بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ

اور ہم نے آپ کی طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم

حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ

## جلد اوّل

سُورۃ الفاتحۃ تا سُورۃ التوبۃ

Dar-ul-Andlus

بسم اللہ الرحمن الرحیم

1 استفادہ میں مزید آسانی کی خاطر اس کتاب میں الیکٹرانک فہرست کا اضافہ کیا گیا ہے

2 فہرست میں کسی قسم کا سہو ہو تو ہمیں ضرور اطلاع فرمائیں

3 اپنی مفید آرا و تجاویز سے ضرور نوازیں

4 مزید الیکٹرانک کتب کے لیے:

https://archive.org/details/@zia_ul_haq_naeem

ziaulhaqnaeem@gmail.com

## استعمال کا طریقہ

## For Android users:

Play store سے Adobe Acrobat Reader انسٹال کریں۔

Adobe Acrobat Reader

1 2 3 4 5
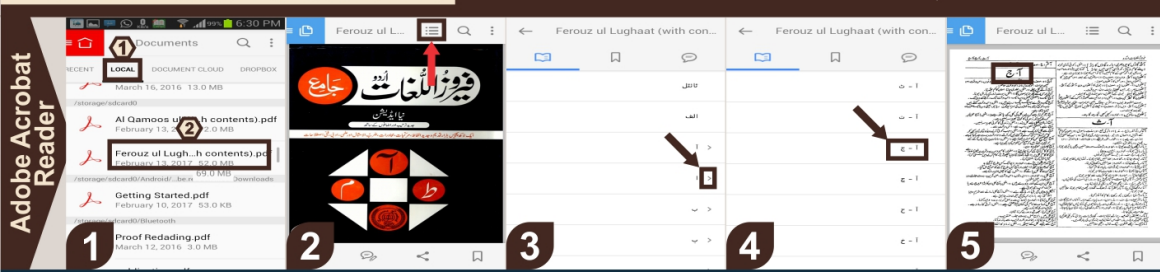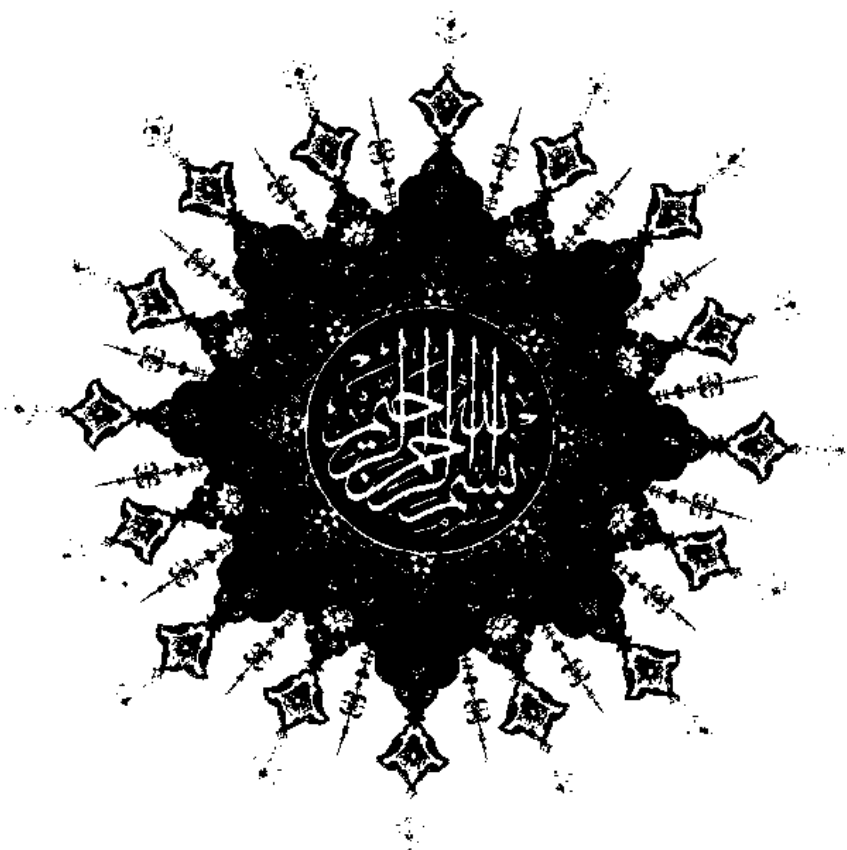
## For iphone users:

1 ibooks استعمال کریں، یا 2 App store سے Adobe Acrobat Reader انسٹال کریں۔

1 ibooks

2 Adobe

## For Desktop & Laptop users:

www.adobe.com سے Adobe Acrobat Reader انسٹال کریں۔

Adobe Acrobat Reader
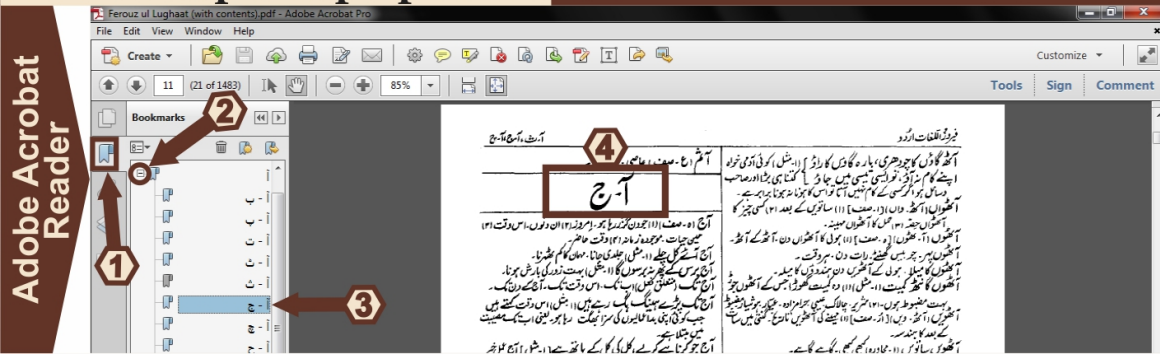
بسم الله الرحمن الرحيم

نام کتاب

# تفسیر القرآن الکریم

## جلد اول

سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ التوبۃ

تفسیر

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ

Dar-ul-Andlus

ناشر

دار الاندلس

Ph: +92-42-37150891 ہیڈ آفس
Fax: +92-42-37150889
4- لیک روڈ چوبرجی لاہور
92-42-37230549+
6- غزنی سٹریٹ نزد رحمٰن مارکیٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾

اور ہم نے آپ کی طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

## جلد اوّل

سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ التوبۃ


Dar-ul-Andlus

دار الاندلس

4-لیک روڈ چوبرجی لاہور
042-37230549

6-غزنی سٹریٹ نزد رحمن مارکیٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314
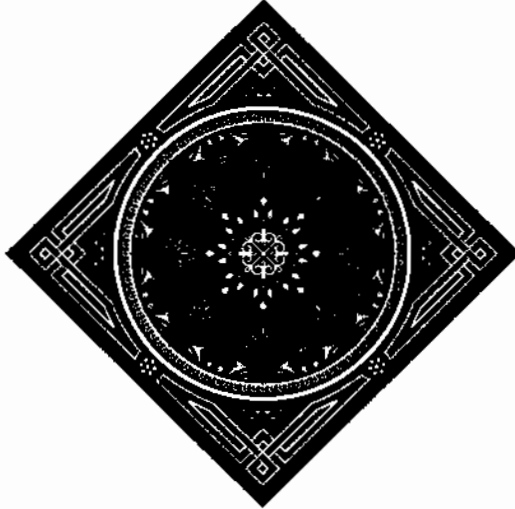
Head Off: +92-42-37150891 Fax: +92-42-37150889

تفسیر القرآن الکریم

# فہرست

# عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ !

قرآن مجید ایک عظیم الشان اور کامل کتاب ہے جو ہر شک وشبہ سے بالا اور ہر نقص سے پاک ہے۔ یہ الہامی کتاب رشد و ہدایت کا منبع، خیر و برکت سے لبریز اور حکمت و دانائی کا خزانہ ہے، جسے انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب حق و باطل میں فرق کرنے والی، کفر وشرک کی تاریکیوں اور گمراہیوں سے نکال کر نورِ توحید سے سینوں کو منور کرنے والی، اپنے ماننے والوں کو کامیابی اور سرفرازی کی خوش خبری سنانے والی اور اعراض برتنے والوں کو زوال اور پستی سے خبردار کرنے والی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(( إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَ يَضَعُ بِهِ آخَرِيْنَ )) [ مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل من يقوم بالقرآن و يعلمه ...... : ۸۱۷ ]

”یقیناً اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے کئی قوموں کو بلند کرتا ہے اور اس سے (روگردانی کرنے والی) اقوام کو پست کرتا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نزولِ قرآن کے ساتھ ہی اس کی تعلیم اور تفہیم کی ابتدا ہوگئی تھی اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

قرآن مجید کی سب سے زیادہ صحیح ترین تفسیر اور قابل اعتماد تشریح وہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کی ہے، جسے تفسیر القرآن بالقرآن کہتے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں یہ اسلوب موجود ہے کہ کسی مسئلہ کو ایک جگہ اختصار کے ساتھ اور دوسری جگہ اسی مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور جسے خود صاحبِ قرآن نے بیان کیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تفسیر ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن کی تعلیم و تبیین ہی تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ان کے سامنے تلاوت قرآن فرماتے تھے اور اللہ کے حکم کے مطابق اس کے معانی و مطالب اور تشریح و تفسیر بھی بیان کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [ النحل : ٤٤ ]

”اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری، تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ غور وفکر کریں۔“

قرآن جن لوگوں کے درمیان نازل ہوا ان کی زبان عربی تھی۔ اہل زبان ہونے کے ناتے وہ عربی زبان کی باریکیوں اور لطافتوں سے خوب واقف تھے اور وہ فصاحت و بلاغت میں عبور، زبان دانی میں کمال اور شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے،

ان جملہ صفات وکمالات کے باوجود انھیں متعدد مقامات پر قرآن فہمی میں دقّت اور مشکل پیش آتی تھی، جس کے حل کے لیے وہ آپ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [ الأنعام: ۸۲ ] ”وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔“ تو اصحاب رسول پر یہ آیت بہت شاق گزری، انھوں نے عرض کی: ”یا رسول اللہ! ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا؟“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ بات اس طرح نہیں جیسے تم سمجھ رہے ہو، بلکہ اس سے مراد وہ ہے جس کا ذکر لقمان (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے سے کیا تھا: ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان : ۱۸ ] ”اے میرے چھوٹے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے (یعنی یہاں ظلم سے مراد شرک ہے)۔“ [ مسلم، الإيمان، باب صدق الإيمان و إخلاصه : ۱۲۴۔ بخاری : ٤٦٢٩ ]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل زبان ہونے اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے کے باوجود لفظ ”ظلم“ کے معنی ومفہوم کا تعیّن نہ کر سکے تو انھوں نے آپ ﷺ سے رجوع کیا تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ یہاں ظلم کا معنی عام ظلم نہیں بلکہ اس سے مراد شرک ہے۔ تو اس سے پتا چلا کہ قرآن فہمی کے لیے صرف اہل زبان ہونا یا عربی زبان کا جاننا ہی کافی نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے بیان کردہ معانی اور تفسیر سے راہنمائی لینا بھی ضروری ہے، جس کا بیش قیمت ذخیرہ کتب احادیث اور سیرت طیّبہ میں محفوظ ہے۔

آپ ﷺ صرف قرآن پڑھ کر سنانے والے ہی نہ تھے، بلکہ آپ ﷺ منصب نبوت کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے شارح ومفسر بھی تھے، اس لیے قرآن کے اجمال کی جو توضیح رسول اللہ ﷺ نے کی ہے وہ صحابہ کرام اور پوری امت کے لیے دلیلِ قطعی اور حُجّت بالغہ کی حیثیت رکھتی ہے اور شرعی امور میں بطورِ دلیل پیش کرنے اور تمام مسائل کے اثبات کے لیے نصِ صریح شمار ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہمیشہ ان دو چیزوں (قرآن و حدیث) کو فہم قرآن کا اصل ماخذ سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ » [ مسند أحمد : ۱۳۱/٤، ح : ۱۷۱۷۹۔ أبو داوٗد : ٤٦٠٤ ]

”(لوگو) سن لو! بے شک مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی۔“

قرآن مجید اور حدیثِ رسول کے درمیان فرق کرنے والوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں تم میں سے کسی شخص کو اپنی مسند پر ٹیک لگائے اس حالت میں نہ دیکھوں کہ اس کے پاس میرے احکام میں سے کوئی حکم آئے کہ جس میں کسی کام کے کرنے کا حکم دیا گیا ہو یا کسی کام سے روکا گیا ہو تو وہ کہے گا کہ ہم اسے نہیں جانتے، ہم تو جو حکم قرآن میں پائیں گے صرف اس کی پیروی کریں گے۔“ [ أبو داوٗد، السنة، باب في لزوم السنة : ٤٦٠٥ ]

آپ ﷺ کے اقوال واعمال سے راہنمائی لینے اور اس کی طرف رجوع کرنے کا صریح حکم اس آیت میں بھی موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [ الحشر : ۷ ] ”اور رسول تمھیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔“

اس کے علاوہ قرآن مجید کی بہت سی دیگر آیات بھی اس معنی و مفہوم پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن کی تفسیر کے لیے آپ ﷺ کے بیان کردہ معانی سب سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد ہیں۔ اسی لیے ائمہ سلف نے فہم قرآن کے لیے قرآن و حدیث ہی کو اصل بنیاد قرار دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی اس وضاحت کے باوجود بعض قدیم اور جدید مفسرین نے حدیث اور سنت نبوی کو ناصرف دلیل قطعی اور حجت شرعی تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا ہے بلکہ تفسیر قرآن کے اصل اور معتبر ترین ماخذ احادیث صحیحہ کو ظنی ماخذ قرار دیا ہے اور اس اصل الاصول کے بجائے لغت عرب، معقولات، درایت، کلام شعرائے عرب، قدیم مخطوطات، اسرائیلیات، اقوالِ رجال، فتاویٰ ائمہ اور آرائے فقہاء کو احادیث صحیحہ اور سنت متواترہ کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتماد سمجھا ہے اور انھیں بنیاد بنا کر قرآن کے الفاظ کے مطالب کا تعین اور مفاہیم کی تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے عام لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں اور بہت سے مسلمان اور غیر مسلم بالخصوص مستشرقین کو قرآنی تعلیمات اور شرعی احکامات پر تنقید اور اعتراضات کرنے کا موقع ملا ہے اور ان کے پیدا کردہ اشکالات اور غلط فہمیوں کی وجہ سے بہت سے لوگ قرآنی تعلیمات اور پیغامِ رسالت سے مستفید ہونے سے محروم ہو گئے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان گمراہ کن خیالات اور فکری کج روی کے بعد اب یہ سوچ پختہ ہوتی جا رہی ہے کہ قرآن کی اصل تعبیر اور صحیح تفسیر صرف قرآن اور حدیث ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ موجودہ ترقی یافتہ دور اور عصری فکر و شعور کا بھی تقاضا ہے کہ قرآن مجید کی مستند اور معیاری تفاسیر کو قرآن فہمی کے لیے عام کیا جائے اور قرآن اور قارئین کے درمیان حائل ہونے والے ان باطل نظریات، وضعی قاعدوں اور خود ساختہ اصولوں کے پردوں کو چاک کر دیا جائے، جو علوم و فنون اور معقولات و درایت کے نام سے روحِ قرآن اور حکمت ربانی کو سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، تاکہ عام مسلمان قرآنی تعلیمات سے براہِ راست استفادہ کر سکیں اور اس عظیم چشمۂ صافی سے اپنی علمی، تحقیقی اور روحانی پیاس بجھا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے فضیلۃ الاستاذ الشیخ الحافظ عبد السلام بن محمد بھٹوی ﷾ کو اس نہج پر تفسیر لکھنے کی توفیق اور سعادت بخشی، اس تفسیر میں انھوں نے احادیث صحیحہ، آثارِ صحابہ اور منہجِ سلف کی روشنی میں تفسیر بالماثور کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے اور عام مفسرین کے برعکس انبیائے کرام اور سابقہ امتوں کے حالات و واقعات کی تفصیل بیان کرنے میں اسرائیلیات اور غیر مستند روایات سے مکمل اجتناب کیا ہے اور ان کے حالات و واقعات کے بیان میں ثقاہت اور حقائق کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن کے مشکل اور تفصیل طلب اہم مقامات کی بڑی عمدہ اور مفید تشریح کی ہے جو متلاشیانِ حق و صداقت کے لیے متاعِ گمشدہ ہے۔ مزید برآں بعض مقامات پر قرآن کے مشکل الفاظ کے معانی کی لغوی اور نحوی وضاحت بھی کی ہے۔ مذکورہ بالا نمایاں اور امتیازی خصوصیات کی حامل یہ تفسیر محترم حافظ صاحب کی 45 سال سے زائد عرصہ پر محیط تعلیمی خدمات، تدریسی تجربے اور دقیق مطالعہ کا خلاصہ ہے۔ اس تفسیر کی نمایاں اور قابل ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ترجمۂ قرآن بھی محترم حافظ صاحب ہی کا ہے، جو لفظی اور با محاورہ ترجمے کا حسین امتزاج ہے، جس میں انھوں نے عام فہم اسلوبِ نگارش اختیار کرتے ہوئے الفاظ کے معانی کے لیے اختصار اور جامعیّت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

محترم حافظ صاحب ایک کامیاب مدرس اور اعلیٰ پائے کے کہنہ مشق استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ وعظ ونصیحت اور دعوت و ارشاد کے میدان میں بھی قابل ذکر خدمات رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں علم ومطالعہ کی وسعت، ایک ماہر استاذ کے فنی محاسن اور واعظ فصیح اللسان کی خوبیوں کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے، ان کا اسلوبِ بیان سادہ، رواں اور سلیس ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مساعئ جمیلہ کو شرف قبولیت بخشے اور اسے ہر قارئ تفسیر کے لیے اصلاحِ عقائد، ترغیب اعمال صالحہ، تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلوب واذہان کا وسیلہ بنا دے۔

ادارہ ''دَارُالاَندُلس'' کی طرف سے مذکورہ جملہ صفات کی حامل چار جلدوں پر مشتمل ''تفسیر القرآن الکریم'' خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائٹل، نفیس طباعت، اعلیٰ اور معیاری کاغذ، دورنگوں میں جاذبِ نظر طباعت اور خوبصورت کتابت سے آراستہ محترم قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

زیرِ نظر تفسیر کی تیاری کے طویل اور صبر آزما مراحل کی نگرانی فاضل رفیق مجلس اور ریسرچ سکالر ابو عمر محمد اشتیاق اصغر نے کی، اس تفسیر کے مندرجات میں ان کے مفید اور قابل قدر مشورے بھی شامل ہیں۔ ریسرچ سکالر ابو الوفاء حافظ سعید الرحمٰن نے بڑی محنت اور ذمہ داری کے ساتھ تخریج کا کام کیا، جلد اوّل میں حافظ رضوان عبد اللہ نے ان کی معاونت کی۔ احادیث کی اصل ماخذ کے ساتھ مراجعت کا محنت طلب کام ابو انیس حافظ ثناء اللہ خان اور ابو سعد مطیع الرحمٰن نے کیا۔ ان تمام احباب نے شب و روز بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ مسودے کی بار بار پروف خوانی کی۔ کمپوزنگ اور تزئین صفحات کا تھکا دینے والا کام ابو خزیمہ محمد شفیق نے کیا اور ابو حمزہ حافظ آصف رشید نے اس کام میں ان کی معاونت کی۔ متن قرآن کی سیٹنگ ماہر تصمیم حنظلہ اقبال نے کی اور تفسیری آیات نکالنے کا کام ظہیر الدین بابر نے کیا اور عطاء الرحمٰن طاہر اور محمد عمر نے جزوی طور پر ان کی معاونت کی۔ خوبصورت اور جاذبِ نظر سرورق ابو حمزہ ضیاء الرحمٰن نے تیار کیا۔ ان کے علاوہ بعض بھائیوں نے پروف خوانی، تفسیری آیات نکالنے اور کمپوزنگ کا جزوی طور پر کام کیا، اللہ تعالیٰ ان سب کے کام کو قبول فرمائے۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ جس کی خاص توفیق اور بے پناہ فضل و کرم سے اس عالی شان اور قابل ذکر تفسیر کی تکمیل ہوئی اور ''دَارُالاَندُلس'' کی ٹیم اور تمام رفقاء مجلس التحقیق کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں، جن کی باہمی مشاورت و معاونت اور شب و روز کی محنت کا عمدہ اور نفیس ثمر علم و حکمت کے موتیوں کا خزینہ بن کر تفسیر کے اوراق پر بکھرا ہوا دادِ تحسین حاصل کرنے کے لیے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کو دنیا و آخرت میں خیر کثیر سے نوازے اور محترم حافظ صاحب کے لیے اسے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین !!

محتاجِ دعا

جاوید الحسن صدیقی

مدیر دَارُالاَندُلس

یکم رمضان 1435ھ، بمطابق 30 جون 2014ء

# تقدیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی أَشْرَفِ الْأَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ، أَمَّا بَعْدُ !

حافظ عبدالسلام بن محمد ﷾ نے بحمد اللہ تعالیٰ پہلے قرآن حکیم کا عام فہم ترجمہ کیا اور اب تفسیر قرآن کا کام مکمل کر رہے ہیں۔ ترجمۃ القرآن میں حافظ صاحب نے جہاں سادگی، آسانی اور تسلسل کو مدنظر رکھا ہے وہاں قرآن کے نبر و تنغیم اور اعراب کا بھی لحاظ رکھا ہے، ترجمہ معتبر اور مستند ہے۔ کثیر تعداد میں لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اللہ مزید برکتوں سے نوازے۔ تفسیر القرآن میں بھی حافظ صاحب کا انداز سادہ اور عام فہم ہے۔ ایک طرف اس تفسیر کو تفسیر بالماثور کا شاندار نمونہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی آیات کی تفسیر احادیث اور آثار صحابہ سے کی گئی ہے اور دوسری طرف یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے کہ کوئی پختہ عالم دین ہو یا عام پڑھا لکھا یا کم پڑھا لکھا، سب اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حافظ صاحب تدریس کا طویل تجربہ رکھتے ہیں اور تقریباً اتنے ہی عرصہ سے خطیب بھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں گہرا علمی شعور عطا کیا ہے اور نصوص کا وسیع مطالعہ بھی ہے۔ مسائل کے استنباط میں سلف کا منہج پیشِ نظر رہتا ہے اور ہر شخص سے اس کی سطح پر جا کر بات کرتے ہیں اور اس کی ذہنی الجھن کو دور کرتے ہیں، اکثر سوال پوچھنے والے مطمئن ہوتے ہیں۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو داعی، مدرس، فقیہ اور خطیب کی خوبیاں عطا کی ہیں۔ پھر طبیعت میں ظرافت بھی ہے اور عاجزی بھی۔ بچے بھی دل کی بات حافظ صاحب سے کہہ لیتے ہیں اور بڑے تو ہر راز کھول دیتے ہیں اور پورا اعتماد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو ایسی جماعت کی نعمت بھی عطا کی ہے جو دعوت و جہاد کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہے۔ قدم قدم پر مسائل پیش آتے ہیں تو اکثر ان مسائل کے حل کے لیے حافظ صاحب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اجتماعی مسائل، جماعتی کیفیات اور حالات انسان کی بہت تربیت کرتے ہیں اور پھر اس زبان اور قلم سے جو جملہ بھی نکلتا ہے اس میں گہرائی، پختگی اور فقہ الواقع کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب شخصیت کے فکر پر قرآن و حدیث اور منہج سلف حاوی ہو اور عمل میں اللہ کا تقویٰ ہو۔ حافظ صاحب کی تفسیر میں بحمد اللہ تعالیٰ ان کے علم، تجربہ اور شخصیت کا اثر موجود ہے، اللہ قبول فرمائے۔ آمین !

غالباً 1988ء کی بات ہے میں نے ایک ماہانہ رسالے میں حافظ عبدالسلام صاحب کا لکھا ہوا تفسیر کے موضوع پر ایک کالم پڑھا، بہت پسند آیا، پڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے سوالات کا جواب مجھے قرآن سے مل رہا ہے۔ پھر حافظ صاحب سے رابطے بڑھتے گئے اور جماعتی امور میں لمبا عرصہ اکٹھے کام کرنے کا اللہ نے

موقع دیا۔ ہمیشہ سے خواہش رہی کہ حافظ صاحب کو تفسیر کے کام کے لیے آمادہ کیا جائے، گاہے گاہے بات بھی ہوتی رہی۔ مجالس میں بھی یہ موضوع زیرِ بحث آتا رہا۔ بالآخر جماعت کی ایک بڑی مجلس میں فیصلہ ہوا اور حافظ صاحب نے ذمہ داری قبول کر لی۔ کام شروع کیا تو ایک آزمائش آ گئی، حافظ صاحب کی طبیعت کافی علیل ہوگئی۔ ہم نے اللہ سے بار بار دعا کی کہ اللہ صحت و عافیت سے نوازے تاکہ حافظ صاحب تفسیر کا کام مکمل کریں۔ الحمد للہ دعائیں قبول ہوئیں، اللہ نے صحت دی۔ حافظ صاحب مسلسل محنت کے ساتھ تفسیر پر کام کر رہے ہیں۔ اللہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے اور عام لوگوں کے لیے مفید بنائے۔ (آمین)

محمد سعید

(امیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان)

یکم رمضان ۱۴۳۲ھ

# عرضِ مترجم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ، أَمَّا بَعْدُ !

قرآن مجید کے تراجم مختلف زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں، اردو زبان کو بھی یہ سعادت سیکڑوں تراجم کی صورت میں حاصل ہے۔ ہر مترجم نے اس کے لیے اپنی بہترین کوشش کی ہے اور چند گمراہ لوگوں کو چھوڑ کر ہر ترجمہ کسی نہ کسی خصوصیت اور خوبی کا حامل ہے۔ اتنے تراجم کی موجودگی میں ایک نئے ترجمے کی بظاہر کوئی ضرورت نظر نہیں آتی، مگر میں نے جو تراجم میسر ہو سکے بغور پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ نئے ترجمے کی اب بھی ضرورت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ برصغیر میں قرآن مجید کے ترجمے کا جو شرف شاہ ولی اللہ اور ان کے نامور بیٹوں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین ؒ کے حصے میں آیا وہ کسی سے مخفی نہیں، بعد میں آنے والے سب لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور اب بھی کوئی ترجمہ کرنے والا ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ شاہ ولی اللہ ؒ کا ترجمہ فارسی میں ہے اور نہایت واضح اور مفید ہے۔ شاہ عبدالقادر ؒ کا ترجمہ بامحاورہ اردو میں اور شاہ رفیع الدین ؒ کا ترجمہ لفظی ہے اور دونوں بہترین ترجمے ہیں۔ ان کے بعد اکثر حضرات کے تراجم بامحاورہ اور چند ایک کے لفظی ہیں، مگر ان تمام تراجم کے باوجود کام کی گنجائش باقی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں آنے والا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف بے مقصد نہیں ہو سکتا، مگر اکثر تراجم میں کئی الفاظ کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے، الفاظ میں حروف کی کمی بیشی کو ترجمے کے وقت ملحوظ نہیں رکھا گیا، الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے معنی میں جو تاکید یا حصر پیدا ہوتا ہے اس کا خیال نہیں کیا گیا اور بعض تراجم میں ایک جگہ ان میں سے کسی چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے تو دوسری جگہ اس کا خیال نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ بعض تراجم میں قرآن کے الفاظ سے زائد الفاظ ترجمے میں داخل کر دیے گئے ہیں، جنھیں تشریح کہا جا سکتا ہے، کلام اللہ کا ترجمہ نہیں۔

اس لیے ایسے ترجمے کی ضرورت باقی ہے جس میں قرآن مجید کے کسی لفظ کا ترجمہ چھوڑا نہ گیا ہو اور اس سے زائد ترجمہ میں داخل نہ کیا گیا ہو۔ میں نے اپنی طاقت کے مطابق یہ کام کیا ہے، مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں حق ادا نہیں کر سکا اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص بھی یہ حق ادا نہیں کر سکتا، کیونکہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ سو فیصد ممکن نہیں، خصوصاً عربی زبان جو نہایت جامع زبان ہے، جس کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہیں، اس کے الفاظ کا تمام مطالب ادا کرنے والا اردو میں متبادل لانا ممکن نہیں، پھر اللہ کا کلام، جس کے ہر حرف میں معانی کا ایک جہان موجود ہے، جس کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثل پوری مخلوق مل کر بھی نہیں بنا سکتی، اس کا ایسا ترجمہ جس میں تمام معانی و مطالب اور فصاحت و بلاغت کے تمام نکات آ سکیں، کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر بھی ہم وسعت کے مطابق مکلف ہیں اور امید ہے میرے ترجمے سے کام کرنے والوں کو راستہ ملے گا اور

---

**نوٹ:** قارئین سے گزارش ہے کہ ترجمہ پڑھنے سے پہلے عرض مترجم اچھی طرح پڑھ لیں، تاکہ اس ترجمہ سے صحیح فائدہ اٹھایا جا سکے۔

وہ مزید بہتر کی کوشش کر سکیں گے۔ میں نے لفظی ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ حتی الامکان آیت کے ہر لفظ کا ترجمہ آجائے اور اسے اردو محاورے کے مطابق بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ترجمہ میں جن باتوں کا خیال رکھا گیا ہے وہ سب اس مختصر تحریر میں نہیں آسکتیں، ہاں دوسرے تراجم ساتھ رکھ کر پڑھنے سے ان کا اندازہ ہو سکتا ہے، ان میں سے بطور مثال چند ایک یہ ہیں:۔

① صیغۂ مبالغہ کا ترجمہ:

عربی زبان کے کچھ اوزان معنی میں مبالغہ کے لیے وضع کیے گئے ہیں، مثلاً ''قادر'' اور ''قدیر''، ''عالم'' اور ''علیم'' کے معنی میں فرق ہے، مگر اکثر تراجم میں ''قدیر'' کا معنی قادر، یا قدرت رکھنے والا اور ''علیم'' کا معنی جاننے والا، یا واقف کیا گیا ہے، جب کہ ''قدیر'' کا معنی پوری طرح قادر، یا خوب قدرت رکھنے والا اور ''علیم'' کا معنی خوب جاننے والا، یا پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ بعض حضرات نے کچھ الفاظ کے ترجمے میں اس کا خیال رکھا ہے کچھ میں نہیں رکھا، بعض نے ایک لفظ کے ترجمہ میں ایک جگہ یہ بات ملحوظ رکھی ہے اور دوسرے مقامات پر ملحوظ نہیں رکھی۔ میں نے "رحمان، رحیم، علیم، حکیم، عزیز، عفوّ، غفور، توّاب" اور دوسرے تمام الفاظ میں، جہاں بھی وہ آئے ہیں، اس بات کا خیال رکھا ہے۔

② حروف تاکید:

عربی زبان میں تاکید کے لیے بہت سے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً حروف قسم، انَّ، لام تاکید، نون تاکید وغیرہ، بعض اوقات ایک ہی جملہ میں تاکید کے لیے کئی حروف لائے جاتے ہیں، اردو محاورہ میں عموماً ایسا نہیں ہوتا، اس لیے بعض مترجمین نے تو اردو محاورے کو مقدم رکھتے ہوئے تاکید کے حروف کا ترجمہ ہی نہیں کیا، یا ایک حرف کا ترجمہ کر کے باقی کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یٰس میں ﴿ اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴾ اور ﴿ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴾ کا ایک ہی ترجمہ کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دوسری آیت میں ''لام'' محض بے فائدہ ٹھہرتا ہے، جب کہ ایسا خیال کرنا بھی درست نہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تاکید کے کسی حرف کا مفہوم ترجمے میں آنے سے رہ نہ جائے۔ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ ''لام'' کا ترجمہ ''البتہ'' اور ''انَّ'' کا ترجمہ ''تحقیق'' سے کرتے ہیں، مگر یہ دونوں لفظ موجودہ دور میں اردو میں عام مستعمل نہیں، اس لیے میں نے تاکید کے عام مستعمل الفاظ میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ''لام تاکید، نون تاکید ثقیلہ و خفیفہ، انَّ اور قد'' کے لیے ''ضرور، بے شک، یقیناً، بلاشبہ، کوئی شک نہیں، ہر صورت، حقیقت یہ ہے، واقعہ یہ ہے، لازماً، فی الواقع، واقعی'' وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں اور بعض اوقات لفظ ''تو'' استعمال کیا ہے، مثلاً یوسف علیہ السلام کے قول ﴿ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴾ کا ترجمہ ''یقیناً ہم تو اس وقت ظالم ہوں گے۔'' تاکید کے لیے ''تو'' کا استعمال میں نے بڑے بڑے جلیل القدر علماء کے تراجم سے سیکھا ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ تاکید کے تمام الفاظ کا ترجمہ کرنا اور پھر محاورے اور کلام کی روانی بھی ملحوظ رکھنا کتنا مشکل کام ہے، مگر ان شاء اللہ تاکید کے زیادہ سے زیادہ الفاظ کے مفہوم کی ادائیگی کے ساتھ محاورے کی حتی الوسع کوشش سے قارئین محظوظ ہوں گے اور محسوس کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بات کس قدر تاکید کے ساتھ فرمائی ہے۔ اگرچہ تاکید کے ہر لفظ کا ترجمہ پھر بھی نہیں ہو سکا اور حقیقت یہ ہے کہ ہو بھی نہیں سکتا۔

③ تنوین:

عربی میں تنوین بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوتی ہے، مثلاً تنکیر، تعظیم، تحقیر وغیرہ، میں نے کوشش کی ہے کہ ہر

تنوین کا موقع کے مناسب ترجمہ آجائے، مثلاً ﴿ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ [ البقرۃ : ١٠ ] ’’ان کے دلوں ہی میں ایک بیماری ہے۔‘‘ ﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [ التوبۃ : ٢٨ ] ’’اور اگر تم کسی قسم کے فقر سے ڈرتے ہو تو اللہ جلد ہی تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔‘‘ ﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ ﴾ [ الطور : ٢١ ] ’’اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔‘‘

قارئین ہر تنوین پر ٹھہر کر ترجمے پر غور فرمائیں گے تو ان پر ہر مقام میں میری محنت واضح ہو جائے گی۔ تنوین کا مفہوم بھی میں نے اپنے پاس سے نہیں بلکہ کسی نہ کسی تفسیر سے اخذ کر کے لکھا ہے۔

## ④ مفعول مطلق:

عربی زبان میں تاکید کے لیے فعل کے بعد مصدر لایا جاتا ہے، عام طور پر اس کا ترجمہ محاورہ کی مشکل کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے، میں نے اس کا ترجمہ بھی کیا ہے اور ہر مقام پر مصدر کی تنوین کے مفہوم کو مدنظر رکھا ہے، مثلاً ﴿ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ١٢ ] ’’اور ہر چیز، ہم نے اسے کھول کر بیان کیا ہے، خوب کھول کر بیان کرنا۔‘‘ ﴿ فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِیْرًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ١٦ ] ’’تو اس پر بات ثابت ہو جاتی ہے، پھر ہم اسے برباد کر دیتے ہیں، بری طرح برباد کرنا۔‘‘

## ⑤ ’’مِنْ ‘‘ کا استعمال:

لفظ ’’مِنْ‘‘ بھی کئی معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً ’’بیان‘‘ کے لیے، ’’بعض‘‘ کا معنی دینے کے لیے، ’’تاکید‘‘ کے لیے، ’’تعلیل‘‘ کے لیے وغیرہ، ہر مقام کے مطابق ترجمے کے لیے بہت محنت درکار ہے، مثلاً ﴿ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ [ الجمعۃ : ١٠ ] ’’اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو۔‘‘ ﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ﴾ [ الزمر : ٢٧ ] ’’اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال بیان کی ہے۔‘‘ ﴿ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا ﴾ [ الحج : ٢٢ ] ’’جب کبھی ارادہ کریں گے کہ سخت گھٹن کی وجہ سے اس سے نکلیں، اس میں لوٹا دیے جائیں گے۔‘‘ ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَدْ یَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴾ [ الممتحنۃ : ١٣ ] ’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ غصے ہو گیا، جو آخرت سے اسی طرح ناامید ہو چکے ہیں جس طرح وہ کافر ناامید ہو چکے ہیں جو قبروں والے ہیں۔‘‘

## ⑥ إِذَا مَا :

عام طور پر چند الفاظ کو زائد کہہ کر ترجمہ میں ان کا خیال نہیں کیا جاتا، حالانکہ کوئی سمجھدار آدمی بھی کوئی لفظ بلا مقصد نہیں بولتا تو رب العالمین کے کلام میں کوئی لفظ بے مقصد کیسے ہو سکتا ہے۔ ان الفاظ میں سے ایک ’’ مَا ‘‘ ہے، مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْهَا ﴾ [ الزمر : ٧١ ] دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوْهَا ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ٢٠ ] اب

دونوں کا ایک ہی ترجمہ ہو تو ''مَا'' بالکل بے فائدہ ٹھہرتا ہے۔ زمخشری نے فرمایا: ﴿ حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ ﴾ میں ''اِذَا'' کے بعد ''مَا'' اس کی تاکید کے لیے ہے۔ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ آگ کے پاس پہنچنے کا وقت ہی ان پر شہادت کا وقت ہوگا، یہ نہیں کہ کچھ وقت شہادت سے خالی ہے۔ تو اس لیے میں نے ''اِذَا'' کا ترجمہ ''جب'' اور ''اِذَا مَا'' کا ترجمہ ''جونہی'' کیا ہے، مثلاً ﴿ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ﴾ [ یونس : ٥١ ] ''کیا پھر جونہی وہ (عذاب) آپڑے گا تو اس پر ایمان لے آؤ گے؟''

### ⑦ اِمَّا :

یہ لفظ ''اِن'' شرطیہ اور ''ما'' سے مرکب ہے، عام طور پر ''اِن'' اور ''اِمَّا'' دونوں کا ترجمہ ''اگر'' کیا جاتا ہے، مگر اس صورت میں ''ما'' بے فائدہ ٹھہرتا ہے، میں نے ترجمہ میں اس کا خیال رکھا ہے، مثلاً ﴿ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ ﴾ [ بنی إسرائیل : ٢٣ ] ''اگر کبھی تیرے پاس دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ ہی جائیں تو ان دونوں کو ''اف'' مت کہہ۔'' شوکانی رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں فرمایا: ''اِن'' شرطیہ اور ''ما'' ابہامیہ ہے۔'' تو میں نے ''اِن'' شرطیہ کے ساتھ ''ما'' کے ابہام اور نون تاکید کے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ دوسری مثال ﴿ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ ﴾ [ الأنفال : ٥٧ ] ''پس اگر کبھی تو انھیں لڑائی میں پا ہی لے۔'' ﴿ وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ ﴾ [ یونس : ٤٦ ] ''اور اگر کبھی ہم تجھے اس کا کچھ حصہ واقعی دکھلا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں۔'' دوسرے تراجم میں اس ''ما'' اور نون تاکید کا ترجمہ شاید ہی ملے گا۔

### ⑧ ''اَنْ'' زائدہ:

﴿ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا ﴾ [ هود : ٧٧ ] اور ﴿ وَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا ﴾ [ العنکبوت : ٣٣ ] دونوں آیات کا ترجمہ ''اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے'' کیا جاتا ہے، میں نے ''اَنْ'' کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر دوسری آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے: ''اور جیسے ہی ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے۔'' ﴿ فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ﴾ [ یوسف : ٩٦ ] ''پھر جیسے ہی خوشخبری دینے والا آیا اس نے اسے اس کے چہرے پر ڈالا تو وہ پھر بینا ہوگیا۔''

### ⑨ ''باء'' زائدہ:

بعض اوقات نفی کے بعد ''باء'' آتی ہے جو نفی کی تاکید کے لیے ہوتی ہے، عام طور پر ترجمہ میں اس کا خیال نہیں کیا جاتا، میں نے حتی الوسع اس کا لحاظ رکھا ہے، مثلاً ﴿ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ البقرة : ٨ ] ''حالانکہ وہ ہرگز ایمان والے نہیں۔'' ﴿ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ [ فاطر : ٢٢ ] ''اور تو ہرگز اسے سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہے۔'' اس فرق کی وجہ سے ﴿ لَسْتَ مُؤْمِنًا ﴾ [ النساء : ٩٤ ] کا معنی ''تو مومن نہیں'' اور ﴿ وَمَاۤ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ النور : ٤٧ ] کا معنی ہوگا ''اور یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔''

### ⑩ ''الف لام'' کا مفہوم:

''الف لام'' عربی زبان میں کئی معانی کے لیے آتا ہے، مثلاً ''تعریف، تخصیص، استغراق، جنس، عہد'' وغیرہ، مثلاً ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الفاتحة] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' ﴿فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴾ [المزمل:١٦] ''سو فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے پکڑ لیا، نہایت سخت پکڑنا۔'' میں نے موقع کے مناسب ہر ''الف لام'' کے مفہوم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

### ⑪ حصر کا مفہوم:

خبر پر ''الف لام'' آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ﴾ [الملك:٢] ''اور وہ سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے'' کے بجائے ''اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے'' ہوگا۔ اکثر تراجم میں یہ خیال نہیں رکھا گیا، بعض تراجم میں ایک جگہ یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے تو دوسری جگہ اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

### ⑫ تخصیص:

کوئی اسم یا جار مجرور، جس کا محل بعد میں ہو، جب اسے پہلے لایا جائے تو اس سے تخصیص پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً ﴿قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ ﴾ [ الزمر : ١٤ ] ''کہہ دے میں اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں۔'' ﴿وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ [الذاريات : ٢٢ ] ''اور آسمان ہی میں تمھارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔'' ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ [الملك : ١] اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے ''بہت بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے'' مگر اس سے ''بِيَدِهِ'' کو پہلے لانے کا اور ''الْمُلْكُ'' کے ''الف لام'' کا معنی ادا نہیں ہوتا، اس لیے اس کا ترجمہ یہ ہونا چاہیے ''بہت برکت والا ہے وہ کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔''

### ⑬ الفاظ کے زائد حروف کا لحاظ:

لفظ میں بعض حروف کے اضافے سے معنی بدل جاتا ہے، مثلاً ''نَزَلَ'' کا معنی ''وہ اترا'' اور ''اَنْزَلَ'' کا معنی ''اس نے اتارا'' اور بعض اوقات طلب یا دوسرے معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر حرف کے اضافے کے باوجود معنی ایک ہی ہو تو معنی میں زیادتی مراد ہوتی ہے، مثلاً ﴿يَسْخَرُوْنَ ﴾ [ صافات : ١٢ ] اور ﴿يَسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ [ صافات : ١٤ ] دونوں کا معنی ''مذاق اڑاتے ہیں'' کیا جائے تو ''سین'' اور ''تاء'' کا اضافہ بے فائدہ ٹھہرتا ہے، اس لیے ﴿يَسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ کا معنی ہوگا ''خوب مذاق اڑاتے ہیں۔'' اس فرق کا لحاظ بہت کم مترجمین نے رکھا ہے۔ بطور مثال چند آیات '' يَذْبَحُوْنَ '' کی بجائے ﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ ﴾ [البقرة : ٤٩ ] ''تمھارے بیٹوں کو بری طرح ذبح کرتے تھے۔'' اور ''حَيَاءٍ'' کے بجائے ﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ﴾ [ القصص : ٢٥ ] ''تو ان دونوں میں سے ایک بہت حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔'' اسی طرح ﴿فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ [ طٰه : ٧١ ] ''پس یقیناً میں ہر صورت تمھارے ہاتھ اور تمھارے

پاؤں مخالف سمت سے بری طرح کاٹوں گا اور ضرور ہر صورت تمھیں کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا۔‘‘ ﴿ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴾ [الأحزاب : ٦١] ’’جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے، بری طرح ٹکڑے کیا جانا۔‘‘ ﴿ فَلَمَّا اسْتَايْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ﴾ [یوسف:٨٠] ’’پھر جب وہ اس سے بالکل ناامید ہو گئے تو مشورہ کرتے ہوئے الگ جا بیٹھے۔‘‘ ﴿ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف:١٨٥] ’’اور کیا انھوں نے نگاہ نہیں کی آسمانوں اور زمین کی عظیم الشان سلطنت میں۔‘‘ ﴿ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [الأنعام : ٥٥] ’’اور اسی طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ خوب واضح ہو جائے۔‘‘ ان آیات کے خط کشیدہ الفاظ اور ان کے ترجمہ پر غور فرمائیں، ہر زائد حروف کا مفہوم ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

### ⑭ صیغے کے مطابق ترجمہ:

قرآن مجید میں آنے والے ہر لفظ کا ترجمہ میں نے اس کے صیغے کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً فعل ماضی، فعل مضارع، اسم فاعل، اسم مفعول وغیرہ۔ ہاں جملہ شرطیہ ہونے یا سیاق کلام کی وجہ سے ماضی کا معنی مضارع میں یا مضارع کا معنی ماضی میں کرنا ضروری ہو تو اسے بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

### ⑮ آسان اردو میں ترجمہ:

ترجمہ زیادہ سے زیادہ آسان اردو میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، فارسی یا عربی الفاظ میں ترجمہ سے مطلب ادا ہو بھی جائے تو عام آدمی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مثلاً بعض اردو ترجمہ کرنے والوں نے ’’مُرْسَلُوْنَ ‘‘ کا ترجمہ ’’فرستادگان الٰہی‘‘، ’’كَذَّابٌ اَشِرٌ ‘‘ کا ترجمہ ’’برخود غلط‘‘، ’’الْحَمِيْدُ ‘‘ کا ترجمہ ’’ستودہ‘‘ اور ’’رَيْبَ الْمَنُوْنِ ‘‘ کا ترجمہ ’’حوادث دہر‘‘ کیا ہے، اس لیے اس سے احتراز کیا گیا ہے۔

### ⑯ لام امر کا ترجمہ:

عام طور پر امر غائب کا ترجمہ لفظ ’’چاہیے‘‘ سے شروع کیا جاتا ہے، مثلاً ﴿ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ﴾ [المائدة : ٤٧] ’’اور چاہیے کہ اہلِ انجیل اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے۔‘‘ میں نے کوشش کی ہے کہ لفظ ’’چاہیے‘‘ کے بغیر امر کا مفہوم ادا ہو جائے، یا پھر ’’چاہیے‘‘ کے بجائے ’’لازم ہے‘‘ استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت کا ترجمہ ہوگا ’’اور لازم ہے کہ انجیل والے اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے۔‘‘

### ⑰ ’’كَانَ‘‘ کا ترجمہ:

تقریباً تمام مترجمین نے ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [آل عمران : ٣١] اور ﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان : ٧٠] کا ایک ہی ترجمہ کیا ہے کہ ’’اور اللہ غفور رحیم ہے‘‘، اسی طرح ﴿ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة : ٤٠] اور ﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ [الفتح :٧] کا اور دوسری تمام صفات کا جو ’’ كَانَ ‘‘ کے بغیر آئی ہیں، یا ’’ كَانَ ‘‘ کے ساتھ آئی ہیں، ایک ہی ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ’’ كَانَ ‘‘ محض بے فائدہ ٹھہرتا ہے، جب کہ ’’ كَانَ‘‘ ماضی میں خبر کے ثبوت کے لیے

آتا ہے۔ اب اگر ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ کا ترجمہ ''اور اللہ غفور رحیم تھا'' کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب وہ ایسا نہیں، حالانکہ یہ بات غلط ہے اور اگر اس کا ترجمہ ''اور اللہ غفور رحیم ہے'' کریں تو ''کَانَ'' کا کچھ مطلب نہیں رہتا۔

ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ مشکل حل فرمائی ہے، صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ حم السجدۃ میں ہے کہ ایک آدمی نے ان سے چند سوالات کیے، جن میں سے ایک سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾، ﴿عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾، ﴿سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ تو گویا وہ ماضی میں ان صفات سے موصوف تھا، پھر نہ رہا۔ تو انھوں نے جواب دیا: ''سَمّٰى نَفْسَهُ ذٰلِكَ، وَ ذٰلِكَ قَوْلُهُ، اَيْ لَمْ يَزَلْ كَذٰلِكَ، فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُرِدْ شَيْئًا اِلَّا اَصَابَ بِهِ الَّذِيْ اَرَادَ'' خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہ اسماء و صفات ماضی میں بھی تھے اور ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ گویا ''کَانَ'' یہاں دوام کے لیے ہے، جو ہمیشگی پر دلالت کر رہا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق ان آیات کا ترجمہ یوں ہوگا: ''اور اللہ ہمیشہ سے غفور رحیم ہے'' ''عزیز حکیم ہے'' ''سمیع بصیر ہے۔'' اس طرح اردو تراجم میں ''کَانَ'' کے مفہوم کی ادائیگی میں پائی جانے والی کمی ان شاء اللہ پوری ہوگئی۔ بعض عربی مفسرین نے ''کَانَ'' کے اس مفہوم کو مختلف مقامات پر اجاگر کیا ہے، مثلاً ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً﴾ [ بنی إسرائيل:٣٢ ] کی تفسیر میں ابوحیان نے فرمایا: ''اَلْمَعْنٰى لَمْ يَزَلْ اَيْ لَمْ يَزَلْ فَاحِشَةً'' [البحر المحيط] یعنی ''وہ ہمیشہ سے بے حیائی ہے۔''

اسی طرح ﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ [ مريم : ٢٩ ] کے متعلق فرمایا: '' اَيْ لَمْ يَزَلْ '' [ البحر المحيط ] یعنی ''ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے۔'' ﴿وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ [ الأنبياء : ١٠٤ ] بقاعی نے فرمایا: ''اَيْ اَزَلًا وَ اَبَدًا'' [نظم الدرر] ''یہ وعدہ ہمارے ذمے ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں۔'' اردو تفاسیر میں ایک مفسر نے ایک مقام پر ترجمے میں یہ بات ملحوظ رکھی ہے، چنانچہ انھوں نے ﴿اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا﴾ [ طٰه:٣٥ ] کا ترجمہ کیا ہے ''تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران رہا ہے۔''

''کَانَ'' اس کے علاوہ بھی کئی معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جن کا لحاظ تقریباً سبھی مترجمین نے رکھا ہے۔ (والحمد للہ) البتہ بعض اوقات ''کَانَ'' نسبت کی تاکید کے لیے آتا ہے، اسے اردو ترجمے میں ادا کرنا بہر حال مشکل ہے۔

## ⑱ نفی کے ساتھ ''کَانَ'' کا ترجمہ:

نفی والے جملے میں ''کَانَ'' کا مفہوم شاید ہی کسی مترجم نے ادا کیا ہو۔ یہ مفہوم لفظ ''کبھی'' سے ادا ہو جاتا ہے۔ (ان شاء اللہ) مثلاً ﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ [ بنی إسرائيل : ٢٠ ] ''اور تیرے رب کی بخشش کبھی بند کی ہوئی نہیں۔'' ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [ بنی إسرائيل : ١٥ ] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔'' ''مَا كَانَ'' کے دوسرے معانی، مثلاً ''لائق نہیں، ممکن نہیں'' وغیرہ کا لحاظ تمام مترجمین نے رکھا ہے۔ [ والحمد لله ]

یہ چند چیزیں مثال کے طور پر ذکر کی گئی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے علماء ان سے بے خبر تھے، یقیناً وہ ہم سے زیادہ

عالم تھے اور انھوں نے ایک دو چیزیں چھوڑ کر ان سب باتوں کا بلکہ ان سے بھی باریک معانی کا لحاظ رکھا ہے، مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہو سکا، یہ ایک عاجز بندے کی کوشش ہے جو ان شاء اللہ آنے والے بھی کرتے رہیں گے۔

دوران ترجمہ پچیس اردو اور فارسی تراجم میرے زیرنظر رہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ بعض مفاہیم کی تعیین کے لیے مجھے کتنی ہی عربی کتب، یعنی تفسیر، حدیث، لغت، ادب اور بلاغت کی کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد و حساب شکر ہے جس نے اس کام کی توفیق بخشی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فَلَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الشُّكْرُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، اَللّٰهُمَّ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ.

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اس مبارک کام میں تعاون فرمایا، ان میں سب سے پہلے امیر جماعۃ الدعوۃ محترم حافظ محمد سعید ﷾ ہیں جن کے حکم سے اس کام کا آغاز ہوا اور جن کی مسلسل حوصلہ افزائی کے ساتھ یہ کام جاری رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے فضل کے بعد اگر ان کی خصوصی توجہ نہ ہوتی اور وہ مجھے اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ فراغت مہیا نہ کرتے تو یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچنا مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے اور ان سے زیادہ سے زیادہ اپنے دین کا کام لے۔ ان کے ساتھ محترم سیف اللہ خالد مدیر "دارالاندلس" ہیں، جو سرمایۂ آخرت سمجھ کر اس کی تکمیل کے لیے میرا پیچھا کرتے رہے اور جنھوں نے نہایت محبت اور ذوق و شوق کے ساتھ اسے طبع کیا۔ ان کے علاوہ وہ تمام بھائی جنھوں نے ترجمے کے متعلق کوئی مشورہ دیا، یا جن کی دعائیں میرے ہمراہ رہیں، میں سب کا شکر گزار ہوں۔

علمائے کرام میں سے محترم مولانا محمد افضل، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مدیر جامعۃ الدراسات الاسلامیہ کراچی اور محترم مولانا حافظ محمد عبداللہ رفیق، شیخ الحدیث دار العلوم المحمدیہ لوکو ورکشاپس لاہور نے مکمل ترجمہ پڑھا اور اس کی اصلاح کی۔ ان کے علاوہ محترم مولانا عبداللطیف، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مدیر المعہد العالی مرکز البدر بہاولپور نے آخری پندرہ پارے پڑھے اور ان کی اصلاح کی۔ محترم مولانا مبشر احمد ربانی، مفتی جماعۃ الدعوۃ، محترم مولانا محمد رمضان، شیخ الحدیث جامعہ رحمانیہ لاہور، محترم ابو سیف محمد جمیل، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، استاد جامعۃ الدعوۃ مریدکے، محترم عبدالرحمان عابد، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، استاذ جامعۃ الدعوۃ اور محترم سعید طیب، استاد جامعہ نے بعض اجزاء پڑھے اور مفید مشورے دیے۔ میں ان سب احباب کا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ (آمین!)

پروف ریڈنگ کا کام محترم مولانا محمد اشتیاق اصغر، حافظ سعید الرحمٰن، حافظ ثناء اللہ خاں اور ابو سعد مطیع الرحمٰن نے کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ یہ کام سرانجام دیا، انھوں نے صرف پروف ریڈنگ ہی نہیں کی بلکہ مجھے بہترین مشورے بھی دیتے رہے اور جس طرح وہ بہتر سمجھتے تھے مجھ سے اجازت لے کر اصلاح بھی کرتے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس محنت کو قبول فرمائے اور ہم سب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ (آمین)

عبدالسلام بن محمد
جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ مرکز طیبہ مریدکے
۲۵ شعبان ۱۴۲۷ھ

# مقدمہ تفسیر

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِينُهُ وَ نَسْتَغْفِرُهُ وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ، اَمَّا بَعْدُ !

آج سے چند سال پہلے جماعۃ الدعوۃ کے احباب کی مجلس میں قرآن مجید کے نئے ترجمے اور تفسیر کی ضرورت پر گفتگو ہوئی۔ محترم حافظ محمد سعید امیر جماعۃ الدعوۃ نے یہ کام میرے ذمے لگایا۔ میں نے انتیسویں اور تیسویں پارے کا ترجمہ اور تفسیر لکھی تو احساس ہوا کہ تفسیر کا کام لمبا ہے، زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، اس لیے پہلے اللہ کی توفیق سے قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کرنا چاہیے، اس کے بعد تفسیر کا کام جتنی اللہ تعالیٰ نے فرصت دی ہوتا رہے گا۔ الحمد للہ قرآن مجید کا ترجمہ مکمل ہو کر شائع ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حُسنِ قبول سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں میری نجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین) ترجمے سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ بیماری کی نذر ہو گیا، اس کے بعد اللہ کا نام لے کر تفسیر کا کام شروع کیا جس کی برکت سے طبیعت بھی بہتر ہوتی گئی۔

شروع میں خیال تھا کہ مختصر حواشی لکھے جائیں جو ایک جلد میں پورے آ جائیں، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ ابتدائی پاروں کی تفسیر مختصر ہے، مگر آہستہ آہستہ اسے قدرے تفصیل سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی جس سے بعد کے پارے قدرے مفصل ہوتے گئے۔ قرآن کی تفسیر کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا، یہ ایک عاجز بندے کی کوشش ہے جو اپنے مالک سے قبولیت کا خواستگار اور امیدوار ہے۔ [ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ]

## تفسیر کا اسلوب:

اہل علم کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ صحیح تفسیر وہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ اس کے کلام کا معنی و مراد کوئی نہیں جانتا اور وہ قرآن مجید اور حدیث رسول ﷺ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر بات مختصر یا مبہم ہوتی ہے اور دوسری جگہ وہی بات مفصل اور واضح ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیر، شیخ امین شنقیطی صاحبِ اضواء البیان اور علامہ قاسمی صاحبِ محاسن التاویل رحمہم اللہ نے قرآن کی تفسیر قرآن کے ساتھ کرنے کا خاص اہتمام فرمایا ہے۔ میں نے اختصار کے لیے ہر جگہ پوری آیات اور ان کا ترجمہ نقل کرنے کے بجائے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے ہیں۔ صاحبِ ذوق حضرات تھوڑی سی محنت سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

احادیث رسول ﷺ سے متعلق میں نے پوری کوشش کی ہے کہ صرف ثابت شدہ احادیث نقل کروں، اس کے لیے شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی کتب، مسند احمد اور دوسری کتب حدیث کی جدید طبعات کے محققین کی تحقیق سے راہنمائی لی ہے اور اکثر ان کی تصحیح یا تحسین کا حوالہ بھی دیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث کی صحت پر امت کا اتفاق ہے، ان کے رخ روشن کو مزید کسی غازہ کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول تفسیر کا مقام ہے، کیونکہ وہ صاحبِ زبان تھے اور انھوں نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے قرآن مجید سنا اور سمجھا تھا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان کی تفسیر صحیح سند سے ثابت ہو اور اسرائیلیات سے نہ ہو۔ صحابہ جب کسی تفسیر پر متفق ہوں تو ان سے اختلاف جائز نہیں۔

تابعین کے اقوال بھی قرآن مجید سمجھنے کے لیے بہت مفید ہیں، بشرطیکہ صحیح سند کے ساتھ ان سے ثابت ہوں اور اسرائیلیات میں سے نہ ہوں۔ تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر حدیث رسول ﷺ اور اقوال صحابہ و تابعین کے ساتھ تفسیر کا بہترین ذخیرہ ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے دکتور حکمت بن بشیر کی تحقیق و تخریج کے ساتھ تفسیر ابن کثیر چھپی ہے جس میں انھوں نے مرفوع احادیث کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے اقوال کی تخریج بھی کر دی ہے اور ہر ایک کی صحت و ضُعف کا حکم بھی بیان کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ تفسیر طبری اور ابن کثیر سے فائدہ اٹھانا آسان ہو گیا ہے۔ اس کے بعد مفسرین کرام کی تفاسیر قرآن فہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، بشرطیکہ ان میں قرآن و سنت سے گریز اختیار نہ کیا گیا ہو اور وہ لغت عرب کے مطابق ہوں۔ قرآن مجید کے صرف و نحو اور بلاغت کے نکات کے لیے شیخ المفسرین امام طبری، زمخشری، رازی، ابوحیان، بقاعی، ابن عادل، ابن عاشور، آلوسی اور قاسمی رحمہم اللہ کی تفاسیر بہت شاندار ہیں۔ ان میں سے بعض نے ربطِ آیات کے ذکر کا اہتمام بھی فرمایا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ ان کا اجتہاد ہے، سوائے اس ربط کے جو بالکل واضح ہو، کسی ربط کو یقین سے اللہ تعالیٰ کی مراد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ''الحاوی فی تفسیر القرآن'' میں ہر آیت سے متعلق بہت سی تفاسیر پوری پوری نقل کر دی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کے فوائد و نکات کی کوئی انتہا نہیں نہ اس کے عجائب کبھی ختم ہو سکتے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ نے اس کے فہم کا دروازہ کبھی بند فرمایا ہے، ہر زمانے میں اس کے نئے سے نئے فوائد و نکات ظاہر ہوتے رہتے ہیں، اگرچہ لوگوں کے فہم اور استعداد میں بہت ہی تفاوت ہے، تاہم قرآن مجید میں غور و فکر کرنے والا کوئی شخص بقدر استعداد و محنت اللہ تعالیٰ کی اس عطا سے محروم نہیں رہتا۔ ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی کتاب ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''نہیں، ہاں اللہ کی کتاب ہے، یا وہ فہم ہے جو کسی مسلم آدمی کو دیا گیا ہو یا جو اس صحیفے میں ہے۔'' ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: ''اس صحیفے میں کیا ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''دیت کے مسائل، قیدی کو چھڑانا اور یہ کہ کوئی مسلم کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔'' [ بخاری، العلم، باب كتابة العلم : ۱۱۱ ]

## ضعیف اور موضوع روایات:

اکثر کتبِ تفسیر کے حسن کو داغ دار کرنے والی سب سے بڑی چیز ضعیف (کمزور) اور موضوع (من گھڑت) روایات ہیں۔ ان روایات نے یہود و نصاریٰ، مستشرقین اور دوسرے غیر مسلم لوگوں کو اور خصوصاً اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ملحدوں اور منکرین حدیث کو اسلام پر طعن کا موقع فراہم کیا ہے، حالانکہ ان روایات کا اسلام اور رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ کی تفسیر کہ "نٓ" سے مراد وہ مچھلی ہے جس کی پشت پر زمین رکھی ہوئی ہے اور ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ کی تفسیر کہ "قٓ" سے مراد ایک پہاڑ ہے جس نے پوری زمین کو گھیر رکھا ہے وغیرہ۔

کسی بھی مفسر کی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صرف وہ روایت نقل کرے جو صحیح یا حسن سند کے ساتھ ثابت ہو، اگر کوئی دوسری روایت بیان کرے تو اس کا باطل یا ضعیف ہونا بھی بیان کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » "جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔" [ بخاری، العلم، باب إثم من كذب على النبی ﷺ : ۱۱۰، عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما ] بلکہ جس کے ثابت ہونے میں شک ہو وہ بیان کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ حَدِيْثًا يُرٰى أَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ » "جو شخص مجھ سے کوئی بات بیان کرے جس کے متعلق وہ گمان کرتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹ بولنے والوں میں سے ایک ہے۔"
[ مسلم، المقدمة، باب وجوب الرواية عن الثقات......، عن المغيرة بن شعبة و سمرة بن جندب رضی اللہ عنہما ]

حقیقت یہ ہے کہ تحقیق اور یقین کے بغیر کسی کے ذمے کوئی بات لگانا جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ » "آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر بات جو سنے اسے بیان کر دے۔" [ مسلم، المقدمة : ۵، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ] قدیم مفسرین اور محدثین روایت کی سند بیان کر کے اپنے آپ کو صحت یا ضُعف بیان کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش سمجھتے ہیں کہ لوگ سند دیکھ کر خود تحقیق کر لیں گے۔ ممکن ہے اس وقت کے اکثر علماء راویوں کے حالات سے عام طور پر آگاہ ہوں اور سند دیکھ کر صحیح اور ضعیف کی پہچان کر لیتے ہوں، مگر اس وقت بھی خالص صحیح احادیث علیحدہ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی، جس کے لیے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے صحیحین تصنیف کر کے امت کی راہنمائی کا عظیم فریضہ سرانجام دیا۔ ان کے بعد اور ائمہ نے بھی یہ فریضہ سرانجام دیا، مگر شیخین کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکے۔

کتبِ تفسیر میں عام طور پر اس بات کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ خصوصاً بدعتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے حضرات مثلاً باطنی، معتزلی، خارجی، رافضی، جہمیہ اور قدریہ سے تعلق رکھنے والے مفسرین کے ہاں اس کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح ہمارے زمانے کے متجدد اور عقل پرست مصنفین کا بھی یہی حال ہے، ان میں سے بعض مفسرین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ تفسیر کرتے ہوئے کسی مسئلہ میں بہت سی روایات ذکر کر دیں گے، جن میں بخاری اور مسلم کی صحیح احادیث بھی ہوں گی اور

تیسرے طبقے کی کتابوں کی ضعیف روایات بھی، مثلاً بیہقی، طبرانی وغیرہ۔ پھر صحیح بخاری اور مسلم کی صحیح ثابت احادیث کے بجائے کسی کمزور روایت کو یہ کہہ کر ترجیح دے دیں گے کہ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے اور اپنے اس طرز عمل کے لیے انھوں نے اصولِ حدیث کے مسلمہ قواعد کو پس پشت ڈالتے ہوئے ذوق، وجدان اور مزاج شناسئ رسول اللہ ﷺ کو حدیث کی صحت و ضُعف کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ یہی حال فقہی فرقوں کے ان متعصب حضرات کا ہے جن کے ہاں صحت وضعف کا فیصلہ ان کے فرقے کے ائمہ کے فقہی اقوال کو مدِنظر رکھ کر ہوتا ہے۔ مقصد سب کا اپنی مرضی کی ضعیف اور موضوع روایات کو رائج کرنا اور صحیح ثابت احادیث سے جان چھڑانا ہے۔ باطنی فرقوں کے پیروکار لوگوں نے تصوف کے پردے میں وحدۃ الوجود کے نام پر خالق و مخلوق کو ایک قرار دے کر اصولِ حدیث ایک طرف، مکمل قرآن و حدیث اور اسلام ہی کو بے معنی قرار دینے کی کوشش کا نام تفسیر قرآن رکھا ہے، جو دراصل تحریفِ قرآن ہے۔ بعض صوفی حضرات براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور آپ ﷺ سے سننے کا دعویٰ رکھتے ہیں، ان کے مریدوں کے لیے وہ جو بھی کہہ دیں حدیث ہے، خواہ وہ واضح طور پر رسول اللہ ﷺ پر بہتان ہو۔ بعض " حَدَّثَنِیْ قَلْبِیْ عَنْ رَبِّیْ " (میرے دل نے مجھے میرے رب سے بیان کیا) کہہ کر قرآن و حدیث بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

الحمد للہ علمائے حدیث کی محنت سے اب یہ ذوق عام ہو رہا ہے کہ حدیث کی صحت وضُعف کو دیکھا جائے اور صرف صحیح احادیث قبول کی جائیں۔ کتبِ احادیث کی جدید طبعات تحقیق کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ اس کام میں شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ ، ان کے شاگردوں اور سعودی عرب اور مصر و شام کے محقق علماء کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اردو میں ہمارے عزیز بھائی سیف اللہ خالد نے اپنی تفسیر ''دعوۃ القرآن'' میں ہر آیت سے متعلق صحیح احادیث کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ اللہ کے فضل سے میں نے بھی اس تفسیر میں صرف صحیح و حسن احادیث کا التزام کیا ہے۔ اگر کوئی خطا ہوئی ہے تو جان بوجھ کر نہیں اور آگاہ ہونے پر ہر وقت اصلاح کا عزم موجود ہے۔ (الحمد للہ)

## اسرائیلیات:

کتبِ تفسیر کے اعتبار کو مجروح کرنے والی دوسری چیز اسرائیلی روایات کی بھر مار ہے۔ محقق علماء مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ اسرائیلی روایات کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ جن کی قرآن یا حدیث نے تصدیق کی ہے، انھیں بیان کرنا بالاتفاق جائز ہے، دوسری وہ جن کی قرآن یا حدیث نے تکذیب کی ہے، انھیں ان کے باطل ہونے کی صراحت کیے بغیر بیان کرنا حرام ہے، تیسری وہ جن کی قرآن و حدیث سے نہ تصدیق ہوتی ہے نہ تکذیب، انھیں بیان کرنا جائز ہے مگر ان پر یقین کرنا یا انھیں صحیح سمجھنا جائز نہیں۔

ایسی روایات کا عام گفتگو میں بیان کرنا جائز بھی ہو تو تفسیر قرآن کے شایان شان ہرگز نہیں۔ ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( یَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ! کَیْفَ تَسْأَلُوْنَ أَهْلَ الْکِتَابِ؟ وَ کِتَابُکُمُ الَّذِیْ أُنْزِلَ عَلٰی نَبِیِّهٖ ﷺ

أَحْدَثُ الْأَخْبَارِ بِاللّٰهِ تَقْرَءُونَهُ لَمْ يُشَبْ، وَ قَدْ حَدَّثَكُمُ اللّٰهُ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ وَ غَيَّرُوْا بِأَيْدِيْهِمُ الْكِتَابَ فَقَالُوْا: ﴿هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ [ البقرة : ٧٩ ] أَفَلَا يَنْهَاكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مُسَاءَلَتِهِمْ ؟ وَلَا وَاللّٰهِ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا مِّنْهُمْ قَطُّ يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ» ''اے مسلمانو کی جماعت! تم اہلِ کتاب سے کس طرح سوال کرتے ہو، جب کہ تمھاری کتاب جو نبی ﷺ پر نازل کی گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی خبروں میں سب سے تازہ ہے۔ تم اسے اس حال میں پڑھتے ہو کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھا تھا اہلِ کتاب نے اسے بدل دیا اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اللہ کی کتاب میں تبدیلی کر دی اور کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ بہت تھوڑی قیمت حاصل کریں، تو کیا تمھارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمھیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا۔ نہیں! قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی آدمی کو کبھی تم سے اس کے متعلق سوال کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔'' [ بخاری، الشهادات، باب لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة وغيرها : ٢٦٨٥ ]

صحیح ابن حبان کے محقق نے «حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ» کے حاشیہ میں اسرائیلی روایات کی تین معروف اقسام ذکر کرتے ہوئے تیسری قسم کے متعلق لکھا ہے: ''تیسری قسم وہ ہے جس کے متعلق قرآن و حدیث خاموش ہیں، نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب، سو ہم نہ ان کا یقین کرتے ہیں اور نہ انھیں جھوٹا سمجھتے ہیں، البتہ انھیں بیان کرنا جائز ہے۔ لیکن جیسا کہ علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ جائز نہیں کہ انھیں قرآن کی تفسیر میں ذکر کیا جائے اور انھیں آیات کے معنی کے بیان کے لیے یا آیات میں غیر معین کی تعیین کے لیے یا آیات میں مجمل کی تفصیل کے لیے ایک قول یا روایت قرار دیا جائے، کیونکہ کلام اللہ کی تفسیر ان روایات کے ساتھ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایات، جن کے صدق و کذب کو ہم جانتے ہی نہیں، اللہ سبحانہ کے کلام کا معنی بیان کر رہی ہیں اور جو کچھ اس میں مجمل بیان کیا گیا اس کی تفصیل کر رہی ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب اس سے کہیں بلند ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے جب ہمیں بنی اسرائیل سے بیان کرنے کی اجازت دی تو ہمیں یہ حکم بھی دیا کہ ہم انھیں نہ سچا کہیں نہ جھوٹا، تو اس سے زیادہ تصدیق کیا ہو گی کہ ہم انھیں اللہ کی کتاب کے ساتھ ملا دیں اور انھیں اس کی تفسیر اور وضاحت کا مقام دے دیں۔ اللہ معاف فرمائے۔''

شاید بعض حضرات «حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ» (بنی اسرائیل سے بیان کرو اور کوئی حرج نہیں) سے استدلال کرتے ہوئے ایسی روایات بیان کرنا جائز قرار دیتے ہوں، مگر اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں جن کے درست ہونے کا یقین ہو، کیونکہ جس بات کے غلط ہونے کا گمان بھی ہو اسے بیان کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ چند احادیث ملاحظہ فرمائیں، جن میں سے بعض پہلے بھی بیان ہو چکی ہیں، سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ حَدِيْثًا يُرٰی أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ» ''جو شخص مجھ سے کوئی حدیث بیان کرے جس کے متعلق وہ گمان کرتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں میں

سے ایک ہے۔'' [ مسلم، المقدمة، باب وجوب الرواية عن الثقات ...... ]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ »
''آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر بات جو سنے اسے بیان کر دے۔'' [ مسلم، المقدمة : ٥ ] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور اہل اسلام کے لیے اس کی تفسیر عربی زبان میں کرتے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَ ﴿ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا ﴾ » [ البقرة : ١٣٦ ]
''اہل کتاب کو نہ سچا کہو اور نہ انھیں جھوٹا کہو اور یہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا۔'' [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ قولوا آمنا بالله وما أنزل إلينا ﴾ : ٤٤٨٥ ]

خلاصہ یہ کہ تیسری قسم کی اسرائیلی روایات کو عام گفتگو میں ذکر کرنا جائز بھی ہو تو ان کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی تفسیر میں انھیں ذکر کرنا ہرگز جائز نہیں۔

## قدیم تفاسیر میں اسرائیلیات:

قدیم مفسرین جن میں بعض تابعین بھی شامل ہیں، اسرائیلی روایات سے قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہیں، مگر یہ ذکر نہیں کرتے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں، بلکہ وہ ان حضرات کی اپنی تفسیر دکھائی دیتی ہے۔ بعض غیر ثقہ اور غیر محتاط راوی انھیں رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے اکثر مقامات پر ایسے اقوال اور روایات کا اسرائیلی ہونا اور ناقابل اعتبار ہونا واضح فرما دیا ہے۔ ایسی روایات پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے، مثلاً کوئی مفسر تابعی ہو یا غیر تابعی اور وہ پہلے زمانے کی بات اپنے پاس سے ذکر کرے، مثلاً یہ کہ عزیز مصر یا اس کی بیوی کا نام فلاں تھا، یا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے نام یہ تھے وغیرہ، تو بات خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب یہ بات قرآن و حدیث میں مذکور نہیں تو ظاہر ہے کہ ان حضرات نے یہ باتیں بنی اسرائیل سے لی ہیں اور ان پر یقین کسی صورت نہیں کیا جا سکتا۔

## بعض جدید مفسرین:

بعض جدید مفسرین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ تفسیر کرتے ہوئے قرآن کی آیات کے معنی کی وضاحت کے لیے یا ان میں غیر معین کی تعیین کے لیے یا ان میں مجمل بات کی تفصیل کے لیے تورات، انجیل اور دوسری سابقہ کتب سے صفحوں کے صفحے نقل کر دیتے ہیں اور عام لوگ ان کی وسعت علم سے مرعوب ہوتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ کتب وہ ہیں ہی نہیں جو انبیاء پر اتری تھیں، کیونکہ ان میں لوط، داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے انبیاء پر نہایت شرم ناک بہتان درج ہیں۔ اہلِ کتاب نے ان میں تبدیلی کر دی ہے اور ان کا اکثر حصہ اہلِ کتاب کا تصنیف کردہ ہے، جس میں موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب اور اس کے بعد کا تذکرہ ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں۔ اس لیے ان کی کسی بھی بات پر یقین

کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ان کتابوں سے صرف قرآن و حدیث کی تصدیق کرنے والی روایات بطورِ شاہد یا دوسری روایات بطور الزام پیش کی جاسکتی ہیں، قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ [ البقرۃ : ١ ] یعنی اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ اب کسی بھی قسم کے شک وشبہ سے پاک کتاب کی تفسیر ان روایات سے کرنا جن کی حیثیت وہم وگمان سے زیادہ کچھ نہیں، تفسیر کے نام سے قرآن مجید پر ظلم ہے۔ چونکہ میرے پیش نظر سلف صالحین کا منہج ہے، اس لیے میں نے ایسے کسی مفسر کا نام ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا، اللہ نے بھی اکثر مقامات پر یہی اسلوب اختیار کیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ ﴾ [ البقرۃ : ٨ ] اور ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ [ الحج : ١١ ] یعنی بعض لوگ یہ کہتے ہیں، بعض لوگ اللہ کی عبادت کنارے پر رہ کر کرتے ہیں وغیرہ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا طریقہ بھی یہ تھا کہ کسی شخص کا کوئی کام نادرست ہوتا تو یہ کہہ کر خطاب عام فرماتے: « مَا بَالُ اَقْوَامٍ » یعنی کیا حال ہے کچھ لوگوں کا جو اس طرح کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کئی لوگوں پر قرآن مجید یا صحیح احادیث کی مخالفت کی وجہ سے رد فرمایا، مگر کسی کا نام نہیں لیا، بلکہ ہر جگہ یہی فرمایا: " وَ قَالَ بَعْضُ النَّاسِ " اور بعض لوگوں نے کہا۔ الحمد للہ میں نے پوری تفسیر میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ کسی کا نام لیے بغیر غلط بات کا رد کروں۔

## آثارِ قدیمہ:

کچھ مفسرین نے قرآن کی تفسیر قدیم اقوام کے کھنڈرات سے برآمد ہونے والے کتبوں سے کی ہے، جن کی زبانیں ناپید ہو چکی ہیں اور کفار نے اپنے ظن وتخمین سے انھیں پڑھا ہے، چنانچہ یہ حضرات ذوالقرنین، اس کی بنائی ہوئی دیوار، اصحابِ کہف اور اصحابِ سبت کی بستی، فراعنۂ مصر اور کشتی نوح وغیرہ سے متعلق ایسے ہی ذرائع سے تفسیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اول تو ان کتبوں کی کچھ حیثیت نہیں، پھر کفار کی ظن وتخمین پر مبنی باتوں کو تحقیق قرار دے کر ان سے قرآن کی تفسیر وہی شخص کر سکتا ہے جو وہم وگمان اور یقین و اطمینان کے درمیان فرق سے ناآشنا ہو۔ اکثر لوگ ایسے مفسرین کے مغربی زبانوں یا بعض مغربی علوم سے واقفیت یا ان کی سیاسی یا مذہبی حیثیت سے مرعوب ہو کر ان کی رطب و یابس تحقیقات مانتے چلے جاتے ہیں اور ان کی تفاسیر کو عصر حاضر کا عجوبہ خیال کرتے ہیں، حالانکہ ان کی ایسی باتوں کی حیثیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اللہ کے فضل سے آپ میری اس تفسیر کو وہم وگمان پر مبنی ایسی باتوں سے پاک پائیں گے۔ (ان شاء اللہ)

## تفسیر کے ماخذ:

جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ مرید کے، کے مکتبہ میں تفسیر کا خاصا ذخیرہ موجود ہے، مگر کمپیوٹر میں مکتبہ شاملہ، مکتبہ ذہبیہ اور دوسرے مکتبہ جات آنے کے بعد تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، بلاغت اور دوسرے بے شمار علوم کی ہزاروں کتابیں ایسی دسترس میں آئیں کہ ایک لیپ ٹاپ نے سمندر کو قطرے میں سمو رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اجرِ جمیل عطا فرمائے جنھوں نے یہ کام سرانجام دیا

اور بے دریغ سرمایہ خرچ کر کے اتنا عظیم ذخیرہ امتِ مسلمہ کو مفت مہیا کر دیا، اگر کوئی شخص اتنی کتابیں خریدنا چاہے تو کروڑوں روپے پاس ہونے کے باوجود بھی نہیں خرید سکتا، کیونکہ بہت سی کتابیں بازار میں دستیاب ہی نہیں۔ [ جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ ] مکتبہ کا تفسیر کا خانہ کھولیں تو بیک وقت ایک آیت سے متعلق بہت سی تفاسیر دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں یہاں ان کتابوں کی فہرست دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ مکتبہ شاملہ عام مل جاتا ہے، میری ہر صاحب علم سے درخواست ہے کہ اس سے ضرور فائدہ اٹھائے۔

اردو تفاسیر میں سے سب سے زیادہ فائدہ میں نے اپنے استاذ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ کے مرتب کردہ ''اشرف الحواشی'' سے اٹھایا ہے۔ یہ حواشی مختصر اور علمی زبان میں ہیں اور بے حد مفید ہیں۔ میں نے ہر جگہ اس کا حوالہ نہیں دیا، کیونکہ میں نے اکثر مقامات پر انھیں آسان زبان میں کچھ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے، یا بعض کمزور باتوں اور ضعیف احادیث کو حذف کیا ہے اور بعض باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ دوسری بہت سی اردو تفاسیر اور حواشی بھی برابر میرے زیر نظر رہے ہیں اور میں نے بقدرِ ضرورت ان سے استفادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان تمام محسن مفسرین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ آسان پیرائے میں تفسیر لکھوں، تاکہ ہر شخص سمجھ سکے، البتہ بعض باتیں جو ادب یا بلاغت سے تعلق رکھتی ہیں، ممکن ہے بعض حضرات کی سمجھ میں پوری طرح نہ آئیں۔ شوق رکھنے والے احباب کسی پختہ عالم سے ایسے مقامات سمجھنے کے لیے رجوع کر سکتے ہیں، صرف آسانی کی غرض سے کتاب کو ایسے فوائد سے خالی رکھنا مجھے گوارا نہیں ہوا۔ اس ترجمہ و تفسیر سے عام قاری کو قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر سمجھنے میں آسانی ہوگی، ترجمہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کو اس سے مدد ملے گی اور خطبہ اور درس دینے والے حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ (ان شاء اللہ ) یاد رہے کہ اس ترجمہ و تفسیر سے پوری طرح فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو اس مقدمۂ تفسیر کے علاوہ عرضِ مترجم کو پوری توجہ سے پڑھے۔

اختصار کے پیش نظر میں نے احادیث کے ایک یا دو حوالوں پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ وہ حدیث کئی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے اور اس اختصار ہی کی وجہ سے اکثر جگہ احادیث کا صرف ترجمہ دیا گیا ہے متن نہیں۔

قرآن مجید کے ترجمے کے بعض مقامات پر میں نے پہلے سے بہتر الفاظ کے ساتھ ترمیم کی ہے، اگر اس تفسیر میں شامل ترجمے کا پہلی اشاعتوں کے ترجمے اور ترجمے کی سی ڈی یا تفسیر دعوۃ القرآن اور اس کی سی ڈی سے کہیں فرق ہو تو اس کا باعث یہ ترمیم ہوگی۔ آئندہ بھی اصلاح و ترمیم کا یہ عمل جاری رہے گا۔ (ان شاء اللہ )

یہ تفسیر کئی شیوخ الحدیث نے پڑھی اور اس کی اصلاح فرمائی ہے۔ خصوصاً مولانا عبدالعزیز علوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے اس جلد کے آخری پانچ پارے پڑھے، مولانا گلزار احمد شیخ الحدیث دار القرآن فیصل آباد، مولانا حافظ محمد عبداللہ رفیق شیخ الحدیث دار العلوم المحمدیہ لوکو ورکشاپس لاہور اور الشیخ مولانا عبدالعزیز کوئٹہ نے تمام پارے پڑھے۔ ان کے علاوہ دار الاندلس کے مجلس التحقیق الاسلامی کے رفقاء محمد اشتیاق اصغر، حافظ سعید الرحمٰن، حافظ ثناء اللہ اور حافظ رضوان عبداللہ نے اس تفسیر

کے حوالہ جات کی مراجعت کی، جہاں ضرورت تھی حوالے درج کیے، پوری کتاب کی بار بار پروف خوانی کی اور مجھے اصلاح کے لیے مشورے دیے۔

دار الاندلس کے مدیر محترم جاوید الحسن صدیقی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر نہایت شوق اور محبت سے اسے طبع کرنے کے لیے مسلسل محنت کی، میں ان سب حضرات کا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ سب کو ان کی محنت کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ ان کے علاوہ محترم حافظ محمد سعید ﷾ کا شکریہ ادا کرنا بھی مجھ پر لازم ہے جن کی خصوصی دلچسپی، ہمت افزائی اور اس کام کے لیے فراغت مہیا کرنے سے میرے لیے یہ کام آسان ہوا۔ اس کے بعد سب سے پہلے بھی اللہ کی حمد اور اس کا شکر ہے اور آخر میں بھی اس کی حمد اور اس کا شکر ہے جس نے مجھے یہ تفسیر لکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اسے طبع کرنے کے اسباب مہیا فرمائے۔ اب تک شروع سے سورۂ طٰہٰ تک تفسیر لکھی جا چکی ہے اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر پہلے ہی طبع ہو چکی ہے۔ اپنے رحمان و رحیم رب سے میری دعا ہے کہ وہ مجھے اس کے باقی اجزا لکھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اسے دنیا اور آخرت میں حسن قبول سے نوازے اور آخرت میں اسے میرے گناہوں کی مغفرت، جنت اور رب تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

عبد السلام بن محمد
جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ مرکز طیبہ مرید کے
۱۴ شعبان ۱۴۳۲ھ

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ ۱ مکیۃ ۵ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ — اٰیاتُھا ۷ رُکُوعاتُھا ۱

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ○

صحیح احادیث میں اس کا نام "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، اَلصَّلَاةُ، سُوْرَةُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، سُوْرَةُ الْحَمْدِ، اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ، اَلْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ، أُمُّ الْقُرْآنِ" اور "أُمُّ الْكِتَابِ" آیا ہے، جیسا کہ فاتحہ کے فضائل کی احادیث میں آ رہا ہے۔ اسماء کی کثرت سورت کے معانی و مطالب کی کثرت کی دلیل ہے۔

**سورۂ فاتحہ کے فضائل:** ① ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ایک دفعہ جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے اوپر زور سے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو سر اٹھایا اور فرمایا: ''یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے، آج سے پہلے یہ کبھی نہیں کھولا گیا۔'' تو اس سے ایک فرشتہ اترا، پھر فرمایا: ''یہ فرشتہ زمین پر اترا ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں اترا۔'' اس فرشتے نے سلام کہا اور کہا: ''آپ کو دو نوروں کی خوش خبری ہو، جو آپ کو دیے گئے ہیں، آپ سے پہلے وہ کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے، فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان دونوں میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے وہ چیز آپ کو ضرور عطا کر دی جائے گی۔'' [ مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل الفاتحة...... ۸۰۶ ]

② ابوسعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے، میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے مجھے بلایا، میں نہ آیا، یہاں تک کہ میں نے نماز پڑھی، پھر آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھارے آنے میں کیا رکاوٹ بنی؟'' میں نے عرض کیا: ''میں نماز پڑھ رہا تھا۔'' فرمایا: ''کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں کہ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اور رسول کی دعوت قبول کرو۔'' پھر فرمایا: ''کیا میں تمھیں مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن مجید کی سب سے عظیم سورت نہ سکھاؤں؟'' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکلنے لگے تو میں نے آپ کو یاد دلایا تو آپ نے فرمایا: ''الحمد للہ رب العالمین ہی ''سبع مثانی'' ہے، (یعنی وہ سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) اور یہی القرآن العظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔'' [ بخاری، التفسير، باب قوله : ﴿ ولقد آتيناك سبعا...... ﴾ : ۴۷۰۳ ]

③ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے ایک سفر میں تھے، راستے میں اترے تو ایک لڑکی آئی اور کہنے لگی: ''قبیلے کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا ہے اور ہمارے لوگ غائب ہیں تو کیا تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟'' چنانچہ اس کے ساتھ ایک آدمی گیا جس کے متعلق ہمیں دم کرنے کا گمان نہیں تھا، اس نے اسے دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا۔ سردار نے اسے تیس بکریاں دینے کو کہا اور ہمیں دودھ پلایا۔ جب وہ واپس آیا تو ہم نے اس سے پوچھا: ''کیا تم اچھی طرح دم کر لیا کرتے تھے؟'' اس نے کہا: ''نہیں، میں نے صرف اُم الکتاب کے ساتھ دم کیا ہے۔'' ہم نے کہا: ''جب تک ہم

رسول اللہ ﷺ کے پاس نہ پہنچیں کچھ نہ کرو۔'' جب ہم مدینہ میں آئے تو ہم نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے کیسے معلوم ہوا کہ یہ دم ہے؟ (بکریاں) تقسیم کر لو اور میرا حصہ بھی رکھو۔'' [ بخاری، فضائل القرآن، باب فضل فاتحة الكتاب : ۵۰۰۷ ] بخاری کی ایک روایت (۵۷۳۶) میں ہے کہ ان لوگوں نے ابوسعید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا تھا، جب انھوں نے دم کی درخواست کی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ کہہ کر کہ تم نے ہماری ضیافت نہیں کی تیس بکریوں کی شرط طے کی تھی۔ مسلم (۲۲۰۱) میں ہے کہ یہ دم کرنے والے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

④ خارجہ بن صلت کے چچا (علاقہ بن صحار تمیمی رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر اسلام لے آئے، پھر واپس گئے تو ان کا گزر کچھ لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے پاس ایک پاگل آدمی لوہے کی زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ اس کے گھر والے کہنے لگے: ''تمھارا یہ ساتھی (یعنی رسول اللہ ﷺ) خیر لے کر آیا ہے تو تمھارے پاس کوئی چیز ہے جس سے تم اس کا علاج کرو؟'' تو میں نے اسے فاتحۃ الکتاب کے ساتھ دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا، انھوں نے مجھے ایک سو بکریاں دیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو (سارا واقعہ) بتایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس کے علاوہ بھی کچھ پڑھا؟'' میں نے کہا: ''نہیں!'' آپ نے فرمایا: ''بکریاں لے لو! مجھے اپنی عمر کی قسم! جس نے باطل دم کے ساتھ کھایا (وہ جانے) تم نے تو حق دم کے ساتھ کھایا ہے۔'' [ أبو داؤد، الطب، باب كيف الرقى : ۳۸۹۶ ]

⑤ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں: ''جس نے کوئی نماز پڑھی جس میں اُم القرآن نہ پڑھی، وہ ناقص ہے۔'' تین دفعہ فرمایا تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ''ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں۔'' تو فرمایا: ''اسے اپنے دل میں پڑھو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں نے ''صلاۃ'' (نماز) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو نصف حصوں میں تقسیم کر لیا ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے سوال کیا۔ تو جب بندہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری حمد کی'' اور جب وہ ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری ثنا کی'' اور جب وہ ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کہتا ہے تو وہ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری تمجید کی (بزرگی بیان کی)'' اور کبھی فرماتا ہے: ''میرے بندے نے (اپنا آپ) میرے سپرد کر دیا۔'' پھر جب وہ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ کہتا ہے تو وہ فرماتا ہے: ''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے سوال کیا۔'' پھر جب وہ ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ کہتا ہے تو وہ فرماتا ہے: ''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے سوال کیا۔'' [ مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في ...... : ۳۹۵ ]

چند فوائد:

① جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے مراتب میں فرق ہے، ان میں سے بعض بعض سے افضل ہیں، ہمارے نبی کریم ﷺ پوری اولاد آدم کے سردار ہیں، اسی طرح سورۂ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت ہے، اگرچہ بہت سی سورتیں آیات کے اعتبار سے اس سے لمبی ہیں، مگر عظمت میں یہ سب سے بڑھ کر ہے، جیسا کہ آیات میں آیت الکرسی سب سے عظیم آیت ہے، گو اس سے لمبی آیات بہت سی ہیں۔

② اس سورت کا نام ''فاتحہ'' اس لیے ہے کہ اس سے کتاب اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔ نماز میں قراءت کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے: " فَاتِحَةُ كُلِّ شَيْءٍ اَوَّلُهُ " ''ہر چیز کا فاتحہ اس کے اول کو کہتے ہیں۔''

③ اس سورت کا نام "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" یا "سُوْرَةُ الْحَمْدِ" اس لیے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی جامع حمد آئی ہے۔

④ اس کا نام "اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ" اس لیے ہے کہ یہ سات آیات ہیں جو ہر نماز (فرض ہو یا نفل) کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں، نماز کے علاوہ بھی کثرت سے پڑھی جاتی ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجر (۸۷)۔

⑤ اس کے نام ''اُم القرآن، اُم الکتاب، القرآن العظیم'' اس لیے ہیں کہ اس میں مختصر طور پر قرآن مجید کے تمام بنیادی مضامین آ گئے ہیں، باقی قرآن ان کی تفصیل ہے، چنانچہ ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال، اس کی حمد، ثنا اور تمجید آ گئی ہیں، جیسا کہ اوپر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزرا اور آگے آیات کی تفسیر میں بیان ہوگا۔ "يَوْمِ الدِّيْنِ" میں آخرت، ثواب و عذاب اور وعدے اور وعید کا ذکر ہے۔ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" میں بندوں کو ایک اللہ سے مانگنے، اسی کے سامنے عاجزی کرنے، اپنی تمام عبادات زبانی ہوں یا بدنی یا مالی اسی کے لیے خاص کرنے اور اسے ہر شریک سے پاک قرار دینے کی تعلیم ہے۔ اسے ''توحیدِ الوہیت'' کہتے ہیں، تمام پیغمبر اسی کی دعوت لے کر آئے۔ "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" میں اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنے، اسی پر توکل کرنے اور عبادت اور دوسرے تمام معاملات میں اسی سے مدد مانگنے کی تعلیم ہے کہ اگر اس کی مدد نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اسے ''استعانت'' کہتے ہیں۔ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" میں شریعت کے تمام احکام، پورا اسلام اور پورا قرآن شامل ہے۔ "اِهْدِنَا" میں زندگی کے ایک ایک لمحہ میں راہِ راست پر چلنے اور آخری دم تک بلکہ جنت میں پہنچنے تک اس پر قائم رہنے کی دعا کی تعلیم ہے۔ "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی تاریخ اور ان کے واقعات کی طرف اشارہ ہے اور ان جیسے اعمال صالحہ اختیار کرنے کی ترغیب ہے، تاکہ ان کے ساتھ جنت میں جا سکیں۔ "الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" میں یہود اور ان تمام اقوام کی تاریخ کا ذکر ہے جو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت پر اڑ گئے اور "الضَّآلِّيْنَ" میں نصاریٰ اور ان تمام لوگوں کے واقعات کی طرف اشارہ ہے جو راہِ راست سے بھٹک گئے اور ان دونوں قسم کے لوگوں کے اعمال بد سے اجتناب کی تلقین

ہے، تاکہ ان کے ساتھ جہنم میں جانے سے بچے رہیں۔ (القاسمی) ان سات آیات میں قرآن مجید کے مزید مضامین کا ذکر ہر آیت کی الگ تفسیر میں بھی آئے گا۔ (ان شاء اللہ العزیز)

⑥ اس سورت کا نام ''صلاۃ'' اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے صلاۃ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو نصف حصوں میں تقسیم کر لیا ہے، اس کی وضاحت سورۃ الفاتحہ کے ساتھ فرمائی۔ معلوم ہوا جو ''صلاۃ'' (نماز) اس ''صلاۃ'' (فاتحہ) کے بغیر ہو وہ ''صلاۃ'' (نماز) ہی نہیں، جیسا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا: (( لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ )) ''اس شخص کی کوئی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔'' [ بخاری، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام...... : ۷۵٦۔ مسلم : ۳۹٤ ]

⑦ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ پورے قرآن کے اسرار سورۂ فاتحہ میں، فاتحہ کے اسرار ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کے اسرار اس کی باء میں اور باء کے اسرار اس کے نقطے میں آ گئے ہیں۔ مگر سورۂ فاتحہ میں پورے قرآن کے مضامین آ جانے کا یہ مطلب درست نہیں، دراصل یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جو نہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں نہ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اپنے ایجاد کردہ طریقوں کو قرآن کا نام دے کر مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ (المنار)

⑧ سورۂ فاتحہ کا دوسری سورتوں سے تعلق: ① کائنات کی تمام چیزوں کی تخلیق، پرورش اور حفاظت ''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' اور ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے تحت ہیں۔ ② توحید کے متعلق تمام قرآنی آیات ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کے تحت ہیں۔ ③ داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں اور دوسرے تمام مقامات میں عدل و انصاف کا ذکر ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے تحت ہے۔ ④ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' کے تحت اور ان کی اور تمام انبیاء کی دعائیں ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کے تحت ہیں۔ ⑤ ایوب علیہ السلام کی شفا، یونس علیہ السلام کی نجات، ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں محفوظ رہنا، زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد ملنا وغیرہ سب ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے تحت ہیں۔ ⑥ ایمان دار اور متقی لوگوں کے احوال و واقعات اور ان کا نیک انجام آخری آیت کے تحت ہیں۔ اسی طرح بدکار اور سرکش لوگوں کے احوال و واقعات اور ان کا انجام بد بھی اسی آیت کے تحت ہیں۔ اسی کے مطابق دوسری تمام آیات و واقعات سمجھ لیں۔ ⑦ شیطان کا تکبر کے باعث دھتکارا ہوا ہونا ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کی مثال ہے۔ (بدیع التفاسیر)

⑨ یہ سورت اگرچہ اللہ کا کلام ہے مگر یہ بندوں کو سکھانے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ وہ یوں کہیں۔ دلیل اس کی گزشتہ حدیث ہے کہ بندہ یوں کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے۔ اس میں بندے کو اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثنا اور تمجید کی جائے، پھر اللہ تعالیٰ سے اس کا بندہ ہونے کے تعلق کا ذکر کیا جائے اور اپنی بندگی کا وسیلہ پیش کیا جائے، اس کے بعد اللہ سے مدد مانگتے ہوئے اصل مقصد کا سوال کیا جائے جو صراط مستقیم کی ہدایت کا سوال ہے، جس سے اہم کوئی سوال نہیں۔ اس لیے بعض اہل علم نے اس کا نام ''تعلیم المسئلہ'' بھی رکھا ہے، یعنی مانگنے کا طریقہ سکھانے والی سورت۔

⑩ بعض لوگ زندہ یا فوت شدہ لوگوں کے نام کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! فلاں کے وسیلے سے یا واسطے سے یا بحرمت فلاں میری دعا قبول فرما، یہ بدعت ہے اور قرآن وسنت سے کہیں ثابت نہیں اور اگر یہ عقیدہ رکھے کہ ان بزرگوں کا نام لیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ سے منوا لیتے ہیں تو یہ شرک ہے جس میں مشرکین عرب مبتلا تھے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۸) اور سورۂ زمر (۳)۔ صحیح وسیلہ جو ثابت ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے وسیلے سے دعا کرنا ہے، یا اپنے کسی صالح عمل کے وسیلے سے دعا کرنا، جیسا کہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" میں ہے اور جیسا کہ آل عمران (۱۹۳) میں ایمان لانے کے وسیلے سے دعا کی گئی ہے اور غار والے تین اصحاب نے اپنے اپنے خالص عمل کے وسیلے سے دعا کی تھی۔ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب حدیث الغار : ٣٤٦٥، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] یا کسی زندہ آدمی سے دعا کروانا، جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کروایا کرتے تھے اور عمر رضی اللہ عنہ عباس رضی اللہ عنہ سے بارش کی دعا کروایا کرتے تھے۔ [ بخاری، فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب ذکر العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ : ٣٧١٠، عن أنس رضی اللہ عنہ ] ان تین صورتوں کے سوا وسیلے کی جتنی صورتیں ہیں، کچھ بدعت ہیں اور کچھ شرک کے زمرے میں آتی ہیں، اس لیے ان سے اجتناب لازم ہے۔

⑪ یہ سورت بہترین دم ہے، سانپ کے زہر جیسی خطرناک بیماری اور دیوانگی جیسی مشکل سے درست ہونے والی بیماری کا دور ہونا اس کی بے انتہا شفائی تاثیر کی دلیل ہے۔ میری ہمشیرہ ایک ٹانگ سے معذور تھی اور بیساکھی کے سہارے سے چلتی تھی، اس کی تندرست ٹانگ بھی بے کار ہوگئی، سارے گھر والے سخت مصیبت میں پھنس گئے، میرے والد صاحب کو ایک عالم نے سورۂ فاتحہ کا دم کرنے کی تاکید کی۔ تیرھویں دن ہمشیرہ دیوار کے سہارے سے ٹانگ پر کھڑی ہوگئی اور پھر اس کی ٹانگ بالکل تندرست ہوگئی۔ تقریباً چالیس برس ہو گئے آج تک وہ بیساکھی کے ساتھ اس ٹانگ پر چلتی پھرتی ہے۔ مجھے زندگی میں دو تین دفعہ نہایت سخت بیماری پیش آئی، علاج کے ساتھ ساتھ گھر والے سورۂ فاتحہ کا دم کرتے رہے، اگرچہ کچھ مدت لگی مگر اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی۔ (الحمد للہ)

⑫ ان احادیث سے قرآن کے ساتھ دم پر اجرت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ: (( اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ )) (سب سے زیادہ حق چیز جس پر تم اجرت لو، اللہ کی کتاب ہے) [ بخاری، الطب، باب الشروط فی الرقیة بفاتحة الکتاب : ٥٧٣٧ ] اس کی دلیل ہیں۔ کتاب اللہ کی کتابت، طباعت، جلد بندی، خرید وفروخت اور تعلیم وغیرہ پر اجرت نہایت پاکیزہ اجرت ہے۔ اہل کتاب کو جو اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت لینے پر ملامت کی گئی اس کی وجہ ان کا حق کو چھپانا اور دنیاوی مفاد کے لیے غلط فتوے دینا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۱، ۷۹، ۱۷۴) اور آل عمران (۱۸۷)۔

■ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ : شیخ المفسرین طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھایا کہ اپنے تمام کاموں اور اہم مواقع سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ عالیہ کا ذکر کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے

## اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے ○

سے اپنی تمام مخلوق کو طریقہ سکھایا کہ اپنی گفتگو کا آغاز اور اپنے خطوط، کتابوں اور تمام ضروری کاموں کی ابتدا اسی کے ساتھ کریں، یہاں تک کہ "بِسۡمِ اللّٰهِ" (اللہ کے نام کے ساتھ) کہتے ہوئے یہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اللہ کے نام کے ساتھ کیا کرنا ہے، حذف شدہ لفظ خود ہی واضح ہوتا ہے کہ میں اللہ کے نام کے ساتھ پڑھتا ہوں یا کھاتا ہوں یا فلاں کام کرتا ہوں۔ یہاں "اسم" (نام) "تَسۡمِيَةٌ" (نام لینے) کے معنی میں ہے، جیسا کہ "کَلَامٌ" "تَکۡلِيۡمٌ" (کلام کرنے) کے معنی میں اور "عَطَاءٌ" "اِعۡطَاءٌ" (دینے) کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ میں اللہ کا نام لینے اور اسے یاد کرنے کے ساتھ پڑھتا ہوں (یا کوئی بھی کام کرتا ہوں) اور اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا کا نام لینے کے ساتھ قراءت (یا کسی بھی کام) کا آغاز کرتا ہوں۔'' مختصراً لفظ "اللّٰهِ" اس ہستی کا علم (ذاتی نام) ہے جو سب سے بلند و برتر اور سب کا خالق و مالک ہے۔ اس لفظ کا اصل "اِلَاہٌ" ہے۔ الف لام لگایا تو "اَلۡاِلَاہٌ" بن گیا۔ کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لیے "اِلَاہٌ" کا ہمزہ حذف کر دیا گیا اور الف لام والے لام کو "اِلَاہٌ" کے لام میں مدغم کر دیا، "اِلَاہٌ" کے لام کے بعد والا الف بھی کثرت استعمال کی وجہ سے لکھنے میں ترک کر دیا گیا، تو لفظ "اللّٰهِ" ہو گیا۔ یہ "فِعَالٌ" بمعنی "مفعول" ہے، یعنی "اِلَاہٌ" بمعنی "مَاۡلُوۡہٌ" ہے، یعنی وہ ذات جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ "الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کی تفسیر اگلی آیت میں آ رہی ہے۔

"بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" سورۂ نمل میں بالاتفاق آیت کا جزو ہے۔ صحابہ کے اجماع کے ساتھ اسے فاتحہ اور دوسری سورتوں کے شروع میں لکھا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورۂ توبہ کے سوا ہر سورت کا جزو ہے۔ ہر سورت کے ساتھ اس کا نازل ہونا صحیح حدیث سے بھی ثابت ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک سورت کا دوسری سے الگ ہونا اس وقت تک نہیں پہچانتے تھے جب تک آپ پر "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" نازل نہیں ہوتی تھی۔ [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب من جهر بها : ۷۸۸ ]

❶ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ: حمد کا معنی کسی خوبی کی وجہ سے تعریف ہے۔ اس پر الف لام استغراق کا ہے جس سے مراد حمد کے تمام افراد ہیں، یعنی جو تعریف بھی ہے اللہ ہی کی ہے، نہ کسی دوسرے خود ساختہ معبود کی نہ کسی مخلوق کی، کیونکہ مخلوق میں اگر تعریف کے لائق کوئی خوبی ہے تو وہ اسی کی پیدا کردہ ہے۔

❷ لفظ ''اللہ'' چونکہ ذاتی نام ہے، اس لیے اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء و صفات آ جاتے ہیں، وہ ننانوے اسماء و صفات بھی جن کا ذکر حدیث میں ہے اور وہ بھی جو ان کے علاوہ ہیں، خواہ وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھائے ہیں یا ان کا علم صرف اپنے پاس رکھا ہے۔ جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد وہ ذات گرامی ہے جو نبی بھی ہے رسول بھی، شاہد، مبشر اور نذیر بھی، داعی الی اللہ اور سراج منیر بھی، ماحی اور عاقب بھی، خاتم النّبیین اور سید ولد آدم بھی، غرض اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(ذاتی نام) میں آپ کے تمام نام اور تمام صفات آ جاتی ہیں، اسی طرح لفظ ''اللہ'' علم (ذاتی نام) ہونے کی وجہ سے تمام اسماء وصفات کا جامع ہے، اس لیے اہل علم فرماتے ہیں کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی، یعنی سب تعریف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ وہ تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے اور ہر صفت پر اس کی حمد لازم ہے۔

3 ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' میں کئی عموم ہیں اور ایک خصوص ہے۔ ''اَلْحَمْدُ'' میں الف لام استغراق کا ہونے کی وجہ سے کئی قسم کا عموم ہے اور ''لِلّٰهِ'' میں ایک خصوص ہے، وہ یہ کہ اس میں لام اختصاص کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر حمد اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ حمد کے عموم میں فاعل کا بھی عموم ہے کہ ہر حمد کرنے والا درحقیقت اللہ ہی کی تعریف کرتا ہے، خواہ وہ خود رب العالمین ہو یا انسان یا جن یا فرشتہ یا کوئی بھی مخلوق ہو۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ [ بنی إسرائيل : ٤٤ ] ''جو بھی شے ہے اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔'' اسی طرح حمد کے عموم میں مکان (جگہ) کا بھی عموم ہے، یعنی وہ کسی بھی جگہ میں ہو، زمین میں ہو یا آسمان میں، یا ان کے درمیان ہو یا عرش پر، فرمایا: ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [ الروم : ١٨ ] یعنی آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہے۔ اسی طرح زمان کا بھی عموم ہے، یعنی وہ حمد دن میں ہو یا رات میں، ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں، دنیا میں ہو یا آخرت میں، سب کی سب اللہ کے لیے خاص ہے، فرمایا: ﴿وَهُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ﴾ [ القصص : ٧٠ ] ''اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے لیے دنیا اور آخرت میں سب تعریف ہے۔'' اس طرح ''اَلْحَمْدُ'' میں خود حمد کا بھی عموم ہے، یعنی وہ حمد کسی بھی لفظ کے ساتھ ہو یا کسی بھی زبان میں، بلند آواز سے ہو یا آہستہ، دل سے ہو یا زبان سے یا دوسرے اعضاء کے ساتھ، غرض تعریف کوئی بھی ہو صرف اکیلے اللہ کے لیے خاص ہے، کسی دوسرے میں کوئی خوبی یا قابلِ تعریف بات ہے تو وہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے، اس لیے اس کی وجہ سے اس کی تعریف بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے۔

4 بعض اہلِ علم نے قرآن مجید کے چار حصے کیے ہیں، ہر حصہ ''اَلْحَمْدُ'' سے شروع ہوتا ہے۔ پہلا حصہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''سورۂ فاتحہ'' سے شروع ہوتا ہے، دوسرا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ سورۂ انعام سے، تیسرا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ سورۂ کہف سے اور چوتھا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ سورۂ سبا سے۔

5 ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ایسا مبارک کلمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا آغاز اس سے ہوتا ہے، نبی ﷺ ہر خطبہ کی ابتدا اس سے کرتے تھے۔ (مسلم : ۸۶۸/۴۵) کھانا کھانے کے بعد اور چھینک آنے پر اللہ کی حمد کرتے تھے۔ (بخاری : ۵۴۵۸، ۶۲۲۴) سوتے وقت بستر پر آ کر یہ دعا پڑھتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَ آوَانَا، فَكَمْ مِمَّنْ لَا كَافِيَ لَهُ وَلَا مُؤْوِيَ» ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور ہمیں پلایا اور ہمیں کافی ہو گیا اور ہمیں ٹھکانا دیا، کیونکہ کتنے ہی لوگ ہیں جنھیں نہ کوئی کفایت کرنے والا ہے اور نہ کوئی ٹھکانا دینے والا۔'' [ مسلم، الذکر والدعاء، باب

الدعاء عند النوم : ۲۷۱۵، عن أنس رضی اللہ عنہ] صبح اٹھتے وقت یہ دعا پڑھتے :(( اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ )) ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔''

[ بخاري، الدعوات، باب وضع اليد تحت الخد اليمنٰى : ٦٣١٤، عن حذيفة رضی اللہ عنہ ]

قیامت کے دن لوگ قبروں سے اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے نکلیں گے، فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ ﴾ [ بني إسرائيل : ٥٢ ] ''جس دن وہ تمھیں بلائے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے چلے آ ؤ گے۔'' اور جنت میں داخل ہونے کے بعد اللہ کی حمد کریں گے، فرمایا: ﴿ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ﴾ [ الأعراف : ٤٤ ] ''اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی۔'' اور جنت میں ان کی گفتگو کا اختتام بھی اسی پر ہوا کرے گا، فرمایا: ﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ يونس : ١٠ ] ''ان کی دعا ان ( جنتوں ) میں یہ ہوگی ''پاک ہے تو اے اللہ!'' اور ان کی آپس کی دعا ان میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔ ( آمین )

(6) کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ایک عظیم الشان حقیقت کا اظہار بھی ہے، کلمۂ شکر بھی اور بہترین مکمل دعا بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پاکیزگی نصف ایمان ہے اور ''الحمد للہ'' میزان کو بھر دیتا ہے۔'' [ مسلم، الطهارة، باب فضل الوضوء : ٢٢٣، عن أبي مالك الأشعري رضی اللہ عنہ ] تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت کا اصل مقصود اسے پکارنا اور اس سے مانگنا ہے، جیسا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ )) ''پکارنا ہی عبادت ہے۔'' [ ترمذي، الدعوات، باب منه ...... : ٣٣٧٢، و صححه الألباني ] انسان کی ہر عبادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، غرض زندگی کا ہر لمحہ اس کے حکم کے مطابق غلام بن کر گزارنا اس سے مانگنے ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں سے بہترین صورت اس کی تعریف کرنا اور اس کا شکر ادا کرنا ہے، اس پر وہ مزید نعمتوں سے نوازتا ہے، فرمایا: ﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ [ إبراهيم : ٧ ] ''بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمھیں زیادہ دوں گا۔'' اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:(( اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ )) ''سب سے بہتر ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے۔'' [ ترمذي، الدعوات، باب ما جاء أن دعوة المسلم مستجابة : ٣٣٨٣، عن جابر رضی اللہ عنہ ـ السلسلة الصحيحة : ١٤٩٧ ] ایک عرب شاعر نے اپنے ممدوح کے متعلق کہا ہے ؎

اِذَا اَثْنٰی عَلَيْكَ الْمَرْءُ يَوْمًا  كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ

''جب کوئی شخص کسی دن تمھاری تعریف کرتا ہے تو اسے اس کے سوال کرنے سے تعریف ہی کافی ہو جاتی ہے۔''

جب ایک سخی شخص جو مخلوق ہے، صرف تعریف سن کر نواز دیتا ہے، صاف لفظوں میں سوال کا انتظار نہیں کرتا تو رب العالمین جو جواد بھی ہے، ماجد بھی، اپنی حمد پر کیوں نہیں نوازے گا۔ خصوصاً جب اس سے بڑھ کر اپنی تعریف سن کر خوش ہونے والا کوئی

نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا کوئی نہیں جسے اللہ سے زیادہ (اپنی) تعریف پسند ہو، اس لیے اس نے خود اپنی تعریف کی ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب قول الله عزو جل : ﴿ قل إنما حرم ربی الفواحش...... ﴾ : ٤٦٣٧، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ]

7 رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: "رَبِّ" کا معنی ہے سردار جس کی اطاعت ہوتی ہو اور مالک اور پرورش کرنے والا۔ یہ " رَبَّ يَرُبُّ (ن) " (پرورش کرنا) میں سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے، یا مصدر ہے جو مبالغہ کے لیے اسم فاعل کی جگہ استعمال ہوا ہے، جیسے "زَيْدٌ عَدْلٌ" "زَيْدٌ عَادِلٌ" کی جگہ استعمال ہوتا ہے، یعنی زید اتنا عادل ہے کہ اس کا وجود ہی عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ میں یہ تینوں صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں، اس سے بڑا سید کوئی نہیں، وہی سب کا مالک ہے اور ہر ایک کو پیدائش سے کمال تک پہنچانے والا اور اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا بھی وہی ہے، گویا وہ ذات پاک سراپا پرورش ہے۔

8 "الْعٰلَمِيْنَ" "اَلْعَالَمُ" کی جمع ہے، جہان۔ "اَلْعَالَمُ" جمع ہے جس کا واحد نہیں، جیسے "قَوْمٌ، رَهْطٌ، نَاسٌ" وغیرہ۔ معنی اس کا ہے: " مَا يُعْلَمُ بِهِ الشَّيْءُ" جس کے ذریعے سے کسی چیز کا علم حاصل ہو، جیسا کہ "خَاتَمٌ" کا معنی ہے: "مَا يُخْتَمُ بِهِ" جس کے ساتھ مہر لگائی جائے۔ عرب یہ وزن آلہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جہان کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ کوئی بھی مخلوق ہو، اس کے ذریعے سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہے کہ اسے پیدا کرنے والا موجود ہے۔ "الْعٰلَمِيْنَ" کو جمع اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے، مثلاً عالم انس، عالم جن، عالم نبات، عالم جماد، عالم ارض اور عالم سماء وغیرہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے کئی عالم ہیں، مثلاً انسانوں میں ہر جنس، ہر زبان اور ہر علاقے والوں کا الگ جہان ہے۔ غرض اتنے بے حساب جہاں ہیں جنھیں رب تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، فرمایا: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ [ المدثر : ۳۱ ] ''اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' ایک چیونٹی ہی کی ہزاروں قسمیں ہیں، پرندوں کے بے شمار جہان ہیں، سمندر کی مخلوقات کا شمار ہی نہیں، بے شمار کہکشائیں اور ان کے سیارے جن کے مقابلے میں سورج چاند وغیرہ ایک انگوٹھی کی طرح ہیں، ہر ایک الگ جہان ہے۔ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے وحدہ لاشریک لہ ہونے کے علم کا ذریعہ ہے۔ رب العالمین ان میں سے ہر ایک کو پیدا کرنے والا، پھر ہر لمحہ اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا اور اسے کمال تک پہنچانے والا ہے۔ غرض سب تعریف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ وہ "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ہے۔

9 "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کے بعد اللہ تعالیٰ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں، پہلی صفت "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں قرآن کے بنیادی مضامین میں سے توحید کے علاوہ وعدہ اور وعید دونوں موجود ہیں کہ پرورش کرنے والا خوش ہو کر نوازتا ہے تو ناراض ہو کر محروم بھی کر دیا کرتا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ

بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ○

① الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ : یہ دوسری اور تیسری صفت ہے۔ جب سارے جہانوں کی ربوبیت کا ذکر ہوا تو ساتھ ہی اللہ کی بے حد وحساب رحمت کا ذکر ہوا، کیونکہ رحمت کے بغیر ربوبیت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ دونوں رحم میں سے مبالغے کے صیغے ہیں۔ معنی دونوں کا بہت زیادہ رحم والا ہے، مگر اس پر اتفاق ہے کہ "الرَّحْمٰنِ" میں مبالغہ زیادہ ہے، کیونکہ اس کے حروف "الرَّحِیْمِ" سے زیادہ ہیں (اور حروف کی زیادتی سے معنی میں زیادتی ظاہر ہوتی ہے) اور اس لیے بھی کہ لفظ ''اللہ'' کی طرح ''رحمان'' بھی صرف باری تعالیٰ کے لیے بولا جاتا ہے، جب کہ ''رحیم'' بعض اوقات مخلوق پر بھی آ جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا: ﴿ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ التوبة : ۱۲۸ ] ''مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے یہاں رحم میں مبالغے کا اظہار کرنے کے لیے دو لفظ کیوں ذکر فرمائے؟ بعض اہل علم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے، مگر اکثر علماء ایک مادے (رحم) سے مشتق ہونے کے باوجود ان دونوں کے درمیان فرق مانتے ہیں۔ اکثر مفسرین نے فرمایا کہ "الرَّحْمٰنِ" کا معنی بڑی بڑی نعمتیں عطا کرنے والا اور "الرَّحِیْمِ" کا معنی دقیق اور باریک نعمتوں سے نوازنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ رحمان وہ ہے جس کی رحمت سب کے لیے عام ہے، مسلم ہوں یا کافر، جب کہ رحیم وہ ہے جو خاص طور پر مومنوں کو رحمت سے نوازنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ رحمان وہ ہے جس کی رحمت دنیا میں مسلم و کافر سب کے لیے اور آخرت میں صرف مسلمانوں کے لیے ہے اور رحیم وہ جو آخرت میں خاص مسلمانوں پر رحم کرنے والا ہے۔ مگر ان تینوں اقوال کی پختہ دلیل، جس پر اعتراض نہ ہو، مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ مفسر قاسمی نے شیخ محمد عبدہ مصری رحمہ اللہ سے ایک مدلل و مضبوط فرق نقل کیا ہے، میں اسے تھوڑی سی وضاحت اور اضافے سے نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رحمان " فَعْلَانُ" کے وزن پر ہے، جو معنی کی کثرت پر دلالت کرتا ہے، مثلاً "عَطْشَانُ" بہت زیادہ پیاسا، "غَرْثَانُ" بہت زیادہ بھوکا اور " غَضْبَانُ" غصے سے بھرا ہوا۔ اس وزن میں معنی کی کثرت تو ہوتی ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے، بلکہ وہ ختم بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام طور سے لوٹے تو "غَضْبَانُ" (غصے سے بھرے ہوئے) تھے، مگر ہارون علیہ السلام کا عذر سن کر غصہ ختم ہو گیا، بلکہ ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔ گویا رحمان کا معنی وہ ذات ہے جس میں بہت ہی زیادہ رحمت ہے، جو بے حد و بے حساب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق پیدا فرمائی تو اس کتاب میں لکھ دیا جو اس کے پاس عرش پر ہے کہ بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔'' [ بخاری، التوحيد، باب قول الله تعالٰی : ﴿ ويحذركم الله نفسه ﴾ : ۷۴۰٤، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] " فَعِيْلٌ" کا وزن کسی چیز میں مفہوم کے لزوم، دوام اور ہمیشگی کے لیے آتا ہے، وہ صفت اس

## مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝

## بدلے کے دن کا مالک ہے ○

سے جدا نہیں ہو سکتی، مثلاً علیم، حلیم، عظیم، خبیر، بصیر، سمیع، رؤف اور رحیم۔ یعنی وہ ذات جس کی رحمت دائمی ہے، کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ دونوں صفتوں کے ملنے سے صفت رحمت کی وسعت بھی ثابت ہوئی اور اس کا دوام بھی۔ اگر اس کی رحمت میں وسعت و کثرت نہ ہو تو بعض مخلوق محروم رہ جائے اور اگر اس میں دوام نہ ہو تو کوئی چیز نہ پایۂ تکمیل تک پہنچے، نہ باقی رہ سکے۔

2 قرآن مجید میں ثنائے الٰہی پر مشتمل تمام آیات "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی تفصیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان نماز کی تقسیم والی حدیث قدسی کے مطابق بندہ جب "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری ثنا کی۔'' [ مسلم، الصلوۃ، وجوب قراءۃ الفاتحۃ ...... : ۳۹۵ ]

1 مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: "الدِّيْنِ" "دَانَ يَدِيْنُ" کا مصدر ہے، بدلہ دینا، جزا دینا۔ رحمٰن و رحیم کے بعد جزا کے دن کا مالک ہونے کی صفت بیان فرمائی۔ ایک قراءت ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ ہے یعنی روزِ جزا کا مالک اور دوسری "مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" ہے، یعنی روز جزا کا بادشاہ۔ قرآن مجید کے رسم الخط میں "مٰلِكِ" لکھا ہے، اسے "مَالِكِ" اور "مَلِكِ" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے اور دونوں قراءتیں متواتر طور پر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا مالک بھی ہے اور بادشاہ بھی۔ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے ساتھ قیامت کے دن کے مالک اور بادشاہ ہونے کی مناسبت یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی بہت رحم کرنے والا ہوتا ہے مگر اس کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا، اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی رحم نہیں کر سکتا، پھر کوئی شخص بہت سی ملکیت کا مالک ہوتا ہے مگر اس کا بادشاہ کوئی اور ہوتا ہے، وہ مالک ہوتے ہوئے بھی پورا اختیار نہیں رکھتا۔ "يَوْمِ الدِّيْنِ" کے معنی یوم جزا کے ہیں۔ اس دنیا میں بھی مکافات، یعنی اعمال کی جزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے، مگر اس جزا کا مکمل ظہور چونکہ قیامت کے دن ہوگا اس لیے قیامت کے دن کو خاص طور پر "يَوْمِ الدِّيْنِ" (بدلے کا دن) کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس دن کے "مَالِكِ" اور "مَلِكِ" (بادشاہ) ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس روز ظاہری طور پر بھی مالکیت اور ملوکیت کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴾ [ الانفطار : ۱۹ ] ''جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کی مالک نہیں ہوگی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔'' اور فرمایا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [ المؤمن : ۱٦ ] ''آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، دبدبے والا ہے۔'' اس دن مالک بھی اللہ تعالیٰ ہوگا، بادشاہ بھی وہی ہوگا، صرف اسی کا حکم چلے گا۔ صفت رحمت اور

## اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ

### ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں ○

بدلے کے دن کی ملکیت میں مناسبت اس حدیث سے واضح ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں، جن میں سے اس نے ایک رحمت جن و انس، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے درمیان نازل فرمائی ہے، اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ننانویں رحمتیں مؤخر کر رکھی ہیں، جن کے ساتھ وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔'' [ مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالىٰ...... : ۲۷۵۲/۱۹۔ بخاری : ۶۰۰۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

2 تقسیم صلاۃ والی حدیث قدسی کے مطابق بندہ جب ﴿ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (( مَجَّدَنِيۡ عَبۡدِيۡ )) ''میرے بندے نے میری تمجید (بزرگی بیان) کی۔'' ایک روایت کے مطابق فرماتا ہے: (( فَوَّضَ اِلَيَّ عَبۡدِيۡ )) ''میرے بندے نے اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا۔'' [ مسلم، الصلوة، باب وجوب قراءة الفاتحة ...... : ۳۹۵ ]

قرآن مجید میں تمجید الٰہی اور تفویض و توکل پر مشتمل تمام آیات ''مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ'' کی تفصیل ہیں۔

1 **اِيَّاكَ نَعۡبُدُ**: سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد غائب کے صیغے کے ساتھ کی گئی ہے، ''اِيَّاكَ نَعۡبُدُ'' اور اس کے بعد کی آیات میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر لیا گیا ہے، اسے التفات کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اسے اس کا قرب اور اس کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، اب وہ براہِ راست خطاب کے صیغے سے اپنی درخواست پیش کرتا ہے۔

2 عربی زبان میں جملہ فعلیہ کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے فعل، پھر فاعل اور اس کے بعد مفعول ہوتا ہے۔ اگر بعد والے لفظ کو پہلے لایا جائے تو اس سے کلام میں تخصیص یا حصر پیدا ہو جاتا ہے۔ ''اِيَّاكَ نَعۡبُدُ'' اصل میں ''نَعۡبُدُكَ'' (ہم تیری عبادت کرتے ہیں) تھا۔ مفعول ''کاف ضمیر'' کو ''نَعۡبُدُ'' سے پہلے لایا گیا تو ''اِيَّاكَ نَعۡبُدُ'' ہو گیا، جس سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں، کسی اور کی نہیں کرتے۔ اس مفہوم کو ''ہم صرف تیری عبادت'' یا ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بعینہٖ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مفہوم ہے، یعنی عبادت کے لائق اللہ تعالیٰ ہی ہے، دوسرا کوئی نہیں۔

3 عبادت کا معنی کسی کو غیبی طاقتوں کا مالک سمجھ کر اس سے انتہائی درجے کی محبت کے ساتھ اس کے سامنے انتہائی درجے کی عاجزی، ذلت اور خوف ہے۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اسلام نے بندوں کو ایسی ہر غلامی سے آزادی دلا کر صرف

ایک ذات پاک کا بندہ اور عبد بنا دیا جو انھیں پیدا کرنے والی اور ان کی پرورش کرنے والی ہے۔ عبادت صرف اس کی ہے، اس کے ساتھ کسی کو نہ شریک کرنا جائز ہے نہ اس کی محبت جیسی محبت یا اس کے خوف جیسا خوف کسی سے جائز ہے۔ افسوس کہ بعض مسلمان اللہ کے گھر میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت اتنے خوف زدہ اور لرزہ براندام نہیں ہوتے جتنے وہ کسی قبر پر یا کسی پیر کے پاس جاتے یا واپس آتے وقت ہوتے ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کے عہد و اقرار کے بعد کسی دوسرے کی بندگی اللہ تعالیٰ سے سب سے بڑی غداری ہے، جسے وہ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۶) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تین جگہ فرمایا کہ ان لوگوں نے اللہ کی قدر اس طرح نہیں کی جیسے اس کی قدر کا حق ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۹۱)، حج (۷۴) اور زمر (۶۷)۔

4 وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: "نَسْتَعِيْنُ" "عَوْنٌ" میں سے باب استفعال فعل مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے، جو اصل میں "نَسْتَعْوِنُ" تھا۔ اس میں بھی "اِيَّاكَ" پہلے آنے کی وجہ سے حصر ہے، یعنی ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، کسی دوسرے سے نہیں۔ یہاں سے بندے کی درخواست شروع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قبول ہو چکی۔

5 "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کو پہلے اور "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کو بعد میں ذکر کر کے دعا کا سلیقہ سکھایا گیا ہے کہ درخواست سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا اور تمجید کے بعد اپنی بندگی اور اپنے تعلق کا حوالہ پیش کرو، یعنی اپنے عمل کے وسیلے سے درخواست کرو۔ یہ وسیلہ حق ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾ [ آل عمران : ۱۹۳ ] "اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک آواز دینے والے کو سنا، جو ایمان کے لیے آواز دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ فوت کر۔" صحیح بخاری (۳۴۶۵) میں غار میں پھنسنے والے تین آدمیوں کا قصہ بھی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص سے کیے ہوئے اعمال کے وسیلے سے دعا قبول ہوتی ہے۔ البتہ کسی شخص کا نام لے کر اس کی ذات یا اس کی حرمت وغیرہ کے وسیلے سے دعا کرنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں، مثلاً یہ کہنا کہ یا اللہ! فلاں کے وسیلے یا طفیل یا واسطے سے یا بحرمت فلاں میری دعا قبول کر۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۷) ﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ﴾ کی تفسیر۔

6 "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کے بعد "وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" لانے میں یہ سبق بھی ہے کہ آدمی یقین رکھے کہ وہ کوئی بھی نیکی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا اور مکمل طور پر اللہ کے سامنے بے بس اور بے اختیار ہونے کا عقیدہ رکھے اور اس کا اظہار و اقرار بھی کرے۔ یعنی ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں اور اپنے تمام کاموں میں تیری ہی مدد مانگتے ہیں، تیری مدد کے بغیر نہ ہم تیری عبادت کر سکتے ہیں نہ کچھ اور۔ اس لفظ میں اللہ پر توکل اور اپنے تمام کام اس کے سپرد کرنے کی اعلیٰ ترین تعلیم دی گئی ہے۔ بعض سلف نے فرمایا، فاتحہ قرآن کا خلاصہ ہے اور ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾

فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ کیونکہ " **اِيَّاكَ نَعْبُدُ** " کہنے سے انسان شرک سے بری ہو جاتا ہے اور " **اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ** " کہنے سے وہ اپنی قوت و طاقت اور اختیار سے خالی ہو کر صرف اللہ پر توکل و اعتماد کا اقرار و اظہار کرتا ہے۔

7 اس استعانت سے مراد ان کاموں میں مدد طلب کرنا ہے جن کا اختیار اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے پاس رکھا ہے، کسی مخلوق کو ان کا اختیار نہیں دیا، مثلاً معالج دوا دے سکتا ہے مگر شفا صرف اللہ کے پاس ہے۔ کوئی صاحب خیر کچھ روپے پیسے دے سکتا ہے مگر غنی یا فقیر کر دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ طبیب علاج کر سکتا ہے مگر اولاد سے نوازنا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فوج، آدمیوں اور اسلحے سے ایک دوسرے کی مدد ہو سکتی ہے مگر فتح و شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ غرض دنیا کے ظاہری اسباب و وسائل جو انسانوں کو عطا کیے گئے ہیں، ان میں ایک دوسرے سے مدد مانگنا بھی جائز ہے اور ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی لازم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى** ﴾ [ المائدۃ : ۲ ] ''نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔'' افسوس کہ بعض لوگ ان ہستیوں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جو سنتے ہی نہیں، نہ پاس موجود ہوتے ہیں اور ایسی چیزوں کی مدد مانگتے ہیں جو اگر وہ زندہ ہوں یا سن رہے ہوں تب بھی ان کے اختیار میں نہیں۔ کتنا ظلم ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں " **اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ** " (صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں) کا اقرار کرتے ہیں، پھر غیر اللہ سے مدد مانگتے ہیں، مثلاً "یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِیْ" (اے اللہ کے رسول! میری مدد کیجیے) یا اے مولا علی، اے شیر خدا! میری کشتی پار لگا دینا، یا المدد یا غوث اعظم، یا مدد کن یا معین الدین چشتی۔ غرض صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کے عہد و اقرار کے بعد غیروں کو رب تعالیٰ کا شریک بنا کر انھیں رب کے اختیارات کا مالک سمجھتے ہیں اور ان سے استغاثہ و استعانت کرتے ہیں۔

8 یہاں ایک سوال ہے کہ " **اِيَّاكَ نَعْبُدُ** " سے آخر فاتحہ تک دعا کرنے والا جمع کے صیغے سے دعا کرتا ہے، جب کہ دعا کرنے والا ایک ہے، اس لیے واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا، اگر جمع کا لفظ تعظیم کے لیے مانا جائے تو یہ دعا کے مناسب نہیں ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ بندہ اپنی انتہائی تواضع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عالی بارگاہ میں اپنی درخواست اکیلا پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتا، بلکہ تمام عبادت کرنے والے جن و انس اور فرشتوں کے ساتھ مل کر پیش کرتا ہے کہ ہم سب (جن میں تیرا یہ عاجز بندہ بھی ہے) تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

بعض اہل علم نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ جمع کے صیغے میں ایک لطیف تواضع پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ واحد کے صیغے میں اپنی کچھ بڑائی کا اظہار ہوتا ہے جو جمع کے صیغے میں نہیں ہے۔ (ابن کثیر) بعض مفسرین نے اس میں یہ حکمت بیان فرمائی کہ ہر مومن دوسرے مومنوں کے ساتھ ایک جسم کی مانند ہے اور ہر مومن تمام مومنوں کی نمائندگی کرتا ہے، اس لیے وہ اکیلا ہی تمام مسلمانوں کی طرف سے عرض کرتا ہے کہ ہم سب صرف تیری تعریف کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلْمُؤْمِنُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاءُ هُمْ وَ يَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ اَدْنَاهُمْ وَ هُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ » ''ایمان والے لوگ، ان کے خون آپس میں برابر ہوتے ہیں، ان کا سب سے معمولی آدمی بھی ان کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور

## اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَۙ

### ہمیں سیدھے راستے پر چلا ○

وہ اپنے سوا سب کے مقابلے میں ایک ہاتھ ہوتے ہیں۔'' [ أبو داؤد، الديات، باب أيقاد المسلم من الكافر؟ : ۴۵۳۰، وقال الألباني حسن صحيح ]

⑨ "اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ" سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عبادت و استعانت کی بہترین صورت اجتماعی عبادت و استعانت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی جامع صورت نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا: ﴿ **وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ** ﴾ [ البقرۃ : ۴۳ ] ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

⑩ "اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ" میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس کام کے لیے مدد مانگتے ہیں، تاکہ وہ عام رہے، مقصد یہ ہے کہ ہر کام میں تیری مدد مانگتے ہیں۔

① **اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ** : ہدایت کا ایک معنی نرمی اور مہربانی کے ساتھ راستہ بتانا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ **وَاِنَّكَ لَتَهۡدِيۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ** ﴾ [ الشوریٰ : ۵۲ ] ''اور بے شک تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔'' یہ ہدایت اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دوسرے لوگ سبھی کر سکتے ہیں۔ ہدایت کا دوسرا معنی راستے پر چلنے کی توفیق دینا ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مخاطب کرکے فرمایا: ﴿ **اِنَّكَ لَا تَهۡدِيۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ** ﴾ [ القصص : ۵۶ ] ''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔'' "**اَلصِّرَاطَ**" اس کا اصل "سِرَاطٌ" ہے، جو "سَرَطَ يَسۡرُطُ سَرَطًا، سَرَطَانًا (ن، ع)" سے مشتق ہے، سین کو صاد سے بدل دیا گیا، اس کا معنی نگلنا ہے۔ "سِرَاطٌ" کا معنی واضح راستہ ہے، کیونکہ اس پر چلنے والا اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے نگلا ہوا کھانا غائب ہو جاتا ہے۔ (القاموس) "**اَلۡمُسۡتَقِيۡمَ**" "قَامَ يَقُوۡمُ" میں سے باب استفعال سے اسم فاعل ہے، جو اصل میں "مُسۡتَقۡوِمٌ" ہے، معنی اس کا وہی ہے جو "قَامَ يَقُوۡمُ" کا ہے۔ حروف کی زیادتی سے معنی میں تاکید پیدا ہوگئی، بالکل سیدھا راستہ۔

② پچھلی آیت میں "اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ" سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا مدد چاہتے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے جواب یہ سکھایا کہ کہو پروردگارا! ہمیں زندگی کے ہر لمحے میں اور اپنے ہر کام میں تیری ہدایت کی ضرورت ہے، کیونکہ اگر تو نہ بتائے تو ہم ظلوم و جہول کسی چیز کے متعلق جان ہی نہیں سکتے کہ اس میں صحیح راستہ کیا ہے۔ اگر جان بھی لیں تو اپنے نفس کی کمزوریوں، شہوت، غضب، حسد، طمع، بخل اور کبر وغیرہ کی وجہ سے اور شیطان اور دوسرے دشمنوں کی وجہ سے اس صحیح راستے پر چلنا اور قائم رہنا تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے ہماری درخواست ہے کہ ہر کام اور ہر لمحے میں ہمیں سیدھے راستے کو

جاننے کی اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

③ بعض لوگ یہاں ایک سوال ذکر کرتے ہیں کہ جب ہم پہلے ہی ہدایت پر ہیں تو پھر ہدایت کی درخواست کا کیا مطلب؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہدایت پر قائم رکھ۔ یہ مطلب بھی درست ہے، مگر آپ خود سوچ لیں کہ انسان کو ہر لمحے کسی نہ کسی کام کے متعلق فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ مجھے اس میں کیا کرنا ہے، تھوڑی سی لغزش اسے بہت دور پہنچا سکتی ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ہم ہر وقت اور ہر کام میں ہدایت پر ہیں، بہت بڑی دلیری کی بات ہے۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر ہم کسی بھی قدم پر گمراہی کا شکار ہو سکتے ہیں، ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگتے رہنا لازم ہے۔

④ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مراد دین اسلام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تک اور جنت تک پہنچانے والا یہی واضح، صاف اور سیدھا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی صراحت فرمائی: ﴿قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ۬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الأنعام: ۱۶۱ تا ۱۶۳] "کہہ دے بے شک مجھے تو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر دی ہے جو مضبوط دین ہے، ابراہیم کی ملت، جو ایک ہی طرف کا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا۔ کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمین (حکم ماننے والوں) میں سب سے پہلا ہوں۔" نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم (سیدھے راستے) کی مثال بیان فرمائی۔ اس راستے کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں۔ ان دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں اور اس راستے کے دروازے پر ایک بلانے والا ہے جو کہتا ہے: "اے لوگو! تم سب اس راستے میں داخل ہو جاؤ اور ٹیڑھے مت ہونا۔" اور ایک بلانے والا اس راستے کے اوپر کنارے سے آواز دے رہا ہے۔ جب کوئی انسان ان دروازوں میں سے کسی کو کھولنا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے: "افسوس تجھ پر! اسے مت کھول، کیونکہ اگر تو اسے کھولے گا تو اس میں داخل ہو جائے گا۔" سو "الصِّرَاطَ" (وہ راستہ) اسلام ہے اور دونوں دیواریں اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں اور کھلے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور راستے کے شروع میں بلانے والی چیز اللہ کی کتاب ہے اور راستے کے اوپر کنارے والا اللہ تعالیٰ کا نصیحت کرنے والا ہے جو ہر مسلم کے دل میں ہے۔" [مسند أحمد: ۱۸۲/۴، ۱۸۳، ح: ۱۷٦۵۲۔ ترمذی: ۲۸۵۹، قال ابن کثیر حسن صحیح و صححه الألبانی والسیوطی] معلوم ہوا صراط مستقیم اسلام ہے جو ہمارے پاس کتاب و سنت کی صورت میں موجود ہے، اس لیے جب کوئی کتاب و سنت سے ہٹ کر کسی شخصیت یا گروہ کے پیچھے لگتا ہے تو وہ صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے، پھر

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۠ ۧ ع

ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں ○

اس کے لیے منزل مقصود جنت تک پہنچنا کسی صورت ممکن نہیں، جب تک ان تمام ٹیڑھی راہوں سے ہٹ کر کتاب و سنت کی واضح، کشادہ، روشن اور سیدھی راہ پر نہیں آتا۔

5 "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" میں پورا اسلام اور اس کے احکام آ گئے، باقی قرآن و سنت اس کی تفصیل ہے۔

1 صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: یعنی جن لوگوں پر تو نے دوسرے بے شمار انعامات کے ساتھ اپنی اطاعت کی توفیق کا خاص انعام کیا، ان سے مراد چار قسم کے لوگ ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے، فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ [ النساء : ٦٩ ] ''اور جو کوئی اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے۔'' قرآن مجید میں مذکور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے تمام واقعات اس مختصر جملے کی تفصیل ہیں۔

2 غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ: قرآن مجید میں "الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" یہود کو کہا گیا ہے، چنانچہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [ البقرة : ٦١ ] ''اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کی طرف سے بھاری غضب لے کر لوٹے۔'' اور فرمایا: ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ [ البقرة : ٩٠ ] ''پس وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔'' اور فرمایا: ﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [ المائدة : ٦٠ ] ''کہہ دے کیا میں تمھیں اللہ کے نزدیک جزا کے اعتبار سے اس سے زیادہ برے لوگ بتاؤں؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر وہ غصے ہوا اور جن میں سے اس نے بندر اور خنزیر بنا دیے اور جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔ یہ لوگ درجے میں سب سے برے اور سیدھے راستے سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔''

اور "الضَّآلِّيْنَ" نصاریٰ کو کہا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [ المائدة : ٧٧ ] ''اور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔'' اس آیت سے پہلے مسلسل نصاریٰ کا ذکر آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی "الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" اور "الضَّآلِّيْنَ" کی یہی تفسیر فرمائی۔ چنانچہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْيَهُوْدُ مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ وَ النَّصَارٰى ضُلَّالٌ)) ''یہود "مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ" ہیں اور نصاریٰ گمراہ ہیں۔''
[ ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة فاتحة الكتاب : ٢٩٥٤، و صححه الألبانی ]

3 رسول اللہ ﷺ کی تفسیر سے ثابت ہو گیا کہ "**الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ**" یہود ہیں اور "**الضَّآلِّيْنَ**" نصاریٰ، مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جن میں وہ عادات و خصائل پائے جاتے ہیں جو یہود کے "**الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ**" بننے کا باعث ٹھہرے، یا جن کی وجہ سے نصاریٰ "**الضَّآلِّيْنَ**" (گمراہ) ٹھہرے۔ مثلاً یہود پر غضب نازل ہونے کے اسباب جو اللہ تعالیٰ نے شمار فرمائے ہیں اختصار کے ساتھ یہ ہیں، اللہ کی کتاب میں تحریف، اللہ کی آیات کو چھپانا، اللہ کی حدود مثلاً رجم اور ہاتھ کاٹنے کو معطل کرنا، اللہ پر جھوٹ باندھنا، اپنے پاس سے مسائل بیان کر کے انھیں اللہ کا حکم قرار دینا، نبی ﷺ پر حسد کی وجہ سے ایمان نہ لانا اور باہمی ضد کی وجہ سے بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ جانا۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: " وَ بِالْجُمْلَةِ فَاِنْ شِئْتَ أَنْ تَرَى نَمُوْذَجَ الْيَهُوْدِ فَانْظُرْ اِلٰى عُلَمَاءِ السُّوْءِ مِنَ الَّذِيْنَ يَطْلُبُوْنَ الدُّنْيَا وَ قَدِ اعْتَادُوْا تَقْلِيْدَ السَّلَفِ وَ اَعْرَضُوْا عَنْ نُصُوْصِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَ تَمَسَّكُوْا بِتَعَمُّقِ عَالِمٍ وَ تَشَدُّدِهٖ وَ اسْتِحْسَانِهٖ فَاَعْرَضُوْا عَنْ كَلَامِ الشَّارِعِ الْمَعْصُوْمِ وَ تَمَسَّكُوْا بِأَحَادِيْثَ مَوْضُوْعَةٍ وَ تَأْوِيْلَاتٍ فَاسِدَةٍ كَانَتْ سَبَبَ هَلَاكِهِمْ " "قصہ مختصر اگر تم چاہو کہ یہود کا نمونہ دیکھو تو ان علمائے سوء کو دیکھ لو جو دنیا طلب کر رہے ہیں اور پہلے لوگوں کی تقلید کے عادی ہو چکے ہیں، جنھوں نے کتاب و سنت کی صریح آیات و احادیث سے منہ موڑ لیا اور کسی عالم کے تکلف، اس کے تشدد اور اس کے استحسان کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے معصوم پیغمبر ﷺ کے کلام سے منہ موڑ لیا اور من گھڑت احادیث اور فاسد تاویلات سے چمٹ گئے، جو ان کی ہلاکت کا باعث بن گئیں۔" (الفوز الکبیر)

اور نصاریٰ کی گمراہی کے اسباب یہ تھے، مسیح علیہ السلام کے بارے میں غلو، ان کو عین خدا یا تین میں سے ایک خدا کہنا، مریم علیہا السلام کو تین میں سے ایک خدا کہنا، مسیح علیہ السلام، مریم علیہا السلام اور صلیب کی پوجا کرنا، قبروں کو مسجدیں بنانا، احبار و رہبان کو رب بنانا وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَاِنْ شِئْتَ أَنْ تَرَى نَمُوْذَجًا لِهٰذَا الْفَرِيْقِ فَانْظُرِ الْيَوْمَ اِلٰى أَوْلَادِ الْمَشَائِخِ الْأَوْلِيَاءِ مَاذَا يَظُنُّوْنَ بِآبَائِهِمْ؟ فَتَجِدُهُمْ قَدْ أَفْرَطُوْا فِيْ اِجْلَالِهِمْ كُلَّ الْاِفْرَاطِ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ " "اگر چاہو کہ اس گروہ کا نمونہ دیکھو تو بزرگ اولیاء کی آج کل کی اولاد کو دیکھ لو کہ وہ اپنے باپ دادا کے متعلق کیا گمان رکھتے ہیں، چنانچہ تم انھیں پاؤ گے کہ وہ ان کی بزرگی بیان کرتے ہیں، جتنا مبالغہ ہو سکے کرتے ہیں اور عنقریب وہ لوگ جان لیں گے جنھوں نے ظلم کیا کہ وہ لوٹنے کی کون سی جگہ لوٹ کر جائیں گے۔" (الفوز الکبیر)

4 "**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ**" کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے: "نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا" مگر حقیقت یہ ہے کہ "**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ**" میں لفظ "**غَيْرِ**" پچھلی آیت میں "**الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" سے بدل یا اس کی صفت ہے، یعنی "**الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" اور "**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ**" دونوں ایک ہی لوگ ہیں، اس لیے ترجمہ یہ ہوگا: "ہمیں سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔"

5 یہاں ایک سوال ہے کہ کیا "**صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" کافی نہ تھا، پھر اس کے بعد "**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا**

الضَّآلِّیْنَ ‘‘ لانے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انعام تو اس کی ہر مخلوق پر بے شمار ہے، کم از کم اسے پیدا کرنا اور اس کی زندگی کی ہر ضرورت پوری کرنا ہی بہت بڑی نعمت ہے، اس لیے یہ تعلیم دی کہ ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی دعا کرو جن پر اللہ نے انعام کیا، مگر وہ غضب کا نشانہ نہیں بنے، نہ ہی وہ گمراہ ہیں، ایسے لوگ وہ چار گروہ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

6 ’’ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ‘‘ میں انعام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے، جب کہ غضب اور ضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے ادب کی تعلیم ہے کہ اگرچہ خیر و شر دونوں کا خالق وہ ہے مگر شر کی نسبت اس کی طرف نہیں کی جاتی، کیونکہ اس کا ہر فعل خیر ہی خیر ہے۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ﴿عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب سب لوگ ایک میدان میں کھڑے ہوں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کو پکاریں گے: « لَبَّيْكَ وَ سَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ » [ مستدرك حاكم، تفسير سورة بني إسرائيل : ۲/۳٦۳، ح : ۳۳۸٤ ] ’’بار بار حاضر ہوں اور بار بار حاضر ہوں، خیر تیرے ہاتھوں میں ہے اور شر تیری طرف نہیں ہے۔‘‘ اسے حاکم نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے اور ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔ سورۂ کہف میں خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو کشتی توڑنے اور دوسرے دو واقعات کی اصل حقیقت بیان کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے اس ادب کا خاص خیال رکھا ہے، ملاحظہ فرمائیں سورۂ کہف (۷۹ تا ۸۲) کی تفسیر۔

7 سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد ’’آمین‘‘ کہنا چاہیے، اس کا معنی اے اللہ! قبول فرما، یا ایسے ہی کر دے ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید کا حصہ نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اسے قرآن مجید کے ساتھ نہیں لکھا گیا۔ امام کے ’’وَلَا الضَّآلِّیْنَ‘‘ کہنے پر امام اور مقتدی دونوں کو آمین کہنا چاہیے۔ مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنا چاہیے۔ اس کے متعلق چند احادیث درج کی جاتی ہیں، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو تم آمین کہو، کیونکہ جس کا (آمین) کہنا فرشتوں کے کہنے کے موافق ہو گیا، اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘ [ بخاري، الأذان، باب جهر المأموم بالتأمين : ۷۸۲ ] ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو، کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہو گیا، اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘ [ بخاري، الأذان، باب جهر الإمام بالتأمين : ۷۸۰۔ مسلم : ٤١٠ ]

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب امام ’’وَلَا الضَّآلِّیْنَ‘‘ کہے تو تم آمین کہو، اللہ تعالیٰ تمھاری دعا قبول کر لے گا۔‘‘ [ مسلم، الصلاة، باب التشهد في الصلاة : ٤٠٤ ] وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے بلند آواز سے آمین کہی اور دائیں اور بائیں سلام پھیرا، یہاں تک کہ میں نے آپ کے رخسار کی سفیدی دیکھ لی۔ [ أبو داوٗد، الصلوة، باب التأمين وراء الإمام : ۹۳٤، وقال الألباني حسن صحيح ]

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب "**وَلَا الضَّآلِّيْنَ**" پڑھتے تو "آمین" کہتے اور اس کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتے۔ [ أبو داؤد، باب التأمين وراء الإمام : ۹۳۳، وقال الألباني صحيح ]

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ **غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ** ﴾ پڑھا اور اس کے ساتھ اپنی آواز کو لمبا کیا۔ [ ترمذی، الصلاۃ، باب ما جاء في التأمين : ۲٤۸، وقال الألباني صحيح ] عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہودیوں نے تم پر کسی چیز میں وہ حسد نہیں کیا جو انھوں نے آمین کہنے اور سلام میں تم پر حسد کیا ہے۔'' [ ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب الجهر بآمين : ۸۵٦۔ مسند أحمد : ١٣٤/٦، ١٣٥، ح : ٢٥٠٨٢، و قال الألباني صحيح ]

سورۃ البقرۃ ۲ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ آیاتہا ۲۸۶ رکوعاتہا ۴۰

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ۝۱

الٓمّٓ ۝۱

یہ قرآن مجید کی سات سب سے لمبی سورتوں میں سے ہے، جن کی اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ اَخَذَ السَّبْعَ الْأُوَلَ فَهُوَ حَبْرٌ » ”جس نے یہ پہلی سات سورتیں حاصل کر لیں وہ بہت بڑا عالم دین بن گیا۔“ [ مسند أحمد: ۸۲/۶، ح : ۲۴۵۸۵، عن عائشة رضی اللہ عنہا، و إسناده حسن ] یہ سورت بہت سے مواعظ و احکام اور قصص پر مشتمل ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے ” سَنَامُ الْقُرْآنِ“ (قرآن کی کوہان) قرار دیا ہے۔ [ مسند أبي يعلى : ۷۵۱۶۔ الصحيحة: ۵۸۸، عن سهل ابن سعد رضی اللہ عنہ ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے گھروں کو مقبرے نہ بناؤ، یقیناً شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوتا جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت ہوتی رہے۔“ [ ترمذی، فضائل القرآن، باب ما جاء فی سورة البقرة ...... : ۲۸۷۷، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ و صححه الألباني ] ایک روایت میں ہے: ”شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔“ [ مسلم، صلوة المسافرين، باب استحباب صلوة النافلة: ۷۸۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دو نہایت روشن سورتیں بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو، کیونکہ قیامت کے دن یہ اس طرح آئیں گی جیسے دو بادل یا دو سائبان یا پرندوں کے دو جھنڈ ہوں، یہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے جھگڑیں گی۔ سورۂ بقرہ پڑھا کرو، کیونکہ اس کا حاصل کرنا باعث برکت ہے اور اسے چھوڑ دینا موجب حسرت ہے اور اہل باطل اس کی طاقت نہیں رکھتے۔“ [ مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل قراءة القرآن و سورة البقرة : ۸۰۴ ] عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء اس زمانے میں اتریں جب میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی۔ [ بخاری، فضائل القرآن، باب تأليف القرآن : ۴۹۹۳ ]

آیت 1 الٓمّٓ : کچھ سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں انھیں مقطعات کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ الگ الگ کر کے پڑھے جاتے ہیں، ان کا معنی تو صاف ظاہر ہے کہ یہ حروف تہجی کے نام ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن کا کوئی معنی ہی نہیں، مگر یہ حروف سورتوں کے شروع میں کیوں لائے گئے ہیں، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند کے ساتھ کوئی بات منقول نہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ نے خلفائے اربعہ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حروف سرِ الٰہی ہیں جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، مگر اس کی سند نہ قرطبی نے ذکر کی ہے نہ کہیں اور مل سکی ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض تابعین سے اس کی تاویل میں مختلف اقوال مروی ہیں، مگر صحتِ سند کے ساتھ ثابت نہیں۔ بعض علماء نے ان کی تفسیر میں اپنی طرف سے کچھ نکات بیان کیے ہیں، مگر وہ محض فنی کاوش ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

سب سے قریب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان حروف کے ذکر سے تمام دنیا کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

یہ کامل کتاب، اس میں کوئی شک نہیں، بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت ہے ② وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں ③

انھی حروف تہجی میں اتارا ہے، اگر تمھیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو حروف تہجی تمھارے بھی علم اور استعمال میں ہیں، تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر لے آؤ۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ عموماً یہ حروف جہاں بھی آئے ہیں ان کے بعد قرآن مجید، کتاب یا وحی کا ذکر آیا ہے، ابن کثیر نے فراء، مبرد، زمخشری اور دوسرے علماء کے علاوہ ابن تیمیہ کا یہی قول ذکر کیا ہے، مگر یہ بات پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ کسی سورت کے شروع میں جو حروف آئے ہیں اس کے ساتھ ان کا خاص تعلق ہے، مثلاً کچھ سورتوں کے شروع میں "الٓمّٓ" ہے تو دوسری سورتوں کے شروع میں "الٓرٰ" یا "طٰسٓ" وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حکمت تک رسائی ہمارے بس سے باہر ہے اور یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ یہ ان متشابہات سے ہیں جن کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

**آیت 2** ① **لَا رَيْبَ فِيْهِ**: یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں شک والی کوئی بات ہی نہیں، اس کی ہر بات یقینی ہے، انسان کا علم چونکہ ناقص ہے، اس لیے اس کی ہر بات یقینی نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں بھی کوئی شک نہیں، فرمایا: ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ السجدۃ : ۲ ] ''اس کتاب کا نازل کرنا جس میں کوئی شک نہیں، جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔'' اگر کسی کو اس کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں شک ہو تو اس کا علاج اسی سورۂ بقرہ کی آیت (۲۳) میں بیان فرمایا گیا ہے۔

② **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ**: ہدایت کا ایک معنی راستہ دکھانا ہے، اس لحاظ سے تو قرآن تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے، فرمایا: ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [ آل عمران : ٤ ] ''(یہ) تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔'' دوسرا معنی منزل تک پہنچا دینا ہے۔ (دیکھیے القصص : ۵۶) اس لحاظ سے یہ صرف متقین کے لیے ہدایت ہے، کیونکہ منزل پر وہی پہنچتا ہے جو رہبر کے کہنے پر چلتا ہے، شفا اسی مریض کو ہوتی ہے جو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ متقی کا لفظ " وِقَايَةٌ " سے مشتق ہے، جس کا معنی بچاؤ اور حفاظت ہے۔ شرع میں متقی وہ ہے جو ہر ایسی چیز سے اپنے آپ کو باز رکھے جس کے کرنے یا چھوڑنے سے خطرہ ہو کہ وہ اللہ کے عذاب کا مستحق ہوسکتا ہے۔ (کشاف) متقین کی کچھ صفات آئندہ آیات میں آ رہی ہیں، مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۷۷)۔

**آیت 3** ① **يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ**: "بِالْغَيْبِ" سے مراد وہ حقائق ہیں جو انسان کے حواس اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ حدیث جبریل، جس کے راوی امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ ہیں، اس میں رسول اللہ ﷺ نے ایمان کی تعریف یہ بیان فرمائی کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت اور اچھی یا بری تقدیر پر ایمان لائے۔ [ مسلم : ۸ ] یہ سب چیزیں غیب میں شامل ہیں، کیونکہ انھیں دیکھے بغیر ان پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ قرآن کی ہدایت سے فیض یاب

وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؃

اور وہ جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں ④

ہونے والے وہی متقی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اپنے مشاہدے یا اپنی عقل سے معلوم ہونے کا مطالبہ نہیں کرتے، غیب کے منکروں کو قرآن سے کچھ حاصل نہیں، جیسے اندھے کو چراغ کا کوئی فائدہ نہیں۔

② **وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ** : قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے غیب پر ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت بھی ضروری ہے، اس کی پہلی اور دائمی علامت بلاناغہ نماز ہے، پانچ وقت اذان سن کر نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے، پھر جو شخص اطاعت پر تیار ہی نہ ہو اسے ہدایت کیسے ہو؟ نماز قائم کرنے سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نماز کی طرح نماز ادا کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز اس طرح پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔'' [ بخاري، الأذان، باب من قال ليؤذن في السفر...... : ٦٢٨، عن مالك بن الحويرث رضي الله عنه ]

ارکان نماز کو اعتدال اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اطمینان سے ارکان نماز ادا نہ کرنے والے آدمی سے فرمایا تھا: ''نماز دوبارہ پڑھو، کیونکہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔'' [ بخاري، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام...... : ٧٥٧، عن أبي هريرة رضي الله عنه ]

جماعت کا اہتمام بھی نماز قائم کرنے میں شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی تین آدمی نہیں جو کسی بستی میں ہوں یا بادیہ میں، جن میں نماز قائم نہ کی جاتی ہو مگر شیطان ان پر غالب آ چکا ہوتا ہے۔'' [ أبو داوٗد، الصلوة، باب التشديد في ترك الجماعة : ٥٤٧، عن أبي الدرداء رضي الله عنه ]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی صفیں درست کرو، بلاشبہ صفیں درست کرنا بھی اقامتِ صلاۃ کا حصہ ہے۔'' [ بخاري، الأذان، باب إقامة الصف...... : ٧٢٣، عن أنس رضي الله عنه ] اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم خوب اچھی طرح ملاتے تھے، انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب نبی ﷺ ہمیں صفیں درست کرنے کا حکم دیتے تو ہم اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ ہر نمازی اپنا پاؤں اور کندھا ساتھ والے کے پاؤں اور کندھے کے ساتھ چپکا دیتا تھا۔'' [ بخاري، الأذان، باب إلزاق المنكب...... : ٧٢٥ ]

③ **وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** : ''جو کچھ ہم نے انھیں دیا'' اس سے مراد ہر نعمت ہے، مثلاً مال و اولاد، علم و عقل، قوت و صحت، عزت و وقار وغیرہ۔ ''ہر نعمت میں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں'' ساری نعمت خرچ کرنے کا مطالبہ ہی نہیں۔ دیکھیے سورۂ محمد (۳۶ تا ۳۸) اس میں ذاتی ملکیت کے منکروں ( کمیونسٹوں ) کا رد ہے، کیونکہ ملکیت نہ ہوگی تو خرچ کس سے کرے گا۔ خرچ میں فرض و نفل ہر قسم کا خرچ ہے اور جو شخص اللہ کے لیے اس کی عطا کردہ نعمت خرچ کرنے پر تیار ہی نہیں وہ قرآن سے رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔

**آیت 4** ① **بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** : خواہ قرآن ہو یا سنت، فرمایا: ﴿ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ [ النساء : ١١٣ ] ''اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی۔''

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

**یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے بڑی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں ۝۵ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انھیں ڈرایا ہو یا انھیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے ۝۶**

② **وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ** : یعنی وہ وحی الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ کسی پیغمبر پر اتری ہو۔ جو لوگ کسی پیغمبر پر وحی کا اترنا ہی نہیں مانتے ان کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں۔ البتہ اب عمل اسی پر ہوگا جو آخری نبی ﷺ لے کر آئے، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ (دیکھیے حجر : ۹) جبکہ پہلی کتابیں اصل حالت میں موجود ہی نہیں۔

③ **وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ** : آخرت کا لفظ ''اول'' کے مقابلے میں ''آخر'' کے ساتھ تاء لگانے سے بنا ہے، دنیا کی زندگی کے بعد والی زندگی۔ اس کا یقین ہی انسان کو نیک اعمال کرنے اور برے اعمال سے بچنے پر آمادہ کر سکتا ہے، اس لیے یہ ایمان کا بنیادی جزو ہے۔ ''هُمْ'' ضمیر کے ساتھ حصر پیدا ہوتا ہے، یعنی آخرت پر صحیح یقین رکھنے والے اہل اسلام ہی ہیں۔ دوسرے لوگوں کے عقائد درحقیقت اوہام و خرافات پر مبنی ہیں، مثلاً یہود و نصاریٰ کا دعویٰ کہ جنت میں ہم ہی جائیں گے اور آگ میں گئے بھی تو چند دن رہیں گے۔ اسی طرح ہندوؤں کا تناسخ کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد نیکوں کی روح کسی بہتر جان دار میں منتقل ہوتی ہے اور بروں کی روح کسی برے جانور، مثلاً کتے یا چوہے وغیرہ کی شکل میں منتقل ہوتی ہے۔

آیت 5 **هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** : الف لام کی وجہ سے ''پورے کامیاب'' ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی وہی متقی جن میں یہ اوصاف ہوں گے رب تعالیٰ کی طرف سے سیدھے راستے پر قائم رہیں گے اور وہی مکمل کامیابی سے سرفراز ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں ہدایت دے گا اور جنت بھی۔ دیکھیے سورۂ یونس (۹)۔

آیت 6 **لَا يُؤْمِنُوْنَ** : اس سے مراد تمام کفار تو ہو نہیں سکتے، کیونکہ بے شمار کافر دعوت کے نتیجے میں ایمان لائے اور لا رہے ہیں۔ اس لیے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو پچھلی آیات میں مذکور چھ چیزوں کا یا ان میں سے بعض کا انکار کر دیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ اگر یہ حق بھی ہو تو ہم اسے نہیں مانیں گے، جیسے بعض یہود مدینہ (بقرہ : ۱۴۶) اور ابوجہل اور اس کے ساتھی وغیرہ۔ (انفال : ۳۲) جب کوئی طے کر لے کہ میں نے ماننا ہی نہیں تو اسے ایمان کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟ سوئے ہوئے کو جگایا جاتا ہے، جاگتے ہوئے مدہوش کو کون جگا سکتا ہے؟ اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈرانا بالکل فضول ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہر شخص تک پہنچانا فرض ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کے علم میں کون ایمان لانے والا ہے اور کس کی قسمت میں کفر پر اصرار ہے، ہمیں ہر حال میں ڈرانے پر ثواب ملے گا اور نہ ڈرانے پر باز پرس ہوگی۔ اس لیے فرمایا کہ ڈرانا نہ ڈرانا ان پر برابر ہے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ پر برابر ہے۔ یہاں ہمزہ کا معنی ''کیا'' نہیں ہوگا، بلکہ یہ برابری کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اسے ''ہمزہ تسویہ'' کہتے ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۷﴾ ع وَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ
مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾

اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی نگاہوں پر بھاری پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۷﴾ اور لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ہرگز مومن نہیں ﴿۸﴾ اللہ سے دھوکا بازی کرتے ہیں اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے، حالانکہ وہ اپنی جانوں کے سوا کسی کو دھوکا نہیں دے رہے اور وہ شعور نہیں رکھتے ﴿۹﴾ ان کے دلوں ہی میں ایک بیماری ہے تو اللہ نے انھیں بیماری میں اور بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے ﴿۱۰﴾

**آیت 7** ان کے کفر اور اعمال بد کے نتیجے میں ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور قبولِ حق کی استعداد جو فطرتاً ہر شخص میں رکھی گئی ہے، ان سے چھن چکی ہے۔ یہ مہر اگرچہ اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے، مگر اس کا باعث ان کا عمل ہے، فرمایا: ﴿ **بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ** ﴾ [ النساء : ۱۵۵ ] ''بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر کر دی۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے، پھر جب وہ باز آ جائے، استغفار کرے اور توبہ کرے تو اس کا دل چمک جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کرے تو نکتہ بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے، یہی وہ زنگ ہے جو اللہ نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ **كَلَّا بَلْ ٜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ** ﴾ [ المطففين : ۱٤ ] ''ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے ہیں۔'' [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ ویل للمطففین ...... : ۳۳۳٤، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ و حسنه الألبانی ] '' **غِشَاوَةٌ** '' پر تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ ''بھاری پردہ'' کیا گیا ہے۔

**آیت 8** ① اس سے پہلے پانچ آیات میں اہلِ ایمان اور دو آیات میں کھلے کافروں کے ذکر کے بعد منافقین کی خصلتوں کا ذکر تیرہ آیات میں فرمایا ہے، کیونکہ چھپا ہوا کفر زیادہ خطرناک اور اس کی پہچان بہت مشکل ہے۔
② ''ما'' نافیہ کی تاکید باء کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''ہرگز'' کے ساتھ کیا گیا ہے۔

**آیت 9** '' **يُخٰدِعُوْنَ** '' باب مفاعلہ سے ہے جس میں مشارکت پائی جاتی ہے، اس لیے ترجمہ ''دھوکا بازی'' کیا گیا ہے، یعنی وہ دل میں کفر چھپاتے اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہیں، حالانکہ دھوکا ان کے ساتھ ہو رہا ہے کہ دنیا میں انھیں مسلمان قرار دیا گیا اور انھیں مسلمانوں والے حقوق اور فوائد حاصل رہے، مگر آخرت میں وہ آگ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے، فرمایا: ﴿ **اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ** ﴾ [ النساء : ۱٤۲ ] ''بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے۔'' اور انھیں اس خود فریبی کا شعور بھی نہیں۔

**آیت 10** ① **فِيْ قُلُوْبِهِمْ** : خبر مقدم ہے، جس سے حصر پیدا ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ ''ان کے دلوں ہی میں'' کیا گیا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں ⑪ سن لو! یقیناً وہی تو فساد ڈالنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے ⑫

② یہ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اللہ کو دھوکا دے جو عالم الغیب ہے اور مومنوں کو دھوکا دے جن سے زیادہ فراست والا کوئی ہو نہیں سکتا اور سمجھے کہ میں دھوکا دینے میں کامیاب ہوں۔ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل ہی ایک ایسے مرض میں مبتلا ہیں جس نے انھیں خود فریبی کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ وہ مرض نفاق ہے جو کفر کو چھپانے کی کوشش کا نام ہے۔ اس بیماری سے بے شمار نفسیاتی بیماریاں مزید پیدا ہوتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں، مثلاً جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی، بدعہدی، بدزبانی جنھیں رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ اسی طرح فساد، خود پسندی، بے وقوفی، دو رخی جن کا ذکر آئندہ آیات میں ہے اور بہت سی دیگر بیماریاں مثلاً بزدلی، طمع، بخل، جہاد سے فرار وغیرہ جن کا ذکر سورۂ توبہ اور دیگر سورتوں میں ہے۔

③ **بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ** : منافقین باطن میں کافر ہونے کی وجہ سے عذابِ عظیم کے مستحق تھے، اب اسلام کے جھوٹے دعوے کی وجہ سے عذابِ الیم یعنی دوہرے عذاب کے حق دار ٹھہرے۔

**آیت 12،11** ① یہاں منافقین کے دو اوصاف بیان ہوئے ہیں، فساد یعنی زمین میں بگاڑ پیدا کرنا، اس میں اللہ کی ہر نافرمانی شامل ہے، کیونکہ اس سے زمین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، فرمایا: ﴿ **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ** ﴾ [ الروم : ۴۱ ] ”خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔“ دوسرا وصف بگاڑ پیدا کرنے کو عین اصلاح قرار دینا۔ یہ لوگ دل میں کفر رکھنے کی وجہ سے کفار سے دوستی رکھتے تھے، مسلمانوں کے راز انھیں بتاتے اور اسلام کے عقائد و احکام پر اعتراض کرتے تھے اور منع کرنے پر اپنے اس عمل بد کو اصلاح کا نام دیتے تھے۔

اب بھی مسلمانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے ساتھ شرک کو اولیاء کا ادب، بدعات کو قربِ الٰہی کا ذریعہ، کفار سے دوستی اور ان کے غلبے کے لیے کوشش کو حالات کا تقاضا قرار دیتے ہیں، مسلمانوں کی نسل کشی کو خاندانی منصوبہ بندی کہتے ہیں، بدکاری و بے حیائی پھیلاتے ہیں اور اسے عورتوں کے حقوق کا تحفظ قرار دیتے ہیں۔ ہر برے سے برا کام نام بدل کر خوش نما بنا لیتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے زنا کو متعہ اور حلالے کا، باجوں گاجوں اور موسیقی کو قوالی اور روح کی غذا کا اور نشہ آور مشروبات کو نبیذ وغیرہ کا نام دے کر حلال کر رکھا ہے۔ یہ سب نفاق کے مختلف مظاہر ہیں۔

② **لَا يَشْعُرُوْنَ** : دل بیمار ہو تو اچھے برے کا شعور بھی ختم ہو جاتا ہے، پھر آدمی اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، فرمایا: ﴿ **اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا** ﴾ [ فاطر : ۸ ] ”تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اس کو اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں)؟“

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں، تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ سن لو! بے شک وہ خود ہی بے وقوف ہیں اور لیکن وہ نہیں جانتے ﴿۱۳﴾ اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیطانوں کی طرف اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں بے شک ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق اڑانے والے ہیں ﴿۱۴﴾ اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے اور انھیں ڈھیل دے رہا ہے، اپنی سرکشی ہی میں حیران پھرتے ہیں ﴿۱۵﴾ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی، تو نہ ان کی تجارت نے نفع دیا اور نہ وہ ہدایت پانے والے بنے ﴿۱۶﴾

**آیت 13** ① " النَّاسُ " سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو خلوص دل سے ایمان لائے اور ایک ہی طرف کے ہو گئے اور اپنے کسی دنیوی نقصان کی پروا نہ کی، منافقین نے انھیں بے وقوف کہا اور اپنے آپ کو عقل مند، کیونکہ اپنے خیال میں انھوں نے دونوں طرف سے فائدہ اٹھایا اور اپنی دنیا کا نقصان نہ ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین ہی کو بے وقوف قرار دیا، کیونکہ ان کا نہ مسلمانوں کے ہاں کچھ اعتبار رہا نہ کفار کے ہاں اور وہ چند روزہ زندگی کے فائدے کے لیے ہمیشہ کی زندگی کا نقصان کر بیٹھے۔ فرمایا یہ ایسے بے وقوف ہیں جنھیں اپنی بے وقوفی کا بھی علم نہیں۔

② اس آیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ منافقین کو ان کے ایمان جیسا ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔

**آیت 14** ① شیاطین سے مراد کفر کے سردار ہیں، خواہ مشرکین و یہود سے ہوں یا خود ان منافقین سے۔ شیطان ہر سرکش اور فسادی شخص کو کہتے ہیں۔ شیاطین جنوں اور انسانوں دونوں سے ہوتے ہیں، فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾ [ الأنعام : ۱۱۲ ] ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔'' لفظ شیطان "شَطَنَ" سے مشتق ہے جس کے معنی ''بُعد'' کے ہیں، یعنی وہ جو ہر خیر سے دور ہو۔

② وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اس سے ظاہر ہے کہ اہل ایمان سے ان کی ملاقات سرسری ہوتی ہے، کبھی کسی مجلس میں، کبھی سر راہ، مگر اپنے شیطانوں کے ساتھ اہتمام کے ساتھ خلوت ہوتی ہے۔ پھر اہل ایمان کو تاکید کے کسی لفظ کے بغیر صرف ''اٰمَنَّا'' کہتے ہیں اور اپنے شیاطین کو " اِنَّا" اور " اِنَّمَا" کی تاکید کے ساتھ اپنے کفر کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ ہم عقیدے میں بلاشک و شبہ تمھارے ساتھی ہیں، رہا ہمارا ایمان کا اقرار و اظہار تو وہ محض مذاق ہے۔

**آیت 15، 16** منافقین دل میں کفر رکھنے اور کفار کا ساتھ دینے کے باوجود مسلمانوں سے ملتے تو ''اٰمَنَّا'' کہتے اور اسے اہل ایمان

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

ان کی مثال اس شخص کی مثال کی سی ہے جس نے ایک آگ خوب بھڑکائی، تو جب اس نے اس کے اردگرد کی چیزوں کو روشن کر دیا تو اللہ ان کے نور کو لے گیا اور انھیں کئی طرح کے اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ نہیں دیکھتے﴿۱۷﴾ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹتے﴿۱۸﴾

---

کے ساتھ مذاق قرار دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی جواباً ان کے ساتھ یہی معاملہ فرمایا کہ ان کے متعلق یہ طے کر دیا کہ وہ جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے، اس کے باوجود دنیا میں انھیں مسلمان قرار دیا اور ان کی رسی دراز کر دی، تاکہ وہ سرکشی میں زیادہ سے زیادہ بڑھ جائیں، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ﴾ [ آل عمران : ۱۷۸ ] ''ہم انھیں صرف اس لیے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔'' وہ ان کا مذاق تھا یہ اللہ تعالیٰ کا مذاق ہے۔ قرآن مجید میں ایسے الفاظ مقابلے میں استعمال ہوئے ہیں جو ابتداءً کم ہی استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مذاق کرنے میں وہ معاملہ بھی شامل ہے جو قیامت میں منافقین کو پیش آئے گا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جاتے ہوئے ان کے نور سے راستہ دیکھتے ہوئے جا رہے ہوں گے کہ یکایک ایک دیوار کے ذریعے سے جہنم کی طرف دھکیل دیے جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ حدید (۱۲ تا ۱۵)۔

**آیت 17** ❶ **اسْتَوْقَدَ نَارًا** : '' اَوْقَدَ نَارًا '' کے معنی ہیں اس نے آگ جلائی۔ '' **اسْتَوْقَدَ** '' میں سین اور تاء زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، اس لیے اس کا ترجمہ ''خوب بھڑکائی'' کیا ہے۔

❷ منافقین کی تشبیہ اس شخص سے کس طرح دی گئی جس نے ایک آگ خوب بھڑکائی، پھر اس کی آگ بجھ گئی اور اللہ ان کا نور لے گیا؟ جواب یہ ہے کہ دو وجہ سے، پہلی یہ کہ یہ لوگ پہلے ایمان لائے تو نور ایمان سے ان کے لیے ہر چیز روشن ہو گئی، پھر نفاق میں مبتلا ہو گئے تو وہ نور بجھ گیا اور وہ کفر و نفاق اور شکوک و شبہات کے کئی اندھیروں میں بھٹکتے رہ گئے۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ [ المنافقون : ۳ ] ''یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔''

تشبیہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمان لانے کی وجہ سے دنیا میں انھیں مسلمانوں والی عزت حاصل ہوئی، مسلمانوں کے ساتھ ان کے رشتے ناتے رہے، وہ ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے، مال غنیمت اور دوسرے بے شمار فوائد حاصل کرتے رہے، مگر جب فوت ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ عزت چھین لی، جیسے اس آگ والے سے اس کی روشنی چھین لی اور انھیں بہت سے اندھیروں (یعنی قبر، یوم محشر اور جہنم کے عذاب) میں چھوڑ دیا۔ (طبری عن ابن عباس بسند حسن)

**آیت 18** ❶ **صُمٌّ** (بہرے) ''اَصَمّ'' کی جمع ہے، **بُكْمٌ** (گونگے) ''اَبْكَم'' کی جمع ہے اور **عُمْيٌ** (اندھے) ''اَعْمٰی'' کی جمع ہے۔ ان کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے کان، زبانیں یا آنکھیں ہیں ہی نہیں، بلکہ مراد یہ ہے

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙۗ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

ع ۲ ۱۲

یا جیسے آسمان سے اترنے والی بارش، جس میں کئی اندھیرے ہیں اور گرج اور چمک ہے، وہ کڑکنے والی بجلیوں کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۱۹﴾ بجلی قریب ہے کہ ان کی نگاہیں اچک کر لے جائے، جب کبھی وہ ان کے لیے روشنی کرتی ہے اس میں چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کر دیتی ہے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور ان کی سماعت اور ان کی نگاہیں لے جاتا، بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۰﴾

کہ انھوں نے یہ سب کچھ رکھنے کے باوجود ان سے فائدہ نہیں اٹھایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ [الأحقاف : ۲۶ ] ”اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔“

② فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: یعنی وہ اس گمراہی سے جو خرید بیٹھے اور اس ہدایت کی طرف جسے فروخت کر بیٹھے واپس نہیں لوٹتے۔ ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو زبان سے مومن اور دل میں پکے کافر تھے۔

**آیت 20،19** ① یہ مثال اللہ تعالیٰ نے منافقین کے دوسرے گروہ کی بیان فرمائی ہے، یعنی وہ لوگ جو بظاہر مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ضعفِ ایمان کی وجہ سے ہمیشہ شک اور تذبذب میں مبتلا رہتے تھے، راحت و آرام کی صورت میں مطمئن نظر آتے، جب تکالیف کا سامنا ہوتا تو شک وشبہ میں پڑ جاتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ا۟طْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ا۟نْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ [الحج : ۱۱ ] ”اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے، پھر اگر اسے کوئی بھلائی پہنچ جائے تو اس کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش آ پہنچے تو اپنے منہ پر الٹا پھر جاتا ہے، اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا، یہی تو صریح خسارہ ہے۔“ ان آیات میں ان کے اسی تذبذب کو بیان فرمایا ہے کہ جب کبھی ان کے لیے روشنی ہوتی ہے چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔ (ابن کثیر)

② بارش سے مراد اسلام ہے، اندھیروں اور گرج سے مراد وہ تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں جو اسلام کی راہ میں پیش آتی ہیں، چمک سے مراد مسلمانوں کو حاصل ہونے والی کامیابیاں اور کڑکنے والی بجلیوں سے مراد جہاد کے احکام ہیں، جن میں منافقین کو موت

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۙ﴿۲۱﴾ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّـكُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۲۱﴾ جس نے تمھارے لیے زمین کو ایک بچھونا اور آسمان کو ایک چھت بنایا اور آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ کئی طرح کے پھل تمھاری روزی کے لیے پیدا کیے، پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تم جانتے ہو ﴿۲۲﴾

---

دکھائی دیتی ہے۔

③ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، دین اسلام میں آخر سب نعمت ہے، مگر اول کچھ محنت ہے، جیسے بارش کہ آخر اسی سے آبادی ہے اور اول کڑک ہے اور بجلی ہے۔ منافق لوگ اول سختی سے ڈر جاتے ہیں اور ان کو آفت سامنے نظر آتی ہے اور جیسے بادل کی چمک میں کچھ اجالا ہوتا ہے اور کبھی اندھیرا، اسی طرح منافق کے دل میں کبھی اقرار ہے کبھی انکار۔ (موضح)

④ **وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ**...... : اور اگر اللہ چاہتا تو پہلے گروہ کی طرح ان کی سماعت اور ان کی نگاہیں لے جاتا، مگر اللہ کا دستور ہے کہ جو شخص جس حد تک سننا اور دیکھنا چاہے وہ اسے سننے اور دیکھنے کا موقع دیتا ہے۔

⑤ "**قَدِيْرٌ**" مبالغے کا صیغہ ہے، اس لیے "پوری طرح قادر" ترجمہ کیا گیا ہے۔

**آیت 21** ① اس سے پہلی آیت تک تو تمہید تھی کہ قرآن جو ہدایت کا اصلی سرچشمہ ہے، اسے ماننے اور نہ ماننے کے اعتبار سے لوگ تین قسم کے ہیں، اب آگے براہِ راست خطاب کے ساتھ تمام لوگوں کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جا رہی ہے جو اس کتاب کی دعوت کا حقیقی مقصد ہے، جس کے لیے کتابیں اتاری گئیں اور انبیاء بھیجے گئے، وہ ہے دعوتِ توحید، یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کی عبادت اور دعا میں کسی کو شریک نہ کرنا۔

② طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "**اُعْبُدُوْا**" کا معنی بیان کیا ہے: " اَیْ وَحِّدُوْا رَبَّكُمْ " یعنی اپنے رب کو ایک مانو۔

③ توحید کے لیے پہلی دلیل یہ بیان فرمائی کہ میں تمھارا رب ہوں جو تمھاری پرورش کر رہا ہے اور تمھاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔ دوسری دلیل اس کی وہ نعمت ہے جو رب ہونے سے بھی پہلے کی ہے اور وہ ہے تمھیں پیدا کرنا۔ باقی تمام نعمتیں اس کے بعد ہیں، اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں، قرآن مجید اس دلیل پر بہت زور دیتا ہے اور اسے بار بار دہراتا ہے۔ اس لیے کہ کفار بھی مانتے تھے کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، فرمایا: ﴿وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [ الزخرف : ۸۷ ] "اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔"

④ " لَعَلَّ " یہاں " کَیْ " یعنی "تاکہ" کے معنی میں ہے۔

⑤ **تَتَّقُوْنَ** : بچ جاؤ یعنی اللہ کی گرفت اور جہنم سے بچ جاؤ۔

**آیت 22** ① یعنی تمھیں اور تمھارے باپ دادا کو پیدا کرنے کے بعد تمھاری ضروریات کے لیے تمھیں کسی دوسری ہستی

وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۪ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾

اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کی مثل ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتی بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۲۳﴾ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا اور نہ کبھی کرو گے تو اس آگ سے بچ جاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۲۴﴾

---

کے سپرد نہیں کر دیا، بلکہ ہر چیز کا بندوبست خود فرمایا، زمین کو تمھارے لیے بچھونا بنایا، آسمان کو چھت بنایا، پھر آسمان سے پانی اُتار کر تمھاری روزی کے لیے مختلف انواع کے پھل پیدا کیے۔ جب تم یہ سب کچھ جانتے ہو تو لازم ہے کہ اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، یا پھر اس کی زمین سے نکل جاؤ اور اپنے کسی داتا یا دستگیر کی بنائی ہوئی زمین کے اوپر اور اس کے بنائے ہوئے آسمان کے نیچے رہو اور اسی کا پیدا کیا ہوا رزق کھاؤ۔

② "مَآءً" کا ترجمہ ''کچھ پانی'' تنوین کی وجہ سے اور "اَنْدَادًا" کا ترجمہ ''کسی قسم کے شریک'' جمع اور نکرہ کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے، یعنی نہ ذات میں شریک بناؤ، نہ صفات میں اور نہ افعال میں۔

آیت 23 ① سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو ﴿لَا رَیۡبَ فِیۡهِ﴾ قرار دیا، اب فرمایا کہ (اس کتاب میں کوئی شک تو نہیں لیکن) اگر تم اس کے بارے میں کسی ادنیٰ سے شک میں بھی مبتلا ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ یہ چیلنج پہلے اس کتاب جیسی ایک کتاب لانے کا کیا گیا۔ [ بنی إسرائیل : ۸۸ ] پھر اس جیسی دس سورتیں لانے کا۔ [ هود : ۱۳ ] پھر مکہ میں اس جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا۔ [ یونس : ۳۸ ] اب مدینہ میں یہ چیلنج دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ مدنی ہے۔

② پچھلی دو آیات میں شرک کی تردید اور توحید کی دعوت ہے۔ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔

③ عَبۡدِنَا: اگرچہ تمام بندے اللہ تعالیٰ ہی کے بندے ہیں مگر ''ہمارے بندے'' سے مراد ہمارا خاص بندہ ہے، جیسے ''بیت اللہ'' اور ''ناقۃ اللہ'' اسے اضافت تشریفی کہتے ہیں۔

④ ہر زمانے میں جو چیز کمال کو پہنچی ہوئی تھی اس زمانے کے پیغمبر کو ایسا معجزہ دیا گیا جس کے سامنے انسانی کمال عاجز اور بے بس ہو، جیسے فرعون کے جادوگر اور عصائے موسیٰ، اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے باکمال طبیب اور عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اہلِ عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر فخر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال سیکڑوں برس گزرنے کے باوجود نہ کوئی پیش کر سکا نہ کر سکے گا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۷ تا ۵۱)۔

آیت 24 ① عام آگ انسانی جسم اور پتھروں سے بجھ جاتی ہے یا مدہم ہو جاتی ہے، مگر جہنم کی آگ کی حرارت اس قدر

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان لوگوں کو خوش خبری دے دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے کہ بے شک ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، جب کبھی ان میں سے کوئی پھل انھیں کھانے کے لیے دیا جائے گا، کہیں گے یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں دیا گیا تھا اور وہ انھیں ایک دوسرے سے ملتا جلتا دیا جائے گا، اور ان کے لیے ان میں نہایت پاک صاف بیویاں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں﴿۲۵﴾

ہے کہ انسان اور پتھر اس کا ایندھن بن کر اسے مزید بھڑکائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمھاری آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔“ [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة : ۳۲٦۵، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] عبد اللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا: ”یہ پتھر گندھک کے ہوں گے۔“ (طبری) وہ بت بھی مراد ہیں جنھیں کفار پوجتے تھے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۹۸)۔

❷ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ جہنم اصل میں کافروں کے لیے بنائی گئی ہے، کوئی مومن اس میں جائے گا تو کفر کے کسی کام کے ارتکاب کی وجہ ہی سے جائے گا، اگرچہ ہمیشہ اس میں نہیں رہے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہنم اس وقت بھی موجود ہے، یہی تمام سلف کا عقیدہ ہے، اس کا انکار صریح آیات و احادیث کا انکار ہے۔

آیت 25 ❶ کفار کو آگ سے ڈرانے کے بعد اب ایمان لانے پر جنت کی بشارت دی جا رہی ہے۔ قرآن مجید میں عموماً یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”﴿ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ [ الزمر : ۲۳ ] میں صحیح ترین قول کے مطابق ”مَثَانِيَ“ سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے ساتھ اس کا مقابل بھی مذکور ہو، مثلاً ایمان کے ساتھ کفر، جنت کے ساتھ جہنم کا ذکر ہو۔“

❷ ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اس کے مطابق عمل کا نام ہے، یہاں ایمان پر عمل صالح کے عطف کا یہ مطلب نہیں کہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، بلکہ ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ عموماً اس میں کوتاہی کی جاتی ہے، حالانکہ عمل سے خالی ایمان کافی نہیں۔ اگر عطف ہی کی وجہ سے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ سمجھا جائے تو سورۂ عصر کی آیت: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ میں مذکور چاروں چیزیں ایک دوسرے سے الگ ماننا پڑیں گی۔ تفصیل کے لیے سورۂ عصر کی تفسیر دیکھیں۔

❸ عمل صالح کی پہلی شرط یہ ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ دیکھیے سورۂ کہف کی آخری آیت اور سورۂ بینہ کی آیت (۵)۔ دوسری یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو۔ آپ کا فرمان ہے: (( مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

بے شک اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی بھی مثال بیان کرے، مچھر کی ہو پھر اس کی جو اس سے اوپر ہے، پس لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے سو جانتے ہیں کہ بے شک وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں اللہ نے اس کے ساتھ مثال دینے سے کیا ارادہ کیا؟ وہ اس کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ فاسقوں کے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرتا﴿۲۶﴾

---

فَهُوَ رَدٌّ ›› ''جو شخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا امر نہ ہو تو وہ مردود ہے۔'' [ مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة...... : ۱۸ / ۱۷۱۸ ]

④ انسان کی لذت و آسائش کی بنیادی چیزیں رہائش، کھانا پینا اور نکاح ہیں۔ ایمان اور عمل صالح والوں کی رہائش کے لیے ﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾، کھانے پینے کے لیے ﴿ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ﴾ اور نکاح کے لیے ﴿ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾ ہیں، پھر یہ نعمتیں حاصل ہونے کے ساتھ اگر ان کے زوال کا خوف ہو تو لذت مکدر ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس خوف کو یہ کہہ کر دور کر دیا: ﴿ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [ اللباب ] جنت کی نہروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ محمد (۱۵)۔

⑤ مُطَهَّرَةٌ : باب تفعیل سے اسم مفعول ہے۔ ایک حرف کے اضافے کی وجہ سے ''نہایت پاک صاف'' ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی وہ ہر قسم کی ظاہری آلائشوں، مثلاً پیشاب، پاخانہ، تھوک، حیض وغیرہ سے اور باطنی آلائشوں، مثلاً جھوٹ، حسد، کینہ وغیرہ سے پاک ہوں گی۔

⑥ مُتَشَابِهًا : یعنی دنیا کے پھلوں کے ہم صورت ہوں گے، یا آپس میں ہم شکل ہوں گے، مگر یہ مشابہت صرف نام یا شکل میں ہوگی، ورنہ جنت کی نعمتوں کو دنیا کی نعمتوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۱۷)۔

**آیت 26** اس سے پہلے منافقین کی دو مثالیں بیان ہوئی ہیں، اس کے علاوہ قرآن مجید میں مکھی (حج : ۷۳)، مکڑے (عنکبوت : ۴۱) کتے (اعراف : ۱۷۶) اور گدھے (جمعہ : ۵) کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ کفار اور منافقین جب قرآن کے چیلنج کا جواب نہ دے سکے تو اعتراض جڑ دیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی مثالوں کی کیا ضرورت تھی؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کو بطور مثال بیان کر سکتا ہے، یہ کوئی عیب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے حیا کرے، وہ مثال مچھر کی ہو یا پھر اس کی جو اس سے بھی بڑھ کر حقیر ہو، مثلاً مچھر کا پر یا ایک ذرہ۔ مچھر سے بڑھ کر ہونے سے مراد اس سے بڑی چیزیں مثلاً مکھی، مکڑا وغیرہ بھی ہو سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بڑی سے بڑی مخلوق اللہ کی قدرت پر اور غیر اللہ کی بے بسی پر دلالت کرتی ہے، اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی مخلوق بھی اللہ کی قدرت کا شاہکار ہے۔ پھر بات سمجھانے کے لیے اگر چھوٹی مخلوق کی مثال زیادہ موزوں ہو تو اس میں حیا کی کیا بات ہے؟ '' اَنَّهُ الْحَقُّ '' میں '' اَنَّهُ '' کی خبر '' الْحَقُّ '' معرفہ آنے کی وجہ سے ترجمہ ''وہی'' کیا گیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۲۷ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۸ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۹ ع

وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں ۲۷ تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۲۸ وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا، پس انھیں درست کر کے سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۲۹

**آیت 27** اللہ کی کتاب سے ہدایت پانے کے بجائے گمراہ ہونے والے فاسقوں کی تین صفات ذکر کی گئی ہیں، اللہ کے عہد کو توڑنا، رشتہ داری اور دوسرے باہمی تعلقات قطع کرنا اور زمین میں فساد کرنا، جیسا کہ مشرکین نے اس عہد کو توڑا جو ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ کے ساتھ ان سے لیا گیا تھا۔ [ الأعراف : ۱۷۲ ] یہود و نصاریٰ نے وہ عہد توڑا جو ان سے نبی ﷺ پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا، کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے رشتہ داری کو قطع کیا اور منافقین نے زمین میں فساد پھیلایا اور یہ تینوں صفات کفار کے تمام گروہوں میں پائی جاتی ہیں۔

**آیت 28** "يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا" کے ساتھ توحید کی جو بات شروع ہوئی تھی وہی بات آگے بڑھائی جا رہی ہے کہ اللہ کے ساتھ تمھارے کفر پر تعجب ہے، جس نے تمھیں اس وقت زندگی بخشی جب تم بے جان تھے، یعنی موجود ہی نہ تھے، پھر وہ تمھیں موت دے گا۔ زندگی اور موت کا یہ سلسلہ جو تمھارے سامنے ہے یہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کی بھی دلیل ہے اور تمھیں دوبارہ زندہ کر کے اپنے سامنے حاضر کرنے کی بھی۔

**آیت 28** ① یہ انسان کے کفر پر تعجب کے لیے اللہ کے مزید احسانات کا ذکر ہے کہ زمین میں جو کچھ ہے سب اس اکیلے نے پیدا کیا اور تمھارے لیے پیدا کیا، پھر اس نے آسمانوں کو درست کر کے سات آسمان بنائے، ایسے محسن سے تم کس طرح کفر کرتے ہو؟ وہ تو ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، تمھارا کفر بھی اس سے مخفی نہیں، اپنا انجام خود سوچ لو۔

② اس آیت سے معلوم ہوا کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا کی گئی، یہی بات سورۂ حم سجدہ کی آیات (۹ تا ۱۲) سے ثابت ہوتی ہے، مگر سورۂ نازعات میں: ﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴾ بظاہر اس کے خلاف ہے، تطبیق کے لیے دیکھیے سورۂ نازعات (۳۰)۔

③ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، یہاں "اسْتَوٰۤى" کے ضمن میں ارادہ کرنے اور متوجہ ہونے کا معنی رکھا گیا ہے، کیونکہ اسے "اِلٰى" کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور بہت سے خون بہائے گا اور ہم تیری تعریف کے ساتھ ہر عیب سے پاک ہونا بیان کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۳۰﴾ اور آدم کو سب کے سب نام سکھلا دیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، پھر فرمایا مجھے ان کے نام بتاؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ انھوں نے کہا تو پاک ہے، ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ فرمایا اے آدم! انھیں ان کے نام بتا،

---

④ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ زمین میں جو کچھ ہے مجموعی طور پر انسان کے فائدے کے لیے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کی ہر چیز ہر انسان کے لیے حلال ہے، بلکہ اسے یہ فائدہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے تحت اٹھانا ہوگا۔

**آیت 31** ① ان آیات سے معلوم ہوا کہ فرشتے ایک الگ مخلوق ہیں اور وہ انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایمان کی تعریف میں اللہ پر ایمان کے بعد فرشتوں پر ایمان کا ذکر فرمایا۔ [ بخاری، الإیمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ ...... : ۵۰ ] نیک انسانوں یا نیکی کی قوتوں کو فرشتے قرار دینا درحقیقت ان کے وجود سے انکار ہے، جو ایمان کے منافی ہے۔

② خلیفہ وہ ہے جو کسی کی موت کے بعد یا اس کے غائب ہونے کی صورت میں اس کا جانشین بنے، یا تمام امور خود سر انجام نہ دے سکنے کی صورت میں بعض معاملات میں اس کا نائب ہو۔ یہاں خلیفہ سے اللہ کا خلیفہ مراد لینا درست نہیں، کیونکہ نہ اللہ تعالیٰ پر موت آئے گی، نہ وہ غائب ہے اور نہ وہ اپنے کاموں میں کسی کا محتاج ہے، بلکہ بقول ابن کثیر رحمہ اللہ " قَوْمًا یَخْلُفُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا قَرْنًا بَعْدَ قَرْنٍ جِیْلًا بَعْدَ جِیْلٍ " یعنی خلیفہ سے ایسے لوگ مراد ہیں جو نسلاً بعد نسل ایک دوسرے کے جانشین بنیں گے۔ اسی طرح خلیفہ سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں بلکہ پوری نوع انسان ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ زمین میں فساد اور خون بہانا آدم علیہ السلام کا نہیں بلکہ اولاد آدم کا کام تھا۔ ( ابن کثیر )

③ فرشتوں کو انسان کا زمین میں فساد کرنا کیسے معلوم ہوا؟ جواب یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے انھیں بتا دیا تھا۔ دلیل ان کا یہ کہنا ہے کہ ''ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا۔'' فرشتوں کا سوال اعتراض کے لیے نہیں بلکہ انسان کی پیدائش کی حکمت معلوم کرنے کے لیے تھا۔

**آیت 31تا33** ① کسی ورکشاپ کی ذمہ داری سپرد کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے اوزاروں کا علم کون رکھتا ہے،

اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ وَ اَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی وَ اسۡتَكۡبَرَ ٭۫ وَ كَانَ مِنَ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۳۴﴾

تو جب اس نے انھیں ان کے نام بتا دیے، فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں ہی آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں جانتا ہوں اور جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے تھے ﴿۳۳﴾ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں سے ہو گیا ﴿۳۴﴾

ظاہر ہے کہ انھیں وہی استعمال کر سکتا ہے جو کم از کم ان کا نام جانتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی اشیاء کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے اور فرشتوں پر واضح کیا کہ زمین کی خلافت کے لیے صرف تسبیح و تقدیس کافی نہیں بلکہ علمِ اسماء بھی ضروری ہے جو آدم کو عطا کیا گیا ہے، فرشتوں کو نہیں۔ رہی یہ بات کہ فرشتوں کو یہ علم کیوں نہیں دیا گیا اور انھیں زمین کی خلافت کیوں نہیں سونپی گئی تو اس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، فرمایا: ﴿ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ ”بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

❷ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کا علم جزوی ہے اور وہ مقرب ہونے کے باوجود علم غیب نہیں رکھتے۔ غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دیکھیے سورۂ نمل (۶۵) عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”جو شخص تمھیں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے تو بلاشبہ اس نے جھوٹ کہا، اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔“ [ بخاری، التوحید، باب : ﴿ عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ أحدًا ...... ﴾ : ۷۳۸۰ ]

**آیت 34** ❶ آدم علیہ السلام کی پہلی فضیلت علم ظاہر فرمائی، اب یہ دوسرا شرف ہے کہ فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ صرف آداب بجالانا یا تابع ہونا نہیں تھا، بلکہ زمین پر پیشانی رکھنا تھا، کیونکہ سجدے کا حقیقی معنی یہی ہے۔

یہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت تو شرک ہے، جس کی اجازت کسی بھی امت میں نہیں تھی، پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں کو شرک کا حکم کیسے دے سکتا تھا، بلکہ یہ تعظیم کا سجدہ تھا، جو پہلی امتوں میں جائز تھا، ہماری امت میں حرام ہے، جیسا کہ بعض پہلی امتوں میں بہن سے نکاح جائز تھا، اب حرام ہے۔

عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ معاذ رضی اللہ عنہ جب شام سے واپس آئے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”معاذ! یہ کیا ہے؟“ کہا، میں شام گیا تو میں نے انھیں دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے دل میں چاہا کہ ہم آپ کے ساتھ اس طرح کریں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم یہ کام نہ کرو، کیونکہ اگر میں کسی کو حکم دینے والا ہوتا کہ وہ غیر اللہ کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔“ [ ابن ماجہ، النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ : ۱۸۵۳ ] مگر افسوس کہ جاہل صوفی اور عوام جب پیروں کے پاس حاضری دیتے

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے کہا اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور دونوں اس میں سے کھلا کھاؤ جہاں چاہو اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم دونوں ظالموں سے ہو جاؤ گے ﴿۳۵﴾

ہیں تو انھیں سجدہ کرتے ہیں اور وہ بھی اس پر خاموش رہ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

③ ابلیس فرشتہ نہیں تھا بلکہ جنوں سے تھا۔ (دیکھیے کہف : ۵۰) یہاں فرشتوں کو سجدے کا حکم دینے کا یہ مطلب نہیں کہ ابلیس فرشتہ تھا، یا یہ کہ اسے حکم ہی نہ تھا، بلکہ یہاں بات مختصر بیان ہوئی ہے۔ سورۂ اعراف میں تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے علاوہ ابلیس کو خاص طور پر سجدے کا حکم دیا تھا، فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ﴾ [الأعراف : ۱۲] ''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا، جب میں نے تجھے حکم دیا؟''

ابلیس کے انکار کا باعث اس کا کبر تھا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہوگا۔'' [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانه : ۹۱ ]

**آیت 35** ① اس آیت میں آدم علیہ السلام کی تیسری فضیلت کا بیان ہے، کہ فرشتوں سے سجدہ کروانے کے بعد انھیں جنت کی سکونت عطا فرمائی۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ حوا علیہا السلام اس وقت پیدا ہو چکی تھیں، ان کی پیدائش کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱) اور سورۂ اعراف (۱۸۹)۔

② یہ کون سا درخت تھا؟ اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایا، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، اگر اس کی ضرورت ہوتی یا اس سے کوئی فائدہ ہوتا تو ضرور بتا دیا جاتا۔ بعض مفسرین نے گندم یا انگور یا انجیر وغیرہ کا نام لیا ہے، مگر یہ سب اقوال بلا دلیل ہیں۔

③ **وَلَا تَقْرَبَا** ...... : اس درخت کے کھانے سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا۔ اس سے شریعت کا قاعدہ سد ذرائع ثابت ہوتا ہے، یعنی جو چیز حرام کا ذریعہ بنتی ہے اس سے بچنا بھی ضروری ہے، مثلاً زنا سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا، فرمایا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى ﴾ [ بنی إسرائیل : ۳۲ ] ''اور زنا کے قریب مت جاؤ'' حرام سے بچنے کے لیے مشتبہات یعنی شبہے والی چیزوں سے بچنے کا حکم دیا۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: ''بے شک حلال بالکل ظاہر ہے اور بے شک حرام بالکل ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ (شبہے والی) چیزیں ہیں جنھیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، تو جو شخص شبہات سے بچے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو پوری طرح بچا لے گا اور جو شبہات میں پڑ جائے گا، وہ حرام میں پڑ جائے گا، جیسے وہ چرواہا جو ممنوعہ چراگاہ کے گرد جانور چراتا ہے، قریب ہے کہ وہ اس کے اندر چرنے لگیں۔ یاد رکھو! ہر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔'' [ مسلم، المساقاۃ والمزارعة، باب أخذ الحلال و ترك الشبهات : ۱۵۹۹ ] اسی طرح

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۞ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۞

تو شیطان نے دونوں کو اس سے پھسلا دیا، پس انھیں اس سے نکال دیا جس میں وہ دونوں تھے اور ہم نے کہا اتر جاؤ، تمھارا بعض بعض کا دشمن ہے اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ۞ پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، تو اس نے اس کی توبہ قبول کر لی، یقیناً وہی ہے جو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ۞

---

اللہ تعالیٰ کو گالی سے بچانے کے لیے معبودانِ باطل کو گالی دینے سے منع فرمایا: ﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [ الأنعام : ۱۰۸ ] ”اور انھیں گالی نہ دو جنھیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، پس وہ زیادتی کرتے ہوئے کچھ جانے بغیر اللہ کو گالی دیں گے۔“

آیت 36 ❶ شیطان کے اس پھسلانے کی تفصیل سورۂ اعراف (۲۰) میں ہے۔

❷ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : یعنی آدم علیہ السلام اور ابلیس اور ان کی اولاد ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ [ الكهف : ۵۰۔ یٰس : ۶۰ ] یہ مطلب بھی درست ہے کہ اولادِ آدم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، جیسا کہ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ ہے۔ [ المائدة: ۲۷ ] فرشتوں نے بھی ﴿ وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾ میں اسی عداوت کا ذکر کیا تھا۔

❸ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ : یہ الفاظ دلیل ہیں کہ آدم علیہ السلام جس جنت میں رکھے گئے تھے وہ آسمان پر تھی، زمین پر جنت سے نکلنے کے بعد آئے۔ ”اهْبِطُوْا“ سے بھی یہی بات نکلتی ہے۔ یہ جمعہ کا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سب سے بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے، اسی میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے، اسی میں جنت میں داخل کیے گئے اور اسی میں اس سے نکالے گئے۔“ [ مسلم، الجمعة، باب فضل يوم الجمعة : ۸۵۴، عن أبي هريرة رضي الله عنه ]

❹ اِلٰى حِيْنٍ : یعنی موت تک کے لیے، کیونکہ انسان کے لیے مرنے کے بعد زمین سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ ”ایک وقت تک“ سے معلوم ہوا کہ زمین پر رہائش عارضی ہے، دائمی نہیں۔

آیت 37 ❶ کلمات یہ تھے: ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ۲۳ ] ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔“ مستدرک حاکم (۶۷۲/۲، ح: ۴۲۲۸) میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے عرش پر ”لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ لکھا ہوا دیکھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا مانگی تو ان کی توبہ قبول ہوئی، مگر ذہبی نے اسے موضوع، یعنی من گھڑت کہا ہے۔ اس روایت کے راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے متعلق خود امام حاکم نے ” اَلْمَدْخَلُ اِلَى الصَّحِيْحِ “

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

ہم نے کہا سب کے سب اس سے اتر جاؤ، پھر اگر کبھی تمھارے پاس میری طرف سے واقعی کوئی ہدایت آ جائے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، سو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۳۸﴾ اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۳۹﴾

میں فرمایا کہ وہ اپنے باپ سے موضوع روایات بیان کرتا ہے، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی گھڑی ہوئی ہیں، یہ روایت بھی اس نے اپنے باپ سے بیان کی ہے۔ قرآن و حدیث میں بہت سی دعائیں آئی ہیں، سب میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے مانگنا سکھایا گیا ہے، کسی نبی یا ولی کا واسطہ و وسیلہ نہیں بتایا گیا۔ مزید دیکھیے سورۂ مائدہ (۳۵) اور بنی اسرائیل (۵۷)۔

② فَتَابَ عَلَيْهِ: خالص توبہ کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں، اپنے گناہ کے نقصان کا احساس، اس پر ندامت اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم۔ "فَتَابَ عَلَيْهِ" سے معلوم ہوا کہ گناہ کے اثرات لازمی اور طبعی نہیں کہ لامحالہ ان کے نتیجے میں سزا مل کر ہی رہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، چاہے تو گناہ کی سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے، انسان توبہ کر لے تو گناہ کا اثر ختم کر دیا جاتا ہے۔

③ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ: اس سے بڑھ کر کیا مہربانی ہوگی کہ خود دعا سکھائی اور پھر قبول بھی فرمائی۔

**آیت 38، 39** ① قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا: توبہ کی قبولیت کے بعد پھر پہلا حکم دہرایا، مقصد یہ کہ گناہ کی معافی کے باوجود اب تمھیں اور تمھاری اولاد سب کو زمین ہی پر رہنا ہوگا، جس کی خلافت کے لیے تمھیں پیدا کیا گیا ہے۔ جنت میں واپسی کے لیے تمھیں اس ہدایت اور راستے پر چلنا ہوگا جو میری طرف سے تمھارے پاس آئے گی۔

② فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى: مخاطب آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی ہیں، مگر مراد ان کی اولاد ہے، یعنی تمھارے پاس میری طرف سے انبیاء و رسل بذریعہ وحی ہدایت لے کر آتے رہیں گے۔ ہدایت کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، قرآن مجید اور حدیث نبوی آخری وحی الٰہی ہے، اس دوران میں کتنے نبی اور رسول آئے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۱۶۴) کا حاشیہ۔ آج ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ دو ہی چیزیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انھیں مضبوطی سے پکڑے رکھو گے، کبھی گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔" [الموطأ، القدر، باب النهي عن القول بالقدر: ۳۔ مستدرك حاكم: ۱۷۱/۱، ح: ۳۱۸۔ الصحيحة: ۱۷۶۱]

③ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ: پہلے "فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى" میں اپنی طرف سے ہدایت آنے کی بات کی پھر "فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ" میں "هُدَايَ" کو یائے متکلم کی طرف مضاف کیا، یعنی "پھر جو میری ہدایت کی پیروی کرے۔" معلوم ہوا ہدایت صرف وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے، لوگوں کی رائے کبھی ہدایت قرار نہیں پا سکتی، خواہ وہ کتنے ہی بڑے عالم ہوں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور تم میرا عہد پورا کرو، میں تمھارا عہد پورا کروں گا اور صرف مجھی سے پس ڈرو ﴿۴۰﴾

④ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ...... : خوف آنے والی کسی چیز سے ڈر کو اور حزن ہاتھ سے نکل جانے والی کسی چیز پر غم کو کہتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کی پیروی کریں گے وہ آخرت میں نہ دنیا کی زندگی پر افسوس کریں گے، جیسا کہ کفار کو افسوس ہوگا۔ [ الأنعام : ۲۷ ] اور نہ قیامت کے دن کی بڑی گھبراہٹ سے انھیں کوئی غم ہوگا۔ [ الأنبياء : ۱۰۳ ] فرمایا: ﴿ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴾ [ النمل : ۸۹ ] ”اور وہ اس دن بڑی گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔“

آیت 40 ① اس سے پہلے ”يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ“ کے ساتھ تمام لوگوں کو دعوت تھی، اب بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب ہے، کیونکہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کا زیادہ حق ہے کہ وہ نبی ﷺ پر ایمان لائیں۔ یہ خطاب کبھی انعامات یاد دلا کر ہے جو ان پر کیے گئے، کبھی ان کی بداعمالیوں پر ڈانٹ کے ساتھ ہے اور کبھی ان سزاؤں کے ذکر کے ساتھ ہے جو ان کی نافرمانیوں پر انھیں دی گئیں۔ یہاں سے لے کر آیت ایک سو سینتالیس (۱۴۷) تک ان پر دس انعامات، ان کی دس بداعمالیوں اور انھیں دی جانے والی دس سزاؤں کا ذکر ہے۔ (التسہیل)

② اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام یا لقب ہے، جس کے معنی ہیں اللہ کا بندہ۔ اس لیے ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل میں پہلے پیغمبر یوسف علیہ السلام اور آخری پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ (قرطبی)

③ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بنی اسرائیل کو یہ چیزیں یاد دلائی گئیں، حالانکہ یہ سب کچھ پہلے بنی اسرائیل پر گزرا تھا، کیونکہ ان کے بزرگوں پر انعام ان پر بھی انعام تھا اور وہ اب بھی اپنے بزرگوں کی بدعادتوں میں ان کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ گزشتہ بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ آپ کے زمانے میں موجود بنی اسرائیل کے اعمال بد کا بھی ذکر فرمایا، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود کفر، کتاب اللہ میں تحریف، جبریل علیہ السلام سے عداوت، جادو کرنا، ایک دوسرے کو قتل کرنا وغیرہ۔ بنی اسرائیل کے احوال اتنی تفصیل سے ذکر فرمانے سے یہ بھی مقصود ہے کہ امت محمد (ﷺ) ان بداعمالیوں سے بچے اور ان کے نتائج سے ڈرتی رہے۔

④ نِعْمَتِيَ : اگرچہ یہ لفظ واحد ہے، مگر جنس مراد ہے، جس میں تمام نعمتیں شامل ہیں۔

⑤ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ ...... : یہاں اس عہد کی تفصیل بیان نہیں فرمائی، سورۂ مائدہ (۱۲) میں اس عہد کی تفصیل موجود ہے۔ اس کے مطابق ان کا اللہ تعالیٰ سے عہد یہ تھا کہ تم نماز قائم کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میرے رسولوں پر (جن میں محمد ﷺ بھی شامل ہیں) ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھا قرض دو گے اور اللہ کا ان سے عہد یہ تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں گا اور تم سے تمھارے گناہ دور کروں گا اور تمھیں جنتوں میں داخل کروں گا۔

وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ١۪ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا١٘ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۝۴۱ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۴۲

اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمھارے پاس ہے اور تم سب سے پہلے اس سے کفر کرنے والے نہ بنو اور میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت مت لو اور صرف مجھی سے پس ڈرو ﴿۴۱﴾ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، جب کہ تم جانتے ہو ﴿۴۲﴾

6 وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ : "اِيَّايَ" کا معنی "خاص مجھ سے" ہے۔ "فَارْهَبُوْنِ" اصل میں "فَارْهَبُوْنِیْ" تھا، یاء حذف ہوگئی، اس کا معنی بھی مجھ سے ڈرو ہے۔ "خاص مجھ سے" کے بعد دوبارہ "مجھ سے ڈرو" کی وجہ سے "خاص مجھی سے ڈرو" ترجمہ کیا گیا ہے، ورنہ خاص کے بعد "مجھ" کا لفظ کافی تھا، "مجھی" کی ضرورت نہ تھی۔

**آیت 42،41** 1 سب سے پہلے کافر بننے سے مراد یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، تمھیں تو سب سے پہلے ایمان لانا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس اگر تم ان کے ساتھ کفر کرتے ہو تو تم پہلے کافر ہوئے جو جانتے بوجھتے ہوئے کفر کر رہے ہو، اپنے آپ پر یہ ظلم نہ کرو۔ اس سے پہلے مشرکین مکہ نے جو کفر کیا تھا وہ جہالت کی وجہ سے تھا۔ اس لیے اشکال لازم نہیں آتا کہ کفارِ مکہ نے ان سے پہلے کفر کیا تھا۔ (بیضاوی)

2 وَلَا تَشْتَرُوْا...... : اس سے مراد دنیاوی مفاد کے لیے آیاتِ الٰہی کو چھپانا ہے۔ یہ مسلّم قاعدہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے کم قیمت لینے کا ذکر جہاں آیا ہے اس کی وضاحت بھی موجود ہے کہ اس سے کیا مراد ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا١ۙ اُولٰٓىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ١ۖۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ١ۚ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴾ [ البقرۃ : ۱۷۴، ۱۷۵ ] "بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب میں سے اتارا ہے اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھا رہے اور نہ اللہ ان سے قیامت کے دن بات کرے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے بدلے خریدا، سو وہ آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں؟" اور سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ١ٞ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا١ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۸۷ ] "اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی کہ تم ہر صورت اسے لوگوں کے لیے صاف صاف بیان کرو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے تو انھوں نے اسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت لے لی۔ سو برا ہے جو وہ خرید رہے ہیں۔" دنیا کی خاطر احکام الٰہی کو بدلنا بھی اس میں شامل ہے۔ وہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو رشوت لے کر غلط فتویٰ دیتے ہیں۔ اس آیت کا تعلیم کتاب کی اجرت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہ اجرت کسی غلط کام پر نہیں،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو﴿۴۳﴾ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟﴿۴۴﴾

---

بلکہ ایک نہایت پاکیزہ محنت پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ » ”سب سے زیادہ حق چیز جس پر تم اجرت لو اللہ کی کتاب ہے۔“ [ بخاری، کتاب الطب، باب الشروط في الرقية …… : ۵۷۳۷ ] بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف دم کی اجرت ہے مگر رسول اللہ ﷺ نے چند سورتوں کی تعلیم کے بدلے ایک صحابی سے ایک خاتون کا نکاح کر دیا تھا۔ [ بخاری، النکاح، باب التزویج علی القرآن …… : ۵۱۴۹، عن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ ] وہاں دم کی تاویل کیسے ہوگی؟ جن حضرات نے قرآن و حدیث کی تعلیم پر اجرت منع کی تھی ان کے نام لیواؤں نے یہ کہہ کر تنخواہ لینا شروع کر دی ہے کہ آج کل قرآن و حدیث کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے، ورنہ مدارس اور مساجد ویران ہو جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل ہی نہیں ہمیشہ سے یہ اجرت حلال تھی۔ بلکہ بہترین محنت اور بہترین اجرت تھی اور ہے، اس کا قرآن بیچنے سے کوئی تعلق نہیں۔

تھوڑی قیمت کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ قیمت لے لو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کے بدلے میں پوری دنیا بھی ملے تو متاعِ قلیل ہے، فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ [ النساء : ۷۷ ] ”کہہ دو، دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے۔“

**آیت 43** اپنے عہد کے مطابق نبی کریم ﷺ پر ایمان لا کر یہ تینوں کام اہتمام سے کرو۔ اس آیت سے باجماعت نماز کی تاکید ظاہر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے ارادہ کیا کہ ایندھن کا حکم دوں، وہ اکٹھا کیا جائے، پھر نماز کا حکم دوں، اس کے لیے اذان کہی جائے، پھر کسی آدمی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو امامت کروائے، پھر ان آدمیوں کی طرف جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے اور ان سمیت ان کے گھروں کو جلا دوں۔“ [ بخاری، الأذان، باب وجوب صلوة الجماعة : ۶۴۴۔ مسلم : ۶۵۱، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اذان سنے اور سن کر (نماز کے لیے مسجد میں) نہ آئے تو اس کی نماز نہیں مگر کسی عذر سے۔“ [ ابن ماجه، المساجد والجماعات، باب التغليظ في التخلف : ۷۹۳، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ صحيح ابن حبان : ۲۰۶۴۔ مستدرك : ۱/ ۳۷۳، ح : ۸۹۴، ۸۹۵، و صححه الألباني ]

**آیت 44** یعنی لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہو اور خود بھول جاتے ہو کہ اس میں نبی ﷺ پر ایمان لانے کا حکم بھی موجود ہے۔ [ ابن أبي حاتم عن ابن عباس : ۱/ ۱۲۲، ح : ۴۷۴، ۴۷۵ ] قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ”بنی اسرائیل لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کا حکم دیتے اور خود عمل نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں عار دلائی۔“ (عبد الرزاق)

اب مسلمانوں کا حال بھی بنی اسرائیل جیسا ہو گیا، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو شخص خود عمل نہ

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو اور بلاشبہ وہ یقیناً بہت بڑی ہے مگر ان عاجزی کرنے والوں پر ﴿۴۵﴾ جو یقین رکھتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ بے شک وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۴۶﴾ اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور یہ کہ بلاشبہ میں نے ہی تمھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ﴿۴۷﴾

---

کرے وہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم نہ دے، کیونکہ یہود کو اس بات پر عار دلائی ہے کہ وہ عمل نہیں کرتے، اس پر نہیں کہ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ جو شخص دعوت دے کر خود عمل نہ کرے اسے دوسروں سے زیادہ سزا ملے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا، اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اس کی انتڑیاں آگ میں نکل کر ڈھیر ہو جائیں گی، وہ ان کے گرد ایسے گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد گھومتا ہے۔ آگ والے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے، اے فلاں! تیرا کیا معاملہ ہے؟ کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور ہمیں برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا، میں تمھیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود وہ کام نہیں کرتا تھا اور تمھیں برائی سے منع کرتا تھا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔“ [ بخاری، بدء الخلق، باب صفۃ النار و أنہا مخلوقۃ : ۳۲۶۷، عن أسامۃ رضی اللہ عنہ ]

**آیت 45** یعنی کسی بھی مصیبت کے برداشت کرنے میں ان دو چیزوں کا سہارا لو۔ نبی ﷺ کو جب اچانک کوئی حادثہ پیش آتا تو آپ ﷺ نماز پڑھتے۔ [ أبو داؤد، التطوع، باب وقت قیام النبی ﷺ من اللیل : ۱۳۱۹، عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ و حسنہ الألبانی ] اہل علم نے فرمایا: ”صبر تین قسم پر ہے، مصیبت پر صبر، اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر اور نافرمانی سے بچنے پر صبر۔“

**آیت 46** نماز کی پابندی ویسے تو ایک نہایت مشکل ذمہ داری ہے، مگر جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کا یقین ہے ان پر یہ بھاری نہیں ہے۔ یہاں ظن سے مراد یقین ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۴ ] ”اور آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں۔“ [ أضواء البیان ]

**آیت 47** ① اوپر آیت (۴۰) میں اختصار کے ساتھ بنی اسرائیل کو اپنے احسانات یاد دلائے تھے، اب تفصیل کے ساتھ ان کا بیان شروع کرنے کے لیے دوبارہ خطاب کیا ہے اور وعظ کا یہ انداز نہایت بلیغ اور مؤثر ہوتا ہے۔ (المنار) نیز ان کو توجہ دلائی ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی مخالفت اور دوسری بے ہودگیوں سے باز آ جاؤ۔

② جہانوں پر فضیلت بخشی، اس سے مراد رسول اللہ ﷺ سے پہلے زمانوں کے لوگ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کے تشریف لانے پر یہ فضیلت ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ [ آل عمران : ۱۱۰ ] فرما کر اس امت کو عطا کر دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ )) ”سب سے بہتر میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

اور اس دن سے بچو جب نہ کوئی جان کسی جان کے کچھ کام آئے گی اور نہ اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۴۸﴾ اور جب ہم نے تمھیں فرعون کی قوم سے نجات دی، جو تمھیں برا عذاب دیتے تھے، تمھارے بیٹوں کو بری طرح ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی ﴿۴۹﴾

ملیں گے، پھر وہ جوان سے ملیں گے۔'' [ بخاري، الشهادات، باب لا يشهد على شهادة جور إذا أشهد : ۲٦٥۲، عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه ]

**آیت 48** ① نعمت یاد دلانے کے بعد انھیں قیامت کے عذاب سے ڈرایا۔ بنی اسرائیل میں فساد کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے انبیاء اور علماء پر ناز کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کتنے ہی گناہ کر لیں ہمارے بزرگ اور آباء و اجداد ہمیں بخشوا لیں گے، ان کے اسی باطل گمان کی تردید کی گئی ہے۔

② کسی گرفتار شخص کو چھڑانے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، کسی کی سفارش کام آ جائے، یا فدیہ دے کر چھڑا لیا جائے، یا زبردستی حملہ کر کے چھڑا لیا جائے، قیامت کے دن ان میں سے کوئی بھی ممکن نہیں۔

③ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کوئی سفارش قبول نہیں ہوگی، مگر دوسرے مقامات پر وضاحت فرمائی ہے کہ جس شفاعت کی نفی کی گئی ہے وہ کفار کے لیے شفاعت ہے: ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ﴾ [ المدثر : ٤٨ ] ''پس انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی۔'' اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر بھی شفاعت ممکن نہیں ہوگی، فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [ البقرة : ٢٥٥ ] ''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔'' ہاں! جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اس کے لیے سفارش ہوگی اور اسے نفع بھی دے گی۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۰۹) اور قیامت کے دن اہل ایمان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی احادیث متواتر ہیں۔

**آیت 49** ① یہاں سے بنی اسرائیل پر کیے جانے والے انعامات اور انھیں دی جانے والی فضیلت کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔

② طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے باہمی مشورہ کیا کہ بنی اسرائیل کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد میں انبیاء اور بادشاہ پیدا فرمائے گا (سو ان کا بندوبست ہونا چاہیے)، تو انھوں نے مشورے سے متفقہ فیصلہ یہ کیا کہ ایسے آدمی مقرر کیے جائیں جن کے پاس چھریاں ہوں، وہ بنی اسرائیل میں چکر لگاتے رہیں، جہاں کوئی نومولود لڑکا ملے اسے ذبح کر دیں، انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جب دیکھا کہ بنی اسرائیل کے

وَ اِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَ اَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤى اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۱﴾

اور جب ہم نے تمھاری وجہ سے سمندر کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تمھیں نجات دی اور ہم نے فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے ﴿۵۰﴾ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کی میعاد مقرر کی، پھر اس کے بعد تم نے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ﴿۵۱﴾

بڑی عمر کے لوگ تو طبعی موت سے مر رہے ہیں اور بچے ذبح ہو رہے ہیں، تو انھوں نے کہا اس طرح تو تم بنی اسرائیل کو فنا کر دو گے، پھر جو خدمت اور مشقت تمھاری جگہ وہ کرتے ہیں وہ تمھیں خود کرنا پڑے گی۔ اس لیے ایک سال ان کے بچے ذبح کرو اور ایک سال انھیں رہنے دو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہارون علیہ السلام کے ساتھ اس سال حاملہ ہوئیں جس میں لڑکے ذبح نہیں کیے جاتے تھے، اس لیے انھوں نے انھیں بلا خوف جنم دیا اور آئندہ سال ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ امید سے ہوئیں۔ (طبری)

ابن عباس رضی اللہ عنہما تک اس کی سند ٹھیک ہے۔ عام طور پر یہاں فرعون کے خواب کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اس نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص اس کی سلطنت ختم کرنے کا باعث ہو گا، اس لیے اس نے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، مگر اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی کثرتِ تعداد کی صورت میں ان کے غلبے سے خائف ہو کر یہ ظلم اختیار کیا تھا۔ آج کل بھی دنیا بھر کے کفار مسلمانوں کی آبادی بڑھنے سے سخت خائف ہیں اور لالچ اور دھمکی، ہر طریقے سے ان کی آبادی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

③ یہ واقعہ عاشورا (دس محرم) کے دن پیش آیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں، آپ نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' انھوں نے کہا، یہ ایک عظیم دن ہے، اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن کا روزہ رکھا۔ آپ نے فرمایا: ''میں تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھتا ہوں۔'' چنانچہ آپ نے اس دن کا روزہ رکھا اور اس کے روزے کا حکم دیا۔ [ بخاری، الصوم، باب صوم یوم عاشوراء: ۲۰۰٤ ] پھر رمضان کے روزے فرض ہونے پر عاشورا کا روزہ نفل قرار دے دیا گیا۔ وفات سے پہلے آپ نے فرمایا: ''آئندہ سال میں زندہ رہا تو نو (محرم) کا روزہ رکھوں گا۔'' مگر آپ اس سے پہلے فوت ہو گئے۔ [ مسلم، الصیام، باب أی یوم یصام فی عاشوراء: ۱۱۳٤ ]



④ ''يُذَبِّحُوْنَ'' باب تفعیل کی وجہ سے ''بری طرح ذبح کرتے تھے'' ترجمہ کیا گیا ہے۔

⑤ ''بَلَآءٌ'' امتحان اور آزمائش، خواہ مصیبت کے ساتھ ہو یا انعام کے ساتھ۔ ''وَفِيْ ذٰلِكُمْ'' میں یہ اشارہ ذبح کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور نجات کی طرف بھی۔ ذبح کیا جانا مصیبت تھی اور نجات انعام۔

**آیت 50** اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۹۰) اور سورۂ شعراء (۵۲ تا ٦۷)۔

**آیت 51** فرعون سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل صحرائے سینا میں پہنچے تو ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، اس

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

پھر ہم نے اس کے بعد تمھیں معاف کر دیا، تاکہ تم شکر کرو ﴿۵۲﴾ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور (حق و باطل میں) فرق کرنے والی چیز عطا کی، تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۵۳﴾ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! بے شک تم نے اپنے بچھڑا بنانے کے ساتھ اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، پس تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کرو، پس اپنے آپ کو قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے، تو اس نے تمھاری توبہ قبول کر لی، بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۴﴾

وقت تک وہ موسیٰ علیہ السلام کی اس وحی پر عمل کرتے آرہے تھے جو تورات سے پہلے موسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی۔ گویا حدیث پر عمل تھا، اب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن رات کے لیے طور پر بلایا، تاکہ انھیں تورات عطا فرمائی جائے، لیکن ان کے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے ایک بچھڑا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی، اسی بنا پر یہاں ان کو ظالم قرار دیا گیا ہے کہ وہ صریح طور پر شرک کے مرتکب ہوئے تھے اور شرک سے بڑھ کر اور کون سا ظلم ہو سکتا ہے۔ بچھڑے کے واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۸۷ تا ۹۷)۔

**آیت 52 تا 53** ”الْكِتٰبَ“ سے مراد بالاتفاق تورات ہے اور ”الْفُرْقَانَ“ (حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز) سے مراد معجزے بھی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کو عطا کردہ قوتِ فیصلہ بھی جو حق و باطل میں فرق کرتی تھی، اگر ”واؤ“ کو تفسیری مانیں تو خود تورات بھی حق و باطل میں فرق کرنے والی تھی۔

**آیت 54** بنی اسرائیل میں جس طرح شادی شدہ زانی کی سزا رجم تھی اسی طرح شرک کے ارتکاب پر بھی انھیں قتل کی سزا سنائی گئی اور اس پر عمل بھی ہوا۔ ہماری امت میں بھی ارتداد کی سزا قتل ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ» ”جو شخص مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو۔“ [ أبو داوٗد، الحدود، باب الحکم فیمن ارتد : ۴۳۵۱، و صححه الألباني ] مگر اتنی تخفیف کر دی گئی کہ مرتد توبہ کر لے تو اسے معاف کر دیا جائے گا، البتہ رجم کی حد توبہ کے باوجود جاری کی جائے گی۔

طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنی قوم کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو قتل کرو، تو وہ لوگ جو بچھڑے کے مجاور بنے تھے گوٹھ مار کر بیٹھ گئے اور جو لوگ مجاور نہیں بنے تھے وہ اٹھے اور انھوں نے ہاتھوں میں خنجر لیے، ان پر ایک سخت تاریکی چھا گئی اور وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے، پھر اندھیرا دور ہو گیا، روشنی ہوئی تو ستر ہزار قتل ہو چکے

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز تیرا یقین نہ کریں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ لیں، تو تمھیں کڑک نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے ﴿۵۵﴾ پھر ہم نے تمھیں تمھارے مرنے کے بعد زندہ کیا، تاکہ تم شکر کرو ﴿۵۶﴾ اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ اتارا، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمھیں دی ہیں اور انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کیا کرتے تھے ﴿۵۷﴾

تھے۔ جو قتل ہو گیا اس کی بھی توبہ قبول ہو گئی اور جو بچ گیا اس کی بھی۔ صاحب "التفسیر الصحیح" فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما تک اس روایت کی سند صحیح ہے۔ اوپر آیت (۵۲) میں جس معافی کا ذکر ہے وہ اس قتل کے بعد کی ہے۔

**آیت 55 تا 56** اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ بات کہنے والے وہ ستر آدمی تھے جن کا سورۂ اعراف (۱۵۵) میں ذکر ہے، جنھیں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت کے لیے چنا تھا، جب موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم تمھارے کہنے پر ہرگز یقین نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تم سے ہم کلام ہوئے ہیں، جب تک ہم خود اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ لیں، اس پر وہ رجفہ (زلزلہ) اور صاعقہ (بجلی کی کڑک) سے بے ہوش ہو کر مر گئے، پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوئے۔ یہاں موت سے بے ہوشی مراد لینا درست نہیں، کیونکہ یہاں واضح طور پر ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ آیا ہے اور سورۂ اعراف (۱۵۵) میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں: ﴿ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ﴾ (اگر تو چاہتا تو انھیں اس سے پہلے ہلاک کر دیتا اور مجھے بھی) آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان لانے کی شرط کے طور پر اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا مطالبہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۵۳) اور فرقان (۲۱)۔

**آیت 57** صحرائے سینا میں ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا اور صحرا کی دھوپ انھیں جلائے دیتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر خاص قسم کے بادل کا سایہ کر دیا اور کھانے کے لیے من و سلویٰ کا انتظام فرما دیا۔ "اَلْمَنَّ" کی تفسیر میں سب سے صحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ» [ بخاری، الطب، باب المن شفاء للعين: ۵۷۰۸۔ مسلم: ۲۰۴۹، عن سعيد بن زيد رضی اللہ عنہ ] "کھنبی "مَنّ" میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ "مَنّ" متعدد چیزیں تھیں جو صحرا میں خود بخود پیدا ہوتی تھیں، ان میں سے ایک

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

اور جب ہم نے کہا اس بستی میں داخل ہو جاؤ، پس اس میں سے کھلا کھاؤ جہاں چاہو اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور کہو بخش دے، تو ہم تمھیں تمھاری خطائیں بخش دیں گے اور ہم نیکی کرنے والوں کو جلد ہی زیادہ دیں گے ﴿۵۸﴾ پھر ان لوگوں نے جنھوں نے ظلم کیا، بات کو اس کے خلاف بدل دیا جو ان سے کہی گئی تھی، تو ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا تھا، آسمان سے ایک عذاب نازل کیا، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

---

کھنبی بھی تھی۔ اسی طرح وہ میٹھی گوند بھی ''مَنّ'' کی ایک قسم تھی جو ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ سے ''مَنّ'' کی تفسیر میں آئی ہے۔ ''السَّلْوٰی'' اسم جنس ہے، اس کا واحد ''سَلْوَاةٌ'' آتا ہے، بٹیر یا بٹیر سے ملتا جلتا پرندہ ہے۔ صحرا میں اللہ کے حکم سے بے شمار پرندے آ جاتے اور وہ انھیں پکڑ کر کھا لیتے تھے۔

**آیت 58** ① اس شہر سے مراد کون سا شہر ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے اریحا شہر مراد ہے، مگر یہ بعید ہے، کیونکہ اس وقت بنی اسرائیل بیت المقدس کی طرف جا رہے تھے اور یہ اس راستے پر نہیں ہے اور بعض نے فرعون والا مصر مراد لیا ہے، یہ قول اس سے بھی زیادہ بعید ہے۔ زیادہ صحیح قول جسے اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ اس سے بیت المقدس کا شہر ہی مراد ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ (۲۱) میں ہے: ﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ ''اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے۔'' (ابن کثیر)

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بیت المقدس تو موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں فتح ہی نہیں ہو سکا، حالانکہ ''فَبَدَّلَ'' کی فاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے بعد وہ فوراً شہر میں چلے گئے۔ رازی نے اس اشکال کا حل پیش کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کی زبانی دیا گیا ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ یوشع بن نون علیہ السلام کے عہد نبوت میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو انھیں حکم دیا گیا ہو کہ اس فتح کی شکر گزاری میں اللہ تعالیٰ کے عاجز بندوں کی طرح سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہوئے شہر میں داخل ہوں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یہ حکم ویسا ہی تھا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ نصر میں فتح کے موقع پر تسبیح و استغفار کا حکم دیا گیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں داخل ہونے کے بعد نمازِ فتح (آٹھ رکعات) ادا کی ہے۔

② **وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ**: یعنی گناہوں کی بخشش کے علاوہ مزید درجات حاصل ہوں گے۔ احسان کا معنی خالص اللہ کے لیے عمل کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کی حقیقت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ )) ''اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہیں دیکھتے ہو تو یقیناً وہ تمھیں دیکھتا ہے۔'' [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ ...... : ۵۰، عن عمر رضی اللہ عنہ ]

**آیت 59** مگر ان ظالموں نے اللہ کے اس حکم کا مذاق اڑایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بنی اسرائیل سے کہا گیا: ﴿ وَادْخُلُوا

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۶۰

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنی لاٹھی اس پتھر پر مار، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، بلاشبہ سب لوگوں نے اپنی پینے کی جگہ معلوم کر لی، کھاؤ اور پیو اللہ کے دیے ہوئے میں سے اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ ۝۶۰

**الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ** ﴾ ''اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور کہو بخش دے۔'' تو انھوں نے اسے بدل دیا اور اپنے سرینوں پر گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انھوں نے کہا: « حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ » ''دانہ بالی میں۔'' [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب : ۳۴۰۳۔ مسلم : ۳۰۱۵ ] بتائیے کہ اس سے بڑھ کر عناد اور حکم الٰہی کی مخالفت اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس عظیم نافرمانی کو قرآن نے ''فسق'' سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی حدود اللہ سے کلیتاً نکل جانے کے ہیں، اس بنا پر انھیں ظالم قرار دیا اور ان کے اس ظلم کی سزا میں ان پر طاعون کا عذاب نازل فرمایا۔ "رِجْزًا" کے معنی گو مطلق عذاب کے ہیں، مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد طاعون ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلطَّاعُوْنُ رِجْسٌ أُرْسِلَ عَلٰى طَائِفَةٍ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَوْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ » [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب : ۳۴۷۳، عن أسامة بن زید رضی اللہ عنہما ] ''طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر یا ان لوگوں پر بھیجا گیا جو تم سے پہلے تھے۔'' مسلم میں "رِجْسٌ" کی جگہ "رِجْزٌ" ہے۔ [ مسلم، السلام، باب الطاعون والطیرۃ ...... : ۲۲۱۸ ] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ قصہ سورۂ اعراف میں بھی مذکور ہے، مگر وہ سورت چونکہ مکی ہے، اس لیے ضمیر غائب سے اس کو ذکر کیا ہے اور یہ سورت مدنی ہے اور مدینہ میں یہود سامنے تھے، اس لیے ضمیر مخاطب لائی گئی ہے۔ الغرض ان دونوں قصوں ( بقرہ اور اعراف ) کے درمیان سیاق کے اعتبار سے دس وجوہ سے فرق پایا گیا ہے، جن میں سے بعض کا تعلق الفاظ سے ہے اور بعض کا معنی سے۔ امام رازی اور امام زمخشری رحمہما اللہ نے وہ دس فرق خوب تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

آیت 60 "الْحَجَرَ" کا ترجمہ ''اس پتھر پر'' اس لیے کیا ہے کہ ''الف لام'' عہد کا ہے، ''الف لام'' جنس کا مانیں تو کوئی بھی پتھر مراد ہو سکتا ہے۔ تفہیم القرآن میں ہے: ''وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے، سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ بارہ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیلی قبیلے بھی بارہ ہی تھے، اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے کے لیے ایک چشمہ نکال دیا، تاکہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔'' مگر ہزاروں سال کے بعد یہ بات یقین کے ساتھ کس طرح کہی جا سکتی ہے کہ یہ وہی چٹان ہے اور بعد میں نہیں بنی، جب کہ اس کی کوئی سند بھی نہیں۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۟ؒ ﴿۶۱﴾

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے، سو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے کچھ ایسی چیزیں نکالے جو زمین اپنی ترکاری اور اپنی ککڑی اور اپنی گندم اور اپنے مسور اور اپنے پیاز میں سے اگاتی ہے۔ فرمایا کیا تم وہ چیز جو کمتر ہے، اس چیز کے بدلے مانگ رہے ہو جو بہتر ہے، کسی شہر میں جا اترو تو یقیناً تمھارے لیے وہ کچھ ہوگا جو تم نے مانگا، اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کی طرف سے بھاری غضب کے ساتھ لوٹے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور نبیوں کو حق کے بغیر قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ﴿۶۱﴾

**آیت 61** ① من اور سلویٰ کو ایک کھانا اس لیے قرار دیا کہ روزانہ یہی کھانے کو ملتا تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ پرندوں کا گوشت اور صحرا کی فطری خود رو چیزیں اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت اور صحت کے لیے بہترین غذا تھیں، پھر انھیں آزادی اور فراغت حاصل تھی، جس میں وہ علم حاصل کر سکتے تھے اور جہاد کی تیاری کر کے عزت و اقتدار حاصل کر سکتے تھے، مگر انھوں نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی اور ان چیزوں کا تقاضا کرنے لگے جن کے وہ زمانۂ غلامی میں عادی تھے اور جو آزاد فضا میں ملنے والے من و سلویٰ کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھیں۔ پھر اس کے لیے کھیتی باڑی میں مشغول ہونا پڑتا تھا، جو ہمیشہ فاتح قومیں مفتوح قوموں سے کرواتی ہیں اور جس میں مکمل مشغولیت کا نتیجہ ذلت و مسکنت ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ﴿ **وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ** ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۵ ] ''اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو۔'' اس آیت کی تفسیر صحیح بخاری میں ہے کہ ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے ہل اور کھیتی باڑی کا کوئی اوزار دیکھا تو فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ هٰذَا بَيْتَ قَوْمٍ إِلَّا أُدْخِلَهُ اللّٰهُ الذُّلَّ )) ''یہ چیزیں کسی گھر میں داخل نہیں ہوتیں مگر اللہ تعالیٰ اس میں ذلت داخل کر دیتا ہے۔'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھیتی باڑی حرام ہے، بلکہ مراد اس کام میں کھو جانا اور جہاد ترک کرنا ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر باب باندھا ہے: '' بَابُ مَا يُحْذَرُ مِنْ عَوَاقِبِ الْاِشْتِغَالِ بِآلَةِ الزَّرْعِ أَوْ مُجَاوَزَةِ الْحَدِّ الَّذِيْ أُمِرَ بِهٖ '' یعنی کھیتی باڑی کے اوزاروں میں زیادہ مشغول ہونے کے نتیجے میں یا اس حد سے تجاوز میں جس کا حکم دیا گیا ہے، جو خطرات ہیں ان کا باب۔'' [ بخاری، الحرث و المزارعۃ، قبل ح : ۲۳۲۱ ]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے گا اور

بنی اسرائیل پر بھی ان کے اس مطالبے کے نتیجے میں ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۱۲)۔

❷ یہاں "مِصْرًا" نکرہ اور منصرف ہے، کیونکہ مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط میں الف موجود ہے، اس لیے اس سے مراد کوئی ایک شہر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی یہی تفسیر کی ہے، بعض نے فرعون والا مصر مراد لیا ہے۔ (ابن کثیر)

❸ "بِغَضَبٍ" اس میں تنوین تہویل یعنی خوف ناکی کے اظہار کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "بھاری غضب" کیا گیا ہے۔

❹ "فُوْمِهَا" اکثر مفسرین نے اس سے مراد گندم لی ہے، بعض نے لہسن مراد لیا ہے۔

❺ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی نبی قتل نہیں ہوا، کیونکہ یہ اس وعدے کے خلاف ہے جو سورۂ ابراہیم (۱۳، ۱۴) میں مذکور ہے۔ یہ لوگ قتل کا معنی ارادۂ قتل یا سخت تکلیف دینا لیتے ہیں، مگر قرآن مجید میں کئی جگہ صریحاً لفظ "قتل" آیا ہے، مثلاً: ﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ ﴾ [ البقرۃ : ۹۱ ] "کہہ دے پھر اس سے پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا کرتے تھے۔" رہا وعدۂ الٰہی تو وہ عام مومنوں سے بھی ہے، دیکھیے سورۂ نور (۵۵)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی مومن قتل نہیں ہوا، یقیناً کئی مومن قتل ہوئے اور کئی انبیاء بھی، خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری میں جس میں فوت ہوئے فرماتے تھے: « يَا عَائِشَةُ ! مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِيْ أَكَلْتُ بِخَيْبَرَ فَهٰذَا أَوَانُ وَجَدْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِيْ مِنْ ذٰلِكَ السُّمِّ » "میں ہمیشہ اس کھانے کی تکلیف محسوس کرتا رہا اور یہ وقت ہے کہ میں نے اس زہر سے اپنی دل کی رگ کا کٹ جانا محسوس کیا ہے۔" [ بخاری، المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاته : ۴۴۲۸ ] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ قَتَلَهُ نَبِيٌّ أَوْ قَتَلَ نَبِيًّا وَ إِمَامُ ضَلَالَةٍ وَ مُمَثِّلٌ مِّنَ الْمُمَثِّلِيْنَ » "قیامت کے دن سب سے سخت عذاب والا وہ آدمی ہے جسے کسی نبی نے قتل کیا یا اس نے کسی نبی کو قتل کیا اور گمراہی کا امام اور مصوروں میں سے کوئی مصور۔" [ مسند أحمد : ۱/۴۰۷، ح : ۳۸۶۷، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ، صححه أحمد شاكر و حسنه الشيخ مقبل الوادعي ] اگر کوئی نبی قتل ہو ہی نہیں سکتا تو اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا؟ خود بائبل میں زکریا علیہ السلام کا قتل (تواریخ، باب: ۲۴، فقرہ: ۲۱) اور یحییٰ علیہ السلام کا قتل (مرقس، باب: ۶، فقرہ: ۱۷-۲۹) مذکور ہے۔

آیت 62 ❶ اس آیت سے پہلی آیات اور اس کے بعد والی آیات میں بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کے مقابلے میں ان کے اعمال بد کا تذکرہ ہے۔ یہ آیت درمیان میں ایک خاص مناسبت کی بنا پر آئی ہے، وہ یہ کہ جب بات ان پر ذلت و مسکنت مسلط ہونے اور اللہ کے غضب کا نشانہ بننے تک پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت کے مطابق ان کے لیے اپنی رحمت کا تذکرہ بھی فرمایا کہ بنی اسرائیل کا ہر فرد اس ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی کا نشانہ نہیں، پہلے بھی اللہ تعالیٰ بے حد مہربان تھا اور

عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

نیک عمل کرے گا تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۶۲﴾

توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایمان اور عمل صالح سے متصف ہو گا، خواہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہو، جیسے آپ سے پہلے اپنے اپنے انبیاء پر ایمان لا کر عمل صالح کرنے والے لوگ ہوں، یا آپ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ میں سے ایمان لانے والے ہوں، مثلاً عبد اللہ بن سلام، صہیب اور سلمان رضی اللہ عنہم، سب کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ یہود و نصاریٰ کو مزید مانوس کرنے کے لیے مسلمانوں اور صابئین کا بھی ساتھ ذکر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی خاص نسل کے ساتھ مخصوص نہیں، شرط صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ [ التحریر والتنویر ]

② بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب بھی اگر عیسائی، یہودی اور صابی اپنے اپنے مذہب پر رہ کر عمل صالح کریں، تو مسلمانوں کی طرح ان کی بھی نجات ہو جائے گی، یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ تورات و انجیل میں بنی اسرائیل کو صاف الفاظ میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم موجود ہے۔ حوالہ جات کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷) اور سورۂ صف (۶) کے حواشی۔ اب اگر ان میں سے کوئی شخص رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا تو اس کا تورات و انجیل پر بھی ایمان نہیں، وہ کیسے نجات پا سکتا ہے؟ ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾ [ آل عمران : ۸۵ ] ”اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔“ اس آیت میں یہی بات بیان ہوئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهٖ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ » [ مسلم، الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالۃ …… : ۱۵۳ ] ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس امت کا کوئی بھی یہودی یا نصرانی جو میرے بارے میں سن لے، پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے مگر وہ آگ میں داخل ہو گا۔“

③ **الصَّابِئِيْنَ**: یہ ” صَابِئٌ “ کی جمع ہے، اس کا مادہ (ص، ب، ء) ہے، جو شخص ایک دین سے دوسرے دین کی طرف نکل جائے، گویا یہ ”صَبَأَ نَابُ الْبَعِيْرِ “ سے ہے، جس کا معنی ہے اونٹ کی کچلی نکل آئی۔ ایک قراءت میں ”اَلصَّابِيْنَ“ ہے، وہ اسی ” الصَّابِئِيْنَ“ میں سے ہمزہ کی تخفیف سے ہے اور بعض نے کہا بلکہ وہ ”صَبَا يَصْبُوْ “ سے ہے، جس کے معنی مائل ہونا ہیں، یعنی وہ ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہو گیا۔ ( راغب )

اسی لیے جو شخص مسلمان ہوتا کفارِ قریش اسے صابی کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے، یہود و نصاریٰ کی طرح یہ لوگ بھی آسمانی دین پر تھے، اس لیے اس آیت میں ان کے ساتھ ان کا ذکر ہوا، بعد میں ان کے اندر بگاڑ پیدا ہو گیا اور وہ ستاروں کی پرستش کرنے لگے۔ یہ لوگ اپنے مذہب کو حد درجہ چھپاتے تھے، شیعہ اسماعیلیہ نے مذہب کو چھپانا انھی سے لیا ہے۔ ان کے اہل کتاب ہونے

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ١ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۶۳ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ١ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۶۴ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۶۵

اور جب ہم نے تمھارا پختہ عہد لیا اور تمھارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا۔ پکڑو قوت کے ساتھ جو ہم نے تمھیں دیا ہے اور جو اس میں ہے اسے یاد کرو، تاکہ تم بچ جاؤ ۶۳ پھر تم اس کے بعد پھر گئے تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے ۶۴ اور بلاشبہ یقیناً تم ان لوگوں کو جان چکے ہو جو تم میں سے ہفتے (کے دن) میں حد سے گزر گئے تو ہم نے ان سے کہا ذلیل بندر بن جاؤ ۶۵

---

کے بارے میں صحابہ وتابعین سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ [ تفصیل کے لیے دیکھیے: جصاص، الفہرست لابن ندیم، الملل والنحل ]

**آیت 63** ① اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات پر عمل کا عہد لیتے ہوئے ایک ہیبت ناک منظر پیدا فرما دیا، تاکہ وہ دل سے یہ عہد کریں۔ اس وقت وہ پہاڑ کے دامن میں تھے کہ زلزلے کے ساتھ پہاڑ اکھڑ کر ( وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ ) ان پر جھک گیا اور سائبان کی طرح ان پر سایہ فگن ہو گیا، حتیٰ کہ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ان پر گرنے ہی والا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۱) یہ دسویں نعمت ہے، کیونکہ یہ عہد و میثاق ان کے فائدے ہی کے لیے تھا۔

② "مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ" کی وضاحت یہاں اگرچہ نہیں آئی، مگر کئی مقامات پر مذکور ہے کہ اس سے مراد کتاب ہے، مثلاً: ﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۴۹ ] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، تاکہ وہ (لوگ) ہدایت پائیں۔"

③ "بِقُوَّةٍ" (قوت کے ساتھ پکڑنے) سے مراد یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔ (مسند عبد بن حمید، عن مجاہد)

**آیت 64** ① اس سارے عہد و پیمان کے بعد انھوں نے بہت سی باتوں میں تورات سے کنارہ کشی اختیار کی، چنانچہ انھوں نے تورات میں تحریف کی، اس کی آیات کو چھپایا، انبیاء کے احکام کی نافرمانی کی، بعض کو جھٹلایا، بعض کو قتل کیا، میدان تیہ میں عجیب وغریب نعمتوں کے مشاہدے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام پر بار بار اعتراض کیے، ان کی حکم عدولی کی، انھیں سخت ایذا پہنچائی۔ ارض مقدس میں داخلے کا حکم ہوا تو صاف انکار کر دیا، حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام نے خود کو ان نافرمانوں سے الگ کر دینے کی دعا کی۔ یہ تو پہلوں کا حال تھا، بعد والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

② لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ : یعنی ان تمام نافرمانیوں کے باوجود فوراً عذاب کے ساتھ ہلاک کرنے کے بجائے تمھیں توبہ و استغفار کی مہلت دی گئی۔

**آیت 65** اس آیت سے ظاہر ہے کہ ہفتے کے دن میں زیادتی کا یہ واقعہ بنی اسرائیل میں معروف تھا۔ اس کی تفصیل سورۂ اعراف (۱۶۳ تا ۱۶۶) کے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸

تو ہم نے اسے ان لوگوں کے لیے جو اس کے سامنے تھے اور جو اس کے پیچھے تھے، ایک عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے ایک نصیحت بنا دیا ﴿۶۶﴾ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، انھوں نے کہا کیا تو ہمیں مذاق بناتا ہے؟ کہا میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں ﴿۶۷﴾ انھوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے واضح کرے وہ (گائے) کیا ہے؟ کہا بے شک وہ فرماتا ہے بے شک وہ ایسی گائے ہے جو نہ بوڑھی ہے اور نہ بچھڑی، اس کے درمیان جوان عمر کی ہے، تو کرو جو تمھیں حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۸﴾ انھوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے واضح کرے اس کا رنگ کیا ہے؟ کہا بے شک وہ فرماتا ہے کہ بلاشبہ وہ گائے زرد رنگ کی ہے، اس کا رنگ خوب گہرا ہے، دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ﴿۶۹﴾ انھوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے واضح کرے وہ (گائے) کیا ہے؟ بے شک گائیں ہم پر ایک دوسری کے مشابہ ہوگئی ہیں اور یقیناً ہم اگر اللہ نے چاہا تو مقصد کو پہنچنے ہی والے ہیں ﴿۷۰﴾ کہا بے شک وہ فرماتا ہے کہ بے شک وہ ایسی گائے ہے جو نہ جوتی ہوئی ہے کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے، صحیح سالم ہے، اس میں کسی اور رنگ کا نشان نہیں۔ انھوں نے کہا اب تو صحیح بات لایا ہے۔ پس انھوں نے اسے ذبح کیا اور وہ قریب نہ تھے کہ کرتے ﴿۷۱﴾

**آیت 66** اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ اس وقت کے لوگوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا۔ ڈرنے والوں کے لیے نصیحت میں یہ بھی شامل ہے کہ امت محمد ﷺ بنی اسرائیل کی ان نافرمانیوں اور ان پر ملنے والی سزاؤں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

**آیت 67 تا 71** ① مصر میں غلامی کے زمانے میں غالب قوم کے اثر سے بنی اسرائیل میں گائے کی تقدیس کا عقیدہ سرایت

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر تم نے اس کے بارے میں جھگڑا کیا اور اللہ اس بات کو نکالنے والا تھا جو تم

کر گیا تھا، اس کا ظہور اس وقت بھی ہوا جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لیے طور پر گئے، تو انھوں نے بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس عقیدے کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے کوئی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا، اس پر انھوں نے مذاق سمجھا کہ بھلا گائے بھی ذبح کی جا سکتی ہے۔ کہنے لگے، کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتوں کی پرستش پر صاف کہا کہ یقیناً تم اور تمھارے آباء و اجداد کھلی گمراہی میں تھے، تو اس پر انھیں اعتبار نہ آیا کہ کوئی شخص بت پرستی کو بھی گمراہی کہہ سکتا ہے، کہنے لگے: ﴿ اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۵۵ ] ''کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے، یا تو کھیلنے والوں سے ہے۔'' الغرض! موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ''میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ جاہلوں سے ہو جاؤں۔'' معلوم ہوا مذاق اور ٹھٹھا جاہلوں کا کام ہے، البتہ مزاح اور خوش طبعی الگ چیز ہے، اس میں کوئی بات حقیقت کے خلاف نہیں ہوتی، نہ اس میں کسی کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہے، بلکہ جس سے خوش طبعی کی جائے وہ خود بھی خوشی محسوس کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مزاح فرما لیتے تھے۔

② بَقَرَةً : اس کی تنوین سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو کافی تھا، مگر وہ تو گائے ذبح کرنے پر آمادہ ہی نہ تھے، ادھر موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے پے در پے سوال کیے، جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کسی طرح جان چھوٹ جائے، مگر وہ جتنے سوال کرتے گئے پھنستے گئے، آخر اس شوخ زرد رنگ کی گائے پر بات آ پہنچی جو عبادت کے لیے مثالی سمجھی جاتی تھی۔ آج کل بعض مسلمان گائے کی تو نہیں، البتہ مخصوص قسم کے گھوڑے کی حد سے بڑھ کر تعظیم کرتے ہیں۔

③ عکرمہ نے فرمایا کہ وہ ''ان شاء اللہ'' نہ کہتے تو کبھی وہ گائے نہ پاتے۔ (طبری بسند حسن) معلوم ہوا کہ انھیں گاؤ پرستی کی نجاست سے نجات بھی اللہ تعالیٰ کے پاک نام کی برکت سے حاصل ہوئی۔

④ '' بَقَرَةً '' میں تاء وحدت کی ہے، ''بَقَرٌ'' جنس ہے، جیسے ''تَمْرٌ'' اور ''نَمْلٌ'' جنس ہے اور '' تَمْرَةٌ '' اور '' نَمْلَةٌ '' سے مراد ایک کھجور اور ایک چیونٹی ہے، اس کا تذکیر و تانیث سے تعلق نہیں، وہ گائے بھی ہو سکتی ہے اور بیل بھی، جیسا کہ ہل چلانا اور پانی کھینچنا بیل کی صفات ہیں۔ عین ممکن ہے کہ انھیں بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصر میں کھیتی باڑی کا کام بیل کے ساتھ ساتھ گائے سے بھی لیا جاتا ہو۔

⑤ اس واقعہ سے بے جا سوالات کی قباحت بھی ظاہر ہے، عمل پر آمادہ انسان زیادہ سوالات کرتا ہی نہیں، فرمایا: ﴿ لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ﴾ [ المائدة : ۱۰۱ ] ''ان چیزوں کے بارے میں سوال مت کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔''

آیت 73،72 ① '' فَادّٰرَءْتُمْ '' اصل میں '' فَتَدَارَأْتُمْ '' تھا، باب تفاعل کی تاء کو دال میں بدل کر دال میں ادغام کر دیا،

بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

چھپا رہے تھے ﴿۷۲﴾ تو ہم نے کہا اس پر اس کا کوئی ٹکڑا مارو، اس طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۷۳﴾

ادغام کرنے سے شروع والا حرف مدغم ساکن ہوا تو ساکن کو پڑھنے کے لیے شروع میں ہمزہ لائے، پھر شروع میں فاء آنے سے ہمزہ تلفظ سے ساقط ہو گیا، لکھنے میں موجود ہے۔ بنی اسرائیل کے کسی شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا اور جو لوگ قاتل کو جانتے تھے انھوں نے اس پر پردہ ڈال دیا۔ اب وہ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے اور جھگڑا شروع ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے ذبح شدہ گائے کا کوئی حصہ مقتول پر مارنے کا حکم دیا، جس سے اس نے زندہ ہو کر قاتل کی نشان دہی کر دی۔ اتنی بات ان آیات سے صاف ظاہر ہے۔ تفاسیر میں اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مال دار شخص کو اس کے بھتیجے نے قتل کر دیا، تاکہ اس کا وارث بن جائے، پھر رات کو لاش اٹھا کر دوسرے شخص کے دروازے پر ڈال دی اور صبح کے وقت ان پر قتل کا دعویٰ کر دیا۔ اس پر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے، لڑائی ہونے ہی والی تھی کہ بعض لوگوں نے کہا، اللہ کے رسول موسیٰ علیہ السلام سے پوچھ لو۔ بالآخر موسیٰ علیہ السلام نے انھیں یہ حکم دیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی تفصیلات اسرائیلیات سے لی گئی ہیں، ان پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

❷ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ قصہ بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے قتل سے شروع ہوتا ہے، اس لیے اس کا مقام پہلے تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم پہلے ذکر فرمایا، تاکہ بنی اسرائیل کی نافرمانی کے متعدد مناظر سامنے آ سکیں، مثلاً گائے ذبح کرنے سے پہلوتہی، بار بار سوال کرنا، ناحق قتل کرنا، پھر اسے چھپانے کی کوشش کرنا۔ اگر آیات کی ابتدا قتل نفس سے ہوتی تو یہ ایک ہی واقعہ معلوم ہوتا اور بنی اسرائیل کی نافرمانی کے متعدد پہلو نمایاں نہ ہوتے۔ (زمخشری) مگر ابوحیان نے فرمایا، ظاہر بات یہ ہے کہ واقعات کی ترتیب بھی اس طرح ہے جس طرح آیات کی ترتیب ہے، چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا، انھیں اس کا راز معلوم نہ تھا، پھر ان میں قتل کا واقعہ ہو گیا، تو ان کے لیے گائے ذبح کرنے کی (ایک اور) حکمت بھی ظاہر کر دی گئی۔ ہمیں کوئی مجبوری نہیں کہ ہم بعد والے واقعہ کو پہلے اور پہلے کو بعد والا قرار دیں۔ رہی تاریخ میں مذکور کہانیاں تو ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ [ البحر المحیط ] ابوحیان کی بات واقعتاً وزن رکھتی ہے۔ اس سے گائے ذبح کرنے کے حکم کی اہمیت و حکمت زیادہ واضح ہوتی ہے، جو گاؤ پرستی کی جڑ پر کلہاڑا مارنا ہے۔

❸ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى : اس سے صاف ظاہر ہے کہ گائے کا ٹکڑا مارنے سے وہ مقتول زندہ ہو گیا۔ فرمایا: ''اس طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے'' یعنی یہ واقعہ قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے کی بھی ایک دلیل اور نشانی ہے، کیونکہ جو ایک مردے کو زندہ کر سکتا ہے وہ تمام مردوں کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہے، فرمایا: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [ لقمان : ۲۸ ] ''نہیں ہے تمھارا پیدا کرنا اور نہ تمھارا اٹھانا مگر ایک جان کی طرح۔''

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ

پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں اور بے شک پتھروں میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بے شک ان میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں، پس ان سے پانی نکلتا ہے اور بے شک ان میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ مقامات پر دنیا میں مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے: ① ﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ [ البقرة : ٥٦ ] ② اس مقتول کا قصہ جو یہاں ذکر ہوا ہے۔ ③ ان لوگوں کا قصہ جو موت سے ڈر کر ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ [ البقرة : ٢٤٣ ] ④ اس شخص کا قصہ جو ایک برباد شہر سے گزرا۔ [ البقرة : ٢٥٩ ] ⑤ ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کا قصہ۔ [ البقرة : ٢٦٠ ] اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے ذریعے سے زمین کو زندہ کرنے سے جسموں کو دوبارہ زندہ کرنے پر استدلال کیا ہے۔ [ يٰس : ٣٣ ]

آیت 74 ① قَسَتْ : " قَسَا يَقْسُوْ (ن) " ناقص واوی سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے، جب ایک شے میں دوسری شے سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہو اور پھر کسی عارضے کے سبب وہ صلاحیت باقی نہ رہے تو عربی زبان میں اس پر "اَلْقَاسِیْ" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہی حال انسان کے دل کا ہے کہ اس میں دلائل و آیات سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، مگر جب مختلف اسباب کی بنا پر وہ صلاحیت باقی نہیں رہتی تو اثر قبول نہ کرنے میں اسے پتھر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی سرزنش فرمائی کہ عجیب کم بخت قوم ہو کہ مردے کا جی اٹھنا تک تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، مگر پھر بھی تم اپنے کفر اور سرکشی پر ڈٹے رہے اور تمھارے دل نرم ہونے کے بجائے اور سخت ہو گئے، جیسے پتھر، بلکہ اس سے بھی سخت۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہل کتاب کا سا رویہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ [ الحديد : ١٦ ] "اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔" (ابن کثیر)

② اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً : یہاں " اَوْ " شک کے لیے نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کیا شک ہو سکتا ہے، بلکہ " بَلْ " کے معنی میں ہے، یعنی وہ پتھر کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ " قَسْوَةٌ " سے اسم تفضیل " اَقْسٰی " آتا ہے، مگر مزید سختی کے اظہار کے لیے " اَشَدُّ قَسْوَةً " فرمایا، ترجمہ میں اس کا خیال رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے نافرمان لوگوں کے دلوں کی سختی کو پتھروں کی سختی سے تشبیہ دینے کے بعد پتھروں کا شکوہ دور فرمایا کہ پروردگارا! ہم سخت ہی سہی، مگر اتنے بھی سخت نہیں کہ ان ظالموں کو ہم سے تشبیہ دی جائے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی نرمی کے بیان کے لیے ان کی تین قسمیں بیان فرمائیں۔

خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۴﴾

اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کر رہے ہو ﴿۷۴﴾

③ ''اللہ کے ڈر سے'' اس کا تعلق پتھروں کی تینوں قسموں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ پتھروں سے نہروں کا پھوٹ نکلنا، ان کا پھٹ جانا اور ان سے پانی کا نکلنا اور ان کا گر پڑنا اللہ کے خوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ پتھر تو بے جان چیز ہیں، وہ کیسے ڈرتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل والی مخلوقات کے علاوہ ان میں بھی ایک شعور اور فہم رکھا ہے، جس کی حقیقت وہی جانتا ہے، اگر فلسفے کا مارا ہوا کوئی شخص انکار کرے تو کرے، اہل السنہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنۡ مِّنۡ شَيۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ ﴾ [ بنی إسرائیل : ٤٤ ] ''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔'' اور فرمایا: ﴿ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّيۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴾ [ النور : ٤١ ] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے اور اللہ اسے خوب جاننے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ وَالنُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيۡرٌ حَقَّ عَلَيۡهِ الۡعَذَابُ ؕ وَمَنۡ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّكۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ [ الحج : ١٨ ] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ۔ اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا اور جسے اللہ ذلیل کر دے پھر اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ﴾ [ الأحزاب : ٧٢ ] ''بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔'' اور فرمایا: ﴿ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ﴾ [ الحشر : ٢١ ] ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا دیکھتا۔'' ﴿ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَيۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴾ [ النحل : ٤٨ ] ''اور کیا انھوں نے اس کو نہیں دیکھا جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، جو بھی چیز ہو کہ اس کے سائے دائیں طرف سے اور بائیں طرفوں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں، اس حال میں کہ وہ عاجز ہیں۔'' ﴿ وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَيۡءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ٢١ ] ''اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا اور اسی نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔'' اسی طرح صحیح

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

کیا تم طمع رکھتے ہو کہ وہ تمھارے لیے ایمان لے آئیں گے، حالانکہ یقیناً ان میں سے کچھ لوگ ہمیشہ ایسے چلے آئے ہیں جو اللہ کا کلام سنتے ہیں، پھر اسے بدل ڈالتے ہیں، اس کے بعد کہ اسے سمجھ چکے ہوتے ہیں اور وہ جانتے ہیں ﴿۷۵﴾ اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب ان میں سے بعض بعض کی طرف اکیلا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کیا تم انھیں وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ وہ ان کے ساتھ تمھارے رب کے پاس تم سے جھگڑا کریں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۷۶﴾

احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''احد ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔'' [ بخاری، : ۷۳۳۳ ] اور آپ نے فرمایا: ''میں مکہ میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں، جو مجھے بعثت سے قبل سلام کہا کرتا تھا۔'' [ أحمد : ۸۹/۵، ح : ۲۰۸۶۹۔ مسلم : ۲۲۷۷ ] اسی طرح کھجور کے تنے کا باآواز بلند رونے کا واقعہ ہے۔ [ صحیح ابن حبان : ۶۵۰۷ ] اتنے واضح دلائل کے بعد انکار صاف گمراہی ہے، ہم پر قرآن کے الفاظ حجت ہیں اور ان کے ظاہر معنی کی پیروی فرض ہے۔

④ ''بِغَافِلٍ'' میں باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''ہرگز'' کے ساتھ کیا گیا ہے۔

**آیت 75** یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ یہود سے ایمان کی توقع بے سود ہے، ان کے پہلے بزرگ یہ ہیں کہ وہ دیدہ و دانستہ اللہ کے کلام یعنی تورات میں تحریف کر ڈالتے تھے۔ اس جگہ لفظ تحریف لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریف کو شامل ہے۔ انھوں نے تورات کے الفاظ بھی بدل ڈالے تھے، مگر زیادہ تر غلط تاویلوں سے معانی تبدیل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ موجودہ یہود نے تورات کی ان آیات کو بدل ڈالا جن میں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کا ذکر تھا اور اپنے دل سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا لیا۔ (ابن کثیر، قرطبی) آج کل کے باطل پرست علماء بھی اپنے خود ساختہ مسائل کو درست ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے حوالہ جات قرآن و حدیث سے تراش رہے ہیں اور شریعت میں تحریف کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

**آیت 76** یہود کی اخلاقی پستی اور اللہ تعالیٰ سے بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے بعض لوگ جب مسلمانوں سے ملتے تو اپنے ایمان کا دعویٰ کرتے اور از راہ نفاق و خوشامد ان سے ان علامتوں اور پیشین گوئیوں کا تذکرہ بھی کرتے جو تورات اور ان کی دوسری کتابوں میں نبی آخر الزماں کے متعلق موجود تھیں، لیکن جب وہ آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو ملامت کرتے کہ تم ان مسلمانوں کو وہ باتیں کیوں بتاتے ہو جو اللہ نے صرف تمھی کو بتائی ہیں؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ یہ مسلمان آخرت میں اللہ کے پاس تمھاری اپنی دی ہوئی معلومات کی بنا پر تم پر حجت قائم کریں گے اور جھگڑیں گے کہ تم نبی آخر الزماں کو جاننے

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

اور کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں؟ ۝ اور ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں، جو کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے چند آرزوؤں کے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ گمان کرتے ہیں ۝ پس ان لوگوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت حاصل کریں، پس ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو وہ کماتے ہیں ۝

اور پہچان لینے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لائے۔

**آیت 78،77** بنی اسرائیل کے عناد اور سرکشی کو بیان کرنے کے بعد اب ان کے مختلف طبقوں کا بیان ہو رہا ہے، اس آیت میں عوام کی حالت بیان کی گئی ہے۔ (رازی) اُمّی وہ ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو اور ”اَمَانِيَّ“ ”اُمْنِيَّةٌ“ کی جمع ہے، جس کے معنی آرزوؤں یا من گھڑت روایات کے ہیں، یعنی یہود میں ایک طبقہ جو عوام کا ہے اور ان پڑھ ہے، انھیں ”الْكِتٰبَ“ یعنی تورات کا تو کچھ علم نہیں، مگر وہ اپنے سینوں میں بعض بے بنیاد قسم کی آرزوئیں پالے ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ ان کے بزرگوں کی وجہ سے اللہ انھیں ضرور بخش دے گا، یا یہ کہ جنت میں یہود کے سوا کوئی نہیں جائے گا وغیرہ، مختلف قسم کی خرافات کا عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی غلط آرزوئیں ہیں یا من گھڑت قصے ہیں جو انھوں نے سن رکھے ہیں۔ (ترجمان)

”اُمْنِيَّةٌ“ کا ایک معنی تلاوت بھی آتا ہے، جیسا کہ: ﴿ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ [ الحج : ٥٢ ] کا ایک ترجمہ تلاوت بھی کیا گیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ خالی تلاوت کر سکتے ہیں مگر انھیں اس کے مطلب کی کچھ خبر نہیں، جیسا کہ آج کل اکثر مسلمان، خواہ حافظِ قرآن ہوں، محض تلاوت کر سکتے ہیں، مگر مفہوم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ایسا پڑھنا نہ پڑھنے ہی کے برابر ہے، اس لیے ان کے اُمّی ہونے کے خلاف نہیں۔

**آیت 79** ❶ یہ تعلیم یافتہ طبقے کی حالت ہے کہ وہ خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے غلط فتوے دیتے رہتے ہیں۔ وہ محض دنیا کمانے کے لیے عوام کو ان کی خواہشات کے مطابق باتیں جوڑ کر لکھ دیتے ہیں اور انھیں بڑی جراُت اور ڈھٹائی سے اللہ اور رسول کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ اللہ اور اس کے رسول کا فرمان

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

اور انھوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنے ہوئے چند دن۔ کہہ دے کیا تم نے اللہ کے پاس کوئی عہد لے رکھا ہے تو اللہ کبھی اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ۝۸۰

بتانے کے بجائے اپنا یا اپنے کسی بزرگ کا قول پیش کر کے باور یہ کرواتے ہیں کہ یہ عین شریعت ہے۔ افسوس اکثر مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو گیا ہے کہ انھوں نے امتیوں کے اقوال کو شریعت قرار دے دیا اور قرآن و حدیث پر چلنے والوں کو لا مذہب قرار دے دیا۔

2 ”وَيْلٌ“ کا معنی ہلاکت اور تباہی ہے، اس پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی ہلاکت“ کیا گیا ہے۔ سنن ترمذی کی جس مرفوع روایت میں ہے: ”ویل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے، کافر ستر سال تک اس کی گہرائی میں گرتا جائے گا مگر اس کی گہرائی تک نہ پہنچے گا“ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف ترمذی (۳۱۶۴) میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

3 اس آیت پر ان حضرات کو خاص طور پر غور کرنا چاہیے جو قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے صحیح احادیث کو چھوڑ کر تورات، انجیل اور تلمود کے ساتھ شوق فرماتے ہیں، جن میں تحریف کی اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور جن میں انبیاء پر تہمتیں، بے سروپا باتیں اور آیات کا باہمی تضاد لفظی تحریف کا واضح ثبوت ہیں۔ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”تم اہل کتاب سے کسی بھی خبر کے متعلق کیوں پوچھتے ہو، جب کہ تمھاری کتاب جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، سب سے نئی ہے؟ تم اسے خالص اور ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک پڑھتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں بتایا ہے کہ اہل کتاب نے اپنی کتاب کو بدل دیا اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے دنیا کا تھوڑا سا مال کما لیں۔ کیا تمھارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمھیں ان سے دریافت کرنے سے روکتا نہیں؟ قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ وہ تم سے اس چیز کے بارے میں دریافت کرتا ہو جو تم پر نازل کی گئی۔“ [ بخاری، الاعتصام بالکتاب والسنة، باب قول النبی ﷺ :لا تسألوا...... : ۷۳۶۳ ]

4 بعض لوگوں نے قرآن مجید کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے، مگر اس آیت کا یہ مطلب نہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیوی مفاد کے لیے اپنے پاس سے غلط باتیں لکھ کر اسے اللہ کا کلام باور کرواتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۱)۔

**آیت 80** اس آیت میں یہود کی ہمہ گیر گمراہی کا بیان ہے، جس میں عوام اور علماء سبھی مبتلا تھے، یعنی ہم اللہ کے محبوب اور پیارے ہیں، ہم چاہے کتنے بھی گناہ کریں جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دن وہاں رکھ کر نکال لیے جائیں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے کئی سوال کیے، ان میں سے ایک یہ تھا: (( مَنْ أَهْلُ النَّارِ؟ )) ”آگ میں جانے والے کون لوگ ہیں؟“ انھوں نے کہا: ”ہم اس میں تھوڑی دیر رہیں گے، پھر اس میں تم ہماری جگہ لے لو گے۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَاللّٰهِ لَا نَخْلُفُكُمْ فِيْهَا أَبَدًا )) ”تم ہی اس میں دفع دور رہو، اللہ کی قسم! ہم اس میں کبھی تمھاری جگہ نہیں لیں گے۔“ [ بخاری، الجزية والموادعة، باب إذا غدر المشركون...... : ۳۱۶۹ ]

﴿ بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ ﴿۸۱﴾

کیوں نہیں! جس نے بڑی برائی کمائی اور اسے اس کے گناہ نے گھیر لیا تو وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۸۱﴾

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو یہودی کہا کرتے تھے کہ دنیا کی مدت صرف سات ہزار سال ہے اور لوگوں کو دنیا کے ایک ہزار سال کے بدلے میں آخرت کے صرف ایک دن کا عذاب ہوگا، تو یہ صرف سات دن ہیں، پھر عذاب ختم ہو جائے گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ [ ابن أبی حاتم بسند حسن : ۱/ ۲۱۰ ] کچھ یہ کہتے تھے کہ جتنے دن ہم نے بچھڑے کی عبادت کی بس اتنے دن جہنم میں رہیں گے۔ [ مصنف عبد الرزاق عن قتادة ]

آیت 81 ﴿ سَیِّئَةً ﴾ : تنوین تنکیر کے لیے نہیں بلکہ تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی برائی'' کیا گیا ہے، مراد اس سے کفر وشرک ہے۔ اس سے ملتا جلتا وہ واقعہ ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ [ الأنعام : ۸۲ ] تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے '' بِظُلْمٍ '' کی تنوین کو تنکیر کے لیے سمجھ کر کہا: ''ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے ایمان میں کسی ظلم کی آمیزش نہیں کی؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آیت میں ظلم سے یہ مراد نہیں ہے، کیا تم نے لقمان کی وہ نصیحت نہیں سنی جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ [ لقمان : ۱۳ ] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب ﴿ لا تشرك بالله ...... ﴾ : ٤٧٧٦ ] تفصیل سورۂ انعام (۸۲) میں دیکھیں۔ اسی طرح یہاں بھی ''سَیِّئَةً'' سے مراد کفر وشرک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس سے مراد ایسا کفر لیا ہے جو ہر نیکی کو ختم کر دے۔

[ ابن أبی حاتم بسند حسن : ۱/ ۲۱٤، ح : ۸۱۲ ]

ان آیات میں یہود کے اس نظریے کی تردید ہے کہ ہم ہر حال میں آخر کار جنت میں جائیں گے، خواہ نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لائیں۔ چنانچہ بتایا گیا کہ جس نے بڑی برائی کا ارتکاب کیا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور اسے اس کے گناہوں نے گھیر لیا کہ اس کی کوئی نیکی باقی نہ رہی تو یہ ابدی جہنمی ہے۔ مراد اس سے یہود اور دوسرے کفار ہیں، کیوں کہ کفر ہی ایسا گناہ ہے جو تمام نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے۔ آیت: ﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [ الفرقان : ۲۳ ] ''اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔'' اس آیت سے گناہ گار مومن مراد نہیں۔ اہل السنہ والجماعہ کا اتفاق ہے کہ آگ میں ہمیشہ کفار ومشرکین ہی رہیں گے، کیونکہ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ گناہ گار کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، وہ چاہے گا تو اپنے فضل وکرم سے ان کے گناہ معاف فرما دے گا اور چاہے گا تو شفاعت سے یا اپنی خاص رحمت سے جہنم سے نکال دے گا۔ اس لیے اس آیت میں ''سَیِّئَةً'' اور ''خَطِیْٓـَٔتُهٗ'' سے مراد کفر وشرک ہی ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جولوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں﴿۸۲﴾ اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور ماں باپ اور قرابت والے اور یتیموں اور مسکینوں سے احسان کرو گے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو، پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم منہ پھیرنے والے تھے﴿۸۳﴾

نے فرمایا: ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً ......﴾ (یہود کو خطاب ہے) کہ جس نے تمھارے اعمال جیسے عمل کیے اور تمھاری طرح کفر کیا، حتیٰ کہ اس کے کفر نے اس کی تمام نیکیوں کو گھیر لیا۔" [ ابن أبي حاتم بسند حسن : ۲۱۳/۱، ح : ۸۲۱ ]

آیت 82 ﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... : کفر پر وعید کے بعد ایمان اور عمل صالح پر بشارت ہے اور یہ قرآن کا عام اسلوب ہے کہ بشارت و نذارت دونوں اکٹھی ذکر ہوتی ہیں۔

آیت 83 ﴾ ❶ گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو وہ تاریخی احسانات یاد دلائے گئے ہیں جو ان کے بزرگوں پر کیے گئے اور انھوں نے شکر گزاری کے بجائے کفر کیا، جس کے نتیجہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی بار عتاب نازل ہوا۔ اب یہاں ان کو وہ عہد یاد دلایا جا رہا ہے جو بنیادی احکام (عبادات و معاملات) دیتے وقت ان سے لیا گیا تھا اور بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس عہد کی پابندی نہ کی اور اس سے سراسر بے پروائی اختیار کی۔ اسی قسم کا حکم سورۂ نساء (۳۶) میں امتِ مسلمہ کو بھی دیا گیا ہے۔ (ابن کثیر)

❷ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ : عبادت کی چار قسمیں ہیں : ① بدنی عبادت، جیسے طواف، رکوع، سجدہ وغیرہ۔ ② مالی عبادت، جیسے صدقہ و خیرات کرنا اور نذر و نیاز ماننا۔ ③ لسانی عبادت (یعنی زبان سے) جیسے کسی کے نام کا وظیفہ جپنا، یا اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کسی کا نام لینا۔ ④ قلبی عبادت (یعنی دل سے) جیسے کسی پر بھروسا رکھنا، کسی سے خوف کھانا یا امید رکھنا۔ یہ سب عبادتیں اللہ کے لیے ہیں، ان میں جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک بنایا وہ شرک کا مرتکب ہو گیا۔

❸ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ...... : ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آنے کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے علاوہ متعدد دوسری آیات میں عبادتِ الٰہی کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حقوق العباد میں سب سے افضل عمل یہی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "سب سے افضل عمل کون سا ہے؟" فرمایا: «اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا» "نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا۔" پوچھا: "پھر کون سا؟" فرمایا: «بِرُّ الْوَالِدَيْنِ» "ماں باپ کے

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ

اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ تم اپنے خون نہیں بہاؤ گے اور نہ اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم خود شہادت دیتے ہو ﴿۸۴﴾ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے آپ کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد گناہ اور زیادتی کے ساتھ کرتے ہو، اور اگر وہ قیدی ہو کر تمھارے پاس آئیں تو ان کا فدیہ دیتے ہو، حالانکہ اصل یہ ہے کہ ان کا نکالنا تم پر حرام ہے،

---

ساتھ نیک سلوک کرنا۔'' پوچھا: ''پھر کون سا؟'' فرمایا: ''جہاد فی سبیل اللہ۔'' [ بخاری، مواقیت الصلاۃ، باب فضل الصلوۃ لوقتھا : ۵۲۷ ] اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اسے جنم دیا، پھر اس کی پرورش کی۔ ﴿ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ۲۴ ] ''اے میرے رب! دونوں پر رحم کر جیسے انھوں نے چھوٹا ہونے کی حالت میں مجھے پالا۔''

④ وَ الْيَتٰمٰى: یتیم وہ ہے جس کا والد بچپن میں فوت ہو جائے۔ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں۔'' [ أبو داوٗد، الوصایا، باب ما جاء متی ینقطع الیتم : ۲۸۷۳ و صححہ الألبانی ]

⑤ وَ الْمَسٰكِيْنِ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ آیت (۶۰) کا حاشیہ۔

⑥ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا: ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''قولِ حسن یہ ہے کہ نیکی کا حکم دے، برائی سے منع کرے، بردباری اور عفو و درگزر سے کام لے اور جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لوگوں سے اچھی بات کرے اور ہر وہ اچھی عادت ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔'' ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، اگر تم کچھ اور نہ کر سکو تو کم از کم اپنے بھائی سے کھلے چہرے کے ساتھ مل لو۔'' [ مسلم، البر والصلۃ، باب استحباب طلاقۃ ...... : ۲۶۲۶ ]

بنی اسرائیل کو قول حسن (اچھی بات) کا حکم تھا، ہماری امت کو اس سے بڑھ کر ''احسن'' (سب سے اچھی بات) کا حکم ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ قُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [ بنی إسرائیل : ۵۳ ] ''اور میرے بندوں سے کہہ دے وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو۔''

⑦ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ: اس سے مراد وہ نماز اور زکوٰۃ ہے جو بنی اسرائیل ادا کرتے تھے۔

⑧ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ: اس سے مراد بنی اسرائیل کے وہ تھوڑے سے لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے اس عہد پر قائم رہے، یا آپ کے تشریف لانے کے بعد آپ پر ایمان لے آئے۔ باقی سب نے اس عہد و پیمان کو پسِ پشت پھینک دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حد درجے کا انصاف ہے کہ ان کی عہد شکنی کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی سب کو مجرم قرار نہیں دیا، بلکہ عہد پر قائم رہنے والوں کو، خواہ وہ تھوڑے تھے، عہد توڑنے والوں سے الگ ذکر فرمایا۔

**آیت 85،84** ① ''ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے'' کے بجائے فرمایا کہ

اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۸۶﴾ ع

پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تو اس شخص کی جزا جو تم میں سے یہ کرے اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ ہرگز اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو﴿۸۵﴾ یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے خریدی، سو نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی﴿۸۶﴾

''تم اپنے خون نہیں بہاؤ گے اور نہ اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نکالو گے'' کیونکہ امتِ مسلمہ کے افراد ایک جسم کی طرح ہیں، کسی بھی مسلم کا خون بہانا اپنا خون بہانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى » ''تمام مومن اپنی باہمی دوستی، ایک دوسرے پر رحم اور ایک دوسرے پر شفقت میں ایک جسم کی مانند ہیں، جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی خاطر سارا جسم بیدار رہتا ہے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' [ مسلم، البر والصلة، باب تراحم المؤمنین ...... : ۲۵۸۶، عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما۔ بخاری : ۶۰۱۱ ] '' وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ '' میں ''هُوَ'' ضمیر شان ہے جس کا ترجمہ ''اصل یہ ہے'' کیا گیا ہے۔

2 دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سے چار عہد لیے گئے تھے: ① ایک دوسرے کا خون نہ بہانا۔ ② ایک دوسرے کو گھروں سے نہ نکالنا۔ ③ ایک دوسرے کے خلاف مدد نہ کرنا۔ ④ قیدی کو فدیہ دے کر چھڑا لینا، مگر وہ صرف فدیہ پر عمل کرتے اور باقی تین کی مخالفت کرتے اور بلا جھجک ان کا ارتکاب کرتے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں یہود کے تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، یہ اہل کتاب تھے۔ مدینہ کے عرب قبائل اوس اور خزرج بت پرست مشرک تھے، انھیں کسی آسمانی دین سے سروکار نہ تھا، یہود کے ان قبائل سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے حلیف تھے۔ اوس اور خزرج کی آپس میں جنگ رہا کرتی تھی اور یہودی قبائل اس میں اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور مقابلے میں آنے والے مشرک قبیلے کے آدمیوں کے علاوہ ان کا ساتھ دینے والے اپنے یہودی بھائیوں کو بھی قتل کرتے، ان کے گھر بھی لوٹ لیتے، پھر جب لڑائی ختم ہوتی اور کچھ یہودی قید ہو کر غالب قبیلے کے پاس آتے تو غالب قبیلے کے حلیف یہودی خود ہی ان کا فدیہ دے کر انھیں چھڑوا دیتے اور کہتے کہ ہمیں اللہ کی کتاب کا حکم ہے کہ اپنے قیدی بھائیوں کو چھڑواؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں فدیہ دے کر چھڑوانے کا حکم تو یاد رہا، مگر اپنے بھائیوں کے خلاف دوسرے کی مدد نہ کرنے، ان کا خون نہ بہانے اور انھیں گھروں سے نہ نکالنے کا حکم یاد نہ رہا، جس پر تم عمل کرتے تو فدیے کی نوبت ہی نہ

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ١ٞ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ١ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ١ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ١ٞ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۸۷

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو واضح نشانیاں دیں اور اسے پاک روح کے ساتھ قوت بخشی۔ پھر کیا جب کبھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا جسے تمھارے دل نہ چاہتے تھے، تم نے تکبر کیا تو ایک گروہ کو جھٹلا دیا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۸۷

آتی۔ گویا تم اللہ کی کتاب کے جس حکم کو اپنی مرضی کے مطابق پاتے ہو مان لیتے ہو اور جو اپنی مرضی کے مطابق نہ ہو اس کی پروا نہیں کرتے، اگر تم واقعی اللہ کی کتاب پر چلتے ہو تو چاروں حکم مانو۔

③ اِلَّا خِزْيٌ: یہودیوں کو دنیا کی زندگی میں جلد ہی رسوائی دیکھنا پڑی کہ بنونضیر اور بنوقینقاع جلا وطن ہوئے اور بنوقریظہ کے بالغ مرد قتل ہوئے، بچے اور عورتیں لونڈی و غلام بنے، پھر آخرت کے عذاب کا تو دنیاوی عذاب سے کچھ موازنہ ہی نہیں۔

④ افسوس! اس وقت اکثر مسلمانوں کا حال بعینہٖ وہی ہو گیا ہے جو اہلِ کتاب کا تھا کہ انھوں نے اسلام کے اپنی مرضی کے چند احکام پر عمل کیا اور باقی کو بھلا دیا، مثلاً مسلمان خنزیر کا گوشت کھانا تو درکنار اس کا نام لینے سے بھی اجتناب کرتے ہیں، جب کہ سود اور جوئے (انشورنس وغیرہ) سے انھیں کچھ پرہیز نہیں، بلکہ ان کے کاروبار کی بنیاد ہی ان کاموں پر ہے۔ وہ قبلے کی طرف منہ کر کے پیشاب نہیں کرتے، مگر انھیں نماز سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ جھٹکے والی مرغی (جسے شرعی طریقے سے حلال نہ کیا گیا ہو) کھانے سے یورپ اور امریکہ میں جا کر بھی اجتناب کرتے ہیں، مگر شراب اور حرام شباب سے انھیں پرہیز نہیں۔ وہ اپنے آپ کو امت مسلمہ کا فرد کہتے ہیں، پھر کفار کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائیوں کو قتل اور ان کے گھروں اور شہروں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ دنیا میں ذلت کی صورت میں تو صاف ظاہر ہے، رہا آخرت کا معاملہ تو کتاب کے بعض پر ایمان (یعنی اس پر عمل) اور بعض کے ساتھ کفر (یعنی اس کی مخالفت کرنا) اہلِ کتاب کو "اَشَدِّ الْعَذَابِ" سے نہیں بچا سکا تو موجودہ مسلمانوں کو اس سے کیسے بچائے گا؟

آیت 87 ① یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے جن انبیاء و رسل کا نام قرآن مجید میں آیا ہے وہ ہارون، ذوالکفل، الیاس، الیسع، داؤد، سلیمان، عزیر، یونس، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ حدیث میں یوشع بن نون علیہ السلام کا ذکر بھی آیا ہے، لقمان علیہ السلام کے نبی ہونے میں اختلاف ہے۔ بہت سے رسولوں کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا گیا، دیکھیے سورۂ مومن (۷۸)۔

② الْبَيِّنٰتِ: اس سے مراد معجزے ہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے، جیسے مردوں کو زندہ کرنا، مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارنے سے پرندہ بن جانا، اندھے اور برص کے مریض کو تندرست کرنا وغیرہ، جن کا ذکر سورۂ آل عمران (۴۹) اور مائدہ (۱۱۰) میں آیا ہے۔

③ بِرُوْحِ الْقُدُسِ: اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ زمخشری رحمہ اللہ نے فرمایا: " بِالرُّوْحِ الْمُقَدَّسَةِ كَمَا تَقُوْلُ حَاتِمُ الْجُوْدِ

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور انھوں نے کہا ہمارے دل غلاف میں (محفوظ) ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی، پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾

وَ رَجُلُ صِدْقٍ " گویا "روح" موصوف ہے جو اپنی صفت کی طرف مضاف ہے اور "قدس" مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے، یعنی پاک روح، جیسا کہ " حَاتِمٌ " کو اس کی صفت " اَلْجُوْدُ " کی طرف مضاف کیا گیا، جبکہ "اَلْجُوْدُ" مصدر بمعنی " اَلْجَوَادُ " ہے، یعنی سخی اور "رَجُلٌ" کو اس کی صفت " صِدْقٌ " کی طرف مضاف کیا گیا، جو "صَادِقٌ" کے معنی میں ہے، یعنی سچا آدمی۔ (الکشاف) بعض اہل علم نے فرمایا: "اَلْقُدُسِ" اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ وہ سراسر پاک ہے، روح اس کی طرف مضاف ہے، گویا روح القدس کا معنی ہوا روح اللہ، اگرچہ تمام روحوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر جبریل علیہ السلام کی خصوصی عزت افزائی کے لیے انھیں "روح اللہ" کہا گیا، جیسا کہ "بیت اللہ" اور "ناقۃ اللہ" کہا جاتا ہے کہ اگرچہ سب گھروں کا مالک اللہ ہی ہے اور سب اونٹنیاں اللہ ہی کی ہیں، مگر کعبہ کو اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ان الفاظ کے ساتھ خاص شرف عطا ہوا۔

اس بات کی دلیل کہ روح القدس سے مراد جبریل علیہ السلام ہی ہیں، یہ ہے کہ سورۂ شعراء (۱۹۳) میں جبریل علیہ السلام کو "الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ" فرمایا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: « اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ » "اے اللہ! اسے روح القدس کے ساتھ قوت بخش۔" [ بخاری، الصلوۃ، باب الشعر فی المسجد : ٤٥٣ ]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ سے جنگ والے دن حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا: « اُهْجُ الْمُشْرِكِيْنَ فَإِنَّ جِبْرِيْلَ مَعَكَ » "مشرکین کی ہجو کر کیونکہ یقیناً جبریل تیرے ساتھ ہے۔" [ بخاری، المغازی، باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الأحزاب : ٤١٢٤ ] معلوم ہوا کہ روح القدس جبریل علیہ السلام ہی ہیں۔

4 اگرچہ تمام انبیاء کو بینات عطا ہوئے اور جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے وحی ہوئی، مگر عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معجزوں اور روح القدس کی تائید کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا کہ یہود نے اتنے برگزیدہ پیغمبر کو بھی جھٹلا دیا، بلکہ انھیں اپنے خیال میں سولی پر چڑھا دیا، پھر اسے اپنا فخریہ کارنامہ قرار دیا: ﴿ وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴾ [النساء : ١٥٧] "اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے (ہم نے ان پر لعنت کی) کہ بلاشبہ ہم نے ہی مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، جو اللہ کا رسول تھا، حالانکہ نہ انھوں نے اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی پر چڑھایا اور لیکن ان کے لیے (کسی کو مسیح کا) شبیہ بنا دیا گیا اور بے شک وہ لوگ جنھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے، یقیناً اس کے متعلق بڑے شک میں ہیں، انھیں اس کے متعلق گمان کی پیروی کے سوا کچھ علم نہیں اور انھوں نے اسے یقیناً قتل نہیں کیا۔"

5 وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ آیت (٦١) کی تفسیر۔

آیت 88 1 غُلْفٌ : یہ " أَغْلَفُ " کی جمع ہے، جیسے "اَحْمَرُ" کی جمع "حُمْرٌ" ہے، یعنی جو چیز غلاف (پردے) میں

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے، حالانکہ وہ اس سے پہلے ان لوگوں پر فتح طلب کیا کرتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کے ساتھ کفر کیا، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿۸۹﴾

ہو، جیسے " رَجُلٌ اَغْلَفُ " ''وہ آدمی جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔'' اور " سَیْفٌ اَغْلَفُ " ''وہ تلوار جو غلاف میں ہو۔'' یہود کہا کرتے تھے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، ان پر تمھاری باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا، فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۵ ] ''اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔'' بعض علمائے تفسیر نے "غُلْفٌ" کے یہ معنی کیے ہیں کہ ہمارے دل علم و حکمت سے پُر ہیں، کسی دوسرے علم کی ان میں گنجائش نہیں ہے۔ اس پر قرآن نے فرمایا کہ حق سے متاثر نہ ہونا فخر کی بات نہیں ہے، یہ تو اللہ کی لعنت کی نشانی ہے۔ (ابن کثیر)

② فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ : " مَا " تاکید کے لیے ہے، اس لیے ''بہت کم'' ترجمہ کیا گیا۔ ''بہت کم ایمان لاتے ہیں'' کا ایک معنی یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ اس صورت میں یہ "یُؤْمِنُوْنَ" کی ضمیر سے حال ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں، پورا ایمان نہیں لاتے، بعض آیات اور بعض انبیاء پر ایمان لاتے ہیں اور بعض سے کفر کرتے ہیں، اس صورت میں یہ "اِیْمَانٌ" محذوف کی صفت ہے۔ "قَلِیْلًا" بعض اوقات عدم کے لیے بھی آتا ہے کہ وہ ایمان لاتے ہی نہیں۔

آیت 89 یَسْتَفْتِحُوْنَ : فتح و نصرت طلب کرتے تھے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جب یہودی عرب کے مشرکین سے مغلوب ہوتے تو وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! نبی آخر الزماں جلد ظاہر ہوں، تاکہ ہم ان کے ساتھ مل کر ان کافروں پر غلبہ حاصل کریں۔ (طبری) "یَسْتَفْتِحُوْنَ" کا دوسرا معنی ہے: " یَفْتَحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا " (فَتَحَ عَلَیْهِ کا معنی ہے خبر دینا) سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی کافروں کو خوب کھول کر بتاتے تھے۔ (زمخشری)

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ساتھ مل کر اوس اور خزرج پر فتح و غلبہ کی دعا کیا کرتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب میں سے مبعوث فرمایا تو انھوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا اور ان سب باتوں کا انکار کر دیا جو وہ آپ کے بارے میں کہا کرتے تھے، تو معاذ بن جبل، بشر بن معرور اور داؤد بن سلمہ رضی اللہ عنہم نے ان سے کہا: ''اے یہود کی جماعت! اللہ سے ڈرو اور مسلمان ہو جاؤ! تم تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مل کر ہم پر فتح و غلبہ کی دعا کیا کرتے تھے، جب ہم شرک میں گرفتار تھے اور تم ہمیں بتایا کرتے تھے کہ اللہ کے آخری نبی مبعوث ہونے والے ہیں اور آپ کی نشانیاں بیان کیا کرتے تھے۔'' تو سلام بن مشکم جو بنو نضیر میں سے تھا، اس نے کہا: ''وہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں لائے جسے ہم پہچانتے ہوں اور

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَ هُوَ الْحَقُّ

بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا کہ اس چیز کا انکار کر دیں جو اللہ نے نازل فرمائی، اس ضد سے کہ اللہ اپنا کچھ فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔ پس وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے اور کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے﴿۹۰﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو اس کے علاوہ ہے اسے وہ نہیں مانتے،

یہ وہ نہیں جو ہم تمھیں بتایا کرتے تھے۔'' اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات پر یہ آیت نازل فرمائی : ﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ [ طبری۔ ابن أبی حاتم بسند حسن : ۲۳۸/۱، ح : ۹۰۸ ]

قرطبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "يَسْتَفْتِحُوْنَ" کے یہ معنی بھی نقل کیے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے جب یہودیوں کا عرب کے مشرکین سے مقابلہ ہوتا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا کرتے اور کہتے : « اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ وَعَدْتَّنَا أَنْ تُخْرِجَهُ لَنَا فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ إِلَّا نَصَرْتَنَا عَلَيْهِمْ » ''اے اللہ! ہم تجھ سے بحق نبی امی سوال کرتے ہیں، جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ اسے ہمارے لیے آخر زمانے میں ظاہر کرے گا کہ ہمیں ان پر فتح عطا فرما۔'' چنانچہ جب وہ دشمن سے ملتے یہ دعا کرتے تو انھیں شکست دیتے۔ ( قرطبی )

یہ روایت مستدرک حاکم (۲۶۳/۲، ح : ۳۰۴۲ ) میں ہے، امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ روایت تفسیر کی مجبوری کی بنا پر لائی گئی ہے اور اس کی حدیث سے یہ غریب ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی تلخیص میں فرمایا کہ اس کی کوئی مجبوری نہیں، کیونکہ راوی عبد الملک متروک ہے، ہلاک ہونے والا ہے، اس کے علاوہ اس مفہوم کی روایات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔

**آیت 90** یعنی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لینے کے باوجود کہ یہ وہی نجات دلانے والا ہے جس کے آنے کی وہ دعائیں کرتے تھے، آپ کا انکار کیا، تو اس کی وجہ صرف ان کی یہ ضد، نسلی تعصب اور حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی ان میں کیوں نہیں بھیجا اور اپنے فضل سے ایک ان پڑھ قوم عرب کو کیوں نوازا۔ یہ نہ سوچا کہ اللہ اپنے فضل کا خود مالک ہے، وہ جسے چاہے نواز دے۔ ان کے اس حسد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غضب پر غضب لے کر پلٹے۔ پہلے جرائم، جن کا گزشتہ آیات میں ذکر ہے، ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث تھا، مثلاً بچھڑے کی عبادت، تورات میں تحریف، رسولوں کا قتل، عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب وغیرہ، اب آخر الزماں نبی کو جھٹلایا تو مزید غضب کا نشانہ بنے، چنانچہ "بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ" کا معنی پہلا اور دوسرا غضب نہیں، بلکہ بار بار اور بڑا غضب ہے، جس کی وجہ سے انھیں "الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" فرمایا گیا ہے۔

**آیت 91** اس آیت میں یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ اور اس کا رد ذکر فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱ وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۹۲ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۳

حالانکہ وہی حق ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے۔ کہہ دے پھر اس سے پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا کرتے تھے، اگر تم مومن تھے؟ ۝۹۱ اور بلاشبہ یقیناً موسیٰ تمھارے پاس واضح نشانیاں لے کر آیا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ۝۹۲ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور تمھارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا، پکڑو قوت کے ساتھ جو ہم نے تمھیں دیا ہے اور سنو۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نہیں مانا، اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں اس بچھڑے کی محبت پلا دی گئی۔ کہہ دے بری ہے وہ چیز جس کا حکم تمھیں تمھارا ایمان دیتا ہے، اگر تم مومن ہو ۝۹۳

جب انھیں قرآن پر ایمان لانے کے لیے کہا جاتا تو وہ کہتے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، یعنی ہم تورات کو مانتے ہیں اور اسی کے مکلف ہیں، اس کے سوا ہم کوئی چیز نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اول تو تمھارا قرآن کو نہ ماننا بے معنی بات ہے، کیونکہ وہ تورات کی تصدیق کرنے والا ہے اور جیسا کہ پچھلی آیت میں ذکر ہے کہ تم پہچان بھی چکے ہو کہ یہ وہی رسول ہے جس کی آمد کا تم شدت سے انتظار کر رہے تھے، پھر اگر تمھارا یہی دعویٰ ہے کہ تم صرف تورات کو مانتے ہو تو تم پہلے انبیاء کو کیوں قتل کرتے تھے؟ حالانکہ وہ سب انبیاء تمھیں تورات کی طرف دعوت دینے آئے تھے اور تورات میں تمھیں انبیاء کے قتل سے منع کیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ تمھارا جھٹلانا محض حسد، بغض اور تکبر کی وجہ سے ہے۔

**آیت 92** ① یہ ایک اور وجہ سے ان کے تورات پر ایمان کے دعوے کا رد ہے کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کیا سلوک کیا جو اپنی نبوت کی واضح نشانیاں اور ناقابل تردید دلائل لے کر تمھارے پاس آئے، جیسے عصا، ید بیضاء، طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک، خون، سمندر کا پھٹنا، من و سلویٰ، پتھر سے بارہ چشموں کا نکلنا، بادل کا سایہ وغیرہ، پھر ان نشانیوں کے آنے کے بعد تم نے بچھڑا بنا کر پوجنا شروع کر دیا، تو کیا یہ تورات پر ایمان تھا؟

② مِنْۢ بَعْدِهٖ: اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے ''طور'' پر جانے کے بعد بھی ہو سکتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے نشانیاں لانے کے بعد بھی۔

**آیت 93** ① ''سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا'' یہ دونوں لفظ انھوں نے زبان سے کہہ دیے ہوں تو کچھ تعجب نہیں، جو قوم ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ ﴾ کہہ سکتی ہے ان سے یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ رفع طور کے وقت ''سَمِعْنَا'' کہہ دیا ہو اور بعد میں صاف ''ہم نہیں مانتے'' کہہ دیا ہو۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ ان کے زبان سے اقرار کو ''سَمِعْنَا'' اور عمل نہ کرنے کو

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

کہہ دے اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں سب لوگوں کو چھوڑ کر خاص تمھارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کرو، اگر تم سچے ہو ﴿۹۴﴾ اور وہ ہرگز اس کی آرزو کبھی نہیں کریں گے، اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۹۵﴾

"عَصَيْنَا" سے بیان فرمایا ہے، گویا انھوں نے زبانِ حال سے یہ کہا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین سے کہا: ﴿ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۱۱ ] "تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے، دونوں نے کہا ہم خوشی سے آ گئے۔" اس تفسیر کی بھی گنجائش ہے، مگر جب ان کا منہ میں موجود زبان سے کہنا ممکن ہے، بلکہ صاف ظاہر ہے تو زبانِ حال کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ گزشتہ آیت: ﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ [ البقرۃ: ٦٤ ] میں بھی ان کا عہد و میثاق کے بعد اس سے پھر جانا گزر چکا ہے۔

❷ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ : جس طرح پانی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اسی طرح اس بچھڑے کی محبت ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی۔ "الْعِجْلَ" سے پہلے " حُبٌّ " کا لفظ مقدر ہے۔ "الْعِجْلَ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے "اس بچھڑے" ترجمہ کیا گیا۔ "اُشْرِبُوْا" کے لفظ سے اشارہ ہے کہ اس بچھڑے کی محبت اس حد تک پہنچ گئی کہ اس میں ان کا کچھ اختیار نہ رہا، بلکہ یہ معاملہ ہو گیا جیسے کسی اور نے ان کے دلوں میں اس کی محبت انڈیل دی ہو۔

❸ بِكُفْرِهِمْ : ان کی بچھڑے سے اس حد تک محبت اور عبادت بھی کفر تھی، مگر اس کا باعث ان کا سابقہ کفر تھا جس کا ذکر شروع سورت سے آ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ کفر مزید کفر کا اور ایمان مزید ایمان کا باعث ہوتا ہے۔

❹ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ : یہ ان کے اس دعویٰ پر مزید چوٹ ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، یعنی حقیقت میں تم تورات پر بھی ایمان نہیں رکھتے، ورنہ تورات پر ایمان تمھیں "سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا" کہنے کا اور بچھڑے کی عبادت جیسے صریح شرک کا حکم کیسے دے سکتا ہے اور اگر دیتا ہے تو تمھارا ایمان تمھیں بہت بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔

**آیت 95،94** ❶ اس آیت سے ملتا جلتا مضمون سورۂ جمعہ (٦ تا ٨) میں بیان ہوا ہے، یہاں " وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا " اور وہاں "وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًا" ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں دعویٰ اللہ کی دوستی کا ہے، جس کی نفی صرف "لَا" کے ساتھ کی گئی، یہاں دارِ آخرت کا یہودیوں کے لیے خاص ہونے کا ہے جو اس سے بڑا دعویٰ ہے، کیونکہ اللہ کی دوستی ذریعہ ہے اور جنت کا حصول نتیجہ ہے، اس لیے یہاں نفی حرف "لَنْ" کے ساتھ کی گئی، جو تاکید کے لیے ہے۔ (رازی) واللہ اعلم !

❷ اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں، ایک یہ کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت میں تمھارے سوا کوئی نہیں جائے گا تو موت کی تمنا کرو، کیونکہ جس شخص کو یقین ہو کہ وہ مرنے کے بعد جنت میں جائے گا وہ تو ضرور موت کی تمنا کرے گا، تاکہ جلد از جلد جنت میں پہنچ جائے۔ ابن جریر اور بعض دوسرے مفسرین نے یہی معنی کیے ہیں، مگر اس پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ یہود ہی موت کی تمنا کیوں کریں، مسلمانوں کو بھی موت کی تمنا کرنی چاہیے، جب کہ موت کی تمنا تو مسلمان بھی کم ہی کرتے ہیں۔

وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع

اور بلاشبہ یقیناً تو انھیں سب لوگوں سے زیادہ کسی بھی طرح زندہ رہنے پر حریص پائے گا اور ان سے بھی جنھوں نے شرک کیا۔ ان کا (ہر) ایک چاہتا ہے کاش! اسے ہزار سال عمر دی جائے، حالانکہ یہ اسے عذاب سے بچانے والا نہیں کہ اسے لمبی عمر دی جائے اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ﴿۹۶﴾

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا سے منع فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نسلی تفاخر میں مبتلا تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور محبوب ہونے کے دعوے دار تھے اور جنت کے واحد ٹھیکے دار بنے ہوئے تھے، جب کہ مسلمانوں کا ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے، وہ اتنے بے خوف ہوتے ہی نہیں کہ اتنا بڑا دعویٰ کریں۔ (دیکھیے مومنون: ۵۷ تا ۶۱) اس کے باوجود مسلمانوں میں شہادت کا شوق اور میدانِ جنگ میں موت کو موت کی جگہوں سے تلاش کرنا عام تھا، جب کہ یہودی اتنے بلند و بالا دعووں کے باوجود آخرت سے سراسر ناامید تھے۔ (دیکھیے سورۂ ممتحنہ: ۱۳) اس لیے وہ کبھی مرنا نہیں چاہتے تھے اور بزدلی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہاں بھی فرمایا کہ وہ اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ اس آیت میں یہود کے زبانی دعوے اور دل کی چوری کی حقیقت کھول کر بیان کی گئی ہے کہ وہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کو اتنے یقین سے پہچانتے تھے کہ آپ کے کہنے پر کبھی موت کی تمنا کرنے پر تیار نہ تھے۔

دوسری تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے کہ "فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ" کا معنی ہے کہ دونوں گروہوں (یہودیوں اور مسلمانوں) میں سے جو جھوٹا ہے اس کے لیے موت کی بددعا کرو، تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس بات کا انکار کر دیا۔ [ ابن أبی حاتم: ۲۴۷/۱، ح: ۹۳۷، بسند حسن ] یعنی اس آیت میں یہود کو دعوتِ مباہلہ دی گئی کہ اگر تم اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہو تو فریقین میں سے جو جھوٹا ہے اس کے لیے موت کی دعا کرو، مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سورۂ جمعہ (۶ تا ۸) میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے، ان میں بھی یہود کو مباہلہ کی دعوت دی گئی ہے، جیسا کہ سورۂ آل عمران (۶۱) میں نجران کے نصرانیوں کو مباہلہ کی دعوت دی گئی اور جس طرح نصرانی مباہلہ سے ڈر گئے تھے یہود بھی بددعا سے ڈر گئے اور جھوٹے گروہ کی موت کی تمنا نہ کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اگر یہودی اس دن جب آپ ﷺ نے ان سے یہ بات کہی، موت کی تمنا کرتے تو زمین پر جو یہودی بھی تھا مر جاتا۔ [ ابن أبی حاتم: ۲۴۷/۱، ح: ۹۳۸، بسند حسن ]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی معنی کو صحیح لکھا ہے، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی مدارج السالکین میں اس معنی کو ترجیح دی ہے اور ہمارے استاذ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اس تفسیر پر یہ اعتراض آتا ہی نہیں کہ یہود ہی موت کی تمنا کیوں کریں، مسلمان کیوں نہ کریں، نہ اس کے جواب کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے، کیونکہ جھوٹے کی موت کی تمنا اور بددعا صرف یہود نے نہیں بلکہ مسلمانوں اور یہود دونوں نے کرنی ہے۔ جس کے لیے مسلمان تو آج بھی اللہ کے فضل سے تیار ہیں، مگر یہود و نصاریٰ آج بھی اس کی جرأت نہیں کرتے اور نہ کبھی کر سکیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

آیت 96 عَلٰى حَيٰوةٍ : اس پر تنوین تنکیر کی ہے، اس لیے ترجمہ "کسی بھی طرح زندہ رہنے پر" کیا گیا ہے، یعنی آپ یہود

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

کہہ دے جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو بے شک اس نے اسے تیرے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے ہے اور مومنوں کے لیے سراسر ہدایت اور خوشخبری ہے ﴿۹۷﴾ جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ سب کافروں کا دشمن ہے ﴿۹۸﴾

کو زندہ رہنے پر سب لوگوں سے زیادہ حریص پائیں گے، خواہ انھیں کسی بھی طرح زندہ رہنا پڑے، غلام بن کر یا عزت و آبرو کی بربادی کے ساتھ۔ مشرکین بھی زندہ رہنے کے بہت خواہش مند ہیں، کیونکہ ان کے سامنے صرف دنیا ہی کی لذتیں ہیں، آخرت پر ان کا یقین نہیں، آخرت سے متعلق انھیں نہ کچھ خوف ہے نہ امید، مگر یہودی زندہ رہنے پر ان سے بھی زیادہ حریص ہیں، کیونکہ مشرکین مرنے کے بعد زندہ ہونے کا عقیدہ ہی نہیں رکھتے، اس لیے وہ موت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا یہودی ڈرتے ہیں، جنھیں خوب علم ہے کہ نبی آخر الزماں کو جاننے پہچاننے کے باوجود ان کے ساتھ کفر کے نتیجے میں انھیں کیا رسوائی اٹھانا پڑے گی۔ اس لیے ان کا ہر شخص ہزار برس زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے، خواہ کیسی ہی ذلیل زندگی ہو، کیونکہ آخرت کے عذاب سے تو بہر حال وہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے کسی شخص کو لمبی عمر مل بھی جائے تو وہ اسے عذاب سے بچانے والی ہرگز نہیں۔

**آیت 98،97** ❶ یہودی رسول اللہ ﷺ کی عداوت میں یہاں تک چلے گئے کہ انھوں نے جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا دشمن قرار دے دیا، کیونکہ وہی آپ پر وحی لے کر آتے تھے۔ جب کہ ان کے خیال میں انھیں بنی اسرائیل کے کسی شخص پر وحی لے کر آنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے انھوں نے ایک بہانا بنایا، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اے ابا القاسم! ہم آپ سے چند سوال کرتے ہیں، اگر آپ نے ان کے جواب دے دیے تو ہم پہچان جائیں گے کہ آپ واقعی نبی ہیں اور آپ کے پیروکار بن جائیں گے۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آپ نے ان سے عہد لیا جیسا کہ اسرائیل علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے لیا تھا، آپ ﷺ نے ان سے یہاں تک کہا کہ اللہ اس پر جو ہم کہہ رہے ہیں وکیل ہے۔ (سوالات کے صحیح صحیح جوابات پانے کے بعد) یہود کہنے لگے: ''اچھا یہ بتائیے کہ فرشتوں میں سے آپ کے پاس آنے والا کون ہے؟ کیونکہ ہر نبی کے پاس کوئی نہ کوئی فرشتہ خبر لے کر آتا ہے۔ یہی آخری بات ہے، اگر آپ بتا دیں گے تو ہم آپ کے پیروکار بن جائیں گے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جبریل ہے۔'' انھوں نے کہا: ''وہ تو لڑائی اور جنگ لے کر اترتا ہے، وہ ہمارا دشمن ہے۔ اگر تم میکائیل بتاتے تو ہم ایمان لے آتے، کیونکہ وہ نباتات، بارش اور رحمت لے کر آتا ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ...... ﴾ [ تفسير ابن أبي حاتم : ۱/۲۵۲، ح : ۹۵۳، بسند حسن ]

اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ سے تین سوال پوچھے، آپ نے فرمایا: ''مجھے ابھی ابھی جبریل علیہ السلام

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تیری طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور ان سے کفر نہیں کرتے مگر جو فاسق ہیں ﴿۹۹﴾ اور کیا جب کبھی انھوں نے کوئی عہد کیا تو اسے ان میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا، بلکہ ان کے اکثر ایمان نہیں رکھتے ﴿۱۰۰﴾

نے ان کے جواب بتائے ہیں۔'' تو وہ کہنے لگے: ''وہ تو فرشتوں میں سے یہود کا دشمن ہے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿من كان عدوا لجبريل﴾ : ٤٤٨٠ ]

② اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس بہانے کے کئی جواب دیے، پہلا یہ کہ جبریل علیہ السلام کا اس میں کیا قصور ہے، اس نے تو اللہ کے حکم سے اسے آپ ﷺ کے دل پر نازل کیا ہے، تمھاری عداوت تو پھر اللہ تعالیٰ سے ہوئی۔ دوسرا یہ کہ اگر جبریل نے تمھاری کتاب کے خلاف یا گمراہی اور عذاب والی کوئی بات کی ہوتی تو بے شک تم اس سے عداوت رکھتے، مگر جب اس کی لائی ہوئی وحی تمھاری کتاب کی تصدیق کر رہی ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے تو پھر تمھیں دشمنی رکھنے کا کیا حق ہے؟ تیسرا یہ کہ تمھارا کہنا کہ میکائیل سے تمھاری دوستی ہے، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے، جب کہ تم جبریل سے دشمنی رکھتے ہو۔ دشمن کا دوست بھی دشمن ہوتا ہے۔ لہٰذا تمھاری دشمنی صرف جبریل سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے، اس کے فرشتوں سے، اس کے رسولوں سے اور جبرئیل و میکائیل سبھی سے ہے، کیونکہ یہ سب جبریل کے دوست ہیں اور سن لو کہ جو ان سب کا دشمن ہے تو ایسے کافروں کا اللہ بھی دشمن ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ » [ بخاری، الرقاق، باب التواضع : ٦٥٠٢ ] ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی دوست سے دشمنی رکھی تو میں اس کے ساتھ جنگ کا اعلان کرتا ہوں۔''

③ فرقہ غرابیہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ جبریل علیہ السلام علی رضی اللہ عنہ پر وحی لے کر آئے تھے، مگر محمد ﷺ اور علی رضی اللہ عنہ کی شکل آپس میں ملتی جلتی تھی، تو جبریل نے علی رضی اللہ عنہ کے بجائے محمد ﷺ پر وحی نازل کر دی۔ ( تحفہ اثنا عشریہ ) جبریل سے عداوت اور ان کی گستاخی میں یہ فرقہ بھی یہود سے ملتا جلتا ہے۔

آیت 99 اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ: یعنی کھلی نشانیاں، جن میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا واضح ثبوت موجود ہے، قرآن کریم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے تمام معجزات اس کے تحت آ جاتے ہیں۔ (ابن کثیر، رازی)

آیت 100 یہاں سے یہود کی ایک اور قبیح عادت کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ یہودیوں سے نبی آخر الزماں کی مدد کرنے اور اس پر ایمان لانے کا بھی عہد لیا گیا تھا، مگر وہ اس عہد سے پھر گئے اور کہنے لگے، ہم سے اس قسم کا کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ عہد شکنی تو ان لوگوں کا پرانا شیوہ ہے۔ جب بھی ان سے کوئی عہد لیا گیا ان میں سے ایک گروہ نے اسے پس پشت ڈال دیا، بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ تو تورات پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ اگر اب عہد شکنی کرتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ (رازی)

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙۗ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول اس کی تصدیق کرنے والا آیا جو ان کے پاس ہے تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے، جنھیں کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، جیسے وہ نہیں جانتے ﴿۱۰۱﴾ اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور (وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے) جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور

آیت 101 یعنی رسول اللہ ﷺ میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو تورات اور دوسری آسمانی کتب "لِمَا مَعَهُمْ" میں نبی آخر الزماں کے مذکور تھے۔ اس اعتبار سے آپ ﷺ تورات اور ان کے پاس موجود دوسری آسمانی کتب "لِمَا مَعَهُمْ" کے پوری طرح مصداق تھے، مگر یہود کی بدنصیبی کہ جب آپ ان کے پاس آئے تو انھوں نے آپ ﷺ کو جھٹلا کر تورات کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، گویا انھیں اپنی کتاب کا بھی پتا نہیں۔ (ابن کثیر)

آیت 102 ① رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری پر یہودیوں نے جاننے پہچاننے کے باوجود حسد اور عناد کی بنا پر آپ کی پیروی سے انکار کر دیا۔ میدان میں وہ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ حق پر ہونے کا عقیدہ و عمل ہی قوت کی بنیاد ہوتا ہے، جس سے ان کے ہاتھ خالی تھے۔ چنانچہ وہ ہر اس قوم کی طرح جو عقیدے اور عمل کی قوت سے خالی ہوتی ہے، جادو ٹونے اور عملیات کے پیچھے پڑ گئے اور ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت اور جدو جہد کے بغیر سارے کام بن جایا کریں۔ جب اور بس نہ چلا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کر دیا۔ یہ جادو کرنے والا لبید بن اعصم یہودی تھا، جس نے رسول اللہ ﷺ کی کنگھی اور اس سے نکلنے والے بالوں پر، جو اس نے ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھے تھے، جادو کیا اور اسے ''ذی اروان'' نامی کنویں کی تہ میں ایک بڑے پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس کا اثر آپ پر یہ ہوا کہ آپ کو خیال ہوتا کہ آپ اپنے اہل کے پاس جاتے ہیں، مگر جا نہیں سکتے تھے۔ (گویا یہ " مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ " کی ایک صورت تھی) آپ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعے سے مطلع فرمایا اور آپ نے وہ سب کچھ نکال کر ختم کروا دیا اور کنواں بھی دفن کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا عطا فرما دی۔ [ بخاری، الأدب، باب قول اللّٰہ تعالٰی: ﴿ إن الله يأمر بالعدل ...... ﴾ : ۶۰۶۳، ۵۷۶۳۔ مسلم : ۲۱۸۹، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ] افسوس مسلمان بھی شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جب ذلت و پستی کے گڑھے میں گرے تو ان کی اکثریت بھی جادو ٹونے اور سفلی علوم کے پیچھے پڑ گئی۔

② وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ...... : یہودیوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ سلیمان علیہ السلام (نعوذ باللہ) جادوگر تھے اور ان کی حکومت کا دار و مدار جادو پر تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی اور بتایا کہ جادو تو کفر ہے، سلیمان علیہ السلام صاحب معجزہ پیغمبر تھے، انھوں نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین نے ان کے عہد میں کفر کا یہ کام کیا کہ وہ خود بھی جادو کرتے اور لوگوں کو بھی جادو سکھاتے۔ یہود ایک تو اس علم

اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ فَلَا تَكۡفُرۡ ؕ فَيَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡهُمَا مَا يُفَرِّقُوۡنَ بِهٖ بَيۡنَ الۡمَرۡءِ وَزَوۡجِهٖ ؕ وَمَا هُمۡ بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوۡنَ مَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ ؕ وَلَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰٮهُ مَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

ماروت پر اتاری گئی، حالانکہ وہ دونوں کسی ایک کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ کہتے ہم تو محض ایک آزمائش ہیں، سو تو کفر نہ کر۔ پھر وہ ان دونوں سے وہ چیز سیکھتے جس کے ساتھ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے اور وہ اس کے ساتھ ہرگز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے مگر اللہ کے اذن کے ساتھ۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو انھیں نقصان پہنچاتی اور انھیں فائدہ نہ دیتی تھی۔ حالانکہ بلاشبہ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ جس نے اسے خریدا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور بے شک بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿۱۰۲﴾

سحر کے پیچھے لگ گئے اور ایک اس علم کے پیچھے لگ گئے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا، جو سحر سے الگ ایک علم تھا اور جسے عمل میں لانا بعض اوقات کفر تھا۔ وہ فرشتے کسی کو بھی وہ علم نہیں سکھاتے تھے جب تک اسے اچھی طرح آگاہ نہ کر دیتے کہ ہم تو محض ایک آزمائش ہیں، لہٰذا تم اس عمل کو کفر کے لیے استعمال نہ کرنا، مگر یہود کی اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ وہ ان سے وہ علم ضرور سیکھتے اور اس میں سے بھی وہ باتیں سیکھتے جو سراسر نقصان پہچانے والی ہیں اور جنھیں عمل میں لانا کفر ہے اور جن پر شیطان سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے، یعنی ایسے عملیات جن سے وہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے۔ فرشتوں کا آزمائش کے لیے بھیجا جانا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ افسوس کہ مسلمان بھی جب پستی کا شکار ہوئے تو جادو کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن کی آیات مثلاً: ﴿ وَاَلۡقَيۡنَا بَيۡنَهُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ ﴾ وغیرہ کو بھائیوں کے درمیان اور میاں بیوی کے درمیان عداوت ڈالنے کے لیے عمل میں لانا شروع کر دیا، حالانکہ یہودی جانتے تھے اور یہ مسلمان بھی جانتے ہیں کہ یہ فعل کفر ہے اور ایسا کرنے والے کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

③ استاذ محمد عبدہ الفلاح رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس مقام پر بعض مفسرین نے ہاروت و ماروت سے متعلق عجیب و غریب داستانیں نقل کر دی ہیں، جن میں زہرہ نامی ایک عورت سے ان کا معاشقہ اور پھر زہرہ کے ستارہ بن جانے کا واقعہ بھی داخل ہے۔ علمائے محققین نے ان قصوں کو یہود کی افسانہ طرازی قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض صحابہ اور تابعین سے اس قسم کی روایات منقول ہیں، مگر زیادہ سے زیادہ ہم ان کو نومسلم یہودی عالم کعب الاحبار کا قول قرار دے سکتے ہیں۔ ابن کثیر (البدایہ: ۱/۳۷، ۳۸) حافظ منذری (الترغیب والترہیب: ۲/۱۰۲) اور علامہ احمد شاکر مصری (تعلیق مسند احمد: ۹/۳۵ تا ۴۱) نے بھی اسی کی تائید کی ہے کہ یہ کعب احبار کا قول ہے۔

④ احسن البیان میں ہے کہ بعض مفسرین نے " وَمَاۤ اُنۡزِلَ " میں " مَاۤ " نافیہ مراد لیا ہے اور ہاروت و ماروت پر کسی چیز کے اترنے کی نفی کی ہے، لیکن قرآن مجید کا سیاق اس کی تائید نہیں کرتا، اسی لیے ابن جریر وغیرہ نے اس کی تردید کی ہے۔ (ابن کثیر)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۰۴ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵

اور اگر واقعی وہ ایمان لاتے اور بچتے تو یقیناً اللہ کے پاس سے تھوڑا ثواب بھی بہت بہتر تھا، کاش! وہ جانتے ہوتے ۝۱۰۳ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم "رَاعِنَا" (ہماری رعایت کر) مت کہو اور "اُنْظُرْنَا" (ہماری طرف دیکھ) کہو اور سنو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ۝۱۰۴ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، نہ وہ پسند کرتے ہیں اور نہ مشرکین کہ تم پر تمھارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی اتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ۝۱۰۵

**آیت 103** ① لَمَثُوْبَةٌ: اس میں تنوین تقلیل کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''تھوڑا ثواب'' کیا گیا ہے۔
② پچھلی آیت میں ہے: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا ﴾ یعنی یہود جانتے تھے، یہاں فرمایا: ﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ''کاش وہ جانتے ہوتے'' اس سے معلوم ہوا کہ علم پر عمل نہ کرنے والا درحقیقت عالم ہی نہیں۔

**آیت 104** ① رَاعِنَا: "رَاعِ" یہ باب مفاعلہ (مراعاۃ) سے فعل امر ہے، یعنی ہماری رعایت کیجیے۔ مسلمان رسول اللہ ﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے، یہودی بھی اس لفظ کے ساتھ آپ کو مخاطب کرتے، مگر زبان کو پیچ دے کر لفظ بدل دیتے، جیسا کہ سورۂ نساء (۴۶) میں ہے، جس سے وہ لفظ گالی بن جاتا۔ مفسرین نے اس کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ "رَاعِنَا" کے بجائے "رَاعِيْنَا" کہتے، جس کا معنی ''ہمارا چرواہا'' ہے۔ دوسری یہ کہ وہ اسے ''رعونت'' سے اسم فاعل قرار دے کر "رَاعِنًا" کہتے جس کا معنی احمق ہے اور منادیٰ غیر معین کو خطاب کی وجہ سے منصوب ہے، پھر آپس میں جا کر خوش ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آپ کے لیے یہ لفظ استعمال کرنے ہی سے منع فرما دیا اور "اُنْظُرْنَا" کہنے کا حکم دیا، ساتھ ہی فرمایا کہ غور سے سنو، تاکہ رسول اللہ ﷺ کو متوجہ کروانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس سے یہودیوں کی دشمنی، ان کی طبیعت کی خست اور شرارت صاف واضح ہے۔ مسلمانوں کو ان کے اعمال کے علاوہ ان کے الفاظ و اقوال کی مشابہت سے بھی منع فرمایا گیا، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ )) ''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انھی میں سے ہے۔'' [ أبوداؤد، اللباس، باب فی لبس الشهرة : ۴۰۳۱، و حسنه الألبانی ]

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے الفاظ جن میں بے ادبی یا گستاخی کا شبہ بھی پیدا ہوتا ہو، وہ استعمال کرنا درست نہیں۔ یہودیوں کی اسی طرح کی ایک اور کمینگی کا ذکر حدیث میں آیا ہے کہ وہ ''السلام علیکم'' کے بجائے "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" کہتے، جس کا معنی ہے تم پر موت ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے جواب میں صرف "عَلَيْكَ" کہنے کا حکم دیا کہ وہ تمھی پر ہو۔
[ مسلم، السلام، باب النهی عن ابتداء ...... : ۲۱۶۴ ]

**آیت 105** وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ ......: مشرکین عرب کے نزدیک رسول اللہ ﷺ ایک عام آدمی تھے اور وہ اپنے کسی عظیم

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۶ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝۱۰۷

جو بھی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں، یا اسے بھلا دیتے ہیں، اس سے بہتر، یا اس جیسی (اور) لے آتے ہیں، کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ۝۱۰۶ کیا تو نے نہیں جانا کہ اللہ ہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ۝۱۰۷

سردار کے بجائے ایک عام آدمی پر وحی کا نزول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۳۱) اور اہل کتاب اللہ کی اس رحمت کو اپنی نسل سے باہر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فرمایا کہ اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہے خاص کرے۔ یہاں رحمت سے مراد نبوت ہے، جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے، وہ نہ کسی کی عظمت کی بنیاد پر ملتی ہے، نہ نسل پر اور نہ کسی کے کسب، محنت اور چلہ کشی پر، جیسا کہ قادیانی دجال کا کہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ﴾ [ الحج : ۷۵ ] ''اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں میں سے بھی۔''

**آیت 107،106** ❶ نسخ کا معنی ہے بعد میں آنے والے حکم کے ساتھ پہلے کسی حکم کو ختم کر دینا، جیسے پہلے بیت المقدس قبلہ مقرر ہوا، پھر بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا اور جیسے ہماری شریعت میں پہلی شریعتوں کے بہت سے احکام منسوخ کر دیے گئے۔ یہودی نسخ کے منکر تھے، اسی لیے انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا کہ انھوں نے تورات کے بعض احکام کیوں منسوخ کیے۔ قرآن پر بھی انھوں نے اعتراض کیا کہ جب پہلا حکم اللہ تعالیٰ کا تھا اور درست تھا تو وہ منسوخ کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے کئی جواب دیے، پہلے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا حکم درحقیقت ہوتا ہی اتنی مدت کے لیے ہے، نسخ اس مدت کے ختم ہونے کا اعلان ہے۔ اس وقت تک وہ پہلا حکم عین حکمت تھا، بعد میں اس جیسے یا اس سے بہتر دوسرے حکم کی ضرورت تھی تو وہ جاری کر دیا گیا۔ کائنات میں ہر وقت اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ نطفہ سے علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں، پھر جنین، پھر بچپن، جوانی، بڑھاپا، موت اور قیامت سب نسخ ہی کی صورتیں ہیں۔ مختلف موسم مثلاً سردی، پھر بہار، پھر گرمی، پھر برسات، اسی طرح رات دن کا چکر اس کی مثالیں ہیں۔ طبیب کا مریض کے لیے ایک نسخہ تجویز کرنا، پھر نئی صورت حال کے لیے دوسرا نسخہ تجویز کرنا بھی اس کی مثال ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلا نسخہ غلط تھا۔ ایک جواب اس اعتراض کا یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنا حکم منسوخ نہ کر سکتا ہو تو وہ عاجز ٹھہرا، چنانچہ فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔'' مزید فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔'' وہ بادشاہ ہی کیا ہوا جو پہلے حکم کی جگہ نیا حکم نافذ نہ کر سکے۔

❷ قرآن کے ساتھ قرآن منسوخ ہو سکتا ہے اور سنت بھی، اسی طرح سنت کے ساتھ سنت منسوخ ہو سکتی ہے اور قرآن بھی، کیونکہ دونوں وحی الٰہی ہیں اور وحی الٰہی کے ساتھ وحی الٰہی منسوخ ہو سکتی ہے۔

اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ يَّتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۱۰۸﴾

یا تم ارادہ رکھتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو، جس طرح اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر کو لے لے تو بے شک وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ﴿۱۰۸﴾

❀ قرآن سے قرآن کے نسخ کی مثال: سورۂ نساء (۱۵) میں اللہ تعالیٰ نے زنا کرنے والی عورتوں کی سزا مقرر فرمائی کہ انھیں گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے، یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی راستہ بنا دے، پھر سورۂ نور کے شروع میں زانی مرد اور زانیہ عورت کو سو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا۔ مزید دیکھیے سورۂ انفال (۶۵، ۶۶) اور مجادلہ (۱۲، ۱۳)۔

❀ قرآن کے ساتھ سنت کے نسخ کی مثال: جیسے شروع شروع میں روزے کی حالت میں مغرب کے بعد سو جانے کے بعد کھانا پینا اور بیوی کے پاس جانا منع تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡهُنَّ وَابۡتَغُوۡا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمۡ وَكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا...... ﴾ [ البقرۃ : ۱۸۷ ] قبلہ کی تبدیلی بھی قرآن کے ساتھ سنت کے نسخ کی مثال ہے۔

❀ سنت کے ساتھ سنت منسوخ ہونے کی مثال: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا وَ نَهَيْتُكُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْأَضَاحِيْ فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَأَمْسِكُوْا مَا بَدَا لَكُمْ » "میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا سو ان کی زیارت کرو اور میں نے تمھیں تین راتوں سے زیادہ قربانیوں کے گوشت (ذخیرہ کرنے) سے منع کیا تھا، سو انھیں رکھ لو، جب تک تمھاری مرضی ہو۔" [ مسلم، الأضاحي، باب بيان ما كان من النهي ...... : ۹۷۷، قبل ح : ۱۹۷٦، عن بريدة رضی اللہ عنہ ]

❀ سنت صحیحہ کے ساتھ قرآن کے نسخ کی مثال خواہ وہ متواتر نہ ہو: جیسا کہ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن سے نکاح حرام ہے، ان میں دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، پھر فرمایا: ﴿ وَاُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمۡ ﴾ [ النساء : ۲٤ ] "ان کے سوا سب عورتوں سے نکاح تمھارے لیے حلال ہے۔" اس آیت کی رو سے خالہ اور اس کی بھانجی، پھوپھی اور اس کی بھتیجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا جائز ہے، مگر رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا تو حرام ہو گیا اور اس پر امت متفق ہے۔

**تنبیہ!** درحقیقت یہ سنت کے ساتھ کتاب اللہ سے زائد حکم کی مثال ہے، بعض لوگ کتاب اللہ پر زیادتی کو نسخ کہتے ہیں، ان کے قول کے مطابق یہ نسخ کی مثال ہے، ورنہ شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سنت کے ساتھ قرآن کے نسخ کی کوئی قابل اطمینان مثال مجھے نہیں ملی۔

③ نسخ احکام میں ہوتا ہے خبر میں نہیں، ورنہ ہر جھوٹا شخص، جب اس کی پیشین گوئی یا گزشتہ یا موجودہ واقعے کی کوئی خبر غلط نکلے، کہہ دے گا وہ منسوخ ہو گئی، جیسے مرزا قادیانی کے مریدوں کا حال ہے۔

④ بعض آیات و احکام جنھیں باقی رکھنا مقصود نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے بھلا دیے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [ الأعلی : ٦، ۷ ] "ہم ضرور تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے۔"

**آیت 108** ① یہاں اگرچہ بیان نہیں ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام سے کیا سوال کیا گیا، مگر پیچھے گزر چکا ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کو

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۹ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۰

بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کاش! وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں، اپنے دلوں کے حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ ان کے لیے حق خوب واضح ہو چکا۔ سو تم معاف کرو اور درگزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ۱۰۹ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو بھی نیکی تم اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پا لو گے۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب دیکھنے والا ہے ۱۱۰

کھلم کھلا دیکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ (دیکھیے بقرہ: ۵۵) اہلِ کتاب نے رسول اللہ ﷺ سے بھی ایسی ہی گستاخی کا رویہ اختیار کیا، چنانچہ سورۂ نساء (۱۵۳) میں ہے: ''اہلِ کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارے، سو وہ تو موسیٰ سے اس سے بڑی بات کا مطالبہ کر چکے ہیں، چنانچہ انھوں نے کہا ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھلا۔'' اللہ تعالیٰ نے گستاخی پر مشتمل سوالات کے علاوہ وحی اترنے کے زمانہ میں ایسی چیزوں کے متعلق سوال سے بھی منع فرما دیا جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو ناگوار ہوں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ کی آیت (۱۰۱) اور اس کا حاشیہ۔

② گستاخانہ سوالات کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرنا قرار دیا ہے۔

**آیت 109** ① كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ...... : اس میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اہلِ کتاب شامل ہیں اور بعد میں آنے والے تمام زمانوں کے یہود و نصاریٰ بھی، جیسا کہ ہمارے دور میں ان کی طرف سے علم و تحقیق کے نام پر اسلام کے عقائد و احکام کے خلاف پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ مسلمان اگر یہودی یا نصرانی نہ بنیں تو کم از کم اپنے دین سے ضرور بدگمان ہو جائیں۔

② حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ...... : حق کو پہچاننے کے باوجود ان کی یہ خواہش محض حسد کی وجہ سے ہے اور حسد بھی کسی دینی جذبے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے دلوں کے بغض و عناد کی وجہ سے ہے۔ اس سے حسد کی قباحت ظاہر ہوئی کہ خود بھی ایمان سے محروم رہے اور دوسروں کے پاس یہ نعمت دیکھنا بھی برداشت نہیں۔ ابلیس کا سجدے سے انکار، آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا اپنے بھائی کو قتل کرنا، برادران یوسف کا اپنے بھائی پر ظلم اور اہل کتاب کا رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود انکار اور دشمنی کا باعث یہی حسد تھا۔

③ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا...... : یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ لڑائی کا حکم نہ آ جائے اس وقت تک عفو و درگزر سے کام لو، ان کے اوچھے حملوں اور حسد و بغض کی وجہ سے بے قابو نہ ہونا۔ پھر لڑائی کا حکم آنے پر بنو نضیر اور بنو قینقاع کو جلا وطن ہونا پڑا اور بنو قریظہ قتل ہوئے۔

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور انھوں نے کہا جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی ہوں گے یا نصاریٰ۔ یہ ان کی آرزوئیں ہی ہیں، کہہ دے لاؤ اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو ﴿۱۱۱﴾ کیوں نہیں، جس نے اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دیا اور وہ نیکی کرنے والا ہو تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۱۲﴾ اور یہودیوں نے کہا نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں اور نصاریٰ نے کہا یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں نے بھی جو کچھ علم نہیں رکھتے، ان کی بات جیسی بات کہی، اب اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۱۳﴾

**آیت 111** ① آیت میں ایک لمبی بات مختصر کر دی گئی ہے، یعنی یہودیوں نے کہا جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی ہوں گے اور نصاریٰ نے کہا کہ جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو نصاریٰ ہوں گے، کیونکہ ان میں سے کوئی فریق بھی دوسرے کے جنت میں جانے کا عقیدہ نہیں رکھتا تھا۔ فرمایا، یہ ان کی آرزوئیں ہی ہیں، حقیقت سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔ اگر یہ سچے ہیں تو اپنی دلیل پیش کریں۔ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا، اس آیت سے ثابت ہوا کہ کوئی بھی دعویٰ کرنے والا، خواہ نفی کا دعویٰ کرے یا اثبات کا، اس پر دلیل اور برہان پیش کرنا لازم ہے اور یہ تقلیداً کہی ہوئی بات کے باطل ہونے کی سب سے سچی اور پکی دلیل ہے (کیونکہ تقلید نام ہی کسی بات کو بلا دلیل قبول کرنے کا ہے)۔

② اَمَانِيُّهُمْ : خبر معرفہ ہونے کی وجہ سے ترجمے میں ''ہی'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ آج کل مسلمان بھی محض آرزوؤں اور خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں، حالانکہ نام کا اسلام نہ دنیا میں عزت کا ضامن ہے نہ آخرت میں۔

**آیت 112** یعنی جنت میں جانے کے لیے کسی گروہ کا فرد ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دے، چہرہ تابع ہو گیا تو پورا جسم تابع ہو گیا، پھر جو عمل کرے اسی کے لیے کرے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ عمل حسن (یعنی نیک) ہو، اس کی طرف اشارہ ''وَ هُوَ مُحْسِنٌ'' کے ساتھ ہے۔ نیک عمل وہی ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ پہلی شرط نہ ہو گی تو منافقت اور ریا کاری ہے، دوسری نہ ہو گی تو بدعت اور گمراہی ہے۔

**آیت 113** ① تورات میں مسیح علیہ السلام کی نبوت کا ذکر موجود تھا اور یہودی اسے پڑھتے اور جانتے تھے، اسی طرح انجیل میں موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا ذکر اور تورات پر عمل کا حکم موجود تھا اور نصاریٰ اسے پڑھتے اور جانتے تھے، مگر تعصب اور ضد میں

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟ یہ لوگ، ان کا حق نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا ہی میں ایک رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۱۴﴾ اور اللہ ہی کے لیے مشرق و مغرب ہے، تو تم جس طرف رخ کرو، سو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔ بے شک اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾

---

آ کر ہر ایک نے دوسرے کے بارے میں کہا کہ وہ سرے سے کسی بھی چیز پر نہیں۔ افسوس! مسلمان بھی جب فرقوں میں تقسیم ہوئے تو ہر ایک نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوسرے فرقے کی بات قرآن و سنت کے مطابق ہے، اسے غلط اور اپنے فرقے کی بات کو غلط جانتے ہوئے بھی درست قرار دیا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

❷ لَا يَعْلَمُوْنَ: علم سے مراد وحی کا علم ہے اور اس سے مراد مشرکین عرب ہیں جو وحی الٰہی کا کچھ علم نہیں رکھتے تھے، ان کے علاوہ وہ تمام لوگ جو آسمانی ہدایت سے بے بہرہ ہیں، اس میں شامل ہیں، مثلاً دہریے اور بت پرست وغیرہ، ان سب نے بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے سوا سب کو سرے ہی سے غلط قرار دیا۔ فرمایا، اب ان کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔

**آیت 114** ❶ اپنے گروہ کو حق پر اور اپنے سوا سب کو غلط قرار دینے والے یہ سب لوگ غور کریں کہ ظلم کے ناجائز ہونے پر تو سب کا اتفاق ہے، پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور انھیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔ یہ کام مشرکین مکہ نے کیا کہ مسلمانوں کو پہلے مکہ سے نکالا، پھر ان کا مکہ میں داخلہ حتیٰ کہ حج و عمرہ کے لیے آنا بند کر دیا۔ ان سے پہلے نصاریٰ کا ٹائٹس کے زمانے میں بیت المقدس پر قبضہ ہوا تو انھوں نے یہودیوں کا داخلہ بیت المقدس میں بند کر دیا، یہ کیسی حق پرستی ہے؟

❷ اِلَّا خَآئِفِيْنَ: یعنی ایسے ظالم لوگوں کا اللہ کی مساجد کا متولی ہونا تو درکنار، ان کا تو داخلہ بھی ڈرتے ہوئے ہونا چاہیے کہ انھوں نے کوئی شرارت کی تو سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ ان کے لیے دنیا ہی میں ایک رسوائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سچ ثابت ہوا، یہود و نصاریٰ اور مشرکین تینوں نے اپنے کیے کی سزا پائی، کعبہ اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ چونکہ مسجدیں اللہ کی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان میں صرف اللہ کا نام لیا جائے، اس لیے تمام مشرکین کو مسجد حرام کے قریب آنے سے روک دیا گیا، خواہ وہ بت پرست ہوں یا عزیر و مسیح پرست، کیونکہ وہ اکیلے اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ اب مسلمانوں میں وہی پہلی قوموں والے مشرکانہ عقائد و اعمال پھیل گئے اور وہ بدعمل ہو کر جہاد چھوڑ بیٹھے، تو بیت المقدس پھر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوبارہ توحید و سنت اور جہاد فی سبیل اللہ پر گامزن فرمائے اور بیت المقدس کی تولیت کا شرف عطا فرمائے۔

**آیت 115** اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، بلکہ مراد خاص صورتوں میں قبلہ کی پابندی ختم کرنا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ان ظالموں کا ذکر ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتے ہیں، یعنی ان ظالموں کی اللہ کی

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اور انھوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۱۱۶﴾ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے ﴿۱۱۷﴾

مسجدوں سے روکنے اور انھیں ویران کرنے کی کوشش اللہ تعالیٰ کی عبادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے، سو انسان کو قبلہ کی طرف رخ کرنے میں اگر کوئی دشواری ہو، دشمن کا خوف ہو یا قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جس طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے درست ہے۔ سنن ابی داؤد " كِتَابُ صَلٰوةِ السَّفَرِ (۱۲۴۹)" میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ خالد بن سفیان کو قتل کر دیں، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے مقابلے کے لیے فوج جمع کر رہا تھا۔ وہ انھیں عرنہ یا عرفات میں نظر آ گیا (جہاں عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا چہرہ کعبہ کی مخالف سمت تھا)، ادھر عصر کا وقت ہو گیا تو انھوں نے نماز فوت ہونے کے خدشے کے پیش نظر دشمن کی طرف چلتے چلتے نماز پڑھ لی، پھر جا کر اسے قتل کر دیا۔ سفر کی حالت میں نفل نماز کے متعلق اجازت ہے کہ وہ سواری پر پڑھ لی جائے، خواہ رخ کسی بھی جانب ہو۔ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مکہ سے مدینہ کی طرف آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی پر (نفل) نماز پڑھتے رہتے تھے، اس کا رخ جدھر بھی ہوتا۔ فرماتے ہیں، اسی کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ [ مسلم، صلوة المسافرين، باب جواز النافلة : ۷۰۰/۳۳ ] ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ کا ایک معنی "حَیْثُمَا تُوَلُّوْا" (جہاں بھی تم رخ کر لو) بھی کیا گیا ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ (طبری) اس صورت میں بھی اس کا تعلق پہلی آیت سے ہے، یعنی اگر تمھیں اللہ کی مسجدوں سے روک دیا جائے تو تم جس جگہ بھی ہو نماز پڑھ لو۔ (التسہیل)

**آیت 116** اللہ کی مسجدوں سے روکنے والوں کا یہ ایک اور ظلم بیان فرمایا کہ انھوں نے کہا، اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔ چنانچہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، اسی طرح مشرکین عرب نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کئی طرح سے اس کا رد فرمایا، پہلے "سُبْحٰنَهٗ" کے ساتھ کہ اولاد تو محتاجی کی دلیل ہے اور اللہ اس سے پاک ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۱۱) دوسرے یہ کہ اللہ آسمان و زمین کا مالک ہے، جس میں عزیر، مسیح علیہما السلام اور فرشتے سب شامل ہیں۔ مالک اور مملوک باپ بیٹا کیسے ہو سکتے ہیں! بیٹا تو باپ کا مملوک بن بھی جائے تو خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ تیسرا یہ کہ بیٹا سرکشی بھی کر سکتا ہے، جب کہ آسمان و زمین میں رہنے والے سب اللہ کے فرمان کے تابع ہیں، ان کا سانس بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں چلتا۔

**آیت 117** "بَدِیْعُ" بمعنی "مُبْدِعٌ" یعنی آسمان و زمین کو بغیر کسی مادے یا کسی نمونے کے پیدا کرنے والا، یہ چوتھی دلیل ہے، کیونکہ بیٹا باپ کا نمونہ ہوتا ہے، جب کہ اللہ نے ہر چیز کو نمونے کے بغیر پیدا کیا ہے۔ پانچویں دلیل کہ جس کے "كُنْ" کہنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے اسے اولاد کی کیا محتاجی ہے؟

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اور ان لوگوں نے کہا جو نہیں جانتے ہم سے اللہ کلام کیوں نہیں کرتا؟ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ ایسے ہی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، ان کی بات جیسی بات کہی، ان کے دل ایک دوسرے جیسے ہو گئے ہیں۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں جو یقین کرتے ہیں ﴿۱۱۸﴾ بے شک ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور تجھ سے جہنم والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا ﴿۱۱۹﴾ اور تجھ سے یہودی ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ نصاریٰ، یہاں تک کہ تو ان کی ملت کی پیروی کرے۔ کہہ دے بے شک اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو تیرے پاس آیا ہے، تو تیرے لیے اللہ سے (چھڑانے میں) نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی مدد گار ﴿۱۲۰﴾

---

تنبیہ: بعض لوگوں نے آپ ﷺ کو اور کچھ اور لوگوں کو اللہ کے نور کا ٹکڑا قرار دیا، یہ اولاد قرار دینے سے بھی بڑا ظلم ہے، دیکھیے سورۂ اخلاص

**آیت 118** اس سے مراد کفارِ عرب ہیں، جنھوں نے اپنے سے پہلے لوگوں یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح یہ مطالبہ کیا۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳)، فرقان (۲۱) اور سورۂ مدثر (۵۲) "تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ" یعنی ان سب کی سوچ ایک جیسی ہے اور فرمایا کہ قرآنِ کریم سے رسول اللہ ﷺ کا صدق واضح ہے، اگر یہ لوگ اہلِ یقین ہوتے تو یہی دلائل کافی تھے۔ (المنار)

**آیت 118** یعنی آپ کا کام حق پہنچاتے ہوئے خوش خبری دینا اور ڈرانا ہے، آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ مسلمان کیوں نہیں ہوئے۔

**آیت 120** اس آیت میں سخت وعید ہے کہ یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے بالفرض اگر رسول اللہ ﷺ بھی ان کی خواہش کے پیچھے لگ جائیں تو ان کے بچنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ اس آیت کے مخاطب اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر سمجھایا امت کو گیا ہے۔ "أَهْوَاءٌ" "هَوًى" کی جمع ہے، بمعنی خواہش، یعنی اصل ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اور وہ قرآن و سنت ہے، ان لوگوں کے پاس اصل ہدایت نہیں، صرف حسبِ خواہش بنایا ہوا دین ہے۔ بدعت کو بھی "هَوًى" کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی دین میں اپنی خواہش کے مطابق بنا کر داخل کی جاتی ہے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا تَنۡفَعُہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ

وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، اسے پڑھتے ہیں جیسے اسے پڑھنے کا حق ہے، یہ لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے تو وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾ اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور یہ کہ بلاشبہ میں نے ہی تمھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ﴿۱۲۲﴾ اور اس دن سے بچو جب نہ کوئی جان کسی جان کے کچھ کام آئے گی اور نہ اس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۱۲۳﴾ اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں کے ساتھ آزمایا

ان کی اہواء و بدعات کی پیروی باعث ہلاکت ہے، اسی طرح کسی بھی بدعتی طبقے کو خوش کرنے کے لیے ان کی اہواء و بدعات کی پیروی بھی باعث ہلاکت ہے۔

**آیت 121** اہل کتاب کے اعمالِ بد کا ذکر کرنے کے بعد اب ان میں سے نیک اور اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اسے پڑھنے کا حق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کی ہم معنی آیات دیکھیے سورۂ قصص (۵۲ تا ۵۴) میں۔ مراد اس سے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حقِ تلاوت یہ ہے کہ اس میں تحریف نہ کی جائے، اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ قرآن کی تلاوت کا حق بھی یہی ہے۔ بعض لوگ حق سے مراد حروف کو ان کے مخارج سے ادا کرنا لیتے ہیں، مگر یہ کافی نہیں۔

**آیت 123،122** بنی اسرائیل سے خطاب کی ابتدا اللہ کی نعمتیں یاد دلانے اور قیامت اور اس کی ہولناکیوں سے ڈرانے سے ہوئی۔ مسلسل چوراسی (۸۴) آیات میں ان پر اللہ کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ ان کی نافرمانیوں کا ذکر بھی فرمایا گیا۔ آخر میں دوبارہ انھیں اللہ کی نعمتیں یاد دلائی گئیں اور آخرت کے دن سے ڈرایا گیا اور متنبہ کیا گیا کہ اوپر بیان کی ہوئی بدکرداریوں کی وجہ سے تم ظالم ٹھہرے، سو اب امامت و قیادت بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں منتقل ہو رہی ہے، جن میں ایک پیغمبر مبعوث کرنے کی دعا ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت کی تھی۔ ان آیات اور پچھلی تمام آیات کا مقصود اہل کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی کرنے پر ابھارنا ہے۔

**آیت 124** ① بِکَلِمٰتٍ : بعض مفسرین نے ان باتوں سے مراد والد، قوم اور بادشاہ کو توحید کی دعوت، بت پرستی، ستارہ پرستی اور شاہ پرستی کی تردید، آگ میں پھینکے جانے پر صبر، پھر ہجرت، مصر کے جبار بادشاہ کی دست درازی کے باوجود استقامت، بیوی بچے

لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

تو اس نے انھیں پورا کر دیا۔ فرمایا بے شک میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ کہا اور میری اولاد میں سے بھی؟ فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا ﴿۱۲۴﴾ اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے لوٹ کر آنے کی جگہ اور سراسر امن بنایا، اور تم ابراہیم کی جائے قیام کو نماز کی جگہ بناؤ۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکیدی حکم دیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو ﴿۱۲۵﴾

کو وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑنا اور اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے پر مکمل آمادگی کو لیا ہے۔ بعض نے آگے آنے والی آیات میں مذکور بیت اللہ کی تعمیر و تطہیر اور حج کے مناسک اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ” اَسْلِمْ “ (فرماں بردار ہو جا) پر فرماں بردار ہونے کے اقرار، پھر اس کے عملی ثبوت کو مراد لیا ہے۔ [ ابن أبي شيبة عن مجاهد ] تفسیر عبد الرزاق میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش طہارت کے احکام کے ساتھ کی، جن میں سے پانچ سر سے متعلق اور پانچ باقی جسم سے متعلق تھے۔ سر سے متعلق مونچھیں کترنا، کلی کرنا، ناک کی پانی سے صفائی کرنا، مسواک کرنا، سر کی مانگ نکالنا تھا اور جسم سے متعلق ناخن کاٹنا، زیر ناف بال مونڈنا، ختنہ کرنا، بغلوں کے بال اکھیڑنا اور پیشاب و پاخانے کے نشان کو پانی سے دھونا تھا۔ صحیح بخاری (۵۸۸۹)، مسلم (۲۵۷) اور ابوداؤد (۴۱۹۸) وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کو فطرت میں سے شمار فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش میں یہ سب چیزیں شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جو بھی حکم دیا انھوں نے وہ پورا کر دکھایا، بڑھاپے میں بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تو پورا کر دیا، اسّی (۸۰) سال کی عمر میں اپنا ختنہ کرنے کا حکم ہوا تو وہ بھی کر دیا۔ [ بخاري، الاستئذان، باب الختان بعد الكبر ...... : ٦٢٩٧ ]

② قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ...... : جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو تمام لوگوں کا امام بنا دیا تو انھوں نے اپنی بعض اولاد کے حق میں امامت کی دعا کی، سب کے حق میں نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، تو یہ دعا کیوں کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، مگر اس کے ساتھ ہی انھیں بتا دیا کہ تمھاری اولاد میں سے ظالم لوگ اس نعمت سے سرفراز نہیں ہوں گے۔ اس سے بنی اسرائیل کے گمراہ لوگوں اور بنی اسماعیل کے مشرکین کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ان کے عقائد و اعمال خراب ہو چکے ہیں، محض ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونا کافی نہیں۔

**آیت 125** ① مَثَابَةً : یہ ” ثَابَ يَثُوْبُ “ (لوٹنا) سے ظرف ہے، یعنی ”لوٹ کر آنے کی جگہ“ لوگ بار بار اللہ کے گھر کی طرف لوٹ کر آتے ہیں، کبھی ان کا دل نہیں بھرتا۔ دیکھیے سورۂ حج (۲۷) اور سورۂ ابراہیم (۳۷) دوسری خصوصیت یہ کہ اسے سراسر امن والی جگہ بنا دیا، جاہلیت میں بھی آدمی اپنے دشمن کو دیکھتا مگر اسے کچھ نہ کہتا۔ اسلام نے اس احترام کو باقی رکھا، بلکہ

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! اس (جگہ) کو ایک امن والا شہر بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے، جو ان میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے۔ فرمایا اور جس نے کفر کیا تو میں اسے بھی تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر اسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کروں گا اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ﴿۱۲۶﴾

---

اس میں تاکید اور اضافہ کیا۔

2 مقامِ ابراہیم علیہ السلام کی تفسیر میں دو قول ہیں، ایک وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا۔ صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کے واقعہ میں جابر رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم طواف سے فارغ ہوئے تو مقامِ ابراہیم کی طرف آئے اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [ البقرة : ۱۲۵ ] پھر مقامِ ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کر کے دو رکعتیں پڑھیں۔ [ مسلم، الحج، باب حجة النبی ﷺ : ۱۲۱۸ ] جیسا کہ حاجی لوگ پڑھتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھنے کا مشورہ عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا جس کی موافقت اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔ [ بخاری، الصلوۃ، باب ما جاء فی القبلة ...... : ۴۰۲ ] عمر رضی اللہ عنہ کی موافقات کی تعداد اٹھارہ ہے۔

دوسرا قول تفسیر عبد الرزاق میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد مقام حج ہے، یعنی حرم اور عرفات جہاں ابراہیم علیہ السلام نے حج میں قیام کیا۔ چنانچہ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ طواف کی دو رکعتیں حرم میں جہاں بھی پڑھ لے درست ہے۔

3 طَهِّرَا بَيْتِيَ ...... : طہارت سے مراد کوڑا کرکٹ سے صفائی ہی نہیں، بلکہ بت پرستی اور شرک کی تمام نجاستوں سے بھی صفائی ہے، کیونکہ طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ اللہ کے سوا کسی کا حق نہیں۔ مشرکینِ مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تمھارے باپ کو کیا حکم دیا گیا تھا اور تم نے عین کعبہ میں بت لا کر کیسی فرماں برداری کی۔

**آیت 126** 1 اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول فرمائی اور مکہ معظّمہ کو امن والا شہر بنا دیا۔ اب حرم کی حدود میں کسی کا خون بہانا، اس کے درختوں کو کاٹنا، شکار کو بھگانا وغیرہ جائز نہیں اور رزق کی وہ فراوانی فرمائی کہ مکہ میں کھیتی باڑی نہ ہونے کے باوجود وہاں سارا سال دنیا بھر کے تازہ پھل اور ہر قسم کا غلہ اتنی فراوانی سے ملتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت آنکھوں سے نظر آتی ہے۔

2 اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے امامت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا، اب ابراہیم علیہ السلام نے رزق کی دعا ظالموں کو نکال کر صرف ایمان والوں کے لیے کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں دنیاوی رزق کفار

وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

اور جب ابراہیم اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہا تھا اور اسماعیل بھی۔ اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما، بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے دکھا اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی نہایت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اے ہمارے رب! اور ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انھیں کتاب و حکمت سکھائے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

---

کو بھی دوں گا، البتہ آخرت میں ان کے لیے عذاب ہے۔ معلوم ہوا دنیا میں کسی کے پاس رزق کی کثرت اس پر اللہ تعالیٰ کے خوش اور راضی ہونے کی دلیل نہیں۔

**آیت 127** "اَلۡقَوَاعِدَ" بنیادیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یعنی بیت اللہ کی وہ بنیادیں جو اس سے پہلے موجود تھیں۔ [ تفسیر عبد الرزاق بسند صحیح ] اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ پہلے تعمیر ہو چکا تھا، اب از سر نو اس کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ سورۂ حج (۲۶) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین فرمائی۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۶) اس کے بعد بیت اللہ کئی دفعہ تعمیر ہوا۔ جاہلیت میں جب سیلاب سے کعبہ منہدم ہو گیا تو قریش نے دوبارہ اس کی تعمیر کی، مگر مال کی کمی کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ باہر چھوڑ دیا، جسے حطیم کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے لیے پتھر اٹھا کر لاتے رہے۔ ابن اسحاق کے مطابق آپ کی عمر اس وقت ۳۵ سال تھی، پھر آپ ہی نے قریش کے جھگڑے میں حجر اسود کا فیصلہ فرمایا اور اسے اس کے مقام پر اپنے دست مبارک سے رکھا۔ دور اسلام میں پہلی مرتبہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اسے ابراہیم علیہ السلام والی بنیادوں پر تعمیر کیا، اس کے بعد عبد الملک کے دور خلافت میں حجاج بن یوسف نے اسے گرا کر دوبارہ اسی طرح بنا دیا جس طرح جاہلیت میں بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد مختلف بادشاہ اسی عمارت کی مرمت و تزئین کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کعبہ کو حبشیوں میں سے ایک پتلی پنڈلیوں والا برباد کرے گا۔'' [ بخاری، الحج، باب قول اللہ تعالی : ﴿ جعل الله الكعبة …… ﴾ : ۱۵۹۱۔ مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة …… : ۵۸/ ۲۹۰۹ ]

**آیت 129** یہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا خاتمہ ہے۔ "رَسُوۡلًا" سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا نبی نہیں ہوا۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عرض کیا کہ آپ ہمیں اپنے متعلق بتائیں،

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

اور کون ہے جو ابراہیم کی ملت سے بے رغبتی کرے گا، سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا لیا، اور بے شک ہم نے اسے دنیا میں چن لیا اور بلاشبہ وہ آخرت میں یقیناً صالح لوگوں سے ہے ﴿۱۳۰﴾ جب اس سے اس کے رب نے کہا فرماں بردار ہو جا، اس نے کہا میں جہانوں کے رب کے لیے فرماں بردار ہو گیا ﴿۱۳۱﴾

تو آپ نے فرمایا: ''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور میری والدہ کو جب میرا حمل ٹھہرا تو انھوں نے دیکھا کہ ان (کے بدن) سے ایک نور نکلا جس سے بصریٰ روشن ہو گیا اور بصریٰ شام کی سرزمین سے ہے۔'' (مستدرک: ۲/۶۰۱، ح: ۴۱۷۶) اسے امام حاکم نے روایت کیا اور امام ذہبی نے صحیح کہنے میں ان کی موافقت کی۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا۔ (سلسلہ صحیحہ: ۱۵۴۵) شام کی تخصیص اس لیے ہے کہ آخر زمانہ میں شام ہی اسلام کا مرکز بنے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی شام میں ہو گا اور حدیث میں جس گروہ کے قیامت تک حق پر رہنے کی خبر دی گئی ہے وہ بھی شام میں ہو گا۔ ابن کثیر میں صحیح بخاری کے حوالے سے ہے: « وَهُمْ بِالشَّامِ » ''وہ شام میں ہوں گے۔'' (بخاری: ۳۶۴۱، ۷۴۶۰) '' الْكِتٰبَ '' سے مراد قرآن مجید اور ''الْحِكْمَةَ'' سے مراد حدیث پاک ہے اور اسلام کے بنیادی اصول یہی دو ہیں۔ پاک کرنے سے مراد شرک اور گناہوں سے پاک کرے اور اطاعت و اخلاص کی تعلیم دے۔ ''اِنَّكَ اَنْتَ'' ضمیر مکرر لانے کے علاوہ ''الْعَزِيْزُ'' پر الف لام سے دوہرا حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ''تو ہی'' ترجمہ کیا گیا۔

**آیت 130** ❶ ''رَغِبَ يَرْغَبُ'' کے بعد اگر ''فِيْ'' آئے تو اس کا معنی کسی چیز میں رغبت رکھنا اور اگر ''عَنْ'' آئے تو اس کا معنی بے رغبتی ہوتا ہے۔

❷ ''مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ'' کی وضاحت اگلی آیات میں آ رہی ہے، یعنی ایک اللہ کی عبادت اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے تابع فرمان کر دینا۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید ہے کہ وہ تینوں ملتِ ابراہیم کے دعوے دار تھے، مگر عملاً اس سے بالکل بے رغبت، بلکہ شدید مخالف تھے، انھوں نے اس میں شرک و بدعت کو شامل کر کے اپنا الگ الگ طریقہ بنا لیا تھا۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا رکھا تھا، نصرانی تین خدا مانتے تھے، صلیب کی پرستش اس پر مزید تھی اور مشرکین عرب نے بت پرستی اختیار کر لی تھی۔ یہود و نصاریٰ کی کچھ بدعات و خرافات کا آئندہ آیات میں ذکر آ رہا ہے۔

❸ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ : بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں چن لیا اور جو آخرت میں صالحین میں شامل ہوں گے، وہی شخص بے رغبتی کرے گا جو عقل کو جواب دے کر اپنے آپ کو بے وقوف بنا لے۔

**آیت 131** ''اَسْلَمَ يُسْلِمُ'' کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا اور وہی کرنا جو وہ کہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لیے اپنے مسلم ہونے کا اقرار کیا اور وجہ بھی ذکر فرمائی کہ رب العالمین ہونے کی وجہ سے یہ حق اسی کا ہے۔

وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

اور اسی کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی اور یعقوب نے بھی۔ اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمھارے لیے یہ دین چن لیا ہے، تو تم ہرگز فوت نہ ہونا مگر اس حال میں کہ تم فرماں بردار ہو ﴿۱۳۲﴾ یا تم موجود تھے جب یعقوب کو موت پیش آئی، جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے، جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے لیے فرماں بردار ہیں ﴿۱۳۳﴾ یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۳۴﴾

**آیت 132** "الدِّيْنَ" سے مراد یہاں اسلام ہے، کیونکہ پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے اسی دین کو اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ مسلم ہونے کی حالت میں فوت ہونا اسی وقت ممکن ہے جب بندہ ہر وقت مسلم، یعنی تابع فرمان رہے، کبھی کوتاہی ہو تو فوراً توبہ کرے، کیونکہ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو اپنے اور اپنی اولاد سے متعلق آخری وقت مسلم ہونے کی بہت فکر رہتی تھی، کیونکہ اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے، حدیث ہے: (( إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ )) [ بخاري، القدر، باب العمل بالخواتيم : ٦٦٠٧ ] یوسف علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ يوسف : ١٠١ ] "مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔" اگرچہ آخر وقت مسلمان ہونا بندے کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جو آدمی دلی لگاؤ کے ساتھ نیک و بد جو بھی راستہ اختیار کرتا ہے اور اس پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اسی کی توفیق دے دی جاتی ہے۔ دیکھیے سورۂ لیل (۵ تا ۱۰)۔

**آیت 132** ان آیات میں بھی یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ مکہ کی تردید ہے جو اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ان کا دین بھی یہودیت، نصرانیت یا بت پرستی تھا۔ قرآن مجید نے بتایا کہ تم ان بزرگوں پر بہتان باندھ رہے ہو، ان کا دین بھی یہی اسلام تھا جس میں توحید اور اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے۔

**آیت 134** یہود کو تنبیہ ہے کہ وہ انبیاء اور صلحاء کی طرف اپنی نسبت پر مغرور نہ ہوں، یہ نسبت تمھارے کچھ کام نہ آ سکے گی، بلکہ نجات کا دارومدار انسان کے اپنے اعمال پر ہے، ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے اور تمھارے اعمال تمھارے ساتھ ہوں گے۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

اور انھوں نے کہا یہودی ہو جاؤ، یا نصرانی ہدایت پا جاؤ گے، کہہ دے بلکہ (ہم) ابراہیم کی ملت (کی پیروی کریں گے) جو ایک اللہ کا ہونے والا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا﴿۱۳۵﴾

آیت 135 ❶ اہلِ کتاب مسلمانوں کو یہودیت اور نصرانیت کی دعوت دیتے اور ہدایت کو اپنے دین میں منحصر مانتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن صوریا (یہودی) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، ہدایت صرف وہ ہے جس پر ہم ہیں، اس لیے آپ ہماری پیروی کریں تو ہدایت پا جائیں گے اور نصرانیوں نے بھی ایسے ہی کہا، اس پر یہ آیت اتری۔ (ابن کثیر بسند حسن) یعنی آپ کہہ دیں ہم تو ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کریں گے، جو حنیف اور مسلم تھے، یعنی تمام گروہوں اور آباء و اجداد کے طریقوں سے ہٹ کر ایک اللہ کی طرف ہو کر پوری طرح اس کے تابع فرمان تھے اور مشرک نہ تھے۔ ان کا دین حق پر ہونا تم بھی مانتے ہو۔ تمھارا حال یہ ہے کہ تم ایک طرف شرک میں گرفتار ہو کہ عزیر اور مسیح علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ کے بیٹے مانتے ہو، کبھی تین خدا مانتے ہو، کبھی صلیب کی پوجا کرتے ہو۔ دوسری طرف تم وحی الٰہی کی پیروی کے بجائے احبار و رہبان کی تقلید میں گرفتار ہو کر فرقوں میں بٹے ہوئے ہو۔ تم ہدایت پر ہونے کا دعویٰ کس منہ سے کرتے ہو؟ افسوس! اب مسلمانوں کی اکثریت کا بھی یہی حال ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے ملت حنفی کو ترک کر کے چند رسوم و بدعات، خرافات اور شرکیہ اعمال کی پابندی کو دینِ ہدایت سمجھ رکھا تھا، اسی طرح انھوں نے بھی قرآن و سنت کو ترک کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدتوں بعد آنے والے بزرگوں کی تقلید کو، جو نبی بھی نہیں تھے، واجب قرار دیا۔ اللہ کے بجائے غیر اللہ سے مانگنے کو، حج کے بجائے بزرگوں کے مقبروں پر جانے کو اور نماز، روزہ، زکوٰۃ ترک کر کے خود ساختہ اوراد و وظائف اور چلہ کشی کو اللہ کے قرب کا ذریعہ قرار دیا، اگر کوئی توحید اور قرآن و سنت کی دعوت دے تو اسے بے دین اور گمراہ قرار دیا۔

❷ اسلام دراصل عقائد اور اصول کے مجموعے کا نام ہے، یعنی توحید کا عقیدہ اور وحیٔ الٰہی کا اتباع۔ دین اور ملت سے بھی یہی مراد ہے۔ تمام انبیاء ایک ہی دین و ملت یعنی اسلام کے پیروکار تھے، اگر کچھ اختلاف ہے تو بعض احکام میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلاَّتٍ، أُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَ دِيْنُهُمْ وَاحِدٌ » ''تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں، ان کی مائیں (یعنی شریعتیں) مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔'' [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالٰی ﴿ واذکر ...... ﴾ : ۳۴۴۳، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ] اس لحاظ سے دین محمدی بھی ملت ابراہیم ہی ہے، یہودیت اور نصرانیت ملتِ ابراہیم سے خارج ہیں، کیونکہ وہ توحید الٰہی کے بجائے شرک میں اور وحیٔ الٰہی کی پیروی کے بجائے تقلید یعنی احبار و رہبان کی پیروی میں گرفتار ہو گئے اور تورات و انجیل پر عمل چھوڑ بیٹھے، اگر وہ واقعی مسلم ہوتے تو تورات اور انجیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات موجود ہونے کی وجہ سے آپ پر ایمان لے آتے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۶۴ تا ۶۸)۔

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ؕ

کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۱۳۶﴾ پھر اگر وہ اس جیسی چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے اور اگر پھر جائیں تو وہ محض ایک مخالفت میں (پڑے ہوئے) ہیں، پس عنقریب اللہ تجھے ان سے کافی ہو جائے گا اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۳۷﴾

**آیت 136** ① **وَالْاَسْبَاطِ:** یہ "سِبْطٌ" کی جمع ہے، جس کا معنی آسانی سے پھیلنا ہے۔ اولاد کی اولاد کو بھی اسی پھیلاؤ کی وجہ سے "سِبْطٌ" کہتے ہیں۔ (مفردات) یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، ان کی اولاد کے بارہ قبائل "الْاَسْبَاطِ" کہلاتے ہیں۔ "الْاَسْبَاطِ" پر الف لام کی وجہ سے ''اس کی اولاد'' اور "وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ" میں "لَهٗ" پہلے آنے کی وجہ سے ''ہم اسی کے فرماں بردار ہیں'' ترجمہ کیا گیا ہے۔

② اس آیت میں مسلمانوں کو اصل ہدایت اور ایمان کی تعلیم دی گئی ہے، یعنی قرآن پاک سے پہلے جتنی آسمانی کتابیں اور جتنے انبیاء و رسل آئے، جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں اور بعض کے نہیں آئے، سب پر مجملاً ایمان لایا جائے کہ وہ سب حق ہیں۔ ان کے درمیان فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو مان لیا کسی کو نہ مانا، جیسے یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کو اور نصرانیوں نے آخری پیغمبر ﷺ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ تفصیلی ایمان صرف قرآن پر ضروری ہے، یعنی اس کے ہر حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا، کیونکہ ① قرآن پاک آنے سے پہلی تمام کتابیں منسوخ ہو گئیں۔ ② پہلے تمام پیغمبر خصوصاً اپنی قوم کی طرف آتے تھے، جب کہ رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے۔ دیکھیے سورۂ سبا (۲۸)۔ ③ پھر پہلی کوئی آسمانی کتاب محفوظ نہیں رہی، بلکہ ان میں تحریف ہو گئی، جب کہ قرآن مجید ہر طرح سے محفوظ ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات عبرانی میں پڑھتے، پھر اہل اسلام کے لیے عربی میں اس کی تفسیر کرتے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اہل کتاب کو نہ سچا کہو اور نہ انھیں جھوٹا کہو، بلکہ یوں کہو: ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ [ البقرۃ : ۱۳٦ ] [ بخاری، التفسیر، باب ﴿قولوا امنا بالله ......﴾ : ٤٤٨٥ ]

**آیت 137** ① **شِقَاقٍ:** یہ "شِقٌّ" میں سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، یعنی بعض کا ایک شق میں اور بعض کا دوسری شق میں ہو کر مقابلے میں آ جانا۔

② یعنی یہ لوگ ان چیزوں پر ایمان لائیں جن پر تم ایمان لائے ہو، جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہے، تو واقعی وہ ہدایت یافتہ

صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ۫ وَّ نَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلۡ اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِی اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمۡ ۚ وَ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ۚ وَ نَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا

اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور رنگ میں اللہ سے بہتر کون ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں ﴿۱۳۸﴾ کہہ دے کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ وہی ہمارا رب اور تمھارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال اور ہم اسی کے لیے خالص کرنے والے ہیں ﴿۱۳۹﴾ یا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد یہودی تھے یا عیسائی؟ کہہ دے کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ؟ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے وہ شہادت چھپالی جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے تھی اور اللہ ہرگز اس سے

ہوں گے اور اگر وہ منہ موڑیں تو محض مخالفت اور ضد کی وجہ سے ایسا کریں گے۔

③ اس وعدے کے مطابق واقعی اللہ تعالیٰ آپ کو ان سے کافی ہو گیا، بنو نضیر اور بنو قینقاع مدینہ سے نکالے گئے، بنو قریظہ قتل ہوئے اور بالآخر تمام یہود و نصاریٰ پورے جزیرۂ عرب سے جلا وطن کر دیے گئے۔

**آیت 138** ① "صِبۡغَةَ اللّٰهِ" اس پر نصب فعل امر " اِلۡزَمُوۡا " کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے، یعنی اللہ کا رنگ اختیار کرو اور مضارع " نَلۡتَزِمُ " کے ساتھ بھی، یعنی ہم اللہ کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔

② اس آیت میں ''اللہ کے رنگ'' سے مراد دین اسلام یا وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کو "صِبۡغَةَ اللّٰهِ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ نے نصرانیت کے لیے ایک زرد رنگ کا پانی مقرر کر رکھا تھا، جب کوئی بچہ پیدا ہوتا یا کوئی شخص ان کے دین میں داخل ہوتا تو اس کو اس پانی سے غسل دیتے اور کہتے کہ یہ اب پاک اور صحیح معنوں میں نصرانی ہوا ہے۔ اس رسم کا نام ان کے ہاں معمودیہ یا بپتسما دینا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ سب سے بہتر رنگ ''اللہ کا رنگ'' یعنی دین اسلام ہے، جسے نوح علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء علیہم السلام لے کر مبعوث ہوئے ہیں، تمھیں چاہیے کہ اس کی پابندی کرو۔

**آیت 139** یہود مسلمانوں سے جھگڑتے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہوئے ہیں، پھر یہ آخری نبی عرب سے کیسے مبعوث ہو گئے؟ ہمارا دین سب سے بہتر اور تمام انبیاء کا دین ہے، تو اس آیت میں ان کی تردید فرمائی گئی ہے کہ ہمارا تمھارا سب کا رب ایک ہے اور ہم عبادت میں مخلص بھی ہیں، پھر تمھارا یہ کہنا کہ ہم بہتر ہیں، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

**آیت 140** یہودیت اپنے موجودہ نظریات و عقائد کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد اور نصرانیت اپنے مخصوص نظریات و

اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَلَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾

ع ۱۶

غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴۱﴾

عقائد کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد وجود میں آئی۔ یہود و نصاریٰ کے عالم لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد اس یہودیت و نصرانیت سے، بلکہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے بھی بہت پہلے ہو گزرے ہیں، مگر یہود و نصاریٰ کے ان علماء نے عوام کے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی تھی کہ یہ تمام انبیاء یہود کے قول کے مطابق یہودی تھے اور نصاریٰ کے قول کے مطابق نصرانی تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علمائے یہود و نصاریٰ کی اس بددیانتی کو ظاہر فرمایا ہے اور شہادت چھپانے کے مجرم قرار دے کر سب سے بڑے ظالم قرار دیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے اس فعل کی مثال امتِ مسلمہ میں ایسے ہے جیسے کوئی مسلم عالم عوام کو یہ باور کروائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقہ حنفی یا فقہ شافعی کے مطابق فیصلے فرماتے تھے، حالانکہ اسے خوب معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد پیدا ہوئے اور وہ نبی بھی نہیں تھے کہ ان کی بات حجت ہو۔

**آیت 141** اس آیت میں دوبارہ تنبیہ فرمائی کہ نجات کا تعلق تو اپنی کمائی اور اپنے عمل پر ہے، اگر نجات چاہتے ہو تو ان انبیاء و صالحین کی طرح خود عمل کرو، ورنہ محض ان کی طرف نسبت اور ان کی کرامتیں بیان کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَنۡ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمۡ يُسۡرِعۡ بِهِ نَسَبُهُ » [ مسلم، الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع ...... : ۲۶۹۹، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ] ''جس کے عمل نے اسے پیچھے رکھا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔''

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ

عنقریب لوگوں میں سے بے وقوف کہیں گے کس چیز نے انھیں ان کے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے؟ کہہ دے اللہ ہی کے لیے مشرق و مغرب ہے، وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے﴿۱۴۲﴾ اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر شہادت دینے والا بنے اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تو تھا، مقرر نہیں کیا تھا مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کون اس رسول کی پیروی کرتا ہے، اس سے

آیت 142 ① براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر آپ کو بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا۔ [ بخاري، أخبار الآحاد، باب ما جاء في إجازة …… : ۷۲۵۲ ]

② اس پر یہود، منافقین اور مشرکین سبھی نے اعتراضات شروع کر دیے کہ اگر وہ پہلا قبلہ درست تھا تو اسے بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر یہ درست ہے تو اتنی دیر بیت المقدس قبلہ کیوں رہا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ لوگ بے وقوفی کی وجہ سے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں، مشرق یا مغرب کی اپنی کچھ حیثیت نہیں کہ ان کی طرف منہ کرنا باعث ثواب ہو، بلکہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرماں برداری ہے، کیونکہ مشرق و مغرب دونوں کا مالک وہی ہے۔ وہ جب چاہے، جدھر چاہے منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے سکتا ہے۔ تمھارا کام حکم ماننا ہے، کیونکہ صراط مستقیم وہی ہے جس کا وہ حکم دے، مگر اس پر چلنے کی توفیق وہ جسے چاہے دیتا ہے، جو توفیق سے محروم ہیں وہ بے وقوفی سے بے کار باتیں بناتے رہتے ہیں، اس آیت: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ …… ﴾ [ البقرة : ۱۷۷ ] میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔

آیت 143 ① وسط کا معنی درمیان ہے، افضل چیز کو بھی وسط کہہ لیتے ہیں، کیونکہ درمیانی چیز سب سے بہتر ہوتی ہے۔ یہاں مراد سب سے بہتر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ [ آل عمران : ۱۱۰ ] ''تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی۔'' کیونکہ دو نقطوں کے درمیان سب سے مختصر اور صحیح خط مستقیم ہی ہوتا ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا معنی یہاں ''عدل'' روایت کیا ہے۔ [ بخاري، التفسير : ٤٤٨٧ ] عدل کا معنی ثقہ اور قابل اعتماد بھی ہے، اعتقاد و اخلاق اور اعمال میں معتدل اور پہلی امتوں کی افراط و تفریط سے پاک بھی۔ نہ یہاں یہود کی سختی ہے نہ نصاریٰ کی نرمی۔ ( کبیر، قرطبی )

② وَكَذٰلِكَ …… : یعنی جس طرح یہ دو باتیں تمھارے پاس پوری ہیں اور تمھارے مخالفوں کے پاس ناقص، ایک یہ کہ تم تمام انبیاء کو مانتے ہو اور یہود و نصاریٰ کسی کو مانتے ہیں کسی کو نہیں، دوسری یہ کہ تمھارا قبلہ کعبہ ہے، جو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے مقرر

اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡهِ ؕ وَ اِنۡ كَانَتۡ لَكَبِیۡرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیۡنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴۳﴾

(جدا کر کے ) جو اپنی دونوں ایڑیوں پر پھر جاتا ہے اور بلاشبہ یہ بات یقیناً بہت بڑی تھی مگر ان لوگوں پر جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر یقیناً بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴۳﴾

ہے اور ابراہیم علیہ السلام سب کے پیشوا ہیں، یہود و نصاریٰ اور ان کے قبلے بعد کی بات ہیں۔ اسی طرح ہم نے تمھیں ہر کام میں افضل امت بنا دیا ہے۔ اس لیے اب تمھارا کام ہے کہ تم دوسروں کی راہنمائی کرو، ان کا کام نہیں کہ تمھاری راہنمائی کریں۔ (موضح)

③ لِتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ...... : اس سے تین طرح کی شہادت مراد ہے، پہلی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہادت دیں گے کہ انھوں نے صحابہ تک پیغام حق پہنچا دیا، صحابہ تابعین پر اور اسی طرح امت کا ہر طبقہ آنے والوں پر یہ شہادت دے گا۔ اس امت کے افضل ہونے کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ آل عمران (۱۱۰) میں فرمایا: ﴿ كُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ ﴾، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا: ''اے لوگو! تم اللہ کے سامنے ننگے پاؤں، ننگے جسم اور بغیر ختنہ کے اکٹھے کیے جانے والے ہو۔'' پھر فرمایا: ''اور میری امت کے کچھ لوگوں کو بائیں طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا، پروردگارا! یہ تو میرے ساتھی ہیں، تو کہا جائے گا، آپ نہیں جانتے انھوں نے آپ کے بعد کیا نیا کام کیا تھا۔ تو میں کہوں گا جیسے صالح بندے (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا تھا: ﴿ وَ كُنۡتُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ اَنۡتَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴾ [ المائدۃ : ۱۱۷ ] ''اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و کنت علیھم شھیدًا ...... ﴾ : ٤٦٢٥ ] یہی بات جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھی: ''کیا میں نے (اللہ تعالیٰ کا) پیغام (آپ لوگوں تک) پہنچا دیا؟'' تو سب نے کہا: ''بے شک آپ نے پہنچا دیا۔'' [ بخاری، الحج، باب الخطبة أیام منی : ۱۷٤۱ ]

اب ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ یہ پیغام آنے والوں تک پہنچائے، تبھی وہ ان پر شہادت دے سکے گا اور تبھی وہ امتِ وسط کہلانے کا حق دار ہوگا اور جو امتِ مسلمہ کی تمام گمراہی دیکھ کر بھی خاموش رہے گا وہ نہ گواہی دے سکے گا اور نہ امتِ وسط کا مصداق ہوگا۔ دوسری وہ شہادت ہے جو امتِ مسلمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے خبر دینے کی بنا پر پہلی تمام امتوں پر دے گی کہ ان کے انبیاء نے اللہ کے احکام ان تک پہنچا دیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نوح علیہ السلام اور ان کی امت آئے گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تم نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ عرض کریں گے، ہاں اے میرے رب! پھر ان کی امت کو فرمائے گا، کیا انھوں نے تمھیں پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ کہیں گے، نہیں! ہمارے پاس تو کوئی نبی آیا ہی نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نوح (علیہ السلام) سے فرمائے گا،

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ

یقیناً ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں، تو یقیناً ہم تجھے اس قبلے کی طرف ضرور پھیر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے، سو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے اور تم جہاں بھی ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لو

---

تمھاری شہادت کون دے گا؟ وہ عرض کریں گے، محمد (ﷺ) اور ان کی امت، پھر ہم شہادت دیں گے کہ یقیناً انھوں نے پیغام پہنچا دیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول الله عزوجل : ﴿ ولقد أرسلنا ...... ﴾ : ٣٣٣٩، ٤٤٨٧، عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ ]

تیسری شہادت دنیا ہی میں مسلمانوں کی کسی کے حق میں نیک یا بد ہونے کی شہادت ہے، جس کی بنا پر نبی ﷺ نے ایک جنازے کے لیے جنت اور دوسرے کے لیے جہنم واجب ہونے کا اعلان فرمایا اور فرمایا: « أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ » ''تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔'' [ بخاری، الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت : ١٣٦٧ ]

④ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ ...... : یہ تحویلِ قبلہ کی ایک حکمت بیان فرمائی ہے۔ قریش کو بطور قبلہ بیت اللہ عزیز تھا اور اہلِ کتاب کو بیت المقدس۔ پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر کے قریش اور ان کے ساتھیوں کی آزمائش ہوئی، پھر بیت اللہ کو مقرر کر کے اہل کتاب کی۔ اپنے محبوب قبلہ کو نبی ﷺ کی فرماں برداری میں ترک کرنا ہدایت یافتہ لوگوں کے سوا دوسروں کے لیے نہایت مشکل تھا، اس لیے جنھیں یہ ہدایت نصیب نہ تھی وہ ڈگمگا گئے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے جس قبلے کی طرف آپ رخ کرتے تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا، اگرچہ قرآنِ مجید میں اس حکم کا ذکر نہیں ہے۔ یہ دلیل ہے کہ آپ ﷺ پر قرآن مجید کے علاوہ بھی احکام نازل ہوتے تھے، جنھیں وحیِ خفی یا حدیث کہا جاتا ہے اور انھیں ماننا بھی قرآن کی طرح فرض ہے۔

⑤ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ : براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تحویل قبلہ سے قبل کئی آدمی پہلے قبلے کے زمانے میں قتل ہو کر فوت ہو چکے تھے، ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ ہم ان کے متعلق کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ ''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔'' یعنی تمھاری پہلی نمازیں اللہ کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ [ بخاری، الإیمان، باب الصلاۃ من الإیمان : ٤٠ ] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو ایمان قرار دیا۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ صرف دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کو ایمان قرار دیتے ہیں ان کی بات درست نہیں، بلکہ اعمال بھی ایمان کا جزو ہیں اور نماز اور زکوٰۃ تو ایسا جزو ہیں جن کے بغیر بندہ اسلامی برادری ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ کا حصہ ہی نہیں بنتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ [ التوبۃ : ١١ ] ''پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔'' اور جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَ بَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ » [ مسلم، الإیمان، باب بیان إطلاق اسم ...... : ٨٢ ] ''آدمی کے درمیان اور شرک و کفر کے درمیان (فرق) نماز کا چھوڑنا ہے۔''

آیت 144 ① فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : یہ قبلہ بدلنے کا اصل حکم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں کہ بے شک ان کے رب کی طرف سے یہی حق ہے اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو وہ کر رہے ہیں۔﴿۱۴۴﴾

---

قرآن میں پہلا نسخ قبلے کا ہے۔ [ابن أبی حاتم عن ابن أبی طلحۃ، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے سولہ یا سترہ ماہ نماز پڑھی اور آپ کو پسند یہ تھا کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو اور آپ نے پہلی نماز (بیت اللہ کی طرف ) عصر کی نماز پڑھی۔ [ بخاری، التفسیر، باب قولہ تعالٰی : ﴿ سیقول السفھاء ...... ﴾ : ۴۴۸۶ ]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کا قبلہ ہونا اس قدر پسند تھا کہ قبلہ بدلنے کی امید میں بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ واضح رہے کہ بیت المقدس شام میں ہے اور یہ مدینہ سے شمال کی طرف ہے اور بیت اللہ اس کے بالکل مخالف جنوب کی طرف ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک صاحب آئے، انھوں نے کہا، آج رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اترا ہے اور آپ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا تم بھی اس کی طرف منہ کر لو۔ ان کا رخ شام کی طرف تھا تو انھوں نے گھوم کر کعبہ کی طرف منہ کر لیا۔ [ بخاری، التفسیر، باب ﴿ ولئن أتیت الذین ...... ﴾ : ۴۴۹۰ ] اس سے صحابہ کا حدیث رسول بلکہ قرآن کریم کے ثبوت کے لیے ایک معتبر آدمی کی خبر (یعنی خبر واحد ) پر اعتماد اور اس پر فوری عمل ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ بعض احادیث کو خبر واحد کہہ کر رد کر دیتے ہیں انھیں غور کرنا چاہیے۔

② **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ**: سفر میں نفل نماز، کشتی میں نماز، حالتِ جنگ میں نماز یا جسے قبلہ معلوم نہ ہو سکے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، وہ جدھر منہ کر کے نماز پڑھ سکیں پڑھ سکتے ہیں، فرمایا: ﴿ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾ [ البقرۃ : ۱۱۵ ] ”تو تم جس طرف رخ کرو، سو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔“ البتہ سفر میں اگر ممکن تو سواری کا رخ قبلہ کی طرف کر کے نفل نماز شروع کر لی جائے، اس کے بعد سواری کا رخ جدھر بھی ہو، مضائقہ نہیں۔ انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کرتے اور نفل پڑھنے کا ارادہ کرتے تو اپنی اونٹنی کا رخ قبلہ کی طرف کر کے تکبیر کہتے، پھر سواری آپ کا رخ جدھر کو بھی کرتی نماز پڑھتے رہتے۔ [ أبو داوٗد، صلاۃ السفر، باب التطوع علی الراحلۃ : ۱۲۲۵، و حسنہ الألبانی ]

③ **لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ**: یعنی یہود کو اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کی بنا پر خوب علم ہے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ مسجد حرام ہو گا، مگر وہ کفر و عناد اور حسد کی بنا پر چھپا رہے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ لوگ (اہل کتاب ) ہم پر کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا جمعہ کے دن پر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے اور اس قبلہ پر جس کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے اور امام کے پیچھے ہمارے آمین کہنے پر۔“ [ أحمد : ۶/۱۳۵، ح : ۲۵۰۸۲، إسنادہ صحیح ]

وَلَىِٕنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور یقیناً اگر تو ان لوگوں کے پاس جنھیں کتاب دی گئی ہے، ہر نشانی بھی لے آئے وہ تیرے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تو کسی صورت ان کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے اور نہ ان کا بعض کسی صورت بعض کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے اور یقیناً اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو تیرے پاس آیا ہے، تو بے شک تو اس وقت ضرور ظالموں سے ہوگا ﴿۱۴۵﴾

آیت 145 ① مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ : یعنی وہ کعبہ کے قبلہ ہونے کو خوب جانتے ہیں، مگر ان کا عناد اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آپ اس کی حقانیت پر خواہ دنیا بھر کے دلائل پیش کر دیں وہ آپ کے قبلہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔

② وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ : اور آپ بھی وحیِ الٰہی کے پابند ہونے کی وجہ سے ان کے قبلہ کو اختیار نہیں کر سکتے۔ "بِتَابِعٍ" میں باء کے ساتھ نفی کی تاکید ہو گئی، اس لیے ترجمہ "اور نہ تو کسی صورت ......" کیا گیا ہے۔

③ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ ...... : اور ان کے باہمی عناد کا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو پسند نہیں کرتے۔ یہود صخرۂ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں اور نصاریٰ بیت المقدس کی مشرقی جانب۔ (قرطبی)

④ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ ......: "اَهْوَاءٌ" کی واحد "هَوًى" ہے جس کا معنی خواہش نفس ہے۔ قرآن وسنت کی پیروی تو ﴿ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے علم کی پیروی ہے، اس کے سوا دین میں جو بھی شامل کیا جائے وہ انسانی خواہش کی پیروی ہے، خواہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے آئے، یا ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے، یا مسلمان اپنے پاس سے ایجاد کر لیں، سب خواہش کی پیروی ہے۔ اس لیے علمائے اسلام اہل بدعت کو عام طور پر "اہل اہواء" کہتے ہیں۔ صاحب کشاف نے ذکر فرمایا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے منع کرنے کی تاکید کئی وجوہ کی بنا پر کی گئی ہے۔ صاحب کشاف نے دس وجوہ سے اس تاکید کی تفصیل بیان کی ہے۔ مزید دیکھیے تفسیر ابن عاشور۔

اس آیت میں اگرچہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے مگر مراد امت ہے، علماء اور عوام سب اس میں شامل ہیں، کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ ایسا کریں تو آپ سے کہا جائے: ﴿ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ تو امتی تو ایسا کرنے سے بالاولیٰ ظالموں میں سے ہوں گے۔ پھر کیا حال ہوگا ان عالموں کا جو منع کرنے کے بجائے تیجے، ساتے، چالیسویں، میلاد، تعزیے، عرس اور قوالی وغیرہ میں شرکت کرتے، خود ساختہ وظیفے کرتے، بعض وظیفوں میں قطب کی طرف رخ کرتے اور قبلے کی طرح اس کی تعظیم کرتے اور ان کاموں کو باعث ثواب قرار دیتے ہیں!

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی، اسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بے شک ان میں سے کچھ لوگ یقیناً حق کو چھپاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۱۴۶﴾ یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے، پس تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو ﴿۱۴۷﴾ اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، جس کی طرف وہ منہ پھیرنے والا ہے، سو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، تم جہاں کہیں ہو گے اللہ تمھیں اکٹھا کر کے لے آئے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۴۸﴾

**آیت 146** اوپر کی آیت میں بیان ہو چکا ہے کہ اہل کتاب کعبہ کے قبلہ برحق ہونے کو خوب جانتے تھے، مگر ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ قبلہ کی طرح اہل کتاب کو رسول اللہ ﷺ کے نبی آخر الزماں ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے، مگر پھر بھی ان میں سے اہل علم کا ایک گروہ حق کو چھپا رہا ہے۔ ایک گروہ اس لیے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے بعض علماء جیسے (یہود میں سے) عبد اللہ بن سلام (اور نصاریٰ میں سے) تمیم داری اور صہیب رضی اللہ عنہم وغیرہ وہ بھی تھے جو آپ ﷺ کے نبی صادق ہونے کو پہچاننے کے بعد مسلمان ہو گئے تھے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

**آیت 147** ① "اَلْحَقُّ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "یہ حق" کیا گیا ہے، یعنی یہ حق جسے یہود و نصاریٰ چھپا رہے ہیں آپ کے رب کی طرف سے ہے، اس لیے آپ کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہوں۔

② اَلْمُمْتَرِيْنَ : یہ "اِمْتِرَاءٌ" یعنی باب افتعال سے اسم فاعل کی جمع ہے، مصدر "مِرْيَةٌ" (بمعنی شک) سے فعل مجرد نہیں آتا، بلکہ ہمیشہ باب افتعال سے آتا ہے۔ (ابن عاشور)

**آیت 146** ① وِجْهَةٌ : وہ جگہ جس طرف منہ کیا جائے۔ اس کا وزن "فِعْلَةٌ" ہے، جو اس "فِعْلٌ" کا مؤنث ہے جو بمعنی مفعول ہے، جیسے "ذِبْحٌ" بمعنی "مَذْبُوْحٌ" (ابن عاشور)

② اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ اگرچہ کعبہ تھا، مگر بعد میں ہر ایک نے اپنی اپنی مرضی سے کسی نہ کسی سمت کو اپنا قبلہ مقرر کر لیا۔ چنانچہ یہود نے بیت المقدس کے صخرہ کو قبلہ قرار دے لیا اور نصاریٰ نے بیت المقدس کی مشرقی جانب کو۔ اب تمھارے لیے کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا گیا ہے، اس لیے ان لوگوں سے اس بحث کا کوئی خاص فائدہ نہیں کہ کون سی سمت افضل ہے۔ اصل چیز نیکیوں میں سبقت ہے، اس کا اہتمام کرو، کیونکہ تم جہاں بھی ہو گے تمھیں اللہ کے حضور پیش ہونا پڑے گا، جیسا کہ فرمایا: "نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور

وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾ وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡكُمۡ حُجَّةٌ ٭ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ ٭ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَ اخۡشَوۡنِیۡ ٭ وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡكُمۡ وَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ۙ

اور تو جہاں سے نکلے سو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے اور بلاشبہ یقیناً یہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ ہرگز اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۹﴾ اور تو جہاں سے نکلے سو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے اور تم جہاں کہیں ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لو، تاکہ لوگوں کے پاس تمھارے خلاف کوئی حجت نہ رہے، سوائے ان کے جنھوں نے ان میں سے ظلم کیا ہے، سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور تاکہ میں❶ اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۱۵۰﴾

---

مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگ دستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں۔“ [ البقرۃ : ۱۷۷ ] نیکیوں میں سبقت میں نماز کو وقت پر ادا کرنا، پہلی صف میں پہلی تکبیر کے ساتھ شامل ہونا، اسی طرح جہاد کی اولین صفوں میں پہنچنا بھی شامل ہے۔

**آیت 149** یعنی فرض نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ایسا حکم ہے کہ سفر میں بھی اس کا اہتمام ضروری ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ سفر کی مشقت کی بنا پر یہاں تخفیف ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَ اِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ﴾ اس حکم کی تاکید کے لیے ہے اور ﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ اس کی مخالفت سے ڈرانے کے لیے ہے، تاکہ اسے معمولی سمجھ کر کوئی نظر انداز نہ کرے۔ (ابن عاشور)

**آیت 150** ❶ اس آیت میں پچھلا حکم دہرایا گیا ہے، پہلے جملے ”فَوَلِّ وَجۡهَكَ“ میں مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں اور دوسرے جملے ”فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ“ میں تمام مسلمان مخاطب ہیں، تاکہ یہ حکم نبی ﷺ کے ساتھ خاص نہ سمجھا جائے۔ دہرانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں بیت اللہ کو قبلہ مقرر کرنے کی مزید حکمتیں بیان کرنا مقصود ہے۔ جن میں سے پہلی حکمت یہ ہے کہ لوگوں میں سے کسی کے پاس تمھارے خلاف کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ اہل کتاب یہ نہ کہہ سکیں کہ پہلی کتابوں میں تو آخری نبی کا قبلہ مسجد حرام ہے، انھوں نے بیت المقدس کو قبلہ کیوں بنا رکھا ہے؟ اور کفار عرب یہ نہ کہہ سکیں کہ ملتِ ابراہیم کا قبلہ تو بیت اللہ ہے، یہ اسے کیوں اختیار نہیں کر رہے؟ دلیل تو ان میں سے کسی کے پاس نہیں رہے گی، البتہ ان میں سے بے انصاف لوگ خاموش نہیں ہوں گے، سو ان سے مت ڈرو، بس مجھی سے ڈرتے رہو۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ جس طرح اس آخری امت

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول تمھی سے بھیجا ہے، جو تم پر ہماری آیات پڑھتا اور تمھیں پاک کرتا اور تمھیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور تمھیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ سو تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو ﴿۱۵۲﴾

کے احکام قیامت تک مکمل اور غیر منسوخ کر کے تم پر اپنی نعمت تمام کی ہے، قبلہ کے بارے میں بھی یہ نعمت تمام ہو اور تیسری حکمت دوسرے احکام کی طرح قبلہ میں بھی تمھیں راہِ حق کی ہدایت عطا کرنا ہے۔

② شروع آیات سے یہاں تک نبی ﷺ کو کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم تین مرتبہ، مسلمانوں کو یہ حکم دو مرتبہ، اس کے حق ہونے کا ذکر تین مرتبہ اور ہر جگہ اس کی طرف رخ کرنے کا حکم تین مرتبہ آیا ہے، اس سے اس حکم کی تاکید اور اس کی شان واضح ہو رہی ہے۔ درمیان میں دوسرے جملے مثلاً اہل کتاب کا اس کے حق ہونے کو جاننا اور اللہ کا تمھارے عمل سے بے خبر نہ ہونا وغیرہ تاکید مزید کا کام دے رہے ہیں۔ (ابن عاشور)

**آیت 151** كَمَآ: یعنی کعبہ کو قبلہ قرار دے کر ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو، جو انھوں نے کعبہ کے بارے میں کی تھی، اسی طرح قبول کیا ہے جیسے ہم نے ان کی اس دعا کو شرف قبولیت بخشا جو انھوں نے مکہ کے رہنے والوں کے لیے انھی میں سے ایک نبی مبعوث کرنے کے لیے کی تھی۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۲۹) قرآن میں ﴿الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ سے مراد کتاب وسنت اور ﴿مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ سے مراد وہ مسائل ہیں جو انسان اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا، مثلاً تخلیق کی ابتدا، حشر نشر، نبوت اور ملائکہ وغیرہ۔

**آیت 152** ① فَاذْكُرُوْنِيْٓ: اس میں ''فاء'' کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے رسول اور قرآن کے ذریعے سے نعمت پوری کرنے کا انعام تم پر کیا ہے، سو تم پر بھی لازم ہے کہ تم مجھے یاد کرو اور یاد رکھو۔ ذکر کا معنی زبان سے یاد کرنا بھی ہے اور دل اور عمل سے بھی۔ یہ نسیان (بھولنے) کی ضد ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ [آل عمران: ۱۳۵] ''اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔'' جب کوئی شخص اللہ کے کسی حکم پر عمل کرتا ہے، نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے تو وہ بھی اللہ کو یاد کرتا ہے، یاد کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روزانہ لاکھ مرتبہ زبان سے ذکر کیا جائے اور اللہ کے احکام کو اور اس کی ڈالی ہوئی ذمہ داریوں کو بھلا ہی دیا جائے۔ کفار خواہ تمام بلاد اسلام پر قابض ہو جائیں ہمیں اپنی روزانہ کی ہزار رکعت پوری کرنے ہی سے فرصت نہ ہو۔ ﴿اَذْكُرْكُمْ﴾ ''میں تمھیں یاد کروں گا'' یہ اللہ کو یاد کرنے کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھے اپنے نفس میں یاد کرے، میں اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے کسی جماعت میں یاد کرے، میں اس سے بہتر

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۵۳﴾

جماعت میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔'' [ بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالی : ﴿ و یحذرکم اللہ ...... ﴾ : ۷۴۰۵۔ مسلم، الذکر والدعاء والاستغفار، باب الحث علی ذکر اللہ تعالی : ۲۶۷۵ ]

② وَاشْكُرُوْا لِيْ : شکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ [ سبا : ۱۳ ] ''اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے عمل کرو۔'' عمل نعمت کے مطابق نہ ہو تو شکر بھی نہیں۔

③ وَلَا تَكْفُرُوْنِ : اس میں ہر ناشکری اور کفر شامل ہے، وہ زبان سے ہو یا عمل سے۔ زبان سے تو الحمد للہ کہنا، لیکن بیٹوں کا نام پیراں دتہ رکھنا، غیر اللہ کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ سن کر بھی سود کھائے جانا، گھر میں بے حیائی کو فروغ دیتے جانا، رشوت لے کر اسے فضل ربی قرار دینا، صدقے یا رسول اللہ کہنا اور ڈاڑھی منڈوا کر آپ ﷺ کی حسین صورت سے بےزاری کا اظہار شکر نہیں، بلکہ کفر اور ناشکری کی بدترین صورتیں ہیں۔

آیت 153 ① ذکر وشکر کے ساتھ صبر اور نماز کی تعلیم دی ہے۔ احکام شریعت پر عمل کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں صبر اور نماز پر ہمیشگی ان مشکلات کا مقابلہ کرنے میں معاون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا سارا کام ہی خیر ہے اور یہ چیز کسی اور کو حاصل نہیں۔ (خیر اس طرح کہ) اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے اور وہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔''
[ مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره کله خیر : ۲۹۹۹، عن صهیب رضی اللہ عنہ ]

② اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے تذکرہ کے بعد (جن میں بیت اللہ کو قبلہ قرار دے کر اپنی نعمت تمام کرنا اور اپنے آخری رسول کو بھیجنا شامل ہے) اپنے ذکر وشکر کا حکم دیا اور اس آیت میں مصیبتوں کے آنے پر صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا حکم ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۴۵) اگرچہ اس میں ایمان والوں پر آنے والی ہر مصیبت کا علاج بتایا گیا ہے، مگر آیات کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار کرنے کی تمہید ہے، کیونکہ قبلہ کی تبدیلی رجب یا شعبان ۲ ہجری میں ہوئی اور غزوۂ بدر رمضان ۲ ہجری میں ہوا۔ دونوں کے درمیان تقریباً دو ماہ کا وقفہ ہے۔

③ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ : اس سے معیت خاصہ (خصوصی ساتھ) مراد ہے اور جسے اللہ کا ساتھ مل جائے اسے کیا غم ہے؟ جیسے نبی ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ [ التوبة : ۴۰ ] ''غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' [ بخاری، المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام : ۳۶۱۵ ] مقصد یہ ہے کہ صبر کرو، تاکہ تمھیں اللہ تعالیٰ کا ساتھ نصیب ہو جائے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اور ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کیے جائیں، مت کہو کہ مُردے ہیں، بلکہ زندہ ہیں اور لیکن تم نہیں سمجھتے ﴿۱۵۴﴾ اور یقیناً ہم تمھیں خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی میں سے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دے ﴿۱۵۵﴾ وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۱۵۶﴾ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے کئی مہربانیاں اور بڑی رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں ﴿۱۵۷﴾

**آیت 154** ① جہاد میں سب سے بڑی مصیبت جان کا جانا ہے، اس پر صبر کی تلقین اس طرح فرمائی کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مت کہو کہ مُردے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تم اس زندگی کو نہیں سمجھتے۔ آل عمران (۱۶۹) میں شہداء کی اس زندگی کے عیش و آرام کا ذکر ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ زندگی دنیاوی زندگی نہیں، نہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ مرنے کے بعد برزخ (قبر) میں ہر شخص کو زندگی حاصل ہے۔ (دیکھیے مومن: ۱۱، ۴۶۔ نوح: ۲۵۔ ابراہیم: ۲۷) مگر مومن کی روح راحت میں ہے اور کافر کی روح کو عذاب ہو رہا ہے۔ احادیث کے مطابق قبر ہی میں ان کے لیے جنت یا دوزخ کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ یہ زندگی انبیاء کو سب سے بڑھ کر کامل حالت میں حاصل ہے، مگر شہداء کی عزت افزائی کے لیے قرآن نے انھیں خاص طور پر "اَحْيَآءٌ" کہا ہے، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں قتل ہوگیا، اس سے زندگی کا عیش و آرام چھن گیا۔ ② اَمْوَاتٌ: اس پر رفع اس لیے آیا ہے کہ اس کا مبتدا "هُمْ" محذوف ہے، اسی طرح "اَحْيَآءٌ" کا مبتدا بھی محذوف ہے۔ سورۂ آل عمران (۱۶۹) میں "اَمْوَاتًا" پر "لَا تَحْسَبَنَّ" کا مفعول ہونے کی وجہ سے نصب آیا ہے۔

**آیت 155تا157** ① مصیبت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان کو اذیت پہنچے، وہ خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ (قرطبی، شوکانی) ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ یہ ایک ایسا کلمہ ہے کہ دل کی حاضری سے کہا جائے تو اس میں اس بات کا اظہار بھی ہے کہ ہم اللہ کی ملکیت اور اس کے بندے ہیں اور اس کا بھی کہ ہمیں ہر حال میں اس کے پاس واپس جانا ہے۔ وہ جب چاہے، جسے چاہے واپس بلائے، اس پر شکوہ و شکایت کا کیا موقع ہے؟ اس سے انسان کو صبر کی توفیق ملتی ہے اور صبر کرنے والوں کو تین نعمتیں ملتی ہیں: ① رب کی مہربانیاں۔ ② اس کی بہت بڑی رحمت (رَحْمَةٌ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے)۔ ③ اور ہدایت یافتہ ہونے کی سند۔ قرآن مجید میں صبر کا ذکر ستر (۷۰) دفعہ آیا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، تو جو کوئی اس گھر کا حج کرے، یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں کا خوب طواف کرے اور جو کوئی خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر دان ہے، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

② اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ: اس میں لفظ "اِذَآ" میں اشارہ ہے کہ مصیبت پہنچتے ہی صبر کرنا اور "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کہنا چاہیے، بعد میں رو دھو کر تو ہر شخص ہی صبر کر لیتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰى )) [ بخاری، الجنائز، باب زیارۃ القبور : ۱۲۸۳ ] ''صبر صرف وہ ہے جو پہلی چوٹ کے وقت ہو۔''

③ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''کوئی مسلمان جسے کوئی مصیبت پہنچے اور وہ وہی کلمہ کہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے (یعنی یہ دعا پڑھے ): (( إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَ أَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِّنْهَا )) (یقیناً ہم اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اے اللہ! مجھے میری مصیبت میں اجر عطا فرما اور مجھے اس کی جگہ اس سے بہتر عطا فرما ) تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بہتر عطا فرماتا ہے۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر جب (میرے خاوند ) ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو میں نے کہا مسلمانوں میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بہتر کون ہوگا؟ پہلا گھرانہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ پھر میں نے یہ (مذکورہ بالا ) کلمہ کہہ لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرما دیے۔[ مسلم، الجنائز، باب ما یقال عند المصیبۃ؟: ۹۱۸ ]

آیت 158 ① يَطَّوَّفَ : یہ باب تفعل سے ہے، "طَافَ يَطُوْفُ" کا معنی طواف کرنا، چکر لگانا ہے، جب باب تفعل میں حروف زیادہ ہوئے تو اس کا معنی ''خوب طواف کرے'' ہو گیا۔ "شَعَآىِٕرِ" یہ "شَعِيْرَةٌ" کی جمع ہے جس کا معنی نشانی ہے۔ بعض لوگوں نے صفا اور مروہ کو جاہلیت کے بتوں کی نشانی سمجھ کر ان کے طواف کو گناہ سمجھا، تو اس پر فرمایا کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

② صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو چھوٹی پہاڑیوں کے نام ہیں۔ ان کے درمیان سعی کرنا (دوڑنا ) ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج اور عمرہ کے مناسک (یعنی احکام ) میں شامل تھا، مگر زمانۂ جاہلیت میں مشرکین نے حج اور عمرہ کے مناسک میں کئی شرکیہ رسوم شامل کر لی تھیں، حتیٰ کہ انھوں نے صفا اور مروہ پر دو بت نصب کر رکھے تھے۔ ایک کا نام ''اساف'' اور دوسرے کا ''نائلہ'' تھا۔ ان مشرکین میں سے بعض وہ تھے جو جاہلیت میں ان کے درمیان سعی کرتے اور ان بتوں کا استلام بھی کرتے، یعنی انھیں بوسہ بھی دیتے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم صفا و مروہ (کی سعی ) کو جاہلیت کا کام سمجھتے تھے، جب اسلام آیا تو ہم ان کی

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾

بے شک وہ لوگ جو اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے واضح دلیلوں اور ہدایت میں سے اتارا ہے، اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے، ایسے لوگ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں ﴿۱۵۹﴾

---

سعی سے رک گئے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [ بخاری، التفسیر، باب قوله تعالى : ﴿ إن الصفا والمروة ...... ﴾ : ٤٤٩٦ ] اور ان مشرکین میں سے بعض وہ تھے جو جاہلیت ہی میں صفا و مروہ کی سعی کے بجائے ''منات'' نامی بت کا طواف کرتے تھے اور مکہ پہنچ کر صفا و مروہ کے طواف کو گناہ سمجھتے تھے، ان کے رد میں بھی یہ آیت نازل ہوئی۔ سعی کے ضروری ہونے پر تو مسلمان متفق تھے، تاہم آیت کے ظاہری الفاظ سے بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ سعی نہ بھی کی جائے تو کوئی حرج نہیں، چنانچہ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنی خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس شبہ کا اظہار کیا، تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر آیت کا مفہوم یہی ہوتا تو قرآن میں یوں ہوتا: " اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا " یعنی طواف نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں۔ پھر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے مزید وضاحت کے لیے فرمایا کہ عرب کے بعض قبائل (ازد، غسان) " مناة الطاغية " بت کی پوجا کرتے تھے۔ یہ بت انھوں نے مُشلّل پہاڑی پر نصب کر رکھا تھا۔ یہ لوگ حج کے لیے جاتے تو اس بت کا نام لے کر لبیک کہتے اور اس کا طواف کرتے۔ مکہ میں پہنچ کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو گناہ سمجھتے، مسلمان ہونے کے بعد اس بارے میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [ بخاری، الحج، باب وجوب الصفا والمروة : ١٦٤٣۔ مسلم : ١٢٧٧ ] یعنی ان لوگوں نے صفا اور مروہ کے درمیان طواف کو گناہ خیال کیا تھا، اس بنا پر قرآن نے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ورنہ جہاں تک خود سعی کا تعلق ہے، تو اس کے متعلق عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ سعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرما دی ہے، اب کسی کو اس کے ترک کرنے کا اختیار نہیں، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِسْعَوْا اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ )) [ أحمد : ٤٢١/٦، ٤٢٢، ح : ٢٧٤٣٥ ] ''سعی کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کر دی ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا: (( لِتَاْخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ )) [ مسلم، الحج، باب استحباب رمی ... : ١٢٩٧ ] ''مجھ سے حج کے مناسک (یعنی احکام) سیکھ لو۔'' ان میں سعی بھی داخل ہے۔

**آیت 159** : ① " اَللَّعْنَةُ " کا اصل معنی " الطَّرْدُ " یعنی دور دفع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت سے مراد ملعون شخص کو اپنے پاس سے اور اپنی رحمت سے دور کرنا ہے اور دوسرے تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت سے مراد اللہ تعالیٰ سے اسے دور کرنے کی دعا کرنا ہے۔ لعنت کرنے والوں سے مراد تمام مومن جن و انس اور فرشتے ہیں۔ (طبری)

② "الْكِتٰبِ" سے مراد یہاں تورات ہے اور "لِلنَّاسِ" سے مراد خاص لوگ یعنی یہود کے علماء ہیں، یعنی علمائے یہود کے

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور کھول کر بیان کر دیا تو یہ لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہوں ﴿۱۶۰﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اس حال میں مرگئے کہ وہ کافر تھے، ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی، سب کی لعنت ہے ﴿۱۶۱﴾ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی ﴿۱۶۲﴾

لیے تورات و انجیل میں رسول اللہ ﷺ کی واضح خوش خبری اور صفات بیان ہونے کے بعد ان میں سے جو لوگ اسے چھپاتے اور اس کا انکار کرتے ہیں ان پر لعنت ہے۔ اگرچہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اس میں وہ مسلم علماء بھی شامل ہیں جو قرآن و حدیث کی بات جانتے ہوئے اسے چھپا جاتے ہیں اور اپنے فرقے کی بات کو دین ظاہر کرکے بیان کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ )) ''جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی، جسے وہ جانتا ہے، پھر اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔'' [ ترمذی، العلم، باب ما جاء فی کتمان العلم : ۲٦٤۹۔ أحمد : ۲٦۳/۲، ح : ۷۵۸۸۔ أبو داؤد : ۳٦۵۸، عن أبی هريرة ﷺ و صححه الألبانی ]

③ اگر کسی مسئلہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہو اور عوام میں فتنہ و فساد کا خوف ہو تو اسے عوام کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہاں مقصود حق کا چھپانا نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو '' لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ '' پر جنت کی بشارت عام لوگوں کو بیان کرنے سے منع کر دیا تھا۔ [ مسلم، الإيمان، باب الدليل على أن من ... : ۳۱ ] اور علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لوگوں سے وہ بات بیان کرو جسے وہ سمجھ سکیں، کیا تم پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھوٹا کہا جائے؟'' [ بخاری، العلم، باب من خص بالعلم قومًا ......، قبل ح : ۱۲۷ ] اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم کسی قوم کو ایسی بات بیان کرو گے جس تک ان کی عقلیں نہ پہنچتی ہوں تو ضرور ان میں سے کسی کے لیے وہ فتنہ بنے گی۔'' [ مسلم، المقدمة، باب النهی عن الحديث بكل ما سمع : ۱٤/۵ ]

**آیت 160 تا 162** ① اس دائرۂ لعنت سے نکلنے کی صرف ایک صورت ہے کہ یہ لوگ اپنی سابقہ کوتاہیوں سے تائب ہوں اور آئندہ لوگوں کے سامنے حق کو صاف طور پر بیان کریں (جیسا کہ عبداللہ بن سلام اور صہیب رضی اللہ عنہما نے کیا تھا)، ورنہ جو لوگ اس حالتِ کفر میں مرگئے وہ ہمیشہ کے لیے لعنت میں گرفتار رہیں گے۔

② اس آیت کی رو سے علماء کا اتفاق ہے کہ کفار پر نام لیے بغیر عام لعنت جائز ہے۔ اسی طرح جن کا کفر پر مرنا ثابت ہو ان پر بھی لعنت جائز ہے، البتہ کسی زندہ مسلم یا کافر پر نام لے کر لعنت کرنا جائز نہیں، کیونکہ کیا خبر اللہ تعالیٰ موت سے پہلے اسے

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ

اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۶۳﴾ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ چیزیں لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیا ہوا ہے، ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿۱۶۴﴾ اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ میں سے کچھ شریک بنا لیتے ہیں، وہ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں، اور وہ

---

توبہ کی توفیق دے دے، جیسا کہ ابوسفیان اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ کو ایمان لانے کی توفیق عطا ہو گئی تھی۔

**آیت 163** اوپر کی آیت میں حق چھپانے پر وعید فرمائی، اب اس آیت میں بیان فرمایا کہ سب سے پہلے جس چیز کا اظہار ضروری ہے وہ مسئلۂ توحید ہے۔ (قرطبی)

**آیت 164** ① اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے الٰہ واحد (ایک معبود) ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں اس کے ایک ہونے کے دلائل کا بیان ہے۔ قرآن نے ان آٹھ چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے ایک ہونے کے ثبوت میں کئی جگہ الگ الگ ذکر فرمایا ہے، مگر یہاں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ کائنات کی ان چیزوں کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے متعلق خود مشرکین بھی مانتے تھے کہ ان کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ (کبیر)

② مفسر قرآن امین شنقیطی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہاں آسمان و زمین کی پیدائش میں توحید کی نشانی ہونے کی تفصیل بیان نہیں ہوئی، دوسرے مقامات پر تفصیل موجود ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ ق (۶ تا ۸) سورۂ ملک (۳ تا ۵، ۱۵) اور سورۂ لقمان (۱۱، ۱۲) اسی طرح دن رات کے بدلنے میں توحید کی نشانی ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۷۱ تا ۷۳) اور اعراف (۵۴) آسمان و زمین کے درمیان بادل کے مسخر ہونے کی کیفیت کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۷) اور سورۂ نور (۴۳)۔

**آیت 165** ① اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب اس آیت میں بتایا کہ اس قدر ظاہر اور واضح دلائل دیکھنے کے باوجود دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو انداد (برابر اور شریک) بناتے ہیں۔

حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

لوگ جو ایمان لائے، اللہ سے محبت میں کہیں زیادہ ہیں اور کاش! وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا اس وقت کو دیکھ لیں جب وہ عذاب کو دیکھیں گے (تو جان لیں) کہ بے شک قوت سب کی سب اللہ کے لیے ہے اور یہ کہ بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ﴿۱۶۵﴾

کائنات کی حکمرانی، مخلوق کی حاجت روائی، مشکل کشائی، دعائیں سننا، تمام غائب و حاضر چیزوں سے واقف ہونا، جو اللہ کی خاص صفات ہیں، یہ لوگ یہ صفات ان بناوٹی معبودوں میں سمجھتے ہیں، بلکہ ان سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں جو صرف اللہ سے ہونی چاہیے، جبکہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان سے کہیں زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ انداد سے مراد وہ فوت شدہ بزرگ ہیں جن کے بت بنا کر وہ انھیں پکارتے اور پوجتے تھے، جیسا کہ سورۂ نوح میں مذکور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ ان کی قوم کے نیک لوگ تھے، جن کے فوت ہونے پر انھوں نے ان کے بت بنائے۔ بعد میں یہی بت عرب میں بھی بن گئے۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ودا ولا سواعا ولا يغوث و يعوق ﴾ : ۴۹۲۰ ] گویا بت پرستی بھی دراصل بزرگ پرستی ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر مکہ فتح ہونے کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کعبہ سے بت نکالے تو ان میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی صورتیں بھی تھیں جن کے ہاتھوں میں فال کے تیر تھے۔ [ بخاری، المغازی، باب أين ركز النبی صلی اللہ علیہ وسلم ...... : ۴۲۸۸ ]

"اَنْدَادًا" میں ہر وہ چیز شامل ہے جو انسان کے دل پر مسلط ہو کر وہ مقام بنا لے جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ بت پرست ان ہستیوں کی مورتیاں بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ قبر پرست ان ہستیوں کی قبروں پر عمارتیں بنا کر ان کی پوجا کرتے ہیں، انھیں نفع و نقصان کا مالک سمجھتے ہیں، مصیبت کے وقت ان سے فریاد کرتے ہیں۔ خصوصاً یہود و نصاریٰ میں یہ چیز عام تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ بنانے سے منع کر دیا اور علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ہر اونچی قبر کو برابر کر دیں۔ [ مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر : ۹۶۹، ۹۷۰ ] کچھ وہ ہیں جو تصورِ شیخ کے ذریعے سے دل میں ایک فانی انسان کا نقشہ جما کر اس سے وہ محبت کرتے ہیں جو محض اللہ کا حق ہے، پھر ان پر وہ محبت ایسی غالب ہوتی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے بجائے شیخ کے حکم کو اللہ کے حکم کا درجہ دیتے ہیں، جب کہ مخلوق کا یہ حق ہی نہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ برابر کیا جائے۔ انداد کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۲۲)۔

② مسلمانوں میں کئی ایسے بدنصیب بھی ہیں جو اس آیت کا، جس میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ جیسی محبت کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس مقصد کے لیے وظیفہ کرتے اور اس کا تعویذ لکھتے ہیں کہ کسی لڑکی یا لڑکے کو اپنی محبت کے دام میں گرفتار کریں۔ یہ وہی یہودیانہ خصلت ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۷۸، ۱۰۲) میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیطان انھیں اس راستے پر

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے آپس کے تعلقات بالکل منقطع ہو جائیں گے ﴿۱۶۶﴾ اور جن لوگوں نے پیروی کی تھی کہیں گے کاش! ہمارے لیے ایک بار دوبارہ جانا ہوتو ہم ان سے بالکل بے تعلق ہو جائیں، جیسے یہ ہم سے بالکل بے تعلق ہو گئے۔ اس طرح اللہ انھیں ان کے اعمال ان پر حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ کسی صورت آگ سے نکلنے والے نہیں ﴿۱۶۷﴾

لگانے والا ہے اور قرآن جس بات سے منع کر رہا ہے اسی کے لیے قرآن کو پڑھایا لکھا جائے تو لعنت کے سوا کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

③ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ: یعنی ایمان والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کو دوسروں کی محبت اور رضا سے مقدم رکھتے ہیں۔ کسی کی محبت بھی ان کے دل میں یہ مقام حاصل نہیں کر سکتی کہ وہ اسے اللہ کی محبت اور رضا پر قربان نہ کر سکیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۲۴)۔

④ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا: اس سے مراد شرک کرنے والے اور کافر لوگ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔'' دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ آگ سے کسی صورت نکلنے والے نہیں اور آگ سے کبھی نہ نکلنے والے یا مشرک ہیں یا کافر۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۸، ۱۱۶) اور سورۂ اعراف (۵۰) جب کہ اہل السنہ کا اتفاق ہے کہ اہل ایمان آخر کار جہنم سے نکل آئیں گے۔

⑤ وَلَوْ يَرَى: ''اس وقت کو دیکھ لیں'' یعنی دنیا میں وہ منظر دیکھ لیں۔

**آیت 167،166** تَبَرَّاَ: یہ ''بَرِئَ'' سے باب تفعل ہے۔ حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''بالکل بے تعلق ہو جائیں گے'' کیا گیا ہے اور ''بِخَارِجِيْنَ'' میں باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''وہ کسی صورت آگ سے نکلنے والے نہیں'' کیا گیا ہے۔ ان آیات میں قیامت کے دن ان مشرکوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کاش! وہ دنیا میں اللہ کی بات پر یقین کر کے اس انجام سے بچ جائیں۔ مزید دیکھیے سورۂ قصص (۶۳، ۶۴) اور سورۂ احقاف (۵، ۶) ان آیات سے قدیم اور جدید علماء کی جماعت نے حرمتِ تقلید پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح اہل شرک جن کے پیچھے لگے، وہ اپنے پیچھے لگنے والوں سے بے زاری ظاہر کریں گے، اسی طرح ائمۂ مجتہدین بھی اپنے مقلدوں سے بے زار ہوں گے، اس لیے کہ چاروں امام رحمہم اللہ اپنی تقلید اور غیر کی تقلید سے منع کر گئے ہیں۔ سو جس کام سے دنیا میں انھوں نے امت کو منع کیا تھا وہ اس کام پر آخرت میں ضرور ہی خفا ہوں گے۔ اس سرکشی اور حکم عدولی کو اپنے مقلدوں سے ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ (ترجمان)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖؗ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اے لوگو! ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں حلال، پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾ وہ تو تمھیں برائی اور بے حیائی ہی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے ﴿۱۶۹﴾

**آیت 168** سورۂ بقرہ میں ''یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ'' کے ساتھ خطاب دوسری مرتبہ کیا گیا ہے۔ اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو ''انداد'' (شریک) بنانے کا برا انجام ذکر کیا گیا ہے۔ مشرکین ان ''انداد'' کی تعظیم و تکریم میں اتنی زیادتی کرتے کہ عبادت اور دعا میں بھی ان کو پکارتے اور ان کے نام پر بہت سے مویشی مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ وغیرہ حرام قرار دے دیتے، ان پر نہ سواری کرتے اور نہ ان کا گوشت کھاتے اور ان کو اللہ کے قریب ہونے کا ذریعہ سمجھتے (دیکھیے انعام: ۱۳۸، ۱۳۹) اور دوسری طرف انھوں نے اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرایا تھا، مثلاً مردار، خون، خنزیر اور غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز۔ چنانچہ اس آیت میں اس طرح کے حرام ٹھہرا لینے سے منع فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم دیا، یعنی اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے بچو اور اس کی حلال کردہ طیب چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ، کیونکہ اسلام تب معتبر ہوگا جب کوئی شخص مسلمانوں کی حلال اشیاء کو حرام نہیں ٹھہرائے گا، جیسا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے وہ نماز پڑھی جو ہم پڑھتے ہیں اور اس قبلے کی طرف رخ کیا جس کی طرف ہم رخ کرتے ہیں اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے۔'' [ بخاری، الصلوۃ، باب فضل استقبال القبلة : ۳۹۱ ] چنانچہ یہاں بھی فرمایا کہ شیطان کے پیچھے لگ کر ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی ہر نافرمانی اور دین میں شامل کی ہوئی ہر وہ بات جو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں بتائی، یعنی ہر بدعت شیطان کے قدموں کی پیروی ہے۔

**آیت 169** ❶ " اَلسُّوْٓءُ " سے مراد کوئی بھی برائی ہے اور " اَلْفَحْشَآءُ " وہ برائی ہے جو حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے، مثلاً حد سے بڑھا ہوا بخل (بقرہ: ۲۶۸)، زنا (نور: ۱۹، ۲۱)، چوری، شراب اور قتل وغیرہ۔

❷ یعنی شیاطین ایک طرف تو معاشرے میں اخلاقی خرابیوں " اَلسُّوْٓءُ وَ الْفَحْشَآءُ " کو فروغ دیتے ہیں اور دوسری طرف دین میں بدعات پیدا کر کے لوگوں کے عقائد و اعمال خراب کرتے ہیں۔ بغیر علم کے اللہ کے ذمے کوئی بات لگانے میں ہر وہ بات شامل ہے جو کتاب و سنت سے ثابت نہ ہو۔ مزید دیکھیے اعراف (۲۸، ۳۳) پچھلی آیات کے لحاظ سے یہاں " اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ " سے مراد اللہ کے لیے شریک بنانا، شیطان کے کہنے پر اللہ کے حلال کردہ کو حرام قرار دینا، مثلاً بحیرہ و سائبہ وغیرہ اور اس کے حرام کو حلال سمجھنا، مثلاً مردار، خون، خنزیر اور غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز دینا، غرض اپنے پاس سے دین کی کوئی بھی بات بنا کر اللہ کے ذمے لگا دینا ہے۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـــًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ مَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّ ۢ بُكۡمٌ عُمۡـىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پاتے ہوں﴿۱۷۰﴾ اور ان لوگوں کی مثال جنھوں نے کفر کیا، اس شخص کی مثال جیسی ہے جو ان جانوروں کو آواز دیتا ہے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو وہ نہیں سمجھتے﴿۱۷۱﴾

**آیت 170** مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے پاس اپنے شرکیہ افعال کے لیے نہ کوئی عقلی دلیل تھی اور نہ ہی اللہ کی طرف سے آنے والی کوئی نقلی دلیل، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احقاف (۴) میں انھیں چیلنج فرمایا کہ اللہ کی کسی کتاب میں سے کوئی نقلی دلیل تمھارے پاس ہے تو پیش کرو۔ چنانچہ جب انھیں کہا جاتا کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو جواب میں ان کے پاس ایک ہی دلیل تھی کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے، وہ ہم سے زیادہ عقل مند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر کسی کے آباء واجداد کو کسی بات کی عقل نہ ہو، مثلاً انھوں نے خسارے کی تجارت کی ہو، یا غلط راستے پر چلتے رہے ہوں تو کیا تم اندھے بن کر انھی کے پیچھے چلتے رہو گے؟ نہیں! بلکہ خود عقل سے کام لو اور سیدھے راستے پر چلو، جو صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔

ان آیات میں روئے سخن اگرچہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی طرف ہے، لیکن اگر مسلمان بھی یہی روش اختیار کریں کہ قرآن و حدیث کے مقابلے میں رسم و رواج پر عمل کرنے میں اپنے آباء واجداد کی پیروی کریں، یا اپنے امام، پیشوا یا عالم دین کے قول، رائے یا فتویٰ پر عمل پیرا ہوں جس کی دلیل قرآن و حدیث میں موجود نہ ہو تو وہ بھی اس آیت میں بیان کردہ مذمت اور وعید کے زمرے میں آئیں گے اور اسی کا نام تقلید ہے، کیونکہ علماء کے نزدیک تقلید کی تعریف یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے بجائے کسی غیر (امام، پیشوا یا عالم دین) کا قول دلیل کے بغیر لے لینا تقلید ہے۔ ایسی باتوں پر عمل کرنا حرام ہے، خواہ ایسا عمل مشرکین اور یہود و نصاریٰ کریں یا مسلمان، لیکن اگر کسی امام، پیشوا یا عالم کی رائے قرآن و حدیث کی نصوص کے خلاف نہ ہو تو ایسی رائے یا فتویٰ پر عمل کرنا تقلید کے زمرے میں نہیں آتا اور نہ ہی اسے ناجائز کہا جائے گا۔

**آیت 171** " نَعَقَ بِغَنَمِہٖ " (ف، ض) اپنی بھیڑ بکریوں کو آواز دینا اور ڈانٹنا۔ (قاموس) کفار کی یہ مثال دو طرح سے ہے، ایک تو یہ کہ ان کفار کو سمجھانے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ان جانوروں کو سمجھاتا ہے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ کفار کان، زبان اور آنکھیں رکھنے کے باوجود ضد اور عناد کی وجہ سے حق سننے، دیکھنے اور اس کا اقرار کرنے سے بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ سورۂ اعراف (۱۷۹) میں ایسے لوگوں کو جانوروں کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو﴿۱۷۲﴾ اس نے تو تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور ہر وہ چیز حرام کی ہے جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے﴿۱۷۳﴾

اور سرے سے بے خبر قرار دیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ زخرف (۴۰) اور یونس (۴۲، ۴۳)۔

دوسری اس طرح کہ ان کی مثال ان بے عقل جانوروں کی سی ہے جن کے گلے (ریوڑ) اپنے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے ان کی آواز پر حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اپنے اپنے پیشواؤں کے پیچھے بغیر سوچے سمجھے چلے جاتے ہیں، گویا یہ تقلیدِ آباء کی تمثیل ہے۔ آیت میں دونوں مفہوم موجود ہیں۔

**آیت 172** اس سے پہلے سب لوگوں کو حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم دیا تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اہل ایمان کو حلال اور پاکیزہ روزی کھانے اور کمانے کا حکم دیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر کوئی دعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے لوگو! بے شک اللہ طیب (پاک) ہے، طیب کے سوا کچھ قبول نہیں فرماتا، اس نے ایمان والوں کو اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے اپنے رسولوں کو حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ [المؤمنون: ۵۱] ”اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں۔“ اور فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ [البقرة: ۱۷۲] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں۔“ پھر آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کرتا ہے، بکھرے بالوں والا ہے، گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: ”اے میرے رب! اے میرے رب!“ (اور صورت حال یہ ہے کہ) اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام اور اسے جو غذا دی گئی ہے وہ بھی حرام تو بھلا اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی؟ [مسلم، الزکوۃ، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب و تربیتها: ۱۰۱۵، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ]

**آیت 173** ① ”اِنَّمَا“ کا لفظ حصر کے لیے آتا ہے، اس لیے آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ چار چیزیں حرام کی ہیں، ان کے سوا کچھ حرام نہیں اور دوسری آیت میں اس سے بھی صریح الفاظ میں یہ بات ذکر ہوئی ہے، فرمایا: ﴿قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓىٕكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۖۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب میں سے اتارا ہے اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھا رہے ہے اور نہ اللہ ان سے قیامت کے دن بات کرے گا اور نہ

رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ [ الأنعام : ۱۴۵ ] ''کہہ دے میں اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کہ بے شک وہ گندگی ہے، یا نافرمانی (کا باعث) ہو، جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔'' یعنی آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں ان چیزوں کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں، مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسری آیات و احادیث سے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، مثلاً خمر یعنی ہر نشہ آور چیز اور درندے وغیرہ، تو یہاں صرف انھی چیزوں کو کیسے حرام کہا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تمام حلال و حرام کا ذکر نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی بات ہو رہی ہے جنھیں مشرکین مکہ نے حرام کر رکھا تھا، جب کہ آیت میں مذکور چاروں حرام چیزوں سے وہ اجتناب نہیں برتتے تھے، اس لیے ان کے اس فعل کے بالمقابل انھیں بتایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں چیزیں حرام ہیں جن سے تم اجتناب نہیں کرتے اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے تم پرہیز کرتے ہو، گویا یہاں صرف ان مشرکین کی نسبت سے اور ان کے بالمقابل بات کی گئی ہے۔ اسے عربی میں حصر اضافی کہتے ہیں۔ یہ حصرِ مطلق یعنی عام قاعدہ نہیں۔

② حرام و حلال سے متعلق قرآن و حدیث میں ان چار چیزوں کے علاوہ جو بنیادی احکام بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: ① سمندر کا ہر جانور خواہ زندہ پکڑا جائے یا مردہ، نام اس کا کچھ بھی ہو، حلال ہے۔ دیکھیے حاشیہ سورۂ مائدہ (۹۶) مراد اس سے پانی میں رہنے والے وہ جانور ہیں جو پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، خواہ سمندر میں ہوں یا دوسری جگہ پانی میں، یعنی دریا وغیرہ میں۔ ② خشکی کے جانوروں میں سے ہر کچلی والا درندہ اور پنجے سے شکار کرنے والا پرندہ حرام ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَ عَنْ كُلِّ ذِيْ مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ )) [ مسلم، الصيد والذبائح، باب تحريم أكل كل ذی ...... : ۱۹۳۴ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کچلی والے جانور اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندوں (کے گوشت) کو حرام قرار دیا ہے۔'' اس کے علاوہ حدیث میں جن جانوروں کو نام لے کر حرام کہا گیا ہے، مثلاً گھریلو گدھا، یا وہ جانور جنھیں جہاں ملیں مار دینے کا حکم ہے، یعنی سانپ، بچھو، چھپکلی، کوا، چیل وغیرہ۔ قرآن و حدیث میں حرام کردہ چیزوں کے علاوہ باقی سب چیزیں حلال ہیں۔

③ آیت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۳) اور انعام (۱۴۵)۔

آیت 174 تا 176 ① یہ آیات گو علمائے یہود کے حق میں نازل ہوئی ہیں، جو دنیا کے مال و جاہ کے حصول کی خاطر تورات

اَلِيْمٌ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝

انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۴﴾ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے بدلے خریدا، سو وہ آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں ﴿۱۷۵﴾ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ نے یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا ہے یقیناً وہ بہت دور کی مخالفت میں (پڑے) ہیں ﴿۱۷۶﴾

میں مذکور رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کو چھپا رہے تھے۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۵۹) مگر اس میں ہر وہ شخص شامل ہے جو دنیا کے مفاد کی خاطر دین کو فروخت کرے۔

❷ ثَمَنًا قَلِيْلًا : اس کا معنی یہ نہیں کہ زیادہ قیمت لے سکتے ہیں، بلکہ ساری دنیا بھی مل جائے تو وہ آخرت کے مقابلے میں قلیل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ [النساء: ۷۷] ''کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے۔''

❸ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ : ''مَا'' بمعنی ''اَیُّ شَیْءٍ'' اسم تعجب مبتدا، ''اَصْبَرَهُمْ'' فعل ماضی مع فاعل، ''هُمْ'' مفعول بہ، جملہ ''مَا'' مبتدا کی خبر۔

❹ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ : یعنی اللہ محبت و رحمت کے ساتھ ان سے بات نہیں کرے گا، ورنہ ناراضی اور ڈانٹ کے طور پر تو اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائے گا۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۱۰۸)۔

❺ ذٰلِكَ : اس میں یہود و نصاریٰ کا حق چھپانا، اس کے بدلے ثمن قلیل، یعنی تھوڑی قیمت لینا، اس پر آگ کا عذاب، اللہ تعالیٰ کا ان سے کلام نہ کرنا، انھیں پاک نہ کرنا اور آگ پر یہود کی جرأت و صبر تمام چیزیں شامل ہیں۔ ﴿بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ﴾ اس میں اور ﴿الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ﴾ دونوں جگہ ''الْكِتٰبِ'' سے تورات اور قرآن دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اگر تورات مراد ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو تورات حق کے ساتھ نازل کی تھی، مگر جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا، یعنی اس میں تحریف کی یا اس کے بعض کو مانا اور بعض کو نہ مانا، وہ حق سے بہت دور کی مخالفت میں جا پڑے۔ اگر قرآن مراد ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب یعنی قرآن حق کے ساتھ نازل کیا، مگر جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا، کسی نے کہا یہ وہ نہیں جس کی تورات میں پیشین گوئی ہے، کسی نے کہا یہ صرف اُمّی (یعنی ان پڑھ عرب) لوگوں کے لیے ہے، جیسا کہ ابن صیاد نے نبی ﷺ سے کہا تھا۔ [ بخاری، الجنائز، باب إذا أسلم الصبی ...... : ۱۳۵٤ ] تو یہ سب لوگ بہت دور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں، ان کا قرآن کو نہ ماننا صرف اس مخالفت کی وجہ سے ہے۔

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰـكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ‌ۚ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِۙ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَفِى الرِّقَابِ‌ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّکٰوةَ‌ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ‌ۚ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں ﴿۱۷۷﴾

**آیت 177** ① مسلمانوں کو جب پہلے بیت المقدس اور پھر کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ بعض اہل کتاب اور بعض مسلمانوں پر شاق گزرا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی حکمت بیان فرمائی کہ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے احکام کی فرماں برداری، جدھر وہ کہے ادھر رخ کرنا اور جو حکم وہ دے اس پر عمل کرنا ہے۔ یہ ہے اصل نیکی، تقویٰ اور کامل ایمان۔ رہا مشرق یا مغرب میں سے کسی طرف رخ کرنے کی پابندی، تو اس میں کوئی نیکی نہیں، اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے نہ ہو۔ (ابن کثیر)

② وَلٰـكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ : اس میں "مَنۡ" سے پہلے "بِرُّ" محذوف ہے، یعنی اصل نیکی اس شخص کی نیکی ہے۔

③ یہ آیت نیکی کی تمام اقسام پر مشتمل ہے اور اس میں تمام بنیادی عقائد، اعمال اور اخلاق آ گئے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کو " كِتَابُ الْاِيْمَانِ " کے تحت " بَابُ اُمُوْرِ الْاِيْمَانِ " (قبل ح: ۹)'' میں ذکر فرمایا ہے کہ ایمان صرف عقائد کا نام نہیں، بلکہ اعمال بھی ایمان کا جز ہیں۔

④ پہلے مال کی محبت کے باوجود اسے ذوی القربیٰ اور دوسرے مستحقین کو دینے کا ذکر فرمایا، بعد میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا ذکر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے مال میں صرف زکوٰۃ ہی واجب نہیں کہ زکوٰۃ دینے کے بعد سارا سال بندہ فارغ ہو گیا، بلکہ ضرورت کے وقت مستحقین پر مال خرچ کرنا بھی واجب ہے، مثلاً ماں باپ اور دوسرے ضرورت مند رشتہ داروں کا نفقہ، مہمان پر خرچ، ضرورت مند ہمسائے، مجاہدین اور آیت میں مذکور دوسرے حضرات پر خرچ کرنا۔ ان کا ذکر زکوٰۃ سے پہلے اس لیے کیا کہ عام طور پر اس سے غفلت برتی جاتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر مقتولوں میں بدلہ لینا لکھ دیا گیا ہے، آزاد (قاتل) کے بدلے وہی آزاد (قاتل) اور غلام (قاتل) کے بدلے وہی غلام (قاتل) اور (قاتلہ) عورت کے بدلے وہی (قاتلہ) عورت (قتل) ہوگی، پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو معروف طریقے سے پیچھا کرنا اور اچھے طریقے سے اس کے پاس پہنچا دینا (لازم) ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے ایک قسم کی آسانی اور ایک مہربانی ہے، پھر جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے﴿۱۷۸﴾

⑤ یتیم وہ ہے جس کا والد فوت ہو جائے اور وہ ابھی بالغ نہ ہوا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ لَا يُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ ﴾ [ أبوداوٗد، الوصايا، باب ما جاء متى ينقطع اليتم : ۲۸۷۳، عن علي رضی اللہ عنہ ] ''بلوغت کے بعد یتیمی نہیں۔'' باقی مستحقین کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۶۰)۔

⑥ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ...... : یہ اور اس سے پہلے مذکور نیکی کرنے والوں سے متعلق سب صیغے ترکیب کی رو سے مرفوع ہیں، جب کہ "الصّٰبِرِيْنَ" کی حالت نصبی ہے، اس کی حکمت مفسرین نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ مدح اور اختصاص کی بنا پر منصوب ہے، یعنی یہ "اَمْدَحُ" یا "اَخُصُّ" کا مفعول ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''اور خصوصاً جو تنگی میں۔'' "الْبَاْسَآءِ" سے مراد فقر، بھوک، تنگ دستی، "الضَّرَّآءِ" سے مراد تکلیف، خصوصاً بیماری اور "الْبَاْسِ" سے مراد جنگ ہے۔ ان تینوں حالتوں میں صبر نہایت مشکل ہوتا ہے، اس لیے ان کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔

آیت 178 ① الْقَتْلٰی : یہ "قَتِيْلٌ" کی جمع ہے، جو بمعنی مقتول ہے۔ اس آیت سے بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مرد، مرد ہی کو قتل کرنے کی صورت میں قتل کیا جائے گا، عورت کو قتل کر دے تو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح عورت، عورت ہی کو قتل کرنے کی صورت میں قتل کی جائے گی، مرد کو قتل کرنے کی صورت میں نہیں، مگر یہ معنی مراد نہیں، بلکہ یہاں اہل جاہلیت کے ایک ظلم کا خاتمہ مقصود ہے کہ اگر ان کے کمزور قبیلے کی کوئی عورت کسی طاقت ور قبیلے کے کسی مرد کو قتل کر دیتی تو وہ قتل کرنے والی عورت کے بجائے اس قبیلے کے کسی بے گناہ مرد یا متعدد مردوں کو قتل کر دیتے۔ اسی طرح کسی کمزور قبیلے کا کوئی غلام کسی زور آور قبیلے کے کسی آزاد آدمی کو قتل کر دیتا تو وہ اس قاتل غلام کی جگہ اس قبیلے کے کسی بے گناہ آزاد ہی کو قتل کرنے پر اصرار کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قتل کرنے والے کے بدلے میں اسی قاتل ہی کو قتل کیا جائے، کسی دوسرے کو نہیں، قاتل خواہ آزاد ہے یا غلام، مرد ہے یا عورت۔ (خلاصہ از طبری)

② اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے تو قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا، بعض لوگوں نے کہا کہ کافر کو قتل کرنے

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٩﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ

اور تمھارے لیے بدلہ لینے میں ایک طرح کی زندگی ہے اے عقلوں والو! تاکہ تم بچ جاؤ﴿١٧٩﴾ تم پر لکھ دیا گیا ہے، جب

کی صورت میں مسلمان کو قتل کر دیا جائے گا، مگر یہ رسول اللہ ﷺ کے صریح فرمان کے خلاف ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: (( وَ اَنْ لَّا يُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ )) ''اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔'' [ بخاری، الدیات، باب لا یقتل المسلم بکافر : ٦٩١٥ ] مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو چوپاؤں کی مانند بلکہ ان سے بھی گمراہ تر قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹)۔

③ "مِنْ اَخِيْهِ" یہاں مقتول کے وارث کو قاتل کا بھائی قرار دینے میں ایک طرح کی سفارش ہے کہ بے شک قاتل نے تمھارے آدمی کو قتل کیا ہے مگر مسلمان ہونے کے ناتے تم اس کے بھائی ہو، تمھیں اسے کچھ نہ کچھ معافی دینی چاہیے۔ معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ صدقہ کرتے ہوئے دیت لیے بغیر معاف کر دیں۔ دوسری یہ کہ دیت لے لیں، پھر خواہ پوری لے لیں یا اس میں سے کچھ معاف کر دیں۔ اگر وہ معاف کرتے ہوئے قصاص کی جگہ دیت قبول کر لیں تو ان پر لازم ہے کہ دیت کا تقاضا اچھے طریقے سے کریں اور قاتل کے قبیلے والوں پر بھی لازم ہے کہ وہ اچھے طریقے سے دیت ادا کر دیں۔ استطاعت ہوتے ہوئے دیت ادا نہ کرنا ظلم ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ )) ''غنی کا دیر کرنا ظلم ہے۔'' [ بخاری، الحوالات، باب الحوالة وهل يرجع في الحوالة : ٢٢٨٧ ]

④ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں صرف قصاص تھا دیت نہیں تھی، اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف فرما کر دیت لینے کی بھی اجازت دے دی ہے۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ یأیها الذین آمنوا ...... ﴾ : ٤٤٩٨ ]

⑤ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ : دیت لے کر بھی کوئی آدمی اگر قاتل کو قتل کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

**آیت 179** ''قصاص میں زندگی'' کے معنی یہ ہیں کہ اس سزا کے خوف سے لوگ قتل کرنے سے رک جائیں گے اور کوئی شخص دوسرے کے قتل پر جرأت نہیں کرے گا۔ پس "تَتَّقُوْنَ" کے معنی یہ ہیں ''تاکہ تم دوسرے کو قتل کرنے سے بچ جاؤ'' مگر اس کے معنی عام لینا بہتر ہے ''تاکہ تم گناہ سے کنارہ کر کے آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤ'' علماء نے لکھا ہے کہ یہ آیت اختصار اور جامعیت میں بے نظیر ہے۔ سعودی عرب میں بے مثال امن اسی آیت پر عمل کی برکت سے ہے۔

**آیت 180** ① ''لکھ دیا گیا ہے'' یعنی فرض کر دیا گیا ہے۔ (راغب) ''کسی کو موت آ پہنچے'' یعنی اس کے اسباب و قرائن آ پہنچیں، کیونکہ موت آنے کے بعد وصیت تو کیا، کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

② چونکہ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے، اس لیے اگر وصیت نہ کرنے کی صورت میں کسی کی حق تلفی کا خطرہ ہو، مثلاً کسی کا قرض ادا کرنا ہو تو وصیت میں بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا حق نہیں جس کے پاس کوئی چیز ہو جس میں اسے وصیت کرنا ہو کہ وہ دو راتیں اس کے بغیر گزارے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔'' [ بخاری، الوصایا، باب الوصایا : ٢٧٣٨، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سننے کے بعد ایک رات بھی نہ گزری تھی کہ میں نے اپنی وصیت لکھ کر اپنے پاس رکھ لی۔ [ مسلم، الوصیة، باب وصیة الرجل مکتوبة عنده : ١٦٢٧/٤ ]

الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨٠﴾
فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٨١﴾
فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨٢﴾ ع

تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے، اگر اس نے کوئی خیر چھوڑی ہو، اچھے طریقے کے ساتھ وصیت کرنا ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے، متقی لوگوں پر یہ لازم ہے ﴿١٨٠﴾ پھر جو شخص اسے بدل دے، اس کے بعد کہ اسے سن چکا ہو تو اس کا گناہ انھی لوگوں پر ہے جو اسے بدلیں، یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿١٨١﴾ پھر جو شخص کسی وصیت کرنے والے سے کسی قسم کی طرف داری یا گناہ سے ڈرے، پس ان کے درمیان اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿١٨٢﴾

③ اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود وصیت کرتے ہوئے ان کا حصہ مقرر فرما دیا ہے، فرمایا: ﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ...... وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [ النساء : ۱۱ تا ۱۴ ] اب اللہ تعالیٰ کی وصیت کے بعد کسی اور کی وصیت کی کیا گنجائش ہے اور عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ )) ''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، چنانچہ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔'' [ نسائی، الوصایا، باب إبطال الوصیة للوارث : ۳۶۷۱۔ ترمذی : ۲۱۲۱۔ ابن ماجه : ۲۷۱۳، وقال الترمذی حسن صحیح ]

④ جب وارثوں کے حق میں وصیت جائز ہی نہیں تو اس آیت میں والدین اور اقربین یعنی قریبی رشتہ داروں کے حق میں وصیت کس طرح فرض کی گئی؟ اس سوال کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ یہ آیت: ﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ﴾ [ النساء : ۱۱ ] کے ساتھ منسوخ ہے، چنانچہ اب والدین اور اقربین کے حق میں وصیت فرض تو دور، جائز بھی نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے شک والدین اور اقربین کے حصے کی خود اللہ تعالیٰ نے وصیت فرما دی ہے، لہٰذا ان کے حق میں وصیت نہیں ہے، مگر کچھ والدین اور قریبی رشتہ دار ایسے بھی ہیں جن کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں فرمایا، ان کے بارے میں وصیت کرنا فرض کر دیا تاکہ وہ محروم نہ رہ جائیں، مثلاً وہ والدین جو کافر ہیں یا غلام ہیں، وہ مسلمان کے وارث نہیں ہو سکتے، ان کے حق میں وصیت فرض ہے۔ یا کسی شخص کے دادا، دادی یا نانا، نانی کا اگر کوئی پرسان حال نہیں تو والدین ہونے کے ناتے ان کے حق میں بھی وصیت لازم ہے، جب کہ قریبی والد کی موجودگی میں وہ وارث نہیں ہیں۔ اسی طرح کسی شخص کے بیٹوں کی موجودگی میں پوتے پوتیاں وارث نہیں ہو سکتے (اگرچہ پاکستان کے قانون میں اللہ کے حکم سے بغاوت کرتے ہوئے انھیں وارث بنایا گیا ہے)، ایسے پوتوں کے حق میں وصیت فرض ہے، تاکہ وہ یتیمی کے داغ کے ساتھ ساتھ دادے کے ورثے سے بھی بالکل محروم نہ رہ جائیں۔

⑤ کل مال میں سے ایک تہائی سے زیادہ وصیت جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو زیادہ سے زیادہ تہائی مال وصیت کی اجازت دی اور اسے بھی بہت قرار دیا۔ [ بخاری، الفرائض، باب میراث البنات : ۶۷۳۳ ]

**آیت 182،181** وصیت کا بدلنا بڑا گناہ ہے، اس میں وصیت کا چھپانا بھی داخل ہے۔ ''جَنَفًا'' ''مائل ہونا'' یعنی اگر کسی

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَی

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۱۸۳﴾ گنے ہوئے چند دنوں میں، پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا کسی سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے اور جو لوگ

کی طرف دلی میلان کی وجہ سے وصیت میں اس کی نامناسب طرف داری ہو۔ " اَوۡ اِثۡمًا " یا ناجائز کام کی وصیت ہو، مثلاً شراب پلانے کی، ناچ کرانے کی، کسی قبر پر چراغاں کرنے یا میلہ اور عرس کرانے کی تو ایسی وصیت کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ "جَنَفًا" سے مراد دلی میلان کی بنا پر غلطی یا بھول چوک سے طرف داری ہو جائے اور "اِثۡمًا" سے مراد جان بوجھ کر کسی کی حق تلفی ہو۔ "فَاَصۡلَحَ بَیۡنَهُمۡ" یعنی وارثوں کو سمجھا بجھا کر ان میں صلح کرا دے۔

**آیت 184،183** ① یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ ...... : روزہ ان پانچ فرائض میں داخل ہے جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔ [ بخاری، الإیمان، باب دعاؤکم إیمانکم : ۸ ]

② **الصِّیَامُ** : یہ مصدر ہے، یہ "صَوۡمٌ" کی جمع نہیں، بلکہ "صَوۡمٌ" بھی مصدر ہے، اصل میں یہ کسی بھی کام سے رک جانے کو کہتے ہیں، کھانا پینا ہو یا کلام ہو یا چلنا پھرنا، اسی لیے گھوڑا چلنے سے یا چارا کھانے سے رکا ہوا ہو تو اسے "فَرَسٌ صَائِمٌ" کہتے ہیں، رکی ہوئی ہوا کو بھی "صَوۡمٌ" کہتے ہیں۔ (راغب) شریعت میں روزہ کی نیت سے صبح صادق سے سورج غروب ہونے تک کھانے پینے اور جماع سے رکے رہنے کا نام صوم ہے۔

③ **لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ** : یہ روزے کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ اسلامی روزے کا مقصد نفس کو عذاب دینا نہیں بلکہ دل میں تقویٰ یعنی بچنے کی عادت پیدا کرنا ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے صبح سے شام تک ان حلال چیزوں سے بچے گا تو وہ ان چیزوں سے جو ہمیشہ کے لیے حرام ہیں، ان سے روزہ کی حالت میں بدرجۂ اولیٰ بچے گا۔ اس طرح روزہ گناہوں سے بچنے کا اور بچنے کی عادت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلصِّیَامُ جُنَّۃٌ )) "روزہ (گناہوں اور آگ سے) ڈھال ہے۔" [ بخاری، الصیام، باب فضل الصوم : ۱۸۹۴ ] اور فرمایا: "جو شخص جھوٹی بات اور اس پر عمل نہ چھوڑے اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" [ بخاری، الصیام، باب من لم یدع قول الزور : ۱۹۰۳، عن أبی هریرۃ رضی اللہ عنہ ] روزہ رکھ کر نماز نہ پڑھنے والے، جھوٹ بولنے والے، دھوکا دینے والے، سارا دن ٹی وی پر کان اور آنکھ کے زنا میں مصروف رہنے والے، غرض کسی بھی نافرمانی کا ارتکاب کرنے والے سوچ لیں کہ انھیں روزہ رکھنے سے کیا ملا؟

④ پہلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ اور پہلی امتیں ہیں۔ روزے کی یہ فرضیت ۲ ہجری میں نازل ہوئی اور روزے نے موجودہ شکل بتدریج اختیار کی۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ قریش (عاشورا) دس محرم کا روزہ رکھتے تھے اور نبی ﷺ بھی رکھتے تھے، جب مدینہ میں آئے تو اس دن کا روزہ رکھا اور اس کے رکھنے کا حکم دیا، پھر جب رمضان (کے روزوں کا حکم) نازل ہوا تو رمضان (کے روزے) فرض ہو گئے اور عاشورا ترک ہو گیا، پھر جو چاہتا اسے رکھتا اور جو چاہتا نہ رکھتا۔ [ بخاری، التفسیر،

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے، پھر جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو﴿۱۸۴﴾

باب : ﴿ يأيها الذين آمنوا كتب ...... ﴾ : ٤٥٠٤ ]

⑤ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ : صحیح سند کے ساتھ اس کی دو تفسیریں آئی ہیں۔ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ تو جو چاہتا کہ روزہ نہ رکھے اور فدیہ دے دے تو ایسا کر لیتا، یہاں تک کہ وہ آیت اتری جو اس کے بعد ہے، تو اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا۔ [ بخاري، كتاب التفسير، باب : ﴿ فمن شهد منكم الشهر ﴾ : ٤٥٠٧ ] ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا۔ [ بخاري، الصوم، باب : ﴿ و على الذين يطيقونه ...... ﴾ : ١٩٤٩ ] یعنی چونکہ شروع میں لوگوں کو روزے کی عادت نہ تھی، اس لیے انھیں یہ رعایت دی گئی کہ جو چاہے روزہ رکھ لے جو چاہے نہ رکھے اور فدیہ دے دے، بعد میں دوسری آیت سے یہ رعایت منسوخ ہو گئی۔ اکثر علماء نے یہی تفسیر کی ہے۔

دوسری تفسیر صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آئی ہے، انھوں نے '' يُطِيْقُوْنَهٗ '' کی جگہ " يُطَوَّقُوْنَهٗ " پڑھا، جس کا معنی ہے: " يَتَجَشَّمُوْنَهٗ " یعنی اس سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ (ابن عاشور رحمہ اللہ نے "التحرير والتنوير" میں فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "يُطَوَّقُوْنَهٗ" کو بطور قراءت نہیں بلکہ "يُطِيْقُوْنَهٗ" کی تفسیر کے طور پر پڑھا ہے ) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، یہ منسوخ نہیں بلکہ اس سے مراد وہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہیں جو روزہ نہیں رکھ سکتے، وہ ہر دن (یعنی ہر روزے ) کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ أيامًا معدودات ...... ﴾ : ٤٥٠٥ ] بخاری ہی میں مذکور ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے بوڑھے ہونے کے بعد ایک یا دو سال ہر دن ایک مسکین کو گوشت کے ساتھ روٹی کھلا دی اور روزہ نہ رکھا۔ [ بخاري التفسير، باب : ﴿ أيامًا معدودات ...... ﴾، قبل ح : ٤٥٠٥ ]

⑥ يُطِيْقُوْنَهٗ : اس کا معنی ''جو اس (روزے) کی طاقت رکھتے ہوں'' بھی ہو سکتا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو معنی کیا ہے کہ ''طاقت نہ رکھتے ہوں'' وہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں باب افعال ازالۂ ماخذ کے لیے ہوگا، جیسے کہا جاتا ہے: " شَكَا اِلَيَّ فَأَشْكَيْتُهٗ" اس نے میرے پاس شکایت کی تو میں نے اس کی شکایت دور کر دی۔ دونوں کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت روزے کی طاقت رکھنے والے کے حق میں منسوخ ہے اور طاقت نہ رکھنے والے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے حق میں منسوخ نہیں اور جس بیمار کے تندرست ہونے کی امید نہ ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

⑦ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا: یعنی ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھلا دے۔ [ طبري عن ابن عباس رضی اللہ عنہما بسند صحيح ] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہر دن کی جگہ نصف صاع فدیہ دے دے۔ [ ابن ابي حاتم بسند حسن، التفسير الصحيح ] ایک روزے کی جگہ ایک کلو اناج فدیہ دے دے یا ایک مسکین کو بلا کر کھانا کھلا دے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ہدایت کی اور (حق و باطل میں) فرق کرنے کی واضح دلیلیں ہیں، تو تم میں سے جو اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس کا روزہ رکھے اور جو بیمار ہو یا کسی سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر جو اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۸۵﴾

**آیت 185** ① یعنی وہ ”اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ“ ماہ رمضان ہیں۔

② **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ :** یعنی اس ماہ لیلۃ القدر میں قرآن کا نزول شروع ہوا، پھر تیئیس برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ماہِ رمضان کو قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق ہے، اس میں کثرت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت اور قیام ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں ہر رات جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے۔ [ بخاری، بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی : ٦ ] صحابہ کرام اور دوسرے سلف صالحین کے عمل سے بھی رمضان میں قرآن سے خصوصی شغف ثابت ہے۔ بہت سی احادیث میں ماہِ رمضان کی راتوں میں قیام کی فضیلت آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ رمضان کا قیام کیا، اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔“ [ بخاری، الصوم، باب فضل من قام رمضان : ۲۰۰۹ ] ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی ۲۳ ویں، ۲۵ ویں اور ۲۷ ویں رات جماعت کے ساتھ قیام کروایا۔ [ أبو داوٗد، تفریع أبواب شهر رمضان، باب في قیام شهر رمضان : ۱۳۷۵، بسند صحیح ] ابوسلمہ رحمہ اللہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کس طرح تھی؟ تو انھوں نے فرمایا کہ آپ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ [ بخاری، صلاۃ التراویح، باب فضل من قام رمضان : ۲۰۱۳ ] عمر رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو ایک امام پر جمع کر دیا، چنانچہ ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت قیام کروائیں۔ [ الموطأ، باب قیام شهر رمضان : ۲٤۱ بسند صحیح ] بیس رکعت پڑھنا یا اس کا حکم دینا صحیح سند کے ساتھ نہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے نہ عمر رضی اللہ عنہ سے۔ بعض روایات میں عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بعض لوگوں سے بیس رکعت پڑھنے کا ذکر آیا ہے، موطا کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو خاص طور پر گیارہ رکعت کا حکم انھی لوگوں کے اس عمل کو ختم

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں ﴿۱۸۶﴾

کرنے کے لیے دیا تھا۔

③ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ: یعنی قرآن لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس کے ساتھ اس میں ہدایت اور حق و باطل میں فرق کرنے والے دلائل بھی ہیں۔ ہدایت ایک عام ہوتی ہے اور ایک وہ ہدایت جس کے ساتھ دلیل بھی ہو، سو اس میں صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اس کے دلائل بھی ہیں۔ (التسہیل)

④ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ: یعنی اس ماہ کا چاند طلوع ہونے کے بعد جو گھر میں موجود ہو وہ ضرور روزہ رکھے۔

⑤ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: اس آیت سے علمائے کرام نے روزوں کی تکمیل پر اس کا شکر ادا کرنے کے لیے عید الفطر کا اہتمام اور اس کے لیے جاتے اور واپس آتے ہوئے تکبیرات کا اہتمام اخذ کیا ہے۔ جس کی عملی تفسیر احادیث رسول ﷺ سے ملتی ہے۔

آیت 186 ① اس آیت سے پہلے اور بعد میں ماہِ رمضان کا ذکر ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہِ رمضان، خصوصاً روزے کی حالت دعا کی قبولیت کا خاص سبب ہے اور پھر افطار کا وقت قبولیتِ دعا کا وقت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''روزے دار کے لیے افطار کے وقت ایک قبول کی جانے والی دعا ہے (یعنی رد نہیں ہوتی)۔'' [ ابن ماجه، الصيام، باب في الصائم لا ترد دعوته : ۱۷۵۳ ] چنانچہ حدیث کے راوی عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما جب روزہ افطار کرتے تو اپنے اہل و اعیال کو بلاتے اور دعا کرتے۔ [ مسند أبي داؤد الطيالسي : ۲۲٦۲ ] یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ [ هداية المستنير ]

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''عِبَادِيْ'' کہہ کر اپنے بندوں پر اپنی خاص رحمت ظاہر کی ہے اور پھر اپنے قریب ہونے کا ذکر کر کے دعا کرنے کی ترغیب دی ہے، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مسلمان ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرے جس میں نہ کوئی گناہ ہو اور نہ قطع رحمی، مگر اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے ایک عطا فرما دیتا ہے، یا تو اس کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے، یا آخرت میں اس کا ذخیرہ کر لیتا ہے، یا اس سے اتنی برائی ٹال دیتا ہے۔'' صحابہ نے کہا: ''پھر تو ہم بہت دعا کریں گے۔'' فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے پاس اس سے کہیں زیادہ ہے۔'' [ مسند أحمد : ۱۸/۳، ح : ۱۱۳۹۔ صحيح ]

③ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ: دعا کی قبولیت کے سلسلے میں دو حکم دیے، ایک تو یہ کہ ان پر بھی لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کے احکام پر عمل نہیں کرتا تو خواہ وہ دعویٰ کرتا رہے مگر (توبہ کے بغیر) اس کے دل میں اللہ کی رحمت کی

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

تمھارے لیے روزے کی رات اپنی عورتوں سے صحبت کرنا حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ بے شک تم اپنی جانوں کی خیانت کرتے تھے تو اس نے تم پر مہربانی فرمائی اور تمھیں معاف کر دیا، تو اب ان سے مباشرت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمھارے لیے لکھا ہے اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ تمھارے لیے سیاہ دھاگے سے سفید دھاگا فجر کا خوب ظاہر ہو جائے، پھر روزے کو رات تک

امید کا چراغ روشن نہیں ہوتا۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۱۸) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا، جو طویل سفر کرتا ہے، بکھرے ہوئے بالوں والا ہے، غبار سے بھرا ہوا ہے، وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے (اور کہتا ہے) ''یارب! یارب!'' حالانکہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام اور وہ حرام غذا کے ساتھ پلا بڑھا ہے تو اس کی دعا کیسے قبول کی جائے؟ [ مسلم، الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ ...... : ۱۰۱۵ ] دوسرا حکم یہ کہ مجھ پر ایمان لائیں اور یقین رکھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے، جب تک کہ کوئی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، بشرطیکہ جلدی بھی نہ کرے۔'' پوچھا گیا: ''یارسول اللہ! وہ جلدی کیا ہے؟'' فرمایا: ''یہ کہ کوئی کہے کہ میں نے دعا کی اور میں نے (دوبارہ) دعا کی تو میں نے نہیں دیکھا کہ وہ میری دعا قبول کرتا ہو، سو اس وقت وہ تھک ہار کر رہ جائے اور دعا کرنا چھوڑ دے۔'' [ مسلم، الذکر والدعاء، باب بیان أنه یستجاب ...... : ۹۲/۲۷۳۵ ]

آیت 187 ① ابن کثیر میں ہے کہ ابتدا میں جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو روزہ کھولنے سے لے کر صرف نماز عشاء تک کھانا پینا اور عورت سے صحبت جائز تھی، اگر کسی شخص نے عشاء کی نماز پڑھ لی، یا وہ اس سے پہلے سو گیا تو اس کا روزہ شروع ہو جاتا تھا، پھر اگلے روز افطار یعنی سورج غروب ہونے تک کھانا پینا اور جماع اس پر حرام ہوتا تھا، بعض لوگ ضبط نہ کر سکے اور رات کو بیویوں سے صحبت کر بیٹھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں لوگ جب عشاء کی نماز پڑھ لیتے تو ان پر کھانا پینا اور بیویاں حرام ہو جاتی تھیں اور وہ اگلی شام تک کے لیے روزے دار ہو جاتے تھے...... تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔ [ أبو داؤد، الصیام، باب مبدأ فرض الصیام : ۲۳۱۳ ] ایک انصاری صحابی قیس بن صرمہ رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ روزے کی حالت میں دن بھر کھیت میں کام کرتے رہے، افطار کے وقت گھر آئے اور بیوی سے پوچھا، کوئی چیز کھانے کے لیے ہے؟ بیوی نے جواب دیا نہیں، آپ ٹھہریے، میں جا کر پڑوسیوں سے کچھ لاتی ہوں۔ بیوی کے چلے جانے کے بعد ان کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گئے۔ بیوی کو یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا، پھر اگلے دن انھیں (بغیر کھائے پیے ہی) روزہ رکھنا پڑا۔ ابھی

الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

پورا کرو اور ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنی آیات لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے، تا کہ وہ بچ جائیں ﴿۱۸۷﴾

آدھا دن نہیں گزرا تھا کہ کمزوری کی وجہ سے غش کھا گئے۔ اس کا علم رسول اللہ ﷺ کو ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ [ بخاری، الصوم، باب قول اللہ جل ذکرہ : ﴿ أحل لكم ...... ﴾ : ۱۹۱۵۔ أبو داؤد : ۲۳۱۴ ]

② هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ ...... : یعنی میاں بیوی ایک دوسرے سے لباس کی طرح مل جاتے ہیں، انھیں جدا رکھنا یقیناً ان پر شاق ہوگا، اس لیے انھیں رمضان کی راتوں میں مباشرت کی اجازت دے دی گئی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کا آپس میں کوئی پردہ نہیں، بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ''وہ ایک دوسرے کی شرم گاہ کو نہیں دیکھ سکتے'' ان کے ایک دوسرے کا لباس ہونے کے منافی ہے۔ عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ''میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کر لیتے، جو میرے اور آپ کے درمیان ہوتا، جبکہ ہم دونوں جنبی ہوتے۔'' [ بخاری، الحیض، باب مباشرۃ الحائض : ۲۹۹ ] عائشہ ؓ سے مروی روایت کہ میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی شرم گاہ نہیں دیکھی، صحیح نہیں۔ [ دیکھیے ضعیف ابن ماجه للألبانی : ٦٦٨ ]

③ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ : اس سے صحبت کی لذت کے ساتھ ساتھ پاک دامنی کا حصول اور اولاد کی طلب مراد ہے۔ کفار کی خواہش کے مطابق مسلمانوں کا اولاد کی کثرت سے اجتناب جائز نہیں۔

④ فجر کے سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔ اس ''سفید دھاگے'' اور ''سیاہ دھاگے'' کے سمجھنے میں بعض صحابہ کو غلط فہمی ہوگئی۔ انھوں نے سرہانے کے ساتھ سفید دھاگا اور سیاہ دھاگا رکھ لیا اور اس کے واضح ہونے کا انتظار کرتے رہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے مراد رات کی سیاہی سے صبح کی سفیدی واضح ہونا ہے۔'' [ بخاری، الصوم، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ و كلوا واشربوا ...... ﴾ : ۱۹۱٦، عن عدی بن حاتم ؓ ] معلوم ہوا کہ قرآن سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ حدیث بھی ضروری ہے۔

⑤ فجر تک کھانے پینے اور جماع کی اجازت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جنابت کی حالت میں روزہ رکھ سکتا ہے، غسل اذان کے بعد کر لے، رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ ثابت ہے۔ [ بخاری، الصوم، باب الصائم یصبح جنبا : ۱۹۲۵، ۱۹۲٦، ۱۹۳۰ ]

⑥ اِلَى الَّيْلِ : یعنی سورج غروب ہونے تک۔ ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے، کیونکہ یہود و نصاریٰ دیر سے افطار کرتے ہیں۔'' [ أبو داود، الصیام، باب ما یستحب من تعجیل الفطر : ۲۳۵۳ ]

⑦ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ : رمضان سے چونکہ اعتکاف کا خاص تعلق ہے، اس لیے یہاں اعتکاف کے احکام کی طرف اشارہ فرما دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء محدثین روزے کے عنوان کے بعد اعتکاف کا عنوان باندھتے ہیں۔ اعتکاف کا معنی اپنے

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ اور نہ انھیں حاکموں کی طرف لے جاؤ، تاکہ لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۱۸۸﴾

آپ کو کسی کے ساتھ یا کسی جگہ روک کر رکھنا ہے۔ (راغب) اعتکاف میں بیوی سے مباشرت جائز نہیں، نہ مسجد سے نکلنا ہی جائز ہے، سوائے ایسی ضرورت کے جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اگر مباشرت کرے گا یا مجبوری والی ضرورت کے بغیر نکلے گا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ ہاں مسجد میں جا کر عورت اپنے خاوند سے ملاقات کر سکتی ہے، جیسا کہ بعض ازواجِ مطہرات نے مسجد میں رسول اللہ ﷺ سے جا کر ملاقات کی اور بیوی خاوند کی خدمت بھی کر سکتی ہے۔ [ بخاری، الاعتکاف، باب هل يخرج المعتكف ...... : ۲۰۳۵، ۲۰۳۰، ۲۰۳۱ ]

⑧ فِي الْمَسٰجِدِ: اس لفظ سے معلوم ہوا کہ اعتکاف گھر میں نہیں ہوتا، مسجد میں ہوتا ہے، عورت ہو یا مرد۔ نبی ﷺ کی بیویاں مسجد میں اعتکاف کرتی تھیں۔ [ بخاری، الصوم، باب اعتكاف النساء : ۲۰۳۳، ۲۰۳۴ ] اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے۔ وہ روایت کہ "تین مسجدوں کے سوا اعتکاف نہیں" منکر ہے۔ صحیح بخاری میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے غیر ثابت ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے باب قائم کیا ہے: " اَلْاِعْتِكَافُ فِي الْمَسَاجِدِ كُلِّهَا " "تمام مسجدوں میں اعتکاف (کے جائز) ہونے کا بیان۔" مسئلہ: احادیث میں سحری کے وقت کھانا کھا کر روزہ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سحری کھاؤ، کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔" [ بخاری، الصوم، باب بركة السحور من غير إيجاب : ۱۹۲۳۔ مسلم : ۱۰۹۵ ] اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہمارے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کھانے کا ہے۔" [ مسلم، الصيام، باب فضل السحور ...... : ۱۰۹۶ ] لہٰذا سحری کے وقت کچھ کھا پی کر روزہ رکھنا چاہیے۔

⑨ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا: یہ احکام یعنی صبح صادق تک مباشرت اور کھانے پینے کا جائز ہونا، فجر سے سورج غروب ہونے تک ان چیزوں کی ممانعت اور اعتکاف کی حالت میں عورتوں سے مباشرت کی ممانعت، یہ کام اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، ان کی سختی سے پابندی کرو۔ (ابن کثیر)

آیت 188 ① وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ ...... : روزے کی حالت میں اللہ کے حکم سے آدمی تین نہایت مرغوب اور حلال چیزیں ترک کر دیتا ہے، اس مناسبت سے اب حرام سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ جو مال بھی ناجائز طریقے سے حاصل کیا جائے، خواہ اس میں مالک کی رضامندی بھی شامل ہو، وہ باطل (یعنی ناحق) طریقے سے کھانا ہے، مثلاً سود، زنا کی اجرت، نجومی کی فیس، شراب کی فروخت، لاٹری یا جوئے کے ذریعے سے کمائی یا گانے بجانے کی اجرت، الغرض تمام ناجائز وسائل باطل کے ساتھ کمانے میں آ جاتے ہیں۔

② تُدْلُوْا: یہ باب افعال کے مصدر " اِدْلَاءٌ " سے جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے، جو " دَلْوٌ " سے بنا ہے، جس کا معنی ڈول ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں اور نیکی ہرگز یہ نہیں کہ گھروں میں ان کی پچھلی طرفوں سے آؤ، اور بلکہ نیکی اس کی ہے جو بچے۔ اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو، تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۱۸۹﴾

" اِدْلَاءٌ " کا اصل معنی ڈول ڈالنا ہے، جیسا کہ سورۂ یوسف میں ہے: ﴿ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ﴾ [ یوسف : ۱۹ ] ''تو اس نے اپنا ڈول ڈالا'' پھر کوئی چیز کسی کی طرف لے جانے یا بھیجنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ حکام کی طرف لے جانے کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مراد ہیں، ایک یہ کہ آدمی کو معلوم ہے کہ فلاں زمین یا مال فلاں شخص کا ہے، مگر اس کے پاس ثبوت نہیں، اگر میں مقدمہ کر دوں تو عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا، چنانچہ وہ حاکم کے پاس مقدمہ لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ﴿ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی جانتے ہوئے ایسا کرنا تو نہایت برا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاد رکھو! میں ایک بشر ہی ہوں اور میرے پاس جھگڑنے والے آتے ہیں، تو شاید ان میں سے ایک اپنی دلیل بیان کرنے میں دوسرے سے زیادہ زبان آور ہو تو میں اسے سچا سمجھتے ہوئے اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، سو میں جس کے لیے کسی مسلمان کے حق کا فیصلہ کر دوں تو وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، خواہ وہ اسے لے لے یا اسے چھوڑ دے۔'' [ بخاری، المظالم، باب إثم من خاصم فی باطل وھو یعلمہ : ۲٤٥٨ ]

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قاضی جس کے حق میں کسی چیز کا فیصلہ کر دے وہ اس کے لیے حلال ہو جاتی ہے، لیکن اس آیت اور حدیث سے ان کی بات کا باطل ہونا ظاہر ہے۔ دوسرا معنی اس آیت کا یہ ہے کہ حکام کو بطور رشوت مال دے کر دوسرے کا حق باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔ " رِشَاءٌ " ڈول کی رسی کو کہتے ہیں، جس کے ذریعے سے پانی نکالا جاتا ہے، اسی طرح راشی رشوت کے ذریعے سے اپنا مطلب حاصل کرتا ہے۔ " رَاشِیْ " رشوت دینے والا اور " مُرْتَشِیْ " رشوت لینے والا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی۔ [ ترمذی، الأحکام، باب ما جاء فی الراشی ...... : ۱۳۳۷، و صححہ الألبانی ] اگر اپنا حق لینے کے لیے تاوان دینا پڑے تو یہ رشوت نہیں، اگرچہ جہاں تک ہو سکے اس سے بھی بچنا لازم ہے، کیونکہ یہ گناہ میں اور بری عادت ڈالنے میں مدد ہے، ہاں کوئی بے بس ہو جائے تو الگ بات ہے۔

**آیت 189** ① **الْاَهِلَّةِ** : یہ " هِلَالٌ " کی جمع ہے۔ پہلی اور دوسری رات کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، پھر اسے ''قمر'' کہا جاتا ہے۔ (راغب) لوگوں نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت دریافت کی تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ چاند ہر ماہ ہلال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، پھر وہ چودھویں کو پورا (بدر) ہو جاتا ہے۔ آخری رات بالکل غائب ہو جاتا ہے، پھر دوبارہ نئے چاند کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے، جس سے شہروں اور بستیوں کے علاوہ صحراؤں اور سمندروں میں رہنے والوں کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نیا مہینا شروع ہو گیا ہے اور وہ اس کی مختلف حالتوں سے تاریخ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ جب کہ سورج

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۱۹۰﴾

ہمیشہ مکمل رہتا ہے، اس کے حساب سے وقت اور تاریخ معلوم کرنا دنیا کے ہر حصے میں رہنے والوں کے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بدلنے والے چاندوں کو بطور کیلنڈر مقرر فرمایا، حج، کفارات اور معاملات، مثلاً طلاق اور وفات کی عدت چاند کے لحاظ ہی سے مقرر فرمائی۔ ہر ماہ طلوع ہونے والے چاندوں کے لحاظ سے ''الْاَهِلَّةِ'' جمع ذکر فرمایا۔

② وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا...... : حج کا ذکر آیا تو ایام حج میں جاہلیت کی ایک رسم کا رد فرمایا۔ براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی، انصار جب حج کرتے، پھر (واپس) آتے تو اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے، اب انصار کا ایک آدمی (حج سے) آیا اور اپنے دروازے کی طرف سے داخل ہو گیا تو گویا اسے اس کی عار دلائی گئی تو یہ آیت اتری: ﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ﴾ [ بخاري، العمرة، باب قول الله تعالٰى : ﴿ و أتوا البيوت من أبوابها ﴾ : ۱۸۰۳ ]

دوسری روایت میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت میں جب لوگ احرام باندھ لیتے تو گھروں کی پچھلی طرف سے گھر آتے، تو اس پر یہ آیت اتری۔ [ بخاري، التفسير، بابٌ : ﴿ وليس البر بأن تأتوا البيوت ...... ﴾ : ٤٥١٢ ] آیت میں دونوں کا رد ہے۔

③ ''وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ'' اس میں ''لَيْسَ'' کی تاکید 'باء' کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے ''نیکی ہرگز یہ نہیں۔''

**آیت 190** ① مسلمان عمرہ کے لیے آئے تو کفار لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ حج کے بیان کے ساتھ لڑائی کے حکم کی مناسبت یہ ہے۔

② بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں صرف ان کفار سے لڑنے کا حکم ہے جو خود لڑنے میں پہل کریں ''لَا تَعْتَدُوْا'' (زیادتی نہ کرو) کا معنی انھوں نے یہ کیا کہ تم لڑائی میں پہل نہ کرو، پھر ان مفسرین نے اسے ان آیات کے ساتھ منسوخ قرار دیا جن میں تمام کفار سے لڑنے کا حکم ہے، وہ پہل کریں یا نہ کریں، مثلاً: ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ [ التوبة : ٣٦ ] ''اور مشرکوں سے ہر حال میں لڑو۔'' اور فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ ﴾ [ التوبة : ١٢٣ ] ''ان لوگوں سے لڑو جو کافروں میں سے تمھارے قریب ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [ التوبة : ٢٩ ] ''لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر۔'' مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت نہ دوسری آیات کے خلاف ہے، نہ منسوخ ہے اور نہ ''لَا تَعْتَدُوْا'' کا معنی یہ ہے کہ لڑنے میں پہل نہ کرو، بلکہ اس میں مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے کہ جب وہ لڑنے سے دریغ نہیں کرتے تو تم بھی ان سے لڑو اور جن جن جگہوں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم بھی انھیں وہاں سے نکالو۔ (ابن کثیر) اور ''لَا تَعْتَدُوْا'' کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ بچوں اور

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور انھیں وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو انھیں قتل کرو، ایسے ہی کافروں کی جزا ہے ﴿۱۹۱﴾ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۹۲﴾

عورتوں کو قتل نہ کرو، نہ بوڑھوں کو اور نہ اس کو جو صلح کی پیش کش کرتا ہے اور لڑنے سے ہاتھ روک لیتا ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو زیادتی کرو گے۔ (ابن کثیر) بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو کسی لشکر کا امیر مقرر فرماتے تو اسے اور باقی مومنوں کو نصیحت فرماتے: ''اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جو اللہ کا منکر ہے اس سے لڑو۔ جنگ کرو، خیانت نہ کرو، نہ عہد شکنی کرو، نہ مثلہ کرو، نہ بچوں کو قتل کرو اور نہ درویشوں، راہبوں کو۔'' [ مسلم، الجهاد، باب تأمير الإمام الأمراء على البعوث...... : ۱۷۳۱ ] امام طبری نے فرمایا: ''یہی معنی درست ہے، کیونکہ نسخ کا دعویٰ کرنے والوں کے پاس کوئی دلیل نہیں اور دلیل کے بغیر دعویٰ تو ہر شخص کر سکتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ اس پیشکش کے بعد کہ ''مسلمان ہو جاؤ یا جزیہ دو یا لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ'' اگر کوئی شخص نہیں لڑتا، بلکہ مسلمان ہو جاتا ہے، یا جزیہ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اس سے لڑنا زیادتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو زیادتی کرنے والے پسند نہیں۔

**آیت 192،191** ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور ۹ ہجری میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور انھیں سورۂ توبہ میں مذکور اعلان کرنے کا حکم دیا جس کے مطابق مشرکین کو چار ماہ تک مکہ میں اور سرزمین عرب میں چلنے پھرنے کی اجازت دی گئی، اس کے بعد مسلمان نہ ہونے کی صورت میں وہ جہاں ملیں انھیں قتل کرنے کا حکم دے کر جزیرۂ عرب سے نکال دیا گیا۔ دیکھیے سورۂ توبہ کی پہلی پانچ آیات۔ پھر یہود کو بھی پہلے مدینہ سے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرزمین عرب سے نکال دیا گیا۔ یہ سب اسی " **اَخْرِجُوْهُمْ** " کے حکم کی تعمیل تھی۔

② **الْفِتْنَةُ** : اس کا اصل معنی آزمائش میں ڈالنا ہے، مفسرین سلف نے اس کا معنی شرک کیا ہے اور ﴿ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ کی تفسیر دو طرح سے کی ہے، ایک تو یہ کہ بے شک مشرکین کو قتل کرنے کا حکم بڑی سخت بات ہے، مگر وہ جس طرح شرک پر اڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے انھیں دوبارہ مشرک بنانے کے لیے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہیں، ان کا یہ شرک کرنا اور مسلمانوں کو اس پر مجبور کرنا اس سے بھی سخت جرم ہے۔ لہٰذا اس جرم کی پاداش میں کسی اندیشے اور سوچ بچار کے بغیر انھیں بے دریغ قتل کرو، یہاں تک کہ اللہ کا دین اتنا غالب ہو جائے کہ کسی کو مسلمان ہونے والے شخص پر ظلم و ستم کر کے اسے دین سے برگشتہ کرنے کی جرأت باقی نہ رہے۔ دوسرا معنی امام طبری رحمہ اللہ نے یہ کیا ہے کہ کسی مومن کو اسلام قبول

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر کوئی زیادتی نہیں ﴿۱۹۳﴾

کرنے پر آزمائش میں ڈالنا، یہاں تک کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو کر دوبارہ مشرک بن جائے، اس مومن کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور نقصان دہ ہے کہ وہ اسلام پر قائم رہتا اور اسی پر قتل ہو جاتا ( کیونکہ قتل تو ایک ہی دفعہ ہو جاتا ہے، جب کہ کفار کی طرف سے سزا اور عذاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے )۔ ( طبری ) مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ مومن کا بت پرستی کی طرف لوٹ جانا اس پر قتل ہونے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ بے شک ان کفار کو قتل کرنا بڑی سخت بات ہے، مگر جو معاملہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں وہ ان کے لیے قتل ہو جانے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے، تو مسلمانوں کو قتل ہو جانے سے بھی بڑی تکلیف اور آزمائش میں مبتلا کرنے کے مقابلے میں مسلمانوں کا انھیں قتل کرنا کم سخت ہے۔ ﴿ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ کے الفاظ میں دونوں معنی موجود ہیں اور یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے۔

③ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ: یعنی سرزمین مکہ حرم ہے، اس میں قتل و قتال منع ہے، مگر کفار اس میں لڑنے کی ابتدا کریں تو تمھارے لیے بھی لڑنا جائز ہے، پھر اگر وہ لڑائی کریں تو پھر تم صرف قتال (لڑائی) ہی نہیں بلکہ انھیں قتل کرو، ایسے کافروں کی یہی جزا ہے۔ "الْكٰفِرِيْنَ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ "ایسے کافروں" کیا گیا ہے۔

**آیت 193** ① یعنی ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ (شرک اور اس پر مجبور کرنے کے لیے ظلم و ستم) کا ہر طرح سے قلع قمع نہیں ہوتا اور اللہ کا دین ہر طرح سے غالب نہیں آ جاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر جب وہ یہ کام کر لیں تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے اموال مجھ سے محفوظ کر لیے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔" [ بخاری، الإیمان، باب : ﴿ فإن تابوا وأقاموا...... ﴾ : ۲۵ ]

② اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ: یعنی اگر یہ شرک سے یا مسلمانوں کے ساتھ لڑائی سے باز آ جائیں تو اس کے بعد جو شخص ان سے جنگ کرے گا وہ ظالم ہے اور اسے اس زیادتی کی سزا ملے گی۔ یہاں "عُدْوَانَ" کا لفظ ایسی ہی سزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (ابن کثیر) دوسرا معنی یہ ہے کہ اگر وہ ظلم یعنی شرک سے باز آ جائیں تو اب ان پر زیادتی جائز نہیں، کیونکہ اب وہ ظالم نہیں۔ عدوان سے مراد وہ زیادتی ہے جو مقابلے میں ہوتی ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے: ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۴ ] "پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔" (ابن کثیر)

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡكُمۡ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡكُمۡ اِلَی التَّهۡلُكَةِ ۚۖۛ وَاَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۵﴾

حرمت والا مہینا حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور سب حرمتیں ایک دوسری کا بدلہ ہیں۔ پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾

**آیت 194** رسول اللہ ﷺ جب ذوالقعدہ ۶ ھ میں عمرہ کے لیے تشریف لے گئے، تو کفار نے مزاحمت کی اور عمرہ سے روک دیا، مگر آخرکار صلح ہو گئی اور قرار پایا کہ مسلمان آئندہ سال عمرہ کر لیں۔ یہ معاہدہ صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے، پھر جب دوسرے سال ۷ ھ میں مسلمان عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تو انھیں اندیشہ ہوا کہ ماہ حرام اور حرم مکہ میں تو لڑائی منع ہے، لیکن اگر کفار نے بدعہدی کی اور ہمیں عمرہ سے روک دیا تو ہم کیا کریں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر) یعنی (حرمت والے مہینوں کی حرمت کی پاس داری کفار کی طرف سے ان کی حرمت کی پاس داری کے مقابلے میں ہے) اگر وہ حرام مہینوں کا لحاظ نہ کریں تو تم بھی نہ کرو اور اگر وہ بدعہدی کریں تو تم بھی حرم کا لحاظ مت کرو۔ (قرطبی، ابن کثیر) واضح رہے کہ حرمت والے مہینے چار ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ اگرچہ زیادتی کے جواب کو زیادتی نہیں کہا جاتا، بلکہ وہ عین حق ہے، مگر یہ صرف لفظ کی حد تک مشابہت ہے کہ "فَمَنِ اعۡتَدٰی" کے مقابلے میں لفظ "فَاعۡتَدُوۡا" آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثۡلُهَا﴾ [الشوریٰ: ۴۰] "اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے۔"

**آیت 195** اس سے پہلی آیت میں قتال فی سبیل اللہ کا حکم ہے، یہ آیت بھی اسی حکم کی تکمیل ہے، یعنی جہاد میں اور اس کی تیاری میں خرچ کرتے رہو اور اس میں کوتاہی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، کیونکہ اس صورت میں کفار تم پر غالب آ جائیں گے، جو سراسر ہلاکت ہے۔ اسلم تُجیبی کہتے ہیں کہ ہم مدینۂ روم (قسطنطنیہ) میں تھے، انھوں نے ہمارے مقابلے کے لیے رومیوں کی ایک بہت بڑی جماعت نکالی، ان کے مقابلے میں اتنے ہی یا ان سے زیادہ مسلمان نکلے، اہل مصر پر عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور جماعت پر فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ (امیر) تھے۔ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے رومیوں کی صف پر حملہ کر دیا، یہاں تک کہ ان میں داخل ہو گیا، لوگ چیخ اٹھے اور کہنے لگے، سبحان اللہ! یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے، تو ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، انھوں نے فرمایا، تم آیت کا یہ مطلب سمجھتے ہو؟ حالانکہ یہ تو ہم انصار کی جماعت کے بارے میں نازل ہوئی، جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی اور اس کے مددگار بہت ہو گئے تو ہم میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے چھپا کر دوسروں سے کہا کہ ہمارے اموال (یعنی کھیت اور باغات وغیرہ) ضائع ہو گئے، اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اور اس کے مددگار بہت ہو گئے ہیں، چنانچہ ہم اگر اپنے اموال میں ٹھہر جائیں اور جو ضائع ہو گئے ہیں انھیں درست کر

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ

اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تم روک دیے جاؤ تو قربانی میں سے جو میسر ہو (کرو) اور اپنے سروں کو نہ مونڈو،

لیں (تو بہتر ہے)، تو اللہ تعالیٰ نے ہماری بات کی تردید کرتے ہوئے یہ آیت اتار دی: ''اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو۔'' [ البقرة : ۱۹۵ ] تو ''ہلاکت'' ہمارا اپنے اموال میں ٹھہر جانا، انھیں درست کرنا اور جنگ کو چھوڑ دینا تھا۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ اللہ کے راستے ہی میں نکلے رہے یہاں تک کہ روم کی سرزمین میں دفن ہوئے۔ [ ترمذی، التفسیر، باب و من سورة البقرة : ۲۹۷۲، و صححه الألبانی ] حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت نفقہ کے بارے میں اتری۔ [ بخاری، قبل ح : ٤٥١٦ ] ابو اسحاق سبیعی کہتے ہیں کہ میں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا، اگر آدمی مشرکین پر حملہ کر دے تو کیا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا ہوگا؟ انھوں نے فرمایا نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ﴿ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ ﴾ [ النساء : ٨٤ ] ''پس اللہ کے راستے میں جنگ کر، تجھے تیری ذات کے سوا کسی کی تکلیف نہیں دی جاتی۔'' [ أحمد : ۲۸۱/٤، ح : ١٨٤٧٧، وهو حسن ]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس آیت کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ جب کسی اکیلے فدائی مسلم کے حملے سے دشمن کو نقصان پہنچنے کی امید ہو، یا اہل اسلام کی شجاعت سے کفار کے حوصلے پست کرنا مقصود ہو، یا شہادت پیش کیے بغیر دشمن کو نقصان پہنچانا ممکن نہ ہو تو فدائی حملے بالکل درست ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ جہاد چھوڑ کر کاروبار میں مصروف ہو جانا اصل ہلاکت ہے۔ تاریخ اسلام میں غزوۂ بدر میں ابوجہل کے قاتل معوذ اور معاذ، غزوۂ خیبر میں ابو رافع یہودی کے قاتل عبداللہ بن عتیک، مدینہ میں کعب بن اشرف کے قاتل محمد بن مسلمہ، خالد بن سفیان کے قاتل عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہم کی کارروائیاں، حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام کی موت پر بیعت، جنگ جسر میں ابو عبید ثقفی کی ہاتھی پر حملہ کرتے ہوئے شہادت، جنگ یمامہ میں براء بن مالک رضی اللہ عنہ کا ساتھیوں سے کہنا کہ مجھے ڈھال پر بٹھا کر ڈھال کو نیزوں کے ساتھ بلند کر کے باغ کے اندر پھینک دو اور وہاں جا کر اسی (۸۰) زخم کھا کر بھی دروازہ کھول کر مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کرنا، (بیہقی : ۹/۱۸۳۷۹) سلطان صلاح الدین ایوبی کے تیار کردہ فدائی جنھوں نے صلیبیوں کی کمر توڑ دی، الغرض! بے شمار واقعات اس کے لیے شاہد ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کی ہلاکت اور ذلت کا باعث یہی ہے کہ انھوں نے جہاد کی تیاری میں خرچ کرنے اور کفار سے لڑنے کے بجائے عیش و عشرت اور جان بچانے کو ترجیح دی تو کفار کے ہاتھوں نہ ان کی جانیں محفوظ رہیں نہ مال اور نہ عزتیں۔ اب بھی اگر اسلام کی آبرو کچھ باقی ہے تو جان قربان کرنے والے ان مجاہدین کے ذریعے سے، جن سے دنیائے کفر کے دل دہلتے ہیں۔

**آیت 196** ① وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ : طبری نے اپنی حسن سند کے ساتھ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے: ''جو شخص حج یا عمرے کا احرام باندھ لے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اسے پورا کرنے سے پہلے حلال ہو۔ حج کا پورا کرنا یہ ہے کہ یوم النحر (دس ذوالحجہ) کو جمرہ عقبہ کو کنکر مارے اور طواف زیارت کرے، تو وہ اپنے احرام سے پوری طرح حلال ہو گیا اور عمرے کا پورا کرنا یہ ہے کہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر لے تو حلال ہو گیا۔'' [ طبری : ۲۱۳/۲، ح :

حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ؕ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ

یہاں تک کہ قربانی اپنے حلال ہونے کی جگہ پر پہنچ جائے، پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا اسے اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزے یا صدقے یا قربانی میں سے کوئی ایک فدیہ ہے۔ پھر جب تم امن میں ہو جاؤ تو تم میں سے جو حج تک عمرے سے فائدہ اٹھائے تو قربانی میں سے جو میسر ہو (کرے) پھر جو نہ پائے تو تین دن کے روزے حج کے دوران اور سات دن کے اس وقت رکھے جب تم واپس جاؤ، یہ پورے دس ہیں۔ یہ اس کے

۱۹۶ ] یعنی حج یا عمرہ فرض ہو یا نفل، احرام باندھ لینے کے بعد پورا کرنا ضروری ہے۔ آیت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ کی خاطر حج اور عمرہ کے تمام ارکان پوری طرح ادا کرو۔ الفاظ میں دونوں معنی موجود ہیں۔

② فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ ......: یعنی کسی دشمن یا مرض کی وجہ سے کعبہ تک نہ پہنچ سکو تو جہاں رکاوٹ پیدا ہو وہیں بکری یا اونٹ اور گائے کا حصہ، جو بھی میسر ہو، قربانی کر کے احرام کھول دو، جیسا کہ ۶ ھ میں مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تو آپ ﷺ نے حدود حرم سے باہر حدیبیہ ہی میں قربانی کر کے احرام کھول دیا۔

③ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ ......: اس کا عطف "اَتِمُّوا الْحَجَّ" پر ہے اور یہ حکم حالت امن کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی حالت امن میں اس وقت تک سر نہ منڈواؤ (یعنی احرام نہ کھولو) جب تک کہ حج و عمرہ کے اعمال پوری طرح ادا نہ کر لو۔ بخاری (۵۰۸۹) اور مسلم (۱۲۰۷) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب کے پاس گئے تو انھوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں اور میں بیمار ہوں!" تو آپ نے فرمایا: "حج کرو اور شرط کر لو کہ میرے حلال ہونے کی جگہ وہ ہوگی جہاں (اے اللہ!) تو مجھے روک لے گا۔" معلوم ہوا کہ احرام کے وقت اگر شرط کر لے تو رکاوٹ کی صورت میں اسی جگہ احرام کھول دے اور اس پر کوئی قربانی وغیرہ لازم نہیں۔

④ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ ......: یعنی احرام باندھنے کے بعد تمھیں کسی بیماری یا عذر کی بنا پر سر منڈوانے کی ضرورت پیش آ جائے تو سر منڈوا کر تین چیزوں میں سے ایک بطور فدیہ انجام دو۔ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس اس حال میں لایا گیا کہ جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمھیں اتنی زیادہ تکلیف ہو گئی ہے، کیا تمھارے پاس کوئی بکری (وغیرہ) ہے؟" میں نے کہا نہیں، تو آپ نے فرمایا: "تو تم تین روزے رکھ لو، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، ہر مسکین کو نصف صاع (یعنی ایک کلو) اور سر منڈوا دو۔" [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ فمن كان منكم مريضًا ...... ﴾ : ۴۵۱۷ ] علماء کا اتفاق ہے کہ تینوں چیزوں میں سے جو چاہے کر لے، قرآن کے الفاظ بھی یہی ہیں۔

⑤ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ ......: کوئی شخص صرف عمرہ ادا کرے یا صرف حج تو اس پر قربانی واجب نہیں، اگر قربانی

كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ

لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ﴿۱۹۶﴾ حج چند مہینے ہے، جو معلوم ہیں، پھر جو ان میں حج فرض کر لے تو حج کے دوران نہ کوئی شہوانی فعل ہو

کرے تو ثواب ہے۔ البتہ اگر حج کے مہینوں میں عمرہ اور حج دونوں کرنے کا فائدہ اٹھائے، خواہ میقات سے دونوں کا احرام اکٹھا باندھے جسے حجِ قران کہتے ہیں، یا پہلے صرف عمرے کا احرام باندھے اور عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھے، جسے حج تمتع کہتے ہیں، دونوں صورتوں میں قربانی واجب ہے، جو کم از کم ایک بکری ہے۔ اگر کسی کے پاس طاقت نہ ہو تو اسے دس روزے رکھنا ہوں گے، تین روزے ایام حج یعنی قربانی کے دن سے پہلے اور سات روزے جب اپنے گھر واپس جائے۔ اگر قربانی کے دن سے پہلے نہ رکھ سکے تو ایام تشریق (گیارہ، بارہ اور تیرہ ذوالحجہ) میں رکھ لے۔

⑥ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ : یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فرما دیا کہ تین روزے حج میں اور سات جب تم واپس جاؤ تو ظاہر ہے کہ یہ دس ہی ہوتے ہیں، پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ یہ پورے دس ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ''واؤ'' سے مراد ''أَوْ'' بھی ہو سکتا تھا کہ حج کے ایام میں تین روزے رکھو، یا پھر واپس جا کر سات روزے رکھو۔ اس لیے وضاحت فرما دی کہ دونوں کام کرنے ہیں اور دس روزے پورے رکھنے ہیں، یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ کوئی ابہام نہیں رہنے دیا۔

⑦ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : یعنی جو لوگ مسجد حرام کے رہنے والے نہیں، بلکہ دور سے آنے والے ہیں، چونکہ انھوں نے عمرہ اور حج کے لیے الگ الگ دو سفر کرنے کے بجائے ایک ہی سفر میں دونوں سرانجام دے دیے ہیں، لہٰذا یہ فائدہ اٹھانے پر انھیں قربانی دینا ہو گی، ورنہ دس روزے رکھیں۔ رہے مکہ کے لوگ تو انھیں حج کے مہینوں میں عمرہ و حج کرنے سے چونکہ ایسا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا، اس لیے وہ حج قران کریں یا حج تمتع، ان پر نہ قربانی ہے نہ روزے، وہ ان کے بغیر ہی دونوں عبادتیں سرانجام دے سکتے ہیں۔ امام مالک، امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور کا یہی قول ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ تمتع اور قران صرف باہر سے آنے والوں کے لیے ہے، اہل مکہ کے لیے جائز نہیں۔ (ابن عاشور) مسجد حرام کے رہنے والوں سے مراد مکہ میں رہنے والے اور مکہ سے اتنی مسافت کے اندر رہنے والے ہیں جس پر قصر ہوتا ہے (جو تقریباً اکیس کلو میٹر ہے)۔ بعض نے اس سے صرف حرم مکہ کے اندر رہنے والے مراد لیے ہیں۔ (ابن کثیر، ابن جریر)

آیت 197 ① اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ : عمرہ سال میں کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے، مگر حج مقررہ وقت ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''حج کے مہینے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائے ہیں شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔'' [ بخاری، الحج، باب قول الله تعالى : ﴿ ذلك لمن لم يكن أهله ...... ﴾ : ۱۵۷۲ ] اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اس سے مراد شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔'' [ بخاری، قبل ح : ۱۵٦۰۔ طبری : ۲/۲٦۷، ح : ۳۵۲۲۔ مستدرك حاكم : ۲/۳۰۳،

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ٘ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

اور نہ کوئی نافرمانی اور نہ کوئی جھگڑا، اور تم نیکی میں سے جو بھی کرو گے اللہ اسے جان لے گا اور زادراہ لے لو کہ بے شک زادراہ کی سب سے بہتر خوبی (سوال سے) بچنا ہے اور مجھ سے ڈرو اے عقلوں والو!﴿۱۹۷﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب

ح : ۳۰۹۲ و صححه ووافقه الذهبی ]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں کے سوا دوسرے مہینوں میں نہ باندھا جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''سنت یہ ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں ہی میں باندھا جائے۔'' [ ابن خزیمة، باب النهی عن الإحرام …… : ۱۶۲/۴، ح : ۲۵۹۶ ] ابن کثیر نے اسے صحیح کہا ہے اور یہ مرفوع کے حکم میں ہے۔

② فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ : حج کو اپنے آپ پر فرض کرنا یہ ہے کہ حج کی نیت کے ساتھ احرام باندھ لے اور زبان سے ''لَبَّيْكَ بِالْحَجِّ'' اور ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ …… '' مکمل تلبیہ کہے۔ (ابن کثیر)

③ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ : یعنی حج میں یہ سب باتیں حرام ہیں۔ ''رَفَثَ'' (شہوانی فعل) سے جماع اور تمام وہ چیزیں مراد ہیں جو جماع کی طرف مائل کرنے والی ہوں۔ ''فُسُوْقَ'' (نافرمانی) کا لفظ ہر گناہ کو شامل ہے اور ''جِدَالَ'' سے لڑائی جھگڑا مراد ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اس گھر کا حج کیا اور (دوران حج میں) رفث و فسوق نہیں کیا وہ اس دن کی طرح (گناہوں سے پاک) لوٹے گا جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔'' [ بخاری، المحصر و جزاء الصید، باب قول الله عزوجل : ﴿ فلا رفث ﴾ : ۱۸۱۹ ]

④ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى : تقویٰ کا لغوی معنی بچنا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اہل یمن حج کرتے تو زادراہ نہیں لاتے تھے اور کہتے تھے، ہم توکل والے ہیں، پھر جب مکہ میں آتے تو لوگوں سے مانگتے، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔'' [ بخاری، الحج، باب قول الله تعالیٰ : ﴿ و تزودوا فإن …… ﴾ : ۱۵۲۳ ] ایسا توکل اللہ پر نہیں بلکہ درحقیقت لوگوں کی جیبوں پر ہے۔ (تلبیس ابلیس) فرمایا زادراہ لو، اس کا فائدہ یہ ہے کہ سوال سے بچ جاؤ گے۔ ظاہری زاد کے ساتھ دلی زاد بھی ضروری ہے، جس کی بہترین صورت تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، آیت سے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں اور دونوں مراد ہیں۔

**آیت 198** ① ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جاہلیت میں بازار تھے، اب مسلمانوں نے حج کے دنوں میں وہاں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا، تو اس پر یہ آیت اتری۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لیس علیکم جناح …… ﴾ : ۴۵۱۹ ] یعنی حج کے دوران میں خرید و فروخت ممنوع نہیں، بلکہ یہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اس لیے روزی کمانا منع نہیں ہے۔

فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ۖ وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰىكُمۡ ۚ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾

کا کوئی فضل تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اس کو اس طرح یاد کرو جیسے اس نے تمھیں ہدایت دی ہے اور بلاشبہ اس سے پہلے تم یقیناً گمراہوں سے تھے ﴿۱۹۸﴾ پھر اس جگہ سے واپس آؤ جہاں سے سب لوگ واپس آئیں اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۹۹﴾

② کعبہ سے چلیں تو پہلے منیٰ، پھر مزدلفہ، پھر عرفات آتا ہے۔ حاجی آٹھ ذوالحجہ (یوم ترویہ) کو منیٰ میں ظہر سے پہلے پہنچتے ہیں، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر منیٰ میں ادا کرتے ہیں۔ احرام کے بعد حج یہاں سے شروع ہوتا ہے، نو ذوالحجہ کو عرفات جاتے ہیں۔ سورج ڈھلنے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک عرفات میں وقوف (ٹھہرنا) حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ عبدالرحمٰن ابن یعمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حج عرفات (میں وقوف) ہی ہے، جس نے مزدلفہ والی رات میں عرفات (کا وقوف) فجر طلوع ہونے سے پہلے پالیا تو اس نے حج کو پالیا۔'' [ ترمذی : ۲۹۷۵۔ أبو داوٗد : ۱۹۵۰، و صححه الألبانی ]

مشعر حرام ایک پہاڑ ہے، اس کے پاس سے مراد مزدلفہ ہے اور حرم کے اندر ہونے کی وجہ سے اسے **''الْحَرَامِ''** کہہ دیا گیا ہے، عرفات سے واپس آ کر حاجی حضرات رات یہاں بسر کرتے ہیں اور صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھ کر سورج طلوع ہونے کے قریب تک ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

③ **وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰىكُمۡ** : یعنی مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے، یہ بھی ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ'' یعنی تیرا کوئی شریک نہیں کہتے تھے، مگر پھر ساتھ شریک ملاتے تھے، کہتے تھے: (( اِلَّا شَرِيْكًا لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ )) [ مسلم، الحج، باب التلبیة : ۱۱۸۵ ] ''ہاں ایک شریک جو تیرا ہے، جس کا تو مالک ہے، وہ خود مالک نہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اس کو اس طرح یاد کرو جیسے اس نے تمھیں ہدایت دی ہے'' یعنی اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو، فرمایا: ﴿ **فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ** ﴾ [ الشعراء : ۲۱۳۔ القصص : ۸۸ ] ''اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔'' پھر کیا حال ہے ان مسلمانوں کا جو وہاں جا کر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔

**آیت 199** عرفات کا میدان حرم کی حدود سے باہر ہے، دوران حج میں تمام لوگ وہاں جاتے، مگر قریش مزدلفہ سے آگے نہ جاتے کہ ہم حرم کے رہنے والے ہیں، اس آیت میں حکم ہوا کہ سب لوگوں کے ساتھ عرفات جانا اور ان کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹنا ضروری ہے۔ (ابن کثیر)

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

پھر جب تم اپنے حج کے احکام پورے کرلو تو اللہ کو یاد کرو، اپنے باپ دادا کو تمھارے یاد کرنے کی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر یاد کرنا، پھر لوگوں میں سے کوئی تو وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے دے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ﴿۲۰۰﴾ اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ﴿۲۰۱﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے جو انھوں نے کمایا اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۲۰۲﴾

**آیت 200 تا 202** ① اسلام سے پہلے عرب حج سے فارغ ہوتے تو منیٰ میں میلہ لگاتے اور اپنے آباء و اجداد کا خوب تذکرہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسی طرح ذکر الٰہی کیا کرو، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ (فتح القدیر)

② ذکر الٰہی کا حکم دینے کے بعد دعا کی کیفیت بیان فرمائی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو صرف دنیا کے طالب ہوتے ہیں، ایسے لوگ آخرت کی نعمتوں سے یکسر محروم رہیں گے (دیکھیے الشوریٰ: ۲۰) اور دوسرے وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرتے ہیں، اصل کامیابی انھی لوگوں کی ہے۔ (رازی، شوکانی) دنیا کی بھلائی (حسنہ) میں نیک بیوی، دنیا میں غلبہ، خلافت اسلامی کا قیام، وسعت رزق، دین و دنیا کا علم اور اللہ کے احکام کے مطابق چلنے کی توفیق، الغرض سب نیک اعمال شامل ہیں اور آخرت کی بھلائی میں دوزخ سے نجات، جنت، رضائے الٰہی کا حصول، حساب میں آسانی اور اللہ تعالیٰ کا دیدار وغیرہ شامل ہیں۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ تھی: «اَللّٰهُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ» ''اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔'' [ بخاری، الدعوات، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ربنا آتنا ...... : ٦٣٨٩۔ مسلم: ٢٦٩٠ ] صحیح مسلم میں ہے: ''انس رضی اللہ عنہ جب بھی کوئی دعا کرنا چاہتے تو یہ (مذکورہ بالا) دعا کرتے اور جب کوئی اور دعا کرنا چاہتے تو اس میں یہ دعا بھی کرتے۔'' خلاصہ یہ کہ یہ ایک نہایت جامع دعا ہے، کئی ایک احادیث میں اس کی ترغیب آئی ہے۔ طواف کے وقت رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان بھی یہ دعا مسنون ہے۔ [ أبو داؤد، المناسك، باب الدعاء فی الطواف، ١٨٩٢ و قال الألبانی حسن ]

اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کے لوگ ذکر فرمائے ہیں، صرف دنیا کی بھلائی طلب کرنے والے اور دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنے والے، تیسری قسم کے لوگ یعنی صرف آخرت کی بھلائی طلب کرنے والے، جو دنیا کی بھلائی نہ مانگتے

وَ اذۡكُرُوا اللّٰهَ فِيۡۤ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِيۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۚ وَ مَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

اور اللہ کو چند گنے ہوئے دنوں میں یاد کرو، پھر جو دو دنوں میں جلد چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اس شخص کے لیے جو ڈرے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿۲۰۳﴾

---

ہوں، وہ ذکر نہیں فرمائے، کیونکہ اسلام ایسا دین ہے جو اپنے ماننے والوں کے لیے دنیا ترک کرنا پسند نہیں کرتا، نہ دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کشی کی اجازت دیتا ہے۔ جب سے مسلمانوں میں ہندو سادھوؤں اور نصرانی راہبوں کی تقلید میں دنیا کے ترک کا رجحان پیدا ہوا تو انھوں نے جہاد چھوڑا، دنیاوی علوم سے کنارہ کش ہوئے اور ہر چیز میں غیروں کے غلام بن گئے۔ کفار کو ان کے تصوف کے سلسلوں سے کوئی تکلیف ہے، نہ تصور شیخ سے اور نہ خانقاہی نظام سے، کیونکہ اس سے غلامی کی خو مزید پختہ ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انھیں اپنے ملکوں میں آمد و رفت کی ہر سہولت مہیا کرتے ہیں، مگر اسلام اور مسلمانوں کی عزت کے ضامن جہاد یا خلافت کا نام لینے والوں پر آخری حد تک دنیا تنگ کر دینے میں کمی نہیں کرتے۔ پھر کیا حال ہو گا جب کہا جائے ؎

دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے؟

اگر کہا جائے شاعر کی مراد فقط رضائے الٰہی کا حصول ہے تو اللہ کی رضا تو دنیا اور آخرت دونوں کی طلب اور ان کے لیے محنت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی ان دونوں کی طلب بلکہ ان کا ہر عمل ہی رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔ ﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ یہ اس لیے فرمایا کہ آخرت میں بھلائی آگ کے کچھ عذاب کے بعد بھی ہو سکتی ہے، اس لیے اس سے بچنے کی الگ دعا مانگی۔ (ابن عاشور)

**آیت 203** ① **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيۡۤ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ**: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ایام معدودات ایام تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ) ہیں۔'' [ بخاری، العیدین، باب فضل العمل …… قبل، ح : ۹۶۹ ] پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے باب باندھا ہے: ''منیٰ میں ٹھہرنے کے دنوں میں تکبیر کہنا اور جب عرفات کو جائے۔'' عمر رضی اللہ عنہ منیٰ میں اپنے خیمے کے اندر تکبیر کہتے، مسجد والے اسے سنتے تو وہ بھی تکبیر کہتے اور بازاروں والے بھی تکبیر کہتے، یہاں تک کہ منیٰ تکبیرات سے گونج اٹھتا۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان دنوں میں منیٰ میں تکبیر کہتے، نمازوں کے بعد تکبیر کہتے اور اپنے بستر پر، اپنے خیمے میں، اپنی مجلس میں اور چلتے پھرتے ان تمام دنوں میں تکبیر کہتے اور ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا قربانی کے دن تکبیر کہتیں اور عورتیں ابان بن عثمان اور عمر بن عبد العزیز کے پیچھے مسجد میں مردوں کے ساتھ تشریق کی راتوں میں تکبیر کہتیں۔ [ بخاری، العیدین، باب التکبیر أیام منیً ……، قبل ح: ۹۷۰ ] معلوم ہوا ان ایام سے مراد عرفہ کی صبح سے لے کر ۱۳ ذوالحجہ کے سورج غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ قربانی کے دن

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جس کی بات دنیا کی زندگی کے بارے میں تجھے اچھی لگتی ہے اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بناتا ہے جو اس کے دل میں ہے، حالانکہ وہ جھگڑے میں سخت جھگڑالو ہے ﴿۲۰۴﴾ اور جب واپس جاتا ہے تو زمین میں دوڑ دھوپ کرتا ہے، تاکہ اس میں فساد پھیلائے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۰۵﴾ اور جب اس سے کہا جاتا ہے اللہ سے ڈر تو اس کی عزت اسے گناہ میں پکڑے رکھتی ہے، سو اسے جہنم ہی کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۲۰۶﴾

---

اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔'' [ مسلم، الصیام، باب تحریم صوم أیام التشریق ...... : ۱۱٤۱ ] اللہ کے ذکر سے مراد وہ تمام تکبیرات ہیں جو جمرات کو کنکر مارتے وقت، جانور ذبح کرتے وقت یا دوسرے اوقات میں کہی جاتی ہیں اور تکبیر کے علاوہ کوئی بھی ذکر ہو، وہ بھی اس حکم میں شامل ہے۔ یعنی ان ایام میں ذکر الٰہی میں مصروف رہو۔

❷ **لِمَنِ اتَّقٰى** : یعنی گیارہ اور بارہ کو دو دن جمرات کو کنکر مار کر چلا آئے، تب بھی جائز ہے اور اگر کوئی تاخیر کرے یعنی پورے تین دن منیٰ میں ٹھہرا رہے تو بھی جائز ہے، بشرطیکہ دل میں تقویٰ ہو اور حج کے احکام خلوص سے ادا کرے۔ (ابن کثیر)

❸ **اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ** : حج کے موقع پر لوگ حشر کی طرح جمع ہوتے ہیں، اس لیے حج کے ذکر کے ساتھ حشر کا دن یاد دلا کر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا۔

**آیت 204 تا 206** ❶ اوپر کی آیات میں ''فَمِنَ النَّاسِ'' سے لے کر یہاں تک دو قسم کے لوگ ذکر کیے، یعنی طالب دنیا اور طالب دنیا و آخرت۔ اب یہاں سے منافقین کے اوصاف کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چند ایسے چال باز لوگ تھے (اور ہمیشہ رہے ہیں)، ان آیات میں ان کی صفات بیان فرما کر ان سے چوکس رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ (قرطبی، فتح القدیر) تفاسیر میں گو ان آیات کا سبب نزول اخنس بن شریق ثقفی کو بیان کیا گیا ہے، مگر الفاظ کے اعتبار سے یہ ہر اس شخص کو شامل ہیں جس میں یہ پانچوں صفات پائی جائیں۔ (کبیر) علاوہ ازیں وہ تمام روایات جن میں اس آیت کے اخنس کے بارے میں اترنے کا ذکر ہے، ضعیف ہیں۔ (دیکھیے الاستیعاب فی بیان الاسباب) اس لیے یہ آیت عام ہے۔

❷ ایسے منافق کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی سے متعلق بہت سی معلومات رکھتا ہے، اس موضوع پر بات کرے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ آخرت پر نہ وہ بات کرتا ہے نہ اسے اس کا علم ہے۔ (دیکھیے الروم : ٦، ٧) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو اللہ کی رضا مندی تلاش کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے اور اللہ ان بندوں پر بے حد نرمی کرنے والا ہے ﴿۲۰۷﴾

---

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہر سخت دل متکبر، بخیل پیٹو سے بغض رکھتا ہے جو بازاروں میں شور کرنے والا ہے، رات کو مردار اور دن کو گدھا ہے، دنیا کے معاملات کا عالم ہے، آخرت کے معاملات سے جاہل ہے۔'' [ صحیح ابن حبان : ۱۹۵۷۔ السلسلة الصحیحة : ۱۹۵ ]

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان و اخلاص کا یقین دلاتا ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کے ہاں اپنے بے اعتبار ہونے کو خوب سمجھتا ہے۔ ( دیکھیے سورۂ منافقون کی ابتدائی آیات )

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ "اَلَدُّ الْخِصَامِ" ہے۔ "اَلَدُّ" کا معنی سخت جھگڑالو ہے۔ "الْخِصَامِ" یا تو باب مفاعلہ کا مصدر ہے، اس صورت میں معنی ہوگا جھگڑے میں سخت جھگڑالو ہے، یا "خَصْمٌ" (جھگڑنے والا) کی جمع ہے، معنی ہوگا جھگڑنے والوں میں سے بہت سخت جھگڑالو ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں سب آدمیوں سے زیادہ مبغوض " اَلْاَلَدُّ الْخَصِمُ " (سخت جھگڑالو) ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ وهو ألد الخصام ﴾ : ۴۵۲۳۔ مسلم : ۲۶۶۸ ] اور رسول اللہ ﷺ نے منافق کی چار نشانیوں میں سے ایک یہ بیان فرمائی: ''وہ جب جھگڑتا ہے تو بدزبانی کرتا ہے۔'' [ بخاری، الإیمان، باب علامة المنافق : ۳۴۔ مسلم : ۵۸ ] چوتھی صفت یہ ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے پاس اپنے اخلاص کی قسمیں کھا کر واپس جاتا ہے تو تخریبی کارروائیوں کے ذریعے سے زمین میں فساد اور کھیتوں اور جان و مال کو برباد کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ "تَوَلّٰى" کا ایک معنی ہے ''وہ واپس جاتا ہے'' اور دوسرا معنی ہے ''جب وہ والی یعنی حاکم یا صاحبِ اقتدار بنتا ہے۔'' پانچویں صفت یہ ہے کہ جب اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے لیے کہا جائے تو اس کی (جھوٹی) عزت اور غرور نفس اسے گناہ میں پھنسائے رکھتا ہے۔

**آیت 207** اوپر اس شخص کا بیان ہوا ہے جو طلب دنیا کی خاطر دین و ایمان کو بیچ ڈالتا ہے، اب اس آیت میں اس شخص کا بیان ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے مال ہی نہیں جان تک قربان کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ ﴾ [ التوبة : ۱۱۱ ] ''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں۔'' اس آیت کے اولین مصداق مہاجر صحابہ ہیں، جنھوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں اور اپنی جائدادیں مکہ میں چھوڑ کر مدینہ چلے گئے اور انصار صحابہ، جنھوں نے اپنے جان و مال سے ان کی مدد کی۔ "بِالْعِبَادِ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ''ان بندوں'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں اس آیت کا سبب نزول صہیب رضی اللہ عنہ کو قرار دیا گیا ہے، جو قریش کے روکنے پر سارا مال ان کے حوالے کر کے ہجرت کر گئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سب صحابہ کا یہی حال تھا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝۲۰۸ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۲۰۹

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ۝۲۰۸ پھر اگر اس کے بعد پھسل جاؤ کہ تمھارے پاس واضح دلیلیں آ چکیں تو جان لو کہ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۝۲۰۹

**آیت 208** مخلص مومن کی مدح و ستائش کے بعد تمام مومنوں کو حکم ہوتا ہے کہ تم بھی پورے اسلام اور ساری شریعت پر چلو، یہ نہیں کہ اسلام کے کچھ احکام پر عمل کر لیا، باقی چھوڑ دیے۔ نماز روزہ کی پابندی کر لی اور عقیدے میں شرک، تجارت میں سود، عدالتوں میں غیر اللہ کا قانون، معاشرت میں ہندو، نصرانی، یہودی تہذیب اختیار کیے رکھی اور اسے زمانے کا تقاضا اور ترقی پسندی قرار دے لیا۔ یہود کی رسوائی کا باعث بھی یہی طرزِ عمل تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ [ البقرۃ : ۸۵ ] ''پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو۔'' اس میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جو کسی دوسرے دین سے نکل کر اسلام میں آئے، مگر انھوں نے اپنے سابقہ دین کی رسوم کو باقی رکھا، جیسے غیر مسلموں کی شادی و مرگ کی رسمیں اور بدعات و رسوم جو سراسر اسلام کے منافی ہیں، یا مسلمان ہو کر بھی انھوں نے اپنے روزمرہ کے پہلے طور طریقوں کو نہ چھوڑا۔

**آیت 209، 210** ① اسلام کا بنیادی عقیدہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول مانتے ہوئے ان کے بتائے ہوئے غیب یعنی بن دیکھی حقیقتوں پر ایمان ہے۔ حدیثِ جبریل علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یوم آخرت اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان رکھنے کو ایمان کہا گیا ہے۔ [ مسلم، الإیمان : ۸ ] دنیا میں آزمائش اسی بات کی ہے کہ بغیر دیکھے کون ان پر ایمان لاتا ہے اور کسی جبر کے بغیر اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ﴾ [ المائدۃ : ۹۴ ] ''تاکہ اللہ جان لے کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۴۹)، فاطر (۱۸)، سورۂ یٰس (۱۱)، سورۂ ق (۳۳) اور حدید (۲۵)۔

کفار کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ حقیقتیں ان کی آنکھوں کے سامنے آئیں گی تو وہ ایمان لائیں گے، ورنہ نہیں۔ کبھی وہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے دیکھنے کا مطالبہ کرتے کہ ''ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے، یا ہم اپنے رب کو دیکھتے۔'' [ الفرقان : ۲۱ ] کبھی ایمان لانے کی شرط یہ رکھتے کہ ''تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔'' [ بنی إسرائیل : ۹۲ ] کبھی قیامت برپا کرنے کی فرمائش کرتے۔ بنی اسرائیل نے بھی یہی کام کیا، فرمایا: ﴿ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ [ البقرۃ : ۵۵ ] ''اور جب تم نے کہا، اے موسیٰ! ہم ہرگز تیرا یقین نہ کریں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ لیں۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنی

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰۤـئِكَةُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ‌ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۲۱۰﴾ ع ۲۵ ۱۴

وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی اور کام تمام کر دیا جائے اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ﴿۲۱۰﴾

کتابوں اور رسولوں کے ذریعے سے اسلام کے حق ہونے کی دلیلیں پیش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اب اگر کوئی شخص حق واضح ہونے کے بعد اس پر ایمان نہیں لاتا، بس معجزات کا مطالبہ ہی کرتا چلا جاتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ غیبی حقیقتیں ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ پھر کسی کو ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں ہوگا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ رَبُّكَ اَوۡ يَاۡتِىَ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ‌ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنۡفَعُ نَفۡسًا اِيۡمَانُهَا لَمۡ تَكُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ ﴾ [ الأنعام : ١٥٨ ] ”وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی، کسی شخص کو اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا۔“ زیر تفسیر آیات میں یہی بات فرمائی کہ اتنے واضح دلائل کے بعد اب یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ خود بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی، مگر پھر تو کام تمام ہو چکا ہوگا اور دنیا میں تو بظاہر کچھ اور لوگوں کے پاس بھی معاملات لے جائے جاتے ہیں، اس وقت سارے معاملات اکیلے اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔

② قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے زمین پر اترنے کا ذکر قرآن میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ [ الفجر : ٢٢ ] ”اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔“ اور فرمایا: ﴿ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ رَبُّكَ ﴾ [ الأنعام : ١٥٨ ] ”وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا تیرا رب آئے۔“ تمام صحابہ اور تابعین اللہ تعالیٰ کے نزول پر ایمان رکھتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ جس طرح اللہ کی شان کے لائق ہے کہ وہ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، قیامت کے دن بھی زمین پر اترے گا۔ دوسری تمام صفات پر بھی وہ ان کے ظاہر الفاظ کے مطابق ایمان رکھتے تھے، وہ نہ ان کا کچھ اور مطلب نکالتے (جسے تاویل کہتے ہیں)، نہ یہ کہتے کہ کس طرح اترے گا؟ یا وہ عرش پر کس طرح ہے؟ (جسے تکییف کہتے ہیں)، نہ وہ اس کے عرش پر ہونے کو یا اس کے اترنے کو اپنی طرح یا کسی مخلوق کی طرح قرار دیتے (جسے تشبیہ کہتے ہیں)، نہ یہ کہتے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ان الفاظ کا معنی کیا ہے، بس یہ اللہ ہی جانتا ہے (جسے تفویض کہتے ہیں)، بعد میں آنے والے لوگوں نے غیر مسلموں سے متاثر ہو کر کسی نے سرے سے ان صفات کا انکار ہی کر دیا، کسی نے تاویل کی، کسی نے اپنے پاس سے کیفیت متعین کی اور کسی نے مخلوق کے ساتھ مشابہ کر دیا۔ یہ تمام صورتیں درحقیقت انکار ہی کی صورتیں ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حاقہ (١٦ تا ١٨) اور سورۂ فجر (٢٢) کے حواشی۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

بنی اسرائیل سے پوچھ! ہم نے انھیں کتنی واضح نشانیاں دیں اور جو شخص اللہ کی نعمت کو بدل دے، اس کے بعد کہ اس کے پاس آ چکی ہو تو یقیناً اللہ بہت سخت سزا والا ہے ﴿۲۱۱﴾ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، دنیا کی زندگی خوشنما بنا دی گئی ہے اور وہ ان لوگوں سے مذاق کرتے ہیں جو ایمان لے آئے، حالانکہ جو لوگ ڈر گئے وہ قیامت کے دن ان سے اوپر ہوں گے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے ﴿۲۱۲﴾ سب لوگ ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان

آیت 211 اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کے مطالبے پر یا مطالبے کے بغیر انبیاء کو کئی معجزے عطا فرمائے، مگر جب وہ معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تو ان پر مختلف عذاب آئے، جیسے قوم ثمود و قوم فرعون اور بنی اسرائیل، اب جب اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے اترنے کا مطالبہ حد سے زیادہ ہونے لگا تو کفارِ عرب سے کہا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ہم نے انھیں کتنے واضح معجزات دکھائے، یعنی عصائے موسیٰ، ید بیضا، طوفان، ٹڈیاں، سمندر کا پھٹنا، صحرا میں بادل کا سایہ، بارہ چشموں کا پھوٹنا، من و سلویٰ کا نزول وغیرہ، تو انھوں نے ان نعمتوں سے کوئی فائدہ اٹھایا جو تم اٹھاؤ گے؟ پھر نعمتوں کی ناشکری کا نتیجہ تو عذاب ہی ہے، فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [ بنی إسرائیل : ٥٩ ] ”اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ ہم نشانیاں دے کر بھیجیں مگر اس بات نے کہ پہلے لوگوں نے انھیں جھٹلا دیا۔“

آیت 212 یعنی کفار کے ایمان نہ لانے کا باعث ان کی نگاہ میں دنیا کا بہت مزین ہونا ہے۔ مومن جو آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی زیب و زینت کو کچھ نہیں سمجھتے، کفار کے خیال میں بھولے بھالے اور دیوانے ہیں، اس لیے انھوں نے ان کا مذاق اڑانے اور انھیں ذلیل کرنے کو اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے، مگر قیامت کے دن اہل تقویٰ ہر اعتبار سے ان سے بلند درجہ ہوں گے، کیونکہ مومنوں کا نام علیین میں ہوگا اور کفار اسفل السافلین ہوں گے۔ یہاں ”بِغَيْرِ حِسَابٍ“ فرمایا، سورۂ نبا میں ”عَطَآءً حِسَابًا“ فرمایا، تطبیق کے لیے دیکھیے سورۂ نبا کی آیت (۳٦) کے حواشی۔

آیت 213 ① اس آیت میں اس تاریخی حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے کہ انسانیت کی ابتدا کفر و شرک اور عظیم الشان مخلوقات، مثلاً سورج، چاند، آگ، ہوا، پانی، فرشتوں اور نیک انسانوں وغیرہ کی پرستش سے نہیں ہوئی، بلکہ خالص توحید سے ہوئی ہے۔ ابتدا میں تمام انسان ایک ہی دین توحید رکھتے تھے اور ان کی ایک ہی ملت تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”آدم اور

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾

باتوں کا فیصلہ کرے جن میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے کیا جنھیں وہ دی گئی تھی، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں، آپس کی ضد کی وجہ سے، پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے ﴿٢١٣﴾

نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن (ایک ہزار سال) تھے۔ یہ سب شریعت حقہ (توحید) پر تھے، پھر (شیطان کے بہکانے سے ان میں شرک آیا اور) ان میں اختلافات پیدا ہوئے، تب اللہ تعالیٰ نے (نوح علیہ السلام اور دوسرے) انبیاء بھیجے۔'' [ طبری و حاکم ۲/ ٤٤٢، ح : ٣٦٥٤، بسند صحیح ] پھر مسلسل انبیاء آتے رہے اور ان پر کتابیں نازل ہوتی رہیں، تاکہ ان کو اختلافات سے نکال کر ہدایت الٰہی کی طرف لایا جائے۔ اس آیت میں '' فَبَعَثَ اللّٰهُ '' کا عطف محذوف پر ہے یعنی '' فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ '' ''پس انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے نبی بھیجے۔'' (کبیر، ابن جریر) مزید دیکھیے سورۂ یونس (۲۱)۔

❷ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ: یعنی پہلی امتوں میں اختلافات لاعلمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ باہمی حسد، ضد اور سرکشی کی وجہ سے پیدا ہوئے، جس سے وہ فرقوں میں بٹ گئیں اور اس وجہ سے گمراہ ہو گئیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی بھیج کر اور اس پر اپنی آخری کتاب نازل فرما کر تمام اختلافات کا فیصلہ فرما دیا اور اپنی توفیق خاص '' بِاِذْنِهٖ '' سے مومنوں کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کر دی ہے۔ (بیضاوی، فتح البیان) واضح رہے کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی شروع میں دین میں کوئی اختلاف نہیں تھا، سلف صالحین سب کے سب کسی شخص کی تقلید کے بجائے براہ راست قرآن و حدیث پر عمل کرتے تھے۔ ان میں نہ شیعہ سنی کی تفریق تھی، نہ ان میں کوئی حنفی تھا، نہ مالکی، نہ شافعی، نہ حنبلی، نہ نقشبندی، نہ قادری، نہ سہروردی، نہ چشتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''تم ضرور ہی اپنے سے پہلے لوگوں کے پیچھے چل پڑو گے، جس طرح بالشت بالشت کے برابر اور ہاتھ ہاتھ کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی ضب (سانڈے) کے بل میں جا گھسے ہوں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے۔'' پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟'' فرمایا: ''پھر اور کون ہیں؟'' [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بنی إسرائیل : ٣٤٥٦۔ مسلم : ٢٦٦٩ ] آپ کے اس فرمان کے مطابق جب اس امت میں بھی اہل کتاب کی طرح شخصی رائے کی تقلید اور اپنے دھڑے کی بے جا حمایت پر جمود پیدا ہو گیا، لوگوں نے قرآن و حدیث کے بجائے اقوالِ رجال کو دین سمجھنا شروع کر دیا تو امت مختلف فرقوں میں بٹ کر تباہ ہو گئی۔ اس سے صرف وہ لوگ محفوظ

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

یا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگی اور تکلیف پہنچی اور وہ سخت ہلائے گئے، یہاں تک کہ وہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو بے شک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾

رہے جو قرآن و سنت پر براہ راست کار بند رہے اور کسی نئے گروہ کا حصہ نہ بنے۔ [ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ ]

3 رسول اللہ ﷺ جب رات کو اٹھتے تو اپنی رات کی نماز کا افتتاح اس دعا سے کرتے: « اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَ اِسْرَافِيْلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ » [ مسلم، صلٰوۃ المسافرین، باب صلوۃ النبی ﷺ ودعاءہ باللیل : ۷۷۰ ]

آیت 214 1 "اَلْبَاْسَآءُ" سے مراد فقر و فاقہ اور "اَلضَّرَّآءُ" سے مراد بیماری اور جسمانی تکالیف اور "زُلْزِلُوْا" کا مطلب ہے سخت ہلائے گئے۔

2 مدینہ میں ہجرت کے بعد مسلمانوں کو جب مشرکین، منافقین اور یہود سے سخت تکالیف پہنچیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی کہ دین کی راہ میں یہ مصیبتیں اور تکلیفیں صرف تم پر نہیں آ رہیں، بلکہ تم سے پہلے لوگ تو فقر و فاقہ، جانی و مالی نقصان اور سخت قسم کے خوف و ہراس میں مبتلا کیے گئے، یہاں تک کہ اس زمانے کا رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے ''اللہ کی مدد کب ہوگی'' پکار اٹھے۔ پھر جس طرح ان پر اللہ کی طرف سے مدد نازل ہوئی تمھاری بھی مدد کی جائے گی۔ چنانچہ جب غزوۂ احزاب میں یہ مرحلہ پیش آیا، جس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب (۱۰، ۱۲) میں کھینچا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ یاد رہے کہ ان کا ''اللہ کی مدد کب ہوگی'' کہنا اعتراض اور شکوہ کے طور پر نہ تھا، بلکہ بے بسی کے عالم میں اپنی عاجزی اور زاری کی حالت کا اظہار تھا۔ (رازی، ابن کثیر) خباب بن ارت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ ہمارے لیے نصرت کی درخواست نہیں کرتے، آپ ہمارے لیے اللہ سے دعا نہیں کرتے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے لوگوں میں سے ایک کے سر کی مانگ پر آرا رکھ دیا جاتا اور وہ اس کے قدموں تک پہنچ جاتا، مگر یہ چیز اسے اس کے دین سے نہیں پھیرتی تھی اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کے گوشت اور ہڈی کو الگ کر دیا جاتا، یہ چیز اسے اس کے دین سے نہیں پھیرتی تھی۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ کام ضرور مکمل ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَ ابۡنِ السَّبِيۡلِ ؕ وَ مَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۱۵﴾

وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دے تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو سو وہ ماں باپ اور زیادہ قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے اور تم نیکی میں سے جو کچھ بھی کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۲۱۵﴾

---

اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہو گا یا اسے اپنی بکریوں سے متعلق بھیڑیے کا (خوف ہو گا)، لیکن تم ایسے لوگ ہو کہ بہت جلدی کرتے ہو۔'' [ شعب الإیمان للبیھقی : ۲/ ۲۴۰، ح : ۱۶۳۳۔ بخاری : ۳۶۱۲۔ ابن کثیر : ۱/ ۲۵۱ ]

**آیت 215** ❶ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے حیات دنیا کے مزین کیے جانے کا ذکر فرمایا، بنی اسرائیل کے باہمی اختلاف کا باعث بھی حسد، ضد اور سرکشی بیان فرمایا، جو عموماً مال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کا ذکر فرمایا کہ وہ (اس فتنے سے بچنے کے لیے) کیا خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ کہاں خرچ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ خرچ کرنے کی جگہیں بھی بتائی جائیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ صفراء (گرمی) کا کوئی مریض کسی مہربان طبیب سے پوچھے کہ میں شہد پی لوں تو وہ جواب میں کہے، پی لو، مگر سرکہ ملا کر، کیونکہ سرکہ اس کی گرمی کو کم کر دے گا۔ ان کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ''تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو'' یعنی جو چاہو خرچ کرو، مگر وہ مال حلال طریقے سے حاصل ہوا ہو، کیونکہ حرام کو خیر نہیں کہہ سکتے۔ (طنطاوی)

❷ خرچ کرنے کی جگہوں میں سے سب سے پہلے والدین کا ذکر کیا، تاکہ ان کے جنم دینے اور پرورش کرنے کا کچھ حق ادا ہو جائے، پھر زیادہ قرابت والے، تاکہ قرابت اور رشتہ داری کا حق ادا ہو، پھر یتامیٰ، کیونکہ وہ مہربان باپ کے سائے سے محروم ہو چکے ہیں، پھر مساکین، ان کے فقر و احتیاج کی وجہ سے، پھر مسافر، کیونکہ وہ اپنے شہر سے دور ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے محتاج ہیں۔ رازی نے فرمایا، خرچ کرنے کی جگہوں میں یہ ترتیب ہی صحیح ترتیب ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے بعد خلاصہ بیان فرمایا کہ تم خیر میں سے جو عمل بھی کرو گے تو بے شک اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔ اس میں وہ کام اور وہ جگہیں بھی آ گئیں جن کا یہاں ذکر نہیں ہوا، مثلاً سائلین اور غارمین وغیرہ، بشرطیکہ وہ کام اور وہ جگہیں خیر ہوں، کیونکہ غلط جگہ خرچ کرنا فعل خیر نہیں۔ میمون بن مہران اس آیت کو پڑھ کر کہنے لگے کہ یہ ہیں مسلمان کے خرچ کرنے کی جگہیں، ان میں طبلہ، سارنگی، لکڑی کی تصویروں اور گھر کی آرائش کا ذکر نہیں ہے۔ (ابن کثیر)

❸ اس آیت میں زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کا ذکر ہے جو نفل ہو، یا بعض اوقات فرض، کیونکہ ماں باپ کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۶۰)۔

❹ ایک روایت میں یہ سوال کرنے والا عمرو بن جموح کو بتایا گیا ہے، مگر وہ روایت موضوع ہے، اس میں کلبی اور ابو صالح

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں سراسر ناپسند ہے اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿٢١٦﴾

---

متہم بالکذب ہیں۔ (الاستیعاب فی بیان الاسباب)

آیت 216 ❶ "كُرْهٌ" یہ مصدر بمعنی "كَرَاهِيَةٌ" ہے۔ مصدر کو اسم مفعول "مَكْرُوْهٌ" کی جگہ مبالغہ کے لیے لایا گیا ہے، جیسا کہ "زَيْدٌ عَدْلٌ" "زید سراپا عدل ہے۔" تو یہاں "كُرْهٌ" کا معنی ہوگا "سراسر ناپسند ہے۔" "كُتِبَ" یہ وہی "كُتِبَ" ہے جو اس سے پہلے قصاص، وصیت اور صیام کے لیے آیا ہے۔

❷ پچھلی آیت میں مال خرچ کرنے کی ترغیب کے بعد اب جان خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ "الْقِتَالُ" سے ہر لڑائی مراد نہیں، بلکہ عہد کا الف لام ہونے کی وجہ سے خاص یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑائی ہے۔

❸ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ جہاد کریں اور دشمنوں سے اسلام کا دفاع کریں۔ امام زہری نے فرمایا، جہاد ہر ایک پر واجب ہے، خواہ لڑائی میں نکلے یا بیٹھا رہے، بیٹھنے والوں پر لازم ہے کہ جب ان سے مدد طلب کی جائے تو وہ امداد کریں، جب ان سے فریاد کی جائے، فریاد کو پہنچیں، جب انھیں میدان میں بلایا جائے نکل کھڑے ہوں۔ (ابن کثیر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس نے نہ جنگ کی اور نہ اپنے نفس کے ساتھ جنگ کی بات کی، تو وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرے گا۔" [مسلم، الإمارة، باب ذم من مات ...... : ۱۹۱۰، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ]

❹ جہاد یعنی اللہ کا دین غالب کرنے کے لیے اپنی آخری کوشش کرتے رہنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن نفیر یعنی لڑائی کے لیے نکلنا ہر وقت ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ (دیکھیے توبہ (۱۲۲)) البتہ تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ تین مواقع پر قتال آدمی پر فرض عین ہو جاتا ہے: ① جب امام کسی خاص شخص کو یا تمام مسلمانوں کو نکلنے کا حکم دے دے، الا یہ کہ امام کسی کو مستثنیٰ کر دے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے تبوک میں سب کو نکلنے کا حکم دیا مگر علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے رہنے کا حکم دیا۔ (مسلم: ۲۴۰۴/۳۱) اس کی دلیل سورۂ توبہ کی آیات (۳۸، ۳۹) ہیں۔ ② جب کفار مسلمانوں کی کسی آبادی پر حملہ کر دیں تو اس کے رہنے والوں پر اس کا دفاع واجب ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۹۱) اس حد تک کہ اگر ان کے پاس کافی اسلحہ نہ بھی ہو تو پتھروں، اینٹوں، لکڑیوں غرض جو کچھ بھی ملے اس کے ذریعے سے لڑنا فرض ہے۔ اگر دانتوں سے کاٹ کھانے کے سوا کچھ نہ ملے تو دانتوں سے کاٹ کر اپنا دفاع واجب ہے۔ اگر اس آبادی والے دفاع نہ کر سکیں یا سستی کریں تو قریب والی آبادی، پھر اس کے بعد والی پر، حتیٰ کہ تمام دنیا کے اہل اسلام پر لڑنا فرض ہو جاتا ہے، کیونکہ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ ③ جب دشمن سے مڈبھیڑ ہو تو ثابت قدم رہنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ﴾

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِيۡهِ ؕ قُلۡ قِتَالٌ فِيۡهِ كَبِيۡرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ كُفۡرٌۢ بِهٖ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ۗ وَ اِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَكۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ وَ الۡفِتۡنَةُ اَكۡبَرُ مِنَ

وہ تجھ سے حرمت والے مہینے کے متعلق اس میں لڑنے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے اس میں لڑنا بہت بڑا ہے اور اللہ کے راستے سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بڑا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔ اور وہ تم سے ہمیشہ لڑتے

[ الأنفال : ۱۵ ] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا، ایک لشکر کی صورت میں ملو تو ان سے پیٹھیں نہ پھیرو۔'' حافظ ابن حجر نے فرمایا: ''جب کسی شخص پر لڑائی فرض عین ہو جائے تو ''فَلَا إِذْنَ '' یعنی اس وقت والدین یا کسی اور سے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔'' [ فتح الباری، الجهاد والسير، باب الجهاد بإذن الأبوين ] اس بات پر بھی علماء کا اتفاق ہے کہ اپنے دفاع کی خاطر لڑنے کے لیے کوئی بھی شرط لازم نہیں، نہ امیر کا حکم، نہ والدین کی اجازت اور نہ کوئی اور شرط، جیسا کہ ابوبصیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کی واضح دلیل ہے۔

5 وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُمۡ : یعنی وہ تمھیں سراسر ناپسند ہے، کیونکہ اس میں زخمی ہونے، اعضاء کٹنے اور جان جانے کا سامنا ہوتا ہے، جب کہ ہر آدمی فطری طور پر زندہ رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مال کا خرچ، اہل و عیال اور وطن سے جدائی، سفری صعوبتیں، کھانے پینے اور نیند کی بے ترتیبی، غرض بے شمار مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔

6 وَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ : قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''معنی یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تم جہاد میں جو مشقت ہے اسے ناپسند کرو، حالانکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، اس لیے کہ تم غالب رہو گے، فتح یاب ہو گے، غنیمت حاصل کرو گے اور اجر پاؤ گے اور تم میں سے جو فوت ہو گا وہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ تم آرام طلبی اور لڑائی ترک کرنے کو پسند کرو، حالانکہ یہ چیز تمھارے لیے بہت بری ہے، کیونکہ تم مغلوب ہو جاؤ گے اور تمھاری حکومت ختم ہو جائے گی۔'' قرطبی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: ''اللہ کا یہ فرمان بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں، جیسا کہ اندلس میں پیش آیا، انھوں نے جہاد ترک کیا، لڑائی سے بزدلی اختیار کی اور کثرت سے فرار اختیار کیا تو دشمن تمام شہروں پر قابض ہو گیا۔ شہر بھی کیسے کیسے اور کیا کیا اسیری؟ قتل و غارت، بچوں اور عورتوں کی غلامی اور عزتوں کی بربادی۔ ( إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ) یہ سب ہمارے اپنے ہاتھوں کا کیا کمایا ہے۔'' (قرطبی)

قرطبی کے کئی سو سال پہلے لکھے ہوئے یہ الفاظ آج بھی حقیقت ہیں، جن سے دل درد و غم سے بھر جاتا ہے، اس وقت اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا گیا تھا، اب مسلمانوں کی آرام طلبی اور ترک جہاد نے کفار کو عراق، افغانستان پر قبضے کا اور باقی تمام مسلمان ممالک میں اپنے احکام چلانے کا موقع دیا ہے اور ہندو بھی اندلس کی طرح مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اب آرام طلبی اور ترک جہاد کا کون سا موقع ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قتال کی کڑوی دوا کے سوا مسلمانوں کی شفا کی کوئی صورت نہیں۔

آیت 217 - 1 قِتَالٍ فِيۡهِ : یہ ''الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ'' سے بدل اشتمال ہے۔ ''قِتَالٌ'' مبتدا اور ''كَبِيۡرٌ'' خبر ہے۔

الْقِتَلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

رہیں گے، یہاں تک کہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں، اگر کر سکیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے، پھر اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہو تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۱۷﴾

''صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' مبتدا ہے، ''كُفْرٌۢ بِهٖ'' اور ''اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ'' کا اس پر عطف ہے اور ان سب کی خبر ''اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ'' ہے اور ''وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'' کا عطف ''سَبِيْلِ اللّٰهِ'' پر ہے اور ''كُفْرٌۢ بِهٖ'' میں ''بِهٖ'' کی ضمیر ''سَبِيْلِ اللّٰهِ'' میں مذکور لفظ ''اللّٰهِ'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور ''الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'' کو پہلے لانے کے بجائے ''كُفْرٌۢ بِهٖ'' کو پہلے لانے میں یہ حکمت ہے کہ سبیل اللہ (اسلام) سے روکنے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر مسجد حرام سے روکنے سے بڑا جرم ہے، اس لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔

2 ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب یہ چار مہینے حرمت والے ہیں، عہد جاہلیت ہی سے ان میں لوٹ مار اور خون ریزی حرام سمجھی جاتی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ ۲ھ میں رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فوج کا ایک دستہ جہاد کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے کافروں کے ایک قافلے پر حملہ کیا، جس سے ان کا ایک آدمی مارا گیا اور بعض کو مال سمیت گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ رجب ۲ھ میں پیش آیا۔ کفار نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم نے رجب میں جنگ کر کے اس حرمت کو توڑا ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ماہ حرام میں جنگ کرنا اگرچہ واقعی بہت بڑا ہے، مگر تم تو اس سے بھی بڑے گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہو (جو یہ ہیں، اللہ کے راستے یعنی اسلام سے روکنا، اللہ کے ساتھ کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا، مسجد حرام یعنی حرم مکہ میں رہنے والے صحابہ اور رسول اللہ ﷺ کو اس سے نکالنا، اس کے علاوہ فتنہ یعنی کفر و شرک پر مسلمانوں کو مجبور کرنے کے لیے عذاب میں مبتلا کرنا قتل سے بھی بڑا جرم ہے)۔ لہٰذا اگر مسلمانوں نے تلوار اٹھالی ہے تو قابل مؤاخذہ نہیں۔ (ابن کثیر، شوکانی)

3 حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی حرمت اکثر فقہاء کے نزدیک سورۂ توبہ کی آیت: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [ التوبۃ : ٥ ] کے ساتھ منسوخ ہو چکی ہے (الجصاص) مگر سورۂ توبہ ہی کی آیت: ﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا ﴾ [ التوبۃ : ٣٦ ] اس آیت میں ہے: ﴿ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾ ''ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔'' پھر فرمایا: ﴿ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ﴾ [ التوبۃ : ٣٦ ] ''سو ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور کافروں سے ہر حال میں لڑو، جیسے وہ ہر حال میں تم سے لڑتے ہیں۔'' اور ﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ ﴾

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۱۸﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۱۸﴾

[ البقرة : ۱۹۴ ] ''حرمت والا مہینا حرمت والے مہینے کے بدلے ہے'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمت والے مہینوں میں لڑنے کی اجازت کا سبب یہ ہے کہ کفار چونکہ ان مہینوں میں بھی مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں، اس لیے مسلمانوں پر بھی ان مہینوں میں نہ لڑنے کی کوئی پابندی نہیں۔ اگر فی الواقع کفار ان مہینوں کی حرمت کی پاس داری کریں تو مسلمانوں کو بھی کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے آخری حج کے خطبہ میں بھی ان مہینوں کی حرمت کا ذکر فرمایا۔ عطاء اور بہت سے اہل علم کا یہ قول ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

④ **وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے آیت: ﴿ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ [ البقرة : ۱۹۱ ]

⑤ **اِنِ اسْتَطَاعُوْا** : یہ اس بات کی بشارت ہے کہ کفار بے شمار لڑائیوں کے باوجود کبھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے کہ تمام مسلمانوں کو دین سے مرتد کر دیں۔ اسلام کو سربلند رکھنے والے کچھ لوگ ہمیشہ ان کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔ دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیات اور سورۂ صف کی آیت (۸، ۹)۔

⑥ **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** : اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص (نعوذ باللہ) مرتد ہو جائے اور اسی حالت میں مر جائے تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، لیکن اگر پھر سچے دل سے تائب ہو کر اسلام قبول کرے تو مرتد ہونے سے پہلے کے اعمال ضائع نہیں جاتے بلکہ ان کا بھی ثواب مل جاتا ہے۔ (فتح البیان)

اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے اور توبہ نہ کرے تو اس کی سزا قتل ہے، جو ﴿ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا ﴾ دنیا میں ان کے اعمال ضائع ہونے کا نتیجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ )) [ بخاری، الجهاد، والسیر، باب لا یعذب بعذاب الله : ۳۰۱۷ ] ''جو اپنا دین (اسلام) بدل لے اسے قتل کر دو۔'' اسلام کی وجہ سے دنیا میں حاصل جان و مال اور عزت کی حرمت، مرنے کے بعد جنازہ اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن، مسلمان بیوی کی زوجیت، وراثت غرض مسلمانوں والے تمام حقوق ارتداد کی وجہ سے ختم ہو جائیں گے۔

**آیت 218** ① **هَاجَرُوْا** : ''هَجَرَ یَهْجُرُ (ن)'' کا معنی کسی سے دل یا زبان یا بدن کے ساتھ جدا ہو جانا ہے اور ''هَاجَرُوْا'' اس میں سے باب مفاعلہ ہے، جس میں مبالغہ مقصود ہے، یعنی ''کسی سے قطع تعلق کر کے الگ ہو جانا'' مراد دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں آ جانا ہے۔ (مفردات)

② **وَجَاهَدُوْا** : ''جَهَدَ یَجْهَدُ (ف)'' کا مطلب ہے ''کسی کام میں کوشش کرنا۔'' ''جَاهَدَ مُجَاهَدَةً وَجِهَادًا'' کا معنی ہے ''دشمن سے لڑنا۔'' (القاموس) ''جَهَدَ'' سے باب مفاعلہ کی وجہ سے اس کا معنی اپنی ساری کوشش صرف کرنا ہے۔ اس لیے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ٞ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾

تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔ اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں، کہہ دے جو بہترین ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور وفکر کرو ﴿۲۱۹﴾

اصحاب لغت نے اس کا معنی ''لڑنا'' کیا ہے کیونکہ کوشش کی انتہا یہی ہے۔

③ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ : یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد ایسے اعمال ہیں جن کے نتیجے میں دل کے اندر اللہ کی رحمت کی امید پیدا ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا دامن ان سے خالی ہے وہ لاکھ اللہ کی رحمت کی امید کا دعویٰ کریں، حقیقت میں ان کے دل کے اندر رحمت کی امید پیدا نہیں ہوتی ؎

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس میں ان مجاہدوں کے لیے بشارت ہے جن کا ذکر حرمت والے مہینوں میں حملہ کرنے کے ضمن میں آیا ہے۔

آیت 219 ① الْخَمْرِ : شراب، اس کی تفسیر خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ )) [ مسلم، الأشربة، باب بيان أن كل مسكر ...... : ٢٠٠٣/٧٤ ] ''ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے۔'' بعض لوگوں نے صرف انگور کی شراب کو ''خمر'' قرار دے کر باقی سب کے دوسرے نام رکھ کر انھیں حلال کر لیا۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے عین مصداق ہیں کہ میری امت میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو عورتوں کی شرم گاہوں کو اور ریشم اور خمر (شراب) کو اور باجوں کو حلال کر لیں گے۔ [ بخاری، الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر ...... : ٥٥٩٠، عن أبي مالك الأشعري رضی اللہ عنہ ] ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے کچھ لوگ خمر (شراب) پییں گے اور اس کا نام کچھ اور رکھ لیں گے۔'' [ أبو داوٗد، الأشربة، باب في الداذي : ٣٦٨٨ ]

② الْمَيْسِرِ : جوا، یہ ''يُسْرٌ'' بمعنی سہولت سے ہے، کیونکہ جوئے میں بغیر مشقت کے دوسرے کا مال آسانی سے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ آج کل پانسے، لاٹری، بیمے اور سٹے وغیرہ کے نام سے جو کاروبار ہو رہا ہے سب جوئے کی صورتیں ہیں، حتیٰ کہ اخروٹوں کے ساتھ کھیل میں شرط ہو تو وہ بھی جوا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے سورۂ مائدہ کی آیت (۳) اور (۹۰) کے حواشی دیکھ لیں۔

③ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا : اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے کچھ فوائد بتلائے، مگر ساتھ ہی فرمایا کہ کچھ فوائد کے ساتھ ان میں بہت بڑا گناہ ہے، پھر مقابلہ نفع اور نقصان کا نہیں کیا کہ ان کے نقصانات ان کے فوائد سے زیادہ ہیں، بلکہ فرمایا

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ

دنیا اور آخرت کے بارے میں۔ اور وہ تجھ سے یتیموں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے ان کے لیے کچھ نہ کچھ سنوارتے

ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی چیز دنیا میں کتنی بھی نفع بخش کیوں نہ ہو، اگر اس میں گناہ ہے تو مومن کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس آیت میں شراب اور جوئے کی حرمت کی طرف اشارہ موجود ہے، کیونکہ ان میں "اِثْمٌ كَبِيْرٌ" بتایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے "اِثْمٌ" کو حرام قرار دیا ہے۔ (دیکھیے الاعراف: ۳۳) اس سے فوٹو کے فوائد اور گناہ کا، گھر میں ٹی وی، وی سی آر وغیرہ رکھنے کے فوائد اور گناہ کا اور کفار کے ملکوں میں جا کر رہنے کے فوائد اور گناہ کا مقابلہ بھی کر لینا چاہیے۔

④ قُلِ الْعَفْوَ: "اَلْعَفْوَ" کا معنی صاحب قاموس نے کیا ہے۔ "خِيَارُ الشَّيْءِ وَ اَجْوَدُهٗ" یعنی کسی چیز کا بہترین اور عمدہ ترین حصہ۔ طبری نے بھی کئی مفسرین سے یہ معنی نقل فرمایا ہے۔ اس صورت میں یہ آیت سورۂ آل عمران کی آیت (۹۲) اور سورۂ بقرہ کی آیت (۲۶۷) کی ہم معنی ہے، یعنی اپنی بہترین اور محبوب ترین چیز خرچ کرو۔ ترجمہ اسی معنی کے مطابق کیا گیا ہے۔

دوسرا معنی ہے ''زائد چیز'' اگرچہ زائد کا معنی بھی یہ ہو سکتا ہے کہ جو عمدگی میں بڑھیا ہو، مگر بہت سے علماء نے اس کا معنی اپنی اور گھر کی ضرورتوں سے زائد چیز کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں "اَلْعَفْوَ" سے مراد وہ مال ہے جو اہل و عیال اور لازمی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد بچ رہے اور جس کے خرچ کرنے کے بعد انسان خود اتنا محتاج نہ ہو جائے کہ دوسروں سے سوال کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہتر صدقہ وہ ہے جو خوش حالی کے ساتھ ہو اور تم پہلے اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔'' [ بخاری، الزكوة، باب لا صدقة ...... : ۱٤۲٦، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] یہ حکم زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقے کا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ (اشرف الحواشی) دونوں معنی مراد لینے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں۔ بعض مسلمان کہلانے والے کمیونسٹوں نے اس آیت سے ضرورت سے زائد چیزوں کی ذاتی ملکیت کے انکار پر استدلال کیا ہے، حالانکہ اس کے معنی اول تو یہ ہیں کہ اپنی بہترین چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس سے اشتراکی نظریے کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ اگر زائد خرچ کرنے کے معنی مراد لیے جائیں تو وہ بھی اگر لوگوں کی ملکیت میں کچھ ہوگا تو خرچ کریں گے اور یہ اختیار بھی ان کے پاس ہوگا کہ وہ کس چیز کو ضرورت سے زائد سمجھتے ہیں۔ اگر ملکیت ہی حکومت کی ہے تو لوگ کیا خرچ کریں گے۔ جبراً سب کچھ چھین لینے کو قرآن کا منشا قرار دینا، لوگوں کی طرح قرآن پر بھی جبر ہے۔

آیت 220 ① فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ: اس کا تعلق اس سے پہلی آیت "لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ" کے ساتھ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمھارے لیے شراب اور جوئے میں دنیا کے فائدے اور دنیا اور آخرت میں ان کے نقصانات اور ان کا کبیرہ گناہ ہونا اور شراب اور جوئے کے بجائے اللہ کے راستے میں اپنی بہترین چیزیں خرچ کرنا کھول کر بیان کر رہا ہے، تاکہ تم چند روزہ دنیا اور ہمیشہ رہنے والی آخرت دونوں میں خود ہی غور و فکر کر لو کہ عقل سے کام لے کر تم کس کو ترجیح دیتے ہو۔

② "اَلْيَتٰمٰى" جس کا باپ فوت ہو گیا ہو وہ بالغ ہونے تک یتیم ہے۔ "لَاَعْنَتَكُمْ" "عَنَتٌ" کا معنی مشقت ہے، جیسے سورۂ توبہ (۱۲۸) میں ہے: ﴿ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ﴾ ''اس پر بہت شاق ہے کہ تم مشقت میں پڑو۔'' "اَعْنَتَ"

فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ

رہنا بہتر ہے اور اگر تم انھیں ساتھ ملا لو تو تمھارے بھائی ہیں اور اللہ بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ضرور مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۲۰﴾ اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر

باب افعال سے ماضی معروف ہے اور " اِعْنَاتٌ" اس سے مصدر ہے، جس کے معنی ہیں، آدمی کو ایسی مشقت میں ڈالنا جس میں ہلاکت کا خطرہ ہو۔ (راغب)

③ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ : "اِصْلَاحٌ" کی تنوین کی وجہ سے "کچھ نہ کچھ سنوارتے رہنا" ترجمہ کیا ہے، یعنی ان کے مال کی حفاظت کے ساتھ ان کی تعلیم، اخلاق، صحت اور تمام معاملات کی کچھ نہ کچھ اصلاح جو تمھارے بس میں ہو، کرتے رہنا، انھیں یتیم سمجھ کر باز پرس نہ کرنے سے بہت بہتر ہے۔

④ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "جب یہ آیت اتری: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [ بنی إسرائیل : ٣٤ ] "اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہے" تو لوگوں نے یتیموں کے اموال الگ کر دیے، چنانچہ یتیموں کا کھانا خراب اور گوشت بدبودار ہونے لگا۔" یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی گئی اور اس پر یہ آیت اتری تو لوگوں نے انھیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ [ مسند أحمد : ٣٢٥/١، ح : ٣٠٠٤۔ مستدرك حاكم : ٣٠٦/٢، ح : ٣١٠٣، صححه الحاكم و وافقه الذهبي و حسنه الألباني ]

⑤ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ : مگر اللہ تعالیٰ نے تم پر مشقت نہیں ڈالی، بلکہ آسانی اور وسعت پیدا فرمائی۔ چنانچہ اصلاح کی نیت سے انھیں اپنے ساتھ ملا سکتے ہو اور اگر محتاج ہو تو بقدر خدمت و ضرورت ان کے مال سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [ النساء : ٦ ] "اور جو غنی ہو تو وہ بہت بچے اور جو محتاج ہو تو وہ جانے پہچانے طریقے سے کھا لے۔"

آیت 221 ① وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ : پہلے مسلمان اور کافر میں رشتہ ناتا جاری تھا، اس آیت سے حرام ٹھہرا۔ اگر مرد یا عورت نے شرک کیا، اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔ شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے، مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے، یا وہ جو چاہے سو کر سکتا ہے، یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے، مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس کو مختار جان کر اس سے حاجت طلب کرے۔ باقی یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح درست ہے، ان کو مشرک نہیں فرمایا۔ (موضح)

شاہ صاحب کے آخری جملہ میں کچھ تفصیل کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اہل کتاب کو مشرکین

اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾

ہے، خواہ وہ تمھیں اچھی لگے اور نہ (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور یقیناً ایک مومن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں اچھا معلوم ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور لوگوں کے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۲۱﴾

کے مقابلے میں ذکر فرمایا ہے، وہاں مشرکین سے مراد بت پرست ہیں، یہود و نصاریٰ نہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ لَمۡ يَكُنِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ مُنۡفَكِّيۡنَ ﴾ [ البینة : ۱ ] ”وہ لوگ جنھوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا، باز آنے والے نہ تھے۔“ یہ اور دوسری وہ آیات جن میں اہل کتاب اور مشرکین کو الگ الگ بیان کیا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ (۱۰۵) اور حج (۱۷) اور بعض مقامات پر یہود و نصاریٰ کو بھی شرک کرنے والے قرار دیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرُ ابۡنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ …… سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴾ [ التوبة : ۳۰، ۳۱ ] ”اور یہودیوں نے کہا، عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے …… وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔“ (مزید دیکھیے مائدہ: ۷۲) چنانچہ بعض صحابہ اہل کتاب میں سے شرک کرنے والی عورتوں سے نکاح کو درست نہیں سمجھتے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”میں اس سے بڑا شرک نہیں جانتا کہ کوئی عورت کہتی ہو میرا رب عیسیٰ ہے، حالانکہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے۔“ [ بخاری، الطلاق، باب قوله : ﴿ ولا تنكحوا المشركات …… ﴾ : ۵۲۸۵ ] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں صرف یہی قول ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق اہل کتاب کی صرف موحد عورتوں سے نکاح درست ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا شرک خود ذکر کرنے کے باوجود ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے، تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔ امیر المومنین عمر بن خطاب، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما اور دوسرے کبار صحابہ کا یہی فتویٰ ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ﴾ [ المائدة : ۵ ] ”تم سے پہلے جنھیں کتاب دی گئی ان کی پاک دامن عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں۔“ خلاصہ یہ کہ مسلمان کے لیے کسی ہندو یا بت پرست، کمیونسٹ یا آتش پرست مشرکہ عورت سے نکاح کرنا حرام ہے، البتہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح میں اگرچہ ایمان کا خطرہ ہے، اس لیے کراہت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۵) اس میں حکمت یہ ہے کہ بت پرست، دہریے اور آتش پرست کسی آسمانی تعلیم کو نہ مانتے ہیں نہ اس کے پابند ہیں، جب کہ اہل کتاب عورتوں کو ان کی کتاب کے حوالے سے توحید و رسالت کی دعوت دی جا سکتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ ﴾ [ آل عمران : ٦٤ ] ”کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَ لَا

اور وہ تجھ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ ایک طرح کی گندگی ہے، سو حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور

ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے۔'' اور مرد کے غالب ہونے کی وجہ سے ان کے توحید قبول کرنے کی بھی قوی امید ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اہل کتاب کی عورتوں سے جو شرک کی مرتکب ہوں، نکاح جائز ہے تو مسلمان عورتیں، جو شرک کرتی ہوں، ان سے بھی نکاح جائز ہے۔ کیونکہ وہ قرآن و حدیث کو مانتی ہیں اور انھیں اس کے حوالے سے توحید و سنت کا قائل کیا جا سکتا ہے۔

② **وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا:** اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان عورت آزاد ہو یا غلام، اسے مشرک کے نکاح میں دینا جائز نہیں، پھر مشرک خواہ بت پرست ہو یا یہودی یا عیسائی یا مجوسی یا دہریہ، کسی بھی غیر مسلم سے مسلم عورت کا نکاح جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں سے نکاح حرام کرنے کے بعد سورۂ مائدہ (۵) میں اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی، مگر مشرک مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دینے سے منع کرنے کے بعد کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی۔ قرطبی نے اس بات پر امت کا اجماع نقل فرمایا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا (کیونکہ یہ اسلام کی سربلندی کے خلاف ہے)۔

تنبیہ: جس طرح کسی بھی مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں، خواہ یہودی ہو یا عیسائی، اسی طرح اگر کوئی کلمہ گو مسلمان بھی شرک کا مرتکب ہو، جیسا کہ اس حاشیے کے شروع میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی ہے تو اس سے کسی مسلمان موحدہ عورت کا نکاح جائز نہیں۔ کیونکہ مرد کے غالب ہونے کی وجہ سے اس موحدہ عورت کو شرک پر مجبور کیے جانے کا خطرہ ہے۔

③ **وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ:** یہ جملہ واضح دلیل ہے کہ عورت اپنا نکاح خود نہیں کر سکتی، بلکہ اس کا ولی اس کا نکاح کر کے دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح سے منع فرمایا، دیکھیے صحیح بخاری جس میں امام بخاری رحمہ اللہ نے زیر تفسیر آیت اور دو مزید آیات اور احادیث سے یہ مسئلہ ثابت فرمایا ہے۔

**آیت 222** ① ''**الْمَحِيْضِ**'' ''حَاضَ يَحِيْضُ (ض)'' سے اسم مصدر ہے، اس کا اصل معنی ''بہنا'' ہے۔ مراد عورت کا وہ خون ہے جو ہر ماہ عادت کے مطابق آتا ہے۔ عادت کے خلاف جو خون آئے وہ استحاضہ (بیماری) ہے۔

''**اَذًى**'' کا لفظ تکلیف، بیماری اور گندگی تینوں معنوں میں آتا ہے۔ نکرہ ہونے کی وجہ سے ''ایک طرح کی گندگی'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کا گندگی ہونا تو ظاہر ہے، طبی حیثیت سے بھی عورت ان دنوں صحت کی نسبت بیماری کے زیادہ قریب ہوتی ہے اور اس حالت میں اس سے جماع خاوند اور بیوی دونوں کے لیے بیماری کا باعث ہو سکتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہود میں جب کسی عورت کو حیض آتا تو وہ نہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے اور نہ گھر میں ان کے ساتھ اکٹھے رہتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس بارے میں) پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ **وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ** ﴾ [البقرة: ۲۲۲] تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جماع کے علاوہ سب کچھ کرو۔'' [مسلم، الحیض،

تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

ان کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں اور ان سے محبت کرتا ہے جو بہت پاک رہنے والے ہیں ﴿۲۲۲﴾

باب جواز غسل الحائض …… : ۳۰۲ ] احادیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ اس حالت میں خاوند کے لیے عورت کا بوسہ لینا، اس سے چمٹنا، الغرض سب کچھ سوائے جماع کے جائز ہے۔ وہ اس حالت میں گھر میں رہ کر کھانا پکانا، بچے کو دودھ پلانا، غرض گھر کا ہر کام کر سکتی ہے، البتہ مسجد میں جانا اور نماز، روزہ اس کے لیے جائز نہیں۔

② **حَتّٰى يَطْهُرْنَ** : یہ باب " نَصَرَ" اور " كَرُمَ " سے ہے، بمعنی پاک ہو جائیں ''**تَطَهَّرْنَ**'' باب تفعل ہے، جس میں مبالغہ ہے، یعنی ''خوب پاک ہو جائیں'' غسل کر لیں۔ "**حَتّٰى يَطْهُرْنَ**" سے معلوم ہوا کہ حیض سے پاک ہونے تک جماع منع ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے جماع کی اجازت "**تَطَهَّرْنَ**" (یعنی غسل کرنے) کے بعد دی ہے۔ اکثر اہل علم یہی فرماتے ہیں کہ غسل سے پہلے جماع جائز نہیں۔ طبری نے اس پر علماء کا اجماع ذکر کیا ہے، البتہ بعض علماء پاک ہونے کے بعد عورت کے شرم گاہ کو دھو لینے کے بعد جماع جائز سمجھتے ہیں، مگر پہلی بات میں زیادہ احتیاط ہے۔

③ **فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ** : "**فَاْتُوْهُنَّ**" کا مطلب یہ نہیں کہ ضرور ہی ان سے صحبت کرو، بلکہ منع کرنے کے بعد امر آئے تو اجازت مراد ہوتی ہے، جیسے: ﴿ **وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا** ﴾ [ المائدۃ : ۲ ] ''جب احرام کھول دو تو شکار کرو۔'' ''جہاں سے تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ سے (یعنی شرم گاہ میں جماع سے) تمھیں منع کیا تھا، اب اس جگہ سے عورت کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ دبر کی اجازت نہ پہلے تھی نہ اب ہے، یہ تو سراسر گندگی ہے اور "**الْمُتَطَهِّرِيْنَ**" (بہت پاک رہنے والوں) سے اس کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ اسی طرح حیض کی حالت میں جانا بھی "**الْمُتَطَهِّرِيْنَ**" کے لائق نہیں۔ اگر کوئی اس حالت میں چلا گیا تو بہت توبہ کرنے سے اللہ کی محبت کا پھر حق دار بن سکتا ہے۔ "**التَّوَّابِيْنَ**" اور "**الْمُتَطَهِّرِيْنَ**" کی یہ تفسیر آیت کی مناسبت سے ہے، ورنہ لفظ عام ہیں، جن میں ہر گناہ سے بہت توبہ اور ہر نجاست سے بہت اجتناب اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

④ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص حیض کی حالت میں بیوی کے پاس جائے وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے۔'' [ أبو داؤد، النکاح، باب فی کفارۃ من أتی حائضًا : ۲۱٦۸۔ نسائی : ۲۹۰۔ ترمذی : ۱۳٦۔ ابن ماجہ : ٦٤۰ ] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرنے کا اختیار ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

تمھاری عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں، سو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لیے آگے (سامان) بھیجو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ یقیناً تم اس سے ملنے والے ہو اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دے ۝۲۲۳ اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ، (اس سے بچنے کے لیے) کہ تم نیکی کرو اور (گناہ سے) بچو اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرو، اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ۝۲۲۴

آیت 223 ① فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ : جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہود کہتے تھے کہ جب عورت سے اس کی پچھلی جانب سے ہو کر جماع کیا جائے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے، اس پر یہ آیت اتری۔ [ بخاری، التفسیر، باب ﴿ نساء كم حرث لكم ﴾ : ٤٥٢٨ ] عورتیں کھیتی ہیں، جماع کے لیے کوئی آسن مقرر نہیں، ہر آسن پر کر سکتے ہو، مگر اولاد پیدا کرنے کی جگہ میں ہو۔ دبر موضع حرث (کھیتی کی جگہ) نہیں، موضع فرث (پاخانے کی جگہ) ہے۔ احادیث میں دبر میں جانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص ملعون ہے جو عورت کے پاس اس کی دبر میں جائے۔'' [ أبو داؤد، النكاح، باب فی جامع النكاح : ٢١٦٢، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ و صححه الألبانی ]

② وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ : یعنی اپنے لیے نیک اعمال آگے بھیجو۔ نیک اولاد انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔ بیوی سے صحبت کے وقت نیک اولاد کے حصول کی نیت بھی اس میں شامل ہے۔

③ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ : میاں بیوی کے باہمی معاملات میں اگر کوئی زیادتی ہو تو نہ کوئی گواہ ہوتا ہے نہ دخیل، مگر اللہ سے ملاقات تو یقیناً ہونی ہے، اس لیے اس سے ڈرتے رہو۔

آیت 224 بعض لوگ غصے میں آ کر کسی نیک کام کے نہ کرنے کی قسم کھا لیتے اور پھر اس قسم کو نیکی سے باز رہنے کے لیے آڑ بنا لیتے۔ اس آیت میں اس قسم کے لوگوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں اس لیے نہ کھاؤ کہ نیکی، پرہیز گاری اور لوگوں میں صلح کرانے جیسے نیک کاموں سے باز رہنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے، کیونکہ غلط قسم پر اڑے رہنا گناہ ہے۔ دیکھیے سورۂ نور (۲۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمان بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''جب تم کسی بات پر قسم کھا لو، پھر دیکھو کہ دوسرا کام اس سے بہتر ہے تو اپنی قسم کا کفارہ دے دو اور وہ کام کرو جو بہتر ہے۔'' [ بخاری، الأيمان والنذور، باب قول الله تعالى : ﴿ لا يؤاخذ كم الله ...... ﴾ : ٦٦٢٢ ] قسم کے کفارے کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۸۹)۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اللہ تمھیں تمھاری قسموں میں لغو پر نہیں پکڑتا، بلکہ تمھیں اس پر پکڑتا ہے جو تمھارے دلوں نے کمایا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۲۲۵﴾ ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں سے قسم کھا لیتے ہیں، چار مہینے انتظار کرنا ہے، پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۲۶﴾ اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۲۷﴾

**آیت 225** لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو نیت کے بغیر عادت کے طور پر یوں ہی زبان سے نکل جاتی ہیں۔ ایسی قسموں پر کسی قسم کا کفارہ یا سزا نہیں ہے، ہاں جو قسمیں دل کے ارادے کے ساتھ کھائی جائیں کہ اللہ کی قسم میں یہ کام ضرور کروں گا، یا نہیں کروں گا اور پھر ان کی خلاف ورزی کی جائے تو ان پر کفارہ ہے، مگر کوئی شخص جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے کہ میں نے یا فلاں نے یہ کام کیا ہے یا نہیں کیا تو یہ کبیرہ گناہ ہے۔ اس کا کفارہ نہیں صرف ندامت، آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد اور استغفار ہی اس کا علاج ہے۔ اسے ''یمین غموس'' کہتے ہیں۔

**آیت 226، 227** يُؤْلُوْنَ: صیغہ جمع مذکر غائب، باب افعال، مہموز الفاء اور ناقص یائی، '' آلٰی يُؤْلِيْ اِيْلَاءً '' '' أ ل ی '' اس کا مادہ ہے۔ ان دو آیتوں میں ''ایلاء'' کے معنی یہ ہیں کہ مرد قسم کھا لے کہ وہ اپنی بیوی سے جماع نہیں کرے گا، پھر اگر یہ قسم چار ماہ یا اس سے کم مدت کے لیے کھائی ہو تو اسے اپنی قسم پوری کرنے کا اختیار ہے، اگر وہ مدت پوری کر کے اپنی بیوی سے تعلق قائم کر لے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں ہو گا اور اگر اس مدت سے پہلے ہی تعلق بحال کر لے تو قسم کا کفارہ دینا ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اپنی بیویوں سے ایک ماہ کے لیے قریب نہ جانے کی قسم کھائی تھی، مدت پوری ہونے پر آپ نے ان سے تعلق قائم فرما لیا۔ [ بخاری، النکاح، باب هجرة النبی ﷺ نساء ه...... : ۵۲۰۲ ] اور آپ ﷺ نے کوئی کفارہ ادا نہیں کیا۔ (شوکانی) جاہلیت میں نکاح کرنے کے بعد بعض لوگ لمبی مدت تک بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم اٹھا لیتے، یا مدت کی تعیین کیے بغیر ہمیشہ کے لیے قسم کھا لیتے، وہ بیچاری لٹکی رہتی، نہ خاوند والی نہ بغیر خاوند کے کہ کہیں اور نکاح کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس ظلم کا خاتمہ فرمایا۔ اب اگر کوئی چار ماہ سے زائد مدت کے لیے، یا مدت مقرر کیے بغیر قسم کھا لے تو ایسے شخص کے لیے اس آیت میں چار ماہ کی مدت مقرر کر دی گئی ہے کہ یا تو اس مدت کے پورا ہوتے ہی اپنی بیوی سے تعلقات قائم کرے، یا پھر سیدھی طرح سے طلاق دے دے۔ پہلی صورت اختیار کرے گا تو اسے کفارہ دینا ہو گا اور اگر وہ دونوں میں سے کوئی صورت

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

ع ۲۸ / ۱۲

اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں اور ان کے لیے حلال نہیں کہ وہ چیز چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے، اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ (معاملہ) درست کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور معروف کے مطابق ان (عورتوں) کے لیے اسی طرح حق ہے جیسے ان کے اوپر حق ہے اور مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۲۸﴾

طلاق واقع نہیں ہو گی۔ آیت کے الفاظ سے یہی ظاہر ہوتا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے "کِتَابُ الطَّلَاقِ (۵۲۹۱)" میں ابن عمر، عثمان، علی، ابودرداء، عائشہ رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ بارہ صحابہ سے یہ قول ذکر فرمایا ہے۔ اکثر ائمہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

آیت 228 ❶ اگر خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ فوراً اس سے جدا نہیں ہوتی، بلکہ اسے کچھ مدت انتظار میں گزارنا ہو گی جس کے اندر خاوند اس سے رجوع کر سکتا ہے اور اس مدت کے گزرنے کے بعد عورت آزاد ہے، جس سے چاہے نکاح کر لے۔ اس مدت کو عدت کہتے ہیں۔

❷ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی خاوند جماع کے بعد اپنی عورت کو طلاق دے اور اسے حیض نہ آتا ہو تو اس کے لیے عدت تین ماہ ہے اور اگر حاملہ ہے تو حمل سے فارغ ہونا۔ (دیکھیے طلاق: ۴) اور اگر جماع سے پہلے ہی طلاق ہو جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں۔ (دیکھیے احزاب: ۴۹) پس اس آیت میں لفظ "اَلْمُطَلَّقٰتُ" (وہ عورتیں جنھیں طلاق دی جائے) سے ان عورتوں کی عدت بیان کرنا مقصود ہے جن سے خاوند صحبت کر چکے ہوں اور وہ حاملہ نہ ہوں، نہ ہی ایسی ہوں جنھیں حیض نہیں آتا، نہ لونڈیاں ہوں۔ تو ان کی عدت تین "قروء" ہے۔ "قُرُوْٓءٍ" کا لفظ جمع ہے اس کا واحد "قُرْءٌ" ہے اور یہ حیض کے ایام پر بھی بولا جاتا ہے اور طہر (یعنی حیض سے پاک ہونے) کے ایام پر بھی۔ بندہ کی تحقیق میں حیض والا معنی راجح ہے۔ مگر فتویٰ دونوں پر صحیح ہے۔ مزید مسائل کے لیے دیکھیے سورۂ طلاق کی ابتدائی آیات۔

❸ اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ پہلے مطلقہ عورت کے لیے کوئی عدت نہیں تھی (خاوند جب چاہتا رجوع کر لیتا) تو جب مجھے طلاق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر طلاق کی عدت کا حکم نازل فرمایا۔ [ أبو داوٗد، الطلاق، باب في عدة المطلقة : ۲۲۸۱، وسنده حسن ]

❹ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ ...... : یعنی عورتوں کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے رحم میں جو کچھ ہے یعنی حمل یا حیض یا طہر،

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۲۲۹

یہ طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لیے حلال نہیں کہ اس میں سے جو تم نے انھیں دیا ہے کچھ بھی لو، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا تو یہی لوگ ظالم ہیں ۲۲۹

اسے چھپائیں اور غلط بیانی کریں، کیونکہ عدت اس پر موقوف ہے۔ حمل چھپانے کی صورت میں کسی کا بچہ دوسرے کے نام لگ جائے گا اور حیض چھپانے کی صورت میں اصل عدت سے پہلے یا بعد فارغ ہوگی، اس میں حرام کے ارتکاب کا امکان ہے۔

5 وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ: یعنی عدت کے اندر اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو عورت کو لازماً ماننا ہوگا۔ (ابن کثیر)

6 وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی عورتوں کا بھی معروف طریقے کے مطابق مردوں پر ویسا ہی حق ہے جیسا کہ مردوں کا عورتوں پر ہے، جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھارا ان (عورتوں) پر یہ حق ہے کہ وہ تمھارے بستر پر اس کو نہ بیٹھنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور اگر وہ ایسا کریں تو انھیں مارو، ایسا مارنا جو شدید نہ ہو اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ انھیں دستور کے مطابق کھانا اور لباس دو۔'' [ مسلم، الحج، باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ۱۲۱۸ ]

7 وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ: یعنی مرتبہ میں، اطاعت کا حق رکھنے میں، خرچ کرنے میں، فطری قوتوں میں، میراث میں، خصوصاً ان آیات میں مذکور طلاق و رجوع کا حق رکھنے میں، الغرض دین و دنیا کے بہت سے شرف عورت پر ان کی برتری کا باعث ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ [ النساء : ۳٤ ] ''مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا۔''

**آیت 229** 1 ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابہ کی روایات کے مطابق ابتدائے ہجرت میں جاہلی دستور کے مطابق مرد عورت کو کئی کئی بار طلاق دیتے اور رجوع کرتے رہتے تھے، مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہوتا تھا۔ اس صورت حال کو روکنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو (پہلے) دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں آپس میں رجوع کر لیں، اگر سمجھیں کہ اللہ کی حدیں قائم رکھیں گے، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، وہ انھیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے جو جانتے ہیں ﴿۲۳۰﴾

② "اَلطَّلَاقُ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ "یہ طلاق" کیا ہے، یعنی وہ طلاق جو اوپر کی آیت میں ذکر ہوئی ہے، جس کے بعد عدت میں خاوند رجوع کر سکتا ہے، وہ دو مرتبہ ہے۔

③ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ : یعنی پہلی یا دوسری طلاق دینے کے بعد خاوند دوبارہ بسانے کا ارادہ رکھتا ہے تو عدت کے اندر رجوع کرے، یہ "اچھے طریقے سے رکھ لینا" ہے۔ اگر یہ ارادہ نہیں تو رجوع نہ کرے، بلکہ عدت گزرنے دے، بیوی خود بخود جدا ہو جائے گی، یہ "نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا" ہے۔ فائدہ اس کا یہ ہوگا کہ عدت گزرنے کے بعد اگرچہ عورت آزاد ہے کہ جس مرد سے چاہے شادی کر لے، مگر اسے پہلے خاوند کے ساتھ شادی کا بھی اختیار ہے۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد خاوند نہ عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے نہ عدت کے بعد نکاح، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

④ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا ...... : خاوند کے لیے بیوی کو تنگ کر کے اس سے حق مہر واپس لینا جائز نہیں۔ (دیکھیے نساء: ۲۰) مگر خلع کی صورت میں خاوند معاوضہ لے کر طلاق پر راضی ہو جائے تو یہ واپسی جائز ہے۔

⑤ فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ : اس میں خلع کا بیان ہے، یعنی عورت خاوند سے علیحدگی حاصل کرنا چاہے اور خاوند طلاق دینے پر تیار نہ ہو تو عورت جان چھڑانے کے لیے اپنا مہر یا خاوند اور بیوی کے درمیان جو بھی آپس میں یا حاکم کی عدالت میں طے پا جائے، وہ چیز بطور فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لے۔ پھر خواہ خاوند خود ہی فدیہ لے کر اسے چھوڑ دے، یا اگر وہ اس پر تیار نہ ہو تو حاکم اسے فدیہ لے کر چھوڑنے کا حکم دے، اگر وہ نہ مانے تو عدالت نکاح فسخ کر دے۔ چونکہ یہ درحقیقت طلاق نہیں بلکہ عورت کی طرف سے علیحدگی کا مطالبہ ہے، اس لیے اسے خلع کہتے ہیں، اس کی عدت ایک حیض ہے۔ [ ترمذی : ۱۱۸۵، عن الربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا ] تاکہ معلوم ہو جائے کہ عورت کو حمل تو نہیں اور عدت کے دوران میں خاوند رجوع بھی نہیں کر سکتا۔

**آیت 230** ① یعنی تیسری طلاق کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر لے اور وہ خاوند اس سے جماع نہ کر لے اور پھر وہ اسے از خود طلاق نہ دے، یا فوت نہ ہو جائے تو پہلے خاوند کے لیے اس سے نکاح حلال نہیں۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ دوسرے خاوند سے اس غرض سے نکاح کرے کہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے، کیونکہ ایسا نکاح کرنے اور کروانے والے پر تو احادیث میں لعنت آئی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۳۱

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے سو بلاشبہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کو بھی جو اس نے کتاب و حکمت میں سے تم پر نازل کیا ہے، وہ تمھیں اس کے ساتھ نصیحت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۝۲۳۱

اور حلالہ کروانے والے پر لعنت فرمائی۔'' [ نسائی، الطلاق، باب إحلال المطلقة ...... : ۳٤٤٥، و حسنه الألبانی۔ ترمذی : ۱۱۱۹، مختصرًا ] بلکہ آپ ﷺ نے حلالہ کرنے والے کو '' اَلتَّيْسُ الْمُسْتَعَارُ '' ( کرائے کا سانڈ ) کہا ہے۔
[ ابن ماجه، النكاح، باب المحلل والمحلل له : ۱۹۳٦، عن عقبة بن عامر و حسنه الألبانی ]

② ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینا منع ہے، لیکن اگر کوئی دے دے تو ایک ہی طلاق واقع ہو گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں، پھر لوگوں نے اس کام میں جلدی شروع کر دی تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لوگوں نے ایسے کام میں جلدی کرنا شروع کر دی ہے جس میں ان کے لیے مہلت تھی، تو اب ہم ان پر کیوں نہ تینوں طلاقیں ہی نافذ کر دیں۔'' چنانچہ انھوں نے اسے نافذ کر دیا۔ [ مسلم، الطلاق، باب الطلاق الثلاث : ۱٤۷۲ ] نیز دیکھیے فتاویٰ ابن تیمیہ ( ۳۳/ ۱۳، ۲۵، ۸۵ تا ۸۷ )۔

**آیت 231** ① فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ: اس کا مطلب عدت ختم ہونا نہیں، بلکہ عدت ختم ہونے کے قریب ہونا ہے۔ اس کی دلیل پیچھے گزرا ہوا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ ﴾ [ البقرة : ۲۲۸ ] ''اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

② یعنی اگر تم اپنی بیویوں کو طلاق رجعی دو تو ان کی عدت پوری ہونے سے پہلے پہلے تمھیں رجوع کا حق پہنچتا ہے، مگر یہ رجوع محض انھیں ستانے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے نہ ہو، کیونکہ ایسا کرنا ظلم و زیادتی اور احکامِ الٰہی سے مذاق کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ جنھیں کوئی سنجیدگی سے کہے تو وہ سنجیدہ ہیں اور ہنسی مذاق میں کہے تب بھی وہ سنجیدہ ہیں، نکاح، طلاق اور رجوع۔'' [ أبو داؤد، الطلاق، باب فی الطلاق علی الهزل : ۲۱۹٤۔ ابن ماجه : ۲۰۳۹ ] ترمذی، ابن حجر، سیوطی اور البانی رحمہم اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کرلیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔ یہ بات ہے جس کی نصیحت تم میں سے اس کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ تمھارے لیے زیادہ ستھرا اور زیادہ پاکیزہ ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۳۲﴾

3 مِنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ : یہاں ”الْحِكْمَةِ“ سے مراد سنت ہے، یعنی کتاب و سنت کی جو نعمت تم پر نازل کی ہے اسے مت بھولو۔ یہ دونوں وحی الٰہی ہیں اور دلیل ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا منکر حدیث کا بھی وہی حکم ہے جو منکر قرآن کا ہے، مطلب یہ کہ ان آیات میں بیان کردہ گھریلو مسائل کو حدیث پاک کی روشنی میں زیر عمل لانا ضروری ہے۔

آیت 232 1 اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ : معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص سے کیا، اس نے اسے طلاق دے دی، جب عدت گزر گئی تو وہ (دوبارہ) نکاح کا پیغام لے کر آیا۔ میں نے اس سے کہا، میں نے تمھارا نکاح کیا، اسے تمھاری بیوی بنایا اور تمھاری عزت افزائی کی، مگر تم نے اسے طلاق دے دی، اب تم پھر اس سے نکاح کا پیغام لے کر آگئے ہو، اللہ کی قسم! وہ تمھارے پاس کبھی نہیں آ سکتی۔ اس شخص میں کوئی برائی نہیں تھی اور میری بہن بھی اس کے پاس جانا چاہتی تھی (لیکن میں مانع تھا) تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ ”تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں۔“ تو میں نے کہا، اے اللہ کے رسول! اب میں نکاح کر دوں گا۔ الغرض! انھوں نے اپنی بہن کا نکاح اس شخص سے کر دیا۔ [ بخاری، النکاح، باب من قال لا نکاح إلا بولی ...... : ۵۱۳۰ ]

2 اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورت خود بخود اپنا نکاح نہیں کر سکتی، بلکہ ولی کی اجازت ضروری ہے۔ امام بخاری نے بھی اس آیت سے یہ استدلال فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ کوئی عورت اپنا نکاح خود کرے، کیونکہ وہ عورت زانیہ ہے جو اپنا نکاح خود کرتی ہے۔“ [ ابن ماجہ، النکاح، باب لا نکاح إلا بولی : ۱۸۸۲، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا، وصححہ الألبانی ] اگر عورت خود اپنا نکاح کر سکتی ہوتی تو عورت کے اولیاء کو قرآن مخاطب نہ کرتا کہ ”تم ان کو مت روکو۔“

3 اَزْوَاجَهُنَّ : اس لفظ سے جس طرح وہ خاوند مراد ہیں جن سے پہلے نکاح ہوا تھا، اسی طرح عدت گزرنے کے بعد اگر وہ کسی اور شخص سے نکاح کرنا چاہیں تو اس ہونے والے خاوند سے نکاح کرنے سے روکنا بھی منع ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہ حکم ہے عورتوں کے ولیوں کو کہ اس کے نکاح میں اس کی خوشی (کا خیال) رکھیں، جہاں وہ راضی ہوں وہاں کر دیں، اگرچہ اپنی نظر میں اور جگہ بہتر معلوم ہو۔“ (موضح)

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۳

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے اور وہ مرد جس کا بچہ ہے، اس کے ذمے معروف طریقے کے مطابق ان (عورتوں) کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔ کسی شخص کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر جو اس کی گنجائش ہے، نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ اس مرد کو جس کا بچہ ہے، اس کے بچے کی وجہ سے۔ اور وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے، پھر اگر وہ دونوں آپس کی رضا مندی اور باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں، جب معروف طریقے کے مطابق پورا ادا کر دو جو تم نے دیا تھا اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ اس کو جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ۝۲۳۳

**آیت 233** ① حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ : نکاح و طلاق کے بعد اس آیت میں رضاعت (بچے کو دودھ پلانے کے مسائل) کا بیان ہے، کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک عورت کو طلاق ہو جائے، یا اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے اور اس کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو۔ اس سلسلے میں ماؤں کو حکم ہو رہا ہے کہ وہ بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچے کو دودھ پلانا ماں پر فرض ہے، خصوصاً جب بچہ اس کے علاوہ کسی دوسری عورت کا دودھ پینے کے لیے تیار نہ ہو۔ (دیکھیے سورۂ طلاق : ٦) نیز اس سے دو باتیں اور بھی معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے، لہٰذا اس دو سال کی عمر کے بعد اگر کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پی لے تو حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہو گی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”صرف اسی رضاعت سے حرمت ثابت ہو گی جو پستان سے پینے کے زمانے میں انتڑیوں کو پھاڑے اور دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔“ [ ترمذی، الرضاع، باب ما جاء ما ذکر أن الرضاعة ...... : ١١٥٢، و قال حسن صحیح ] ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس کی ہم معنی حدیث ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَاِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ )) [ بخاری، الشهادات، باب الشهادة علی الأنساب ...... : ٢٦٤٧ ] ”یقیناً رضاعت وہی معتبر ہے جو (کم سنی میں) بھوک کی بنا پر ہو۔“ بعض لوگ دودھ چھڑانے کی مدت اڑھائی سال بتاتے ہیں، مگر وہ اس آیت اور دوسری آیت: ﴿ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ [ لقمان : ١٤ ] (اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے) کے صریح خلاف ہے۔ مزید دیکھیے

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے اور دس راتیں انتظار میں رکھیں، پھر جب اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو وہ اپنی جانوں کے بارے میں معروف طریقے سے کریں اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو پوری طرح باخبر ہے ﴿۲۳۴﴾

سورۂ احقاف (۱۵) کی تفسیر۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سالم کو، جسے انھوں نے بیٹوں کی طرح پالا تھا، جوان ہونے پر ابو حذیفہ کی بیوی کا دودھ پی کر ان کا رضاعی بیٹا بننے کی اجازت دی تھی۔ [ مسلم : ۱۴۵۳/۲۷ ] اس لیے عائشہ رضی اللہ عنہا رضاعتِ کبیر کی قائل تھیں، مگر دوسری امہات المومنین نے اسے ان سے خاص ہونے کے امکان کی وجہ سے تسلیم نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ سالم رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرح شدید ضرورت میں اس کی اجازت ممکن ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ دو سال کی مدت پوری کرنا ضروری نہیں، اس سے پہلے بھی بچے کا دودھ چھڑایا جا سکتا ہے۔

رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ : اس سے معلوم ہوا کہ دودھ پلانے والی ماں کو، جب کہ اسے طلاق ہو چکی ہو، عام معروف طریقے کے مطابق کھانا اور لباس مہیا کرنا والد پر فرض ہے۔ عام حالات میں جب کہ طلاق نہ ہوئی ہو، بیوی کا کھانا اور لباس اس کے شوہر پر ویسے ہی فرض ہے۔ نیز دیکھیے سورۂ طلاق (۶)۔

لَا تُضَآرَّ : یہ ”ضَرَرَ“ سے باب مفاعلہ کا واحد مؤنث نہی حاضر مجہول کا صیغہ ہے، ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ نہی حاضر معلوم بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ماں کو تکلیف دینا یہ ہے کہ وہ مثلاً اپنے بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہے مگر باپ زبردستی چھین لے، یا یہ کہ اسے دودھ پلانے پر مجبور کرے اور خرچہ نہ دے اور باپ کو تکلیف دینا یہ ہے کہ ماں بچے کا سارا بوجھ اس پر ڈال دے، یا دودھ پلانے سے انکار کر دے، یا بھاری اخراجات کا مطالبہ کرے جو باپ کی وسعت سے باہر ہوں۔“ آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”نہ ماں بچے کی وجہ سے ضرر پہنچا کر باپ کو تکلیف دے اور نہ باپ بچے کی وجہ سے ماں کو ضرر پہنچائے۔“ پہلی صورت میں ”لَا تُضَآرَّ“ صیغہ فعل مجہول کا ہوگا۔ دوسرے ترجمہ کے اعتبار سے صیغہ معروف، نتیجہ ایک ہی ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ : یعنی اگر باپ مر جائے تو جو بھی اس کا وارث ہو اس پر فرض ہے کہ وہ بچے کو دودھ پلانے والی ماں کے یہ حقوق ادا کرے۔



یعنی اگر تم بچے کو اس کی ماں کے سوا کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہو، اس لیے کہ ماں کے ساتھ سمجھوتہ نہ ہو سکے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ﴾ [ الطلاق : ۶ ] ”اور اگر تم آپس میں تنگی کرو تو اسے کوئی اور عورت دودھ پلا دے گی“ تو اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ جو معاوضہ تم دینا چاہتے ہو وہ معروف طریقے سے پورا پورا ادا کر دو۔

234 ➊ خاوند کی وفات کی یہ عدت تمام عورتوں کے لیے یکساں ہے۔ شوہر نے اس سے صحبت کی ہو، یا اس سے پہلے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

اورتم پر اس بات میں کچھ گناہ نہیں جس کے ساتھ تم ان عورتوں کے پیغام نکاح کا اشارہ کرو، یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم انھیں ضرور یاد کرو گے، اور لیکن ان سے پوشیدہ عہد و پیمان مت کرو، مگر یہ کہ کوئی معروف بات کرو اور نکاح کی گرہ پختہ نہ کرو، یہاں تک کہ لکھا ہوا حکم اپنی مدت کو پہنچ جائے اور جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ پس اس سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۲۳۵﴾

ہی فوت ہو گیا ہو، اسی طرح خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ میں سب بیویاں شامل ہیں۔ بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے خاوند صحبت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ اسے پورا مہر ملے گا، اسے عدت گزارنا ہو گی اور اسے میراث میں سے بھی حصہ ملے گا۔ [ ترمذی، النکاح، باب ما جاء فی الرجل ...... : ۱۱۴۵۔ أبو داوٗد : ۲۱۱٤ ]

اس عدت میں ایک حکمت یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ عورت کو حمل تو نہیں، اگر حمل ہو تو اس کی عدت حمل سے فارغ ہونا ہے، خواہ تھوڑی دیر میں فارغ ہو جائے، خواہ آٹھ نو ماہ بعد، کیونکہ حکم ہے: ﴿ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [ الطلاق : ٤ ] ''اور جو حمل والیاں ہیں ان کی عدت (طلاق سے ہو یا خاوند فوت ہونے سے ) یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں۔''

اس عدت کے دوران عورت کے لیے نکاح کرنا ہی حرام نہیں، بلکہ سوگ منانا بھی ضروری ہے، یعنی ہر قسم کی زینت سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے، مثلاً شوخ کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی ہی ایک عورت کو آنکھ میں تکلیف کے باوجود سرمہ ڈالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ [ بخاری، الطلاق، باب الکحل للحادۃ : ۵۳۳۸ ] عدت کے دوران اسے خاوند والے مکان سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی بھی اجازت نہیں۔ [ أبو داوٗد، الطلاق، باب فی المتوفی عنها تنتقل : ۲۳۰۰۔ ترمذی : ۱۲۰٤، و صححه الألبانی ]

❷ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ : یعنی عدت گزرنے کے بعد وہ زیب و زینت اختیار کریں، یا اولیاء کی اجازت سے دوسرا نکاح کریں، تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ ہندوؤں کے اثرات سے بیوہ کے لیے دوسرے نکاح کو جو برا سمجھا جاتا ہے اور اس میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے، یہ شریعت اسلام کے سراسر خلاف ہے۔

**آیت 235** ❶ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ...... : یعنی عدت کے دوران میں عورت کو صاف الفاظ کے ساتھ پیغام نکاح دینا جائز نہیں، البتہ مناسب طریقے سے یعنی اشارہ کنایہ سے کوئی بات کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ ...... ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میرا شادی کرنے کا پروگرام ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو، جب تک تم نے انھیں ہاتھ نہ لگایا ہو، یا ان کے لیے کوئی مہر مقرر نہ کیا ہو اور انھیں سامان دو، وسعت والے پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگی والے پر اس کی طاقت کے مطابق ہے، سامان معروف طریقے کے مطابق دینا ہے، نیکی کرنے والوں پر یہ حق ہے ﴿۲۳۶﴾ اور اگر تم انھیں اس سے پہلے طلاق دے دو کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، اس حال میں کہ تم ان کے لیے کوئی مہر مقرر کر چکے ہو تو تم نے جو مہر مقرر کیا ہے اس کا نصف (لازم) ہے، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور یہ (بات) کہ تم معاف کر دو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور آپس میں احسان کرنا نہ بھولو، بے شک اللہ اس کو جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۳۷﴾

کوئی نیک بیوی عطا فرمائے۔'' [ بخاری، النکاح، باب قول الله عزوجل : ﴿ ولا جناح علیکم فیما ...... ﴾ : ۵۱۲۴ ] لیکن یہ حکم اس عورت کا ہے جس کا شوہر فوت ہو گیا ہو یا اسے تینوں طلاقیں ہو چکی ہوں، جیسا کہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو تینوں طلاقیں ہو گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں فرمایا: ''جب تمھاری عدت گزر جائے تو مجھے اطلاع دینا۔'' جب انھوں نے عدت گزرنے کی اطلاع دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسامہ بن زید سے نکاح کر لو۔'' [ مسلم، الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها : ۱۴۸۰ ] مگر وہ عورت جسے رجعی طلاق دی گئی ہو تو اس سے دوران عدت میں کسی شخص کا نکاح کے لیے اشارہ کنایہ سے بات کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ ابھی تک اس پر اس کے شوہر کا حق ہے۔

② یعنی جب تک عدت پوری نہ ہو جائے نکاح کی گرہ مت باندھو۔ اس پر تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ عدت کے اندر نکاح صحیح نہیں۔ (ابن کثیر، شوکانی)

③ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ: اس میں نکاح کے سلسلے میں شرعی احکام کے خلاف حیلے نکالنے پر وعید اور توبہ کی ترغیب ہے۔

**آیت 236** یعنی جس عورت کا عقد نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر نہ ہوا ہو، اگر شوہر اسے ہاتھ لگانے (یعنی جماع یا خلوت صحیحہ) سے پہلے طلاق دے دے تو شوہر پر مہر وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا مالی تاوان نہیں۔ آیت میں ''لَا جُنَاحَ'' فرما کر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شوہر اپنی مالی حالت کے مطابق اسے کچھ دے کر رخصت کرے، اس اعانت کو ''متعہ طلاق'' کہا جاتا ہے، سورۂ احزاب (۴۹) میں مزید بتایا کہ ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی صورت میں عورت پر عدت بھی نہیں، بلکہ وہ شوہر سے رخصت ہو کر فوراً نکاح کر سکتی ہے۔

**آیت 237** یہ دوسری صورت ہے کہ مہر مقرر کیا جا چکا ہو اور شوہر نے ہاتھ لگانے (جماع یا خلوت صحیحہ) سے پہلے طلاق

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو ﴿۲۳۸﴾

دے دی تو اس صورت میں عورت نصف مہر کی حق دار ہوگی۔ ہاں اگر وہ عورت خود معاف کر دے تو دوسری بات ہے، یا خاوند جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، معاف کر دے، یعنی وہ پورا مہر دے چکا ہے تو نصف واپس نہ لے، یا اپنی خوشی سے پورا مہر دے دے۔ پھر ﴿ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ فرما کر شوہر کو ترغیب دی ہے کہ پورا مہر دے دینا ہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ اس میں مخاطب مرد ہیں۔

مسئلہ: اگر شوہر ہاتھ لگانے سے قبل وفات پا جائے تو بیوی پورے مہر کی حق دار ہوگی، اسے ورثہ بھی ملے گا اور اس پر عدت بھی واجب ہوگی، جیسا کہ بروع بنت واشق کی حدیث میں اوپر گزر چکا ہے۔ واضح رہے کہ مطلقہ عورت کی دو قسمیں ہیں: ① مہر مقرر ہو چکا تھا اور خاوند نے صحبت کے بعد طلاق دے دی۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۲۹) ② عقد کے وقت مہر مقرر نہ تھا، مگر صحبت کے بعد طلاق دے دی۔ اس صورت میں عورت مہر مثل کی حق دار ہوگی، یعنی جتنا مہر عموماً اس کے خاندان کی عورتوں کا مقرر ہوتا ہے، اس کے مطابق اسے مہر دلوایا جائے گا، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت (۲۴) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (شوکانی)

آیت 238 ① حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى: شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”درمیانی نماز عصر ہے کہ دن اور رات کے درمیان میں ہے اور اس کی پابندی پر زیادہ زور دیا اور طلاق کے حکموں میں نماز کا ذکر فرما دیا کہ دنیا کے معاملات میں غرق ہو کر عبادت کو نہ بھول جاؤ۔ عصر کی پابندی کا حکم اس لیے زیادہ ہے کہ اس وقت دنیا کا شغل زیادہ ہوتا ہے۔“ (موضح)

② حفاظت سے مراد وقت کا خیال رکھنا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ”تمام اعمال میں سے اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل محبوب ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔“ [ بخاری، الصلاۃ، باب فضل الصلوۃ لوقتها : ۵۲۷ ]

③ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى : اس کے متعلق گو اختلاف ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ یہی صحیح اور راجح ہے، متعدد احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری، مسلم اور سنن کی کتابوں میں متعدد صحابہ سے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے موقع پر فرمایا: « شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَ قُبُوْرَهُمْ نَارًا »[ مسلم، المساجد، باب الدليل لمن ...... : ۲۰۵ / ۶۲۷۔ بخاری : ۶۳۹۶ ] ”انھوں نے ہمیں صلاۃ الوسطیٰ یعنی عصر کی نماز سے روک دیا، اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھرے۔“ بہت سے صحابہ کے آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا اس کا اہل وعیال اور مال لوٹ لیا گیا۔“ [ بخاری، مواقيت الصلوة، باب إثم من فاتته العصر : ۵۵۲۔ مسلم : ۶۲۶ ]

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

پھر اگر تم ڈرو تو پیدل پڑھ لو یا سوار، پھر جب امن میں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جیسے اس نے تمھیں سکھایا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۲۳۹﴾ اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نکالے بغیر سامان دینے کی وصیت کریں، پھر اگر وہ نکل جائیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ معروف طریقے میں سے اپنی جانوں کے بارے میں کریں اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۴۰﴾

④ قٰنِتِيْنَ : فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو، یعنی نماز میں کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے معلوم ہو کہ آدمی نماز کی حالت میں نہیں ہے، جیسے کھانا پینا اور کسی سے بات کرنا۔ عربی زبان میں قنوت کے کئی معانی آتے ہیں، مگر یہاں مراد سکوت (خاموشی) ہے۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ہم نماز میں ایک دوسرے سے بات کر لیا کرتے تھے، کوئی بھی شخص اپنے دوسرے بھائی سے (جو نماز میں ہوتا) اپنی کسی ضرورت کے لیے بات کر لیا کرتا تھا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ تو ہمیں (نماز میں) خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا اور باتیں کرنے سے منع کر دیا گیا۔“ [ بخاری، التفسیر، باب ﴿ و قوموا للہ ...... ﴾ : ٤٥٣٤۔ مسلم، المساجد، باب تحریم الکلام ...... : ٥٣٩ ]

آیت 239 اس آیت میں نماز کی حفاظت کی مزید تاکید ہے کہ خوف اور ہنگامی حالت میں بھی نماز معاف نہیں ہے، بلکہ پیدل یا سوار، جس حالت میں بھی ممکن ہو، خوف کے وقت نماز ادا کر لو۔ ہاں خوف ختم ہونے کے بعد نماز کو ان پورے شرائط و ارکان اور آداب کے ساتھ ادا کرو جن کی تمھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے تعلیم دی ہے۔ صلاۃ خوف کے احکام کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۰۲) کی تفسیر۔

آیت 240 وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ...... : بہت سے علماء نے اس آیت کو اس آیت سے منسوخ قرار دیا ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہے، جس میں فوت شدہ خاوند کی بیوی کی عدت چار مہینے دس دن بیان کی گئی ہے۔ اس صورت میں یہ آیت تلاوت کی ترتیب کے لحاظ سے بعد میں آنے کے باوجود ترتیب میں پہلے آنے والی آیت کے ساتھ منسوخ ٹھہرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زیر تفسیر آیت کی رو سے پہلے اس عورت کی عدت ایک سال تھی، پھر اسی سورت کی آیت (۲۳۴) سے چار ماہ دس دن قرار دی گئی۔ چنانچہ عدت ایک سال ہونا منسوخ ہو گیا اور چار ماہ دس دن کے بعد رہائش اور کھانے وغیرہ کا خرچہ آیت میراث (نساء: ۱۱، ۱۲) کے ساتھ منسوخ ہو گیا، کیونکہ اس میں تمام وارثوں کے حصے مقرر کر دیے گئے۔ اب وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ حالانکہ دونوں آیات کے الفاظ پر غور کریں تو پہلی آیت میں واضح حکم ہے کہ ایسی عورت چار ماہ

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْیَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

اور ان عورتوں کے لیے جنھیں طلاق دی گئی ہے، کچھ نہ کچھ سامان دینا معروف طریقے سے (لازم) ہے، پرہیز گاروں پر یہ حق ہے ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۲۴۲﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے، جب کہ وہ کئی ہزار تھے، تو اللہ نے ان سے کہا مر جاؤ، پھر انھیں زندہ کر دیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾

دس دن نکاح نہیں کر سکتی، بلکہ اپنے آپ کو انتظار میں رکھے گی۔ اسے عدت کہتے ہیں، جب کہ دوسری آیت میں ایک سال اپنے آپ کو انتظار میں رکھنے اور نکاح نہ کرنے کا ذکر ہی نہیں، تو اس آیت کی رو سے عدت ایک سال کیسے بن گئی؟ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ پہلی آیت سے منسوخ نہیں، نہ ہی ترتیب تلاوت میں کوئی خلل ہے۔

رہ گیا نان ونفقہ اور رہائش کا منسوخ ہونا تو جو علماء منسوخ بتاتے ہیں وہ سورۂ نساء کی آیتِ میراث سے منسوخ بتاتے ہیں، جو سورۂ بقرہ کے بعد اتری ہے۔ اس لیے زیر تفسیر آیت کسی طرح بھی پہلی آیت کے ساتھ منسوخ نہیں۔ اگر اس کا کچھ حصہ منسوخ ہے بھی تو سورۂ نساء کے ساتھ منسوخ ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں، اس میں عدت بیان ہی نہیں ہوئی، بلکہ میت کے اولیاء کو وصیت کا ذکر ہے کہ وہ عورت کی دل جوئی کی خاطر اور مرنے والے سے اظہار محبت واخلاص کے طور پر چار ماہ دس دن کے بعد مزید سات ماہ بیس دن اسے اپنے شوہر کے گھر میں رہنے دیں۔ ہاں اگر عورت چار ماہ دس دن یا وضع حمل کے بعد اپنی مرضی سے اس گھر سے منتقل ہونا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آیتِ میراث کے باوجود چار ماہ دس دن اس گھر میں رہنے کا لازمی حکم دے سکتا ہے تو سال کے باقی ماندہ دن اختیاری طور پر وہاں رہنے کی اجازت کا حکم بھی دے سکتا ہے اور یہ آیتِ میراث کے خلاف نہیں۔ یہ رائے امام مجاہد بن جبر، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دوسرے کئی اہل علم کی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسے قوی قرار دیا ہے اور اس سے قرآن کی آیات کی ترتیب کا حسن بھی باقی رہتا ہے۔

**آیت 241** سورۂ بقرہ کی آیت (۲۳۶) میں ان مطلقہ عورتوں کو سامان دینے کا حکم تھا جنھیں نہ خاوند نے ہاتھ لگایا ہو اور نہ مہر مقرر ہوا ہو، جبکہ اس آیت میں تمام مطلقہ عورتوں کو اچھے طریقے سے کچھ سامان، کپڑوں کا جوڑا وغیرہ دے کر رخصت کرنے کا حکم ہے، تاکہ عورت کی کچھ دل جوئی ہو جائے۔ یہ احسان کا تقاضا ہے۔

**آیت 242** یہاں نکاح و طلاق کے مسائل ختم ہوئے اب جہاد کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

**آیت 242** ① یہ واقعہ سابقہ کسی امت کا ہے، جس کی تفصیل کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں کی گئی۔ یہ لوگ دشمن کے حملے کے وقت قتل ہونے کے خوف سے ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مقابلہ کرنے کے بجائے شہر چھوڑ کر بھاگ

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور اللہ کے راستے میں لڑو اور جان لو کہ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۴۴﴾ کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، پس وہ اسے اس کے لیے بہت زیادہ گنا بڑھا دے اور اللہ بند کرتا اور کھولتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴۵﴾

پڑے، یا وبا واقع ہونے پر تقدیر پر صابر رہنے کے بجائے موت سے بچنے کے لیے گھر بار چھوڑ کر نکل گئے، لیکن وہ بھاگ کر موت سے نہ بچ سکے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب پر موت طاری کر دی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا اور انھیں زندہ کر دیا۔ اس سے اگلی آیت (۲۴۴) میں اللہ کی راہ میں قتال یعنی لڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس حکم سے پہلے اس واقعہ کے بیان میں یہی حکمت ہے کہ جہاد سے جی مت چراؤ، موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے تم جہاد سے گریز اور فرار اختیار کر کے ٹال نہیں سکتے، نہ تقدیر سے بچ کر کہیں جا سکتے ہو۔

2 یہ قصہ قیامت کے دن جسموں کے دوبارہ زندہ ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

3 **اَلَمْ تَرَ**: اس کا لفظی معنی ہے ''کیا تو نے نہیں دیکھا'' مگر مجاہد رحمہ اللہ نے اس کا معنی کیا ہے: '' اَلَمْ تَعْلَمْ '' ''کیا تجھے معلوم نہیں'' [ بخاری، التفسیر، سورۃ ﴿ ألم تر ﴾، قبل ح : ٤٩٦٤ ] مزید دیکھیے سورۂ فیل کے حواشی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اترنے کے وقت ان لوگوں کا قصہ عام طور پر معروف و مشہور تھا۔ بعض اوقات کسی بات کو سننے کا شوق دلانے کے لیے بھی ''اَلَمْ تَرَ'' سے بات شروع کی جاتی ہے۔

4 عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جب تم سنو کہ کسی زمین میں وبا پھیلی ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جب کسی زمین میں وبا پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اس سے فرار اختیار کر کے وہاں سے مت نکلو۔'' [ بخاری، الطب، باب ما یذکر فی الطاعون : ٥٧٢٩ ]

**آیت 244** **وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ**: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، جس طرح جان بچانا تقدیر سے نہیں بچاتا، اسی طرح جہاد سے فرار اور اجتناب سے نہ موت قریب ہوتی ہے نہ دور، بلکہ اجل اور رزق کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ …… ﴾ [ آل عمران : ١٦٨ ] اور فرمایا: ﴿ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ '' [ النساء : ٧٨ ] ''تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔''

**آیت 245** **مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا**: اس سے پہلی آیت میں اللہ کے راستے میں لڑنے کا حکم تھا، اب جہاد میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا، جب انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر کہ ہم اللہ کے راستے میں لڑیں۔ اس نے کہا یقیناً تم قریب ہو کہ اگر تم پر لڑنا فرض کر دیا جائے تو تم نہ لڑو۔ انھوں نے کہا اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ کے راستے میں نہ لڑیں، حالانکہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بیٹوں سے نکال دیا گیا ہے۔ پھر جب ان پر لڑنا فرض کر دیا گیا تو ان میں سے بہت تھوڑے لوگوں کے سوا سب پھر گئے اور اللہ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے﴿۲۴۶﴾

لیے مال خرچ کرے اور اس میں ریا کاری یا کسی کو ستانے اور اس پر احسان رکھنے کی نیت نہ ہو۔ اللہ کا کرم دیکھیے کہ خود ہی سب کچھ عطا کر کے بندوں سے مانگ رہا ہے اور اسے اپنے ذمے قرض قرار دے رہا ہے۔ سورۂ توبہ میں مال کے ساتھ جان کا بھی ذکر ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ [ التوبۃ : ۱۱۱ ] ''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ یقیناً ان کے لیے جنت ہے۔'' سورۂ بقرہ (۲۶۱) ہی میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرض حسن کو کئی گنا بڑھا کر واپس کریں گے۔

**آیت 246** ① اَلْمَلَاِ : یہ ''مَلَأَ یَمْلَأُ (ف)'' یعنی ''پُر کرنا، بھرنا'' سے ہے۔ قوم کے سردار بھی اپنی ہیبت اور رعب سے آنکھیں بھر دیتے ہیں، اس لیے ان کو ''مَلَأٌ'' کہا جاتا ہے۔

② '' اَلَمْ تَرَ '' سے ابتدا کر کے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا ایک عجیب قصہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ جب ان کی بزدلی اور ترک جہاد کی وجہ سے انھیں ان کے وطن سے نکال دیا گیا، ان کے بچوں اور عورتوں کو لونڈیاں اور غلام بنا لیا گیا تو ان کے سرداروں نے وقت کے نبی سے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں، تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی کو ان کے مزاج اور عادات کا اندازہ تھا، انھوں نے کہا، اچھی طرح دیکھ لو! جب تم پر قتال فرض ہو گیا تو تم نہیں لڑو گے۔ انھوں نے کہا، ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑیں گے، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور بیٹوں سے نکال دیا گیا۔ آخر نبی کا اندازہ درست نکلا، لڑنے کے لیے چند لوگ ہی رہ گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے جہاد میں استقامت کی بدولت ان کو بھی فتح عطا فرما دی۔ اس سے ترک جہاد کا نقصان یعنی وطن اور سلطنت سے محرومی اور اہل و عیال کا دشمن کی غلامی میں چلا جانا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کا علاج بھی کہ یہ کھوئی ہوئی عزت جہاد کے بغیر کسی صورت دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور ان سے ان کے نبی نے کہا بے شک اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا اس کی حکومت ہم پر کیسے ہو سکتی ہے، جبکہ ہم حکومت کے اس سے زیادہ حق دار ہیں اور اسے مال کی کوئی وسعت بھی نہیں دی گئی؟ فرمایا بے شک اللہ نے اسے تم پر چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں زیادہ فراخی عطا فرمائی ہے اور اللہ اپنی حکومت جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۴۷﴾

مسلمان اگر اپنا وطن حاصل کرنے کے لیے لڑیں تو یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ زمین پر کفار کے قبضے سے اللہ کا کلمہ نیچا اور مسلمانوں کے قبضے سے اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے۔ کچھ نادان بھارت کے زیر تسلط کشمیر میں لڑائی کو وطن کے لیے لڑائی قرار دے کر اس کے فی سبیل اللہ قتال ہونے سے انکار کرتے ہیں، انھیں ان آیات پر غور کرنا چاہیے۔

③ جب ان پر قتال فرض ہوا تو نبی کے اندیشے کے مطابق اکثر لوگ لڑائی سے پیچھے ہٹ گئے، یہ ان کا اپنی جانوں پر ظلم تھا۔ "الظّٰلِمِيْنَ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ "ان ظالموں کو" کیا گیا ہے۔

**آیت 247** ① اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا: ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ یہاں غور کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں طالوت کا نام بتا دیا، آگے چل کر داؤد علیہ السلام کا نام اور دشمنوں کے سردار جالوت کا نام بھی بتا دیا، مگر اس نبی کا نام نہیں بتایا۔ یقیناً اس میں کوئی حکمت ہے، جو بظاہر یہ ہے کہ نبی کوئی بھی ہو واجب الاطاعت ہوتا ہے، اس کا نام مشہور ہو یا نہ ہو۔ اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ ہم اس نبی کے نام کی تعیین کا تکلف نہ کریں۔

② قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا: طالوت کو بادشاہ مقرر کرنے پر سرداروں نے دو اعتراض کیے، ایک تو یہ کہ بادشاہ بننے کا حق ہم اس سے زیادہ رکھتے ہیں، کیونکہ خاندانی طور پر سرداری ہم میں چلی آ رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ طالوت کوئی سرمایہ دار شخص نہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اب بھی دنیا میں سربراہ بننے کے لیے یہی دو پیمانے جاری ہیں، یا تو وہ کسی سربراہ خاندان سے ہو، یا سرمایہ دار ہو۔ نبی نے دونوں چیزوں کی نفی کر کے انھیں بتایا کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے تم پر برتری عطا فرما کر چن لیا ہے، اب اللہ کے انتخاب پر اعتراض کا تمھیں کوئی حق نہیں۔ دوسری یہ کہ حکومت کے لیے خاندان یا سرمایہ کے بجائے علم اور جسمانی قوت کا ہونا ضروری ہے اور یہ دونوں چیزیں طالوت میں تم سب سے زیادہ ہیں۔ تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بادشاہت عطا کرنے میں کسی کی مرضی کا پابند نہیں، وہ جسے چاہتا ہے سلطنت عطا کر دیتا ہے۔

③ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں، اگر کوئی بادشاہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر چلے تو صرف بادشاہ ہونے کی بنا پر قابل رد نہیں۔ آپ اسے خلیفہ بھی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے متعلق خلیفہ کا لفظ بھی آیا ہے، فرمایا:

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

اور ان کے نبی نے ان سے کہا بے شک اس کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق آ جائے جس میں تمھارے رب کی طرف سے ایک تسلی ہے اور اس میں سے چند باقی ماندہ چیزیں ہیں جو موسیٰ کی آل اور ہارون کی آل نے چھوڑا تھا، فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے، بے شک اس میں تمھارے لیے یقیناً ایک نشانی ہے، اگر تم مومن ہو ﴿۲۴۸﴾ پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر جدا ہوا تو کہا بے شک اللہ ایک نہر کے ساتھ تمھاری آزمائش کرنے والا ہے، پس جس نے اس میں سے پیا تو وہ مجھ سے نہیں اور جس نے اسے نہ چکھا تو بے شک وہ مجھ سے ہے، مگر جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر پانی لے لے۔ تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے اس سے پی لیا۔ جب وہ اور اس کے ساتھ وہ لوگ نہر سے پار ہو گئے جو ایمان لائے تھے، تو انھوں نے کہا آج ہمارے پاس جالوت اور اس کے لشکروں سے مقابلے کی کوئی طاقت نہیں۔ جو لوگ سمجھتے تھے کہ یقیناً وہ اللہ سے ملنے والے ہیں انھوں نے کہا کتنی ہی تھوڑی جماعتیں زیادہ جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۲۴۹﴾

﴿ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾ [ صٓ:۲٦ ] ”بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔“ اور یہ بھی کہ ﴿ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۱ ] ”اور اللہ نے اسے بادشاہی عطا کی۔“ اس لحاظ سے وہ طالوت کے بعد مَلِک (بادشاہ) بھی تھے۔

**آیت 248** اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ ...... : بنی اسرائیل کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اور طالوت کی بادشاہت پر یقین میں اضافے کے لیے نبی نے طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے کی ایک نشانی بیان فرمائی کہ وہ تابوت (جو دشمن تم سے چھین کر لے گیا تھا) جس کے ہوتے ہوئے تمھیں (دشمن کے مقابلے کے وقت) سکون و اطمینان حاصل رہتا تھا اور جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چند باقی ماندہ چیزیں تھیں، وہ تابوت تمھارے پاس آ جائے گا، جسے فرشتے اٹھا لائیں گے۔ چنانچہ اس تابوت (صندوق) کے آ جانے سے بنی اسرائیل کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

**آیت 248** ① فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ: ”بِالْجُنُوْدِ“ (لشکروں) کے لفظ سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی بہت بڑی تعداد لڑنے کے لیے نکلی تھی۔ طالوت نے ان کی اطاعت، جفاکشی، بھوک پیاس اور میدانِ جنگ میں صبر کا امتحان لینا

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور ان کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد فرما﴿۲۵۰﴾ تو انھوں نے اللہ کے حکم سے انھیں شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور دانائی عطا کی اور جتنا کچھ چاہتا تھا سکھا دیا۔ اور اگر اللہ کا لوگوں کو ان کے بعض کو بعض کے ساتھ ہٹانا نہ ہوتا تو یقیناً زمین برباد ہو جاتی اور لیکن اللہ جہانوں پر بڑے فضل والا ہے﴿۲۵۱﴾

---

ضروری سمجھا، تاکہ صرف وہ شخص ساتھ جائے جس میں یہ صفات موجود ہوں، مگر اس امتحان میں تھوڑے سے لوگ کامیاب ہوئے، باقی ناکام ہو گئے۔ کامیاب ہونے والے نہر سے پار ہوئے تو دشمن کی تعداد دیکھ کر ان میں سے کچھ کمزور ایمان والے کہہ اٹھے کہ ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے کی طاقت نہیں، مگر پختہ ایمان والوں نے، جنھیں اللہ سے ملاقات کا یقین تھا، ان کی ہمت بندھائی کہ لڑائی میں قلت و کثرت فیصلہ کن نہیں ہوتی، اللہ کا حکم فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو تھوڑی جماعتیں صبر و استقامت کی وجہ سے بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں، کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ امتِ محمدیہ ﷺ میں اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ بدر، احد، خندق کو دیکھ لیجیے۔ جنگ موتہ میں مسلمان تین ہزار اور دشمن دو لاکھ تھا۔ (الرحیق المختوم، معرکہ موتہ)

2 براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مجھے اصحاب محمد ﷺ نے بتایا، جو بدر میں شریک تھے کہ ان کی تعداد طالوت کے ساتھیوں کے برابر تھی جو نہر سے پار ہوئے تھے، تین سو دس سے کچھ زیادہ۔ براء کہتے ہیں، اللہ کی قسم! اس کے ساتھ کسی مومن کے سوا کوئی پار نہیں ہوا۔ [ بخاري، المغازي، باب عدة أصحاب بدر : ۳۹۵۷ ]

آیت 250 **اَفْرِغْ عَلَيْنَا** : یہ باب افعال سے امر کا صیغہ ہے، جس کا معنی برتن انڈیل کر خالی کرنا ہے، یعنی انھوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہم پر پورا صبر انڈیل دے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں پر ہماری مدد فرما۔ یہ بڑی جامع اور حسن ترتیب سے آراستہ دعا ہے، کیونکہ صبر آتا ہے، تو ثابت قدمی ملتی ہے، ثابت قدمی ہو تو نصرتِ الٰہی ملتی ہے۔ معلوم ہوا مومن کے لیے میدان جنگ میں بھی تیاری کے باوجود سب سے بڑا ہتھیار اللہ پر اعتماد اور اس سے دعا ہے۔

آیت 251 1 **فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ** : چنانچہ ان تھوڑے سے مسلمانوں نے جالوت کے لشکروں کو اللہ کے حکم سے

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انھیں حق کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں اور بلاشبہ تو یقیناً رسولوں میں سے ہے﴿۲۵۲﴾

شکست دی اور داؤد علیہ السلام نے، جو اس وقت ایک سپاہی تھے، کفار کے بادشاہ جالوت کو قتل کر دیا، جس کے نتیجے میں طالوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں سلطنت اور حکمت یعنی نبوت عطا فرمائی اور جو چاہا سکھایا، ان کو سکھائے گئے علوم میں سے قرآن مجید میں ان کے اسلحہ سازی کے علم، پرندوں کی بولی کے علم اور حکم یعنی قوتِ فیصلہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی خوش الحانی اور پرندوں اور پہاڑوں کے ان کے ساتھ تسبیح کرنے کا بھی ذکر ہے۔

❷ نادان لوگ کہتے ہیں کہ لڑائی کرنا نبیوں کا کام نہیں، اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جہاد ہمیشہ سے رہا ہے اور اگر جہاد نہ ہو تو مفسد لوگ شہروں کو ویران کر ڈالیں۔ (موضح)

❸ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ...... : اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی گروہ قوت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر انسانی حد سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کسی دوسرے گروہ کو اٹھا کر اس کی سرکوبی کروا دیتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین میں امن قائم نہ ہو سکتا۔ مزید دیکھیے سورۂ حج (۴۰)۔

آیت 252 یعنی پچھلی امتوں کے یہ واقعات جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں، یہ آپ کے نبی صادق ہونے کی واضح دلیل ہیں، کیونکہ آپ نے انھیں نہ کسی کتاب میں پڑھا اور نہ کسی سے سنا، پھر بھی انھیں اس طرح ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل بھی ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ کافروں کی طرف سے آپ کی رسالت کے انکار پر انتہائی تاکیدی الفاظ "اِنَّ" اور "لام تاکید" کے ساتھ آپ کی رسالت کا اثبات ہے۔ کافر آپ کی رسالت کے انکاری تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ﴾[ الرعد : ۴۳ ] "اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں، تو کسی طرح رسول نہیں ہے۔" اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار کا رد کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ "بلاشبہ تو یقیناً رسولوں میں سے ہے۔"

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ ﴿۲۵۳﴾

یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان کے بعض کو اس نے درجوں میں بلند کیا اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں دیں اور اسے پاک روح کے ساتھ قوت بخشی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو جو لوگ ان کے بعد تھے آپس میں نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکیں اور لیکن انھوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے کوئی تو وہ تھا جو ایمان لایا اور ان سے کوئی وہ تھا جس نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے اور لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۲۵۳﴾

آیت 253 ① تِلْكَ الرُّسُلُ …… : اس سے وہ رسول مراد ہیں جن کا اس سورت میں ذکر آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء درجات میں مختلف ہیں اور فضیلت میں ایک دوسرے سے زیادہ ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ ﴾ [ بنی إسرائیل : ٥٥ ] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی۔''

② مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ : جیسے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے: ﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا ﴾ [ النساء : ١٦٤ ] ''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔''

③ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ : یہ بات اسی آیت میں پہلے بھی گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی، اب پھر فرمایا: ''ان میں سے بعض کو درجات میں بلند کیا'' اس سے ایک خاص شخصیت کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے، جسے سب جانتے ہیں، اس لیے نام لینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جیسا کہ یہ آیت ہے: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ ﴾ [ بنی إسرائیل : ١ ] اس میں بھی اس بندے کا نام بتانے کی ضرورت نہیں پڑی اور وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ فضیلت دو طرح کی ہے، ایک مجموعی اور کلی فضیلت اور دوسری جزوی فضیلت، یعنی کسی ایک چیز میں دوسروں سے بڑھ کر ہونا، مثلاً یوسف علیہ السلام کہ وہ خود، ان کے والد، دادا اور پردادا نبی تھے، یہ فضیلت کسی اور رسول کو حاصل نہیں، چنانچہ اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں '' أَكْرَمُ النَّاسِ ''یعنی سب لوگوں سے زیادہ معزز فرمایا۔ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول الله تعالی : ﴿ واتخذ الله …… ﴾ : ٣٣٥٣ ] آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ (٦٠) ہاتھ قد عطا کیا اور انھیں اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، یہ آدم علیہ السلام کی جزوی فضیلت ہے، کلی اور مجموعی طور پر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں، یہی صحیح عقیدہ ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا فَخْرَ )) ''میں آدم علیہ السلام کی اولاد کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں۔'' [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة بنی إسرائیل : ٣١٤٨، و صححه الألبانی ]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ کوئی سفارش اور کافر لوگ ہی ظالم ہیں ﴿۲۵۴﴾

آپ ﷺ کی افضلیت کے لیے قرآن مجید ہی کافی ہے۔ دوسرے تمام انبیاء کے معجزات ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے جبکہ قرآن قیامت تک باقی ہے۔ مفسرین بالخصوص رازی نے آپ ﷺ کی افضلیت کو دلائل سے ثابت کیا ہے اور اس سلسلہ میں شبہات کے جواب دیے ہیں، لیکن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی رسول اللہ ﷺ کا فرمان بظاہر اس کے خلاف ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے موسیٰ (علیہ السلام) سے بہتر نہ کہو۔“ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب وفاة موسی...... : ۳٤٠٨ ] اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ )) ”اللہ کے انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت مت دو۔“ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالی ...... : ۳٤١٤ ] علماء نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں، جن میں سے واضح ترین جواب دو ہیں، ایک یہ کہ آپ ﷺ کی مراد ہے کہ میری فضیلت ایسے انداز سے بیان نہ کرو جس سے دوسرے انبیاء کی کسر شان کا پہلو نکلتا ہو، کیونکہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ مسلمان اور یہودی کے جھگڑے کے موقع پر فرمائے تھے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی نبی کو ایک ایک چیز میں دوسرے انبیاء سے افضل نہ بتاؤ، کیونکہ جزوی فضیلت کسی بھی نبی کی ہو سکتی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، لیکن حدیث میں فضیلت دینے سے جو منع فرمایا ہے اس سے مراد مقابلہ کی صورت میں ہے، یا جزوی فضیلت مراد ہے، لہٰذا کتاب و سنت میں کوئی تعارض نہیں۔“ ( ابن کثیر، فتح القدیر )

④ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ...... : یہاں ”الْبَيِّنٰتِ“ سے مراد واضح دلائل اور معجزات ہیں، دیکھیے سورۂ آل عمران (۴۹) اور روح القدس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۸۷)۔

⑤ یعنی انبیاء کے متبعین میں یہ سب دلائل دیکھنے کے بعد ضد و عناد کی وجہ سے اختلاف اور پھر اس اختلاف کی بنا پر آپس کی لڑائی اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت سے ہے۔ یہاں ”ایسا کیوں ہوا“ نہیں کہا سکتا کیونکہ اس کا جواب ہمارے فہم سے بالا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک اختیار دیا ہے، پھر اسے بھی اپنے اختیار کے تحت رکھا ہے، اس کی حکمت وہی جانتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تقدیر اللہ تعالیٰ کا ایک بھید ہے جو ہم سے مخفی رکھا گیا ہے، لہٰذا اسے معلوم کرنے کی کوشش کا کچھ فائدہ نہیں، بلکہ مان لینا چاہیے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۲۳)۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ کفر و ایمان میں لوگوں کا اختلاف تو پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے، کوئی نبی ایسا نہیں کہ جس کی ساری امت ایمان لے آئی ہو، لہٰذا آپ ان کے انکار سے رنجیدہ نہ ہوں۔

**آیت 254** ① انسان پر سب سے زیادہ مشکل جان و مال کی قربانی ہے اور عموماً شریعت کے احکام کا تعلق ان دونوں

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی

اللہ (وہ ہے کہ ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے، نہ اسے کچھ اونگھ پکڑتی ہے اور نہ کوئی نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے ،کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی

---

سے ہے۔ اس سورت میں پہلے ﴿ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ﴾ [ البقرۃ : ۲۴۴ ] فرما کر جہاد کا حکم دیا اور آیت: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ ...... ﴾ [ البقرۃ : ۲۴۵ ] سے جہاد کے لیے مال خرچ کرنے کی ترغیب دی، اس کے بعد طالوت کے قصے کے ساتھ پہلے حکم کی تاکید کی اور اس آیت کے ساتھ دوسرے حکم کی تاکید کے لیے دوبارہ مال خرچ کرنے کا حکم دیا۔ ( رازی )

2 مقصد یہ کہ انسان دنیاوی اسباب و وسائل کو چھوڑ کر اکیلا ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو گا۔ لہٰذا آخرت میں نجات کے لیے صدقہ و خیرات اور اس جیسے نیک اعمال کو وسیلہ بناؤ۔ قیامت کے دن دنیاوی دوستی، رشتہ داری کا تعلق اور سفارش وغیرہ کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ ( ابن کثیر )

3 اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا منکر کافر ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ سے جہاد کیا، جیسا کہ کفار سے کیا جاتا ہے۔ ( قرطبی )

آیت 255 1 یہ آیت الکرسی ہے جو قرآن مجید کی تمام آیات سے عظیم آیت ہے۔

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابومنذر! کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے پاس اللہ کی کتاب میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' فرماتے ہیں، میں نے کہا، اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابومنذر! کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے پاس اللہ کی کتاب میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' کہتے ہیں، میں نے عرض کیا: ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''اللہ کی قسم! (تم نے درست کہا) اے ابومنذر! تمھیں یہ علم مبارک ہو۔'' [ مسلم، صلوۃ المسافرین، باب فضل سورۃ الکھف و آیۃ الکرسی : ۸۱۰ ] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث ہے، اس میں ان کا زکوٰۃ الفطر کی حفاظت پر مامور ہونا اور ایک شخص کا تین دن آ کر چوری کی کوشش کرنا، روزانہ گرفتار ہو کر منتیں کر کے چھوٹنا اور تیسری دفعہ گرفتار ہونے پر انھیں یہ بتانا مذکور ہے کہ جب تم بستر پر آؤ تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، تو لازماً اللہ کی طرف سے تم پر ایک حفاظت کرنے والا مقرر ہو گا اور تمھارے صبح کرنے تک کوئی شیطان تمھارے قریب نہیں آئے گا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اسے چھوڑ دیا، صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تمھارے قیدی کا کیا بنا؟'' میں نے سارا قصہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یاد رکھو! اس نے تمھیں سچ بتایا، حالانکہ وہ بہت جھوٹا تھا۔'' پھر آپ ﷺ نے بتایا: ''وہ شیطان تھا۔'' [ بخاری، الوکالۃ، باب إذا وکل رجلا فترك ...... : ۲۳۱۱، ۵۰۱۰ ]

اس حدیث سے آیت الکرسی کی فضیلت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کا نام آیت الکرسی ہونے کی تصدیق بھی معلوم ہوئی۔ ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے اسے

الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ

اجازت کے بغیر سفارش کرے، جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا

جنت میں داخلے سے سوائے موت کے کوئی اور چیز نہیں روکے گی۔'' [ الیوم واللیلۃ للنسائی، ص : ۱۸۳۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ : ۹۷۲۔ ابن کثیر اور البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے ]

② قرآن مجید کی سب سے لمبی آیت : ﴿ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ ﴾ [ البقرۃ : ۲۸۲ ] ہے، مگر سب سے زیادہ عظمت والی آیت، آیت الکرسی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کا موضوع توحید ہے، جو اس میں کئی دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ موضوع اور دلیلوں کی وجہ سے یہ سب سے بڑی آیت ہے۔ سورۂ اخلاص چھوٹی سی سورت ہونے کے باوجود قرآن کے ثلث (تہائی حصے) کے برابر ہے۔[ بخاری، فضائل القرآن، باب فضل : ﴿ قل ہو اللہ أحد ﴾ : ۵۰۱۳ ] اس کی وجہ بھی موضوعِ توحید کی عظمت ہے۔

نکتہ : آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے اسماء اور ضمائر کی صورت میں انیس دفعہ آیا ہے۔ "يَعْلَمُ" اور "شَآءَ" میں بھی ضمیریں موجود ہیں۔

③ آیت الکرسی ایک دعویٰ اور اس کی گیارہ دلیلوں پر مشتمل آیت ہے۔ دعویٰ یہ ہے : ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔

پہلی دلیل : وہ "الْحَيُّ" ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهٗ )) ''اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔'' [ بخاری، التوحید، باب ﴿ و کان عرشہ علی الماء ﴾ : ۷۴۱۸ ] اس کے سوا کسی ہستی میں یہ خوبی نہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هُوَ الْحَيُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ [ المؤمن : ۶۵ ] ''وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' اس کے سوا جس چیز کی عبادت بھی کی جاتی ہے وہ نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گی، ہر چیز موت کی آغوش سے نکلی ہے اور اسی کی آغوش میں جانے والی ہے، فرمایا: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا ﴾ [ البقرۃ : ۲۸ ] ''تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ﴾ [ النحل : ۲۰، ۲۱ ] ''اور وہ لوگ جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں۔''

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے — جہاں کی وراثت اسی کو سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے — نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب — غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب (حالی)

دوسری دلیل : "الْقَيُّوْمُ" یہ "قَامَ يَقُوْمُ" سے "فَيْعُوْلٌ" کے وزن پر ہے، اصل میں "قَيْوُوْمٌ" تھا، پہلی واؤ کو یاء سے بدل دیا، پھر پہلی یاء کو دوسری میں ادغام کر دیا، یاء کے اضافے سے مزید مبالغہ پیدا ہو گیا، یعنی وہ کسی سہارے کے بغیر خود قائم ہے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا، تھامنے والا ہے۔ انسان جو "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے، ایک لحہ بھی اللہ تعالیٰ

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ

احاطہ نہیں کرتے مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے اور اسے ان دونوں کی

کے تھامنے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خود اس کے دل کی دھڑکن، سانس کی آمدورفت، پیشاب و پاخانے کا نظام، خون کی گردش، نیند اور بیداری حتیٰ کہ زندگی اور موت کچھ بھی اس کے ہاتھ میں نہیں، تو دوسروں کو کیا تھامے گا۔ ہمارے رسول ﷺ کی زندگی، آپ پر آنے والی تکلیفیں، یعنی آپ کا زخمی ہونا، گھوڑے سے گر کر موچ آنا، بیمار ہونا، بھوک، پیاس، غرض پوری زندگی اس کی شاہد ہے، پھر اتنی وسیع کائنات اور لاتعداد مخلوقات کو اللہ کے سوا کون ہے جو تھامے ہوئے ہے کہ اسے مشکل کشا، داتا یا دستگیر یا جھولی بھرنے والا سمجھا جائے۔ آسمان و زمین سے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ﴾ [ فاطر : ٤١ ] ”بے شک اللہ ہی آسمانوں کو اور زمین کو تھامے رکھتا ہے، اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں۔“ اڑتے پرندوں کے متعلق فرمایا: ﴿ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ﴾ [ الملك : ١٩ ] ”رحمان کے سوا انھیں کوئی تھام نہیں رہا ہوتا۔“

تیسری دلیل: ”لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ“ ”سِنَةٌ“ اصل میں ”وَسْنٌ“ تھا، جیسے: ”وَعْدٌ“ سے ”عِدَةٌ“ ہے، شروع سے ”واؤ“ حذف کر کے آخر میں ”تاء“ لے آئے۔ معنی ہے نیند سے پہلے آنے والی اونگھ، جب آدمی سونے اور جاگنے کے درمیان ہوتا ہے۔ ”سِنَةٌ“ اور ”نَوْمٌ“ کی تنوین کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے: ”اسے نہ کچھ اونگھ پکڑتی ہے نہ کوئی نیند“ یعنی اللہ تعالیٰ کو ذرا برابر اونگھ یا نیند اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اونگھ اور نیند اتنی زبردست چیزیں ہیں کہ جس پر آتی ہیں اسے پکڑ لیتی ہیں، انسان ان کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ ہمارے رسول ﷺ ایک دفعہ صبح کی نماز کے لیے طلوعِ آفتاب کے بعد بیدار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اونگھ اور نیند دونوں سے پاک ہے، کیونکہ اگر اسے اونگھ یا نیند آ جائے تو کائنات آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جائے، اگر تجربہ کرنا ہو تو ہوشیار سے ہوشیار شخص کے دونوں ہاتھوں میں شیشے کا ایک ایک گلاس دے کر اسے ایک دو راتیں جگا کر تجربہ کر لیں۔

چوتھی دلیل: ”لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“ یعنی جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اسی کا ہے۔ (مزید دیکھیے مریم: ۹۳ تا ۹۵) جب مالک وہ ہے تو عبادت بھی اسی کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یحییٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو یہ بات سمجھائی کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص نے اپنے خالص مال سونے یا چاندی کے ساتھ ایک غلام خریدا اور غلام سے کہا کہ یہ میرا گھر ہے اور یہ میرا کام ہے، اس میں کام کرو اور اس کی آمدنی مجھے دیا کرو۔ غلام سارا دن کام کرتا اور شام کو آمدنی مالک کے سوا کسی اور کو دے دیتا، تو تم میں سے کون ہے جو ایسے غلام کو پسند کرے؟“ [ ترمذی، الأدب، باب ما جاء فی مثل الصلوۃ ...... : ۲۸۶۳، و صححه الألبانی ]

پانچویں دلیل: ”مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ“ یعنی کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ آیت الکرسی سے پہلی آیت میں قیامت کے دن کسی بھی قسم کی سفارش کی نفی فرمائی ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ سفارش ممکن بتائی ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی انسان یا جن یا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے

وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

حفاظت نہیں تھکاتی اور وہی سب سے بلند، سب سے بڑا ہے ﴿۲۵۵﴾

بغیر کسی کی سفارش کی جرأت کرے۔ ہمارے نبی ﷺ بھی جب سفارش کے لیے جائیں گے تو عرش کے نیچے سجدے میں گر کر اللہ تعالیٰ کی تعریفیں کریں گے، جو اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو سکھائے گا، پھر اللہ تعالیٰ سر اٹھانے کا حکم دے گا اور ایک حد مقرر کر کے فرمائے گا کہ ان لوگوں کو جہنم سے نکال لو۔ [ بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ لما خلقت بیدی ﴾ : ۷۴۱۰ ]

قیامت کے دن سفارش تو کجا اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات کرنے کی جرأت بھی نہیں کرے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙۗ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴾ [ النبا : ۳۸ ] ''جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے، وہ کلام نہیں کریں گے، مگر وہی جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔''

یہ عقیدہ کہ کوئی زبردستی اللہ تعالیٰ سے بات منوا سکتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کسی کی محبت کے ہاتھوں اس کی سفارش ماننے پر مجبور ہو گا، خالص جاہلانہ عقیدہ ہے اور مکہ کے مشرکوں کا بھی یہی عقیدہ تھا، اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ زمر (۳) اور سورۂ یونس (۱۸) وہاں عجز و نیاز کے سوا اور خود اس کی مہربانی سے اجازت کے بغیر کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ شفاعت کا مضمون اچھی طرح سمجھنے کے لیے شاہ اسماعیل دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کی تیسری فصل کا مطالعہ کریں۔

چھٹی دلیل: "يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ " یعنی وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ سامنے سے مراد حاضر چیزیں اور پیچھے سے مراد غائب چیزیں ہیں۔ اس میں ماضی، حال اور استقبال سب کا علم آ گیا۔ اس کے سوا کسی ہستی میں یہ صفت موجود نہیں، فرمایا: ﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [ النمل : ٦٥ ] ''کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا اور وہ شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔'' جب اللہ تعالیٰ ہمارے اور پوری کائنات کے تمام گزشتہ، موجودہ اور آئندہ حالات سے واقف ہے تو عبادت بھی اسی کا حق ہے۔

ساتویں دلیل: "وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ " یعنی کوئی شخص اللہ کے علم یعنی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتا مگر جتنا وہ چاہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ﴾ [ الجن : ۲٦، ۲۷ ] ''(وہ) غیب کو جاننے والا ہے، پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر کوئی رسول، جسے وہ پسند کر لے'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک اور معنی کا احتمال بھی ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی ہے وہ اللہ کی ذات و صفات کے علم میں سے کسی بات پر مطلع نہیں ہو سکتا مگر جتنا وہ خود چاہے اور بتا دے، گویا یہ اس آیت کی ہم معنی ہے: ﴿ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴾ [ طٰہٰ : ۱۱۰ ] ''اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں مذکور ہے کہ ایک چڑیا نے سمندر میں ایک یا دو ٹھونگے مارے تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''میرے اور آپ کے علم نے اللہ کے علم سے کم نہیں کیا مگر جتنا اس چڑیا کے ٹھونگے نے سمندر سے کم کیا ہے۔'' [ بخاری،

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ

دین میں کوئی زبردستی نہیں، بلاشبہ ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی، پھر جو کوئی باطل معبود کا انکار کرے اور اللہ پر

العلم، باب ما يستحب للعالم..... : ۱۲۲ ] اب خود سوچ لو کہ عبادت کے لائق اللہ تعالیٰ ہے یا یہ بے بس مخلوق۔

آٹھویں دلیل : "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ" کرسی کا معنی سب لوگوں کے ہاں معروف ہے، یعنی وہ چیز جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ سلف صالحین کے نزدیک اس کا معنی کرسی ہی ہے۔ ان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی کرسی موجود ہے اور ہمارا اس کے وجود پر ایمان ہے، اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسی ہے، کیونکہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں، البتہ قرآن مجید میں جو آیا ہے اس کے مطابق اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسیع ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے۔

بعد میں آنے والے مفسرین میں سے بعض نے سلف کا مسلک ہی اختیار کیا ہے، البتہ بعض نے کہا کہ کرسی سے مراد اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہے اور بعض نے کہا، اس سے مراد علم ہے۔ عموماً یہ وہ لوگ ہیں جو عرش کے بھی منکر ہیں، چنانچہ وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ نہ کوئی عرش ہے نہ کرسی، بلکہ مراد اللہ تعالیٰ کی سلطنت اور حکومت ہے۔ مگر کرسی کا یہ معنی حقیقی نہیں مجازی ہے، جو اس وقت کیا جاتا ہے جب حقیقت ناممکن ہو، حالانکہ اللہ کے عرش اور کرسی کو حقیقی معنوں میں لینے سے کچھ خرابی لازم نہیں آتی۔

رہا یہ خیال کہ پھر تو اللہ تعالیٰ آدمیوں کے مشابہ ہو گیا جبکہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں تو سلف کے فرمان کے مطابق ہم یہ کہتے ہی نہیں کہ وہ کرسی ہماری کرسیوں جیسی ہے، نہیں بلکہ وہ اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ انسان علیم ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [ الذاریات : ۲۸ ] "اور انھوں نے اسے ایک بہت علیم بیٹے کی خوش خبری دی" اور اللہ تعالیٰ بھی علیم ہے، تو کیا ہم اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا انکار کر دیں کہ اس سے مشابہت لازم آتی ہے، نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ علیم ہے اپنی شان کے مطابق۔ اس سے بھی بڑھ کر مثال لے لیں، انسان موجود ہے تو کیا ہم اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا انکار کر دیں گے کہ اس سے انسان کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح آئی ہیں اسی طرح ماننا پڑیں گی۔ ہاں، وہ صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں۔ آیت میں یہ جملہ بھی توحید کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کرسی کی وسعت اس کے ایک معبود ہونے کی دلیل ہے۔

نویں دلیل :"وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا" "آدَ يَؤُوْدُ" کا معنی کسی چیز کا بھاری بوجھ بننا، مشقت میں ڈال دینا ہے۔ مخلوق کتنی بھی بڑی ہو خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی جب کہ اللہ تعالیٰ کے لیے زمین و آسمان کی حفاظت کچھ بوجھ نہیں۔

دسویں اور گیارھویں دلیل : "وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ" بلندی اور عظمت اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، مخلوق اللہ تعالیٰ کی بلندی اور عظمت کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ آخر میں اس آیت میں موجود ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ آیت باری تعالیٰ کے نام "اللہ" سے شروع ہوئی ہے، یہ نام تمام صفات کا جامع ہے، مخلوق میں سے کسی پر یہ نام نہیں بولا جا سکتا ہے۔ تمام مذاہب میں مذکور خداؤں کی تثنیہ و جمع بن سکتی ہے، مثلاً دیویوں، دیوتاؤں اور Gods وغیرہ مگر لفظ "اللہ" واحد ہی رہے گا، اس کی نہ جمع بن سکتی ہے نہ تثنیہ۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کی زبردست دلیل ہے، اگر اس نکتہ کو بھی شامل کر لیں تو آیت میں توحید کی بارہ دلیلیں موجود ہیں۔

**آیت 256** ① لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "(جاہلیت میں) اگر کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے

بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ ع

ایمان لائے تو یقیناً اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا، جسے کسی صورت ٹوٹنا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۵۶﴾ اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے دوست باطل معبود ہیں، وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لاتے ہیں۔ یہ لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۵۷﴾

تو وہ یہ نذر مان لیتی تھی کہ اگر بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنا دے گی، پھر جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان میں انصار کے کئی لڑکے تھے، انصار نے کہا: ''ہم انھیں نہیں چھوڑیں گے'' تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔'' [ أبوداوٗد، الجهاد، باب في الأسير يكره على الإسلام : ۲۶۸۲، وصححه الألباني ]

یعنی زبردستی کسی کو مسلمان بنانا جائز نہیں، جو مسلمان ہونا چاہے سوچ سمجھ کر مسلمان ہو۔ زبردستی ہو گی تو دل میں ایمان نہیں آئے گا، اس کا کیا فائدہ؟ البتہ اسلام مسلمانوں کو کفر کا محکوم بننے کے بجائے جہاد کے ذریعے سے تمام کفار کو اسلام کا محکوم بنانے کا حکم دیتا ہے، جس میں کفار پر مسلمان ہونے کے لیے زبردستی نہیں کی جاتی، وہ امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں مگر غلبۂ اسلام کی علامت کے طور پر ان سے معمولی رقم بطور جزیہ لی جاتی ہے۔ اگر زبردستی مسلمان بنانا جائز ہوتا تو آج ہندوستان میں غیر مسلموں کا نام و نشان بھی نہ ہوتا، جیسا کہ اندلس میں نصرانیوں نے مسلمانوں پر زبردستی کر کے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔

② بِالطَّاغُوْتِ: یہ '' طَغٰى يَطْغٰى طُغْيَانًا '' سے صیغہ مبالغہ ''فَعَلُوْتٌ'' کے وزن پر ہے، جیسے جبروت اور ملکوت ہے۔ ''فَعَلُوْتٌ'' کے وزن پر ''طَغَيُوْتٌ'' تھا، پھر تخفیف کے لیے اس میں قلب کیا گیا، یاء کو پہلے اور غین کو بعد میں کر دیا گیا ''طَيَغُوْتٌ'' ہو گیا، پھر یائے متحرکہ کا ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے یاء کو الف سے بدل دیا گیا تو ''طَاغُوْتٌ'' بن گیا، جس کا وزن ''فَلَعُوْتٌ'' ہے۔ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، جس کا معنی ہے کسی چیز کا اپنی حد سے آگے بڑھ جانا۔ طاغوت میں ''واؤ'' اور ''تاء'' مبالغہ کے لیے ہیں، یعنی جو اپنی حد سے بہت زیادہ آگے بڑھ جائے۔ تمام باطل معبود طاغوت ہیں، کیونکہ انھیں حد سے بڑھا کر اللہ تعالیٰ کے برابر کر دیا گیا ہے۔ شیطان کو بھی اسی لیے طاغوت کہتے ہیں۔ جو شخص لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی بندگی اور اطاعت کرواتا ہے وہ بھی طاغوت ہے۔

**آیت 257** ① قرآن پاک میں جہاں بھی ''الظُّلُمٰتِ'' اور ''النُّوْرَ'' کے الفاظ آئے ہیں ان سے مراد کفر و ایمان ہی ہے، ماسوائے سورۂ انعام (۱) ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ کہ وہاں رات اور دن مراد ہیں۔ (رازی) اس آیت میں ''النُّوْرَ'' کا لفظ بصیغہ واحد اور ''الظُّلُمٰتِ'' کا لفظ بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ حق ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی ہے اور کفر

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ

کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، اس لیے کہ اللہ نے اسے حکومت دی تھی، جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، اس نے کہا میں

وشرک اور جہالت کی قسموں کا شمار نہیں، وہ سب باطل ہیں۔ (ابن کثیر) آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان پہلے کافر ہوتا ہے اور ایمان لانے کے بعد کفر کی تاریکی سے نکل کر ایمان کی روشنی میں داخل ہوتا ہے، مگر یہ معنی مراد نہیں بلکہ جو شخص ابتدا ہی سے مسلمان ہے اس کے حق میں بھی توفیق و رحمت کے اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کفر کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لے لیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے: ﴿ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ﴾ [ یونس : ۹۸ ] ”جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں ہٹا دیا۔“ حالانکہ ان پر تاحال عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ ﴾ [ النحل : ۷۰ ] ”اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمّی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔“ حالانکہ وہ پہلے کبھی نکمّی عمر میں نہ تھے جس کی طرف دوبارہ لوٹائے گئے ہوں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے سنا کہ اس نے کہا: " أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ " تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( خَرَجَ مِنَ النَّارِ )) ”یہ شخص آگ سے نکل آیا۔“ [ مجمع الزوائد : ۳۳۴/۱ ] حالانکہ وہ پہلے آگ میں نہیں تھا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ [ یوسف : ۳۷ ] ”میں نے ان لوگوں کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔“ حالانکہ یوسف علیہ السلام کبھی ان کی ملت میں داخل نہیں تھے۔ الغرض! قرآن و حدیث میں اس قسم کے محاورات بکثرت مذکور ہیں، خوب سمجھ لو۔ (رازی)

② اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ : یعنی یہ کافر اور ان کے باطل معبود سب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۴) اور سورۂ انبیاء (۹۸)۔

آیت 258 ① اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ : یعنی اس بادشاہ کے رب تعالیٰ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑے کی وجہ یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت عطا فرمائی، اس کا شکر اس نے یہ ادا کیا کہ خود رب بن بیٹھا اور جس نے اسے حکومت عطا فرمائی تھی اس کا انکار کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے فقیر بنا دیتا تو کبھی یہ جسارت نہ کرتا۔

② ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے، ان کے زمانے میں عراق کے اندر شرک تقریباً اپنی ساری صورتوں کے ساتھ موجود تھا، بتوں کو وہ پوجتے تھے، سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش وہ کرتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ بادشاہ وقت کو بھی رب مانتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کے ذمے ان سب صورتوں کی تردید کر کے لوگوں کو اکیلے رب کی عبادت کی دعوت دینا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد اور قوم کو بت پرستی چھوڑ کر ایک رب کی عبادت کی دعوت دی، نتیجے میں گھر سے نکلنا پڑا، پھر نہایت حکیمانہ طریقے سے سورج، چاند اور ستاروں کا رب نہ ہونا ایسا واضح کیا کہ قوم لاجواب ہو گئی۔ (دیکھیے انعام: ۷۶ تا ۸۲) نتیجے میں قوم کے جھگڑے اور سورج، چاند اور ستاروں کے غضب کا نشانہ بننے کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ محض نصیحت

يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡىٖ وَاُمِيۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاۡتِىۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىۡ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا پھر اللہ تو سورج کو مشرق سے لاتا ہے، پس تو اسے مغرب سے لے آ تو وہ جس نے کفر کیا تھا حیرت زدہ رہ گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۲۵۸﴾

سے بتوں کی بے بسی ماننے پر یہ لوگ تیار نہیں تو میلے والے دن ان کے بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سارے بت توڑ دیے۔ تفتیش ہوئی، ابراہیم علیہ السلام مجرم قرار پائے، اس موقع پر ساری قوم کے سامنے بتوں کی بے بسی ایسی واضح فرمائی کہ وہ اپنے دلوں میں مان گئے کہ ظالم وہ خود ہی ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) کا کچھ قصور نہیں۔ اب حق کو قبول کرنے کے بجائے الٹا کہنے لگے کہ اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ (دیکھیے انبیاء: ۵۱ تا ۷۰) اب ظاہر ہے کہ عوام جتنے بھی ہوں کسی کو سزا دینا تو حکومت کا کام ہے، اس لیے انھیں وقت کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، وہ اپنی سلطنت میں بت پرستی، ستارہ پرستی کو برداشت کرتا تھا، بلکہ اس کی پشت پناہی کرتا تھا، کیونکہ وہ خود بھی مشرک تھا اور اپنے رب ہونے کا بھی دعویدار تھا۔ اس موقع پر بادشاہ کے ساتھ یہ مناظرہ ہوا، جس میں لاجواب ہو کر اس نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھنکوا دیا۔

③ یہ واقعہ اور بعد والے دونوں واقعات اس بات کی مثال اور دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو کس طرح اندھیرے سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور طاغوت اپنے دوستوں کو کس طرح روشنی سے اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔

④ ابراہیم علیہ السلام نے جب اس بادشاہ کے رب ہونے سے انکار کیا تو اس نے پوچھا: ''تمھارا رب کون ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔'' اس نے کہا: ''میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔'' بعض تابعین سے منقول ہے کہ اس نے دو قیدی منگوائے، ایک کو قتل کر دیا، ایک کو چھوڑ دیا اور کہا: ''دیکھو! انھیں زندہ رکھنا یا مارنا میرے ہاتھ میں ہے۔'' تابعین کی بات اسرائیلی روایت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ خود تو اس وقت موجود نہیں تھے اور اس کی ضرورت اس وقت ہے جب وہ بادشاہ متقی اور ہمیشہ سچ بولنے والا ہو۔ ایک جھوٹا شخص کوئی غلط بات کہے تو اسے تاویل کے ساتھ صحیح ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں رب ہوں، اسے یہ دعویٰ کرنے میں کیا چیز مانع ہے کہ میں ہی سب کو زندہ کرتا ہوں اور میں ہی مارتا ہوں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ کج بحثی پر اترا ہوا ہے تو پہلی دلیل چھوڑ کر دوسری دلیل سورج والی دی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے پہلی دلیل چھوڑی نہیں، بلکہ اس کے ذریعے سے اس کے منہ سے اس دعویٰ کا اقرار کروالیا کہ میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اب اس دعویٰ پر دوسری دلیل کی بنیاد رکھی کہ جب تم میں اتنی قوت ہے کہ تمھی سب کو پیدا کرتے ہو اور تمھی مارتے ہو تو اس کے مقابلے میں ایک معمولی سا کام کر کے دکھاؤ، یہ کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے، جب سارا اختیار تمھارے پاس ہے تو سورج کو مغرب سے طلوع کر کے دکھا دو، اس پر وہ بے ایمان حیرت زدہ ہو کر بالکل لاجواب ہو گیا اور ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ بھی راہِ راست پر آنے کی توفیق نہیں دیتا۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی پر گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی، اس نے کہا اللہ اس کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے سو (۱۰۰) سال تک موت دے دی، پھر اسے زندہ کیا، فرمایا تو کتنی دیر رہا ہے؟ اس نے کہا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں۔ فرمایا بلکہ تو سو (۱۰۰) سال رہا ہے، سو اپنے کھانے اور اپنے پینے کی چیزیں دیکھ کہ بگڑی نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھ اور تا کہ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کو دیکھ ہم انھیں کیسے اٹھا کر جوڑتے ہیں، پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں۔ پھر جب اس کے لیے خوب واضح ہو گیا تو اس نے کہا میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۵۹﴾

⑤ نمرود کی ناک میں مچھر کے گھسنے اور چار سو سال تک ہتھوڑوں سے اپنے آپ کو پٹوانے کے واقعات نہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں نہ کسی صحابی سے۔

آیت 259 ① اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ : اس "اَوْ" کا عطف اس سے پہلی آیت ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ﴾ میں مذکور "الَّذِيْ" پر ہے، یعنی کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ......، یا کیا تو نے اس جیسے شخص کو نہیں دیکھا......۔ "اَلَمْ تَرَ" کا معنی "اَلَمْ تَعْلَمْ" ہوتا ہے۔ (دیکھیے سورۂ فیل کے حواشی) اور "اَلَمْ تَرَ" سے مقصود کوئی عجیب واقعہ بیان کرنے سے پہلے اس کے سننے کا شوق دلانا ہوتا ہے۔

② خَاوِيَةٌ : یہ باب "ضَرَبَ" سے اسم فاعل ہے، مادہ "خ و ی" ہے، جس کا معنی کھوکھلا ہونا ہے۔ چونکہ کھوکھلا ہونے کا نتیجہ گر پڑنا ہے، اس لیے اس کا معنی گر پڑنا بھی آتا ہے، عموماً پہلے چھت گرتی ہے پھر دیواریں اس پر گر پڑتی ہیں، اس لیے فرمایا: "چھتوں پر گری ہوئی تھی۔"

③ لَمْ يَتَسَنَّهْ: اس لفظ کا مادہ یا تو "س ن ن" ہے، جس کا معنی بدبودار ہونا ہے، جیسے فرمایا: ﴿مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ [ الحجر : ۲٦ ] "جو بدبودار، سیاہ کیچڑ سے تھی۔" باب تفعل میں "لَمْ يَتَسَنَّنْ" ہو گیا، پھر آخری نون کو "ہاء" سے بدل دیا، جیسے: "لَمْ يَتَقَضَّضِ الْبَازِيْ" (باز تیزی سے نہیں جھپٹا) کو "لَمْ يَتَقَضَّهْ" کر دیتے ہیں۔ یا پھر اس کا مادہ "س ن ہ" ہے، اس سے باب تفعل "تَسَنَّهَ" کا معنی روٹی کا بدبودار ہونا ہے، اس صورت میں "ہاء" اصل ہے، تو "لَمْ يَتَسَنَّهْ" کا معنی ہے، بدبودار نہیں ہوا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا اور کیا تو نے یقین نہیں کیا؟ کہا کیوں نہیں اور لیکن اس لیے کہ میرا دل پوری تسلی حاصل کر لے۔ فرمایا پھر چار پرندے پکڑ اور انھیں اپنے ساتھ مانوس کر لے، پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک حصہ رکھ دے، پھر انھیں بلا، دوڑتے ہوئے تیرے پاس آ جائیں گے اور جان لے کہ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۶۰﴾

④ پہلے قصے سے کائنات کو بنانے والے کا ایک ہونا (یعنی توحید) بیان کرنا مقصود تھا، جبکہ اس قصے اور اس کے بعد والے قصے سے حشر و نشر ثابت کرنا مقصود ہے۔ اس آیت میں مذکور شخص سے متعلق رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند کے ساتھ کوئی ذکر نہیں ملتا کہ وہ کون تھا۔ بعض تابعین نے اس کا نام عزیر علیہ السلام بتایا ہے اور بعض نے ارمیا اور ظاہر ہے کہ اس کا ماخذ وہ اسرائیلی روایات ہیں جنھیں نہ سچا کہا جا سکتا ہے نہ ہی جھوٹا۔ واللہ اعلم!

البتہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ان سے پوچھنا اور پھر اصل مدت بتانا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اللہ کے نبی تھے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کا اس بستی کو دوبارہ زندہ کرنا بعید کیوں سمجھا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ انھوں نے بعید سمجھ کر یہ سوال نہیں کیا تھا اور نہ انھیں قیامت اور دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ اس سے اطمینان حاصل کرنا مقصود تھا اور وہ دوبارہ زندہ ہونے کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو بعض حقیقتوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کروا دیتا ہے۔ ان دونوں واقعات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس شخص کا دوست اور کارساز اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اسے کس طرح اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ (رازی)

معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نبی نے وفات پائی تھی تو اس وقت کچھ دن چڑھا ہوا تھا اور جب دوبارہ زندہ ہوئے تو سورج غروب ہونے کو تھا، اس لیے انھوں نے سو سال گزرنے کے باوجود یہ سمجھا کہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ گزرا ہے۔

**آیت 260** ① ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، اللہ تعالیٰ کے فرشتے اور احکام ان کے پاس آتے رہتے تھے، ان کو مردوں کے جی اٹھنے میں کوئی شک نہ تھا مگر انھوں نے آنکھوں سے دیکھ لینا چاہا، انسانی عادت ہے کہ وہ علم کے بعد آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے علم الیقین کے بعد عین الیقین کا مرتبہ حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ (ابن کثیر)

② **فَصُرْهُنَّ**: یہ "صَارَ يَصُوْرُ" یا "يَصِيْرُ" (اجوف واوی یا یائی) سے ہے۔ اس لفظ کے معنی عموماً "اَمِلْهُنَّ" کیے گئے ہیں، یعنی "ان کو ہلا لے۔" شاہ عبد القادر رحمہ اللہ اپنے فائدے میں لکھتے ہیں: "ابراہیم علیہ السلام کو ہلانے کو اس لیے فرمایا گیا تا کہ وہ زندہ ہونے کے بعد خوب پہچانے جا سکیں کہ واقعی وہی ہیں جو ذبح کر کے پہاڑ پر رکھے گئے ہیں اور کوئی شبہ نہ رہے۔ اس صورت

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانے کی مثال کی طرح ہے جس نے سات خوشے اگائے، ہر خوشے میں سو دانے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۱﴾

---

میں "ثُمَّ اجْعَلْ" سے پہلے "ثُمَّ قَطِّعْهُنَّ" محذوف ماننا پڑے گا اور کہا جائے گا کہ بعد کا جملہ چونکہ اس پر دلالت کر رہا ہے، اس لیے اسے حذف کر دیا گیا۔ (بیضاوی) صحابہ و تابعین اور اہل لغت کی ایک جماعت نے "فَصُرْهُنَّ" کے معنی "قَطِّعْهُنَّ" بھی بتائے ہیں، یعنی "ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔" چنانچہ ابن جریر اور طبری نے اس معنی پر بہت سے شواہد پیش کیے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ "صَارَ يَصُوْرُ" یا "يَصِيْرُ" سے امر کا صیغہ ہے، جس کے معنی قطع کرنا بھی آئے ہیں اور مائل کرنا بھی اور اس میں قراءت کے اختلاف نے اور زیادہ اشتباہ اور وسعت پیدا کر دی اور علمائے لغت نے اسے اضداد میں ذکر کیا ہے۔ (أضداد أبي الطيب، مجاز أبي عبيدة) ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس جگہ سوال و جواب کے انداز اور سیاق کلام سے "قطع" کے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں اور اس پر سلف مفسرین بھی تقریباً متفق نظر آتے ہیں۔" (واللہ اعلم)

بندۂ عاجز نے ترجمہ "اَمِلْهُنَّ" کیا ہے، یعنی ان کو اپنی طرف ہلا لے، مانوس کر لے۔ اس کی وجہ ایک تو استاذ مرحوم کا فائدے کے شروع میں فرمانا ہے کہ عموماً اس کا معنی یہی کیا جاتا ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں فرزندان ارجمند اور بہت سے علماء نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ "فَصُرْهُنَّ" کے بعد "اِلَيْكَ" (اپنی طرف) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ ذبح کر کے ان کے ٹکڑے پہاڑوں پر رکھنے میں کوئی شک نہیں۔

❸ ان چار جانوروں کی تعیین میں علمائے تفسیر کا اختلاف ہے، بعض نے مرغ، مور، کوا اور کبوتر بتائے ہیں اور بعض نے دوسرے نام ذکر کیے ہیں اور پھر چار پہاڑوں پر ان کو الگ الگ رکھنے اور ان کے درمیان کھڑے ہو کر ہر ایک کا نام لے کر پکارنے کی کیفیت بھی بعض تابعین سے منقول ہے، مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جانوروں کی یہ تعیین بے فائدہ ہے، اس کی کچھ اہمیت ہوتی تو قرآن خاموش نہ رہتا۔

❹ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل الفاظ ساری آیت کا خلاصہ ہوتے ہیں، یہ قرآنی اعجاز ہے۔ اس آیت میں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے مردوں کو زندہ کرنے پر اسے کامل غلبہ وقدرت حاصل ہے "حَكِيْمٌ" کامل حکمت والا ہے، جس کے مطابق اس نے زندوں کی موت کے لیے اور مردوں کو زندہ کرنے کے لیے ایک وقت مقرر رکھا ہے۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ تین قصے بیان فرمائے ہیں اس پر کہ اللہ خود ہدایت کرنے والا ہے جس کو چاہے، اگر شبہ لائے تو ساتھ ہی جواب سمجھا دیتا ہے۔ اب آگے پھر جہاد کا ذکر ہے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا۔ (موضح)

آیت 261 ❶ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: قرآن مجید میں "سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا لفظ عام یعنی اسلام کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر انھوں نے جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ کسی طرح کا احسان جتلانا لگاتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف پہنچانا، ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۶۲﴾ اچھی بات اور معاف کر دینا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے کسی طرح کا تکلیف پہنچانا ہو اور اللہ بہت بے پروا، بے حد برد بار ہے ﴿۲۶۳﴾

﴿ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [ التوبة: ٣٤ ] ''بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔'' اس صورت میں اسلام کے ہر کام میں خرچ کرنا فی سبیل اللہ خرچ کرنا ہے اور خاص معنوں میں بھی آیا ہے، جیسا کہ سورۂ توبہ (۶۰) میں صدقات خرچ کرنے کی جگہوں میں ایک " فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ " ہے۔ وہاں " فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ " سے خاص جہاد مراد ہے، نیز صحیح بخاری میں حج کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔ یہاں اگرچہ عام معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہے مگر جیسا کہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جہاد مراد لینا گزشتہ اور آئندہ آیات کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔''

**آیت 262** اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ...... : یعنی یہ ثواب صرف ان لوگوں کو حاصل ہو گا جو رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد نہ کسی پر احسان جتلاتے ہیں اور نہ زبان و عمل سے کوئی تکلیف دیتے ہیں، کسی کو کچھ دے کر احسان جتلانا کبیرہ گناہ ہے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا، نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ یہ فرمایا۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''وہ تو ناکام و نامراد ہو گئے، یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''کپڑا لٹکانے والا، احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کے ساتھ اپنا مال فروخت کرنے والا۔'' [ مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم إسبال ...... : ١٠٦ ]

**آیت 263** ① قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ...... : یعنی اگر کوئی صدقہ نہیں کر سکتا تو اچھے الفاظ کے ساتھ معذرت کر لے اور سائل کے اصرار اور بدتمیزی پر غصے ہونے کے بجائے مغفرت یعنی معافی اور درگزر سے کام لے اور سوچ لے کہ اللہ تعالیٰ کتنا غنی ہے، پھر بھی کتنا بردبار ہے جو ہماری خطاؤں کے باوجود حلم سے کام لیتا ہے۔ ہمیں بھی اس طرح حلم سے کام لینا چاہیے۔

② جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی میں سے یہ بھی ہے کہ تو اپنے بھائی کو کھلے چہرے کے ساتھ ملے اور یہ کہ اپنے ڈول میں سے اس کے ڈول میں (پانی) انڈیل دے۔'' [ ترمذی،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقے احسان رکھنے اور تکلیف پہنچانے سے برباد مت کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، تو اس کی مثال ایک صاف چٹان کی مثال جیسی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو، پھر اس پر ایک زوردار بارش برسے، پس اسے ایک سخت چٹان کی صورت چھوڑ جائے۔ وہ اس میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں پائیں گے جو انھوں نے کمایا اور اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۲۶۴﴾ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی رضا چاہتے ہوئے اور اپنے دلوں کو ثابت رکھتے ہوئے خرچ کرتے ہیں، اس باغ کی مثال جیسی ہے جو کسی اونچی جگہ پر ہو، جس پر ایک زوردار بارش برسے تو وہ اپنا پھل دوگنا دے، پس اگر اس پر زور کی بارش نہ برسے تو کچھ شبنم۔ اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۶۵﴾

---

البر والصلة، باب ما جاء فی طلاقة ...... : ۱۹۷۰، و صححه الألبانی ]

**آیت 264** ① لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ...... : یعنی کسی کو صدقہ دینے کے بعد اس پر احسان جتلا کر یا اسے تکلیف دے کر اس منافق کی طرح اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو جو صرف ریا کاری کے جذبہ کے تحت اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ (ابن کثیر)

② كَمَثَلِ صَفْوَانٍ : یعنی یہ ریا کار بظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی جمی ہوئی ہو ("تُرَابٌ" کی تنوین تقلیل کے لیے ہے) اور دیکھنے والا اسے قابل کاشت زمین خیال کرے، لیکن جونہی بارش ہو اس کی تمام مٹی ڈھل جائے اور وہ صاف چٹان کی چٹان رہ جائے، اسی طرح ریا کاروں کے عمل ان کے صحیفۂ اعمال سے مٹ جائیں گے اور وہ ان سے نہ کوئی فائدہ اٹھا سکیں گے اور نہ انھیں ان کا کوئی اجر ملے گا۔ اوپر کی آیت میں مثال تھی مخلص مومن کے صدقہ و خیرات کی، جو محض رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے اور یہ مثال ہے ریا کار کے خرچ کرنے کی، جس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 265** ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ : یہ ریا کاروں کے مقابلے میں مخلص مومنوں کی مثال ہے، یعنی جو لوگ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور دل کے اس اطمینان کے ساتھ خرچ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس کا وافر اجر عطا

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع

کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں، اس کے لیے اس میں ہر قسم کے کچھ نہ کچھ پھل ہوں اور اسے بڑھاپا آ پہنچے اور اس کے کمزور بچے ہوں، پھر اسے ایک بگولا آ پہنچے، جس میں ایک آگ ہو تو وہ بالکل جل جائے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم سوچو ﴿۲۶۶﴾

---

فرمائے گا اور ان کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔ دل کو ثابت رکھتے ہوئے خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ انھیں خرچ کرتے ہوئے کوئی تردد یا پریشانی ہوتی ہے نہ بعد میں کوئی پشیمانی۔ ان کے خرچ کرنے کی مثال اس باغ کی سی ہے جو کسی پر فضا اور بلند مقام پر ہو، اگر اس پر زور کی بارش ہو تو دوسرے باغوں سے دگنا پھل دے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ہلکی بارش ہی کافی رہے۔ یہی حالت مومن کے عمل کی ہے، وہ کسی صورت میں ضائع نہیں ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ (ابن کثیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''زور کے مینہ سے مراد زیادہ مال خرچ کرنا ہے اور ''طَلٌّ'' (کچھ شبنم) سے مراد تھوڑا مال۔ (''طَلٌّ'' پر تنوین تقلیل کی وجہ سے کچھ شبنم ترجمہ کیا ہے) سو اگر نیت درست ہے تو زیادہ خرچ کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے اور تھوڑا بھی کام آتا ہے، جیسے خالص زمین پر باغ ہے، جتنا مینہ برسے گا اس کا فائدہ ہے، بلکہ اوس بھی کافی ہے اور نیت درست نہیں تو جس قدر زیادہ خرچ کرے ضائع ہے، کیونکہ زیادہ مال دینے میں دکھاوا بھی زیادہ ہے، جیسے پتھر پر دانہ کہ جتنا زور کا مینہ برسے زیادہ نقصان پہنچائے کہ مٹی دھوئی جائے۔'' (موضح)

**آیت 266** ① اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ ...... : یعنی بڑھاپے میں باغ جلنے پر نہ خود اس میں اتنی طاقت ہے کہ باغ دوبارہ لگا سکے اور نہ اس کی اولاد اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے، اسی طرح منافق صدقہ و خیرات کرتا ہے مگر ریاکاری سے کام لیتا ہے تو قیامت کے دن، جو نہایت احتیاج کا وقت ہوگا، اس کا ثواب ضائع ہو جائے گا اور اس وقت ثواب حاصل کرنے کے لیے دوبارہ نیکی کا وقت بھی نہیں ہوگا۔ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی ایک دوسری تفسیر آئی ہے، جس کی تائید عمر رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مثال اس شخص کی ہے جو عمر بھر نیک عمل کرتا رہتا ہے، لیکن آخر عمر میں اس کی سیرت بدل جاتی ہے اور نیک عمل کے بجائے برے عمل کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی پہلی نیکیاں بھی برباد کر لیتا ہے اور قیامت کے دن، جو بہت تنگی کا وقت ہوگا، وہ نیکی اس کے کچھ کام نہ آئے گی اور اس نازک وقت میں اس کا عمل اس سے خیانت کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ لوگوں کی نگاہ میں جنتیوں کے سے عمل کرتا ہے، حالانکہ وہ دوزخی ہوتا ہے اور بعض دفعہ بندہ لوگوں کی نگاہ میں دوزخیوں کے سے عمل کرتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے اور اعمال کا دار و مدار تو آخری وقت کے اعمال پر ہے۔'' [ بخاری، الرقاق، باب الأعمال بالخواتيم ...... : ٦٤٩٣، عن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ ]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں اور اس میں سے گندی چیز کا ارادہ نہ کرو، جسے تم خرچ کرتے ہو، حالانکہ تم اسے کسی صورت لینے والے نہیں، مگر یہ کہ اس کے بارے میں آنکھیں بند کر لو اور جان لو کہ بے شک اللہ بڑا بے پروا، بے حد خوبیوں والا ہے ﴿۲۶۷﴾

② مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ : میں ''مِنْ'' تبعیضیہ اور ''كُلِّ الثَّمَرٰتِ'' کی وجہ سے ''ہر قسم کے کچھ نہ کچھ پھل'' ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیت 267 ① اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ ...... : اوپر کی آیات میں بتایا ہے کہ صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیت کے لیے شرط یہ ہے کہ اخلاص و ایمان ہو اور یہ بھی بتایا ہے کہ ریا کاری، احسان جتلانے اور تکلیف دینے سے صدقہ ضائع ہو جاتا ہے اور پھر مثالوں سے وضاحت کر کے سمجھایا ہے۔ اب اس آیت میں قبولیت صدقہ کے لیے ایک اور شرط بیان کی ہے کہ صدقہ میں دی جانے والی چیز کا عمدہ اور طیب ہونا ضروری ہے، اگر کوئی شخص ردی چیز دے گا تو وہ اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوگی۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں اتری، ہم کھجوروں والے تھے تو ہر آدمی اپنے درختوں میں سے زیادہ یا کم درختوں کے مطابق لے کر آتا تھا، کوئی آدمی ایک خوشہ اور کوئی دو خوشے لا کر مسجد میں لٹکا دیتا۔ اہل صفہ کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہوتا تھا تو ان میں سے جب کسی کو بھوک لگتی تو وہ خوشے کے پاس آ کر اپنے عصا سے ضرب لگاتا تو اس میں سے نیم پختہ اور پختہ کھجوریں گر پڑتیں اور وہ کھا لیتا۔ کچھ لوگ جنھیں نیکی میں رغبت نہ تھی، وہ نکمے اور ردی خوشے لے آتے اور ایسے خوشے بھی جو ٹوٹے ہوئے ہوتے اور انھیں لٹکا دیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ...... ﴾ مطلب یہ کہ اگر تم میں سے کسی کو اس جیسا تحفہ دیا جائے جو اس نے دیا ہے تو وہ اسے کسی صورت نہ لے، مگر چشم پوشی اور حیا کی وجہ سے۔ براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، اس کے بعد ہم میں سے ہر ایک اپنی سب سے عمدہ چیز لے کر آتا۔ [ ترمذی، التفسیر، باب ومن سورۃ البقرۃ : ۲۹۸۷ و صححہ الألبانی ]

گو شان نزول میں نفل صدقے کا ذکر ہے مگر یہ حکم فرض زکوٰۃ اور نفل صدقے دونوں کو شامل ہے۔ سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے میں '' جُعْرُوْر '' اور '' لَوْن الْحُبَيْق '' (دو ردی قسم کی کھجوریں) وصول کرنے سے منع فرمایا۔'' [ أبوداؤد، الزکوۃ، باب ما لا یجوز من الثمرۃ ...... : ۱۶۰۷، و صححہ الألبانی ]

② ''لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ'' میں ''لَسْتُمْ'' نفی کی تاکید ''بِاٰخِذِيْهِ'' کی باء کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''تم اسے کسی صورت لینے والے نہیں'' کیا گیا ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۖۙ ﴿۲۶۸﴾

شیطان تمھیں فقر کا ڈراوا دیتا ہے اور تمھیں شرمناک بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمھیں اپنی طرف سے بڑی بخشش اور فضل کا وعدہ دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۸﴾

③ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ...... : لفظ طیب جس طرح عمدہ مال کے معنی میں آتا ہے اسی طرح اس میں وہ مال بھی آ جاتا ہے جو حلال طریقے سے کمایا ہوا ہو، پس معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کی راہ میں پاکیزہ اور حلال طریقے سے کمایا ہوا مال خرچ کرو، خبیث یعنی حرام مال سے صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے، وہ قبول نہیں کرتا مگر پاک کو۔'' [ مسلم، الزکوۃ، باب قبول الصدقة ...... : ۱۰۱۵، عن أبی هريرة ﷺ ]

④ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: انسانی کمائی کے بڑے ذرائع چار ہیں، زراعت، صنعت، تجارت اور ملازمت۔ کمائی جس طریقے سے بھی ہو اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ بعض لوگ کہتے ہیں مالِ تجارت میں زکوٰۃ نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال کر کے ان کا رد فرمایا ہے۔[ بخاری، الزکوۃ، باب صدقة الكسب والتجارة، قبل ح : ۱۴۴۵] البتہ زمین سے حاصل ہونے والی فصل کا عشر فصل اٹھاتے ہی ادا کرنا ہو گا، اگر نصاب کو پہنچ جائے، جو 600 کلوگرام ہے۔ اس آیت میں ﴿ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ سے مراد فصل پر عشر یا نصف عشر ہے۔ اگر پانی زمین سے کھینچ کر لگایا جائے تو 5 فیصد، اگر بارانی یا نہری ہو تو 10 فیصد۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا رسالہ ''احکامِ زکوٰۃ و عشر۔''

⑤ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ: یعنی اللہ تعالیٰ کو تمھارے مال کی ضرورت نہیں، وہ تو سب سے زیادہ بے پروا اور ہر تعریف کے لائق ہے، یہ سب تمھارے ہی فائدے کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت 268 ① اَلْفَحْشَآءِ : کوئی بھی قول یا فعل جس میں بہت بڑی قباحت ہو (راغب) مثلاً زنا، قوم لوط کا عمل وغیرہ، یہاں بہت قبیح درجے کا بخل مراد ہے۔

② اوپر کی آیت میں عمدہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی، اب یہاں شیطان کے وسوسے سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ (رازی)

③ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ : یعنی انسان کے دل میں وہم اور وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے کہ اگر نیک کاموں میں خرچ کرو گے تو فقیر ہو جاؤ گے اور '' فَحْشَآءُ '' یعنی شرمناک بخل کی ترغیب دیتا اور اس پر اکساتا رہتا ہے۔ '' فَحْشَآءُ '' سے بے حیائی اور بدکاری کے کام بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ شیطان ان میں مال صرف کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ صدقہ و خیرات تمھارے گناہوں کا کفارہ بھی ہو گا اور اس پر تمھیں کئی گنا زیادہ اجر بھی ملے گا اور مال میں

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

دانائی عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے دانائی عطا کی جائے تو بلاشبہ اسے بہت زیادہ بھلائی دے دی گئی اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر جو عقلوں والے ہیں ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو بھی خرچ کرو، کوئی خرچ، یا نذر مانو، کوئی نذر تو بے شک اللہ اسے جانتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۲۷۰﴾

برکت بھی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر روز جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک دعا کرتا ہے، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کی جگہ اور دے اور دوسرا بد دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! (ہاتھ) روکنے والے کے مال کو تلف کر دے۔'' [بخاری، الزکاۃ، باب قول اللہ تعالی : ﴿ فأما من أعطی...... ﴾ : ۱۴۴۲، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: (( مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ )) ''صدقہ مال کو کچھ بھی کم نہیں کرتا۔'' [ مسلم، البر والصلۃ، باب استحباب العفو والتواضع : ۲۵۸۸، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ]

آیت 269 ① يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ : یہاں ''الْحِكْمَةَ'' سے مراد دین کا صحیح فہم اور علم وفقہ میں صحیح بصیرت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رشک دو خوبیوں کے سوا کسی پر جائز نہیں، ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا، پھر اسے (راہ) حق میں خرچ کرنے کی مکمل قدرت (توفیق) دی اور ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی، تو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔'' [ بخاری، العلم، باب الاغتباط فی ...... : ۷۳، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ]

② اُولُوا الْاَلْبَابِ : '' اَلْبَابٌ '' جمع ہے '' لُبٌّ '' کی، جس کے معنی صاف ستھری اور پاکیزہ عقل کے ہیں، ہر عقل کو '' لُبٌّ '' نہیں کہتے۔ (راغب) '' اُولُوا الْاَلْبَابِ '' کا ترجمہ جمع ہونے کی وجہ سے ''جو عقلوں والے ہیں'' کیا گیا ہے۔ جبکہ عام تراجم میں ''عقل والے'' ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیت 270 ① وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ ......: نذر کا معنی ہے، اپنے آپ پر وہ چیز فرض کر لینا جو فرض نہیں تھی، مثلاً کوئی نفل نماز یا نفل روزہ یا صدقہ یا نفل حج وغیرہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک نذر مطلق اور دوسری نذر معلق۔ نذر مطلق یہ ہے کہ کوئی شرط لگائے بغیر صرف اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ پر کوئی نیکی لازم کر لے، مثلاً یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے ہمیشہ یا اتنے دن تہجد پڑھوں گا، یا عمرہ کروں گا۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے اور اسے پورا کرنا ضروری ہے۔ نذر معلق یہ ہے کہ کسی شرط کے ساتھ نذر مانے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں فلاں نیکی کروں گا، مثلاً صدقہ یا نوافل وغیرہ۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آدمی کی شرط سے مستغنی ہے، وہ اس کی وجہ سے اس کی مراد نہیں لائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نذر نہ مانا کرو، اس لیے کہ نذر تقدیر میں طے شدہ کاموں میں کچھ فائدہ نہیں دیتی،

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَ یُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے اور یہ تم سے تمھارے کچھ گناہ دور کرے گا اور اللہ اس سے جو تم کر رہے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ (۲۷۱)

---

صرف اتنا ہوتا ہے کہ بخیل سے مال نکل آتا ہے۔'' [ مسلم، النذر، باب النهي عن النذر...... : ۱٦٤٠، عن أبي هريرة ﷺ ] البتہ اگر وہ کام ہو جائے تو نذر پوری کرنا پڑے گی۔ گناہ کے کام کی نذر پوری کرنا جائز نہیں۔ اگر نذر پوری نہ کر سکے تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا جو وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ ( ۸۹ )۔

❷ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُهٗ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں تمھاری نیت اور عمل سے واقف ہے۔ اس میں ایک طرف مخلصین کے لیے وعدہ ہے اور دوسری طرف ریا کار اور غیر اللہ کی نذریں ماننے والوں کے لیے وعید بھی ہے کہ ایسے لوگ ظالم ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کسی صورت رہائی نہیں ہو سکے گی۔

**آیت 271** ❶ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ : ''صَدَقَةٌ'' کا لفظ ''صِدْقٌ'' سے نکلا ہے، یعنی وہ مال جو آدمی صدقِ دل سے خرچ کرتا ہے، عموماً یہ فقط نفل صدقے پر بولا جاتا ہے لیکن بعض اوقات فرض صدقے پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ ...... ﴾ [ التوبة : ٦٠ ] ''صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں اور ان پر مقرر عاملوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں الفت ڈالنی مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے میں اور تاوان بھرنے والوں میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافروں میں ( خرچ کرنے کے لیے ہیں )۔''

❷ فَنِعِمَّا هِیَ : یہ اصل میں '' نِعْمَ مَا '' ہے جس میں '' مَا '' بمعنی '' شَيْءٌ '' ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''تو یہ اچھی بات ہے'' اس میں علانیہ صدقہ کی تعریف کی گئی ہے، بشرطیکہ خالص نیت سے ہو اور ریا سے خالی ہو، کیونکہ اس سے آدمی بخل اور حقوق ادا نہ کرنے کی تہمت سے بچتا ہے اور اس سے دوسرے اہل خیر کو صدقہ کرنے کی ترغیب ہوتی ہے، جیسا کہ جنگ تبوک کے موقع پر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال لا کر پیش کر دیا، اسی طرح دوسرے صحابہ نے بڑھ چڑھ کر صدقہ کیا۔

❸ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا : یعنی صدقہ علانیہ دینا بھی گو اچھا ہے مگر پوشیدہ طور پر دینا زیادہ فضیلت رکھتا ہے، کیونکہ یہ ریا سے بعید ہوتا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے نفل صدقات مراد ہیں۔ ( شوکانی ) اس کے برعکس فرض زکوٰۃ کو پوشیدہ طور پر دینا جائز ہے، مگر اسے لوگوں کے سامنے دینا افضل ہے، ورنہ زکوٰۃ نہ دینے کی تہمت لگے گی، جب کہ نماز اور زکوٰۃ ایمان کے بنیادی ارکان ہیں۔ نیز طبری نے اس پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ ( فتح الباری: ۲۲/٦ )

متعدد احادیث میں نفل صدقات کو پوشیدہ طور پر دینے کی فضیلت آئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان سات آدمیوں میں، جن کو عرش کا سایہ نصیب ہوگا، ایک وہ شخص شمار کیا جس نے دائیں ہاتھ سے صدقہ کیا اور اسے چھپا کر کیا، حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے سو تمھارے اپنے ہی لیے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۷۲﴾

معلوم نہیں کہ دائیں نے کیا خرچ کیا۔ [ بخاري، الزكاة، باب الصدقة باليمين : ۱۴۲۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] اس شخص کے واقعہ سے بھی خفیہ صدقے کی فضیلت اور برکت معلوم ہوتی ہے جس نے ایک رات خفیہ صدقہ ایک چور، ایک رات ایک زانیہ اور ایک رات ایک غنی کو دے دیا۔ [ بخاري، الزكوة، باب إذا تصدق على ...... : ۱۴۲۱، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

④ وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ : چھپا کر فقراء کو دینے میں ان کی پردہ پوشی ہوتی ہے اور ان کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔

⑤ مِنْ سَيِّاٰتِكُمْ : "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "کچھ گناہ" کیا ہے، یعنی کم یا زیادہ جتنا مال خرچ کرے گا، اس کے لحاظ سے گناہ معاف ہوں گے۔ علاوہ ازیں کچھ گناہ ایسے ہیں جو مال خرچ کرنے سے معاف نہیں ہوتے، بلکہ ان کے لیے توبہ ضروری ہے۔

**آیت 272** ① لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ...... : اس آیت سے پہلے اور بعد میں صدقے کے مسائل و فضائل بیان ہو رہے ہیں، درمیان میں یہ کہنا کہ "تیرے ذمے ان کی ہدایت نہیں" کیا مناسبت رکھتا ہے؟ اکثر مفسرین نے تو "هُدٰىهُمْ" سے مراد کفار کی ہدایت لی ہے اور اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ رشتے دار یا ضرورت مند اگر کافر ہے تو اس پر بھی صدقہ کرو، کافر ہونے کی وجہ سے صدقے سے ہاتھ نہ روکو، کیونکہ ان (کفار) کی ہدایت تمھارے ذمے نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صحابہ اپنے مشرک رشتہ داروں کو تھوڑی سی چیز دینا بھی ناپسند کرتے تھے، پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور یہ آیت اتری: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [ السنن الكبرى للنسائي، التفسير، باب قوله : ﴿ ليس عليك هداهم ﴾ : ۳۷/۱۰، ح : ۱۰۹۸۶ ]

صلح حدیبیہ کی مدت میں اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی والدہ، جو مشرکہ تھی، ان کے پاس آئی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "میری والدہ آئی ہے، کیا میں ان سے صلہ رحمی کروں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں، اپنی والدہ سے صلہ رحمی کرو۔" [ بخاري، الأدب، باب صلة المرأة أمها ...... : ۵۹۷۹ ]

اسلام کی رحمت عام کو دیکھیے کہ مشرک پر خرچ کرنا بھی باعث ثواب ہے، بشرطیکہ وہ حالت جنگ میں نہ ہو، بلکہ کسی جانور پر خرچ کرنا بھی باعث ثواب ہے، جیسا کہ پیاسے کتے کو پانی پلانے والے شخص کی اس عمل کی وجہ سے بخشش ہو گئی۔ صحابہ نے پوچھا: "کیا جانوروں کے بارے میں بھی ہمیں اجر ملتا ہے؟" فرمایا: "جو بھی تر جگر والا (جاندار) ہے اس میں اجر ہے۔" [ بخاري، الأدب، باب رحمة الناس و البهائم : ۶۰۰۹ ] لیکن یاد رہے کہ کفار پر صرف نفل صدقہ جائز ہے، فرض زکوۃ نہیں، اس پر امت

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ٘ يَحْسَبُهُمُ

(یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ناواقف

---

کا اجماع ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ مسلمانوں کے اغنیاء سے لی جاتی ہے اور انھی کے فقراء پر لوٹائی جاتی ہے۔" [ بخاری، الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ : ۱۳۹۵ ] صدقہ فطر چونکہ فرض ہے، اس لیے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض مفسرین نے "هُدٰىهُمْ" سے مراد وہ مسلمان لیے ہیں جن کی ہدایت میں خامی ہے اور جن کا تذکرہ پچھلی آیات میں آیا ہے، یعنی ریا سے صدقہ کرنے والے، صدقہ کر کے تکلیف دینے والے، یا احسان رکھنے والے، یا نکمّی چیز خرچ کرنے والے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کا رویہ دیکھ کر تنگ دل نہ ہوں، انھیں ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

② وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ : یعنی مسلمانوں پر خرچ کرو یا کفار پر، جس مال یا وقت یا اثر و رسوخ یا علم سے کسی کو فائدہ پہنچاؤ اس کا فائدہ تمھی کو ہے، یعنی دنیا میں سعادت و برکت اور آخرت میں ثواب اور دخول جنت۔

③ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ: عام طور پر اس کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کی رضا کیا جاتا ہے، مگر جو لطف "اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے" میں ہے، وہ دوسرے لفظ میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "وَجْهِ" کا اصل معنی چہرہ ہے اور حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی خرابی بھی نہیں، کیونکہ مومن کی سب سے بڑی طلب اور تمنا اللہ تعالیٰ کے چہرے کا دیدار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔ (آمین) یہاں لفظ اگرچہ نفی کے ہیں مگر مراد نہی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے چہرے کی طلب کے سوا خرچ مت کرو۔

**آیت 273** اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب کے بعد اب خاص طور پر کچھ لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے، جو سب سے زیادہ مدد اور مالی تعاون کے حق دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی چھ صفات بیان فرمائی ہیں اور یہ ساری صفات اصحاب صفہ میں پائی جاتی تھیں، اس لیے اس آیت کے سب سے پہلے مصداق وہی ہیں، پھر قیامت تک جو لوگ بھی ان صفات کے حامل ہوں گے وہ سب سے زیادہ مالی تعاون کے حق دار ہوں گے، اب آپ وہ صفات ملاحظہ فرمائیں:

① "لِلْفُقَرَآءِ" یہاں ان کے فقر کا سبب بیان نہیں فرمایا، سورۂ حشر میں بیان فرمایا ہے: ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ ﴾ [ الحشر : ۸ ] "(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔" اب وہ خالی ہاتھ تھے، نہ ان کے پاس مال تھا نہ گھر۔ ان کے لیے مسجد نبوی میں ایک صفہ بنا دیا گیا۔ ان کی تعداد چار سو تھی جو غزوات اور مہموں پر بھیجنے کی وجہ سے کم زیادہ ہوتی رہتی تھی۔

② "الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" احصار لغت میں یہ ہے کہ آدمی جو کام کرنا چاہتا ہے اس کے کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش آ جائے، مثلاً کوئی بیماری، بڑھاپا، خرچ نہ ہونا، یا کوئی دشمن وغیرہ۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں، یعنی جہاد اور طلب علم نے انھیں کمائی کرنے سے روک دیا ہے، وہ منتظر بیٹھے ہیں کہ کب حکم ہو اور وہ جہاد کے لیے نکلیں۔ یہ لوگ اللہ کی خاطر گھر سے نکلے، اللہ کی خاطر مال مویشی چھوڑ کر فقر اختیار کیا اور اب اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں وقف کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت بھی جو مجاہد یا دین کے طالب علم کاروبار یا ملازمت کے بجائے اپنے آپ کو جہاد اور دینی علوم کے حصول کے

الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

انھیں سوال سے بچنے کی وجہ سے مال دار سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، اور تم خیر میں سے جو خرچ کرو گے سو یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۲۷۳﴾

لیے روکے ہوئے ہیں ان پر خرچ کرنا اولین فریضہ ہے۔

③ ”لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ“ یعنی جہاد اور طلب علم کی وجہ سے وہ سفر نہیں کر سکتے۔

④ ”يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ“ یعنی ان کی بے نیازی، عزت نفس اور سوال سے بچنے کی وجہ سے ناواقف آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غنی ہیں۔ بندہ (عبد السلام) عرض کرتا ہے کہ میرے والد حافظ محمد ابوالقاسم رحمہ اللہ نے مجھے اپنے طالب علمی کے زمانے کا واقعہ سنایا کہ وہ ان دنوں فیروز پور کے ایک گاؤں ”لکھوکی“ میں پڑھتے تھے، والد فوت ہو چکے تھے، گھر میں غربت تھی اور سردی کے موسم میں قمیص بھی نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ میں نے وہ چھ ماہ قمیص کے بغیر دوہر (دوہرا کھیس) لپیٹ کر گزار دیے، کسی کو پتا تک نہیں چلنے دیا کہ میرے پاس قمیص نہیں، پھر والدہ نے روئی وغیرہ کی چنائی سے حاصل ہونے والی کچھ رقم بھیجی تو انھوں نے قمیص بنائی۔ [اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ]

⑤ ”تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ“ تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ بھوک کی وجہ سے کمزوری اور چہرے کی زردی سے تم ان کا فقر پہچان لو گے، مگر یہ معنی ہو تو یہ تو ناواقف بھی پہچان لیتا ہے، اس لیے اس کا مطلب چہرے کا نور اور وہ رونق ہے جو ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ان کے چہرے پر نمایاں تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾ [الفتح: ۲۹] ”ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے، سجدے کرنے کے اثر سے۔“ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرے کی ایک خاص رونق سے پہچانے جاتے تھے۔ دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیت کی تفسیر۔

⑥ ”لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا“ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ بظاہر اس کا معنی یہ ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر لوگوں سے لپٹ کر نہیں، مگر یہ معنی درست نہیں، کیونکہ اگر یہ معنی ہو تو پچھلے دونوں جملے بے مقصد ٹھہرتے ہیں، کیونکہ جب سوال کر لیا تو تعفف (سوال سے بچنا) کہاں رہا اور پھر پہچان کے لیے چہرے کی علامت پر غور کی کیا ضرورت ہے، فقر کا اظہار تو ان کے سوال ہی سے ہو گیا، اس لیے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ نہ وہ لوگوں سے سوال کرتے ہیں نہ لپٹتے ہیں۔ یہاں ”لَا“ صرف ”يَسْـَٔلُوْنَ“ پر نہیں بلکہ ”اِلْحَافًا“ پر بھی ہے۔ دراصل یہ بھکاریوں کی عادت کی مذمت ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں، مگر ہمارے یہ فقراء ایسا نہیں کرتے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو کہے میرا باپ نامی گرامی چور نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ چور تو تھا مگر نامی گرامی نہیں، بلکہ وہ دوسرے آدمی کو تعریض کر رہا ہے کہ تمھارا باپ ایسا تھا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ )) ”مومن بہت طعن کرنے والا اور بہت لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔“ [ترمذی، البر والصلة، باب ما جاء فی اللعنة: ۱۹۷۷، عن عبد الله رضی اللہ عنہ و صححه الألبانی] اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

وہ لوگ جو اپنے اموال رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں، سو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۴﴾

تھوڑا طعن اور تھوڑی لعنت کر لیتا ہے، نہیں بلکہ تعریض ہے کہ کافر ایسا ہوتا ہے مومن نہیں۔ اس کی دلیل ایک اور حدیث سے ملاحظہ فرمائیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں جو لوگوں پر چکر لگاتا رہتا ہے، اسے ایک لقمہ یا دو لقمے اور ایک کھجور یا دو کھجوریں دے دی جاتی ہیں تو آگے چل پڑتا ہے، لیکن مسکین وہ ہے جو نہ تو اتنا مال رکھتا ہے جو اسے غنی کر دے اور نہ اس کا پتا چلتا ہے کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے سوال کرتا ہے۔'' [ بخاری، الزکاۃ، باب قول اللہ عزوجل : ﴿ للفقراء الذین احصروا ...... ﴾ : ۱۴۷۹، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ]

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے      کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

رسول اللہ ﷺ نے سوال کی بہت مذمت فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہو گی۔'' [ بخاری، الزکوۃ، باب من سأل الناس تکثرا : ۱۴۷۴، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ سے خاص طور پر اس بات کی بیعت لی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے اور پانچ نمازیں پڑھیں گے اور اطاعت کریں گے اور ایک خفیہ بات چھپا کر کہی کہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال مت کرنا۔ عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر میں نے ان آدمیوں میں سے بعض کو دیکھا کہ اس کا کوڑا گر پڑتا تو وہ کسی سے سوال نہ کرتا کہ اسے پکڑا دے۔'' [ مسلم، الزکوۃ، باب کراھۃ مسئلۃ الناس : ۱۰۴۳ ] البتہ مجبوری کی بات الگ ہے کہ مجبوری میں تو خنزیر کھانے کی بھی اجازت ہے۔ نبی ﷺ نے تین آدمیوں کے لیے سوال کی اجازت دی ہے، ایک وہ جس نے (کسی دیت کی ادائیگی یا کسی کا تاوان اٹھانے کی) کوئی ضمانت اٹھائی ہو، دوسرا وہ آدمی جسے فاقہ پہنچے اور اس کی قوم کے تین عقل مند آدمی اسے فاقہ پہنچنے کی شہادت دیں، تیسرا وہ آدمی جسے کوئی آفت پہنچے جو اس کا سارا مال برباد کر دے۔ ان تینوں کو ضرورت پوری ہونے تک سوال کی اجازت ہے، ضرورت پوری ہو جائے تو مانگنا چھوڑ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے قبیصہ! ان کے سوا جو سوال بھی ہے حرام ہے، سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔'' [ مسلم، الزکاۃ، باب من تحل له المسئلة : ۱۰۴۴، عن قبیصة بن مخارق رضی اللہ عنہ ]

**آیت 274** یہاں تک چودہ آیات میں صدقے کا بیان تھا، اس کے بعد سود کو حرام قرار دیا۔ جب صدقے کی تاکید فرمائی تو قرض دینا تو بالاولی ضروری ٹھہرا اور قرض پر سود کیوں لیا جائے۔ (موضح)

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، کھڑے نہیں ہوں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا بیع تو سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا، پھر جس کے پاس

آیت 275 ❶ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا...... :یعنی سود خور قیامت کے دن مخبوط الحواس اور پاگل ہو کر اٹھیں گے۔ دنیا میں بھی بے پناہ حرص کی وجہ سے ان کی یہی حالت ہوتی ہے۔

"الرِّبٰوا" کا لفظی معنی بڑھنا، زیادہ ہونا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾ [ الحج : ۵ ] ''پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے۔'' شریعت کی اصطلاح میں قرض دے کر اصل مال سے جو زیادہ لیا جاتا ہے اسے ربا کہتے ہیں۔ (راغب) یعنی کسی قرض پر بغیر کسی مالی معاوضہ کے محض مہلت بڑھا دینے کی بنا پر زیادہ حاصل کیا جائے۔ (ابن العربی: ۱/ ۲۹۰)

موجودہ بینکنگ کا نظام بھی واضح سود پر مبنی ہے۔ سیونگ اکاؤنٹ اور پی ایل ایس تو واضح سود ہیں، کرنٹ اکاؤنٹ میں اگرچہ سود نہیں دیا جاتا مگر بنک وہ رقم آگے سود پر چلاتا ہے، آج کل اسلامی بینکنگ کا بہت شور ہے مگر علماء نے، جن میں حنفی علماء بھی شامل ہیں، اسے سودی حیلہ پر مبنی قرار دیا ہے۔ بیمہ (انشورنس) بھی سود اور جوئے کا مرکب ہے۔ اسی طرح انعامی بانڈ بھی سود اور جوئے کا مرکب ہے۔ سود کی ایک صورت نقد اور ادھار کی قیمتوں کا فرق ہے، قسطوں کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے، حالانکہ یہ رقم سود ہے، مثلاً ایک شخص کہے کہ میں تمھیں ایک ہزار روپے ادھار قرض دیتا ہوں مگر میں تم سے گیارہ سو روپے لوں گا، اس کے سود ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اسی طرح ایک چیز جس کی قیمت سب جانتے ہیں کہ ایک ہزار ہے، بیچنے والے اور لینے والے کو بھی علم ہے، پھر وہ اسے قسطوں پر گیارہ سو میں دیتا ہے، تو یہ کیوں سود نہیں؟ سود خواہ کوئی ذاتی ضرورت کے لیے لے یا تجارت کے لیے جب اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا تو ہر طرح کا سود حرام ہے۔ اگر کوئی بچنا چاہے تو اسے واضح سود کے ساتھ سود کے حیلے اور سود کے شک والے معاملات سے بھی بچنا ہوگا۔ مزید دیکھیے آل عمران (۱۳۰)۔

❷ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا: یعنی ان کی یہ حالت اس لیے ہوگی کہ انھوں نے بیع، یعنی فروخت کو بھی سود جیسا قرار دیا اور سود کو اتنا حلال قرار دیا کہ بیع کی حلت کا سبب بھی سود کے ساتھ مشابہت کو قرار دیا، بقول زمخشری: ''انھوں نے بیع کو سود کے مشابہ سود کی حلت میں مبالغہ کے لیے قرار دیا۔'' ان ظالموں کے نزدیک بیع اور سود میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ دونوں میں نفع آتا ہے۔ آج کل کفار کی تہذیب سے متاثر نیا روشن خیال تاریک دل طبقہ بھی سود کو ایک کاروبار سمجھتا ہے، حالانکہ دونوں میں واضح کئی فرق ہیں جن میں سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے، دونوں برابر کیسے ہو گئے؟ علاوہ ازیں ایک فرق یہ ہے کہ تجارت میں نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی ہوتا ہے جب کہ سودی قرض لینے والے کو نفع

مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت آئے پس وہ باز آ جائے تو جو پہلے ہو چکا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو دوبارہ ایسا کرے تو وہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۷۵﴾

ہو یا نقصان سود خور نے (خواہ ایک شخص ہو یا بنک) ہر حال میں پوری رقم مع سود وصول کرنی ہے جو آئندہ بڑھتی ہی جائے گی۔ اس لیے سود ظلم اور مفت خوری کی بدترین شکل ہے۔

③ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ : شیطان کا آدمی کو نقصان پہنچانا، خصوصاً اس کے دماغ پر حملہ آور ہونا کئی آیات و احادیث سے ثابت ہے، مثلاً چوکے مارنا اور غصہ دلانا، فرمایا: ﴿مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ [ المؤمنون : ۹۷ ] ''شیطانوں کی اکساہٹوں سے۔'' بہکا کر حیران چھوڑ دینا، فرمایا: ﴿كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ﴾ [ الأنعام : ۷۱ ] ''اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا، اس حال میں کہ حیران ہے۔'' تکلیف یا بیماری میں مبتلا کر دینا، فرمایا: ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ﴾ [ صٓ : ۴۱ ] ''بے شک شیطان نے مجھے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے۔'' بھلا دینا، فرمایا: ﴿وَ مَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾ [ الکہف : ۶۳ ] ''اور مجھے وہ (بات) نہیں بھلائی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شیطان انسان میں خون کی گردش کی طرح گردش کرتا ہے۔'' [ بخاری، الاعتکاف، باب زیارۃ المرأۃ ...... : ۲۰۳۸ ] الغرض! شیطان کے انسان کو چھو کر خبطی بنا دینے سے انکار قرآن و حدیث سے انکار ہے۔ البتہ مجھے آج تک کوئی ایسی حدیث یا رسول اللہ ﷺ کے زمانے کا کوئی واقعہ نہیں ملا جس میں ذکر ہو کہ شیطان یا جن نے کسی آدمی کے جسم میں داخل ہو کر اس کی زبان پر گفتگو کی ہو، صرف مشاہدہ اس کی ناکافی دلیل ہے، کیونکہ " اَلْجُنُوْنُ فُنُوْنٌ " یعنی جنون کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ واللہ اعلم!

④ فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ : یعنی سود کی حرمت کا حکم آنے کے بعد جو سود سے باز آ جائے وہ پہلے جو سود لے چکا ہے اس کا مطالبہ اس سے نہیں کیا جائے گا، البتہ معاملہ اس کا اللہ کے سپرد ہے وہ اس کے آئندہ طرز عمل، ندامت، توبہ کو دیکھ کر فیصلہ فرمائے گا۔ یاد رہے یہ اس وقت کی بات ہے جب سود کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اب سود کی حرمت کو جانتے ہوئے کوئی شخص ساری عمر سود کھا کر آخر میں چھوڑ دے تو وہ مال اس کا نہیں ہو جائے گا بلکہ اسے حتی الامکان اس کے مالکوں کو لوٹانا ہوگا اور جو نہ لوٹا سکے اس پر توبہ اور استغفار کرنا ہوگا۔

⑤ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ : یہ سود خوروں کے لیے سخت وعید ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر، سود دینے والے پر، سود لکھنے والے پر اور سودی لین دین کے گواہوں پر اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔'' [ مسلم، المساقاۃ، باب لعن آکل الربا و موکلہ : ۱۵۹۸ ] بعض نے "وَ مَنْ عَادَ"

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ایسے شخص سے محبت نہیں رکھتا جو سخت ناشکرا، سخت گنہگار ہو ﴿۲۷۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۷﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو باقی ہے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو ﴿۲۷۸﴾

---

کے یہ معنی کیے ہیں کہ حرام قرار دیے جانے کے بعد بھی اگر کوئی بیع اور سود کو برابر قرار دے گا اور سود کو حلال سمجھ کر کھائے گا تو ایسا شخص چونکہ کافر ہے، اس لیے اسے ہمیشہ کے لیے دوزخی قرار دیا ہے۔ (شوکانی)

**آیت 276** ① **يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا:** یعنی سود کا مال بظاہر جتنا بھی بڑھ جائے حقیقت میں نہیں بڑھتا، فرمایا: ﴿وَمَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الروم : ۳۹] ''اور جو کوئی سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ لوگوں کے اموال میں بڑھ جائے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سود خواہ کتنا ہی بڑھ جائے انجام اس کا قلت ہی ہوگا۔'' [ أحمد : ۱/ ٤٢٤، ح : ٤٠٢٥، عن ابن مسعود و صححه محققه و وافقه الألباني في صحيح ابن ماجه ]

وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سودی مال میں خیر و برکت عطا نہیں فرماتا، چنانچہ سود خور پر دنیا بھی لعنت بھیجتی ہے اور آخرت میں بھی اسے وہ سزا ملے گی جو کسی دوسرے مجرم کو نہیں ملے گی۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتا ہے اور ان میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص پاک کمائی میں سے ایک کھجور بھی صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ پاک مال ہی کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتا ہے، پھر اسے صدقہ کرنے والے کے لیے اس طرح پالتا پوستا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے گھوڑی کے بچے کی پرورش کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ صدقہ (بڑھ کر) پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔'' [ بخاري، الزكاة، باب الصدقة من كسب طيب : ١٤١٠۔ مسلم : ١٠١٤، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

② **كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ:** یعنی مال دار ہو کر محتاج کو قرض بھی مفت نہ دے جب تک سود نہ رکھ لے، یہ نعمت کی سخت ناشکری ہے۔ (موضح)

**آیت 277** **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ......:** اللہ تعالیٰ کفر و ایمان دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر فرماتا ہے، تاکہ دونوں پہلو سامنے رہیں۔ ربا کی آیتوں کے درمیان ایمان والوں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایمان، عملِ صالح، نماز اور زکوٰۃ سودی کاروبار سے بچنے کا اہم ذریعہ ہیں۔

**آیت 276** **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ......:** اس آیت میں واضح حکم دیا گیا کہ اگر تم مومن ہو تو تمھارا جو سود لوگوں

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کے اعلان سے آگاہ ہو جاؤ اور اگر توبہ کر لو تو تمھارے لیے تمھارے اصل مال ہیں، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا ﴿۲۷۹﴾ اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو آسانی تک مہلت دینا لازم ہے اور یہ بات کہ صدقہ کر دو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾

کے ذمے ہے چھوڑ دو۔ معلوم ہوا کہ سود اور ایمان دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے وہ تمام سود باطل قرار دے دیے جو قریش، ثقیف اور دوسرے عرب قبائل میں سے بعض تاجروں کے اپنے قرض داروں کے ذمے باقی تھے، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا: ''جاہلیت کے زمانے کے تمام سود میرے قدموں کے نیچے پامال کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلا سود جو میں باطل قرار دیتا ہوں وہ ہمارے سودوں میں سے عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، وہ پورے کا پورا چھوڑ دیا گیا ہے۔'' [ مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ : ۱۲۱۸، عن جابر رضی اللہ عنہ ]

آیت 279 ① فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: '' بِحَرْبٍ '' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ''بڑی جنگ'' ترجمہ کیا ہے۔ '' أَذِنَ يَأْذَنُ (س) '' کا صلہ اگر لام ہو، مثلاً ''أَذِنَ لَهُ'' تو اس کا معنی ''اِسْتَمَعَ'' ہوتا ہے یعنی کان لگانا، سننا اور اگر ''أَذِنَ بِهِ'' ہو تو اس کا معنی ''عَلِمَ بِهِ'' ہوتا ہے یعنی جاننا، آگاہ ہونا۔ خبردار ہونا۔ ( قاموس ) یعنی اگر تم نے سود نہ چھوڑا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سے آگاہ اور خبردار ہو جاؤ۔ اور یہ وہ وعید ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے دوسرے کسی جرم کے بارے میں اتنے واضح الفاظ میں نہیں دی گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن سیرین، حسن بصری اور بعض دیگر ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک سود خور کو توبہ پر مجبور کیا جائے گا، اگر پھر بھی روش نہ بدلے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (ابن کثیر)

② لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ: یعنی اصل مال سے زائد وصول کرو تو یہ تمھارا لوگوں پر ظلم ہو گا اور اگر تمھیں اصل مال بھی نہ ملے تو یہ لوگوں کا تم پر ظلم ہو گا اور یہ دونوں چیزیں ہی انصاف کے خلاف ہیں۔ (ابن کثیر)

آیت 280 وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ ......: جاہلیت میں قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں سود در سود سے اصل رقم میں اضافہ ہوتا جاتا، جس سے تھوڑی سی رقم ایک پہاڑ بن جاتی اور اس کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی، آج کل بھی یہی حال ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کوئی تنگدست ہو تو (سود تو درکنار) آسانی تک اسے مہلت دو اور اگر قرض بالکل معاف کر دو تو زیادہ اچھا ہے۔ احادیث میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے، بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرضے کے برابر ثواب ملے گا۔'' پھر میں نے آپ کو یہ

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ

اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿٢٨١﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب آپس میں ایک مقرر مدت تک قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور ایک لکھنے والا تمھارے درمیان انصاف کے ساتھ لکھے اور کوئی لکھنے والا اس سے انکار نہ کرے کہ لکھے جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے، سو اسے لازم ہے کہ لکھ دے اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق (قرض) ہو، اور اللہ سے ڈرے جو

---

فرماتے ہوئے بھی سنا: ''جس نے کسی تنگدست شخص کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرض سے دگنا صدقے کے برابر ثواب ملے گا۔'' میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرض کے برابر صدقے کا ثواب ملے گا اور پھر میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے بھی سنا کہ جس شخص نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرض سے دگنا صدقے کے برابر ثواب ملے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''قرض چکانے کی مدت تک اسے قرض کے برابر صدقے کا ثواب ملے گا اور اگر قرض چکانے کی مدت کے آنے پر مہلت دے تو اسے قرض سے دگنا صدقے کے برابر ثواب ملے گا۔'' [ مسند أحمد : ٣٦٠/٥، ح : ٢٣١١٠ـ الصحيحة : ٨٦ ]

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اپنے قرض دار کو مہلت دی، یا قرض معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے دن) اپنا سایہ عطا فرمائے گا۔'' [مسلم، الزهد، باب حديث جابر الطويل ...... : ٣٠٠٦، عن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ ]

**آیت 281** اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا کے زوال پذیر ہونے اور اس کے اموال وغیرہ کے فانی ہونے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور ہر عمل کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا ہونے کے ساتھ نصیحت فرمائی ہے۔ (ابن کثیر)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''قرآن میں سب سے آخر میں جو آیت اتری وہ یہ ہے۔'' [ السنن الكبرى للنسائي : ٣٩/١٠، ٤٠، ح : ١٠٩٩١، ١٠٩٩٢، صحيح ـ هداية المستنير : ٨٧٠ ]

**آیت 282** ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ : اس آیت کو " آيَةُ الدَّيْنِ " یا " آيَةُ الْمُدَايَنَةِ " کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن کی سب سے لمبی آیت ہے، جب سود حرام کیا گیا تو قرض کا صحیح طریقہ بیان کرنا ضروری تھا، چنانچہ وہ اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور اصولی طور پر تین باتیں ضروری قرار دی ہیں، ایک اسے لکھ لینا، دوسری مدت مقرر کر لینا، تیسری گواہ بنا لینا۔ عموماً لوگ ادھار یا قرض کے معاملے میں تحریر کو معیوب اور باہمی بے اعتمادی کی علامت سمجھتے ہیں، آیت کے آخر میں اس کی حکمت بیان فرما دی گئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف والی، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی اور ہر قسم کے

وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اس کا رب ہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے۔ پھر اگر وہ شخص جس کے ذمے حق (قرض) ہے، بے سمجھ یا کمزور ہے، یا وہ طاقت نہیں رکھتا کہ خود لکھوائے تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو گواہوں کو گواہ بنا لو، پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو، (اس لیے) کہ دونوں میں سے ایک بھول جائے تو ان میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ اور گواہ جب بھی بلائے جائیں انکار نہ کریں۔ اور اس سے مت اکتاؤ وہ چھوٹا (معاملہ) ہو یا بڑا کہ اسے اس کی مدت تک لکھو۔ یہ کام اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والا اور شہادت کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، مگر یہ کہ نقد سودا ہو، جسے تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اسے نہ لکھو۔ اور جب آپس میں خرید و فروخت کرو تو گواہ بنا لو، اور نہ کسی لکھنے والے کو تکلیف دی جائے اور نہ کسی گواہ کو اور اگر ایسا کرو گے تو بلاشبہ یہ تم میں (پائی جانے والی بہت) بڑی نافرمانی ہے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمھیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۲۸۲﴾

---

شک و شبہ سے بچانے والی چیز ہے۔ اس بنا پر ایسے معاملات میں اس قسم کی احتیاط مناسب ہے، تاکہ آئندہ جھگڑا پیدا نہ ہو سکے۔ (ابن کثیر)

② **اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى :** اس سے ادھار کی ادائیگی کی مدت مقرر کرنا ضروری ثابت ہوا۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اس آیت سے بیع سلم کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔'' (شوکانی) بیع سلم یا سلف یہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت پیشگی ادا کر دی جائے اور وہ چیز مقرر کردہ وقت پر بعد میں وصول کر لی جائے۔ اس بیع کی شرائط بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیں، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو دیکھا کہ اہل مدینہ دو سال یا تین سال

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع

اور اگر تم کسی سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو ایسی گروی لازم ہے جو قبضے میں لے لی گئی ہو، پھر اگر تم میں سے کوئی کسی پر اعتبار کرے تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور شہادت مت چھپاؤ اور جو اسے چھپائے تو بے شک وہ، اس کا دل گناہ گار ہے اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۲۸۳﴾

کے لیے کھجور میں بیع سلف کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی چیز میں بیع سلف کرے وہ مقررہ ماپ تول میں اور مقررہ مدت تک کرے۔'' [ بخاری، المساقاۃ، باب السلم : ۱٦۰٤ ] نیز ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مقررہ قیمت کا بھی ذکر ہے۔

③ اس آیت کریمہ سے بظاہر قرض کا لکھنا واجب معلوم ہوتا ہے، مگر اس سے اگلی آیت میں ﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ سے معلوم ہوا کہ یہ حکم واجب نہیں مستحب ہے۔

④ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ : یعنی جو دیانت، امانت اور اخلاق کے اعتبار سے تم میں قابل اعتماد سمجھے جاتے ہوں، نیز وہ مسلمان ہوں، عاقل، بالغ، فرائض کے پابند اور کبیرہ گناہوں سے بچنے والے بھی ہوں، کیونکہ اہل اسلام کے ہاں یہی لوگ پسندیدہ ہیں۔ غیر مسلم کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔

⑤ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً : یعنی اگر تجارت میں لین دین نقد ہو، ادھار نہ ہو تو گواہ بنا لینے ہی کافی ہیں، لکھنا ضروری نہیں، کیونکہ اس میں تکلیف ہے اور گواہ بنا لینا بھی واجب نہیں، مستحب ہے۔ ( شوکانی )

⑥ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ : ''اور نہ کسی لکھنے والے کو تکلیف دی جائے اور نہ کسی گواہ کو۔'' یہ ترجمہ '' لَا يُضَآرَّ '' فعل مجہول کی صورت میں ہے۔ یہ فعل معروف بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں ترجمہ ہوگا ''نہ لکھنے والا نقصان پہنچائے اور نہ گواہ'' مثلاً لکھنے والا غلط بات لکھ دے، جس سے صاحب حق یا مقروض کو نقصان پہنچے، یا گواہ شہادت میں ہیر پھیر کر کے غلط گواہی دے اور کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچایا جانا یہ ہے کہ انھیں ان کی مشغولیت کے وقت تنگ کر کے بلایا جائے یا غلط شہادت پر مجبور کرنے کے لیے خوف زدہ کیا جائے وغیرہ۔

آیت 283 ① وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا...... : یہ بیع اور قرض کی ایک دوسری شکل ہے، یعنی اگر تم سفر میں قرض کا معاملہ کرو اور تمھیں لکھنے والا نہ مل سکے، یا لکھنے کے لیے قلم دوات وغیرہ میسر نہ ہوں تو مقروض کو چاہیے کہ قرض دینے والے کے پاس کوئی چیز رہن ( گروی ) رکھ دے۔ سفر کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ معاملہ زیادہ تر سفر میں پیش آتا ہے، ورنہ رہن ( گروی ) رکھنا حضر میں بھی جائز ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر عملاً اس کی

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور اگر تم اسے ظاہر کرو جو تمھارے دلوں میں ہے، یا اسے چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۸۴﴾ یہ رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی جانب سے اس کی طرف

وضاحت کر دی۔ [ بخاری، البیوع، باب شراء الإمام الحوائج بنفسه : ۲۰۹۶۔ مسلم : ۱۶۰۳ ] چنانچہ سفر میں رہن نص قرآنی سے ثابت ہے اور حضر میں رسول اللہ ﷺ کے فعل سے۔ (شوکانی)

② جو چیز رہن رکھی جائے اگر دودھ والا جانور ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے چارا ڈالنے کے بدلے اس کا دودھ پینے کی اجازت دی، اسی طرح گھوڑے، اونٹ، گدھے یا خچر وغیرہ پر اس کے چارے کے بدلے سواری کی اجازت دی۔ [ بخاری، فی الرهن فی الحضر، باب الرهن مرکوب : ۲۵۱۱ عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ ] ان کے علاوہ گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا منع ہے، یہ سود کے زمرے میں آتا ہے، مثلاً قرض پر رقم لے کر زمین رہن رکھ دی جائے تو گروی لینے والا اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا بلکہ اگر کاشت کرے تو اس کا ٹھیکہ وغیرہ قرض میں وضع کرنا ہوگا۔

③ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ : مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص قرض لینے والے کا اعتبار کرے اور اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر اسے قرض دے دے تو اسے بھی چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کا قرض ادا کر دے۔

④ فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ : اس میں "اٰثِمٌ" (گناہ) کی نسبت دل کی طرف کی ہے، اس لیے کہ چھپانا دل کا فعل ہے اور سب سے پہلے اس کا خیال دل ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ وعید ہے کہ شہادت چھپانا اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس سے دل گناہ گار ہو جاتا ہے۔ [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ ]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَكْبَرُ الْكَبَائِرِ ، اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَ قَتْلُ النَّفْسِ وَ عُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَ قَوْلُ الزُّوْرِ أَوْ قَالَ وَ شَهَادَةُ الزُّوْرِ )) ''کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ اللہ کے ساتھ شریک بنانا، کسی شخص کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی اور جھوٹی بات، یا فرمایا، جھوٹی گواہی ہیں۔'' [ بخاری، الدیات، باب : ﴿ و من أحیاها ﴾ : ۶۸۷۱، عن أنس رضی اللہ عنہ ]

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''گواہی چھپانا بھی اکبر الکبائر میں سے ہے۔'' (طبری)

**آیت 284، 285** ① لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ : یہ پچھلی آیت میں موجود ﴿ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ کی علت ہے، یعنی جب آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔

② يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ : اس سے معلوم ہوا کہ دل کے فعل پر بھی محاسبہ ہوگا، مگر اس سے مراد دل کے وہ اعمال ہیں جن پر انسان کو اختیار ہو اور جن کا وہ پختہ ارادہ کر لے، مثلاً ایمان، کفر، کسی نیکی یا بدی کا عزم اور پختہ ارادہ، مثلاً ایک شخص دل میں کفر رکھتا

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

نازل کیا گیا اور سب مومن بھی ، ہر ایک اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے ۔ اور انھوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ، تیری بخشش مانگتے ہیں اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸۵﴾

ہے، یا چوری اور زنا کا عزم رکھتا ہے، مگر اسے کفر کے اظہار کا یا چوری اور زنا پر عمل کا موقع نہیں ملتا تو اس پر محاسبہ ضرور ہو گا۔ رہے وہ خیالات جو انسان کی طاقت اور اختیار سے باہر ہیں، خود بخود آتے جاتے رہتے ہیں، اگر آدمی ان کو اپنے دل میں جگہ نہ دے تو ان پر محاسبہ نہیں ہو گا، جیسا کہ اس سورت کی آخری آیت ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ میں ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیت ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ……﴾ نازل ہوئی تو صحابہ پر گراں گزری، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم نماز، روزہ وغیرہ اعمال تو بجا لا رہے ہیں، مگر اس آیت (دل کی باتوں پر محاسبہ) کے مطابق تو بڑی مشکل پڑے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم بھی اہل کتاب کی طرح '' سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا '' کہنا چاہتے ہو، بلکہ تم یوں کہو: (( سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ )) ''ہم نے سن لیا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا اقرار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ نازل فرمائی اور آیت ﴿اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ کو منسوخ کر دیا اور جب اگلی آیت: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ نازل فرمائی تو اس کے ہر دعائیہ جملہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (( قَدْ فَعَلْتُ )) ''میں نے ایسا کر دیا۔'' [ مسند أحمد : ۲/۴۱۳، ح : ۹۳۶۳۔ مسلم، الإیمان، باب بیان تجاوز اللہ …… : ۱۲۵ ]

واضح رہے کہ یہاں دوسری آیت سے پہلی کے منسوخ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پہلی آیت میں جو ابہام تھا اس کی وضاحت فرما دی۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نسخ کا لفظ وضاحت کے معنی میں بھی استعمال کرتے تھے۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے لیے میری امت کے لوگوں کے وہ خیالات اور وساوس معاف کر دیے گئے ہیں جو ان کے دلوں میں آئیں، تاوقتیکہ ان کو زبان پر نہ لائیں، یا ان پر عمل نہ کریں۔''
[ مسلم، الإیمان، باب تجاوز اللہ عن …… : ۱۲۷۔ بخاری : ۵۲۶۹ ] (ابن کثیر، شوکانی)

③ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ: یعنی ایسا نہیں کہ ہم بعض انبیاء کو مانتے ہوں اور بعض کا انکار کرتے ہوں، بلکہ ہم تمام انبیاء کو مانتے ہیں۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ٝ وَاغْفِرْ لَنَا ٝ وَارْحَمْنَا ٝ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ؑ ﴿۲۸۶﴾

ع ۸

اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق، اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا، اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں، اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی بھاری بوجھ نہ ڈال، جیسے تو نے اسے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب! اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، تو ہی ہمارا مالک ہے، سو کافر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ﴿۲۸۶﴾

**آیت 286** ① یہ اور اس سے پہلی آیت رسول اللہ ﷺ کو معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس عطا فرمائی گئیں۔ [ مسلم، الإیمان، باب في ذکر سدرة المنتهى : ۱۷۳ ] ان آیات کی فضیلت میں کئی احادیث آئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص رات کو سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھ لے تو وہ اس کے لیے کافی ہوں گی۔“ [ بخاری، فضائل القرآن، باب فضل سورة البقرة : ۵۰۰۹، عن أبي مسعود رضی اللہ عنہ ]

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے اوپر سے ایک زوردار آواز سنی، انھوں نے سر اٹھایا، پھر فرمایا: ”یہ آسمان کا دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے، آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔“ پھر اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا: ”یہ ایک فرشتہ ہے جو آج زمین کی طرف نازل ہوا ہے اور آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا۔“ پھر اس فرشتے نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اور کہا: ”دو نوروں کی خوش خبری سنیے، یہ دونوں صرف آپ کو عطا کیے گئے ہیں، آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے۔ ایک نور سورۂ فاتحہ ہے اور دوسرا نور سورۂ بقرہ کی آخری آیات ہیں، آپ جب کبھی ان دونوں میں سے کوئی کلمہ تلاوت کریں گے تو آپ کو مانگی ہوئی چیز مل جائے گی۔“ [ مسلم، صلاة المسافرین، باب فضل الفاتحة و خواتیم سورة البقرة : ۸۰۶ ] نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی، اس میں سے اس نے دو آیتیں نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۂ بقرہ کا اختتام کیا، وہ کسی گھر میں تین راتیں نہیں پڑھی جائیں کہ پھر شیطان اس کے قریب آسکے۔“ [ ترمذی، فضائل القرآن، باب ما جاء في آخر سورة البقرة، ۲۸۸۲، وصححه الألباني ]

سورۂ آل عمران ۳ مدنیۃ ۸۹ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — ایاتھا ۲۰۰ رکوعاتھا ۲۰

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۙ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ① اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے ② اس نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے اور اس نے تورات اور انجیل اتاری ③

سورۂ آل عمران کی فضیلت سورۂ بقرہ کی فضیلت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ اس سورت کے مدنی ہونے پر مفسرین کا اتفاق ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی ۸۳ آیتیں وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ۹ ھ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ (فتح القدیر) مگر ابن عاشور کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وفد تقریباً ۳ ھ میں آیا ہے، کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مدنی سورتوں کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ نزول کے اعتبار سے کل سورتوں میں اس کا نمبر ۴۸ واں ہے۔ ۹ ھ میں نازل ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی غلطی کا باعث یہ ہے کہ وفود اس سال آئے تھے، جبکہ وفد نجران پہلے آ چکا تھا۔ [التحریر والتنویر] یہ وفد ساٹھ سواروں پر مشتمل تھا، جن میں چودہ ان کے معزز افراد بھی شامل تھے۔ تین آدمی ان سب میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا امیر عاقب تھا جس کا نام عبد المسیح تھا۔ دوسرا ''سید'' تھا اس کا نام الایہم تھا، یہ اس کا مشیر اور بہت سمجھدار تھا۔ تیسرا ابوحارثہ بن علقمہ الکبریٰ تھا، یہ ان کا لاٹ پادری تھا۔ ان سے دوسری باتوں کے علاوہ مسیح علیہ السلام کے خدا ہونے پر بھی رسول اللہ ﷺ کا مناظرہ ہوا۔ آپ نے فرمایا: ''مسیح فنا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ ہی ''حی'' یعنی ہمیشہ زندہ ہے اور رہے گا۔'' آپ نے یہ اور دوسرے دلائل پیش کیے جس پر وہ خاموش ہو گئے، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ بقیہ تفصیل کے لیے دیکھیے آیت مباہلہ ''۶۱''۔ (معالم، ابن کثیر)

**آیت 1** الٓمّٓ ۔ حروف مقطعات کی تشریح سورۂ بقرہ کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔

**آیت 2** ❶ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: یہ اس سورت کا دعویٰ ہے اور وفد نجران کو دعوت کی مناسبت سے اس کے اثبات پر زور دیا گیا ہے۔

❷ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ : یہ اسمائے حسنیٰ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ حیات اور قیومیت اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ میں سے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اسے موت اور فنا نہیں۔ '' الۡقَیُّوۡمُ '' کا مطلب ہے ساری کائنات قائم رکھنے والا، محافظ اور نگران، ساری کائنات اس کی محتاج وہ کسی کا محتاج نہیں۔ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ یا اللہ کا بیٹا یا تین میں سے ایک مانتے تھے۔ گویا ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی مخلوق ہیں، وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کی پیدائش کا زمانہ بھی کائنات کے پیدا ہونے سے بہت بعد کا ہے، پھر ان پر موت بھی آئے گی اور عیسائیوں کے بقول تو ان پر موت آ چکی، تو جب نہ ان کی حیات ہمیشہ، نہ انھیں قیومیت حاصل تو وہ اللہ یا اللہ کا بیٹا کیسے بن گئے؟

**آیت 3** ❶ یہاں ''الۡکِتٰبَ'' سے مراد قرآن مجید ہے، گویا کتاب کامل یہی ہے۔ الف لام عہد کا ہونے کی مناسبت سے

مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخۡفٰى عَلَيۡهِ شَىۡءٌ فِى الۡاَرۡضِ وَ لَا فِى السَّمَآءِ ؕ هُوَ الَّذِىۡ يُصَوِّرُكُمۡ فِى الۡاَرۡحَامِ كَيۡفَ يَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝

اس سے پہلے، لوگوں کی ہدایت کے لیے۔ اور اس نے (حق و باطل میں) فرق کرنے والی (کتاب) اتاری، بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور اللہ سب پر غالب، بدلہ لینے والا ہے ④ بے شک اللہ وہ ہے جس پر کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں ⑤ وہی ہے جو رحموں میں تمھاری صورت بناتا ہے، جس طرح چاہتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ⑥

''یہ کتاب'' ترجمہ کیا ہے۔ "نَزَّلَ" کا معنی آہستہ آہستہ اتارنا ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس قرآن تیئیس (۲۳) برس میں مکمل نازل ہوا۔ اس کی حکمتوں کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان (۳۲)۔ "بِالْحَقِّ" سے اس کا سچا اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونا مراد ہے۔

② مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: اس کے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو خبریں اور بشارتیں مذکور ہیں اس میں بھی وہی خبریں اور بشارتیں ہیں، اگر یہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتیں تو ان میں بہت اختلاف ہوتا۔ ایک خبر یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کو آخری رسول بنا کر بھیجے گا اور بشارت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان پر قرآن نازل فرمائے گا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷) اور سورۂ صف (۶) تو جب تم ان کتابوں کو مانتے ہو جن کی تصدیق ہو رہی ہے تو تصدیق کرنے والی کتاب کو بھی مانو۔ (ابن کثیر، رازی)

③ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: تورات سے مراد وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور انجیل سے مراد وہ کتاب ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ اس وقت یہ دونوں کتابیں اصل شکل میں موجود نہیں ہیں۔ تورات بائبل کے عہد قدیم کی پہلی پانچ کتابوں کا نام ہے اور انجیل بائبل کے عہد جدید کی پہلی چار کتابوں میں متفرق طور پر درج ہے۔ یہود و نصاریٰ نے انھیں بڑی حد تک بدل ڈالا ہے اور ان میں اپنی طرف سے تشریحات ملا کر خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ کتابیں پہلے زمانے میں لوگوں کے لیے ہدایت کا کام کرتی تھیں، مگر جب ان کے اندر باطل شامل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے صحیح اور غلط میں فرق کرنے والی کتاب قرآن مجید اتاری اور اسی لحاظ سے اس کا نام ''الْفُرْقَانَ'' رکھا۔ اب اسے سچا مانے بغیر ہدایت حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اس میں نازل شدہ آیات کا انکار کرنے والوں کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور اللہ پر یہ کچھ مشکل نہیں، وہ سب پر غالب بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی ہے۔

**آیت 6،5** ① یہ دونوں آیات اللہ تعالیٰ کے ﴿عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ﴾ ہونے کے لیے بھی دلیل ہیں اور سورت کے دعویٰ

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ

وہی ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری، جس میں سے کچھ آیات محکم ہیں، وہی کتاب کی اصل ہیں اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، پھر جن لوگوں کے دلوں میں تو کجی ہے وہ اس میں سے ان کی پیروی کرتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور ان کی اصل مراد کی تلاش کے لیے، حالانکہ ان کی اصل مراد نہیں جانتا

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ کے لیے بھی۔ یہاں پہلے بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کی ہر بڑی اور چھوٹی، ظاہر اور پوشیدہ چیز کا علم ہے، حالانکہ وہ عرش معلیٰ پر ہے اور پھر اس طرف اشارہ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ایک بندے ہیں۔ جس طرح دوسرے انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ میں پیدا کیا اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو ماں کے پیٹ میں جیسے چاہا پیدا کیا، پھر وہ خدا یا خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، جیسا کہ نصرانیوں کا غلط عقیدہ ہے۔

2 هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ : یعنی مذکر و مؤنث، سرخ یا سیاہ، کامل یا ناقص اور خوش قسمت یا بدقسمت، حتیٰ کہ عمر اور رزق بھی اسی وقت لکھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ متعدد احادیث میں مذکور ہے۔ [ دیکھیے بخاری، بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ : ۳۲۰۸ ] آخر میں پھر وہی دعویٰ ”لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ“ والا دہرا دیا اور اس کی مزید دلیلیں بھی دیں کہ کائنات کا یہ سارا سلسلہ اس اکیلے کے غلبہ و قوت اور حکمت و دانائی کے ساتھ چل رہا ہے، اس کے سوا کسی میں یہ صفات نہیں، سو عبادت بھی صرف اسی کا حق ہے، وہ نہ مسیح کا حق ہے، نہ ان کی والدہ کا اور نہ کسی اور کا۔

**آیت 7** 1 ایک جگہ قرآن مجید کی تمام آیات کو محکم کہا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ﴾ [ ھود : ۱ ] ”الٓرٰ، ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں۔“ اور دوسری جگہ تمام آیات کو متشابہ، چنانچہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا﴾ [ الزمر : ۲۳ ] ”اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے۔“ اور یہاں بعض آیات کو متشابہ قرار دیا ہے، بعض کو محکم، مگر اس میں کوئی تعارض نہیں۔ تمام آیات کے محکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پورے قرآن میں کوئی کمی یا خرابی نہیں، نہایت مضبوط اور محکم ہے اور متشابہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام آیات فصاحت و بلاغت اور مضامین و معانی میں ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ اس جگہ جو فرمایا کہ بعض محکم ہیں اور بعض متشابہ، تو محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم بالکل واضح اور صریح ہے، ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ان کو ”اُمُّ الْكِتٰبِ“ قرار دیا ہے، یعنی اصل اور بنیاد۔ انھی آیات میں لوگوں کو دین کی طرف دعوت دی گئی ہے اور انھی میں دین کے بنیادی عقائد، عبادات اور احکام بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں مذکور نصیحتیں اور عبرتیں بھی ان میں شامل ہیں، انسانی گمراہیوں کی نشاندہی بھی ان آیات میں کی گئی ہے۔ جبکہ متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جو ملتے جلتے کئی معانی کا احتمال رکھتی ہیں، اس لیے ان کا اصل مرادی معنی سمجھنے میں لوگوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے، یا ان میں تاویل کی گنجائش نکل سکتی ہے، یا جن میں

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

مگر اللہ اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر جو عقلوں والے ہیں ⑦

ایسے حقائق کا بیان ہے جن پر مجمل طور پر ایمان لانا تو ضروری ہے لیکن ان کی تفصیلات کو جاننا نہ انسان کے لیے ضروری ہے اور نہ عقلی استعداد کے ساتھ ممکن ہے۔ تفسیر وحیدی میں لکھا ہے: ''صفاتِ الٰہیہ کے منکرین تو اللہ تعالیٰ کے استواء (عرش پر ہونے کو) اور اس کے ید (ہاتھ) اور اس کے نزول (ہر رات آسمان دنیا پر اور قیامت کے دن زمین پر اترنے) کو متشابہات قرار دے کر ان کے معنی سمجھنے ہی کو ناممکن قرار دیتے ہیں، مگر اہل حدیث انھیں محکم مانتے ہیں، ان کے معانی کو واضح سمجھتے ہیں، البتہ کیفیت کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔''

② اس آیت میں نصاریٰ کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ''كَلِمَتُهٗ'' اور ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' وغیرہ آیات سے عیسیٰ علیہ السلام کے الٰہ ہونے اور اللہ کا بیٹا ہونے پر تو استدلال کرتے ہیں مگر دوسری آیات: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾ [ الزخرف : ٥٩ ] ''نہیں ہے وہ مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام کیا'' اور ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ﴾ [ آل عمران : ٥٩ ] ''بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے'' ان پر اور ان جیسی دیگر آیات پر دھیان نہیں دیتے۔ (ابن کثیر)

③ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ: یعنی وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے اور جن کا مشغلہ ہی محض فتنہ جوئی ہوتا ہے، وہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں اور چونکہ وہ کئی معانی کا احتمال رکھتی ہیں، اس لیے وہ ان سے وہ معنی نکالتے ہیں جو قرآن کی صریح اور محکم آیات کے خلاف ہوتے ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور اپنے خیال میں اس کی اصل مراد تلاش کرنے کے لیے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو ''اُولُوا الْاَلْبَابِ'' تک پڑھا اور پھر فرمایا: ''جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے، سو تم ان سے بچو۔'' [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ منه آيات محكمات ﴾ : ٤٥٤٧ ]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔'' [ أبو داؤد، السنة، باب النهي عن الجدال : ٤٦٠٣، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ، صحيح ] پس ضروری ہے کہ قرآن کا جو حصہ محکم ہے اس پر عمل کیا جائے اور جو متشابہ ہے اس پر جوں کا توں ایمان رکھا جائے اور تفصیلات سے بحث نہ کی جائے۔ (فتح البیان، ابن کثیر)

④ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ: اکثر ائمہ لفظ ''اللّٰهُ'' پر وقف کر کے ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ'' سے نیا کلام شروع سمجھتے ہیں، یعنی متشابہات کی اصل مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخ فی العلم لوگ کہتے ہیں کہ محکم و متشابہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں، ہم متشابہات کی اصل مراد نہ جانتے ہوئے بھی ان کے من عند اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧
رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ⑨ ع ۹

اے ہمارے رب! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر، اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی بے حد عطا کرنے والا ہے ⑧ اے ہمارے رب! بے شک تو سب لوگوں کو اس دن کے لیے جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ⑨

اور کچھ ائمہ کا کہنا ہے: "وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" کا لفظ "اللّٰهُ" پر عطف ہے، یعنی اہل زیغ متشابہ آیات کا پیچھا فتنے کی تلاش کے لیے اور ان سے فاسد معنی مراد لینے کے لیے کرتے ہیں اور ایسے معنی نکالتے ہیں جو قرآن وحدیث کی نصوص کے خلاف ہوتے ہیں، حالانکہ ان کا اصل معنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے، یا پختہ علم والے جو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے، اس لیے ان کا ایسا معنی مراد ہو ہی نہیں سکتا جو دوسری آیات واحادیث کے خلاف ہو۔

❾ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ: الْاَلْبَابِ " لُبٌّ " کی جمع ہے، جس کا معنی خالص عقل ہے۔ (راغب) جس عقل میں خواہش پرستی، بدعت یا شرک کی آمیزش ہو وہ " لُبٌّ " نہیں کہلاتی۔ مقصد یہ ہے کہ متشابہ کے اصل معنی تک رسائی کی توفیق اہل علم کو بھی ہوتی ہے مگر صرف ان اہل علم کو جن کی عقل ہر قسم کی خواہش پرستی، بدعت اور شرک سے پاک ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے دعا فرمائی: (( اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ )) "اے اللہ! اسے دین میں سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما۔" [ مستدرك حاكم : ٣/٥٣٤، ح : ٦٢٨٠۔ مسند أحمد : ١/٢٦٦، ح: ٢٤٠١، صحيح ] معلوم ہوا تاویل کا علم راسخ فی العلم لوگوں کو بھی ہوتا ہے۔

❿ تفسیر احسن البیان میں ہے، تاویل کے ایک معنی تو ہیں کسی چیز کی اصل حقیقت، اس معنی کے لحاظ سے " اِلَّا اللّٰهُ " پر وقف ضروری ہے، کیونکہ ہر چیز کی اصل حقیقت واضح طور پر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ تاویل کے دوسرے معنی ہیں، کسی چیز کی تفسیر اور بیان وتوضیح، اس اعتبار سے " اِلَّا اللّٰهُ " پر وقف کے بجائے " وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ " پر بھی وقف کیا جا سکتا ہے، کیونکہ مضبوط علم والے بھی صحیح تفسیر وتوضیح کا علم رکھتے ہیں۔ تاویل کے یہ دونوں معنی قرآن کریم کے استعمال سے ثابت ہیں۔ (ملخص از ابن کثیر)

**آیت 9، 8** یہ وہ دعا ہے جو راسخ فی العلم حضرات اللہ تعالیٰ کے حضور کرتے رہتے ہیں، ہدایت پر ثابت قدمی کی دعا کے ساتھ قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیش ہونے کا یقین بھی ہر وقت ان کے پیش نگاہ رہتا ہے، ان کی اصل کوشش اور دعا دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے لیے ہوتی ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے: (( يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ )) "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" [ ترمذی، الدعوات،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۙ۝۱۰ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد انھیں اللہ (کی پکڑ) سے ہرگز کچھ کام نہ آئیں گے اور وہی آگ کا ایندھن ہیں ۝۱۰ (ان کا حال) فرعون کی قوم اور ان لوگوں کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ۝۱۱ ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا کہ تم جلد ہی مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے ۝۱۲ یقیناً تمھارے لیے ان دو جماعتوں میں عظیم نشانی تھی جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں، ایک جماعت اللہ کے راستے میں لڑتی تھی اور دوسری کافر تھی، یہ ان کو آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی مدد کے ساتھ قوت بخشتا ہے، بلاشبہ اس میں آنکھوں والوں کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے ۝۱۳

باب دعاء یا مقلب القلوب ! ...... : ۳۵۲۲، وصححه الألبانی ]

**آیت 10، 11** "كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ" اس کی ترکیب کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۵۲، ۵۴) یعنی جس طرح کا عذاب قوم فرعون اور پہلی امتوں کو رسولوں کو جھٹلانے کی وجہ سے دیا گیا، اسی طرح کا عذاب ان اموال و اولاد والے کفار کو دیا جائے گا۔ یہاں ان کفار سے مراد وفد نجران، یہود، مشرکین عرب اور دوسرے تمام کفار بھی ہو سکتے ہیں۔ (شوکانی)

**آیت 12** قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : یہاں کافروں سے مراد یہودی ہیں، اس آیت کے نزول کے بعد بنو قریظہ کے قتل، بنو نضیر کے جلاوطن اور خیبر کے فتح ہو جانے سے قرآن کی یہ پیشین گوئی بحمد اللہ حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ (شوکانی)

**آیت 13** ❶ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ...... : یعنی اوپر جو پیشین گوئی (یہودی) کافروں کے مغلوب اور جہنم واصل ہونے کی ذکر ہوئی ہے اس کے سچ ہونے کے لیے معرکۂ بدر میں بہت بڑی آیت (دلیل) موجود تھی۔

❷ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمان کفار کو اپنے سے صرف دو گنا دیکھ رہے تھے، حالانکہ وہ ان سے تین گنا تھے، تاکہ مسلمان ثابت قدم رہیں، چنانچہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ دوسرا یہ کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے، حالانکہ ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی اور مسلمان کل ۳۱۳ تھے، مگر مسلمان دو گنا اس لیے نظر آتے تھے کہ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

لوگوں کے لیے نفسانی خواہشوں کی محبت مزین کی گئی ہے، جو عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی ہیں۔ یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے ﴿۱۴﴾

اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت کے لیے فرشتے بھیج دیے تھے اور اللہ اپنی نصرت کے ساتھ جسے چاہے قوت بخشتا ہے۔ اکثر مفسرین نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور بعض نے دوسرے کو۔ (ابن کثیر، شوکانی) واضح رہے کہ دوگنا دکھلانا لڑائی سے پہلے تھا ورنہ لڑائی کے وقت تو ہر گروہ دوسروں کو اپنے سے کم خیال کر رہا تھا۔ دیکھیے سورۂ انفال (۴۳، ۴۴)۔

**آیت 14** ① ''اَلشَّهَوٰتِ'' یہ '' شَهْوَةٌ '' کی جمع ہے جس کا معنی ہے ''کسی مرغوب چیز کی طرف نفس کا کھنچ جانا'' یہاں '' اَلشَّهَوٰتِ'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو طبیعت کو مرغوب ہیں، یعنی مصدر بمعنی اسم مفعول '' مُشْتَهَيَاتٌ '' ہے اور '' مِنَ النِّسَآءِ'' میں ''مِنْ'' بیانیہ ہے، یعنی وہ چیزیں یہ ہیں۔ '' اَلْقَنَاطِيْرِ '' کا واحد '' قِنْطَارٌ '' ہے، اس کی مقدار میں مختلف اقوال ہیں، مگر سب کا حاصل یہ ہے کہ مال کثیر کو '' قِنْطَارٌ'' کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی) ہماری زبان میں اس کا ترجمہ ''خزانے'' ہو سکتا ہے۔ ''مَتَاعُ'' اس سامان کو کہا جاتا ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ حاصل یہ کہ انسان ان چیزوں کی محبت میں پھنس کر اللہ اور اس کے دین سے غافل ہو جائے اور انھیں تفاخر و زینت کا ذریعہ سمجھے اور غرور و تکبر پر اتر آئے تو یہ تمام چیزیں مذموم ہیں، ورنہ اگر ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت خیال کرتے ہوئے ذریعۂ آخرت بنایا جائے اور شریعت کی حدود میں رہ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ مذموم و مبغوض نہیں بلکہ نہایت مرغوب و محمود ہیں۔ اصل چیز نیت اور عمل ہے، اس لیے حدیث میں ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ہے: ''میرے بعد مردوں کے لیے کوئی فتنہ عورتوں سے بڑھ کر نقصان دہ نہیں۔'' [بخاری، النکاح، باب ما يتقى من شؤم المرأة ...... : ۵۰۹۶، عن أسامة رضی اللہ عنہ] اور دوسری طرف آپ ﷺ نے یہ فرمایا: ''دنیا متاع (فائدہ اٹھانے کا سامان) ہے اور اس کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔'' [ مسلم، النكاح، باب خير متاع الدنيا ...... ۱۴۶۹، عن ابن عمرو رضی اللہ عنہما] اور یہ بھی فرمایا: ''دنیا میں سے عورت اور خوشبو میرے لیے پسندیدہ بنا دی گئی ہیں۔'' [ نسائی، عشرة النساء، باب حب النساء : ۳۳۹۱، عن أنس رضی اللہ عنہ قال الألباني حسن صحيح ] آیت کے آخر میں ان کو دنیاوی زندگی کا سامان قرار دے کر دنیاوی زندگی سے بے رغبتی اور آخرت میں رغبت پر زور دیا ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

② '' اَلْخَيْلِ'' یہ اسم جمع ہے، ''خُيَلَاءٌ'' سے مشتق ہے، جس کا معنی تکبر ہے۔ گھوڑے کی چال میں ایک طرح کا تکبر پایا جاتا ہے۔ '' اَلْمُسَوَّمَةِ'' یہ ''سِيْمَا '' یا ''سِيْمِيَاءُ '' سے مشتق ہو تو نشان لگائے ہوئے اور '' سَوْمٌ '' سے مشتق ہو تو چرنے کے لیے چھوڑے ہوئے گھوڑے۔ '' اَلْاَنْعَامِ'' یہ ''نَعَمٌ '' کی جمع ہے، اونٹ، گائے، بکریاں وغیرہ اور اکثر اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

کہہ دے کیا میں تمھیں اس سے بہتر چیز بتاؤں، جو لوگ متقی بنے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور نہایت پاک صاف بیویاں اور اللہ کی جانب سے عظیم خوشنودی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۵﴾ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! بے شک ہم ایمان لے آئے، سو ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ﴿۱۶﴾ جو صبر کرنے والے اور سچ کہنے والے اور حکم ماننے والے اور خرچ کرنے والے اور رات کی آخری گھڑیوں میں بخشش مانگنے والے ہیں ﴿۱۷﴾

**آیت 15** دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵) کی تفسیر۔ اس آیت میں مذکور لفظ "رِضْوَانٌ" "رَضِيَ يَرْضَى (س)" ناقص واوی سے مصدر ہے، اس کا مصدر "رِضًا" بھی آتا ہے، مگر "رِضْوَانٌ" میں حروف زیادہ ہونے اور تنوین برائے تعظیم ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''عظیم خوشنودی'' کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نعمت جنت کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے، اللہ نے فرمایا:
﴿ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [التوبة : ۷۲] ''اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی ہے۔''

**آیت 16** ① اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کے متقی بندے، جنھیں آخرت میں مذکورہ نعمتیں حاصل ہوں گی، وہ ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں اور جن میں وہ صفات پائی جاتی ہیں جن کا اگلی آیت میں ذکر آ رہا ہے۔

② اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا: اس دعا میں اپنے ایمان لانے کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے، اس سے دعا کے لیے عمل کا وسیلہ پیش کرنا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ میں ہے۔

**آیت 17** ① "اَلصّٰبِرِيْنَ" نیکی کرنے پر، گناہ سے بچنے پر، مصیبتیں آنے پر صبر کرنے والے۔ صبر کی یہ تین قسمیں ہیں۔ "وَالصّٰدِقِيْنَ" نیت، قول اور فعل میں سچے، حکم ماننے والے، اپنا مال و جان، اپنی اولاد اور اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت خرچ کرنے والے اور یہ سب کچھ کرنے کے باوجود سحریوں (رات کی آخری گھڑیوں) میں اپنی عبادت پر مغرور ہونے کی بجائے اپنی کوتاہیوں کے لیے استغفار کرنے والے۔

② اس آیت سے خاص طور پر سحر (پچھلی رات) کے وقت استغفار کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھیے ذاریات : ۱۵ تا ۱۸)
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

اللہ نے گواہی دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۸﴾ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی انھوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا، آپس میں ضد کی وجہ سے اور جو اللہ کی آیات کا انکار کرے تو بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۹﴾

---

ہے، فرماتا ہے: ''کون ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اسے دوں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے تو میں اسے بخشوں؟'' [ بخاري، التهجد، باب الدعاء …… : ۱۱۴۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

**آیت 18** ① شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر دین اسلام ہے، جیسا کہ آئندہ آیت میں آ رہا ہے اور اسلام کی بنیاد توحید الٰہی پر ہے۔ اس حقیقت سے وفد نجران اور تمام دنیا کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ ''شَهِدَ'' کا معنی ''بَيَّنَ وَ اَعْلَمَ'' یعنی بیان کیا اور آگاہ کیا ہے۔ (فتح القدیر) شاہد وہ ہے جو اپنے یقینی علم کے ساتھ آگاہ کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق اور ساری کائنات میں موجود بے شمار دلائل اور نشانیوں کے ساتھ اور اپنے رسولوں کے ذریعے سے پیغام بھیج کر شہادت دی اور آگاہ کیا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس حال میں کہ وہ اپنی مخلوق کے تمام معاملات و احوال میں عدل پر قائم ہے اور اس سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے اور اس کے پاک فرشتوں اور اہل علم نے بھی یہ شہادت دی ہے۔ آیت کے آخر میں پھر وہی دعویٰ ''لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' دہرایا اور اس کی دو مزید دلیلیں پیش فرمائیں کہ وہ سب پر غالب اور کمال حکمت والا ہے، کوئی اس پر غالب نہیں اور کمال حکمت والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ کوئی ہے تو لاؤ پیش کرو۔

② قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ : یہ لفظ ''اللّٰهُ'' سے حال ہے۔

**آیت 19** ① اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ کے احکام کے تابع کر دینا، جو اس کے رسول مختلف اوقات میں لے کر آتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے آخر میں خاتم الانبیاء کو مبعوث فرمایا اور محمد ﷺ کے راستے کے سوا اپنے تک پہنچنے والے تمام راستوں کو بند کر دیا۔ اب اگر آپ ﷺ کی شریعت کے سوا کوئی اور دین لے کر اللہ کے پاس جائے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، فرمایا: ﴿ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾ [ آل عمران : ۸۵ ] ''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔''

اب جو شخص رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا قائل نہیں اور نہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنا عمل اور عقیدہ ہی درست کرتا ہے تو اس کا دین اللہ کے ہاں معتبر نہیں، خواہ وہ توحید کا قائل اور دوسرے ایمانیات کا اقرار کرتا ہو۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع

پھر اگر وہ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے میں نے اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دیا اور اس نے بھی جس نے میری پیروی کی، اور ان لوگوں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے اور ان پڑھ لوگوں سے کہہ دے کیا تم تابع ہو گئے؟ پس اگر وہ تابع ہو جائیں تو بے شک ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو تیرے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾

② وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء بھیجے ان سب کا دین یہی اسلام تھا۔ اہل کتاب نے یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ دین حق اسلام ہی ہے اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول اور آخری نبی ہیں، محض باہمی بغض وعناد کی بنا پر اسلام سے انحراف کیا ہے۔ آج بھی ان کے لیے صحیح روش یہی ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں اور دین اسلام کو اختیار کریں۔

③ سَرِيْعُ الْحِسَابِ : یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد محاسبہ ہونے والا ہے اور آیاتِ الٰہی سے کفر کی سزا مل کر رہے گی۔

آیت 20 ① فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ : اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کا صدق ثابت ہو جانے کے باوجود بھی اگر اہل کتاب کفر وعناد کی راہ اختیار کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تو اپنا ظاہر و باطن اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے اور یہی حال میرا اتباع کرنے والے مسلمانوں کا بھی ہے اور اہل کتاب یہود ونصاریٰ اور اُمی لوگوں، یعنی مشرکین عرب، سب سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو صراط مستقیم پر گامزن ہو جاؤ گے اور اگر روگردانی کرو گے تو میرا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب تو تمھیں اللہ ہی کو دینا ہوگا۔

② اس آیت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے عرب وعجم کے تمام ملوک و امراء کو دعوتی خطوط لکھے اور اپنی عمومی رسالت کا اعلان کیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس امت میں سے اگر کوئی بھی یہودی ہو یا نصرانی، وہ میرے بارے میں سنے اور اس پر ایمان نہ لائے جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تو وہ اصحاب النار میں سے ہوگا۔'' [ مسلم، الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالة ...... : ۱۵۳ ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے سرخ وسیاہ (یعنی عرب وعجم) کی طرف بھیجا گیا ہے۔'' [ مسند أحمد : ۵/ ۱۴۵، ح : ۲۱۳۵۷، عن أبي ذر رضی اللہ عنہ ]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کو خاص اس کی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔'' [ بخاري، التیمم، باب : ۳۳۵ ] آپ ﷺ کے قیامت تک اور تمام لوگوں کی طرف رسول ہونے پر کتاب وسنت میں بکثرت دلائل موجود ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۸) اور سبا (۲۸) حتیٰ کہ جنوں کی طرف بھی۔ دیکھیے احقاف (۳۱)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَ غَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرتے ہیں اور لوگوں میں سے جو انصاف کرنے کا حکم دیتے ہیں انھیں قتل کرتے ہیں، سو انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے ﴿۲۱﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کی مدد کرنے والے کوئی نہیں ﴿۲۲﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب میں سے ایک حصہ دیا گیا، انھیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے، اس حال میں کہ وہ منہ موڑنے والے ہوتے ہیں ﴿۲۳﴾ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی، مگر چند گنے ہوئے دن اور انھیں ان کے دین میں ان باتوں نے دھوکا دیا جو وہ گھڑا کرتے تھے ﴿۲۴﴾

**آیت 22،21** اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ ...... : اس میں اہل کتاب کی مذمت ہے، جن کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے نہ صرف احکام الٰہی پر عمل کرنے سے انکار کیا بلکہ انبیاء اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے، جنھوں نے کبھی ان کے سامنے دعوت حق پیش کی اور یہ تکبر کی آخری حد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کے دل میں ذرہ برابر کبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔“ ایک آدمی نے عرض کیا: ”ایک آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا خوبصورت ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔“ [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانہ : ۹۱، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ]

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن سب سے سخت عذاب اس شخص کو ہو گا جسے کسی نبی نے قتل کیا، یا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو۔“ [ مسند أحمد : ۱/ ۴۰۷، ح : ۳۸۶۷، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ۔ الصحیحۃ ۲۸۱ ]

**آیت 23** اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا ...... : اس آیت میں ”كِتٰبِ اللّٰهِ“ سے مراد تورات اور انجیل ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب انھیں خود ان کی کتابوں کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ چلو انھی کو حکم مان لو اور بتاؤ کہ ان میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے یا نہیں تو یہ اس سے بھی پہلو تہی کر جاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں جیسے انھیں کسی چیز کا علم ہی نہیں۔

**آیت 24** ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ...... : یعنی جس چیز نے انھیں حق سے کھلم کھلا انحراف اور بڑے سے

فَكَيۡفَ اِذَا جَمَعۡنٰهُمۡ لِيَوۡمٍ لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ‌ وَوُفِّيَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ‌ؕ بِيَدِكَ الۡخَيۡرُ‌ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۶﴾

پھر کیا حال ہو گا جب ہم انھیں اس دن کے لیے جمع کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر جان کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۵﴾ کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۶﴾

بڑے گناہ کا بے شرمی سے ارتکاب کر لینے پر دلیر و جری بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور سزا کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ ان کے آباء و اجداد انھیں طرح طرح کی خام خیالیوں اور جھوٹی تمناؤں میں مبتلا کر گئے ہیں، کبھی وہ اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں (مائدہ: ۱۸) کبھی کہتے ہیں کہ جنت بنی ہی ہمارے لیے ہے (بقرہ: ۱۱۱) اور کبھی کہتے ہیں کہ اگر ہمیں تھوڑی بہت سزا ہوئی بھی تو چند دن سے زیادہ نہیں ہو گی، ہمارے بزرگوں کا، جن کے ہم نام لیوا ہیں اور جن کا ہم دامن پکڑے ہوئے ہیں ان کا اللہ پر اتنا زور ہے کہ وہ چاہے بھی تو ہمیں سزا نہیں دے سکے گا۔ (مزید دیکھیے بقرہ: ۷۸ تا ۸۰) اور نصاریٰ نے تو مسئلۂ کفارہ گھڑ کے گناہوں پر سزا کا سارا معاملہ ہی ختم کر دیا ہے۔ یعنی مسیح علیہ السلام اپنی امت کے گناہوں کی پاداش میں صلیب پر چڑھ گئے جس سے امت کے تمام گناہ معاف ہو گئے۔ اب اتنا ہی کافی ہے کہ عیسائی ہو جاؤ پھر جو مرضی کرتے رہو، مسیح علیہ السلام سب گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔

یہی حال اب بہت سے مسلمانوں کا ہو گیا، کوئی شیخ جیلانی کو زبردستی موت کے فرشتے سے روحیں چھین لینے والا بنا بیٹھا ہے اور کوئی حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو اپنے نام لیواؤں کے گناہوں کا کفارہ سمجھ بیٹھا ہے۔ [ فَاِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى ]

**آیت 25** یعنی انھیں جان لینا چاہیے کہ قیامت کے روز جب ہمارے حضور جمع ہوں گے تو ان کا بہت برا حال ہو گا، ان کے یہ من گھڑت عقیدے ان کے کسی کام نہیں آ سکیں گے اور نہ انھیں اپنے بزرگوں سے جھوٹی محبت اور دامن گیری اللہ کے عذاب سے بچا سکے گی۔ کوئی نبی یا ولی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر سفارش بھی نہیں کر سکے گا۔ (ترجمان)

**آیت 25** ① قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ: سیبویہ اور خلیل نے کہا "اَللّٰهُمَّ" اصل میں "یَا اللّٰهُ" تھا، شروع سے "یا" کو حذف کیا تو آخر میں میم مشدد لگا دی۔ "مٰلِكَ الْمُلْكِ" سے پہلے بھی "یا" پوشیدہ ہے، اس لیے لفظ "مٰلِكَ" منصوب ہے۔ (شوکانی) گویا اس دعا میں اللہ کے ذاتی اور صفاتی دونوں ناموں سے دعا کرنا سکھایا گیا ہے۔

② یہودی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حکم و نبوت کا یہ سلسلہ ہمیشہ ان میں رہے گا، دوسری قوم اس کا حق نہیں رکھتی، مگر جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی قوم بنی اسماعیل سے مبعوث ہو گئے تو ان کے غیظ و غضب اور حسد کی انتہا نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور تو مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور تو جسے چاہے کسی حساب کے بغیر رزق دیتا ہے ﴿۲۷﴾ ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح بچنا اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸﴾

---

کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی والا اور ساری بادشاہی کا مالک ہے۔ وہ جس قوم کو چاہتا ہے دنیا میں عزت وسلطنت سے نواز دیتا ہے۔ لہٰذا نبوت جو بہت بڑی عزت ہے، اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا پسند فرما لیا۔ اللہ تعالیٰ پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ یہاں دعا کے انداز میں مسلمانوں کو بشارت بھی دے دی کہ تمھیں اس دنیا میں غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا اور خاتم النبیین ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، لہٰذا تمھیں چاہیے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ۔

③ "الْخَيْرُ" میں الف لام استغراق کا ہے اور "بِيَدِكَ" خبر پہلے آنے سے تخصیص پیدا ہوگئی ہے، اس لیے ترجمہ "تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے" کیا گیا ہے۔

**آیت 27** ① تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ : اس سے موسموں کے اعتبار سے رات اور دن کے بڑھنے اور گھٹنے کی طرف اشارہ ہے، ایک ہی وقت کبھی رات کا حصہ بن جاتا ہے اور کبھی دن کا۔ اس طرح رات دن میں داخل ہو جاتی ہے اور دن رات میں۔

② وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ...... : مردہ سے زندہ، یعنی کافر سے مسلمان، جیسے آزر سے ابراہیم علیہ السلام، نطفہ سے حیوان، انڈے سے پرندہ اور زندہ سے مردہ جیسے نوح علیہ السلام سے کنعان اور حیوان اور پرندے سے نطفہ اور انڈا۔

③ طبرانی کی ایک روایت میں اس آیت کے اندر اسم اعظم ہونے کا ذکر ہے۔ "هداية المستنير" میں اس روایت کو ایک راوی محمد بن زکریا غلابی کی وجہ سے موضوع کہا گیا ہے اور "الضعیفہ (۲۷۷۲)" سے "ضَعِيْفٌ جِدًّا" کا حکم نقل کیا گیا ہے۔

**آیت 28** ① لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ...... : جب اکیلا اللہ تعالیٰ ہی بادشاہی کا مالک، عزت و ذلت دینے والا اور ہر خیر والا ہے تو ایمان والوں پر بھی لازم ہے کہ وہ اس کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھیں، کسی فائدے کی امید پر اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ رکھیں اور جو شخص ایسا کرے گا اس کے لیے اللہ کی دوستی میں سے ذرہ برابر حصہ بھی نہیں ہوگا۔ ہاں، ان کے شر سے کسی طرح بچنے کے لیے ظاہری طور پر دوستی کا اظہار جائز ہے، جب کہ دل میں ان کے کفر

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖۛ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

کہہ دے اگر تم اسے چھپاؤ جو تمھارے سینوں میں ہے، یا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جان لے گا اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۹﴾ جس دن ہر شخص حاضر کیا ہوا پائے گا جو اس نے نیکی میں سے کیا اور وہ بھی جو اس نے برائی میں سے کیا، چاہے گا کاش! اس کے درمیان اور اس کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں سے بے حد نرمی کرنے والا ہے ﴿۳۰﴾ کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۱﴾

---

کی وجہ سے نفرت ہو۔ اسی طرح جو کافر مسلمانوں کے خلاف نہ لڑتے ہوں اور نہ کسی لڑنے والے کی مدد کرتے ہوں تو ان سے حسن سلوک اور مدارات جائز ہے۔ دیکھیے سورۂ ممتحنہ (۸، ۹)۔

❷ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً :لفظ ''تُقٰىةً'' ''وَقٰى يَقِيْ'' سے مصدر ہے، تنوین کی وجہ سے ''کسی طرح بچنا'' ترجمہ کیا ہے۔ ''تقیہ'' بھی اس کا ہم معنی ہے۔ طبری اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو منع کیا ہے کہ وہ کافروں سے دلی دوستی رکھیں، الا یہ کہ کافر ان پر غالب ہوں تو ان کے لیے نرمی کا اظہار کریں، مگر دین میں ان کی مخالفت کریں۔ مزید تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۵۱، ۵۶) اور تقیہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۱۰۶)۔

ان آیات سے کسی مسلمان کے لیے مسلمانوں کے ملک کو چھوڑ کر کفار کے ملک میں رہنے کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ وہاں مسلمان کے لیے کفار سے دوستی کے عملی ثبوت کے بغیر رہنا اور اپنے اور اہل و عیال کے دین کو بچانا مشکل ہے، اس لیے اگر کوئی مسلمان کہیں مغلوب ہے تو اسے جان بچانے کے لیے دوستی کا اظہار تو جائز ہے، مگر وہاں سے ہجرت کرکے مسلمانوں کے علاقے میں آنا لازم ہے۔ ہاں، بے بس ہو تو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔ یہ اور اس مفہوم کی دوسری آیات مسلم حکومتوں کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کرتی ہیں اور انفرادی معاملات میں مدارات کی بھی، جیسا کہ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم بعض لوگوں کے سامنے مسکراتے ہیں، جب کہ ہمارے دل ان پر لعنت کر رہے ہوتے ہیں۔'' [ بخاري، الأدب، باب المداراة مع الناس ......، قبل ح : ٦١٣١ ]

**آیت 31** قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ...... : یہود و نصاریٰ اور مشرکین بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ رکھتے تھے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان سے کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو اب اس دعویٰ کے

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾

کہہ دے اللہ اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو بے شک اللہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا ﴿۳۲﴾ بے شک اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم کے گھرانے اور عمران کے گھرانے کو جہانوں پر چن لیا ﴿۳۳﴾

---

سچا ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ مجھے نبی مان کر میری پیروی اختیار کرو، اس سے نہ صرف تمھاری اللہ سے محبت قبول ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے اور وہ تمھارے گناہ بھی بخش دے گا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جو کوئی کسی کی محبت کا دعویٰ کرے تو اس طرح محبت کرے جس طرح محبوب چاہے، نہ کہ جس طرح اپنا جی چاہے اور اسی طرح چاہے تو محبوب اس کو چاہے۔'' (موضح) اس خطاب کا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے کہ اگر تم کو اللہ کی محبت کا دعویٰ ہے تو اس کے لیے زبانی اظہار محبت کافی نہیں ہے، بلکہ اپنے تمام اقوال و افعال میں میری پیروی اختیار کرو۔ اپنے پاس سے گھڑے ہوئے طریقوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی، اسی لیے حدیث میں بدعت کی شدید مذمت آئی ہے۔

آیت 32 ① قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ : پچھلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کے اتباع کا حکم تھا جس کا معنی آپ کے نقش قدم پر چلنا، آپ کی پیروی کرنا ہے، اگرچہ اتباع میں حکم ماننا بھی آ جاتا ہے مگر اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا خاص طور پر الگ ذکر فرمایا، جس کا معنی حکم ماننا ہے۔ آگے فرمایا کہ اگر وہ منہ پھیر لیں تو اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔ یہاں بات صاف سمجھ میں آ رہی ہے کہ بات مختصر کر دی گئی ہے، جو اس طرح تھی کہ اگر وہ منہ پھیر لیں تو وہ کافر ہیں اور اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا۔ ''الْكٰفِرِيْنَ'' میں الف لام عہد کا ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''ایسے کافروں'' کیا گیا ہے۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ''الرَّسُوْلَ'' یعنی محمد ﷺ کی اطاعت کا مستقل حیثیت سے حکم دیا گیا ہے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد ''الرَّسُوْلَ'' کی اطاعت سنت کی پیروی ہی سے ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر کہہ دیتے ہیں کہ حدیث وہی حجت ہو گی جو قرآن کے مطابق ہو، حالانکہ قرآن نے متعدد مواقع پر حدیث کو مستقل دلیل اور شریعت کے مآخذ کی حیثیت دی ہے، لہٰذا قانون کا ماخذ قرآن و حدیث دونوں قرار پائیں گے۔ حدیث میں قرآن سے زائد حکم تو ہو سکتے ہیں مگر کوئی صحیح حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے، اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی عقل و فہم کا قصور ہے، یا اس کی نیت کا فتور۔ مزید دیکھیے سورۂ نجم (۴)۔

③ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے ہو اور اس کے پاس میرے حکم میں سے کوئی حکم آئے، ان چیزوں میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے، یا میں نے منع کیا تو وہ کہے، ہم نہیں جانتے، ہم اللہ کی کتاب میں جو پائیں گے اسی کی پیروی کریں گے۔'' [ أبو داوٗد، السنة، باب فی لزوم السنة : ٤٦٠٥، عن أبی الدرداء رضی اللہ عنہ ]

آیت 33 اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى ...... : اوپر کی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و اطاعت کا حکم دیا ہے، اب اس آیت

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَ اِنِّيْۤ اُعِيْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾

ایسی نسل جس کا بعض بعض سے ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۳۴﴾ جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے رب! بے شک میں نے تیرے لیے اس کی نذر مانی ہے جو میرے پیٹ میں ہے کہ آزاد چھوڑا ہوگا، سو مجھ سے قبول فرما، بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۳۵﴾ پھر جب اس نے اسے جنا تو کہا اے میرے رب! یہ تو میں نے لڑکی جنی ہے اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو اس نے جنا اور لڑکا اس لڑکی جیسا نہیں، اور بے شک میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور بے شک میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں ﴿۳۶﴾

میں آپ کی رسالت کے اثبات کے سلسلہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ کا تعلق بھی اس خاندان نبوت سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے (کیونکہ آپ آل ابراہیم سے ہیں)۔ (شوکانی) عمران نام کی دو شخصیتیں گزری ہیں، ایک موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد اور دوسرے مریم علیہا السلام کے والد۔ اکثر مفسرین نے یہاں دوسرے عمران مراد لیے ہیں، کیونکہ انھی کی آل (مریم و عیسیٰ علیہما السلام) کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے۔ (ابن کثیر، رازی) غالباً اس سورت کا نام بھی اسی قصہ کی بنا پر رکھا گیا ہے۔

**آیت 34** ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ: گویا سب انبیا آدم علیہ السلام، پھر نوح علیہ السلام، پھر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام بھی ابراہیم علیہ السلام اور پھر آل عمران سے تھے، لہٰذا وہ بھی انسان تھے، اللہ یا اللہ کے بیٹے نہیں تھے۔ یہاں سے اہل نجران اور دوسرے نصرانیوں کے عقیدے کے ابطال کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ شروع ہوتا ہے۔

**آیت 35** تفاسیر میں عمران کی بیوی کا نام "حَنَّہ" مذکور ہے اور یہ کہ دمشق کے بیرونی حصے میں ان کی قبر ہے، مگر ان دونوں باتوں کی کوئی پختہ دلیل نہیں۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ بعض لڑکوں کو ماں باپ اپنے حق سے آزاد کر کے اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیتے اور عبادت خانے کے سپرد کر دیتے۔ عمران کی بیوی حاملہ تھیں، انھوں نے بھی یہی نذر مانی۔ "مُحَرَّرًا" کے معنی ہیں کہ وہ صرف مسجد کی خدمت ہی کے لیے وقف رہے گا۔ (قرطبی)

**آیت 36** ① وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى: بظاہر تو کہنا چاہیے تھا کہ لڑکی لڑکے جیسی نہیں، مگر الٹ فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ لڑکا جو عمران کی بیوی کے ذہن میں تھا، اس لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا جو انھیں عطا کی گئی۔ "الذَّكَرُ" اور "كَالْاُنْثٰى" میں الف لام عہد ذہنی کا ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

تو اس کے رب نے اسے اچھی قبولیت کے ساتھ قبول کیا اور اچھی نشو و نما کے ساتھ اس کی پرورش کی اور اس کا کفیل زکریا کو بنا دیا۔ جب کبھی زکریا اس کے پاس عبادت خانے میں داخل ہوتا، اس کے پاس کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز پاتا، کہا اے مریم! یہ تیرے لیے کہاں سے ہے؟ اس نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے کسی حساب کے بغیر رزق دیتا ہے ﴿۳۷﴾

وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ : اس سے معلوم ہوا کہ پیدائش کے ساتھ ہی نام رکھا جا سکتا ہے، ساتویں دن کا انتظار ضروری نہیں، بلکہ ساتواں دن نام رکھنے کی آخری حد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آج رات میرے گھر بچہ پیدا ہوا ہے اور میں نے اپنے باپ (ابراہیم علیہ السلام) کے نام پر اس کا نام رکھا ہے۔'' [ مسلم، الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبیان ...... : ۲۳۱۵، عن أنس رضی اللہ عنہ ]

وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُھَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ : چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے چھوتا ہے، شیطان کے اسے چھونے کی وجہ سے وہ چیخ کر رونے لگتا ہے، مگر مریم اور اس کا بیٹا۔'' [ بخاری، التفسیر، باب قول الله تعالٰی : ﴿ واذكر فی الکتاب مریم ...... ﴾ : ۳۴۳۱، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ]

آیت 37 ① وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا : عام قول کے مطابق زکریا علیہ السلام ان کے خالو تھے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ وہ مریم علیہا السلام کے بہنوئی تھے۔ اس کی دلیل حدیث معراج ہے جس میں دوسرے آسمان پر رسول اللہ ﷺ کی یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے ملاقات کا ذکر ہے اور صراحت ہے کہ وہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ [ بخاری، الأنبیاء، باب قول الله تعالٰی : ﴿ ذکر رحمة ربك ...... ﴾ : ۳۴۳۰ ]

② الْمِحْرَابَ : اس سے مراد معروف محراب نہیں ہے جو مسجدوں میں امام کے لیے بنایا جاتا ہے، بلکہ اس کا معنی اس کمرہ کے ہیں جو تنہائی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ (دیکھیے سبا: ۱۳) یہود و نصاریٰ عبادت خانے سے الگ کچھ بلندی پر یہ محراب بناتے تھے، جن میں مسجد کے عبادت گزار رہتے تھے۔

③ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا : اسلوب کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ رزق بطور کرامت مریم علیہا السلام کے پاس پہنچ رہا تھا۔ اکثر تابعین سے منقول ہے کہ زکریا علیہ السلام جب بھی مریم علیہا السلام کے حجرے میں جاتے تو ان کے ہاں بے موسم کے تازہ پھل پاتے۔ (ابن جریر، ابن کثیر) تابعین کا یہ فرمان آیت کے الفاظ کی تشریح ہو، جیسا کہ ظاہر ہے تو اس رزق کے بطور کرامت ملنے کی تائید ہے اور اگر اسرائیلی روایت سے ہو تو اسے سچا یا جھوٹا کہنے کی اجازت نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اسباب کے بغیر رزق عطا کرنا کچھ بعید نہیں اور امت محمد ﷺ کے اولیاء و شہداء کو یہ کرامت اور عزت افزائی ملنا صحیح سند سے ثابت ہے۔

صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے خبیب رضی اللہ عنہ کی سولی کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، مکہ کے جس گھر میں انھیں قید رکھا گیا،

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، کہا اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے ایک پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو ہی دعا کو بہت سننے والا ہے ﴿۳۸﴾ تو فرشتوں نے اسے آواز دی، جب کہ وہ عبادت خانے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ بے شک اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ کے ایک کلمے (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والا اور سردار اور اپنے آپ پر بہت ضبط رکھنے والا اور نبی ہوگا نیک لوگوں میں سے ﴿۳۹﴾ ۔

اس گھر والی بنت الحارث کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم! میں نے خبیب سے بہتر قیدی کبھی نہیں دیکھا، اللہ کی قسم! میں نے ایک دن انھیں انگور کا گچھا کھاتے ہوئے دیکھا، جو ان کے ہاتھ میں تھا، جب کہ وہ لوہے کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے، حالانکہ مکہ میں کوئی پھل نہیں تھا۔ (بنت الحارث) کہتی تھیں کہ یقیناً وہ اللہ کی طرف سے رزق تھا جو اس نے خبیب کو دیا تھا۔ [ بخاری، الجهاد والسير، باب هل يستأسر الرجل …… : ۳۰۴۵ ] مگر کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ وہ جو چاہے کرے، ورنہ خبیب زنجیریں توڑ کر آزاد ہو جاتے، حتیٰ کہ نبی بھی اپنی مرضی سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے، فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [ إبراهيم : ۱۱ ]

**آیت 38** ﴿ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ﴾ …… : زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور ابھی تک بے اولاد تھے، بیوی بانجھ تھی، بظاہر انھیں اولاد کی کوئی امید نہ تھی، لیکن یہ دیکھ کر کہ کس طرح مریم علیہا السلام کو خرق عادت کے طور پر بے موسم کا رزق پہنچ رہا ہے، ان کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ بے موسم کا رزق پہنچانے والا مایوسی کے عالم میں اولاد بھی عطا فرما سکتا ہے، چنانچہ اسی جگہ اور اسی وقت اللہ تعالیٰ کے حضور نیک اولاد کی دعا کی۔ بعض علماء نے مریم علیہا السلام کو خرق عادت میوے پہنچنے کا انکار کیا اور کہا ہے کہ یہ محاورہ ہے کہ خدا رسیدہ لوگ ہر نعمت کو (من عند اللہ) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، مگر زکریا علیہ السلام کا اس حالت کو دیکھ کر اظہار تعجب اور دعا کرنا بتا رہا ہے کہ رزق خرق عادت (بطور کرامت) ہی مل رہا تھا۔ پچھلی آیت کے حاشیہ میں خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں اور زکریا علیہ السلام کا واقعہ سورۂ مریم کے شروع میں ملاحظہ کریں۔

**آیت 39** ① ﴿ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ …… : عبادت خانے میں نماز پڑھنے کے دوران ہی فرشتوں نے انھیں یحییٰ نامی بیٹے کی خوش خبری دی۔ معلوم ہوا پیدائش سے پہلے بھی اولاد کا نام رکھا جا سکتا ہے۔

② ﴿ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾: یہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے، اگرچہ ہر شخص ہی اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کُن'' سے پیدا ہوا ہے، مگر عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے پر انھیں بطور شرف یہ لقب دیا گیا، جیسے بیت اللہ، ناقۃ اللہ، اگرچہ ہر مسجد اور ہر اونٹنی اللہ ہی کی ہے۔ یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، تبھی انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

کہا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، جب کہ مجھے تو بڑھاپا آ پہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟ فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۴۰﴾ کہا اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی بنادے؟ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہیں کرے گا مگر اشارے سے اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر ﴿۴۱﴾ اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک کر دیا اور سب جہانوں کی عورتوں پر تجھے چن لیا ہے ﴿۴۲﴾

③ "حَصُوْرًا" سے مراد ایسا شخص ہے جسے اپنی جنسی خواہشوں پر پوری طرح قابو حاصل ہو۔ (فتح البیان) بعض لوگوں نے معنی کیا ہے جو عورت کے پاس نہ جا سکتا ہو، مگر یہ نہ کوئی خوبی ہے نہ یہاں مراد ہے۔

**آیت 40** قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ ...... : دعا کی فوری قبولیت اور بظاہر ناممکن کام کی بشارت پر انھیں تعجب ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود ہی دعا کر رہے ہیں اور پھر خود ہی انھیں اتنا تعجب ہو رہا ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ جواب ملا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔

**آیت 41** قَالَ رَبِّ اجْعَلْ ...... : زکریا علیہ السلام کا تعجب اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نشانی کی درخواست کر دی، فرمایا کہ تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک صحیح سالم ہونے کے باوجود (ہاتھ یا ابرو وغیرہ کے) اشارے کے سوا لوگوں سے بات چیت نہ کر سکو گے، لہٰذا اس دوران تم اپنا سارا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر و شکر اور تسبیح میں صرف کرو۔

**آیت 42** ① اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے مریم علیہا السلام کو چننے کا ذکر دو مرتبہ آیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محض تاکید کے لیے ہو، یا پہلے چننے سے مراد بچپن میں مریم علیہا السلام کو شرف قبولیت بخشنا ہو، جو آیت: ﴿ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ ﴾ میں مذکور ہے اور دوسرے چننے سے مراد اللہ تعالیٰ کا انھیں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے لیے منتخب فرمانا اور خصوصی فضیلت عطا کرنا ہو۔

② عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ: سب جہانوں کی عورتوں سے مراد صرف اس زمانے کی عورتیں ہیں، کیونکہ احادیث میں مریم علیہا السلام کی طرح خدیجہ، فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہن کی فضیلت میں بھی اسی قسم کے الفاظ مذکور ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مردوں میں سے بہت سے لوگ کامل ہوئے ہیں لیکن عورتوں میں سے آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران ہی کامل ہوئی ہیں اور عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو باقی کھانوں پر فضیلت حاصل ہے۔" [ بخاري، أحاديث الأنبياء،

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اے مریم! اپنے رب کی فرماں بردار بن اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر ﴿۴۳﴾ یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، ہم اسے تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنے قلم پھینک رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے اور نہ تو اس وقت ان کے پاس تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے ﴿۴۴﴾

باب قول الله تعالى : ﴿ و ضرب الله مثلاً...... ﴾ : ۳٤۱۱، عن أبي موسى الأشعرى رضي الله عنه ]

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام جہانوں کی عورتوں میں تمھارے لیے مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد اور آسیہ زوجۂ فرعون کافی ہیں۔'' [ ترمذی، المناقب، باب فضل خديجة : ۳۸۷۸ ]

**آیت 43** وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ : مریم علیہا السلام چونکہ بیت المقدس کے ساتھ محراب میں رہتی تھیں اور بیت المقدس کی خادمہ تھیں، اس لیے انھیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔

**آیت 44** ① ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ...... : اس آیت سے پانچ مسئلے واضح طور پر ثابت ہوئے، پہلا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے تھے، ورنہ انھیں غیب کی یہ خبریں وحی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا۔ تیسرا یہ کہ اولیاء اور دوسرے انبیاء بھی غیب دان نہیں، ورنہ بیت المقدس کے خدام اور وقت کے پیغمبر زکریا علیہ السلام کو قرعہ ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ چوتھا یہ کہ جب چیز ایک ہو اور اس کے حق دار کئی ہوں تو اس وقت قرعہ کے ذریعے سے فیصلہ شریعت کا فیصلہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''كِتَابُ الشَّهَادَاتِ'' میں باب باندھا ہے: '' بَابُ الْقُرْعَةِ فِي الْمُشْكِلَاتِ '' ''مشکل معاملات میں قرعہ اندازی کا بیان'' اور اس میں کئی احادیث لائے ہیں۔ بعض لوگوں نے قرعہ کو جوا قرار دیا ہے، یہ ان کی غلطی ہے۔ ہاں، اگر اس مقصد کے لیے قرعہ ڈالا جائے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں، تو یہ قرعہ نہیں بلکہ فال نکالنا ہے جو حرام ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۹۰)۔

پانچواں یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس واقعہ کے وقت نہ موجود تھے، نہ اسے جانتے تھے، آپ کا وحی الٰہی سے اس واقعہ کو بیان کرنا آپ کے رسول برحق ہونے کی دلیل ہے۔

② اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ : اس قرعہ اندازی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مریم علیہا السلام یہودیوں کے بہت بڑے عالم عمران کی بیٹی تھیں، جب ان کی والدہ نے انھیں اپنی عبادت گاہ کی نذر کیا تو عبادت گاہ کے خدام میں جھگڑا ہوا کہ ان کی سرپرستی اور نگرانی کا شرف کون حاصل کرے، آخر کار انھوں نے قرعہ اندازی کی اور قرعہ زکریا علیہ السلام کے نام نکلا۔ ( ابن کثیر، قرطبی )

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے، دنیا اور آخرت میں بہت مرتبے والا اور مقرب لوگوں سے ہوگا ۝ اور لوگوں سے گھوارے میں بات کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی اور نیک لوگوں سے ہوگا ۝ اس نے کہا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، حالانکہ کسی بشر نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا؟ فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے یہی کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے ۝

آیت 46،45 ① **اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ**……: اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کلمہ قرار دیا گیا ہے، اس کی وضاحت آیت (۳۸) کے حواشی میں گزر چکی ہے۔ فرشتوں نے مریم علیہا السلام سے بالمشافہہ یہ بات کی، جیسا کہ سورۂ مریم (۱۷) میں ہے کہ جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں ان سے ہم کلام ہوئے۔

"**الْمَسِيْحُ**" لفظ "مَسَحَ" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہاتھ پھیرنے یا زمین کی مساحت کے ہیں۔ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح یا تو اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ بیماروں اور کوڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے اور وہ تندرست ہو جاتے تھے، یا اس بنا پر کہ آپ ہر وقت زمین میں سفر کرتے رہتے تھے۔ (ابن کثیر)

② یہاں مسیح علیہ السلام کے چار اوصاف بیان ہوئے ہیں: ① "**وَجِيْهًا**" یعنی بہت وجاہت والا ہوگا۔ چہرہ آدمی کی ذات کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے اونچے مرتبے کو وجاہت کہتے ہیں۔ ② مقرب لوگوں میں سے ہوگا۔ ③ گھوارے اور ادھیڑ عمر میں یکساں حکیمانہ کلام کرے گا۔ گھوارے میں ان کا کلام سورۂ مریم (۳۰ تا ۳۳) میں نقل ہوا ہے اور ادھیڑ عمر میں کلام کرنے میں ان کے دوبارہ اترنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ④ صالحین سے ہوگا۔ صالح وہ ہے جس کے سارے کام درست ہوں، اس لیے یوسف اور سلیمان علیہما السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے صالح بندوں میں داخل کیے جانے کی دعا کی۔ دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۱) اور سورۂ نمل (۱۹)

آیت 47 **اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ**: مریم علیہا السلام کو جب لڑکے کی خوشخبری دی گئی تو انھوں نے تعجب کا اظہار کیا، تعجب کا اظہار اس کے ناممکن ہونے پر نہیں بلکہ کس طرح ہونے پر کیا، کیونکہ ظاہری اسباب موجود نہیں۔ کہنے لگیں، مجھے تو آج تک کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا، پھر میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا!؟ فرمایا: ''اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔'' زکریا علیہ السلام کے قصے میں "**يَفْعَلُ**" اور یہاں "**يَخْلُقُ**" فرمایا۔ پہلا لفظ عام ہے، کیونکہ وہاں میاں بیوی دونوں موجود تھے، گو بوڑھے تھے۔ "**يَخْلُقُ**" خاص ہے، کیونکہ مرد کے بغیر اسباب ہی مکمل نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ مریم (۲۰، ۲۱)۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ۴۸ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ۴۹

اور وہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائے گا ۴۸ اور بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا کہ بے شک میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے عظیم نشانی لے کر آیا ہوں کہ بے شک میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل کی مانند بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور برص والے کو تندرست کرتا ہوں اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تمھیں بتا دیتا ہوں جو کچھ تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو ذخیرہ کرتے ہو، بے شک اس میں تمھارے لیے ایک نشانی ہے، اگر تم مومن ہو ۴۹

آیت 48 وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ : عیسیٰ علیہ السلام کو تورات اور ہر کتاب بغیر پڑھے آتی تھی اور یہ سب معجزے تھے۔ (موضح) بعض مفسرین نے "الْكِتٰبَ" کا معنی لکھنا کیا ہے۔

آیت 48 ① اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ : یعنی جب وہ رسول بن کر آئیں گے تو ان کی دعوت یہ ہوگی جو آگے بیان ہوئی ہے۔

② اَنِّيْٓ اَخْلُقُ : یہاں " خَلَقَ " کا لفظ ظاہری شکل وصورت بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تصویر بنانے والوں سے فرمائے گا: « اَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ » "تم نے جو خلق کیا اسے زندہ کرو۔" [ بخاري، البيوع، باب التجارة فيما يكره...... ۲۱۰۵ ] پیدا کرنے اور زندگی دینے کے معنی میں خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

③ بِاِذْنِ اللّٰهِ : یہاں "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا لفظ بار بار لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو عیسیٰ علیہ السلام یہ معجزات نہ دکھا سکتے اور یہی ہر نبی کے معجزات کا حال ہے کہ وہ اللہ ہی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔

④ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو اس کے زمانے کے مناسب حال معجزات عطا فرمائے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو اور جادوگروں کا زور تھا، سو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ معجزات دے کر بھیجا جن سے تمام جادوگر دنگ رہ گئے اور ان کی عقل چکرا گئی، بالآخر وہ جادوگر از خود مسلمان ہوئے اور اسلام کی راہ میں سولی چڑھنے تک کے لیے تیار ہو گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب اور علوم طبعیہ (سائنس) کا چرچا تھا، سو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ معجزات عطا فرمائے جن کے سامنے تمام اطباء اور سائنسدان اپنے عاجز اور درماندہ ہونے کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصاحت وبلاغت اور شعر وادب کا ڈنکا بجتا تھا، سو اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ کتاب نازل فرمائی جس نے تمام فصحاء وبلغاء کی گردنیں خم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اس کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے تورات سے ہے اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کردوں جو تم پر حرام کی گئی تھیں اور میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے عظیم نشانی لے کر آیا ہوں، سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو﴿۵۰﴾ بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۵۱﴾ پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا تو اس نے کہا کون ہیں جو اللہ کی طرف میرے مددگار ہیں؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ ہو جا کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں ﴿۵۲﴾

تین طرح کا چیلنج دیا، پہلے پورے قرآن کی مثل لانے کا (بنی اسرائیل : ۸۸) پھر دس سورتیں اس جیسی لانے کا (ہود: ۱۳) پھر اس جیسی کوئی ایک سورت لانے کا (یونس : ۳۸) مگر وہ بار بار چیلنج سننے کے باوجود اس جیسی دس سورتیں تو کجا، اس جیسی ایک سورت بھی پیش نہ کر سکے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پروردگار کا کلام مخلوق کے کلام سے مماثلت نہیں رکھتا۔ (ابن کثیر، رازی)

**آیت 50** **وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ ......** : عیسیٰ علیہ السلام کے وقت تورات میں سے کئی حکم جو مشکل تھے، موقوف ہوئے، باقی وہی تورات کا حکم تھا۔ (موضح) عیسیٰ علیہ السلام اپنی کوئی الگ مستقل شریعت لے کر مبعوث نہیں ہوئے تھے، بلکہ موسوی شریعت کی تائید و تصدیق کرنے اور بنی اسرائیل کو تورات پر عمل کی دعوت دینے کے لیے آئے تھے، البتہ تورات میں بعض چیزیں جو بطور تشدید ان پر حرام کر دی گئی تھیں، ان کو اللہ کے حکم سے حلال قرار دینا بھی ان کے مقصد بعثت میں شامل تھا، جیسے اونٹ کا گوشت اور حلال جانوروں کی چربی وغیرہ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے صرف ان چیزوں کو حلال قرار دیا جنھیں یہود نے آپس کے اختلافات اور موشگافیوں کی وجہ سے حرام قرار دے لیا تھا۔ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ انھوں نے بعض چیزوں کی حرمت کو منسوخ بھی کیا ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 51** **اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ ......** : عیسیٰ علیہ السلام نے معجزات پیش کرنے کے ساتھ ضروری سمجھا کہ اصل دین کی تاکید فرما دیں کہ میرا اور تمھارا داتا (رب) اللہ ہے، سو اسی کی عبادت کرو۔ مگر افسوس کہ نصرانیوں نے مسیح علیہ السلام کو اللہ یا اللہ کا بیٹا قرار دے کر رب اور نفع و نقصان کا مالک سمجھ لیا اور ان سے فریادیں کرنے لگے۔

**آیت 52** ① **فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ ......** : یعنی صرف عقل سے نہیں سمجھا بلکہ حواس سے معلوم کر لیا، آنکھوں اور کانوں سے یہ حقیقت جان لی کہ یہود اور ان کے علماء اللہ کی دی ہوئی نشانیوں اور دلائل و معجزات کے سامنے بے بس ہو چکے

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنۡزَلۡتَ وَ اتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۵۳﴾ وَ مَكَرُوۡا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ﴿۵۴﴾ ع

اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل فرمایا اور ہم رسول کے پیرو کار بن گئے، سو تو ہمیں شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لے ﴿۵۳﴾ اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۵۴﴾

ہیں، مگر ماننے کے لیے کسی صورت آمادہ نہیں، بلکہ ان کی زندگی کے درپے ہیں اور اس مقصد کے لیے سازشیں کر رہے ہیں تو انھیں اپنے دنیا سے رخصت ہونے میں کچھ شبہ نہ رہا۔ اب انھیں فکر تھی تو یہ کہ دین کی اشاعت و تبلیغ کا کام رکنا نہیں چاہیے، چنانچہ انھوں نے اپنے پیروکاروں سے پوچھا کہ کون ہے جو اللہ کی طرف دعوت دینے اور اس کے راستے پر چلنے اور چلانے میں میرا مددگار ہو؟ اللہ تعالیٰ نے چند لوگوں کو توفیق عطا فرمائی، وہ ایمان لائے اور پوری تن دہی کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کرتے رہے اور یہی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کہلائے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں سے مدد مانگ رہے ہیں، اگر وہ مختار کل ہوتے تو مدد مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے دور کے قبر پرست بھی عجیب ہیں، اس آیت سے استدلال کر کے فوت شدہ بزرگوں سے وہ چیزیں مانگتے ہیں جو ان کے اختیار میں نہیں اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بزرگوں نے چھوٹوں سے وہ مدد مانگی ہے جو ان کے اختیار میں تھی۔

② عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ویسا ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے زمانۂ حج میں مختلف قبائل عرب سے فرمایا کرتے تھے کہ کون ہے جو مجھے پناہ دے تاکہ میں لوگوں تک اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں، اس لیے کہ قریش نے مجھے یہ پیغام پہنچانے سے روک رکھا ہے؟ تا آنکہ آپ کو انصار مل گئے، جنھوں نے آپ کو پناہ دی اور اپنی جان و مال سے آپ کی مدد کی۔ مگر آپ کے حواری (خاص جاں نثار و مددگار) صرف انصار ہی نہ تھے، مہاجر بھی تھے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دوران میں تین دفعہ پوچھا: ''کون ہے جو بنو قریظہ کی خبر لائے گا؟'' تینوں دفعہ زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں، میرا حواری زبیر ہے۔'' [ مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل طلحة ...... : ۲٤۱۵، عن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما ]

**آیت 54** وَمَكَرُوۡا وَمَكَرَ اللّٰهُ ...... : شیخ شنقیطی نے فرمایا: ''یہاں نہ یہود کی خفیہ تدبیر کا ذکر فرمایا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کا، مگر دوسری جگہ ان کی تدبیر کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﴾ [ النساء : ۱۵۷ ] ''اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ بلاشبہ ہم نے ہی مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، جو اللہ کا رسول تھا۔'' اور اللہ کی خفیہ تدبیر کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَلٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ ﴾ [ النساء : ۱۵۷ ] ''اور لیکن ان کے لیے (کسی کو اس مسیح کا) شبیہ بنا دیا گیا۔'' وہ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ کو سولی دے کر سمجھ بیٹھے کہ ہم نے مسیح کو قتل کر دیا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۵۷)۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؗ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے قبض کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھے ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنھوں نے کفر کیا اور ان لوگوں کو جنھوں نے تیری پیروی کی، قیامت کے دن تک ان لوگوں کے اوپر کرنے والا ہوں جنھوں نے کفر کیا، پھر میری ہی طرف تمھارا لوٹ کر آنا ہے تو میں تمھارے درمیان اس چیز کے بارے میں فیصلہ کروں گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۵۵﴾ پھر جن لوگوں نے تو کفر کیا سو میں انھیں دنیا اور آخرت میں عذاب دوں گا، بہت سخت عذاب اور کوئی ان کی مدد کرنے والے نہیں ﴿۵۶﴾ اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو وہ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ﴿۵۷﴾ یہ ہے جسے ہم آیات اور پر حکمت نصیحت میں سے تجھ پر پڑھتے ہیں ﴿۵۸﴾

**آیت 55** ① **مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ:** " وَفٰى يَفِيْ " کا معنی پورا ہونا یا پورا کرنا ہے۔ "اِسْتَوْفٰى" اور " تَوَفّٰى " کا معنی پورا لے لینا ہے۔ " اِسْتَوْفَيْتُ مِنْهُ وَ تَوَفَّيْتُ " کا معنی ہے "میں نے اس سے پورا حق لے لیا۔" اس بنا پر "مُتَوَفِّيْكَ" کا معنی ہے "میں تمھیں پورا لینے والا ہوں" اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو روح و بدن دونوں کے ساتھ اٹھا لیا جاتا۔ بعض نے اس کا معنی "(وقت پر) فوت کرنے والا ہوں" کیا ہے اور میں نے ترجمہ کیا ہے "قبض کرنے والا ہوں۔" اس میں دونوں معنی آ جاتے ہیں۔ یوں تو قرآن میں " تَوَفّٰى " کا معنی سلا دینا بھی آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ [ الأنعام : ٦٠ ] "اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا (سلا دیتا) ہے" اور فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ﴾ [ الزمر : ٤٢ ] "اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں۔"

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے " اَلْجَوَابُ الصَّحِيْحُ " میں لکھا ہے کہ لغت عرب میں "تَوَفّٰى" کے معنی "اِسْتِيْفَاءٌ" اور قبض کے آئے ہیں اور یہ نیند کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور موت کی صورت میں بھی اور یہ " تَوَفِّي الرُّوْحِ مَعَ الْبَدَنِ جَمِيْعًا " (روح اور بدن دونوں کو لے لینے) کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے کہ اسے تھوڑی سی مٹی سے بنایا، پھر اسے فرمایا ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے ﴿۵۹﴾ یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے، سو تو شک کرنے والوں سے نہ ہو ﴿۶۰﴾

آیت میں ﴿ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ سے عیسیٰ علیہ السلام کا مع جسم آسمان کی طرف اٹھایا جانا مراد ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ ''اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔'' دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور سولی کی نفی فرمائی اور ''تَوَفِّيْ'' کا لفظ استعمال کیے بغیر فرمایا: ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ [النساء : ۱۵۸] ''بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔''

② وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا : عیسیٰ علیہ السلام کے اول تابع نصاریٰ تھے، ان کے بعد مسلمان ہیں، سو یہ ہمیشہ غالب رہے۔ (موضح) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان سے مراد صرف نصاریٰ بھی ہو سکتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ یہود جو مسیح علیہ السلام کے منکر ہیں ان پر نصاریٰ ہمیشہ غالب رہیں گے۔ (ابن کثیر)

اس سے مراد یہ بھی ہے کہ قیامت کے قریب جب مسیح علیہ السلام تشریف لائیں گے تو ان کے پیروکار مسلمان سب کفار پر غالب ہوں گے۔

**آیت 59** ① اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى ...... : یہ سورت شروع سے لے کر یہاں تک (یعنی پہلی آیت سے ۵۹ تک) وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وفد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کے دوران عیسیٰ علیہ السلام کی ''بُنُوَّة'' (اللہ کا بیٹا ہونے) پر اس سے استدلال کیا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی کہ اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا اللہ کا بیٹا ہونے کی دلیل ہو سکتا ہے تو آدم علیہ السلام جو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے وہ بالاولیٰ اللہ کا بیٹا کہلانے کے حق دار ہیں، مگر یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی طرح مسیح علیہ السلام کو بھی ''كُنْ'' سے پیدا کر کے اپنی قدرتِ کاملہ کو ظاہر فرمایا ہے۔ (ابن کثیر)

② ''مِنْ تُرَابٍ'' میں تنوین تقلیل یا تحقیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے ''تھوڑی سی مٹی۔''

**آیت 60** اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ...... : یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمھارے سامنے جو حق بیان ہوا ہے یہ تیرے رب کی طرف سے ہے۔ ''اَلْحَقُّ'' میں الف لام عہد کا ہے جس کا اشارہ گزشتہ بیان کی طرف ہے اس لیے ترجمہ ''یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے'' کیا گیا ہے۔ اور اس میں شک و شبہ کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔ (ابن کثیر) یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مقصود تمام مسلمانوں کو تنبیہ کرنا ہے۔ (رازی)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾

ع ۱۴

پھر جو شخص تجھ سے اس کے بارے میں جھگڑا کرے، اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آ چکا تو کہہ دے آؤ! ہم اپنے بیٹوں اور تمھارے بیٹوں کو بلا لیں اور اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمھیں بھی، پھر گڑ گڑا کر دعا کریں، پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں ﴿۶۱﴾ بلاشبہ یہ، یقیناً یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں اور بلاشبہ اللہ، یقیناً وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۲﴾ پھر اگر وہ پھر جائیں تو بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۶۳﴾

**آیت 61** ① فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ : سورت کے شروع سے لے کر یہاں تک اللہ تعالیٰ کی توحید، مسیح علیہ السلام کی ولادت کا بیان اور ان کا اللہ یا اللہ کا بیٹا نہ ہونا زبردست علمی دلائل کے ساتھ بیان ہوا۔ اب حکم ہوا کہ جو شخص اتنے واضح دلائل کے بعد بھی نہ مانے تو وہ عناد پر آمادہ ہے، اس سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں، پھر انھیں مباہلہ کی دعوت دو۔

② مباہلہ کی صورت یہ بیان فرمائی کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمھارے بیٹوں کو بلا لیں اور اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمھیں بھی، پھر گڑ گڑا کر دعا کریں، پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

" بَهَلَ يَبْهَلُ (ف) " کا معنی لعنت کرنا ہے اور " بَاهَلَ مُبَاهَلَةً " اور " اِبْتَهَلَ يَبْتَهِلُ " کا معنی ایک دوسرے پر لعنت کی دعا کرنا ہے، چونکہ یہ دعا نہایت خلوص اور عاجزی سے ہوتی ہے، اس لیے " اِبْتَهَلَ " کا لفظ عاجزی سے دعا کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

③ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ...... ﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، پھر فرمایا: (( اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلِيْ )) "اے اللہ! یہ میرے اہل ہیں۔" [ مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه : ۲۴۰۴/۳۲ ]

مگر اہل نجران مباہلہ سے ڈر گئے اور انھوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا، جیسا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عاقب اور السید نجران والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، وہ آپ سے مباہلہ کا ارادہ رکھتے تھے تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: "ایسا مت کرو، کیونکہ اللہ کی قسم! اگر یہ نبی ہوئے اور ہم نے مباہلہ کر لیا تو نہ ہم کبھی فلاح پائیں گے اور نہ ہمارے بعد ہماری نسل۔" تو دونوں نے کہا: "آپ نے ہم سے جو مطالبہ کیا ہے ہم آپ کو دیں گے اور آپ ہمارے ساتھ کوئی امین آدمی بھیج دیں اور کسی اور کو نہیں صرف امانت دار کو بھیجیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یقیناً میں تمھارے ساتھ ایک سچے پکے امانت دار کو

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے پھر اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں ﴿۶۴﴾

بھیجوں گا۔'' تو اصحاب رسول ﷺ نے اس کے لیے گردنیں اٹھائیں (کہ کس پر آپ کی نظر پڑتی ہے) تو آپ نے فرمایا: ''اے ابوعبیدہ بن جراح! اٹھو۔'' جب وہ کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اس امت کا امین ہے۔'' [ بخاری، المغازی، باب قصة أهل نجران : ۴۳۸۰ ] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اگر وہ لوگ نبی ﷺ سے مباہلہ کرتے تو اس حال میں واپس جاتے کہ نہ اپنے اہل کو پاتے اور نہ مال کو۔'' (طبری بسند حسن)

④ اس آیت سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ ضد میں آ کر حق سے انکار کرنے والے سے مباہلہ ہو سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو لعان بھی مباہلہ کی ایک صورت ہے۔

⑤ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ : آیت مباہلہ میں اپنے بیٹوں اور اپنی عورتوں کو بلانے کا ذکر ہے۔ ''نِسَآء'' (عورتوں) کا لفظ بیویوں پر استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں بار بار نبی ﷺ کی بیویوں کو ''يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ'' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اور انھیں اہل بیت کہہ کر خطاب کیا ہے۔ (دیکھیے احزاب : ۳۰ تا ۳۴) اولاد پر بیٹیوں کا لفظ آتا ہے نہ کہ عورتوں کا، ہاں، دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر ان پر بھی یہ لفظ آ سکتا ہے۔ یہاں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ نے فاطمہ، علی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، آپ کے اہل بیت یہی تھے، بیویوں کو نہیں بلایا۔ حالانکہ کسی حدیث میں بیویوں کو نہ بلانے کا ذکر نہیں ہے اور یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ کسی چیز کا ذکر نہ ہونے سے اس کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ احادیث میں تو دوسرے صحابہ کو بلانے کا یا ان کے آنے کا بھی ذکر نہیں، تو کیا وہاں اور کوئی بھی موجود نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والے تو آپ کی بیویاں ہی تھیں، بیٹا کوئی زندہ نہ تھا، اس لیے آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے آل علی کو اپنے اہل میں شامل کروایا، دلیل اس کی لفظ '' اَللّٰهُمَّ '' ہے اور یہ تو معروف ہے کہ بیٹی کی اولاد کی نسبت اس کے خاوند اور خاوند کے آباء و اجداد کی طرف ہوتی ہے، نہ کہ نانا کی طرف۔ ہاں، یہ علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کی خصوصیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا سے وہ بھی اہل بیت ہیں، مگر بیویوں کو جو اصل گھر والی ہیں، انھیں گھر والوں ہی سے نکال دینا محض تعصب ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ انھیں گھر والیاں فرما رہا ہے، فرمایا: ﴿ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ [ الأحزاب : ۳۳ ] ''اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے اہل بیت!'' اور جبریل علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ علیہا السلام کو ﴿ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ کے الفاظ سے مخاطب کر رہے ہیں، یعنی ''اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے اہل بیت!'' [ ھود : ۷۳ ]

آیت 64 ① قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ ...... : اس آیت میں اہل کتاب کو تین مشترکہ باتوں کی دعوت دینے کا حکم دیا گیا ہے:

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَ الۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۵﴾

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ جب کہ تورات اور انجیل تو نازل ہی اس کے بعد کی گئی ہیں، تو کیا تم سمجھتے نہیں ﴿۶۵﴾

① اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں۔ ② اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ ③ اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ تورات و انجیل میں تحریف کے باوجود تورات تو اب بھی توحید سے اور شرک کی ممانعت سے لبریز ہے، انجیل میں بھی یہی تعلیم متفرق طور پر موجود ہے، جیسے: ''تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔'' [ متی : ٤ : ١٠ ] بلکہ یہ بھی ہے: ''زمین پر اللہ کے احکام پر عمل ہونا چاہیے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔'' [ متی : ٦ : ١٠ ]

③ اہل کتاب تینوں باتوں کی مخالفت کر رہے تھے، یہود نے عزیر کو اور نصاریٰ نے مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور دونوں نے اپنے اپنے احبار و رہبان کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ کو حرام ٹھہرا کر انھیں رب ہونے کا درجہ دے دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۳۰، ۳۱) اور ان کے حواشی۔

④ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اہل کتاب کو اس مشترکہ عقیدہ کی دعوت دی، جو قریب تھے انھیں براہِ راست دعوت دی اور جو دور تھے انھیں خط لکھے، چنانچہ شاہ روم ہرقل کو خط لکھا تو اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ زیر تفسیر آیت بھی لکھی، جیسا کہ صحیح بخاری ''کتاب التفسیر (۴۵۵۳)'' میں مذکور ہے۔

⑤ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ : یعنی اگر اہل کتاب اس عقیدہ کے ماننے سے انحراف کریں تو تم اپنی طرف سے اس عقیدہ پر قائم رہنے کا اعلان کر دو۔ اس میں متنبہ کیا ہے کہ اہل کتاب اس عقیدہ سے منحرف ہو چکے ہیں، کیونکہ انھوں نے عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کے بیٹے قرار دے دیا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا تھا۔

آیت 65 يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ ...... : یہود ابراہیم علیہ السلام کے یہودی ہونے کے دعوے دار تھے اور نصاریٰ ان کے نصرانی ہونے کے اور یہ بات ایسی تھی جو واضح طور پر غلط تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے ہزاروں برس پہلے کا ہے، یہ تورات و انجیل ان کے بہت بعد نازل ہوئیں تو وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہوئے؟ بھلا یہ کوئی ایسی بات ہے جس پر عقلمند لوگ باہمی جھگڑے میں مشغول ہوں۔ ہماری امت میں سے بھی اگر بعد میں بننے والا کوئی گروہ جو: (( مَا اَنَا عَلَيۡهِ وَ اَصۡحَابِيۡ )) پر قائم نہ ہو اور دعویٰ کرے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گروہ سے تھے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ تمھاری تو بنیاد ہی بعد میں رکھی گئی، جب کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تو آپ ﷺ تمھارے گروہ میں کیسے شامل ہو گئے؟

هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۞ مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۞ اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَـلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا‌ ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۞

دیکھو تم وہ لوگ ہو کہ تم نے اس بات میں جھگڑا کیا جس کے متعلق تمھیں کچھ علم تھا، تو اس بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کچھ علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۶۶) ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ ایک طرف والا فرماں بردار تھا اور مشرکوں سے نہ تھا (۶۷) بے شک سب لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ قریب یقیناً وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور اللہ ہی ایمان والوں کا دوست ہے (۶۸)

**آیت 66** لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ : یعنی اس دین ابراہیمی سے متعلق۔ مراد یہ ہے کہ جب تم تورات و انجیل ہی کے مسائل میں بھٹکے اور کیسے بھٹکے، حالانکہ وہاں کچھ علم تمھیں حاصل تھا، تو اب دینِ ابراہیمی کے بارے میں کیوں کٹ حجتی پر تلے ہو، جس کے بارے میں تو تمھیں علم کا شائبہ بھی حاصل نہیں؟ (ماجدی) اس آیت میں نہ صرف غلط طور پر جھگڑا کرنے سے منع کیا گیا ہے، بلکہ مطلقاً جھگڑے سے گریز کی نصیحت بھی کی ہے۔ (ابن کثیر، فتح القدیر)

**آیت 67** مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا...... : اس آیت میں اشارہ ہے کہ یہود و نصاریٰ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اپنے گروہ میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ یہ مشرک ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے مشائخ اور علماء کو رب اور ان کے اقوال کو شریعت بنا رکھا ہے اور عزیر و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا اور نبیوں اور ولیوں کی قبروں کو مسجدیں بنائے ہوئے ہیں، جب کہ ابراہیم علیہ السلام ایک اللہ کی پرستش کرنے والے مسلم تھے، وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔ کچھ ایسا ہی حال اس امت کا بھی ہے کہ ہر فرقے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اپنے گروہ میں شامل کرتے ہیں، حالانکہ وہ سب گروہ بہت بعد میں بنے، اور انھوں نے اپنے سربراہوں کے اقوال کو شریعت قرار دے کر ان سربراہوں کو اللہ کا درجہ دے دیا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف "مَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ" (اللہ کے نازل کردہ دین) پر چلنے والے مسلم تھے اور ہرگز مشرک نہ تھے۔

**آیت 66** اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ...... : مطلب یہ کہ اگر تم اس معنی میں ابراہیم علیہ السلام کو یہودی یا نصرانی کہتے ہو کہ ان کی شریعت تمھاری شریعت سے ملتی جلتی ہے تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کے پیروکاروں کے بعد ان کے سب سے زیادہ قریب یہ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کو یہ کہنے کا حق تم سے زیادہ پہنچتا ہے کہ ہم اس طریق پر ہیں جس پر ابراہیم علیہ السلام تھے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُلَاةً مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَ اِنَّ وَلِيِّيْ أَبِيْ

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

ع ۸ ۱۵

اہل کتاب کی ایک جماعت نے چاہا کاش! وہ تمھیں گمراہ کر دیں۔ حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو گمراہ نہیں کر رہے اور وہ شعور نہیں رکھتے ﴿۶۹﴾ اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو ﴿۷۰﴾ اے اہل کتاب! تم کیوں حق کو باطل سے خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۷۱﴾

---

خَلِيْلُ رَبِّيْ ›› ’’ہر نبی کے لیے نبیوں میں سے کچھ دوست ہیں۔ جن سے اس کا خصوصی تعلق ہوتا ہے اور میرا (خاص تعلق والا) دوست میرا باپ اور میرے رب کا خلیل ہے۔‘‘ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة آل عمران : ۲۹۹۵۔ صحیح ]

**آیت 69** وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ ...... : اس گروہ کی سازشوں کا ذکر اسی سورت (۷۲، ۷۳) میں آ رہا ہے۔ فرمایا یہ لوگ مسلمانوں کو یہودی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، مسلمان ان کے بہکاوے میں کیا آئیں گے، وہ تو ایمان میں پختہ ہیں، یہ خود ہی مارے جائیں گے، مگر انھیں اس کا شعور ہی نہیں۔

**آیت 70** لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ...... : اللہ کی آیات سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی وہ بشارتیں ہیں جو پہلے انبیاء سے منقول تھیں۔ یہود ان کو صحیح سمجھتے تھے مگر مانتے نہیں تھے۔ اللہ کی آیات سے رسول اللہ ﷺ کی بشارتوں پر مشتمل آیات کے ساتھ ساتھ عقائد و احکام وغیرہ پر مشتمل دوسری آیات بھی مراد ہو سکتی ہیں، یعنی وہ لوگ صرف آپ ﷺ سے متعلق ہی نہیں، بلکہ دوسری آیات کو بھی اللہ کا کلام سمجھنے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لاتے تھے۔

**آیت 71** لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ...... : اہل کتاب کی مذہبی بدبختیوں کی طرف اشارہ ہے، اس سے پہلی آیت میں علمائے یہود کی یہ بدبختی بیان کی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سچا پیغمبر ہونے کے دلائل جان لینے کے باوجود کفر کر رہے ہیں، اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ ملانا اور حق کو چھپانا ان کا عام شیوہ بن چکا ہے۔ پہلی آیت میں ان کی اپنی گمراہی کا بیان تھا، اس آیت میں دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذکر ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۲)۔ (رازی) یہ مقام عبرت ہے کہ ہمارے دور کے فرقہ پرست علماء اور تجدد زدہ حضرات بھی دنیوی اور مادی اغراض و مصالح کے پیش نظر قرآن مجید سے وہی سلوک کر رہے ہیں جو ان کے پیش رو تورات و انجیل کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بالکل صحیح فرمایا: « لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ » [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بنی إسرائیل : ۳۴۵۶ ] ’’تم لازماً پہلی امتوں کے نقش قدم پر چلو گے۔‘‘

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا تم دن کے شروع میں اس چیز پر ایمان لاؤ جو ان لوگوں پر نازل کی گئی ہے جو ایمان لائے ہیں اور اس کے آخر میں انکار کر دو، تاکہ وہ واپس لوٹ آئیں ﴿٧٢﴾ اور کسی کے لیے مت مانو، سوائے اس کے جو تمھارے دین کی پیروی کرے۔ کہہ دے اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے، (یہ مت مانو) کہ جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے اس جیسا کسی اور کو بھی دیا جائے گا، یا وہ تم سے تمھارے رب کے پاس جھگڑا کریں گے۔ کہہ دے بے شک سب فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اسے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿٧٣﴾ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿٧٤﴾

**آیت 72** وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ ...... : کمزور ایمان والے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے یہود مختلف سازشیں کرتے رہتے تھے، یہ بھی اس سلسلہ کی ان کی ایک سازش کا بیان ہے کہ صبح کے وقت قرآن اور پیغمبر پر ایمان کا اظہار کرو اور شام کو کفر و انحراف کا اعلان کر دو، ممکن ہے یہ طریقہ اختیار کرنے سے بعض مسلمان بھی سوچنے لگیں کہ یہ پڑھے لکھے لوگ مسلمان ہونے کے بعد اس تحریک سے الگ ہو گئے ہیں تو آخر انھوں نے کوئی خرابی یا کمزور پہلو ضرور دیکھا ہوگا۔ (ابن کثیر، شوکانی)

**آیت 73، 74** وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ...... : یہ بھی ان گروہوں کا کلام ہے جن کا ذکر چلا آ رہا ہے اور اس سے ان کا مذہبی تعصب اور حسد ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اپنے متبعین کو تاکید کرتے رہتے ہیں: ﴿ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ﴾ امام طبری نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ اپنے ہم مشرب کے سوا کسی کی بات پر یقین نہ کرو، نہ یہ تسلیم کرو کہ تمھاری طرح کسی اور کو بھی نبوت دی جا سکتی ہے اور نہ یہ مانو کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے حضور جا کر تم پر کوئی حجت قائم کر سکیں گے۔ اس صورت میں ﴿ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ﴾ جملہ معترضہ ہوگا اور اس کا ربط ﴿ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ﴾ کے ساتھ ہوگا۔ (ابن کثیر، ابن جریر) یہاں تک ان کی دینی خیانت اور مذہبی تعصب کا بیان تھا، اب اگلی آیت میں ان کی مالی خیانت اور مسلمانوں سے بغض کا بیان ہے۔ (رازی)

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝75

اور اہل کتاب میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک خزانہ امانت رکھ دے وہ اسے تیری طرف ادا کر دے اور ان میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک دینار امانت رکھے وہ اسے تیری طرف ادا نہیں کرے گا مگر جب تک تو اس کے اوپر کھڑا رہے، یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا ہم پر ان پڑھوں کے بارے میں (گرفت کا) کوئی راستہ نہیں اور وہ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں ۝75

تفسیر آیت 75 ① اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ : اللہ تعالیٰ کا انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اہل کتاب کی مذمت کے دوران بھی اگر ان کے کچھ لوگوں میں کوئی خوبی تھی تو اس کا اعتراف فرمایا ہے، مذمت صرف ان کی فرمائی ہے جو اس کے حق دار تھے۔ ایک خزانہ امانت ادا کر دینے والوں کی بہترین مثال صحیح بخاری میں مذکور وہ تفصیلی واقعہ ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے اسرائیلی سے ایک ہزار دینار قرض مانگا، پھر پہنچانے کے لیے کشتی نہ ملنے پر لکڑی میں ڈال کر سمندر کے حوالے کر دیا، پھر بعد میں خود بھی لے کر حاضر ہوا۔ مگر دوسرے نے بھی امانت کا مظاہرہ کیا اور بتایا کہ مجھے تمھاری طرف سے لکڑی میں بھیجی ہوئی رقم مل گئی تھی۔ [ بخاری، الکفالۃ، باب الکفالۃ فی القرض ..... : ۲۲۹۱ ]

② لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ : سر پر کھڑا رہنے کے بغیر ایک دینار بھی ادا نہ کرنے کی وجہ ان کے کہنے کے مطابق یہ ہے کہ امی (عرب) لوگوں کا مال کھا جانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ رہے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کبھی امانت میں خیانت کا حکم نہیں دیا، خواہ وہ اسرائیلی ہو یا عرب، بلکہ اسلام نے تو کسی ذمی کے مال کو بھی بلا اجازت لینا جائز قرار نہیں دیا اور کسی حربی کافر کے مال کو بھی خیانت سے کھانے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ﴾ [ النساء : ۵۸ ] ”بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔“ افسوس کہ یہود کی طرح بعض مسلمان بھی کفار کے ممالک میں سود کے لین دین کے لیے کہتے ہیں کہ دارالحرب میں سود جائز ہے اور دارالحرب بھی اپنی مرضی کا بنایا ہوا ہے، خواہ ان سے جنگ ہو رہی ہو یا نہ۔

③ ہمارے ایک تاجر دوست نے اس آیت سے استدلال کیا کہ کوئی شخص کتنا بھی قرض واپس نہ کرنے والا ہو، اگر آپ بار بار اس سے تقاضا کرتے رہیں گے تو آخر کار آپ کے پیسے نکل آئیں گے، بشرطیکہ آپ نہ اس سے لڑیں، نہ اسے لڑنے کا موقع دیں، کیونکہ پھر بار بار تقاضا ممکن نہیں رہتا۔ اس نے کہا یہ میرا تجربہ ہے۔

بَلٰی مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ وَ اتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ وَ اَیۡمَانِہِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ وَ لَا یَنۡظُرُ اِلَیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۪ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۷﴾

کیوں نہیں! جو شخص اپنا عہد پورا کرے اور ڈرے تو یقیناً اللہ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۷۶﴾ بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت لیتے ہیں، وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۷۷﴾

**آیت 76** ”بَلٰی“ (کیوں نہیں) یعنی اس بدعہدی اور خیانت پر ضرور مؤاخذہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور محبوب شخص تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں سے کیا ہوا عہد پورا کرتا ہے (اس میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد بھی داخل ہے) اور پھر ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس شریعت کا اتباع کرتا ہے جو آپ ﷺ لے کر مبعوث ہوئے۔

**آیت 77** اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ ...... : عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بازار میں کچھ سامانِ تجارت لا کر رکھا، پھر اس پر قسم کھا کر کہا کہ میں نے اس سامان کے اتنے روپے دیے، حالانکہ اس نے اتنے روپے نہیں دیے تھے (یا کہا کہ مجھے اس سامان کے اتنے روپے مل رہے تھے، حالانکہ اسے اتنے روپے نہیں مل رہے تھے) قسم کا مقصد یہ تھا کہ کسی مسلمان کو اس میں پھنسا لے تو اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ وَ اَیۡمَانِہِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ﴾ [ بخاری، البیوع، باب ما یکرہ من الحلف فی البیع : ۲۰۸۸، ۴۵۵۱ ] یعنی جو لوگ بدعہدی، خیانت اور جھوٹی قسمیں کھا کر لوگوں کا مال کھاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر ایسا ناراض ہوگا کہ نہ آخرت میں ان کا کچھ حصہ ہوگا، نہ اللہ ان سے کلام کرے گا، نہ انھیں (نظر رحمت سے) دیکھے گا، نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے پکی قسم کھائی، تاکہ اس کے ساتھ کسی مسلمان کا مال ہڑپ کر لے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت غصے ہوگا۔“ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں (زیر تفسیر) یہ آیت اتاری۔ [ بخاری، التفسیر، باب ﴿ إن الذین یشترون بعھد اللہ ...... ﴾ : ۴۵۴۹ ]

ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”تین شخص ایسے ہیں جن سے نہ تو اللہ تعالیٰ کلام کرے گا، نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ (وہ یہ ہیں) اپنے کپڑے کو لٹکانے والا، احسان کر کے جتلانے والا اور اپنے سودے کو جھوٹی قسم کے ساتھ بیچنے والا۔“ [ مسلم، الإیمان، باب بیان غلظ تحریم الإسبال ...... : ۱۰۶، عن أبی ذر رضی اللہ عنہ ]

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

اور بے شک ان میں سے یقیناً کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب (پڑھنے) کے ساتھ اپنی زبانیں مروڑتے ہیں، تاکہ تم اسے کتاب میں سے سمجھو، حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں اور اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۷۸﴾ کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اور لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے ﴿۷۹﴾

آیت 78 وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ...... : اس کا عطف پہلی آیت پر ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اوپر کی آیت بھی یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے (اگرچہ لفظ عام ہونے کی وجہ سے ایسے تمام لوگ اس میں داخل ہیں)۔ (رازی) اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ تورات و انجیل میں تحریف کرتے ہیں اور اس میں (خصوصاً ان آیات میں جن میں رسول اللہ ﷺ کی صفت مذکور ہے) کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھا کر اس انداز اور لہجہ سے پڑھتے ہیں کہ سننے والا ان کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ سمجھ لیتا ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں، پھر یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ان کی بے خوفی اور ڈھٹائی کی حد یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے اللہ کی طرف سے ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں اور جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ افسوس، امت محمد ﷺ میں بھی بہت سے لوگ اسی راہ پر چل رہے ہیں اور وہ اپنی دنیاوی اغراض یا مذہبی فرقہ پرستی کی وجہ سے قرآن کریم کے ساتھ یہ معاملہ کبھی لفظی اور کبھی معنوی تحریف کے ساتھ کرتے ہیں، عوام بے چارے اسے اللہ کا حکم سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ مولوی صاحب یا ان کے کسی پیشوا کی بات ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سچ فرمایا: ''یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چل پڑو گے۔'' [ بخاری، الاعتصام بالکتاب والسنة، باب قول النبی ﷺ : لتتبعن سنن ...... : ۷۳۲۰ ]

آیت 79 ① مَا كَانَ لِبَشَرٍ ...... : تورات و انجیل میں اہل کتاب کی تحریف بیان کرنے کے بعد اشارہ فرمایا ہے کہ انجیل میں عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کے دعویٰ کی خاطر بھی تحریف کی گئی ہے، ورنہ نبی تو بشر ہوتے ہیں اور وحی و نبوت ایسی صفات سے مشرف ہونے کے بعد ان کی طرف سے اپنے الٰہ (خدا) ہونے کا دعویٰ محال ہے۔ (رازی)

② پھر جب نبی کا یہ حق نہیں کہ لوگ اس کی عبادت کریں تو دوسرے مشائخ اور ائمہ اس مرتبے پر کیسے فائز ہو سکتے ہیں اور

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو ﴿۸۰﴾

انھیں یہ حق کیسے حاصل ہو گیا کہ اپنے مریدوں کو چوبیس گھنٹے اپنی صورت آنکھوں اور ذہن کے سامنے رکھنے کا حکم دیں اور ان سے یہ عہد لیں کہ میری ہر بات تمھیں ماننا ہو گی، صحیح معلوم ہو یا غلط اور جب مصیبت پیش آئے تو ہمیں یاد کرو گے۔ بتائیے خدائی اور کیا ہوتی ہے؟ نبی ہونے کی حیثیت سے انبیاء کی پیروی اور ان کا ہر حکم ماننا واجب ہوتا ہے، مشائخ اور ائمہ تو واجب الاتباع بھی نہیں ہوتے۔

③ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ: اس سے معلوم ہوا کہ عبد المسیح یا عبد الرسول یا عبد المصطفیٰ نام رکھنا جائز نہیں۔

④ ’’اَلرَّبَّانِيُّ‘‘ لفظ ’’رب‘‘ پر الف نون بڑھا کر یاء نسبت کی لگا دی گئی ہے اور اس کے معنی عالم باعمل کے ہیں۔ مبرّد فرماتے ہیں کہ یہ ’’رَبَّهٗ يَرُبُّهٗ فَهُوَ رَبَّانٌ‘‘ ہے، یعنی صیغہ صفت۔ ’’رَبَّانٌ‘‘ کے ساتھ ’’یاء‘‘ ملائی گئی ہے۔ (فتح البیان) صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، آیت: ﴿ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ﴾ کا معنی ہے حکماء، فقہاء بنو اور کہا: ’’کہا جاتا ہے ’’الربانی‘‘ وہ ہے جو علم کی بڑی باتوں سے پہلے اس کی چھوٹی باتوں کے ساتھ لوگوں کی تربیت کرے۔ [ بخاری، العلم، باب العلم قبل القول والعمل ……، بعد ح : ٦٧ ]

⑤ بِمَا كُنْتُمْ: اس میں ’’باء‘‘ برائے سببیت ہے، چونکہ تم تعلیم و دراست کا مشغلہ رکھتے ہو، اس لیے تمھیں عالم باعمل اور اللہ کے عبادت گزار بندے بننا چاہیے۔ (بیضاوی)

⑥ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ’’ہاں، تم کو (اے اہل کتاب!) یہ کہنا ہے کہ تم میں جو آگے دین داری تھی، یعنی کتاب کا پڑھنا اور سکھانا، وہ اب نہیں رہی۔ اب میری صحبت میں پھر وہی کمال حاصل کرو۔‘‘ (موضح) اور یہ بات اب قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

⑦ کسی شخص میں اگر علم اور کتب الٰہیہ کے پڑھنے پڑھانے سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کی خصلت پیدا نہیں ہوتی تو یہ مشغلہ وقت ضائع کرنا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے علم سے پناہ مانگی ہے، آپ دعا کیا کرتے تھے: (( اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ )) [ مسلم، الذكر والدعاء، باب في الأدعية : ٢٧٢٢ ] ’’اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔‘‘ (فتح البیان)

**آیت 80** ① وَلَا يَاْمُرَكُمْ ……: اور نہ نبی کا یہ حق ہے کہ تمھیں اس بات کا حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو۔ یہ کام تو صریح کفر ہے، پھر ایک پیغمبر تمھارے مسلمان ہونے کے بعد تمھیں کفر کا حکم کیسے دے سکتا ہے؟

② اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے طرز عمل پر چوٹ ہے، جنھوں نے انبیاء اور فرشتوں کی تعظیم میں اس قدر غلو کیا کہ ان کو رب تعالیٰ کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ انبیاء اور صالحین کی قبروں پر عمارتیں بنا کر ان میں ان کی تصویریں بنا ڈالیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

اور جب اللہ نے سب نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ میں کتاب و حکمت میں سے جو کچھ تمھیں دوں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ انھوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو گواہ رہو اور تمھارے ساتھ میں بھی گواہوں سے ہوں ﴿۸۱﴾

---

سے روایت ہے کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک کنیسہ (گرجے) کا ذکر کیا، جو انھوں نے حبشہ میں دیکھا تھا، جس میں تصویریں تھیں۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی ہوتا اور وہ فوت ہو جاتا تو وہ لوگ اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے اور اس میں یہ تصویریں بنا دیتے، یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے ہاں ساری مخلوق سے بدتر ہوں گے۔'' [ بخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة الحبشة : ۳۸۷۳ ] اب آپ کو مسلمانوں کے ہر شہر اور تقریباً ہر محلے میں یہی نقشہ نظر آئے گا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو چونا گچ کرنے، اس پر عمارت بنانے یا اس پر (مجاور بن کر) بیٹھنے سے منع فرمایا۔ [ مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر والبناء عليه : ۹۷۰، عن جابر رضی اللہ عنہ ] بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ہر تصویر کو مٹا دو اور ہر اونچی قبر کو برابر کر دو۔ [ مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر : ۹۶۹ ]

استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس آیت: ﴿ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ ﴾ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نبی یا فرشتے کی پرستش صریح کفر ہے اور کوئی ایک تعلیم یا فلسفہ، جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی سکھائے یا اللہ کے کسی نبی یا بزرگ کو رب تعالیٰ کے مقام پر بٹھائے، وہ ہرگز اللہ تعالیٰ یا اس کے نبی کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ "اَيَاْمُرُكُمْ" میں استفہام انکاری ہے، یعنی یہ ممکن ہی نہیں، کیونکہ انبیاء تو لوگوں کو عبادتِ الٰہی کی تعلیم دینے اور مسلمان بنانے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں نہ کہ الٹا کافر بنانے کے لیے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

آیت 81 ❶ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ ...... : ان آیات سے مقصود ایسے دلائل کی وضاحت ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت ہوتی ہے۔ (رازی) یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کے بعد ہر نبی سے عہد لیا کہ وہ اپنے بعد آنے والے نبی کی تصدیق اور اس کی مدد کرے گا اور اس بارے میں کسی قسم کی گروہ بندی اور عصبیت اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اگر وہ نبی اس کی زندگی میں آ جائے تو بذاتِ خود اس پر ایمان لائے گا اور اگر اس کی وفات کے بعد آئے تو وہ اپنی امت کو بعد میں آنے والے نبی پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کا حکم دے کر جائے گا۔ اس اعتبار سے گویا موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام پر اور عیسیٰ علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا ہے۔ طبری اور ابن ابی حاتم میں حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے عہد لیا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری زندگی میں آ جائیں تو تم ان پر ایمان لاؤ گے۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٨٤﴾

پھر جو اس کے بعد پھر جائے تو یہی لوگ نافرمان ہیں ﴿٨٢﴾ تو کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کچھ اور تلاش کرتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے خوشی اور ناخوشی سے اسی کا فرماں بردار ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿٨٣﴾ کہہ دے ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل کیا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿٨٤﴾

---

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر کوئی الگ نہیں بلکہ پہلی تفسیر ہی میں شامل ہے۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور واجب الاتباع ہیں، اب آپ کے سوا کسی اور نبی کی اتباع جائز نہیں۔

② "اِصْر" کسی چیز کے باندھنے اور زبردستی بند کرنے کو کہتے ہیں، یعنی بھاری بوجھ۔ اسی طرح مؤکد عہد کو بھی " اِصْر " کہتے ہیں، کیونکہ وہ انسان کو باندھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب انبیاء سے یہ عہد اور اقرار لیا، انھیں اس کی شہادت کا حکم دیا اور خود بھی شہادت دی۔

**آیت 82** فَمَنْ تَوَلّٰى ...... : اس آیت میں اہل کتاب کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لا کر دراصل اس عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمھارے انبیاء سے اور ان کے ذریعے تم سے لیا گیا ہے، اب بتاؤ تمھارے فاسق ہونے میں کوئی شک وشبہ ہو سکتا ہے؟ (رازی)

**آیت 82** ① طَوْعًا وَّ كَرْهًا : اگر کوئی کہے کہ بہت سے انسان اللہ کے فرماں بردار ہیں ہی نہیں تو جواب یہ ہے کہ وہ بھی فرماں بردار ہونے میں بے بس ہیں، ورنہ اپنا سانس یا دل کی دھڑکن یا بھوک و پیاس یا پیشاب و پاخانہ روک کر دکھائیں، ہاں اعمال سے متعلق انسان کو ایک حد تک اختیار دیا گیا ہے اور اسی سے متعلق باز پرس ہوگی۔

② اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ : یعنی جب آسمان و زمین کی ہر چیز، فرشتے، جن وانس وغیرہ اللہ کے قانون فطرت کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور اختیاری وغیر اختیاری طور پر اس کے حکم کے تابع ہیں تو یہ لوگ اس کے قانون شریعت ''دِيْنِ اللّٰهِ'' کو چھوڑ کر دوسرا راستہ کیوں اختیار کرتے ہیں، انھیں چاہیے کہ اگر آخرت میں نجات چاہتے ہیں تو اللہ کا دین، جو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے ہیں، اسے اختیار کر لیں۔ نیز دیکھیے سورۂ آل عمران (٨٥)۔

**آیت 84** قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ...... : اس آیت کی تشریح کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت (١٣٦) دیکھیے۔

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں سے ہو گا ﴿۸۵﴾ اللہ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور (اس کے بعد کہ) انھوں نے شہادت دی کہ یقیناً یہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۸۶﴾ یہ لوگ! ان کی جزا یہ ہے کہ بے شک ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے ﴿۸۷﴾ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے ﴿۸۸﴾

**آیت 85** وَ مَنْ يَّبْتَغِ ...... : یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہو جانے کے بعد جو شخص آپ کی فرماں برداری اور اطاعت کا راستہ چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا، یا کسی پہلے راستے پر چلتا رہے گا، وہ چاہے کتنا توحید پرست کیوں نہ ہو اور پچھلے انبیاء پر ایمان رکھنے والا ہو، اگر وہ محمد ﷺ پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی دین داری اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہو گی اور وہ آخرت میں نامراد و ناکام ہو گا۔ واضح رہے کہ اگرچہ تمام انبیاء کا دین اسلام تھا، مگر آخری پیغمبر ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اسلام صرف آپ کی پیروی کا نام ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں بھی اب اسلام سے یہی مراد ہوتا ہے، اس معنی میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ)) [ مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ...... : ۱۸/۱۷۱۸، عن عائشة رضی اللہ عنہا ] ”جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔“

**آیت 86تا88** ① یعنی جو لوگ حق کے پوری طرح واضح ہو جانے اور رسول اللہ ﷺ کے سچا نبی ہونے کے روشن دلائل دیکھنے کے باوجود محض کبر و حسد اور مال و جاہ کی محبت کی بنا پر کفر کی روش پر قائم رہے، یا ایک مرتبہ اسلام قبول کر لینے کے بعد پھر مرتد ہو گئے تو وہ سراسر ظالم و بدبخت ہیں، ایسے لوگوں کو راہِ ہدایت دکھانا اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرتد شخص کافر سے زیادہ مجرم ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

② حسن بصری رحمہ اللہ نے ایک اور آیت کے ساتھ اس کی بہترین تفسیر فرمائی کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں، وہ اپنی کتابوں میں محمد ﷺ کو موجود پاتے تھے، ان کی آمد پر ان کے ذریعے سے فتح کی دعائیں کیا کرتے تھے (گویا آپ پر ایمان رکھتے تھے) جب آپ تشریف لائے تو انھوں نے آپ کے ساتھ کفر اختیار کیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [ البقرة : ۸۹ ] ”حالانکہ وہ اس سے پہلے

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۸۹ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝۹۰ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى

مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ۸۹ بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا، پھر کفر میں بڑھ گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اور وہی لوگ سراسر گمراہ ہیں ۹۰ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے سو ان کے کسی ایک سے زمین بھرنے کے برابر سونا ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، خواہ وہ اسے فدیے میں دے

ان لوگوں پر فتح طلب کیا کرتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کے ساتھ کفر کیا، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (طبری بسند حسن)

آیت 89 ❶ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ...... : اس سے معلوم ہوا کہ اگر مشرک صدقِ دل سے توبہ کر لے اور دوبارہ اسلام لے آئے تو اللہ تعالیٰ اس کی پچھلی غلطی کو معاف کر دیتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''انصار میں سے ایک آدمی اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا اور مشرکوں سے جا ملا، پھر وہ پشیمان ہوا اور اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے کہلا بھیجا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرو کہ آیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اس کے بھائی نے) اسے یہ آیت بھیج دی اور وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا۔[ نسائی، تحریم الدم، باب توبة المرتد ...... : ٤٠٧٣ وقال الالبانی صحیح ] اس شخص کا نام حارث بن سوید تھا۔ (طبری)

❷ کسی شخص کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا، فرمایا: ﴿ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ [البقرة : ٢٥٦] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔'' مگر کوئی مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو، پھر ارتداد سے توبہ نہ کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ )) ''جو اپنا دین (یعنی اسلام) بدل لے اسے قتل کر دو۔'' [ بخاری، استتابة المرتدين و المعاندين وقتالهم، باب إثم من أشرك ...... : ٦٩١٨ ]

آیت 90 یعنی یہود پہلے اقرار کرتے تھے کہ یہ یقیناً نبی ہے لیکن جب ان سے معاملہ ہوا تو وہ منکر ہو گئے۔ (موضح) اور ایسے لوگ بھی اس کا مصداق ہیں جو اسلام سے مرتد ہونے کے بعد موت کے وقت تک کفر پر قائم رہتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ حالت نزع میں اگر یہ لوگ توبہ کریں گے بھی تو ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ )) [ ترمذی، الدعوات، باب إن الله يقبل التوبة ...... : ٣٥٣٧، حسنه الألبانی ] ''یقیناً اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک روح حلق تک نہ پہنچے۔'' نیز دیکھیے سورۂ نساء (۱۸) اور ''الضَّآلُّوْنَ '' سے مراد'' کامل درجہ کے گمراہ ہیں۔'' (رازی)

بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

ع ۹ / ۱۱ / ۱۷

یہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۹۱﴾

**آیت 91** اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں اور کفر ہی کی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب سے ہلکے عذاب والے جہنمی سے پوچھے گا: ''اگر دنیا میں جو بھی چیز ہے تمھاری ہو جائے تو کیا تم اسے (اپنی جان بچانے کے لیے) فدیہ میں دے دو گے؟'' وہ کہے گا: ''ہاں!'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں نے تم سے اس وقت جب تم آدم کی پشت میں تھے، اس سے بہت زیادہ آسان بات کا تقاضا کیا تھا کہ شرک نہ کرنا تو میں تمھیں دوزخ میں داخل نہیں کروں گا، لیکن تم نہ مانے اور شرک کرتے رہے۔'' [ مسلم، صفات المنافقین، باب طلب الکافر الفداء …… : ۲۸۰۵، عن أنس رضی اللہ عنہ ]

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

تم پوری نیکی ہرگز حاصل نہیں کرو گے، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو اور تم جو چیز بھی خرچ کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۹۲﴾

**آیت 92** ❶ **لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ ......** : "الْبِرَّ" "کامل نیکی"، "مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو) عام ہے، یعنی جان و مال، اولاد و اقارب، جاہ و عزت، غرض ہر چیز کو شامل ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو بھی ہے اور یہود کو بھی۔ مسلمانوں سے خطاب کی مناسبت یہ معلوم ہوتی ہے کہ پچھلی آیت میں بیان فرمایا ہے کہ کافر کو خرچ کرنے سے کچھ بھی نفع نہیں ہوگا، اب اس آیت میں مومنوں کو خرچ کرنے کی کیفیت بتلائی، جس سے آخرت میں انھیں نفع ہوگا۔

❷ **وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ ......** : مقصد یہ کہ انسان جو کچھ بھی فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ، وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور انسان کو (بشرطیکہ مسلمان ہو اور اخلاص سے خرچ کرے) اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اس لیے معمولی چیز خرچ کرنے کو بھی عار نہ سمجھے۔ مگر نیکی میں کامل درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عزیز ترین چیز صرف کی جائے۔ یہ آیت سن کر اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "یا رسول اللہ! میری جائداد میں سے مجھے سب سے محبوب "بَیْرُحَاء" باغ ہے (جو عین مسجد نبوی کے سامنے تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جایا کرتے اور اس کا نفیس پانی پیا کرتے تھے) اور اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ سو میں اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اس کے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں، آپ اس کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ فرما دیں۔" [ بخاری، الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الأقارب ...... : ۱۴۶۱، مختصرًا ] عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! مجھے خیبر میں سے جو حصہ ملا ہے اس سے بڑھ کر نفیس مال مجھے آج تک حاصل نہیں ہوا، میں نے ارادہ کیا ہے کہ اسے صدقہ کر دوں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اصل اپنے پاس رکھو اور اس کے پھل کو اللہ کے راستے میں تقسیم کر دو۔" چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے اسے وقف کر دیا۔ [ بخاری، الشروط، باب الشروط فی الوقف : ۲۷۳۷۔ ابن ماجہ : ۲۳۹۶، ۲۳۹۷ ]

❸ یہود سے خطاب کی صورت میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "شاید یہود کے ذکر میں یہ آیت اس واسطے ذکر فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست بہت عزیز تھی، جس کے تھامنے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ ہوتے تھے، تو جب وہی نہ چھوڑیں تو اللہ کی راہ میں درجۂ ایمان نہ پائیں۔" (موضح)

❹ **مِمَّا تُحِبُّوْنَ**: اللہ کا کرم دیکھیے، بندوں سے ان کی محبوب چیزیں ساری نہیں مانگیں، بلکہ اس میں سے کچھ خرچ کرنے ہی کو کامل نیکی قرار دے دیا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۹۳ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹۴

کھانے کی ہر چیز بنی اسرائیل کے لیے حلال تھی مگر جو اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام کر لی، اس سے پہلے کہ تورات اتاری جائے، کہہ دے تو لاؤ تورات، پھر اسے پڑھو، اگر تم سچے ہو ۹۳ پھر جس نے اس کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھا تو وہی ظالم ہیں ۹۴

آیت 94،93 كُلُّ الطَّعَامِ ...... :اوپر کی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے اثبات میں دلائل پیش کیے اور اہل کتاب پر الزامات قائم کیے ہیں۔ اب یہاں سے ان کے شبہات کا جواب ہے، جو وہ آپ ﷺ کی نبوت پر پیش کرتے تھے۔ (رازی) جب قرآن نے بیان کیا کہ یہود کے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے بہت سی چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں (النساء: ۱۶۰۔ الانعام: ۱۴۶) ورنہ یہ چیزیں ابراہیم علیہ السلام کے عہدِ نبوت میں حلال تھیں، تو یہود نے ان آیات کو جھٹلایا اور کہنے لگے کہ یہ چیزیں تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حرام چلی آئی ہیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (شوکانی) بعض مفسرین نے ان آیات (۹۴،۹۳) کی شانِ نزول میں لکھا ہے کہ یہود تورات میں نسخ کے قائل نہیں تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یہود نے اسی لیے جھٹلا دیا تھا کہ وہ تورات میں بعض حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیتے تھے اور اسی لیے انھوں نے قرآن کے ناسخ و منسوخ پر بھی اعتراض کیا تو ان کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں کہ یہ نسخ تو خود تمھاری شریعت میں بھی موجود ہے کہ جب تک تورات نازل نہیں ہوئی تھی تو کھانے کی تمام چیزیں تمھارے لیے حلال تھیں، جن میں اونٹ کا گوشت اور دودھ بھی شامل ہے، پھر جب یعقوب علیہ السلام عرق النساء کے مرض میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے صحت یاب ہونے پر بطور نذر اونٹ کا گوشت حرام قرار دے لیا۔ پھر جب تورات نازل ہوئی تو اس میں اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام قرار دے دیا گیا۔ (ابن کثیر، الکشاف) حلال کو حرام قرار دے لینے کی یہ نذر ان کی شریعت میں جائز تھی۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک واقعہ میں شہد پینے کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا، گو یہ نذر نہ تھی مگر قرآن نے اس قسم کی نذر سے اور حلال کو حرام کرنے سے منع فرما دیا اور کفارہ مقرر فرما دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ تحریم۔

بعض نے لکھا ہے کہ یہود رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے سلسلہ میں یہ اعتراض بھی کرتے تھے کہ یہ پیغمبر خود کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا دعوے دار بتاتا ہے اور اونٹ کا گوشت کھاتا ہے، حالانکہ یہ گوشت ملتِ ابراہیمی میں حرام ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ تورات کے اترنے سے پہلے تو یہ سب چیزیں حلال تھیں، پھر ملتِ ابراہیمی میں یہ کیسے حرام ہو سکتی ہیں، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات میں دکھاؤ، ورنہ اللہ تعالیٰ پر اس قسم کے بہتان گھڑنے سے باز رہو۔ (ابن کثیر)

مسند احمد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہود کے رسول اللہ ﷺ سے چار سوال اور ان کے جواب مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۛ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

کہہ دے اللہ نے سچ فرمایا، سو تم ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، جو ایک طرف کا تھا اور وہ شرک کرنے والوں سے نہ تھا ﴿۹۵﴾ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا، یقیناً وہی ہے جو بکہ میں ہے، بہت بابرکت اور جہانوں کے لیے ہدایت ہے ﴿۹۶﴾

یہ تھا کہ کھانے کی وہ کون سی چیزیں تھیں جنھیں یعقوب علیہ السلام نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے لیے حرام قرار دے لیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب یہ دیا کہ اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام جب سخت بیمار ہو گئے تھے، ان کی بیماری بہت طول اختیار کر گئی تو انھوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ انھیں شفا عطا فرما دے تو وہ اپنے پسندیدہ کھانے اور پسندیدہ مشروب کو ترک کر دیں گے اور ان کا پسندیدہ کھانا اونٹ کا گوشت اور پسندیدہ مشروب اونٹ کا دودھ تھا۔ یہ بات سن کر یہود نے آپ کی تصدیق کی، آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! تو ان پر گواہ ہو جا۔'' [ أحمد : ۱/ ۲۷۸، ح : ۲۵۱۸، و حسنه و صححه أحمد شاكر والحاكم و وافقه الذهبي. المعجم الكبير للطبراني : ۱۲/ ۱۹۰، ۱۹۱، ح : ۱۳۰۱۲ ] اس واقعہ کی ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ سے مناسبت بھی ظاہر ہے۔

**آیت 95** **قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ......** : یعنی اللہ تعالیٰ کا بیان صدق پر مبنی ہے کہ کھانے کی یہ قسم پہلے حلال تھی، اس کے بعد اسرائیل اور ان کی اولاد پر حرام کر دی گئی، لہٰذا ''نسخ'' صحیح ہے اور تمھارا شبہ باطل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، یہ عین ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے مطابق ہے۔ لہٰذا تم بھی دینِ اسلام میں داخل ہو جاؤ، جو اصول و فروع کے اعتبار سے عین دینِ ابراہیم کے مطابق ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 96** **اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ ......** : یہ یہود کے دوسرے شبہ کا جواب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے شام کی طرف ہجرت کی اور ان کی اولاد میں سے تمام انبیاء شام میں ہوئے، ان کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مسلمانوں نے اس قدیم قبلہ کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنا لیا ہے، پھر یہ ملتِ ابراہیم کے متبع کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرآن نے بتایا کہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ تو کعبہ ہے، جو ''بکہ'' میں ہے۔ بکہ مکہ ہی کا نام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت بخشا۔ اس پر بہت سے واضح دلائل موجود ہیں۔ جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ دورِ جاہلیت سے یہ محترم چلا آ رہا ہے کہ اگر کسی کے باپ کا قاتل بھی اس میں داخل ہو جائے تو وہ اس سے تعرض نہیں کرتا، نیز اس میں مقامِ ابراہیم، یعنی وہ پتھر ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بانی ابراہیم علیہ السلام ہیں اور یہ کہ یہی ابراہیمی قبلہ ہے، کیونکہ بیت المقدس کی تعمیر کعبۃ اللہ سے چالیس برس بعد ہوئی۔

ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟'' آپ نے فرمایا: ''مسجد حرام۔'' پوچھا: ''پھر کون سی؟'' آپ نے فرمایا: ''مسجد اقصیٰ۔'' پوچھا: ''ان

فِيۡهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا ؕ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۹۷﴾

اس میں واضح نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو کوئی اس میں داخل ہوا امن والا ہو گیا اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ تمام جہانوں سے بہت بے پروا ہے ﴿۹۷﴾

---

دونوں کے درمیان کتنی مدت ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''چالیس سال۔'' [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، بابٌ : ۳۳۶۶ ]

آیت 97 ❶ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کی (شہادت) کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔'' [ بخاری، الإیمان، باب دعاؤکم إیمانکم : ۸، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] ہر عاقل و بالغ مسلمان پر جو کعبہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے، اس پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج فرض ہے۔ [ مسلم، الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر : ۱۳۳۷ ]

❷ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا: استطاعت کی تفسیر حدیث میں زادِ راہ اور سواری سے کی گئی ہے۔ [ ترمذی، الحج، باب ما جاء من التغلیظ...... : ۸۱۲، عن علی رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ ] شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح الترغیب میں اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ [ هدایة المستنیر ]

استطاعت کے مفہوم میں راستے کا پُرامن ہونا، جان و مال کے تلف ہونے کا اندیشہ نہ ہونا بھی شامل ہے اور عورت کے لیے محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مالی استطاعت ہو مگر جسمانی نہ ہو تو کوئی دوسرا اس کی جگہ حج کر لے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ خثعم قبیلے کی ایک عورت آئی، اس نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اللہ کا اپنے بندوں پر جو فریضۂ حج ہے، وہ میرے والد پر اس حال میں آیا ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہے، سواری پر جم کر بیٹھ نہیں سکتا، تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟'' فرمایا: ''ہاں!'' اور یہ حجۃ الوداع کی بات ہے۔ [ بخاری، جزاء الصید، باب حج المرأۃ عن الرجل : ۱۸۵۵ ]

اسی طرح اگر کسی صاحب پر حج فرض تھا، جو سستی سے رہ گیا اور وہ فوت ہو گیا تو اس کی میراث میں سے حج ادا کیا جائے گا، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( فَاقْضِ اللّٰهَ فَهُوَ أَحَقُّ بِالْقَضَاءِ )) ''اللہ کا قرض ادا کرو، کیونکہ وہ پورا کیے جانے کا زیادہ حق دار ہے۔'' [ بخاری، الأیمان والنذور، باب من مات و علیه نذر : ۶۶۹۹۔ مسلم : ۱۱۴۸ ]

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

کہہ دے اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے ہو، جب کہ اللہ اس پر پوری طرح شاہد ہے جو تم کرتے ہو﴿۹۸﴾ کہہ دے اے اہل کتاب! تم اللہ کے راستے سے اس شخص کو کیوں روکتے ہو جو ایمان لے آیا، تم اس (راستے) میں کوئی نہ کوئی کجی تلاش کرتے ہو، حالانکہ تم گواہ ہو اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کر رہے ہو﴿۹۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم ان میں سے کچھ لوگوں کا کہنا مانو گے، جنھیں کتاب دی گئی ہے، تو وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں گے﴿۱۰۰﴾

---

ایک صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کی طرف سے وہ شخص حج کرے جو پہلے اپنا حج کر چکا ہو۔ [ أبو داوٗد، المناسك، باب الرجل يحج عن غيره : ۱۸۱۱، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ]

③ وَمَنْ كَفَرَ : اس سے معلوم ہوا کہ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا کفر ہے اور جو کفر کرے تو اس بے چارے کی کیا اوقات ہے، اللہ تعالیٰ تو سارے جہانوں سے بے پروا ہے۔ اسلام کی پانچ بنیادوں کے ترک اور دوسری چیزوں کے ترک کا یہی فرق ہے کہ ان پانچوں میں سے کسی کے ترک سے اسلام کی بنیاد ڈھے جاتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابو بکر اسماعیلی الحافظ رحمہ اللہ کی سند سے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''جو شخص حج کی طاقت رکھے اور پھر حج نہ کرے تو اس پر برابر ہے کہ یہودی ہونے کی حالت میں مرے یا نصرانی ہونے کی حالت میں۔'' امام ابن کثیر نے فرمایا: ''یہ سند عمر رضی اللہ عنہ تک صحیح ہے۔''

**آیت 99،98** قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ ...... : اہل کتاب کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد اب انھیں ڈانٹ پلائی جا رہی ہے کہ تم نہ صرف یہ کہ حق پر خود ایمان نہیں لاتے، بلکہ جو لوگ اس پر ایمان لا چکے ہیں ان میں طرح طرح کے فتنے اور شوشے چھوڑ کر حق کی راہ میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ ''تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا'' کا مطلب ہے: ''تَبْغُوْنَ فِيْهَا عِوَجًا'' (تم اس دین میں کوئی نہ کوئی کجی تلاش کرتے ہو) اور پھر یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تمھارے یہ کرتوت خوب معلوم ہیں، تمھیں اپنے اس جرم کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ ''سَبِيْلِ اللّٰهِ'' سے مراد یہاں اسلام ہے۔

**آیت 100** ① اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا...... : اوپر کی دو آیتوں میں اہل کتاب کو وعید سنائی گئی جو لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے، اب یہاں سے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی جا رہی ہے کہ ان سے ہوشیار رہیں اور گمراہی میں نہ پڑ جائیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

اور تم کیسے کفر کرتے ہو، حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول (موجود) ہے اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لے تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی گئی۞

---

لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے شبہات کا جواب دے کر مسلمانوں سے فرمایا کہ ان کی بات مت سنو، یہی علاج ہے، ورنہ شبہات سنتے سنتے اپنی راہ سے پھسل جاؤ گے۔ اب بھی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ شک پیدا کرنے والوں کی بات نہ سنیں، اس میں دین کی سلامتی ہے اور بحث سے جھگڑے بڑھتے ہیں۔'' (موضح)

❷ **يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ** ...... : ایمان کے بعد پھر کافر بنا دینے میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کا کام آپس میں لڑانا ہے۔ اگر ان کی بات مانو گے تو آپس کے اتفاق اور محبت سے محروم ہو جاؤ گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد پھر کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔'' [ بخاري، المغازي، باب حجة الوداع : ۴۴۰۳، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] یاد رہے کہ اس کفر سے مراد اسلام میں رہ کر کفر ہے، مرتد ہونا نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دو لڑنے والے گروہوں میں سے دونوں کو مومن قرار دے کر ان کے درمیان صلح کروانے کا حکم دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حجرات (۹، ۱۰)۔

آیت 101 ❶ **وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ** ...... : ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''جاہلیت میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی رہی تھی، اب ایک دفعہ وہ بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے آپس میں جو کچھ ہوا تھا اس کا ذکر کیا تو دونوں غصے میں آ گئے اور ایک دوسرے کے مقابلے کے لیے اسلحہ لینے کے لیے اٹھے، تو اس پر یہ آیت اتری: ﴿ **وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ** ﴾ [ابن أبي حاتم : ۳/ ۱۱۰، ح : ۳۹۴۸۔ طبري ]

❷ **وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ** : یعنی تمھاری طرف سے کفر کا ارتکاب بہت بعید ہے، کیونکہ اللہ کی آیات تم پر پڑھی جا رہی ہیں، اس کا رسول بنفس نفیس تم میں موجود ہے اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لے تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی گئی۔ اس کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، لیکن نصیحت کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔ آج گو ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس موجود نہیں ہیں، مگر اللہ کی کتاب، یعنی قرآن کریم اور آپ ﷺ کی سنت موجود ہے، جن پر عمل پیرا ہو کر موجودہ دور کے فتنوں اور ہر قسم کی بدعت و ضلالت سے مسلمان محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اب بغیر دیکھے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور کتاب و سنت پر عمل کرنا بہت بڑے اجر کا باعث ہے۔ ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابو جمعہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ہمیں کوئی حدیث سناؤ جو تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو انھوں نے کہا: ''ہاں، میں تمھیں ایک جید حدیث سناؤں گا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ناشتہ کیا اور ہمارے ساتھ ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی تھے، انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم سے بھی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو ﴿۱۰۲﴾ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۱۰۳﴾

کوئی بہتر ہے؟ ہم آپ کے ساتھ اسلام لائے اور آپ کے ساتھ جہاد کیا؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، وہ لوگ جو تمھارے بعد ہوں گے، وہ مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انھوں نے مجھے دیکھا نہیں۔'' [ أحمد : ۴/۱۰۶، ح : ۱۶۹۷۸، ۱۶۹۷۹، و سندہ صحيح ]

امام احمد کے علاوہ ابو نعیم، حاکم اور ابو یعلی الموصلی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی شروع کی آیات ﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ کی تفسیر میں اس مفہوم کی کئی احادیث حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لائے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ ہم میں موجود نہیں، بلکہ اب ہم ایمان بالغیب لا کر قرآن و سنت پر عمل کریں گے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حجرات (۷)۔

**آیت 102** ① اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ...... : عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر یوں مروی ہے: ''اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے بھلایا نہ جائے، اس کا شکر ادا کیا جائے ناشکری نہ کی جائے۔'' [ ابن أبي حاتم ۳/۱۱۲۔ مستدرك حاكم : ۲/۳۲۳، ح : ۳۱۵۹ ] ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قول کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، مراد حسبِ استطاعت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [ التغابن : ۱۶ ] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

② وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: چونکہ موت کا علم ہی نہیں کب آ جائے، اس لیے موت آنے تک ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اسی طرح ڈرتے رہو۔

**آیت 103** ① وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا ...... : مومنوں کو اہل کتاب کی اطاعت سے دور رہنے کی نصیحت فرما کر اب یہاں سے چند اصولی باتوں کا حکم دیا جا رہا ہے، جن کی پابندی سے انسان ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا جیسے ڈرنے کا حق ہے، سب کا مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنا اور جدا جدا نہ ہونا اور اللہ کی نعمت، یعنی دلوں

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور لازم ہے کہ تمھاری صورت میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں﴿۱۰۴﴾

---

میں الفت ڈالنے کو یاد رکھنا۔

2 اللہ کی رسی سے مراد قرآن ہے، درحقیقت یہ ایک استعارہ ہے کہ اگر کچھ لوگ پہاڑ کی بلندی سے کسی گہری کھائی میں گر پڑیں تو انھیں نکالنے کے لیے اوپر سے رسی پھینکی جاتی ہے۔ اب جو لوگ مل کر اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں وہ اس رسی کے ساتھ اوپر نکل آئیں گے اور دوسرے گڑھے ہی میں رہ جائیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے گمراہی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے آسمان سے قرآن اتارا ہے، جس کے ساتھ وحی الٰہی، یعنی سنت رسول بھی اتاری ہے۔ مسلمان موجودہ فرقہ بندیوں سے بھی اسی صورت میں نجات پا سکتے ہیں کہ قرآن مجید کو لائحہ عمل قرار دیں اور ذاتی خیالات و آراء کو ترک کر کے سنت کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں اور مشائخ وائمہ کے اقوال و فتاویٰ کو قرآن و سنت کا درجہ دے کر گروہ بندی اختیار نہ کریں۔

3 اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً …… : اسلام سے پہلے اوس اور خزرج ہی نہیں بلکہ تمام عرب کفر و شرک اور باہمی عداوتوں میں مبتلا تھے۔ اسی کو یہاں آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں آگ میں گرنے سے بچا لیا اور عداوت کے بجائے اخوت پیدا کر دی۔ اگر اس عداوت کا اندازہ کرنا ہو تو سورۂ انفال (۶۲، ۶۳) کا مطالعہ کریں۔

**آیت 104** وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ ……: یعنی اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوط پکڑنے اور اختلاف و ضلالت سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ تم میں سے ایک جماعت نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کا فریضہ سرانجام دیتی رہے۔ جب تک اس قسم کی جماعت قائم رہے گی، لوگ ہدایت پر رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، پھر اگر طاقت نہ رکھے تو اپنی زبان سے، پھر اگر طاقت نہ رکھے تو اپنے دل سے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' [ مسلم، الإیمان، باب بیان کون النھی عن المنکر …… : ۴۹، عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ ] شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ ایک جماعت قائم رہے جہاد کرنے کے لیے اور دین کا تقید کرنے (پابندی کرنے اور کروانے) کے لیے، تا کہ کوئی دین کے خلاف نہ کرے اور جو اس کام پر قائم ہوں وہی کامیاب ہیں اور یہ کہ کوئی کسی سے واسطہ نہ رکھے ''موسیٰ بدین خود، عیسیٰ بدین خود'' (موسیٰ اپنے دین پر اور عیسیٰ اپنے دین پر) یہ راہ مسلمان کی نہیں ہے۔'' (موضح)

یہ تفسیر ''مِنْكُمْ'' کے ''مِنْ'' کو بعض کے معنی میں لینے کی صورت میں ہے، جیسا کہ عام طور پر ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ''

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۱۰۵﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۰۵﴾

میں "مِنْ" کو تبعیض کے لیے سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تفسیر کی رو سے مسلمانوں کی ایک جماعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے کافی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان "وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کے ہر فرد پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، کیونکہ آخر میں فرمایا کہ کامیاب صرف وہ ہیں جو یہ فریضہ سرانجام دیں اور ظاہر ہے کہ کامیابی کی ضرورت ہر مسلمان کو ہے۔ اس لیے یہاں "مِنْكُمْ" کے "مِنْ" کو بیانیہ ماننا پڑے گا اور معنی یہ ہو گا کہ اے مسلمانو! تمھاری صورت میں ایک ایسی جماعت ہونا لازم ہے جو نیکی کا حکم دیں۔ ابن جزی نے فرمایا: " وَ قَوْلُهُ "مِنْكُمْ" دَلِيْلٌ عَلٰی اَنَّهُ فَرْضُ كِفَايَةٍ لِاَنَّ مِنْ لِلتَّبْعِيْضِ وَ قِيْلَ اَنَّهَا لِبَيَانِ الْجِنْسِ وَالْمَعْنٰی كُوْنُوْا اُمَّةً " "یعنی ایک قول یہ ہے کہ "مِنْ" جنس کے بیان کے لیے ہے اور معنی یہ ہے کہ تم سب ایسی امت بن جاؤ جو ...... جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ [ الحج : ۳۰ ] "پس گندگی سے بچ جاؤ جو بت ہیں۔" ابن جزی کہتے ہیں: "مِنْ" لِبَيَانِ الْجِنْسِ كَاَنَّهُ قَالَ الرِّجْسُ هُوَ الْاَوْثَانُ " یعنی "مِنْ" جنس کے لیے ہے اور "رجس" سے مراد بت ہیں۔ [ التسهيل لابن جزی ]

**آیت 105** **وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا......:** اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلاف اور فرقہ بندی کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں حق کا پتا نہ تھا اور وہ اس کے دلائل سے بے خبر تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے سب کچھ جانتے ہوئے محض اپنے دنیاوی مفاد اور نفسانی اغراض کے لیے اختلاف اور فرقہ بندی کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس پر جمے ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے مختلف طریقوں سے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی اور اس سے دور رہنے کی تاکید فرمائی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہود اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) فرقوں میں جدا جدا ہو گئے، اسی طرح نصاریٰ بھی اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں جدا جدا ہو جائے گی۔" [ ترمذی، الإیمان، باب ما جاء فی افتراق هذه الأمة : ۲٦٤٠، و قال حسن صحیح ] دوسری حدیث میں وضاحت ہے کہ آپ نے فرمایا: "سب آگ میں جائیں گے مگر ایک۔" پوچھنے پر بتایا: (( مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِيْ )) "جس طریقے پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔" [ ترمذی، الإیمان، باب ما جاء فی افتراق هذه الأمة : ۲٦٤١، و حسنه الألبانی ]

افسوس! امت مسلمہ کے تفرقہ بازوں نے بھی وہی روش اختیار کی کہ حق اور اس کے روشن دلائل قرآن کریم اور سنت صحیحہ کی صورت میں انھیں خوب اچھی طرح معلوم ہیں، مگر وہ اپنی فرقہ بندیوں پر جمے ہوئے ہیں اور اپنی عقل و ذہانت کا سارا زور پہلی امتوں کی طرح تاویل و تحریف کے مکروہ شغل میں ضائع کر رہے ہیں۔

يَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّ تَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ ۡ اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ ابۡيَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِىۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَـقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۱۰۹﴾

جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، تو وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا؟ تو عذاب چکھو، اس وجہ سے کہ تم کفر کیا کرتے تھے ﴿۱۰۶﴾ اور رہے وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہوں گے، سو اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۰۷﴾ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں پر کوئی ظلم نہیں چاہتا ﴿۱۰۸﴾ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں ﴿۱۰۹﴾

**آیت 106** **اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ** : اس سے بظاہر تو مرتدین مراد ہیں، مگر درحقیقت یہ تمام کفار کو شامل ہے، کیونکہ جب ثابت ہے کہ روز اول کے وقت سب نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ ہر شخص دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لہٰذا جو بھی کفر اختیار کرے گا وہ ایمان لانے کے بعد ہی کافر ہوگا۔ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اصلی کافر، مرتدین، منافقین اور پھر اہل بدعت سبھی آ جاتے ہیں، کیونکہ یہ سب ایمان لانے کے بعد کفر کر رہے ہیں۔ (رازی، شوکانی) شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''معلوم ہوا کہ سیاہ منہ ان کے ہیں جو مسلمانی میں کفر کرتے ہیں، منہ سے کلمۂ اسلام کہتے ہیں اور عقیدہ خلاف رکھتے ہیں، سب گمراہ فرقوں کا یہی حکم ہے۔'' (موضح)

**آیت 107** **وَاَمَّا الَّذِيۡنَ ابۡيَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ** : چہروں کی یہ سیاہی اور سفیدی قیامت کے دن ہوگی۔ جو لوگ ایمان پر قائم رہے، پھر بدعات اور گروہ بندی سے بچ کر اصل کتاب و سنت « مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِیْ » پر قائم رہے، ان کے چہرے سفید ہوں گے۔

**آیت 108** **وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ** : یعنی جہاد اور امر بالمعروف کا جو حکم فرمایا یہ مخلوق پر ظلم نہیں، اس میں ان کی تربیت ہے۔ (موضح) جب اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم اور ہر چیز پر قدرت حاصل ہے تو اسے کسی پر ظلم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 109** **وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ......** : یعنی جہاد میں خلق کی جان و مال تلف ہو تو مالک کے حکم سے ہے، ہر چیز اللہ کا مال ہے۔ (موضح)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا، ان میں سے کچھ مومن ہیں اور ان کے اکثر نافرمان ہیں ﴿۱۱۰﴾

آیت 110 ① كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ...... : یعنی یہ امت ہر امت سے بہتر ہے انھی دو صفات میں، امر بالمعروف یعنی جہاد اور ایمان یعنی توحید کا تقید (پابندی) اس قدر کسی اور دین میں نہیں۔ (موضح) ان دو صفتوں سے پہلے ایک اور صفت بھی ذکر فرمائی ہے اور وہ ہے "اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" یعنی یہ امت پیدا ہی لوگوں کی خیر خواہی اور اصلاح کے لیے کی گئی ہے۔ یاد رہے! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد جہاد ہے، وہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے یا دل سے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی یہ تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: (( خَيْرَ النَّاسِ لِلنَّاسِ تَأْتُوْنَ بِهِمْ فِي السَّلَاسِلِ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ حَتّٰى يَدْخُلُوْا فِي الْإِسْلَامِ )) [ بخاري، التفسير، باب : ﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس﴾ : ٤٥٥٧ ] "تم لوگوں کے حق میں تمام لوگوں سے بہتر ہو کہ ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر لاتے ہو، حتیٰ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔" معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم ستر (۷۰) امتوں کو پورا کر رہے ہو، جن میں سے تم اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بہتر اور سب سے معزز ہو۔" [ أحمد : ٤٤٧/٤، ح : ٢٠٠٣٧۔ ترمذي، التفسير، باب و من سورة آل عمران : ٣٠٠١، و حسنه الألباني ]

② کچھ لوگ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے لوگ خود بخود برائی چھوڑ دیں گے، اگر ایسا ہوتا تو برائی سے منع کرنے کا حکم نہ ہوتا اور سب سے بڑی برائی شرک و کفر کو زبان سے روکنے کے ساتھ قتال (لڑنا) فرض نہ ہوتا۔

③ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ : یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں دنیا کے کاروبار کا جو نقصان ہوتا ہے تم اس کی پروا نہیں کرتے، بلکہ اللہ پر یقین رکھتے ہو کہ وہ اپنا کام سرانجام دینے والوں کے لیے کوئی کمی نہیں رہنے دے گا۔

④ خَيْرَ اُمَّةٍ : اس کا ایک معنی پہلے گزر چکا کہ یہ امت تمام امتوں سے بہتر ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ خطاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہے کہ تم پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر ہو، کیونکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر (جہاد) اور ایمان باللہ (توحید خالص کا عقیدہ) تم میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس سے صحابہ کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور ان پر کفر کا فتویٰ لگانے والوں کے منہ میں خاک پڑتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ الفاظ کے لحاظ سے دونوں معنی درست ہیں اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔

⑤ بہترین امت ہونے کا وصف چند شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، یعنی لوگوں کی خیر خواہی و اصلاح، امر بالمعروف و نہی عن المنکر (جہاد) اور ایمان باللہ (توحید خالص)، جب اس امت میں یہ چیزیں نہیں رہیں گی تو وہ بہترین امت ہونے کے وصف

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

وہ تمھیں ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے مگر معمولی تکلیف اور اگر تم سے لڑیں گے تو تم سے پیٹھیں پھیر جائیں گے، پھر وہ مدد نہیں کیے جائیں گے ﴿۱۱۱﴾ ان پر ذلت مسلط کر دی گئی جہاں کہیں وہ پائے جائیں مگر اللہ کی پناہ اور لوگوں کی پناہ کے ساتھ اور وہ اللہ کے بھاری غضب کے ساتھ لوٹے اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی، یہ اس لیے کہ بے شک وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ﴿۱۱۲﴾

---

سے محروم ہو جائے گی، جیسا کہ یہود کے بارے میں آتا ہے: ﴿ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ﴾ [ المائدۃ : ۷۹ ] ''وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے جو انھوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے۔'' جیسا کہ اب اس امت کا حال ہو رہا ہے۔

6 وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ …… : اس آیت میں اہل کتاب کو اسلام لانے کی ترغیب ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان میں سے کچھ مومن ہیں، مگر اکثر فاسق ہیں اور یہ اللہ کی مشیت ہے جس کی حکمت وہی جانتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ یوسف : ۱۰۳ ] ''اور اکثر لوگ خواہ تو حرص کرے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں۔'' اس سے جمہوریت کا بھی رد ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو۔

آیت 111 اِلَّاۤ اَذًى: "اَذًى" میں تنوین تقلیل وتحقیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''معمولی تکلیف'' کیا ہے، مراد زبانی بہتان تراشی اور سازشیں ہیں، مگر میدان میں تمھارے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہود کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہر جگہ شکست ہوئی اور رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا، بالآخر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے انھیں جزیرۂ عرب سے جلاوطن کر دیا۔ یہ آیت اخبار بالغیب اور پیشین گوئی پر مشتمل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس میں فتح و کامیابی اور نصرت کی بشارت دی ہے۔ اب اگرچہ یہود نصرانیوں کے بل بوتے پر فلسطین کے کچھ حصے اور بیت المقدس پر قابض ہیں، مگر وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ جب مسلمانوں کے ساتھ یہود کی جنگ میں پتھر اور درخت بھی مسلمان کو بلا کر کہیں گے: ''اے مسلم! یہ میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، اسے قتل کر دے۔'' [ مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة حتی …… : ۲۹۲۱، ۲۹۲۲ ]

آیت 112 1 ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ …… : یعنی مغلوب ہونے کے ساتھ ہی ان پر ذلت بھی مسلط کر دی گئی۔ سورۂ بقرہ (۶۱) یہود کی اس ذلت سے بچاؤ کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ کی پناہ میں آ جائیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

وہ سب برابر نہیں۔ اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر) قائم ہے، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدے کرتے ہیں﴿۱۱۳﴾ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے جلدی کرتے ہیں اور یہ لوگ صالحین سے ہیں﴿۱۱۴﴾

وہ اسلام قبول کر لیں، یا اسلامی مملکت میں جزیہ دے کر ذمی کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کی پناہ ان کو حاصل ہو جائے۔ اس کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ اسلامی مملکت کے بجائے عام مسلمان ان کو پناہ دے دیں، جیسا کہ ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہے اور اسلامی مملکت کے حکمرانوں اور تمام مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ معمولی درجے کے مسلمان حتیٰ کہ کسی عورت کی دی ہوئی پناہ کو بھی رد نہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی بڑی غیر مسلم طاقت کی پشت پناہی انھیں حاصل ہو جائے، کیونکہ ''النَّاسِ'' عام ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔

② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : یعنی نافرمانی اور حد سے گزرنے کا اثر یہ ہوا کہ وہ کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے، پھر کفر اور قتل انبیاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا غضب اترا، ذلیل و محتاج ہو گئے، حکومت اور ریاست چھن گئی۔ حاصل یہ کہ ذلت و غضب اور مسکنت کی وجہ کفر اور قتلِ انبیاء ہے اور کفر اور قتلِ انبیاء کی وجہ ان کی نافرمانی اور زیادتی ہے، پس ''ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا'' سے سبب کے سبب کی طرف اشارہ ہے۔

**آیت 113** ① لَيْسُوْا سَوَآءً ...... : یعنی گو اہل کتاب کی اکثریت فاسق ہے مگر سب ایک جیسے نہیں، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ایمان لے آتے ہیں۔ طبری اور ابن ابی حاتم نے حسن سندوں کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید، اسد بن عبید رضی اللہ عنہم اور ان کے دوسرے ساتھی مسلمان ہوئے اور اسلام میں رغبت رکھ کر پکے ہو گئے تو یہودی مولوی اور ان کے بے ایمان لوگ کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیچھے صرف ہمارے برے لوگ ہی لگے ہیں، اگر وہ ہمارے اچھے لوگ ہوتے تو اپنے آباء کا دین چھوڑ کر غیر کی طرف نہ جاتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات (۱۱۳، ۱۱۴) نازل فرمائیں۔ یہ الفاظ طبری کے ہیں۔ اہل کتاب کے ان اچھے لوگوں کا ذکر سورۂ آل عمران (۱۹۹)، بنی اسرائیل (۱۰۷ تا ۱۰۹) اور سورۂ بقرہ (۱۲۱) میں بھی ہے۔

② اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ ...... : یعنی رات کو قیام کرتے ہیں اور تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ''قَآئِمَةٌ'' کا ایک معنی ''مُسْتَقِيْمَةٌ'' ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرماں بردار ہیں اور ان کی شریعت پر قائم ہیں۔

**آیت 114** يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ...... : یہ یہود پر طنز ہے کہ جن لوگوں کو تم برا کہتے ہو ان میں تو یہ نیک اوصاف ہیں، وہ برے

وَ مَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝۱۱۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱۶ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۷

اور وہ جو نیکی بھی کریں اس میں ان کی بے قدری ہرگز نہیں کی جائے گی اور اللہ متقی لوگوں کو خوب جاننے والا ہے ۝۱۱۵ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا نہ کبھی ان کے اموال انھیں اللہ سے (بچانے میں) کچھ کام آئیں گے اور نہ ان کی اولاد اور وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝۱۱۶ اس کی مثال جو وہ اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس ہوا کی مثال جیسی ہے جس میں سخت سردی ہے، جو ایسے لوگوں کی کھیتی کو آ پہنچی جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، تو اس نے اسے برباد کر دیا اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ (خود) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں ۝۱۱۷

---

کیسے ہو گئے، وہ تو صالحین میں سے ہیں۔

آیت 115 وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ ...... : یعنی اہل کتاب میں سے جو لوگ بھی صفاتِ مذکورہ سے متصف ہو جائیں گے انھیں صرف ان کے بعد کے نیک اعمال کا ثواب ہی نہیں ملے گا بلکہ اسلام میں داخل ہونے سے قبل کی نیکیوں کا اجر بھی حاصل ہوگا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ''تین آدمیوں کو دوہرا اجر ملے گا، ان میں سے ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص ہے جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور پھر مجھ پر بھی، تو اسے دو اجر ملیں گے، دوسرا وہ غلام جو کسی کی ملکیت میں ہے، اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے مالکوں کا بھی، اس کے لیے بھی دو اجر ہیں اور تیسرا وہ آدمی جس نے اپنی لونڈی کو ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا، پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا تو اس کے لیے بھی دو اجر ہیں۔'' [ بخاري، العلم، باب تعليم الرجل أمته وأهله : ۹۷۔ مسلم : ۱۵٤ ] اور دیکھیے سورۂ حدید (۲۸)۔

آیت 117،116 ❶ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ ...... : یعنی جو مال خرچ کیا اور اللہ کی رضا پر نہ دیا، آخرت میں دیا نہ دیا برابر ہے۔ (موضح)

عام طور پر مصیبت کے وقت اولاد انسان کے کام آتی ہے، مگر اس وقت کفار کی اولاد ان کے کسی کام نہیں آئے گی۔ اوپر کی آیات میں مومن اور متقی کے نیک اعمال کا انجام ذکر فرمایا کہ ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی بھی ضائع نہیں ہوگی، بلکہ اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا، اب اس آیت میں کافر کے صدقہ و خیرات اور رفاہی کاموں کو آخرت میں بے فائدہ اور ضائع ہونے کے اعتبار سے ان لوگوں کی کھیتی سے تشبیہ دی ہے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، جو کھیتی دیکھنے میں سرسبز و شاداب نظر آئے لیکن یکایک سخت سرد ہوا چلے اور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ یہی حال کفار کے صدقہ و خیرات کا ہے، وہ چونکہ ایمان و اخلاص کی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا١ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ١ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ١ۖۚ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ١ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۱۱۸

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے، وہ ہر ایسی چیز کو پسند کرتے ہیں جس سے تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی شدید دشمنی تو ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپا رہے ہیں وہ زیادہ بڑا ہے۔ بے شک ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم سمجھتے ہو۱۱۸

---

دولت سے محروم ہیں، اس لیے آخرت میں ان کے اعمال تباہ و برباد ہو جائیں گے اور انھیں ان اعمال کا کچھ بھی اجر نہیں ملے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان (۲۳) اور سورۂ نور (۳۹، ۴۰) ہاں کفار کو دنیا ہی میں ان کے اچھے اعمال کا بدلہ مل جائے گا۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۲۰) "صِرٌّ" شدید ٹھنڈی ہوا جو کھیتوں کو جلا دے۔ واضح رہے کہ قرآن میں عموماً "رِيْحٌ" کا لفظ عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے اور "رِيَاحٌ" جمع کا لفظ رحمت کے لیے۔ (مفردات) سورۂ یونس (۲۲) میں "رِيْحٌ" کا لفظ موافق ہوا کے لیے آیا ہے: ﴿وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ﴾ دوسرے مقامات پر عذاب کی ہوا کے لیے آیا ہے۔

② وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ ...... : یعنی ان کے اعمال جو ضائع اور برباد ہوئے یہ اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم کیا ہے، بلکہ خود ان کے اپنے اوپر ظلم کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انھوں نے نہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں اور کتابوں کی تصدیق کی اور نہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کیے، بلکہ ریا کاری کرتے رہے۔

**آیت 118** ① "بِطَانَةً" پوشیدہ چیز اور وہ کپڑا جو اوپر والے کپڑے کے نیچے جسم کے ساتھ ملا ہوتا ہے، مراد دلی دوست خاص راز دار۔ یہ باب "نَصَرَ" سے مصدر ہے، واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ "مِنْ دُوْنِكُمْ" (اپنے مخلص مسلمانوں کے سوا) اس کا تعلق ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۰۰] سے ہے اور اس میں کفار کی طرف میلان اور ان کی دوستی سے منع فرمایا گیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: "مسلمانوں میں سے کچھ آدمی یہودیوں سے میل جول اور تعلقات رکھتے تھے۔ کیونکہ اسلام سے پہلے وہ آپس میں ہمسائے اور حلیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کر کے انھیں اپنے اندرونی راز داں اور دلی دوست بنانے سے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس میں (راز افشا ہونے اور) ان کی طرف سے فتنے کا شدید خطرہ تھا۔"

ابن ابی حاتم ہی نے صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ اہل حیرہ سے ایک نوجوان محفوظ رکھنے والا کاتب ہے، آپ اسے کاتب (سیکرٹری) رکھ لیں۔ فرمایا: "پھر تو میں مومنوں کے سوا "بِطَانَةً" (راز دار) بنانے والا ہوں گا۔" [ابن أبي حاتم: ۳/ ۱۴۷، ح: ۴۰۸۷] ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

ہاں! تم وہ لوگ ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے انگلیوں کی پوریں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ کہہ دے اپنے غصے میں مر جاؤ، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۹﴾

اس ایک نصرانی کاتب ہے۔'' انھوں نے فرمایا: ''اللہ تجھے مارے، یہ تم نے کیا کیا؟ کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ [ المائدة : ۵۱ ] تم نے کسی مسلمان کو کیوں نہیں رکھا؟'' میں نے عرض کی: ''اے امیر المومنین! مجھے اس کی کتابت سے غرض ہے، اس کا دین اس کے لیے ہے۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب اللہ نے انھیں رسوا کر دیا ہے تو میں ان کی تکریم نہیں کر سکتا، جب اللہ نے انھیں ذلیل کیا ہے تو میں انھیں عزت نہیں دے سکتا، جب اللہ نے انھیں دور کر دیا ہے تو میں انھیں قریب نہیں کر سکتا۔'' [ السنن الکبریٰ للبیہقی : ۱۰/ ۱۲۷، ح : ۲۰۹۱۱، وھو حسن ]

"مِنْ دُوْنِكُمْ" (اپنے سوا) کے الفاظ عام ہیں، یہود و نصاریٰ، منافقین اور مشرکین سبھی "مِنْ دُوْنِكُمْ" میں داخل ہیں، اس لیے انتظامی امور میں کسی منافق یا غیر مسلم (ذمی) کو متعین کرنا ممنوع ہے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کے راز فاش ہونے کا خطرہ ہے۔ بلکہ مسلمان کے لیے مشرکین کے ملک میں رہنا بھی درست نہیں۔ دیکھیے سورۂ نساء (۹۷، ۹۸)۔

افسوس کہ اس وقت مسلمان ملکوں کے حکمرانوں نے اللہ کے اس حکم کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور غیر مسلم ان کے کلیدی عہدوں پر فائز اور تقریباً تمام اہم رازوں سے آگاہ ہیں، نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

❷ لَا يَاْلُوْنَكُمْ: "اَلَا يَاْلُوْ (ن)" کمی کرنا، کوتاہی کرنا۔ "خَبَالًا" خرابی ڈالنا، نقصان پہنچانا۔ "مَا عَنِتُّمْ" "عَنَتٌ" مشقت، تکلیف، یعنی ''جس سے تم تکلیف میں پڑو۔'' دلی دوست نہ بنانے کے حکم کی وجہ کی طرف اشارہ ہے، یعنی اگرچہ یہ لوگ اپنی منافقت کی بنا پر تم سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہتے جن سے تمھیں ان کی اسلام دشمنی کا پتا چل سکے، مگر شدید عداوت کی وجہ سے ان کی زبان پر ایسے الفاظ آ ہی جاتے ہیں، جن سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ تمھارے خیر خواہ نہیں بلکہ بدترین دشمن ہیں اور تمھارے خلاف جو جذبات اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

❸ قَدْ بَيَّنَّا......: یعنی کفار سے دوستی نہ کرنے کے سلسلہ میں یہودیوں اور منافقین کے بغض و عناد اور ان کے دلی حسد سے متعلق ہم نے پتے کی باتیں خوب کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اب غور و فکر کرنا تمھارا کام ہے۔

آیت 119 "الْاَنَامِلَ" یہ "اَنمِلَةٌ" کی جمع ہے، جس کا معنی ہے انگلیوں کے پورے۔ "عَضَّ يَعَضُّ (ف)" کا معنی

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۱۲۰﴾ وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۲۱﴾

اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔ بے شک اللہ، وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۲۰﴾ اور جب تو صبح سویرے اپنے گھر والوں کے پاس سے نکلا، مومنوں کو لڑائی کے لیے مختلف ٹھکانوں پر مقرر کرتا تھا اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۲۱﴾

ہے دانتوں سے کاٹنا۔ ''الکتاب'' سے مراد تمام آسمانی کتابیں ہیں، یعنی تم تو سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور وہ کسی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے، پھر بھی بجائے اس کے کہ تم ان سے نفرت کرو، الٹا ان سے دوستی کرتے ہو اور وہ بجائے دوستی کے تم سے دشمنی رکھتے ہیں اور دشمنی بھی اتنی سخت کہ اکیلے ہوتے ہیں تو غصے کی وجہ سے دانتوں سے انگلیوں کے پورے کاٹتے ہیں، مگر جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ منافقین کی مسلم دشمنی کو واضح فرمایا ہے۔

**آیت 120** اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ...... : اس آیت میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ دشمنوں کے مکر و فریب اور ان کی چالوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ تم صبر و استقلال اور تقویٰ سے کام لو، اگر یہ اصول اپنا لو گے تو دشمن تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اکثر منافق بھی یہود میں سے تھے، اس واسطے ان کے ذکر کے ساتھ یہود کا ذکر بھی فرمایا۔ اب آگے غزوۂ احد کی باتیں مذکور ہیں، کیونکہ اس میں بھی مسلمانوں نے بعض کافروں کا کہنا مان لیا تھا اور لڑائی سے پھر چلے تھے اور منافقوں نے اپنے نفاق کی باتیں ظاہر کی تھیں۔'' (موضح)

**آیت 121** وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ ...... : یہاں سے غزوۂ احد کا بیان ہے۔ غزوۂ بدر میں ذلت آمیز شکست، ستر آدمی قتل اور ستر قید ہونے کے بعد مشرکین نے جوش انتقام میں مدینہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا اور ارد گرد سے مختلف قبائل جمع کر کے تین ہزار کا مسلح لشکر لیا اور جبل احد کے قریب آ کر ٹھہر گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ بعض نے مدینہ میں رہ کر لڑنے کا مشورہ دیا، جب کہ بعض پر جوش نوجوانوں نے، جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، میدان میں نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آپ ان کی رائے کے مطابق ایک ہزار کی جمعیت لے کر باہر نکلے۔ مقام ''شوط'' پر عبد اللہ بن ابی نے مسلمانوں کو دھوکا دیا اور اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ لوٹ آیا۔ اس سے بعض مسلمانوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ثابت قدمی بخشی۔ رسول اللہ ﷺ سات سو صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ جمعیت لے کر آگے بڑھے اور احد کے قریب وادی میں فوج کو آراستہ کیا، جس کی طرف قرآن نے ﴿ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ﴾ میں اشارہ کیا ہے۔ اسلامی فوج کی پشت پر جبلِ احد تھا اور ایک جانب ٹیلے پر عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں پچاس تیر اندازوں کو

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ

اور جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں، حالانکہ اللہ ان دونوں کا دوست تھا اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ﴿۱۲۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بدر میں تمھاری مدد کی، جب کہ تم نہایت کمزور تھے، پس اللہ سے ڈرو، تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۲۳﴾ جب تو ایمان والوں سے کہہ رہا تھا کیا تمھیں کسی طرح کافی نہ ہوگا کہ تمھارا رب تین ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے، جو اتارے ہوئے ہوں ﴿۱۲۴﴾ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو اور وہ اپنے اسی جوش میں تم پر آ پڑیں تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا، جو خاص نشان والے ہوں

دستہ متعین تھا، نیز آپ ﷺ نے انھیں حکم دیا تھا کہ اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمارے جسموں کو نوچ رہے ہیں، تو پھر بھی اس جگہ کو نہ چھوڑنا، یہاں تک کہ میں تمھیں پیغام بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے کفار کو شکست دے دی ہے اور انھیں پامال کر دیا ہے، پھر بھی اس جگہ کو نہ چھوڑنا، یہاں تک کہ میں پیغام بھیجوں۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ کفار کو پسپا ہوتے دیکھ کر نیچے اتر آئے اور اس گھاٹی کو چھوڑ دیا جس سے مشرکین کو عقب سے حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ثابت قدم رہے۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کا دانت مبارک شہید ہو گیا، سر اور پیشانی مبارک بھی زخمی ہو گئے۔ آخر کار صحابہ آپ ﷺ کے گرد دوبارہ جمع ہوئے، جس سے میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا اور دشمن کو ناکام ہو کر لوٹ جانا پڑا۔ یہ شوال ۳ھ کا واقعہ ہے۔ ان آیات میں جنگ کے بعض واقعات کی طرف اشارے آ رہے ہیں۔ (ابن کثیر)

**آیت 122** اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ ...... : ان دو جماعتوں سے مراد انصار کے دو قبیلے بنوسلمہ اور بنو حارثہ ہیں (جو منافق عبداللہ بن ابی کی واپسی دیکھ کر دل شکستہ ہو گئے اور انھوں نے واپس آنے کا ارادہ کر لیا تھا)۔ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ إذ همت طآئفتان ...... ﴾ : ٤٥٥٨ ]

**آیت 123** وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ : اس لفظ سے مسلمانوں کی قلت تعداد اور ضعفِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ مقام بدر مدینہ سے قریباً بیس میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ غزوۂ بدر بروز جمعہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ (۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کو پیش آیا۔ اس آیت میں جنگ احد میں شکست کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معرکۂ بدر کے واقعات پر غور و فکر کی دعوت اور آئندہ ثابت قدم رہنے کے لیے تقویٰ کی تعلیم دی ہے۔ جنگِ بدر کی تفصیل کے لیے سورۂ انفال (۴۱) ملاحظہ کیجیے۔ (شوکانی، ابن کثیر)

**آیت 124 تا 127** اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ...... : اس کا تعلق یا تو جنگ بدر سے ہے یا جنگ احد سے۔ امام طبری نے پہلی

مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

گے ﴿۱۲۵﴾ اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر تمھارے لیے ایک خوشخبری اور تاکہ تمھارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہو جائیں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے، جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۲۶﴾ تاکہ وہ ان لوگوں کا ایک حصہ کاٹ دے جنھوں نے کفر کیا، یا انھیں ذلیل کر دے، پس وہ ناکام واپس لوٹ جائیں ﴿۱۲۷﴾ تیرے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں، یا وہ ان پر مہربانی فرمائے، یا انھیں عذاب دے، کیوں کہ بلاشبہ وہ ظالم ہیں ﴿۱۲۸﴾ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور اللہ بے حد بخشنے والا نہایت رحم والا ہے ﴿۱۲۹﴾

بات کو ترجیح دی ہے، یعنی جب کفار کی تیاری اور کثرتِ تعداد کو دیکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں تشویش پیدا ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرشتوں کی مدد کا ذکر کر کے انھیں تسلی دی۔ چنانچہ بدر میں فرشتے نازل ہوئے۔ بدر میں فرشتوں کے نزول کی کیفیت کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۹)۔ (ابن کثیر، شوکانی) بدر کے دن فرشتوں کی تعداد سورۂ انفال میں ایک ہزار ذکر ہوئی ہے، جبکہ یہاں تین ہزار اور پانچ ہزار کا ذکر ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ پہلے ایک ہزار کا وعدہ ہوا، پھر تین ہزار اور پھر پانچ ہزار کی بشارت ہوئی، ان کا آپس میں کوئی تعارض نہیں۔ (ابن کثیر)

بعض کے نزدیک اس وعدے کا تعلق جنگ احد سے ہے اور انھوں نے کہا ہے، چونکہ مسلمانوں نے جنگِ احد میں توکل اور صبر سے کام نہ لیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مدد کو روک لیا، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر فرشتے نازل ہوتے تو مسلمان شکست نہ کھاتے۔ (ابن جریر)

**آیت 129،128** ① لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ…… : اس آیت میں پیغمبر ﷺ سے فرمایا کہ بندے کو اختیار نہیں، ہر قسم کے اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ (موضح)

بئر معونہ پر جن قبائل نے آپ ﷺ کے ستر صحابہ کو دھوکے سے قتل کیا تھا، ان کے خلاف اور جنگِ احد میں مشرکین کی طرف سے جو لوگ پیش پیش تھے، ان کے خلاف رسول اللہ ﷺ نے نام لے لے کر دعائے قنوت شروع کی۔ بئر معونہ والا واقعہ بخاری میں موجود ہے۔ [ بخاری، المغازی، باب غزوۃ الرجیع…… : ۴۰۸۶ ]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۳۰

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مت کھاؤ سود کئی گنا، جو دگنے کیے ہوئے ہوں اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم فلاح پاؤ (۱۳۰)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد سر اٹھاتے تو " سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ " کے بعد یہ دعا کیا کرتے: ''اے اللہ! فلاں، فلاں اور فلاں پر لعنت فرما۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ ''تیرے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ليس لك من الأمر شيء ﴾ : ٤٠٦٩ ]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام لوگوں کو جن کا نام لے کر آپ لعنت فرماتے تھے، توبہ کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مختار کل اور عالم الغیب ذات صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ہی ہے، ورنہ آپ اپنے عزیز چچا کو ضرور مسلمان کر لیتے اور احد اور بئر معونہ میں ظلم کرنے والوں کو ضرور ملعون کروا لیتے۔

ان آیات اور احادیث سے معلوم ہوا کہ قنوت نازلہ میں کسی کافر کا نام لے کر لعنت کرنا جائز نہیں، کیا خبر اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق بخش دے۔ ہاں، عام کفار پر لعنت درست ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔

آیت 130 ❶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا: شاید سود کا ذکر یہاں (جنگ احد کے تذکرے میں) اس لیے فرمایا کہ اوپر (آیت ۱۲۲ میں) ذکر ہوا جہاد میں نامردی کا اور سود کھانے سے نامردی آتی ہے دو سبب سے، ایک یہ کہ مال حرام کھانے سے توفیق اطاعت کم ہوتی ہے اور بڑی اطاعت جہاد ہے اور دوسرے یہ کہ سود لینا کمال بخل ہے۔ چاہیے تھا کہ اپنا مال جتنا دیا تھا لے لیتا، درمیان میں کسی کا کام نکل جاتا، یہ بھی مفت نہ چھوڑے، اس کا جدا بدلہ چاہے، تو جس کو مال پر اتنا بخل ہو وہ جان کب دینا چاہے گا۔ (موضح)

پھر انصار کے یہود کے ساتھ سودی لین دین کے تعلقات تھے اور احد میں منافقینِ یہود کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا، گویا اس کو حرام قرار دے کر ان تعلقات کو ختم کر دیا۔

❷ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً: اس سے بعض لوگوں نے سود مرکب کو حرام اور سود مفرد کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہاں اس زمانے کے سود خوروں کی سنگ دلی بیان ہو رہی ہے، جو آج بھی موجود ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بہت سے لوگ دوسروں کو سودی قرض دیا کرتے، جب قرض کی میعاد ختم ہو جاتی تو مقروض سے کہتے، قرض ادا کرو ورنہ سود میں اضافہ کرو۔ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں میعاد میں توسیع کر دی جاتی اور سود کی مقدار میں اضافہ کر دیا جاتا۔ اس طرح کچھ عرصے کے بعد سود کی مقدار اصل زر سے بھی کئی گنا زیادہ ہو جاتی اور یہ سود تجارتی اور غیر تجارتی دونوں طرح کا ہوتا تھا، جیسا کہ اس آیت کی تفسیر کے تحت تابعین نے تصریح کی ہے۔ سودی کاروبار کی اس بھیانک صورت کی طرف قرآن نے "اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ مرکب سود حرام اور سادہ جائز ہے۔ اسلام میں ہر قسم کا سود حرام ہے،

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ۚ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ۚ وَ سَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾ۙ

اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ اور رسول کا حکم مانو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۳۲﴾ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دوڑو اپنے رب کی جانب سے بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے، ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۳﴾

---

صرف قرض کی ایک صورت جائز ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴾ [ البقرۃ : ۲۷۹ ] ''اور اگر تم توبہ کر لو تو تمھیں اپنے اصل مال لینے کی اجازت ہے، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔''

**آیت 131** وَاتَّقُوا النَّارَ ...... : اس آیت میں سود خوروں کو اس آگ سے ڈرایا گیا ہے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا سود لینا اور دینا مسلمان کا کام نہیں۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے اور باز نہیں آتا اسے اس آگ کے لیے تیار رہنا چاہیے جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا اعلان کان کھول کر سننے کا حکم ہے۔ (قرطبی)

**آیت 132** وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار تو وہ شخص ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا فرماں بردار ہو۔ سود کھانا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا دو متضاد چیزیں ہیں۔ آیت کے الفاظ عام ہونے کی وجہ سے اس میں ہر نافرمان کے لیے بھی عتاب موجود ہے۔ (رازی)

**آیت 132** ① وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ : اہل ایمان کو ان اعمال صالحہ کی طرف جلدی کرنی چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا سبب بنتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نیک اعمال سرانجام دینے میں جلدی کر لو، ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے جو اندھیری رات کے مختلف ٹکڑوں کی طرح (یکے بعد دیگرے) رونما ہوں گے۔ صبح کو آدمی مومن ہوگا اور شام کو کافر ہوگا اور شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر، وہ اپنے دین کو دنیا کے معمولی سامان کے عوض بیچ دے گا۔'' [ مسلم، الإیمان، باب الحث علی المبادرۃ...... : ۱۱۸، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ]

② وَجَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ ...... : یعنی جس طرح سود خور کافر کے لیے دوزخ تیار کی گئی ہے اسی طرح فرماں بردار متقی کے لیے جنت تیار کی گئی ہے اور پھر جنت کے متعلق ﴿ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ﴾ فرما کر اس کی وسعت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اے محمد! یہ بتائیں کہ جنت

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۳۴﴾

---

عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو آگ کہاں ہے؟'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہ بتاؤ کہ پہلے رات تھی، پھر نہیں رہی تو کہاں چلی گئی؟'' اس نے کہا: ''اللہ بہتر جانتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔'' [ صحیح ابن حبان : ۱۰۳۔ مستدرك حاكم : ۹۲/۱، ح : ۱۰۳، وصححه و وافقه الذهبی ]

حقیقت یہ ہے کہ جنت اور جہنم کے جو اوصاف قرآن و حدیث میں جس طرح مذکور ہیں اسی طرح ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے، خواہ ہماری عقل و ذہن کی رسائی ان تک نہ ہو، اور یہی نہیں، آخرت کے تمام معاملات کا یہی حال ہے۔

**آیت 134** ① **الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ ......** : ان آیات میں اہل جنت کی صفات کا ذکر ہے، چنانچہ ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ خوش حالی اور تنگ دستی ہر حالت میں وہ اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں اور نیک کاموں اور رضائے الٰہی کے لیے مال صرف کرنے سے انھیں کوئی چیز غافل نہیں کرتی۔ (ابن کثیر)

② **وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ** : ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ غصہ سے مغلوب ہونے کے بجائے اس پر قابو پا لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پہلوان وہ نہیں جو پچھاڑ دینے والا ہو، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔'' [ بخاری، الأدب، باب الحذر من الغضب: ۶۱۱۴، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے عرض کی: ''مجھے وصیت فرمائیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَا تَغْضَبْ )) ''غصہ مت کر۔'' اس نے کئی دفعہ درخواست دہرائی، آپ نے یہی فرمایا: (( لَا تَغْضَبْ )) ''غصہ مت کر۔'' [ بخاری، الأدب، باب الحذر من الغضب : ۶۱۱۶۔ ترمذی : ۲۰۲۰ ]

③ **وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ** : یہ دراصل غصہ پی جانے کا لازمی تقاضا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین چیزوں پر میں قسم کھاتا ہوں، صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ معاف کر دینے سے بندے کی عزت میں اضافہ ہی کرتا ہے اور جو اللہ کے لیے نیچا ہوتا ہے اللہ اسے اونچا کر دیتا ہے۔'' [ مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو : ۲۵۸۸۔ عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ] اور یہ احسان کا مقام ہے اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟ اور انھوں نے جو کیا اس پر اصرار نہیں کرتے جب کہ وہ جانتے ہوں ﴿۱۳۵﴾ یہ لوگ ہیں جن کی جزا ان کے رب کی طرف سے بڑی بخشش اور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں اور (یہ) عمل کرنے والوں کا اچھا اجر ہے ﴿۱۳۶﴾

**آیت 135** ① وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ...... : یعنی اگر بشری تقاضے کے تحت ان سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی نے گناہ کیا تو کہا: ''اے میرے رب! میں نے ایک گناہ کیا ہے، تو مجھے وہ بخش دے۔'' تو اللہ عزوجل نے فرمایا: ''میرے بندے نے ایک گناہ کیا تو اس نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے، سو میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔'' پھر اس نے ایک اور گناہ کیا اور کہا: ''اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، تو اسے بخش دے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے، (فرشتو! گواہ رہو کہ) میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، پھر بندہ رکا رہا جتنا اللہ نے چاہا پھر اس نے ایک اور گناہ کیا تو کہا: ''اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، تو اسے بخش دے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے (فرشتو! گواہ رہو کہ) میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، سو وہ جو چاہے کرے۔'' [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿يريدون أن يبدلوا كلام الله﴾ : ۷۵۰۷۔ مسلم، التوبة، باب قبول التوبة...... : ۲۷۵۸ ]

② وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا ...... : اصرار کے معنی ہیں اڑ جانا اور بے پروائی سے گناہ کرتے جانا۔ نہ ان پر ندامت کا اظہار کرنا اور نہ توبہ کرنا۔ ورنہ اگر کسی شخص سے سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد گناہ سرزد بھی ہو جاتا ہے تو اسے اصرار نہیں کہتے، جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا ہے۔ '' وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ '' یعنی کسی کام کے گناہ ہونے کا علم ہونے پر اس پر اصرار نہیں کرتے۔ مزید دیکھیے سورۂ نساء: (۱۷، ۱۸)۔

**آیت 136** اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵)۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

بلاشبہ تم سے پہلے بہت سے طریقے گزر چکے، سو زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟﴿۱۳۷﴾ یہ لوگوں کے لیے ایک وضاحت ہے اور بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت ہے﴿۱۳۸﴾ اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو﴿۱۳۹﴾ اگر تمھیں کوئی زخم پہنچے تو یقیناً ان لوگوں کو بھی اس جیسا زخم پہنچا ہے اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں، اور تا کہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے بعض کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا﴿۱۴۰﴾ اور تا کہ اللہ ان لوگوں کو خالص کر دے جو ایمان لائے اور کافروں کو مٹا دے﴿۱۴۱﴾

**آیت 137** قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ ...... : اوپر کی آیات میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر اور ان کی نافرمانی سے توبہ پر بخشش اور جنت کا وعدہ فرمایا، اب یہاں اطاعت اور توبہ کی ترغیب کے لیے پہلی امتوں کی تاریخ پر غور و فکر کا حکم دیا ہے، تا کہ ان میں سے مطیع اور نافرمان کے احوال پر غور کر کے انسان اپنے لیے سامانِ عبرت حاصل کرے۔ "سُنَنٌ" کا مفرد "سُنَّةٌ" ہے، اس کے معنی طریق مستقیم اور اس نمونے کے ہیں جس کا اتباع کیا جاتا ہے۔ یہ " فُعْلَةٌ " بمعنی " مَفْعُوْلَةٌ " ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فعل چونکہ مسلمان کے لیے نمونہ اور طریق مستقیم ہوتا ہے، اس لیے اسے سنت کہتے ہیں۔

جنگ احد میں جب ستر مسلمان شہید اور کچھ زخمی ہوئے تو اس شکست سے مسلمانوں کو قدرتی طور پر بہت تکلیف ہوئی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ اس شکست سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کہ یہ بات تو پہلی امتوں اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہوتی چلی آئی ہے کہ ابتدا میں ان کو تکالیف سے دو چار ہونا پڑا اور بالآخر جھٹلانے والے ذلیل و خوار ہوئے۔ (ابن کثیر)

**آیت 138** هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ ...... : یعنی قرآن میں اس کا واضح ثبوت موجود ہے کہ پہلی امتوں کا ان کے دشمنوں کے ساتھ مقابلے میں کیا حال ہوا۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا متقین کے نیک انجام اور جھٹلانے والوں کی ہلاکت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

**آیت 139** وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا...... : اوپر کی آیت "قَدْ خَلَتْ" اس بشارت کی تمہید تھی اور "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ" کے لیے ایک طرح کی دلیل کہ پہلی امتوں کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اہل باطل کو اگرچہ غلبہ حاصل ہوا مگر عارضی، آخر کار وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ یہی حال تمھارا ہے، اس لیے کسی قسم کے " وَهْنٌ " (کمزوری) سے کام نہ لو، غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ چنانچہ اس کے بعد ہر لڑائی میں مسلمان غالب ہوتے رہے۔

**آیت 141،140** ① اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ...... : یعنی اگر "احد" کے دن تمھیں مشرکین کے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے تو

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

یا تم نے گمان کر لیا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک اللہ نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور تا کہ وہ صبر کرنے والوں کو جان لے ۝

---

تم بھی بدر کے دن انھیں اسی قسم کا نقصان پہنچا چکے ہو، اس لیے یہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ " اَلْحَرْبُ سِجَالٌ " (لڑائی میں باریاں ہوتی ہیں ) جب بھی دو گروہوں میں جنگ ہوئی ہے تو کبھی ایک کا پلڑا بھاری رہا ہے، کبھی دوسرے کا۔

❷ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ ...... : جنگ احد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان پہنچا۔ یہود اور منافقین کے طعنے مزید دل دکھانے کا باعث بنے۔ منافق کہتے تھے کہ اگر آپ (ﷺ) سچے نبی ہوتے تو مسلمان یہ نقصان اور ہزیمت کی ذلت کیوں اٹھاتے وغیرہ۔ ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ فتح و شکست تو ادلتی بدلتی چیز ہے، یہ حق اور ناحق کا معیار نہیں، آج اگر تم نے زخم کھایا ہے تو کل وہ جنگ بدر میں تمھارے ہاتھوں اسی قسم کا زخم کھا چکے ہیں اور خود اس جنگ کے شروع میں ان کے بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں، جیسا کہ اس آیت: ﴿ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ﴾ [ آل عمران : ۱۵۲ ] (جب تم انھیں اس کے حکم سے کاٹ رہے تھے ) سے معلوم ہوتا ہے۔ تمھاری اس شکست میں بھی کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں، ایک یہ کہ ایمان و اخلاص اور کفر و نفاق میں تمیز ہو گئی، مومن اور منافق الگ الگ ہو گئے، اگر ہمیشہ مسلمانوں کو فتح ہوتی تو منافقین کا نفاق ظاہر نہ ہوتا۔ دوسری مومنوں کو شہادت نصیب ہوئی، فرمایا: ﴿ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ﴾ جو اللہ کے ہاں بہت بڑا شرف ہے۔ کفار کی اس عارضی فتح کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ ظالموں اور مشرکوں کو پسند کرتا ہے، فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ ''اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔'' تیسری یہ کہ مومنوں کو خالص کرے، اگر ان میں کچھ کمی ہے تو دور کر دے، فرمایا: ﴿ وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ''اور تا کہ اللہ ان لوگوں کو خالص کر دے جو ایمان لائے'' اور چوتھی یہ کہ کفار کی طاقت کو ختم کرنا مقصود ہے، ﴿ وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ اس طرح کہ وہ اپنی عارضی فتح پر مغرور ہو کر پھر لڑنے آئیں گے اور اس وقت ان کی وہ سرکوبی ہو گی کہ دوبارہ اس طرف رخ کرنے کا نام نہیں لیں گے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ایسا ہی ہوا کہ اس کے بعد کفار نے دفاعی جنگیں تو لڑیں مگر خود حملے کی جرأت نہ کر سکے۔ (رازی، شوکانی )

**آیت 142** وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا ...... : بعض سلف نے اس کا معنی کیا ہے ''ابھی تک اللہ نے ظاہر نہیں کیا'' ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ماضی، حال اور مستقبل ہر بات کا علم ہے، اس لیے یہ ترجمہ کہ ''ابھی تک اللہ نے نہیں جانا'' درست نہیں، مگر " عَلِمَ يَعْلَمُ " کا معنی تو جاننا ہی ہوتا ہے، ظاہر کرنے کے لیے تو " لَمَّا يُظْهِرِ اللّٰهُ " یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہونے چاہییں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نوع ازلی ہے مگر ان کے افراد حادث ہوتے رہتے ہیں، مثلاً پیدا کرنا، سننا اور جاننا وغیرہ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ [ الرحمٰن : ۲۹ ] ''ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔'' خالق تو وہ ازل سے

وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

اور بے شک تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے، اس سے پہلے کہ اسے ملو، تو بلاشبہ تم نے اسے اس حال میں دیکھ لیا کہ تم (آنکھوں سے) دیکھ رہے تھے ﴿۱۴۳﴾ اور نہیں ہے محمد مگر ایک رسول، بے شک اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے تو کیا اگر وہ فوت ہو جائے، یا قتل کر دیا جائے تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا ﴿۱۴۴﴾

ہے، مگر جب وہ کوئی چیز پیدا کرے گا تو اس چیز کی خلق اس وقت وجود میں آئے گی۔ اسی طرح آیت: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا﴾ [ المجادلة : ۱ ] ''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی'' اس عورت کے جھگڑے کے بعد ہی واقعاتی سماع وجود میں آیا، اسی طرح جہاد کرنے کا واقعاتی علم تو جہاد کے واقع ہونے کے بعد ہی ہو گا۔ مقصد یہ کہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا وقوع میں آنا نہیں جانا کہ تم میں سے کس نے جہاد کیا ہے۔ ''وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ'' میں میم ''لام کَیْ'' کی وجہ سے منصوب ہے، جو یہاں محذوف ہے اس لیے ترجمہ کیا ہے ''اور تاکہ وہ صبر کرنے والوں کو جان لے۔'' خلاصہ یہ ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسی آزمائش کے بغیر ہی تم کو جنت میں اعلیٰ مراتب مل جائیں گے؟ مطلب یہ کہ جب تک اس قسم کی آزمائشوں میں پورے نہیں اترو گے جنت میں اعلیٰ مراتب حاصل نہیں ہو سکتے۔

**آیت 143** وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ : یہاں موت کا معنی جنگ یا شہادت ہے۔ (بغوی) جن لوگوں کو جنگ بدر میں حاضری کا موقع نہیں ملا تھا وہ تمنا کیا کرتے تھے کہ دشمن سے مقابلے کا موقع ملے تو ہم بھی شہدائے بدر کا درجہ حاصل کر لیں، مگر جب جنگ احد میں موقع ملا تو دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے ثابت قدم نہ رہ سکے اور بعض بھاگ نکلے۔ اس آیت میں صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمھاری تمنا کے مطابق اب یہ موقع آیا تو تمھیں چاہیے تھا کہ پوری جواں مردی سے دشمن کا مقابلہ کرتے اور پامردی کا ثبوت دیتے۔ عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کیا کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگتے رہا کرو، ہاں، اگر دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر صبر کرو اور خوب جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' [ بخاری، الجهاد والسیر، باب لا تمنوا لقاء العدو : ۳۰۲۵ ]

**آیت 144** ① وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ : جنگ احد میں بعض صحابہ نے تو مرتبۂ شہادت حاصل کر لیا اور بعض میدان چھوڑ کر فرار ہونے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہو گئے اور کسی شیطان نے آپ کی شہادت کی افواہ پھیلا دی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل اس افواہ سے ٹوٹ گئے اور وہ ہمت ہار بیٹھے اور منافقین نے طعن و تشنیع کے نشتر چبھونے شروع کر دیے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور کسی جان کے لیے کبھی ممکن نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے، لکھے ہوئے کے مطابق جس کا وقت مقرر ہے، اور جو شخص دنیا کا بدلہ چاہے ہم اسے اس میں سے دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے اسے اس میں سے دیں گے اور ہم شکر کرنے والوں کو جلد جزا دیں گے ﴿۱۴۵﴾

اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہوتے تو قتل کیوں ہوتے؟! اس پر یہ آیات اتریں: ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ﴾ "نہیں ہے محمد مگر ایک رسول۔" اس میں قصرِ قلب ہے کہ محمد ﷺ کے متعلق تم نے جو سمجھا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہیں، یا اللہ تعالیٰ کے اختیارات کے مالک ہیں، ایسا نہیں، وہ محض اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ وہ قتل بھی ہو سکتے ہیں، فوت بھی ہو سکتے ہیں اور ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں۔ کیا محمد رسول اللہ ﷺ کے قتل ہونے یا طبعی موت مر جانے سے تم اللہ کا دین چھوڑ بیٹھو گے؟ تمھیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہو۔ (ابن کثیر، قرطبی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "اور اشارتاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی وفات پر بعض لوگ پھر جائیں گے۔ اسی طرح ہوا کہ بہت سے لوگ آپ ﷺ کے بعد مرتد ہوئے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو پھر مسلمان کیا اور بعضوں کو مارا۔" (موضح)

② عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو) ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے جو "اَلسُّنُح" میں تھا، گھوڑے پر تشریف لائے، وہ گھوڑے سے اتر کر مسجد میں آ گئے، لوگوں سے انھوں نے کوئی بات نہ کی، بلکہ سیدہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے ہاں چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ کا قصد کیا، اس وقت آپ یمنی دھاری دار چادر سے ڈھانپے ہوئے تھے، انھوں نے آپ ﷺ کے چہرے سے کپڑا ہٹایا، پھر آپ پر جھک کر آپ کو بوسہ دیا، پھر رو پڑے اور کہنے لگے: "میرے ماں باپ آپ پر قربان! اے اللہ کے نبی! اللہ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا، جو موت آپ پر لکھی گئی تھی، وہ آپ فوت ہو چکے۔" ابو سلمہ کہتے ہیں، مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نکلے، عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے، تو فرمایا: "بیٹھ جاؤ۔" انھوں نے نہ مانا، پھر فرمایا: "بیٹھ جاؤ۔" وہ پھر بھی نہ مانے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا، اب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اما بعد! تم میں سے جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ زندہ ہے، کبھی فوت نہیں ہو گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾ یہ مکمل آیت تلاوت کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لوگ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے، یہاں تک کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آیت پڑھی تو لوگوں نے اسے ان سے لے لیا تو جسے سنو یہی آیت پڑھ رہا تھا۔" سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے جب اس آیت کی تلاوت سنی تو میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا، میرے پاؤں مجھے اٹھا نہیں رہے تھے، یہاں تک کہ میں گر گیا۔" [ بخاری، المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ : ۴۴۵۲، ۴۴۵۳، ۴۴۵۴ ]

آیت 145 وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ...... : اس سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنا اور ان کے

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اور کتنے ہی نبی ہیں جن کے ہمراہ بہت سے رب والوں نے جنگ کی، تو نہ انھوں نے اس مصیبت کی وجہ سے ہمت ہاری جو انھیں اللہ کی راہ میں پہنچی اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ انھوں نے عاجزی دکھائی اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۴۶﴾ اور ان کی بات اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہماری زیادتی کو بھی اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافر لوگوں پر ہماری مدد فرما ﴿۱۴۷﴾ تو اللہ نے انھیں دنیا کا بدلہ عطا فرمایا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۴۸﴾

---

ذہن میں یہ بات بٹھانا ہے کہ موت سے فرار کی راہ اختیار کرنے سے انسان موت کے پنجے سے نجات نہیں پا سکتا، اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر فرمایا ہے، جو آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔ "اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" میں "اِذْنٌ" بمعنی علم ہے، یعنی ہر شخص کی موت کا وقت اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "اِذْنٌ" بمعنی قضا و قدر ہو۔ الغرض! تمھیں چاہیے کہ موت سے بھاگنے کی فکر چھوڑ کر بے جگری سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو اور اس جہاد سے تمھارا مقصود آخرت کا ثواب ہونا چاہیے، ورنہ اگر تم صرف دنیا کا ثواب، شہرت اور مال غنیمت وغیرہ ہی چاہو گے تو تمھیں صرف وہی ملے گا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت پر اور آخرت سے محروم رہو گے۔ یہاں "كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا" سے مراد وہ کتاب ہے جو "آجَالٌ" (مقررہ اوقات) پر مشتمل ہے۔ بعض نے اس سے مراد لوح محفوظ لیا ہے۔ احادیث میں ہے: "اللہ تعالیٰ نے قلم سے فرمایا: (( اُكْتُبْ فَكَتَبَ مَا هُوَ كَائِنٌ )) "لکھ دے، تو قلم نے جو کچھ ہونے والا تھا، سب لکھ دیا۔" [ أحمد : ۳۱۷/۵، ح : ۲۲۷۷۳، و ابن أبي عاصم عن عبادة بن الصامت ﷺ و سنده حسن ]

اس آیت میں اشارہ ہے کہ جنگ احد میں حاضر ہونے والے اپنی نیتوں کے اعتبار سے دو قسم کے تھے، بعض غنیمت کے طالب تھے اور بعض آخرت کے۔ یہ آیت گو خاص جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر حکم کے اعتبار سے عام ہے اور تمام اعمال کا مدار انسان کے ارادے اور نیت پر ہے۔ معلوم ہوا مقتول بھی موت کے مقررہ وقت پر مرتا ہے اور مقررہ وقت میں تبدیلی ناممکن ہے۔

**آیت 146 تا 148** "رِبِّيُّوْنَ" یہ "رِبِّيٌّ" کی جمع ہے، جو "رَبَّانِيٌّ" کا ہم معنی ہے۔ (کشاف) ایک معنی اور بھی اہل علم نے کیا ہے کہ یہ "رِبَّةٌ" کی طرف منسوب ہے، جس کا معنی کثیر جماعت ہے، یعنی ان کے ہمراہ بہت سی جماعتیں تھیں۔ (قرطبی)

"وَهْنٌ، ضُعْفٌ، اِسْتِكَانَةٌ" یہ تینوں لفظ قریب المعنی ہیں، کمزوری کے معنی میں یہ بالترتیب واقع ہوتے ہیں۔ "وَهْنٌ" دل سے ہمت ہارنا، "ضُعْفٌ" عام کمزوری اور "اِسْتِكَانَةٌ" دشمن کے سامنے عاجزی کا اظہار۔ ان تینوں آیتوں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم ان لوگوں کا کہنا مانو گے جنھوں نے کفر کیا تو وہ تمھیں تمھاری ایڑیوں پر پھیر دیں گے، پھر تم خسارہ اٹھانے والے ہو کر پلٹو گے ﴿۱۴۹﴾ بلکہ اللہ ہی تمھارا مالک ہے اور وہ سب مدد کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۱۵۰﴾ ہم عنقریب ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اس کو شریک بنایا جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ ظالموں کا برا ٹھکانا ہے ﴿۱۵۱﴾

سے مقصود ان لوگوں پر عتاب اور تنبیہ ہے جو احد کے دن شکست کے آثار دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر بالکل ہی پست ہو گئے، پس فرمایا کہ تم سے پہلے انبیاء کے متبعین گزر چکے ہیں، ان کی اتباع کرو اور اس قسم کی کمزوری نہ دکھاؤ۔ (قرطبی۔ ابن کثیر)

یعنی ان لوگوں میں سے بہت سے "رِبِّيُّوْنَ" اپنے انبیاء کے ساتھ مل کر جہاد کرتے رہے، لیکن انھوں نے اپنی تعداد کی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود کبھی ہمت نہیں ہاری اور نہ کبھی اپنے انبیاء کے وفات پا جانے یا شہید ہو جانے کی صورت میں وسوسوں میں مبتلا ہوئے، بلکہ ہمیشہ اور ہر حال میں صبر و استقلال سے کام لیتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں پر عفو و درگزر کی درخواست کرتے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا و آخرت دونوں کے ثواب سے نواز دیا، بلکہ آخرت کے حسن ثواب سے اور احسان کا مرتبہ پا لینے کی وجہ سے اپنی محبت بھی عطا فرمائی، فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

**آیت 149** يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا : احد کی عارضی سی شکست کے بعد کفار نے، جن میں منافقین، یہود و نصاریٰ اور مشرکین سبھی شامل تھے، مسلمانوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کر کے انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ کفار کے فریب میں مت آنا، ورنہ تم خسارے میں پڑ جاؤ گے۔ یہ آیت بھی پچھلی آیت کے مضمون کو مکمل کر رہی ہے۔ یاد رہے کہ دنیا میں سب سے بڑا خسارا یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور آخرت کا خسارا ثواب سے محرومی اور عذاب میں گرفتاری ہے۔ پس خسارہ عام ہے۔

**آیت 150** بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ...... : مولیٰ کا معنی مالک، مددگار اور دوست وغیرہ ہے، یعنی تم کفار کی اطاعت تو اس لیے کرو گے کہ وہ تمھاری کچھ مدد کریں، مگر یہ سراسر جہالت ہے، تمھارا مالک، حامی و ناصر تو اللہ تعالیٰ ہے، اس پر بھروسا رکھو گے تو دنیا کی کوئی طاقت تمھارا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے "خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ" محاورۂ کلام کے اعتبار سے ہے، ورنہ یہ معنی نہیں ہیں کہ کچھ اور ناصرین بھی ہیں جن میں سے اللہ تعالیٰ سب سے بہتر ہے۔ (کبیر)

**آیت 151** ① سَنُلْقِيْ ...... : یہ آیت اپنے سیاق کے اعتبار سے اوپر کے بیان کو مکمل کر رہی ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ

وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کر دیا، جب تم انھیں اس کے حکم سے کاٹ رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے ہمت ہار دی اور تم نے حکم کے بارے میں آپس میں جھگڑا کیا اور تم نے نافرمانی کی، اس کے بعد کہ اس نے تمھیں وہ چیز دکھا دی جسے تم پسند کرتے تھے۔ تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے، پھر اس نے تمھیں ان سے پھیر دیا، تاکہ تمھیں آزمائے اور بلاشبہ یقیناً اس نے تمھیں معاف کر دیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے ﴿۱۵۲﴾

نے مختلف وجوہ سے جہاد کی ترغیب دی ہے اور کفار کے خوف کو دلوں سے نکالا ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھو گے اور اسی سے مدد مانگو گے تو اللہ تعالیٰ کفار کے دلوں میں تمھارا خوف ڈال دے گا، اس طرح تمھیں ان پر غلبہ حاصل ہو جائے گا، کیونکہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، لہٰذا "بِمَاۤ اَشْرَكُوْا" میں باء برائے سببیت ہے۔ (قرطبی)

② شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "مشرک اللہ تعالیٰ کے چور ہیں اور چور کے دل میں ڈر ہوتا ہے۔" (موضح) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ سچا ہوا اور کافر احد میں باوجود غالب ہونے کے چپکے سے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ واپسی کے وقت راستے میں انھوں نے دوبارہ مدینہ پر حملے کا ارادہ کیا مگر مرعوب ہو گئے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پانچ چیزوں میں مجھے پہلے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ماہ کی مسافت پر دشمن کے دل میں میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے۔" [ بخاری، التیمم، باب : ۳۳۵۔ مسلم : ۵۲۱، عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما ] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کفار کے دل میں رعب ڈالنے کا وعدہ احد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے۔

③ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے ساتھ آپ کی امت، یعنی مسلمانوں کا رعب بھی مشرکوں پر ڈال دیا گیا ہے اور اس کی وجہ ان کا شرک ہے، گویا شرک کرنے والوں کا دل دوسروں کی ہیبت سے ڈرتا اور لرزتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کی بڑی تعداد مشرکانہ عقائد و اعمال میں گرفتار ہوئی، تقریباً ہر شہر اور محلّے میں پختہ قبریں اور غیر اللہ کے آستانے بن گئے اور غیر اللہ سے استغاثہ اور مدد مانگنا شروع ہو گئے، تو وہی رعب جو شرک کی وجہ سے کفار کے دل میں تھا، ڈیڑھ ارب کے قریب تعداد ہونے کے باوجود مسلمانوں کے دلوں میں پڑ گیا۔ ہاں، توحید والے اس رعب سے محفوظ ہیں اور قیامت تک کفار سے جہاد جاری رکھیں گے اور ان کا رعب کفار کے دلوں میں کفار کے مشرکانہ عقائد و اعمال کی وجہ سے رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَنْ يَّبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ » [ مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۲، عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ ] "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس پر لڑتی رہے گی، حتیٰ کہ قیامت قائم ہو۔"

آیت 152 ① وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ ...... : جنگ احد میں پہلے پہل اللہ تعالیٰ کی مدد مسلمانوں کے شامل حال

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّـكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۵۳

جب تم دور چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اور رسول تمھاری پچھلی جماعت میں تمھیں بلا رہا تھا تو اس نے بدلے میں تمھیں غم کے ساتھ اور غم دیا، تاکہ تم نہ اس پر غمزدہ ہو جو تمھارے ہاتھ سے نکل گیا اور نہ اس پر جو تمھیں مصیبت پہنچی اور اللہ اس کی پوری خبر رکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو۔ ﴿۱۵۳﴾

رہی اور وہ مشرکین کو اللہ کے حکم سے خوب کاٹتے رہے، حتیٰ کہ جب فتح کے آثار نظر آنے لگے اور مشرکین اور ان کی عورتوں نے بھاگنا شروع کر دیا تو پچاس تیر انداز، جنھیں آپ ﷺ نے عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک پہاڑی پر متعین کیا تھا، تاکہ ادھر سے مشرک حملہ آور نہ ہوں، انھوں نے مال غنیمت دیکھ کر باہم جھگڑنا شروع کر دیا۔ پچاس آدمیوں میں سے اکثر آپ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کر کے اپنی جگہ چھوڑ کر مال غنیمت کی طرف دوڑ پڑے، اس سبب سے مشرکین کو عقب سے حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ (ابن کثیر)

جنگ کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ واپس آئے تو بعض لوگ کہنے لگے کہ یہ مصیبت ہم پر کیسے آ گئی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نصرت کا وعدہ فرمایا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا، پھر جو کچھ ہوا یہ تمھارے ہمت ہارنے اور آپس میں جھگڑنے اور تمھاری نافرمانی کا نتیجہ تھا۔ (قرطبی)

② ثُمَّ صَرَفَكُمۡ ...... : یعنی غلبہ کے بعد ان کے مقابلہ میں تمھیں پسپائی دلائی، تاکہ تمھاری آزمائش ہو کہ کون سچا مسلمان ہے اور کون کمزور ایمان والا اور جھوٹا۔ (قرطبی)

③ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ : یعنی گو تم نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور جنگ سے فرار کی راہ اختیار کر کے نہایت سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا، جس کی تمھیں سخت سزا دی جا سکتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھارا سارا قصور معاف فرما دیا۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس شرف کا اظہار ہے جو ان کی کوتاہیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمایا، یعنی ان کی غلطیوں کی وضاحت کر کے، تاکہ آئندہ ان کا اعادہ نہ کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے معافی کا عام اعلان فرما دیا تو اب کسی کے لیے ان پر طعن و تشنیع کی کیا گنجائش رہ گئی۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس عثمان رضی اللہ عنہ پر بعض اعتراضات کیے، ایک ان میں سے یہ تھا کہ وہ احد کے دن فرار ہو گئے تھے، تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف فرما دیا۔“ [ بخاری، المغازی، باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿ إن الذين تولوا منكم...... ﴾ : ٤٠٦٦ ]

**آیت 153** ① اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ...... : یہ بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی کیفیت کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمھاری پچھلی جماعت میں، جو ثابت قدم رہی تھی، تمھیں پکار رہے تھے کہ اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، میں یہاں ہوں، مگر تم دور دوڑے جا رہے تھے اور کسی کو نہ مڑ کر دیکھتے تھے، نہ کسی کی سنتے تھے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ

پھر اس غم کے بعد اس نے تم پر ایک امن نازل فرمایا، جو ایک اونگھ تھی، جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی اور کچھ لوگ وہ تھے جنھیں ان کی جانوں نے فکر میں ڈال رکھا تھا، وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلیت کا گمان کر رہے تھے، کہتے تھے کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دے بے شک معاملہ سب کا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے تھے جو تیرے لیے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے اگر اس معاملے میں ہمارا کچھ اختیار

② فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ : یعنی تمھاری کوتاہی کے بدلے میں تمھیں غم پر غم پہنچایا، ایک شکست کا غم اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ کا صدمہ، جو پہلے غم سے زیادہ سخت تھا، پس "بِغَمٍّ" کے معنی "عَلٰی غَمٍّ" ہیں اور بعض نے باء کو سببیت کے لیے مانا ہے، یعنی آپ ﷺ کو مغموم کرنے کی وجہ سے تمھیں غم پہنچایا، مگر پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

③ لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا...... : یعنی تمھیں دوہرے غم میں مبتلا کر دیا، تاکہ نہ تو تمھیں مال غنیمت کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہو اور نہ زخمی و شہید ہونے اور شکست کا غم ہو، کیونکہ متواتر غم خصوصاً بڑے غم کے آنے کے ساتھ پہلے غم ہلکے ہو جاتے ہیں اور انسان سختیاں برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

آیت 154 ① ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ ...... : ان پے در پے صدموں کے بعد اللہ تعالیٰ نے میدان جنگ میں موجود مسلمانوں پر اپنا خاص فضل فرمایا کہ ان پر اونگھ مسلط کر دی، جس سے انھیں امن و اطمینان حاصل ہو گیا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ہم پر اونگھ چھا گئی، جب کہ ہم احد کے دن اپنی صفوں میں کھڑے تھے، حالت یہ تھی کہ میری تلوار میرے ہاتھ سے گری جاتی تھی، میں اسے اٹھا لیتا تھا، وہ پھر گر جاتی تھی اور میں اسے پھر اٹھا لیتا تھا۔'' [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ أمنة نعاسًا ﴾ : ٤٥٦٢ ] ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ہی بیان فرماتے ہیں: ''میں نے احد کے دن اپنا سر بلند کیا اور لوگوں کو دیکھنے لگا تو (کیا دیکھتا ہوں کہ) ہر شخص اونگھ کی وجہ سے اپنے سر کو ڈھال کے نیچے جھکائے ہوئے ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مطلب ہے: ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا ﴾ [ ترمذی، التفسیر، باب ومن سورة آل عمران : ٣٠٠٧ ]

② وَ طَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ : کہ ظاہر ہے اس سے مراد منافقین اور ضعیف ایمان والے مسلمان ہیں۔ ایسے حالات میں انھیں تو اپنی جانوں ہی کی فکر تھی۔

③ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ......: "ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ" یہ "غَيْرَ الْحَقِّ" سے بدل ہے، یعنی وہ یہ گمان کر رہے تھے کہ دین اسلام اور اس کے حاملین بس اب ہلاک ہو گئے، مسلمانوں کی کبھی مدد نہیں ہو گی اور یہ دعوت حق پروان نہیں چڑھے گی۔

شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے، کہہ دے اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن لوگوں پر قتل ہونا لکھا جا چکا تھا اپنے لیٹنے کی جگہوں کی طرف ضرور نکل آتے اور تا کہ اللہ اسے آزمالے جو تمھارے سینوں میں ہے اور تا کہ اسے خالص کر دے جو تمھارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۵۴﴾

④ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ: یہ جملہ "يَظُنُّوْنَ" سے بدل ہے اور "مِنَ الْاَمْرِ" سے مراد فتح و نصرت ہے، یعنی بالکل مایوسی کا اظہار کرنے لگے اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں کبھی فتح بھی نصیب ہو گی اور کچھ ملے گا بھی؟ یا "مِنَ الْاَمْرِ" سے مراد معاملے کا فیصلہ ہے کہ اس معاملے میں ہماری بات تو مانی ہی نہیں گئی، ہمیں مجبوراً ساتھ دینا پڑا، ورنہ ہم تو شہر سے باہر نکل کر لڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ ہم تو مجبور محض ہیں، ہمارا تو کچھ بھی اختیار نہیں۔ (فتح القدیر)

⑤ مَا قُتِلْنَا هٰهُنَا: مطلب یہ کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی کہ شہر کے اندر رہ کر ہی جنگ لڑی جائے تو آج ہمارا یہ جانی نقصان نہ ہوتا، مگر ہماری کسی نے نہ سنی۔ یہ بات یا تو ان منافقین نے کہی جو جنگ میں شریک تھے، جیسا کہ زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! میں معتب بن بشیر، جو بنو عمرو بن عوف سے تھا، اس کی بات سن رہا تھا، جب کہ اونگھ مجھے ڈھانپ رہی تھی، میں خواب کی طرح اس کی بات سن رہا تھا، جب وہ کہہ رہا تھا، اگر اس معاملے میں ہمارا کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔" [ المختارة، ح: ٨٦٤، ٨٦٥ ] اسے ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں بھی حسن سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بات ان منافقین نے کہی ہو جو عبد اللہ بن ابی کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے تھے، اس صورت میں "هٰهُنَا" (یہاں) کا اشارہ مدینہ کے قریب احد کی طرف ہو گا۔ (قرطبی، شوکانی)

⑥ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ......: اس سے ان کے خیال کی تردید مقصود ہے، یعنی اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے تب بھی جن لوگوں کی قسمت میں قتل ہونا لکھا جا چکا تھا وہ ضرور اپنے گھروں سے نکلتے اور جہاں اب مارے گئے ہیں، وہیں مارے جاتے، کیونکہ اللہ کی تقدیر سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

⑦ وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ ......: یہ جملہ محذوف کی علت ہے، یعنی جنگ احد میں جو کچھ ہوا اور جن حالات سے مسلمان دوچار ہوئے، اس سے کئی اور حکمتوں کے ساتھ مقصود یہ بھی تھا کہ تمھارے دلوں کی حالت ظاہر ہو جائے اور تمھارے دل وساوس سے پاک ہو جائیں، یا یہ کہ منافقین کے دلوں کا نفاق باہر نکل آئے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور احد کی لڑائی بگڑنے سے سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوْا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

بے شک وہ لوگ جو تم میں سے اس دن پیٹھ پھیر گئے جب دو جماعتیں بھڑیں، شیطان نے انھیں ان بعض اعمال ہی کی وجہ سے پھسلایا جو انھوں نے کیے تھے اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۱۵۵﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا جب انھوں نے زمین میں سفر کیا، یا وہ لڑنے والے تھے، اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، تاکہ اللہ اسے ان کے دلوں میں حسرت بنا دے اور اللہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور اللہ اس کو جو تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۵۶﴾

**آیت 155** ① إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا...... : یعنی احد کے دن جو مسلمان میدان جنگ سے ہٹ گئے، وہ شیطان کے پھسلانے کے سبب ہٹے، مگر شیطان کو انھیں پھسلانے کا موقع انھی کے کچھ گزشتہ گناہوں کی وجہ سے ملا۔ جن میں سے بعض کا ایک گناہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کی تھی۔ سلف سے مروی ہے کہ ایک نیک کام کرنے سے دوسرے نیک کام کی توفیق ملتی ہے اور ایک گناہ دوسرے گناہ کے ارتکاب کا سبب بنتا ہے۔ (ابن کثیر) مقصد یہ کہ بعض مخلص مسلمان جو اس دن بھاگ کھڑے ہوئے وہ اس وجہ سے نہیں بھاگے کہ وہ اسلام سے پھر گئے تھے، یا منافق تھے، بلکہ شامتِ نفس اور سیئات اعمال کی وجہ سے شیطان کو انھیں بہکانے کا موقع ملا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ اپنے خطبہ میں فرمایا کرتے تھے: (( وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا )) ''ہم اپنے نفس کے شر اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔'' [ ابن ماجه، النكاح، باب خطبة النكاح : ۱۸۹۲، وصححه الألبانی ] یہ بھی معلوم ہوا کہ نفس کا شر ہو یا اعمال کی شامت، ان کے ساتھ شیطان کا گمراہ کرنا بھی شامل ہوتا ہے۔

② وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ : اس سے تین آیات پہلے بھی '' وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ '' کہہ کر ان کی معافی کی نوید سنائی گئی ہے۔ اب پھر مزید اطمینان اور تسلی کے لیے دوبارہ خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ بلاشبہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا ہے، یعنی جو واقعی دل میں اخلاص رکھتے تھے ان کی توبہ اور معذرت کے سبب اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا، اب نہ ان پر کوئی گناہ ہے اور نہ کسی کو طعن کا حق ہے۔ مزید تفصیل دیکھیے آل عمران (۱۵۲) کے فوائد۔

**آیت 156** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا...... : '' غُزًّى '' یہ '' غَازٍ '' کی جمع ہے، جو '' غَزَا يَغْزُوْ '' سے اسم فاعل ہے،

وَ لَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَحۡمَۃٌ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾ وَ لَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاِالَی اللّٰہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

اور بلاشبہ یقیناً اگر تم اللہ کے راستے میں قتل کر دیے جاؤ، یا فوت ہو جاؤ تو یقیناً اللہ کی طرف سے تھوڑی سی بخشش اور رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں ﴿۱۵۷﴾ اور بلاشبہ اگر تم مر جاؤ، یا قتل کیے جاؤ تو یقیناً تم اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۱۵۸﴾

بمعنی لڑنے والے، جیسے " رَاكِعٌ "کی جمع " رُكَّعٌ " آتی ہے۔ مسلمانوں کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے نفاق کی وجہ سے کافر ہیں اور یہ گندہ عقیدہ صرف دل ہی میں نہیں رکھتے بلکہ برملا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ہمارے جو بھائی جہاد کے سفر میں فوت ہو گئے یا لڑتے ہوئے مارے گئے، اگر ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے۔ ان کا یہ عقیدہ اور قول اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے ان کے دلوں میں حسرت و افسوس کا باعث بنائے رکھے گا۔ مسلمانوں کو اس عقیدہ سے اس لیے روکا کہ غلط ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بزدلی کا باعث بنتا ہے، جب کہ موت و حیات تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وقت مقرر ہے۔ یہی عقیدہ مسلمان کی قوت کا باعث ہے، اس لیے حکم دیا کہ دل مضبوط رکھو، موت اپنے وقت سے ایک لمحہ بھی پہلے نہیں آ سکتی۔ اگر مگر کے الفاظ شیطان کو دخل اندازی کا موقع دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قوی مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضعیف سے بہتر اور زیادہ محبوب ہے اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بھلائی ہے، اس چیز کی حرص کرو جو تمھیں نفع دے اور اللہ سے مدد مانگو اور عاجز مت ہو جاؤ اور اگر تمھیں کوئی مصیبت پہنچے تو یہ مت کہو، اگر میں ایسا اور ایسا کرتا (تو مجھے یہ مصیبت نہ پہنچتی) بلکہ یوں کہو کہ اللہ نے جو مقدر کیا اور جو چاہا کر دیا، اس لیے کہ " لَوْ " (اگر کا لفظ) شیطان کے کام (کا راستہ) کھول دیتا ہے۔'' [ مسلم، القدر، باب الإیمان بالقدر والاذعان له : ٢٦٦٤، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ ]

**آیت 157** یعنی اگر تمھارا مرنا یا قتل ہونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے تو یہ یقیناً تمھارے لیے مغفرت اور رحمت کا سبب بنے گا اور یہ مغفرت و رحمت اس مال و متاع سے بہتر ہے جس کے جمع کرنے کی فکر میں یہ کفار اور منافقین ہر آن لگے رہتے ہیں، یہ ان کے شبہ کا دوسرا جواب ہے۔ ''لَمَغْفِرَةٌ'' اور ''رَحْمَةٌ'' میں تنوین تقلیل کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''تھوڑی سی بخشش اور رحمت'' کیا گیا ہے۔

**آیت 158** وَ لَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ ...... : اوپر کی آیت میں خاص قسم کے قتل اور موت، یعنی فی سبیل اللہ کا ذکر تھا، جس پر رحمت و مغفرت کی خوش خبری تھی، اب یہاں عمومی موت اور قتل کا ذکر ہے (جس طرح بھی واقع ہو) مطلب یہ کہ تمھیں مر کر بہر حال ہمارے پاس آنا اور اپنے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ پانا ہے، اگر تمھاری زندگی اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی خاطر ہو اور اسی کی راہ میں موت ہو تو تم اپنے اعمال کا خوش کن بدلہ پاؤ گے۔

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

پس اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہی کی وجہ سے تو ان کے لیے نرم ہوگیا ہے اور اگر تو بد خلق، سخت دل ہوتا تو یقیناً وہ تیرے گرد سے منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کر اور ان کے لیے بخشش کی دعا کر اور کام میں ان سے مشورہ کر، پھر جب تو پختہ ارادہ کر لے تو اللہ پر بھروسا کر، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں سے محبت کرتا

آیت 159، 160 ① فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ: یہاں جار مجرور " بِرَحۡمَةٍ " پہلے آنے ہی سے تاکید پیدا ہوگئی تھی، پھر "مَا" لا کر "فَبِمَا رَحۡمَةٍ" میں تاکید مزید ہوگئی۔ "رَحۡمَةٍ" پر تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ "بڑی رحمت" کیا ہے۔

② وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ...... : احد کے دن مسلمانوں نے خوف ناک غلطی کی اور میدان چھوڑ کر فرار اختیار کیا، پھر جب رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے دوبارہ جمع ہوئے تو آپ نے ان کو کسی قسم کی سرزنش نہیں کی، بلکہ حسن اخلاق سے پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کا یہ حسن خلق اور طبیعت کی نرمی اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و احسان اور رحمت کا نتیجہ ہے، ورنہ مسلمانوں کا جمع ہونا ممکن نہ تھا۔ (قرطبی) معلوم ہوا دعوت دین کے لیے نرمی اور حسن اخلاق نہایت ضروری چیزیں ہیں، بد خلقی، درشتی اور سخت دلی سے لوگ کبھی قریب نہیں آ سکتے۔

③ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ ...... : یعنی جنگ میں ان سے جو غلطیاں ہوئیں وہ انھیں معاف کر دیں، اللہ سے بھی ان کے لیے استغفار کریں اور مشورے سے محروم نہ کریں بلکہ برابر مشورہ کرتے رہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "شاید رسول اللہ ﷺ کا دل مسلمانوں سے خفا ہوا ہوگا اور چاہا ہوگا کہ اب ان سے مشورہ نہ پوچھیے، سو حق تعالیٰ نے تلقین فرمائی کہ اول مشورہ کر لینا بہتر ہے، جب ایک بات طے ہو جائے پھر پس و پیش نہ کرے۔" (موضح) اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جب کبھی جنگ یا انتظامی قسم کا کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو، جس میں ہماری طرف سے بذریعۂ وحی کوئی متعین حکم نہ دیا جائے تو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لیا کرو، تاکہ ان کی دل جوئی ہو اور انھیں بعد میں باہمی مشورہ سے مل کر کام کرنے کی تربیت بھی حاصل ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اکثر اہم امور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورے فرمائے اور ان پر عمل بھی ہوا۔ (دیکھیے ابن کثیر زیر بحث آیت) اس کے بعد خلفائے راشدین بھی اس سنت پر پوری طرح کار بند رہے۔ پھر اگر مشورے کے بعد کسی چیز کا فیصلہ کر لیا جائے تو اسے پوری دل جمعی سے کر گزرنے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینے کا نام توکل ہے۔ چنانچہ مذکور ہے کہ جنگ اُحد کے موقع پر کھلے میدان میں لڑائی کرنے کے فیصلے کے بعد جب آپ مسلح ہو کر تشریف لے آئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے آپ کی رائے کے مطابق شہر ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے پر رضا مندی ظاہر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَيۡسَ لِنَبِيٍّ إِذَا لَبِسَ لَأۡمَتَهُ أَنۡ يَّضَعَهَا حَتّٰى يُقَاتِلَ )) [ مسند أحمد : ۳۵۱/۳، ح : ۱۴۷۹۹ ] "کسی نبی کے لائق نہیں کہ جب اپنا اسلحہ پہن لے تو لڑنے سے پہلے اسے اتار دے۔" یہ آیت اور آیت: ﴿ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ﴾

يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

ہے (۱۵۹) اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرے گا اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں (۱۶۰)

[ الشوریٰ : ۳۸ ] اسلامی طرزِ حکومت کے لیے بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ اپنی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہت سے معاملات میں مشورہ کرتے تھے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''(جنگ بدر کے موقع پر) نبی ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر ملی تو آپ نے مشورہ کیا۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بات کی تو آپ نے ان سے اعراض کیا۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: ''شاید آپ ہم (انصار) سے پوچھنا چاہتے ہیں، اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ ہم گھوڑوں کو سمندر میں ڈال دیں تو ہم ضرور ڈال دیں گے اور اگر آپ حکم دیں کہ گھوڑوں کو برک الغماد (مدینہ سے بہت دور ایک جگہ) تک لے جائیں تو ہم ضرور لے جائیں گے۔'' [ مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة بدر : ۱۷۷۹ ] جنگ خندق میں رسول اللہ ﷺ کے مشورہ کرنے پر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خندق کھودنے کی رائے دی جس پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس مشورے میں بہت برکت پیدا فرمائی۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء برابر دیانت دار اہل علم سے مشورہ لیتے رہے۔'' (قرطبی)

آج کل بہت سے لوگ مشورے اور ووٹ کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور جمہوریت کو اسلامی شوریٰ قرار دیتے ہیں، حالانکہ موجودہ جمہوریت اور اسلامی شوریٰ الگ الگ چیزیں ہیں، کیونکہ جمہوریت ایک مستقل دین ہے۔ اس میں: ① ہر اہل اور نا اہل کا ووٹ برابر ہے۔ ② اس میں عوام کی اکثریت فیصلہ کن ہے، فیصلوں میں انھی کو اللہ اور رسول کا مقام حاصل ہے، خواہ وہ سود کو حلال کر دیں، یا زنا اور قوم لوط کے عمل کو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی کوئی شرط نہیں، اگر کہیں ہے بھی تو دھوکا دینے کے لیے۔ ③ اس میں فیصلہ اکثریت کے نمائندوں کی اکثریت کا ہوتا ہے، صدر اس فیصلے کا پابند ہے، خواہ اسے غلط سمجھتا ہو یا صحیح۔ ④ ان کے ہاں مشورے کا معنی اکثریت ہے۔ جب کہ اسلام میں: ① امیر مشورہ لینے کا پابند ہے، مگر صرف ان امور میں جو قرآن و سنت میں مذکور نہ ہوں، بلکہ تدبیری اور انتظامی قسم کے ہوں۔ ② امیر مشورہ ان لوگوں سے لے گا جو اس معاملے میں رائے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''حکمرانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ علماء سے ایسے معاملات میں مشورہ کریں جن کا انھیں علم نہیں ہے، یا ان کے بارے میں انھیں اشکال ہے، فوج کے سربراہوں سے فوجی معاملات میں، سربرآوردہ لوگوں سے عوام کے مصالح کے بارے میں اور ماتحت حکام و والیان سے ان کے علاقوں کی ضروریات و ترجیحات کے متعلق مشورہ کریں۔'' ③ مشورے کے بعد آخری فیصلہ امیر کا ہو گا، فرمایا: ﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [ آل عمران : ۱۵۹ ] اگر وہ مناسب سمجھے تو اکثریت کے فیصلے پر عمل کرے اور اگر کم لوگوں میں زیادہ اہلیت والے لوگ ہونے کی وجہ سے ان

وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

اور کسی نبی کے لیے کبھی ممکن نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرے گا قیامت کے دن لے کر آئے گا جو اس نے خیانت کی، پھر ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا﴿۱۶۱﴾ تو کیا وہ شخص جو اللہ کی رضا کے پیچھے چلا اس شخص جیسا ہے جو اللہ کی طرف سے سخت ناراضی لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے﴿۱۶۲﴾ یہ لوگ اللہ کے نزدیک مختلف طبقے ہیں اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں﴿۱۶۳﴾ بلاشبہ یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس نے ان میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور انھیں پاک کرتا اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے﴿۱۶۴﴾

کی رائے کو بہتر سمجھے تو اس پر فیصلہ کرے، کیونکہ فیصلوں کے نتائج کا آخری ذمہ دار امیر ہوگا، اکثریت نہیں اور وہ بھی اللہ پر توکل کرتے ہوئے فیصلے پر عمل کرے گا، نہ کہ مشورہ دینے والوں کی یا اپنی عقل وفہم پر۔ اگلی آیت میں پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کی تاکید ہے۔

آیت 161 ① وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ...... : اوپر کی آیات میں جہاد کی ترغیب ہے اور اس آیت میں جہاد کے احکام کا بیان ہے۔

② جنگ احد کے دوران جو لوگ مورچہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے دوڑ پڑے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نہ پہنچے تو سارا مال غنیمت دوسرے لوگ سمیٹ کر لے جائیں گے، اس پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ آخر تم نے یہ تصور کیسے کر لیا کہ اس مال میں سے تمھارا حصہ تمھیں نہیں دیا جائے گا۔ کیا تمھیں نبی ﷺ کی امانت پر اطمینان نہیں؟ یاد رکھو! ایک پیغمبر سے کسی قسم کی خیانت کا صدور ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ خیانت نبوت کے منافی ہے۔ معلوم ہوا غلول (خیانت) کے معنی ”تقسیم میں ناانصافی“ کے بھی آتے ہیں اور یہ بھی غلول ہے کہ تقسیم سے پہلے مال غنیمت سے کوئی چیز بلا اجازت اٹھالی جائے۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”طمع کے کام تو ادنیٰ نبیوں سے بھی سرزد نہیں ہو سکتے (چہ جائیکہ سید الانبیاء سے)۔“ (موضح)

آیت 164 ① لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ ...... : اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کے بشر ہونے اور انسانوں ہی میں سے ہونے کو ایک احسان کے

اَوَ لَمَّآ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۶۵﴾

اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری اپنی طرف سے ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۶۵﴾

طور پر بیان کر رہا ہے اور فی الواقع یہ احسان عظیم ہے کہ اس طرح ایک تو وہ اپنی قوم کی زبان اور لہجے ہی میں اللہ کا پیغام پہنچائے گا، جسے سمجھنا ہر شخص کے لیے آسان ہوگا، دوسرے لوگ ہم جنس ہونے کی وجہ سے اس سے مانوس اور اس سے قریب ہوں گے اور تیسرے انسان کے لیے انسان، یعنی بشر کی پیروی تو ممکن ہے، لیکن فرشتوں کی پیروی اس کے بس کی بات نہیں، نہ فرشتوں میں وہ کمزوریاں اور ضرورتیں پائی جاتی ہیں جو انسان میں ہیں اور نہ فرشتہ انسان کے وجدان و شعور کی گہرائیوں اور باریکیوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر پیغمبر فرشتوں میں سے ہوتے تو وہ ان ساری ضروریات سے محروم ہوتے جو تبلیغ و دعوت کے لیے لازمی ہیں، اس لیے جتنے انبیاء بھی آئے سب کے سب بشر ہی تھے۔ قرآن مجید نے ان کی بشریت کو خوب کھول کر بیان کیا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۹)، سورۂ فرقان (۲۰)، سورۂ حم السجدہ (۶) اور سورۂ کہف کی آخری آیت۔

② اوپر کی آیت میں جب یہ بیان فرمایا کہ غلول اور خیانت ایک نبی کی شان سے بعید ہے، نبوت و خیانت جمع نہیں ہو سکتے تو اب اس آیت میں اسی کی مزید تاکید فرمائی کہ آپ ﷺ کو ایک پاکیزہ اور اعلیٰ نصب العین دے کر مبعوث کیا گیا ہے، جو یہ ہے کہ تم پر اس کی آیات پڑھے، تمھیں کتاب و حکمت (سنت) کی تعلیم دے اور رذائل سے پاک کرے، پھر ایسی پاکیزہ ہستی کی طرف، جو اتنے عظیم مقصد کے حصول کی خاطر مبعوث ہوئی ہو، کوئی عقل مند آدمی غلول کی نسبت کیسے کر سکتا ہے، یا کسی کے دل میں یہ خیال کیسے آ سکتا ہے کہ آپ خیانت جیسے کبیرہ اور مذموم فعل کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بہت سی احادیث میں اس گناہ کو کبیرہ قرار دیا ہے، حتیٰ کہ ابن لتبیہ والی حدیث میں حکام کے ہدیوں (تحائف) کو بھی غلول شمار کیا۔ [ بخاری، الحیل، باب احتیال العامل۔۔۔۔۔ : ۶۹۷۹ ] ”وَاِنۡ كَانُوۡا“ یہ اصل میں ” وَ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا “ تھا، دلیل اس کی ”لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ“ پر لام تاکید کا آنا ہے۔

**آیت 165** ① اَوَلَمَّآ اَصَابَتۡكُمۡ ...... : یعنی احد میں تمھارے ستر آدمی شہید ہو گئے تو بدر میں تم نے ان کے ستر آدمی قتل اور ستر قید کیے تھے اور قیدی بھی مقتول کے حکم میں ہوتا ہے کہ جب گرفتار کرنے والے کی مرضی ہو اسے قتل کر ڈالے۔

② هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ : یعنی تمھارے گناہوں کی وجہ سے، یا خود تمھارے پسند کرنے کی وجہ سے۔ (فتح القدیر) پہلی صورت سے مراد یہ ہے کہ تمھاری اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی وجہ سے، جس کا ارتکاب تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ کر کیا۔ (قرطبی) دوسری صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تمھارے فدیہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے۔ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کو اختیار دیا تھا کہ اگر تم فدیہ لینا چاہتے ہو تو اس کے

وَ مَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ۚ

اور جو مصیبت تمھیں اس دن پہنچی جب دو جماعتیں بھڑیں تو وہ اللہ کے حکم سے تھی اور تاکہ وہ ایمان والوں کو جان لے ﴿۱۶۶﴾ اور تاکہ وہ ان لوگوں کو جان لے جنھوں نے منافقت کی اور جن سے کہا گیا آؤ اللہ کے راستے میں لڑو، یا مدافعت کرو تو انھوں نے کہا اگر ہم کوئی لڑائی معلوم کرتے تو ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس دن اپنے ایمان (کے قریب ہونے) کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے، اپنے مونہوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو وہ چھپاتے ہیں ﴿۱۶۷﴾

بدلے میں آئندہ تمھارے ستر آدمی شہید ہوں گے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے منظور کر لیا تھا، قرآن نے یہاں ﴿ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾ کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[ ابن کثیر۔ طبری۔ أحمد : ۱/ ۳۰، ۳۱، ح : ۲۰۹ ]

آیت 166 وَمَآ اَصَابَكُمْ ...... : یعنی جنگ احد میں تمھیں جس نقصان کا سامنا کرنا پڑا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مشیت سے تھا اور اس میں حکمت یہ تھی کہ اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان تمیز ہو جائے۔

آیت 167 ① اَوِ ادْفَعُوْا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد میں ایک ہزار کی جمعیت لے کر احد کی طرف چلے، مقام شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں سمیت وہاں سے لوٹ آیا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اگر اللہ کی راہ میں جہاد نہیں کر سکتے تو کم از کم مسلمانوں کے ساتھ رہو، تاکہ کثرت تعداد کا دشمنوں پر اثر پڑے اور وہ آگے بڑھنے کی جرأت نہ کریں۔ اکثر مفسرین نے "اَوِ ادْفَعُوْا" کے یہی معنی کیے ہیں، مگر بعض نے یہ معنی بھی کیے ہیں کہ حمیت قومی اور حفاظت وطن کی خاطر ہی لڑائی میں شامل رہو۔ (یہ معنی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے) الغرض! لوگوں نے ہر طرح سے انھیں واپس لانے کی کوشش کی مگر وہ تیار نہ ہوئے اور وہ جواب دیا جو آگے آ رہا ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

② قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا ...... : وہ کہنے لگے، کوئی لڑائی وڑائی نہیں ہوگی، اگر ہمیں واقعی لڑائی کی توقع ہوتی تو ہم ضرور تمھارا ساتھ دیتے، یا مطلب یہ ہے کہ کوئی ڈھب کی جنگ ہوتی اور فریقین میں کچھ تناسب ہوتا تو ہم ضرور شرکت کرتے، مگر اُدھر تین ہزار کا مسلح لشکر ہے اور اِدھر ایک ہزار بے سروسامان آدمی ہیں، یہ کوئی جنگ ہے!؟ یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس بنا پر ہم ساتھ نہیں دے سکتے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ کلمہ انھوں نے طعن کے طور پر کہا تھا اور مطلب یہ تھا کہ مسلمان فنون حرب سے بالکل ناآشنا ہیں، ورنہ ہماری رائے مان لی جاتی تو مدینہ کے اندر رہ کر مدافعت کی جاتی۔'' (موضح)

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

جنھوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا اور خود بیٹھے رہے، اگر وہ ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ دے پھر اپنے آپ سے موت کو ہٹا دینا، اگر تم سچے ہو ﴿۱۶۸﴾ اور تو ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے، ہرگز مردہ گمان نہ کر، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں ﴿۱۶۹﴾

③ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ: یعنی اس سے قبل تو وہ بظاہر مسلمانوں کے ساتھ شامل تھے، گو ان کے باطن میں کفر تھا، مگر اعلانیہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، لیکن اس روز انھوں نے ایمان کو چھوڑ کر علانیہ کفر اختیار کر لیا، یا مطلب یہ ہے کہ اس دن انھیں ایمان کی بہ نسبت کفر کا مفاد زیادہ عزیز تھا اور انھوں نے واپس ہو کر مسلمانوں کو کمزور کیا اور کفر کو تقویت بخشی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ کلمہ انھوں نے طعن کے طور پر کہا تھا، پس اس لفظ کی وجہ سے وہ کفر کے قریب اور ایمان سے دور ہو گئے۔'' (موضح)

④ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ ......: یعنی بظاہر یہ کلمہ کہہ کر عذر لنگ اور بہانہ بناتے ہیں، مگر جو جذبات ان کے دلوں میں چھپے ہوئے ہیں ان کا صاف طور پر اظہار نہیں کرتے، دراصل یہ مسلمانوں کی ہلاکت کے متمنی ہیں، لیکن انھیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کی باتوں سے خوب واقف ہے۔

**آیت 168** جو مسلمان جنگ احد میں شہید ہوئے ان کے بارے میں منافقین نے اس قسم کا اظہار کیا، تاکہ لوگوں کو جہاد میں شمولیت سے متنفر کیا جا سکے۔ قرآن نے ان کے اس شبہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر واقعی گھروں میں بیٹھے رہنا تمھیں موت سے بچا سکتا ہے تو ذرا اپنے اوپر واقع ہونے والی موت کو ٹال کر دکھاؤ۔

**آیت 168** اس آیت میں منافقین کے اس شبہ کی کہ ''جہاد میں شامل ہونا خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے'' ایک دوسرے طریقے سے تردید کی ہے۔ فرمایا، نہیں بلکہ اس سے دائمی زندگی حاصل ہوتی ہے، شہداء کو اللہ کے ہاں بلند درجے ملتے ہیں، پروردگار کے ہاں انھیں ہر قسم کی نعمت اور لذت حاصل ہوتی ہے، یہ زندگی حقیقی زندگی ہے مگر دنیا والی زندگی نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جو تمھاری نگاہ سے اوجھل ہے، جسے ''برزخ'' کہتے ہیں اور جو تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکتی، فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۵۴] ''اور لیکن تم (اس زندگی کو) نہیں سمجھتے۔''

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کریمہ ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا﴾ سے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان (شہداء) کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں ہوتی ہیں اور ان کے لیے عرش الٰہی کے ساتھ قندیلیں معلق ہوتی ہیں، وہ جنت میں جہاں سے چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں، پھر عرش کے

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾

اس پر بہت خوش ہیں جو انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دیا ہے اور ان کے بارے میں بھی بہت خوش ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ ان کے پیچھے سے نہیں ملے کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۷۰﴾ وہ اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل پر بہت خوش ہوتے ہیں اور (اس بات پر) کہ بے شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۱۷۱﴾ وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا، اس کے بعد کہ انھیں زخم پہنچا، ان میں سے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نیکی کی اور متقی بنے بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۷۲﴾

---

نیچے لٹکی ہوئی انھی قندیلوں میں آ کر رہتی ہیں۔'' [ مسلم، الإمارة، باب بيان أن أرواح الشهداء في الجنة...... : ١٨٨٧ ]

**آیت 170** وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ ......: یعنی اپنے جن مسلمان بھائیوں کو جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول چھوڑ آئے ہیں ان کا تصور کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ان کو بھی ہماری طرح پر لطف اور بے خوف و خطر زندگی حاصل ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمھارے بھائی احد میں شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز رنگ کے پرندوں کے قالبوں میں ڈال دیا، جو جنت کی نہروں پر آتی ہیں، جنت کے پھل کھاتی ہیں اور عرش کے سائے میں سونے کی قندیلوں کے پاس ٹھہر جاتی ہیں، جب انھوں نے اپنے پاکیزہ کھانے اور پینے کو دیکھا اور اپنے حسن انجام کو ملاحظہ کیا تو کہنے لگے: ''اے کاش! ہمارے بھائیوں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ کیا اچھا سلوک فرمایا ہے، تا کہ وہ جہاد سے غافل ہو کر جنگ سے منہ نہ موڑیں۔'' تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تمھارا یہ پیغام میں پہنچا دیتا ہوں۔'' تو یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ [ أحمد : ٢٦٥/١، ٢٦٦، ح : ٢٣٨٨، عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما و صححه أحمد شاكر في المسند : ٢٣٨٩ ] ''يَسْتَبْشِرُوْنَ'' میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''بہت خوش ہوتے ہیں'' کیا ہے۔

**آیت 172** یہ حمراء الاسد، یعنی جنگ احد سے اگلے روز کا واقعہ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ احد سے پلٹ کر جب مشرکین چند منزل دور چلے گئے تو آپس میں کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی کہ مسلمانوں کا پوری طرح خاتمہ کیے بغیر واپس چلے آئے۔ چنانچہ وہ مدینے پر دوبارہ حملہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگے، ادھر جب رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ نے مسلمانوں کو مشرکین کے تعاقب میں نکلنے کا حکم دیا، تا کہ وہ واقعی پلٹ کر مدینہ پر حملہ نہ کر دیں۔ اس وقت اگرچہ شرکائے احد میں سے اکثر لوگ سخت زخمی اور تھکے تھے لیکن اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل میں فوراً نکل کھڑے ہوئے۔ جب مدینہ سے

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے ﴿۱۷۳﴾

تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر حمراء الاسد (نامی جگہ) پہنچے تو مشرکین کو ان کے آنے کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے آپس میں کہا کہ اس مرتبہ تو واپس چلتے ہیں، اگلے سال پھر آئیں گے۔ اس صورت حال کے پیش نظر نبی ﷺ بھی مدینہ واپس تشریف لے آئے، چنانچہ آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے اور مسلمانوں کو بشارت ہے۔ (ابن کثیر)

عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے عروہ سے کہا: ''اے میرے بھانجے! تیرے دونوں باپ زبیر (والد) اور ابوبکر (نانا) بھی ان میں شامل تھے، جب رسول اللہ ﷺ کو احد میں وہ تکالیف پہنچیں جو پہنچیں اور مشرکین واپس چلے گئے تو آپ نے خوف محسوس کیا کہ وہ پلٹ نہ آئیں تو فرمایا: ''ان کے پیچھے کون جائے گا؟'' تو ان میں سے ستر آدمیوں نے لبیک کہا، ان میں ابوبکر اور زبیر بھی تھے۔'' [ بخاری، المغازی، باب: ﴿ الذين استجابوا لله والرسول ﴾ : ۴۰۷۷، عن عائشة رضی اللہ عنہا ]

آیت 173 ① اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ...... : یہ آیت بھی واقعہ حمراء الاسد ہی سے متعلق ہے اور وہ اس طرح کہ جب ابوسفیان کو جو اس وقت مشرکین کی قیادت کر رہا تھا، مسلمانوں کے تعاقب کی اطلاع ملی تو اس نے ایک تجارتی قافلے کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو یہ چیلنج بھیجا کہ میں نے بڑا لاؤلشکر جمع کر لیا ہے اور میں مدینہ پر پھر سے حملہ کرنے والا ہوں، یہ سن کر مسلمانوں میں خوف اور کمزوری کے بجائے مزید ایمانی قوت پیدا ہوئی اور آپ ﷺ اور صحابہ نے کہا: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ ''ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔'' (ابن کثیر)

② عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ کا کلمہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا جب انھیں آگ میں ڈالا گیا اور محمد ﷺ نے اس وقت کہا جب لوگوں نے کہا: ﴿ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ﴾ ''بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس بات نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا'' اور انھوں نے کہا: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ ''ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿ الذين قال لهم الناس ...... ﴾ : ۴۵۶۳ ]

③ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا : اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کا ایمان مشرکین کے چیلنج کرنے سے بڑھ گیا، ظاہر ہے وہ پہلے نسبتاً کم تھا، تب ہی بڑھا۔ اس سے ایمان کی کمی بیشی ثابت ہوتی ہے اور ان لوگوں کی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان جبریل علیہ السلام اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان جیسا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان جس قدر بڑھتا ہے جذبۂ جہاد بھی بڑھتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نہ جنگ کی نہ اپنے دل سے جنگ کی بات کی، وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرے گا۔'' [ مسلم، الإمارة، باب ذم من مات و لم يغز ...... : ۱۹۱۰۔ أبو داوٗد، الجهاد، باب كراهية ترك الغزو : ۲۵۰۲، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

تو وہ اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی برائی نہیں پہنچی اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۱۷۴﴾ یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو ﴿۱۷۵﴾ اور وہ لوگ تجھے غمزدہ نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، بے شک وہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۷۶﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کو ایمان کے بدلے خریدا، وہ ہرگز اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۷﴾

**آیت 174** اس آیت سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے کلمہ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ کس طرح ابراہیم علیہ السلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر قسم کی برائی سے محفوظ رہ کر اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس پلٹے اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی۔ اس لیے ہر مصیبت کے وقت اس وظیفہ کے معنی کا خیال کرتے ہوئے دل اور زبان کو ایک کر کے اسے کثرت سے پڑھنا چاہیے۔

**آیت 175** وہ شخص جو یہ افواہیں پھیلا رہا تھا اسے شیطان فرمایا اور بتایا کہ یہ اپنے کافر اور منافق دوستوں سے ڈرا رہا ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر دل میں نہ لائیں۔ حقیقی شیطان بھی اپنے انسانی دوست شیطانوں کے دلوں میں مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کے نئے سے نئے طریقے ڈالتا رہتا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۲) آج کل اخبار، ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ جھوٹ پھیلانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے شیطان کے آلات ہیں۔ مومن کو ان کی خبروں سے ڈرنے کے بجائے اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے اور "اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ" کے تحت ان کا علاج بھی کرنا چاہیے۔

**آیت 176** کافر اور منافق مختلف طریقوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے رہتے، جس سے آپ طبعی طور پر رنجیدہ خاطر بھی ہو جاتے، خصوصاً غزوۂ احد کے واقعہ کو منافقین نے بہت ہوا دی اور مسلمانوں کو اللہ کی نصرت سے مایوس کرنے کی کوشش کی اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ اس قسم کی مخالفتوں سے کفار اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اس قسم کا رویہ اختیار کر کے خود ہی آخرت کے حصے سے محروم ہو رہے ہیں۔

**آیت 177** یعنی یہ لوگ ایمان کے بجائے کفر اختیار کر کے خود اپنا برا کر رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں دردناک عذاب سے

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ہرگز گمان نہ کریں کہ بے شک جو مہلت ہم انھیں دے رہے ہیں وہ ان کی جانوں کے لیے بہتر ہے، ہم تو انھیں صرف اس لیے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے﴿۱۷۸﴾ اللہ کبھی ایسا نہیں کہ ایمان والوں کو اس حال پر چھوڑ دے جس پر تم ہو، یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھیں غیب پر مطلع کرے اور لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے، پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور متقی بنو تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے﴿۱۷۹﴾

دو چار ہوں گے۔

**آیت 178** فرمایا، ہم جو کافروں کی عمریں لمبی کرتے چلے جا رہے ہیں اور انھیں ان کے حال پر چھوٹ دے رہے ہیں، مال، اولاد اور دنیا کی نعمتیں وافر دے رہے ہیں، تو کیا یہ سب کچھ ان کے لیے بہتر ہے؟ نہیں، بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے، کیونکہ اس سے ان کے گناہوں میں اضافہ ہوگا، ان کے خلاف حجت مضبوط ہوگی، بلکہ دنیا میں بھی یہ سب کچھ ان کے لیے عذاب کا باعث بنے گا، دیکھیے سورۂ مومنون (۵۵، ۵۶)، سورۂ قلم (۴۴) اور سورۂ توبہ (۵۵)۔

**آیت 179** ① مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ...... : چنانچہ جنگ احد میں کفر و نفاق اور ایمان و اخلاص الگ ہو کر سامنے آ گئے۔ رازی لکھتے ہیں: ''اس آیت کا تعلق بھی قصۂ احد سے ہے۔ چنانچہ اس حادثہ میں قتل و ہزیمت اور پھر اس کے بعد ابوسفیان کے چیلنج کے جواب میں مسلمانوں کا نکلنا وغیرہ، سب ایسے واقعات تھے جن سے کفر و نفاق اور ایمان و اخلاص الگ الگ ہو کر سامنے آ گئے اور مومن اور منافق میں امتیاز ہو گیا۔ چونکہ منافقین کا مومنوں کے ساتھ ملا جلا رہنا حکمتِ الٰہی کے خلاف تھا، اس لیے یہ تمام واقعات پیش آئے۔

② وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ: یعنی اگر اللہ تعالیٰ اس طرح آزمائش کے ذریعے سے مخلص مومنوں اور منافقین کے حالات اور ان کے ظاہر و باطن کو نمایاں نہ کرے تو تمھارے پاس کوئی غیب کا علم تو ہے نہیں کہ جس سے تم پر یہ چیزیں ظاہر ہو جائیں اور تم جان سکو کہ کون مومن ہے اور کون منافق؟ اور نہ تم میں سے ہر ایک کو غیب کی بات پر اطلاع دی جا سکتی ہے اور نہ تم میں سے کسی کو بھی پورے غیب کی اطلاع دی جا سکتی ہے۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

اور وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے، ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے، عنقریب قیامت کے دن انھیں اس چیز کا طوق پہنایا جائے گا جس میں انھوں نے بخل کیا اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی میراث ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پورا باخبر ہے ﴿۱۸۰﴾

③ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ...... : ہاں، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب کی جتنی بات چاہتا ہے اس کی اطلاع دے دیتا ہے، جو نہیں چاہتا نہیں بتاتا۔ اب منافقین میں سے بعض کا بتا دیا اور بعض کا نہیں بتایا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ﴾ [ التوبة : ۱۰۱ ] ”اور ان لوگوں میں سے جو تمھارے ارد گرد بدویوں میں سے ہیں، کچھ منافق ہیں اور کچھ اہل مدینہ میں سے بھی جو نفاق پر اڑ گئے ہیں، تو انھیں نہیں جانتا، ہم ہی انھیں جانتے ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے چنے ہوئے رسولوں کو غیب کی کچھ باتوں کی اطلاع دیتا ہے، جن کی انھیں نبوت کی دلیل کے طور پر ضرورت ہوتی ہے، مگر وہ اس سے عالم الغیب نہیں بنتے، عالم الغیب ایک اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۵۹)، سورۂ نمل (۶۵) اور سورۂ جن (۲۶ تا ۲۸)۔

④ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ : مسلمانوں کا یہ کام نہیں کہ رسول سے اپنی مرضی کی غیب کی باتیں بتانے کا مطالبہ کریں۔ ان کا کام اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا ہے اور اگر وہ ایمان لا کر تقویٰ اختیار کریں گے تو ان کے لیے اجر عظیم ہے۔

**آیت 180** ① وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ...... : اوپر ترغیب جہاد کے سلسلے میں جانی قربانی پر زور دیا ہے اور جو جان بچانے کی خاطر اس سے فرار اختیار کرتے ہیں ان کے حق میں وعید سنائی ہے۔ اب یہاں جہاد میں مالی قربانی پر زور دیا جا رہا ہے اور بخل کرنے والوں کی مذمت کی جا رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح ان منافقین کو اپنی جان پیاری ہے اسی طرح ان کو اپنا مال بھی پیارا ہے اور جو لوگ مال کے حقوق ادا کرنے سے پہلوتہی کرتے ہیں، قیامت کے دن یہی مال ان کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ مال دیا ہے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے مال کو ایک گنجے سانپ کی شکل دے دی جائے گی اور وہ طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ اسے اپنے دونوں جبڑوں سے پکڑے گا اور اس سے کہے گا: ”میں ہوں تمھارا مال، میں ہوں تمھارا خزانہ۔“ پھر نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ولا يحسبن الذين يبخلون...... ﴾ : ۴۵۶۵، عن أبي هريرة رضي الله عنه ]

② بخل ان حقوق کو ادا نہ کرنے کا نام ہے جو انسان پر واجب ہوں، مثلاً گھر والوں کا نان و نفقہ، مہمان نوازی، جہاد کی تیاری، زکوٰۃ و عشر وغیرہ۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (( وَ اَيُّ دَاءٍ اَدْوَأُ مِنَ الْبُخْلِ )) ”بخل سے بڑی بیماری کیا ہو سکتی ہے؟“

لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيۡرٌ وَّ نَحۡنُ اَغۡنِيَآءُ ۘ سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا وَ قَتۡلَهُمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۱۸۲﴾

بلاشبہ یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے کہا بے شک اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں، ہم ضرور لکھیں گے جو انھوں نے کہا اور ان کا نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرنا بھی اور ہم کہیں گے جلنے کا عذاب چکھو ﴿۱۸۱﴾ یہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اس لیے کہ بے شک اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ﴿۱۸۲﴾

[ بخاری، المغازی، باب قصة عمان والبحرین : ۴۳۸۳ ]

③ وَلِلّٰهِ مِيۡرَاثُ…… : یعنی جب زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی میراث اور ملکیت ہے تو جس مال کے بظاہر تم وارث بنائے گئے ہو، اس میں بخل کیوں کرتے ہو؟ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اللہ وارث ہے، آخر تم مر جاؤ گے اور مال اسی کا ہو رہے گا، تم اپنے ہاتھ سے دو تو ثواب پاؤ۔'' (موضح)

آیت 181 ① لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيۡرٌ…… : اوپر کی آیات میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے پر زور دیا، اب ان آیات میں یہود کے اعتراضات کا بیان اور ان کا جواب دینا مقصود ہے۔ دراصل یہود یہ اعتراضات نبوت پر طعن کی غرض سے کرتے تھے۔ کتب تفسیر میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَنۡ ذَا الَّذِيۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا﴾ [ البقرة : ۲۴۵ ] ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض'' تو بعض یہود نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: ''لو جی، اللہ میاں بھی فقیر ہو گئے ہیں اور بندوں سے قرض مانگنے پر اتر آئے ہیں۔'' تو ان کے جواب میں یہ آیت اتری۔ (ابن کثیر) دراصل اس قسم کے اعتراضات وہ عوام کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے متنفر کرنے کی غرض سے کرتے تھے، ورنہ وہ بھی خوب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے الفاظ کہنا کتنی بڑی گستاخی اور کفر ہے۔ (قرطبی)

② سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا: یعنی ان کی اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ گستاخی اور رسولوں کو ناحق قتل کرنا، سب ان کے نامۂ اعمال میں درج کیا جا رہا ہے۔ قیامت کے دن ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا اور وہ عذاب حریق کی سزا میں گرفتار ہوں گے۔

آیت 182 وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ: اس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ '' ظَلَّامٌ '' مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا معنی بہت ظلم کرنے والا ہے۔ بظاہر معنی یہ ہوا کہ ''اللہ بندوں پر بہت ظلم کرنے والا نہیں'' گویا کم ظلم کر سکتا ہے۔ اس کا ایک جواب استاذ مرحوم مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ نے دیا ہے: ''اس مبالغے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے (نعوذ باللہ) رتی برابر بھی ظلم صادر ہو تو وہ '' ظَلَّامٌ '' ٹھہرے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم سے منزہ ہے۔'' یہ جواب بھی اچھا ہے، مگر اس سے قوی جواب یہ ہے کہ بعض اوقات مبالغے کے صیغے پر نفی آئے تو اس سے مراد مبالغہ کی نفی نہیں ہوتی بلکہ نفی میں مبالغہ ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ ''اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔'' جیسا کہ طرفہ نے کہا ہے ؎

اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

جنھوں نے کہا بے شک اللہ نے ہمیں تاکیدی حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول کی بات کا یقین نہ کریں، یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لائے جسے آگ کھا جائے، کہہ دے بے شک مجھ سے پہلے کئی رسول تمھارے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے اور وہ چیز لے کر بھی جو تم نے کہی ہے، پھر تم نے انھیں کیوں قتل کیا، اگر تم سچے تھے ﴿۱۸۳﴾ پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بے شک کئی رسول تجھ سے پہلے جھٹلائے گئے، جو واضح دلیلیں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے ﴿۱۸۴﴾

وَلَسْتُ بِحَلَّالِ التِّلَاعِ مَخَافَةً　　وَلٰكِنْ مَتٰى يَسْتَرْفِدِ الْقَوْمُ أَرْفِدِ

ظاہر الفاظ کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا ''اور میں خوف کی وجہ سے ٹیلوں پر بہت زیادہ چڑھنے والا نہیں، بلکہ قوم جب مجھ سے عطیہ مانگے تو میں عطیہ دیتا ہوں۔'' مگر یہاں یہ معنی نہیں کہ میں بہت زیادہ چڑھنے والا نہیں، بلکہ معنی ہے کہ میں بالکل ٹیلوں پر نہیں چڑھتا۔ دلیل یہ ہے کہ میں عطیہ مانگنے پر دیتا ہوں۔ دیکھیے '' البحر المحیط '' اور '' اللباب '' وغیرہ۔

**آیت 183** ❶ اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ ...... : یہ ان کا دوسرا اعتراض ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہ لانے کے سلسلے میں پیش کیا کہ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا ہے کہ اگر کوئی نبی یہ معجزہ پیش نہ کرے تو اس پر ایمان نہ لائیں۔ (رازی) حالانکہ ان کی کسی کتاب میں یہ حکم نہیں اور ان کے تمام انبیاء کو یہ معجزہ عطا بھی نہیں ہوا تھا، جیسا کہ اسی آیت میں اشارہ ہے: ﴿قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ﴾ یہاں ''رُسُلٌ'' نکرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تمام انبیاء کو نہیں، بلکہ بعض کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ جب کوئی سوختنی (جلائی جانے والی) قربانی (نذر) پیش کی جاتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے، اس قربانی (نذر) کی قبولیت کی علامت کے طور پر آسمان سے آگ اترتی، جو اسے جلا ڈالتی، جیسا کہ ایلیاء اور سلیمان علیہما السلام کے متعلق مذکور ہے۔ (ابن کثیر)

❷ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ ...... : یہ ان کے اس اعتراض کا جواب ہے، جو اوپر ذکر ہوا کہ اگر واقعی تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو پھر تمھارے آباء و اجداد نے ان بہت سے انبیاء کو قتل کیوں کر ڈالا جو اپنی نبوت کے صدق پر دوسری واضح دلیلوں کے ساتھ یہ معجزہ بھی لے کر آئے جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو؟

**آیت 184** یہود کے تمسخر اور اعتراضات کا جواب دینے کے بعد آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اس قسم کے شبہات پیدا کر کے اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو یہ غم کی بات نہیں، کیونکہ آپ سے پہلے بہت سے انبیاء کے ساتھ وہ یہ سلوک کر چکے ہیں۔ ''بِالْبَيِّنٰتِ'' سے دلائل عقلیہ اور معجزات دونوں مراد ہیں۔ '' الزُّبُرِ '' یہ زبور کی جمع ہے، اس سے وہ چھوٹے چھوٹے

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۟ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

ہر جان موت کو چکھنے والی ہے اور تمھیں تمھارے اجر قیامت کے دن ہی پورے دیے جائیں گے، پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہوگیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۸۵﴾ یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے ﴿۱۸۶﴾

صحیفے مراد ہیں جن میں نیکی کی نصیحت، برائی سے روکنے اور حکمت و دانائی کی باتیں ہوتی تھیں۔ داؤد علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی، قرآن نے اسے بھی "زبور" کہا ہے، کیونکہ اس میں بھی انھی چیزوں کا پہلو نمایاں ہے اور قرآن کی اصطلاح میں "الْكِتٰبِ" سے مراد وہ بڑی کتاب ہے جس میں مسائل و احکام اور دوسری سب چیزیں ہوں، مگر ان کتابوں میں قرآن مجید کے سوا کسی کتاب کو اعجازی حیثیت حاصل نہیں ہوئی (کہ اس کی کسی سورت کے مقابلے میں اس جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج ہو)۔

**آیت 185** بخیلوں کا حال اور ان کا کفر بیان کرنے کے بعد یہاں بتایا کہ دنیا کے جس مال و متاع کے جمع کرنے کے لیے انسان بخل کرتا ہے، یہ سب کچھ فانی ہے اور باقی نہ رہنے والا ہے اور آخرت کی زندگی ہی باقی اور ابدی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ آخرت کی فکر کرے اور اس میں کامیابی کی کوشش کرتا رہے۔ اور یہ جو فرمایا: "تمھیں تمھارے اجر قیامت کے دن ہی پورے دیے جائیں گے" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو دنیا یا برزخ میں بھی کچھ نہ کچھ اعمال کا بدلہ ملتا ہے، مگر پورا بدلہ یعنی پورا ثواب و عقاب قیامت کے دن ہی ملے گا، اس سے پہلے ممکن نہیں۔ اور دنیا کی زندگی محض "مَتَاعُ الْغُرُوْرِ" (دھوکے کا سامان) ہے، اس کی ظاہری زیب و زینت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ [ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ ]

**آیت 186** یہ خطاب نبی ﷺ اور عام مسلمانوں سے ہے کہ آئندہ بھی جان و مال میں تمھاری آزمائش ہوگی اور تمھیں ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنا ہوں گی، جیسے اموال کا تلف ہو جانا اور بیمار پڑ جانا وغیرہ۔ اہل کتاب اور مشرکین کی زبانوں سے تمھیں انتہائی دل آزار اور جگر خراش طعن و تشنیع، بے ہودہ گفتگو اور جھوٹے الزامات سننا پڑیں گے، جیسا کہ منافقین نے ہر طرح ستایا۔ سورۂ منافقون اور سورۂ توبہ میں تفصیل دیکھ لیں، نیز کعب بن اشرف یہودی نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ١ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ١ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ١ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی کہ تم ہر صورت اسے لوگوں کے لیے صاف صاف بیان کرو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے تو انھوں نے اسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت لے لی، سو برا ہے جو وہ خرید رہے ہیں ﴿۱۸۷﴾ ان لوگوں کو ہرگز خیال نہ کر جو ان (کاموں) پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیے اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ان (کاموں) پر کی جائے جو انھوں نے نہیں کیے، پس تو انھیں عذاب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہرگز خیال نہ کر اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۸۸﴾

ہجو کی اور اپنے قصائد میں مسلمان خواتین کا نام لے کر تشبیب کہی۔ مگر ان کا علاج یہ ہے کہ تم صبر، یعنی ثابت قدمی اور استقلال سے کام لو اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اپنے دلوں میں رکھو۔ اگر صبر اور تقویٰ سے ان آزمائشوں کا مقابلہ کرو گے تو یہ نہایت ہمت، حوصلے اور اولوالعزمی کا کام ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمیشہ صبر اور تقویٰ سے کام لیتے رہے، حتیٰ کہ حالتِ جنگ میں بھی نہ ان کی طرح بدزبانی سے کام لیا اور نہ عملاً اس طرح زیادتی کی جس طرح انھوں نے کی تھی۔

**آیت 187** یعنی اہل کتاب سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ ان کی کتابوں میں جو احکام دیے گئے ہیں اور نبی آخر الزماں ﷺ سے متعلق جو بشارتیں اور علامتیں بیان کی گئی ہیں، ان کا اعلانیہ اظہار کریں گے اور ان کو چھپانے کے جرم کا ارتکاب نہیں کریں گے، مگر انھوں نے دنیا طلبی میں پڑ کر اس عہد کی کوئی پروا نہ کی اور ان احکام کی بھی لفظی اور معنوی تحریف کی اور ان بشارتوں اور علامتوں کو چھپایا، ﴿ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴾ ”سو برا ہے جو وہ خرید رہے ہیں۔“ اس آیت میں ضمناً مسلمان علماء کو بھی یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ حق بات کو جانتے بوجھتے ہوئے چھپانے کے جرم کا ارتکاب نہ کریں۔ حدیث میں متعدد سندوں سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے: (( مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهٗ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ )) [ ترمذی، العلم، باب ما جاء في كتمان العلم : ۲٦٤٩، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ”جس سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی اور اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔“

**آیت 188** یعنی جو کام انھوں نے کیے ہیں ان پر اتراتے چلے جاتے ہیں اور جو کام انھوں نے نہیں کیے ان کے متعلق بھی چاہتے ہیں کہ انھیں ان کے کارناموں میں شمار کیا جائے، ایسے لوگوں کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے چھوٹ جائیں گے۔ یہ آیت دراصل یہود اور منافقین کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہود سے کوئی بات دریافت کی تو انھوں نے اس کا غلط جواب دیا، پھر خوش ہوئے کہ ہم نے

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۸۹﴾ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۱۹۰﴾

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن کر دیا، اب انھیں ہماری تعریف کرنی چاہیے۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا تحسبن الذين يفرحون بما أتوا﴾ : ۴۵۶۸ ]

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے لیے تشریف لے جاتے تو بعض منافقین آپ کے ساتھ نہ جاتے اور آپ کے جانے کے بعد ( اپنے گھروں میں ) بیٹھے رہنے سے بہت خوش ہوا کرتے، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے تو عذر اور بہانے پیش کرتے اور (ان عذر بہانوں پر ) قسم کھاتے اور چاہتے کہ اس کام پر ان کی تعریف کی جائے جو انھوں نے نہیں کیا، چنانچہ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا ﴾ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولا تحسبن الذين يفرحون بما أتوا﴾ : ۴۵۶۷ ] مگر یہ حکم اہل کتاب اور مسلمانوں کے لیے عام ہے، جو بھی خوشامد پسند ہوگا اور اس قسم کا ذہن رکھے گا کہ اس کے ناکردہ کارناموں پر اس کی تعریف کی جائے اس کے لیے وہ وعید ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ ( شوکانی )

**آیت 189** وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : جب حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے تو یہ حقیقت اگر تم ہر وقت اپنے سامنے رکھو تو شاید ایک نافرمانی کی جرأت بھی نہ کر سکو۔

**آیت 190** ❶ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... اس آیت سے آخر سورت تک آیات کی بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کے لیے اٹھتے تو ان آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ربنا إنك من تدخل النار ﴾ : ۴۵۷۰، ۴۵۷۱، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ]

❷ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ: "الْاَلْبَابِ" یہ " لُبٌّ "کی جمع ہے، جس کا معنی خالص عقل ہے، اس لیے ترجمہ " عقلوں والوں" کیا ہے۔ یعنی جو لوگ زمین و آسمان کی تخلیق اور کائنات کے دیگر اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں، انھیں کائنات کے خالق اور اس کے اصل فرماں روا کی پہچان ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اتنی طویل و عریض کائنات کا یہ لگا بندھا نظام، جس میں ذرا خلل واقع نہیں ہوتا، یقیناً اس کے پیچھے ایک ذات ہے جو اسے چلا رہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ اس میں عقلوں والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اکیلے مالک ہونے کی، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کاریگری کی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حاکمیت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

نظام فلکی اور اس کی تفصیلات، چاند سورج، ستاروں کی تعداد، ان کے درمیانی فاصلے، ان کے باہمی تعلقات و تاثرات، ان کی گردشوں کی پیمائش، گرہن کے اسباب و اوقات، ان کے طلوع و غروب اور نور و حرارت وغیرہ کے قاعدے و ضابطے، غرض

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، سو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ﴿۱۹۱﴾

اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ رہی زمین تو اس کی شکل و صورت، اس کی پیمائش، اس کے پہاڑ اور سمندر، اس کی معدنیات، اس کی کشش، اس کی ہواؤں اور موسموں کے تغیرات وغیرہ کے لیے تو کوئی ایک فن بھی پوری طرح کافی نہ ہوا، بلکہ جغرافیہ، جغرافیہ طبعی، جیالوجی، فزیالوجی، میٹرالوجی اور آرکیالوجی، اللہ جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی کاریگری کے اندازے اور تخمینے ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔ اب "**اُولُوا الْاَلْبَابِ**" کے بجائے غیر مسلم قومیں ان چیزوں پر غور میں مصروف ہیں اور چونکہ ان کا ہدف ہی دنیا ہے، اس لیے دنیا کے بے شمار فائدے حاصل کر رہے ہیں، بلکہ انھی فنون کے ذریعے سے انھوں نے مسلمانوں کو مغلوب کر رکھا ہے، ہدف کی غلطی کی وجہ سے انھیں ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ کاش! مسلمان ان فنون میں پوری طرح حصہ لیتے تو یہ سارے علوم دین کی سربلندی اور توحید کی دعوت کا زبردست ذریعہ بنتے اور دنیا پر غلبے کے کام آتے، کیونکہ مسلمان تو ﴿**رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ**﴾ کا ہدف سامنے رکھتا ہے۔

آیت 191 ❶ **الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ** ......: پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز کے خالق اور رب ہونے کا ذکر تھا، اب اس اکیلے کی عبادت کا ذکر ہے، یعنی وہ "**اُولُوا الْاَلْبَابِ**" دل، زبان اور دوسرے سب اعضاء سے کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہر حالت میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ روزی کماتے وقت اللہ کے حکم کا خیال رکھنا بھی اس کی یاد ہے، عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر اسے نہ بھولنا بھی یاد ہے، نظر کو بے لگام نہ ہونے دینا بھی اس کا ذکر ہے، اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کی تیاری میں مصروف ہونا بھی اس کی یاد ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے صرف نماز اور تسبیح و تحمید کو ذکر سمجھ لیا اور اللہ کی جس یاد اور ملاقات کے شوق سے صحابہ و تابعین کے سینے روشن تھے اور وہ موت کو موت کی جگہوں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے، اس کو اپنے شب و روز سے نکال دیا، حالانکہ یہ ذکر اسلام کے بنیادی ارکان کے بعد تمام اذکار سے کہیں افضل ہے۔ فرمایا: ﴿**اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ**﴾ [ التوبة : ۱۹ ] "کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں۔" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَوْقِفُ سَاعَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنْ قِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ عِنْدَ الْحَجَرِ الْاَسْوَدِ )) "ایک گھڑی اللہ کے راستے ( جہاد ) میں رہنا حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے۔" [ ابن حبان : ۴۶۰۳، و صححه الألباني، الصحيحة : ۱۰۶۸ ]

رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَيۡتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ۚ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخۡزِنَا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ﴿۱۹۴﴾

اے ہمارے رب! بلاشبہ تو جسے آگ میں ڈالے سو یقیناً تو نے اسے رسوا کر دیا اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں (۱۹۲) اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک آواز دینے والے کو سنا، جو ایمان کے لیے آواز دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے رب! پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ فوت کر (۱۹۳) اے ہمارے رب! اور ہمیں عطا فرما جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبانی کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر، بے شک تو وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا (۱۹۴)

② وَيَتَفَكَّرُوۡنَ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: یعنی زمین و آسمان کو پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے جو حکمت رکھی ہے وہ اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ علوم ہیئت فلکیات اور ریاضی کو اگر دینی نقطۂ نظر سے پڑھا جائے تو فی الجملہ عبادت میں داخل ہے۔

③ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا: یعنی بے مقصد نہیں بنایا، بلکہ اس عالم کی انتہا دوسرے عالم میں ہو رہی ہے، جس میں حساب کتاب ہوگا۔ (موضح) اس میں مادہ پرستوں اور دہریوں کا رد ہے جو کائنات کو محض اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، یعنی غور و فکر سے ان پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام یونہی پیدا نہیں کیا، بلکہ اس کے پیچھے یہ مقصد کارفرما ہے کہ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے تو اجر و ثواب پائے اور نافرمانی کرے تو آخرت میں عذاب بھگتے، اس لیے وہ آگ سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

**آیت 193** ① رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا...... : "مُنَادِيًا" سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں یا قرآن یا پھر ہر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جو دعوتِ حق پیش کرے۔

② رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا: اس میں اپنے ایمان لانے کے عمل کے وسیلے سے گناہوں کی مغفرت کی دعا ہے اور یہ مسنون ہے۔

**آیت 194** ① رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا: یعنی تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے سے ان کی تصدیق اور اتباع کرنے پر دنیا اور آخرت میں جس نصرت اور اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، وہ ہمیں عطا فرما۔

② اِنَّكَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ: یعنی ہمیں یہ ڈر تو نہیں کہ تو وعدہ خلافی کرے گا، بلکہ ہمیں ڈر اپنے ہی اعمال سے ہے کہ یہ اچھے نہیں ہیں، کہیں ہماری رسوائی کا باعث نہ بنیں، اگر تو اپنی رحیمی و کریمی اور غفاری سے ہماری کوتاہیوں کو معاف فرما دے اور ہمیں رسوائی سے بچا لے تو ہماری عین سرفرازی اور تیری بندہ نوازی ہے۔ پس کلمہ ﴿ اِنَّكَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ﴾ سے مقصد

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

تو ان کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی کہ بے شک میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، تمھارا بعض بعض سے ہے۔ تو وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور انھیں میرے راستے میں ایذا دی گئی اور وہ لڑے اور قتل کیے گئے، یقیناً میں ان سے ان کی برائیاں ضرور دور کروں گا اور ہر صورت انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، اللہ کے ہاں سے بدلے کے لیے اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اچھا بدلہ ہے ﴿۱۹۵﴾

عاجزی، خشوع اور بندگی کا اظہار ہے نہ کہ اس کا مطالبہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی تو محال ہے، پھر مومن اس کا تصور کیسے کر سکتے ہیں۔ (رازی) دعا اور اس کی قبولیت کا یہ وعدہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، دعا میں اس کا وسیلہ بھی پیش کر سکتے ہیں، جیسا کہ غار میں پھنس جانے والے تین آدمیوں نے کیا تھا، البتہ دعا کی قبولیت کے لیے کسی نیک ہستی کو وسیلہ بنانا کہ یا اللہ! فلاں کے طفیل میری یہ مشکل حل فرما دے، قرآن و حدیث میں مذکور دعاؤں کے خلاف ہے۔ ہاں، کسی زندہ آدمی سے دعا کروائی جا سکتی ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے۔

آیت 195 ① فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ ......: یعنی انھوں نے اس طرح دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما لی۔ پھر ان کی دعا کی قبولیت کی صورت اور کیفیت کا بھی ذکر فرما دیا کہ باری تعالیٰ کسی عامل کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اس میں مرد عورت کا بھی کوئی فرق نہیں، کیونکہ ان کا بعض بعض سے ہے، وہ کوئی الگ الگ مخلوق نہیں ہیں۔ اخروی نجات اور اللہ کے ہاں درجات حاصل کرنے میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں، ہاں، مرد و عورت کی جداگانہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے فطرتاً ان کی صلاحیتوں میں فرق ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۳۲، ۳۴)۔

② فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا ......: یعنی جنھوں نے دین کی خاطر اپنی خوشی سے ہجرت کی، اپنے وطن اور مال و منال کو خیر باد کہہ کر مرکز اسلامی میں پہنچ گئے اور وہ لوگ جن پر کفار نے ظلم و ستم ڈھائے، انھیں سخت اذیتیں دے کر گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا، انھیں کسی طرح چین سے نہ بیٹھنے دیا اور انھیں محض اس لیے تکالیف کا نشانہ بنایا کہ انھوں نے دین اسلام کی راہ اختیار کی، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ﴾ [ الممتحنة : ۱ ] ”یہ کافر پیغمبر (ﷺ) کو اور تمھیں گھروں سے محض اس جرم کی پاداش میں نکالتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَمَا

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

تجھے ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے جنھوں نے کفر کیا﴿۱۹۶﴾ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھران کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا بچھونا ہے﴿۱۹۷﴾ لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں، اللہ کے پاس سے مہمانی کے طور پر اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے﴿۱۹۸﴾

---

نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ [ البروج : ۸ ] ”اور انھوں نے ان سے اس کے سوا کسی چیز کا بدلہ نہیں لیا کہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو سب پر غالب ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔“

**آیت 196 تا 198** لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... : اوپر کی آیات میں مومنوں کے گناہ بخشنے اور ثواب عظیم کا وعدہ فرمایا، حالانکہ وہ فقر و فاقہ کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے بالمقابل کفار نہایت عیش و نعمت میں تھے، انھیں دیکھ کر بعض اوقات مسلمان غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے اور مختلف خیالات کی دنیا میں چلے جاتے، لہٰذا ان آیات میں مسلمانوں کا ذہن صاف کرنے کے لیے کفار کا انجام بیان فرمایا اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نیکی کے معاملہ میں مومن کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا، اسے اس نیکی کا بدلہ دنیا میں بھی دیتا ہے اور آخرت میں بھی اور کافر جو نیکیاں اللہ کے لیے کرتا ہے اس کا بدلہ اسے دنیا ہی میں پورا دے دیا جاتا ہے، پھر جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی نہیں ہوگی کہ اس کا بدلہ اسے دیا جائے۔“ [ مسلم، صفات المنافقین، باب جزاء المؤمن...... : ۲۸۰۸ ] مقصد یہ ہے کہ شہروں میں کفار کے تجارتی کاروبار، ان کی خوش حالی اور مال و دولت کی فراوانی کو دیکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں کسی قسم کا حزن و غم نہیں آنا چاہیے، نہ ان کو ناامیدی کا شکار ہونا چاہیے، نہ منافقین کا سا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، جو سختی اور خوف کے وقت پکار اٹھتے ہیں: ﴿ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ [ الأحزاب : ۱۲ ] ”اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے محض دھوکا دینے کے لیے وعدہ کیا تھا۔“ کفار کی دنیوی خوشحالی سے کفر کے حق ہونے پر استدلال نہیں کرنا چاہیے، یہ چند روزہ زندگی کا قلیل سا سامان اور عارضی بہار ہے، مرنے کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس کے مخاطب بظاہر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر مراد امت ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں مومنین کی جزا کا ذکر فرمایا، تاکہ مزید تشفی حاصل ہو اور یہ چونکہ کفار کے مقابلے میں بیان کی جا رہی ہے، اس لیے ” لٰكِنِ “ کا لفظ بطور استدراک ذکر فرمایا۔ (المنار)

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

اور بلاشبہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ یقیناً ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر بھی جو تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو ان کی طرف نازل کیا گیا، اللہ کے لیے عاجزی کرنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۹۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو اور مقابلے میں جمے رہو اور مورچوں میں ڈٹے رہو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۲۰۰﴾

**آیت 199** وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ...... : اس آیت میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اس گروہ کا ذکر ہے جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے تھے، ان کے ایمان اور ایمانی صفات کا ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے انھیں دوسرے اہل کتاب سے ممتاز فرما دیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، پہلی کتابوں اور قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں، اللہ کی آیات کے بدلے دنیاوی مفاد حاصل نہیں کرتے، ان کے لیے اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے، بلکہ دوہرا اجر ہے، جیسا کہ سورۂ حدید (۲۸) میں ہے۔ یہ صفات یہود میں بہت کم تھیں۔ علمائے یہود میں سے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے ان صفات کے حامل چند لوگ ہی تھے، جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ تھی، البتہ نصرانیوں میں سے بہت سے لوگوں نے ایمان قبول کیا، جن میں حبشہ کے بادشاہ اصحمہ نجاشی بھی شامل تھے، ان کی موت کی خبر آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ان پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ [ بخاری، مناقب الأنصار، باب موت النجاشی : ۳۸۷۷، عن جابر رضی اللہ عنہ ]

**آیت 200** "اصْبِرُوْا" یعنی دین اسلام پر ثابت قدمی سے جمے رہو۔ "صَابِرُوْا" یہ باب مفاعلہ سے ہے جس میں مقابلہ کا معنی پایا جاتا ہے، یعنی کافروں کے مقابلے میں ان سے بڑھ کر پامردی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو۔ "وَرَابِطُوْا" یعنی دشمنوں سے جہاد کے مورچوں پر ڈٹے رہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں ایک دن (سرحدوں پر) پہرا دینا دنیا اور دنیا میں جو کچھ موجود ہے، اس سب سے بہتر ہے۔'' [ بخاری، الجهاد والسیر، باب فضل رباط یوم فی سبیل الله : ۲۸۹۲، عن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ ] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں ایک دن اور ایک رات کا پہرا دینا ایک مہینے کے قیام اور صیام سے بہتر ہے اور اگر اس حالت میں مجاہد فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کیا کرتا تھا اور اس کے مطابق اس کا رزق بھی جاری رہے گا، نیز وہ آزمائش سے بھی محفوظ رہے گا۔'' [ مسلم، الإمارة، باب فضل الرباط فی سبیل الله عز و جل : ۱۹۱۳، عن سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ ]

سورۃ النساء ۴ مدنیۃ ۹۲ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — اٰیاتھا ۱۷۶ رکوعاتھا ۲۴

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتوں سے بھی، بے شک اللہ ہمیشہ تم پر پورا نگہبان ہے ①

احادیث میں سختی اور تکلیف کے اوقات میں پوری طرح وضو کرنے، مسجد کی طرف چل کر آنے اور پھر ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کو بھی آپ ﷺ نے "رِبَاطٌ" فرمایا ہے۔ [ مسلم، الطهارة، باب فضل إسباغ الوضوء على المكاره : ۲۵۱ ] ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مقام پر اللہ کی راہ میں مورچہ بند ہونے اور پہرا دینے کی بہت سی احادیث جمع فرمائی ہیں۔ [ فَجَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرًا ]

## سورة النساء

سورۂ نساء مدنی ہے، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء ایسے زمانے میں نازل ہوئیں جب میں (رخصتی کے بعد) رسول اللہ ﷺ کے گھر آ چکی تھی۔ [ بخاری، فضائل القرآن، باب تأليف القرآن : ۴۹۹۳ ] اس سورت میں عورتوں سے متعلقہ مسائل کی وجہ سے اس کا نام سورۂ نساء ہے۔

**آیت 1** ① خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ: یعنی پوری نوع انسانی آدم علیہ السلام کی نسل سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(قیامت کے دن) لوگ آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے، اے آدم! آپ انسانوں کے باپ ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔" [ بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ و لقد أرسلنا ...... ﴾ : ۳۳۴۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ایک جان سے پیدا کرنے سے یہ توجہ دلانا بھی مقصود ہے کہ تم تمام انسان ایک شخص کی اولاد ہو، کوئی اور رشتہ داری نہ ہو تو یہ رشتہ داری کیا کم ہے، اس کا خیال ہی رکھو اور اپنے کمزوروں کی مدد کرتے رہو۔

② وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر کا ہوتا ہے، سو اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ بیٹھو گے اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو اس طرح فائدہ اٹھاؤ گے کہ اس میں برابر ٹیڑھا پن ہو گا۔" [ بخاری، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم و ذريته : ۳۳۳۱، ۵۱۸۴، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور گندی چیز کو اچھی چیز کے عوض بدل کر نہ لو اور نہ ان کے اموال اپنے مالوں سے ملا کر کھاؤ، یقیناً یہ ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے ۝۲

بعض روایات میں ہے: (( وَ كَسْرُهَا طَلَاقُهَا )) ”اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے۔“ [ مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء : ۵۹/۷۱۵، بعد ح : ۱۴۶۶۔ بخاری : ۵۱۸۴ ]

قرآن کی آیت سے معلوم ہوا کہ حواء علیہا السلام آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئیں۔ حدیث سے ثابت ہوا کہ پسلی سے پیدا ہوئیں، اس کی کیفیت رسول اللہ ﷺ نے بیان نہیں کی۔ بعض لوگ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ عورت میں کچھ ٹیڑھا پن رہتا ہی ہے، اس لیے اسے پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر قرآن کے صریح الفاظ کہ آدم سے اس کی بیوی کو پیدا کیا، ان کے ساتھ حدیث ملائیں تو اس کا پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہاں، اس کی کجی بھی اپنی جگہ درست ہے۔

3 تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ : یعنی جس اللہ کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اس اللہ سے ڈرو۔ ”وَ الْاَرْحَامَ“ اس کا عطف لفظ ”اللّٰهَ“ پر ہے، یعنی ”وَاتَّقُوا الْأَرْحَامَ“ کہ قطع رحمی اور رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی سے بچو۔ ”الْاَرْحَامَ“ کو میم کے کسرہ سے پڑھنا غلط ہے اور قواعد نحویہ کی رو سے بھی ٹھیک نہیں، ہاں معنی کے اعتبار سے صحیح ہے، یعنی جس رشتہ داری کے نام پر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ ( قرطبی ) شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام علمائے شریعت ولغت کا اتفاق ہے کہ ” الْاَرْحَامَ“ سے محرم اور غیر محرم تمام رشتے مراد ہیں۔ قرآن و حدیث میں قطع رحمی کی بہت مذمت آئی ہے۔ دیکھیے سورۂ محمد (۲۲، ۲۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رشتے داری کو توڑنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔“ [ بخاری، الأدب، باب إثم القاطع : ۵۹۸۴، عن جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ] اور فرمایا: ”جو شخص چاہے کہ اس کے رزق میں فراخی ہو اور اس کے نشانِ ( قدم ) دیر تک رکھے جائیں وہ اپنی رشتے داری کو ملائے۔“ [ بخاری، الأدب، باب فضل صلة الرحم...... : ۵۹۸۳، عن أبی أیوب الأنصاری رضی اللہ عنہ ]

4 رَقِيْبًا : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، سو اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔“ [ بخاری، الإیمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ : ۵۰۔ مسلم : ۸، عن أبی هريرة و عمر رضی اللہ عنہما ]

آیت 2 وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ ...... : یعنی جب یتیم بالغ ہو جائیں تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دو اور یہ نہ کرو کہ یتیم کے مال سے اچھی چیز (طیب) لے کر اس کی جگہ ردی چیز (خبیث) رکھ دو۔ طیب اور خبیث حلال اور حرام کے معنی میں بھی آتے ہیں، اس لیے بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ اپنا حلال مال چھوڑ کر دوسرے کا مال مت کھاؤ جو تمھارے لیے حرام ہے۔“ آیت میں ” اِلٰۤى“ بمعنی ” مَعَ“ ہے، یعنی ان کے اموال کو ناجائز طریقے سے کھانے کے لیے اپنے مالوں کے ساتھ مت ملاؤ،

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۳

اور اگر تم ڈرو کہ یتیموں کے حق میں انصاف نہیں کرو گے تو (اور) عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو، دو دو سے اور تین تین سے اور چار چار سے، پھر اگر تم ڈرو کہ عدل نہیں کرو گے تو ایک بیوی سے، یا جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں (یعنی لونڈیاں)۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو ۳

ایسا کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ ہاں، اصلاح کی نیت سے ملانا جائز ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۲۰)۔

**آیت 3** ① **وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا ......** : اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''بعض یتیم لڑکیاں کچھ لوگوں کی پرورش میں ہوتیں، وہ ان لڑکیوں کے مال اور جمال کی وجہ سے ان سے نکاح کر لیتے، لیکن انھیں اپنے گھر کی لڑکیاں سمجھ کر پرائے گھر کی لڑکیوں جیسا نہ تو مہر دیتے اور نہ ان کے دوسرے حقوق ویسے ادا کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انھیں ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ اگر تم یتیم لڑکیوں سے ان کے مہر اور نفقات میں انصاف نہیں کر سکتے تو ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے، جو تمھیں پسند ہوں، نکاح کرلو۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و إن خفتم ألا تقسطوا فى اليتمى ﴾ : ٤٥٧٤ ]

② **مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ** : اس آیت سے دلیل لیتے ہوئے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور علماء نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے لیے بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں اپنے حرم میں رکھنا جائز نہیں، یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنت سے بصراحت یہ مسئلہ ثابت ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شافعی رحمہ اللہ نے جو فرمایا اس پر علماء کا اجماع ہے۔ غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں سے چار کا انتخاب کر لو۔'' [ أحمد : ۱٤/۲، ح : ٤٦٣٠۔ ابن ماجه، النكاح، باب الرجل يسلم و عنده ...... : ۱۹٥۳، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما و قال الألبانى صحيح ] مزید صحابہ کے واقعات ابن کثیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''رافضی (شیعہ) اور بعض دوسرے لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ شادیاں چار سے زائد بھی جائز ہیں، مگر یہ لغت اور سنت سے جہالت کا نتیجہ ہے۔''

③ **فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا ......** : اس سے بعض لوگوں نے ایک سے زیادہ شادیوں کے ناجائز ہونے پر استدلال کیا ہے کہ اگر تمھیں خوف ہو کہ عدل نہیں کرو گے تو ایک بیوی پر اکتفا کرو یا لونڈی پر۔ اس کے ساتھ وہ دوسری آیت بھی ملاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ﴾ [ النساء : ۱۲۹ ] ''اور تم ہرگز نہ کر سکو گے کہ عورتوں کے درمیان برابری (عدل) کرو، خواہ تم حرص بھی کرو۔'' خلاصہ دونوں کا یہ نکالا کہ جب عدل ہو ہی نہیں سکتا تو مرد ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ ان حضرات نے وہی کام کیا ہے جو ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ ﴾ والے حضرات کرتے ہیں کہ آگے ﴿ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ [ النساء : ٤٣ ] پڑھتے ہی نہیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا پورا فرمان یوں ہے: ''اور تم ہرگز نہ کر

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا ۝۴ وَ لَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَكُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ قِیٰمًا وَّ ارۡزُقُوۡهُمۡ فِیۡهَا وَ اكۡسُوۡهُمۡ وَ قُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۝۵

اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو، پھر اگر وہ اس میں سے کوئی چیز تمھارے لیے چھوڑنے پر دل سے خوش ہو جائیں تو اسے کھالو، اس حال میں کہ مزے دار، خوشگوار ہے۝۴ اور بے سمجھوں کو اپنے مال نہ دو، جو اللہ نے تمھارے قائم رہنے کا ذریعہ بنائے ہیں اور انھیں ان میں سے کھانے کے لیے دو اور انھیں پہننے کے لیے دو اور ان سے اچھی بات کہو۝۵

سکو گے کہ عورتوں کے درمیان برابری کرو، خواہ تم حرص بھی کرو، پس مت جھک جاؤ (ایک کی طرف) مکمل جھک جانا کہ اس (دوسری) کو لٹکائی ہوئی کی طرح چھوڑ دو، اور اگر تم اصلاح کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، بے حد مہربان ہے۔'' [ النساء : ۱۲۹ ] معلوم ہوا وہ عدل جو انسان کر ہی نہیں سکتا، یعنی دلی میلان، وہ واجب ہی نہیں۔ زیادہ بیویاں ہمارے نبی اور اصحاب کی سنت ہے۔

4 ذٰلِكَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا: یعنی اگر کسی کو خوف ہے کہ وہ اتنا عدل بھی نہیں کر سکتا جتنا واجب ہے کہ رات رہنے اور نان ونفقہ میں بھی برابری نہیں کر سکتا، کیونکہ دلی محبت اور میلان وصحبت میں تو برابری ممکن ہی نہیں، تو ایک بیوی رکھے یا لونڈیاں، یہ زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''یہ زیادہ قریب ہے کہ تمھارے عیال زیادہ نہ ہو جائیں اور تم فقیر نہ ہو جاؤ'' اور پھر اس پر برتھ کنٹرول کی بنیاد رکھ دی ہے کہ بچے کم پیدا کرو۔ حالانکہ بچے تو لونڈیوں سے بھی پیدا ہوتے ہیں اور لونڈیوں کی تعداد بھی مقرر نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے زیادہ بچے پیدا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ''ان عورتوں سے نکاح کرو جو بہت بچے جننے والی اور بہت محبت کرنے والی ہوں، کیونکہ میں (قیامت کے دن) تمھاری کثرت پر فخر کروں گا۔''

[أبو داؤد، النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء : ۲۰۵۰، عن معقل بن يسار رضي الله عنه قال الألباني حسن صحيح ]

پھر ''اَلَّا تَعُوۡلُوۡا'' کا معنی خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: ''یہ زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، انصاف سے نہ ہٹو۔''

[ ابن حبان : ۴۰۲۹، عن عائشة رضي الله عنها، و صححه الألباني، الصحيحة : ۳۲۲۲ ]

آیت 4 جاہلیت میں عورتوں کا مہر لوگ خود لے لیتے اور انھیں کچھ بھی نہیں دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی سے دو، پھر اگر کوئی عورت خوش دلی سے مہر کا کچھ حصہ یا سارا شوہر کو دے دے تو وہ خاوند کے لیے جائز ہے اور خوش دلی سے کھا سکتا ہے، لیکن اگر عورت شوہر کی بداخلاقی یا برے برتاؤ کی وجہ سے معاف کرے اور شوہر قبول کرے تو یہ اس آیت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر دھوکا دے کر مہر معاف کروالے، پھر طلاق دے دے تو وہ بھی جائز نہیں ہوگا، بلکہ مہر دینا پڑے گا، کیونکہ وہ خوش دلی کے خلاف ہے۔

آیت 5 یہاں بے سمجھوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مال کے انتظام کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ اس میں چھوٹے بچے اور

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝

اور یتیموں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان سے کچھ سمجھداری معلوم کرو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو اور فضول خرچی کرتے ہوئے اور اس سے جلدی کرتے ہوئے انھیں مت کھاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ اور جو غنی ہو تو وہ بہت بچے اور جو محتاج ہو تو وہ جانے پہچانے طریقے سے کھالے، پھر جب ان کے مال ان کے سپرد کرو تو ان پر گواہ بنا لو اور اللہ پورا حساب لینے والا کافی ہے۔ ۝

ناتجربہ کار بیوی بھی آ جاتی ہے اور نادان یتیم بھی، یعنی اگر یتیم ناتجربہ کار اور کم عقل ہوں تو وصی یا متولی کو چاہیے کہ یتیم کے مال سے اس کے کھانے پینے اور لباس کا انتظام کرتا رہے، مگر وہ مال اس کے سپرد نہ کرے۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ تین آدمی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، ایک وہ آدمی جس کی بیوی بد خلق تھی پھر اس نے اسے طلاق نہیں دی اور ایک وہ آدمی جس کا کسی شخص کے ذمے مال تھا مگر اس نے اس پر کوئی گواہ نہیں بنایا اور ایک وہ آدمی جس نے کسی سفیہ (بے وقوف) کو اپنا مال دے دیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تم بے وقوفوں کو اپنے مال مت دو۔'' [ صحیح الجامع : ۳۰۷۵ ] اس آیت سے علماء نے سفیہ (کم عقل) پر ''حجر'' (پابندی) کا حکم اخذ کیا ہے کہ حاکم وقت اس کے لین دین پر پابندی لگا سکتا ہے۔ (قرطبی)

**آیت 6** ① **وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى** ...... : بلوغت کے لیے مرد کی علامت احتلام اور عورت کی حیض ہے، علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے (بلوغت کے سلسلے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یہ یاد رکھا ہے کہ احتلام کے بعد یتیمی نہیں اور دن سے لے کر رات تک خاموشی نہیں۔'' [ أبو داوٗد، الوصایا، باب ما جاء متی ینقطع الیتم : ۲۸۷۳، و قال الألبانی صحیح ]

عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''قریظہ کے دن ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو جس کے (زیر ناف) بال اگے تھے اسے قتل کر دیا گیا اور جس کے بال نہیں اگے تھے اسے قتل نہیں کیا گیا، میں ان میں سے تھا جن کے بال ابھی نہیں اگے تھے، لہٰذا مجھے چھوڑ دیا گیا۔'' [ أبو داوٗد، الحدود، باب فی الغلام یصیب الحد : ۴۴۰۴، و قال الألبانی صحیح ]

جنگ میں شرکت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو چودہ سال کی عمر میں احد میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ خندق میں جائزہ لیا گیا تو پندرہ سال کے تھے، آپ نے اجازت دے دی۔ نافع نے عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کو یہ حدیث پہنچائی تو انھوں نے کہا: ''بچے اور بڑے کا یہی فرق ہے۔'' [ بخاری، الشهادات، باب بلوغ الصبیان ...... : ۲۶۶۴ ] مگر ظاہر ہے کہ یہ فرق بچے اور اس بڑے کا ہے جسے جنگ میں شرکت کی اجازت ہے۔ محض بلوغت کی علامت احتلام ہے، اگر اس کا علم نہ ہو سکے تو زیر ناف بال اگنا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۷﴾ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾

مردوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی اس میں سے ایک حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اس میں سے جو اس (مال) سے تھوڑا ہو یا بہت، اس حال میں کہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے ⑦ اور جب تقسیم کے وقت قرابت والے اور یتیم اور مسکین حاضر ہوں تو انھیں اس میں سے کچھ دو اور ان سے اچھی بات کہو ⑧

❷ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا: یعنی یتیموں کا امتحان اور ان کی تربیت کرتے رہو، جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پہلے تھوڑا سا مال دے کر ان کو کسی کام پر لگا کر دیکھو کہ آیا وہ مال کو بڑھاتے ہیں یا نہیں، پھر جب وہ بالغ ہو جائیں اور ان میں رشد ہو تو بلاتوقف مال ان کے حوالے کر دو۔ " رُشْدًا " سے مراد عقلی اور دینی صلاحیت ہے، پس بالغ ہونے کے علاوہ مال کی سپرد داری کے لیے رشد بھی شرط ہے، اگر کسی شخص میں رشد نہیں ہے تو خواہ وہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو جائے متولی یا وصی کو چاہیے کہ وہ مال اس کے حوالے نہ کرے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

❸ "فَلْيَسْتَعْفِفْ" "عَفَّ يَعِفُّ (ض)" کا معنی بچنا ہے، "فَلْيَسْتَعْفِفْ" کا باب استفعال میں حروف کی زیادتی کی وجہ سے ترجمہ "بہت بچے" کیا گیا ہے۔

❹ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا ...... : جانا پہچانا طریقہ یہی ہے کہ اس کے اموال کی نگرانی کی اجرت جو معروف ہے، لے لے۔ دوسرا یہ کہ زیادہ سے زیادہ اتنا لے لے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔

❺ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ : یتیم کے متولی یا وصی کو حکم ہے کہ گواہوں کے رو برو مال واپس کرے، تاکہ کل کو اس پر کوئی الزام نہ آئے۔ "وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا" کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو تو مطمئن کر لو گے، مگر اصل حساب تو اللہ تعالیٰ نے لینا ہے، اس کا خاص خیال رکھو۔

آیت 7 لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ ...... : اس آیت میں ایک اصولی حکم دیا ہے کہ ماں باپ اور رشتے داروں کی چھوڑی ہوئی جائداد میں، چاہے وہ کسی نوعیت کی ہو، جس طرح مردوں کا حق ہے اسی طرح عورتوں اور چھوٹے بچوں، حتیٰ کہ جنین کا بھی حق ہے۔ اس سے عرب کے جاہلی دستور کی تردید مقصود ہے۔ جس کے مطابق عورتوں اور بچوں کو میت کے متروکہ مال اور جائداد سے محروم کر دیا جاتا اور صرف بالغ لڑکے ہی جائداد پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس آیت کی شان نزول اور مردوں اور عورتوں کے حصوں کی تعیین بعد کی آیات میں آ رہی ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 8 یعنی وارثوں کو چاہیے کہ متروکہ مال میں سے کچھ حصہ بطور صدقہ و خیرات ان رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں کو

وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰ ع ۱۲

اور لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اپنے پیچھے اگر کمزور اولاد چھوڑتے تو ان کے متعلق ڈرتے، پس لازم ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں ۹ بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے ۱۰

---

بھی دیں جو خاندان میں موجود ہوں اور تقسیم کے وقت موقع پر پہنچ جائیں اور اگر وہ لوگ زیادہ حرص کریں تو ''ان سے اچھی بات کہو'' یعنی معذرت کرو کہ یہ وارثوں کا مال ہے، تمھارا حق نہیں ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ یہ حکم ''فرائض'' یعنی وارثوں کے حصے مقرر ہونے سے پہلے تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے، اس لیے اب یہ بخشش نہیں ہے، اب صدقہ وخیرات میت کی وصیت ہی سے ہو سکتا ہے، لیکن بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں اور وارثوں کو حکم ہے کہ تقسیم ترکہ کے وقت ان رشتہ داروں سے صلہ رحمی کریں جن کا میراث میں حصہ نہیں جب وہ تقسیم کے وقت آ جائیں۔ [ بخاری، التفسیر، باب قول الله عزوجل : ﴿ و إذا حضر القسمة ...... ﴾ ۲۷۵۹ ]

**آیت 9** وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا ...... : یہ حکم میت کی وصیت سن کر نافذ کرنے والوں کو ہے اور ان لوگوں کو بھی جو یتیموں کے سرپرست اور وصی مقرر ہوں۔ ان سب کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے میت کی اولاد اور یتیموں کے مفاد کا اسی طرح خیال رکھیں جس طرح وہ چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی چھوٹی اور بے بس اولاد کے مفاد کا خیال رکھا جائے، لہٰذا انھیں یتیموں سے بہتر سلوک کرنا چاہیے اور ان کی عمدہ سے عمدہ تعلیم و تربیت کرنی چاہیے۔ یتیموں کے اولیاء سے اس آیت کا تعلق زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بعد میں یتامیٰ کی حق تلفی کرنے والوں کے متعلق جو وعید آ رہی ہے اولیاء کی اس کے ساتھ زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ ویسے عام مسلمانوں کو بھی یتیموں کے ساتھ خاص احسان اور سلوک کرنے کا حکم ہے۔

**آیت 10** اس آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت اور اس سے اجتناب کی مزید تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات تباہ کن چیزوں سے اجتناب کرو۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟'' فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو، اس جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ پھیرنا اور پاک دامن، بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا۔'' [ بخاری، الحدود، باب رمی المحصنات : ۶۸۵۷، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ]

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ‌ ۚ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ‌ ۚ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ‌ ۚ وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ‌ ؕ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ‌ ۚ

اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں تاکیدی حکم دیتا ہے، مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ہے، پھر اگر وہ دو سے زیادہ عورتیں (ہی) ہوں، تو ان کے لیے اس کا دو تہائی ہے جو اس نے چھوڑا اور اگر ایک عورت ہو تو اس کے لیے نصف ہے۔ اور اس کے ماں باپ کے لیے، ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے، جو اس نے چھوڑا، اگر اس کی کوئی اولاد ہو۔ پھر اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے، پھر اگر اس کے (ایک سے زیادہ) بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے، اس

آیت 11 ① يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ : اب یہاں سے وارثوں کے تفصیلی حصوں کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ دونوں آیات اور اس سورت کی آخری آیت علم وراثت میں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وراثت کے تفصیلی حصے ان تین آیات سے مستنبط ہیں اور وراثت کے حصوں سے متعلقہ احادیث بھی ان آیات ہی کی تفسیر ہیں۔ (ابن کثیر) ایک حدیث میں ہے کہ جب جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جابر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مال کے بارے میں دریافت کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ ﴾ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ یوصیکم الله فی أولادکم ﴾ : ۴۵۷۷ ] ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور ان کی بیٹیوں کے چچا نے سارا ورثہ سنبھال لیا۔ سعد رضی اللہ عنہ کی دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی بیوی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ورثے کا سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کے چچا کو پیغام بھیجا کہ سعد کی دو بیٹیوں کو دو تہائی اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو بچ جائے وہ تمھارے لیے ہے۔ [ أبو داؤد، الفرائض، باب ما جاء فی میراث الصلب : ۲۸۹۱۔ عن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما ترمذی : ۲۰۹۲۔ أحمد : ۳/ ۳۵۲، ح : ۱۴۸۱۰، و قال الألبانی حسن ]

② لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ : مطلب یہ ہے کہ جب اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں موجود ہوں تو لڑکے کو لڑکی سے دگنا ملے گا۔ اسے دو حصے دینے کی وجہ یہ ہے کہ مرد پر عورت کی نسبت معاشی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ (مہر ہی کو لے لیجیے کہ مرد دیتا ہے، عورت لیتی ہے، اسی طرح عورت کا نان و نفقہ بھی خاوند کے ذمے ہوتا ہے) اس بنا پر مرد کے لیے عورت سے دگنا حصہ دینا عین قرین انصاف ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

③ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ...... : دو سے زیادہ ہی کا نہیں دو عورتوں کا بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ اس آیت کے پہلے فائدے میں سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی دو بیٹیوں کو دو تہائی دینے کا ذکر ہوا ہے، پھر اس سورت کی آخری آیت میں جب دو بہنوں کو دو تہائی حصہ دیا گیا ہے تو دو بیٹیوں کو بدرجۂ اولیٰ دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ بیٹی بہن کے مقابلہ میں آدمی کے زیادہ قریب ہے، لہٰذا

فَإِنْ كَانَ لَهٗۤ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ أَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

وصیت کے بعد جو وہ کر جائے، یا قرض (کے بعد)۔ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے ان میں سے کون فائدہ پہنچانے میں تم سے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ حصے ہیں، بے شک اللہ ہمیشہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۱﴾

ہم کہہ سکتے ہیں کہ دو لڑکیوں کا دو تہائی حصہ قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے۔ (ابن کثیر)

④ اس حکم سے چند صورتیں مستثنیٰ ہیں: ① رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ )) [ بخاری، فرض الخمس، باب فرض الخمس: ۳۰۹۳ ] ''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔'' لہٰذا آپ ﷺ کی میراث تقسیم نہیں ہوئی۔ دیکھیے سورۂ مریم آیت (۶) کی تفسیر۔ ② جان بوجھ کر قتل کرنے والا اپنے مقتول کا وارث نہیں ہوگا۔ یہ حکم سنت سے ثابت ہے اور اس پر اجماع ہے۔ [ ابن ماجه، الفرائض، باب میراث القاتل: ۲۷۳۵ و قال الألبانی صحیح ] ③ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے۔'' [ بخاری، الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر...: ۶۷۶۴ ] لہٰذا کافر مسلمان کی وراثت سے محروم ہوگا بیٹا ہو یا بیٹی، باپ ہو یا ماں، بھائی ہو یا بہن، خاوند ہو یا بیوی، یا کوئی اور رشتہ دار، اسی طرح مسلمان کافر کی وراثت سے محروم ہوگا۔

⑤ **وَ إِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ** : اس سے بھی معلوم ہوا کہ جب ایک بیٹی کا نصف ہے تو دو یا دو سے زیادہ بیٹیوں کا دو تہائی ہونا چاہیے۔

⑥ **وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ......** : یعنی میت کی اولاد ہونے کی صورت میں ماں باپ دونوں میں سے ہر ایک کو کل ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا، مثلاً میت کی ایک بیٹی اور ماں باپ ہیں تو ترکہ کے چھ مساوی حصے کر لیے جائیں۔ بیٹی کو تین حصے (نصف) ماں کو ایک حصہ (سدس) باپ کو ایک حصہ (سدس) مقرر شدہ اور ایک حصہ (سدس) عصبہ ہونے کی وجہ سے ملے گا اور اگر میت کی دو یا زیادہ بیٹیاں ہیں تو ترکہ کے چھ حصوں میں سے چار حصے (دو ثلث) بیٹیوں کے اور ایک ایک حصہ (سدس) ماں باپ کا ہوگا اور اگر ماں باپ کے ساتھ لڑکے لڑکیاں دونوں ہیں تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے اس میں سے لڑکے کے دو حصے اور لڑکی کا ایک حصہ ہوگا۔

⑦ **فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ......** : یہ ماں باپ کی دوسری حالت ہے، یعنی اگر میت کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ زندہ ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملے گا اور بقیہ دو تہائی حصہ باپ کو مل جائے گا اور اگر ماں باپ کے ساتھ میت کے مرد ہونے کی صورت میں بیوی اور عورت ہونے کی صورت میں اس کا شوہر بھی زندہ ہو تو شوہر یا بیوی کا حصہ، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، پہلے نکالنے کے بعد باقی ماندہ سے ماں کو ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی ملے گا۔ والدین کی مذکورہ دونوں صورتیں قرآن مجید ہی سے واضح ہو رہی ہیں، کیونکہ پہلی صورت میں ساتھ یہ ہے ''**وَوَرِثَهٗۤ أَبَوٰهُ**'' یعنی اس کے وارث صرف ماں باپ ہوں، بیوی یا خاوند موجود ہونے کی صورت دوسری ہے۔ اس میں والدہ کو باقی کا ثلث اس لیے دیا جائے گا کہ عورت (ماں) کا حصہ، مرد

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ

اور تمھارے لیے اس کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑ جائیں، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمھارے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے، جو انھوں نے چھوڑا، اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائیں، یا قرض (کے بعد)۔ اور ان کے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے جو تم چھوڑ جاؤ، اگر تمھاری کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر تمھاری کوئی اولاد ہو تو ان کے لیے اس میں سے آٹھواں حصہ ہے جو تم نے چھوڑا، اس وصیت کے بعد جو تم کر جاؤ، یا قرض (کے بعد)

(باپ) کے نصف سے زیادہ نہ ہو جائے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہی قول فقہائے سبعہ، ائمہ اربعہ اور جمہور اہل علم کا ہے۔

⑧ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ ...... : یہ ماں باپ کی تیسری حالت کا بیان ہے، یعنی اگر میت کی کوئی اولاد نہ ہو، ماں باپ کے علاوہ بھائی بھی ہوں (خواہ ماں باپ دونوں سے یا صرف ماں سے یا صرف باپ سے) تو باپ کی موجودگی میں انھیں حصہ تو نہیں ملے گا، البتہ وہ ماں کا حصہ تہائی سے چھٹا کر دیں گے اور اگر ماں کے ساتھ سوائے باپ کے کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو بقیہ سارا ۵/۶ حصہ باپ کو مل جائے گا۔ یاد رہے کہ ''اِخْوَةٌ'' کا لفظ جمع ہے اور یہ جمہور علماء کے نزدیک دو کو بھی شامل ہے، لہٰذا اگر صرف ایک بھائی ہو تو وہ ماں کا تہائی سے چھٹا حصہ نہیں کر سکتا۔ (ابن کثیر)

⑨ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ ...... : میت کے مال میں سے اول کفن دفن پر صرف کیا جائے، پھر باقی ماندہ سے حسب مراتب قرض ادا کیا جائے، سب سے زیادہ ادا کیے جانے کا حق دار اللہ تعالیٰ کا قرض ہے، مثلاً اگر زکاۃ یا حج اس کے ذمے ہے تو وہ ادا کیا جائے، پھر دوسرے قرض ادا کیے جائیں، پھر مال کے تہائی حصے سے وصیت پوری کی جائے، اس کے بعد وارثوں کے درمیان باقی ترکے کے حصے کیے جائیں۔ (قرطبی) قرآن میں گو قرض کا ذکر وصیت کے بعد ہے، مگر سلف و خلف کا اس پر اجماع ہے کہ ادائے قرض وصیت پر مقدم ہے، لہٰذا پہلے قرض ادا کیا جائے، پھر وصیت کا نفاذ ہونا چاہیے۔ غور سے دیکھیں تو آیت کے معنی و مفہوم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں وصیت کو قرض سے پہلے ذکر کرنے کی اہل علم نے کئی حکمتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ عام طور پر وصیت پر عمل میں کوتاہی کی جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاکید کے لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔

⑩ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے علیم و حکیم ہے، اس نے خود میراث کا یہ قانون اس لیے مقرر فرمایا کہ تم اپنے نفع و نقصان کو نہیں سمجھتے، اگر تم اپنے اجتہاد سے ورثہ تقسیم کرتے تو حصوں کا ضبط میں لانا مشکل تھا۔ (قرطبی، ابن کثیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی ان حصوں میں عقل کا دخل نہیں، اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں، وہ سب سے دانا ہے۔'' (موضح)

آیت 12 ① وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ ...... : اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تمھاری بیویاں مال چھوڑ کر مریں اور ان کی کوئی اولاد نہ ہو تو تمھیں آدھا مال ملے گا اور اگر ان کی اولاد ہے، ایک یا زائد بیٹے بیٹیاں یا

وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ﴿۱۲﴾

اور اگر کوئی مرد، جس کا ورثہ لیا جا رہا ہے، ایسا ہے جس کا نہ باپ ہو نہ اولاد، یا ایسی عورت ہے اور اس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے، پھر اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں حصے دار ہیں، اس وصیت کے بعد جو کی جائے، یا قرض (کے بعد)، اس طرح کہ کسی کا نقصان نہ کیا گیا ہو۔ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۱۲﴾

پوتے یا پڑپوتے، خواہ تم سے یا کسی اور خاوند سے تو تمھیں چوتھا حصہ ملے گا اور اگر تمھاری اولاد نہ ہو تو تمھاری بیویوں کو چوتھا حصہ ملے گا اور تمھارے فوت ہونے کی صورت میں اگر تمھاری اولاد یا اولاد کی اولاد ہے، پھر وہ خواہ ان بیویوں سے ہے یا کسی اور سے، بہرحال بیویوں کو آٹھواں حصہ ملے گا، قرض اور وصیت کی ادائیگی کے بعد، پھر بیوی ایک ہو یا زیادہ سب چوتھائی یا آٹھویں حصے میں شریک ہوں گی، اس پر اجماع ہے۔

② يُوْرَثُ كَلٰلَةً: اگر کوئی مرد یا عورت مر جائے، اس کا نہ والد ہو نہ اولاد تو اسے ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ بعض ایسی میت کے وارثوں کو ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ بہرحال دونوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

③ وَلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ: بھائی بہن تین طرح کے ہوتے ہیں: ① عینی یعنی جن کے ماں باپ ایک ہوں۔ ② علاتی، یعنی جن کا باپ ایک ہو، مائیں مختلف ہوں۔ ③ اخیافی، جن کی ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں۔ یہاں بالاتفاق اخیافی بھائی بہن مراد ہیں، جیسا کہ ایک قراءت میں بھی ہے۔

④ اخیافی بھائی چار احکام میں دوسرے وارثوں سے مختلف ہیں: ① یہ صرف ماں کی جہت سے ورثہ لیتے ہیں۔ ② ان میں سے مرد اور عورت کو مساوی حصہ دیا جاتا ہے۔ ③ ان کو صرف میت کے کلالہ ہونے کی صورت میں حصہ ملتا ہے۔ ④ خواہ کتنے ہی ہوں ان کا حصہ ثلث سے زیادہ نہیں ہوتا، مثلاً ایک میت کا شوہر، ماں، دو اخیافی اور دو عینی بھائی موجود ہوں تو جمہور اہل علم کے نزدیک شوہر کو نصف (۱/۲) ملے گا، ماں کو سدس (۱/۶) ملے گا اور بقیہ تہائی حصے میں اخیافی بھائیوں کے ساتھ عینی بھائی بھی شریک ہوں گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمہ میں یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ صحابہ میں سے عثمان، ابن مسعود، ابن عباس اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور ائمہ میں سے امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے، البتہ علی رضی اللہ عنہ اخیافی بھائیوں کو دیگر سگے بھائیوں کے عصبہ ہونے کی وجہ سے محروم قرار دیتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس دوسرے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ (ابن کثیر، فتح القدیر)

⑤ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ: اخیافی بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو مرد ہو یا عورتیں، یا مرد اور عورتیں ملے ہوئے ہوں، سب میں تیسرا حصہ برابر تقسیم کر دیا جائے گا، یعنی یہاں مرد کو عورت پر فضیلت نہیں ہوگی، جیسا کہ آیت میں ''شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ''

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَ الّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ

یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے (۱۳) اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے وہ اسے آگ میں داخل کرے گا، ہمیشہ اس میں رہنے والا ہے اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے (۱۴) اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں ان پر اپنے میں سے چار

---

سے معلوم ہوتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا اور ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ محض اجتہاد سے نہیں کیا جا سکتا۔ (ابن کثیر)

(6) غَيْرَ مُضَآرٍّ: یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس کا تعلق وصیت اور قرض دونوں سے ہے۔ وصیت میں نقصان پہنچانا ایک تو یہ ہے کہ تہائی مال سے زیادہ وصیت کرے، اس صورت میں تہائی سے زائد وصیت کا نفاذ نہیں ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی وارث کو مزید رعایت سے زائد مال دلوایا جائے، اس کا بھی اعتبار نہیں ہوگا، الا یہ کہ تمام وارث برضا و رغبت اسے قبول کر لیں۔ قرض میں نقصان پہنچانا یہ ہے کہ محض وارثوں کا حق تلف کرنے کے لیے مرنے والا اپنے ذمے کسی ایسے قرض کا اقرار کرے جو حقیقت میں اس کے ذمے نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''وصیت میں نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔''
[السنن الکبریٰ للنسائی: ۶۰/۱۰، ح: ۱۱۰۲۶، و سندہ صحیح]

آیت 14،13 تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ...... : اللہ تعالیٰ نے وراثت کو حدود اللہ قرار دیا اور اس حکم کی اطاعت پر جنت اور فوز عظیم کا وعدہ فرمایا ہے اور نافرمانی اور حدود اللہ کی پامالی کی صورت میں ہمیشہ کی آگ اور عذاب مہین کی سزا سنائی ہے۔ افسوس کہ بڑے بڑے بظاہر متقی لوگ بھی بہنوں کو ان کا حصہ نہیں دیتے، اکثر لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جائداد بیٹوں کو دے دیں اور بیٹیوں کو محروم کر دیں۔ اسی طرح اگر کوئی وارث کمزور ہو تو اسے بھی وراثت سے حصہ نہیں دیتے، ان سب کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اس کے رسوا کن عذاب اور ہمیشہ کی آگ سے ڈرنا چاہیے۔

آیت 16،15 (1) وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ ...... : اوپر کی آیات میں عورتوں کے ساتھ احسان اور ان کے مہر ادا کرنے اور مردوں کے ساتھ ان کو وراثت میں شریک قرار دے کر ان کے حقوق کی حفاظت کا بیان تھا، اب یہاں سے عورتوں کی تادیب اور ان پر سختی کا بیان ہے، تاکہ عورت اپنے آپ کو بالکل ہی آزاد نہ سمجھے۔ (قرطبی) پہلی آیت میں زنا کار عورتوں کی سزا بیان کی کہ زنا شہادت سے ثابت ہو جائے تو انھیں تاعمر گھر میں محبوس رکھا جائے، یہاں تک کہ وہ مر جائیں، یا اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کوئی دوسری سزا نازل فرما دے۔ اسلام میں زنا کار عورتوں کے لیے یہ پہلی سزا ہے جو بعد میں حد زنا نازل ہونے سے منسوخ ہوگئی۔ سورۂ نور میں جو سو کوڑوں کی سزا نازل ہوئی ہے، یہاں ''سَبِيْلًا'' سے اسی طرف اشارہ ہے۔ دوسری

فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝۱۵ وَ الَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۱۶

مرد گواہ طلب کرو، پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو انھیں گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ بنا دے ⑮ اور وہ دونوں جو تم میں سے اس کا ارتکاب کریں سو ان دونوں کو ایذا دو، پھر اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے خیال ہٹا لو، بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے ⑯

آیت میں زانی مرد اور زنا کار عورت کے متعلق یہ حکم دیا گیا کہ ان کو اذیت دی جائے اور ذلیل کیا جائے، حتیٰ کہ تائب ہو جائیں، یہ سزا پہلی سزا کے ساتھ ہی ہے، بعد میں یہ دونوں سزائیں منسوخ ہو گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے (احکام دین) لو، اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لیے سبیل پیدا فرما دی ہے کہ کنوارا کنواری کے ساتھ (زنا کرے) تو اس کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی اور شادی شدہ شادی شدہ کے ساتھ (زنا کرے) تو ان کے لیے سو کوڑے اور سنگسار ہے۔'' [ مسلم، الحدود، باب حد الزنی : ۱۶۹۰، عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ ] مزید دیکھیے سورۂ نور (۲)۔ (ابن کثیر، قرطبی)

② اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ : چونکہ زنا کی سزا انہایت سخت ہے، اس لیے اس پر گواہی بھی زیادہ مضبوط رکھی۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جو چیز شمار کی جا رہی ہے، وہ مذکر ہو تو عدد مؤنث ہوتا ہے، اس لیے " اَرْبَعَةً " کی وجہ سے ترجمہ ''چار مرد'' کیا ہے۔

③ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا ...... : بعض علماء نے اس سے مراد قوم لوط کا عمل کرنے والے دو مرد لیے ہیں، اگرچہ " وَالَّذٰنِ " کے لفظ میں، جو تثنیہ مذکر کے لیے آتا ہے، اس کی گنجائش ہے، مگر یہ مطلب نہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، نہ کسی صحابی سے، بلکہ طبری اور ابن ابی حاتم نے اپنی حسن سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ سے، انھوں نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ عورت جب زنا کرتی تو گھر میں بیٹھی رہتی یہاں تک کہ فوت ہو جاتی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ﴾ کے متعلق فرمایا کہ مرد جب زنا کرتا تو اسے تعزیر اور جوتے مارنے کے ساتھ ایذا دی جاتی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ [ النور : ۲ ] یعنی زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کو سو سو کوڑے مارو۔ پھر اگر وہ شادی شدہ ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق انھیں رجم کر دیا جائے گا۔ یہ ہے وہ ''سبیل'' جو اللہ نے فرمایا: ﴿ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴾ (یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ بنا دے) اسی طرح طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد سے نقل کیا ہے کہ ﴿ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ ﴾ سے مراد زنا کرنے والے مرد و عورت ہیں۔ علاوہ ازیں " يَاْتِيٰنِهَا " میں "ھا" کی ضمیر پچھلی آیت میں مذکور '' الْفَاحِشَةَ '' کی طرف جا رہی ہے جس سے اس مقام پر مراد زنا ہے۔ اس فاحشہ سے مراد قوم لوط کا عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا " الَّذٰنِ " تثنیہ مذکر کا لفظ تو دو افراد اگر

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

توبہ (جس کا قبول کرنا) اللہ کے ذمے (ہے) صرف ان لوگوں کی ہے جو جہالت سے برائی کرتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، تو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ پھر مہربان ہو جاتا ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے﴿۱۷﴾ اور توبہ ان لوگوں کی نہیں جو برے کام کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے بے شک میں نے اب توبہ کر لی اور نہ ان کی ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہوتے ہیں، یہ لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے﴿۱۸﴾

---

مذکر و مؤنث ہوں تو ان کے لیے تثنیہ مذکر کی ضمیر عام استعمال ہوتی ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

آیت 17 ① اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ : یہاں ''عَلَى اللّٰهِ'' کے معنی یہ ہیں کہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمے لے لیا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم نہیں ہے۔ (قرطبی)

② "بِجَهَالَةٍ" یعنی اگر کبھی نادانی اور جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ کر بھی لیتے ہیں تو "مِنْ قَرِيْبٍ" یعنی جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو جہالت سے گناہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی جہالت سے گناہ نہ کرے بلکہ دیدہ و دانستہ علم رکھتے ہوئے گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہی نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں "بِجَهَالَةٍ" کی قید احتراز کے لیے نہیں ہے، بلکہ بیان واقعہ کے لیے ہے، یعنی ہر گناہ ہوتا ہی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ہے۔ گناہ کرنے والا اس کے انجام سے بے خبر ہو کر ہی گناہ کی جرأت کرتا ہے، اگر اس کا انجام پوری طرح اس کی آنکھوں کے سامنے ہو تو وہ کبھی گناہ کا ارتکاب نہ کر سکے۔ "مِنْ قَرِيْبٍ" کا مفہوم یہ ہے کہ موت کے آثار مشاہدہ کرنے سے پہلے پہلے تائب ہو جاتے ہیں۔ ان دو شرطوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

آیت 19 ① وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ ...... : یعنی ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ کو اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ موت کے وقت اس کی روح حلق تک نہ پہنچ جائے۔'' [ ترمذی، الدعوات، باب إن الله يقبل ...... : ۳۵۳۷، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما وقال الألباني حسن ] آخری وقت میں تو فرعون نے بھی توبہ کر لی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [ یونس : ۹۱ ] ''کیا اب؟ حالانکہ بے شک تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں سے تھا۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے لیے حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور نہ انھیں اس لیے روک رکھو کہ

② وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ: یعنی جو لوگ مرتے دم تک کفر و شرک میں مبتلا رہتے ہیں اور موت کے آثار دیکھ کر توبہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [ المؤمن : ۸۴، ۸۵ ] ''پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا ہم اس اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے ان کا انکار کیا جنھیں ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے تھے۔ پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور اس موقع پر کافر خسارے میں رہے۔'' نیز دیکھیے سورۂ انعام (۱۵۸)۔

آیت 19 ① لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا: زنا وغیرہ کے سلسلہ میں ضمناً توبہ کے احکام بیان فرمانے کے بعد اب یہاں سے پھر عورتوں کے حقوق کا بیان ہو رہا ہے اور اس سے مقصد عورتوں کو اس ظلم و زیادتی سے نجات دلانا ہے جو جاہلیت میں ان پر روا رکھی جاتی تھی۔ اس کے مخاطب یا تو شوہر کے اولیاء ہیں، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ اور دوسرے محدثین نے اس آیت کی شانِ نزول میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں میت کے اولیاء دوسری چیزوں کی طرح اس کی بیوی کے بھی مالک ہوتے تھے، ان میں سے اگر کوئی چاہتا تو خود اس سے شادی کر لیتا، یا کسی دوسرے سے شادی کر دیتے (اور مہر خود لے لیتے) اور اگر چاہتے تو عورت کو کلیتاً شادی ہی سے روک دیتے (حتیٰ کہ وہ مر جاتی اور اس کے مال کے وارث خود بن جاتے) عورت کے اولیاء کو اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہ ہوتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور عورت پر ان کے تسلط کو ختم کر دیا۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا يحل لكم ...... ﴾ : ۴۵۷۹ ] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے مخاطب شوہر ہوں، چنانچہ بعض علماء نے اس کی شان نزول میں لکھا ہے کہ وہ عورتوں کو طلاق نہ دیتے بلکہ تنگ کرتے رہتے، تاکہ اگر مر جائیں تو ان کے وارث بن جائیں اور اگر طلاق لینا چاہیں تو جو کچھ انھیں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پہلی صورت میں اس کا حاصل یہ ہے کہ خاوند کے مرنے کے بعد اسے نکاح سے روکنا جائز نہیں، بلکہ وہ جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے اور خاوند کے اولیاء اس طرح زبردستی اس کے وارث نہیں بن سکتے۔ دوسری صورت میں، یعنی جب شوہر مخاطب ہوں، تو خلاصہ یہ ہوگا کہ شوہر کے لیے جائز نہیں کہ عورت سے مہر واپس لینے کی غرض سے اسے تنگ کرتا رہے اور طلاق نہ دے، حتیٰ کہ وہ خلع پر مجبور ہو جائے۔ یہ دوسری صورت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور ابن عطیہ وغیرہ نے اسی کو پسند کیا ہے، اس لیے کہ آیت کے بقیہ حصے کا تعلق بلا شک و شبہ شوہروں ہی کے ساتھ ہے، کیونکہ واضح بے حیائی کے ارتکاب کی

اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ⑲

تم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو مگر اس صورت میں کہ وہ کھلم کھلا بے حیائی کا ارتکاب کریں اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو، پھر اگر تم انھیں ناپسند کرو تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھ دے ⑲

صورت میں خاوند ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے روک رکھے، تاکہ اسے مہر وغیرہ، جو کچھ دیا ہے، واپس لے کر طلاق دے، شوہر کے اولیاء کو یہ اختیار نہیں ہے۔ (فتح القدیر، قرطبی) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خطاب عام مسلمانوں سے ہو، جس میں شوہر، میت کے اولیاء اور دوسرے مسلمان سبھی آ جاتے ہوں۔ (فتح القدیر)

② اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ : ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے "بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ" سے مراد سرکشی اور نافرمانی لی ہے، مگر ابن جریر رحمہ اللہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اسے عام رکھا جائے اور یہ فحش کلامی، بدخلقی، ایذا رسانی، زنا اور اس قسم کے جملہ رذائل کو شامل ہو اور مطلب یہ ہوگا کہ اگر زیادتی عورت کی طرف سے ہو تو تم اسے خلع لینے پر مجبور کر سکتے ہو، تاکہ وہ لیا ہوا مال واپس کر دے۔

③ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ : یہ عورتوں سے متعلق تیسرا حکم ہے کہ ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي)) [ ابن ماجه، النكاح، باب حسن معاشرة النساء : ١٩٧٧، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ ترمذی : ٣٨٩٥۔ الصحيحة : ٢٨٥ ] "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے اور میں تم میں سے اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔"

④ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى...... : یہ بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہنے کی بات کی تکمیل ہے، یعنی اگر کسی اخلاقی کمزوری یا بدصورت ہونے کی وجہ سے تمھیں ان سے نفرت ہو جائے اور ان کو طلاق دینا چاہو تو بھی فوراً طلاق نہ دو، بلکہ بہتر طریقے سے انھیں اپنے پاس رکھو، ہوسکتا ہے کہ ان کی صحبت سے خیر کثیر، یعنی صالح اولاد حاصل ہو جائے یا مال میں برکت ہو جائے اور تمھاری نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی مومن اپنی مومنہ بیوی سے بغض نہ رکھے، اگر اسے اس کی کوئی ایک عادت ناپسند ہوگی تو دوسری پسند بھی ہوگی۔" [ مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء : ١٤٦٧، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر نفرت کے سبب تم ان سے علیحدگی اختیار کرنا چاہو تو ہوسکتا ہے کہ اس علیحدگی میں ان کے لیے خیر کثیر مضمر ہو، مثلاً ان کو بہتر خاوند مل جائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۰)۔

وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

اور اگر تم کسی بیوی کی جگہ اور بیوی بدل کر لانے کا ارادہ کرو اور تم ان میں سے کسی کو ایک خزانہ دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کر کے لو گے ﴿۲۰﴾ اور تم اسے کیسے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے صحبت کر چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں ﴿۲۱﴾

**آیت 21،20** ❶ **وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ** ...... : یہ عورتوں سے متعلق چوتھا حکم ہے۔ جب پہلی آیات میں بیان فرمایا کہ اگر صحیح طریقے سے ساتھ نہ رہنے کی وجہ عورت کی جانب سے ہو تو مہر واپس لینے کے لیے اسے تنگ کرنا جائز ہے، یہاں بتایا کہ جب زیادتی شوہر کی جانب سے ہو تو پھر عورت سے فدیۂ طلاق لینا ممنوع اور حرام ہے۔ یعنی بلاوجہ تنگ کر کے ان سے مہر واپس لو گے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بہتان باندھ کر مہر واپس لے رہا ہے اور اس صورت میں تم ان پر دوہرا ظلم کرو گے، ایک بلاوجہ تنگ کرنا اور دوسرا مہر واپس لینا، اس لیے اسے "**اِثْمًا مُّبِيْنًا**" فرمایا۔

❷ **وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا** : اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ مہر کی کوئی حد معین نہیں ہے، خاوند اپنی حیثیت کے مطابق جتنا مہر دینا چاہے دے سکتا ہے۔ اس مقام پر امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مہر زیادہ رکھنے سے منع کرنے پر ایک عورت کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس نے زیادہ مہر کے جواز کے لیے یہ آیت پڑھی تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمر سے ہر شخص زیادہ سمجھ دار ہے اور اس سے کئی دشمنان صحابہ عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کرتے ہیں۔ عورت کا واقعہ کسی صحیح سند سے ثابت نہیں، تفصیل کے لیے دیکھیں ارواء الغلیل (۱۹۲۷)۔

❸ **وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى** ...... : اس سے معلوم ہوا کہ جماع کے بعد دیا ہوا مہر واپس نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپ نے لعان کرنے والے مرد کے مہر واپس لینے کے مطالبے پر فرمایا تھا: ''اگر تم نے اپنی بیوی پر زنا کی بات سچ کہی ہے تو مہر اس کے عوض ہے جو تم نے اس کی شرم گاہ اپنے لیے حلال کی اور اگر اس پر جھوٹ کہا ہے تو پھر تو (مہر کی واپسی) زیادہ ہی بعید ہے۔''

[ بخاري، الطلاق، باب قول الإمام للمتلاعنين ...... : ۵۳۱۲۔ مسلم : ۵/۱۴۹۳، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ]

❹ **وَ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا** : ''پختہ عہد'' سے مراد عقد نکاح ہے، یعنی تمھارا یہ کہنا کہ میں نے فلاں عورت سے نکاح قبول کیا۔ اب طلاق کی صورت میں دو ہی راستے ہیں: ﴿ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ [ البقرۃ : ۲۲۹ ] اور ظاہر ہے کہ طلاق دے کر مہر نہ دینا ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ

اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں، مگر جو پہلے گزر چکا، بے شک یہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی اور سخت غصے کی بات ہے اور برا راستہ ہے ﴿۲۲﴾ حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں اور تمھاری بیویوں کی مائیں اور تمھاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمھاری

---

آیت 22 وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ ...... : جاہلیت کے دستور میں بیٹے کے لیے اپنے باپ کی منکوحہ (سوتیلی ماں) سے شادی کر لینا جائز تھا، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اہل جاہلیت ان رشتوں کو حرام سمجھتے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا، سوائے باپ کی بیوی اور دو بہنوں کو جمع کرنے کے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ [النساء: ۲۲] اور ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ [النساء: ۲۳]'' [ابن جریر: ۳۶۹/۴، صحیح] اللہ تعالیٰ نے اسے سخت حرام قرار دیا، حتیٰ کہ اگر باپ نے صرف عقد ہی کیا ہو تو بھی بیٹے کا اس سے نکاح حرام ہے۔ یہ سخت بے حیائی اور اللہ کی سخت ناراضگی کا باعث اور برا راستہ ہے کہ آج تم نے اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح کیا ہے، کل تمھاری منکوحہ سے تمھارا بیٹا نکاح کرے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ ہی بند کر دیا۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ اپنے ماموں ابو بردہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی طرف بھیجا جس نے اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا کہ اسے قتل کر دیں اور اس کا مال لے لیں۔ [أبو داوٗد، الحدود، باب في الرجل یزني بحریمه: ۴۴۵۷۔ ترمذی: ۱۳۶۲۔ نسائی: ۳۳۳۴۔ ابن ماجه: ۲۶۰۷، و قال الألبانی صحیح] معلوم ہوا ایسا شخص واجب القتل ہے۔

آیت 23 ① حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ ...... : جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے ان کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے، ایک تو پچھلی آیت میں بیان ہوا کہ باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام ہے، اب یہاں نسب کے سات حرام رشتوں کا ذکر ہے: ① ماں: اس کے حکم میں نانی اور دادی اوپر تک، مثلاً، پڑدادی، پڑنانی شامل ہیں۔ ② بیٹی: اس کے حکم میں پوتی اور نواسی نیچے تک آ جاتی ہیں۔ ③ بہن: سگی ہو یا علاتی یا اخیافی، بہرحال حرام ہے۔ ④ پھوپھی: اس میں دادا کی بہن اور نانا کی بہن بھی شامل ہے۔ ⑤ خالہ: یہ لفظ ماں، نانی اور دادی سب کی بہنوں کو شامل ہے۔ ⑥ ⑦ بھتیجی اور بھانجی کے حکم میں ان کی بیٹیاں نیچے تک آ جاتی ہیں۔ (قرطبی)

فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۙ﴿۲۳﴾

گود میں تمھاری ان عورتوں سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری پشتوں سے ہیں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو، مگر جو گزر چکا۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۲۳﴾

② وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ ...... : یعنی نسبی ماں اور بہن کی طرح دودھ کی ماں اور بہن بھی حرام ہیں۔ یہاں دو رشتوں کا ذکر ہے، مگر حدیث کی رو سے وہ ساتوں رشتے جو نسب سے حرام ہیں، دودھ سے بھی حرام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہیں۔'' [ بخاری، النكاح، باب : ﴿ و أمهاتكم التی أرضعنكم ﴾ : ۵۰۹۹، عن عائشة رضی اللہ عنہا ]

قرآن مجید نے دودھ پینے کو حرمت کا سبب قرار دیا ہے، یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ کم از کم کتنی دفعہ دودھ پیا ہو، مگر مسلم میں ام الفضل اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک یا دو دفعہ دودھ پینا حرمت کا باعث نہیں ہوتا۔'' [ مسلم، الرضاع، باب فی المصة والمصتان : ۱۴۵۰، ۱۴۵۱ ] عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قرآن میں اترنے والے حکم میں تھا کہ دس دفعہ دودھ پینا جو معلوم ہو، حرام کرتا ہے، پھر وہ پانچ کے ساتھ منسوخ ہو گیا، تو نبی ﷺ فوت ہوئے اور وہ قرآن میں پڑھے جاتے تھے۔ [ مسلم، الرضاع، باب التحریم بخمس رضعات : ۱۴۵۲ ] یاد رہے کہ یہ دودھ پلانا اسی وقت معتبر ہوگا، جب دودھ پلانے کی مدت، یعنی دو سال کے اندر ہو۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۳۳)۔

③ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ : اس میں بیویوں کی نانیاں اور دادیاں بھی اوپر تک شامل ہیں۔ بیوی کی ماں (ساس) حرام ہے، خواہ بیوی کو جماع سے پہلے طلاق دے دی ہو، یا اس کا انتقال ہو گیا ہو۔

④ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ : "رَبَائِبُ" یہ "رَبِیْبَةٌ" کی جمع ہے، یعنی بیوی کی دوسرے خاوند سے جو لڑکی ہو وہ بھی حرام ہے، بشرطیکہ اپنی بیوی (اس لڑکی کی ماں) سے جماع کر لیا ہو، اگر قبل از جماع طلاق دے دی تو عورت کی لڑکی سے نکاح جائز ہے، اس پر علماء کا اتفاق ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

"فِیْ حُجُوْرِكُمْ" (تمھاری گود میں) کی قید شرط کے طور پر نہیں، بلکہ اتفاقی ہے یعنی عام حالات میں ایسا ہوتا ہے، ورنہ اگر اس کی پرورش کسی اور جگہ ہوئی ہو تو بھی وہ حرام ہے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ

اور خاوند والی عورتیں (بھی حرام کی گئی ہیں) مگر وہ (لونڈیاں) جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں، یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا ہے اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں کہ اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو، اس حال میں کہ نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے۔ پھر وہ جن سے تم ان عورتوں میں سے فائدہ اٹھاؤ

---

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ: "حَلَآئِلُ" یہ "حَلِيْلَةٌ" کی جمع ہے، یعنی صلبی بیٹوں کی بیویاں نہ کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۳۷)۔

وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ...... : یہ محل رفع میں ہے، یعنی "حُرِّمَ عَلَيْكُمُ الْجَمْعُ بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ" کہ دو بہنوں کو، صلبی ہوں یا رضاعی، ایک وقت میں نکاح میں جمع رکھنا حرام ہے۔ قرآن مجید میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنا منع ہے، مگر حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں جمع نہ کیا جائے۔" [ بخاری، النکاح، باب لا تنکح المرأة علی عمتها : ۵۱۰۹، عن أبی هريرة رضی الله عنه ] اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے علاوہ سنت بھی شریعت کا مستقل ماخذ ہے، قرآن میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنا منع آیا ہے اور حدیث میں پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی منع آیا ہے، یہ بھی ماننا پڑے گا۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: یعنی پہلے جو رشتے ایسے ہو چکے ان کا کچھ گناہ نہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کو برقرار رکھا جائے گا۔

آیت 24 ① وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ...... : اوپر کی آیت میں حرام رشتوں کا ذکر تھا، وہ تو بہر صورت حرام ہیں، خواہ ان میں سے کوئی عورت کسی کی لونڈی بن کر آ جائے۔ اس بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ دو بہنوں کو جمع کرنا صرف نکاح ہی میں نہیں بلکہ ایک مالک کی لونڈیاں ہوں تب بھی اسے دونوں سے صحبت حرام ہے۔ (ابن کثیر) اب یہاں فرمایا کہ جن عورتوں کے شوہر موجود ہوں ان سے نکاح بھی حرام ہے، ہاں جنگ کی صورت میں دار الحرب سے جو عورتیں قیدی بن کر آئیں تو اموال غنیمت کی تقسیم کے بعد جن کے حصہ میں آئیں گی ان کے لیے "استبراء" کے بعد ان سے صحبت جائز ہے، خواہ پیچھے ان کے خاوند موجود ہی کیوں نہ ہوں۔ "استبراء" یہ ہے کہ وہ عورت ایک حیض سے پاک ہو جائے، یا اگر حاملہ ہے تو وضع حمل ہو جائے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (۸ھ میں) حنین کے دن اوطاس کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا، ان کا مقابلہ دشمن سے ہوا تو انھوں نے مقابلہ کیا اور فتح پائی، بہت سے قیدی ان کے ہاتھ آئے، (تقسیم کے بعد جو لونڈیاں حصے میں آئیں) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان قیدی عورتوں سے صحبت کو گناہ سمجھا، اس لیے کہ ان کے مشرک شوہر موجود تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ یعنی عدت کے بعد وہ تمھارے

اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

پس انھیں ان کے مہر دو، جو مقرر شدہ ہوں اور تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم مقرر کر لینے کے بعد آپس میں راضی ہو جاؤ، بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۴﴾

لیے حلال کر دی گئی ہیں۔[ مسلم، الرضاع، باب جواز وطیء المسبیة...... : ١٤٥٦ ]

② احصان کا لفظی معنی محفوظ کرنا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ چند معانی میں آیا ہے: ① شادی شدہ عورتوں کے معنی میں، جیسے اس آیت کے شروع میں "اَلْمُحْصَنٰتُ" ( صاد کے فتحہ کے ساتھ ) اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ ② آزاد عورتوں کے معنی میں، جیسے اگلی آیت میں ہے۔ ③ پاک دامن عورتوں کے معنی میں، جیسے اس سے اگلی آیت میں اور سورۂ مائدہ (۵) میں ہے۔

③ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ : یعنی جن حرام رشتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان سے نکاح نہ کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کا ماننا تم پر لازم ہے۔ (ابن کثیر)

④ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ : اور ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں، بشرطیکہ حدیث میں ان کی حرمت نہ آئی ہو، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے کسی عورت کے ساتھ اس کی خالہ یا پھوپھی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے سے منع فرمایا۔ ایسی ہی چند اور صورتیں بھی ہیں، مثلاً چار سے زیادہ عورتیں بیک وقت نکاح میں رکھنا، یا نکاح متعہ کرنا یا حلالہ کرنا، یا بنت رسول ﷺ اور بنت عدو اللہ (ابوجہل) کو ایک نکاح میں جمع کرنا یا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنا، یا نکاح شغار یعنی وٹہ سٹہ کا نکاح جس میں یہ شرط ہو کہ اگر تم رشتہ دو گے تو میں رشتہ دوں گا، اس شرط کے بعد مہر مقرر ہو تب بھی نکاح حرام ہے، جیسا کہ ابوداؤد میں ہے کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے عبدالرحمان بن حکم سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور عبدالرحمان بن حکم نے اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کی طرف خط لکھا اور اسے حکم دیا کہ ان دونوں کے درمیان علیحدگی کروا دیں اور دونوں نے مہر بھی مقرر کیا تھا۔[ أبو داوٗد، النکاح، باب فی الشغار : ٢٠٧٥۔ و صححه الألبانی ]

⑤ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ...... : موضح میں ہے کہ ان مذکورہ محارم کے سوا سب حلال ہیں، مگر چار شرطوں کے ساتھ، اول یہ کہ طلب کرو، یعنی دونوں طرف سے زبانی ایجاب و قبول ہو، دوسرے یہ کہ مال یعنی مہر دینا قبول کرو، تیسرے یہ کہ ان عورتوں کو قید (دائمی قبضہ) میں لانا غرض ہو، (صرف) مستی نکالنے کی غرض نہ ہو (جیسے زنا میں ہوتا ہے) یعنی وہ عورت اس مرد کی بندی ہو جائے، چھوڑے بغیر نہ چھوٹے، یعنی کسی مہینے یا برس (مدت) کا ذکر نہ آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متعہ حرام ہے (اور حلالہ بھی، کیونکہ اس میں بھی جماع کے بعد طلاق کی نیت ہوتی ہے۔) چوتھی یہ کہ چھپی یاری نہ ہو، مراد لوگ نکاح کے شاہد ہوں، کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں، یہی چار شرطیں اس آیت سے سمجھ میں آ رہی ہیں۔ اس چوتھی شرط میں یہ بھی شامل

وَ مَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ ؕ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ

اور تم میں سے جو مالی لحاظ سے طاقت نہ رکھے کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو ان میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں، تمھاری مومن لونڈیوں سے (نکاح کر لے) اور اللہ تمھارے ایمان کو زیادہ جاننے والا ہے، تمھارا بعض بعض سے ہے۔ تو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر لو اور انھیں ان کے مہر اچھے

ہے کہ نکاح ولی کر کے دے، کیونکہ ولی کے بغیر نکاح چھپی یاری میں داخل ہے۔ اسلام نے ولی کے بغیر نکاح کو باطل قرار دیا قرآن و حدیث کے دلائل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری میں " کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح إلا بولی: ۵۱۲۷"

⑥ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ: یعنی نکاح کے بعد جن عورتوں سے فائدہ اٹھاؤ، یعنی صحبت کرو ان کے پورے مہر ان کے حوالے کرو۔ اکثر پہلے اور پچھلے مفسرین نے یہی معنی کیے ہیں کہ استمتاع سے مراد نکاحِ شرعی (جس کی چار شرطوں کا اوپر ذکر آیا ہے) کے بعد صحبت ہے۔ رافضیوں نے اس سے متعہ کا جواز ثابت کیا ہے، مگر علمائے اہل سنت بالاجماع اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ ہجرت کے ابتدائی برسوں میں بے شک رسول اللہ ﷺ نے (اس آیت کی رو سے نہیں بلکہ) اس رواج کی بنیاد پر جو اسلام سے پہلے چلا آ رہا تھا (جسے استصحابِ حال کہتے ہیں) بعض مواقع پر حسب ضرورت متعہ کی اجازت دی، مگر بعد میں نبی ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا۔ سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! میں نے تمھیں عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی مگر اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت کے دن تک کے لیے حرام قرار دے دیا ہے، سو اب جن کے پاس متعہ والی عورتیں ہیں وہ انھیں چھوڑ دیں اور جو مال تم نے انھیں دیا ہے وہ ان سے واپس نہ لو۔'' [ مسلم، النکاح، باب نکاح المتعۃ...... : ۲۱/۱۴۰۶ ] نیز متعہ والی عورتیں نہ لونڈیاں ہیں نہ بیویاں تو ان سے متعہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۵ تا ۷)۔

⑦ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ ......: یعنی اگر خاوند اور بیوی باہمی رضامندی سے طے شدہ مہر میں کمی بیشی کر لیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔

آیت 25 ① وَ مَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ ......: یعنی اگر کسی شخص کی مالی حالت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرے تو کسی دوسرے مسلمان کی لونڈی سے نکاح کر لے، بشرطیکہ وہ لونڈی مسلمان ہو۔ یہاں کسی شخص کو اپنی لونڈی سے نکاح کرنے کی اجازت کا بیان نہیں، کیونکہ اس کا لونڈی ہونا ہی مالک کے لیے اس سے صحبت کے جواز کا باعث ہے، اس کے علاوہ کوئی اور اس سے صحبت نہیں کر سکتا اور اس کی اولاد جائز اولاد سمجھی جائے گی، ہاں اگر نکاح ہی کرنا چاہتا ہے تو پھر اسے آزاد کر دے اور آزاد کر کے نکاح کر لے۔ (فتح القدیر)

اَهۡلِهِنَّ وَ اٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ ؕ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۵﴾ ع

طریقے سے دو، جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چھپے یار بنانے والی، پھر جب وہ نکاح میں لائی جا چکیں تو اگر کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں پر ہے۔ یہ اس کے لیے ہے جو تم میں سے گناہ میں پڑنے سے ڈرے اور یہ کہ تم صبر کرو تمھارے لیے بہتر ہے اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۲۵﴾

② بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ: یعنی تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور تمھاری ملت بھی ایک ہے، پھر محض لونڈی ہونے کی وجہ سے اس سے نکاح میں تردد نہ کرو۔ (شوکانی)

③ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ: یعنی جیسے آزاد مسلمان عورت سے نکاح کے لیے ولی (سرپرست) کی اجازت ضروری ہے، اسی طرح لونڈی سے نکاح کے لیے بھی اس کے مالک کی اجازت ضروری ہے۔ اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا۔

④ وَ اٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ: ان الفاظ سے بعض نے سمجھا ہے کہ مہر لونڈی کا حق ہے، لیکن اکثر علمائے سلف کے نزدیک یہ مہر لونڈی کے مالک کا ہوگا، لونڈی کی طرف مہر کی اضافت مجازی ہے۔ (فتح القدیر)

⑤ وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ: "اَخۡدَانٍ" "خِدۡنٌ" کی جمع ہے "خفیہ آشنا" چھپی یاری سے منع فرمایا تو نکاح میں گواہ لازم ہوئے۔

⑥ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ: "الۡمُحۡصَنٰتُ" میں الف لام عہد کا ہے، اس سے مخصوص محصنات یعنی کنواری آزاد عورتیں مراد ہیں، کیونکہ ان کی سزا سو کوڑے ہے جس کا نصف ہو سکتا ہے، شادی شدہ آزاد عورتوں کی سزا رجم ہے، اس کا نہ نصف ہو سکتا ہے نہ یہاں "الۡمُحۡصَنٰتُ" سے وہ مراد ہیں، یعنی لونڈیاں اگر شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کریں تو انھیں کنواری آزاد عورتوں کی سزا سے نصف سزا دی جائے گی جو پچاس کوڑے ہے۔ جن لوگوں نے اس آیت کو رجم کے انکار کی دلیل بنایا ہے کہ چونکہ رجم کا نصف ہو نہیں سکتا ہے، اس لیے رجم شریعت میں ہے ہی نہیں، انھوں نے اپنی کم علمی سے الف لام کا مفہوم سمجھا ہی نہیں، نہ "الۡمُحۡصَنٰتُ" کی صحیح مراد سمجھی ہے۔ عبد اللہ بن عیاش مخزومی فرماتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے اور قریش کے چند نوجوانوں کو حکم دیا تو ہم نے حکومتی لونڈیوں میں سے کچھ لونڈیوں کو زنا کرنے کی وجہ سے پچاس پچاس کوڑے لگائے۔ [ الموطأ، الحدود، باب ما جاء فی حد الزنا : ۱٦ ]

⑦ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ: یعنی مذکورہ شرطوں کے ساتھ لونڈی سے نکاح صرف اسی صورت میں جائز ہے جب بدکاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ (قرطبی)

⑧ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ: اس سے اکثر علمائے سلف نے استدلال کیا ہے کہ لونڈی سے نکاح نہ کرنا ہی بہتر ہے، کیونکہ

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۶﴾ اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (سیدھے راستے سے) ہٹ جاؤ، بہت بڑا ہٹ جانا ﴿۲۷﴾ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے ﴿۲۸﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو!

ایسی منکوحہ لونڈی کی اولاد بھی اس کے مالک کی غلام ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 26** يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ …… : یعنی اللہ تعالیٰ اپنے احکام اس لیے بیان فرما رہا ہے کہ تم کو حلال و حرام کا پتا چل جائے اور پہلے لوگوں کے عمدہ طریق کی ہدایت ہو جائے، پہلے لوگوں سے مراد انبیاء اور ان کی امتوں کے نیک لوگ ہیں۔ (ابن کثیر، شوکانی)

**آیت 27** وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ …… : یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم فسق و فجور کے بجائے پاکیزگی اپناؤ، مگر خواہشات کا اتباع کرنے والے بدکار چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی ان کی طرح ہر حد سے آزاد ہو کر حق سے بہت دور ہٹ جائیں، لہٰذا تم شہوت پرستوں کے کہنے میں نہ آؤ۔ مراد یہود و نصاریٰ، مجوسی اور کمیونسٹ ہیں، جو حرام رشتوں سے بھی نکاح جائز سمجھتے ہیں، بلکہ بعض تو نکاح کا طریقہ ہی ختم کر کے جانور بن چکے ہیں، حتیٰ کہ قوم لوط کے عمل کو قانوناً جائز کر چکے ہیں۔

**آیت 28** يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ …… : یعنی اللہ تعالیٰ کو انسان کی کمزوری کا خوب علم ہے کہ عورتوں کے معاملے میں یہ کس قدر کمزور ہے، اس لیے احکام شریعت میں اس کی سہولت کا خیال رکھا گیا ہے اور دین میں سختی نہیں برتی گئی، فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [ الحج : ۷۸ ] ''اور اس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک دین آسان ہے۔'' [ بخاري، الإيمان، باب الدين يسر : ۳۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھارے پاس نہایت آسان حنفی شریعت لے کر آیا ہوں۔'' [ مسند أحمد، ۵/ ۲۶۶، ح : ۲۲۳۵۴۔ بخاري، الإيمان، باب الدين يسر، قبل ح : ۳۹ ]

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''دین اسلام میں کوئی تنگی نہیں کہ کوئی حلال کو چھوڑے اور حرام کو دوڑے۔'' (موضح)

**آیت 29** ① لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ: کمائی کے جتنے بھی ناجائز طریقے ہیں سب کے سب ''بِالْبَاطِلِ'' میں آجاتے ہیں، حتیٰ کہ حیلہ سازی کے ساتھ کسی کا مال کھانا بھی حرام ہے اور اپنے مال کو غلط طریقے سے اڑانا بھی اسی میں

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹

اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضا مندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے ۝۲۹

داخل ہے۔ (رازی، ابن کثیر)

❷ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ : یعنی وہ تجارت اور لین دین (صنعت و حرفت وغیرہ) جس میں حقیقی باہمی رضا مندی ہو، اس کے ذریعے سے کماؤ اور کھاؤ۔ آپس کی رضا مندی میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شرع کے خلاف نہ ہو، کیونکہ وہ حقیقی رضا مندی ہوتی ہی نہیں، مجبوری کی رضا مندی ہوتی ہے، مثلاً رشوت اور سود میں بظاہر رضا مندی ہے مگر حقیقی نہیں، کیونکہ ایک فریق دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی طرح جوئے اور لاٹری وغیرہ کا معاملہ ہے کہ یہ دونوں فریق نفع کی موہوم امید کے فریب میں آ کر یہ کام کر رہے ہیں، اس فریب کو حقیقی رضا مندی نہیں کہا جا سکتا۔ پورے طور پر باہمی رضا مندی میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ جب تک بیچنے والا اور خریدنے والا مجلس بیع سے الگ نہ ہوں اس وقت تک دونوں کو ایک دوسرے کی بیع رد کرنے کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خرید و فروخت کرنے والوں میں سے ہر ایک کو (بیع فسخ کرنے کا) اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں، سوائے اس تجارت کے جس میں یہ اختیار باقی رکھا جائے۔'' [ بخاري، البيوع، باب البيعان بالخيار ما لم يتفرقا : ۲۱۱۱، عن ابن عمر رضي الله عنهما ]

❸ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ : اس کے تین معانی ہو سکتے ہیں اور تینوں مراد ہیں، پہلا یہ کہ شریعت کی مخالفت کرتے ہوئے حقیقی باہمی رضا مندی کے بغیر اگر لین دین کرو گے تو اس کا نتیجہ آپس میں قتل و غارت ہو گا، جیسا کہ جوئے کے نتیجے میں ہارنے والے کے ہاتھوں کئی جیتنے والے قتل ہو جاتے ہیں، لہٰذا یہ کام مت کرو۔ دوسرا یہ کہ ایک دوسرے کو قتل مت کرو، کیونکہ یہ اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے اور تیسرا یہ کہ خودکشی مت کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے چھری کے ساتھ اپنے آپ کو قتل کیا تو جہنم میں چھری اس کے ہاتھ میں ہو گی اور وہ اس کے ساتھ اپنے پیٹ کو پھاڑے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی میں رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو زہر سے قتل کیا تو جہنم میں اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہو گا، جسے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پیے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی میں رہے گا اور جس نے پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو قتل کیا تو وہ جہنم کی آگ میں گرتا رہے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہے گا۔'' [ مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم...... : ۱۰۹۔ بخاري : ۵۷۷۸، عن أبي هريرة رضي الله عنه ]

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

اور جو زیادتی اور ظلم سے ایسا کرے گا تو عنقریب ہم اسے سخت ہولناک آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ پر ہمیشہ سے بہت آسان ہے ۝ اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے اور تمھیں باعزت داخلے کی جگہ میں داخل کریں گے ۝ اور اس چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے، جو انھوں نے محنت سے کمایا اور عورتوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے، جو انھوں نے محنت سے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۝

آیت 30 ❶ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ...... : "ذٰلِكَ" کا اشارہ قتل نفس کی طرف بھی ہو سکتا ہے، دوسروں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی طرف بھی اور سورت کی ابتدا سے یہاں تک جتنی چیزیں منع کی گئی ہیں ان سب کی طرف بھی۔

❷ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا: یہ انداز بیان ڈانٹنے میں مبالغے پر دلالت کر رہا ہے۔ (رازی) موضح میں ہے: "یعنی مغرور نہ ہوں کہ ہم مسلمان دوزخ میں کیوں کر جائیں گے؟ اللہ تعالیٰ پر یہ آسان ہے۔"

آیت 31 ❶ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ ...... : کبیرہ گناہ وہ ہیں جن کے متعلق قرآن یا حدیث میں صاف طور پر دوزخ کی وعید آئی ہو، یا اللہ کے غصے کا اظہار ہوتا ہو، یا شریعت میں ان پر حد مقرر کی گئی ہو اور " سَيِّاٰتٌ " وہ گناہ ہیں جن سے صرف منع کیا گیا ہو اور ان پر وعید وارد نہ ہوئی ہو۔ (رازی، ابن کثیر)

❷ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ : یعنی اگر تم کبائر سے اجتناب کرتے رہو گے تو ہم تمھارے صغیرہ گناہ تمھارے نیک اعمال کی وجہ سے معاف فرما دیں گے۔ بعض روایات میں کبائر کا شمار بھی آیا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، کسی جان کو ناحق قتل کرنا، جوا، شراب نوشی اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا وغیرہ، مگر ان کی کوئی تحدید نہیں ہے، یہ سات سے ستر بلکہ سات سو تک بھی ہو سکتے ہیں اور بعض علماء نے اپنی کتابوں میں کبیرہ گناہوں کو جمع بھی کیا ہے، جن کا ذکر قرآن یا حدیث میں آیا ہے، جیسے امام ذہبی رحمہ اللہ کی " اَلْكَبَائِرُ " اور امام ہیثمی رحمہ اللہ کی "اَلزَّوَاجِرُ عَنِ اقْتِرَافِ الْكَبَائِرِ" مزید دیکھیے سورۂ نجم (۳۲)۔

آیت 32 وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ ...... : یعنی یہ نہ کہو کہ کاش ! یہ درجہ یا مال مجھے مل جائے، یہ تقدیر پر راضی نہ ہونے کی دلیل ہے اور اگر یہ بھی ہو کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے تو حسد ہے، جس کی بہت مذمت آئی ہے، ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مرد لوگ جہاد کرتے ہیں، ہم اس سے محروم ہیں، میراث میں بھی ہمارا نصف حصہ ہے تو اس

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

اور ہم نے اس (ترکے) میں جو والدین اور زیادہ قرابت والے چھوڑ جائیں، ہر ایک کے وارث مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں کو تمھارے عہد و پیمان نے باندھ رکھا ہے انھیں ان کا حصہ دو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر حاضر ہے۔ مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا۔ پس نیک عورتیں فرماں بردار ہیں، غیر حاضری میں حفاظت کرنے والی ہیں، اس لیے کہ اللہ

پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [أحمد : ٦/ ٣٢٢ ح : ٢٦٧٩٢] یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب نیک اعمال سے ہے، مرد کو محض مرد ہونے کی وجہ سے عورت پر عمل میں فضیلت نہیں ہے اور عورت محض عورت ہونے کی وجہ سے نیک عمل کے ثواب سے محروم نہیں ہے، لہٰذا تم بجائے حسد کے اللہ تعالیٰ کا فضل چاہا کرو۔ (ابن کثیر، بغوی)

**آیت 33** وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ...... : اس آیت کریمہ کے پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کے ورثا اور رشتے دار ہوتے ہیں، جو اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث بنتے ہیں۔ آیت کے دوسرے حصے ﴿ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے جو حلف یا معاہدہ کسی کے ساتھ کیا ہوا ہے تو اس کا حصہ اسے دو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب مہاجرین مدینہ آئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کر دیا تھا، انصاری کا وارث اس کے رشتے داروں کے بجائے مہاجر ہوتا تھا، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ ﴾ تو وہ (وراثت جو مہاجرین اور انصار کے درمیان قائم کی گئی تھی) منسوخ ہوگئی، پھر فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ نصرت، اعانت اور نصیحت کی صورت میں انھیں ان کا حصہ دو، کیونکہ میراث سے ان کا تعلق ختم ہو گیا ہے، ہاں! البتہ ان کے لیے وصیت کی جا سکتی ہے۔ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ ولكل جعلنا موالي ...... ﴾ : ٤٥٨٠ ] نیز دیکھیے سورۂ انفال کی آخری آیت۔

مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں "مَوَالِيَ" سے مراد عصبہ ہیں اور عصبہ کی وراثت میں "اَلْأَقْرَبُ فَالْأَقْرَبُ" کا اصول مقرر ہے، یعنی اول سب سے قریبی، پھر دوسرا اور ایک حدیث میں بھی « فَلِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ » کے الفاظ ہیں، یعنی اصحاب فروض سے جو کچھ بچ جائے گا وہ عصبہ میں سے اس شخص کو ملے گا جو میت کے مردوں میں سب سے زیادہ قریب ہوگا اور اس پر علماء کا اجماع بھی ہو چکا ہے۔ [ دیکھیے فتح الباري : ٦/ ٢٩٤۔ المحلى : ٩/ ٢٧١۔ أحكام القرآن للجصاص : ٢/ ٢٢٤ ]

**آیت 34** ① اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ...... : شریعت نے گھر کے بندوبست اور انتظام کے لیے مرد کو گھر کا قوام (نگران، ذمہ دار) قرار دیا ہے اور عورت کو اس کے ماتحت رکھا ہے۔ قرآن نے اس کی دو وجہیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ مرد کو طبعی طور پر

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ ۚ

فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡهِنَّ سَبِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیۡرًا ﴿۳۴﴾

نے (انھیں) محفوظ رکھا اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی سے تم ڈرتے ہو، سو انھیں نصیحت کرو اور بستروں میں ان سے الگ ہو جاؤ اور انھیں مارو، پھر اگر وہ تمھاری فرماں برداری کریں تو ان پر (زیادتی کا) کوئی راستہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ ہمیشہ سے بہت بلند، بہت بڑا ہے ﴿۳۴﴾

امتیاز حاصل ہے کہ وہ منتظم بنے اور دوسرے یہ کہ گھر کے سارے اخراجات بیوی کے نفقہ سمیت مرد کے ذمے ہیں۔ اس بنا پر گھر کا نگران بننے کا حق مرد کو ہے عورت کو نہیں۔ یہی حال حکومتی امور کا ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ یا امیر عورت نہیں ہو سکتی، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً» ''وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حاکم عورت کو بنا لیا۔'' [ بخاری، المغازی، باب كتاب النبی ﷺ إلى كسرىٰ و قيصر : ٤٤٢٥ ]

❷ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ ...... : اس آیت کی تشریح وہ حدیث کرتی ہے جس میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''بہترین بیوی وہ ہے جسے اگر تم دیکھو تو تمھیں خوش کرے، اگر تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمھاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو تمھارے پیچھے وہ تمھارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ ﴾ [ مسند أبي داوٗد الطيالسي : ٢٤٤٤ ـ ابن جرير : ٦٢/٤، و صححه صاحب هداية المستنير ]

❸ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ : یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ نے خاوندوں کو عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دے کر ان کے حقوق محفوظ کر دیے ہیں، اس کے بدلے میں وہ خاوندوں کی غیر موجودگی میں ان کے مال اور عزت و آبرو کی حفاظت رکھتی ہیں۔ [ دیکھیے نسائی، النكاح، باب أي النساء خير : ٣٢٣٣ ] یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ان کے مال و عزت اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور خیانت سے کام نہیں لیتیں۔ (شوکانی)

❹ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ ...... : نشوز کا لفظی معنی ''اونچا ہونا، چڑھائی کرنا ہے'' اور عورت کے نشوز کا معنی ''خاوند سے بغض رکھنا اور اس کی اطاعت سے اپنے آپ کو اونچا سمجھنا ہے۔'' (مفردات) عورت پر مرد کا بہت بڑا حق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' [ ترمذی، الرضاع ، باب ما جاء في حق...... : ١١٥٩، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ـ أبو داوٗد : ٢١٤٠ ]

عورت نافرمانی کا رویہ اختیار کرے تو خاوند کو حالات کے مطابق تین چیزوں کا اختیار دیا گیا ہے، تینوں یکے بعد دیگرے اور اکٹھی بھی ہو سکتی ہیں، نصیحت کرنا، ایک ہی بستر میں رہ کر انھیں چھوڑ نا اور انھیں مارنا۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض ناگزیر حالات میں مارنے کی اجازت دی، مگر فرمایا: ''چہرے پر مت مارو، اسے بدصورت نہ کہو اور اسے مت چھوڑو مگر گھر میں۔'' [ أبو داوٗد، النكاح، باب في حق المرأة على زوجها : ٢١٤٢، عن حكيم بن معاوية رضی اللہ عنہ ] اسی طرح ایسی مار سے بھی منع کیا جس سے سخت چوٹ

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا

اور اگر ان دونوں کے درمیان مخالفت سے ڈرو تو ایک منصف مرد کے گھر والوں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۵﴾ اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ

آئے۔[ مسلم، الحج، باب حجۃ النبی ﷺ : ۱۲۱۸، عن جابر رضی اللہ عنہ ] اور فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح نہ مارے جس طرح غلام کو مارتے ہیں، پھر دن کے آخر حصے میں اس سے جماع کرے گا۔'' [ بخاری، النکاح، باب ما یکرہ من ضرب النساء : ۵۲۰۴ ]

⑤ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا : یعنی اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو ان پر زیادتی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو، مثلاً طلاق دینا، تنگ کر کے خلع پر مجبور کرنا وغیرہ۔

**آیت 35** وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا ...... : پہلے صرف عورت کی طرف سے نشوز کا ذکر تھا اب اگر دونوں کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا سلسلہ چل نکلے اور جدائی کا اندیشہ ہو تو حاکم کو چاہیے کہ میاں بیوی دونوں کی طرف ان کے خاندان کا ایک ایک سمجھدار آدمی بطور حکم (پنچ یا منصف) مقرر کر دیں، اگر وہ دونوں اصلاح کرانے میں مخلص ہوں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اگر اصلاح کی کوئی صورت نہ بنے تو کیا انھیں علیحدگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اگر میاں بیوی دونوں اسے صلح یا جدائی کا اختیار دیں کہ تم جو فیصلہ کرو ہمیں منظور ہوگا تو اسے علیحدگی کے فیصلے کا بھی اختیار ہے اور بعض نے فرمایا کہ اگر وہ حاکم جس نے اسے حکم مقرر کیا ہے اسے صلح یا جدائی دونوں کے فیصلے کا اختیار دیتا ہے تو اسے علیحدگی کے فیصلے کا اختیار ہے ورنہ نہیں۔ مگر جمہور علماء کا کہنا ہے کہ حکم مقرر کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حکم دونوں فریقوں کے معاملات کا جائزہ لے کر صلح یا تفریق کا جو فیصلہ کر دیں نافذ ہوگا۔ اس کے لیے میاں بیوی یا حاکم کے اسے الگ اختیار دینے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں زیادہ زور موافقت کرانے کی کوشش پر دیا گیا ہے۔

**آیت 35** ① وَاعْبُدُوا اللّٰهَ : میاں بیوی کے معاملات کے بعد دوسرے حقوق والوں کے ساتھ احسان کا ذکر ہے، مگر ابتدا اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم اور شرک سے منع کرنے سے کی ہے، کیونکہ ہر کام کی ابتدا اس سے ہوتی ہے، جیسا کہ اس سورت کا موضوع عموماً عورتوں کے مسائل ہیں، مگر سورت کی ابتدا ﴿ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ﴾ سے کی ہے۔ (ابن عاشور)

② وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا: یعنی کسی چیز کو کسی صورت میں اس کا شریک نہ بنانا۔ اس کا شریک نہ بنانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک و مختار تسلیم کیا جائے اور اس کی کسی صفت میں کسی زندہ یا مردہ مخلوق کو شریک قرار نہ دیا جائے، تمام مرادیں اور حاجات اسی سے مانگی جائیں کہ وہی عالم میں متصرف ہے، کوئی اور نہیں۔

③ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: توحید کا حکم دینے کے بعد درجہ بدرجہ رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے حقوق بیان فرمائے۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿۳۶﴾

اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور قرابت والے کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت والے ہمسائے اور اجنبی ہمسائے اور پہلو کے ساتھی اور مسافر (کے ساتھ) اور (ان کے ساتھ بھی) جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ بنے ہیں، یقیناً اللہ ایسے شخص سے محبت نہیں کرتا جو اکڑنے والا، شیخی مارنے والا ہو ﴿۳۶﴾

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اول حق اللہ تعالیٰ کا، پھر ماں باپ کا اور پھر ان سب کا درجہ بدرجہ۔'' (موضح) انسان کے عدم سے وجود میں آنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بعد ماں باپ بنتے ہیں، اس لیے ان کا حق پہلے رکھا۔

وَ بِذِي الْقُرْبٰى : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے اور رشتے دار پر صدقہ، صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔'' [ ترمذی، الزکاۃ، باب ما جاء في الصدقة...... : ٦٥٨ ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص پسند کرے کہ اس کے لیے اس کا رزق فراخ کیا جائے اور اس کے نشان قدم میں تاخیر کی جائے تو چاہیے کہ وہ اپنی رشتے داری کو ملائے۔'' [ مسلم، البر والصلة، باب صلة الرحم...... : ٢٥٥٧/٢١ ]

وَالْيَتٰمٰى: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔'' آپ نے اپنی شہادت کی اور درمیانی انگلی کو ملا کر بتایا۔ [ بخاري، الأدب، باب فضل من يعول يتيمًا : ٦٠٠٥، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

مسکین کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۶۰)۔

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ: قرابت والے ہمسائے سے مراد رشتے دار ہمسایہ ہے اور اجنبی ہمسائے سے مراد غیر رشتے دار ہمسایہ ہے۔ ہمسائیگی کے حقوق کی نگہداشت میں متعدد احادیث وارد ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جبریل علیہ السلام مجھے ہمیشہ پڑوسی کے متعلق وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ پڑوسی کو وارث قرار دے دیں گے۔'' [ بخاري، الأدب، باب الوصاة بالجار : ٦٠١٥، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] اور رسول اللہ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا: ''اللہ کی قسم! وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا۔'' صحابہ نے پوچھا: ''کون شخص؟'' فرمایا: ''وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ بے خوف نہ ہو۔'' [ بخاري، الأدب، باب إثم من لا يأمن جاره بوائقه : ٦٠١٦، عن أبي شريح رضی اللہ عنہ ]

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ: پہلو کے ساتھی سے ہم نشین دوست، سفر کا ساتھی، بیوی، علم سیکھنے کے لیے آنے والے یا کاروباری سلسلے میں پاس آ بیٹھنے والے سب مراد ہیں۔

وَابْنِ السَّبِيْلِ: مسافر سے مراد اکثر سلف کے نزدیک مہمان بھی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام (عزت افزائی) کرے۔'' [ بخاري، الأدب، باب من كان يؤمن...... : ٦٠١٩، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۳۷﴾ اور وہ لوگ جو اپنے اموال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر، اور وہ شخص کہ شیطان اس کا ساتھی ہو تو وہ برا ساتھی ہے ﴿۳۸﴾

﴿۱۰﴾ **وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ** : اس سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں، کیونکہ وہ ملکیت میں ہونے کی وجہ سے بالکل ہی بے بس ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آخری وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ''نماز اور تمھارے غلام (ان دونوں کا خاص خیال رکھنا)۔'' [ أبو داؤد، الأدب، باب في حق المملوك : ٥١٥٦، عن علی رضی اللہ عنہ ] آج کل اگرچہ کفار نے زنا پھیلانے اور دوسرے مذموم مقاصد کے لیے غلامی کو ختم کر دیا ہے اور جنگوں میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو غلامی کی صورت میں ایک ایک آدمی کی ملکیت میں دینے کے بجائے کیمپوں میں رکھ کر ان پر فوجیوں کے ظلم و جبر اور آبروریزی کا دروازہ کھولا ہے، پھر نہ ان بیچاریوں کا کوئی غم خوار یا ذمہ دار ہوتا ہے نہ ان کی اولاد کا کوئی باپ، جب کہ غلامی کی صورت میں وہ ایک مالک کی غلامی میں رہ کر اس کی اولاد کی ماں بن کر عزت حاصل کرتی ہیں۔ مگر اس آیت پر عمل کرنے کے لیے آدمی کے ماتحت افراد جو اگرچہ غلام نہیں، حسن سلوک کے حق دار ہیں، مثلاً گھر، دکان اور کارخانوں کے ملازم اور نوکر چاکر وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کو اتنا ہی گناہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کرے جن کی خوراک کا وہ ذمے دار ہے۔'' [ مسلم، الزکوٰۃ، باب فضل النفقة...... : ٩٩٦، عن ابن عمرو رضی اللہ عنہما ]

﴿۱۱﴾ **مُخْتَالًا فَخُوْرًا**: ''**مُخْتَالًا**'' جو خرچ کرنے سے پہلے متکبر ہو اور ''**فَخُوْرًا**'' جو خرچ کرنے کے بعد فخر کرے۔ معلوم ہوا متکبر اور فخر کرنے والا نام و نمود کے لیے خرچ کرے گا، مگر اللہ کی خاطر خرچ نہیں کر سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت نہیں رکھتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اکڑنے والے، شیخی باز بخیل ہوتے ہیں، کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے کہ اس پر خرچ کریں۔ حقیقی سخی متواضع ہوتے ہیں۔ جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔'' تو آپ نے (چند اہم امور کا تذکرہ کرنے کے بعد) فرمایا: ''تہ بند کو نیچے نہ لٹکاؤ، کیونکہ تہ بند کا (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانا تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔'' [ أحمد : ٥/ ٦٤، ح : ٢٠٦٦٣ ]

**آیت 37** اس آیت میں بخل کی مذمت کی گئی ہے اور بخیل کے لیے کافر کا لفظ استعمال کیا ہے، کیونکہ کافر کا معنی چھپانے والا ہے اور بخیل بھی اللہ کی نعمت کو چھپانے والا ہوتا ہے۔ بعض سلف نے اس آیت میں بخل کے لفظ کو یہودیوں کے بخل پر محمول کیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی صفات اور علامات کو لوگوں سے چھپاتے تھے۔ غرض بخل مال کا ہو یا علم کا شدید مذموم ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 38** بخیلوں کی مذمت کے بعد اب ریا کاری سے خرچ کرنے والوں کی مذمت کی جا رہی ہے اور انھیں شیطان کا

وَ مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

اور ان پر کیا آفت آ جاتی اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آتے اور اس میں سے خرچ کرتے جو انھیں اللہ نے دیا ہے اور اللہ ہمیشہ سے انھیں خوب جاننے والا ہے ﴿۳۹﴾ بے شک اللہ ایک ذرے کے برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دوگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا ﴿۴۰﴾ پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے ﴿۴۱﴾

ساتھی قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین آدمیوں کو سب سے پہلے آگ میں جھونکا جائے گا اور وہ ہیں: ① ریا کار عالم ② ریا کار مجاہد ③ اور ریا کار سخی۔" [ مسلم، الإمارة، باب من قاتل للریاء…… : ۱۹۰۵ ] شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "مال دینے میں بخل کرنا جیسا اللہ کے نزدیک برا ہے ویسا ہی خلق کے دکھانے کو دینا۔ قبول وہ ہے جو ان حق داروں کو دے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور پھر اللہ کے یقین اور آخرت کی توقع سے دے۔" (موضح)

**آیت 40،39** بخل اور ریا کاری کی مذمت کے بعد ایمان و طاعت اور صدقہ و خیرات کی ترغیب دلائی، پھر مزید ترغیب کے لیے فرمایا کہ جب ذرا ذرا سی چیز کا اللہ تعالیٰ کئی گنا اجر دیتے ہیں، پھر لوگ کیوں نیک کاموں میں سستی کرتے اور ریا کاری سے کام لے کر اپنے اجر کو ضائع کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خبر دی ہے کہ وہ کسی پر ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرے گا، بلکہ ایک نیکی ہوگی تو اسے بھی بڑھا چڑھا کر اپنے پاس سے اجر عظیم دے کر نجات کا باعث بنا دے گا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک طویل حدیث) میں فرمایا: "اللہ تعالیٰ (فرشتوں سے) فرمائے گا، تم جاؤ اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی خیر (یعنی ایمان) کو پاؤ اسے بھی جہنم سے نکال لاؤ، چنانچہ وہ بہت سی مخلوق کو نکال لائیں گے۔" یہ حدیث بیان کرنے کے بعد ابو سعید رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "اگر تم مجھے اس حدیث میں سچا نہ جانو تو یہ آیت پڑھو: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا﴾ [ مسلم، الإیمان، باب معرفة طریق الرؤیة : ۱۸۳ ] بے شک اللہ ایک ذرے کے برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا، یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے قسم کھائی ہے۔

**آیت 41** اوپر کی آیتوں میں قیامت کے دن ظلم کی نفی اور کئی گنا اجر کا وعدہ فرمایا، اب یہاں بیان فرمایا جا رہا ہے کہ اچھا یا برا بدلہ پیغمبروں یا ان لوگوں کی گواہی سے ملے گا جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام اپنی مخلوق تک پہنچایا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۳) اور رسول اللہ ﷺ اپنی امت پر اور پہلی امتوں پر دین پہنچانے کی گواہی دیں گے۔

يَوْمَىٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۟ؒ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ

اس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، چاہیں گے کاش! ان پر زمین برابر کر دی جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے ﴿۴۲﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم جانو جو کچھ کہتے ہو اور نہ اس حال میں کہ جنبی ہو، مگر راستہ عبور کرنے والے، یہاں تک کہ غسل کر

آیت 42 ① يَوْمَىٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ......: اس سے مقصود کفار کو وعید سنانا ہے جو اس موقع پر آرزو کریں گے کہ کاش! ہم انسان نہ ہوتے بلکہ زمین میں مل کر خاک ہو جاتے۔ دیکھیے سورۂ نبا کی آخری آیت۔ (ابن کثیر)

② وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا: کفار کے متعلق قرآن میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شرک سے انکار کر دیں گے کہ ہم نے شرک کیا ہی نہیں۔ (انعام: ۲۳) مگر یہ آیت اس کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ وہ پہلے واقعی شرک کرنے سے انکار کریں گے مگر جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے (حٰمٓ السجدۃ: ۲۱ تا ۲۳) تو پھر وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپا نہ سکیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''قیامت کا دن بہت لمبا دن ہے، کسی موقع پر وہ انکار کریں گے اور دوسرے موقع پر اپنے شرک اور بداعمالی پر افسوس کریں گے۔'' (رازی، ابن کثیر)

آیت 43 ① لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى......: شراب کی مذمت اور قباحت کے سلسلے میں سب سے پہلے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۱۹) نازل ہوئی، جس میں شراب اور جوئے کے گناہ کو ان کے نفع سے بڑا قرار دیا، اس پر بہت سے مسلمانوں نے شراب چھوڑ دی، تاہم بعض بدستور پیتے رہے کہ ہم اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے کھانا پکایا، پھر ہمیں بلایا اور ہمیں شراب پلائی، شراب نے ہمیں مدہوش کر دیا، اتنے میں نماز کا وقت آ گیا اور انھوں نے مجھے امام بنا دیا، میں نے پڑھا: '' قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ، وَ نَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' ''کہہ دے اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو اور ہم اس کی عبادت کرتے ہیں جس کی تم عبادت کرتے ہو'' (ظاہر ہے اس سے آیت کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ النساء: ۳۰۲۶، وقال حسن صحیح غریب ] اس پر لوگوں نے نماز کے اوقات میں شراب ترک کر دی، یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کی آیات (۹۰، ۹۱) نازل ہوئیں، جس سے شراب قطعی طور پر حرام کر دی گئی۔ (ابن کثیر) بعض علماء نے یہاں ''وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى'' (جمع سکران) سے نیند کا غلبہ مراد لیا ہے اور اس کے مناسب صحیح بخاری کی وہ حدیث ذکر کی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند کی حالت میں نماز سے منع فرمایا کہ معلوم نہیں کیا پڑھے اور کیا نہ پڑھے، مگر صحیح یہ ہے کہ اس سے شراب کا نشہ مراد ہے اور یہی جمہور صحابہ و تابعین کا قول ہے،

مِنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر کوئی پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو، پس اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر ملو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا، بے حد بخشنے والا ہے۔ ﴿۴۳﴾

تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ آیت شراب نوشی سے متعلق نازل ہوئی۔

② **وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ:** بعض مفسرین نے اس سے مراد سفر لیا ہے مگر سفر کا ذکر (**اَوْ عَلٰى سَفَرٍ**) آگے آ رہا ہے اس تفسیر کی بنا پر سفر کے ذکر میں تکرار لازم آتا ہے، اس لیے اکثر سلف نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ”**الصَّلٰوةَ**“ سے مراد نماز کی جگہ یعنی مسجد ہے، مطلب یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں ”**الصَّلٰوةَ**“ یعنی نماز کی جگہوں (مسجدوں) میں نہ جاؤ۔ ہاں، اگر مسجد سے گزرنا پڑے تو مجبوری کی صورت میں گزر سکتے ہو (ٹھہر نہیں سکتے)۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسے راجح قرار دیا ہے، پس یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی ”لَا تَقْرَبُوْا مَوَاضِعَ الصَّلَاةِ“ (طبری) اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے کہ جنبی یا حائضہ کے لیے مسجد سے گزرنا جائز ہے، ٹھہرنا جائز نہیں، کیونکہ بہت سے صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، ان کے لیے غسل کر کے گزرنا مشکل تھا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مگر آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دریچے کے سوا مسجد میں کھلنے والے تمام دریچے بند کروا دیے۔ [ بخاری، الصلاۃ، باب الخوخۃ ...... : ۴۶۷، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] بعض لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کا دروازہ کھلا رکھنے کی روایت بھی بیان کی ہے، مگر اہل علم نے اسے ضعیف کہا ہے۔ (ابن کثیر) خلاصہ یہ کہ مراد اس سے یہ ہے کہ جنبی مسجد سے گزر سکتا ہے، ٹھہر نہیں سکتا۔ گویا آیت کے دو حصے ہیں، پہلے حصے: ﴿ **لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى** ﴾ اس میں ”**الصَّلٰوةَ**“ سے مراد نماز ہی ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ اور دوسرے حصے: ﴿ **وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا** ﴾ میں ”**لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ**“ سے مراد نماز کی جگہ ہے، یعنی اس جنبی ہونے کی حالت میں مسجد کے قریب نہ جاؤ، الا یہ کہ راستہ عبور کر کے گزر جانے والے ہو۔ (طنطاوی)

③ **وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ......:** سفر سے مراد مطلق سفر ہے، اکثر علماء کے نزدیک تیمم کے جواز کے لیے اتنے سفر کی کوئی شرط نہیں جس میں نماز قصر پڑھی جا سکتی ہے۔ ”یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو“ کے تحت ہر وہ چیز آ جاتی ہے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ عورتوں کو چھونے یا مباشرت سے مراد (راجح مسلک کی بنا پر) جماع ہے، ورنہ صرف چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں گھر میں لیٹی ہوتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نفل نماز پڑھتے تو سجدہ کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے میرے پاؤں سامنے سے ہٹا دیتے۔ [ بخاری، الصلوۃ، باب التطوع خلف المرأۃ : ۵۱۳، ۵۱۴۔ مسلم : ۵۱۲ ] ”**اَوْ عَلٰى سَفَرٍ**“ کا مقصد ہے کہ سفر میں پینے کے لیے تو پانی ہے مگر وضو یا غسل کے لیے نہیں۔ بیماری کا مطلب یہ ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ٝ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ گمراہی کو خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم راستے سے بھٹک جاؤ ﴿۴۴﴾ اور اللہ تمھارے دشمنوں کو زیادہ جاننے والا ہے اور اللہ کافی دوست ہے اور اللہ کافی مددگار ہے ﴿۴۵﴾

پانی کے استعمال سے بیمار ہونے یا بیماری بڑھنے کا خطرہ ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک سرد رات میں احتلام ہو گیا، انھوں نے تیمم کر لیا اور یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ [ النساء : ۲۹ ] ''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ [ بخاری، التیمم، باب إذا خاف الجنب علی نفسہ المرض...... قبل ح : ۳۴۵، تعلیقًا ]

④ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً: پانی نہ پانے میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ پانی میسر ہی نہ ہو اور یہ بھی کہ بیماری یا عذر کی بنا پر پانی استعمال نہ کیا جا سکے۔

⑤ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا...... : تیمم کا معنی ہے قصد کرنا۔ ''صَعِيْدًا طَيِّبًا'' سے مراد پاک مٹی ہے، خواہ کپڑے، کاغذ یا کسی جگہ کی گرد سے حاصل ہو جائے۔ اس کی تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں تین باتوں میں لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے، جن میں سے ایک یہ ہے: « وَ جُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْرًا إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ » ''جب ہمیں پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لیے پاک کرنے والی بنا دی گئی ہے۔'' [ مسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلوۃ : ۵۲۲ ] تیمم خواہ وضو کے لیے ہو یا غسل کے لیے، دونوں کا ایک ہی طریقہ ہے، صرف نیت مختلف ہو گی۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک جہادی سفر میں انھیں احتلام ہو گیا تو انھوں نے زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر نماز پڑھ لی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھیں اتنا ہی کافی تھا۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا، پھر ان میں پھونک مار کر انھیں اپنے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں پر مل لیا۔ [ بخاری، التیمم، باب المتیمم هل ینفخ فیهما ؟ : ۳۳۸ ]

اس سے معلوم ہوا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا تیمم کا طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک دفعہ زمین پر ہاتھ مار کر اس میں پھونک مار کر چہرے اور ہتھیلیوں پر مل لیا جائے۔ بعض احادیث میں دو دفعہ زمین پر ہاتھ مارنے کا اور کہنیوں تک ملنے کا ذکر ہے، مگر وہ احادیث یا تو صحابہ کا اجتہاد ہیں یا کمزور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ترین حدیث وہی ہے جو عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے آئی ہے۔

**آیت 44، 45** ① اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا: اس سے پہلے ﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا ﴾ میں مشرکین کے طرز عمل سے متنبہ کرنے کے بعد درمیان میں ضرورت کے کچھ مسائل، مثلاً شراب، نماز اور تیمم وغیرہ ذکر کرنے کے بعد یہود کے فریب اور ان کی دشمنی کا ذکر تفصیل سے شروع ہو گیا ہے۔ یہود کو تیمم میں بھی مسلمانوں سے حسد تھا۔ اسی حسد

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

وہ لوگ جو یہودی بن گئے، ان میں سے کچھ لوگ بات کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (ہم نے سنا اور نہیں مانا) اور اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (سن اس حال میں کہ تجھے نہ سنایا جائے) اور رَاعِنَا (ہماری رعایت کر) (یہ الفاظ) اپنی زبانوں کو پیچ دیتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے (کہتے ہیں) اور اگر بے شک وہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور مانا) اور اسْمَعْ وَانْظُرْنَا (سن اور ہماری طرف دیکھ) کہتے تو یقیناً ان کے لیے بہتر اور زیادہ درست ہوتا اور لیکن اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کی، پس وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم ﴿۴۶﴾

کی بنا پر وہ خود مسلمان ہونے کے بجائے چاہتے تھے کہ مسلمان بھی کافر ہو جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [ البقرۃ : ۱۰۹ ] ''بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ کاش! وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں، اپنے دلوں کے حسد کی وجہ سے۔''

② نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ: یعنی انھیں کتاب کا کچھ حصہ ہی ملا ہے، باقی ضائع کر بیٹھے ہیں اور یہ بھی مراد ہے کہ جو حصہ ملا ہے اس کے الفاظ ملے ہیں، عمل کا حصہ عطا نہیں ہوا اور یہ بھی کہ تورات میں انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت تو معلوم کر لی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت معلوم نہ کر سکے۔

آیت 46 ① مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ...... : اوپر کی آیت میں فرمایا کہ وہ گمراہی مول لیتے ہیں، اب اس آیت میں چند امور کے ساتھ اس گمراہی کی تشریح فرمائی۔ یعنی وہ تورات کے احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۳، ۱۴)۔ سورۂ مائدہ میں ''عَنْ مَّوَاضِعِهٖ'' کے علاوہ ''مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ'' بھی ہے، جس کا معنی تحریفِ لفظی ہے، یہاں '' عَنْ مَّوَاضِعِهٖ'' ہے، اس سے مراد تحریفِ معنوی ہے، یعنی تاویلاتِ فاسدہ سے کام لیتے ہیں، مثلاً قصۂ ذبیح کا تعلق اسماعیل علیہ السلام کے بجائے اسحاق علیہ السلام کے ساتھ جوڑنا۔ (رازی، شوکانی) ہمارے زمانے میں بھی تمام بدعتیوں کا شیوہ ہو گیا ہے کہ جو آیت یا حدیث امام، مجتہد یا پیر و مرشد کے قول کے خلاف نظر آتی ہے، اس کی تاویل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے حیا نہیں کرتے کہ پیر و مرشد اور امام و مجتہد تو معصوم نہ تھے، بخلاف پیغمبر کے کہ خطا سے ان کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ فرماتا تھا۔ (وحیدی)

② لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ: ''لَيًّا'' یہ ''لَوَى يَلْوِيْ لَيًّا'' سے ہے، بمعنی توڑنا مروڑنا، یعنی زبان کو توڑ مروڑ کر ''رَاعِيْنَا'' کہتے، جو توہین کا کلمہ ہے۔ دیکھیے بقرہ (۱۰۴) ان کی ایک گمراہی یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم سنتے ہیں تو ظاہر میں ''سَمِعْنَا'' کہتے ہیں (یعنی ہم نے سنا) مگر ساتھ ہی بے حد عداوت کی وجہ سے ''عَصَيْنَا'' (نہیں مانا) بھی کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات کرتے تو کہتے ''اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'' (سنو، تمھیں کوئی نہ سنائے) ظاہر میں یہ نیک دعا ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اے لوگو جنھیں کتاب دی گئی ہے! اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمھارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں، پھر انھیں ان کی پیٹھوں پر پھیر دیں، یا ان پر لعنت کریں، جس طرح ہم نے ہفتے کے دن والوں پر لعنت کی تھی اور اللہ کا حکم ہمیشہ (پورا) کیا ہوا ہے ﴿۴۷﴾

تم ہمیشہ غالب رہو، کوئی تمھیں بری بات نہ سنا سکے اور دل میں نیت رکھتے کہ تو بہرا ہو جائے، سن نہ سکے، ایسی شرارت کرتے۔ (رازی، ابن کثیر)

③ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ: یعنی یہ سب حرکتیں کر رہے ہیں اور پھر دین میں طعن کی غرض سے کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب معلوم کر لیتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے خبث باطن کو ظاہر فرما دیا اور وہی طعن الٹا رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کی پختہ دلیل بن گیا۔ (رازی)

④ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ...... : یعنی یہ اگر اس قسم کی حرکات اور طعن کے بجائے ایسے کلمات استعمال کرتے جن میں شرارت کی آمیزش نہیں ہو سکتی اور اخلاص سے پیش آتے، مثلاً "عَصَيْنَا" کے بجائے "اَطَعْنَا" اور "غَيْرَ مُسْمَعٍ" کے بجائے صرف "اسْمَعْ" اور "رَاعِنَا" کے بجائے "انْظُرْنَا" تو ان کے حق میں بہتر ہوتا، مگر افسوس کہ یہ بہت ہی تھوڑے احکام پر ایمان رکھتے ہیں۔ پس "قَلِيْلًا" یہاں مصدر محذوف "اِيْمَانًا" کی صفت ہے اور یہ معنی بھی ہے کہ ان میں سے بہت ہی کم لوگ ایمان لاتے ہیں، حتیٰ کہ یہودیوں میں سے دس بھی بمشکل ایمان لائے ہوں گے۔

آیت 47 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... : یہود کی شرارتوں کو بیان کرنے کے بعد اب اس آیت میں انھیں ایمان کی دعوت دی اور ہٹ دھرمی سے احکام خداوندی بجا نہ لانے پر وعید سنائی، کیونکہ یہود عالم تھے اور علم و معرفت کے باوجود ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے۔ (رازی) اس وعید کا تعلق یا تو قیامت کے دن سے ہے، یا دنیا میں چہروں کو مسخ کر دینا مراد ہے اور اصحاب سبت جیسی لعنت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا تھا، تمھیں بھی ویسا ہی بنا دیا جائے۔ اصحاب سبت کے قصہ کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۶۳)۔ اس وقت یہودی ہوں یا نصرانی یا مسلمان سب رسول اللہ ﷺ کی امت ہیں، کلمہ پڑھنے والے امت اجابت، یعنی قبول کر لینے والے ہیں اور دوسرے امت دعوت، یعنی جو آپ کی دعوت کے مخاطب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: « بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَسْخٌ وَ خَسْفٌ وَ قَذْفٌ » [ ابن ماجه، الفتن، باب الخسوف: ۴۰۵۹، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ صحیح الجامع للألبانی: ۲۸۵۶ ] "قیامت سے پہلے شکلوں کے بدل جانے، زمین میں دھنس جانے اور پتھروں کی بارش کے واقعات رونما ہوں گے۔" اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « سَيَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ خَسْفٌ وَ قَذْفٌ وَ مَسْخٌ، قِيْلَ وَ مَتٰى ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !؟ قَالَ إِذَا ظَهَرَتِ الْمَعَازِفُ وَ الْقَيْنَاتُ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے اور جو اللہ کا شریک بنائے تو یقیناً اس نے بہت بڑا گناہ گھڑا ﴿۴۸﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاک کہتے ہیں، بلکہ اللہ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ان پر ایک دھاگے کے برابر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۴۹﴾

وَاسْتُحِلَّتِ الْخَمْرُ)) [ المعجم الكبير : ۱۵۰/۶، ح : ۵۸۱۰۔ صحیح الجامع للألبانی : ۳۶۶۵ ] ''آخر زمانے میں زمین میں دھنسنا، پتھروں کی بارش اور شکلوں کا بدل جانا واقع ہوگا۔'' پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسول! یہ کب ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب باجے گاجے اور گانے والیاں عام ہو جائیں گی اور شراب حلال کر لی جائے گی۔'' اب بھی اہل کتاب اور ان کی روش پر چلنے والے مسلمانوں کو ان عذابوں سے ڈر کر توبہ کرنی چاہیے۔

آیت 48 ❶ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ ...... : یہود کو وعید اور ڈانٹ سنانے کے بعد اب اس آیت میں اشارہ فرمایا کہ یہ وعید ایمان نہ لانے اور کفر و شرک کی وجہ سے ہے، ورنہ دوسرے گناہ تو قابل معافی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت ہیں، جسے اللہ چاہے گا معاف فرما دے گا، جسے چاہے گا سزا دے کر چھوڑ دے گا، مگر شرک کی معافی نہیں، کیونکہ مشرک پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۷۲) یہود و نصاریٰ کی طرح نام کے مسلمان، جو ایسے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں جس سے انسان ملتِ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، جو مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارتے، اٹھتے بیٹھتے ان کے نام کا وظیفہ کرتے ہیں، ان کے نام کا روزہ رکھتے، ان کی قبروں کو پوجتے، ان کے نام پر جانور ذبح کرتے اور ان کی منتیں مانتے ہیں، وہ بھی اس وعید کے مصداق ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حج (۳۱)، سورۂ لقمان (۱۳)، سورۂ انعام (۸۸)، سورۂ زمر (۶۵) اور سورۂ نساء (۱۱۶)۔

❷ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا: اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا بھی کوئی شریک ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان: ۱۳ ] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔''

آیت 49 ''فَتِيْلًا'' اس پتلے دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے کٹاؤ میں نظر آتا ہے۔ یہ محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ (طبری) یہود اپنے آپ کو پاک باز اور مقدس کہتے، کبھی کہتے جنت میں ہم ہی جائیں گے: ﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ [ البقرة : ۱۱۱ ] ''جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی ہوں گے یا نصاریٰ۔'' کبھی اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب بتاتے۔ (دیکھیے مائدہ: ۱۸) اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی کہ کسی کو پاک باز قرار دینا تو اللہ کا کام ہے، اپنی تعریف آپ کرنا انسان کے لیے مہلک ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۟۠ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۟ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۟ؕ

دیکھ وہ اللہ پر کس طرح جھوٹ باندھتے ہیں اور صریح گناہ گار ہونے کے لیے یہی کافی ہے ﴿۵۰﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں ﴿۵۱﴾ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے پھر تو کوئی اس کی مدد کرنے والا ہرگز نہ پائے گا ﴿۵۲﴾

﴿ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ [ النجم : ۳۲ ] ”اپنے آپ کو پاک مت قرار دو، وہ زیادہ جانتا ہے کون متقی ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے ایک دوسرے کی تعریف سے بھی، خصوصاً جب کوئی سامنے ہو یا مبالغہ کے ساتھ ہو منع فرمایا۔ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا: (( أَنْ نَحْثِيَ فِيْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِيْنَ التُّرَابَ )) [ مسلم، الزھد، باب النھی عن المدح...... : ۳۰۰۲ ] ”ہم زیادہ تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دیں۔“ اور فرمایا: (( إِيَّاكُمْ وَالتَّمَادُحَ فَإِنَّهُ ذَبْحٌ )) [ ابن ماجہ، الأدب، باب المدح : ۳۷۴۳ ] ”باہمی مدح گوئی سے بچو کیونکہ یہ ذبح کرنا ہے۔“ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دوسرے کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( وَيْحَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ )) ”تجھ پر افسوس! تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی۔“ پھر فرمایا: ”اگر تم میں سے کسی کو کسی کی لامحالہ تعریف کرنی ہے تو اس طرح کہا کرے کہ میں اسے اس طرح گمان کرتا ہوں، اللہ کے سامنے کسی کا تزکیہ نہ کرے (پاک قرار نہ دے)۔“ [ بخاری، الأدب، باب ما یکرہ من التمادح : ۶۰۶۱ ]

**آیت 50** وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا: یعنی ان کے یہ جھوٹے دعوے اور اللہ تعالیٰ پر افترا ہی ان کے سخت گناہ گار ہونے کے لیے کافی ہے۔

**آیت 52،51** ① اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ ...... : عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جبت سے مراد جادو اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔“ [ بخاری، التفسیر، باب قولہ : ﴿و إن كنتم مرضى أو على سفر﴾ قبل ح : ۴۵۸۳، معلقاً ] جوہری نے الصحاح میں فرمایا: ”جبت کا لفظ بت، کاہن، جادوگر اور اس قسم کی دوسری چیزوں پر استعمال ہوتا ہے۔“ اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ پرندوں کو اڑا کر شگون لینا اور زمین پر لکیریں کھینچ کر فال گیری کرنا جبت میں شامل ہے۔ [ أبو داؤد، الطب،

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

یا ان کے پاس سلطنت کا کچھ حصہ ہے؟ تو اس وقت تو وہ لوگوں کو کھجور کی گٹھلی کے نقطہ کے برابر نہ دیں گے ﴿۵۳﴾ یا وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے، تو ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور ہم نے انھیں بہت بڑی سلطنت عطا فرمائی ﴿۵۴﴾

باب في الخط وزجر الطير : ۳۹۰۷ ] اور طاغوت سے مراد شیطان ہے اور ہر وہ شخص جو گناہ کی دعوت دے اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ عرب میں بتوں کے ترجمان ہوتے تھے، جو ان کی زبان سے جھوٹ نقل کرتے اور لوگوں کو گمراہ کرتے، ان کو طاغوت کہا جاتا تھا۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ ( ۲۵۲ )۔

2 یہودیوں کی رسول اللہ ﷺ سے مخالفت ہوئی تو انھوں نے مشرکین مکہ سے رابطہ قائم کر لیا اور ان سے کہنے لگے کہ تمھارا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے۔ یہ سب کچھ اس حسد کی وجہ سے تھا کہ نبوت اور ریاست دینی ہمارے سوا دوسروں کو کیوں مل گئی، اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان کو الزام دیا۔

**آیت 53** اوپر کی آیت میں یہود کی جہالت بیان کی کہ وہ بتوں کی پوجا کو اللہ واحد کی عبادت پر ترجیح دیتے ہیں، اس آیت میں ان کے بخل اور حسد کو بیان فرمایا۔ بخل تو یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے کسی کو دی ہو دوسروں سے اسے روک لینا اور حسد یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو دی ہے، اس پر جلے بھنے اور آرزو کرے کہ اس سے چھن جائے، پھر خواہ مجھے ملے یا نہ ملے۔ پس حسد اور بخل دونوں میں یہ بات قدرے مشترک ہے کہ دوسروں سے نعمت کو روکنا اور یہ گوارا نہ کرنا کہ اپنی ذات کے سوا دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ ( کبیر، قرطبی ) یہود میں یہ دونوں صفتیں اتم اور اکمل طور پر پائی جاتی تھیں، قرآن نے بتایا کہ یہ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں اور ان کے بخل کا یہ حال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ملک و سلطنت میں ان کو کچھ اختیار ہوتا تو کسی کو "تل برابر" بھی نہ دیتے۔ "نَقِيْرًا" دراصل اس نقطے کو کہتے ہیں جو گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے اور یہ قلت میں ضرب المثل ہے۔

**آیت 54** مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں مدت دراز تک نبوت اور بادشاہت رہی ہے اور داؤد و سلیمان علیہما السلام اور دوسرے اولوا العزم پیغمبر ہو گزرے ہیں، اب بنو اسماعیل میں سے رسول اللہ ﷺ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرما دیا گیا ہے تو یہ کیوں حسد کر رہے ہیں؟! یہاں "مِنْ فَضْلِهٖ" سے مراد نبوت اور دین و دنیا کی وہ عزت ہے جو نبوت کی برکت سے حاصل ہوئی۔ "الْكِتٰبَ" سے مراد کتاب الٰہی اور "وَالْحِكْمَةَ" سے اس کا فہم اور اس پر عمل کرنا مراد ہے اور "مُلْكًا عَظِيْمًا" سے مراد سلطنت اور غلبہ و اقتدار ہے۔ ( رازی، ابن کثیر )

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ٝ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

پھران میں سے کوئی وہ ہے جو اس پر ایمان لے آیا اور کوئی وہ ہے جو اس سے منہ موڑ گیا اور جلانے کے لیے جہنم کافی ہے ﴿۵۵﴾ بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ہم انھیں عنقریب ایک سخت آگ میں جھونکیں گے، جب بھی ان کی کھالیں گل سڑ جائیں گی ہم انھیں ان کے علاوہ اور کھالیں بدل دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۶﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ہم انھیں عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ ان کے لیے ان میں نہایت پاک صاف بیویاں ہوں گی اور ہم انھیں بہت گھنے سائے میں داخل کریں گے ﴿۵۷﴾

**آیت 55** "اٰمَنَ بِهٖ" میں "بِهٖ" کی ضمیر "اِیْتَاءٌ" کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے جو "اٰتَيْنَآ" سے مفہوم ہوتا ہے، یعنی بعض تو اس ایتائے انعام (انعام دینے) پر ایمان لے آئے اور بعض اس سے منہ موڑ گئے اور لوگوں کو بھی روکنے کی کوشش کی (صَدَّ عَنْهُ کے دونوں معنی ہیں، منہ موڑنا اور روکنا) لہٰذا آپ ان کے کفر سے دل گیر نہ ہوں۔ (ابن کثیر) اگر اس ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ دیکھ لینے کے باوجود یہود میں سے کچھ لوگ تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے، لیکن اکثر نہ صرف خود ایمان نہیں لائے بلکہ جو ایمان لانا چاہتے ہیں انھیں بھی روکنا چاہتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا کے لیے جہنم کافی ہے۔ (فتح القدیر، کبیر)

**آیت 56** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا...... : یہاں بتایا کہ یہ سزا اہل کتاب کے ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ سب کفار کو ملے گی۔ (رازی) ﴿ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ﴾ سے اہل جہنم کے عذاب کی سختی بیان کرنا مقصود ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اتنی تیز آگ میں ان کے چمڑے ایک ایک لمحے میں کتنی کتنی بار جل کر دوبارہ تبدیل ہوں گے، البتہ یہ تو صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جہنمیوں کا جسم بہت بڑھا دیا جائے گا، حدیث میں ہے: "کافر کے کان کی کونپل اور کندھے کے درمیان ستر سال کا فاصلہ ہو گا۔" [ أحمد : ٦/١١٦، ١١٧، ح : ٢٤٩٠٩ و سنده صحيح۔ هداية المستنير ] اور اسی طرح فرمایا: "کافر کی داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہو گی اور اس کی جلد کی موٹائی تین دن کے فاصلے کے برابر ہو گی۔" [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها و أهلها : ٢٨٥١ ] اس طرح انھیں دائمی عذاب ہوتا رہے گا۔

**آیت 57** ① وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ...... : قرآن پاک میں عموماً وعدہ اور وعید کو ایک ساتھ بیان فرمایا گیا ہے

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰٓى أَهْلِهَا ۙ وَ إِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو، یقیناً اللہ تمھیں یہ بہت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۵۸﴾

اور اس اسلوب کی وجہ سے قرآن کو "كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا" فرمایا ہے اور وعظ و تذکیر کا یہ مؤثر ترین انداز ہے۔ بعض نے اس آیت سے سمجھا ہے کہ عمل صالح ایمان سے الگ چیز ہے، کیونکہ یہ دونوں عطف کے ساتھ آئے ہیں، مگر قرآن نے متعدد آیات میں عمل صالح پر زور دینے کے لیے عمل صالح کو الگ عطف کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ورنہ یہ بھی ایمان میں داخل ہے۔ (دیکھیے سورۂ عصر کی تفسیر) جنت کی نہروں کا بیان سورۂ محمد کی آیت (۱۵) میں دیکھیے "اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ" کے لیے سورۂ رحمٰن کا آخری حصہ اور سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

② وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا: اسی سائے کو دوسری آیت میں "ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ" فرمایا ہے۔ (دیکھیے سورۂ واقعہ : ۲۷ تا ۳۰) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں ایک درخت ایسا ہے جس کے سائے میں سوار سو برس تک چلے گا پھر بھی اسے طے نہ کر پائے گا۔" [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة ..... : ۳۲۵۱، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ایک حدیث میں اس درخت کا نام "شجرۃ الخلد" آیا ہے۔ [ أحمد : ۲/۴۵۵ ح : ۹۸۸۳ ]

**آیت 58** ① إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا ...... : درمیان میں کفار کے احوال اور ان کے حق میں وعید کا ذکر آ گیا تھا، اب دوبارہ سلسلۂ احکام شروع ہو رہا ہے۔ یہود امانت میں خیانت کرتے اور فیصلہ میں رشوت لے کر ظلم و جور کرتے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان باتوں سے دور رہنے کا حکم دیا۔ یہاں امانت سے مراد گو ہر قسم کی امانت ہے، اس کا تعلق مذہب و دیانت سے ہو یا دنیاوی معاملات سے، لیکن یہود حق کو چھپا کر علمی امانت میں خیانت کے مرتکب بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے منافق کی تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ امانت میں خیانت اتنا [illegible] ہے کہ شہادت سے بھی معاف نہیں ہوتا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خیبر سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ وادیٔ القریٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو آپ ﷺ کا غلام "مدعم" آپ ﷺ کی اونٹنی سے پالان اتار رہا تھا کہ اسے ایک اندھا تیر لگا جس نے اسے قتل کر دیا، لوگوں نے کہا، اسے جنت مبارک ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ چادر جو اس نے خیبر کے دن غنیمتوں میں سے لی تھی، جو ابھی تقسیم نہیں ہوئی تھیں، اس پر آگ بن کر شعلے مار رہی ہے۔" [ بخاري، المغازي، باب غزوة خيبر : ۴۲۳۴ ]

شہادت سے اس گناہ کے معاف نہ ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگوں کے حقوق ہیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے ﴿۵۹﴾

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شہید کے لیے ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے سوائے قرض کے۔'' [ مسلم، الإمارة، باب من قتل في سبيل الله...... : ۱۸۸۵ ] البتہ ایک حدیث میں ایک بشارت ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص لوگوں کے اموال لے اور ان کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا اور جو شخص لوگوں کے اموال لے اور انھیں تلف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تلف کرے گا۔'' [ بخاری، الاستقراض، باب من أخذ أموال الناس...... : ۲۳۸۷ ] اس سے معلوم ہوا کہ اگر شہید ہونے والے کا ارادہ ادائیگی کا تھا تو اگر وارث ادا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے ادا کر دے گا، لیکن ظاہر ہے کہ خیانت والے کا تو یہ ارادہ ہوتا ہی نہیں۔ امانت میں لوگوں سے لی ہوئی امانتیں بھی شامل ہیں اور عہدوں اور مناصب کی تقسیم بھی، جب ذمہ دار شخص کو معلوم ہو کہ فلاں صاحب اس منصب کا اہل نہیں تو پھر اپنے ذاتی تعلق یا خاندانی یا کسی دنیوی مقصد کے لیے یا کوٹہ سسٹم کی وجہ سے اہل کو چھوڑ کر نااہل شخص کو وہ منصب دیا جائے تو یہ بہت بڑی خیانت ہے۔ سورۂ احزاب (۷۲)، سورۂ مومنون (۸) اور سورۂ بقرہ (۲۸۳) میں بھی امانت داری کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

② وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ: قرآن مجید میں کئی مقامات پر عدل کی تاکید فرمائی، خواہ وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو، دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۵) اور کسی دشمنی کی بنا پر عدل نہ کرنے سے بھی منع فرمایا۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۸)، سورۂ نحل (۹۰) اور سورۂ حجرات (۹) وہ سات خوش قسمت لوگ جنھیں روزِ قیامت عرش کا سایہ ملے گا، ان میں پہلا شخص عادل حکمران ہوگا۔ [ بخاری، الأذان، باب من جلس في المسجد...... : ٦٦٠ ]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک انصاف کرنے والے جو اپنے فیصلے میں، اپنے اہل و عیال میں اور رعایا میں انصاف کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر ہوں گے، رحمان عز و جل کے دائیں طرف ہوں گے اور رحمان کے دونوں ہاتھ ہی دائیں ہیں۔'' [ مسلم، الإمارة، باب فضيلة الأمير العادل...... : ۱۸۲۷، عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً اللہ تعالیٰ قاضی اور حاکم کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم نہ کرے اور جب وہ ظلم کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔'' [ ابن ماجه، الأحكام، باب التغليظ في الحيف والرشوة : ۲۳۱۲، عن عبد الله بن أوفى رضي الله عنه وصححه الألباني ]

آیت 59 ① اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ......: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رعایا کو، چاہے فوج کے افراد ہوں یا

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ

کیا تو نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جوگمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا۔ چاہتے یہ ہیں کہ آپس کے فیصلے غیراللہ کی طرف لے جائیں، حالانکہ انھیں حکم دیا گیا

تمام لوگ، انھیں اپنی، اپنے رسول ﷺ کی اور حکام و امراء کی اطاعت کا حکم دیا ہے، الا یہ کہ حکام اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اختیار والے بادشاہ، قاضی اور جو کسی کام پر مقرر ہو اس کے حکم پر چلنا ضروری ہے، جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف حکم نہ کرے، اگر صریح خلاف کرے تو وہ حکم نہ مانیے۔'' (موضح) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ )) ''اطاعت صرف نیکی کے امور میں ہے۔'' [ بخاري، الأحكام، باب السمع والطاعة للإمام ...... : ۷۱۴۵، عن علي رضی اللہ عنہ ]

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر مسلمان کو لازم ہے کہ وہ ہر کام میں، خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، سمع و طاعت بجا لائے، بشرطیکہ اسے کسی معصیت کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اگر اسے کسی معصیت کے کام کا حکم دیا گیا ہو تو اس میں سمع و طاعت نہیں۔'' [ بخاري، الأحكام، باب السمع والطاعة للإمام ...... : ۷۱۴۴ ]

(۵) فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ ...... : اس آیت میں ایک نہایت اہم حکم دیا ہے کہ باہمی نزاع اور جھگڑے کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع شرط ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو قرآن کی اطاعت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت آپ ﷺ کی زندگی کے بعد آپ کی سنت کی اطاعت ہے اور یہ اطاعتیں اصل اور مستقل ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیث بھی اسلامی قانون کا مستقل ماخذ ہے۔ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس آیت سے مقلدین تقلید کے واجب ہونے پر دلیل لیتے ہیں لیکن یہ دلیل نہیں ہو سکتی، کیونکہ ''اولی الامر'' سے بادشاہ اور حکام مراد ہیں۔ (دیکھیے فوائد موضح) اگر بعض اہل علم کے مطابق اس سے علمائے دین مراد ہیں تو اس میں اول تو کسی عالم کی تخصیص نہیں ہے، دوسرے بہ فرض تسلیم عالم کی تقلید کا حکم ہے تو وہ اسی وقت تک ہے کہ اس کا حکم قرآن و حدیث کے موافق ہو (اگرچہ یہ تقلید نہیں بلکہ قرآن و حدیث پر عمل ہے) پھر خود چاروں اماموں نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے اور قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ ائمہ کی اتباع میں جھگڑا ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔'' (ترجمان) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ، تابعین یا ائمہ میں اگر کسی مسئلے پر نزاع ہو تو کسی کا قول بھی حجت نہیں، بلکہ وہاں صرف قرآن و حدیث پر عمل ہوگا۔

(۶) ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا: اگر دو مسلمان جھگڑتے ہیں اور ایک نے کہا، چل شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا، میں شرع کو (کچھ) نہیں سمجھتا یا مجھے شرع سے کام نہیں وہ بے شک کافر ہوا۔ (موضح)

آیت 61،60 اوپر کی آیات میں مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، یہاں فرمایا کہ

ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝۶۰ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖۗ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ۝۶۲ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ۝۶۳

ہے کہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہ کر دے، بہت دور گمراہ کرنا ﴿۶۰﴾ اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو تو منافقوں کو دیکھے گا کہ تجھ سے منہ موڑ لیتے ہیں، صاف منہ موڑنا ﴿۶۱﴾ پھر کیسے گزرتی ہے اس وقت جب انھیں کوئی مصیبت اس کی وجہ سے پہنچتی ہے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا، پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں کہ ہم نے تو بھلائی اور آپس میں ملانے کے سوا کچھ نہیں چاہا تھا ﴿۶۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، سو تو ان سے دھیان ہٹا لے اور انھیں نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں بہت اثر کرنے والی ہو ﴿۶۳﴾

منافق ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں اور کبھی آپ ﷺ کے فیصلے اور حکم پر راضی نہیں ہوتے، بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی مشرک سردار یا یہودی یا نصرانی عدالت یا کسی کاہن سے فیصلہ کروایا جائے، حالانکہ اسلام ان سب کے انکار کا حکم دیتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل نہ کرنے والی ہر عدالت کو طاغوت قرار دیتا ہے۔ مومن کا کام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ سننا اور ماننا ہے۔ (دیکھیے نور: ۵۱) اور منافقوں کا حال اس کے برعکس ہے (دیکھیے نور: ۴۸۔ لقمان: ۲۱) افسوس کہ اس وقت اکثر مسلمان ملکوں کی عدالتوں میں قرآن و سنت کا نظام عدل نافذ ہی نہیں، بلکہ کفار کے بنائے ہوئے قانون نافذ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک قرآن و سنت کا کوئی متبع حکمران کفار کے اس نظام کو بزور بازو نکال باہر نہیں کرتا اس وقت تک عدالتوں میں قرآن و سنت کی رسائی مشکل ہے۔

**آیت 63،62** یعنی جب اپنے کرتوتوں کے سبب عتاب الٰہی کا شکار ہو کر مصیبتوں میں پھنستے ہیں تو پھر آ کر کہتے ہیں کہ کسی دوسری جگہ جانے سے مقصد یہ نہیں تھا کہ وہاں سے ہم فیصلہ کروائیں گے، یا آپ سے زیادہ ہمیں وہاں سے انصاف ملے گا، بلکہ مقصد صلح اور ملاپ کرانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم ان کے دلوں کے بھیدوں سے واقف ہیں، جس پر ہم انھیں جزا دیں گے، لیکن اے پیغمبر! آپ ان کے ظاہر کو سامنے رکھتے ہوئے درگزر ہی فرمائیے اور وعظ و نصیحت اور قول بلیغ کے ذریعے سے ان کے باطن کی اصلاح کی کوشش جاری رکھیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے دشمنوں کی سازش کو عفو و درگزر، وعظ و نصیحت اور قول بلیغ ہی کے ذریعے سے ناکام بنانے کی سعی کی جانی چاہیے۔ یاد رہے! یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب منافق مغلوب تھے اور اسلام

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے اور اگر واقعی یہ لوگ، جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تیرے پاس آتے، پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے بخشش مانگتا تو اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان پاتے ﴿۶۴﴾ پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں

اور اس کے احکام اور عدالتیں غالب تھیں اور منافق دوسرے لوگوں سے فیصلہ کرانے پر پشیمان ہو کر عذر معذرتیں کرتے تھے۔

آیت 64 ① وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ ...... : اطاعت رسول کی دوبارہ ترغیب دی ہے، یعنی اللہ کے رسول دنیا میں اس لیے آتے ہیں کہ تمام معاملات میں اللہ کے حکم کے مطابق ان کی اطاعت کی جائے۔ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا معنی اللہ کی توفیق و اعانت بھی کیا گیا ہے، وہ بھی درست ہے، معلوم ہوا ہر رسول واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

② وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا ......: اپنی جان پر ظلم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس آنا اور آپ سے استغفار کروانا آپ کی زندگی کے ساتھ خاص تھا، آپ کی وفات کے بعد کسی صحابی سے ثابت نہیں کہ وہ آپ کی قبر مبارک پر آیا ہو اور آپ سے دعا کرنے کی درخواست کی ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں ایک بدوی کی حکایت نقل کی ہے، جس نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کے پاس آ کر یہ آیت پڑھتے ہوئے کچھ شعر پڑھے اور کہا کہ میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور آپ کو سفارشی بناتا ہوں، اس قبر انور کے پاس بیٹھنے والے ایک شخص نے کہا، خواب میں آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے: ''اس بدوی کو بخش دیا گیا ہے۔'' لیکن یہ ایک حکایت ہے جو آیت کی مناسبت سے ذکر کر دی گئی ہے، یہ نہ آیت کی تفسیر ہے نہ حدیث ہے۔ "الصارم المنکی (ص: ۲۲۳)" میں لکھا ہے کہ اس حکایت کی سند نہایت کمزور ہے اور نبی کے خواب کے علاوہ کسی کا خواب دین میں دلیل بھی نہیں بنتا۔ آیت سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ سے دعائے مغفرت کروائی جا سکتی تھی، مگر آپ کی وفات کے بعد اس آیت کی رو سے قبر پر جا کر سفارش اور دعا کی درخواست کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

③ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ : اللہ تعالیٰ کی بخشش حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ و استغفار ضروری اور کافی ہے، لیکن یہاں جو کہا گیا ہے کہ اے پیغمبر! وہ تیرے پاس آتے اور اللہ سے بخشش مانگتے اور تو بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرتا، تو یہ اس لیے کہ چونکہ انھوں نے جھگڑے کے فیصلے کے لیے دوسروں کی طرف رجوع کر کے آپ کی شان کے نامناسب حرکت کی تھی، اس لیے اس کے ازالے کے لیے انھیں آپ ﷺ کے پاس آنے کی تاکید فرمائی۔

آیت 65 ① فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ......: اس آیت کی شان نزول میں ایک مسلمان اور یہودی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کروانے کے بعد عمر رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کروانے گیا تھا، جس پر عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسلمان کی گردن

يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّ
قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں
اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کرلیں، پوری طرح تسلیم کرنا ﴿۶۵﴾

اڑا دی تھی۔ مگر یہ واقعہ سنداً صحیح نہیں ہے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی وضاحت کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے اصرار کے باوجود منافقوں کی بڑی بڑی گستاخیوں پر نہ انھیں قتل کرتے، نہ قتل کی اجازت دیتے اور وجہ یہ بتاتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔[ مسلم، الزکوۃ، باب ذکر الخوارج : ۱۰۶۳ ]

② عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کے درمیان حرہ کی نالیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ کی زمین اوپر کی جانب تھی، جہاں سے پانی آتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ سے انصاری کے حق میں رعایت کی سفارش کی اور فرمایا: ''اپنے باغ کو پانی دے کر اپنے پڑوسی کے لیے چھوڑ دو۔'' اس پر انصاری نے کہا: ''یہ اس لیے کہ زبیر (رضی اللہ عنہ) آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔'' مطلب یہ تھا کہ آپ نے اس رشتے کی رعایت کی ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف محسوس ہوئی اور فرمایا: ''زبیر! اپنے باغ کو اتنا پانی دو کہ منڈیروں تک چڑھ جائے، پھر اس کے لیے چھوڑ دو۔'' پہلے آپ نے انصاری کی سفارش کی تھی، اب جب اس نے آپ کو غصہ دلایا تو آپ نے سفارش کے بجائے فیصلہ کیا اور زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کا پورا حق دلوایا۔ زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ آیت: ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ اس بارے میں نازل ہوئی۔[ مسلم، الفضائل، باب وجوب اتباعه ﷺ : ۲۳۵۷۔ بخاری : ۴۵۸۵ ]

③ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر مومن ہونے کی تین شرطیں بیان کی ہیں، پہلی یہ کہ کسی بھی جھگڑے کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے پاس نہ لے جایا جائے۔ ( دیکھیے نور : ۵۱۔ احزاب : ۳۶ ) دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کی جائے اور تیسری یہ کہ صاف اعلان کر کے اس فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن و سنت سے فیصلہ طلب کیا جائے گا۔ اس سے منکرین حدیث کے ایمان کی حقیقت پوری طرح کھل جاتی ہے۔ یہ آیت منکرین حدیث کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جن کے امام یا پیر کے خلاف کوئی آیت یا حدیث آ جائے تو وہ صرف دل میں تنگی ہی محسوس نہیں کرتے بلکہ ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ کیا ہمارے امام کو اس آیت و حدیث کا علم نہ تھا، یا پھر اس کی تاویل کرنے یا اسے منسوخ قرار دینے کے لیے اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت کے صریح الفاظ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف دل میں ذرہ بھر تنگی یا ناپسندیدگی محسوس کی جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۟ۙ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ۟ۙ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ

اور اگر ہم واقعی ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو، یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو وہ ایسا نہ کرتے مگر ان میں سے تھوڑے اور اگر وہ واقعی اس پر عمل کرتے جو انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لیے بہتر اور زیادہ ثابت قدم رکھنے والا ہوتا ﴿۶۶﴾ اور اس وقت ہم یقیناً انھیں اپنے پاس سے بہت بڑا اجر دیتے ﴿۶۷﴾ اور یقیناً ہم انھیں سیدھے راستے پر چلاتے ﴿۶۸﴾ اور جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے

**آیت 66تا68** ① ان آیات کا تعلق بھی منافقین سے ہے، ان میں انھیں اخلاص اور ترک نفاق کی ترغیب دی گئی ہے۔ یعنی چاہیے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کیا جائے، (مگر یہ ایسے ہیں کہ) اگر کہیں ان کو اللہ تعالیٰ اپنی جانیں ہلاک کر ڈالنے یا اپنے گھر چھوڑ دینے کا حکم دے دیتا تو یہ اسے کب بجا لانے والے تھے، جو حکم ہم نے انھیں دیے ہیں وہ نہایت آسان اور محض ان کی خیر خواہی کے لیے ہیں، نصیحت مانیں اور ان احکام پر چلیں، نفاق جاتا رہے گا، ایمان کامل نصیب ہوگا، اس کو غنیمت سمجھیں۔ (موضح)

② ابن عاشور فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ تمہید ہے جہاد کے ان احکام کی جو ساتھ ہی شروع ہو رہے ہیں: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴾ [ النساء : ۷۱ ] اور ان آیات کے ساتھ مناسبت یہ بھی ہے کہ اگر ہم ان پر ہجرت یا قتال یعنی ﴿ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ ﴾ فرض کر دیتے تو بہت کم لوگ اس پر عمل کرتے، لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور بے شمار اجر کا باعث ہوتا۔ یعنی ابھی تو ایمان کے اعلیٰ مدارج جو اسلام کی کوہان کی چوٹی ہیں، ان کا حکم بھی آنے والا ہے، کجا یہ کہ یہ لوگ فیصلے بھی کہیں اور سے کروانا چاہتے ہیں۔ [ التحریر والتنویر ]

**آیت 69، 70** ① " وَالصِّدِّيْقِيْنَ " یہ صدق سے مبالغہ ہے، یعنی جو بہت سچا ہو۔ بعض نے کہا، جو کبھی جھوٹ نہ بولے۔ بعض نے کہا، صدیق وہ ہے کہ صدق کی عادت کی وجہ سے اس سے جھوٹ ناممکن ہو اور بعض نے کہا کہ جو اپنے اعتقاد اور قول میں سچا ہو اور اپنے فعل کے ساتھ اپنے صدق کو ثابت کرے۔ (مفردات) استاد محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صدیق تصدیق سے مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی جو جملہ امور دین کی تصدیق کرنے والا ہو اور کبھی کسی معاملے میں خلجان اور شک اس کے دل میں پیدا نہ ہو، یا وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق میں سبقت کرنے کی وجہ سے دوسروں کے لیے اسوہ بنے، اس اعتبار سے اس امت کے صدیق ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دوسرے افاضل صحابہ کے لیے نمونہ بنے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ بھی اول مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں، مگر چھوٹے بچے ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لیے نمونہ نہیں بن سکے۔ چونکہ

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۞ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۞ ع ۱۱

جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں ۞ یہی اللہ کی طرف سے خاص فضل ہے اور اللہ کافی ہے سب کچھ جاننے والا ۞

نبی کے بعد صدیق کا درجہ ہے، اس لیے علمائے اہل سنت کا اجماع ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں۔ ''وَ الشُّهَدَآءِ'' یہ شہید کی جمع ہے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دی اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شہداء ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ''وَ الصّٰلِحِيْنَ'' اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہر طرح عقیدہ وعمل کے اعتبار سے صالح اور درست رہے اور ہر قسم کے فساد سے محفوظ رہے۔ (رازی)

② مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ...... : یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے انعام کا ذکر ہے کہ انھیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت، یعنی ان کا ساتھ نصیب ہوگا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا شوق بہت زیادہ تھا، دنیا میں بھی وہ اس کے بہت مشتاق تھے اور انھیں جنت میں آپ کی معیت کا شوق تو حد سے زیادہ تھا۔ ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات بسر کیا کرتا تھا اور آپ کے لیے پانی اور دیگر ضروریات کا اہتمام کر دیا کرتا تھا، ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کچھ مانگ لو!'' میں نے عرض کی: ''میں آپ سے جنت میں آپ کی مرافقت (ساتھ) کا سوال کرتا ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی اور سوال؟'' میں نے عرض کی: ''وہ بھی یہی ہے۔'' اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر سجدوں کی کثرت کے ساتھ اپنے بارے میں میری مدد کرو۔'' [ مسلم، الصلاة، باب فضل السجود والحث علیه : ٤٨٩ ] یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالص محبت اور اطاعت کی برکت ہے کہ اگر عمل میں کچھ کمی ہوئی تب بھی اطاعت واخلاص کی وجہ سے اتنے اونچے لوگوں کا ساتھ مل جائے گا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو کچھ لوگوں سے محبت رکھتا ہے، مگر ابھی تک (اعمال میں) ان سے نہیں مل سکا۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہوگی۔'' [ بخاری، الأدب، باب علامة الحب فی اللہ...... : ٦١٦٩ ] حقیقت یہ ہے کہ اطاعت اور محبت لازم وملزوم ہیں، وہ محبت جس میں اطاعت نہ ہو جھوٹی ہے اور وہ اطاعت جس کی بنیاد محبت نہ ہو، دکھاوا ہے۔ ہاں، محبت واخلاص کے ساتھ عمل واطاعت میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے پورا کر دے گا، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سے زیادہ اچھا ساتھی کوئی نہیں اور اللہ کے فضل سے بڑی نعمت کوئی نہیں اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کے حالات خوب جانتا ہے کہ کسے کس کے ساتھ رکھنا ہے۔

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت ہے، لہٰذا مجھے امید ہے کہ ان کے ساتھ محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ساتھ ہی اٹھائیں گے، گو میں ان جیسے عمل نہیں کر سکا۔'' [ بخاری، فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ...... : ٣٦٨٨ ]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے بچاؤ کا سامان پکڑو، پھر دستوں کی صورت میں نکلو، یا اکٹھے ہو کر نکلو ﴿۷۱﴾ اور بے شک تم میں سے یقیناً کوئی ایسا بھی ہے جو ہر صورت دیر لگا دے گا، پھر اگر تمھیں کوئی مصیبت آ پہنچی تو کہے گا بے شک اللہ نے مجھ پر انعام فرمایا، جب کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا ﴿۷۲﴾ اور اگر واقعی تمھیں اللہ کی طرف سے کوئی فضل حاصل ہو گیا تو یقیناً وہ ضرور کہے گا، جیسے تمھارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی نہ تھی، اے کاش کہ میں ان کے ساتھ ہوتا تو بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا ﴿۷۳﴾ پس لازم ہے کہ اللہ کے راستے میں وہ لوگ لڑیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچتے ہیں اور جو شخص اللہ کے راستے میں لڑے، پھر قتل کر دیا جائے، یا غالب آ جائے تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے ﴿۷۴﴾

**آیت 71** اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم فرمایا اور اس کی ترغیب کے سلسلہ میں یہ بھی بتایا کہ اس اطاعت سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت حاصل ہو گی۔ اب اس آیت میں جہاد کا حکم فرمایا، جو سب سے مشکل اطاعت ہے اور کفار و منافقین سے پورا بچاؤ رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ حالات کے مطابق الگ الگ دستوں یا اکٹھے لشکر کی صورت نکلنے میں سے جو بہتر ہو اختیار کرو۔

**آیت 73،72** یہ مسلمانوں میں منافقوں کے کردار کا تذکرہ ہے، یعنی ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو دیدہ و دانستہ اور حیلوں بہانوں سے جہاد پر نکلنے میں دیر کرتے ہیں اور پیچھے رہ جانے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اگر اس سفر جہاد میں مسلمانوں کو کچھ تکلیف پہنچے تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں پیچھے رہ گیا، ورنہ مجھے بھی وہ دکھ اٹھانا پڑتا جو دوسرے مسلمانوں نے اٹھایا ہے اور اگر مسلمانوں کو فتح و خوشی نصیب ہو اور غنیمت کا مال ہاتھ لگے تو حسرت سے کہتے ہیں کہ اگر ہم بھی ان میں شامل ہوتے تو ہمارا بھی کام بن جاتا۔ یہ جملہ وہ اس انداز سے ادا کرتے جیسے پہلے ان کا اور مسلمانوں کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں انھیں محض دنیاوی تکلیف اور دنیاوی مفادات ہی کا احساس ہوتا ہے، اخروی زندگی یا رضائے الٰہی سے انھیں کبھی غرض نہیں ہوتی اور یہی ان کے منافق ہونے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی دلیل ہے۔

**آیت 74** ① فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : اوپر کی دو آیتوں میں جہاد سے پیچھے رہنے والوں اور دوسروں کو روکنے

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اوران بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مدد گار بنا ﴿۷۵﴾

والوں، یعنی " مُبَطِّئِيْنَ " کی مذمت کے بعد اب مخلصین کو ترغیب دی جا رہی ہے۔ " شَرٰی يَشْرِيْ " کے معنی بیچنا اور خریدنا دونوں آتے ہیں، یہاں ترجمہ بیچنے کا کیا گیا ہے اور اکثر مفسرین نے اسے ترجیح دی ہے، لیکن اگر اسے خریدنے کے معنی میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جو منافق گھر میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے آخرت کے بدلے دنیا خرید رہے ہیں ان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں اور آخرت کا نقصان کر کے دنیا حاصل نہ کریں۔ (فتح القدیر، طبری)

② فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا: یعنی مسلمانوں پر لازم ہے کہ دنیا کی زندگی پر نظر نہ رکھیں، بلکہ آخرت کی خواہش رکھیں اور سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہر طرح نفع ہے۔ (موضح) مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں، شہادت یا فتح اور دونوں مسلمانوں کے حق میں خوش کن ہیں، کیونکہ دونوں ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر عظیم کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ﴾ [ التوبة : ٥٢ ] ''کہہ دے تم ہمارے بارے میں دو بہترین چیزوں میں سے ایک کے سوا کس کا انتظار کرتے ہو۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والے اس شخص کے لیے ضمانت دی ہے جسے اس کے راستے میں جہاد اور اس کے کلمات کی تصدیق کے سوا کوئی چیز نہیں نکالتی کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا، یا اس کی رہائش گاہ پر لائے گا جہاں سے وہ نکلا تھا، ساتھ وہ اجر اور غنیمت بھی ہوگی جو اس نے حاصل کی۔'' [ بخاری، فرض الخمس، باب قول النبی ﷺ: أحلت لکم الغنائم : ۳۱۲۳، عن أبی ہریرة رضی اللہ عنہ ]

**آیت 75** وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ ...... : اس آیت کا تعلق بھی ترغیب جہاد سے ہے، یعنی دو وجوہ کی بنا پر تمھارے لیے کفار سے لڑنا ضروری ہے، اول اعلائے کلمۃ اللہ، یعنی اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے، دوم ان مظلوم مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو کفار کے چنگل میں بے بس پڑے ہیں۔ (قرطبی) مکہ معظمہ میں بہت سے لوگ ایسے رہ گئے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے تھے اور ان کے اقارب ان پر تشدد کرنے لگے تھے، تاکہ انھیں اسلام سے پھیر کر پھر کافر بنا لیں۔ پس " الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا " سے مراد مکہ ہے اور مشرک ہونے کی وجہ سے یا مظلوم مسلمانوں کو ستانے کی وجہ سے اس کے باشندوں کو ظالم فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اور میری والدہ بھی ان " الْمُسْتَضْعَفِيْنَ " (بے بس مسلمانوں)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾

وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا وہ باطل معبود کے راستے میں لڑتے ہیں۔ پس تم شیطان کے دوستوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے ﴿٧٦﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، پھر جب ان پر لڑنا لکھا گیا اچانک ان میں سے کچھ لوگ، لوگوں سے ڈرنے لگے، جیسے اللہ سے ڈرنا ہو، یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! تو نے ہم پر لڑنا کیوں لکھ دیا، تو نے ہمیں ایک قریب وقت تک مہلت کیوں نہ دی۔ کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے اور تم پر دھاگے برابر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿٧٧﴾

میں شامل تھے (جنھیں اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا)۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ إلا المستضعفين من...... ﴾ : ۴۵۹۷ ] مدینہ میں رسول اللہ ﷺ ان ''مستضعفین'' کے حق میں نام لے کر دعا فرمایا کرتے تھے: (( اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ وَ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَ عَيَّاشَ بْنَ أَبِيْ رَبِيْعَةَ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ )) ''یا اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور (مکہ میں گھرے ہوئے) دوسرے بے بس مسلمانوں کو رہائی دلا۔'' [ بخاری، الأذان، باب يهوى بالتكبير حين يسجد : ۸۰۴، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] افسوس کہ اس وقت مسلمان کفار کے مختلف ممالک کی غلامی میں بے بس ہیں، وہ انھیں نہ آزادی دیتے ہیں، نہ نکلنے دیتے ہیں اور نہ کوئی مسلمان ملک انھیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے، بتائیں اس وقت سے بڑھ کر جہاد کب فرض ہوگا؟ آیت میں مسلمانوں کو تمام مظلوم اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے لڑنے کا حکم ہے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، جیسے اس وقت بھارت میں مسلمان اور شودر ہندو دونوں ظلم کا شکار ہیں۔

آیت 76 اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : جہاد کی فرضیت اور ترغیب کے بعد اس آیت میں بتایا کہ جہاد کی ظاہری صورت کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ جہاد اپنے مقصد کے اعتبار سے جہاد ہے، مومن ہمیشہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرتا ہے اور کافر کسی طاغوتی طاقت کو بچانے یا مضبوط کرنے کے لیے لڑتے ہیں، لہٰذا تم ان سے خوب لڑو۔ شیطان خواہ اپنے دوستوں کو کتنے ہی مکر و فریب سمجھائے، مگر تمھارے خلاف وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

آیت 77 ① اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ ......: یعنی جب تک مسلمان مکہ میں تھے اور کافر انھیں ایذا دیتے تھے اللہ تعالیٰ

اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا ﴿۷۸﴾

تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں ﴿۷۸﴾

نے انھیں لڑنے سے روکے رکھا اور صبر کا حکم فرمایا، اب جو (مدینہ منورہ میں) لڑائی کا حکم آیا ہے تو ان کو سمجھنا چاہیے کہ ہماری مراد ملی، لیکن کچے مسلمان کنارہ کرتے ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے برابر آدمیوں سے خطرہ کرتے ہیں۔ (موضح) متعدد روایات میں ہے کہ مسلمانوں نے مکی زندگی میں کئی دفعہ چاہا کہ ظالموں سے دو بدو نمٹیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حکم ہوتا کہ ابھی نماز اور زکوٰۃ (مال خرچ کرنے) کا جو تمھیں حکم ہوا ہے اس کی خوب عادت ڈالو، تاکہ تمھاری تربیت ہو جائے، مدینہ منورہ میں بھی ہجرت کے ابتدائی برسوں میں مسلمانوں کی خواہش یہی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لڑائی کی اجازت آ گئی تو اب بعض خام قسم کے مسلمان اس سے ہچکچانے لگے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر، قرطبی)

② لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کیوں نہ جینے دیا ہم کو تھوڑی سی عمر'' جواب آگے ہے۔ بعض نے ترجمہ کیا ہے: ''قتال کی فرضیت کا یہ حکم نازل کرنے میں تو نے ہمیں کچھ مہلت کیوں نہ دی؟''

③ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ: لڑائی سے ہچکچانے والے کمزور ایمان والوں اور منافقین کا حوصلہ دو باتوں سے بلند فرمایا ہے، پہلی تو یہ کہ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کر کے جہاد کی ترغیب دی ہے، دنیا جتنی بھی ہو فانی ہے اور فانی جتنی بھی ہو قلیل (بہت تھوڑی) ہے۔ فانی اور باقی کا مقابلہ ہی کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس طرح کوئی شخص سمندر میں انگلی ڈبو کر نکالے اور اس کی انگلی میں تھوڑی سی نمی رہ جائے، ایسی ہی مثال دنیا اور آخرت کی ہے۔'' [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب فناء الدنيا ...... : ۲۸۵۸، عن المستورد الفهري رضی اللہ عنہ ] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اور دنیا کی مثال ایک مسافر کی سی ہے جو ایک درخت کے سائے میں آرام کرتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا ہے۔'' [ترمذی، الزهد، باب حديث " ما الدنيا إلا كراكب استظل " : ۲۳۷۷، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ]

آیت 78 ① اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ: ''بُرُوْجٍ'' یہ ''بُرْجٌ'' کی جمع ہے، مضبوط عمارت، قلعہ۔ ''مُّشَیَّدَةٍ'' جو ''اَلشِّیْدُ'' یعنی چونے سے بنے ہوئے ہوں۔ یہ جہاد کے لیے حوصلہ بڑھانے والی دوسری بات ہے کہ جب موت سے تمھیں کسی حال میں چھٹکارا نہیں تو پھر اللہ کی راہ میں جہاد سے کیوں ہچکچاتے ہو۔ اس مطلب کی آیات قرآن کریم میں بہت ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ لَّنْ یَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ ﴾ [ الأحزاب : ١٦ ] ''کہہ دے تمھیں بھاگنا

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کافی گواہ ہے ﴿۷۹﴾

ہرگز نفع نہ دے گا اگر تم مرنے یا قتل ہونے سے بھاگو گے۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ﴾ [الجمعة : ۸ ] ''کہہ دے بلاشبہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو سو یقیناً وہ تم سے ملنے والی ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ﴾ [آل عمران : ۱۸۵ ] ''ہر جان موت کو چکھنے والی ہے۔''

② وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ ...... : اوپر منافقین کی دو مذموم خصلتیں بتائیں، ایک جہاد سے جی چرانا دوسری موت سے ڈرنا، اب یہاں ان کی ایک اور مذموم خصلت کا ذکر فرمایا جو پہلی دونوں سے بری ہے، یعنی نحوست کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرنا۔ یہاں ''حَسَنَةٌ'' (بھلائی) سے مراد فتح، نصرت، غلبہ اور خوش حالی وغیرہ ہے اور ''سَيِّئَةٌ'' سے مراد لڑائی میں نقصان، مصیبت، قتل اور ہزیمت وغیرہ ہے۔

③ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ : یہ ان کے کلام کا جواب ہے کہ برائی اور بھلائی دونوں اسی کی طرف سے اور اسی کے حکم سے ہیں، ہر چیز کا پیدا کرنے والا وہی ہے، بلا اور مصیبت کو کسی کی نحوست قرار دینا قطعی غلط اور پہلے کافروں کا طریقہ ہے، جیسا کہ قوم ثمود کا کہنا: ﴿ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ﴾ [ النمل : ۴۷ ] ''انھوں نے کہا ہم نے تیرے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو تیرے ہمراہ ہیں، بدشگونی پکڑی ہے۔'' اور سورۂ یٰس میں ہے: ﴿ اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ﴾ [ یٰس : ۱۸ ] ''بے شک ہم نے تمھیں منحوس پایا ہے۔'' اور فرعون کی قوم کے بارے میں ہے: ﴿ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ﴾ [ الأعراف : ۱۳۱ ] ''اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔''

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ منافقوں کا ذکر ہے کہ اگر تدبیر جنگ درست آئی اور فتح اور غنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی، یعنی اتفاقاً بن گئی۔ آپ ﷺ کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے نبی ﷺ کی تدبیر پر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب اللہ کی طرف سے ہے، یعنی پیغمبر کی تدبیر اللہ کا الہام ہے، غلط نہیں اور اگر بگڑی تو اس کو بگڑا نہ بوجھو، یہ اللہ تم کو سدھاتا ہے تمھاری تقصیر پر۔ اگلی آیت میں کھول کر بیان فرما دیا۔'' (موضح)

④ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ ...... : یعنی تعجب ہے کہ کسی غور و فکر کے بغیر سمجھ میں آنے والی حقیقت بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (رازی)

آیت 79 ① مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ ...... : اس میں برائی اور بھلائی کا ایک قانون بیان فرما دیا ہے کہ بھلائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے اس کا بھیجنے والا بھی گو اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے مگر اس کا سبب تمھارے گناہ ہوتے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ شوریٰ : ۳۰) اس لیے سلف صالحین کا عام قاعدہ تھا کہ جب کوئی اجتہادی رائے پیش کرتے تو کہتے، اگر یہ

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰ وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۸۱

جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جس نے منہ موڑا تو ہم نے تجھے ان پر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ۝۸۰ اور وہ کہتے ہیں اطاعت ہوگی، پھر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ رات کو اس کے خلاف مشورے کرتا ہے جو وہ کہہ رہا تھا اور اللہ لکھ رہا ہے جو وہ رات کو مشورے کرتے ہیں۔ پس ان سے منہ موڑ لے اور اللہ پر بھروسا کر اور اللہ کافی وکیل ہے ۝۸۱

صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی توفیق سے ہے اور اگر غلط ہے تو ہماری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ (ابن کثیر) اوپر کی آیت میں پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے اعتبار سے "حَسَنَةٌ" اور "سَيِّئَةٌ" دونوں کو "مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" (اللہ کی طرف سے) قرار دیا ہے کہ دونوں چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں، لیکن یہاں سبب اور کسب کی مناسبت سے برائی کی نسبت انسان کی طرف کر دی ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (رازی) موضح میں ہے: ''بندہ کو چاہیے کہ نیکی اللہ کا فضل سمجھے اور تکلیف اپنی تقصیر سے۔ تقصیروں سے اللہ واقف ہے اور وہی جزا دیتا ہے۔''

② وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ...... : یعنی آپ کا اصل منصب رسالت اور تبلیغ ہے اور اللہ گواہ ہے کہ آپ نے اس امانت کے ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی اور وہ کافی گواہ ہے، پھر اس کے بعد بھی اگر کسی کو ہدایت نہیں ہوتی تو آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ (رازی) نیز یہ آپ ﷺ کی عمومی رسالت کا بیان بھی ہے کہ آپ تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۰۸) اور سورۂ سبا (۲۸)۔

**آیت 80** ① مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ ...... : چونکہ نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول اور مبلغ ہیں، اس لیے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے شریعت کے احکام سب ایسے ہیں جنھیں آپ ﷺ کی توضیح کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں، لہٰذا قرآن مجید سمجھنے کے لیے کوئی شخص سنت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ [ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الرسالة للشافعي رقم : ۵۷، ۵۸) أيضًا بحث البيان الرابع ]

② وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ : یعنی اس کے بعد بھی اگر لوگ گمراہ ہوتے ہیں تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں، اس میں آپ ﷺ کو تسلی دی ہے۔ (رازی)

**آیت 81** وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ...... : یہاں منافقین کی ایک اور مذموم خصلت بیان فرمائی ہے اور ان کو سرزنش کی ہے اور آپ ﷺ کو ان کی حرکات سیۂ سے چشم پوشی اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا حکم فرمایا ہے۔ "بَيَّتَ" کا لفظ اصل میں "بَيْتٌ" (گھر) سے ہے اور انسان چونکہ عموماً رات کو گھر میں رہتا ہے، اس لیے "بَاتَ" کے معنی رات گزارنے کے ہیں، پھر چونکہ رات کے فارغ اوقات میں آدمی اپنے معاملات پر غور و فکر کرتا ہے، اس لیے "بَيَّتَ" کا لفظ کسی معاملہ میں نہایت غور و فکر کے معنی میں استعمال ہونے لگا

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے، اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے ﴿۸۲﴾ اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بہت تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے ﴿۸۳﴾

ہے۔ (رازی) یعنی دن کو وہ آپ کے سامنے اطاعت کا یقین دلاتے ہیں مگر رات کو ان کے بعض گروہ اس کے برعکس مشورے کرتے ہیں، جو وہ دن کو آپ کے سامنے کہہ رہے تھے اس ''طائفہ'' سے مراد لیڈر ہیں کیونکہ عام لوگ تو ان کے پیچھے چلنے والے ہیں۔

آیت 82 اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ...... : منافقین کے مکر وفریب اور مذموم خصائل کے ضمن میں قرآن کی حقانیت کے اثبات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ منافقین یہ سب مکر وفریب اور سازشیں اس بنا پر کر رہے تھے کہ وہ آپ کو سچا نبی نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا یہاں آپ ﷺ کے صدقِ نبوت پر بطور دلیل کے قرآن کو پیش کیا اور قرآن حکیم آپ ﷺ کے صدقِ نبوت کی تین وجھوں سے دلیل بنتا ہے، اول اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۳) دوم امورِ غیب کی خبروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اور سوم اختلاف وتناقض سے پاک اور مبرا ہونے کی بنا پر۔ یہاں اسی تیسری چیز کو بیان فرمایا ہے۔ (رازی) مطلب یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں کہ ایک انسان برس ہا برس تک مختلف حالتوں میں مختلف موضوعات پر، خصوصاً امورِ غیب سے متعلق اس قدر تفصیل سے گفتگو کرتا رہے اور اس کی ایک بات بھی دوسری سے متصادم نہ ہو۔ یہ خصوصیت صرف قرآن میں پائی جاتی ہے، جو غور وفکر کرنے والے کے لیے اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ (شوکانی) اختلاف سے پاک ہونا بوجہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی فصیح و بلیغ کیوں نہ ہو، جب اتنی بڑی کتاب لکھے گا تو اس کے کلام میں قدرے تفاوت ضرور ہوگا اور ساری کتاب بلاغت میں یکساں مرتبہ کی نہیں ہوگی۔ پھر یہ منافقین خفیہ طور سازشیں کرتے رہتے ہیں اور وحی کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو ان کے بھید من وعن بتا دیے جاتے ہیں اور کبھی یہ نہیں ہوا کہ کسی راز کے افشا کرنے میں قرآن نے تھوڑی بہت بھی غلطی کی ہو اور یہی اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ (رازی)

معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں تدبر کے بغیر انسان کے شکوک وشبہات دور نہیں ہو سکتے اور نہ قرآن صحیح طور پر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم اگر غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلافِ کثیر ہوتا، اب یہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لیے اختلافِ کثیر کجا، سرے سے اس میں اختلاف ہے ہی نہیں۔

آیت 83 ① وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ ...... : امن کی خبر یہ کہ مسلمانوں کو فتح ہوئی، یا دشمن کا لشکر

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

پس اللہ کے راستے میں جنگ کر، تجھے تیری ذات کے سوا کسی کی تکلیف نہیں دی جاتی اور ایمان والوں کو رغبت دلا، اللہ قریب ہے کہ ان لوگوں کی لڑائی روک دے جنھوں نے کفر کیا اور اللہ بہت سخت لڑائی والا اور بہت سخت سزا دینے والا ہے ﴿۸۴﴾

واپس چلا گیا، جس سے مسلمان بے فکر ہو کر تیاری کم کر دیں وغیرہ اور خوف کی خبر یہ کہ فلاں مقام پر مسلمانوں کو شکست ہوئی، یا دشمن بہت بڑی تعداد میں حملہ آور ہونے والا ہے، جس سے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلے۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے مختلف سرایا (جنگی دستے) لڑائی کے لیے بھیجتے رہتے تھے، اس لیے اس قسم کی افواہیں مدینہ میں اکثر پہنچتی رہتی تھیں، لیکن منافقین اور بے احتیاط قسم کے مسلمان بجائے اس کے کہ انھیں سب سے پہلے آپ ﷺ یا آپ ﷺ کے ذمے دار اصحاب تک پہنچائیں، از خود ان افواہوں کی تشہیر شروع کر دیتے، ان کے اسی طرز عمل کی یہاں مذمت کی جا رہی ہے۔ (فتح القدیر، قرطبی)

② **يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ:** اس کا مادہ " نَبَطٌ " ہے۔ " نَبَطٌ " وہ پانی ہے جو کنواں کھودتے وقت سب سے پہلے نکلتا ہے، اس لیے "استنباط" تحقیق اور بات کی تہ تک پہنچنے کو کہا جاتا ہے، اسی طرح مخفی بات کی حقیقت معلوم اور ظاہر کرنے کو بھی " نَبَطٌ " اور "اِسْتِنْبَاطٌ" کہا جاتا ہے۔ کان کی گہرائی سے کوئی معدن نکالنے کو بھی "اِسْتِنْبَاطٌ" کہتے ہیں۔ ﴿ **لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ** ﴾ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر امن یا خوف کی وہ خبر بلاتحقیق پھیلانے کے بجائے اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے امراء کو پہنچاتے تو سب سے پہلے وہ غور و خوض اور تحقیق کر کے معلوم کرتے کہ خبر صحیح بھی ہے یا غلط، کیونکہ بلاتحقیق آگے بات کرنے کو رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا: «كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ» [ مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع : ٥ ] "آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جو کچھ سنے (بلاتحقیق) آگے بیان کر دے۔" پھر وہ ذمے دار حضرات فیصلہ کرتے کہ اس خبر کی اشاعت کرنی چاہیے یا نہیں، اس کے بعد اگر وہ قابل اشاعت ہوتی تو اسے نشر کرتے، ورنہ روک دیتے۔ انفرادی زندگی میں عموماً اور اجتماعی زندگی میں خصوصاً اس ہدایت پر عمل نہایت ضروری ہے، ورنہ اس بے احتیاطی کے بے حد نقصانات ہو سکتے ہیں، بالخصوص جنگ کے ایام میں، جب خبریں اور افواہیں فوجی کارروائیوں سے بڑھ کر تاثیر رکھتی ہیں، خبروں کے محاذ کو بھی جنگ کا زبردست محاذ سمجھ کر اس کے مطابق معاملہ کرنا چاہیے۔

③ **اِلَّا قَلِيْلًا:** شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ جو فرمایا: "اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا تو شیطان کے پیچھے چلتے مگر تھوڑے" یعنی ہر وقت احکام تربیت کے نہ پہنچتے رہیں تو کم لوگ ہدایت پر قائم رہیں۔ (موضح)

**آیت 84** ① **فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ......** : اوپر کی آیات میں جہاد کی ترغیب دی، اس کے بعد منافقین کی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور اب اس آیت میں فرمایا کہ آپ ان منافقین کے ساتھ ہونے یا نہ ہونے کی پروا نہ کریں، آپ

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

جو کوئی سفارش کرے گا، اچھی سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہوگا اور جو کوئی سفارش کرے گا، بری سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک بوجھ ہوگا اور اللہ ہمیشہ ہر چیز پر نگہبان ہے ﴿۸۵﴾ اور جب تمھیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم اس سے اچھی سلامتی کی دعا دو، یا جواب میں وہی کہہ دو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کا پورا حساب کرنے والا ہے ﴿۸۶﴾

کی ذمہ داری ہے کہ آپ خود جہاد کے لیے نکلیں اور دوسرے مومنوں کو بھی ترغیب دیں۔ ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ میں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''جو شخص مشرکوں پر حملہ کرتا ہے تو کیا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا اور ان سے فرمایا: ﴿ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ ﴾ اور جس آیت کا آپ حوالہ دے رہے ہیں: ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۵ ] اس کا تعلق تو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے (اور نہ کرنے) سے ہے۔'' [ مسند أحمد : ۴/ ۲۸۱، ح : ۱۸۵۰۶ ] اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کے لیے کئی شرطیں لوگ اپنے پاس ہی سے بنا لیتے ہیں۔

② عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اللہ تعالیٰ کے لیے ''عَسٰی'' کا لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، پس آیت میں وعدہ کیا جا رہا ہے کہ عنقریب کفار کا زور ٹوٹ جائے گا اور مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔

**آیت 85** مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً ...... : اوپر کی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مومنوں کو جہاد کی ترغیب دو، جو اعمالِ حسنہ میں سے ہے، یہاں بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر اجر عظیم ملے گا۔ پس یہاں شفاعت حسنہ سے ترغیب جہاد مراد ہے اور شفاعت سیئہ سے مراد اس کارِ خیر سے روکنا ہے، دوسرے کاموں کے لیے سفارش کا بھی یہی حکم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم سفارش کرو تمھیں اجر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہے گا فیصلہ فرمائے گا۔'' [ بخاری، الزکاۃ، باب التحریض علی الصدقۃ ...... : ۱۴۳۲، عن أبی موسٰی رضی اللہ عنہ ]

**آیت 86** وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ ...... : جہاد کا حکم دینے کے بعد اب صلح کے بعض احکام بیان فرمائے، چنانچہ فرمایا کہ اگر کفار کی طرف سے جنگ ختم کرنے اور صلح کرنے کی کوئی پیش کش کی جاتی ہے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا کم از کم اتنی پیش کش ضرور قبول کرو۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [ الأنفال : ۶۱ ] ''اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔'' ایک مصداق اس آیت کا یہ ہے کہ جہاد کے سفر کے دوران کوئی شخص اگر اطاعت کے اظہار کے لیے یا اسلام قبول کرنے کے اظہار کے لیے سلام کہے تو یہ کہہ کر اسے قتل

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر صورت تمھیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے ﴿۸۷﴾ پھر تمھیں کیا ہوا کہ منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے، حالانکہ اللہ نے انھیں اس کی وجہ سے الٹا کر دیا جو انھوں نے کمایا، کیا تم چاہتے ہو کہ اس شخص کو راستے پر لے آؤ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر تو اس کے لیے کبھی کوئی راستہ نہ پائے گا ﴿۸۸﴾ وہ چاہتے ہیں کاش کہ تم کفر کرو جیسے انھوں نے کفر کیا، پھر تم برابر ہو جاؤ، سو تم ان میں سے کسی طرح کے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کے راستے میں ہجرت کریں، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو انھیں پکڑو اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور نہ ان سے کوئی دوست بناؤ اور نہ کوئی مدد گار ﴿۸۹﴾

مت کرو کہ تو مومن نہیں۔ (دیکھیے نساء: ۹۴) اور ایک مصداق وہ ہے جو آیت کے صریح الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ جب کوئی شخص تمھیں سلام کہے تو اسے اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو۔ "تَحِيَّةٌ" "حَيَاةٌ" میں سے باب تفعیل کا مصدر ہے، زندگی کی یا سلامتی کی دعا دینا، مراد سلام ہے۔ بہتر جواب دینے کی تفسیر حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کے جواب میں " وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ " کا اضافہ اور " اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ " کے جواب میں " وَ بَرَكَاتُهٗ " کا اضافہ کر دیا جائے، لیکن اگر کوئی شخص یہ سارے الفاظ بول دے تو انھی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ "وَمَغْفِرَتُهٗ وَ رِضْوَانُهٗ " وغیرہ کا اضافہ صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ہر لفظ کے اضافے کے ساتھ دس نیکیاں زیادہ ہوتی جائیں گی۔ [ أحمد : ۴۳۹/۴، ۴۴۰، ح : ۱۹۹۷۰ ] گویا کوئی شخص جتنا سلام کہے اتنا جواب دینا فرض ہے، زائد مستحب ہے۔

**آیت 88** یعنی تم ان منافقین کے بارے میں دو گروہ کیوں ہو گئے، تمھیں تو ان کے متعلق ایک رائے پر متفق ہونا چاہیے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد کے لیے نکلے تو کچھ لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ کر راستے ہی سے واپس ہو گئے، ان کے بارے میں مسلمانوں کے دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ کہنے لگا، آپ انھیں قتل کریں اور دوسرا گروہ اس کے خلاف تھا، تو یہ آیت اتری: ﴿ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ ﴾ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ طیبہ ہے، یہ گند کو اس طرح دور کر دیتا ہے جیسے آگ چاندی کے گند کو۔" [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ فما لكم في المنافقين …… ﴾ : ۴۵۸۹ ] شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ حدیث اس آیت کے اسباب نزول میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔

**آیت 89** وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً …… : معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقوں کی وہ قسم تھی جو مدینہ کے

اِلَّا الَّذِيۡنَ يَصِلُوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡكُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ اَوۡ يُقَاتِلُوۡا قَوۡمَهُمۡ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمۡ عَلَيۡكُمۡ فَلَقٰتَلُوۡكُمۡ‌ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّاۡمَنُوۡكُمۡ وَيَاۡمَنُوۡا قَوۡمَهُمۡ ؕ كُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَعۡتَزِلُوۡكُمۡ وَيُلۡقُوۡۤا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فَخُذُوۡهُمۡ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ‌ ؕ وَاُولٰٓـئِكُمۡ جَعَلۡنَا لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۹۱﴾ ع ۱۲ ۹

مگر وہ لوگ جو ان لوگوں سے جا ملتے ہیں کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان عہد و پیمان ہے، یا وہ تمھارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل اس سے تنگ ہوں کہ وہ تم سے لڑیں، یا اپنی قوم سے لڑیں اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور انھیں تم پر مسلط کر دیتا، پھر یقیناً وہ تم سے لڑتے۔ تو اگر وہ تم سے الگ رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور تمھاری طرف صلح کا پیغام بھیجیں تو اللہ نے تمھارے لیے ان پر زیادتی کا کوئی راستہ نہیں رکھا ﴿۹۰﴾ عنقریب تم کچھ اور لوگ پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں، وہ جب بھی فتنے کی طرف لوٹائے جاتے ہیں اس میں الٹا دیے جاتے ہیں، تو اگر وہ نہ تم سے الگ رہیں اور نہ صلح کا پیغام بھیجیں اور نہ اپنے ہاتھ روکیں تو انھیں پکڑو اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور یہی لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمھارے لیے واضح دلیل بنا دی ہے ﴿۹۱﴾

اردگرد پھیلے ہوئے قبائل سے تعلق رکھتی تھی، دلیل اس کی یہ الفاظ ہیں: ﴿فَلَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡهُمۡ اَوۡلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ ''تو ان میں سے کسی طرح کے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کے راستے میں ہجرت کریں۔'' یہ لوگ مسلمانوں سے خیر خواہی اور محبت کا اظہار ضرور کرتے تھے مگر عملی طور پر اپنے ہم وطن کافروں کا ساتھ دیتے تھے، یا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ ان کے لیے معیار یہ مقرر کیا گیا کہ اگر وہ ہجرت کر کے تمھارے پاس مدینہ آ جائیں اور تمھیں ان کے ایمان کا یقین ہو جائے تو اس صورت میں تم انھیں سچا بھی سمجھو اور ہمدرد بھی اور اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں تو اگرچہ وہ اسلام کا اظہار کریں ان سے کافروں جیسا سلوک کرو، کیونکہ دارالکفر میں چلے جانے کے بعد ان کا کفر کھل کر سامنے آ گیا، اس لیے انھیں گرفتار کرو اور حل و حرم میں جہاں پاؤ انھیں قتل کرو اور انھیں اپنا دوست نہ بناؤ۔

**آیت 90** اِلَّا الَّذِيۡنَ يَصِلُوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍۢ ...... : منافقین کے سلسلے میں جو اوپر حکم بیان ہوا اس سے دو قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مستثنیٰ کر دیا اور فرمایا کہ انھیں نہ قید کرو اور نہ ان سے قتال (لڑائی) کرو۔ ایک تو وہ منافقین جو کسی ایسی قوم کے پاس جا کر پناہ لے لیں یا حلیف بن جائیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا صلح اور امن کا معاہدہ ہو تو وہ انھی کے حکم میں ہو جائیں گے، ورنہ عہد ٹوٹ جائے گا اور جنگ چھڑ جائے گی اور دوسرے وہ لوگ جو اپنی صلح جوئی کی وجہ سے نہ مسلمانوں سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔

**آیت 91** سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِيۡنَ ...... : اس آیت کریمہ میں ایک تیسری قسم کے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو بہت ہی

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ٘ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۹۲

اور کسی مومن کا کبھی یہ کام نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن گردن آزاد کرنا اور دیت دینا ہے، جو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی ہو، مگر یہ کہ وہ صدقہ (کرتے ہوئے معاف) کر دیں۔ پھر اگر وہ اس قوم میں سے ہو جو تمھاری دشمن ہے اور وہ مومن ہو تو ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے، اور اگر اس قوم میں سے ہو کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان ہو تو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی دیت ادا کرنا اور ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے، پھر جو نہ پائے تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھنا ہے۔ یہ بطور توبہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ ہمیشہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ۝۹۲

بدترین قسم کے منافق ہیں، جو ڈھنڈورا تو اپنی امن پسندی کا پیٹتے ہیں مگر جب داؤ لگ جائے تو اسلام دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کا امن پسندی کا دعویٰ سچا ہونے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں سے صلح کر لیں، دوسرے یہ کہ لشکر کفار میں شامل نہ ہوں اور تیسرے یہ کہ اگر انھیں مجبوراً شامل ہونا ہی پڑے تو پھر اپنے ہاتھ روکے رکھیں، یعنی عملاً لڑائی میں شامل نہ ہوں، جیسا کہ جنگ بدر میں عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ انھیں قتل نہ کیا جائے، کیونکہ وہ مجبور کر کے لائے گئے ہیں۔ اگر یہ تینوں باتیں نہ پائی جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کی نیتوں میں فتور ہے اور وہ امن پسندی کی آڑ میں دھوکا دے کر مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں، لہٰذا ایسے منافقوں کا علاج یہ ہے کہ انھیں پکڑو اور جہاں ملیں قتل کر دو۔

**آیت 92** ① وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا: کفار کے ساتھ جنگ کی اجازت نازل ہوئی تو یہ عین ممکن تھا کہ کسی شخص کو کافر حربی (جس سے جنگ ہو) سمجھ کر مسلمان قتل کر دیں اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ مسلمان تھا، اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے قتل خطا کے احکام بیان فرما دیے۔ (رازی) آیت میں "اِلَّا" بمعنی "لٰكِنْ" ہے اور مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی کسی بھی حال میں مسلمان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر غلطی سے مارا جائے تو اس پر کفارہ ہے، جس کا بعد میں ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی آدمی کا خون، جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، تین صورتوں میں سے کسی ایک کے سوا حلال نہیں: ① جان کے بدلے جان۔ ② شادی شدہ بدکار۔ ③ اسلام کو چھوڑنے والا (مرتد) جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والا۔'' [ بخاري، الديات، باب قول الله تعالى : ﴿ أن النفس بالنفس

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، جس میں ہمیشہ رہنے والا ہو اور اللہ اس پر غصے ہو گیا اور اس نے اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہے ﴿۹۳﴾

والعین بالعین ﷺ : ٦٨٧٨، عن عبد الله رضی اللہ عنہ ]

❷ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ ...... : یعنی جب کوئی مسلمان غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کر دے تو اس کے دو حکم ہیں، ایک کفارہ دوسرا دیت یعنی خون بہا۔ کفارہ تو یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان غلام (مرد یا عورت) کو آزاد کرے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور اس کے وارثوں کو دیت ادا کرے، کفارہ تو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا، ہاں، دیت اگر وارث معاف کر دیں تو ساقط ہو سکتی ہے، مگر یہ اس وقت ہے کہ جب مقتول کے وارث بھی مسلمان ہوں یا کافر ہوں لیکن ان سے معاہدہ ہو یا ذمی ہوں، جیسے آگے آ رہا ہے۔

❸ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ ...... : لیکن اگر اس کے وارث حربی کافر ہوں تو پھر قاتل کے ذمے صرف کفارہ ہے، یعنی ایک مسلمان گردن آزاد کرنا، اگر نہ ہو سکے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا۔ مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ دشمن ہیں۔ (قرطبی)

❹ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ...... : اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مقتول مسلمان ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جن سے تمھارا معاہدہ ہے، یا ذمی ہیں تو اس صورت میں بھی دو چیزیں واجب ہوں گی، دیت (خون بہا) اور کفارہ۔ یہاں دیت کو کفارہ سے پہلے ذکر فرمایا ہے کہ اسے غیر مسلم قوم کا فرد سمجھ کر دیت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی جائے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مقتول معاہد یا ذمی ہو (مسلمان نہ ہو) تو اس صورت میں بھی کفارہ اور وارثوں کو خون بہا ادا کرنا پڑے گا، مگر زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں بھی مسلمان مقتول ہی کی بات ہو رہی ہے۔ دیت ایک سو اونٹ یا اس کے اندازے کے ساتھ قیمت ہو گی، جو خطا کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہو گی۔

❺ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ : اگر کوئی کسی شرعی عذر یعنی مرض، حیض، نفاس وغیرہ کے بغیر ایک روزہ بھی چھوڑے گا تو نئے سرے سے دوبارہ دو ماہ کے روزے رکھنے پڑیں گے۔ (قرطبی)

آیت 93 وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا ...... : قتل خطا کا حکم بیان کرنے کے بعد اب اس آیت میں قتل عمد (قصداً قتل کرنے) کا حکم بیان فرمایا ہے، اس کا ایک حکم تو بیان ہو چکا ہے، یعنی اس صورت میں قصاص یا دیت واجب ہے، یا مقتول کے وارث کچھ معاف کر دیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۷۸) یہاں صرف اس کے گناہ اور وعید کا ذکر ہے۔ متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس جرم کو اشراک باللہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، یہاں فرمایا کہ اس کی جزا جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہے اور اللہ تعالیٰ اس پر غصے ہو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کے راستے میں سفر کرو تو خوب تحقیق کر لو اور جو تمھیں سلام پیش کرے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں، اس سے پہلے تم بھی ایسے ہی تھے تو اللہ نے تم پر احسان فرمایا۔ پس خوب تحقیق کر لو، بے شک اللہ ہمیشہ اس سے جو تم کرتے ہو، پورا باخبر ہے ﴿۹۴﴾

گیا اور اس پر لعنت کی اور اس کے لیے عذاب عظیم تیار کیا ہے۔ اتنی سخت سزائیں یکجا ذکر کرنے سے اس گناہ کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے اور بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مومن کو قصداً قتل کرنے والا ابدی جہنمی ہے اور اس کی توبہ بھی قبول نہیں۔ مگر سورۂ فرقان (۶۸) میں قتل عمد کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے۔ اب بعض مفسرین کا کہنا تو یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرنے کی توبہ اس وقت قبول ہے جب اس نے حالت کفر میں یہ قتل کیا ہو، مسلمان ہونے کے بعد کسی مسلم کو قتل کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں، بلکہ "خَالِدًا فِيْهَا" کے الفاظ سے اس کا ابدی جہنمی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ والذين لايدعون...... ﴾ : ٤٧٦٢ ] مگر اکثر سلف اس کی توبہ قبول ہونے کے قائل ہیں، کیونکہ ① شرک باللہ سے بڑا کوئی گناہ نہیں، وہ توبہ سے معاف ہو سکتا ہے تو یہ بھی معاف ہو سکتا ہے۔ ② اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ وہ آگ میں ہمیشہ رہے گا، بلکہ فرمایا یہ ہے (کہ یہ جرم اتنا بڑا ہے) کہ اس کی جزا جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے، باقی اللہ معاف کرنا چاہے تو توبہ کے بعد یا توبہ کے بغیر بھی معاف کر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [ النساء : ٤٨ ] "بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔" لہٰذا یہ اللہ کی مشیت پر ہے چاہے تو سزا دے کر معاف کر دے، چاہے تو ویسے ہی معاف کر دے۔ خصوصاً توبہ کے بعد تو واضح بشارت موجود ہے: ﴿ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ﴾ [ الزمر : ٥٣ ] "اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔" ③ بنی اسرائیل کا وہ مسلمان جس نے سو آدمی قتل کیے تھے، اس کا واقعہ بھی قتل عمد کی توبہ کے قبول ہو سکنے کی دلیل ہے۔ [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب : ٣٤٧٠ ]

بعض اہل علم نے فرمایا کہ وہ قاتل عمد ابدی جہنمی ہے جو اس عمل کو جائز سمجھے، کیونکہ شریعت کے حرام کام کو حلال سمجھنا کفر ہے اور جنت کی نعمتیں کفار پر حرام ہیں، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ٥٠ ] "بے شک اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں۔" بے شک اللہ تعالیٰ نے (جنت کا پانی اور رزق) دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں مگر اس صورت میں اس کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا باعث قتل عمد نہیں بلکہ کفر ہو گا۔

**آیت 94** ① فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا...... : ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنی تھوڑی سے بکریوں کے پاس تھا،

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

ایمان والوں میں سے بیٹھ رہنے والے، جو کسی تکلیف والے نہیں اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے ﴿۹۵﴾

کچھ مسلمان وہاں سے گزرے، اس نے ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہا لیکن مسلمانوں نے اسے قتل کر ڈالا اور اس کی بکریاں لے لیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری، جس میں ہے: ﴿ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ ''تم دنیا کا سامان چاہتے ہو؟'' اس سے مراد وہ تھوڑی سی بکریاں ہیں۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولا تقولوا لمن ألقیٰ...... ﴾ : ۴۵۹۱ ]

❷ فَتَبَيَّنُوْا : یہاں تبین یعنی تحقیق کر لینے کا حکم سفر کے ساتھ ذکر کیا ہے، مگر یہاں سفر کی قید بیان واقعہ کے لیے ہے، یعنی یہ حادثہ جس سے متعلق آیت نازل ہوئی ہے، سفر میں پیش آیا تھا، ورنہ تحقیق کا حکم جس طرح سفر میں ہے اسی طرح حضر میں بھی ہے۔ (قرطبی)

❸ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ : یعنی یہی حالت پہلے تمھاری تھی، تم کافروں کے شہر میں رہتے تھے اور اپنے ایمان کو چھپاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دین کو غالب کر کے تم پر احسان کیا۔ (قرطبی)

آیت 95 ❶ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ...... : جہاد کے فرضِ عین ہونے کی صورت میں تو کسی شخص کو بلا عذر گھر میں بیٹھے رہنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ ایسی صورت میں جہاد میں شامل نہ ہونا صریح نفاق ہے، مگر جب نفیرِ عام (سب کے نکلنے) کا حکم نہ ہو اور امام کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے کہ جو شخص جہاد کے لیے نکل سکتا ہو نکلے اور جو اپنے کام کی وجہ سے نہیں نکل سکتا اسے اپنے گھر میں بیٹھے رہنے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں جو شخص جہاد کے لیے نکلے اس آیت میں اس کی فضیلت کا ذکر ہے، یعنی جہاد کے لیے نکلنا لازم نہ ہونے کے باوجود جو لوگ جہاد کے لیے نکلتے ہیں اور جو گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں کتابت کے لیے حاضر ہوا تو عبد اللہ بن ام مکتوم، جو نابینا تھے، آ گئے اور کہنے لگے، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! اگر میں آپ کے ہمراہ جہاد کر سکتا ہوتا تو ضرور کرتا، تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل فرمائی اور ''غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ'' (جو کسی تکلیف والے نہیں) کا کلمہ نازل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لکھوا دیا۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا یستوی القاعدون من

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

اپنی طرف سے بہت سے درجوں کی اور عظیم بخشش اور رحمت کی۔ اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۹۶﴾ بے شک وہ لوگ جنھیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، کہتے ہیں تم کس کام میں تھے؟ وہ کہتے ہیں ہم اس سرزمین میں نہایت کمزور تھے۔ وہ کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ﴿۹۷﴾

---

المؤمنين ﷺ : ٤٥٩٢ ] معلوم ہوا کہ جس شخص کی نیت جہاد کی ہو مگر اسے کوئی تکلیف ہو اور وہ کسی عذر کی بنا پر جہاد میں شریک نہ ہو سکے وہ مجاہدین کے برابر ہو سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مدینہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم نے جس قدر سفر کیا اور جتنی وادیاں طے کیں وہ تمھارے ساتھ تھے۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! وہ تو مدینہ میں ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ہاں) اگرچہ وہ مدینہ میں ہیں، لیکن انھیں کسی عذر نے جہاد میں شرکت سے روکا ہے۔'' [ بخاري، المغازي، باب : ٤٤٢٣، عن أنس رضی اللہ عنہ ] کئی دوسری روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں میں سے کسی شخص کو بھی اس کے جسم میں کوئی آزمائش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان محافظ فرشتوں کو حکم دیتا ہے جو اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ میرے بندے کے لیے اسی طرح عمل لکھ دو جس طرح وہ اس وقت عمل کرتا تھا جب وہ تندرست تھا جب تک وہ میری گرفت میں رہے۔ [ أحمد : ٢/ ١٩٤، ح : ٦٨٢٥، صحيح على شرط مسلم ]

② وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى: یعنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو جو فضیلت حاصل ہو گی، جہاد میں حصہ نہ لینے والے اگرچہ اس سے محروم رہیں گے، تاہم اللہ تعالیٰ نے دونوں کے ساتھ ہی بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ عام حالات میں جہاد کے لیے نکلنا فرض عین نہیں، فرضِ کفایہ ہے، یعنی اگر بقدر ضرورت آدمی جہاد میں حصہ لے لیں تو اس علاقے کے دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی یہ فرض ادا شدہ سمجھا جائے گا، لیکن اگر بقدر ضرورت نہ نکلیں تو تمام لوگ گناہ گار ہوں گے۔

**آیت 97** ① اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْۤ اَنْفُسِهِمْ : یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مکہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان تو ہو چکے تھے لیکن انھوں نے اپنے آبائی علاقے اور خاندان کو چھوڑ کر ہجرت کرنے سے گریز کیا، (حالانکہ انھیں ہجرت میں کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی) جب کہ مسلمانوں کی قوت کو ایک جگہ مجتمع کرنے کے لیے ہجرت کا نہایت تاکیدی حکم دیا جا چکا تھا، اس لیے جن لوگوں نے ہجرت کے حکم پر عمل نہیں کیا ان کو یہاں ظالم قرار دیا گیا ہے

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

مگر وہ نہایت کمزور مرد اور عورتیں اور بچے جو نہ کسی تدبیر کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ کوئی راستہ پاتے ہیں ﴿۹۸﴾ تو یہ لوگ، اللہ قریب ہے کہ انھیں معاف کر دے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے ﴿۹۹﴾

اور ان کا ٹھکانا جہنم بتلایا گیا ہے، جس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حالات اور موقع کے لحاظ سے اسلام کے بعض احکام کفر یا اسلام کے مترادف بن جاتے ہیں۔ جیسے اس موقع پر ہجرت کو اسلام اور اس سے گریز کو کفر کے مترادف قرار دیا۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ایسے دار الکفر سے ہجرت کرنا فرض ہے جہاں اسلام کی تعلیمات پر عمل مشکل اور وہاں رہنا کفر اور اہلِ کفر کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو۔

② قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ...... : یعنی فرشتے ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں ان سے پوچھتے ہیں کہ تم مسلمان تھے یا کافر؟ یا دار الکفر میں پڑے کیا کرتے رہے اور مدینہ کی طرف ہجرت کیوں نہیں کی؟ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بلا عذر ترک ہجرت کی بنا پر ظالم کی موت مرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَ سَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ )) [ أبو داوٗد ، الجهاد، باب في الإقامة بأرض الشرك : ۲۷۸۷، عن سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ ] ''جو شخص مشرک کے ساتھ اکٹھا رہے اور اس کے ساتھ سکونت رکھے تو یقیناً وہ اسی جیسا ہے۔''

آیت 98 ① اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ ...... : اس آیت میں ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو واقعی بے بس اور معذور تھے اور ہجرت نہیں کر سکتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''میں اور میری والدہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا۔'' [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ وما لكم لا تقاتلون...... ﴾ : ٤٥٨٨ ] ان لوگوں میں عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام وغیرہ بھی شامل ہیں جن کے حق میں رسول اللہ ﷺ کفار کے پنجے سے نجات کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ فاولئك عسى الله...... ﴾ : ٤٥٩٨ ]

② ابن عباس رضی اللہ عنہما کی والدہ ام الفضل بنت الحارث ہیں اور ان کا نام لبابہ ہے، جو ام المومنین میمونہ بنت الحارث کی بہن تھیں۔ ''بنات حارث'' نو بہنیں تھیں، ان میں سے ایک اسماء بنت عمیس خثعمیہ تھیں جو ماں کی طرف سے میمونہ کی بہن تھیں اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی۔ جعفر رضی اللہ عنہ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آ گئیں۔ ( قرطبی )

آیت 99 فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ : اللہ تعالیٰ کے لیے ''عَسٰی'' کا لفظ یقین کے لیے ہوتا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص واقعی ہجرت نہیں کر سکتا، وہ کفار کی قید میں ہے، یا اسے راستے کا علم نہیں، یا اس کے پاس زادِ راہ نہیں، غرض کوئی بھی صحیح عذر ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے گا، مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امید کے انداز میں بات کرنے میں حکمت بھی ہے

وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً ؕ وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۟۱۰۰ ع

اور وہ شخص جو اللہ کے راستے میں ہجرت کرے، وہ زمین میں پناہ کی بہت سی جگہ اور بڑی وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، پھر اسے موت پالے تو بے شک اس کا اجر اللہ پر ثابت ہو گیا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ۱۰۰

کہ بندے بے خوف نہ ہو جائیں۔

آیت 100 ① مُرٰغَمًا : یہ اسم ظرف ہے، یعنی ”مَوْضِعُ رَغْمِ الْاَعْدَاءِ“ دشمنوں کی ناک خاک آلود ہونے کی جگہ، جس سے دشمن ذلیل ہوں۔ ”مُرٰغَمًا“ کے معنی جگہ، جائے قیام اور جائے پناہ بھی آتے ہیں۔ ہجرت کر کے نکلنے کے بعد حاصل ہونے والی جائے قیام کو ”مُرٰغَمًا“ اس لیے فرمایا کہ وہ تمام دشمنوں کی ناک کو خاک آلود کر دیتی ہے۔ (قرطبی) اس آیت میں اگرچہ ان لوگوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جو مکہ اور دوسرے مقامات پر دار الکفر میں زندگی بسر کر رہے تھے اور ہجرت نہیں کر رہے تھے، لیکن یہ آیت عام ہے اور متعدد احادیث میں ہجرت کی ترغیب دی گئی ہے اور وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے گا اور اس کی طرف سے بڑی وسعت بھی ملے گی۔

② وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ...... : اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خلوصِ نیت سے ہجرت کرتے ہیں مگر راستے میں ان کا وقت آخر آ جاتا ہے تو ان کا اجر اللہ پر ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ اصل مدار نیت پر ہے، جیسا کہ مشہور حدیث ہے: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...... : ١ ] ”تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔“ چنانچہ خالد بن حزام رضی اللہ عنہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے نکلے، انھیں ایک سانپ نے ڈس لیا تو ان کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿ وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ ﴾ [ ابن أبي حاتم : ٤/ ٣٢٨، ح : ٥٨٨٨، حسن ] سو آدمیوں کو قتل کر کے ہجرت کرنے والے شخص کا قصہ بھی اس کی دلیل ہے۔

③ ہجرت کے معنی ہیں دار الحرب سے دار السلام کی طرف منتقل ہونا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فرض تھی اور اس کی فرضیت تا قیامت باقی ہے۔ جس ہجرت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ” لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ “ (فتح کے بعد ہجرت نہیں) فرما کر منسوخ فرمایا ہے، وہ مکہ یا کسی بھی جگہ سے مدینہ کی طرف ہجرت تھی۔ اسی طرح اہل بدعت کی آبادی سے بھی ہجرت کرنی چاہیے، امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”کسی شخص کے لیے ایسے مقام پر رہنا جائز نہیں جہاں سلف کو گالیاں دی جاتی ہوں۔“ علیٰ ہذا القیاس جس علاقے میں حلال روزی نہ ملتی ہو، یا دین میں فتنے کا خوف ہو وہاں سے بھی ہجرت کرنی چاہیے۔ (قرطبی)

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖۗ اِنْ خِفْتُمْ

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کچھ کم کر لو، اگر ڈرو کہ تمھیں وہ لوگ فتنے میں ڈال دیں گے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَنَا بَرِیءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ أَظْهُرِ الْمُشْرِكِينَ » ''میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان مقیم ہو۔'' [ أبو داوٗد، الجهاد، باب النهي عن قتل من اعتصم بالسجود : ٢٦٤٥ ]

آیت 101 ① وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ ...... : قصر کا معنی کمی ہے، یہ کمی رکعات کی تعداد میں بھی مسنون ہے اور اگر خوف زیادہ ہو تو نماز کی ہیئت و شکل میں بھی کمی ہو سکتی ہے، مثلاً پیدل جاتے جاتے نماز پڑھ لینا۔ ظاہر ہے اس میں سجدہ اور رکوع تو پوری طرح ممکن نہیں، یا سواری پر اشارے سے نماز پڑھ لینا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۳۹)۔ رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو خالد بن سفیان کے قتل کے لیے بھیجا، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے لشکر تیار کر رہا تھا۔ عبد اللہ وہاں پہنچے تو عصر کا وقت قریب تھا، انھوں نے جاتے جاتے ہی نماز پڑھ لی۔ [ أبو داوٗد، صلاة السفر، باب صلاة الطالب : ١٢٤٩ ] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس کی سند کو حسن اور ابن کثیر نے جید کہا ہے۔ [ هداية المستنير ] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی کی زبان سے حضر میں چار، سفر میں دو اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔'' [ مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين و قصرها : ٦٨٧ ]

عام سفر میں مغرب اور صبح کی نماز کے علاوہ دوسری نمازوں میں چار کے بجائے دو رکعت پڑھنا قصر ہے۔ ''تم پر کچھ گناہ نہیں'' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حالت سفر میں قصر واجب نہیں، اس کی صرف اجازت ہے اور یہی اکثر علمائے سلف کا مسلک ہے، مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ سفر میں قصر پڑھی ہے، لہٰذا آپ کی سنت کو دیکھتے ہوئے امام شافعی، امام احمد ابن حنبل اور اکثر محدثین رحمہم اللہ کے نزدیک قصر افضل ہے۔

② سفر سے مراد بظاہر تو عام سفر ہے، جسے عرف میں سفر کہا جاتا ہو، اب رہی میلوں یا دنوں کی مقدار کی تعیین تو نہ قرآن کی کسی آیت میں اس کا صاف ذکر ہے اور نہ نبی ﷺ کی کسی صریح حدیث میں۔ اس بنا پر جن ائمہ اور علماء نے کسی مقدار کی تعیین کی ہے، انھوں نے عموماً نبی ﷺ کے سفروں کو دیکھتے ہوئے اپنے اجتہاد سے کی ہے، تاہم سب سے قوی دلیل سفر کی مقدار کی تعیین میں صحیح مسلم (۶۹۱) میں مروی حدیث انس ہے، جس کی رو سے تین فرسخ (۹ کوس) تقریباً اکیس کلو میٹر سفر کرنا ہو تو شہر سے نکل کر قصر کر سکتے ہیں۔

③ کسی صحیح حدیث میں نبی ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کسی سفر میں فرض نماز سے پہلے یا بعد میں سنتیں ادا کی ہوں، ہاں رات کے وتر اور صبح کی سنتیں آپ ﷺ ہر سفر میں پڑھا کرتے تھے اور کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ (زاد المعاد: ۴۵۶/۱) صحابہ میں سے ابو بکر، عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل تھا۔ [ بخاري، التقصير، باب من لم يتطوع في السفر دبر الصلاة : ١١٠٢ ]

④ مسافر اگر مقیم کے پیچھے نماز پڑھے گا تو قصر نہیں کرے گا۔ موسیٰ بن سلمہ فرماتے ہیں کہ ہم ابن عباس کے ساتھ مکہ میں تھے

اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾

جنھوں نے کفر کیا۔ بے شک کافر لوگ ہمیشہ سے تمھارے کھلے دشمن ہیں ﴿۱۰۱﴾

تو میں نے کہا جب ہم آپ کے ساتھ ہوتے ہیں تو چار رکعت پڑھتے ہیں اور جب اپنی رہائش کی جگہوں میں جاتے ہیں تو دو رکعت پڑھتے ہیں تو انھوں نے فرمایا: ''یہ ابو القاسم ﷺ کی سنت ہے۔'' [ أحمد : ۱/ ۲۱٦، ح : ۱۸٦۷ ] اس کی ہم معنی روایت صحیح ابی عوانہ (۲/ ۳۴۰) میں ہے۔ [ إرواء الغليل، تحت الحديث : ۵۷۱ ]

⑤ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... : یہ آیت چونکہ جہاد کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، اس لیے اس میں نماز قصر کی اجازت کے ساتھ ''اگر تمھیں ڈر ہو کہ کافر تمھیں فتنے میں ڈال دیں گے'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ باقی رہا عام سفر، جس میں دشمن کا خوف نہ ہو تو اس میں قصر کے حکم کے بارے میں یہ آیت خاموش ہے، اسے نبی ﷺ نے اپنے قول و فعل سے واضح فرمایا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے سوال کیا: ''کیا وجہ ہے کہ لوگ ہر سفر میں قصر کر رہے ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں یہ حکم خوف کے ساتھ مقید ہے؟'' تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''خود مجھے بھی اس سے تعجب ہوا تھا اور میں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ایک صدقہ ہے، جو اللہ نے تم پر کیا ہے، لہٰذا تم اس کا صدقہ قبول کرو۔'' [ مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين و قصرها : ٦٨٦ ] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت رب العالمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا مگر آپ نے دو ہی رکعت نماز پڑھی۔'' [ نسائی، تقصير الصلاة في السفر، باب : ١٤٣٦ ] انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے تو آپ نماز کی دو دو رکعتیں ادا فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم مدینہ واپس آ گئے۔'' حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: ''آپ لوگوں نے مکہ میں کتنی دیر قیام کیا تھا؟'' تو انھوں نے جواب دیا: ''ہم نے دس دن قیام کیا تھا۔'' [ بخاري، التقصير، باب ما جاء في التقصير ...... : ١٠٨١ ]

ایک مرتبہ آپ نے مکہ میں انیس (۱۹) دن بھی قیام کیا تھا۔ [ بخاري، المغازي، باب مقام النبي ﷺ بمكة زمن الفتح : ٤٢٩٨ ] جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ تبوک میں بیس دن ٹھہرے رہے اور نماز قصر کرتے رہے۔ [ أحمد : ۳/ ۲۹۵، ح : ١٤١٣٩، و صححه الألباني في الإرواء ] نبی کریم ﷺ سے یہ مدت صراحت کے ساتھ نہیں آئی کہ کتنے دن کسی جگہ ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو قصر کر سکتا ہے۔ علماء کے اجتہادات مختلف ہیں، بعض نے فرمایا انیس دن ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو نماز پوری پڑھے، اس سے کم ہو تو قصر کرے۔ بعض نے یہ مدت پندرہ دن بیان فرمائی، بعض نے چار دن، مگر راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جب تک کسی جگہ اقامت کا ارادہ نہ کرے قصر کر سکتا ہے۔ ثمامہ بن شراحیل فرماتے ہیں کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس گیا تو ہم نے عرض کیا: ''مسافر کی نماز کیسے ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''دو دو رکعتیں سوائے مغرب کے کہ وہ تین رکعتیں ہے۔'' میں نے کہا ''یہ بتائیں اگر ہم ذوالمجاز میں ہوں؟'' انھوں نے فرمایا: ''ذوالمجاز کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''ایک جگہ ہے جس میں ہم جمع ہوتے ہیں اور خرید و فروخت کرتے ہیں اور بیس راتیں یا پندرہ راتیں ٹھہرتے ہیں۔'' تو انھوں نے فرمایا: ''اے آدمی! میں آذر بائیجان میں رہا، میں نہیں جانتا کہ انھوں نے چار مہینے کہا یا دو ماہ، تو میں نے انھیں دیکھا کہ وہ دو دو رکعت پڑھتے تھے اور میں نے اپنی

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

اور جب تو ان میں موجود ہو، پس ان کے لیے نماز کھڑی کرے تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک جماعت تیرے ساتھ کھڑی ہو اور وہ اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں، پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسری جماعت آئے جنھوں نے نماز نہیں پڑھی، پس تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں۔ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا چاہتے ہیں کاش کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامانوں سے غفلت کرو تو وہ تم پر ایک ہی بار حملہ کر دیں۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تمھیں بارش کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو، یا تم بیمار ہو کہ اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو اور اپنے بچاؤ کا سامان پکڑے رکھو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۰۲﴾

آنکھوں کے سامنے نبی ﷺ کو دو دو رکعت پڑھتے دیکھا۔“ پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [ الأحزاب : ۲۱ ] [ أحمد : ۲/۸۳، ح : ۵۵۵۲، و حسنه شعيب الأرنؤوط ]

آیت 102 ① وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ ...... : اس آیت میں صلاۃ الخوف کی اجازت بلکہ حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ خوف کی نماز کا وہ موقع ہے کہ جب دشمن موجود ہو اور اس کے حملے کا خطرہ ہو، عملاً جنگ نہ ہو رہی ہو، لیکن ذرا سی غفلت بڑے نقصان کا باعث بن سکتی ہو، ایسے حالات میں اگر نماز کا وقت ہو جائے تو صلاۃ الخوف پڑھنے کا حکم ہے، جس کی مختلف صورتیں حدیث میں بیان کی گئی ہیں، مثلاً فوج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک حصہ ( گروہ ) دشمن کے بالمقابل کھڑا رہا، تا کہ کافروں کو حملہ کرنے کی جسارت نہ ہو اور ایک حصے نے آ کر نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، جب یہ حصہ نماز سے فارغ ہو گیا تو یہ پہلے کی جگہ مورچہ زن ہو گیا اور مورچہ زن حصہ نماز کے لیے آ گیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں حصوں کو ایک ایک رکعت پڑھائی، اس طرح آپ ﷺ کی دو رکعت اور باقی فوجیوں کی ایک ایک رکعت ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ دو، دو رکعات پڑھائیں، اس طرح آپ کی چار رکعت اور فوجیوں کی دو، دو رکعت ہوئیں۔ نیز بعض میں آتا ہے کہ ایک رکعت پڑھ کر

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

پھر جب تم نماز پوری کر لو تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے یاد کرو، پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز قائم کرو۔ بے شک نماز ایمان والوں پر ہمیشہ سے ایسا فرض ہے جس کا وقت مقرر کیا ہوا ہے ﴿۱۰۳﴾

التحیات کی طرح بیٹھے رہے، فوجیوں نے کھڑے ہو کر اپنے طور پر ایک رکعت اور پڑھ کر دو رکعات پوری کیں اور دشمن کے سامنے ڈٹ گئے، دوسرے حصے (گروہ) نے آ کر نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، آپ نے انھیں بھی ایک رکعت پڑھائی اور التحیات میں بیٹھ گئے اور اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک فوجیوں نے دوسری رکعت پوری نہیں کر لی، پھر ان کے ساتھ آپ ﷺ نے سلام پھیر دیا، اس طرح آپ کی بھی دو رکعت اور فوج کے دونوں حصوں کی بھی دو رکعات ہوئیں۔

② ابن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چودہ مرتبہ صلاۃ الخوف پڑھی ہے اور امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صلاۃ الخوف میں تمام احادیث صحیح اور ثابت ہیں، لہٰذا جس صورت میں نماز ادا کر لی جائے جائز ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب احادیث کا مرجع چھ سات صورتوں کی طرف ہے، جن میں سے ہر صورت پر حسب موقع عمل کیا جا سکتا ہے۔ (زاد المعاد : ۵۱۲/۱) امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے صلاۃ الخوف کی صورتیں صحیح سندوں کے ساتھ بہت تفصیل سے ذکر فرمائی ہیں۔ یہ تمام صورتیں اس وقت ہیں کہ جب جماعت ممکن ہو، اگر ممکن نہ ہو تو اکیلا پڑھ لے، پیادہ یا سوار یا اشارے سے، جس طرح ہو سکے ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ [ البقرة : ۲۳۹ ] ''پھر اگر تم ڈرو تو پیدل پڑھ لو یا سوار۔'' اگر جنگ جاری ہو اور اشارے سے بھی نہ پڑھ سکے تو بعد میں قضا کر کے پڑھ لے۔ صحیح بخاری میں ہے، انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تُستر قلعے کی فتح کے وقت موجود تھا، جب فجر روشن ہو رہی تھی اور لڑائی شدید بھڑک اٹھی تھی تو ہم نماز پڑھ ہی نہ سکے، چنانچہ دن بلند ہونے کے بعد ہی نماز پڑھی۔ ہم نے وہ نماز ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پڑھی، اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔ انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے دنیا و مافیہا مل جائے تب بھی اتنی خوشی نہ ہو، جتنی اس نماز سے ہوئی۔'' [ بخاری، صلاة الخوف، باب الصلاة عند مناهضة الحصون و لقاء العدو، قبل ح : ۹۴۵ ]

**آیت 103** ① **فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ**……: یعنی صلاۃ الخوف میں نماز کی حالت میں اذکار پورے نہیں ہو سکتے، اس لیے نماز پوری ہونے پر کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرو، تاکہ تلافی ہو جائے، اس کے علاوہ ہر حال ہی میں ذکر کی کثرت ہونی چاہیے۔ جنگ کے موقع پر تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا خاص حکم دیا، فرمایا: ﴿إِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [ الأنفال : ۴۵ ] ''جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو جمے رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

② **فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ**: یعنی جب خوف کی حالت ختم ہو جائے اور دشمن کا کوئی خطرہ نہ رہے تو نماز کو اس کے پورے ارکان و شرائط اور حدود کے ساتھ مقررہ اوقات پر ادا کرو۔ ہاں سفر میں رسول اللہ ﷺ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾

اور اس قوم کا پیچھا کرنے میں ہمت نہ ہارو، اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو یقیناً وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں، جیسے تم تکلیف اٹھاتے ہو اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو وہ امید نہیں رکھتے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۰۴﴾ بے شک ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دکھایا ہے اور تو خیانت کرنے والوں کی خاطر جھگڑنے والا نہ بن ﴿۱۰۵﴾

جمع کر کے پڑھی ہیں، جیسا کہ عرفات، مزدلفہ اور دوسرے سفروں میں جمع کیا ہے، تو سفر میں جمع کرنے کی رعایت بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے پاس سے تو وقت مقرر کرنے کا اختیار ہی نہ تھا۔ اس لیے اس کا وقت وہی ہے۔

**آیت 104** **وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ** ...... یہ آیت اس آیت سے ملتی جلتی ہے: ﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾ [ آل عمران : ۱۴۰ ] ''اگر تمھیں کوئی زخم پہنچے تو یقیناً ان لوگوں کو بھی اس جیسا زخم پہنچا ہے۔'' قرطبی نے جنگ احد میں زخم کھانے کے باوجود کفار کا پیچھا کرنے کو اس آیت کی شان نزول بتایا ہے، مگر الفاظ عام ہیں، اس لیے اس واقعہ کے علاوہ ہر ایسے موقع پر یہی حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمت افزائی ہے کہ درد و الم میں تو تم یکساں ہو مگر اللہ سے اجر کی امید میں تمھارا اور ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں، تو پھر ان کا پیچھا کرنے میں کیوں ہمت ہارتے ہو؟

**آیت 105** ① **اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ** ...... : جمہور مفسرین نے ان آیات (۱۰۴ سے ۱۱۳ تک) کی شانِ نزول چوری کا ایک واقعہ بتایا ہے، جو ترمذی میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بشر، بشیر اور مبشر تین بھائی تھے، جو اُبَیرِق یا طعمہ بن اُبَیرِق کے بیٹے تھے۔ بعض نے کہا کہ ان میں سے بشیر کی کنیت ابوطعمہ تھی، یہ لوگ مدینہ کے قبیلہ بنوظفر سے تھے۔ ان میں بشیر سب سے بدتر تھا، یہ شخص منافق تھا اور مسلمانوں کی ہجو کر کے وہ شعر دوسروں کے نام لگا دیتا تھا۔ یہ غریب فاقہ زدہ لوگ تھے اور رفاعہ بن زید کے ہمسائے تھے۔ ایک دفعہ شام سے ایک قافلہ میدہ لے کر آیا تو رفاعہ بن زید نے اس میں سے ایک بوری خرید لی۔ مدینہ کے لوگ آٹا کھاتے تھے، رہا میدہ تو وہ گھر کے بڑے آدمیوں کے لیے سنبھال کر رکھ لیا جاتا تھا۔ رفاعہ نے وہ میدہ اپنے اسلحہ کے سٹور میں اسلحہ کے ساتھ محفوظ کر دیا۔ اُبیرق کے بیٹوں نے سٹور میں نقب لگا کر میدہ اور اسلحہ چرا لیا۔ صبح ہوئی تو رفاعہ نے اپنا اسلحہ اور میدہ نقب لگا کر چرانے کی بات اپنے بھتیجے قتادہ بن نعمان کے ساتھ کی۔ اب اس نے تفتیش شروع کی تو معلوم ہوا کہ اس رات ابیرق کے بیٹوں نے آگ جلائی تھی اور شاید انھوں نے رفاعہ کے میدہ ہی سے کھانا تیار کیا ہو۔ جب ابیرق کے بیٹوں کا راز فاش ہو گیا تو انھوں نے چوری کا وہ اسلحہ وغیرہ ایک یہودی کے گھر پھینک دیا اور ان کے قبیلے بنوظفر کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہلے ہی آ کر شکایت کر دی کہ رفاعہ بن زید اور اس کے بھتیجے نے ہمارے ایک گھر والوں پر، جو ایمان دار اور نیک لوگ ہیں،

وَّ اسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۰۶﴾ۚ وَ لَا تُجَادِلۡ عَنِ الَّذِیۡنَ یَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ خَوَّانًا اَثِیۡمًا ﴿۱۰۷﴾ۚۙ یَّسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا یَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ وَ ہُوَ مَعَہُمۡ اِذۡ یُبَیِّتُوۡنَ مَا لَا یَرۡضٰی مِنَ الۡقَوۡلِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطًا ﴿۱۰۸﴾

اور اللہ سے بخشش مانگ، یقیناً اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۰۶﴾ اور ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کر جو اپنی جانوں سے خیانت کرتے ہیں، یقیناً اللہ ایسے شخص سے محبت نہیں کرتا جو ہمیشہ بہت خائن، سخت گناہ گار ہو ﴿۱۰۷﴾ وہ لوگوں سے چھپاؤ کرتے ہیں اور اللہ سے چھپاؤ نہیں کرتے، حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتا اور اللہ ہمیشہ اس کا جو وہ کرتے ہیں، احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۰۸﴾

چوری کا الزام لگا دیا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے بلا دلیل ایمان دار نیک لوگوں پر چوری کا الزام لگا دیا ہے۔'' ان لوگوں نے مشہور کر دیا کہ مسروقہ سامان یہودی کے گھر سے نکلا ہے، تو اس پر یہ آیات اتریں۔ [ ترمذی، التفسیر، باب ومن سورۃ النساء : ۳۰۳۶ ] اللہ تعالیٰ نے معاملے کی حقیقت کھول دی، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جرم تو بنو ابیرق کا تھا، مگر مجرم یہودی کو بنا دیا گیا، کیونکہ وہ اپنا نہیں تھا۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کے انصاف پر بہت بڑا دھبا آ سکتا تھا۔

② وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا: اس سے مراد ابیرق کے بیٹے ہیں کہ آپ ان کی حمایت نہ کریں، اس سے معلوم ہوا کہ آپ عالم الغیب نہیں تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانے کی ضرورت نہ تھی کہ ''آپ ان خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں۔''

**آیت 106** وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ...... : یعنی جو حمایت آپ نے کی اس کی مغفرت طلب کریں۔ ایک معنی مفسرین نے یہ بھی کیا ہے کہ ان گناہ گاروں کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات قاضی ایک فریق کی چرب زبانی کی وجہ سے اس کے حق میں فیصلہ دے دے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صحیح نہیں ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! میں ایک انسان ہی ہوں اور جس طرح سنتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہوں، ممکن ہے ایک شخص اپنی دلیل و حجت پیش کرنے میں تیز طرار اور ہوشیار ہو اور میں اس کی گفتگو سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، حالانکہ وہ حق پر نہ ہو اور اس طرح میں دوسرے مسلمان کا حق اسے دے دوں، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ آگ کا ٹکڑا ہے، اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔'' [ بخاری، المظالم، باب إثم من خاصم ...... : ۲۴۵۸ ]

**آیت 107** وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ ...... : مطلب یہ کہ یہ لوگ جنھوں نے دوسروں کی خیانت کی ہے، درحقیقت سب سے پہلے انھوں نے اپنی جانوں سے خیانت کی ہے، کیونکہ دوسروں سے دغا کرنے والا پہلے اپنے آپ سے دغا کرتا ہے۔

**آیت 108** يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ ...... : یعنی ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ گناہوں کا ارتکاب کرنے میں لوگوں سے چھپاؤ تو کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے چھپاؤ نہیں کرتے، جو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کی گھڑیوں میں نامناسب

هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١١٠﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١١١﴾

سن لو! تمھی وہ لوگ ہو جنھوں نے ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا، تو ان کی طرف سے اللہ سے قیامت کے دن کون جھگڑے گا، یا کون ان پر وکیل ہوگا؟ ﴿١٠٩﴾ اور جو بھی کوئی برا کام کرے، یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش مانگے وہ اللہ کو بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان پائے گا ﴿١١٠﴾ اور جو شخص کوئی گناہ کمائے تو وہ اسے صرف اپنی جان پر کماتا ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿١١١﴾

کاموں کے مشورے کر رہے ہوتے ہیں، وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، اس سے بچ کر کہاں جائیں گے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کے مطلب کے لیے دیکھیے سورۂ حدید (۴) اور سورۂ مجادلہ (۷)۔

**آیت 109** ﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ﴾ ...... : یہ ان لوگوں سے کہا جا رہا ہے جو ابیرق کے بیٹوں کی طرف سے وکالت اور بحث کرتے تھے۔

**آیت 110** ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ﴾ ...... : مزید آیات دیکھیے سورۂ زمر (۵۳، ۵۴) سورۂ فرقان (۶۸ تا ۷۱) اور سورۂ آل عمران (۱۳۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی آدمی جب جو کوئی گناہ کرے، پھر اٹھ کر اچھی طرح وضو کرے، پھر اللہ سے معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [ آل عمران : ۱۳۵ ] ”اور وہ لوگ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہ کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون بخشتا ہے۔“ [ ترمذی، الصلاۃ، باب ما جاء فی الصلاۃ عند التوبۃ : ٤٠٦ ]

اس آیت میں ہر قسم کے گناہوں کے نتائج بد سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کی جائے۔ ”سُوْٓءًا“ وہ گناہ جن سے انسان اپنے علاوہ دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے، جیسے جھوٹی شہادت اور بے گناہ کو متہم کرنا اور ”اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ“ سے ان گناہوں کی طرف اشارہ ہے جن سے انسان صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، جیسے نماز چھوڑنا اور شراب پینا وغیرہ۔

**آیت 111** ”کَسَبَ“ کا لفظ کسی شخص کے اس فعل پر بولا جاتا ہے جس سے اسے کوئی نفع یا نقصان حاصل ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ نفع و نقصان سے غنی ہے، اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف ”کَسَبَ“ کی نسبت نہیں ہو سکتی۔ (قرطبی) یعنی جو گناہ کرے گا وہی

وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ خَطِيۡٓــَٔةً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ يَرۡمِ بِهٖ بَرِيۡٓــًٔا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُهۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ وَرَحۡمَتُهٗ لَهَمَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّضِلُّوۡكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَضُرُّوۡنَكَ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ﴿۱۱۳﴾

اور جو بھی کوئی خطا، یا گناہ کمائے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو یقیناً اس نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا ﴿۱۱۲﴾ اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً ان کے ایک گروہ نے ارادہ کر لیا تھا کہ تجھے غلطی میں ڈال دیں، حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو غلطی میں نہیں ڈال رہے اور تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا رہے اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر ہمیشہ سے بہت بڑا ہے ﴿۱۱۳﴾

اس کی سزا بھگتے گا، کوئی دوسرا اس گناہ میں نہیں پکڑا جائے گا، دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ﴾ [ بني إسرائيل : ۱۵ ] ''اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھاتی۔''

**آیت 112** ''خَطِيۡٓــَٔةً'' کا لفظ غیر ارادی گناہ پر بولا جاتا ہے اور اس کے برعکس ''اِثۡمًا'' وہ گناہ ہے جو ارادی طور پر کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ خود گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد کسی بے قصور آدمی کو اس میں ملوث کرنے کی کوشش کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور کسی بے گناہ شخص پر تہمت لگانے کو بہتان کہا جاتا ہے۔ (قرطبی)

**آیت 113** ① **وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ ......** : اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر یہ تھی کہ آپ کو وحی کے ذریعے سے اصل واقع کی حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ ورنہ وہ طائفہ جو بنو ابیرق کا حامی تھا، آپ کو قائل کر کے انھیں بری کرانے ہی والا تھا، اس کا نتیجہ صرف یہی نہ تھا کہ ایک مجرم بچ جاتا اور ایک بے گناہ مجرم بن جاتا، بلکہ اس کے نتائج بہت دور رس تھے، جس سے مسلمانوں کی ساکھ اور کردار مجروح ہو جاتا۔ فرمایا ایسے لوگ درحقیقت اپنی عاقبت برباد کر کے اپنا ہی نقصان کر رہے تھے، آپ کا محافظ خود اللہ تعالیٰ تھا، آپ کو وہ نہ دھوکا دے سکتے تھے نہ آپ کا کچھ نقصان کر سکتے تھے۔

② **وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ** : یعنی آپ کو وحی کے ذریعے سے وہ کچھ سکھایا جو آپ جانتے نہ تھے، بلکہ جس کی آپ امید بھی نہ رکھتے تھے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۸، ۴۹)، سورۂ قصص (۸۶)، سورۂ شوریٰ (۵۲) اور سورۂ ہود (۴۹) یہ ہے اللہ کا آپ پر فضل عظیم۔ بعض لوگ اس سے رسول اللہ ﷺ کے عالم الغیب ہونے کی دلیل پکڑتے ہیں، حالانکہ یہی الفاظ اللہ نے ہر انسان کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں: ﴿ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ﴾ [ العلق : ۵ ] ''اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔'' پھر ہر انسان کا عالم الغیب ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس شخص کے جو کسی صدقے یا نیک کام یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے اور جو بھی یہ کام اللہ کی رضا کی طلب کے لیے کرے گا تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے ﴿۱۱۴﴾

**آیت 114** ① لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ ......: " نَجْوَی " کچھ لوگوں سے علیحدہ ہو کر صلاح مشورہ کو کہتے ہیں، یہ مصدر ہے اور مبالغہ کے طور پر " عَدْلٌ " اور " رِضًی " کی طرح جمع پر بھی بولا جاتا ہے اور "اِلَّا" کے بعد " نَجْوَی" محذوف ہے، یعنی " إِلَّا نَجْوَی مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ " یعنی ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس شخص کی سرگوشی کے جو صدقے کا حکم دے۔

"بِصَدَقَةٍ" صدقہ اس مال کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا جائے۔ یہ اصل میں نفل پر بولا جاتا ہے لیکن بعض اوقات فرض پر بھی بول دیتے ہیں، جیسے: ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ﴾ [ التوبة : ٦٠ ] مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ عمل دل کے صدق سے ادا ہو رہا ہے۔ (راغب) "مَعْرُوْفٍ" یہ لفظ نیکی کے تمام کاموں کو شامل ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمھارا اپنے بھائی کو کھلے چہرے سے ملنا بھی معروف میں سے ہے۔" [ ترمذی، البر والصلة، باب ما جاء فی طلاقة الوجه ...... : ١٩٧٠، عن جابر رضی اللہ عنہ و صححه الألبانی ]

"اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ" کے الفاظ مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کے اختلافات ختم کرنے کو شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ [ الأنفال : ١ ] "سو اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔"

ام کلثوم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: "وہ شخص جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے اور (اس مقصد کے لیے) کوئی اچھی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے یا اچھی بات کہتا ہے۔" [ بخاری، الصلح، باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس : ٢٦٩٢ ]

② منافق لوگ جو راتوں کو الگ بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں، وہ اکثر اوقات بری باتیں ہی سوچتے ہیں، جو خیر سے خالی ہوتی ہیں، کیونکہ بھلائی کی بات اور صاف ستھری بات کو چھپانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ البتہ کچھ کام چھپا کر کرنا بہتر ہوتے ہیں، مثلاً کسی کو صدقہ دے تو چھپا کر دے، تاکہ لینے والا شرمندہ نہ ہو، یا صدقہ دینے سے متعلق الگ مشورہ بھی اچھا کام ہے۔ اسی طرح بھلائی کے کاموں اور بالخصوص لوگوں کے درمیان صلح کرانے سے متعلق اگر خفیہ مشورہ بھی کیا جائے تو یہ بھی ایک نیکی کا عمل ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ ان امور میں سے تو کسی بات کا مشورہ نہیں کرتے، بلکہ ایسے مشورے کرتے ہیں جن سے شر پیدا ہو اور دوسروں کو نقصان پہنچے اور جو شخص مذکورہ بالا امور سے متعلق محض اللہ کی رضا کے لیے مشورہ کرے تو یہ بڑی نیکی کے کام ہیں۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع

اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے ﴿۱۱۵﴾

آیت 115 ① وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ ...... : "يُّشَاقِقِ" "شق" سے باب مفاعلہ کا فعل مضارع معلوم ہے۔ "شق" کا معنی طرف، کنارہ ہے، یعنی جو شخص یا گروہ رسول اللہ ﷺ کی اس طرح مخالفت کرے کہ آپ کے مقابلے میں آ جائے، ایک طرف اللہ کے رسول ہوں دوسری طرف یہ شخص یا گروہ ہو اور حق معلوم ہو جانے کے باوجود مومنوں کے سیدھے اور صاف راستے سے (جو ہر حال میں اتباع رسول ہے) ہٹ جائے، تو ہم بھی اسے اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ پھرے گا اور اسی ٹیڑھی راہ پر جانے دیں گے جو اسے لے جا کر جہنم میں ڈال دے گی اور وہ بہت برا راستہ ہے۔

② ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی کرنا درحقیقت دین اسلام ہی سے نکل جانا ہے، جس پر یہاں جہنم کی وعید بیان فرمائی گئی ہے۔ مومنین سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو دین اسلام کے سب سے پہلے پیروکار اور اس کی تعلیم کا مکمل نمونہ تھے اور ان آیات کے نزول کے وقت جن کے سوا کوئی اور گروہ مومنین کا موجود نہ تھا، جو یہاں مراد ہو سکے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور غیر سبیل المومنین کی پیروی دونوں حقیقت میں ایک ہی چیز کا نام ہے، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے سے ہٹنا بھی کفر اور گمراہی ہے۔ بعض علماء نے "سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ" سے مراد اجماع امت لیا ہے، یعنی پوری امت کے اجماع سے انحراف بھی کفر ہے۔ اجماعِ امت کا مطلب ہے کسی مسئلے میں امت کے تمام علماء وفقہاء کا اتفاق، یا کسی مسئلے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو، یہ دونوں صورتیں اجماعِ امت کی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تو بہت سے مسائل میں ملتا ہے، یعنی اجماع کی یہ صورت تو ملتی ہے لیکن اجماعِ صحابہ کے بعد کسی مسئلے میں پوری امت کے اجماع و اتفاق کے دعوے تو بہت مسائل میں کیے گئے ہیں، لیکن ایسے اجماعی مسائل بہت کم ہیں جن میں فی الواقع امت کے تمام علماء وفقہاء میں اتفاق ہو، پھر ایسے مسائل پر سب علماء وفقہاء کے اتفاق کا پتا چلانا اور بھی مشکل ہے۔ پھر امت میں بہت سے فرقوں کے بن جانے نے یہ نتیجہ دکھایا ہے کہ ہر گروہ اپنی بات کو مضبوط بنانے کے لیے اجماع کا دعویٰ کر دیتا ہے، خواہ وہ صریحاً قرآن و حدیث کے خلاف ہو، مثلاً قبروں پر عمارت بنانا، ان پر غلاف چڑھانا، چراغ جلانا، غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا، تعزیہ نکالنا، انبیاء کو انسان نہ سمجھنا، انھیں خدائی اوصاف دینا، میلاد، گیارھویں، تیجہ، ساتواں، دسواں، چالیسواں، عرس، میلے، پیر کا تصور باندھنا، اس کی ہر صحیح و غلط بات ماننا، الغرض! صریح شرک و بدعت کے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا اور جو اللہ کے ساتھ شریک بنائے تو یقیناً وہ بھٹک گیا، بہت دور بھٹکنا ﴿۱۱۶﴾

کاموں کو اجماع کا نام دے دیا گیا ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ایسے مسائل جن پر فی الواقع پوری امت کے علماء و فقہاء کا اجماع ہو ان کا انکار بھی صحابہ کے اجماع کے انکار کی طرح کفر ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔'' [ ترمذی، الفتن، باب ما جاء فی لزوم الجماعة : ۲۱۶۷، و صححه الألبانی ]

⑥ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا: اس آیت میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جو نبی ﷺ کی سنت اور سلف صالحین کے مسلک سے منہ موڑ کر دوسروں کی پیروی کرتے ہیں اور آئے دن نئی بدعات ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تقلید کی ایجاد بھی بعد کی صدیوں میں ہوئی، سلف صالحین کے دور میں اس کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ کتاب و سنت کی دلیل سے اس کی کوئی گنجائش نکلتی ہے۔

آیت 116 ① اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ......: پچھلی آیت میں اس شخص کا ذکر ہے جو رسول کی مخالفت کرتا ہے اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرتا ہے۔ ایسا وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے کفر پر اصرار کرے اور دینِ اسلام قبول نہ کرے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر پر اڑنے کو شرک قرار دیا اور صراحت فرما دی کہ اس کی بخشش کی کوئی صورت نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص دینِ اسلام قبول کر لے، اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت دے، اس کا عملی ثبوت دے اور ایسے فعل سے بچا رہے جس سے آدمی ملتِ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، تو پھر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے چاہے تو ویسے ہی معاف کر دے یا سزا دے کر جنت میں داخل کر دے۔ مگر جو شخص اسلام ہی قبول نہ کرے، یا اسلام لا کر صریح ارتداد والے اعمال کا ارتکاب کرے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی نہیں، کیونکہ اسے معافی دینے کا مقصد باغی اور غدار کو معافی دینا ہے جو اپنی بغاوت اور غدر پر قائم ہو۔ بغاوت کو کوئی معمولی سے معمولی بادشاہ بھی برداشت نہیں کرتا، تو بادشاہوں کا بادشاہ، جس کی غیرت بے پناہ ہے، وہ بغاوت کو کیسے معاف کر سکتا ہے؟ معلوم ہوا ابدی جہنمی صرف کفار و مشرکین ہوں گے، مسلمان گناہ گار ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔ اس سے ان لوگوں کا رد نکلتا ہے جو کبیرہ گناہ کے مرتکب مسلم کو دائمی جہنمی کہتے ہیں۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۴۸)۔

② اوپر سے منافقوں کا ذکر آ رہا ہے جو پیغمبر ﷺ کے فیصلوں کو پسند نہ کرتے اور جدا راستے پر چلتے تھے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا، تو معلوم ہوا کہ اسلام کے سوا کسی دوسرے دین (طریقہ) کو محبوب رکھا جائے اور اس کو معمول

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾

وہ اس کے سوانہیں پکارتے مگر مؤنثوں کواور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو ﴿۱۱۷﴾ جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس نے کہا کہ میں ہر صورت تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ ضرور لوں گا ﴿۱۱۸﴾

بنایا جائے تو یہ شرک ہے، کیونکہ اسلام کے سوا جو دین بھی ہے شرک ہے، اگرچہ پرستش کا شرک نہ بھی کیا جائے۔ (موضح)

**آیت 117** ❶ "اِنٰثًا" "اُنْثٰی" کی جمع ہے، یعنی مؤنث۔ ان سے مراد یا تو بت ہیں جن کے اکثر نام (لات، مناۃ، عزیٰ وغیرہ) مؤنث تھے۔ یونانیوں اور ہندوؤں نے بھی عبادت کے لیے دیویاں بنا رکھی ہیں۔ مسلمانوں نے ان کی دیکھا دیکھی ایسی ہستیوں میں ایسے اوصاف مشہور کر رکھے ہیں جیسے وہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی محبوبائیں ہوں، بلکہ ان کے خیال میں جو پہنچے ہوئے ہیں وہ اپنی وضع قطع بھی عورتوں والی بنا کر رکھتے ہیں، وہی چوڑیاں وہی زیور وغیرہ، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی جو عورت کا سا لباس پہنے اور اس عورت پر جو مرد کا سا لباس پہنے۔ [ صحیح ابن حبان: ۵۷۵۲، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ و صححہ محققہ ]

❷ اِنْ يَّدْعُوْنَ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی وضاحت اللہ کے سوا کسی دوسرے کو پکارنے کے ساتھ کی ہے، کیونکہ عبادت میں اصل ہے ہی پکارنا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ )) "پکارنا ہی تو عبادت ہے" [ ترمذی، الدعوات، باب منه [ الدعاء مخ العبادة ] : ۳۳۷۲۔ أبو داؤد: ۱۴۷۹ ] اور دیکھیے سورۂ مومن (۶۰) جو شخص بھی غیبی مدد کے لیے کسی کو اللہ کے سوا پکارتا ہے وہ مشرک ہے، کیونکہ عبادت اسی پکارنے ہی کا نام ہے، بلکہ عبادت کی جتنی بھی صورتیں ہیں، یعنی قیام، رکوع، سجدہ، نذر و نیاز اور پکارنا وغیرہ، ان سب کا اصل مقصد کسی کو غیبی قوتوں کا مالک جان کر مانگنا ہی ہوتا ہے، کوئی اللہ کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے تو اس سے مانگتا ہے، غیر اللہ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے مانگتا ہے۔

❸ شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا: بتوں، فرشتوں، دیوی دیوتاؤں اور دوسری ہستیوں کی عبادت کرنے والے اپنے خیال میں جس کی بھی عبادت کرتے رہیں حقیقت میں وہ سرکش شیطان ہی کی عبادت کر رہے ہیں، کیونکہ شیطان ہی انھیں اللہ کے دروازے سے ہٹا کر دوسروں کے آستانوں اور چوکھٹوں پر جھکاتا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔ جن لوگوں کی یہ پوجا کرتے ہیں، انھیں تو خبر ہی نہیں کہ کوئی ہمیں پکار رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۵، ۶) اور یونس (۲۸، ۲۹) یہ لوگ صرف شیطان کے کہنے پر اپنے وہم و گمان سے بنائی ہوئی ہستیوں کو پوج رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ نجم (۲۳) اور یونس (۶۶)۔

**آیت 118** نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا: یعنی تیرے بندوں میں سے ایک گروہ کو اپنی راہ پر ڈال لوں گا، وہ اپنے مال میں میرا حصہ مقرر رکھیں گے، جیسے بتوں اور قبروں کے نام کی نذر و نیاز نکالی جاتی ہے۔ (موضح) جتنے گمراہ دوزخی ہیں سب نصیب شیطان (شیطان کے حصے) میں شامل ہیں۔ (قرطبی) شیطان ملعون اپنی سرکشی سے خود بھی گمراہ ہوا اور انسانوں کو گمراہ کرنے پر بھی اس کی

وَ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

اور یقیناً میں انھیں ضرور گمراہ کروں گا اور یقیناً میں انھیں ضرور آرزوئیں دلاؤں گا اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور چوپاؤں کے کان کاٹیں گے اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت بدلیں گے اور جو کوئی شیطان کو اللہ کے سوا دوست بنائے تو یقیناً اس نے خسارہ اٹھایا، واضح خسارہ ﴿۱۱۹﴾

کمر باندھی کہ نہ دشمنی چھپاتا ہے اور نہ دشمنی سے باز آتا ہے۔

**آیت 119** ① وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ ...... : یہ وہ باطل امیدیں ہیں جو شیطان انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے کہ گناہ کرتے رہو اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے، ایمان مسلمان کے دل میں ہونا چاہیے، نماز پڑھنے اور دوسرے نیک اعمال کی کیا ضرورت ہے، یا ابھی جلدی کیا ہے، مرتے وقت توبہ کر لیں گے، یا جن بزرگوں اور پیروں کا تم دم بھرتے ہو ان کا اللہ پر بڑا زور ہے، تم ان کا دامن تھام لینا وہ تمھیں سیدھے جنت میں لے جائیں گے وغیرہ۔ اس قسم کے تمام خیالات اور گمان شیطانی آرزوؤں میں داخل ہیں۔ (قرطبی، ابن کثیر)

② فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ : " بتك " کا معنی قطع کرنا ہے، یعنی غیر اللہ کے نام پر جانوروں کے کان کاٹ کر ان پر سواری کرنا حرام سمجھیں گے، جنھیں بحیرہ وسائبہ وغیرہ کہتے تھے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۰۳)۔

③ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کی شکل وصورت تبدیل کریں گے اور ان کے حلال وحرام ہونے کے احکام بھی بدل دیں گے۔ اس میں رہبانیت (دنیا میں اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کر کے جنگل میں جا رہنا)، قوم لوط کا عمل، مردوں کا خصی ہو کر ہیجڑا بن جانا، عورتوں کو بانجھ بنانا، برتھ کنٹرول کے نام پر مردوں کی نس بندی اور عورتوں کے آپریشن کر کے بچے پیدا ہونے میں رکاوٹیں ڈالنا، عورتوں کو گھروں سے نکال کر ان کے فطری فرائض سے سبکدوش کر کے مردوں کی صف میں کھڑا کر دینا، عورتوں کو مملکت کی سربراہ بنا دینا، خوب صورتی کے لیے ابروؤں کے بال اکھاڑنا، جلد میں نیل وغیرہ بھر کر نقش و نگار بنانا، دانت باریک کروانا، سر پر مصنوعی بال لگوانا، مردوں کا داڑھی منڈوانا، عورتوں کا لباس کم از کم کر کے انھیں ننگا کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب شیطانی کام ہیں اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کا موجب ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے لعنت کی گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر (جلد میں نیل یا سرمہ بھر کر نقش بنوانے والیوں)، چہرے کے بال صاف کرنے والیوں اور کروانے والیوں پر اور حسن کے لیے دانتوں میں فاصلہ کروانے والیوں پر جو اللہ عزوجل کی خلق (پیدائش) کو بدلتی ہیں۔'' پھر فرمایا: ''میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی اور وہ اللہ کی کتاب میں بھی ہے'' اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر : ۷] ''جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو، جس سے منع کر دے اس سے باز آ جاؤ۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ وما آتاکم الرسول فخذوہ ﴾ : ٤٨٨٦ ]

يَعِدُهُمۡ وَ يُمَنِّيۡهِمۡ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا يَجِدُوۡنَ عَنۡهَا مَحِيۡصًا ﴿۱۲۱﴾ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيۡلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ وَلَاۤ اَمَانِىِّ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ ؕ مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ﴿۱۲۳﴾

وہ انھیں وعدے دیتا ہے اور انھیں آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انھیں دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتا ﴿۱۲۰﴾ یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے ﴿۱۲۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، عنقریب ہم انھیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہمیشہ۔ اللہ کا وعدہ ہے سچا اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے ﴿۱۲۲﴾ نہ تمھاری آرزوؤں پر (موقوف ہے) اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کی جزا دی جائے گی اور وہ اس کے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائے گا اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۲۳﴾

**آیت 121،120** ابلیس کے پاس جھوٹے وعدوں، غلط آرزوؤں اور وسوسوں کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ اس کے سب وعدے جھوٹے اور سراسر دھوکا ہیں، بظاہر خوش نما، اندر سے مہلک ہیں۔ دیکھیے سورۂ فاطر (۵، ۶) اور سورۂ ابراہیم (۲۲) اور ظاہر ہے کہ اپنے دشمن کو پہچانتے ہوئے پھر اس کے وعدوں پر اعتبار اور غلط آرزوؤں کو سچ سمجھنے کا نتیجہ جہنم کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

**آیت 122** جس طرح شیطان اپنی پیروی کرنے والوں سے وعدے کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے نیک بندوں سے جنت اور بلند درجات کے وعدے فرماتا ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے اور بات میں کون سچا ہو سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيۡثًا ﴾ [ النساء : ۸۷ ] ''اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے۔''

**آیت 122** ❶ لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ ...... : اہل کتاب کا خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں، جن گناہوں پر لوگ پکڑے جائیں گے ہم نہیں پکڑے جائیں گے، ہمارے پیغمبر ہماری حمایت کریں گے، ہم صرف چند دن جہنم میں رہیں گے۔ (دیکھیے بقرہ: ۸۰) جنت میں صرف ہم جائیں گے۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۱۱) آج کل کچھ نادان مسلمان بھی اپنے حق میں یہ خیال رکھتے ہیں، سو اللہ نے فرمایا کہ برا کام جو کرے گا، کوئی ہو، سزا پائے گا، کسی کی حمایت کام نہیں آئے گی۔ اللہ کا پکڑا وہی چھوڑے تو چھوٹے۔ دنیا کی مصیبت پر آدمی قیاس کر لے۔

❷ مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ ...... : خوش فہمیاں اور خام خیالیاں سزا کو دفع نہیں کر سکتیں، سزا ضرور ملے گی، خواہ دنیا میں ملے

وَ مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَ لَا يُظۡلَمُوۡنَ نَقِيۡرًا ﴿۱۲۴﴾ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ دِيۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحۡسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبۡرٰهِيۡمَ خَلِيۡلًا ﴿۱۲۵﴾

اور جو شخص نیک کاموں میں سے (کوئی کام) کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور کھجور کی گٹھلی کے نقطے کے برابر ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۱۲۴﴾ اور دین کے لحاظ سے اس سے بہتر کون ہے جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے تابع کر دیا، جب کہ وہ نیکی کرنے والا ہو اور اس نے ابراہیم کی ملت کی پیروی کی، جو ایک (اللہ کی) طرف ہو جانے والا تھا اور اللہ نے ابراہیم کو خاص دوست بنا لیا ﴿۱۲۵﴾

یا آخرت میں، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کی وجہ سے، یا کسی نیک عمل کی وجہ سے، یا دنیا میں آنے والی مصیبتوں کی وجہ سے معاف فرما دے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہاں اسے کوئی اپنے زور سے چھڑوا لے گا: ﴿ وَلَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ﴾ ''اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے نہ کوئی دوست پائے گا اور نہ کوئی مدد گار'' ہاں، اللہ تعالیٰ خود ہی دنیا کی تکلیفوں کو اس کے لیے کفارہ بنا دے، یا اس کے توحید و سنت پر گامزن ہونے کی وجہ سے اس سے درگزر کر دے تو وہ مالک و مختار ہے۔

**آیت 124** نَقِيۡرًا : نقیر اس چھوٹے سے گڑھے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے، یعنی مرد ہو یا عورت اگر ایمان اور عمل صالح موجود ہے تو جنت میں جائیں گے اور ان پر تھوڑے سے تھوڑا ظلم بھی نہیں کیا جائے گا۔

**آیت 125** ❶ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ دِيۡنًا ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عمل کی قبولیت کی شرطیں بیان کی ہیں، پہلی یہ کہ اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کے تابع کر دے، دوسری یہ کہ وہ محسن ہو، تیسری یہ کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرے، جو حنیف تھے۔ چہرہ تابع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دے، اپنی مرضی ختم کر کے اس کی مرضی پر چلے، یہ ایمان ہے۔ محسن ہونے کا مطلب ہے کہ ہر عمل خالص اللہ کے لیے کرے، جیسا کہ آپ ﷺ نے احسان کے بارے میں فرمایا: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ ))[ بخاری، الإیمان، باب سؤال جبریل النبیّ ﷺ : ٥٠ ] اور ملت ابراہیم کی پیروی کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا پوری طرح فرماں بردار ہو جائے، کیونکہ اب قیامت تک ملت ابراہیم پر قائم صرف امت مسلمہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ [ آل عمران : ٦٨ ] ''بے شک سب لوگوں سے ابراہیم کے قریب یقیناً وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے۔'' اور دیکھیے سورۂ نحل (۱۲۳) اگر ایمان نہیں تو کوئی عمل قبول نہیں، احسان و خلوص نہیں تو ریا ہے، جو شرک ہے اور نبی کے طریقے پر نہیں تو سنت نہیں، بلکہ بدعت ہے۔

❷ خَلِيۡلًا : جس کی دوستی دل کے درمیان پہنچ جائے اور اس میں کسی پہلو سے بھی کوئی خامی نہ رہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۲۶﴾ اور وہ تجھ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو کچھ تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جنھیں تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے فرض کیا گیا ہے اور رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو اور نہایت کمزور بچوں کے بارے میں ہے اور اس بارے میں ہے کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو اور تم جو بھی نیکی کرو سو بے شک اللہ ہمیشہ سے اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾

''اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی خلیل بنایا ہے جس طرح اس نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا۔'' [ مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور ...... : ۵۳۲ ]

**آیت 126** یعنی اللہ تعالیٰ کے ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوست بنانے کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرح دوست برابر ہوتے ہیں، ان کی ملکیت بھی ایک ہی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل تھے، نہیں بلکہ آسمان و زمین کی ملکیت اب بھی اللہ ہی کے پاس ہے اور ہر شے کا احاطہ بھی اسی کے پاس ہے، یہ تو اس کا فضل و کرم ہے کہ اپنے ان خاص بندوں کو اپنا خلیل قرار دے کر ان کی عزت افزائی فرمائی۔ دلیل چاہو تو ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کا معاملہ دیکھ لو۔

**آیت 127** ① وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ...... : گو یہاں یہ صراحت نہیں ہے کہ عورتوں کے بارے میں کیا سوال کر رہے تھے، لیکن اگلی چار آیات میں جو فتویٰ دیا گیا ہے اس سے اس سوال کا خود بخود پتا چل جاتا ہے۔

② قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ...... : یہاں دراصل کچھ سوالوں کے جواب کے لیے پچھلی آیات کا حوالہ دیا ہے کہ کتاب کی اسی سورت میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ اسی سے متعلق ہے، مثلاً آیت (۳) اور اس کے بعد کی آیات یتیم لڑکیوں کے نکاح سے متعلق ہیں، پھر عورتوں کے حقوق اور نابالغ بچوں کی نگہداشت اور ان کا مال کھانے سے اجتناب اور ان کا ورثہ دینا یہ سب اسی کے بارے میں ہے۔

③ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ: ''اور رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو'' یہ ترجمہ اس صورت میں ہے کہ جب '' تَرْغَبُوْنَ'' کا صلہ '' فِيْ '' محذوف مانا جائے، جس کا معنی رغبت کرنا ہے اور اگر اس کا صلہ '' عَنْ '' محذوف مانا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا کہ تم ان سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے اس دوسرے ترجمے کی تائید ہوتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں

وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے کسی قسم کی زیادتی یا بے رخی سے ڈرے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں کسی طرح کی صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے، اور تمام طبیعتوں میں حرص (حاضر) رکھی گئی ہے اور اگر تم نیکی کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پورا باخبر ہے ﴿۱۲۸﴾

---

یتیم بچیوں پر دونوں طرح کا ظلم کیا جاتا تھا۔ ابتدا سورت میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ (قرطبی) اس آیت کے مطلب میں شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس سورت کے اول میں یتیم کے حق کا ذکر تھا اور فرمایا تھا کہ یتیم لڑکی، جس کا کوئی ولی نہ ہو مگر اس کا چچازاد، سو وہ اگر سمجھے کہ میں اس کا حق ادا نہ کر سکوں گا تو وہ اسے اپنے نکاح میں نہ لائے، کسی دوسرے سے اس کا نکاح کر دے اور خود اس کا ولی بن جائے۔ اب مسلمانوں نے ایسی عورتوں کو نکاح میں لانا موقوف کر دیا، پھر دیکھا گیا کہ بعض اوقات لڑکی کے ولی ہی کے لیے اسے اپنے نکاح میں رکھنا بہتر ہوتا ہے، اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت مانگی گئی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اجازت مل گئی اور فرمایا کہ وہ جو کتاب میں منع کیا گیا تھا وہ اس وقت ہے کہ اس کا حق پورا نہ دو، اگر ان کے حق کی بہتری کی سوچو تو رخصت ہے۔'' (موضح)

④ **وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ**: یعنی ان کے بارے میں بھی اپنے احکام یاد دلاتا ہے جو اس سورت کے شروع میں میراث کے تحت دیے گئے ہیں۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۰، ۱۱)۔

**آیت 128** ① **وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ ......** : ''**نُشُوْزًا**'' کا مطلب ہے زیادتی، لڑائی جھگڑا، اعراض، بے رخی۔ نشوز یا اعراض یہ ہے کہ اس سے بدسلوکی کرے، اس کو حقیر سمجھے، اس کے پاس سونا بیٹھنا چھوڑ دے، اسے نان و نفقہ نہ دے، مارنے کے لیے بہانے تراشے، یا اس کے پاس اور بیوی ہے جسے وہ زیادہ چاہتا ہے، اس لیے اس کی طرف توجہ کم ہے، تو اس صورت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ عورت سمجھے کہ میں اسی شخص کے نکاح میں رہوں تو میرے حق میں بہتر ہے، خواہ مجھے اپنے کچھ حقوق چھوڑنے پڑیں۔ دوسری یہ کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائے، آیت (۱۲۸) میں پہلی صورت کا ذکر ہے اور آیت (۱۳۰) میں دوسری صورت کا ذکر ہے۔

② **اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا**: ''**صُلْحًا**'' کی تنکیر (کسی طرح کی صلح) سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی آپس میں کسی طریقے سے بھی صلح کر لیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''کسی مرد کے پاس کوئی عورت ہوتی اور اب وہ اسے مزید نہ رکھنا چاہتا اور طلاق دینے کا ارادہ کرتا تو وہ عورت کہہ دیتی کہ (مجھے طلاق نہ دے، اپنے نکاح میں رہنے دے) میں اپنی

وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

اور تم ہرگز نہ کر سکو گے کہ عورتوں کے درمیان برابری کرو، خواہ تم حرص بھی کرو، پس مت جھک جاؤ (ایک کی طرف) مکمل جھک جانا کہ اس (دوسری) کو لٹکائی ہوئی کی طرح چھوڑ دو اور اگر تم اصلاح کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۲۹﴾

باری کے بارے میں تمھیں اجازت دیتی ہوں (کہ تو جس بیوی کے پاس چاہے رہے) چنانچہ یہ آیت اس سلسلے میں نازل ہوئی۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و إن امرأة خافت...... ﴾ : ٤٦٠١ ]

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ سودہ رضی اللہ عنہا کو اندیشہ لاحق ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں طلاق دے دیں گے تو انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میری باری کا دن عائشہ کو دے دیں مگر مجھے طلاق نہ دیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کیا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا ﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''وہ دونوں جس چیز پر صلح کر لیں وہ جائز ہے۔'' [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة النساء : ٣٠٤٠ ] عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا عمر رسیدہ ہو گئیں تو انھوں نے اپنا دن عائشہ کو ہبہ کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کا دن بھی عائشہ کے پاس گزارتے تھے۔ [ بخاری، النکاح، باب المرأة تهب يومها من زوجها...... : ٥٢١٢ ]

③ وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ: یعنی صلح ہر حال میں بہتر ہے، کیونکہ شیطان اپنے کارندوں میں سے اس کارندے کو اپنے قریب کر کے شاباش دیتا ہے جو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کروا دے۔ [ مسلم، صفات المنافقين و أحكامهم، باب تحريش الشيطان ...... : ٢٨١٣/٦٧ ]

④ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ: ''الشُّحَّ'' کا معنی ہے بخل، جس کے ساتھ حرص بھی ہو، یعنی انسان کا بخل اور لالچ تو فطری امر ہے، مرد کا شح یہ ہے کہ عورت سے فائدہ اٹھائے مگر اس کے پورے حقوق ادا نہ کرے اور عورت کا شح یہ ہے کہ مہر اور نان و نفقہ تو پورا وصول کرے مگر حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔

⑤ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا...... : یعنی اس لالچ کے جذبے کے باوجود اگر میاں بیوی ایک دوسرے سے احسان اور فیاضی کا سلوک کریں اور اللہ سے ڈرتے رہیں تو اللہ کے ہاں اس کا اجر ضرور پائیں گے، جو ان کے ہر عمل سے پورا باخبر ہے۔

**آیت 129** ① وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا...... : یعنی دو یا دو سے زیادہ بیویوں کے درمیان ہر لحاظ سے پوری پوری مساوات برتنا انسانی طاقت سے باہر ہے، کیونکہ عورتوں میں اپنی طبیعتوں، اخلاق و عادات، حسن صورت اور عمر وغیرہ میں ایک دوسری سے فرق ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مرد کا میلان ایک کی طرف زیادہ اور دوسری کی طرف کم ہو تو یہ ایک فطری امر ہے، جس پر وہ چاہے بھی تو قابو نہیں پا سکتا۔ لہٰذا قرآن نے اس بات پر زور دیا کہ ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں

وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے غنی کر دے گا اور اللہ ہمیشہ سے وسعت والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۳۰﴾

ایک کی طرف اس طرح جھک جانا کہ دوسری معلق (لٹکی ہوئی) ہو کر رہ جائے، گویا اس کا کوئی شوہر ہی نہیں اور نہ وہ غیر شادی شدہ ہے کہ کہیں اور نکاح کر لے، تو یہ حرام ہے، ظاہری حقوق میں عورتوں سے مساوی سلوک کیا جائے، دل کے میلان پر گرفت نہیں ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''یا اللہ! یہ میری بیویوں کے درمیان اس چیز کی تقسیم ہے جس کا میں اختیار رکھتا ہوں (یعنی کھانا پینا، کپڑا، سونا بیٹھنا وغیرہ) لہٰذا تو مجھے اس چیز پر ملامت نہ فرما جس کا میں اختیار نہیں رکھتا (یعنی دلی میلان اور محبت)۔'' [ أبو داؤد، النكاح، باب في القسم بين النساء : ٢١٣٤ـ ترمذي : ١١٤٠ ]

② بعض لوگوں نے اس آیت اور اس سورت کی آیت (۳) دونوں کو ملا کر نتیجہ نکالا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل ممکن ہی نہیں۔ دوسرا حکم ہے کہ اگر عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو بس ایک بیوی یا لونڈی رکھو۔ معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح جائز نہیں۔ اس کے جواب کے لیے سورۂ نساء کی آیت (۳) کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ بلکہ زیر تفسیر آیت میں تو عورتوں کے درمیان عدل میں اتنی رعایت دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے منع نہ کیا ہوتا تو آدمی چار سے زیادہ بیویاں بھی رکھ سکتا تھا، بشرطیکہ کوئی عورت ایسی لٹکی ہوئی نہ ہوتی کہ خاوند اس کے پاس چکر ہی نہ لگاتا، نہ اس کے کھانے پینے کی فکر کرتا۔ اگر آدمی اصلاح کرے اور ڈرے تو جو کمی بیشی ہے وہ اللہ معاف کر دے گا۔

آیت 130 ① وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ: یہ دوسری صورت ہے کہ میاں بیوی کے درمیان صلح کی کوئی صورت باقی ہی نہیں رہی تو اچھے طریقے سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ مرد کو دوسری بیوی مل جائے گی، جو اسے پسند ہو اور عورت کو دوسرا شوہر مل جائے گا جو اس سے محبت کرے اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھے۔ (قرطبی) اس سے اسلام کے احکام کی حکمت، وسعت اور رحمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض مذاہب میں طلاق کو حرام قرار دیا گیا ہے، ایک دفعہ جب نکاح ہو گیا اب وہ خواہ ایک دوسرے سے کتنے متنفر ہو جائیں، خواہ ان کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جائے، طلاق نہیں دے سکتے۔ نہیں ہرگز نہیں، جب تعلق روگ بن جائے تو اس کا ٹوٹنا ہی اچھا ہے۔ اسلام نے دونوں کے لیے علیحدگی کا راستہ رکھا ہے، جس کے ذریعے سے وہ نئی زندگی شروع کر کے امن و اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے ہیں، رہی وہ حدیث جس میں ہے: « أَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰهِ الطَّلَاقُ » (اللہ کے نزدیک حلال میں سب سے ناپسندیدہ طلاق ہے) تو یہ حدیث صحیح سند سے رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [ دیکھیے إرواء الغلیل : ۱۰٦/۷، ح : ۲۰٤۰ ]



② وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا: یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ کسی کا رزق میرے ہاتھ میں ہے، اگر میں نہ دوں گا تو وہ بھوکا مر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ رازق مطلق ہے اور اس کے انتظامات انسانی سمجھ سے بالاتر ہیں، اس نے جس طرح ملاپ میں حکمت رکھی ہے، جدائی میں بھی رکھی ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اگر تم کفر کرو گے تو بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہمیشہ سے ہر طرح بے پروا، ہر تعریف کا حق دار ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بطور وکیل کافی ہے ﴿۱۳۲﴾ اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اے لوگو! اور کچھ دوسروں کو لے آئے اور اللہ ہمیشہ سے اس پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۳۳﴾

**آیت 131، 132** ① وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: گزشتہ آیات میں عورتوں اور یتیم بچوں سے متعلق احکام بیان کیے گئے تھے، اب جو یہ فرمایا کہ زمین و آسمان کی ہر شے اللہ کی ہے، تو اس سے لوگوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ان احکام پر عمل کرنے میں تمھارا ہی فائدہ ہے، اللہ تعالیٰ کسی کے فائدے اور نقصان سے بے نیاز ہے۔

② وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... : یعنی تم سے پہلے لوگوں کو اور تم سب کو اس بات کا تاکیداً حکم دیا گیا کہ اللہ سے ڈرو، یعنی اس کے دیے گئے احکام پر عمل کرو۔ یہ جملہ "اتَّقُوا اللّٰهَ" قرآن کی تمام آیات کے لیے بمنزلہ رحی (چکی) کے ہے کہ اسی کی لٹھ پر تمام آیات گھومتی ہیں۔ ابن عاشور رحمہ اللہ نے فرمایا: ''قرآن مجید میں اللہ کے اسماء کے بعد سب سے زیادہ اسی کا ذکر ہوا ہے۔''

③ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''تین بار فرمایا کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، پہلی بار کشائش (کھلا رزق دینے) کا بیان ہے (کہ علیحدگی کی صورت میں اللہ تعالیٰ دونوں کو غنی کر دے گا، کیونکہ جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کا ہے، جسے جس طرح چاہے دیتا ہے) دوسری دفعہ اس کی بے پروائی کا بیان ہے کہ اگر تم کفر کرو، منکر بنو تو اللہ بھی بے پروا ہے، کیونکہ سبھی کچھ اس کا ہے) اور تیسری بار اللہ کے کارساز ہونے کا بیان ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو وہ کافی وکیل ہے۔'' (موضح)

**آیت 133** : یعنی اگر تم تقویٰ اختیار نہ کرو تو مت بھولو کہ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور تمھاری جگہ اور لوگوں کو یہاں بسا دے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد: ۳۸] ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔''

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

جو شخص دنیا کا بدلہ چاہتا ہو تو اللہ ہی کے پاس دنیا اور آخرت کا بدلہ ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۱۳۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر پوری طرح قائم رہنے والے، اللہ کے لیے شہادت دینے والے بن جاؤ، خواہ تمھاری ذاتوں یا والدین اور زیادہ قرابت والوں کے خلاف ہو، اگر کوئی غنی ہے یا فقیر تو اللہ ان دونوں پر زیادہ حق رکھنے والا ہے۔ پس اس میں خواہش کی پیروی نہ کرو کہ عدل کرو اور اگر تم زبان کو پیچ دو، یا پہلو بچاؤ تو بے شک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پوری طرح باخبر ہے ﴿۱۳۵﴾

**آیت 134** یعنی جس شخص کا مطلوب و مقصود صرف دنیا ہی ہے اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے تو تم صرف فانی کی طلب میں کیوں بیٹھے ہو، دنیا اور آخرت دونوں کیوں طلب نہیں کرتے۔ اللہ کے احکام پر عمل کرو گے تو دنیا بھی تمھاری اور آخرت بھی۔ صرف دنیا کی طلب تو خسارا ہی خسارا ہے۔ رہا یہ کہ تمھارا عمل دنیا کے لیے ہے یا آخرت کے لیے، تو اسے اللہ تعالیٰ خوب سنتا ہے، دیکھتا ہے۔ (دیکھیے ہود: ۱۵، ۱۶۔ بقرہ: ۲۰۰ تا ۲۰۲۔ بنی اسرائیل: ۱۸ تا ۲۱)

**آیت 135** ① كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ ...... : یعنی انصاف پر پوری طرح قائم رہ کر اللہ کے لیے گواہی دو، چاہے وہ تمھارے خلاف ہی پڑے، یا والدین یا قرابت داروں کے اور اس میں تمھارا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ (ابن کثیر)

② اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اولاد کی شہادت ماں باپ کے خلاف قبول ہوگی اور یہ ان کے ساتھ " بِرّ " یعنی احسان کے منافی نہیں ہے۔ والدین اور بھائی کی شہادت بھی سلف کے نزدیک مقبول ہے، مگر یہ اسی صورت میں ہے کہ جب وہ عادل ہوں اور ان پر تہمت نہ ہو۔ اسی تہمت کے پیش نظر بعض ائمہ نے میاں بیوی کی ایک دوسرے کے حق میں شہادت کو جائز رکھا ہے اور بعض نے رد کیا ہے۔ (قرطبی)

③ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا...... : یعنی جس کے خلاف تمھاری گواہی پڑ رہی ہے وہ دولت مند ہے تب اور غریب ہے تب، تم اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت سے بڑھ کر اس کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے، لہٰذا نہ تم دولت مند کی دولت مندی کی وجہ سے اس کی بے جا حمایت یا مخالفت کرو اور نہ غریب پر ترس کھا کر اس کی بے جا رعایت کرو، بلکہ ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سچی گواہی دو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ غریب کی غربت تمھیں اس کی بے جا حمایت پر آمادہ کر دے، تم اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اس کے بندوں کے، خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، نہ زیادہ خیر خواہ ہو سکتے ہو اور نہ زیادہ ان پر حق رکھنے والے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی اور جو شخص اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت (کے ساتھ) کفر کرے تو یقیناً وہ گمراہ ہوا، بہت دور گمراہ ہونا ﴿۱۳۶﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا، پھر وہ کفر میں بڑھ گئے، اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں بخش دے اور نہ یہ کہ انھیں کسی راستے کی ہدایت دے ﴿۱۳۷﴾

④ وَ اِنْ تَلْوٗۤا...... "لَوٰی يَلْوِیْ لَيًّا (ض)" پیچ دینا، یعنی اگر تم زبان کو پیچ دے کر اس طرح بات بنا کر پیش کرو کہ جس کے خلاف گواہی پڑنی چاہیے وہ بچ جائے، یا "تُعْرِضُوْا" یعنی گواہی دینے ہی سے پہلو بچاؤ، بلکہ چھپا جاؤ تو بے شک تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اس سے پوری طرح باخبر ہے، اس کی پوری سزا اللہ کے ہاں پاؤ گے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم نے صاف جھوٹ نہیں بولا تو جھوٹی گواہی کے گناہ سے بچ جائیں گے۔

آیت 136 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...... : یہاں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دیا جا رہا ہے، یعنی ایمان پر ثابت قدم رہو، یا اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرو، اس کے مخاطب تمام مومنین ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کے مخاطب اہل کتاب کے مومن ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ (فتح القدیر) قرطبی لکھتے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ یہ خطاب منافقین سے ہے، ان کے بظاہر مسلمان ہونے کی وجہ سے ایمان والے فرما دیا اور معنی یہ ہے کہ جب تک دل میں کامل یقین پیدا نہیں کرو گے اور خالص اللہ کو نہیں مانو گے تو اللہ کے ہاں مسلمان نہیں ہو سکتے۔

② پہلی کتابوں پر ایمان رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ بھی قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ باقی رہا عمل! تو وہ ان پر نہیں بلکہ قرآن مجید اور نبی ﷺ کی سنت پر کیا جائے گا۔ ان کتابوں میں جو چیز کتاب و سنت کے مطابق ہوگی اس کی تصدیق کی جائے گی اور جو ان کے خلاف ہوگی اسے رد کر دیا جائے گا۔

③ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ...... : یعنی اگر ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کیا تو گویا تمام چیزوں کا انکار کر دیا۔

آیت 137 اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ...... : ان لوگوں سے مراد منافقین ہیں جو مسلمان تو ہو گئے مگر جب کوئی فائدہ دیکھتے تو ایمان کی طرف بڑھ جاتے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی تو کافر ہو جاتے۔ یہ لوگ مشرکین اوس و خزرج میں سے بھی

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ؗۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ﴿۱۴۰﴾

منافقوں کوخوش خبری دے دے کہ بے شک ان کے لیے ایک درد ناک عذاب ہے ﴿۱۳۸﴾ وہ جو کافروں کومومنوں کے سوا دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں؟ تو بے شک عزت سب اللہ کے لیے ہے ﴿۱۳۹﴾ اور بلاشبہ اس نے تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کو سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ بے شک تم بھی اس وقت ان جیسے ہو، بے شک اللہ منافقوں اور کافروں، سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے ﴿۱۴۰﴾

تھے اور یہود مدینہ سے بھی۔ اب بھی بے شمار مسلمانوں کا یہی حال ہے، فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ [ الحج : ۱۱ ] ''اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے۔'' پھر ''کفر میں بڑھ گئے'' یعنی پھر وہ کفر پر قائم رہے اور اسی پر مر گئے، کیونکہ کفر کا یہی وہ درجہ ہے جس کی بخشش نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص تائب ہو جائے اور ایمان لے آئے تو اس کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ یہاں بات ان لوگوں کی ہو رہی ہے جنھوں نے ایمان قبول کیا، پھر اسے چھوڑ دیا، پھر اسے قبول کر لیا، پھر اسے چھوڑ کر گمراہی کو قبول کر لیا اور پھر گمراہی میں بڑھتے ہی گئے، حتیٰ کہ کفر کی حالت میں مر گئے، تو مرنے کے بعد ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں، اللہ انھیں معاف نہیں کرے گا، کیونکہ اس صورت حال تک پہنچنے کے بعد اس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں کہ اب انھیں نکلنے کی کوئی صورت مل سکے۔ انھی لوگوں کا ذکر سورۂ آل عمران (۷۲)، سورۂ منافقون (۳) اور سورۂ نساء (۱۸) میں کیا گیا ہے۔

**آیت 139،138** يَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ...... : بشارت خوشی کی خبر کو کہتے ہیں، یہاں بطورِ طنز کہا ہے کہ منافقوں کو عذابِ الیم کی خوش خبری دے دو، جو مسلمانوں کے بجائے کافروں کو اس لیے دوست بناتے ہیں کہ اس سے انھیں عزت حاصل ہو گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عزت کافروں کی دوستی میں نہیں بلکہ وہ تو سب کی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی بات سورۂ فاطر (۱۰) اور سورۂ منافقون (۸) میں بیان فرمائی، بلکہ سورۂ منافقون میں فرمایا: ''لیکن منافق نہیں جانتے'' کہ اللہ کے ہاں عزت تو کفر کی وجہ سے گئی اور کفار کے پاس عزت تھی ہی نہیں جو انھیں ملتی، اگر بظاہر کچھ تھی بھی تو ان کے دوغلے پن کی وجہ سے ان کا اعتبار بھی اٹھ گیا۔ [ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ]

**آیت 140** وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ ...... : اس سے پہلے سورۂ انعام (۶۸) میں یہ حکم نازل ہو چکا تھا، چنانچہ فرمایا:

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۷

وہ جو تمھارے بارے میں انتظار کرتے ہیں، پھر اگر تمھارے لیے اللہ کی طرف سے کوئی فتح ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کوئی حصہ مل جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہیں ہو گئے تھے اور ہم نے تمھیں ایمان والوں سے نہیں بچایا تھا۔ پس اللہ تمھارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راستہ نہیں بنائے گا ﴿۱۴۱﴾

''اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔'' [ الأنعام : ٦٨ ] حدیث میں ایسی مجلس میں بیٹھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جہاں اللہ کے حکم کی صریح نافرمانی ہو، چنانچہ فرمایا: ''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اس دستر خوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب کا دور چلتا ہو۔'' [ أحمد: ١ / ٢٠، ح : ١٢٦ ، و حسنه الألباني في غاية المرام ] ایسے واضح احکام کے باوجود منافقین کی یہ روش تھی کہ مسلمانوں کی مجلسوں کو چھوڑ کر یہودیوں اور مشرکوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے جہاں آیات الٰہی کا مذاق اڑایا جاتا۔ زیر تفسیر آیت میں ان کی اسی روش کی طرف اشارہ ہے، ویسے آیت عام ہے اور ہر ایسی مجلس میں شرکت حرام ہے جہاں قرآن و سنت کا مذاق اڑایا جاتا ہو، چاہے وہ کفار و مشرکین کی مجلس ہو یا اہل بدعت اور فساق و فجار کی۔ جب برائی کو ہاتھ سے بھی نہ روک سکے، نہ زبان سے تو پھر خاموش بیٹھ کر سنتے رہنا اور دل میں برا بھی نہ جاننا تو کمزور ترین ایمان کے بھی منافی ہے، بلکہ فرمایا: ''تم بھی اس وقت ان جیسے ہو گے۔'' اسی لیے شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جو شخص ایک مجلس میں اپنے دین کے عیب سنے، پھر انھی میں بیٹھے، اگرچہ آپ نہ کہے وہی منافق ہے۔'' (موضح)

**آیت 141** ① الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ...... : یعنی یہ منافقین تمھارے بارے میں تاک اور انتظار میں رہتے ہیں، اگر اللہ کی طرف سے تمھیں فتح مل جائے تو کہتے ہیں، کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے، یعنی اس فتح میں ہمارا بھی حصہ ہے اور اگر کسی وقت کافروں کو کوئی حصہ مل جائے تو ان سے کہتے ہیں، کیا ہم تم پر غالب نہیں آ گئے تھے، پھر یہ ہمارا ہی کام تھا کہ ہم نے ایسے وسائل اختیار کیے جن سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور ہم نے تمھیں مسلمانوں سے بچا لیا، یعنی منافقین دونوں طرف اپنا احسان چڑھاتے رہتے تھے۔

② فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: یعنی دنیا میں تو ان منافقین نے بظاہر کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو بچا لیا، لیکن آخرت میں ان کی حقیقت کھول دی جائے گی اور پتا چل جائے گا کہ کون مومن تھا اور کون منافق؟

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۟ۙ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖۗ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم ﴿۱۴۲﴾ اس کے درمیان متردد ہیں، نہ ان کی طرف ہیں اور نہ ان کی طرف اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر تو اس کے لیے ہرگز کوئی راستہ نہ پائے گا ﴿۱۴۳﴾

③ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ …… : اگر کوئی کہے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راستہ نہیں بنائے گا، مگر اس وقت معاملہ اس کے برعکس ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ ان مومنوں پر جن کا یہاں ذکر ہے، کفار کو کبھی غلبہ حاصل نہیں ہوا، اب اگر مومن ہی وہ مومن نہ رہیں اور جہاد چھوڑ بیٹھیں تو اس میں اللہ کے وعدے کا کیا قصور ہے؟

آیت 142 ① اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ : اس جملے کی تشریح سورۂ بقرہ کی آیت (۹) اور (۱۵) میں ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انھیں دھوکا دینا بھی اسی طرح ہوگا جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔

② وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى …… : اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کو اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرنے کے لیے مسجد میں آنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی مسجد میں نماز نہ پڑھتا تو مسلمان شمار نہیں ہوتا تھا، منافقین کی یہ نمازیں صرف مسلمانوں کے دکھلاوے کے لیے تھیں، اس لیے جن نمازوں میں چھپنے کی گنجائش ہوتی اس میں وہ غیر حاضر رہتے، جیسے صبح اور عشاء کی نماز۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''منافقین پر صبح اور عشاء کی نماز تمام نمازوں سے زیادہ بھاری ہے، حالانکہ اگر وہ جانتے کہ ان کا کیا ثواب ہے تو وہ ان میں حاضر ہوتے، چاہے انھیں ان میں گھسٹ کر آنا پڑتا۔'' [ بخاري، الأذان، باب فضل في صلوة العشاء…… : ٦٥٧۔ مسلم : ٦٥١/٢٥٢ ]

③ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا : یعنی جلدی جلدی، جیسے کوئی بیگار ٹالنا مقصود ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ منافق کی نماز ہے، بیٹھا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان (یعنی غروب کے بالکل قریب) ہو جاتا ہے، تو اٹھتا ہے اور چار ٹھونگے مار لیتا ہے، ان میں اللہ کو یاد نہیں کرتا مگر بہت کم۔'' [ مسلم، المساجد، باب استحباب التبكير : ٦٢٢ ] معلوم ہوا کہ عصر کی نماز دیر سے پڑھنا بھی نفاق ہے اور جلدی جلدی اکٹھے دو سجدے بھی، جن میں وقفہ نہ ہو، ایک ہی سجدہ ہوتے ہیں، ورنہ آپ چار کے بجائے آٹھ ٹھونگے فرماتے۔

آیت 143 ① مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ …… : نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے جو دو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَ سَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کے لیے اپنے خلاف ایک واضح حجت بنا لو ﴿۱۴۴﴾ بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا ﴿۱۴۵﴾ مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور اللہ کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنا دین اللہ کے لیے خالص کر لیا تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ مومنوں کو جلد ہی بہت بڑا اجر دے گا ﴿۱۴۶﴾

ریوڑوں کے درمیان ماری ماری پھرتی ہے، کبھی اس ریوڑ کی طرف اور کبھی اس ریوڑ کی طرف اور نہیں جانتی کہ ان دونوں میں سے کس کے پیچھے لگے۔'' [ مسلم، صفات المنافقین، باب صفات المنافقین : ۲۷۸۴ ]

② یعنی جو شخص سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود خود گمراہی میں پڑا ہوا اور باطل پرستی کی طرف راغب ہو تو اسے راہِ راست پر لانے کے لیے کوئی انسانی نصیحت اور کوشش کارگر نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی سزا کے طور پر گمراہی اور باطل پرستی میں پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے گا۔

**آیت 144** ① لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ...... : اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کافروں کو دوست بنانے کی جگہ جگہ ممانعت کی ہے، دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۸)، سورۂ مائدہ (۵۱)، سورۂ مجادلہ (۲۲) اور سورۂ ممتحنہ (۱)۔

② اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا...... : یعنی اس کے حکم کی خلاف ورزی کر کے عذاب الٰہی کے لیے ایسی واضح اور کھلی دلیل اپنے اوپر قائم کرنا چاہتے ہو کہ اس کے بعد مستحق عذاب ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔

**آیت 145** اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ...... : جس طرح جنت کے درجات ہیں، سب سے اونچا درجہ فردوس سب سے افضل ہے، اسی طرح جہنم کے بھی درکات ہیں، جو جتنا نیچا ہے اتنا ہی سخت ہے۔ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے، کیونکہ نفاق صریح کفر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

**آیت 145** اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا...... : جن منافقین کی اوپر مذمت کی ہے ان کی نجات کے لیے بطور استثنا چار باتیں فرمائیں، ایک یہ کہ اپنے پچھلے رویے پر نادم ہوں، دوسری یہ کہ آئندہ کے لیے اپنی پوری طرح اصلاح کر لیں، تیسری یہ کہ اللہ کی رسی مضبوط پکڑیں، چوتھی یہ کہ دین کا جو کام کریں خالص اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کریں۔ (احسن التفاسیر) یہ چاروں کام درجہ بدرجہ اور ایک دوسرے کی ترتیب پر قائم ہوں گے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اللہ تمھیں عذاب دینے سے کیا کرے گا، اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ۔ اور اللہ ہمیشہ سے قدر کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۴۷﴾

آیت 147 مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ ...... : مقصد یہ بتانا ہے کہ عذاب کا باعث تمھارا شکر نہ کرنا اور ایمان نہ لانا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے کہ تمھیں عذاب دے، سو اگر تم دل سے ایمان لے آؤ اور قول و فعل سے اللہ کی فرماں برداری کر کے اس کا شکر ادا کرو تو اللہ قدر دان ہے اور سب کچھ جانتا بھی ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

اللہ بری بات کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتا مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۴۸﴾ اگر تم کوئی نیکی ظاہر کرو، یا اسے چھپاؤ، یا کسی برائی سے درگزر کرو تو بے شک اللہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۴۹﴾

آیت 148 ① لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ……: یعنی اگر کسی شخص میں کوئی دینی یا دنیوی عیب پایا جاتا ہے تو اسے سر عام ذلیل کرنا جائز نہیں اور نہ ہر شخص کو بتانا جائز ہے، کیونکہ یہ غیبت ہے اور غیبت قطعی حرام ہے، البتہ جب کوئی شخص ظلم پر اتر آئے تو مظلوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کی زیادتی کے خلاف آواز بلند کرے، خصوصاً جہاں آواز بلند کرنے سے اس پر ظلم رک سکتا ہو، یا اس کا مداوا ہو سکتا ہو۔ اسی طرح لوگوں کو اس کے ظلم سے بچانے کے لیے اس کا عیب بیان کرنا بھی جائز ہے۔ حدیث کے راویوں پر جرح بھی اسی ضمن میں آتی ہے، کیونکہ ضعیف روایت بیان کرنا امت پر ظلم ہے۔ کوئی شخص باوجود وسعت کے دوسرے کا حق نہ دیتا ہو تو اس کو طعن و ملامت کرنا بھی جائز ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''غنی آدمی کا حق ادا کرنے میں دیر کرنا، یا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور اس کی عزت کو حلال کر دیتا ہے۔'' [ بخاری، الاستقراض، باب لصاحب الحق مقال، قبل ح : ۲٤۰۱ ] اسی طرح جو زیادتی میں پہل کرے اسے جواب دینا جائز ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''آپس میں گالی گلوچ کرنے والے، وہ دونوں جو کچھ بھی کہیں، سب گناہ پہل کرنے والے پر ہے، جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے۔'' [ مسلم، البر والصلة، باب النهی عن السباب : ۲۵۸۷ ] اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ ظالم کے حق میں بددعا کرنا جائز ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ شوریٰ (۴۱) کوئی شخص زبردستی اس کے منہ سے برا کلمہ نکلوائے تو وہ بھی اس کے تحت جائز ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی) ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ہمسائے کی زیادتیوں کی شکایت کی، آپ نے اسے اپنا سامان گھر کے باہر راستے میں نکال کر رکھ دینے کا مشورہ دیا، اب جو گزرتا پوچھتا تو وہ ہمسائے کا ظلم بتاتا۔ ہمسائے نے یہ دیکھ کر معذرت کر لی اور آئندہ ایذا نہ پہنچانے کا وعدہ کیا اور سامان اندر رکھنے کی درخواست کی۔ [ أبو داوٗد، الأدب، باب فی حق الجوار : ۵۱۵۳ ]

② گزشتہ آیات میں منافقین کے عیوب کا بیان تھا، یہاں بات مکمل کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ چونکہ ظالم ہیں، اس لیے ان کے عیب ظاہر کرنا جائز ہے۔ (کبیر) تاہم حتی الوسع نام لے کر بیان نہ کرے۔ (موضح) ﴿وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا﴾ یعنی اگر مظلوم زیادتی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو وہ بھی معلوم ہے۔

آیت 149 اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا……: اس آیت میں معاف کر دینے کی ترغیب ہے، یعنی اگرچہ ظالم کا شکوہ یا اس کے حق میں بددعا جائز ہے، تاہم عفو و درگزر سے کام لینا بہتر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پوری قدرت رکھنے کے باوجود بہت معاف کرنے والا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مال صدقے سے کم نہیں ہوتا اور معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں ﴿۱۵۰﴾ یہی لوگ حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۵۱﴾

میں اضافہ ہی کرتا ہے اور کوئی شخص اللہ کے لیے نیچا نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ اسے اونچا کر دیتا ہے۔" [ مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع : ۲۵۸۸ ]

**آیت 150** ① اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ : منافقین کے قبیح اعمال و اقوال بیان کرنے کے بعد اب یہاں سے اہل کتاب ( یہود و نصاریٰ ) کے خیالات و شبہات اور ان کی تردید کا بیان شروع ہو رہا ہے اور یہ سلسلہ سورت کے آخر تک چلا گیا ہے۔ (رازی ) اللہ تعالیٰ کو ماننا اور رسالت و نبوت کو نہ ماننا کفر ہے۔ ( قرطبی ) اس لیے کہ اللہ کا ماننا یہی ہے کہ زمانے کے پیغمبر کا حکم مانے، اس کے بغیر اللہ کا ماننا غلط ہے۔ ( موضح ) نیز اللہ کے احکام ماننے سے انکار اس کا بندہ ہونے سے انکار ہے اور بندگی ( عبادت ) سے انکار کا مطلب کائنات کو بنانے والے کا انکار ہے تھے۔

② وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ...... : مراد اہل کتاب ہی ہیں اور بعد والے جملے انھی کی خصلتوں کی تفسیر ہیں۔ ( قرطبی، رازی ) یہود موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے لیکن عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتے تھے اور نصاریٰ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو مانتے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتے تھے۔ (ابن کثیر )

③ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا : یعنی سب کو ماننا ایمان ہے، کسی ایک کا انکار کفر ہے، جب کہ یہ لوگ بعض پر ایمان لا کر اور بعض سے انکار کر کے ایک تیسری راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اس کا نام یہودیت یا نصرانیت رکھتے ہیں، جیسا کہ ہمارے زمانے کے مادہ پرستوں نے مسجدوں میں نماز، بازاروں میں سود، غم و شادی اور عام رہن سہن میں غیر مسلموں کی نقالی اور عدالتوں اور حکومت کے شعبوں میں کفریہ قوانین، سب کچھ کو ملا کر اس کا نام اسلام رکھ دیا ہے اور بعض نے کہا کہ قرآن کو تو مانیں گے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو نہیں مانیں گے۔ یہ منکرینِ حدیث بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں۔

**آیت 151** اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا : یعنی ان لوگوں کے کافر ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ "حَقًّا" مصدر محذوف کی تاکید ہے۔ ( کبیر )

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور انھوں نے ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہ کی، یہی لوگ ہیں جنھیں وہ عنقریب ان کے اجر دے گا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۵۲﴾ اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارے، سو وہ تو موسیٰ سے اس سے بڑی بات کا مطالبہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھلا، تو انھیں بجلی نے ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑ لیا، پھر انھوں نے بچھڑے کو پکڑ لیا، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکی تھیں، تو ہم نے اس سے درگزر کیا اور ہم نے موسیٰ کو واضح غلبہ عطا کیا ﴿۱۵۳﴾

**آیت 152** وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ...... : مراد امت محمد ﷺ ہے جو تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتی ہے، لہٰذا ان کے لیے بشارت ہے۔ (قرطبی)

**آیت 152** ① يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ...... : اس آیت میں یہود کی ایک اور جہالت کا بیان ہے اور اس کا مقصد ان کی سرکشی اور طبعی ضد و عناد کو بیان کرنا ہے۔ (کبیر) ان کا مقصد آپ ﷺ پر ایمان لانا تو تھا نہیں، محض شرارت کے لیے اور لاجواب کرنے کے لیے نت نئے اعتراضات پیش کرتے رہتے۔ ان میں سے ان کی ایک فرمائش یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تختیاں ملی تھیں، لہٰذا آپ بھی اللہ تعالیٰ کے پاس سے اسی طرح کی کتاب لا کر دکھائیں، تا کہ ہم آپ کی تصدیق کریں اور آپ پر ایمان لائیں۔ قرآن نے اس اعتراض کے جواب میں پہلے تو ان پر ان کی گزشتہ کارستانیاں بطور الزام پیش کیں (کیونکہ اصل خاموش کرانے والا جواب الزامی ہوتا ہے کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، پھر اعتراض کرو) اور پھر آیت (۱۶۳) ﴿ اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ ﴾ سے اس اعتراض کا تحقیقی جواب دیا ہے۔ (کبیر) اور یہ سلسلۂ بیان آیت (۱۷۰) تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ ﴾ سے نصاریٰ سے خطاب ہے۔ (فتح الرحمٰن)

② فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ : فرمایا (تمھاری اس فرمائش کے عین مطابق) موسیٰ علیہ السلام کتاب لائے تو تم نے اس سے بڑا مطالبہ پیش کر دیا، یعنی یہ کہ ہمیں واضح طور پر سامنے اللہ تعالیٰ کا دیدار کراؤ۔ (دیکھیے بقرہ: ۵۵) پھر اس سے بھی بڑی گستاخی کی کہ بچھڑے کو معبود بنا لیا، مگر ہم نے تمھیں معاف کر دیا اور تمھاری اس ضد، عناد اور جہل کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کو ہم

وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

اور ہم نے ان پر پہاڑ کو ان کا پختہ عہد لینے کے ساتھ اٹھا کھڑا کیا اور ہم نے ان سے کہا دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور ہم نے ان سے کہا کہ ہفتے کے دن میں زیادتی مت کرو اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا﴿۱۵۴﴾ پھر ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے ہی کی وجہ سے (ہم نے ان پر لعنت کی) اور ان کے اللہ کی آیات کا کفر کرنے اور ان کے انبیاء کو کسی حق کے بغیر قتل کرنے اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر کر دی تو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم﴿۱۵۵﴾

نے غلبہ اور اقتدار عطا فرما دیا اور تم لوگ ان کے حکم کی مخالفت نہ کر سکے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی بشارت ہے کہ آخر کار یہ ضد اور عناد رکھنے والے مغلوب ہوں گے۔ اس کے بعد ان کی دوسری جہالتوں کا بیان ہے۔ (کبیر)

**آیت 154** ① "وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۳) اور "ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۵۸، ۵۹)۔

② وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ: "اصحاب سبت" جنھیں ہفتے کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا، ان کے قصے کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۵) اور سورۂ اعراف (۱۶۳)۔

**آیت 155** ① فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: اس میں "مَا" تاکید کے لیے بڑھایا گیا ہے، یعنی ان کے اپنے پختہ عہد کو توڑنے ہی کی وجہ سے۔ یہاں کچھ الفاظ محذوف ہیں جو آیت پڑھنے والے کی سمجھ پر چھوڑ دیے گئے ہیں، چنانچہ اکثر مفسرین نے تو لکھا ہے کہ وہ الفاظ ہیں "لَعَنَّاهُمْ" یعنی ہم نے ان پر لعنت کی، اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ﴾ [المائدة: ۱۳] "ان کے اپنے پختہ عہد کو توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی" اور بعض نے کہا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بات کو عام رکھا ہے اسے عام رکھنا ہی بہتر ہے یعنی ان کے عہد کو توڑنے ہی کی وجہ سے "فَعَلْنَا بِهِمْ مَّا فَعَلْنَا" (ہم نے ان کے ساتھ کیا جو کیا) یعنی جو ہم نے ان کے ساتھ کیا وہ تمھارے اندازے سے باہر ہے۔

② "وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۱) اور "غُلْفٌ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۸۸)۔

③ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: یعنی بہت کم لوگ، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ساتھی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "قَلِيْلًا" مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی "اِيْمَانًا قَلِيْلًا" (وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا) یعنی صرف موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر۔ یہ ان کے گمان کے اعتبار سے فرمایا، ورنہ ایک نبی کو بھی جھٹلایا تو گویا سب کو جھٹلا دیا۔ (رازی)

وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾

اور ان کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر ان کے بہت بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے ﴿۱۵۶﴾ اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ بلاشبہ ہم نے ہی مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، جو اللہ کا رسول تھا، حالانکہ نہ انھوں نے اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی پر چڑھایا اور لیکن ان کے لیے (کسی کو مسیح کا) شبیہ بنا دیا گیا اور بے شک وہ لوگ جنھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے، یقیناً اس کے متعلق بڑے شک میں ہیں، انھیں اس کے متعلق گمان کی پیروی کے سوا کچھ علم نہیں اور انھوں نے اسے یقیناً قتل نہیں کیا ﴿۱۵۷﴾

**آیت 156** **وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ ......** : اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی نبوت کا انکار کر کے صریح کفر کا ارتکاب کیا اور پھر مریم علیہا السلام کی طرف زنا کی نسبت کر کے مزید بہتان باندھا۔

**آیت 157** ① **وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ** : یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود خود مسیح علیہ السلام کی رسالت کا اقرار کر کے اپنے گمان میں انھیں قتل کرنے کا دعویٰ اور اس پر فخر کر رہے ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مفسرین نے اس کے چند جواب دیے ہیں، پہلا یہ کہ وہ جو اپنے آپ کو ''رسول اللہ'' سمجھتا تھا، ہم نے اسے قتل کر دیا۔ دوسرا یہ کہ وہ بطور طنز انھیں ''رسول اللہ'' کہہ رہے تھے۔ تیسرا یہ کہ یہودیوں کا عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کو بطور فخر ذکر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے اکرام اور شرف کے اظہار کے لیے اپنے پاس سے لفظ ''رسول اللہ'' کا اضافہ کر دیا کہ ان ظالموں نے کتنی بڑی ہستی کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا۔ چوتھا یہ کہ یہودیوں کو نہ مریم علیہا السلام کے پاکباز ہونے میں کوئی شک تھا، نہ عیسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے میں، کیونکہ پیدائش کے دن ہی بطور معجزہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کی زبانی تمام یہودیوں کے سامنے مریم علیہا السلام کی پاکبازی اور مسیح علیہ السلام کی رسالت ثابت فرما دی تھی، مگر قوم یہود کو جب مسیح علیہ السلام نے ان کے کفر و شرک، ریاکاری اور سود خوری پر ٹوکا تو وہ ان کی جان کے درپے ہو گئے اور گناہوں نے ان کے دل اس طرح مسخ کر دیے تھے کہ جس عظیم خاتون کو وہ تیس سال تک پاکباز سمجھتے رہے اس پر زنا کی تہمت لگا دی اور جسے دل سے رسول مانتے رہے گناہوں سے ٹوکنے پر اسے قتل کرنے کے درپے ہو گئے، حتیٰ کہ اپنے خیال میں قتل میں کامیاب ہو گئے اور اس پر فخر بھی کرنے لگے۔ انسانی طبائع جب مسخ ہوتی ہیں تو ان کی شقاوت کہاں تک پہنچ جاتی ہے، یہ اس کی مثال ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی رسولوں کو قتل کر چکے تھے۔

② **وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ** : قرآن پاک نے یہودیوں کے دعویٰ کی صاف نفی کی اور فرمایا کہ نہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ سولی دی، بلکہ ان کے لیے کسی اور آدمی کو مسیح علیہ السلام کی شبیہ (ان جیسا) بنا دیا گیا۔ وہ اسے سولی

# بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۵۸﴾

دے کر سمجھتے رہے کہ ہم نے مسیح کو صلیب پر چڑھا دیا۔ یہ آدمی کون تھا اور کیسے شبیہ بنایا گیا، قرآن مجید یا حدیث رسول میں اس کی تفصیل بیان نہیں ہوئی، ہاں اگلی آیت میں آ رہا ہے کہ (عیسیٰ علیہ السلام کو نہ انھوں نے قتل کیا نہ سولی دیا بلکہ) اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی طرف اٹھا لیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ بنائے جانے کی کیفیت کی ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ امام ابن کثیر اور ابن جریر نے بیان فرمائی ہے کہ جب یہودی مسیح علیہ السلام کو پکڑنے کے لیے گئے تو آپ نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس بات پر راضی ہے کہ اسے میرا شبیہ بنا دیا جائے؟ ایک حواری اس پر راضی ہو گیا، چنانچہ مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف اٹھا لیا اور اس نوجوان کو مسیح علیہ السلام کی شکل و صورت میں تبدیل کر دیا گیا، یہودی آئے اور اس نوجوان کو سولی دے دی۔

③ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ: عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شکل کو قتل کرنے کے بعد وہ لوگ خود تردد میں پڑ گئے کہ جسے ہم نے سولی دی ہے، کون ہے! بعض نے کہا، مسیح ہی قتل ہوئے ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ مسیح تو نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ خود انھیں بھی یقین نہ ہو سکا کہ واقعی ہم نے انھی کو صلیب پر چڑھایا ہے، بس ایک گمان کی پیروی کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ یقینی علم تو بہت دور ہے، خود وہ بھی اختلاف کا شکار ہیں اور شک میں مبتلا ہیں کہ کون قتل ہوا۔ یہ اختلاف یہود میں بھی تھا اور نصاریٰ کے فرقوں میں بھی ہے، جن میں سے بعض کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ناسوت (انسانی جسم) کو سولی دی گئی اور لاہوت (ان کا وہ حصہ جو خدا تھا) اوپر اٹھا لیا گیا۔ بعض دونوں کی سولی کے قائل ہیں وغیرہ، قرآن مجید نے ان سب کو جھوٹا قرار دیا۔

آیت 158 بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: یہ صاف وصریح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا۔ صحیح احادیث سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ یہ احادیث بخاری و مسلم سمیت حدیث کی اکثر کتابوں میں موجود ہیں۔ [ دیکھیے بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب نزول عیسی ابن مریم علیہما السلام : ۳۴۴۸۔ مسلم : ۱۵۵ ] ان احادیث میں آسمان پر اٹھائے جانے کے علاوہ قیامت کے قریب ان کے نزول اور دوسری بہت سی باتوں کا ذکر ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ تمام روایات ذکر کر کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر ہیں، ان کے راویوں میں ابو ہریرہ، عبد اللہ بن مسعود، عثمان بن ابی العاص، ابو امامہ، نواس بن سمعان، عبد اللہ بن عمرو بن عاص، مجمع بن جاریہ، ابو سریحہ اور حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ ان احادیث میں آپ کے نزول کی کیفیت اور جگہ کا بیان ہے۔ آپ دمشق میں منارۂ شرقیہ کے پاس اس وقت اتریں گے جب فجر کی نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہو گی۔ آپ خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب توڑ دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، ان کے دور میں سب مسلمان ہو جائیں گے، دجال کا قتل بھی آپ کے ہاتھوں سے ہو گا اور یاجوج ماجوج کا ظہور و فساد بھی آپ کی موجودگی میں ہو گا، بالآخر آپ ہی کی بد دعا سے ان کی ہلاکت واقع ہو گی۔ مسیح علیہ السلام کا اپنے جسم کے ساتھ اٹھایا جانا، وہاں ان کا زندہ موجود ہونا، دوبارہ دنیا میں آ کر کئی سال رہنا اور دجال کو قتل کرنے

وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ۚ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ۙ﴿۱۶۰﴾

اور اہل کتاب میں کوئی نہیں مگر اس کی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا ﴿۱۵۹﴾ تو جو لوگ یہودی بن گئے، ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں، جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے ﴿۱۶۰﴾

کے بعد اپنی طبعی موت مرنا امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے، جس کی بنیاد قرآنی تصریحات اور ان تفصیلات پر ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اِتَّفَقَ أَصْحَابُ الْأَخْبَارِ وَالتَّفْسِيرِ عَلٰى أَنَّ عِيسٰى رُفِعَ بِبَدَنِهٖ" [ التلخيص الحبير ] "تمام اصحاب تفسیر اور ائمۂ حدیث اس پر متفق ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے بدن سمیت آسمان پر زندہ اٹھائے گئے۔" لہٰذا حیاتِ مسیح کے انکار سے قرآن وحدیث کا انکار لازم آتا ہے جو سراسر گمراہی ہے۔ "عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا" کا لفظ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا عام فوت ہونے والوں کی طرح نہیں تھا۔

**آیت 159** ❶ وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ : اس آیت کے دو مطلب ہیں اور دونوں درست ہیں، پہلا تو یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کا ہر شخص اپنے مرنے سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور ان کے زندہ اٹھائے جانے پر ایمان لے آئے گا، مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب موت سامنے آ جاتی ہے، جیسا کہ فرعون مرتے وقت ایمان لے آیا تھا، مگر اس وقت ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب عادل حاکم کی صورت میں اتریں گے اور دجال اور دوسرے تمام کفار سے جہاد کریں گے، تو ان کی موت سے پہلے پہلے تمام دنیا میں اسلام غالب ہو جائے گا۔ یہود و نصاریٰ یا تو مقابلے میں قتل ہو جائیں گے، یا اسلام لے آئیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام صلیب توڑ دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، چنانچہ جب عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوں گے تو ان کی وفات سے پہلے ہر موجود یہودی اور نصرانی ان کی نبوت اور ان کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے اور دوبارہ اترنے پر ایمان لا چکا ہوگا۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں مذکور اس حدیث کے آخر میں ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان کر کے فرماتے: "اگر چاہو تو یہ آیت پڑھو: ﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ﴾ "اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر اس کی موت سے پہلے ضرور اس پر ایمان لائے گا۔"

❷ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا : اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۱۷)۔

**آیت 160** ❶ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا : "فَبِظُلۡمٍ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے اور جار مجرور پہلے آنے کی وجہ سے تخصیص پیدا ہوگئی، اس لیے ترجمہ "ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے" کیا گیا ہے۔

❷ یہود کی سرکشی اور شرارتیں ذکر کرنے کے بعد اب ان پر سختی کا ذکر ہے۔ ( کبیر )

❸ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ ...... : پاکیزہ چیزوں کی یہ حرمت کچھ تو ان کی سرکشی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

اور ان کے سود لینے کی وجہ سے، حالانکہ یقیناً انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور ان کے لوگوں کے اموال باطل طریقے کے ساتھ کھانے کی وجہ سے اور ہم نے ان میں سے کفر کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۶۱﴾ لیکن ان میں سے وہ لوگ جو علم میں پختہ ہیں اور جو مومن ہیں، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا اور جو خاص کر نماز ادا کرنے والے ہیں اور جو زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے ہیں، یہ لوگ ہیں جنھیں ہم عنقریب بہت بڑا اجر عطا کریں گے ﴿۱۶۲﴾

---

سے تھی، کیونکہ وہ گناہ پر بہت دلیر تھے، تاکہ ان کی سرکشی کچھ ٹوٹے، یہ شرعی حرمت تھی، جیسا کہ سورۂ انعام (۱۴۶) میں ہے اور کچھ چیزیں انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام کا اختیار دے کر ان کے حرام قرار دینے کی وجہ سے حرام کر لیں، گویا یہ اللہ کی تقدیر میں ان کے بڑے ظلم شرک (احبار و رہبان کو رب بنانے) کی سزا کے طور پر حرام ہوئیں، جیسا کہ اب مسلمانوں میں سے بھی بعض نے اپنے اماموں کے کہنے پر کئی حلال چیزیں حرام اور کئی حرام چیزیں حلال قرار دے رکھی ہیں۔

④ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایک اور نفیس مطلب بیان کیا ہے کہ یہاں "طَيِّبٰتٍ" سے مراد ان انعامات کا موقوف کر دینا ہے جو بادشاہی اور نبوت و نصرت کی شکل میں حاصل تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ﴾ [ البقرۃ : ٦١ ] "اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔" (فتح الرحمٰن) حقیقت میں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

**آیت 161** ① وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ: اس وقت جو تورات موجود ہے اس میں بھی متعدد مقامات پر سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ (دیکھیے کتاب خروج، باب ۲۲، فقرہ ۲۵ تا ۲۷)۔

② وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ: یعنی رشوت، جوئے، دھوکے اور دوسرے ناجائز ذرائع سے لوگوں کے اموال کھانا۔ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، مخلوق پر ظلم اور حق سے اعراض۔ اوپر کی آیت: ﴿ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے) سے مخلوق پر ظلم کی طرف اشارہ ہے، باقی کا تعلق "اعراض عن الحق" سے ہے۔ (کبیر)

**آیت 162** ① لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ......: علم میں پختہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف سے آنے والی وحی کے متلاشی ہوں اور اسی سے دلیل اور رہنمائی حاصل کریں، نہ لکیر کے فقیر ہوں نہ تقلید آباء کے اور "الْمُؤْمِنُوْنَ" سے مراد تورات پر صحیح ایمان رکھنے والے ہیں، یعنی یہ مومن اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا۔

اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ کَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ۚ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ عِیۡسٰی وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡنُسَ وَ ہٰرُوۡنَ وَسُلَیۡمٰنَ ۚ وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾ وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰہُمۡ عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡہُمۡ عَلَیۡکَ ؕ وَ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوۡسٰی تَکۡلِیۡمًا ﴿۱۶۴﴾ۚ

بلاشبہ ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوح اور اس کے بعد (دوسرے) نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ﴿۱۶۳﴾ اور بہت سے رسولوں کی طرف جنھیں ہم اس سے پہلے تجھ سے بیان کر چکے ہیں اور بہت سے ایسے رسولوں کی طرف جنھیں ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا ﴿۱۶۴﴾

یہ اہل کتاب کے مومنوں کو بشارت ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے، مثلاً عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

② وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ: اس سے پہلے اور بعد والی تمام صفات مرفوع ہیں اور یہ منصوب ہے، اسے "منصوب علی المدح" یا "علی الاختصاص" کہا جاتا ہے۔ گویا یہ "اَخُصُّ" کا مفعول ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "اور جو خاص کر نماز ادا کرنے والے ہیں۔"

**آیت 163** ① اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ...... : یہ ان کے اس اعتراض اور مطالبے کا اصل جواب ہے کہ آپ تورات کی طرح آسمان سے اکٹھی کتاب نازل کروائیں، یعنی وحی اور دعوت الی الحق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دوسرے انبیاء سے مختلف نہیں ہے، نوح علیہ السلام سے لے کر جتنے انبیاء و رسل ہوئے ہیں سب کو الگ الگ معجزات ملے اور تورات کے علاوہ کسی کو بھی یک بارگی کتاب نہیں دی گئی، پھر جب یک بارگی کتاب ان پر نازل نہ کرنے سے ان کی نبوت پر حرف نہیں آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لیے باعث اعتراض کیوں ہے؟ نوح علیہ السلام سے پہلے بھی بہت سے انبیاء ہوئے ہیں مگر اولوالعزم اور صاحب شریعت نبی سب سے پہلے نوح علیہ السلام تھے اور نوح علیہ السلام ہی وہ نبی ہیں جن کی قوم پر عذاب نازل ہوا اور رد شرک کا وعظ بھی نوح علیہ السلام سے شروع ہوا، اس لیے سب سے پہلے ان کا نام ذکر کیا ہے۔ (قرطبی، کبیر) وحی کے اصل معنی تو "کسی مخفی ذریعے سے کوئی بات سمجھا دینا" کے ہیں اور "اِیْحَاءٌ" (افعال) بمعنی الہام بھی آ جاتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ شوریٰ (۵۱)۔

② وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا : یعنی تم زبور کو تو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے ہو، حالانکہ وہ بھی داؤد علیہ السلام پر تورات کی طرح تختیوں کی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھی، پھر قرآن مجید کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہونے سے کیوں انکار کرتے ہو؟ (کبیر) موجودہ زبور میں ایک سو پچاس سورتیں ہیں، جن میں دعائیں نصیحتیں اور تمثیلیں مذکور ہیں، حلت و حرمت کے احکام مذکور نہیں ہیں۔

**آیت 164** ① وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡہُمۡ عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ : جن رسولوں کے اسمائے گرامی اور واقعات قرآن کریم میں بیان کیے گئے ہیں ان کی تعداد چوبیس (۲۴) یا پچیس (۲۵) ہے۔ آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحاق، یعقوب،

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

ایسے رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۶۵﴾

یوسف، ایوب، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلیمان، الیاس، یسع، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، ذوالکفل (اکثر مفسرین کے نزدیک) اور محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین۔

② وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ : جن انبیاء و رسل کے نام قرآن میں ذکر نہیں ہوئے ان کی تعداد کتنی ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے، جو بہت مشہور ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ایک حدیث میں آٹھ ہزار بتائی گئی ہے، مگر ان احادیث میں کلام ہے۔

③ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا : یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہم کلامی کا شرف بخشا، جو کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۳) پھر اگر موسیٰ علیہ السلام کے اس شرف سے دوسرے انبیاء پر طعن نہیں آ سکتا تو تورات کا یک بارگی نزول دوسرے انبیاء کے لیے موجب طعن کیسے ہو سکتا ہے۔ (رازی)

④ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا بھی ثابت ہوا، جو لوگ یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے کلام کا انکار کرتے ہیں وہ قیامت کے دن ان آیات و احادیث کا کیا جواب دیں گے جن میں صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا ذکر ہے۔ اللہ کے ان بندوں نے اللہ تعالیٰ کو انسان سے بھی عاجز یعنی گونگا بنا دیا اور اپنے خیال میں اسے اللہ تعالیٰ کی خوبی سمجھ رہے ہیں۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ ایسے ہی لوگوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ قرآن یا حدیث میں کہیں دکھاؤ کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ مخلوق ہے مگر نہ اس وقت ان کے مخالف یہ دکھا سکے نہ اب کوئی دکھا سکتا ہے۔

آیت 165 رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ...... : یعنی انبیاء کی بعثت کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور اپنی اصلاح کر لیں انھیں جنت کی خوش خبری دیں اور جو کفر اور نادانی پر جمے رہیں انھیں ان کے غلط رویے کے انجام بد سے ڈرائیں، تاکہ اس طرح ان پر اتمامِ حجت ہو جائے اور وہ اللہ کے ہاں کوئی عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہمارے پاس تو تیری طرف سے کوئی خوش خبری دینے والا یا ڈرانے والا آیا ہی نہیں اور یہ مقصد کتاب و شریعت کے نازل کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت بس یہ دونوں چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی امام یا مجتہد کو دین میں حجت نہیں بنایا) عام اس سے کہ وہ کتاب یک بارگی دے دی جائے یا تدریجاً نازل ہو۔ بعثت کے اس اصلی مقصد پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ کتاب کے حسب ضرورت تدریجاً نازل کرنے سے تو یہ مقصد زیادہ کامل طریقے سے پورا ہوتا ہے، پھر ان کا یہ کہنا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح یک بارگی کتاب لائیں گے تو مانیں گے ورنہ نہیں، محض ضد اور عناد ہے۔ (کبیر)

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

لیکن اللہ شہادت دیتا ہے اس کے متعلق جو اس نے تیری طرف نازل کیا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور فرشتے شہادت دیتے ہیں اور اللہ کافی گواہ ہے ﴿۱۶۶﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا یقیناً وہ گمراہ ہو گئے، بہت دور گمراہ ہونا ﴿۱۶۷﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں بخشے اور نہ یہ کہ انھیں کسی راستے کی ہدایت دے ﴿۱۶۸﴾ سوائے جہنم کی راہ کے، جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ، اور یہ ہمیشہ سے اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۱۶۹﴾

**آیت 166** لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ...... : یعنی وحی ہر پیغمبر پر آتی رہی ہے، کچھ نیا کام نہیں، پر اس کلام (قرآن مجید) میں اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص علم اتارا اور اللہ تعالیٰ اس حق کو ظاہر کر دے گا، چنانچہ ظاہر ہوا کہ جس قدر ہدایت اس نبی سے ہوئی اور کسی سے نہ ہوئی۔ (موضح) یہ آیت بھی یہود کے مذکورہ سوال کے جواب میں ہے کہ اگر یہود قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہیں تو اس سے قرآن کا سچا ہونا مجروح نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے قرآن اپنے علم اور حکمت بالغہ کے ساتھ نازل کیا ہے، جو اس کے انتہائی کامل ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ اس کا علم ماضی، حال اور مستقبل سب کو محیط ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ قرآن اپنے علم سے، یعنی خوب جانتے ہوئے اتارا ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں سے بڑھ کر آپ ہی اس چیز کے اہل تھے کہ آپ پر یہ قرآن نازل کیا جاتا۔

**آیت 167** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... : ان لوگوں سے مراد یہودی ہیں جو نبی ﷺ پر خود بھی ایمان نہ لاتے اور لوگوں کو بھی یہ کہہ کر روکا کرتے تھے کہ اس شخص کی کوئی صفت ہماری کتاب میں مذکور نہیں، یا یہ کہ نبوت کا دائرہ تو ہارون اور داؤد علیہما السلام کی اولاد تک محدود ہے، یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت منسوخ نہیں ہو سکتی، ان کی اسی قسم کی کوششوں کو قرآن نے دور کی گمراہی قرار دیا ہے۔

**آیت 166** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا...... : ان کی گمراہی کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اب ان کو وعید سنائی جا رہی ہے۔ (کبیر) یعنی گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا، یا آخری نبی ﷺ کی صفات کو چھپا کر ان پر ظلم کیا، یا دوسرے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ان پر ظلم کیا۔ (قرطبی)

**آیت 167** اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا...... : یعنی جب کفر ہی کی حالت میں مر جائیں گے اور مرنے سے پہلے توبہ نہیں کریں گے تو سیدھے جہنم میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کو جہنم میں لے جانا اور پھر ہمیشہ وہاں رکھنا

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ

اے لوگو! بلاشبہ تمھارے پاس یہ رسول حق کے ساتھ تمھارے رب کی طرف سے آیا ہے، پس تم ایمان لے آؤ، تمھارے لیے بہتر ہوگا اور اگر کفر کرو تو بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ۝ اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ گزرو اور اللہ پر مت کہو مگر حق۔

اللہ تعالیٰ پر کچھ مشکل نہیں ہے، لہٰذا اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ کفر و عناد سے باز آ جائیں اور آپ ﷺ کی اتباع اختیار کر لیں۔

آیت 170 يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ ...... : متعدد طریقوں سے یہود کے اعتراضات و شبہات کی تردید اور قرآن کی حقانیت ثابت کرنے کے بعد اب سب لوگوں کو آپ ﷺ کی رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے، جن میں یہود بھی شامل ہیں کہ جب یہ رسول برحق ہے اور قرآن بھی اللہ کی سچی کتاب ہے تو تمھیں لازم ہے کہ اس دعوت کو قبول کر لو، اس میں تمھارا بھلا ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے، ورنہ یاد رکھو کہ زمین و آسمان میں جتنی مخلوق ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس کا تمھارے ایمان نہ لانے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۸)۔

آیت 171 ① يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ ...... : رازی لکھتے ہیں، یہود کے شبہات کا جواب دینے کے بعد اب اس آیت میں نصاریٰ کے شبہ کی تردید کی جا رہی ہے۔ (کذا فی فتح الرحمٰن) مگر بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے، اس لیے کہ ''غلو'' راہ اعتدال کے چھوڑ دینے کا نام ہے اور یہ افراط و تفریط (زیادتی اور کمی) دونوں صورتوں میں ہے۔ ایک طرف نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں افراط سے کام لے کر ان کو اللہ کا بیٹا قرار دے رکھا تھا، تو دوسری طرف یہود نے مسیح علیہ السلام سے متعلق یہاں تک تفریط برتی کہ ان کی رسالت کا بھی انکار کر دیا، قرآن نے بتایا کہ یہ دونوں فریق غلو کر رہے ہیں۔ اعتدال کی راہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو اللہ کے بیٹے ہیں کہ ان کو معبود بنا لیا جائے اور نہ جھوٹے نبی ہیں، بلکہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ (قرطبی) آج کل اسی قسم کا غلو مسلمانوں میں بھی آ گیا ہے اور ایسے لوگ موجود ہیں جو نبی ﷺ اور اولیائے امت کا درجہ اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ انھیں خدا کی خدائی میں شریک قرار دیتے ہیں اور پھر رسول اللہ ﷺ کو بشر سمجھنا انتہائی درجے کی گستاخی شمار کرتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ نے اس غلو سے سختی سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ» [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿ واذكر في الكتاب مريم ...... ﴾ : ۳۴۴۵ ] ''مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑھایا۔ میں تو اس کا بندہ ہوں، لہٰذا تم مجھے اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہا کرو۔''

② وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ : یعنی انھیں کلمۂ ''کُنْ'' سے بنایا اور اس طرح ان کی پیدائش بن باپ کے ہوئی، یہ معنی

كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ، جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف سے ایک روح ہے۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ تین ہیں، باز آ جاؤ، تمھارے لیے بہتر ہوگا۔ اللہ صرف ایک ہی معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بطور وکیل کافی ہے ﴿۱۷۱﴾

نہیں کہ وہ کلمہ ہی عیسیٰ علیہ السلام بن گیا، ورنہ آدم علیہ السلام تو ماں باپ دونوں کے بغیر کلمۂ "کُنْ" سے پیدا ہوئے تھے۔ پھر انھیں بھی رب ماننا پڑے گا، دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۹)۔

③ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ : یعنی اس کی پیدا کردہ روح، اس اضافت سے عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا اظہار مقصود ہے، ورنہ تمام روحیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہیں، فرمایا: ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ﴾ [ فاطر : ۳ ] "کیا اللہ کے سوا بھی کوئی پیدا کرنے والا ہے؟" جیسے فرمایا: "نَاقَةُ اللّٰهِ" "اللہ کی اونٹنی" اور "بَيْتِيَ" "میرے گھر کو" حالانکہ تمام اونٹنیوں اور تمام گھروں کا مالک اللہ ہے۔ یہ "مِنْ" تبعیضیہ نہیں ہے بلکہ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ (ابن کثیر)

④ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ : یعنی عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول ہیں، پس تم دوسرے پیغمبروں کی طرح ان کو اللہ کا رسول ہی مانو اور انھیں الوہیت (خدائی) کا مقام مت دو۔ (کبیر)

⑤ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ : "ثَلٰثَةٌ" مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی "اٰلِهَتُنَا ثَلَاثَةٌ" یا "اَلْاَقَانِيْمُ ثَلَاثَةٌ" کہ ہمارے معبود تین ہیں، یا اقانیم تین ہیں۔ مبتدا اس لیے حذف کیا ہے کہ نصرانیوں کے اقوال بہت ہی مختلف ہیں، اگرچہ خلاصہ ان کا ایک ہے کہ خدا تین ہیں مگر وہ تین نہیں ایک ہیں۔ اب ایک ذات اور اس کی بے شمار صفات تو ہو سکتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ، مریم اور عیسیٰ علیہما السلام یہ تو تین مستقل شخصیتیں اور ذاتیں ہیں، یہ ایک ذات کیسے ہو گئے! نصرانی بیک وقت خدا کو ایک بھی تسلیم کرتے ہیں اور پھر اقانیم ثلاثہ کے بھی قائل ہیں۔ یہ اقانیم ثلاثہ کا چکر بھی نہایت پر پیچ اور نا قابل فہم ہے۔ (کبیر) جس طرح بعض مسلمانوں میں "نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ" کا عقیدہ نہایت گمراہ کن ہے، جو واضح طور پر سورۂ اخلاص اور پورے قرآن کے خلاف ہے۔ نصرانی کبھی تو ان تین سے مراد وجود، علم اور حیات بتاتے ہیں اور کبھی انھیں باپ، بیٹا اور روح القدس سے تعبیر کر لیتے ہیں، حالانکہ وجود، علم اور حیات تو ایک ذات کی صفات ہوتی ہیں مگر باپ، بیٹا اور روح القدس تو تین شخصیتیں ہیں، یہ ایک کیسے بن گئے؟ پھر ان کی کور فہمی دیکھو کہ کبھی کہتے ہیں کہ باپ سے وجود، روح سے حیات اور بیٹے سے مراد مسیح علیہ السلام ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۬ وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

مسیح ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا ﴿۱۷۲﴾ پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو وہ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ بھی دے گا اور رہے وہ جنھوں نے عار سمجھا اور تکبر کیا تو وہ انھیں دردناک عذاب دے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۷۳﴾

---

اقانیم ثلاثہ سے مراد اللہ تعالیٰ، مریم اور عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ قرآن نے بھی اس آخری قول کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۷۳، ۷۵، ۷۶، ۱۱۶) الغرض نصرانیوں کے عقیدۂ تثلیث سے زیادہ بعید از عقل کوئی عقیدہ نہیں اور اس بارے میں ان میں اس قدر انتشار و افتراق ہے کہ دنیا کے کسی عقیدہ میں نہیں، اس لیے قرآن نے انھیں دعوت دی کہ تم تین خداؤں کے گورکھ دھندے کو چھوڑ کر خالص توحید کا عقیدہ اختیار کرلو۔

⑥ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: یعنی نہ کوئی اس کا شریک ہے، نہ بیوی اور نہ کوئی رشتے دار، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا۔

⑦ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اور جسے تم نے اس کا شریک ٹھہرایا ہے وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح اس کا مملوک اور مخلوق ہے اور جو شخص مملوک یا مخلوق ہو وہ خالق یا مالک کا بیٹا یا شریک کیسے ہوسکتا ہے؟

⑧ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: یعنی اس کو بیٹے کی کیا ضرورت ہے، وکیل یعنی سارے کام بنانے والا تو وہ خود ہی ہے۔ (موضح)

**آیت 172** لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ ...... : اس آیت میں نصاریٰ اور مشرکین دونوں کے غلط عقیدے کی تردید ہے، کیونکہ نصرانی مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ دونوں اللہ کی بندگی کا اقرار کرتے ہیں اور اس کا بندہ ہونے پر کچھ بھی عار اور شرم محسوس نہیں کرتے۔ یہی حال ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ جب کوئی شخص آپ کو اللہ کا بندہ کہتا تو آپ کو بے انتہا خوشی ہوتی۔ کیونکہ اس مالک الملک اور شہنشاہِ مطلق کا بندہ ہونا انتہائی عزت و شرف کا مقام ہے، نہ کہ کسی ذلت و رسوائی کا۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''انوار القلوب'' میں لکھا ہے کہ آدمی کے لیے بندگی کے مقام سے زیادہ عزت کا کوئی مقام نہیں، اکرم الخلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تین مقامات پر، جو نہایت عزت کے مقامات ہیں، لفظ ''عبد'' یعنی بندہ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے، وہ تین مقام یہ ہیں: ① نزول وحی۔ (دیکھیے کہف: ۱۔ فرقان: ۱۔ نجم: ۱۰۔ حدید: ۹) ② اسراء و معراج۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱) ③ دعا۔ (دیکھیے جن: ۱۹)۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ

اے لوگو! بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک واضح نور نازل کیا ہے ﴿۱۷۴﴾ پھر جو لوگ تو اللہ پر ایمان لائے اور اسے مضبوطی سے تھام لیا تو عنقریب وہ انھیں اپنی خاص رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور انھیں اپنی طرف سیدھے راستے کی ہدایت دے گا ﴿۱۷۵﴾ وہ تجھ سے فتویٰ مانگتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی آدمی مر جائے، جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی

**آیت 174** يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ ...... : جب اللہ تعالیٰ نے تمام گمراہ فرقوں کفار، منافقین، یہود و نصاریٰ پر دلائل قائم کر دیے اور ان کے شکوک و شبہات کی بھی مکمل تردید فرما دی تو اب اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کی عام دعوت دی کہ تمھارے پاس رسول اللہ ﷺ کے نبی برحق ہونے کی واضح دلیل آ چکی اور ہم نے حق کو واضح کرنے والا نور، یعنی قرآن مجید نازل فرما دیا جو انسان کو ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے اور دل میں نور ایمان پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

**آیت 176,175** ① يَسْتَفْتُوْنَكَ : سورت کی ابتدا تقویٰ کے حکم کے بعد اموال کے احکام سے ہوئی تھی، اب آخر میں انھی احکام کے ساتھ سورت کا اختتام ہے۔ درمیان سورت میں مخالفین سے مجادلہ اور ان کی تردید ہے۔ (رازی) کلالہ پر بحث اس سورت کی آیت (۱۱) میں گزر چکی ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں اس وقت بیمار اور بے ہوش تھا، آپ نے وضو کیا، پھر وضو کے بچے ہوئے پانی سے مجھ پر چھینٹے مارے، یا فرمایا: ”اس پر چھینٹے مارو۔“ جس سے مجھے ہوش آ گیا، میں نے عرض کی کہ میں کلالہ ہوں، میری میراث کیسے تقسیم ہوگی، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [ بخاری، المرض، باب وضوء العائد للمريض : ٥٦٧٦۔ مسلم : ١٦١٦ ]

② لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ ...... : بعض نے اس سے استدلال کیا ہے کہ جس کی اولاد نہ ہو، خواہ اس کا باپ زندہ ہی ہو، اسے کلالہ کہا جائے گا، مگر یہ صحیح نہیں، صحیح معنی وہی ہے جو پہلے گزرا، یعنی کلالہ اس مرنے والے کو کہا جاتا ہے جس کا باپ یا دادا نہ ہو اور اولاد بھی نہ ہو، کیونکہ باپ کی موجودگی میں بہن سرے سے وارث نہیں ہوتی، باپ اس کے حق میں حاجب بن جاتا ہے لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر اس کی بہن ہو تو وہ اس کے نصف مال کی وارث ہوگی، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کلالہ وہ ہے کہ اولاد نہ ہونے کے ساتھ ساتھ باپ دادا بھی نہ ہوں۔ یوں اولاد کی نفی تو الفاظ سے واضح ثابت ہوگئی اور باپ کی نفی اشارے سے۔

وَلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کا نصف ہے جو اس نے چھوڑا اور وہ (خود) اس (بہن) کا وارث ہوگا، اگر اس (بہن) کی کوئی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر وہ دو (بہنیں) ہوں تو ان کے لیے اس میں سے دو تہائی ہوگا جو اس نے چھوڑا اور اگر وہ کئی بھائی بہن مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۷۶﴾

3 اولاد سے مراد بیٹا، بیٹی اور بیٹے کی اولاد ہے، اسی طرح بہن سے مراد یہاں سگی بہن یا علاتی (باپ شریک) بہن ہے، کیونکہ اخیافی بہن، جو صرف ماں کی طرف سے ہو، اس کا حکم پہلے سورۂ نساء (۱۲) میں گزر چکا ہے۔ (ابن کثیر)

4 "وَلَدٌ" کا لفظ بیٹا بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر بعض نے کہا کہ بیٹی ہونے کی صورت میں بہن محروم رہے گی، مگر صحیح بخاری (۶۷۴۱) میں معاذ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے کہ اگر ایک شخص فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء میں صرف بیٹی اور بہن ہے تو بیٹی کو نصف اور باقی بہن کو (بوجہ عصبہ ہونے کے) دیا جائے گا۔ اور بخاری ہی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرنے والے کی ایک بہن، ایک بیٹی اور ایک پوتی کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ بیٹی کے لیے نصف ہے، پوتی کے لیے چھٹا حصہ، تاکہ دو ثلث پورے ہو جائیں اور جو باقی بچے گا وہ بہن کے لیے ہے۔ [ بخاری، الفرائض، باب میراث ابنة ابن مع ابنة : ٦٧٣٦ ]

5 فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا ...... : اور یہی حکم دو سے زیادہ بہنوں کا ہے، انھیں بھی دو ثلث ہی ملے گا اور اگر کلالہ کے وارث بھائی اور بہن دونوں ہوں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔

6 يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے میراث کے یہ حصے خود اس لیے واضح فرمائے ہیں کہ اگر یہ تم پر چھوڑ دیے جائیں تو تم کبھی صحیح فیصلہ نہ کر سکو، کیونکہ تمھیں ہر بات کا علم نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کو ہر بات کا خوب علم ہے، اس لیے اس کے فیصلے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔

سُورَةُ الْمَآئِدَةِ ٥ مدنية ١١٢ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اٰيَاتُهَا ١٢٠ رُكُوْعَاتُهَا ١٦

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! عہد پورے کرو۔ تمھارے لیے چرنے والے چوپائے حلال کیے گئے ہیں، سوائے ان کے جو تم پر پڑھے جائیں گے، اس حال میں کہ شکار کو حلال جاننے والے نہ ہو، جب کہ تم احرام والے ہو، بے شک اللہ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ①

اس سورت کے مدنی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''یہ سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی، لہٰذا اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھو۔'' [ أحمد : ٦/ ١٨٨، ح : ٢٥٦٠٢۔ ترمذی : ٣٠٦٣، عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما وحسنه الهلالي في الاستيعاب ] سورۂ بقرہ کے شروع میں اس کی کچھ فضیلت بیان ہو چکی ہے۔

آیت 1 ❶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا...... : اس آیت میں پانچ احکام بیان ہوئے ہیں: ① عقود اور عہود کا پورا کرنا۔ ② چوپاؤں کا حلال ہونا۔ ③ کچھ چوپاؤں کا حرام ہونا، جن کا ذکر اس سورت کی دوسری اور تیسری آیت میں ہے۔ ④ محرم کے لیے اور حرم میں شکار کا حرام ہونا۔ ⑤ غیر محرم کے لیے غیر حرم میں شکار کا حلال ہونا۔

❷ بِالْعُقُوْدِ: یہ '' عَقْدٌ '' کی جمع ہے جس کا معنی گرہ لگانا ہے، عہد و پیمان کے معنی میں بھی آتا ہے، کیونکہ وہ بھی گرہ کی طرح پختہ کیا جاتا ہے، مراد شریعت کے احکام ہیں۔ دوسری جگہ عقد کو عہد سے بھی تعبیر کیا ہے، فرمایا: ﴿ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْۤ ﴾ [البقرۃ : ٤٠ ] ''اور تم میرا عہد پورا کرو۔'' اس میں آپس کے عہد و پیمان بھی شامل ہیں۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے، اس کے بعد نیچے اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ ( کبیر، ابن کثیر )

❸ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ: ''بَهِيْمَةٌ'' سے مراد درندوں کو چھوڑ کر باقی چوپائے ہیں، وہ سب حلال ہیں، خواہ پالتو ہوں یا وحشی، مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ، سوائے ان کے جن کا نام لے کر قرآن یا حدیث میں حرام کہا گیا ہے، مثلاً گدھا وغیرہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۳) '' الْاَنْعَامِ '' سے مراد اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۲ تا ۱۴۴)۔

❹ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ : اس کی تفسیر اسی سورت کی آیت (۲، ۳) میں آ رہی ہے۔

❺ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ : '' حُرُمٌ '' یہ ''حَرَامٌ'' کی جمع ہے، جس نے عمرہ یا حج کا احرام باندھا ہو، اسی طرح جو شخص مکہ کی حدود حرم میں ہو، خواہ احرام نہ باندھا ہو، اس حالت میں شکار بھی ممنوع ہے اور شکار کرنے والے کی کسی طریقے سے مدد کی بھی ممانعت آئی ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۹۵، ۹۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو بھی حرم قرار دیا، اس کی حدود

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۲

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ حرم کی قربانی کی اور نہ پٹوں (والے جانوروں) کی اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنے والوں کی، جو اپنے رب کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہیں، اور جب احرام کھول دو تو شکار کرو، اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ انھوں نے تمھیں مسجد حرام سے روکا، تمھیں اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ حد سے بڑھ جاؤ، اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے ۲

---

میں بھی شکار منع ہے۔[ بخاری، فضائل المدینة، باب حرم المدینة : ۱۸٦۸ ]

**آیت 2** ❶ لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ: ”شَعَآىِٕرَ“ یہ ”شَعِیْرَةٌ“ کی جمع ہے جو ”فَعِیْلَةٌ“ بمعنی ”مُفْعَلَةٌ“ ہے، یعنی ہر وہ چیز جس پر نشان لگایا گیا ہو یا جو بطور علامت مقرر کی گئی ہو، مراد وہ چیزیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق ہو اور اس خاص تعلق کی بنا پر ان کی تعظیم کی جاتی ہو۔ بعض نے اسے عام رکھا ہے کہ اس سے مراد اللہ کے تمام اوامر و نواہی ہیں اور بعض نے حج و عمرہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزیں مراد لی ہیں۔ ”لَا تُحِلُّوْا“ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ترک نہ کرو اور ان کی بے حرمتی نہ کرو۔

❷ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ : ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ”سال کے بارہ مہینے ہیں، جن میں سے چار حرمت والے ہیں، تین مسلسل ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک رجبِ مضر جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔“ [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ إن عدة الشهور...... ﴾ : ٤٦٦٢ ] مطلب یہ ہے کہ ان مہینوں میں جنگ کر کے ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۳٦)۔

❸ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ: ”الْهَدْیَ“ ایسے جانور کو کہا جاتا ہے جو حاجی حرم میں قربان کرنے کے لیے ساتھ لے جاتے تھے۔ اونٹوں کی کوہان کی دائیں طرف تھوڑا سا زخم کر کے مل دیتے، اسے اشعار کہتے ہیں اور گلے میں ایک جوتا یا پٹا ڈال دیتے۔ ”الْقَلَآىِٕدَ“ یہ ”قِلَادَةٌ“ کی جمع ہے، جس سے مراد وہ پٹا یا رسی وغیرہ ہے جو پرو کر ہدی (قربانی) کے گلے میں بطور علامت باندھ دی جاتی تھی۔ چھوٹے جانوروں کا اشعار نہیں کرتے تھے۔ ”الْقَلَآىِٕدَ“ کا معنی اگرچہ پٹے ہیں مگر مراد وہ جانور ہیں جن کے گلے میں وہ پٹا ڈالا گیا ہو۔ ان سب چیزوں کا ذکر اگرچہ ”شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ“ کے ضمن میں آ چکا ہے مگر ان کے مزید احترام کی خاطر ان کو الگ بیان کیا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ

تم پر مردار حرام کیا گیا ہے اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے والا جانور اور جسے چوٹ لگی ہو اور گرنے والا اور جسے سینگ لگا ہو اور جسے درندے نے کھایا ہو، مگر جو تم ذبح کرلو، اور جو تھانوں

④ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ...... : یعنی وہ لوگ جو مسجد حرام کا قصد کر کے جا رہے ہیں۔ رب کے فضل سے مراد رزق ہے جو تجارت وغیرہ سے کمایا جاتا ہے اور اللہ کی رضا مندی سے مراد حج یا عمرہ ہے جو طلبِ ثواب کے لیے کیا جاتا ہے۔ بعض نے فضل سے ثواب ہی مراد لیا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مکہ جا رہے ہیں۔ اگر اس کے تحت مشرک بھی داخل ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ بھی اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، لہٰذا ان کو تکلیف مت دو۔ مگر یہ حکم سورۂ توبہ کی آیت (۲۸) سے منسوخ ہو گا۔ اب مشرکین کو حدود حرم میں داخلے کی اجازت نہیں۔ (ابن کثیر، قرطبی)

⑤ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا: یعنی احرام کھولنے کے بعد شکار کرو۔ یہ حکم بیانِ جواز کے لیے ہے، یعنی اب شکار جائز ہے، یہ معنی نہیں کہ اب ضرور ہی شکار کرو، کیونکہ وہ احرام سے پہلے بھی ضروری نہ تھا۔ (ابن کثیر)

⑥ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ ...... : یعنی اگرچہ ان مشرکین نے تمھیں ۶ ہجری میں اور اس سے پہلے مسجد حرام میں جانے سے روک دیا تھا لیکن تم ان کے اس روکنے کی وجہ سے ان کی دشمنی کی بنا پر حد سے مت بڑھو۔

⑦ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ...... : ہر قسم کا نیک کام کرنے کا نام " اَلْبِرّ " اور برائی کو ترک کرنے کا نام "اَلتَّقْوٰی" ہے۔ ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور نہ کرنے کے لیے ایک اصول مقرر فرما دیا ہے جس سے اسلامی معاشرے میں برائی کا سد باب ہو سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' ایک آدمی نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! جب وہ مظلوم ہو، میں اس کی مدد کروں گا لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کس طرح کروں؟'' فرمایا: ''اس وقت اس کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روکو۔'' [ بخاری، الإکراہ، باب یمین الرجل...... : ۶۹۵۲۔ مسلم : ۲۵۸۴ ]

**آیت 3** ① حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ: شروع کی آیت میں جن جانوروں کے حرام ہونے کے بیان کا وعدہ ''سوائے ان کے جو تم پر پڑھے جائیں گے'' کے ساتھ کیا گیا تھا اس آیت میں ان کا ذکر ہے۔

② اَلْمَيْتَةُ: مردار میں سے مچھلی اور ٹڈی حلال ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کر دیے گئے ہیں، مردار تو مچھلی اور ٹڈی ہیں (کیونکہ ان میں دم مسفوح نہیں ہوتا) اور خون جگر اور تلی ہیں۔'' [ أحمد : ۲/۹۷، ح : ۵۷۲۵۔ ابن ماجه : ۳۳۱۴، و صححه الألبانی فی الصحیحة : ۱۱۱۸ ] حرام خون اور لحم خنزیر کی تفصیل سورۂ انعام (۱۴۵) میں ہے۔

وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ

ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تم تیروں کے ساتھ قسمت معلوم کرو۔ یہ سراسر نافرمانی ہے۔ آج وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تمھارے دین سے مایوس ہو گئے، تو تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو، آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا پھر جو شخص بھوک

③ وَالْمُنْخَنِقَةُ : گلا گھٹنے والا جانور، خواہ خود بخود رسی وغیرہ سے گھٹ کر مر جائے یا کوئی گلا گھونٹ کر مار دے۔

④ وَالْمَوْقُوْذَةُ : جسے کسی لاٹھی یا پتھر وغیرہ کی چوٹ سے مارا جائے۔

⑤ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ : اس کا تعلق اس سے پہلے مذکور پانچ چیزوں کے ساتھ ہے کہ ان پانچوں چیزوں میں سے کسی کے اندر اگر جان باقی ہو اور مرنے سے پہلے اسے ذبح کر لو تو وہ حلال ہے۔ شرعی ذبح یہ ہے کہ حلال جانور کو " بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" کہہ کر کسی تیز دھار آلے سے اس کا گلا اس طرح کاٹا جائے کہ رگیں کٹ جائیں۔ ذبح کے علاوہ نحر بھی شرعی طریقہ ہے کہ کھڑے اونٹ کے حلق کے گڑھے میں چھری وغیرہ ماری جائے۔ ذبح اور نحر حلق یا لبہ (حلق کے گڑھے) ہی میں ہوتا ہے، البتہ اگر مجبوری ہو، مثلاً جانور قابو نہیں آ رہا، یا ایسی جگہ ہے جہاں پکڑ کر ذبح کرنا مشکل ہے تو " بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ " پڑھ کر جہاں سے بھی ہو سکے چھری یا نیزے سے خون بہا کر ذبح کیا جا سکتا ہے۔ اگر ذبح کرتے وقت جان بوجھ کر نہیں بلکہ اتفاقاً گردن الگ ہو جائے تو وہ بھی حلال ہے۔

⑥ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ : مشرکین اپنے جھوٹے معبودوں کے لیے جو جگہیں مقرر کرتے انھیں نصب کہا جاتا تھا، کیونکہ عموماً وہاں کوئی نشان نصب ہوتا، مثلاً بت، درخت، قبر یا دریا وغیرہ۔ پھر اس کے پاس ان کا قرب حاصل کرنے کے لیے جانور ذبح کرتے تھے۔ ایسی جگہوں کو استھان، تھان اور آستانہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ایسے جانور بھی حرام ہیں خواہ ان پر "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" بھی پڑھا جائے، اگرچہ ان کا ذکر ﴿ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ کے ضمن میں آ چکا تھا مگر مزید تاکید کے لیے ان کو الگ بھی ذکر فرمایا۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک شخص نے نذر مانی کہ وہ ''بوانہ'' مقام پر اونٹ نحر کرے گا، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے ''بوانہ'' مقام پر ایک اونٹ نحر کرنے کی نذر مانی تھی۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہاں ایام جاہلیت کے (انصاب) استھانوں میں سے کوئی استھان تھا؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں!'' آپ نے مزید پوچھا: ''کیا وہاں مشرکین کی عیدوں (میلوں) میں سے کوئی عید تھی؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں!'' آپ نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کرو۔'' [ أبو داوٗد، الأیمان والنذور، باب ما یؤمر به من وفاء النذر : ۳۳۱۳ ]

⑦ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ : " اَزْلَامٌ " یہ "زَلَمٌ" کی جمع ہے، یہ وہ تیر تھے جو قسمت معلوم کرنے کے لیے ہبل بت کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی تصویروں کے ہاتھوں میں بھی تھمائے ہوئے تھے، بلکہ لوگ

الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِیۡ مَخۡمَصَۃٍ غَیۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳﴾

کی کسی صورت میں مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ کسی گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳﴾

---

اپنے ساتھ بھی قسمت آزمائی کے یہ تھیلے رکھ لیتے تھے، جیسا کہ سراقہ نے نبی ﷺ کا تعاقب کرتے ہوئے ان تیروں سے فال نکالی تھی۔ ان میں سے کسی پر ''اِفۡعَلۡ'' (کرلو) لکھا ہوتا، کسی پر "لَا تَفۡعَلۡ" (مت کرو) لکھا ہوتا اور کوئی خالی ہوتا۔ قسمت معلوم کرنے والا تیر نکالتا، جو حکم نکلتا اس پر عمل کرتا، اگر خالی تیر نکلتا تو دوبارہ تیر نکالتا۔ اس قسم کے تمام کام، خواہ انھیں فال نامہ کہا جائے یا استخارہ یا کسی نجومی سے پوچھا جائے حرام ہیں، شرک ہیں کیونکہ غیب تو اللہ کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں، مسنون استخارے میں اس چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ ﴿ وَ اَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ﴾ کا ایک اور مطلب بھی ہے، یعنی جوئے کے تیروں کے ذریعے سے ذبح شدہ گوشت کے حصے تقسیم کرنا، اس میں کسی کا حصہ نکل آتا، کوئی محروم رہ جاتا، یہ وہی چیز ہے جسے آج کل لاٹری کہا جاتا ہے، یہ بھی حرام ہے۔ (قرطبی)

⑧ اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا...... : یعنی اب تمھاری طاقت اس قدر مستحکم ہوگئی ہے کہ تمھارے دشمنوں کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور وہ اس چیز سے قطعی مایوس ہو گئے ہیں کہ تمھارے دین کو نیچا دکھا سکیں۔

⑨ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ...... : طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ اپنی کتاب میں ایک ایسی آیت پڑھتے ہیں کہ اگر ہم یہودیوں کی کتاب میں یہ آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نزول کے دن کو عید بنا لیتے۔'' آپ نے فرمایا: ''کون سی آیت؟'' اس نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ﴾ [ المائدۃ : ۳ ] یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم اس دن اور جگہ کو جانتے ہیں جب یہ (آیت) رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی، آپ (۹ ذوالحجہ کو) عرفہ میں تھے (پچھلے پہر کا وقت تھا) اور جمعۃ المبارک کا دن۔'' [ بخاری، الإیمان، باب زیادۃ الإیمان و نقصانہ : ٤٥ ]

دین کو مکمل کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اس کے تمام ارکان، فرائض، سنن، حدود اور احکام بیان کر دیے گئے ہیں اور کفر و شرک کا خاتمہ کر کے اس نعمت کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ اب دین میں جو حرام ہونا تھا یا حلال ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اگر کوئی اس میں تبدیلی یا اضافہ کرے گا، یا نئی چیز نکالے گا وہ دین نہیں ہو سکتی بلکہ دین میں بدعت ہے، جو سراسر گمراہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنۡ أَحۡدَثَ فِیۡ أَمۡرِنَا ھٰذَا مَا لَیۡسَ مِنۡهُ فَھُوَ رَدٌّ )) ''جو ہمارے اس امر (دین) میں کوئی نئی چیز شروع کرے گا جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔'' [ بخاری، الصلح، باب إذا اصطلحوا...... : ٢٦٩٧ ]

⑩ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِیۡ مَخۡمَصَۃٍ...... : یعنی بھوک کی وجہ سے مجبور اور لاچار آدمی اگر حرام چیزوں میں سے کچھ کھا لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ حرام کھانے کا شوق نہ ہو اور اسے جائز نہ سمجھنے لگے اور دوسرا بقدر ضرورت کھائے، حد سے نہ گزرے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ٝ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہہ دے تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جو تم نے سدھائے ہیں، (جنھیں تم) شکاری بنانے والے ہو، انھیں اس میں سے سکھاتے ہو جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے تو اس میں سے کھاؤ جو وہ تمھاری خاطر روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام ذکر کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۝۴

---

معلوم ہوا حرام کھانے کا تعلق بھوک اور حقیقی مجبوری سے ہے۔ زندگی کا معیار بلند کرنے کے لیے اضطرار کا بہانہ بنا کر سود کھانا شروع کر دے، یہ مراد نہیں۔

**آیت 4** ❶ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ...... : چوپاؤں کا حکم تو فرما دیا، پھر لوگوں نے اور چیزوں کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے دین کا ایک عظیم الشان اصول بیان فرما دیا، جسے فقہی زبان میں یوں ادا کیا جاتا ہے: ''ہر چیز کی اصل اباحت ہے۔'' یعنی کھانے پینے کی تمام طیبات یعنی ستھری چیزیں حلال ہیں، سو رسول اللہ ﷺ نے جو چیزیں حرام فرمائیں معلوم ہوا وہ ستھری نہیں، جیسے کچلی والے درندے اور پنجے سے شکار کرنے والے پرندے، یا جن کا نام لے کر حرام قرار دے دیا، باقی سب حلال ہیں۔ اس قاعدے سے حرام اشیاء کا دائرہ تنگ ہو گیا اور حلال اشیاء کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

❷ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ ...... : شکاری جانور سے ہر وہ درندہ اور پرندہ مراد ہے جسے شکار کے لیے رکھا اور سدھایا جاتا ہے، مثلاً کتا، چیتا، باز اور شکرا وغیرہ اور اس کے ''سدھائے ہوئے'' ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ شکار پر چھوڑا جائے تو اسے اپنے مالک کے لیے پکڑ کر رکھے، اگر وہ خود شکار پکڑ کر کھانے لگے تو وہ شکار کھانا درست نہیں اور یہی معنی ﴿ مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ ﴾ کے ہیں۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم اپنے سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑو اور اللہ کا نام لو تو جو شکار وہ تمھارے لیے پکڑے اسے کھا لو۔'' میں نے کہا: ''خواہ وہ اسے قتل کر دے؟'' فرمایا: ''خواہ وہ اسے قتل کر دے، بشرطیکہ قتل میں کوئی ایسا کتا شریک نہ ہو جو ان میں سے نہ ہو، کیونکہ تم نے اپنے کتے کو چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا ہے، کسی دوسرے پر نہیں لیا۔'' [ بخاری، الذبائح والصید، باب صید المعراض : ۵۴۷۶ ]

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم اپنا کتا چھوڑو اور وہ تمھارے لیے پکڑ کر رکھے اور اسے زندہ پا لو تو اسے ذبح کر لو اور اگر تم اسے پاؤ کہ اس نے قتل کر دیا ہے لیکن اسے خود نہیں کھایا تو پھر تم اسے کھا لو، کیونکہ کتے کا اسے پکڑنا ہی ذبح کرنا ہے۔'' [ بخاری، الذبائح والصید، باب التسمیة علی الصید : ۵۴۷۵ ]

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ؗ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۠﴿۵﴾

آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جنھیں کتاب دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو، اس حال میں کہ تم قید نکاح میں لانے والے ہو، بدکاری کرنے والے نہیں اور نہ چھپی آشنائیں بنانے والے اور جو ایمان سے انکار کرے تو یقیناً اس کا عمل ضائع ہوگیا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں سے ہے ﴿۵﴾

③ وَاتَّقُوا اللّٰهَ : یعنی اگر حلال ہونے کی کوئی شرط کم ہے تو شکار کھانے کے شوق میں اللہ سے بے خوف ہو کر اسے مت کھاؤ۔

**آیت 5** ① وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ...... : اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا طعام، جس میں ذبیحہ بھی شامل ہے، مسلمانوں کے لیے حلال ہے، بشرطیکہ انھوں نے غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا ہو اور واقعی ذبح کیا ہو۔ کسی چھری یا مشین سے سر کاٹ کر الگ کر دینا یا سخت گرم پانی میں جانور کو ڈال کر یا بجلی کے کرنٹ سے مار دینا ذبح نہیں، کیونکہ ان طریقوں سے جسم سے بہتا ہوا خون (دم مسفوح) پوری طرح باہر نہیں نکلتا جو حرام ہے، اس لیے ایسے جانور کا گوشت کھانا درست نہیں۔ اگر صحیح ذبح کیا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے سے متعلق حدیث ہے کہ خیبر کی فتح کے بعد نبی کریم ﷺ کو (ایک یہودی عورت کی طرف سے) بکری کے گوشت کا ہدیہ پیش کیا گیا جس میں زہر ملا ہوا تھا اور آپ نے اس میں سے کچھ کھایا۔ [ بخاری، المغازی، باب الشاة التی سمت للنبی ﷺ بخیبر : ۴۲۴۹ ] اسی طرح بعض صحابہ نے بھی وہ چربی کھائی جو خیبر میں یہودیوں سے حاصل ہوئی تھی۔ [ مسلم، الجهاد، باب جواز الأكل من طعام الغنيمة ...... : ۱۷۷۲ ] مگر جو چیزیں ہماری شریعت میں حرام ہیں، جیسے مردار، خون، خنزیر کا گوشت وغیرہ، یہ چیزیں ان کے دستر خوان پر کھانا بھی حرام ہے، بلکہ ایسے دستر خوان پر بیٹھنا بھی جائز نہیں، نہ ان کے ایسے برتن استعمال کرنا جائز ہے، ہاں اگر اور برتن نہ ملیں اور مجبوری ہو تو انھیں خوب دھو کر اور صاف کر کے استعمال کر سکتے ہیں۔

② وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... : یعنی ان سے نکاح کرنا درست ہے، چاہے وہ اپنے دین پر قائم رہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن ہوں نہ کہ آزاد منش اور آوارہ قسم کی، جو انسان کے ایمان کو بھی تباہ کر ڈالیں۔ جمہور کے نزدیک یہاں "الْمُحْصَنٰتُ" کے یہی معنی مراد ہیں، تا کہ کفر اور زنا کی دو آفات ان میں جمع نہ ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھو لو) اور اگر جنبی ہو تو غسل کر لو اور اگر تم بیمار ہو، یا کسی سفر پر، یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر کوئی پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو، پس اس

دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۲۱)۔

③ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ...... : اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح صرف جائز ہے، مستحسن اور مستحب نہیں، یعنی کوئی باعث ثواب اور اچھی چیز نہیں اور جو شخص اس اجازت سے فائدہ اٹھائے اسے اپنے ایمان کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی غیر مسلم بیوی سے متاثر ہو کر اپنے ایمان و اخلاق سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

**آیت 6** ① يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ...... : اوپر کی آیات میں "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" کے تحت حلال و حرام چیزیں بتائی گئی تھیں، اب اس آیت میں اسی کے تحت وضو اور تیمم کے احکام بیان فرمائے ہیں جو عقود میں شامل ہیں اور سہولت پر مشتمل ہونے کے اعتبار سے اتمام نعمت (نعمت پوری کرنا) بھی ہیں۔ (کبیر، قرطبی) غزوۂ مریسیع (۵ یا ٦ ہجری) میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا تھا، ہار کی تلاش میں صبح ہو گئی اور پانی موجود نہ تھا، لوگ فکر مند ہوئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [ بخاري، التيمم، باب : ٣٣٤ ] اس آیت سے چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کی رخصت ملی، اس لیے علماء نے اس آیت کو آیتِ وضو کے بجائے آیتِ تیمم بھی کہا ہے۔ (قرطبی)

نماز سے پہلے وضو نہ ہو تو وضو فرض ہے ورنہ مستحب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں پڑھی ہیں۔ [ مسلم، الطهارة، باب جواز الصلوات كلها بوضوء واحد : ٢٧٧ ] اس آیت میں وضو کا بیان ہے، وضو میں سب سے پہلے نیت ضروری ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » "تمام اعمال (عبادات) کے لیے نیت ضروری ہے۔" [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ : ١ ] اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ الغرض تمام اعمال داخل ہیں۔" قرآن نے چار اعضا کا ذکر کیا ہے، مگر اس کا عملی طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق ہونا چاہیے۔

② فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ: منہ دھونے میں کلی کرنا اور ناک میں پانی داخل کر کے جھاڑنا اور داڑھی کا خلال بھی شامل ہے۔[ ابن ماجه، الطهارة، باب ما جاء في تخليل اللحية : ٤٣١ ] "کہنیوں تک" میں کہنیاں بھی شامل

صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے، تاکہ تم شکر کرو۞

---

ہیں، انھیں بھی دھونا لازم ہے۔ نعیم مجمر فرماتے ہیں میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا، انھوں نے چہرہ دھویا اور مکمل وضو کیا، پھر اپنا دایاں ہاتھ دھویا یہاں تک کہ کہنی سے اوپر والے حصے تک لے گئے، پھر بایاں ہاتھ یہاں تک کہ کہنی سے اوپر تک لے گئے، پھر اپنا دایاں پاؤں دھویا یہاں تک کہ پنڈلی تک پہنچا دیا، پھر بایاں پاؤں دھویا یہاں تک کہ پنڈلی تک لے گئے، پھر فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔'' [ مسلم، الطهارة، باب استحباب إطالة الغرة...... : ٢٤٦ ]

③ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ : گو بہت سے علماء نے لکھا ہے کہ سارے سر کا مسح فرض نہیں بلکہ سر کے کچھ حصے کا مسح کر لیا جائے تو بھی کافی ہے، مگر قرآن کے ظاہر اور احادیث کی رو سے سارے سر کا مسح کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ بھی پگڑی کے بغیر سر کے کچھ حصے کا مسح ثابت نہیں، آپ دونوں ہاتھ آگے سے گدی تک لے جاتے، پھر واپس لے آتے، ہاں پگڑی ہونے کی صورت میں سر کے سامنے والے حصے کے بعد پگڑی پر مسح کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم (۸۱/۲۷۴) میں ہے، پوری پگڑی پر بھی مسح کر سکتا ہے۔ [ أبو داوٗد : ١٤٦ ] سر کے مسح کے ساتھ کانوں کا مسح حدیث سے ثابت ہے۔ [ نسائی : ١٠٣۔ ابن ماجه : ٤٣٩ ] سر کے مسح کے بعد گردن کا الگ مسح یا الٹے ہاتھوں مسح کرنے کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نہیں ملتا، لہٰذا یہ بدعت ہے۔

④ وَاَرْجُلَكُمْ : اس میں ''لام'' کے زبر اور زیر کے ساتھ دو قراءتیں مروی ہیں۔ فتح والی قراءت کی رو سے تو ظاہر ہے کہ ''فَاغْسِلُوْا'' کا مفعول ہونے کی بنا پر پاؤں دھونا ثابت ہے۔ زیر والی قراءت میں قریب ہونے کی وجہ سے جر ہے، یعنی پہلا لفظ ''بِرُءُوْسِكُمْ'' مجرور ہونے کی موافقت کے لیے ''وَاَرْجُلِكُمْ'' کو کسرہ دے دیا، ورنہ ''فَاغْسِلُوْا'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے دراصل منصوب ہے۔ تمام علمائے اہل سنت کا یہی مذہب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث میں ثابت ہے کہ آپ پاؤں دھویا کرتے تھے، ان پر مسح نہیں فرماتے تھے۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے، پھر آپ نے ہمیں پا لیا، نماز کا وقت ہو گیا تھا، ہم وضو کر رہے تھے اور (جلدی میں) اپنے پاؤں پر گیلا ہاتھ پھیر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں تین مرتبہ فرمایا: ''ان ایڑیوں کے لیے آگ میں بڑی ہلاکت ہے۔'' [ بخاري، العلم، باب من رفع صوته بالعلم : ٦٠ ] اگر موزے یا جرابیں باوضو ہونے کی حالت میں پہنی ہوں تو ان پر صحیح احادیث کے مطابق مسح کیا جا سکتا ہے۔ وضو میں ترتیب بھی ضروری ہے، جیسا کہ ''فَاغْسِلُوْا'' کی ''فاء'' سے ثابت ہوتا

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کا عہد جو اس نے تم سے مضبوط باندھا، جب تم نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ۞ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر خوب قائم رہنے والے، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں ہرگز اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو ۞

ہے کہ چہرہ پہلے دھویا جائے گا، باقی اعضاء میں بھی ترتیب ہوگی، مسح راس کے بعد غسل رجلین کے ذکر میں بھی ترتیب کی طرف اشارہ ہے، یعنی ''فَاغْسِلُوْا'' کا مفعول بعد میں ذکر ہوا ہے اور ہمیشہ رسول اللہ ﷺ نے اسی ترتیب سے وضو کیا ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں کیا۔ اعضاء کو کم از کم ایک مرتبہ اور زیادہ سے زیادہ تین دفعہ دھونا ثابت ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں۔

5 فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۴۳)۔

6 مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ...... : تنگی میں نہ ڈالنے کی وجہ سے اور پانی نہ ہونے کی صورت میں مٹی کے ساتھ مکمل طہارت ہی کے لیے اس نے تیمم کا حکم نازل فرمایا ہے، تاکہ تم پر نعمت تمام ہو اور تم شکر ادا کرو۔

**آیت 7** وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ...... : اس آیت میں نعمت سے مراد اسلام ہے، یثاق اور اقرار سے مراد وہ عہد ہے جو رسول اللہ ﷺ ہر آدمی سے مسلمان ہونے پر لیا کرتے تھے، چونکہ وہ اللہ کے حکم سے تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا (منکرین حدیث کو غور کرنا چاہیے)۔ اس سے مراد وہ عہد بھی ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد سے لیا تھا، جو ان کی فطرت میں داخل ہے اور یہ بھی کہ یہود کو متنبہ فرمایا ہو کہ آخری نبی کی پیروی کا جو عہد تم سے لیا گیا ہے اسے پورا کرو، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (ابن کثیر، قرطبی)

**آیت 8** كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ : اس کی تشریح سورۂ نساء (۱۳۵) میں گزر چکی ہے، اسی طرح ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ ...... ﴾ کی تشریح سورۂ مائدہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اکثر کافروں نے مسلمانوں سے بڑی دشمنی کی تھی، جب وہ مسلمان ہوئے تو فرمایا کہ ان سے وہ دشمنی نہ نکالو اور ہر جگہ یہی حکم ہے، حق بات میں دوست اور دشمن برابر ہیں۔'' (موضح)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے کہ بے شک ان کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ⑨ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی بھڑکتی آگ والے ہیں ⑩ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو۔ جب کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ⑪

**آیت 11** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ : عمومی انعامات کے بعد اب خصوصی انعام کا ذکر ہے۔ (رازی)

② اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ ...... : جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نجد کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں ساتھ تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے تو وہ بھی واپس لوٹے۔ دوپہر کے آرام کا وقت ایسی وادی میں آیا جہاں بہت سے خاردار درخت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے اور لوگ درختوں کے سائے کے لیے درختوں (کی تلاش) میں بکھر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کیکر کے درخت کے نیچے اترے اور اپنی تلوار اس کے ساتھ لٹکا دی۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر ہی سوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا، ہم آپ کے پاس آئے تو آپ کے پاس ایک بدوی بیٹھا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے میری تلوار سونت لی، جب کہ میں سویا ہوا تھا، میں جاگ پڑا تو اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی، مجھ سے کہنے لگا، تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا، اللہ! تو دیکھو یہ بیٹھا ہے۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ نہیں کہا۔ [ بخاری، المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع : ٤١٣٥ ]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دیت کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ایک یہودی قبیلے بنونضیر کے ہاں تشریف لے گئے، انھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایک دیوار کے سائے میں بٹھایا اور آپس میں پروگرام بنایا کہ ان کے اوپر چکی کا پاٹ گرا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبردار کر دیا اور آپ وہاں سے اٹھ گئے۔ (ابن کثیر) ممکن ہے قرآن نے اس ایک آیت میں ان متعدد واقعات کی طرف اشارہ فرمایا ہو اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک آیت ایک واقعہ کے متعلق نازل ہوتی ہے، پھر یاد دہانی کے لیے دوسرے واقعہ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ (المنار، قرطبی)

وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ‌ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا‌ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مَعَكُمۡ‌ؕ لَئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيۡتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِىۡ وَعَزَّرۡتُمُوۡهُمۡ وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ۚ فَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰ لِكَ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا

اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے اور اللہ نے فرمایا بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور انھیں قوت دی اور اللہ کو قرض دیا، اچھا قرض تو یقیناً میں تم سے تمھارے گناہ ضرور دور کروں گا اور یقیناً تمھیں ایسے باغوں میں ضرور داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، پھر جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ﴿۱۲﴾ تو ان کے اپنے عہد کو توڑنے کی وجہ ہی سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا

**آیت 12** وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ...... : پیچھے آیت (۷) میں گزرا ہے کہ مسلمانو! اپنے آپ پر اللہ کی نعمت اور اپنے اس عہد کو یاد کرو جب تم نے سمع و طاعت کا پختہ عہد کیا تھا، اب فرمایا کہ یہ عہد صرف تم ہی سے نہیں لیا گیا بلکہ تم سے پہلے بنی اسرائیل سے بھی اسی قسم کا عہد لیا گیا تھا، مگر انھوں نے عہد توڑ دیا اور ذلت و مسکنت کا شکار ہوئے، لہٰذا تم ان جیسے مت بنو۔ (کبیر) بنی اسرائیل کے کل بارہ قبیلے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھی میں سے ان پر بارہ سردار مقرر کر دیے، تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھیں اور انھیں اپنے عہد پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ نقیب (سردار) ان جبارین (زبردست لوگوں کی قوم) کی خبر لانے کے لیے مقرر کیے تھے جن کا ذکر آیت (۲۱ تا ۲۶) میں آ رہا ہے۔ (ابن کثیر) مگر ظاہر الفاظ سے پہلی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی لیلۃ العقبہ میں جب سمع و طاعت پر بیعت لی تھی تو ان پر بارہ نقیب ہی مقرر فرمائے تھے۔ (قرطبی)

**آیت 13** ① فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ ...... : یعنی انھوں نے اپنے عہد و میثاق کی پاس داری کے بجائے سمع و طاعت کا وہ عہد توڑ دیا، نماز کو ضائع کرنا شروع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ (دیکھیے مریم: ۵۹) زکوٰۃ اور قرض حسنہ (صدقہ وغیرہ) کے بجائے بخل اور کمینگی کی انتہا کو پہنچ گئے اور سود لینا شروع کر دیا، رسولوں اور ان کی کتابوں پر ایمان لانے اور جہاد کے ساتھ انھیں قوت دینے کے بجائے کتابوں میں تحریف کی اور جہاد میں جانے ہی سے صاف انکار کر دیا، تورات کے بہت سے حصے پر عمل ترک کر دیا، جس کے نتیجے میں اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں میں نفاق بھر گیا۔ "قَسِيَّةً" یا "قَاسِيَةً" اصل میں اس سکے کو کہتے ہیں جس میں ملاوٹ ہو، یہ "قَسْوَةٌ" سے ہے جس کا معنی شدت اور سختی ہے۔ خالص سونا اور چاندی نرم ہوتے ہیں اور ان میں جتنی ملاوٹ زیادہ ہو اتنا ہی وہ زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، اس تشبیہ کی رعایت سے انھیں "قَاسِيَةً" فرمایا۔

قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣﴾

کہ وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور وہ اس میں سے ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی اور تو ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر پاتا رہے گا، سوائے ان کے تھوڑے سے لوگوں کے، سو انھیں معاف کر دے اور ان سے درگزر کر۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿١٣﴾

② يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ : یعنی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیتے، یا اس کے اصل مفہوم کے بجائے کوئی غلط مفہوم نکال لیتے جسے تاویل باطل کہتے ہیں، اپنی اسی خست کی وجہ سے ہیرا پھیری کر کے انھوں نے نبی ﷺ کی ان صفات کو بدل ڈالا جو تورات میں مذکور تھیں۔ (قرطبی)

③ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ : یعنی انھوں نے تورات کے بہت سے حصے پر عمل ترک کر دیا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا، زانی کو سنگسار کرنا، سود کو حرام سمجھنا وغیرہ۔ افسوس اہل کتاب کی طرح مسلمانوں کی اکثریت نے بھی سمع و طاعت کو چھوڑا، نمازیں ضائع کیں، سود کھانے لگے، جہاد چھوڑ بیٹھے، باہمی فرقوں میں بٹ کر اللہ کی کتاب میں تحریف کی حد تک تاویلیں کرنے لگے، تو نتیجہ بھی وہی ہے جو پہلوں کا تھا، مگر امید افزا بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق امت مسلمہ میں ایسے لوگ قیامت تک رہیں گے جو حق پر قائم رہیں گے اور حق کی خاطر لڑتے رہیں گے، انھی کو "عَلَى الْحَقِّ مَنْصُوْرِيْنَ" کہا گیا ہے۔ [ مسلم، الإمارة، باب قوله: لا تزال طائفة...... : ۱۰۳۷، بعد ح : ۱۹۲۳۔ ابن ماجه : ۱۰ ]

④ "خَآئِنَةٍ" مصدر ہے بروزن "عَافِيَةٌ" بمعنی خیانت یعنی ان سے آئے دن کسی نہ کسی خیانت اور بدعہدی کا ظہور ہوتا رہے گا، یا اسم فاعل ہے کہ خیانت کرنے والی جماعت یا شخصیت یعنی ان میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہیں گے جو خیانت اور بدعہدی کا ارتکاب کرتے رہیں گے اور آپ کو ہرگز ان کی طرف سے امن نصیب نہیں ہوگا۔ "اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ" یعنی ان میں سے چند لوگ ایسے ہیں جو کسی خیانت و بدعہدی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ ان سے خاص کر عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مراد ہیں، یا وہ لوگ جنھوں نے کفر کے باوجود کسی قسم کی خیانت اور بدعہدی نہیں کی۔ (کبیر)

⑤ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ : یعنی ان کی انفرادی خیانتوں اور بدعہدیوں سے درگزر کیجیے نہ کہ ان بدعہدیوں سے جو اجتماعی (یا اجتماعی کے حکم میں) ہوں، کیونکہ اس صورت میں تو وہ واضح حربی (جو حالت جنگ میں ہوں) قرار پائیں گے، جن کی سرکوبی بہر حال کی جائے گی۔ (المنار) یا یہ کہ جو ان میں سے خیانت کا ارتکاب نہیں کرتے اور اپنے عہد پر قائم ہیں، ان کی دوسری لغزشوں سے درگزر فرمائیں۔ (رازی) ان دونوں صورتوں میں یہ آیت محکم رہے گی، ورنہ اسے قتال (لڑائی) کے حکم والی آیت سے منسوخ سمجھا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۲۹)۔

وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ١۪ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ١ؕ وَ سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۰۰۱۴ يٰۤاَهْلَ

اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا بے شک ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان کا پختہ عہد لیا، پھر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور کینہ وری بھڑکا دی اور عنقریب اللہ انھیں اس کی خبر دے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴﴾ اے اہل کتاب! بے شک تمھارے پاس ہمارا

آیت 14 ❶ وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى ……: یعنی ''اللہ کے مددگار'' چونکہ یہ لوگ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے نصاریٰ سے اقرار لیا، بلکہ یہ فرمایا کہ ہم نے ان لوگوں سے اقرار لیا جو اپنے آپ کو ''نصاریٰ'' کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کی طرح نصاریٰ سے بھی ہم نے توحید اور نبی آخر الزماں پر ایمان لانے کا عہد لیا مگر انھوں نے بھی اس عہد کو توڑ ڈالا۔ (کبیر، قرطبی)

❷ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ: یعنی ہم نے اس وقت سے لے کر قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور کینہ وری بھڑکا دی، چنانچہ اس وقت بھی ان میں آپس میں مذہبی عداوت پائی جاتی ہے اور پھر خود نصرانیوں کے بھی بہت سے فرقے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے دشمن اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ رہا مسلمانوں کے مقابلے میں ان کا ایک ہونا تو وہ مسلمانوں کے ترکِ جہاد اور کفار کے مسلمانوں کے ممالک سے اپنا اپنا حصہ لینے کے لیے ہے، ورنہ ظاہر میں ایک نظر آنے کے باوجود ان کی باہمی لڑائی ایک یقینی حقیقت ہے، جس کا مطالعہ کر کے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ﴾ [ الحشر: ۱٤ ] ''تو خیال کرے گا کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔''

مگر افسوس اب مسلمانوں میں ایسا اختلاف اور دشمنی پیدا ہوگئی کہ صرف مسلمان نام نے انھیں جمع کر رکھا ہے، باقی کفار ان کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر ان پر حکومت کر رہے ہیں۔

آیت 15 ❶ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا ……: یہود و نصاریٰ کے عہد توڑنے اور حق سے منہ موڑنے کا ذکر کرنے کے بعد اب ان کو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ (کبیر) اس آیت میں آپ ﷺ کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ بہت سے احکام جو وہ چھپایا کرتے تھے آپ ﷺ ان کو بیان کرتے ہیں، جیسے رجم کی آیت، سبت والوں کا قصہ جن کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا گیا تھا، اسی طرح رسول کریم ﷺ کی صفات سے متعلق آیات، الغرض! یہود ان تمام باتوں کو چھپایا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک یہودی مرد اور عورت کو لایا گیا، جنھوں نے زنا کیا تھا، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم اپنی کتاب میں اس کے بارے میں کیا حکم پاتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہمارے علماء نے (اس کی سزا) چہرے کو سیاہ کرنا اور گدھے پر گشت کروانا تجویز کی ہوئی ہے۔'' عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ان (کے علماء) کو تورات سمیت بلائیے۔'' چنانچہ تورات لائی

الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾

رسول آیا ہے، جو تمھارے لیے ان میں سے بہت سی باتیں کھول کر بیان کرتا ہے، جو تم کتاب میں سے چھپایا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے، بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آئی ہے ﴿١٥﴾

گئی تو ان میں سے ایک نے رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے سے پڑھنا شروع کر دیا، عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔'' اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس کے نیچے سے رجم کی آیت نکلی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور وہ دونوں سنگسار کر دیے گئے۔ [ بخاری، الحدود، باب الرجم فی البلاط : ٦٨١٩ ]

❷ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ: نور سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب ہی ہے۔ واؤ عاطفہ دونوں کو الگ الگ بتانے کے لیے نہیں بلکہ تفسیر کے لیے ہے، یعنی کتاب مبین اس نور کی تفسیر ہے، جس کی واضح دلیل ایک تو اس سے بعد والی یہ آیت ہے: ﴿ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ﴾ یعنی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے۔ اب اس آیت میں اگر نور اور کتاب مبین الگ الگ چیزیں ہوتیں تو الفاظ '' يَهْدِيْ بِهِمَا اللّٰهُ '' (اللہ ان دونوں کے ساتھ ہدایت دیتا ہے) ہوتے۔ دوسری جگہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نور قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ١٥٧ ] ''سو وہ لوگ جو اس رسول پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اترنے والی کتاب ہی نور ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِيْۤ اَنْزَلْنَا ﴾ [ التغابن : ٨ ] ''سو تم اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا۔'' قرآن مجید کے لیے نور کا لفظ سورۂ نساء اور دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴾ [ النساء : ١٧٤ ] ''اے لوگو! بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک واضح نور نازل کیا ہے۔''

بعض مفسرین نے نور سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے مراد قرآن مجید لیا ہے۔ اس صورت میں بھی معنی یہ ہوگا کہ اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روشنی بن کر اور قرآن ایک کتاب مبین بن کر آئے ہیں، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے، یعنی آپ ایک تو ہدایت کا نور ہیں، دوسرا '' نُوْرٌ مِّنَ اللّٰهِ '' یعنی اللہ کی طرف سے آنے والے نور ہیں جو اللہ کی مخلوق ہیں نہ کہ '' نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ '' یعنی اللہ کے نور میں سے نور کا ایک ٹکڑا ہیں کہ اللہ کا حصہ ہوں یا خود ہی اللہ ہوں۔ یہ تو وہی نصرانیوں والا عقیدہ ہے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنایا اور ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا ٹکڑا بنا دیا۔ سورۂ اخلاص اس گندے اور شرکیہ عقیدے کی خوب تردید کرتی ہے۔

یَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے اور انھیں اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے ﴿۱۶﴾ بلاشبہ یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ بے شک اللہ مسیح ہی تو ہے، جو مریم کا بیٹا ہے، کہہ دے پھر کون اللہ سے کسی چیز کا مالک ہے، اگر وہ ارادہ کرے کہ مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور زمین میں جو لوگ ہیں سب کو ہلاک کر دے، اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿۱۷﴾

**آیت 17** ① لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا ...... : یعنی جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اور مسیح ایک ہی چیز ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پرانے زمانے میں یہ صرف نصرانیوں کے ایک فرقے یعقوبیہ کا عقیدہ تھا، مگر اس زمانے میں نصرانیوں کے جو تین فرقے پروٹسٹنٹ، کیتھولک اور آرتھوڈیکس پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اگرچہ تثلیث کے قائل ہیں لیکن ان کا اصل مقصد مسیح علیہ السلام کو الٰہ (خدا) ماننا ہے، گویا وہ سب کے سب خدا اور مسیح کے ایک چیز ہونے کے قائل ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان سب پر کافر ہونے کا فتویٰ لگایا ہے۔ (المنار) مسلمانوں میں الحمد للہ توحید الٰہی پر قائم لوگ کثرت سے موجود ہیں، مگر کئی ایسے گمراہ بھی ہیں جنھوں نے صاف کہہ دیا ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

یہ بعینہٖ اوپر مذکور شرکیہ عقیدہ ہے، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو توحید الٰہی کا عقیدہ رکھنے کی ہدایت اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین!

② قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ...... : یعنی وہ مالک کل اور مختار کل ہے اور سب چیزوں پر اسے قدرت اور برتری حاصل ہے، وہ چاہے تو سب کو آن کی آن میں فنا کر سکتا ہے، اگر مسیح علیہ السلام خدا ہوتے تو کم از کم خود کو اور اپنی والدہ کو تو بچا سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کو فوت کر لیا اور ان کو بھی مقرر وقت پر فوت کرے گا، وہ موت سے بچ نہیں سکیں گے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نہ تو خدا ہیں اور نہ خدا کے بیٹے، بلکہ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ (کبیر، قرطبی)

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

اور یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، کہہ دے پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی وجہ سے سزا کیوں دیتا ہے، بلکہ تم اس (مخلوق) میں سے ایک بشر ہو جو اس نے پیدا کی ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۱۸﴾

③ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ: یعنی وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور جس کو جیسے چاہتا ہے بناتا ہے، آدم علیہ السلام کو اس نے ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا تو عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر دینا اس کے لیے کیا مشکل تھا، محض باپ کے بغیر پیدا ہونے سے کوئی بندہ خدا نہیں بن جاتا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ انبیاء کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تاکہ ان کی امت والے ان کو بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھائیں۔ (موضح)

**آیت 18** وَ قَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ...... : اس آیت کریمہ میں یہود و نصاریٰ کی ایک اور گمراہی بیان کی گئی ہے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور محبوب لوگ ہیں، چنانچہ بائبل میں آج تک اس قسم کے حوالے موجود ہیں: ''خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے۔'' (خروج: ۴:۲۲) ''تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔'' (استثناء: ۱۴: ۲۲) اور انجیل میں ہے کہ مسیح علیہ السلام نے نصاریٰ سے کہا: ''میں اپنے اور تمھارے باپ کے پاس جاتا ہوں۔''

اگرچہ بعض یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ بیٹے سے مراد پیارا اور محبوب ہے، مگر پھر بھی ان کا یہ فخر اور دوسروں پر برتری کا اظہار کہ ہم خاص حق کے مقرب اور اونچے طبقے کے لوگ ہیں، جیسے برہمن وغیرہ کہتے ہیں، بالکل غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی اور کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر اللہ تمھارے گناہوں کی وجہ سے تمھیں عذاب کیوں دے گا! کہیں کوئی محبّ اپنے حبیب کو عذاب دیتا ہے؟ حالانکہ تم خود اپنی زبان سے اعتراف کرتے ہو کہ ہمیں صرف گنتی کے دن آگ میں ڈالا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا یہ گمان، جس کے سہارے تم جی رہے ہو، سراسر باطل ہے۔ تم تو انسان ہو، اللہ کا تم سے تعلق بس وہی ہے جو خالق کا مخلوق سے اور مالک کا غلام سے ہوتا ہے، وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے۔ کوئی کتنا بھی مقرب ہو یا سید یا برہمن یا پیر و مرشد ہو، اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو نہ خود عذاب سے بچ سکتا ہے نہ کسی کو بچا سکتا ہے۔ یہ سب تو خود اس کے حضور پیش ہوں گے اور لرز رہے ہوں گے کہ ہمارا کیا فیصلہ ہوتا ہے، تم اپنی جھوٹی امیدوں سے کیوں اپنی بربادی کر رہے ہو۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ١ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ١ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۠ ۞ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا١ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۞

اے اہل کتاب! بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا، تو یقیناً تمھارے پاس ایک خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آ چکا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے (۱۹) اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تمھیں بادشاہ بنا دیا اور تمھیں وہ کچھ دیا جو جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا (۲۰)

آیت 19 (1) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا...... : یعنی ایک مدت سے رسولوں کی آمد کا یہ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں ابن مریم (علیہ السلام) کا تمام لوگوں سے زیادہ حق دار یا تمام لوگوں سے زیادہ قریب ہوں، انبیاء آپس میں علاتی بھائی ہیں، میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں۔'' [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿ واذکر فی الکتاب مریم ﴾ : ۳۴۴۲ ] بقول سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان کی بعثت پر بھی ۶۰۰ سال گزر چکے تھے۔ [ بخاری، مناقب الأنصار، باب إسلام سلمان الأنصاری : ۳۹۴۸ ] اور کوئی نبی نہیں آیا تھا، پھر آخری نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اس آیت پر شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی رسول نہیں آیا تھا، سو فرمایا کہ تم افسوس کرتے کہ ہم رسولوں کے وقت میں نہ ہوئے کہ تربیت ان کی پاتے، اب بعد مدت تم کو رسول کی صحبت میسر ہوئی، غنیمت جانو اور اللہ قادر ہے، اگر تم قبول نہ کرو گے تو اور خلق کھڑی کر دے گا تم سے بہتر، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم نے جہاد کرنا پسند نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو محروم کر دیا، اوروں کے ہاتھ سے ملک شام فتح کروا دیا۔ (موضح)

(2) فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ : اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد بیان فرمایا ہے، یعنی عرصہ دراز سے کسی اولو العزم پیغمبر کے نہ آنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام میں تغیر و تبدل اور تحریف ہو چکی تھی اور حق و باطل میں امتیاز نہ تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت ابراہیم کو تغیر و تبدل اور تحریف سے پاک کر کے لوگوں کو حق سے روشناس کرایا تاکہ ان پر حجت پوری ہو جائے اور عذر کی گنجائش نہ رہے۔ (قرطبی)

آیت 20 (1) وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ : اس آیت کا تعلق ﴿ وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [ المائدۃ :

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿٢٢﴾

اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پیٹھوں پر نہ پھر جاؤ، ورنہ خسارہ اٹھانے والے ہو کر لوٹو گے ﴿٢١﴾ انھوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک اس میں ایک بہت زبردست قوم ہے اور بے شک ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائیں، پس اگر وہ اس سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہونے والے ہیں ﴿٢٢﴾

۱۲ ] کے ساتھ ہے، یعنی ان سے عہد لیا اور موسیٰ علیہ السلام نے ان انعامات الٰہی کو یاد دلا کر ارض مقدس واپس لینے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ اس وقت وہاں عمالقہ (جبارین) کی حکومت تھی، لیکن بنی اسرائیل نے عہد شکنی کی اور عمالقہ کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ (کبیر)

② يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ...... : اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تین نعمتوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے، ایک یہ کہ ان میں جلیل القدر انبیاء مبعوث فرمائے، جیسے اسحاق، یعقوب، یوسف اور موسیٰ علیہم السلام۔ دوسری یہ کہ ان سب (بنی اسرائیل) کو بادشاہ بنا دیا، یعنی ان کو فرعون سے آزادی دی اور اپنی حکومت عطا فرمائی۔ معلوم ہوا کہ آزاد اور حاکم قوم کا ہر فرد ہی بادشاہ اور محکوم قوم کا ہر فرد غلام ہوتا ہے۔ تیسری یہ کہ انھیں توحید کا علم بردار بنایا، جبکہ دوسری تمام قومیں شرک میں مبتلا تھیں۔ اس تیسری نعمت میں وہ معجزات بھی شامل ہیں جو بنی اسرائیل کی مدد کے لیے وجود میں آئے، مثلاً سمندر کا پھٹنا، بادل کا سایہ، پتھر سے چشمے کا پھوٹنا، من و سلویٰ وغیرہ۔

**آیت 21** ① يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ ...... : مراد شام ہے، فلسطین (کنعان) اسی کے ایک علاقے کا نام ہے، کیونکہ یہیں سے بنی اسرائیل مصر گئے تھے اور یہی ان کی آبائی میراث تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دی تھی۔ تورات میں اس وعدے کی صراحتیں موجود ہیں: ''دیکھو میں نے اس ملک کو تمھارے سامنے کر دیا ہے، پس جاؤ اور اس ملک کو اپنے قبضہ میں کر لو جس کی بابت خداوند نے تمھارے باپ دادا ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ اسے ان کو اور ان کے بعد ان کی نسل کو دے گا۔'' (استثناء، باب: ۸)

② موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل سے یہ خطاب اس موقع پر ہے جب وہ مصر سے نکلنے کے بعد جزیرہ نمائے سینا میں خیمہ زن تھے اور ان پر من و سلویٰ اتر رہا تھا۔ (ابن کثیر)

**آیت 22** ① قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ...... : ایمان کمزور ہونے کی وجہ سے انھوں نے کہا کہ وہاں بڑے

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿٢٤﴾

دو آدمیوں نے کہا، جو ان لوگوں میں سے تھے جو ڈرتے تھے، ان دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، تم ان پر دروازے میں داخل ہو جاؤ، پھر جب تم اس میں داخل ہو گئے تو یقیناً تم غالب ہو اور اللہ ہی پر پس بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو ﴿٢٣﴾ انھوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک ہم ہرگز اس میں کبھی داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، سو تو اور تیرا رب جاؤ، پس دونوں لڑو، بے شک ہم یہیں بیٹھنے والے ہیں ﴿٢٤﴾

زبردست جنگ جو ( جبارین ) لوگ رہتے ہیں، جن کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں۔ جب تک وہ لوگ آپ کے معجزے کی بدولت وہاں سے نہ نکل جائیں، ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے، اگر وہ خود بخود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔
② "جَبَّارِيْنَ" سے بڑے ڈیل ڈول والے، بہت اسلحے والے جنگ جو مراد ہیں، مگر جس انداز سے بعض تفسیروں میں ان لوگوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ سب ایسی اسرائیلی روایات ہیں جنھیں ایک معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا، خصوصاً عوج بن عنق کا افسانہ جس کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ سب من گھڑت افسانے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ تھا، اس کے بعد سے برابر لوگ گھٹ رہے ہیں۔" [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم و ذريته : ٣٣٢٦۔ مسلم : ٢٨٤١ ] پھر عوج بن عنق کا قد تین ہزار تین سو تینتیس ( ٣٣٣٣ ) ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے!؟ (ابن کثیر )

آیت 23 قَالَ رَجُلٰنِ: اللہ تعالیٰ نے ان دو آدمیوں کا ذکر بطور نکرہ فرمایا ہے اور کسی حدیث میں بھی ان کے ناموں کی صراحت نہیں آئی۔

آیت 24 قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا...... : ان دو آدمیوں نے کہا تھا کہ تم لوگ ان پر حملے کے لیے بس دروازے میں داخل ہو جاؤ، یعنی اللہ کے وعدے اور بشارت کے مطابق تمھارے داخلے کی دیر ہے، دشمن بھاگ جائے گا، لیکن انھوں نے حد سے بڑھا ہوا گستاخانہ جملہ کہا: "جا تو اور تیرا رب لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔" اس کے برعکس بدر کے موقع پر جنگ کے اچانک سامنے آنے کے باوجود اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال عزم و ہمت اور شجاعت و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے بدر کے دن عرض کی: "اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" یہ سن کر ایسے محسوس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب پریشانی دور ہو گئی۔ [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ فاذهب أنت وربك فقاتلا...... ﴾ : ٤٦٠٩ ]

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میں اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں، سو تو ہمارے درمیان اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان علیحدگی کر دے ﴿۲۵﴾ فرمایا پھر بے شک وہ ان پر چالیس سال حرام کی ہوئی ہے، زمین میں سر مارتے پھریں گے، پس تو ان نافرمان لوگوں پر غم نہ کر ﴿۲۶﴾ اور ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر کی تلاوت حق کے ساتھ کر، جب ان دونوں نے کچھ قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہ کی گئی۔ اس نے کہا میں تجھے ضرور ہی قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا بے شک اللہ متقی لوگوں ہی سے قبول کرتا ہے ﴿۲۷﴾

**آیت 25** قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ...... : اس پر موسیٰ علیہ السلام ایسے بد دل ہوئے کہ انھوں نے دعا کی کہ پروردگارا! میرے اختیار میں میری جان اور اپنے بھائی کے سوا کچھ نہیں، تو ہمیں ان لوگوں سے علیحدہ کر دے، ایسا نہ ہو کہ تیرا عذاب آئے اور ان کے ساتھ ہم بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں۔ (کبیر، ابن کثیر) معلوم ہوا کہ جب کوئی قوم سرکشی اور نافرمانی پر تل جائے تو بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء اور مصلحین کی بھی وہاں کچھ پیش نہیں جاتی۔

**آیت 25** قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ...... : "يَتِيْهُوْنَ" "تَاهَ يَتِيْهُ تَيْهًا" بھٹکتے پھرنا۔ "اَرْضٌ تِيْهٌ" وہ زمین جس میں کوئی راستہ نہ ملے۔ (قاموس) اس کے بعد یہ لوگ چالیس سال تک بیابان میں بھٹکتے رہے اور اس کا نام "صحرائے تیہ" پڑ گیا۔ یہیں پہلے ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوا، پھر موسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا گئے۔ بعد میں کسی وقت بنی اسرائیل ارض مقدس میں داخل ہوئے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کو قصہ سنایا، اس پر اگر تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نہ کرو گے تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہوگی۔ آگے اس پر قصہ سنایا ہابیل قابیل کا کہ حسد مت کرو، حسد والا مردود ہے۔ (موضح)

**آیت 27** ① وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ: آدم علیہ السلام کے ان دو بیٹوں کا نام ہابیل اور قابیل مشہور ہے، اگرچہ قرآن یا حدیث میں یہ نام نہیں آئے۔

② اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ...... : یہ نذر یا قربانی کس لیے پیش کی گئی اس کے بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں، البتہ مشہور یہ ہے کہ ابتدا میں آدم اور حوا علیہما السلام کے ملاپ سے بیک وقت لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے تھے، دوسرے حمل سے پھر لڑکا لڑکی ہوتے، ایک حمل کے بہن بھائی کا نکاح دوسرے حمل کے بہن بھائی سے کر دیا جاتا۔ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بہن بدصورت تھی، جبکہ قابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بہن خوبصورت تھی، اس وقت کے اصول کے مطابق ہابیل کا نکاح قابیل کی بہن کے ساتھ اور

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

اگر تو نے اپنا ہاتھ میری طرف اس لیے بڑھایا کہ مجھے قتل کرے تو میں ہرگز اپنا ہاتھ تیری طرف اس لیے بڑھانے والا نہیں کہ تجھے قتل کروں، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، جو سارے جہانوں کا رب ہے ﴿۲۸﴾

قابیل کا ہابیل کی بہن کے ساتھ ہونا تھا، لیکن قابیل چاہتا تھا کہ وہ ہابیل کی بہن کے بجائے اپنی ہی بہن کے ساتھ، جو خوبصورت تھی، نکاح کرے۔ آدم علیہ السلام نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہ سمجھا۔ بالآخر آدم علیہ السلام نے دونوں کو بارگاہ الٰہی میں قربانیاں پیش کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جس کی قربانی قبول ہو جائے گی قابیل کی بہن کا نکاح اس سے کر دیا جائے گا۔ ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی، یعنی آسمان سے آگ آئی اور اسے کھا گئی جو اس کے قبول ہونے کی دلیل تھی، لیکن جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ بات ثابت نہیں ہے۔

③ اوپر کی آیات میں یہ بیان فرمایا تھا کہ مخالفین ہر طرح سے مسلمانوں پر مصائب و شدائد لانا چاہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ ﴾ [ المائدۃ : ۱۱ ] ”جب کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں۔“ مگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کی حفاظت فرما رہا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے کچھ واقعات بیان فرمائے، جن سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیاوی نعمتوں سے نوازا ہے، لوگ اس سے ہمیشہ حسد و بغض سے پیش آتے رہے ہیں، چنانچہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت بھی ان کی سرکشی اور بغض و حسد پر مبنی ہے، لہٰذا ان پر افسوس اور غم نہ کیجیے۔ اب یہاں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کیا، جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، کیونکہ ایک بھائی کا دوسرے کو قتل کرنا حسد کی بنا پر تھا۔ الغرض ان تمام واقعات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے اور ہو سکتا ہے کہ بتانا مقصود ہو کہ یہود اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کہتے ہیں: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ﴾ [ المائدۃ : ۱۸ ] اور انبیاء کی اولاد ہونے پر ان کو فخر ہے، مگر کفر اور حسد و عناد کے ساتھ یہ نسبی شرف ان کے لیے مفید نہیں ہو سکتا، آدم کے دو بیٹوں کا قصہ اس پر شاہد ہے۔ ( کبیر، قرطبی ) اس سے مقصد حسد سے بچنے کی تاکید ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دونوں آدمی بنی اسرائیل سے تھے۔ یہود کا حسد بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بطور مثال یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کی دلیل اس قصے کے آخر میں آنے والی آیت ہے: ﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ...... ﴾ [ المائدۃ : ۳۲ ] یعنی اس قصے ہی کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا...... ( کبیر، قرطبی )

مگر صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث کی وجہ سے یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص بھی ظلم سے قتل کیا جاتا ہے ( قاتل کے ساتھ ) اس کے خون ناحق کا بوجھ آدم ( علیہ السلام ) کے پہلے بیٹے پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے قتل کا کام شروع کیا۔“ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم و ذریته: ۳۳۳۵۔ مسلم: ۱۶۷۷ ]

④ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ: یعنی تم بھی اگر اللہ کی نافرمانی سے بچتے اور اللہ سے ڈرتے تو تمھاری قربانی بھی قبول ہو جاتی۔

28 لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ ......: یعنی میں تمھیں قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ تمھاری طرف نہیں بڑھاؤں گا،

اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتۡ لَہٗ نَفۡسُہٗ قَتۡلَ اَخِیۡہِ فَقَتَلَہٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَہٗ کَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَۃَ اَخِیۡہِ ؕ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِثۡلَ ہٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَۃَ اَخِیۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِیۡنَ ﴿ۚۛ۳۱﴾

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنا گناہ لے کر لوٹے، پھر تو آگ والوں میں سے ہو جائے اور یہی ظالموں کی جزا ہے ﴿۲۹﴾ تو اس کے لیے اس کے نفس نے اس کے بھائی کا قتل پسندیدہ بنا دیا، سو اس نے اسے قتل کر دیا، پھر خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا ﴿۳۰﴾ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا، جو زمین کریدتا تھا، تاکہ اسے دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے، کہنے لگا ہائے میری بربادی! کیا میں اس سے بھی رہ گیا کہ اس کوے جیسا ہو جاؤں تو اپنے بھائی کی لاش چھپا دوں۔ سو وہ پشیمان ہونے والوں میں سے ہو گیا ﴿۳۱﴾

اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ اٹھاؤں تو الگ بات ہے، کیونکہ اپنا دفاع تو ضروری ہے اور اس پر امت مسلمہ کا بھی اجماع ہے۔ (قرطبی) اگر مقتول بھی اپنے قاتل کو قتل کرنے کے پیچھے لگا ہوا ہو تو ایسی صورت میں دونوں جہنمی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔'' احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! یہ تو قاتل ہے، مقتول کا کیا قصور ہے؟'' فرمایا: ''اس لیے کہ وہ بھی اپنے قاتل کے قتل پر حریص تھا۔'' [ بخاری، الإیمان، باب : ﴿ و إن طائفتان من المؤمنین...... ﴾ : ۳۱ ]

**آیت 29** اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ...... : میرا گناہ، یعنی جو مجھے اس صورت میں ہوتا جب میں بھی تجھے قتل کرنے کے درپے ہوتا، جیسا کہ پیچھے حدیث میں گزرا ہے، یا یہ کہ میرے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ڈالا جائے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ''قیامت کے دن ظالم کو لایا جائے گا اور اس کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی، اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔'' [ بخاری، المظالم، باب من کانت له مظلمة عند الرجل...... : ۲٤٤۹ ]

**آیت 30** فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ : یعنی اس کی دنیا بھی برباد ہو گئی اور آخرت میں بھی سخت عذاب کا مستحق ٹھہرا، کیونکہ ہر بعد والے قتل کا گناہ اس کی گردن پر بھی ہو گا، جیسا کہ پیچھے حدیث میں گزرا ہے۔

**آیت 31** ① فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ : او رنقل میں یوں آیا ہے کہ ایک کوے نے زمین کھود کر دوسرے کوے کو دفن کیا، اس نے کوے کی خیر خواہی دوسرے کوے کے لیے دیکھی تو اپنے فعل پر پشیمان ہوا۔ (موضح) مگر یہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے، قرآن کے ظاہر الفاظ سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اسے زمین کریدتے دیکھا تو اس نے سمجھ لیا کہ اسے دفن کر دینا چاہیے۔ (قرطبی)

مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ فِى الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَسۡعَوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ يُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ يُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡىٌ فِى الدُّنۡيَا وَلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۳۳﴾

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جس نے ایک جان کو کسی جان کے (بدلے کے) بغیر، یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے اسے زندگی بخشی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی اور بلاشبہ ان کے پاس ہمارے رسول واضح دلائل لے کر آئے، پھر بے شک ان میں سے بہت سے لوگ اس کے بعد بھی زمین میں یقیناً حد سے بڑھنے والے ہیں ﴿۳۲﴾ ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے کہ انھیں بری طرح قتل کیا جائے، یا انھیں بری طرح سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے بری طرح کاٹے جائیں، یا انھیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے ﴿۳۳﴾

② فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِيۡنَ: یعنی بھائی کے مرنے پر، پھر اسے ٹھکانے لگانے کی بات جلد سمجھ میں نہ آنے پر پشیمان ہوا، کیونکہ اگر وہ اپنے فعل پر پشیمان ہوتا اور توبہ کرتا تو گناہ معاف ہو جاتا اور دنیا میں جو قتل ہوتے ہیں ان کا گناہ اس پر نہ ہوتا۔ (قرطبی)

آیت 32 ① مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ: دیکھیے اس سے پہلے آیت (۲۷) کا حاشیہ (۳) حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حکم صرف بنی اسرائیل کے لیے نہیں ہے بلکہ سب لوگوں کے لیے ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کے خون دوسرے مسلمانوں کے خون سے زیادہ قیمتی نہ تھے۔ (ابن کثیر)

② وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ ...... :یعنی اگر ایک شخص کو مرنے سے بچالے گا تو اس کا ثواب اتنا ہے گویا سب کو بچا لیا۔

آیت 33 ① اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ ...... : یہ آیت محاربہ کہلاتی ہے، مراد وہ لوگ ہیں جو اس حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام نافذ کرنے والی ہے اور اسلام کی سرزمین میں ڈاکا ڈالتے، لوٹ مار کرتے، فساد پھیلانے کی کوشش کرتے اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہیں۔ حاکم وقت ان چار سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا انھیں دے سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ صرف اسی کو قتل کیا جائے گا جس نے قتل کیا ہو اور اتنی ہی سزا دی جائے گی جتنا اس کا جرم ہوگا، مگر آیت کے صریح الفاظ اس کی موافقت نہیں کرتے، بلکہ ان لوگوں کا حکم حربیوں (جنگ کرنے والوں) کا ہے،

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

مگر جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پاؤ تو جان لو کہ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف قرب تلاش کرو اور اس کے راستے میں جہاد کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۳۵﴾

---

وقت ان سزاؤں میں سے جو چاہے سزا دے سکتا ہے، عام اس سے کہ مشرک ہوں یا یہودی یا باغی مسلمان ہوں۔

② اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا: باب تفعیل کی وجہ سے معنی میں زیادتی کے اظہار کے لیے ترجمہ میں ''بری طرح'' کا اضافہ کیا گیا ہے، اسی طرح ''اَوْ يُصَلَّبُوْٓا'' اور '' اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ'' میں بھی باب کا خیال رکھا گیا ہے۔

③ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیت عکل اور عرینہ کے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کا قصہ انس رضی اللہ عنہ نے یوں بیان کیا ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آئے، لیکن وہاں کی آب و ہوا انھیں موافق نہ آئی اور وہ بیمار ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مدینہ سے باہر صدقہ کے اونٹوں میں رہنے کا حکم دیا کہ ان کا دودھ اور پیشاب (ملا کر) پییں۔ یہ لوگ وہاں چلے گئے، تندرست ہونے کے بعد وہ اسلام سے پھر گئے اور چرواہے (یسار نُوبی) کو قتل کر کے اونٹ ہانک کر لے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تعاقب میں سوار بھیجے جو انھیں پکڑ کر مدینہ منورہ لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جائیں اور ان کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیری جائیں، پھر انھیں دھوپ میں پھینک دیا گیا، یہاں تک کہ سب مر گئے۔ [ بخاری، الجهاد والسير، باب إذا حرق المشرك المسلم هل يحرق: ٣٠١٨۔ مسلم: ١٦٧١ ] مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے گرم سلائیاں پھیرنے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ انھوں نے چرواہے کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ [ مسلم، القسامة والمحاربين، باب حكم المحاربين و المرتدين: ١٦٧١/١٤ ]

**آیت 34** اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا......: یعنی ایسے لوگوں کا قصور معاف کر دیا جائے گا اور انھیں مذکورہ سزائیں نہیں دی جائیں گی، کیونکہ ان کا گرفتار ہونے سے پہلے از خود اپنے آپ کو حوالے کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے جرائم سے توبہ کر لی ہے، لیکن پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ سزاؤں کی معافی کے ساتھ انھوں نے قتل کر کے یا مال لوٹ کر یا آبروریزی کر کے بندوں پر جو دست درازی کی ہے یہ جرائم بھی معاف ہو جائیں گے یا ان کا بدلہ لیا جائے گا؟ بعض علماء کے نزدیک یہ معاف نہیں ہوں گے، ان کا قصاص لیا جائے گا۔ ابن کثیر اور شوکانی رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ مطلقاً انھیں معاف کر دیا جائے گا، انھوں نے آیت کے ظاہر الفاظ کا تقاضا یہی بتایا ہے، البتہ گرفتاری کے بعد توبہ سے جرائم معاف نہیں ہوں گے، وہ مستحق سزا ہوں گے۔ (فتح القدیر، ابن کثیر)

**آیت 35** ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ......: یعنی رسول کی اطاعت میں جو نیکی کرو وہ قبول ہے ( کیونکہ اللہ کے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر واقعی ان کے پاس زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہو، تاکہ وہ اس کے ساتھ قیامت کے دن کے عذاب سے فدیہ دے دیں تو ان سے قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۳۶﴾

قرب کے حصول کے لیے اب رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے سوا کوئی وسیلہ نہیں ) اور بغیر اس کے عقل سے کرو سو ( وہ ) قبول نہیں۔ (موضح ) لفظ "الْوَسِيْلَةَ" یہ " تَوَسَّلْتُ اِلَيْهِ " سے " فَعِيْلَةٌ " کے وزن پر ہے۔ اس کی جمع "وَسَائِلُ" آتی ہے، اس کا لفظی معنی قرب ہے، مراد ہر وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔ اس آیت میں اللہ کے تقوے کا اور اس کا قرب حاصل کرنے کا حکم دینے کے بعد جہاد کا حکم دیا، معلوم ہوا کہ اللہ کا تقویٰ اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ اس کی راہ میں جہاد ( سرتوڑ کوشش خصوصاً قتال ) ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی زندہ شخص سے دعا کروانا بھی جائز ہے، مگر کسی زندہ یا مردہ کا نام لے کر کہنا کہ یا اللہ! فلاں کے وسیلے یا طفیل ہماری دعا قبول فرما، نہ قرآن سے ثابت ہے نہ صحیح حدیث سے، ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا واسطہ دے کر یا اپنا کوئی خالص عمل پیش کر کے دعا کر سکتا ہے، یہ قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ وسیلہ ایک مقام کا نام بھی ہے، اس میں بھی قرب کا معنی ہی ملحوظ ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ''جب تم مؤذن کو سنو تو اسی طرح کہو جس طرح وہ کہتا ہے، پھر مجھ پر درود بھیجو، جس نے مجھ پر ایک بار درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس بار رحمت نازل فرمائے گا، پھر میرے لیے وسیلے کی دعا کرو، وسیلہ جنت کا وہ مقام ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک ہی کو نصیب ہوگا اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہوں گا، لہٰذا جس نے میرے لیے وسیلے کی دعا کی تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔'' [ مسلم، الصلاۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن...... : ٣٨٤ ] اللہ کا قرب (وسیلہ ) اتنی بڑی نعمت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے جتنا قریب ہے اس سے مزید قرب کی دعا اور کوشش کرتا ہے۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۵۷)۔

﴿٢﴾ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ : یہود کو اپنے نسب پر فخر تھا اور وہ اسی خوش فہمی میں ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے رہتے تھے اور اپنے آپ کو اللہ کا محبوب سمجھتے تھے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ اب اس آیت میں مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ تم اگرچہ بہتر امت ہو اور تمھارا نبی بھی سب سے افضل ہے، مگر تمھیں چاہیے کہ نیک اعمال کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو، تاکہ آخرت میں فلاح حاصل کر سکو، یعنی یہود کی طرح بدعمل نہ بنو۔ ( کبیر )

آیت 36 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ...... : سورۂ آل عمران کی آیت (۹۱) اس کی ہم معنی ہے، انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص سے کہے گا جسے آگ والوں میں سے سب سے ہلکا

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں، حالانکہ وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے ۝ اور جو چوری کرنے والا اور جو چوری کرنے والی ہے سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، اس کی جزا کے لیے جو ان دونوں نے کمایا، اللہ کی طرف سے عبرت کے لیے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۝

عذاب ہوگا: ''اگر زمین میں جو بھی چیز ہے تمھاری ہو تو کیا تم اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ دے دو گے؟'' وہ کہے گا: ''ہاں!'' تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں نے تم سے اس سے کہیں زیادہ آسان چیز کا مطالبہ کیا تھا جب تو آدم کی پشت میں تھا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنانا، مگر تو میرے ساتھ شریک بنائے بغیر مانا ہی نہیں۔'' [ بخاری، الرقاق، باب صفة الجنة والنار : ٦٥٥٧ ]

آیت 37 يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا: یہ آیت کفار کے بارے میں ہے، جیسا کہ اوپر کی آیت میں ان کا صاف ذکر کیا گیا ہے، رہے گناہ گار مسلمان تو صحیح احادیث میں ہے کہ انھیں گناہوں کی سزا بھگت لینے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ سورۂ حج کی آیت (۲۲) اس کی ہم معنی ہے۔

آیت 38 ❶ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ...... : اوپر کی آیت میں محاربین (جو لوٹ مار کرتے اور فساد پھیلاتے ہیں) کی سزا بیان ہوئی تھی، اب اس آیت میں چوری کی حد (قانونی سزا) بیان فرمائی کہ مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ حدیث میں اس کی تفصیل ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر دینار کے ایک چوتھائی یا زیادہ میں۔'' [ مسلم، الحدود، باب حد السرقة و نصابها : ١٦٨٤/٢ ]

❷ چور کو حاکم کے پاس لے جانے سے پہلے معاف کیا جا سکتا ہے، بعد میں نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور کو لایا گیا جس نے ایک چادر چرائی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ چادر کے مالک صفوان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میرا ارادہ یہ نہیں تھا (کہ اس کا ہاتھ کٹوا دوں) میری چادر اس پر صدقہ ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اسے میرے پاس لانے سے پہلے کیوں (یہ صدقہ) نہ کیا؟'' [ ابن ماجه، الحدود، باب من سرق من الحرز : ٢٥٩٥، قال الألبانی صحيح ] بعض لوگوں نے چوری کی حد باطل کرنے کے لیے بہت سے حیلے ایجاد کیے ہیں، ان میں سے دو حیلے ایسے ہیں جن کی موجودگی میں کسی چور کا ہاتھ کاٹا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک یہ کہ عدالت میں جانے کے بعد مال مسروقہ کا مالک چور کو چرائی ہوئی چیز ہبہ کر دے، یا اس کے ہاتھ بیچ دے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، حالانکہ یہ صحیح حدیث کے صریح خلاف ہے۔ دوسرا یہ کہ چور پر شہادتوں کے ساتھ چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو چور دعویٰ کر دے کہ مال مسروقہ میرا مال ہے، تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، خواہ وہ اپنی ملکیت کی کوئی دلیل پیش نہ کرے۔ یہ حیلہ لکھنے والے نے اس پر لکھا ہے کہ مخالف کی طرف سے اس پر اعتراض ہوتا

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

پھر جو اپنے ظلم کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کرے تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۹﴾ کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، عذاب دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۴۰﴾

ہے کہ اس طرح تو کوئی چور بھی جھوٹا دعویٰ کرنے سے عاجز نہیں، ہر چور ہی مالک ہونے کا دعویٰ کر دے گا اور چوری کی حد سرے سے ختم ہو جائے گی۔ اس کا جواب اس نے یہ دیا ہے کہ یہ بات صرف علماء کو معلوم ہے، چوروں کو معلوم نہیں، اس لیے حد ختم ہونے کی کوئی فکر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حیلوں کی وجہ سے بھی مسلم حکومتوں میں حدود اللہ ختم ہوئیں جس کے نتیجے میں ظلم و ستم حد سے بڑھے، پھر اغیار مسلمانوں پر مسلط ہو گئے، اس کا علاج دوبارہ حدود اللہ کا صحیح نفاذ ہے۔

③ جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ: یہ اس کے گناہ کی سزا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت بھی کہ وہ تمام عمر لوگوں کے لیے چوری سے رکنے کا باعث اور یاد دہانی بنا رہے گا کہ چور کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے۔ اگر اسے قتل بھی کر دیا جاتا تو یہ عبرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

**آیت 39** فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ ...... : یہاں ظلم سے مراد چوری ہے، یعنی جس نے چوری کے بعد توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لی اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف فرما دے گا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ توبہ کر لینے سے چوری کی حد اس سے ساقط ہو جائے گی۔ نبی ﷺ نے ایک چور کے متعلق فرمایا: ''اسے لے جاؤ، اس کا ہاتھ کاٹ دو، پھر اسے داغ دو، پھر میرے پاس لاؤ۔'' الغرض! اس کا ہاتھ کاٹا گیا، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا، آپ نے اس سے فرمایا: ''اللہ سے توبہ کرو۔'' اس نے کہا: ''میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تیری توبہ قبول کرے۔'' [مستدرك حاکم: ٣٨١/٤، ح: ٨١٥٠ و صححه و قال صاحب نيل الأوطار سنده صحيح ] یہ تو بالکل صحیح ہے کہ حدود صرف گناہ سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ اس گناہ کا کفارہ بھی ہیں، ان سے وہ گناہ معاف ہو جاتا ہے مگر ساتھ توبہ بھی ضروری ہے، تاکہ آئندہ وہ یہ حرکت نہ کرے۔ ہاں کوئی شخص چوری کرے اور اس کا کسی کو پتا نہ چلے، یا چوری کے مال کا مالک اسے عدالت میں نہ لے جائے تو اس کے لیے توبہ و استغفار ہی کافی ہے۔

**آیت 40** اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... : یہ اس لیے فرمایا کہ کوئی تعجب نہ کرے کہ چور کو تھوڑی خطا پر بڑی سزا فرمائی۔ (موضح) اس آیت کا خطاب تو رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن مراد تمام لوگ ہیں، یا ہر شخص سے خطاب

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

اے رسول! تجھے وہ لوگ غمگین نہ کریں جو کفر میں دوڑ کر جاتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے مونہوں سے کہا ہم ایمان لائے، حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے اور ان لوگوں میں سے جو یہودی بنے۔ بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، بہت سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کے لیے جو تیرے پاس نہیں آئے، وہ کلام کو اس کی جگہوں کے بعد پھیر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر تمھیں یہ دیا جائے تو لے لو اور اگر تمھیں یہ نہ دیا جائے تو بچ جاؤ۔ اور وہ شخص کہ اللہ اسے فتنے میں ڈالنے کا ارادہ کرلے اس کے لیے تو اللہ سے ہرگز کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے ﴿۴۱﴾

ہے۔ (فتح البیان) یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں سے کسی کو رعایت نہیں مل سکتی، جو بھی جرم کرے گا اسے سزا ملے گی، اس معاملے میں کسی بڑے مرتبے والے کو چھوٹے پر فوقیت نہیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ جس جرم پر جو سزا چاہے مقرر فرما دے، اسے مخلوق پر کل اختیار ہے۔ (قرطبی) ایک ملحد شاعر ابو العلاء معری نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر اعتراض کیا کہ دیکھیے ایک ہاتھ جس کی دیت پچاس اونٹ تھی، وہ چوتھائی دینار کی حقیر مالیت پر کاٹ دیا گیا، یہ عجیب تناقض ہے، پھر قرآن پر اعتراض کی وجہ سے گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگ گیا۔ چنانچہ بہت سے علماء نے اس کا جواب لکھا، قاضی عبد الوہاب نے کہا: "لَمَّا كَانَتْ اَمِيْنَةً كَانَتْ ثَمِيْنَةً فَلَمَّا خَانَتْ هَانَتْ" ''جب تک ہاتھ امین تھا قیمتی تھا جب خیانت کی تو بے قدر ہو گیا۔'' (ابن کثیر) سزاؤں کا ایک مقصد گناہوں سے روکنا بھی ہے، ہاتھ کاٹنے سے روکنے کے لیے ہاتھ کی دیت زیادہ رکھنا ضروری تھا، تاکہ لوگ کسی کا ہاتھ کاٹنے سے بچیں اور چوری سے روکنے کے لیے ہاتھ کاٹنے کا نصاب کم مقرر کرنا ضروری تھا، تاکہ لوگ چوری سے بچیں۔

آیت 41 ① يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ...... : رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے تو صرف مشرکین سے واسطہ تھا، مدینہ میں آئے تو منافقین اور یہود کی سازشیں بھی ساتھ مل گئیں، اس پر تسلی دینے کے لیے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں جو کفر میں دوڑ کر جاتے ہیں، یعنی جب بھی انھیں کوئی موقع ہاتھ آتا ہے فوراً کفر کی طرف پلٹ جاتے ہیں، کافروں سے مل جاتے ہیں۔ اس کا تعلق منافقین سے ہے۔ (رازی)

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، بہت کھانے والے ہیں حرام کو، پھر اگر وہ تیرے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کر یا ان سے منہ پھیر لے اور اگر تو ان سے منہ پھیر لے تو ہرگز تجھے کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۴۲﴾

② وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ......: یعنی کفر میں دوڑ کر جانے والے یہودی بھی آپ کو غمگین نہ کریں۔ "سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ" جو جھوٹی باتیں بہت سنتے ہیں، یعنی جو کچھ ان کو ان کے مذہبی پیشوا تورات میں تحریف کر کے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر طعن کے طور پر کہتے ہیں اسے خوب سنتے اور قبول کرتے ہیں۔ "سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ" یعنی پھر یہ ان لوگوں کے جاسوس بن کر مسلمانوں اور نبی کریم ﷺ کی مجالس میں جا کر خوب سنتے ہیں، جو تکبر کی وجہ سے ان مجلسوں میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے۔ (کبیر)

③ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ: کتب تفاسیر و احادیث میں لکھا ہے کہ یہود میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کا ارتکاب کیا، ان کے علماء نے باہم مشورہ کر کے طے کیا کہ اس مقدمے کا فیصلہ محمد (ﷺ) سے کروا لیتے ہیں، کیونکہ وہ نرم شریعت لے کر آئے ہیں، اگر انھوں نے کوڑے مارنے کا حکم دیا تو ہماری مراد بر آئے گی اور اگر انھوں نے سنگ سار کرنے کا حکم دیا تو ہم ان کا فیصلہ ٹھکرا دیں گے۔ چنانچہ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ [ مسلم، الحدود، باب رجم الیھود أھل الذمة فی الزنی: ۱٦۹۹ ] مفصل واقعہ کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۵) کا حاشیہ (۱)۔

آیت 42 ① سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، جاسوسی کرنے کے لیے زیادہ باتیں سننا یا دوسروں کی باتیں ماننے اور قبول کرنے کے لیے سننا۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، جیسا کہ آیت (۴۱) کے حاشیہ (۲) میں دونوں قسم کے گروہوں کا بیان ہوا ہے۔

② لِلسُّحْتِ: اس کے لفظی معنی مٹانے اور ہلاک کرنے کے ہیں، گویا حرام مال وہ چیز ہے جو انسان کی نیکیوں کو اکارت کر دیتا ہے اور ہر اس خسیس مال پر " سُحْتٌ " کا لفظ بولا جاتا ہے جس کے لینے میں عار ہو اور خفیہ طور پر لیا جائے، اس میں رشوت بھی شامل ہے اور احادیث میں زانیہ کی اجرت، کتے، شراب اور مردار کی قیمت کو " سُحْتٌ " کہا گیا ہے۔ سود، چوری کا مال اور جوئے سے کمایا ہوا مال بھی " سُحْتٌ " میں داخل ہے۔ (کبیر، قرطبی)

③ جس زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی یہودیوں کی حیثیت محض ایک معاہد قوم کی تھی جس کے ساتھ صلح سے رہنے کا معاہدہ تھا

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ؑ﴿۴۳﴾

اور وہ تجھے کیسے منصف بنائیں گے، جبکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے، پھر وہ اس کے بعد پھر جاتے ہیں اور یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ﴿۴۳﴾

اور وہ ذمی، یعنی اسلامی حکومت کی رعایا نہ تھے، اس لیے نبی ﷺ کی عدالت کو اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو انکار کر دیں اور یہی اختیار اسلامی حکومت کو کسی غیر مسلم معاہد قوم کے افراد کے درمیان فیصلہ کرنے کا ہے۔ رہے ذمی لوگ سو اگر وہ اپنے مقدمات اسلامی عدالت میں لائیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنا ضروری ہوگا۔ (المنار) یہی تفصیل امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے، پس اس اختیار کا تعلق معاہد قوم سے ہے۔ (کبیر) مگر دوسرے علماء کا خیال ہے کہ یہ اختیار منسوخ ہے، اب اگر وہ فیصلہ لائیں تو فیصلہ کرنا ہوگا۔ ان علماء میں عمر بن عبد العزیز اور امام نخعی رحمہما اللہ شامل ہیں۔ نحاس نے بھی ناسخ و منسوخ میں یہی لکھا ہے کہ آیت: ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ [ المائدۃ : ٤٨ ] سے یہ آیت منسوخ ہے، جس کے معنی ہیں کہ آپ اللہ کے نازل کردہ کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کریں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا زیادہ صحیح قول بھی یہی ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”شروع سے یہ طریقہ چلا آیا ہے کہ باہمی حقوق اور وراثت میں اہل کتاب کا فیصلہ ان کے دین کے مطابق کیا جائے، ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کے خواہش مند ہوں تو پھر اسی کے مطابق کر دیا جائے۔“ اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ گو بعض جزئیات میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم ان کی اکثریت نسخ ہی کی قائل ہے۔ (قرطبی)

**آیت 43** ① وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ: یہاں ان کی جہالت و عناد کا بیان ہے، یعنی وہ جانتے ہیں کہ جو مقدمہ وہ آپ کے پاس لا رہے ہیں، اس کا فیصلہ تورات میں موجود ہے، تاہم آپ کے پاس اس لیے مقدمہ لاتے ہیں کہ شاید آپ کا فیصلہ تورات کی بہ نسبت کچھ ہلکا ہو، لیکن جب آپ کا فیصلہ بھی وہی ہوتا ہے جو تورات کا ہوتا ہے تو وہ اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو وہ تورات پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آپ پر۔ اصل میں یہ اپنی اغراض کے بندے ہیں اور ان کا مقصدِ حیات ہی دنیوی مصالح کا حاصل کرنا ہے۔ (کبیر)

② وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تورات میں موجود رجم کے فیصلے کو اللہ کا فیصلہ قرار دیا ہے، جو لوگ رجم کے منکر ہیں اگرچہ بہت سی صحیح احادیث بھی ان کا رد کرتی ہیں، مگر یہ آیت پختہ ترین مضبوط دلیل ہے کہ قرآن نے تورات میں موجود رجم کے حکم کو اللہ کا حکم قرار دیا ہے، پھر نہ اس کی تردید کی ہے نہ منسوخ کہا ہے، بلکہ اللہ کے اس حکم کو یہود اور مسلمان دونوں پر نافذ فرمایا۔ معلوم ہوا قرآن میں بھی رجم کا ذکر موجود ہے۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

بے شک ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے انبیاء جو فرماں بردار تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی بنے اور رب والے اور علماء، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے۔ تو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں ۝

آیت 44 ① اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ...... : اس میں یہود کو تنبیہ ہے جو حد رجم (سنگ ساری) کا انکار کرتے تھے اور ان کے لیے ترغیب ہے کہ وہ اپنے اسلاف، انبیاء، احبار اور علمائے ربانیین کا مسلک اختیار کریں۔ (کبیر) بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تک بہت سے پیغمبر ایسے گزرے ہیں جن پر کوئی نئی کتاب نازل نہیں کی گئی اور وہ اپنے زمانے میں لوگوں کو تورات ہی پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے اور ان کے درمیان اسی کے احکام کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ خود عیسیٰ علیہ السلام کو کوئی نئی شریعت نہیں دی گئی، بلکہ ان کی بعثت کا مقصد تورات ہی کی شریعت کو زندہ کرنا تھا۔ "اَلَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا" یہ صفت مدح ہے اور ان انبیاء کے فرماں بردار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین ابراہیم کے تابع تھے، یا اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے۔ (قرطبی، کبیر)

② بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ: "بِمَا" کی باء کا تعلق "الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ" سے ہے، مطلب یہ ہے کہ جس زمانے میں کوئی نبی نہیں ہوتا تھا تو یہ درویش اور تعلیم یافتہ لوگ یہودیوں کے مابین تورات کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے، کیونکہ انبیاء نے انھی کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات کا محافظ مقرر کیا تھا اور "شُهَدَآءَ" کے معنی یہ ہیں کہ وہ تورات کے اللہ کی طرف سے ہونے پر گواہ تھے۔ بعض علماء نے "بِمَا اسْتُحْفِظُوْا" کی "باء" کا تعلق "يَحْكُمُ" سے بیان کیا ہے کہ اللہ کی کتاب کی جو امانت ان کے سپرد کی گئی تھی وہ اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ (قرطبی، کبیر)

③ تورات کی حفاظت کے ذمے دار اور اس کے محافظ تو علماء اور رب والے لوگ بنائے گئے تھے مگر قرآن مجید اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا، فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [ الحجر : ۹ ] "بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔" اگرچہ قرآن کی حفاظت کا کام بھی اللہ تعالیٰ نے علماء اور ربانیین ہی سے لیا، مگر اس کا ذمہ خود اٹھانے کی وجہ سے تورات اور قرآن کے محفوظ

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ

اور ہم نے اس میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان

رہنے میں جو فرق ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

④ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ: یعنی تم بھی اپنے انبیاء اور بزرگوں کے نقش قدم پر چلو اور تورات میں کوئی تحریف نہ کرو، نہ اسے چھپا کر نہ غلط مسئلہ بتا کر دنیا کا فائدہ اٹھاؤ، کیونکہ دنیا جتنی بھی ہو قلیل ہے اور حق بات کہنے میں اور محمد ﷺ کے جو حالات اس میں مذکور ہیں ان کے بیان کرنے میں لوگوں کی پروا مت کرو، نہ ان سے ڈرو، بلکہ صرف میرے انتقام اور عذاب کا ڈر اپنے دلوں میں رکھو۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حکام پر اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں لازم کی ہیں: ① خواہش کی پیروی نہ کریں: ﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [ صٓ : ٢٦ ] اور فرمایا: ﴿ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا ﴾ [المائدۃ: ٤٤ ] ② صحیح فیصلہ کرنے میں لوگوں سے نہ ڈریں: ﴿ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ ﴾ [ المائدۃ : ٤٤ ] ③ اور رشوت لے کر غلط فیصلہ نہ کریں: ﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [ المائدۃ : ٤٤ ] [ بخاری، الأحکام، باب متی یستوجب الرجل القضاء، قبل ح : ٧١٦٣ ] یہ تینوں باتیں اس آیت میں مذکور ہیں۔

⑤ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: یہ خطاب یہود سے ہے، یعنی جب وہ جان بوجھ کر تورات کے فیصلے کو چھپاتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ باوجود زبانی دعویٰ کرنے کے یہ کافر ہیں۔ مسلم حاکم پر کفر کا فتویٰ اسی وقت لگا سکتے ہیں جب وہ قرآن و حدیث کا انکار کر کے ان کے خلاف فیصلہ صادر کرے، ایسے شخص کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

**آیت 45** ① وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ: اس آیت میں بھی یہود کو ڈانٹ ہے، یعنی انھوں نے جس طرح رجم (سنگ ساری) کے حکم کو تبدیل کر دیا تھا اسی طرح ان پر نفوس (جانوں) اور جروح (زخموں) میں برابری رکھی گئی تھی، جو اب بھی تورات کی کتاب خروج، باب (۲۱) فقرہ (۲۳۔۲۵) میں موجود ہے، مگر انھوں نے اس کو تبدیل کر کے معطل کر ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہودی قبائل میں سے بنونضیر طاقتور اور بنو قریظہ کمزور تھے، اس لیے یہودی بنونضیر کا قصاص تو بنو قریظہ سے لے لیتے لیکن بنو قریظہ کا قصاص بنونضیر سے نہیں لیتے تھے، بلکہ ان کے مقتول کی دیت ادا کر دیتے۔ (ابن جریر) ''ھدایۃ المستنیر'' کے مصنف نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس آیت میں مذکور مسائل کے حجت ہونے پر اجماع ہے، پس عورت کے بدلے قاتل مرد ہی قتل کیا جائے گا، خواہ چھوٹے قبیلے کا ہو یا بڑے کا، قصاص میں سب برابر ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ )) ''مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔'' [ أبو داوٗد، الجھاد، باب فی السریۃ ترد علی أھل العسکر : ٢٧٥١۔ أحمد : ١/ ١٢٣، ح : ٩٩٥۔ نسائی : ٢٧٥٠، ابن ماجہ : ٢٦٨٣، وقال الألبانی حسن صحیح ] بعض لوگوں نے اس آیت (جان کے بدلے جان) سے نکالا ہے کہ کافر کے بدلے مسلمان کو قتل کیا جائے گا، مگر صحیح بخاری

بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا

کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں میں برابر بدلہ ہے، پھر جو اس (قصاص) کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ ظالم ہیں ﴿۴۵﴾ اور ہم نے ان کے پیچھے ان کے قدموں کے نشانوں پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا، جو اس سے پہلے تورات کی تصدیق کرنے

(۶۹۱۵) میں رسول اللہ ﷺ کا یہ صریح فرمان موجود ہے: «وَ اَنْ لَا يُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ» ”کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر مومن کا کفو (برابر) نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے ان بعض لوگوں کے خلاف امت کا اجماع نقل فرمایا ہے جو کافر کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کے قائل ہیں۔ (ابن کثیر)

② اس وقت مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے قرآن و سنت کے صریح خلاف ایسے احکام ایجاد کر لیے جن کی موجودگی میں قصاص تقریباً ناممکن ہے۔ انھوں نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ تیز دھار آلے کے ساتھ قتل کرے یا آگ سے جلائے تو قصاص ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ خواہ جان بوجھ کر قتل کے ارادے سے بھاری سے بھاری پتھر مار مار کر قتل کر دے تو قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت ہوگی، حالانکہ یہ بات قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی کا سر پتھروں سے اسی طرح کچلا تھا جس طرح اس نے ایک بچی کا سر کچلا تھا۔ [ بخاری، الدیات، باب سؤال القاتل حتی یقر…… : ۶۸۷۶ ] لہٰذا قرآن و حدیث کے مطابق قتل کے ارادے سے اگر جان بوجھ کر قتل کرنا ثابت ہو جائے تو پھر قصاص ہے، خواہ کسی طرح بھی قتل کرے۔ مگر ان بعض لوگوں نے کہا کہ اگر کوئی کسی کو ڈبو کر مار دے، یا بھوکا رکھ کر مار دے، یا برف کے بلاک میں رکھ کر مار دے، غرض بہت سی صورتیں بیان کر کے کہتے ہیں کہ ان میں قصاص نہیں، کیونکہ آلہ تیز دھار نہیں۔ ظاہر ہے جن عدالتوں میں ان لوگوں کا حکم چلتا ہو، وہاں قصاص کا نشانہ صرف وہی لوگ بنتے ہوں گے جو ان حیلوں کو نہیں جانتے ہوں گے، پھر جب قانون ہی میں انصاف نہ رہے تو کوئی قوم اللہ کی نصرت کے وعدے کی حق دار کیسے رہ سکتی ہے؟

③ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ: عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کے جسم پر کوئی زخم لگایا جائے، پھر وہ اسے معاف کر دے تو جتنا اس نے معاف کیا اللہ تعالیٰ اتنا ہی اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا۔“ [ أحمد : ۵/۳۱۶، ح : ۲۲۷۶۷۔ السنن الکبریٰ للنسائی، التفسیر : ۱۱۱۴۶ ]

④ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ……: یعنی اگر قرآن و حدیث کا انکار تو نہیں کرتا مگر اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو یہ ظالم ہے۔

آیت 46 وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ …… : عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت یا نیا دین لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ وہ خود بھی اسی شریعت پر چلتے تھے اور انجیل بھی اسی شریعت پر چلنے کا حکم دیتی تھی۔ انجیل میں ہے: ”یہ نہ سمجھو کہ میں

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۚ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ

والا تھا اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے تورات تھی اور متقی لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ﴿٤٦﴾ اور لازم ہے کہ انجیل والے اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ نافرمان ہیں ﴿٤٧﴾ اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ بھیجی، اس حال میں کہ اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو کتابوں میں سے اس سے پہلے ہے اور اس پر محافظ ہے۔ پس ان کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کر جو اللہ نے نازل کیا

---

تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں، کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔'' (انجیل متی: ۵: ۱۷، ۱۸) تورات، انجیل اور پھر قرآن کریم کے متعلق ''هُدًى وَّنُوْرٌ'' کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، ان نازل شدہ کتابوں کا ہدایت ہونا تو اس اعتبار سے ہے کہ یہ دنیا اور آخرت کے حقائق کے بیان پر مشتمل ہیں اور نور (روشنی) اس لحاظ سے کہ انسان کے لیے عملی زندگی میں رہنمائی کا کام دیتی ہیں۔ (کبیر)

**آیت 47** وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ...... : اہل انجیل کا اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے، فیصلہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر لازم ہے کہ انجیل میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو پیش گوئیاں اور دلائل اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں وہ ان کو چھپانے یا ان کی غلط تاویلیں کرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ انجیل کے حکم کے مطابق مسلمان ہو جائیں اور قرآن وسنت کے مطابق فیصلہ کریں اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہ نافرمان ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب میں اترا ہوا اللہ کا حکم نہیں مانا۔

**آیت 48** ❶ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ...... : اوپر کی آیات میں تورات اور انجیل کے اوصاف بیان کیے اور اہل کتاب کو ان پر عامل نہ ہونے کی وجہ سے کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا۔ اب اس آیت میں قرآن کی توصیف بیان کی ہے اور آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ قرآن کے مطابق فیصلے کرو۔ ''مُهَيْمِنًا'' کے معنی محافظ، نگہبان اور شاہد کے آتے ہیں۔ قرآن پاک سابقہ کتابوں کا محافظ ہے، یعنی ہدایت کے جو علوم، معانی اور مضامین پہلی کتابوں میں تھے وہ سب کمال

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ﴿۴۸﴾

اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر، اس سے ہٹ کر جو حق میں سے تیرے پاس آیا ہے۔ تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک راستہ اور ایک طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ایک امت بنا دیتا اور لیکن تاکہ وہ تمھیں اس میں آزمائے جو اس نے تمھیں دیا ہے۔ پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۴۸﴾

امانت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور یہود کی تحریفات اور غلط تاویلات کو بیان کرتا ہے۔ یہ معنی بھی ہیں کہ تورات اور انجیل کے ہر حکم کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے گا، صحیح اترنے کی صورت میں قبول کر لیا جائے گا ورنہ رد کر دیا جائے گا۔

❷ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ...... : اس سے پہلے آیت (۴۲) میں نبی کریم ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا کہ آپ ان کے معاملات کے فیصلے کریں یا نہ کریں آپ کی مرضی ہے، لیکن اب اس کی جگہ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کے آپس کے معاملات میں بھی قرآن کے مطابق فیصلے فرمائیں۔

❸ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا : اس کے مخاطب یہود و نصاریٰ اور مسلمان ہیں، یعنی گو تمام انبیاء کا دین ایک ہے مگر اپنے اپنے وقت میں ہر امت کی شریعت (احکام فرعیہ) اور طریقے مختلف رہے ہیں، ہر بعد میں آنے والے نبی کی شریعت میں پہلی شریعت سے مختلف احکام پائے جاتے ہیں، اب نبی آخر الزماں کی شریعت ہر لحاظ سے مکمل اور قیامت تک کے لیے ہے۔ ایک حدیث میں ہے: ''انبیاء علاتی بھائی ہیں، ان کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔'' [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله : ﴿ واذكر في الكتاب مريم...... ﴾ : ۳۴۴۳ ] یعنی سب کا دین اور اصول تو ایک ہیں، اختلاف جو کچھ بھی ہے وہ صرف فروعی احکام کی حد تک ہے۔ اب آخری نبی کے بعد نہ کسی پہلے نبی کے احکام و مسائل پر عمل ہوگا اور نہ اس امت کے کسی امام و مجتہد کے قول، رائے یا فتویٰ پر۔

❹ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ : یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو جبراً ایک ہی امت بنا دیتا مگر یہ اختلاف اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارا امتحان کرنا چاہتا ہے کہ تم اس عقل اور ان اختیارات کو کیسے استعمال کرتے ہو جو اس نے تمھیں دیے ہیں، تاکہ اس پر جزا و سزا ہو سکے۔

❺ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ : یعنی خواہ مخواہ کی کج بحثیوں کو چھوڑ کر ان نیکیوں کو اختیار کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھو جن کا اب تمھیں آخری شریعت میں حکم دیا جا رہا ہے۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کر جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور ان سے بچ کہ وہ تجھے کسی ایسے حکم سے بہکا دیں جو اللہ نے تیری طرف نازل کیا ہے، پھر اگر وہ پھر جائیں تو جان لے کہ اللہ یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے کچھ گناہوں کی سزا پہنچائے اور بے شک بہت سے لوگ یقیناً نافرمان ہیں ﴿۴۹﴾ پھر کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے، ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں ﴿۵۰﴾

**آیت 49** ① وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ...... : یعنی یہ اہل کتاب اگرچہ آپس میں دست و گریباں رہیں، مگر آپ ان کے باہمی اختلاف سے متاثر نہ ہوں، آپ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں اور ان سے ہوشیار رہیں، ایسا نہ ہو کہ ان کے کسی گروہ کو خوش کرنے یا ان سے مصالحت کی کوئی خواہش آپ کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام سے ہٹا دے۔ مزید دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۳)، سورۂ بنی اسرائیل (۷۳ تا ۷۵) اور سورۂ قلم (۸، ۹)۔

② فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ : یعنی اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ان کو ایمان کی توفیق سے محروم رکھ کر اس دنیا میں ان کو جلاوطنی، جزیہ یا قتل کی سزا دے، کیونکہ ان میں انصاف پسند اور حق پر چلنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کو اس کے گناہوں کی شامت کیا کیا نقصان پہنچاتی ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ خطبہ میں کہا کرتے تھے: « وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا » [ ابن ماجه، النكاح، باب خطبة النكاح: ١٨٩٢ ] ”ہم اپنے نفسوں کی شرارتوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔“

**آیت 50** اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ...... : کیا یہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق کیے ہوئے فیصلے کو چھوڑ کر کفر و جاہلیت کے زمانے کا فیصلہ پسند کرتے ہیں جس کی بنیاد ذاتی خواہشات پر ہوتی تھی اور جن میں کمزور کے مقابلے میں طاقت ور کی طرف داری کی جاتی تھی، اسی کا نام یہودیت ہے کہ وہ چھوٹے درجے کے آدمی کے مقابلے میں بڑے کی رعایت کرتے، کمزوروں پر حدود قائم کرتے اور مال دار طبقہ کی رعایت کرتے۔ ( کبیر، قرطبی )

افسوس بعض مسلم حکام کے زمانے کے علماء نے ایسے احکام اور حیلے ایجاد کیے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کا نفاذ تقریباً ناممکن ہو گیا، مثلاً انھوں نے شراب کی ایک دو قسمیں چھوڑ کر باقی نشہ آور چیزیں حلال کر دیں۔ اجرت پر لائی ہوئی عورت کے ساتھ زنا پر حد ختم کر دی۔ قصاص کو جیسا کہ اوپر گزرا تقریباً باطل کر دیا۔ سود کی کئی صورتوں کو حلال کر دیا۔ چور کو عدالت میں پیش ہونے کے بعد بھی صاحب مال کو معاف کرنے کا اختیار دے دیا۔ شواہد کے ساتھ چور کا جرم ثابت ہونے کے بعد چور کے صرف اس

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ؔۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۱ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝۵۲ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں اور تم میں سے جو انھیں دوست بنائے گا تو یقیناً وہ ان میں سے ہے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۵۱ پس تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں ایک بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان میں جاتے ہیں، کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی چکر آ پہنچے، تو قریب ہے کہ اللہ فتح لے آئے، یا اپنے پاس سے کوئی اور معاملہ تو وہ اس پر جو انھوں نے اپنے دلوں میں چھپایا تھا، پشیمان ہو جائیں ۵۲

دعوے سے کہ یہ میرا مال تھا، اس کی حد معاف کر دی، خواہ وہ اپنی ملکیت کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ اس امام (حاکم) کو جس سے اوپر کوئی امام نہ ہو ایک دو چیزوں کے سوا تمام حدود معاف کر دیں اور جاہلیت کے ان احکام کو شرع اسلام قرار دے کر مسلمان ملکوں میں نافذ کر دیا، تو کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ''پھر کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں'' جس طرح یہود و نصاریٰ میں شریعت بدلنے والوں کے لیے تھا، اسی طرح ایسے مسلمانوں کے لیے نہیں ہوگا جو قرآن و حدیث کے صریح احکام کے مقابلے میں اپنے من گھڑت احکام نافذ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس کا نتیجہ بھی دنیا پر غلبے سے محرومی اور کفار کی بدترین غلامی کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اب بھی مسلمانوں کے اکثر حکام نے طرز حکومت اور ملکی قانون کفار کے طریقے کے مطابق بنایا ہوا ہے اور وہ ایسی علماء کونسلیں بناتے رہتے ہیں جو قدیم جاہلیت کے ساتھ ساتھ نئی سے نئی جاہلیت کے نفاذ کے لیے قانون بنائیں اور اس کا نام اسلامی کونسل رکھتے ہیں۔ [اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ]

**آیت 51** لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ...... : ''اَوْلِيَآءَ'' ''وَلِيٌّ'' کی جمع ہے، مراد دلی دوست ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور یہ طے شدہ بات ہے کہ دشمن کا دوست بھی دشمن ہوتا ہے، تو جسے تم اپنا خیر خواہ سمجھ کر دوست بنا رہے ہو اس کی اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ بھی دوستی ہے جو تمھارے شدید دشمن ہیں، وہ آپس میں کتنا بھی اختلاف رکھتے ہوں تمھاری عداوت میں وہ ایک ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں، تو تمھاری یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس پر اتنی سختی فرمائی کہ فرمایا تم میں سے جو ان سے دوستی رکھے گا وہ انھی میں سے ہے۔ رہا ان سے اچھا تعلق رکھنا، خوش اخلاقی، حسن سلوک اور احسان تو وہ ان لوگوں کے ساتھ کر سکتے ہو جنھوں نے دین کی وجہ سے تم سے جنگ نہیں کی، جن کا ذکر سورۂ ممتحنہ (۸) میں ہے۔ صرف یہود و نصاریٰ ہی سے نہیں تمام کفار کی دلی دوستی سے منع فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۲۳)، سورۂ مجادلہ (۲۲) اور آل عمران (۲۸، ۱۱۸)۔

**آیت 52** فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ...... : یعنی منافقین جو یہود و نصاریٰ کی طرف دوڑتے اور ان کے ساتھ

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

اور وہ لوگ جو ایمان لائے ، کہتے ہیں کیا یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی تھی کہ بلاشبہ وہ یقیناً تمھارے ساتھ ہیں۔ ان کے اعمال ضائع ہو گئے، پس وہ خسارہ اٹھانے والے ہو گئے (۵۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے (۵۴)

---

دوستی کیے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں مسلمان زمانے کے کسی چکر میں آ کر مغلوب نہ ہو جائیں، پھر ہمارا کیا بنے گا، اس وقت ان کی دوستی ہمارے کام آئے گی، سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، بلکہ یقیناً ہو گا، ( لفظ "عَسٰی" اللہ اور رسول کے فرمان میں یقین کے معنی میں آتا ہے ) کہ مسلمانوں کو فتح ہو گی، کافر مغلوب ہوں گے، پھر وہ قتل ہوں گے، یا جلاوطن ہوں گے، یا انھیں جزیہ دینا پڑے گا، پھر ان منافقین کو ندامت ہو گی کہ ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا، مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، بنو قریظہ کے یہودی قتل ہوئے، بنو نضیر کو سرزمین مدینہ سے نکال دیا گیا اور یہ لوگ اپنے نفاق پر کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔

**آیت 53** وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا ...... : یعنی مسلمان جب جنگ کے وقت منافقین کو یہود و کفار کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو تعجب سے کہتے ہیں کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم سے پکی قسمیں کھا کر کہا تھا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اور کفار کے دشمن ہیں!! اب ان کی حقیقت کھل گئی۔

**آیت 54** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ ...... : اللہ تعالیٰ جو ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ جانتا ہے، اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بہت سے عرب قبائل اسلام سے مرتد ہو جائیں گے، اس لیے اس نے آئندہ سے متعلق یہ آیت پہلے ہی نازل فرما دی۔ چنانچہ جب نبی ﷺ فوت ہوئے تو تین مقامات مکہ، مدینہ اور بحرین کے علاوہ تمام علاقوں سے عرب قبائل کے مرتد ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔ اس وقت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان مرتدین سے جہاد کیا۔ اس فتنۂ ارتداد کا خاتمہ جن لوگوں کے ہاتھوں ہونا

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾

تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں ﴿٥٥﴾ اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو اور ان لوگوں کو دوست بنائے جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو غالب ہیں ﴿٥٦﴾

---

تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی پانچ صفات بیان کی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی انصار و مہاجرین اور یمن سے آنے والے مجاہدین میں یہ پانچوں خوبیاں موجود تھیں۔ کتنے بے نصیب ہیں وہ لوگ جو ایسے لوگوں سے بغض رکھتے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے: ① اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ ② مومنوں پر بہت نرم ہیں۔ ③ کافروں پر بہت سخت ہیں۔ ④ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ ⑤ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ ان خوش نصیب لوگوں کے سردار اور خلیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر عرب دین سے پھرے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یمن سے مسلمان بلائے، ان سے جہاد کروایا کہ تمام عرب مسلمان ہوئے، یہ ان کے حق میں بشارت ہے۔ (موضح)

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اس (ابوموسیٰ) کی قوم ہے۔'' (ابن ابی حاتم، ابن جریر) ''هداية المستنير'' کے مصنف نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔ الغرض ابوبکر رضی اللہ عنہ، ان کے ساتھی مہاجرین و انصار اور اہل یمن میں یہ خوبیاں موجود تھیں۔

صاحب الکشاف نے لکھا ہے کہ مرتد ہونے والوں کے بارہ (۱۲) فرقے تھے، ان میں سے تین فرقے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں مرتد ہو گئے تھے: ① بنو مدلج جن کا رئیس اسود عنسی تھا، جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اسے فیروز دیلمی نے قتل کیا۔ (کشاف کے محشی نے لکھا ہے کہ اسود عنسی بنو مدلج سے نہیں بلکہ بنو عنس سے تھا) ② مسیلمہ کذاب کی قوم بنو حنیفہ، جس سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ کی اور وہ حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ③ بنو اسد جن کا رئیس طلیحہ بن خویلد تھا، ان کی سرکوبی کے لیے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا۔ یہ شخص آخر میں مسلمان ہو گیا تھا۔

آیت 56،55 ① اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ...... : اوپر کی آیات میں کفار سے دوستی کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اب اس آیت میں ''اِنَّمَا'' کلمۂ حصر کے ساتھ بتایا کہ تمھارے دوست صرف اور صرف اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اہل ایمان ہیں، اس لیے یہود کو مددگار اور دوست نہ بناؤ، بلکہ صرف مومنین کو اپنا مددگار سمجھو۔ (ابن کثیر، کبیر) یہاں ''وَهُمْ رٰكِعُوْنَ'' کے معنی ہیں ''جھکنے والے، عاجزی کرنے والے۔'' چنانچہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ [ المؤمنون : ٦٠ ] ''اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کو جنھوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا، ان لوگوں میں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور کفار کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو، اگر تم ایمان والے ہو ﴿۵۷﴾

ہیں۔'' (کبیر، ثنائی) بعض لوگوں نے ''وَهُمْ رٰكِعُوْنَ'' کو ''وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ'' کے فاعل سے حال قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے ''وہ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں'' اور بعض روایات سے ثابت کیا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی صدقہ کی تھی، اس پر ان کی تعریف میں یہ آیت نازل ہوئی، مگر یہ سب روایات بہت ضعیف اور کمزور ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان روایات پر سخت تنقید کی ہے اور ان کو بے اصل قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ان روایات سے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرنا زکوٰۃ دینے کی افضل ترین صورت ہے، مگر آج تک کسی عالم نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔ (ابن کثیر، المنار) پس صحیح یہ ہے کہ آیت عام مومنین کے حق میں نازل ہوئی ہے اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء اس آیت کے اولین مصداق ہیں۔ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین سے پوچھا گیا کہ ''وَلِيُّكُمْ'' سے مراد علی رضی اللہ عنہ ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ بھی ان مومنوں میں سے ایک ہیں، یعنی یہ آیت سب مومنوں کے حق میں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ یہاں جو صفات مذکور ہیں کہ ''وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں'' ان سے کیا مقصد ہے؟ تو ہم کہتے ہیں کہ اس سے منافقین پر طنز مقصود ہے جو ان صفات سے خالی تھے۔ (رازی)

2 شیعہ حضرات ان دو آیات سے علی رضی اللہ عنہ کی امامت بلافصل ثابت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسی وقت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ ان کے استدلال کا مدار تو اس بات پر ہے کہ یہ آیت خاص کر علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، مگر ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ آیت سب مومنوں کے حق میں نازل ہوئی ہے اور علی رضی اللہ عنہ بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس آیت میں تمام صیغے جمع کے ہیں تو پھر صرف علی رضی اللہ عنہ کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟ اور پھر جب آیت کے نزول کے ساتھ ہی علی رضی اللہ عنہ کی ولایت ثابت ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تک اس کو ملتوی رکھنا بے معنی ہے، نیز ولی کے معنی دوست اور مددگار کے بھی آتے ہیں اور والی اور متصرف (حاکم) کے بھی۔ آیت کا سیاق و سباق (اس کے الفاظ اور اس سے پہلے والی آیات کے الفاظ) پہلے معنی کی تائید کرتے ہیں تو سیاق کے قرینہ کے خلاف دوسرے معنی لینے کے لیے کون سی وجہ جواز ہو سکتی ہے؟ امام رازی رحمہ اللہ نے آٹھ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آیت میں ولی کے پہلے معنی مراد ہیں، دوسرے معنی دلائل کے خلاف ہیں۔ (کبیر)

**آیت 57** یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ ...... : اوپر کی آیات میں خاص طور پر یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع فرمایا، اب یہاں تمام کفار کی دوستی سے منع فرمایا ہے۔ اس آیت کی رو سے ان بے دین لوگوں اور اہل بدعت سے دلی دوستی رکھنا بھی جائز نہیں جنھوں نے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، کبھی داڑھی کا مذاق اڑاتے ہیں، کبھی مسنون لباس کا

وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جب تم نماز کی طرف آواز دیتے ہو تو وہ اسے مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ﴿۵۸﴾ کہہ دے اے اہل کتاب! تم ہم سے اس کے سوا کس چیز کا انتقام لیتے ہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو اس سے پہلے نازل کیا گیا اور یہ کہ بے شک تمھارے اکثر نافرمان ہیں ﴿۵۹﴾

---

اور کبھی اللہ تعالیٰ کی حدود کا۔ اسی طرح سنت کے مطابق نماز کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو شخص پیدائش، نکاح اور موت کے وقت کفار خصوصاً ہندوؤں کی رسموں میں ان کا ساتھ نہ دے، اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو جب ان میں بھی وہی وصف پایا جاتا ہے جو اہل کتاب اور کفار میں پایا جاتا ہے تو ان کا حکم بھی وہی ہونا چاہیے جو اہل کتاب اور کفار کا ہے۔

آیت 58 ① وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ : " نَادَیْتُمْ " کا معنی ہے جب تم آواز دیتے ہو، تو اس سے مراد نماز کے لیے اذان ہے یعنی اس کی نقلیں اتارتے ہیں، تمسخر سے اس کے الفاظ بدلتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں، شور و ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔ (ابن کثیر، فتح القدیر) شیطان کو بھی اذان کی آواز برداشت نہیں، حدیث میں ہے: "شیطان جب اذان کی آواز سنتا ہے تو گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے (کہ اذان اس کے کانوں میں نہ پڑے)، پھر واپس آ جاتا ہے، اقامت کے وقت پھر پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے، جب تکبیر ختم ہوتی ہے تو پھر آ کر نمازیوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔" [ بخاری، الأذان، باب فضل التأذین : ٦٠٨ ]

② نماز کے لیے آواز دینے کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے، ایک اس آیت میں دوسرا سورۂ جمعہ میں۔ اسی ندا کو اذان کہتے ہیں، مگر پورے قرآن میں نہ اذان کا طریقہ بیان ہوا، نہ اس کے کلمات اور نہ اس کے اوقات۔ یہ آواز کیسے دی جائے، اس کے لیے حدیث رسول سے رہنمائی لینا ہوگی۔ معلوم ہوا حدیث کے بغیر قرآن پر عمل ممکن ہی نہیں۔ ﴿ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ [ النساء : ٥٩ ] اور ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ﴾ [ آل عمران : ٣١ ] کے تحت قرآن کے ساتھ حدیث پر عمل بھی واجب ہے، اسی لیے اہل علم نے منکرین حدیث پر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

③ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ: یعنی اگر ان میں کچھ بھی عقل ہوتی تو اذان کی آواز سن کر ان کے دل نرم پڑ جاتے، وہ حق کی طرف متوجہ ہوتے، یا کم از کم مسلمانوں سے دینی اختلاف رکھنے کے باوجود اس قسم کی گھٹیا حرکتیں نہ کرتے۔

آیت 59 ① وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ: یعنی پہلی کتابوں پر، جیسے تورات، انجیل اور زبور وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ ہمارا ایمان انھی چیزوں پر ہے جنھیں تم بھی صحیح مانتے ہو، پھر تم ہم سے کس بات کا انتقام لیتے ہو اور ہمارا کیا عیب ہے جس

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝٦٠ وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۝٦١

کہہ دے کیا میں تمھیں اللہ کے نزدیک جزا کے اعتبار سے اس سے زیادہ برے لوگ بتاؤں، وہ جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر غصے ہوا اور جن میں سے بندر اور خنزیر بنا دیے اور جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔ یہ لوگ درجے میں زیادہ برے اور سیدھے راستے سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ۝٦٠ اور جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے، حالانکہ یقیناً وہ کفر کے ساتھ داخل ہوئے اور یقیناً اسی کے ساتھ وہ نکل گئے اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو وہ چھپاتے تھے ۝٦١

کی وجہ سے تم ہم سے دشمنی رکھتے ہو؟

② وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ: اصل بات یہ ہے کہ تم میں سے اکثر لوگ فاسق (نافرمان) اور بدکار ہیں اور تمھاری ساری مذہبی اجارہ داری گروہی تعصب اور غلط قسم کی روایات پر قائم ہے، اس لیے تم اپنے سوا کسی دوسرے میں کوئی اچھی بات دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ فاسق کی تو روایت ہی قابل قبول نہیں، کیونکہ اسے جھوٹ سے کوئی پرہیز نہیں ہوتا، اس لیے اسلام کے خلاف تمھاری تمام روایات و حرکات بے وقعت ہیں۔ قرآن مجید کا انصاف ملاحظہ فرمائیے کہ شدید غضب کے باوجود ان سب کو نہیں بلکہ اکثر کو فاسق کہا ہے۔

آیت 60 ① قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ ......: یعنی تمھارے گمان میں ہم برے ہیں، اس لیے تم ہم پر عیب لگاتے ہو اور انتقام لینے کی کوشش کرتے ہو، لیکن ذرا اپنی تاریخ پر بھی غور کرو اور اپنے ان پہلوں کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی جرأت کرو جن کا انجام اللہ کے ہاں اس سے بھی کہیں بدتر ہوا اور ہونے والا ہے، جس کا تم ہمارے بارے میں دعویٰ کرتے ہو۔ یہ لوگ تمھارے ہی آباء و اجداد تھے جو دین کا مذاق اڑانے اور مختلف جرائم کے مرتکب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کے غضب میں مبتلا ہوئے، ان میں سے بہت سوں (اصحاب سبت) کی صورتیں مسخ کر کے انھیں بندر اور خنزیر بنا دیا گیا اور جو شیطان کی اطاعت میں اس حد تک نکل گئے کہ انھوں نے طاغوت کی عبادت شروع کر دی، جیسے سامری کا بنایا ہوا بچھڑا، جو دراصل شیطان ہی کی پوجا تھی۔

② اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ: یعنی تم ہمیں کتنا ہی گمراہ کہہ لو، لیکن یہ بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ تمھارے باپ دادا یقیناً گمراہ تھے اور ان کا انجام اللہ کے ہاں بہت برا ہو گا۔

آیت 61 ① وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ......: اس سے یہود کے وہ منافق مراد ہیں جو مدینہ اور اس کے قرب و جوار

وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ

اور تو ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور زیادتی اور اپنی حرام خوری میں دوڑ کر جاتے ہیں۔ یقیناً برا ہے جو وہ عمل کرتے تھے ﴿۶۲﴾ انھیں رب والے لوگ اور علماء ان کے جھوٹ کہنے اور ان کے حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ یقیناً برا ہے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۶۳﴾ اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، ان کے ہاتھ باندھے گئے اور ان

---

میں رہتے تھے۔ (کبیر)

❷ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ: یعنی ان کے دلوں میں مسلمانوں کے متعلق بہت زیادہ بغض و حسد بھرا ہوا ہے۔ ورنہ اگر وہ تمھارے پاس دل میں کفر لے کر نہ آئے ہوتے تو ان پر نبی ﷺ کی اور مسلمانوں کی مجلس کا کچھ اثر تو ضرور ہوتا اور کفر میں کچھ کمی ہوتی، مگر وہ نکلتے وقت بھی اتنا یا اس سے کچھ زیادہ ہی کفر لے کر واپس گئے، جتنا لے کر آئے تھے۔

آیت 63،62 لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ ...... : یعنی جس طرح گناہ کرنا جرم ہے اسی طرح گناہ سے نہ روکنا بھی جرم ہے۔ جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے: ''کوئی بھی شخص جو ایسی قوم میں ہو جن میں معاصی کا ارتکاب کیا جاتا ہو جو اسے روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر اسے نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ ان کے مرنے سے پہلے ان پر کوئی عذاب بھیجے گا۔'' [ أبو داوٗد، الملاحم، باب الأمر والنهی : ۴۳۳۹، وحسنه الألبانی ] ان کے علماء اور مشائخ انھیں جھوٹ کہنے اور حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے، یقیناً ان کے علماء و مشائخ بھی جو کرتے چلے آئے ہیں بہت برا ہے کہ انھیں منع کرنے کے بجائے وہ خود بھی جھوٹ کہہ کر اسلام سے روکتے اور سحت (رشوت اور حرام) کھاتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۳۴)۔

آیت 64 ❶ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ...... : اللہ تعالیٰ نے جب اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ان الفاظ میں دی کہ کون اللہ کو قرض حسنہ دیتا ہے؟ حالانکہ وہ مال اللہ تعالیٰ ہی کا تھا، اسی نے دیا تھا اور اسی کے دیے ہوئے میں سے انھوں نے دینا تھا، تو یہودی بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے انداز بیان اور اس کے فضل و کرم پر غور کرتے اور سمجھتے کہ اللہ ہمیں کئی گنا بڑھا کر دینے کے لیے صدقے کی ترغیب دے رہا ہے اور اسے قرض کہہ رہا ہے، کہنے لگے کہ اللہ تو فقیر ہے اور ہم غنی ہیں، تبھی وہ ہم سے قرض مانگتا ہے۔ یہ یہودیوں کی انتہائی خست اور کمینگی تھی، وہی کمینگی اس آیت میں دوسرے الفاظ میں ذکر کی گئی ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، یعنی وہ بخیل ہے، کچھ دیتا نہیں، بلکہ مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاتھ تو انھی کے بندھے ہوئے ہیں اور بخیلی انھی کی صفت ہے اور انھی گستاخیوں اور کمینگیوں کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہیں، وہ بے انتہا فضل و کرم کا مالک اور بے حد و حساب عطا فرمانے والا ہے، تمام خزانے اسی کے پاس ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے، تمام مخلوق کی ہر حاجت اور ضرورت جو پڑتی یا پڑ سکتی

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

پر لعنت کی گئی، اس کی وجہ سے جو انھوں نے کہا، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے، اور یقیناً جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو سرکشی اور کفر میں ضرور بڑھا دے گا، اور ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا۔ جب کبھی وہ لڑائی کی کوئی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۶۴﴾

ہے، وہی پوری کرتا ہے، فرمایا: ﴿ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [ إبراهيم : ٣٤ ] ”اور اس نے تمھیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے، یقیناً انسان بڑا ظالم بہت ناشکرا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے، کسی طرح کا خرچ کرنا اسے کم نہیں کرتا۔ کیا تم نے دیکھا کہ اس نے جب سے آسمان و زمین پیدا کیے کس قدر خرچ کیا ہے؟ تو اس سے اس میں کچھ کمی نہیں ہوئی جو اس کے دائیں ہاتھ میں ہے۔“ [ بخاری، التوحید، باب : ﴿ وكان عرشه على الماء ﴾ : ٧٤١٩ ] ایک حدیث میں فرمایا: ”اللہ کے دونوں ہاتھ ہی دائیں ہیں۔“ [ مسلم، الإمارة، باب فضيلة الأمير العادل...... : ١٨٢٧ ]

❷ اس آیت اور دوسری بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ موجود ہیں۔ بعض لوگ اس کا ترجمہ قبضہ، قدرت وغیرہ کرتے ہیں اور ہاتھوں کا انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اس کے ہاتھ مانیں تو وہ ہمارے جیسا ہو جائے گا، حالانکہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ ان لوگوں کی بات درست نہیں، کیونکہ یہ تو اس وقت ہوگا جب ہم کہیں کہ اس کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں جیسے ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ ہیں مگر ہمارے جیسے نہیں، بلکہ ایسے ہیں جیسے اس کی شان کے لائق ہیں تو اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی، جبکہ اس کے ہاتھوں کے انکار سے کئی احادیث اور قرآن کی آیات کا انکار لازم آتا ہے۔ اب ہم سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی دیکھتا اور سنتا ہے تو کیا وہ ہمارے جیسا ہوگا؟ نہیں، بلکہ اس کا سننا اور دیکھنا ہماری طرح نہیں، بلکہ ایسا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔ اسی طرح اللہ بھی موجود ہے ہم بھی موجود ہیں، تو کیا وہ بھی ہماری مثل ہو جائے گا؟ نتیجہ تو یہی نکلا کہ مشابہت ثابت ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ [ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ] نہیں، بلکہ وہ موجود ہے، سمیع و بصیر ہے، اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، اس کا سمع و بصر اور اس کا وجود سب کچھ قرآن سے ثابت ہے اور ماننا لازم ہے، مگر وہ وجود اور سمع و بصر اور ہاتھ ہمارے یا کسی مخلوق جیسے نہیں، بلکہ ایسے ہیں جیسے اس کے لائق ہیں۔ اللہ کی ذات بھی بے مثل ہے، اس کی صفات بھی بے مثل ہیں۔ کئی ایسے بھی بے نصیب ہیں جو اسی

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور اگر واقعی اہل کتاب ایمان لے آتے اور ڈرتے تو ہم ضرور ان سے ان کے گناہ دور کر دیتے اور انھیں ضرور نعمت کے باغوں میں داخل کرتے ﴿۶۵﴾ اور اگر وہ واقعی تورات اور انجیل کی پابندی کرتے اور اس کی جو ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے تو یقیناً وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے ایک جماعت درمیانے راستے والی ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ، برا ہے جو کر رہے ہیں ﴿۶۶﴾

---

شبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سننے، دیکھنے اور قیامت کے دن زمین پر آنے کا صاف انکار کر کے اپنے ڈھکوسلے سے بنایا ہوا کوئی معنی کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے۔

③ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا ...... : یعنی یہ لوگ اگر ہدایت کے طلب گار ہوتے تو آپ پر نازل ہونے والی ہر آیت و حدیث سے صحابہ کے ایمان کی طرح ان کے ایمان میں اضافہ اور ترقی ہوتی، مگر چونکہ ان کے دل بغض و عناد، ضد اور حسد سے بھرے ہوئے ہیں، اس لیے تیرے رب کی طرف سے جو کچھ بھی تجھ پر نازل ہوگا وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کی سرکشی اور کفر ہی میں اضافہ کرے گا، اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسے جیسے قرآن اترتا ان کی سرکشی اور کفر بڑھتا جاتا۔

④ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ ...... : یعنی ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان باہمی عداوت اور بغض اس حد تک پہنچ گیا کہ وہ قیامت تک آپس میں ایک نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ بہت سے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اسی لعنت کا اثر ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی کی کوششوں کے بجائے وہ دنیا میں کہیں نہ کہیں لڑائی کی آگ بھڑکائے رکھتے ہیں، مگر وہ جب بھی یہ آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے۔ ان کی ساری تگ و دو دنیا میں فساد پھیلانے کی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے موجودہ حالات جاننے والا ہر شخص جانتا ہے کہ کس طرح ہر لڑائی کے پیچھے یہودیوں کا خفیہ ہاتھ ہوتا ہے، یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ وہ ان کے منصوبے پورے نہیں ہونے دیتا۔ افسوس! اب مسلمانوں کے اکثر علماء و عوام کا بھی تقریباً یہی حال ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین پر عمل چھوڑ رکھا ہے، بلکہ جب بھی موقع ملتا ہے اسلام کے کسی نہ کسی حکم سے انکار یا اس کی گستاخی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ یہودیانہ خصلت ہے جس کی وجہ سے مسلمان ملکوں کے مالک ہو کر بھی کفار کے محکوم ہیں اور ان برکات سے محروم ہیں جو کتاب و سنت پر عمل کرنے اور برائیوں کو روکنے کے لیے جہاد کرنے کی صورت میں انھیں حاصل ہوتیں۔

آیت 66 ① وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ : تورات و انجیل کی پابندی کرنے کا مطلب دوسرے احکام و حدود کی پابندی کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا بھی ہے، کیونکہ دونوں کتابوں میں اس کا حکم موجود ہے۔ " وَ مَاۤ اُنْزِلَ

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾

اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو تو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔ بے شک اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿٦٧﴾

اِلَيْهِمْ " سے مراد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن اور آپ کی سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اہل کتاب میں سے ہو، اپنے نبی پر ایمان لایا ہو اور پھر محمد ﷺ پر بھی ایمان لائے تو اس کے لیے دگنا ثواب ہے۔'' [ بخاری، العلم، باب تعلیم الرجل أمته و أهله : ۹۷ ]

② لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ : یعنی آسمان بابرکت بارشیں برساتا، زمین سے کھیتی اور دوسرے خزانوں کی فراوانی ہو جاتی اور انھیں روزی کمانے کے سلسلے میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا، جیسا کہ سورۂ اعراف میں صرف اہل کتاب ہی نہیں ہر قوم اور آبادی کے لیے ایمان اور تقویٰ کی صورت میں یہی بشارت دی گئی ہے، فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [ الأعراف : ۹٦ ] ''اور اگر واقعی بستیوں والے ایمان لے آتے اور بچ کر چلتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے بہت سی برکتیں کھول دیتے۔'' اب مسلمان بھی اگر یہ نعمت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا طریقہ ایمان اور تقویٰ ہے، کفار سے بھیک مانگنا اور ان کے کفریہ طریقے اختیار کرنا نہیں۔

③ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ : یعنی افراط و تفریط ( زیادتی اور کمی ) سے بچ کر درمیانے راستے پر چلنے والے ہیں۔ ان سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی۔

④ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ : اس سے مراد بقیہ یہودی ہیں جو ایمان نہیں لائے۔

آیت 67 ① وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ : یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغام میں سے اگر کچھ بھی چھپا لیا، یا پہنچانے میں سستی کی تو گویا سرے سے اس کا پیغام پہنچایا ہی نہیں، خصوصاً یہود و نصاریٰ سے متعلق اعلانات۔ اس آیت میں ان لوگوں کی تردید ہے جو نبی ﷺ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ نے قرآن کی بعض آیات مسلمانوں تک نہیں پہنچائیں، بلکہ صرف علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کو بتائیں۔ خود علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اس باطل عقیدے کی تردید فرمائی، چنانچہ ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''کیا آپ ( اہل بیت ) کے پاس کوئی اور کتاب ہے؟'' تو انھوں نے فرمایا: ''نہیں، مگر اللہ کی کتاب یا کتاب اللہ کی وہ سمجھ ہے جو کسی مسلمان آدمی کو عطا کی جائے، یا جو اس صحیفے میں ہے۔'' میں نے پوچھا: اس صحیفے میں کیا ہے؟'' فرمایا: ''دیت اور قیدیوں کو چھڑانے سے متعلق احادیث اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔'' [ بخاری، العلم، باب کتابة العلم : ۱۱۱ ] عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جو شخص یہ کہے کہ محمد ﷺ نے اس میں سے کوئی چیز چھپا لی تھی جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائی تو یقیناً اس نے جھوٹ بولا،

**قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ**

کہہ دے اے اہل کتاب! تم کسی چیز پر نہیں ہو، یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو قائم کرو اور اس کو جو تمھارے

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ ''اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ يأيها الرسول بلغ ما أنزل إليك من ربك ﴾ : ٤٦١٢ ]

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ( حجۃ الوداع کے دن ) اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو کیا جواب دو گے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''ہم سب یہ گواہی دیں گے کہ بے شک آپ نے پیغام رسالت کو پہنچا دیا اور ( پہنچانے کا ) حق ادا کر دیا اور یہ کہ آپ نے خیر خواہی فرمائی۔'' اس پر آپ نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور صحابہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ! تو گواہ ہو جا، اے اللہ! تو گواہ ہو جا۔'' [ مسلم، الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ١٢١٨۔ بخاری : ١٧٤١ ]

② **وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** : اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص حفاظت میں لے لیا اور فرمایا کہ تم میرا پیغام پہنچاؤ، میں خود تمھیں لوگوں سے بچاؤں گا۔ اس آیت کے اترنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہرا دیا جاتا تھا، عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو نہیں رہے تھے، میں بھی آپ کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی، میں نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''کاش! کوئی نیک آدمی میرا پہرا دیتا۔'' تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ میں نے ہتھیاروں کی جھنکار سنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کون ہے؟'' آنے والے نے کہا: ''سعد بن ابی وقاص ہوں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیسے آنا ہوا؟'' انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں آیا ہوں کہ ( آج رات ) آپ کا پہرا دوں۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام سے سو گئے، حتیٰ کہ میں نے آپ کے خراٹوں کی آواز سنی۔'' [ بخاری، الجہاد والسیر، باب الحراسة في الغزو في سبيل الله : ٢٨٨٥۔ مسلم : ٢٤١٠ ]

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پہرے کا انتظام کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ تو آپ نے خیمے سے سر نکال کر فرمایا: ''لوگو! تم چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ مجھے ( دشمن سے ) بچائے گا۔'' [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ المائدۃ : ٣٠٤٦ ] اس کی ایک مثال وہ اعرابی بھی ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتے ہوئے آپ کی تلوار پکڑ کر کہا تھا کہ تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ!''

③ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ** : یعنی اللہ تعالیٰ کفار کو ان کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ ( کبیر ) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یعنی اگرچہ وہ دشمن ہوں تم بے فکر یہ پیغام پہنچاؤ اور خطرہ نہ کرو۔ ( موضح ) یا مطلب یہ ہے کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو فکر نہ کرو۔ ( ابن کثیر )

آیت 68 ① **قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ** ...... : تورات و انجیل قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان میں جو عہد ان

مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾

رب کی جانب سے تمھاری طرف نازل کیا گیا اور یقیناً جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو سرکشی اور کفر میں ضرور بڑھا دے گا، سو تو کافر لوگوں پر غم نہ کر ﴿٦٨﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصاریٰ، جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿٦٩﴾

سے لیے گئے ان کو پورا کریں اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت پر ایمان لانے کے جو دلائل ان کتابوں میں موجود ہیں ان کے مطابق آپ کی نبوت کا اقرار کریں اور تورات و انجیل کے احکام و حدود پر عمل پیرا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پورے طور پر ان کتابوں پر عمل نہیں کرو گے تو نہ تمھاری کوئی حیثیت اور نہ تمھاری کوئی دین داری۔ (ابن کثیر) یہی بات مسلمانوں پر صادق آتی ہے کہ اگر وہ قرآن پر پوری طرح عمل نہیں کریں گے تو نہ ان کی کچھ حیثیت ہو گی نہ کوئی دین داری۔

② وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ : دیکھیے اسی سورت کی آیت (٦٤) کا حاشیہ (٣)۔

③ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: اس لیے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور اس کا وبال خود بھگت کر رہیں گے۔

**آیت 69** ① اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... : اوپر کی آیات میں بتایا کہ اہل کتاب جب تک ایمان لا کر عمل صالح نہ کریں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس میں فرمایا کہ صرف اہل کتاب ہی نہیں سب مسلم و غیر مسلم لوگوں کا یہی حکم ہے۔

② اس آیت میں لفظ " الصَّابِئُوْنَ" بظاہر تو منصوب ہونا چاہیے تھا مگر سیبویہ اور خلیل نے لکھا ہے کہ یہ " مَرْفُوْعٌ بِالْاِبْتِدَاءِ عَلٰى نِيَّةِ التَّأْخِيْرِ " ہے، یعنی یہ لفظ " الصَّابِئُوْنَ" اصل میں " وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" کے بعد ہونے کی نیت سے مبتدا ہے اور اس کی خبر " كَذٰلِكَ " ہے، یعنی " الصَّابِئُوْنَ" کا بھی یہی حکم ہے۔ اس کے مرفوع لانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ دراصل یہ سب فرقوں سے زیادہ گمراہ فرقہ ہے۔ اس لیے ان کا علیحدہ بیان ہوا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان فرقوں میں سے جو بھی ایمان لا کر عمل صالح کرے گا اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، حتیٰ کہ اگر صابی بھی ایمان لے آئیں تو ان کو بھی یہ رعایت مل سکتی ہے۔ (کبیر) " الصَّابِئِيْنَ" کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (٦٢) کے حواشی۔ آپ ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، گویا اس آیت میں " اٰمَنَ بِاللّٰهِ" سے مراد مسلمان ہونا ہے، یا یہ کہ اپنے اپنے زمانے میں ان میں جو بھی آسمانی دین تھا اس پر ایمان لا کر عمل کرنے والے مراد ہیں، مگر رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۟ۗ وَ حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۟

بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے، جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ چیز لے کر آیا جسے ان کے دل نہیں چاہتے تھے تو انھوں نے ایک گروہ کو جھٹلا دیا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے ﴿۷۰﴾ اور انھوں نے سمجھا کہ کوئی فتنہ واقع نہ ہوگا تو وہ اندھے ہوگئے اور بہرے ہوگئے، پھر اللہ ان پر مہربان ہوگیا، پھر ان میں بہت سے اندھے ہوگئے اور بہرے ہوگئے اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں ﴿۷۱﴾

کوئی شخص کتنا بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اگر آپ ﷺ کی آمد سے مطلع ہونے کے باوجود کلمہ نہیں پڑھتا تو وہ جہنمی ہے۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو صرف زبان سے ایمان لائے دل سے نہیں، یعنی منافق، ان میں سے جو دل سے ایمان لا کر عمل صالح کرے گا، یا سب مسلمان مراد ہیں کہ اگر وہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کریں گے تو خوف اور حزن سے بچیں گے۔ صرف کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں، عمل صالح بھی ضروری ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۲)۔

**آیت 70** لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ......: اس سے مقصود بنی اسرائیل کی سرکشی اور وعدہ پورا نہ کرنے کا بیان ہے، گویا اس کا تعلق ابتدائے سورت "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" سے ہے، یعنی ہم نے ان سے عہد لیا کہ توحید و شریعت پر قائم رہیں گے اور جو رسول ان کی طرف بھیجے جائیں گے ان کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔ اس میثاق کا ذکر اس سورت کی آیت (۱۲) اور سورۂ بقرہ کی آیت (۸۳ تا ۸۵) میں ہے۔

**آیت 71** ① وَحَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: "فِتْنَةٌ" کے اصل معنی آزمائش کے ہیں، مطلب یہ کہ انھوں نے سمجھا کہ ہم کیسے ہی گناہ کرلیں، خواہ انبیاء تک کو قتل کریں، چونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں، اس لیے دنیا میں کسی قسم کی بدبختی و نحوست یا غلبۂ دشمن قسم کی کوئی بلا ہم پر نازل نہیں ہوگی۔ (کبیر)

② فَعَمُوْا وَصَمُّوْا: مگر حق سے اندھے اور بہرے ہونے کی وجہ سے ان پر بلا نازل ہوئی۔ پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ان پر مسلط کر دیا جس نے ان کی مسجد اقصیٰ کو جلا ڈالا، ان کے اموال لوٹے اور ان کی اکثریت کو لونڈی و غلام بنا کر بابل لے گیا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴ تا ۸)۔

③ ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ: یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں بخت نصر کی غلامی سے نجات دی اور انھوں نے اپنی حالت سدھاری اور کچھ عرصہ کے لیے ٹھیک رہے۔

④ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ......: یعنی پھر دوبارہ پہلے جیسی سرکشی پر اتر آئے، یہاں تک کہ انھوں نے زکریا اور

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا بے شک اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا رب اور تمھارا رب ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۷۲﴾

یحییٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کو قتل کر ڈالا اور عیسیٰ علیہ السلام سے انتہائی توہین آمیز سلوک کیا، بلکہ انھیں بھی قتل کرنے کے درپے ہوئے۔ بعض نے گمراہی کے پہلے دور کو زکریا اور یحییٰ علیہ السلام کے زمانے کے ساتھ خاص کیا ہے اور دوسرے دور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ اور یہاں "كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ" میں اشارہ ہے کہ ان میں سے بعض حق پرست مسلمان ہو گئے تھے، جیسے عبد اللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا۔ اور ہو سکتا ہے کہ ﴿ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ ﴾ [ بنی إسرائیل : ٤ ] (بے شک تم زمین میں ضرور دو بار فساد کرو گے) سے ان دونوں ادوار کی طرف اشارہ ہو۔ (کبیر) ﴿ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴾ اس سے مقصود انھیں اللہ اور اس کے عذاب سے ڈرانا ہے۔

**آیت 72** ① لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ : اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۷)۔ یہود کے بعد اب نصاریٰ کی گمراہیوں کا بیان اور انھیں سزا سے ڈرانے کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ (کبیر) ان لوگوں سے نصرانیوں کا وہ فرقہ مراد ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم ہی تو ہے۔ اللہ اور مسیح علیہ السلام کو ایک کہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت تاکیدی الفاظ "لَقَدْ" (بلاشبہ، یقیناً) کے ساتھ کافر قرار دیا۔ مسلمان کہلانے والوں میں بھی کئی لوگ یہ کہنے والے ہیں کہ ''احد'' اور ''احمد'' میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہیں، اللہ تعالیٰ بشری جامہ پہن کر آ گیا، پھر کئی اپنے بزرگوں کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ عبادت کرتے کرتے اللہ میں فنا ہو کر ایک ہو گئے اور بعض ان کے متعلق کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان میں اتر آیا۔ پہلا عقیدہ اتحاد اور دوسرا حلول کہلاتا ہے۔ اگر مسیح کو عین اللہ تعالیٰ، یعنی مسیح علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کو ایک کہنے والے کافر ہیں تو یہ نام نہاد مسلمان کیوں کافر نہیں؟ معلوم ہوا حلول اور اتحاد کا عقیدہ واضح کفر ہے، جسے بعض ملحد لوگوں نے تصوف کے پردے میں معرفت قرار دے رکھا ہے۔

② وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ : حالانکہ مسیح علیہ السلام نے اپنے آپ کو ہمیشہ اللہ کا بندہ کہا، جب پیدا ہوئے تو دنیا میں آنے کے بعد بچپن ہی میں ان کی زبان سے یہی نکلا: ﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ [ مریم : ۳۰ ] ''یقیناً میں اللہ کا بندہ ہوں۔'' اور لوگوں کو بھی اسی وقت فرمایا: ﴿ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ﴾ [ مریم : ۳٦ ] ''یقیناً اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے،

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾

بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا بے شک اللہ تین میں سے تیسرا ہے، حالانکہ کوئی بھی معبود نہیں مگر ایک معبود، اور اگر وہ اس سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو یقیناً ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا انھیں ضرور دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۷۳﴾ تو کیا وہ اللہ کی طرف توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے، اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۷۴﴾

سو اسی کی عبادت کرو۔'' جوانی میں بھی یہی فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ﴾ [ الزخرف : ٦٤ ] ''بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو۔'' نیز مسیح علیہ السلام کا یہ قول آج بھی انجیل یوحنا، باب (۷) میں موجود ہے: ''یہی ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے کہ وہ تجھ حقیقی الٰہ کو اور اس یسوع مسیح کو پہچانیں جسے تو نے رسول بنا کر بھیجا۔'' (المنار)

③ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ ...... : یعنی اتحاد، حلول یا شرک کی کسی قسم کا عقیدہ و عمل رکھنے والوں پر جنت حرام اور جہنم واجب ہے۔ ''مِنْ اَنْصَارٍ'' میں ''اَنْصَارٍ'' جمع اس لیے لائے ہیں کہ مشرک لوگوں نے کئی ہستیوں کے متعلق گمان کر رکھا ہے کہ وہ ہمیں جہنم سے بچا لیں گی۔

آیت 73 ① لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کو تین میں سے تیسرا قرار دینے والے بھی کافر ہو گئے، جبکہ معبود تو ایک ہی ہے، اب خواہ وہ تین اقانیم، باپ، بیٹا اور روح القدس کو الگ الگ خدا قرار دیں یا کہیں کہ یہ تین الگ الگ نہیں بلکہ مل کر ایک ہی خدا ہیں، بہرحال یہ عقیدہ رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کافر قرار دیا۔ پھر نیکی کا لبادہ اوڑھ کر شرک پھیلانے والے وہ ظالم جو یہ کہیں کہ ہر چیز ہی خدا ہے اور اسے وحدت الوجود کا نام یا کوئی اور نام دیں، ان کے کافر ہونے میں بھی کیا شک ہے، بلکہ اس عقیدے سے تو قرآن و سنت اور اسلام کی ہر بات اور ہر حکم ہی باطل ٹھہرتا ہے کہ حکم دینے والا بھی وہی ہے اور جسے حکم دیا گیا وہ بھی وہی ہے، جنت و دوزخ بھی اور ان میں جانے والے بھی سب ایک ہی ہیں۔ غرض یہ عقیدہ اسلام کی جڑ اکھاڑ دینے کے لیے بنایا گیا ہے، پھر کیسی توحید اور کہاں کی نماز، غرض سب کچھ ایک ہے تو دین کی کون سی چیز باقی رہے گی۔

② وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا ...... : یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کو تین میں سے تیسرا قرار دینے سے باز نہ آئیں اور خالص توحید اختیار نہ کریں، جس کی طرف انبیاء دعوت دیتے رہے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے۔

آیت 74 اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ ...... : یہ بظاہر سوال ہے مگر اصل میں امر (حکم دینے) کی ایک صورت ہے۔ (کبیر)

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، یقیناً اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے اور اس کی ماں صدیقہ ہے، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔ دیکھ ان کے لیے ہم کس طرح کھول کر آیات بیان کرتے ہیں، پھر دیکھ کس طرح پھیرے جاتے ہیں ﴿۷۵﴾ کہہ دے کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمھارے لیے نہ کسی نقصان کی مالک ہے اور نہ نفع کی، اور اللہ ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۷۶﴾

---

یعنی ان کا یہ جرم انتہائی سنگین اور صریحاً شرک کی حد تک پہنچا ہوا ہے، تاہم اگر توبہ کر لیں تو ان کا یہ قصور معاف ہو سکتا ہے۔

**آیت 75** ① مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ …… : مسیح علیہ السلام ایک رسول کے سوا کچھ نہیں، یعنی تم جو کچھ کہتے ہو خدا یا خدا کا بیٹا، وہ ہرگز نہیں، وہ تو صرف اللہ کا رسول ہے۔ اسے قصر اضافی کہتے ہیں۔ اس میں یہود کی تردید بھی ہو گئی جو معاذ اللہ مریم اور مسیح علیہما السلام کے متعلق گستاخی کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔

② وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ : یعنی بندگی کے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں، جو نبوت کے بعد دوسرا درجہ ہے، یعنی نہایت سچی اور اللہ اور اس کے رسولوں کی بہت تصدیق کرنے والی تھیں۔ دیکھیے سورۂ تحریم (۱۲) اور سورۂ نساء (۶۹) وہ نبی نہیں تھیں، جیسا کہ ابن حزم وغیرہ کا خیال ہے، کیونکہ انبیاء رجال (مردوں) ہی سے ہوئے ہیں۔ دیکھیے یوسف (۱۰۹)، نحل (۴۳) اور انبیاء (۷) ابو الحسن اشعری نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ (ابن کثیر) بھلا ایک عورت، خواہ کتنی شان والی ہو، تین خداؤں میں سے ایک بن گئی؟

③ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ : یعنی وہ دونوں عام انسانوں جیسے انسان تھے، ان میں وہ تمام بشری خصوصیتیں اور ضروریات پائی جاتی تھیں جو دوسرے انسانوں میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کلام نہایت ہی نفیس اور بلیغ ہے۔ کھانا کھانے کا لازمی نتیجہ قضائے حاجت ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا، صرف یہ کہہ دیا کہ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اب کھانا کھانے سے جتنی چیزوں کا انسان محتاج ہوتا ہے ان کے ہوتے ہوئے اسے خدا یا اس کی بیوی یا اس کا بیٹا قرار دینا کتنی بڑی جہالت اور ظلم ہے۔ جو خود محتاج ہو وہ دوسروں کی حاجت کیا پوری کرے گا!؟

④ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ …… : یعنی توحید کے اتنے صاف بیان اور تثلیث کی اتنی واضح تردید کے باوجود وہ اپنے گروہی تعصب کی بنا پر اپنے غلط عقیدے سے چمٹے رہیں تو چمٹے رہیں، ورنہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل ان کے پاس نہیں ہے جس کے بودے پن کو "دو اور دو چار" کی طرح واضح نہ کر دیا گیا ہو۔ (ابن کثیر)

**آیت 75** قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ …… : یہ نصاریٰ کے عقیدے کی تردید پر دوسری دلیل ہے، مطلب یہ ہے کہ

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

کہہ دے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق حد سے نہ بڑھو اور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے ﴿۷۷﴾

جن کی تم عبادت کرتے ہو ان میں الوہیت (معبود ہونے) کا کوئی وصف بھی نہیں ہے، ان کا دوسروں کو نفع پہنچانا یا نقصان سے بچانا تو کجا وہ تو خود اپنے سے دشمنوں کے ظلم کو دفع کرنے کے لیے اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ! مجھ سے مصیبت کا یہ وقت ٹال دے۔ پھر اس کے بعد اگر اس سمیع و علیم کو چھوڑ کر عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا معبود بناؤ تو اس سے بڑھ کر جہالت اور کیا ہو گی۔

آیت 77 ① قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ ...... : یہود و نصاریٰ کی الگ الگ تردید کے بعد اب دونوں کو مخاطب فرمایا ہے۔ (کبیر) نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے معاملہ میں غلو کیا اور ایک بشر جسے اللہ تعالیٰ نے نبوت بخشی تھی اور اسے اپنی قدرت کاملہ کی نشانی قرار دیا تھا (دیکھیے زخرف: ۵۹۔ مومنون: ۵۰) اسے معبود کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ دوسری طرف یہودیوں نے انھیں جھوٹا قرار دیا، ان سے انتہائی توہین آمیز سلوک کیا، ان پر اور ان کی والدہ پر تہمت طرازی کی اور ان کے قتل کے درپے ہوئے، بلکہ بقول یہود و نصاریٰ یہود نے مسیح علیہ السلام کو سولی دے دی اور ان کی پسلیوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ (کبیر، ابن کثیر) حقیقت یہ ہے کہ دین میں جو بھی خرابی آئی ہے وہ اسی غلو (راہ اعتدال کو چھوڑنے) کی وجہ سے آئی ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بار بار نصیحت فرمائی: ”مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح نصاریٰ نے مسیح ابن مریم (علیہما السلام) کو حد سے بڑھا دیا تھا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، اس لیے تم مجھے اس کا بندہ اور رسول ہی کہو۔“ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب: ﴿ واذكر في الكتاب مريم ...... ﴾ : ٣٤٤٥ ] مگر مسلمانوں نے بھی اس قدر غلو کیا کہ اپنے ائمہ کو نبی کا درجہ دے کر ان کی بے دلیل بات پر عمل کو بھی واجب قرار دیا اور جو ایسا نہ کرے اسے لامذہب قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ تعالیٰ والی صفات ہونے کا عقیدہ اپنا لیا کہ وہ بھی ہر بات سنتے اور جانتے ہیں اور کائنات میں ان کا حکم بھی چلتا ہے۔ بعض نے اللہ اور رسول کو ایک ہی ذات قرار دیا، اگر کوئی ان کی تردید کرے تو کہتے ہیں کہ یہ اولیاء کو، نبی کو اور اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے، حالانکہ ہم اللہ کو اپنا معبود اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول اور اولیاء کو اللہ کے مقرب بندے مانتے ہیں، مگر اولیاء کو نبی نہیں مانتے اور رسول کو اللہ تعالیٰ نہیں مانتے۔

② قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ ...... : پہلے فرمایا: ﴿ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ ﴾ (اس سے پہلے گمراہ ہو چکے) آخر میں پھر فرمایا: ﴿ وَ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ (اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے) گو یہ دونوں جملے بظاہر ایک ہی ہیں، مگر علماء نے لکھا ہے کہ اول سے مراد یہ ہے کہ وہ گمراہ ہوئے اور دوسرے ”ضَلُّوْا“ سے مراد یہ ہے کہ وہ اب تک اس گمراہی پر جمے ہوئے ہیں اور یہ بھی

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

وہ لوگ جنھوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، ان پر داؤد اور مسیح ابن مریم کی زبان پر لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ﴿۷۸﴾ وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے، جو انھوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے، بے شک برا ہے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۷۹﴾

ہوسکتا ہے کہ پہلی گمراہی سے مراد عقیدہ کی گمراہی اور دوسری سے مراد عمل کی گمراہی ہو۔ یعنی اپنے سے پہلے لوگوں کے پیچھے مت چلو جنھوں نے کسی نبی (مثلاً عزیر یا عیسیٰ علیہما السلام) کو الٰہ بنایا، کسی نبی (مثلاً داؤد، مسیح، ان کی والدہ اور لوط علیہم السلام) پر زنا وغیرہ کی تہمتیں لگائیں اور کسی کو قتل کر دیا، ان کاموں کے ساتھ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور آخر وقت تک سیدھے راستے پر نہیں آئے۔ ''ان کے پیچھے مت چلو'' سے معلوم ہوا کہ یہ گمراہیاں ان میں پہلے لوگوں کی تقلید کی وجہ سے آئی تھیں، تم یہ کام مت کرنا۔

**آیت 78** لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ...... : اسرائیلیوں کا یہ کفر اپنے اپنے پیغمبروں کے مقابلے میں تھا، چنانچہ داؤد علیہ السلام کے زمانے میں انھوں نے قانون ''سبت'' کو توڑا اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی نبوت سے انکار کر دیا۔ داؤد علیہ السلام کی زبانی لعنت کے لیے دیکھیے زبور (۷۸: ۲۱، ۲۲، ۲۳) اور مسیح علیہ السلام کی زبانی لعنت کے لیے دیکھیے انجیل متی (۲۳: ۳۱، ۳۲) لعنت کا معنی اللہ کی رحمت اور بھلائی سے دوری ہے۔

**آیت 78** كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ ...... : ''لَا يَتَنَاهَوْنَ'' باب تفاعل سے ہے، اس کا معنی باز آنا بھی ہے اور ایک دوسرے کو منع کرنا بھی۔ یہاں پچھلی آیت میں مذکور ان کی نافرمانی اور حد سے گزرنے کی تفسیر ہے کہ ایک تو وہ جب کوئی برا کام کرتے اس پر ڈٹ جاتے، باز ہی نہیں آتے تھے، یعنی گناہ پر ندامت کے بجائے اس پر اصرار کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک دوسرے کو برائی سے منع نہیں کرتے تھے، ان کے نیک لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اگر کچھ لوگ برے کام کر رہے ہیں تو کرتے رہیں، ان کا وبال خود ان پر ہوگا، ہم تو اپنی جگہ نیک ہیں، حالانکہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو اور دل سے نفرت بھی نہ ہو تو ایمان کا آخری درجہ، یعنی کمزور ترین ایمان بھی نہیں رہتا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل دے، اگر یہ طاقت نہ رکھے تو اپنی زبان کے ساتھ، اگر یہ بھی نہ ہو تو دل کے ساتھ اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' [ مسلم، الإیمان، باب کون النهی عن المنكر عن الإیمان...... : ٤٩ ]

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم ضرور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے منع کرو گے، یا پھر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنے ہاں سے عذاب بھیج دے، پھر تم اس سے دعا کرو گے تو وہ تمھاری دعا قبول نہیں کرے گا۔'' [ أحمد : ٥/٣٨٨، ح : ٢٣٣٦٣۔ ترمذی : ٢١٦٩، وحسنه الترمذی والألبانی ]

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا

تو ان میں سے بہت سوں کو دیکھے گا وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جنھوں نے کفر کیا۔ یقیناً برا ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان پر غصے ہوگیا اور عذاب ہی میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۸۰﴾ اور اگر وہ اللہ اور نبی پر اور اس پر ایمان رکھتے ہوتے جو اس کی طرف نازل کیا گیا ہے تو انھیں دوست نہ بناتے اور لیکن ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں ﴿۸۱﴾ یقیناً تو ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں، سب لوگوں سے زیادہ سخت عداوت

**آیت 80** ① تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ …… : یعنی ان کے پہلے لوگوں کی وہ حالت تھی اور اب جو موجود ہیں ان کی یہ حالت ہے۔ (کبیر) جیسے کعب بن اشرف اور مدینہ کے یہودی قبائل کے دوسرے افراد، جو مسلمانوں کی دشمنی میں مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین سے دوستی رکھتے تھے۔

② لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ …… : یعنی کفار (مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ) سے دوستی قائم کر کے اہل کتاب نے مسلمانوں کے خلاف جو تیاری کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ان پر اللہ کا غضب ہوا اور آخرت میں بھی وہ دائمی عذاب کے مستحق قرار پائے۔

**آیت 81** وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ …… : یعنی اگر وہ واقعی اللہ تعالیٰ پر اور اپنے نبی (موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام) پر اور ان پر نازل شدہ کتاب (تورات و انجیل) پر ایمان رکھتے تو کبھی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی قائم نہ کرتے، کیونکہ تورات میں اس کام کو حرام کہا گیا ہے، یا یہ کہ اگر وہ کفار صدق دل سے ایمان لائے ہوتے، نفاق کے مریض نہ ہوتے تو پھر یہ کبھی ان سے دوستی پیدا نہ کرتے۔

**آیت 82** ① لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً …… : اس لیے کہ یہودیوں میں عناد و انکار، حق سے دشمنی، تکبر اور اہل علم و ایمان کی تنقیص کا جذبہ بہت پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبیوں کو جھٹلانا بلکہ قتل کر دینا ان کا شعار رہا ہے، حتیٰ کہ انھوں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے قتل کی سازش کی، آپ پر جادو بھی کیا اور ہر طرح نقصان پہنچانے کی مذموم کوشش کی۔ اس معاملے میں مشرکین کا حال بھی یہی ہے۔ یہ واقعی ایک حقیقت ہے جس کا اس زمانے میں بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، آج بھی جو دشمنی یہودیوں اور مشرکوں (گائے اور بتوں کے پجاری ہندوؤں، دہریوں اور کمیونسٹوں) کو مسلمانوں سے ہے وہ بہرحال نصرانیوں کو نہیں ہے، ہاں جن نصرانیوں پر یہودیت غالب ہے وہ واقعی مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں۔

② ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ …… : یہود و نصاریٰ کی مسلم دشمنی میں جو فرق مذکور ہوا یہ اس کی علت ہے، جس طرح یہود کے عالم کو حبر کہا جاتا ہے، جس کی جمع احبار ہے، اسی طرح نصاریٰ کے رئیس اور عالم قسیس کہلاتے ہیں، یعنی جن لوگوں نے کہا

الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۸۲﴾

رکھنے والے یہود کو اور ان لوگوں کو پائے گا جنھوں نے شریک بنائے ہیں اور یقیناً تو ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں، ان میں سے دوستی میں سب سے قریب ان کو پائے گا جنھوں نے کہا بے شک ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ بے شک ان میں علماء اور راہب ہیں اور اس لیے کہ بے شک وہ تکبر نہیں کرتے ﴿۸۲﴾

کہ ہم نصاریٰ ہیں، جو واقعی عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ مسلمانوں کے نسبتاً قریب ہیں، کیونکہ ان میں علم اور زہد یعنی دنیا سے بے رغبتی پائی جاتی ہے اور دین مسیحی میں نرمی اور عفو و درگزر کی تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ پھر ان میں علماء، عبادت گزار اور زاہد لوگ بھی ہوتے ہیں، جو تواضع اختیار کرتے ہیں، یہودیوں کی طرح کبر و غرور میں مبتلا نہیں ہوتے۔ نصرانیوں میں رہبانیت (دنیا سے کنارہ کشی) کی بدعت رائج تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا، فرمایا: ﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [ الحدید : ۲۷ ] ”اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔“ رہبانیت بے شک یہودیوں کی دنیا پرستی اور سخت دلی کے مقابلے میں قابل تعریف تھی، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رہبانیت ہر لحاظ سے قابل تعریف اور اچھی چیز ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر یہود اور مشرکین کی نسبت نصرانیوں کو مسلمانوں کے زیادہ قریب قرار دیا۔ ورنہ جہاں تک خود اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کا تعلق ہے تو بغض و عناد نصرانیوں میں بھی موجود ہے، جیسا کہ صلیب و ہلال کی صدیوں پر محیط لڑائیوں سے واضح ہے اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور اب تو اسلام کے خلاف مشرکین کے ساتھ یہودی اور نصرانی دونوں اکٹھے ہو گئے ہیں، اسی لیے قرآن نے مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ کی دوستی سے بھی منع فرمایا ہے۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا ہے تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی ہوتی ہیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، سو ہمیں شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لے ﴿۸۳﴾

آیت 83 ① وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ ...... : مفسرین کے بیان کے مطابق ان سے مراد نصاریٰ کے وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو میں نے کھانا تیار کیا اور اسے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سلمان! یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''صدقہ ہے۔'' تو آپ نے اپنے اصحاب سے کہا کھاؤ اور خود نہیں کھایا۔ چنانچہ میں واپس آ گیا، پھر کچھ کھانا اکٹھا کیا اور اسے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ نے فرمایا: ''سلمان! یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''ہدیہ ہے۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا اور کھایا اور (ساتھ ہی) اپنے ساتھیوں سے بھی فرمایا کہ کھاؤ۔ میں نے کہا: ''آپ مجھے نصاریٰ کے متعلق بتائیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں کوئی خیر نہیں ہے۔'' میں بوجھل دل کے ساتھ اٹھ آیا، تو اللہ عزوجل نے یہ آیات نازل کیں: ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ ...... تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف پیغام بھیجا اور مجھے فرمایا: سلمان! یہ (آنسوؤں والے) تیرے وہ ساتھی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔'' [ المعجم الکبیر : ۶/ ۴۹، ح : ۶۱۲۱ ] سلیم الہلالی اور ان کے ساتھی نے اس حدیث کو کتاب ''الاستیعاب فی بیان الاسباب'' میں صحیح کہا ہے۔

ان لوگوں میں نجاشی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی بھی شامل ہیں کہ جب مکہ میں مسلمان ہونے والے صحابہ ہجرت کر کے نجاشی کے ملک حبشہ میں گئے اور انھیں کفار مکہ کے سفیروں کی شکایت پر بادشاہ کے دربار میں بلایا گیا تو جعفر رضی اللہ عنہ نے اس کے سامنے تقریر کی اور اس میں سورۂ مریم کی تلاوت کی، جس میں مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا ذکر ہے، تو نجاشی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور نجاشی (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہو گئے، اگرچہ وہ مدینہ نہیں جا سکے مگر ان کی وفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا غائبانہ جنازہ پڑھایا۔ اس کے علاوہ ایسے مسلمان ہونے والے نصاریٰ کا ذکر دوسرے مقامات پر بھی فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۹۹) اور سورۂ قصص (۵۲ تا ۵۵) اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوہرے اجر کی بشارت دی۔ [ بخاری، العلم، باب تعلیم الرجل أمته وأهله : ۹۷ ]

② فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ: یعنی ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل فرما کر ان کی طرح شہادت دینے والوں میں شامل فرما۔ امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت سے متعلق دیکھیں سورۂ بقرہ (۱۴۳) یا یہ کہ انبیاء اور مومنین جو توحید کی گواہی دیتے ہیں، ان کی جماعت میں شامل فرما۔

وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ (پر) اور اس چیز پر ایمان نہ لائیں جو حق میں سے ہمارے پاس آئی ہے اور یہ طمع نہ رکھیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ داخل کر لے گا ﴿۸۴﴾ تو اللہ نے اس کے بدلے میں جو انھوں نے کہا، انھیں ایسے باغات دیے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی نیکی کرنے والوں کی جزا ہے ﴿۸۵﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہی لوگ بھڑکتی آگ والے ہیں ﴿۸۶﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۸۷﴾

**آیت 84** مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ: اور یہ طمع نہ رکھیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ داخل کرے گا، یعنی ہمارا حشر مسلمانوں کے ساتھ فرمائے گا۔ اس صورت میں ''وَنَطْمَعُ'' کا عطف ''لَا نُؤْمِنُ'' پر ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''نَطْمَعُ'' کا جملہ ''لَا نُؤْمِنُ'' کی ضمیر سے حال ہو اور مطلب یہ ہو کہ ہم کیوں ایمان نہ لائیں، حالانکہ ہم طمع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں اپنے نیک بندوں کے ساتھ داخل کرے، یعنی ہمیں ضرور ایمان لانا چاہیے، ایمان لائے بغیر قیامت کے دن نیک بندوں کے ساتھ داخل ہونے کی توقع اور طمع سراسر جہالت اور حماقت ہے۔

**آیت 87** لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ ......: عہد توڑنے کے سلسلہ میں یہود و نصاریٰ سے مباحثہ کے بعد اب اصل موضوع کی طرف پھر توجہ کی ہے، یعنی ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' کی تشریح جو اس سورت کا بنیادی موضوع ہے۔ (قرطبی، رازی) نصاریٰ کے راہبوں کی تعریف کے بعد پاکیزہ چیزوں کو حرام ٹھہرانے سے منع کرنا اس لیے بھی زیادہ مناسب تھا کہ انھوں نے ان باتوں کو نیکی میں داخل کر رکھا تھا، لہٰذا مومنین کو اس سے منع فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ نے رہبانیت سے متعلق فرمایا: ﴿ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [ الحدید : ۲۷ ] ''اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔''

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو چیز شرع میں صاف حلال ہو اس سے پرہیز کرنا برا ہے، یہ دو طرح سے ہوتا ہے، ایک زہد سے، یہ رہبانیت ہے جو ہمارے دین میں پسندیدہ نہیں ہے، اس کے بجائے تقویٰ اختیار کیا جائے، یعنی ممنوع چیز کے قریب نہ جائے۔ دوم یہ کہ کسی مباح (جائز) کام کے نہ کرنے کی قسم کھا لے، یہ بھی بہتر نہیں، اسے چاہیے کہ قسم توڑے اور کفارہ ادا کرے۔'' (موضح) انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے گھروں میں آئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

اور اللہ نے تمھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے حلال، طیب کھاؤ اور اس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھنے والے ہو ﴿۸۸﴾ اللہ تم سے تمھاری قسموں میں لغو پر مؤاخذہ نہیں کرتا اور لیکن تم سے اس پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تم نے پختہ ارادے سے قسمیں کھائیں۔ تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، درمیانے درجے کا، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک گردن آزاد کرنا، پھر جو نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمھاری

---

کی عبادت کے متعلق دریافت کر رہے تھے، جب انھیں اس کے متعلق بتایا گیا تو جیسے انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے، ہماری رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ کے تو پہلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا، میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا، میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی افطار نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ آئے تو فرمایا: ''تمھی لوگوں نے اس اس طرح کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس سے بچنے والا ہوں، لیکن روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، تو جو میری سنت سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔'' [مسلم، النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه...... : ۱۴۰۱۔ بخاری : ۵۰۶۳ ] اس سلسلے میں اور بھی کئی روایات ہیں جن میں سے بعض میں یہ تصریح ہے کہ یہ آیت ایسے ہی کسی موقع پر نازل ہوئی۔ چنانچہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگ کرتے تھے، ہمارے ساتھ بیویاں نہیں تھیں تو ہم نے عرض کیا، ہم خصی نہ ہو جائیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرما دیا، پھر ہمیں رخصت دے دی کہ ہم کپڑے کے ساتھ عورت سے نکاح کر لیں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ ﴾ [ بخاری، التفسیر، باب قوله تعالى : ﴿ يأيها الذين آمنوا ...... ﴾ : ۴۶۱۵ ] واضح رہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے متعہ ہمیشہ کے لیے حرام فرما دیا، چنانچہ سبرہ (بن معبد) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! میں نے تمھیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت کے دن تک حرام فرما دیا ہے تو جس شخص کے پاس ایسی عورتوں میں سے کوئی موجود ہو وہ اسے چھوڑ دے اور تم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لو۔'' [ مسلم، النکاح، باب نكاح المتعة وبيان أنه ...... : ۲۱ / ۱۴۰۶ ]

آیت 88 یعنی حلال کو حرام تو نہ ٹھہراؤ، ہاں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور جو چیزیں حرام ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

آیت 89 ① ''الْاَيْمَانَ'' یہ ''يَمِيْنٌ'' کی جمع ہے، بمعنی قسم۔ اس مقام پر یہ دوسرا حکم ہے کہ اگر کوئی طیبات (پاکیزہ چیزیں) چھوڑنے کی قسم کھالے تو اس کا کیا حکم ہے۔ قسم کی تین قسمیں ہیں: ① یمین لغو، جو بے ساختہ عادت کے طور پر زبان

اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَ احْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۸۹ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰

قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم شکر کرو ﴿۸۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور شرک کے لیے نصب کردہ چیزیں اور فال کے تیر سراسر گندے ہیں، شیطان کے کام سے ہیں، سو اس سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۹۰﴾

---

سے یوں ہی نکل جاتی ہے، جیسے ''لَا وَاللّٰهِ وَبَلٰى وَاللّٰهِ'' (نہیں! اللہ کی قسم، یا کیوں نہیں! اللہ کی قسم) ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے نہ سزا۔ ② یمین غموس، یعنی جھوٹی قسم، جو انسان نیت اور ارادہ کے ساتھ دھوکا و فریب دینے کے لیے جھوٹ بول کر قسم اٹھائے کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں ہوا، حالانکہ اس کی قسم واقعہ کے خلاف ہو۔ یہ کبیرہ گناہ ہے، اس کا کوئی کفارہ نہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ سچے دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرے، کیونکہ اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ③ منعقد ہونے والی قسم، یعنی ارادے اور نیت کے ساتھ قسم کھائے کہ میں ایسا کروں گا یا نہیں کروں گا، پھر اگر وہ قسم پوری نہ کر سکے تو اس آیت میں اس کا کفارہ بیان ہوا ہے۔ جو یہ ہے کہ تین کاموں میں سے جو چاہے اختیار کر لے، یعنی دس مسکینوں کو اوسط (درمیانے) درجے کا کھانا کھلانا، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک گردن آزاد کرنا، اگر ان تینوں ہی کی طاقت نہ ہو تو تین روزے رکھے۔ بعض اہل علم نے اوسط کا معنی افضل لکھا ہے، لغت میں یہ معنی بھی موجود ہے، فرمایا: ﴿جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [ البقرۃ : ۱۴۳ ] اور آیت: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ [ البقرۃ : ۲۳۸ ] یہ تین روزے خواہ پے در پے رکھے یا الگ الگ، دونوں طرح درست ہے۔

② وَ احْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ : یعنی قسم توڑنے سے پرہیز کرو، لیکن اگر اسے توڑ دو تو اس کا کفارہ ادا کرو۔ ہاں، اگر وہ قسم کوئی ناجائز کام کرنے کی ہے تو وہ ہرگز پوری نہ کرو بلکہ توڑ دو، اس کا کفارہ ہے یا نہیں، اہل علم کا اس میں اختلاف ہے، بہتر ہے کہ ادا کر دو اور اگر یہ قسم کسی جائز کام کے چھوڑنے کی ہے تو اسے توڑ کر کفارہ ادا کر دو۔ عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی کام پر قسم کھاؤ اور اس کے علاوہ دوسرے کام کو بہتر سمجھو تو بہتر کام کر لو اور قسم کا کفارہ ادا کر دو۔''
[ بخاری، الأیمان والنذور، باب قول اللہ تعالی : ﴿لا یؤاخذکم اللہ......﴾ : ٦٦٢٢ ]

③ اگر کسی نے کوئی نذر مانی ہو اور اسے پورا نہ کر سکے تو اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا ہے۔ [ مسلم، النذر، باب فی کفارۃ النذر : ١٦٤٥، عن کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ ]

آیت 90 ① اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ ...... : یہ شراب کے سلسلے میں تیسرا اور آخری حکم ہے، جس کے بعد وہ قطعی حرام قرار دے دی گئی، اس سے پہلے دو حکم آ چکے تھے، پہلا حکم سورۂ بقرہ (۲۱۹) میں اور دوسرا سورۂ نساء (۴۳) میں، مگر ان دونوں آیتوں میں قطعی حرمت کا ذکر نہیں تھا، اس لیے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کی آیات نازل ہونے کے بعد کہا

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والے ہو ﴿۹۱﴾

"یا اللہ! ہمارے لیے شراب کے بارے میں واضح حکم فرما۔" آخر صریح حرمت کی یہ آیت تین مزید چیزوں کی حرمت کے ساتھ اتری۔ [ نسائی، الأشربۃ، باب تحریم الخمر : ۵۵۴۲ ]

❷ "اَلْخَمْرُ" کی تفسیر خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی، چنانچہ صحیح مسلم میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ » "ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے (خواہ کسی بھی چیز سے بنی ہو)۔" [ مسلم، الأشربۃ، باب بیان أن کل مسکر خمر...... : ۲۰۰۳ ] خلافت اسلامیہ کو برباد کرنے کے اسباب میں سے یہ بھی ایک بڑا سبب ہے کہ بعض علماء نے صرف انگور اور کھجور کی شراب پینے پر حد لازم قرار دی، باقی ہر نشہ آور چیز پینے پر حد ختم کر دی، خواہ وہ کسی چیز سے بنی ہو اور خواہ اس سے نشہ کیوں نہ آ جائے۔ اب جن اسلامی خلافتوں میں ام الخبائث کی کئی قسمیں پینے پر حد معاف ہو وہاں رعایا، لشکر اور خلفاء کا کیا حال ہو گا؟

❸ اس آیت اور اس سے اگلی آیت سے شراب اور جوئے کی حرمت سات وجھوں سے ثابت ہوتی ہے، اسی لیے اسے "ام الخبائث" قرار دیا گیا ہے: ① "رِجْسٌ" گندی چیز ہے۔ ② عمل شیطان ہے۔ ③ "فَاجْتَنِبُوْهُ" امر کا صیغہ فرض کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ اس سے اجتناب فرض ہے، لہٰذا پینا حرام ہے۔ ④ "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" اس کے ترک سے فلاح کی امید ہے، ورنہ نہیں۔ ⑤ شیطان اس کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈالنا چاہتا ہے اور عداوت اور بغض پیدا کرنے والا ہر کام حرام ہے۔ ⑥ اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنا چاہتا ہے۔ یہ بھی اس کی حرمت کی ایک وجہ ہے۔ ⑦ "تو کیا تم باز آنے والے ہو؟" یہ سوال کی صورت میں امر ہے اور امر فرض کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا صحابہ رضی اللہ عنہم نے سن کر کہا "اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا" یعنی ہم باز آ گئے، ہم باز آ گئے۔ چنانچہ صحابہ نے شراب کے مٹکے توڑ دیے اور شراب گلیوں میں بہنے لگ گئی۔ اتنی صراحتوں کے باوجود کفار کے نمائندے کئی لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں شراب کہاں حرام ہے؟

❹ "اَلْمَيْسِرُ" علماء نے لکھا ہے کہ جس چیز میں بھی ہار جیت پر شرط لگائی جائے وہ جوا ہے، لاٹری، قسمت کی پڑی، انعامی بانڈ، انعامی معمے، انعامی سکیمیں سب جوئے کی قسمیں ہیں۔ کئی ظالم جوئے والی سکیموں پر عمرے یا حج کا انعام رکھ کر لوگوں کو پھنساتے ہیں، یاد رکھیں حرام مال اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا نہ حرام کے ساتھ کی ہوئی عبادت قبول ہے۔ انشورنش (بیمہ) سود اور جوئے کا بدترین مرکب ہے، بولی والی کمیٹی سراسر سود ہے اور شطرنج وغیرہ میں گو شرط نہ بھی لگائی جائے، پھر بھی یہ حرام ہے، کیونکہ یہ نماز سے غفلت کا سبب بنتی ہے۔

آیت 91 اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ ...... : جوئے اور شراب کی حرمت کا حکم دے کر اب ان کے

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور بچ جاؤ، پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمے تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے ﴿۹۲﴾ ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو وہ کھا چکے، جب کہ وہ متقی بنے اور ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، پھر وہ متقی بنے اور ایمان لائے، پھر وہ متقی بنے اور انھوں نے نیکی کی اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۹۳﴾

---

دینی اور دنیاوی نقصانات بیان فرمائے ہیں، دینی نقصان تو یہ کہ شراب اور جوا نماز اور ذکر الٰہی سے روکنے اور غافل کرنے کا سبب بنتے ہیں اور دنیاوی نقصان یہ کہ آپس میں عداوت اور کینہ پیدا کرتے ہیں اور ان دونوں میں ان خرابیوں کا پایا جانا بالکل واضح ہے۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں انصار اور مہاجرین کے کچھ لوگوں کے پاس آیا تو انھوں نے کہا، آؤ تمھیں کھلائیں اور شراب پلائیں۔ یہ شراب کی حرمت سے پہلے کی بات ہے، چنانچہ میں ان کے پاس ایک باغ میں گیا، وہاں ان کے پاس اونٹ کی بھنی ہوئی سری اور شراب کا ایک مشکیزہ تھا۔ میں نے ان کے ساتھ کھایا اور پیا، ان کے پاس مہاجرین و انصار کا ذکر ہوا تو میں نے کہا، مہاجرین انصار سے بہتر ہیں، تو ایک آدمی نے سری کا ایک جبڑا پکڑا اور مجھے دے مارا، جس سے میری ناک زخمی ہو گئی، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو یہ بات بتائی تو اللہ تعالیٰ نے شراب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ ﴾ [ مسلم، فضائل الصحابة، باب فى فضل سعد بن أبى وقاص، قبل ح : ۱۷۴۸ ]

**آیت 92** ① وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ: یعنی جوئے اور شراب سے باز رہنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت سے بچ جاؤ۔ (رازی، قرطبی) یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے مراد قرآن و سنت کی پیروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَلَا إِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ » ”مجھے کتاب یعنی قرآن دیا گیا ہے اور اس جیسی ایک اور چیز (حدیث) بھی۔“ [ أبو داؤد، السنة، باب فى لزوم السنة: ۴۶۰۴ وصححه الألبانی ]

② فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ ......: اس میں ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو اس حکم قطعی کے باوجود شراب نوشی اور جوئے سے باز نہیں آتے۔ (کبیر)

**آیت 93** ① لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... : یعنی اس کی حرمت سے پہلے ایمان اور عمل صالح والے جو لوگ شراب پیتے رہے اور جوا کھیلتے رہے، ان پر اس سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ یہ آیت اس وقت اتری جب شراب کی حرمت نازل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً اللہ تمھیں شکار میں سے کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائے گا، جس پر تمھارے ہاتھ اور نیزے پہنچتے ہوں گے، تاکہ اللہ جان لے کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے، پھر جو اس کے بعد حد سے بڑھے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۹۴﴾

ہونے کے بعد بعض صحابہ یہ کہنے لگے کہ ہمارے ان بھائیوں کا کیا حال ہوگا جو شراب پیتے اور جوا کھیلتے تھے اور ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے کیا بدلہ ملے گا جو جنگ احد میں شہید ہو گئے، حالانکہ شراب ان کے پیٹوں میں تھی۔ (کبیر، ابن کثیر)

❷ اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ...... : یہاں تقویٰ کا حکم تین دفعہ دینے سے مراد یا تو تاکید ہے یا پہلے ''اتَّقَوْا'' سے مراد شرک سے بچے، دوسرے تقویٰ سے مراد شراب سے بچے اور تیسرے تقویٰ سے مراد سب بری باتوں سے بچے یا تقویٰ پر قائم رہے۔

بعض نے لکھا ہے کہ پہلے ''اتَّقَوْا'' سے مراد شرک سے بچے، دوسرے سے مراد گناہوں سے بچے اور تیسرے سے مراد صغیرہ گناہوں سے بچے۔ اسی طرح ''اٰمَنُوْا'' میں پہلے ایمان سے مراد اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہے اور دوسرے سے مراد ایمان پر ثابت رہنا ہے۔ تیسری مرتبہ ''اٰمَنُوْا'' کے بجائے ''اَحْسَنُوْا'' فرمایا، یعنی لوگوں کے ساتھ احسان کریں اور عبادت میں احسان حاصل کریں جو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، پھر اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

آیت 94 ❶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ ...... : اس سے پہلے آیت: ﴿لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ [المائدۃ: ۸۷] میں حلال چیزوں کو حرام ٹھہرانے سے منع کیا تھا، اب اس آیت میں وہ حلال چیزیں ذکر کی ہیں جو کچھ وقت کے لیے بطورِ امتحان حرام فرمائی ہیں، یعنی احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا منع کر دیا، تاکہ فرماں برداروں اور نافرمانوں کی آزمائش ہو جائے کہ بن دیکھے اللہ سے کون ڈرتا ہے۔

❷ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ : یعنی چھوٹے جانور یا جانوروں کے بچے جنھیں تم ہاتھ سے پکڑ سکتے ہو، یا بڑے جانور جن کا تم نیزوں سے شکار کر سکتے ہو۔

❸ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ ...... : یعنی اب جبکہ احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کا شکار منع کر دیا گیا ہے۔ (قرطبی)

❹ یہ اور اگلی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب مسلمان حدیبیہ میں احرام باندھے ہوئے تھے اور خلاف معمول چھوٹے بڑے جنگلی جانور ان کے خیموں میں گھس آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان کے شکار سے منع فرما دیا۔ (ابن کثیر)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۹۵

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شکار کو مت قتل کرو، اس حال میں کہ تم احرام والے ہو اور تم میں سے جو اسے جان بوجھ کر قتل کرے تو چوپاؤں میں سے اس کی مثل بدلہ ہے جو اس نے قتل کیا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو انصاف والے کریں، بطور قربانی جو کعبہ میں پہنچنے والی ہے، یا کفارہ ہے مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا اس کے برابر روزے رکھنا، تاکہ وہ اپنے کام کا وبال چکھے۔ اللہ نے معاف کر دیا جو گزر چکا اور جو دوبارہ کرے تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ سب پر غالب، بڑے انتقام والا ہے ۝۹۵

آیت 95 ① یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ : محرم نہ شکار کرے نہ شکار میں کسی طرح مدد کرے، فرمایا: ﴿ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ﴾ [ المائدۃ : ۲ ] ''اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔'' ہاں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانچ جانور فاسق ہیں، انھیں حرم میں بھی قتل کیا جاتا ہے، یعنی چوہا، بچھو، چیل، کوا اور کاٹنے والا کتا۔'' [ بخاری، بدء الخلق، باب إذا وقع الذباب أحدکم ..... : ۳۳۱٤ ]

اہل علم نے فواسق، یعنی خواہ مخواہ ایذا دینے والے جانوروں میں ''اَلْکَلْبُ الْعَقُوْرُ'' شامل ہونے کی بنا پر سانپ، بھیڑیے، چیتے اور شیر وغیرہ کو مارنے کی اجازت اخذ کی ہے۔

② وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا ...... : یعنی احرام کی حالت میں جیسا شکار مارے اسی کی ''مثل'' کا فدیہ دے۔ مثل سے مراد یہ ہے کہ تن و توش، قد و قامت اور شکل و صورت میں اس سے ملتا جلتا ہو، جیسے ہرن کی جگہ بکرا۔

③ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ...... : یعنی دو عادل مسلمان مل کر فیصلہ کریں کہ اس شکار کی مثل کون سا جانور ہو سکتا ہے۔

④ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ : یعنی اس جانور کو مکہ معظمہ میں لے جا کر ذبح کیا جائے اور وہیں اس کا گوشت مسکینوں میں تقسیم کیا جائے، اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔

⑤ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ ...... : اس آیت میں ''اَوْ'' اختیار کے لیے ہے، یعنی شکار کرنے والے کو اختیار ہے کہ ان تینوں میں سے جو کفارہ چاہے ادا کر دے، شکار کردہ جانور کی مثل جانور کعبہ، یعنی حرم میں لے جا کر قربان کیا جائے، یا اس کی مثل کے مساوی قیمت کا غلہ بطور کفارہ مسکینوں میں تقسیم کیا جائے، یا اس کے برابر روزے رکھے جائیں۔ قاموس اور دوسری کتب لغت میں ''مُد'' کی تعریف یہ لکھی ہے کہ ایک معتدل قد والا آدمی دونوں ہاتھ پھیلا کر کوئی چیز اٹھائے تو وہ ایک مد ہے۔ صاحب

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩٦﴾

تمھارے لیے سمندر کا شکار حلال کر دیا گیا اور اس کا کھانا بھی، اس حال میں کہ تمھارے لیے سامانِ زندگی ہے اور قافلے کے لیے اور تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا ہے، جب تک تم احرام والے رہو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿٩٦﴾

قاموس کہتے ہیں میں نے تجربہ کر کے دیکھا تو اسے درست پایا۔ صاع چار مُد کا ہوتا ہے، آپ خود تجربہ کر کے دیکھ لیں، ایک مُد میں گندم آدھ کلو سے زیادہ نہیں آتی، ظاہر ہے دوسری اجناس کا وزن مختلف ہوگا۔ یعنی ہر دو مُد غلے (یعنی ایک کلو) کے بدلے میں ایک روزہ رکھے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۹۶) میں مذکور کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جو صحیح بخاری (۴۵۱۷، ۴۱۹۱، ۵۹۱۷) میں آئی ہے۔

❸ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ: یعنی زمانۂ جاہلیت میں یا اس حکم کے آنے سے پہلے احرام کی حالت میں جو شکار تم کر چکے ہو اسے اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، اب اس کا بدلہ دینا ضروری نہیں۔

آیت 96 ❶ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ ......: "الْبَحْرِ" سے مراد پانی ہے، اس میں سمندر اور غیر سمندر سب پانی برابر ہیں اور اس میں وہ تمام جانور شامل ہیں جو پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتے، وہ مچھلی ہو یا کوئی اور جانور۔ زندہ بھی پکڑے جائیں تو ذبح کی ضرورت ہی نہیں۔ قرآن و حدیث میں پانی کے شکار کو حلال کہا گیا ہے اور کسی صحیح حدیث میں یہ نہیں کہ مچھلی کے سوا سب حرام ہیں۔ "صَيْدُ الْبَحْرِ" سے مراد پانی کا ہر وہ جانور ہے جو زندہ پکڑا جائے اور "طَعَامُ" سے مراد پانی کا وہ جانور ہے جو وہیں مر جائے اور سمندر یا دریا اسے باہر پھینک دے، یا مر کر پانی کے اوپر آ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ تفسیر آئی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے: (( طَعَامُهُ مَا لَفِظَهُ الْبَحْرُ مَيْتًا )) یعنی اس آیت میں "طَعَامُ" سے مراد وہ جانور ہے جسے سمندر مردہ حالت میں کنارے پر پھینک دے۔ "هداية المستنير" کے مصنف نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ ابن جریر نے بہت سے صحابہ سے یہی معنی نقل فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے صرف مچھلی کو حلال اور پانی کے دوسرے تمام جانوروں کو حرام کہہ دیا ہے اور وہ بھی صرف وہ جو زندہ پکڑی جائے، اگر مر کر پانی کے اوپر آ جائے تو اسے حرام کہتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں، کیونکہ وہ اس آیت کے خلاف ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سمندر کے پانی کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: (( هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ، الْحِلُّ مَيْتَتُهُ )) "سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے۔" [ الموطأ، الطهارة، الطهور للوضوء : ۱۲۔ أبوداوٗد : ۸۳۔ ترمذی : ۶۹، صححه الألبانی ] اسی طرح کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی مہم پر بھیجا، ان کے پاس کھانے کی چیزیں ختم ہوگئیں تو انھوں نے ٹیلے جیسی ایک بہت بڑی مچھلی دیکھی، جسے سمندر کا کنارے پر چھوڑ کر ہٹ چکا تھا۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ امیر تھے، انھوں نے اسے کھانے کی اجازت دے دی، ایک ماہ تک تین سو

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

اللہ نے کعبہ کو، جو حرمت والا گھر ہے، لوگوں کے قیام کا باعث بنایا ہے اور حرمت والے مہینے کو اور قربانی کے جانوروں کو اور پٹوں (والے جانوروں) کو۔ یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور یہ کہ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۹۷﴾

آدمی اسے کھاتے رہے اور خشک کر کے ساتھ بھی لے آئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمھارے پاس اس کا کچھ گوشت ہے تو ہمیں بھی دو۔“ چنانچہ صحابہ نے کچھ گوشت آپ ﷺ کی طرف بھیجا تو آپ نے تناول فرمایا۔ [ مسلم، الصید والذبائح، باب إباحة میتات البحر : ۱۹۳۵ ]

② مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ: اس سے یہ اشارہ فرمایا کہ یہ رخصت تمھارے فائدے کے لیے ہے، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حج کے طفیل حلال ہوئی ہے، یعنی سمندر کا جانور محرم وغیر محرم سب کے لیے حلال ہے۔

آیت 97 ① جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ...... : اوپر کی آیت میں محرم کے لیے شکار کو حرام قرار دیا، اب اس آیت میں بتایا کہ جس طرح حرم کو اللہ تعالیٰ نے وحشی جانوروں اور پرندوں کے لیے سبب امن قرار دیا ہے اسی طرح اسے لوگوں کے لیے بھی جائے امن بنا دیا ہے اور دینوی اور اخروی سعادتیں حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ (کبیر) دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۷)، سورۂ قصص (۵۷) اور سورۂ بقرہ (۱۲۵) یعنی اہل مکہ کی معاش (روزی) کا مدار اسی پر ہے کہ لوگ دور دراز سے حج اور تجارت کے ارادے سے یہاں پہنچتے ہیں اور ہر قسم کی ضروریات ساتھ لاتے ہیں، جس سے اہلِ مکہ رزق حاصل کرتے ہیں اور لوگ یہاں پہنچ کر امن و امان پاتے ہیں، حتیٰ کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی حرم کے اندر کوئی شخص اپنے باپ یا بیٹے کے قاتل تک کو کچھ نہیں کہتا تھا اور عبادت و ثواب کے اعتبار سے یہ بہترین جگہ ہے۔ الغرض! یہ تمام چیزیں لوگوں کے قیام کا باعث ہیں۔ (کبیر، فتح القدیر) کعبۃ اللہ لوگوں کے قائم رہنے کا ایک ذریعہ ہے، کیونکہ قیامت کے قریب جب ایک حبشی کعبۃ اللہ کو گرا دے گا تو اس کے بعد بہت جلد قیامت آجائے گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کعبہ کو دو پتلی پنڈلیوں والا حبشی گرائے گا۔“ [ بخاری، الحج، باب هدم الكعبة : ۱۵۹۶۔ مسلم : ۲۹۰۹ ]

② وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ : حرمت والے مہینے چار ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ ان چار مہینوں میں لوگ امن سے سفر اور تجارت کرتے اور سال بھر کی ضروریات جمع کر لیتے تھے، اس اعتبار سے یہ مہینے بھی گویا لوگوں کی زندگی قائم رہنے کا ذریعہ ہیں۔

③ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ: ان کا لوگوں کے لیے قیام کا سبب ہونا اس اعتبار سے ہے کہ ہدی (قربانی) کا گوشت مکہ کے فقراء میں تقسیم ہوتا اور ہدی اور قلادہ والے جانور کوئی شخص لے کر چلتا تو اس کا تمام عرب احترام کرتے۔ مقصد کعبہ کی عظمت کو بیان کرنا تھا، اس کے ساتھ ان چیزوں کا بھی ذکر کر دیا، کیونکہ ان کا تعلق بھی بیت اللہ سے ہے۔ (کبیر)

④ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ ...... : ”ذٰلِكَ“ (یہ) یعنی اللہ تعالیٰ کا ان چیزوں کو لوگوں کے قیام کا باعث بنانا اس لیے ہے کہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کی تفصیل جانتا ہے اور اس نے اپنے علم کے مطابق لوگوں کے قیام اور فائدے کے لیے یہ

اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

جان لو! بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے اور بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۹۸﴾ رسول پر پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو ﴿۹۹﴾ کہہ دے ناپاک اور پاک برابر نہیں، خواہ ناپاک کی کثرت تجھے تعجب میں ڈالے۔ پس اللہ سے ڈرو اے عقلوں والو! تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۱۰۰﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان چیزوں کے بارے میں سوال مت کرو جو اگر تمھارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں اور اگر تم ان کے بارے میں اس وقت سوال کرو گے جب قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو تمھارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۱۰۱﴾

---

احکام جاری فرمائے ہیں۔ ﴿ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی تمام تفصیلات جانتا ہے اور اسے خوب معلوم ہے کہ تمھاری دینی اور معاشی بہتری کس چیز میں ہے اور کس چیز میں نہیں۔

**ت 98** اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ...... : لہٰذا تم ایک طرف اس کے عذاب سے بھی پناہ مانگتے رہو اور دوسری طرف اس کی رحمت کے بھی امیدوار رہو۔ اصل ایمان یہ ہے کہ بندے پر خوف و رجا (ڈر اور امید) کی حالت طاری رہے، فرمایا: ﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ﴾ [ الأعراف: ٥٦ ] ''اور اسے خوف اور طمع سے پکارو۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر مومن کو اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ سزا (عذاب کا علم ہو جائے تو کوئی جنت کی طمع نہ کرے اور اگر کافر کو اللہ تعالیٰ کی رحمت (کی وسعت) کا علم ہو جائے تو کوئی اس کی جنت سے مایوس نہ ہو۔'' [ مسلم، التوبة، باب فی سعة رحمة الله ...... : ٢٧٥٥ ]

**ت 99** مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ : یعنی جب انھوں نے یہ حکم پہنچا دیا تو اپنا فریضہ ادا کر دیا اور تم پر حجت قائم ہو گئی، اب کسی شخص کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو گا۔ (ابن کثیر)

**ت 100** قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ ...... : یعنی حرام اور حلال یا کافر اور مومن برابر نہیں ہو سکتے۔ حرام رزق کی فراوانی اور اس پر عیش و عشرت گو بظاہر کتنی ہی خوش کن کیوں نہ ہو، انسان پر لازم ہے کہ وہ رزق حلال پر قناعت کرے، خواہ وہ بظاہر میں کتنا ہی حقیر ہو۔ اسی طرح کافر کتنا بھی اچھا نظر آئے مومن کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ رزقِ حلال اور مومن طیب ہیں اور رزقِ حرام اور کافر خبیث ہیں، خبث نے ان کی اچھائی کو ختم کر دیا ہے۔

**ت 101** ① لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ ...... : یعنی اگر بلا ضرورت سوال کرو گے اور اس کا جواب تمھاری آسانی کے

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

بے شک تم سے پہلے ان کے بارے میں کچھ لوگوں نے سوال کیا، پھر وہ ان سے کفر کرنے والے ہو گئے ﴿۱۰۲﴾ اللہ نے نہ کوئی کان پھٹی اونٹنی مقرر فرمائی ہے اور نہ کوئی سانڈ چھٹی ہوئی اور نہ کوئی اوپر تلے بچے دینے والی مادہ اور نہ کوئی بچوں کا باپ اونٹ اور لیکن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان کے اکثر نہیں سمجھتے ﴿۱۰۳﴾

خلاف اتر آیا تو خواہ مخواہ مشکل میں پڑ جاؤ گے اور پھر بجا نہ لانے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمان قرار پاؤ گے۔ اب جب کہ قرآن اتر رہا ہے، تمھارے سوالوں کا جواب بھی اتر سکتا ہے، تو تم بہت سی چیزوں کو اپنے اوپر فرض یا حرام قرار دلوا لو گے۔ اس بنا پر متعدد روایات میں رسول اللہ ﷺ نے زیادہ سوال کرنے سے منع فرمایا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک مسلمانوں کے حق میں مسلمانوں میں سے جرم کے لحاظ سے سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو حرام قرار نہیں دی گئی تھی، پھر اس کے سوال کی وجہ سے حرام قرار دے دی گئی۔'' [ بخاری، الاعتصام، باب ما یکرہ من کثرۃ السؤال ... : ۷۲۸۹۔ مسلم : ۲۳۵۸ ] مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۰۸)۔

② عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا: ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے جو سوال تم کر چکے اللہ تعالیٰ نے وہ معاف فرما دیے ہیں اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور معافی ہے کہ اس نے ان چیزوں سے درگزر کیا ہے، بیان نہیں فرمایا اور تمھارے لیے ان کے کرنے اور نہ کرنے کی گنجائش باقی چھوڑ دی۔ (رازی، ابن کثیر)

آیت 102 قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ...... : یہ بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان کا حال یہ تھا کہ اپنے انبیاء سے ایک چیز خواہ مخواہ کرید کرید کر دریافت کرتے اور جب وہ حرام قرار دے دی جاتی تو بجا نہ لاتے، اس طرح دونوں حالتوں میں نافرمان ٹھہرتے۔ یہ ساری آفت بلا ضرورت کثرتِ سوال سے پیش آتی۔ ان کی اس روش کی متعدد مثالیں سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: ''لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا حج کرو۔'' تو ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا ہر سال؟'' آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہی بات کہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو فرض ہو جاتا اور تم نہ کر سکتے۔'' پھر فرمایا: ''مجھے چھوڑے رکھو جب تک میں تمھیں چھوڑے رکھوں، کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے سوالوں کی کثرت اور انبیاء سے اختلاف کی وجہ ہی سے ہلاک ہوئے، تو جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو اس میں سے جتنا کر سکو کرو اور جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کر دوں تو اسے چھوڑ دو۔'' [ مسلم، الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر : ۱۳۳۷ ]

آیت 103 مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ ......: اوپر کی آیات میں ایسی باتوں کو کرید کرنے اور ایسے سوال کرنے سے منع فرمایا جو

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا١ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ۝۱۰۴

اور جب ان سے کہا جاتا ہے آؤ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں ہمیں وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پاتے ہوں ﴿۱۰۴﴾

لوگوں پر لازم نہیں کی گئیں، اب اس آیت میں ایسے کام اپنے اوپر لازم کر لینے سے منع فرمایا جو اللہ کی طرف سے لازم نہ ہوں۔ ( کبیر )

اہل عرب زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیتے، پھر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھتے۔ یہاں چار قسم کے جانور بیان کیے ہیں، سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ① ''بحیرہ'' وہ جانور ہے جس کا دودھ بتوں کے لیے روک لیا جاتا، پھر لوگوں میں سے کوئی اسے نہیں دوھتا تھا۔ ② ''سائبہ'' وہ جسے وہ اپنے معبودوں کے لیے کھلا چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی چیز نہیں لادی جاتی تھی۔ ③ ''وصیلہ'' وہ اونٹنی جو پہلی دفعہ مادہ بچہ دیتی، پھر دوسری بار بھی مادہ بچہ دیتی، وہ اسے اپنے بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے ( کیونکہ وصیلہ وصل سے نکلا ہے ) یہ نام اس لیے رکھتے کہ اس نے دو مادہ بچے یکے بعد دیگرے جنے ہیں، بیچ میں نر نہیں ہے۔ ④ ''حام'' وہ سانڈ اونٹ جس کے جفتی کرنے سے اونٹنیوں کی ایک مخصوص تعداد حاملہ ہوتی، اسے وہ اپنے بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی چیز نہ لادتے اور اس کا نام ''حامی'' رکھتے۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی انتڑیاں آگ میں کھینچ رہا تھا، یہ پہلا شخص تھا جس نے سائبہ چھوڑنے کی رسم نکالی تھی۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ما جعل الله من بحيرة ...... ﴾ : ٤٦٢٣ ] بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی یہ تفسیر سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کی ہے، مشرکین عرب کسی ایک دین پر تو متفق تھے نہیں، خصوصاً بدعات ہر قبیلے کی الگ الگ ہوتی ہیں، اس لیے تابعین سے ان چاروں کی تفسیر اور بھی آئی ہے، چنانچہ بعض نے فرمایا کہ بحیرہ وہ ہے جس کا کان بتوں کے نام پر پھاڑا ہوا ہو۔ یہ ''بحر'' سے '' فَعِيْلَةٌ '' بمعنی '' مَفْعُوْلَةٌ '' ہے، جس کا معنی شق یعنی پھاڑنا ہے۔ سائبہ آزاد چھوڑی ہوئی، جس اونٹنی کے پیٹ سے دس بچے سب کے سب مؤنث پیدا ہوتے تو اسے چھوڑ دیتے، نہ اس پر سواری کی جاتی نہ اس کے بچے اور مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ پیتا۔ وصیلہ دو مادہ بچے سات مرتبہ یکے بعد دیگرے لانے والی۔ حامی یعنی اپنی حفاظت کرنے والا، جس اونٹ کی پشت سے دس بچے پیدا ہو جاتے اسے سانڈ بنا کر چھوڑ دیتے کہ اس نے اپنی پشت محفوظ کر لی ہے، پھر اس پر نہ سواری کی جاتی نہ بوجھ لادا جاتا نہ اسے پانی یا چارے سے روکا جاتا۔ مزید ظلم یہ کرتے کہ ایسا کرنے کو اللہ کا حکم قرار دیتے۔ اللہ نے اس کی تردید '' مَا جَعَلَ اللّٰهُ '' کہہ کر فرمائی۔ ان کی دوسری تشریحات بھی تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں اور اس کی وجہ اوپر گزر چکی کہ عرب کے جاہلوں میں سے ہر ایک کا الگ ہی طریقہ تھا۔ غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنے کا یہ سلسلہ اب بھی کفار کے علاوہ نام نہاد مسلمانوں میں جاری ہے، مثلاً پیروں کی گائیں، یا مختلف درباروں کے نام کے جانور جہاں چاہیں پھریں، انھیں کچھ نہیں کہا جاتا۔

**104** وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا ...... : اس آیت میں اگرچہ عرب کے مشرکین کی بات ہو رہی ہے مگر لفظ عام ہیں جن میں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ‌ۚ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ‌ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا شَهَادَةُ بَيۡنِكُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ حِيۡنَ الۡوَصِيَّةِ اثۡنٰنِ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ اَوۡ اٰخَرٰنِ مِنۡ غَيۡرِكُمۡ اِنۡ اَنۡتُمۡ ضَرَبۡتُمۡ فِى

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر اپنی جانوں کا بچاؤ لازم ہے، تمھیں وہ شخص نقصان نہیں پہنچائے گا جو گمراہ ہے، جب تم ہدایت پا چکے، اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿۱۰۵﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھاری آپس کی شہادت، جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچے، وصیت کے وقت، دو عدل والے آدمی ہوں گے، جو تم میں سے ہوں، یا دو اور تمھارے غیر سے ہوں، اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو، پھر تمھیں موت

ان تمام لوگوں کی مذمت کی جارہی ہے جو حق بات پر غور وفکر کرنے اور اسے مان لینے کے بجائے اپنے باپ دادا کے رسم و رواج یا مذہبی پیشواؤں کی تقلید کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۰)۔

**آیت 105** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ ...... : یعنی توحید اور شریعت کے احکام کی اس قدر وضاحت اور بار بار ترغیب دلانے اور اللہ کے احکام کی نافرمانی اور اس کے عذاب سے ڈرانے کے باوجود اگر یہ لوگ اپنی جہالت پر اصرار کریں تو تم ان کی گمراہی اور جہالت کی پروا نہ کرو، خود سیدھے راستے پر رہو گے تو ان لوگوں کی جہالت کا تم پر کوئی وبال نہیں ہوگا۔ یعنی اپنی اصلاح کی سب سے پہلے فکر کرو، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی غلطیوں اور عیوب کی فکر میں لگ کر اپنی اصلاح کو بھول ہی جاؤ۔ اگر تم سیدھے راستے پر ہو گے تو گمراہ لوگ تمھارا کچھ نقصان نہیں کر سکیں گے۔ خود سیدھے راستے اور ہدایت پر رہنے میں یہ بھی شامل ہے کہ نیکی کا حکم دیتے رہو گے اور برائی سے منع کرتے رہو گے تو ان کی گمراہی قطعاً تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ سمجھ لیا ہے کہ انسان بس اپنی نجات کی فکر کرے، دوسروں کی اصلاح ضروری نہیں۔ چنانچہ اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: ''لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کا غلط مطلب لیتے ہو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے: ''جب لوگ ظالم کو دیکھیں، پھر اس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر عذاب لے آئے۔'' اسی حدیث میں ہے: ''کوئی قوم ایسی نہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر عمل کیا جاتا ہو، پھر وہ طاقت رکھتے ہوں کہ اسے بدل دیں، مگر وہ نہ بدلیں مگر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ان سب کو عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔'' [ أبو داؤد، الملاحم، باب الأمر والنهي : ۴۳۳۸ ] '' اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ '' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ باوجود تمھارے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لوگ باز نہ آئیں تو امر بالمعروف کرنے والوں پر کچھ بوجھ نہیں ہوگا۔ (ابن کثیر)

**آیت 106 تا 108** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا شَهَادَةُ بَيۡنِكُمۡ ...... : ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! جب تم سفر کی حالت میں ہو اور تم پر موت کے آثار ظاہر ہونے لگیں اور تمھارے پاس کوئی مال یا اثاثہ ہو تو اللہ کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں میں

الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

کی مصیبت آ پہنچے، تم ان دونوں کو نماز کے بعد روک لو گے، اگر تم شک کرو، پس وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں گے کہ ہم اس کے ساتھ کوئی قیمت نہیں لیں گے، اگر چہ وہ قرابت والا ہو اور نہ ہم اللہ کی شہادت چھپائیں گے، بے شک ہم اس وقت یقیناً گناہ گاروں سے ہوں گے ﴿۱۰۶﴾ پھر اگر اطلاع پائی جائے کہ بے شک وہ دونوں کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو دو اور ان کی جگہ کھڑے ہوں گے، ان میں سے جن کے خلاف گناہ کا ارتکاب ہوا ہے، جو زیادہ قریب ہوں، پس وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں گے کہ یقیناً ہماری گواہی ان کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی، بے شک ہم اس وقت یقیناً ظالموں میں سے ہوں گے ﴿۱۰۷﴾ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ گواہی کو اس کے طریقے پر ادا کریں، یا اس سے ڈریں کہ (ان کی) قسمیں ان (قرابت داروں) کی قسموں کے بعد رد کر دی جائیں گی اور اللہ سے ڈرو اور سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۰۸﴾

غیر مسلموں میں سے دو عدل وصدق والے آدمیوں کو اس پر گواہ بنا دو۔ جو میت کے وارثوں کے پاس مرنے والے کا سامان پہنچا دیں، اگر ان دونوں گواہوں کے بارے میں میت کے ورثا کو شبہ ہو جائے کہ انھوں نے خیانت کی ہے اور میت کا کچھ مال چھپا لیا ہے تو انھیں نماز کے بعد حلف اٹھانے کے لیے روک لیا جائے گا، پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں گے اور کہیں گے کہ ہم مال کی وجہ سے اللہ کی جھوٹی قسم نہیں کھائیں گے، چاہے جسے فائدہ پہنچانے کے لیے ہم قسم کھا رہے ہیں وہ ہمارا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو اور جس گواہی کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے نہیں چھپائیں گے، اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً گناہ گاروں میں سے ہوں گے۔ اگر ان دونوں کے قسم کھا لینے کے بعد پتا چل جائے کہ انھوں نے خیانت کی ہے تو میت کے رشتے داروں میں سے دو قریبی رشتے دار آگے بڑھیں گے اور حلف اٹھائیں گے کہ ہم دونوں کی گواہی کہ ان دونوں نے خیانت کی ہے اور جھوٹی قسم کھائی ہے، ان دونوں کی گواہی سے زیادہ قابل قبول ہے اور یہ کہ ہم نے ان پر خیانت کی جو شہادت دی ہے تو اس میں ہم نے ان پر زیادتی نہیں کی، اگر ہم نے زیادتی کی ہے تو یقیناً ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس طرح حلف لینے کی

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر کہے گا تمھیں کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، بے شک تو ہی چھپی باتوں کو بہت خوب جاننے والا ہے ﴿۱۰۹﴾

حکمت و مصلحت بیان فرمائی کہ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ گواہ آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہوئے امر واقع میں کوئی تبدیلی لائے بغیر گواہی دیں گے اور خیانت کی شکل میں دو قریبی رشتہ داروں سے حلف لینے کی حکمت یہ ہے کہ حالتِ سفر کے گواہ ڈریں گے کہ اگر ہم نے جھوٹی قسم اٹھائی تو وہ رد کر دی جائے گی، کیونکہ قریبی رشتہ دار قسم کھائیں گے اور ہمارا جھوٹ لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بنو سہم قبیلے کا ایک (مسلم) شخص تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ سفر کے لیے نکلا۔ (یہ دونوں اس وقت نصرانی تھے) سہمی کو اس سرزمین پر موت آئی جہاں کوئی مسلمان نہ تھا جسے وہ وصیت کرتا، لہٰذا اس نے اپنا سامان تمیم داری اور عدی کے حوالے کر دیا، پھر جب وہ دونوں اس کے ترکے کے ساتھ واپس آئے تو ورثا نے دیکھا کہ چاندی کا ایک جام، جس پر سونے کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، غائب ہے۔ (مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم داری اور عدی سے قسم لی (اور انھیں چھوڑ دیا) بعد میں وہ جام مکہ میں ملا، ان لوگوں نے (جن کے پاس سے وہ جام ملا تھا) کہا کہ ہم نے اسے تمیم اور عدی بن بداء سے خریدا ہے، پھر اس سہمی کے ورثا میں سے دو آدمی کھڑے ہوئے اور انھوں نے گواہی دی کہ یقیناً یہ جام ہمارے قریبی رشتے دار، یعنی سہمی کا جام ہے، چنانچہ یہ آیت انھی کے بارے میں نازل ہوئی: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ [ المائدة : ۱۰۶ ] [ بخاري، الوصايا، باب قول الله عزوجل : ﴿ يأيها الذين امنوا شهادة بينكم...... ﴾ : ۲۷۸ ]

**آیت 109** ① یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ...... : دین کے کچھ مسائل اور احکام بیان کرنے کے بعد اب قیامت کے بعض احوال ذکر فرما دیے، تاکہ نافرمانی کرنے والوں کو تنبیہ ہو۔ (کبیر) مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن پیغمبروں کو جمع کر کے ان سے سوال ہوگا کہ جو دعوت تم نے دی تھی تمھاری امتوں نے اسے کس حد تک قبول کیا۔ پیغمبروں سے یہ سوال درحقیقت امتوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے لیے ہوگا۔ (ابن کثیر) جیسا کہ آیت: ﴿ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ﴾ ''جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا'' یہ سوال درحقیقت زندہ درگور کرنے والوں کو ذلیل کرنے کے لیے ہوگا۔

② قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا...... : وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتوں کے اپنے اپنے رسولوں کو جواب کا کچھ علم تو پیغمبروں کو تھا، کیونکہ ان کی عمر انھی میں گزری تھی، تو وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ علم نہیں۔ اس سوال کا جواب ﴿ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴾ میں موجود ہے، یعنی ہم تو صرف ان کے ظاہری جواب کی حد تک واقف ہیں، جو ہماری زندگی میں انھوں نے دیا اور پیغمبر شہادت بھی اسی کے متعلق دیں گے۔ (دیکھیے نساء: ۴۱۔ بقرہ: ۱۴۳) باقی رہا کہ انھوں

اِذۡ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ اذۡكُرۡ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡكَ وَ عَلٰی وَالِدَتِكَ ۘ اِذۡ اَیَّدۡتُّكَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَهۡدِ وَ كَهۡلًا ۚ وَ اِذۡ عَلَّمۡتُكَ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ۚ وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ كَهَیۡـَٔةِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ فَتَنۡفُخُ فِیۡهَا فَتَكُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِیۡ وَ تُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَ الۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ كَفَفۡتُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَنۡكَ اِذۡ جِئۡتَهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۱۰﴾

جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم! اپنے اوپر اور اپنی والدہ پر میری نعمت یاد کر، جب میں نے روح پاک سے تیری مدد کی، تو گود میں اور ادھیڑ عمر میں لوگوں سے باتیں کرتا تھا اور جب میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائی اور جب تو مٹی سے پرندے کی شکل کی مانند میرے حکم سے بناتا تھا، پھر تو اس میں پھونک مارتا تو وہ میرے حکم سے ایک پرندہ بن جاتی تھی اور تو پیدائشی اندھے اور برص والے کو میرے حکم سے تندرست کرتا تھا اور جب تو مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتا تھا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روکا، جب تو ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو ان میں سے ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۱۰﴾

---

نے فی الحقیقت ہماری دعوت کو دل سے قبول کیا یا نہیں اور ہمارے بعد ہماری امتیں اس دعوت پر کہاں تک ثابت قدم رہیں تو اس کا علم تیرے سوا کسی کو نہیں، کیونکہ چھپی ہوئی باتوں کو تو ہی خوب جاننے والا ہے، سو آیات میں بحمد اللہ کوئی تعارض نہیں۔ (کبیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ان کو سنایا جو پیغمبروں کی شفاعت پر مغرور ہیں، تاکہ معلوم کریں کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی کسی کے دل پر گواہی نہیں دیتا اور کوئی کسی کی سفارش نہیں کرتا۔ (موضح)

**آیت 110** ① چونکہ پیغمبروں سے سوال امتوں کے سرکش لوگوں کو ڈانٹنے اور ملامت کرنے کے لیے ہوگا اور سب سے زیادہ ملامت کے لائق نصاریٰ ہوں گے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنا لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے لیے بیوی اور اولاد ثابت کی تھی (جس سے اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے) اس بنا پر تمام پیغمبروں کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے انعامات ذکر فرمائیں گے اور پھر ان سے سوال ہوگا، اس سے مقصد نصرانیوں کی تردید ہے۔ (کبیر)

② **اِذۡ اَیَّدۡتُّكَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ**: یعنی جبریل علیہ السلام کو تمھاری مدد کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ پہلا احسان یہ ذکر فرمایا۔

③ **وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ**: یہاں "تَخۡلُقُ" کا لفظ صرف ظاہری شکل و صورت بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تصویر بنانے والوں سے فرمائے گا: «أَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ» "جو تم نے خلق کیا ہے اسے زندہ کرو۔" [ بخاری، اللباس، باب عذاب المصورین یوم القیامة : ۵۹۵۱ ] پیدا کرنے اور زندگی دینے کے معنی میں خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۴۹)۔

وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، انھوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں ﴿۱۱۱﴾ جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان اتارے؟ اس نے کہا اللہ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو ﴿۱۱۲﴾

④ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِیْ: اس آیت میں "بِاِذْنِیْ" (میرے حکم سے) کا لفظ چار مرتبہ آیا ہے، جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو عیسیٰ (علیہ السلام) یہ معجزات نہیں دکھا سکتے تھے اور یہی حال ہر نبی کے معجزات کا ہے، وہ نہ عالم الغیب ہوتے ہیں، نہ انھیں ہر کام کا اختیار ہوتا ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا جائے یا جس کام کا اختیار دیا جائے صرف وہی ان کے علم اور اختیار میں ہوتا ہے۔

⑤ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ...... : یہودیوں نے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے شر سے محفوظ رکھا اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۵) اور سورۂ نساء (۱۵۸) یہ بھی احسان فرمایا۔

⑥ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکروں نے ان کے معجزات کو کھلا جادو قرار دیا۔ بدبخت اتنا نہ سمجھ سکے کہ مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو شفایاب اور مردے کو زندہ کرنا کسی جادوگر کے لیے ممکن نہیں، چاہے وہ جادو میں کتنا ہی کمال کیوں نہ رکھتا ہو اور یوں بھی جادو کرنا اور کرانا فاسق و بدکار قسم کے لوگوں کا کام ہے، حالانکہ وہ خود دیکھ رہے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام انھیں ایک اللہ کی عبادت و اطاعت کا حکم دیتے تھے۔ یہود کی اس حرکت کی بنیاد حسد تھی اور سچ ہے کہ " كُلُّ ذِیْ نِعْمَةٍ مَحْسُوْدٌ " ہر صاحب نعمت پر لوگ حسد کرتے ہیں۔

آیت 111 وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ...... : یہ بھی اللہ تعالیٰ کا عیسیٰ علیہ السلام پر احسان تھا کہ حواریوں کو ان کا مخلص ساتھی اور مددگار بنا دیا۔ حواری کے قریب قریب وہی معنی ہیں جو ہمارے ہاں انصار کے ہیں۔ یہاں "اَوْحَيْنَاۤ" کا معنی انبیاء والی وحی نہیں بلکہ الہام ہے، جو غیر انبیاء کو بھی ہوتا ہے اور اس پر بھی وحی کا لفظ بول دیا جاتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى ﴾ [ القصص : ۷ ] "اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی۔" حالانکہ قرآن مجید میں صاف آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا (کوئی عورت نبی نہیں ہوئی)۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۷) اسی طرح فرمایا: ﴿ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ﴾ [ النحل : ٦٨ ] "اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی فرمائی۔"

آیت 112 ① اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ...... : حواری اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے تھے، جیسا کہ اوپر کی آیت میں مذکور

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ واقعی تو نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس پر گواہوں سے ہو جائیں ﴿۱۱۳﴾ عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے اللہ! اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک دسترخوان اتار، جو ہمارے پہلوں اور ہمارے پچھلوں کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور ہمیں رزق دے اور تو سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے ﴿۱۱۴﴾

ہے، اس لیے ان کا یہ سوال اللہ کی قدرت پر شک و شبہ کے طور پر نہ تھا، بلکہ دلی اطمینان حاصل کرنے کے لیے تھا، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا۔ (ابن کثیر) اور یہ الفاظ کہ کیا تیرا رب یہ کر سکتا ہے، ان کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہے، بلکہ مطلب یہ پوچھنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تو نہیں، یا اس میں کوئی مانع تو نہیں؟ ''مائدہ'' وہ بڑا تھال جس پر کھانا رکھا ہو۔ اب اس تھال اور کھانے دونوں پر مائدہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ (راغب)

② قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ ...... : کیونکہ ایسے معجزات معین کر کے طلب کرنا حکم چلانے اور سرکشی کرنے کا معنی رکھتا ہے، اس لیے اللہ سے ڈرو اور ایسا سوال نہ کرو۔ (کبیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ڈرو اللہ سے'' یعنی بندے کو چاہیے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں، اگرچہ مالک بہت زیادہ مہربانی کرے۔'' (موضح) ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو اور اسے مائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ، جیسے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [ الطلاق : ۲، ۳ ] ''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا۔'' (ابن کثیر)

آیت 113 ① قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا: یعنی ہم یہ معجزہ ایمان لانے کی شرط کے طور پر نہیں مانگ رہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے کہا تھا: ﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ [ البقرۃ : ۵۵ ] ''ہم ہرگز تیرا یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ لیں۔'' بلکہ چند امور کے پیش نظر طلب کر رہے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہم بھوکے ہیں یا برکت کے لیے کچھ کھانا چاہتے ہیں۔

② وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا: یعنی ہمیں اس بات کا اطمینان ہو جائے (جو ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے) اور ہم عین الیقین کے درجے کا علم حاصل کر لیں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور بنی اسرائیل کے سامنے آپ کے سچا رسول ہونے کی گواہی دے سکیں۔

آیت 114 ① قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ ...... : یہ انتہا درجے کی عاجزی کے ساتھ دعا ہے کہ '' اللّٰهُمَّ '' (اے اللہ!) کے ساتھ '' رَبَّنَاۤ '' (اے ہمارے پالنے والے!) بھی ملایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ اللہ تھے، نہ اللہ

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اللہ نے فرمایا بے شک میں اسے تم پر اتارنے والا ہوں، پھر جو اس کے بعد تم میں سے ناشکری کرے گا تو بے شک میں اسے عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ وہ جہانوں میں سے کسی ایک کو نہ دوں گا ﴿۱۱۵﴾

کے بیٹے، نہ اللہ کے اختیار رکھنے والے، ان کے حواری بھی ان میں سے کسی چیز کے قائل نہ تھے، ورنہ وہ عیسیٰ علیہ السلام سے دعا کیوں کرواتے اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اتنی عاجزی کے ساتھ دعا کیوں کرتے، بلکہ ان کے حواری خود ان سے مائدہ کا مطالبہ کرتے اور وہ خود ہی پورا کر دیتے۔

② تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا: علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ وہ دسترخوان اتوار کے دن اترا، کیونکہ وہ نصرانیوں کی عید ہے، سبت یہودیوں کی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عید کا دن جمعہ تھا مگر یہودیوں اور نصرانیوں نے اصل دن میں اختلاف کیا اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر کسی چون و چرا کے بغیر جمعہ کو تسلیم کر لیا۔ [ دیکھیے مسلم، الجمعة، باب هداية هذه الأمة...... : ۸۵۶ ] لفظ عید ”عَادَ يَعُوْدُ“ سے ہے، یعنی ایسی خوشی جو بار بار لوٹ کر آئے، یہ سالانہ بھی ہو سکتی ہے اور ہفتہ وار بھی۔ مسلمانوں کی دو عیدیں سالانہ ہیں اور ایک ہر ساتویں دن عید جمعہ ہے۔ ان کے علاوہ کوئی عید قرآن و سنت سے ثابت نہیں، مثلاً عید میلاد یا عید غدیر وغیرہ، یہ سب خود ساختہ اور بدعت ہیں۔

③ وَاٰيَةً مِّنْكَ: یعنی تیری توحید اور تیرے نبی کی رسالت کے حق ہونے پر دلیل قائم ہو۔ ( کبیر )

④ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: کیونکہ حقیقت میں تو ہی روزی دینے والا ہے، تیرے سوا ایک بھی روزی پیدا کرنے والا نہیں، سب تیرا دیا ہوا ہی کھاتے، یا کسی دوسرے کو دیتے ہیں۔

آیت 115 قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ...... : علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ دسترخوان اترا یا نہیں، اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ اترا، شوکانی، ابن جریر اور بہت سے علماء نے اسی کو صحیح کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تاکید کے ساتھ فرمانا: ﴿ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ﴾ ”یقیناً میں اسے تم پر اتارنے والا ہوں۔“ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اتارا۔ جامع ترمذی میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مائدہ آسمان سے گوشت روٹی کی صورت میں اترا اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ نہ خیانت کریں اور نہ کل کے لیے ذخیرہ کریں، مگر انھوں نے خیانت کی اور ذخیرہ کیا اور کل کے لیے اٹھا رکھا تو انھیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں بدل دیا گیا۔“ [ ترمذی، تفسير القرآن، باب و من سورة المائدة : ۳۰۶۱ ] اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو کسی کو اختلاف کی مجال ہی نہ تھی، مگر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس کے حدیث رسول ہونے یا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قول ہونے، دونوں باتوں کو ضعیف کہا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء کا کہنا ہے کہ بعد کے الفاظ: ﴿ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یہ الفاظ سن کر وہ ڈر گئے اور انھوں نے دعا کا مطالبہ واپس لے لیا۔ یہ قول

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

اور جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ وہ کہے گا تو پاک ہے، میرے لیے بنتا ہی نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر میں نے یہ بات کہی تھی تو یقیناً تو نے اسے جان لیا، تو جانتا ہے جو میرے نفس میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے، یقیناً تو ہی سب چھپی باتوں کو بہت خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۶﴾

مجاہد اور حسن بصری کا ہے، ان کی سندوں کو ابن کثیر نے صحیح کہا ہے، مگر یہ بھی تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کا قول ہے، رسول اللہ ﷺ سے یہ بات بھی ثابت نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مائدہ اترا تھا، وہ اس کا ایک قرینہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس سے پہلی آیات میں اللہ نے مسیح علیہ السلام پر اپنے احسان شمار کیے ہیں، ان کے ساتھ اس واقعہ کو بھی بطور احسان ذکر فرمایا ہے اور آخر میں ان سے سوال کیا ہے کہ کیا تم نے میرے اتنے احسانات کے باوجود لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لینا، اس لیے مائدہ کا اترنا بھی ایک احسان تھا۔ دوسرے حضرات کہہ سکتے ہیں کہ مائدہ نہ اتار کر انھیں امتحان سے بچا لینا بھی ایک احسان ہی تھا۔ بہرحال قرآن مجید کے الفاظ دونوں صورتوں کا احتمال رکھتے ہیں اور اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''شاید عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کا اثر ہے کہ اس کی امت میں مال کی آسودگی ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔'' مگر رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا امتی وہی ہے جو اسلام قبول کر لے، دوسرے لوگوں کا اپنے آپ کو مسیح علیہ السلام کا امتی کہلانا سینہ زوری ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے واضح طور پر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔ اب تمام دنیا رسول اللہ ﷺ ہی کی امت ہے، خواہ وہ امت اجابت ہو یا امت دعوت۔ رہا دنیا کا مال تو وہ کبھی کسی کے پاس زیادہ ہوتا ہے، کبھی کسی کے پاس، اس کا ایمان و کفر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ﴾ [ بنی إسرائيل : ۲۰ ] ''ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی اور ان کی بھی، تیرے رب کی بخشش سے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ [ آل عمران : ۱٤۰ ] ''اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔''

**آیت 116** ① وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ...... : اس کا تعلق اوپر کی آیت: ﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ ﴾ کے ساتھ ہے، گویا پہلے بطور تمہید عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے انعامات شمار کیے اور اب اصل مقصد شروع ہو رہا ہے۔ یہ

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾

میں نے انھیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو، جو میرا رب اور تمھارا رب ہے اور میں ان پر گواہ تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۱۱۷﴾

سوال قیامت کے دن ہو گا، کیونکہ آگے چل کر آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ﴾ اس خطاب سے مقصود عیسیٰ علیہ السلام کو ڈانٹنا نہیں ہو گا، بلکہ ان کو ڈانٹنا مقصود ہو گا جنھوں نے مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کو معبود بنا لیا۔ تاکہ وہ جان لیں کہ انھوں نے جس مسیح اور اس کی ماں کو معبود اور حاجت روا بنایا وہ تو خود اللہ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے اور امت کے شرک کی وجہ سے ان سے باز پرس ہو گی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نصرانیوں نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ ان کی والدہ کو بھی معبود بنا لیا، تیسری یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ بھی " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " ( اللہ کے سوا ) ہیں، صرف پتھر یا لکڑی یا کسی دھات کے بنے ہوئے بت ہی " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " نہیں، جنھیں پکارنے سے آدمی مشرک ہو جاتا ہے، جیسا کہ آج کل کے قبر پرست لوگوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " نہیں، ان سے مرادیں مانگنا اور فریاد کرنا جائز ہے، یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " میں مسیح علیہ السلام، ان کی والدہ ماجدہ اور تمام انبیاء و صلحاء شامل ہیں، ان میں سے کسی کو حاجت روا، مشکل کشا اور خدائی اختیارات کا مالک سمجھنا صاف شرک اکبر ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی ہے ہی نہیں۔

② سُبْحٰنَكَ: تو ہر شریک سے پاک ہے، پھر میں اور میری والدہ تیرے شریک کیسے ہو سکتے ہیں۔

③ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ...... : یعنی میں تو تیرے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں، پھر بندے کی کیا مجال کہ اپنے آقا کے مقابلے میں خدائی کا دعویٰ کرے۔

④ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ: یعنی بالفرض میں نے ایسی کوئی بات کہی بھی ہو تو تجھے ضرور اس کا علم ہو گا، کیونکہ تجھ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

⑤ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ...... : جب تو میرے دل کی بات جانتا ہے تو زبان سے نکالی ہوئی کیوں نہ جانے گا؟ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے لیے نفس ثابت ہوتا ہے۔

⑥ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ: تیرے سوا کسی کو علم غیب نہیں، جس بندے کے پاس جو بھی علم ہے وہ سب تیرا ہی عطا کردہ ہے، کسی اور کا علم تیرے علم کے مقابلے میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتا جتنی سمندر کے مقابلے میں پانی کا ایک قطرہ اور جسے اتنا ہی علم ہو جو اسے بتایا گیا ہے وہ عالم الغیب نہیں، عالم الغیب تو وہ ہے جو کسی کے بتائے بغیر سب کچھ جانتا ہے اور وہ فقط تیری ذات پاک ہی ہے۔

آیت 117 ① اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ...... : یعنی صرف اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا سب کا رب ہے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بے شک تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۱۸﴾

2 فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ : اس آیت سے قادیانی استدلال کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ عیسیٰ علیہ السلام یہ بیان قیامت کے دن دیں گے جب وہ زمین پر آنے کے بعد اپنی عمر پوری کر کے فوت ہو چکے ہوں گے۔ اگر اصرار کیا جائے کہ "تَوَفَّيْتَنِيْ" سے مراد پہلا وقت ہے، جب انھیں آسمان پر اٹھایا گیا تھا تو معلوم ہونا چاہیے کہ لفظ وفات قرآن پاک میں تین معنی میں آیا ہے، ایک موت، جیسے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ [ الزمر : ٤٢ ] ''اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے۔'' دوسرے نیند، جیسے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ [ الأنعام : ٦٠ ] ''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے۔'' تیسرے جسم سمیت اٹھا کر لے جانا، جیسے یہاں ہے اور سورۂ آل عمران (۵۵) اور سورۂ نساء (۱۵۸) میں ہے۔

3 كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ...... : یعنی میں تو اس وقت تک کے ان کے ظاہری اعمال کی شہادت دے سکتا ہوں جب تک میں ان کے اندر موجود تھا، جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو پھر تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر شہید ہے، یعنی ان میں میری موجودگی کے وقت بھی تو ہی شہید تھا اور میرے الگ ہونے کے بعد بھی تو ہی شہید ہے۔ شہید اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ شہادت دیکھنے، سننے اور جاننے کے معنی میں بھی ہو سکتی ہے اور کلام کے ساتھ شہادت دینے کے معنی میں بھی۔ (کبیر) مگر دوسروں کے حق میں مطلق شہید یا شاہد کا لفظ (جب کہ کوئی خاص قرینہ نہ ہو) تو کلام کے ساتھ شہادت کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز اور ہر شخص کی ہر وقت خبر رکھنے والا ایک اللہ ہی ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن میری امت کے کچھ آدمیوں کو لایا جائے گا تو انھیں بائیں طرف کر دیا جائے گا، میں کہوں گا: ''یہ تو میرے ساتھی ہیں۔'' تو کہا جائے گا: ''تو نہیں جانتا کہ انھوں نے تیرے بعد کیا کیا کام شروع کر دیا تھا۔'' تب میں بھی اسی طرح کہوں گا جیسے اللہ کے نیک بندے (عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے: ﴿ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ پھر کہا جائے گا کہ جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ اپنی ایڑیوں پر پھرنے والے (مرتد) ہی رہے۔'' [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ و كنت عليهم...... ﴾ : ٤٦٢٥ ]

آیت 118 اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ...... : اس آیت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام نہایت حکیمانہ طریقے سے ان کی سفارش کریں گے۔ پہلے اللہ کی کبریائی بیان کرتے ہوئے کہیں گے کہ اگر تو انھیں عذاب دے گا تو یہ تیرے بندے ہی ہیں، نہ دم مار سکتے ہیں نہ بھاگ کر کہیں جا سکتے ہیں اور اگر تو انھیں معاف ہی فرما دے تو تو ہر کام پر غالب ہے اور تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ساری رات صبح تک (نماز میں) اسی آیت کو بار بار پڑھتے

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

اللہ فرمائے گا یہ وہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا، ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۱۹﴾ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۲۰﴾

رہے۔'' [ نسائي، الافتتاح، باب ترديد الآية : ۱۰۱۱ ]

**آیت 119** ❶ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ : سب سے بڑا ظلم اور جھوٹ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور کفر کرنا ہے اور سب سے بڑا سچ اور انصاف اللہ تعالیٰ کی توحید اور ایمان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔ یعنی مشرکین کی معافی اور بخشش کی کوئی صورت نہ ہوگی، البتہ توحید والوں کو ان کی توحید ضرور نفع پہنچائے گی، خواہ کتنے گناہ گار ہوں۔ چنانچہ ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تک اس آیت کو نماز میں پڑھتے رہے: ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [ المائدة : ۱۱۸ ] ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ اس آیت کو ساری رات پڑھتے رہے، یہاں تک کہ اپنے رکوع اور سجدے میں بھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس آیت کو بار بار پڑھ کر میں نے اللہ تعالیٰ سے شفاعت کی التجا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے میری التجا قبول کر لی ہے، میری امت میں سے جو شخص بغیر شرک کی حالت میں مرے گا اس کو میری شفاعت نصیب ہوگی۔'' [ أحمد : ۱۴۹/۵، ح : ۲۱۳۸۶ ] ''الصّٰدِقِيْنَ'' کے لیے مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۷)، سورۂ زمر (۳۳) اور سورۂ حجرات (۱۵)۔

❷ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ : اس کے مقابلے میں دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

**آیت 120** سورت کے آخر میں نصاریٰ کی تردید کے سلسلہ میں یہ خاتمہ نہایت مناسب ہے، یعنی اکیلا وہی زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا (جن میں انسان بھی ہیں) بادشاہ ہے اور یہ حق بھی اسی کا ہے کہ اس کی بندگی کی جائے، عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا ان کی والدہ یا روح القدس، سب اس کے بندے ہیں، جو کسی طرح معبود ہونے میں اس کے شریک قرار نہیں دیے جا سکتے۔

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ ۶ مدنية ۵۵ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ۱۶۵ رُكُوْعَاتُهَا ۲۰

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر (بھی) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں ① وہی ہے جس نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت مقرر کی اور ایک اور مدت اس کے ہاں مقرر ہے، پھر (بھی) تم شک کرتے ہو ②

یہ سورت اسلام کے بنیادی عقائد توحید و آخرت وغیرہ کے ثبوت اور مشرکین اور اہل بدعت کے رد کے دلائل پر مشتمل ہے، سورۂ بقرہ کے ساتھ اس کی فضیلت ذکر ہو چکی ہے۔

آیت 1 ① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: اس آیت میں اکیلے اللہ تعالیٰ کے تمام خوبیوں کا مالک اور معبود ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے اور کفار کے شرک پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔

② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ...... : اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک زمین و آسمان کا جو جوہر ہیں، یعنی اپنا الگ وجود رکھتے ہیں اور دوسرے اندھیروں اور اجالے کا جو عرض ہیں، یعنی دوسری چیزوں کے ذریعے سے قائم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کوئی جوہر یا عرض ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا نہ کیا ہو۔ اندھیروں اور اجالے سے یہی رات اور دن مراد ہیں، یا پھر ایمان کا نور اور کفر کے اندھیرے۔ (قرطبی) "النُّوْرَ" کو واحد اور "الظُّلُمٰتِ" کو جمع بیان کرنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایمان کا نور ایک ہی ہے، جبکہ کفر کی گمراہیاں بے شمار ہیں۔ سیدھا راستہ ایک ہے اور غلط راستوں کا شمار ہی نہیں۔

③ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ : یعنی جب ہر چیز کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور یہ مشرکین اسے اپنا رب (پالنے والا) بھی تسلیم کرتے ہیں تو ان پر لازم تھا کہ عبادت بھی اسی کی کرتے، مگر یہ پھر بھی دوسروں کو اس کے برابر گردانتے ہیں، ان کے سامنے سجدے کرتے ہیں، ان کے نام کی نذریں چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں اور مشکلات میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں۔ کس قدر بے عقلی ہے کہ پیدا اللہ تعالیٰ کرے، روزی بھی وہی دے، پھر مانگا غیر سے جائے اور اسے اپنے رب کے برابر ٹھہرایا جائے۔ دیکھیے سورۂ لقمان (۱۰، ۱۱) اور سورۂ عنکبوت (۶۱ تا ۶۳)۔

آیت 2 ① هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ: تمھیں مٹی سے پیدا کیا، یعنی آدم علیہ السلام کو، باقی سب لوگ چونکہ آدم ہی کی اولاد ہیں، اس لیے گویا سبھی مٹی سے پیدا ہوئے۔ "طِیْنٍ" میں تنوین تحقیر کے لیے ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "حقیر مٹی" کیا گیا ہے۔

② ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا: پھر ایک مدت مقرر کی، یعنی موت کا وقت اور ایک اور مدت اس کے ہاں مقرر ہے، یعنی قیامت کا وقت،

وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③ وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ④

اور آسمانوں میں اور زمین میں وہی اللہ ہے، تمھارے چھپے اور تمھارے کھلے کو جانتا ہے اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو ③ اور ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں ④

جسے صرف وہ جانتا ہے، اس کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں۔ پھر بھی تم شک کرتے ہو، یعنی اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جس نے مٹی کی ایک مٹھی سے تمھیں پیدا کیا، وہ دوبارہ بھی تمھیں زندہ کر سکتا ہے۔

**آیت 3** وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ...... : اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال کو ثابت کیا ہے، اس آیت میں اس کے علم کا کامل ہونا ثابت فرمایا ہے، یعنی وہی ہستی ہے جسے آسمانوں اور زمین میں اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ آیت تقریباً اس آیت کی ہم معنی ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴾ [ الزخرف : ۸۴ ] ''اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔'' یعنی آسمانوں اور زمین میں ایک ہی ذات ہے جسے ''اللہ'' کہہ کر پکارا جاتا ہے، جس کی آسمانوں اور زمین دونوں میں حکومت ہے اور دونوں میں اس اکیلے ہی کی عبادت کی جاتی ہے، کیونکہ وہ تمھاری ہر چھپی یا کھلی بات کو اور تمھارے ہر عمل کو جانتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے علم کا کمال ثابت ہوتا ہے اور یہ کمال اس کے معبود برحق ہونے کی ایک دلیل ہے۔

بعض لوگ اس آیت کو اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کے خلاف بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ ہے اور کوئی عرش وغیرہ نہیں، جس پر اللہ تعالیٰ بلند ہو، حالانکہ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں، کیونکہ آیت میں اس کی ذات یا شخصیت کے آسمان و زمین میں ہونے کا بیان نہیں بلکہ زمین و آسمان میں اس کے ''اللہ'' یعنی معبود برحق ہونے کا بیان ہے، رہی اس کی ذات تو قرآن مجید میں اس کے عرش کا اور اللہ تعالیٰ کے اس کے اوپر ہونے کا واضح بیان ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً اٹھارہ جگہ اللہ تعالیٰ کے عرش کا ذکر ہے، اور آٹھ جگہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر ہے، اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش کے اوپر ہے، البتہ اپنے علم اور قدرت کے اعتبار سے وہ ہر جگہ ہے۔ اس لیے یہاں اس کے زمین و آسمان میں اللہ اور الٰہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ دونوں جگہ عبادت اسی کی کرنا لازم ہے اور دونوں جگہ وہی ہے جو کمال علم کی وجہ سے معبود برحق ہونے کا حق دار ہے۔

**آیت 4** وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ ...... : ان آیات سے مراد وہ احکام بھی ہیں جو آیات کی صورت میں انبیاء علیہم السلام پر اترتے رہے اور وہ معجزات بھی جو نبوت کی دلیل کے طور پر اترتے رہے۔ اس کے علاوہ زمین و آسمان میں موجود وہ بے شمار نشانیاں بھی جو اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں، مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۴)، یوسف (۱۰۵) اور ذاریات (۲۰ تا ۲۳)۔

فَقَدۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ؕ فَسَوۡفَ يَاۡتِيۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۵ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّـكُمۡ وَاَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَيۡهِمۡ مِّدۡرَارًا ۖ وَّجَعَلۡنَا الۡاَنۡهٰرَ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهِمۡ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ وَاَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ ۝۶

پس بے شک انھوں نے حق کو جھٹلا دیا، جب وہ ان کے پاس آیا، تو عنقریب ان کے پاس اس کی خبریں آ جائیں گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے ہیں ⑤ کیا انھوں نے نہیں دیکھا ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے، جنھیں ہم نے زمین میں وہ اقتدار دیا تھا جو تمھیں نہیں دیا اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارش برسائی اور ہم نے نہریں بنائیں، جو ان کے نیچے سے بہتی تھیں، پھر ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسرے زمانے کے لوگ پیدا کر دیے ⑥

---

آیت 5 فَقَدۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ ...... : اوپر کی آیات میں توحید اور آخرت کو ثابت کیا ہے، اس آیت میں تقلید کا باطل ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ (رازی) حق سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ پر اترنے والی کتاب ہیں۔ کفار جس چیز پر ہنستے تھے وہ آخرت اور اس میں پیش آنے والے معاملات تھے اور اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے بھی جو اس نے قرآن میں دین اسلام کے غالب اور دشمنوں کے مغلوب ہونے سے متعلق کیے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تو یہ کفار اس وعدے کو محض مذاق سمجھتے ہوئے اس پر ہنستے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن عنقریب مسلمانوں کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا جائے گا اور پھر ایسے واقعات پیش آئیں گے کہ جن سے یہ وعدہ حقیقت بن کر ان کے سامنے آ جائے گا اور آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے کہ آخرت بھی، جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ان کے سامنے آ جائے گی۔

آیت 6 اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا ...... : کفار کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ کیا انھیں معلوم نہیں کہ ان سے پہلے کئی اقوام، مثلاً قوم نوح، عاد و ثمود اور آل فرعون جو قوت و اقتدار میں ان سے کہیں بڑھ کر تھے اور بارشوں اور نہروں کی وجہ سے ان کے باغ اور کھیت سرسبز و شاداب تھے اور عیش و خوشحالی کا دور دورہ تھا، جب انھوں نے بغاوت اور سرکشی پر کمر باندھی تو ہم نے ان کا نام و نشان مٹا دیا، پھر ان کے بعد اور قومیں پیدا کر دیں۔ جب تم سے زیادہ طاقت ور قوموں کو ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا تو تمھاری کیا حیثیت ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ احقاف (۲۶، ۲۷) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیوی ترقی اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ ان پر حجت قائم کرنے کے لیے استدراج (رسی ڈھیلی کرنا) بھی ہو سکتا ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ آخرت کو سامنے آئے گا۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝

اور اگر ہم آپ پر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی چیز اتارتے، پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، یہی کہتے کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ۝ اور انھوں نے کہا اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو ضرور کام تمام کر دیا جاتا، پھر انھیں مہلت نہ دی جاتی ۝ اور اگر ہم اسے فرشتہ بناتے تو یقیناً اسے آدمی بناتے اور ضرور ان پر وہی شبہ ڈالتے جو وہ (اپنے آپ پر اور دوسروں پر) ڈال رہے ہیں ۝

آیت 7 وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا ...... : اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو انبیاء کے معجزات کی کوئی الٹی سیدھی تاویل کر کے انھیں جھٹلا دیتے تھے۔ (رازی) اس آیت میں کفار مکہ کی نبی کریم ﷺ کو جھٹلانے کے لیے پیش کردہ فرمائشوں میں سے ایک فرمائش (بنی اسرائیل: ۹۳) کا جواب ہے کہ ہم اس وقت تک تمھارے آسمان پر چڑھنے کا یقین نہیں کریں گے جب تک تم ہم پر ایسی کتاب نازل نہیں کرتے جسے ہم خود پڑھیں۔ یہ لوگ اپنی سرکشی اور کفر کی روش میں اس قدر پختہ ہیں کہ اگر ہم ان پر آسمان سے لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے، جسے یہ اپنے ہاتھوں سے چھو کر صاف معلوم کر لیتے کہ یہ کوئی خیالی اور نظر بندی جیسی چیز نہیں، بلکہ حقیقت ہے، تب بھی یہ لوگ اسے کھلا جادو قرار دیتے، پھر اگر یہ بد بخت قرآن کو جادو قرار دیتے ہیں تو کیا تعجب ہے؟ (قرطبی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جس کی قسمت میں ہدایت نہیں اس کا شبہ نہیں مٹتا۔'' (موضح) مزید دیکھیے سورۂ حجر (۱۴، ۱۵) اور طور (۴۴)۔

آیت 8 ❶ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ: یہ نبوت کے منکرین کا ایک اور اعتراض ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی طرف رسول بھیجنا ہی تھا تو وہ انسان کے بجائے فرشتہ ہونا چاہیے تھا، یا فرشتہ اس کے ساتھ ساتھ پھرتا اور کہتا کہ یہ اللہ کا رسول ہے، اس پر ایمان لے آؤ، ورنہ تمھیں سزا دی جائے گی۔

❷ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ...... : یہ پہلا جواب ہے۔ (رازی) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ چلا آیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی سے معجزہ طلب کرے اور وہ اسے دکھا دیا جائے، لیکن اس کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے تو اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے، اس لیے اگر فرشتے اصل صورت میں نازل ہوتے تو ان کے پاس عذاب لے کر آتے اور ان کا قصہ ہی تمام ہو جاتا۔ دیکھیے سورۂ حجر (۶ تا ۸) اور سورۂ فرقان (۲۱، ۲۲)۔

آیت 9 وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا ...... : یہ کفار کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے، یعنی ان کے مطالبے کو مانتے ہوئے ہم فرشتہ اتارنا منظور کر بھی لیتے تو وہ بھی انسانی صورت میں آتا، کیونکہ یہ اسے اس کی اصل شکل میں تو دیکھ ہی نہیں سکتے اور جب وہ

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا، تو ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے مذاق اڑایا تھا، اسی چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۱۰﴾ کہہ دے زمین میں چلو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۱۱﴾ کہہ کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟ کہہ اللہ کا ہے، اس نے اپنے آپ پر رحم کرنا لکھ دیا ہے، یقیناً وہ تمھیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) ضرور جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، سو وہی ایمان نہیں لاتے ﴿۱۲﴾

آدمی کی شکل میں ہوتا تو پھر یہی اعتراض کرتے جواب کر رہے ہیں۔ اس وقت کے کافر کسی انسان کو نبی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، کیونکہ آپ ﷺ ان کی قوم سے تھے، ان کے سامنے جوان ہوئے اور انھی میں زندگی گزاری۔ اب کچھ لوگ آپ ﷺ کو نبی تو مانتے ہیں، مگر آپ ﷺ کو انسان ماننے کے لیے تیار نہیں۔ گویا ایک ہی عقیدے کی دو شکلیں ہیں اور دونوں باطل ہیں، حالانکہ اللہ نے اپنا احسان جتلایا ہے کہ میں نے انسانوں میں انھی کے اندر سے رسول بھیجا ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۶۴)۔

آیت 10 وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ ...... : اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ کو جھٹلانے اور اللہ کے عذاب کا مذاق اڑانے کا جو معاملہ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ہوا، آخر کار اسی عذاب نے کفار کو آ گھیرا جس کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی عذاب نہیں آئے گا، یہ محض دھمکی ہے۔

آیت 11 قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... : اس سے کفار کو ڈرانا مقصود ہے، یعنی دنیا کے مختلف خطوں میں جو قومیں پائی گئی ہیں، ذرا ان کے حالات اور تاریخ پر غور کرو، تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی اطاعت سے انکار کیا انھیں کیسے عبرت ناک انجام سے دو چار ہونا پڑا، پھر اس سے اندازہ کر لو کہ اب جو تم ہمارے آخری رسول ﷺ اور آخری کتاب کا مذاق اڑا رہے ہو تمھارا انجام کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

آیت 12 ① قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... : وعظ و نصیحت اور ڈرانے کے بعد انھی تینوں اصولوں (کائنات کی ابتدا، اسے دوبارہ زندہ کرنے اور انبیاء کی نبوت) کو ثابت کرنے پر دلیل قائم کی ہے۔ نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کافروں سے پوچھیے کہ آسمانوں اور زمین کا مالک کون ہے؟ اس سوال کا مقصد ڈانٹ اور پھٹکار ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں ٹھہرا ہوا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۳﴾

آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ خود ہی جواب دے دیجیے کہ اللہ کے سوا کون ہو سکتا ہے اور یہ جملہ بھی رسول اللہ ﷺ ہی کی زبانی ادا کیا گیا ہے کہ آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کرنا لازم کر لیا ہے، وہ توبہ واستغفار قبول کرتا ہے اور اسی صفت رحمت کا تقاضا ہے کہ اس نے تمھیں دنیا میں مہلت دی ہے، فوراً نہیں پکڑتا، لیکن قیامت کے دن تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے اپنے پاس کتاب میں، جو اس کے پاس عرش کے اوپر ہے، اپنے متعلق لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''
[ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿ ويحذركم الله نفسه...... ﴾ : ۷٤٠٤ ]

لیکن یہ رحمت قیامت کے دن صرف اہل ایمان کے لیے ہوگی، کافروں کے لیے اللہ تعالیٰ سخت غضب ناک ہوگا۔ دنیا میں اس رحمت سے مسلم اور کافر، نیک اور بد سب فائدہ اٹھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ١٥٦ ] ''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔'' مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۸) رہا دنیا میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴾ [ بني إسرائيل : ٢٠ ] ''ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی بھی اور ان کی بھی، تیرے رب کی بخشش سے اور تیرے رب کی بخشش کبھی بند کی ہوئی نہیں۔''

❷ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ...... : یعنی قیامت کا آنا ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی سمجھ دار آدمی انکار نہیں کر سکتا، اس سے انکار اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہی جو اپنی عقل وفطرت سے کام نہیں لیتا اور خسارے کے سودے پر اڑا ہوا ہے، نفع کے سودے کی خواہش ہی نہیں رکھتا، حالانکہ اللہ نے فرمایا: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾ [ آل عمران : ١٨٥ ] ''پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا۔''

**آیت 13** وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ...... : گزشتہ آیت : ﴿ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ میں مکان (جگہ) کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ بادشاہ ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں زمان اور وقت کے اعتبار سے اس کی بادشاہی عام ہونے کا ذکر ہے۔ کیونکہ آسمان و زمین کے سوا کوئی مکان (جگہ) نہیں اور رات اور دن کے سوا کوئی زمانہ (وقت) نہیں، گویا ہر جگہ اور ہر وقت اسی کی حکومت اور اسی کا قبضہ و اقتدار ہے۔ پھر یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ تمام جگہوں اور تمام اوقات اور زمانوں کا مالک ہے، فرمایا: ﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی وہ ہر چیز کی دعا اور پکار سنتا ہے۔ ''الْعَلِيْمُ'' ہر چیز کے عمل اور اس کی ضرورت سے آگاہ ہے تو پھر کسی اور کو پکارنے کی ضرورت کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہاں ''مَا سَكَنَ'' میں

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی مالک بناؤں جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، حالانکہ وہ کھلاتا ہے اور اسے نہیں کھلایا جاتا۔ کہہ بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا شخص بنوں جو فرماں بردار بنا، اور تو ہرگز شریک بنانے والوں سے نہ ہو ﴿۱۴﴾ کہہ دے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بے شک میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۱۵﴾ جس شخص سے اس دن وہ ہٹا لیا جائے گا تو یقیناً اس نے اس پر رحم کر دیا اور یہی کھلی کامیابی ہے ﴿۱۶﴾

سکون سے مراد حلول، یعنی رہنا ہے اور سکون جو حرکت کی ضد ہے وہ مراد نہیں۔ اس لیے ٹھہرا ہوا ہے کا معنی بھی یہی ہے کہ جو بھی رات اور دن میں بس رہا ہے۔

**آیت 14** ① قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا: "ولی" کا معنی دوست بھی آتا ہے، مالک و مددگار اور معبود و کارساز بھی، یہاں اس کا معنی مالک و مددگار اور معبود و کارساز ہے، یعنی وہ زمان و مکاں کا خالق ہی نہیں بلکہ اسے باقی رکھنے والا اور چلانے والا بھی وہی ہے، اسے کسی سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں، باقی سب اسی کا دیا ہوا کھانے والے اور ہر لحاظ سے اس کے محتاج ہیں۔ اس ایک جملے سے مشرکین نے اللہ کے سوا جتنے معبود بنا رکھے تھے، ان سب کی نفی ہو جاتی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ ذاریات (۵۶ تا ۵۸)۔

② قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ ......: کیونکہ میں اس کا رسول ہوں اور رسول کا کام یہ ہے کہ تمام بندوں سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اپنے مالک کے احکام کو مانے۔ اور ﴿وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شرک میں مبتلا ہوتا ہے تو ہوتا پھرے، آپ کا یہ کام نہیں کہ اس لعنت میں پڑنے کا خیال بھی اپنے ذہن میں لائیں۔

**آیت 15** قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ...... : رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ اعلان کروا کر دوسرے سب لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اگر بفرض محال ہمارے معصوم اور سب سے زیادہ نیک بندے سے بھی نافرمانی کا ارتکاب ہو جائے تو وہ بھی ہمارے عذاب سے نہیں بچ سکتا، پھر دوسروں کے لیے کیسے ممکن ہے کہ انبیاء کو جھٹلانے جیسے جرائم کرنے کے باوجود ہمارے عذاب سے بے فکر ہو کر بیٹھ رہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۸۱ تا ۸۸) اور سورۂ زمر (۶۴، ۶۵)۔

**آیت 16** مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ......: یعنی بلند مقام حاصل کرنا تو بہت بڑی بات ہے، اگر کسی سے آخرت کا عذاب ہی ٹل جائے تو اپنی جگہ یہی بہت واضح کامیابی ہے۔

وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ۫ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۫ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۷﴾ اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہی کمال حکمت والا، ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۸﴾ کہہ کون سی چیز گواہی میں سب سے بڑی ہے؟ کہہ اللہ میرے درمیان اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے، تاکہ میں تمھیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے، کیا

**آیت 17** وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ ...... : اس آیت سے شرک کی جڑ کٹ گئی۔ کیونکہ جس انسان کا یہ عقیدہ پختہ ہو جائے کہ دکھ اور تکلیف کو دور کرنے والا اور ہر قسم کی خیر کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر وہ دوسروں کے آگے سجدے کرنا اور ان کی قبروں پر نذرانے چڑھانا اور سمجھنا کہ وہ حاجتیں پوری کر سکتے ہیں، بہت بڑی حماقت سمجھے گا۔ قرآن نے اس بات پر خصوصی زور دیا ہے کہ ہر قسم کا نفع وضرر اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس پر عقیدہ پختہ ہو جائے تو انسان شرک میں مبتلا نہیں ہوتا۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۸)، یونس (۱۰۴ تا ۱۰۷)، فاطر (۲)، سورۂ زمر (۳۸) اور سورۂ جن (۲۱)۔

**آیت 18** وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ...... : یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے سوا کسی کو ولی نہیں بنانا چاہیے۔ (رازی) مطلب یہ ہے کہ سب لوگ، خواہ بڑے سے بڑے جابر ہوں، اس کے سامنے بے بس ہیں، تمام گردنیں اس کے آگے جھکی ہوئی ہیں، وہ ہر ایک پر غالب ہے اور ساری کائنات اس کی مطیع ہے۔ صفات کمال دو ہیں، قدرت اور علم، پہلے جملے ﴿ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ﴾ میں کمال قدرت کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے جملے ﴿ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴾ سے کمال علم ثابت ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے احکام میں کمال حکمت والا اور اپنے بندوں کے معاملات کی پوری خبر رکھنے والا ہے۔ (رازی) اس لیے غلبہ و تسلط کے باوجود اپنی مخلوق کے معاملے میں حکمت اور آگاہی کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔

**آیت 19** ① قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ...... : کفارِ مکہ کے بعد جب یہود و نصاریٰ کی اکثریت نے بھی آپ کو جھٹلا دیا تو کفار کہنے لگے، بتاؤ اب تمھاری رسالت کی گواہی کون دیتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ ان کافروں سے کہیے کہ اللہ کی ہستی سے بڑی ہستی کون سی ہے؟ جب کوئی نہیں تو بتاؤ سب سے بڑا شہادت دینے والا کون ہوگا؟ آپ خود ہی ان کے سامنے واضح فرما دیجیے کہ وہ تو اللہ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی گواہی یہ ہے کہ اس نے مجھ پر قرآن اتارا، جو قیامت تک کے لیے زندہ معجزہ ہے کہ کوئی بھی اس کی کسی ایک سورت جیسی کوئی سورت نہیں لا سکا اور نہ لا سکے گا۔ یہ قرآن معجزہ ہونے کے اعتبار سے میرے سچے نبی ہونے کی صریح دلیل ہے، اسی کے پیش نظر فرمایا: ﴿ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ﴾ ”اور میری طرف

لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ⑲

بے شک تم واقعی گواہی دیتے ہو کہ بے شک اللہ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دے میں (یہ) گواہی نہیں دیتا، کہہ دے وہ تو صرف ایک ہی معبود ہے اور بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم شریک ٹھہراتے ہو ⑲

یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔'' (رازی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہاں گواہی فرمایا قسم کو، یعنی میں قسم کھاتا ہوں اللہ کی، اس سے زیادہ کیا قسم ہوگی۔ (موضح) اس آیت میں اللہ کے لیے ''شَیْءٌ'' ہونے کو ثابت کیا جا رہا ہے کہ وہ ایک موجود، زندۂ جاوید ہستی ہے، محض ایک خیال و تصوراتی ہستی نہیں ہے۔

② لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ: یعنی میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمھیں اس سے ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے۔ اس سے مراد قیامت تک آنے والے تمام عرب و عجم اور جن و انس ہیں اور مقصد یہ ہے کہ میری رسالت عالم گیر اور قیامت تک کے لیے ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے مطابق روم، ایران، حبشہ اور کئی ممالک کو دین اسلام کی دعوت دی اور اپنی امت کے ہر فرد کو حکم دیا: (( بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً )) ''میری طرف سے پہنچا دو خواہ ایک آیت (مسئلہ) ہو۔'' [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل : ٣٤٦١، عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہ ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری بات سننے والوں میں سے ہر شخص اسے پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔'' [ بخاري، الحج، باب الخطبة أيام منًى : ١٧٤١ ]

اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہر اس بندے (کے چہرے) کو تروتازہ رکھے جو میری بات یاد رکھے اور آگے پہنچا دے۔'' [ ترمذي، العلم، باب ما جاء في الحث على تبليغ السماع : ٢٦٥٦ تا ٢٦٥٨ ] ان احادیث اور آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے احکام تمام لوگوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہر زمانے کے لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اسے اگلے زمانے کے لوگوں تک پہنچائیں۔ قرآن کے احکام کو صرف نبی ﷺ کے زمانے تک محدود رکھنا اور حالات کی تبدیلی کے بہانے قرآن و حدیث کے احکام میں تبدیلی کرنا، قرآن کے احکام سے جان چھڑانے کی کوشش ہے اور صریح تحریف ہے، جس کی وجہ سے یہودی ملعون ٹھہرے۔

③ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ......: یعنی قرآن میں مذکور توحید کے واضح اور قطعی دلائل کے باوجود کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں۔ آپ کہہ دیجیے تم جو چاہو کہو، میں یہ شہادت کبھی نہیں دے سکتا۔ کہہ دیجیے کہ معبود تو صرف ایک اللہ ہے، میں کسی اور کو معبود نہیں مانتا اور صاف کہتا ہوں کہ میں ان تمام ہستیوں سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، بری ہوں ''مَا'' مصدریہ ہو تو معنی ہوگا، میں تمھارے شرک سے جو تم کرتے ہو، بری ہوں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، سو وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۲۰﴾ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ پر کوئی جھوٹ باندھا، یا اس کی آیات کو جھٹلایا، بے شک حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے ﴿۲۱﴾

آیت 20 ① اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ ......: یعنی یہود و نصاریٰ کو رسول اللہ ﷺ کے سچے رسول ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ ان کی اپنی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر خیر موجود ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۶)، سورۂ اعراف (۱۵۷) اور سورۂ صف (۶)۔

② کفارِ مکہ نے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا تو انھوں نے آپ کی نبوت سے انکار کیا اور کہا کہ تورات و انجیل میں آپ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس پر کفار نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اہل کتاب تو آپ کی نبوت کا انکار کر رہے ہیں، پھر آپ کی نبوت کی شہادت کون دیتا ہے؟ اس کا جواب اس سے پہلی آیت میں دیا گیا ہے، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب جھوٹ بولتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ذکر تورات و انجیل میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ آپ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کو پورے یقین سے جانتے ہیں مگر ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر انکار کر کے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رہے ہیں، ایسے لوگوں سے ایمان کی امید نہیں، ہاں جن لوگوں کے دلوں میں اخلاص ہے وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔

آیت 21 وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى ......: یعنی اگر میں نے جھوٹ بولا تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں اور اگر میں نے سچ پہنچایا اور تم نے جھٹلایا تو تم سے زیادہ گناہ گار کوئی نہیں، پس اپنی فکر کرو۔ (موضح) اب اس آیت میں ان کے خسارے کا سبب بیان فرمایا۔ (رازی) خسارے کا پہلا سبب افتراء علی اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا قرار دیا ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ کفار مکہ کے دین کی بنیاد ہی جھوٹ گھڑنے پر تھی۔ بتوں کو اللہ کا شریک قرار دینا، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہنا اور بحیرہ و سائبہ وغیرہ کو حرام قرار دینا، یہ سب چیزیں جھوٹ گھڑنے پر مبنی تھیں۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے دین میں بہت سے افترا شامل ہو گئے تھے، مثلاً وہ تورات و انجیل کو ناقابل نسخ قرار دیتے، اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اس کے حبیب کہتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے متعلق بہت سی جہالت کی باتیں کرتے تھے۔ خسارے کا دوسرا سبب اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا ہے، جس میں معجزات و احکام کو جھٹلانا بھی شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والوں میں نبوت کے جھوٹے دعوے دار وہ تیس کذاب بھی شامل ہیں جن کی نبی ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی۔ [ مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة ...... : ۲۹۲۳/۸٤ ] جن میں مرزا قادیانی اور اسے نبی کہنے والے بھی

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے کہاں ہیں تمھارے وہ شریک جنھیں تم گمان کرتے تھے ﴿۲۲﴾ پھر ان کا فریب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کہیں گے اللہ کی قسم! جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے ﴿۲۳﴾ دیکھ انھوں نے کیسے اپنے آپ پر جھوٹ بولا اور ان سے گم ہوگیا جو وہ جھوٹ بنایا کرتے تھے ﴿۲۴﴾ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں، اس سے کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (رکھ دیا ہے) اور اگر وہ ہر نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ جب تیرے پاس جھگڑتے ہوئے آتے ہیں تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں یہ پہلے لوگوں کی فرضی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ﴿۲۵﴾

شامل ہیں، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے ذمے کوئی جھوٹی حدیث لگانے والے بھی، کیونکہ آپ کے ذمے کوئی بات لگانے والا درحقیقت وہ بات اللہ کے ذمے لگا رہا ہوتا ہے۔

**آیت 23،22** وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا...... : اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن جب ان سے ان کے بنائے ہوئے شریکوں سے متعلق باز پرس ہوگی تو ان کے پاس کوئی بہانہ یا فریب اس کے سوا نہ ہوگا کہ وہ قسم کھا کر اپنے شرک کرنے ہی سے انکار کر دیں گے۔ دیکھیے سورۂ مجادلہ (۱۸)۔

دوسری آیت میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۲) دونوں باتوں میں تطبیق یہ ہے کہ پہلے وہ اہل توحید کو جنت میں داخل ہوتا دیکھیں گے تو اپنے شرک کا انکار کریں گے، پھر جب ان کے مونہوں پر مہر لگے گی اور ان کے ہاتھ، پاؤں اور جسم کا ہر حصہ بول کر گواہی دے گا تو پھر ان کی کوئی بات چھپ نہیں سکے گی۔

**آیت 24** اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا...... : یعنی وہاں ان کا شرک ان کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کے بنائے ہوئے حاجت روا اور مشکل کشا کہیں نظر آئیں گے۔

**آیت 25** وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ...... : یعنی کان لگا لگا کر سنتے ہیں، جب قیامت کے دن گزشتہ کافروں پر گزرنے والے کچھ احوال بیان فرمائے تو موجودہ کافروں کا بھی کچھ حال بیان فرمایا۔ (رازی) فرمایا کہ مشرکین آپ کے پاس آ کر

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾

اور وہ اس سے روکتے ہیں اور اس سے دور رہتے ہیں اور وہ اپنے سوا کسی کو ہلاک نہیں کر رہے اور نہیں سمجھتے ﴿۲۶﴾ اور کاش! تو دیکھے جب وہ آگ پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش! ہم واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں ﴿۲۷﴾

بڑے غور سے قرآن سنتے ہیں، لیکن ضد اور عناد کی وجہ سے ہدایت حاصل کرنا ان کا مقصد ہی نہیں ہوتا، اس لیے انھیں سننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے حق کو پہچان کر نہ ماننے اور ان کی بدنیتی کی وجہ سے ہم نے انھیں یہ سزا دی ہے کہ ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیے ہیں، جن کی وجہ سے وہ کان لگا کر سننے کے باوجود نہ سمجھتے ہیں، نہ سنتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹) اب قرآن جیسا عظیم معجزہ دیکھ کر وہ ایمان نہیں لائے تو یہ امید مت رکھیں کہ وہ کوئی بھی معجزہ دیکھ کر ایمان لے آئیں گے۔ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کو برحق جاننے کے باوجود ان کی ضد اور عناد یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ آپ کے پاس آ کر جب وہ آپ سے جھگڑتے ہیں اور ان انکار کرنے والوں کو آپ ﷺ کے واضح دلائل کا کوئی جواب نہیں سوجھتا تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی فرضی کہانیاں ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں اخلاق، حکمت اور شریعت کی باتیں ہیں اور اس میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں، وہ سب سچے واقعات ہیں اور صرف عبرت و نصیحت کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

**آیت 26** ① وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ : یعنی صرف قرآن پر طعن کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قرآن سننے سے اور لوگوں کو آپ ﷺ کے پاس جانے سے بھی روکتے ہیں اور خود بھی دور رہتے ہیں۔ آج کل مسلمانوں میں سے بہت سے شرک و بدعت میں مبتلا مولوی بھی اہل توحید کی تقریریں سننے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں اور خود بھی نہیں سنتے، بلکہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے سے لوگوں کو روکتے ہیں کہ کہیں حق واضح ہو جانے کے بعد اسے قبول کر کے ہمارے چنگل سے نہ نکل جائیں۔

② وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ : یعنی ایسا کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، بلکہ اپنی ہی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ایسا کرنے سے ہم اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔

**آیت 27** وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ ...... : جب قیامت کا عذاب دیکھ لیں گے تو اس کی ہلاکت اور تباہی سے بچنے کے لیے اس خواہش کا اظہار کریں گے کہ اے کاش! ہمیں دنیا میں دوبارہ جانے کا موقع ملے تو ہم اس تکذیب سے جس کی بنا پر ہم عذاب سے دوچار ہو رہے ہیں، باز آ جائیں اور توحید و نبوت پر یقین کر لیں، لیکن یہ ان کی محض ایک خواہش ہو گی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اس لیے اگلی آیت میں بتا دیا کہ وہ اس خواہش میں جھوٹ بول رہے ہیں۔

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَ قَالُوْۤا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾

بلکہ ان کے لیے ظاہر ہوگیا جو وہ اس سے پہلے چھپاتے تھے اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں ﴿۲۸﴾ اور انھوں نے کہا، نہیں ہے یہ (زندگی) مگر ہماری دنیا کی زندگی اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ﴿۲۹﴾ اور کاش! تو دیکھے جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، وہ فرمائے گا کیا یہ حق نہیں؟ کہیں گے کیوں نہیں! ہمارے رب کی قسم! فرمائے گا پھر چکھو عذاب اس کے بدلے جو تم کفر کیا کرتے تھے ﴿۳۰﴾

آیت 28 ① بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا...... : اس سے پہلے (اللہ تعالیٰ کے سامنے) جس کفر و شرک اور نفاق کو وہ جھوٹی قسمیں کھا کر چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، اس کی حقیقت کھل جائے گی۔ بعض نے ”مِنْ قَبْلُ“ سے دنیا میں چھپانا مراد لیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے، یا پھر اس سے کفار کے سردار مراد ہیں، یعنی وہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کا سچا ہونا جانتے تھے، مگر اپنے پیروکاروں سے چھپاتے تھے۔ قیامت کے دن یہ حقیقت ان کے پیروکاروں پر کھل جائے گی اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمیں دھوکا دیتے رہے ہیں۔

② وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ : یعنی پھر کفر و شرک اور نفاق کی راہ اختیار کریں گے، کیونکہ ان کی یہ آرزو ایمان لے آنے کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی طرح جہنم سے بچنے کے لیے ہے۔

③ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ : اس لیے آخرت میں اس آرزو کے اظہار میں بھی جھوٹ ہی سے کام لیں گے۔

آیت 29 وَ قَالُوْۤا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا...... : یعنی زندگی بس وہی ہے جو دنیا میں ہم گزار رہے ہیں، کوئی آخرت نہیں، نہ کچھ ثواب و عذاب ہے، یہ محض لوگوں کو الّو بنانے کے لیے ڈھکوسلا ہے۔

آیت 30 ① وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا ...... : پچھلی آیت میں کفار کا وہ قول بیان کیا ہے جو وہ دنیا میں کہا کرتے تھے اور اب آخرت میں ان کی حالت کا ذکر ہے۔

② قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ...... : کاش! آپ وہ منظر دیکھیں جب انھیں آگ کے سامنے کھڑا کر کے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ (آخرت اور جزا و سزا) حق نہیں ہے۔ اب وہ اپنا قول بالکل ہی بدل لیں گے اور قسم کھا کر قیامت کے دن کے حق ہونے کا اقرار کریں گے، مگر اس وقت کا اقرار انھیں کچھ فائدہ نہیں دے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ پھر اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔ قرآن مجید میں قیامت کے دن ان کی اس خواہش کا اور اسے ٹھکرا دیے جانے کا کئی جگہ ذکر ہے۔ دیکھیے

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَ هُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝۳۱ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۳۲ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۳۳

یقیناً خسارے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس قیامت اچانک آپہنچے گی کہیں گے ہائے ہمارا افسوس! اس پر جو ہم نے اس میں کوتاہی کی اور وہ اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے۔ سن لو! برا ہے جو وہ بوجھ اٹھائیں گے ۝۳۱ اور دنیا کی زندگی کھیل اور دل لگی کے سوا کچھ نہیں اور یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، تو کیا تم نہیں سمجھتے ۝۳۲ بے شک ہم جانتے ہیں کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ یقیناً تجھے وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، تو بے شک وہ تجھے نہیں جھٹلاتے اور لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات ہی کا انکار کرتے ہیں ۝۳۳

---

سورۂ مومنون (۱۰۷، ۱۰۸) اور سورۂ سجدہ (۱۲)۔

**آیت 31** عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا: یہاں "فِيْهَا" کی ضمیر یا تو "الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ" کی طرف جا رہی ہے، یا "السَّاعَةُ" کی طرف، یعنی ہائے ہمارا افسوس! اس کوتاہی پر جو ہم نے دنیا میں کی، یا اس کوتاہی پر جو ہم نے قیامت کے بارے میں کی۔

**آیت 32** ❶ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ ...... : دنیوی زندگی کے بہت جلد ختم ہونے کے اعتبار سے اس کو لہو ولعب فرمایا ہے۔ (رازی) یعنی آخرت کی حقیقی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی زندگی اور اس کی لذتیں ایسی ہی ہیں جیسے بچوں کا کھیل تماشا جو تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ حدید (۲۰) انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے راستے میں ایک شام یا ایک صبح دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے اور جنت میں تمھارے کسی شخص کی ایک کمان کی مقدار کے برابر یا اس کے کوڑے کے برابر جگہ دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے، اور اگر اہل جنت میں سے کوئی عورت زمین والوں کی طرف جھانک لے تو آسمان و زمین کے درمیان کی جگہ کو روشن کر دے اور اسے خوشبو سے بھر دے اور اس کے سر کا دوپٹا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔" [ بخاری، الجهاد والسير، باب الحور العين و صفتهن : ۲۷۹٦ ]

❷ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ ...... : یعنی آخرت کا گھر دنیا سے کہیں بہتر ہے، مگر ان کے لیے جو کفر و شرک، نفاق اور کبائر سے بچتے ہیں، ورنہ کافر کے لیے تو دنیا کی زندگی ہی بہتر ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْكَافِرِ »[ مسلم، الزهد، باب الدنيا سجن ...... : ۲۹۵٦ ] "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔"

**آیت 33** قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ ...... : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تک نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا آپ کی قوم کے تمام لوگ

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تو انھوں نے اس پر صبر کیا کہ وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی اور کوئی اللہ کی باتوں کو بدلنے والا نہیں اور بلاشبہ یقیناً تیرے پاس ان رسولوں کی کچھ خبریں آئی ہیں ﴿۳۴﴾

---

آپ کو صادق اور امین کہتے تھے، لیکن جونہی آپ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور انھیں اللہ کی آیات سنانا شروع کیں تو ان میں سے اکثر آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور آپ کو ( نعوذ باللہ ) جھوٹا قرار دینے لگے۔ ابوسفیان جو بدر، احد اور خندق کی جنگ کا باعث تھا، اس سے رومی بادشاہ ہرقل نے پوچھا کہ محمد (ﷺ) نے کبھی جھوٹ بولا ہے، تو اس نے کافر ہونے کے باوجود جواب دیا کہ محمد (ﷺ) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ یہ لوگ جو آپ کو جھٹلا رہے ہیں، وہ حقیقت میں آپ کو نہیں بلکہ ہماری آیات کو جھٹلا رہے ہیں، کیونکہ شخصی لحاظ سے تو آپ کو جھٹلا ہی نہیں سکتے، آپ کے نبوت سے پہلے کے چالیس سال اس کا ثبوت ہیں۔ ان سے مراد دراصل وہ کفار ہیں جو بشر کے نبی اور رسول ہونے کو محال سمجھتے تھے۔ (ابن کثیر، رازی)

**آیت 34** ① وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ ...... : اس آیت میں ایک دوسرے طریقے سے آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ صرف آپ ہی کو نہیں، بلکہ آپ سے پہلے کئی انبیاء و رسل کو بھی جھٹلایا گیا، اس لیے آپ بھی اسی طرح صبر و استقامت سے کام لیں جس طرح انھوں نے لیا۔

② وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ : "لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آپ کی نصرت اور آپ کو غالب اور کفار کو مغلوب کرنے کا وعدہ کیا ہے، جیسے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [المؤمن : ۵۱ ] ''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔'' اور فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ ﴾ [ المجادلة : ۲۱ ] ''اللہ نے لکھ دیا کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔'' اور فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ [ الفتح : ۲۸ ] ''وہی ہے جس نے اپنا رسول بھیجا ہدایت اور دین حق کے ساتھ، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔'' تو یہ وعدہ ہر حال میں پورا ہو گا، لہٰذا آپ اطمینان رکھیں کہ اللہ کی باتوں کو کوئی نہیں بدل سکتا، جس طرح انھوں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اسی طرح آپ بھی صبر و استقامت سے اپنی دعوت پیش کرتے رہیں اور کسی بے چینی کو اپنے اندر راہ نہ پانے دیں۔ یقیناً آپ کی بھی اسی طرح نصرت و تائید کی جائے گی۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور اگر تجھ پر ان کا منہ پھیرنا بھاری گزرا ہے تو اگر تو کر سکے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ نکالے، پھر ان کے پاس کوئی نشانی لے آئے (تو لے آ) اور اگر اللہ چاہتا تو یقیناً انھیں ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تو جاہلوں میں سے ہرگز نہ ہو ﴿۳۵﴾ قبول تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں انھیں اللہ اٹھائے گا، پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۳۶﴾

**آیت 35** ① وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ ...... : نبی کریم ﷺ کو کفار کے جھٹلانے سے جو تکلیف اور دل شکنی ہوتی تھی اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ان لوگوں کی بے رخی اگر بہت زیادہ ہی آپ پر شاق گزر رہی ہے تو زمین میں سرنگ نکال کر یا آسمان پر سیڑھی کے ذریعے سے چڑھ کر آپ کوئی معجزہ لا کر ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں، تو آپ ایسا بھی کر کے دیکھ لیجیے، لیکن یہ چونکہ آپ سے ہو نہیں سکتا تو رنجیدہ ہونے سے کیا فائدہ، بہتر ہے کہ انجام کار ہم پر چھوڑتے ہوئے پورے اطمینان اور پورے سکون کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگے رہیں۔ کفار کس طرح کے معجزات کا تقاضا کرتے تھے، اس کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۷)۔

② وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ ...... : یعنی ایسا خیال مت کیجیے کہ کوئی نشانی (معجزہ) لانے سے یہ راہِ ہدایت پر ضرور ہی آجائیں گے، کیونکہ ہدایت سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں اور ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر ہرگز کوئی غم یا افسوس نہ کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں تو اسے یہ کام کچھ مشکل نہ تھا، اس نے صرف "کُنْ" کہنا تھا کہ سب لوگ ایمان لے آتے اور ہدایت پر جمع ہو جاتے۔ دیکھیے یونس (۹۹) مگر ایسا کرنا اس کی مشیت اور حکمت کے خلاف ہے، جو بظاہر یہ ہے کہ اس سے اختیار دے کر آزمانے کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ بہر حال اپنے کاموں کی حقیقی حکمت و مصلحت وہی جانتا ہے، لہٰذا اس قسم کے نظریے کو اپنے دل میں جگہ نہ دیجیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و تقدیر اور اس کی مصلحتوں پر ایمان رکھ کر تسلی حاصل کریں۔

**آیت 36** اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو مردوں کے مشابہ قرار دیا ہے جن کو جتنا بھی پکارا جائے وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے، یعنی ان کفار کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور ان مردوں کو اگر عقل آئے گی تو اسی وقت جب اللہ تعالیٰ ان کو دنیا سے اٹھائے گا اور ان کا محاسبہ کرے گا۔ سورۂ نمل کی آیات (۸۰، ۸۱) اس کی ہم معنی ہیں۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۞

اور انھوں نے کہا اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ کہہ دے بے شک اللہ اس پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتارے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ۳۷ اور زمین میں نہ کوئی چلنے والا ہے اور نہ کوئی اڑنے والا، جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر تمھاری طرح امتیں ہیں، ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی، پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ۳۸

آیت 37 ① وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ ...... : منکرین نبوت یہ شبہ بھی پیش کرتے تھے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو اپنے ساتھ نظر آنے والا ایسا معجزہ کیوں نہیں لاتے جسے دیکھ کر ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا رسول ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ ایسا کرنے پر قادر ہے، مگر اس کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ اگر صاف کھلی نشانی آجائے، جیسے اونٹنی جو صالح علیہ السلام کے عہد میں بھیجی گئی تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کی مدتِ مہلت ختم ہو جائے گی اور فوراً عذاب آجائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ ان کو ہلاک نہ کیا جائے، مگر ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ (رازی) دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۵۹)۔

آیت 38 ① وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ ...... : یعنی زمین پر چلنے والا کوئی جانور (دیکھیے سورۂ نور: ۴۵) اور کوئی دو پروں سے اڑنے والا پرندہ نہیں، مگر سب تمھاری طرح امتیں ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ طائر کا معنی ہی پرندہ (اڑنے والا) ہے، پھر ان الفاظ کی کیا ضرورت تھی کہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض اوقات تیز دوڑنے والے کو بھی پرندہ کہہ دیا جاتا ہے، جیسے کہہ دیا جائے کہ گھوڑا اڑتا جا رہا تھا۔ ''دو پروں'' کے لفظ نے یہ احتمال ختم کر دیا اور بتا دیا کہ یہاں مراد حقیقی پرندہ ہے، جو پروں سے اڑتا ہے، صرف تیز رفتار مراد نہیں۔

② اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ : یعنی زمین پر چلنے والے اور اڑنے والے تمام جانور تمھاری طرح کی امتیں ہیں، تمھاری طرح پیدا ہوتی ہیں، جوانی کو پہنچتی ہیں، پھر مر جاتی ہیں، تمھاری طرح ان کا پیدا کرنا، ان کی روزی کا سامان اور ہر ضرورت پوری کرنا اور ان کی مصلحتوں کا اہتمام کرنا سب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ (دیکھیے سورۂ ہود: ۶) جس طرح اللہ تعالیٰ ان کی مصلحتوں کی رعایت کرتا ہے اسی طرح تمھاری تمام مصلحتوں کا بھی خیال رکھتا ہے، ان لوگوں کے مطالبے کے مطابق نشانیاں اور معجزے نازل کرنا خود ان کی مصلحت کے خلاف ہے۔

③ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ : ''الْكِتٰبِ'' سے مراد لوح محفوظ ہے، جو مخلوقات کے تمام احوال پر حاوی ہے، کوئی چیز ایسی

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۹

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں، اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں، جسے اللہ چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے ۳۹

نہیں جس کے بیان کی اس میں کمی رہ گئی ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قلم خشک ہو چکا ہے اس پر جو تم کرنے والے ہو۔'' [ بخاری، القدر، باب جف القلم علی علم اللہ ... قبل ح : ۶۵۹۶ ] "الْكِتٰبِ" سے مراد یہاں قرآن کریم بھی ہو سکتا ہے۔ رازی نے فرمایا ( یہی معنی زیادہ ظاہر ہے ) اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں دین کے متعلق تمام اصول ( بنیادی امور ) بیان کر دیے اور جن جزئیات کا ذکر نہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے بیان فرما دی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ [ النحل : ۸۹ ] ''ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی، اس حال میں کہ وہ ہر چیز کا واضح بیان ہے۔'' اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ پیغمبر جس چیز کا حکم دیں اسے بجا لاؤ اور جس چیز سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ، فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [ الحشر : ۷ ] خلاصہ یہ کہ حدیث نبوی بھی کتاب الٰہی ہے اور دین کی کوئی ایسی بات نہیں جو "الْكِتٰبِ" ( قرآن و حدیث ) میں بیان نہ کر دی گئی ہو۔

④ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ: کفار کو متنبہ کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ زمین کے کسی جانور یا پرندے کے حالات سے ناواقف نہیں ہے اور اس کا نامۂ اعمال محفوظ ہے اور اس کا بدلہ بھی اسے ملے گا تو تم اپنے بارے میں یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ تمھیں تمھارے اعمال کا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ ( رازی )

⑤ اس آیت : ﴿ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ اور ایک دوسری آیت : ﴿ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴾ [ التکویر : ۵ ] ( اور جب جنگلی جانور اکٹھے کیے جائیں گے ) سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کا بھی قیامت کے دن حشر ہوگا۔ ان سے کفر و شرک اور ایمان و اعمال کا محاسبہ تو نہیں ہوگا، مگر جو ظلم کسی جانور نے دوسرے پر کیا ہوگا اس کا بدلہ ضرور دلوایا جائے گا، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ضرور بالضرور حق داروں کے حقوق ادا کروائے جائیں گے، حتیٰ کہ بے سینگ بکری کا بدلہ سینگ والی بکری سے لیا جائے گا۔'' [ مسلم، البر و الصلة، باب تحریم الظلم : ۲۵۸۲ ] بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ بات بطور تمثیل بیان کی گئی ہے، کیونکہ جانور تو مکلف ہی نہیں ہیں، مگر حدیث میں ''بدلے'' کے صریح الفاظ اس خیال کی نفی کرتے ہیں۔

**آیت 39** ① وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ......: یعنی ہماری آیات کو جھٹلانے والے چونکہ حق بات نہ سنتے ہیں، نہ ان کی زبانوں سے حق بات نکلتی ہے، اس لیے وہ بہرے اور گونگے ہیں اور کفر و شرک اور نفس کی بے جا خواہشوں کے اندھیروں میں

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾
بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے، یا تم پر قیامت آ جائے تو کیا اللہ کے سوا غیر کو پکارو گے؟ اگر تم سچے ہو ﴿۴۰﴾ بلکہ تم اسی کو پکارو گے، تو وہ دور کر دے گا جس کی طرف تم اسے پکارو گے، اگر اس نے چاہا اور تم بھول جاؤ گے جو شریک بناتے ہو ﴿۴۱﴾

---

پھنسے ہوئے ہیں۔ یہی بات سورۂ بقرہ (۱۷، ۱۸) اور سورۂ نور (۴۶) میں بیان ہوئی ہے۔

② مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ...... : مگر وہ گمراہ انھی کو کرتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو صحیح استعمال نہیں کرتے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶، ۲۷) اور سورۂ اعراف (۱۷۶) اور ہدایت انھی کو دیتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۱۱)۔

**آیت 40،41** قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ ...... : اس مضمون کو بھی اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ بیان کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۶۷)، سورۂ زمر (۳۸)، سورۂ مومنون (۸۴ تا ۸۹)، سورۂ لقمان (۳۲) اور سورۂ یونس (۲۲) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے زمانے کے مشرکین کا طرز عمل بیان فرمایا، مطلب یہ ہے کہ توحید انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے، وہ ماحول کے اثر سے یا آباء و اجداد کی تقلید سے شرک میں گرفتار ہوتا ہے اور غیر اللہ کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتا رہتا ہے، نذر و نیاز بھی ان کے نام کی نکالتا ہے، لیکن جب آزمائش سے دو چار ہوتا ہے تو پھر سب کو بھول جاتا ہے اور فطرت ان سب پر غالب آ جاتی ہے، پھر بے بس انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور صرف اسی ایک ذات کو پکارتا ہے جسے پکارنا چاہیے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی طرز عمل کو بطور ثبوت توحید کی دلیل کے طور پر بیان کیا، یعنی اگر اپنے اس دعویٰ میں کہ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ تم پر آئی ہوئی بلا ٹال سکتے ہیں تو یہ بتاؤ کہ اللہ کا عذاب آنے کی صورت میں، یا قیامت آنے پر بھی کیا تم غیر اللہ کو پکارو گے؟ نہیں بلکہ تم صرف اسی کو پکارو گے، باقی مشکل کشا تمھیں بھول جائیں گے۔ یہ تو ان کفار و مشرکین کا حال تھا لیکن آج خود مسلمانوں کے اندر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کی فطرت اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ وہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی فریاد کرتے ہیں تو اپنے کسی خود ساختہ داتا سے یا علی (رضی اللہ عنہ) سے، یا شیخ عبد القادر جیلانی سے، انھیں غوث اعظم، یعنی سب سے بڑا مددگار کہہ کر، یا رسول اللہ ﷺ سے، یا فاطمہ، حسین اور حسن رضی اللہ عنہم سے۔ نعرے بھی ان سے مدد مانگنے کے الفاظ کے ساتھ لگاتے ہیں، جیسا کہ یا رسول اللہ، یا علی، یا غوث اعظم وغیرہ، گویا ان کی حالت عملی طور پر ان پہلے کفار و مشرکین سے بھی بدتر ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْ لَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی امتوں کی طرف رسول بھیجے، پھر انھیں تنگ دستی اور تکلیف کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ عاجزی کریں ﴿۴۲﴾ پھر انھوں نے کیوں عاجزی نہ کی، جب ان پر ہمارا عذاب آیا اور لیکن ان کے دل سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کے لیے خوش نما بنا دیا جو کچھ وہ کرتے تھے ﴿۴۳﴾ پھر جب وہ اس کو بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں کے ساتھ خوش ہوگئے جو انھیں دی گئی تھیں، ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا تو اچانک وہ ناامید تھے ﴿۴۴﴾

**آیت 43،42** وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ ...... : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کا ذکر فرمایا ہے جن کے دل ایسے سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کے بداعمال کو ان کے لیے ایسا خوبصورت بنا دیا کہ وہ اللہ کا عذاب آنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے دنیاوی اسباب ہی کو اس عذاب کا نتیجہ قرار دیتے رہے۔ حالانکہ مصائب و آفات بھیجنے کا مقصد لوگوں کو اپنی روش سے باز آنے کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے، لیکن وہ اس موقع کو بھی گنوا دیتے ہیں۔ کیا آج کل ہم مسلمانوں کی اکثریت کا یہ حال نہیں ہوگیا کہ جب کوئی جنگ یا قحط یا سیلاب یا زلزلہ یا کوئی دوسری اجتماعی آفت ہم پر نازل ہوتی ہے تو ہم میں سے کئی افراد اسے محض مادی اسباب کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ اور سزا سمجھنے کو جہالت اور بے وقوفی قرار دیتے ہیں، خصوصاً منکرین حدیث اور کفار سے مرعوب لوگوں کا یہی حال ہے۔

**آیت 44** ① فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ......: جب انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرامین کو فراموش ہی کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرنے کے لیے ان کی رسی دراز کر دی اور ان پر ہر قسم کی نعمتوں کے دروازے کھول دیے، پھر جب وہ عیش و آرام میں پوری طرح مگن ہوگئے تو اللہ نے اچانک انھیں پکڑ لیا، یعنی اچانک ایسا عذاب آیا کہ وہ اپنا تمام عیش و آرام بھول گئے اور انھیں بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور اسی یاس اور ناامیدی کی حالت میں تباہ و برباد کر دیے گئے۔ عقل مند آدمی کو چاہیے کہ جب سختی اور مصیبت آئے تو اسے اللہ کی طرف سے تنبیہ سمجھ کر برے کاموں سے توبہ کر لے، ورنہ غفلت بڑھتی جائے گی اور اچانک ایسی سخت پکڑ ہوگی کہ توبہ کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ "مُّبْلِسُوْنَ" یہ "مُبْلِسٌ" کی جمع ہے، یعنی جس کی امید ختم ہو جائے۔

② فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کفر و شرک اور اللہ کی نافرمانی کے باوجود کوئی قوم دنیوی مال کے لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ اور خوش حال ہے تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس پر خوش ہے، نہیں، بلکہ یہ استدراج ہے اور ان کے حق میں نہایت خطرناک ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۷۸)۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

تو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا رب ہے ﴿۴۵﴾ کہہ کیا تم نے دیکھا اگر اللہ تمھاری سماعت اور تمھاری نگاہوں کو لے لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھیں یہ چیزیں لا دے؟ دیکھ ہم کیسے آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، پھر وہ منہ موڑ لیتے ہیں ﴿۴۶﴾ کہہ کیا تم نے دیکھا اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک یا کھلم کھلا آ جائے، کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی ہلاک کیا جائے گا؟ ﴿۴۷﴾

**آیت 45** فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا...... : یعنی وہ سب نیست و نابود کر دیے گئے اور ان کی ہلاکت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تھی، جس پر ہر چیز نے سکھ کا سانس لیا اور ان کا نام و نشان مٹنے پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، جس نے رب العالمین ہونے کی وجہ سے اپنی مخلوق پر رحم فرما کر زمین کو ان کے وجود سے پاک کیا۔

**آیت 46** قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ...... : فرمایا، اب تو تمھارے کان، آنکھیں اور دل موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور آیات سن کر، دیکھ کر اور ان سے متعلق سوچ کر کفر سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کو لے ہی جائے اور دلوں پر مہر لگا دے تو بتاؤ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہے جو یہ نعمتیں واپس دے دے؟ اس لیے ان کے جانے سے پہلے پہلے توبہ کر لو اور اس میں ہرگز دیر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے حقائق بیان کرتا ہے، تاکہ لوگ حقائق سے آگاہ ہو جائیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی روش سے باز نہیں آتے اور اللہ کی آیات سے بے رخی پر قائم رہتے ہیں۔

**آیت 47** قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ ...... : "بَغْتَةً" اچانک، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے، یعنی رات کو اور "جَهْرَةً" کھلم کھلا، سب کے دیکھتے ہوئے، یعنی دن کو، جیسا کہ سورۂ یونس کی آیت (۵۰) میں ہے: ﴿بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا﴾ ''رات کو یا دن کو۔'' پہلی آیت میں صرف ان کے کانوں، آنکھوں اور دلوں کو لے جانے یا مہر لگا کر بند کر دینے کی بات کی تھی، اب اس آیت میں عام عذاب کے ساتھ ڈرایا جا رہا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو تم کسی صورت بچ نہیں سکو گے۔ باقی رہے رسول کریم ﷺ اور آپ کے ساتھی تو اللہ تعالیٰ انھیں ضرور بچائے گا، کیونکہ پہلے جتنی بھی قومیں تباہ کی گئیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا مستقل طریقہ یہی رہا ہے کہ پہلے رسول اور اس کے پیروکاروں کو ظالم قوم کی بستی سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، جب وہ نکل گئے تو ظالم لوگوں کو تباہ کر دیا گیا۔

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۴۸ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۴۹ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے، پھر جو شخص ایمان لے آئے اور اصلاح کر لے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۴۸ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا انھیں عذاب پہنچے گا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ۴۹ کہہ دے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں تو فرشتہ ہوں، میں پیروی نہیں کرتا مگر اس کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ تو کیا تم غور نہیں کرتے ۵۰

**آیت 50** ① قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ: وہ لوگ نبی کریم ﷺ سے کہتے تھے کہ اگر تم اللہ کے رسول ہو تو اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کرو کہ ہمیں دنیا کا ساز و سامان اور فراوانی حاصل ہو جائے، تو اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ فلاں مرید کو فلاں پیر نے ایک خزانہ بخش دیا، یا مال دار کر دیا تو یہ عقیدہ شرک کے ذیل میں آئے گا۔

② وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: اور نہ میں غیب جانتا ہوں کہ آئندہ کی جو بات مجھ سے پوچھتے جاؤ میں تمھیں بتلاتا جاؤں۔ غیب کا جاننا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، مجھے جو اور جتنا علم ہے اس کی اسی نے اطلاع دی ہے، وہ چاہتا تو مجھے اتنا علم بھی نہ دیتا اور چاہتا تو اس سے بھی زیادہ دے دیتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو علم غیب ہوتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ جب سید الرسل ﷺ کو علم غیب نہ ہوا تو دوسروں کا ذکر کیا ہے اور جب رسول غیب دان نہ ٹھہرے تو پھر کوئی پیر، شہید، ولی، مجذوب، سالک یا عالم و عابد کیسے غیب دان ہو سکتا ہے؟ اور کاہن، نجومی اور رمل والے کس شمار و قطار میں ہیں؟ دیکھیے سورۂ نمل (۶۵) اور سورۂ لقمان (۳۴)۔

③ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ: اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، بلکہ تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں، تو پھر تم مجھ سے آسمان پر چڑھنے کا مطالبہ کیوں کرتے ہو۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۸) اور سورۂ ہود (۳۱)۔

④ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ: یعنی میں تمھی جیسا انسان ہوں، فرشتہ نہیں، البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے اور تمھارے پاس نہیں آتی (دیکھیے کہف: ۱۱۰) اور میں کسی معاملے میں اپنی خواہش کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے بندوں تک جتنے احکام پہنچائے، چاہے قرآن کی شکل میں یا احادیث کی صورت میں، وہ سب اللہ کی طرف سے تھے، لہٰذا قرآن کی طرح سنت کی پیروی بھی ضروری ہے، بلکہ سنت کے

وَ اَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰی رَبِّهِمۡ لَیۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾ وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَیۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ مَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۲﴾

اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف (لے جا کر) اکٹھے کیے جائیں گے، ان کے لیے اس کے سوا نہ کوئی مدد گار ہو گا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، تاکہ وہ بچ جائیں ﴿۵۱﴾ اور ان لوگوں کو دور نہ ہٹا جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں، تجھ پر ان کے حساب میں سے کچھ نہیں اور نہ تیرے حساب میں سے ان پر کچھ ہے کہ تو انھیں دور ہٹا دے، پس تو ظالموں میں سے ہو جائے ﴿۵۲﴾

بغیر قرآن کی پیروی ممکن ہی نہیں ہے۔ جو لوگ سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کی پیروی پر زور دیتے ہیں وہ دراصل اپنی من مانی تاویلات کرنا چاہتے ہیں، جن کی راہ میں حدیث حائل ہے۔

⑤ قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ: یہ بظاہر سوال ہے مگر حقیقت میں اس بات کا انکار ہے کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں۔ اسے استفہام انکاری کہتے ہیں، اندھے اور دیکھنے والے سے مراد باطل پرست اور حق پرست، یا کافر اور مسلمان، یا جاہل اور عالم ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ پیغمبر آدمی کے سوا کچھ اور نہیں ہو جاتے کہ ان سے محال باتیں طلب کی جائیں۔ ایک اندھے اور ایک دیکھتے کا یہی فرق ہے۔ (موضح)

آیت 51 ① وَ اَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِیۡنَ ......: اوپر کی آیت میں پیغمبروں کے متعلق فرمایا کہ وہ مبشر (خوشخبری دینے والے) اور منذر (ڈرانے والے) ہوتے ہیں، اب اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو انذار (ڈرانے) کا حکم دیا۔ (رازی) یعنی ڈرانے کا فائدہ انھی کو ہو سکتا ہے جنھیں دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کا خوف ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا نہ ان کی حمایت کرنے والا کوئی مدد گار ہو گا اور نہ سفارشی۔ جو لوگ حشر اور قیامت کو مانتے ہی نہیں اور انکار پر اڑے ہوئے ہیں، انھیں آپ کے ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴾ [ البقرة : ٦ ] ”ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انھیں ڈرایا ہو، یا انھیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔“

② لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ: یعنی ان لوگوں کو ڈرانے کا یہ فائدہ ہو گا کہ آپ کے ڈرانے سے ان میں اللہ کا خوف اور زیادہ ہو جائے گا اور وہ گناہوں سے باز آ جائیں گے۔ اس آیت سے ان کافروں کا رد بھی مقصود ہے جو یہ گمان رکھتے تھے کہ ان کے معبود اور ٹھاکر وغیرہ اللہ تعالیٰ سے سفارش کر کے انھیں بچا لیں گے۔ اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی اس میں عبرت ہے جو اپنے بزرگوں کی سفارش پر تکیہ کر کے بے فکر ہو کر بے کھٹکے گناہ کرتے رہتے ہیں، کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی سفارش نہیں چل سکے گی۔

آیت 52 ① وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ ......: سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم چھ آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ مشرکین نے کہا، ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نکال دیں، تاکہ یہ ہم پر جرأت نہ کر سکیں۔ ان لوگوں میں میں تھا، ابن مسعود،

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کی بعض کے ساتھ آزمائش کی ہے، تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے احسان فرمایا ہے؟ کیا اللہ شکر کرنے والوں کو زیادہ جاننے والا نہیں؟ ﴿۵۳﴾ اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ سلام ہے تم پر، تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کر لیا ہے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص جہالت سے کوئی برائی کرے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو یقیناً وہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۴﴾

ہذیل کا ایک آدمی اور دو اور جن کا میں نام نہیں لیتا، تو رسول اللہ ﷺ کے دل میں اللہ نے جو چاہا خیال آیا، آپ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرما دی: ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ [ مسلم، الفضائل، باب فی فضل سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ : ۴۶ / ۲۴۱۳ ] یعنی اللہ کے طالب اگرچہ غریب ہیں انھی کی خاطر داری مقدم ہے۔ (موضح)

② مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ ...... : یعنی نہ ان کا حساب آپ کے ذمے ہے، نہ آپ کا ان کے ذمے، تو ان کا کیا قصور ہے کہ آپ انھیں اپنے سے دور کریں، جس کے نتیجے میں آپ ظالم ٹھہریں۔

**آیت 53** وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ...... : جیسا کہ معلوم ہے ابتدا میں ایمان لانے والوں کی اکثریت کمزور مردوں، عورتوں، لونڈیوں اور غلاموں کی تھی، دولت مند بہت کم تھے اور یہی چیز کافر سرداروں کی آزمائش کا ذریعہ بن گئی۔ وہ ان غریبوں کا مذاق بھی اڑاتے اور جن پر ان کا بس چلتا انھیں زیادہ سے زیادہ اذیت بھی پہنچاتے اور کہتے کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا ہے؟! مقصد ان کا یہ تھا کہ ایمان اور اسلام اگر واقعی اللہ کا احسان ہوتا تو سب سے پہلے ہم پر ہوتا (دیکھیے احقاف: ۱۱) کیونکہ دنیوی زندگی میں اس نے ہم کو برتری دی ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی دولت مندوں کو غریبوں سے آزمایا ہے کہ ان کو ذلیل دیکھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ لائق ہیں اللہ کے فضل کے اور اللہ دل دیکھتا ہے کہ اللہ کا حق مانتے ہیں۔'' (موضح) دراصل اللہ کے ہاں قدر و منزلت ہے تو انھی لوگوں کی جو اخلاص سے اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں، چاہے وہ کتنے ہی غریب اور محتاج ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خالی دنیوی حسب نسب اور خوشحالی کی کوئی قدر نہیں، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [ الحجرات : ۱۳ ] ''تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ باعزت وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔''

**آیت 54** ① وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ ...... : پہلی آیت میں کمزور اہل ایمان کو اپنے پاس سے دور ہٹانے سے منع فرمایا، اب اس آیت میں ان کے اکرام اور عزت افزائی کا حکم دیا۔ (رازی) یعنی جو لوگ کفر و شرک کے غلبے کے باوجود اس پر آشوب دور

ﵧ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

اور اسی طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ خوب واضح ہو جائے ﴿۵۵﴾ کہہ دے بے شک مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، کہہ دے میں تمھاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چلتا، یقیناً میں اس وقت گمراہ ہوگیا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہیں ہوں ﴿۵۶﴾

میں آپ کی دعوت قبول کر کے مسلمان ہو رہے ہیں انھیں امن اور سلامتی کی خوش خبری دے دیجیے، یعنی یہ کہ اسلام لانے کے بعد وہ اللہ کے عذاب سے امن والے ہو گئے، اب ان کی ان اعمال پر پکڑ نہیں ہوگی جو وہ کفر کی زندگی میں کرتے رہے ہیں۔ (المنار) اس سے معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کا احترام کرنا چاہیے اور انھیں ناراض نہیں کرنا چاہیے۔

② كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ: اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۲) کی تفسیر۔

③ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ......: جہالت کے ساتھ گناہ کا مطلب اس کے برے انجام کو نہ سمجھنا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۷) پہلے انذار (ڈرانا) تھا، اب تبشیر (خوش خبری) ہے، یعنی یہ اس کی رحمت کا اثر ہے کہ وہ اعمال سیئہ کو چھوڑ کر اعمال حسنہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ اصلاح کاروں سے مجرموں کا راستہ ممتاز اور خوب واضح ہو جائے۔

**آیت 55** ① وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ ......: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ باتیں اس لیے کھول کر بیان کی ہیں تاکہ حق ظاہر ہو جائے اور اس پر عمل کیا جا سکے اور مجرموں کا راستہ خوب واضح ہو جائے، تاکہ اس سے بچا جا سکے۔ (جلالین) اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہیں انھیں مخالفین (مجرمین) کے ہتھکنڈوں سے پوری طرح باخبر ہونا چاہیے، تاکہ ان کی تردید کر سکیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہی خوبی تھی کہ ایک طرف تو وہ اسلام کو خوب سمجھتے تھے اور دوسری طرف جاہلیت کے رسم و رواج اور قوانین سے پوری واقفیت رکھتے تھے، کیونکہ وہ جاہلیت سے گزر کر آئے تھے۔ یہ مضمون حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب الفوائد میں خوب بیان ہوا ہے۔

② وَلِتَسْتَبِيْنَ: "بَانَ يَبِيْنُ" کا معنی ہے الگ ہونا، واضح ہونا، تو باب استفعال میں حروف کی کثرت کی وجہ سے "خوب واضح ہو جائے" ترجمہ کیا ہے۔

**آیت 56** ① قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ ......: اوپر کی آیت میں تو یہ بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، تاکہ حق واضح ہو اور مجرموں کا راستہ ظاہر ہو جائے، اب اس آیت میں مجرموں کے راستے پر چلنے سے منع فرمایا، جس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مجرموں کا راستہ کیا ہے، جس پر چلنے سے تمھیں منع کیا گیا ہے؟ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ میں تمھاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چلوں گا، اگر میں ایسا کروں تو میں گمراہوں میں شامل ہو جاؤں گا اور میں ہدایت پانے والوں میں

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

کہہ دے بے شک میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جسے تم جلدی مانگ رہے ہو، فیصلہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، وہ حق بیان کرتا ہے اور وہی فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے ﴿۵۷﴾ کہہ دے اگر واقعی میرے پاس وہ چیز ہوتی جو تم جلدی مانگ رہے ہو تو میرے درمیان اور تمھارے درمیان معاملے کا ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور اللہ ظالموں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿۵۸﴾ اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ نہیں اور نہ کوئی تر ہے اور نہ خشک مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے ﴿۵۹﴾

سے نہیں ہوں گا۔ اللہ کی ہدایت کے مخالف قول کو کتنا ہی حکیمانہ اور دانشمندانہ سمجھا جائے وہ محض خواہش پر مبنی ہے اور سراسر ضلالت و گمراہی ہے۔ کیونکہ کسی کے پاس حکم کا اختیار سمجھنا اس کی عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت شرک ہے، جو سب سے بڑا گناہ ہے۔

❷ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ : یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے اللہ کے سوا ان تمام چیزوں کی عبادت سے منع کیا گیا ہے جنھیں تم پکارتے ہو۔

آیت 57 ❶ قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ ...... : کہہ دیجیے کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح دلیل، یعنی وحی الٰہی موجود ہے، جس کا اصل الاصول توحید ہے، اسے تم نے جھٹلایا۔ اب جس عذاب کے جلدی لانے کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ میرے اختیار میں نہیں۔ عذاب لانے یا نہ لانے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔

❷ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ : معلوم ہوا کہ انبیاء کو معجزات پر کوئی اختیار نہیں ہوتا، یہ اختیار صرف اللہ عزوجل کے پاس ہے۔

آیت 58 ❶ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ : یعنی اگر عذاب کا لانا میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمھارے جھٹلانے کی وجہ سے اب تک تمھیں ہلاک کر چکا ہوتا۔ (رازی)

❷ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ : یعنی اللہ ہی جانتا ہے کہ کب عذاب لانا ہے اور کب تک انھیں مہلت دینی ہے۔

آیت 59 ❶ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ ...... : یعنی خلق میں سے کسی ایک کو بھی غیبی امور کا علم نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نجومی یا پنڈت یا رمال اور جفار جو اپنی غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کو آئندہ پیش

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ

اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کمایا، پھر وہ تمھیں اس میں اٹھا دیتا ہے، تاکہ مقرر مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمھارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ۝ اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر کئی محافظ بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تمھارے

آنے والی باتیں بتاتے ہیں، وہ سب جھوٹے اور ٹھگ ہیں اور ان کے پاس جانا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نمل (۶۵)۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''غیب کی کنجیاں پانچ ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ [لقمان: ۳٤] ''بے شک اللہ، اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿وعنده مفاتح الغیب...... ﴾ : ٤٦٢٧ ]

② اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: یعنی اس کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی اور پوشیدہ سے پوشیدہ چیز لوح محفوظ میں درج ہے۔

آیت 60 ① يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ: یہاں قبض کرنے سے مراد نیند ہے۔ ''تَوَفّٰی'' کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ زمر (۴۲)۔

② ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ: یعنی دن کے وقت تمھاری روح لوٹا دیتا ہے، معلوم ہوا کہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔

③ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى: یعنی تم میں سے ہر ایک کے لیے جو رزق اور عمر متعین ہے وہ پوری کی جاتی ہے۔

④ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ...... : یعنی دن میں تمھاری روح لوٹا کر زندہ کر دیتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ تم نے اچھے عمل کیے یا برے، پھر اچھا کام کیا ہوگا تو اچھا بدلہ دے گا اور برا کیا ہوگا تو برا بدلہ دے گا۔ اوپر کی آیت میں کمال علم کا بیان تھا اور اس سے کمال قدرت ثابت ہوتی ہے۔ (رازی)

آیت 61 ① وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ: ''هُوَ'' اس جملے میں مبتدا ہے، ''الْقَاهِرُ'' خبر پر الف لام آنے کی وجہ سے ترجمہ ''وہی'' کیا ہے۔ ''الْقَاهِرُ'' کے معنی غالب ہیں اور یہ ''اَلْقَادِرُ'' سے زائد صفت ہے، یعنی خود قادر ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے کو مراد حاصل کرنے سے روک دینے والا بھی ہے۔ (بغوی) اللہ تعالیٰ کی صفت قہاریت یہ ہے کہ وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا، پھر وجود پر فنا اور خرابی طاری کرتا رہتا ہے، تو کائنات میں جس قدر بھی پیدا کرنے اور فنا کرنے کا کام ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کی قہاریت کا مظہر ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیات (۲۶، ۲۷) اس صفت کی پوری تشریح کر رہی ہیں۔

② وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً: حفاظت کرنے والے کچھ فرشتے تو وہ ہیں جو انسان کی آفات سے حفاظت کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [ الرعد : ۱۱ ] ''اس کے لیے اس کے

عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

کسی ایک کو موت آتی ہے اسے ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے ﴿۶۱﴾ پھر وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے، جو ان کا سچا مالک ہے، سن لو! اسی کا حکم ہے اور وہی سب حساب لینے والوں سے زیادہ جلد (حساب لینے والا) ہے ﴿۶۲﴾ کہہ کون تمھیں خشکی اور سمندر کے اندھیروں سے نجات دیتا ہے؟ تم اسے گڑ گڑا کر اور خفیہ طریقے سے پکارتے ہو کہ بے شک اگر وہ ہمیں اس سے نجات دے دے تو ہم ضرور شکر ادا کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے ﴿۶۳﴾ کہہ دے اللہ تمھیں اس سے نجات دیتا ہے اور ہر بے قراری سے، پھر تم شریک بناتے ہو ﴿۶۴﴾

آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔" اور کچھ وہ ہیں جو انسان کا عمل لکھتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [ الانفطار : ۱۰ تا ۱۲ ] "حالانکہ بلاشبہ تم پر یقیناً نگہبان (مقرر) ہیں۔ جو بہت عزت والے لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔"

③ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ...... : فوت کرنے والے فرشتے کا نام عزرائیل مشہور ہے، لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے ایسی تمام روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [ أحكام الجنائز، باب بدع الجنائز، حاشيه بدعة، رقم : ۹۲ ] قرآن مجید میں اسے ملک الموت کہا گیا ہے، فرمایا: ﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ [ السجدة : ۱۱ ] "کہہ دے تمھیں موت کا فرشتہ قبض کر لے گا۔"

"تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" سے معلوم ہوتا ہے کہ موت والے کئی فرشتے ہیں اور کئی آیات میں اللہ تعالیٰ کے روح قبض کرنے کا ذکر ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ [ الزمر : ۴۲ ] "اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے۔" ان تمام آیات کو مد نظر رکھیں تو صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ روح قبض کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس کے حکم سے سب کچھ ہوتا ہے، پھر ملک الموت ہے، جو اکثر علماء کے نزدیک ایک ہی ہے، البتہ اس کے معاون رحمت اور عذاب کے فرشتے کئی ہیں، جیسا کہ زیر تفسیر آیت اور براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ملک الموت کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے بھی ہوتے ہیں۔

④ وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ: یعنی جس کی جان قبض کرتے ہیں اللہ کے حکم سے اس کے مقررہ وقت پر کرتے ہیں، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

**آیت 62** ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ: پھر اللہ تعالیٰ جو ان کا سچا مالک ہے، جس نے اپنے حکم سے انھیں دنیا میں بھیجا تھا، اس کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

**آیت 63، 64** قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ ...... : یہ حالت ان مشرکوں کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، ہمارے زمانے

قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَفۡقَهُوۡنَ ﴿۶۵﴾ وَ کَذَّبَ بِهٖ قَوۡمُکَ وَ هُوَ الۡحَقُّ ؕ قُلۡ لَّسۡتُ عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۶۶﴾ لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسۡتَقَرٌّ ۫ وَّ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۷﴾

کہہ دے وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے، یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے، یا تمھیں مختلف گروہ بنا کر گتھم گتھا کر دے اور تمھارے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھائے، دیکھ ہم کیسے آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ سمجھیں ﴿۶۵﴾ اور اسے تیری قوم نے جھٹلا دیا، حالانکہ وہی حق ہے، کہہ دے میں ہرگز تم پر کوئی نگہبان نہیں ﴿۶۶﴾ ہر خبر کے لیے واقع ہونے کا ایک وقت ہے اور تم عنقریب جان لو گے ﴿۶۷﴾

میں مسلمان کہلانے والے کئی ایسے لوگ ہیں جو مشکل میں پھنسے ہوئے بھی دوسروں کو پکارتے ہیں۔ [ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ]

**آیت 65** **قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ** ...... : اوپر سے عذاب جیسے بارش کی کثرت، طوفان، بجلی، اولے اور آندھی وغیرہ، یا ظالم حکمران، یا عورت کے لیے اس پر ظلم کرنے والا خاوند اور نیچے سے عذاب، جیسے زلزلہ، قحط، زمین میں دھنس جانا، یا ایسے ماتحت جو خائن اور بد دیانت ہوں، مرد کے لیے ناموافق بیوی۔ "**اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا**" یعنی مختلف گروہ بنا کر انھیں آپس میں گتھم گتھا کر دے، یہ لڑائی بھی خوفناک عذاب ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ''کہہ دے وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے'' تو آپ نے دعا کی: ''میں تیرے چہرے کی پناہ چاہتا ہوں۔'' پھر یہ نازل ہوا: ''یا تمھارے نیچے سے'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: ''میں تیرے چہرے کی پناہ چاہتا ہوں۔'' پھر یہ نازل ہوا: ''یا تمھیں گروہ بنا کر آپس میں گتھم گتھا کر دے'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ان دونوں سے ہلکا عذاب ہے۔'' [ بخاري، التفسير، باب: ﴿ قل هو القادر علی...... ﴾ : ٤٦٢٨ ]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے تین دعائیں کی ہیں: ① میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری ساری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ نے میری یہ دعا قبول فرمائی۔ ② میں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میری ساری امت کو قحط میں مبتلا نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ نے میری اس دعا کو بھی قبول فرمالیا۔ ③ میں نے دعا کی کہ میری امت کو آپس میں اختلاف اور انتشار سے بچائے تو اللہ تعالیٰ نے میری اس دعا کو قبول نہیں فرمایا۔'' [ مسلم، الفتن، باب هلاك هذه الأمة بعضهم ببعض : ٢٨٩٠ ]

**آیت 66** **وَ کَذَّبَ بِهٖ قَوۡمُکَ** : تیری قوم نے اسے جھٹلا دیا۔ اس "**بِهٖ**" کی ضمیر سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور اوپر کی آیات میں مذکور عذاب بھی۔ ﴿ **قُلۡ لَّسۡتُ عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ** ﴾ یعنی میرا یہ کام نہیں ہے کہ تمھارے جھٹلا دینے اور بدتمیزی کرنے پر خود عذاب نازل کر دوں، میرا کام تو صرف یہ ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دوں اور نہ ماننے والوں کو اس کی سزا بتا دوں، اس کے بعد عذاب بھیجنا یا نہ بھیجنا اللہ کے اختیار میں ہے اور اس سے بچنے کی فکر کرنا تمھارا کام ہے۔

**آیت 67** **لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسۡتَقَرٌّ** ...... : اس آیت میں کفار کے لیے دھمکی ہے۔ (رازی) یعنی اللہ کی دی ہوئی خبر غلط نہیں ہو سکتی،

وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ ﴿۶۸﴾ اور ان لوگوں کے ذمے جو بچتے ہیں، ان کے حساب میں سے کوئی چیز نہیں اور لیکن یاد دہانی ہے، تاکہ وہ بچ جائیں ﴿۶۹﴾

لیکن اس کا ایک وقت متعین ہے۔ چنانچہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو، جب اس کا وقت آئے گا تو وہ بھی نازل ہو جائے گا۔ اس وقت تم جان لو گے کہ جس چیز سے میں تمھیں بار بار ڈرا رہا تھا وہ کہاں تک سچی تھی۔ اس عذاب سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہے اور وہ عذاب بھی جو دنیا میں کفار پر لڑائی، خوف اور قحط کی صورت میں نازل ہوا۔

**آیت 68** وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ...... : یعنی جب تم ایسے لوگوں کی مجلس دیکھو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کا مذاق اڑا رہے ہوں، یا عملاً ان کی بے قدری کر رہے ہوں، یا وہ اہل بدعت ہوں جو اپنی بے جا تاویلوں اور تحریفات سے آیات الٰہی کو توڑ مروڑ رہے ہوں، یا ان پر نکتہ چینی کر رہے ہوں اور الٹے سیدھے معنی پہنا کر ان کا مذاق اڑا رہے ہوں، تو اس مجلس سے اس وقت تک کنارہ کرو جب تک وہ دوسری باتوں میں مشغول نہ ہو جائیں اور اگر شیطان کے بھلانے سے اس مجلس میں بیٹھ ہی جاؤ تو یاد آنے کے بعد ان ظالموں کی مجلس میں بیٹھے نہ رہو۔ سورۂ نساء (۱۴۰) میں یہ حکم پہلے بھی گزر چکا ہے، اس میں یہ بھی ہے: ﴿ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ ''بے شک اس وقت تم بھی ان جیسے ہو گے۔'' اہل بدعت کی صحبت اس صحبت سے بھی کئی درجے بدتر ہے جس میں گناہوں کا علانیہ ارتکاب ہو رہا ہو، خصوصاً اس شخص کے لیے جو علمی اور ذہنی طور پر پختہ نہ ہو اور بدعتیوں کی غلط تاویلوں کی غلطی سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ ہاں، اہل علم ان کی غلط باتوں پر تنقید کے لیے اور کلمۂ حق بلند کرنے کے لیے ایسی مجلسوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔

**آیت 69** وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ...... : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یعنی اگر کوئی متقی شخص چاہے کہ ایسے جاہلوں کے پاس نصیحت کے لیے بھی نہ بیٹھے تو اس کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ نہ بیٹھے تو اس پر ان کے گمراہ رہنے کا کوئی گناہ نہیں، البتہ انھیں نصیحت کرے تو بہتر ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈر جائیں تو اسے نصیحت کرنے کا ثواب مل جائے۔ (موضح) اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پرہیز گار لوگ اگر ان کی مجلس میں نصیحت کے لیے بیٹھ جائیں تو کچھ حرج نہیں ہے، لیکن ہم نے جو کنارہ کرنے کا حکم دیا ہے تو اس نصیحت کے پیش نظر کہ شاید تمھارے کنارہ کرنے کی وجہ سے وہ اس قسم کی بے ہودگی سے باز آ جائیں۔ واللہ اعلم! (ابن کثیر)

وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖۗ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۟۷۰ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۟ۙ۷۱ وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۷۲

اور ان لوگوں کو چھوڑ دے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور دل لگی بنا لیا اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور اس کے ساتھ نصیحت کر کہ کہیں کوئی جان اس کے بدلے ہلاکت میں (نہ) ڈال دی جائے جو اس نے کمایا، اس کے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی مدد گار ہو اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ اور اگر وہ فدیہ دے، ہر فدیہ، تو اس سے نہ لیا جائے، یہی لوگ ہیں جو ہلاکت کے سپرد کیے گئے، اس کے بدلے جو انھوں نے کمایا، ان کے لیے گرم پانی سے پینا اور درد ناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے ﴿۷۰﴾ کہہ دے کیا ہم اللہ کے سوا اس کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے اور نہ ہمیں نقصان دے اور ہم اپنی ایڑیوں پر پھیر دیے جائیں، اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی ہے، اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا، اس حال میں کہ حیران ہے، اسی کے کچھ ساتھی ہیں جو اسے سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں کہ ہمارے پاس چلا آ۔ کہہ دے بے شک اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی اصل راستہ ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم جہانوں کے رب کے فرماں بردار بن جائیں ﴿۷۱﴾ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿۷۲﴾

آیت 70 وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا...... : اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ جو لوگ دینِ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں اور دنیا کی زندگی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، آپ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور اس قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو نصیحت کرتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اپنے برے اعمال کی وجہ سے جو اس نے کمائے، ہلاک کر دیا جائے، پھر آخرت میں اس کے چھوٹنے کی کوئی صورت ہی نہ رہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا اور وہ کوئی بھی فدیہ دیں ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی کمائی اور بداعمال کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے۔ ان کے پینے کے لیے سخت گرم پانی ہوگا اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۸)۔

آیت 72،71 قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ...... : آپ ان سے کہہ دیں کہ کیا ہم توحید کی سیدھی سڑک چھوڑ کر پھر شرک

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن کہے گا ''ہو جا'' تو وہ ہو جائے گا۔ اس کی بات ہی سچی ہے اور اسی کی بادشاہی ہوگی، جس دن صور میں پھونکا جائے گا، غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے اور وہی کمال حکمت والا، پوری خبر رکھنے والا ہے ۝

میں مبتلا ہو جائیں، اگر ہم ایسا کریں تو ہماری مثال اس شخص کی طرح ہوگی جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی صحرا سے گزر رہا ہو اور شیطانوں کے نرغے میں آ جائے، جو اسے سیدھے راستے سے بھٹکا کر کسی اور طرف لے جائیں اور وہ حیران و پریشان نہ سمجھ سکے کہ کیا کرے اور اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ہماری طرف آ جاؤ، سیدھی راہ ادھر ہے، لیکن وہ شیطانوں کے چکر میں ایسا پھنس گیا ہے کہ نہ وہ ساتھیوں کی پکار کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کی طرف جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک اختیار کر کے جو گمراہ ہو گیا ہے، وہ بھٹکے ہوئے راہی کی طرح ہدایت کی طرف نہیں آ سکتا۔ ہاں، اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہدایت مقدر کر دی ہے تو یقیناً اللہ کی توفیق سے وہ راہ یاب ہو جائے گا، کیونکہ سیدھے راستے پر چلانا اسی کا کام ہے، ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ ہم اللہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور نماز قائم کریں اور اللہ سے ڈرتے رہیں، اس یقین کے ساتھ کہ قیامت کے دن سب کو اسی کے سامنے جمع ہونا ہے۔

**آیت 73** ① **وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ ......** : یعنی اللہ تعالیٰ ہی نے زمین و آسمان کو پیدا کیا، لیکن بے مقصد اور کھیل کے لیے نہیں بلکہ حق، یعنی خاص مقصد کے لیے پیدا فرمایا ہے، وہ مقصد کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا: ﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [ الملك : ۱ ] ''تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔'' اور انسان اور جن کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [ الذاريات : ٥٦ ] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا، مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ [ الجاثية : ۱۳ ] ''اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔'' اور فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ [ البقرة : ۲۹ ] ''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ بھی ہے سب تمھارے لیے پیدا فرمایا۔'' معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ انسان کے فائدے اور اس کی آزمائش کے لیے ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

② **وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ**: یعنی حشر کے دن جب وہ تمام مردوں کو زندہ کرنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ کے لفظ ''کن'' کہنے سے تمام مردے زندہ ہو جائیں گے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝۷۴

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے؟ بے شک میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں ۝۷۴

③ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ : یعنی دنیا میں مجازی طور پر جن کو بادشاہ کہا جاتا تھا ان کی مجازی بادشاہت بھی ختم ہو جائے گی، اللہ فرمائے گا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [ المؤمن : ١٦ ] ”آج کس کی بادشاہی ہے، صرف اللہ کی جو ایک ہے، زبردست ہے۔“ نیز دیکھیے سورۂ فاتحہ میں ”مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ“ کی تفسیر۔ ”الصُّوْرِ“ کیا چیز ہے؟ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا، اس نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول ! صور کیا ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس سے مراد وہ سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔“ [ أحمد : ٢/ ١٦٢، ح : ٦٥١٤۔ ترمذی، صفات المؤمنين، باب صفة القيامة...... : ٢٤٣٠ ] اس لیے عام طور پر اس کا ترجمہ نرسنگا کیا جاتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: ”صور پھونکنے والا فرشتہ اس وقت سے تیار عرش کی طرف دیکھ رہا ہے جب سے اسے صور دیا گیا ہے اور وہ آنکھ بھی نہیں جھپک رہا کہ کہیں اسی اثنا میں اسے حکم نہ دے دیا جائے۔“ [ مستدرك حاكم : ٤/ ٥٥٨، ح : ٨٦٧٦۔ الصحيحة : ٢/ ٦٥، ح : ١٠٧٨ ] پس صحیح یہی ہے کہ صور ایک قرن ( نرسنگا ) ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ”الصُّوْرِ“ ”صُوْرَةٌ“ کی جمع ہے اور اس سے مراد مخلوق کی صورتیں ہیں تو یہ قول قرآن و سنت کی رو سے مردود ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نمل ( ۸۷ ) پہلے ایک صور پھونکا جائے گا، ساری خلقت گھبرا جائے گی، پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو ساری خلقت فنا ہو جائے گی، پھر تیسری دفعہ پھونکا جائے گا تو ساری خلقت زندہ ہو کر ایک جگہ جمع ہو جائے گی۔ بعض نے لکھا ہے کہ نفخہ اصل میں دو بار ہوگا، پہلے کو نفخۂ فزع یا صعق کہا جاتا ہے، گویا پہلے گھبراہٹ پھر بے ہوشی اور نتیجتاً فنا، یعنی دونوں ایک ہی ہیں اور دوسرے کو نفخۂ قیام۔ واللہ اعلم! (ابن کثیر، قرطبی )

④ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ : ”الْغَيْبِ“ سے مراد بندوں کے اعتبار سے غیب (پوشیدہ ) اور ”الشَّهَادَةِ“ کا معنی حاضر ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی بھی چیز پوشیدہ نہیں، سب حاضر ہی حاضر ہے۔

⑤ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ : یعنی جو رب یہ صفات رکھتا ہے وہی اس لائق ہے کہ تم اس کی فرماں برداری اختیار کرو، اس کے بندے بن کر رہو اور سمجھو کہ تمھیں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور اچھے یا برے ہر عمل کا بدلہ پانا ہے۔

آیت 74 ① وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ ...... : اوپر کی آیات میں توحید کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کے دلائل بیان کرتے ہوئے مشرکین مکہ کے غلط عقائد پر تنقید کی گئی اور اب شرک کی تردید کے لیے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بطور تائید بیان فرمایا کہ وہ توحید کے سب سے بڑے داعی اور شرک سے بے زار تھے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ دیکھو انھوں نے کس طرح قوم سے علیحدگی اختیار کی۔ مشرکین مکہ ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہونے کے دعوے دار تھے، جب ابراہیم علیہ السلام موحد تھے تو اب شرک کے جواز پر تمھارے پاس کیا دلیل رہ جاتی ہے۔

② اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر تھا۔ اب پہلی کتابوں میں اگر ان کا نام آرخ یا تارخ لکھا ہو تو

وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی عظیم سلطنت دکھاتے تھے اور تاکہ وہ کامل یقین والوں سے ہو جائے ﴿۷۵﴾ تو جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہو گیا تو اس نے کہا میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۷۶﴾ پھر جب اس نے چاند کو چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہو گیا تو اس نے کہا بلاشبہ اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی تو یقیناً میں ضرور گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا ﴿۷۷﴾ پھر جب اس نے سورج چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہو گیا کہنے لگا اے میری قوم! بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو ﴿۷۸﴾ بے شک میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ایک (اللہ کی) طرف ہو کر اور میں مشرکوں سے نہیں ﴿۷۹﴾

قرآن کی بات ہی حق ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آرخ یا تارخ اس کا لقب ہو گا، مگر یہ کہنا کہ ان کے باپ کا نام آزر نہیں تھا بلکہ یہ نام چچا کا تھا، بالکل ہی بے دلیل ہے۔

**آیت 75** مَلَكُوْتَ: "مُلْكٌ" کے آخر میں واؤ اور تاء کا اضافہ کر کے "مَلَكُوْتَ" فرمایا، مقصد حروف بڑھانے کا معنی میں زیادتی ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "عظیم سلطنت" کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم نے پچھلی آیات میں شرک کی تردید کی ہے اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمان و زمین کی عظیم سلطنت کا مشاہدہ کروایا، جس کے کئی مقاصد کے ساتھ ایک یہ بھی تھا کہ انھیں توحید کا آنکھوں دیکھا یقین حاصل ہو جائے۔ ایسے ہی انھیں یہ مشاہدہ بھی کروایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔

**آیت 76 تا 79** فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ ...... : ابراہیم علیہ السلام کی قوم کئی معبودوں کی پرستش کرتی تھی، جن میں بت، سورج، چاند اور ستارے بھی تھے بلکہ بادشاہ بھی ان کا رب تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان سب چیزوں کے معبود نہ ہونے کے ایسے زبردست دلائل پیش کیے، جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ بتوں کے معبود نہ ہونے کو انھوں نے بت توڑ کر ثابت کیا۔ بادشاہ سے ایسی

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۸۰

اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا، اس نے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ یقیناً اس نے مجھے ہدایت دی ہے اور میں اس سے نہیں ڈرتا جسے تم اس کے ساتھ شریک بناتے ہو، مگر یہ کہ میرا رب کچھ چاہے، میرے رب نے ہر چیز کا احاطہ علم سے کر رکھا ہے، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ۝۸۰

مدلل بات کی کہ آخر وہ "فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ" بالکل لاجواب ہو گیا۔ یہاں زیر تفسیر آیات میں ان کا اپنی قوم کے ساتھ سورج، چاند اور ستاروں کے معبود نہ ہونے پر مناظرے کا ذکر ہے۔ چنانچہ ایک رات ابراہیم علیہ السلام نے ایک بہت چمکتا ہوا ستارہ دیکھ کر کہا: "یہ میرا رب ہے۔" یقیناً وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے ہوں گے، مگر یہ تو توحید کے منکروں کو گھیر کر مارنے کی عظیم تدبیر تھی۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ایک محال چیز کو مفروضہ کے طور پر تسلیم کیا، تاکہ دل نشین طریقے سے انھیں قائل کیا جائے۔ چنانچہ جب وہ غروب ہوا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔" پھر چاند کو اپنا رب کہا، جب وہ بھی غروب ہو گیا تو فرمایا: "میرے رب نے اگر مجھے ہدایت نہ دی تو یقیناً میں بھی گمراہوں سے ہو جاؤں گا۔" اس میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ میں جس ہدایت پر ہوں وہ میری ذاتی سوچ اور فکر نہیں ہے اور نہ یہ میری ذاتی اور شخصی دعوت ہے، یہ میرے رب کی عنایت اور اسی کا احسان ہے، اس لیے میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ پھر سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا اور کہا: "یہ سب سے بڑا ہے، اس لیے یہی میرا رب ہے۔" قوم کو امید پیدا ہوئی ہوگی کہ چلو ہمارے کسی معبود کو ماننے پر تو تیار ہو گیا ہے، مگر سورج کے غروب ہونے پر ان کے تمام معبودوں سے بے زاری کا اور زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے ایک ہی معبود برحق کا اعلان کیا تو قوم جھگڑے پر اتر آئی، جھگڑے کے ساتھ اپنے خداؤں کے غضب سے ڈرانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "میں تمھارے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں، اللہ تعالیٰ کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو وہ پہنچا سکتا ہے۔"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کی ولادت اور پرورش ایک غار کے اندر ہوئی تھی، تاکہ بادشاہ اپنے ایک خواب کی وجہ سے انھیں قتل نہ کر دے۔ جب باہر آئے تو اپنا رب ڈھونڈنے کے لیے غور و فکر کے یہ مراحل طے کیے اور آخر کار اللہ تعالیٰ تک پہنچ گئے، حالانکہ ان آیات میں صاف ذکر ہے کہ قوم کی مجلس میں یہ سب باتیں ہوئی ہیں جن کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو لاجواب کیا ہے۔ پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود یہاں فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ﴾ [ الأنعام : ۸۳ ] "یہ تمام باتیں ہم نے دلیل کے طور پر ابراہیم کو قوم کے مقابلے میں عطا فرمائی تھیں۔" اور جب انھوں نے اللہ کے حکم کے مطابق قوم کو اس دلیل کے ذریعے سے سورج، چاند اور ستارے کے رب نہ ہو سکنے کی بات سمجھائی تو وہ جھگڑے پر اتر آئے، جو ان کے لاجواب ہونے کی دلیل تھی۔

آیت 80 ① وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ...... : قوم کے ساتھ یہ مناظرہ ہوا تو ان کی قوم نے اپنے عقیدے کے صحیح ہونے کے بہت سے دلائل پیش کیے، مثلاً انھوں نے ایک دلیل یہ پیش کی: ﴿ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ ﴾ [ الزخرف : ۲۲ ] "بے شک

وَ كَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

اور میں اس سے کیسے ڈروں جسے تم نے شریک بنایا ہے، حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ بے شک تم نے اللہ کے ساتھ اس کو شریک بنایا ہے جس کی کوئی دلیل اس نے تم پر نہیں اتاری، تو دونوں گروہوں میں سے امن کا زیادہ حق دار کون ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۸۱﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں ﴿۸۲﴾

ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے۔'' نیز ابراہیم علیہ السلام کو دھمکی دی کہ یہ بت تمھیں آفات اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ فرما کر ''وَقَدْ هَدٰىنِ'' (اللہ نے مجھے سیدھا راستہ بتا دیا ہے) ان کی پہلی دلیل کا جواب دیا کہ یقینی دلیل کے مقابلے میں تمھارے باپ دادا کا دین بے معنی ہے اور ان کی دھمکی کے جواب میں فرمایا کہ پروردگار کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچنی ہو تو پہنچ سکتی ہے مگر یہ تمھارے بت اور جھوٹے پروردگار میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ (رازی)

② وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: ہر چیز کی حقیقت و اصلیت کا علم میرے رب کو ہے، اس لیے وہی بتا سکتا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا ہے، جب اس نے مجھے ہدایت کا علم عطا فرما دیا ہے تو پھر ہدایت کوئی اور چیز کیسے ہو سکتی ہے، تو کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے؟

**آیت 81** ① وَكَيْفَ اَخَافُ...... : یہ اوپر کی آیت میں دوسرے جواب کو مکمل کیا ہے، یعنی میں تمھارے ان معبودوں سے کیوں ڈروں، جب کہ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے، ڈرنا تو تمھیں چاہیے جو بلا دلیل اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا کر ظلم عظیم کر رہے ہو۔

② فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ...... : ہم دونوں میں سے کون امن (بے خوف ہونے) کا زیادہ حق دار ہے؟ کیا تم مشرکین، جو ان بتوں کے متعلق محض وہم پرستی کی راہ سے یہ سمجھ رہے ہو کہ شاید یہ نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں، یا ہم خالص توحید پرست، جنھیں یہ یقین و اطمینان حاصل ہے کہ اللہ ہی ہر نفع و نقصان پر قادر ہے اور اس کے سوا دنیا کی کوئی مردہ یا زندہ ہستی ہمارا ذرہ بھر نقصان نہیں کر سکتی۔ اس امت کے کلمہ گو پیر پرست بھی اہل توحید سے کہتے ہیں کہ جو شخص بڑے پیر کی گیارھویں چھوڑ دے اس کا بیٹا یا بھینس مر جاتی ہے، یا کوئی اور نقصان پہنچ سکتا ہے، تو ان کے لیے بھی یہی جواب ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

**آیت 82** ① اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا...... : یہ آیت اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی ہو سکتا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی بات کو مکمل کرنے والا حصہ بھی۔

② تنوین اکثر تنکیر کے لیے ہوتی ہے، اس سے لفظ عام ہو جاتا ہے اور اس کا ہر فرد اس میں شامل ہو جاتا ہے، جیسے اس آیت

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی، ہم درجوں میں بلند کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں۔ بے شک تیرا رب کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۸۳﴾

میں مذکور '' بِظُلْمٍ '' کی تنوین کو تنکیر کے لیے لیں تو معنی ہوگا: ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو کسی ظلم کے ساتھ نہیں ملایا'' اور بعض اوقات وہ دوسرے معانی کے لیے بھی ہوتی ہے، جن میں سے ایک معنی تعظیم بھی ہے، جس سے اس لفظ کا بڑا فرد مراد ہوتا ہے۔ جیسے اسی آیت میں '' بِظُلْمٍ '' کی تنوین کو تعظیم کے معنی میں لیا جائے تو مطلب ہوگا: ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بہت بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ [ الأنعام : ۸۲ ] تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اس آیت کا مضمون شاق گزرا۔ انھوں نے عرض کیا: ''ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر (کوئی) ظلم (یعنی گناہ) نہیں کیا؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تم سمجھ رہے ہو وہ بات نہیں، کیا تم نے لقمان کا قول نہیں سنا، جو وہ اپنے بیٹے سے کہہ رہے تھے: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان : ۱۳ ] ''یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولم يلبسوا إيمانهم بظلم ﴾ : ۴۶۲۹۔ مسلم : ۱۲۴ ]

آپ دیکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل زبان ہونے کے باوجود '' بِظُلْمٍ '' کی تنوین کو تنکیر کے لیے سمجھ کر پریشان ہو گئے کہ کون ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لقمان کا قول ذکر کر کے انھیں بتایا کہ یہ تنوین تعظیم کے لیے ہے، نہ کہ تنکیر کے لیے اور معنی یہ نہیں کہ کسی ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، بلکہ معنی یہ ہے کہ بہت بڑے ظلم، یعنی شرک کے ساتھ نہیں ملایا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان جاننا کافی نہیں، کئی مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر بھی ضروری ہے، اس لیے قرآن کو حدیث کے بغیر سمجھنے کا دعویٰ کرنے والے واضح گمراہ ہیں۔

③ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ امن وسکون اور ہدایت ایسے خالص ایمان ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں جس میں توحید کے ساتھ کسی قسم کے شرک کی آمیزش نہ کی گئی ہو، جو قوم خالص ایمان اور خالص توحید سے محروم اور کسی بھی قسم کے شرک میں مبتلا ہو اسے کسی صورت امن وچین اور ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ افسوس کہ مسلمانوں نے خالص توحید کو چھوڑا اور قبروں اور آستانوں کی پرستش شروع کر دی (الا ما شاء اللہ) جس کے نتیجے میں پورا عالم اسلام ذلت ومسکنت کا نشانہ بن گیا۔ اب نہ کہیں امن ہے نہ ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ امت مسلمہ دوبارہ خالص توحید کی طرف پلٹے اور صرف اپنے رب کے آستانے پر جمی رہے۔

آیت 83 ① وَتِلْكَ حُجَّتُنَاۤ ...... : اس حجت سے مراد توحید کے وہ دلائل ہیں جو قوم کے مقابلے میں ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیے، یہ دلائل اللہ تعالیٰ نے قوم کے مقابلے میں ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے

وَ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ ؕ كُلًّا هَدَيۡنَا ۚ وَ نُوۡحًا هَدَيۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ وَ اَيُّوۡبَ وَ يُوۡسُفَ وَ مُوۡسٰى وَ هٰرُوۡنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۸۴﴾ۙ وَ زَكَرِيَّا وَيَحۡيٰى وَ عِيۡسٰى وَ اِلۡيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۸۵﴾ۙ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ الۡيَسَعَ وَ يُوۡنُسَ وَ لُوۡطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۶﴾ۙ

اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ان سب کو ہدایت دی اور اس سے پہلے نوح کو ہدایت دی اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں ﴿۸۴﴾ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو، یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے ﴿۸۵﴾ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو، اور ان سب کو جہانوں پر فضیلت دی ﴿۸۶﴾

کہ یہ باتیں ان کے بچپن کے زمانے کی نہیں کہ آپ شرک سے درجہ بہ درجہ توحید کی طرف بڑھے ہوں، کیونکہ اللہ کا نبی اللہ تعالیٰ کی توحید سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔

② نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ : یعنی چونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی جان کی پروا نہیں کی اور اپنے آپ کو توحید کی دعوت دینے کے لیے وقف کر دیا، اس لیے ہم نے بھی ان پر بڑے بڑے احسانات فرمائے۔ دنیا ہی میں انھیں یہ انعام دیا کہ بڑھاپے میں انھیں نیک اولاد سے نوازا، ان کے بعد ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب اتارنے کا سلسلہ جاری کر دیا اور اسی سلسلے کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

**آیت 84** ① كُلًّا هَدَيۡنَا: یعنی ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر لگایا اور نبوت عطا کی۔ دیکھیے سورۂ مریم (۴۹)۔

② وَمِنۡ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ ...... : "ذُرِّيَّتِهٖ" میں موجود ضمیر سے مراد نوح علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ مذکور نبیوں میں سب سے قریب نوح علیہ السلام ہی ہیں، امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہ ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور کلام کے سیاق کے پیش نظر اس کو ترجیح دی جا سکتی ہے، مگر اس کے تحت مذکور انبیاء میں سے لوط علیہ السلام کے ذکر سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں تھے، بلکہ ان کے بھتیجے تھے، مگر ہو سکتا ہے کہ بھتیجے کو بھی اولاد میں شمار کر لیا ہو، جیسا کہ سورۂ بقرہ (۱۳۳) میں اسماعیل علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے آباء میں ذکر کیا ہے۔ (ابن کثیر)

③ عیسیٰ علیہ السلام کو نوح علیہ السلام اور دوسرے قول کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بیٹیوں کی اولاد بھی آدمی کی اولاد میں سے شمار ہوتی ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت صرف ماں کی طرف سے ہے، ان کا باپ نہیں تھا۔ (ابن کثیر)

**آیت 86** وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ: یعنی اپنے اپنے زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت بخشی۔

وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور ان کے باپ دادا اور ان کی اولادوں اور ان کے بھائیوں میں سے بعض کو بھی اور ہم نے انھیں چنا اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ﴿۸۷﴾ یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس پر اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے چلاتا ہے اور اگر یہ لوگ شریک بناتے تو یقیناً ان سے ضائع ہو جاتا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ﴿۸۸﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی، پھر اگر یہ لوگ ان باتوں کا انکار کریں تو ہم نے ان کے لیے ایسے لوگ مقرر کیے ہیں جو کسی صورت ان کا انکار کرنے والے نہیں ﴿۸۹﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر، کہہ میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، یہ تو تمام جہانوں کے لیے ایک نصیحت کے سوا کچھ نہیں ﴿۹۰﴾

آیت 87 وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ ...... : یعنی ان کے باپ دادا اور پڑدادا اوپر تک اور ان کے بیٹوں، پوتوں، پرپوتوں نیچے تک اور ان کے بھائیوں میں سے جو بھی ایمان دار تھے انھیں بھی ہم نے ہدایت پر لگایا اور بزرگی دی۔ (ابن کثیر)

آیت 88 وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ ...... : اٹھارہ پیغمبروں کا نام لے کر، ان کے ساتھ ان کے آباء، اولاد اور اخوان کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر بفرض محال نبی یا اس کے قرابت دار بھی شرک کر بیٹھتے تو ان کا کیا کرایا سب ضائع ہو جاتا۔ کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی قبول نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [ الزمر : ٦٥ ] ''اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کا بھی تمام عمل ضائع ہو جائے گا۔'' پیغمبر سے شرک ہونا تو ممکن نہیں، یہ سب کچھ امتیوں کو سنایا جا رہا ہے۔

آیت 89 فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ ...... : یعنی اگر یہ لوگ اس کتاب، حکم اور نبوت کو نہ مانیں (اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو نہ ماننے والے کفار اور مشرکین ہیں) تو ہم نے ان (کتاب اور نبوت) کے لیے ایسے لوگ مقرر کیے ہیں (اس سے مراد مہاجرین انصار اور قیامت تک آنے والے ایمان دار ہیں) جو ان نعمتوں کا انکار نہیں کرتے۔

آیت 90 ① فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ: یعنی توحید اور عقائد میں ان کی راہ پر قائم رہیے، کیونکہ تمام انبیاء ان باتوں میں متفق ہیں، باقی احکام میں سے بھی جو منسوخ نہیں ہوئے ان کی بھی پیروی کیجیے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ان انبیاء کی طرح آپ بھی دشمنوں کی ایذا رسانی پر صبر کیجیے۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جن کاموں میں کوئی نیا حکم نہیں آیا ان میں نبی ﷺ کو پہلے انبیاء کے طریق پر رہنے کا حکم تھا۔ مجاہد رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا:

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ ؕ قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡـكِتٰبَ الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى نُوۡرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا ۚ وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾

اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی، جو اس کی قدر کا حق تھا، جب انھوں نے کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ کہہ وہ کتاب کس نے اتاری جو موسیٰ لے کر آیا؟ جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، تم اسے چند ورق بناتے ہو، جنھیں ظاہر کرتے ہو اور بہت سے چھپاتے ہو اور تمھیں وہ علم دیا گیا جو نہ تم نے جانا اور نہ تمھارے باپ دادا نے۔ کہہ اللہ نے، پھر انھیں چھوڑ دے، اپنی (فضول) بحث میں کھیلتے رہیں ﴿۹۱﴾

---

''کیا سورۂ ص میں سجدہ ہے؟'' تو انھوں نے ﴿ وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ ﴾ سے لے کر ﴿ فَبِهُدٰٮهُمُ اقۡتَدِهۡ ﴾ تک تلاوت کر کے فرمایا: ''ہاں، وہ (داؤد علیہ السلام) بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کی پیروی کا آپ کو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے اور اس آیت میں داؤد علیہ السلام کے سجدے کا ذکر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان انبیاء کی پیروی کا حکم ہے۔'' [ بخاري، التفسير، باب قوله: ﴿ أولئك الذين هدى الله ...... : ٤٦٣٢ ]

② اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡعٰلَمِيۡنَ: اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جن و انس دونوں کی طرف بھیجے گئے اور آپ کی رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔

**آیت 91** وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ ...... : یہ خطاب یہود کو ہے، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی اور بغض وعناد کی بنا پر ایسی حقیقت کا انکار کر دیا جسے وہ خود بھی مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس آیت میں ان کے اعتراض کا دو طرح سے جواب دیا گیا، ایک یہ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر اور اسے پہچاننے کا جو حق تھا اس کے مطابق انھوں نے اسے پہچانا ہی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ خود لوگوں سے کلام کرتا ہے اور نہ اس کام کے لیے کوئی فرشتہ بھیجتا ہے۔ اس کی ممکن صورت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام فرشتوں کے ذریعے سے صرف نبی پر نازل فرمائے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ تو تم بھی مانتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام بشر تھے، آدم کی اولاد سے تھے، ان کے ماں باپ بھی تھے، تو ان پر جو کتاب اتاری گئی تھی وہ کس نے اتاری تھی؟ اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے نہیں اتاری تھی تو پھر تم اسے اتنا سنبھال کر کیوں رکھتے ہو؟ اور اس کتاب میں جو ہدایت کی باتیں اور علم کی روشنی ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور ایسی باتیں بتا سکتا ہے؟ جو ہدایت کی باتیں اس کتاب میں موجود ہیں، انھیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے آباء و اجداد، پھر تمھارا اس کتاب کا کچھ حصہ لوگوں کو بتانا اور اپنی خواہشات کے مطابق کچھ حصہ چھپانا، یہ سب کچھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور تمھارے لیے حجت ہے، ورنہ اگر یہ کسی انسان کی تصنیف ہوتی تو تمھیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کہہ دیجیے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تورات اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ علوم اور

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ

اور یہ ایک کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا، بڑی برکت والی ہے، اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے ہے اور تاکہ تو بستیوں کے مرکز اور اس کے ارد گرد لوگوں کو ڈرائے اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ﴿۹۲﴾ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، یا کہے میری طرف وحی کی گئی ہے، حالانکہ اس کی طرف کوئی چیز وحی نہیں کی گئی اور جو کہے میں (بھی) ضرور اس جیسا نازل

معارف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی تو پھر رسولوں پر بالعموم اور نبی کریم ﷺ پر بالخصوص وحی کے نازل ہونے کا انکار تم کیسے کر سکتے ہو؟ یہ سارا خطاب کفار مکہ کو بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کو وہ بھی مانتے تھے۔ "قَرَاطِیْسَ" یہ "قِرْطَاسٌ" کی جمع ہے، یعنی ورق، کاغذ، یعنی یہودی تورات کو ایک کتاب کی طرح جمع کرنے کے بجائے الگ الگ ورقوں کی صورت میں رکھتے تھے اور اپنے مطلب کا ورق نکال کر دکھا دیتے تھے۔

**آیت 92** ① **وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا:** اس آیت میں مکہ کو "ام القریٰ" کہا گیا ہے، جس کا معنی ہے تمام بستیوں کی جڑ یا ان کا مرکز اور "وَمَنْ حَوْلَهَا" سے مراد قبائلِ عرب اور آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، خواہ عرب ہوں یا عجم۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( بُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ كَافَّةً )) "مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔" [ بخاری، الصلاۃ، باب قول النبی ﷺ : جعلت لی الأرض...... : ۴۳۸ ] نیز دیکھیے سورۂ انعام (۹)، سورۂ اعراف (۱۵۸) اور سورۂ سبا (۲۸)۔

② **وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ:** کیونکہ قرآن مجید آخرت کی راہ بتلاتا ہے۔

③ **وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ:** کیونکہ نماز تمام عبادتوں کی اصل اور آخرت میں کامیابی کی کنجی ہے۔ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ اس شخص کا ایمان آخرت پر صحیح اور درست ہے جو قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہے اور نماز کی نگہداشت اور نگرانی کرتا ہے، جو شخص قرآن پر ایمان نہیں رکھتا یا نماز کی حفاظت نہیں کرتا اس کا آخرت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

**آیت 93** ① **وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی......:** اس آیت کریمہ میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے زیادہ اپنے حق میں کون ظالم ہوسکتا ہے، ایک تو وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے غیروں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں، یا جو اپنی طرف سے حلال و حرام کے احکام وضع کرتے ہیں، دوسرے وہ لوگ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پر اللہ کی جانب سے وحی کی جاتی ہے، جیسے اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور قادیانی دجال وغیرہ اور تیسرے وہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ قرآن جیسا کلام پیش کر سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے کچھ مشرکوں نے کہا تھا: ﴿ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ

مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَ مَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

کروں گا جو اللہ نے نازل کیا۔ اور کاش! تو دیکھے جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے ا[ن کے] ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، نکالو اپنی جانیں، آج تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، اس کے بدلے جو تم ا[للہ] پر ناحق (باتیں) کہتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے ﴿۹۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آئے ہو، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اپنی پیٹھوں کے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو کچھ ہم نے تمھیں دیا تھا او[ر] ہم تمھارے ساتھ وہ سفارش کرنے والے نہیں دیکھتے جنھیں تم نے گمان کیا تھا کہ بے شک وہ تم میں حصے دا[ر] ہیں۔ بلاشبہ یقیناً تمھارا آپس کا رشتہ کٹ گیا اور تم سے گم ہو گیا جو کچھ تم گمان کیا کرتے تھے ﴿۹۴﴾

---

هٰذَآ ﴾ [ الأنفال : ۳۱ ] اگر ہم چاہیں تو یقیناً اس جیسا ہم بھی کہہ دیں حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ تین ہی وعیدیں ان کے حق میں بیان کی گئی ہیں، ایک سب سے بڑے ظالم ہونا، دوسری فرشتوں کا ان کی روح قبض کرتے وقت سختی کرنا اور تیسری ذلت کا عذاب۔

❷ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ : نکالو اپنی جانیں اور انھیں ہمارے حوالے کرو کہ سزا دیں، یا انھیں موت کی سختیوں اور عذاب سے بچا کر تو دکھاؤ۔ (فتح القدیر)

❸ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ ...... : آج سے مراد وہ دن ہے جس میں ان کی روح قبض کی جائے گی اور عذاب قبر کی ابتدا ہو گی۔ اس آیت میں واضح عذاب قبر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ قیامت تو جب اللہ چاہے گا قائم ہو گی، درمیان کا وقفہ یعنی برزخ ہم سے پردے میں ہے۔ انسان کا کوئی جز کسی بھی جگہ میں ہو یا راکھ بن جائے، اسے وہیں عذاب قبر ہو گا۔

**آیت 94** وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى ...... : یعنی ان سے کہا جائے گا کہ آج تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے ہو کر آئے ہو اور جو مال و اولاد تمھارے پاس تھا وہیں چھوڑ آئے ہو اور ہم تمھارے ساتھ وہ سفارشی بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم کہتے تھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں یہ بھی حق رکھتے ہیں۔ لاؤ دکھاؤ، یہ ڈانٹنے کے لیے کہا جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۹۶﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

بے شک اللہ دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے، وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے، یہی اللہ ہے، پھر تم کہاں بہکائے جاتے ہو ﴿۹۵﴾ صبح کو پھاڑ نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا۔ یہ اس زبردست غالب، سب کچھ جاننے والے کا مقرر کردہ اندازہ ہے ﴿۹۶﴾ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے، تاکہ تم ان کے ساتھ خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں راستہ معلوم کرو۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کر دی ہیں جو جانتے ہیں ﴿۹۷﴾

**آیت 95** ① اِنَّ اللّٰهَ فٰلِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ...... : اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس سے تعلق رکھنے والی کچھ چیزیں بیان کرنے کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور کمال قدرت و علم کا بیان شروع کیا جو اس سورت کا اصل موضوع ہے۔

② " النَّوٰی " یہ " نَوَاةٌ " کی جمع ہے، اس لیے ترجمہ ''گٹھلیاں'' کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ زمین کے اندر دانے کو پھاڑ کر لہلہاتا ہوا پودا اور گٹھلی کو پھاڑ کر کھجور کا ہرا بھرا درخت نکالتا ہے۔ اس کی کاری گری دیکھیے کہ مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، نطفے اور انڈے سے جان دار، دانے اور گٹھلی سے زندہ درخت اور کافر سے مسلمان کو پیدا کرتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے، جیسے حیوان اور پرندے سے نطفہ اور انڈا، پودوں اور درختوں سے دانے اور گٹھلیاں اور مسلمان سے کافر پیدا کرتا ہے۔ یہ ہے اللہ جو تمھاری عبادت کا حق دار ہے، پھر کیسی عجیب بات ہے کہ تم شیطان کے بہکاوے میں آ کر اس کے غیر کی عبادت کرنے لگتے ہو۔

**آیت 96** فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ...... : وہی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح روشن نکالنے والا ہے، پھر اس نے رات کا اندھیرا طاری کر کے سب کو سکون اور آرام کا موقع فراہم کیا اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا، جس سے وقت، دن، رات، مہینوں اور سالوں کا حساب وجود میں آتا ہے۔ " الْعَزِیْزِ " سے مراد کمال قدرت والا اور " الْعَلِیْمِ " سے مراد کمال علم والا ہے۔ جس کا علم اور قدرت آسمان و زمین کے ذرے ذرے کو محیط ہے۔ عموماً قرآن میں رات دن اور سورج چاند کے پیدا کرنے اور مسخر کرنے کو اسمائے حسنیٰ میں سے ان دو صفاتی ناموں کے ساتھ ختم کیا ہے۔

**آیت 97** وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ ...... : یہ ستاروں کا ایک فائدہ ہے، دوسری آیات میں تاروں کو آسمان کی زینت اور شیطانوں کے لیے سنگ باری ( رجوم ) کا سامان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ صافات (۶، ۷) اور سورۂ ملک (۵) اللہ ہی

وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ اور ایک سونپے جانے کی جگہ ہے۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿۹۸﴾ اور وہی ہے جس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو ہم نے اس کے ساتھ ہر چیز کی انگوری نکالی، پھر ہم نے اس سے سبز کھیتی نکالی، جس میں سے ہم تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے ان کے گابھے میں سے جھکے ہوئے خوشے ہیں اور انگوروں اور زیتون اور انار کے باغات ملتے جلتے اور نہ ملنے جلنے والے۔ اس کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل لائے اور اس کے پکنے کی طرف۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۹۹﴾

بہتر جانتا ہے کہ ان میں اور کتنے فوائد ہیں، مگر ان کے ذریعے سے غیب معلوم ہونے یا ان کا قدرت کے کارخانے میں کوئی اختیار ہونے کا عقیدہ صاف گمراہی اور شرک ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بار بار علم اور قدرت کا مالک صرف ایک اللہ کو قرار دیا گیا ہے۔

آیت 98 ① وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ...... : یعنی اسی نے تمھیں ایک جان آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، پھر اس کے لیے ٹھہرنے کی جگہ بنائی اور سونپے جانے کی جگہ بنائی۔ ٹھہرنے کی جگہ ماں کا رحم اور سونپے جانے کی جگہ باپ کی پشت۔ مفسرین کی ایک جماعت سے اس کے برعکس بھی منقول ہے، یعنی "فَمُسْتَقَرٌّ" باپ کی پشت اور "مُسْتَوْدَعٌ" ماں کا رحم۔ بعض نے ان سے دنیا اور آخرت یا قبر مراد لی ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اول ماں کے پیٹ میں سپرد ہوتا ہے، تا کہ آہستہ آہستہ دنیا میں رہنے کی صلاحیت حاصل کر لے، پھر دنیا میں آ کر ٹھہرتا ہے، پھر سپرد ہوگا، قبر میں تا کہ آہستہ آہستہ آخرت کا اثر قبول کر سکے، پھر جا ٹھہرے گا جنت یا دوزخ میں۔ (موضح)

② لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ: پہلے آفاقی دلائل بیان فرمائے، جو انسان کی ذات سے باہر کی دنیا ہے، دوسری آیت میں انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے، جو انسان کی ذات میں موجود ہیں۔ دلائل آفاقی سے دلائل انفسی کا سمجھنا ذرا زیادہ غور کا محتاج ہے، اس لیے یہاں سمجھ کا لفظ فرمایا اور پہلے کے متعلق علم کا۔ (واللہ اعلم)

آیت 99 ① وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ...... : "قِنْوَانٌ" یہ " قِنْوٌ " کی جمع ہے بمعنی خوشے۔ "دَانِيَةٌ" یہ "دَنَا يَدْنُوْ " سے اسم فاعل ہے، یعنی قریب، مراد نیچے جھکے ہوئے۔ "مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ" یعنی پتے ملتے ہیں، مگر پھل

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

اور انھوں نے جنوں کو اللہ کے شریک بنا دیا، حالانکہ اس نے انھیں پیدا کیا اور اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں کچھ جانے بغیر تراش لیں، وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۱۰۰﴾ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسے ہوگی، جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۰۱﴾

مختلف ہیں، یا ایک ہی درخت، مثلاً آم کو لے لیں کہ ان کے پودے ملتے جلتے ہیں، مگر ہر پودے کے پھل کی لذت الگ ہے۔

❷ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتوں میں سے ایک عظیم قدرت اور نعمت کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس کے ذریعے سے نرم و نازک انگوری نکالی، جس سے تہ بہ تہ دانوں سے بھرے ہوئے خوشے نکالے اور کھجور کو دیکھو کہ پہلے ایک سُوا سا نکلا، پھر وہ درخت بن گیا، پھر اس سے کچا پھل بنایا، پھر اس کا رنگ بدلتا جاتا ہے اور وہ بڑا بھی ہو جاتا ہے۔ ان کے پھل دینے کو اور ان کے پکنے کو دیکھو، جب کچا ہوتا ہے تو اس کی کچھ حیثیت نہیں اور پک کر کس قدر لذیذ ہو جاتا ہے۔ یہی حال انگور، زیتون اور انار کا ہے۔

**آیت 100** وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ ......: اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے معبودِ برحق ہونے کے لیے آسمان و زمین اور ان کے درمیان والی چیزوں میں سے پانچ دلائل بیان فرمائے، اب بتایا کہ بعض لوگ پھر بھی اللہ کے لیے جنوں کو شریک بناتے ہیں، حالانکہ انھیں بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے، پھر مخلوق کو خالق کا شریک ٹھہرانا سراسر جہالت نہیں تو کیا ہے؟ (رازی)

عرب میں بعض فرقے ایسے بھی تھے جو جنات اور خبیث شیطانوں کی عبادت کرتے تھے اور مصیبت کے وقت ان کے نام کی دہائی دیتے اور کائنات میں ان کا تصرف مانتے تھے۔ ان سب کی اس آیت میں تردید فرمائی کہ بے سمجھے انھوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا اور اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔ چنانچہ عرب کے مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ ان گھڑی ہوئی باتوں سے پاک ہے۔ بعض سلف نے فرمایا کہ یہ آیت ان زندیقوں اور مجوسیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کو انسانوں، جانوروں اور ہر اچھی چیز کا خالق سمجھتے اور اسے ''یزداں'' کہتے تھے اور شیطان (ابلیس) کو درندوں، سانپوں اور ہر قسم کے شر کا خالق سمجھتے تھے اور اسے ''اہرمن'' کہتے تھے اور ان دونوں کو کائنات کے پیدا کرنے میں اللہ کا شریک بناتے تھے، حالانکہ ان کا اور ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے اہلِ علم نے مجوس کو زنادقہ (بالکل بے دین) قرار دیا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں کہ زیرِ تفسیر آیت کی مذکورہ توجیہات میں سے یہ بہترین توجیہ ہے۔

**آیت 101** ❶ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: بدیع کا معنی ہے کسی چیز کو بغیر نمونے کے پیدا کرنے والا، یعنی ان کا پہلے

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

یہی اللہ تمھارا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ سو تم اس کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے ﴿۱۰۲﴾ اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے اور وہی نہایت باریک بین، سب خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۰۳﴾

---

کوئی نمونہ موجود نہ تھا، اس نے ان کو ایجاد فرمایا۔

② اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ ...... : مشرکین کی تردید کے بعد اب ان کی تردید کی ہے جو اللہ کی اولاد مانتے تھے۔ فرمایا، اللہ کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے، جب کہ اولاد تو وہ ہوتی ہے جو بیوی کے ذریعے سے پیدا ہو اور اگر کسی کو بیوی کے بغیر بنایا جائے تو وہ مخلوق ہوتی ہے نہ کہ اولاد، جیسا کہ آسمان و زمین کی پیدائش یا آدم علیہ السلام کی پیدائش۔ (رازی)

**آیت 102** ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ...... : یعنی صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرو اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے یقین رکھو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق، حفیظ اور رقیب ہے۔ (ترجمان)

**آیت 102** لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ...... : " اَدْرَكَ يُدْرِكُ " کا معنی کسی چیز کو پالینا ہے، اس لیے اس کا معنی دیکھنا بھی ہوسکتا ہے اور کسی چیز کی حقیقت کو پالینا بھی۔ ادراک کا معنی اگر آنکھوں سے دیکھنا ہو تو اس کے متعلق ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جو تمھیں بیان کرے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا تو اس نے یقیناً جھوٹ کہا۔'' پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾...... پھر فرمایا: ''لیکن آپ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دو دفعہ دیکھا ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، سورۃ والنجم : ۴۸۵۵ ] عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا (سورۂ نجم میں مذکور آیات) ﴿ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ فکان قاب قوسین أو أدنی ﴾ : ۴۸۵۶ ]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں رب تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، صرف ابن عباس رضی اللہ عنہما دیکھنے کے قائل ہیں، مگر وہ بھی ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل کی آنکھ سے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ مزید تفصیل سورۂ نجم میں آئے گی۔ یہ تمام بحث دنیا میں نہ دیکھ سکنے کی ہے، مگر قرآن مجید کی متعدد آیات اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن انبیاء کے علاوہ مومنوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور وہ بغیر کسی تکلیف کے اپنی اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے، جیسے چاند کے دیکھنے میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور جنت کی سب سے بڑی نعمت یہی ہوگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [ القیامۃ : ۲۱، ۲۲ ] ''کئی چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ۝۱۰۴ وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۱۰۵

بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کئی نشانیاں آ چکیں، پھر جس نے دیکھ لیا تو اس کی جان کے لیے ہے اور جو اندھا رہا تو اسی پر ہے اور میں تم پر کوئی محافظ نہیں ﴿۱۰۴﴾ اور اسی طرح ہم آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں تو نے پڑھا ہے اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لیے واضح کر دیں جو جانتے ہیں ﴿۱۰۵﴾

لیکن ادراک کا معنی اگر حقیقت کو پالینا ہو تو یہ تو قیامت کے دن بھی نہ کسی فرشتے کے لیے ممکن ہے نہ رسول کے لیے، کیونکہ محدود مخلوق لامحدود کی حقیقت کو کیسے پا سکتی ہے۔ پھر زیر تفسیر آیت کے مطابق دنیا اور آخرت کسی جگہ بھی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو نہیں پا سکتیں۔

**آیت 104** قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ...... : "بَصَآئِرُ" یہ "بَصِیْرَۃٌ" کی جمع ہے، جو دل کی روشنی کا نام ہے، جیسا کہ بصارت آنکھوں سے دیکھنے کو کہتے ہیں، یعنی مالک کی طرف سے تمھارے پاس دل اور آنکھوں کو روشن کرنے والے دلائل تو پہنچ چکے، جو اوپر کی آیات میں مذکور ہیں، اب ان پر غور و فکر کر کے جو ایمان لے آئے تو اس کا اپنا ہی فائدہ ہے اور جو ان پر غور نہ کرے اور ایمان نہ لائے تو اپنا ہی برا کرے گا۔ میں تم پر کوئی محافظ نہیں کہ تمھارے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود تمھیں سیدھی راہ پر ڈال سکوں، ہدایت دینا یا نہ دینا تو اللہ ہی کا کام ہے۔

**آیت 105** ① وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ : یہاں تک اللہ تعالیٰ کے معبودِ برحق ہونے کا اثبات تھا، اب نبوت کو ثابت کرنے کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ ہم ایسے ہی مختلف طریقوں کے ساتھ بار بار دہراتے ہیں، کبھی مومنوں کو خوش خبری، کبھی کافروں کو تنبیہ، کبھی گزشتہ قوموں کے واقعات کے ذریعے سے نصیحت اور کبھی کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کے احکام، تاکہ جو لوگ عقل و فہم رکھتے ہیں، وہ ان کے ذریعے سے راہ ہدایت پائیں اور مخالفین پر حجت ہو۔

② وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ : یعنی ہم آیات کو پھیر پھیر کر اس لیے بیان فرماتے ہیں کہ اگر ایک طرف ان آیات کے ذریعے سے عقل و فہم والے راہِ ہدایت پائیں گے تو دوسری طرف ضدی اور آباء و اجداد کے رسم و رواج سے چمٹے رہنے والے کافر و مشرک آپ سے یہ کہہ کر گمراہ ہوں گے کہ یہ قرآن جسے تم ہمارے سامنے پڑھ رہے ہو، تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوا، بلکہ تم نے کسی سے پڑھا اور سیکھا ہے۔ مشرکین کے اسی قسم کے اقوال کئی دوسری آیات میں مذکور ہیں، مثلاً سورۂ فرقان (۴، ۵) اور سورۂ مدثر (۱۸ تا ۲۵) (رازی، قرطبی) "وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ" کی واؤ سے دیگر حکمتوں کی طرف اشارہ ہے جنھیں قصداً حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ ان سب کا بیان بہت طویل تھا۔ واؤ کے بعد ایک حکمت بیان فرما دی گئی۔

③ وَ لِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ : آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرنے کی پہلی حکمت یہ بیان فرمائی کہ کفار اور عناد رکھنے والے یہ کہیں کہ تم نے یہ قرآن کسی سے پڑھ لکھ کر سیکھ لیا ہے، تاکہ اس طرح زیادہ گمراہ ہوں، یہاں دوسری حکمت بیان کی ہے "تاکہ

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمۡ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ مَّرۡجِعُہُمۡ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

اس کی پیروی کر جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے وحی کی گئی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے کنارا کر ﴿۱۰۶﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شریک نہ بناتے، اور ہم نے تجھے ان پر محافظ نہیں بنایا اور نہ تو ان پر کوئی نگہبان ہے ﴿۱۰۷﴾ اور انھیں گالی نہ دو جنھیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، پس وہ زیادتی کرتے ہوئے کچھ جانے بغیر اللہ کو گالی دیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کا عمل مزین کر دیا ہے، پھر ان کے رب ہی کی طرف ان کا لوٹنا ہے تو وہ انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۰۸﴾

---

اہل علم کے لیے بیان اور فہم حاصل ہو۔'' (رازی)

**آیت 106** اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ...... : یعنی ان کے اس قسم کے بے بنیاد شبہات سے متاثر ہو کر دعوت و تبلیغ ترک نہ کرو۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے۔

**آیت 107** وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا...... : یعنی آپ ان کی حماقتوں اور کفر سے متاثر نہ ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر ایمان و کفر دونوں کی استعداد رکھی ہے اور اس سے ان کا امتحان مقصود ہے کہ شکر گزار بنتے ہیں یا کفر اختیار کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو فرشتوں کی طرح بھی بنا سکتا تھا کہ وہ فطری طور پر مومن ہونے کے ساتھ کفر یا نافرمانی کر ہی نہیں سکتے، بلکہ ہر طرح فرماں بردار ہیں، لیکن یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

**آیت 108** ① وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ...... : یہ آیت سدّ ذرائع کی دلیل ہے، یعنی اگر ایک جائز کام کسی بڑی خرابی کا ذریعہ بنتا ہو تو اس جائز کام کو بھی چھوڑنا ضروری ہے۔ یعنی اگر تم مشرکین کے معبودوں کو گالی دو گے تو وہ جہالت سے اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے اور تم اس کا سبب بنو گے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کے ماں باپ کو گالی دینے سے منع فرمایا کہ اس طرح تم خود اپنے والدین کو گالی دینے کا سبب بن جاؤ گے۔ [ بخاری، الأدب، باب لا یسب الرجل والدیہ : ۵۹۷۳ ]

② کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ...... : یعنی انسان کی عادت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ہر کام کو، چاہے وہ درحقیقت اچھا ہو یا برا، اچھا ہی سمجھتا ہے، یعنی: ﴿ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ ﴾ [ المؤمنون : ۵۳ ] ''ہر گروہ کے لوگ اسی پر خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔'' لیکن انسان میں غور و فکر کی صلاحیت بھی رکھی ہے کہ وہ برے کام کو پوری آزادی سے چھوڑ کر نیک راستہ اختیار کر سکتا ہے، دنیا کا ہر کام اللہ کے چاہنے سے ہوتا ہے، وہ نہ چاہے تو نہیں ہوتا۔ انسانوں کو امتحان کے لیے اچھے برے دونوں

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

اور انھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ بے شک اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو اس پر ضرور ہی ایمان لے آئیں گے تو کہہ نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں اور تمھیں کیا چیز معلوم کرواتی ہے کہ بے شک وہ جب آئے گی تو یہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۱۰۹﴾ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے اور انھیں چھوڑ دیں گے، اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں گے ﴿۱۱۰﴾

کاموں کا اختیار دینا بھی اس کی مرضی اور حکمت سے ہے، مگر وہ اپنے بندوں کے لیے کفر اور برے کاموں کو پسند نہیں کرتا۔ دیکھیے سورۂ زمر (۷)۔

**آیت 109** لَىِٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ ...... : مثلاً صفا پہاڑی کو سونے کا بنا دیا جائے، یا ان مطالبوں کو پورا کیا جائے جو ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں ذکر فرمائے ہیں۔ فرمایا ان سے کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں، میرے اختیار میں نہیں اور تمھیں کیا خبر کہ نیا معجزہ یا نشانی آ بھی جائے تو یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

**آیت 110** وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ ...... : یعنی اس سے پہلے معجزے دیکھ کر جب یہ ایمان نہیں لائے تو اب کیسے لائیں گے؟ جو شخص حق واضح ہونے کے بعد ہٹ دھرمی سے ایک دفعہ انکار کر دیتا ہے، پھر وہ مسلسل انکار ہی کرتا رہتا ہے۔ اس کے اس بدعمل کی وجہ سے آئندہ ایمان لانے کی توفیق اس سے چھین لی جاتی ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۷۴) اور سورۂ انفال (۲۴) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یعنی جن کو اللہ ہدایت دیتا ہے وہ پہلی دفعہ ہی حق کی بات سن کر انصاف سے قبول کر لیتے ہیں اور جس شخص نے پہلے ہی ضد سے ٹھان رکھی ہے کہ مانے گا ہی نہیں، وہ معجزہ دیکھ کر بھی کوئی حیلہ بنا لیتا ہے، مثلاً فرعون نے کتنے ہی معجزے دیکھے پر وہ ایمان نہ لایا۔ (موضح)

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور اگر واقعی ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیتے اور ان سے مردے گفتگو کرتے اور ہم ہر چیز ان کے پاس سامنے لا جمع کرتے تو بھی وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لے آتے مگر یہ کہ اللہ چاہے اور لیکن ان کے اکثر جہالت برتتے ہیں ﴿۱۱۱﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ گھڑتے ہیں ﴿۱۱۲﴾

**آیت 111** ① وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ ...... : پچھلی آیت : ﴿ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ میں جو بات مختصر بیان کی گئی تھی یہاں اسی کی تفصیل ہے، یعنی اگر ہم ان کے تمام مطالبات پورے کر دیں، جیسے فرشتوں کو نازل کرنا اور مُردوں کا کلام کرنا وغیرہ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہم ہر چیز گروہ در گروہ یا آمنے سامنے لا کھڑی کر دیں تو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہر چیز سے مراد ان کے مطالبات میں سے ہر چیز ہے، کیونکہ ''كُلَّ'' کے لفظ سے موقع کے مناسب ہر چیز ہوتا ہے، جیسا کہ ہدہد نے ملکۂ سبا سے متعلق کہا: ﴿ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [ النمل : ۲۳ ] ''اور اسے ہر چیز دی گئی ہے۔'' ظاہر ہے کہ ہر چیز تو اسے نہیں دی گئی تھی، حکومت و سلطنت سے متعلقہ اشیاء ہی عنایت کی گئی تھیں۔

② اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: مگر اللہ چاہے تو ضدی سے ضدی منکر کو بھی ایمان سے نواز سکتا ہے، جیسا کہ بعد میں عرب کے بے شمار عناد رکھنے والے کافر بھی مکہ فتح ہونے پر مسلمان ہو گئے۔ یہ مسلمانوں کے لیے بشارت کے الفاظ ہیں۔

③ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ: یہاں وہ جہل مراد نہیں جو علم کے مقابلے میں ہوتا ہے، بلکہ وہ جہل ہے جو حلم کے مقابلے میں ہوتا ہے، یعنی اکھڑ پن یعنی بعض حلم والے بھی ان میں موجود ہیں۔

**آیت 112** ① وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا...... : یعنی جس طرح جن و انس کے شیطان آپ سے دشمنی کر رہے ہیں، یہ صرف آپ کا حال نہیں، بلکہ اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے تمام انبیاء کے لیے بھی جن و انس شیطان دشمن بنائے تھے، لہٰذا آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، بلکہ جس طرح پہلے انبیاء نے اپنے شریر دشمنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لیا، آپ بھی ان کی ایذا رسانی پر صبر کیجیے، مایوسی اور گھبراہٹ کو اپنے اندر راہ نہ دیجیے۔

② يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ...... : وحی کا معنی خفیہ طریقے سے اطلاع دینا ہے، یعنی وہ انسان اور جن جو شیطان ہیں، وہ

وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور تا کہ ان لوگوں کے دل اس (جھوٹ) کی طرف مائل ہوں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور تا کہ وہ اسے پسند کریں اور تا کہ وہ بھی وہی برائیاں کریں جو یہ کرنے والے ہیں ﴿۱۱۳﴾ تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور منصف تلاش کروں، حالانکہ اسی نے تمھاری طرف یہ کتاب مفصل نازل کی ہے اور وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ جانتے ہیں کہ یقیناً یہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی ہوئی ہے، پس تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو ﴿۱۱۴﴾

اپنوں میں سے سیدھے سادے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے چوری چھپے طرح طرح کے مزین اور ملمع کیے ہوئے حیلے اور مکر سکھاتے ہیں۔ "غُرُوْرًا" مفعول لہ ہے، یعنی دھوکا دینے کے لیے۔

③ وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ: مگر وہ چونکہ حجت پوری کرنے کے لیے انھیں امتحان کا پورا پورا موقع دینا چاہتا ہے اور کسی کو زبردستی اپنی نافرمانی سے باز رکھنا اس کی حکمت اور تکوینی نظام کے خلاف ہے، اس لیے وہ انھیں ڈھیل دے رہا ہے۔

④ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ: یعنی ان کی کوئی پروا نہ کریں، انھیں اور ان کے جھوٹ گھڑنے کو اللہ پر چھوڑ دیں، وہ خود ان سے نمٹ لے گا۔

آیت 113 ① وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ...... : اس کا عطف "غُرُوْرًا" پر ہے، یعنی " لِيَغُرُّوْا بِذٰلِكَ وَ لِتَصْغٰى" "تا کہ وہ اس کے ساتھ دھوکا دیں اور تا کہ ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اس (جھوٹ) کی طرف مائل ہوں۔" یہ توجیہ ان تمام توجیہوں سے بہتر ہے جو یہاں کی گئی ہیں۔ (رازی)

② لِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا...... : "اِكْتَسَبَ يَكْتَسِبُ" اچھی یا بری دونوں کمائیوں کو کہتے ہیں، جبکہ "اِقْتَرَفَ يَقْتَرِفُ" برے اعمال کمانے کو کہتے ہیں، یعنی ان شیاطین کے پیشِ نظر اس وحی سے یہ سب مقاصد ہیں۔ (رازی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ کئی آیتیں اس وقت نازل ہوئیں جب کفار کہنے لگے کہ مسلمان اپنا مارا ہوا جانور کھاتے ہیں اور اللہ کے مارے ہوئے کو حرام سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسی فریب کی باتیں شیطان کرتے ہیں، تا کہ انسانوں کو شبہات میں ڈالا جائے۔ عقل کا حکم نہیں، حکم اللہ کا ہے۔ آگے پھر واضح طور پر سمجھایا گیا کہ ہر جانور کو مارنے والا اللہ ہی ہے اور اس کے نام میں برکت ہے، سو جو اس کے نام پر ذبح ہوا وہ حلال ہے اور جو اس کے نام کے بغیر مر گیا وہ مردار ہے۔ (موضح)

آیت 114 ① اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا...... : اوپر کی آیات میں یہ بتا دیا کہ یہ کفار کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے، لہٰذا ان کے لیے آیات کا نازل کرنا بے فائدہ ہے۔ اب یہاں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مفصل کتاب نازل فرمائی ہے وہ آپ کی نبوت کے سچا ہونے پر دلیل کے لیے کافی ہے۔ کفار مکہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے اور نبی ﷺ کے درمیان جو مخالفت ہے اس

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور تیرے رب کی بات سچ اور انصاف کے اعتبار سے پوری ہوگئی، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾ اور اگر تو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہیں ﴿۱۱۶﴾

کے بارے میں اہل کتاب یا کسی اور کو حکم بنا لیا جائے، پھر جو فیصلہ وہ دیں اسے تسلیم کر لیا جائے، اس آیت میں ان کی اس تجویز کا جواب دیا جا رہا ہے کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور منصف تلاش کروں۔

② يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ: کیونکہ ان کے انبیاء بھی انھیں نبی ﷺ کی بشارت دیتے رہے ہیں اور ان کی کتابوں میں بھی آپ کی علامات موجود ہیں۔

③ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ: یعنی اس بارے میں کہ اہل کتاب کے دلوں میں قرآن کے سچا ہونے کا یقین ہے۔ خطاب تو آپ ﷺ سے ہے، مگر اس سے مراد سارے مسلمان ہیں۔ (رازی)

**آیت 115** ① وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ...... : یہاں کلمہ اور کلمات سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن معجزہ ہونے اور آپ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کی دلیل کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ قرآن کے تمام مضامین دو ہی قسم کے ہیں، خبریں یا احکام۔ یہاں "صِدْقًا" کا تعلق خبروں سے ہے اور "عَدْلًا" کا تعلق احکام سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تمام خبریں، خواہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے ہو یا گزشتہ واقعات یا مستقبل کے وعدے اور حوادث سے، وہ سب پورے طور پر سچے ہیں اور اس میں جتنے احکام ہیں وہ سب عدل و انصاف پر مشتمل ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسی کامل کتاب کی موجودگی میں ان شیطانی وساوس یا عقلی شکوک و شبہات کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ (رازی) پھر ذبیحہ جیسے اہم مسئلے میں یہ اپنی کج فہمی سے کیوں دخل دے رہے ہیں۔

② لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ: یعنی نہ تو اس قسم کے شبہات قرآن کے معجزہ ہونے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے اوامر و نواہی میں کوئی ترمیم جائز ہے اور نہ جیسے تورات و انجیل میں تحریف ہوئی، قرآن میں ہو سکے گی۔ (رازی)

**آیت 115** وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ...... : اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اپنے نبی کو متنبہ کیا ہے کہ کثرت آپ کے نزدیک حق کی دلیل نہیں ہونی چاہیے اور محض کثرت کی بنیاد پر آپ کو اہل زمین کا اتباع نہیں کرنا چاہیے، ورنہ آپ راہ حق سے ہٹ جائیں گے۔ یہ کفار جو کثیر تعداد میں ہیں، اس جھوٹے گمان میں مبتلا ہیں کہ ان کے آباء و اجداد حق پر تھے،

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ يَّضِلُّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ بِاٰيٰتِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۱۸﴾ وَ مَا لَكُمۡ اَلَّا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ وَ قَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَيۡهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيۡرًا لَّيُضِلُّوۡنَ بِاَهۡوَآئِهِمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾

بے شک تیرا رب ہی خوب جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے بھٹکتا ہے اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۷﴾ تو اس میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو ﴿۱۱۸﴾ اور تمھیں کیا ہے کہ تم اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، حالانکہ بلاشبہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ اور بے شک بہت سے لوگ اپنی خواہشوں کے ساتھ کچھ جانے بغیر یقیناً گمراہ کرتے ہیں، بے شک تیرا رب ہی حد سے بڑھنے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿۱۱۹﴾

اس لیے ان کی تقلید کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ لوگوں کی اکثریت اسی دین پر قائم ہے جو ان کا بھی دین ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں، کبھی کسی کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں تو کبھی بتوں کو اللہ کے پاس اپنا سفارشی بناتے ہیں اور کبھی مردوں اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانوروں کو حلال قرار دیتے ہیں۔ اس آیت سے جمہوریت کی حقیقت بھی خوب واضح ہوتی ہے، جس میں اکثریت ہی کو فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے۔ اکثریت سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے علاوہ بھی حق پر نہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ [ یوسف : ۱۰۳ ] ”اور اکثر لوگ خواہ تو حرص کرے ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [ یونس : ۵۵ ] ”اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِيَ الشَّكُوۡرُ ﴾ [ سبا : ۱۳ ] ”اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيۡلٌ مَّا هُمۡ ﴾ [ ص : ۲٤ ] ”مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور یہ لوگ بہت ہی کم ہیں۔“

اب ایک طرف اللہ کا حکم ہو جس سے پکی دلیل کوئی ہو نہیں سکتی اور ایک طرف اکثریت ہو جن کی بنیاد محض ان کے گمان اور اٹکل پر ہے اور اس اٹکل کی بنیاد پر انھوں نے بے شمار حرام چیزوں، مثلاً شرک، سود، زنا، قوم لوط کے عمل وغیرہ کو حلال کر لیا اور بے شمار حلال چیزوں کو حرام قرار دے دیا ہے تو بتائیے حق کس طرف ہوگا؟ اس لیے اس آیت میں اللہ کے حکم کے مقابلے میں اہل زمین کی اکثریت کی اطاعت سے منع فرمایا۔

آیت 118 فَكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ ...... : یعنی وہ حلال جانور جسے ذبح یا شکار کرتے وقت اللہ کا نام یعنی ”بِسۡمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكۡبَرُ“ لیا جائے اسے کھاؤ، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو، یعنی صرف ایسا ذبیحہ کھانا ایمان کا تقاضا ہے۔

آیت 119 ① وَقَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ : یعنی جب اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حرام چیزوں کو خوب کھول کر

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور ظاہر گناہ کو چھوڑ دو اور اس کے چھپے کو بھی، بے شک جو لوگ گناہ کماتے ہیں عنقریب انھیں اس کا بدلہ دیا جائے گا، جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے ﴿۱۲۰﴾ اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور بلاشبہ یہ یقیناً سراسر نافرمانی ہے اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ضرور باتیں ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے ان کا کہنا مان لیا تو بلاشبہ تم یقیناً مشرک ہو ﴿۱۲۱﴾

بیان کر دیا ہے، جن کی تفصیل آگے اسی سورت میں آ رہی ہے اور سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں بھی ہے اور بعض کا ذکر احادیث میں ہے، تو ان کے علاوہ سب جانور حلال ہیں اور اللہ کے نام پر ذبح یا شکار کیا ہوا جانور ان حرام چیزوں میں شامل نہیں ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم اسے نہ کھاؤ اور اللہ کے نام کے بغیر یا غیر اللہ کے نام پر ذبح یا شکار کیا ہوا جانور کھاؤ۔

② اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ: یعنی اضطرار اور مجبوری میں حرام کھانا جائز ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۳)، سورۂ مائدہ (۳) اور اسی سورت کی آیت (۱۴۵)۔

③ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ: مراد وہ لوگ ہیں جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیتے ہیں۔ مقصود اس سے ڈرانا ہے۔ (رازی)

**آیت 120** وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ...... : یعنی حلال و حرام صرف کھانے کی چیزوں میں منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر ظاہر و باطن گناہ کو چھوڑنا ضروری ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی کافروں کے بہکانے پر نہ ظاہر میں عمل کرو اور نہ دل میں شبہ رکھو۔'' (موضح) علماء نے لکھا ہے کہ ظاہر گناہ وہ ہیں جو ہاتھ پاؤں سے کیے جائیں، جیسے چوری، زنا وغیرہ اور چھپے گناہ وہ ہیں جن کے کرنے کا دل میں عزم ہو، یا جو عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، جیسے کفر و شرک اور نفاق وغیرہ، یا جن گناہوں کا نقصان عام لوگوں پر واضح ہو وہ ظاہر گناہ کہلاتے ہیں اور جن کے نقصان سے چند مخصوص آدمیوں کے سوا دوسرے واقف نہ ہوں وہ باطن کہلاتے ہیں۔ (المنار)

**آیت 121** ① وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ: پہلے اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ کے نام کا ذبیحہ حلال ہے۔ اب اس آیت میں بیان فرمایا کہ جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے، اس میں مردار اور وہ جانور تو آیت کے صاف الفاظ میں داخل ہیں جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے ہوں اور لفظ عام ہونے کی وجہ سے آیت گو ہر اس چیز کو شامل ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، خواہ وہ کھانے کی کوئی بھی چیز ہو، مگر فقہاء نے اس سے بالاجماع ذبیحہ مراد لیا ہے۔ (رازی)

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنا دی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں ہے، ان سے کسی صورت نکلنے والا نہیں۔ اسی طرح کافروں کے لیے وہ عمل خوشنما بنا دیے گئے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۲۲﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں سب سے بڑے اس کے مجرموں کو بنا دیا، تاکہ وہ اس میں مکر و فریب کریں اور وہ مکر و فریب نہیں کرتے مگر اپنے ساتھ ہی اور وہ شعور نہیں رکھتے ﴿۱۲۳﴾

---

یاد رہے! اگر کسی ذبیحہ پر جان بوجھ کر اللہ کا نام ترک کر دیا جائے تو وہ اکثر فقہاء کے نزدیک حرام ہے، مگر جب مسلمان ذبح کرتے وقت " بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ " بھول جائے تو اس کا کھانا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے خطا اور نسیان معاف کر دیا ہے۔

② وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ: یعنی جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا فسق ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۵)۔

③ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ......: دیکھیے اسی سورت آیت کی (۱۱۳) کا حاشیہ (۲)۔

④ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ: اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال قرار دینے والا بھی مشرک ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کو حاکم بنا لیا، یعنی تحلیل و تحریم کا حق کسی اور کے لیے تسلیم کر لیا، جب کہ یہ صرف اللہ کا حق ہے۔ (رازی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے اللہ کے پوجے، بلکہ شرک حکم میں بھی ہے کہ کسی اور کا مطیع ہووے۔ (موضح)

**آیت 122** ① اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ...... : یعنی وہ کافر تھا اسے مسلمان بنایا۔ (شوکانی) اوپر جانوروں کے مُردوں کا ذکر تھا، یہاں کافر پر وہی مثال فرمائی، یعنی جب کافر تھے تو جہل اور کفر و شرک کے باعث سب مُردے تھے، پھر جس کو ایمان ملا وہ زندہ ہوا اور روشنی اور راہِ ہدایت پائی اور اس کے چہرے پر سب لوگ ایمان کی روشنی دیکھتے ہیں اور جس کو ایمان نہ ملا وہ اندھیروں میں پڑا رہا۔ (موضح) مسلمان اور کافر کے زندہ اور مردہ ہونے کا مضمون دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۷)، سورۂ ہود (۲۴) اور سورۂ فاطر (۱۹ تا ۲۲) میں۔

② كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: یعنی شیطان اپنے وسوسوں کے ذریعے سے ان کافروں کی نگاہ میں ان کے اعمال کو خوبصورت کر کے پیش کرتا ہے۔

**آیت 123** ① وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ...... : " اَكٰبِرَ " یہ " اَكْبَرُ " کی جمع ہے، " مُجْرِمِيْنَ " کا نون

وَ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيۡبُ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہمیں اس جیسا دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا، اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔ عنقریب ان لوگوں کو جنھوں نے جرم کیے، اللہ کے ہاں بڑی ذلت پہنچے گی اور بہت سخت عذاب، اس وجہ سے کہ وہ فریب کیا کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾ تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے ﴿۱۲۵﴾

" ھا " کی طرف اضافت کی وجہ سے گر گیا، یعنی مکہ کی طرح پہلے بھی ہم نے ہر بستی کے اکابر یعنی چودھری اور کھڑپینچ اس کے مجرموں کو بنا دیا، جس کے نتیجے میں وہ اپنے مکر و فریب اور قوت و اقتدار کے ذریعے سے لوگوں کو ایمان سے روکتے رہے اور فسق و فجور میں پڑے رہے۔ انبیاء کے مقابلے میں بھی یہی لوگ آتے رہے، مگر آخر انجام ایمان والوں کے غلبے پر ہوا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے ہیں، تاکہ عوام الناس پیغمبر کے مطیع نہ ہو جائیں، جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ جادو کے زور سے سلطنت لینا چاہتا ہے۔ (موضح)

❷ وَمَا يَمۡكُرُوۡنَ اِلَّا بِاَنۡفُسِهِمۡ: یعنی اس کا وبال خود ان پر پڑے گا، تو گویا اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں۔

**آیت 124** ❶ وَ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ ...... : یعنی ان کفار کے مکر و فریب کا یہ عالم ہے کہ جب بھی ان کے سامنے نبی ﷺ کے صدق کی دلیل کے طور پر کوئی معجزہ ظاہر ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ جب تک ہم خود اس منصب پر فائز نہ ہوں اور ہمیں یہ معجزہ نہ ملے ہم ایمان نہیں لا سکتے۔

❷ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسٰلَتَهٗ: یعنی نبوت و رسالت محض وہبی چیز ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے نبوت کی امانت اس کے سپرد کر دیتا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ یہ نعمت کسے عطا کرنی ہے، مکہ کے ایک یتیم کو یا مکہ اور طائف کے کسی متکبر سردار کو۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۳۱، ۳۲)۔

**آیت 125** ❶ فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ...... : "اسلام" کا لفظی معنی ہے تابع ہو جانا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ

اور یہ تمھارے رب کا راستہ ہے سیدھا۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۲۶﴾ انھی کے لیے ان کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا مددگار ہے، ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے ﴿۱۲۷﴾ اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، اے جنوں کی جماعت! بلاشبہ تم نے

**"حَرَجًا"** نہایت تنگ، گھٹا ہوا، درختوں کا وہ جھنڈ جس میں کوئی چیز داخل نہ ہو سکے۔ **"يَصَّعَّدُ"** یہ " صَعِدَ يَصْعَدُ (س) " سے باب تفعل کا مضارع ہے، یعنی " **يَصَّعَّدُ** " اصل میں "يَتَصَعَّدُ" تھا، حروف زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہو گیا ہے، یعنی مشکل سے چڑھ رہا ہے۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ رسالت کی طرح ہدایت و گمراہی بھی اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے نظام عدل کے مطابق جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ صحیح بات تسلیم کرنے کے لیے کھول دیتا ہے، اس کے لیے ہدایت کے راستے آسان کر دیتا ہے، اسے حق قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور وہ آسانی سے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے تابع فرمان کر دیتا ہے اور جسے اس کی سرکشی کے باعث ہدایت نہیں دینا چاہتا اس کا سینہ حق قبول کرنے کے لیے تنگ اور نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، جیسا کہ وہ بلندی کی طرف مشکل سے چڑھ رہا ہے، جوں جوں اوپر چڑھتا ہے، ایک تو چڑھائی کی وجہ سے دوسرے آکسیجن کے کم اور پھر ختم ہونے کی وجہ سے سانس ہی نہیں لے سکتا۔ جو لوگ حق سمجھ کر انکار کا راستہ اختیار کرنے والے ہیں ان پر ایمان کی طہارت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے کفر کی گندگی چڑھتی چلی جاتی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۶، ۷)، سورۂ توبہ (۱۲۵)، سورۂ لیل (۵ تا ۱۰) اور سورۂ یونس (۱۰۰)۔

③ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اوپر فرمایا تھا کہ کافر قسمیں کھاتے ہیں کہ ایک آیت (نشانی) دیکھیں تو ضرور یقین لے آئیں گے، اب فرمایا کہ ہم نہ دیں گے ایمان تو کیونکر لائیں گے۔ بیچ میں مردہ حلال کرنے کے حیلے ذکر کیے، اب اس بات کا جواب فرمایا کہ جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات کو نہ چھوڑے، جو دلیل دیکھے کچھ حیلہ بنا لے، وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری پر وہ نشان ہدایت ہے۔ ان لوگوں میں نشان ہیں گمراہی کے، ان کو کوئی آیت اثر نہ کرے گی۔'' (موضح)

آیت 126 وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ...... : "هٰذَا" یعنی حکم برداری میں عقل کو راہ نہ دینا سیدھی راہ ہے۔ (موضح)

آیت 126 ① وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا...... : جنوں سے مراد یہاں شیطان جن ہیں۔ ان کا بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لینے کا مطلب انھیں گمراہ کر کے اپنے راستے پر لگا لینا ہے اور جنوں کا انسانوں سے فائدہ اٹھانا یہ ہے کہ انھوں نے ان کو گمراہی کی دعوت دی اور انھوں نے اسے قبول کر لیا اور ان کی تعظیم و تکریم اور مصیبتوں کے وقت ان کو پکارنا شروع کر دیا اور

قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا، اور انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے اے ہمارے رب! ہمارے بعض نے بعض سے فائدہ اٹھایا اور ہم اپنے اس وقت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ فرمائے گا آگ ہی تمھارا ٹھکانا ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تیرا رب کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض کا دوست بنا دیتے ہیں، اس کی وجہ سے جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۱۲۹﴾

یہی شیاطین کی کامیابی ہے اور انسانوں کا جنوں سے فائدہ اٹھانے سے مراد ان سے آسمان کے فرشتوں سے سنی ہوئی خبریں، جو وہ جھوٹ ملا کر بتاتے ہیں، سن کر اپنی جھوٹی غیب دانی کا بازار چمکانا، جادو ٹونے میں ان سے مدد لینا وغیرہ ہے اور پھر لوگوں سے پیسے بٹورنا، مزید کئی فوائد حاصل کرنا اور انھیں گمراہ کرنا ہے۔

② قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ : یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے بعد جو شخص بھی کسی جن سے کوئی غلط فائدہ اٹھائے یا قید کر کے اس سے کوئی مقصد حاصل کرے اس شخص اور جن دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شیطان جن کو نماز کے دوران آپ پر حملہ کرنے پر گرفتار کر لیا اور مسجد کے ستون سے باندھنے کا ارادہ کیا تو سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد کر کے اسے چھوڑ دیا کہ انھوں نے دعا کی تھی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ......﴾ [ص: ٣٤ تا ٤٠] مزید دیکھیے سورۂ شعراء (۲۲۱ تا ۲۲۳) اور سورۂ جن (٦)۔

③ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ : اس لفظ سے جو شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جہنم آخر ختم ہو جائے گی اس کے جواب میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو فرمایا کہ آگ میں رہا کریں گے مگر جو چاہے اللہ تو یہ اس لیے کہ اگر دوزخ کا عذاب دائمی ہے تو اسی کے چاہنے سے ہے، وہ چاہے تو موقوف کرے مگر وہ چاہ چکا۔ (موضح)

آیت 129 وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا ...... : یعنی جس طرح ہم نے جنات اور بعض انسانوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا اسی طرح ہم ظالم اور فاسق و فاجر انسانوں کو ان کے اعمال کے سبب ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں، جیسا کہ دیکھیے سورۂ توبہ (٦٧، ٧١) ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیں گے کہ جس طرح وہ دنیا میں گناہوں کے ارتکاب میں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار تھے اسی طرح آخرت کا عذاب بھگتنے میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریک حال ہوں گے۔ بعض نے "نُوَلِّيْ" کا ایک معنی یہ کیا ہے کہ ہم ظالموں میں سے بعض کو بعض پر والی اور حاکم بنا دیتے ہیں کہ جس طرح ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بعض کو بعض پر مسلط کر دیا،

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے کوئی رسول نہیں آئے، جو تم پر میری آیات بیان کرتے ہوں اور تمھیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ وہ کہیں گے ہم اپنے آپ پر گواہی دیتے ہیں اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ اپنے آپ پر گواہی دیں گے کہ یقیناً وہ کافر تھے ﴿۱۳۰﴾ یہ اس لیے کہ بے شک تیرا رب کبھی بستیوں کو (ان کے) کسی ظلم کی وجہ سے ہلاک کرنے والا نہیں، جب کہ اس کے رہنے والے بے خبر ہوں ﴿۱۳۱﴾ اور ہر ایک کے لیے مختلف درجے ہیں، ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے کیے اور تیرا رب اس سے ہرگز بے خبر نہیں جو وہ کر رہے ہیں ﴿۱۳۲﴾

اسی طرح دنیا میں ہم ظالموں کو بھی ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں کہ ظالم ماتحت پر ظلم کرتا ہے اور کمزور زبردست کا ظلم سہتا ہے، مگر آیات کے سیاق اور الفاظ "اَوْلِيٰٓـئُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ" کی یہاں حاکم کے معنی کے ساتھ مناسبت محل نظر ہے۔

**آیت 130** ① يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ: "تم میں سے رسول" کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول جن و انس میں سے انسان ہی ہوئے ہیں۔ افضل مخلوق فرشتے یا انسان ہیں۔ دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۹) اور سورۂ فرقان (۲۰) جنوں کا نبی ہونا ثابت نہیں، علمائے سلف و خلف کی اکثریت کا یہی قول ہے کہ کسی جن کو رسول نہیں بنایا گیا، البتہ ان میں سے کئی منذرین گزرے ہیں، یعنی اپنی قوم کو خبردار کرنے والے، جو انسانوں کی طرف آنے والے رسولوں پر ایمان لا کر اپنی قوم کو پیغام پہنچاتے تھے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۲۹ تا ۳۲) اور سورۂ جن۔ جنوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کیا ہے اور اپنی قوم کو ایمان لانے کی دعوت دی ہے، بلکہ سورۂ احقاف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن پہلے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔

② اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سورت میں اوپر مذکور ہوا کہ اول کافر اپنے کفر کا انکار کریں گے، پھر حق تعالیٰ تدبیر سے ان کو قائل کرے گا۔ (موضح) دیکھیے سورۂ انعام (۲۳ اور ۲۷ تا ۳۰)، سورۂ حم السجدۃ (۲۰، ۲۱) اور سورۂ یٰس (۶۵)۔

**آیت 131** ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ......: یعنی ان کے پاس کوئی پیغمبر یا اس کا نائب نہ پہنچا ہو اور اس نے انھیں حقیقت حال سے آگاہ نہ کر دیا ہو۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۵)۔

**آیت 132** وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا......: اس سے معلوم ہوا کہ جنوں میں سے بھی جو نیک ہیں وہ جنت میں اور جو بدکار

وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ؕ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

اور تیرا رب ہی ہر طرح بے پروا، کمال رحمت والا ہے، اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور تمھارے بعد جانشین بنا دے جسے چاہے، جس طرح اس نے تمھیں کچھ اور لوگوں کی اولاد سے پیدا کیا ہے ﴿۱۳۳﴾ بے شک وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے، ضرور آنے والی ہے اور تم کسی صورت عاجز کرنے والے نہیں ﴿۱۳۴﴾ کہہ دے اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر عمل کرو، بے شک میں (بھی) عمل کرنے والا ہوں، تو تم عنقریب جان لو گے وہ کون ہے جس کے لیے اس گھر کا اچھا انجام ہوتا ہے۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے ﴿۱۳۵﴾

ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔ سورۂ رحمٰن میں اس کی تفصیل موجود ہے اور جنت اور جہنم میں بھی ان کے درجات و درکات مختلف ہوں گے۔

**آیت 133** ① وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ: یہاں "اَلْغَنِيُّ" خبر معرفہ ہونے اور "الرَّحْمَةِ" پر ''الف لام'' ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے ''اور تیرا رب ہی ہر طرح بے پروا، کمال رحمت والا ہے'' اس کے سوا کوئی اور نہ ہی بے پروا ہے نہ کمال رحمت والا، یعنی اسے مخلوق سے کوئی حاجت نہیں، پھر بھی بطور احسان کمال رحمت والا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ پہلے جو نعمتیں ذکر ہوئی ہیں، مثلاً رسولوں کا بھیجنا وغیرہ، محض رحمت کی بنا پر ہیں، اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں۔

② ذُو الرَّحْمَةِ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں، ایک رحمت اس نے جنوں، آدمیوں، جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں میں اتاری ہے، وہ اسی ایک رحمت کی وجہ سے ایک دوسرے پر مہربانی کرتے ہیں اور رحم کرتے ہیں اور اسی ایک رحمت کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور ننانویں رحمتیں اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھی ہیں جو اپنے بندوں پر قیامت کے دن کرے گا۔'' [ مسلم، التوبة، باب فی سعة رحمة الله تعالى ...... : ۲۷۵۲/۱۹ ]

③ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ ...... : یعنی جس طرح تمھیں پہلے لوگوں کا جانشین بنایا اسی طرح تمھیں تباہ کر کے دوسروں کو تمھارا جانشین بنا سکتا ہے، یا یہ کہ اس کی قدرت جن و انس کو پیدا کرنے ہی پر منحصر نہیں، بلکہ وہ ان کے بجائے کوئی تیسری قسم کی مخلوق بھی پیدا کر سکتا ہے۔ (رازی) دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۳)، سورۂ ابراہیم (۱۹، ۲۰) اور سورۂ فاطر (۱۵ تا ۱۷)۔

**آیت 134** وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ: باء تاکید کی وجہ سے ترجمہ میں ''کسی صورت'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ تم اس سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے کہ وہ تمھیں پکڑنے سے عاجز رہ جائے۔

**آیت 133** ① قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ: مطلب یہ نہیں کہ تمھیں اجازت ہے کہ جو چاہو کرو، بلکہ ڈانٹنا

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآىِٕنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىِٕهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآىِٕهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۱۳۶

اور انھوں نے اللہ کے لیے ان چیزوں میں سے جو اس نے کھیتی اور چوپاؤں میں سے پیدا کی ہیں، ایک حصہ مقرر کیا، پس انھوں نے کہا یہ اللہ کے لیے ہے، ان کے خیال کے مطابق اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے ہے، پھر جو ان کے شرکا کے لیے ہے سو وہ اللہ کی طرف نہیں پہنچتا اور جو اللہ کے لیے ہے سو وہ ان کے شریکوں کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ۝۱۳۶

مقصود ہے، جیسے کوئی شخص کہتا ہے کہ اچھا جو کچھ تم کر رہے ہو کرتے رہو، میں عنقریب تم سے نمٹ لوں گا۔

② مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ : ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے وعدہ پورا فرمایا اور انھیں تمام ملک پر قبضہ عطا فرمایا، مخالفین ان کے رحم و کرم پر رہ گئے، مکہ فتح کروا دیا اور یہ سب کچھ آپ کی زندگی میں ہو گیا، پھر آپ کی وفات کے بعد مشرق سے مغرب تک ملک فتح ہو گئے۔ آخرت میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر اچھا انجام ہو گا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۵۱، ۵۲)

③ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ : ''بلاشبہ'' ''اِنَّ'' کا اور ''حقیقت یہ ہے۔'' ضمیر شان ''ہٗ'' کا ترجمہ ہے۔

آیت 136 وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ ...... : قیامت اور جزا و سزا کے متعلق ان کے خیالات کی تردید کے بعد یہاں سے ان کی دوسری اعتقادی اور عملی حماقتوں اور جہالتوں کا بیان شروع ہو رہا ہے جو مدت سے چلی آئی تھیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب تم عربوں کی جہالت معلوم کرنا چاہو تو سورۂ انعام کی آیت (۱۳۰) سے لے کر ﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا ﴾ یعنی آیت (۱۴۰) تک پڑھ لو۔ [ بخاری، المناقب، باب قصة زمزم و جهل العرب : ۳۵۲۴ ] ان میں سے پہلی جہالت یہ تھی کہ اپنی کھیتی اور چوپاؤں میں سے ایک حصہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے، یعنی مہمان نوازی، صلہ رحمی اور اللہ کو خوش کرنے والے کاموں کے لیے مقرر کیا ہوا تھا اور ایک حصہ اپنے داتاؤں، مشکل کشاؤں، ان کی شکل پر بنائے ہوئے بتوں، ان کے پروہتوں اور کاہنوں کے لیے۔ اگر کسی وجہ سے بتوں اور کاہنوں کا حصہ کم پڑ جاتا تو اللہ تعالیٰ کے حصے میں سے لے کر اس میں ڈال دیتے اور کہتے کہ اللہ تو غنی ہے، اس کو زیادہ مال کی کیا ضرورت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا حصہ کم پڑ جاتا تو اس میں بتوں کے حصے میں سے کچھ نہ ڈالتے۔ اب بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں شریک بنانا کون سی کم جہالت تھی کہ اس سے بڑھ کر ان شرکا کو خوش کرنے کے لیے کھیتی اور چوپاؤں کے حصے میں ان کو اللہ پر ترجیح دینے کی جہالت اختیار کرتے ! یہ اسی طرح ہے جیسے آج کل بعض مسلمان اللہ کا فرض زکوٰۃ اور عشر نہیں نکالیں گے، مگر اپنے فوت شدہ داتاؤں اور غریب نوازوں کی نیاز میں کبھی ناغہ نہیں آنے دیں گے اور عقیدہ یہ رکھیں گے کہ اگر اس میں کمی ہو گئی تو جانوروں کے تھنوں میں سے دودھ

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کو مار ڈالنا ان کے شریکوں نے خوش نما بنا دیا، تاکہ وہ انھیں ہلاک کریں اور تاکہ وہ ان پر ان کا دین خلط ملط کریں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ باندھتے ہیں ﴿۱۳۷﴾

---

کے بجائے خون آئے گا۔ نام اس کا ایصال ثواب رکھیں گے، مگر ایصال ثواب تو اللہ کے نام پر صدقہ کرنے سے ہوتا ہے، نہ کہ بزرگوں کی قبروں پر چڑھاوے چڑھا کر اور اگر اللہ ہی کو خوش کرنا ہو تو غیر اللہ کی نذر و نیاز کے بجائے عشر اور زکوٰۃ نکالیں۔

**آیت 137** ① **وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ** ...... : یہ ان کی دوسری جہالت اور گمراہی تھی، اس کا عطف "**جَعَلُوْا**" پر ہے، یعنی جیسے کھیتی اور جانوروں میں سے انھوں نے اپنے شرکاء کا حصہ مقرر کیا، اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکا نے اپنی اولاد کو قتل کرنا بھی خوش نما بنا دیا اور عام طور پر ان کے سامنے تین چیزیں جواز کے بہانے کے طور پر رکھ دیں، ایک یہ کہ انھیں کہاں سے کھلاؤ گے، یعنی ﴿ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ﴾ [ بنی إسرائیل : ۳۱ ] "مفلسی کے ڈر سے۔" جیسا کہ آج کل کے نام نہاد مسلمان بھی منصوبہ بندی کے نام پر یہ کام کر رہے ہیں، کفار کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ دوسرا لڑکی کا باعثِ عار ہونا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ﴾ [ النحل : ۵۹ ] "وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس خوش خبری کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی گئی۔" اور تیسرا اپنے شریکوں کو خوش کرنے کے لیے اولاد کو ان کے نام پر ذبح کر دینا، جسے ہندو بھینٹ چڑھانا کہتے ہیں۔ ان پروہتوں اور بت خانوں کے پجاریوں کو شریک اس لیے کہا کہ وہ انھیں اپنے نفع و نقصان میں دخیل سمجھتے تھے اور انھی کی ترغیب پر بچوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے، جیسا کہ آج کل کئی قبروں کے پجاری یہ کام کرتے ہیں اور اس لیے بھی کہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی اور کا حکم ماننا بھی اسے شریک بنانا ہے اور سب سے بڑا شریک تو شیطان ہے جس کے خوش نما بنانے پر وہ اللہ کے ساتھ شرک اور اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں۔

② **لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ** : "**لِيُرْدُوْهُمْ**" باب افعال سے "اَرْدٰى يُرْدِىْ" کا معنی ہے ہلاک کرنا۔ "**لِيَلْبِسُوْا**" اگر "لَبَسَ يَلْبِسُ (ض)" ہو تو خلط ملط کرنا اور "لَبِسَ يَلْبَسُ (س)" ہو تو پہننا۔ اہل عرب اصل میں ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہونے کے مدعی تھے، لیکن شیطان نے آہستہ آہستہ بت پرستی، قتل اولاد اور بہت سی غلط باتیں ان کے دین میں داخل کر دی تھیں۔ فرمایا کہ ان کے شرکاء نے یہ سب کچھ انھیں برباد کرنے اور ان کے دین کو خلط ملط کرنے کے لیے کیا۔

③ **وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ** ...... : مگر یہ جبر ہوتا اور اس اختیار کے خلاف ہوتا جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دے کر امتحان لے رہا تھا، اس لیے آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، ان کی ان تمام حرکتوں کو افترا ( جھوٹ باندھنا ) قرار دیا۔

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

اور انھوں نے کہا یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں کھائے گا جسے ہم چاہیں گے، ان کے خیال کے مطابق اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام کی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے، اس پر جھوٹ باندھتے ہوئے۔ عنقریب وہ انھیں اس کی جزا دے گا جو وہ جھوٹ باندھتے تھے ﴿۱۳۸﴾ اور انھوں نے کہا جو ان چوپاؤں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری بیویوں پر حرام کیا ہوا ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو وہ سب اس میں شریک ہیں۔ عنقریب وہ انھیں ان کے کہنے کی جزا دے گا۔ بے شک وہ کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۳۹﴾

آیت 138 ① "حِجْرٌ" بمعنی "مَحْجُوْرٌ" ہے، یعنی ممنوع۔ اس آیت میں ان کی جاہلیت کی تین اور صورتیں بیان فرمائی ہیں، پہلی صورت یہ کہ فلاں جانور یا کھیت کا استعمال ممنوع ہے، مگر اس کے لیے جسے ہم اجازت دیں گے اور یہ اجازت بت خانوں کے مجاوروں اور خادموں کے لیے ہوتی تھی۔

② حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا : یہ دوسری صورت ہے کہ وہ مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے اور ان سے سواری یا بوجھ اٹھوانے کا کام نہ لیتے، جیسے بحیرہ، سائبہ وغیرہ۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۰۳)۔

③ وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا ...... : یہ تیسری صورت ہے کہ وہ کچھ جانوروں کو بت خانوں کے مجاوروں کے لیے خاص کرتے ہوئے انھیں ذبح کرتے وقت یا سوار ہوتے وقت صرف اپنے بت کا نام لیتے، اللہ کا نام نہ لیتے، بلکہ ان پر حج کے لیے بھی نہ جاتے، تاکہ ان مجاوروں کے سوا کوئی انھیں استعمال نہ کر سکے۔ بہرحال یہ ساری صورتیں گھڑی ہوئی تو ان کی اپنی تھیں مگر وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے اور باور کرواتے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

آیت 139 وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ ...... : یہ ایک اور شکل تھی کہ جو جانور وہ اپنے بتوں کے نام پر وقف کرتے، ان میں سے بعض کے بارے میں کہتے کہ ان کا دودھ اور ان کے پیٹ سے پیدا ہونے والا زندہ بچہ صرف ہمارے مردوں کے لیے حلال ہے، عورتوں کے لیے حرام ہے، ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہو تو پھر مرد اور عورت اس کے کھانے میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کی ان غلط بیانیوں پر عنقریب انھیں بدلہ دے گا اور اپنی کامل حکمت اور علم کے مطابق دے گا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

بے شک ان لوگوں نے خسارہ اٹھایا جنھوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے کچھ جانے بغیر قتل کیا اور اللہ نے انھیں جو کچھ دیا تھا اسے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے حرام ٹھہرا لیا۔ یقیناً وہ گمراہ ہو گئے اور ہدایت پانے والے نہ ہوئے ﴿۱۴۰﴾ اور وہی ہے جس نے باغات پیدا کیے چھپروں پر چڑھائے ہوئے اور نہ چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور کھیتی، جن کے پھل مختلف ہیں اور زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے۔ اس کے پھل میں سے کھاؤ، جب وہ پھل لائے اور اس کا حق اس کی کٹائی کے دن ادا کرو اور حد سے نہ گزرو، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا ﴿۱۴۱﴾

**آیت 140** قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ …… : فرمایا جن لوگوں نے یہ کام کیے انھوں نے دنیا اور آخرت میں خسارا اٹھایا، دنیا میں اپنی بے وقوفی اور جہالت سے اپنی اولاد کو قتل کرنے کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوئے اور اپنے اموال میں سے کچھ چیزوں کو خود ہی حرام قرار دے کر اپنے آپ کو تنگی اور مشکل میں ڈال لیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور بہتان باندھنے کی وجہ سے بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔

**آیت 141** ❶ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ …… : "مَّعْرُوْشٰتٍ" کا مادہ "عرش (ن، ض)" ہے۔ جب اس کا ذکر کسی پودے کی بیل کے ساتھ ہو تو اس کا معنی اس کی ٹہنیوں کو لکڑیوں وغیرہ پر اوپر اٹھانا ہے۔ "عَرَشَ الْكَرْمَ" یعنی اس نے انگور کی بیل کو لکڑی وغیرہ پر بلند کیا۔

❷ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ: اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے اس سورت کی آیت (۹۹) کا حاشیہ۔

❸ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زمین سے پیدا ہونے والی ہر کھیتی، پھل، سبزی اور درخت کا ذکر فرما کر حکم دیا ہے کہ کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو، اس لیے زمین سے پیدا ہونے والے ہر پھل اور کھیتی میں سے اللہ کا حق ادا کرنا ضروری ہے، خواہ وہ "مَعْرُوْشٰتٍ" ہوں، یعنی جن کی بیلیں چھتوں پر چڑھائی جاتی ہیں، مثلاً انگور، توری وغیرہ، یا ایسے باغات ہوں جن کی بیلیں زمین پر پھیلتی ہیں، مثلاً خربوزہ، تربوز، گرما وغیرہ، یا ایسے پھل دار درخت ہوں جو اپنے تنے پر قائم ہوں، مثلاً کھجور، زیتون اور انار وغیرہ، یا کوئی بھی کھیتی ہو، زمین سے پیدا ہونے والے ہر پھل اور کھیتی میں سے اللہ تعالیٰ کا حق نکالنا فرض ہے اور مال میں اللہ

وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

اور چوپاؤں میں سے کچھ بوجھ اٹھانے والے اور کچھ زمین سے لگے ہوئے (پیدا کیے)۔ کھاؤ اس میں سے جو اللہ نے تمھیں رزق دیا اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿۱۴۲﴾

کا سب سے بڑا حق زکوٰۃ وعشر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق بارش، چشموں اور نہروں سے سیراب ہونے والی ہر فصل میں عشر، یعنی دس من میں سے ایک من اور پانی کھینچ کر سیراب کی جانے والی ہر فصل میں نصف العشر، یعنی بیس من میں سے ایک من ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے کسی فصل کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ مفصل احکام کتب احادیث میں ملاحظہ فرمائیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ سبزیوں میں اور ان پھلوں میں عشر نہیں ہے جن کا ذخیرہ نہ ہو سکتا ہو، مثلاً مالٹا، انار وغیرہ، دلیل کے طور پر ترمذی کی حدیث بیان کرتے ہیں کہ سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے، مگر خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور نہ اس مطلب کی کوئی اور حدیث نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ اس آیت میں ہر کھیتی، زیتون اور انار کا ذکر ہے، حالانکہ انار کا ذخیرہ نہیں ہوتا۔ دورِ رسالت کے عمل کو دیکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت ایسی چیزوں کے عشر لینے کا اہتمام کرے جن کا ذخیرہ کر سکے، باقی باغوں اور کھیتوں والے اللہ کا حق خود مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ فتاویٰ علمائے حدیث کی ساتویں جلد میں متعدد جلیل القدر علماء کے مقالات میں ہر پھل اور کھیتی میں سے عشر کی بات نہایت مفصل اور مدلل بیان کی گئی ہے۔

❹ "وَلَا تُسْرِفُوْا" سے مراد ناجائز جگہ خرچ کرنا بھی ہے اور اعتدال سے بڑھ کر خرچ کرنا بھی، اسی طرح کھانے میں زیادتی بھی منع ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ﴾ [ الأعراف : ۳۱ ] "اور کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ گزرو۔" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق یہ آخری معنی یہاں زیادہ موزوں ہے، اس لیے بھی کہ یہ جسم اور عقل دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اتنا صدقہ کرنا بھی اسراف ہے کہ اس کے بعد آدمی خود محتاج ہو کر مانگنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ حکم حکمرانوں کے لیے بھی ہے کہ جتنا کسی کے ذمے بنتا ہے اس سے زیادہ وصول نہ کریں۔

**آیت 142** وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا......: "حَمُوْلَةً" جن پر بوجھ لادا جاتا ہے، مثلاً اونٹ اور بیل اور "فَرْشًا" سے مراد زمین سے لگے ہوئے، جیسے بھیڑ اور بکری۔ (موضح) جیسا کہ اگلی آیات میں ان کی تصریح ہے۔ بیل کی پشت پر اگرچہ بوجھ نہیں لادا جاتا مگر وہ بہت بھاری بوجھ کھینچ کر لے جاتے ہیں، اسے بھی بوجھ لادنا کہہ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کھیت اور چوپائے جو تمھیں عطا کیے ہیں تمھارے لیے حلال ہیں، انھیں کھاؤ اور شیطان کی پیروی مت کرو، جس کے بہکانے پر جاہل مشرکوں نے ان میں سے کئی قسموں کو حرام کر رکھا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۙ﴿۱۴۳﴾ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

آٹھ قسمیں، بھیڑ میں سے دو اور بکری میں سے دو۔ کہہ کیا اس نے دونوں نر حرام کیے یا دونوں مادہ؟ یا وہ (بچہ) جس پر دونوں ماداؤں کے رحم لپٹے ہوئے ہیں؟ مجھے کسی علم کے ساتھ بتاؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۱۴۳﴾ اور اونٹوں میں سے دو اور گائیوں میں سے دو، کہہ کیا اس نے دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ؟ یا وہ (بچہ) جس پر دونوں ماداؤں کے رحم لپٹے ہوئے ہیں؟ یا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے تمھیں اس کی وصیت کی تھی؟ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، تاکہ لوگوں کو کسی علم کے بغیر گمراہ کرے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۴۴﴾

آیت 144،143 ① ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ: یہ آیت (۱۴۱) میں "اَنْشَاَ" کا مفعول بہ ہے۔ "اَزْوَاجٍ" "زَوْجٌ" کی جمع ہے۔ عربی میں جوڑے کے دو افراد میں سے ہر ایک کو زوج کہتے ہیں، نر ہو یا مادہ۔ اس لیے زوجین کا معنی (نر اور مادہ دو قسمیں) ایک جوڑا ہو گا نہ کہ دو جوڑے۔ اسی کے مطابق ترجمہ آٹھ قسمیں کیا گیا ہے۔

② قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ ...... : جب مشرکین نے اونٹوں، گائیوں اور بھیڑ بکریوں میں سے بعض مخصوص جانوروں کو حرام اور ان کے پیٹ کے بچوں میں سے زندہ بچوں کو عورتوں کے لیے حرام اور مردہ کو سب کے لیے حلال قرار دیا تو اللہ تعالیٰ اب ان سے اس کی دلیل کا مطالبہ فرما رہے ہیں کہ اگر وہ دلیل عقلی ہے تو بتاؤ کہ حرام ہونے کی وجہ ان دونوں کا نر ہونا ہے، اگر یہ وجہ ہے تو پھر ان میں سے کئی نر تم کیوں کھاتے ہو؟ یا مادہ ہونا ہے تو پھر تم ان میں سے کئی مادہ جانور حلال کیوں سمجھتے ہو؟ یا پیٹ کا بچہ ہونا ہے تو تم کئی پیٹ کے بچے خود کیوں کھاتے ہو اور اگر دلیل نقلی ہے تو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم لاؤ جس میں اس نے ان جانوروں کے کسی نر یا مادہ یا رحم میں موجود بچے کو تمھارے کہنے کے مطابق حلال یا حرام کہا ہو، یا تم خود اس وقت موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے حلال یا حرام کرنے کا یہ حکم جاری فرمایا؟ پھر بتاؤ اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے نہ خود سنا، نہ کسی رسول کے واسطے سے سنا بلکہ اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نے عمرو بن لحی کو جہنم میں اپنی انتڑیاں کھینچتے ہوئے دیکھا، سب سے پہلے بتوں کے نام پر جانور (بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی) اسی نے چھوڑے تھے۔''
[ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ...... ﴾ : ٤٦٢٣ ]

مقصود مشرکین کے خود ساختہ حرام کیے ہوئے جانوروں کی حرمت کی تردید ہے کہ بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کو انھوں

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کہہ دے میں اس وحی میں، جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کہ بے شک وہ گندگی ہے، یا نافرمانی (کا باعث) ہو، جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو بے شک تیرا رب بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴۵﴾

نے اپنی طرف سے حرام کر رکھا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے یہ جانور حلال کیے ہیں۔

③ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ: ہرن بکری کی جنس میں داخل ہے اور بھینس، نیل گائے اور گورخر (جنگلی گدھا) یہ گائے اور بیل کی جنس ہیں۔ یہ جانور عرب میں اتنے نہیں ہوتے۔ چوپاؤں کی مشہور چار قسمیں وہی ہیں جو یہاں مذکور ہیں۔

**آیت 145** ① قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ ...... : مردہ سے مراد ہر وہ حلال جانور ہے جو بغیر ذبح کیے طبعی طور پر یا حادثے سے (جس کی تفصیل مائدہ کی آیت ۳ میں ہے) مر جائے یا شرعی طریقے کے خلاف ذبح کیا گیا ہو، مثلاً جان بوجھ کر تیز دھار آلے کی ایک ہی ضرب سے گردن جدا کر دی جائے، یا سخت گرم پانی میں ڈبو کر مار دیا جائے، یا کرنٹ وغیرہ کے ذریعے سے، غرض شرعی ذبیحہ یا شکار کے علاوہ سب مردار ہیں اور حرام ہیں۔ خون جو بہایا جائے، زندہ کا یا ذبیحہ کا، حرام ہے، البتہ جسم کے ساتھ لگا رہ جانے والا خون یا کلیجی اور تلی، بہایا ہوا خون نہ ہونے کی وجہ سے حلال ہیں۔ خنزیر کا گوشت کہ وہ گندگی ہے، یعنی صحت کے لحاظ سے بے شمار بیماریوں کا باعث ہونے اور بے غیرتی میں بدترین جانور ہونے کی وجہ سے کھانے والوں میں اس کی تاثیر کی بنا پر معنوی طور پر سراسر گندگی ہے۔ "اَوْ فِسْقًا" اس کا عطف "لَحْمَ خِنْزِيْرٍ" پر ہے، یعنی یہ بھی اسی طرح حرام ہے۔ "فِسْقًا" کا معنی اللہ کی فرماں برداری سے نکل جانا ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے، اس لیے وہ جانور جس پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے، حرام ہے۔ "اُهِلَّ" کا معنی آواز بلند کرنا ہے، کسی جانور پر اگر کسی غیر اللہ کا نام مشہور کر دیا جائے کہ یہ داتا کا بکرا ہے، یا بری امام کی گائے ہے، یا فلاں پیر یا امام کی نذر و نیاز ہے، اس سے مقصود چونکہ غیر اللہ کو راضی کرنا ہے کہ وہ راضی ہو کر ہمارے کام سنوار دیں گے، اس لیے ایسے جانور کو ان کی رضا کے لیے ذبح کرتے وقت اس پر "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھی جائے تو بھی حرام ہے، کیونکہ اعتبار نیت کا ہے اور نیت کا اظہار خود ان کی زبانی ہو چکا ہے اور عرس اور قبر کا ماحول بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور ان لوگوں پر جو یہودی بن گئے، ہم نے ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا اور گائیوں اور بھیڑ بکریوں میں سے ہم نے ان پر دونوں کی چربیاں حرام کر دیں، سوائے اس کے جو ان کی پشتیں یا انتڑیاں اٹھائے ہوئے ہوں، یا جو کسی ہڈی کے ساتھ ملی ہو۔ یہ ہم نے انھیں ان کی سرکشی کی جزا دی اور بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں ﴿۱۴۶﴾

② فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ...... : یعنی جو شخص مجبوری کی بنا پر ان حرام چیزوں کو کھا لے بشرطیکہ نہ انھیں حلال سمجھے اور نہ ضرورت سے آگے بڑھے تو تیرا رب نہایت بخشنے والا بے حد رحم والا ہے۔ سورۂ بقرہ میں صراحت ہے: ﴿ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [ البقرة : ۱۷۳ ] ''اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

③ اس آیت پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ حرام چیزیں تو ان کے علاوہ بھی ہیں، پھر یہ فرمانے کا کیا مطلب کہ میں اپنی طرف کی ہوئی وحی میں ان کے علاوہ کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا؟ اس کا جواب سورۂ بقرہ کی آیت (۱۷۳) کی تفسیر میں گزر چکا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دراصل اس زمانے کے مشرکین کے لحاظ سے بات ہو رہی ہے کہ انھوں نے بحیرہ، سائبہ وغیرہ کو حرام کر رکھا تھا اور مذکورہ بالا چاروں چیزیں وہ حلال سمجھتے اور کھاتے تھے، اس لیے فرمایا کہ میری وحی میں تو تمھاری حرام کردہ چیزیں حرام نہیں، صرف یہ چار چیزیں، جو تم بے دریغ کھاتے ہو، حرام ہیں۔ دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ ان آیات کے اترنے تک یہی چیزیں حرام تھیں، بعد میں رسول اللہ ﷺ نے مزید کئی چیزیں حرام فرمائیں، جیسے قرآن مجید میں وہ رشتے مذکور ہیں جن سے نکاح حرام ہے، باقی سب کو حلال فرمایا، مگر رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں ان دو عورتوں کو جو آپس میں خالہ اور بھانجی یا پھوپھی اور بھتیجی ہوں، ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح نبی ﷺ سے صحیح احادیث میں مزید کئی جانوروں کو حرام قرار دینا ثابت ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۳) کے حواشی۔

**آیت 146** ① وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ...... : ہر ناخن والے جانور سے مراد وہ جانور یا پرندہ ہے جس کی انگلیاں پھٹی ہوئی، یعنی الگ الگ نہ ہوں، مثلاً اونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ، یعنی صرف وہ پرندے یا جانور حلال تھے جن کے پنجے کھلے ہوں۔

② اَوِ الْحَوَايَآ : یہ ''حَوِيَّةٌ'' کی جمع ہے، جیسے ''عَطِيَّةٌ'' کی جمع ''عَطَايَا'' اور ''خَطِيَّةٌ'' کی جمع ''خَطَايَا'' ہے، یا یہ ''حَاوِيَةٌ'' کی جمع ہے، جیسے ''ضَارِبَةٌ'' کی جمع ''ضَوَارِبُ'' مطلب وہ انتڑیاں جن میں مینگنیاں ہوتی ہیں۔

③ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ: یعنی یہ چیزیں جس طرح اب شریعت محمدی ﷺ میں حرام نہیں ہیں، اس سے

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾

پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے تمھارا رب وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا ﴿۱۴۷﴾ عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو، تم تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے اور تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہو ﴿۱۴۸﴾

---

پہلے بھی حرام نہ تھیں، البتہ یہودیوں کو ان کی سرکشی کی سزا دینے کے لیے ہم نے انھیں وقتی طور پر حرام کر دیا تھا۔ (دیکھیے نساء: ۱۶۰) مقصد یہودیوں کے اس دعوے کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کوئی چیز حرام نہیں کی، سوائے ان چیزوں کے جو اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے خود اپنے آپ پر حرام کر لی تھیں۔ (قرطبی، ابن کثیر) اور "اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ" (بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ دعویٰ غلط ہے اور صحیح بات وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے، نیز دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۳)۔

مگر یہودیوں نے حیلے سے چربی کی ایک صورت حلال کر ہی لی۔ جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ کے سال مکہ میں سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ یہود کو برباد کرے، جب ان کے لیے چربیوں کو حرام کیا گیا تو انھوں نے انھیں پگھلایا اور پھر ان کی قیمت کھا گئے۔'' [ بخاری، البیوع، باب بیع المیتة والأصنام : ۲۲۳۶ ] یہ ایسے ہی ہے جیسے آج کل کئی مسلمان شراب خود نہیں پیتے اور خنزیر کا گوشت وغیرہ خود نہیں کھاتے، مگر کفار کے ہاتھوں بیچ کر قیمت کھا جاتے ہیں۔

**آیت 147** فَاِنْ كَذَّبُوْكَ ...... : یعنی اگر تم اب بھی نافرمانی کی روش چھوڑ کر حق کی سیدھی راہ اختیار کر لو تو اپنے رب کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے کھلا پاؤ گے، لیکن اگر اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو یہ مت سمجھو کہ اللہ کا عذاب تم پر سے ٹل گیا ہے، جب اس کا عذاب آتا ہے تو مجرموں اور سرکشوں کو کوئی چیز اس سے بچا نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ آیت کے پہلے حصے "ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ" میں ترغیب (شوق دلانا) ہے اور آخری حصہ "وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ" میں ترہیب (ڈرانا) ہے اور یہ قرآن کا خاص اندازِ نصیحت ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 148** ① سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ...... : یعنی جب وہ اپنے شرک اور مجرمانہ روش پر قائم رہنے کی دلیل نہیں پاتے تو تقدیر کا سہارا لے کر کہتے ہیں کہ ہمارے حق میں خود اللہ کی مرضی اور ارادہ یہ ہے کہ ہم شرک کریں اور جو چیزیں ہم نے

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا ﴿۱۴۹﴾

حرام ٹھہرائی ہیں انھیں حرام ٹھہرائیں، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوتی تو ہم سے یہ کام ہو ہی نہیں سکتے تھے، یہ دلیل ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ خوش ہے، لہٰذا یہ صحیح اور حق ہے۔ مطلب یہ کہ انھوں نے اللہ کی مشیت اور ارادے کو شرک کے اور بعض حلال چیزوں کو حرام ٹھہرا لینے کے صحیح اور حق ہونے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا، گویا ان کے کہنے کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کاموں پر خوش ہے اور انھیں پسند کرتا ہے اور وہ درست ہیں، حالانکہ یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ﴾ [ الزمر: ۷ ] ”اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرے گا۔“ یعنی کفر اور ناشکری اللہ کے ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتی مگر وہ نہ اس پر راضی ہے نہ اسے پسند کرتا ہے۔ مشیت و ارادہ اور رضا و محبت ایک دوسرے کو لازم نہیں، دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے تحت ہو رہا ہے لیکن وہ ہر چیز پر راضی نہیں ہے، رضا اس کی شریعت کی پابندی کا نام ہے اور ارادہ و مشیت اس کی تکوین ہے یعنی اس کا کائنات کو چلانے کا نظام ہے۔ تکوینی طور پر وہ کیا چاہتا ہے اسے کوئی نہیں جانتا اور نہ جان سکتا ہے، تشریعی طور پر وہ کس چیز کو پسند کرتا ہے یہ بتانے کے لیے اس نے پیغمبر بھیجے اور ہر شخص اسے جان سکتا ہے، اس لیے ہم شریعت پر عمل کے پابند ہیں۔

② كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی درحقیقت یہ بات کہنا اور اللہ کی تقدیر اور مشیت کو اس کے خوش ہونے کی دلیل قرار دینا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی تکذیب (جھٹلانا) ہے۔ ان سے پہلے لوگ بھی اسی بہانے کو بنیاد بنا کر رسولوں کو جھٹلاتے آئے ہیں۔

③ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا : یعنی ان کا یہ عذر قطعی غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو ان سے پہلے لوگوں پر ان کے جرائم اور تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنا عذاب کیوں نازل کرتا؟ (ابن کثیر)

④ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ ...... : یعنی تم جو یہ عذر پیش کر رہے ہو وہ کسی عقلی یا علمی بنیاد پر قائم نہیں ہے، اگر تمھارے پاس علم کی کوئی بات ہے تو لاؤ اور پیش کرو۔ کبھی دنیا کی کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے بھی تم نے تقدیر کو بہانہ بنا کر جدوجہد کو ترک کیا ہے، یا اللہ تعالیٰ نے تمھیں پہلے بتا دیا ہے کہ میں نے آئندہ اس طرح کرنا ہے۔ جب تمھیں معلوم ہی نہیں کہ تقدیر میں کیا ہے تو یہ بہانہ یا شبہ محض تمھارا وہم و گمان ہے اور تم لوگ صرف اٹکل لگا کر اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ رہے ہو، جب کہ حقیقت کی دنیا میں وہم و گمان کی کچھ حیثیت نہیں۔ دیکھیے سورۂ نجم (۲۳ اور ۲۸)۔

**آیت 149** ① قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ...... : آپ ان سے کہہ دیں کہ پھر کامل دلیل تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے جو واقع کے عین مطابق ہے کہ اس کی مشیت، ارادہ اور اختیار الگ چیز ہے اور کسی کام پر راضی اور خوش ہونا الگ چیز ہے اور اس میں

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۞١٥٠ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا

کہہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو شہادت دیں کہ واقعی اللہ نے یہ چیزیں حرام کی ہیں، پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تو ان کے ساتھ شہادت مت دے اور ان لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے مت چل جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں ۱۵۰ کہہ دے آؤ میں پڑھوں جو تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، (اس نے تاکیدی حکم دیا ہے) کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ خوب احسان

اس کی حکمت ہے کہ اس نے تمھیں ہدایت اور گمراہی کا اختیار دے کر آزمایا ہے، اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا، پھر کوئی گمراہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، مگر یہ جبر ہوتا، جو اس کی حکمت کا تقاضا نہیں ہے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۱۱۸، ۱۱۹) اور یونس (۹۹)۔

**آیت 150** ① **فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ:** کیونکہ جو بھی یہ گواہی دے گا وہ کبھی سچا نہیں ہوسکتا۔

② **وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ:** یعنی وہ مخلوق کو رب کے برابر ٹھہرا کر شرک جیسے ظلم عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں، خواہ کسی طرح برابر ٹھہرائیں، حالانکہ رب تعالیٰ کے ساتھ کسی کی برابری ہو ہی نہیں سکتی، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ علم میں، نہ حقوق و اختیار میں اور نہ کسی اور چیز میں، تو پھر ایسے جاہلوں کی خواہشات کی پیروی آپ کیوں اختیار کریں؟ دیکھیے سورۂ رعد (۱۶) اور سورۂ شعراء (۹۱ تا ۹۸)۔

**آیت 151** ① **قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ:** اب اللہ تعالیٰ تفصیل سے بیان فرماتے ہیں کہ حرام وہ نہیں جو تم نے اپنی مرضی سے حرام بنا لیا، بلکہ وہ ہے جو تمھیں پیدا کرنے والے اور ہر لمحے پالنے والے نے تم پر حرام کیا ہے، آؤ! میں خود وہ تم سے بیان کرتا ہوں۔ یہ دس احکام ہیں جو اسلام کا خلاصہ ہیں۔

② **اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا:** یہاں بیان تو وہ چیزیں کرنی تھیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمائی ہیں، مگر بیان وہ چیزیں کی ہیں جن کا نہایت تاکید کے ساتھ حکم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حرام کرنے سے تمھارے لیے جو حکم تاکید کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ گویا یہ مفہوم "حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" کے ضمن ہی میں شامل ہے کہ یہاں "وَصَّاكُمْ بِهٖ" محذوف ہے، یعنی اس نے تمھیں تاکیداً حکم دیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اس کی دلیل یہاں مذکور تینوں آیات کے آخری الفاظ ہیں: ﴿ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ﴾ یعنی یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے۔ اگر مراد ہوتا کہ یہ چیزیں حرام کی ہیں تو آخر میں یہ الفاظ ہونے چاہییں تھے: " ذٰلِكُمْ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ " یعنی یہ ہیں وہ چیزیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا تاکیدی حکم یہ دیا کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، نہ کسی انسان کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی پہاڑ، پتھر، دریا یا درخت کو۔ غرض کوئی چیز کتنی بھی عظیم الشان ہو اسے اللہ کا کسی بھی چیز میں شریک مت بناؤ، کیونکہ سب اللہ

تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائیوں کے قریب نہ جاؤ، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۱۵۱﴾

کے پیدا کردہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کا شریک بناؤ، حالانکہ اس نے تمھیں پیدا کیا۔'' [ بخاری، التفسیر، باب قوله تعالٰی ﴿ فلا تجعلوا للّٰه اندادًا...... ﴾ ٤٤٧٧ ]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے جسے چاہے گا۔'' [ النساء : ١١٦ ] اور اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کا قول ذکر فرمایا کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی۔ [ المائدة : ٧٢ ]

③ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا : ''اِحْسَانًا'' فعل محذوف ''اَحْسِنُوْا'' کا مفعول مطلق ہے جس سے مقصود تاکید ہے، اس لیے ترجمہ ''خوب احسان کرو'' کیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور شرک سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی بھی تاکید کی گئی ہے، کیونکہ والدین کو اللہ تعالیٰ نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر ولادت کا اور دلی محبت کے ساتھ پالنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد بندوں کے حقوق میں سے سب سے مقدم حق انسان پر اس کے والدین کا ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۲۳) اور سورۂ لقمان (۱۴، ۱۵)۔

④ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ...... : پیدا ہو چکنے کے بعد یا جب وہ ماؤں کے پیٹ میں ہوں، مثلاً کوئی دوا کھلا کر قبل از وقت حمل گرا دینا۔ سورۂ بنی اسرائیل (۳۱) میں بھی یہی حکم دیا گیا ہے، مگر یہاں اور وہاں دو فرق ہیں، یہاں ''مِنْ اِمْلَاقٍ'' (مفلسی کی وجہ سے) ہے اور وہاں ''خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ'' (مفلسی کے ڈر سے) ہے۔ اسی طرح یہاں ''نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ'' (ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی) ہے اور وہاں ''نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ'' (ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی) ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقام پر ان لوگوں کی بات ہے جو مفلسی میں گرفتار ہیں۔ فرمایا کہ اس مفلسی میں انھیں قتل مت کرو، ہم مفلسی کے باوجود تمھیں جو روزی دیتے ہیں انھیں بھی دیں گے، جبکہ بنی اسرائیل میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مفلسی میں مبتلا تو نہیں مگر بچوں کے پیدا ہونے پر مفلسی سے ڈر رہے ہیں، فرمایا کہ ڈرو نہیں ہم انھیں بھی روزی دیں گے، تمھیں بھی تو دے رہے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمھارا یہ سمجھنا کہ روزی کے مالک تم خود ہو، بالکل غلط ہے، یہ ہمارا کام اور ہمارا ذمہ ہے۔ (دیکھیے ہود: ٦) کفار کا تو کہنا ہی کیا ہے، اس وقت مسلم حکومتیں اسی بہانے سے ضبطِ ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر منظم طریقے سے قتل اولاد کا جرم کر رہی ہیں کہ ہمارے پاس وسائل کم ہیں، ہم زیادہ آبادی کی خوراک کا بندوبست نہیں کر

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ ہم کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق اور جب بات کرو تو انصاف کرو خواہ رشتہ دار ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۱۵۲﴾

سکتے، حالانکہ یہ کفر کا کلمہ ہے۔ خوراک کا بندوبست تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، بلکہ ان حکمرانوں کا تمام عیش ان مفلسوں کی محنت ہی کا نتیجہ ہے، جن کی خوراک کے وہ ذمہ دار بن رہے ہیں۔ ہر بچے کو اللہ تعالیٰ کھانے کے لیے ایک منہ اور کمانے کے لیے دو ہاتھ دے کر بھیجتا ہے اور جیسے جیسے آبادی بڑھتی ہے زمین کے خزانوں کے منہ کھلتے جا رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجر (۱۹ تا ۲۲)۔

⑤ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ...... : "اَلْفَاحِشَةُ"، "اَلْفَحْشَاءُ" اور "اَلْفُحْشُ" کا معنی ہے ہر وہ قول یا فعل جو قباحت میں بہت بڑھا ہوا ہو، مثلاً زنا، شدید بخل وغیرہ۔ (راغب) اس لیے اس کا ترجمہ بے حیائی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہر کام کو خواہ ظاہر ہو، جیسے سب کے سامنے زنا یا قوم لوط کی حرکتیں کرنا، یا پوشیدہ، مثلاً چھپ کر زنا اور چوری وغیرہ کرنا، انھیں حرام قرار دیا۔ اس مقام پر ایسے ہر کام کے قریب جانے کو بھی حرام قرار دیا، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل (۳۲) میں زنا کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا، کیونکہ قریب جانا ہی گناہ کے ارتکاب کا باعث بنتا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی غیرت والا نہیں، اسی لیے اس نے بے حیائی کی ظاہر اور پوشیدہ تمام شکلوں کو حرام قرار دیا ہے۔"

[ بخاري، التفسير، باب قوله تعالٰى : ﴿ ولا تقربوا الفواحش ...... ﴾ : ٤٦٣٤ ]

⑥ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ...... : عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی مسلمان کا خون، جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، تین صورتوں کے سوا کسی بھی صورت میں حلال نہیں: ① جان کے بدلے جان۔ ② شادی شدہ زانی۔ ③ اور دین سے جدا ہو کر (مسلمانوں کی) جماعت کو ترک کر دینے والا۔" [ بخاري، الديات، باب قول الله تعالٰى : ﴿ إن النفس بالنفس والعين بالعين ﴾ : ٦٨٧٨ ] یا ان تینوں کے علاوہ جس کے قتل کرنے کا واضح حکم قرآن یا حدیث میں موجود ہو، مثلاً محارب (ڈاکو، باغی) یا محرم سے نکاح کرنے والا، انھیں قتل کرنا ناحق نہیں بلکہ حق ہے۔

⑦ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سمجھو، عقل کرو، کیونکہ یہ ایسے کام ہیں کہ ان کا ارتکاب عقل کی خست کی دلیل ہے اور ان کاموں کی قباحت عقل بھی محسوس کرتی ہے، نصیحت اس لیے ہے کہ تم عقل کے تقاضے کے مطابق چلو۔

آیت 152 ① وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ...... : "سب سے اچھے طریقے" میں یتیم کے مال کی حفاظت کرنا، اسے

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۱۵۳﴾

بڑھانے کے متعلق سوچنا، یتیموں کی بہتری کے سوا اسے خرچ کرنے سے بچنا وغیرہ سب شامل ہیں۔ "حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ" میں جوانی کے ساتھ سمجھ داری بھی شامل ہے کہ اس میں معاملات کو خود نپٹانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۶)۔

② **وَاَوْفُوا الْكَيْلَ......** : اس میں انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیتے وقت ماپ تول میں کمی نہ کرنا اور لیتے وقت زیادہ نہ لینا دونوں شامل ہیں۔ دیکھیے سورۂ مطففین (۱ تا ۳)، سورۂ رحمٰن (۹) اور سورۂ بنی اسرائیل (۳۵)۔

③ **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** : یعنی اگر پورا تولنے اور ماپنے کی کوشش کرے مگر بھول چوک کی وجہ سے غلطی کر بیٹھے تو اس سے باز پرس نہیں ہو گی۔ "اِلَّا وُسْعَهَا" کا یہی مطلب ہے۔

④ **وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا......** : جب بات کرو، خواہ فیصلہ کر رہے ہو یا حکم دے رہے ہو یا شہادت دے رہے ہو، تو ہر حال میں عدل و انصاف سے کام لو، کوئی رشتہ داری یا قرابت یا دوستی انصاف میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۵) اور سورۂ مائدہ (۸)۔

⑤ **وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا** : یعنی تم نے اسلام قبول کر کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا جو عہد کیا ہے وہ پورا کرو۔ اس سے مراد قرآن و سنت کے تمام احکام پر عمل کرنا ہے۔ لوگوں سے کیے ہوئے عہد پورا کرنے کا بھی اللہ نے حکم دیا ہے۔

⑥ **لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ** : اس آیت میں مذکور چیزیں ایسی ہیں جو معاشرے میں معروف ہیں، ان کی تاکید اس لیے کی ہے کہ تمھیں یاد آ جائے اور تمھیں نصیحت ہو جائے۔ "ذِكْرٌ" کا معنی "یاد" اور "نصیحت" دونوں ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( فَإِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِيْ )) [ بخاری، الصلوة، باب التوجه نحو القبلة حيث كان : ۴۰۱ ] "جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کروا دو۔"

**آیت 153** ① **وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا......** : یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ ایک ہی ہے اور وہی سیدھی اور جنت تک پہنچانے والی ہے، مگر شیطان نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اس کے اردگرد بہت سی راہیں بنا ڈالی ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمارے لیے ایک لکیر کھینچی، پھر فرمایا: "یہ اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ ہے۔" پھر اس کے دائیں بائیں کئی لکیریں کھینچیں اور فرمایا: "یہ الگ الگ راستے ہیں، ان میں سے ہر راہ پر ایک شیطان بیٹھا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔" اس کے بعد آپ نے سیدھی راہ پر ہاتھ رکھا اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [ أحمد : ۱/۴۶۵، ح : ۴۴۳۶۔ مستدرك حاكم : ۲/۳۱۸، ح : ۳۲۴۱ ]

تمام دینوں میں سے صراط مستقیم صرف اسلام ہے، باقی سب باطل ہیں، اس آیت میں جس طرح تمام باطل دینوں سے منع

ثُمَّ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيۡۤ اَحۡسَنَ وَتَفۡصِيۡلًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً لَّعَلَّهُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّهِمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوۡهُ وَاتَّقُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اُنۡزِلَ الۡكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيۡنِ مِنۡ قَبۡلِنَا وَاِنۡ كُنَّا عَنۡ دِرَاسَتِهِمۡ لَغٰفِلِيۡنَ ﴿۱۵۶﴾

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس شخص پر (نعمت) پوری کرنے کے لیے جس نے نیکی کی اور ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت کے لیے، تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لے آئیں ﴿۱۵۴﴾ اور یہ عظیم کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی برکت والی، پس اس کی پیروی کرو اور بچ جاؤ، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۵۵﴾ ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب تو صرف ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور بے شک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے یقیناً بے خبر تھے ﴿۱۵۶﴾

فرمایا گیا ہے اسی طرح اسلام میں بھی فرقے بنانے سے روک دیا گیا ہے۔ اسلام میں سیدھی راہ صرف کتاب و سنت کی راہ ہے، جس پر وہ پہلے تین زمانے گزرے ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے "خیر الناس" قرار دیا ہے۔ [ بخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب فضائل أصحاب النبی ﷺ ...... : ۳۶۵۱ ] اس کے سوا سب راستے ممنوع ٹھہرے، خواہ وہ مذاہب اربعہ کی تقلید ہو یا اہل بدعت کے بنائے ہوئے اور طریقے ہوں، کیونکہ یہ شروع ہی بعد میں ہوئے ہیں۔ پرانی اور نئی ہر قسم کی بدعات گمراہ کن ہیں، خود ائمۂ دین اور سارے مجتہدینِ سلف و خلف نے یہی وصیت کی ہے کہ کوئی ان کی تقلید نہ کرے، بلکہ سب کے سب کتاب و سنت کا اتباع کریں، یہی صراط مستقیم ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے دعوت دی ہے۔

② لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ: تاکہ تم اللہ کی نافرمانی، اس کے عذاب اور جہنم سے بچ جاؤ، کیونکہ مختلف راستوں سے بچ کر اس کے سیدھے راستے پر چلنے کے سوا بچنے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے تقویٰ کی راہ یہی ہے۔

آیت 154 ① ثُمَّ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ: "پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی" میں "پھر" کا لفظ زمانے کی ترتیب کے لیے نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بعد میں ملی، بلکہ بعد میں ذکر کی وجہ سے ہے، اسے ترتیب ذکری کہتے ہیں، مثلاً دیکھیے سورۂ بلد کی آیت (۱۷)۔ متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور تورات کا ذکر اکٹھا کیا ہے۔ (ابن کثیر)

② تَمَامًا عَلَى الَّذِيۡۤ اَحۡسَنَ...... : "تَمَامًا" یہاں "اِتۡمَامًا" (پورا کرنے) کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے تورات ہر اس شخص پر نعمت پوری کرنے کے لیے جو نیکی کرے اور ہر چیز کی تفصیل، رہنمائی اور رحمت کے لیے نازل فرمائی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یعنی بنی اسرائیل اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔

آیت 155 وَهٰذَا كِتٰبٌ ...... : اس سے مراد قرآن مجید ہے۔

آیت 156 اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اُنۡزِلَ...... : تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہماری طرف تو کوئی کتاب آئی ہی نہیں، کتاب تو صرف

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ

یا یہ کہو کہ اگر واقعی ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت والے ہوتے۔ پس بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت آ چکی، پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے کنارا کرے۔ عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے کنارا کرتے ہیں، برے عذاب کی جزا دیں گے، اس کے بدلے جو وہ کنارا کرتے تھے ﴿۱۵۷﴾ وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے

ہم سے پہلے دو گروہوں یہود و نصاریٰ پر اتری اور وہ صرف ان کے لیے تھی اور انھوں نے ہمیں دعوت بھی نہیں دی کہ ہم ان سے پڑھ کر ایمان لے آتے، بلکہ وہ اسے بنی اسرائیل ہی کے لیے قرار دیتے رہے، ہم بھی اسے ان کے ساتھ مخصوص سمجھ کر اور کچھ اپنی غفلت کی وجہ سے اسے پڑھنے سے بے خبر رہے، ورنہ زبان نہ جاننا تو کوئی معقول عذر نہیں کیونکہ جب معلوم ہو جائے کہ اللہ کا حکم آیا ہے تو آدمی کسی سے سمجھ بھی سکتا ہے۔

**آیت 157** ❶ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ……: یعنی یہ عذر بھی نہ کر سکو۔ "بَيِّنَةٌ" (روشن دلیل) سے مراد قرآن مجید ہے، جو صرف ہدایت اور رحمت ہی نہیں بلکہ اپنے سچے ہونے کی واضح اور روشن دلیل بھی ہے اور جو صرف عربوں ہی کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے تمام لوگوں اور تمام اقوام کے لیے ہے اور وہ کسی سے عربی پڑھ کر اللہ کے احکام معلوم کر سکتے ہیں، جیسا کہ اللہ کے فضل سے تمام اقوام میں اسلام پھیل چکا ہے۔

❷ صَدَفَ عَنْهَا: اس کے معنی کنارہ کرنے کے بھی ہیں اور دوسروں کو روکنے کے بھی۔ کفار خود بھی ایمان نہیں لاتے تھے اور دوسروں کو بھی روکتے تھے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۶، ۲۷)۔

**آیت 158** ❶ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: کفار پر اسلام کے حق ہونے کے دلائل تو پوری طرح واضح ہو چکے تھے، مگر وہ صرف لاجواب کرنے کے لیے ایسی چیزیں دکھانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے جن کا دنیا میں ہوتے ہوئے دکھایا جانا ممکن ہی نہیں، کیونکہ ان کے آنے کے بعد اپنے اختیار سے غیب پر ایمان کا موقع ہی باقی نہیں رہتا، نہ ان کے آنے کے بعد کسی کی مجال ہے کہ وہ ایمان نہ لائے، مگر اس وقت ایمان لانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ ان مطالبات کا قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں اکٹھے نو مطالبات پیش کیے گئے ہیں، جن میں نہایت گستاخانہ مطالبہ خود اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لانے کا تھا: ﴿ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴾ [ بنی إسرائيل : ۹۲ ] "یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔" سورۂ فرقان میں بھی یہ مطالبہ ذکر فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ

الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا

آئیں، یا تیرا رب آئے، یا تیرے رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی کسی شخص کو

اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ﴾ [ الفرقان : ۲۱ ] ''ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے، یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟'' اس مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان پر حجت تو پوری ہو چکی، یعنی : ﴿ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ ﴾ [ الأنعام : ۱۵۷ ] اب دلیل کی تو نہ انھیں ضرورت ہے نہ ان کا مطالبہ، اب اس کے سوا انھیں کیا انتظار ہے کہ ان کے پاس فرشتے آ جائیں، یا تیرا رب خود آئے، یا تیرے رب کی کوئی نشانی آ جائے۔ مگر فرشتے آئے تو موت یا عذاب لے کر آئیں گے، پھر ایمان کی مہلت کہاں؟ جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴾ [ الحجر : ۸ ] ''ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے۔'' اور اللہ تعالیٰ آئے گا تو قیامت کے دن فیصلے کے لیے فرشتوں کے ساتھ آئے گا: ﴿ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ [ الفجر: ۲۱، ۲۲ ] ''ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔'' پھر تو دنیا کا کام ہی تمام ہو جائے گا، فرمایا: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ﴾ [ البقرة : ۲۱۰ ] ''وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی اور کام تمام کر دیا جائے۔'' اور تیرے رب کی بعض نشانیوں سے مراد خاص نشانیاں ہیں، جن کی تفصیل آ رہی ہے۔

② بعض لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے آنے کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے آنے کا مطلب اس کے حکم کا یا عذاب کا آنا ہے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے زمین و آسمان کو پیدا فرما کر عرش پر بلند ہونے کے بھی منکر ہیں اور اس کے آسمان دنیا پر اترنے کے بھی، بلکہ عرش کو بھی نہیں مانتے۔ سورۂ حاقہ (۱۷) میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ کا عرش آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔ یہاں لاجواب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ متشابہات سے ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا آنا پھر بھی نہیں مانتے۔ اللہ کے بندو! تم نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سے بھی عاجز سمجھ لیا کہ تم اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہو جاؤ، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی مرضی سے آنا جانا ممکن ہی نہیں مانتے۔ یہ سب نتیجہ یونانی فلسفے اور ان کے خدا کے متعلق تصورات سے متاثر ہونے کا ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، ہر رات آسمانِ دنیا پر اترتا ہے، قیامت کے دن زمین پر آئے گا اور زمین اس کے نور سے روشن ہو جائے گی، مگر اس کا آنا مخلوق کی طرح نہیں، بلکہ اس طرح ہے جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔

③ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ: اس سے مراد صحیح احادیث کے مطابق قیامت کے قریب نمودار ہونے والی چند نشانیاں ہیں، جن میں سے سب سے پہلے ظاہر ہونے والی نشانی سورج کا مغرب کی طرف سے طلوع ہونا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہو گی یہاں تک کہ سورج اپنے مغرب سے طلوع ہو گا، جب اسے لوگ

اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝۱۵۸

اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔ کہہ دے انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) منتظر ہیں ۝۱۵۸

دیکھیں گے تو جو بھی زمین پر ہوں گے ایمان لے آئیں گے، تو یہ وہ وقت ہوگا جب کسی جان کو اس کا ایمان فائدہ نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لائی ہوگی۔'' [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا ینفع نفسا إیمانها ﴾ : ٤٦٣٥ ]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' تین نشانیاں جب نمودار ہوں گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال کا آنا اور زمین سے جانور کا نکلنا۔'' [ مسلم، الإیمان، باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیه الإیمان : ١٥٨ ]

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کی نشانیوں میں سے سب سے پہلے نکلنے والی نشانی مغرب سے سورج کا طلوع ہونا ہے اور زمین سے ایک جانور کا دوپہر کے وقت لوگوں کے سامنے نکلنا ہے۔ دونوں میں سے جو بھی پہلے ہوئی دوسری قریب ہی اس کے پیچھے ہوگی۔'' [ مسلم، الفتن، باب فی خروج الدجال و مکثه فی الأرض......: ٢٩٤١ ]

اس جانور کا ذکر سورۂ نمل (۸۲) میں بھی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مراد قیامت کی کوئی بھی بڑی نشانی ہے جس کے بعد اختیار ختم ہو جائے گا اور ایمان لانے اور توبہ کرنے کے بغیر چارہ ہی نہیں رہے گا، البتہ اکثر اہل ایمان کا رجحان مغرب سے سورج طلوع ہونے کی طرف ہے، جیسا کہ ہمارے استاد مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ نے صرف اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔

④ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ...... : طبری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ کسی کافر کو جو سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے ایمان نہ لایا ہو، اس کے طلوع ہونے کے بعد اس کا ایمان لانا اسے کوئی نفع نہیں دے گا اور کسی مومن کو بھی، جس نے طلوع سے پہلے نیک عمل نہ کیا ہوگا طلوع کے بعد وہ اسے نفع نہیں دے گا، کیونکہ اس وقت ایمان اور عمل کا حکم اس شخص کے ایمان و عمل جیسا ہے جو موت کے غرغرہ کے وقت ایمان لائے یا عمل کرے، جبکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ﴾ [ المؤمن : ٨٥ ] ''پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔'' اور جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک اس کا غرغرہ (موت کے وقت گلا بولنا) شروع نہ ہو۔ (ترمذی: ۳۵۳۷) اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب کافر اس دن ایمان لائے گا تو اس سے قبول نہیں ہوگا لیکن جو اس سے پہلے مومن ہوگا تو اگر اپنے عمل میں درست ہوگا تو وہ بہت بڑی بھلائی پر ہوگا اور اگر درست نہیں ہوگا اور اس وقت توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور یہی مطلب ہوگا ﴿ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ﴾ کا، یعنی اس کا نیک عمل اس وقت قبول نہیں ہوگا جب وہ اس سے پہلے اسے کرنے والا نہ ہوگا۔

⑤ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ: یہ ایمان لانے اور نافرمانی ترک کرنے میں دیر کرنے والوں کے لیے شدید دھمکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر لیا اور کئی گروہ بن گئے، تو کسی چیز میں بھی ان سے نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہ انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۵۹﴾

دیکھیے سورۂ محمد (۱۸) اور سورۂ مومن (۸۴، ۸۵)۔

آیت 159 اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ ......: یعنی اصل دین شروع سے ایک ہی ہے جس کی بنیاد اللہ کی توحید، یوم آخرت اور انبیاء پر ایمان اور ان کی اطاعت پر ہے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۵۲، ۵۳)، سورۂ یونس (۱۹)، سورۂ انعام (۱۵۳) اور سورۂ بقرہ (۲۱۳) اپنے اپنے زمانے کے مطابق احکام میں کچھ فرق ہو سکتا ہے مگر اصل سب کا ایک اسلام ہی ہے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد پر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ہر شخص کے لیے آپ پر ایمان لانا اور آپ کے طریقے پر چلنا لازم قرار دے دیا۔ اب جو شخص بھی اپنا کوئی جدا راستہ اختیار کر کے الگ گروہ بنائے، خواہ وہ دہریہ ہو یا مشرک یا یہودی یا نصرانی، اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ ان سے بری ہیں اور آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح آپ کی امت میں سے اسلام قبول کرنے کے بعد جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے احکام، یعنی قرآن و سنت کے علاوہ کوئی نیا طریقہ یعنی بدعت اختیار کر کے اپنا الگ گروہ بنا لیں، آپ ان سے بری ہیں، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہود ۷۱ یا ۷۲ فرقوں میں اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں جدا جدا ہو گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔'' [ أبو داوٗد، السنة، باب شرح السنة : ٤٥٩٦۔ ترمذی : ٢٦٤٠۔ ابن ماجه: ٣٩٩٢۔ ابن حبان : ٦٧٣١ ] معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''یاد رکھو، تم سے پہلے اہل کتاب ۷۲ ملتوں میں فرقہ فرقہ ہو گئے اور یہ ملت ۷۳ ملتوں میں فرقہ فرقہ ہو جائے گی، ۷۲ آگ میں ہوں گے اور ایک جنت میں اور وہ جماعت ہے۔'' [ أبو داوٗد، السنة، باب شرح السنة : ٤٥٩٧۔ أحمد : ١٠٢/٤، ح : ١٦٩٤٠ ] عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے: ''وہ سب آگ میں ہوں گے مگر ایک ملت۔'' لوگوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ )) ''جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔'' [ ترمذی، الإیمان، باب ما جاء فی افتراق هذه الأمة : ٢٦٤١ ] اس حدیث کے مزید حوالوں اور صحت کے لیے دیکھیے ''السلسلة الصحیحة : ٤٠٢/١ تا ٤١٤، ٢٠٣، ٢٠٤۔''

یاد رہے کہ سوچ اور اجتہاد کا اختلاف یا علم نہ ہو سکنے کی وجہ سے اختلاف تو صحابہ اور تابعین میں بھی پایا جاتا تھا، مگر وہ سب ایک ہی جماعت تھے، انھوں نے کسی شخصیت کی تقلید کی خاطر فرقے نہیں بنائے تھے۔ مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنا اپنا الگ پیشوا بنا کر اس کی ہر صحیح اور غلط بات کو دین قرار دے کر الگ فرقہ بنا لیا۔ یہ چیز مسلمانوں کے تین بہترین زمانوں میں

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہوں گی اور جو برائی لے کر آئے گا سو اسے جزا نہیں دی جائے گی، مگر اسی کی مثل اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۱۶۰﴾

نہیں تھی، پہلے انبیاء کی امتوں کو اسی چیز نے برباد کیا اور امت محمدیہ ﷺ کے بگاڑ کا باعث بھی یہی بات بنی کہ قرآن وحدیث کا واضح حکم آنے کے بعد بھی کچھ لوگ اپنے دھڑے کی وجہ سے اپنے امام یا مرشد کی غلط باتوں پر اڑ کر الگ الگ ہو گئے اور مسلمانوں کا شخصیتوں کی بنیاد پر بنے ہوئے فرقوں کو چھوڑ کر کتاب و سنت پر جمع ہونا ایک خواب ہی رہ گیا جس کی تعبیر کسی زبردست خلیفہ یا مہدی یا مسیح علیہ السلام ہی کے ذریعے سے پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔

**آیت 160** ① مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا...... : اللہ تعالیٰ ڈرانے کے ساتھ بشارت کا سلسلہ بھی جاری رکھتا ہے، اب اللہ تعالیٰ کا نیکی کرنے والوں پر اپنے فضل اور برائی کرنے والوں پر عدل کا بیان ہے۔ نیکی کرنے والوں کی نیکی میں دس گنا اضافہ کم از کم ہے، ورنہ وہ سات سو گنا سے لے کر بے حساب بھی بڑھایا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنے والے کی مثال ایک دانے کو سات سو دانوں تک بڑھانے کے ساتھ اپنی مرضی کے ساتھ اس سے بھی بڑھانے کی بات فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۱) خوشے کی مثال کا جہاد سے تعلق سمجھنے کے لیے سورۂ بقرہ (۲۷۳) اور سورۂ توبہ (۶۰) ملاحظہ فرمائیں۔ جہاد کے ساتھ دوسری نیکیوں میں سات سو سے بڑھ کر ثواب بھی قرآن میں مذکور ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ الزمر : ۱۰ ] ”صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔“

② وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: یعنی ایک بدی کا بدلہ ایک سے زیادہ کا نہیں دیا جائے گا۔

③ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا: ”جو شخص نیکی کا ارادہ کرے، پھر اسے نہ کرے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اگر کرے تو دس سے لے کر سات سو گنا سے بہت گنا تک لکھی جاتی ہے اور جو شخص برائی کا ارادہ کرے، پھر اسے نہ کرے تو اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھی جاتی ہے اور اگر برائی کا ارادہ کیا اور اسے کر بھی لیا تو اللہ اس کے لیے ایک ہی برائی لکھتا ہے، یا اللہ عزوجل اسے بھی مٹا دیتا ہے اور اللہ کے ہاں ہلاک نہیں ہوتا مگر جو سرے ہی سے ہلاک ہونے والا ہو۔“ [ مسلم، الإیمان، باب إذا هم العبد بحسنة ...... : ۱۳۱۔ بخاری : ۶٤۹۱ ] اس مقام پر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک نفیس بات لکھی ہے کہ برائی چھوڑنے والا جو اسے نہیں کرتا، تین طرح کا ہوتا ہے، کبھی تو وہ اسے اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑتا ہے، اس پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے کہ برائی سے اللہ کے لیے رک جانا ایک عمل اور نیت ہے، جیسا کہ بعض صحیح احادیث میں ہے کہ اس نے اسے میری خاطر چھوڑا ہے اور کبھی وہ غفلت یا بھول کی وجہ سے برائی نہیں کرتا، اسے نہ

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ۬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

کہہ دے بے شک مجھے تو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر دی ہے، جو مضبوط دین ہے، ابراہیم کی ملت، جو ایک ہی طرف کا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا ﴿۱۶۱﴾ کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے ﴿۱۶۲﴾ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں ﴿۱۶۳﴾

گناہ ہے نہ ثواب، کیونکہ اس کی نیت نہ خیر کی ہے نہ شر کی اور کبھی اپنی پوری کوشش کے باوجود بس نہ چلنے کی وجہ سے کر نہیں سکتا، تو یہ اس شخص کی طرح ہے جس نے وہ برائی کی ہو، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہوں گے۔'' لوگوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! یہ تو قاتل ہے، مقتول کا کیا معاملہ ہے؟'' فرمایا: ''وہ بھی اپنے ساتھی کے قتل کی حرص رکھتا تھا۔'' [ بخاری، الإیمان، باب : ﴿ و إن طائفتان من المؤمنین اقتتلوا ...... ﴾ : ۳۱۔ مسلم : ۲۸۸۸ ]

**آیت 161** ❶ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ...... : پوری سورت میں توحید کو دلائل سے ثابت کرنے اور مشرکین کی تردید کے بعد آخر میں خلاصہ چند حقائق کی صورت میں بیان فرمایا۔ ''قِيَمًا'' یہ '' قِیَامٌ '' کے معنی میں مصدر ہے جسے مبالغے کے لیے دین کی صفت قرار دیا ہے، جیسے '' زَیْدٌ عَدْلٌ '' ہے، یعنی زید بہت عادل ہے، گویا سراسر عدل ہے، یعنی یہ دین نہایت قائم، مضبوط اور سیدھا ہے۔

❷ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ : اس میں مشرکین مکہ اور یہود و نصاریٰ کی تردید ہے جو اس زعم میں مبتلا تھے کہ وہ دین ابراہیم پر قائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تمھارا دعویٰ غلط ہے، تمھاری اور ان کی کیا نسبت! تم مشرک اور ابراہیم علیہ السلام شرک سے بے زار اور ایک اللہ کی طرف ہو چکنے والے۔ ان کا دین تو سچا، سیدھا اور نہایت مضبوط دین اسلام تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کے لیے پسند فرمایا اور جس کی ہدایت میرے رب نے مجھے عطا فرمائی۔

**آیت 163،162** قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ ...... : '' اَلنُّسُكُ '' کا معنی عبادت ہے، یہ ذبح، قربانی اور حج کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ [ الحج : ۳۴ ] ''اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کی، تاکہ وہ ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔'' اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا ﴾ [ البقرۃ : ۱۲۸ ] ''اور ہمیں ہماری عبادت (یا حج)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں، حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے۔ اور کوئی جان کمائی نہیں کرتی مگر اپنے آپ پر اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی، پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹ کر جانا ہے، تو وہ تمھیں بتائے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۶۴﴾

کے طریقے دکھا۔ ''اَلصَّلَاۃُ'' قلبی، زبانی اور جسم کے تمام اعضاء کی عبادت کا مجموعہ ہے۔ ''مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ'' یہ مصدر بھی ہو سکتے ہیں اور ظرف زمان بھی، یعنی مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی قلبی، زبانی اور جسمانی عبادات، مثلاً قیام، رکوع اور سجود، یہ سب غیر اللہ کے لیے تھیں، اسی طرح ان کی قربانیاں اور زندگی اور موت کا وقت سب انھی کی نذر تھا، ہاں کبھی اللہ تعالیٰ کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ فرمایا، ان سے صاف کہہ دیجیے کہ میرا تو یہ سب کچھ ایک اللہ ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے یہی حکم ہے اور سب سے پہلے میں اپنے آپ کو ایک اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے والا اور اس کا فرماں بردار بنانے والا ہوں، میرا جینا اور مرنا بھی اس اکیلے کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے ساتھ شرک کو ختم کرنے کے لیے ہے، حتیٰ کہ اسی پر میری موت آ جائے۔

**آیت 164** ① قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا ...... : مکہ کے مشرک اللہ تعالیٰ کو رب مانتے تھے، مگر معبود کئی بنا رکھے تھے جن سے وہ نفع و نقصان کی امید رکھتے اور انھی کی پوجا کرتے اور پکارتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے رب ہونے کو اپنی الوہیت، یعنی معبود ہونے کی دلیل کے طور پر بار بار پیش کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۳۱)، سورۂ سبا (۲۲) اور سورۂ فاطر (۱۳) یہاں بھی مراد یہی ہے کہ عبادت تو صرف اسی کی ہو سکتی ہے جو رب ہو، اس لیے تمھارا غیر اللہ کو پکارنا، ان کی عبادت کرنا انھیں رب بنانا ہی ہے، اب اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کر کے اسے رب کیسے بناؤں، جب کہ ہر شے کا رب وہی ہے۔

② وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ...... : کفار رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے کہتے کہ تم آبائی دین میں ہماری پیروی اختیار کرو اور گناہ کی فکر مت کرو، اگر یہ گناہ ہوا تو ہم اٹھا لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی نہیں اٹھائیں گے، بلکہ وہ صاف جھوٹے ہیں۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۱۲، ۱۳) یہاں بھی ان کے اس فریب اور چکمے کا جواب دیا ہے، فرمایا، کوئی جان بھی کوئی گناہ کماتی ہے تو وہ اسی پر ہوتا ہے، کوئی دوسری جان کسی صورت اسے نہیں اٹھائے گی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے عدل ہی کے خلاف ہے، جس کے سامنے تم نے لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھارے اختلاف کا اور حق و ناحق ہونے کا فیصلہ تمھیں سنائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے کا ذکر کئی جگہ فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۳۱)، سورۂ فاطر (۱۸) اور سورۂ نجم (۳۸، ۳۹)۔

وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾ ع

اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین کے جانشین بنایا اور تمھارے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کر دیا، تاکہ وہ ان چیزوں میں تمھاری آزمائش کرے جو اس نے تمھیں دی ہیں۔ بے شک تیرا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۶۵﴾

آیت 165 ① وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ: یعنی زمین میں ایک دوسرے کے بعد اقتدار بخشا، یا ایک دوسرے کا جانشین اور وارث بنایا۔

② وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ...... : یعنی شکل و صورت، مال و جاہ اور علم و عقل میں ایک دوسرے پر برتری بخشنے کا مقصد اپنی دی ہوئی نعمتوں میں تمھارا امتحان ہے، اگر کفر اختیار کر کے ناکام ہو گئے تو بہت جلد سزا مل جائے گی، کیونکہ ہر آنے والی چیز قریب ہے اور موت اور قیامت تو یقیناً آنے والی ہیں اور بہت جلد آنے والی ہیں اور اگر ایمان لے آئے، پھر کوئی لغزش بھی ہوئی تو وہ ذات پاک حد سے بڑھ کر بخشنے والی اور بے حد رحم کرنے والی ہے۔

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ ۷ مَدَنِيَّةٌ ۳۹ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اٰيَاتُهَا ۲۰۶ رُكُوْعَاتُهَا ۲۴

الٓمّٓصٓ ۝۱ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲
اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓصٓ ① ایک عظیم کتاب ہے جو تیری طرف نازل کی گئی ہے، تو تیرے سینے میں اس سے کوئی تنگی نہ ہو، تاکہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور ایمان والوں کے لیے سراسر نصیحت ہے ② اس کے پیچھے چلو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے سوا اور دوستوں کے پیچھے مت چلو۔ بہت کم تم نصیحت قبول کرتے ہو ③

**آیت 1** الٓمّٓصٓ: یہ حروف مقطعات ہیں، تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱)۔

**آیت 2** كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ......: کتاب نازل کی گئی، کس نے نازل کی، یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ کتاب کس نے نازل کی ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ آپ جھٹلانے والوں کو ڈرائیں اور خبردار کریں، تاکہ وہ ایمان لے آئیں اور ایمان والوں کو نصیحت کریں، تاکہ ان کے ایمان اور ہدایت میں اضافہ ہو، اس لیے آپ اسے پہنچانے میں دل میں کوئی تنگی یا خوف نہ آنے دیں کہ لوگ آپ کی مخالفت کریں گے، کیونکہ اگر کچھ جھٹلانے والے ہوں گے تو ایمان لانے والے بھی ہوں گے اور آپ پر یہ کتاب اتارنے والا آپ کا حامی و ناصر ہوگا، اس لیے کسی تنگ دلی یا خوف میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کا کام صرف پہنچانا ہے، ہدایت دینا نہ دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

**آیت 3** اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ......: رسالت (پیغام پہنچانے) کا معاملہ تین افراد کے درمیان ہوتا ہے: "مُرْسِلٌ" پیغام بھیجنے والا، یعنی اللہ تعالیٰ، "مُرْسَلٌ" جسے پیغام دے کر بھیجا جائے، یعنی رسول اور "مُرْسَلٌ اِلَيْهِ" جس کی طرف پیغام بھیجا جائے، یعنی امت۔ پچھلی آیت میں رسول کو انذار (ڈرانے) اور تذکیر (نصیحت کرنے) کا حکم ہے، اس آیت میں امت کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام کی پیروی کا اور اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے کی پیروی نہ کرنے کا حکم ہے، کیونکہ اللہ کے نازل کردہ کے سوا کسی بھی دوسرے کی پیروی کرنا اللہ کے مقابلے میں غیر اللہ (من دون اللہ) کو اولیاء بنانا ہے۔ حکم صرف اللہ کا حق ہے، جسے پہنچانا رسول کی ذمہ داری ہے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف قرآن اور حدیث دونوں وحی کے ذریعے سے نازل ہوئے، اس لیے رسول کا ہر حکم اللہ کا حکم ہے، سو اسی کی پیروی کرو، قرآن و سنت کے مقابلے میں کسی کی بات مت مانو، خواہ وہ کتنا ہی بڑا امام، بزرگ، محقق یا دانش ور ہو، ہر ایک کی بات کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المائدۃ: ۳] کے مطابق دین کا ہر مسئلہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اگر کوئی بات قرآن و حدیث میں صریح الفاظ میں نہ ملے تو کسی آیت یا حدیث میں اس کی طرف اشارہ ضرور ہوگا، اس کے لیے

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝٤ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝٥ فَلَنَسْــَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْــَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٦

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا، تو ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آیا، یا جب کہ وہ دوپہر کو آرام کرنے والے تھے ④ پھر ان کی پکار، جب ان پر ہمارا عذاب آیا، اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا یقیناً ہم ہی ظالم تھے ⑤ تو یقیناً ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور یقیناً ہم رسولوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے ⑥

کسی بھی بڑے عالم سے پوچھ سکتے ہیں۔ کسی ایک ہی کی ہر بات کی تقلید، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط، تو یہ "مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ" کی طرف لے جائے گی، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

**آیت 4** وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ...... : پچھلی آیت میں فرمایا کہ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو، یہاں فرمایا کہ دیکھ لو کہ نصیحت اور عبرت کے لیے تمھارے سامنے کتنی ہی بستیاں ہیں، جنھیں غیر اللہ کی عبادت اور رسولوں کو جھٹلانے کی وجہ سے ہم نے ہلاک کر دیا، جن میں سے کچھ تو وہ تھے جو رات امن و اطمینان سے سو رہے تھے کہ ان پر ہمارا عذاب آ گیا، جیسا کہ قوم لوط اور کچھ وہ تھے جو دوپہر کو آرام کر رہے تھے، جیسے شعیب علیہ السلام کی قوم۔ آرام اور بے خبری کی حالت میں آنے والا عذاب زیادہ خوف ناک ہوتا ہے، یعنی ان کفار کو اپنی خوش حالی پر مغرور نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک آ کر اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اور اس کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۹۷، ۹۸) اور سورۂ نحل (۴۵ تا ۴۷)۔

**آیت 5** فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ ...... : "دَعْوٰی" کا معنی دعا بھی ہوتا ہے اور ادّعا بھی، یعنی اس وقت ان سے سوائے گناہ کے اعتراف کے کچھ بن نہ پڑا اور وہ اپنے بنائے ہوئے اولیاء، یعنی جھوٹے معبودوں کو بھول گئے اور اپنے تمام دعوے بھی، مثلاً یہ کہ آخرت کو بھی ہم ہی مقرب ہوں گے، مگر اس وقت کا اعترافِ گناہ ان کے کس کام آ سکتا تھا؟ جب گناہ سے توبہ کا وقت تھا اس وقت تو غفلت کی نیند سوتے رہے۔ ایسے وقت میں ان کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلنے سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے بھی ان کے دماغ میں یہ بات ہر وقت رہتی تھی کہ تم شرک کر کے اور اللہ کے رسول کو جھٹلا کر ظلم کر رہے ہو، مگر ان کے تکبر اور عناد نے انھیں اقرار نہیں کرنے دیا۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۱۱ تا ۱۵) اور سورۂ مومن (۸۵)۔

**آیت 6** فَلَنَسْــَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ ...... : پچھلی آیت میں جس چیز سے ڈرایا گیا وہ دنیا کا عذاب تھا، اس آیت میں آخرت کے معاملات سے ڈرایا گیا ہے۔ (کبیر) یعنی ہم لوگوں سے تو یہ پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے پیغمبروں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا جیسا کہ سورۂ قصص میں فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [ القصص : ٦٥ ]

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيۡنَ ۝ وَ الۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ ۨالۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝

پھر یقیناً ہم ان کے سامنے ضرور پورے علم کے ساتھ بیان کریں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے ⑦ اور اس دن وزن حق ہے، پھر وہ شخص کہ اس کے پلڑے بھاری ہوگئے، تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں ⑧

''اور جس دن وہ انھیں آواز دے گا، پس کہے گا تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا۔'' اور پیغمبروں سے دریافت کریں گے کہ تم نے لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچایا تھا یا نہیں؟ اور پہنچایا تھا تو انھوں نے کیا جواب دیا تھا؟ جیسا کہ سورۂ مائدہ میں فرمایا: ﴿يَوۡمَ يَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ﴾ [ المائدۃ : ۱۰۹ ] جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر کہے گا تمھیں کیا جواب دیا گیا۔'' مقصود کفار کو ڈانٹنا اور ذلیل کرنا ہوگا۔

**آیت 7** فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ ...... : یعنی ہم سب کچھ سن رہے تھے اور دیکھ رہے تھے اور ان کے عمل کے وقت غائب نہیں تھے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۱) اور سورۂ مجادلہ (۶، ۷) اگر وہ خاموش رہیں گے یا غلط بات کریں گے تو ہم خود پورے علم کے ساتھ بتا دیں گے، یعنی دلیل بھی ساتھ ہوگی کہ خود ان کے اعضاء گواہی دیں گے۔ [ دیکھیے یٰسٓ: ۶۵۔ حٰمٓ السجدۃ : ۱۹ تا ۲۱ ] زمین گواہی دے گی۔ [ دیکھیے الزلزال : ۴ ] امت محمد ﷺ گواہی دے گی۔ [ دیکھیے البقرۃ : ۱۴۳ ] اور جہنم کے داروغے کے سامنے وہ خود اپنی زبان سے مان جائیں گے۔ [ دیکھیے الزمر : ۷۱۔ الملک : ۱۰ ] '' بِعِلۡمٍ '' تنوین کی وجہ سے ''پورے علم'' ترجمہ کیا ہے۔

**آیت 8** وَالۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ ۨالۡحَقُّ ...... : اوپر کی آیت میں سوال اور حساب کا ذکر ہے، اس آیت میں وزن اعمال کا، یعنی ہر ایک کے نیک و بد اعمال کا وزن ہوگا۔ یہاں اس اشکال کی بنا پر کہ ان اعمال کا تو اس وقت وجود ہی ختم ہو چکا ہوگا، بعض عقل پرستوں نے وزن اعمال ہی سے انکار کر دیا، مگر اللہ تعالیٰ کی بات کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری کو ختم ہی اس بات کو قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ ثابت کرنے سے کیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۴۷) یہ وزن کیسے ہوگا، کچھ اہل علم نے کہا کہ وہ کاغذ تولے جائیں گے جن میں عمل لکھے ہوں گے۔ بعض نے کہا کہ ان اعمال کو جسم دے کر وہ جسم تولے جائیں گے۔ بعض نے کہا کہ اس عمل والے کو تولا جائے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''تینوں صورتیں ممکن ہیں اور آیات و احادیث میں ہر ایک کی تائید ملتی ہے۔'' چوتھی صورت یہ ہے کہ خود عمل تولے جائیں گے، کیونکہ ان کا وجود ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَ وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا﴾ [ الکہف : ۴۹ ] ''اور انھوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے۔'' اور فرمایا: ﴿وَ اِنۡ كَانَ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ اَتَيۡنَا بِهَا﴾ [ الأنبیاء : ۴۷ ] ''اور اگر رائی کے ایک دانہ کے برابر عمل ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے۔'' اور سورۂ لقمان (۱۶) میں بھی یہی بات فرمائی، سورۂ زلزال میں فرمایا: ﴿فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [ الزلزال : ۷، ۸ ] ''اور جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ⑨
وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ⑩ ع ٨

اور وہ شخص کہ اس کے پلڑے ہلکے ہو گئے تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، اس لیے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے ⑨ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھیں زمین میں ٹھکانا دیا اور ہم نے تمھارے لیے اس میں زندگی کے سامان بنائے، بہت کم تم شکر کرتے ہو ⑩

---

لے گا اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔'' سورۂ آل عمران (۳۰) میں بھی یہ بات موجود ہے اور یہی چوتھی صورت راجح ہے۔ اب تو جدید سائنس نے دنیا ہی میں یہ مسئلہ حل کر دیا ہے، ہوا میں تحلیل ہو جانے والی آوازوں اور اعمال کا سارا نقشہ اور ختم ہونے والی چیزوں کا وزن سب کچھ انسان کے ہاتھوں ظاہر ہو رہا ہے۔ [ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ]
مگر ماننے کا لطف اس وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی بات عقل میں آئے یا نہ آئے اسے من وعن تسلیم کیا جائے اور اسی کا نام اسلام ہے، سائنس سے ثابت ہونے کے بعد کسی نے مانا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کو کیا مانا؟

**آیت 9** **وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ**...... : اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد کافر ہیں، کیونکہ قرآن نے انھیں **''خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ''** قرار دیا ہے، مومن گناہ گار تو آخر کار کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں پہنچ جائیں گے۔ (کبیر) مزید دیکھیے سورۂ حاقہ (۲۵ تا ۲۹) کی تفسیر۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے ایک شخص کو قیامت کے روز سب کے سامنے لایا جائے گا، اس کے ننانوے اعمال نامے پھیلائے جائیں گے اور ان میں سے ہر ایک اتنا لمبا ہو گا جتنی دور نگاہ جاتی ہے، پھر پروردگار اس سے فرمائے گا: ''کیا تم ان میں سے کسی عمل سے انکار کرتے ہو؟'' وہ عرض کرے گا: ''نہیں۔'' پھر پروردگار فرمائے گا: ''تمھاری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے اور آج تم سے کوئی بے انصافی نہیں کی جائے گی۔'' پھر ایک بطاقہ (کاغذ کا ٹکڑا) لایا جائے گا جس پر '' أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ '' درج ہو گا۔ وہ عرض کرے گا: ''بھلا یہ ایک پرزہ ان تمام دفتروں کے مقابلے میں کس کام آئے گا؟'' حکم ہو گا کہ تم پر کوئی ظلم نہیں ہو گا (لہٰذا صبر کرو) پھر وہ تمام دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور یہ کاغذ کا ایک پرزہ دوسرے پلڑے میں، تو وہ دفتر ہلکے ہو جائیں گے اور وہ پرزہ بھاری ہو گا اور اللہ کے نام کے مقابلے میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو گی۔'' [ ترمذی، الإیمان، باب ما جاء فیمن یموت...... : ۲٦٣٩۔ ابن ماجه : ٤٣٠٠۔ سلسلة الأحادیث الصحیحة : ١/ ٢٦١ ] اہل علم نے دوسری آیات و احادیث کو مدنظر رکھ کر اس شخص سے وہ آدمی مراد لیا ہے جسے کلمہ پڑھنے کے بعد عمل کا موقع ہی نہیں ملا، یعنی جسے آخری وقت پر کفر و شرک سے باز آنے اور اسلام لانے کی توفیق ملی اور اسلام لانے سے اس کے تمام گناہ معاف ہو گئے، یا بدعمل تھا اور آخری وقت توبہ کی توفیق نصیب ہو گئی۔

**آیت 10** **وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ**...... : اوپر کی آیات میں انذار و تبشیر کے ساتھ لوگوں کو انبیاء کی دعوت قبول کرنے

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖۗ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر ہم نے تمھاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ سجدہ کرنے والوں سے نہ ہوا ⑪ فرمایا تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا، جب میں نے تجھے حکم دیا؟ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور تو نے اسے مٹی سے پیدا کیا ہے ⑫

---

کی ترغیب دی اور ترغیب میں نعمتوں کی کثرت کی طرف اشارہ تھا، اب یہاں سے نعمتوں کے بیان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، ساتھ ہی شیطان کے حسد اور انسان کو اللہ کی نعمتوں سے محروم کرنے کی جدو جہد کا ذکر ہے، تاکہ ہم اس سے بچ سکیں۔

**آیت 11** ① **وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ** : " خَلَقَ " کا اصل معنی جس چیز کا وجود نہ ہو اس کا صحیح خاکہ بنانا اور وجود میں لانا ہے۔ اس معنی میں خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہاں، کسی چیز سے کوئی خاکہ تیار کرنے کو بھی " خَلَقَ " کہہ لیتے ہیں، یہ مخلوق بھی کر سکتی ہے، سورۂ مائدہ (۱۱۰) میں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے : ﴿ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ ﴾ (راغب) "خلق، برأ" اور " تصویر" پیدائش کے تین مراحل ہیں، سورۂ حشر (۲۴) میں فرمایا: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ﴾ تینوں الفاظ میں سے اکیلا کوئی بھی لفظ آئے تو پیدا کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، اکٹھے آئیں تو کچھ فرق ہے، یعنی ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر تمھیں صورت بخشی۔

② **ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ** : اس سجدے سے مراد مطلق تعظیم ہے یا حقیقی سجدہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۴)

**آیت 12** ① **قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ** : یہاں " اَلَّا " زور اور تاکید کے لیے ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ ص (۷۵) میں فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ ﴾ "تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا" اور یہاں ہے کہ تجھے کس نے روکا کہ اس کے روکنے کے باعث تو نے سجدہ نہ کیا۔

② اس سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو تھا، ابلیس جنوں میں سے تھا، فرشتہ تھا ہی نہیں تو وہ نافرمان کیوں ٹھہرا؟ اس کے عجیب و غریب جواب دیے گئے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علاوہ ابلیس کو بطور خاص مخاطب کر کے حکم دیا گیا تھا۔

③ **خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ** : آگ مٹی سے افضل ہے اور افضل اپنے سے کم درجہ کو کیسے سجدہ کر سکتا ہے؟ اس نے یہ نہ دیکھا کہ حکم کون دے رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی موجودگی میں عقلی قیاس سے کام لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دھتکارا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا، اسی لیے اہل علم فرماتے ہیں کہ پہلا شخص جس نے واضح حکم کی موجودگی میں قیاس کیا ابلیس تھا۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾

فرمایا پھر اس سے اتر جا، کیوں کہ تیرے لیے یہ نہ ہوگا کہ تو اس میں تکبر کرے۔ سو نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے ⑬ اس نے کہا مجھے اس دن تک مہلت دے جب یہ اٹھائے جائیں گے ⑭ فرمایا بے شک تو مہلت دیے جانے والوں سے ہے ⑮ اس نے کہا پھر اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، میں ضرور ہی ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا ⑯

ابن سیرین نے فرمایا کہ شرک کی بنیاد بھی قیاس ہی تھا۔ (طبری) اب بھی آیات و احادیث کے مقابلے میں جو شخص اسی طرح عقلی قیاس سے کام لے گا اس کا یہ کام شیطانی ہے، اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو ابلیس کا ہوا۔

④ وَخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ: یہاں شیطان نے متعدد غلطیاں کیں، ایک تو یہ بات ہی غلط ہے کہ افضل اپنے سے کم تر کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ بات برتر یا کم تر کی نہیں، حکم کی ہے اور اللہ تعالیٰ جسے جو چاہے حکم دے سکتا ہے۔ دوسرا اس کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ میں آدم سے بہتر ہوں، کیونکہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنانے کا اور عزت و تکریم بخشنے کا جو شرف عطا فرمایا وہ کسی بھی مخلوق کو نہیں بخشا، اس لیے فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ [ ص : ۷۵ ] ''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔'' اور تیسری یہ بات بھی غلط ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے، کیونکہ آگ میں تیزی، جلانا اور بھڑکنا ہے، جبکہ مٹی میں تواضع، ٹھکانا بننے، اگانے اور بڑھانے کی خوبی موجود ہے۔ اب بھی جو لوگ قرآن و حدیث کے مقابلے میں قیاس کرتے ہیں اس پر تھوڑا سا غور کریں تو اس کا فاسد و باطل ہونا آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا۔

آیت 13 فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کبریائی (بڑائی) میری رداء (اوپر کی چادر) اور عزت میری ازار (نیچے کی چادر) ہے، جو ان میں سے ایک بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے آگ میں پھینکوں گا۔'' [ مسلم، البر والصلة، باب تحریم الکبر : ۲۶۲۰، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ ] یعنی تکبر کے بعد جنت میں رہنے کا شرف تیرے پاس رہنا ممکن ہی نہیں۔ یہی حال ہر تکبر اور غرور والے کا ہوگا۔

آیت 13 قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ: شیطان نے مہلت تو قیامت تک کی مانگی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علم میں طے شدہ وقت تک مہلت دی۔ دیکھیے سورۂ حجر (۳۸) اور سورۂ ص (۸۱) قیامت تک مہلت کی کہیں تصریح نہیں ہے۔ شیطان کو مہلت دینے سے مقصود بندوں کا امتحان ہے کہ وہ رحمان کی راہ پر چلتے ہیں یا شیطان کی۔

آیت 16 ① قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ: ابلیس کی شیطنت دیکھیے کہ گمراہ ہونے میں سارا قصور اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا ہے

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ‌ؕ وَلَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا‌ؕ لَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۸﴾

پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا ﴿۱۷﴾ فرمایا اس سے نکل جا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا، بے شک ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا میں ضرور ہی جہنم کو تم سب سے بھروں گا ﴿۱۸﴾

اور اپنے اختیار کی نفی کر رہا ہے، یہی جبریہ کا عقیدہ ہے اور مشرکین نے بھی اللہ تعالیٰ کے ذمے یہی الزام لگایا کہ اگر وہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۸)۔

② لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ : یعنی میں تو گمراہ ہوں ہی ان کی بھی راہ ماروں گا۔ (موضح) یہاں شیطان جبری کے بجائے قدری بن گیا کہ میں یہ کروں گا اور وہ کروں گا، پہلے کہتا تھا کہ سب تو نے ہی کیا۔ معلوم ہوا شیطان میں جبری اور قدری (تقدیر کا منکر) ہونے کی دونوں گمراہیاں موجود ہیں، جبکہ ایمان ان دونوں کے درمیان ہے۔

**آیت 17** ① ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ ...... : اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے شیطان اور دوسری تمام آفات سے تمام اطراف سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے، چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ صبح و شام یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور کبھی ان میں ناغہ نہیں کرتے تھے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَ دُنْيَايَ وَأَهْلِيْ وَمَالِيْ، اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ وَآمِنْ رَّوْعَاتِيْ، اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَ مِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَّمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ » [ أحمد : ۲/ ۲۵، ح : ٤٧٨٤۔ أبو داؤد، الأدب، باب ما يقول إذا أصبح : ٥٠٧٤ ] ”اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین میں اور اپنی دنیا میں اور اپنے اہل میں اور مال میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! تو میری پردے والی چیزوں پر پردہ ڈال دے اور میری گھبراہٹوں کو امن عطا فرما۔ اے اللہ! میری حفاظت فرما میرے آگے سے اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں سے اور میرے بائیں سے اور میرے اوپر سے اور میں تیری عظمت کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں اپنے نیچے سے اچانک پکڑ لیا جاؤں۔“

② وَلَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ: ابلیس کو غیب کی خبر تو نہ تھی محض گمان پر اس نے یہ دعویٰ کر دیا مگر ظالم نے اپنا یہ گمان واقعی سچا کر دکھایا، جیسا کہ سورۂ سبا (۲۰) میں ہے۔

وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور اے آدم! تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو، پس دونوں کھاؤ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے قریب مت جاؤ کہ دونوں ظالموں سے ہو جاؤ گے ﴿۱۹﴾ پھر شیطان نے ان دونوں کے لیے وسوسہ ڈالا، تا کہ ان کے لیے ظاہر کر دے جو کچھ ان کی شرم گاہوں میں سے ان سے چھپایا گیا تھا اور اس نے کہا تم دونوں کے رب نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا مگر اس لیے کہ کہیں تم دونوں فرشتے بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ ﴿۲۰﴾

**آیت 19** وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ ...... : اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ (۳۵)۔

**آیت 20** ① لِيُبْدِيَ لَهُمَا: بعض علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ "لِيُبْدِيَ" میں "لام" عاقبت کا ہے، یعنی شیطان کے دل میں نہیں تھا کہ وہ ننگے ہو جائیں گے مگر ایسا کرنے کا انجام یہی تھا، لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ "لام" تعلیل کا ہے اور اس کی غرض یہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ درخت کھانے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ شرم گاہ کو "سَوْءَةٌ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا ننگا ہونا انسان کو طبعاً برا لگتا ہے اور "سَاءَ يَسُوْءُ" کا معنی برا لگنا ہے، گویا ان کو جنت کا جو لباس پہنایا گیا تھا، جس سے ان کی شرم گاہیں چھپی ہوئی تھیں، وہ ممنوعہ درخت کھانے سے اتر جانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پہلے ہی جنت کی چار خصوصی سہولتیں بتائی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ تو جنت میں ننگا نہیں ہوگا اور ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ ممنوعہ درخت کھانے سے یہ سہولتیں چھن جائیں گی، اس لیے یہ بات آدم علیہ السلام کو بھی معلوم تھی، مگر شیطان کے قسم کھانے سے بھول گئے۔ ان سہولتوں کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۱۸، ۱۱۹)۔

② "وُرِيَ" یہ "وَارٰى يُوَارِيْ مُوَارَاةً" (مفاعلہ) سے ماضی مجہول ہے۔

③ وَ قَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا ...... : شیطان نے ان دونوں کو یوں بہکایا کہ اللہ تعالیٰ کے تمھیں اس درخت سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کھانے سے تم فرشتے بن جاؤ گے، یعنی ان کی خصوصیات اور فطری کمالات تم میں بھی پیدا ہو جائیں گی، یا ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ جن دو چیزوں کے درمیان "اَوْ" کا لفظ آئے ان میں سے ایک چیز بھی ہو سکتی ہے اور دونوں بھی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بھی نہ ہو۔ ایک بہر حال ضرور ہوگی، دوسری بھی ممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام فرشتوں کو اللہ کے قریب رہنے کی وجہ سے اپنے سے بہتر سمجھتے تھے، سورۂ انبیاء میں ہے: ﴿ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۱۹ ] "اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اس کی عبادت سے تکبر کرتے

وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۲﴾

اور اس نے دونوں سے بار بار قسم کھا کر کہا کہ بے شک میں تم دونوں کے لیے یقیناً خیر خواہوں سے ہوں ﴿۲۱﴾ پس اس نے دونوں کو دھوکے سے نیچے اتار لیا، پھر جب دونوں نے اس درخت کو چکھا تو ان کے لیے ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں اور دونوں جنت کے پتوں سے (لے لے کر) اپنے آپ پر چپکانے لگے اور ان دونوں کو ان کے رب نے آواز دی کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا اور تم دونوں سے نہیں کہا کہ بے شک شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے ﴿۲۲﴾

ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔'' مگر یہ ایک جزوی فضیلت ہے، اس سے ہر لحاظ سے فرشتوں کا انسان سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

**آیت 21** وَ قَاسَمَهُمَآ : باب مفاعلہ (مقاسمہ) دو طرف سے مقابلہ کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں صرف شیطان نے قسم کھائی تھی، آدم علیہ السلام نے مقابلے میں کوئی قسم نہیں کھائی، اس لیے یہاں مبالغہ کے لیے ہے، لہٰذا ترجمہ ''بار بار قسم کھائی'' کیا گیا ہے۔

**آیت 22** ① فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ : ''دَلّٰی یُدَلِّیْ تَدْلِیَةً'' (تفعیل) اور '' اَدْلٰی یُدْلِیْ اِدْلَاءً '' (افعال) یہ ''دَلْوٌ'' (ڈول) سے ہے، یعنی جیسے ڈول نیچے گرایا جاتا ہے اس طرح کسی چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف چھوڑنا، یعنی شیطان نے دھوکے سے ان کو ان کے بلند مرتبے سے نیچے اتار دیا۔

② فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ : سورۂ طٰہٰ (۱۲۱) میں ہے: ﴿ فَاَكَلَا مِنْهَا ﴾ کہ انھوں نے اس میں سے کھا لیا۔ زیر تفسیر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں سے صرف چکھنے کی دیر تھی کہ جنت کی کرامت چھن گئی اور وہ بے لباس ہو گئے۔

③ وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ : معلوم ہوا انسان فطرتاً باحیا پیدا ہوا ہے اور ننگا ہونا انسانی فطرت کے خلاف ہے، اس لیے آدم اور حوا علیہما السلام درختوں کے پتوں سے ستر چھپانے لگے۔ شیطان اسی لیے بے لباس ہونے کو پسند کرتا ہے، جبکہ ننگا ہونا جانوروں کی فطرت ہے اور کفار اور ان کے پیروکار ننگا ہونا پسند کرتے ہیں، اگر لباس پہنتے ہیں تو ایسا جو انھیں بے لباس ہونے سے بھی زیادہ ننگا کرے، ان کی انسانی فطرت مسخ ہو چکی ہے، انھی کے بارے میں آتا ہے: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ [ الأعراف : ۱۷۹ ] ''یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔''

④ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ : اس آیت اور دوسری بہت سی آیات و احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں صوت (آواز) ہے اور فرشتے اور آدمی اسے سن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آواز اور کلام سے انکار کر کے قرآن کو کلام اللہ کے بجائے مخلوق قرار دینا سراسر گمراہی ہے۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی عظیم استقامت کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کے دلائل سے

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے ﴿۲۳﴾ فرمایا اتر جاؤ، تمھارا بعض بعض کا دشمن ہے اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک ایک ٹھکانا اور کچھ (زندگی کا) سامان ہے ﴿۲۴﴾ فرمایا تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے ﴿۲۵﴾ اے آدم کی اولاد! بے شک ہم نے تم پر لباس اتارا ہے، جو تمھاری شرمگاہوں کو چھپاتا ہے اور زینت بھی اور تقویٰ کا لباس! وہ سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۶﴾

---

تمام دنیا کے سامنے اس بات کا غلط ہونا ثابت فرما دیا۔

**آیت 23** قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ...... : سورۂ بقرہ میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے یہ کلمات رب تعالیٰ سے سیکھے تھے اور انھی کلمات سے ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳۷) کے حواشی۔ آدم علیہ السلام کی اس دعا سے ان کا اور ابلیس کا فرق واضح ہوتا ہے، یہاں عجز ہے، اعتراف گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی محتاجی کا اظہار اور بخشش کی درخواست ہے، وہاں تکبر ہے، اپنے گناہ پر اصرار ہے، آئندہ مزید نافرمانی کے ارادے کا اظہار ہے اور مہلت کی درخواست ہے۔ اسی طرح یہاں پاک فطرت ہونے کی بنا پر قسم کی وجہ سے دشمن پر بھی اعتبار ہے، وہاں حسد کی وجہ سے بے گناہوں سے بھی دشمنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی دیکھیے کہ دوست کی دعا بھی قبول اور دشمن کی بھی۔ یقیناً اس میں اس پاک پروردگار کی بے شمار حکمتیں تھیں۔

**آیت 24** قَالَ اهْبِطُوْا ...... : "مَتَاعٌ" یعنی عارضی لذتیں اور فائدے، تنوینِ تنکیر سے معلوم ہوا کہ وہ بھی چند۔ مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳۶) کے حواشی۔

**آیت 25** قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو بنی آدم کے لیے زندگی میں جائے سکونت قرار دیا ہے، پھر مرنے کے بعد بھی اسی میں دفن ہوں گے اور قیامت کے دن بھی اسی سے زندہ ہو کر نکلیں گے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۵۵)۔

**آیت 26** ① يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا: یعنی آسمان سے پانی اتارا، جس سے روئی اگتی ہے، ریشم اور پشم کا سامان مہیا ہوتا ہے، پھر تمھیں زراعت، شجر کاری، حیوان پروری، کپڑا بننے اور دوسری چیزیں بنانے کا طریقہ سکھا دیا۔ راغب نے فرمایا کہ یہاں "اَنْزَلَ" بمعنی "خلق" ہے، جیسے: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ [ الحدید : ۲۵ ] "اور ہم نے لوہا اتارا۔"

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَاۤ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے آدم کی اولاد! کہیں شیطان تمھیں فتنے میں نہ ڈال دے، جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، وہ دونوں سے ان کے لباس اتارتا تھا، تاکہ دونوں کو ان کی شرمگاہیں دکھائے، بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کے دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ﴿۲۷﴾

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی دشمن نے جنت کے کپڑے تم سے اتروائے، پھر ہم نے تم کو دنیا میں لباس کی تدبیر سکھا دی۔'' (موضح)

② يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا: یعنی لباس کا مقصد ستر پوشی اور زینت ہے۔ اس کے علاوہ وہ سردی، گرمی اور چوٹ وغیرہ سے بھی بچانے کا باعث بنتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ﴾ [ النحل: ۸۱ ] ''اور اس نے تمھارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ قمیصیں جو تمھیں تمھاری لڑائی میں بچاتی ہیں۔''

③ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ: یعنی اس ظاہری لباس کے علاوہ جس سے تم صرف بدن ڈھانکتے ہو یا زینت کا کام لیتے ہو ایک اور معنوی لباس بھی ہے جو ہر لباس سے بہتر ہے، لہٰذا تمھیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور وہ ہے پرہیز گاری، یعنی اللہ کا خوف، ایمان اور عمل صالح کا لباس۔ بعض نے کہا ہے کہ '' لِبَاسُ التَّقْوٰى '' سے مراد اون اور کھدر وغیرہ کی قسم کا کھردرا اور موٹا لباس ہے، جسے صوفی لوگ پہنتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین، جن کی پرہیز گاری بے مثال تھی، عمدہ لباس بھی پہنا کرتے تھے اور وسعت کے باوجود سادہ لباس بھی پہنتے تھے۔ بعض نے زرہ وغیرہ فوجی لباس مراد لیا ہے جو دشمن سے بچاؤ کا ذریعہ بنتا ہے۔ (قرطبی، روح المعانی) ہاں یہ ضرور ہے کہ جس لباس کی ممانعت آئی ہے وہ نہ پہنا جائے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو، یعنی مرد ریشمی (اور زعفرانی رنگ کا) لباس نہ پہنے، دامن لمبا نہ رکھے جو ٹخنوں کو ڈھانک لے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک (یا تنگ) لباس نہ پہنے کہ لوگوں کو بدن نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھائے۔ (موضح)

④ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ: تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی اس بڑی نعمت کی قدر کریں، یا نصیحت حاصل کریں اور برے کاموں سے بچیں۔

آیت 27 ① يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ...... : شیطان کی کوشش یہ ہے کہ تم جنت میں نہ جانے پاؤ، جیسا کہ اس

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے ﴿۲۸﴾

---

نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، اس کے لیے وہ بے پردگی کو اور بے لباس ہونے کو عام کرتا ہے، تا کہ بے حیائی اور بدکاری پھیل جائے۔ دیکھنا کہیں اس فتنے میں مبتلا ہو کر جنت سے محروم نہ ہو جانا۔

② اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ ...... : یعنی ایسے دشمن سے تو بہت زیادہ محتاط اور چوکنا رہنا چاہیے جو ہمیں دیکھے مگر ہم اسے دیکھ نہ پائیں۔ اس آیت سے بعض اہل علم نے یہ استدلال کیا ہے کہ جنوں کو دیکھنا ممکن نہیں ہے، مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگرچہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا قبیلہ ہمیں دیکھ رہے ہوتے ہیں جبکہ ہم انھیں نہیں دیکھتے ہوتے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا دکھائی دینا کسی وقت بھی ممکن نہیں۔ یہ "قَضِيَّةٌ مُطْلَقَةٌ لَا دَائِمَةٌ" ہے، لہٰذا صحیح یہی ہے کہ جنوں کو دیکھنا ممکن ہے۔ احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنوں کو دیکھا ہے۔ (فتح القدیر) اور زکوٰۃِ رمضان کی نگرانی کے قصے میں مذکور ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مسلسل تین راتیں ایک شیطان کو پکڑتے رہے۔ [ بخاری : ۲۳۱۱ ] اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آج رات میری نماز قطع کرنے کے لیے میرے پاس ایک سرکش جن آ گیا، اگر میرے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی دعا نہ ہوتی تو میں اسے پکڑ کر ستون سے باندھ دیتا اور صبح کو مدینہ کے بچے اس سے کھیلتے۔'' [ مسلم، المساجد، باب جواز لعن الشیطان ...... : ۵۴۱۔ بخاری : ۴۶۱ ] سلیمان علیہ السلام کے پاس تو باقاعدہ جنوں کی قوم تھی۔ [ دیکھیے النمل : ۱۷ ] اب رہا امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ فرمانا کہ جو شخص جنات کو دیکھنے کا دعویٰ کرے اس کی شہادت مردود ہے، تو شاید ان کا مطلب یہ ہو کہ انھیں ان کی اصل شکل پر دیکھنے کا دعویٰ کرے، ورنہ احادیث سے ثابت شدہ بات مقدم ہے۔

آیت 28 ① وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ...... : یہاں "فَاحِشَةً" اور "بِالْفَحْشَآءِ" سے مراد وہ عبادات ہیں جو انھوں نے از خود ایجاد کر لی تھیں، مثلاً ان کے مرد اور عورتیں ننگے ہو کر طواف کرتے کہ جن کپڑوں میں ہم گناہ کرتے ہیں ان میں طواف کیسے کریں؟ اس کے علاوہ اس آیت میں مشرکین کے اپنی بے حیائی اور بدکاری پر قائم رہنے کے دو عذر بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ ہم نے بڑوں کو ایسا کرتے پایا ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ پہلی بات یعنی اپنے بڑوں کو ایسا کرتے ہوئے پانے کی چونکہ درست تھی اس لیے یہاں اس کی نفی نہیں کی گئی۔ ہاں دوسری کئی آیات میں بتایا گیا ہے کہ باپ دادا کے نقش قدم پر چلتے رہنا کوئی دلیل نہیں ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۰) اور سورۂ مائدہ (۱۰۴) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یعنی سن چکے کہ باپ نے شیطان کا فریب کھایا، پھر باپ کی سند کیوں لاتے ہو؟'' (موضح) رہا دوسرا عذر تو چونکہ بطور واقعہ بھی غلط تھا اور بطور دلیل بھی، اس لیے یہاں اس کی تردید فرمائی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ جب انبیاء کی زبان سے

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ۝۲۹

کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو اور اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارو۔ جس طرح اس نے تمھاری ابتدا کی، اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے (۲۹)

ان کاموں کا برا اور قبیح ہونا ثابت ہو چکا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی بے حیائی کا حکم دے۔ (رازی)

② اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ......: اس آیت میں ان لوگوں کو بھی سخت تنبیہ ہے جو محض باپ دادا کی رسموں کو دین سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونے کو ثواب سمجھتے ہیں اور ان مقلدین کے لیے بھی جو امام پرستی، شیخ پرستی یا کسی بھی شخصیت پرستی میں گرفتار ہیں، جب بھی انھیں حق کی بات دلیل کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ لاجواب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کو کیا اس کا علم نہ تھا؟ کیا وہ جاہل تھے؟ ہمارے بڑے یہی کرتے آئے ہیں، ہم بھی اسی پر قائم رہیں گے۔ یہی وہ خصلت ہے جس کی وجہ سے یہودی یہودیت پر، نصرانی نصرانیت پر اور بدعتی بدعت پر قائم رہے۔

**آیت 29** ① قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ: لہٰذا تم اس کی پیروی کرو۔ یہاں "اَلْقِسْطُ" (انصاف) سے مراد توحید ہے، پھر بے حیائی اور بدکاری سے بچنا ہے، کیونکہ سب سے بڑا ظلم اللہ کے ساتھ شرک ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان : ۱۳ ] "بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔" پھر کسی انسان کی جان، مال یا آبرو برباد کرنا بڑا ظلم ہے اور سب سے بڑا انصاف اللہ تعالیٰ کی توحید کی شہادت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے: ﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ﴾ [ آل عمران : ۱۸ ] "اللہ نے گواہی دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔"

② وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: "مَسْجِدٍ" سے مصدر میمی، ظرف زمان اور ظرف مکان تینوں مراد ہو سکتے ہیں۔ مصدر میمی ہو تو اس کا معنی سجدہ بھی ہے اور نماز بھی، جیسے "رَكْعَةٌ" کا معنی رکوع بھی ہے اور نماز میں قیام، رکوع، قومہ، سجدہ اور قراءت وغیرہ کے مجموعہ کو بھی "رَكْعَةٌ" کہا جاتا ہے اور سجدہ بھی اور قیام بھی۔ یعنی جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے، تو معنی ہو گا ہر نماز میں۔ اگر مراد زمان ہو تو ہر سجدے یا نماز کے وقت اور مکان ہو تو ہر سجدے یا نماز کی جگہ اپنے رخ سیدھے کر لو، یعنی قبلہ کی طرف، یا جیسے اللہ کے رسول نے حکم دیا ہے اس طرح اپنے چہروں، یعنی اپنے آپ کو سیدھا کر لو اور ان کے بتائے ہوئے طریقے پر نماز پڑھو۔

③ وَ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: "الدِّيْنَ" کا معنی یہاں عبادت ہے، یعنی خالصتاً اس کی عبادت کرو اور اس کو پکارنے اور اس کی عبادت کرنے میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرو، مراد ریا سے بچنا ہے۔ الغرض اس آیت میں تین باتوں کا حکم دیا

فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

ایک گروہ کو اس نے ہدایت دی اور ایک گروہ، ان پر گمراہی ثابت ہو چکی، بے شک انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنالیا اور سمجھتے ہیں کہ یقیناً وہ ہدایت پانے والے ہیں ﴿۳۰﴾ اے آدم کی اولاد! ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ گزرو، بے شک وہ حد سے گزرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۳۱﴾

ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ جو عبادت شرک یا ممنوع چیزوں، مثلاً ننگے ہونے یا ریا وغیرہ پر مشتمل ہو وہ فواحش میں داخل ہے۔ (رازی) خلاصہ یہ کہ ہر عبادت کے لیے توحید، اتباع رسول اور اخلاص (ریا سے پاک ہونا) تینوں چیزیں ضروری ہیں، ورنہ وہ مردود ہو گی۔

④ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ: یعنی جس طرح تم پہلے کچھ نہ تھے، اللہ نے کسی مشکل کے بغیر تمھیں پیدا فرمایا، اسی طرح تمھارے مر جانے کے بعد وہ تمھیں دوبارہ نہایت آسانی سے زندہ کر دے گا اور جس طرح تم پیدا ہوئے تو تمھارے پاس کچھ نہ تھا اور بغیر ختنے اور لباس کے تھے، ایسے ہی دوبارہ زندہ ہوتے وقت ہو گے۔

آیت 30 ① فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ: ایک گروہ، یعنی مومنوں کو اس نے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق بخشی اور ایک گروہ، یعنی کافروں پر گمراہی ثابت ہو چکی۔

② اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ......: یعنی ان پر ضلالت اس لیے ثابت ہوئی کہ وہ شیاطین کے کہنے پر چلتے رہے اور سمجھتے یہ رہے کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔

آیت 31 ① خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ......: زینت سے مراد لباس ہے، یعنی طواف اور نماز میں پردے کی چیزوں کو چھپانا فرض ہے، مرد کے لیے کمر سے گھٹنوں تک (اور نماز میں اس کے ساتھ کندھے پر کچھ لباس کا ہونا) اور عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھوں کے سوا سارا بدن۔ باریک کپڑا جس سے بدن اور بال نظر آئیں معتبر نہیں، یعنی نہ ہونے کے برابر ہے۔ (موضح) البتہ جمعہ کے دن خاص طور پر غسل، خوش بو اور اپنے بہترین لباس پہننے کا حکم دیا۔ جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ سالانہ عیدیں ہیں، ان میں تو بدرجۂ اولیٰ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

② ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عورت بیت اللہ کا طواف ننگی ہو کر کرتی تھی اور کہتی کہ کون مجھے طواف کے لیے کپڑا دے گا، اس کو وہ شرم گاہ پر ڈال لیتی اور کہتی:

اَلْيَوْمَ يَبْدُوْ بَعْضُهٗ اَوْ كُلُّهٗ وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا اُحِلُّهٗ

"آج اس کا کچھ حصہ یا سارے کا سارا ظاہر ہو جائے گا اور اس میں سے جو ظاہر ہو گا میں اسے حلال نہیں کروں گی۔" [ مسلم،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟ کہہ دے یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں (بھی) ہیں، جبکہ قیامت کے دن (ان کے لیے) خالص ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں ﴿۳۲﴾

---

التفسير، باب في قوله تعالى : ﴿ خذوا زينتكم عند كل مسجد ﴾ : ۳۰۲۸ ] کئی مرد بھی ننگے طواف کرتے تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس حج (یعنی ۹ ہجری) میں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے پہلے ان کو امیر بنا کر بھیجا تھا، مجھے قربانی کے دن چند آدمیوں کے ہمراہ بھیجا کہ میں لوگوں میں اعلان کر دوں کہ اس سال کے بعد نہ کوئی مشرک حج کرے گا اور نہ کوئی شخص ننگا ہو کر طواف کرے گا۔ [ بخاري، الحج، باب لا يطوف بالبيت عريان...... : ۱۶۲۲ ]

③ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا...... : جب اوپر کی آیت میں قسط (عدل و انصاف) کا حکم دیا، تو دوسری چیزوں کے ساتھ لباس اور کھانے پینے میں بھی ''قسط'' کا حکم ہو گیا، اس لیے ان میں بھی اسراف سے منع فرما دیا۔ (کبیر) اسراف یہ ہے کہ آدمی حلال کو حرام ٹھہرا لے، جیسا کہ مشرکین کرتے تھے، یا اہل تصوف کرتے ہیں، یا حلال سے تجاوز کر کے حرام کھائے یا حرام کام میں خرچ کرے کہ یہ تھوڑا بھی اسراف ہے۔ اسراف، یعنی حد سے نکلنا کسی بھی چیز میں ناپسندیدہ ہے، خصوصاً کھانے پینے میں بے احتیاطی تو اکثر بیماریوں کی جڑ اور دنیا و آخرت دونوں میں نقصان دہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کھاؤ، پیو، پہنو اور صدقہ کرو بغیر اسراف کے اور بغیر تکبر کے۔'' [ بخاري، اللباس، باب قول الله تعالى : ﴿ قل من حرم زينة الله التي...... ﴾ قبل ح : ۵۷۸۳، تعليقًا ] جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور اپنی تہ بند پنڈلی تک اٹھاؤ، اگر نہیں مانتے تو ٹخنوں تک اور تہ بند لٹکانے سے بچو، کیونکہ یہ تکبر میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔'' [ أبو داؤد، اللباس، باب ما جاء في إسبال الأزار : ۴۰۸۴۔ ترمذی : ۱۷۸۳، و صححه الألباني ] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص تکبر سے اپنا کپڑا کھینچے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔'' [ بخاري، اللباس، باب قول الله تعالى : ﴿ قل من حرم زينة الله التي...... ﴾ : ۵۷۸۳، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] معلوم ہوا صرف تہ بند ہی نہیں کوئی بھی کپڑا جان بوجھ کر ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر اور حرام ہے، بے اختیار یا بے دھیانی میں لٹک جائے تو الگ بات ہے۔

مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''ابن آدم نے پیٹ سے برا کوئی برتن نہیں بھرا، ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں، اگر ضرور ہی کھانا ہے تو ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے ہے۔'' [ أحمد : ۱۳۲/۴، ح : ۱۷۱۹۱۔ ترمذی : ۲۳۸۰، صحيح ] ہاں زیادہ دیر کا بھوکا ہو تو زیادہ کھا سکتا ہے، جیسا کہ احادیث سے بعض مواقع پر ثابت ہے۔

**آیت 32** قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ...... : اس آیت میں ''زِيْنَةَ اللهِ'' سے عمدہ لباس اور وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے ﴿۳۳﴾

سے انسان کو حسن و جمال حاصل ہوتا ہے اور "الطَّيِّبٰتِ" سے عمدہ قسم کے لذیذ کھانے مراد ہیں۔ اس آیت میں ان لوگوں کی سخت تردید ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے ترک استعمال کو درویشی سمجھتے ہیں اور گھٹیا قسم کا کھانا کھانے اور لباس پہننے ہی کو بڑی نیکی سمجھتے ہیں اور ان صوفیوں کی بھی تردید ہے جو خود ساختہ وظیفے بتانے کے ساتھ ہی ہر جان دار کا اور جان دار سے حاصل ہونے والی چیز، مثلاً دودھ، گھی اور شہد کا کھانا منع کر دیتے ہیں اور اسے ترک حیوانات جلالی و جمالی کا نام دے رکھا ہے جو دراصل ہندو سادھوؤں اور جوگیوں کا مذہب ہے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کا اثر اس پر ظاہر ہو۔" [ ترمذی، الأدب، باب ما جاء أن الله يحب...... : ۲۸۱۹، و صححه الألبانی ] شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یعنی منع کام میں خرچ نہ کرے، باقی کھانا پینا سب روا ہے، جو نعمت ہے مسلمان کے واسطے پیدا ہوئی ہے، دنیا میں کافر بھی شریک ہو گئے، آخرت میں صرف انھی کے لیے ہے۔" مزید دیکھیے سورۂ احقاف (۲۰)۔

**آیت 33** قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ ...... : اوپر کی آیت میں یہ بیان فرمایا کہ لوگوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام کر رکھی تھیں، اب اس آیت میں اصل حرام چیزوں کو بیان فرما دیا۔ (رازی) "الْفَوَاحِشَ" یہ "فَاحِشَةٌ" کی جمع ہے اور انتہائی قبیح فعل کو کہتے ہیں۔ "الْاِثْمَ" سے تمام چھوٹے بڑے گناہ مراد ہیں اور شراب کو بھی "اِثْمٌ" کہہ لیتے ہیں اور "الْبَغْيَ" کے معنی لوگوں پر ظلم اور زیادتی کے ہیں۔ الغرض یہاں محرمات کی پانچ قسمیں بیان فرمائی ہیں اور وہ بھی "اِنَّمَا" کلمۂ حصر کے ساتھ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں ہے، حالانکہ بہت سی دوسری اشیاء کی حرمت بھی قرآن و حدیث میں مذکور ہے۔ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دراصل جنایات (جرائم، قصور، زیادتیاں) پانچ ہی قسم کی ہیں، پہلی نسب پر جنایت ہے، اس کا سبب زنا (اور اس سے ملتی جلتی چیزیں) ہے۔ "الْفَوَاحِشَ" سے یہی مراد ہے۔ دوسری عقل پر جنایت جس کے دوسرے معنی شراب نوشی کے ہیں اور "الْاِثْمَ" میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ تیسری عزت پر جنایت، چوتھی جان و مال پر جنایت اور "الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ" میں ان دونوں کی حرمت کی طرف اشارہ ہے۔ پانچویں دین پر جنایت اور یہ دو قسم کی ہے: ① توحید میں طعن کرنا جس کی طرف ﴿وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ﴾ سے اشارہ فرمایا ہے۔ ② اور بغیر علم کے اللہ کے ذمے بات لگانا اور فتویٰ دینا جس کی طرف ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ سے اشارہ فرمایا ہے۔ غرض کہ تمام

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں ﴿۳۴﴾ اے آدم کی اولاد! اگر کبھی تمھارے پاس واقعی تم میں سے کچھ رسول آئیں، جو تمھارے سامنے میری آیات بیان کریں تو جو شخص ڈر گیا اور اس نے اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور انھیں ماننے سے تکبر کیا، وہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۳۶﴾ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں لکھے ہوئے میں سے ان کا حصہ ملے گا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے آئیں گے، جو انھیں قبض کریں گے تو کہیں گے کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے؟ کہیں گے وہ ہم سے گم ہو گئے اور وہ اپنے آپ پر شہادت دیں گے کہ واقعی وہ کافر تھے ﴿۳۷﴾

جرائم اور جنایات میں یہ پانچ اصول کی حیثیت رکھتی ہیں اور باقی ان کی شاخیں اور ان کے تحت آنے والی چیزیں ہیں، اس بنا پر " اِنَّمَا" کے ساتھ حصر صحیح ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ (کبیر) یاد رہے کہ اللہ کے ذمے بات لگانے میں رسول اللہ ﷺ کے ذمے بات لگانا بھی شامل ہے، کیونکہ وہ اللہ ہی کی بات ہے، اسی لیے جو جان بوجھ کر ان پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ رازی رحمہ اللہ کے جواب کے لاجواب ہونے میں شک نہیں، مگر ایک سادہ جواب یہ ہے کہ "الْاِثْمَ" میں ہر گناہ آ جاتا ہے، اس لیے " اِنَّمَا" کے ساتھ حصر پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔

**آیت 34 تا 36** وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ...... : پہلی آیت میں بیان فرمایا کہ ہر ایک کے لیے ایک وقت مقرر ہے جو آگے پیچھے نہیں ہو سکتا، دوسری آیت میں بتایا کہ جو لوگ فرماں بردار ہوں گے مرنے کے بعد ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہو گا، مگر جو سرکش ہوں گے وہ سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اسی قسم کا خطاب سورۂ بقرہ میں آدم علیہ السلام کے قصے کے آخر میں بھی مذکور ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۸، ۳۹)۔

**آیت 37** ① فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا...... : اس کا تعلق اوپر کی آیت: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾ سے

قَالَ ادۡخُلُوۡا فِیۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ فِی النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتۡ اُمَّةٌ لَّعَنَتۡ اُخۡتَهَا ؕ حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَكُوۡا فِیۡهَا جَمِیۡعًا ۙ قَالَتۡ اُخۡرٰىهُمۡ لِاُوۡلٰىهُمۡ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوۡنَا فَاٰتِهِمۡ عَذَابًا ضِعۡفًا مِّنَ النَّارِ ۬ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعۡفٌ وَّ لٰكِنۡ لَّا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾

فرمائے گا ان جماعتوں کے ہمراہ جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے گزر چکی ہیں، آگ میں داخل ہو جاؤ۔ جب بھی کوئی جماعت داخل ہوگی اپنے ساتھ والی کو لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جس وقت سب ایک دوسرے سے آملیں گے تو ان کی پچھلی جماعت اپنے سے پہلی جماعت کے متعلق کہے گی اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا، تو انھیں آگ کا دگنا عذاب دے۔ فرمائے گا سبھی کے لیے دگنا ہے اور لیکن تم نہیں جانتے ﴿۳۸﴾

ہے، یعنی یہ دو قسم کے لوگ تو بہت ہی بڑے ظالم ہیں، پہلی قسم میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے یا اللہ کا شریک بنانے والے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف کسی حکم کی جھوٹی نسبت کرنے والے، (اس میں رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی بات کی جھوٹی نسبت کرنے والے بھی شامل ہیں) اور دوسری قسم میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو قرآن کے کتاب الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں، یا رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے منکر ہیں۔

2 **اُولٰٓئِكَ یَنَالُهُمۡ نَصِیۡبُهُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ**: یعنی اللہ تعالیٰ نے کتاب ''لوح محفوظ'' میں ان کا جو حصہ عمر، رزق، راحت یا رنج وغیرہ کا لکھا ہے وہ انھیں ملے گا اور ان کے ظلم اور بدکاری کے باوجود اس میں کمی نہیں کی جائے گی کہ شاید توبہ کر لیں، یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو انھیں ڈانٹتے ہوئے کہیں گے کہ کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ وہ تو ہم سے گم ہو گئے اور وہ اپنے آپ پر شہادت دیں گے کہ واقعی وہ کافر تھے۔ یہ آیت صریح نص ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی پکارنا، اس سے مدد مانگنا، فریاد کرنا، استغاثہ کرنا، اسے غوث یا مشکل کشا کہنا یا سمجھنا کفر ہے، خواہ وہ اللہ کے سوا کتنی بڑی ہستی کوئی فرشتہ یا رسول یا ولی ہو۔ قیامت کے دن وہ حضرات ان کو منہ بھی نہیں دکھائیں گے اور اللہ کے سوا کسی کو پکارنے والے خود اپنے آپ پر شہادت دیں گے کہ واقعی ہم کافر تھے اور ایمان سے محروم تھے۔ ایک دفعہ غیر اللہ کو پکارنے والوں سے گفتگو کے موقع پر مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ نے ندائے غیر اللہ کے کفر ہونے کی دلیل کے لیے یہ آیت پڑھی اور آخر گفتگو تک اسی پر قائم رہے۔ غیر اللہ کو پکارنے والوں میں سے کوئی بھی اس آیت کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ افسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایسی واضح آیات کے ہوتے ہوئے مسلمان کہلانے والے بعض علماء اور ان کے پیروکار غیر اللہ کو پکارتے ہیں، ان سے مدد طلب کرتے ہیں، کوئی '' یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَغِثْنِیْ '' کہتا ہے، کوئی یا علی مدد کہتا ہے، کوئی شیخ عبد القادر کو مدد کے لیے پکارتا ہے، پھر بھی ایسے لوگ اپنے آپ کو مسلمان اور موحدین کو کافر قرار دیتے ہیں۔ بہرحال قیامت کچھ دور نہیں ہے۔

آیت 38 **قَالَ ادۡخُلُوۡا فِیۡۤ اُمَمٍ** ...... : اس میں بھی کفار کی حالت کا بیان ہے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کفار

وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۳۹ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ۝۴۰

اور ان کی پہلی جماعت اپنی پچھلی جماعت سے کہے گی پھر تمھاری ہم پر کوئی برتری تو نہ ہوئی، تو عذاب چکھو اس کے بدلے جو تم کمایا کرتے تھے ۝۳۹ بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور انھیں قبول کرنے سے تکبر کیا، ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے اور ہم مجرموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ۝۴۰

ایک ساتھ جہنم میں نہیں جائیں گے، بلکہ ان میں سے کچھ پہلے جائیں گے، کچھ بعد میں جائیں گے۔ (رازی)

② كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا: "اُخْتٌ" کا معنی بہن ہوتا ہے، یعنی ہر بعد میں داخل ہونے والی امت اپنی پہلی ہم مذہب امت پر لعنت کرے گی جو اس سے پہلے جہنم میں داخل ہو گی، مثلاً یہودی دوسرے یہودیوں پر، دہریے دوسرے دہریوں پر، نصاریٰ دوسرے نصاریٰ پر، مشرکین اور ندائے غیر اللہ والے دوسرے مشرکین اور غیر اللہ کو پکارنے والوں پر۔

③ حَتّٰى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا: "ادَّارَكُوْا" اصل میں "تَدَارَكُوْا" ہے، یعنی ایک دوسرے کو آ ملیں گے۔

④ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ: یعنی جہنم میں بعد میں داخل ہونے والے پہلے داخل ہونے والوں کے بارے میں، یا پیروی کرنے والے عوام اپنے سرداروں اور پیشواؤں کے بارے میں کہیں گے۔

⑤ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا ...... : یعنی ہم تو اپنے ان پہلوں کی تقلید میں یا انھی کی باتوں میں آ کر ایمان کے بجائے شرک و بدعت اور منکرات کی راہ پر چلتے رہے، ہمیں گمراہ کرنے والے یہی ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ احزاب (۶۷، ۶۸)۔

⑥ لِكُلٍّ ضِعْفٌ: ہر ایک کے لیے ایک عذاب کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اگر خود گمراہ ہوئے تو پچھلوں نے ان کا کہا مانا اور خود غور و فکر نہ کیا، لہٰذا دونوں مجرم ہوئے اور دوگنا عذاب ہونے کی وجہ یہ کہ پہلوں نے انھیں گمراہ کیا تو انھوں نے بھی اپنے بعد والوں کو گمراہ کیا، لہٰذا دونوں دگنے عذاب کے حق دار ٹھہرے۔ رازی نے لکھا ہے کہ جہنم کا عذاب چونکہ مسلسل اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہو گا اور ایک دور کے بعد دوسرا دور شروع ہو جائے گا، اس اعتبار سے ہر ایک کے لیے "ضِعْفٌ" "دوگنا" قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نحل (۸۸) دونوں گروہوں کا ایسا ہی مکالمہ سورۂ سبا (۳۱، ۳۲) میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

آیت 39 فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ: یعنی اگر ہم مجرم و بدکار تھے تو تمھارا حال ہم سے کون سا بہتر تھا، تم نے بھی اپنی مرضی سے کفر کی روش اختیار کی اور اگر ہم نے تمھیں گمراہ کیا تھا تو تم نے بھی کتنے لوگوں کا بیڑا غرق کیا، اب تمھیں ہم پر کون سی برتری حاصل رہی؟

آیت 40 ① اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ...... : یہ پچھلی آیت میں مذکور وعید "پس چکھو عذاب ......" کی کچھ تفصیل

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ ٝ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا اور ان کے اوپر کے لحاف ہوں گے اور ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۱﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، ہم کسی شخص کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتے، یہ لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۴۲﴾

ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمانوں کے دروازے ہیں۔ بہت سی صحیح احادیث میں ان دروازوں کا ذکر موجود ہے۔ دروازے نہ کھولے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال اور دعا کے اوپر جانے کے لیے دروازے نہیں کھلتے اور یہ بھی کہ مرنے کے بعد ان کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے، جیسا کہ مومن کی روح کے اوپر چڑھنے کے لیے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث میں ہے کہ مومن کی روح اوپر چڑھتی ہے تو اس کے لیے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور فرشتے مرحبا کہہ کر اس کا استقبال کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ساتویں آسمان پر چلی جاتی ہے، مگر جب کافر کی روح آسمان تک پہنچتی ہے تو اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ...... ﴾ [ مسند أحمد : ۲۸۸/۴، ح : ۱۸۵۶۱ ]

② حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ : یہ ایک محاورہ ہے جو ایسے کام کے لیے بولا جاتا ہے جس کا ہونا ممکن ہی نہ ہو۔ نہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو سکے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں۔

**آیت 41** **لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ ......** : "**غَوَاشٍ**" یہ "غَاشِيَةٌ" کی جمع ہے، ڈھانپنے والے، یعنی ان کے نیچے اور اوپر آگ ہوگی۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۴، ۵۵) "**الظّٰلِمِيْنَ**" سے مراد یہاں مشرک ہیں، کیونکہ آیات کو جھٹلانا اور ان سے تکبر کرنا مسلمان کا کام نہیں۔

**آیت 42** **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ** : یہ جملہ کہ "ہم کسی شخص کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتے" جملہ معترضہ ہے، اس جملے کو بیچ میں لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جنت میں جانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو کام فرض کیے ہیں وہ انسان کی وسعت اور طاقت سے زیادہ نہیں کہ انسان کے لیے ان کا کرنا مشکل ہو، بلکہ سب اس کی وسعت کے مطابق ہیں کہ ان کا کرنا اس کے لیے آسان ہے، نیز وہ اتنے ہی بجا لانے فرض ہیں جتنی انسان میں طاقت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے بچ جاؤ اور جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اس میں سے اتنا بجا لاؤ جتنی تم میں طاقت ہو۔" [ بخاری، الاعتصام بالکتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : ۷۲۸۸، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

اوران کے سینوں میں جو بھی کینہ ہوگا ہم نکال دیں گے، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے، اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی، بلاشبہ یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے۔ اور انھیں آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے جس کے وارث تم اس کی وجہ سے بنائے گئے ہو جو تم کیا کرتے تھے ﴿۴۳﴾

آیت 43 ① وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ : ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اہل جنت کے اوصاف میں ایک لمبی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے دل ایک آدمی کے دل کی طرح ہوں گے، نہ ان میں کوئی اختلاف ہوگا نہ باہمی بغض۔'' [ بخاری، بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة و أنها مخلوقة : ۳۲۴۶ ]

دنیا میں اگر ان کے درمیان کوئی بغض تھا تو وہ صاف ہونے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن آگ سے بچ کر نکلیں گے تو انھیں جنت اور آگ کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا، پھر وہ ایک دوسرے سے ان زیادتیوں کا قصاص لیں گے جو دنیا میں ان سے ہوئیں، یہاں تک کہ جب وہ تراش خراش کروا کر بالکل صاف ستھرے ہو جائیں گے تو انھیں جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی۔'' [ بخاری، الرقاق، باب القصاص یوم القیامة : ۶۵۳۵، عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ ] سینوں میں موجود کینے میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کی باہمی رنجشیں بھی شامل ہیں، جو دنیا میں سیاسی یا دوسری وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئیں۔

② وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا ...... : یعنی یہ ہدایت جس سے ہمیں ایمان اور عمل صالح کی توفیق عطا ہوئی، پھر انھیں قبولیت کا شرف حاصل ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور اس کا فضل ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔

③ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ : یہ باء سببیہ ہے، باء عوض نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ یہ جنت میرے فضل سے تمھارے کسی عوض یا قیمت ادا کیے بغیر تمھیں بطور ہبہ دی جا رہی ہے، جیسا کہ میراث بغیر کسی عوض کے دی جاتی ہے اور تمھاری اس عزت افزائی کا سبب دنیا میں تمھارے اعمال صالحہ ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ''تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں ہرگز داخل نہیں کرے گا۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟'' فرمایا: ''نہیں، مجھے بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔'' [ بخاری، الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل : ۶۴۶۳ ] آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رحمت انسانی اعمال کی بنیاد پر ہوگی، یعنی اس کے اعمال صالحہ ہی رحمت کا سبب بنیں گے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۸)۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور جنت والے آگ والوں کو آواز دیں گے کہ ہم نے تو واقعی وہ وعدہ سچا پالیا ہے جو ہم سے ہمارے رب نے کیا تھا، تو کیا تم نے وہ وعدہ سچا پالیا جو تمھارے رب نے تم سے کیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿۴۴﴾ جو اللہ کے راستے سے روکتے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں ﴿۴۵﴾

آیت 44 وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ...... : جنتی جہنمیوں کی حسرت و ندامت بڑھانے کے لیے اور اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے اور انتقام لینے کے لیے ان سے یہ باتیں کہیں گے: ﴿ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۙ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ؕ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ [ المطففين : ٣٤ تا ٣٦ ] ”سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں، تختوں پر ( بیٹھے ) نظارہ کر رہے ہیں، کیا کافروں کو اس کا بدلہ دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟“ بالکل یہی الفاظ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مشرک مقتولین سے کہے تھے، چنانچہ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن قریش کے چوبیس سرداروں کے متعلق حکم دیا، تو انھیں بدر کے ایک نہایت گندے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ تیسرے دن آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر اس کی طرف چلے، کنویں کے کنارے پر جا کھڑے ہوئے، آپ کے صحابہ بھی ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں ایک ایک کا نام لے کر پکارنا شروع کیا: ”اے فلاں بن فلاں! اے فلاں بن فلاں! کیا تمھیں پسند ہے کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول کی بات مانی ہوتی؟ کیونکہ ہم نے تو جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا سچا پالیا، تو کیا تم نے بھی جو وعدہ تمھارے رب نے کیا تھا سچا پالیا؟“ تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”آپ ایسے لاشوں سے بات کر رہے ہیں جن میں جان ہی نہیں۔“ فرمایا: ”تم ان سے زیادہ وہ بات نہیں سن رہے جو میں انھیں کہہ رہا ہوں۔“ قتادہ نے کہا کہ اللہ نے انھیں زندگی دی، یہاں تک کہ انھیں ڈانٹنے، ذلیل کرنے، انتقام اور حسرت و ندامت کے لیے آپ کی بات سنوا دی۔ [ بخاری، المغازی، باب قتل أبی جهل : ٣٩٧٦ ]

آیت 45 ① الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... : یعنی اللہ کے راستے ( اسلام ) میں کجی تلاش کرتے ہیں اور اس میں شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو اس سے نفرت دلاتے ہیں، یا لوگوں کو دھمکی دے کر راہِ حق سے روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ راہ سیدھی راہ نہیں، صحیح راہ وہ ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔

② وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ: یعنی وہ ظالم جن میں یہ تین صفات ہوں گی کہ وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اللہ کی راہ میں کجی

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور (اس کی ) بلندیوں پر کچھ مرد ہوں گے، جو سب کو ان کی نشانی سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو آواز دیں گے کہ تم پر سلام ہے۔ وہ اس میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور وہ طمع رکھتے ہوں گے ﴿۴۶﴾

تلاش کرتے ہیں اور آخرت کا انکار کرتے ہیں ان پر لعنت کی ہے، ورنہ ہر فاسق پر لعنت نہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں بے انصاف ( ظالم ) فرمایا اکثر گناہوں پر لیکن لعنت نہیں کی مگر ایسوں پر۔ (موضح) مطلب یہ ہے کہ وہ بے دریغ ہر قسم کے برے اقوال و اعمال کا ارتکاب اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ آخرت کے منکر ہیں۔

آیت 46 ① وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ: جو جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار ہوگی، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ﴾ [ الحدید : ۱۳ ] یعنی جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان ایک دیوار بنا دی جائے گی، جس کے اندر کی طرف اللہ کی رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وآں مسمّٰی باعراف است۔'' یعنی اس دیوار کو ''اعراف'' کہا جاتا ہے۔ (فتح الرحمٰن)

② وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ: ''الْأَعْرَافِ'' یہ '' عُرْفٌ'' کی جمع ہے اور لغت میں ''عَرَفَ يَعْرِفُ مَعْرِفَةً'' پہچاننے کو اور '' عُرْفٌ'' بلند جگہ کو کہتے ہیں، کیونکہ بلند چیز ممتاز ہونے کی وجہ سے آسانی سے پہچانی جاتی ہے، اسی سے مرغ کی کلغی اور گھوڑے کی گردن کے بلند حصے کے بالوں کو '' عُرْفٌ'' کہتے ہیں، کیونکہ بلندی کی وجہ سے وہ پہچان میں ممتاز ہوتے ہیں، لہٰذا ''الْأَعْرَافِ'' سے مراد جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان دیوار کی بلندیاں ہیں، جہاں ٹھہرنے والوں کو ایک طرف جنتی اور دوسری طرف جہنمی لوگ نظر آئیں گے، اکثر مفسرین یہی فرماتے ہیں۔

③ يَعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰهُمْ: '' سِيْمَا '' کا معنی نشانی ہے، مثلاً جنتیوں کے چہرے سفید اور نورانی ہوں گے اور جہنمیوں کے کالے سیاہ، یا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے اعضاء چمک رہے ہوں گے۔ ''الْأَعْرَافِ'' میں کون لوگ ہوں گے، اس بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ قرطبی نے دس قول ذکر کیے ہیں، ان میں سب سے مشہور قول جسے جمہور مفسرین نے کثرت روایات کی بنا پر ترجیح دی ہے، یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی، اس لیے وہ بیچ میں دیوار پر ہوں گے۔ اس کا ایک قرینہ یہ جملہ بھی ہے: ﴿لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ﴾ ''وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور اس کی طمع رکھتے ہوں گے۔''

④ وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ: یعنی جنت میں جانے کی امید رکھتے ہوں گے، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اعراف والے

وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٤٨﴾

اور جب ان کی نگاہیں آگ والوں کی طرف پھیری جائیں گی تو کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ مت کر ﴿٤٧﴾ اور ان بلندیوں والے کچھ مردوں کو آواز دیں گے، جنھیں وہ ان کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے، کہیں گے تمھارے کام نہ تمھاری جماعت آئی اور نہ جو تم بڑے بنتے تھے ﴿٤٨﴾

ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، مگر امید رکھتے ہوں گے کہ انھیں آئندہ جنت نصیب ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اعراف والے ان لوگوں کو پکاریں گے جن کا جنتی ہونا ان کی علامات دیکھ کر معلوم ہو جائے گا، حالانکہ وہ ابھی حساب کتاب میں مشغول ہونے کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے۔ (ابن کثیر)

5 ابن کثیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب الاعراف سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو نافرمانی کرتے ہوئے ماں باپ کی اجازت کے بغیر چلے گئے اور اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے، اب انھیں جنت میں داخلے سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور آگ میں داخل ہونے سے انھیں اللہ کی راہ میں قتل ہونے نے روک دیا۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان روایات کے غیر معتبر ہونے کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ مرفوع روایات کی صحت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور ابن کثیر کی تخریج ''هداية المستنير'' میں ان تمام روایات کا غیر معتبر ہونا تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے۔

آیت 47 1 وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ : ''صُرِفَتْ'' مجہول کا صیغہ ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اعراف والے جنتیوں کی طرف تو شوق اور رغبت سے دیکھیں گے اور انھیں سلام کریں گے، مگر جہنمیوں کی طرف خود نگاہ اٹھانا بھی پسند نہیں کریں گے، بلکہ ان کی نگاہیں ان کی طرف پھیری جائیں گی، تاکہ انھیں عافیت کی قدر معلوم ہو۔ (المنار)

2 مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ : یعنی جہاں وہ اب ہیں یا آئندہ ہوں گے۔

آیت 48 1 يَعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ : کہ یہ جہنمی ہیں یا جن کو وہ دنیا میں پہچانتے ہوں گے۔

2 مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اہل نار میں سے اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال تھا، پھر اسے آگ میں ایک غوطہ دیا جائے گا، پھر کہا جائے گا: ''اے ابن آدم! تو نے کبھی کوئی آرام دیکھا تھا؟'' وہ کہے گا: ''نہیں، اللہ کی قسم! اے میرے رب!'' [ مسلم، صفات المنافقين و أحكامهم، باب صبغ أنعم أهل الدنيا في النار...... : ٢٨٠٧ ]

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡكُمۡ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ اَفِیۡضُوۡا عَلَیۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَهُمۡ لَهۡوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتۡهُمُ الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا ۚ فَالۡیَوۡمَ نَنۡسٰىهُمۡ كَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ یَوۡمِهِمۡ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۵۱﴾

کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ انھیں کوئی رحمت نہیں پہنچائے گا؟ جنت میں داخل ہو جاؤ، نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے ﴿۴۹﴾ اور آگ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ ہم پر کچھ پانی بہا دو، یا اس میں سے کچھ جو اللہ نے تمھیں رزق دیا ہے۔ وہ کہیں گے بے شک اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں ﴿۵۰﴾ وہ جنھوں نے اپنے دین کو دل لگی اور کھیل بنا لیا اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا تو آج ہم انھیں بھلا دیں گے، جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے اور جیسے وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۵۱﴾

**آیت 49** **اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ ......** : قریش کے کھاتے پیتے لوگ جب نبی ﷺ کے پاس غریب و نادار مسلمانوں کو دیکھتے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ان لوگوں کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت سے نوازے۔ اب اعراف والے جہنم میں ان لوگوں کو پہچان کر جو نادار مسلمانوں سے اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے، کہیں گے کہ دیکھو یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کوئی رحمت نہیں پہنچائے گا، دیکھ لو! اب یہ وہی ہیں جنھیں کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔

**آیت 50** **اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ**: جیسا کہ پہلے گزرا کہ جنت کی نعمتیں اہل ایمان کے لیے خالص ہوں گی، جنتی انھیں جواب دیں گے کہ جنت کا پانی اور رزق اللہ تعالیٰ نے کافروں پر حرام کر دیا ہے، لہٰذا ہم تم سے کوئی ہمدردی کا سلوک کر کے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اصحاب اعراف کے جنت میں داخل ہونے کے بعد کفار، یعنی جہنمی لوگ یہ فریاد کریں گے۔ (شوکانی)

**آیت 51** ① **فَالۡیَوۡمَ نَنۡسٰىهُمۡ ......** : آیت کے شروع میں کافروں کی علامات بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اپنے دین کو دل لگی اور کھیل بنا لیا اور انھیں دنیوی زندگی کی فراوانی اور خوشحالی نے آخرت کے بارے میں دھوکے میں رکھا اور انھوں نے آخرت کو بھلا دیا اور اسی نسیان کے نتیجے میں انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندے سے ملے گا اور فرمائے گا: ''اے فلاں! کیا میں نے یہ نہیں کیا کہ تجھے عزت بخشی؟ تجھے سردار بنایا؟ تیری شادی کی؟ تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ تابع کر دیے اور تجھے کھلا چھوڑ دیا کہ لوگوں کا سردار بنے اور ان کی آمدنی کا چوتھا حصہ ٹیکس

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کی بنا پر خوب کھول کر بیان کیا ہے، ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت بنا کر جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۵۲﴾ وہ اس کے انجام کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ جس دن اس کا انجام آ پہنچے گا تو وہ لوگ جنھوں نے اس سے پہلے اسے بھلا دیا تھا، کہیں گے یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے، تو کیا ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والے ہیں کہ وہ ہمارے لیے سفارش کریں، یا ہمیں واپس بھیجا جائے تو ہم اس کے برخلاف عمل کریں جو ہم کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا اور ان سے گم ہو گیا جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے ﴿۵۳﴾

لے؟'' وہ کہے گا: ''کیوں نہیں، اے میرے رب!'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تو تو نے یقین کیا کہ تو مجھ سے ملنے والا ہے؟'' وہ کہے گا: ''نہیں!'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''پھر میں بھی تجھے بھلا رہا ہوں جیسے تو نے مجھے بھلا دیا۔'' [ مسلم، الزھد والرقائق، باب الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر : ۲۹۶۸، عن أبی ھریرة رضی اللہ عنہ ] یہاں نسیان کا معنی چھوڑ دینا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بھولتا ہی نہیں، فرمایا: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى ﴾ [ طٰہٰ : ۵۲ ] ''میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ انھیں جہنم میں ڈال کر ان کی کوئی خبر نہیں لیں گے۔ یہاں بھلانے کے بدلے کو بھلانا فرمایا ہے، یعنی خواہ کتنا ہی پکاریں ان پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

② كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا: معلوم ہوا کہ دین کو لہو و لعب بنانے والے اور آیاتِ الٰہی کا انکار کرنے والے وہی ہوتے ہیں جو آخرت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو بھول جاتے ہیں اور دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔

آیت 52 وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ...... : یعنی یہ کفار یہ عذر نہیں کر سکتے کہ ہمیں معلوم نہ تھا، کیونکہ ہم نے ان کی طرف یہ کتاب بھیج کر ہر بات کھول کر بیان کر دی تھی اور ہمارا طریقہ ہی نہیں کہ پیغام پہنچائے بغیر عذاب دیں، فرمایا: ﴿ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ۱۵ ] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

آیت 53 ① هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ: تاویل کا معنی کسی چیز کی اصل حقیقت یا اس کا انجام ہے۔ اس میں جھٹلانے والوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ قرآن میں جس عذاب (دنیوی یا اخروی) کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، کیا وہ اس کے پیش آنے کا انتظار کر رہے ہیں؟

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے، جو تیز چلتا ہوا اس کے پیچھے چلا آتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے (پیدا کیے) اس حال میں کہ اس کے حکم سے تابع کیے ہوئے ہیں، سن لو! پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کا کام ہے، بہت برکت والا ہے اللہ جو سارے جہانوں کا رب ہے ﴿۵۴﴾

② يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ...... : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یعنی کافر راہ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں خبر ہے عذاب کی، ہم دیکھ لیں کہ ٹھیک پڑے (درست نکلے) تب قبول کر لیں۔ سو جب ٹھیک پڑے گی تو خلاصی کہاں ملے گی۔ خبر اس لیے ہے کہ آگے (پہلے) سے بچاؤ پکڑیں۔“ (موضح) یعنی جس انجام کے یہ منتظر تھے اس کے سامنے آ جانے کے بعد حق کا اعتراف یا دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی آرزو اور کسی سفارشی کی تلاش، یہ سب چیزیں بے فائدہ ہوں گی، وہ معبود بھی ان سے گم ہو جائیں گے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے، وہ ان کی مدد کر سکیں گے نہ سفارش اور نہ جہنم کے عذاب سے چھڑا سکیں گے۔

**آیت 54** ① اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ...... : ان چھ دنوں سے مراد دنیا کے چھ دن تو ہو نہیں سکتے، کیونکہ ان کا وجود سورج اور زمین سے ہے اور اس وقت سورج تھا نہ زمین۔ اب یا تو مراد ہزار سال کا وہ دن ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا: ﴿وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [ الحج : ۴۷ ] ”اور ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار سال کے برابر ہے، اس گنتی سے جو تم شمار کرتے ہو“ یا چھ ادوار مراد ہیں۔ قرآن مجید کی مختلف آیات پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر دور میں کون سی چیز بنائی گئی۔ دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۱۰) صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم الاحد (اتوار) سے خلق کی ابتدا ہوئی اور جمعہ کے دن پوری ہو گئی۔ (ابن کثیر، المنار) اللہ تعالیٰ چاہتا تو لفظ ”کُنْ“ سے ایک لمحے میں سب کچھ پیدا فرما دیتا، مگر اس کی حکمت کا تقاضا اسی طرح کرنے کا تھا جو اس نے کیا۔ بعض اہل علم نے اس سے اپنے کام بالتدریج کرنے کا استنباط فرمایا ہے۔

② ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: یہ جملہ قرآن میں سات مقامات پر آیا ہے۔ آٹھویں جگہ سورۂ طٰہٰ (۵) میں ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ہے۔ اس کے معنی عرش پر بلند ہونے کے ہیں۔ سلف صالحین نے بلا تاویل اللہ تعالیٰ کو عرش پر تسلیم کیا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ ”استواء“ کے معنی تو معلوم ہیں، مگر اس کی کیفیت ہماری عقل سے بالا ہے، اس کا اقرار عین ایمان ہے اور انکار کفر ہے۔ یہی مذہب چاروں اماموں کا ہے۔ پس صحیح عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری مخلوق سے الگ عرش پر ہے، تاہم

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اپنے رب کو گڑگڑا کر اور خفیہ طور پر پکارو، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا ۝ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت پھیلاؤ اور اسے خوف اور طمع سے پکارو، بے شک اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے ۝

اس کا علم و قدرت سب پر حاوی ہے۔ اہل السنہ کا یہی عقیدہ ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش آسمان و زمین پر محیط ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

3 **يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا**: یعنی رات کے بعد دن تیزی سے پہنچ جاتا ہے، کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔

4 **مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ**: یعنی اللہ تعالیٰ نے جو وقت اور راستہ ان کے لیے مقرر فرمایا ہے وہ اسی پر چلتے رہتے ہیں اور بال برابر اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتے۔

5 **اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ**: یعنی جس طرح خلق (پیدا کرنے) میں اس کا کوئی شریک نہیں، اسی طرح حکم بھی اسی کا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں، خواہ تکوینی حکم ہو جو ساری کائنات میں چلتا ہے، یا تشریعی، یعنی شریعت کا قانون جو اس نے اپنے بندوں کو ایک حد تک اختیار دے کر دیا ہے اور جس پر عمل کے مطابق جنت یا جہنم کی جزا یا سزا ملے گی۔

آیت 56،55 1 **اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً**: ان دو آیات میں چار حکم ہیں، پہلا یہ کہ دعا عاجزی سے گڑگڑا کر اور خشوع سے ہونی چاہیے اور دعا تنہائی میں کرنا مستحب اور بہتر ہے، کیونکہ اس سے ریا کو راستہ نہیں ملتا اور اخلاص میں خلل نہیں آتا۔

2 **اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ**: دوسرا یہ کہ حد سے بڑھنا اللہ تعالیٰ کو کسی صورت پسند نہیں۔ اس میں اللہ کے ساتھ شرک کرنا یا کسی پر ظلم کرنا بھی شامل ہے اور ایسی چیز کی دعا کرنا جو ناممکن ہو، مثلاً میں ہمیشہ زندہ رہوں، یا مجھے آخرت میں انبیاء کا مرتبہ حاصل ہو جائے، یا ایسی چیز کی دعا کرنا جس کے متعلق علم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا مانگنا پسند ہے، جیسے نوح علیہ السلام کی اپنے بیٹے کے لیے دعا بھی حد سے تجاوز تھا۔ اسی طرح چیخنا چلانا اور مسنون دعائیں چھوڑ کر مقفّٰی و مسجع کلام اور اشعار وغیرہ بھی حد سے تجاوز میں شامل ہیں۔ (شوکانی) ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ سفر کے دوران میں ہماری آوازیں تکبیر اور لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ بلند ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگو! اپنے آپ پر نرمی کرو (یعنی ذرا آہستہ پکارو)، کیونکہ تم کسی گونگے یا غائب کو نہیں پکار رہے، بلکہ جسے پکار رہے ہو وہ سننے والا ہے اور قریب بھی۔'' [ بخاری، الجهاد و السير، باب ما يكره من رفع الصوت في التكبير : ۲۹۹۲ ]

3 **وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا**: تیسرا یہ کہ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو، یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور شرک کے کام مت کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر اور گناہوں کا ارتکاب ہی ''فساد فی الارض'' ہے، فرمایا: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ﴾ [ الروم : ۴۱ ] ''خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا اس کی وجہ سے جو

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿57﴾

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مُردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں، پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿57﴾

لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔''

④ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا: چوتھا یہ کہ دعا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف بھی ہو اور دل میں دعا کی قبولیت کی طمع بھی، اسی طرح جہنم سے خوف بھی ہو اور جنت کی طمع بھی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یعنی اللہ پر دلیر مت ہو اور نا امید بھی مت ہو۔'' (موضح) طمع میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ انسان دعا کے بعد مایوس نہ ہو، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے اور جلدی یہ ہے کہ کہے میں نے اپنے رب سے دعا کی، مگر اس نے قبول نہ کی۔'' [ بخاری، الدعوات، باب یستجاب للعبد ما لم یعجل : ۶۳۴۰ ]

⑤ کئی صوفیا کہتے ہیں کہ دعا کسی طمع اور خوف کے بغیر محض رب کی رضا کے لیے ہونی چاہیے، حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ جنت کو جلا دوں اور جہنم کو بجھا دوں، تاکہ لوگ کسی خوف اور طمع کے بغیر اللہ کو یاد کریں۔ بعض کہتے ہیں کہ بس اللہ تعالیٰ مجھ پر راضی ہو جائے، پھر خواہ مجھے جنت میں بھیج دے یا جہنم میں پھینک دے۔ یہ بات کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے جنت کی دعا مانگتے اور جہنم سے پناہ مانگتے تھے۔ زیر تفسیر آیت بھی اس نظریے کے خلاف ہے اور دیگر بہت سی آیات بھی، مثلاً: ﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ [ السجدۃ : ۱۶ ] ''وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔'' درحقیقت یہ بات اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے بعض لوگوں نے جنت اور جہنم کو بے وقعت ٹھہرانے کے لیے بنائی ہے۔ جنت کی طمع اور جہنم سے خوف اللہ کی رضا سے الگ چیز نہیں ہے، بلکہ جنت اللہ کی رضا ہی سے حاصل ہوگی اور جہنم بھی اسی کے غضب کا نتیجہ ہے، جس سے بچنا بھی اس کی رضا ہی سے ممکن ہوگا۔

⑥ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ: اس میں ترغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اصل حق دار وہی ہیں جو احسان کرنے والے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری بہتر سے بہتر انداز میں بجا لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اعمالِ صالحہ پر دوام کرتے ہیں۔ ''قَرِيْبٌ'' یہ ''فَعِيْلٌ'' کے وزن پر ہے، جب یہ مسافت کے لیے آئے تو اس میں تذکیر و تانیث برابر ہوتی ہے اور اگر نسب کے لیے ہو تو بلا اختلاف ''قَرِيْبَةٌ'' بولا جاتا ہے۔ یعنی مذکر اور مؤنث میں تاء کے ساتھ فرق کیا جاتا ہے۔ (شوکانی)

آیت 57 ① وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ ......: ''بُشْرًا'' یہ ''بَشِيْرٌ'' کی جمع ہے، یہ وزن مذکر و مؤنث دونوں

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کی کھیتی اس کے رب کے حکم سے نکلتی ہے اور جو خراب ہے (اس کی کھیتی) ناقص کے سوا نہیں نکلتی۔ اس طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں جو شکر کرتے ہیں ﴿۵۸﴾

کے لیے آتا ہے، یعنی "مُبَشِّرَاتٌ" خوش خبری دینے والیاں۔ "رَحْمَتِهٖ" سے مراد یہاں بارش ہے۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۲۸) اور سورۂ روم (۴۶) "ثِقَالًا" یہ "ثَقِيلٌ" کی جمع ہے، یعنی پانی کی کثرت سے بھاری۔ "لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ" مردہ شہر، یعنی جس زمین میں کوئی پودا نہیں اور نہ چرنے کی کوئی چیز ہے۔

② كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى ...... : بارش کے ساتھ مردہ زمین کی زندگی کو آخرت میں مُردوں کو زندہ کرنے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے، یعنی جس ذات پاک نے مردہ زمین کو دم بھر میں زندہ کر دیا وہ انسانوں کو بھی ان کے مر جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر سکتی ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش نازل فرمائے گا جس سے لوگوں کے جسم اس طرح (زمین سے) اگ پڑیں گے جس طرح سبزی اگتی ہے۔" [ مسلم، الفتن و أشراط الساعة، باب ما بين النفختين : ۲۹۵۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

آیت 58 ① وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ ...... : یہی مثال مومن اور کافر و منافق کے دل کی ہے، جیسا کہ تابعین سے مروی ہے۔ (شوکانی) ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی مثال رحمت کی اس بارش کی ہے جو ایک زمین پر برسی، اس کے جو حصے زرخیز تھے انھوں نے پانی کو جذب کر لیا اور خوب گھاس اور چارا اگایا، بعض حصے سخت تھے، انھوں نے پانی کو روک لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دیا، چنانچہ انھوں نے خود پیا اور پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا اور اس کا ایک حصہ ایک اور ٹکڑے پر برسا جو محض چٹیل میدان تھے، انھوں نے نہ پانی روکا اور نہ کوئی سبزہ اگایا، یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین کو سمجھ کر اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا اور اس شخص کی جس نے نہ اس کے ساتھ سر ہی اٹھایا (نہ خود سمجھا) اور نہ اللہ کی وہ ہدایت قبول کی جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔" [ بخاری، العلم، باب فضل من علم و علّم : ۷۹ ]

② لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے پچھلی آیت میں بارش کے ساتھ زمین کو زندہ کرنے کی مثال مردوں کو زندہ کرنے کے لیے بیان فرمائی، اس سے مقصود نصیحت حاصل کرنا ہے، اس لیے وہاں "لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ" فرمایا۔ اس آیت کا موضوع وحی الٰہی کا علم، اس پر عمل اور دعوت کا فائدہ اٹھانا ہے جس پر شکر لازم ٹھہرتا ہے، اس لیے یہاں "لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ" فرمایا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾

بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، بے شک میں تم پر ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۵۹﴾ اس کی قوم میں سے سرداروں نے کہا بے شک ہم یقیناً تجھے کھلی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں ﴿۶۰﴾ اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں اور لیکن میں جہانوں کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں ﴿۶۱﴾

**آیت 59** **لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ**......: اوپر بیان فرمایا ہے کہ ہدایتِ الٰہی اور اس کی برکات سے فائدہ اٹھانے یا نہ اٹھانے میں لوگوں کی دو قسمیں ہیں، ایک پاکیزہ فطرت (طیب) جو ہدایتِ الٰہی اور اس کی برکات سے خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے علم و عمل سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، دوسرے وہ جو شرارت پسند اور بدفطرت ہوتے ہیں، یہ لوگ ہدایت کی بارش سے فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹا جھاڑیاں اور کانٹے بن کر نکل آتے ہیں اور ان کے دلوں کی زمین چونکہ شور ہوتی ہے، اس لیے ان پر رحمت کی بارش فائدہ بخش نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد اب یہاں سے تاریخی شواہد کے طور پر پہلی قوموں کے واقعات بیان کر کے گویا تاریخی ثبوت پیش کیا ہے کہ ہمیشہ سے لوگ دو قسم کے چلے آئے ہیں۔ (کبیر) نوح علیہ السلام چونکہ سب سے پہلے نبی مرسل تھے جو مشرک قوم کی طرف بھیجے گئے، جیسا کہ حدیث شفاعتِ کبریٰ (بخاری : ۴۷۱۲) اور بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انھی کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (سورۂ نوح میں مذکور بت) ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نیک لوگوں کے نام تھے، جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ان کی مجالس میں، جن میں وہ بیٹھا کرتے تھے، ان کے مجسمے نصب کر دو اور ان کے نام پر ان کے نام رکھ دو، یہاں تک کہ جب وہ نسل فوت ہو گئی اور علم مٹ گیا تو ان کی عبادت شروع ہو گئی۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ودا ولا سواعا ولا يغوث و يعوق ﴾ : ۴۹۲۰ ] تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح عراق میں آباد تھی، ان کا زمانہ ۳۸۰۰ تا ۲۸۰۰ قبل مسیح ہے، مگر اس زمانے کی صحت کی کوئی دلیل نہیں۔

**آیت 60** **قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ**......: کھلی گمراہی میں اس لیے کہ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر ہمیں ایک نئے دین (توحید) کی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں یہ بات قرآن نے نمایاں طور پر بیان فرمائی ہے کہ ان کی دعوتِ توحید کی مخالفت کرنے والوں میں امراء کا طبقہ ہر زمانے میں پیش پیش رہا ہے، کیونکہ انقلابی دعوت کا پہلا نشانہ یہی لوگ بنتے ہیں۔

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع

میں تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۶۲﴾ اور کیا تم نے عجیب سمجھا کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر ایک عظیم الشان نصیحت آئی، تاکہ وہ تمھیں ڈرائے اور تاکہ تم بچ جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۶۳﴾ پھر انھوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو کشتی میں اس کے ساتھ تھے، بچا لیا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ یقیناً وہ اندھے لوگ تھے ﴿۶۴﴾

---

آیت 62 وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ : کیونکہ میری طرف وحی آتی ہے اور تمھاری طرف وحی نہیں آتی۔ (شوکانی)

آیت 62 ① اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ ...... : تمام کافر اقوام کا اعتراض یہی تھا کہ ہمیں میں سے ایک شخص یعنی کوئی انسان رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ آج کل کے کئی کلمہ گو کہتے ہیں کہ جو نبی ہو وہ انسان کیسے ہو سکتا ہے؟ دونوں کی اصل مشکل ایک ہی ہے۔ نوح علیہ السلام کا جواب یہ تھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھاری طرف نصیحت بھیجی، تاکہ وہ نمونہ بنے، تمھیں خبردار کرے اور تم اللہ سے ڈرو اور تم پر رحم ہو جائے۔ فرشتے یا کسی اور مخلوق کو بھیجنے سے یہ مقصد کبھی حاصل نہ ہوتا۔

② وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ : اشارہ فرمایا کہ انبیاء کی دعوت قبول کر لینے سے دلوں میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور یہی تقویٰ آخرت میں رحمت کا سبب بنے گا۔ (رازی)

آیت 64 فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ...... : آخر مومنوں کو سفینے (بحری جہاز) میں اللہ تعالیٰ نے نجات دی اور مخالفین طوفان سے ہلاک ہو گئے۔ اہل تاریخ کا کہنا ہے کہ طوفان نوح کا تخمینی سال ۳۲۰۰ قبل مسیح ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کا یہ سفینہ تین منزلہ تھا، طول ۳۰۰ ہاتھ، عرض ۵۰ ہاتھ اور اونچائی ۳۰ ہاتھ، لیکن ان باتوں کی کوئی دلیل نہیں۔ تورات کے بیان کے مطابق یہ جہاز تقریباً پانچ ماہ چلتا رہا، مگر ہمارے پاس اس کی تصدیق یا تکذیب کا کوئی ذریعہ نہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں اور مختلف پہاڑوں پر ایک قدیم اور زبردست طوفان کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ قصۂ نوح کی تفصیل سورۂ نوح اور سورۂ ہود وغیرہ میں ہے۔ ان کا اندھا پن یہ تھا کہ حق نہ دیکھتے تھے نہ قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم نہیں ڈرتے؟ ﴿۶۵﴾ اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا، کہا بے شک ہم یقیناً تجھے بہت بڑی بے وقوفی میں (مبتلا) دیکھ رہے ہیں اور بے شک ہم یقیناً تجھے جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں ﴿۶۶﴾ اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں کوئی بے وقوفی نہیں اور لیکن میں سارے جہانوں کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں ﴿۶۷﴾ میں تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمھارے لیے ایک امانت دار، خیر خواہ ہوں ﴿۶۸﴾ اور کیا تم نے عجیب سمجھا کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر عظیم الشان نصیحت آئی، تاکہ وہ تمھیں ڈرائے اور یاد کرو جب اس نے تمھیں نوح کی قوم کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں قد وقامت میں زیادہ پھیلاؤ دیا۔ سو اللہ کی نعمتیں یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۶۹﴾

**آیت 65** **وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا:** عاد عرب کی ایک قدیم ترین قوم تھی جو جنوبی عرب میں آباد تھی۔ قرآن کے بیان کے مطابق ان کا مسکن ''احقاف'' کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور عمان کے درمیان واقع ہے اور اب ''ربع خالی'' کے نام سے مشہور ہے۔ یمن کا شہر حضرموت ان کا پایۂ تخت تھا۔ ان کا نسب یوں بیان کیا جاتا ہے، عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح۔ (ابن کثیر) مگر اس کی صحت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہود علیہ السلام کی قومِ عاد قرآن میں عادِ ارم یا عادِ اولیٰ کے نام سے مذکور ہے۔ حضرموت کے نزدیک ایک مقام پر ہود علیہ السلام کی قبر بتائی جاتی ہے۔ (المنار) مگر ملا علی قاری نے الموضوعات میں لکھا ہے کہ انبیاء میں سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ میں سے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں کے سوا کسی نبی یا صحابی کی قبر کا کوئی صحیح علم نہیں ہے۔

**آیت 66** **اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ:** ان کے نزدیک آباء کی تقلید میں شرک کرنا اور دوسری خرافات اختیار کرنا عین عقل مندی اور اس کی مخالفت بے وقوفی تھی۔

**آیت 69** **وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ** ...... یعنی تمھیں قوی اور زبردست بنایا اور قوم نوح کے

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اس اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس کی دھمکی تو ہمیں دیتا ہے وہ ہم پر لے آ، اگر تو سچوں میں سے ہے ۝ اس نے کہا یقیناً تم پر تمھارے رب کی طرف سے بھاری عذاب اور غضب آپڑا ہے، کیا تم مجھ سے ان ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، جن کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔ تو انتظار کرو، بے شک میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ۝

بعد ایک زبردست قوم کی حیثیت سے تمھیں زمین میں آباد کیا۔ یہاں "خُلَفَآءَ" سے یہی معنی مراد ہے، یہ مطلب نہیں کہ قوم نوح کے وطن عراق میں ان کا جانشین بنایا۔ (قرطبی) قوم عاد کے قد و قامت میں پھیلاؤ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود شہادت دی ہے، فرمایا: ﴿ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴾ [ الفجر : ۸ ] یعنی ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا اور یہ کہ عذاب کے بعد وہ یوں گرے ہوئے تھے جیسے کھجوروں کے گرے ہوئے تنے۔ دیکھیے سورۂ الحاقہ (۷)۔

بعض علمائے تفسیر نے قوم عاد کی جسمانی قوت اور ان کے قد و قامت کی لمبائی کے بارے میں عجیب و غریب روایات نقل کی ہیں، مثلاً یہ کہ قوم عاد کا لمبا آدمی سو ہاتھ کا اور سب سے چھوٹے قد کا ساٹھ ہاتھ کا ہوتا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ اس کا ایک آدمی اتنے بڑے پتھر کو اٹھا لیتا تھا جسے ہمارے زمانے کے پانچ سو آدمی بھی نہیں اٹھا سکتے وغیرہ۔ مگر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس کی صورت پر پیدا فرمایا کہ اس کا طول ساٹھ ہاتھ تھا...... پھر اس کے بعد سے اب تک یہ مخلوق گھٹتی رہی ہے۔'' [ بخاری، الاستئذان، باب بدء السلام : ۶۲۲۷ ] اس لیے قوم عاد سے متعلق اس قسم کی کہانیوں پر اعتماد جائز نہیں۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ عاد کے لوگ غیر معمولی جسمانی قوت اور قد و قامت رکھتے تھے، اونچی اونچی عمارتیں بنانے والے اور نہایت سخت گیر تھے، جیسا کہ سورۂ شعراء (۱۲۳ تا ۱۳۴) اور حم السجدہ (۱۵) میں مذکور ہے۔

آیت 71 ① اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ : کسی کو بارش کا، کسی کو ہوا کا، کسی کو دولت کا اور کسی کو بیماری کا خدا کہتے ہو، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی درحقیقت کسی چیز کا خدا نہیں ہے، یہ صرف نام ہی نام ہیں، ان کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔

② مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ : یعنی اس نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اپنی خدائی کے اس قسم کے اختیارات فلاں کی

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾
وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ

تو ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے، اپنی عظیم رحمت سے نجات دی اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ایمان والے نہ تھے ﴿۷۲﴾ اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح

---

طرف منتقل کر دیے ہیں اور فلاں کو مشکل کشا، فلاں کو گنج بخش، فلاں کو غوث، فلاں کو دستگیر اور فلاں کو داتا بنایا ہے، یہ اور اس قسم کے القاب لوگوں نے گھڑ کر ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیے ہیں جو شرک کا موجب بنے ہیں۔

**آیت 72** وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا...... : اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کے تباہ کیے جانے کی کیفیت تفصیل سے بیان فرمائی ہے، مثلاً سورۂ قمر (۱۸ تا ۲۰)، سورۂ ذاریات (۴۱، ۴۲) اور سورۂ حاقہ (۶ تا ۸) میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان خیز آندھی چلائی جو مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن چلتی رہی، وہ آندھی اس قدر تند و تیز تھی کہ جس چیز پر سے گزرتی اسے چورا کر ڈالتی، حتیٰ کہ اس نے انھیں پٹخ پٹخ کر ہلاک کر ڈالا، ان کی لاشیں اس طرح دکھائی دیتیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہیں۔ قرآن نے یہاں اور دوسرے مقامات پر بھی تصریح فرمائی ہے کہ عاد اولیٰ کا نام ونشان تک باقی نہ چھوڑا، فرمایا: ﴿ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴾ [ الحاقة : ۸ ] ”تو کیا تو ان میں سے کوئی بھی باقی رہنے والا دیکھتا ہے۔“ عرب مؤرخین نے بھی بالاتفاق ان کو عرب بائدہ (ہلاک ہو جانے والوں) میں شمار کیا ہے۔ صرف ہود علیہ السلام اور ان کے متبعین اس عذاب سے محفوظ رہے اور بقول بعض ان کی نسل ”عادِ ثانیہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ بعض آثارِ قدیمہ سے ان کے متعلق معلومات بھی ملتی ہیں۔

**آیت 73** ① وَاِلٰى ثَمُوْدَ : ثمود کا شمار بھی عرب کی قدیم ترین قوموں میں ہوتا ہے، عاد کے بعد سب سے مشہور قوم یہی ہے، اسی بنا پر بعض نے اسے ”عادِ ثانیہ“ بھی لکھ دیا ہے۔ ان کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی ”الحجر“ کے نام سے معروف ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر (۸۰) (ابن کثیر) بعض علماء کا کہنا ہے کہ ان کے علاقے میں پانی کی کمی کی وجہ سے ان کا نام ثمود پڑا، کیونکہ ”ثمد“ قلیل پانی کو کہتے ہیں۔ مدینہ اور تبوک کے درمیان شام کو جانے والی شاہراہ پر ایک شہر مدائن صالح کے نام سے مشہور ہے، یہی قوم ثمود کا صدر مقام تھا۔ سورۂ شعراء (۱۴۶ تا ۱۴۹) میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعمیری اور زرعی مہارت کا ذکر فرمایا ہے۔ وہاں اب بھی اچھی خاصی تعداد میں وہ عمارتیں پائی جاتی ہیں جو ثمود نے پہاڑوں کو تراش کر بنائی تھیں اور ان کے اردگرد بڑا وسیع میدان ہے جہاں وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کے پاس رکے تو آپ صحابہ کے ساتھ حجر میں ثمود کے گھروں کے پاس ٹھہرے، لوگوں نے ان کنوؤں سے پانی پیا جہاں سے ثمود پیتے تھے، اسی پانی کے ساتھ آٹا بھی گوندھا اور ہانڈیاں بھی پکا لیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو انھوں نے ہانڈیاں گرا دیں

مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

دلیل آ چکی۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے، سو اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے کسی برے طریقے سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ تمھیں ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ ﴿۷۳﴾

اور آٹا اونٹوں کو کھلا دیا، پھر آپ وہاں سے روانہ ہوئے اور اس کنویں کے پاس پڑاؤ ڈالا جس سے (صالح علیہ السلام کی) اونٹنی پانی پیتی تھی۔ آپ نے ان لوگوں کے گھروں میں جانے سے منع فرما دیا جن پر عذاب نازل ہوا تھا اور فرمایا: ''میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آ جائے جو ان پر نازل ہوا تھا، اس لیے ان کے گھروں میں نہ جاؤ۔'' [ أحمد : ۲/ ۱۱۷، ح : ۵۹۸۹۔ مسلم : ۲۹۸۰ ]

وہ کنواں اب بھی موجود ہے، مگر خشک ہو چکا ہے۔ (ابن کثیر) جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حجر میں اترے تو خطبہ دیا، فرمایا: ''لوگو! اپنے نبی سے آیات (معجزات) طلب مت کیا کرو، دیکھو صالح علیہ السلام کی قوم نے اپنے نبی سے سوال کیا کہ ان کے لیے اونٹنی بھیجے تو وہ اس پہاڑی درے سے آتی اور ان کا پانی پیتی جس دن اس کے پینے کی باری ہوتی اور وہ اس کا دودھ اتنا حاصل کرتے جتنا پانی سے سیراب ہوتے تھے۔'' [ مستدرك حاكم : ۲/ ۳٤۰، ح ۳۳۰٤۔ صححه الحاكم ووافقه الذهبی ] بعض سیاحت ناموں میں مذکور ہے کہ جس پہاڑی سے وہ اونٹنی بطور معجزہ برآمد ہوئی تھی اس میں اب تک شگاف موجود ہے۔ ابن کثیر نے اس چٹان کا نام ''الکاتبہ'' لکھا ہے۔ (البدایہ) مگر ہزاروں برس گزرنے کے بعد کسی پختہ دلیل کے بغیر کسی شگاف کو اونٹنی برآمد ہونے کی جگہ قرار دینا اندھیرے میں تیر چلانے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

② **اَخَاهُمْ صٰلِحًا:** حافظ بغوی رحمہ اللہ نے ان کا نسب نامہ یوں بیان کیا ہے، صالح بن عبید بن آسف بن ماشح بن عبید بن حاذر بن ثمود۔ (بغوی) اس سے آگے مزید بیان کیا جاتا ہے، عاثر بن ارم بن سام بن نوح۔ ثمود کے دو بھائی اور تھے جن کے نام پر طسم اور جدیس دو قبیلے مشہور ہیں۔ (ابن کثیر) مگر اس زمانے کے انساب کا درست ہونا یقینی نہیں، کیونکہ اس کا کوئی معتبر ذریعہ ہمارے پاس نہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی کنارے پر صالح علیہ السلام کی قبر موجود ہے جو آج بھی زیارت گاہِ خلائق ہے اور اسی جزیرے میں جبل موسیٰ کے قریب صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا نقش قدم معروف ہے، مگر جیسا کہ میں نے آیت (۶۵) میں ملا علی قاری سے نقل کیا ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی نبی کی قبر معلوم نہیں اور نقش قدم بنانے میں تو دیر ہی نہیں لگتی، ہاں کوئی پختہ ذریعۂ علم ہو تو الگ بات ہے اور وہ یہاں موجود نہیں۔

③ **هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ:** سورۂ شعراء (۱۴۸ تا ۱۵۹) میں مذکور ہے کہ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت و اطاعت کی اور فساد فی الارض سے بچنے کی دعوت دی تو انھوں نے آپ کو جادو زدہ اور اپنے جیسا انسان کہہ کر جھٹلا دیا، انھیں نبی تسلیم کرنے کے لیے کوئی معجزہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی بھیج دی جو عجیب معجزہ تھی کہ ایک دن وہ ان کا سارا پانی پیتی اور دوسرے دن ان کی اور ان کے جانوروں کی باری ہوتی۔ قرآن و حدیث

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور یاد کرو جب اس نے تمھیں عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں جگہ دی، تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو مکانوں کی صورت میں تراشتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ ﴿۷۴﴾ اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، ان لوگوں سے کہا جو کمزور گنے جاتے تھے، ان میں سے انھیں (کہا) جو ایمان لے آئے تھے، کیا تم جانتے ہو کہ واقعی صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا بے شک ہم جو کچھ دے کر اسے بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہیں ﴿۷۵﴾

---

میں یہ تفصیل نہیں کہ وہ اونٹنی کیسے نمودار ہوئی، مگر تواریخ و تفاسیر میں ہے کہ پہاڑی چٹان پھٹی اور اس میں سے وہ اونٹنی برآمد ہوئی۔ صالح علیہ السلام نے انھیں آگاہ کیا کہ اگر تم نے اس اونٹنی کو کوئی نقصان پہنچایا تو تمھیں بہت بڑا اور دردناک عذاب پکڑ لے گا، پھر ان کے ۹ بدمعاشوں نے صالح علیہ السلام اور ان کے اہل خانہ کو شب خون مار کر شہید کرنے کا منصوبہ بنایا، جس کی تفصیل سورۂ نمل (۴۸ تا ۵۳) میں ہے۔ آخر کار انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ہی ڈالا، پھر ان پر عذاب آ گیا جس کی تفصیل اس مقام پر اور سورۂ ہود، شعراء، نمل اور شمس وغیرہ میں مذکور ہے اور اپنے اپنے مقام پر آ رہی ہے۔ "نَاقَةُ اللّٰهِ" اگرچہ تمام اونٹنیاں بلکہ ساری کائنات ہی اللہ مالک الملک کی ہے، مگر اس اونٹنی کو خاص طور پر "اللہ کی اونٹنی" قرار دے کر اس کی عظمت اور معجزانہ شان کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جیسے تمام گھر اللہ کی ملکیت ہونے کے باوجود "بیت اللہ" اسی کو کہا ہے جو مکہ میں ہے۔

④ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : یعنی اگر اسے ستاؤ گے یا زخمی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب تم پر نازل ہو جائے گا۔

**آیت 74** ① تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا...... : یعنی ہموار علاقہ ہو تو اینٹوں سے عالی شان محل بنا لیتے ہو اور پہاڑ ہوں تو انھیں کھود اور تراش کر سردی، گرمی اور طوفان سے محفوظ مکان بنا لیتے ہو۔

② "اٰلَآءَ" یہ "اِلًی" کی جمع ہے جو اصل میں "اِلَيٌ" تھا، جیسے اَمْعَاءٌ (انتڑیاں) "مِعًی" کی جمع ہے۔ "وَلَا تَعْثَوْا" یہ "عَثِيَ يَعْثَى (س)" سے نہی کا صیغہ ہے، اس کا معنی سخت فساد کرنا ہوتا ہے، "مُفْسِدِيْنَ" تاکید کے لیے حال ہے، اس لیے ترجمہ میں "وَلَا تَعْثَوْا" کا معنی "دنگا نہ مچاؤ" اور "مُفْسِدِيْنَ" کا معنی "فساد کرتے ہوئے" کیا ہے۔

**آیت 75** ① اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ : ان کا یہ پوچھنا اپنے تکبر کے اظہار اور طنز کے لیے تھا۔

② اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ : یعنی ہمیں نہ صرف ان کے رسول ہونے پر یقین ہے، بلکہ ان کے دیے ہوئے ایک ایک حکم

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝

وہ لوگ جو بڑے بنے ہوئے تھے، انھوں نے کہا بے شک ہم جس پر تم ایمان لائے ہو، اس کے منکر ہیں (۷۶) تو انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکش ہو گئے اور انھوں نے کہا اے صالح! لے آ ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو رسولوں سے ہے (۷۷) تو انھیں زلزلے نے پکڑ لیا تو انھوں نے اس حال میں صبح کی کہ اپنے گھر میں گرے پڑے تھے (۷۸)

---

کے صحیح ہونے پر بھی یقین ہے۔

**آیت 77** ① **فَعَقَرُوا النَّاقَةَ ......** : اگرچہ اونٹنی کو ایک ہی شخص نے کاٹا تھا مگر چونکہ ان سب نے اسے مقرر کیا تھا اور وہ سب اس کی پشت پناہی کر رہے تھے، اس لیے سب ہی مجرم ٹھہرے اور سبھی پر عذاب آیا۔ سورۂ قمر میں ہے: ﴿ **فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ** ﴾ [ القمر : ٢٩ ] ''تو انھوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، سو اس نے (اسے) پکڑا، پس (اس کی) کونچیں کاٹ دیں۔'' علمائے تفسیر نے اس اشقیٰ ''سب سے بڑے بدبخت'' (شمس: ۱۲) کا نام قُدار بن سالف لکھا ہے۔ (واللہ اعلم)

② **وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ ......** : یعنی تو کہتا تھا کہ دیکھنا اس اونٹنی کو کسی برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگا بیٹھنا، ورنہ اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اب اگر واقعی رسول ہو تو وہ عذاب لے آؤ۔

**آیت 78** ① **فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ......** : سورۂ ہود (٦٥، ٦٦) میں ہے کہ صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا ہے تو انھیں تین دن کی مہلت دی، جب یہ مہلت پوری ہو گئی تو ان پر عذاب نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام اور آپ کے اہل ایمان ساتھیوں کو بچا لیا، ان کے سوا ساری قوم ہلاک ہو گئی۔ تفاسیر و احادیث میں ہے کہ ان میں سے صرف ایک شخص ابو رغال ان دنوں حرم میں مقیم تھا، وہ عذاب سے محفوظ رہا، لیکن جب وہ حرم چھوڑ کر طائف کی طرف روانہ ہوا تو وہ بھی ہلاک ہو گیا اور راستے میں دفن کر دیا گیا۔ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر فرمایا کہ راستے سے گزرنے والے اس کی قبر پر سنگ باری کرتے تھے۔ [ ابن حبان : ٤٦٣ ] جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے آسمان کے نیچے ان سب کو ہلاک کر دیا، صرف ایک شخص بچا جو حرم میں تھا۔'' پوچھا گیا: ''وہ کون تھا؟'' تو آپ نے فرمایا: ''وہ ابو رغال تھا، لیکن جیسے ہی وہ حرم سے نکلا عذاب نے اسے بھی پکڑ لیا۔'' [ مستدرک حاکم : ٢/ ٣٢٠، ح : ٣٢٤٨۔ أحمد : ٣/ ٢٩٦، ح : ١٤١٦٠ ] شعیب ارنؤوط اور اس کے ساتھیوں نے اس حدیث کو قوی کہا ہے۔

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَ قَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَ نَصَحۡتُ لَكُمۡ وَ لٰكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ ﴿۷۹﴾ وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۰﴾

تو وہ ان سے واپس لوٹا اور اس نے کہا اے میری قوم! بلاشبہ یقیناً میں نے تمھیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی اور لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے ﴿۷۹﴾ اور لوط کو (بھیجا)، جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے نہیں کی ﴿۸۰﴾

یہاں "الرَّجْفَةُ" (زلزلے) کا ذکر ہے، سورۂ ہود (۶۷) میں "الصَّيْحَةُ" (چیخ) کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم پر دو طرح کا عذاب آیا، اوپر سے صیحہ (چیخ) اور نیچے سے زلزلہ، یا وہ خوف ناک آواز یعنی چیخ زلزلے ہی کی تھی، جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ زلزلے کے ساتھ خوف ناک آواز بھی ہوتی ہے۔

② "جٰثِمِيْنَ" یہ "جُثُوْمٌ" سے اسم فاعل ہے، یہ انسان اور پرندوں کے لیے انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں اونٹوں کے لیے "بُرُوْكٌ" ہوتا ہے، یعنی سینے کے بل گرنے والے یا اپنی جگہ سے نہ ہل سکنے والے۔ یعنی وہ اپنے گھٹنوں پر منہ کے بل گرے ہوئے تھے، ان میں کوئی حرکت باقی نہ رہی۔ (طنطاوی)

**آیت 79** **فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ** : یہ اسی قسم کا خطاب تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مشرک مقتولین سے کیا تھا۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۴۳) کی تفسیر۔ دوسرے تمام انبیاء کے ذکر میں "رِسٰلٰتِ رَبِّيْ" جمع کا لفظ ہے اور یہاں "رِسَالَةَ رَبِّيْ" واحد ہے۔ بقاعی نے فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک ہی معجزہ تھا، یعنی اونٹنی۔ (نظم الدرر) (واللہ اعلم)

**آیت 80** ① **وَ لُوْطًا** : ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے بحفاظت نکل آئے تو لوط علیہ السلام ان پر ایمان لے آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے باوجود قوم کے ایمان نہ لانے پر عراق سے ہجرت اختیار فرمائی۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۲۶) ان کے ساتھ ان کی بیوی سارہ اور لوط علیہما السلام بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو سدوم والوں کی طرف مبعوث فرمایا، جو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا اور نہایت آباد اور زرخیز تھا۔

② **اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ** : اہل سدوم کو لوط علیہ السلام کی قوم اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ ان کی طرف مبعوث تھے، ورنہ وہ تو عراق سے آئے تھے، یا شاید ان کا ان سے سسرالی رشتہ ہوگا، کیونکہ اگر وہاں ان کا کوئی نسبی رشتہ ہوتا تو وہ اس بے چارگی کا اظہار نہ فرماتے جس کا ذکر سورۂ ہود (۸۰) میں ہے۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

بے شک تم تو عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت سے آتے ہو، بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو ﴿۸۱﴾ اور اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا انھیں اپنی بستی سے نکال دو، بے شک یہ ایسے لوگ ہیں جو بہت پاک بنتے ہیں ﴿۸۲﴾

**آیت 81** ① اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ: چھوٹے یا بے ریش لڑکوں کے بجائے مردوں کا لفظ ان کے فعل کی قباحت کے مزید اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ فعل بد تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا، جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں ہے: ﴿ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی تم دوہرے مجرم ہو، ایک اس فعل بد کی وجہ سے، دوسرے اس فعل بد کا آغاز کرنے کی وجہ سے۔ اب قیامت تک اس جرم کے ہر مرتکب کا گناہ اس کے ساتھ ساتھ قوم لوط کی گردن پر بھی ہوتا ہے۔

② شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ: یہ تیسرا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری خواہش نفس پوری کرنے کے لیے جو بیویاں بنائی ہیں انھیں چھوڑ کر مردوں سے خواہش نفس پوری کرتے ہو، یہ تمھاری فطرت مسخ ہونے کی دلیل ہے، پھر بیویوں سے حاجت پوری کرنے میں خواہش نفس پوری کرنے کے ساتھ بہت سی حکمتیں وابستہ ہیں، اولاد کی طلب، گھر کی رونق، دلی سکون، میاں بیوی کی باہمی دوستی کے ساتھ ایک دوسرے پر رحم اور شفقت۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۱)۔ جبکہ تمھارا مردوں کے پاس جانا صرف خواہش نفس پوری کرنے کے لیے ہے جو نہایت کمینگی کی بات ہے۔

③ مِنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ: سورۂ شعراء میں فرمایا: ﴿ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴾ [ الشعراء : ۱٦٦ ] ''اور انھیں چھوڑ دیتے ہو جو تمھارے رب نے تمھارے لیے تمھاری بیویاں پیدا کی ہیں، بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔'' یعنی تم نے اس خبیث فعل کی وجہ سے بیویوں کو چھوڑ رکھا ہے، تم اپنے آپ پر بھی زیادتی کر رہے ہو اور ان مردوں پر بھی جن سے یہ فعل کرتے ہو اور ان عورتوں پر بھی جو تمھاری بیویاں ہیں۔ ذرا غور کرو کہ اس عمل کا نتیجہ تمھاری بیویوں پر کیا مرتب ہوگا؟ ان کی کچھ اور زیادتیوں کا ذکر سورۂ عنکبوت (۲۹) میں بھی کیا گیا ہے۔ اس وقت امریکہ اور یورپ کی اقوام نے ہم جنس پرستی کو جائز قرار دے کر مرد کی مرد اور عورت کی عورت کے ساتھ شادی کو قانونی تحفظ دے رکھا ہے، اب ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں بھی اس فعل کو جرم نہ سمجھا جائے اور اس کے لیے وہ اپنے تمام وسائل استعمال کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حق پر قائم رہنے کی اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے کفار کی اللہ تعالیٰ سے علانیہ بغاوت کو کچلنے کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ اب اللہ تعالیٰ کا قانون آسمانی عذاب کے بجائے مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دینا ہے، فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [ التوبة : ١٤ ] ''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔''

**آیت 82** اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ: یعنی ان پاک باز لوگوں کا ہم گناہ گار و ناپاک لوگوں میں کیا کام؟ یہ بات انھوں

فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۸۳﴾ وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۸۴﴾ وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ

تو ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی بیوی، وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی ﴿۸۳﴾ اور ہم نے ان پر بارش برسائی، ایک زبردست بارش۔ پس دیکھ مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۸۴﴾ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں،

نے طنز اور تمسخر سے کہی اور ان کا جرم کیا بتایا کہ وہ گندگی میں آلودہ ہونے کا جرم کیوں نہیں کرتے، انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔ "یَتَطَهَّرُوْنَ" باب تفعل سے ہے جس کا ایک معنی تکلف بھی ہے، اس صورت میں ان کا کہنا طنز کے ساتھ بہتان بھی ہے کہ یہ لوگ پاک باز بنتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ پاک باز نہیں ہیں۔

**آیت 83** ① فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ: یعنی ہم نے لوط علیہ السلام اور اس کے گھر والوں کو عذاب سے بچا لیا، کیونکہ اس بستی میں یہی ایک گھر مسلم تھا۔ دیکھیے سورۂ ذاریات (۳۶)۔

② اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ ہم نے تمھاری بیوی کی خیانت و کفر کی وجہ سے اس کا پیچھے رہنا طے کر دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نمل (۵۷) اور سورۂ تحریم (۱۰) چنانچہ وہ ان لوگوں میں رہ گئی جو لوط علیہ السلام کے ساتھ نہیں نکلے، بلکہ اپنے علاقے ہی میں رہے، ان پر عذاب نازل ہوا تو وہ بھی ان کے ساتھ تباہ ہو گئی۔

**آیت 84** وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ......: "مَطَرًا" یہ "اَمْطَرْنَا" کی تاکید ہے اور تنوین اس کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے، یعنی ایک زبردست بارش۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بستی الٹ دی، اس لیے قرآن میں اس بستی اور اس کے ارد گرد کی بستیوں کو "الْمُؤْتَفِكَةَ" (نجم: ۵۳) یعنی الٹنے والی اور "الْمُؤْتَفِكٰتِ" (توبہ: ۷۰) کہا گیا ہے، پھر ان پر کھنگر والے تہ در تہ پتھروں کی بارش برسائی۔ (دیکھیے ہود: ۸۲) اور وہ علاقہ ایسا تباہ ہوا کہ اب تک آباد نہیں ہو سکا۔ ان پر عذاب کا باعث ان کے فعل بد اور اس پر اصرار کے ساتھ ساتھ پیغمبر کے ساتھ کفر اور استہزا تھا۔

**آیت 85** ① وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا: مدین کا علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا اور آج بھی اس علاقے میں ایک جگہ اسی نام سے مشہور ہے۔ شعیب علیہ السلام کا نسب نامہ امام نووی رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے، شعیب بن میکائیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیم۔ (المنار) مگر اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ شعیب علیہ السلام کو اہل مدین کا بھائی قرار دیا، کیونکہ وہ اس قوم سے تھے اور ان کا قبیلہ بہت زبردست تھا جس کی وجہ سے ان کے کفار آپ کو نقصان پہنچانے سے ڈرتے تھے، اس لیے انھوں نے کہا تھا: ﴿ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ﴾ [ هود : ۹۱ ] "اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم ضرور تمھیں سنگسار کر دیتے۔" شعیب علیہ السلام ہی کو اصحاب الایکہ کی طرف بھیجا گیا، مگر وہاں انھیں ان کا بھائی نہیں کہا گیا، فرمایا: ﴿ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ [ الشعراء : ۱۷۶، ۱۷۷ ]

اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَ الۡمِيۡزَانَ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِي الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ﴿۸۵﴾

بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آ چکی۔ پس ماپ اور تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو ﴿۸۵﴾

---

''ایکہ والوں نے رسولوں کو جھٹلایا، جب ان سے شعیب نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟'' اب بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی قوم کے نام ہیں اور ان پر دو قسم کے عذاب آئے، ایک ''عَذَابُ يَوۡمِ الظُّلَّةِ'' (شعراء: ۱۸۹) اور ایک ''الرَّجۡفَةُ'' (اعراف: ۹۱) اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ دو الگ الگ قومیں تھیں، اصحاب مدین پر ''الرَّجۡفَةُ'' (زلزلے) کا عذاب آیا اور اصحاب ایکہ پر ''يَوۡمِ الظُّلَّةِ'' کا عذاب آیا۔ (واللہ اعلم)

② قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ ...... : مدین والوں کا سب سے بڑا جرم اللہ کے ساتھ شرک تھا، شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے انھیں اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی اور ہر پیغمبر کی پہلی دعوت یہی تھی: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِيۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ﴾ [الأنبياء: ۲۵] ''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

③ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ : یعنی میرے سچا ہونے کی واضح دلیل تم دیکھ چکے ہو، لہٰذا ضروری ہے کہ جو بات میں کہتا ہوں اسے صحیح سمجھو۔ رازی نے فرمایا کہ یہاں ''بَيِّنَةٌ'' (واضح دلیل) سے مراد معجزہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کو کوئی نہ کوئی ایسا معجزہ دے کر بھیجا گیا جسے دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے اور مجھے جو (معجزہ) دیا گیا وہ وحی (قرآن و سنت) ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف فرمائی اور مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے۔'' [بخاري، فضائل القرآن، باب كيف نزل الوحي و أول ما أنزل: ۴۹۸۱۔ مسلم: ۱۵۲، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

مگر شعیب علیہ السلام کے معجزے کا قرآن کریم میں ذکر نہیں۔ زمخشری لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جو عصا یعنی لاٹھی تھی وہ شعیب علیہ السلام ہی نے انھیں عطا فرمائی تھی اور وہ دراصل شعیب علیہ السلام ہی کا معجزہ تھا۔ (کشاف) مگر موسیٰ علیہ السلام مدین کے جس بزرگ کے پاس ٹھہرے اور ان کے داماد بنے تھے، ان کے شعیب علیہ السلام ہونے کی کوئی دلیل نہیں، نہ ہی مدین کے کسی بزرگ کا ذکر کرنے پر بلا دلیل یہ سمجھ لینا درست ہے کہ وہ لازماً اللہ کے رسول شعیب علیہ السلام ہی تھے۔ قرآن مجید میں نہ ہر پیغمبر کا نام مذکور ہے نہ ہر نبی کا معجزہ۔ اتنا ہی کافی ہے کہ یقیناً شعیب علیہ السلام کوئی معجزہ لے کر آئے تھے، زیادہ کریدنے سے کچھ حاصل نہیں۔

④ فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم میں شرک کے ساتھ دوسری خرابی ماپ تول میں لیتے وقت زیادتی اور دیتے وقت کمی تھی، اگر کوئی ان کی اس زیادتی کے خلاف احتجاج کرتا تو مل کر اس کی بے عزتی کرتے اور اسے مارتے پیٹتے، جیسا کہ آج کل بھی عموماً ریڑھیوں والے ایسے موقع پر گاہک کے خلاف ایکا کر لیتے ہیں، اس لیے شعیب علیہ السلام نے انھیں سمجھایا

وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہر راستے پر نہ بیٹھو کہ دھمکاتے ہو اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو ہر اس شخص کو جو اس پر ایمان لائے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہو۔ اور یاد کرو جب تم بہت کم تھے تو اس نے تمھیں زیادہ کر دیا اور دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۸۶﴾ اور اگر تم میں سے کچھ لوگ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے اور کچھ لوگ ایمان نہیں لائے تو صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۸۷﴾

کہ ماپ تول ہر حال میں پورا کرو اور انبیاء اور صالحین کی محنت سے دنیا میں جو اصلاح ہوئی ہے اس کے بعد شرک اور بد دیانتی اور ان کے ساتھ پیدا ہونے والی برائیوں کے ذریعے سے اس میں فساد مت پھیلاؤ، کیونکہ ان دونوں سے اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی تلف ہوتے ہیں اور لوگوں کے بھی۔

⑤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: یعنی اگر تم مجھ پر ایمان لا کر شرک اور بد دیانتی ترک کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، کیونکہ کافر رہتے ہوئے یہ چیزیں چھوڑ بھی دو تو قیامت کے دن اس کا کچھ فائدہ نہیں

**آیت 86** وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ...... : یہ لوگ راستوں پر ناکے لگا کر لوگوں سے زبردستی ٹیکس وصول کرتے، کبھی ڈرا دھمکا کر ان کی بے عزتی کرتے اور ان کا سب کچھ ہی چھین لیتے۔ اگر کوئی شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے کی طرف مائل نظر آتا تو اسے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کرتے اور اسلام کے احکام میں طرح طرح کی خرابیاں نکال کر اور شبہات پیدا کر کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ سیدھا نہیں بلکہ غلط راستہ ہے، جیسا کہ آج کل بھی نام کے وہ مسلمان دانش ور، صحافی، پروفیسر اور حکمران جو کفار سے مرعوب ہیں اسلام کے احکام کو وحشیانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ شعیب علیہ السلام نے انھیں ان برائیوں سے روکا اور اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلایا کہ اس نے تمھاری تھوڑی سی نسل کو کس قدر بڑھایا اور انھیں مفسدین کے انجامِ بد سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین فرمائی۔

**آیت 87** فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ: یہ انھیں کفر پر صبر کا حکم نہیں بلکہ انھیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴾ [ التوبة : ۵۲ ] ''سو انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔''

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾

اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے کہا جو بڑے بنے ہوئے تھے، اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ہمراہ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور ہی نکال دیں گے، یا ہر صورت تم ہمارے دین میں واپس آ ؤ گے۔ اس نے کہا اور کیا اگرچہ ہم ناپسند کرنے والے ہوں؟ ﴿۸۸﴾

آیت 88 ① قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ : "اسْتَكْبَرُوْا" باب استفعال سے ہے، جس کا معنی عموماً طلب ہوتا ہے، یعنی وہ سردار بڑا بننے کے بہت خواہش مند تھے، گویا ان کی طلب ہی یہ تھی۔

② لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ : یعنی انھوں نے صرف جھٹلانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ نہایت بدتمیزی سے نام کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمھیں ہر صورت دو باتوں میں سے ایک اختیار کرنا ہوگی، یا ہم تمھیں اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا تمھیں پھر سے ہماری ملت، یعنی کفر و شرک میں پلٹنا ہوگا۔ اب تم سوچ لو کہ اپنے لیے ان میں سے کون سی بات پسند کرتے ہو؟

③ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ : "مَعَكَ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق "اٰمَنُوْا" سے ہو، یعنی جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، دوسرا یہ کہ اس کا تعلق "لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ" کے ساتھ ہو، یعنی تجھے اور تیرے ساتھ ان لوگوں کو بھی نکال دیں گے جو ایمان لائے ہیں۔ ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے اس کا تعلق "لَنُخْرِجَنَّكَ" کے ساتھ قرار دیا ہے۔

④ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا : "عَادَ یَعُوْدُ عَوْدًا" کے معنی کسی چیز کی طرف لوٹ آنے کے ہیں۔ شعیب علیہ السلام خود تو کبھی کفر و شرک میں مبتلا نہیں رہے، پھر ان کے دین میں لوٹ آنے کے کیا معنی ہوں گے؟ اگلی آیت میں شعیب علیہ السلام کے قول "اِنْ عُدْنَا" (اگر ہم تمھاری ملت میں پھر آ جائیں) اور "اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ" سے یہ اشکال اور قوی ہو جاتا ہے۔ علماء نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں، ایک یہ کہ نبوت سے پہلے شعیب علیہ السلام اگرچہ کفر و شرک سے اور نبوت کے منصب کے منافی ناپسندیدہ کاموں سے محفوظ تھے، مگر نبوت عطا ہونے سے پہلے عام طور طریقے میں اپنی قوم ہی کے ساتھ تھے۔ البتہ کفر، شرک اور گندے کاموں سے اجتناب کے باوجود مبعوث نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہتے تھے۔ جس سے ان کی قوم کے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے ہی دین پر ہیں۔ اس لیے انھوں نے "اَوْ لَتَعُوْدُنَّ" کہہ دیا، ورنہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ یا ان کا مطلب یہ تھا کہ پہلے کی طرح اب بھی خاموش ہو جاؤ، تو ہم تمھیں اپنا ہی سمجھ لیں گے۔ فرمایا، اب ہم پہلے کی طرح نہیں ہو سکتے۔ دوسرا یہ کہ ان کے اکثر ساتھی چونکہ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے ان سب کے ساتھ شعیب علیہ السلام کو بھی شامل کر دیا۔ اسے تغلیب کہتے ہیں، یعنی سب پر وہی الفاظ بول دیے جو اکثر پر صادق آتے تھے۔ شعیب علیہ السلام نے بھی انھی کے لہجہ میں "اِنْ عُدْنَا" اور "اَنْ نَّعُوْدَ" فرما دیا۔ تیسرا یہ کہ "عَادَ یَعُوْدُ" بعض اوقات "صَارَ یَصِیْرُ" کے معنی میں بھی آتا ہے، اسے "صَیْرُوْرَةٌ" کہتے ہیں، یعنی ابتداءً (پہلی بار) کسی چیز کو اختیار کرنا، معنی یہ کہ تم ہمارا دین اختیار کر لو گے۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

یقیناً ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا اگر ہم تمھاری ملت میں پھر آ جائیں، اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی اور ہمارے لیے ممکن نہیں کہ اس میں پھر آ جائیں مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو ہمارا رب ہے، ہمارے رب نے ہر چیز کا علم سے احاطہ کر رکھا ہے، ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا، اے ہمارے رب! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۸۹﴾

⑤ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ: یعنی اگر ہمیں دونوں باتیں ہی گوارا نہ ہوں تو کیا پھر بھی ہم ایک ضرور اختیار کریں گے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ سوال درحقیقت انکار کے لیے ہے۔

آیت 89 ① قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ...... : یہ ایک دوسرے طریقے سے جواب ہے، شعیب علیہ السلام عرب تھے اور عربوں میں شروع ہی سے جھوٹ سے شدید نفرت رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ نبی جو تمام دنیا کی طرف اور قیامت تک کے لیے تھا عربوں میں مبعوث کرنا اس لیے طے فرمایا کہ عرب اپنی تمام برائیوں کے باوجود کچھ اوصاف حمیدہ رکھتے تھے، دوسری قومیں ان کی طرح نہیں تھیں، ان میں سے ایک وصف سچ سے محبت اور جھوٹ سے نفرت تھی۔ اسی لیے ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں جھوٹ نہیں بولا کہ مکہ میں جا کر کوئی یہ نہ کہے کہ سردار نے جھوٹ بولا۔ اس لیے شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں تمھارے دین سے بچا کر توحید کا اعلان کرنے کی توفیق بخشی تو اب ہم پھر تمھارا دین اختیار کریں تو مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جھوٹ باندھا تھا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ پر! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

② وَمَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ ......: یعنی ہمارے لیے تمھارے دین کو اختیار کرنا ممکن ہی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، اس لیے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ اب ہم جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ دوبارہ تمھارا دین اختیار نہیں کریں گے، وہ بھی اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کی بنا پر کر رہے ہیں، کیونکہ ارادہ خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو اس کا پورا ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت پر موقوف ہے۔ اس استثنا سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شعیب علیہ السلام کو اپنے خاتمہ بالخیر میں شک تھا، بلکہ انھوں نے یہ بات صرف اپنی عاجزی کے اظہار اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنے کے لیے کہی ہے اور اس میں دوسرے مومنوں کو بھی شامل رکھا ہے۔ واحدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور امت کے اکابر ہمیشہ ہی برے انجام سے پناہ مانگتے رہے۔ خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾ [ إبراھیم : ۳۵ ] ”اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔“ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ تھی: (( يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ ))

وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

اور اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے کہا جنھوں نے کفر کیا بے شک اگر تم شعیب کے پیچھے چلے تو بے شک تم اس وقت ضرور خسارہ اٹھانے والے ہو ﴿۹۰﴾ تو انھیں زلزلے نے پکڑ لیا، تو انھوں نے اس حال میں صبح کی کہ اپنے گھر میں گرے پڑے تھے ﴿۹۱﴾ وہ لوگ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا گویا وہ اس میں بسے ہی نہ تھے، وہ لوگ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارہ اٹھانے والے تھے ﴿۹۲﴾

"اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" [ ترمذی، الدعوات، باب یا مقلب القلوب ...... : ۳۵۲۲، عن أم سلمة رضی اللہ عنہا و صححه الألبانی ] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ بطور فرض ہو، یعنی تمھارے جبر و اکراہ سے تو ہم کفر اختیار نہیں کر سکتے، ہاں! (بالفرض) اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی یہ ہو تو دوسری بات ہے۔

③ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا: یعنی ہم ایمان پر استقامت کے لیے اپنی قوت پر نہیں بلکہ صرف اللہ پر بھروسا کرتے ہیں۔ "عَلَى اللّٰهِ" کو پہلے لانے سے حصر کا معنی پیدا ہو گیا۔

④ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا ......: "فَتَحَ" کا معنی واضح فیصلہ ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو اپنے ماننے والوں ہی کے حق میں ہو گا، یعنی انکار اور ضد پر اڑے ہوئے ان مشرکین کے مقابلے میں ہماری مدد فرما کر ہمارے حق پر ہونے اور ان کے باطل پر ہونے کو خوب واضح کر دے۔

آیت 90 اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ: یعنی شعیب علیہ السلام کی پیروی کی صورت میں تم یقیناً خسارہ اٹھاؤ گے کہ اپنے آبائی دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے اور جن ناجائز ذرائع سے دولت کما رہے ہو ان کو بھی ترک کرنا پڑے گا۔ یہ بات شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرداروں تک محدود نہیں بلکہ ہر زمانے میں دنیا پرستوں نے اخلاق و دیانت کے اصولوں کی پابندی سے یہی خطرہ محسوس کیا ہے اور ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ تجارت اور دیگر بنیادی معاملات بددیانتی، دغا بازی اور سود خوری کے بغیر نہیں چل سکتے اور سمجھتے رہے ہیں کہ سچی اور صاف بات کہنے سے کاروبار تباہ ہو جاتے ہیں۔

آیت 91 فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ......: ان پر عذاب دونوں طرح سے آیا، یعنی "الرَّجْفَةُ" (زلزلہ) بھی، جیسے یہاں مذکور ہے اور "الصَّيْحَةُ" (چیخ) بھی، جیسا کہ سورۂ ہود (۹۴) میں ہے۔ "جٰثِمِيْنَ" کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۷۸) کے حواشی۔

آیت 92 كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا: "غَنِيَ يَغْنَى (س)" کا معنی ہے کسی جگہ رہنا، یعنی وہ جو شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بستی سے نکالنے کے درپے تھے وہ خود اس طرح ہو گئے جیسے وہ کبھی اس میں رہے ہی نہیں تھے اور انھیں خسارے سے ڈرانے والے خود ہی خسارا اٹھانے والے ہو گئے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

پھر وہ ان سے واپس لوٹا اور اس نے کہا اے میری قوم! بلاشبہ یقیناً میں نے تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی، تو میں نہ ماننے والے لوگوں پر کیسے غم کروں ﴿۹۳﴾ اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس کے رہنے والوں کو تنگی اور تکلیف کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ گڑ گڑائیں ﴿۹۴﴾ پھر ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوشحالی بدل کر دے دی، یہاں تک کہ وہ خوب بڑھ گئے اور انھوں نے کہا یہ تکلیف اور خوشی تو ہمارے باپ دادا کو (بھی) پہنچی تھی۔ تو ہم نے انھیں اچانک اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ سوچتے نہ تھے ﴿۹۵﴾

آیت 93 فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ: یعنی بے شک تم میرے عزیز تھے، مگر جب تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا تو کافروں کی ہلاکت پر میں کیسے غم کروں۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۷۹) کے حواشی۔

آیت 94 ① وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ ......: اس سے پہلے بعض انبیاء، نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب ؑ کے اپنی اقوام کے ساتھ گزرے ہوئے چند واقعات کے ذکر کے بعد اور آگے موسیٰ ؑ کے فرعون اور بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آنے والے مفصل واقعات سے پہلے درمیان میں مختصر طور پر تمام انبیاء اور ان کی اقوام کا ذکر فرمایا۔ مقصود رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا اور کفار کو خبردار کرنا ہے۔

② بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ: "بِالْبَاْسَآءِ" سے مراد اموال میں پہنچنے والی مصیبت، مثلاً فقر و فاقہ اور قحط وغیرہ اور "الضَّرَّآءِ" سے مراد انسانی بدن کو نقصان پہنچانے والی اشیاء، مثلاً بیماری، مصائب اور جنگ وغیرہ۔

③ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ: یعنی جب بھی ہم نے کسی بستی کی طرف کوئی نبی بھیجا اور وہ اس پر ایمان نہ لائے تو ہم نے ان کی نصیحت کے لیے بڑے عذاب سے پہلے کم تر عذاب بھیجے جو جنگ، تنگ دستی، قحط یا بیماری اور دوسرے مصائب کی صورت میں تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی شامت اعمال سے آگاہ ہو کر ہمارے سامنے عجز کا اظہار کریں اور سیدھی راہ پر آ جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [ السجدة : ۲۱ ] "اور یقیناً ہم انھیں قریب عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔"

آیت 95 ① ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ ......: "عَفَوْا" یہ "عَفَا يَعْفُوْ" سے ماضی معلوم جمع مذکر غائب ہے، معنی ہے "بڑھ گئے۔" باب افعال کا معنی "بڑھانا" ہے، جیسا کہ فرمایا: (( أَعْفُوا اللِّحَى )) [ بخاري، اللباس، باب إعفاء اللحى :

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور اگر واقعی بستیوں والے ایمان لے آتے اور بچ کر چلتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے بہت سی برکتیں کھول دیتے اور لیکن انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے انھیں اس کی وجہ سے پکڑ لیا جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۹۶﴾

۵۸۹۳] ''ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ۔'' مگر جب انھوں نے ایسا نہ کیا تو ہم نے بدحالی کی جگہ انھیں خوش حالی دے کر واپس پلٹنے کا موقع دیا، انھیں قحط کے بجائے ارزانی اور بیماری کے بجائے تندرستی عطا فرمائی، آبادی ان کی خوب بڑھ گئی اور مال و دولت کی ریل پیل ہوگئی، تو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے رب کے رسول پر ایمان لے آنے کے بجائے پہلی سختی کو بھول گئے اور ان نعمتوں کی بھی قدر نہ کی اور کہنے لگے، اگر ہم قحط اور دوسری مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو محض زمانے کی گردش کی وجہ سے ہوئے ہیں نہ کہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے۔ دنیا میں ایسے ہوتا ہی رہتا ہے، موسم کے تغیر سے حالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی بیماری اور کبھی تندرستی، کبھی خوش حالی اور کبھی بدحالی وغیرہ۔ یہ حالات ہمیں کو نہیں بلکہ ہمارے باپ دادا کو بھی پیش آتے رہے ہیں، مگر جلد ہی ٹلتے بھی رہے ہیں، اس قسم کے حالات پیش آنے میں انسانوں کے اعمال کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایسی توجیہات اب بعض مسلمان بھی کرنے لگے ہیں۔

② فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ: یعنی جب اللہ تعالیٰ کو اس طرح فراموش کر بیٹھے تو یکا یک اللہ کا غضب نازل ہوا اور ایسا عذاب آیا کہ آن کی آن میں سب نیست و نابود ہو گئے۔ ان قوموں کے بعد فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آ رہا ہے، فرعون کی قوم پر تنگی اور تکلیف کی گرفت متعدد بار آئی، مثلاً طوفان، جراد اور قمل وغیرہ، مگر انھوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو پہلی قوموں کی طرح اچانک عذاب آیا اور سمندر میں غرق کر دیے گئے۔ اس کے برعکس مومنین خوش حالی میں شکر اور تنگ دستی میں صبر کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ بھی خوب ہے، کیونکہ اس کا سارا معاملہ بہترین ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔'' [ مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹ ] اس آیت کی تشریح میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بندے کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی ہے تو امید ہے توبہ کرے اور جب گناہ راست (موافق) آ گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کا بھلاوا ہے، پھر ڈر ہے ہلاک (ہونے) کا، جیسے زہر کھایا، اگل دے تو امید ہے اور اگر پچ گیا (ہضم ہوگیا) تو کام آخر ہوا۔'' (موضح)

آیت 96 ① وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا ...... : اگر واقعی بستیوں والے ایمان لاتے اور اللہ کی حدود کی پابندی کرتے تو اس ایمان اور تقویٰ کا نتیجہ ان انعامات کی شکل میں پاتے کہ......! اور ایمان اور تقویٰ اختیار نہ کرنے کا نتیجہ عذاب الٰہی کی صورت میں نکلتا ہے کہ وہ برکات سے محروم ہو کر عذاب سے دو چار ہوتے ہیں۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

تو کیا بستیوں والے بے خوف ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان پر راتوں رات آ جائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں ﴿۹۷﴾ اور کیا بستیوں والے بے خوف ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان پر دن چڑھے آ جائے اور وہ کھیل رہے ہوں ﴿۹۸﴾ پھر کیا وہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں، تو اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۹۹﴾ اور کیا اس بات نے ان لوگوں کی رہنمائی نہیں کی جو زمین کے وارث اس کے رہنے والوں کے بعد بنتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں سزا دیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں تو وہ نہیں سنتے ﴿۱۰۰﴾

---

② لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ: "بَرَكٰتٍ" "بَرَكَةٌ" کی جمع ہے، کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہونا۔ اصل میں "بَرَكَةٌ" حوض کو کہتے ہیں، جس طرح حوض میں پانی جمع ہوتا ہے، اسی طرح کسی چیز میں بہت سی خیر موجود ہونا "بَرَكَةٌ" کہلاتا ہے۔ راغب نے فرمایا: "چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر اس طرح آتی ہے کہ آتے ہوئے نہ اس کا احساس ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی شمار ہوتا ہے، اس لیے اگر کسی شخص یا چیز میں محسوس نہ ہونے والی بہتری کا مشاہدہ ہو رہا ہو تو کہتے ہیں کہ وہ مبارک ہے اور اس میں برکت ہے۔" (طنطاوی)

"برکتیں کھول دیتے" یہ استعارہ ہے کہ جس طرح دروازہ کھل جاتا ہے اس طرح ان پر برکات کا نزول ہوتا، یعنی آسمان سے بارش اور رحمتوں کی صورت میں اور زمین سے پانی زرعی اجناس (غلے اور پھل) اور زمین سے نکلنے والی بے شمار نعمتوں، مثلاً پٹرول، گیس، سونا، چاندی اور جواہرات وغیرہ کی صورت میں۔

**آیت 98،97** اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى ...... : یعنی اللہ کا عذاب ان کے بے خبر سونے کی حالت میں بھی آ سکتا ہے اور عین دوپہر جاگتے ہوئے مصروفیت کی صورت میں بھی آ سکتا ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ دن ہو تو اس کا مقابلہ کر لیں گے۔ (بقاعی)

**آیت 99** فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ ......: اللہ تعالیٰ کے مکر (خفیہ تدبیر) سے مراد کسی شخص کے خلاف ایسی خفیہ تدبیر کرنا ہے کہ جب تک وہ عین اس کے سر پر نہ پہنچ جائے اسے کوئی ہوش نہ آئے اور نہ کچھ پتا ہی چلے کہ اس کی شامت آنے والی ہے، یہ خفیہ تدبیر چونکہ کافروں کے مکر و فریب کے جواب میں ہوتی ہے یا اس کی سزا دینے کے لیے کی جاتی ہے، اس لیے اسے بھی بطور مجانست "مکر" کہہ دیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۵)۔

**آیت 100** ① اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ......: یعنی کیا بعد میں آنے والوں کو پہلوں کے حالات سن اور

تِلۡكَ الۡقُرٰى نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِهَا‌ ۚ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ‌ ۚ فَمَا كَانُوۡا لِيُـؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ‌ ؕ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۱﴾

یہ بستیاں ہیں، ہم تجھ سے ان کے کچھ حالات بیان کر رہے ہیں اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے، تو وہ ایسے نہ تھے کہ اس چیز کو مان لیتے جسے وہ اس سے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے ﴿۱۰۱﴾

دیکھ کر یہ بات واضح طور پر معلوم نہیں ہوئی اور انھیں اس سے رہنمائی حاصل نہیں ہوئی کہ ہم چاہیں تو ان کی طرح ان کو بھی ان کے گناہوں میں پکڑ لیں۔

② **وَنَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ:** یعنی ہم ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں تو وہ نصیحت کی کوئی بات نہیں سنتے، آخر کار اللہ کا عذاب آتا ہے اور وہ بھی تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس فقرے کا یہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا جب اسے " **اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ** " پر معطوف نہ مانا جائے (بلکہ نیا کلام مانا جائے) اور اگر اسے " **اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ** " پر معطوف مانا جائے (اور ہمارے خیال میں زیادہ صحیح یہی ہے) تو ترجمہ یوں ہوگا: ''اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیں کہ پھر وہ نصیحت کی کوئی بات نہ سن سکیں۔'' مگر ابن عاشور صاحب ''التحریر والتنویر'' اور محیی الدین الدرویش صاحب ''اعراب القرآن'' نے اس معنی کی تردید کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کا عطف '' **بِذُنُوۡبِهِمۡ** '' پر مانا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے دل پر مہر کر دیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک مہر نہیں لگائی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، اس لیے '' **وَنَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ** '' نیا کلام ہے، اس کا عطف '' **بِذُنُوۡبِهِمۡ** '' پر درست نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین کے کسی حصے میں آباد فرماتا ہے انھیں ہر آن اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور یہ جانتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی چاہیے کہ اگر ظلم و فساد کا ارتکاب کریں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں بھی اسی طرح تباہ کر دے گا جس طرح اس نے پہلی امتوں کو تباہ کر دیا۔ پہلی امتوں پر جو تباہی آئی وہ ناگہانی حادثہ نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ سزا تھی۔

**آیت 101** ① **تِلۡكَ الۡقُرٰى......** : یہاں " **الۡقُرٰى** " سے مراد گزشتہ پانچ اقوام (قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب) کی بستیاں ہیں۔ آپ کو ان کے کچھ حالات سنانے کا مقصد یہ ہے کہ کفار مکہ جو ان بستیوں میں رہنے والوں کی طرح آپ کی مخالفت کر رہے ہیں، عبرت حاصل کریں۔

② **فَمَا كَانُوۡا لِيُـؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ:** یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے رسولوں کے پاس اپنے سچا ہونے کے دلائل نہیں تھے، یا وہ دلائل اتنے واضح اور روشن نہیں تھے کہ قائل کر سکیں، بلکہ اس کا سبب ان کی قوم کا پہلے سے طے کر لینا تھا کہ ہم نے ماننا ہی نہیں۔ اب پہلے جھٹلا دینے کے بعد وہ ایمان لے آتے تو ان کی جھوٹی عزت نفس پر حرف آتا

وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور ہم نے ان میں سے اکثر کا کوئی بھی عہد نہیں پایا اور بے شک ہم نے ان کے اکثر کو فاسق ہی پایا﴿۱۰۲﴾ پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا تو انھوں نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ پھر دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا؟﴿۱۰۳﴾

تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴾ [ البقرۃ : ۲۰۶ ] ”اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اس کی عزت اسے گناہ میں پکڑے رکھتی ہے، سو اسے جہنم ہی کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے۔“ یہی گناہ (یعنی دلائل دیکھنے کے باوجود پہلے ہی جھٹلا دینا اور اس پر اصرار کرنا) ان کے دلوں پر مہر کا باعث بن گیا، دیکھیے سورۂ انعام (۱۰۹، ۱۱۰)۔

❸ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ: یعنی جس طرح پہلی امتوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے دلوں کی صلاحیتیں سلب کر لی گئی تھیں اور انھیں ایمان نصیب نہیں ہوا تھا اسی طرح ان کے دل بھی مسخ ہو چکے ہیں اور ان میں ایمان کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

**آیت 102** ❶ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ: ”مِنْ عَهْدٍ“ (کوئی بھی عہد) کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے، جس کا عموم ”مِنْ“ سے مزید بڑھ گیا ہے۔ مراد کسی بھی قسم کا عہد ہے، نہ فطری جو ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ“ کے وقت کیا تھا، نہ شرعی جو پیغمبروں سے عذاب ٹالنے کی درخواست کے وقت کرتے تھے اور نہ عرفی جو وہ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔

❷ لَفٰسِقِيْنَ: ”نافرمان“ یعنی کسی عہد کا پاس نہ کرنے والے پکے بے ایمان۔

**آیت 102** فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: وہ سب کے سب غرق کر دیے گئے اور ان کی ساری شان و شوکت خاک میں ملا دی گئی۔ یہ چھٹا قصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں بیان فرمایا ہے اور اسے جس تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے دوسرے کسی قصے کو اس طرح بیان نہیں فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ان تمام انبیاء سے بڑھ کر تھے اسی طرح ان کی امت بھی جہالت اور سرکشی میں سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ البتہ یہاں ان کی زندگی کے ابتدائی حالات کے بجائے دوسرے انبیاء کی طرح دعوت کے آغاز سے بات شروع فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا، اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، فرعون اور اس کی قوم کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ سارا اختیار فرعون کے ہاتھ میں تھا، اگر وہ ایمان لے آتا تو اس کی قوم بھی ایمان لے آتی اور اس جبر و قہر میں اس کے سردار اس کے معاون تھے۔ اس ظالم نے بنی اسرائیل کے علاوہ اپنی قوم کو بھی اتنا بے وقعت بنا دیا تھا کہ ان کے پاس فرعون کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۵۴) گویا اس کی اپنی قوم بھی اس کے ہاتھوں مظلوم تھی مگر بنی اسرائیل پر ظلم تو انھیں غلام بنا کر رکھنے،

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾

اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! بے شک میں جہانوں کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں ﴿۱۰۴﴾ اس بات پر پوری طرح قائم ہوں کہ اللہ پر حق کے سوا نہ کہوں، بلاشبہ میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل لے کر آیا ہوں، سو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے ﴿۱۰۵﴾

---

ملک سے نکلنے کی ممانعت اور ان کی اولاد کے قتل کی حد تک پہنچ چکا تھا۔

**آیت 104** **وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ**...... : فرعون مصر کے ہر بادشاہ کا لقب تھا، جیسا کہ روم کے بادشاہ کا قیصر اور فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے اس کے عزت والے نام کے ساتھ نہایت نرمی کے ساتھ مخاطب فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھیجتے وقت تلقین فرمائی تھی۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۴۴) اس فرعون کا نام منفتاح بن رمسیس ثانی یا ولید بن ریان بتایا جاتا ہے، مگر یہ بات کسی قابل اعتماد ذریعے سے ثابت نہیں۔

**آیت 105** ① **حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ** : کیونکہ میں اللہ کا رسول (پیغام پہنچانے والا) ہوں اور رسول کا کام یہ ہے کہ بھیجنے والے کا پیغام کسی کمی بیشی کے بغیر پہنچا دے، اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہ کرے، لہٰذا میری ہر بات صحیح اور سچی ہوگی۔ نافع کی قراءت میں ہے: " حَقِيقٌ عَلَيَّ أَلَّا أَقُولَ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ " اس صورت میں "**حَقِيْقٌ**" کا معنی ہے واجب، یعنی مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ عاصم کی قراءت میں وہی ہے جو ہم پڑھتے ہیں: ﴿ **حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ** ﴾ اس صورت میں "**حَقِيْقٌ**" کا معنی ہے قائم، ثابت۔ "**حَقِيْقٌ**" مبتدا محذوف " أَنَا " کی خبر ہے، یعنی میں اس بات پر قائم ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔

② **فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ** : یعنی انھیں غلامی سے آزاد کر، تاکہ وہ میرے ساتھ کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں وہ اپنے اور تیرے رب کی پوری آزادی کے ساتھ عبادت کر سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے اس مطالبے کا پس منظر یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانے میں ان کے بھائی مصر میں آ کر آباد ہو گئے اور وہیں ان کی نسل پھیلی جو بنی اسرائیل کہلائی۔ یوسف علیہ السلام کی زندگی تک تو انھیں پوری طرح اقتدار حاصل رہا لیکن اس کے بعد فرعونوں نے انھیں غلام بنا لیا اور مصر میں ان کی حالت اچھوتوں سے بھی بدتر ہوگئی، وہ چونکہ مسلمان تھے اس لیے موسیٰ علیہ السلام کے مشن میں جہاں یہ چیز شامل تھی کہ فرعون کو توحید کی دعوت دی جائے وہاں یہ بھی ضروری تھا کہ اگر فرعون دعوت حق کو قبول نہ کرے اور بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے باز نہ آئے تو بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نجات دلا کر کسی دوسری جگہ لے جایا جائے، جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کر سکیں۔ یہاں "**فَاَرْسِلْ**" میں حرف فاء تفریع کے لیے ہے، یعنی جب تو کھلے دلائل جاننے کے باوجود انکار پر قائم ہے تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ مطالبہ اس وقت کیا جب فرعون نے ہر طرح رب العالمین کا اقرار کرنے سے انکار کر دیا، جیسا کہ اس کی

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

اس نے کہا اگر تو کوئی نشانی لے کر آیا ہے تو وہ لے آ، اگر تو سچوں میں سے ہے ﴿۱۰۶﴾ تو اس نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اچانک وہ ایک ظاہر اژدہا تھی ﴿۱۰۷﴾ اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید چمکنے والا تھا ﴿۱۰۸﴾ فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یقیناً یہ تو ایک ماہر فن جادوگر ہے ﴿۱۰۹﴾ جو چاہتا ہے کہ تمھیں تمھاری سرزمین سے نکال دے، تو تم کیا حکم دیتے ہو؟ ﴿۱۱۰﴾

---

تفصیل دوسرے مقامات پر مذکور ہے۔

**آیت 106** قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ ...... : فرعون موسیٰ علیہ السلام کی شرافت و نجابت اور ان کے صدق و امانت سے پوری طرح واقف تھا، کیونکہ ان کی پرورش اسی کے گھر میں ہوئی تھی، مگر اس نے ان کی رسالت اور صدق کو تسلیم کرنے کے لیے کوئی معجزہ پیش کرنے کا مطالبہ کر دیا، تاکہ انکار کا کوئی بہانہ مل سکے۔

**آیت 107** فَاَلْقٰى عَصَاهُ ...... : موسیٰ علیہ السلام نے فوراً ہی اپنا عصا پھینکا تو وہ خوف ناک اژدہا بن گیا۔ بعض مفسرین نے اس کی عجیب و غریب صفات لکھی ہیں، مثلاً اس نے منہ کھولا تو اس کا نچلا جبڑا زمین پر اور اوپر کا جبڑا اسی (۸۰) ہاتھ اوپر کی طرف اٹھ کر محل کی دیوار کی بلندی تک پہنچ گیا اور وہ فرعون کی طرف بڑھا تو وہ بھاگ اٹھا اور اس کا پاخانہ خطا ہو گیا، لوگ بھی بھاگ گئے، فرعون چیخا کہ موسیٰ! اسے پکڑو، میں ایمان لے آؤں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پکڑا تو وہ پھر لاٹھی بن گیا۔ (ابن کثیر، بقاعی) اگرچہ اس کی کوئی صحیح سند نہیں اور نہ اس کی تصدیق یا تردید کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہے، تاہم "ثُعْبَانٌ" کی صفت "مُّبِيْنٌ" سے اور اتنی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل جانے سے جن سے میدان بھرا ہوا تھا، اس کا غیر معمولی ہونا ضرور معلوم ہوتا ہے اور اس سے فرعون اور اس کے سرداروں کا خوف زدہ ہونا تو صاف ظاہر ہے، کیونکہ وہ قتل کی دھمکیوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی نصرت اور ان معجزوں کی دہشت کی وجہ سے انھیں کوئی نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکے۔ دیکھیے سورۂ مومن (۲۶)۔

اس معجزے سے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کا بھی اظہار ہو گیا کہ وہ چاہے تو ایک بے جان اور بے ضرر سی لاٹھی کو زندگی عطا فرما کر اتنا بڑا خوف ناک اژدہا بنا دے اور چاہے تو ایک مہیب اژدہا کو بے جان لاٹھی بنا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون کے لیے یہ معجزہ ہی کافی تھا، مگر وہ دل سے مان جانے کے باوجود (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۲) بار بار معجزے دیکھ کر ایمان لانے کا وعدہ کرنے کے بعد مکرتا رہا، حتیٰ کہ سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

**آیت 108** بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کی وہ سفیدی عام سفیدی نہیں تھی بلکہ اس میں کوئی معجزانہ شان تھی کہ اس کی چمک اور ہیبت کی وجہ سے فرعون نے اسے جادو قرار دیا، ورنہ عام سفیدی کو جادو کون کہتا ہے؟

**آیت 110،109** قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ ...... : یہاں یہ ذکر ہوا ہے کہ فرعون کی قوم کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام کو

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْۤا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

انھوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو مؤخر رکھ اور شہروں میں جمع کرنے والے بھیج دے ﴿۱۱۱﴾ کہ وہ تیرے پاس ہر ماہر فن جادوگر لے آئیں ﴿۱۱۲﴾ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے، انھوں نے کہا یقیناً ہمارے لیے ضرور کچھ صلہ ہوگا، اگر ہم ہی غالب ہوئے ﴿۱۱۳﴾ کہا ہاں! اور یقیناً تم ضرور مقرب لوگوں سے ہو گے ﴿۱۱۴﴾ انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تو پھینکے، یا ہم ہی پھینکنے والے ہوں ﴿۱۱۵﴾ کہا تم پھینکو۔ تو جب انھوں نے پھینکا، لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں سخت خوف زدہ کر دیا اور وہ بہت بڑا جادو لے کر آئے ﴿۱۱۶﴾

---

جادوگر قرار دیا۔ سورۂ شعراء (۳۴) میں مذکور ہے کہ فرعون نے اپنے سرداروں سے یہ بات کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو بے اثر بنانے کے لیے دو بہتان گھڑے، ایک تو یہ کہ یہ ماہر جادوگر ہے اور دوسرا یہ کہ یہ حکومت پر قبضہ کر کے تمھیں سرزمین مصر سے نکالنا چاہتا ہے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۳۴، ۳۵) اس کی قوم جسے اس نے اس حد تک بے وقوف اور بے وقعت بنایا تھا کہ وہ اسے اپنا معبود اور اس کی بات کو اپنے رب کی بات ماننے لگ گئے تھے (دیکھیے زخرف: ۵۴) اس قوم نے بھی اسی کی بات کو دہرا دیا۔

**آیت 112،111** قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ...... : "اَرْجِهْ" یہ "أَرْجَأَ يُرْجِئُ إِرْجَاءً" سے امر حاضر کا صیغہ ہے، جو اصل میں "اَرْجِئْهُ" تھا، جس کا معنی "اَخِّرْهُ" ہے، یعنی ان کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہ کیا جائے اور ان کا معاملہ چند روز تک ملتوی رکھا جائے، اس اثنا میں ملک بھر کے شہروں سے تمام ماہر فن جادوگر جمع کیے جائیں۔ چنانچہ فرعون نے ایسا ہی کیا (دیکھیے شعراء: ۳۸) اور موسیٰ علیہ السلام سے تقاضا کر کے مقابلے کا دن یوم الزینہ اور دن چڑھے کا وقت طے کر لیا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۵۹) یہاں یہ سب محذوف ہے۔

**آیت 113** قَالُوْۤا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا...... : جادوگروں کے سامنے کوئی بلند مقصد نہ تھا، بلکہ محض پیشہ ورانہ کمائی تھی، اس لیے انھوں نے پہلے فرعون سے بطور سوال اس کا تقاضا کیا۔

**آیت 114** قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ: فرعون نے اجرت کا بلکہ مقربین میں شامل کرنے کا وعدہ کیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ فرعون کی بات پوری ہوئی مگر ان کے لیے وہ اجرت اور مقرب ہونا فرعون کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونا مقدر تھا، اللہ کی شان دیکھیے کہ خدائی کے دعویدار کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ انھیں اجرت اور قرب کس کی طرف سے ملنا ہے۔

**آیت 116،115** ① وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ : "اَرْهَبَ يُرْهِبُ" کا معنی ہے ڈرانا، خوف زدہ کرنا، "وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ" میں

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی پھینک، تو اچانک وہ ان چیزوں کو نگلنے لگی جو وہ جھوٹ موٹ بنا رہے تھے ﴿۱۱۷﴾ پس حق ثابت ہوگیا اور باطل ہوگیا جو کچھ وہ کر رہے تھے ﴿۱۱۸﴾ تو اس موقع پر وہ مغلوب ہو گئے اور ذلیل ہو کر واپس ہوئے ﴿۱۱۹﴾ اور جادوگر سجدے میں گرا دیے گئے ﴿۱۲۰﴾

حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''سخت خوف زدہ'' کیا ہے۔ جادوگروں نے اپنے غلبے کے یقینی اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو لوگوں کے سامنے بے وقعت ظاہر کرنے کے لیے پوچھا کہ تم پہلے اپنا معجزہ پیش کرو گے یا ہم اپنے جادو کے ہتھیار پیش کریں؟ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے بڑھ کر شانِ بے نیازی سے فرمایا کہ تمھیں جو کچھ پیش کرنا ہے سب پیش کر لو۔ چونکہ مقابلے میں جس کی پہل ہو اسے ایک قسم کی برتری پہلے ہی حاصل ہوتی ہے، تم اس برتری سے فائدہ اٹھا لو، چنانچہ انھوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینک دیں تو ہر طرف زمین پر سانپ ہی سانپ دوڑتے ہوئے معلوم ہونے لگے، فرمایا: ﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴾ [ طٰہٰ : ٦٦ ] ''تو اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں، اس کے خیال میں ڈالا جاتا تھا ان کے جادو کی وجہ سے کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔'' یہاں بھی فرمایا کہ ''انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں سخت خوف زدہ کر دیا اور وہ بہت بڑا جادو لے کر آئے۔'' درحقیقت وہ زمانہ ہی جادو کے کمال کا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا معجزہ دیا جس کے سامنے جادو بے بس ہو۔

② سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ: اس سے معلوم ہوا کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی، صرف دیکھنے میں وہ چیز دوسری نظر آتی ہے اور اس کا اثر محض خیال پر ہوتا ہے، چونکہ انسان کا جسم دماغ کے تابع ہے، اس لیے خیال کا نقصان یا فائدہ بعض اوقات جسم کو بھی ہوتا ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کا جادو دیکھ کر خوف محسوس کیا، فرمایا: ﴿ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴾ [ طٰہٰ : ٦٧ ] ''تو موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لبید بن اعصم کے جادو کی وجہ سے کچھ عرصہ بیمار رہے۔ اس لیے جادو کی تاثیر سے انکار درست نہیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے جادو کو بہت بڑا قرار دیا ہے۔

**آیت 118،117** وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰۤى ......: موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی وحی سے اپنی لاٹھی پھینکی تو اس نے ان کے جھوٹ موٹ بنائے ہوئے سانپوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معجزہ جو حق تھا، ثابت ہوگیا اور جادو جو جھوٹ شعبدے اور مکاری پر مبنی تھا، بے کار اور باطل ہوگیا۔

**آیت 120** وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ: یعنی چونکہ جادوگر جادو کی حقیقت کو سمجھتے تھے، اس لیے معجزہ دیکھ کر وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑے، جیسے وہ خود نہ گرے ہوں بلکہ اندر سے کسی چیز نے انھیں گرا دیا ہو۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

انھوں نے کہا ہم جہانوں کے رب پر ایمان لائے ﴿۱۲۱﴾ موسیٰ اور ہارون کے رب پر ﴿۱۲۲﴾ فرعون نے کہا تم اس پر اس سے پہلے ایمان لے آئے کہ میں تمھیں اجازت دوں، بے شک یہ تو ایک چال ہے جو تم نے اس شہر میں چلی ہے، تاکہ تم اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال دو، سو تم جلد جان لو گے ﴿۱۲۳﴾ یقیناً میں ضرور تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف سمت سے بری طرح کاٹوں گا، پھر یقیناً تم سب کو ضرور بری طرح سولی دوں گا ﴿۱۲۴﴾

**آیت 122،121** قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ......: ”ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے“ کے ساتھ ﴿رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ﴾ (جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے) اس لیے کہا کہ کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ انھوں نے فرعون کو رب العالمین سمجھتے ہوئے سجدہ کیا ہے۔ اس طرح فرعون اور اس کے مشیروں کے لیے کسی طرح ممکن نہ رہا کہ لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام کے محض ایک جادوگر ہونے کا یقین دلا سکیں۔

**آیت 124،123** ① قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ......: یعنی میری اجازت سے پہلے تمھیں کوئی حق نہ تھا کہ تم موسیٰ کی برتری اور کامرانی کا اعلان کرتے۔ ہر متکبر و سرکش یہی چاہتا ہے کہ لوگ اس کی ہاں میں ہاں ملائیں اور جو کچھ وہ کہے اسے مان کر اسی کی تشہیر و اشاعت کریں، اسی طرح دنیا میں ہر متکبر اور سرکش حکمران کا یہ قاعدہ ہے کہ جب وہ دلیل کے میدان میں ہار جاتا ہے تو جیل، پھانسی، سولی اور قتل کی دھمکی دینے پر اتر آتا ہے اور اس کے لیے ایسے قوانین وضع کرتا ہے جن کی رو سے کسی پر اس کا جرم ثابت کیے بغیر اسے سزا دی جا سکے۔ چنانچہ یہی کام فرعون نے کیا، جب وہ دلیل کے میدان میں شکست کھا گیا تو سزا دینے کی دھمکی پر اتر آیا اور فی الفور عوام کے سامنے دو الزام لگا دیے، پہلا کہ یہ جادوگروں اور موسیٰ کی باہمی سازش ہے اور دوسرا یہ کہ یہ لوگ اس سازش کے ذریعے سے مصریوں کو ملک بدر کر کے حکومت پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ اس لیے پہلے ”فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ“ (سو تم جلد جان لو گے) کہہ کر دھمکی دی، پھر اس دھمکی کی وضاحت بھی سنا دی۔

② ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ: یعنی ایک جانب سے ہاتھ اور دوسری جانب سے پاؤں کٹوا کر تمھیں سولی دے دوں گا۔ عام طور پر لوگ سولی اور پھانسی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ پھانسی میں تو گلے میں رسا ڈال کر گلا گھونٹ کر مارا جاتا ہے، جبکہ سولی میں ایک اونچا کھمبا کھڑا کر کے اس کے اوپر ایک آڑی لکڑی باندھ دی جاتی ہے، پھر ملزم کو اوپر چڑھا کر اس کے بازو اس آڑی لکڑی کے ساتھ باندھ دیے جاتے ہیں، جبکہ جسم اونچی لکڑی کے ساتھ بندھا ہوتا ہے، وہ وہیں دھوپ، سردی، پرندوں کی نوچ کھسوٹ اور دشمنوں کے تیروں یا نیزوں کے زخم کھاتا ہوا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سورۂ طٰہٰ (۷۱) میں ہے: ”میں تمھیں ہر صورت کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا۔“ یہ پھانسی سے کہیں زیادہ خوف ناک سزا ہے۔

قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

انھوں نے کہا یقیناً ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۱۲۵﴾ اور تو ہم سے اس کے سوا کس چیز کا بدلہ لے رہا ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر ایمان لے آئے، جب وہ ہمارے پاس آئیں، اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں اس حال میں فوت کر کہ فرماں بردار ہوں ﴿۱۲۶﴾

**آیت 125** قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ: یعنی موت سے کسی حال میں چھٹکارا نہیں، وہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور آنی ہے، اگر ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ہمارا خاتمہ سولی پر ہو تو ہمیں بڑی خوشی سے سولی دو، ہمیں کوئی پروا نہیں۔

**آیت 125** وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا......: " نَقِمَ مِنْهُ (ض، ع)" اور "اِنْتَقَمَ" عَاقَبَهُ یعنی "نَقَمَ مِنْهُ" اور "اِنْتَقَمَ مِنْهُ" کا معنی بدلہ لینا، سزا دینا ہے اور " نَقَّمَ الْأَمْرَ" کا معنی " كَرِهَهُ" یعنی کسی شے سے بہت زیادہ نفرت اور کراہت ہے۔ (قاموس) مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارا کوئی گناہ ہے تو صرف یہ کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی فن کو جتنا اس فن والا جانتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا، چنانچہ ان جادوگروں نے جب موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو دیکھا تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ ہرگز جادو نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزہ ہے، اس لیے وہ اس پر فوراً ایمان لے آئے اور ان کے ایمان میں اس قدر پختگی تھی کہ انھوں نے جان تک کی پروا نہیں کی، بلکہ اللہ تعالیٰ سے صبر و استقامت اور ایمان و اسلام پر موت کی دعا کی۔

مشہور قول کے مطابق وہ قتل کر دیے گئے، چنانچہ طبری اور دوسرے مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے کہ شروع دن میں وہ جادوگر تھے اور پھر دن کے آخری حصے میں شہداء میں داخل ہو گئے۔ دکتور حکمت بن بشیر نے تفسیر ابن کثیر کی تخریج میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے متعلق لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ابن ابی حاتم نے ضعیف سند کے ساتھ سدی عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے، جب کہ سدی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نہیں سنا (لہٰذا روایت منقطع ہے صحیح نہیں)۔ قرآن مجید نے اس مقام پر یہ ذکر نہیں فرمایا کہ ان کا انجام کیا ہوا، نہ ہی سورۂ شعراء اور سورۂ طٰہٰ میں یا کسی اور جگہ یہ ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا مقصد عبرت کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی مدد، فرعون کی شکست، جادوگروں کے ایمان لانے، فرعون کی دھمکیوں کے باوجود اس پر قائم رہنے کے عزم اور صبر اور ایمان پر خاتمے کی دعا کا بیان ہے، محض قصہ بیان کرنا نہیں، جیسا کہ سورۂ نازعات میں فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴾ [ النازعات : ۲۶ ] "بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے جو ڈرتا ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ فرعون اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا، جیسا کہ اس نے اپنے سرداروں سے کہا تھا: "مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں۔" [ المؤمن : ۲٦ ] اور آل فرعون میں سے وہ مومن جس نے بھرے دربار میں موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی مخالفت کی اس کے خلاف بھی فرعون نے بدترین سازش کی، مگر وہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کر سکا اور اس مومن کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی سازشوں

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ

اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا، تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں

سے بچالیا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۴۵) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دے کر بھیجا تھا: ﴿سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَا ۚ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [ القصص : ۳۵ ] ''ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو ضرور مضبوط کریں گے اور تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے، ہماری نشانیوں کے ساتھ تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب آنے والے ہو۔'' زیر تفسیر مقام پر بھی اگر وہ اپنی اس دھمکی پر عمل کر چکا ہوتا تو اس کی قوم کے سرداروں کو اسے نئے سرے سے بھڑکانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) چونکہ قرآن مجید میں ان کے انجام کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

آیت 127 ① وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ …… : موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے غلبے اور جادوگروں کے ایمان لانے پر اگرچہ چند ہی نوجوانوں نے ایمان لانے کی جرأت کی اور وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے۔ (دیکھیے یونس : ۸۳) تاہم فرعون کی بنی اسرائیل کے خلاف کارروائیاں کچھ کم ہوگئیں تو اس کے سرداروں نے اسے یہ کہہ کر بھڑکایا کہ کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا کہ وہ زمین میں فساد کریں، یعنی وہ تمھاری رعیت کو دعوت دیتے پھریں کہ وہ تمھارے اور تمھارے معبودوں کے بجائے اللہ واحد کی عبادت کریں اور ملک میں دعوتِ توحید سے فساد پھیلاتے پھریں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تعجب ہے کہ یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے فساد پھیلانے سے ڈر رہے ہیں، حالانکہ فساد پھیلانے والے تو وہ خود ہیں۔'' جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [ البقرة : ۱۲ ] ''سن لو! یقیناً وہی تو فساد ڈالنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے۔''

② وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ : " آلِهَةٌ " یہ " اِلٰهٌ " کی جمع ہے، جس کا معنی معبود ہے، یعنی وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے بھی کچھ معبود تھے جن کی وہ عبادت کرتا تھا۔ بعض صحابہ کی قراءت میں "اِلَاهَتَكَ" ہے، " اِلَاهَةٌ " کا معنی عبادت ہے، یعنی وہ تجھے اور تیری عبادت کو چھوڑے رکھیں، یہ بھی اگرچہ درست ہے مگر مشہور قراءت پہلی ہی ہے۔ اس لیے اہل علم نے اس کی کئی توجیہات کی ہیں اور وہ سبھی ممکن ہیں۔ ایک توجیہ اس کی یہ ہے کہ وہ واقعی ربِ اعلیٰ ہونے کے اعلان کے باوجود خود کئی معبودوں کی پرستش کرتا تھا اور ان معبودوں کے تقدس کا عقیدہ اس کی قوم میں بھی موجود تھا، مثلاً گائے کی پرستش تو عام تھی، جس کے نتیجے میں ان سے میل جول اور ان کی محکومیت کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بھی یہ عقیدہ در آیا تھا۔ جس کی دلیل آزاد ہونے کے بعد بھی گائے ذبح کرنے کے حکم پر ان کے بہانے اور موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے کے بعد سامری کا بچھڑا بنا کر قوم کو اس کی عبادت پر لگانا ہے۔ مصری تہذیب ہندوؤں سے ملتی جلتی تھی۔ مشرکانہ

وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴿۱۲۷﴾

اور وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے؟ اس نے کہا ہم ان کے بیٹوں کو بری طرح قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور یقیناً ہم ان پر قابو رکھنے والے ہیں﴿۱۲۷﴾

مذاہب میں عجیب پیچیدگی پائی جاتی ہے، عموماً ان کے ہاں اصل خدا کسی انسان میں اتر آتا ہے جو مسلمان صوفیا کے ہاں حلول کے نام سے معروف ہے۔ فرعون اپنے آپ کو ان تمام معبودوں کا نمائندہ قرار دے کر اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ کہلاتا تھا اور اپنے سرداروں سے کہتا تھا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [ القصص : ۳۸ ] ''مجھے اپنے سوا تمھارا کوئی معبود معلوم نہیں۔'' یہ وہی بات ہے جو بعض مسلمانی کا دعویٰ کرنے والوں نے کہی ہے ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر     اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

مگر یہ لوگ مصطفیٰ ﷺ کو اصلی خدا مان کر بھی بہت سے زندہ خداؤں، مثلاً مرشدوں اور مردہ خداؤں کی قبروں کی پرستش کرتے ہیں اور ان میں بھی اللہ کے ظہور کا عقیدہ رکھتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس قسم کے تمام گندے عقیدوں سے بری ہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ درحقیقت فرعون دہری تھا۔ کائنات کا کوئی بنانے والا مانتا ہی نہ تھا، اس کے نزدیک بادشاہ ہی معبود کا مقام رکھتا تھا کہ جو اس کے منہ سے نکلے وہی دین اور قانون ہے۔ اپنے سرداروں کے لیے یہ مقام وہ خود رکھتا تھا اور اس کے سردار اپنے اپنے علاقے کی رعایا کے لیے یہ مقام رکھتے تھے، چنانچہ اس نے اپنے بت بنوا کر لوگوں کے گھروں میں رکھے ہوئے تھے، جیسا کہ آج کل کے اکثر حکمران اپنی تصاویر اور مجسموں کے ذریعے سے لوگوں کے ذہنوں میں اپنی خدائی بٹھاتے ہیں، کمیونسٹ حکمران سٹالن، لینن اور ماؤزے تنگ بھی خدا کے منکر ہونے کے باوجود لوگوں کے دماغوں میں اپنی خدائی کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جمہوری حکمران بھی اس کوشش میں حتی الوسع کمی نہیں کرتے، اگرچہ وہ نام عوام کا استعمال کرتے ہیں۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ حاکمیت میں وہ اپنے سوا کسی کو معبود نہیں مانتا تھا، البتہ غیبی مدد کرنے والے کچھ معبود اس نے بھی رکھے ہوئے تھے، جس طرح آج کل بعض حکمران قانون اپنا چلاتے ہیں مگر غیبی مدد حاصل کرنے کے لیے کئی ہستیوں کی نیاز دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کعبہ کی طرح پختہ قبروں کو عرق گلاب سے غسل دیتے اور بزرگوں کو کرنی والا سمجھتے ہیں اور کچھ کچھ اللہ کو بھی مان لیتے ہیں، مگر کیا مجال کہ اس کا کوئی قانون عمل میں لائیں یا لانے دیں۔

③ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ ...... : یعنی ہم جو ظلم و ستم موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بنی اسرائیل پر کرتے تھے اس کا سلسلہ پھر سے شروع کریں گے، اس طرح یہ تباہ ہو جائیں گے اور ان کا تخم تک باقی نہیں رہے گا۔ ان کے مرد مارے جائیں گے اور صرف عورتیں بچیں گی، وہ کیا کر سکیں گی، ان کو ہم لونڈیاں بنا کر اپنے گھروں میں رکھیں گے۔ ابھی تک اس کی جرأت نہ کرنے

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۬ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اس کا وارث اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے بناتا ہے اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے (۱۲۸) انھوں نے کہا ہمیں اس سے پہلے ایذا دی گئی کہ تو ہمارے پاس آئے اور اس کے بعد بھی کہ تو ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا تمھارا رب قریب ہے کہ تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو (۱۲۹)

---

کے لیے اس نے یہ حیلہ تراشا کہ ایسی کیا جلدی ہے، ہم ان پر پوری طرح قابو رکھتے ہیں، جب چاہیں گے ایسا کر لیں گے۔

**آیت 128** ① **قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ ......** : فرعون کی دھمکیوں پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دینا ضروری سمجھا، چنانچہ انھیں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور صبر کرنے کی تلقین فرمائی، جس پر انھوں نے ظالموں سے پناہ کی وہ دعا لازم کر لی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس میں ذکر فرمائی ہے: ﴿ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [ یونس : ۸۵، ۸٦ ] موسیٰ علیہ السلام نے انھیں تسلی دیتے ہوئے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ آج اگر مصر پر فرعون حکمران ہے تو کل اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی سرزمین کا وارث، یعنی حکمران بنا سکتا ہے۔

② **وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ** : " عَاقِبَةٌ " کا لفظی معنی تو انجام ہے جو اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [ القصص : ٤٠ ] ''سو دیکھو ظالموں کا انجام کیسا تھا۔'' مگر جب اس پر ''الف لام'' آ جائے تو اس کا معنی اچھا انجام ہی ہوتا ہے۔

**آیت 129** ① **قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ ......** : پہلے بھی ہمارے بچوں کو قتل کیا جاتا رہا ہے، ہم سے مشقت کے کام لیے جاتے رہے ہیں اور ہماری آزادی سلب رہی ہے، اب آپ کے آنے کے بعد بھی وہی غلامی اور مشقت ہے اور دوبارہ بچوں کے قتل کے فیصلے کیے جا رہے ہیں۔

② **فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ** : موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی کہ عن قریب تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کر کے تمھیں آزادی اور حکومت دینے والا ہے اور دیکھنے والا ہے کہ تم اس کا شکر کرتے اور احکام بجا لاتے ہو یا تم بھی ناشکری اور نافرمانی کرنے لگتے ہو؟ معلوم ہوا کہ آزادی اور حکومت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کفار کی غلامی پر راضی رہنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ کلام نقل فرمایا مسلمانوں کے سنانے کو، یہ سورت مکی ہے، اس وقت مسلمان بھی ایسے ہی مظلوم تھے، پھر بشارت پہنچی پردے میں۔'' (موضح)

وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے فرعون کی آل کو قحط سالیوں اور پھلوں کی کمی کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں ﴿۱۳۰﴾ تو جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے یہ تو ہمارا حق ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔ سن لو! ان کی نحوست تو اللہ ہی کے پاس ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۱۳۱﴾

**آیت 130** وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ...... : اوپر کی آیت میں جب موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ وقت قریب ہے کہ تمھارا مالک تمھارے دشمن کو تباہ کر دے، تو اب یہاں سے ان تکلیفوں اور مصیبتوں کا بیان شروع کیا جن میں وقتاً فوقتاً آل فرعون کو مبتلا کیا گیا، حتیٰ کہ آخر کار تباہ کر دیے گئے، تاکہ ان مشرکین کو کفر پر کچھ تنبیہ ہو اور انھیں خبردار کیا جائے کہ پیغمبروں کے جھٹلانے کا انجام تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ تکالیف اور مصیبتیں ان پر اس لیے بھیجیں کہ نصیحت حاصل کریں اور اپنی سرکشی سے باز آ جائیں، کیونکہ مصیبت کے وقت دل نرم اور اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

**آیت 131** ① فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ...... : جیسا کہ آیت (۹۴، ۹۵) میں ذکر فرمایا تھا کہ ہر قوم کی آزمائش تنگی اور تکلیف کے علاوہ خوش حالی اور آسودگی کے ساتھ بھی ہوئی، اس کے مطابق فرعون کی قوم پر سختی اور مصیبت کے بعد راحت اور خوش حالی آتی تو بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھ کر شکر گزاری کریں، وہ "لَنَا هٰذِهٖ" کہتے، یعنی یہ ہمارے حسن انتظام کا نتیجہ اور ہمارا حق ہے۔

② وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى...... : "یَطَّیَّرُوْا" "تَطَیَّرَ یَتَطَیَّرُ" باب تفعل سے ہے جس کا مادہ "طَیْرٌ" (پرندہ) ہے۔ اصل میں "یَتَطَیَّرُوْا" تھا، تاء کا طاء میں ادغام کر دیا ہے۔ مشرکین کا طریقہ تھا کہ فال لینے کے لیے کسی پرندے کو اڑاتے، اگر وہ اڑ کر دائیں طرف جاتا تو اسے نیک فال اور باعث برکت سمجھتے اور اگر بائیں طرف جاتا تو بدفال اور باعث نحوست سمجھتے، یہاں تمام مفسرین کے نزدیک "تَطَیَّرَ" کا معنی فالِ بد اور نحوست ہے، یعنی اپنی مصیبتوں کا باعث موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کو قرار دیتے۔

③ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ...... : یعنی اس نحوست کا اصل سبب تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور خیر و شر جو کچھ ان کو پہنچ رہا ہے تمام کا تمام اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہے جو ان کے اعمال کے سبب ان کے حق میں لکھا جا چکا ہے، یہ سراسر جہالت ہے کہ بھلائی کو اپنی خوبی اور برائی کو کسی دوسرے کی نحوست قرار دیا جائے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یعنی شومی قسمت بد ہے، سو اللہ کی تقدیر سے ہے، برائی اور بھلائی کا اثر آخرت میں ہوگا، اس کا جواب یہاں یہ نہیں فرمایا کہ شومی ان کے کفر سے تھی، کیونکہ کافر بھی دنیا میں عیش کرتے ہیں۔ اصل حقیقت (جو) تھی سو فرمائی کہ دنیا کے احوال موقوف بہ تقدیر ہیں۔" (موضح)

وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا

اور انھوں نے کہا تو ہمارے پاس جو نشانی بھی لے آئے، تاکہ ہم پر اس کے ساتھ جادو کرے تو ہم تیری بات ہرگز ماننے والے نہیں ﴿۱۳۲﴾ تو ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، جو الگ الگ نشانیاں تھیں، پھر بھی انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے ﴿۱۳۳﴾ اور جب ان پر عذاب آتا تو کہتے اے موسیٰ! اپنے رب سے ہمارے لیے اس عہد کے واسطے سے دعا کر جو اس نے تیرے ہاں دے رکھا ہے، یقیناً اگر تو ہم سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ضرور ہی تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ضرور ہی بھیج دیں گے ﴿۱۳۴﴾ پھر جب ہم ان سے عذاب کو

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بدشگونی شرک ہے، بدشگونی شرک ہے'' تین دفعہ فرمایا ''اور ہم میں سے ہر ایک کو (کوئی نہ کوئی وہم ہو جاتا ہے) مگر اللہ تعالیٰ اسے توکل کی برکت سے دور کر دیتا ہے۔'' [ أبو داؤد، الطب، باب في الطيرة : ۳۹۱۰ ترمذی : ۱۶۱۴ ]

**آیت 132** وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ ...... : اوپر کی آیت میں ان کی یہ جہالت بیان فرمائی کہ وہ حوادث کی نسبت اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کی طرف کرنے کے بجائے دوسرے اسباب کی طرف کرتے ہیں، اب اس آیت میں ان کی دوسری جہالت بیان فرمائی کہ اتنی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی کم بخت فرعونی موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر ہی کہتے رہے اور انھوں نے معجزات اور جادو کا فرق آخر تک تسلیم نہ کیا، بلکہ اپنی سرکشی اور تمرد سے بالآخر قطعی طور پر اعلان کر دیا کہ تم (موسیٰ علیہ السلام) جو بھی معجزہ دکھاؤ ہم اسے تمھارا جادو ہی سمجھیں گے اور تم پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے، حالانکہ انھیں ان معجزوں کے حق ہونے کا یقین تھا۔ دیکھیے سورۂ نمل (۱۳، ۱۴)۔

**آیت 133 تا 136** فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ ...... : جب وہ قحط سالی اور پھلوں کی کمی کی گرفت کے باوجود کفر اور سرکشی پر ڈٹ گئے اور اس مصیبت کو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مزید سختیاں نازل ہونا شروع ہوئیں جو فرعون اور اس کی فوجوں کے مکمل خاتمے اور غرق ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ قحط سالیوں کے بعد ''الطُّوْفَانَ'' یعنی سخت بارش اور سیلاب شروع ہوا جس سے ان کی زندگی دشوار ہو گئی تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی کہ تمھارا اپنے رب سے جو عہد اور معاملہ ہے اسے پیش کر کے اس سے ہمارے لیے یہ عذاب دور کرنے کی دعا کریں، اگر تم نے ہم سے یہ عذاب دور کروا دیا تو ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو

كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

اس وقت تک دور کر دیتے جسے وہ پہنچنے والے ہوتے تو اچانک وہ عہد توڑ دیتے تھے﴿۱۳۵﴾ تو ہم نے ان سے انتقام لیا، پس انھیں سمندر میں غرق کر دیا، اس وجہ سے کہ بے شک انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے﴿۱۳۶﴾

تمھارے ساتھ بھیج دیں گے۔ (لام تاکید اور نون ثقیلہ عربی میں قسم کا مفہوم رکھتا ہے) ظالم اب بھی اپنے اور ساری کائنات کے رب کو موسیٰ علیہ السلام کا رب ہی کہہ رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب ٹلا تو مدت کی سوکھی زمین نے پانی کی فراوانی کی وجہ سے بے حساب چارا اور غلہ پیدا کیا، یہ ان کی خوش حالی کے ساتھ آزمائش تھی، جس سے وہ سب عہد و پیمان بھول کر کہنے لگے کہ یہ سیلاب تو ہمارے لیے نعمت تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان پر "اَلْجَرَادَ" (ٹڈیوں) کا عذاب بھیجا جو ان کے درخت، چارے اور لکڑیاں تک چٹ کر گئیں۔ انھوں نے پھر موسیٰ علیہ السلام سے انھی الفاظ میں عذاب ٹالنے کی دعا کی درخواست کی جو اوپر ذکر ہوئے ہیں۔ یہ عذاب دور ہوا تو پھر خوش حالی کا ایک وقفہ آیا کہ بچی فصل سے بھی بے شمار غلہ پیدا ہوا، جسے کاٹ کر انھوں نے اپنے گھروں میں محفوظ کر لیا اور اپنے خیال میں کم از کم سال بھر کے لیے بے فکر ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے کیا ہوا عہد و پیمان پھر بھول گئے۔ اب ان پر "اَلْقُمَّلَ" کا عذاب نازل ہوا، یعنی جوئیں، چچڑیاں، چھوٹے چھوٹے کالے کیڑے، گھن کے کیڑے، پسو وغیرہ، ان سب پر "اَلْقُمَّلَ" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ انسانوں اور جانوروں کے جسموں، کپڑوں اور بستروں پر جوؤں، پسوؤں اور کھٹملوں کی یلغار ہو گئی۔ غلے کو گھن لگ گیا، پسوانے کے لیے بوریاں لے جاتے تو آٹے کا فقط ایک تھیلا نکلتا، پھر مجبور ہو کر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اسی طرح دعا کی درخواست کی۔ جب ان کی دعا سے وہ بلا ٹلی اور راحت و آرام کا وقفہ آیا تو اپنے عہد سے پہلے کی طرح پھر گئے، اب ان پر "اَلضَّفَادِعَ" یعنی "مینڈکوں" کا عذاب آیا اور وہ اس کثرت سے پھیل گئے کہ ہر چیز اور برتن میں مینڈک ہی مینڈک نظر آنے لگے، کھانا کھاتے ہوئے لقمے کی جگہ اچھل کر منہ میں مینڈک جا پڑتا، لیٹتے تو بستر اور جسم مینڈکوں سے بھر جاتا۔ مجبور ہو کر انھوں نے پھر موسیٰ علیہ السلام سے یہ عذاب ٹالنے کے لیے دعا کی درخواست انھی وعدوں کے ساتھ کی، مگر جب عافیت ملی تو پھر ایمان لانے اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ اب ان پر خون کا عذاب آیا، کھانے یا پینے کی جو چیز رکھتے خون میں بدل جاتی، پانی کے برتنوں اور ذخیروں نے خون کی صورت اختیار کر لی۔ بعض مفسرین نے خون کے عذاب میں نکسیر کی وبا کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ ان کے رجوع اور درخواست پر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب ٹلا تو پھر اپنے کیے ہوئے عہد سے پھر گئے۔ اب اللہ تعالیٰ کے انتقام کا وقت آ گیا اور ان سب کو اللہ کی آیات و معجزات جھٹلانے اور ان سے جان بوجھ کر غفلت اختیار کرنے کی پاداش میں سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ یہاں اس غرق کی تفصیلات بیان نہیں ہوئیں، وہ سورۂ یونس، شعراء اور طٰہٰ وغیرہ میں بیان ہوئی ہیں، کیونکہ یہاں اصل مقصد کفار کو سختی اور خوش حالی کی آزمائش کی پروا نہ کرتے ہوئے کفر پر اصرار کے انجام سے ڈرانا ہے۔ "اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ" سے معلوم ہوتا ہے کہ

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا

اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس سرزمین کے مشرقوں اور اس کے مغربوں کا وارث بنا دیا، جس میں

عذاب اور عافیت کے یہ وقفے یکے بعد دیگرے آئے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ اس بات پر چالیس برس رہا کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن جانے دے اور آخر میں یہ عذاب ایک ایک ہفتے کے وقفے سے آئے۔ (موضح) تفسیر طبری میں تابعین کی بعض روایات میں عذاب کا عرصہ ایک ہفتہ اور درمیانی عافیت کا عرصہ ایک ماہ لکھا ہے، مگر ہمارے پاس ان میں سے کسی قول کی تصدیق یا تردید کا کوئی صحیح ذریعہ نہیں۔ نصیحت کے لیے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے وہی کافی ہے۔

آیت 138،137 ① وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ : موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے دو وعدے کیے تھے، دشمن کی ہلاکت اور ملک کی وراثت و خلافت۔ چنانچہ پہلا وعدہ پورا ہونے کے بعد اب یہاں دوسرے وعدے کی تکمیل کا بیان ہے۔ یہاں مبارک سرزمین سے شام کی سرزمین مراد ہے اور یہ وعدہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد یوشع علیہ السلام کے دور میں پورا ہونا شروع ہوا، جب انھوں نے عمالقہ سے جہاد کر کے بعض علاقے اپنے قبضے میں لے لیے مگر پورا ملک شام داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں قبضے میں آیا۔

② مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا : "مَشَارِقَ الْاَرْضِ" یہ "یُسْتَضْعَفُوْنَ" کا مفعول نہیں بلکہ "اَوْرَثْنَا" کا مفعول ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کو زیادہ سے زیادہ کمزور اور بے بس تو مصر میں بنایا گیا تھا، شام میں نہیں۔ ارضِ مبارک سے مراد قرآن مجید میں عام طور پر سرزمین شام لی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱)، انبیاء (۷۱، ۸۱) اور سبا (۱۸) مشارق و مغارب جمع لانے کا مقصد یہ ہے کہ سرزمین شام کے تمام مشرقی اور مغربی علاقوں پر ان کی حکومت ہوگئی۔ کیونکہ ہر روز زمین کے ہر حصے میں سورج کے طلوع و غروب کا وقت اور جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ بعض اہل علم نے مصر اور شام دونوں مراد لیے ہیں اور لکھا ہے کہ فرعون کی تباہی کے بعد بنی اسرائیل مدتوں مصر پر حکمران رہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ دیکھیے سورۂ دخان (۲۸)، شعراء (۵۹) اور قصص (۵) اس صورت میں "بٰرَكْنَا فِیْهَا" سے مراد سرزمین مصر و شام کا نہایت زرخیز اور آباد ہونا ہوگا۔

③ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی ...... : "الْحُسْنٰی" یہ "اَلْاَحْسَنُ" کی مؤنث ہے جو تفضیل کا صیغہ ہے۔ بہترین بات سے مراد اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم تمھارے دشمنوں کو ہلاک کریں گے اور تمھیں اس سرزمین کی وراثت اور حکومت عطا فرمائیں گے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ وعدہ پورا کرنے کا باعث اللہ تعالیٰ نے ان کا صبر بیان فرمایا کہ اتنی سختیوں کے باوجود انھوں نے فرعون کو رب نہیں مانا، اپنے مسلمان ہونے پر قائم رہے، اگرچہ غلامی اور محکومیت کی وجہ سے ان کے مزاج اور دینی حالت میں کئی خرابیاں آچکی تھیں، مگر انھوں نے اسلام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

④ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ : "یَصْنَعُ" سے مراد ان کی مصنوعات، کارخانے، عمارتیں اور ہتھیار وغیرہ ہیں اور "یَعْرِشُوْنَ" کا معنی اگرچہ انگور وغیرہ کے لیے چھپر وغیرہ بنانا بھی ہوتا ہے، مگر مصر میں چونکہ چھپر والے انگوروں کا رواج

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ

ہم نے برکت رکھی ہے اور تیرے رب کی بہترین بات بنی اسرائیل پر پوری ہوگئی، اس وجہ سے کہ انھوں نے صبر کیا اور

---

نہیں تھا، اس لیے اس سے مراد وہ بلند عمارتیں ہیں جو وہ بناتے تھے۔

⑤ وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ : فرعون سے نجات پا کر سمندر پار کرنے کا یہ مبارک دن عاشوراء (دس محرم) تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے شکر ادا کرنے کے لیے اس دن کا روزہ رکھا اور یہودی بھی اس دن روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں سے روزے کی وجہ پوچھ کر فرمایا: ''ہم تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھتے ہیں۔'' چنانچہ خود بھی روزہ رکھا اور تمام مسلمانوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ آئندہ سال رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کا روزہ نفل ہوگیا، جو چاہے رکھے جو چاہے نہ رکھے۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و لقد أوحينا إلى موسىٰ ...... ﴾ : ۴۷۳۷، ۱۵۹۲، عن ابن عباس وعائشة رضی اللہ عنہم ]

اہل مکہ بھی جاہلیت میں اس دن کا روزہ رکھتے تھے اور اس دن کعبہ پر نیا غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ [ بخاری، الحج، باب قول الله تعالى : ﴿ جعل الله الكعبة...... ﴾ : ۱۵۹۲، عن عائشة رضی اللہ عنہا ] آخر عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روزے کی فضیلت کے حصول اور یہود کی مخالفت کی خاطر فرمایا: (( لَئِنْ بَقِيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ التَّاسِعَ )) ''اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو ۹ کا روزہ رکھوں گا۔'' مگر آئندہ سال آنے سے پہلے آپ فوت ہو گئے۔ [ مسلم، الصيام، باب أي يوم يصام في عاشوراء : ۱۱۳۴/۱۳۴، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اس دن ہوئی مگر دین اس سے پہلے مکمل ہو چکا تھا، ان کی شہادت کی وجہ سے دین میں کوئی بھی اضافہ، مثلاً ماتم یا جلوس یا سبیلیں وغیرہ لگانا بدعت ہوگا۔

⑥ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ : پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مظالم پر بنی اسرائیل کے صبر کی تعریف اور اس کی وجہ سے ان پر اپنے مزید انعامات کا ذکر فرمایا تھا۔ اب یہاں سے ان کی خوش حالی کے دور کی آزمائش کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اسی سورت میں ہر قوم کی تنگی اور آسانی کے ساتھ آزمائش کا ذکر ہوا تھا۔ (دیکھیے اعراف: ۹۴) اور اس بات کا بھی کہ ہم نے ان میں سے اکثر کے لیے کوئی عہد نہیں پایا اور ان کے اکثر کو ہم نے فاسق ہی پایا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۰۲) آزادی ملنے کے بعد بنی اسرائیل کی بدعہدی اور فسق کا اور اس کے نتیجے میں انھیں ملنے والی سزا کا تذکرہ بنی اسرائیل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی دعوت اور آپ کی مخالفت سے باز رہنے کی نصیحت کے لیے کیا گیا ہے۔ اس میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی نصیحت ہے کہ تم لوگ بھی ان کے نقش قدم پر نہ چل نکلنا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں سمندر سے پار کر دیا تو انھوں نے مشرق کی طرف بیت المقدس ارضِ شام کا رخ کیا، ابھی چلے ہی تھے کہ ان کا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں پر مجاور بنے بیٹھے تھے، یعنی ان کی پوجا کر رہے تھے۔ یہ بت بزرگوں کے تھے یا گائے وغیرہ کے، قرآن نے ذکر نہیں فرمایا اور نہ ہی حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کا جہل اور کفر دیکھیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اتنے واضح معجزات اور اللہ تعالیٰ کے انعامات دیکھنے کے بعد انھوں نے گستاخانہ لہجے میں نام لیتے ہوئے ''اے موسیٰ'' کہہ کر مطالبہ کر دیا کہ ہمارے لیے بھی ان کے معبودوں جیسے معبود بنا دو۔ اس کی وجہ لمبے عرصے تک غلامی کی وجہ سے اہلِ مصر کے

فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ

ہم نے برباد کر دیا جو کچھ فرعون اور اس کے لوگ بناتے تھے اور جو عمارتیں وہ بلند کرتے تھے ﴿۱۳۷﴾ اور ہم نے

مشرکانہ عقائد کا ذہنوں میں جاگزیں ہونا تھا۔

بعض علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل چونکہ موحد تھے، اس لیے ان کی بت بنانے کے اس مطالبے سے یہ غرض نہ تھی کہ وہ شرک کریں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم اس بت کی تعظیم سے اللہ کا تقرب چاہیں گے، وہ سمجھے کہ یہ شرک نہیں ہے، حالانکہ اس کا شرک ہونا انبیاء علیہم السلام کا اجماعی مسئلہ ہے، کیونکہ اگر یہ شرک نہ ہو تو مکہ کے مشرک اور دوسرے بہت سے مشرک بھی موحد ہی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک جگہ ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [ یونس : ۱۸ ] ''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے نہ وہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔'' اور دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [ الزمر : ۳ ] ''اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔''

❼ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ: یعنی افسوس کہ تم اللہ تعالیٰ کی شان نہیں پہچانتے، اللہ تعالیٰ کی ذات تو وہ ہے کہ نہ اس کی کوئی صورت بن سکتی ہے اور نہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک ٹھہرایا جا سکتا ہے، سو یہ مطالبہ سراسر جاہلانہ اور مشرکانہ ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جاہل آدمی نظر نہ آنے والے رب کی عبادت کر کے تسکین نہیں پاتا جب تک سامنے ایک صورت نہ ہو، بنی اسرائیل نے جب وہ قوم دیکھی کہ گائے کی صورت کی پوجا کرتے تھے تو انھیں بھی یہ ہوس آئی، آخر سونے کا بچھڑا بنایا اور پوجا۔'' (موضح) آیت میں گائے کی صورت کی صراحت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کی بنیاد بن دیکھے رب تعالیٰ پر ایمان لانا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ (۳) میں ہے: ﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی لذت نے موسیٰ علیہ السلام کے دل کو پروردگار کو دیکھنے کی درخواست پر مجبور کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں مشاہدہ کروا کر واضح کر دیا کہ دنیا میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اب پیغمبر کا بن دیکھے رب پر ایمان دیکھیے اور قوم کا نظر آنے والے خدا کا مطالبہ دیکھیے! دراصل شرک کی بنیاد ہی یہ ہے کہ معبود آنکھوں کے سامنے نظر آنا ضروری ہے، اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد — عشق فریب می دہد جان امیدوار را

یعنی معبود کو اپنے سامنے حاضر دیکھنے کے ذوق ہی نے دنیا میں بت بنانے کی رسم کی بنیاد رکھی، کیونکہ عشق امید رکھنے والی

يَعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

بنی اسرائیل کو سمندر سے پار اتارا تو وہ ایسے لوگوں پر آئے جو اپنے کچھ بتوں پر جمے بیٹھے تھے، کہنے لگے اے موسیٰ! ہمارے لیے کوئی معبود بنا دے، جیسے ان کے کچھ معبود ہیں؟ اس نے کہا بے شک تم ایسے لوگ ہو جو نادانی کرتے ہو ﴿۱۳۸﴾

جان کو فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ افسوس کہ بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کچھ مسلمانوں نے تو پختہ قبریں بنا کر ان پر مجاورت کے ذریعے سے اپنا یہ ذوق پورا کیا اور اکثر لوگوں نے معرفت کے نام پر اپنے شیخ کا تصور ہر لمحے آنکھوں کے سامنے اس طرح رکھا کہ وہ عدم موجودگی میں بھی انھیں آنکھوں سے نظر آنے لگا اور وہ اپنے خیال میں اس سے پوچھ کر ہر کام کرنے لگے۔ اس کا نام انھوں نے فنا فی الشیخ ہونا رکھا، پھر کچھ آگے بڑھے اور اسی صورت کو رسول قرار دے کر انھیں آنکھوں سے دیکھنا، ان سے باتیں کرنا اور ہدایات لینا شروع کر دیا اور اسے فنا فی الرسول قرار دیا، پھر کچھ اور آگے بڑھے تو اسی صورت کو رب قرار دے کر ہر لمحے آنکھوں کے سامنے رکھ لیا اور اسے فنا فی اللہ کہہ کر شیخ کی صورت کے خدا ہونے اور ہر وقت اس کے دیدار اور اس سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ انتہا یہاں جا کر ہوئی کہ اپنے آپ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ہو جانے کا دعویٰ کر دیا۔ کسی نے کہا "أَنَا الْحَقُّ" میں خدا ہوں۔ کسی نے کہا "سُبْحَانِیْ مَا أَعْظَمُ شَأْنِیْ" میں سبحان ہوں، میری شان کس قدر عظیم ہے اور کسی نے کہا ؎

من تو شدم تو من شدی — من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں — من دیگرم تو دیگری

یعنی "میں تو ہو گیا، تو میں ہو گیا، میں جان بن گیا تو جسم بن گیا، تاکہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہے کہ میں اور ہوں اور تو کوئی دوسرا ہے۔" شرک اور مشرکین کا یہ سارا گورکھ دھندا دماغ کی خرابی اور وہم و خیال پر مبنی ہے اور ان کی تمام ریاضتیں دماغ کو خراب کرنے کے لیے ہیں، جو ہندو جوگیوں اور نصرانی راہبوں سے لی گئی ہیں۔ جن کے نتیجے میں وہ کچھ آنکھوں کو دکھائی دینے لگتا ہے جو محض گمان اور خیال کی پیداوار ہوتا ہے اور جس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ترک حیواناتِ جلالی و جمالی کی اصطلاح بنا کر اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں، مثلاً گوشت، دودھ، دہی، گھی اور شہد چھوڑنے سے دماغ میں مزید خشکی اور خرابی پیدا ہو کر انھیں نظر نہ آنے والی چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔ تمام بت پرست اسی خیال اور خواہشِ نفس کے پیچھے لگ کر خیالی خداؤں کی پرستش کر رہے ہیں، کوئی پتھر کی بنی ہوئی صورت سامنے رکھ کر اور کوئی اس کا تصور سامنے رکھ کر، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت قرآن و حدیث میں قرب الٰہی کے لیے ان ریاضتوں، سلسلوں اور ذریعوں کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے وہم و گمان اور خواہشِ نفس کا اتباع کہہ کر بت پرستی قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نجم (۱۹ تا ۲۵) اگر اللہ تعالیٰ کے

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع

بے شک یہ لوگ، تباہ کیا جانے والا ہے وہ کام جس میں وہ لگے ہوئے ہیں اور باطل ہے جو کچھ وہ کرتے چلے آ رہے ہیں﴿۱۳۹﴾ کہا کیا میں اللہ کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود تلاش کروں؟ حالانکہ اس نے تمھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ہے﴿۱۴۰﴾ اور جب ہم نے تمھیں فرعون کی آل سے نجات دی، وہ تمھیں برا عذاب دیتے تھے، تمھارے بیٹوں کو بری طرح قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی﴿۱۴۱﴾

قرب اور دیدار کا طریقہ یہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ہمیں ضرور بتا دیتے۔ جب موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر دنیا میں رب تعالیٰ کا دیدار برداشت نہیں کر سکے تو کسی اور بے چارے کی کیا مجال ہے۔

**آیت 139** اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ ...... : موسیٰ علیہ السلام نے ان کے مطالبے کے جواب میں چار باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ تم لوگ جہالت، یعنی نادانی اور اکھڑ پن اختیار کر رہے ہو، جیسا کہ پچھلی آیت میں گزرا ہے۔ دوسری یہ کہ یہ لوگ اس وقت جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ و برباد کر دیا جانے والا ہے اور اس سے پہلے بھی یہ جو کچھ کرتے آئے ہیں، باطل ہے۔ ایسے کام کا مطالبہ دنیا میں گمراہی و تباہی اور آخرت میں عذاب کا باعث ہے۔

**آیت 140** قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا ...... : تیسری ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے بطور سوال ڈانٹ ہے کہ کیا الٰہ (معبود) بھی کوئی ایسی ہستی ہے کہ انسان جسے جی چاہے بنا لے، بلکہ معبود تو وہی ہو سکتا ہے جو انسان کو ہر قسم کے انعامات سے نوازتا ہے اور پھر جس ذات نے تم پر بے بہا انعامات کیے ہیں اور تمھیں تمام عالم پر فضیلت بخشی ہے، کیا اب اس کی شکر گزاری یہی ہے کہ اسے چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرنے لگو؟ یہ شکر گزاری نہیں بلکہ عین ناشکری اور نمک حرامی ہے۔

**آیت 141** وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ...... : چوتھی یہ کہ آل فرعون سے نجات کو یاد کرو کہ اکیلے فرعون ہی نے نہیں بلکہ پوری قوم نے تمھیں غلام بنا رکھا تھا۔ ”بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ“ آزمائش انعام اور مصیبت دونوں طرح ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں تم پر مصیبت کا ابتلا بھی آیا اور انعام کا بھی۔ تمھارے لڑکوں کا ذبح کرنا اور عورتوں کو زندہ رکھ کر لونڈیاں بنا کر ان سے کام لینا اور اپنی خواہش نفس پوری کرنا اور مردوں کو ختم کرنے کے ذریعے سے بنی اسرائیل کی نسل ختم کرنے کا منصوبہ بنانا مصیبت تھا اور اس سے نجات انعام۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۹)۔

ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حنین کی طرف نکلے تو مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کی میعاد مقرر کی اور اسے دس راتوں کے ساتھ پورا کر دیا، سو اس کے رب کی مقررہ مدت چالیس راتیں پوری ہوگئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا میری قوم میں تو میرا جانشین رہ اور اصلاح کرنا اور مفسدوں کے راستے پر نہ چلنا ﴿۱۴۲﴾

گزرے، جسے ذاتِ انواط کہا جاتا تھا، وہ لوگ اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ تو (نومسلم) لوگ کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! آپ ہمارے لیے بھی ایک ذاتِ انواط مقرر فرما دیں، جیسا کہ ان کے لیے ذاتِ انواط ہے۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! یہ تو اسی طرح کی بات ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی کہ ہمارے لیے کوئی معبود بنا دے جس طرح ان (مشرکین) کے معبود ہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر سوار ہو جاؤ گے۔'' [ ترمذی، الفتن، باب ما جاء لترکبن سنن ...... : ۲۱۸۰ ] ترمذی اور البانی رحمہما اللہ دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔

**آیت 142** وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً ...... : فرعون سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر طلب فرمایا، تاکہ انھیں کتاب دی جائے۔ پہلے تیس دن کی میعاد مقرر کی گئی، پھر اس میں دس دن کا اضافہ کر دیا گیا، تاکہ ان چالیس دنوں میں موسیٰ علیہ السلام روزہ رکھیں اور دن رات عبادت اور تفکر و تدبر میں مصروف رہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تیس راتوں کی خلوت سے عبادت اور مناجات کی عادت پڑ جائے گی اور مناجات کی لذت سے آشنائی کے بعد دس راتیں بڑھانے سے بھی طبیعت پر بوجھ نہیں پڑے گا، ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو پہلے ہی چالیس راتیں تھیں جو دس بڑھانے سے مکمل ہوگئیں۔ (واللہ اعلم) بعض روایات میں ہے کہ ان دس دنوں کا اضافہ اس لیے کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن کے روزوں کے بعد مسواک کر لی، جس سے وہ بو جاتی رہی جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب تھی، مگر اس روایت کا کوئی سراغ قرآن و حدیث سے نہیں ملا، نہ کسی صحیح سند سے اس کی تائید ہوتی ہے اور مسواک سے وہ بو جاتی بھی نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت معدہ خالی ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے روزے دار کے لیے مسواک کے مستحب ہونے کا ایک باب مقرر فرمایا ہے: (( بَابُ السِّوَاكِ الرَّطْبِ وَالْيَابِسِ لِلصَّائِمِ )) یعنی روزے دار تازہ اور خشک مسواک کر سکتا ہے۔ [ بخاری، الصوم، قبل ح : ۱۹۳٤ ]

جب موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کی یہ میعاد پوری کر چکے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا اور انھیں تورات کی الواح (تختیاں) عطا فرمائیں۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کا مزاج سمجھتے تھے، ہارون علیہ السلام اگرچہ اس سے پہلے بھی اصلاح کی کوشش کرتے رہتے تھے مگر ان

وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ وَ لٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا اور لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ، سو اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔ تو جب اس کا رب پہاڑ کے سامنے ظاہر ہوا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا، پھر

---

کی حیثیت ایک مددگار اور وزیر کی تھی، اصل قائد موسیٰ علیہ السلام ہی تھے، اب ان دنوں کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے انھیں اپنا خلیفہ (جانشین) مقرر فرمایا اور تاکید فرمائی کہ وہ ان کی اصلاح کرتے رہیں اور فسادیوں کے پیچھے مت لگیں۔

آیت 143 ① وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا: میقات سے مراد مقرر کردہ وقت ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حاضری کا وعدہ تھا، اس لیے ''وٰعَدۡنَا'' (باب مفاعلہ) استعمال فرمایا جو دو فریقوں کے درمیان ہوتا ہے۔

② وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ: یعنی کسی واسطے کے بغیر کلام فرمایا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۳) اور نساء (۱۶۴) یہ ان کا اللہ سے ہم کلام ہونے کا دوسرا موقع تھا۔ پہلے موقعے کا ذکر سورۂ طٰہٰ (۱۲) میں ہے، جب آگ لینے گئے تھے اور رسالت سے سرفراز ہوئے تھے۔ واسطے کے بغیر اس لیے کہ فرشتے کے ذریعے سے یا دل میں ڈال کر تو ہر نبی سے کلام ہوتا تھا، جسے ''وحی'' کہتے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کیا ہوئی؟ جس کا ذکر تمام لوگ قیامت کے دن موسیٰ علیہ السلام سے کر کے سفارش کی درخواست کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا۔ مشرک یونانیوں کے فلسفی عقائد سے متاثر لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کلام کر ہی نہیں سکتا، اس لیے یہاں ایسا کلام مراد ہے جس میں نہ لفظ تھے نہ آواز۔ کوئی ان سے پوچھے کہ یہ بات تمھیں قرآن مجید کی کس آیت یا حدیث سے معلوم ہوئی؟ قرآن مجید نے تو موسیٰ علیہ السلام کے لیے ''کلام'' کا لفظ استعمال فرمایا اور ''ندا'' کا بھی۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۱۰) اللہ کے کلام کرنے کے منکروں نے کہا، کلام سے مراد کلام نفسی ہے جو دل میں ہوتا ہے۔ مگر وہ تو سنائی نہیں دیتا اور وہ تو گونگوں کے دل میں بھی ہوتا ہے، اسے آپ سوچ، فکر اور ارادہ وغیرہ کہہ سکتے ہیں، مگر الفاظ کے نکلے بغیر کلام کیسے بن گیا؟ تم نے اللہ تعالیٰ کی کیا قدر کی کہ اسے بولنے سے معذور قرار دے کر گونگوں کے برابر کر دیا!! یہ لوگ قرآن کو بھی اللہ کا کلام نہیں مانتے، بلکہ اسے مخلوق کہتے ہیں کہ جو مفہوم اور معانی اللہ تعالیٰ کی ذات کے اندر موجود تھے اللہ تعالیٰ نے وہ معانی موسیٰ علیہ السلام کو پہنچانے کے لیے ہوا میں ایسے لفظ پیدا کر دیے جو وہ مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن اللہ کا کلام نہیں، اس کی مخلوق ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مخلوق تو فنا بھی ہو سکتی ہے، اس لیے قرآن سے جان چھڑانے کا ایک حیلہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قرآن اللہ کی مخلوق تھا، فنا ہو گیا، لہٰذا اب عمل کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں سے بس ایک ہی سوال ہے جو امام اہل السنہ احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے ان سے بار بار اور مسلسل کیا کہ بتاؤ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہاں فرمائی ہے؟! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان اس کے ثبوت کے لیے پیش کرو؟ محض فلسفیوں کے دماغ کی خرابی سے دین کبھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ تو کلام اللہ کو مخلوق کہنے والے اور اسے اللہ کی

وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

جب اسے ہوش آیا تو اس نے کہا تو پاک ہے، میں نے تیری طرف توبہ کی اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں ﴿۱۴۳﴾

صفت ماننے کے منکر آخر وقت تک یہ مطالبہ پورا نہ کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔

③ **قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ**…… : فرشتے کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کے کلام کی لذت سے موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ایسا شوق پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کر دی کہ پروردگارا! اپنا آپ مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا: ﴿**لَنْ تَرٰىنِيْ**﴾ ''تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا۔'' یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے کسی آنکھ میں یہ طاقت نہیں رکھی کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کو برداشت کر سکے۔ رہا آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار تو وہ مومنوں کے حق میں قرآن مجید کی آیات اور متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قیامہ (۲۲، ۲۳) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اس مقام پر لکھا ہے: ''یقین ہے کہ آخرت میں اللہ کو دیکھنا ہے، گمراہ لوگ منکر ہیں کہ ان کے نصیب میں نہیں۔'' (موضح)

④ **وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ**: یعنی جب میں پہاڑ پر تجلی فرماؤں تو دیکھ اگر…… یہ مشاہدہ کروا کر موسیٰ علیہ السلام کی دل جوئی فرمائی کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا کوئی برداشت ہی نہیں کر سکتا، تاکہ وہ درخواست قبول نہ ہونے پر دل گیر نہ ہوں۔

⑤ **فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ**…… : ''**تَجَلّٰى**'' یہ ''جَلَا يَجْلُوْ جَلْوَةً'' سے باب تفعل ہے۔ ''جَلَا'' کا معنی ظاہر کرنا، پردہ ہٹانا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

وَجَلَا السُّيُوْلُ عَنِ الطُّلُوْلِ كَاَنَّهَا زُبُرٌ تُجِدُّ مُتُوْنَهَا اَقْلَامُهَا

''سیلابوں نے پرانے کھنڈر اس طرح ظاہر کر دیے جیسے وہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلم ان کے متون کو نیا کر دیتے ہیں۔''

''**تَجَلّٰى**'' کا معنی ظاہر ہوا۔ ''**دَكًّا**'' مصدر ہے۔ ''دَكَّ يَدُكُّ'' (ن) اور ''دَقَّ يَدُقُّ'' قریب قریب معنی رکھتے ہیں، یعنی کسی چیز کو کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دینا۔ یہاں ''**دَكًّا**'' مفعول مطلق ہے، یعنی ''دَكَّهٗ دَكًّا'' کہ اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿**اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا**﴾ [ الفجر : ۲۱ ] اور ﴿**وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً**﴾ [ الحاقة : ۱۴ ] ''اَرْضٌ دَكَّاءُ'' اس زمین کو بھی کہتے ہیں جو برابر اور ہموار ہو، یعنی جب رب تعالیٰ پہاڑ کے لیے ظاہر ہوا تو اس جلوے نے پہاڑ کو زمین کے برابر کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا جلوہ تو کجا پہاڑ کی حالت دیکھنے کی تاب بھی نہ لا سکے، بلکہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بعض لوگوں نے ''**صَعِقًا**'' کا معنی کیا ہے کہ فوت ہو کر گر پڑے، اگرچہ ''**صَعِقًا**'' اس معنی میں بھی آتا ہے، مگر ''**فَلَمَّآ اَفَاقَ**'' (جب اسے ہوش آیا) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام فوت نہیں بلکہ بے ہوش ہوئے تھے۔ انس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے متعلق بیان کرتے ہیں: ﴿**فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا**﴾ [ الأعراف : ۱۴۳ ] فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (سمجھانے کے لیے) اپنا انگوٹھا انگلی کے پورے کے قریب رکھا (اور فرمایا) ''تو پہاڑ دھنس گیا۔'' [ ابن أبي عاصم في السنة : ۴۸۰، و صححه الألباني ]

قَالَ يٰمُوۡسٰۤى اِنِّى اصۡطَفَيۡتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىۡ وَبِكَلَامِىۡ ۖ فَخُذۡ مَاۤ اٰتَيۡتُكَ وَكُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِيۡنَ ۝ وَكَتَبۡنَا لَهٗ فِى الۡاَلۡوَاحِ مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ مَّوۡعِظَةً وَّتَفۡصِيۡلًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ ۚ فَخُذۡهَا بِقُوَّةٍ وَّاۡمُرۡ قَوۡمَكَ يَاۡخُذُوۡا بِاَحۡسَنِهَا ؕ سَاُورِيۡكُمۡ دَارَ الۡفٰسِقِيۡنَ ۝

فرمایا اے موسیٰ! بے شک میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر چن لیا ہے، پس لے لے جو کچھ میں نے تجھے دیا ہے اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جا ﴿۱۴۴﴾ اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں ہر چیز کے بارے میں نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی، سو انھیں قوت کے ساتھ پکڑ اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کی بہترین باتوں کو پکڑے رکھیں، عنقریب میں تمھیں نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا ﴿۱۴۵﴾

⑥ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ: تو پاک ہے (کہ تجھے دنیا میں کوئی دیکھ سکے) میں توبہ کرتا ہوں (اس بات سے کہ تیری اجازت کے بغیر تجھے دیکھنے کی درخواست کر بیٹھا)

⑦ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں، یعنی تجھ پر اور تیری عظمت وجلال پر، یا اس پر کہ کوئی تجھے قیامت سے پہلے نہیں دیکھ سکتا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے بزرگی دی کہ فرشتے کے بغیر خود کلام فرمایا، ان کو شوق ہوا کہ دیدار بھی کروں، اس کی برداشت نہ ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ممکن ہے، کیونکہ نمود (ظہور) ہوا تھا پہاڑ کی طرف، لیکن دنیا کے وجود کو برداشت نہ ہوئی مگر آخرت کے وجود کو برداشت ہوگی، وہاں دیکھنا یقینی ہے۔'' (موضح)

آیت 144 وَكُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِيۡنَ: یعنی میں نے جو اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے لیے تمھیں چنا ہے یہی بہت بڑی نعمت ہے، لہٰذا جو چیز مل گئی اس پر قناعت کر اور کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کر جو تیری طاقت سے باہر ہے۔ اس سے مقصود موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا ہے کہ دیکھنے سے روک دینے پر دل گرفتہ نہ ہوں۔

آیت 145 ① وَكَتَبۡنَا لَهٗ فِى الۡاَلۡوَاحِ مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ ...... : یعنی تمام عقائد و احکام اور نصائح جن کی حلال و حرام اور دین کے دوسرے معاملات معلوم کرنے کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کو ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ ''كُلّ'' کا لفظ موقع کی مناسبت ہی سے متعین ہوتا ہے، مثلاً ملکۂ سبا کے متعلق آتا ہے: ﴿وَاُوۡتِيَتۡ مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ﴾ [ النمل : ۲۳ ] ''اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔'' اور قوم عاد پر آنے والی آندھی کے متعلق فرمایا: ﴿تُدَمِّرُ كُلَّ شَىۡءٍۢ بِاَمۡرِ رَبِّهَا﴾ [ الأحقاف : ۲۵ ] ''جو ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی۔'' حالانکہ ظاہر ہے کہ نہ ملکۂ سبا کو کائنات کی ہر چیز عطا ہوئی تھی اور نہ اس آندھی نے کائنات کی ہر چیز کو برباد کیا تھا۔

② فَخُذۡهَا بِقُوَّةٍ: اسے قوت کے ساتھ پکڑ۔ مجاہد نے فرمایا، جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کر۔ [ بخاری، التفسیر، قبل ح : ٤٤٧٧ ]

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

عنقریب میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں حق کے بغیر بڑے بنتے ہیں اور اگر ہر نشانی دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لاتے اور اگر بھلائی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے راستہ نہیں بناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اسے راستہ بنا لیتے ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے ﴿۱۴۶﴾ اور جن لوگوں نے

③ موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن کے اعتکاف کے بعد کتاب ملی، جب کہ اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور ان کے احکام سے انکار کی وجہ سے ہلاک کی جا چکی تھی اور اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کو کوئی کتاب نہیں ملی تھی، تقریباً چالیس سال تک اترنے والی وحی موسیٰ علیہ السلام کی حدیث ہی تھی، جس کے انکار کی وجہ سے فرعون غرق ہوا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اسی طرح دونوں قسم کی وحی اتری، ایک کتاب اللہ اور دوسری حدیث۔ جس طرح کتاب اللہ کا منکر مسلمان نہیں، اسی طرح حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننے والا بھی کافر ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پہلے نبیوں کی طرح دونوں قسم کی وحی اتری۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۶۳ تا ۱۶۵) از فوائد مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ۔

④ وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا: ''اس کی بہتر باتیں'' یعنی جو کرنے کے حکم ہیں اور بری باتیں (وہ ہیں) جن کے نہ کرنے کا حکم ہے۔ (موضح) یا رخصت کے بجائے عزیمت اختیار کریں جو بہترین ہے اور جس کا اجر زیادہ ہے۔ یا دو کاموں میں سے ایک اچھا ہے اور ایک اس سے بھی اچھا ہے تو بہترین پر عمل کی کوشش کریں، مثلاً قصاص لینا، یا معاف کر دینا، انتقام لینا یا صبر کرنا اور درگزر سے کام لینا۔ قرض وصول کرنے میں مہلت دینا یا چھوڑ دینا وغیرہ، اگرچہ دونوں اچھے ہیں مگر احسن پر عمل کی کوشش کریں۔

⑤ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ: یعنی میں تمھیں فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا، یعنی دوبارہ فرعون اور اس کی آل کے گھر مصر لے جاؤں گا، اگرچہ کچھ دیر کے بعد، جیسا کہ بعد میں بنی اسرائیل کو فرعون کے باغات اور خزانوں کا مالک بنا دیا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۷) کے حواشی۔ استاد محمد عبدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے، یعنی اگر تم نے ان باتوں پر عمل نہ کیا تو تمھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ میری نافرمانی کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور انھیں کس قسم کی تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے (گویا "دَارَ الْفٰسِقِيْنَ" سے مراد جہنم ہے)۔ (ابن جریر) بعض نے لکھا ہے کہ "دَارَ الْفٰسِقِيْنَ" سے مراد اہل شام ہیں، گویا اس میں وعدہ ہے کہ ملک شام تمھارے قبضے میں آئے گا۔ (کبیر) یا یہ کہ اگر تم نے نافرمانی کی تو تم کو اسی طرح ذلیل کریں گے جس طرح شام کا ملک ان سے چھین کر تم کو دیا۔ (موضح)

آیت 146 ① سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ ...... : نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں

وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ضائع ہوگئے، وہ اسی کا بدلہ دیے جائیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴۷﴾ اور موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنالیا، جو ایک جسم تھا، جس کی گائے جیسی آواز تھی۔ کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ بے شک وہ نہ ان سے بات کرتا ہے اور نہ انھیں کوئی راستہ بتاتا ہے۔ انھوں نے اسے (معبود) بنالیا اور وہ ظالم تھے ﴿۱۴۸﴾

ذرہ برابر کبر ہوگا۔'' ایک آدمی نے کہا: ''آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (کیا یہ بھی کبر ہے)؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر تو بڑا بنتے ہوئے حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر اور بے وقعت جاننے کا نام ہے۔'' [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانه : ۹۱، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ] اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سن کر جو لوگ اپنی بڑائی اور برتری کے زعم میں حق قبول نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ بھی انھیں اپنی آیات قبول کرنے سے دفع دور کر دیتا ہے۔ یہاں فرمایا: ''میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا......'' یعنی انھیں یہ سزا دوں گا کہ وہ میری عظمت، شریعت اور احکام کو سمجھ نہ سکیں گے اور پھر جاہل رہنے کی وجہ سے دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل ہوں گے۔ (نیز دیکھیے انعام : ۱۱۰) اس لیے بعض سلف کا قول ہے: ''متکبر شخص علم حاصل نہیں کر سکتا اور جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے ایک ساعت کی ذلت گوارا نہیں کر سکتا وہ جاہل رہ کر ہمیشہ کی ذلت مول لیتا ہے۔'' (ابن کثیر) ''**بِغَيْرِ الْحَقِّ**'' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حق بنتا ہو وہاں بڑا بن کے دکھانا درست ہے، مثلاً کفار کے مقابلے میں میدان جنگ کے اندر اللہ تعالیٰ کو متکبرانہ انداز کی چال بھی محبوب ہے جو عام حالات میں اسے سخت ناپسند ہے۔

② **وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ**: یعنی یہ سب ان کے اپنے کیے کی سزا ہوگی، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ **فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ** ﴾ [ الصف : ۵ ] ''جب وہ ٹیڑھے ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔'' شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''الواح (تختیاں) دے کر یہ بھی فرمایا کہ قوم کو تقید (پابند) کرو کہ عمل کریں اور یہ بھی فرما دیا کہ جو بے انصاف ہیں اور حق پرست نہیں ان کے دل میں پھیر دوں گا، اس پر عمل نہیں کریں گے، یعنی ان حکموں کی توفیق نہ ہوگی اور جو اپنی عقل سے کریں گے وہ قبول نہ ہوگا۔'' (موضح)

**آیت 148** ① **وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى**...... : یہی قصہ سورۂ طٰہٰ میں بھی بیان ہوا ہے۔ ''**مِنْ حُلِيِّهِمْ**'' (اپنے زیوروں سے) یہ الفاظ صراحت کر رہے ہیں کہ وہ زیورات بنی اسرائیل کے اپنے تھے، اس لیے بائبل اور ہماری تفسیروں کی اسرائیلی

وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ١ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۱۴۹

اور جب وہ پشیمان ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ بے شک وہ تو گمراہ ہوگئے ہیں، تو انھوں نے کہا یقیناً اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور ہی خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے ﴿۱۴۹﴾

روایات میں جو کہا گیا ہے کہ وہ زیور قبطیوں کے تھے اور بنی اسرائیل نے ان سے ادھار لیے تھے وہ درست نہیں، مزید تفصیل سورۂ طٰہٰ (۸۷) میں دیکھیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے تو ان میں سے ایک شخص سامری نے ان سے یہ زیورات لے لیے اور انھیں آگ میں پگھلا کر بچھڑے کی شکل کا ایک مجسمہ بنا ڈالا، جس سے گائے کی آواز نکلتی تھی، اس آیت میں اس مجسمے کے بنانے کو بنی اسرائیل کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیونکہ سامری نے اسے ان کی اجازت اور رضا مندی سے بنایا تھا اور وہ اپنے لیے اس قسم کے ایک معبود کی خواہش رکھتے تھے۔ (ابن کثیر) تفسیر ثنائی میں ہے کہ موجودہ تورات کی دوسری کتاب کے بتیسویں باب میں جو لکھا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے خود ہی ان کو بچھڑا بنا دیا تھا، یہ صریح غلط ہے، شانِ نبوت اور شرک اجتماع ضدین ہے۔ عیسائیو! قرآن کے "مُهَيْمِنٌ عَلَى التَّوْرَاةِ" ہونے میں اب بھی شک کرو گے؟ (مُهَيْمِنٌ کا معنی سمجھنے کے لیے ملاحظہ کیجیے سورۂ مائدہ: ۴۸ کے حواشی) مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ بچھڑا واقعی گوشت پوست اور خون کا بن گیا تھا اور اس میں جان پڑ گئی تھی، یا وہ محض ایک مجسمہ رہا، جس میں ہوا داخل ہوتی یا داخل کی جاتی تو اس سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی؟ جو مفسرین اس کے واقعی جاندار بچھڑا ہونے کے قائل ہیں وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے پاس گھوڑی پر سوار آئے، سامری نے انھیں دیکھ لیا اور ان کی گھوڑی کے پاؤں تلے کی کچھ مٹی لے لی اور انھوں نے سورۂ طٰہٰ کی آیت (۹۶) ﴿ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ ﴾ کے یہی معنی کیے ہیں، چنانچہ اس مٹی کو جب انھوں نے بچھڑے کے اس مجسمے پر ڈالا تو وہ سچ مچ کا بچھڑا بن گیا، لیکن یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ نیز دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۸۸ تا ۹۶)۔

② اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا: اللہ تعالیٰ نے تو نظر نہ آنے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور ہدایت کا راستہ بھی بتایا، یہ عجیب معبود ہے کہ سامنے ہونے کے باوجود نہ بات کر سکتا ہے نہ ہدایت دے سکتا ہے، پھر وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر بالفرض اس میں جان بھی پڑ گئی ہے تو وہ ایک عاجز حیوان ہے، اس جیسی بلکہ اس سے بہتر بے شمار گائیں ڈنڈے کھاتی پھرتی ہیں اور زنجیروں میں بندھی ہوئی بے بس ہو کر دودھ دے رہی ہیں۔ معلوم ہوا معبود کے لیے کلام کرنے والا اور ہدایت دینے والا ہونا ضروری ہے۔ ''کلام کرنے والا'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حکم دے سکے، منع کر سکے اور ''ہدایت دینے والا'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہدایت دینے پر قدرت ہو۔

آیت 149 وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ: یہ عربی زبان کا محاورہ ہے، جس کا معنی ہے کہ جب وہ نادم اور پشیمان ہوئے۔ رہی یہ بات کہ یہ محاورہ کیسے بنا تو ظاہر ہے کہ یہاں ان کے ہاتھوں میں گر پڑنے والی چیز مجہول رکھی گئی ہے، گویا ندامت کی

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَ كَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۫ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

اور جب موسیٰ غصے سے بھرا ہوا، افسوس کرتا ہوا اپنی قوم کی طرف واپس آیا تو اس نے کہا بری ہے جو تم نے میرے بعد میری جانشینی کی، کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے جلدی کی، اور اس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کے سر کو پکڑ لیا، اسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اس نے کہا اے میری ماں کے بیٹے! بے شک ان لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھے قتل کر دیتے، سو دشمنوں کو مجھ پر خوش نہ کر اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر ﴿۱۵۰﴾

وجہ سے ان کے منہ ہاتھوں میں آ گرے اور اس پشیمانی میں انھوں نے اپنے چہرے ہاتھوں میں چھپا لیے۔ یا انسان جب پشیمان اور نادم ہوتا ہے تو وہ دانتوں سے ہاتھ کاٹتا ہے، گویا اس کا منہ اور دانت ہاتھوں میں آ گرتے ہیں، یعنی بے اختیار پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی جب انھیں کچھ ہارون علیہ السلام کے سمجھانے سے اور کچھ موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری پر ان کے غیظ و غضب سے احساس ہوا کہ ہم کتنا بڑا غلط کام کر بیٹھے ہیں تو انھوں نے یہ دعا کی۔ سورۂ بقرہ (۵۴) کی تفسیر میں ان کی توبہ، ایک دوسرے کو قتل کرنے اور توبہ کی قبولیت کا ذکر گزر چکا ہے۔

**آیت 150** ① **وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا:** "غَضْبَانَ" "فَعْلَانَ" کے وزن پر کسی چیز سے بھرے ہوئے ہونے پر دلالت کرتا ہے، یعنی غصے سے بھرے ہوئے۔ "**اَسِفًا**" صفت کا صیغہ ہے، لغت میں اس کا معنی غصے والا بھی ہے جو غضب سے بھی بڑھ کر ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ **فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ** ﴾ [ الزخرف : ۵۵ ] "پھر جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔" اور اس کا معنی افسوس اور غم بھی ہوتا ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ شدید غصہ اور افسوس ایک ہی چیز کی دو حالتیں ہیں، کوئی کمزور ہو تو اس پر غصہ آتا ہے اور طاقت ور ہو تو افسوس ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں رہ کر موسیٰ علیہ السلام کو ان پر غلبہ بھی حاصل تھا اور ان کی جہالتوں پر بے بس بھی تھے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام غصے اور افسوس سے بھرے ہوئے واپس لوٹے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں طور پر ہی خبر دے دی تھی کہ سامری نے آپ کے بعد آپ کی قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۸۵)۔

② **بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ:** یعنی میں جاتے وقت تمھیں کہہ گیا تھا کہ جب تک میں نہ آؤں ہارون میرے خلیفہ ہوں گے، ان کا حکم ماننا اور مفسدوں کے پیچھے نہ لگنا، مگر میں جب مقرر میعاد (۳۰) دن تک واپس نہ آیا تو تم نے سمجھ لیا کہ میں مر گیا ہوں، اس پر تم نے بچھڑا بنا کر پوجنا شروع کر دیا، اس طرح تم میرے بعد بہت برے جانشین ثابت ہوئے، یا تم نے بہت برا کام کیا ہے۔ (المنار)

قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِاَخِیۡ وَ اَدۡخِلۡنَا فِیۡ رَحۡمَتِکَ ۫ۖ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾

اس نے کہا اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم والا ہے ﴿۱۵۱﴾

③ وَ اَلۡقَی الۡاَلۡوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاۡسِ اَخِیۡہِ...... : موسیٰ علیہ السلام کا شدید غصہ دو کاموں کی صورت میں ظاہر ہوا، ایک الواح کو پھینکنا اور دوسرا ہارون علیہ السلام کے سر کو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سنی ہوئی بات آنکھوں سے دیکھنے کی طرح نہیں ہوتی، اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دی جو ان کی قوم نے بچھڑے کے معاملے میں کیا تھا، مگر انھوں نے تختیاں نہیں پھینکیں، جب آنکھوں سے دیکھا جو کچھ انھوں نے کیا تھا تو تختیاں پھینک دیں تو وہ ٹوٹ گئیں۔'' [ أحمد : ۱/ ۲۷۱، ح : ۲٤٥۱۔ مستدرك حاكم : ۲/ ۳۲۱، ح : ۳۲٥۰، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وصححه الألباني ]

④ قَالَ ابۡنَ اُمَّ : موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کے سگے بھائی ہی تھے، مگر انھوں نے ان کی شفقت حاصل کرنے کے لیے ''اے میری ماں کے بیٹے'' کہا۔ ''ابۡنَ اُمَّ '' اصل میں ''یَا ابۡنَ اُمِّیۡ ''تھا، حرف ندا یاء حذف کر دیا اور ''اُمِّیۡ'' کی یاء کو الف سے بدل دیا تو ''ابۡنَ اُمَّا'' بن گیا، پھر مزید تخفیف کے لیے الف بھی حذف کر دیا تو '' ابۡنَ اُمَّ '' بن گیا۔

⑤ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ...... : یعنی میں نے انھیں بچھڑے کی پوجا سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۹۰ ) مگر یہ لوگ مجھ پر پل پڑے اور قریب تھا کہ مجھے قتل ہی کر دیتے۔

⑥ فَلَا تُشۡمِتۡ بِیَ الۡاَعۡدَآءَ...... : ''شَمَاتَۃٌ '' کا معنی کسی نقصان پر دشمن کا خوش ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس انداز غضب پر دشمن تو ضرور خوش ہوئے ہوں گے، دشمنوں سے مراد بچھڑا بنانے والے اور اس کی عبادت کی حمایت کرنے والے ہیں۔ اس لیے ہارون علیہ السلام نے کہا کہ اس طرح میری گرفت کر کے دشمنوں کو خوش نہ کرو۔ ﴿وَلَا تَجۡعَلۡنِیۡ مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ﴾ اور یہ طے نہ کر لو کہ میں بھی ان کے بچھڑا بنانے یا پوجنے کے عمل میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ اس سے ہارون علیہ السلام پر تورات کی اس تہمت کا واضح رد ہو گیا جس کا ذکر پیچھے ( آیت ۱۴۸ ) میں ہوا ہے کہ یہ بچھڑا ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ ہارون علیہ السلام کو اس بات سے بھی بہت تکلیف ہوئی کہ بھائیوں کے اختلاف سے دشمن خوش ہوں گے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ''شَمَاتَۃِ الۡاَعۡدَاءِ'' سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے، یعنی اس بات سے ہمیشہ پناہ مانگتے کہ کسی مصیبت پر دشمنوں کو خوشی حاصل ہو۔ پوری دعا اس طرح ہے: (( اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَ دَرَكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ )) [ بخاري، الدعوات، باب التعوذ من جهد البلاء : ٦٣٤٧ ]

آیت 151 قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِاَخِیۡ : ہارون علیہ السلام کے حلیمانہ دعا جزانہ لہجے اور عذر سے موسیٰ علیہ السلام نرم ہو گئے اور اللہ

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْۤا ؗ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

بے شک وہ لوگ جنھوں نے بچھڑا بنا لیا عنقریب انھیں ان کے رب کی طرف سے بھاری غضب پہنچے گا اور بڑی رسوائی دنیا کی زندگی میں اور ہم جھوٹ باندھنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں﴿۱۵۲﴾ اور جن لوگوں نے برے اعمال کیے، پھر ان کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، بے شک تیرا رب اس کے بعد ضرور بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے﴿۱۵۳﴾ اور جب موسیٰ کا غصہ خاموش ہو گیا تو اس نے تختیوں کو اٹھا لیا اور ان کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی جو صرف اپنے رب سے ڈرتے ہیں﴿۱۵۴﴾

تعالیٰ سے دعا کی کہ میری اس زیادتی کو معاف فرما جو مجھ سے غصہ کی حالت میں ہارون علیہ السلام کو ڈانٹنے میں ہوئی اور ہارون علیہ السلام کی اس کوتاہی سے درگزر فرما جو ممکن ہے لوگوں کو باز رکھنے میں ان سے ہوئی ہو۔

**آیت 152** ① سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: اللہ تعالیٰ کا ان پر غضب یہ ہوا کہ جب تک ان میں سے بعض نے بعض کو قتل نہیں کیا ان کی توبہ قبول نہیں ہوئی۔ (دیکھیے بقرہ: ۵۴) بنی اسرائیل میں جس طرح قتلِ عمد کی حد قتل تھی اسی طرح شرک کی حد بھی قتل ہی تھی اور یہ اس "اِصْر" یعنی بوجھ میں شامل تھی جو پہلی امتوں پر ڈالے گئے۔ ہماری امت میں یہ تخفیف ہوئی کہ شرک کی حد اب قتل نہیں بلکہ صدق دل سے توبہ ہی سے معافی ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر شرک پر اصرار کرے تو وہ مرتد ہے اور اسے قتل کیا جائے گا۔

② وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ: ابو قلابہ رحمہ اللہ نے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا: ''قیامت تک ہر مفتری کی یہی سزا ہے (خواہ دین میں شرکیہ کام ایجاد کرے یا کوئی اور)۔'' کیونکہ کوئی بھی نئی چیز دین میں داخل کرنے والا مفتری ہے اور بدعت بدترین جھوٹ ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے لگایا جاتا ہے۔ امام مالک اور سفیان بن عیینہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''مفترین'' کے معنی ''مبتدعین'' یعنی اہل بدعت کے ہیں اور ہر بدعتی قیامت تک ذلیل و خوار ہوتا رہے گا۔ (قرطبی، بغوی)

**آیت 153** وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ...... : معلوم ہوا خالص توبہ کے بعد ایمان و اصلاح کے ساتھ زندگی گزارنے سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے، وہ چھوٹا ہو یا بڑا، جس توبہ کے بعد عمل کی اصلاح نہ ہو اس کا اعتبار نہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۰)، آل عمران (۸۹) اور سورۂ نحل (۱۱۹)۔

**آیت 154** ① وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ: ''سَكَتَ'' کا لفظی معنی ''خاموش ہونا'' ہے۔ یہ ایک پر لطف استعارہ

وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقررہ وقت کے لیے چنے، پھر جب انھیں زلزلے نے آ پکڑا تو اس نے کہا اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو انھیں اس سے پہلے ہلاک کر دیتا اور مجھے بھی، کیا تو ہمیں اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا ہے؟ یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش، جس کے ساتھ تو گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے، تو ہی ہمارا یار و مدد گار ہے، سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے﴿۱۵۵﴾

ہے، گویا یہاں غصے کو ایسے آدمی سے تشبیہ دی ہے جو مسلسل موسیٰ علیہ السلام کو بھڑکا رہا تھا، جب وہ انھیں بھڑکانے سے خاموش ہو گیا تو موسیٰ علیہ السلام بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ قرآن مجید میں جو لطف یہاں "سَكَتَ" کا لفظ دے رہا ہے کوئی دوسرا لفظ، مثلاً "سَكَنَ" (ساکن ہو گیا) وغیرہ کبھی یہ لطف نہ دیتا۔

❷ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ: غصہ ٹھنڈا ہونے پر موسیٰ علیہ السلام نے وہ تختیاں اٹھائیں جو اگرچہ گرنے کی وجہ سے کچھ ٹوٹ گئی تھیں، جیسا کہ اس سے پہلے آیت (۱۵۰) کے حاشیہ (۳) میں صحیح حدیث سے نقل ہوا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ ٹوٹنا معمولی تھا، ایسا نہ تھا کہ تختیاں اٹھائی نہ جا سکتیں، یا انھیں پڑھنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہوتا۔

❸ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا: "نُسْخَةٌ" "فُعْلَةٌ" کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے۔ "نَسَخَ يَنْسَخُ (ف)" کے معنی اگرچہ پہلے حکم کو دوسرے حکم کے ساتھ ختم کرنے کے بھی آتے ہیں، مگر اس کا معنی "لکھنا" بھی آتا ہے۔ "اِسْتَنْسَخَ" بھی اسی معنی میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الجاثیۃ : ۲۹ ] "بے شک ہم لکھواتے جاتے تھے جو تم عمل کرتے تھے۔" "نُسْخَةٌ" اس اصل کو بھی کہتے ہیں جس سے نقل کیا جائے اور نقل شدہ کو بھی "نُسْخَةٌ" کہا جاتا ہے۔

❹ لِلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ: آسمانی کتابوں سے فائدہ اور ہدایت انھی کو حاصل ہوتی ہے جو صرف اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۳)۔

آیت 155 ❶ وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ......: موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ وقت پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب فرمایا، ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے بہترین آدمیوں ہی کا انتخاب کیا ہو گا، مگر وہاں جا کر ان پر اللہ کا ایسا غضب ہوا کہ وہ سب زلزلے سے مر گئے۔ اس عذاب کا باعث کیا تھا؟ مفسرین نے مختلف وجوہ بیان کی ہیں، جن میں سے سب سے راجح وہی بات ہے جو سورۂ بقرہ (۵۵) میں ذکر ہوئی ہے کہ انھوں نے

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا میرا عذاب، میں اسے پہنچاتا ہوں جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر

---

تھا: ''اے موسیٰ! جب تک ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں تیرا یقین ہرگز نہیں کریں گے۔'' اس گستاخی پر ان پر بجلی گری جس سے وہ سب مر گئے۔ یہاں ''الرَّجْفَةُ'' (زلزلے) کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ بجلی کی کڑک سے، خصوصاً جب وہ بصورت عذاب ہو، زلزلہ آنا معمول کی بات ہے۔

2 قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ: یعنی اگر تو چاہتا تو ان ستر آدمیوں کو بنی اسرائیل سے نکلنے سے پہلے وہیں ہلاک کر دیتا، تاکہ بنی اسرائیل ان کی ہلاکت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے اور مجھ پر الزام نہ رکھ سکتے کہ میں نے انھیں ہلاک کر دیا ہے اور تو چاہتا تو میری قوم کی گستاخی کی پاداش میں مجھے بھی ہلاک کر دیتا، تو نے جب اس وقت ہم پر رحم کرتے ہوئے ایسا نہیں کیا تو اب بھی ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما اور انھیں ہلاک نہ کر۔

3 اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا: بے وقوفوں کے فعل سے مراد بچھڑے کی عبادت بھی ہو سکتی ہے، مگر زیادہ واضح بے وقوفی موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کو صاف دکھانے کا مطالبہ اور شرط ہے کہ ہم اس کے بغیر تیری بات کا یقین ہی نہیں کریں گے۔

4 بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا: معلوم ہوا کہ نہ بچھڑے کی عبادت تمام بنی اسرائیل نے کی تھی اور نہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ ستر کے ستر نے کیا تھا۔ یہ ان کے جاہل اور بے وقوف لوگوں کا فعل تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگارا! کیا تو ہم میں سے بے وقوف لوگوں کے فعل کی وجہ سے سب کو ہلاک کر دے گا۔

5 اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ: یعنی جنھوں نے بچھڑے کی پوجا کی یا تجھے آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کیا، حقیقت میں یہ سب کام تیری طرف سے ایک آزمائش تھے، تو جس طرح چاہتا ہے امتحان لیتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ (ابن کثیر) اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۵۶)۔

آیت 156 1 قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ...... : یعنی میرا عذاب تو صرف ان کافروں اور نافرمانوں کے لیے مخصوص ہے جنھیں میں ان کی نافرمانی پر سزا دینا چاہتا ہوں، کیونکہ عذاب دینا میری غالب صفت نہیں بلکہ وہ میرا ایک فعل ہے جو عدل کے تقاضے کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ میری اصل اور غالب صفت جس کے ساتھ کائنات کا نظام چل رہا ہے، وہ میری رحمت ہے، جس سے کائنات کی ہر چیز فیض یاب ہو رہی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، اسی اثنا میں ایک اعرابی نے نماز کی حالت میں کہہ دیا: ''اے اللہ!

وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۵۶ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ

ایمان لاتے ہیں۞ وہ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو اُمّی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا

مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم نہ فرما۔'' جب رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تو اس اعرابی سے فرمایا: (( لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعًا )) ''تو نے اللہ تعالیٰ کی رحمت واسع کو محدود کر دیا۔'' [ بخاري، الأدب، باب رحمة الناس والبهائم : ٦٠١٠ ] اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں بھی خاص نیکو کاروں کے لیے ہوتی اور کفر و نافرمانی پر فوراً مؤاخذہ ہوتا تو وہ روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۶۱) اور فاطر (۴۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے سو رحمت پیدا فرمائی، اس میں سے ایک رحمت جن و انس، جانوروں اور زہریلے سانپوں اور کیڑوں میں اتاری، اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر شفقت اور ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور ننانویں رحمتیں اللہ تعالیٰ نے مؤخر کر رکھی ہیں جن کے ساتھ وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔'' [ مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى...... : ٢٧٥٢، ٢٧٥٣، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

② فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ: ''وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ'' کے الفاظ میں ابلیس اور تمام کفار بھی شامل تھے، کیونکہ ''كُلَّ شَيْءٍ'' میں یہ سب داخل ہیں، اس لیے یہ بتانے کے لیے کہ یہ سب میری رحمت سے محروم ہیں، فرمایا کہ میں اپنی رحمت صرف ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو ڈرتے ہیں اور ان تمام صفات کے حامل ہیں جو اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں مذکور ہیں۔ یہ بھی وضاحت فرما دی کہ نبی اُمّی ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اس رحمت کے مستحق صرف وہ ہیں جو آپ ﷺ کے متبع ہوں گے۔

③ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: دوسرے ارکان و فرائض کو چھوڑ کر خاص طور پر زکوٰۃ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہودیوں میں مال کی محبت بہت پائی جاتی تھی جس کی بنا پر وہ جتنی کوتاہی ادائے زکوٰۃ میں کرتے تھے کوئی اور فریضہ ادا کرنے میں نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ اس محبت نے زکوٰۃ دینے میں کوتاہی سے آگے بڑھ کر انھیں سود خوری پر لگا دیا۔ وہی حال اب امت محمد ﷺ کا ہے، مگر جس پر میرے رب کا خاص کرم ہو۔

④ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ آیت تمام احکام شریعت پر حاوی ہے۔ تقویٰ (نافرمانی سے پرہیز)، زکوٰۃ (حقوق مالی) اور اللہ کی آیات پر ایمان میں ہر قسم کی معرفت آ جاتی ہے، یہاں موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا جواب ختم ہو گیا، اب اگلی آیت سے موقع کی مناسبت سے یہود و نصاریٰ کو نبی ﷺ کی پیروی اختیار کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ دنیا و آخرت میں رحمت الٰہی کے حصول کے لیے مندرجہ بالا صفات کے علاوہ ''نبی اُمّی'' کی پیروی بھی ضروری ہے۔

**آیت 157** ① اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ......: یعنی اس زمانے میں میری رحمت کے خاص طور پر مستحق وہ لوگ ہیں......۔ (قرطبی)

مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ؕ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ

ہوا پاتے ہیں، جو انھیں نیکی کا حکم دیتا اور انھیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔ سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی

② اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی نو صفات مذکور ہیں اور الْاُمِّيَّ (جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو) کے لفظ سے یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود آپ میں جو کمال علم پایا جاتا ہے وہ آپ کا بہت بڑا معجزہ ہے، جو ''علوم نبوت'' قرآن مجید اور احادیث کی شکل میں موجود ہیں انھیں پڑھ کر عرب جیسی ان پڑھ قوم دنیا کی انتہائی تعلیم یافتہ اور مہذب ترین قوموں کی راہنما بن گئی۔

③ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا ...... : اگرچہ یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل میں لفظی اور معنوی تحریف میں کم ہی کسر چھوڑی ہے، خصوصاً مختلف زبانوں کے تراجم میں آپ ﷺ کے نام کے بجائے اس کا ترجمہ کر دیا ہے، حالانکہ نام کا ترجمہ نہیں کیا جاتا، پھر ترجمہ بھی اپنی مرضی کے مطابق کیا ہے اور اصل زبان میں جو کتابیں تھیں وہ ملتی ہی نہیں، تاہم آج بھی تورات و انجیل میں وہ مقامات موجود ہیں جن میں بنی اسرائیل کو نبی ﷺ کی آمد کی بشارت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے استثناء، باب ۱۸، فقرہ ۱۵ تا ۱۹۔ باب ۳۳، فقرہ ۲۔ متی، باب ۳، فقرہ ۱ تا ۱۲۔ یوحنا، باب ۱، فقرہ ۱۹ تا ۲۳۔ باب ۱۴، فقرہ ۱۵ تا ۱۷ اور ۲۵ تا ۲۷۔ باب ۱۶، فقرہ ۱۲ تا ۱۵۔ علاوہ ازیں دیکھیے تورات کی پانچویں کتاب استثناء، باب ۱۷، فقرہ ۱۴۔ یوحنا، باب ۱۶، فقرہ ۱۲ تا ۱۴۔

④ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ ...... : یعنی جو طیب چیزیں ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کر دی گئی تھیں، یا انھوں نے خود انھیں اپنے اوپر حرام کر لیا تھا (جیسے اونٹ کا گوشت اور چربی وغیرہ) وہ انھیں حلال قرار دیتا ہے اور جن ناپاک چیزوں کو انھوں نے حلال قرار دے رکھا تھا (جیسے سور کا گوشت اور شراب وغیرہ) وہ انھیں حرام قرار دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو چیز شریعت نے حلال قرار دی ہے وہ طیب ہے اور جو حرام قرار دی ہے وہ خبیث ہے۔

⑤ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ ...... : ''اِصْرٌ'' (بوجھ) سے مراد وہ سخت احکام ہیں جو پچھلی شریعت میں تھے، مثلاً نماز صرف عبادت خانوں ہی میں ادا کرنا، شرک کی حد قتل ہی ہونا وغیرہ اور ''الْاَغْلٰلَ'' (طوقوں) سے مراد وہ خود ساختہ پابندیاں ہیں جو ان کے علماء نے ان پر لگا رکھی تھیں، یا ان کے عوام نے جو رسوم خود اپنے آپ پر لازم قرار دے رکھی تھیں، مثلاً حائضہ کو کھانے پینے میں الگ کر دینا، اس کی رہائش بھی الگ کر دینا، جیسا کہ مسلمانوں میں نصرانیوں اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی موت کی

الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

لوگ فلاح پانے والے ہیں۝۱۵۷ کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ (اللہ) کہ

رسوم تیجا، ساتواں، چالیسواں، پیدائش اور نکاح کی رسوم، مثلاً بچے کی پیدائش پر دروازے پر سرس یعنی شرینہ کے پتے لٹکانا، زچہ کی چارپائی پر لوہا رکھنا، کھسرے نچانا، ان پر خرچ کرنا، بے اولاد خاتون کو منحوس سمجھ کر گھر میں نہ آنے دینا، نکاح میں سہرا، گانا، مہندی، منگنی کی خود ساختہ رسمیں، اسی طرح نیوندرہ، سلامی اور جہیز وغیرہ جن سے لوگوں کی زندگی دشوار ہو چکی ہے اور جو نہ اللہ کی کتاب میں ہیں نہ سنت رسول ﷺ میں۔ اسی طرح اللہ بہتر جانتا ہے کہ پیغمبروں کی گستاخی کرنے والی حتیٰ کہ انھیں قتل تک کر دینے والی اس امت کے احبار و رہبان نے کتنی حلال چیزوں کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا ہو گا اور ختم اور میت بخشوانے وغیرہ کے نام پر لوگوں کا مال کس کس طرح کھایا ہو گا۔ محمد ﷺ نے وہ تمام بوجھ اور طوق اتار کر اور وہ تمام پابندیاں توڑ کر اصل اسلام پیش فرمایا جو نہایت سادہ اور آسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَحَبُّ الدِّيْنِ إِلَى اللّٰهِ الْحَنِيْفِيَّةُ السَّمْحَةُ )) ''اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب آسان حنفی دین ہے۔'' [ بخاری، الإیمان، باب الدین یسر، قبل ح : ۳۹، تعلیقًا ] اور فرمایا: (( اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ )) ''دین آسان ہے۔'' [ بخاری، الإیمان، باب الدین یسر : ۳۹ ] ایک دوسری حدیث ہے: (( لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ )) [ السلسلة الصحيحة : ۲۵۰ ] یعنی نہ ابتداءً نقصان پہنچانا جائز ہے نہ بدلے میں نقصان پہنچانا۔ نیز آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہمیشہ تلقین فرماتے: (( يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا )) ''آسانی کرو، تنگی مت کرو۔'' [ بخاری، الأدب، باب قول النبی ﷺ : یسروا ولا تعسروا : ۶۱۲۵ ]

افسوس مسلمانوں نے بھی اہل کتاب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شریعت کے فرائض کی پابندی کرنا اور منع کردہ چیزوں سے اجتناب چھوڑ دیا اور اپنی اور اپنے مولویوں اور جاہل عوام کی خود ساختہ رسوم و رواج کے بوجھ اور طوق اپنے اوپر ڈال کر اپنی زندگی کو مشکل میں ڈال دیا۔ وہ حج پر نہیں جاتے مگر قبروں پر عرسوں میں ہزاروں لٹا دیتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے مگر مرشدوں کے وظائف پر گھنٹے لگا دیتے ہیں۔ زکوٰۃ و عشر نہیں دیتے مگر میت کے موقع پر دیگوں، ختموں اور مولوی صاحبان پر لاکھوں اڑا دیتے ہیں، نکاح کی رسوم پوری کرنے، جہیز بنانے کے لیے ساری عمر کے لیے مقروض ہو جاتے ہیں مگر لڑکیوں کو ورثہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اب اس کی شکایت اللہ کے سوا کس کے سامنے کی جائے۔

⑥ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ ...... : وہ نور جو آپ کے ساتھ اتارا گیا وحی الٰہی ہے جو قرآن و سنت کی صورت میں قیامت تک محفوظ ہے۔ "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد آپ کی آمد کا علم ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا، خواہ یہودی ہو یا نصرانی یا کوئی اور، وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۶۲) کا حاشیہ (۲)۔

**آیت 158** ① قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ...... : یعنی میری رسالت تمام دنیا کے لوگوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ "جَمِيْعًا" کے مفہوم میں یہ دونوں باتیں صاف ظاہر ہیں اور مجھے ہدایت کا پیغام پہنچانے

وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اس کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، پس تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ، جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ﴿۱۵۸﴾ اور موسیٰ کی قوم میں سے کچھ لوگ ہیں جو حق کے ساتھ رہنمائی کرتے اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں﴿۱۵۹﴾

کے لیے بھیجنے والا وہ ہے جو آسمان و زمین کا بادشاہ، اکیلا عبادت کا حق دار اور موت و حیات کا مالک ہے۔ اب مجھ پر ایمان نہ لانے کی صورت میں اپنا انجام سوچ لو۔ رسول اللہ ﷺ کے تاقیامت تمام قوموں کے لیے رسول ہونے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ سبا (۲۸)، فرقان (۱) اور احزاب (۴۰)۔ ''جہاں تک پہنچے'' کے الفاظ کے ساتھ رسالت عام ہونے کی تصریح کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۹) عرب اور اہل کتاب کی صراحت کے ساتھ دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۰) اور دوسری آیات۔

2 فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ...... : پچھلی آیت میں اور اس میں نبی ﷺ کے وصف نبی اُمی کا خاص ذکر فرمایا ہے اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر نبوت سے پہلے آپ کے ان پڑھ ہونے اور پہلی کتابوں اور ایمان کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہونے کو کئی جگہ بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ''آپ اس سے پہلے نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔'' [ العنکبوت : ٤٨ ] اور فرمایا: ''یہ غیب کی خبروں سے ہے۔ اس سے پہلے انھیں نہ آپ جانتے تھے، نہ آپ کی قوم۔'' [ هود : ٤٩ ] اور فرمایا: ''آپ وحی سے پہلے نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔'' [ الشوریٰ : ٥٢ ] بلکہ فرمایا: ''آپ کو امید تک نہ تھی کہ آپ کو کتاب عطا کی جائے گی۔'' [ القصص : ٨٦ ] کئی لوگوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ قرآن کو مانتے ہیں پھر بھی کہتے ہیں کہ نبی ﷺ پیدا ہونے سے بھی پہلے ہر چیز کا علم رکھتے تھے، پھر آپ کا خاص وصف امی کیا ہوا کہ ایک بالکل ان پڑھ شخص دنیا کے تمام پڑھے لکھے، دانشور، فلسفی اور دوسرے علوم میں کمال رکھنے والوں کا استاد بن گیا۔

3 يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ : اللہ تعالیٰ کے کلمات کے لامحدود ہونے کا تذکرہ دیکھیے سورۂ کہف (۱۰۹) اور لقمان (۲۷) میں۔

4 لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ : معلوم ہوا اب ہدایت صرف رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی میں ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی (انفرادی ہو یا اجتماعی اس) کے ہر گوشہ میں آپ ہی کی ہدایت اور نقش قدم پر چلا جائے، اس کے علاوہ ہدایت کا کوئی راستہ نہیں۔ دیکھیے سورۂ نجم (۳، ۴)۔

آیت 159 وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ...... : اس سے مراد وہ یہودی ہیں جو تورات پر قائم رہے اور وہ جو نبی ﷺ کی آمد

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

اور ہم نے انھیں بارہ قبیلوں میں تقسیم کر دیا، جو کئی گروہ تھے اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی، جب اس کی قوم نے اس سے پانی مانگا کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مار تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، بلاشبہ سب لوگوں نے اپنی پانی پینے کی جگہ معلوم کر لی اور ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من اور سلویٰ اتارا، کھاؤ ان پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمھیں عطا کیں اور انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۰﴾ اور جب ان سے کہا گیا اس بستی میں رہو اور اس میں سے جہاں چاہو کھاؤ اور کہو بخش دے اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو تو ہم تمھارے لیے تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے، عنقریب ہم نیکی کرنے والوں کو زیادہ دیں گے ﴿۱۶۱﴾ تو ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا، انھوں نے بات کو اس کے خلاف بدل دیا جو ان سے کہی گئی تھی، تو ہم نے ان پر آسمان سے ایک عذاب بھیجا، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۲﴾

---

پر آپ پر ایمان لے آئے، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی۔

**آیت 160 تا 162** ① **وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا** : "اَسْبَاطًا" یہ "سِبْطٌ" کی جمع ہے جس کا معنی اولاد کی اولاد ہے۔ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے بارہ قبائل وجود میں آئے۔ اپنے الگ الگ اوصاف کی وجہ سے ہر قبیلے نے اپنا الگ وجود برقرار رکھا، اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے پر ایک نقیب مقرر فرمایا: ﴿وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا﴾ [المائدة: ۱۲] "اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔" "اُمَمًا" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعداد میں بہت بڑھ گئے۔

② اس آیت میں "فَانْۢبَجَسَتْ" اور سورۂ بقرہ میں "فَانْفَجَرَتْ" ہے۔ راغب اصفہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اِنْبَجَسَ" اکثر اس کے متعلق کہا جاتا ہے جو تنگ چیز سے نکلے اور "اِنْفَجَرَ" اس معنی میں بھی آتا ہے اور اس کے متعلق بھی جو کھلی چیز سے

وَ سْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

اور ان سے اس بستی کے بارے پوچھ جو سمندر کے کنارے پر تھی، جب وہ ہفتے کے دن میں حد سے تجاوز کرتے تھے، جب ان کی مچھلیاں ان کے ہفتے کے دن سر اٹھائے ہوئے ان کے پاس آتیں اور جس دن ان کا ہفتہ نہ ہوتا وہ ان کے پاس نہ آتی تھیں، اس طرح ہم ان کی آزمائش کرتے تھے، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۱۶۳﴾

نکلے۔ (مفردات) ان آیات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۵۸ تا ۶۰)۔

آیت 163 ① وَ سْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ ...... : اس واقعہ کا انداز بیان پچھلی آیات سے ذرا مختلف ہے، فرمایا، ان سے اس بستی کے بارے میں پوچھیے، کیونکہ تورات یا کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں تھا مگر یہودیوں کو یہ واقعہ خوب معلوم تھا اور وہ اپنے دوسرے عیوب کی طرح اسے بھی چھپاتے تھے۔ جب آپ پوچھیں گے تو انھیں ضرور سوچنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ اس واقعہ کی خبر آپ تک کیسے پہنچی، وحی کے سوا کوئی اور ذریعہ اس کے لیے ممکن نہیں، اس لیے لامحالہ انھیں آپ کے نبیٔ الٰہی ہونے کی ایک اور شہادت مل جائے گی۔

② اللہ تعالیٰ نے صرف یہ بتایا ہے کہ وہ بستی سمندر کے کنارے آباد تھی اور نصیحت کے لیے اتنا بتانا ہی کافی تھا۔ البتہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس قریہ (شہر) سے مراد ''ایلات'' ہے جو بحر قلزم کے ساحل پر مدین اور طور کے درمیان واقع ہے۔ یہ شہر بحر قلزم کے اندر خلیج عقبہ میں اس جگہ واقع تھا جہاں اب اردن کی بندرگاہ عقبہ پائی جاتی ہے، اس کے قریب خلیج عقبہ ہی میں یہودیوں نے جونئی بندرگاہ بنائی ہے اس کا نام انھوں نے ''ایلات'' ہی رکھا ہے۔ مگر کسی یقینی دلیل کے بغیر اس شہر کی تعیین ممکن نہیں۔

③ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کے دن ان کے لیے شکار جائز نہیں تھا۔

④ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ ...... : ''حِيْتَانٌ'' یہ ''حُوْتٌ'' کی جمع ہے، یعنی بڑی مچھلی۔ دوسری جگہ یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ ﴾ [ الصافات : ۱٤۲ ] ''پس مچھلی نے اسے نگل لیا۔'' (راغب) ''شُرَّعًا'' ''شَارِعٌ'' کی جمع ہے، یعنی پانی سے سر نکالے ہوئے آ جاتیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ انھیں حکم تو یہ تھا کہ اس دن کی تعظیم کریں اور اس میں شکار وغیرہ سے باز رہیں مگر انھوں نے فریب اور حیلہ سازی سے مچھلیاں پکڑنا شروع کر دیا، چنانچہ انھوں نے سمندر کے کنارے بڑے بڑے حوض کھود لیے، ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں تو ان حوضوں میں داخل ہو جاتیں، وہ سمندر کی طرف سے ان کا راستہ بند کر دیتے اور اتوار کے دن ان کو پکڑ لیتے، یا جمعہ کے دن سمندر میں جال نصب کر دیتے اور ہفتہ کے دن ان میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کو اتوار کے دن پکڑ لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی حرام کام کا ارتکاب کرنے کے لیے حیلہ کرنا حرام ہے۔ ہاں جائز کام کے لیے حیلہ بھی جائز ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام ابوعبد اللہ بن بطہ رحمہ اللہ کی سند سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل فرمایا ہے: (( لَا تَرْتَكِبُوْا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُوْدُ فَتَسْتَحِلُّوْا مَحَارِمَ اللّٰهِ بِأَدْنَى الْحِيَلِ )) ''وہ کام مت کرو جو یہود نے کیا، ورنہ تم اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو معمولی حیلوں سے حلال کر لو گے۔'' اور فرمایا کہ یہ سند جید ہے۔ مگر افسوس کہ بعض مسلمان فقہاء نے اسلام کے فرائض سے جان چھڑانے کے لیے کئی حیلے ایجاد کیے، مثلاً رمضان کے آخر میں دو

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے، یا انھیں عذاب دینے والا ہے، بہت سخت عذاب؟ انھوں نے کہا تمھارے رب کے سامنے عذر کرنے کے لیے اور اس لیے کہ شاید وہ ڈر جائیں ﴿۱۶۴﴾

رکعتوں کا نام قضائے عمری رکھ کر پچھلی نمازیں معاف ہونے کا فتویٰ دے دیا اور صاف لکھ دیا کہ زکوٰۃ اور شفعہ سے جان چھڑانے کے لیے حیلہ حرام تو کجا مکروہ بھی نہیں۔ قتل کے قصاص کو ختم کرنے کے لیے تیز دھار آلے سے قتل کی شرط لگا دی اور کہا کہ اگر کوئی جان بوجھ کر بھاری سے بھاری پتھر یا ہتھوڑے کے ساتھ قتل کر دے، یا ڈبو کر مار دے، یا برف کے بلاک میں رکھ کر، یا کسی چار دیواری میں بھوکا پیاسا رکھ کر مار دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، زیادہ سے زیادہ دیت لے سکتے ہیں۔ زنا کو حلال کرنے کے لیے اجرت پر عورت لا کر زنا کرنے سے حد ختم کر دی۔ شراب حلال کرنے کے لیے صرف انگور اور کھجور کی شراب کو حرام اور باقی سب کو حلال کہہ دیا۔ چور کی حد چوری کا جرم شہادتوں سے ثابت ہونے کے بعد صرف اتنی بات سے ختم کر دی کہ چور مسروقہ مال کا مالک ہونے کا دعویٰ کر دے، خواہ اس کی کوئی دلیل بھی پیش نہ کرے۔ بتائیے بلا دلیل دعویٰ کرنے سے ہاتھ کٹنے سے بچ جائے تو کون سا چور یہ دعویٰ نہیں کرے گا۔ سود کو دار الحرب میں اور بہت سی خود ساختہ صورتوں میں حلال کر دیا۔ بعض نے جو شخص نماز پڑھے اور جو نہ پڑھے دونوں کا ایمان برابر قرار دے دیا۔ جب اتنے بڑے گناہ حیلے سے جائز ہو گئے تو ان کے مرتکب بھی صالح اور عادل ٹھہرے اور حکومت اور قضاء کے اہل قرار دیے گئے۔ ایسے حکام، ایسی عدالتوں اور ایسے شاہدوں اور قاضیوں کے فیصلوں کا نتیجہ اہلِ کتاب ہی کی طرح پہلے شدید بد عملی، پھر انتہائی ذلت کی صورت میں سب کے سامنے ہے، اس کا علاج یہی ہے کہ مسلمان ان "**اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ**" کا طریقہ چھوڑ کر کتاب و سنت کو بلا حیل و حجت مضبوطی سے تھام لیں تو اللہ تعالیٰ انھیں پھر وہی عزت و کرامت عطا فرمائے گا جو اس نے پہلے عطا فرمائی تھی۔

5 **كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ**: اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو حلال روزی نہ ملے اور حرام آسانی سے ملے تو لازم ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھے، اگر حرام کا مرتکب ہو جائے گا تو وہ روزی وبال ہو گی اور اگر صبر کرے گا اور حرام سے بچ کر امتحان میں کامیاب ہو جائے گا تو انعام ملے گا۔

**آیت 164** 1 **وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ** ...... : یعنی اس بستی کے نیک لوگوں میں سے ایک گروہ نے ان لوگوں سے کہا جو اس حیلہ سازی سے شکار کرنے والوں کو منع کرتے تھے۔ جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اس بستی کے لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے، ایک وہ ظالم جو اس حیلہ سازی سے ہفتہ کے دن مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔ دوسرا گروہ وہ جو ان کو ایسا کرنے سے منع کرتا تھا اور تیسرا گروہ وہ جو خود اگرچہ نیک تھا لیکن دوسروں کو برائی سے منع نہیں کرتا تھا، پس یہاں "اُمَّةٌ" سے

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴿۱۶۶﴾

پھر جب وہ اس بات کو بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے منع کرتے تھے، اور ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا جنھوں نے ظلم کیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۱۶۵﴾ پھر جب وہ اس بات میں حد سے بڑھ گئے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ ﴿۱۶۶﴾

---

مراد یہی تیسرا گروہ ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ گروہ جو برائی سے منع کرنے والوں سے کہتا تھا کہ تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو، یہ بھی نیک لوگ تھے اور اپنی طرف سے پورا زور لگا چکے تھے کہ انھیں اس گناہ سے منع کریں مگر ان کی ہٹ دھرمی کے بعد ان سے مایوس ہو کر خاموش ہو گئے تھے اور اب ان پر عذاب آنے کے منتظر تھے۔

② لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ ...... : یعنی کیوں ان کے سمجھانے میں وقت ضائع کرتے ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں عذاب لکھ دیا ہے تو تم انھیں کیسے بچا لو گے؟! مطلب یہ کہ خود نیکی پر قائم رہو اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

③ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ ...... : برائی سے منع کرنے والوں نے اپنے عمل کی دو وجہیں بیان کیں، ایک تو یہ کہ کہیں اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس جرم میں نہ پکڑ لے کہ تم نے انھیں نصیحت کرنا کیوں چھوڑ دیا تھا، تاکہ ہمارا عذر بن جائے کہ ہم تو منع کرتے رہے تھے اور دوسری یہ کہ ہم کسی صورت ناامید ہونے والے نہیں، شاید یہ سب یا ان میں سے کچھ لوگ اس عمل بد سے بچ جائیں، کیونکہ داعی کو ہمیشہ پر امید رہنا چاہیے۔

**آیت 166،165** ① فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ ...... : یعنی جب ہفتہ کی تعظیم کا حکم انھوں نے سرے سے بھلا ہی دیا اور حیلے سے بڑھ کر علانیہ نافرمانی شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے برائی سے منع کرنے والوں کو عذاب سے بچا لیا اور ظلم کرنے والوں کو بہت سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ اب بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ پہلے ان پر نافرمانی کی وجہ سے ایک عذاب بھیجا گیا، جیسا کہ یہاں "بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ" فرمایا ہے کہ شاید وہ باز آ جائیں۔ (دیکھیے سورۂ سجدہ: ۲۱) لیکن جب اس پر بھی باز نہ آئے تو اگلی آیت میں مذکور مسخ کی سزا دی گئی اور بعض نے فرمایا کہ "بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ" سے مراد یہی مسخ ہے، لیکن ﴿ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ کے بعد دوبارہ ﴿ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا عذاب تنبیہ کے لیے تھا، پھر بھی جب وہ متنبہ نہ ہوئے، بلکہ سرکشی اختیار کی تو ان سرکشوں کو بندر بنا دیا گیا۔ واللہ اعلم!

② وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ...... : اللہ تعالیٰ نے برائی سے منع کرنے والوں کی نجات اور ظلم کرنے والوں کو سخت عذاب، مثلاً قحط یا بیماری وغیرہ میں پکڑنے کا ذکر کیا ہے اور اس سے اگلی آیت میں سرکشی کرنے والوں کی شکلیں بدل کر بندر بنا دینے کا ذکر فرمایا ہے۔ تیسرے گروہ کا واضح ذکر نہیں فرمایا کہ ان کا کیا بنا۔ اکثر مفسرین کا کہنا یہی ہے کہ صرف اس جرم کا مسلسل ارتکاب

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

اور جب تیرے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسا شخص ضرور بھیجتا رہے گا جو انھیں برا عذاب دے، بے شک تیرا رب یقیناً بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۶۷﴾

کرنے والے ہی عذاب میں گرفتار ہوئے، جیسا کہ "بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ" کے استمرار سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی دونوں گروہ بچ گئے۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ بھی برائی سے منع نہ کرنے کی وجہ سے ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام سے خاموشی اختیار فرمائی تو ہمیں بھی خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ مگر حافظ ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے ان کے بچ جانے ہی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ لوگ سرکشی اختیار کرنے والے ہرگز نہ تھے، بلکہ جیسا کہ اسی آیت کے حاشیہ (۱) میں ذکر ہوا ہے، یہ لوگ اس برائی سے نفرت رکھنے والے تھے اور عین ممکن ہے کہ منع کرنے کے بعد تھک کر ان پر عذاب کے منتظر ہوں، مگر ان پر لازم تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جاری رکھتے۔
ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: "کوئی بھی قوم جس میں اللہ کی نافرمانیوں پر عمل ہوتا ہو، پھر وہ اسے بدلنے کی طاقت رکھتے ہوں، پھر نہ بدلیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے۔"
[ أبو داؤد، الملاحم، باب الأمر والنهي : ٤٣٣٨۔ ترمذی : ٣٠٥٧، و قال الألبانی صحيح ]
راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ان پر "بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍ" آیا، جو قحط یا بیماری یا خوف وغیرہ کی شکل میں تھا، اس میں شکار کرنے والے اور اس پر خاموش رہنے والے دونوں گرفتار ہوئے، کیونکہ برائی پر خاموش رہنا بھی ایک قسم کا ظلم تھا مگر جب بندر بنانے کا عذاب آیا تو یہ صرف ان پر آیا جو اس سرکشی کے مرتکب تھے اور اب کھلم کھلا بلا جھجک یہ کام کر رہے تھے۔ [ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَ عِلْمُهُ أَتَمُّ ]

③ قرآن کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی شکلیں بدل کر بندر کی بنا دی گئیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان میں صرف بندروں کی خصلتیں پیدا کر دی گئیں، مگر اس تاویل کی ضرورت تب ہے جب اللہ تعالیٰ کا انھیں بندر بنانا ممکن نہ ہو، یا پہلے ان کی خصلتیں انسانوں والی ہوں اور اب بندروں والی بنا دی گئی ہوں، جبکہ ان کے تمام حیلے ایسے تھے جو سلیم الفطرت انسان کر ہی نہیں سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو مسخ کرے (شکل بدل دے) تو نہ اس کے پیچھے رہنے والا کوئی ہوتا ہے اور نہ اس کی نسل ہوتی ہے۔" [ المعجم الكبير : ٧٤٦، و صححه الألبانی فی صحيح الجامع : ٥٦٧٣، عن أم سلمة رضی اللہ عنہا۔ مسلم : ٢٦٦٣ ]

**آیت 167** وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ ...... : گزشتہ آیات میں یہود کی آسانی اور سختی کے ساتھ آزمائشوں اور ان کے بعض نیک و بد اعمال کا ذکر فرمایا، اب اس آیت میں بتایا کہ قیامت تک ان پر ایسے لوگ مسلط کیے جاتے رہیں گے جو انھیں

وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

اور ہم نے انھیں زمین میں مختلف گروہوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، انھی میں سے کچھ نیک تھے اور ان میں سے کچھ اس کے علاوہ تھے اور ہم نے اچھے حالات اور برے حالات کے ساتھ ان کی آزمائش کی، تاکہ وہ باز آجائیں ﴿۱۶۸﴾

بدترین عذاب چکھاتے رہیں گے۔ سورۂ آل عمران (۱۱۲) میں فرمایا کہ ان پر ذلت مسلط کر دی گئی مگر اللہ کی پناہ اور لوگوں کی پناہ کے ساتھ۔ دیکھیے آیت مذکورہ کی تفسیر۔ یہودیوں کی پوری تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے، وہ ہر زمانے میں جہاں بھی رہے دوسروں کے محکوم اور غلام بن کر رہے اور آئے دن ان پر ایسے حکمران مسلط ہوتے رہے جنھوں نے انھیں ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴ تا ۸) قریب زمانے میں ہٹلر نے ان سے جو سلوک کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اگر کسی جگہ عارضی طور پر انھیں امن و امان نصیب ہوا بھی اور ان کی برائے نام حکومت قائم ہوئی بھی تو وہ اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ سراسر دوسروں کے سہارے پر۔

**آیت 168** ① **وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا:** تاکہ ان کی کوئی اجتماعی قوت وجود میں نہ آسکے۔ اس لیے یہودی تمام دنیا میں ٹکڑوں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں اور جہاں رہتے ہیں اپنی سود خوری اور اس ملک کے خلاف سرگرمیوں اور جاسوسی کی وجہ سے نفرت کی نگاہوں کا نشانہ بنے رہتے ہیں، پھر ان کی برتری کی خواہش اور دنیا کی دولت اور حکومت کو اپنے قبضے میں لینے کی خواہش کے لیے ان کی سازشیں یہودی پروٹوکول کی صورت میں دنیا کے سامنے آچکی ہیں۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور کتنے ہی ملکوں سے انھیں نکالا گیا اور تہ تیغ کیا گیا، اب اگرچہ جرمنی سے غداری کے انعام میں برطانیہ اور امریکہ کے بل بوتے پر وہ عربوں کے قلب میں اسرائیل کے خنجر کی صورت میں پیوست ہو چکے ہیں، مگر ان کی اصل قوت امریکہ اور برطانیہ وغیرہ ہی ہیں۔ یہاں جمع ہو کر بھی وہ ظلم و ستم سے باز آنے کے بجائے فلسطینی عربوں پر ناقابل بیان مظالم ڈھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے مؤاخذے میں اس دیر کا انجام کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

② **مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ:** ان میں سے کچھ نیک ہیں، یعنی وہ جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے، یا جیسے وہ لوگ جنھوں نے ہفتے کے روز مچھلی کے شکار سے منع کیا تھا۔ دیکھیے آل عمران (۱۱۳ تا ۱۱۵) اور کچھ ان کے علاوہ، یعنی نیک نہیں بلکہ شریر اور بدکار، جیسے سود، رشوت اور دوسرے طریقوں سے حرام کھانے والے اور انبیاء تک کو قتل کر ڈالنے والے اور نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود آپ کی مخالفت کرنے والے۔

③ **وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ ......:** کبھی راحت اور آرام دیا اور کبھی تکلیف میں مبتلا کر دیا، اسی طرح کبھی خوش حالی عطا فرمائی، کبھی فقر و فاقہ سے دوچار کر دیا، تاکہ وہ باز آجائیں، یعنی اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور تورات کے احکام پر عمل کریں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہود کی دولت برہم ہوئی تو آپس کی مخالفت سے ہر طرف نکل گئے اور مختلف

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

پھر ان کے بعد ان کی جگہ نالائق جانشین آئے، جو کتاب کے وارث بنے، وہ اس حقیر دنیا کا سامان لیتے اور کہتے ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا اور اگر ان کے پاس اس جیسا اور سامان آ جاتا تو اسے بھی لے لیتے، کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا کہ اللہ پر حق کے سوا کچھ نہ کہیں گے اور انھوں نے جو کچھ اس میں تھا پڑھ بھی لیا تھا اور آخری گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۱۶۹﴾

---

مذاہب پیدا ہوئے، یہ احوال اس امت کو سنایا کہ یہ سب کچھ ان پر بھی ہوگا۔ حدیث میں فرمایا ہے کہ اس امت میں بعض بندر اور سور ہو جائیں گے۔ اللہ گمراہی سے پناہ دے۔'' (موضح) یہ حدیث بخاری میں ہے، فرمایا: (( وَ يُمْسَخُ آخَرِيْنَ قِرَدَةً وَ خَنَازِيْرَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ )) [ بخاري، الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر...... : ٥٥٩٠ ] ''اور ان میں سے بہت سوں کو قیامت تک کے لیے بندروں اور خنزیروں کی صورت میں مسخ کر دے گا۔''

**آیت 169** ① **فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ**......: قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا '' اَلْخَلْفُ '' لام کے سکون کے ساتھ، بمعنی اولاد، واحد جمع یکساں ہیں اور '' اَلْخَلَفُ '' لام کے فتح کے ساتھ پہلوں کی جگہ آنے والا، اولاد ہو یا اجنبی۔ ابن الاعرابی نے فرمایا، لام کے فتح کے ساتھ نیک جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ نالائق جانشین اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال کر لیے جاتے ہیں۔ (طنطاوی) ''**عَرَضٌ**'' دنیا کا سامان، کیونکہ وہ عارضی ہے۔ ''**هٰذَا الْاَدْنٰى**'' میں ''**هٰذَا**'' (اس) کے لفظ سے حقارت مراد ہے اور '' **الْاَدْنٰى** '' کے لفظ سے بھی دنیا کی دنایت اور حقارت مراد ہے۔ (کشاف) پھر ان کے جانشین ایسے نالائق ہوئے جو کتاب اللہ کے وارث بنے، یعنی انھوں نے اسے پڑھا، اس کا علم حاصل کیا اور اس میں مذکور حلال و حرام اور امر و نہی سے پوری طرح آگاہ ہوئے، مگر انھوں نے اس کا اثر قبول کرنے کے بجائے اس کے احکام کی مخالفت کی اور اس کے حرام کو حلال کر لیا اور شدید حرص کی وجہ سے اس حقیر دنیا کے مال کے حصول کی کوشش میں لگ گئے، حلال طریقے سے ملے یا حرام سے، سود ہو یا رشوت یا غیر کا حق۔ اس کے باوجود یہ کہتے رہے کہ ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا۔ ''**سَيُغْفَرُ لَنَا**'' میں سین تاکید کے لیے ہے۔ (آلوسی) کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے، اس کے محبوب اور اس کے انبیاء کی نسل سے ہیں، فرمایا: ﴿ **وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ** ﴾ [ المائدة : ١٨ ] ''اور یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔''

② **وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ**: یعنی گناہ کرنے اور حرام کھانے کے بعد نہ وہ شرمندہ ہوتے ہیں اور نہ ان میں توبہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بلکہ گناہوں پر اور حرام خوری پر ان کی جرأت بڑھتی جاتی ہے، حالانکہ بخشش کے لیے تو توبہ کی ضرورت ہے، جس کا لازمی جزو گزشتہ پر ندامت اور آئندہ کے لیے وہ کام نہ کرنے کا خالص اور پختہ عزم ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ

وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع

اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور انھوں نے نماز قائم کی، یقیناً ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ﴿۱۷۰﴾ اور جب ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان کے اوپر اٹھایا، جیسے وہ ایک سائبان ہو اور انھوں نے یقین کر لیا کہ بے شک وہ ان پر گرنے والا ہے۔ جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے اسے قوت کے ساتھ پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۱۷۱﴾

---

پہلی دفعہ حرام کھانے کے بعد اسی طرح کا حرام دوبارہ مل جائے تو اسے بھی نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رشوت لینے کے بعد جونہی انھیں دوبارہ رشوت کا موقع ملتا ہے بلا جھجک اسے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ ان کے علماء کا حال ہے کہ لوگوں کو غلط مسئلے بتا کر حرام کھانے کے باوجود دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بخشش ہو جائے گی، حالانکہ وہ غلط کام چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، جو بخشش کی شرطِ اول ہے۔

③ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ...... : یہ عہد تفصیل کے ساتھ تورات کے علاوہ آل عمران کی آیت (۱۸۷) میں مذکور ہے۔

④ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ : اور انھوں نے جو کچھ اس میں ہے پڑھ لیا ہے، یعنی خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں کہیں نہیں لکھا کہ تم جو گناہ چاہو کرتے جاؤ، میں تمھیں بخش دوں گا، مگر ان کی جرأت اور بے خوفی کا یہ عالم ہے کہ گناہ بھی کیے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی آیات کو بیچ کر دنیا بھی کمائے جاتے ہیں اور اللہ عزوجل کی طرف وہ باتیں بھی منسوب کیے جاتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔

⑤ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ : یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈر کر حرام کھانے سے بچنے والوں کے لیے آخرت میں جو نعمتیں تیار ہیں وہ اس حقیر دنیا کے عارضی ساز و سامان سے کہیں بہتر ہیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے حرام کھانے والو! کیا تم یہ نہیں سمجھتے؟

آیت 170 وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ...... : کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے سے مراد اس پر عمل کرنا ہے اور نماز بھی اگرچہ اس میں شامل تھی مگر اس کو خصوصاً اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ دین کا بنیادی ستون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَ بَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ )) [ مسلم، الإيمان، باب بيان اطلاق اسم الكفر...... : ۸۲، عن جابر رضی اللہ عنہ ] ”یقیناً آدمی کے درمیان اور شرک و کفر کے درمیان نماز کا ترک ہے۔“ گویا نماز نہیں تو کتاب سے تمسک بھی نہیں۔

آیت 171 وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ...... : ”نَتَقَ يَنْتِقُ“ کا معنی ”کسی چیز کو زور سے کھینچ کر ہلانا“ ہے۔ (راغب) یہاں پہاڑ کا ذکر ہے اور سورۂ بقرہ میں طور کا ذکر ہے، یا تو وہ طور نامی پہاڑ تھا اور یا لفظ ”طور“ عام پہاڑ کے معنی میں بھی آتا

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ

اور جب تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انھیں خود ان کی جانوں پر

ہے، دونوں جگہ دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی سابقہ سرکشیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے تورات کے احکام پر عمل کا پختہ عہد لینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زلزلے کے ساتھ پہاڑ کو اکھاڑ کر ان کے سروں پر سایہ فگن کر دیا اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ ہم پر گرنے ہی والا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس ہیبت ناک ماحول میں وہ اللہ سے ڈرتے ہوئے عمل کا سچا عہد کریں۔ قوت کے ساتھ پکڑنے کا مطلب اس پر عمل کرنا ہے۔

**آیت 172** ① وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ ...... : یہاں تک رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے بنی آدم کی ہدایت کا جو اہتمام فرمایا اس کا ذکر تھا، اب کائنات میں اور خود انسان کی ذات ( اَنْفُسِهِمْ ) میں ہدایت کی جو دلیلیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں ان کا ذکر ہے۔ اہل علم نے اس آیت کی دو تفسیریں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ یہ جانے کہ میرا ایک رب ہے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے روزی دیتا ہے اور یہ بات جب اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی اولاد کو نسلاً بعد نسل پیدا کرتا ہے اور بنی آدم میں سے کسی کی پشت سے اس کا نطفہ جدا کر کے ماں کے رحم میں اس کی اولاد پیدا کرتا ہے، اسی وقت اس اولاد کی فطرت میں رکھ کر اس کے نفس اور اس کی ذات میں اپنے رب ہونے کے اتنے دلائل رکھ دیتا ہے گویا خود اسے اپنے آپ پر گواہ بنا دیتا ہے کہ اس کا رب اللہ ہے۔ گویا وہ پیدا ہی اسلام پر ہوتا ہے۔ ایک بوند جو جونک بنی، پھر مضغہ بنی، پھر ہڈیاں، پھر کامل اعضا والا جان دار انسان، یہ اور بے شمار نشانیاں خود اس کی ذات اور کائنات میں اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ اس کا ایک رب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۵۳ ] ”عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان کے لیے واضح ہو جائے کہ یقیناً یہی حق ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [ الذاریات : ۲۰، ۲۱ ] ”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں اور تمھارے نفسوں میں بھی تو کیا تم نہیں دیکھتے؟“ اور شہادت ضروری نہیں زبان ہی سے ہو، قرآن مجید کے مطابق حالت کی بھی شہادت ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ﴾ [ التوبۃ : ۱۷ ] ”مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت دینے والے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ﴾ [ العادیات : ۶، ۷ ] ”بے شک انسان اپنے رب کا یقیناً بہت ناشکرا ہے اور بے شک وہ اس بات پر یقیناً خود گواہ ہے۔“

معلوم ہوا کہ انسان کی فطرت ہی توحید ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔“ [ بخاری، الجنائز، باب ما قیل فی أولاد المشرکین : ۱۳۸۵ ] اس

بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

گواہ بنایا، کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں، ہم نے شہادت دی۔ (ایسا نہ ہو) کہ تم قیامت کے دن کہو بے شک ہم اس سے غافل تھے ﴿۱۷۲﴾

---

لیے انسان کی ذات میں اور کائنات میں موجود اللہ تعالیٰ کے رب واحد ہونے کے دلائل ہی اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ اس لیے بعض علماء نے کہا کہ اگر کوئی بھی رسول نہ آتا تو انسان پر عقل، فطرتِ سلیمہ اور اپنی ذات اور کائنات میں موجود توحید کے بے شمار دلائل کی وجہ سے شرک سے بچنا لازم تھا، اگر وہ شرک کرے تو اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ اس سے مؤاخذہ فرمائے۔ مگر قرآن مجید سے اللہ تعالیٰ کا یہ بے حد وحساب رحم وکرم ثابت ہے کہ انسان کے نفس پر اس کی اپنی شہادت کے باوجود وہ رسولوں کے ذریعے سے حق واضح کیے بغیر عذاب نہیں دیتا، فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ۱۵ ] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔'' اس کی مثال یوں سمجھیے کہ دیکھنے کے لیے آنکھ میں نور ہونا بھی ضروری ہے اور سورج، چاند یا کسی اور چیز کے ذریعے سے روشنی ہونا بھی ضروری ہے، آنکھ میں روشنی نہ ہو یا باہر روشنی نہ ہو تو نظر نہیں آتا۔ فطرت میں رکھی ہوئی عقل اور کائنات کے دلائل رب کی پہچان کے لیے آنکھ کے نور کی طرح ہیں اور پیغمبر سورج اور چاند کی طرح اس کے لیے دلائل کو روشن کر کے سمجھانے والے ہیں۔ شیخ صالح آل الشیخ نے شرح عقیدہ طحاویہ میں فرمایا کہ اہل السنہ کے بہت سے ائمہ مثلاً شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ، ابن القیم، ابن کثیر، ابن ابی العز حنفی شارح طحاویہ، شیخ عبد الرحمان سعدی اور دوسرے کئی ائمہ رحمہم اللہ نے " واخذ ربك " کی یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے۔ واضح رہے کہ آنکھ اور سورج کی روشنی کی مثال ان ائمہ کی تفسیر کا حصہ نہیں۔

دوسری تفسیر وہ میثاق (عہد و پیمان) ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام اولادِ آدم کو نکال کر ان سے لیا اور جو عموماً عہد الست سے مشہور ہے، وہ عبد اللہ بن عباس اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نعمان (نون کے فتحہ کے ساتھ) یعنی عرفہ میں آدم علیہ السلام کی پشت سے میثاق (عہد و پیمان) لیا، چنانچہ اس کی پشت سے تمام اولاد جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنی تھی نکالی اور اس کے آگے بکھیر دی، پھر ان سے آمنے سامنے بات کی، فرمایا: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ ''کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟'' انھوں نے کہا: ﴿ بَلٰى ﴾ کیوں نہیں، ہم نے شہادت دی! (ایسا نہ ہو) کہ تم قیامت کے دن کہو ہم اس سے غافل تھے۔ آخر آیات تک۔ [ أحمد : ۱/ ۲۷۲، ح : ۲٤٥۹۔ مستدرك حاكم : ۲/ ٥٤٤، ح : ٤۰۰۰ ] حاکم اور ذہبی نے اس حدیث کو صحیح فرمایا ہے، شوکانی اور بہت سے علماء نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے، مگر قرآن کے الفاظ اور حدیث کے الفاظ میں کئی لحاظ سے فرق ہے، ایک تو یہ کہ آیت میں ﴿ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ ﴾ ہے " مِنْ آدَمَ " نہیں، دوسرا ﴿ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ ہے " مِنْ ظَهْرِهِ " نہیں۔ تیسرا ﴿ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ ہے، " ذُرِّيَّتَهٗ " نہیں، چوتھا یہ کہ فرمایا: ﴿ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ﴾ گواہ کو وہ بات یاد تو ہونی چاہیے جس کی گواہی اس نے دینی ہے جبکہ وہ عہد کسی کو یاد نہیں، البتہ انسان کے نفس اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور توحید کے دلائل کا وہ خود فطری شاہد ہے، یہ الگ بات ہے کہ گندے

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

یا یہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا ہی نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ایک نسل تھے، تو کیا تو ہمیں اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو باطل والوں نے کیا؟ ﴿۱۷۳﴾ اور اسی طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ پلٹ آئیں ﴿۱۷۴﴾ اور انھیں اس شخص کی خبر پڑھ کر سنا جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں تو وہ ان سے صاف نکل گیا، پھر شیطان نے اسے پیچھے لگا لیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا ﴿۱۷۵﴾

عقیدوں والوں کے ساتھ مل کر اس کی فطرت پر پردہ پڑ گیا ہو۔ اگر کوئی کہے کہ بے شک آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلتے وقت کیا ہوا عہد ہمیں یاد نہیں مگر پیغمبروں کا اس میثاق کو یاد کرا دینا ہی کافی ہے تو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ مشرک تو پیغمبروں کی کوئی بات صحیح مانتے ہی نہیں تھے، ان کا یاد کرا دینا ان پر حجت کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ (جب کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اس گواہ بنانے کو بطور حجت ذکر فرمایا ہے، جس طرح رسولوں کے بھیجنے کو بطور حجت ذکر فرمایا ہے) غرض ابن ابی العز نے شرح عقیدہ طحاویہ میں آیت اور احادیث کے درمیان دس فرق بیان کیے ہیں۔ اس لیے دونوں الگ الگ ہیں، ہاں! تطبیق کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولادوں کو نکالنا بھی آدم علیہ السلام کی پشت سے اس کی اولاد کو نکالنے ہی کی تفصیل ہے۔ (واللہ اعلم)

② اَنْ تَقُوْلُوْا: یہ اصل میں ''لِئَلَّا تَقُوْلُوْا'' یا ''كَرَاهَةَ اَنْ تَقُوْلُوْا'' ہے، یعنی یہ عہد تم سے اس لیے لیا کہ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا میں شرک و نافرمانی کی روش اختیار کرو اور قیامت کے روز تم سے باز پرس کی جائے تو یہ کہہ کر اپنی صفائی پیش کرنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ (ابن کثیر)

**آیت 173** اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ ......: یا یہ عذر پیش کرو کہ ہم تو اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی شرک کی راہ پر چلتے رہے، ہمارا کیا قصور ہے، مطلب یہ ہے کہ شرک کے بارے میں مقلد کا کوئی عذر قبول نہیں ہو گا۔ ''الْمُبْطِلُوْنَ'' سے مراد آباء و اجداد ہیں، یعنی یہ کہنا ہے کہ اصل مجرم وہی ہیں ہم نہیں، اس قسم کے عذر کا وہاں کوئی موقع نہیں ہو گا، کیونکہ ابتداءً ہر شخص کی فطرت میں اپنے رب کی پہچان اور اس کی توحید رکھ دی گئی ہے، پھر اس کی یاد دہانی اور تفسیر و تشریح کے لیے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائی گئی ہیں اور کائنات میں اس کے دلائل رکھ دیے گئے ہیں اور ان کے فہم کے لیے عقل بھی عنایت کی گئی ہے۔

**آیت 174** وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: ''اور تاکہ وہ پلٹ آئیں'' اور باطل کو چھوڑ دیں۔ یہ واقعہ یہود کو سنایا، کیونکہ وہ بھی مشرکوں کی طرح اپنے عہد سے پھرے ہوئے تھے۔

**آیت 173** وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ ......: ''سَلَخَ (ن، ف)'' ''کھال اتارنا۔'' ''مَسْلُوْخٌ'' وہ بکری جس کی کھال

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَا ِ۟الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان کے ذریعے بلند کر دیتے، مگر وہ زمین کی طرف چمٹ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، تو اس کی مثال کتے کی مثال کی طرح ہے کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تو زبان نکالے ہانپتا ہے، یا اسے چھوڑ دے تو بھی زبان نکالے ہانپتا ہے، یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ سو تو یہ بیان سنا دے، تاکہ وہ غور وفکر کریں ﴿۱۷۶﴾ برے ہیں وہ لوگ مثال کی رو سے جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے ﴿۱۷۷﴾

اتار لی گئی۔ "اِنْسَلَخَ الْحَيَّةُ" ''سانپ اپنی کینچلی سے نکل گیا۔'' (قاموس) ان الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا قصہ یہاں عبرت کے لیے بیان کیا جا رہا ہے وہ ضرور کوئی خاص شخص ہے، لیکن قرآن اور صحیح حدیث میں نہ تو اس کے نام کی تصریح ہے اور نہ ہی زمانے کا ذکر ہے۔ صاحب المنار فرماتے ہیں کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ پر اتاری جانے والی آیات کو جھٹلانے والوں کی بیان فرمائی۔ یہ اس شخص کی مثال ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا علم عطا فرمایا، وہ ان کا عالم، ان کے قواعد کا حافظ اور اس کے احکام کو بیان کرنے اور بحث کر کے ثابت کرنے کے لائق ہو گیا مگر شیطان نے اسے اپنے پیچھے ایسا لگایا کہ وہ اس علم پر عامل نہ ہوا، بلکہ اس کا عمل اپنے علم کے سراسر مخالف رہا تو پھر اس سے ان آیات کا علم بھی چھن گیا، کیونکہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ تھوڑی مدت ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ تو یہ شخص اس سانپ کی طرح ہو گیا جو اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے اور اسے اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے، یا اپنے علم و عمل میں مخالفت کی وجہ سے اس شخص کی طرح ہو گیا جو اپنے علم سے نکل جاتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے، جیسے کوئی شخص اپنے پرانے کپڑے اتار دیتا ہے اور سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ مثال کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے رسول پر نازل کردہ آیات کو جھٹلانے والے لوگ اس عالم کی طرح ہیں جو اپنے علم کے پھل سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو گیا ہو، کیونکہ دونوں ہی نے دلائل و آیات میں اخلاص کے ساتھ عبرت حاصل کرنے کے لیے غور نہیں کیا۔

**آیت 176، 177** ① **وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا** ...... : اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیات پر عمل کی توفیق دے کر صالحین و ابرار کے آسمان پر بلند کر دیتے، مگر وہ زمین اور پستی (دنیا کے حقیر ساز و سامان) کی طرف چمٹ ہی گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے لگ کر ہر وقت دنیا کی طلب میں لگ گیا، تو اس کی مثال ہر وقت زبان نکال کر ہانپتے ہوئے کتے کے ساتھ دی گئی۔ مفسرین میں سے بعض نے گزشتہ امتوں میں سے اس کا نام بلعم بن باعورا بتایا ہے اور بعض نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بعض

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے سو وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۱۷۸﴾

اشخاص، مثلاً امیہ بن صلت وغیرہ کا نام ذکر کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصداق ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا اور ان میں یہ اشخاص بھی شامل ہیں۔

❷ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ...... : ''لَهَثٌ'' تھکاوٹ یا پیاس اور گرمی کی وجہ سے زبان باہر نکال کر ہانپنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے جانوروں پر اگر حملہ کیا جائے تو دوڑنے اور پیاس اور گرمی کی وجہ سے وہ ہانپنے لگتے ہیں، لیکن اگر انھیں کچھ نہ کہا جائے تو آرام سے بیٹھے رہتے ہیں، زبان باہر نکالے ہوئے ہانپتے نہیں، مگر کتا ایسا جانور ہے کہ تازہ ہوا سہولت کے ساتھ نہ اندر کھینچ سکتا ہے نہ گرم ہوا باہر نکال سکتا ہے، اس لیے کوئی اس پر حملہ کرے اور دوڑنے کی وجہ سے اسے سانس چڑھا ہو یا وہ آرام سے بیٹھا ہو، ہر حال میں اس کی زبان لٹکی ہوئی ہوگی اور وہ ہانپ رہا ہوگا۔ دنیا کی حرص کی وجہ سے اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے۔ کیونکہ اگر وہ اپنے علم کے مطابق اللہ کی آیات پر ایمان لاتا اور عمل کرتا تو اپنی ضروریات اور خواہشات کو اللہ اور اس کے رسول کے مطابق حلال تک محدود کر کے باقی وقت ہر قسم کی حرص اور فکر سے آزاد ہو کر اللہ کی بندگی اور دین کی تعلیم و تعلم اور اس پر عمل میں صرف کرتا تو نہایت چین اور اطمینان کے ساتھ حیاتِ طیبہ بسر کرتا۔ مگر اسے دنیا کی ضرورت تھی یا نہ تھی، حلال و حرام ہر طریقے سے ہر وقت دنیا کے حصول کی جدوجہد میں لگا رہا، اس کتے کی طرح جس پر حملہ ہو یا نہ ہو، زبان نکالے ہانپتا رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے لائق بری مثال نہیں ہے، وہ شخص جو اپنا دیا ہوا ہبہ واپس لیتا ہے اس کتے کی طرح ہے جو دوبارہ اپنی قے چاٹ لیتا ہے۔'' [ بخاری، الهبة و فضلها، باب لا يحل لأحد أن يرجع في هبته : ۲٦۲۲، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ]

آیت 178 مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ...... : ہدایت کا نور اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہ اس کا مالک ہے، جسے چاہے عطا کر دے اور جسے چاہے عطا نہ کرے اور وہ ضلالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہے۔ یہ مسئلۂ تقدیر ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ کسی کو ہدایت نہ دے تو ظالم نہیں، کیونکہ مالک جسے چاہے اپنی چیز دے جسے چاہے نہ دے اور وہ تو ایسا مالک ہے جس سے کوئی پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا، فرمایا: ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۲۳ ] ''اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔'' ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ عین عدل ہے، کیونکہ وہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا، فرمایا: ﴿ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ [ حم السجدة : ٤٦ ] ''اور تیرا رب اپنے بندوں پر ہرگز کوئی ظلم کرنے والا نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ اپنے ہر خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کرتے تھے: (( مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ )) [ مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة و الخطبة : ۸٦۸، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] ''جسے اللہ سیدھی راہ پر لگائے اسے

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہی ہیں جو بالکل بے خبر ہیں ﴿۱۷۹﴾ اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو اسے ان کے ساتھ پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارے میں سیدھے راستے سے ہٹتے ہیں،

---

کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی سیدھی راہ پر نہیں لگا سکتا۔"

**آیت 179** ① وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ: "لِجَهَنَّمَ" میں لام عاقبت (برائے انجام) بھی ہو سکتا ہے، یعنی اپنے حواس سے صحیح فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ سے وہ انجام کار جہنم میں جائیں گے، گویا انھیں جہنم ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور لام غایت کا بھی ہو سکتا ہے، یعنی کائنات کو بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو آئندہ کی ہر بات کا علم تھا کہ فلاں جن یا انسان نے دنیا میں جا کر دوزخیوں والے کام کرنے تھے، اسی علم کے مطابق اس نے سب کچھ لکھ دیا تھا، اس کا نام قضا و قدر ہے، آگے اہل جہنم کی صفات بیان ہوئی ہیں کہ جن میں یہ صفات ہوں وہ ہدایت قبول نہیں کیا کرتے، گو اللہ کا شریعت اور انبیاء کے بھیجنے کا مقصد یہی ہے کہ انسان اللہ کی عبادت کرے، مگر اسے پہلے ہی یہ بھی علم ہے کہ کون شریعت پر چلے گا اور کون نہیں چلے گا۔ علماء نے تقدیر میں اور انسان کے مجبور ہونے میں فرق کی وضاحت فرمائی ہے۔

② لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں دل، آنکھیں اور کان تو اس لیے دیے ہیں کہ انسان ان سے فائدہ اٹھا کر اپنے مالک کو پہچانیں، کائنات اور اپنی ذات میں اس کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں، حق کی بات غور سے سنیں اور اسے قبول کریں، مگر جب انھوں نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ انعام (چوپاؤں) کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ثابت ہوئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کی طبیعت میں جو تقاضے رکھے ہیں اور جس مقصد کے لیے وہ پیدا ہوئے ہیں وہ بخوبی پورا کر رہے ہیں، اس کے برعکس کفار اپنے مقصدِ حیات، یعنی عبادت کے بجائے اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے خالق کی نافرمانی کر رہے ہیں۔

③ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ: یعنی اپنے مقصدِ حیات سے غافل ہیں اور مرنے کے بعد زندگی اور جواب دہی سے بے فکر ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا اور ان کے احکام کو سیکھنا ہر شخص پر فرض ہے، اگر کوئی ایسا نہ کرے گا تو جہنم میں جائے گا۔" (موضح)

**آیت 180** ① وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى: "الْحُسْنٰى" یہ "اَلْاَحْسَنُ" کی مؤنث ہے، سب سے اچھے نام۔ "لِلّٰهِ"

اَسۡمَآئِهٖ ؕ سَيُجۡزَوۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾

انھیں جلد ہی اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۸۰﴾

خبر کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا کہ سب سے اچھے نام اور صفات صرف اور صرف اللہ کی ہیں۔ معلوم ہوا کہ پچھلی آیت میں مذکور ضلالت اور جہنم سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انھی ناموں کے ساتھ اسے پکارو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ لِلّٰهِ تِسۡعَةً وَّ تِسۡعِيۡنَ اسۡمًا، مِائَةً إِلَّا وَاحِدَةً، مَنۡ أَحۡصَاهَا دَخَلَ الۡجَنَّةَ » ''بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں، جو ان کا احصاء کرلے جنت میں داخل ہوگا۔'' [ بخاری، الشروط، باب ما یجوز من الاشتراط ...... : ۲۷۳٦، عن أبی ہریرة رضی اللہ عنہ ] احصاء کا معنی یاد کرنا، شمار کرنا اور حفاظت کرنا بھی آتے ہیں، یعنی ان کے معانی پر ایمان لائے، برکت اور ثواب کے لیے اخلاص کے ساتھ انھیں گن گن کر پڑھے، انھیں حفظ کرے اور ان کے تقاضوں کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالے۔ حدیث کے جو الفاظ اوپر ذکر ہوئے ہیں وہ تو بہت سی روایات میں صحیح سندوں کے ساتھ آئے ہیں، البتہ ترمذی کی ایک روایت میں اِن ننانوے ناموں کی تصریح بھی کر دی گئی ہے، مگر اہلِ علم کا تقریباً اتفاق ہے کہ یہ نام بعض راویوں نے قرآن مجید سے ترتیب دے کر روایت میں شامل کر دیے ہیں، ورنہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت روایت میں یہ نام نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان ناموں کے سوا اللہ تعالیٰ کے اور نام نہیں بلکہ قرآن و حدیث میں کئی اور نام بھی آئے ہیں۔ علماء نے اسمائے حسنیٰ پر کتابیں لکھی ہیں، بعض علماء نے قرآن و حدیث سے ہزار سے زیادہ اسمائے حسنیٰ نکالے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی صفات کا شمار نہیں تو اس کے اسماء کا شمار بھی نہیں ہو سکتا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کئی نام ایسے ہیں جو اس نے کسی کو بھی نہیں بتائے، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو جب بھی کوئی فکر یا غم لاحق ہو وہ یہ دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا غم و فکر دور کر دیتا ہے۔'' آپ سے عرض کیا گیا: ''یا رسول اللہ! ہم اسے سیکھ نہ لیں؟'' فرمایا: ''جو بھی اسے سنے اسے اس کو سیکھ لینا چاہیے۔'' دعا یہ ہے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيۡ عَبۡدُكَ وَ ابۡنُ عَبۡدِكَ وَ ابۡنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِيۡ بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكۡمُكَ، عَدۡلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ أَسۡأَلُكَ بِكُلِّ اسۡمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيۡتَ بِهٖ نَفۡسَكَ أَوۡ عَلَّمۡتَهٗ أَحَدًا مِّنۡ خَلۡقِكَ أَوۡ أَنۡزَلۡتَهٗ فِيۡ كِتَابِكَ أَوِ اسۡتَأۡثَرۡتَ بِهٖ فِيۡ عِلۡمِ الۡغَيۡبِ عِنۡدَكَ أَنۡ تَجۡعَلَ الۡقُرۡآنَ رَبِيۡعَ قَلۡبِيۡ وَ نُوۡرَ صَدۡرِيۡ وَ جَلَاءَ حُزۡنِيۡ وَ ذَهَابَ هَمِّيۡ » ''اے اللہ! بے شک میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا بیٹا ہوں اور تیری بندی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، تیرا فیصلہ مجھ پر نافذ ہے، تیرا فیصلہ میرے بارے میں عین انصاف ہے، میں تیرے ہر نام کے وسیلے سے جسے تو نے خود اپنا نام رکھا ہے، یا اسے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یا اپنی کتاب میں نازل کیا ہے، یا تو نے اسے علم غیب میں اپنے پاس رکھنے کو ترجیح دی ہے، میں تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا ازالہ اور میرے فکر کو دور کرنے کا ذریعہ بنا دے۔'' [ أحمد : ۳۹۱/۱، ح : ۳۷۱۱ ]

وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے پیدا کیا کچھ لوگ ایسے ہیں جو حق کے ساتھ رہنمائی کرتے اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں ﴿۱۸۱﴾

ابن حبان (۹۷۲) اور ابو یعلیٰ (۹/۱۹۸، ۱۹۹، ح: ۵۲۹۷) میں الفاظ میں کچھ فرق ہے۔

اس مبارک دعا میں اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کے واسطے سے دعا کی گئی ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام صرف ننانوے تک محدود نہیں ہیں۔ حدیثِ شفاعت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضری کی اجازت ہوگی اور آپ سجدے میں گر جائیں گے تو اس وقت آپ اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد وثنا کریں گے جو صرف اسی وقت اللہ تعالیٰ آپ کو سکھائے گا۔ [ بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿ وجوہ یومئذ ناضرۃ ﴾ : ۷٤٤۰۔ مسلم : ۱۹٤ ]

② فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ: اللہ کا ذاتی نام ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے، باقی صفاتی نام ہیں۔ فرمایا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارے میں کج روی اختیار کرتے، یعنی سیدھے راستے سے ہٹتے ہیں۔ سیدھے راستے سے ہٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے پاس سے اس کا کوئی نام رکھ لے، یا ایسے لفظ سے پکارے جس سے اللہ تعالیٰ کی شان میں کمی ہوتی ہو۔ بعض قوموں میں اللہ تعالیٰ کے ایسے نام رائج ہیں جو ایک سے زائد معبودوں میں سے کسی ایک پر بولے جاتے ہیں، مثلاً یزدان، بھگوان اور رام وغیرہ، ایسے نام اللہ تعالیٰ پر بولنے سے بچنا فرض ہے۔ سیدھے راستے سے ہٹنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کو بگاڑ کر بتوں کے نام رکھے جائیں، جیسے اللات، العزیٰ اور منات کہ یہ لفظ اللہ، عزیز اور منان کی بگاڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ (ابن کثیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے کج روی کی ایک صورت یہ بھی لکھی ہے: ''اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ٹونے ٹوٹکوں میں استعمال کیا جائے، ایسے لوگوں کو دنیوی مطلب اگرچہ حاصل ہو جائے مگر سزا ان کو ضرور ملے گی۔'' (موضح) اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ان کے واضح معنی سے انکار کر دیا جائے (یہ تعطیل ہے)، یا تحریف کر دی جائے اور اسے تاویل کا نام دیا جائے، یا ان کو مخلوق کے مشابہ سمجھا جائے (یہ تشبیہ ہے)، یا کہا جائے کہ معلوم ہی نہیں ان کا معنی کیا ہے (یہ تفویض ہے) بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان صفات پر مشتمل الفاظ کا جو معنی ہے وہ سب کو معلوم ہے، مثلاً ''سَمِیْعٌ'' کا معنی سننے والا ہے، مگر وہ اس طرح ہے جس طرح اللہ کی شان کے لائق ہے۔ رہا یہ کہ وہ کیسے ہے؟ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی جائے۔ عربی زبان میں اللہ تعالیٰ کے کسی صفاتی نام کا اگر ترجمہ اپنی زبان میں کر دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، مثلاً رب کو پروردگار، یا پالنے والا، رزاق کو روزی دینے والا کہہ دیا جائے تو یہ جائز ہے۔

**آیت 181** وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ: یہی وصف اس سے پہلے آیت (۱۵۹) میں موسیٰ علیہ السلام کی امت کے بعض اشخاص کا بیان ہوا ہے۔ یہاں مراد امت محمد ﷺ ہے، کیونکہ اب حق صرف اس امت کے پاس ہے۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم،

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہم ضرور انھیں آہستہ آہستہ کھینچ کر لے جائیں گے، جہاں سے وہ نہیں جانتے ﴿۱۸۲﴾ اور میں انھیں مہلت دوں گا، بے شک میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے ﴿۱۸۳﴾ اور کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی میں جنون کی کون سی چیز ہے؟ وہ تو ایک کھلم کھلا ڈرانے والے کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۸۴﴾

تابعین، سلف صالحین اور وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کتاب و سنت کو چھوڑ کر نئے راستے اختیار نہیں کرتے، بلکہ صرف کتاب و سنت پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی بھی اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، کیونکہ حق یہی ہے اور اسی کے مطابق تمام معاملات میں لوگوں کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی آخری کوشش تک لگا دیتے ہیں، یعنی جہاد کرتے ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ”میری امت میں سے ایک گروہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گا، نہ انھیں وہ شخص نقصان پہنچا سکے گا جو انھیں چھوڑ دے اور نہ وہ جو ان کی مخالفت کرے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا اور وہ اسی پر قائم ہوں گے۔“ [ بخاري، المناقب، باب : ۳٦٤١ ] اس جماعت کی خاص صفت کتاب و سنت پر عمل کے ساتھ کفار سے لڑنا بھی ہے۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔“ [ مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لاتزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۰ ]

**آیت 182** وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ ......: یعنی ان پر فوری گرفت نہیں کروں گا، تاکہ وہ غفلت میں پڑے رہیں اور گناہ پر گناہ کرتے جائیں، اسی کا نام ڈھیل اور استدراج (آہستہ آہستہ کھینچ کر لے جانا) ہے، جو کفار کو ان کے گناہوں کی سزا میں دی جاتی ہے، مگر وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پر بڑی مہربانی ہو رہی ہے، حالانکہ انھیں آخری عذاب کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۴۴، ۴۵)۔

**آیت 182** ① وَ اُمْلِيْ لَهُمْ : ” اَمْلٰی يُمْلِيْ اِمْلَاءً “ لمبی مہلت دینے کو کہتے ہیں۔

② اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ : جس کی کسی حیلہ اور تدبیر سے مدافعت نہیں کی جا سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اسے پکڑتا ہے تو اسے بھاگ کر جانے نہیں دیتا“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى ﴾ [ هود : ۱۰۲ ][ بخاري، التفسير، باب : ﴿ و كذلك أخذ ربك...... ﴾ : ٤٦٨٦، عن أبي موسى رضي الله عنه ]

**آیت 184** اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ : اوپر کی آیات میں ان کی غفلت اور بے رخی پر تنبیہ تھی، اب یہاں سے نبوت پر ان کے شبہات کی تردید ہو رہی ہے۔ کفار قریش آپ کو مجنون (پاگل) قرار دیتے تھے، دیکھیے سورۂ حجر

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ١ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ١ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۸۵ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ١ؕ

اور کیا انھوں نے نگاہ نہیں کی آسمانوں اور زمین کی عظیم الشان سلطنت میں اور کسی بھی ایسی چیز میں جو اللہ نے پیدا کی ہے اور اس بات میں کہ شاید ان کا مقررہ وقت واقعی بہت قریب آ چکا ہو، پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے ۝۱۸۵ جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور وہ انھیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیتا ہے،

(۶) اور دخان (۱۳، ۱۴) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کے دو جواب دیے، ایک یہ کہ کبھی تم نے سوچا ہے کہ نبی ﷺ کسی اور جگہ سے نہیں آئے، تمھارے ساتھی ہیں، تمھی میں رہتے ہیں، تم ان سے خوب واقف ہو، انھوں نے چالیس برس تم میں گزارے ہیں، کچھ غور تو کرو، کیا پاگل ایسے ہوتے ہیں؟ "صَاحِبُكُمْ" (تمھارے ساتھی) کے لفظ میں یہی جواب دیا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۶) دوسرا یہ کہ ان لوگوں نے کبھی یہ سوچا بھی ہے کہ جن باتوں کا آپ ﷺ حکم دیتے ہیں، مثلاً توحید، نماز، صدقہ، صلہ رحمی، پاک دامنی اور صدق وغیرہ ان میں سے کون سی چیز جنون ہے، یا آپ کے عادات و خصائل میں کون سی چیز ہے جسے جنون کہا جا سکے، آپ تو محض اللہ تعالیٰ اور اس کے عذاب سے کھلم کھلا ڈرانے والے ہیں۔ دیکھیے سورۂ سبا (۴۶)۔

**آیت 185** ① اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ: "مَلَكُوْتِ" یہ "مُلْكٌ" کے لفظ میں واؤ اور تاء کا اضافہ معنی میں وسعت کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "عظیم الشان سلطنت" کیا گیا ہے۔ دلائل کونیہ یعنی اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان سلطنت سے بھی رسول اللہ ﷺ کے سچے نبی ہونے کا ثبوت مل رہا ہے، کیونکہ آپ ﷺ جس توحید کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ آسمان و زمین کی عظیم الشان سلطنت اور پوری کائنات کی ایک ایک چیز بلکہ ایک ایک ذرے سے ثابت ہو رہی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ﴾ کے الفاظ کے ساتھ اس سلطنت میں جو بھی بڑی سے بڑی یا چھوٹی سے چھوٹی چیز پیدا فرمائی ہے اس کی طرف نگاہ کرنے کی بھی دعوت دی ہے۔ اتنی بڑی سلطنت کا ہر ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ مجھے کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہ ایک ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے کسی حصے میں کوئی خرابی، کوئی ٹکراؤ یا حادثہ نہیں۔

② وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ : اور کیا انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کا مقرر وقت بالکل قریب آ پہنچا ہو، یعنی موت کا مقرر وقت تو کسی کو معلوم نہیں، انسان کو کم از کم یہی سمجھ کر اپنے عقائد و اعمال کی پڑتال کرتے رہنا چاہیے کہ شاید اس کی موت کی گھڑی قریب آ گئی ہو، مگر یہ بدبخت اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

③ تفکر اور غور و فکر کی دعوت اس بات کی دلیل ہے کہ تقلید کا عذر قیامت کے دن کسی کام نہیں آئے گا۔

④ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ: یعنی قرآن سے بڑا معجزہ کیا ہوگا اور اس سے بہتر نصیحت کس کتاب میں ہوگی اور محمد ﷺ سے بہتر سمجھانے والا اور کون ہوگا، جس کی باتوں پر یہ ایمان لائیں گے؟ آئندہ آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل باعث ان کا تکبر اور سرکشی ہیں جو انھیں غور و فکر کرنے ہی نہیں دیتے۔

وَ يَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

بھٹکتے پھرتے ہیں ﴿۱۸۶﴾ وہ تجھ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں اس کا قیام کب ہوگا؟ کہہ دے اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، اسے اس کے وقت پر اس کے سوا کوئی ظاہر نہیں کرے گا، وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری واقع ہوئی ہے، تم پر اچانک ہی آئے گی۔ تجھ سے پوچھتے ہیں جیسے تو اس کے بارے میں خوب تحقیق کرنے والا ہے۔ کہہ دے اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۱۸۷﴾

---

**آیت 186** مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ...... : ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اس کا قانون ہے کہ وہ گمراہ اس کو کرتا ہے جو نیکی کا واضح راستہ چھوڑ کر بدی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ بھی اسے اس کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵، ۲۶) اور سورۂ اعراف (۱۷۸، ۱۷۹)۔

**آیت 187** ① يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا: "اَلسَّاعَةِ" ایک گھڑی، لمحہ، پل یا سیکنڈ، کیونکہ قیامت اچانک ایک ہی لمحے میں برپا ہو جائے گی۔ "اَيَّانَ" زیادہ صحیح یہی ہے کہ "اَیٌّ" سے "فَعْلَانَ" کا وزن ہے، ظرف زمان بمعنی "مَتٰی" یعنی کب۔ "مُرْسٰىهَا" یہ "اَرْسٰی یُرْسِیْ" باب افعال سے مصدر میمی ہے، لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے، زیادہ تر بہت بھاری چیز کے ٹھہرنے، گڑ جانے، گاڑ دینے اور ٹھہرا دینے کو کہتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا﴾ [ النازعات : ۳۲ ] "اور پہاڑ، اس نے انھیں گاڑ دیا۔" "اَرْسَتِ السَّفِيْنَةُ" "بحری جہاز لنگر انداز ہوا۔" "اَيَّانَ مُرْسٰىهَا" کا معنی ہے "اَيَّانَ وُقُوْعُهَا" کہ اس کا واقعہ ہونا کب ہے؟ (قاموس) توحید، نبوت اور قضا و قدر کے بعد اب چوتھی چیز قیامت کے بارے میں بات ہو رہی ہے، کیونکہ قرآن میں یہ چاروں چیزیں اصل بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

② قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ...... : "اِنَّمَا" کلمۂ حصر ہے، یعنی اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اس نے یہ بات نہ کسی مقرب فرشتے کو بتائی ہے نہ کسی نبی مرسل کو۔ دیکھیے سورۂ نازعات (۴۴) اور نمل (۶۶)۔

③ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ اس کی ہیبت سے زمین و آسمان لرزتے ہیں، کیونکہ وہ سب اس وقت زیر و زبر ہو جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ تکویر، انفطار، انشقاق، قمر (۴۶) اور حج (۱، ۲) دوسرا یہ کہ اس کا علم زمین و آسمان سے بھی برداشت نہیں ہو سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے صرف اپنے پاس رکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "الفوز الکبیر" میں اس کا معنی "خَفِيَتْ" کیا ہے، یعنی وہ آسمانوں اور زمین میں کسی کو معلوم نہیں۔ ابن جزی نے فرمایا: "ثَقُلَتْ ثَقُلَ عِلْمُنَا اَیْ خَفِیَ" یعنی اس کا علم مخفی ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

کہہ دے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں نہیں ہوں مگر ایک ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۱۸۸﴾

④ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً: بے شک اس کی علاماتِ عامہ اور علاماتِ خاصہ، مثلاً دجال، دابہ، یاجوج ماجوج کا خروج اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول وغیرہ بتائی گئی ہیں، مگر ان واقعات میں سے بھی کوئی اس کا عین مقرر وقت نہیں کہ اس کے ساتھ ہی قیامت آجائے، اصل وقت صرف اللہ کے پاس ہے اور وہ اچانک یک لخت آئے گا۔

⑤ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا: "حَفِيٌّ" اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جس نے کسی چیز کے متعلق بار بار پوچھ کر اچھی طرح اس کا علم حاصل کر رکھا ہو، یعنی یہ لوگ آپ سے بار بار اس طرح پوچھتے ہیں جیسے آپ نے بڑی کرید اور جستجو کے بعد اس کا پورا پورا علم حاصل کر لیا ہے۔

آیت 188 ① قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے جو کچھ ہونا ہے ہو رہا ہے، مجھ میں ذاتی طور پر یہ بھی قدرت و اختیار نہیں کہ میں اپنی جان سے کسی نقصان یا تکلیف کو روک سکوں، یا کچھ نفع حاصل کر سکوں۔ تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ اختیار نہیں تو پھر وہ کون ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار عطا فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۳) اور یونس (۱۰۶، ۱۰۷) بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے واقعی اختیار نہیں رکھتے، مگر دوسرے سب لوگوں کے لیے نفع وضرر کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس کے لیے دیکھیے سورۂ جن (۲۰ تا ۲۲)۔

② وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: یعنی نہ میں غیب دان ہی ہوں، اگر ایسا ہوتا تو کتنے ہی فائدے ہیں جنھیں میں پیشگی سمیٹ لیتا اور کتنے ہی نقصانات ہیں جن سے قبل از وقت آگاہ ہونے کی بنا پر میں بچ جاتا۔ یہاں لفظ "لَوْ" (اگر) سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود افضل المرسلین ہونے کے علم غیب نہیں رکھتے تھے، کیونکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔ دیکھیے سورۂ نمل (۶۵) اس کے باوجود بعض نادان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب باور کرواتے ہیں، حالانکہ بعض جنگوں میں آپ کا چہرہ زخمی ہوا، دانت مبارک بھی شہید ہوا، چہرے میں خود کی کڑیاں چبھ گئیں، ہونٹ پھٹ گیا، گھوڑے سے گر کر زخمی ہوئے تو کتنے دن صاحبِ فراش رہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگا تو پورا ایک مہینا آپ پریشان رہے، ایک یہودی عورت نے کھانے میں زہر ملا دیا، جسے کھانے سے آپ کے بعض صحابہ شہید بھی ہو گئے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زہر کا اثر آخر تک محسوس کرتے رہے۔ یہ سب واقعات شاہد ہیں کہ "اگر میں غیب جانتا ہوتا تو مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔" اس مضمون کو تفصیل سے پڑھنے کے لیے تقویۃ الایمان شاہ اسماعیل رحمہ اللہ اور تلاش حق از ارشاد اللہ مان صاحب کا مطالعہ فرمائیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا

وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، تا کہ وہ اس کی طرف (جا کر) سکون حاصل کرے، پھر جب اس نے اس (عورت) کو ڈھانکا تو اس نے ہلکا سا حمل اٹھالیا، پس اسے لے کر چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ بھاری ہوگئی تو دونوں نے اللہ سے دعا کی، جو ان کا رب ہے کہ بے شک اگر تو نے ہمیں تندرست

③ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کو جو اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں سے بڑا بنایا ہے، سو ان میں بڑائی یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی راہ بتاتے ہیں اور اس بات میں کچھ ان کی بڑائی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عالم میں تصرف کی قدرت دے دی ہو کہ موت و حیات یا نفع و نقصان ان کے اختیار میں ہو، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیب دانی دے دی ہو کہ جس کے احوال جب چاہیں معلوم کر لیں۔ اس آیت سے شرک کی جڑ کٹ گئی، جب رسول اللہ ﷺ کو جو تمام عالم کے سردار ہیں، اپنی جان کے نفع و نقصان کا اختیار نہ ہو، نہ غیب کی بات معلوم ہو تو کسی اور نبی یا ولی یا بزرگ یا فقیر یا جن یا فرشتے کو کیا قدرت ہے کہ کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچائے، یا غیب کی کوئی بات بتائے، البتہ وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ آپ کو جو بات بتا دیتا وہ آپ کو معلوم ہو جاتی اور آپ لوگوں کو اس کی خبر دے دیتے۔ (وحیدی)

**آیت 190،189** ① هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ...... : ایک جان، یعنی آدم علیہ السلام سے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی پہلی آیت۔

② لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا ...... :معلوم ہوا میاں بیوی کے تعلق کا اصل سکون و راحت ہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۱) "فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا" جس مقصد کے لیے قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر ادب، حیا، پردے اور پاکیزگی کے ساتھ وہ مطلب ادا کرنے والے اور لفظ ملنا مشکل ہیں۔ "صَالِحًا" یعنی صحیح و سالم بچہ، جس میں کوئی جسمانی نقص نہ ہو۔

اس آیت کی صحیح تفسیر جسے حافظ ابن کثیر اور دوسرے محققین نے اختیار فرمایا ہے، وہ ہے جو حسن بصری رحمہ اللہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ بے شک شروع میں بطور تمہید آدم و حوا علیہما السلام کا ذکر ہے، مگر اس کے بعد "فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا" سے سلسلۂ کلام ان کی اولاد میں سے مشرکین کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں فرد کے ذکر سے سلسلۂ کلام جنس کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعد میں ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ﴾ وغیرہ یعنی تمام آیات میں آخر تک جمع کے الفاظ استعمال ہوئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے جنس آدم مراد ہے۔ آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہو کر شرک کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں؟ بہت سے مفسرین نے ان سے مراد آدم اور حوا علیہما السلام لیے ہیں، ان کی بنیاد

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

بچہ عطا کیا تو ہم ضرور ہی شکر کرنے والوں سے ہوں گے ﴿۱۸۹﴾ پھر جب اس نے انھیں تندرست بچہ عطا کیا تو دونوں نے اس کے لیے اس میں شریک بنا لیے جو اس نے انھیں عطا کیا تھا، پس اللہ اس سے بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۱۹۰﴾

اس روایت پر ہے جو سمرہ رضی اللہ عنہ سے ترمذی اور حاکم وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب حوا نے بچہ جنا تو ابلیس ان کے پاس آیا، ان کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا۔ ابلیس کہنے لگا: ''اس کا نام عبد الحارث رکھو تو یہ زندہ رہے گا۔'' چنانچہ انھوں نے بچے کا نام عبد الحارث رکھا اور وہ زندہ بچ گیا۔ یہ سب کچھ شیطان کے اشارے سے تھا۔'' لیکن حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو ضعیف اور اسرائیلیات سے ماخوذ قرار دیا ہے اور اس کے ضعف کے تین اسباب بیان فرمائے ہیں، خصوصاً اس لیے بھی کہ اس میں شرک کی نسبت اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی سلسلہ ضعیفہ (۳۴۲) میں اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ اس روایت کی سند میں موجود ایک راوی حسن بصری رحمہ اللہ نے وہ تفسیر فرمائی جو اوپر گزری اور صحیح سند کے ساتھ ان سے تفسیر طبری وغیرہ میں مروی ہے، اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت کو صحیح سمجھتے تو خود اس کے خلاف ہرگز تفسیر نہ فرماتے۔ اس لیے وہی تفسیر درست ہے۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اگر یہ سارا قصہ آدم و حوا علیہما السلام کے متعلق ہی تسلیم کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ " جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ " میں استفہام انکاری ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں تندرست بچہ عطا کیا تو کیا آدم و حوا نے شرک کیا تھا؟ جیسا کہ مشرکین عرب ان کی طرف شرک کی نسبت کرتے ہیں، یعنی نہیں۔ یہ تاویل بھی درست ہے، کیونکہ یہاں تک تثنیہ کی ضمیریں ہیں، آگے جمع کے صیغے کے ساتھ مشرکین پر رد ہے۔

③ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ : اس سے مراد بالاتفاق کفار عرب ہیں، جیسا کہ بعد والی آیات سے ثابت ہو رہا ہے، یعنی جب اولاد کی امید ہوتی ہے تو مشرکین اللہ سے تندرست اولاد عطا کرنے کی دعا کرتے اور شکر گزار ہونے کا وعدہ کرتے ہیں، مگر جب ٹھیک ٹھاک تندرست اولاد عطا ہو جاتی ہے تو اسے غیر اللہ کی دین قرار دے دیتے ہیں، کوئی اسے عبد العزیٰ کہتا ہے، کوئی عبد المطلب، کوئی عبد ود اور کوئی عبد یغوث، یا کسی مردے کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں، یا شکریہ ادا کرنے کے لیے بچے کو کسی قبر پر لے جا کر اس کا ماتھا وہاں ٹکاتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کے طفیل یہ بچہ ملا ہے۔ یہ سب صورتیں اللہ کا شریک ٹھہرانے کی ہیں جو صرف مشرکین عرب ہی میں نہیں تھیں بلکہ مسلمان کہلانے والے بہت سے لوگوں میں اب بھی عام ہیں، چنانچہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اللہ کو سب سے پیارے دو نام عبد اللہ یا عبد الرحمٰن یا اس سے ملتے جلتے نام یا شرک سے پاک نام رکھنے کے بجائے نبی بخش، حسین بخش، پیراں دتہ، عبد النبی، عبد الرسول اور بندۂ علی وغیرہ نام رکھتے ہیں۔ پھر وہ کسی کو کسی آستانے کا فقیر بنا دیتے ہیں، کسی کو کسی قبر کا مجاور بنا دیتے ہیں۔ کوئی اپنا نام سگ دربار غوثیہ رکھ لیتا ہے، کوئی سگ رسول یا سگ مدینہ۔ [ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ]

اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

کیا وہ انھیں شریک بناتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں ﴿۱۹۱﴾ اور نہ ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں ﴿۱۹۲﴾ اور اگر تم انھیں سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو وہ تمھارے پیچھے نہیں آئیں گے، تم پر برابر ہے کہ تم نے انھیں بلایا ہو، یا تم خاموش ہو ﴿۱۹۳﴾ بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمھارے جیسے بندے ہیں، پس انھیں پکارو تو لازم ہے کہ وہ تمھاری دعا قبول کریں، اگر تم سچے ہو ﴿۱۹۴﴾

---

**آیت 192،191** اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا ...... : اس سلسلۂ کلام سے مقصود بتوں کی پرستش کی تردید ہے کہ ان میں معبود ہونے کی کوئی صفت نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی، حتیٰ کہ وہ سب جمع بھی ہو جائیں تو مکھی تک بنانا بلکہ اس سے چھینی ہوئی چیز واپس لینا بھی ان کے اختیار میں نہیں۔ دیکھیے سورۂ حج (۷۳) وہ خود مخلوق ہیں، اپنے پوجنے والوں کی مدد تو درکنار اگر خود انھیں کوئی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تو وہ اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے، تو پھر خالق کو چھوڑ کر اس بے بس مخلوق کی پوجا کیوں؟

**آیت 193** وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ...... : اوپر کی آیات میں بتوں سے ہر قسم کی قدرت کی نفی تھی، اب ان سے ہر طرح کے علم کی نفی کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بت، جن کی یہ پوجا کر رہے ہیں، ان میں نہ تو نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت ہے، نہ سننے یا دیکھنے یا کسی اور طرح سے تمھاری حالت سے باخبر ہونے کی۔ (دیکھیے مریم: ۴۲) پھر تم کتنے احمق ہو کہ ان سے امید رکھتے ہو کہ تمھیں سیدھے راستے پر لگائیں گے، یا تم انھیں سیدھے راستے پر چلنے کی دعوت دو گے تو تمھارے پیچھے چلے آئیں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ تم ان کے لیے کسی کام کے ہو نہ وہ تمھارے لیے۔

**آیت 193** اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ...... : بت پرستوں نے اللہ کے نبیوں اور نیک لوگوں کے مجسمے ہی بت بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نوح (۲۳) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بتوں کی صورت میں تمھارے یہ معبود جنھیں تم پکارتے ہو، تمھارے جیسے بندے ہی ہیں۔ یہ الفاظ بھی دلیل ہیں کہ وہ لوگ صرف پتھروں کو نہیں بلکہ بتوں کی صورت میں بزرگوں کو پوجتے اور پکارتے تھے، کیونکہ پتھروں کو تمھارے جیسے بندے نہیں کہا جا سکتا۔ بزرگ خواہ بت کی صورت میں ہوں، خواہ پختہ قبر میں مدفون ہوں، بات ایک ہی ہے کہ تمھاری طرح عبد ہیں، معبود نہیں، یعنی تمھارے

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنَّ وَلِيِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ کہہ دے تم اپنے شریکوں کو بلا لو، پھر میرے خلاف تدبیر کرو، پس مجھے مہلت نہ دو ۝ بے شک میرا یار و مددگار اللہ ہے، جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہی نیکوں کا یار و مددگار بنتا ہے ۝ اور جنھیں تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں ۝

---

عقیدے کے مطابق اگر ان میں عقل و فہم مان بھی لیں، یا ان کے زندہ ہونے کے وقت کو سامنے رکھ لیں تو زیادہ سے زیادہ ان کا تمھارے جیسا بندہ ہونا ثابت ہو سکتا ہے، عبادت کے لائق ہونا نہیں، مگر یہ تو تمھاری طرح کے جاندار بھی نہیں، جیسا کہ بعد کی آیت میں "اَمْثَالُكُمْ" (تمھارے جیسے) ہونے کی بھی نفی کر دی ہے۔ فرمایا انھیں پکارو کہ تمھاری دعاؤں کو قبول اور تمھاری مرادوں کو پورا کریں۔ یہ بات مشرکوں کو لاجواب کرنے کے لیے فرمائی۔

**آیت 195** ① اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ : تو پھر تمھاری عقل کہاں چلی گئی کہ انھیں مدد کے لیے پکارتے ہو اور ان کے سامنے ماتھے رگڑتے ہو۔ اس آیت سے مقصد یہ ہے کہ بے شک تم نے ان بتوں کے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں اور کان بنا رکھے ہیں، مگر زندہ انسان بہر حال ان بتوں سے بہتر ہے، کیونکہ ان چاروں اعضا کی وجہ سے وہ احساس بھی رکھتا ہے اور حرکت بھی کر سکتا ہے۔ رہے یہ بت، تو ان میں نہ شعور و احساس ہے نہ حس و حرکت۔

② قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ : یعنی اپنا جو زور میرے خلاف لگا سکتے ہو لگا لو، جو خفیہ تدبیر میرے خلاف کر سکتے ہو اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔

**آیت 196** اِنَّ وَلِيِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ...... : یہ جواب ہے مشرکین کی ان دھمکیوں کا جو وہ نبی ﷺ کو دیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے ان معبودوں کو برا کہنے سے باز آ جاؤ، ورنہ تم ان کے غضب میں گرفتار ہو کر تباہ ہو جاؤ گے۔ فرمایا میرا یار و مددگار اللہ ہے، مجھے تمھاری دھمکیوں کی کوئی پروا نہیں۔ نیز اس میں توحید کی دعوت بھی ہے کہ جب یہ اصنام قدرت و علم سے محروم ہیں تو جو لوگ عقل و فکر رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کریں، جس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کامل کتاب نازل فرمائی اور وہ ہر طرح سے نیک لوگوں کا یار و مددگار بھی ہے۔

**آیت 197** وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ : یہ بات پہلے بھی بیان فرمائی تھی، اس کا دوبارہ تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

اور اگر تم انھیں سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو نہیں سنیں گے اور تو انھیں دیکھتا ہے کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ نہیں دیکھتے ﴿۱۹۸﴾ درگزر اختیار کر اور نیکی کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کر ﴿۱۹۹﴾

---

ان مشرکین کی بے وقوفی خوب واضح ہو جائے۔ (شوکانی)

**آیت 198** وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ ...... : یعنی مشرکین اپنے بتوں کی صورتیں بناتے وقت ان کی آنکھیں ایسی بناتے کہ ان کی طرف دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہو کہ وہ سچ مچ دیکھ رہے ہیں، مگر جب وہ بے جان بت ہیں تو دیکھیں گے کیسے؟ (ابن جریر) یا آیت کے معنی یہ ہیں کہ مشرکین بظاہر تو آنکھیں رکھتے ہیں مگر بصیرت کے اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (ابن کثیر)

**آیت 199** ① خُذِ الْعَفْوَ : یعنی توحید کی دعوت کے جواب میں آپ کو مشرکوں اور جاہلوں کی طرف سے بہت تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ دیکھیے آل عمران (۱۸۶) اور بقرہ (۱۰۹) آپ اس کے مقابلے میں درگزر سے کام لیں۔ یہاں آپ ﷺ کو حسن اخلاق کی تعلیم دی ہے اور آپ کے واسطے سے ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اسلام کی دعوت کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [ النحل : ۱۲۵ ] ”اور ان سے اس طریقے سے بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ [ آل عمران : ۱۵۹ ] ”اور اگر تو بدخلق سخت دل ہوتا تو یقیناً وہ تیرے گرد سے منتشر ہو جاتے۔“

② وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ : ”عَرَفَ يَعْرِفُ“ سے مصدر بمعنی معروف ہے، وہ بات جس کا اچھا ہونا فطرتِ انسانی پہچانتی ہے اور شریعت اس کی تائید کرتی ہے۔ یعنی درگزر کا مطلب یہ نہیں کہ آپ انھیں نیکی کا حکم دینا چھوڑ دیں، بلکہ عفو و درگزر کا تعلق حسن اخلاق سے ہے۔

③ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ : اگر وہ ضد پر اڑ کر مخالفانہ رویہ اختیار کریں اور بے فائدہ تکرار کریں تو بجائے الجھنے کے آپ خاموشی اختیار کریں، خواہ وہ اس خاموشی کو کوئی معنی پہنا دیں۔ امید ہے کہ اس سے ان کے رویے میں تبدیلی پیدا ہو گی اور ان کی جارحیت کا وار خالی جائے گا۔ دیکھیے سورۂ قصص (۵۵) اور فرقان (۶۳) بعض علماء نے فرمایا کہ عفو و درگزر کا یہ حکم مکہ میں تھا، مدینہ میں جا کر قتال اور اقامتِ حدود کا حکم نازل ہوا تو یہ منسوخ ہو گیا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۰۹) مگر اس کے بعد بھی جو لوگ مسلمانوں میں سے جہالت اختیار کریں، جیسے منافق یا وہ کفار جن سے جنگ نہیں ہو رہی، ان سے درگزر کرنے، نیکی کا حکم دینے اور ان کی جہالت سے اعراض کا حکم اب بھی ہے، بلکہ دعوت کے وقت ان چیزوں کا خیال ہمیشہ رکھنا پڑے گا۔ ہاں حدود کے مجرموں یا جنگ پر آمادہ لوگوں سے ان کے لائق معاملہ کیا جائے گا اور اس کے واضح احکام قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ تجھے ابھار ہی دے تو اللہ کی پناہ طلب کر، بے شک وہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے﴿۲۰۰﴾ یقیناً جو لوگ ڈر گئے، جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی (برا) خیال چھوتا ہے وہ ہشیار ہو جاتے ہیں، پھر اچانک وہ بصیرت والے ہوتے ہیں﴿۲۰۱﴾

**آیت 200** وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ ...... : قرآن میں تین مقامات پر معروف کا حکم دینے، درگزر کرنے، بہترین طریقے سے جواب دینے اور جاہلوں سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک پچھلی آیت میں، دوسرا سورۂ مومنون (۹۶ تا ۹۸) میں اور تیسرا حم السجدہ (۳۴ تا ۳۶) میں اور حم السجدہ میں اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ دشمن بھی متاثر ہو کر دلی دوست کی طرح ہو جائے گا، مگر شیطان پر احسان کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کھلا دشمن ہے اور ہر موقع پر انسان کو اکساتا اور غصہ دلاتا ہے۔ اس شیطانی حملے کا مقابلہ انسان کے بس کی بات نہیں، اس لیے تینوں آیات میں حکم دیا کہ اگر معلوم ہو کہ شیطان مجھے بھڑکا رہا ہے، غصے پر اکسا رہا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو۔ اس پناہ کے سامنے شیطان بے بس ہے۔ قاموس میں "نَزْغٌ" کا معنی "چوکا مارنا، بھڑکانا اور وسوسہ ڈالنا" لکھا ہے۔

سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمی آپس میں گالی گلوچ کرنے لگے، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، ان میں سے ایک سخت غصے میں اپنے ساتھی کو گالیاں دے رہا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر وہ اسے کہہ لے تو جو حالت اس کی ہے ختم ہو جائے، وہ ہے " اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" لوگوں نے اس آدمی سے کہا: "تم سنتے نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرما رہے ہیں؟" اس نے کہا: "میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔" [ بخاري، الأدب، باب الحذر من الغضب ...... : ٦١١٥۔ مسلم : ٢٦١٠ ] اوپر جن تین آیات کے حوالے دیے گئے ہیں ان کے حواشی بھی ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 201** اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ ...... : "طٰٓئِفٌ" "طَافَ يَطُوْفُ" کا معنی ہے گھومنا، چکر لگانا، تو "طٰٓئِفٌ" وہ خیال جو ذہن میں آتا ہے، رات خواب میں آنے والا کسی کا خیال بھی "طَيْفٌ" یا "طٰٓئِفٌ" کہلاتا ہے۔ قاموس میں اس کا ترجمہ غضب بھی کیا گیا ہے۔ "مَسَّ يَمَسُّ (ع)" کا معنی ہے چھونا، یعنی شیطان کی طرف سے آنے والے خیال یا غصے کے چھونے کے ساتھ ہی انھیں اللہ تعالیٰ کا جلال، آخرت کی جوابدہی اور شیطان کی دشمنی یاد آ جاتی ہے، جس سے فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، ان میں بصیرت اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے، وہ اسی وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہوئے اس وسوسے، خیال یا غصے کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں اور اس پر عمل سے باز رہتے ہیں۔

وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۝ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

اور جو ان (شیطانوں) کے بھائی ہیں وہ انھیں گمراہی میں بڑھاتے رہتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے ﴿۲۰۲﴾ اور جب تو ان کے پاس کوئی نشانی نہ لائے تو کہتے ہیں تو خود اس کا انتخاب کر کے کیوں نہیں لے آیا؟ کہہ دے میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی جانب سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے سمجھ کی باتیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۲۰۳﴾ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۲۰۴﴾

---

آیت 202 وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے مقابلے میں ان کفار و منافقین کا جو اپنی شرارت اور خباثت نفس میں شیاطین کے بھائی ہیں، یہ حال ہے کہ ان کے بھائی شیاطین انھیں گمراہی میں بڑھاتے اور گھسیٹتے ہی لیے جاتے ہیں اور انھیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ (ابن کثیر)

آیت 202 ❶ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ ...... : اس آیت میں شیاطین کے بھائیوں کی گمراہی اور بے جا ضد کی ایک مثال بیان فرمائی ہے، یعنی وہ پیغمبر سے ازراہ عناد کہتے ہیں کہ تم اپنے پاس ہی سے کوئی آیت (معجزہ) کیوں نہیں لے آتے۔ فرمایا میں تو صرف وحیٔ الٰہی کا تابع ہوں اور اپنی طرف سے کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۵ تا ۱۷)۔

❷ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ...... : اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کریم ہی بڑا کافی معجزہ ہے، اس کے ہوتے ہوئے مزید معجزوں کی طلب محض نہ ماننے کا بہانہ ہے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۰، ۵۱) پھر یہاں قرآن کے تین بڑے اوصاف بیان فرمائے ہیں، جو صرف اس معجزے کی خصوصیت ہیں۔

آیت 204 وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ...... : قرآن کی عظمت بیان کرنے کے بعد اب اس سے فائدہ اٹھانے کے آداب کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے پڑھے جانے کے وقت استماع اور انصات ضروری ہے، سو توجہ اور خاموشی سے سنو، تا کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا رحم ہو جائے۔ یہ ان ضد اور عناد کے مارے ہوئے کفار کو نصیحت ہے جن کا ذکر مسلسل چلا آ رہا ہے اور جو ہمیشہ نئے سے نئے معجزے کا مطالبہ کرتے اور جب قرآن پڑھا جاتا تو شور مچا کر دوسروں کو بھی سننے سے روکتے اور اس بے ہودہ طریقے سے غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حم السجدہ (۲۶) میں فرمایا: ''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تا کہ تم غالب رہو۔'' اس آیت میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں جو کفار نے کہیں، پہلی یہ کہ اس قرآن کو مت سنو، دوسری یہ کہ اس میں شور کرو، تیسری یہ کہ تا کہ تم غالب رہو،

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی سے اور خوف سے اور بلند آواز کے بغیر الفاظ سے صبح و شام یاد کر اور غافلوں سے نہ ہو ﴿۲۰۵﴾

اس کے جواب میں سورۂ اعراف کی زیر تفسیر آیت: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ﴾ میں تین باتوں کی تلقین فرمائی، چنانچہ "لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ" کے جواب میں "فَاسْتَمِعُوْا" فرمایا، یعنی کان لگا کر سنو اور "وَالْغَوْا فِيْهِ" یعنی شور وغل کرو کے جواب میں "اَنْصِتُوْا" یعنی خاموش رہو فرمایا اور "لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ" کے جواب میں فرمایا "لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تمھیں قرآن سنایا جائے تو شور وغل کے بجائے کان لگا کر خاموشی سے سنو۔ یہ حکم عام ہے، کافر ہوں یا مسلمان، سب کو قرآن مجید توجہ سے سننا چاہیے۔ خصوصاً نماز اور خطبہ جمعہ میں تو خاموش رہنا فرض ہے، جس کے دلائل حدیث میں موجود ہیں۔ ہاں، اگر کوئی اپنے طور پر قرآن پڑھ رہا ہے تو سب کچھ چھوڑ کر اسے سننا ضروری نہیں، ورنہ ایک مسجد کے سپیکر سے قرآن کی تلاوت پوری بستی کو خاموش کرانے کے لیے کافی ہوگی۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے، مگر یہ استدلال بالکل بے محل ہے، کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور ماقبل سے مشرکین سے خطاب چلا آ رہا ہے، اس لیے نظم قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں بھی مشرکین ہی مخاطب ہوں، اگر اس آیت کو عام بھی مان لیا جائے تو اصولِ فقہ کی رو سے حدیث « لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ » (جسے امام بخاری نے متواتر قرار دیا ہے) کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی تخصیص ہو جائے گی، کیونکہ اس کے بغیر امام، منفرد، مقتدی کسی کی بھی نماز نہیں ہوتی۔ مقتدی آواز کے بغیر پڑھے تو خاموشی کے خلاف بھی نہیں۔

جیسا کہ آپ ﷺ نے خطبہ جمعہ میں خاموش رہ کر غور سے سننے کا حکم دیا، اس کے باوجود صحیح مسلم (۸۷۵/۵۹) میں جابر رضی اللہ عنہ سے آپ کا یہ حکم مروی ہے: ''تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعتیں پڑھے اور انھیں مختصر پڑھے۔'' اب ظاہر ہے کہ اس کا دو رکعتیں پڑھنا خاموشی کے خلاف نہیں، ورنہ اس صحیح حدیث میں آپ ﷺ خطبہ کے دوران میں ہر آنے والے شخص کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہ دیتے، مگر آپ کے حکم کی وجہ سے خطبہ کے دوران میں آنے پر دو رکعتیں پڑھنا ہوں گی، اسی طرح امام کے پیچھے فاتحہ بھی پڑھنی ہوگی اور خاموشی بھی قائم رہے گی۔ تعجب اس بات پر ہے کہ بعض لوگ اس وقت بھی مقتدی کو کچھ نہ پڑھنے کا حکم دیتے ہیں جب امام بلند آواز سے قراءت نہ کر رہا ہو۔ فرمائیے اس کے ساتھ اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ پھر ہمارے بعض بھائی امام کی قراءت سنتے ہوئے صبح کی سنتیں پڑھتے رہتے ہیں، مگر انھیں اس وقت یہ آیت یاد نہیں آتی اور سب سے زیادہ تعجب تو ان کی اس بات پر ہے کہ ان کے ہاں سورۂ فاتحہ امام، منفرد، یا مقتدی کسی کے لیے بھی نماز میں فرض نہیں۔ قرآن کی کوئی بھی ایک آیت پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی۔ بتائیے پھر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ ''جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں'' یہ امام، منفرد یا مقتدی میں سے کسی کے لیے نہیں تو اس کا مخاطب کون ہوگا؟

آیت 205 وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ ...: "بِالْغُدُوِّ" سے مراد فجر سے لے کر سورج طلوع ہونے تک کا وقت ہے اور

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

بے شک جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں ﴿۲۰۶﴾

"الْاٰصَالِ" "اَصِيْلٌ" کی جمع ہے، جیسے "اَيْمَانٌ" "يَمِيْنٌ" کی جمع ہے، اس سے مراد عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت ہے۔ ان اوقات میں دل کی حاضری کے ساتھ اللہ کا ذکر غفلت دور کرنے میں بے حد مفید ہے۔ بعض اوقات صبح و شام بول کر ہر وقت بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی تاکید اور اس کے آداب بیان ہوئے ہیں: ① "فِيْ نَفْسِكَ" ذکر دل کے ساتھ کرے، صرف زبان چل رہی ہو اور دل حاضر نہ ہو تو خاص فائدہ نہیں۔ ② " تَضَرُّعًا" ذکر خوب عاجزی کے ساتھ اور گڑگڑا کر کیا جائے۔ ③ '' خِيْفَةً '' اللہ کا خوف دل پر طاری ہو اور اپنی عملی کوتاہی اور اللہ تعالیٰ کی گرفت کا ڈر ہو۔ ④ "دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ آواز کے بغیر ہو، کیونکہ یہ اخلاص سے قریب اور ریا سے دور ہے۔ دوسرا یہ کہ ذکر اور قرآن کی تلاوت نہ بالکل آہستہ ہو نہ بہت بلند آواز سے، بلکہ درمیانی آواز کے ساتھ پڑھا جائے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۱۰) اور جیسا کہ آپ ﷺ نے نمازِ تہجد میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آواز کچھ بلند کرنے اور عمر رضی اللہ عنہ کو کچھ پست کرنے کا حکم دیا تھا۔ [ أبو داوٗد، التطوع، باب فی رفع الصوت...... : ۱۳۲۹ ] دونوں صورتوں میں دل کی حاضری کے ساتھ زبان سے الفاظ کا ادا ہونا بھی ضروری ہے، صرف دل میں ذکر کو فکر کہتے ہیں، ذکر نہیں۔ اگر کوئی شخص نماز صرف دل سے پڑھتا جائے، زبان سے الفاظ ادا نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہو گی۔ ⑤ "وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ" ذکر ہر وقت جاری رہے، خصوصاً صبح و شام کے اوقات میں اور کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو۔

**آیت 206** اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب مقرب فرشتے بھی اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو چاہیے کہ اس کے سوا اور کسی کو سجدہ نہ کرے۔'' (موضح )

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ تجھ سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں، سو اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر تم مومن ہو ①

آیت 1 ① یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ: "اَلْاَنْفَالِ" یہ " نَفَلٌ" (نون اور فاء کے فتح کے ساتھ ) کی جمع ہے، جیسا کہ "فَرَسٌ" کی جمع " اَفْرَاسٌ " ہے۔ جس کا معنی زائد چیز ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ [ بنی إسرائیل : ۷۹ ] ''اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ، اس حال میں کہ تیرے لیے زائد ہے۔'' یعنی رات کا قیام فرض نمازوں سے زائد ہے۔ یہ لفظ کئی معنوں میں آتا ہے: ① مال غنیمت، کیونکہ جہاد کا اصل مقصد تو ثواب اور حصولِ جنت ہے، غنیمت تو ایک زائد چیز ہے۔ شاید اسی لیے پہلی امتوں کے لیے غنیمت حلال نہیں تھی، اس امت کو ثواب پر مزید غنیمت بھی حلال کر دی گئی۔ ② امیر کسی خاص کارنامے پر غنیمت کے حصے سے زائد کسی انعام کا اعلان کر دے، یا دینا چاہے تو یہ بھی نفل ہے۔ ③ مقتول کے پاس جو بھی سامان اسلحہ یا سواری وغیرہ ہو وہ قاتل کو دیا جائے، اسے ''سلب'' کہتے ہیں، یہ بھی نفل ہے۔ ④ عام جنگ کے علاوہ کچھ دستے جنگ کے لیے جاتے ہوئے یا واپسی پر کسی بستی پر حملے کے لیے بھیجے جائیں اور وہ غنیمت لے کر آئیں تو وہ پورے لشکر کے لیے ہوگی، مگر اس دستے کو مجموعی غنیمت میں سے الگ زائد حصہ بھی دیا جائے گا جو رسول اللہ ﷺ جاتے وقت چوتھا حصہ اور واپسی پر تیسرا حصہ عطا فرماتے تھے۔ ⑤ امیر غنیمت کی تقسیم سے پہلے کوئی ایک چیز اپنے لیے چن لے، مثلاً کوئی اسلحہ یا سواری، یا لونڈی وغیرہ، اسے ''صفی'' بھی کہتے تھے۔

زمانۂ جاہلیت میں معمول تھا کہ جنگ میں جو شخص جو کچھ لوٹ لیتا اسی کا ہوتا۔ اسلام میں سب سے پہلا عظیم الشان معرکہ بدر واقع ہوا تو ابھی تک کفار سے حاصل ہونے والے مال کی تقسیم کا طریقہ مقرر نہیں ہوا تھا۔ بدر میں جب بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا تو یہ مسئلہ پیش آیا۔ چنانچہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے تو میں آپ کے ساتھ بدر میں شریک ہوا۔ لوگوں کا باہمی مقابلہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی، تو ایک گروہ انھیں ہزیمت دیتے اور قتل کرتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑا، ایک گروہ لشکر گاہ پر متوجہ ہو کر اس کی حفاظت اور مال جمع کرنے لگ گیا اور ایک گروہ نے رسول اللہ ﷺ کے گرد گھیرا ڈالے رکھا کہ دشمن آپ کے متعلق کسی غفلت سے فائدہ نہ اٹھا لے۔ آخر سب لوگ واپس آ کر جمع ہوئے تو جنھوں نے غنیمتیں جمع کی تھیں، کہنے لگے، یہ ہم نے جمع کی ہیں، کسی اور کا ان میں کوئی حصہ نہیں، جو دشمن کے پیچھے گئے تھے انھوں نے کہا تم ہم سے زیادہ اس کے حق دار نہیں ہو، ہم نے دشمن کو ان سے ہٹایا اور انھیں مار بھگایا ہے۔ جنھوں نے

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ إِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ

(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی

---

رسول اللہ ﷺ کے گرد گھیرا ڈالے رکھا، انھوں نے کہا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کو گھیرے میں رکھا اور اس بات سے ڈرے کہ دشمن کسی طرح کی غفلت میں آپ کو نقصان نہ پہنچائے، چنانچہ ہم اس کام میں مشغول رہے، تو اس وقت یہ آیات اتریں: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ﴾ تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور رسول اللہ ﷺ جب دشمن کی زمین میں حملے کے لیے جاتے تو چوتھا حصہ بطور نفل (زائد) دیتے تھے، پھر جب واپس آتے، لوگ تھکے ہوئے ہوتے تو تیسرا حصہ بطور نفل عطا فرماتے تھے اور آپ خصوصاً زائد حصے دینا پسند نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''مومنوں کا قوت والا ان کے کمزور پر غنیمت واپس لاتا ہے۔'' [ أحمد : ۳۲۳/۵، ۳۲٤، ح ۲۲۷٦۲، وقال شعيب الأرنؤوط حسن لغيره ] ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور مستدرک حاکم میں بھی اس حدیث کے بعض اجزا مروی ہیں۔

❷ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ...... : فرمایا آپ سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ کس کا حق ہیں، کس طرح تقسیم ہوں گی، آپ فرما دیں کہ غنیمتیں حقیقت میں تم میں سے کسی کی بھی ملکیت نہیں، یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ملکیت ہیں، تمھارا ان میں کچھ دخل نہیں، کیونکہ فتح تمھاری طاقت سے نہیں بلکہ اللہ کی مدد سے ہوئی ہے۔ آگے دور تک یہ بات بیان کی ہے کہ فتح اللہ کی مدد ہی سے ہوئی ہے اور ہوتی ہے، اس لیے تم اللہ سے ڈرو اور ان اموال کی وجہ سے تمھارے باہمی تعلقات میں جو خرابی آئی ہے اسے درست کرو اور اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کا رسول جو بھی حکم دیں اس کی اطاعت کرو، جسے جتنا دیں یا نہ دیں، وہ اس پر راضی رہے اور اس مال کی بنا پر تمھارے آپس کے تعلقات ہرگز خراب نہیں ہونے چاہییں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم آپس کے تعلقات بگاڑنے سے بچو، اس لیے کہ یہ چیز (دین) کو مونڈ دینے والی ہے۔'' [ ترمذی، صفة القيامة، باب فی فضل صلاح ذات البين : ۲۵۰۸، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ] تفسیر ابن کثیر میں یہاں مسند ابی یعلیٰ کے حوالے سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں اپنے بھائی کو معاف کرنے والے کے لیے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں جانے کا ذکر ہے، یہ روایت مستدرک میں بھی ہے، جسے امام حاکم نے صحیح کہا ہے، مگر ذہبی نے اس کے ایک راوی عباد کو ضعیف اور اس کے شیخ کو ''لَا يُعْرَفُ'' کہا ہے۔

❸ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو بھی ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے مراد (جیسا کہ ظاہر ہے) آپ کی سنت کی پیروی ہے، لہٰذا جو شخص آپ کی سنت سے منہ موڑ کر صرف قرآن کی اطاعت کرنا چاہتا ہے (جبکہ حدیث کے بغیر قرآن پر عمل کسی صورت ممکن ہی نہیں) وہ قرآن کی واضح تصریح کے مطابق دائرۂ ایمان سے خارج ہے۔

**آیت 2 تا 4** اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ ...... : اوپر فرمایا کہ اطاعت ہے تو ایمان ہے، اب ان آیات میں

اِيۡمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۚۖ ﴿۲﴾ الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ؕ ﴿۳﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَهُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَ مَغۡفِرَةٌ وَّ رِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ۚ ﴿۴﴾ كَمَاۤ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ ۖ وَ اِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ ۙ ﴿۵﴾

جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں ﴿۲﴾ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا، خرچ کرتے ہیں ﴿۳﴾ یہی لوگ سچے مومن ہیں، انھی کے لیے ان کے رب کے پاس بہت سے درجے اور بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے ﴿۴﴾ جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے حق کے ساتھ نکالا، حالانکہ یقیناً مومنوں کی ایک جماعت تو ناپسند کرنے والی تھی ﴿۵﴾

ایمان والوں کی چند صفات بیان فرمائیں۔ سرفہرست یہ ہے کہ جب ان کے تنازعات کے درمیان اللہ کا ذکر یا اس کا حکم آجائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور وہ اس کی نافرمانی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ دوسری علامت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کے احکام بیان کیے جائیں تو وہ انھیں سچے دل سے مانتے ہوئے ان کی اطاعت کرتے ہیں، جس سے ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان ایک ہی حالت پر نہیں رہتا بلکہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ دلائل کو دیکھ کر یقین وتصدیق میں بھی اور اعمال کی کمی بیشی کے لحاظ سے بھی۔ تیسری علامت یہ ہے کہ جس کام کا انھیں حکم دیا جاتا ہے وہ اس کے تمام ذرائع اور اسباب تو اختیار کرتے اور اپنی کوشش پوری کرتے ہیں، مگر ان کا بھروسا ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، اپنی تیاری یا اسباب پر نہیں۔ اپنی پوری کوششوں کے بعد وہ اس کے انجام کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ان کی چوتھی علامت یہ ہے کہ وہ نماز کو اس کے پورے حقوق اور آداب کے ساتھ ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور پانچویں علامت یہ ہے کہ اپنے اموال میں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرتے ہیں، جن لوگوں میں یہ پانچ علامات پائی جائیں اللہ تعالیٰ نے صرف انھی کو "الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا" یعنی پکے سچے مومن قرار دیا ہے، ایسے ہی مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند درجات بھی ہوں گے، بڑی بخشش بھی اور باعزت روزی بھی۔

**آیت 5** كَمَاۤ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ …… : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ بھی اسی طرح ہے جیسے تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے حق کے ساتھ نکالا۔ مفسرین نے اس "كَمَاۤ" (جس طرح) کی کئی توجیہیں کی ہیں، بعض نے وہ بیس تک پہنچا دی ہیں، البتہ صاحب کشاف نے صرف دو توجیہیں کی ہیں، جن میں سے زیادہ واضح یہ ہے کہ یہاں مبتدا محذوف ہے اور عبارت یوں ہوگی " هٰذِهِ الۡحَالُ كَحَالِ إِخۡرَاجِكَ يَعۡنِيۡ اَنَّ حَالَهُمۡ فِيۡ كَرَاهِيَةِ مَا رَأَيۡتَ مِنۡ تَنۡفِيۡلِ الۡغُزَاةِ مِثۡلُ حَالِهِمۡ فِيۡ كَرَاهَةِ خُرُوۡجِكَ لِلۡحَرۡبِ " یعنی غزوۂ بدر سے حاصل ہونے والی غنیمت کی تقسیم کے بارے میں آپ کی رائے اور فیصلے کو ناگوار سمجھنے میں ان کا حال ایسا ہی ہے جس طرح ان کا حال آپ کے لڑائی کے لیے نکلنے کے بارے میں تھا، حالانکہ دونوں ہی میں آپ کے لیے اور مسلمانوں کے لیے خیر ہی خیر

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۞ وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۞

وہ تجھ سے حق میں جھگڑتے تھے، اس کے بعد کہ وہ صاف ظاہر ہو چکا تھا، جیسے انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں⑥ اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہوگا اور تم چاہتے تھے کہ جو کانٹے والا نہیں وہ تمھیں مل جائے اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں کے ساتھ سچا کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے⑦

تھی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”غنیمت کا یہ جھگڑا ابھی ویسا ہی ہے جیسا کہ نکلتے وقت عقل سے تدبیریں کرنے لگے اور آخر کار صلاح وہی ٹھہری جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تو ہر کام میں یہی اختیار کرو کہ حکم برداری میں اپنی عقل کو دخل نہ دو۔“ (موضح)

**آیت 6** ① **يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ ......** : حق سے مراد کفار کا قافلہ نکل جانے کے بعد کفار سے ہر صورت لڑائی ہے، جس کا انجام فتح اور غنائم ہوگا۔ مختصراً واقعہ یہ ہے کہ سن ۲ ھ میں نبی ﷺ کو اطلاع ملی کہ کفارِ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے مکہ جا رہا ہے اور مدینہ کے قریب کے راستے پر پہنچ چکا ہے، آپ ﷺ مسلمانوں کی مختصر سی جمعیت جو تین سو سے کچھ اوپر تھی، لے کر قافلے کے تعاقب کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ابوسفیان کو آپ کے نکلنے کی اطلاع ہوگئی، اس نے ایک تیز رفتار سوار کے ذریعے سے مکہ اطلاع بھیج دی اور خود احتیاطاً اصل راستہ چھوڑ کر ساحلی راستہ اختیار کر لیا۔ مکہ میں جب یہ خبر پہنچی تو ابوجہل ایک بڑا مسلح لشکر لے کر قافلے کی حفاظت کے لیے روانہ ہوگیا اور آ کر بدر میں ڈیرے ڈال دیے۔ نبی ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے مسلمانوں کے سامنے ساری صورت حال رکھ دی کہ ایک طرف تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف قریش کا لشکر ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ تمھیں دونوں میں سے ایک ضرور ملے گا۔ اس پر بعض صحابہ کو تردد ہوا، وہ چاہتے تھے کہ لشکر کے بجائے قافلے کا تعاقب کیا جائے۔ اس وقت ابوبکر، عمر، سعد بن معاذ اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم نے اطاعت کی تقریریں کیں، مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ ہمیں موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں جیسا نہیں پائیں گے، جنھوں نے کہا کہ جا تو اور تیرا رب لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں!! تب آپ بدر کی طرف روانہ ہوئے اور اس وقت بعض صحابہ نے لشکر سے نہ لڑنے کا مشورہ دیا تھا، اسے ”يُجَادِلُوْنَكَ“ (وہ تجھ سے جھگڑتے تھے) سے تعبیر کیا ہے۔

② **كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ ......** : یعنی سمجھتے تھے کہ اتنے بڑے لشکر سے لڑنا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔

**آیت 7** ① **وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ** : یعنی قافلے یا کفار پر فتح اور اموال غنیمت۔

② **وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ ......** : ”الشَّوْكَةِ“ کانٹے کو کہتے ہیں، یعنی تمھاری خواہش یہ تھی کہ کسی تکلیف اور جنگ کے بغیر حاصل ہونے والا قافلہ تمھیں مل جائے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنی باتوں اور وعدوں کے مطابق حق کو سچا

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹

تاکہ وہ حق کو سچا کر دے اور باطل کو جھوٹا کر دے، خواہ مجرم ناپسند ہی کریں ⑧ جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی کہ بے شک میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرنے والا ہوں، جو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں ⑨

ثابت فرمائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

**آیت 8** **لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ......** : اس لیے اس نے ایسے اسباب پیدا فرما دیے کہ تمھارا مقابلہ تجارتی قافلے کے بجائے قریش کے لشکر سے ہوا اور تمھیں فتح نصیب ہوئی، جس سے ان کی سیاسی اور فوجی طاقت پر کاری ضرب لگی، یہی اللہ تعالیٰ کی وہ حکمت تھی جسے تم نہیں سمجھ رہے تھے اور تم میں سے بہت سے لوگ یہ چاہ رہے تھے کہ لشکر سے مقابلے کے بجائے تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ لگے۔

**آیت 9** ① **اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ......** : اپنی تعداد، تیاری، اسلحہ کی کمی اور دشمن کے تین گنا سے زیادہ اور ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہونے کی وجہ سے سب مسلمان ہی اپنے پروردگار سے مدد کے لیے فریاد کر رہے تھے۔ خصوصاً رسول اللہ ﷺ تو نہایت عجز اور الحاح کے ساتھ دعا فرما رہے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بدر کا دن ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا، وہ ایک ہزار تھے اور آپ کے ساتھی تین سو انیس آدمی تھے، تو اللہ کے نبی ﷺ نے قبلے کی طرف رخ کر کے ہاتھ پھیلا دیے اور اپنے رب سے بلند آواز سے فریاد کرنے لگے: ''اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ مجھ سے پورا کر، اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ مجھ سے پورا کر۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔'' آپ اپنے رب سے بلند آواز سے فریاد کرتے رہے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے دعا کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی چادر کندھوں سے گر گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے، آپ کی چادر پکڑی، اسے آپ کے کندھوں پر ڈالا، پھر پیچھے سے آپ سے چمٹ گئے اور کہا: ''اے اللہ کے نبی! آپ کا اپنے رب کو قسم دینا آپ کے لیے کافی ہے، کیونکہ یقیناً وہ آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی۔ [ مسلم، الجهاد، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر...... : ۱۷۶۳ ] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کہنے کے بعد آپ یہ کہتے ہوئے نکلے: ﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ [ القمر : ٤٥ ] ''یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھیں پھیر کر بھاگیں گے۔'' [ بخاري، المغازي، باب قول الله تعالىٰ : ﴿ إذ تستغيثون ربكم...... ﴾ : ۳۹۵۳ ]

② **اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ**: ایک دوسرے کے پیچھے، یعنی پے در پے آنے والے ہیں۔ چنانچہ بدر میں

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۠ﱠ ۱۰

ع ۱۵

اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر ایک خوش خبری اور تاکہ اس کے ساتھ تمھارے دل مطمئن ہوں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے۔ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ⑩

فرشتے نازل ہوئے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن فرمایا: ''یہ جبریل ہیں، اپنے گھوڑے کے سر (لگام) کو پکڑے ہوئے ہیں، لڑائی کے ہتھیار پہنے ہوئے ہیں۔'' [ بخاری، المغازی، باب شهود الملائكة بدرًا: ۳۹۹۵ ] یہاں ایک ہزار فرشتے اترنے کے وعدے کا ذکر ہے جو واقعی اترے۔ رفاعہ بن رافع قرظی بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس آئے، پوچھا: ''تم اہل بدر کو اپنے میں کیسا شمار کرتے ہو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کے سب سے بہتر لوگ۔'' یا اس کے ہم معنی کوئی بات کہی۔ (جبریل علیہ السلام نے) فرمایا: ''اسی طرح وہ فرشتے بھی (افضل) ہیں جو بدر میں شریک ہوئے تھے۔'' [ بخاری، المغازی، باب شهود الملائكة بدرًا : ۳۹۹۲ ] سورۂ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کے وعدے کا ذکر ہے، تطبیق کے لیے دیکھیے آل عمران (۱۲۴، ۱۲۵)۔

آیت 10 ① وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى ...... : آیت کے ان الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ فرشتوں نے خود لڑنے میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مسلمانوں کی مدد کے لیے محض اس لیے بھیجا تھا کہ ان کے حوصلے بلند ہوں اور انھیں اطمینان رہے کہ ان کی مدد کے لیے فرشتے موجود ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس دوران میں کہ ایک مسلمان مشرکین میں سے ایک آدمی کے پیچھے دوڑ رہا تھا کہ اس نے کوڑا مارنے کی ضرب کی آواز سنی اور ایک سوار کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا حیزوم! آگے بڑھو۔ اس نے اس مشرک کو دیکھا کہ وہ چت گر گیا ہے، دیکھا تو اس کی ناک پر نشان تھا، چہرہ پھٹ گیا تھا، جس طرح کوڑا مارنے سے ہوتا ہے اور وہ ساری جگہ سبز ہو گئی تھی۔ وہ انصاری آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات بیان کی، تو آپ نے فرمایا: ''تم نے سچ کہا، یہ تیسرے آسمان کی مدد میں سے تھا۔'' [ مسلم، الجهاد، باب الامداد بالملائكة في غزوة بدر...... : ۱۷۶۳ ] بدر کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے کئی جنگوں میں فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ میں نے بہت سے قابل اعتماد لوگوں سے سنا کہ متحدہ ہندوستان میں حافظ عبد اللہ روپڑی رحمہ اللہ کے حکم پر مسلمانوں نے عید الاضحیٰ کے دن گائیں ذبح کیں، تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، مسلمانوں نے تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود مقابلہ کیا تو کفار کثیر تعداد میں قتل ہوئے اور بھاگ گئے۔ جب مقدمہ چلا تو جنگ میں شریک مسلمان اور کافر پیش ہوئے، کفار کو شناخت کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا، ہم سے تو وہ لوگ لڑے ہیں جو سفید لباس میں ملبوس گھوڑوں پر سوار تھے، حالانکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس حالت میں نہ تھا۔ کشمیر میں کفار کے خلاف کارروائیوں کے دوران بھی فرشتوں کی مدد کے کئی واقعات پیش آئے ہیں جو مجلۃ الدعوۃ اور غزوہ کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔ شاعر

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَ لِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

جب وہ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا، اپنی طرف سے خوف دور کرنے کے لیے اور تم پر آسمان سے پانی اتارتا تھا، تاکہ اس کے ساتھ تمھیں پاک کر دے اور تم سے شیطان کی گندگی دور کرے اور تاکہ تمھارے دلوں پر مضبوط گرہ باندھے اور اس کے ساتھ قدموں کو جما دے ﴿۱۱﴾

---

نے سچ کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

② وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ...... : یعنی یہ نہ سمجھو کہ تمھیں جو فتح نصیب ہوئی ہے وہ ان فرشتوں کی وجہ سے ہوئی ہے، بلکہ حقیقت میں مدد اللہ کی طرف سے ہے، وہ چاہتا تو فرشتوں کے بغیر ہی تمھیں فتح عطا کر دیتا، مگر جہاد کو دین کا حصہ بنانے سے تمھارے ایمان کا امتحان، تمھارے ہاتھوں کافروں کو ذلیل اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت سے سرفراز کرنا مقصود ہے۔ پہلی امتوں میں سے جو امت اپنے پیغمبر کو جھٹلاتی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نہ کسی طرح کا عذاب نازل ہو جاتا، پانی میں غرق کرنا، خوف ناک چیخ، زلزلہ، پتھروں کی بارش اور شکلیں مسخ کر دینا وغیرہ۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے غرق ہونے سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک یہی سلسلہ قائم رہا۔ آخر کار جب موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی تو جہاد شروع ہوا اور اس کے بعد یہی طریقہ جاری ہے، اب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ہاتھوں کفار کو عذاب دینا چاہتا ہے، فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ...... ﴾ [ التوبة : ١٤، ١٥ ] ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کے چھ فائدے بیان فرمائے ہیں، تفصیل کے لیے سورۂ توبہ میں ان آیات کی تفسیر دیکھیے۔ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی آسمان سے عذاب کے بعض واقعات پیش آئے، جیسے اصحاب الفیل کا واقعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق آپ کی امت میں شراب، زنا، ریشم اور باجوں گاجوں کو حلال کر لینے والوں پر زمین میں دھنس جانے اور بندر اور خنزیر بنا دیے جانے کے عذاب آئیں گے۔ [ بخاري، الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر...... : ٥٥٩٠، عن أبي مالك الأشعري رضی اللہ عنہ ] مگر وہ عبرت کے لیے ہوں گے اور جزوی، یعنی کہیں کہیں ہوں گے۔ کفار کو کفر سے روکنے اور ان کی سرکشی ختم کر کے انھیں اسلام کے زیرنگیں لانے کی ذمہ داری اب جہاد کے ذریعے سے مسلمانوں ہی پر ہے، جس میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شامل ہوگی۔

**آیت 11** ① اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ : جنگ بدر میں فرشتوں کے ساتھ مدد کے علاوہ یہ دوسری مدد تھی۔ یہ اونگھ دو طرح سے آئی، ایک تو یہ کہ جس رات کی صبح کو لڑائی ہونے والی تھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خوب سوئے، حالانکہ دشمن کی فکر لگی ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند بھیج دی، تاکہ وہ تازہ دم ہو جائیں اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''بدر کے دن مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کے پاس گھوڑا نہیں تھا، میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر شخص سو رہا تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ ﴿۱۲﴾

جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں، عنقریب میں ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دوں گا۔ پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ﴿۱۲﴾

---

درخت کے نیچے نماز پڑھتے رہے اور رو رو کر دعائیں کرتے رہے، حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔'' [ أحمد : ۱۲۵/۱، ح : ۱۰۲۳، قال شعیب الأرنؤوط إسنادہ صحیح ] اس نیند کے ساتھ مسلمان تازہ دم ہو گئے۔ دوسرا یہ کہ لڑائی سے پہلے میدان میں آنے پر تمام مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے اونگھ طاری کر دی، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ پر بھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لڑائی کے دوران میں اونگھ طاری ہونے کا واقعہ جنگِ احد میں بھی پیش آیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ﴾ [ آل عمران : ۱۵۴ ] ''پھر اس غم کے بعد اس نے تم پر ایک امن نازل فرمایا، جو ایک اونگھ تھی، جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی۔'' یہاں مذکور آیت: ﴿ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ ﴾ میں یہ معاملہ بدر کے دن پیش آیا، جس سے مسلمانوں کے دلوں سے دشمن کا خوف ختم ہو گیا اور امن و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔'' سبھی شرکاء پر ایک ہی وقت میں اونگھ طاری کرنا، جس سے وہ بے سدھ ہو کر سو بھی نہ جائیں، بلکہ دشمن کی حرکت پر فوراً متحرک ہو جائیں اور اس اونگھ کی برکت سے انھیں ہر قسم کے خطرے سے بے خوف کر کے امن عطا کرنا، یقیناً ایک عظیم معجزہ تھا۔ اہلِ علم فرماتے ہیں، لڑائی کے دوران میں اونگھ آنا اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہوتی ہے۔

② وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ...... : یہ بھی اسی رات کا واقعہ ہے کہ رات کو بارش ہو گئی، جس سے ایک تو ریت جم گئی اور زمین پر پاؤں اچھی طرح جمنے لگے، جس سے فائدہ اٹھا کر مسلمان آگے بڑھے، نقل و حرکت آسان ہو گئی، دوسرے پانی کی کمی دور ہو گئی اور وضو اور طہارت کے لیے آسانی ہو گئی، جب کہ کفار کے پڑاؤ کی جگہ نیچی تھی، وہاں بارش کی وجہ سے کیچڑ ہو گئی اور پاؤں پھسلنے لگے۔ تیسرے مسلمانوں کے دلوں سے شیطان کی گندگی، یعنی گھبراہٹ، خوف، اللہ تعالیٰ سے بدگمانی اور مایوسی کی کیفیت دور ہو گئی اور صبح ہوئی تو وہ لڑنے کے لیے چاق چوبند تھے۔ بدر کے موقع پر یہ تیسرا انعام تھا جس سے کفار پر فتح یاب ہونے میں بڑی مدد ملی۔ (ابن کثیر)

**آیت 12** ① اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ : اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے۔

② سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ : یہ چوتھا انعام ہے جو میدان بدر ہی میں نہیں بلکہ تمام جنگوں میں رسول اللہ ﷺ اور امت مسلمہ کو عطا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔'' ان میں سے ایک یہ بیان فرمائی: ''مجھے ایک مہینے کی مسافت پر رعب کے ذریعے سے مدد دی گئی۔'' [ بخاري، التیمم، باب : ۳۳۵ ]

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾

یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے﴿۱۳﴾ یہ ہے! سو اسے چکھو اور (جان لو) کہ بے شک کافروں کے لیے آگ کا عذاب ہے﴿۱۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا، آمنے سامنے مقابلے کی صورت میں ملو تو ان سے پیٹھیں نہ پھیرو﴿۱۵﴾

---

اس کا باعث اللہ تعالیٰ نے دوسری آیات میں کفار کا مشرک ہونا بیان فرمایا۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۵۱)۔

③ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ ...... : گردنوں پر مارو، تاکہ ان کے ناپاک جسموں سے زمین پاک ہو اور ہاتھوں اور پاؤں کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ، تاکہ وہ ہاتھوں سے لڑ نہ سکیں اور پاؤں سے بھاگ نہ سکیں۔

**آیت 13** ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ: یعنی کفار کو بدر کے دن جو ذلت آمیز شکست ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اس طرح مخالفت کی کہ صاف مقابلے پر اتر آئے۔ "شَآقُّوْا" یہ "شِقٌّ" سے مفاعلہ ہے کہ ایک طرف ایک ہو اور دوسری طرف دوسرا اس کے مقابلے میں ہو، یعنی مخالفت، مقابلے میں آنا۔

**آیت 14** ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ: "ذٰلِكُمْ" یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر گزشتہ آیت میں مذکور "الْعِقَابِ" ہے، یعنی "ذٰلِكُمُ الْعَذَابُ فَذُوْقُوْهُ" "یہ ہے وہ عذاب سو اسے چکھو۔"

**آیت 15** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا ......: "زَحَفَ الصَّبِیُّ" جب بچہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے۔ "زَحَفَ الْجَيْشُ" بڑا لشکر بھی چونکہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے، اس لیے لشکر کے بڑھنے کو بھی "زَحْفَ" کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دشمن جب مقابلے کے لیے میدان میں سامنے آ کھڑا ہوا، تو بھاگو نہیں۔ یہ حکم صرف بدر ہی میں نہیں تھا بلکہ یہ حکم سب مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ہے۔ متعدد احادیث میں کفار سے بھاگنے کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔" ان میں سے ایک دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت پیٹھ پھیرنا ہے۔ [ بخاری، الوصایا، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ إن الذین یأکلون...... ﴾ : ۲۷٦٦ ] رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے بزدلی سے پناہ کی کئی دعائیں سکھائی ہیں، چنانچہ آپ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے: (( اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ )) [ بخاری، الدعوات، باب الاستعاذة من أرذل العمر...... : ٦٣٧٤، عن سعد رضی اللہ عنہ ]

انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ جب کسی منزل پر اترتے تو میں کثرت سے آپ کو یہ پڑھتے ہوئے سنتا: (( اَللّٰهُمَّ

وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

اور جو کوئی اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے، ماسوائے اس کے جو لڑائی کے لیے پینترا بدلنے والا ہو، یا کسی جماعت کی طرف پناہ لینے والا ہو تو یقیناً وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ﴿۱۶﴾ پس تم نے انھیں قتل نہیں کیا اور لیکن اللہ نے انھیں قتل کیا اور تو نے نہیں پھینکا جب تو نے پھینکا اور لیکن اللہ نے پھینکا اور تا کہ وہ مومنوں کو انعام عطا کرے، اپنی طرف سے اچھا انعام، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۷﴾

أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَ ضَلَعِ الدَّيْنِ وَ غَلَبَةِ الرِّجَالِ» [ بخاری، الجهاد والسير، باب من غزا بصبي للخدمة : ۲۸۹۳ ]

**آیت 16** اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ: "مُتَحَيِّزًا" " تَحَرَّفَ " سے اسم فاعل ہے، جس کا معنی ایک طرف ہونا ہے، یعنی ایک طرف سے دوسری طرف دشمن کو دھوکا دینے کے لیے پلٹنا، پینترا بدلنا۔ "مُتَحَيِّزًا" " تَحَيَّزَ " سے ہے، کسی جگہ اکٹھا ہونا، یعنی دشمن کو گھیرنے کے لیے یا ان کو دھوکا دینے کے لیے ایک طرف سے دوسری طرف پلٹنا یا پیچھے ہٹنا یا مسلمانوں کی بڑی جماعت کی طرف پناہ کے لیے اور دوبارہ حملے کے لیے لوٹ آنا گناہ نہیں، یعنی اللہ کا غضب اور جہنم کا ٹھکانا ہونا تو جنگ سے بھاگنے والے پر ہے، اگر فنونِ حرب کے تحت میدان چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائے تو گناہ نہیں۔

**آیت 17** ❶ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ...... : صاحبِ کشاف نے فرمایا، یہاں حرف "فاء" یعنی "پس" ایک شرط کا جواب ہے کہ اگر تم فخر کرو کہ ہم نے یہ کیا وہ کیا تو درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا، کیونکہ نہ تمھاری تعداد زیادہ تھی اور نہ تمھارے پاس اتنا سروسامان تھا کہ تم کافروں کے ہر طرح سے مسلح اور عظیم لشکر کو شکست دے سکتے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ اس لیے فرمایا کہ مسلمان یہ سمجھیں کہ فتح ہماری قوت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہے، لہٰذا ان کو چاہیے کہ کسی بات میں اپنا دخل نہ دیا کریں۔ (موضح )

❷ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ: یعنی وہ مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی، کیونکہ اگر وہ آپ کی پھینکی ہوئی ہوتی تو اتنی دور ہی جا سکتی جتنی ایک آدمی کے پھینکنے سے جا سکتی ہے، اس کو اتنا بڑھانا اور ٹھیک نشانے پر پہنچانا کہ ہر مشرک کی آنکھ میں پہنچ جائے صرف اللہ تعالیٰ کا کام تھا۔ یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو حافظ ابن کثیر نے علی بن طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حسن سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا: "یا رب! اگر یہ جماعت ہلاک ہو گئی

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ⑱

بات یہ ہے! اور یہ کہ یقیناً اللہ کافروں کی خفیہ تدبیر کو کمزور کرنے والا ہے ⑱

تو پھر زمین میں تیری عبادت کبھی نہیں ہوگی۔'' تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ''آپ مٹی کی ایک مٹھی لیں اور ان کے چہروں پر پھینکیں۔'' آپ ﷺ نے مٹی کی ایک مٹھی پکڑی اور ان کے چہروں کی طرف پھینکی تو جو بھی مشرک تھا اس کی آنکھوں، نتھنوں اور منہ میں اس مٹھی کا کچھ حصہ جا پہنچا تو وہ پیٹھ دے کر بھاگ گئے۔ گویا مٹی پھینکی آپ نے لیکن اس کو نشانے تک اللہ نے پہنچایا، ابتدائی کام پھینکنا آپ کا تھا اور انتہا نشانے پر لگانا اللہ کا فعل تھا۔ اگر درحقیقت خود آپ ہی اللہ تعالیٰ تھے تو دونوں فعل آپ کے ہوئے، آپ سے ایک فعل (نشانے پر لگانے) کی نفی کیوں کی گئی؟

③ بعض لوگ "مَا رَمَيْتَ" سے ثابت کرتے ہیں کہ درحقیقت نبی ﷺ خود ہی پروردگار عالم تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے پھینکنے کو اپنا پھینکنا قرار دیا، مگر اس صورت میں تو لازم آئے گا کہ "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ" سے بدری مسلمان بھی خود اللہ تعالیٰ ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفار کے قتل کرنے کو اپنا کام قرار دیا ہے۔ مگر یہ نہایت کفریہ بات ہے جس سے دین اسلام کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کچھ بدر ہی میں شہید ہوئے، کچھ بعد میں فوت یا شہید ہوئے، خود نبی ﷺ نے زہر کے اثر سے وفات پائی اور اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ زندہ حی و قیوم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ہستی تو ایک ہی ہے، فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ ان لوگوں کا رب عجیب ہے، جو ایک نہیں بلکہ بڑی تعداد میں ہے اور وہ شہید ہوتا اور مرتا بھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہندوؤں کی طرح ہر چیز کو رب مانتے ہیں اور اسے وحدت الوجود کہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ قرآن و حدیث کے احکام کا خاتمہ اور اسلام و کفر اور جنت و دوزخ سب کے وجود کا انکار ہے۔ [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ]

④ وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا: "لِيُبْلِيَ" یہ "بَلَآءٌ" سے مشتق ہے، از باب افعال، آزمانا، جو سختی اور مصیبت کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور نعمت عطا فرما کر بھی، اس لیے "بَلَآءٌ" کا معنی مصیبت بھی ہے اور انعام بھی۔ یہاں مراد انعام یا احسان اور عطا کے ساتھ آزمانا ہے۔ یعنی باوجود یہ کہ مسلمانوں کا سامان اور لشکر کافروں کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں فتح دی، تاکہ وہ اس نعمت کو پہچانیں اور اس کا شکر بجا لائیں۔

آیت 18 ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ: یعنی یہ بات تو ہے ہی جس کا ذکر گزرا، یعنی فرشتوں کے ساتھ مدد، بارش برسانا، اونگھ ڈالنا، مشرکین کی آنکھوں میں خاک ڈالنا، ان کے ستر آدمیوں کا قتل اور ستر کا قید ہونا اور مسلمانوں کو فتح عظیم عطا ہونا وغیرہ، اس کے ساتھ مزید سنو کہ اللہ آئندہ بھی کفار کی سازشوں کو کمزور کر دے گا اور یہ اپنی کسی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ (ابن کثیر) یا یہ کہ انھوں نے جو یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اپنے تجارتی قافلے کو بچا لے جائیں گے اور مسلمانوں کا زور بھی توڑ دیں گے، ان کا منصوبہ خاک میں ملا دیا، وہ خود مارے گئے اور تمھارے ہاتھوں قیدی بن گئے اور بھاری جانی و مالی نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔

اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَكُمُ الۡفَتۡحُ ۚ وَاِنۡ تَنۡتَهُوۡا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَ اِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ ۚ وَلَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡكُمۡ فِئَتُكُمۡ شَيۡـئًا وَّلَوۡ كَثُرَتۡ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۰﴾

اگر تم فیصلہ چاہو تو یقیناً تمھارے پاس فیصلہ آ چکا اور اگر باز آ جاؤ تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ کرو گے تو ہم (بھی) دوبارہ کریں گے اور تمھاری جماعت ہرگز تمھارے کچھ کام نہ آئے گی، خواہ بہت زیادہ ہو اور (جان لو) کہ بے شک اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اس سے منہ نہ پھیرو، جب کہ تم سن رہے ہو ﴿۲۰﴾

**آیت 19** ① اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَكُمُ الۡفَتۡحُ...... : فتح کا معنی یہاں فیصلہ ہے، جیسا کہ کفار کہتے تھے: ﴿ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴾ [ السجدة : ٢٨ ] ”یہ فیصلہ کب ہو گا، اگر تم سچے ہو؟“ عبد اللہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ”جب (بدر کے دن) لوگ ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو ابوجہل نے کہا، اے اللہ! ہم میں سے جو شخص زیادہ رشتوں کو توڑنے والا اور ہمارے سامنے غیر معروف بات پیش کرنے والا ہے، اسے آج صبح ہلاک کر دے، تو یہ فیصلہ طلب کرنے والا ابوجہل تھا۔“ [ مستدرك حاكم ٣٢٨/٢، ح : ٣٢٦٤۔ أحمد : ٤٣١/٥، ح : ٢٣٦٦١، وصححه شعيب الأرنؤوط۔ السنن الكبرى للنسائي : ٣٥٠/٦، ح : ١١٢٠١ ] ”اگر تم فیصلہ چاہو“ یہ خطاب کفار سے ہے، کیونکہ انھوں نے مکہ سے روانہ ہوتے وقت اور ابوجہل نے معرکۂ بدر سے پہلے یہ دعا کی تھی: ”اے اللہ! ہم میں سے جو حق پر ہے اسے غالب اور جو باطل پر ہے اسے رسوا کر۔“ گویا یہاں ”الۡفَتۡحُ“ کا معنی حکم اور فیصلہ ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”مکی سورتوں میں ہر جگہ کافروں کا یہ کلام نقل فرمایا کہ ہر گھڑی کہتے ہیں: ﴿ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ ﴾ یعنی کب فیصلہ ہو گا، سو اب فرمایا کہ یہ فیصلہ آ پہنچا۔“ (موضح)

② وَاِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ: یعنی اگر پھر مسلمانوں کی مخالفت اور ان سے جنگ کرو گے تو ہم پھر تمھارے ساتھ یہی سلوک کریں گے، اگرچہ تمھاری جماعت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

③ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: ”اَنَّ“ سے پہلے کئی الفاظ مقدر مانے جا سکتے ہیں، آسان یہ ہے کہ اس جملے کو ”وَاعۡلَمُوۡا“ کا مفعول مان لیا جائے، یعنی جان لو کہ یقیناً اللہ مومنوں کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ ہو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

**آیت 20** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ...... : کفار کو تنبیہ کے بعد اب مسلمانوں کو تلقین ہو رہی ہے کہ جب تمھیں کسی معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم معلوم ہو جائے تو اس کے خلاف کسی کی مت سنو! بلکہ اس کی اطاعت کرو۔ پہلے اللہ کی اطاعت بطور تمہید ہے، کیونکہ رسول کی اطاعت بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ سورت کے ابتدا میں اموالِ غنیمت کے متعلق اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ﴿ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ ﴾ کا اعلان فرمایا تھا اور اطاعت رسول کو ایمان کی شرط

وَلَا تَكُونُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا ہم نے سنا، حالانکہ وہ نہیں سنتے ﴿۲۱﴾ بے شک تمام جانوروں سے برے اللہ کے نزدیک وہ بہرے، گونگے ہیں، جو سمجھتے نہیں ﴿۲۲﴾ اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنوا دیتا اور اگر وہ انھیں سنوا دیتا تو بھی وہ منہ پھیر جاتے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے ہوتے ﴿۲۳﴾

قرار دیا تھا، پھر درمیان میں اپنے انعامات ذکر فرمائے اور اب پہلے کلام کو پھر اطاعت کی تلقین پر ختم فرمایا۔

② وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تم سن رہے ہو اس وقت اس سے منہ نہ پھیرو، دوسرے اوقات میں بے شک پھیر لو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم ہر وقت اللہ کے احکام قرآن و حدیث کی صورت میں سنتے ہو، اگر نہ سنا ہو، یا علم نہ ہو تو عذر ہو سکتا ہے، مگر حکم سن کر پھر بجا نہ لانا ایمان والوں کو زیب نہیں دیتا۔ جو شخص خود حکم سن کر بجا نہیں لاتا اس تک حکم اگر کسی کے واسطے سے پہنچے گا تو کیسے مانے گا۔

**آیت 21** وَلَا تَكُونُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا ...... : ان سے مراد مشرکین، منافقین اور اہل کتاب ہیں جو کانوں سے تو اللہ اور اس کے رسول کا کلام سنتے ہیں، مگر اس طرح کہ وہ نہیں سنتے، کیونکہ نہ وہ دل سے سنتے ہیں نہ قبول کرتے ہیں، ان کا سننا نہ سننے کے برابر ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۶)۔

**آیت 22** اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ ......: "الدَّوَآبِّ" "دَابَّةٌ" کی جمع ہے، "دَبَّ يَدِبُّ (ض)" زمین پر چلنا۔ انسان کو "الدَّوَآبِّ" میں اس لیے شمار کیا کہ کتب لغہ میں ہر جاندار کو دابہ کہہ لیتے ہیں۔ مصباح میں ہے "دَابَّةٌ" زمین کا ہر جاندار، خواہ سمجھ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، یعنی کفار و منافقین جو کان سے اچھی بات نہ سنیں، زبان سے اچھی بات نہ نکالیں اور اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام نہ لیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام جانوروں سے بدتر ہیں، کیونکہ جانور تو اپنے فطری تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور ان لوگوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مگر یہ اس غرض کو بھی پورا نہیں کرتے۔ یہاں پہلے بہرے ہونے کا ذکر ہے، پھر گونگے ہونے کا، کیونکہ حق سن کر ہی اس کی تائید و تبلیغ زبان سے ہوتی ہے، پھر بے عقل ہونے کا، کیونکہ بعض بہرے اور گونگے عقل سے حق کو سمجھتے اور اسے قبول کر لیتے ہیں، مگر یہ لوگ تینوں چیزوں سے خالی ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹) اور فرقان (۴۴)۔

**آیت 23** وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ...... : یعنی اگر ان کے دل میں خیر یعنی حق کی طلب ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے سننے کو نافع بنا کر ایمان و عمل کی توفیق دے دیتا۔ پہلے "لَّاَسْمَعَهُمْ" (انھیں ضرور سنوا دیتا) سے مراد وہ سنانا ہے جو دل سے ہو اور فائدہ مند ہو اور "لَوْ اَسْمَعَهُمْ" (اور اگر وہ انھیں سنوا دیتا) سے مراد محض کانوں سے سنوانا ہے، یعنی اگر انھیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اور رسول کی دعوت خوشی سے قبول کرو، جب وہ تمھیں اس چیز کے لیے دعوت دے جو تمھیں زندگی بخشتی ہے اور جان لو کہ بے شک اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے اور یہ کہ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴﴾

اسی حال میں کہ ان کے اندر کوئی بھلائی نہیں ہے، سنوا تا تو یقیناً وہ منہ پھیر کر چل دیتے، یعنی ان لوگوں نے گناہوں کا ارتکاب کر کر کے اپنے اندر سے وہ استعداد ہی ختم کر دی ہے جو ایمان اور راہِ ہدایت کی پیروی کے لیے بیج کی حیثیت رکھتی ہے، پھر جب بیج ہی نہ ہو تو پھل کی امید کیا ہو سکتی ہے، چنانچہ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [ المطففين : ١٤ ] ''خبردار رہو کہ ان کے برے اعمال ان کے دلوں پر زنگ بن کر چھا گئے ہیں۔''

**آیت 24** ❶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ: "اَجَابَ يُجِيْبُ" کا معنی قبول کرنا ہے اور "اسْتَجِيْبُوْا" باب استفعال "اِسْتَجَابَ يَسْتَجِيْبُ" سے ہے، جس میں عموماً طلب ہوتی ہے، یہاں طلب کا معنی نہیں ہو سکتا، لہٰذا سین اور تاء کے اضافے سے معنی میں زیادتی مراد ہوگی، اس لیے ''خوشی سے قبول کرو'' ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر خوشی سے لبیک کہنا تم پر لازم ہے۔

❷ اِذَا دَعَاكُمْ : ''جب وہ تمھیں دعوت دے'' کا مطلب یہ ہے کہ فوراً قبول کرو، دیر نہ کرو۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بلایا، وہ نماز پوری کر کے آئے تو آپ نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا: ''تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا؟'' انھوں نے کہا: ''آئندہ میں ان شاء اللہ ایسا نہیں کروں گا۔'' [ ترمذی، فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل فاتحۃ الکتاب : ٢٨٧٥ ] صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں ابو سعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے ہوئے بلانا اور اسی وقت نہ آنے پر یہی تلقین فرمانا موجود ہے۔ [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ يأيها الذين امنوا استجيبوا...... ﴾ : ٤٦٤٧ ]

❸ لِمَا يُحْيِيْكُمْ : ''اس چیز کے لیے جو تمھیں زندگی بخشتی ہے'' اس سے متعلق علمائے سلف کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے اسلام و ایمان اور بعض نے قرآن، لیکن اکثر نے اس سے جہاد مراد لیا ہے، کیونکہ جہاد دنیا اور آخرت میں زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، خصوصاً اس لیے کہ شروع سورت سے یہی بات چلی آ رہی ہے، آیت: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ﴾ [ البقرة : ٢٤٣ ] سے مراد بھی جہاد کی ترغیب ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: ''جب تم عینہ (حیلے سے سود کی ایک قسم) کے ساتھ بیع کرو گے اور بیلوں کی دمیں پکڑ لو گے اور کاشت کاری پر خوش ہو جاؤ گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی بڑی ذلت مسلط کرے گا جسے دور نہیں کرے گا، حتیٰ کہ تم اپنے دین (جہاد) کی طرف لوٹ آؤ۔'' [ أبو داؤد، البیوع، باب فی النھی عن العینۃ : ٣٤٦٢۔ السلسلۃ الصحیحۃ : ١١ ]

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اور اس عظیم فتنے سے بچ جاؤ جو لازماً ان لوگوں کو خاص طور پر نہیں پہنچے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا اور جان لو کہ بے شک اللہ بہت سخت سزا والا ہے ﴿۲۵﴾

④ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ: یعنی حق واضح ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا حکم نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو یہ سزا ملتی ہے کہ وہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اسے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق نہیں ملتی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ [ الصف : ۵ ] ''جب وہ خود ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔'' آیت کے یہ معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور مفسرین نے بیان فرمائے ہیں۔ سورۂ انعام کی آیت (۱۰۹، ۱۱۰) میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے، جنگِ تبوک میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فوری طور پر نہ نکل سکے تو بعد میں جانے کی توفیق ہی نہیں ملی، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق اور انابت کی وجہ سے انھیں توبہ کی توفیق دی اور قرآن میں ان کا ذکر خیر فرمایا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح یہ فرماتے ہیں: ''حکم بجا لانے میں دیر نہ کرو، شاید اس وقت دل ایسا نہ رہے، دل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' (موضح) بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ اللہ کے حائل ہونے سے مراد موت ہے، یعنی موت آنے سے پہلے اطاعت بجا لاؤ، اس کے بعد ﴿وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ (اور جان لو کہ یہ یقینی حقیقت ہے کہ تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) کے جملے سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دونوں معنی ہی مراد ہو سکتے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں۔

**آیت 25** ① وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا...... : ''فِتْنَةً'' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ''عظیم فتنہ'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جب کسی قوم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام نہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر ہمہ گیر عذاب بھیج دیتا ہے۔ (ابن کثیر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم ضرور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے منع کرو گے، یا پھر اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیج دے گا، پھر تم اس سے دعا کرو گے مگر وہ تمھاری دعا قبول نہیں کرے گا۔'' [ أحمد : ۵/ ۳۸۸، ۳۸۹، ح : ۲۳۳۰۱، عن حذیفۃ بن یمان رضی اللہ عنہ وحسنہ شعیب الأرنؤوط ] اصحاب سبت یعنی ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑنے والوں کا قصہ اس کی ایک مثال ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۶۴ تا ۱۶۷)۔

② وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: مطلب یہ ہے کہ حکم کی بجا آوری میں کاہلی کرنے سے ایک تو دل ہٹتا ہے، دم بدم مشکل میں پڑتا ہے، دوسرے نیک لوگوں کے عمل میں سستی اختیار کرنے سے گناہ گار بالکل ہی عمل چھوڑ بیٹھیں گے، تو رسم بد پھیلے گی، اس کا وبال سب پر پڑے گا۔

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، زمین میں نہایت کمزور سمجھے گئے تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تمھیں اچک کر لے جائیں گے تو اس نے تمھیں جگہ دی اور اپنی مدد کے ساتھ تمھیں قوت بخشی اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، تاکہ تم شکر کرو ﴿۲۶﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو، جبکہ تم جانتے ہو ﴿۲۷﴾ اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش کے سوا کچھ نہیں اور یہ کہ یقیناً اللہ، اسی کے پاس بہت بڑا اجر ہے ﴿۲۸﴾

آیت 26 وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ...... : اس میں مکی زندگی میں مسلمانوں کی قلت تعداد، سختی اور خوف کا، پھر مدینہ میں ان کو اپنا گھر، امن وسکون اور راحت وآرام ملنے کا ذکر ہے۔ ''اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا'' میں دوسری تمام پاکیزہ نعمتوں کے ساتھ غنیمت کے اموال کا حلال کرنا بھی شامل ہے، کیونکہ یہ پہلی امتوں کے لیے حلال نہیں تھے، بلکہ جلا دیے جاتے تھے۔

آیت 27 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ...... : امانتوں میں خیانت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس سے وہ تمام ذمہ داریاں اور عہد معاہدے مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ یا بندوں سے کیے گئے ہوں۔ صلح، جنگ اور نکاح وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں، ایک دوسرے کے ذاتی راز اور فوجی راز بھی امانت ہیں۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے پہلے ایک عورت کو خط دے کر مکہ بھیجا تھا، جس میں اہل مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حملے کے ارادے سے آگاہ کیا تھا اور اس پر اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی تھی۔ [ بخاری، ۳۹۸۳۔ مسلم : ۲۴۹۴ ] سورۂ ممتحنہ کے شروع میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کم ہی کوئی خطبہ دیا مگر اس میں فرمایا: « لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهُ » [ أحمد : ۳/ ۱۳۵، ح : ۱۲۳۸۳، و حسنه شعیب الأرنؤوط۔ ابن حبان : ۱۹۴ ] ''اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس کی کوئی امانت نہیں اور اس شخص کا کوئی دین نہیں جس کا کوئی عہد نہیں۔'' عبد اللہ بن عمرو اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ منافق کی علامات میں سے ایک علامت امانت میں خیانت بھی ہے۔ [ بخاری، الإیمان، باب علامات المنافق : ۳۳۔ مسلم : ۵۹ ]

آیت 28 وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ...... : مال اور اولاد کی محبت انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے، کیونکہ عام طور پر انھی کے لیے آدمی خیانت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اِنَّ الْوَلَدَ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ مَجْهَلَةٌ مَحْزَنَةٌ » ''بے شک بچہ بخل، بزدلی، جہالت اور غم کا باعث ہوتا ہے۔'' [ صحیح

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے (حق و باطل میں) فرق کرنے کی بڑی قوت بنا دے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۲۹﴾ اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے، تا کہ تجھے قید کر دیں، یا تجھے قتل کر دیں، یا تجھے

---

الجامع الصغير : ۱۹۹۰۔ مستدرك حاكم : ۲۹۶/۳، ح : ۵۲۸٤، عن الأسود بن خلف ] درحقیقت اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتا ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ترجیح دیتا ہے، یا مال اور اولاد کی ایسی محبت کو جس سے خیانت اور احکامِ الٰہی کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ اس ناجائز محبت پر غالب آنے کا طریقہ اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بہت ہی بڑا اجر ہے۔

آیت 29 ❶ اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا ...... : مال اور اولاد کی آزمائش سے خبردار کرنے کے بعد اب تقویٰ کی تعلیم دی ہے اور اس کے فوائد بیان کیے ہیں، تقویٰ کا مادہ ''و ق ی'' ہے اور یہ اسم مصدر ہے۔ ''تَتَّقُوْا'' باب افتعال سے ہے، اس کا معنی بچنا ہے، آدمی اسی چیز سے بچتا ہے جس سے ڈرتا ہو، اس لیے اس کا معنی ڈرنا بھی کر لیا جاتا ہے۔ ''فَرْقٌ'' اور ''فُرْقَانٌ'' مصدر ہیں، دونوں کا ایک ہی معنی ہے، مگر ''فُرْقَانًا'' کے حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی اگر تم ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس کی نافرمانی سے بچتے رہو گے، خواہ کوئی دوسرا تمھارے پاس ہو یا نہ ہو تو تمھیں چار نعمتیں عطا ہوں گی، پہلی یہ کہ تم میں حق اور باطل کو پہچاننے اور ان کے درمیان فرق کرنے کی بہت بڑی قوت پیدا ہو جائے گی اور اس قوت کی بدولت اللہ تعالیٰ تمھیں کسی بھی شبہے، شک یا تذبذب کا شکار ہونے کے بجائے واضح طور پر ہر کام کے درست یا نا درست ہونے کی پہچان اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کی قوت عطا کرے گا، تم آسانی سے حق کا فیصلہ کر کے اس پر عمل کر سکو گے۔ دیکھیے سورۂ حدید (۲۸) اسی طرح وہ تمھیں فتح و نصرت عطا کر کے تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ دوسری یہ کہ وہ تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تیسری یہ کہ قیامت کے دن وہ تمھارے گناہ بخش دے گا۔

❷ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ : یہ چوتھی نعمت ہے۔ فضل کا معنی زائد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں اتنا ہی بدلہ نہیں دے گا جتنا تم عمل کرو گے بلکہ اس سے کہیں زیادہ دے گا، کیونکہ وہ بہت زائد حتیٰ کہ تمھاری سوچ سے بھی بہت زائد عطیہ دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ [ السجدة : ۱۷ ] ''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔''

آیت 30 وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : جب تقریباً تمام صحابہ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، علی رضی اللہ عنہما اور اکا دکا مسلمان مکہ میں رہ گئے تو کفار کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر محمد (ﷺ) بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تو وہ ہمارے لیے ایسا خطرہ ثابت ہوں گے جو ہمارے قابو سے باہر ہو گا۔ چنانچہ ان کی دار الندوہ میں مجلس ہوئی، جس میں تجاویز و

يُخْرِجُوْكَ ؕ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

نکال دیں اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے﴿۳۰﴾ اور جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو یقیناً اس جیسا ہم بھی کہہ دیں، یہ تو پہلے لوگوں کی فرضی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں﴿۳۱﴾

آراء طلب کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا خلاصہ بیان فرمایا ہے، ایک رائے یہ تھی کہ آپ کو قید کر دیں اور موت تک وہاں سے نہ نکلنے دیں، اس پر یہ امکان سامنے آیا کہ ان کے ساتھی کارروائی کر کے انھیں چھڑا لیں گے۔ ایک تجویز یہ آئی کہ انھیں قتل کر دیا جائے، اس پر آپ کے خاندان بنو عبد مناف کے ساتھ لڑائی کا خطرہ سامنے آیا اور ایک مشورہ یہ آیا کہ ہم خود ہی انھیں مکہ سے نکال دیں، جہاں چاہیں جائیں، ہماری تو جان چھوٹے گی، اس پر یہ خطرہ سامنے آیا کہ وہ اپنے صدق و امانت، خوش خلقی اور خوش کلامی سے لوگوں کو اکٹھا کر کے تم پر حملہ آور ہوں گے۔ آخر فیصلہ یہ ٹھہرا کہ ہر قبیلے سے ایک نوجوان لیا جائے، وہ سب رات کو آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیں، آپ جونہی باہر نکلیں وہ سب مل کر حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دیں۔ بنو عبد مناف کس کس سے لڑیں گے، آخر دیت پر راضی ہو جائیں گے۔ جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کو ان کی سازش کی اطلاع دے دی اور یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ آپ اس رات اپنے بستر پر نہیں سوئے، بلکہ علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ کافر ساری رات انتظار میں رہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خفیہ تدبیر سے کفار کی سازش کو ناکام کر کے آپ کو بحفاظت نکال لیا، اگلے دن آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت فرمائی۔ سیرت کی تمام کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے جس کا یہ خلاصہ قرآن مجید کے مطابق ہے۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''ہجرت کی رات علی رضی اللہ عنہ نے اپنی جان کا سودا کیا، وہ یہ کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھی اور آپ کی جگہ سو گئے۔'' [ أحمد : ۱/ ۳۳۰، ۳۳۱، ح : ۳۰۶۲۔ مستدرك حاكم : ۳/ ۴، ح ۴۲۶۴۔ وصححه الحاكم و وافقه الذهبي ] ہجرت کے واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۴۰) اور ''مکر'' کے معنی کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۴)۔

**آیت 31** ① وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا ...... : ''اَسَاطِيْرُ'' یہ ''اُسْطُوْرَةٌ، اُسْطَارَةٌ، اُسْطِيْرَةٌ'' کی جمع ہے، بے ترتیب کہانیاں۔ (قاموس) ابن جریر نے فرمایا کہ ''سَطْرٌ'' کی جمع ''اَسْطُرٌ'' ہے اور اس کی جمع ''اَسَاطِيْرُ'' ہے۔ کفار کہتے تھے کہ یہ قرآن ہے ہی کیا، محض پہلے لوگوں کی بے ترتیب فرضی کہانیاں ہیں۔ یہ انھوں نے محض جہل کی وجہ سے کہا، کیونکہ قرآن ترتیب وار تاریخ اور قصے بیان کرنے کے لیے نہیں، بلکہ نصیحت کے لیے اتارا گیا ہے، اس لیے جس مقام پر جس واقعے کے جس قدر بیان کی ضرورت تھی، بیان فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ان کا یہ اعتراض اور اس کا جواب اس مقام

وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

اور جب انھوں نے کہا اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ ﴿۳۲﴾

سے کچھ مفصل ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۵، ۶)۔

② لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ : یہ ان کے عجز کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں پہلے پورے قرآن، پھر اس کی دس سورتوں اور پھر صرف ایک سورت کی مثل لانے کے لیے کہا۔ وہ جواب میں کہہ رہے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو اس جیسا ہم بھی کہہ دیں، کوئی ان سے پوچھے اگر واقعی ایسا ہی ہے تو تمھیں کس نے اس جیسا کلام لانے سے روکا ہے، تمھاری مقابلے کی غیرت کہاں گئی؟ اس قدر لاجواب ہونے کے باوجود تم کیوں نہیں کہنا چاہتے؟ کچھ تو زبان کھولو، صرف ﴿ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴾ کی تین آیتوں جیسی ہی سورت لے آؤ۔ معلوم ہوا تم صاف جھوٹ کہہ رہے ہو۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۳، ۲۴)۔

**آیت 32** وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ...... : یہ آیت اس بات کی مثال ہے کہ انسان جب مخالفت اور شدید دشمنی پر اتر آئے تو وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یا کر رہا ہوں اس میں خود میرا کس قدر نقصان ہے۔ اب مکہ کے جاہل کافروں کو دیکھیے، اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنے کے بجائے کہ یا اللہ! اگر یہ دین حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہمیں اس کے قبول کرنے کی توفیق دے، وہ رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! اگر یہ دین واقعی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر عذاب الیم لے آ۔ اپنے خیال میں انھوں نے یہ بڑی دانش مندی کی بات کی ہوگی، مگر یہ قیامت تک کے لیے ان کی بے عقلی اور جہالت کی دلیل اور ان کے لیے عار کا باعث بن گئی۔ قرآن میں ان کے بار بار عذاب لے آنے کے مطالبے کا کئی مقامات پر ذکر ہے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۳)، سورۂ ص (۱۶) اور معارج (۱ تا ۳) صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ مطالبہ ابوجہل نے کیا تھا۔ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ و إذ قالوا اللهم إن كان هذا...... ﴾ : ٤٦٤٨ ] چونکہ باقی سب نے اسے پسند کیا تھا، اس لیے اسے سب کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ التفسیر الوسیط میں سید طنطاوی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے جس کی سند ذکر نہیں کی (واللہ اعلم) مگر واقعہ دلچسپ اور سبق آموز ہے، اگر سنداً ثابت نہ بھی ہو تو بھی بات درست ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے قوم سبا (اصحاب یمن) کے ایک آدمی سے کہا: ''تیری قوم کس قدر جاہل تھی کہ جنھوں نے ایک عورت کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔'' اس نے جواب میں کہا: ''میری قوم سے آپ کی قوم زیادہ جاہل تھی کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق کے جواب میں یہ تو کہا: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ ''اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب لے آ) مگر یہ نہ کہا کہ یا اللہ! اگر یہی حق ہے تو ہمیں اس کے لیے ہدایت عطا فرما۔''

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ تو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں ﴿۳۳﴾ اور انھیں کیا ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جب کہ وہ مسجد حرام سے روک رہے ہیں، حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی نہیں ہیں مگر جو متقی ہیں اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۳۴﴾

**آیت 33** ① **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ** : یعنی جب تک آپ ان میں موجود تھے اللہ تعالیٰ ان پر کبھی عذاب بھیجنے والا نہیں تھا، کیونکہ اس کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان کا رسول اور ایمان والے ان میں موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ نوح، ہود، صالح اور لوط علیہم السلام کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ قوم لوط کے متعلق فرمایا: ﴿ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ الذاریات : ۳۵ ] ''ہم نے اس بستی سے جو بھی مومن تھا نکال لیا۔'' اسی طرح نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تمام اہل ایمان کو کشتی میں بٹھا لو، پھر عذاب بڑھنا شروع ہوا۔ دیکھیے سورۂ ہود (۴۰) اور سورۂ مومنون (۲۷)۔

② **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ** ...... : یعنی یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے گناہوں پر نادم ہو کر استغفار کرتی رہتی ہے وہ اسے ہلاک نہیں کرتا۔ یہاں فرمایا: ''جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔'' اس کی دو توجیہیں زیادہ معتبر ہیں، ایک تو یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر جانے کے بعد بھی کچھ مسلمان مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اپنے رب سے استغفار کرتے رہتے تھے، ان کے استغفار کی برکت سے اہل مکہ پر عذاب نہیں آیا، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [ الفتح : ۲۵ ] ''اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ضرور ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے کفر کیا تھا، عذاب دیتے دردناک عذاب۔'' دوسری توجیہ یہ ہے کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے علم میں ایسے لوگ موجود تھے جو آئندہ چل کر مسلمان ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں گے، اس لیے ان پر ایسا عذاب نہیں آ سکتا تھا جو سب کو سرے سے فنا کر ڈالے۔ اس توجیہ کی طرف اشارہ بھی سورۂ فتح (۲۵) میں موجود ہے: ﴿ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ''تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کر لے۔''

**آیت 34** **وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ** ...... : اس آیت میں ان کے عذاب کا مستحق ہونے کی چند وجہیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کے مسجد حرام میں داخلے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ زبردستی مسجد حرام کے مالک اور متولی بنے بیٹھے ہیں، حالانکہ کعبہ کی تولیت صرف موحدین متقین کا حق ہے، مشرکین کا نہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۷، ۱۸) تیسری یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی شان کے لائق اور اس کے بتائے ہوئے طریقے سے کرنے کے بجائے تالیاں پیٹ کر اور

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور ان کی نماز اس گھر کے پاس سیٹیاں بجانے اور تالیاں بجانے کے سوا کبھی کچھ نہیں ہوتی۔ سو عذاب چکھو اس وجہ سے جو تم کفر کرتے تھے ﴿۳۵﴾

سیٹیاں بجا کر قوالی کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ اس لیے ان پر عذاب کیوں نہ آئے، عذاب آئے گا اور ضرور آئے گا۔ پچھلی آیت میں جس عذاب کی نفی کی تھی وہ تھا جس سے قوموں کا نام ونشان مٹ جاتا تھا، یعنی عذاب استیصال۔ اس آیت میں اس عذاب کا ذکر ہے جو قحط، خوف اور جنگ کی صورت میں عبرت کے لیے ان پر مسلط ہوا، دیکھیے سورۂ نحل (۱۱۲، ۱۱۳)، سورۂ سجدہ (۲۱) اور سورۂ دخان (۱۰ تا ۱۶) یہ عذاب جنگِ بدر، قحط، بھوک، خوف اور آخر میں فتح مکہ کی صورت میں اہلِ مکہ پر مسلط ہوا۔ جس سے ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، یا قید ہوئے اور جو مرنے سے بچ گئے وہ آخر کار اسلام میں داخل ہو گئے۔

آیت 35 ① وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً: "مُكَآءً" "مَكَا يَمْكُوْ مَكْوًا وَ مُكَاءً" سیٹی بجانا اور "تَصْدِيَةً" "صَدّٰى يُصَدِّيْ تَصْدِيَةً" (تفعیل) تالیاں بجانا۔ یعنی وہ لوگ کعبہ کے پاس عین حرم میں تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے اور اسے اپنی نماز، اللہ کی عبادت اور اس کے قرب کا ذریعہ قرار دیتے۔ افسوس کہ اب مسلمانوں نے بھی نمازیں اور قرآن چھوڑ کر عاشقانہ اشعار، سیٹیوں اور تالیوں کے مجموعے قوالی کو طریقت و معرفت کا نام دے کر روح کی غذا قرار دے رکھا ہے۔ بے شمار لوگ اسے تصوف کا اہم رکن قرار دے کر صرف سیٹیوں اور تالیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باقاعدہ مرشد کے ارد گرد طواف اور رقص کر کے اسے اپنی نماز سمجھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں ؎

نماز عابداں سجدہ سجود است — نماز عاشقاں کلی وجود است

"عابدوں کی نماز سجدہ سجود ہے مگر عاشقوں کی نماز (معشوق کا) پورا وجود ہی ہے۔"

ایک صوفی نے تو صاف ہی اپنے مرشد کو قبلہ بھی قرار دے دیا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے — من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

"ہر قوم کا ایک راستہ، ایک دین اور ایک قبلہ ہوتا ہے، مگر میں نے تو اپنا قبلہ ایک ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف سیدھا کر لیا ہے۔" اگر ان میں سے کوئی نماز پڑھتا بھی ہے تو ایسے طریقے سے جس طریقے سے پڑھنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دوبارہ نماز پڑھ، تو نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ اللہ کی قسم! جب تک مسلمان تصور شیخ کا شرک اور صوفیوں کی عبادت کے یہ خود ساختہ طریقے اور موسیقی و رقص جیسی دل میں نفاق پیدا کرنے والی خرافات ترک نہیں کرتے اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ارکان اسلام و ایمان کی پابندی، خصوصاً جہاد نہیں کرتے کبھی دنیا میں سر نہیں اٹھا سکتے، ہمیشہ ذلت و خواری ہی ان پر مسلط رہے گی۔

② فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: کفر و شرک کے ارتکاب، سیٹیوں، تالیوں اور رقص کو نماز سمجھنے کا نتیجہ دنیا اور

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ ع ۱۸

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں، تاکہ اللہ کے راستے سے روکیں۔ پس عنقریب وہ انھیں خرچ کریں گے، پھر وہ ان پر افسوس کا باعث ہوں گے، پھر وہ مغلوب ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ﴿۳۶﴾ تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے اور ناپاک کو، اس کے بعض کو بعض پر رکھے، پس اسے اکٹھا ڈھیر بنا دے، پھر اسے جہنم میں ڈال دے۔ یہی لوگ اصل خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۳۷﴾ ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ گزر چکا انھیں بخش دیا جائے گا اور اگر پھر ایسا ہی کریں تو پہلے لوگوں کا

---

آخرت کے عذاب کی صورت میں چکھو۔

**آیت 36** اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ...... : یہاں ”عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ“ سے مراد اسلام ہے، یعنی کفار خصوصاً اہلِ مکہ کہ جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، وہ اپنے اموال لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لیے ہر طرح سے خرچ کرتے ہیں، مال کا لالچ دے کر بھی اور جنگ کی تیاری کے لیے خوراک، سواریاں اور اسلحہ و افراد مہیا کر کے بھی۔ انھیں اسلام سے اس قدر دشمنی اور عناد ہے کہ اس سے روکنے کے لیے وہ اپنی محبوب ترین چیز مال خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی خبردار کر دیا کہ آئندہ جب بھی یہ مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے انھیں اسی طرح ناکامی اور حسرت کا سامنا کرنا پڑے گا جس طرح اب بدر میں ان کا حشر ہوا ہے، چنانچہ اس کے بعد جنگ احد اور خندق میں بھی انھیں ناکامی کے ساتھ لوٹنا پڑا، نہ مدینہ پر قبضہ کر سکے، نہ مالِ غنیمت حاصل کر سکے اور نہ ہی کسی کو لونڈی و غلام بنا سکے اور آخرت میں ان کافروں کا انجام یہ ہے کہ وہ جہنم میں دھکیل کر اکٹھے کیے جائیں گے۔ بعد میں بھی جب تک مسلمان اللہ کے احکام پر کاربند رہے اور انھوں نے جہاد کی تیاری میں کوتاہی نہ کی، ان کے خلاف جنگ کے لیے خرچ کیے ہوئے کفار کے اموال ہمیشہ ان کے لیے باعث حسرت ہی بنے اور وہ ہمیشہ مغلوب ہی ہوئے۔

**آیت 37** لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ......: ناپاک کو پاک سے جدا کرنے سے مراد یا تو قیامت کے دن کفار اور مسلمانوں کو جدا جدا کر کے خبیث کفار کو تہ بہ تہ جمع کر کے جہنم میں پھینکنا ہے، یا دنیا ہی میں جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کو جدا جدا کرنے کے بعد خبیث لوگوں یعنی کفار کو تہ تیغ کر کے جہنم میں پھینکنا ہے اور یہی لوگ ہیں جو اصل خسارا اٹھانے والے ہیں۔

**آیت 38** ① قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا: ” نَهٰى يَنْهٰى“ منع کرنا اور ” اِنْتَهٰى يَنْتَهِيْ“ باز آ جانا۔ اس آیت

اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾

طریقہ گزر ہی چکا ہے ﴿۳۸﴾ اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۳۹﴾

میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ عذاب کی ان تمام وعیدوں کے باوجود امید کا دروازہ کھلا ہے۔ چنانچہ نبیٔ رحمت ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ ان منکروں سے کہہ دیں کہ اب بھی اگر وہ عناد اور کفر سے باز آ جائیں، اسلام میں داخل ہو جائیں اور ایک اللہ کی عبادت اور نبی ﷺ کی اطاعت اختیار کر لیں تو ان کے پہلے قصور معاف کر دیے جائیں گے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو اسلام کی طرف مائل کیا تو میں نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''اپنا دایاں ہاتھ پھیلائیے کہ میں بیعت کروں۔'' آپ نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا، آپ نے فرمایا: ''عمرو! تمھیں کیا ہوا؟'' میں نے عرض کیا: ''میں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں؟'' فرمایا: ''کس چیز کی شرط کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔'' آپ نے فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے گناہ گرا دیتا ہے اور ہجرت اپنے سے پہلے گناہ گرا دیتی ہے اور حج اپنے سے پہلے گناہ گرا دیتا ہے۔'' [ مسلم، الإیمان، باب کون الإیمان یهدم ما قبله : ۱۲۱ ]

باز آ جانے میں یہ بھی شامل ہے کہ اسلام لا کر اپنی حالت بھی بدلیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم نے جو کچھ جاہلیت میں کیا اس پر ہمارا مؤاخذہ ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اسلام میں اچھے عمل کرے گا تو اس سے جاہلیت میں کیے ہوئے اعمال کا مؤاخذہ نہیں ہوگا اور جس نے اسلام میں برے عمل کیے وہ پہلے اور پچھلے اعمال کے ساتھ پکڑا جائے گا۔'' [ بخاری، استتابة المرتدین والمعاندین و قتالهم ، باب إثم من أشرك…… : ۶۹۲۱ ]

② وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ: یعنی اگر پھر اسلام کو اکھیڑنے اور مسلمانوں کی طاقت ختم کرنے کا منصوبہ بنائیں تو جس طرح پہلے لوگ تباہ و برباد ہوئے، جنھوں نے انبیاء کو ستایا اور ان سے جنگ کی اسی طرح یہ بھی تباہ و برباد ہوں گے اور اس سے پہلے جنگِ بدر میں ان کا جو حشر ہوا اب بھی وہی ہوگا۔ (ابن کثیر)

آیت 39 ① وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: ''فِتْنَةٌ'' کے لفظی معنی آگ میں تپانے اور آزمانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک کفار سے لڑتے رہو جب تک کسی شخص کے اسلام لانے پر مشرکوں کی اسے ستانے اور آزمائش میں ڈالنے کی قوت ختم نہیں ہو جاتی اور تمام دنیا سے شرک کا غلبہ ختم نہیں ہوتا۔ اس لیے صحیح احادیث میں فتنہ کا معنی شرک بھی آیا ہے۔ مگر اس سے مراد زبردستی مسلمان بنانا اور مشرکین و کفار کو ختم کرنا نہیں، فرمایا: ﴿ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ [ البقرة : ۲۵۶ ] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔'' کیونکہ پھر کفار کے جزیہ دینے کی نوبت ہی نہیں آ سکتی، بلکہ اس وقت تک لڑتے رہنا ہے جب تک ایمان لانے والوں کے راستے میں کفار کے رکاوٹ بننے کی قوت ختم نہیں ہوتی، پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ نہیں ہوتا اور کفر پر

وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

اور اگر وہ منہ موڑ لیں تو جان لو کہ یقیناً اللہ تمھارا دوست ہے، وہ اچھا دوست اور اچھا مددگار ہے ﴿۴۰﴾

اصرار کی صورت میں جزیہ دے کر اسلام کی برتری تسلیم نہیں کرتے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۹۱، ۱۹۳، ۲۱۷) اور توبہ (۲۹)۔

② وَ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ: یعنی تمام دینوں پر اسلام کا غلبہ ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت اور محمد رسول اللہ (ﷺ) کی شہادت دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، پھر جب وہ یہ کچھ کر لیں تو انھوں نے اپنے خون اور اموال مجھ سے محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔'' [ بخاری، الإیمان، باب فإن تابوا و أقاموا...... : ۲۵، عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما۔ مسلم : ۲۲ ]

③ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: یعنی اسلام لے آئیں تو تمھارے لیے ان کا ظاہر کافی ہے۔ اگر وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے یا چھپ کر کوئی غلط کام کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ظاہری اور باطنی اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے، وہ خود نمٹ لے گا۔

**آیت 40** ① وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ: یعنی اگر وہ مسلمانوں کو ستانا اور ان سے لڑنا ترک نہ کریں تو یقیناً اللہ دشمنوں کے خلاف تمھارا دوست اور یار و مددگار ہے۔

② نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ: اور جس کا دوست اور یار و مددگار وہ ہو تو وہ بہت اچھا دوست اور بہت اچھا مددگار ہے، پھر اس پر کون غالب آ سکتا ہے؟ دیکھیے سورۂ محمد (۱۰، ۱۱)۔

وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَ لِلرَّسُوۡلِ وَ لِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ اِنۡ کُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰہِ وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا یَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ

اور جان لو کہ بے شک تم جو کچھ بھی غنیمت حاصل کرو تو بے شک اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے، اگر تم اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر

آیت 41 ① وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ : غنیمت وہ مال ہے جو کفار سے جنگ کی صورت میں حاصل ہو، اگر ان سے جنگ کے بغیر کوئی مال حاصل ہو تو اسے فے کہتے ہیں، اس کا ذکر سورۂ حشر (۶ تا ۹) میں ہے، مثلاً کفار خود ہی ہتھیار پھینک دیں، یا صلح کی صورت میں ان سے جزیہ وصول ہو، یا زمین کا خراج وغیرہ ہو۔ غنیمت اور فے بعض اوقات ایک دوسرے کے معنی میں بھی آ جاتے ہیں۔ "غَنَمٌ" کا معنی بھیڑ بکریاں ہے، جو عرب میں اکثر جنگ کے بعد غالب فریق کے قبضے میں آتی تھیں۔ بعد میں قبضے میں آنے والی ہر چیز کو غنیمت کہنے لگے۔

② سورت کے شروع میں "انفال" کو اللہ اور اس کے رسول کی ملکیت قرار دیا گیا تھا، اب غنیمت کی تقسیم کا طریقہ بیان ہوتا ہے۔ ایک مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے ﴿وَقٰتِلُوۡہُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ﴾ میں لڑائی کا حکم ہے جس کے نتیجے میں عموماً مالِ غنیمت حاصل ہوتا ہے، اس لیے اب اس کے خرچ کی جگہیں بیان فرمائیں۔

③ مِنۡ شَیۡءٍ : اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی چیز بڑی سے بڑی ہو یا چھوٹی سے چھوٹی، کوئی شخص اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق سوئی دھاگا حتیٰ کہ اونٹ کی اون کی گچھی تک جمع کروانا ہو گی، اگر رکھے گا تو یہ غلول (خیانت) شمار ہو گا، جس کی وعید سورۂ آل عمران (۱۶۱) میں ہے۔

④ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَ لِلرَّسُوۡلِ...... : مطلب یہ ہے کہ کل غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے، چار حصے ان لوگوں کو ملیں گے جنھوں نے جنگ میں شرکت کی، ان میں بھی پیادے کو ایک حصہ اور سوار کو تین حصے ملیں گے، ایک اس کا اپنا اور دو حصے گھوڑے کے اور خمس (پانچواں حصہ) ان اغراض کے لیے الگ کر لیا جائے گا جن کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی امت محمد (ﷺ) پر احسان ہے، ورنہ پہلی امتوں میں تو اموال غنیمت حلال ہی نہ تھے بلکہ انھیں جلا دیا جاتا تھا۔

یہاں اللہ تعالیٰ کا نام بطور برکت وتمہید آیا ہے، کیونکہ سب مال اللہ ہی کا ہے۔ اصل میں خمس کے مصرف پانچ ہیں، ایک حصہ رسول اللہ ﷺ اپنی اور اپنی بیویوں کی ضروریات کے بعد عام مسلمانوں کی مصلحت میں خرچ کرتے تھے، مثلاً مجاہدین کے لیے اسلحہ اور سواریاں وغیرہ۔ آپ کے بعد خلیفۂ وقت جہاں مناسب سمجھے خرچ کرنے میں آپ کا جانشین ہو گا۔ خمس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کو سارے مال غنیمت میں سے کوئی ایک چیز مثلاً کوئی ہتھیار یا گھوڑا یا لونڈی اپنے لیے رکھنے کا اختیار تھا، اسے "صَفِیٌّ" کہتے ہیں۔ "وَلِذِی الۡقُرۡبٰی" سے مراد رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار ہیں، آپ کے جداعلیٰ عبد مناف کی اولاد چار قبیلے تھے، بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو عبد شمس اور بنو نوفل۔ آپ ﷺ بنو ہاشم میں سے تھے، مگر آپ نے "ذَوِی الۡقُرۡبٰی" میں

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ

فیصلے کے دن نازل کی، جس دن دو جماعتیں مقابل ہوئیں اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ (۴۱) جب تم قریب والے

سے پہلے دو قبیلوں کو خمس میں سے حصہ دیا، بعد والے دو کو نہیں دیا اور ان کے پوچھنے پر بتایا کہ بنو مطلب اسلام لانے سے پہلے بھی بنو ہاشم کے ساتھی رہے ہیں، جبکہ آخری دونوں قبیلے اس وقت مخالفت میں سرگرم رہتے تھے۔ " الْيَتٰمٰى " وہ نابالغ بچے جن کے باپ فوت ہو چکے ہوں۔ " الْمَسٰكِيْنِ " وہ ضرورت مند جن کی آمدنی ضرورت سے کم ہو۔ " ابْنِ السَّبِيْلِ " راہ گیر مسافر۔ اس خمس کا پانچ حصوں میں تقسیم کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا سب کو برابر دیا جائے گا، یا حسب ضرورت خرچ کیا جائے گا؟ امام مالک اور اکثر سلف رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ امام (خلیفۂ اسلام) کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت، مثلاً جہاد کی تیاری، اسلحہ کی خریداری وغیرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس طرح چاہے اسے تقسیم یا خرچ کرے۔ اسی پر خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کا عمل رہا ہے۔ (قرطبی) نسائی کی حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ کی کوہان سے دو انگلیوں میں تھوڑی سی پشم پکڑی، پھر فرمایا: "میرے لیے فے (غنیمت) میں سے کچھ نہیں، حتیٰ کہ یہ (پشم) بھی نہیں، مگر پانچواں حصہ اور وہ پانچواں حصہ بھی تمھی میں لوٹایا جائے گا۔" [ نسائی، أول كتاب قسم الفيء : ٤١٤٤، و صححه الألباني ]

پھر ضروری نہیں کہ پانچ حصوں میں برابر تقسیم کرے، جہاں زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت ہو زیادہ کر سکتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے اس کو سب سے صحیح قول قرار دیا ہے۔

⑤ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا: یعنی جو فرشتے، آیات و معجزات اور نصرتِ الٰہی بدر میں اللہ تعالیٰ نے اتارے۔ " عَبْدِنَا " میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا بندہ کہہ کر خاص اعزاز بخشا، جیسا کہ ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ [ بنی إسرائيل : ۱ ] میں اور ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا ﴾ [ البقرة : ۲۳ ] میں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا یہ اعزاز بہت عزیز تھا، آپ کی مشہور دعا ہے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ » [ أحمد : ۳۹۱/۱، ح : ۳۷۱۱، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ]

⑥ يَوْمَ الْفُرْقَانِ: " الْفُرْقَانِ " واضح فیصلہ، یعنی بدر کے دن جس میں حق اور باطل کا فیصلہ ہوا، حق کو فتح ہوئی اور باطل مغلوب ہوا۔ (ابن کثیر) حق و باطل کے درمیان یہ پہلی باقاعدہ جنگ تھی جو ۱۷ رمضان بروز جمعہ (بروایت ابن جریر عن علی) واقع ہوئی۔

**آیت 42** ① اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا ...... : جنگ کا محل وقوع ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ تم جس ارادے سے نکلے تھے کہ ہمیں وہ قافلہ مل جائے گا جو نہایت قیمتی ہے اور جس کے محافظ صرف تیس یا چالیس شخص ہیں، اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایسی جگہ لا کھڑا کیا جہاں لڑائی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ " عُدْوَةٌ " کنارا۔ " الدُّنْيَا " " دُنُوٌّ " (قریب ہونا) میں سے " أَدْنٰى " کی مؤنث ہے، قریب ترین، یعنی تم وادی بدر کے اس سرے پر تھے جو مدینہ کے قریب ترین ہے۔ " الْقُصْوٰى " " أَقْصٰى " کی مؤنث ہے دور ترین، یعنی قریش اسی وادی بدر کے مدینہ سے دور والے کنارے پر تھے۔ " وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ

الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾

کنارے پر اور وہ دور والے کنارے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو ضرور مقرر وقت کے بارے میں آگے پیچھے ہو جاتے اور لیکن تا کہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو کیا جانے والا تھا، تا کہ جو ہلاک ہو واضح دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے واضح دلیل سے زندہ رہے اور بے شک اللہ یقیناً سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۴۲﴾ جب اللہ تجھے تیرے خواب میں دکھا رہا تھا کہ وہ تھوڑے ہیں اور اگر وہ تجھے دکھاتا کہ وہ بہت ہیں تو تم ضرور ہمت ہار جاتے اور ضرور اس معاملے میں آپس میں جھگڑ پڑتے اور لیکن اللہ نے سلامت رکھا۔ بے شک وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۴۳﴾

**مِنْكُمْ** " یعنی جس قافلے کی خاطر تم نکلے تھے وہ تم سے نیچے ساحل سمندر پر تھا، جہاں تمھارا پہنچنا اس وقت ممکن نہ تھا اور تم اور قریش کسی پیشگی ارادے کے بغیر ایک ہی وادی کے کناروں پر آ جمع ہوئے تھے، نہ انھیں تمھارا علم تھا نہ تمھیں ان کا اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ حق و باطل کا ٹکراؤ کروا کر حق واضح کر دے۔ اگر تم اور قریش وقت اور جگہ طے کر کے لڑائی کے لیے نکلتے تو یقیناً طے کردہ وعدے پر پہنچنے میں کمی بیشی ہو جاتی، یا تم اپنی تعداد اور تیاری کی کمی کی وجہ سے نہ پہنچتے، یا کفار رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ رعب سے خائف ہو کر نہ پہنچتے، مگر اللہ تعالیٰ کا تمھیں عین ایک ہی وادی میں لا جمع کرنا اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرنا چاہتا تھا وہ پورا کر دے، یعنی مسلمانوں کو فتح اور کفار کو شکست ہو۔

② **لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ** ......: یعنی اس لیے کہ کفار کی اتنی کثرت اور تیاری اور مسلمانوں کی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں کی فتح کے ساتھ کفار پر حجت پوری ہو جائے اور اسلام کی حقانیت واضح ہو جائے، اس کے بعد اگر کوئی کافر رہے تو دلیل دیکھ کر کافر رہے اور ہلاکت میں پڑے اور جو کوئی مسلمان ہو تو وہ بھی دلیل دیکھ کر مسلمان ہو اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کرے۔

**آیت 43** ① **اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا** : نبی ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ کافروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اسی کی خبر آپ ﷺ نے صحابہ کو دی، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ہمت اور ثابت قدمی پیدا ہو گئی۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کا خواب تو وحی ہوتا ہے، پھر آپ کو وہ کم کیوں نظر آئے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ آپ کا خواب اس لحاظ سے سچا تھا کہ بعد میں ان کافروں میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ فرشتے بھی شامل تھے،

وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا

اور جب وہ تمھیں، جس وقت تم مقابل ہوئے، انھیں تمھاری آنکھوں میں تھوڑے دکھاتا تھا اور تمھیں ان کی آنکھوں میں بہت کم کرتا تھا، تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو کیا جانے والا تھا اور سب معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں﴿۴۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو جمے رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو،

اس لیے ان کے مقابلے میں کافروں کی تعداد کم ہی تھی یا معنوی طور پر یعنی اخلاقی اور روحانی طور پر ان میں قوت و طاقت نہ تھی، بظاہر وہ بہت تھے لیکن میدان کارزار میں ثبات و استقلال میں کمزور تھے، اس لیے گویا وہ تعداد میں بھی کم تھے۔

❷ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ : یعنی کوئی کہتا لڑو اور کوئی کہتا نہ لڑو، وہ بہت ہیں اور ہم کم۔

❸ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ : یعنی نہ ہمت ہار جانے کا موقع دیا اور نہ آپس میں لڑنے جھگڑنے کا۔

**آیت 44** ❶ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا ...... : پہلا واقعہ رسول اللہ ﷺ کے خواب کا تھا، یہ عین میدان جنگ کا واقعہ ہے، جب جنگ ہونے والی تھی مگر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، کافر مسلمانوں کو تھوڑے نظر آتے تھے، حتیٰ کہ بعض نے دوسرے سے پوچھا، تمھارے خیال میں یہ کتنے ہوں گے؟ اس نے کہا، ستر (۷۰) کے قریب ہوں گے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کے خواب کی بھی تائید ہو رہی تھی اور یہ بھی کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھ جائے اور کفار کی نظر میں مسلمانوں کو کم دکھانے کی حکمت یہ تھی کہ وہ زیادہ تیاری کی ضرورت نہ سمجھیں اور لڑائی سے گریز نہ کریں، بلکہ دونوں فریق ایک دوسرے کو کم سمجھتے ہوئے لڑائی پر آمادہ ہو جائیں۔ یہ شروع کی بات ہے، مگر جب جنگ شروع ہوگئی تو کافروں کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آنے لگی، جیسا کہ آل عمران میں ہے: ﴿ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ﴾ [ آل عمران : ۱۳ ] ”اور دوسری جماعت کافر تھی جو ان (مسلمانوں) کو آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔“ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جنگ شروع ہوگئی، پھر شروع ہونے پر کافروں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ جلد ہی شکست کھا کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے اور مسلمانوں کے حوصلے بدستور بڑھتے گئے۔

❷ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا : یعنی وہی کہ اسلام کی فتح اور کفر کی شکست ہو اور رسول اللہ ﷺ کی سچائی پر معجزانہ دلیل قائم ہو جائے۔

❸ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ : یعنی وہی جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور پھر جب اصل اختیار ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے تو مسلمان کو چاہیے کہ اسی کو اپنا مقصود بنائے۔

**آیت 46،45** اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا ...... : ”لَقِيْتُمْ“ ”لِقَاءٌ“ سے ہے، یعنی ملنا اور آمنے سامنے ہونا، اکثر لڑائی

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾

تا کہ تم فلاح پاؤ﴿۴۵﴾ اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں مت جھگڑو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے﴿۴۶﴾

کی ملاقات کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی یہی مراد ہے۔ "فِئَةً" جماعت، گروہ۔ یہ "فَاءَ يَفِيْءُ فَيْئًا" (لوٹنا) سے مشتق ہے، کیونکہ ایک جماعت کے لوگ مدد کے لیے ایک دوسرے کی طرف لوٹ کر آتے ہیں۔ (راغب) قرآن مجید میں زیادہ تر یہ لفظ لڑنے والی جماعت کے لیے استعمال ہوا ہے، خواہ وہ کفار کی جماعت ہو یا مسلمانوں کی اور خواہ مستقل جماعت ہو یا کمک کے لیے آنے والی، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [ البقرة : ۲۴۹ ] "کتنی ہی تھوڑی جماعتیں زیادہ جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں۔" اور دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۳) اور سورۂ کہف (۴۳) اس آیت میں دشمن سے مقابلے کے وقت لڑائی کے آداب اور دلیری و شجاعت حاصل کرنے کے طریقے سکھائے۔ ان میں سے پہلی چیز ثابت قدمی اور ڈٹے رہنا ہے، کیونکہ اس کے بغیر میدانِ جنگ میں ٹھہرنا ممکن ہی نہیں۔ ثابت قدمی سے مراد انتہائی بے جگری سے لڑنا ہے، لہٰذا یہ آیت ﴿اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ﴾ [ الأنفال : ۱۶ ] کے خلاف نہیں، کیونکہ جنگی چال کے طور پر ایک طرف ہونا یا پیچھے ہٹنا فرار نہیں بلکہ ثابت قدمی ہی کی ایک صورت ہے۔ دوسری چیز اللہ کو کثرت سے یاد کرنا ہے، کیونکہ فتح و نصرت کا انحصار ظاہری اسباب پر نہیں بلکہ دل کی استقامت، اللہ کی یاد اور اس کا حکم بجا لانے پر ہے، اس لیے طالوت کے ساتھیوں نے دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت یہ دعا کی تھی: ﴿رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [ البقرة : ۲۸۶ ] "اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور ان کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد فرما۔" نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بدر اور دوسرے مقامات پر نہایت عجز و زاری سے اللہ کو یاد کیا اور اس سے مدد مانگی۔ مسلمان تھوڑے ہوں تو اللہ کی مدد طلب کریں اور زیادہ ہوں تو بھی اپنی طاقت اور کثرت کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا رکھیں اور اس کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ تیسری ہدایت اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری ہے جو ہر حال میں لازم ہے، مگر میدانِ جنگ میں اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے، کیونکہ وہاں تھوڑی سی نافرمانی بھی بعض اوقات نا قابل تلافی نقصان کا باعث بن جاتی ہے، جیسا کہ جنگ اُحد میں ہوا۔ اس میں امیر کی اطاعت بھی شامل ہے کہ وہ بھی اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ چوتھی ہدایت یہ کہ آپس میں جھگڑا اور اختلاف نہ کرو، ورنہ فتح کے بعد شکست نظر آنے لگے گی، جس سے تمھارے دلوں میں بزدلی پیدا ہو جائے گی اور تم ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا جاتی رہے گی، یعنی تمھارے درمیان پھوٹ دیکھ کر دشمنوں پر سے رعب اٹھ جائے گا اور وہ تم پر غلبہ پانے کے لیے اپنے اندر جرأت محسوس کرنے لگیں گے۔ پانچویں ہدایت یہ کہ صبر کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اگر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و معیت، یعنی خاص مدد اور خصوصی ساتھ بھی حاصل نہیں رہے گا۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۰۰)۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاوا کرتے ہوئے نکلے اور وہ اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور اللہ اس کا جو وہ کر رہے تھے، احاطہ کرنے والا تھا ﴿۴۷﴾

عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ کے موقع پر انتظار کیا، یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا، پھر لوگوں میں کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا، فرمایا: ''اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتے رہو اور جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو صبر کرو (ڈٹے رہو) اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' [ بخاری، الجهاد والسير، باب كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا لم يقاتل أول النهار...... : ۲۹۶۵، ۲۹۶۶ ] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں وہ شجاعت، صبر و ثبات اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی فرماں برداری تھی جو نہ اس سے پہلے کسی کو حاصل ہوئی نہ بعد میں ہو گی، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت اور آپ کی اطاعت سے شرق و غرب کے ممالک کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی فتح کیا اور روم و فارس کے مقابلے میں نہایت تھوڑی تعداد کے باوجود سب پر غالب آئے، یہاں تک کہ اللہ کا بول سب پر بالا ہو گیا اور اس کا دین سب ادیان پر غالب آ گیا اور صرف تیس سال سے بھی کم عرصے میں اسلامی ممالک مشرق سے مغرب تک پھیل گئے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور انھیں راضی کرے اور ہمارا حشر بھی ان کے ساتھ کرے، وہ بے حد کرم اور عطا والا ہے۔

**آیت 47** وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ ......: مسلمانوں کو لڑائی میں ثابت قدمی اور ذکر الٰہی کی کثرت کا حکم دینے کے بعد اب کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) ان سے مراد ہیں ابوجہل اور اس کے ساتھی، جو تین مقصد لے کر نکلے تھے، ''بَطَرًا'' اپنی اکڑ اور بڑائی ثابت کرنے کے لیے، ''رِئَآءَ النَّاسِ'' لوگوں کو اپنی شان و شوکت اور شجاعت دکھانے کے لیے اور ''يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' اللہ کے راستے، یعنی اسلام سے لوگوں کو روکنے کے لیے، جبکہ مومن صرف اور صرف اللہ کا دین غالب کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے نکلتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شان و شوکت کا اظہار، فخریہ اشعار اور شراب نوشی کی محفلوں کے بجائے انھیں موت کے پیالے پی کر، ذلت و رسوائی اور دردناک مصیبتوں کے ساتھ واپس لوٹنا پڑا۔ یہ لوگ گویا اپنے رب کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلے تھے اور اس قادر و قہار کے احاطے سے تو ان کا کوئی چھوٹا بڑا عمل باہر نہ تھا، اس کے آگے ان کی کیا پیش جا سکتی تھی۔ خندق کے موقع پر کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا تھا:

جَاءَتْ سَخِيْنَةُ كَيْ تُغَالِبَ رَبَّهَا ۔۔۔ وَلَيُغْلَبَنَّ مُغَالِبُ الْغَلَّابِ

''سخینہ یعنی قریش اپنے رب سے مقابلے کے لیے آئے اور اس زبردست غالب کا مقابلہ کرنے والا یقیناً ہر صورت مغلوب ہو گا۔''

وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ ع

اور جب شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوشنما بنا دیے اور کہا آج تم پر لوگوں میں سے کوئی غالب آنے والا نہیں اور یقیناً میں تمھارا حمایتی ہوں، پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ اپنی ایڑیوں پر واپس پلٹا اور اس نے کہا بے شک میں تم سے بری ہوں، بے شک میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ﴿۴۸﴾

**آیت 48** ❶ **وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ ......:** "**جَارٌ**" کا معنی یہاں مجیر، معین، ناصر یعنی حمایتی و مددگار ہے۔ "**نَكَصَ**" الٹے پاؤں پیچھے ہٹا۔ شیطان کے ان کے لیے ان کے اعمال کو مزین کرنے، انھیں ان کے غالب ہونے اور اپنی حمایت کا یقین دلانے کی تفسیر بعض مفسرین، مثلاً طبری، ابن کثیر اور قرطبی رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمائی ہے کہ قریش اور بنو کنانہ کی باہم دشمنی تھی اور انھیں ان کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ پیچھے سے ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ شیطان نے ان کے سردار سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں آ کر ان کی طرف سے قریش کو بے فکر ہو جانے کا اور اپنی حمایت کا یقین دلایا اور اپنے لشکر کو بھی لے کر آیا، مگر بدر میں جب مسلمانوں کے ساتھ جبریل علیہ السلام اور فرشتوں کو دیکھا تو الٹے پاؤں یہ الفاظ کہتا ہوا بھاگ گیا جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔

بعض مفسرین مثلاً صاحب المنار نے یہ تفسیر کی ہے کہ شیطان انسانی شکل میں نہیں آیا بلکہ یہ تمام باتیں بطور وسوسہ اس نے ان کے دلوں میں ڈالیں کہ میں تمھارا حمایتی ہوں، یعنی جن بتوں اور خداؤں کو تم پوجتے ہو وہ ہر طرح سے تمھاری حمایت اور مدد کریں گے اور اس وقت تم اتنی تعداد اور قوت میں ہو کہ تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ اپنے بتوں اور خداؤں کے بھروسے پر جو درحقیقت شیطان پر بھروسا تھا اور اپنی قوت کے زعم میں شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسے پر اپنی فتح کا یقین کر بیٹھے، مگر بدر کے میدان میں لڑائی شروع ہونے کے بعد انھیں مسلمان دگنے نظر آنے لگے تو شیطان کے سارے دلائے ہوئے وسوسے اور یقین باطل ہو گئے۔ سید رشید رضا نے شیطان کے انسانی صورت میں آنے کی روایات کی صحت میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ روایات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں جو اس وقت پانچ برس کے تھے، انھوں نے کسی اور ہی سے سنی ہوں گی، مگر صحابہ کی مرسلات بھی قبول ہوتی ہیں، کیونکہ انھوں نے کسی نہ کسی صحابی ہی سے سنی ہوتی ہیں جو سب معتبر ہیں۔

ابن کثیر کی تخریج " هداية المستنير " میں لکھا ہے کہ ابن کثیر نے ان آیات کے تحت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی روایات

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں ایک بیماری تھی، کہہ رہے تھے ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے۔ اور جو اللہ پر بھروسا کرے تو بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۴۹﴾

ذکر کی ہیں جن میں سے کوئی بھی ضعف سے خالی نہیں، مگر ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کا اصل ضرور ہے، اس لیے انھیں بیان کرنے میں کوئی مانع نہیں اور " الاستیعاب فی بیان الأسباب " میں سلیم الہلالی اور محمد بن موسیٰ نے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی (یہاں مذکور) روایت حسن ہے، اس میں دو علتیں بیان کی گئی ہیں مگر ان کی کچھ حیثیت نہیں۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی کوئی وضاحت صحیح حدیث میں نہیں آئی اور یہ معاملہ غیب سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اگرچہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ شیطان نے واقعی انسانی وجود میں آ کر انھیں یہ کہا یا محض دل میں غرور پیدا کر کے انھیں دھوکا دیا، مگر قرآن کے الفاظ "قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ" اور "نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ" سے یہی راجح نظر آتا ہے کہ وہ ظالم انسانی شکل میں آیا تھا اور شیطان کا بعض اوقات انسانی شکل میں آنا کچھ بعید نہیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں حملہ آور ہوا تو آپ نے پکڑ کر اس کا گلا گھونٹا، مگر پھر سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد کر کے اسے چھوڑ دیا۔ [ بخاری، الصلاة، باب الأسیر أو الغریم یربط فی المسجد : ٤٦١ ] ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھی تین دن نظر آتا رہا اور وہ گرفتار کر کے اسے چھوڑ دیتے رہے، اس لیے اس اہم موقع پر خود اس کا آنا کوئی بعید نہیں ہے۔

② اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ: یعنی مجھے وہ فرشتے نظر آ رہے ہیں جو تمھیں نظر نہیں آ رہے۔

③ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ: ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے اس دن تک مہلت دی جو اللہ کے علم میں ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر (۳۷، ۳۸) اور سورۂ ص (۸۰، ۸۱) قیامت تک کا وعدہ نہیں فرمایا، اس لیے ہو سکتا ہے کہ ابلیس نے فرشتوں کو دیکھ کر یہ سمجھا ہو کہ میری مہلت کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے اس نے اللہ سے ڈرنے کا ذکر کیا، ورنہ وہ ظالم کب اللہ سے ڈرتا تھا۔

**آیت 49** ① اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: "جن کے دلوں میں بیماری" سے مراد نئے مسلمان ہیں، جن کے دلوں میں شک ختم ہو کر یقین کی پوری کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہودی اور مد مقابل مشرکین بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

② غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ : یعنی ان کے دینی جوش نے ان کو بالکل دیوانہ بنا دیا ہے، دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تھوڑی سی تعداد ہے، کوئی سر و سامان بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ لڑنے کے لیے ایک کے سوا دوسرا گھوڑا بھی نہیں ہے، مگر چلے ہیں قریش کے مسلح اور

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾

اور کاش! تو دیکھے جب فرشتے ان لوگوں کی جان قبض کرتے ہیں جنھوں نے کفر کیا، ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے ہیں۔ اور جلنے کا عذاب چکھو ﴿۵۰﴾ یہ اس کے بدلے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اس لیے کہ یقیناً اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ﴿۵۱﴾

---

عظیم الشان لشکر سے مقابلہ کرنے، پاگل ہی تو ہیں جو اپنی موت کو خود دعوت دے رہے ہیں۔ رسولوں اور ان کے ساتھیوں کو پاگل و دیوانہ کہنے کا یہ سلسلہ پہلے رسول سے لے کر ہمارے رسول تک چلا آیا ہے، کیونکہ کفار وہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے جو ایمان سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ دیکھیے سورۂ ذاریات (۵۲، ۵۳) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کی دلیری دیکھ کر منافق طعن کرنے لگے، اللہ نے فرمایا، یہ غرور (دھوکا کھانا) نہیں، توکل ہے۔'' (موضح)

③ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ...... : اور جس کا بھروسا اس سب پر غالب اور کمال حکمت والے پر ہو اس کا دل یقیناً مضبوط ہو گا، اس لیے مسلمان کفار کے عظیم الشان لشکر کے ساتھ مقابلے کے لیے ہر طرح سے آمادہ اور پر عزم ہیں۔

آیت 50 وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ...... : کفار کی زندگی کے بعض احوال بیان کرنے کے بعد ان کی موت کی حالت بیان کی ہے۔ یہ آیت یہاں اگرچہ واقعۂ بدر کے سلسلے میں آئی ہے، اس لیے بعض مفسرین نے اسے بدر کے کفار کا حال قرار دیا ہے، لیکن لفظ عام ہونے کی وجہ سے یہ ہر کافر کے مرنے کے وقت کا حال بیان کر رہی ہے۔ فرمایا کہ کافروں کی روح قبض کرتے وقت فرشتے جس طرح ان کے مونہوں اور پشتوں پر مارتے اور جس طرح جھڑکتے اور سختی کرتے ہیں، کاش آپ وہ منظر دیکھ لیں، کیونکہ سننے میں وہ بات نہیں جو دیکھنے میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام (۹۳) اور سورۂ محمد (۲۷، ۲۸) میں یہی بات بیان فرمائی ہے اور احادیث میں کافر کی جان کنی کا منظر بہت ہی ہولناک بیان کیا گیا ہے۔

آیت 51 ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ ...... : یعنی یہ عذاب عین عدل ہے، کیونکہ اس نے تمھارے سمجھانے کے لیے اپنے رسول بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، مگر تم نے ایک نہ مانی۔ '' ظَلَّامٌ '' مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بہت ظلم کرنے والا، مگر یہاں اس پر نفی آئی ہے تو مبالغے کی نفی نہیں کہ معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت ظلم کرنے والا نہیں (گویا تھوڑا کر سکتا ہے) بلکہ یہاں نفی میں مبالغہ مراد ہو گا، یعنی اللہ تعالیٰ بندوں پر ذرہ برابر ظلم کرنے والا بھی نہیں۔ دیکھیے فوائد سورۂ آل عمران (۱۸۲) ایک لمبی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندو! میں نے ظلم اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا ہے اور اسے تمھارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا ہے، لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ میرے بندو! یہ تمھارے اپنے ہی اعمال ہیں جن کو

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۵۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۵۳

(ان کا حال) فرعون کی آل اور ان لوگوں کے حال کی طرح (ہوا) جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا بے شک اللہ بہت قوت والا، بہت سخت عذاب والا ہے ۝۵۲ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ کبھی وہ نعمت بدلنے والا نہیں جو اس نے کسی قوم پر کی ہو، یہاں تک کہ وہ بدل دیں جو ان کے دلوں میں ہے اور اس لیے کہ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ۝۵۳

میں محفوظ رکھتا ہوں، پھر تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا، پھر جو خیر پائے وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جو اس کے سوا پائے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔'' [ مسلم، البر والصلة، باب تحریم الظلم : ۲۵۷۷، عن أبی ذر رضی اللہ عنہ ]

**آیت 52** كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... : یہاں مبتدا محذوف ہے '' دَأْبُهُمْ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ......'' یعنی ان کا حال اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور اس کے نتیجے میں عذاب میں مبتلا ہونے میں آل فرعون اور ان سے پہلے کفار کی طرح ہے۔

**آیت 53** ① حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ : ''جو ان کے دلوں میں ہے'' یعنی اعتقاد اور نیت جب تک نہ بدلے اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی۔ (موضح) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی عطا کردہ نعمت سے اسی صورت میں محروم کرتا ہے جب وہ اپنے عقائد و اعمال اور اخلاق کو بدل کر اپنے متعلق ثابت کر دیتی ہے کہ وہ اس نعمت کی مستحق ہرگز نہیں ہے، مثلاً ایمان کے بجائے کفر، شکر کے بجائے ناشکری اور نیکی کے بجائے گناہ کرنے لگتی ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ بھی اس سے اپنی عطا کردہ نعمت واپس لے لیتا ہے اور اسے مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فرعون کی قوم اور اسی طرح قریش کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شان و شوکت اور خوش حالی سے نوازا تھا، لیکن ان سے اپنی نعمتیں چھین لیں۔ اس زمانے میں مسلمان جو ساری دنیا میں ذلت، غلامی اور دوسروں کی حاشیہ برداری کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ بھی ان کی اپنی بداعمالیوں کی سزا ہے، ورنہ ممکن ہی نہیں کہ ایک قوم کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتی ہو اور اس پر عامل ہو، پھر بھی دنیا میں ذلیل و خوار رہے۔

② وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ : یعنی وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے، اس کے بندے جیسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں ویسا ہی وہ انھیں بدلہ دیتا ہے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿ۖۚ۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

(ان کا حال) فرعون کی آل اور ان لوگوں کے حال کی طرح (ہوا) جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعون کی آل کو غرق کیا اور وہ سب ظالم تھے ﴿۵۴﴾ بے شک سب جانوروں سے برے اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا، سو وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۵۵﴾ وہ جن سے تو نے عہد باندھا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ نہیں ڈرتے ﴿۵۶﴾

**آیت 54** كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ...... : یعنی آپ سے لڑنے والے ان لوگوں کا حال آل فرعون اور ان سے پہلے کفار جیسا ہے۔ یہ بات دہرانے سے مقصود ایک تو پہلی بات کی تاکید ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۙ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾ [القیامۃ: ۳۴، ۳۵] دوسرا اس میں پچھلی آیت کی کچھ تفصیل ہے، اُس میں "كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی آیات کے انکار اور نہ ماننے کا ذکر تھا، یہاں تفصیل ہے کہ انھوں نے انکار کے ساتھ انھیں جھٹلایا بھی تھا۔ تیسرا اُس میں گناہوں پر گرفت کا ذکر تھا، اس میں آل فرعون پر اس گرفت کی تفصیل، یعنی غرق کا بیان ہے اور عذاب کے سبب کی صاف الفاظ میں وضاحت ہے کہ وہ سب ظالم تھے، جب کہ اس سے پہلے قریب ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم کرنے والا نہیں، اگر وہ ظالم و گناہ گار نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی ذاتی بیر نہ تھا کہ انھیں بلاوجہ ہلاک یا غرق کر دیتا۔ واضح رہے کہ اللہ کی آیات سے مراد رسولوں کے لائے ہوئے احکام بھی ہیں اور نشانیاں اور معجزات بھی۔

**آیت 56،55** اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ ...... : اوپر کی آیت میں جب تمام کفار کا یہ وصف بیان فرمایا کہ وہ ظالم ہیں تو اب یہاں کفار کی بعض خاص شرارتوں کا ذکر فرمایا۔ "وَهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے نہیں ڈرتے، یا وہ اپنی بدعہدی کے انجام سے نہیں ڈرتے۔ ان سے مراد خاص طور پر مدینہ منورہ کے یہودی ہیں، جن سے مدینہ منورہ پہنچ کر نبی ﷺ نے اچھے ہمسایوں کی طرح رہنے اور باہمی تعاون کا معاہدہ کیا تھا، لیکن اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت انھیں ایک نظر نہ بھاتی تھی، چنانچہ کبھی وہ اوس و خزرج کے درمیان جاہلی عصبیت ابھار کر ان کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے اور کبھی اسلام کے دشمنوں کی ہتھیاروں سے مدد کر کے معاہدے کی بار بار خلاف ورزی کرتے اور جب ان سے کہا جاتا تو کہہ دیتے کہ ہمیں معاہدہ یاد نہیں رہا تھا، لیکن جونہی موقع ملتا پھر کوئی ایسی حرکت کر گزرتے جو معاہدے کے خلاف ہوتی، حتیٰ کہ اس معاہدے کے ہوتے ہوئے ان کا سردار کعب بن اشرف (جو بدر میں قریش کی شکست سے انتہائی سیخ پا ہوا تھا) مکہ پہنچا اور وہاں مقتولین کفار بدر کے ہیجان انگیز مرثیے پڑھ کر قریش کے نوجوانوں کو مسلمانوں سے انتقام لینے کا جوش دلاتا رہا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنھیں

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

پس اگر کبھی تو انھیں لڑائی میں پا ہی لے تو ان (پر کاری ضرب) کے ساتھ ان لوگوں کو بھگا دے جو ان کے پیچھے ہیں، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں ﴿۵۷﴾ اور اگر کبھی تو کسی قوم کی جانب سے کسی خیانت سے فی الواقع ڈرے تو (ان کا عہد) ان کی طرف مساوی طور پر پھینک دے۔ بے شک اللہ خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۵۸﴾

"شَرَّ الدَّوَآبِّ" (بدترین جانور) فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) یہاں انھیں "شَرَّ النَّاسِ" (سب لوگوں سے برے) کے بجائے "شَرَّ الدَّوَآبِّ" کہا گیا ہے، اگرچہ "الدَّوَآبِّ" میں انسان بھی آ جاتے ہیں، کیونکہ وہ بھی چلتے پھرتے ہیں، مگر عام طور پر یہ لفظ انسان کے بجائے جانوروں پر بولا جاتا ہے، گویا کفر کی وجہ سے یہ لوگ انسانیت کے شرف سے محروم ہو چکے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بینہ (۶)، سورۂ اعراف (۱۷۹) اور سورۂ فرقان (۴۴)۔

**آیت 57** فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ ......: "تَشْرِيْدٌ" کا معنی خوف پیدا کرنے کے ساتھ بھگدڑ مچا کر انھیں منتشر کرنا ہے، یعنی اگر کبھی لڑائی میں آپ انھیں کہیں پا لیں تو انھیں بدعہدی کی ایسی سخت سزا دیں کہ ان کے پیچھے جو دوسرے ایسے کفار ہیں اور جن سے تمھارا معاہدہ ہے، وہ بھی مرعوب اور خوف زدہ ہو جائیں اور انھیں ایسی عبرت حاصل ہو کہ معاہدے کی خلاف ورزی کا نام تک نہ لیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ اس سے پہلے یہود بنو نضیر اور بنو قینقاع کی جلاوطنی ہی پر اکتفا فرمایا تھا، مگر بنو قریظہ کی مسلسل بدعہدیوں اور عین خندق کے موقع پر معاہدہ توڑنے کے نتیجے میں انھیں ۲۵ دن کے محاصرے کے بعد انتہائی عبرت ناک سزا دی کہ ان کے تمام ۶۰۰ بالغ مردوں کو قتل کروا دیا، جن میں ایک جنگی مجرم عورت بھی تھی اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا۔ افسوس کہ اس وقت کفار، بھارت ہو یا امریکہ و یورپ، کوئی بھی مسلمانوں سے کیے ہوئے عہد کو پورا نہیں کر رہے، مگر مسلمان اپنی نااہلی اور عیش و عشرت کی وجہ سے غیرت و حمیت کے اظہار کے بجائے ذلت اور بے بسی پر قناعت کر رہے ہیں۔

**آیت 58** وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً ......: یعنی عہد توڑنا خیانت ہے جو مسلمان کے لیے کسی صورت جائز نہیں، حتیٰ کہ اگر کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو ان کے خلاف کوئی بھی کارروائی جائز نہیں، خواہ وہ لوگ تمھاری ریاست کے اندر ہوں یا باہر۔ اگر فی الواقع ان کی طرف سے عہد توڑنے یا دھوکا دینے کا خطرہ پیدا ہو جائے، جو آثار سے نظر آ جاتا ہے تو پھر بھی آگاہ کیے بغیر ان کے خلاف خفیہ کارروائی یا کھلا حملہ کر دینا جائز نہیں، بلکہ صاف اعلان کر کے واضح کر دو کہ ہمارا تمھارا معاہدہ ختم ہے، تاکہ تم پر عہد توڑنے یا دھوکا دینے کا الزام نہ آئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے خلفاء کی سیرت بھی یہی رہی کہ کفار کی طرف سے عہد شکنی کے خطرے کی صورت میں معاہدے کے خاتمے کا اعلان فرما دیتے اور پھر حملہ آور ہوتے۔ مگر جب کسی قوم نے بدعہدی کر دی ہو تو اس پر بے خبری میں حملہ بھی جائز ہے، جیسا کہ کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے حلیف بنو خزاعہ پر بنو بکر کے حملے میں شریک ہو کر صلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑا تو رسول اللہ ﷺ

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝۵۹ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ (بچ کر) نکل گئے، بے شک وہ عاجز نہیں کریں گے ۵۹ اور ان کے لیے جتنی کر سکو قوت کی صورت میں اور تیار بندھے گھوڑوں کی صورت میں تیاری رکھو، جس کے ساتھ تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو ڈراؤ گے اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں کو بھی جنھیں تم نہیں جانتے، اللہ انھیں جانتا ہے اور تم

نے ان پر خبر دیے بغیر چڑھائی کر دی اور انھیں خبر اس وقت ہوئی جب اسلامی فوجیں مکہ کے قریب آ پہنچیں۔ مسلمان اپنے معاہدوں کی کس قدر پاس داری کرتے تھے، اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو سلیم بن عامر بیان کرتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ رومیوں کی سرزمین کی طرف کوچ کر رہے تھے، جبکہ آپ کے اور ان کے درمیان ایک معاہدہ تھا، آپ چاہتے تھے کہ ان کے قریب پہنچ جائیں اور جب معاہدے کی مدت ختم ہو تو (اچانک) ان پر حملہ کر دیں، تو انھوں نے دیکھا کہ ایک بزرگ سواری پر سوار ہیں اور کہہ رہے ہیں اللہ اکبر، اللہ اکبر، عہد پورا کرنا ہے، عہد توڑنا نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جس کا کسی قوم سے کوئی عہد ہو تو ہرگز نہ کوئی گرہ کھولے اور نہ اسے باندھے یہاں تک کہ اس کی مدت ختم ہو جائے، یا برابری کی بنیاد پر ان کا عہد ان کی طرف پھینک دے۔“ یہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو واپس آ گئے۔ حدیث بیان کرنے والے یہ بزرگ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔
[ أحمد : ۱۱۱/٤، ح : ۱۷۰۱۷۔ أبو داوٗد : ۲۷۵۹ ]

**آیت 59** **وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا** ...... : یہاں سب سے پہلے وہ کفار قریش مراد ہیں جو میدانِ بدر سے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز نہ سمجھیں کہ وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر نکل گئے ہیں، اس کی گرفت سے کون نکل سکتا ہے اور اسے کون عاجز اور بے بس کر کے بھاگ سکتا ہے؟ ویسے الفاظ کے عموم کا تقاضا اور حقیقت واقعی یہی ہے کہ کافر کوئی بھی ہو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نکلنے میں ہرگز کامیاب نہ سمجھے، اگر دنیا میں اس گرفت کا مظاہرہ نہ ہو تو موت کے وقت اور اس کے بعد وہ بچ کر کہاں جائیں گے؟ وہ کبھی اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے جیسا چاہے ان پر عذاب بھیج سکتا ہے۔

**آیت 60** ① **وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ** : ”قُوَّةٍ“ کا لفظ نکرہ لایا گیا ہے، ”مِنْ“ کے ساتھ عموم اور زیادہ ہو گیا ہے، یعنی ہر قسم کی قوت، خواہ جو بھی ہو، تاکہ اس میں وہ تمام چیزیں آ جائیں جو جنگ میں قوت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾ اور فرمایا: (( أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ )) تین دفعہ فرمایا کہ یاد رکھو اصل قوت ”رَمْيٌ“ ہے۔ [ مسلم، الإمارة، باب فضل الرمي والحث عليه...... : ۱۹۱۷ ] ”رَمْيٌ“ کا لفظ اگرچہ تیر اندازی کے معنی میں بھی آتا ہے، مگر اس میں تیر کے ساتھ ساتھ وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو دور سے پھینکی جاتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

جو چیز بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے وہ تمھاری طرف پوری لوٹائی جائے گی اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۝

﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ ﴾ [ الأنفال : ۱۷ ] سے مراد مٹی اور کنکریوں کی مٹھی پھینکنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دور سے مار کرنے والی جو بھی چیز تھی آپ نے جنگ میں استعمال فرمائی، حتیٰ کہ منجنیق بھی دشمن کے خلاف استعمال فرمائی، جس کے ساتھ دور سے پتھر پھینک کر قلعوں کی دیواریں توڑ دی جاتی تھیں اور ہمیشہ مسلمانوں نے اپنے غلبے کے زمانے میں ہر جدید ہتھیار مثلاً نِفط (پٹرول وغیرہ) کے ہتھیار استعمال کیے۔ بارود کی ایجاد کے بعد بھی ترک خلفاء توپوں کی تیاری سے غافل نہیں رہے، مگر افسوس اس کے بعد مسلمانوں نے اس حکم سے اتنی بے پروائی کی کہ دشمن اس میدان، یعنی اسلحہ کی تیاری میں ان سے بہت آگے نکل گیا۔ اب عالم اسلام اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر نعمت کے باوجود اسلحے کے لیے غیروں کا محتاج ہے، چھوٹے موٹے ہتھیار تو بنتے ہیں، مگر ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر، گاڑیاں، کمپیوٹر، توپیں، ریڈار وغیرہ تمام چیزوں میں وہ دوسروں کا دست نگر ہے۔ (الا ما شاء اللہ) جس کے نتیجے میں کفار مسلمانوں کی دولت بھی لوٹ رہے ہیں، ان کے وسائل اور دینی اقدار کو بھی چھین رہے ہیں اور جب چاہتے ہیں ان ہتھیاروں اور جہازوں کی ضروریات وغیرہ روک کر بے بس کر دیتے ہیں، حالانکہ پاکستان اگر ایٹم بم بنا سکتا ہے تو وہ کون سی چیز ہے جو مسلم ممالک نہیں بنا سکتے؟ مگر مسلمانوں کی دین سے بے گانگی، دشمن کی چال بازی، اپنوں کی غداری اور طمع وحرص کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بزدلی ان میں یہ چیزیں بنانے کی جرأت ہی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی گاڑی، ریل یا ہوائی جہاز پر سوار ہو کر اپنے ملک میں یا بیرون ملک سفر کرتے ہیں تو دل میں سخت تکلیف ہوتی ہے کہ یہ تمام سواریاں ہمارے دشمنوں کی بنائی ہوئی ہیں، ہم اپنے بل بوتے پر کچھ بھی نہیں بنا سکے۔ یہ سب مسلمانوں کے رہنماؤں کا کیا دھرا ہے، جو اپنے عوام ہی کی تصویر ہیں، مگر مایوس ہونا کسی صورت بھی جائز نہیں اور نہ کفار کو ناقابل شکست سمجھ کر ہاتھ توڑ کر بیٹھ جانا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق کفار جتنی بھی کوشش کر لیں کبھی نورِ اسلام کو بجھا نہ سکیں گے، فرمایا: ﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [ الصف : ۸ ] ''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کے ساتھ بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، اگرچہ کافر لوگ ناپسند کریں۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت قیامت قائم ہونے تک اس کی خاطر لڑتی رہے گی۔'' [ مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۲، عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ ] مغیرہ بن شعبہ، جابر بن عبد اللہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے مروی رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں ان لوگوں کے دین پر قائم رہنے اور غالب رہنے کی خوش خبری بھی آئی ہے۔ [ دیکھیے مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۱، ۱۹۲۳، ۱۰۳۷، بعد ح : ۱۹۲۳ ] اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس وقت مجاہدین اسلام اور کفار کے درمیان جو جنگ جاری ہے اس میں اہل اسلام کی کس قدر آزمائش باقی ہے؟ اور کفار اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی جس حد تک پہنچ چکے ہیں ان کی سزا میں کتنی دیر ہے؟

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۶۱﴾

---

اور اللہ تعالیٰ اپنے کن بندوں کے ہاتھوں کفار کو کس طرح کیفر کردار تک پہنچاتا ہے؟ فرمان الٰہی ہے: ﴿ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [ محمد : ۳۸ ] ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگ لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔'' اور دیکھیے سورۂ مائدہ (۵۴)۔

② وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ: اس حکم سے سوار فوج کی اہمیت ظاہر ہے۔ "قُوَّةٍ" اور "رِبَاطِ الْخَيْلِ" میں فوجی گاڑیاں، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، جنگی جہاز، آبدوزیں، بحری بیڑے، جاسوسی کے آلات اور ادارے، اعلام کے ذرائع، سب آ جاتے ہیں، مگر ان سب کے باوجود قیامت تک جنگ میں گھوڑوں کی ضرورت اور اہمیت کبھی ختم نہیں ہو گی۔ جو کام یہ مبارک جانور سرانجام دے سکتا ہے دنیا کی کوئی چیز نہیں دے سکتی۔ عروہ بارقی اور جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''یہ گھوڑے، ان کی پیشانیوں میں قیامت کے دن تک خیر باندھ دی گئی ہے، اجر اور غنیمت۔'' [ مسلم، الإمارة، باب فضيلة الخيل ...... : ۱۸۷۲، ۱۸۷۳ ] اس لیے مسلمانوں کو ڈرائیور، پائلٹ، ملاح، بحری مجاہد، تیراک اور غوطہ خور ہونے کے ساتھ ساتھ گھڑ سوار ہونا بھی لازم ہے۔

③ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ: یعنی اس قدر مضبوط تیاری رکھو کہ اللہ کا دشمن اور تمھارا دشمن اور تمھارے ساتھ کد رکھنے والا ہر شخص تم سے خوف زدہ رہے اور لڑنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ ان واضح دشمنوں میں مشرکین، یہود و نصاریٰ اور جانے پہچانے منافق سب شامل ہیں۔

④ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ: اس سے مراد مسلمانوں کی صفوں میں کفار کے چھپے ہوئے ہمدرد منافق ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۰۱) علاوہ ازیں کئی اقوام جو بظاہر اس وقت تمھارے خلاف نہیں، مگر موقع پانے پر دل میں تم سے لڑائی کا ارادہ رکھتی ہیں، تمھاری مکمل تیاری اور ہر وقت جہاد میں مصروف رہنا سب کو خوف زدہ رکھے گا۔ بعض مفسرین نے اس سے جن و شیاطین کے لشکر مراد لیے ہیں، تمھاری تیاری کی بدولت وہ بھی دشمنوں کے دلوں میں لڑائی کے جذبات نہیں ابھار سکیں گے۔

⑤ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ......: اس سے جہاد میں مال خرچ کرنے کی ترغیب مقصود ہے۔ فی سبیل اللہ خرچ کی فضیلت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۱)۔

آیت 61 وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا......: بھرپور جنگی تیاری اور جہاد جاری رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دشمن صلح کی طرف مائل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے صلح کی طرف مائل ہونے والوں سے صلح کر لینے کا حکم دیا، کیونکہ اسلامی جہاد کا مقصد اللہ کے دین کا غلبہ ہے، ہر حال میں غیر مسلموں کو تہ تیغ کرنا نہیں، نہ انھیں زبردستی مسلمان بنانا ہے۔ اس صلح کے نتیجے میں بہت سی

وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۙ﴿۶۲﴾ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾ ع

اور اگر وہ ارادہ کریں کہ تجھے دھوکا دیں تو بے شک تجھے اللہ ہی کافی ہے۔ وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قوت بخشی ﴿۶۲﴾ اور ان کے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی، اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا ان کے دلوں کے درمیان الفت نہ ڈالتا اور لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی۔ بے شک وہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۳﴾ اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو بھی جو تیرے پیچھے چلے ہیں ﴿۶۴﴾

دینی اور دنیوی برکات حاصل ہوں گی، مسلمانوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے کفار اسلام سے واقف ہوں گے، اسلام کی اشاعت بڑھے گی، جس کا نتیجہ اسلام کا غلبہ ہوگا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو ''فتح مبین'' قرار دیا۔ بعض اوقات جزیے پر صلح ہوگی جو مسلمانوں کی مالی قوت میں اضافے کا باعث ہوگی اور دنیا میں جنگ کے ماحول کے بجائے امن و اطمینان کا دور دورہ ہوگا جو صرف اسلام کے غلبے کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ محض ہمت ہار کر بزدلی کی وجہ سے خود دشمن کو صلح کی پیش کش اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ دیکھیے سورۂ محمد (۳۵) صلح کی صورت میں کفار کی عہد شکنی یا سازشوں کے خطرے کی پروا نہ کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں، وہ سب کچھ سن رہا ہے، دیکھ رہا ہے۔

**آیت 63،62** **وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ ......** : اس جملے میں پچھلی آیت کے جملے **''وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ''** کی مزید تفصیل و تاکید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یقین دلایا کہ اگر ان کے ارادے میں فتور بھی ہے تب بھی آپ فکر نہ کریں، آپ کو اللہ تعالیٰ ہر طرح کافی ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ اس نے کس طرح اپنی خاص نصرت کے ساتھ آپ کو قوت بخشی، اہل ایمان ساتھی عطا کیے، ان کی باہمی عداوتیں، جو آپ کے پوری زمین کی ہر چیز خرچ کرنے پر بھی دور نہیں ہوسکتی تھیں، اس نے اپنے خاص فضل سے دور کر کے ایمان کی بدولت ان کے دلوں میں الفت و محبت ڈال دی اور انھیں یک جان کر کے آپ کی پشت پر کھڑا کر دیا۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے، مگر اس کا غلبہ اندھے کی لاٹھی نہیں، وہ کمال درجے کی حکمت بھی رکھتا ہے، اس لیے تم صرف اسی پر بھروسا رکھو۔

**آیت 64** **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ......** : اوپر فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے، اس سے شاید کوئی خیال کرتا کہ اللہ تعالیٰ کی تائید صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، اس لیے یہاں دوبارہ اس جملے کو لا کر ساتھ مومنین کا بھی اضافہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی پیروی کرنے والے تمام مومنوں کو کافی ہے۔ **''وَمَنِ اتَّبَعَكَ''** میں واؤ کا عطف **''حَسْبُكَ''** کے کاف پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تجھے اور تیرے پیچھے چلنے والے مومنوں کو کافی ہے۔ یہ واؤ بمعنی ''مَعَ'' بھی ہوسکتی ہے، یعنی اللہ

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

اے نبی! ایمان والوں کولڑائی پر ابھار، اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو ان ہزار پر غالب آئیں گے جنھوں نے کفر کیا۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ﴿۶۵﴾

---

تعالیٰ آپ کو مع آپ کے ساتھیوں کے سب کو کافی ہے۔ بعض لوگوں نے اس واؤ کا عطف لفظ "اللہ" پر ڈالا ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ تجھے اللہ کافی ہے اور وہ مومن کافی ہیں جو تیرے پیروکار ہیں، مگر یہ عطف اور ترجمہ سراسر غلط ہے، کیونکہ پورے قرآن وحدیث میں صرف اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنے اور اسی کو کافی سمجھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کا حکم ہے، فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ......﴾ توکل کا یہ حکم "الْمُؤْمِنُوْنَ" اور "الْمُتَوَكِّلُوْنَ" کے الفاظ کے ساتھ ۹ جگہ ہے اور فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [ المائدة : ۲۳ ] ''اور صرف اللہ پر بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو۔'' مخلوق تو خود اپنے لیے کافی نہیں، وہ دوسروں کو کیا کفایت کرے گی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ ایسے مواقع پر ایک شعر لکھا کرتے تھے ؎

سنبھلتا نہیں جن سے اپنا دوپٹا     سنبھالیں گے کیا وہ کلیجہ کسی کا

ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں پھینکے جانے کے وقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے احد کے بعد کفار کے جمع ہو کر دوبارہ حملہ آور ہونے کے موقع پر ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [ آل عمران : ۱۷۳ ] کہا۔ [ بخاری، التفسیر، سورۃ آل عمران : ۴۵۶۳ ] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ اور میرے ساتھی کافی ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ [ التوبة : ۱۲۹ ] ''پھر اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور وہی عرش عظیم کا رب ہے۔'' بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [ آل عمران : ۱۶۰ ] ''اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرے گا؟ اور اللہ ہی پر پھر لازم ہے کہ مومن بھروسا رکھیں۔''

**آیت 65** ① حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ......: ''تحریض'' کا معنی خوب رغبت دلا کر کسی کام پر ابھار دینا ہے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں جہاد کا ذکر تقریباً سات پاروں کے برابر بنتا ہے۔ کتب احادیث میں کتاب الجہاد اس

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

اب اللہ نے تم سے (بوجھ) ہلکا کر دیا اور جان لیا کہ یقیناً تم میں کچھ کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں سے ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۶۶﴾

---

کے فضائل سے بھری ہوئی ہیں۔ یہاں بیس مسلمانوں کو کفار کے دو سو آدمیوں پر غالب آنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مگر یہ حکم خبر کی صورت میں ہے، کیونکہ یہ بات معروف ہے کہ حکم بہت تاکید کے ساتھ دینا ہو تو وہ خبر کے الفاظ میں دیا جاتا ہے، مثلاً یہ کہنا ہو ''سب لوگ نماز کے لیے مسجد میں جائیں'' تو کہا جاتا ہے ''سب لوگ مسجد میں جائیں گے۔'' یہاں بیس مسلمانوں کو کفار کے دو سو آدمیوں پر غالب آنے کا حکم دیا جا رہا ہے مگر خبر کے الفاظ میں کہ اگر تم میں سے بیس صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے، مراد یہ ہے کہ غالب آئیں۔ اس کی دلیل اگلی آیت ہے کہ اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے، سو اگر تم میں سے ایک سو صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے۔ مراد یہ ہے کہ دو سو پر غالب آئیں، ظاہر ہے کہ تخفیف امر (حکم) میں ہوتی ہے، خبر میں نہیں۔ ان آیات میں خوش خبری بھی ہے مگر ایمان اور صبر کی شرط کے ساتھ۔

② بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ: یعنی سمجھ سے کام نہیں لیتے، نہ ثواب یا شہادت کے حصول کی نیت ہوتی ہے، نہ عذاب سے بچنے کی، نہ ہی وہ کسی پائدار اور دائمی مقصد کے لیے لڑتے ہیں، اس لیے ان میں وہ جذبہ اور اخلاقی قوت موجود نہیں ہوتی جو انھیں میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنے کا حوصلہ عطا کرے، لہٰذا یہ ان سرفروش مجاہدین کا کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں جن کی بڑی تمنا شہادت کی فضیلت حاصل کرنا ہے؟

③ بیس کے دو سو پر غالب آنے کے بعد سو کے ہزار پر غالب آنے کے بیان میں یہ حکمت ہے کہ لشکر چھوٹا ہو یا بڑا، ہر ایک کو یہ حکم ہے اور ہر ایک سے نصرت کا وعدہ ہے۔

**آیت 66** اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ ...... : اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب گزشتہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں کو اپنے سے دس گنا کفار کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کا حکم دشوار معلوم ہوا، پھر تخفیف کا حکم آ گیا اور اپنے سے دوگنا کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا واجب اور بھاگنا حرام قرار دے دیا گیا۔ [ بخاري، التفسير، سورة الأنفال، باب : ﴿ الآن خفف الله عنكم ...... ﴾ : ٤٦٥٣ ] اگر کفار دوگنا سے زیادہ ہوں تو بھاگنا گناہ نہیں، لیکن لڑنا اور جمے رہنا بہر حال افضل ہے، جیسا کہ عہدِ نبوی اور خلفائے راشدین کے عہد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ (ابن کثیر، قرطبی) اس آیت میں یہ خوش خبری بھی ہے کہ مسلمانوں کے لشکر ہزاروں تک جائیں گے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے، تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۷﴾

آیت 67 مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى …… : کسی نبی کے لیے جائز نہیں کہ وہ قیدی بنائے، پھر انھیں قید رکھے یا احسان کرے یا فدیہ لے، جب تک میدانِ جنگ میں خوب خون ریزی کے بعد کفر کی کمر نہ ٹوٹ جائے اور وہ دوبارہ مقابلے کے قابل نہ رہ جائیں، اس کے بعد قیدی بنانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن مسلمانو! تم نے بدر میں قیدی بنانے میں جلدی سے کام لیا، تم فدیے کی صورت میں دنیا کا سامان چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اعلائے کلمۃ اللہ کے ذریعے سے آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتا تھا اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے، تمھارا یہ عمل عزت و حکمت کے مطابق نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ﴾ [ محمد : ٤ ] ”تو جب ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب انھیں خوب قتل کر چکو تو (ان کو) مضبوط باندھ لو۔“

سن ۲ ہجری غزوۂ بدر میں قیدی بنانے میں عجلت کے بعد دوسری فرو گزاشت یہ ہوئی کہ قیدیوں کا فیصلہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا، کیونکہ اس وقت فدیہ لینے کے بجائے انھیں قتل کرنے سے کفر کی کمر مزید ٹوٹتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سمیت تمام مسلمانوں پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (جنگ بدر میں) جب قیدی گرفتار کر لیے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا کہ ان قیدیوں کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اے اللہ کے نبی! یہ ہمارے چچا زاد بھائی اور خاندان ہی کے لوگ ہیں، سو میری رائے تو یہ ہے کہ ان سے فدیہ لے لیا جائے، تاکہ (اس رقم سے) کفار کے مقابلے میں قوت حاصل ہو اور کیا عجب کہ اللہ انھیں اسلام کی ہدایت دے دے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابن خطاب! تمھاری کیا رائے ہے؟“ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں نے کہا، اے اللہ کے رسول! میری رائے ابو بکر کی رائے کے مطابق نہیں ہے، میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ان کو ہمارے حوالے کیجیے، تاکہ ہم ان کی گردنیں اڑا دیں۔ عقیل کو علی کے حوالے کیجیے، تاکہ وہ اس کی گردن اڑائیں اور میرے حوالے فلاں کو کیجیے، تاکہ میں اس کی گردن اڑاؤں، اس لیے کہ یہ لوگ کفر کے سرغنے اور اس کے سردار ہیں۔ (اکثر مسلمانوں کی رائے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق تھی، کچھ مالی فائدے کے پیش نظر اور کچھ انسانی اور رشتہ داری کی محبت کی وجہ سے) نبی ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے اختیار فرمائی اور میری رائے اختیار نہیں کی، پھر جب دوسرے دن کی صبح ہوئی، میں آیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے بھی بتائیے آپ اور آپ کے دوست کیوں رو رہے ہیں، تاکہ اگر مجھے رونا آئے تو میں بھی روؤں، ورنہ کم از کم آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے رونے

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾

اگر اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی بات نہ ہوتی، جو پہلے طے ہو چکی تو جو کچھ تم نے لیا اس کی وجہ سے تمھیں بہت بڑا عذاب پہنچتا ﴿۶۸﴾ سو اس میں سے کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی، اس حال میں کہ حلال، طیب ہے اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۶۹﴾

والی صورت ہی بنا لوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس فیصلے کے مشورے کی وجہ سے رو رہا ہوں جو تمھارے ساتھیوں نے قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے متعلق دیا تھا، اب میرے سامنے ان کا عذاب پیش کیا گیا جو اس درخت سے بھی قریب تھا۔'' اور آپ کے قریب ایک درخت تھا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ [ الأنفال : ٦٧ تا ٦٩ ] [ مسلم، الجهاد، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر ...... : ١٧٦٣ ]

علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام اترے اور آپ ﷺ سے کہا کہ اپنے ساتھیوں کو بدر کے قیدیوں کے متعلق اختیار دیں کہ انھیں قتل کر دیں یا فدیہ لے لیں، اس شرط پر کہ ان میں سے آئندہ اتنے ہی قتل کیے جائیں گے۔ انھوں نے فدیہ لینا اور آئندہ اپنے آدمیوں کی شہادت اختیار کی۔ [ ترمذی، السیر، باب ما جاء في قتل الأساری و الفداء : ١٥٦٧ وقال الألباني صحيح ] یہ صورت چونکہ بہتر نہ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر عتاب فرمایا۔

**آیت 68** لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ ...... : یہاں ''اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب'' سے مراد کئی باتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اگر اس امت کے لیے غنیمت حلال نہ کر دی گئی ہوتی، جیسا کہ بخاری کی حدیث (٣٣٥) « وَ اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ » (اور میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئیں) سے معلوم ہوتا ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو پسند فرمایا۔ دوسری یہ کہ بدر میں جو صحابہ شریک ہوئے ان کے گناہ بخشے جا چکے وغیرہ۔ (ابن کثیر، فتح القدیر) بعض اہل علم نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا وجود عذاب نازل ہونے سے مانع تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ [ الأنفال : ٣٣ ] ''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے جب کہ تو ان میں ہو۔'' شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وہ بات یہ لکھ چکا کہ ان قیدی لوگوں میں بہت سوں کی قسمت تھی مسلمان ہونا۔'' (موضح) الغرض اگر یہ باتیں پہلے نہ لکھی جا چکی ہوتیں تو تم پر عذاب نازل ہو جاتا۔

**آیت 69** فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ...... : اللہ تعالیٰ کے ناراضگی کے اظہار سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ فدیے کا مال لینا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس شبے کو دور فرمایا کہ یہ بھی مال غنیمت ہے اور اس امت کے لیے حلال اور طیب ہے، سو اسے کسی شک و شبہ کے بغیر کھاؤ۔ اس سے ''لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ'' کی تفسیر ''اس امت کے لیے غنیمت حلال ہونے''

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

اے نبی! تمھارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دے اگر اللہ تمھارے دلوں میں کوئی بھلائی معلوم کرے گا تو تمھیں اس سے بہتر دے دے گا جو تم سے لیا گیا اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے (۷۰) اور اگر وہ تجھ سے خیانت کا ارادہ کریں تو بے شک وہ اس سے پہلے اللہ سے خیانت کر چکے ہیں، تو اس نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے (۷۱)

کے قول کو تقویت ملتی ہے۔ ”وَاتَّقُوا اللّٰهَ“ البتہ یہ اصل مقصود نہیں، بلکہ اصل مقصود اللہ کا تقویٰ ہے، اسے اختیار کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

**آیت 70** قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ...... : جب بدر کے قیدی لائے گئے تو بعض نے اسلام کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے مجبور کیے جانے پر جنگ میں شرکت کی تھی، ان میں عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو فدیے کی معافی نہیں دی گئی، بلکہ دل سے مسلمان ہونے کی صورت میں لیے گئے فدیے سے بہتر عطا اور مغفرت کا وعدہ کیا گیا۔ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اللہ کی قسم! یہ آیت میرے بارے میں اتری، جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام لانے کی خبر دی اور درخواست کی کہ مجھ سے جو بیس اوقیہ فدیہ لیا گیا ہے اس کے بدلے میں مجھے کچھ دیں، تو آپ نے مجھے ان کے بدلے میں بیس غلام دیے جو سب میرے مال سے میرے لیے تجارت کر رہے ہیں، اس کے ساتھ میں اللہ جل ذکرہٗ سے مغفرت کی بھی امید رکھتا ہوں۔“ [ مسند إسحاق بن راهويه۔ تفسير طبري۔ طبراني وغيرهم ] ”الاستيعاب في بيان الأسباب“ میں بہت سے حوالے دے کر اسے حسن کہا گیا ہے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے عقیل کا فدیہ بھی اپنے پاس سے دیا تھا۔ [ بخاري، الجهاد والسير، باب فداء المشركين : ۳۰۴۹ ]

**آیت 71** وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ ...... : یعنی اگر وہ اسلام کا دعویٰ یا آئندہ آپ سے نہ لڑنے کا وعدہ صرف رہائی اور آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں اور ان کے دل میں کھوٹ ہے، تو پہلے انھوں نے اللہ کے ساتھ شرک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کی خیانت کر کے کیا حاصل کر لیا، یہی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر قابو عطا فرمایا، اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوش خبری اور قیدیوں کے لیے وعید ہے۔ ”فَاَمْكَنَ“ کا مفعول محذوف ہے، یعنی ”أَمْكَنَكَ مِنْهُمْ“ کہ اس نے آپ کو ان پر قابو دے دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ١ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا١ۚ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ١ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۝۷۲

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، یہ لوگ! ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہ کی تمھارے لیے ان کی دوستی میں سے کچھ بھی نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگر اس قوم کے خلاف کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور اللہ اسے جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے۝۷۲

آیت 72 ❶ سورۂ انفال کے آخر میں ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسلمان چار قسم کے تھے، پہلے وہ جو پہلی ہجرت کرنے والے مہاجرین اولین ہیں، دوسرے انصار مدینہ، تیسرے وہ مومن جنھوں نے ہجرت نہیں کی اور چوتھے وہ جنھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کی۔

❷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا ...... : ان سے مراد اولین مہاجر ہیں جو سب سے افضل ہیں۔

❸ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا : یہ انصار ہیں، ان کی فضیلت بھی بے شمار ہے، مگر اس بات پر اتفاق ہے کہ مہاجرین انصار سے افضل ہیں۔ عبد اللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ہجرت (کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں انصار میں سے ایک شخص ہوتا۔'' [ بخاري، المغازي، باب غزوة الطائف ...... : ۴۳۳۰ ]

❹ اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ : ''اَوْلِيَآءُ'' سے مراد دوست، حمایتی اور مددگار بھی ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے وارث بھی۔ دوسرے مفہوم کے مطابق اشارہ ہوگا اس مؤاخات (بھائی چارے) کی طرف جو رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار کے درمیان قائم کیا، جس کی بنا پر جاہلیت کے رواج کے مطابق آپس میں بھائی بننے والے ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، یہاں تک کہ میراث کی آیت: ﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [ الأنفال : ۷۵ ] نازل ہوئی تو یہ طریقہ منسوخ ہو گیا۔

❺ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا : یہ اس عہد کے مسلمانوں کی تیسری قسم ہے۔ دار الاسلام قائم ہونے کے باوجود اس کی طرف ہجرت نہ کرنے اور کفار کی غلامی میں رہنے پر قناعت کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان کچا ہے، یہ لوگ جہاد میں حصہ لے ہی نہیں سکتے، اس لیے ان کے ساتھ پہلے دو فریقوں جیسی دوستی اور حمایت کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی، جب تک ہجرت نہ کریں۔

❻ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ ...... : مثلاً کافر ان پر ظلم کر رہے ہوں اور وہ تم سے مدد مانگیں تو تم پر انھیں ظالموں کے پنجے سے

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ؕ﴿۷۳﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا﴿۷۳﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی

چھڑانا فرض ہے، فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا﴾ [ النساء : ۷۵ ] ''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔''

⑦ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ: یعنی اگر تمھارا کفار سے کوئی معاہدہ ہو کہ آپس میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے تو تم معاہدے کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان کی مدد نہیں کر سکتے، بلکہ ان مسلمانوں سے یہی کہا جائے گا کہ ''دارالکفر'' کو چھوڑ کر ''دارالاسلام'' میں چلے آئیں۔

آیت 73 ① وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: یعنی کافر آپس میں خواہ جتنی بھی دشمنی رکھتے ہوں تمھارے خلاف سب کے سب ایک دوسرے کے مددگار اور حمایتی ہیں۔ کافر، کافر ہی کا دوست ہے، مسلمان کا نہیں، اس لیے مسلمان اور کافر کا آپس میں موالات (دوستی، حمایت اور مدد) کا رشتہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔

② اِلَّا تَفْعَلُوْهُ: یعنی اگر تم آپس میں محبت، حمایت اور نصرت نہیں کرو گے اور کفار سے ترک موالات نہیں کرو گے، یعنی ان کے ساتھ باہمی محبت، تعاون اور ایک دوسرے کا وارث بننا نہیں چھوڑو گے اور قطع تعلق نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا، نہ کافر مسلمان کا وارث بنتا ہے۔'' [ بخاري، الفرائض، باب لا يرث المسلم الكافر ...... : ٦٧٦٤ ـ مسلم : ١٦١٤ ]

③ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ: یعنی مسلمانوں کے راز افشا ہوتے رہیں گے، آئے دن جنگ رہے گی، کفار کے خلاف مسلمانوں کے یک جان نہ ہونے سے اسلام اور مسلمان کمزور ہوں گے، ان کا رعب جاتا رہے گا، کفار غالب آئیں گے، تو ان کے ساتھ رہنے والے مسلمان مجبوراً مرتد ہو جائیں گے، یا ان کے رسوم و رواج، عقائد اور اعمال قبول کریں گے، یا ان پر خاموش رہیں گے، یا شدید آزمائش کا شکار ہوں گے۔ غرض کفار کے غلبے اور ان کے ساتھ رہ کر ان کی غلامی پر قناعت یا ان سے دوستی کی صورت میں اللہ کی زمین پر امن کسی صورت قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ ہر طرف فتنہ و فساد، جنگ و جدل، شرک و کفر، بے حیائی اور بدکاری ہی کا دور دورہ ہوگا۔

آیت 74 وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا ...... : اس آیت میں مسلمانوں کے پہلے دو گروہوں، یعنی مہاجرین اولین اور

الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

وہی سچے مومن ہیں، انھی کے لیے بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے ﴿۷۴﴾ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم ہی سے ہیں، اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں، ان کے بعض، بعض کے زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۷۵﴾

انصار کی تعریف فرمائی ہے، کیونکہ پہلے ان کا ذکر باہمی دوستی اور تعاون کی تاکید کے لیے تھا۔ اس آیت میں ان کی تعریف تین طرح سے کی ہے، پہلا تو یہ کہ یہ لوگ ایمان، ہجرت، جہاد اور اہل ایمان کو جگہ دینے اور نصرت کی وجہ سے پکے مومن ہیں، بخلاف ان کے جو ایمان تو لائے مگر ہجرت نہیں کی، جس کی وجہ ان کے ایمان کی خامی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۹۷) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مہاجرین و انصار کے لیے ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ﴾ بہت بڑی سند ہے۔ دوسرا ان کے لیے عظیم مغفرت اور بخشش ہے۔ "مَغْفِرَةٌ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ تیسرا یہ کہ ان کے لیے رزق کریم ہے، اس میں جنت کی بے شمار نعمتوں کے ساتھ دنیا میں باعزت روزی کا وعدہ ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں عزت کی روزی سے مراد مال غنیمت اور فے ہے، جو خالص ان لوگوں کا حق ہے جو سردار کے ساتھ شریکِ جنگ ہوں۔ (موضح)

**آیت 75** ❶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ...... : اس آیت میں مسلمانوں کے چوتھے گروہ کا ذکر ہے جنھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد یا بدر کے بعد، جب اسلام ایک طاقت بن گیا، ایمان لا کر ہجرت کی، یہ لوگ بھی مہاجرین اولین اور انصار کے ساتھی شمار ہوں گے، اگرچہ سبقت کی وجہ سے پہلوں کا درجہ ان سے مقدم ہے، فرمایا: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ [ الواقعة : ۱۰ ] ''اور جو پہل کرنے والے ہیں، وہی آگے بڑھنے والے ہیں۔'' مگر بخاری (۶۱۶۸) اور مسلم (۲۶۴۰) کی حدیث (( اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ )) (قیامت کے دن انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت اور دوستی رہی ہے) کی رو سے ان کا شمار انھی میں ہوگا۔ [ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ]

❷ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ: یعنی اب آئندہ سے میراث دینی بھائی چارے کی بنا پر نہیں بلکہ رشتہ داری کی بنا پر تقسیم ہوگی، کیونکہ ایمان، ہجرت اور جہاد کے ساتھ ساتھ رشتہ داری ان کے قرب کی ایک زائد وجہ ہے۔ اس سے وہ طریقہ منسوخ ہو گیا جس میں مہاجرین و انصار ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے۔ (ابن کثیر)

❸ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ : وہی جانتا ہے کہ کس کا حق پہلے اور کس کا بعد میں ہے، لہٰذا اس کے تمام احکام سراسر علم و حکمت پر مبنی ہیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ﴿۱﴾

**اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکوں کی طرف بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا ①**

یہ پوری کی پوری سورت مدنی ہے جو فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں نازل ہوئی۔ چونکہ سورۂ توبہ اور انفال میں ذکر ہونے والے واقعات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، اس لیے ان دونوں سورتوں کو ایک سورت کے حکم میں رکھا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھی گئی اور یہ سبع طوال (سات لمبی سورتوں) میں سے ساتویں سورت ہے، جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ أَخَذَ السَّبْعَ الْأُوَلَ مِنَ الْقُرْآنِ فَهُوَ حَبْرٌ )) ''جس نے قرآن مجید کی یہ پہلی سات سورتیں حاصل کر لیں وہ بہت بڑا عالم بن گیا۔'' [ أحمد : ٦/ ٨٢، ح : ٢٤٥٨٥، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ]

اس کے کئی نام ہیں جن میں سے ایک ''توبہ'' اور دوسرا ''براءۃ'' ہے۔ ''توبہ'' اس اعتبار سے کہ اس میں ایک مقام پر بعض اہل ایمان کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے اور ''براءۃ'' اس لحاظ سے کہ اس کے شروع میں مشرکین سے براءت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ''سورۃ الفاضحہ'' یعنی (منافقوں کو) رسوا کرنے والی سورت بھی کہتے ہیں۔ اس سورت کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھی جاتی، مفسرین نے اس کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں، مثلاً یہ کہ اس میں مشرکین سے قطع تعلق اور مسلمان نہ ہونے کی صورت میں ان کے قتل کا حکم ہے اور اہل کتاب کے مسلمان نہ ہونے یا جزیہ نہ دینے کی صورت میں ان سے مسلسل لڑتے رہنے کا حکم ہے وغیرہ، مگر سب سے معقول اور سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ چونکہ نبی ﷺ نے اس کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھوائی، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں لکھی۔

**آیت 1** بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ ...... : اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان تمام معاہدوں کی تنسیخ کا اعلان فرمایا ہے جو مسلمانوں نے مشرکوں سے کیے تھے۔ منسوخ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین ان عہد ناموں کو بار بار توڑ دیتے تھے اور ان کی شرائط کو پورا نہیں کرتے تھے، خصوصاً جب آپ ﷺ فتح مکہ کے بعد تبوک گئے تو کفار نے سمجھا کہ مسلمان رومیوں کی طاقت کے مقابلے میں فنا ہو جائیں گے، اس لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے کیے ہوئے کسی عہد کا لحاظ رکھا نہ باہمی رشتہ داری کا، فرمایا: ﴿ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ﴾ [ التوبۃ : ۱۰ ] ''یہ لوگ کسی مومن کے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کا۔'' اور فرمایا: ﴿ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ ﴾ [ التوبۃ : ۱۳ ] ''کیا تم ان لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں۔'' مگر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم دیکھو کہ ان مشرکین کو اچانک حملہ کر کے برباد کرنے کے بجائے پہلے تمام عہد منسوخ کرنے کا اعلان دنیا کے سب سے بڑے مجمع میں کیا گیا۔ ۹ھ میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیر امارت حج کے دن دس ذوالحجہ یوم نحر کو میدانِ منیٰ میں دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کی موجودگی میں اعلان ہوا اور کئی آدمی

فَسِيۡحُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخۡزِى الۡكٰفِرِيۡنَ ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىۡۤءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ وَرَسُوۡلُهٗ ؕ فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝۳

تو اس سرزمین میں چار ماہ چلو پھرو اور جان لو کہ بے شک تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور یہ کہ یقیناً اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے ② اور اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کی طرف صاف اعلان ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری ہے اور اس کا رسول بھی۔ پس اگر تم توبہ کرلو تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر منہ موڑ و تو جان لو کہ یقیناً تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور جنھوں نے کفر کیا انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دے ③

مقرر کیے گئے، جنھوں نے اس مجمع کے ہر مقام پر پہنچ کر بلند آواز کے ساتھ یہ اعلان کیا۔ اس سال رسول اللہ ﷺ کے خود حج پر نہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس اعلان کے بعد ہی مکہ میں مشرکوں کا داخلہ بند ہوا اور ان کی بے حیائی کی رسمیں ختم ہوئیں۔

**آیت 2** ① **فَسِيۡحُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ** : یہ اللہ تعالیٰ کا مزید کرم تھا کہ مشرکین کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے چار ماہ کی مہلت دی گئی، جس کی ابتدا ۱۰ ذوالحجہ یوم النحر سے ہوئی، کیونکہ اس دن یہ اعلان کیا گیا اور ۱۰ ربیع الثانی کو یہ مدت ختم ہوگئی۔ اس مہلت کا مقصد یہ تھا کہ وہ اتنی مدت میں اپنے بارے میں خوب سوچ سمجھ لیں، پھر یا تو مسلمان ہو جائیں یا سرزمین عرب سے باہر کسی ملک میں اپنا ٹھکانا بنالیں۔ اگر وہ اس کے بعد بھی باقی رہیں تو انھیں پکڑ کر، گھیر کر، گھات لگا کر جیسے بھی ممکن ہو قتل کر دیا جائے۔ یہ چار ماہ کی مدت ان لوگوں کے لیے تھی جن سے معاہدے کی مدت چار ماہ سے کم باقی تھی، یا معاہدہ تو زیادہ مدت کا تھا مگر انھوں نے اس کی خلاف ورزی کی تھی، یا مدت کے تعین کے بغیر معاہدہ تھا، البتہ وہ قبائل جن سے کسی خاص مدت تک معاہدہ تھا اور انھوں نے معاہدے کی کسی قسم کی مخالفت بھی نہ کی تھی ان کا عہد ان کی مدت تک پورے کرنے کا حکم دیا گیا، فرمایا: ﴿ فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ ﴾ [ التوبة : ٤ ] ”تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو۔“

② **وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ ......** : مشرکوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ مہلت مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے نہیں دی گئی بلکہ اس میں کئی حکمتیں ہیں، ورنہ تم لوگ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں، اگر تم کفر پر قائم رہے تو خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ذلیل و رسوا کرنے والا ہے۔ دیکھیے سورۂ انفال کی آیت (۵۹) کے حواشی۔ غرض صرف بیت اللہ ہی نہیں پورے جزیرۂ عرب کو مشرکین کے نجس وجود سے پاک کر دیا گیا۔

**آیت 3** ① **وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ ......** : یوم حج اکبر سے مراد ۱۰ ذوالحجہ ہے، جس دن حاجی منیٰ میں

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ

مگر مشرکوں میں سے وہ لوگ جن سے تم نے عہد کیا، پھر انھوں نے تم سے عہد میں کچھ کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ متقی لوگوں سے محبت کرتا ہے ④ پس جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان

آ کر قربانی کرتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے ان لوگوں کے ہمراہ بھیجا جو قربانی کے دن منیٰ میں اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی ننگا شخص بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا اور حج اکبر کا دن یوم النحر (قربانی کا دن) ہے، کیونکہ لوگ (عمرے کو) حج اصغر کہتے تھے، چنانچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سال صاف اعلان کروا دیا، تو حجۃ الوداع جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا، کسی مشرک نے حج نہیں کیا۔ [ بخاری، الجزیة و الموادعة، باب کیف ینبذ إلی أهل العهد ؟ : ۳۱۷۷ ]

اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو اس حج کو حجِ اکبر کہتے ہیں جو جمعہ کے دن آئے ان کی بات درست نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں مزید اضافہ ہے کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان دے کر بھیجا، پھر آپ نے ان کے بعد علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) یہ اعلان کریں، چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ، جو امیر حج تھے، ان کے حکم پر میں نے، میرے ساتھیوں نے اور علی رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں یہ اعلان کیا۔ [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ و أذان من الله ...... ﴾ : ٤٦٥٦ ] مسند احمد میں ہے کہ چار ماہ کی مہلت دینے، ننگے کو طواف کی اجازت ختم کرنے اور آئندہ سال کسی مشرک کے حج نہ کرنے کے اعلان کے ساتھ ایک اعلان یہ بھی کرتے تھے کہ جنت میں ایمان والوں کے سوا کوئی داخل نہیں ہو گا۔ [ أحمد : ۲۹۹/۲، ح : ۷۹۹۶ ]

② وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا ...... : یہ اعلان تاکید کے لیے دوبارہ کیا گیا، تاکہ کافر اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ سے کسی طرح بھی بچ نکلنے والے نہ سمجھیں۔

**آیت 4** اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ...... : یعنی معاہدوں کی پاس داری میں کوئی کمی نہ کرنے والے مشرکوں کے لیے چار ماہ کی مہلت نہیں بلکہ ان کے لیے معاہدے کی طے کردہ مدت پوری کرو، کیونکہ تقوے کا تقاضا عہد پورا کرنا ہے اور اللہ متقین سے محبت رکھتا ہے۔

**آیت 5** ① فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ ...... : ان چار مہینوں سے مراد ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۰ ربیع الثانی تک کے ایام ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے معروف حرمت والے مہینے مراد لیے ہیں، یعنی رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ ۱۰ ذوالحجہ کو اعلان براءت ہو تو محرم ختم ہونے تک کل پچاس دن بنتے ہیں، اس لیے حافظ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین نے ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۰ ربیع الثانی

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝۵

تک ہی چار ماہ مراد لیے ہیں اور انھیں ”اَلْاَشْهُرُ الْحُرُمُ“ اس لیے کہا گیا کہ اس مہلت میں مشرکین کا قتل حرام کر دیا گیا، یہی تفسیر درست ہے۔

② كُلَّ مَرْصَدٍ: گھات کی جگہ سے مراد وہ راستہ یا جگہ ہے جہاں سے دشمن کے گزرنے کی توقع ہو اور جہاں سے اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کرنا ممکن ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین سے صرف میدانِ جنگ میں لڑنا ہی کافی نہیں، بلکہ جس طریقے سے بھی تم ان پر قابو پا کر انھیں قتل کر سکتے ہو ضرور کرو۔

③ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ...... : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جن سے وعدہ ٹھہر گیا تھا اور دغا ان سے نہ دیکھی ان کی صلح قائم رہی اور جن سے کچھ وعدہ نہ تھا ان کو فرصت ملی چار مہینے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دل کی خبر اللہ کو ہے، ظاہر میں جو مسلمان ہو وہ سب کے برابر امان میں ہے اور ظاہر مسلمانی کی حد ٹھہرائی ایمان لانا، کفر سے توبہ کرنا اور نماز اور زکوٰۃ۔ اس واسطے جب کوئی شخص نماز چھوڑ دے تو اس سے امان اٹھ گئی۔“ (موضح) یہی وہ حکم ہے جس کی بنا پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کے منکرین سے جنگ کی اور فرمایا کہ میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑائی کروں، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر جب وہ یہ (تین) کام کر لیں تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔“ [ بخاری، الإیمان، باب : ﴿ فإن تابوا و أقاموا الصلاة...... ﴾ : ۲۵ ]

یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت میں آپ کے تمام احکام کی فرماں برداری کا اقرار آ جاتا ہے، اگر ان میں سے کسی حکم کا انکار کرے، جو عام سب کو معلوم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے تو مرتد ٹھہرے گا اور اگر کسی حکم کا انکار تو نہ کرے مگر عمل نہ کر سکے تو گناہ گار مسلمان ہو گا، کافر نہیں ہو گا۔ البتہ مسلمان ہونے کی ظاہری نشانیاں وہ ہیں جو اوپر ذکر ہوئیں، ان کا صرف اقرار کرنا یا دل میں ماننا کافی نہیں، بلکہ ان پر عمل کرنا خون اور مال کی حفاظت کا ضامن ٹھہرایا گیا ہے۔

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۟ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۟

اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پر پہنچا دے۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے ⑥ ان مشرکوں کا اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد کیسے ممکن ہے، سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا۔ سو جب تک وہ تمھارے لیے پوری طرح قائم رہیں تو تم ان کے لیے پوری طرح قائم رہو۔ بے شک اللہ متقی لوگوں سے محبت کرتا ہے ⑦

**آیت 6** ① وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ...... : یعنی امن کی مدت گزرنے کے بعد اگر کوئی مشرک، جس سے تمھارا کوئی عہد نہیں، تم سے درخواست کرے کہ مجھے اپنے ہاں پناہ دو تو اسے پناہ دے دو، تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے اور اگر آیا ہی اسلام کو سمجھنے یا اپنے شبہات دور کرنے کے لیے ہے تو اسے بدرجۂ اولیٰ پناہ دینی چاہیے۔ اب اگر وہ اسلام لانے کے لیے آمادہ نہ ہو اور اپنے ٹھکانے پر واپس جانا چاہے تو تم اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دو، کیونکہ ان لوگوں کو اسلام کی حقیقت معلوم نہیں، ممکن ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی باتیں سن کر، ان کا معاشرہ اور اخلاق و کردار دیکھ کر مسلمان ہو جائیں، پھر جب وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے تو دوسرے مشرکین کی طرح اسے مارنا اور قتل کرنا جائز ہے، اس سے پہلے جائز نہیں۔ یہ حکم ہمیشہ کے لیے ہے اور کوئی بھی مسلمان ہو وہ کافر کو پناہ دے سکتا ہے، خواہ مسلمانوں میں اس کی حیثیت معمولی ہو اور تمام مسلمانوں پر یہ پناہ پوری کرنا لازم ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر ام ہانی رضی اللہ عنہا نے ایک مشرک کو پناہ دی، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا: ''ہم نے اسے پناہ دی جسے تم نے پناہ دی، ہم نے اسے امان دی جسے تم نے امان دی۔'' [ أبو داوٗد، الجهاد، باب في أمان المرأة : ۲۷٦۳۔ بخاری : ۳۵۷ ]

② حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو پناہ دینے سے اصل مقصود دعوت دین، قرآن سنانا اور اسلام کا تعارف کروانا ہے، پھر اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو انھیں جلدی رخصت کر دینا چاہیے، یہ نہیں کہ وہ اپنے اڈے بنا کر جاسوسی کریں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔

**آیت 7** ① كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ...... : یعنی وہ لوگ جو ہیں ہی مشرک، جنھوں نے اپنے خالق کی توحید کا عہد ہی پورا نہیں کیا، ان کی طرف سے کوئی عہد پورا ہونا کیسے ممکن ہے، وہ تو جو عہد کرتے ہیں توڑ ڈالتے ہیں۔

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾

کیسے ممکن ہے جبکہ وہ اگر تم پر غالب آجائیں تو تمھارے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کریں گے اور نہ کسی عہد کا، تمھیں اپنے مونہوں سے خوش کرتے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان کے اکثر نافرمان ہیں ﴿۸﴾

② اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : ان سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر پہلے ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ﴾ [ التوبة : ٤ ] میں گزر چکا ہے۔ صلح حدیبیہ جو رسول اللہ ﷺ اور کفار قریش کے درمیان دس سال کے لیے قرار پائی، یہ صلح نامہ چونکہ حدود حرم کے اندر قرار پایا تھا، اس لیے اسے "عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" فرما دیا۔ (ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس عہد پر قائم رہے ان سے قتال مت کرو۔ اس معاہدے میں شرط یہ تھی کہ ایک دوسرے پر حملہ آور نہیں ہوں گے اور نہ دوسرے کے خلاف کسی کی مدد کریں گے۔ اس معاہدے میں بنو خزاعہ مسلمانوں کے ساتھ شامل تھے اور بنو بکر قریش کے حلیف تھے، مگر کچھ عرصہ بعد بنو بکر اور بنو خزاعہ کے درمیان لڑائی چھڑ گئی اور مشرکین نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے رمضان ۸ ھ کو مکہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ (ابن کثیر) ابن جریر طبری نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد بنو بکر کے وہ قبائل ہیں جو صلح حدیبیہ والے اپنے عہد پر قائم رہے اور انھوں نے بنو خزاعہ پر نہ حملہ کیا، نہ اس میں مدد کی، کیونکہ ان آیات کے نزول کے وقت فتح مکہ کو ایک سال گزر چکا تھا، قریش کو ان کی بدعہدی کی سزا بھی مل چکی تھی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''صلح والے تین قسم فرمائے، ایک جن سے مدت نہیں ٹھہری، ان کو جواب دیا (کہ تم کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے) مگر جو مکے کی صلح میں شامل تھے (تو) جب تک وہ دغا نہ کرے، یہ ادب ہے مکہ کا اور تیسرے جن سے مدت ٹھہری وہ صلح قائم رہی، لیکن آخر سب مشرک عرب کے ایمان لائے۔'' (موضح) "اسْتَقَامُوْا" میں حروف ''سین'' اور ''تا'' کی زیادتی کی وجہ سے ترجمہ ''پوری طرح قائم رہیں'' کیا گیا ہے۔

③ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ : اور عہد کا پورا کرنا بھی متقی ہونے کے لیے ضروری شرط ہے۔

**آیت 8** كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا ...... : مشرکین سے ''براءت'' کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے معاہدے کا کوئی اعتبار نہیں، یہ لوگ زبان سے دوستی اور وفاداری کی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں اور دل میں یہ ہے کہ اگر کبھی موقع مل جائے تو معاہدے کو پس پشت ڈال کر ان مسلمانوں کو کچا چبا ڈالیں۔ " اَلْاِلُّ " کے معنی عہد، حلف، قرابت سبھی آتے ہیں اور یہاں آگے "ذِمَّةً" (عہد) الگ ذکر ہونے کی وجہ سے قرابت مراد ہے۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱

انھوں نے اللہ کی آیات کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت لے لی، پھر انھوں نے اس کے راستے سے روکا۔ بے شک یہ لوگ برا ہے جو کچھ کرتے رہے ہیں ⑨ وہ کسی مومن کے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کا اور یہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں ⑩ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں، اور ہم ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں ⑪

**آیت 9** اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا …… : یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی چند روزہ زندگی کے مفاد کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام کو رد کر دیا، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ خود اسلام نہیں لائے، بلکہ دوسروں کو بھی اسلام کی راہ اختیار کرنے سے روکتے رہے۔ (شوکانی)

**آیت 10** ❶ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً : ان کی مذمت کی تاکید کے لیے دوبارہ ان کے اس فعل بد کا تذکرہ فرمایا۔ بعض مفسرین نے پہلی آیات سے مراد تمام مشرکین اور ان آیات سے مراد یہود مدینہ لیے ہیں، کیونکہ اللہ کی کتاب انھی کے پاس تھی جس کی آیات پر عمل کر کے مسلمان ہونے کے بجائے وہ دنیا کے مفاد کو ترجیح دیتے تھے، اگرچہ اللہ کے احکام کو رد کر کے دنیا کے مفاد کو ترجیح دینا مشرکین و یہود سب کا وتیرہ ہے۔ اس صورت میں "بِاٰيٰتِ اللّٰهِ" سے مراد نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی آیات ہوں گی۔

❷ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ : یعنی عہد شکنی اور زیادتی جب بھی ہوئی انھی کی طرف سے ہوئی۔

**آیت 11** ❶ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ …… : یعنی ایمانی اخوت، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات (۱۰) میں کیا ہے: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ "مومن تو سب بھائی ہی ہیں" وہ ان تین چیزوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ ان تین چیزوں سے انھیں اسلامی معاشرے میں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یہ جو فرمایا بھائی ہیں حکم شرع میں، اس میں سمجھ لیں کہ جو شخص قرائن سے معلوم ہو کہ ظاہر میں مسلمان ہے اور دل سے یقین نہیں رکھتا تو چاہے اسے حکم ظاہری میں مسلمان گنیں، مگر معتمد اور دوست نہ پکڑیں۔" (موضح) یہ بات پہلے بھی گزری ہے یہاں مزید تاکید ہوگئی کہ نماز اور زکوٰۃ کا محض اقرار ہی اخوت دینی کے لیے کافی نہیں بلکہ عملاً ان کی ادائیگی امتِ مسلمہ میں شامل ہونے کے لیے ضروری ہے اور مسلمان حاکم پر لازم ہے کہ ان کی عدم ادائیگی پر باز پرس کرے اور سزا دے اور اگر وہ ان کی ادائیگی سے انکار یا انھیں مذاق کریں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح انھیں مرتد قرار دے کر ان سے جنگ کی جائے۔

وَ اِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَطَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَـئِمَّةَ الۡـكُفۡرِ‌ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنۡتَهُوۡنَ ﴿۱۲﴾

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمھارے دین میں طعن کریں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو۔ بے شک یہ لوگ، ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، تاکہ وہ باز آ جائیں ﴿۱۲﴾

❷ وَنُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ: جاننے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی نافرمانی کا انجام سمجھتے اور اس کا خوف اپنے دلوں میں رکھتے ہیں، ایسے ہی لوگ ہیں جو اس کی آیات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

**آیت 12** ❶ وَ اِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ ......: یعنی جن لوگوں کی حالت یہ ہو کہ وہ نہ صرف تم سے معاہدہ کر کے اسے توڑتے ہوں بلکہ تمھارے دین کا مذاق اڑاتے، اس میں طعن کرتے اور عیب نکالتے ہوں تو سمجھ لو کہ یہی "اَـئِمَّةَ الۡـكُفۡرِ" (کفر کے سردار) ہیں۔ ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں، لہٰذا تم ان لوگوں کو کسی قسم کا موقع دیے بغیر ان سے جنگ کرو، تاکہ تمھاری تلواروں کی کاٹ سے وہ اپنے کرتوتوں سے باز آ جائیں۔ معلوم ہوا کہ دینِ اسلام پر طعن کرنے والا اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے والا واجب القتل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ تمام کفار سے جنگ کی، مگر دین میں طعن، اسلام اور مسلمانوں کی توہین اور آپ ﷺ کی توہین کرنے والوں کے قتل کا خاص اہتمام فرمایا۔ کعب بن اشرف یہودی اور ابو رافع یہودی وغیرہ کو فدائی حملوں کے ذریعے سے قتل کروانے کے واقعات اس کی واضح مثالیں ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر بدزبانوں کا خون رائگاں قرار دینا بھی اس کی مثال ہے۔ کفار کی طرف سے عہد توڑنے کے بعد اگر ان سے جنگ نہ کی جائے تو یہ مسلمانوں کی طرف سے بے حد کمزوری کا اظہار اور انتہا درجے کی ذلت اور بے غیرتی ہوگی، اس لیے رسول اللہ ﷺ عہد توڑنے والوں سے درگزر نہیں فرماتے تھے، بلکہ فوراً انھیں ان کے انجام تک پہنچاتے تھے۔ بنو قریظہ اور اہلِ مکہ کے عہد توڑنے پر رسول اللہ ﷺ کی کارروائی اس کی روشن مثال ہے، مگر افسوس آج کفار کے اپنے تمام معاہدے توڑنے کے باوجود مسلمان حکام ان سے خوف زدہ اور خاموش ہیں۔

❷ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ: اللہ تعالیٰ نے کفار کے کسی عہد و پیمان کے معتبر نہ ہونے کا جو ذکر فرمایا یہ واقعی حقیقت ہے جس کا ثبوت نصرانیوں کا اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینا ہے اور وہ سلوک بھی جو تاتاریوں نے مسلمانوں خصوصاً بغداد کے مسلمانوں کے ساتھ ۶۵۶ھ میں کیا اور جو کچھ ہندوؤں نے پاکستان آنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا اور اب تک کشمیر اور بھارت کے مسلمانوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ روس اور دوسری کمیونسٹ ریاستوں نے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کے لیے کیا اور اب امریکہ، یورپ اور پورا عالم کفر جس طرح عراق، افغانستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے اور جھوٹے الزام گھڑ کر وہ تمام عہد جو اقوام متحدہ کے ذریعے سے کیے تھے، پس پشت ڈال کر اسلام اور مسلمانوں کو برباد کر رہا ہے، یہ سب کفار کے کسی عہد کے عہد نہ ہونے کی واضح مثالیں ہیں۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ

کیا تم ان لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا اور انھوں نے ہی پہلی بار تم سے ابتدا کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو ﴿۱۳﴾ ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا ﴿۱۴﴾ اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے

**آیت 13** ① اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ ...... : اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نہایت بلیغ طریقے سے کفار کے خلاف جنگ پر ابھارا ہے اور انھیں جوش اور غیرت دلائی ہے کہ جن لوگوں کے یہ جرائم ہیں کیا تم ان کے خلاف بھی نہیں لڑو گے؟ پھر ان کے تین جرم بیان فرمائے، پہلا یہ کہ انھوں نے اپنے عہد توڑ ڈالے اور وہ قسمیں بھی جو عہد پختہ کرنے کے لیے کھائی تھیں، صلح حدیبیہ ہو جانے کے بعد بھی وہ بنوخزاعہ کے خلاف (جو مسلمانوں کے حلیف تھے) بنوبکر کی پیٹھ ٹھونکتے اور اسلحہ وغیرہ سے ان کی مدد کرتے رہے، حالانکہ ان کا ایسا کرنا صلح کے معاہدے کی صریح خلاف ورزی تھی۔ دوسرا یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے تو وہ آپ کے خلاف منصوبے سوچتے رہتے، جیسا کہ سورۂ انفال (۳۰) میں گزر چکا ہے کہ قتل، قید اور کم از کم یہ کہ آپ کو مکہ سے نکال دیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے کسی ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آپ ﷺ نے خود اللہ کے حکم سے ہجرت کی اور تیسرا یہ کہ پہلی بار لڑنے کی ابتدا انھوں نے کی کہ بدر کے موقع پر جب ان کا تجارتی قافلہ بچ گیا تھا تو انھوں نے واپس جانے کے بجائے خواہ مخواہ جنگ چھیڑی۔ اس کے بعد احد، خندق اور بنوخزاعہ کے خلاف جنگ کی ابتدا بھی انھوں نے کی۔ ان تینوں میں سے ہر جرم ہی ان سے لڑنے کا کافی سبب ہے، اب یہ تین سبب جمع ہونے پر بھی کیا تم ان سے نہیں لڑو گے؟

② اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ ...... : یہ بھی جنگ پر ابھارنے کا ایک زبردست طریقہ ہے کہ کسی کو کہا جائے کہ کیا تم دشمنوں سے ڈرتے ہو؟ غیرت مند یہی کہے گا اور کر کے دکھائے گا کہ نہیں، میں دشمنوں سے نہیں ڈرتا، پھر مسلمانوں کی ہمت بندھائی کہ تم تو اللہ پر ایمان و یقین رکھنے والے ہو کہ فتح و شکست اور نفع و نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے، ایسی صورت میں تو لازماً حق بنتا ہے کہ تم کفار کے بجائے اللہ سے ڈرو اور ان سے قتال کرو۔

**آیت 14، 15** ① قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ...... : ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے والے کفار سے لڑنے کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ پانچ وعدے کیے ہیں جو سب کے سب پورے فرمائے، پہلا یہ کہ "يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ"

وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۵﴾

یعنی پہلی قوموں پر اللہ کی طرف سے قدرتی آفات کے ذریعے سے عذاب آتا تھا، اب تم ان سے لڑو، اللہ تعالیٰ تمھارے ہاتھوں انھیں عذاب دے گا، جو کفار کے قتل، زخمی، قید ہونے اور ان سے مال غنیمت کے حصول کی صورت میں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ "یُخْزِهِمْ" انھیں رسوا کرے گا، ان کی فوجی قوتوں کا گھمنڈ توڑ کر ان کی حکومت کی عزت خاک میں ملا کر انھیں ذلیل و رسوا کرے گا۔ تیسرا یہ کہ " وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ " ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں غلبہ عطا کرے گا۔ اسے الگ اس لیے ذکر فرمایا کہ ہوسکتا تھا کہ کفار تو ذلیل ہو جائیں مگر مسلمانوں کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئے۔ چوتھا یہ کہ "وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ" تمھارے ان سے لڑنے اور غلبہ پانے سے ان مومنوں کے سینوں کو شفا ملے گی جو ان کفار موذیوں کے ہاتھوں ظلم و ستم سہتے رہے۔ ان سے مراد وہ مسلمان ہیں جو مکہ اور دوسری جگہوں میں کفار کی ایذا کا نشانہ بنے۔ بعض نے فرمایا کہ ان سے مراد بنوخزاعہ ہیں جنھیں بنوبکر اور قریش نے بدعہدی کر کے سخت نقصان پہنچایا اور واقعی یہ لوگ بھی کفار کے زخم خوردہ لوگوں میں شامل تھے اور پانچواں یہ کہ " وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ "ان کے دلوں کے غصے کو دور کرے گا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ شفائے صدور ہی کی تاکید ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک الگ نعمت ہے۔ شفائے صدور سے مراد ان ظالموں کا قتل اور ان کی رسوائی ہے اور دلوں کا غصہ دور کرنے سے مراد مسلمانوں کو محکومی کی بے بسی میں جو غصہ کفار پر آتا تھا مگر کچھ کر نہ سکتے تھے، اب فتح و غلبہ کی صورت میں اس غصے کو دور کرنا ہے اور ویسے بھی شفائے قلوب کے بعد بھی ظلم و ستم کے جو آثار غصے کی صورت میں باقی رہتے ہیں الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے واقعات سن کر دل میں غصہ تو آتا ہی ہے، جیسے اب بھارت و کشمیر، فلسطین و فلپائن، برما، عیسائی اور کمیونسٹ ممالک میں مسلمانوں پر ظلم کی داستانیں سن کر دل کو غصہ آتا ہے، کفار پر فتح یاب ہونے سے اس غصے کا بھی مداوا ہوتا ہے۔

❷ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ: اس سے پہلے پانچ الفاظ "يُعَذِّبْهُمْ" "يُخْزِهِمْ" "يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ" "يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ" اور "يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ "فعل مضارع مجزوم تھے، کیونکہ وہ "قَاتِلُوْهُمْ" امر کا جواب تھے کہ لڑنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمھیں یہ پانچ انعام عطا فرمائے گا۔ اب " وَيَتُوْبُ اللّٰهُ" مجزوم نہیں بلکہ مرفوع ہے۔ معلوم ہوا یہاں سے نئی بات شروع ہو رہی ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: "اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔" یہاں اس جملے کے لانے کا مقصد یہ ہے کہ تمھارے جہاد کی صورت میں جب بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں خم ہوں گی، تو وہ اسلام کی حقانیت پر غور کریں گے اور یہ عام مشاہدہ ہے کہ لوگ غالب قوم کے دین اور ان کی تہذیب کو قبول کرتے ہیں، لہٰذا اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو توبہ کی توفیق بھی دے گا، جیسا کہ فتح مکہ کے بعد عکرمہ بن ابی جہل، ابوسفیان، سہیل بن عمرو اور ان کے علاوہ فوج در فوج لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ مگر اس کو "قَاتِلُوْهُمْ" کا جواب بنانے کے بجائے الگ اس لیے ذکر کیا

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَ لَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَ لَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوۡلِهٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلِيۡجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾ ع

یا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک اللہ نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور نہ اللہ کے اور نہ اس کے رسول کے اور نہ ایمان والوں کے سوا کسی کو راز دار بنایا اور اللہ اس سے پورا باخبر ہے جو تم کرتے ہو﴿۱۶﴾

ہے کہ توبہ کی توفیق صرف کفار سے لڑائی ہی پر موقوف نہیں بلکہ اسلام اتنا واضح، روشن، مدلل اور فطرت کے مطابق دین ہے کہ بعض لوگ لڑائی کے بغیر بھی اللہ کی توفیق سے اسے سینے سے لگا لیتے ہیں اور اس میں اتنی کشش اور اتنا حسن ہے کہ اسے مٹانے کی کوشش کرنے والے لوگ اور مسلمانوں پر فتح یاب ہو جانے والے کفار بھی اللہ کی توفیق سے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں ہر جگہ مسلمان اگرچہ مغلوب ہیں، مگر اسلام تمام ادیان سے زیادہ یورپ، امریکہ اور دنیا بھر کے ممالک میں پھیل رہا ہے۔ تاتاریوں نے بھی بغداد فنا کرنے کے بعد آخر اسی اسلام کی آغوش میں پناہ لی اور اسلام کو مٹانے والے ہی صدیوں تک اس کے محافظ بنے رہے ؎

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے　　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

③ **وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ** : وہ گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کی ہر بات جانتا ہے اور اپنی کمال حکمت کے مطابق جسے چاہتا ہے توبہ کی توفیق سے نوازتا ہے۔

④ ان آیات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کے علم میں پکے مومن تھے، تبھی یہ پیش گوئیاں انھی مومنین کے ہاتھوں پوری ہوئیں، انھوں نے ہی مکہ اور جزیرۂ عرب فتح کیا، روم، شام، یمن، ایران، عراق، افریقہ و ایشیا، مشرق سے مغرب تک اللہ تعالیٰ نے انھی کے ہاتھوں اسلام پھیلایا۔ ان کے ذکر سے مومنوں کے دل ٹھنڈے ہوتے ہیں اور کفار کے دل غصے سے بھر جاتے ہیں، دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیت۔

**آیت 16** ① **اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا** ...... : "**وَلِيۡجَةً**" " وَلَجَ يَلِجُ " (وَعَدَ) سے ہے جس کا معنی داخل ہونا ہے، یعنی دل کے اندر داخل ہو جانے والا، قلبی دوست اور محبوب، جس کے سامنے آدمی اپنے دلی راز بھی رکھ دے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ کفار کو کسی صورت دلی دوست نہ بناؤ، فرمایا: ﴿لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا﴾ [ آل عمران : ۱۱۸ ] ''اپنے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے۔'' احکامِ جہاد کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جہاد کی ایک حکمت بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے کھرے اور کھوٹے اہلِ ایمان کو الگ الگ کرنا چاہتا ہے اور ان لوگوں کو خالص کرنا چاہتا ہے جن میں جہاد اور صرف مسلمانوں سے دلی دوستی اور راز داری کا وصف پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ چیز لڑائی ہی سے نکھر کر سامنے آتی ہے۔ منافقین بھی بعض اوقات جہاد میں شریک ہو جاتے ہیں، مگر کفار

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت دینے والے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آگ ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۷﴾

سے دلی دوستی اور راز داری کا تعلق ختم نہیں کرتے، نہ ہی وہ صرف اللہ کی رضا کے لیے لڑتے ہیں، نیز دیکھیے سورۂ عنکبوت (۱ تا ۳) اور سورۂ آل عمران (۱۷۹)۔

② وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ تمھارے تمام اعمال سے پوری طرح باخبر ہے، وہ ظاہر اعمال کے ساتھ دل کا حال بھی جانتا ہے، اس لیے اپنے اعمال درست کرو اور ان کے لیے نیت خالص اللہ کی رضا رکھو۔

آیت 17 ① مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ ...... : یہاں تک کفار کے عہد و پیمان سے براءت کا اعلان، کفار سے جہاد، اس کے فوائد اور حکمتوں کا بیان تھا۔ اب یہ بیان شروع ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مساجد کی آباد کاری، ان کی نگرانی اور تولیت و خدمت مشرکین کا کسی صورت حق نہیں بنتا، کیونکہ مساجد تو خالص اللہ کے لیے ہیں: ﴿ وَ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [ الجن : ۱۸ ] ''اور یہ کہ بلاشبہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔'' سو ان کی نگرانی اور آباد کاری ان لوگوں کا حق کیسے ہو سکتا ہے جو خود اپنے آپ پر اس اکیلے مالک کے ساتھ کفر کے گواہ اور شاہد ہیں، جو حج اور عمرہ کے وقت بھی (جو صرف اللہ کے لیے ہیں) لبیک کہتے وقت غیروں کو علی الاعلان اس کا شریک بناتے ہیں۔ چنانچہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے: (( لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ )) ''حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ''اسی پر بس کر دو، آگے مت کہنا۔'' مگر وہ کہتے: (( إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَ مَا مَلَكَ )) ''مگر ایک شریک جو تیرا ہی ہے جس کا تو مالک ہے، وہ خود مالک نہیں۔'' وہ لوگ یہ الفاظ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے کہتے تھے۔ [ مسلم، الحج، باب التلبیة و صفتها و وقتها : ۱۱۸۵ ] ان کی اپنے کفر پر شہادت وہ تین سو ساٹھ بت بھی تھے جو انھوں نے کعبہ کے اندر اور اس کے اردگرد رکھے ہوئے تھے، کعبہ کی دیواروں پر بزرگوں اور دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنا رکھی تھیں۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی صورتیں بنا کر ان کے ہاتھ میں فال کے تیر پکڑائے ہوئے تھے، ان کی عبادت غیر اللہ کو پکارنا تھا، ان کا بیت اللہ کا احترام انتہائی بے حیائی، یعنی ننگے ہو کر مردوں اور عورتوں کا طواف کرنا تھا اور ان کی نماز تالیاں پیٹ کر اور سیٹیاں بجا کر مشرکانہ قوالیاں کرنا تھا۔ ایسے لوگ اللہ کے سب سے پہلے اور افضل گھر کے تو کجا اس کی کسی مسجد کے متولی، مجاور یا خادم بننے کا بھی کوئی حق نہیں رکھتے، اس لیے ان سے کعبہ اور دوسری مساجد کو آزاد کروانا مسلمانوں پر فرض ہے۔ علامہ اقبال نے یہاں ایک نہایت نفیس نکتہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے پوری زمین کو مسجد بنایا ہے، جیسا کہ فرمایا: (( جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا )) [ بخاری، التیمم، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ فلم تجدوا ماء ...... ﴾ : ۳۳۵۔ مسلم : ۵۲۳ ] اس

اِنَّمَا يَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمۡ يَخۡشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ۝۱۸ اَجَعَلۡتُمۡ سِقَايَةَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَةَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ كَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝۱۹

اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے ⑱ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ⑲

لیے مسلمانوں کے لیے غیرت اور ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ان کی مسجد پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو، نہیں بلکہ یہ ساری مسجد، یعنی ساری زمین مسلمانوں کے قبضے میں ہونی چاہیے اور کفار کو ان کے ماتحت ہونا چاہیے۔

② اُولٰٓئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ : یعنی انھوں نے اگر کچھ نیک کام کیے بھی ہیں، جیسے مسجد حرام اور حاجیوں کی خدمت وغیرہ، تو ان کے شرک کی وجہ سے وہ سب اکارت گئے۔

آیت 18 اِنَّمَا يَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ...... : آباد کرنے میں مساجد کی تعمیر، ان میں نمازوں کے لیے آنا، صفائی، روشنی، مرمت اور نگرانی وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں اور یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جن میں خصوصاً چار چیزیں پائی جائیں: ① اللہ اور یوم آخرت پر ایمان۔ ② ظاہر میں اس ایمان کی شہادت کے لیے نماز کا قیام۔ ③ زکوٰۃ کی ادائیگی۔ ④ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا، جبکہ مشرکین ان چاروں صفات سے عاری ہیں۔ مساجد کی تعمیر، آبادکاری اور ان کا ادب و احترام نہایت اعلیٰ درجے کا عمل ہے۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص اللہ کے لیے کوئی مسجد بنائے تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے اس جیسا گھر بنائے گا۔“ [ بخاري، الصلاة، باب من بنى مسجدًا : ٤٥٠ ] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام بلاد (جگہوں) میں سب سے زیادہ محبوب ان کی مسجدیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام بلاد (جگہوں) سے زیادہ ناپسند ان کے بازار ہیں۔“ [ مسلم، المساجد، باب فضل الجلوس في مصلاه ...... : ٦٧١ ]

آیت 19 اَجَعَلۡتُمۡ سِقَايَةَ الۡحَآجِّ ...... : اس آیت کے مخاطب مشرکین اور مسلمان دونوں ہیں، کیونکہ مشرکین کعبہ کی خدمت، تولیت اور حاجیوں کو شربت اور پانی پلانے پر بہت فخر کرتے تھے اور بعض مسلمان بھی اس کو سب سے اعلیٰ عمل سمجھتے تھے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس آپ کے اصحاب کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا، تو

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں درجے میں بہت بڑے ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں ﴿۲۰﴾ ان کا رب انھیں اپنی طرف سے بڑی رحمت اور عظیم رضامندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے ﴿۲۱﴾ جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس بہت بڑا اجر ہے ﴿۲۲﴾

ایک آدمی نے کہا کہ اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ میں کوئی کام نہ کروں تو مجھے کچھ پروا نہیں۔ دوسرے نے کہا، بلکہ مسجد حرام کی آباد کاری (افضل ہے)۔ ایک اور نے کہا، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ اس سے بہتر ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تو عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں ڈانٹا اور فرمایا کہ نبی ﷺ کے منبر کے پاس آوازیں مت بلند کرو، یہ جمعہ کے دن کی بات ہے، لیکن جب تم جمعہ پڑھ چکو گے تو میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤں گا اور تمھارے اس جھگڑے کا فیصلہ کروا لوں گا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [ مسلم، الإمارة، باب فضل الشهادة في سبيل الله تعالى : ۱۸۷۹ ] یعنی یہ کام گو فضیلت کے ہیں مگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے اور پھر یہ ایمان کے بغیر مقبول بھی نہیں۔ ﴿ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ شرک سب سے بڑا ظلم ہے، پھر جو اس پر اصرار کرے اس ظالم کو سیدھی راہ کیسے نصیب ہو؟

**آیت 20** ① اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا: "هَاجَرُوْا" یعنی اپنا دین اور جان و مال بچانے کے لیے اپنا گھر بار اور رشتہ داروں کو چھوڑا۔

② وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ: اس آیت سے مہاجرین کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے جن میں ابو بکر، عمر، عثمان، علی، ابوعبیدہ بن جراح، طلحہ، زبیر اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب پر راضی ہو اور ہمیں ان کے ساتھ اٹھائے۔ قرآن خود ان کے آخرت میں فائز و سرخرو ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ انھیں برا بھلا کہتے اور ان پر لعنت بھیجتے ہیں وہ خود لعنتی ہیں۔

**آیت 22،21** يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ ...... : "بِرَحْمَةٍ" اور "رِضْوَانٍ" پر تنوین تعظیم کی ہے۔ اب اس رحمت اور رضامندی کا کون اندازہ کر سکتا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ خاص اپنی طرف سے اور عظیم قرار دے رہا ہے، اگلی آیت میں دوبارہ اسے اجر عظیم قرار دیا ہے۔ جب مالک خود ان لوگوں سے راضی اور انھیں اپنی رحمت اور جنت کی خوش خبری دے رہا ہے، تو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ؕ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر سے محبت رکھیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا سو وہی لوگ ظالم ہیں ﴿۲۳﴾ کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات، جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ

ڈوب مرنا چاہیے ان لوگوں کو جو ان کے خلاف اپنی زبانیں کھولتے ہیں، اگر ان میں ذرہ بھر بھی غیرت اور شرم و حیا ہے۔ ورنہ سیدھی طرح اپنی بدتمیزی اور گستاخی سے توبہ کر کے ان کا وہ مقام تسلیم کرنا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول نے انھیں دیا ہے۔ یاد رہے کہ ایمان، جہاد اور ہجرت کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا اور وہ سب مجاہدین اس فضیلت میں شامل ہیں جو یہ شرف حاصل کریں گے۔ ابو حیان نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے تین وصف ایمان، ہجرت اور مال و جان کے ساتھ جہاد ذکر فرمائے، ان کے مقابلے میں تین ہی انعام ذکر فرمائے، ایمان کے مقابلے میں رحمت، کیونکہ وہ صرف ایمان سے حاصل ہوتی ہے اور سب سے عام ہے۔ جان و مال کے ساتھ جہاد کے مقابلے میں رضوان جو کسی سے حسنِ سلوک کی انتہا ہے اور ہجرت، یعنی وطن چھوڑنے کے بدلے میں جنت جو دائمی اقامت کا گھر ہے۔

**آیت 23** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ ...... : یعنی بعض لوگ دل سے مسلمان ہیں لیکن برادری سے تعلق توڑ بھی نہیں سکتے کہ اپنے اسلام کا اعلان کر دیں، ان کا حال یہاں سے سمجھو۔ (موضح) مزید دیکھیے سورۂ مجادلہ (۲۲)، سورۂ ممتحنہ (۱ تا ۳)، سورۂ آل عمران (۲۸، ۱۱۸) اور سورۂ مائدہ (۵۱)۔

**آیت 24** ① قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ ...... : یہ اور اس سے پہلی آیت دونوں مسلمانوں کے کسی خاص گروہ یا واقعہ سے متعلق نہیں بلکہ عام اور ہر زمانے کے لیے ہیں، ان میں تمام مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی محبت انھیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہیے، یہ تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے شمار فرمائی ہیں ہر انسان کو طبعی طور پر محبوب ہوتی ہیں، فرمایا: ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾ [ آل عمران : ١٤ ] ”لوگوں کے لیے نفسانی

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۲۴﴾

خواہشوں کی محبت مزین کی گئی ہے جو عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی ہیں، یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔'' ان چیزوں سے محبت کوئی گناہ بھی نہیں، بلکہ ان سے محبت اور ان کے حقوق کی ادائیگی آدمی کی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقاضا صرف یہ ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کے راستے میں جہاد سے بڑھ کر نہیں ہونی چاہیے۔ پیمانہ اس کا یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کا حکم ہو اور اسلام کی خاطر جہاد کرتے ہوئے سب کچھ قربان کر دینے کی ضرورت ہو اور دوسری طرف ماں باپ اور خویش و اقارب کی محبت ہو اور دنیا کے دوسرے تعلقات یا مفادات و خطرات اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہوں تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص اور ہر مصلحت سے بے پروا ہو کر اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے حکم کی پیروی کرے اور کوئی دنیوی مفاد یا خطرہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اسے اللہ کا حکم ماننے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے باز رکھ سکے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی وقت عذاب آ سکتا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی ﷺ نے بار بار واضح فرمایا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' [ بخاری، الإیمان، باب حب الرسول ﷺ من الإیمان : ۱۵، عن أنس رضی اللہ عنہ ] عبد اللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا رہے تھے اور عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے اپنی جان کے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب تک کہ میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔'' فرمایا: ''اب اے عمر! (تیرے ایمان کا معاملہ درست ہوا)۔'' [ بخاری، الأیمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی ﷺ : ۶۶۳۲ ]

**❷ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ:** ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم ''عینہ'' (حیلے کے ساتھ سود کی ایک قسم) کے ساتھ بیع کرو گے اور بیلوں کی دمیں پکڑ لو گے اور کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے، تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کرے گا جسے ختم نہیں کرے گا، جب تک تم اپنے دین (جہاد) کی طرف لوٹ نہیں آؤ گے۔'' [أبو داوٗد، البیوع، باب فی النھی عن العینۃ : ۳۴۶۲، و صححہ الألبانی ] زمخشری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ آیت بہت سخت ہے، اس سے سخت آپ کوئی آیت نہیں دیکھیں گے۔ یہ انسان کی دینی کمزوری اور یقین کی کمی کی نشان دہی کرتی ہے۔ اپنے دل میں بہت پرہیزگار اور متقی شخص انصاف سے سوچے کہ کیا واقعی اس میں اتنی دینی پختگی ہے کہ اس آیت میں مذکور تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّ یَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ۟ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۟

بلاشبہ یقیناً اللہ نے بہت سی جگہوں میں تمھاری مدد فرمائی اور حنین کے دن بھی، جب تمھاری کثرت نے تمھیں خود پسند بنا دیا، پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین تنگ ہوگئی، باوجود اس کے کہ وہ فراخ تھی، پھر تم پیٹھ پھیرتے ہوئے لوٹ گئے ﴿۲۵﴾ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کو سزا دی جنھوں نے کفر کیا اور یہی کافروں کی جزا ہے ﴿۲۶﴾

کی رضا کے خلاف ہونے کی بنا پر کسی معاملے میں چھوڑ سکتا ہے، یا کسی کی تھوڑی سی ناراضگی یا دنیا کے معمولی سے مفاد کی بنا پر وہ کش مکش میں پڑ جاتا ہے کہ کسے رکھوں اور کسے چھوڑوں؟ پھر اکثر یہی ہوتا ہے کہ اس کی بیوی، اولاد، دوستوں، معاشرے اور تجارتی مفاد کے تقاضے ہی اللہ کے دین کے تقاضوں پر غالب آتے ہیں۔ (الا ماشاء اللہ)

**آیت 26،25** ① لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ: بدر میں اپنے انعامات کے تذکرے، جہاد کی ترغیب، کفار سے دوستی ترک کرنے کی تلقین اور دنیا کی ہر چیز پر اللہ اور اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ کی ترجیح کے حکم کے بعد اب اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ مزید انعامات ذکر فرمائے، جن میں حنین کا خاص ذکر فرمایا، مگر حنین کا ذکر کرنے سے پہلے بہت سے گزشتہ مواقع میں (فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ) اپنی مدد کا ذکر فرمایا، ان میں ہجرت ﴿فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ [ التوبۃ : ۴۰ ] بدر ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ﴾ [ آل عمران : ۱۲۳ ] احد ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ [ آل عمران : ۱۵۲ ] خندق ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ﴾ [ الأحزاب : ۹ ] حدیبیہ ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا﴾ [ الفتح : ۱ ] فتح مکہ ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ [ النصر : ۱ ] یہودی قبائل ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ [ الحشر : ۲ ] اور منافقین سے معاملات وغیرہ سب شامل ہیں اور سب کا ذکر قرآن و حدیث میں مختلف مقامات پر موجود ہے، مگر ان کو یہاں بطور تمہید ذکر فرما کر اصل تذکرہ حنین کے دن کیے جانے والے انعام کا فرمایا اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی۔ حنین مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے، وہاں فتح مکہ (رمضان ۸ ھ) کے ایک ماہ بعد شوال ۸ ھ میں مسلمانوں کی ہوازن، ثقیف، بنو جشم، بنو سعد اور بعض دوسرے قبائل سے جنگ ہوئی تھی۔

② وَیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ ......: نبی ﷺ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تو ان مہاجرین و انصار کا تھا جو فتح مکہ

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

پھر اس کے بعد اللہ توبہ کی توفیق دے گا جسے چاہے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۷﴾

کے لیے آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے اور دو ہزار آدمی آپ کے ساتھ اہلِ مکہ (طلقاء) میں سے شامل ہو گئے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کا کل لشکر بارہ ہزار لڑنے والوں پر مشتمل تھا، جبکہ اس کے مقابلے میں دشمنوں کی تعداد صرف چار ہزار کے قریب تھی، اس پر بہت سے مسلمانوں میں عجب (خود پسندی) اور ایک قسم کا غرور پیدا ہو گیا، حتیٰ کہ بعض نے کہا آج ہم قلت تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا۔ (ابن کثیر) جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم وادیٔ حنین کی طرف چلے تو ہم تہامہ کی وادیوں میں سے ایک وادی میں اترے، وادی بڑی وسیع و عریض تھی، اس میں اوپر نیچے ٹیلے اور چھوٹی چھوٹی ڈھلوانی پہاڑیاں تھیں، ہم اوپر چڑھتے اور نیچے اترتے ہوئے آگے کی جانب بڑھتے اور لڑھکتے جا رہے تھے، ابھی صبح کا اندھیرا تھا، دشمن ہمارے لیے مختلف گھاٹیوں، کناروں اور تنگ گزرگاہوں میں پورے اتفاق اور مقابلے کی تیاری کے ساتھ چھپے بیٹھے تھے۔ اللہ کی قسم! ہمیں اترتے اترتے پتا ہی نہ چلا کہ دشمن نے مل کر اس طرح حملہ کیا جیسے ایک آدمی کرتا ہے۔ (دوسری روایات میں ہے کہ وہ زبردست نشانہ باز تھے، انھوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی) لوگ شکست کھا کر واپس پلٹے، وہ بھاگے جاتے تھے اور کوئی کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں طرف ایک جگہ ہو گئے، پھر فرمایا: ''لوگو! میری طرف توجہ کرو، میری طرف آؤ، میں رسول اللہ ہوں، میں محمد بن عبد اللہ ہوں۔'' کہیں سے جواب نہیں آ رہا تھا، اونٹ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے، لوگ ادھر ادھر نکل گئے، سوائے مہاجرین و انصار کے ایک گروہ اور آپ کے خاندان کے لوگوں کے جو زیادہ نہ تھے۔ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما آپ کے ساتھ ڈٹے رہے، آپ کے خاندان والوں میں سے علی بن ابو طالب، عباس بن عبد المطلب، ان کے بیٹے فضل، ابوسفیان بن حارث اور ایمن بن عبید جو ام ایمن کے بیٹے تھے اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم۔

[ أحمد : ۳۷٦/۳، ح : ۱۵۰۲۷، وحسنه شعيب الأرنؤوط۔ ابن حبان : ٤٧٧٤ ]

عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری آواز بڑی بلند تھی، اس وجہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا: ''اے عباس! کیکر (کے درخت) والوں کو آواز دو۔'' چنانچہ میں نے بلند آواز سے پکارا کہ کیکر (تلے بیعت رضوان کرنے) والے کہاں ہیں؟ اللہ کی قسم! ان لوگوں نے جب میری آواز سنی تو وہ ''ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں'' کہتے ہوئے اس طرح دوڑے جس طرح گائے اپنے بچے کی طرف دوڑتی ہے۔ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکر پکڑے اور دشمنوں کی طرف پھینکے، اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''محمد کے رب کی قسم! وہ شکست کھا گئے۔'' [ مسلم، الجهاد، باب غزوة حنين : ۱۷۷۵ ] یہ وہ وقت ہے جب مسلمان جم گئے اور فرشتے نازل ہوئے: ﴿وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ ''اور اس نے ایسے لشکر اتارے جنھیں تم نے نہیں دیکھا۔''

③ وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : اللہ تعالیٰ نے کفار کو یہ سزا دی کہ انھیں شکست فاش ہوئی، ان کے بچے اور عورتیں لونڈی و غلام اور ان کے اموال مسلمانوں کی غنیمت بنے، بہت سے بڑے بھی اسیر ہوئے اور دنیا میں کفار کی یہی جزا ہے۔

آیت 27 ① ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ : چنانچہ غزوۂ حنین کے تقریباً بیس روز بعد ہوازن کے بقیہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بات یہی ہے کہ مشرک لوگ ناپاک ہیں، پس وہ اپنے اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب

لوگ مسلمان ہو کر جعرانہ کے مقام پر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، رسول اللہ ﷺ کا ان لوگوں سے رضاعی رشتہ بھی تھا، کیونکہ آپ کی رضاعی ماں حلیمہ رضی اللہ عنہا انھی سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مسلمان ہونے کی توفیق بخشی، یہ اپنے اموال اور قیدی واپس لینے کی درخواست لے کر آئے۔ آپ نے فرمایا: ''تم نے آنے میں دیر کر دی، میں نے غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے تمھارا بہت انتظار کیا، اب دیکھ رہے ہو یہ لشکر میرے ساتھ ہے، اب ایک چیز کا انتخاب کر لو، یا اپنے اموال لے لو یا قیدی۔'' انھوں نے کہا، آپ ہمارے قیدی آزاد کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ان کے قیدی جو ابن کثیر کے مطابق (عورتیں بچے ملا کر) چھ ہزار تھے، سب مسلمانوں کو ترغیب دلا کر آزاد کر دیے، البتہ مال غنیمت واپس نہیں کیا۔ [ بخاری، المغازی، باب قول الله تعالى : ﴿ ويوم حنين...... ﴾ : ۴۳۱۸، ۴۳۱۹ ]

2 حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے غزوات کا آغاز بدر سے اور خاتمہ حنین سے کیا، اس لیے یہاں دونوں کو یکے بعد دیگرے ملا کر ذکر فرمایا، ان دونوں کے درمیان سات سال کا فاصلہ تھا، اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے مقابلے میں عرب کی جنگ کا انگارا بجھ گیا۔ پہلی جنگ نے انھیں خوف زدہ کر کے ان کی قوت توڑ دی تھی، آخری جنگ نے ان کی قوت کا خاتمہ کر دیا، ان کا اسلحہ بے اثر کر دیا اور ان کی جماعت کو اس طرح پیسا کہ ان کے لیے اسلام میں داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ادھر اس آخری جنگ میں مسلمانوں کو یہ سبق بھی خوب یاد کروا دیا کہ جنگ میں فتح تمھاری کثرت یا اسلحہ کی برتری کی وجہ سے نہیں بلکہ دین کی برکت اور اللہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔

آیت 28 1 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ...... : زمخشری نے فرمایا: ''نَجَسٌ'' مصدر ہے، کہا جاتا ہے ''نَجِسَ نَجَسًا وَ قَذِرَ قَذَرًا (ع، ن)'' گندا، ناپاک، پلید ہونا۔ گویا تمام مشرک اتنے ناپاک ہیں کہ یوں سمجھو کہ وہ سراسر نجاست ہیں۔ ناپاک ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ عقائد و اعمال اور اخلاق کے لحاظ سے گندے ہیں، ان کی نجاست معنوی نجاست ہے، بدن ناپاک ہونا مراد نہیں کہ اسے ہاتھ لگنے یا اس کے ہاتھ لگانے سے کوئی چیز پلید ہو جاتی ہو، اس لیے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنا، انھیں لونڈی و غلام بنا کر خدمت لینا جائز ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک عورت کے مشکیزوں کا پانی پیا۔ [ بخاری : ۳۵۷۱ ] اور آپ نے خیبر کے یہود کی دعوت قبول فرمائی۔ [ بخاری : ۲۶۱۷ ] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ہاتھ یا جسم لگنے سے کوئی چیز پلید نہیں ہوتی۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو مشرک بدنی طور پر بھی طہارت کا اہتمام نہیں کرتے، نہ استنجا، نہ غسل جنابت، نہ زیر ناف کی صفائی، نہ کسی نجاست سے اجتناب، پھر خنزیر کھانا، سگریٹ اور شراب پینا اور زنا کرنا ان کی عام روش ہے۔ الغرض مشرک جتنا بھی صاف ستھرا ہو، فرانس وغیرہ کی بنی ہوئی خوشبو جتنی بھی لگا لے اس کے جسم اور کپڑوں سے بد بو ختم نہیں ہوگی۔ مسلمان جتنا بھی میلا کچیلا ہو اس سے اس قسم کی بد بو کبھی نہیں آئے گی، بشرطیکہ نماز پڑھتا ہو، اگر نماز ہی نہیں پڑھتا تو مشرک کا اور اس کا معاملہ ایک جیسا ہی ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات

هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

نہ آئیں اور اگر تم کسی قسم کے فقر سے ڈرتے ہو تو اللہ جلد ہی تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا، اگر اس نے چاہا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۸﴾

ہے، اس لیے کفار کو مسلمان ہونے سے پہلے غسل کی تاکید کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو ناپاک قرار دے کر آئندہ کے لیے مسجد حرام کے قریب آنے سے بھی منع فرما دیا، چنانچہ جیسا کہ پہلے گزرا ہے ۹ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے اعلان کروایا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک ہرگز حج نہیں کرے گا۔ قریب آنے سے ممانعت کا صاف مطلب ہے کہ غیر مسلم کا پورے حرم مکہ میں داخلہ منع ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت ابن کثیر نے جابر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے اس سال کے بعد ہماری اس مسجد میں ذمی اور ان کے خادم کے سوا کوئی نہ آئے۔'' مسند احمد میں ایک اور روایت ہے: ''ہماری اس مسجد میں ہمارے اس سال کے بعد اہل کتاب اور ان کے خادموں کے سوا کوئی داخل نہ ہو۔'' مگر یہ دونوں روایتیں ثابت نہیں۔ شعیب الارنؤوط نے دونوں کی سند کو ضعیف کہا ہے، حسن بصری نے جابر رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا اور دو راوی اشعث بن سوار اور شریک ضعیف ہیں، لہٰذا کسی بھی غیر مسلم کو حرم مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں، بلکہ اپنی آخری وصیت میں تو آپ ﷺ نے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب ہی سے نکال دینے کا حکم دیا تھا، چنانچہ اس وصیت کے مطابق امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے یہود و نصاریٰ کو بھی جزیرۂ عرب سے نکال دیا۔

② مسجد حرام کے سوا دوسری مساجد میں غیر مسلم داخل ہو سکتا ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے بعض مشرکوں کو اپنی مسجد میں آنے کی اجازت دی اور ثمامہ کو مسجد کے ستون سے باندھنے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے۔

③ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً ...... : غیر مسلموں کی سال بھر تجارت اور حج و عمرہ کے لیے آمد و رفت بند ہونے سے وہ سامان تجارت جو وہ لایا کرتے تھے اور دوسرے مالی فوائد جو ان کی آمد سے اہل مکہ کو حاصل ہوتے تھے، لازماً ختم ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اندیشے کو رفع کرنے اور مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے یہ الفاظ نازل فرمائے کہ تجارت اور کاروبار کی بندش کی فکر مت کرو، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو تمھیں ضرور غنی کر دے گا، وہ سب کچھ جانتا ہے، یہ تو اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں کہ وہ مسلمانوں کو کیسے غنی کرتا ہے، مگر اس کا ہر کام اور ہر طریقہ حکمت پر مبنی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فتوحات عالم کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور وہ سب اللہ کے فضل سے غنی ہو گئے، پھر حج و عمرہ کرنے والے مسلمانوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ اہل مکہ کے لیے فقر کا مسئلہ ہی نہ رہا۔ اس وقت ۱۴۳۱ھ میں تقریباً ۳۵ یا ۴۰ لاکھ حاجیوں نے حج ادا کیا ہے اور حکومت سعودیہ کا اندازہ ہے کہ چند ہی سال میں یہ تعداد ایک کروڑ تک پہنچ جائے گی اور حکومت اس کے مطابق باقاعدہ حرم کی عمارات اور رہائشی عمارات کی توسیع کے منصوبے پر نہایت تیزی کے ساتھ عمل کر رہی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا

لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے

④ اِنْ شَآءَ : یہ بطور شرط نہیں بلکہ بات کو پختہ کرنے کے لیے ہے، کیونکہ ہر معاملہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فتح (۲۷)۔

آیت 29 ① قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ...... : مشرکین عرب سے قتال (لڑائی) کا حکم دینے کے بعد اب اہل کتاب سے قتال کا حکم دیا جا رہا ہے اور اس کی چار وجہیں بیان فرمائی ہیں: ① ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہے۔ رہا ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان کا دعویٰ تو وہ درست نہیں، کیونکہ وہ اس کے مطابق نہیں جو رسول اللہ ﷺ اور تمام رسولوں نے بتایا، بلکہ وہ اللہ پر ایمان کے بجائے اللہ تعالیٰ کی توہین والا عقیدہ رکھتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ [ التوبة : ۳۰ ] ''اور یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔'' یعنی یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر اسے محتاج ثابت کر رہے ہیں اور اس کی وحدانیت کا انکار کر رہے ہیں۔ ② یوم آخرت پر ان کا ایمان بھی کالعدم ہے، کیونکہ ایک تو وہ خاتم النبیین ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آپ کے بتانے کے مطابق نہ ہو وہ نہ ہونے کے برابر ہے اور پھر بھی وہ اپنے تمام اعمال بد کے باوجود جنت کے ٹھیکیدار ہونے کے دعوے دار ہیں، فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ [ البقرة : ۱۱۱ ] ''جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی یا نصاریٰ بنیں گے۔'' پھر یہودیوں نے زیادہ سے زیادہ چند دن جہنم میں رہنے کی، یعنی: ﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ [ البقرة : ۸۰ ] اور عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو اپنے گناہوں کا کفارہ قرار دے کر سرے ہی سے جہنم سے محفوظ رہنے کی آرزوئیں دل میں پال رکھی ہیں۔ کیا کوئی بھی سلیم العقل انسان ایسے یوم آخرت کو یوم جزا سمجھ سکتا ہے؟ اگر کوئی کہے کہ یہ بات تو اب بعض مسلمانوں میں بھی آ چکی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور اپنے پیشواؤں کے اعتماد پر جہنم سے بے فکر ہو چکے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ بھی انھی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو ان کے پیچھے چلنے سے منع فرمایا تھا۔ ③ وہ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر تو ان کا ایمان ہی نہیں، اس لیے ان کی حرام کردہ کو حرام سمجھنا تو دور کی بات ہے، وہ اپنی کتاب تورات میں مذکور حرام چیزوں کو بھی حرام نہیں سمجھتے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں انھوں نے سود لینا، رشوت اور حرام کھانا اختیار کر رکھا تھا، فرمایا: ﴿ وَ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾ [ النساء : ۱۶۱ ] یعنی ان پر لعنت کا سبب ان کا سود لینا تھا، حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانا بھی لعنت کا سبب تھا۔ نصرانیوں نے ایک نیا دین رہبانیت نکال لیا تھا، فرمایا: ﴿ وَ رَهْبَانِيَّةَ ا۟بْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [ الحديد : ۲۷ ] ''اور رہبانیت، اسے انھوں نے خود ہی ایجاد کر لیا، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔'' اور اب تو یہود و نصاریٰ نے مروت و انسانیت کی ہر حد پار کر کے زنا، قوم لوط کے عمل اور بے شمار

يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾

رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں ﴿۲۹﴾

---

خلافِ فطرت کاموں کو جمہوریت کے نام پر حلال قرار دے دیا ہے اور تمام دنیا کو زور و زبردستی سے ان میں مبتلا کرنے کی جد و جہد شروع کر رکھی ہے۔ ④ وہ دین حق قبول نہیں کرتے، حالانکہ اسے قبول کرنے کے لیے ان کے انبیاء کے صریح احکام موجود ہیں اور اسلام کے حق ہونے کے واضح دلائل ان کے سامنے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہلِ کتاب سے لڑنے کا حکم دیا۔ یہ ۹ ھ کی بات ہے، آپ نے رومیوں سے جہاد کی تیاری کی، لوگوں کو اس کے لیے دعوت دی، مدینہ کے اردگرد سے بھی لوگوں کو بلایا، تقریباً تیس ہزار مجاہد لے کر آپ روانہ ہوئے، مدینہ اور اس کے اردگرد کے منافقین ہی پیچھے رہ گئے، یا چند مخلص مسلمان۔ آپ نے شام کا رخ کیا، تبوک تک پہنچے، تقریباً بیس دن وہاں ٹھہرے، مگر رومی سامنے نہ آئے اور آپ اس علاقے کے لوگوں سے معاہدے کر کے واپس آ گئے۔ (ملخصاً) اس کے بعد خلفائے راشدین، بنو امیہ، بنو عباس اور دوسرے خلفاء نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو مسلمانوں کی عزت اور غلبہ بھی قائم رہا اور مشرق سے مغرب تک ان کی حکومت بھی رہی، مگر افسوس جب مسلمانوں نے اس حکم کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ کے شرعی اور کونی نظام کی مخالفت کے نتیجے میں انھیں خود ذلیل ہو کر زندگی گزارنا قبول کرنا پڑا۔ ہاں ایک گروہ ہے جو اس پر اب بھی قائم ہے اور قائم رہے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق غالب رہے گا۔

② **حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ**: اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کا مقصد ان کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانا نہیں، بلکہ اگر وہ اطاعت قبول کر لیں اور جزیہ دیتے رہیں تو وہ اپنے دین پر رہ کر پر امن زندگی گزار سکتے ہیں، اس کے عوض اسلامی حکومت ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہو گی۔ یہاں صرف اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر ہے، یعنی اہلِ کتاب کے سامنے تین راستے ہیں، مسلمان ہو جائیں یا جزیہ دے کر ماتحتی قبول کر لیں یا لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔ رہے دوسرے کفار تو عرب کے مشرکین کے سامنے دو ہی راستے تھے، اسلام قبول کریں یا قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائیں، الا یہ کہ وہ اس سے پہلے ہی جزیرۂ عرب سے نکل جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس سے بھی اہلِ کتاب والا معاملہ کیا۔ [ بخاری، الجزية، باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب : ۳۱۵۶، عن عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ] باقی دنیا کے مشرکین کے متعلق تاریخ اسلام میں مشرکین عرب والے سلوک کا کہیں ذکر نہیں، مثلاً ہندو، بدھ اور دوسرے بت پرست وغیرہ، بلکہ مسلمانوں نے انھیں بھی اپنی رعایا بنا کر ان سے بہترین سلوک کیا۔ اگر اسلامی لڑائی کا مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو جس طرح عیسائیوں نے اندلس میں اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان عیسائی نہ ہونے پر مٹا دیا، اسی طرح مصر، شام، عراق، ایران، ہند، چین، ترکستان وغیرہ ہر جگہ سے بزور شمشیر کفار کو ختم کر دیا جاتا۔ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں نہ ہوتے،

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کا اپنے مونہوں کا کہنا ہے، وہ ان لوگوں کی بات کی مشابہت کر رہے ہیں جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ انھیں مارے، کدھر بہکائے جا رہے ہیں ﴿۳۰﴾

بلکہ سارا ہند مسلمان ہوتا اور یہاں کفار کا نام و نشان تک نہ ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا، ارشاد ہوتا ہے: ﴿ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ [ البقرۃ : ۲۵٦ ] ''دین میں زبردستی نہیں۔'' جو مسلمان ہو سوچ سمجھ کر مسلمان ہو۔ ہاں یہ بات حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کسی طرح قبول نہیں کہ دنیا میں اللہ کے باغی غالب ہوں اور اسلام اور مسلمان مغلوب ہو کر رہیں، کیونکہ اس صورت میں نہ دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے نہ فتنہ و فساد ختم ہو سکتا ہے۔ امن صرف اسلام ہی کے ذریعے سے ممکن ہے، اس لیے تمام دنیا کے کفار سے اسلام قبول کرنے یا جزیہ دینے تک لڑتے رہنے کا حکم دیا گیا اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ کفار میں اتنی قوت کبھی نہ ہونے پائے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں آ سکیں، بلکہ لازم ہے کہ وہ اسلام کے مقابلے سے دستبردار ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور حقیر ہو کر رہیں۔ ''صٰغِرُوْنَ'' کا معنی یہی ہے کہ وہ محکوم بن کر اسلام کے سائے میں زندگی بسر کریں۔ اس جزیے کی رقم کا تعین ہر علاقے کے لوگوں کی مالی حالت کو مدنظر رکھ کر کیا جائے گا، جو ان کے ہر شخص کی طرف سے ہر سال ادا کیا جائے گا۔ معاذ رضی اللہ عنہ یمن گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کے برابر وہاں کے بنے ہوئے کپڑے وصول کرنے کا حکم دیا۔ [ أبو داوٗد، الخراج، باب في أخذ الجزیۃ : ۳۰۳۸ ]

**آیت 30** ① وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ ...... : پچھلی آیت میں اہل کتاب کے ساتھ قتال کی چار وجوہ بیان فرمائی تھیں، اب ان میں سے بعض کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [ الإخلاص ] ''کہہ دے اللہ ایک ہے، اللہ ہی بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ کبھی کوئی اس کے برابر کا ہے۔'' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کا بیٹا ماننے کی صورت میں اس کی بیوی بھی ماننا پڑے گی اور خاوند، بیوی، باپ، بیٹا ایک ہی جنس سے ہوتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں سے پاک ہے۔ الغرض ان سے قتال کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کے متعلق ان کا عقیدہ سراسر اللہ تعالیٰ کی توہین اور متعدد معبودوں کو ماننا ہے، تثلیث ( تین خدا ماننا ) ہو یا حلول ( کسی انسان یا مخلوق میں اللہ کا اتر آنا ) یا اتحاد کسی انسان کا خدا بن جانا، ان سب کو قرآن نے کفر قرار دیا۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۷۲، ۷۳ ) پھر جو شخص ہر چیز ہی کو اللہ تعالیٰ قرار دے، ''ہمہ اوست'' کا نعرہ لگائے، وحدت الوجود کو معرفت قرار دے، اس کے کفر میں کیا شک ہے؟ اسی طرح اب اگر کوئی مسلمان بھی یہ عقیدہ رکھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اللہ تعالیٰ ہی تھے، یا اس کے نور کا ٹکڑا تھے، یا اولیاء میں اللہ تعالیٰ اتر آتا ہے، یا ترقی کر کے ولی بھی اللہ تعالیٰ بن جاتا ہے اور اس کے اختیارات کا مالک بن جاتا ہے، اس

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا

انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا

لیے وہ " أَنَا الْحَقُّ " (میں ہی حق یعنی اللہ ہوں ) کا نعرہ لگاتا ہے اور "سُبْحَانِیْ مَا أَعْظَمَ شَانِیْ" (میں پاک ہوں، میری شان کتنی بڑی ہے ) کہتا ہے، تو بے شک یہ مسلمان کہلاتا رہے حقیقت میں یہود و نصاریٰ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں اور ہندوؤں کے کروڑوں خداؤں کے عقیدے اور اس کے عقیدے میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اس خبیث عقیدے سے تو تمام دین، تمام انبیاء و رسل اور ان کے احکام ہی بے کار ٹھہرتے ہیں۔ ایسے عقیدے والا شخص اپنے آپ کو تصوف یا معرفت یا طریقت کے پردوں میں لاکھ چھپائے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی تمام شریعتوں، رسولوں، کتابوں اور ان کے احکام کا منکر ہے، جس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے تقدس کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

② ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ : یعنی نہ عقل سے اس کی کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے نہ نقل سے، محض منہ کی بے کار بات ہے، جیسے خواہ مخواہ کوئی شخص مہمل اور بے معنی باتیں کرتا رہے۔

③ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ : یعنی ( یہ لوگ ) اہل کتاب ہو کر بھی مشرکوں کی ریس کرنے لگے۔ (موضح ) اور پہلی مشرک اور کافر قوموں کی طرح گمراہ ہو گئے۔ صاحب المنار فرماتے ہیں کہ شرق و غرب کے قدیم بت پرستوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اللہ ہونے، حلول اور تثلیث ( اور متعدد معبودوں ) کا عقیدہ ہند کے برہمنوں میں معروف تھا (اور اب بھی ہے )، اسی طرح چین، جاپان، قدیم مصریوں اور قدیم ایرانیوں میں بھی یہ عقائد مشہور و معروف تھے۔ اہل کتاب بھی ان کفار کی ریس کرنے لگے اور اب بعض مسلمان بھی ان کے نقش قدم پر چل پڑے۔

④ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ : یعنی یہ لوگ اس کے حق دار ہیں کہ ان کے حق میں یہ بددعا کی جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو دعا یا بددعا کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو خود جو چاہے کر سکتا ہے۔

آیت 31 ① اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ ...... : "حَبْرٌ" حاء کی زبر اور زیر دونوں کے ساتھ آتا ہے اور باء ساکن ہے، وہ عالم جو بہت خوب صورت اور پختہ بات کہے۔ یہ "تَحْبِيْرٌ" سے ہے جس کا معنی مزین کرنا ہے۔ رہبان، راہب کی جمع ہے، ڈرنے والا، یعنی جو اللہ کے خوف سے دنیا ترک کر کے لوگوں سے الگ کسی کٹیا میں جا ڈیرہ لگائے۔ ان کے مسیح ابن مریم علیہ السلام کو رب بنانے کا ذکر تو اوپر بھی آ چکا ہے، کیونکہ بیٹا باپ کے اختیارات میں اس کا شریک اور جانشین ہوتا ہے، اس لیے مسیح علیہ السلام کو بیٹا ماننے پر ان کو رب بنانے میں کیا کسر رہ گئی۔ رہے ان کے عالم اور درویش تو انھیں رب بنانے والے کچھ لوگ تو وہ تھے جو واقعی کائنات میں ان کا حکم چلنے کا عقیدہ رکھتے تھے، جس طرح آج کل بعض مسلمان پیروں، فقیروں کو سجدہ کرتے، ان سے اولاد، حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور یہ باطل عقیدہ رکھتے ہیں کہ کائنات کو قطب، ابدال اور اوتاد چلا رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ان پہلوں ہی کے نقش قدم پر چل رہے

لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۳۱﴾

ہیں، مگر بعض اہل کتاب نے انھیں ایک اور طریقے سے رب بنا رکھا تھا۔ چنانچہ عدی بن حاتم طائی، جو مسلمان ہو چکے تھے، فرماتے ہیں میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بت اپنے آپ سے اتار کر پھینک دو۔'' اور میں نے آپ سے سنا کہ آپ سورۂ براءت میں یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ میں نے کہا: ''احبار و رہبان کو رب تو کوئی نہیں مانتا۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ ان کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے، لیکن وہ جب ان کے لیے کوئی چیز حلال کر دیتے اسے حلال سمجھ لیتے اور جب ان پر کوئی چیز حرام کرتے تو اسے حرام سمجھ لیتے۔'' [ ترمذی، التفسیر، باب و من سورة التوبة : ۳۰۹۵، و حسنه الألبانی ]

گویا یہ ان کا دوسرا شرک تھا کہ انھوں نے حلال و حرام قرار دینے کا اختیار اپنے مشائخ و علماء کو دے دیا، حالانکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور ان پر لازم تھا کہ اپنے نبی کے بتائے ہوئے طریقے اور فرامین پر قائم رہتے۔ بالکل یہی طرز عمل ہمارے زمانے کے مقلدین کا ہے کہ ان کے امام کا قول صاف قرآن یا صحیح حدیث کے خلاف آ جائے تب بھی وہ قرآن اور صحیح حدیث ماننے کے بجائے اپنے امام کے حلال کردہ کو حلال اور اس کے حرام کردہ کو حرام کہیں گے، پھر اس پر اصرار کریں گے، مثلاً قرآن مجید کا صاف حکم ہے کہ رضاعت کی مکمل مدت دو سال ہے، مگر کچھ لوگوں نے اسے ماننے کے بجائے اپنے امام کے کہنے پر اسے اڑھائی سال قرار دے لیا اور رسول اللہ ﷺ کے صحیح اور صریح فرمان: ''ہر نشہ آور حرام ہے'' کے باوجود کھجور اور انگور کے سوا کسی بھی چیز سے بنی ہوئی نشہ آور چیز کو حلال قرار دے لیا، زنا کو حلالہ کہہ کر حلال کر لیا، اجرت پر لائی عورت سے زنا پر حد معاف کر دی، تیز دھار آلے اور آگ کے سوا جان بوجھ کر کسی بھی طریقے سے قتل کر دینے پر قصاص ختم کر دیا، بادشاہِ وقت سے اللہ تعالیٰ کی کئی حدود بالکل ہی معاف کر دیں، چور کے چوری کے مال پر ملکیت کے خالی دعوے سے، جس پر وہ کوئی دلیل بھی نہ دے، چوری کی حد ختم کر دی، گانے بجانے اور رقص کو مشائخ کے کہنے پر معرفت اور روح کی غذا قرار دے لیا اور بعض مشائخ و علماء نے عوام سے یہ بیعت لینا شروع کر دی کہ ہمارا ہر حکم، خواہ وہ قرآن و حدیث کے موافق ہو یا مخالف، تم مانو گے۔ بتائیے ان مسلمانوں کے احبار و رہبان کو رب بنانے میں کیا کسر رہ گئی؟! خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا وہ فرمان بالکل پورا ہوا کہ تم ہو بہو پہلے لوگوں کے نشان قدم پر چل پڑو گے، پھر ہر گروہ کے اپنے پیشوا کی غلط باتوں پر ڈٹ جانے سے مسلمانوں میں ایسا شگاف پڑا جو قرآن و حدیث کی طرف واپس آنے کے بغیر کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ ''اِتَّسَعَ الْخَرْقُ عَلَى الرَّاقِعِ'' کی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ شگاف پیوند لگانے والے کی بساط سے بھی زیادہ کھلا ہو گیا۔ پہلے (۷۲) گروہ بنے تھے یہ (۷۳) بن گئے۔ [ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ]

② یہود و نصاریٰ کا اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام کا اختیار دینا انھیں رب بنانا تھا، اب جب یہود و نصاریٰ نے احبار و

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور اللہ نہیں مانتا مگر یہ کہ اپنے نور کو پورا کرے، خواہ کافر لوگ برا جانیں ﴿۳۲﴾

رہبان کے کرتوتوں کو دیکھ کر ان سے بغاوت کر دی تو عوام کی اکثریت کو حلال و حرام کا اختیار دے کر انھیں رب بنا لیا اور اس نئے دین کا نام جمہوریت رکھا، جس میں حلال و حرام کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بجائے پارلیمنٹ کی اکثریت کرتی ہے، جو صریح شرک ہے۔ افسوس کہ مسلمان اس شرک میں ان کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں، بلکہ اسلام سے اس بغاوت پر فخر کرتے اور دن رات اس کی تعریف کرتے ہیں اور یہ کہنے میں کوئی حیا محسوس نہیں کرتے کہ رسول اللہ ﷺ بھی جمہوریت نافذ کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان بے چاروں کو معلوم نہیں کہ جمہوریت صرف ان امور میں مشورے کا نام نہیں جہاں اللہ اور اس کے رسول کا حکم موجود نہ ہو بلکہ یہ ایک الگ دین ہے جس کا رب بھی عوام یا ان کے نمائندے ہیں اور رسول بھی۔ انھی کو حلال و حرام اور جائز و ناجائز قرار دینے کا حق حاصل ہے۔ اس دین میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول یا اس کی کتاب کا کچھ دخل نہیں، ہاں دھوکا دینے کے لیے ان کا نام استعمال ہوتا ہے۔

❸ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ : مسیح ابن مریم علیہ السلام کو دوبارہ لا کر ان کا رب بنانا اس لیے ذکر فرمایا کہ یہودیوں نے عزیر علیہ السلام یا علماء و رہبان کی پرستش اس طرح نہیں کی تھی جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کی کی اور نہ وہ اس معنی میں عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ماننے کا اقرار کرتے ہیں جن معنوں میں نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ رہے احبار و رہبان تو ان کو یہود و نصاریٰ دونوں نے ایک ہی معنی میں رب بنایا تھا۔ پیچھے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا ذکر کر کے ان کی اس دلیل کو بھی بے معنی قرار دیا تھا کہ وہ تو باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے، اگر وہ رب نہیں تو ماں سے پیدا ہونے والا کیسے رب ہو گیا؟

❹ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا: یعنی یہ تمام بے ہودگی یہود و نصاریٰ نے تورات میں موجود واضح احکام کے باوجود اختیار کی کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، جو اب بھی تورات کی تحریف کے باوجود مختلف الفاظ کے ساتھ اس میں جا بجا موجود ہیں۔

**آیت 32** يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ...... : اللہ کے نور سے مراد اسلام اور اس کے صدق کے دلائل ہیں جو بے انتہا روشن ہیں۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کی تیسری قبیح صفت کا بیان ہے کہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کو روکنے اور اسے مٹانے کے لیے ہر قسم کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ یہاں ان کی اسلام کو روکنے اور مٹانے کی تمام کوششوں کے بے کار ہونے کو استعارے کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک طرف بہت ہی بڑا نور مثلاً سورج یا چاند ہو اور دوسری طرف اسے

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَ لَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾

وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک لوگ برا جانیں ﴿۳۳﴾

بجھانے کی سب سے کمزور کوشش منہ سے پھونکیں مارنا ہو تو ان پھونکوں کا انجام ہر ایک پر واضح ہے۔ اسی طرح ایک طرف اللہ کا نور، یعنی اسلام ہے، جسے اللہ تعالیٰ ہر حال میں پورا کرنا طے کر چکا ہے، دوسری طرف ان یہود و نصاریٰ کی اسے روکنے اور مٹانے کی حقیر اور بے کار کوششیں ہیں، جو سورج کو نہیں بلکہ کائنات کے سب سے بڑے نور کو سب سے حقیر چیز منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ بھلا اس سے وہ نور اسلام کی تکمیل کو روک سکتے ہیں؟

آیت 33 هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا دین اس لیے نہیں آیا کہ وہ کسی دوسرے دین، بت پرستی، دہریت، یہودیت، عیسائیت، جمہوریت یا سوشلزم سے مغلوب ہو کر اس سے مصالحت کرکے دنیا میں زندہ رہے، بلکہ دین اسلام کا اول و آخر مقصد یہ ہے کہ وہ دوسرے تمام ادیان اور نظام ہائے زندگی کو مغلوب کرکے ساری دنیا پر غالب دین اور نظام زندگی کی حیثیت سے زندہ رہے۔ یہاں "لِیُظۡهِرَهٗ" میں ظہور (غلبہ) سے مراد دلائل و براہین کے ساتھ غلبہ بھی ہے اور حکمرانی کے لحاظ سے بھی۔ پہلی قسم کا غلبہ تو ہمیشہ اور دائمی ہے اور آج تک کوئی شخص قرآن کے چیلنج تین آیتوں کی سورت کا جواب لانے کی جرأت نہیں کر سکا۔ دوسری قسم کا غلبہ ایک مرتبہ ہم دورِ نبوت و خلافت میں دیکھ چکے ہیں اور دوبارہ مزید غلبے کی بشارتیں ضرور پوری ہو کر رہیں گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے صحیح مومن ہونے کی شرط لگائی ہے، فرمایا: ﴿ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۹ ] "اور تم ہی غالب ہو اگر تم مومن ہو۔" الحمد للہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مختلف مقامات پر جہاد کے ساتھ اس کے آثار شروع ہو چکے ہیں۔ ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے لیے یہ زمین، اس کے مشرق و مغرب لپیٹ دیے گئے اور میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی جو میرے لیے اس میں سے لپیٹا گیا ہے۔" [ مسلم، الفتن، باب هلاك هذه الأمة بعضهم ببعض: ۲۸۸۹ ]

مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زمین کی پشت پر نہ کوئی اینٹ کا مکان اور نہ پشم کا (خیمہ) باقی رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا، عزت والے کو عزت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر، یا تو انھیں عزت بخشے گا تو وہ اس میں داخل ہو جائیں گے، یا انھیں ذلیل کرے گا تو اس کے تحت ہو جائیں گے۔ [ مستدرك حاكم : ۴/ ۴۳۰، ح : ۸۳۲۴، وصححه هو والذهبي ] یہ پیش گوئی ابھی پوری نہیں ہوئی، پوری ہو کر رہے گی۔ (ان شاء اللہ) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، اس پر مسلمانوں کی ایک قوی جماعت لڑتی رہے گی، حتیٰ کہ قیامت قائم ہو۔'' [ مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۲ ]

**آیت 35،34** ① يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ...... : سلسلۂ کلام کو دیکھیں تو یہاں احبار و رہبان سے مراد اہلِ کتاب کے عالم اور درویش ہیں، مگر الفاظ عام ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے علماء اور زہاد و صوفیا بھی اس میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ سب احبار و رہبان کو ایک جیسا قرار نہیں دیا بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں کا یہ حال بیان فرمایا کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۶۲، ۵۹) رازی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہود و نصاریٰ کے بہت سے احبار و رہبان کے فخر و کبر، اللہ کے محبوب ہونے، عام لوگوں سے اونچی مخلوق ہونے اور خدائی اختیارات کے دعووں کا ذکر کیا تو اب بتایا کہ ان تمام چیزوں کے اظہار سے ان کا مقصود لوگوں سے رشوت لے کر، غلط مسئلے بتا کر، رسول اللہ ﷺ کے متعلق بشارتوں کو چھپا کر اور ان کو غلط معنی پہنا کر ان کا مال باطل طریقے سے ہتھیانا اور انھیں اللہ کے راستے، یعنی اسلام سے روکنا ہے۔ اللہ جانتا ہے آپ یہود و نصاریٰ کے بہت سے احبار و رہبان کی جگہ آج کل مسلمانوں کے بہت سے احبار و رہبان کا لفظ لگا دیں تو آپ دونوں میں کوئی فرق نہیں پائیں گے، وہی خدا کے محبوب ہونے اور اس سے ہم کلام ہونے کے دعوے، اسی طرح ترک دنیا کا اظہار جس کے پیچھے بدترین حرص چھپی ہوئی ہے، تقدس کا اظہار جس کے پیچھے کتنی عفیفاؤں کی عزت لوٹنے کی وارداتیں موجود ہیں، دینِ اسلام کے عالم، ستون اور محقق ہونے کے دعووں کے باوجود وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنے یا اپنے پیشواؤں کے اقوال کو اللہ اور اس کے رسول کا حکم کہہ کر پیش کرتے اور اصل قرآن و سنت سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو کسی گدی نشین، خانقاہ کے شیخ یا دار العلوم کے حضرت صاحب (الا ما شاء اللہ) کا تجربہ کر لیں، آپ کو وہی فرشتوں جیسی پاکیزگی اور دنیا سے کامل بے رغبتی کے اظہار کے پیچھے بہت کچھ چھپا ہوا مل جائے گا۔ جس سے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی تصدیق ہو گی، آپ نے فرمایا: ''یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر (برابر) سوار ہو جاؤ گے، جس طرح ایک بالشت دوسری بالشت کے اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے برابر ہوتا ہے۔'' [ مستدرك حاكم ٤/ ٤٥٥، ح : ٨٤٠٤ ] ہاں، یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس دین کی حفاظت کا ذمہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہوا ہے، اس لیے آپ ہی کی پیش گوئی کے مطابق مسلمانوں میں اصل دین پر قائم رہنے والے اہلِ حق ہر طبقہ، مثلاً علماء، زہاد، مجاہدین، تجار وغیرہم میں قیامت تک موجود رہیں گے اور اللہ کی مدد سے غالب و منصور

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٤﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾

کرتے، تو انھیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دے ﴿٣٤﴾ جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے خزانہ بنایا تھا، سو چکھو جو تم خزانہ بنایا کرتے تھے ﴿٣٥﴾

رہیں گے، جیسا کہ چند احادیث پچھلی آیت کی تفسیر میں گزری ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل سے ان لوگوں میں شامل فرمائے۔

② وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ......: اس میں "اَلَّذِيْنَ" (وہ لوگ) سے مراد بعض صحابہ اور مفسرین نے یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان ہی لیے ہیں، جن کی پہلی دو کمینگیوں (باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانا اور اللہ کی راہ سے روکنا) کے بعد تیسری کمینگی سونا چاندی جمع کرنا بیان فرمائی ہے، کیونکہ بات انھی کی ہو رہی ہے، لیکن اکثر صحابہ اور مفسرین کے مطابق الفاظ کے عام ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ ہوں یا مسلمان، یہ کمینگی جس میں بھی پائی جائے وہ اس وعید کا مستحق ہے اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بھی شخص جو سونے یا چاندی کا مالک ہو، اس سے اس کا حق ادا نہ کرے، اس کے لیے قیامت کے دن آگ سے (اس سونے یا چاندی کی) سلاخیں یا تختے بنائے جائیں گے، پھر جہنم کی آگ میں انھیں خوب گرم کر کے اس کے پہلو، پیشانی اور پیٹھ کو داغا جائے گا، جب وہ ٹھنڈے ہو جائیں گے تو انھیں دوبارہ گرم کر لیا جائے گا، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، یہاں تک کہ بندوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے، تو وہ جنت یا آگ کی طرف اپنا راستہ دیکھے گا۔'' (لمبی حدیث ہے جس میں اونٹوں، بکریوں اور گھوڑوں وغیرہ کا حق ادا نہ کرنے والوں کی وعید بھی مذکور ہے) [ مسلم، الزکاۃ، باب إثم مانع الزکاۃ : ٢٤/٩٨٧ ]

③ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یہ ہے کہ زکوٰۃ دیتا رہے، اس کے علاوہ بھی ضرورت مندوں پر خرچ کرتا رہے، حاجت مندوں کو قرض دے، حق داروں کا حق ادا کرے، جیسا کہ "لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا" والی آیت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال دینے کا بیان ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (١٧٧) مثلاً اہل خانہ کے اخراجات، مہمان کی ضیافت، مسجد بنانا، جہاد کی تیاری میں مال خرچ کرنا وغیرہ۔

④ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: بعض صحابہ جیسے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی رو سے مطلقاً سونا چاندی جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے، مگر جمہور صحابہ جیسے امیر المومنین عمر، ابن عمر، ابن عباس، جابر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اس طرف گئے ہیں کہ جس مال کی زکوٰۃ دے دی جائے وہ یہ کنز نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس وعید کے تحت آتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''یہ زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے، جب زکوٰۃ کا حکم اترا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اموال کے پاک کرنے کا ذریعہ بنا دیا۔'' [ بخاری، التفسیر، باب قولہ عز وجل : ﴿ یوم یحمی علیھا ﴾ : ٤٦٦١ ] اگر ضرورت سے زائد سارا مال خرچ کرنا واجب ہو تو میراث

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰهِ اثۡنَا عَشَرَ شَهۡرًا فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ

بے شک مہینوں کی گنتی، اللہ کے نزدیک، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہے، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا

اور وصیت وغیرہ کا کچھ مطلب باقی نہیں رہتا اور ایک صحابی کو رسول اللہ ﷺ نے ارکانِ اسلام بتاتے ہوئے جب زکوٰۃ کے فرض ہونے کا ذکر فرمایا تو اس نے پوچھا: (( هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ )) ''کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی فرض ہے؟'' تو آپ ﷺ نے جواب دیا: (( لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ )) ''نہیں، مگر یہ کہ تو خوشی سے دے۔'' یعنی اس سے زائد فرض نہیں نفل ہے۔ [ بخاری، الإیمان، باب الزکوٰۃ : ٤٦۔ مسلم : ١١ ]

زکوٰۃ جس کی ادائیگی سے مال کنز کے حکم میں نہیں رہتا، پاک ہو جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی مقدار مقرر فرمائی۔ چاندی پانچ اوقیہ (۲۰۰ درہم) سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔ جب دو سو درہم ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ ہوگی، یعنی اڑھائی فیصد (چالیس میں سے ایک درہم) اور سونے میں جب تک بیس دینار نہ ہوں زکوٰۃ نہیں، جب بیس دینار ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ ہے، جو زیادہ ہو اس کی زکوٰۃ اسی حساب سے ہوگی۔ [ أبو داوٗد، الزکاۃ، باب زکاۃ السائمۃ : ١٥٧٣، عن علی، عن رسول اللہ ﷺ و صححہ الألبانی ]

**آیت 36** ❶ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰهِ اثۡنَا عَشَرَ شَهۡرًا ...... : سورۂ توبہ میں مشرکین سے براءت اور ان سے جہاد کے درمیان ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ﴾ آیت (۲۹) سے لے کر ﴿ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ ﴾ آیت (۳۵) تک سات آیات میں اہل کتاب سے قتال اور ان کے تینوں سربرآوردہ طبقات احبار، رہبان اور مال دار لوگوں کے بگاڑ کا ذکر اور مذمت کرنے کے بعد آگے ان دو آیات میں مشرکین کی کچھ مزید خرابیوں کا ذکر فرمایا۔

❷ یہود و نصاریٰ کی طرح مشرکین عرب بھی اللہ کے احکام بدلنے کے لیے حیلہ سازی سے کام لیتے تھے، مثلاً آسمان و زمین کی پیدائش کے دن سے تمام ادیان میں یہ طریقہ چلا آ رہا تھا کہ مہینے اور سال شمسی حساب یعنی سورج کے بجائے قمری حساب یعنی چاند کے لحاظ سے معتبر سمجھے جاتے تھے اور تمام عبادات میں یہی تاریخیں ملحوظ رکھی جاتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی طریقہ قائم رکھا، کیونکہ چاند کی حالت کا روزانہ بدلنا تاریخ کے تعین میں اتنا واضح اور آسان ہے کہ آبادیوں کے علاوہ جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور سمندروں میں رہنے والے لوگ کسی کیلنڈر کی محتاجی کے بغیر مہینوں اور سالوں کا حساب آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِيَآءً وَّالۡقَمَرَ نُوۡرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ ﴾ [ یونس : ٥ ] ''وہی ہے جس نے سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔'' اللہ تعالیٰ نے تمام شرعی احکام قمری حساب کے مطابق رکھے، جس میں دوسری بے شمار حکمتوں کے ساتھ یہ حکمت بھی ہے کہ یہ عبادات ہر سال ایک ہی موسم میں نہ آئیں بلکہ بدل بدل کر آتی رہیں، ورنہ کسی علاقے میں روزے ہمیشہ گرمی میں آتے، کہیں ہمیشہ سردی میں۔ قمری حساب کی وجہ سے حج بھی مختلف موسموں میں آتا ہے، تاکہ مسلمان سختی اور نرمی

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ

کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ سو ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور مشرکوں سے ہر

دونوں حالتوں میں روزہ و حج اور اللہ کے دوسرے احکام ادا کرنے کی عادت ڈال سکیں۔

قمری مہینا ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا ہے، نہ اس سے ایک دن کم نہ زیادہ اور سال بارہ ماہ میں ۳۵۴ یا ۳۵۵ دنوں کا ہوتا ہے، جبکہ شمسی سال ۳۶۵ دن اور ایک دن کے چوتھائی حصے کے برابر ہوتا ہے اور اس کے بارہ ماہ میں سے کوئی تیس، کوئی اکتیس دن کا اور فروری ۲۸ دن کا ہوتا ہے جو چوتھے سال ۲۹ دن کا شمار کیا جاتا ہے، شمسی سال کا ہر ماہ اور دن اپنے مقرر موسم ہی میں آتا ہے۔

③ قمری مہینوں میں سے چار ماہ کو دین ابراہیمی میں حرمت والے مہینے قرار دیا گیا تھا، جن میں ہر قسم کی لڑائی حرام تھی، حتیٰ کہ اگر کوئی ان دنوں میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ لیتا تو قتل نہ کرتا، جن میں سے تین مسلسل تھے ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم، تا کہ حج کے ایام اور ان سے ایک ماہ پہلے اور ایک ماہ بعد پورے عرب میں لوگ حج کے لیے بے خوف اور پرامن ہو کر حج کر سکیں اور رجب کا مہینا الگ رکھا، تا کہ لوگ امن کے ساتھ عمرہ کے لیے آنے جانے کا سفر کر سکیں۔

④ اللہ تعالیٰ نے یہاں مہینوں کی گنتی بارہ ماہ ہونے کی صراحت اس لیے فرمائی ہے کہ مشرکین عرب حج کو شمسی سال کی طرح ہر سال ایک ہی دن خوشگوار موسم میں ادا کرنے کے لیے قمری مہینوں کے سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لیے کبھی قمری سال میں اضافہ کر کے اسے تیرہ یا چودہ ماہ کا کر لیتے تھے اور اسے ”کبیسہ“ کہتے تھے۔ یہ بھی ”نسیٔ“ کی ایک صورت تھی، یعنی حرمت والے مہینے اپنے اصل مقام سے مؤخر ہو جاتے تھے اور حلال مہینوں کو وہ حرمت والا قرار دے لیتے تھے۔ جس سال رسول اللہ ﷺ نے حج کیا اس سال اتفاق سے حج اپنے اصلی دن، یعنی قمری لحاظ سے ۱۰ ذوالحجہ کو ادا ہوا تھا، اس کے بعد سے لے کر اللہ کے حکم کے مطابق حج اور اسلام کی دوسری تمام عبادات قمری تاریخ کے مطابق اصل وقت ہی پر ادا ہو رہی ہیں۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جو ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (حجۃ الوداع کے خطبہ میں) فرمایا: ”زمانہ گھوم پھر کر اپنی اس اصل پر آ گیا ہے جو اس دن تھی جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔ سال بارہ ماہ کا ہے، جن میں سے چار حرمت والے ہیں، تین پے در پے ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور مضر قبیلے کا رجب جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے۔“ [ بخاري، المغازي، باب حجة الوداع : ٤٤٠٦ ] آپ ﷺ نے اسے مضر کا رجب اس لیے فرمایا کہ بنو ربیعہ رمضان کو حرمت کا مہینا قرار دیتے تھے اور بنو مضر اصل رجب کو، اس لیے آپ ﷺ نے اس کے جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہونے کی تصریح فرمائی۔

⑤ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ : اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے مہینوں میں بے شک اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہو، بلکہ کچھ مقامات اور اوقات جو زیادہ فضیلت رکھتے ہیں، مثلاً مکہ، مدینہ، بیت المقدس، اللہ تعالیٰ کی مساجد، ماہ رمضان، لیلۃ القدر، حرمت والے ماہ وغیرہ، ان میں نیکی کی تاکید زیادہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ [ البقرہ :

كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

حال میں لڑو، جیسے وہ ہر حال میں تم سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ بے شک اللہ متقی لوگوں کے ساتھ ہے ۝ حقیقت یہی ہے کہ مہینوں کو پیچھے کر دینا کفر میں زیادتی ہے، جس کے ساتھ وہ لوگ گمراہ کیے جاتے ہیں جنھوں نے کفر کیا، ایک سال

۲۳۸ ] ''سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی۔'' اسی طرح ان میں ظلم سے باز رہنے کی تاکید بھی زیادہ ہے، حتیٰ کہ حرم مکہ میں ظلم کے ساتھ الحاد ( کج روی ) کے ارادے پر بھی عذاب الیم کی وعید ہے۔ دیکھیے سورۂ حج (۲۵) جب کہ دوسری جگہوں میں ارادے پر یہ مؤاخذہ نہیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مہینوں کو آگے پیچھے کر کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے اپنے آپ پر ظلم مت کرو۔

6 وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ...... : ''كَآفَّةً'' مصدر ہے اور فاعل اور مفعول دونوں سے حال بن سکتا ہے۔ یہ لفظ اسی طرح آتا ہے، اس کا تثنیہ یا جمع نہیں آتا، نہ اس پر ''الف لام'' آتا ہے اور یہ لازماً مؤنث ہی آتا ہے، جیسا کہ '' عَامَّةً '' یا ''خَاصَّةً '' ہے۔ ''كَآفَّةً'' کا معنی ''جَمِيْعًا '' ہے۔ اس کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ جس طرح مشرکین تم سے سب کے سب اکٹھے ہو کر لڑتے ہیں تم بھی سب مل کر ان سے اکٹھے ہو کر لڑو۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ بے شک یہ چار مہینے حرمت والے ہیں، مگر مشرکین چونکہ اس کی پروا نہیں کرتے اور عین حرمت والے مہینوں میں بھی وہ تم سے لڑنے سے دریغ نہیں کرتے، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ذوالقعدہ میں وہ لڑنے پر تیار ہو گئے تھے، اس سے پہلے انھوں نے حرم کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا تھا اور پھر وہاں داخلے سے روک دیا تھا، مسلمانوں پر ظلم کرنے میں نہ حرم کا خیال رکھا نہ حرمت والے مہینوں کا، اس لیے تم بھی ان سے تمام مہینوں میں اور ہر حال میں ہر جگہ لڑو، جس طرح وہ تم سے ہر حال میں ہر جگہ اور تمام مہینوں میں لڑتے ہیں۔ تفصیل ''التحرير والتنوير'' میں دیکھیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اور لڑو مشرکوں سے ہر حال، جیسے وہ لڑتے ہیں تم سے ہر حال۔'' اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ صراحت فرمائی ہے: ﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ [ البقرة : ۱۹۴ ] ''حرمت والا مہینا حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور سب حرمتیں ایک دوسری کا بدلہ ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اگر مشرکین حرمت والے مہینوں کی حرمت اور حرم مکہ کی حرمت کا پوری طرح پاس کریں اور ان میں کوئی جنگی کارروائی نہ کریں تو مسلمانوں کو بھی اس کا پاس رکھنا چاہیے، ورنہ ہر وقت اور ہر جگہ ان کے خلاف جنگ کی جائے گی، فرمایا: ﴿ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ﴾ [ البقرة : ۱۹۱ ] ''اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں۔''

آیت 37 ﴿ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ...... : ''النَّسِيْٓءُ'' یہ '' فَعِيْلٌ '' کے وزن پر مصدر ہے۔ ''نَسَأَ الشَّيْءَ'' کا

فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ

اسے حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام کر لیتے ہیں، تاکہ ان کی گنتی پوری کر لیں جو اللہ نے حرام کیے ہیں، پھر جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کر لیں۔ ان کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے گئے ہیں اور اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا﴿۳۷﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کے راستے میں

---

معنی ہے اس نے فلاں چیز کو مؤخر (پیچھے) کر دیا۔ اونٹوں کو حوض سے ہٹایا جائے تو کہا جاتا ہے: ”نَسَأْتُ الْإِبِلَ عَنِ الْحَوْضِ“ ”میں نے اونٹوں کو حوض سے پیچھے ہٹا دیا۔“ مشرکین ”نسی“ دو طرح سے کرتے تھے، ایک تو وہ جو اوپر حاشیہ (۴) میں بیان ہوا ہے، دوسرا یہ کہ وہ لوگ جنگ و جدل اور لوٹ مار کے عادی تھے، مسلسل تین ماہ اس کام سے باز رہنا ان کے لیے مشکل تھا، اس لیے وہ حرمت والے مہینے، مثلاً محرم کو حلال قرار دے کر اس سے اگلے ماہ صفر کو حرمت والا مقرر کر لیتے۔ ان کے ہاں بس چار ماہ حرمت والے پورے کرنے ضروری تھے، رہی ان کی تعیین تو وہ انھوں نے اپنے اختیار میں لے رکھی تھی، اسی کو اللہ تعالیٰ نے کفر میں زیادتی قرار دیا، کیوں کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینا تو اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں عبادات کے اوقات جو قمری حساب سے بدل بدل کر ہر موسم میں آتے رہتے تھے انھوں نے ان کے اصل اوقات سے ہٹا دیے تھے، یہ بھی کفر پر مزید کفر تھا۔ پھر وہ اپنے اس عمل پر خوش تھے اور شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال بھی خوشنما بنا دیے تھے۔ ﴿وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ یعنی اب جو حق کو چھپانے اور اس سے انکار پر تل ہی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے سیدھے راستے پر کیوں لائے گا؟ کفر کا معنی چھپانا اور انکار دونوں آتے ہیں۔

**آیت 38** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا ...... : سورت کے شروع سے لے کر ۳۷ آیات تک عرب کے مشرکین سے اعلانِ براءت اور اہل کتاب سے مسلمانوں کے تعلقات اور جہاد کے بنیادی احکام، بدر اور حنین کے واقعات اور ان میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غیبی مدد کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد اب جنگ تبوک کا تفصیلی ذکر اور اس میں منافقین کے کردار کو کھول کر بیان کیا گیا ہے اور اس جنگ سے پیچھے رہنے والوں پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے، اس لیے اس سورت کو فاضحہ یعنی منافقین کو رسوا کرنے والی بھی کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں جہاد پر ابھارنے کے لیے وعدہ وعید، انذار و تبشیر اور ثواب و عذاب وغیرہ کے بیان کے کئی طریقے اختیار کیے گئے ہیں، اس لیے اس کا نام بحوث یعنی نہایت ابھارنے والی سورت بھی ہے۔

② علمائے تفسیر متفق ہیں کہ یہاں سے ان لوگوں پر عتاب کا آغاز ہوتا ہے جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہے تھے، جب پھل تیار تھے، گرمی شدید تھی اور سائے نہایت خوش گوار محسوس ہو رہے تھے، اس لیے بعض نام نہاد مسلمان جہاد پر

بِالۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا مِنَ الۡاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیۡلٌ ﴿۳۸﴾

نکلو تو تم زمین کی طرف نہایت بوجھل ہو جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو؟ تو دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں نہیں ہے مگر بہت تھوڑا ﴿۳۸﴾

---

روانہ ہونے سے جی چرانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے بات شروع ہی ایمان کو حرکت دینے سے کی ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہو گیا؟ اپنے ایمان کے تقاضے ہی پر غور کرو، کیا اس کا تقاضا یہی ہے جو جہاد کے لیے نکلنے کے حکم پر تم اختیار کر رہے ہو۔ "اثَّاقَلْتُمْ" اصل میں "تَثَاقَلْتُمْ" تھا جو باب تفاعل سے ہے۔ "ثَقُلَ" سے بڑھا کر تفاعل میں لے جا کر بھاری ہونے کے مفہوم کو انتہا تک پہنچانے کے لیے لفظ بھی آخری حد تک بھاری بنا دیا "اثَّاقَلْتُمْ" یعنی نہایت بھاری اور بوجھل ہو جاتے ہو کہ اٹھانے سے نہیں اٹھتے، اس کا باعث اس کے سوا کیا ہے کہ تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کے معمولی، حقیر اور ناپائدار ساز و سامان پر جو کسی وقت بھی چھن جائے گا، اس آخرت کے مقابلے میں راضی ہو گئے ہو جو ہمیشہ رہنے والی ہے اور جس میں وہ نعمتیں ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھی ہیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ان کا خیال ہی کسی انسان کے دل میں آیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو دنیا کی زندگی کا یہ ساز و سامان تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑا ہے، کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ اس کی مثال تو سمندر کے مقابلے میں انگلی ڈبونے سے اس پر لگنے والے پانی کی سی ہے، جیسا کہ مستورد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا ہے۔ [ مسلم، الجنة و صفة نعیمها، باب فناء الدنیا ...... : ۲۸۵۸ ]

③ تبوک ایک مشہور مقام کا نام ہے جو مدینہ سے شمال کی طرف تقریباً چھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ واقعہ فتح مکہ کے بعد ۹ ھ میں پیش آیا۔ اس غزوے کا پس منظر یہ تھا کہ ملک شام پر قبیلہ غسان حکمران تھا، جو شاہِ روم کے تابع تھا، اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۂ عرب سے فارغ ہو چکے ہیں، اب ہماری باری ہے تو کیوں نہ شاہِ روم کو بلا کر عرب پر پہلے ہی چڑھائی کر دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ سرزمین عرب سے نکل کر دشمن کے علاقے، یعنی شام میں جا کر انھیں عرب پر حملے سے روکا جائے، چونکہ سفر بہت مشکل اور لمبا تھا، فصل کی کٹائی کا موسم تھا اور سواریاں اور سامان حرب بھی پوری طرح میسر نہ تھا، اس لیے اسے جیش العسرۃ "تنگی کے زمانے کا لشکر" کہا جاتا ہے۔ اس لیے اگرچہ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ آپ جب کہیں حملہ کرنا چاہتے تو توریہ کرتے، یعنی اصل جگہ کی نشان دہی کے بجائے ادھر ادھر کے متعلق لوگوں سے حالات معلوم کرتے، تاکہ لوگوں کو حملے کے اصل مقام کا پتا نہ چلے، لیکن اب آپ نے لوگوں کو صاف الفاظ میں اپنا ہدف واضح کر دیا اور سب کو نکلنے کا حکم دیا۔ تقریباً تیس ہزار مجاہد تیار ہو گئے۔ آپ نے اس سے پہلے شاہِ روم کو خط بھی لکھا تھا جس میں اسے دین اسلام کی دعوت دی۔ وہ اسلام لانے پر آمادہ بھی ہو گیا، لیکن قوم نے اس کا ساتھ نہ دیا، اس لیے وہ اسلام سے محروم رہا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر تبوک پہنچ گئے اور دشمن کا بیس دن تک انتظار کرتے رہے، مگر کسی میں مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی، نہ ہی کوئی جنگ ہوئی، اس علاقے کے اور ارد گرد کے

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۹ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ

اگر تم نہ نکلو گے تو وہ تمھیں دردناک عذاب دے گا اور بدل کر تمھارے علاوہ اور لوگ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نقصان نہ کرو گے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ۝۳۹ اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے ان لوگوں نے نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان

---

لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت کا عہد کیا، اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے۔ آپ دشمن کو خوف زدہ کر کے اسلام کی دھاک بٹھا کر کامیاب فاتح ہو کر واپس تشریف لائے۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سارا ملک شام فتح ہو گیا اور اسرائیل کے مقبوضہ حصے کے سوا اب تک اسلام کے زیر نگین ہے۔

**آیت 39** ﴿ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ...... : عذاب الیم یعنی دنیا میں ذلت و رسوائی، محکومیت اور غلامی اور آخرت میں آگ کا عذاب جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ ﴿ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ یعنی یہ نہ سمجھو کہ اگر ہم جہاد کے لیے نہ نکلیں گے تو اللہ تعالیٰ کا کام پورا ہونے سے رہ جائے گا، ہرگز نہیں، اگر تم نہ نکلو گے تو وہ تمھاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور انھیں اسلام غالب کرنے کے لیے جہاد کی سعادت سے نوازے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے، کیونکہ وہ تمھاری یا کسی اور کی مدد کے بغیر خود اکیلا ہی ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

**آیت 40** ① اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ ...... : یعنی اگر تم تبوک کے لیے نہیں نکلو گے اور اس کی مدد نہیں کرو گے تو وہ خود اکیلا ہی اس کی مدد کے لیے کافی ہے، دیکھ لو جب مکہ کے مشرکوں نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر کے اسے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کے ساتھ صرف ایک ساتھی تھا، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسی کی مدد کے بغیر خود اس کی مدد کی تھی۔ اب بھی اسے تم میں سے کسی کی ضرورت نہیں، ہاں تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ دشمنانِ اسلام کے مقابلے کے لیے نکلو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔

② ثَانِيَ اثْنَيْنِ: ''دو میں سے دوسرا'' سے مراد پہلا ہے۔ ''ثَانِيَ اثْنَيْنِ'' میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی طرح ''ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ'' یا ''رَابِعُ اَرْبَعَةٍ'' میں ثالث یا رابع وہ ہوگا جو پہلا ہوگا، باقی بعد میں ہوں گے، ہاں ''رَابِعُ ثَلَاثَةٍ'' یا ''خَامِسُ اَرْبَعَةٍ'' میں رابع یا خامس وہ ہوگا جو بعد میں ملے گا اور اس کا نمبر چوتھا یا پانچواں ہوگا۔ [ الوسیط للطنطاوی ]

**تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور اکثر دینی منصبوں اور عہدوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**

اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۰

لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۝۴۰

کے بعد دوسرے نمبر پر وہی فائز رہے۔ سب سے پہلے مسلمان ہوئے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، جس پر بہت سے جلیل القدر صحابہ ؓ مسلمان ہوئے، جنگوں میں آپ ﷺ سے الگ نہیں ہوئے۔ مرض الموت میں آپ ﷺ کے نہایت تاکیدی حکم کے ساتھ اور کسی بھی دوسرے کی امامت سے آپ ﷺ کے انکار کے بعد آپ کے قائم مقام کی حیثیت سے آپ ﷺ کے مصلے پر کھڑے ہوئے، پھر آپ کے پہلو میں دفن ہوئے، اس طرح اول و آخر صدیق اکبر ؓ کو دوسرا ہونے کا شرف حاصل رہا۔

③ **اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ** : یہاں صاحب (ساتھی) ہونے کا شرف بھی ابوبکر ؓ کو حاصل ہے۔ صاحب کا لفظ اصل میں اکثر اوقات ساتھ رہنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے بیوی کو " صَاحِبَةٌ " کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ﴾ [ الأنعام : ۱۰۱ ] ''اس کی اولاد کیسے ہو گی جبکہ اس کی کوئی بیوی ہی نہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ابوبکر ؓ کے صاحبِ رسول، یعنی آپ کے خاص ساتھی اور یار غار ہونے کا منکر ہے وہ درحقیقت قرآن کا منکر ہے۔ شاہ عبد القادر ؒ لکھتے ہیں: ''رفیقِ غار ابوبکر ؓ تھے، صرف یہی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، دوسرے اصحاب بعض پہلے نکل گئے تھے بعض بعد میں آئے۔'' (موضح)

④ **اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ** : اس غار سے مراد ثور پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع غار ہے، جو مکہ سے جنوب کی طرف تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ آپ کا تعاقب کیا جائے گا، اس لیے آپ نے مدینے کا راستہ جو شمال کی طرف ہے، چھوڑ کر جنوب کی سمت اختیار کی اور غار ثور میں چھپ گئے، تاکہ تلاش کرنے والے آپ کو آسانی سے پا نہ سکیں۔ تفسیر ماجدی میں ہے: ''اس غار کا دہانہ اب تک اتنا تنگ ہے کہ اندر صرف لیٹ کر ہی جانا ممکن ہے۔'' شیخ رشید رضا مصری نے تفسیر المنار میں ایک مصری امیر الحج ابراہیم رفعت پاشا (سنِ حج ۱۳۸۱ھ) کے حوالے سے غار کی پیمائش وغیرہ دی ہے اور اس کی تنگی کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ آپ ﷺ وہاں تین دن چھپے رہے، پھر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کی گرفتاری پر انعام مقرر ہو چکا تھا، اس لیے دشمنوں نے آپ کی تلاش کے لیے ہر ممکن کوشش کی، حتیٰ کہ بعض قدموں کے نشان پہچاننے والے غار کے سرے پر پہنچ گئے اور آپ ﷺ کو ان کے قدم نظر آنے لگے، ابوبکر ؓ کو آپ ﷺ کے متعلق فکر لاحق ہوئی اور وہ سخت غم زدہ ہو گئے۔

⑤ **لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** : انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر ؓ نے فرمایا، میں نے نبی ﷺ سے کہا، جب کہ میں اس غار میں تھا: ''اگر ان میں سے کوئی شخص اپنے قدموں کے نیچے نظر ڈالے تو ہمیں ضرور دیکھ لے گا۔'' تو آپ ﷺ نے

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

نکلو ہلکے اور بوجھل اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۴۱﴾

فرمایا: ''اے ابوبکر! ان دو کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ تعالیٰ ہے۔'' [ بخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب المهاجرين وفضلهم...... : ۳۶۵۳ ] ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' (بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے) اس ''ساتھ'' سے مراد خاص ساتھ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی خاص مدد اور نصرت، ورنہ عام معیت (ساتھ) تو ہر شخص کو حاصل ہے، فرمایا: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾ [ الحديد : ٤ ] ''اور وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔'' اس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سمندر کے کنارے پہنچنے پر اور فرعون کی فوج کو دیکھنے پر ان کی قوم نے اپنے پکڑے جانے کا خطرہ پیش کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ ﴾ [ الشعراء : ٦٢ ] ''ہرگز نہیں، بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے۔'' چنانچہ انھوں نے ''مَعِيَ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی معیت میں اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ ''بے شک اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔''

⑥ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ: یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔ بعض مفسرین نے مراد ابوبکر رضی اللہ عنہ لیے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ پر تو اللہ تعالیٰ کی سکینت پہلے ہی نازل تھی، مگر اس سے ''عَلَيْهِ'' کی ضمیر کی بعد میں آنے والی ضمیر ''وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا'' کے ساتھ مطابقت نہیں رہتی اور کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر پہلی سکینت کے علاوہ خاص سکینت نازل فرمائی ہو۔ جس سے آپ کے اطمینان میں مزید اضافہ ہوا ہو، اس لیے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ ''عَلَيْهِ'' سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

⑦ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا: یعنی فرشتوں کے لشکروں کے ساتھ جنھیں تم نے نہیں دیکھا کہ انھوں نے تعاقب کرنے والوں کی نگاہیں آپ پر پڑنے ہی نہیں دیں۔ جیسا کہ حنین میں مدد فرمائی (دیکھیے توبہ: ۲۶) اور بدر میں (دیکھیے انفال: ۹۔ آل عمران: ۱۲۴، ۱۲۵)۔

⑧ بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ عنکبوت (مکڑی) نے جالا بن دیا تھا اور کبوتری نے گھونسلا بنا کر انڈے دے دیے تھے، مگر یہ بات ثابت نہیں، الشیخ علامہ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے سلسلہ ضعیفہ میں عنکبوت کے قصے کو ضعیف قرار دیا ہے۔

⑨ وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ......: یعنی ہجرت، بدر، احد، خندق، حدیبیہ، فتح مکہ، حنین، تبوک، ہر جگہ کفر کو نیچا دکھایا۔ ''وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا'' اور اللہ تعالیٰ کا بول ہی سب سے بالا اور اس کی بات ہی سب سے اونچی ہے، اگر کہیں مسلمان نیچے رہے تو اللہ کی بات کے نیچا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ایمان و عمل کی کسی کمی کی وجہ سے، فرمایا: ﴿ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۹ ] ''اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔'' اور دیکھیے سورۂ محمد (۳۵)۔

آیت 41 ① اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ......: اللہ تعالیٰ نے تبوک کے لیے نہ نکلنے کی صورت میں دنیا و آخرت میں

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ

اگر کوئی قریب سامان اور درمیانہ سفر ہوتا تو وہ ضرور تیرے ساتھ جاتے، لیکن ان پر فاصلہ دور پڑ گیا اور عنقریب وہ اللہ کی

عذاب الیم کی وعید سنا کر اور نبی ﷺ کو اللہ کے سوا کسی کی مدد کا محتاج نہ ہونے کا ذکر فرما کر اب تاکید کے ساتھ تمام مسلمانوں کو جنگ کے لیے نکلنے کا حکم دیا، اسے ''نفیر عام'' کہا جاتا ہے۔ اس حکم کے بعد ہر مسلمان پر نکلنا فرض ہو جاتا ہے، ماں باپ یا کسی کے اذن (اجازت) کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ''ہلکے اور بوجھل'' الفاظ عام ہیں، اس لیے اس میں سب شامل ہیں، یعنی طبیعت چاہتی ہے یا نہیں، خوش حال ہو یا تنگ دست، مجرد ہو یا عیال دار، جوان ہو یا بوڑھے، ہتھیار بند ہو یا بے ہتھیار، ہر حال میں جہاد کے لیے نکلو۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ تو کہنے لگے: ''میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم بوڑھوں اور جوانوں سب کو نکلنے کے لیے کہا ہے۔'' ان کی اولاد نے کہا: ''ابا جان! آپ نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگیں لڑیں، حتیٰ کہ وہ فوت ہو گئے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی تو ہم آپ کی جگہ جنگ کریں گے، مگر وہ نہ مانے، چنانچہ انھوں نے سمندر کا سفر اختیار کیا، یہاں تک کہ فوت ہو گئے۔ تو سات دن تک انھیں دفن کرنے کے لیے کوئی جزیرہ نہ ملا اور اس دوران میں ان کے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ [ مستدرك حاكم : ۳/ ۳۵۳، ح : ۵۵۰۸، صححه الحاكم و سكت عنه الذهبی ] اسی طرح مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بڑھاپے اور بھاری جسم کے باوجود نکلے، ایک آدمی نے ان سے کہا، کاش آپ اس سال جنگ کے لیے نہ جائیں تو انھوں نے کہا: ''سورۂ بحوث (توبہ) ہمیں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ ''نکلو، ہلکے ہو یا بھاری'' اور میں اپنے آپ کو ہلکا ہی پاتا ہوں۔'' [ السنن الكبرىٰ للبيهقی : ۹/ ۲۱، ح : ۱۸۲۵٦ ]

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر میں شریک ہوئے، پھر ایک سال کے سوا کبھی مسلمانوں کی کسی جنگ سے پیچھے نہیں رہے۔ تاریخ کی کتابوں کے مطابق نوے سال کی عمر میں قسطنطنیہ جانے والے لشکر میں آپ شریک ہوئے، ان کے امیر یزید بن معاویہ تھے، بیمار ہوئے تو یزید ان کی بیمار پرسی کے لیے آئے۔ پوچھا: ''کوئی خواہش ہو تو بتائیں؟'' فرمایا: ''میری خواہش یہ ہے کہ جب میں فوت ہو جاؤں تو سوار ہو کر دشمن کی سرزمین میں جہاں تک آگے جا سکو جاؤ، جب اس سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہ رہے تو مجھے وہاں دفن کر دو، پھر واپس آ جاؤ۔'' ابوایوب رضی اللہ عنہ یہ آیت پڑھا کرتے: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ اور فرماتے: ''تو میں یا تو ہلکا ہوں گا یا بوجھل۔'' یعنی ہر حال میں نکلنے کا حکم ہے۔ [ مستدرك حاكم : ۳/ ۴۵۸، ح : ۵۹۳۰، سكت عنه الذهبی ]

② جہاد کے لیے نکلنا کسی شخص پر کب ہر حال میں فرض ہوتا ہے اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۱۶) کے حواشی۔

**آیت 42** لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا ...... : یہ آیت غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

قسم کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ ضرور جھوٹے ہیں ﴿۴۲﴾ اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انھیں کیوں اجازت دی، یہاں تک کہ تیرے لیے وہ لوگ صاف ظاہر ہو جاتے جنھوں نے سچ کہا اور تو جھوٹوں کو جان لیتا ﴿۴۳﴾

’’عَرَضًا‘‘ دنیا کا وہ ساز و سامان جو انسان کی خواہشوں کے پیش نظر رہتا ہے۔ ’’قَرِيْبًا‘‘ جس کا حصول بالکل آسان ہو۔ ’’قَاصِدًا‘‘ درمیانہ، یعنی جس میں شدید مشقت درپیش نہ ہوتی۔ ’’الشُّقَّةُ‘‘ وہ فاصلہ جو نہایت مشقت اور تھکن سے طے ہو۔ یہ مشقت سے مشتق ہے۔ ابوعبیدہ نے فرمایا ’’الشُّقَّةُ‘‘ کا معنی ارضِ بعید کا سفر ہے، یعنی اگر آسانی سے مالِ غنیمت ملنے کی توقع ہوتی اور سفر بہت لمبا نہ ہوتا، جس کا راستہ بھی نہایت کٹھن تھا تو یہ لوگ ضرور آپ کے ساتھ جاتے۔ مگر خالص فی سبیل اللہ جہاد جس میں آسانی سے حصولِ غنیمت کے بجائے مال و جان کی قربانی، بعید سفر اور شہادت کا واضح امکان سامنے ہو، منافق کے لیے نہات دشوار ہے۔

**آیت 43** عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ...... : ہوا یہ کہ جب نبی ﷺ تبوک کی طرف روانہ ہونے لگے تو بعض منافقین نے بناوٹی حیلے بہانے پیش کر کے آپ ﷺ سے مدینہ ہی میں رہنے کی اجازت چاہی، حالانکہ انھوں نے طے کر رکھا تھا کہ اجازت نہ ملی پھر بھی نہیں جائیں گے۔ اب ان کی آزمائش کے لیے انھیں اجازت دینے سے اس وقت تک گریز کرنا چاہیے تھا جب تک واضح نہ ہو جاتا کہ کس کا عذر حقیقی ہے اور کون بہانے باز ہے، مگر آپ ﷺ نے ان کی حقیقت کھلنے سے پہلے ہی انھیں مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس اجازت دینے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے ناراض ہونے کا اظہار فرمایا، مگر نہایت لطف و کرم اور مہربانی کے ساتھ کہ اس اظہار سے پہلے معاف کر دینے کی اطلاع دی اور پھر فرمایا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس میں پیچھے رہنے والوں کی مذمت بھی صاف نمایاں ہے، کیونکہ ان میں کم ہی تھے جن کا عذر صحیح تھا، اکثر جھوٹ ہی بول رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں ان لوگوں کو اجازت دینے پر ناراضی کا اظہار فرمایا جنھوں نے آپ سے اجازت مانگی اور انھیں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے بتایا جو جہاد میں نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے اور سورۂ نور میں فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [ النور : ٦٢ ] ’’بے شک جو لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔‘‘ وہاں مراد یہ ہے کہ منافقین اجتماعی کام مثلاً جہاد وغیرہ میں آئے ہوئے ہوں تو بغیر پوچھے کھسک جاتے ہیں، اجازت مانگتے ہی نہیں، جب کہ اہل ایمان ضرورت کے وقت بھی آپ سے پوچھے بغیر نہیں جاتے۔

لَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ ﴿۴۶﴾

تجھ سے وہ لوگ اجازت نہیں مانگتے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس سے کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کریں اور اللہ متقی لوگوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۴۴﴾ تجھ سے اجازت صرف وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، سو وہ اپنے شک میں حیران پھرتے ہیں ﴿۴۵﴾ اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے کچھ سامان ضرور تیار کرتے اور لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو انھیں روک دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ﴿۴۶﴾

---

**آیت 44** لَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ...... : کیونکہ انھیں تو خود جہاد میں جانے کا شوق ہے اور وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب انھیں اللہ کی راہ میں شہید ہونے کا موقع ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کے معاش میں ان کے لیے سب سے بہتر وہ آدمی ہے جو اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے ہے، اس کی پشت پر اڑتا پھر رہا ہے، جب بھی دشمن کی آمد پر کوئی خوف کی آواز یا گھبراہٹ سنتا ہے تو اڑ کر وہاں پہنچ جاتا ہے، وہ قتل اور موت کو ان جگہوں میں تلاش کرتا ہے جہاں وہ مل سکتی ہیں۔'' [ مسلم، الإمارة، باب فضل الجهاد والرباط : ۱۸۸۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

**آیت 45** اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ...... : پس مومنین اور منافقین کے درمیان فرق یہ ہے کہ جہاد کا اعلان ہونے پر مومن تو بلا تامل نکل کھڑے ہوتے ہیں، مگر جو منافق ہیں وہ بہانے تراشتے ہیں اور ہر ایسے موقع پر مذبذب بھی ہو جاتے ہیں، کبھی دل کہتا ہے چلو! شاید پیغمبر ﷺ سچ ہی کہتے ہوں اور کبھی دل میں آتا ہے نہیں، یہ سب ڈھکوسلے اور ڈرانے کی باتیں ہیں، بس دنیا میں چند روز جینا ہے، آرام سے دن کاٹ لیں۔

**آیت 46** ① وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنگ تبوک کے موقع پر منافقین اور ان تمام جھوٹے دعوے داروں کی حقیقت کھول دی جو کہتے ہیں کہ ہم بھی مجاہد ہیں اور ہر وقت جہاد کے لیے نکلنے کو تیار ہیں، مگر ساٹھ ستر برس کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود کبھی نہ مجاہدین کے ساتھ نکلے، نہ نشانہ بازی سیکھی، نہ تیراکی، نہ فنون حرب میں سے کوئی فن سیکھا، نہ کسی معرکے میں شریک ہوئے، نہ جہاد کے لیے جسم تیار کیا، نہ جہاد کے لیے درکار سامان جمع کیا۔ بس ڈگریوں کے حصول، ملازمت، کفار کی غلامی، کاروبار اور حلال و حرام ہر طرح دنیا کمانے میں لگے رہے، یا پیری فقیری اور ھُو حق میں لگے رہے۔ اولاد کو بھی اسی پر لگائے رکھا اور جب جہاد کا تذکرہ ہوا تو اللہ کے راستے میں نکلنے والوں پر دو چار طنزیہ

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرور تمھارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم میں فتنہ تلاش کرتے، اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں اور اللہ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے﴿۴۷﴾ بلاشبہ یقیناً انھوں نے اس سے پہلے فتنہ ڈالنا چاہا اور تیرے لیے کئی معاملات الٹ پلٹ کیے، یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا حکم غالب ہو گیا، حالانکہ وہ ناپسند کرنے والے تھے﴿۴۸﴾

فقرے کس کر اپنے آپ کو نفس سے جہاد کرنے والا مجاہد اکبر اور جان قربان کرنے والوں کو جہاد اصغر میں مصروف قرار دے دیا (جو نبی ﷺ کے ذمے صاف جھوٹ ہے)۔ ان کے جہاد اکبر اور نفس سے جہاد کی حقیقت ان کی جہاد کی تیاری ہی سے ظاہر ہے، اللہ تعالیٰ کو بھی ان کے نفاق اور بدعملی کی وجہ سے مخلص مجاہدین کے ساتھ ان کا نکلنا پسند نہیں ہے، تبھی اس نے انھیں نکلنے کی توفیق ہی سے محروم کر دیا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص مر گیا اور اس نے نہ جنگ کی اور نہ اپنے دل کے ساتھ کبھی جنگ کرنے کی بات چیت کی تو وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرے گا۔" [ مسلم، الإمارة، باب ذم من مات ولم يغز...... : ۱۹۱۰ ]

② فَثَبَّطَهُمْ : "ثَبَّطَهُ تَثْبِيْطًا" کسی آدمی کے کام میں رکاوٹ ڈال دینا، یا کسی طریقے سے اسے اس سے باز رکھنا۔

③ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ: اس سے ان کی مذمت مقصود ہے کہ انھوں نے اپنے نفاق، بزدلی اور بے ہمتی کی وجہ سے عورتوں، بچوں، بیماروں اور جنگ میں شرکت سے لاچار بوڑھوں کے ساتھ پیچھے بیٹھ رہنا پسند کر لیا۔

آیت 47 ① لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا ......: اس میں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی تمھارے لیے بہتر تھا، کیونکہ یہ لوگ ساتھ جا کر مزید خرابی ہی پیدا کرتے اور تمھارے درمیان فساد ڈالنے کی نیت سے ہر طرح کی دوڑ دھوپ کرتے، کبھی کسی کی چغلی کھاتے، کبھی ایک مسلمان کو دوسرے سے لڑانے کی کوشش کرتے اور کبھی مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی تدبیریں سوچتے، انھی وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انھیں نکلنے کی توفیق نہیں دی۔

② وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ......: تبوک کے لیے نکل آنے والوں میں بعض لوگ منافقین کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے دوسرے تمام مجاہدوں کو خبردار کیا ہے کہ تم میں سے بعض سادہ دل ان کی باتیں بڑے غور سے سنتے ہیں، حالانکہ ایسے بزدلی پھیلانے والوں کی بات سننی بھی نہیں چاہیے۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں، یعنی تمھاری کمزوریاں انھیں پہنچاتے ہیں۔ "بِالظّٰلِمِيْنَ" کے الف لام برائے عہد کی وجہ سے "ان ظالموں کو" ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے جو اس کام کا ارتکاب کر کے اپنے آپ پر بھی ظلم کر رہے ہیں اور دوسروں میں افتراق اور شبہات پیدا کر کے ان پر بھی ظلم کرتے ہیں۔

آیت 48 لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ......: اس آیت میں ان کے خبث باطن اور مزید مکاریوں کا پردہ چاک کیا گیا

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ لَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۴۹

اور ان میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے مجھے اجازت دے دے اور مجھے فتنے میں نہ ڈال۔ سن لو! وہ فتنے ہی میں تو پڑے ہوئے ہیں اور بے شک جہنم کافروں کو ضرور گھیرنے والی ہے ۝۴۹

ہے، یعنی آپ ﷺ کے خلاف مکر و فریب کرنا ان کی پرانی عادت ہے۔ پہلے بھی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی تدبیریں کرتے رہے، مگر جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو ان کے نہ چاہتے ہوئے غلبہ عطا فرمایا تو یہ بظاہر اسلام میں داخل ہوگئے، پھر بھی شرارتوں سے باز نہ آئے، جیسا کہ عبد اللہ بن ابی منافق نے غزوۂ احد کے دن کیا کہ عین میدان جنگ سے اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر لوٹ آیا۔ ہر موقع پر ان کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ رہیں، بنو نضیر اور دوسرے کئی یہودیوں کو قتل سے بچایا، بنو قریظہ کو ابھارتے رہے، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگایا، مسجد ضرار بنا کر مسلمانوں کے خلاف مورچہ تعمیر کیا، تبوک میں جانے پر بددلی پھیلاتے رہے۔ واپسی پر جب موقع ملا تو آپ ﷺ پر چھپ کر حملہ آور ہونے سے بھی دریغ نہ کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد سے مکہ فتح ہونے اور تبوک کی فتح کے بعد سارا عرب اسلام میں داخل ہوگیا اور یہ بے بسی سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔

آیت 49 ① وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ: فتنے کا معنی یہاں گناہ میں مبتلا ہونا کیا گیا ہے اور ہلاکت بھی۔ اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ آپ مجھے اتنی شدید گرمی میں اتنے طویل و پر مشقت سفر اور جنگ کا حکم دے کر گناہ میں نہ ڈالیں، کیونکہ اگر میں آپ کے حکم کے بعد نہ گیا تو گناہ گار ہوں گا اور گیا تو ہلاکت کا خطرہ ہے، ادھر گھر اکیلے رہ جائیں گے اور اہل و عیال ہلاک ہو جائیں گے، اس لیے آپ خود ہی مجھے مدینہ میں رہ جانے کی اجازت دے کر اس فتنے سے بچالیں۔ یہ تفسیر الفاظ کے قریب ہے، جنگ خندق میں بھی منافقین کے بہانوں میں سے ایک بہانہ گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا تھا۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۱۳) دوسری تفسیر یہ ہے کہ ایک منافق جد بن قیس نے یہ بہانہ بنایا کہ یا رسول اللہ! رومی عورتیں بہت خوبصورت ہیں، اگر میں وہاں چلا گیا تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکوں گا، اس لیے آپ مجھے معذور سمجھ کر یہاں رہنے کی اجازت دے دیجیے۔ (ہاں، میں مال خرچ کر کے مدد کروں گا)۔ [ المعجم الکبیر : ۲۷۵/۲، ح : ۲۱۵٤۔ أبو نعیم فی المعرفة ] اسے "هداية المستنير" والے نے ضعیف کہا ہے اور " الاستیعاب فی بیان الأسباب" والوں نے حسن کہا ہے۔ (واللہ اعلم!)

② اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا: یعنی بہانے تو یہ کرتے ہیں کہ ہم فتنے میں نہ پڑ جائیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فتنے ہی میں تو پڑے ہوئے ہیں کہ جہاد پر جانے سے گریز کر رہے ہیں۔ " فِي الْفِتْنَةِ " پہلے لانے سے حصر کا معنی حاصل ہوتا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر سے بڑھ کر بھی دنیا میں کوئی فتنہ ہوگا اور پھر جہاد میں شریک نہ ہونا خود ایک فتنہ ہے، اب تو

اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ يَتَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۵۰﴾ قُلۡ لَّنۡ يُّصِيۡبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوۡلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾

اگر تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں ہم نے تو پہلے ہی اپنا معاملہ سنبھال لیا تھا اور اس حال میں پھرتے ہیں کہ وہ بہت خوش ہوتے ہیں ﴿۵۰﴾ کہہ دے ہمیں ہرگز نہیں پہنچے گا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا، وہی ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ ایمان والے بھروسا کریں ﴿۵۱﴾

---

حیلے بہانے تراش کر یہ نکل جائیں گے، مگر جہنم کے گھیرے سے کیسے نکل پائیں گے؟

**آیت 50** **اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ** ...... : یہاں "**حَسَنَةٌ**" سے مراد کامیابی، فتح، غنیمت اور سلامتی ہے اور "**مُصِيۡبَةٌ**" سے مراد فتح حاصل کرنے میں وقتی ناکامی یا مسلمانوں کا زخمی اور شہید ہونا ہے۔ یہ بھی ان کے خبث باطن اور مکر وفریب کی ایک دلیل ہے کہ انھیں مسلمانوں کو کوئی فائدہ حاصل ہونا ناگوار ہوتا ہے اور اگر وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو خوش ہوتے ہیں اور انھیں اپنی ہوش مندی اور سیاست دانی کا پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی بچاؤ کر لیا تھا، جیسے جنگ احد کے بعد عبد اللہ بن ابی منافق نے کہا تھا کہ ہم تو اسی وجہ سے پہلے پلٹ آئے تھے کہ ہمیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہوگی اور وہ مارے جائیں گے۔ ایسے ہی وہ منافق جو غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ میں رہ گئے تھے، نبی ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق مشہور کرتے رہے کہ یہ لوگ رومیوں سے بچ کر نہیں آسکیں گے، لیکن جب انھیں اطلاع ملی کہ مسلمان صحیح وسالم فتح حاصل کر کے واپس آرہے ہیں تو انھیں انتہائی غم ہوا۔ (ابن کثیر) ان کی اس بدخصلت کے مزید تذکرے کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۵٦) اور نساء (۷۲)۔

**آیت 51** ① **قُلۡ لَّنۡ يُّصِيۡبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا** : یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان ویقین کی برکت کا ذکر ہے، سچ ہے: "مَنْ عَلِمَ سِرَّ اللّٰهِ فِي الْقَدَرِ هَانَتْ عَلَيْهِ الْمَصَائِبُ" "جس نے قضا وقدر میں اللہ تعالیٰ کے راز کو پالیا اس پر مصیبتیں آسان ہو جاتی ہیں۔" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کوئی مصیبت نہ زمین میں پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں، یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے، تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے۔" [ الحدید : ۲۲، ۲۳ ]

② **هُوَ مَوۡلٰىنَا** ...... : وہی ہمارا مالک، مددگار اور حمایتی ہے۔ ہم اپنے مالک پر خوش ہیں اور ایمان والوں کو تو بس اللہ ہی پر بھروسا رکھنا لازم ہے، نہ دنیا کے ساز وسامان پر اور نہ اس کے سوا کسی اور ذات پر۔ "**عَلَى اللّٰهِ**" کے پہلے آنے سے حصر کا مفہوم پیدا ہو گیا اور "**فَلۡيَتَوَكَّلِ**" میں فاء کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان منافقین کے رویے سے پیدا ہونے والی بددلی کا علاج

قُلۡ هَلۡ تَرَبَّصُوۡنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡدَى الۡحُسۡنَيَيۡنِ ؕ وَ نَحۡنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمۡ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖۤ اَوۡ بِاَيۡدِيۡنَا ۖ فَتَرَبَّصُوۡۤا اِنَّا مَعَكُمۡ مُّتَرَبِّصُوۡنَ ﴿۵۲﴾ قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا لَّنۡ يُّتَقَبَّلَ مِنۡكُمۡ ؕ اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ﴿۵۳﴾

کہہ دے تم ہمارے بارے میں دو بہترین چیزوں میں سے ایک کے سوا کس کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمھارے بارے میں انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تمھیں اپنے پاس سے کوئی عذاب پہنچائے، یا ہمارے ہاتھوں سے۔ سو انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) تمھارے ساتھ منتظر ہیں ﴿۵۲﴾ کہہ دے خوشی سے خرچ کرو، یا ناخوشی سے، تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ بے شک تم ہمیشہ سے نافرمان لوگ ہو ﴿۵۳﴾

---

چاہتے ہیں تو ایمان والوں کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسا رکھیں اور اس کے سوا کسی کی پروا نہ کریں۔

**آیت 52** **قُلۡ هَلۡ تَرَبَّصُوۡنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡدَى الۡحُسۡنَيَيۡنِ**......: "**اِحۡدَى**" کا معنی ایک اور "**الۡحُسۡنَيَيۡنِ**" "اَلۡحُسۡنٰى" کی تثنیہ ہے، جو "اَلۡاَحۡسَنُ" (اسم تفضیل) کی مؤنث ہے، یعنی سب سے اچھی دو چیزوں میں سے ایک۔ مسلمانوں کی مصیبت پر منافقین کی خوشی کا یہ دوسرا جواب ہے کہ ہم ہر حال میں سب لوگوں سے اچھے ہیں، دنیا میں یا تو ہمیں فتح اور غنیمت حاصل ہوگی جو بہترین چیز ہے، یا پھر ہم اللہ کی راہ میں شہید ہوں گے، تو یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اور ہماری عین تمنا ہے کہ ہم جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے ضمانت دی ہے جس نے اس کے راستے میں جہاد کیا۔ اسے اس کے راستے میں جہاد اور اس کی باتوں کو سچا یقین کرنے کے سوا کسی اور چیز نے نہیں نکالا کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا، یا اسے اس کے گھر جس سے نکل کر گیا ہے، اجر یا غنیمت دے کر واپس لائے گا۔'' [ بخاری، فرض الخمس، باب قول النبی ﷺ: أحلت لكم الغنائم: ۳۱۲۳، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ] اس کے برعکس منافقین ہیں کہ دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں یا اللہ کی طرف سے انھیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخرت میں اللہ کی طرف سے جہنم کے درکِ اسفل میں دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، پس ہم اور تم ایک دوسرے کے متعلق دو حالتوں میں سے ایک کے منتظر ہیں۔

**آیت 53** ❶ **قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا**...... : اوپر کی آیت میں بتایا کہ منافقین کے لیے بہرحال عذاب ہے، اب اس آیت میں فرمایا کہ اس عذاب سے کسی طور وہ نجات نہیں پا سکتے، کیونکہ آخرت میں ان کی کوئی نیکی قبول نہیں ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر بعض منافقین ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ ہمیں ساتھ جانے سے معافی دی جائے، اس کے عوض ہم مالی اعانت پر تیار ہیں۔ وہ یہ بات اس لیے کہتے تھے کہ کہیں مسلمانوں میں بالکل ہی بدنام ہو کر نہ رہ جائیں، انھی کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا کہ جن لوگوں کے دلوں میں نفاق اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی دشمنی بھری ہو، ان کی مالی امداد کسی

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور انھیں کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوئی کہ ان کی خرچ کی ہوئی چیزیں قبول کی جائیں مگر یہ بات کہ بے شک انھوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نماز کو نہیں آتے مگر اس طرح کہ سست ہوتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ ناخوش ہوتے ہیں ﴿۵۴﴾ سو تجھے نہ ان کے اموال بھلے معلوم ہوں اور نہ ان کی اولاد، اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں ﴿۵۵﴾

---

طور قبول نہیں، خواہ خوشی سے دیں یا مجبوراً۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جد بن قیس نے مال خرچ کرنے کی بابت جو کہا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں۔“ (موضح)

② اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: عمل کی قبولیت کے لیے تقویٰ شرط ہے جو تم میں ہے ہی نہیں، فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [المائدۃ: ۲۷] ”بے شک اللہ متقی لوگوں ہی سے قبول کرتا ہے۔“ اور دیکھیے سورۂ حج (۳۷) اور بقرہ (۲۶۵)۔

**آیت 54** وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ ......: اس آیت میں ان کے صدقات قبول نہ ہونے کے تین اسباب بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ ان کے دل اللہ اور اس کے رسول پر ایمان سے خالی ہیں، بلکہ وہ دونوں کے منکر ہیں اور ان کا کفر ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایمان کی بدنی شہادت نماز ہے، وہ بھی یہ لوگ خوشی اور نشاط سے نہیں بلکہ مارے باندھے سستی سے صرف اپنے ایمان کے دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں، ان کا سستی سے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کے سامنے ہوئے تو پڑھ لی اکیلے ہوئے تو چھوڑ دی۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۴۲) تیسرا مالی عبادت بھی خوش دلی سے نہیں بلکہ مجبوراً جرمانہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۴) اب ان کا خرچ کیا ہوا مال اللہ تعالیٰ کی جناب میں کیسے قبول ہو؟ پکے مومن تو اپنے مال کی پاکیزگی اور سکون قلب کے حصول کے لیے زکوٰۃ دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ [التوبۃ: ۱۰۳] ”ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے۔“

**آیت 55** ① فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ: یعنی آپ ان لوگوں کے مال و دولت، اولاد اور دنیوی چمک دمک سے دھوکے میں نہ پڑیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوتا تو یہ اس قدر مال دار اور صاحب اولاد کیوں ہوتے؟ بلکہ آپ ان کی ان چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۱) اور مومنون (۵۵، ۵۶)۔

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ بے شک وہ ضرور تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں اور لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں ﴿۵۶﴾ اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ پا لیں، یا کوئی غاریں، یا گھسنے کی کوئی جگہ تو اس کی طرف لوٹ جائیں، اس حال میں کہ وہ رسیاں تڑا رہے ہوں ﴿۵۷﴾

---

❷ **اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا**: یعنی دنیا میں ان چیزوں کو سعادت مندی خیال مت کریں، اللہ تعالیٰ نے انھیں صرف اس لیے ڈھیل دے رکھی ہے کہ دن رات مال جمع کرنے اور اولاد کی حفاظت کی فکر میں لگے رہیں، نہ انھیں دن کا چین نصیب ہو نہ رات کا آرام۔ سکون قلب جو فقط اللہ کی یاد سے حاصل ہوتا ہے، یعنی ﴿ **اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ** ﴾ [ الرعد : ۲۸ ] اس سے یہ سراسر محروم رہیں۔

❸ **وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ**: یعنی آخر دم تک انھیں توبہ کرنے اور سچے دل سے ایمان لانے کی توفیق نصیب نہ ہو، بلکہ جب یہ مریں تو اپنے مال اور اولاد ہی کی طرف ان کا دھیان ہو، نہ آخرت کی فکر نہ اللہ تعالیٰ سے کوئی غرض۔ اگرچہ مومن کو بھی اپنے مال اور اولاد کی فکر ہوتی ہے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے نزدیک ہر چیز سے مقدم ہوتی ہے اس لیے یہ چیزیں اس کے لیے نعمت ہی ہوتی ہیں وبال جان نہیں ہوتیں۔

**آیت 56** **وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ ......**: "فَرِقَ يَفْرَقُ (ع)" سخت خوف زدہ ہونا اور گھبرانا، یعنی یہ منافق تم سے شدید خوف کی وجہ سے اپنے کفر کا اظہار نہیں کر سکتے، نہ مقابلے میں آنے کی جرأت کر سکتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں انھیں اپنے قتل اور بیوی بچوں کے لونڈی غلام بننے کا سخت خطرہ ہے، اس لیے قسمیں کھا کھا کر تم میں سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نفاق آدمی میں دوسروں کا خوف اور بزدلی پیدا کرتا ہے۔

**آیت 57** **لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً ......**: "**مَلْجَاً**" "لَجَأَ يَلْجَأُ (ف، س)" سے اسم ظرف ہے، پناہ لینے کی جگہ۔ "**مَغٰرٰتٍ**" "مَغَارَةٌ" کی جمع ہے۔ "غَوْرٌ" گہری جگہ کو کہتے ہیں، پہاڑ یا زمین میں کوئی غار۔ "**مُدَّخَلًا**" "دَخَلَ" سے باب افتعال میں سے ظرف ہے، حروف بڑھ جانے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی مشکل اور مشقت سے گھس جانے کی کوئی جگہ۔ مطلب یہ ہے کہ انھیں فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، ورنہ اگر انھیں بری سے بری جگہ بھی جانے کے لیے مل جائے تو رسیاں تڑاتے ہوئے اس کی طرف بھاگ جائیں، کیونکہ بری سے بری جگہیں یہی تین ہو سکتی ہیں، جن کی طرف جایا جا سکتا ہے۔ "**يَجْمَحُوْنَ**" "جَمَحَ الْفَرَسُ" اصل میں گھوڑے کے منہ زور ہو کر سوار کے قابو سے نکل کر بھاگ جانے کو کہتے ہیں، یعنی انھیں مسلمانوں سے، ان کی مجالس اور ان کے معاشرے سے بڑا شدید بغض ہے مگر ان کا بس نہیں چلتا، اس لیے مسلم معاشرے میں رہنے اور

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّلۡمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَ اِنۡ لَّمۡ یُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ یَسۡخَطُوۡنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ ۙ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَیُؤۡتِیۡنَا اللّٰهُ

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تجھ پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں، پھر اگر انھیں ان میں سے دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انھیں ان میں سے نہ دیا جائے تو اسی وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں ﴿۵۸﴾ اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل

---

اس کے فوائد حاصل کرنے کے لیے تمھارے سامنے تمھارا ہونے کی قسمیں کھاتے ہیں۔

**آیت 58** **وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّلۡمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ ......:** " لَمَزَ (ض) " سامنے عیب نکالنا، طعن کرنا، یہ بھی منافقین کا شیوہ تھا کہ غنائم و صدقات کی تقسیم میں وہ رسول اللہ ﷺ پر طعن کرنے اور عیب لگانے سے باز نہیں آتے تھے۔ یہ نہیں کہ صرف صدقات کی تقسیم میں طعن کرتے ہوں، بلکہ یہ ان کے لگائے ہوئے الزامات میں سے ایک تھا، چنانچہ آپ غنائم یا صدقات تقسیم فرماتے تو کہتے دیکھو کیسی خویش پروری اور دوست نوازی ہو رہی ہے، انصاف نہیں ہو رہا۔ مطلب یہ کہ ہمیں کیوں نہیں ملا، ان کے ہاں انصاف کا پیمانہ بس اتنا تھا کہ انھیں مل جائے تو وہ خوش ہیں اور آپ ﷺ زبردست انصاف کرنے والے ہیں، لیکن اگر اسلام کی مصلحت کے پیش نظر یا کسی دوسرے شخص کے زیادہ ضرورت مند ہونے کی وجہ سے انھیں کچھ نہ مل سکے تو وہ سخت ناراض اور ان کے بقول نبی ﷺ عدل نہ کرنے والے۔ (نعوذ باللہ) ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کچھ تقسیم فرما رہے تھے کہ ذوالخویصرہ تمیمی آیا، کہنے لگا: ''یا رسول اللہ! عدل کیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں ویل ہو، جب میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون عدل کرے گا؟'' عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اجازت دیجیے میں اس کی گردن اتار دوں۔'' فرمایا: ''رہنے دو، اس کے کچھ ساتھی ہیں (اور ہوں گے) کہ تم میں سے ایک اپنی نماز ان کی نماز کے مقابلے میں اور اپنے روزے ان کے روزوں کے مقابلے میں حقیر سمجھے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔'' ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّلۡمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ﴾ [ بخاری، المناقب، باب علامات النبوۃ فی الإسلام : ۳۶۱۰ ] حنین کی غنیمتوں کی تقسیم کے وقت اور دوسرے کئی موقعوں پر بھی ان لوگوں نے اس قسم کی گستاخیاں کیں۔ خالد بن ولید اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ نے ان کے قتل کی اجازت مانگی، مگر آپ ﷺ نے فرمایا، رہنے دو۔ بعض موقعوں پر جب انھوں نے مہاجرین و انصار کو بھڑکا کر ایک دوسرے سے لڑا دیا اور آپ نے صلح کروا دی، اس وقت بھی عبد اللہ بن ابی نے اور اس کے ساتھیوں نے بہت بڑی گستاخی کی، جس کا ذکر سورۂ منافقون میں ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے اجازت مانگنے کے باوجود آپ نے ان کے قتل کی اجازت نہیں دی، یہ کہہ کر کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ سواء علیهم أستغفرت لهم ﴾ : ۴۹۰۵ ]

**آیت 59** ① **وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَیُؤۡتِیۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ......:** یعنی کاش! وہ طعنہ زنی اور عیب جوئی کے بجائے اس

مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ

سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں ﴿۵۹﴾ صدقات تو صرف فقیروں

طرح کہتے، کیونکہ ان کے حق میں یہی بہتر تھا اور یقیناً اللہ تعالیٰ بھی ان پر فضل کرتا مگر ان ناشکروں کو اتنی توفیق کہاں کہ اس قسم کا کلمۂ خیر کہہ سکیں، یہ تو جب بات کریں گے ایسی ہی کریں گے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی برائی کا پہلو نکلتا ہو۔

② بعض لوگوں نے اس آیت سے زبردستی یہ بات نکالنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی دیتے ہیں، حالانکہ ان آیات میں آپ کی زندگی میں غنیمت اور صدقات کی تقسیم کا ذکر ہو رہا ہے اور اگر شرک کی نجاست ذہن میں نہ بھری ہو تو اسی آیت میں یہ الفاظ "حَسْبُنَا اللّٰهُ" (ہمیں اللہ کافی ہے) پھر "سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ" اور "وَرَسُوْلُهٗۤ" کے درمیان "مِنْ فَضْلِهٖ" اللہ کے فضل کا ذکر کر کے دونوں کو الگ کرنا اور آخر میں "اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ" (بے شک ہم تو اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں) کے الفاظ واضح دلالت کر رہے ہیں کہ دینے والا فقط اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس سے پہلے فرمایا: ''کاش وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا۔'' اس کے بعد وہ الفاظ ذکر فرمائے جو اوپر ذکر ہوئے ہیں، جن کا معنی یہ ہے کہ اصل دینے والا تو اللہ ہے لیکن اس کے حکم سے تقسیم آپ کرتے تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ » [ بخاری، العلم، باب من يرد الله ...... : ۷۱ ] ''میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والا تو اللہ ہی ہے۔'' اپنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ اللہ کے حکم کے مطابق تقسیم فرماتے تھے، اب ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق امیر المومنین تقسیم فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کئی جگہ یہ اعلان فرمانے کا حکم دیا کہ میں نہ اپنے نفع و نقصان کا مالک ہوں نہ تمھارے اور یہ بھی کہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ دیکھیے سورۂ جن (۲۱)، اعراف (۱۸۸، ۱۹۷، ۱۹۸) اور فاطر (۱۳ تا ۱۵) جنگِ تبوک میں جب آپ سے سواریاں مانگنے کے لیے بعض مجاہد آپ کے پاس آتے اور آپ فرماتے کہ میرے پاس سواریاں نہیں ہیں جو میں تمھیں دوں، تو سواریاں حاصل نہ کر سکنے والے مجاہد روتے ہوئے واپس جاتے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۹۲)۔

**آیت 60** ① اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ ...... : منافقین کا طعن دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود صدقات کے حق دار بیان فرما دیے، تاکہ سب لوگ جان لیں کہ صدقات کی تقسیم کا رسول اللہ ﷺ کو بھی اختیار نہیں، لہٰذا آپ ﷺ پر طعن بے سود ہے۔ یہاں صدقات سے مراد فرض صدقات، یعنی زکوٰۃ و عشر ہیں، کیونکہ حکومت کی طرف سے وصولی کے لیے عاملین فرض زکوٰۃ ہی کے لیے بھیجے جاتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی ان کے پاس نفل صدقہ بھی جمع کروا دے۔ صدقہ کو صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کے لیے مال خرچ کرنے والا عملی طور پر اپنے ایمان کے صدق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر نفلی خرچ پر بولا جاتا ہے، مگر کبھی فرض پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ [ التوبۃ :

عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً

اور مسکینوں کے لیے اور ان پر مقرر عاملوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں الفت ڈالنی مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے میں اور تاوان بھرنے والوں میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافر میں (خرچ کرنے کے لیے ہیں)۔

۱۰۳ ] یہاں فرض صدقات ہی مراد ہیں۔ اس آیت کے آخر میں "فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ" سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ نفلی صدقات کو فریضہ نہیں کہا جاتا۔ "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ" سے معلوم ہوا کہ ان مقامات کے علاوہ زکوٰۃ و عشر خرچ کرنا جائز نہیں۔

② لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ: فقیر اور مسکین دونوں لفظ محتاج کے معنی میں آتے ہیں، بعض اہل علم فقیر کو زیادہ بدحال قرار دیتے ہیں، بعض مسکین کو اور بعض دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔ دلائل کے لحاظ سے راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ فقیر مسکین سے زیادہ بدحال ہوتا ہے، کیونکہ یہ "فقر" سے مشتق ہے، کمر کے مہروں کو " فَقَرَاتُ الظَّهْرِ" کہتے ہیں۔ فقیر بمعنی مفقور ہے، یعنی ضرورت کی اشیاء نہ ہونے کی وجہ سے گویا اس کی کمر ٹوٹی ہوئی ہے۔ مسکین "سکن" سے مشتق ہے کہ ضرورت مندی نے اس کی حرکت کو سکون میں بدل دیا ہے۔ گویا فقیر کی حالت اس شخص کی سی ہے جس کے پاس کچھ نہیں اور مسکین وہ ہے جس کی آمدنی اس کی ضروریات سے کم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ ﴾ [ الکھف : ۷۹ ] یعنی وہ کشتی چند مساکین کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کشتی کا مالک جو کام بھی کرتا ہو بالکل خالی ہاتھ نہیں ہوتا۔ ہاں، آمدنی ضرورت سے کم ہونے کی وجہ سے وہ ضرورت مند و محتاج ہوتا ہے۔ زیر تفسیر آیت میں فقراء کو پہلے لانے سے بھی ان کے زیادہ بدحال ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہ فرق اس وقت ضروری ہو گا جب فقیر اور مسکین دونوں لفظ اکٹھے آئیں، جیسے ایمان اور اسلام کا فرق ہے، لیکن الگ الگ آئیں تو دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح ان میں سے صرف فقیر یا مسکین کا لفظ آئے تو وہ دونوں قسم کے ضرورت مندوں پر بول لیا جاتا ہے، خواہ ان کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو۔ یہ دونوں زکوٰۃ کے مستحق ہیں، خواہ وہ بدحال فقیر ہوں یا سفید پوش ضرورت مند۔

③ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا: زکوٰۃ و عشر کی وصولی کے لیے رسول اللہ ﷺ آدمی مقرر فرماتے تھے اور باقاعدہ ان کا محاسبہ فرماتے تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ابن اللتبیہ رضی اللہ عنہ کو اس کام پر مقرر فرمایا تھا اور ان کی آمد پر محاسبہ کرتے ہوئے حکومت کے عمال کو ملنے والے تحائف کو ان کے لیے ناجائز قرار دیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے " كِتَابُ الْأَحْكَامِ" میں باب قائم فرمایا ہے: " بَابُ رِزْقِ الْحُكَّامِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا۔"

④ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ: اس سے مراد وہ نومسلم ہیں جن کی دل جوئی کر کے انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھنا مقصود ہو، یا وہ کفار جن کی دل جوئی سے ان کے اسلام لانے کی امید ہے، یا وہ بااثر لوگ جن پر خرچ کرنے سے کئی لوگوں کے مسلمان ہونے کی امید ہے، یا وہ کافر سردار جن پر خرچ کرنے سے ان کے علاقے میں مسلمانوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کی امید ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کے غلبے کے بعد یہ مد ختم ہو گئی، جیسا کہ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مگر موجودہ زمانے کے

مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

یہ اللہ کی طرف سے ایک فریضہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۰﴾

حالات کو سامنے رکھیں تو آج کل شاید رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے، کیونکہ کفار اسی طریقے سے مسلمانوں کو مرتد کر رہے ہیں۔

⑤ وَفِي الرِّقَابِ: گردنیں چھڑانے سے مراد غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا ہے۔ مکاتب غلاموں کی (جنھوں نے اپنے مالکوں سے اپنی قیمت قسطوں میں ادا کرنے کی شرط پر آزادی کا معاہدہ کیا ہوا ہے) مدد کرنا ہے۔ آج کل عدالتوں کے کفریہ نظام کی وجہ سے بے گناہ لوگ یا وہ گناہ گار جن کی شرعی سزا قید نہیں ہے، مگر کافرانہ قانون کی وجہ سے قید ہیں، یا کفر کی عدالتوں کا عائد کردہ جرمانہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے یا مقدمہ کے اخراجات ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے جیلوں میں سال ہا سال سے سڑ رہے ہیں ان کو چھڑانے پر زکوٰۃ صرف کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ (واللہ اعلم)

⑥ وَالْغٰرِمِيْنَ: وہ مقروض جو قرض ادا نہیں کر سکتے، یا وہ کاروباری لوگ یا زمیندار وغیرہ جو کاروبار یا فصل برباد ہو جانے کی وجہ سے زیر بار ہو گئے، اگر وہ اپنی جائداد میں سے قرض ادا کریں تو فقیر ہو جائیں، یا وہ بااثر لوگ جنھوں نے صلح کروانے کے لیے لوگوں کی دیتیں یا رقوم اپنے ذمے لے لیں، یہ سب غارمین میں آتے ہیں۔

⑦ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اس لفظ کے دو استعمال ہیں، ایک تو ہر نیکی ہی اللہ کے لیے اور اللہ کے راستے میں ہے اور فقراء و مساکین وغیرہ پر خرچ بھی فی سبیل اللہ ہے، جن کا ذکر اسی آیت میں پہلے ہو چکا ہے۔ دوسرا ان سب سے الگ فی سبیل اللہ ہے۔ اس سے مراد تمام مفسرین کے اتفاق کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ مجاہد غنی بھی ہو تو اس پر جہادی ضروریات کی خاطر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں حج و عمرہ کو بھی اس مد میں شامل کیا گیا ہے۔ آپ تفسیر کی کتابیں دیکھ لیں یا فقہ کی "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کی تشریح "هُمُ الْغُزَاةُ" ہی پائیں گے کہ اس سے مراد اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہیں، بلکہ اہل علم کا فیصلہ ہے کہ اگر ایک طرف فقراء و مساکین ہوں اور ایک طرف غازیانِ اسلام کو ضرورت ہو تو مجاہدین کی مدد کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ شکست کی صورت میں فقر و مسکنت کے ساتھ کفار کی غلامی کی ذلت اور اسلام کی بے حرمتی کی مصیبت بھی جمع ہو جائے گی۔

⑧ وَابْنِ السَّبِيْلِ: مسافر خواہ صاحب حیثیت ہو اگر سفر میں اسے ضرورت پڑ جائے تو اس پر زکوٰۃ میں سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

⑨ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ: معلوم ہوا کہ یہ مصارف فرض صدقات و عشر کے بیان ہوئے ہیں۔ چند اہل علم نے کہا کہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ اور عشر میں آنے والا مال آٹھ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور لازماً ہر مصرف میں خرچ کیا جائے، مگر رسول اللہ ﷺ اور خلفاء کے عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر اہل علم کا کہنا یہ ہے کہ ان میں سے جس مصرف میں زیادہ ضرورت ہو وہاں زیادہ بلکہ سب کا سب بھی صرف کیا جا سکتا ہے۔ ہاں، ان مصارف کے علاوہ خرچ کرنا جائز نہیں اور یہی بات درست ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے۔ یاد رہے کہ فرض صدقہ صرف مسلمانوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ

وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

اوران میں سے کچھ وہ ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں وہ (تو) ایک کان ہے۔ کہہ دے تمھارے لیے بھلائی کا کان ہے، اللہ پر یقین رکھتا ہے اور مومنوں کی بات کا یقین کرتا ہے اور ان کے لیے ایک رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۶۱﴾ تمھارے لیے اللہ کی قسم کھاتے ہیں، تاکہ تمھیں خوش کریں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہے کہ وہ اسے خوش کریں، اگر وہ مومن ہیں ﴿۶۲﴾

کو یمن بھیجتے وقت انھیں اہل یمن کو کلمۂ شہادت اور روزانہ پانچ نمازیں تسلیم کر لینے کے بعد زکوٰۃ بتانے کا حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال میں صدقہ فرض فرمایا ہے: (( تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ فَتُرَدُّ فِيْ فُقَرَاءِهِمْ )) ''جو ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور انھی کے فقراء پر واپس کر دیا جائے گا۔'' [ بخاري، الزكوٰة، باب أخذ الزكوٰة من الأغنياء ...... : ١٤٩٦ ] مولفۃ القلوب پر خرچ بھی دراصل مسلمانوں ہی پر خرچ کی ایک صورت ہے۔

آیت 61 ① مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ ...... : زمخشری نے فرمایا ''اُذُنٌ'' (کان) وہ آدمی ہے جو ہر ایک کی بات سن کر اسے سچا سمجھے۔ سنتے چلے جانے کی وجہ سے اس آدمی کا نام ہی کان رکھ دیا، جیسے جاسوس کا کام آنکھ سے تعلق رکھتا ہے، اس کا نام ہی ''عین'' (آنکھ) رکھ دیا گیا۔ ان منافقین کا مطلب یہ تھا کہ آپ کان کے کچے ہیں، ہر ایک کی بات سن کر اس پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ دیکھیے یہ آپ پر کتنا تکلیف دہ تبصرہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے والوں کے لیے سورۂ احزاب (۵۷) میں دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت اور رسوا کن عذاب کا ذکر ہے اور یہاں ان کے لیے عذاب الیم بیان فرمایا۔

② قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ : یعنی ہاں تمھاری بات اس حد تک صحیح ہے کہ محمد ﷺ ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں، مگر یہ الزام صحیح نہیں کہ ہر بات سن کر اس پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ اعتبار صرف اسی بات کا کرتے ہیں جو سچی اور حقیقی ہوتی ہے، جو پکے مومن بتاتے ہیں۔ جھوٹی بات کو سن تو لیتے ہیں مگر اس پر صبر اور درگزر سے کام لیتے ہیں، یہ چیز تمھارے حق میں خیر (بہتر) ہے۔ ورنہ آپ جھوٹی بات سن کر اگر اس پر فوراً مؤاخذہ کرنے والے ہوتے تو تم اپنے جھوٹے عذروں کی بنا پر یا تو کب کے قتل کر دیے گئے ہوتے یا مدینہ سے نکال دیے گئے ہوتے۔

③ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ : یہاں ایمان لانے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، چاہے دل سے ایمان دار نہ ہوں، ایسے لوگوں کے لیے رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے راز کھولتے نہیں بلکہ انھیں اپنی اصلاح کر لینے کا موقع دیتے ہیں۔ (فتح القدیر)

آیت 62 يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ...... : منافقین جب الگ مجلسوں میں بیٹھتے یا کہیں اکیلے ہوتے تو مسلمانوں

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرے تو بے شک اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے، یہی بہت بڑی رسوائی ہے﴿۶۳﴾ منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی ایسی سورت اتاری جائے جو انھیں وہ باتیں بتا دے جو ان کے دلوں میں ہیں۔ کہہ دے تم مذاق اڑاؤ، بے شک اللہ ان باتوں کو نکال ظاہر کرنے والا ہے جن سے تم ڈرتے ہو﴿۶۴﴾ اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے تو ضرور ہی کہیں گے ہم تو صرف شغل کی بات کر رہے تھے اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہہ دے کیا تم اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ مذاق کر رہے تھے؟﴿۶۵﴾

اور رسول اللہ ﷺ پر پھبتیاں کستے۔ مسلمانوں کو یا نبی ﷺ کو اگر کبھی ان کی اطلاع ہو جاتی تو وہ قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں کو راضی کرنے کی کوشش کرتے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی پروا نہ کرتے۔ اس آیت میں منافقین کی اس حرکت کا ذکر کیا گیا ہے۔

**آیت 63** اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ...... : "يُحَادِدِ" یہ "حَدٌّ" سے مشتق ہے جس کا معنی "جانب" ہے۔ باب مفاعلہ عموماً مقابلے کے لیے آتا ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول ایک جانب ہوں اور یہ اس کے مقابلے میں دوسری جانب ہوں۔ آگے سوال کے طور پر ان کا انجام ذکر فرمایا کہ کیا انھیں یہ معلوم نہیں؟ سوال کا مقصد پوچھنا نہیں بلکہ بتانا ہے کہ یہ بات اتنی واضح ہے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے مقابلے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

**آیت 64** يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ...... : اب منافقین کی مزید کمینی حرکتوں کا ذکر ہوتا ہے اور کافی آگے تک چلا جاتا ہے، اس بنا پر اس سورت کو "الفاضحہ" بھی کہتے ہیں، یعنی منافقوں کے راز کھولنے والی اور ان کو رسوا کرنے والی۔ منافقین بظاہر ایمان کے باوجود دل میں رسول اللہ ﷺ سے کفر رکھتے تھے، ان میں سے بعض رسول اللہ ﷺ کو سچا سمجھنے کے باوجود ضد اور تعصب کی وجہ سے دل میں آپ سے کفر رکھتے تھے، کچھ شک میں مبتلا تھے، اس لیے ایمان سے خالی تھے اور جو بالکل دل سے آپ کو جھوٹا سمجھتے تھے وہ بھی کئی دفعہ مشاہدہ کر چکے تھے کہ جوں ہی وہ ایسی کوئی بات یا حرکت کرتے تو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کر دیتا، اس لیے وہ اپنے دلی کفر کی وجہ سے کبھی کبھی آپس میں اپنے دلی بغض کا اظہار کر لیتے، مگر ساتھ ہی خوف زدہ رہتے کہ کوئی سورت اترے گی جو ان کے راز اور دلی کیفیت ان کے سامنے اور مسلمانوں کے سامنے کھول کر رکھ دے گی۔ "تُنَبِّئُهُمْ" میں "هُمْ" کی ضمیر منافقوں کی طرف بھی جا سکتی ہے اور مومنوں کی طرف بھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تم مذاق اڑا لو، تم جس بات کے ظاہر ہونے سے ڈر رہے ہو اللہ تعالیٰ یقیناً اسے سب کے سامنے لے آنے والا ہے۔

**آیت 65** وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ...... : منافق آپس میں گپیں لگاتے ہوئے اللہ، اس کے رسول اور آیاتِ الٰہی کا مذاق

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۶۶ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۶۷ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۶۸

بہانے مت بناؤ، بے شک تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں تو ایک گروہ کو عذاب دیں گے، اس وجہ سے کہ یقیناً وہ مجرم تھے ۶۶ منافق مرد اور منافق عورتیں، ان کے بعض بعض سے ہیں، وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں بھلا دیا۔ یقیناً منافق لوگ ہی نافرمان ہیں ۶۷ اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، وہی ان کو کافی ہے اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے ۶۸

اڑاتے۔ رسول اللہ ﷺ کو کسی ذریعے سے یا وحی الٰہی سے اطلاع ہوتی اور آپ پوچھتے تو وہ کہتے ہم تو یوں ہی راستہ کاٹنے کے لیے شغل کی باتیں اور دل لگی کر رہے تھے۔ فرمایا ان سے کہیے کہ تمھارے آپس کے شغل اور دل لگی کا اللہ اور اس کے رسول اور اس کی آیات کے ساتھ مذاق سے کیا تعلق اور کیا دل لگی کے لیے تمھیں یہی ملے ہیں؟ وہ لوگ بار بار معذرت کرتے، مگر رسول اللہ ﷺ یہی فرماتے۔

**آیت 66** ① لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ...... : بہانے مت بناؤ، صاف مانو کہ تم نے ایمان لا کر پھر صریح کفر کیا ہے۔ جو شخص دین کی باتوں میں ٹھٹھا کرے اگرچہ دل سے منکر نہ ہو تو وہ کافر ہو گیا، اگر یہ نہ بھی ہو تو تب بھی وہ منافق تو لازماً ہے۔ اصل یہ ہے کہ دین کی باتوں میں ظاہر و باطن کا باادب رہنا ضروری ہے۔ (موضح)

② اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ ...... : یعنی جس نے نفاق سے توبہ کر لی اور آئندہ مخلص ہو کر زندگی بسر کی، اسے تو ہم معاف کرتے ہیں مگر جو اپنے کفر پر قائم رہا اسے ضرور عذاب ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی دیکھیے منافقین کو بھی اخلاص اختیار کرنے پر معافی کا وعدہ اور اس کی ترغیب دی جا رہی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی منافقین بھی بعد میں مخلص مسلمان ہو گئے تھے۔

**آیت 67** ① اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ...... : یعنی منافق مرد ہوں یا عورتیں سب ایک جیسے ہیں

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

ان لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے تھے، وہ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور اموال اور اولاد میں بہت زیادہ تھے۔ تو انھوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا، پھر تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا، جس طرح ان لوگوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا جو تم سے پہلے تھے اور تم نے فضول باتیں کیں، جس طرح انھوں نے فضول باتیں کیں۔ یہ لوگ! ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہوگئے اور یہی خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۶۹﴾

---

اور سب کی ایک جیسی عادات اور بد خصلتیں ہیں، وہ برے کام کا حکم دیں گے، اچھے کام سے روکیں گے اور بخل کی وجہ سے اپنے ہاتھ بند رکھیں گے، یعنی خرچ نہیں کریں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے انھیں بھلا دینے کا ذکر ان کے اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کے مقابلے میں فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے یہی سلوک کیا کہ ان کی پروا ہی نہیں فرمائی، بلکہ انھیں اپنے فضل و کرم سے محروم کر دیا۔ اس تاویل کی ضرورت اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴾ [ طٰہٰ: ۵۲ ] ''میرا رب بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' معلوم ہوا کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی بھولنے کی طرف نسبت صرف لفظ کے ہم شکل ہونے تک ہے، ورنہ وہ ذات پاک بھولنے سے ہر طرح پاک ہے۔

❷ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: یعنی فسق (نافرمانی) میں حد کمال تک پہنچ چکے ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بے اعتقاد کی صلاحیت کیا معتبر ہے، اسے فاسق ہی کہنا چاہیے۔'' (موضح)

**آیت 69** كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ...... : اس سے پہلے منافقین کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ ہو رہا تھا، اب مزید تنبیہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں براہِ راست مخاطب فرمایا، یعنی تم بھی ان لوگوں کی طرح ہو اور تمھارے کرتوت بھی ان لوگوں جیسے ہیں جنھوں نے تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ کفر کیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور اموال و اولاد میں بہت زیادہ تھے۔ تمھاری ایک دوسرے سے مشابہت دو طرح سے ہے، دنیا میں انھوں نے اپنے لکھے ہوئے حصے سے فائدہ اٹھایا، تم نے بھی اپنے سے پہلے لوگوں کی طرح اپنے نصیب سے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے اپنے انبیاء کا مذاق اڑایا اور ان کے متعلق فضول باتیں کیں، تم نے بھی یہی کام کیا۔ اب آخرت میں بھی اعمال ضائع ہونے اور خائب و خاسر ہونے میں تم دونوں ایک جیسے ہو۔

اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۙ وَقَوۡمِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاَصۡحٰبِ مَدۡيَنَ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتِ ؕ اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ۝ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيۡعُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ؕ اُولٰۤـئِكَ سَيَرۡحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝

کیا ان کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو ان سے پہلے تھے؟ نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین والے اور الٹی ہوئی بستیوں والے، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا اور لیکن وہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (۷۰) اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم کرے گا، بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے (۷۱)

**آیت 70** اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ...... : "الۡمُؤۡتَفِكٰتِ" "اِئۡتَفَكَ يَأۡتَفِكُ" باب افتعال سے اسم فاعل ہے، الٹنے والیاں، یعنی لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں جن کا مرکز سدوم تھا، جنھیں ان کے اعمال بد کی وجہ سے زمین سے اٹھا کر الٹا گرا دیا گیا اور کھنگروں کی بارش برسائی گئی۔ ان چھ قوموں کا خصوصاً ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ عرب کے آس پاس عراق، شام اور یمن میں آباد تھیں۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور اس کے انبیاء کو جھٹلایا، اس لیے انھوں نے خود اپنے اوپر عذاب کو دعوت دی۔ سورۂ اعراف میں ان کے واقعات گزر چکے ہیں اور آگے سورۂ ہود میں مزید تفصیل آ رہی ہے۔

**آیت 71** وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ...... : منافق مردوں اور منافق عورتوں کی بد عادات ذکر کرنے کے بعد اب اہل ایمان مردوں اور اہل ایمان عورتوں کے خصال حمیدہ کا ذکر ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کے اولیاء، یعنی دوست، محبت رکھنے والے اور مدد کرنے والے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص صاحب ایمان نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ وہ اپنے (مسلم) بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔" [ بخاري، الإيمان، باب من الإيمان أن يحب لأخيه : ۱۳، عن أنس رضی اللہ عنہ ] نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومنوں کی مثال آپس کی محبت، ایک دوسرے پر رحم اور شفقت میں ایک جسم کی ہے، جس کے اگر ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو بقیہ سارے اعضا بخار اور بے چینی کی صورت میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔" [ مسلم، البر والصلة، باب تراحم المؤمنين...... : ۲۵۸۶ ] اور فرمایا: "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے جس کی بعض اینٹیں بعض کو سہارا دیتی ہیں۔" [ مسلم، البر والصلة،

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے، اور پاکیزہ رہنے کی جگہوں کا جو ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گی اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی ہے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے﴿۷۲﴾ اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور

باب تراحم المؤمنين...... : ۲۵۸۵ ] اس کے بعد مومنوں کی مزید صفات جو منافقوں کے بالکل برعکس ہیں، بیان فرمائیں اور ان پر رحم کا وعدہ فرمایا، ساتھ ہی اپنے ہر چیز پر غلبے اور کمال حکمت کا ذکر فرمایا کہ وہ ہر چیز پر غالب ہے مگر اس کا غلبہ اندھا غلبہ نہیں بلکہ کمال حکمت کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

**آیت 72** ① وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ...... "عَدْنٍ" ہمیشہ رہنے کا مقام، ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(جنت میں) ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے اور تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم زندہ رہو گے کبھی نہیں مرو گے اور تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم خوش حال رہو گے کبھی تنگی میں مبتلا نہیں ہو گے، سو یہ ہے اس کا فرمان: ﴿وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [ الأعراف : ٤٣ ] "انھیں آواز دی جائے گی کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے، اس وجہ سے کہ تم عمل کرتے تھے۔" [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب في دوام نعيم أهل الجنة...... : ۲۸۳۷ ]

② وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ : ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ جنت والوں سے فرمائے گا: "اے جنت والو! کیا تم خوش ہو گئے؟" وہ عرض کریں گے: "اے ہمارے پروردگار! ہم خوش کیوں نہ ہوں، تو نے ہمیں وہ کچھ عنایت فرمایا جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا۔" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا میں تمھیں ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر ایک اور نعمت نہ دوں؟" وہ عرض کریں گے: "اب اس سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "میں تمھیں اپنی خوشنودی سے نوازتا ہوں، اب کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔" [ بخاري، التوحيد، باب كلام الرب مع أهل الجنة : ۷۵۱۸۔ مسلم : ۲۸۲۹ ]

③ "رِضْوَانٌ" میں تنوینِ تقلیل اللہ تعالیٰ کی رضا کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سے تھوڑی رضا بھی جنت کی نعمتوں اور جنت عدن کے پاکیزہ مکانوں سے بہت ہی بڑی ہے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

**آیت 73** يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ...... : مدینہ آنے پر رسول اللہ ﷺ طویل مدت تک منافقین سے نرمی برتتے رہے اور ان کی سازشوں اور کمینگیوں سے درگزر فرماتے رہے، مگر اس حسن سلوک سے اصلاح کے بجائے ان

اَلْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ

ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بری جگہ ہے﴿۷۳﴾ وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے بات نہیں کہی، حالانکہ بلاشبہ یقیناً انھوں نے کفر کی بات کہی اور اپنے اسلام کے بعد کفر کیا اور اس چیز کا ارادہ کیا جو انھوں نے نہیں

کی سرکشی بڑھتی ہی گئی، اس لیے جب یہ سورت اتری جو قرآن کی سب سے آخر میں اترنے والی سورتوں میں سے ہے تو حکم ہوا کہ اب نرمی اور درگزر کے بجائے سختی اور بندوبست کا وقت آ گیا ہے، اس لیے اب تک آپ جو نرمی اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے رہے اسے ختم کیجیے اور ان کے ہر قصور پر سختی سے گرفت کیجیے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ منافقین صریح کفر کا اظہار کریں اور اس پر قائم رہیں تو کفار کی طرح ان سے بھی جہاد بالسیف کیا جائے۔ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ البتہ اگر وہ کفر کے اظہار کے بعد اس لیے مکر جائیں تو ان پر سختی کی جائے اور زبان سے طعن و ملامت کی جائے، تلوار سے قتال نہ کیا جائے۔ ہاں حدودِ الٰہی ان پر ضرور نافذ کی جائیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین سے قتال بالسیف نہیں کیا بلکہ قتل کی اجازت طلب کرنے پر بھی فرمایا: ''رہنے دو لوگ کہیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''ان اقوال میں اختلاف نہیں، اصل بات یہ ہے کہ مختلف حالات میں حسب موقع سزا دی جا سکتی ہے، یعنی منافقین صریح کفر کے اظہار کی جراءت کریں تو پھر ان سے کفار کی طرح ہی معاملہ ہو گا۔''

**آیت 74** ① **يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا:** منافقین اپنی نجی مجلسوں میں کفریہ باتیں کرتے، مگر پردہ چاک اور راز فاش ہونے پر جھوٹی قسمیں کھا کر مکر جاتے، جب گواہیوں سے بات ثابت ہو جاتی تو بہانہ بنا لیتے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی میں ایسی باتیں کر رہے تھے، آپ نے انھیں سنجیدہ لے لیا ہے اور اپنی قسموں کو بطور ڈھال استعمال کرتے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۶۲) اور توبہ (۴۲، ۵۶، ۱۰۷)۔

② **وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ......** : وہ کفر کی بات کیا تھی جو ان منافقوں نے کہی تھی، قرآن مجید نے یہاں اس کی صراحت نہیں فرمائی، اس لیے کہ یہ کوئی ایک آدھ واقعہ نہیں تھا نہ ہی ایک آدھ شخص کی بات تھی، اکثر منافقین بلکہ سبھی کا یہی وتیرہ تھا اور ان لوگوں نے مختلف موقعوں پر کفر کی باتیں کہی تھیں۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو سورۂ منافقون میں مختصر اور بخاری و مسلم میں کچھ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک لڑائی میں تھا تو میں نے عبد اللہ بن ابی سے سنا، وہ کہہ رہا تھا: ''ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ منتشر ہو جائیں جو آپ کے اردگرد ہیں اور یہ کہ ہم اگر مدینہ واپس پہنچ گئے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل تر کو نکال دے گا۔'' میں نے یہ بات اپنے چچا یا عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کی، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں نے آپ کو یہ بات بیان کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کی طرف پیغام بھیجا، وہ

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

پائی اور انھوں نے انتقام نہیں لیا مگر اس کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انھیں اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ پس اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا اور اگر منہ پھیر لیں تو اللہ انھیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور ان کے لیے زمین میں نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار ﴿۷۴﴾

سب قسمیں کھا گئے کہ انھوں نے یہ بات نہیں کہی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے جھوٹا قرار دے دیا، مجھے ایسی فکر لاحق ہوئی جو مجھے کبھی لاحق نہ ہوئی تھی تو میں گھر میں بیٹھ گیا۔ میرے چچا نے کہا، تم نے یہ کیا چاہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمھیں جھوٹا قرار دیا اور تم پر ناراض بھی ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقون نازل فرما دی، رسول اللہ ﷺ نے میری طرف آدمی بھیجا اور یہ سورت پڑھی اور فرمایا: ''زید! اللہ تعالیٰ نے تمھیں سچا قرار دیا ہے۔'' [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ إذا جاء ك المنافقون..... ﴾ : ٤٩٠٠، ٤٩٠١۔ مسلم : ٢٧٧٢ ]

③ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا......: یعنی منافقین نے جو ارادہ کیا تھا وہ اپنی مراد کو نہیں پہنچ سکے اور یہ ناکامی اور نامرادی کوئی ایک مرتبہ نہیں ہوئی، بلکہ وہ ہمیشہ اپنے ناپاک منصوبوں اور سازشوں میں ناکام ہوئے، جن کی چند مثالیں یہ ہیں: ① وہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنا چاہتے تھے اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ ② مجاہدین کے مالی ذرائع بند کرنا چاہتے تھے۔ ③ یہودیوں کو مدینہ میں آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ ④ عبداللہ بن ابی کو تاجِ سلطانی پہنانا چاہتے تھے۔ ⑤ مسلمانوں کے خلاف مسجد ضرار کا مورچہ بنانا چاہتے تھے۔ ⑥ تبوک میں رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا نام و نشان مٹتا ہوا دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے، مگر سب منصوبوں میں ناکام اور نامراد ہوئے۔ آخری حد جس تک وہ پہنچے وہ جنگ تبوک سے واپسی پر آپ کے قتل کا منصوبہ تھا۔ راستے میں عقبہ ایک بلند، دشوار گزار اور تنگ جگہ تھی، رسول اللہ ﷺ نے اعلان کروا دیا کہ آپ اس راستے سے جائیں گے، اس لیے ادھر سے کوئی نہ جائے۔ چند منافقین نے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس مقام پر آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ صحیح مسلم کی اس حدیث سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے، ابو طفیل بیان فرماتے ہیں کہ ''عقبہ'' والے لوگوں میں سے ایک شخص اور حذیفہ رضی اللہ عنہ (رسول اللہ ﷺ کے خاص راز دار) کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوگئی، تو وہ کہنے لگا: ''میں تمھیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ وہ ''عقبہ'' والے کتنے آدمی تھے۔'' (حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کچھ گریز کیا) تو لوگوں نے کہا: ''جب وہ پوچھ رہا ہے تو آپ اسے بتا دیں۔'' انھوں نے فرمایا: ''ہمیں بتایا جاتا تھا کہ وہ چودہ تھے، اگر تو بھی ان میں شامل تھا تو یہ لوگ پندرہ ہو گئے اور میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ ان میں سے بارہ تو دنیا کی زندگی میں اور اس دن جب گواہ پیش ہوں گے دونوں (جہاں) میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمن ہیں۔ باقی رہے تین تو انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ نہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اعلان کرنے والے کو سنا تھا اور نہ ہمیں معلوم ہو سکا کہ ان لوگوں کا ارادہ کیا

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ یقیناً اگر اس نے ہمیں اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا تو ہم ضرور ہی صدقہ کریں گے اور ضرور ہی نیک لوگوں سے ہو جائیں گے ﴿۷۵﴾ پھر جب اس نے انھیں اپنے فضل میں سے کچھ عطا فرمایا تو انھوں نے اس میں بخل کیا اور منہ موڑ گئے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے تھے ﴿۷۶﴾ تو اس کے

ہے۔'' [ مسلم، صفات المنافقین : ۲۷۷۹/۱۱ ] بیہقی کی دلائل النبوۃ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے انھیں دیکھ کر للکارا تو وہ بھاگ گئے (کیونکہ ان کا منصوبہ خفیہ نہ رہ سکنے کی وجہ سے ناکام ہو گیا)۔ صاحب ''هداية المستنير'' نے دلائل النبوۃ (۲۶۰/۷) کا حوالہ دے کر اسے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ اس روایت سے صحیح مسلم کی حدیث کی وضاحت ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں سے بارہ منافق ایسے ہیں جو نہ جنت میں جائیں گے اور نہ اس کی خوشبو پائیں گے، حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے، ان میں سے آٹھ کے لیے تو پھوڑا کافی ہوگا جو آگ کا چراغ ہوگا، جو ان کے کندھوں میں نکلے گا، یہاں تک کہ ان کے سینوں سے نمودار ہوگا۔'' [ مسلم، صفات المنافقین، باب صفات المنافقین...... : ۲۷۷۹/۱۰ ]

**آیت 75 تا 77** ① وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ ...... : پہلے یہ لوگ فاقوں مرتے تھے اور ان کے شہر مدینہ جس کا نام ان دنوں یثرب تھا، اس کی بھی کوئی حیثیت نہ تھی، لیکن نبی ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ان کا شہر پورے عرب کا مرکز بن گیا اور ان کی تجارت کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا اور جنگوں کی وجہ سے بہت سا مال غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا، جس سے یہ لوگ مال دار ہو گئے۔ آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ منافقین اتنے احسان فراموش ہیں کہ اللہ اور رسول جن کی بدولت انھیں یہ خوش حالی نصیب ہوئی، انھی کے خلاف بگڑ کر یہ اپنے دلوں کا فساد ظاہر کر رہے ہیں اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد تو یہ کیا تھا کہ اگر اس نے ہمیں اپنا فضل عطا کیا تو ہم صدقہ بھی ضرور کریں گے اور نیک بھی ہو جائیں گے، لیکن اب اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور اس نے مال و دولت سے نوازا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ مال اسلام کی سربلندی کے لیے خرچ کرنے کے بجائے بخل کر کے اللہ اور اس کے رسول سے منہ ہی موڑ لیا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ان کے دلوں میں نفاق رکھ دیا۔

② بعض مفسرین نے ان آیات کا سبب نزول ثعلبہ بن حاطب کو قرار دیا ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے مال کے لیے دعا کروائی اور صدقہ کرنے کا وعدہ کیا، جب مال بہت بڑھا تو نماز با جماعت چھوڑنے کے بعد جمعہ بھی چھوڑ دیا اور زکوٰۃ لینے والا اس کے پاس گیا تو کہنے لگا، یہ تو جزیہ ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''افسوس ثعلبہ پر!'' یہ سن کر وہ زکوٰۃ لے کر آیا، مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کے بعد ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان رضی اللہ عنہم نے بھی قبول کرنے سے انکار کیا، اسی حالت

اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ

نتیجے میں اس نے ان کے دلوں میں اس دن تک نفاق رکھ دیا جس میں وہ اس سے ملیں گے۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے اس کی خلاف ورزی کی جو اس سے وعدہ کیا تھا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے ﴿۷۷﴾ کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ان کا راز اور ان کی سرگوشی جانتا ہے اور یہ کہ بلاشک اللہ سب غیبوں کو بہت خوب جاننے والا ہے ﴿۷۸﴾ وہ لوگ جو صدقات

میں وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں فوت ہو گیا۔ مگر اہل علم نے اس روایت کا شدید رد کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کی کوئی صحیح سند نہیں۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ قصہ باطل ہے، کیونکہ ثعلبہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں۔

**آیت 78** اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ......: اس آیت میں منافقین کو سخت ڈرایا گیا ہے کہ کیا انھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کے راز اور سرگوشیاں سب جانتا ہے اور وہ تو تمام غیبوں کو بہت خوب جاننے والا ہے۔ کیا یہ اس سے بھی اپنی دلی حالت چھپا سکیں گے۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۸۰) اور مجادلہ (۷)۔

**آیت 79** ① اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ ......: "اَلْمُطَّوِّعِيْنَ" باب تفعل سے اسم فاعل ہے جو اصل میں "مُتَطَوِّعِيْنَ" تھا۔ جو لوگ فرض زکوٰۃ کے علاوہ مزید مال خوشی سے خرچ کرتے ہیں۔ جہد کا معنی محنت و مشقت ہے، یعنی وہ لوگ جو مال دار نہیں مگر محنت مشقت کر کے کمایا ہوا تھوڑا مال بھی خرچ کرتے ہیں۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کی اپیل کی تو بڑے بڑے مال دار منافقین ہاتھ سکیڑ کر بیٹھ رہے، لیکن مخلص اہل ایمان چندہ لانے لگے تو یہ ان پر باتیں چھانٹنے لگے، جب کوئی شخص زیادہ چندہ لاتا تو یہ اسے ریا کار کہتے اور جب کوئی تھوڑا مال یا غلہ لا کر پیش کرتا تو یہ کہتے کہ بھلا اللہ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ دونوں صورتوں میں مذاق اڑاتے اور ٹھٹھا کرتے۔ یہ وہ موقع تھا جب عمر رضی اللہ عنہ اپنا نصف مال لے آئے اس خیال سے کہ اگر بڑھ سکا تو آج ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ جاؤں گا، جب ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو گھر کا سارا مال لے آئے تھے۔ [ ترمذی، المناقب، باب رجاؤه أن يكون أبوبكر...... : ۳٦٧٥، وقال حسن صحيح وحسنه الألباني ]

عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے وقت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار دینار لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں رکھ دیے۔ عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دیناروں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے دو مرتبہ فرمایا: ''آج کے (اس عمل کے) بعد عثمان جو بھی عمل کریں وہ انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔'' [ ترمذی، المناقب، باب في عد عثمان تسميته شهيدا...... : ۳۷۰۱ ] ابو مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب صدقے کی آیت اتری تو ہم اپنی پیٹھوں پر بوجھ اٹھاتے، یعنی اس طرح اجرت حاصل کرتے تو ایک آدمی آیا اس نے بہت زیادہ چیز کا صدقہ کیا تو (منافق) کہنے لگے، یہ دکھاوا چاہتا ہے اور ایک آدمی آیا اور اس نے ایک صاع (دو کلو غلہ) صدقہ کیا تو انھوں نے کہا، اللہ تعالیٰ اس کے صدقے سے بے نیاز ہے (اسے اس کی کیا ضرورت ہے؟) تو یہ آیت اتری۔ [ بخاري، الزكوٰة، باب : اتقوا النار ولو بشق تمرة

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾ ع ۸/۱۶

میں خوش دلی سے حصہ لینے والے مومنوں پر طعن کرتے ہیں اور ان پر بھی جو اپنی محنت کے سوا کچھ نہیں پاتے، سو وہ ان سے مذاق کرتے ہیں۔ اللہ نے ان سے مذاق کیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۷۹﴾ ان کے لیے بخشش مانگ، یا ان کے لیے بخشش نہ مانگ، اگر تو ان کے لیے ستر بار بخشش کی دعا کرے گا تو بھی اللہ انھیں ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نا فرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۸۰﴾

...... : ۱٤۱٥ ] ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ابوعقیل (مزدوری کر کے) آدھا صاع (ایک کلو غلہ) لائے اور ایک اور صاحب زیادہ مال لائے، تو منافق کہنے لگے، اس (نصف صاع) کی اللہ کو کیا ضرورت تھی اور اس دوسرے نے تو محض دکھاوے کے لیے دیا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ ﴾ [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ الذين يلمزون المطوعين...... ﴾ : ٤٦٦٩ ]

② سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۵)۔

**آیت 80** ① اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ...... : یعنی آپ کا ان کے لیے استغفار کرنا یا نہ کرنا برابر ہے، یہاں یہ بات امر کے صیغے کے ساتھ آئی ہے، مگر مراد خبر دینا ہی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ صاف خبر کے الفاظ میں فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ [ المنافقون : ٦ ] ''ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔'' اس آیت کی تفسیر کا کچھ حصہ آیت (۸۴) کی تفسیر میں آرہا ہے۔

② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ : یعنی آپ ان کے حق میں کتنا ہی استغفار کریں اللہ تعالیٰ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کی وجہ سے وہ بخشے جانے کے لائق ہی نہیں ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہاں سے فرق نکلتا ہے بے اعتقاد اور گناہ گار کا۔ گناہ ایسا کون سا ہے جو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بخشانے سے نہ بخشا جائے اور بے اعتقاد کو پیغمبر کا ستر دفعہ استغفار فائدہ نہ کرے۔ اب بے اعتقاد لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر کس دلیل سے بھروسا کر سکتے ہیں؟ آدمی سے برائی ہو جائے یا عمل میں کوتاہی ہو اور وہ شرمندہ ہے تو وہ گناہ گار ہے اور جو بدکام کو عیب نہ جانے اور اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرض کے کرنے اور نہ کرنے کو برابر سمجھے اور کرنے والوں پر طعن کرے، وہ بے اعتقاد

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اللہ کے رسول کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور انھوں نے کہا اس گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دے جہنم کی آگ کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ سمجھتے ہوتے ﴿۸۱﴾

---

ہے۔ ایسے شخص کو پیغمبر ﷺ کا استغفار بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ (موضح)

آیت 81 ① فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ ...... : منافقین کے مختلف احوال اور ان کی سازشوں اور منصوبوں کے طویل ذکر کے بعد اب خصوصاً ان منافقین کا ذکر شروع ہوتا ہے جو جنگ تبوک میں نبی ﷺ کے ساتھ نہ گئے بلکہ جھوٹے عذر پیش کر کے اجازت لی اور مدینہ منورہ میں ٹھہرے رہے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے "الْمُخَلَّفُوْنَ" کا لفظ استعمال کیا ہے ''وہ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے'' یعنی وہ خوش نہ ہوں کہ یہ ان کا کارنامہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ نہیں گئے اور آرام کے ساتھ مدینہ کے اندر گھروں میں رہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں اللہ کی طرف سے جانے کی توفیق ہی نہیں ملی اور وہ اس کی جناب سے دھکیلے ہوئے پیچھے چھوڑ دیے گئے۔ ان کی حیثیت اس ردی سامان کی ہے جو ساتھ نہیں لے جایا جاتا، بلکہ پھینک دیا جاتا ہے، یا پیچھے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

② وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ......: کیونکہ اللہ کی خاطر خوشی سے مال و جان کی قربانی ایمان کے بغیر نہیں دی جا سکتی، جس سے یہ محروم ہیں۔ اس میں نکلنے والے مومنوں کی دلی کیفیت اور ان کی تعریف بھی ظاہر ہے کہ وہ کس خوشی سے نکلے۔

③ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ...... : یعنی صرف خود ہی نہیں دوسروں کو گرمی کی شدت اور لمبے سفر کی صعوبتوں سے ڈرا کر پیچھے رکھنے کی کوشش کرتے رہے، کیونکہ یہ سفر سخت گرمی کے موسم میں پیش آیا تھا۔ زمخشری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی جہالت کا نتیجہ قرار دیا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ آدمی تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنے سے اگر ہمیشہ کی ناقابل برداشت تکلیف سے بچ رہا ہو تو کوئی جاہل بلکہ اجہل ہی ہوگا جو وہ تھوڑی سی تکلیف برداشت نہ کرے اور ہمیشہ کی سخت ترین تکلیف برداشت کرنا پسند کر لے۔ اسی طرح انھیں معلوم ہی نہیں کہ اصل گرمی کیا ہوتی ہے، ورنہ اگر وہ جہنم کی گرمی سے آگاہ ہوتے اور ان کا اس پر ایمان ہوتا تو وہ دنیا کی شدید سے شدید گرمی کی بھی پروا نہ کرتے۔ "لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ" کا یہی مطلب ہے، کیونکہ جہنم کا ایک غوطہ دنیا کی تمام لذتیں بھلا دے گا۔ [ مسلم : ۲۸۰۷ ] اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھاری آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔'' آپ سے کہا گیا: ''یا رسول اللہ! یقیناً وہی کافی تھی۔''

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

پس وہ بہت کم ہنسیں اور بہت زیادہ روئیں، اس کے بدلے جو وہ کمائی کرتے رہے ہیں ﴿۸۲﴾ پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے، پھر وہ تجھ سے (جنگ کے لیے) نکلنے کی اجازت طلب کریں تو کہہ دے تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے۔ بے شک تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے، سو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ﴿۸۳﴾

---

فرمایا: ''وہ ان (آگوں) سے اُنہتر (۶۹) حصے زیادہ کر دی گئی ہے اور وہ سب اس کی گرمی کی طرح ہیں۔'' [ بخاری، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة : ۳۲۶۵۔ مسلم : ۲۸۴۳ ]

**آیت 82** فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا: کیونکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے، فانی اور باقی کا کیا مقابلہ؟ اس لیے ان کا ہنسنا بہت ہی کم عرصے کے لیے اور رونا بے حد وحساب مدت کے لیے ہے جس کی انتہا ہی نہیں۔ یہ بظاہر حکم ہے مگر منافقین حکم ماننے والے کب تھے، اس لیے یہ امر کے الفاظ میں خبر دی جا رہی ہے، یعنی یہ لوگ بہت کم ہنسیں گے اور بہت زیادہ روئیں گے۔ ''جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ'' سے اس امر کے بمعنی خبر ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ خبر میں تو صدق و کذب کا بھی احتمال ہوتا ہے، مگر انشاء (امر و نہی) میں اس کا احتمال ہی نہیں ہوتا، وہ حتمی ہوتی ہے (اگرچہ اللہ تعالیٰ کی خبر میں بھی کذب کا احتمال نہیں)۔ (المنار) اسی آیت کی ہم معنی وہ حدیث ہے کہ اگر تم وہ کچھ جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت کم ہنسو اور بہت زیادہ روؤ۔ [ بخاری، الکسوف، باب الصدقة في الکسوف : ۱۰۴۴ ]

**آیت 83** ❶ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ: ''اگر اللہ تجھے ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے۔'' ''رَجَعَ'' لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے، یعنی لوٹنا اور لوٹانا، یہاں متعدی کے معنی میں ہے۔

یعنی جو جنگ تبوک کے لیے نہیں نکلے تھے بلکہ گھروں میں بیٹھے رہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو آئندہ انھیں اپنے ساتھ لے جانے اور اپنے ہمراہ لڑانے سے منع فرما دیا، اس لیے کہ ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ جب وہ مشکل وقت میں ساتھ نہیں گئے تو آسان وقت میں بھی کیوں جائیں، جیسا کہ سورۂ فتح میں حدیبیہ کے لیے نہ جانے والے اعراب کو خیبر کی فتح میں شرکت سے منع فرما دیا۔ دیکھیے سورۂ فتح (۱۱ تا ۱۵) مگر وہاں ہمیشہ کے لیے منع نہیں فرمایا، جبکہ تبوک سے پیچھے رہنے والے منافقین کو ہمیشہ کے لیے ساتھ لے جانے سے منع فرما دیا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جو فرمایا کہ ''اگر پھر لے جائے تجھے اللہ کسی فرقہ کی طرف'' وہ اس واسطے کہ یہ آیت سفر میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ مدینہ میں منافق تھے اور فرقے اس واسطے فرمایا کہ بعض منافق پیچھے مر گئے اور سب بیٹھنے والے منافق نہ تھے، بعض مسلمان بھی تھے، ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ (موضح)

❷ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ: یعنی پہلی مرتبہ کی طرح اب بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو جو بے عذر گھروں میں رہ گئے

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے ﴿۸۴﴾ اور تجھے ان کے اموال اور ان کی اولاد تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں ﴿۸۵﴾

---

یا معذوروں کے ساتھ بیٹھے رہے، جیسے عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار اور اپاہج وغیرہ۔

**آیت 84** وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ...... : ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب عبد اللہ بن ابی فوت ہوا تو اس کا بیٹا نبی ﷺ کے پاس آیا کہ مجھے اپنی قمیص دیجیے کہ میں اسے اس میں کفن دوں اور آپ اس پر جنازہ پڑھیں اور اس کے لیے بخشش کی دعا فرمائیں تو نبی ﷺ نے اسے اپنی قمیص دی اور فرمایا: ''مجھے اطلاع دینا، تاکہ میں اس کا جنازہ پڑھوں۔'' اس نے اطلاع دی تو جب آپ نے اس پر جنازے کا ارادہ کیا، عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو کھینچ لیا اور کہا، کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین کا جنازہ پڑھنے سے منع نہیں فرمایا؟ آپ نے فرمایا: ''مجھے دو اختیار ہیں: ﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ﴾ [ التوبة : ۸۰ ] (ان کے لیے بخشش مانگ یا ان کے لیے بخشش نہ مانگ)۔'' سو آپ نے اس کا جنازہ پڑھا تو یہ آیت اتری: ﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ﴾ [ بخاری، الجنائز، باب ما یکرہ من الصلوۃ علی المنافقین...... : ۱۳۶۶۔ مسلم : ۲٤۰۰ ]

اب جو شخص کلمہ پڑھ کر صریح شرک کرتا ہے اور غیر اللہ سے وہ مدد مانگتا ہے جو اللہ کے سوا کسی کے اختیار ہی میں نہیں، یا کلمہ کے بعد مسلمان ہونے کی پہلی شناخت نماز ہی اس میں نہیں پائی جاتی، یا وہ صاف اللہ تعالیٰ کی حدود کو وحشیانہ سزائیں کہتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاق اڑاتا ہے، یا اس زمانے میں انھیں ناقابل عمل کہتا ہے، اس کا جنازہ پڑھنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ میت کو جنازے کے بعد دفن کر کے قبر پر کھڑے ہو کر دعا مانگتے تھے۔ مختلف دوسرے اوقات میں وہاں جا کر ان کے لیے دعا کرتے تھے، منافقین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بھی منع فرما دیا۔ کیونکہ اس میں منافق، کافر اور مشرک کی تکریم اور عزت افزائی ہے جو اللہ تعالیٰ کو کسی صورت منظور نہیں۔

**آیت 85** وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ...... : اس سے پہلے آیت (۵۵) میں بھی چند الفاظ کے فرق کے ساتھ یہ آیت گزری ہے، یہاں دوبارہ لانے کا مقصد یہ ہے کہ نفاق انھی چیزوں کی محبت اور حرص سے پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ منافقون میں ان کے اعمال بد کے تذکرے کے بعد آخر میں یہی تلقین فرمائی: ﴿ لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [ المنافقون : ۹ ] ''دیکھنا کہیں تمھارے اموال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔'' یہاں بھی گزشتہ آیت کو

وَ اِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ وَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان میں سے دولت والے تجھ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ دے کہ ہم بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ رہ جائیں ﴿۸۶﴾ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی، سو وہ نہیں سمجھتے ﴿۸۷﴾ لیکن رسول نے اور ان لوگوں نے جو اس کے ہمراہ ایمان لائے، اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے سب بھلائیاں ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں ﴿۸۸﴾

---

دوبارہ لانے سے مقصود دنیا کی فراوانی پر رشک سے بچنے کی تاکید اور منافقین کے لیے اموال و اولاد کی فراوانی کے ان کے لیے نقصان دہ ہونے کا بیان ہے۔ مزید اسی سورت کی آیت (۵۵) کے حواشی دیکھیے۔

**آیت 86، 87** وَ اِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ...... : "سُوْرَةٌ" آیات کا ایک حصہ، ٹکڑا۔ "الطَّوْلِ" کا معنی "اَلْفَضْلُ وَالْقُدْرَةُ وَالْغِنٰى وَالسَّعَةُ" ہے۔ (قاموس) یعنی وسعت و طاقت اور مال و دولت۔ "الْخَوَالِفِ" یہ "خَالِفَةٌ" کی جمع ہے "پیچھے رہنے والی عورتیں۔" "فَاعِلَةٌ" کی جمع "فَوَاعِلُ" آتی ہے، جیسے "قَاطِعَةٌ" کی جمع "قَوَاطِعُ" اور "ضَارِبَةٌ" کی جمع "ضَوَارِبُ" اور "قَافِلَةٌ" کی جمع "قَوَافِلُ" یعنی جہاد کے حکم والی آیات کا کوئی حصہ اترنے پر وہ لوگ عذر کریں جن کے پاس کچھ نہیں اور جو ضروریات جہاد حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے ساتھ نہیں جا سکتے تو بات سمجھ میں آتی ہے، مگر ان منافقین میں سے وسعت و طاقت والے بھی جہاد میں نہ جانے اور پیچھے رہنے کی اجازت مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اسباب بیان فرمائے کہ بزدلی کی وجہ سے ان میں ایسی کمینگی پیدا ہو چکی ہے کہ انھیں عورتوں کے ساتھ پیچھے رہ جانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس پر خوش ہیں اور ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ جہاد کی برکات کو اور بزدلی اور ترک جہاد کی نحوست اور نقصانات کو نہیں سمجھتے۔ نہ ان پر اللہ اور اس کے رسول کی بات کا اثر ہوتا ہے اور نہ کسی سمجھانے والے کی نصیحت کا۔

**آیت 88** لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ...... : لیکن رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کا حال منافقین جیسا نہیں، ان میں نہ ان کی طرح بزدلی ہے، نہ جہاد سے گریز، نہ مال و جان کی قربانی میں بخل، نہ اللہ اور اس کے رسول سے کفر، نہ نافرمانی، بلکہ وہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد یعنی اپنی آخری کوشش کرتے ہیں اور ہر حال میں اطاعت کرتے ہیں۔ انھی کے لیے تمام بھلائیاں، یعنی دنیا کی فتوحات و غنائم اور آخرت کے سب سے بلند درجے

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۸۹﴾ اور بدویوں میں سے بہانے بنانے والے آئے، تاکہ انھیں اجازت دی جائے اور وہ لوگ بیٹھ رہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا۔ ان میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، جلد ہی دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۹۰﴾

ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجرات (۱۵) اور صف (۱۰ تا ۱۲) انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں پہنچ جانے والا کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو پسند کرے کہ دنیا میں واپس آئے، خواہ دنیا کی ہر چیز اسے دے دی جائے، سوائے شہید کے، وہ تمنا کرے گا کہ دنیا کی طرف واپس جائے، پھر دس مرتبہ قتل کیا جائے، اس عزت و کرامت کی وجہ سے جو وہ دیکھے گا۔'' [ بخاري، الجهاد والسير، باب تمنى المجاهد أن يرجع إلى الدنيا : ۲۸۱۷ ]

**آیت 89** اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ ...... : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار کیے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہے تو جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو اس سے فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے بہتر اور سب سے بلند حصہ ہے، جس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔'' [ بخاري، الجهاد والسير، باب درجات المجاهدين في سبيل الله : ۲۷۹۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

**آیت 90** وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ ...... : اس سے پہلے مدینہ کے منافقین اور اہل ایمان کا ذکر تھا، اب مدینہ کے اردگرد بادیہ نشینوں کا حال ذکر ہوتا ہے، کیونکہ ان میں بھی دونوں قسم کے لوگ موجود تھے، جیسا کہ آگے آیت (۹۸، ۹۹) اور پھر (۱۰۱، ۱۰۲) میں ذکر آ رہا ہے۔ مفسرین نے اس کی تفسیر دو طرح کی ہے، کیونکہ عذر کرنے والے سچے بھی ہو سکتے ہیں اور جھوٹے بھی، اس لیے بعض نے تو ''الْمُعَذِّرُوْنَ'' سے مراد وہ اعراب لیے ہیں جو صحیح مومن تھے مگر کسی حقیقی عذر کی وجہ سے نہیں جا سکے تھے، یہ لوگ تو اپنا عذر بیان کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا اور دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ گھروں ہی میں بیٹھے رہے، انھوں نے آ کر عذر پیش کرنے کی زحمت ہی نہیں کی، چنانچہ ان میں سے کفر کرنے والوں کو عذاب الیم کی وعید سنائی گئی، یعنی دنیا میں قید اور قتل اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

بعض مفسرین نے ''الْمُعَذِّرُوْنَ'' سے مراد جھوٹے بہانے اور باطل عذر پیش کرنے والے لیے ہیں۔ زمخشری رحمہ اللہ نے اس رائے کی تائید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''الْمُعَذِّرُوْنَ'' باب تفعیل سے ہو تو ''عَذَّرَ فِي الْأَمْرِ'' کا معنی ہی یہ ہے کہ اس نے

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۹۱

نہ کمزوروں پر کوئی حرج ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جو وہ چیز نہیں پاتے جو خرچ کریں، جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خلوص رکھیں۔ نیکی کرنے والوں پر (اعتراض کا) کوئی راستہ نہیں اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ۹۱

کام میں سستی کی، اس کی کوشش ہی نہیں کی اور ظاہر یہ کیا کہ اس کا عذر تھا، حالانکہ اس کا عذر کوئی نہ تھا اور اگر ”اَلْمُعَذِّرُوْنَ“ باب افتعال سے ہو اور اس کا اصل ”مُعْتَذِرُوْنَ“ ہو پھر بھی جھوٹے بہانے ہی مراد ہیں، جیسا کہ آگے صاف آ رہا ہے: ﴿يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ﴾ [ التوبة : ۹۴ ] ”تمھارے سامنے عذر پیش کریں گے، جب تم ان کی طرف واپس آؤ گے۔“

پہلی تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ہر عذر والا جھوٹا نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اگلی آیت میں کئی عذر والوں کو گناہ سے بری قرار دیا ہے اور اس آیت میں بھی دونوں قسموں میں سے ”الَّذِيْنَ كَفَرُوْا“ ہی کو عذاب کی وعید سنائی ہے، اگرچہ ترجیح کا رجحان دوسری تفسیر کی طرف ہے، مگر امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی بات میں وزن معلوم ہوتا ہے۔

آیت 91 ① لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ ...... : اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو واقعی معذور تھے اور ان کا عذر واضح تھا۔ ان میں سب سے پہلے ”الضُّعَفَآءِ“ ہیں، ان سے مراد لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، عورتیں اور بچے ہیں۔ دوسرے ”الْمَرْضٰى“ (مریض کی جمع) جو بیماری کی وجہ سے نہیں جا سکتے، دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ [ الفتح : ۱۷ ] ”نہیں ہے اندھے پر کوئی تنگی اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی اور نہ مریض پر کوئی تنگی۔“ اور تیسرے وہ تندرست طاقت رکھنے والے جو مالی استطاعت نہیں رکھتے کہ جہاد کے سفر اور اس کے سازو سامان مثلاً سواری اور ہتھیار وغیرہ کی تیاری کر سکیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [ البقرة : ۲۸۶ ] ”اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔“

② اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: یعنی وہ کام نہ کرتے ہوں جس سے اللہ کے دین، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مومنوں کو کوئی نقصان اور ان کے دشمنوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ )) ”دین خیر خواہی (خلوص) ہی کا نام ہے۔“ ہم نے کہا: ”کس کے لیے؟“ فرمایا: ”اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے حکام کے لیے اور ان کے تمام لوگوں کے لیے۔“ [ مسلم، الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة : ۵۵، عن تميم رضی اللہ عنہ ] عام لوگوں کی خیر خواہی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ جب مجاہدین جہاد پر گئے ہوئے ہوں تو یہ لوگ شہر میں رہیں، ان کے گھروں کی، کاروبار کی اور بال بچوں کی خبر گیری رکھیں، ان کی عزت و آبرو کی ہر طرح سے حفاظت کریں، مجاہدین کی ضروریات بھیجتے رہیں، جھوٹی خبریں یا افواہیں نہ پھیلائیں، کسی قسم کا فساد برپا نہ کریں اور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے والوں کا منہ بند کریں۔

③ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ: یعنی یہ لوگ معذور ہیں، اگر جہاد میں شرکت نہ کریں تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس آئے، مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا: ”بے شک مدینہ میں کئی لوگ ہیں، تم

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور نہ ان لوگوں پر کہ جب بھی وہ تیرے پاس آئے ہیں، تاکہ تو انھیں سواری دے تو تو نے کہا میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمھیں سوار کروں، تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی تھیں، اس غم سے کہ وہ نہیں پاتے جو خرچ کریں ﴿۹۲﴾ (اعتراض کا) راستہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو تجھ سے اجازت مانگتے ہیں، حالانکہ وہ دولت مند ہیں، وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی، سو وہ نہیں جانتے ﴿۹۳﴾

کسی راستے پر نہیں چلے اور نہ تم نے کوئی وادی طے کی ہے، مگر وہ تمھارے ساتھ رہے ہیں۔'' لوگوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اور وہ مدینہ ہی میں تھے؟'' فرمایا: ''(ہاں) وہ مدینہ ہی میں تھے، انھیں عذر نے روک رکھا تھا۔'' [ بخاري، المغازي، باب : ٤٤٢٣ ]

**آیت 92** ① وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ ...... : یہ مخلص مسلمانوں کے ایک اور گروہ کا ذکر ہے جن کے پاس اپنی سواریاں نہیں تھیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سواریاں لینے کے لیے آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا، میرے پاس تمھیں سواری دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، اس پر انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے اور ایسے روئے گویا آنکھیں پانی کے چشمے بن گئیں، جن سے آنسوؤں کی نالیاں رواں ہوں کہ ہمارے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں کہ ہم جہاد میں شریک ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی گناہ سے بری قرار دیا کہ ان لوگوں پر اعتراض کا کوئی راستہ اور کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ محسنین ہیں۔

② اس آیت پر ان لوگوں کو خلوص کے ساتھ غور کرنا چاہیے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دنیا و آخرت کے خزانوں کے مالک اور مختار کل ہیں۔ یہ حضرات آپ کے اس فرمان کا ترجمہ کیا کریں گے: ﴿لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ﴾ ''میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمھیں سوار کروں۔'' ان بھائیوں کو اللہ کا خوف کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو مالک الملک اور مختار کل کہہ کر اللہ کا شریک بنانے سے توبہ کرنی چاہیے، کیونکہ یہ گناہ اللہ کے ہاں کسی صورت قابل معافی نہیں ہے۔

**آیت 92** ① اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ ...... : اللہ تعالیٰ اکثر مقامات پر ہر چیز کے دونوں پہلو بیان کرتا ہے، فرمایا ان پر تو کچھ اعتراض نہیں جن کا ذکر اوپر گزرا، صرف ان لوگوں پر گناہ کا سارا بوجھ ہے جن کے پاس سواری بھی ہے، زادِ راہ بھی اور تندرستی بھی اور پھر اغنیاء ہو کر بھی آپ سے اجازت مانگتے ہیں اور اپنی بزدلی، نفاق اور کفر کی وجہ سے پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جانے میں انھیں کوئی عار نہیں، بلکہ اس پر انھیں فخر اور خوشی ہے کہ ہم گرمی میں سفر اور ہلاکت سے بچ گئے۔

② وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ...... : ان کے نفاق کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا کر انھیں ایسا بند کر دیا ہے کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے میں اور جہاد فی سبیل اللہ میں کیا لذت ہے اور ان کی کیا فضیلت اور کیا ثواب ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

تمھارے سامنے عذر پیش کریں گے، جب تم ان کی طرف واپس آؤ گے، کہہ دے عذر مت کرو، ہم ہرگز تمھارا یقین نہ کریں گے، بے شک اللہ ہمیں تمھاری کچھ خبریں بتا چکا ہے، اور عنقریب اللہ تمھارا عمل دیکھے گا اور اس کا رسول بھی، پھر تم ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے ﴿۹۴﴾

آیت 94 ① يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ ......: جیسا کہ پہلے گزرا کہ یہ سلسلۂ آیات تبوک سے واپسی پر نازل ہوا، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی ان کے جھوٹے بہانوں کی اطلاع دے دی اور ساتھ ہی حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ بہانے مت تراشو، ہم کسی صورت تمھارا اعتبار نہیں کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمھاری کچھ خبریں بتا دی ہیں۔ اب دیکھا جائے گا کہ تمھارا آئندہ رویہ کیا رہتا ہے، آیا تم موجودہ روش سے باز آتے ہو یا اسی پر جمے رہتے ہو۔

② وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ: یہ عبارت یوں بھی ہو سکتی تھی کہ "وَ سَيَرَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ عَمَلَكُمْ" کہ عنقریب اللہ اور اس کا رسول تمھارا عمل دیکھیں گے، مگر مفعول "عَمَلَكُمْ" کو "رَسُوْلُهٗ" سے پہلے لانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اصل دیکھنے والا اور نگرانی کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، کیونکہ وہ ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ اس کے بعد اللہ کے رسول بھی تمھارا عمل جو سامنے ہو گا دیکھیں گے، لیکن رسول اللہ ﷺ کو اگر ظاہری عمل سے مطمئن کر بھی لو اور تمھاری دلی کیفیت درست نہیں تو پھر تمھیں غائب و حاضر کو جاننے والے کے سامنے بھی حاضر ہونا ہے اور وہ تمھیں تمھاری اصل حقیقت سے آگاہ کرے گا۔ بعض شرک کے بیماروں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حالات سے واقف ہے اور اس کا رسول بھی، کیونکہ اس آیت کے مطابق وہ دونوں سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ آیت کا مطلب تو اوپر بیان ہو چکا ہے مگر یہ حضرات اسی سورت کی آیت (۱۰۵) کا کیا کریں گے کہ جس میں ہے: ''اور کہہ دے تم عمل کرو پس عنقریب اللہ تمھارا عمل دیکھے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے بھی۔'' تو کیا اللہ کے سوا رسول اور مومنین بھی سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور ہر بات سے واقف ہیں؟ مومن ہونے کا خیال تو ان حضرات کا اپنے بارے میں بھی ہو گا، ذرا اپنی حیثیت اور علم کی رسائی پر غور فرما لیں تو بہت جلد بات سمجھ میں آجائے گی۔ سورۂ نمل کی آیت (۶۵) اور اعراف کی آیت (۱۸۸) پر بھی ایک نظر ڈال لیں اور اسی سورۂ توبہ کی آیت (۱۰۱) ﴿ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ﴾ پر بھی غور فرما لیں۔

③ ان آیات میں منافقین کو اخلاص کی طرف پلٹنے کی دعوت بھی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ منافقین کو بھی اسی طرح بار بار بلاتا ہے کہ ہاں عمل کرو ہم تمھاری نگرانی کر رہے ہیں، اگر پلٹ آؤ گے تو ہم معاف کر دیں گے اور فی الواقع کئی منافقین

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

عنقریب وہ تمھارے لیے اللہ کی قسم کھائیں گے جب تم ان کی طرف واپس آؤ گے، تاکہ تم ان سے توجہ ہٹا لو۔ سو ان سے بے توجہی کرو، بے شک وہ گندے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اس کے بدلے جو وہ کماتے رہے ہیں ﴿۹۵﴾ تمھارے لیے قسم کھائیں گے، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، پس اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو بے شک اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا ﴿۹۶﴾

---

اخلاص کی دولت سے سرفراز بھی ہوئے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۶۶) اور نساء (۴۴، ۴۵)۔

**آیت 95** سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ ...... : اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ تمھارے سامنے اللہ کی قسم کھانے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ تم ان سے اعراض کرو، سو واقعی تم ان سے اعراض کرو۔ پہلے اعراض کا مطلب ہے کہ تم ان سے درگزر اور چشم پوشی کرو اور دوسرے اعراض کا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے درگزر اور چشم پوشی کے ساتھ قطع تعلق بھی کرو۔ پھر ان سے قطع تعلق کا سبب بیان فرمایا کہ یہ رجس ہیں، جس کا معنی ''گندگی'' ہے، یعنی عقائد و اعمال کے لحاظ سے وہ اتنے گندے ہیں کہ سمجھو سراسر گندگی ہیں، گندگی کی پوٹ ہیں۔ گندگی سے تعلق کا نتیجہ آلودگی ہی ہے، اس لیے ان سے بچ جاؤ، تاکہ کہیں ان سے متاثر نہ ہو جاؤ۔ ''صحبت طالح ترا طالح کند'' پھر ان کا انجام بیان فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ان سے چشم پوشی اور درگزر ہی سے کام لیا۔ چنانچہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ (ان تین مخلص مسلمانوں میں سے ایک جو بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سفر سے واپس آتے تو مسجد سے ابتدا کرتے، چنانچہ آپ لوگوں کے لیے بیٹھ گئے تو پیچھے رہ جانے والے آئے اور عذر پیش کرنے لگے اور آپ کے سامنے قسمیں کھانے لگے، یہ اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ لوگ تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ظاہر کو قبول فرمایا، ان سے بیعت لی، ان کے لیے استغفار کیا اور ان کے پوشیدہ معاملات اللہ کے سپرد کر دیے۔ [ بخاري، المغازي، باب حديث كعب بن مالك رضي الله عنه ...... : ٤٤١٨ ]

**آیت 96** يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ...... : یعنی ان کے قسمیں کھانے اور حیلے بہانے کرنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ تم ان سے درگزر کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ ان سے راضی بھی ہو جاؤ، اگر تم ان کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ تعالیٰ ان کے فسق کی وجہ سے ان سے کبھی راضی نہیں ہو گا۔ " فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنْهُمْ " کے بجائے ﴿لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ کہنے میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بیان ہوا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے بھی ان کے فسق کی وجہ سے کسی صورت ان سے راضی ہونا جائز نہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جس

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

بدوی لوگ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور زیادہ لائق ہیں کہ وہ حدیں نہ جانیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۹۷﴾

شخص کے حالات سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ منافق ہے، اس کی طرف سے تغافل تو جائز ہے مگر اس سے دوستی اور محبت روا نہیں۔'' (موضح)

**آیت 97** ① اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا ...... : ''اَلْاَعْرَابُ'' عرب کے صحرا اور بادیہ میں رہنے والوں کے لیے اسم جنس ہے، واحد کے لیے ''اَعْرَابِی'' اور مؤنث کے لیے ''اَعْرَابِيَّةٌ'' استعمال ہوتا ہے، جمع ''اَعَارِيْبُ'' ہے۔ ''اَلْعَرَبُ'' اس نسل کے لیے اسم جنس ہے جو عربی زبان بولتی ہے، خواہ شہری ہو یا بادیہ نشیں، اس کا واحد ''عَرَبِیٌّ'' آتا ہے۔ یہاں اعراب سے مراد ان کی جنس کے بعض افراد ہیں ہر شخص نہیں، کیونکہ ان میں سے بعض مخلص اہل ایمان کا ذکر آئندہ آیات میں آ رہا ہے۔

② ''اَلْاَعْرَابُ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو مدینہ منورہ سے دور دیہاتی اور صحرائی علاقوں میں رہتے تھے، ان میں سے اکثر اسلام کی دعوت کو سمجھ کر سچے دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ محض اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ انھیں شہر (مدینہ منورہ) میں آنے، مسلمانوں سے میل جول رکھنے اور آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بہت کم موقع ملتا تھا، اس لیے یہ نرے گنوار اور اجڈ قسم کے لوگ تھے، جن کے دلوں میں نہ نرمی پیدا ہوئی تھی اور نہ انھیں علم کی ہوا لگی تھی۔ اس لیے ان میں جو منافق تھے ان کا نفاق بھی اہل مدینہ کے نفاق سے سخت تھا۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ بدوی اور شہری لوگوں کی طبیعتوں میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو ایک باغ کے میوے اور پہاڑی درخت کے میوے میں محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بستیوں سے مبعوث فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [ یوسف : ۱۰۹ ] ''اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر کچھ مرد، جن کی طرف ہم ان بستیوں والوں میں سے وحی کیا کرتے تھے۔'' اور آخری رسول ﷺ کو تمام بستیوں کی ماں ام القریٰ مکہ میں پیدا فرمایا، تاکہ وہ شہری معاشرے کی شائستگی اور نرم دلی کے حامل ہوں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بدویوں کی سرشت میں بے حکمی، مفاد پرستی اور جہالت رچی بسی ہوئی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت سے نہ ان پر زیادہ ذمہ داری ڈالی اور نہ ان کو درجات کی بلندی عطا ہوئی۔'' (موضح)

لوگوں کے ساتھ میل جول کی کمی کی وجہ سے طبیعت میں سختی پیدا ہو جانا فطری سی بات ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بادیہ میں سکونت رکھے وہ سخت دل ہو جاتا ہے، جو شکار کے پیچھے ہی لگ جائے وہ غافل ہو جاتا ہے اور جو سلطان کے پاس آئے وہ آزمائش میں ڈال دیا جاتا ہے۔'' [ أحمد : ۳۵۷/۱، ح : ۳۳۶۱۔ أبو داوٗد : ۲۸۵۹۔ ترمذی : ۲۲۵۶۔ نسائی : ۴۳۱۴، وصححه الألبانی ]

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ

اور بدویوں میں سے کچھ وہ ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تم پر (زمانے کے) چکروں کا انتظار کرتے ہیں، برا چکر انھی پر ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۹۸﴾ اور بدویوں میں سے کچھ وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قربتوں اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ

---

بعض اعراب کی سخت دلی پر اس حدیث سے کافی روشنی پڑتی ہے جو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمائی کہ اعراب کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے (انھوں نے آپ کو حسن یا حسین رضی اللہ عنہما کو چومتے دیکھا) تو کہنے لگے: ''کیا تم لوگ اپنے بچوں کو چومتے ہو؟'' لوگوں نے کہا: ''ہاں!'' تو وہ کہنے لگے: ''لیکن اللہ کی قسم! ہم تو نہیں چومتے!'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور کیا میں اختیار رکھتا ہوں، اگر اللہ نے تم سے رحم کرنا نکال لیا ہے۔'' [ مسلم، الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبيان ...... : ٢٣١٧۔ بخاری : ٥٩٩٨ ] مفسرین نے اس مقام پر اعراب کی سخت دلی کے کئی واقعات لکھے ہیں۔

**آیت 98** ① **وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ ......** : **"مَغْرَمًا"** سے مراد تاوان، چٹی اور جرمانہ ہے، قرض کو بھی **"مَغْرَمًا"** کہہ لیتے ہیں۔ قرض خواہ کو غریم کہتے ہیں، کیونکہ غرام کا معنی لازم ہونا، چمٹنا بھی ہے۔ تاوان بھی لازم ہو جاتا ہے اور قرض خواہ بھی جان نہیں چھوڑتا، سورۂ فرقان میں ہے: ﴿ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴾ [ الفرقان : ٦٥ ] ''بے شک اس کا عذاب ہمیشہ چمٹ جانے والا ہے۔'' یعنی بعض اعراب ایسے ہیں کہ زکوٰۃ ہو یا جہاد، اس کے لیے جب بھی چندہ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر نہیں اور نہ دلی جذبہ کے ساتھ، بلکہ محض چٹی یا جرمانہ سمجھ کر بادل ناخواستہ ادا کرتے ہیں کہ اگر ادا نہ کریں گے تو مسلمان انھیں مشتبہ نگاہوں سے دیکھیں گے اور ان کے درمیان زندگی بسر کرنا دوبھر ہو جائے گا۔

② **وَ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ** : **"الدَّوَآئِرَ"** "دَائِرَةٌ" کی جمع ہے، جو "دَارَ يَدُوْرُ دَوْرًا" (گھومنا) سے اسم فاعل ہے، چکر، گھومنے والا، یعنی وہ انتظار کر رہے ہیں کہ تم پر کب کوئی اچانک مصیبت اترتی ہے اور تم کب زمانے کے کسی چکر کے گھیرے میں آ کر زوال کا شکار ہوتے ہو، یا یہ کہ کب پیغمبر ﷺ فوت ہوتے ہیں اور مشرکین کو تم پر غلبہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زبانی بدگوئی اور دلی بدخواہی کو ہی نہیں، بلکہ ہر بات کو سننے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

③ **عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ** : **"السَّوْءِ"** "سَاءَهُ يَسُوْءُهُ سَوْءًا" سین کے فتح کے ساتھ مصدر ہے، جب کسی کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جو اسے برا لگے اور سین کے ضمہ کے ساتھ اسم مصدر ہے، یعنی یہ برا چکر انھی پر آنے والا ہے، یا بددعا ہے کہ برا چکر انھی پر آئے، مگر اللہ تعالیٰ کو بددعا کی کیا ضرورت ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کی اس بدخواہی کا تقاضا ہے کہ ان پر یہ بددعا کی جائے کہ برا چکر انھی پر چلے۔

**آیت 98** **وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ ......** : **"قُرُبٰتٍ"** یہ "قُرْبَةٌ" کی جمع ہے، وہ عمل جسے انسان اپنے خالق کے

قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ

سمجھتے ہیں۔ سن لو! بے شک وہ ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے، عنقریب اللہ انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۹۹﴾ اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے

قریب ہونے کا ذریعہ بنائے۔ "صَلَوٰتِ" یہ "صَلَاةٌ" کی جمع ہے جس کا معنی نماز کے علاوہ دعا بھی آتا ہے۔ یعنی سب اعراب ایک جیسے نہیں، ان میں کئی مخلص مسلمان بھی ہیں، جو خوش دلی سے صدقہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کے ہاں قربتوں اور رسول کی دعاؤں کو حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شہادت دی کہ ان کے یہ اعمال یقیناً ان کے لیے قرب کا ذریعہ ثابت ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں ضرور اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ لے کر آتا تو آپ اس کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى فُلَانٍ» "اے اللہ! فلاں پر رحم فرما۔" عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب میرے والد زکوۃ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ نے انھیں دعا دیتے ہوئے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ اَبِيْ اَوْفٰى» "اے اللہ! ابو اوفی کی آل پر رحم فرما۔" [ بخاری، الزکاۃ، باب صلاۃ الإمام و دعاءه لصاحب الصدقۃ ...... : ۱٤۹۷ ]

**آیت 100** ① **وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ** ...... : مدینہ کے اندر رہنے والے منافقین کے ذکر کے بعد اس کے اردگرد رہنے والے بعض اعراب منافقین کا ذکر فرمایا، پھر بعض اعراب مومنوں کے اخلاص کا ذکر فرمایا اور انھیں اپنی رحمت کی خوش خبری سنائی، اب ان سے اعلیٰ مراتب والے خوش نصیبوں کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے تین گروہوں کی تعریف فرمائی ہے، پہلا گروہ مہاجرین میں سے سبقت کرنے والے پہلے لوگ۔ ان کی تعیین میں مفسرین سے مختلف اقوال منقول ہیں، وہ لوگ جنھوں نے مکہ میں اپنی جائدادیں، گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر ہجرت کی، بعض نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھنے والے، بعض نے بدری صحابہ، بعض نے بیعت رضوان تک والے اور بعض نے فتح مکہ تک والے صحابہ مراد لیے ہیں۔ بہر حال ان سب کو دوسروں پر یقیناً ایک قسم کی سبقت حاصل ہے۔ دوسرا گروہ انصار میں سے سابقون وہ ہیں جنھوں نے مدینہ سے آکر ۱۱ نبوی میں مکہ میں حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر پہلی بیعت عقبہ کی۔ یہ سات افراد تھے، دوسری بیعت عقبہ جو ۱۲ نبوی میں ہوئی اس میں ستر (۷۰) آدمی اور دو خواتین شامل تھیں، پھر وہ جو ان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ ہجرت سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، پھر وہ سب اہل مدینہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد کے بعد مسلمان ہوئے، ان سب کو درجہ بدرجہ سبقت حاصل ہے۔ تیسرا گروہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سابقین مہاجرین و انصار کے بعد ایمان لا کر ہجرت یا نصرت کا شرف حاصل کیا، جیسا کہ سورۂ انفال میں مہاجرین و انصار کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ وَ اَعَدَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ تَحۡتَهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۰۰﴾

اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۰۰﴾

اٰمَنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا مَعَكُمۡ ﴾ [ الأنفال : ۷۵ ] ”اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا۔“ گویا صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایمان لانے والے اور اس پر استقامت اختیار کرنے والے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس تیسرے گروہ میں شامل ہیں۔

❷ آلوسی صاحب روح المعانی نے فرمایا: ”بہت سے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ ﴿ وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ ﴾ سے مراد رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت کے شرف کی بنا پر بعد والے تمام لوگوں پر سبقت حاصل ہے، جو پھر کسی کو نصیب نہ ہو سکی اور ﴿ وَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ ﴾ (اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے) سے قیامت تک آنے والے وہ تمام مسلمان مراد ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صرف قرآن اور سنت رسول پر اخلاص کے ساتھ عمل کرتے رہے۔“ کیونکہ دوسرے کسی بھی فرقے کے لوگ اپنے امام کی تقلید کا دعویٰ تو کر سکتے ہیں، مگر تمام صحابہ کی اچھے طریقے اور نیکی سے پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے، کیونکہ صحابہ کا عمل صرف قرآن و سنت پر تھا۔ اس وقت نہ فرقے تھے نہ وہ لوگ جن کے نام پر فرقے بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر بھی بالکل درست ہے، البتہ اس آیت سے صرف اصطلاحی تابعین مراد لینا کہ وہ لوگ جنھوں نے ایمان کی حالت میں صحابہ کی زیارت کی ہو ہرگز درست نہیں، کیونکہ احسان کے ساتھ مہاجرین و انصار کے پیچھے چلنے والے صرف وہی نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے سبھی مسلمان ہیں جن کے اخلاص اور قول و عمل میں احسان پایا جاتا ہے۔ ہاں اصطلاحی تابعین بدرجۂ اولیٰ ان میں شامل ہیں۔

❸ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جو اسلام میں بھی اول ہیں اور ہجرت میں بھی آپ ﷺ کے ساتھی ہیں، پھر بالترتیب دوسرے خلفاء رضی اللہ عنہم کے درجے ہیں، ان کے بعد باقی عشرہ مبشرہ جن میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، عبد الرحمٰن بن عوف اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم شامل ہیں، پھر بدری اور عقبہ والے صحابہ کا درجہ ہے اور ان کے بعد جو بیعت رضوان میں شریک ہوئے، پھر جو فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور ہجرت و نصرت کی۔ صحابہ کی فضیلت کی اس ترتیب پر اہل السنہ والجماعہ متفق ہیں۔

❹ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ: چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور جنت میں داخلے کی خوش خبری کی جو وجہ بیان ہوئی ہے، یعنی ہجرت و نصرت وہ دائمی ہے۔ کوئی شخص ان سے یہ اعزاز نہیں چھین سکتا۔ اس لیے اس پر ملنے والی بشارت بھی دائمی

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ﴿۱۰۱﴾

اور ان لوگوں میں سے جو تمھارے ارد گرد بدویوں میں سے ہیں، کچھ منافق ہیں اور کچھ اہل مدینہ میں سے بھی جو نفاق پر اڑ گئے ہیں، تو انھیں نہیں جانتا، ہم ہی انھیں جانتے ہیں۔ عنقریب ہم انھیں دوبار عذاب دیں گے، پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۱۰۱﴾

اور ہمیشہ کے لیے ہے، لہٰذا ان صحابہ میں سے۔ (العیاذ باللہ ) کسی کے مرتد ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اپنی رضا اور جنت کی خوش خبری دے ہی نہیں سکتا جس کے متعلق اسے علم ہو کہ اس نے مرتد ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جس طرح گزشتہ اور موجودہ حالات کا مکمل علم ہے آئندہ آنے والی ہر بات کا بھی اسی طرح مکمل علم ہے۔ وہ کفر پر مرنے والوں کو جنت اور رضا کی بشارت کیسے دے سکتا ہے؟ پھر کتنے بدبخت اور لعنتی ہیں وہ لوگ جو ان حضرات کے خلاف عموماً اور ان میں سے افضل ترین اور رسول اللہ ﷺ کی محبوب ترین ہستیوں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات امہات المومنین رضی اللہ عنہن جو ہجرت و نصرت کا شرف بھی رکھتیں ہیں، ان کے خلاف زبان درازی، سب و شتم، تہمت تراشی اور تبرا بازی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں اور ان کو برے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

**آیت 101** ① وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ...... : پہلے اعراب (بدوی) منافقین کا ذکر فرمایا، پھر اعراب میں سے مخلصین کا تذکرہ کیا۔ ان کے بعد سابقین مہاجرین و انصار اور ان کے پیچھے آنے والے صاحب احسان لوگوں کو خوش خبری دی اور ان کے لیے بلند مراتب کا بیان فرمایا (ان کا تذکرہ سورۂ جمعہ کی ابتدائی آیات میں بھی فرمایا ہے ) اب ان ضمنی مباحث کے بعد پھر منافقین کے ایک گروہ کا ذکر فرمایا جو مدینہ اور اس کے ماحول میں رہتے ہوئے اپنے نفاق میں "مَرَدُوْا" اتنے مشاق اور ماہر ہو گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی تیز ترین فراست اور قوی ترین اندازے کے باوجود ان سب کو معین طور پر نہیں پہچان سکے، گو بعض کو ان کے لہجے اور دوسری علامات سے، یا اللہ تعالیٰ کی نشان دہی سے پہچانتے ہوں۔ دیکھیے سورۂ محمد (۳۰) لہٰذا جن روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے بعض منافقین کے نام بھی حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بتا دیے تھے، وہ اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ آپ ان تمام کو نہیں جانتے، گویا آپ بعض منافقین کو جانتے تھے اور بعض کو نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے، اس سے رسول اللہ ﷺ کے عالم الغیب ہونے کے غلط دعویٰ کی حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے۔

② سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ : ایک تو دنیا میں غم و اندوہ اور فکر مندی کا عذاب، جس میں منافقین ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں، فرمایا: ﴿ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ [ المنافقون : ٤ ] کہ وہ ہر لمحہ اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کرتے ہیں، ہر بلند آواز کو اپنے خلاف گمان کرتے ہیں اور پھر یہ رسوائی بھی کہ کفار اور مسلمانوں میں سے انھیں اپنا سمجھنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا اور مرنے کے بعد قبر کے عذاب کو دوسرا عذاب فرمایا۔ یا "مَرَّتَيْنِ" سے مراد موت کے وقت فرشتوں کی مار ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَضْرِبُوْنَ

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

اور کچھ دوسرے ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے کچھ عمل نیک اور کچھ دوسرے برے ملا دیے، قریب ہے کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰۲﴾

---

وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴾ [ محمد : ٢٧ ] ”وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوں گے۔“ پھر قبر کا عذاب، اس کے بعد ” عَذَابٍ عَظِيْمٍ “ سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ ”مَرَّتَيْنِ“ کا معنی ”بار بار“ بھی آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ﴾ [ الملك : ٤ ] ”پھر بار بار نگاہ لوٹا، نظر ناکام ہو کر تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی۔“ یعنی دنیا میں مال و اولاد، پریشانیوں اور ذلتوں کے ذریعے سے، پھر موت کے وقت، پھر قبر کے اندر بار بار عذاب دے کر آخر کار جہنم میں پہنچا دیں گے۔ یہ معنی بہت جامع ہے۔

③ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”مَرَّتَيْنِ“ یعنی دنیا میں تکلیف پر تکلیف پائیں گے، پھر آخرت میں پکڑے جائیں گے۔“ (موضح)

**آیت 102** وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ ......: ﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ والی آیت میں مسلمانوں کے بہترین لوگوں کا ذکر ہے اور ﴿ وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ﴾ میں مسلمان کہلانے والے بدترین لوگوں کا ذکر ہے، جو آگ کے درکِ اسفل (سب سے نچلے حصے) کا ایندھن بننے والے ہیں اور اب عام مسلمانوں کا ذکر ہے جن کے صالح اعمال بھی ہیں اور کچھ اعمال سیئہ (برے کام) بھی ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مفسرین نے یہاں ابولبابہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کا تذکرہ فرمایا کہ وہ مخلص مسلمان ہونے کے باوجود تبوک پر نہ جا سکے تو انھوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خود کھولیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری توبہ قبول ہو گئی۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے انھیں اپنے ہاتھ سے کھولا اور پہلے ان کا پیش کردہ صدقہ قبول نہیں کیا تھا پھر اگلی آیت ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ اتری تو ان کا صدقہ بھی قبول فرمایا۔ اس مفہوم کی اکثر روایات مرسل یا کمزور ہیں، البتہ ”الاستيعاب في بيان الأسباب“ میں ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت کو حسن قرار دیا گیا ہے، جس میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے پیچھے رہ جانے پر اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھنے اور آخر کار اللہ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انھیں اپنے ہاتھ سے کھولنے کا اور ﴿ وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ ﴾ سے ﴿ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴾ تک آیات اترنے کا ذکر ہے۔ (واللہ اعلم) البتہ اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ جس طرح ﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ والی آیت میں مذکور افراد ﴿ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ﴾ میں قیامت تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام محسن پیروکار شامل ہیں، اسی طرح یہ آیت قیامت تک آنے والے تمام گناہ گار مخلص مسلمانوں کو شامل ہے، جنھوں نے اپنے اچھے اعمال کے ساتھ کچھ دوسرے برے اعمال بھی ملا جلا رکھے ہیں۔ سند کے لحاظ سے اس کی صحیح ترین

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۰۳﴾

تفسیر وہ ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں اپنی صحیح میں درج فرمائی ہے کہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آج رات دو آنے والے میرے پاس آئے، انھوں نے مجھے اٹھایا، پھر وہ مجھے ایک ایسے شہر میں لے گئے جو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنایا گیا تھا، وہاں میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کا نصف بدن سب سے زیادہ خوبصورت شخص کی طرح تھا جو تم دیکھنے والے ہو اور نصف اس بدصورت ترین شخص کی طرح تھا جو تم دیکھنے والے ہو۔ دونوں فرشتوں نے ان لوگوں سے کہا، اس نہر کے اندر داخل ہو جاؤ، وہ اس میں داخل ہو گئے، پھر ہماری طرف واپس آئے تو ان سے وہ بدصورتی جا چکی تھی اور وہ بہترین صورت میں بدل چکے تھے۔ دونوں (فرشتوں) نے مجھ سے کہا، یہ جنت عدن ہے اور وہ تمھارا گھر ہے۔ دونوں نے کہا کہ وہ لوگ جن کا نصف حصہ خوبصورت اور نصف بدصورت تھا «فَاِنَّهُمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَ آخَرَ سَيِّئًا تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهُمْ» تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نیک عمل کیے اور ان کے ساتھ برے عمل بھی ملا جلا دیے، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر فرما دیا۔'' [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ وآخرون اعترفوا بذنوبهم ﴾ : ٤٦٧٤ ]

آیت 103 ① خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً : ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو پچھلی آیت کی تفسیر میں ذکر ہوئی، اس میں ہے کہ جب ان لوگوں کی توبہ قبول ہو گئی تو یہ اپنے اموال لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہمارا صدقہ قبول فرمائیے اور ہمارے لیے استغفار کیجیے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ قبول کرنے سے انکار فرما دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے ان کا صدقہ قبول فرما لیا۔

② اس حکم میں ان اعتراف گناہ کرنے والوں کا صدقہ قبول کرنے کے ساتھ تمام مسلمانوں سے بھی صدقہ وصول کرنے کا حکم ہے، کیونکہ زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکانِ خمسہ میں شامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں ان کے نائب کو صدقہ ادا کرنا ہوگا۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے کا حق صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا، آپ کے بعد کسی کا یہ حق نہیں۔ چنانچہ آپ کی وفات کے بعد بعض لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ نے ان کی تاویل کو رد کیا اور ان سے اس وقت تک جنگ کی جب تک انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ اس موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا وہ مشہور قول ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ مجھ سے ایک عناق (بکری کی پٹھوری) اور ایک روایت میں ہے کہ ایک عقال (ایک رسی یا ایک سال کی زکوٰۃ) روکیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے

اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهٖ وَ يَاۡخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ وَسَتُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ

کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور صدقے لیتا ہے اور یہ کہ بے شک اللہ ہی ہے جو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰۴﴾ اور کہہ دے تم عمل کرو، پس عنقریب اللہ تمھارا عمل

تھے تو میں ہر صورت ان کے نہ دینے کی وجہ سے ان سے جنگ کروں گا۔

③ تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا : اس سے زکوٰۃ اور صدقات کی فضیلت ظاہر ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان کے مال کو اور اس کی نیت اور عمل کو طہارت اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور دونوں میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ " زَكَا يَزْكُوْ" جس سے "تُزَكِّيۡهِمۡ" مشتق ہے، پاک ہونے اور بڑھنے دونوں معنی میں آتا ہے۔ ویسے بھی صدقہ کو صدقہ کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے کے صدق کو ظاہر کرتا ہے۔

④ وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ...... : " صَلَاةٌ " کا معنی نماز، رحمت اور دعا بھی آتا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صدقہ پیش کرنے والوں کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کا حکم دیا کہ اس سے ان کے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے، اس لیے آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب کوئی صدقہ (فرض زکوٰۃ یا نفل صدقہ) لے کر آتا تو آپ اس کے لیے دعا فرماتے، جیسا کہ پیچھے آیت (۹۹) کی تفسیر میں باحوالہ گزرا ہے کہ آپ نے ابو اوفیٰ رضی اللہ عنہ کے زکوٰۃ لانے پر (( اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ اَبِيْ اَوْفٰى )) کہہ کر ان کے ساتھ ان کے پورے اہل کو بھی دعا میں شامل فرما لیا۔ ﴿ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جو وہ کہہ رہے ہیں یا جو ان کے دل میں ہے سب سے واقف ہے، کیونکہ وہ سمیع بھی ہے علیم بھی۔

**آیت 104** اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ ...... : اس آیت میں (گناہ گاروں کو) توبہ اور صدقے پر ابھارا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بھی توبہ کرے اور پھر عمل صالح کرے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے، بلکہ ساتھ ہی اس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۷۰، ۷۱) بھلا اس کرم کی کوئی حد ہے؟ پھر وہ صدقہ قبول ہی نہیں کرتا، بلکہ اسے بڑھاتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ قبول کرتا ہے اور اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لیتا ہے، پھر اسے تمھارے ایک کے لیے پالتا بڑھاتا ہے، جس طرح تمھارا کوئی شخص اپنے گھوڑی کے بچھیرے کو پالتا ہے، یہاں تک کہ ایک لقمہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔'' پھر اس کی تصدیق میں زیر تفسیر آیت اور یہ آیت پڑھی: ﴿ يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [ البقرة : ۲۷٦ ] ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔'' [ ترمذی، الزکوٰۃ، باب ما جاء فی فضل الصدقة : ٦٦٢ ] اس کا اصل بخاری اور مسلم میں بھی ہے۔ [ هداية المستنير ]

**آیت 105** ① وَقُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ ...... : یعنی اب اگر قصور ہو گیا تو آئندہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء

الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾ وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا

دیکھے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے بھی اور عنقریب تم ہر پوشیدہ اور ظاہر بات کو جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿١٠٥﴾ اور کچھ دوسرے ہیں جو اللہ کے حکم کے لیے مؤخر رکھے گئے ہیں، یا تو وہ انھیں عذاب دے اور یا پھر ان پر مہربان ہو جائے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿١٠٦﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے اور کفر کرنے (کے لیے) اور ایمان والوں

---

کے دور میں جو جہاد ہونے والے ہیں ان میں خوب کام کر لو۔ (موضح) اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کے تمام احوال سے پوری طرح باخبر ہے مگر تم عمل کرو، تمھارے عمل کو وجود میں آتا ہوا اللہ تعالیٰ بھی دیکھ لے گا، اس کا رسول بھی اور ان کے زمانے کے مومن اور بعد میں آنے والے خلفاء اور اہل ایمان بھی، کیونکہ آدمی اچھا یا برا جو کام بھی کرتا ہے اس کی اسی طرح کی شہرت ہر طرف پھیل جاتی ہے، خصوصاً مومن اس سے بے خبر نہیں رہتے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ )) [ النسائي، الجنائز، باب الثناء : ١٩٣٤، ١٩٣٥ ] ''تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔'' یہ الفاظ آپ ﷺ نے ایک جنازے کے گزرنے پر لوگوں کی اچھی تعریف اور دوسرے کے گزرنے پر لوگوں کے اس کی بری تعریف کرنے پر ارشاد فرمائے اور پہلے کے لیے جنت کی بشارت دی اور دوسرے کے لیے آگ کی۔ ایک روایت میں ہے: (( اَلْمُؤْمِنُوْنَ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ )) ''مومن زمین میں اللہ کے گواہ ہیں۔'' [ بخاري، الجنائز، باب ثناء الناس على الميت : ١٣٦٧ ]

② وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ...... : یعنی اگر بالفرض لوگوں کو تمھاری حقیقت کی خبر نہ ہو سکی تو آخر کار تمھیں واپس عالم الغیب والشہادہ کے پاس جانا ہے، وہاں کچھ مخفی نہیں رہے گا۔

**آیت 106** وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ ...... : جو لوگ غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوئے اور مدینہ سے نہیں نکلے، وہ تین طرح کے تھے، ایک منافقین، دوسرے ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور تیسرے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دو ساتھی مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، جنھوں نے اگرچہ آپ ﷺ کے سامنے کوئی جھوٹا عذر بنا کر پیش نہیں کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ جلدی قبول نہ فرمائی بلکہ ان کے معاملے کو مؤخر رکھا۔ اس آیت میں انھی کا ذکر ہے اور ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر آگے آیت میں آ رہا ہے۔

**آیت 107** وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا ...... : یہ منافقین کے ایک اور قبیح کام کا ذکر ہے کہ انھیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبے اور سازشیں بنانے کے لیے جمع ہونے اور اپنے راز مخفی رکھنے کے لیے کوئی موزوں جگہ نہیں ملتی تھی، چنانچہ انھوں نے مسجد قبا کے ساتھ ہی ایک مسجد بنائی جس کے بنانے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے چار مقصد بیان فرمائے ہیں۔ چاروں

بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

کے درمیان پھوٹ ڈالنے (کے لیے) اور ایسے لوگوں کے لیے گھات کی جگہ بنانے کے لیے جنھوں نے اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور یقیناً وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے بھلائی کے سوا ارادہ نہیں کیا اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں ﴿۱۰۷﴾

مقصد مصدر کے لفظ کے ساتھ آئے ہیں: ① "ضِرَارًا" یعنی یہ مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے نہیں بلکہ مومنوں کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے لیے ہے۔ ② "وَكُفْرًا" یعنی مساجد کی بنیاد تو اللہ اور رسول پر ایمان اور اکیلے اللہ کو پکارنے کے لیے ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [ الجن : ۱۸ ] مگر اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف دلوں میں چھپا ہوا کفر و شرک اور اس کی اشاعت ہے۔ ③ "وَتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" مسجد قبا کی موجودگی میں اس کے ساتھ ہی مسجد بنانے کا واضح مطلب مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا تھا کہ وہ ایک جگہ نماز نہ پڑھیں، کیونکہ مسلمانوں کی اسلام کی وجہ سے باہمی محبت اور اتفاق و اتحاد سے منافقین کو شدید حسد تھا۔ ④ "وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" اس سے پہلے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے رہے اور ان سے برسر جنگ رہے، خصوصاً منافقین اور وہ لوگ جو مدینہ سے بھاگ گئے تھے اور دشمنوں کی پناہ میں رہ کر اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے تھے ان کے لیے اور ان کے بھیجے ہوئے آدمیوں کے لیے مسجد کے پردے میں چھپاؤ کی جگہ مہیا کرنا۔ مؤرخین نے خصوصاً یہاں ابوعامر راہب (جس کا نام مسلمانوں نے ابوعامر فاسق رکھا ہوا تھا) کا ذکر کیا ہے، جو مشہور صحابی حنظلہ غسیل الملائکہ کا والد تھا اور عیسائی ہو کر ہرقل کے پاس مسلمانوں کے خلاف کمک حاصل کرنے کے لیے گیا تھا، اس کی تجویز پر مسلمانوں سے جنگ کے لیے آنے والوں کے لیے بطور گھات اور کمین گاہ یہ مسجد بنائی گئی تھی۔

منافقین نے مسلمانوں کے دلوں سے شک دور کرنے کے لیے مسجد بنانے کا بہانہ یہ بنایا کہ ہم نے بیماروں اور کمزوروں کی سہولت کے لیے یہ مسجد بنائی ہے، تاکہ وہ سردی اور بارش میں سہولت سے یہاں نماز پڑھ سکیں اور ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے درخواست کی کہ آپ وہاں چل کر نماز پڑھیں، تاکہ ہمیں برکت حاصل ہو۔ خواہش ان کی یہ تھی کہ آپ کے نماز پڑھنے سے ہماری مسجد تسلیم ہو جائے اور ہم اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ آپ اس وقت تبوک کے لیے روانہ ہو رہے تھے، اس لیے آپ نے فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو واپسی پر میں تمھاری مسجد میں آ کر نماز پڑھوں گا۔ جب آپ ﷺ تبوک سے واپسی پر مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو جبریل علیہ السلام یہ آیات لے کر نازل ہوئے جن میں اس مسجد ضرار کا پول کھولا

لَا تَقُمۡ فِيۡهِ اَبَدًا ؕ لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى مِنۡ اَوَّلِ يَوۡمٍ اَحَقُّ اَنۡ تَقُوۡمَ فِيۡهِ ؕ فِيۡهِ

اس میں کبھی کھڑے نہ ہونا۔ یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی زیادہ حق دار ہے کہ تو اس میں

گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ یہ لوگ یقیناً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ اس مسجد بنانے سے بھلائی کے سوا کچھ نہ تھا، جب کہ اللہ تعالیٰ کی شہادت یہ ہے کہ بلاشک وشبہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

آیت 108 ① لَا تَقُمۡ فِيۡهِ اَبَدًا: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ آپ اس میں کبھی نماز نہ پڑھیں، کیونکہ قیام نماز کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ حدیث ہے: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا» دوسرا یہ کہ نماز تو دور کی بات ہے آپ کبھی اس مسجد میں جا کر کھڑے بھی نہ ہوں، کیونکہ اس میں ان کی عزت افزائی ہوگی، جیسا کہ آپ کو منافقین کا جنازہ پڑھنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے بھی منع فرمایا: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ﴾ [ التوبة : ٨٤ ] چنانچہ آپ نے راستے ہی سے آدمی بھیج کر اس مسجد کو جلوا کر مسمار کروا دیا۔

② لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى مِنۡ اَوَّلِ يَوۡمٍ ...... : اس مسجد سے کون سی مسجد مراد ہے؟ سیاق و سباق سے واضح طور پر مسجد قبا ہی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کی بنیاد مسجد ضرار کے برعکس پہلے دن ہی سے اللہ کے تقویٰ اور اس کی رضا کے حصول پر رکھی گئی تھی اور اس کی خاص فضیلت بھی صحیح احادیث میں آئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسجد قبا میں نماز عمرہ کی طرح ہے۔'' [ ترمذی، الصلاة، باب ما جاء فی مسجد قباء : ٣٢٤، عن أسید بن ظهیر رضی اللہ عنہ ] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قبا میں سوار ہو کر یا پیدل آیا کرتے تھے اور اس میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ [ مسلم، الحج، باب فضل مسجد قباء...... : ١٣٩٩ ]

صحیح بخاری میں ہجرت سے متعلق طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کے موقع پر پہلے بنو عمرو بن عوف میں دس سے کچھ زیادہ راتیں ٹھہرے اور اس مسجد کی بنیاد رکھی جو ﴿اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى مِنۡ اَوَّلِ يَوۡمٍ﴾ ہے اور آپ نے اس میں نماز پڑھی، پھر اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے آگے روانہ ہوئے، یہاں تک کہ اونٹنی رسول اللہ ﷺ کی اس مسجد کے پاس بیٹھ گئی جو مدینہ میں ہے اور وہ سہل اور سہیل رضی اللہ عنہما کی کھجوریں سکھانے کی جگہ تھی۔ [ بخاری، مناقب الأنصار، باب هجرة النبی ﷺ و أصحابه إلى المدينة : ٣٩٠٦ ] اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسجد قبا ہے، مگر بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا مصداق مسجد نبوی کو قرار دیا، چنانچہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمیوں کی اس مسجد کے بارے میں بحث ہوگئی کہ وہ کون سی مسجد ہے جو ﴿اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى مِنۡ اَوَّلِ يَوۡمٍ﴾ ہے۔ ایک نے کہا، وہ مسجد قبا ہے۔ دوسرے نے کہا، وہ مسجد رسول ﷺ، یعنی مسجد نبوی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ میری یہ مسجد (مسجد نبوی) ہے۔'' [ ترمذی، تفسیر القرآن، سورة التوبة : ٣٠٩٩ ] اس کی سند بھی صحیح ہے اور احمد، مسلم اور نسائی میں مذکور احادیث میں بھی آپ ﷺ نے اسے مسجد نبوی ہی قرار دیا ہے۔ اہل علم نے فرمایا، ان دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں،

رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝۱۰۸

کھڑا ہو۔ اس میں ایسے مرد ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ بہت پاک رہیں اور اللہ بہت پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۰۸﴾

کیونکہ دونوں مسجدوں کی بنیاد پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور آپ کا مسجد نبوی کی صراحت کرنا اس لیے تھا کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھ لے کہ پہلے دن سے تقویٰ پر بنیاد صرف مسجد قبا کی رکھی گئی ہے، بلکہ واضح فرمایا کہ مسجد نبوی کی بنیاد بھی پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور وہ بالا ولیٰ اس آیت کی مصداق ہے۔

③ ہر وہ مسجد جس کی بنیاد مسلمانوں کو نقصان پہنچانے یا تفریق ڈالنے کے لیے رکھی جائے، اس میں نماز جائز نہیں اور اسے ڈھا دینا لازم ہے اور ایک مسجد کے ساتھ ہی دوسری مسجد بنانا درست نہیں، الا یہ کہ آبادی زیادہ ہو جو ایک مسجد میں نماز نہ پڑھ سکیں۔ اسی طرح کوئی بھی مسجد جس کے بنانے والوں نے اس کی بنیاد ہی مشرکانہ عقائد پھیلانے اور توحید اور اہلِ توحید و سنت کی عداوت اور مخالفت کے لیے رکھی ہو اور اس میں قبر بنا دی ہو یا شرکیہ کلمات لکھے ہوں، اس میں بھی نماز پڑھنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ہاں، جس مسجد کی بنیاد پوری بستی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز ہی کے لیے رکھی ہو بعد میں کوئی مشرکانہ عقیدے والا اس میں شرک کی کوئی علامت نمایاں کر دے، جسے ختم کرنے پر آدمی قدرت نہ رکھتا ہو، یا کوئی قدیم مسجد جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ اس کے بنانے والے نے اس کی بنیاد مشرکانہ عقیدے پر رکھی ہے، وہاں نماز پڑھنا جائز ہے، کیونکہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، جیسا کہ مشرکین نے کعبہ کے اندر اور اردگرد بت رکھ دیے تھے، مگر رسول اللہ ﷺ فتح مکہ سے پہلے اس میں نماز پڑھتے اور طواف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ قوت عطا فرمائے تو ان مساجد کو شرک کے مظاہر و علامات سے پاک کر دیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب ان کی باہمی تفریق ہے، اس لیے تمام کفار اور منافقین اسے زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ تفریق صوفیانہ فرقوں کی ہو یا فقہی فرقوں کی، یا سیاسی فرقوں کی مسلمانوں کی نجات، ترقی اور غلبہ تمام فرقے ختم کر کے صرف کتاب و سنت پر ایک ہو جانے میں ہے۔ ہماری تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی چاروں کی الگ مسجدیں، الگ مدرسے، الگ عدالتیں تھیں، حتیٰ کہ عین مسجد حرام میں چار الگ الگ مصلوں پر جماعتیں ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے سلطان عبد العزیز رحمہ اللہ کو جنھوں نے تمام مملکت نجد و حجاز میں اور خانہ کعبہ میں یہ تفریق ختم کر کے سب کو ایک ہی امام پر جمع فرمایا۔ دوسرے ممالک میں ابھی تک ہر فرقے کی الگ الگ مسجدیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو فرقہ بازی چھوڑ کر توحید و سنت پر جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائے، جیسا کہ مسلمانوں کا پہلا ایک سو سال کا روشن ترین زمانہ ان فرقوں اور الگ الگ عدالتوں اور مساجد سے پاک تھا اور تمام مسلمانوں کے کتاب و سنت پر متحد ہونے کی وجہ سے پوری دنیا پر ان کا غلبہ تھا۔ یہ تمام فرقے اور جن کے ناموں پر فرقے بنے ہیں سب بعد میں ظہور پذیر ہوئے، خیر القرون میں ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

④ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ...... : "يَتَطَهَّرُوْا" اور "الْمُطَّهِّرِيْنَ" یہ "طَهُرَ (کرم)" میں سے باب تفعل یعنی "تَطَهَّرَ يَتَطَهَّرُ" کے صیغے ہیں، اس لیے ان کا معنی حروف میں اضافے کی وجہ سے بہت پاک ہونا اور رہنا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

تو کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی، بہتر ہے، یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کھوکھلے تودے کے کنارے پر رکھی، جو گرنے والا تھا؟ پس وہ اسے لے کر جہنم کی آگ میں گر گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۰۹﴾

سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ آیت: ﴿ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ اہل قبا کے متعلق اتری، وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے۔'' [ أبو داوٗد، الطهارة، باب في الاستنجاء بالماء : ٤٤۔ ترمذی : ٣١٠٠۔ ابن ماجه : ٣٥٥، و صححه الألبانی ]

5 حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل قبا سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ تمھاری تعریف کرتا ہے (اس کی کیا وجہ ہے؟) انھوں نے کہا کہ ہم پتھروں کے بعد پانی استعمال کرتے ہیں۔ اس حدیث کی وجہ سے بہت سے لوگ جہاں پانی میسر ہو وہاں بھی پہلے ڈھیلے استعمال کرتے ہیں پھر پانی، جس سے گندگی بھی پھیلتی ہے اور گٹر بھی بند ہوتے ہیں۔ کئی لوگ استنجا خانے سے باہر شلوار ہاتھ میں پکڑ کر ڈھیلے سے پیشاب خشک کر رہے ہوتے ہیں جو نہایت بے ہودہ دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل قبا کی تعریف اس لیے تھی کہ وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے، پانی کی موجودگی میں ڈھیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کسی کو صرف پانی کے ساتھ طہارت سے تسلی نہیں ہوتی تو وہ وسوسے کا مریض ہے۔ یہ حدیث جس میں پتھروں کے بعد پانی کا ذکر ہے، اس کے متعلق خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں فرمایا کہ اسے بزار نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اصل حدیث ابوداؤد اور ترمذی میں ہے، جسے ابن خزیمہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح کہا ہے اور وہ پتھروں کے ذکر کے بغیر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے " التلخیص الحبیر" میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اسے صرف محمد بن عبد العزیز راوی نے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اسے ابوحاتم نے ضعیف کہا ہے۔ ہاں استنجا صرف پتھروں سے بھی جائز اور کافی ہے اور اگر کبھی اس کا اتفاق ہو اور اس کے بعد پانی سے مزید صفائی کر لے تو بہتر ہے، ورنہ پانی کی موجودگی میں پتھر استعمال کرنے کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

**آیت 109** 1 اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى...... : "شَفَا" کنارا "جُرُفٍ" ندی نالے یا دریا کا کنارا جس کے نیچے سے پانی مٹی بہا کر لے گیا ہو اور وہ بس گرنے ہی والا ہو، کیونکہ اس کے نیچے کوئی بنیاد ہی نہیں کہ ٹھہر سکے، صرف مٹی کا نیچے سے کھوکھلا تودا ہے۔ "هَارٍ" اسم فاعل ہے "هَارَ يَهَارُ (خَافَ يَخَافُ)" سے یا هَارَ يَهُوْرُ (قَالَ يَقُوْلُ) " سے۔ اصل "هَائِرٌ" تھا، جیسا کہ "خَائِفٌ" یا "قَائِلٌ"، پھر اس میں قلب واقع ہوا تو "هَارِيٌ" ہو گیا اور "رَاضِيٌ" سے یاء گرنے کے بعد "رَاضٍ" کی طرح "هَارِيٌ" سے "هَارٍ" ہو گیا۔ "فَانْهَارَ" باب انفعال " اِنْهِيَارٌ" سے ماضی معلوم ہے۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١٠﴾ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ

ان کی عمارت جو انھوں نے بنائی، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے چینی کا باعث بنی رہے گی، مگر اس صورت میں کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿١١٠﴾ بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ یقیناً ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں

یہ دو شخصوں کی مثال ہے، ایک وہ جس کے عقیدہ و عمل کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور اس کی رضا پر ہے، دوسرا وہ جس کے عقیدہ و عمل کی بنیاد محض کفر و نفاق پر ہے۔ اول الذکر کی عمارت کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہے، وہ کبھی گرنے والی نہیں اور دوسرے کی عمارت ایسی چیز پر ہے جو دکھائی تو دیتی ہے مگر نیچے سے خالی ہے، گویا اس کی بنیاد ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ عمارت ہر حال میں اسے بھی لے کر گرے گی اور کفر و نفاق (جس کا انجام آگ ہے) کے اوپر کھڑی ہونے کی وجہ سے جہنم کی آگ میں لے کر گرے گی۔

② وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ: یعنی بے انصافی (ظلم) کی یہ شامت پڑتی ہے کہ نیک عمل کرنا بھی چاہیں تو بن نہیں آتا۔ (موضح)

آیت 110 لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً ......: ''رِيبَةً'' بے چینی، جیسا کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلصِّدْقُ طُمَأْنِينَةٌ وَالْكِذْبُ رِيبَةٌ )) [ أحمد : ۱/ ۲۰۰، ح ۱۷۲۳۔ ترمذی : ۲۵۱۸، و صححه الألبانی ] ''سچ اطمینان کا باعث ہے اور جھوٹ بے چینی کا باعث ہے۔'' یعنی یہ مسجد ضرار گرائے جانے کے بعد اس کے بنانے والوں کے دلوں کو بے چین رکھے گی کہ ہمارا نفاق و کفر ظاہر ہو گیا، اب کوئی مسلمان ہمیں دل سے اپنا سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوگا، ان کی یہ حالت موت تک ایسے ہی رہے گی۔ ﴿ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ﴾ کا یہی معنی ہے، نہ ان کا دل نفاق سے پاک ہوگا نہ انھیں اطمینان نصیب ہوگا۔

آیت 110 ① إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ ...... : ''فَاسْتَبْشِرُوا'' ''اَلْاِسْتِبْشَارُ'' ایسی زبردست خوشی جس کے اثرات بشرے یعنی چہرے پر بھی ظاہر ہوں۔ سین اور تاء کے اضافے سے بشریٰ، یعنی خوش خبری کے مفہوم میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ جہاد کی اس سے بہتر اور اس سے بڑھ کر مؤثر ترغیب آپ کسی آیت میں نہیں پائیں گے، کیونکہ اسے ایک سودے اور معاہدے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو سودا رب العزت کے ساتھ ہے۔ سودے کا سامان مومنوں کی جانیں اور مال ہیں اور قیمت اس کی اتنی قیمتی اور بے مثال ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال تک آیا۔ یہ سودا اور معاہدہ صرف اس پر نہیں کہ وہ قتل کیے جائیں گے تو قیمت ملے گی، بلکہ اللہ کے دین کی

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوب خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۱۱﴾

نصرت اور اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے وہ کفار کو قتل کریں گے تب بھی یہی قیمت ملے گی۔ پھر اس معاہدے کی باقاعدہ تسجیل (رجسٹری) آسمانی کتابوں تورات، انجیل اور قرآن میں کی گئی، اس سے بڑھ کر سودے کی پختگی کا تحریری ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے، پھر اسے اللہ تعالیٰ کا سچا پکا عہد قرار دے کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنا عہد کون پورا کرنے والا ہے۔ سو اس کا ادھار دوسرے تمام نقدوں سے بڑھ کر ہے، پھر اس کا ادھار وعدہ جنت یقینی ہے۔ اس آیت کے علاوہ دیکھیے سورۂ حدید (۲۱)، سورۂ صف (۱۰ تا ۱۲) اور سورۂ توبہ (۲۰ تا ۲۲) اور اگر کچھ زندگی باقی ہے تو وہ بھی اس کے بے پایاں انعام سے خالی نہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ضمانت دی ہے کہ جو اس کے راستے میں جہاد کرے اور اسے اس کے راستے میں نکالنے والی چیز اس کی راہ میں جہاد اور اس کی باتوں کو سچا یقین کرنے کے سوا کچھ نہ ہو تو وہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا، یا اسے اس کے گھر میں اجر یا غنیمت سمیت واپس لائے گا جس گھر سے وہ نکل کر گیا تھا۔'' [ بخاري، فرض الخمس، باب قول النبي ﷺ : أحلت لكم الغنائم : ۳۱۲۳ ]

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مجاہدین ایران میں جہاد کے لیے گئے تو کسریٰ کے جرنیل نے مسلمانوں کے سفیر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تم لوگ کیا ہو؟'' انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا تعارف کرانے کے بعد فرمایا: ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہمارے رب کا پیغام پہنچایا کہ ہم میں سے جو قتل کر دیا جائے گا وہ جنت کی ایسی نعمتوں میں جائے گا جو کبھی کسی کے دیکھنے میں نہیں آئیں اور جو ہم میں سے باقی رہے گا وہ تمھاری گردنوں کا مالک بنے گا۔'' [ بخاري، الجزية والموادعة، باب الجزية والموادعة ...... : ۳۱۵۹ ] جہاد کے بے شمار فضائل کے لیے کتب احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

② **وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** : اس میں حصر کے لیے "**هُوَ**" ضمیر لا کر اور خبر "**الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ**" پر الف لام لا کر واضح فرمایا کہ فوزِ عظیم ہے تو بس یہ ہے، اس کے سوا کوئی کامیابی عظیم نہیں، بلکہ معمولی اور بے وقعت ہے۔

③ حسن بصری رحمہ اللہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا کرم دیکھیے، جانیں ہیں تو اسی نے دیں، اموال ہیں تو اس نے عطا فرمائے، پھر وہ ہم ہی سے سودا کر رہا ہے کہ ہم اس کے راستے میں خرچ کریں گے اور وہ ہمیں اس کے بدلے جنت میں داخل ہی نہیں کرے گا بلکہ وہ اسے ہماری ملکیت بنا دے گا۔ "**لَهُمُ**" پہلے آنے سے حصر کا معنی حاصل ہوا "**بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ**" کہ جنت انھی کی ہے۔

اَلتَّآىِٕبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ السَّآىِٕحُوۡنَ الرّٰكِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّاهُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ الۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۱۲﴾

(وہ مومن) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، (اللہ کی راہ میں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور ان مومنوں کو خوش خبری دے دے ﴿۱۱۲﴾

آیت 112 ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سچے مجاہد مومنوں کی نو صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی چھ صفات میں صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے، ساتویں اور آٹھویں صفت کا تعلق مخلوق سے ہے اور آخری کا تعلق دونوں سے ہے۔

② اَلتَّآىِٕبُوۡنَ : اپنے گناہوں پر نادم ہو کر ان کو چھوڑنے کا عزم کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے والے، کیونکہ توبہ ان تینوں کے جمع ہونے سے مکمل ہوتی ہے۔ میدان قتال میں توبہ واستغفار سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے نبیوں کے ہمراہ قتال کرنے والوں کی دعا ذکر فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ [ آل عمران : ۱۴۶ ] ”اور ان کا کہنا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہماری زیادتی کو بھی اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافر لوگوں پر ہماری مدد فرما۔“

③ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ : مشکل اور آسانی، خوشی اور ناخوشی، آرام اور تکلیف ہر حال میں اللہ کی عبادت کرنے والے اور ہر حال میں اس کی تعریف کرنے والے اور اس پر راضی رہنے والے۔

④ السَّآىِٕحُوۡنَ : ”سَاحَ يَسِيۡحُ سِيَاحَةً“ کا معنی پانی کا زمین پر چلنا، پھیل جانا۔ ” اَلسِّيَاحَةُ “ عبادت کے لیے (گھر بار چھوڑ کر) زمین میں نکل جانا۔ (قاموس) چونکہ اس میں آرام و آسائش کا ترک اور دنیا کا ترک پایا جاتا ہے۔ نصرانیت میں اس نے رہبانیت کی صورت اختیار کی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَرَهۡبَانِيَّةَ ۨ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ﴾ [ الحدید : ۲۷ ] ”اور رہبانیت (دنیا سے کنارہ کشی) تو انھوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔“ اب اس کی صورت اللہ تعالیٰ کی خاطر ہجرت (وطن چھوڑنا) ہے کہ جہاں اللہ کے دین پر عمل نہ کر سکے، نہ اس کی دعوت دے سکے، اسے چھوڑ کر اللہ کی زمین میں کہیں اور نکل جائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۹۷ تا ۱۰۰)، زمر (۱۰) اور عنکبوت (۵۶) ایک صورت جہاد فی سبیل اللہ ہے جس میں مجاہد گھر سے نکل کر آرام و آسائش ترک کر کے اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے اللہ کی زمین کے مشکل سے مشکل اور خوبصورت سے خوبصورت مقامات پر پھرتا ہے اور ہر جگہ اللہ کا بول بالا کرتا ہے۔ ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ”یا رسول اللہ! مجھے سیاحت کی اجازت دیجیے۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِنَّ سِيَاحَةَ أُمَّتِي الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ )) ”میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“ [ أبو داوٗد، الجهاد، باب فی النهی عن السیاحة : ۲۴۸۶، و صححه الألبانی ] بعض علماء کے مطابق ”السَّآىِٕحُوۡنَ“ میں وہ طالب علم بھی آ جاتے ہیں جو اللہ کا دین سیکھنے کے لیے شہر بہ شہر

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ

اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ

سفر کرتے ہیں۔ ایک صورت "اَلسَّآئِحُوْنَ" کی روزہ کی ہے کہ اس میں انسان تمام گناہ چھوڑنے کے ساتھ اپنی سب سے زیادہ مرغوب تین چیزیں کھانا پینا اور بیوی سے مباشرت ترک کر دیتا ہے۔ "اَلسَّآئِحُوْنَ" کا معنی ''روزہ رکھنے والے'' ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور کئی تابعین سے آیا ہے۔ (ابن کثیر) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلسَّائِحُوْنَ هُمُ الصَّائِمُوْنَ )) ''سائحون روزہ دار ہی ہیں۔'' مستدرک وغیرہ مگر شیخ البانی رحمہ اللہ نے سلسلہ ضعیفہ (۳۷۲۹) میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بے تعلق رہنا روزہ ہے یا ہجرت ہے یا دل نہ لگانا دنیا کے مزوں میں۔ (موضح) "اَلسَّآئِحُوْنَ" کے لغوی معنی اور صحیح حدیث کو مدنظر رکھیں تو ہجرت یا جہاد اور اعلائے دین کے لیے یا دوسرے نیک مقاصد کے لیے زمین میں پھرنے والے ہی اس کا اصل مصداق ٹھہرتے ہیں۔ پاسپورٹ اور ویزا کا نظام کفار نے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو ختم کرنے ہی کے لیے اپنے اور مسلمانوں کے ملکوں میں نافذ کروا دیا ہے، کیونکہ سفر کے ذریعے ہی سے ہجرت، جہاد، طلب علم، تبلیغ دین، تجارت اور بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں جو اس وقت تک حاصل رہے جب تک مسلمان ساری زمین پر پھرتے رہے اور اس قوت سے سرفراز رہے۔ جب وہ گھروں میں بیٹھ گئے اور آرام طلبی اختیار کی تو کفار کی مراد بر آئی۔

5 اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ: اس کے اولین مصداق تو وہ ہیں جو فرض نمازوں کے علاوہ نوافل بھی ادا کرتے ہیں، جن کے متعلق کفار نے بھی شہادت دی: "هُمْ بِاللَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَانٌ" کہ وہ رات کو راہب اور دن کو شاہ سوار ہوتے ہیں۔ ورنہ کم از کم فرض نمازوں کے پابند ہونا تو اس کے لیے بنیادی چیز ہے۔ ترک نماز کے ساتھ اپنے آپ کو جنت کے سوداگر سمجھنا اپنی جان کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں۔

6 اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ...... : یعنی دوسروں کو نیکی کا حکم دے کر اور برائی سے منع کر کے کفار کو مسلمان بنانے والے اور مسلمانوں کو اسلام پر عمل کی تاکید کرنے والے اور صرف دوسروں ہی کو نہیں خود بھی اللہ کی ہر حد کی پابندی اور ہر حکم کی اطاعت کرنے والے۔ "اَلْمُؤْمِنِيْنَ" میں الف لام کی وجہ سے ''ان مومنوں کو'' ترجمہ کیا ہے کہ خوش خبری کے حق دار ان صفات کے حامل مومن ہیں، فقط دعویٰ رکھنے والے نہیں۔

آیت 113 1 مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ......: ابتدا سورت سے لے کر یہاں تک مشرکین اور منافقین سے کلی طور پر تعلق ختم کرنے کے اعلان و اظہار کا حکم دیا ہے۔ اب یہاں بتایا کہ جس طرح ان کے زندوں سے لاتعلقی کا اظہار ضروری ہے، اسی طرح ان کے مردوں سے براءت کا اظہار بھی لازم ہے اور ان کے لیے بخشش کی دعا کرنا جائز نہیں۔ مسیّب بن حزن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے تو اس کے پاس ابوجہل بن ہشام اور

مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴿۱۱۳﴾

قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہوگیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں﴿۱۱۳﴾

عبد اللہ بن امیہ بن مغیرہ کو پایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب سے کہا: ''اے چچا! تو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہہ دے، میں اللہ کے پاس اس کلمے کی شہادت دوں گا۔'' تو ابوجہل اور عبد اللہ بن امیہ نے ابوطالب سے کہا: ''کیا تو عبدالمطلب کے دین سے منہ موڑ رہا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ اس کے سامنے یہی ( کلمہ ) پیش کرتے رہے اور وہ دونوں اپنی بات دہراتے رہے، یہاں تک کہ مرتے وقت آخری بات جو اس نے کہی: (( عَلٰى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ )) کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مر رہا ہوں۔ اس نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے سے انکار کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں تیرے لیے استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے منع نہ کر دیا گیا۔'' اس پر یہ آیت اتری۔ [ بخاری، الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت لا إله إلا الله : ۱۳۶۰۔ مسلم : ۲٤ ] دوسری کتب حدیث میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس حدیث میں ابوطالب کے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے سے انکار کی صراحت موجود ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ دینِ عبدالمطلب دینِ ابراہیم ہی تھا، اس لیے ابوطالب مسلمان تھے، ان کی بات کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ ابوطالب کے کفر پر مرنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو بے حد غم اور صدمہ ہوا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [ القصص : ٥٦ ] ''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ جہنم میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کو ہوگا، اسے ( آگ کی ) دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جن کی وجہ سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔ [ مسلم، الإيمان، باب أهون أهل النار عذابا : ۲۱۲ ]

② **مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ** ...... : جب تک کوئی کافر زندہ ہے اس کے ایمان کی امید ہے، اس لیے اس کی ہدایت اور مغفرت کی دعا جائز ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو اس کے لیے دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا، البتہ جب کفر پر موت کے بعد صاف واضح ہو گیا کہ وہ جہنمی ہے، اب نبی کریم ﷺ یا ایمان والوں کو اس کے لیے بخشش کی دعا کرنا جائز نہیں، کیونکہ مشرک پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۸) اور مائدہ (۷۲) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، آپ خود بھی روئے اور اپنے اردگرد والوں کو بھی رلایا، پھر آپ نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اجازت مانگی کہ اس کے لیے استغفار کروں مگر مجھے اجازت نہیں دی گئی اور میں نے اس سے اجازت مانگی کہ اس کی قبر کی زیارت کر لوں تو مجھے اجازت دے دی گئی، سو تم قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔'' [ مسلم، الجنائز، باب استئذان النبي ﷺ ربه عزوجل...... : ۹۷۶/۱۰۸ ] مسند احمد وغیرہ میں اس مفہوم کی اور بھی احادیث ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بخاری کی شرح فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ یہ سارے واقعات نزول آیت کا سبب بن سکتے ہیں۔ مگر جن روایات میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کے والدین کو زندہ کیا گیا اور وہ ایمان لا کر پھر فوت ہو گئے ان روایات میں سے کوئی ایک بھی حافظ

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدے کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا، پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔ بے شک ابراہیم یقیناً بہت نرم دل، بڑا بردبار تھا ﴿۱۱۴﴾

ابن کثیر اور دوسرے محققین کی تصریح کے مطابق ثابت نہیں۔

**آیت 114** ① وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ ...... : علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کر رہا تھا، جب کہ وہ مشرک تھے۔ میں نے کہا تم ان کے لیے بخشش کی دعا کر رہے ہو جب کہ وہ مشرک تھے، تو اس نے کہا، کیا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار نہیں کیا تھا؟ چنانچہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے یہ بات ذکر کی تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ﴾ ”اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا۔“ [ نسائی، الجنائز، باب النهی عن الاستغفار للمشركين : ۲۰۳۸، و حسنه الألبانی ] ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ سے یہ وعدہ اس وقت کیا تھا جب اس نے انھیں توحید کی دعوت کی وجہ سے گھر سے نکال دیا تھا۔ دیکھیے سورۂ مریم (۴۷) چنانچہ حسبِ وعدہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۸۶) قیامت کو بھی سفارش کریں گے کہ یا اللہ! میرے باپ کے جہنم میں ہونے سے زیادہ میری کیا رسوائی ہے تو حکم ہو گا کہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھو، دیکھیں گے تو ان کے والد کی شکل گندگی میں آلودہ بجو کی بنا دی جائے گی اور فرشتے اسے پاؤں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیں گے کہ نہ کوئی اسے پہچانے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا والد ہے اور نہ ان کی رسوائی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کو رسوائی سے بچا لیا مگر مشرک کو جہنم سے نہیں بچایا۔ [ دیکھیے بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ واتخذ الله إبراهيم خليلا ...... ﴾ : ۳۳۵۰ ]

② فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ : یعنی قیامت کے دن سفارش کے بعد اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سلوک کو دیکھ کر جب انھیں اپنے والد کا ابدی جہنمی، شرف انسانیت سے محروم اور اللہ تعالیٰ کا دشمن ہونا خوب واضح ہو گیا تو وہ اس سے بری اور لاتعلق ہو گئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا خلیل اپنے خلیل کے دشمن سے دوستی یا تعلق کیسے رکھ سکتا ہے، چنانچہ ان کے دل میں جو تعلق باقی تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

③ اگر کسی کا کوئی کافر رشتے دار یا دوست فوت ہو جائے تو مسلمان اس کی تجہیز و تکفین میں شریک تو ہو سکتا ہے، مگر اس کے لیے دعائے مغفرت نہیں کر سکتا۔ (ابن کثیر)

④ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ : ”لَاَوَّاهٌ“ کا معنی بہت آہ، آہ کہنے والا ہے اور یہ دل کی نرمی کی علامت ہے، یعنی وہ اللہ کے

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ

اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ کسی قوم کو اس کے بعد گمراہ کر دے کہ انھیں ہدایت دے چکا ہو، یہاں تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں واضح کر دے جن سے وہ بچیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾ بے شک اللہ ہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مدد گار ﴿۱۱۶﴾ بلاشبہ یقیناً اللہ نے نبی پر مہربانی کے ساتھ توجہ فرمائی اور مہاجرین و انصار پر بھی، جو تنگ دستی

---

حضور بہت آہیں بھرنے والے، بڑے حلم والے تھے۔ یہ ابتدا میں اپنے والد کے حق میں ان کی نرمی اور استغفار کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تھے ہی ایسے کہ اگر کوئی سختی سے پیش آتا تو اسے نرمی سے جواب دیتے۔

**آیت 115** وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا...... : اس میں ان مسلمانوں کو تسلی دی ہے جنھوں نے اوپر کی آیت کے نزول سے پہلے اپنے کافر رشتہ داروں کے لیے دعائے مغفرت کی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کے مسلمان ہونے کے بعد گمراہ ہونے کا حکم نہیں لگاتا جب تک اس کے لیے یہ واضح نہ کر دے کہ فلاں کام منع ہے اس سے بچ جاؤ، اگر پھر بھی وہ اس پر اصرار کرے تو گناہ گار بھی ہے اور شامتِ اعمال کے نتیجے میں اس کا رخ بھی گمراہی کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا جانتے ہوئے نافرمانی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے، اگر ابھی کسی کام سے منع ہی نہیں کیا گیا تو اس کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ کبھی گرفت کرنے والا نہیں، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ کوئی بھی کام کرنے والا اسے لاعلمی میں کر رہا ہے یا دیدہ و دانستہ، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے پہلے جو استغفار مشرکین کے لیے کیا اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔

**آیت 115** اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ...... : کفار سے ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد ہر طرح کی دلی لاتعلقی کا سبب بیان فرمایا کہ آسمانوں کا اور زمین کا مالک صرف اللہ، زندگی بخشنے والا اور موت دینے والا صرف اللہ، تمھارا والی وارث اور تمھارے تمام کاموں کا متولی اور سنبھالنے والا صرف اللہ، مشکل کے وقت اور دشمن کے مقابلے میں تمھارا مددگار صرف اللہ، اس کے سوا تمھارا نہ کوئی والی نہ مددگار، تو پھر اس کے دشمن سے تمھارا کیا تعلق، کیسی دوستی اور اس کے لیے کیسا استغفار؟

**آیت 117** ① لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ...... : "تَابَ" کے معانی لوٹ آنا، مہربان ہو جانا، معافی مانگنا، معاف کر دینا، آئندہ غلطی سے باز آنا اور توبہ قبول کر لینا سبھی آتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مہاجرین و انصار پر مہربان ہونے اور معاف فرمانے کا مطلب " فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ " کے الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ تنگی کی گھڑی سے مراد غزوۂ تبوک پر

اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۱۱۷﴾ وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۠﴿۱۱۸﴾

ع ۴

کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہے، اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ٹیڑھے ہو جائیں، پھر وہ ان پر دوبارہ مہربان ہوگیا۔ یقیناً وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۱۷﴾ اور ان تینوں پر بھی جو موقوف رکھے گئے، یہاں تک کہ جب زمین ان پر تنگ ہوگئی، باوجود اس کے کہ فراخ تھی اور ان پر ان کی جانیں تنگ ہوگئیں اور انھوں نے یقین کر لیا کہ بے شک اللہ سے پناہ کی کوئی جگہ اس کی جناب کے سوا نہیں، پھر اس نے ان پر مہربانی کے ساتھ توجہ فرمائی، تاکہ وہ توبہ کریں۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۱۸﴾

روانگی کا وقت ہے جب شدید گرمی کا موسم تھا، قحط سالی تھی، فصلیں پکنے والی تھیں اور بے سروسامانی کی حالت تھی، ادھر چھ سو کلو میٹر کا طویل اور پر مشقت سفر سامنے تھا۔ دس آدمیوں کے لیے صرف ایک اونٹ تھا، سواریوں، زادِ راہ اور پانی تینوں کی سخت تنگی تھی۔ چنانچہ اس وقت بعض سچے مخلص مسلمان بھی جہاد پر روانہ ہونے سے گھبرانے لگے، آخر ان کے ایمان کی پختگی ان کے نفس پر غالب آئی اور وہ پورے عزم کے ساتھ جہاد پر نکل کھڑے ہوئے۔ یہاں اللہ کی مہربانی سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اس گھبراہٹ کے عالم میں انھیں روانگی کے لیے ہمت و جرأت عطا فرمائی اور ان کے دل میں آنے والے خطرات بھی معاف فرما دیے اور نبی ﷺ پر مہربانی سے مراد وہ آیت (۴۳) ہے جس کا آغاز ہی اس طرح ہوا تھا: ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ﴾ کہ اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا، آپ نے ایسے ہٹے کٹے، تنومند اور کھاتے پیتے منافقوں کو جہاد پر جانے کی رخصت کیوں دے دی؟

**آیت 118** ① وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا...... : "خُلِّفُوْا" کا لفظی معنی اگرچہ پیچھے چھوڑے گئے ہے، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ جن کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا۔ اسی بات کا تذکرہ اس سے پہلے آیت (۱۰۷) ﴿ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ ﴾ میں گزرا ہے۔ "وَعَلَى الثَّلٰثَةِ" کا عطف "عَلَى النَّبِيِّ" پر ہے (یعنی انصار و مہاجرین پر مہربان ہونے اور انھیں معاف کرنے میں) وہ تین شخص بھی داخل ہوئے جن پر پچاس دن میں ایسی حالت گزری کہ موت سے بھی بدتر۔ (موضح) یہ تین صحابہ تھے، کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، اس سے قبل تقریباً ہر غزوے میں یہ شریک ہوتے رہے، اس

## يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١١٩﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ ﴿١١٩﴾

غزوۂ تبوک میں صرف سستی کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے، بعد میں انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سوچا کہ ایک غلطی (پیچھے رہنے کی) تو ہو ہی گئی ہے، لیکن اب منافقین کی طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جھوٹا عذر پیش کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ چنانچہ حاضر خدمت ہو کر اپنی غلطی کا صاف اعتراف کر لیا اور اس کی سزا کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ نبی ﷺ نے ان کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا کہ وہی ان کے بارے میں کوئی حکم نازل فرمائے گا، تاہم اس دوران میں آپ نے تمام صحابہ کو ان سے بائیکاٹ کا حکم دے دیا، حتیٰ کہ بات چیت تک سے روک دیا اور چالیس راتوں کے بعد حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں سے بھی دور رہیں۔ یہ وہ وقت تھا جس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے تین جملوں میں کھینچا ہے کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور خود ان کی جانیں ان پر تنگ ہو گئیں اور انھوں نے یقین کر لیا کہ بے شک اللہ سے پناہ کی کوئی جگہ اس کی جناب کے سوا نہیں۔ آخر مزید دس دن گزرنے کے بعد ان کی توبہ قبول کر لی گئی اور مذکورہ آیت اتری۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنی قلبی کیفیت کی بہترین ترجمانی کرتے ہوئے بڑی لمبی حدیث میں بیان فرمایا ہے جو صحیح بخاری کی کتاب المغازی اور مسلم کی کتاب التوبہ میں مذکور ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں بھی اسے مفصل نقل کیا گیا ہے۔

② اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ : معلوم ہوا کہ توبہ کا قبول ہونا محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے، ورنہ اس پر کسی کا زور نہیں۔

**آیت 119** وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ: یہ صادقین رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخلص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ صدق نیت، قول اور فعل تینوں میں ہو تو صدق ہے، ورنہ فعل قول کی تکذیب کرے تو یہ بھی صدق نہیں، اس لیے جو لوگ اپنے اخلاص نیت اور قول کے مطابق عملاً تبوک کی طرف نکلے بھی وہی صادقین ٹھہرے اور ان کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا۔ ان تینوں نے بھی سچ کہا، اپنی خطا مانی اس لیے بخشے گئے، نہیں تو منافقین میں ملتے۔ (موضح) اللہ تعالیٰ نے سچے مومن قرار ہی ان لوگوں کو دیا ہے جو ایمان لانے کے بعد شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا، فرمایا کہ صادق صرف یہی لوگ ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجرات (۱۵) اور سورۂ حشر (۸) کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام مجھ پر یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سچ بولا، ورنہ میں بھی جھوٹ بول کر ہلاک ہو جاتا جس طرح دوسرے ہلاک ہو گئے۔ [ بخاری، المغازی، باب حديث كعب بن مالك رضي الله عنه ...... : ٤٤١٨ ] بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس سچ بولنے کے انعام میں ان کی توبہ کا تذکرہ قرآن میں فرمایا جو قیامت تک پڑھا جائے گا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”سچ کو لازم پکڑو، کیونکہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ کہتا رہتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ سے

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۱۲۰﴾

مدینہ والوں کا اور ان کے ارد گرد جو بدوی ہیں، ان کا حق نہ تھا کہ وہ رسول اللہ سے پیچھے رہتے اور نہ یہ کہ اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ عزیز رکھتے۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ، اللہ کے راستے میں انھیں نہ کوئی پیاس پہنچتی ہے اور نہ کوئی تکان اور نہ کوئی بھوک اور نہ کسی ایسی جگہ پر قدم رکھتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور نہ کسی دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۱۲۰﴾

بچ جاؤ، کیونکہ جھوٹ نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور نافرمانی آگ کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ کہتا رہتا ہے اور جھوٹ کی کوشش کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔'' [ بخاري، الأدب، باب قول الله تعالٰى : ﴿ يأيها الذين امنوا اتقوا الله ...... ﴾ : ٦٠٩٤ ۔ مسلم : ٢٦٠٧ ]

**آیت 120** ① **مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ** ...... : مدینہ میں رہنے والے لوگوں اور ان کے ارد گرد رہنے والے بدویوں یعنی مزینہ، جہینہ، اشجع، اسلم اور غفار وغیرہ قبائل کے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ تنگی اور تکلیف میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ رہیں اور مشکل مواقع پر پیش آنے والے تمام مصائب و آلام میں خوش دلی کے ساتھ آپ کے ہمراہ رہیں، جو سختیاں آپ ﷺ اٹھا رہے ہیں وہ بھی اٹھائیں، کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزیز اور مکرم آپ ﷺ ہی ہیں، تو جب آپ اتنی عزت و کرامت کے باوجود ان سختیوں اور مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں تو پھر سب کا حق ہے کہ جن چیزوں کا سامنا آپ کر رہے ہیں وہ بھی کریں اور آپ کی جان عزیز کی خاطر اپنی جانوں کی نہ پروا کریں، نہ ان کی کوئی قدر و قیمت سمجھیں، کجا یہ کہ رسول اللہ ﷺ تو اپنی جان اور اپنا راحت و آرام سب کچھ قربانی کے لیے پیش کریں اور یہ اپنی جانیں بچا بچا کر رکھیں، یہ کبھی بھی ان کا حق نہیں بنتا۔ (زمخشری) عبد اللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ تھے، آپ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا تو عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: ''یا رسول اللہ! یقیناً آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میری جان کے۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہاں تک کہ میں تمھیں تمھاری جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں۔'' تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو پھر یقین کیجیے کہ اب اللہ کی قسم! آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''اب اے عمر! (تو کامل مومن ہوا)۔'' [ بخاري، الأيمان والنذور، باب كيف كان يمين النبي ﷺ : ٦٦٣٢ ]

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور نہ وہ خرچ کرتے ہیں کوئی چھوٹا خرچ اور نہ کوئی بڑا اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہیں، مگر وہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ انھیں اس عمل کی بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۲۱﴾

② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ...... : "ظَمَاٌ" پیاس، "نَصَبٌ" تھکاوٹ، مشقت، محنت۔ "مَخْمَصَةٌ" سخت بھوک جس میں پیٹ ساتھ لگ جائے، جس طرح پاؤں کا تلوا (اَخْمَصُ) ہوتا ہے۔ "وَطِئَ يَطَأُ مَوْطِئًا (ع)" ظرف ہے، روندنے، قدم رکھنے کی جگہ۔ "غَاظَ يَغِيْظُ" غصہ دلانا، یعنی جن راستوں، پہاڑیوں، بستیوں، زمینوں، مکانوں اور کھیتوں وغیرہ پر ان کے قدم رکھنے سے یا ان کے گھوڑوں اور دوسری سواریوں کے انھیں روندتے ہوئے گزرنے سے کفار کے دلوں میں غصہ اور جلن پیدا ہو اور وہ ہراساں اور خوف زدہ ہوں۔ (ابن کثیر) "وَلَا يَنَالُوْنَ" "نَالَ يَنَالُ" کا لفظی معنی لینا، حاصل کرنا ہے، یعنی مسلمان دشمن کی کوئی زمین یا شہر فتح کریں، یا انھیں قتل یا قید کریں، یا مال غنیمت حاصل کریں، یا انھیں کوئی نقصان پہنچائیں، غرض ان سے حاصل ہونے والی ہر کامیابی اور ہر نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے اور اس کا اجر انھیں ضرور ملے گا، کیونکہ ان کے یہ تمام اعمال اللہ کی خاطر اور رسول اللہ ﷺ کی فرماں برداری میں ہیں اور اسی کا نام احسان اور نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

**آیت 121** ① وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً...... : پچھلی آیت میں جہاد میں کیے جانے والے وہ اعمال بھی ہیں جو انسان کے اختیار میں ہیں اور وہ بھی جو بے اختیار پیش آتے ہیں، مثلاً مشکلات و مصائب، اس آیت میں صرف ان اعمال کا ذکر ہے جو آدمی کے اختیار میں ہیں، مگر جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد ہیں، یعنی زادِ سفر، سواری اور اسلحہ پر جو میسر ہو خرچ کرنا، پھر سفر جہاد پر نکل کھڑے ہونا اور جنگل اور وادیاں طے کرتے چلے جانا، سب کچھ لکھا جاتا ہے۔

② اس جنگ میں عثمان رضی اللہ عنہ نے لشکر کی تیاری میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا، یعنی ''نفقہ کبیرہ'' (بڑا خرچ) اور انھوں نے اس وقت صحابہ کو مخاطب کر کے اس کا ذکر بھی فرمایا تھا جب باغیوں نے ان کا محاصرہ کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں نے "جَيْشُ الْعُسْرَةِ" (تنگ دستی کے وقت کے لشکر) کا سامان تیار کیا تھا؟ تمام صحابہ نے اس کا اعتراف کیا۔ [ ترمذی، المناقب، باب فی عد عثمان تسميته شهيدا...... : ۳٦۹۹، وحسنه الألبانی ] تفصیل اس کی یہ ہے کہ عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار اپنی آستین میں لے کر آئے، جب آپ ﷺ نے "جَيْشُ الْعُسْرَةِ" کو تیار کیا تو اسے آپ ﷺ کی گود میں ڈال دیا۔ عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ انھیں اپنی گود میں الٹ پلٹ کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''آج کے بعد عثمان جو کام بھی کرے اسے کچھ نقصان نہیں دے گا۔'' دو مرتبہ فرمایا۔ [ ترمذی، المناقب، باب فی عد عثمان تسميته شهيدا...... : ۳۷۰۰، ۳۷۰۱، و حسنه الألبانی ] اور کم خرچ کرنے والے (نفقہ صغیرہ) وہ

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ

اور ممکن نہیں کہ مومن سب کے سب نکل جائیں، سو ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہ نکلے، تاکہ وہ دین میں

بھی تھے جو رات بھر محنت کر کے نصف صاع (اکلو) کھجوریں لے کر آئے۔ دیکھیے سورۂ توبہ آیت (۷۹) کی تفسیر۔

③ وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ : پہاڑوں کے درمیان کے میدان اور پانی کی گزرگاہ کو وادی کہتے ہیں، یعنی ہر وادی طے کرنے پر وہ ان کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہے۔

④ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ ...... : یہ سب کچھ اس لیے لکھا جاتا ہے کہ کسی بھی عمل کی زیادہ سے زیادہ اچھی جزا جو ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں وہ عطا فرمائے۔

**آیت 122** وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ...... : " نَفَرَ يَنْفِرُ " عام طور پر لڑائی کے لیے نکلنے کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ﴾ [ التوبة : ۳۸ ] اور فرمایا: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ [ التوبة : ٤١ ] اور فرمایا: ﴿ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ ﴾ [ التوبة : ۳۹ ] اور فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ﴾ [ التوبة : ۸۱ ] اور یہ سورت شروع سے آخر تک جہاد ہی کے تذکرے سے بھری پڑی ہے، اس لیے "لِيَنْفِرُوْا" کا معنی "لڑائی کے لیے نکلیں" ہی سیاق سے مناسبت رکھتا ہے۔ جنگ تبوک میں نفیر عام، یعنی تمام مسلمانوں کو نکلنے کا حکم تھا اور فرمایا کہ اہل مدینہ اور اس کے اردگرد کے اعراب کا حق ہی نہیں بنتا تھا کہ وہ جنگ میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہیں، اب اس آیت میں ایسے مواقع کا ذکر ہے جن میں سب کے نکلنے کا حکم نہیں، بلکہ کچھ لوگوں کا نکلنا کافی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام مسلمان جنگ کے لیے نکل جائیں، کیونکہ کچھ لوگوں کا شہروں کی حفاظت اور گھروں کے انتظام کے لیے پیچھے رہنا بھی ضروری ہے، کچھ لوگ کسی اور ضروری عذر کی وجہ سے نہیں نکل سکتے، اس لیے ہر بڑے گروہ میں سے جنگ کی ضرورت کے حساب سے کچھ لوگوں کے لیے لازم ہے کہ جہاد کے لیے نکلیں، تاکہ وہ جہاد کے سفر، اس کے درمیان پڑاؤ، رباط کے دوران اور میدان قتال میں پوری کوشش کے ساتھ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈرائیں کہ دشمن کیا کیا منصوبے بنا رہا ہے اور اس کی تیاری کس قدر ہے اور اس سے نمٹنے کی کیا صورت ہے، تاکہ وہ آئندہ کے لیے مکمل تیاری کر کے دشمن پر فتح یاب ہو سکیں۔ "تفقہ فی الدین" سے یہاں مراد یہ ہے جو بیان ہوا، جب کہ اس وقت ہمارے ہاں "تفقہ فی الدین" صرف نماز، روزے وغیرہ کے مسائل ہی کو سمجھ لیا گیا ہے، دشمن کے منصوبوں، سازشوں، چالوں اور کارروائیوں کو سمجھنے، ان سے بچنے اور دفاع کے بجائے ان پر حملہ آور ہونے کو "تفقہ فی الدین" سے باہر قرار دے دیا گیا ہے۔

اس آیت سے چند باتیں واضح طور پر سمجھ میں آ رہی ہیں: ① ہر جنگ میں تمام مسلمانوں کا نکلنا نہ ضروری ہے نہ ممکن، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر عمل ہو گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنولحیان کی طرف ایک لشکر بھیجتے ہوئے فرمایا: "ہر دو آدمیوں میں سے ایک آدمی نکلے اور اجر دونوں کے لیے برابر ہے (تاکہ ایک میدان میں جائے اور دوسرا اپنے اور اپنے بھائی کے پیچھے کے

لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

سمجھ حاصل کریں اور تاکہ وہ اپنی قوم کو ڈرائیں، جب ان کی طرف واپس جائیں، تاکہ وہ بچ جائیں ﴿۱۲۲﴾

معاملات کی خیر کے ساتھ نگرانی کرے )۔'' [ مسلم، الإمارة، باب فضل إعانة الغازی...... : ۱۳۸/۱۸۹۶ ] ہاں، اگر ضرورت کی بنا پر امیر نفیر عام کا حکم دے تو سب کا نکلنا ضروری ہوگا۔ ② فرقہ بڑا ہوتا ہے اور طائفہ چھوٹا، حتیٰ کہ ایک آدمی پر بھی طائفہ کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا﴾ [ الحجرات : ۹ ] یہ آیت دو لڑنے والے آدمیوں کے لیے بھی ہے، کسی گروہ میں سے جنگ کے لیے زیادہ لوگ نکلیں یا ایک آدمی، سب پر طائفہ کا لفظ صادق آتا ہے۔ ③ ''لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ'' تفقہ باب تفعل سے ہے، مراد کوشش اور محنت کے ساتھ اچھی طرح سمجھ حاصل کرنا ہے۔ یہاں دین کے دو معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک تو قتال فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں لڑنا، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم عینہ (حیلے کے ساتھ سود کی ایک صورت ) کے ساتھ بیع کرنے لگو گے اور کھیتی باڑی پر خوش ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کرے گا جسے دور نہیں کرے گا (( حَتّٰى تَرْجِعُوْا اِلٰى دِيْنِكُمْ )) ''یہاں تک کہ تم اپنے دین کی طرف واپس پلٹ آؤ۔'' [ أبو داوٗد، البیوع، باب فی النہی عن العینۃ : ۳۴۶۲، و صححه الألبانی ]

یہاں دین سے مراد قتال فی سبیل اللہ ہے، اس میں تفقہ جنگ کے میدانوں ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ سو سال تک شیخ الحدیث کی مسند پر بیٹھے رہیں، کبھی یہ تفقہ حاصل نہیں ہوگا، آپ اپنے گھر یا سکول یا کالج یا یونیورسٹی یا اکیڈمی یا دار العلوم میں جتنی بھی جنگی کتابیں اور دشمن کی چالیں پڑھ لیں، یا غازیان اسلام کے معرکے پڑھ لیں، میدانِ جنگ میں جائے بغیر دین (جنگ ) کی حقیقی اور واقعی سمجھ کسی صورت حاصل نہیں ہو سکتی، نہ ہی آدمی اپنی قوم کو دشمن کے خطرے سے صحیح طور پر ڈرا کر اس سے بچنے کے لیے خبردار کر سکتا ہے۔

دین کا دوسرا معنی عام ہے، یعنی پورا دین اسلام، اس میں تفقہ حاصل کرنے کے لیے بھی جہاد کے میدانوں کا رخ کرنا ضروری تھا، کیونکہ دین کے علم کا سر چشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی اور آپ مدینہ میں ہجرت کے بعد اکثر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سفر ہی میں رہتے، یا پھر اپنے کسی صاحب علم و فقہ صحابی کو امیر بنا کر بھیجتے تھے۔ بہت سے معجزات اور مسائل و احکام دوران سفر ہی واقع یا نازل ہوئے، اس لیے جب صحابہ کے حالات بیان ہوتے ہیں تو ان کی قابلیت و فضیلت کا ذکر اس طرح ہوتا ہے: ''شَهِدَ الْمُشَاهِدَ كُلَّهَا'' کہ وہ تمام جنگوں میں حاضر رہے اور کہا جاتا ہے: '' شَهِدَ الْبَدْرَ اَوِ الْحُدَيْبِيَةَ اَوْ فَتْحَ مَكَّةَ اَوْ حُنَيْنًا اَوْ تَبُوْكَ '' کہ فلاں صاحب بدر یا حدیبیہ یا فتح مکہ یا حنین یا تبوک میں شریک ہوئے اور یہ بات تو عیاں ہے کہ گھر کے بکھیڑوں میں علم و فقہ کا حصول اس طرح ممکن ہی نہیں جس طرح ہر چیز سے فارغ ہو کر لشکرِ اسلام میں جا کر ممکن ہے۔ دیکھو مسیلمہ کذاب کی لڑائی میں قرآن کے کتنے قاری اور علماء و فقہاء شہید ہوئے۔ لڑائی تو تھوڑی دیر کے لیے ہوئی تھی، باقی دوران سفر اقامت اور رباط میں تعلیم و تعلّم یعنی تفقہ فی الدین ہی کا شغل ہوتا تھا، جس میں لڑنے کے سلیقے کے ساتھ ساتھ زندگی

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں سے لڑو جو کافروں میں سے تمھارے قریب ہیں اور لازم ہے کہ وہ تم میں کچھ

کے تمام مسائل سیکھے سکھائے جاتے تھے اور سب لوگ رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر، عشرہ مبشرہ اور دوسرے افاضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دورانِ جہاد میں دین سیکھتے اور واپس اپنی قوم میں جا کر انھیں دوسرے دینی مسائل سکھانے کے ساتھ ساتھ دنیا اور آخرت کی ذلت، ترکِ جہاد سے ڈرا کر انھیں دشمن سے بچنے کی ترغیب دیتے۔ ”لِيُنْذِرُوْا“ اور ”يَحْذَرُوْنَ“ پر غور فرمائیں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آ جائے گی کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی حالتِ زار کون سی چیز میں تفقہ حاصل نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ سید المفسرین امام طبری رحمہ اللہ اور کئی اور مفسرین نے اسی مفہوم کو ترجیح دی ہے، البتہ ”لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ“ میں دین سے جہاد مراد لینے کی دلیل: « حَتّٰى تَرْجِعُوْا اِلٰى دِيْنِكُمْ » انھوں نے ذکر نہیں فرمائی۔

آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۂ توبہ میں جنگ تبوک سے رہ جانے والوں پر اللہ تعالیٰ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا تو ہر مسلمان کی کوشش اور خواہش یہ تھی کہ آئندہ ہم ہر جنگ میں ضرور جائیں گے، اس پر یہ آیت اتری کہ تمام مسلمانوں کو ہر مہم کے لیے نہیں نکل جانا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں اکیلے رہ جائیں، بلکہ ہر قبیلے میں سے کچھ لوگوں کو مدینہ میں آپ کے پاس بھی آ کر حاضر رہنا چاہیے، تاکہ وہ مدینہ کی اور رسول اللہ ﷺ کی پہرے داری کا فریضہ بھی سرانجام دیں اور علم بھی حاصل کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو تعلیم دین سے آراستہ کریں۔ اسی طرح کچھ لوگوں کو دینی مدارس میں پڑھنے کے لیے بھی نکلنا چاہیے، تاکہ وہ یکسوئی سے دین کی اچھی طرح سمجھ حاصل کریں اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کو دین سمجھا سکیں۔ ہاں حالات کے تحت امیر المومنین نفیر عام کا حکم دیں تو پھر سب کو نکلنا چاہیے، کیونکہ جب قیام کا وقت ہو سجدہ نہیں کیا جاتا۔ یہ مطلب بھی بہت سے مفسرین نے بیان فرمایا ہے۔

**آیت 123** ① **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ :** یعنی کفار میں سے جو لوگ تم سے جتنے زیادہ قریب ہیں اتنا ہی ان سے پہلے جہاد کرو، پہلے انھیں اسلامی قلمرو میں شامل کرنے کے بعد ان سے جہاد کرو جو ان کی بہ نسبت دور ہیں، کیونکہ ہر کام میں آسان سے آسان اور بہتر سے بہتر ہونے کا خیال سب سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ اپنی سرحد سے ملنے والوں کے ساتھ لڑائی میں نہ زیادہ سواریوں کی ضرورت ہے نہ زیادہ اخراجات کی، نہ دور کے سفر کی مشقت ہے، نہ ان کے احوال سے باخبر رہنے کے لیے زیادہ محنت اور وسائل کی، کیونکہ آپ ان کے محل وقوع، ان کے مراکز قوت اور ان کی کمزوریوں سے خوب واقف ہیں۔ پھر دور والے دشمن سے لڑائی میں پیچھے سے اپنے ملک پر کسی دشمن کے حملے یا اندرونی خلفشار کا جو خطرہ رہتا ہے قریب والوں کے ساتھ جنگ میں وہ بھی نہیں ہوگا، بلکہ اپنی پشت محفوظ رہے گی۔ بے شک تمام مشرکین سے لڑنے کا حکم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ [ التوبة : ۳٦ ] مگر ترتیب کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ دعوت میں بھی یہی

اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا

سختی پائیں اور جان لو کہ بے شک اللہ متقی لوگوں کے ساتھ ہے ﴿۱۲۳﴾ اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو

ترتیب ہے، پہلے گھر والے، پھر خاندان، پھر قبیلہ، پھر شہر، پھر اپنا ملک، پھر تمام دنیا اور جہاد میں بھی یہی ترتیب ہے، کیونکہ جہاد بھی دعوت ہی کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب کے ساتھ نبی ﷺ نے پہلے اپنے خاص قبیلہ قریش سے جنگ کی، پھر جزیرۂ عرب کے دوسرے قبائل سے، پھر بنی قریظہ اور بنی نضیر سے، پھر خیبر اور فدک کے اہل کتاب سے جو مدینہ کے اردگرد تھے، پھر مکہ فتح ہوا اور پھر یمن اور بحرین حتیٰ کہ پورا جزیرۂ عرب مسلمان ہوگیا۔ جب ان سے فارغ ہوئے تو غزوۂ تبوک کی مہم پر ملک شام کے نصاریٰ سے جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ یہی ترتیب آپ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق شہید محراب رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفاء نے ملحوظ رکھی۔ چنانچہ ان کے زمانے میں پہلے ملک شام اور عراق و فارس فتح کیے گئے، پھر مصر، پھر مشرق کی طرف ہند، خراسان، کاشغر (چین) اور مغرب کی طرف افریقہ، اندلس اور فرانس، غرض مشرق سے مغرب تک اسلام کا پھریرا لہرانے لگا۔ والحمد للہ! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوبارہ جہاد کے ساتھ کفار کے تسلط کو ختم کر کے اپنے موجودہ ممالک میں اور دنیا بھر کے ممالک میں اللہ کے دین کو غالب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿2﴾ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً: لازم ہے کہ تم حملہ کرو تو اس کی شدت کفار کو واضح طور پر محسوس ہو اور اگر کبھی وہ حملہ کرنے کی غلطی کریں تو جواب میں انھیں کسی جگہ نرمی اور کمزوری نہ مل سکے۔ کیونکہ ایمان کا کمال ہی مسلمان بھائی کے لیے نرم ہونا اور کفار کے لیے سخت ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خوبی بتائی: ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح: ۲۹] ''کافروں پر بہت سخت، آپس میں نہایت رحم دل۔'' اور مجاہدین کی شان بیان فرمائی: ﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [المائدۃ: ۵۴] ''مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت۔''

﴿3﴾ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ: اس کا مشاہدہ پوری تاریخ اسلام میں ہوتا رہا ہے۔ مسلمانوں کے خلفاء و ملوک اور امراء و عوام جب متقی ہوتے اللہ تعالیٰ کی خاص معیت و نصرت ان کے ساتھ ہوتی اور ہر جگہ فتح ان کے قدم چومتی اور جب وہ ظالم یا فاسق ہوتے اور عیش و عشرت یا باہمی لڑائیوں میں مصروف ہوتے، تو اللہ کی مدد اٹھ جاتی اور دشمن ان کے علاقوں پر قابض ہو جاتے۔ اب بھی اللہ تعالیٰ کی معیت، ساتھ اور نصرت و تائید حاصل کرنی ہے تو وہ تقویٰ کے ساتھ ہی حاصل ہوگی، محض سائنسی ترقی یا کثرت تعداد سے کبھی نہیں۔

**آیت 125،124** ﴿1﴾ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ ......: ''يَسْتَبْشِرُوْنَ'' حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے، ایسی زبردست خوشی جس کے آثار بشرے پر بھی ظاہر ہوں۔ ''سُوْرَةٌ'' سے مراد پوری سورت بھی ہوسکتی ہے اور آیات کا کوئی

اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اس نے تم میں سے کس کو ایمان میں زیادہ کیا؟ پس جو لوگ ایمان لائے، سو ان کو تو اس نے ایمان میں زیادہ کر دیا اور وہ بہت خوش ہوتے ہیں ﴿۱۲۴﴾ اور رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں کوئی بیماری ہے تو اس نے ان کو ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی میں زیادہ کر دیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ کافر تھے ﴿۱۲۵﴾

ٹکڑا بھی۔ کسی بھی سورت کے نزول پر اسے قبول کرنے میں اہل ایمان اور اہل نفاق کا واضح فرق ہوتا ہے، بیج کی عمدگی زمین کی قابلیت کے بغیر فائدہ مند نہیں ہوتی، چنانچہ منافقین ایک دوسرے سے بطور استہزا و مذاق یا بعض کمزور ایمان والے مسلمانوں کو شک میں ڈالنے کے لیے پوچھتے ہیں کہ ان آیات کے ساتھ تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے؟ فرمایا کہ اہل ایمان کے ایمان میں تو ان سے اضافہ اور زیادتی ہوتی ہے، دل کے علم اور یقین میں بھی، زبانی تصدیق میں بھی اور عمل میں بھی اور ان تینوں کا نام ایمان ہے۔ "وَهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ" اور وہ بہت ہی خوش ہوتے ہیں، جس کے آثار ان کے چہرے پر بھی نمایاں ہوتے ہیں اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کفر اور نفاق کا مرض ہے وہ پہلی سورتوں اور آیات ہی کے منکر تھے، جب اس سے بھی انکار کیا تو کفر کا ایک اور ردہ ان کے دلوں پر چڑھ گیا اور ان کی کفر پر موت کا باعث بن گیا۔

❷ یہ آیت اور قرآن مجید کی کئی اور آیات واضح الفاظ میں ایمان کے زیادہ ہونے کی صراحت فرما رہی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کتاب الایمان کے شروع میں آٹھ آیات اور پھر بہت سی احادیث ذکر فرمائی ہیں جو صاف ایمان کی کمی اور زیادتی پر دلالت کرتی ہیں اور صرف عمل کے لحاظ ہی سے نہیں، بلکہ نفس تصدیق اور یقین میں بھی کمی اور زیادتی پر دلالت کرتی ہیں۔ تعجب ہے ان شیوخ الحدیث والتفسیر پر جو ساری عمر صحیح بخاری اور قرآن مجید پڑھاتے ہیں مگر ایمان کے زیادہ یا کم ہونے کی آیات و احادیث آتی ہیں تو یا تو انھیں مذہب کے خلاف کہہ کر رد کر دیتے ہیں، یا ایسی تاویل کرتے ہیں جو آیات و احادیث کے منشا کے صریح خلاف اور تاویل کے بجائے تحریف کہلانے کے زیادہ لائق ہے۔ اس وقت تو ان کے سامنے شاید کوئی نہ بول سکے مگر وہ پاک پروردگار جو آیات کے ساتھ مومنوں کے دلوں میں ایمان و یقین بڑھاتا ہے، اس کے سامنے کیا تاویل کریں گے؟ اور وہ حضرات اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے جو کہتے ہیں کہ میرا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اور میرا اور جبریل علیہ السلام کا ایمان ایک جیسا ہے، کیونکہ ایمان سب کا برابر ہے، اس میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ وہ خود ہی سوچیں کہ کیا انھیں اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا وہ یقین حاصل ہے جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جبریل علیہ السلام کو حاصل تھا؟

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ

اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ نصیحت پکڑتے ہیں ﴿۱۲۶﴾ اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان کا بعض بعض کی طرف دیکھتا ہے کہ کیا تمھیں کوئی دیکھ رہا ہے؟ پھر واپس پلٹ جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں، اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں سمجھتے ﴿۱۲۷﴾ بلاشبہ یقیناً تمھارے پاس تمھی سے ایک رسول آیا ہے، اس پر بہت شاق ہے کہ تم

**آیت 126** اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ ...... : اکثر جنگ و جہاد کے وقت منافق معلوم ہو جاتے تھے (مگر پھر بھی وہ نفاق پر قائم رہتے تھے)۔ (موضح) اسی طرح ہر آدمی پر کوئی نہ کوئی آزمائش بیماری یا خوف وغیرہ کی صورت میں ہر سال ایک دو مرتبہ آتی رہتی ہے، تاکہ اسے سوچنے کا موقع ملے، فرمایا: ﴿وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [ السجدۃ : ۲۱ ] "اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔" سعادت مندوں کو اس سے توبہ اور نصیحت حاصل کرنے کی توفیق ملتی ہے، مگر منافق محروم رہتا ہے۔ پہلا معنی اس مقام پر زیادہ موزوں ہے۔

**آیت 127** ❶ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس وقت کا نقشہ کھینچا ہے جب منافقین رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں موجود ہوتے اور ان کے راز کھولنے والی یا جہاد کے حکم پر مبنی کوئی سورت یا آیات اترتیں، پھر وہ کمینگی اور شرارت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور موقع پا کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، مجلس سے کھسک جاتے۔ ان کی سمجھ میں صاف آ رہا ہوتا کہ ان آیات کا مصداق وہی ہیں، کیونکہ جہاد کے لیے نکلنا ان کے لیے موت تھی اور اس مجلس میں بیٹھنا ان کے لیے سراسر تذلیل کا باعث ہوتا، چنانچہ وہ تائب ہونے کے بجائے نکل جانے کو ترجیح دیتے۔ فرمایا: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ [ النور : ٦٣ ] "بے شک اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔"

❷ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ : "اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں" کیونکہ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہماری فلاح اور بھلائی کس چیز میں ہے، یا یہ بددعا ہے کہ وہ اس کے اہل ہیں کہ ان کے حق میں کہا جائے کہ اللہ ان کے دلوں کو پھیر دے۔

**آیت 126** لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ...... : اس میں آپ ﷺ کی بعض صفات عالیہ کا اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے۔ ایک صفت "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" میں لفظ "رَسُوْلٌ" ہے کہ آپ ﷺ رسول ہیں، یعنی

مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

مشقت میں پڑو، تم پر بہت حرص رکھنے والا ہے، مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۲۸﴾

خود نہیں آئے بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ایک احسان "جَآءَكُمْ" ہے، یعنی تمام لوگوں کی طرف قیامت تک کے لیے آنے والا رسول تم عربوں میں آیا ہے، عربی رسول بھیج کر اللہ تعالیٰ نے دنیا کی امامت کے لیے تمھیں منتخب فرمایا ہے۔ "كُمْ" کے مخاطب تمام دنیا کے لوگ ہیں، مگر اول مخاطب عرب ہیں، آپ کی تیسری صفت اور اللہ کا احسان "مِنْ اَنْفُسِكُمْ" ہے کہ آپ ﷺ تمھاری جنس سے، یعنی انسانوں میں سے ہیں، انھیں تمام انسانی ضروریات لاحق ہیں، وہ آدم کی اولاد سے ہیں، ان کے ماں باپ بھی ہیں، قریش کے ہر خاندان سے کوئی نہ کوئی رشتہ داری ہے، بیویاں اور اولاد بھی ہیں، بچپن، جوانی، بڑھاپا، بھوک، پیاس اور وفات سب کچھ آپ پر گزرا، صحت و مرض، رنج و راحت ہر مرحلے سے گزرے، اس لیے آپ ﷺ ہر چیز میں تمھارے لیے نمونہ ہیں۔ اگر وہ جن یا فرشتہ یا کوئی اور جنس ہوتے تو تمھارے لیے نمونہ اور اسوۂ حسنہ کیسے بنتے؟ اللہ کا احسان مانو کہ اس نے خود تم میں سے ایک نمونہ اپنا پیغام دے کر بھیجا کہ اس کی بات بھی سنو اور اس کی ذات کو دیکھ کر اس کے مطابق عمل بھی کرو۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۶۴) چوتھی یہ کہ "عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" تمھارا کسی طرح بھی مشقت یا مصیبت میں پڑنا اس پر نہایت شاق ہے، وہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ تم کفر اختیار کر کے دنیا میں حیوانوں سے بدتر زندگی گزارو، پھر آخرت میں جہنم کا ایندھن بنو، اس فکر میں وہ گھلتا جا رہا ہے، اتنا کہ اللہ تعالیٰ کو اسے تسلی دلانا پڑتی ہے۔ دیکھیے سورۂ کہف (۶)، آل عمران (۱۷۶)، شعراء (۳) اور شوریٰ (۴۸) پھر وہ ایسا دین لے کر آیا ہے جس میں کوئی مشکل نہیں، نہایت آسان اور سادہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: « اِنِّیْ اُرْسِلْتُ بِحَنِیْفِیَّةٍ سَمْحَةٍ » [ أحمد : ۶/ ۱۱۶، ح : ۲۴۹۰۸، عن عائشة رضی اللہ عنہا، قال شعیب الأرنؤوط وغیرہ حدیث قوی، إسنادہ حسن ] "مجھے حنیفی (ابراہیم حنیف والی) آسان شریعت دے کر بھیجا گیا ہے۔" اور فرمایا: « اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ » "یہ دین سراسر آسان ہے۔" [ بخاری، الإیمان، باب الدین یسر : ۳۹، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ] ایسا مہربان نبی کہ طائف میں دس دن رہ کر مار کھا کر زخمی اور بے ہوش ہو کر نکلا اور ہوش آنے پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا کہ اگر کہو تو میں (دو پہاڑوں) اخشبین میں ان کفار کو پیس دوں؟ تو عرض کیا: "مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ نکالے گا جو ایک اللہ کی عبادت کریں گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔" [ بخاری، بدء الخلق، باب إذا قال إحدکم آمین...... : ۳۲۳۱، عن عائشة رضی اللہ عنہا ]

پانچویں یہ کہ "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ" رات دن اس کی یہی کوشش ہے اور اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے تم دوزخ سے بچ جاؤ اور دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کر لو۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ" کا ترجمہ کیا ہے "تلاش رکھتا ہے تمھاری۔" اس کی وضاحت میں فرمایا: "چاہتا ہے کہ میری امت زیادہ ہوتی رہے۔" (موضح) اس لیے زیادہ اولاد

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۲۹﴾

پھر اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور وہی عرش عظیم کا رب ہے ﴿۱۲۹﴾

---

دینے والے خاندانوں میں نکاح کرنے کی ترغیب دی، فرمایا: « تَزَوَّجُوا الْوُلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ » ’’ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو بہت بچے دینے والی، بہت محبت کرنے والی ہوں، کیونکہ میں دوسری امتوں کے سامنے تمھاری کثرت پر فخر کرنے والا ہوں۔‘‘ [ نسائي، النكاح، باب كراهية تزويج العقيم : ٣٢٢٩ ـ أبو داؤد : ٢٠٥٠ ] چھٹی ” بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ “ نبی کریم ﷺ اپنے ساتھیوں کی عیادت کے لیے جاتے، ان کے جنازے میں پہنچتے، نماز میں بچے کے رونے کی آواز سن کر ماں کی تکلیف محسوس کرتے ہوئے نماز مختصر کر دیتے، خود بھوکے رہ کر انھیں کھلاتے پلاتے، نبوت سے پہلے آپ ﷺ کی تمام انسانوں کے ساتھ شفقت و ہمدردی کو دیکھیں جس کی شہادت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دی، تو مومنوں پر آپ کی نرمی اور رحمت کا خود بخود اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے، اللہ تعالیٰ نے جو ایک مقبول دعا ہر نبی کی طرح آپ کو عطا کی، سب نے کر لی، مگر آپ نے اپنی امت کی شفاعت کرنے کے لیے سنبھال کر رکھ لی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل سے جنت میں اپنے اس مہربان نبی کی رفاقت عطا فرمائے۔ ( آمین )

**آیت 129** ① فَاِنۡ تَوَلَّوۡا ...... : یعنی ایسے مہربان نبی، اس کی مومنوں پر شفقت و رحمت و حرص اور اس قدر سہل دین کے باوجود اگر وہ منہ موڑیں، تو آپ یہ کہیں: ﴿ حَسۡبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ ﴾ صرف یہ عقیدہ ہی نہ رکھیں، بلکہ برملا اعلان کریں اور اللہ کے کافی ہونے پر اپنی خوشی اور فخر کا اظہار کریں ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ۔۔۔ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

② حَسۡبِیَ اللّٰهُ : ”حَسۡبِیَ“ پہلے آنے کی وجہ سے معنی میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی مجھے صرف اللہ کافی ہے، خواہ سب لوگ مجھے چھوڑ جائیں۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف ۔۔۔ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

بے شک اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسباب بنائے ہیں، ساتھیوں کی مدد سے قوت ملتی ہے اور ایک دوسرے کی مدد کا حکم بھی ہے: ﴿ وَ تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ﴾ [ المائدة : ٢ ] ’’اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔‘‘ مگر کافر اور مومن کا یہی فرق ہے کہ دنیاوی اسباب ختم ہونے پر کافر ناامید ہو جاتا ہے اور مشرک کو اپنے معبودوں پر اتنا اعتماد ہو ہی نہیں سکتا جتنا موحد کو ایک اللہ پر ہوتا ہے، اس لیے مومن کبھی ناامید ہو کر کفر کے مقابلے سے دستبردار نہیں ہوتا ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا ۔۔۔ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس لیے قرآن و حدیث کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ اسباب وضروریات مہیا کرنے کی پوری کوشش کرو، وہ جمع ہو جائیں تب بھی ان پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرو اور ایک بھی سبب مہیا نہ ہو سکے تب بھی صرف اللہ پر بھروسا رکھو جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ کوئی عام بادشاہ نہیں، عرش عظیم کا رب ہے، کوئی چیز اس کی سلطنت اور دسترس سے باہر نہیں۔ تمام اسباب ختم ہونے پر ایک اللہ پر اسی اعتماد اور اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظاہرہ غار ثور میں ہوا، فرمایا: ﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ ...... ﴾ [ التوبة : ٤٠ ] اسی کا مظاہرہ جنگ احد کے اختتام پر دشمن کے اجتماع کی خبر پر اہل ایمان کے قول کے وقت ہوا اور اسی کا مظاہرہ دنیا کا ہر سہارا ختم ہونے پر آگ میں پھینکے جانے کے وقت ابراہیم علیہ السلام کے قول ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ کہنے اور بلا اسباب آگ کو گلزار بنا کر اللہ تعالیٰ کی مدد کی صورت میں ہوا۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (١٧٣، ١٧٤) اور سورۂ بروج میں مذکور اصحاب الاخدود والے لڑکے کے پاس جب تمام اسباب ختم ہو گئے تو اس نے انھی الفاظ کے ہم معنی الفاظ « اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ بِمَا شِئْتَ » (اے اللہ! مجھے ان سے کافی ہو جا جس چیز کے ساتھ تو چاہے) کے ساتھ دعا کی تو پہاڑ سے گرانے والے خود گر کر مر گئے اور سمندر میں ڈبونے والے خود ڈوب گئے، مگر اس کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ [ دیکھیے مسلم، الزھد، باب قصة أصحاب الأخدود...... : ٣٠٠٥، عن صهيب رضی اللہ عنہ ] اب بھی اگر کوئی یقین کے ساتھ اللہ پر اعتماد کرنے والا یہ دعائیں پڑھے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اسی طرح آئے گی، خواہ ساری دنیا اس سے منہ موڑ جائے۔ بندۂ عاجز عبد السلام عرض کرتا ہے کہ یہ ان مبارک دعاؤں میں سے ہے جن کے پڑھنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں "قُلْ" کے لفظ کے ساتھ حکم دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی اپنے صبح و شام کے اذکار میں اسے شامل کرنا چاہیے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "جو شخص یہ دعا ﴿ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ صبح و شام سات سات دفعہ پڑھے، اللہ تعالیٰ اسے تمام فکروں سے کافی ہو جاتا ہے۔" یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ثابت نہیں، ہاں ابو درداء رضی اللہ عنہ کے قول کی سند کے راوی اچھے ہیں، البتہ اس میں « صَادِقًا كَانَ بِهَا اَوْ كَاذِبًا » کے الفاظ صحیح نہیں، بلکہ منکر ہیں۔ [ دیکھیے سلسلة الأحاديث الضعيفة و الموضوعة : ٥٢٨٦ ] بالفرض اگر صحابی کا قول بھی نہ ہو تو اس کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان "قُلْ" ہی کافی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

اور ہم نے آپ کی طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم

حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ

## جلد دوم

سورۃ یونس تا سورۃ الحج

دار الاندلس
Dar-ul-Andlus

بسم الله الرحمن الرحیم

نام کتاب

# تفسیر القرآن الکریم

## جلد دوم

سورۃ یونس تا سورۃ الحج

تفسیر

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبدالسلام بن محمد

Dar-al-Andlus

ناشر

دارالاندلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

## جلد دوم

سورۃ یونس تا سورۃ الحج


Dar-ul-Andlus

دار الاندلس

+92 42 37242314 | 042 37230549

تفسیر القرآن الکریم

# فہرست

سُوْرَۃُ یُوْنُسَ ۱۰ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اٰيَاتُهَا ۱۰۹ رُكُوْعَاتُهَا ۱۱

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ① اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ②

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓرٰ۔ یہ کمال حکمت والی کتاب کی آیات ہیں① کیا لوگوں کے لیے ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے ان میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈرا اور جو لوگ ایمان لائے انھیں بشارت دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سچا مرتبہ ہے۔ کافروں نے کہا بے شک یہ تو کھلا جادوگر ہے②

**آیت 1** ① الٓرٰ : یہ حروف مقطعات ہیں، تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔

② تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ : "تِلْكَ" اسم اشارہ ہے، مشار الیہ "اَلْاٰيَاتُ" مقدر ہے۔ مراد قرآن مجید کی تمام آیات ہیں جن میں ہماری یہ سورت بھی شامل ہے، یعنی یہ عظیم الشان آیات کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ "الْحَكِيْمِ" (کمال حکمت والی) کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ دانائی اور حکمت سے بھری ہوئی ہے، اس کی کوئی بات نہ خطا ہے، نہ عقل کے خلاف اور نہ کمتر درجہ کی، بلکہ ہر بات ہی کمال عقل و دانش پر مبنی ہے اور ایک معنی یہ ہے کہ یہ کتاب انتہائی محکم اور مضبوط ہے، اس کی آیات میں کوئی باہمی اختلاف نہیں، نہ ہی اس کے حلال و حرام اور حدود و احکام کبھی منسوخ ہوں گے، یعنی حکیم بمعنی محکم ہے۔

**آیت 2** ① اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا...... : یعنی آخر اس میں تعجب اور حیرت کی کون سی بات ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے اور فلاح و سعادت کی راہ دکھانے کے لیے خود انھی میں سے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا گیا؟ تعجب کی بات تو تب ہوتی کہ ان کا پروردگار ان کی ہدایت کا کوئی سامان نہ کرتا، یا ان میں کسی جن یا فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتا، کیونکہ فرشتہ یا جن انسانوں کے لیے نمونۂ عمل بن ہی نہیں سکتا۔ مزید دیکھیے سورۂ توبہ (۱۲۸) اور آل عمران (۱۶۴) کی تفسیر۔

② اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ...... : "قَدَمَ" کا معنی تو ظاہر ہے، دوسروں سے آگے وہی نکلتا ہے جس کا قدم دوڑ میں سب سے آگے نکل جائے، اس لیے "قَدَمَ" کا معنی پیش قدمی بھی کرتے ہیں۔ درجے اور مرتبے کی بلندی بھی آگے نکلنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ "صِدْقٍ" (سچ) مبالغہ کے لیے مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی اتنا سچا کہ سراپا سچ ہے، جیسے "زَيْدٌ عَدْلٌ" "أَيْ زَيْدٌ عَادِلٌ" گویا زید سراپا عدل ہے۔ صدق قول میں بھی ہوتا ہے اور فعل میں بھی۔ "قَدَمَ" (موصوف) اپنی صفت "صِدْقٍ" کی طرف مضاف ہے، جیسا کہ "مَسْجِدُ الْجَامِعِ" معنی یہ ہوا کہ ایمان والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیقی پیش قدمی اور سچا مرتبہ ہے، کفار اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھے ہی نہیں بلکہ شرک و کفر میں ایسے اندھے ہوئے کہ وہ شخص جس کی چالیس سالہ زندگی کے صدق و امانت کے وہ خود شاہد تھے اس پر ایمان لانے کے بجائے ضد اور عناد سے اسے جادوگر کہہ

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ

بے شک تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ ہر کام کی تدبیر

دیا، ایسے اندھوں اور بہروں کو رب تعالیٰ کے ہاں حقیقی پیش قدمی اور سچا مرتبہ کیسے حاصل ہو سکتا تھا۔ سو وہ آگے بڑھنے کے بجائے جہنم میں گرنے کے لیے پیچھے رہ گئے۔ چونکہ ان کا آپ کو جادوگر قرار دینا بالکل ہی بودی بات تھی، اس لیے اس کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔

❸ رسول اللہ ﷺ کو جادوگر قرار دینے سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کے دماغ یہ مان گئے تھے کہ آپ ﷺ عام آدمی نہیں۔ مگر ان کی بدبختی دیکھیے کہ وہ جادوگروں کی غلیظ اور خبیث زندگی اور بد عادات سے خوب واقف ہونے کے باوجود سب سے زیادہ امین، راست باز، پاک دامن اور صاحب عقل و دانش انسان کو محض ہٹ دھرمی کی بنا پر جادوگر کہہ رہے ہیں۔

آیت 3 ❶ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ ......: نبوت کے اثبات کے بعد توحید و قیامت کے دلائل شروع ہوتے ہیں۔ توحید کی پہلی اور اظہر من الشمس دلیل جو قرآن بار بار بیان کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا آسمان و زمین اور ہر چیز کا خالق و مالک، رب اور مدبر ہونا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱، ۲۲) یہ بات مکہ کے مشرک بھی مانتے تھے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۸۴ تا ۸۹) جب رب وہی ہے تو عبادت کسی اور کی کیوں کی جائے۔ اس آیت میں اور دوسرے بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دوسری صفات کو اس کے واحد معبود برحق ہونے کی دلیل بنایا ہے۔

❷ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ: اس آیت میں دہریہ کا بھی رد ہے جو رب تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں، جب معمولی سے معمولی چیز بنانے والے کے بغیر نہیں بنتی تو سمجھ لو کہ اتنی بڑی کائنات اور اس کا عظیم الشان نظام، جس میں کوئی حادثہ یا تصادم نہیں، اسے بنانے والا تمھارا رب ہی ہے۔ چھ دنوں سے مراد یا تو وہ دن ہیں جن میں سے ایک دن ہمارے ہزار سال کے برابر ہے، فرمایا: ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ [ الحج : ٤٧ ] ”اور بے شک ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار سال کے برابر ہے، اس گنتی سے جو تم شمار کرتے ہو۔“ یا ہمارے چھ دنوں کے برابر مدت مراد ہے، کیونکہ یہ دن رات تو سورج کی پیدائش کے بعد وجود میں آئے۔ (واللہ اعلم)

اس سے اللہ تعالیٰ کی حکمت تدریج بھی ظاہر ہو رہی ہے، کیونکہ وہ چاہتا تو سب کچھ ایک لمحے میں ”کُنْ“ کہہ کر پیدا فرما لیتا، مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ زمین و آسمان کو مرحلہ وار پیدا فرمائے۔ اس میں ہمارے لیے بھی ہر کام آرام و اطمینان کے ساتھ کرنے کا سبق ہے۔ کائنات کی اکثر اشیاء پر غور کریں تو وہ چھ مرحلوں سے گزر کر مکمل ہوئی ہیں، مثلاً انسان کی پیدائش کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون (۱۲ تا ۱۴)۔

❸ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ......: پھر عرش پر بلند ہوا اور وہاں رہ کر اسے کائنات کی تدبیر کا مرکز بنایا۔ نیز دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴) ”يُدَبِّرُ الْاَمْرَ“ سے معلوم ہوا کہ پیدا کرنے کے بعد اس کا سارا اختیار اور تدبیر و انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ مشرکین نے اختیار کچھ اور ہستیوں کے پاس سمجھ لیا، بھلا پیدا کرنے کے بعد اپنی ملکیت و اختیار کسی دوسرے کو کون دیتا ہے، پھر یہ کیسے ہو

الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۳

کرتا ہے۔ کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کی اجازت کے بعد، وہی اللہ تمھارا رب ہے، سو اس کی عبادت کرو۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ۳

سکتا ہے کہ وہ ملکیت و اختیار بے بس مخلوق کو دے دے جو اپنا آپ نہیں سنبھال سکتی، حقیقت یہی ہے کہ مشرک سے بڑھ کر بے عقل کوئی نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۸)۔

4 مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ : کفار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا خیال تھا اور ہے کہ کچھ ہستیاں ایسی ہیں جو مالک تو نہیں، مگر وہ اللہ تعالیٰ سے جو چاہیں کروا سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ان کی محبت کے ہاتھوں یا ان کی غیبی قوت سے مجبور ہو کر ان کی بات اور سفارش ماننا پڑتی ہے۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ان سے التجائیں کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی صاف نفی فرما دی۔ ہاں، خود اللہ تعالیٰ کسی کو عزت بخشنے کے لیے اسے سفارش کی اجازت دے دے تو وہ سفارش کر سکے گا، مگر صرف اس کے لیے جس کے حق میں اجازت ملے گی۔ اس میں اس کا اپنا اختیار کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ مضمون کہ اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کر سکے گا قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۵)، طٰہٰ (۱۰۹)، سبا (۲۳) اور نجم (۲۶) بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے سرے سے شفاعت ہی کی نفی کی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴾ [ المدثر : ۴۸ ] ”پس انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی۔“ اور فرمایا: ﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾ [ البقرۃ : ۴۸، ۱۲۳ ] ”اور کسی جان سے کوئی سفارش قبول نہ کی جائے گی۔“ وہاں یا تو کفار کا ذکر ہے کہ ان کی سفارش فائدہ نہیں دے گی، یا اجازت کے بغیر سفارش مراد ہے، ورنہ امت کے گناہ گاروں کے حق میں شفاعت تو صحیح احادیث سے ثابت ہے اور یہ بھی کہ آپ ﷺ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ ”اِلَّا بِاِذْنِهٖ“ والی آیات سے بھی یہ شفاعت ثابت ہو رہی ہے، مگر یہ شفاعت اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد ہی ہوگی۔

5 فَاعْبُدُوْهُ : عبادت کا معنی ”پوجا کرنا“ بھی ہے اور پوری زندگی ”عبد“ یعنی اس کا فرماں بردار غلام (بندہ) بن کر گزارنے کو بھی عبادت کہا جاتا ہے اور حاجت روائی کے لیے کسی غیبی قوت کے پکارنے کو بھی عبادت کہا جاتا ہے۔ قرآن نے ہر قسم کی عبادت کو اللہ کے ساتھ خاص کیا ہے، پس ”فَاعْبُدُوْهُ“ کے معنی ہیں اسی کی پوجا کرو، اسی کو مشکلات دور کرنے کے لیے پکارو اور پوری زندگی اسی کی بندگی (غلامی) میں بسر کرو۔ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اگر تم کسی اور کی بندگی اختیار کرو گے تو گویا اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک ٹھہراؤ گے۔

6 اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ : یہ اصل میں ”تَتَذَكَّرُوْنَ“ تھا، یہاں فکر کے بجائے ذکر کی دعوت دی ہے۔ ذکر یاد کرنے کو کہتے ہیں، نصیحت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مقصد ہے کہ اللہ واحد ہی کو عبادت کے لائق سمجھنے کے لیے لمبی چوڑی فکر اور سوچ کی ضرورت نہیں، جو کچھ تمھارے گرد و پیش ہے اور جو کچھ تمھارے ذہن میں موجود ہے اسی کو یاد کرو، نصیحت کے لیے وہی کافی ہے۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵

اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے، اللہ کا وعدہ ہے سچا۔ بے شک وہی پیدائش شروع کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا، تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، انھیں انصاف کے ساتھ جزا دے اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے نہایت گرم پانی سے پینا ہے اور درد ناک عذاب ہے، اس کے بدلے جو وہ کفر کیا کرتے تھے ۝۴ وہی ہے جس نے سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ۔ وہ آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے جو جانتے ہیں ۝۵

**آیت 4** **اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا** ...... اس میں قیامت، یعنی سب لوگوں کے دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے حضور پیش ہونے کا بیان ہے۔ یہ اللہ کا پکا سچا وعدہ ہے، کیونکہ دنیا میں نیک و بد کی جزا و سزا نہ ضروری ہے نہ ممکن، نہ یہاں اس کے لیے مطلوب فرصت میسر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنے سچے وعدے کو پورا کرتے ہوئے تمھیں دوبارہ زندہ کر کے ایمان والوں کو انصاف کے ساتھ جزا دے گا اور کافروں کو ان کے کفر کا بدلہ دے گا۔ اگر کوئی اسے ناممکن سمجھے تو سوچ لے کہ جو ذات تمھیں شروع میں پیدا کرتی ہے، یعنی عدم سے وجود میں لاتی ہے، کیا اس کے لیے یہ مشکل ہے کہ تمھارے مر جانے کے بعد تمھیں دوبارہ زندگی دے۔ مزید دیکھیے سورۂ روم (۲۷) "حَمِيْمٍ" وہ پانی جو گرمی کی انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ دیکھیے سورۂ رحمٰن (۴۴) اور سورۂ محمد (۱۵)۔

**آیت 5** ❶ **هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً** ......: "ضِيَآءً" "ضَاءَ يَضُوْءُ ضَوْءًا وَ ضِيَاءً" سے ہے اور "قِيَامًا" کی طرح مصدر ہے، بعض کہتے ہیں یہ "ضَوْءٌ" کی جمع ہے، جیسا کہ "سَوْطٌ" کی جمع "سِيَاطٌ"۔ یعنی سورج کو "ذَاتَ ضِيَاءٍ" تیز روشنی والا اور چاند کو "ذَا نُوْرٍ" نور والا بنایا، پھر "ذَاتَ" اور "ذَا" کو حذف کر کے مبالغہ کے لیے سورج کو سراپا ضیاء اور چاند کو سراپا نور قرار دیا۔ ضیاء اور نور میں وہی فرق ہے جو سورج کی تیز اور گرم روشنی اور چاند کی پرسکون روشنی میں ہوتا ہے۔ انسان اور کائنات کی حرکت و سکون کے لیے دن اور رات کی طرح سورج اور چاند بھی ضروری ہیں۔

❷ **وَ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ** ......یعنی چاند کی منزلیں مقرر فرمائیں کہ ہر روز گھٹتا اور بڑھتا ہے، اگرچہ سورج کی بھی منزلیں مقرر ہیں،

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸﴾

بے شک رات اور دن کے بدلنے میں اور ان چیزوں (میں) جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہیں، یقیناً ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں ﴿۶﴾ بے شک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہوگئے اور اس پر مطمئن ہوگئے اور وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں ﴿۷﴾ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اس کے بدلے جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۸﴾

جس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے، مگر چاند کا اٹھائیس منزلوں میں روزانہ شکل بدل کر آنا، پھر ایک یا دو دن چھپ کر نئے سرے سے طلوع ہونا، تاریخ اور ماہ و سال کی تعیین کے لیے زیادہ آسان اور قابل عمل ہے۔ اس لیے شریعت کے تمام احکام مثلاً حج، روزہ اور کفارہ وغیرہ بھی اسی سے متعلق ہیں۔ دیکھیے ﴿یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ [البقرۃ: ۱۸۹] کی تفسیر۔

③ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ بے فائدہ اور بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ یہ تفصیل علم و فہم رکھنے والوں کے لیے ہے، کیونکہ بے علم اور بے سمجھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کے بیان سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

**آیت 6** اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ ...... : سورج روزانہ نئی جگہ سے طلوع اور نئی جگہ غروب ہوتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رب المشارق (بہت سے مشرقوں کا رب) ہے۔ اسی سے دن رات کا چھوٹا بڑا ہونا، موسموں کا بدلنا، ٹھیک وقت پر شمسی سال کے لحاظ سے سال کے بعد وہی موسم دوبارہ آ جانا اور زمین و آسمان میں موجود اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ بے شمار چیزوں میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی توحید کی بے شمار نشانیاں ہیں، مگر ان کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور برے انجام سے بچتے ہیں۔ ان نشانیوں کی تفصیل چاہو تو ہر قدم پر اور ہر لحہ تمھارے سامنے ہیں، مگر جو منہ ہی موڑ لے اس کا کیا علاج؟ دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۵) موٹی موٹی نشانیوں کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۴)۔

**آیت 8،7** ① اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ...... : آخرت کے ذکر کے بعد دو آیتوں میں اس کے منکرین اور پھر اس پر ایمان والوں کا ذکر فرمایا، آخرت کے منکروں کی چار صفات بیان فرمائی ہیں، پہلی صفت "لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا" "رَجَاءٌ" کا لفظ طمع اور خوف دونوں معنوں میں آتا ہے، اس لیے "لَا یَرْجُوْنَ" کا مطلب ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے، یا اس سے نہیں ڈرتے، نہ ہی آخرت میں ہونے والے حشر و نشر پر ان کا ایمان ہے۔ دوسری یہ کہ وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہوگئے اور اس پر وہی خوش ہوتا ہے جو پورے کا پورا جسمانی لذات و خواہشات کا اسیر ہو جائے۔ تیسری یہ کہ وہ اس پر مطمئن ہوگئے، مطمئن وہی ہوتا ہے جو اسے اپنی آخری پناہ سمجھ لے، سعادت مند لوگوں کو تو اللہ کے ذکر سے اطمینان ہوتا ہے، کیونکہ ان کی

# اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۹﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی رہنمائی کرے گا، ان کے نیچے سے نعمت کے باغوں میں نہریں بہتی ہوں گی ﴿۹﴾

آخری پناہ گاہ وہی ہے، حیاتِ دنیا کے فانی ہونے کی وجہ سے وہ کبھی اس پر مطمئن نہیں ہوتے۔

④ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ : چوتھی یہ کہ وہ آسمان و زمین میں موجود بے شمار نشانیوں سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے، نہ ان پر کچھ غور و فکر کرتے ہیں۔ اگر ان آیات سے مراد آیات قرآنی ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ ہمارے احکام سے غفلت برتتے ہیں، نہ ان پر غور کرتے ہیں اور نہ انھیں بجا لاتے ہیں۔ (ابن کثیر) ٹھکانا ان کا ان کے اعمال بد کی وجہ سے آگ ہے۔

**آیت 9** ① يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ : یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کو ان کے ایمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا میں صراط مستقیم کی ہدایت، یعنی سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے، یا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ایمان لانے کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی ہو گی، حتیٰ کہ وہ (پل) صراط سے گزر کر سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ ان دونوں معنوں میں باء سببیت کے لیے ہے، یہ باء استعانت کے لیے بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ سورۂ حدید (۱۲، ۱۳) میں فرمایا کہ ایمان والے مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہا ہو گا، جب کہ منافق مرد اور عورتیں ان سے درخواست کریں گے کہ ہمیں بھی اپنے نور سے فائدہ اٹھا کر ساتھ چلنے کا موقع دو۔ گویا مومن اپنے نور ایمان کی مدد سے چلتے ہوئے جنت میں پہنچ جائیں گے، جب کہ منافق اندھیرے میں رہ جائیں گے۔

② تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ : جنت کی نہروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ محمد (۱۵)۔

③ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ : ان نعمتوں کی تفصیل بیان میں نہیں آ سکتی، فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ [ السجدة : ۱۷ ] ”پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ )) [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب صفة الجنة : ۲۸۲٤/٤، عن أبي هريرة ﷺ ] ”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال ہی گزرا۔“

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾

ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ''پاک ہے تو اے اللہ!'' اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے ﴿۱۰﴾

آیت 10 ① دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ...... : یعنی وہ جنت کی نعمتیں اور عجائب دیکھ کر بے اختیار کہیں گے: ''اے اللہ! تو پاک ہے'' بلکہ جس طرح دنیا میں خود بخود سانس جاری رہتا ہے اہل جنت کے دل و زبان پر ہر وقت خود بخود اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید جاری رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَأْكُلُوْنَ فِيْهَا وَيَشْرَبُوْنَ وَلَا يَتْفِلُوْنَ وَلَا يَبُوْلُوْنَ وَلَا يَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا يَمْتَخِطُوْنَ، قَالُوْا فَمَا بَالُ الطَّعَامِ؟ قَالَ جُشَاءٌ وَرَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ وَالتَّحْمِيْدَ كَمَا يُلْهَمُوْنَ النَّفَسَ » [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب في صفات الجنة وأهلها......: ٢٨٣٥، عن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما ] ''جنتی جنت میں کھائیں گے اور پییں گے، وہ نہ تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے اور نہ ناک صاف کریں گے۔'' صحابہ نے پوچھا: ''جو کھانا وہ کھائیں گے وہ کہاں جائے گا؟'' تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''بس ڈکار آئے گا اور پسینا آئے گا جس سے مشک (کستوری) کی خوشبو آئے گی (اور ان کا کھانا تحلیل ہو جائے گا)۔ (ان کے دلوں میں اور ان کی زبانوں پر) تسبیح اور حمد خود بخود بے اختیار جاری ہوگی جس طرح سانس خود بخود جاری ہوتا ہے۔'' ''تَحِيَّتُهُمْ'' باب تفعیل کا مصدر، زندگی کی دعا دینا کہ اللہ تمھیں زندگی بخشے، یعنی وہ ایک دوسرے سے ملیں گے تو ایک دوسرے کو زندہ رہنے کی دعا سلام کے الفاظ سے دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ابراہیم (۲۳)، سورۂ مریم (۶۰ تا ۶۲) اور سورۂ واقعہ (۲۵، ۲۶) میں بیان فرمایا ہے۔

② وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : اور ان کی دعا اور گفتگو کا اختتام رب العالمین کی حمد کے ساتھ ہوگا، دنیا میں بھی ان کی گفتگو اور دعا کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کے ساتھ ہوا کرتا تھا، جنت میں بھی اسی طرح جاری رہے گا۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص یہ الفاظ کہے: « سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ » کسی ذکر کی مجلس میں تو یہ مہر کی طرح ہوں گے جو آخر میں لگائی جاتی ہے اور جو انھیں کسی لغو کی مجلس میں کہے تو اس کے لیے کفارہ ہوں گے۔'' [ مستدرك حاكم : ١/ ٥٣٧، ح : ١٩٧٠۔ السلسلة الصحيحة : ١/ ١٢٠ ] عبداللہ بن عمرو اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی روایت کے الفاظ ہیں کہ کفارۂ مجلس یہ ہے کہ بندہ یوں کہے: « سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ » [ صحيح الجامع : ٤٤٨٧ ]

وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪ وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا

اور اگر اللہ لوگوں کو برائی جلدی دے انھیں بہت جلدی بھلائی دینے کی طرح تو یقیناً ان کی طرف ان کی مدت پوری کر دی جائے۔ تو ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، چھوڑ دیتے ہیں، وہ اپنی سرکشی ہی میں حیران پھرتے ہیں ⑪ اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پہلو پر، یا بیٹھا ہوا، یا کھڑا ہوا ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم

**آیت 11** وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ...... : "تَعْجِيْلٌ" "تفعیل" سے ہے، اس کا معنی وقت سے پہلے طلب کرنا اور "اِسْتِعْجَالٌ" کا معنی بھی جلدی طلب کرنا ہے، مگر یہاں یہ دونوں جلدی طلب کے معنی میں نہیں بلکہ جلدی دینے کے معنی میں ہیں اور حروف میں اضافہ معنی میں اضافے کے لیے ہے۔ اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ کفار جلدی مچاتے تھے کہ لاؤ عذاب جس سے ہمیں ڈراتے ہو، فرمایا: ﴿ وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ [ الحج : ٤٧ ] "اور وہ تجھ سے عذاب جلدی مانگتے ہیں۔" حتیٰ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! اگر اسلام واقعی حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا کوئی عذاب الیم بھیج دے۔ دیکھیے سورۂ انفال (۳۲) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جس طرح انھیں خیر بہت جلدی عطا کر دیتے ہیں اسی طرح (ان کے مطالبے پر) عذاب بھی جلدی بھیج دیتے تو یہ کبھی کے ہلاک ہو چکے ہوتے، مگر ہم انھیں مہلت دے کر پورا موقع دیتے ہیں کہ واپس پلٹ آئیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، انسان جب اپنے لیے یا دوسروں کے لیے بھلائی کی دعا کرتا ہے تو اسے جلد قبول فرماتا ہے، لیکن جب غصے یا رنج میں آکر اپنے منہ سے اپنے یا اپنے بچوں یا دوسروں کے لیے بددعا کے کلمات نکالتا ہے تو وہ انھیں قبول نہیں فرماتا، بلکہ ڈھیل اور مہلت دیتا ہے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کریں اور اگر وہ یہ بھی جلدی قبول کر لے تو لوگ جلد ہی ہلاک ہو جائیں۔ اس صورت میں "استعجال" میں طلب کا معنی موجود ہے، "تعجیل" میں نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا تَدْعُوْا عَلٰی أَنْفُسِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی أَوْلَادِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی خَدَمِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی أَمْوَالِكُمْ، لَا تُوَافِقُوْا مِنَ اللّٰهِ سَاعَةً نَيْلَ عَطَاءٍ فَيَسْتَجِيْبَ لَكُمْ » [ أبو داؤد، الوتر، باب النهي عن أن يدعو ...... : ١٥٣٢، عن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہ و صححه الألباني ] "اپنے آپ پر بددعا نہ کرو اور اپنی اولاد پر بددعا نہ کرو اور اپنے خادموں پر بددعا نہ کرو اور اپنے مالوں پر بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے وقت میں دعا کر بیٹھو جس میں (مانگی ہوئی چیز) دے دی جاتی ہے اور وہ تمھاری بددعا قبول کر لے۔" آخر میں فرمایا کہ آخرت کے دن پر ایمان نہ لانے والوں کو ہم ان کے کفر و شرک اور ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلی تفسیر ان الفاظ کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

**آیت 12** وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ...... : یہاں "الْاِنْسَانَ" سے مراد اکثر انسان ہیں، جن میں کفار و مشرکین بھی شامل ہیں، کیونکہ انھی کا ذکر پہلے اور بعد میں چل رہا ہے اور وہ بھی مصیبت کے وقت اللہ کو پکارتے ہیں، پھر مقصد پورا ہو جانے کے بعد سرے سے اسے بھول جاتے ہیں، بعض مومنوں کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی انسان اس قدر عاجز و ناتواں ہے کہ

اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں کسی تکلیف کی طرف، جو اسے پہنچی ہو، پکارا ہی نہیں۔ اسی طرح حد سے بڑھنے والوں کے لیے مزین بنا دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تم سے پہلے بہت سے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے، جب انھوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آئے اور وہ ہرگز ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے۔ اسی طرح ہم مجرم لوگوں کو جزا دیا کرتے ہیں ﴿۱۳﴾

---

جوں ہی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے، بیٹھے اور کھڑے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے، لیکن اس کی بے وفائی کا یہ عالم ہے کہ جوں ہی تکلیف دور ہوتی ہے اسی پہلے غرور میں بدمست ہو جاتا ہے اور اپنی مصیبت اور تکلیف سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ انسان کی اس عادت کا کئی آیات میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ دیکھیے حٰم السجدہ (۵۱)، زمر (۴۹) اور ہود (۱۰، ۱۱)۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں انھی لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جن کا دعا کا طریقہ یہ ہے، البتہ وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور اپنی توفیق خاص سے نوازا ہے وہ ان میں شامل نہیں، کیونکہ وہ سختی اور نرمی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے اور اسے یاد رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ، وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ» [ مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير : ۲۹۹۹، عن صهيب رضی اللہ عنہ ] ''مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر کام ہی خیر ہے اور یہ چیز (کامل) مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی حاصل ہو تو شکر کرتا ہے، پس وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے، سو وہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔'' ''مُسْرِفِيْنَ'' (حد سے بڑھنے والوں) کو یہ نعمت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس آیت میں مذکور لوگوں کی طرح ان کے لیے ان کے اعمال بد ہی خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کے لیے ان کے اعمال کس نے خوش نما بنائے ہیں، آیت میں اس کا ذکر نہیں، کیونکہ وہ کئی چیزیں ہو سکتی ہیں: ① شیطان، فرمایا: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ [ النمل : ۲۴ ] ''اور شیطان نے ان کے لیے ان کے عمل خوش نما بنا دیے۔'' ② نفس، فرمایا: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ [ یوسف : ۵۳ ] ''بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے۔''

ہمارے لیے اس میں سبق یہ ہے کہ ہمیں مصیبت دور ہونے پر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دعا میں کمی نہیں کرنی چاہیے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَّسْتَجِيْبَ اللّٰهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ وَالْكُرَبِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِي الرَّخَاءِ» [ ترمذی، کتاب الدعوات، باب أن دعوة المسلم مستجابة : ۳۳۸۲، و حسنه الألباني ] ''جسے پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ سختیوں اور مصیبتوں میں اس کی دعا قبول فرمائے تو وہ خوش حالی میں کثرت سے دعا کیا کرے۔''

**آیت 12** ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ...... : قرن سے مراد ایک عہد کے لوگ ہیں، یہاں مراد ایسی اقوام ہیں

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

پھر ان کے بعد ہم نے تمھیں زمین میں جانشین بنا دیا، تاکہ ہم دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو ﴿۱۴﴾ اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کوئی قرآن اس کے سوا لے آ، یا اسے بدل دے۔ کہہ دے میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں، میں پیروی نہیں کرتا، مگر اسی کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک میں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۱۵﴾

جنھوں نے اپنے اپنے دور میں عروج حاصل کیا، پھر ظلم کی وجہ سے ملیا میٹ کر دی گئیں، یا عروج سے زوال میں جا گریں۔ یہ دونوں صورتیں ہی ہلاکت ہیں۔ اوپر بتایا کہ ان کی بد دعا اور طلب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب نہ اترنے میں سراسر اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، پھر ان کا حال یہ ہے کہ تکلیف نازل ہونے پر آہ وزاری کرنے لگتے ہیں، اب انھیں ڈرایا جا رہا ہے کہ تمھاری بداعمالیوں کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب ٹل جائے تو تمھیں بے فکر نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ایک نہ ایک دن ان بداعمالیوں کی سزا تو مل کر ہی رہے گی۔ تمھیں چاہیے کہ پہلی مجرم قوموں کے حالات پر غور کرو کہ آخر ان کا انجام کیا ہوا۔

**آیت 14** ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ ...... : یعنی ان کے بعد تمھیں زمین میں ان کے جانشین بنایا، اگر تم بھی ان کی طرح ظلم و سرکشی پر کمربستہ رہو گے تو تمھاری تباہی بھی یقینی ہے۔ یہ خطاب ان تمام لوگوں کو ہے جن کی طرف رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔

**آیت 15** ① وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ...... : اس سے پچھلی آیات میں مشرکین کو مخاطب کیا تھا، یہاں ان کا ذکر غائب کے صیغے سے کیا ہے، اسے التفات کہتے ہیں اور یہاں اس سے مقصود مشرکین کی تحقیر اور ان پر ناراضگی کا اظہار ہے کہ یہ بے عقل لوگ خطاب کے قابل ہی نہیں ہیں۔ مشرکین کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور شرک کی تردید کا ذکر اور آخرت پر یقین کی بات سننا کسی طرح گوارا نہ تھا۔ وہ آیات الٰہی سن کر مطالبہ کرتے کہ اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لائیں، جس میں ہمارے لیے یہ تکلیف دہ باتیں نہ ہوں، بلکہ کچھ ہماری پسندیدہ باتیں بھی ہوں، اللہ کے سوا بھی کسی داتا، دستگیر، مشکل کشا، بگڑی بنانے والے کے اختیارات مذکور ہوں، اگر پورا قرآن اور نہیں لا سکتے تو اس میں ہماری خاطر داری کے لیے کچھ اپنے پاس ہی سے تبدیلیاں کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ ان سے کہہ دیں کہ پورا قرآن اور لانا تو بہت دور کی بات ہے میں تو اس میں اپنی طرف سے ایک شوشہ بھی نہیں بدل سکتا۔ میرا کام نہ قرآن تصنیف کرنا ہے، نہ اس میں ترمیم، تبدیلی یا اضافہ کرنا۔ میرا کام صرف یہ

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ وہ تمھیں اس کی خبر دیتا، پس بے شک میں تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہ چکا ہوں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۱۶﴾ پھر اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر کوئی جھوٹ باندھے، یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ مجرم لوگ فلاح نہیں پاتے ﴿۱۷﴾

ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے وہ پہنچا دوں، اگر میں ایسی کسی حرکت کا ارتکاب کروں گا تو میں اپنے رب کے عذاب سے ڈرتا ہوں جو بہت بڑے دن میں واقع ہونے والا ہے۔

2 بعض مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ پر تہمت لگاتے تھے کہ قرآن انھوں نے خود ہی تصنیف کیا ہے، اب اپنی اس بات کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے وہ آپ سے کوئی اور قرآن لانے کا یا اس میں اپنے پاس سے تبدیلی کا مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ یہ مطالبہ مان لیں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ قرآن خود انھی کا تصنیف کردہ ہے، پھر ہمیں آپ کو جھٹلانے اور مذاق اڑانے کا موقع مل جائے گا۔ کفار کی مراد پہلی تفسیر اور اس تفسیر میں مذکور دونوں باتیں ہی ہو سکتی ہیں اور ہیں۔

**آیت 16** قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ ......: "تَلَوْتُ" "تَلَا يَتْلُوْ تِلَاوَةً" (ن) سے واحد متکلم ماضی معلوم کا صیغہ ہے۔ "مَا تَلَوْتُهٗ" میں اسے نہ پڑھتا۔ "أَدْرٰى" یہ "دَرٰى يَدْرِىْ" (ض) (جاننا، معلوم کرنا) سے باب افعال "اَدْرٰى يُدْرِىْ" کا ماضی معلوم واحد غائب کا صیغہ ہے۔ "وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ" اور نہ وہ تمھیں اس کی خبر دیتا، یا تمھیں یہ معلوم کرواتا۔ مطلب یہ ہے کہ میں نبوت سے پہلے ایک عمر، یعنی چالیس برس تم میں رہا، اس ساری مدت میں تم سب جانتے ہو کہ نہ مجھے پڑھنا آتا تھا نہ لکھنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۸] "اور اس سے پہلے تو نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا، اس وقت باطل والے ضرور شک کرتے۔" اور دیکھیے سورۂ شوریٰ (۵۲، ۵۳) اور تم سب کا میرے صدق اور امانت پر بھی اتفاق ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۳۳) تو کیا تمھاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ قرآن جس کی سب سے چھوٹی سورت کی مثل پیش کرنے سے اللہ کے سوا پوری کائنات عاجز ہے، وہ میں نے کیسے تصنیف کر لیا اور تم اعتبار کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ وہ اسے مجھ پر نازل کرتا، نہ میں اسے پڑھ کر تمھیں سناتا اور نہ وہ اس کی خبر تمھیں دیتا۔ اب کوئی اور قرآن میں کہاں سے لاؤں، یا اس میں اپنے پاس سے تبدیلی کیسے کروں؟ یہ بات میرے امکان اور میرے بس میں ہی نہیں۔

**آیت 17** فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى ......: یعنی اگر یہ قرآن میں نے خود تصنیف کر لیا ہے، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو میں نے

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۱۸

اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ۱۸

اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا، جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں، مگر اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا اوپر کے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، اس کے بعد بھی اگر تم نے اس کی آیات کو جھٹلایا تو تم سے بڑا ظالم اور گناہ گار کوئی نہیں اور ایسے گناہ گار اور مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

**آیت 18** ① وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... : مکہ کے مشرک اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرتے تھے اور کچھ اور ہستیوں کو بھی غائبانہ پکارتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم انھیں اللہ تعالیٰ نہیں مانتے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ سے ہمارے کام کروا دیتے ہیں (دیکھیے زمر: ۳) اللہ تعالیٰ ان کی سفارش رد نہیں کرتا، حالانکہ وہ نہ انھیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے تھے نہ نقصان (دیکھیے مائدہ: ۷۶۔ فرقان: ۳) بلکہ ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ کوئی ہمیں پکار رہا ہے یا ہماری پوجا کر رہا ہے۔ یہی حال ہمارے زمانے کے ان لوگوں کا ہے جو پیروں فقیروں کو حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں اور مردہ اولیاء اللہ کی قبروں کو سجدہ کرتے، ان کا طواف کرتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور ان کے سامنے عاجزی سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھانے کے لیے جب کوئی بات کی جاتی ہے تو وہ یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم ان بزرگوں کو یہ سمجھ کر تو سجدہ نہیں کرتے اور نہ ان سے مرادیں مانگتے ہیں کہ یہ خود اللہ تعالیٰ ہیں، بلکہ انھیں صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا سفارشی سمجھتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ان کا اتنا زور ہے اور ان کی محبت میں وہ ایسا مجبور ہے کہ وہ ان کی کوئی سفارش رد نہیں کر سکتا۔ اسی چیز کا جواب اگلے جملے میں دیا جا رہا ہے۔

② قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کی ہر بات اور ہر چیز کو جانتا ہے، بلکہ وہی انھیں پیدا کرنے والا اور ہر لحہ پالنے والا ہے، تو وہ کیسے بے خبر ہو سکتا ہے۔ اگر معاذ اللہ، تمھارے یہ بت یا زندہ و مردہ معبود اس کے شریک یا سفارشی ہوتے تو وہ انھیں بھی ضرور جانتا ہوتا، جب وہ ان میں سے کسی کے بھی شریک یا سفارشی ہونے سے انکار کر رہا ہے تو معلوم ہوا کہ ان کا کوئی وجود یا حقیقت نہیں، اب تمھارے ان کو شریک یا سفارشی اور نفع و نقصان پہنچانے والے ماننے پر اصرار کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کو تو آسمان و زمین میں کوئی ایسی ہستی معلوم نہیں ہے مگر تم اسے وہ چیز بتا رہے ہو جو اس کے علم ہی میں نہیں۔ معلوم ہوا تمھارا یہ کہنا اور اس کی بنیاد پر کیے جانے والے تمھارے سب افعال بالکل بے ہودہ اور لغو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کے شرک سے ہر طرح سے پاک اور بے حد بلند ہے، وہ نہ کسی مددگار کا محتاج ہے نہ کسی سفارشی کے ہاتھوں مجبور۔

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۹ وَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝۲۰ ع ۲

اور نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی امت، پھر وہ جدا جدا ہو گئے اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے پہلے طے ہو چکی تو ان کے درمیان اس بات کے بارے میں ضرور فیصلہ کر دیا جاتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ۝۱۹ اور وہ کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ سو کہہ دے غیب تو صرف اللہ کے پاس ہے، پس انتظار کرو، بے شک میں (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں ۝۲۰

آیت 19 ① وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا : اس زمانے کے ملحد فلسفیوں اور تاریخ سازوں کے برعکس قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ انسانیت کی ابتدا کفر یا شرک سے نہیں بلکہ خالص توحید سے ہوئی۔ ابتدا میں تمام انسان ایک ہی دین، یعنی اسلام رکھتے تھے اور ایک ہی ان کی ملت تھی، لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اس دین سے انحراف کیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے لگ کر آپس میں اختلاف کر کے اپنی اپنی مرضی کے دین اور قانون گھڑ لیے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۳)۔

② وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ...... : یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ دنیا میں لوگوں کو مہلت دی جائے گی، تاکہ وہ اپنی عقل و فہم سے کام لے کر جس راستے کو چاہیں اختیار کریں اور جس راستے کو چاہیں چھوڑ دیں اور قیامت ہی کے دن انھیں ان کے اچھے یا برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا تو کبھی کا اللہ تعالیٰ حقیقت کو بے نقاب کر کے ان لوگوں کو پکڑ چکا ہوتا جو ایمان کا راستہ چھوڑ کر کفر و شرک کے راستے پر چل رہے ہیں۔ (ابن کثیر، قرطبی)

آیت 20 ① وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ : مثلاً یہ مکہ کے سب پہاڑ سونے کے کر دیتا، ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا، یا کوئی فرشتہ اتار دیتا جو ہمارے ساتھ بازاروں اور گلی کوچوں میں چل پھر کر اعلان کرتا کہ واقعی محمد (ﷺ) کو اللہ ہی نے اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں ان کی معجزوں کی کئی فرمائشیں ذکر ہوئی ہیں۔

② فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ...... : یعنی اللہ کے سوا کوئی غیب کی بات نہیں جانتا، لہٰذا مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس قسم کی کوئی نشانی اتارے گا کہ نہیں اور اگر اتارے گا تو کب اتارے گا۔ نشانی اتارنا یا نہ اتارنا اس کی مرضی پر موقوف ہے، اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ نشانی اتارے گا تب تم ایمان لاؤ گے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو، میں بھی دیکھوں گا تمھارا یہ مطالبہ پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ (مگر تمھارے جیسے لوگوں کے متعلق تجربہ یہی ہے کہ وہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے، بلکہ ایمان نہ لانے کا بہانہ بنانے کے لیے معجزے کو بھی جھٹلا دیتے ہیں۔ دیکھیے انعام: ۷، ۱۱۱۔ بنی اسرائیل: ۵۹)۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب ہم لوگوں کو کوئی رحمت چکھاتے ہیں، کسی تکلیف کے بعد، جو انھیں پہنچی ہو، تو اچانک ان کے لیے ہماری آیات کے بارے میں کوئی نہ کوئی چال ہوتی ہے۔ کہہ دے اللہ چال میں زیادہ تیز ہے بے شک ہمارے بھیجے ہوئے لکھ رہے ہیں جو تم چال چلتے ہو ﴿۲۱﴾ وہی ہے جو تمھیں خشکی اور سمندر میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں لے کر عمدہ ہوا کے ساتھ چل پڑتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں تو ان (کشتیوں) پر سخت تیز ہوا آجاتی ہے اور ان پر ہر جگہ سے موج آجاتی ہے اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کو گھیر لیا گیا ہے، تو اللہ کو اس طرح پکارتے ہیں کہ ہر عبادت کو اس کے لیے خالص کرنے والے ہوتے ہیں، یقیناً اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو ہم ضرور ہی شکر کرنے والوں سے ہوں گے ﴿۲۲﴾

**آیت 21** ❶ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا : یعنی جب ہم لوگوں کو بیماری کے بعد شفا، قحط کے بعد خوش حالی، جنگ کے بعد امن یا انھیں پہنچنے والی کسی بھی تکلیف کے بعد اپنی کسی رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو ہمارے شکر گزار ہو کر ہماری توحید اور ہمارے رسول کی رسالت ماننے کے بجائے اسے جھٹلانے اور اس کا مذاق اڑانے کی کوئی نہ کوئی چال اختیار کرتے ہیں۔ ''مکر'' کا معنی خفیہ تدبیر ہے، جو شر کے لیے ہو، یہ لفظ کبھی خیر کے لیے بھی استعمال ہو جاتا ہے، یا مقابلے میں بول لیا جاتا ہے۔ کفار کی اس عادت کی مثال فرعون کا پے در پے معجزے دیکھ کر انھیں جادو کہہ کر ایمان لانے سے انکار ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۰ تا ۱۳۶) انسان کی اس عادت کا تذکرہ سورۂ زمر (۸)، ہود (۱۰) اور اعراف (۹۵) میں بھی کیا گیا ہے۔

❷ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا: اللہ کی چال سے مراد وہ سزا ہے جو وہ مشرکین کو ان کی مکاریوں اور چال بازیوں پر دیتا ہے اور وہ ہے اس کا انھیں ان کی باغیانہ روش پر چھوٹ دینا اور انھیں اپنے رزق اور نعمتوں سے نوازتے رہنا، تاکہ وہ جی بھر کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے رہیں۔

❸ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ : یعنی جب تمھارا نامۂ اعمال خوب سیاہ ہو جائے گا تو اچانک موت کا پیغام آ جائے گا اور تم اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے دھر لیے جاؤ گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر اللہ پر رہتی ہے، جب کام بن گیا تو لگا اسباب پر نگاہ رکھنے۔ سو ڈرتا نہیں کہ اللہ پھر کوئی سبب کھڑا کر دے اسی تکلیف کا، سب اسباب اس کے ہاتھ میں (ہر وقت) تیار ہیں، ایک اسی کی صورت آگے اور فرمائی۔'' (موضح)

**آیت 22** ❶ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ...... : اس آیت میں بھی پہلے مشرکین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہی ہے

فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

پھر جب اس نے انھیں نجات دے دی اچانک وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمھاری سرکشی تمھاری جانوں ہی پر ہے، دنیا کی زندگی کے فائدے کے لیے، پھر ہماری ہی طرف تمھارا لوٹ کر آنا ہے، تو ہم تمھیں بتائیں گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿۲۳﴾

جو تمھیں خشکی اور سمندر میں چلاتا ہے۔ آگے چل کر ان کا ذکر غائب کے ساتھ کیا کہ وہ کشتیاں انھیں لے کر چل پڑتی ہیں۔ مخاطب کو غائب کے الفاظ سے ذکر کرنا التفات کہلاتا ہے۔ یہ التفات بھی ناراضگی کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ لوگ اپنی بدعہدی کی وجہ سے خطاب کے قابل نہیں، اس لیے ان کا غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا کہ جب وہ کشتیاں موافق اور طیب ہوا کے ساتھ ان کی خواہش کے مطابق چل رہی ہوتی ہیں تو اچانک تند و تیز آندھی آ جاتی ہے اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ گھیرے میں آ چکے ہیں، اب اگر اللہ تعالیٰ نہ بچائے تو بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

② دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ : تو یہ مشرک لوگ (جو خطاب کے قابل ہی نہیں ہیں) اپنی پوری عبادت اور اطاعت ایک اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کو پکارتے ہیں اور اپنے تمام معبودوں اور بتوں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ و زاری کرتے ہیں۔ (ابن کثیر)

③ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ : یہ تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب کا حال بیان فرمایا ہے، مگر ہمارے زمانے کے بعض نام کے مسلمانوں کا حال ان سے بھی بدتر ہے، ان پر جب کوئی بڑی مصیبت آتی ہے، مثلاً دریا میں ڈوبنے یا آگ میں جلنے لگتے ہیں تو بھی شرک سے توبہ نہیں کرتے اور وہی ''یا خواجہ خضر'' ''یا علی مدد'' کا نعرہ لگاتے ہیں، مرتے اور ڈوبتے وقت بھی اللہ کو نہیں پکارتے۔ [ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ]

آیت 23 ① فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ ...... : یعنی طوفان سے بچ نکلنے پر پھر وہی ناحق سرکشی اور ظلم شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ مشرکین کے اس رویے کا ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۵، ۶۶) اور لقمان (۳۲) ہاں، کوئی سعادت مند ہو تو اپنے عہد پر قائم رہتا ہے مگر وہ اتنے کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں، جیسا کہ سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن چار مردوں اور دو عورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ جہاں پائے جائیں قتل کر دیے جائیں۔ ان میں سے ایک عکرمہ بن ابوجہل بھی تھے۔ عکرمہ نے یہ سنا تو سمندر کے راستے راہ فرار اختیار کی، لیکن جب سفر شروع ہوا تو کشتی والوں کو تند و تیز ہوا نے آ لیا۔ (لوگ اپنے اپنے خداؤں کو پکارنے لگے) کشتی والوں نے کہا: (( أَخْلِصُوْا فَإِنَّ آلِهَتَكُمْ لَا تُغْنِیْ عَنْكُمْ شَیْئًا هٰهُنَا، فَقَالَ عِكْرِمَةُ وَاللّٰهِ! لَئِنْ لَمْ یُنَجِّنِیْ مِنَ الْبَحْرِ إِلَّا الْإِخْلَاصُ لَا یُنَجِّیْنِیْ فِی الْبَرِّ غَیْرُهُ، اَللّٰهُمَّ إِنَّ لَكَ عَلَیَّ عَهْدًا إِنْ أَنْتَ عَافَیْتَنِیْ مِمَّا أَنَا فِیْهِ أَنْ آتِیَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی أَضَعَ یَدِیْ فِیْ

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۴

دنیا کی زندگی کی مثال تو بس اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے ساتھ زمین سے اگنے والی چیزیں خوب مل جل گئیں، جس سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی آرائش حاصل کر لی اور خوب مزین ہوگئی اور اس کے رہنے والوں نے یقین کر لیا کہ وہ اس پر قادر ہیں تو رات یا دن کو اس پر ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اسے کٹی ہوئی کر دیا، جیسے وہ کل تھی ہی نہیں۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کرتے ہیں جو خوب سوچتے ہیں ۝۲۴

فَلَأَجِدَنَّهُ عَفُوًّا كَرِيْمًا فَجَاءَ فَأَسْلَمَ ﴾ [ نسائی، تحریم الدم، باب الحکم فی المرتد : ۴۰۷۲، وصححه الألبانی ] ''خالص اللہ کو پکارو، کیونکہ اس وقت یہاں تمھارے (خود ساختہ) معبود تمھارے کچھ کام نہیں آئیں گے۔'' عکرمہ نے (دل میں) کہا: ''اللہ کی قسم! اگر سمندر میں نجات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات دے سکتی ہے تو پھر خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا، اے اللہ! اگر تو نے مجھے اس طوفان سے نجات دے دی تو میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ میں محمد (ﷺ) کے پاس جا کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا، کیونکہ میں انھیں بہت درگزر کرنے والا، مہربان پاتا ہوں۔'' چنانچہ وہ آئے اور مسلمان ہو گئے۔''

2 يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ...... : یعنی اس سرکشی کا وبال تمھاری اپنی ہی جانوں پر ہے، اس سے تم کسی اور کو نقصان نہیں پہنچا سکو گے، دنیوی زندگی کا تھوڑا سا فائدہ اٹھا لو، آخر تمھیں ہمارے پاس ہی آنا ہے، پھر ہم تمھیں بتلائیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو، یعنی پھر ہم تمھیں ایسی سزا دیں گے جس سے تمھیں پتا چل جائے گا کہ تم کتنا بھاری ظلم کرتے رہے ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُعَجِّلَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِصَاحِبِهِ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يَدَّخِرُ لَهٗ فِي الْآخِرَةِ مِثْلُ الْبَغْيِ وَقَطِيْعَةِ الرَّحِمِ ﴾ [ أبو داؤد، الأدب، باب في النهي عن البغي : ۴۹۰۲، عن أبي بكرة رضی اللہ عنہ ] ''کوئی گناہ اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دنیا میں بھی جلدی دے اور اس کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی اس کی سزا باقی رکھے سوائے ظلم و زیادتی اور قطع رحمی کے۔''

**آیت 24** 1 اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ...... : پچھلی آیت میں ذکر تھا کہ تم یہاں جتنی بھی سرکشی کر لو یا لذتوں میں مست ہو کر ہماری آیات کو جھٹلا لو، یہ دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے اور بہت جلد فنا ہو جانے والا ہے۔ اس آیت میں اس کی مثال بیان فرمائی کہ آسمان سے پانی برسنے سے زمین میں سے لوگوں کے اور ان کے چوپاؤں کے کھانے اور لذت حاصل کرنے

وَ اللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے تک پہنچا دیتا ہے ﴿۲۵﴾

کے لیے مختلف فصلیں، کھیتیاں، چارا اور پھل پیدا ہوئے، پھر خوب پھلے پھولے، زمین سج گئی، مالک سمجھنے لگے کہ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کی اور اس سے غلہ، میوے اور سبزیاں حاصل کرنے کی پوری قدرت حاصل ہے۔

② اَتٰهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا ...... : "اَمْرُنَا" سے مراد اس کے فنا کا حکم ہے، خواہ وہ پک کر زرد ہوگئی ہو اور کاٹ لی گئی ہو، یا پھر کسی دشمن نے کچی ہی برباد کر دی ہو، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آفت سیلاب، پالے، آگ یا طوفان کی شکل میں آ پڑی کہ پکنے سے پہلے کچی ہی اس طرح کٹ کر ناپید ہوگئی گویا کبھی یہاں رہی ہی نہیں۔ "حَصِيْدًا" بمعنی "مَحْصُوْدٌ" یعنی کٹی ہوئی۔

③ كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ : "لَمْ تَغْنَ" "غَنِيَ يَغْنَى" (ع) کسی جگہ رہنا۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے، روح پانی کی طرح آسمان سے اترتی ہے اور بدن اس سے مل کر خوب پھلتا پھولتا ہے، جب جوانی پر آتا ہے تو علم و ہنر سیکھتا ہے اور امید ہو جاتی ہے کہ چند روز جی کر مزے اڑائیں گے، گھر والوں کو یقین ہوتا ہے کہ اب کما کر لائے گا کہ یکا یک موت آ جاتی ہے اور تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور ایسے معلوم ہوتا ہے "كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ" (جیسے وہ کل تھا ہی نہیں)، کچھ مدت بعد وہ ذہنوں سے بھی محو ہو جاتا ہے اور اگر وہ اپنی عمر پوری بھی کر لے تو جس طرح پکی ہوئی کھیتی کاٹ لی جاتی ہے یا خود بخود ہی چورا بن کر بکھر جاتی ہے، اسی طرح بڑھاپے کے بعد یہ بھی فنا کی نذر ہو جاتا ہے۔ سورۂ حدید (۲۰) اور قلم (۱۷ تا ۳۳) میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ اسی لیے ایک لمبی حدیث میں آیا ہے: (( يُؤْتٰى بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيْمٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ لَا وَاللّٰهِ ! يَا رَبِّ! وَيُؤْتٰى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهُ يَا ابْنَ آدَمَ ! هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ لَا وَاللّٰهِ ! يَا رَبِّ ! مَا مَرَّ بِيْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ )) [ مسلم، صفات المنافقين، باب صبغ أنعم أهل الدنيا في النار : ۲۸۰۷، عن أنس رضی اللہ عنہ ] "قیامت کے دن اس شخص کو جو اہل جہنم میں سے دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال تھا، لایا جائے گا، اسے آگ میں ایک غوطہ دے کر نکالا جائے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا: "کیا تم نے کبھی کوئی خوشحالی دیکھی، کیا تیرے پاس آسودگی آئی؟" وہ جواب دے گا: "نہیں اللہ کی قسم! اے میرے رب!" پھر اہل جنت میں سے اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ بدحال تھا، اسے جنت میں ایک غوطہ دے کر نکالا جائے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا: "کیا تم نے دنیا میں کوئی بدحالی دیکھی، یا کوئی سختی پہنچی؟" وہ جواب دے گا: "نہیں اللہ کی قسم! اے میرے رب! مجھے کوئی سختی نہیں پہنچی اور میں نے کوئی بدحالی نہیں دیکھی۔"

④ يَّتَفَكَّرُوْنَ : تاکہ ان پر غور کریں اور ان سے سبق حاصل کریں۔

**آیت 25** وَ اللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ...... : اوپر کی آیت میں دنیا اور اس کے بہت جلد زوال کا ذکر کر کے لوگوں کو اس کی طرف مائل ہونے سے نفرت دلائی، اب اس آیت میں جنت کی ترغیب دی اور جنت کا نام "دار السلام" رکھا۔ دیکھیے سورۂ انعام

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؕ وَ لَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

جن لوگوں نے نیکی کی انھی کے لیے نہایت اچھا بدلہ اور کچھ زیادہ ہے اور ان کے چہروں کو نہ کوئی سیاہی ڈھانپے گی اور نہ کوئی ذلت، یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۶﴾

(۱۲۵ تا ۱۲۷) یعنی جو ہر قسم کے آفات و آلام سے پاک ہے اور اس میں سلامتی ہی سلامتی ہے، فرشتے ہر طرف سے اس میں سلام کریں گے اور اہل جنت بھی ایک دوسرے کو سلام کا تحیہ پیش کریں گے، فرمایا: ﴿ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴾ [یونس : ۱۰] ''اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی۔'' رب رحیم کی طرف سے بھی سلام کی نعمت سے سرفراز ہوں گے، فرمایا: ﴿ سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ [یٰس : ۵۸] ''سلام ہو، اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے جنت کی دعوت رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے دی ہے، چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل اور میکائیل نے آپس میں میرے لیے ایک مثال بیان کی کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک محل بنایا، پھر اس میں ایک شان دار دعوت کا اہتمام کیا اور لوگوں کو بلانے کے لیے ایک بلانے والا بھیجا، پس جس شخص نے اس بلانے والے کے کہنے کو قبول کیا وہ تو محل میں بھی داخل ہوگا اور کھانا بھی کھائے گا اور جو بلانے والے کے کہنے کو قبول نہیں کرے گا وہ نہ تو محل میں داخل ہوگا اور نہ کھانا کھائے گا، پھر انھوں نے کہا، اس کے لیے اس کی وضاحت کرو، تاکہ یہ سمجھ جائے! تو ایک نے کہا کہ وہ محل جنت ہے اور اس کی طرف بلانے والے محمد ﷺ ہیں، تو جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی، تو اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ لوگوں کے (اچھے برے کے) درمیان فرق (کرنے والے) ہیں۔ [ بخاري، الاعتصام بالكتاب و السنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ : ۷۲۸۱ ]

**آیت 26** لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ : احسان کی تفسیر حدیث جبریل میں ہے، فرمایا: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ )) [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ ...... : ۵۰ ] ''اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو یقیناً وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔'' مقصد یہ کہ خلوص کے ساتھ اللہ کی بندگی کرنے والوں کو جنت کے ساتھ ایک عظیم زائد چیز بھی عطا ہوگی۔ ''زِيَادَةٌ'' میں تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔

جنت کی دعوت دینے کے بعد اس کی سعادتوں کا ذکر فرمایا۔ اس آیت کریمہ میں ''الْحُسْنٰى'' جو ''اَحْسَنُ'' کی مؤنث ہے، اس کا معنی سب سے اچھا بدلہ ہے اور فرمایا ایک عظیم زائد چیز بھی ہے۔ ''زِيَادَةٌ'' مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، اس ''زِيَادَةٌ'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ یہی مفہوم سورۂ نساء (۱۷۳)، نور (۳۸) اور سورۂ ق (۳۵) میں بیان ہوا ہے۔ متعدد صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہی تفسیر فرمائی ہے، چنانچہ صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ﴾ اور فرمایا: ''جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو اس وقت ایک منادی کرنے والا

وَ الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷

اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں، کسی بھی برائی کا بدلہ اس جیسا ہوگا اور انھیں بڑی ذلت ڈھانپے گی، انھیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا، گویا ان کے چہروں پر رات کے بہت سے ٹکڑے اوڑھا دیے گئے ہیں، جبکہ وہ اندھیری ہے۔ یہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝۲۷

پکارے گا: ''اے جنت والو! اللہ نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا، وہ چاہتا ہے کہ اسے بھی پورا کر دیا جائے۔'' وہ کہیں گے: ''وہ کون سا وعدہ ہے؟ کیا اس نے ہمارے میزان (نیک اعمال کے تول) بھاری نہیں کر دیے؟ کیا اس نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے، ہمیں جنت میں داخل اور آگ سے محفوظ نہیں کر دیا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( فَيَكْشِفُ لَهُمُ الْحِجَابَ فَيَنْظُرُوْنَ إِلَيْهِ، قَالَ: " فَوَاللّٰهِ ! مَا أَعْطَاهُمْ شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَيْهِ وَلَا أَقَرَّ بِأَعْيُنِهِمْ )) [ مسند أحمد : ۴/ ۳۳۳، ح : ۱۸۹۶۵۔ مسلم، الإیمان، باب إثبات رؤیة المؤمنین ...... : ۱۸۱ ] ''اس وقت ان کے لیے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور وہ اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے۔'' پھر فرمایا: ''اللہ کی قسم! انھیں اب تک ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی ہو گی جو انھیں اس دیدار سے زیادہ محبوب ہو اور اس میں ان کی آنکھوں کے لیے اس سے زیادہ ٹھنڈک ہو۔'' اس آیت کی تفسیر ایک دوسری آیت اور اس کی تفسیر سے بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۷۲)۔

**آیت 27** ① **وَالَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ** ...... : اوپر محسنین (نیکی کرنے والوں) کا بیان تھا، اب ان لوگوں کی حالت بیان کی جو سیئات (برائیوں) کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ''سَیِّئَةٍ'' میں تنوین تنکیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''کسی بھی برائی'' کیا ہے۔ گزشتہ آیت میں ذکر ہے کہ نیکی کا بدلہ اس سے بہت اچھا، یعنی جنت اور مزید دیدار الٰہی کی صورت میں ملے گا، اب بتایا کہ برائی خواہ کوئی ہو اس کا بدلہ صرف اس کے برابر ملے گا، زیادہ یا کئی گنا نہیں ملے گا۔ انھیں بہت بڑی ذلت گھیرے ہوئے ہو گی، یعنی ''ذِلَّةٌ'' میں تنوین تہویل و تعظیم کے لیے ہے۔

② **مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ** : حقیقت میں تو دنیا ہو یا آخرت، کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں، مگر انسان دنیا میں بہت سے سہارے تلاش کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کے ذریعے سے میں نے اپنی مراد حاصل کر لی ہے، مگر آخرت میں اس قسم کے سب اسباب ختم ہو جائیں گے اور ہر ایک کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اب اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں، جیسا کہ سورۂ قیامہ میں فرمایا: ﴿ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ا۟لْمُسْتَقَرُّ ﴾ [ القیامة : ۱۰ تا ۱۲ ] ''اور انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں، اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے۔''

③ **كَاَنَّمَاۤ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا** : ''غَشِيَ يَغْشَى'' (ع) ڈھانپنا۔ ''اَغْشٰى يُغْشِيْ'' (افعال) کسی پر کوئی چیز ڈال دینا جو اسے ڈھانپ لے۔ ان کے چہروں کی حد سے بڑھی ہوئی سیاہی کو تشبیہ دی ہے کہ گویا اندھیری رات کے

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے جنھوں نے شریک بنائے تھے، کہیں گے اپنی جگہ ٹھہرے رہو، تم اور تمھارے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان علیحدگی کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾

اندھیروں کے کئی ٹکڑے ملا کر ان کے چہروں پر ڈال دیے گئے ہوں، جنھوں نے ان کو ڈھانپ رکھا ہو۔ مجرموں کے چہروں کی سیاہی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر کیا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۰۶، ۱۰۷)، قیامہ (۲۴ تا ۲۵) اور عبس (۳۸ تا ۴۱) "مُظْلِمًا" یہ "الَّيْلِ" سے حال ہے۔

آیت 28 ① وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا: اس آیت میں بھی کفار کی ایک رسوائی بیان کی گئی ہے کہ جس دن ہم شروع سے آخر تک کے تمام جن و انس، مسلم و کافر اور نیک و بد کو اکٹھا کریں گے (دیکھیے کہف: ۴۷۔ مریم: ۹۳، ۹۴) اس دن شرک کرنے والوں اور جنھیں وہ شریک بناتے رہے ان سب کو بھی اکٹھا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی عظمت و رفعت کے اظہار کے لیے اپنا ذکر جمع کے صیغے سے کیا ہے کہ "ہم" جمع کریں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے واحد، احد ہونے میں کیا شک ہے، پورا قرآن ہی یہ سمجھانے کے لیے نازل ہوا کہ وہ ذات پاک وحدہ لا شریک لہ ہے۔

② ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ......: پھر ہم شرک کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم اور جنھیں تم نے شریک بنایا تھا اپنی جگہ ٹھہرے رہو، تاکہ تمھارے لیے تمھارے شرک اور شرکاء کی حقیقت واضح ہو جائے۔

③ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ: ان کے درمیان علیحدگی کرنے سے مراد ایک تو یہ ہے کہ مسلم و کافر الگ الگ کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ [ یٰس: ۵۹ ] "اور الگ ہو جاؤ آج اے مجرمو!" اور دیکھیے سورۂ روم (۱۴ تا ۱۶، ۴۳) اور ایک مطلب یہ ہے کہ شرک کرنے والوں کو اور ان کے قرار دیے گئے شرکاء کو اپنی اپنی جگہ ٹھہرنے کا حکم دے کر ان کی گفتگو کروائی جائے گی۔ مشرک ان سے کہیں گے کہ ہم دنیا میں تمھاری عبادت کرتے رہے، مشکل کے وقت پکارتے رہے، اپنے نفع نقصان کا مالک سمجھتے رہے، قیامت کے دن تمھاری پناہ میں آ کر عذاب سے بچانے کی درخواست کرتے رہے۔

④ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ: وہ شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو نہیں کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کس کی عبادت کرتے رہے ہو؟ دنیا میں جن لوگوں کی پرستش کی گئی ان میں سے کچھ وہ تھے جو اپنی پرستش کروانا چاہتے تھے، جیسے فرعون، ابلیس وغیرہ اور کچھ وہ تھے جو یہ نہیں چاہتے تھے، بلکہ اللہ کا شریک کسی کو بھی بنانے سے منع کرتے تھے، جیسے انبیاء و صالحین۔ اب جب اللہ تعالیٰ سب کو جمع کرے گا، تو وہ سب لوگ جن کی عبادت اور پرستش کی گئی اپنے پرستش کرنے والوں سے صاف لاتعلق ہو جائیں گے، جو اپنی پرستش کروانا چاہتے تھے وہ بھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ (۱۶۵ تا ۱۶۷) میں مذکور ہے اور وہ

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو اللہ ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان کافی گواہ ہے کہ بے شک ہم تمھاری عبادت سے یقیناً بے خبر تھے ﴿۲۹﴾

بھی جو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے تھے، جیسا کہ مسیح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء و صلحاء۔ ان سب کی اپنی عبادت کرنے والوں سے اور پوجنے پکارنے والوں سے صاف بری اور لاتعلق ہونے کی کئی وجہیں ہوں گی، جن میں سے پہلی وجہ تو یہ ہوگی کہ یہ مشرک تو اللہ کے سوا کسی اور کو بھی عالم الغیب، ان کے حالات سے واقف اور ان کی فریاد سننے والا سمجھتے رہے اور یہ سمجھ کر دن رات یا علی یا حسن یا حسین یا دستگیر یا داتا یا شکر گنج وغیرہ پکارتے رہے، جب کہ ان حضرات کو کچھ خبر ہی نہ تھی کہ کوئی ہمیں پکار رہا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [ الأحقاف : ٥، ٦ ] ''اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انھیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔ اور جب سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہوں گے۔''

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا بھی کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے، جب کہ قرآن اترا ہی یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، مثلاً دیکھیے سورۂ یونس (۱۰۶، ۱۰۷)، زمر (۳۸)، مومنون (۸۶ تا ۸۹)، جن (۲۱) اور بہت سی دیگر آیات۔ اس لیے تمام شرکاء کہیں گے کہ ہمارا اختیار ہی کچھ نہ تھا، معلوم نہیں تم کیسے پکارتے تھے، بہر حال ہمیں تو نہیں پکارتے تھے۔ تیسری وجہ یہ کہ مشرک لوگ حقیقت میں صرف اپنے وہم و گمان کے بنائے ہوئے مشکل کشاؤں کی پرستش کرتے رہے، جب کہ وہ سب لوگ جن کو یہ پکارتے رہے، ایک بھی نہ اللہ کا شریک تھا نہ کسی اختیار کا مالک۔ اب اپنے گمان کی پوجا کر کے ان کے نام لگانے پر ان کو غصہ آئے گا۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۶) چوتھی وجہ یہ ہوگی کہ ان ظالموں کے شرک کی وجہ سے ان انبیاء اور صالحین کی قیامت کے دن اللہ کے دربار میں پیشی پڑ جائے گی اور ان سے باز پرس ہوگی اور وہ اپنی صفائی اور لاعلمی کا عذر پیش کریں گے، تو ان کے شرک کی وجہ سے، سوال کی وجہ سے جو ان کے دل پر گزرے گی اور پیشی پڑنے پر جو فکر مندی ہوگی ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ اس کی وجہ سے وہ ان سے کس قدر بے زار اور ان کے کتنے زبردست دشمن ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۱۶ تا ۱۱۸) رہے وہ بادشاہ اور پیر اور شیطان جو اپنی پرستش کروانا چاہتے تھے اور ان کو شرک پر لگانے والے تھے، وہ خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں گے، وہ ان کے قابو کہاں آئیں گے، حتیٰ کہ شیطان بھی کہے گا کہ میں نے تم پر کوئی فوج بھیجی تھی؟ محض تمھیں دعوت دی تھی، تم نہ مانتے، اب نہ میں کسی طرح تمھاری مدد کر سکتا ہوں نہ تم میری۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۲۱، ۲۲)۔

5 اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ شرک صرف پتھر کے بتوں یا قبروں کو پکارنے ہی کا نام نہیں بلکہ ان شخصیتوں کو پکارنا ہے جن کے وہ بت ہیں یا قبریں ہیں، ورنہ بت بنانے کی ضرورت کیا تھی، کسی بھی پتھر کو پوج لیتے، بت اور قبر کی نیاز اور سجدے کا صاف مطلب ان شخصیتوں کی پرستش ہے جن کے وہ بت یا قبریں ہیں۔ دیکھیے سورۂ نوح کی آیت (۲۳) کی تفسیر۔

آیت 29 فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا ...... : یہ الفاظ قسم کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ ''اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ'' میں

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

اس موقع پر ہر شخص جانچ لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے ﴿۳۰﴾ کہہ دے کون ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یا کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے؟ اور کون زندہ کو مردہ سے نکالتا اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون ہے جو ہر کام کی تدبیر کرتا ہے؟ تو ضرور کہیں گے ''اللہ'' تو کہہ پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۳۱﴾

'' اِنْ كُنَّا '' دراصل '' اِنَّا كُنَّا '' تھا، '' غٰفِلِيْنَ '' پر لام کا آنا اس بات کی دلیل ہے، اس لیے اس '' اِنْ كُنَّا '' کا معنی '' اِنَّا كُنَّا '' کیا ہے، یعنی یہاں ''اِنَّ'' کا ایک نون اور جمع متکلم کی ضمیر '' نَا '' دونوں مقدر ہیں۔

**آیت 30** ''هُنَالِكَ'' ''اس وقت، اس جگہ'' دونوں معنی میں آتا ہے، اس لیے ترجمہ ''اس موقع پر'' کیا ہے، تاکہ دونوں معنی شامل ہو جائیں۔ '' تَبْلُوْا '' آزمائش کرنا، جانچ لینا۔ جانچنے پرکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اس چیز کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے، یعنی اپنے آگے بھیجے ہوئے اعمال کی پوری حقیقت ہر شخص کے سامنے پوری طرح کھل جائے گی اور اپنے اصل مالک کے پاس پہنچنے کے بعد نہ ان کے اپنے گھڑے ہوئے اور بنائے ہوئے مشکل کشا کہیں نظر آئیں گے، نہ کوئی زبردستی سفارش کے ساتھ چھڑا لینے والا کہیں ڈھونڈے سے ملے گا۔ سب لغو اور جھوٹی باتیں ہوا ہو جائیں گی۔

**آیت 31** ① قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ...... : بت پرستوں کی حماقتوں اور ان کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہاں سے بت پرستی کی تردید میں دلائل کا بیان شروع ہوا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہاں چار چیزیں شرک کی تردید اور توحید الٰہی کی دلیل کے طور پر پیش فرمائی ہیں، اول یہ کہ آسمان و زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ آسمان سے بارش برسانے والا اور زمین سے تمھارے کھانے اور ضرورت کی ہر چیز پیدا کر کے تمھیں روزی دینے والا کون ہے؟ دوم انسان کے حواس جن میں سب سے زیادہ باشرف سمع و بصر ہیں، جو انسان کے علم کا ذریعہ بنتے ہیں، یہ دونوں کس کے قبضہ میں ہیں کہ اگر چاہے تو چھین کر اندھا اور بہرا کر دے؟ سوم موت و حیات کا اختیار کس کے پاس ہے، کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ مثلاً نطفہ اور جان دار، انڈا اور پرندے، بیج اور لہلہاتے کھیت اور درخت، مومن اور کافر میں سے ایک کو دوسرے سے کون نکالتا ہے۔ چہارم پوری کائنات کے ہر معاملہ کی تدبیر کون کرتا ہے کہ اس میں نہ کوئی خرابی ہے نہ حادثہ؟ تدبیر میں پہلی تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں، جو باقی رہ گئی تھیں تدبیر کی صراحت کے بعد وہ سب بھی شامل ہو گئیں۔ یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

سو وہ اللہ ہی تمھارا سچا رب ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ پھر کہاں پھیرے جاتے ہو؟ ﴿۳۲﴾

② فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ...... : یہ ''سین'' تاکید کے لیے ہے، قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، یعنی یہ مشرک بھی ضرور کہیں گے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرمایا تم ان سے کہو کہ پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر بتوں یا بزرگوں کو اس کی جناب میں اپنا وکیل اور وسیلہ سمجھ کر مانتے تھے، اس سے کافر ہو گئے۔ سو اب بھی جو کوئی کسی مخلوق کے لیے عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اس کو مانے اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے، گو اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اس کے مقابلہ کی طاقت اس کو ثابت نہ کرے۔

آیت 32 ① فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ : ''اَلْحَقُّ'' ثابت شدہ، سچا، یعنی تمھارے رزق، موت و حیات، تمھارے جسم کا مالک و خالق اور پوری کائنات کی تدبیر کرنے والا جب تم بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہو تو جان لو کہ پھر تمھارا سچا، ثابت شدہ اور حق رب تو یہی اللہ ہے۔ اب خواہ کوئی بھی چیز ہو وہ یا تو حق ہوگی یا باطل، دونوں نہیں ہو سکتیں کہ حق بھی ہو باطل بھی، تو جب اللہ کا رب اور مالک ہونا حق ہے اور صرف اسی کا صاحب اختیار ہونا حق ہے تو پھر کسی اور کا صاحب اختیار ہونا یا اللہ تعالیٰ سے بات منوانے کی قوت رکھنے والا ہونا باطل نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے باوجود تمھارا دل کیسے مانتا ہے کہ حق کو چھوڑ کر گمراہی اور توحید کو چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کرتے ہو۔ سوچو! راہ حق سے کیسے ہٹائے جا رہے ہو؟

② فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے، یہ بات کہ جو جہاں لگا ہوا ہے لگا رہنے دو، سب ٹھیک ہیں، یا مسلمانوں میں خیر القرون کے بعد بننے والے چاروں سنی فرقے، حنفی ہوں یا شافعی، مالکی ہوں یا حنبلی سب حق ہیں، اس آیت کے خلاف ہے۔ ان تمام مذاہب کی ہر بات ایک ہی وقت میں حق کیسے ہو سکتی ہے؟ ان کے اختلافی مسائل میں حق مسئلہ اگر ہوا تو صرف ایک ہوگا، دوسرے خطا ہوں گے۔ مجتہد کو اگرچہ خطا کے باوجود اس کی نیک نیتی اور محنت کا ایک اجر مل جائے گا مگر اس کی خطا کو حق ہرگز نہیں کہہ سکتے، مثلاً ایک فرقے کی یہ بات کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور دوسرے کی یہ بات کہ صرف انگور یا کھجور کی بنائی ہوئی شراب حرام ہے، باقی نشہ آور چیزیں سب حلال ہیں، دونوں حق کیسے ہو سکتی ہیں؟ ایک کی یہ بات کہ اجرت پر لا کر کسی عورت سے زنا کرے تو اس پر حد ہے اور دوسرے کی یہ بات کہ اجرت پر لائی ہوئی عورت سے زنا کرنے پر حد نہیں، دونوں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ ایک مسلک کا یہ کہنا کہ ماں بہن سے نکاح کی حرمت کے علم کے باوجود نکاح کر کے زنا کر لے تو حد نہیں اور دوسرے کا یہ کہنا کہ یہ حرکت تو ارتداد ہے جس کی حد قتل ہے، دونوں باتیں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ پھر بہت سے ائمہ کا کہنا کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اور اعمال ایمان کا جز ہیں اور ہمارے اور انبیاء و ملائکہ و صحابہ کے ایمان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض حضرات کا یہ کہنا کہ ایمان صرف دل سے

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر سچی ہوگئی جنھوں نے نافرمانی کی کہ بے شک وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۳۳﴾ کہہ دے کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پیدائش کی ابتدا کرتا ہو، پھر اسے دوبارہ بناتا ہو؟ کہہ دے اللہ ہی پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ بناتا ہے، تو تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟ ﴿۳۴﴾

تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے، اعمال خواہ نماز روزہ ہی ہوں، ایمان کا جز نہیں اور چونکہ تصدیق اور اقرار ہم نے بھی کیا ہے، جبریل علیہ السلام اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی کیا ہے، سو ایمان میں ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کہ کسی کا کم ہو یا کسی کا زیادہ، سب کا برابر ہے۔ آپ خود ہی بتائیں اتنے تضاد کے باوجود دونوں حق کس طرح ہو گئے؟ خلاصہ یہ کہ ہر دو متضاد چیزوں میں اگر ایک حق ہے تو یقیناً دوسری ضلال اور گمراہی ہو گی۔

**آیت 33** كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ …… : یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کا رب ہونا ثابت ہوا، یا جس طرح یہ ثابت ہوا کہ حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جو لوگ فسق اختیار کریں، یعنی جان بوجھ کر ضد اور سرکشی اختیار کریں وہ ایمان نہیں لایا کرتے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یعنی چونکہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ لوگ سرکش اور نافرمان ہوں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں ایمان لکھا ہی نہیں۔" (موضح)

**آیت 34** قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ …… : "تُؤْفَكُوْنَ" "اِفْكٌ" کا معنی ہے کسی کو کسی چیز سے پھیر دینا، ہٹا دینا۔ اس لیے جھوٹ اور بہتان کو بھی "اِفْكٌ" کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بھی سننے والے کو اصل بات سے پھیر دیا جاتا ہے۔ یعنی آپ ان سے پوچھیں کیا تمھارا کوئی شریک ایسا ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہو، پھر اسے دوبارہ بنائے؟ جیسا کہ اللہ نے انسان کو مٹی سے، پھر نطفہ، پھر علقہ، غرض تمام منازل سے گزار کر پیدا کیا، اسی طرح ساری مخلوق کی ابتدا اس نے کی اور دوبارہ بھی وہی بنائے گا۔ وہ جواب میں خاموشی اختیار کریں گے، اگر کوئی ایسا شریک ہے تو اس کا نام لو۔ اب نہ وہ ایسے شریک کا نام لے سکتے ہیں، کیونکہ خود مان چکے ہیں کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور نہ وہ یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ ہمارے شرکاء میں سے کوئی ایسا نہیں، کیونکہ اس سے ان کے شرکاء کی حقیقت کھلتی اور ان کی بے بسی ظاہر ہوتی ہے، اس لیے وہ جواب ہی نہیں دیں گے۔ سو اگر وہ جواب نہ دیں تو آپ خود فرمائیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے جو پہلے پیدا کرتا ہے دوبارہ بھی وہی اٹھائے گا۔ پھر اس کے باوجود تم کیسے گوارا کرتے ہو کہ سیدھے راستے، یعنی توحید کو چھوڑ کر صاف گمراہی، یعنی شرک کی طرف پھیر دیے جاؤ جو سراسر افک (جھوٹ) ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

کہہ دے کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرے؟ کہہ اللہ حق کے لیے رہنمائی کرتا ہے۔ تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرے وہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا وہ جو خود اس کے سوا راستہ نہیں پاتا کہ اسے راستہ بتایا جائے؟ تو تمھیں کیا ہے، تم کیسے فیصلہ کرتے ہو؟ ﴿۳۵﴾

آیت 35 ❶ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ...... : "يَهْدِيْ" ہدایت دیتا ہے۔ "لَا يَهِدِّيْ" اصل میں " لَا يَهْتَدِيْ " تھا، تاء کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کر دیا، جس کا معنی ہے ہدایت نہیں پاتا، یعنی آپ ان سے پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے ان کی حق کی طرف راہنمائی کا انتظام بھی فرمایا، رسول بھیجے، کتابیں اتاریں، شریعت مقرر فرمائی، کائنات کا نہایت دقیق و مستحکم نظام مقرر کیا کہ اس کے مقرر کردہ راستے سے کوئی چیز ایک ذرہ ادھر ادھر نہیں ہوتی۔ انسان کو پیدا ہوتے ہی پستان چوسنا سکھایا، فرمایا: ﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ [ البلد : ۱۰ ] "اور ہم نے اسے دو واضح راستے دکھا دیے۔" بطخ کو تیرنا، پرندوں کو اڑنا، درندوں کو شکار کرنا، چرندوں کو چرنا، بلبل کو پھول کی طرف رغبت، پروانے کو جلنا، ماں کو محبت کی طرف اور موذی اشیاء کو دشمنی کی طرف راہ نمائی کون کر رہا ہے؟ اسی طرح زمین، آسمان، سورج، چاند، سیاروں، کہکشاؤں، سمندروں اور بادلوں کا راستہ کہاں سے متعین ہو رہا ہے؟ غرض ہر چیز محض اللہ کی ہدایت کے مطابق چل رہی ہے، کسی داتا یا دستگیر کا اس میں کوئی دخل ہے تو پیش کرو۔ بتاؤ تمھارا وہ شریک کون سا ہے جس نے حق کی طرف ہدایت کا کام کیا ہو، یا کائنات کے راہِ راست پر چلنے کے نظام میں اس کا کوئی دخل ہو۔ اب خود ہی بتاؤ کہ وہ ذات پاک جو حق کی طرف ہدایت دیتی ہے، شرعی طور پر بھی اور کونی طور پر بھی، اس کا اتباع کیا جانا چاہیے، یا وہ شرکاء جو اللہ تعالیٰ کی "کونی" ہدایت کے بغیر خود اپنا راستہ معلوم نہیں کر سکتے، جنھیں کھانا، پینا، چلنا، دیکھنا سب کچھ اللہ تعالیٰ نے سکھایا، وہ خود کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ رازی نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اکثر اپنی توحید کے اثبات کے لیے خلق کے ساتھ ہدایت کو بھی ذکر فرمایا ہے، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کا قول: ﴿ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴾ [ الشعراء : ۷۸ ] "وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہ مجھے راستہ دکھاتا ہے۔" اور موسیٰ علیہ السلام کا قول: ﴿ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۵۰ ] "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راستہ دکھایا۔" اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴾ [ الأعلٰی : ۱ تا ۳ ] "اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے۔ وہ جس نے پیدا کیا، پھر درست بنایا۔ اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر راستہ دکھایا۔"

❷ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ : یہ دو جملے ہیں ڈانٹنے کے لیے اور حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے، دو طرح سے سوال کیا، ایک یہ کہ تمھیں کیا ہو گیا؟ دوسرا یہ کہ تم کیسے فیصلہ کرتے ہو؟

وَ مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور ان کے اکثر پیروی نہیں کرتے مگر ایک گمان کی، بے شک گمان حق کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں ﴿۳۶﴾

آیت 36 ① وَ مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ...... : ظن کا لفظ اگرچہ بعض اوقات یقین پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ ﴾ [ البقرۃ : ۴۶ ] ”وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔“ بعض اوقات غالب گمان کے معنی میں بھی آتا ہے، جو صحیح گمان ہو، اگرچہ اس میں خطا کا بھی نہایت کمزور سا احتمال ہو۔ جہاں یہ معانی مراد ہوں وہاں اس کا قرینہ اور دلیل بھی موجود ہوتی ہے۔ اس معنی میں ظن پر دنیا کے تمام معاملات چل رہے ہیں، جب تک کسی دلیل سے اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو اس پر عمل واجب ہوتا ہے۔ خط، ٹیلی فون، پیغام کے ذریعے سے پہنچنے والی تمام خبریں ظنی ہوتی ہیں، کیونکہ ان میں غلطی یا جعل سازی کا کمزور سا احتمال موجود ہوتا ہے، مگر سب لوگ ان پر عمل کرتے، ان کے ذریعے کاروبار کرتے ہیں اور شرعی احکام پر بھی عمل کرتے ہیں، خطا کے احتمال کی پروا نہیں کرتے۔ خبر واحد یا حدیث کو بعض لوگ جو ظنی کہتے ہیں وہ اسی معنی میں ہے، اگرچہ فی نفسہ یہ بات درست نہیں کہ احادیث رسول ﷺ ظنی ہیں، بلکہ صحیح احادیث رسول ﷺ قطعی اور یقینی ہیں، خصوصاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام احادیث اور دوسری کتب کی سنداً صحیح احادیث سب یقینی اور قطعی ہیں اور ان پر عمل واجب ہے۔ البتہ عام طور پر ظن کا جو معنی مراد لیا جاتا ہے وہ ہے ایسا وہم و گمان اور خیال جس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ قرآن و حدیث میں یہ لفظ اکثر اسی مذموم معنی کے لیے استعمال ہوا ہے اور ایسے استعمال کے موقع پر اس کی مذمت کا قرینہ بھی موجود ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ » [ بخاري، النكاح، باب لا يخطب على خطبة أخيه ...... : ۵۱۴۳ ] ”(ظن) گمان سے بچو، کیونکہ ظن (گمان) سب سے جھوٹی بات ہے۔“ اس ظن سے وہ بے بنیاد بات مراد ہے جو محض کسی کی تقلید یا وہم و خیال پر مبنی ہو اور اس کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ مشرکین کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ محض ظن، یعنی بے بنیاد وہم و خیال کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ دلیل، جیسا کہ لات، عزیٰ اور منات کے پجاریوں کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ﴾ [ النجم : ۲۳ ] ”یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں۔“ اور فرشتوں کا نام عورتوں والا رکھنے والے مشرکوں کے متعلق فرمایا، جو فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے: ﴿ وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾ [ النجم : ۲۸ ] ”حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور بے شک گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا۔“ یہاں بھی ظن کا یہی معنی ہے، کیونکہ یہ حق کے مقابلے میں آیا ہے اور صاف واضح ہے کہ اللہ کا شریک بنانے والے علم سے بالکل کورے اور کسی بھی عقلی یا نقلی دلیل سے بالکل خالی ہاتھ ہیں اور ایسے وہم و گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتے۔ اسی

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور یہ قرآن ہرگز ایسا نہیں کہ اللہ کے غیر سے گھڑ لیا جائے اور لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور رب العالمین کی طرف سے کتاب کی تفصیل ہے، جس میں کوئی شک نہیں ﴿۳۷﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے؟ کہہ دے تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۳۸﴾

مفہوم کی تائید کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۶۶) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی جو لوگ پکارتے ہیں حقیقت میں کوئی ایسا شریک ہے ہی نہیں جسے وہ پکارتے ہوں، بلکہ محض اپنے دماغ کے بنائے ہوئے خیالی خاکوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

❷ یہاں ایک سوال ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے اکثر محض گمان کی پیروی کرتے ہیں، جب کہ حقیقت میں تمام مشرکین محض گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، تو مفسرین نے اسے دو طرح سے حل کیا ہے، ایک تو یہ کہ اکثر سے مراد وہ سب کے سب ہیں اور ایسا کلام عرب میں اکثر ہوتا ہے کہ اکثر بول کر سب مراد لیے جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کے اکثر کا تو یہی حال ہے کہ وہ نہ کچھ جانتے ہیں نہ عقل رکھتے ہیں، مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کے واحد معبود ہونے کو جانتے ہیں، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے نبی ﷺ پر ایمان نہیں لاتے اور شرک پر اڑے ہوئے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۲] ”پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تم جانتے ہو (کہ اس کا کوئی شریک نہیں)۔“

❸ اِلَّا ظَنًّا: ظن کو نکرہ رکھا ہے کہ ان کے اکثر ایک نہ ایک گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، کسی کا کسی کے متعلق کچھ گمان ہے، کسی کا کسی دوسرے کے متعلق اور ہی گمان ہے۔ اپنے شرکاء کی تعیین اور ان کے اختیارات کے تعین پر بھی ان کا اتفاق نہیں، ہر ایک کا اپنا ایک الگ ہی گمان ہے۔

❹ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانا ہے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ یقیناً اسے خوب جانتا ہے، وہ خود ہی ان سے نمٹ لے گا۔

**آیت 38،37** وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ...... : اللہ تعالیٰ کی توحید ثابت کرنے اور شرک کی تردید کرنے کے بعد قرآن مجید کی حقانیت کا بیان فرمایا کہ یہ ہرگز ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اپنے پاس سے بنا لائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ایسے شخص پر نازل فرمایا جو نہ لکھنا جانتا تھا نہ پڑھنا، تصنیف تو بہت دور کی بات ہے۔ تم بھی اہل زبان ہو، بڑے بڑے شاعر و ادیب اور فصاحت و بلاغت رکھنے والے مصنف ہو، اگر یقین نہ ہو کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور تمھیں اصرار ہو کہ یہ

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

بلکہ انھوں نے اس چیز کو جھٹلا دیا جس کے علم کا انھوں نے احاطہ نہیں کیا، حالانکہ اس کی اصل حقیقت ابھی ان کے پاس نہیں آئی تھی۔ اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔ سو دیکھ ظالموں کا انجام کیسا ہوا ﴿۳۹﴾

انسانی کلام ہے تو تم تمام جن وانس ایک دوسرے کی مدد کر کے اس جیسی کتاب تصنیف کر کے دکھا دو۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۸۸) پھر یہ نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے دس سورتوں کا چیلنج کیا۔ دیکھیے سورۂ ہود (۱۳) جب یہ بھی نہ کر سکے تو یہاں سورۂ یونس مکی میں اس کی مثل ایک سورت لانے کا چیلنج کیا، پھر مدینہ میں یہی چیلنج سورۂ بقرہ (۲۳) میں دوبارہ دہرایا۔ قارئین یہ سب مقامات ملاحظہ فرمالیں، آج تک کوئی مشرک کافر سورۃ الکوثر کے برابر تین آیتوں کی سورت بھی نہیں لا سکا، جسے کسی اہل زبان یا صاحب عقل نے تسلیم کیا ہو۔ ”وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ“ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا وصف بیان فرمایا کہ یہ پہلی تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور رب العالمین کی طرف سے انسان کے لیے تمام ضروری عقائد و اعمال کی تفصیل پر مشتمل کتاب ہے۔

**آیت 39** ❶ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ : یعنی یہ لوگ جو قرآن کو جھٹلا رہے ہیں اور اس پر ایمان نہیں لا رہے، ان کے جھٹلانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے نہ اسے پوری طرح جانا اور نہ اس کے مطالب و مضامین سمجھنے کی کوشش کی، ان کی بنیاد جہالت، ہٹ دھرمی اور باپ دادا کی اندھی تقلید پر ہے، انھوں نے محض یہ دیکھ کر کہ قرآن ان کے موروثی عقائد و خیالات کی تردید کرتا ہے، جھٹ سے اس کا انکار کر دیا، ورنہ قرآن کا ایسے حقائق کے بیان پر مشتمل ہونا جو ان کے فہم سے بالاتر ہیں اور جن کی تہ تک یہ نہیں پہنچ سکتے کسی طرح بھی جھٹلانے کی وجہ نہیں بن سکتا۔ قصور ان کے فہم کا ہے قرآن کا نہیں۔ (روح المعانی، کبیر) یہی حال ان حضرات کا بھی ہے جو محض اپنے بزرگوں اور اماموں کی تقلید کے چکر میں پھنس کر صحیح حدیث سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ ان صحیح احادیث پر غور کرتے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرتے تو کبھی صحیح حدیث کو رد نہیں کر سکتے تھے۔

❷ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ : یعنی ان کے قرآن کو جھٹلانے کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ یہ کہ وہ اس کی تاویل و تفسیر سمجھنے سے قاصر ہیں اور قرآن جن غیبی چیزوں پر مشتمل ہے ان کا وقوع ان کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، ورنہ اگر وہ غور و فکر کرتے اور جن امور کی پیش گوئی قرآن مجید میں کی گئی ہے ان کے واقع ہونے کا انتظار کرتے تو ان کا انکار از خود ہی زائل ہو جاتا۔ (روح المعانی)

”وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ“ کے متعلق شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یعنی جو وعدہ ہے اس قرآن میں وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا۔“ (موضح)

❸ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ : یعنی وہ ظالم سب کے سب برباد ہو گئے، فرمایا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور تیرا رب فساد کرنے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿۴۰﴾ اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو ﴿۴۱﴾

اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ [ العنکبوت : ۴۰ ] ”تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔“ اسی طرح اب یہ بھی اپنی تباہی و بربادی کا سامان کر رہے ہیں۔

آیت 40 ① وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ : یعنی ان کفار میں دو طرح کے لوگ ہیں، بعض ایسے ہیں جنھیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس جیسی معجز تصنیف کر لینا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، مگر وہ ہٹ دھرمی سے اسے جھٹلائے جا رہے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بالکل عقل کے اندھے اور سمجھ کے کورے ہیں، انھیں اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا واقعی یقین نہیں ہے۔ اس آیت کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لے آئیں گے اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ کفر پر قائم رہیں گے۔ یہ مطلب بھی درست ہے۔

② وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ : جو خواہ مخواہ تعصب اور ہٹ دھرمی سے قرآن کے برحق ہونے سے انکار کیے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ اپنے دل میں اس کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہیں، یا تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ان میں سے کفر پر اڑا رہے گا اور کون اس کفر سے باز آ جائے گا۔ گویا مفسدین کا معنی ہے مسلمان نہ ہونے والے۔

آیت 41 وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ...... : یعنی اگر وہ حجت پوری ہونے کے بعد بھی جھٹلانے پر اصرار کریں تو انھیں صاف کہہ دیں کہ مجھ پر قرآن اور اللہ کے احکام پہنچانے کا جو فریضہ عائد کیا گیا تھا، میں نے اسے کسی کمی یا زیادتی کے بغیر ادا کر دیا ہے، اگر تم اس پر ایمان لانے سے انکار کرو تو تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو گے، مجھ پر اس کا کوئی بوجھ نہیں ہو گا۔ اس مفہوم کی چند مزید آیات کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۳۹)، آل عمران (۲۰)، شوریٰ (۱۵) اور سورۃ الکافرون مکمل۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡكَ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَ لَوۡ كَانُوۡا لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡظُرُ اِلَیۡكَ ؕ اَفَاَنۡتَ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَ لَوۡ كَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تو بہروں کو سنائے گا، اگرچہ وہ نہ سمجھتے ہوں ﴿۴۲﴾ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تو اندھوں کو راستہ دکھائے گا، اگرچہ وہ بصیرت نہ رکھتے ہوں ﴿۴۳﴾ بے شک اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا اور لیکن لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں ﴿۴۴﴾

**آیت 43، 42** وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡكَ ...... : پچھلی آیت (۴۰) کی ایک تفسیر کے مطابق کفار کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو قرآن کے حق ہونے پر یقین رکھتے ہیں، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے اسے جھٹلا رہے ہیں اور ایک وہ جو عقل کے اندھے ہیں، جنھیں قرآن کے حق ہونے کا یقین ہی نہیں۔ دوسری تفسیر کے مطابق کچھ وہ کفار ہیں جو آئندہ ایمان لے آئیں گے، کچھ وہ جن کی قسمت میں یہ نعمت نہیں ہے۔ اس آیت میں کفار کی اس دوسری قسم کا ذکر ہے جن کی قسمت میں ایمان نہیں اور جنھوں نے ہر حال میں کفر پر اڑے رہنا ہے۔ فرمایا کہ ان میں سے کچھ لوگ آپ کی بات اور قرآن کی قراءت پر کان لگاتے ہیں مگر فائدہ نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ حق سننے سے ان کے کان بہرے ہیں، پھر بہرے بھی اگر عقل رکھتے ہیں تو بات سمجھ جاتے ہیں مگر جو بہرے بھی ہوں اور عقل سے بھی خالی ہوں، آپ اپنی بات ان تک کیسے پہنچا سکتے ہیں۔ ”اَلصُّمَّ“ جمع ہے ”اَصَمُّ“ کی، یعنی بہرے۔ اسی طرح کچھ لوگ آپ کی طرف دیکھتے ہیں، اگر کوئی عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسا سعادت مند ہو تو چہرہ دیکھ کر ہی پہچان لیتا ہے کہ یہ جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ [ ترمذی : ۲٤۸٥ ۔ ابن ماجه : ۱۳۳٤ ] مگر جو جان بوجھ کر اندھا بن جائے اور دل کا بھی اندھا ہو، کیا آپ اسے راہ راست پر لا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ”اَفَاَنۡتَ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ“ میں ”الۡعُمۡیَ“ ”اَعۡمٰی“ کی جمع ہے، مراد آنکھوں کا اندھا ہونا اور ”لَا یُبۡصِرُوۡنَ“ میں مراد بصارت نہیں بلکہ بصیرت کا نہ ہونا ہے، تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔ ایسے لوگوں کو اندھے و بہرے کے علاوہ مردہ بھی کہا گیا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی ﴾ [ النمل : ۸۰ ] ”بے شک تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔“ مقصد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ ایسے لوگوں کے ایمان نہ لانے سے آپ پریشان خاطر یا دل برداشتہ نہ ہوں۔

**آیت 44** اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡـًٔا ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسرے انسانوں کی طرح پورے حواس دیے ہیں، پھر یہ ضد اور ہٹ دھرمی سے ایمان نہ لائیں تو ان کا اپنا قصور ہے، اللہ کی طرف سے ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ مزید دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۰)۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور جس دن وہ انھیں اکٹھا کرے گا، گویا وہ نہیں ٹھہرے مگر دن کی ایک گھڑی، آپس میں جان پہچان کرتے رہے۔ بے شک وہ لوگ خسارے میں رہے جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ راہ پانے والے نہ ہوئے ﴿۴۵﴾

**آیت 45** ① وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا ......: "سَاعَةً" ایک گھڑی، عرب نہایت کم مدت کے لیے یہ لفظ بولتے ہیں۔ قیامت بھی چونکہ ایک لمحے میں قائم ہو جائے گی، اس لیے اس پر بھی "اَلسَّاعَةُ" کا لفظ بولا جاتا ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ ان حق سے اندھے اور بہرے لوگوں کو حساب کے لیے اکٹھا کرے گا تو انھیں دنیا میں گزری ہوئی راحت ولذت والی لمبی مدت اور طویل ماہ وسال ایک گھڑی محسوس ہوں گے اور انھیں وہ سب لذتیں بھول جائیں گی، جیسا کہ سورۂ احقاف (۳۵) اور سورۂ روم (۵۵) میں ہے کہ مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک ساعت (لمحے) کے سوا دنیا میں نہیں رہے۔

② سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ: دن کی گھڑی چونکہ رات کی بہ نسبت زیادہ یاد رہتی ہے، اس لیے "مِنَ النَّهَارِ" فرمایا۔

③ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ: اس کی دو تفسیریں ہیں، ایک تو یہ کہ دنیا میں ان کی وہ گھڑی بھی ایک دوسرے کی جان پہچان کرتے گزر گئی اور دوسری یہ کہ قیامت کے دن وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور آپس میں ایک دوسرے کو گمراہ کرنے پر ملامت اور گلے شکوے کریں گے۔

④ قرآن مجید کی بعض آیات میں ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم تو محض ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دنیا میں رہے ہیں، جیسا کہ سورۂ مومنون (۱۱۲، ۱۱۳) میں ہے، یا یہ کہ ہم ایک سہ پہر یا دو پہر وہاں رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ نازعات (۴۶) یا یہ کہ ہم تو صرف دس راتیں وہاں رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۰۳) اب ایک گھڑی رہنے اور ان آیات میں کیا تطبیق ہوگی، جواب یہ ہے کہ مجرموں کے درجات اور احوال مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے اندازے بھی مختلف ہوں گے۔ اسی طرح قیامت کا دن پچاس ہزار سال کی انتہائی لمبی مدت کا دن ہے (دیکھیے معارج: ۴) جس میں مجرموں پر مختلف احوال گزریں گے، اس میں ہونے والی ان کی باہمی بحثوں کا نتیجہ وہ کبھی کچھ نکالیں گے اور کبھی کچھ نکالیں گے۔ یہ بھی ان کی بدحالی کا ایک اظہار ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ا۟لْقَوْلَ﴾ [سبا: ۳۱] "اور کاش! تو دیکھے جب یہ ظالم اپنے رب کے پاس کھڑے کیے ہوئے ہوں گے، ان میں سے ایک دوسرے کی بات رد کر رہا ہوگا۔"

⑤ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا ......: اللہ کی ملاقات جھٹلانے کا مطلب قیامت اور حساب کتاب کا انکار ہے اور خسارا یہ کہ دنیا میں بھی حیوانوں کی سی بے اصولی زندگی بسر کی اور آخرت میں بھی جہنم کا ایندھن بنے۔

وَ اِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور اگر کبھی ہم تجھے اس کا کچھ حصہ واقعی دکھلا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا تجھے اٹھا ہی لیں تو ہماری ہی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے، پھر اللہ اس پر اچھی طرح گواہ ہے جو وہ کر رہے ہیں ﴿۴۶﴾ اور ہر امت کے لیے ایک پیغام پہنچانے والا ہے، تو جب ان کا پیغام پہنچانے والا آتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جاتے ﴿۴۷﴾

آیت 46 ❶ وَ اِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ...... : یعنی اسلام کے غلبے اور مخالفین کی ذلت وخواری، یعنی قتل و قید اور شکست کے جو وعدے ہم ان کفار سے وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، اگر ہم ان میں سے بعض آپ کی زندگی ہی میں پورے کر کے آپ کو دکھلا دیں، یا ان میں سے بعض کے پورا کرنے سے پہلے ہی آپ کو اٹھا لیں، دونوں حالتوں میں انھیں ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس پر اچھی طرح گواہ ہے جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں۔ وہاں وہ ان کا انجام آپ کو دکھا دے گا۔ " شَاهِدٌ " کا معنی گواہ اور " شَهِیْدٌ " میں مبالغہ ہے۔

❷ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کچھ وعدے آپ کی زندگی میں پورے کر دکھائے، مثلاً اہل مکہ پر قحط، بھوک اور خوف کا مسلط ہونا۔ دیکھیے نحل (۱۱۲) اس قحط کی وجہ سے ان کا ہڈیاں تک کھا جانا اور زمین و آسمان کے درمیان انھیں ہر طرف دھواں نظر آنا۔ دیکھیے دخان (۱۰، ۱۱) حتیٰ کہ اس وقت کفار کے سردار ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ سے آ کر یوں بارش کی دعا کی درخواست کی: ((أَيْ مُحَمَّدُ إِنَّ قَوْمَكَ قَدْ هَلَكُوْا، فَادْعُ اللّٰهَ أَنْ يَّكْشِفَ عَنْهُمْ، فَدَعَا)) [ بخاري، التفسير، باب ﴿ثم تولوا......﴾ : ٤٨٢٤ ] " اے محمد! بے شک تیری قوم کے لوگ ہلاک ہو گئے، پس آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان سے (اس مصیبت کو) دور کر دے تو آپ نے دعا کی۔" پھر بدر، احد، خندق، حدیبیہ اور آخر میں فتح مکہ و خیبر اور پورے جزیرۂ عرب کا آپ کی زندگی میں حلقہ بگوش اسلام ہونا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آپ کی زندگی میں دکھا دیا اور کچھ وعدے آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلفاء کے زمانے میں پورے ہوئے۔ بہرحال آپ کے سچا ہونے میں کوئی شک نہ رہا۔ موضح القرآن میں ہے: " غلبۂ اسلام کچھ آپ ﷺ کے روبرو ہوا اور باقی آپ کے خلیفوں سے۔" شاید " اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ " میں دوسرے دور کی طرف اشارہ ہے۔

آیت 47 وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ...... : اس کی دو تفسیریں ہیں، ایک وہ جو اس آیت کا مفہوم ہے: ﴿ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ١٥ ] " اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔" یعنی دنیا میں ہر قوم کی طرف کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجا جاتا ہے، پھر اس کی نافرمانی اور فرماں برداری کو مدنظر رکھ کر جزا و سزا کا

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو ﴿۴۸﴾ کہہ دے میں اپنی ذات کے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں اور نہ کسی نفع کا، مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، جب ان کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں ﴿۴۹﴾

فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ بے گناہ کو سزا نہیں ہوتی اور نہ حجت تمام کیے بغیر ان کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''عمل بد آگے سے ہوتے ہیں لیکن رسول پہنچ کر سزا ملتی ہے۔'' (موضح) پہلی امتوں میں چونکہ دنیا کے لوگوں کا ایک دوسرے سے رابطہ نہ تھا، اس لیے ہر امت کے لیے الگ الگ رسول مبعوث ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے وقت دنیا کے تمام ممالک کے درمیان روابط پیدا ہو چکے تھے اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ تمام دنیا ایک آبادی کی طرح بن جانے والی ہے، اس لیے خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا۔ اب آپ پر ایمان لانا یا نہ لانا قیامت کے دن جنت یا دوزخ میں جانے کا سبب ہوگا۔ دوسرا مفہوم آیت کا یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر امت کے سامنے اس کا رسول بطور شاہد پیش ہوگا کہ میں نے اس امت کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا، پھر وہ سب لوگ بھی جنھوں نے دوسروں تک پیغام حق پہنچایا بطور گواہ پیش ہوں گے، پھر ان کی شہادت کی روشنی میں انصاف کے ساتھ فیصلہ ہوگا۔ یہی بات ان آیات میں کہی گئی ہے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ [ النساء : ۴۱ ] ''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔'' اور فرمایا: ﴿وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [ الزمر : ۶۹ ] ''اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ روشن ہو جائے گی اور لکھا ہوا (سامنے) رکھا جائے گا اور نبی اور گواہ لائے جائیں گے اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

**آیت 48** ﴿وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ ......﴾: جب مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنے اور ان کا محاسبہ کرنے کے خلاف کفار کے پاس کوئی دلیل نہ رہ جاتی تو ان کا آخری تیر یہ تھا کہ لاؤ وہ قیامت، وہ عذاب لاتے کیوں نہیں، یہ وعدہ جو تم کرتے ہو کب پورا ہوگا؟ اس کا جواب تو واضح ہے کہ جب معلوم ہو کہ امتحان ہونا یقینی ہے، پھر آدمی محض اس لیے تیاری نہ کرے یا اس کا انکار کرے کہ اس کی تاریخ بتاؤ، ڈیٹ شیٹ کیا ہے، تو ایسے آدمی کی بے عقلی میں کیا شبہ ہے۔ مگر ان کے اصرار پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جواب دینے کے لیے کہا جو اگلی آیت میں ہے۔

**آیت 49** ① ﴿قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾: یعنی یہ تعیین میرے اختیار میں نہیں، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تم پر اس کا عذاب رات کو، یا دن کو آجائے تو مجرم اس میں سے کون سی چیز جلدی طلب کریں گے ﴿۵۰﴾

کے ہاتھ میں ہے۔ ہر امت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ آجائے گا پھر ایک لمحے کا آگا پیچھا نہیں ہوگا۔
② قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ...... : یعنی تمھاری موت کا وقت یا عذاب آنے کا وقت سب اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت اور مرضی پر موقوف ہے، جب چاہے گا تم پر عذاب بھیجے گا اور جب تک نہیں چاہے گا نہیں بھیجے گا۔ رہا تمھارا مجھ سے اصرار تو میں تمھیں کیا بتاؤں، میں تو خود اپنی ذات کے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں اور نہ کسی نفع کا، مگر جو اللہ چاہے، میرے اختیار میں ہوتا تو تم پر کبھی کا عذاب آچکا ہوتا۔ دیکھیے سورۂ انعام (۵۷، ۵۸) قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان لوگوں کو سخت تنبیہ ہے جو مصیبتوں اور مشکل کی گھڑیوں میں، جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا، نبی ﷺ کو پکارتے ہیں اور آپ ﷺ سے مدد طلب کرتے ہیں، یا نبی ﷺ سے ایسی چیزیں چاہتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ یہ مقام صرف رب العالمین کا ہے جس نے تمام انبیاء، صالحین اور مخلوقات کو پیدا فرمایا، وہی انھیں روزی اور زندگی بخشتا ہے اور جب چاہتا ہے اس دنیا سے اٹھا لیتا ہے، پھر کسی نبی یا فرشتے یا کسی نیک سے نیک بندے سے کسی ایسی چیز کی درخواست کیونکر کی جا سکتی ہے جس پر اسے قدرت ہی حاصل نہیں؟ اس آیت میں نصیحت کا خاص پہلو یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے بارے میں جو تمام بنی آدم کے سردار اور تمام انبیاء سے افضل ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کسی نقصان یا نفع کا مالک نہ ہونے کی صراحت فرما دی ہے تو کوئی ولی یا امام یا پیر اپنے یا کسی دوسرے کے نفع نقصان کا مالک کیونکر ہو سکتا ہے؟ سخت تعجب کا مقام ہے کہ پھر بھی کچھ لوگ، جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں، مردوں کی قبروں پر جھکتے اور ان سے ایسی ایسی مرادیں طلب کرتے ہیں جنھیں پورا کرنے کی قدرت اللہ کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ یہ صریحاً شرک اور کلمہ " لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ " کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے اور اس سے بڑھ کر افسوس ان کے علماء و مشائخ پر ہے جو انھیں اس کام سے منع نہیں کرتے۔ یہ وہی جاہلیت ہے جو نبی ﷺ سے پہلے عربوں میں پائی جاتی تھی، بلکہ اس کا معاملہ اس جاہلیت سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ عرب مشرکین نفع نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھتے تھے اور بتوں کو صرف اپنا سفارشی خیال کرتے تھے، مگر یہ لوگ تو قبروں والوں کو نفع نقصان کا مالک سمجھتے ہیں اور کبھی ان کو علیحدہ اور کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اس امت میں کتنے ہی لوگ ہیں جنھیں شیطان مردود نے اس ذریعے سے کفر کی راہ پر ڈال دیا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہوئے اس پر آگے سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں کہ ﴿ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴾ [ الکھف : ۱۰۴ ] " وہ بڑا نیک کام کر رہے ہیں۔" [ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ] اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت فرمائے۔ آمین! (مختصر از شوکانی)

آیت 50 قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ ......: " اَرَءَيْتُمْ " کا لفظی معنی تو یہی ہے کہ " کیا تم نے دیکھا " مگر اہل عرب اس سے مراد " اَخْبِرُوْنِیْ " لیتے ہیں، یعنی اگر تم نے دیکھا ہے تو بتاؤ۔ " بَيَاتًا " یعنی رات کو، گھر کو " بَيْتٌ " اسی لیے کہتے ہیں کہ

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۵۱ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۵۲ وَ يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۵۳

کیا پھر جوں ہی وہ (عذاب) آپڑے گا تو اس پر ایمان لاؤ گے؟ کیا اب! حالانکہ یقیناً تم اسی کو جلدی طلب کیا کرتے تھے ۝۵۱ پھر ان لوگوں سے جنھوں نے ظلم کیا، کہا جائے گا چکھو ہمیشگی کا عذاب، تمھیں بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اسی کا جو تم کمایا کرتے تھے ۝۵۲ اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟ تو کہہ ہاں! مجھے اپنے رب کی قسم! یقیناً یہ ضرور سچ ہے اور تم ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہو ۝۵۳

آدمی وہاں رات گزارتا ہے۔ یہ ان کے سوال "مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ" کا دوسرا جواب ہے، یعنی اگر بالفرض عذاب رات سوتے ہوئے یا دن کی مصروفیت میں یک لخت آ گیا تو وہ کون سی میٹھی اور خوش گوار چیز ہے کہ مجرم جلد از جلد اس کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ تو نہایت تلخ اور ناقابل برداشت چیز ہے، اس کے آنے کے بعد ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہو سکے گا اور آخرت میں دائمی عذاب سامنے ہے، پس جب حالت یہ ہے تو اس کے آنے کی کیوں جلدی مچا رہے ہیں۔

**آیت 51** اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ...... : یعنی کیا جوں ہی وہ عذاب آ گیا تو فوراً ایمان لے آؤ گے؟ ہاں، بے شک اس وقت ایمان لے آؤ گے مگر عذاب آنے پر ایمان کب قبول ہوگا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۸۴، ۸۵)، یونس (۹۰، ۹۱) اور نساء (۱۸) اس لیے تمھارا پہلے ایمان لانے کے بجائے پہلے عذاب کی جلدی مچانا بے کار ہے۔

**آیت 52** ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا...... : یہ بات عذاب آنے پر انھیں مزید ڈانٹنے اور ذلیل کرنے کے لیے کہی جائے گی۔

**آیت 51** ① وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ...... : "نَبَأٌ" بہت بڑی اہمیت والی خبر کو کہتے ہیں۔ (راغب) "يَسْتَنْبِئُوْنَ" "نَبَأٌ" کے باب استفعال سے طلب کے لیے ہے۔ جب کفار کو ان کے سوال "مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ" کا مذکورہ جواب دیا گیا تو انھوں نے اسی سلسلہ میں آپ ﷺ سے دوبارہ سوال کیا "اَحَقٌّ هُوَ" کیا یہ سچ ہی ہے، یا محض ہمیں ڈرایا جا رہا ہے؟ چونکہ کفار اپنے قیامت کے انکار اور قرآن کے اس کے قیام پر واضح دلائل کی وجہ سے سخت قلق اور پریشانی کا شکار تھے کہ اسے مانیں یا نہ مانیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یقین دلانے کے لیے تاکید کے کئی الفاظ جمع کر کے فرمایا "قُلْ" آپ ان سے کہہ دیجیے: ﴿اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ﴾ "اِيْ" کا معنی "نَعَمْ" یعنی ہاں ہے، مگر یہ ہمیشہ قسم کے ساتھ آتا ہے، پھر "اِنَّ" تاکید کا ہے، پھر لام تاکید ہے کہ ہاں، مجھے اپنے رب کی قسم ہے! یقیناً یہ ضرور حق ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، قرآن مجید میں اس جیسی صرف دو اور آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے منکروں کو قسم کھا کر کہنے کا حکم دیا، پہلی آیت: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ﴾ [ سبا : ۳ ] دوسری آیت: ﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ

وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور اگر ہر شخص کے لیے جس نے ظلم کیا ہے، وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اسے ضرور فدیے میں دے دے اور وہ پشیمانی کو چھپائیں گے، جب عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے ﴿۵۴﴾ سن لو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ سن لو! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۵۵﴾

لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ﴾ [ التغابن : ۷ ]

② وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ : ''باء'' کی وجہ سے نفی کی تاکید کے لیے ترجمہ ''ہرگز'' کیا گیا ہے، یعنی نہ تم ہمارے عذاب سے بھاگ کر کہیں جا سکتے ہو کہ ہمیں پکڑنے سے عاجز کر دو اور نہ کسی طرح اسے روک سکتے ہو۔

آیت 54 ① وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ : یعنی جس عذاب کا وہ ساری عمر مذاق اڑاتے رہے جب وہ ان کی توقع کے بالکل خلاف یکا یک سامنے آ جائے گا تو ان کی عجیب کیفیت ہوگی، ایک طرف وہ سخت شرمندہ ہوں گے اور ان کے ضمیر انھیں کوس رہے ہوں گے، لیکن دوسری طرف وہ اپنی شرمندگی کو اپنے ساتھیوں اور ماننے والوں سے چھپانا بھی چاہیں گے کہ کہیں وہ ملامت نہ کریں، اس لیے دل ہی دل میں شرمندہ ہوں گے اور بظاہر مطمئن بننے کی کوشش کریں گے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ '' اَسَرَّهٗ '' اضداد میں سے ہے، اس کا معنی چھپانا بھی ہے اور ظاہر کرنا بھی۔ دوسرا معنی یہ بنے گا کہ وہ عذاب دیکھیں گے تو ندامت کا اظہار کریں گے۔

② وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ : یعنی یہ عذاب ان کے اعمال ہی کا نتیجہ ہوگا، اس لیے وہ عین انصاف ہوگا اور ان پر کسی طرح ظلم نہیں ہوگا۔

آیت 55 اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... : ''اَلَاۤ'' حرف تنبیہ ہے، یعنی آگاہ ہو جاؤ! خبردار ہو جاؤ! سن لو! پچھلی آیت میں ذکر تھا کہ ہر شخص جس نے ظلم کیا ہے، اگر آسمان و زمین میں موجود سب کچھ اس کی ملکیت ہو تو اس دن جان چھڑانے کے لیے ضرور ہی بطور فدیہ دے دے گا۔ ''لَوْ'' (اگر) ناممکن چیز کے لیے ہوتا ہے، اس لیے یہاں فرمایا کہ کان کھول کر سن لو کہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے، وہ ظالم فدیہ لائے گا کہاں سے۔ دوبارہ ''اَلَاۤ'' (سن لو) کہہ کر فرمایا کہ یقیناً قیامت قائم ہونے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ بالکل برحق ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ '' اَكْثَرَهُمْ '' کے ساتھ اہل ایمان کو منکرین قیامت سے مستثنیٰ فرمایا، اس اشارے کے ساتھ کہ وہ تعداد میں دوسروں سے کم ہیں۔ زمین و آسمان کی ملکیت میں کسی دوسرے کا حصہ کتنا ہے، دیکھیے سورۂ سبا (۲۲) اور فاطر (۱۳)۔

هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

وہی زندگی بخشا اور موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۵۶﴾ اے لوگو! بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے عظیم نصیحت اور اس کے لیے سراسر شفا جو سینوں میں ہے اور ایمان والوں کے لیے سراسر ہدایت اور رحمت آئی ہے ﴿۵۷﴾

**آیت 56** هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ...... : یعنی زمین و آسمان کی ملکیت ہی نہیں، زندگی بخشا اور موت دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے اور تمھیں دوبارہ زندہ ہو کر اسی کے پاس جانا ہے۔

**آیت 57** يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ ...... : یہاں سے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے قرآن مجید کی برکات اور خوبیاں بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ بنیادی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے تمھارے پاس آئی ہے، اب دنیا کی کسی اور کتاب کو یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کی چار صفات بیان فرمائیں، پہلی یہ کہ یہ ''مَوْعِظَةٌ'' ہے، تنوین تعظیم کی وجہ سے ''عظیم نصیحت'' ترجمہ کیا ہے۔ خلیل نے فرمایا کہ اس کا معنی نیکی کی نصیحت ہے جس سے دل نرم ہو جائے۔ (مفردات) راغب نے خود اس کا معنی کیا ہے کہ کسی کام سے منع کرنا، جس کے ساتھ ڈرانا بھی شامل ہو، گویا یہ کتاب موعظت نرمی و سختی ہر طرح سے سمجھا کر انسان کی اصلاح کرتی ہے۔ دوسری صفت ہے ''وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ'' یعنی یہ کتاب دلوں میں جو کفر و نفاق، حسد و ریا اور برے اخلاق کی بیماریاں پائی جاتی ہیں ان کے لیے سراسر تندرستی کا باعث ہے۔ بعض لوگوں نے ان آیات سے یہ بات اخذ کی ہے کہ قرآن مجید جسمانی بیماریوں کا بھی علاج ہے، جیسا کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے سے سانپ کا ڈسا ہوا تندرست ہو گیا اور انھوں نے اس پر تیس بکریاں لیں۔ [ بخاري، الإجارة، باب ما يعطى في الرقية على أحياء العرب ...... : ۲۲۷۶ ] اور خارجہ بن صلت رضی اللہ عنہ کے چچا نے بیڑیوں میں جکڑے ہوئے پاگل آدمی کو سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا اور ان لوگوں نے انھیں ایک سو بکریاں دیں۔ [ أبو داوٗد، الطب، باب كيف الرقى : ۳۸۹۶ و صححه الألباني ] اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ سورۂ فاتحہ اور دوسری آیات پڑھ کر دم کرنے سے اللہ تعالیٰ چاہے تو شفا ہوتی ہے اور صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ کافروں پر دم کریں تو انھیں بھی ہوتی ہے، مگر ان آیات کا یہ مطلب نہیں بلکہ ان سے مراد روحانی بیماریاں کفر و شرک، نفاق اور حسد و بغض وغیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [ بنی إسرائيل : ۸۲ ] ''اور ہم قرآن میں سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے کے سوا کسی چیز میں زیادہ نہیں کرتا۔'' اور فرمایا: ''اور رہے وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو اس (سورت) نے ان کو ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی میں زیادہ کر دیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ کافر تھے۔'' [ التوبة : ۱۲۵ ] اور فرمایا: ''کہہ دے یہ (قرآن) ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے

﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸ ﴾

کہہ دے (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت ہی سے ہے، سو اسی کے ساتھ پھر لازم ہے کہ وہ خوش ہوں۔ یہ اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ۵۸

ہدایت اور شفا ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ ان کے حق میں اندھا ہونے کا باعث ہے۔" [ حٰم السجدۃ : ٤٤ ] یعنی کفار کو اس سے سینے کی بیماریوں سے شفا نہیں ہوتی۔ تیسری صفت "هُدًى" نرمی اور مہربانی کے ساتھ راستہ بتانا۔ (مفردات) چوتھی صفت "رَحْمَةٌ" ہے، اس کا معنی ہر شخص سمجھتا ہے۔ یہاں چاروں صفات "مَوْعِظَةٌ ، شِفَآءٌ ، هُدًى ، رَحْمَةٌ" مبالغہ کے لیے مصدر کے لفظ کے ساتھ آئی ہیں، مراد ان سے اسم فاعل کا مفہوم ہے، جیسے کہتے ہیں "زَيْدٌ عَدْلٌ" زید انصاف ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اتنا عادل ہے کہ گویا سراسر عدل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو سراپا حسن ہے، مراد بہت حسن والا ہوتا ہے، یعنی یہ کتاب اس قدر نصیحت، شفا، ہدایت اور رحمت والی ہے، گویا یہ اہل ایمان کے لیے سراسر نصیحت، شفا، ہدایت اور رحمت ہے۔

**آیت 58** ① **قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ** : اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے مراد قرآن مجید، دین حق، خاتم النبیین پیغمبر، جنت اور تمام اخروی نعمتیں ہیں۔ حرف باء "بِفَضْلِ اللّٰهِ" اور "بِرَحْمَتِهٖ" دونوں پر آیا ہے، مطلب یہ کہ آخرت کی ہر ہر نعمت مستقل طور پر اپنی اپنی جگہ اس لائق ہے کہ اہل ایمان اس پر خوش ہوں۔

② **فَبِذٰلِكَ** : اس فاء سے محذوف شرط کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی چیز حقیقی خوشی کے قابل ہے اور اگر تمھیں خوش ہونا ہے تو پھر یہ چیز ہے جس پر خوش ہونا چاہیے۔ "فَبِذٰلِكَ" پہلے لانے سے حصر بھی پیدا ہو گیا کہ صرف یہی اصل خوشی کی چیز ہے، باقی تمام چیزیں فانی ہیں اور سراسر دھوکا۔

③ **فَلْيَفْرَحُوْا** : مفردات القرآن میں ہے کہ "فَرَحٌ" کا معنی ہے کسی جلدی مل جانے والی لذت سے سینے کا کھل جانا، خوش ہو جانا۔ یہ لفظ اکثر بدنی لذتوں سے حاصل ہونے والی خوشی پر بولا جاتا ہے، اس لیے فرمایا: ﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ ﴾ [ الحدید : ٢٣ ] "اور نہ اس پر پھول جاؤ جو اس نے تمھیں دیا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [ الرعد : ٢٦ ] "اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے۔" اور فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً ﴾ [ الأنعام : ٤٤ ] "یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں کے ساتھ خوش ہو گئے جو انھیں دی گئی تھیں ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا۔" اور فرمایا: ﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴾ [ القصص : ٧٦ ] "جب اس (قارون) کو اس کی قوم نے کہا، مت پھول، بے شک اللہ پھولنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔" "فَرَحٌ" کی اجازت صرف اللہ کے اس فرمان میں دی گئی ہے: ﴿ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ﴾ یعنی زیر تفسیر آیت میں [ مفردات القرآن للراغب ] معلوم ہوا فرح دل کی خوشی کا نام ہے، اب بعض لوگوں نے اس آیت سے میلاد کے جلوس کے لیے دلیل نکالی ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ کا فضل ہیں، لہٰذا ان کے یوم ولادت پر خوشی منانی

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

کہہ کیا تم نے دیکھا جو اللہ نے تمھارے لیے رزق اتارا، پھر تم نے اس میں سے کچھ حرام اور کچھ حلال بنا لیا۔ کہہ کیا اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے، یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو ﴿۵۹﴾

چاہیے، اس لیے یہ یوم عید ہے اور تیسری بلکہ سب سے بڑی عید ہے۔ ہمارے یہ بھائی اگر ایک دو باتیں مدنظر رکھیں تو کبھی آیت کے مفہوم میں اتنی تحریف کر کے بدعت کے لیے دلیل نہ گھڑیں۔ ایک تو یہ کہ ”فَرِحَ“ کا معنی خوشی منانا تو کسی لغت میں نہیں، اس کا معنی تو خوش ہونا ہے، یہ دل کی خوشی کی کیفیت کا نام ہے نہ کہ جلوس نکال کر عید منانے کا۔ دوسرا یہ کہ یہ خوشی تو ہر وقت چوبیس گھنٹے، پورا سال اور ساری عمر مومن کے دل میں رہتی ہے اور اس کے سینے کو ٹھنڈا رکھتی ہے، آپ کو یہ کس نے کہا کہ یہ سال میں صرف ایک دن کے لیے ہے، ایک شاعر نے اپنی خوشی کا اظہار کس خوبصورتی سے کیا ہے ؎

نہ بہ نظم شاعر خوش غزل، نہ بہ نثر ناثر بے بدل    بغلامیٔ شہ عزوجل و بہ عاشقی نبی خوشم

”میں نہ کسی بہترین غزل گو شاعر کے شعروں پر خوش ہوں اور نہ کسی بے مثال نثر لکھنے والے کی نثر پر، بلکہ میں تو صرف اللہ بادشاہ عزوجل کا غلام ہونے پر اور نبی ﷺ سے محبت رکھنے پر خوش ہوں۔“ اللہ تعالیٰ یہ خوشی ہمیشہ ہمارے نصیب میں رکھے۔ آمین!

④ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ : یعنی یہ دنیا کے ساز و سامان سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں، کیونکہ وہ مال و دولت اور جاہ و شرف دنیا میں بھی کام آتا ہے، کبھی نہیں۔ اگر کام آتا بھی ہے تو چند دن کے لیے، پھر وہ چیز جو چھن جانے والی ہے اس پر خوشی کیسی؟ حسن، قوت، جوانی، مال و دولت، عز و جاہ کیا ہی دل لبھانے والی چیزیں ہیں، مگر کیا کیا جائے کہ ان میں سے باقی رہنے والی ایک بھی نہیں، فرمایا: ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ [ النحل : ۹۶ ] ”جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔“ فانی کو باقی سے کیا نسبت؟

**آیت 59** ① قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ …… : مشرکین اور یہود نے اپنے پاس سے کئی حلال چیزوں کو حرام اور حرام کو حلال کر رکھا تھا، ان سے سوال ہے کہ بتاؤ تم نے یہ حلال و حرام کس کے کہنے پر قرار دیے ہیں؟ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے، مثلاً مشرکین کے متعلق دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۰۳)، انعام (۱۱۸ تا ۱۲۱ اور ۱۳۶ تا ۱۴۰) اور یہود کے متعلق دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۳) اور ان کے فوائد۔

② اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ اپنی خواہشوں سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینا افتراء علی اللہ، یعنی اللہ پر بہتان باندھنا ہے۔ (ابن کثیر) قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان مقلد حضرات کے لیے سخت تنبیہ ہے جو فتوی صادر فرمانے کی کرسی پر براجمان ہو جاتے ہیں اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز ہونے کے فتوے صادر کرتے ہیں، حالانکہ وہ قرآن و حدیث

وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ

اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، قیامت کے دن میں؟ بے شک اللہ تو لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے ﴿۶۰﴾ اور تو نہ کسی حال میں ہوتا ہے اور نہ اس کی طرف سے (آنے والے) قرآن میں سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم کوئی عمل کرتے ہو، مگر ہم تم پر شاہد ہوتے ہیں، جب تم اس میں

کا علم نہیں رکھتے، ان کے علم کی رسائی صرف یہاں تک ہوتی ہے کہ امت کے کسی ایک شخص نے جو بات کہہ دی ہے اسے نقل کر دیتے ہیں، گویا انھوں نے اس شخص کو شارع (اللہ اور اس کے رسول) کی حیثیت دے رکھی ہے، کتاب و سنت کے جس حکم پر اس نے عمل کیا اس پر یہ بھی عمل کریں گے اور جو چیز اسے نہیں پہنچی یا پہنچی مگر وہ اسے ٹھیک طرح سمجھ نہ سکا یا سمجھا مگر اپنے اجتہاد و ترجیح میں غلطی کر بیٹھا، وہ ان کی نظر میں منسوخ ہے اور اس کا حکم ختم ہے، حالانکہ جس کی یہ لوگ تقلید کر رہے ہیں وہ بھی شریعت اور اس کے احکام کا اسی طرح پابند تھا جس طرح خود یہ لوگ۔ اس نے اجتہاد سے کام لیا اور جس رائے پر پہنچا اسے بیان کر دیا۔ اگر اس نے غلطی نہیں کی تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر غلطی کی تو اکہرا اجر پائے گا۔ وہ شخص تو اپنی جگہ معذور ہے، مگر یہ حضرات کسی طرح بھی معذور قرار نہیں دیے جا سکتے جنھوں نے اس کی آراء کو ایک مستقل شریعت اور قابل عمل دلیل بنا لیا۔ اہل علم کے نزدیک کسی مجتہد کی تقلید کرتے ہوئے اس کے اجتہاد پر عمل کرنا صحیح نہیں۔ (شوکانی)

**آیت 60** ① وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ : یعنی ان سے کیا سلوک کیا جائے گا؟ (فتح الرحمٰن) کیا ان کا گمان یہ ہے کہ ان کے بلا دلیل اپنے پاس سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے کر اللہ پر بہتان باندھنے پر ان کی کوئی پکڑ نہ ہوگی اور انھیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟

② اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ ...... : "فَضْلٍ" کی تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بہت بڑے فضل والا ہے کہ پیدا کر کے عقل اور ہر نعمت بخشی، پھر انھیں مہلت دی، نافرمانیوں کے باوجود ان کے رزق میں کمی نہ کی، مگر وہ اس کی نرمی اور استدراج (مہلت دینے) کو دیکھ کر گناہوں پر اور دلیر ہو جاتے ہیں اور اس کے دیے ہوئے رزق میں سے جسے چاہتے ہیں حلال اور جسے چاہتے ہیں حرام قرار دے لیتے ہیں۔ اس قسم کی ناشکر گزاری میں مشرکین بھی مبتلا تھے اور اہل کتاب بھی کہ انھوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزوں کو دین بنا رکھا تھا۔ (ابن کثیر)

**آیت 61** ① وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ ...... : اس آیت کے شروع میں دو صیغے "تَكُوْنُ" اور "تَتْلُوْا" واحد مذکر حاضر کے ہیں جن کا معنی "تو" ہے اور دو صیغے "تَعْمَلُوْنَ" اور "تُفِيْضُوْنَ" جمع مذکر حاضر کے ہیں جن کا معنی "تم" ہے۔ مفسرین نے

مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ وَ لَآ أَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَآ أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾

مشغول ہوتے ہو اور تیرے رب سے کوئی ذرہ برابر (چیز) نہ زمین میں غائب ہوتی ہے اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر ایک واضح کتاب میں موجود ہے ﴿۶۱﴾

اس کی تفسیر دو طرح سے کی ہے، ایک تو یہ کہ پہلے دونوں الفاظ کے مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں اور بعد والے دونوں الفاظ کے مخاطب تمام لوگ ہیں۔ متن میں آیت کا ترجمہ لفظوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلے دونوں الفاظ میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے، مگر اس میں بھی تمام لوگ شامل ہیں، اس لیے بعد والے صیغے جمع لائے گئے ہیں، مراد ہر مخاطب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ [ الطلاق : ۱ ] ''اے نبی! جب تم (لوگ) عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو۔'' اس میں ابتدا میں نبی ﷺ کو مخاطب کر کے تمام امت کو شامل کر لیا ہے۔ یعنی لوگوں میں سے کوئی بھی کسی حال میں ہو، قرآن پڑھ رہا ہو یا کوئی اور عمل کر رہا ہو اللہ تعالیٰ اس پر شاہد ہوتا ہے۔ یہ تفسیر بھی صحیح ہے۔

② ''شَاْنٍ'' کا معنی حال ہے، مگر ایسا حال جو اہمیت رکھتا ہو، جیسے فرمایا: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍ﴾ [ الرحمٰن : ۲۹ ] ''ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔'' یہ لفظ معمولی اور حقیر کام پر نہیں بولا جاتا۔

③ وَمَا تَتْلُوْا مِنْهُ : ''مِنْهُ'' کی ضمیر کے متعلق مفسرین نے بہت سے احتمال ذکر فرمائے ہیں کہ یہ کس کی طرف لوٹتی ہے، وہ سب درست ہیں، مگر میری دانست میں ان میں سب سے آسان اور واضح وہ ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہو رہا ہے، یعنی یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ قرآن اسی کی طرف سے آیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف ضمیر لوٹانے کے لیے اس کا پہلے ذکر ہونا ضروری نہیں، کیونکہ وہ ہر وقت ہر ذہن میں موجود ہے۔

④ وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ...... : اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے لیے تسلی کا پیغام ہے کہ آپ کی بندگی کی ہر ہر ادا اور عمل ہمارے سامنے ہے اور مخالفین کے لیے وعید ہے کہ تم جو عمل کرتے ہو، تمھارے اس کام میں مشغول ہوتے ہی ہم بھی گواہ ہوتے ہیں، نہ ہم اس سے بے خبر ہیں، نہ تم اس کی سزا سے بچ سکو گے۔

⑤ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ...... : یہ بعض جاہل فلسفیوں کی اس بات کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ کلیات کو جانتا ہے جزئیات کو نہیں جانتا، بڑی بڑی باتیں اس کے علم میں آتی ہیں، چھوٹی باتیں نہیں۔ ''ذَرَّةٍ'' سب سے چھوٹی چیونٹی کو بھی کہتے ہیں اور روشن دان وغیرہ سے آنے والی روشنی کے اندر بکھرے ہوئے باریک ذروں کو بھی۔ فرمایا کہ زمین ہو یا آسمان اس میں نہ ایک ذرہ برابر چیز اس سے غائب ہے، نہ اس سے بھی چھوٹی یا بڑی کوئی چیز، بلکہ وہ سب کتاب مبین میں ہیں۔ کتاب مبین کا

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۶۲﴾ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے ﴿۶۳﴾

معنی لوح محفوظ بھی کرتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم بھی۔ اسی آیت کی ہم معنی سورۂ انعام کی آیات (۵۹، ۶۰) ہیں۔

**آیت 62** اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ ..... : "اَلَاۤ" حرف تنبیہ کہلاتا ہے، یعنی خوب سن لو، آگاہ ہو جاؤ، بہت اہم بات ہونے والی ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ لکھا ہے " اَلْاَخْلَاقُ وَ السِّيَرُ "جس میں اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ بیان فرمایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں: ''میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا میں جو شخص کوئی بھی محنت کرتا ہے اس کے پیش نظر خوشی کا حصول اور خوف (وغم) سے بچنا ہوتا ہے۔'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوشی کے حصول اور خوف وغم سے بچنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ولایت اور دوستی کا حصول۔ چنانچہ فرمایا: ''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' یعنی آخرت میں یا دنیا اور آخرت دونوں میں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ خوف (ڈر) آنے والی چیز کا ہوتا ہے اور غم گزری ہوئی مصیبت کا۔ اللہ تعالیٰ کے اولیاء (دوستوں) کو مستقبل کا کوئی خوف نہیں، کیونکہ آخرت میں وہ ہر خوف سے آزاد ہوں گے۔ وہاں انھیں نہ کسی مصیبت کے آنے یا نعمت کے چھن جانے کا خوف ہوگا، نہ کسی گزشتہ چیز کا غم۔ اس کے برعکس چونکہ اللہ کے دشمنوں کا نہ آخرت پر ایمان ہے نہ اس کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ، فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [ ھود : ۱۶ ] ''یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہوگیا جو کچھ انھوں نے اس دنیا میں کیا اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔'' اس لیے ان کا ایک ایک لمحہ خوف میں گزرتا ہے، جو نعمت انھیں حاصل ہے اس کے چھن جانے کا خوف اور جو حاصل نہیں اس کے حاصل نہ ہو سکنے کا غم، پھر موت کا خوف، پھر بعد میں کیا ہوگا، کچھ خبر ہی نہیں، غرض خوف ہی خوف۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال و اولاد کو بھی حیاتِ دنیا میں انھیں عذاب دینے کا ذریعہ بتایا۔ اللہ کے اولیاء کو آخرت میں کوئی غم نہیں ہوگا، کیونکہ ان پر دنیا میں گزری ہوئی ہر تکلیف جنت کی ایک ڈبکی سے کافور ہو جائے گی، پھر غم کیسا؟ دنیا میں آنے والی مصیبتیں دنیا میں بھی ان کے لیے کفار کی طرح غم کا باعث نہیں بنتیں، کیونکہ ایک تو انھیں ہر مصیبت پر اجر کی امید ہوتی ہے، دوسرے تقدیر پر ان کا ایمان انھیں کفار جیسے غم سے بچاتا ہے کہ اللہ کی تقدیر میں لکھی ہوئی کوئی مصیبت ہماری کسی تدبیر سے نہ ٹل سکتی تھی، نہ ٹل سکتی ہے، پھر غم سے کیا حاصل، فرمایا: ﴿ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ ﴾ [ الحدید : ۲۳ ] ''تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا کرے۔''

**آیت 63** الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ: کچھ لوگوں نے اولیاء اللہ کچھ انوکھی قسم کے مافوق الفطرت آدمیوں کو سمجھ رکھا ہے، جن سے عجیب و غریب کرامتیں اور شعبدے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق پھر یہ بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے کہ دیکھا جائے ان کا عقیدہ کیا ہے؟ وہ موحد ہیں یا مشرک، وہ نماز بھی پڑھتے ہیں یا نہیں، پاک دامن اور حلال وحرام کا خیال

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ

انھی کے لیے دنیا کی زندگی میں خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں کے لیے کوئی تبدیلی نہیں،

رکھنے والے بھی ہیں یا نہیں۔ حالانکہ اس قسم کی چیزیں اور شعبدے تو شیطانوں اور ان کے چیلوں مثلاً ہندو جوگیوں سے بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مسمریزم اور ہپناٹزم کے ماہرین بھی لوگوں کو بے وقوف بناتے رہتے ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی ہوں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء، یعنی دوستوں کی پہچان خود بتائی کہ " اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا " یعنی وہ لوگ جنھوں نے قرآن وسنت کے مطابق اپنے اعتقاد کو درست کر لیا۔ " وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ " اور ہمیشہ گناہوں سے بچتے رہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرتے رہے۔ لفظ " كَانَ " تقویٰ کے استمرار اور ہمیشگی پر دلالت کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر انسان جو عقیدہ وعمل درست کر لے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کر لے وہ اللہ کا ولی ہے۔ لیکن لوگ جنگلوں اور پہاڑوں کے عافیت خانوں میں یا خانقاہوں کے حجروں میں ولیوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، مگر اللہ کے راستے میں جان و مال قربان کرنے والوں سے بڑھ کر اللہ کا ولی ( دوست ) کون ہو سکتا ہے۔ ولی وہ نہیں جسے سُرخاب کا پر لگا ہوا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ خود اپنے فرمان کے مطابق تمام اہل ایمان کا ولی ہے، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۷ ] '' اللہ ان لوگوں کا ولی ( دوست ) ہے جو ایمان لائے۔'' اور دیکھیے سورۂ مائدہ ( ۵۵ ) اور یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ جن کا ولی ہے وہ اللہ کے ولی ہیں، کیونکہ دوستی دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں ہی کا ولی ہے، دشمنوں کا ولی ہرگز نہیں۔ پھر دوستی اور دشمنی کے درمیان کوئی مرتبہ نہیں، کوئی بھی شخص یا اللہ کا دوست ہوگا یا دشمن، اب آپ خود سوچ لیں کہ آپ اللہ کے دوست ہیں یا دشمن۔ اللہ کے یہ دوست ہر طبقے میں موجود ہیں، علماء، تاجر، صنعت کار، مزدور، کاشت کار، غرض ضروری نہیں کہ پیر یا مولوی ہی ولی ہو، بلکہ ہر طبقے میں ایمان اور تقویٰ والے لوگ اللہ کے ولی ہیں۔ البتہ ایسا شخص جو غیب کی باتیں بتاتا ہو، یا کائنات میں قدرت و اختیار رکھنے کی ڈینگ مارتا ہو، یا لوگ اس کے سامنے اس کی یہ شان بیان کرتے ہوں اور وہ چپ رہ کر ان کی تائید کرتا ہو، وہ رحمان کا ولی ہرگز نہیں، وہ تو شیطان کا ولی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اولیاء کے درجے یقیناً مختلف ہیں، اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ جیسی خلت، ولایت اور دوستی دوسرے رسولوں کو بھی حاصل نہیں ہو سکی، عام آدمی کو کیسے مل سکتی ہے، پھر انبیاء میں بھی درجے ہیں، فرمایا: ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۳ ] '' یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔'' اسی طرح اہل ایمان کے ایمان وتقویٰ کے فرق کے مطابق ان کی ولایت میں بھی فرق ہوگا، ہاں کوئی بھی مخلص مومن اللہ کی ولایت سے یکسر محروم نہیں اور یہ دوستی اپنے درجے کے مطابق قیامت کے دن کسی نہ کسی وقت ضرور کام آئے گی۔ پھر کافر بھی خواہش کریں گے کہ کاش! ہم کسی درجے کے بھی مسلمان ہوتے، فرمایا: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [ الحجر : ۲ ] '' کسی وقت چاہیں گے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا کاش! وہ مسلمان ہوتے۔'' یعنی جن کے دل میں ذرہ برابر یا اس سے بھی کم ایمان ہوگا وہ جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں گے تو کفار چاہیں گے کاش! دنیا میں ہم بھی مسلم بن جاتے، خواہ کسی درجے کے، تاکہ ہمیشہ کے لیے تو جہنم میں نہ رہتے۔

آیت 64 ① لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ...... : " لَهُمْ " پہلے آنے کی وجہ سے حصر کا معنی پیدا ہو گیا، یعنی دنیا کی

# الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾

## یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿٦٤﴾

زندگی میں خاص خوش خبری انھی کے لیے ہے۔ اس میں کئی چیزیں شامل ہیں: ① پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ﴾ [ النحل : ٩٧ ] ''جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی۔'' ② تقدیر پر ایمان کی وجہ سے کفار جیسی بے صبری اور خوف و غم سے محفوظ رہنا، جیسا کہ اوپر گزرا ہے اور فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴾ [ المعارج : ١٩ تا ٢٢ ] ''بلاشبہ انسان تھڑدلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔ سوائے نماز ادا کرنے والوں کے۔'' پھر ان نمازیوں کی چند صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [ المعارج : ٣٥ ] ''یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں۔'' ③ اچھے خواب، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: (( لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلاَّ الْمُبَشِّرَاتُ ، قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ ؟ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ )) [ بخاري، التعبير، باب المبشرات : ٦٩٩٠ ] ''نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر مبشرات (بشارت والی چیزیں)۔'' لوگوں نے پوچھا: ''مبشرات کیا ہیں؟'' فرمایا: ''اچھے خواب۔'' ④ وہ بشارت بھی اس میں شامل ہو سکتی ہے جو دنیا کے آخری وقت میں فرشتے اسے موت کے وقت دیتے ہیں۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں: (( اَلْمُؤْمِنُ إِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللّٰهِ وَكَرَامَتِهِ فَلَيْسَ شَيْءٌ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ فَأَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ وَأَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ )) [ بخاري، الرقاق، باب من أحب لقاء الله...... : ٦٥٠٧ ] ''مومن کے پاس جب موت حاضر ہوتی ہے تو اسے اللہ کی رضا اور اس کی طرف سے عزت عطا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے۔ اس وقت مومن کو کوئی چیز اس سے زیادہ عزیز نہیں ہوتی جو اس کے آگے (جنت اور اللہ کی رضا کی صورت میں) ہوتی ہے، تو وہ اللہ کی ملاقات محبوب رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے (جبکہ کافر کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے)۔'' ⑤ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے محبت ہونا اور لوگوں کا اس کی تعریف اور مدح و ثنا کرنا، اگرچہ وہ عبادت اس لیے نہیں کرتا بلکہ محض اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، مگر اللہ نیک لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے محبت رکھ دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ مریم (٩٦) ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: ''یہ بتائیں کہ آدمی خیر کا کوئی عمل کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ )) [ مسلم، البر والصلة، باب إذا أثني على الصالح ...... : ٢٦٤٢ ] ''یہ مومن کو جلد ملنے والی خوش خبری ہے۔'' ⑥ دعاؤں کی قبولیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ )) ''اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم ڈال دیں تو وہ اسے پورا کر دے۔'' [ بخاري، الصلح، باب الصلح في الدية : ٢٧٠٣ ]

وَ لَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ

اور تجھے ان کی بات غمگین نہ کرے، بے شک عزت سب اللہ کے لیے ہے، وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۶۵﴾ سن لو! بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور جو لوگ اللہ کے غیر کو پکارتے ہیں وہ کسی بھی قسم کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ اس کے

**② وَفِی الْاٰخِرَةِ:** اس سے وہ تمام بشارتیں مراد ہیں جو مومنوں کو آخرت میں دی گئی ہیں۔ دیکھیے سورۂ زمر (۲۰) اور شوریٰ (۲۲، ۲۳) اور بہت ہی بڑی نعمتیں، مثلاً موت کا ذبح کر دیا جانا، ہمیشہ جنت میں رہنا، اللہ تعالیٰ کا ان سے راضی ہونا اور اللہ تعالیٰ کا دیدار۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ نعمتیں عطا فرمائے۔ (آمین) یہ تمام چیزیں قرآن مجید اور صحیح احادیث میں موجود ہیں۔

**③ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ:** لہٰذا اس کے وہ وعدے پورے ہو کر رہیں گے جو اس نے اہل ایمان سے کر رکھے ہیں۔

**④ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ:** "هُوَ" ضمیر فصل کہلاتی ہے۔ اس کے تین فائدے ہوتے ہیں، ایک تاکید، دوسرا حصر اور تیسرا موصوف صفت اور مبتدا و خبر میں فرق۔ محلاً اس کا اعراب کچھ نہیں ہوتا، اس لیے ترجمہ ہے "یہی بہت بڑی کامیابی ہے" اس کے سوا اول تو کوئی کامیابی وجود ہی نہیں رکھتی، اگر مان بھی لی جائے تو وہ بے حیثیت ہے، اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

**آیت 65** **① وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ......:** اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی دنیا اور آخرت کی سعادت بیان کرنے کے بعد اپنے رسول ﷺ کو تسلی دی کہ دشمنوں کی باتوں، مثلاً جادوگر، دیوانہ اور کذاب وغیرہ کہنے سے آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے اس سے آپ غم زدہ نہ ہوں۔ غم اگرچہ ایک طبعی چیز ہے مگر آپ نہ بد دل ہوں نہ مایوس، کیونکہ عزت یعنی غلبہ، اقتدار اور فتح تو سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی جسے چاہے غالب اور جسے چاہے مغلوب کرتا ہے، لہٰذا آپ کو ان کافروں کی دھمکیوں، ان کے کفر و شرک اور طعن و تشنیع سے رنجیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اللہ کے رسول ہیں، آخر کار غلبہ اور اقتدار آپ کو اور آپ کے پیش کردہ دین ہی کو حاصل ہوگا۔ نیز دیکھیے سورۂ مجادلہ (۲۱) اور منافقون (۸)۔

**② هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ:** وہ ان کی فضول باتیں سن رہا ہے اور آپ کے ساتھ ان کا سلوک بھی خوب جانتا ہے، وہ جلد ہی آپ کے مخالفین سے نپٹ لے گا۔

**آیت 66** **① اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ:** "اَلَاۤ" سے خبردار کیا کہ بات پر غور کرو۔ "مَنْ" کا لفظ عام طور پر ذوی العقول یعنی انسان، جن اور فرشتوں پر بولا جاتا ہے۔ اس جملے سے دو باتیں نہایت واضح ہیں، ایک تو یہ کہ جب آسمان و زمین کا ہر شخص انسان ہو یا جن یا فرشتہ، وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، تو یہ کفار و مشرکین بھی، جو آپ کی مخالفت کر رہے ہیں، اسی کی ملکیت ہوئے، وہی ان کے معاملات جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے، لہٰذا آپ کو ان کی ایذا رسانی اور طعن و تشنیع سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ آپ کو کوئی ایسی تکلیف نہیں پہنچا سکتے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت

وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

سوا کچھ نہیں کہ اٹکلیں دوڑاتے ہیں ﴿۶۶﴾ وہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی، تا کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن۔ بے شک اسی میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں ﴿۶۷﴾

نہ دی ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت نہ ہو۔ دوسری یہ کہ جب یہ تینوں افضل مخلوقات اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں تو باقی چیزیں، پتھر، بت، دریا، درخت، جانور اور قبریں تو بدرجۂ اولیٰ اس کی ملکیت ہیں۔ تو کتنی بے عقلی کی بات ہے کہ مالک کو چھوڑ کر مملوک کی پرستش کی جائے، اس لیے اس کے ساتھ ہی شرک کی تردید فرمائی۔ (شوکانی، ابن کثیر)

② وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ : یعنی حقیقت میں تو کوئی بھی اللہ کا شریک نہیں کہ یہ کہا جائے کہ فلاں اللہ کا شریک ہے۔ مملوک مالک کا شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ رہا یہ سوال کہ پھر اتنے بے شمار لوگوں نے جو شریک بنا رکھے ہیں یہ کیسے بن گئے؟ فرمایا، اللہ کے سوا جس کسی کی بھی کوئی پوجا کرتا ہے، اسے مشکل کشا یا حاجت روا سمجھتا یا اسے پکارتا ہے، ان میں سے کسی شریک کا بھی حقیقت میں کوئی وجود نہیں، وہ محض ان مشرکوں کے وہم اور خیال کے تراشے ہوئے خاکے ہیں اور حقیقت میں تمام مشرک خواہ بت پرست ہوں، قبر پرست یا کسی بھی چیز کو پوجنے والے، وہ محض اپنے خیال ہی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور اسی کی پوجا کر رہے ہیں۔ البتہ اپنے وہم و گمان کے تراشے ہوئے خاکے کا انھوں نے کوئی نہ کوئی نام رکھ چھوڑا ہے، کوئی لات، کوئی عزیٰ، کوئی غوث، کوئی مشکل کشا، کوئی دستگیر، کوئی داتا۔ دیکھیے سورۂ نجم (۲۳ تا ۲۸)۔

③ "وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ" میں بعض علماء نے "مَا" کو استفہامیہ بنایا ہے، گویا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ اللہ کے سوا شرکاء کو پکارتے ہیں، آخر وہ کیا چیز ہے جسے وہ پکار رہے ہیں؟ کیونکہ کسی شریک کا تو وجود ہی نہیں، پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیا کہ وہ محض اپنے وہم و گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

④ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ...... : یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور نہ دلیل کو دیکھتے ہیں، اگر عقل سے کام لیتے اور دلیل پر غور کرتے تو انھیں صاف معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ ہی حق اور اکیلا معبود ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس وہم و گمان اور اٹکل پچو کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آیت 67 ① هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ ...... : اپنی قدرت، احسان اور وحدانیت کی ایک اور دلیل بیان فرمائی۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۷۱ تا ۷۳) "مُبْصِرًا" کا لفظی معنی ہے دیکھنے والا، یہ باب لازم استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دن روشن ہوتا ہے تو ہر چیز نظر آنے لگتی ہے، رات اندھیری ہوتی ہے تو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

② لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ : یعنی ان میں صرف یہی حکمت نہیں جو ذکر فرمائی ہے، بلکہ رات اور دن کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

انھوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔ وہ پاک ہے، وہی بے پروا ہے، اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں، کیا تم اللہ پر وہ کہتے ہو جو نہیں جانتے؟ ﴿۶۸﴾

قدرت کاملہ کے اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔ ”لَاٰيٰتٍ“ بہت سی نشانیاں اور دلائل۔

آیت 68 ① قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا : یہاں ان کے ایک اور غلط عقیدے اور باطل خیال کی تردید کی ہے۔ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، یہود عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، ان کے اس عقیدے کی بنیاد بھی چونکہ محض ظن و تخمین پر تھی، اس لیے یہاں ” اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ “ کے تحت اس کی بھی تردید فرما دی۔

② سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ : یہ ان کے شرک کو رد کرنے اور صرف اکیلے اللہ کے غنی ہونے کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں کہ اسے بیٹے یا بیٹی کی ضرورت ہو، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، آسمان و زمین کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے، جبکہ بیٹا ملکیت نہیں بلکہ جانشین ہوتا ہے، پھر اولاد کا حاصل کرنا شہوت و لذت کو چاہتا ہے جو دونوں چیزیں بیوی کا محتاج بناتی ہیں، جبکہ اللہ کسی کا محتاج نہیں، وہ اکیلی ذات ہی تو غنی اور ہر ایک سے بے پروا ہے۔ ”هُوَ الْغَنِيُّ“ میں ” هُوَ “ کے بعد ”الْغَنِيُّ“ پر الف لام کا معنی ہی یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی غنی، کوئی بے پروا ہے ہی نہیں، سب محتاج ہیں۔ اولاد وہی حاصل کرتا ہے جو فانی ہو، تاکہ اس کے فنا ہونے کے بعد اولاد اس کی قائم مقام ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی ذات ازلی اور ابدی ہے، شہوت و لذت اور فقر و احتیاج سے پاک اور بالا ہے، لہٰذا اس کی طرف اولاد کی نسبت سرے سے محال ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۱۱)، کہف (۴، ۵) اور مریم (۸۸ تا ۹۰)۔

③ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا : ان کے عقیدے کو دلیل سے رد کرنے کے بعد مزید رد اور انکار کے لیے فرمایا کہ ان کے پاس اس کی قطعاً کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ بات جس کے ساتھ اس کی دلیل نہ ہو توجہ کے قابل نہیں ہوتی۔ (شوکانی)

④ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ : یہ نہایت مبالغہ کے ساتھ ان کے گمان کی تردید ہے، یعنی تم وہ بات کہتے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں، کیا تم سب سے عظیم اور ہر چیز کی مالک ہستی اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جس کی نہ تمھارے پاس کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی علم۔ محض جہل کی بنیاد پر بہتان باندھ رہے ہو۔ آلوسی نے فرمایا: ”اس آیت میں دلیل ہے کہ ہر وہ بات جس کی دلیل نہ ہو علم نہیں بلکہ جہل ہے، جب کہ عقیدے کے لیے قطعی یقینی علم ضروری ہے اور یہ کہ تقلید کا ہدایت سے کوئی تعلق نہیں۔“ قرآن مجید نے کئی جگہ اہل باطل سے دلیل کا مطالبہ کیا ہے، فرمایا: ﴿ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ البقرۃ :

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ نُذِیْقُھُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکُمْ مَّقَامِیْ وَ تَذْکِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَعَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَکُمْ وَ شُرَکَآءَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُنْ اَمْرُکُمْ عَلَیْکُمْ غُمَّۃً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

کہہ دے بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے ﴿۶۹﴾ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے، پھر ہم انھیں بہت سخت عذاب چکھائیں گے، اس کی وجہ سے جو وہ کفر کرتے تھے ﴿۷۰﴾ اور ان پر نوح کی خبر پڑھ، جب اس نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیات کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تم پر بھاری گزرا ہے تو میں نے اللہ ہی پر بھروسا کیا ہے، سو تم اپنا معاملہ اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر پکا کر لو، پھر تمھارا معاملہ تم پر کسی طرح مخفی نہ رہے، پھر میرے ساتھ کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو ﴿۷۱﴾

[۱۱۱] ''کہہ دے لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو'' مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۲۴)، نمل (۶۴) اور قصص (۷۵)۔

**آیت 69** قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ ...... : افترا کا معنی ہی جھوٹ گھڑنا ہے۔ ''الْکَذِبَ'' کا لفظ تاکید کے لیے ہے، یعنی جو لوگ جھوٹ بکتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں وہ تو کسی طور بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (شوکانی)

**آیت 70** مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ...... : بس زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اللہ پر بہتان باندھ کر دنیا کا تھوڑا سا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ تنوین تقلیل کے لیے ہے، کیونکہ ساری دنیا بھی حاصل کر لیں تو وہ ختم ہونے والی ہے، لہٰذا نہایت کم اور بے وقعت ہے، پھر انھیں واپس تو ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ ''اِلَیْنَا'' پہلے لانے سے حصر پیدا ہوا، جس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں اور نہیں جا سکتے، پھر ہم انھیں ان کی کفریات کی بہت سخت سزا چکھائیں گے۔

**آیت 71** ① وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ...... : نبوت پر کفار کے شبہات اور ان کے مدلل جوابات بیان کرنے کے بعد یہاں کئی انبیاء کا ذکر فرمایا، خصوصاً تین انبیاء کے قصے کچھ تفصیل سے بیان فرمائے۔ اس میں کئی حکمتیں ہیں: ① انداز بیان بدلنے اور نئی بات شروع کرنے سے سننے والوں میں اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی اور آدمی خوش دلی اور رغبت سے بات سنتا رہتا ہے۔ ایک ہی قسم کی بات خواہ کتنی علمی ہو، لمبی ہو جائے تو رغبت کم ہو جاتی ہے۔ ② تاکہ رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے پیروکاروں کو ان واقعات کے سننے سے تسلی ہو اور وہ کفار کی ایذا رسانی سے ملول نہ ہوں، بلکہ ان انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ بنائیں۔ ③ کفار کو بھی تنبیہ ہو تاکہ وہ دنیا میں سب سے پہلے اور پھر سب سے آخر میں غرق ہونے والی قوموں کے انجام پر غور کریں اور اس قسم کی گستاخیوں سے باز آ جائیں۔ ④ پھر ان تاریخی قصوں کو کسی قسم کی کمی بیشی کے

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

پھر اگر تم منہ موڑ لو تو میں نے تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی، میری مزدوری نہیں ہے مگر اللہ پر اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں سے ہو جاؤں ﴿۷۲﴾

بغیر ایک اُمّی نبی کا بیان کرنا خود اس کے صدق نبوت کی دلیل بھی ہے۔

2 نوح علیہ السلام اولوالعزم رسولوں میں سے ایک ہیں۔ قرآن میں ان کا ذکر تینتالیس (۴۳) جگہ آیا ہے، ان کی قوم بت پرست تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب اہل عرب بھی بت پرست تھے، ان کے بتوں کے نام بھی تقریباً ملتے جلتے تھے۔ نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر سورۂ اعراف، ہود، مومنون اور نوح میں زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے، یہاں مختصر ذکر ہے اور ان کی زندگی کا یہ پہلو زیادہ نمایاں کیا ہے کہ طویل مدت تک اپنی قوم میں رہنے اور ان کے ایمان نہ لانے کے باوجود ان کا اللہ تعالیٰ پر اتنا بھروسا تھا کہ انھوں نے اپنی قوم کو چیلنج کیا کہ تم سب مل کر مجھے جو نقصان پہنچا سکتے ہو پہنچا لو۔

3 "فَاَجْمِعُوْۤا" باب افعال سے امر ہے، "اَجْمَعْتُ عَلَی الْاَمْرِ" یعنی میں نے فلاں کام کا پکا ارادہ کر لیا۔ "وَ شُرَكَآءَكُمْ" مفعول معہ ہے اور واؤ بمعنی "مَعَ" ہے۔ "غُمَّةً" پوشیدگی کے معنی میں ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: "غَمَّ عَلٰی فُلَانٍ الْاَمْرُ" "فلاں شخص پر معاملہ مخفی اور پوشیدہ رہا۔" یعنی نوح علیہ السلام نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ پوری قوم کی اور ان کے جہالت سے بنائے ہوئے خداؤں کی ذرہ برابر وقعت نہیں سمجھتے اور ان کا اپنے رب پر اتنا توکل ہے کہ وہ ان کی کسی سازش سے نہیں ڈرتے، سب کو صاف چیلنج کیا کہ اگر میرا تم میں رہنا اور نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے اور تم سمجھانے سے سمجھنے پر کسی طرح تیار نہیں تو اپنے بتوں کے ساتھ مل کر، جنھیں تم جہالت اور بے شرمی سے اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہو، میرے خلاف جو سازش میرے قتل یا ایذا کی کر سکتے ہو کر لو۔

4 ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ ...... : یعنی میرے مار ڈالنے کا جو منصوبہ تیار کرو اس پر اچھی طرح غور کر لو تا کہ اس کا کوئی پہلو تم پر ڈھکا چھپا نہ رہے، پھر میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھے مہلت مت دو۔

5 ان آیات سے نوح علیہ السلام کی انتہا درجے کی شجاعت، اللہ تعالیٰ پر کمال توکل، مخلوق سے کلی استغناء اور فریضۂ رسالت کی نہایت طویل مدت تک بغیر وقفے یا اکتاہٹ یا تھکاوٹ کے مسلسل ادائیگی اور اس کے دوران آنے والی ہر تکلیف، طعن اور استہزا کو کمال صبر سے برداشت کرنا ظاہر ہو رہا ہے۔ تبھی ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم ہوا کہ ان اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کرو۔ ہمیں تو ان پر پیش آنے والے حالات کے تصور ہی سے پسینا آ جاتا ہے اور بدن کانپ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی دعوت کے کام کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

آیت 72 فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ ...... : یعنی اگر تم میری دعوت ٹھکرانے پر اصرار کرو تو میرا کچھ نقصان نہیں، کیونکہ میں

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىِٕفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

پس انھوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے اسے نجات دی اور ان کو بھی جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور انھیں جانشین بنایا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ سو دیکھ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جنھیں ڈرایا گیا تھا ﴿۷۳﴾ پھر اس کے بعد ہم نے کئی پیغمبر ان کی قوم کی طرف بھیجے تو وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے۔ سو وہ ہرگز ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جسے اس سے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے گزرنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں ﴿۷۴﴾

---

نے تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی۔ تمھارے نہ ماننے یا بے رخی کرنے سے میرے ثواب اور مزدوری میں کمی نہیں ہو گی، وہ میرے اللہ کے ذمے ہے، جو مجھے کبھی تمھارا محتاج نہیں ہونے دے گا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۲) میری طرف سے تمھیں ایمان لانے کی دعوت بھی تمھارے ہی فائدے کے لیے ہے اور مجھے حکم ہے کہ مسلمین (حکم ماننے والوں) سے ہو جاؤں۔ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کا دین اسلام ہی تھا اور وہ سب مسلم تھے۔

**آیت 73** ❶ **فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ :** اس کی تفصیل سورۂ ہود (۳۶ تا ۴۹) میں دیکھیں۔

❷ **وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىِٕفَ :** یعنی ان کے بعد دنیا میں وہی بسنے والے رہ گئے۔ دیکھیے سورۂ صافات (۷۷) اس لیے نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

❸ **فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ :** یہاں "**فَانْظُرْ**" کا معنی ہے غور و فکر کر اور عبرت حاصل کر کہ وہ کیسے تباہ و برباد کر دیے گئے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل ایمان کو تسلی ہے اور ان لوگوں کے لیے مقام عبرت ہے جو آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رہے ہیں۔

**آیت 74** ❶ **ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ :** یہاں نوح علیہ السلام کے بعد جن پیغمبروں کے مبعوث ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان میں ہود، صالح، ابراہیم، لوط اور شعیب علیہم السلام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کا تذکرہ اگلی سورت ہود میں آ رہا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی مرقوم ہے اور "**اِلٰى قَوْمِهِمْ**" کے الفاظ سے اشارہ فرما دیا ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان کے بعد جتنے پیغمبر ہوئے ہیں ان میں سے کسی کی رسالت بنی نوع انسان کے لیے عام نہیں تھی بلکہ خاص خاص اقوام کی طرف مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ البتہ نوح علیہ السلام کی بعثت میں اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ بھی خاص طور پر اپنی قوم ہی کی طرف مبعوث تھے۔ (ہمارے استاذ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق صحیح یہی ہے کہ طوفان سے روئے زمین کے تمام لوگ غرق نہیں ہوئے بلکہ خاص علاقہ تباہ و برباد ہوا ہے) یہ درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے کہ ان کی رسالت تمام اقوام عالم

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۠ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تو انھوں نے بہت تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے ﴿۷۵﴾ تو جب ان کے پاس ہمارے ہاں سے حق آیا تو کہنے لگے بے شک یہ تو کھلا جادو ہے ﴿۷۶﴾

کے لیے عام ہے اور قیامت تک اسی طرح باقی رہے گی۔ دیکھیے سورۂ سبا (۲۸)۔

❷ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: یعنی ایسے دلائل و معجزات لے کر آئے جو اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ واقعی یہ اللہ کے رسول ہیں۔ ہمارے رسول ﷺ کا معجزہ قرآن سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مؤثر تھا، جس کی وجہ سے آپ کی امت بھی سب سے زیادہ ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۰، ۵۱) کے فوائد۔

❸ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ : لیکن یہ امتیں رسولوں کی دعوت پر ایمان نہیں لائیں، اس کا سبب یہ ہوا کہ جب اللہ کے رسول شروع میں ان کے پاس آئے تو انھوں نے اپنی سرکشی اور تکبر کی وجہ سے ایمان لانے سے انکار کر دیا اور یہ انکار ان کے لیے مستقل حجاب بن گیا اور وہ یہی سوچتے رہے کہ جسے ہم جھٹلا چکے اب اس پر ایمان کیسے لائیں۔ نتیجتاً وہ ایمان کی نعمت سے محروم رہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے "كَذَّبُوْا" کا فاعل قوم نوح کو بنایا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان رسولوں کی قومیں بھی ایسی نہ تھیں جو اس چیز پر ایمان لاتیں جسے قوم نوح اور پہلے کے لوگ اس سے قبل جھٹلا چکے تھے، بلکہ ان کے دلوں پر قوم نوح کی طرح مہر لگ گئی۔ پہلا معنی زیادہ مناسب ہے، اگرچہ یہ بھی درست ہے۔

❹ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ : یعنی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخر کار یہ سزا دیتا ہے کہ انھیں کبھی راہِ ہدایت پانے کی توفیق نہیں ہوتی اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا ان کے دلوں پر مہر لگانے کا۔ آئندہ بھی جو یہ روش اختیار کرے گا اسے یہی سزا ملے گی۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۷)، انعام (۱۰۹، ۱۱۰) اور انفال (۲۴)۔

**آیت 75** ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ...... : یہ دوسرا قصہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی قوم کا ہے جو غرق ہونے میں نوح علیہ السلام کی قوم کی مثال ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ قریش آپ کو جادوگر کہہ رہے ہیں (یہ کوئی نئی بات نہیں، جو شخص یا قوم بھی دلیل سے لاجواب ہو جائے وہ اسے جادو کہہ کر جان چھڑاتے ہیں) مگر ان میں سے بعض تو ان جادوگروں کی طرح ایمان لے آئیں گے اور جو اپنے کفر پر اڑے رہے وہ فرعون اور اس کی قوم کی طرح تباہ و برباد ہوں گے۔ "آیات" سے مراد وہ نو (۹) معجزے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل (۱۰۱) میں ذکر ہوئے ہیں۔

**آیت 76** فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ ...... : "ہماری طرف سے حق" اس حق کی عظمت کے بیان کے لیے ہے جو موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے۔ اس واضح حق کی تردید جب وہ کسی طرح نہ کر سکے تو اسے جادو کہہ دیا۔

قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

موسیٰ نے کہا کیا تم حق کے بارے میں (یہ) کہتے ہو، جب وہ تمھارے پاس آیا، کیا جادو ہے یہ؟ حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہوتے ﴿۷۷﴾ انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اس سرزمین میں تم دونوں ہی کو بڑائی مل جائے؟ اور ہم تم دونوں کو ہرگز ماننے والے نہیں ﴿۷۸﴾

**آیت 77** قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ ......: مفسرین نے فرمایا کفار کے جواب میں درحقیقت یہ تین جملے ہیں، پہلا ”اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ“ یعنی یہ بات کہ ”یہ جادو ہے“ کیا تم حق کے بارے میں کہہ رہے ہو، جب کہ حق تمھارے سامنے ہے؟ دوسرا ”اَسِحْرٌ هٰذَا“ کیا یہ جادو ہے؟ یہ سوال انکار کے لیے ہے، جیسے کوئی پھول کو پتھر کہے تو اسے کہا جائے، کیا یہ پتھر ہے؟ تیسرا یہ کہ جادوگر تو کامیاب نہیں ہوتے، جبکہ تم دیکھ رہے ہو کہ میں دلیل و برہان کی رو سے کامیاب ہوں، تو پھر یہ جادو کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں آئندہ جادوگروں کے ساتھ مقابلہ میں اپنی کامیابی اور جادوگروں کی ناکامی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے۔

**آیت 78** قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا ......: فرعون اور اس کے ساتھی اپنے شرکیہ عقائد کی وجہ سے مذہبی برتری بھی جتاتے رہتے تھے اور سرزمین مصر کی حکومت پر قبضے کی وجہ سے تمام وسائل کے مالک بن کر سیاسی طور پر بھی سب سے بڑے بنے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے یہ دو الزام دھر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح کی ہر تحریک، پرانی ہو یا نئی، وقت کے تمام فرعون اس پر یہی الزام رکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا مقصد اصلاح نہیں، بلکہ ہماری مذہبی سیادت اور سیاسی برتری کو ختم کرنا اور اپنی حکومت قائم کرنا ہے، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے بھی کہا تھا کہ یہ شخص محض تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے، فرمایا: ﴿يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ﴾ [ المؤمنون : ٢٤ ] ”یہ چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کر لے۔“ حالانکہ انبیاء اور مصلحین محض اصلاح کے لیے آتے ہیں، اگر حکمران اسلام قبول کر لیں اور خود ہی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیں تو ان کی حکومت سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ مثلاً اس دور میں محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ نے ابن سعود کے ذریعے سے توحید و سنت کی دعوت کو پھیلایا، خود حکومت طلب نہیں کی، نہ ان کی اولاد میں سے کسی نے یہ خواہش یا کوشش کی۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے وقت کے حاکموں کو جہاد پر ابھار کر اور ان کا ساتھ دے کر تاتاریوں کو مار بھگایا، خود کوئی عہدہ نہ طلب کیا نہ قبول کیا۔ اس لیے ہرقل نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر چاہتے ہو کہ تمھاری حکومت قائم رہے تو اسلام قبول کر لو، مگر وہ بدنصیب نکلے اور ہرقل بھی ان کی بادشاہت کے طمع میں ایمان سے محروم رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان ہونے والے قبائل کے سرداروں کو اور مختلف علاقوں کے مسلمان

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۠ىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور فرعون نے کہا میرے پاس ہر ماہر فن جادوگر لے کر آؤ ﴿۷۹﴾ تو جب جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے ان سے کہا پھینکو جو کچھ تم پھینکنے والے ہو ﴿۸۰﴾ تو جب انھوں نے پھینکا، موسیٰ نے کہا تم جو کچھ لائے ہو یہ تو جادو ہے، یقیناً اللہ اسے جلدی باطل کر دے گا۔ بے شک اللہ مفسدوں کا کام درست نہیں کرتا ﴿۸۱﴾ اور اللہ حق کو اپنی باتوں کے ساتھ سچا کر دیتا ہے، خواہ مجرم برا ہی جانیں ﴿۸۲﴾ تو موسیٰ پر اس کی قوم کے چند لڑکوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا، (وہ بھی) فرعون اور ان کے سرداروں کے خوف کے باوجود کہ وہ انھیں آزمائش میں ڈال دے گا اور بے شک فرعون یقیناً زمین میں سرکش ہے اور بے شک وہ یقیناً حد سے گزرنے والوں سے ہے ﴿۸۳﴾

ہونے والے بادشاہوں، مثلاً ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ وغیرہ کو ان کے عہدوں پر قائم رکھا۔ آخر میں فرعون کے ساتھیوں نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ ہم تم دونوں کو ہرگز ماننے والے نہیں۔

**آیت 79 تا 82** ❶ **وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ ......** : یہ قصہ تفصیل سے سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے اور سورۂ طٰہٰ اور شعراء میں بھی آ رہا ہے۔

❷ **مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ** : یعنی جادو تو وہ ہے جو تم لائے ہو، نہ کہ وہ جو میں پیش کر رہا ہوں۔ **"عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ"** جادوگروں کو مفسد قرار دیا ہے جو ایک مشرک ظالم اور خدائی کے دعوے دار کی حمایت محض دنیا کے لالچ میں کر رہے تھے۔

❸ **وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ** : اپنے کلمات (اپنی باتوں) کے ساتھ، یعنی ان وعدوں کے مطابق جو اس نے حق کو غالب کرنے کے متعلق کیے ہیں، حق کو سچا کر دیتا ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ چاہے تو اپنے کلمہ "کُنْ" کے ساتھ، یعنی اپنے کسی حکم کے ساتھ ظاہری اسباب کے بغیر بھی حق کو سچا کر دیتا ہے، یا اپنے کلمات کی برکت سے حق کو سچا کر دیتا ہے۔

**آیت 83** **فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ ......** : اتنے واضح معجزات دیکھنے اور جادوگروں کی شکست اور ان کے ایمان لانے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام پر اس کی قوم کے چند لڑکوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ یہاں "اس کی قوم" سے کس کی قوم

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسا کرو، اگر تم فرماں بردار ہو ﴿۸۴﴾

مراد ہے؟ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اپنی قوم بنی اسرائیل کے چند لڑکے لڑکیوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا، وہ بھی فرعون اور اپنے یعنی بنی اسرائیل کے سرداروں کے خوف کے ہوتے ہوئے جو فرعون کے ایجنٹ تھے کہ وہ انھیں ایمان سے ہٹانے کے لیے آزمائشوں اور مصیبتوں میں ڈالیں گے۔ اس تفسیر کا نتیجہ تو یہی ہے کہ فرعون کی قوم میں سے جادوگروں کے سوا اور بنی اسرائیل میں سے چند لڑکوں کے سوا ایک شخص بھی ایمان نہ لایا۔ فرعون کی پوری قوم اور بنی اسرائیل کے تمام بڑی عمر کے لوگ ایمان سے محروم اور فرعون کے دین پر رہے۔ ابن جریر اور ان کے ہم خیال حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کیفیت ابتدائی دور کی ہے، بعد میں تو قارون کے سوا سب بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ "مَلَاۡئِهِمْ" (ان کے سرداروں) میں "هُمْ" ضمیر جمع یا تو فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ مصری لوگ فرعون کے لیے بطور تعظیم جمع کی ضمیر استعمال کرتے تھے، یا اس سے مراد بنی اسرائیل کے سردار ہیں، یعنی بنی اسرائیل میں سے جو نوجوان ایمان لائے انھیں ایک طرف فرعون کا ڈر تھا اور دوسری طرف خود اپنے سرداروں کا۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے آیت کے اس مطلب کی سخت تردید کی ہے، ان کی ترجیح میں "ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ" میں "ہ" ضمیر فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ بنی اسرائیل تو پہلے سے موسیٰ علیہ السلام کی آمد کے منتظر تھے اور ان کے تشریف لانے پر سب کے سب ایمان لے آئے اور اس کی تائید اگلی آیت بھی کر رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کے تمام بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے، البتہ فرعون کی قوم قبطیوں میں سے چند نوجوان ہی ایسے نکلے جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: ''پھر موسیٰ پر اس (فرعون) کی قوم قبطیوں میں سے صرف چند نوجوان ہی ایمان لائے اور وہ فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرے کہ کہیں وہ فرعون انھیں آزمائش میں نہ ڈالے۔'' یہ ترجمہ زیادہ واضح ہے اور علمائے تحقیق نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (ابن کثیر، روح المعانی) اگر غور کیا جائے تو بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے بھی اپنی تمام خرابیوں کے باوجود مسلمان ہونا اور پیغمبروں کی اولاد ہونے پر فخر کرنا معلوم ہے، ورنہ اگر وہ فرعون کا دین قبول کر لیتے اور آزادی کا مطالبہ نہ کرتے تو فرعون کو ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کا ایک قبطی کو قتل کرنے کا واقعہ بھی اپنی قوم کے آدمی کی حمایت ہی کی وجہ سے پیش آیا۔ اس وقت بھی موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اپنی جماعت اور قبطیوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور بنی اسرائیل بھی موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہی سمجھتے تھے، تب ہی اس اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارا، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تک نبوت عطا نہیں ہوئی تھی۔ اب اگر خدانخواستہ اہل کشمیر ہندو ہو جائیں یا فلسطینی یہودی ہو جائیں تو ہندوؤں اور یہودیوں کو ان پر ظلم و جبر کی کیا ضرورت ہے، مگر عقیدے اور عمل کی بے شمار خرابیوں کے باوجود ان کا مسلمان ہونا اور اس پر استقامت کفار کو کسی صورت برداشت نہیں۔

**آیت 84** وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ ...... : موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور سچا نبی ثابت ہونے پر بھی فرعون

فَقَالُوۡا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۝ وَ نَجِّنَا بِرَحۡمَتِكَ مِنَ الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝

تو انھوں نے کہا ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے آزمائش نہ بنا (۸۵) اور اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں کافر لوگوں سے نجات دے (۸۶)

کے ظلم میں کمی نہ آئی، بلکہ وہ اور بڑھ گیا۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کیا کہ آپ کے آنے سے پہلے بھی اور آپ کے آنے پر بھی ہمیں ایذا ہی دی گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے انھیں صبر اور توکل کی تلقین فرمائی۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۲۸، ۱۲۹) زیر تفسیر آیت میں اللہ پر توکل کو ایمان اور اسلام کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا، جیسا کہ دوسری آیات میں ایمان اور توکل یا عبادت اور توکل کو ایک ساتھ بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۱۲۳)، ملک (۲۹) اور فاتحہ (۴)۔

**آیت 85، 86** ❶ **فَقَالُوۡا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا** ...... : انھوں نے پیغمبر کی نصیحت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ زبان سے اقرار بھی کیا کہ ہم صرف اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں، وہی ہمارا سہارا ہے اور اس کے ساتھ دو دعائیں کیں اور یہ دونوں دعائیں ظالم حکمرانوں کے ظلم سے بچنے کے لیے اکسیر ہیں۔ پہلی دعا یہ کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ "فِتۡنَةً" کا لفظ مصدر ہے جو " فَتَنَ " فعل معروف کا مصدر بمعنی اسم فاعل ہوگا، یعنی " فَاتِنِیۡنَ " فتنے اور آزمائش میں ڈالنے والے۔ اسی طرح یہ " فُتِنَ " فعل مجہول کا مصدر بمعنی اسم مفعول بھی ہوسکتا ہے، یعنی " مَفۡتُوۡنِیۡنَ " فتنے میں ڈالے ہوئے۔ پہلی صورت میں معنی ہوگا کہ یا اللہ! تو ہمیں ان ظالموں کو فتنے میں ڈالنے والے، یعنی کفر کے فتنے میں ڈالنے کا باعث نہ بنا کہ اگر یہ ہم پر مسلط رہے اور ہم مسلسل ان کے ظلم کا نشانہ ہی بنے رہے تو یہ اپنے سچے ہونے اور حق پر ہونے کے فتنے میں پڑ جائیں گے اور کفر میں مزید پختہ ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ اگر مسلمان سچے اور حق پر ہوتے تو ان کا رب ضرور ان کی مدد کرتا، جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں  طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

اور "فِتۡنَةً" کو مصدر مجہول ماننے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہمیں ان ظالموں کے لیے (مفتون) فتنے میں پڑ جانے والے نہ بنا کہ ان کے ظلم و تشدد کی وجہ سے ہمارا کوئی شخص فتنۂ ارتداد میں پڑ کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دوسری دعا یہ کی کہ پروردگارا! تو ہمیں صرف ان کے لیے فتنے کا باعث بننے ہی سے نہ بچا، بلکہ اپنی رحمت کے ساتھ ان کافروں سے ہمیں نجات اور آزادی بھی دلا۔ اس دعا سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بندوں کو ایمان اور آخرت کی کتنی فکر تھی کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی شخص کے کفر میں مبتلا رہنے کا باعث بنیں اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کسی کے ظلم کی وجہ سے خود فتنے میں پڑ کر اپنا ایمان ضائع کر بیٹھیں۔

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھروں کو ٹھکانا مقرر کرلو اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنالو اور نماز قائم کرو، اور ایمان والوں کو خوش خبری دے دے ﴿۸۷﴾

آیت 87 ① وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ ...... : ہماری امت کی خصوصیت ہے کہ اس کے لیے پوری زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔ مسلمان کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے نماز پڑھ سکتا ہے۔ پہلی امتوں میں یہ سہولت نہ تھی، بلکہ عبادت کے لیے مقررہ مقامات ہی میں نماز پڑھنا ضروری تھا، خواہ آپ اسے مسجد کہہ لیں یا کنیسہ۔ فرعون کو بنی اسرائیل کا جمع ہونا کسی طرح برداشت نہ تھا، خصوصاً جو مقام فرعون کی ربوبیت کے انکار کا اور اکیلے اللہ کی ربوبیت اور عبادت کا نشان ہو اور ایک اللہ کے پرستار بنی اسرائیل روزانہ کئی مرتبہ وہاں جمع ہوتے ہوں۔ اس لیے ان آیات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ فرعون نے ان کے عبادت خانوں میں جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو وحی فرمائی کہ مصر میں کچھ گھروں کو اپنی نماز کی جگہ مقرر کرلو اور اپنے گھر قبلہ رخ بنالو۔ اس سے کسی حد تک اجتماع کا موقع بھی ملتا رہے گا، باہمی ملاقات سے محبت بھی بڑھتی رہے گی اور نماز باجماعت بھی ہوتی رہے گی اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی بھی۔ ایسی صورت میں بنی اسرائیل سے مسجدوں میں جانے کی پابندی اضطرار کی بنا پر ختم کر دی گئی، البتہ نماز پھر بھی ہر جگہ پڑھنے کی اجازت نہیں ملی، بلکہ اپنے گھر قبلہ رخ بنا کر ان میں چھپ کر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گھر قبلہ رخ بنانے کا حکم ہوا مگر نماز کے لیے چند گھر مخصوص تھے، جن کا صرف مسلمانوں کو علم تھا، اگر کسی گھر کا راز فاش ہو جاتا تو دوسرا کوئی گھر مقرر کرلیا جاتا اور تمام گھروں کے قبلہ رخ ہونے کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ دلیل اس کی ایک تو یہ ہے کہ فرمایا: ﴿اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا﴾ "بُيُوْتًا" یعنی پوری قوم کے لیے چند گھروں کو ٹھکانا مقرر کرلو۔ دوسری یہ کہ حکم تھا: ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اور اقامت صلوٰۃ صفوں کی درستگی کے بغیر نہیں ہوتی جو جماعت کی صورت ہی میں بنتی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ » [ بخاری، الأذان، باب إقامة الصف من تمام الصلاة : ۷۲۳، عن أنس رضی اللہ عنہ ] "اپنی صفیں برابر کرو، کیونکہ صفیں برابر کرنا اقامتِ صلاۃ کا حصہ ہے۔" تیسری یہ کہ بنی اسرائیل کو بھی ہماری امت کی طرح جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم تھا (جب کوئی عذر نہ ہو) فرمایا: ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ [ البقرۃ : ۴۳ ] "اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔"

② وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ : ایسے مشکل حالات میں بھی بنی اسرائیل کو نماز کی معافی نہیں ملی، بلکہ اسے خاص طور پر قائم کرنے کا حکم ہوا، کیونکہ صبر اور نماز ہی مشکل کے وقت اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، فرمایا: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں بہت سی زینت اور اموال عطا کیے ہیں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ تیرے راستے سے گمراہ کریں، اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں ﴿۸۸﴾

[ البقرۃ : ٤٥ ] ''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔'' اور نماز ہی روزانہ کئی مرتبہ بندے کا تعلق اپنے رب سے جوڑتی اور اس سے ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ زکوٰۃ مال ہونے کی صورت میں سال میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے، روزے بھی سال میں کچھ دن فرض ہیں، حج استطاعت کی صورت میں عمر بھر میں ایک دفعہ فرض ہے، یہ نماز ہی ہے کہ آدمی کو جب بھی کوئی مشکل پیش آئے تو وہ اس کے ذریعے سے اپنے رب سے تار جوڑ سکتا ہے اور اس کے ساتھ آدمی کو پانچ دفعہ تو ضرور ہی اپنے مالک کے حضور پیش ہو کر فریاد کرنے کا موقع ملتا ہے۔

② وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ : یعنی اہل ایمان کو خوش خبری دو، اس خوش خبری کا ذکر سورۂ اعراف (۱۲۹) میں ہے کہ تمھارے دشمنوں کی ہلاکت اور تمھاری آزادی کے دن قریب ہی ہیں۔

آیت 88 ① وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ ...... : پے در پے معجزات دیکھنے اور مختلف عذابوں کے نزول پر ایمان لانے اور آزادی دینے کے وعدوں کے باوجود جب فرعون اور اس کے ساتھی کفر اور ظلم سے کسی صورت باز نہ آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے تنگ آ کر ان کے حق میں بددعا کی۔

② رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ : "لِيُضِلُّوْا" میں لام عاقبت اور انجام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت و اموال عطا فرمائے، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ تیرا شکر ادا کرنے کے بجائے اس دولت کے بل بوتے پر لوگوں کو تیری راہ سے گمراہ کرنے لگے۔ یہ معنی سیبویہ اور خلیل نے بیان کیا ہے۔ بعض مفسرین نے "لِيُضِلُّوْا" کے لام کو تعلیل کا بھی بتایا ہے، جس کا معنیٰ ''تاکہ'' ہے، یعنی تو نے انھیں دنیا کا مال و دولت اور اس کی زینت اس لیے دی ہے کہ تو اس کے ذریعے سے انھیں فتنے اور آزمائش میں ڈالے اور یہ مال و دولت تو نے انھیں دی ہی اس لیے ہے کہ یہ فتنے میں پڑ کر خود بھی گمراہ ہوں اور شیطان کی طرح دوسرے لوگوں کو بھی تیری راہ سے گمراہ کرتے پھریں۔ یہ معنی ابن جریر طبری نے کیا ہے اور دلیل میں سورۂ جن کی یہ آیت پیش کی ہے: ﴿ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۝ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ﴾ [ الجن : ١٦، ١٧ ] ''تو ہم انھیں ضرور بہت وافر پانی پلاتے۔ تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں۔''

قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

فرمایا بلاشبہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی، پس دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے راستے پر ہرگز نہ چلو جو نہیں جانتے ﴿۸۹﴾

③ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ ...... : پروردگارا! ان کا ظلم اب حد سے بڑھ گیا ہے، اس لیے تیرے حضور درخواست ہے کہ تو ان کے مالوں کو مٹا دے، جن کے زور پر یہ تیری راہ سے گمراہ کرتے ہیں اور ایمان لانے کے وعدوں کی انھوں نے اتنی بار خلاف ورزی کی ہے کہ ان کی سزا یہی ہے کہ تو انھیں ایمان کی توفیق سے محروم کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی گرہ لگا کہ یہ عذاب الیم دیکھنے تک ایمان نہ لا سکیں، جس کے دیکھنے کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر نے یہ بددعا اللہ تعالیٰ کے کسی اشارے کے بعد کی ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کی قسمت میں ایمان نہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے صاف بتا دیا کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ان کے بعد مزید کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا (دیکھیے ہود: ۳۶) تو انھوں نے ان کے خلاف وہ زبردست بددعا کی جو سورۂ نوح میں مذکور ہے۔ یا جب آل فرعون نے تمام معجزات دیکھ کر کہا کہ تو ہمارے پاس خواہ کوئی بھی نشانی لے آئے ہم ہرگز تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے (دیکھیے اعراف: ۱۳۲) تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے ان کے ایمان سے مایوس ہو کر یہ بددعا کی۔

**آیت 89** ① قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا : یعنی یقیناً تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی۔ معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام بھی اس دعا میں شریک تھے۔ بعض اہل علم کے اقوال ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے، مگر یہ بات قرآن مجید سے یا حدیث سے مجھے نہیں ملی۔

② فَاسْتَقِیْمَا : اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ دعوت پر ثابت قدم رہو، بے شک تمھاری دعا قبول ہے، مگر قبولیت ظاہر ہونے میں دیر ہو سکتی ہے، اس لیے دیر کی وجہ سے دعوت میں کوتاہی نہ کرنا۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ قبولیت کا اثر کب ظاہر ہوگا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اب اپنی اس بددعا پر قائم رہنا، ایسا نہ ہو کہ میرا عذاب آنے پر ان کی سفارش کرنے لگو۔ یہ ایسے ہی ہے جس طرح نوح علیہ السلام نے بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ سارے کافر غرق ہوں گے، مگر اب مجھ سے ان ظالموں کے (حق میں) بات نہ کرنا۔ (دیکھیے ہود: ۳۷) اللہ تعالیٰ کو نوح اور موسیٰ علیہما السلام کی بددعا کے باوجود ان کے دل کی نرمی کا علم تھا، اس لیے انھیں پہلے ہی اپنی بددعا پر ثابت رہنے کی تاکید فرما دی۔ مگر نوح علیہ السلام پھر بھی بیٹے کے لیے سفارش کر بیٹھے اور انھیں اللہ تعالیٰ کا عتاب سننا پڑا، جس پر انھوں نے معافی مانگی۔ دیکھیے سورۂ ہود (۴۵ تا ۴۷)۔

③ وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ : یعنی ان لوگوں کا راستہ اختیار نہ کرنا جو دعوت کے کام میں حوصلہ چھوڑ بیٹھتے ہیں، یا دعا کرتے ہی چاہتے ہیں کہ ان کا مطلب پورا ہو جائے اور اگر فوراً پورا نہ ہو تو شکایت کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے بہت دعائیں کیں مگر پروردگار نے قبول ہی نہیں کیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( یُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ یَعْجَلْ ، یَقُوْلُ دَعَوْتُ

وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ وَ جُنُوۡدُهٗ بَغۡیًا وَّ عَدۡوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَهُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾ آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا تو فرعون اور اس کے لشکروں نے سرکشی اور زیادتی کرتے ہوئے ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے پا لیا تو اس نے کہا میں ایمان لے آیا کہ حق یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرماں برداروں سے ہوں﴿۹۰﴾ کیا اب؟ حالانکہ بے شک تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں سے تھا﴿۹۱﴾

---

فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِیْ ﴾ [ بخاری، الدعوات، باب یستجاب للعبد ما لم یعجل : ٦٣٤٠۔ مسلم : ٢٧٣٥، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ ] ''تم میں سے کسی شخص کی دعا قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ جلدی نہیں کرتا، یہ نہیں کہتا کہ میں نے دعا کی مگر میری دعا قبول نہیں کی گئی۔''

**آیت 91، 90** ❶ **وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ** : یعنی بنی اسرائیل کا سمندر پار کرنا انسانی اسباب کے ساتھ نہ تھا، بلکہ انسان کے اختیار سے باہر خاص ہمارے پار کرانے سے تھا۔ بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے، فرعون کے تعاقب، موسیٰ علیہ السلام کے لاٹھی مارنے سے سمندر کے پھٹنے اور پانی کے منجمد ہو کر راستے دینے کی تفصیل سورۂ شعراء (۵۲ تا ۶۸) اور دخان (۲۳ تا ۳۱) میں آئے گی۔

❷ **فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ وَ جُنُوۡدُهٗ بَغۡیًا وَّ عَدۡوًا** : فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا انھیں ستانے، ان پر زیادتی کرنے اور انھیں دوبارہ غلام بنانے کے لیے کیا، یعنی ان کی نیت صلح یا اصلاح کی نہ تھی۔ ''بَغۡیًا'' اور ''عَدۡوًا'' حال بمعنی اسم فاعل یا مصدر برائے مفعول لہ ہیں۔ ہمارے استاذ مولانا عبدہ رحمہ اللہ نے قرطبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''بَغۡیٌ'' وہ زیادتی ہے جو قول سے ہو اور ''عَدۡوٌ'' وہ جو فعل سے ہو اور طنطاوی نے لکھا ہے: ''بَغٰی فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ بَغْیًا'' جب کوئی کسی پر دست درازی اور ظلم کرے اور ''عَدَا عَلَیْهِ عَدْوًا'' جب اس سے اس کا حق چھین لے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم تھا کہ سمندر سے پار ہو کر اسے اسی حالت میں رہنے دو۔ (دیکھیے دخان : ۲۴) چنانچہ جب بنی اسرائیل کا آخری آدمی بھی نکل گیا اور فرعون کا پورا لشکر ان کے پیچھے مع فرعون سمندر میں داخل ہو گیا تو سمندر کا پانی برابر ہو گیا۔

❸ **حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَهُ الۡغَرَقُ** ...... غرق یعنی ڈوبنے نے اسے پا لیا، گویا غرق اللہ کا سپاہی تھا جس نے اسے آ پکڑا اور واقعی اللہ کے لشکروں اور سپاہیوں کا شمار نہیں۔ تو فرعون نے تین دفعہ مسلمان ہونے کا اقرار کیا: ① ''**اٰمَنۡتُ**'' ② ''**اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ**'' ③ ''**وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ**'' یہ سارا معاملہ غیب کا ہے، ڈوبتے وقت اس نے کیا کہا؟ اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتوں کے سوا وہاں کون تھا؟ سو یہ ساری بات اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے بتائی، جو آپ کی نبوت کی زبردست دلیل ہے۔

❹ **آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ** ...... : کیا اب؟ یہ اللہ کی طرف سے ڈانٹ تھی اور بتانا تھا کہ عذاب نازل ہو جانے کے بعد

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

ع ١٠ ١٣

پس آج ہم تجھے تیرے (خالی) بدن کے ساتھ بچالیں گے، تاکہ تو ان کے لیے عظیم نشانی بنے جو تیرے بعد ہوں اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے یقیناً غافل ہیں ﴿۹۲﴾

توبہ کرنے اور ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں، فرمایا: ﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ﴾ [ المؤمن : ۸۵ ] ”پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔“ اور دیکھیے سورۂ یونس (۵۱) اور نساء (۱۸) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ )) [ ترمذی، الدعوات، باب إن اللہ یقبل توبۃ العبد ما لم یغرغر...... : ۳۵۳۷، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] ”بے شک اللہ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے، جب تک اس کا غرغرہ (جان نکلنے کی حالت) نہ ہو۔“

5 فرعون کی سرکشی پر اللہ کے فرشتوں کو بھی اس قدر غصہ تھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا: (( قَالَ لِيْ جِبْرِيْلُ لَوْ رَأَيْتَنِيْ وَأَنَا آخِذٌ مِنْ حَالِ الْبَحْرِ فَأَدُسُّهُ فِيْ فَمِ فِرْعَوْنَ مَخَافَةَ أَنْ تُدْرِكَهُ الرَّحْمَةُ )) [ السلسلة الصحيحة : ۲۶/۵، ح : ۲۰۱۵۔ مسند طیالسی : ۲۶۱۸۔ ترمذی : ۳۱۰۸ ] ”مجھ سے جبریل علیہ السلام نے کہا، کاش! آپ مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کا سیاہ کیچڑ اٹھا کر فرعون کے منہ میں ٹھونس رہا تھا، اس خوف سے کہ کہیں اس کو رحمت نہ آ پہنچے۔“

6 یہ واقعہ دس محرم (عاشوراء) کو پیش آیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہودی عاشوراء کے دن کا روزہ رکھتے تھے، آپ نے فرمایا: (( مَا هٰذَا؟ قَالُوْا هٰذَا يَوْمٌ صَالِحٌ، هٰذَا يَوْمٌ نَجَّى اللّٰهُ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ مِنْ عَدُوِّهِمْ، فَصَامَهُ مُوْسٰى قَالَ فَأَنَا أَحَقُّ بِمُوْسٰى مِنْكُمْ، فَصَامَهُ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ )) [ بخاری، الصوم، باب صوم یوم عاشوراء : ۲۰۰۴ ] ”یہ کیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”یہ ایک صالح دن ہے، اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دلائی تھی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن کا روزہ رکھا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر میں تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھنے والا ہوں۔“ چنانچہ آپ نے اس (دن) کا روزہ رکھا اور اس کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔“ صحیح بخاری ہی کی دوسری روایت میں ہے: (( هٰذَا يَوْمٌ ظَهَرَ فِيْهِ مُوْسٰى عَلٰى فِرْعَوْنَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَصْحَابِهِ أَنْتُمْ أَحَقُّ بِمُوْسٰى مِنْهُمْ فَصُوْمُوْا )) [ بخاری، التفسیر، باب : ﴿ وجاوزنا ببني إسرائيل البحر ﴾ : ۴۶۸۰ ] ”اس دن موسیٰ علیہ السلام فرعون پر غالب آئے تھے، تو نبی ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ”تم ان (یہود) سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھتے ہو، پس روزہ رکھو۔“

**آیت 92** 1 **فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ** ......: ” نُنَجِّيْ “ ” نَجَا يَنْجُوْ “ سے باب تفعیل ہے۔ ” نَجَّاهُ اللّٰهُ “ ”اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا۔“ ”اَلنَّجْوَةُ“ یا ”اَلنَّجَا“ اونچی جگہ یا ٹیلے کو بھی کہتے ہیں۔ ” نَجَّاهُ “ کا معنی اس صورت میں یہ ہوگا کہ اس نے اسے اونچی جگہ پھینک دیا، یعنی آج ہم تمھارے بے جان لاشے کو سمندر سے بچالیں گے، یا اونچی جگہ پھینک دیں گے، تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنے۔ ”اٰيَةً“ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی فرعون اور اس کی ساری فوج کے غرق

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھکانا دیا، باعزت ٹھکانا، اور انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا، پھر انھوں نے آپس میں اختلاف نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس علم آگیا، بے شک تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے ﴿۹۳﴾

ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش سمندر کے کنارے پر باہر نکال پھینکی، تاکہ وہ بعد والوں کے لیے عظیم نشانی بنے اور بنی اسرائیل کے کمزور عقیدے والوں کو بھی خدائی کے دعوے دار کی حقیقت اور انجام آنکھوں سے دیکھنے کا موقع مل جائے اور فرعون اور اس کا سمندر میں غرق ہونے کا واقعہ بعد میں ہر اس شخص کے لیے قدرت کی عظیم نشانی بن جائے جو اس کو سنے یا پڑھے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ فرعون کی لاش مصر کے عجائب گھر میں اب تک محفوظ ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ اسی فرعون کی لاش ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس کی لاش محفوظ نہ بھی رہے تو تاریخ اور قرآن میں اس واقعہ کا ذکر ہی بعد والوں کے لیے بطور عبرت اور نشانی کافی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب سبت کو بندر بنانے کے متعلق فرمایا: ﴿ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾ [ البقرۃ : ٦٦ ] ''تو ہم نے اسے (یعنی اس واقعہ کو) ان لوگوں کے لیے جو اس کے سامنے تھے اور جو اس کے پیچھے تھے ایک عبرت اور ایک نصیحت بنا دیا۔'' حالانکہ ان میں سے کسی مسخ شدہ بندر کی کوئی ممی کہیں موجود نہیں۔ الغرض! یہ اس فرعون کی لاش نہ ہو تب بھی بعد والوں کے لیے اس واقعہ کے نشان عظیم ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

❷ ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''آج تک جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر اس مقام کی نشان دہی کی جاتی ہے، جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی۔ اس زمانے میں اس مقام کو جبلِ فرعون یا حمامہ فرعون کہا جاتا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابوزنیمہ (جہاں تانبے وغیرہ کی کانیں ہیں) سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے، آج قاہرہ کے عجائب گھر میں جن فرعونوں کی لاشیں موجود ہیں ان میں سے ایک فرعون کی لاش کو اسی فرعون کی لاش بتایا جاتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جب فرعونوں کی لاشیں دریافت ہوئی تھیں تو اس فرعون کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو سمندر کے کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی کھلی علامت تھی۔''

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جیسا وہ بے وقوف ایمان لایا بے فائدہ ویسا ہی اللہ نے مرنے کے بعد اس کا بدن دریا سے نکال کر ٹیلے پر ڈال دیا، تاکہ بنی اسرائیل دیکھ کر شکر کریں اور عبرت پکڑیں۔ اس کو بدن بچنے سے کیا فائدہ؟'' (موضح)

❸ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ: یعنی ان پر غور نہیں کرتے اور ان سے سبق حاصل نہیں کرتے، اگر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی بساط کیا ہے؟

آیت 93 ❶ وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ......: ''مُبَوَّاَ'' (ٹھکانا) کی ''صِدْقٍ'' کی طرف اضافت کا مطلب

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾

پھر اگر تو اس کے بارے میں کسی شک میں ہے جو ہم نے تیری طرف نازل کیا ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، بلاشبہ یقیناً تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا ہے، سو تو ہرگز شک کرنے والوں سے نہ ہو ﴿۹۴﴾

اس کی تعریف ہے، یعنی بہترین باعزت ٹھکانا۔ اہل عرب جس چیز کی تعریف کرنا چاہیں اسے "صِدْق" کی طرف مضاف کر دیتے ہیں، جیسے کہتے ہیں: "رَجُلُ صِدْقٍ" "سچ مچ کا آدمی۔" فرمایا: ﴿ أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ [ یونس: ۲ ] اور فرمایا: ﴿ وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ ﴾ [ بنی إسرائیل: ۸۰ ] یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو نہایت باعزت ٹھکانا، حکومت اور وافر صاف ستھری چیزیں کھانے کے لیے عطا فرمائیں۔ ان بنی اسرائیل سے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی مراد لینا تو مشکل ہے، کیونکہ وہ تو موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر جہاد کے لیے نکلنے سے صاف انکار کی پاداش میں چالیس سال صحرائے سینا ہی میں بھٹکتے رہے تھے، البتہ ان کے بعد یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں نئی نسل نے فلسطین اور شام اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق فتح کیے، وعدہ یہ تھا: ﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ [ المائدۃ: ۲۱ ] "اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے۔" پھر مصر پر بھی بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہوگئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ﴾ [ الشعراء: ۵۹ ] "ایسے ہی ہوا اور ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔" پھر بنی اسرائیل پر حکومت اور غلامی کے کئی دور آئے، کبھی داؤد اور سلیمان علیہما السلام جیسے عظیم الشان حکمران آئے اور کبھی بخت نصر اور دوسرے کفار کے ہاتھوں ان کی پامالی ہوئی اور اس پامالی کا سبب ہمیشہ ان کا اختلاف بنا، جس کا باعث ان کی لاعلمی نہ تھا بلکہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے وہ احبار و رہبان کو رب بنا کر مختلف سیاسی اور دینی فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ احادیث میں ان کے بہتر (۷۲) فرقوں کا ذکر ہے، ان میں صحیح کون تھا اور غلط کون! یہ فیصلہ اب قیامت کے دن رب تعالیٰ ہی فرمائیں گے۔

2 "فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ" کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اللہ کی کتاب تورات کی صاف پیش گوئی کے مطابق بنی اسرائیل کا اتفاق تھا کہ خاتم النبیین محمد ﷺ آنے والے ہیں، کسی کا بھی اختلاف نہ تھا اور کوئی اس سے لاعلم نہ تھا، بلکہ سب آپ کے آنے کے منتظر تھے اور آپ کے آنے کی دعا کرتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [ البقرۃ: ۸۹ ] "حالانکہ وہ اس سے پہلے ان لوگوں پر فتح طلب کیا کرتے تھے جنھوں نے کفر کیا۔" مگر جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کو پہچان لینے کے بعد محض ضد اور حسد کی وجہ سے ان کا اتفاق اختلاف میں بدل گیا۔ کسی نے کہا، وہ ہیں ہی نہیں جن کے آنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کسی نے کہا یہ ہمارے نہیں بلکہ صرف امیوں کے رسول ہیں۔ بعض خوش نصیبوں نے ایمان قبول بھی کر لیا، بہرحال علم کے بعد اختلاف کا فیصلہ اب رب تعالیٰ ہی فرمائیں گے۔

آیت 94 ﴿ فَإِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ ﴾ ...... اس سورت کا اصل موضوع رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا ثبوت اور مخالفین

وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور نہ کبھی ان لوگوں سے ہونا جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا، ورنہ تو خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا ﴿۹۵﴾ بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی، وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۹۶﴾

کے شبہات کی تردید ہے۔ یہاں سورت کے آخر میں پھر اصل موضوع کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ مشرکین عرب چونکہ ان پڑھ اور آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے، اس لیے ان کو توجہ دلائی کہ اگر تمھیں کوئی شک ہے، خود علم نہیں ہے تو ان علمائے یہود سے دریافت کر لو جو تورات وغیرہ کا آسمانی علم رکھتے ہیں۔ ان میں سے جو منصف مزاج اور اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ اقرار کریں گے کہ قرآن واقعی آسمانی کتاب اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، کیونکہ ان کی کتابوں میں جگہ جگہ آپ ﷺ کی بشارتیں موجود ہیں اور آپ کی علامات بیان کی گئی ہیں۔ الغرض! یہ خطاب تو آپ ﷺ سے ہے مگر مقصود مشرکین عرب کو توجہ دلانا ہے، ورنہ آپ کو اپنی رسالت پر شک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی مد نظر رہنی چاہیے کہ بعض اوقات ایک بات بطور فرض و تقدیر کی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع ایسا ہے، یعنی اگر فرض کریں آپ کو کوئی شک ہے تو اہل کتاب سے پوچھ لیں، ان کی کتابوں میں آپ کا واضح ذکر خیر موجود ہے، پھر شک کیسا؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ جب عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو؟ تو وہ اپنے تفصیلی بیان میں یہ بھی کہیں گے: ﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ﴾ [ المائدۃ: ۱۱۶ ] یعنی فرض کریں کہ میں نے یہ بات کہی تھی تو یا اللہ! تجھ سے تو اوجھل نہیں رہ سکتی۔ مطلب صاف ہے کہ میں نے یہ بات ہرگز نہیں کہی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو نہ شک تھا نہ آپ کو کسی اہل کتاب سے پوچھنے کی ضرورت تھی۔ ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ یہاں "كُنْتَ فِيْ شَكٍّ" میں ہر انسان کو براہ راست خطاب ہے، کیونکہ یہ کتاب ہر ایک کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔

**آیت 95** وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا ...... : یہاں بھی آپ ﷺ کو خطاب کر کے امت ہی کو سمجھایا جا رہا ہے۔

**آیت 96** اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ...... : اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک ارادہ و اختیار دیا ہے، جس کے مطابق وہ نیکی یا بدی میں سے جس پر چاہے عمل کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو شروع سے اب تک واقع ہوا، اسی طرح وہ آئندہ ہونے والی ہر بات کا بھی پورا علم رکھتا ہے اور اس کی رو سے اسے پہلے ہی معلوم ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار کو استعمال کرتے ہوئے کون حق کو قبول کرے گا اور کون کفر کی راہ اختیار کرے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس ازلی علم کو "كَلِمَتُ رَبِّكَ" کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کفر میں اور اللہ کی نافرمانی میں اس قدر غرق ہو جاتے ہیں کہ ان کی حق قبول کرنے کی استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کسی صورت ایمان نہیں لاتے، بلکہ وہ کفر ہی پر مریں گے اور ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انھیں ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوگی۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۶)، یٰس (۷) اور زمر (۱۹)۔

وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

خواہ ان کے پاس ہر نشانی آ جائے، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں ﴿۹۷﴾ سو کوئی ایسی بستی کیوں نہ ہوئی جو ایمان لائی ہو، پھر اس کے ایمان نے اسے نفع دیا ہو، یونس کی قوم کے سوا، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں ہٹا دیا اور انھیں ایک وقت تک سامان دیا ﴿۹۸﴾

**آیت 97** وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ ...... : یعنی کوئی بھی نشانی یا معجزہ آ جائے، وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ عذاب الیم دیکھ لیں، مگر اس وقت انھیں ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا، جیسا کہ فرعون اور اس کی قوم کو کچھ فائدہ نہیں ہوا اور اسی طرح دوسرے پیغمبروں کی امتوں کے کفار کو اللہ کا عذاب دیکھنے پر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۸۵) اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ اگر اس وقت ان کو چھوڑ دیا جائے تو وہ دوبارہ کفر کی روش پر چل نکلیں گے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۷، ۲۸)۔

**آیت 98** ① فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ ...... : یعنی کوئی ایسی بستی کیوں نہ ہوئی جو رسول کے عذاب سے ڈرانے پر ڈر جاتی اور عذاب آنے سے پہلے ایمان لے آتی، پھر اس کا ایمان اسے نفع دیتا، مگر ایسی کوئی بستی بھی نہ ہوئی، سب اس وقت ہی ایمان لائے جب ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا، سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے کہ یونس علیہ السلام کے کئی سال دعوت دینے کے باوجود جب وہ ایمان نہ لائے تو یونس علیہ السلام نے ان پر عذاب کے لیے بددعا کی اور انھیں آگاہ کر دیا کہ تم پر عذاب آنے ہی والا ہے اور خود وہاں سے ناراض ہو کر نکل گئے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۸۷) اور صافات (۱۴۰) قوم جانتی تھی کہ یونس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، ان کے نکل جانے سے وہ مزید ڈر گئے، اس لیے عذاب آنے سے پہلے ہی پوری بستی نے نہایت عاجزی کے ساتھ کفر سے توبہ کی اور یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئے، اب یہ ایمان چونکہ بروقت تھا، عذاب دیکھنے سے پہلے تھا، اس لیے اس ایمان نے انھیں یہ نفع دیا کہ ان سے عذاب ہٹا لیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی طبعی عمر تک دنیا کی زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ سورۂ صافات کی آخری آیات میں بھی ان کے ایمان لانے اور اس کے نافع ہونے کا ذکر ہے۔

② یہ کفار قریش اور اہل کتاب کو تنبیہ ہے کہ تمھیں یونس علیہ السلام کی قوم سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور عذاب سے پہلے ایمان لے آنا چاہیے، نہ کہ آل فرعون اور دوسری برباد ہونے والی قوموں کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔

③ تفسیر قاسمی میں ہے کہ یہ بات کہ عذاب کے بادل پہنچ گئے تھے، اندھیرا چھا گیا تھا، پھر انھوں نے توبہ کی، قرآن و حدیث میں کہیں مذکور نہیں اور نہ ہی عذاب آنے کے بعد ٹلتا ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰

اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً جو لوگ زمین میں ہیں سب کے سب اکٹھے ایمان لے آتے۔ تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا، یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں؟ ۝۹۹ اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ ایمان لائے مگر اللہ کے اذن سے اور وہ گندگی ان لوگوں پر ڈالتا ہے جو نہیں سمجھتے ۝۱۰۰

**آیت 99** ❶ وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ...... : یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فرشتوں کی طرح جنوں اور انسانوں کی فطرت بھی ایسی بنا دیتا کہ وہ کفر و نافرمانی کر ہی نہ سکتے، یا ان سب کے دل ایمان و طاعت کی طرف پھیر دیتا، لیکن اس طرح چونکہ جنوں اور انسانوں کو علیحدہ قسم کی حیثیت سے پیدا کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ (دیکھیے ہود: ۱۱۸، ۱۱۹۔ فاطر: ۸) اس لیے اس نے اپنی مرضی سے ان کی فطرت میں یہ چیز رکھی ہے کہ وہ عقل سے کام لے کر چاہیں تو ایمان و طاعت کا راستہ اختیار کریں یا چاہیں تو کفر و نافرمانی کا۔

❷ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ : یعنی ایمان دل کا معاملہ ہے، اس پر کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہی نہیں اور مجبور کرنا جائز بھی نہیں، فرمایا: ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [ البقرة : ۲۵۶ ] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔'' اگر آپ کسی کو زبردستی مسلمان بنا بھی لیں تو دل کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں بھی ایمان آ چکا ہے۔ نبی ﷺ کی ازراہ شفقت یہ زبردست خواہش تھی کہ اللہ کے سب بندے ایمان لے آئیں، اس لیے اس آیت میں آپ ﷺ کو یہ کہہ کر تسلی دی گئی کہ یہ چونکہ ہونے والی بات نہیں، اس لیے آپ کیوں اپنے آپ کو رنج و کرب میں مبتلا کرتے ہیں؟

**آیت 100** ❶ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ : یعنی جس طرح تکوینی طور پر دنیا کی کوئی نعمت کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، یعنی دنیا کی نعمتوں میں بھی اگرچہ آدمی کی محنت کا دخل ہے، مگر اللہ کے اذن کے بغیر کوئی محنت نہ ہو سکتی ہے اور نہ نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کسی شخص کو ایمان کی نعمت حاصل ہونے یا نہ ہونے کا انحصار بھی اللہ کے اذن پر ہے۔ کوئی شخص اس نعمت کو نہ خود پا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو عطا کر سکتا ہے، اس لیے اگر نبی چاہے بھی کہ تمام لوگوں کو مومن بنا دے تو نہیں بنا سکتا۔ نبی ﷺ کے چچا ابوطالب، نوح علیہ السلام کا بیٹا اور نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویاں اس کی مثال ہیں، اسی طرح بت گر آزر کا بیٹا ابراہیم، فرعون کی بیوی آسیہ، ابوجہل کا بیٹا عکرمہ اللہ کے اپنی مرضی سے ایمان کی نعمت عطا کرنے کی مثالیں ہیں۔

❷ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ : یعنی اگرچہ ایمان کی توفیق دینے یا نہ دینے کا کلی اختیار اللہ تعالیٰ ہی کو ہے،

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

کہہ تم دیکھو آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ موجود ہے۔ اور نشانیاں اور ڈرانے والی چیزیں ان لوگوں کے کام نہیں آتیں جو ایمان نہیں لاتے ﴿۱۰۱﴾ تو یہ لوگ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے ان لوگوں کے سے ایام کے جو ان سے پہلے گزر چکے۔ کہہ دے پس انتظار کرو، یقیناً میں (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں ﴿۱۰۲﴾ پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جو ایمان لائے، اسی طرح ہم پر حق ہے کہ ہم مومنوں کو نجات بخشیں ﴿۱۰۳﴾

مگر اس کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس نعمت سے انھی لوگوں کو محروم رکھتا ہے اور انھی کو کفر و شرک کی نجاست میں پڑے رہنے کے لیے چھوڑتا ہے جو اس کی عطا کردہ عقل سے کام نہیں لیتے اور جس راستے پر اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھتے ہیں اسی پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا پسند کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶، ۲۷)۔

**آیت 101** ① قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : یعنی ایمان لانے کے لیے زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی توحید کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴾ [ یوسف : ۱۰۵ ] ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴾ [ الذاریات : ۲۰ ] ''اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں۔''

② وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن کی قسمت ہی میں نہیں کہ وہ ایمان لائیں گے، انھیں نہ نشانیوں سے کچھ فائدہ ہوتا ہے نہ ڈرانے والی چیزوں یا ڈرانے والے پیغمبروں اور داعی حضرات سے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جو لوگ طے کر لیتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے ہم ہرگز اپنے باپ دادا کا راستہ چھوڑ کر ایمان نہیں لائیں گے، انھیں نشانیوں اور ڈرانے والے پیغمبروں سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ ''النُّذُرُ'' ''نَذِيْرٌ'' کی جمع ہے، ڈرانے والے معجزے ہوں یا آیات یا پیغمبر۔

**آیت 103،102** فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی کیا یہ مشرکین چاہتے ہیں کہ ان پر گزشتہ قوموں کی طرح عذاب آ جائے؟ فرمایا، ٹھیک ہے تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرنے والوں میں شامل ہوں، مگر یاد رکھو کہ پھر عذاب آنے پر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اور ایمان والوں کو ہر حال میں عذاب سے بچا لیتا ہے اور یہ اللہ پر حق ہے کہ وہ مومنوں کو ضرور ہی بچا لیتا ہے۔ بطور مثال دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۱۸) میں قوم عاد و ثمود کے عذاب میں سے ایمان اور تقویٰ والوں کو بچا لینے کا ذکر۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنا بڑا عذاب بھی آ جائے اہل خیر کا وجود زمین میں ہمیشہ رہتا ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

کہہ دے اے لوگو! اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو اور لیکن میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمھیں قبض کرتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان والوں سے ہو جاؤں ﴿۱۰۴﴾ اور یہ کہ تو اپنا چہرہ یکسو ہو کر اسی دین کی طرف سیدھا رکھ اور مشرکوں سے ہرگز نہ ہو ﴿۱۰۵﴾ اور اللہ کو چھوڑ کر اس چیز کو مت پکار جو نہ تجھے نفع دے اور نہ تجھے نقصان پہنچائے، پھر اگر تو نے ایسا کیا تو یقیناً تو اس وقت ظالموں سے ہوگا ﴿۱۰۶﴾

**آیت 104** قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ ...... : شک کا معنی یہ ہے کہ ذہن میں کسی چیز کے حق ہونے یا ناحق ہونے کا برابر امکان ہو، اگر اس کی ذہنی کیفیت کو ترازو میں تولا جائے تو وہ اسے نہ حق کہہ سکے نہ باطل۔ اب دنیا کے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا "اِنْ" اگر تمھیں میرے دین کے بارے میں کوئی بھی شک ہے۔ ''اگر'' کا لفظ بتاتا ہے کہ شک کی گنجائش تو نہیں لیکن فرض کرو کہ تمھیں اس میں کوئی شک ہے تو میرا اعلان سن لو کہ میں ایک اللہ کے سوا تمھارے معبودوں میں سے کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اللہ کی عبادت سے پہلے تمام باطل معبودوں کا انکار کیا گیا ہے، جیسے ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ میں ہے، پھر صرف ایک اللہ کی عبادت کا اعلان کیا گیا اور ساتھ ہی اس کی دلیل ذکر فرما دی: ﴿الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ﴾ ''وہ جو تمھاری روح قبض کرتا ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ زمر (۴۲) کوئی اور معبود یہ کام کرتا ہو تو سامنے لاؤ۔ ساتھ ہی اس میں دھمکی بھی ہے کہ اگر تم شرک پر قائم رہے تو اس اللہ کو کیا جواب دو گے جو تمھاری روح قبض کرتا ہے اور ہر حال میں تمھیں اسی کے پاس جانا ہے، پھر وہ تم سے نمٹ لے گا اور مجھے تو یہی حکم ہے کہ میں مومن بن کر رہوں اور اپنی پیشانی اس کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکاؤں، لہٰذا میری اور تمھاری راہ ایک دوسرے سے سراسر مختلف ہے۔

**آیت 105** وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ...... : "حَنِيْفًا" ''یکسو، ایک طرف ہو جانے والا'' یعنی تمام باطل معبودوں کو چھوڑ کر ایک اللہ ہی کا ہو جانے والا۔ حنیف بن کر مشرکین میں سے ہرگز نہ ہونے کی تاکید کا مطلب یہ ہے کہ عرب کے مشرک دینِ ابراہیم کے پیروکار ہونے کا دعویٰ رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو حنیف کہتے، پھر شرک بھی کیے جاتے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، حنیف بن مگر مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو اور ایک معنی یہ ہے کہ کسی طرح بھی مشرکین کے ساتھ شامل نہ ہو، نہ شرک جلی میں اور نہ شرک خفی میں۔ ریا کو شرک خفی کہا جاتا ہے۔

**آیت 106** ① وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ : اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا زمین و آسمان کی ہر زندہ

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کر لے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں، وہ اسے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے اور وہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰۷﴾

یا مردہ ہستی اور ہر جان دار یا بے جان چیز آ گئی۔ یہ مطلب نہیں کہ پہلے تو کسی بزرگ یا نبی کی قبر کے بارے میں یہ غلط عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ وہ نفع نقصان پہنچا سکتی ہے، پھر اسے سجدے کیے جائیں اور اس سے مرادیں طلب کی جائیں اور کہا جائے کہ ہم نفع نقصان کا اختیار رکھنے والوں ہی کو پکار رہے ہیں۔ اس آیت کی اس طرح تاویل کرنا اللہ کی کتاب سے کھیلنا اور اس کا مذاق اڑانا ہے۔ اس آیت کا صاف مطلب مشرکین کو سمجھانا ہے کہ ہر قسم کے نفع نقصان کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (فتح القدیر) اس سے اگلی آیت میں اس کی صراحت بھی آ رہی ہے۔ یہاں اگرچہ نبی ﷺ کو غیر اللہ کے پکارنے سے منع کیا گیا ہے، مگر درحقیقت پوری امت کو اس سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس شخص کو منع کرنا جس نے نہ وہ کام کیا ہو نہ کبھی کرنا ہو، اس کا مطلب دوسروں کو منع کرنے میں مبالغہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [ الزمر : ٦٥ ] ”اور بلاشبہ یقیناً تیری طرف وحی کی گئی اور ان لوگوں کی طرف بھی جو تجھ سے پہلے تھے کہ بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا۔“

2 فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ : کیونکہ شرک کے برابر کوئی ظلم نہیں، جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [ لقمان : ١٣ ] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ ظلم کا مطلب ہے: ”وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ“ کہ کسی چیز کو بے موقع اور غلط جگہ استعمال کرنا۔ تو عبادت جو صرف خالق کا حق ہے کسی مخلوق کو دینے سے بڑا ظلم اور بے انصافی کیا ہو سکتی ہے۔ یہاں ”اگر تو نے ایسا کیا“ سے مراد ہے کہ اگر تو نے اس کو پکارا جو نہ تجھے نفع دے نہ نقصان تو ظالموں میں سے ہو گا۔ یہ مضمون قرآن مجید کی کئی آیات میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی نہ کسی نفع کا مالک ہے نہ نقصان کا۔ دیکھیے سورۂ نمل (٦٢)، مائدہ (٧٦) اور سبا (٢٢) اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

**آیت 107** وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ...... : عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے (سوار) تھا، آپ نے فرمایا: (( يَا غُلَامُ ! إِنِّيْ أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

کہہ دے اے لوگو! بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، تو جو سیدھے راستے پر آیا تو وہ اپنی جان ہی کے لیے راستے پر آتا ہے اور جو گمراہ ہوا وہ اسی پر گمراہ ہوتا ہے اور میں تم پر ہرگز کوئی نگران نہیں ہوں ﴿۱۰۸﴾ اور اس کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کر، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کرے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۱۰۹﴾

عَلٰى أَنْ يَنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَ إِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى أَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَ جَفَّتِ الصُّحُفُ ﴾ [ ترمذی، صفۃ القیامۃ، باب : ۲۵۱٦ ۔ مسند أحمد : ۱/ ۲۹۳، ح : ۲٦۷۳، و صححہ الأئمۃ ] ”اے لڑکے! میں تمھیں چند باتیں سکھاتا ہوں، تو اللہ کا دھیان رکھ وہ تیرا دھیان رکھے گا، تو اللہ کا دھیان رکھ تو تو اسے اپنے سامنے پائے گا اور جب تو مانگے تو اللہ سے مانگ اور جب مدد مانگے تو اللہ سے مدد مانگ اور جان لے کہ بے شک اگر سارے لوگ جمع ہو جائیں کہ تجھے کسی چیز کا فائدہ پہنچائیں تو اس چیز کے سوا نہیں پہنچا سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دی ہے اور اگر وہ سب جمع ہو جائیں کہ تجھے کسی چیز کا نقصان پہنچائیں تو اس کے سوا تجھے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر لکھ دی ہے، قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔“ بعض اہل علم نے فرمایا کہ قرآن مجید کی تین آیات پر اگر کوئی محکم یقین کر لے تو ان شاء اللہ مخلوق سے مستغنی ہو جائے گا، ایک تو یہ آیت، دوسری : ﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَ مَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [ فاطر : ۲ ] ”جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے کسی بھی رحمت میں سے کھول دے تو اس کے بعد کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو اللہ بند کر دے اسے اس کے بعد کوئی کھولنے والا نہیں اور وہی سب پر غالب کمال حکمت والا ہے۔“ اور تیسری : ﴿ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ﴾ [ ھود : ٦ ] ”اور زمین میں کوئی چلنے والا (جان دار) نہیں، مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے اور وہی اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔“ بیہقی نے شعب الایمان میں عامر بن قیس کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی تین آیتوں نے مجھے سارے جہان سے بے نیاز کر دیا، پھر اوپر والی تین آیات ذکر فرمائیں۔ اس اثر کی سند تو کمزور ہے مگر آیات کے مضمون کے لحاظ سے اصل بات بلاشک و شبہ درست ہے۔

**آیت 108** وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ : یعنی میں تمھارا ذمہ دار نہیں ہوں کہ اگر تم سیدھی راہ پر نہ آؤ تو مجھ سے باز پرس ہو۔

**آیت 109** وَ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ ...... : یعنی آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کریں، خود بھی عمل کریں اور تمام لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیں، پھر اس کے نتیجے میں آنے والی بے پناہ مشکلات اور آزمائشوں پر صبر کریں، یہاں تک کہ

سورۃ ھود ۱۱ مکیۃ ۵۲ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — ایاتھا ۱۲۳ رکوعاتھا ۱۰

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

**الٓرٰ**۔ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں، پھر انھیں کھول کر بیان کیا گیا ایک کمال حکمت والے کی طرف سے جو پوری خبر رکھنے والا ہے ﴿۱﴾

اللہ تعالیٰ آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ فرما دے کہ دنیا میں غالب ہو کر کسے رہنا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے اور وہ فیصلہ اس نے قرآن میں کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴾ [ الصف : ۹ ] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک برا مانیں۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ لَا تَہِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۹ ] ”اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو اگر تم مومن ہو۔“ اب اگر مسلمان مغلوب ہیں تو ان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شرط ”اگر تم مومن ہو“ پر غور کریں اور صحیح مومن بنیں، تاکہ خیر الحاکمین کا فیصلہ ان کے حق میں ہو۔

## سورۂ ہود

آیت 1 ① **الٓرٰ** : دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔ اس سورت میں توحید کی دعوت، انبیاء کی اس دعوت کے دوران میں عزیمت اور ان پر گزرنے والے حالات و واقعات، انھیں جھٹلانے والوں کا بدترین انجام اور ان پر آنے والے عذابوں کے تذکرے اور اہل ایمان کی نجات اور ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے۔ چونکہ اس میں انذار (ڈرانے) کا پہلو غالب ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ پر اس کا بہت اثر ہوا، چنانچہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: « یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ شِبْتَ، قَالَ شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَالْوَاقِعَةُ وَالْمُرْسَلَاتُ وَ ﴿ عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴾ وَ ﴿ اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ﴾ » [ ترمذی، التفسیر، باب ومن سورۃ الواقعۃ : ۳۲۹۷۔ السلسلۃ الصحیحۃ : ۹۵۵ ] ”یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے۔“ فرمایا: ”مجھے ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون اور تکویر نے بوڑھا کر دیا۔“

② **کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ** : یہاں قرآن کریم کی چار صفات بیان ہوئی ہیں، پہلی یہ کہ یہ قرآن (پڑھا جانے والا مجموعہ) کتاب (لکھا ہوا مجموعہ) بھی ہے، دوسری یہ کہ اس کی آیات محکم یعنی خوب پختہ، مضبوط اور اٹل نازل کی گئی ہیں، جن میں کوئی عیب یا کمی نہیں اور نہ وہ (مجموعی اعتبار سے) منسوخ ہیں، نہ منسوخ ہوں گی اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی کتاب لائی جا سکتی ہے، خواہ ساری مخلوق جمع ہو جائے، ایسی محکم آیات والی کتاب صرف یہ ہے۔

③ **ثُمَّ فُصِّلَتۡ** : تیسری یہ کہ اس کی آیات ایسی واضح ہیں اور کھول کر بیان کی گئی ہیں کہ کسی آیت کے مفہوم میں ابہام یا پیچیدگی نہیں ہے، پھر ساری کتاب مختلف سورتوں اور آیتوں میں تقسیم ہے۔ ہر آیت جدا جدا ہے، اپنی جگہ مستقل، ایک بے حد خوبصورت

اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡهُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾

یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تمھارے لیے اس کی طرف سے ایک ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ﴿۲﴾

ہار کی طرح جو رنگا رنگ مضامین توحید، آخرت، نبوت، قصص کے موتیوں سے پرویا ہوا ہے اور وہ نہایت مناسب فاصلے، ترتیب اور حسن سے اپنی اپنی جگہ جگمگا رہے ہیں، پھر نزول میں بھی آیات اور سورتیں ضرورت کے مطابق الگ الگ نازل کی گئی ہیں۔ "فُصِّلَتۡ" میں یہ سب باتیں آ جاتی ہیں۔

④ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ : چوتھی یہ کہ یہ کسی انسان، فرشتے، جن یا کسی بھی مخلوق کی تصنیف نہیں، بلکہ اس ذات پاک کا کلام ہے جو حکیم ہے۔ حکیم کا ایک معنی پختہ و محکم بنانے والا ہے، جس کی بنائی ہوئی ہر چیز نہایت محکم، پختہ اور مضبوط ہے، فرمایا: ﴿صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ﴾ [ النمل : ۸۸ ] "اس اللہ کی کاری گری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔" یعنی پہاڑ اور ان کا قیامت کو بادلوں کی طرح چلنا اس اللہ کی کاری گری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ جب اس کی مخلوق کا یہ حال ہے تو اس کے کلام کے محکم ہونے کی کوئی حد ہو گی؟ حکیم کا دوسرا معنی حکمت، یعنی دانائی والا ہے، یعنی اس کی تمام آیات کمال حکمت اور دانائی سے پُر ہیں، خبیر یعنی ان کو اتارنے والا ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے۔

آیت 2 ① اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ : یعنی یہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بلکہ ہر رسول کو اللہ تعالیٰ نے اسی لیے بھیجا، فرمایا: ﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ﴾ [ الأنبياء : ۲۵ ] "اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔" سورۂ نحل (۳۶) میں بھی ہر رسول کے بھیجنے کا مقصد ایک اللہ کی عبادت کا حکم اور طاغوت سے اجتناب کی تاکید بیان فرمایا ہے۔

② اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡهُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ : چنانچہ آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے گھر والوں ام المومنین خدیجہ، زید، علی اور اپنے خاص دوست ابوبکر رضی اللہ عنہم کے سامنے اللہ کا حکم پیش کیا، وہ ایمان لے آئے، پھر جب یہ آیت اتری: ﴿وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ﴾ [ الشعراء : ۲۱٤ ] "اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرا" تو آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے قبائل کو آواز دے کر جمع کیا اور ان تک اللہ کا پیغام پہنچایا۔ [ بخاری : ٤۷۷۰ ] پھر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے تحت: ﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا﴾ [ سبا : ۲۸ ] تمام دنیا کے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور اس کے ثواب کی خوش خبری کا پیغام پہنچانے کا کام شروع کیا۔ چنانچہ دوسرے ملکوں سے پہلے جزیرۂ عرب کے لوگوں تک نرمی اور محبت کے ساتھ اور پھر جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے یہ پیغام پہنچایا اور ان سب کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کیا، پھر تمام دنیا کے بادشاہوں کو خطوط لکھے، جن میں بشارت بھی تھی اور نذارت بھی۔ چنانچہ روم کے فرماں روا ہرقل کو خوش خبری دی کہ تم مسلمان ہو جاؤ تو سلامت بھی رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمھیں دوہرا اجر دے گا اور ڈرایا بھی کہ اگر تم نے اسلام سے منہ موڑا تو تمھاری رعایا کے کفر کا

وَ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾

اور یہ کہ اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تمھیں ایک معین مدت تک اچھا سازوسامان دے گا اور ہر زیادہ عمل والے کو اس کا زیادہ ثواب دے گا اور اگر تم پھر گئے تو یقیناً میں تم پر ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۳﴾

---

بوجھ بھی تمھاری گردن پر ہو گا۔[بخاری : ۷] دوسرے تمام حکمرانوں تک بھی یہ پیغام پہنچایا، پھر آپ کے خلفاء نے مشرق سے مغرب تک یہ پیغام پہنچا دیا۔

**آیت 3** ① **وَ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ** : پچھلی آیت میں " اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ " سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں استغفار اور توبہ سے مراد غیر اللہ کی عبادت سے استغفار اور توبہ ہے، یعنی تم اللہ کے ساتھ جو بھی شرک اور اس کی نافرمانیاں کر چکے ہو ان کی معافی اور بخشش مانگو، مگر اس استغفار کا فائدہ تب ہے کہ ان گناہوں سے واپس پلٹ آؤ اور آئندہ کے لیے نہ کرنے کا خلوصِ دل سے عزم کرو، پھر اگر انسانی کمزوری سے کوئی گناہ ہو جائے تو پھر معافی مانگو اور ساتھ ہی آئندہ کے لیے خلوصِ دل سے پھر توبہ کرو اور یہ سلسلہ ساری زندگی ہر لغزش پر، خواہ کتنی بار بھی ہو جائے جاری رکھو۔ نہ گناہ کے بعد معافی مانگنے میں دیر کرو اور نہ معافی مانگنے کے ساتھ توبہ میں۔ تب استغفار اور توبہ کا فائدہ ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۷، ۱۸)۔

② **يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى** : اس میں استغفار اور توبہ کا کمال فائدہ بیان فرمایا ہے۔ یہ دنیا جسے اللہ تعالیٰ نے متاع غرور بتایا ہے، اسے اللہ تعالیٰ استغفار اور توبہ کرنے والے مومن کے لیے موت تک متاع حسن بنا دے گا۔ وہ دنیا کی نعمتوں سے سرفراز ہو کر بھی متاع غرور کے بجائے متاع حسن سے فائدہ اٹھائے گا۔ وہ استغفار اور توبہ کے ساتھ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بسر کرے گا، تو اس کی نفسانی لذتیں بھی اس کے لیے ثواب بن جائیں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (( وَلَسْتَ تُنْفِقُ نَفَقَةً تَبْتَغِيْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ إِلَّا أُجِرْتَ بِهَا ( وَ فِيْ رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ : فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ) حَتَّى اللُّقْمَةَ تَجْعَلُهَا فِيْ فِيْ امْرَأَتِكَ )) [ مسلم، الوصیۃ، باب الوصیۃ بالثلث : ۱۶۲۸۔ بخاری : ۲۷۴۲ ] "تم جو بھی خرچ کرو گے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہو گے، اس پر تمھیں اجر دیا جائے گا (بخاری کے الفاظ ہیں کہ وہی صدقہ بن جائے گا) یہاں تک کہ وہ لقمہ بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔" ایسے مومن کو دنیا میں حیاتِ طیبہ عطا ہوتی ہے (خواہ بظاہر وہ مصیبت میں گرفتار ہو) اور آخرت کا بہترین اجر عطا ہو گا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۹۷) عمل صالح اور استغفار کی بے شمار برکات اور فوائد ہیں، چند فوائد کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۵۲، ۶۱، ۹۰)۔

③ **وَ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ** : " فَضْلٍ " کا معنی زائد ہے، یعنی جو اطاعت اور نیک اعمال میں جتنا زیادہ ہو گا اسے اللہ تعالیٰ دنیا یا آخرت یا دونوں میں زیادہ اجر دے گا۔ اللہ کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، اس کا قاعدہ ہے کہ جو کوئی برائی کرتا ہے اس

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ④ اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا

اللہ ہی کی طرف تمھارا لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ④ سن لو! بلاشبہ وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں، تاکہ

کے لیے ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے اور جو نیکی کرتا ہے اس کے لیے کم از کم دس (۱۰) نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ کا کوئی حساب نہیں، فرمایا: ﴿ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ النور : ۳۸ ] ''اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔'' ایک مطلب یہ بھی ہے کہ صدقہ عموماً اپنی ضرورت سے زائد چیز ہی کا کیا جاتا ہے، تو ہر شخص جو اپنی ضرورت سے زائد چیز اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، تو اللہ تعالیٰ اسے ہرگز کمی نہیں ہونے دے گا، بلکہ اس کی زائد چیز ضرور اسے دے گا، پھر جو اپنی ضرورت کے باوجود صدقہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس پر کس قدر فضل فرمائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ )) [ مسلم، کتاب البر و الصلة، باب استحباب العفو و التواضع : ۲۵۸۸، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ] ''کوئی صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا۔''

③ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ : بہت بڑے دن کے عذاب سے، یعنی میں تم پر دنیا کے عذاب کے علاوہ آخرت کے دن کے عذاب سے بھی ڈرتا ہوں، جو بہت بڑا، یعنی پچاس ہزار سال کا دن ہے اور جس کے بعد پھر کفار کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے۔

**آیت 4** اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ...... : ''اِلَى اللّٰهِ'' کے پہلے آنے سے حصر پیدا ہو گیا، یعنی اگر تمھیں آخرت کے عذاب کا اس لیے خوف نہیں کہ تم اس دن کے منکر ہو تو یاد رکھو کہ اللہ کے سوا تم کہیں جا ہی نہیں سکتے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔ جب اس نے پہلی دفعہ تمھیں پیدا کیا تو دوبارہ اپنے پاس حاضر کیوں نہیں کر سکتا۔

**آیت 5** اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ ...... : ''يَثْنُوْنَ'' ''ثَنٰى يَثْنِيْ'' (ض) سے فعل مضارع جمع مذکر غائب ہے۔ اس کا معنی ہے دوہرا کرنا، موڑنا۔ دوسرے عدد کو ثانی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ واحد کو دو بنا دیتا ہے۔ ''لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ'' ''اِخْتَفٰى يَخْتَفِيْ'' کا معنی چھپنا اور استفعال کی سین اور تاء کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا۔ اسی طرح ''يَسْتَغْشُوْنَ'' میں بھی سین اور تاء کے اضافے نے معنی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق مشرکین کے جہل اور لاعلمی کی انتہا بیان ہوئی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کا حال بیان فرمایا: ﴿ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ۲۲ ] ''اور تم اس سے پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمھارے خلاف تمھارے کان گواہی دیں گے اور نہ تمھاری آنکھیں اور نہ تمھارے چمڑے اور لیکن تم نے گمان کیا کہ بے شک اللہ بہت سے کام جو تم کرتے ہو، نہیں جانتا۔'' گویا ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ سے چھپ کر بھی کچھ کام ہو سکتے ہیں جن کا اسے پتا نہ چلے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: (( اِجْتَمَعَ عِنْدَ الْبَيْتِ ثَقَفِيَّانِ وَ قُرَشِيٌّ، أَوْ قُرَشِيَّانِ وَ ثَقَفِيٌّ، كَثِيْرَةٌ شَحْمُ بُطُوْنِهِمْ قَلِيْلَةٌ فِقْهُ قُلُوْبِهِمْ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَتَرَوْنَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْمَعُ مَا

مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

اس سے اچھی طرح چھپے رہیں، سن لو! جب وہ اپنے کپڑے اچھی طرح لپیٹ لیتے ہیں وہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ۝

نَقُوْلُ ؟ قَالَ الْآخَرُ : يَسْمَعُ إِنْ جَهَرْنَا وَلَا يَسْمَعُ إِنْ أَخْفَيْنَا، وَ قَالَ الْآخَرُ : إِنْ كَانَ يَسْمَعُ إِذَا جَهَرْنَا فَإِنَّهُ يَسْمَعُ إِذَا أَخْفَيْنَا، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ﴾ » [ بخاري، التوحيد، باب قول الله عزوجل : ﴿ وما كنتم تستترون ...... ﴾ : ٧٥٢١ ] ”کعبہ کے پاس دو قریشی اور ایک ثقفی یا دو ثقفی اور ایک قریشی جمع ہوئے، جن کے پیٹوں کی چربی بہت تھی اور دلوں کی سمجھ بہت کم تھی، تو ان میں سے ایک نے کہا: ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ اسے سن رہا ہے؟“ دوسرے نے کہا: ”اگر ہم بلند آواز سے بات کریں تو سنتا ہے، اگر آہستہ کریں تو نہیں۔“ تو اگلے نے کہا: ”اگر وہ اس وقت سنتا ہے جب ہم بلند آواز سے بولتے ہیں تو یقیناً وہ اس وقت بھی سنتا ہے جب ہم آہستہ بات کرتے ہیں۔“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ﴾ [ حٰم السجدة : ٢٢ ] اس سے معلوم ہوا کہ کئی جاہل مشرکین یہ بھی سمجھتے تھے کہ آہستہ بات کریں تو اللہ تعالیٰ کو پتا نہیں چلتا۔

تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے، البتہ جب بھی اللہ کی ناراضگی والا کوئی کام کرتے تو خوب چھپ کر تاکہ اللہ تعالیٰ سے چھپے رہیں، اسے پتا نہ چل جائے، کبھی کپڑوں اور دیواروں کے پردے کے پیچھے، کبھی سینہ دوہرا کر کے حاصل ہونے والی پوشیدگی کے ذریعے سے، مثلاً ملاوٹ کرنے کے لیے، دھوکا دینے کے لیے یا کوئی اور شنیع فعل کرنے کے لیے سینہ دوہرا کر کے اپنے خیال میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے چھپا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یاد رکھو! خوب اچھی طرح کپڑے لپیٹ کر بھی تم جو کچھ کرتے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے، بلکہ اس سے بھی کہیں آگے جو کچھ سینوں کے حصار میں محفوظ دل کے اندر باتیں ہیں وہ انھیں بھی خوب جانتا ہے، اس لیے تمھارے یہ خیال اور یہ حرکات لغو اور باطل ہیں، ان کا تمھیں کچھ فائدہ نہیں۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ اوپر جو فرمایا تھا: ﴿ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴾ (اور اگر تم پھر جاؤ تو یقیناً میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں) وہاں ظاہری اور جسمانی طور پر منہ پھیرنا مراد تھا اور یہاں دل سے اعراض مراد ہے، کیونکہ سینے سے مراد دل ہوتا ہے، جیسا کہ ”عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ“ سے بھی ظاہر ہے۔ ”يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ“ گویا سینے کو موڑنا محاورہ ہے، مراد دل کو موڑنا، اعراض کرنا، غلط سوچنا، بے اصل شبہات سے اپنے دل کو تسلی دینا، عقائد حقہ سے اعراض کرنا وغیرہ ہے، کیونکہ یہاں صدور سے مراد علوم صدر ہیں۔ (فتح الرحمان از شاہ ولی اللہ) مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ

اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے

سینوں میں جو کفر و عناد رکھتے ہیں اسے چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ان کے چھپے ہوئے رازوں کی اطلاع نہ ہونے پائے۔ (شوکانی) یہ دونوں حوالے ہمارے استاذ مرحوم نے اشرف الحواشی میں نقل کیے ہیں۔ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور ہی مطلب منقول ہے کہ ایک صاحب نے ان سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ”کچھ لوگ اس سے حیا کرتے تھے کہ قضائے حاجت کے وقت اپنی شرم گاہوں کو آسمان کے سامنے ننگا کریں اور اپنی بیویوں سے جماع کریں تو شرم گاہوں کو آسمان کے سامنے ظاہر کریں، تو یہ آیت ان کے بارے میں اتری۔“
[ بخاری، التفسیر، باب: ﴿ألا إنهم يثنون صدورهم...... ﴾ : ٤٦٨١، ٤٦٨٢ ]

اس شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو غلبۂ حیا کی وجہ سے قضائے حاجت اور ہم بستری کے وقت ننگا ہونے سے پرہیز کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اس لیے وہ ایسے موقعوں پر شرم گاہ کو چھپانے کے لیے اپنے سینے کو دہرا کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رات کے اندھیرے میں جب وہ بستروں میں اپنے آپ کو ڈھانپ لیتے ہیں تو اس وقت بھی وہ ان کو دیکھتا اور ان کی چھپی اور علانیہ باتوں کو جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرم و حیا کا جذبہ اپنی جگہ بہت اچھا ہے، لیکن اس میں اتنا غلو اور زیادتی بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ جس ذات کی خاطر وہ ایسا کرتے ہیں اس سے تو وہ پھر بھی چھپ نہیں سکتے تو پھر اس طرح کے تکلف کا کیا فائدہ؟ اگرچہ یہ تفسیر حبر الامہ سے حدیث کی صحیح ترین کتاب صحیح بخاری میں آئی ہے اور بلاشبہ درست ہے، مگر اکثر مفسرین نے فرمایا کہ آیات کے سیاق کے مطابق یہ آیت کفار کے رویے ہی سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ پہلے اور بعد میں مسلسل انھی کا ذکر ہو رہا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے جو حیا کے جذبے سے ایسا کرتے تھے۔ اصول تفسیر میں اہل علم نے یہ بات واضح فرمائی ہے کہ صحابہ و تابعین کسی آیت کے متعلق جہاں بھی وہ منطبق ہوتی اور صادق آتی ہو کہہ دیتے ہیں ”نَزَلَتْ فِيْ كَذَا“ کہ یہ آیت فلاں چیز کے بارے میں اتری، اس لیے ایک ہی آیت کے کئی شان نزول صحابہ و تابعین سے مروی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہوتا بلکہ سبھی مراد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ آیت کے نزول کے وقت یا اس کے قریب ان میں سے کوئی ایک واقعہ یا چند واقعات ہی ظہور پذیر ہوئے ہوں اور دوسرے واقعات انطباق کی وجہ سے شان نزول قرار دے دیے گئے ہوں۔

**آیت 6** ① وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ...... : ”دَآبَّةٍ“ ”دَبَّ يَدِبُّ دَبِيْبًا“ سے اسم فاعل ہے، جس کا معنی آہستہ چلنا ہے۔ ہر جان دار خواہ مذکر ہو یا مؤنث، عاقل ہو یا غیر عاقل، سب پر ”دَآبَّةٍ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ﴾ [ النور: ٤٥ ] ”اور اللہ نے ہر چلنے والا (جان دار) ایک قسم کے پانی سے پیدا کیا، پھر ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے پیٹ پر

كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۶﴾

سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، سب کچھ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ ﴿۶﴾

چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو چار پر چلتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے پیٹ پر یا دو یا چار ٹانگوں پر چلنے والے تمام جانداروں کو ''دَآبَّۃٍ'' فرمایا۔

❷ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت اور احاطے کا بیان تھا کہ انسان کے ظاہر اور پوشیدہ احوال ہی نہیں، وہ تو دلوں کے خیالات تک سے واقف ہے۔ اس آیت میں اسی پر دلیل پیش کی ہے کہ ہر جان دار کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے روزی پہنچ رہی ہے، پھر اگر اللہ تعالیٰ کا علم وسیع نہ ہوتا تو روزی کا یہ بندوبست کیسے ممکن تھا؟ مگر اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ رزق اللہ کے ذمے ہے تو انسان اس کی کمائی اور تلاش کے لیے محنت نہ کرے، بلکہ رزق کے تمام خزانے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، مگر انسان کو محنت کا حکم ہے اور اسے وہ اسباب اختیار کرنا لازم ہے جن سے رزق حاصل ہوتا ہے، لیکن اس محنت اور ان اسباب پر بھروسا جائز نہیں، تمام اسباب مہیا کرنے کے بعد بھی بھروسا اور توکل صرف اللہ پر لازم ہے، کیونکہ وہ نہ چاہے تو تمام اسباب کے باوجود بندہ رزق سے محروم رہتا ہے اور اگر وہ چاہے تو بندہ کوئی سبب بھی مہیا نہ کر سکے تو وہ اسباب کے بغیر بھی روزی دے سکتا ہے۔ مگر حکم یہی ہے کہ رزق کی تلاش میں نکلو۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا )) [ ترمذی، الزهد، باب في التوكل على الله : ۲۳۴۴ ] ''اگر تم اللہ پر توکل (بھروسا) کرو جیسا اس پر توکل کا حق ہے تو یقیناً تمھیں اسی طرح رزق دیا جائے جیسے پرندوں کو دیا جاتا ہے، وہ صبح نکلتے ہیں تو خالی پیٹ ہوتے ہیں، شام کو آتے ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔'' اس حدیث میں صبح نکلنا کسب ہے اور یہ فکر نہ کرنا کہ کل کو کیا کھائیں گے، توکل ہے۔ بہرحال اسباب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِعْقِلْهَا وَ تَوَكَّلْ )) [ ترمذی، صفة القيامة، باب حديث اعقلها و توكل ...... ۲۵۱۷، عن أنس رضی اللہ عنہ ] ''اونٹنی کا گھٹنا باندھ اور توکل کر۔'' ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ أَجَلَهَا وَتَسْتَوْعِبَ رِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّ أَحَدَكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ يَّطْلُبَهٗ بِمَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يُنَالُ مَا عِنْدَهٗ إِلَّا بِطَاعَتِهٖ )) [ صحيح الجامع : ۲۰۸۵ ] ''بے شک روح القدس (جبریل علیہ السلام) نے میرے دل میں وحی کی کہ کوئی جان اس وقت تک فوت نہیں ہوگی جب تک اپنی مقررہ مدت پوری نہ کر لے اور اپنا پورا رزق حاصل نہ کر لے۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور (رزق کی) تلاش میں اچھا طریقہ اختیار کرو اور رزق ملنے میں دیر ہو جانا تم میں سے کسی کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ وہ اسے اللہ کی نافرمانی کے ذریعے تلاش کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ (نعمت اور جنت) ہے وہ اس کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔'' یہ ذہن بھی غلط ہے کہ تلاش اور کوشش کے بغیر رزق نہیں ملتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم

بہت سی مخلوق وہ ہے جسے اسباب اختیار کیے بغیر رزق مل رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۰)۔

③ وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا: یہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم ہی کا مزید بیان ہے۔ " مُسْتَقَرٌّ " اور " مُسْتَوْدَعٌ " کی تفسیر اگرچہ لوگوں نے مختلف بیان کی ہے، مگر الفاظ کے پیش نظر واضح مطلب یہی نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ تمام جگہیں بھی جانتا ہے جہاں انسان نے کچھ مدت کے لیے ٹھہرنا ہے، خواہ باپ کی پشت ہو یا ماں کا رحم، یا زمین کا کوئی حصہ جہاں اس نے زندگی میں ٹھہرنا ہے اور اللہ تعالیٰ وہ جگہیں بھی جانتا ہے جن کے سپرد انسان نے مرنے کے بعد ہونا ہے، خواہ وہ زمین میں کھودی ہوئی جگہ ہو یا کسی جانور کا پیٹ یا جو جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اس کے سپرد ہونے کے لیے لکھی ہے اور وہ سب کچھ اس کے لیے قبر ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو موت اور قبر دینے کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴾ [ عبس : ۲۱ ] ''پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا۔'' پھر قیامت کو زندہ ہو کر اسے دوزخ کے سپرد ہونا ہے یا جنت کے، یہ سب اس کے لیے " مُسْتَوْدَعٌ " (سونپے جانے کی جگہ) ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جان دار کی زندگی کے ہر حال کو بھی جانتا ہے اور موت کے بعد کے تمام حالات کو بھی۔ '' كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ '' سے مراد لوح محفوظ ہے۔

آیت 7 ① وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ: اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے کمال علم کو ثابت فرمایا اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال کا بیان ہے۔ آسمان و زمین کی چھ دنوں میں پیدائش کے متعلق دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴) اور حم السجدہ (۹ تا ۱۲)۔

② وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ: اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمان و زمین پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا، پھر سب سے پہلے کیا پیدا کیا؟ اس کے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہل یمن کے کچھ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر (کائنات) کی ابتدا کے متعلق پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهٗ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْءٍ )) [ بخاری، التوحید، باب : ﴿ و كان عرشه على الماء ﴾ : ۷۴۱۸ ] ''اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور ذکر (لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی۔'' عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ )) [ مسلم، القدر، باب حجاج آدم و موسٰی صلی اللہ علیہما وسلم : ۲۶۵۳ ] ''اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیریں آسمان و زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیں اور اس کا عرش پانی پر تھا۔''

سنن ترمذی (۳۱۰۹) اور ابن ماجہ (۱۸۲) کی روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''خلق کی پیدائش سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا؟'' اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَانَ فِيْ عَمَاءٍ مَا تَحْتَهٗ هَوَاءٌ وَمَا فَوْقَهٗ هَوَاءٌ ))

اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔ اور یقیناً اگر تو کہے کہ بے شک تم موت کے بعد اٹھائے جانے والے ہو تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ضرور ہی کہیں گے یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ۝

''عَمَاء'' کا معنی نہایہ میں لکھا ہے، بادل، پتلا سا بادل یا نامعلوم چیز، جس کی حقیقت سے ہم ناواقف گویا اُمّی ہیں۔ حدیث کا ترجمہ ہے: ''اللہ تعالیٰ ایک عماء (نامعلوم چیز) میں تھا، اس کا اوپر خالی تھا اور اس کے نیچے بھی خلا تھا۔'' مگر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اور ان سے پہلے رازی اور دوسرے اہل علم رحمہم اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے، جبکہ استدلال خصوصاً عقیدے میں اور اتنے اہم مسئلہ میں صحیح حدیث ہی سے ہو سکتا ہے۔ صحیح حدیث جس سے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے، یہ ہے کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: (( إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالَى الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اكْتُبْ فَقَالَ رَبِّ وَ مَاذَا أَكْتُبُ؟ قَالَ اكْتُبْ مَقَادِيْرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ )) [ أبو داوٗد، السنة، باب في القدر : ۴۷۰۰۔ ترمذی: ۲۳۱۹ ] ''بے شک اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو پیدا کیا قلم تھا تو اسے فرمایا: ''لکھ۔'' اس نے کہا: ''اے میرے رب! میں کیا لکھوں؟'' فرمایا: ''ہر چیز کی تقدیریں لکھ، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔'' یہ حدیث صحیح ہے، شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہی (بات) صحیح ہے، البتہ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے قلم کی پیدائش اور تقدیر کا لکھا جانا پانی اور عرش کے بعد لکھا ہے۔ شاید ان کا استدلال اس آیت: ﴿ وَ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ﴾ سے ہو۔ (واللہ اعلم) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی قلم سے پہلے عرش اور پانی کے پیدا کیے جانے کا ذکر کیا ہے اور اس کے کچھ دلائل ذکر کیے ہیں۔ دیکھیے فتح الباری میں '' كِتَابُ بَدْءِ الْخَلْقِ '' کا پہلا باب۔ ایک روایت میں ہے کہ سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا، مگر وہ روایت ضعیف ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''المنار المنیف'' میں لکھا ہے کہ عقل کے متعلق تمام احادیث باطل ہیں۔

❷ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا : اللہ تعالیٰ کو جس طرح گزشتہ اور موجودہ ہر بات کا علم ہے، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ آئندہ کیا ہو گا، مگر آئندہ ہونے والی چیز کے متعلق یہ علم کہ وہ واقع ہو چکی ہے، اس کے واقع ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ آزمانے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق جو کچھ آئندہ ہونا ہے وہ وجود میں آ کر سب کے سامنے آ جائے اور نتیجہ دوسروں کے سامنے بھی ظاہر ہو جائے۔ قرآن مجید میں '' لِيَعْلَمَ '' اور '' لِيَبْلُوَكُمْ '' وغیرہ الفاظ جہاں بھی آئے ہیں ان سے مراد یہی ہے۔

❸ اَحْسَنُ عَمَلًا : یعنی آزمائش یہی نہیں کہ عمل میں برا کون ہے اور اچھا کون، بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا قدر دان ہے کہ عمل میں اچھائی کے درجات کو بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ زیادہ اچھا کون ہے، جیسے فرمایا: ﴿ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۶۳ ] ''وہ لوگ (اللہ کی رضا چاہنے والے) اللہ کے ہاں کئی درجوں والے ہیں اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔'' بلکہ برے عمل میں بھی سب کو ایک جیسا نہیں رکھا، منافقین آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہیں، جبکہ

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹

اور بلاشبہ اگر ہم ان سے عذاب کو ایک گنی ہوئی مدت تک مؤخر کر دیں تو یقیناً ضرور کہیں گے اسے کیا چیز روک رہی ہے؟ سن لو! جس دن وہ ان پر آئے گا تو ان سے ہٹایا جانے والا نہیں اور انھیں وہ چیز گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ⑧ اور یقیناً اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھائیں، پھر اسے اس سے چھین لیں تو بے شک وہ یقیناً نہایت ناامید، بے حد ناشکرا ہوتا ہے ⑨

---

ابو طالب صرف آگ کے جوتے پہنے ہوئے ہے۔ رہی یہ بات کہ کیسے پتا چلے گا کہ میں اچھا عمل کر رہا ہوں تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کے بتانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اس لیے اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ اچھے عمل کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، دوسری یہ کہ کتاب و سنت کے مطابق ہو، کیونکہ اس میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ہے۔

④ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ...... : اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور خلق (پیدا کرنے) جیسی صفات کو با دلائل ذکر کرنے کے بعد بھی اگر آپ ان مشرکوں سے کہیں کہ اتنی زبردست قوتوں والے رب نے تمھیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت، زمین و آسمان اور خود ان کو پیدا کرنے اور عرش عظیم کا مالک ہونے کو جاننے اور ماننے کے باوجود دوبارہ زندہ کرنے کی بات کرنے پر عقل و دانش سے مکمل عاری ہو کر کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں، یعنی دوبارہ زندہ ہونے کی کچھ حقیقت نہیں، جو لوگ اسے مان بیٹھے ہیں ان پر جادو ہو گیا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ پھر تم اس جادو کی زد میں آنے سے کیسے بچ گئے؟

**آیت 8** وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ ......: "اُمَّةٍ" کے بہت سے معانی ہیں، مثلاً جماعت، امام، طریقہ، مدت اور راستہ وغیرہ، یہاں مدت مراد ہے اور "مَعْدُوْدَةٍ" کا معنی تھوڑی سی ہے، کیونکہ زیادہ چیز کی گنتی نہیں ہوا کرتی اور جو چیز گنی جا سکے وہ آخر ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا کے عذاب بدر، احد، خندق، فتح مکہ، قتل، قید، غلامی اور پھر مرنے کے بعد جہنم کے عذاب آنے میں گنتی ہی کے دن ہیں، مگر آ جانے کے بعد پھر وہ عذاب ہٹایا نہیں جا سکے گا اور وہی عذاب جسے وہ مذاق کیا کرتے تھے انھیں چاروں طرف سے گھیر لے گا۔

**آیت 9** وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ...... : یعنی انسان میں یہ کمزوری ہے کہ کوئی رحمت صرف چکھنے کے بعد، یعنی تھوڑی سی نعمت صرف کچھ دیر کے لیے ملنے کے بعد چھن جائے تو اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتیں اس طرح بھولتا ہے کہ آئندہ کے لیے اس کی تمام نعمتوں سے نہایت ناامید ہو جاتا ہے اور گزشتہ اور موجودہ کوئی نعمت اسے یاد ہی نہیں رہتی۔ یہی اس کی ناشکری اور نعمت کا انکار ہے۔ شوکانی نے فرمایا کہ "اَذَقْنَا" کے لفظ سے ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت تھوڑی سی مدت کے لیے ملنا واضح ہو رہا ہے۔

وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۙ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ ضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ﴿۱۲﴾

اور بے شک اگر ہم اسے کوئی نعمت چکھائیں کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو تو یقیناً ضرور کہے گا سب تکلیفیں مجھ سے دور ہو گئیں۔ بلاشبہ وہ یقیناً بہت پھولنے والا، بہت فخر کرنے والا ہے ﴿۱۰﴾ مگر وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے، یہ لوگ ہیں جن کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۱﴾ پھر شاید تو اس کا کچھ حصہ چھوڑ دینے والا ہے جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے تیرا سینہ تنگ ہونے والا ہے کہ وہ کہیں گے اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا، یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا؟ تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے ﴿۱۲﴾

**آیت 10** وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ ......: "نَعْمَآءَ" ایسی نعمت جس کا اثر صاحب نعمت پر ظاہر ہو۔ اسی طرح "ضَرَّآءَ" ایسی مصیبت جس کا برا اثر انسان پر ظاہر ہو۔ (طنطاوی) "اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ" یعنی بہت پھولنے اور اترانے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب تمام مصیبتیں اور سختیاں دور ہو گئیں۔

**آیت 11** اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یعنی صابر مومن کا یہ حال نہیں، وہ نہ راحت میں پھولتا ہے اور نہ مصیبت میں رب کی نعمتوں کو بھولتا ہے۔ یہی بات سورۂ معارج (۱۹ تا ۳۵) میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ، وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ )) [ مسلم، الزھد، باب المؤمن أمرہ کلہ خیر : ۲۹۹۹ ] "مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر کام ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے، سو وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، سو وہ بھی اس کے لیے خیر ہوتی ہے۔"

**آیت 12** ① فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ ......: کفار ہر وقت کوئی نہ کوئی معجزہ لانے کی فرمائش کرتے رہتے تھے کہ آپ پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ چلیے آپ احد پہاڑ ہی سونے کا بنا دیجیے، یا کوئی فرشتہ ہی ساتھ لے آئیے۔ ان کی عجیب وغریب فرمائشوں کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) اور سورۂ فرقان (۷، ۸) میں کچھ تفصیل کے ساتھ ہے۔ ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے شبہات، مطالبات اور طعن و تشنیع سے تنگ آ کر آپ پریشان اور غم زدہ نہ ہو جائیں، بلکہ شرک کی مذمت کے لیے اور توحید کے اثبات کے لیے جو بھی وحی آئے آپ کسی بھی کمی بیشی کے بغیر ان تک پہنچاتے رہیں۔ یہ نہ ہو کہ وحی کا وہ حصہ حذف کر دیں جس میں بتوں کی عیب جوئی اور شرک کی مذمت ہے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ‌ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ وَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے۔ کہہ دے پھر اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۱۳﴾ پس اگر وہ تمھاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ صرف اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم حکم ماننے والے ہو؟ ﴿۱۴﴾

② اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِيۡرٌ : یعنی آپ کو اللہ تعالیٰ نے محض عذاب سے ڈرانے کے لیے بھیجا ہے، لہٰذا کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا کیے بغیر آپ اس فریضہ کو سرانجام دیتے رہیں۔

③ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ : یعنی ان کے مطالبات کو پورا کرنا یا نہ کرنا اللہ کا کام ہے، ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو آپ کو ایک خزانہ کیا روئے زمین کے تمام خزانے دے دے گا اور ایک فرشتہ کیا آپ پر سیکڑوں فرشتے اتار دے گا۔ بہرحال جیسی اس کی مصلحت اور حکمت ہوگی ویسا ہی کرے گا، آپ کو ان چیزوں سے کیا غرض؟ ہر چیز کا نگران وہ خود ہے۔ آپ تو اللہ تعالیٰ کا جو حکم آئے بے دھڑک ان کو سناتے رہیں۔

**آیت 13** اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ‌ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ ...... : یعنی اگر تمھیں اس قرآن کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے میں شک وشبہ ہے تو تم سب جمع ہو کر اس چیلنج کا جواب دینے کی کوشش کر دو۔ واضح رہے کہ قرآن میں متعدد مرتبہ اہل عرب کو چیلنج کیا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل (۸۸) اور سورۂ طور (۳۴) میں پورے قرآن کی مثل لانے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہاں سورۂ ہود میں دس سورتوں کا چیلنج کیا گیا ہے، پھر سورۂ یونس اور بقرہ میں ایک سورت کا۔ لیکن اہل عرب پورا قرآن یا دس سورتیں تو کیا ایک سورت بھی بنا کر پیش نہ کر سکے۔ یہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ (ابن کثیر) یاد رہے کہ قرآن مجید کا معجز ہونا، یعنی اس جیسی ایک سورت کی تصنیف بھی ناممکن ہونے کی وجہ قرآن مجید کی بے شمار خوبیاں ہیں، جو مخلوق کی بساط سے باہر ہیں۔ مسلم علماء نے اس پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جن کا عنوان ہی ''اعجاز القرآن'' (از باقلانی، صالح بن عبد العزیز وغیرہ) یا اس سے ملتا جلتا ہے۔ ان خوبیوں میں اس کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ اس کے انداز بیان کا اللہ کی شان کے مطابق جلال و جمال، اس کی کسی پیش گوئی یا خبر کا غلط نہ ہونا، اس کی آیات کا ایک دوسرے سے ٹکرانے سے پاک ہونا اور اس کی جامعیت وغیرہ بھی شامل ہیں۔

**آیت 14** فَاِلَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا ...... : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اے مسلمانو! اگر وہ کفار تمھارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کر لو کہ یہ صرف اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم حکم ماننے والے ہو؟ یعنی اپنی کتاب کی حقانیت اس قدر واضح اور روشن ہونے پر تمھارے ایمان و یقین اور اس پر عمل میں اضافہ ہونا لازم ہے، تو

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَ زِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَ هُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتا ہو ہم انھیں ان کے اعمال کا بدلہ اسی (دنیا) میں پورا دے دیں گے اور اس (دنیا) میں ان سے کمی نہ کی جائے گی ﴿۱۵﴾ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہو گیا جو کچھ انھوں نے اس میں کیا اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے تھے ﴿۱۶﴾

---

کیا تم ایسا کرو گے؟ یا ایمان لانے کے باوجود حکم ماننے میں کوتاہی کرتے رہو گے؟ دوسرا معنی یہ ہے کہ پچھلی آیت میں مشرکین کو جو فرمایا تھا: ﴿ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ﴾ کہ اللہ کے سوا جسے بلا سکتے ہو بلا لو، اس کے بعد اب فرمایا، اگر وہ تمام لوگ جنھیں تم اس کام کے لیے بلاؤ گے، مثلاً عرب کے بڑے بڑے فصحاء، بلغاء، شعراء، خطباء اور تمھارے تمام داتا اور دستگیر، اگر ان میں سے کوئی بھی تمھاری بات قبول نہ کرے اور "اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ" جیسی تین آیات بھی نہ بنا سکیں تو پھر تمھیں لازم ہے کہ ایک تو اس بات پر یقین کر لو کہ یہ کتاب اللہ کے علم سے نازل کی گئی ہے، اس کی مثل لانا مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ دوسرا اس بات پر یقین کر لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ تو اے جماعت کفار! پھر کیا تم اسلام قبول کرو گے یا اب بھی ضد اور عناد ہی پر اڑے رہو گے؟

آیت 16،15 مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَ زِيۡنَتَهَا ...... : یہ دو آیات کفار اور مشرکین کے بارے میں ہیں، کیونکہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ لَيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ﴾ "ان کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں۔" مطلب یہ ہے کہ جو کفار یہاں دنیا طلبی کے لیے صدقہ وخیرات وغیرہ اور نیک عمل کرتے ہیں، جن کا تعلق رفاہ عامہ سے ہے، انھیں ان کاموں کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دے دیا جاتا ہے، لیکن یہ بدلہ ملنا اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلٰٮهَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴾ [ بنی اسرائیل : ۱۸ ] "جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہو گا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا۔" اسی معنی کی ایک اور آیت سورۂ شوریٰ (۲۰) میں بھی ہے۔ کفار کو دنیا میں کسی نیکی کا فائدہ آخرت میں عذاب کم ہونے کی صورت میں تو ہو سکتا ہے، لیکن ان کا آگ سے نکلنا کسی صورت ممکن نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت اور آپ ﷺ کی سفارش کی وجہ سے ابوطالب کے عذاب میں تخفیف ہو گی، مگر وہ آگ سے نکل نہیں سکے گا۔ اسی طرح آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر میں زیادتی اور کمی کی وجہ سے جہنم میں کفار کے عذاب میں کمی بیشی ہو گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہو اور اس کی طرف سے ایک گواہ اس کی تائید کر رہا ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی جو امام اور رحمت تھی، یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور گروہوں میں سے جو

[ النساء : ۱٤٥ ] ''بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔'' نیکی کی کمی بیشی کی وجہ سے جنت کے درجات اور بدی کی کمی بیشی کی وجہ سے جہنم کے درکات میں فرق ہوگا۔ البتہ کفار کی کوئی نیکی انھیں جہنم سے نہیں نکال سکے گی، کیونکہ آخرت میں نیک عمل کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر کی دوسری آیت کی تفسیر۔

علمائے تفسیر نے ان دو آیتوں کو عام بھی مانا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں منافق اور ریا کار بھی شامل ہیں کہ ان کے عمل بھی آخرت میں اکارت جائیں گے۔ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعْمَتَهٗ فَعَرَفَهَا، قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا، قَالَ قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُّقَالَ جَرِيْءٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ )) [ مسلم، الإمارة، باب من قاتل للرياء... : ۱۹۰۵ ] ''قیامت کے دن ایک شہید کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ انھیں پہچان لے گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تو نے ان کے لیے کیا کیا؟'' وہ کہے گا: ''یا اللہ! میں نے لڑتے لڑتے تیری راہ میں جان دے دی۔'' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''تو نے جھوٹ کہا، تو نے محض اس لیے جنگ کی تھی کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، چنانچہ تجھے یہ داد مل گئی۔'' پھر حکم ہوگا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریا کار قاری اور ریا کار دولت مند کے متعلق بھی یہی بیان فرمایا۔ واضح رہے کہ اگر اس آیت کو عام رکھا جائے تو ''لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ'' (ان کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں) کی تاویل کی جائے گی کہ کفار اور منافقین کے لیے تو دائمی جہنم ہے، مگر مسلمان گناہ گار سزا کے بعد جہنم سے نکل بھی آئیں گے اور بعض کو اللہ تعالیٰ معاف بھی کر دے گا، اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔

**آیت 17** ① اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ......: ''يَتْلُوْهُ'' ''تَلَا يَتْلُوْ'' کا معنی ہے پیچھے آنا، مراد اس کی تائید کرنا ہے۔ اس آیت کی مفسرین نے کئی تفسیریں کی ہیں، ان میں سے دو تفسیریں زیادہ درست معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے واضح اور درست تفسیر تو یہ ہے کہ کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ''بَيِّنَةٍ'' (واضح دلیل) پر ہے، اس شخص سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبع مومن ہیں۔ ''بَيِّنَةٍ'' سے مراد نبوت کی نشانیاں اور دلائل ہیں اور ''يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ'' (اس کی طرف سے ایک گواہ اس کی تائید کر رہا ہو) میں ''شَاهِدٌ'' سے مراد قرآن مجید ہے جو آپ کے صدق کا شاہد ہے اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب سے مراد تورات ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دے رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ رسول اور اس کے پیروکار جو اپنے رب کی طرف سے دلیل پر ہیں، ان لوگوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کے پاس نہ رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل ہے، نہ کوئی شاہد اور نہ کوئی اور پہلی آسمانی کتاب جو ان کی تائید کرے۔ یہ مطلب سب سے درست اس لیے کہا گیا ہے

وَرَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

اس کا انکار کرے تو آگ ہی اس کے وعدے کی جگہ ہے۔ سو تو اس کے بارے میں کسی شک میں نہ رہ، یقیناً یہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۱۷﴾

---

کہ اسی سورۂ ہود میں تقریباً ہر نبی نے یہ کہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک "بَيِّنَةٍ" پر ہوں۔ دیکھیے نوح علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴾ [ ھود : ۲۸ ] "اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک (بینہ) واضح دلیل پر (قائم) ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے بڑی رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تم پر مخفی رکھی گئی ہو، تو کیا ہم زبردستی اسے تم پر چپکا دیں گے، جب کہ تم اسے ناپسند کرنے والے ہو۔" صالح علیہ السلام نے کہا: ﴿ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ ﴾ [ ھود : ۶۳ ] شعیب علیہ السلام نے کہا: ﴿ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ ﴾ [ ھود : ۸۸ ] غرض ہر پیغمبر یہ کہتا رہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے "بَيِّنَةٍ" پر ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر پیغمبر کو اس کی نبوت کی واضح نشانی دے کر بھیجتے تھے اور قرآن مجید کا معجزہ، جس کی ایک سورت کی مثال پیش نہ کی جا سکی، وہ اللہ کی طرف سے آپ کا شاہد ہے۔ اسی طرح تورات بھی آپ کے حق ہونے کی شاہد ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "بَيِّنَةٍ" سے مراد عقل سلیم اور وہ فطرت سلیمہ ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور وہ عہد "اَلَسْتُ" ہے جس کا ہر شخص اپنے آپ پر شاہد بنایا گیا ہے اور وہ ہے توحید الٰہی اور اپنے رب کی پہچان، فرمایا: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ [ الأعراف : ۱۷۲ ] "کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ )) [ بخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين : ۱۳۸۵ ] "ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔" یعنی کیا وہ لوگ جو فطرت سلیمہ پر قائم ہیں، عقل سلیم سے کام لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک گواہ بھی آ چکا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن اور اس سے پہلے تورات بھی اس کی شہادت دے رہی ہے، جو رہنما بھی تھی اور رحمت بھی، تو کیا یہ لوگ ان کی طرح ہیں جن کے پاس نہ رب کی طرف سے کوئی "بَيِّنَةٍ" ہے، نہ کوئی اس کی طرف سے شاہد اور نہ گزشتہ کسی آسمانی کتاب کی شہادت۔ ہرگز نہیں، ایک مومن دوسرا کافر، دونوں ایک جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔

② اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ : یعنی یہ "بَيِّنَةٍ" پر قائم لوگ اس رسول پر ایمان لاتے ہیں۔

③ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ : اور جو اس کے ساتھ کفر کرے، خواہ وہ کسی گروہ عیسائی، یہودی، ہندو یا بدھ وغیرہ سے تعلق رکھتا ہو، اس کا ٹھکانا آگ ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ ! لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ )) [ مسلم، الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد ﷺ ... : ۱۵۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ]

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر کوئی جھوٹ باندھے؟ یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور گواہ کہیں گے یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿۱۸﴾

’’قسم اس کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! میرے بارے میں اس امت (دعوت) میں سے کوئی یہودی یا نصرانی سن لے پھر وہ فوت ہو اور اس پر ایمان نہ لایا ہو جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے، تو وہ اصحاب النار سے ہوگا۔‘‘ مشرکین اور نام کے مسلمان، جو دل سے آپ کی رسالت کو نہیں مانتے، وہ بھی انھی میں شامل ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۲) اور نساء (۱۵۰ تا ۱۵۲)۔

④ **فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ** : بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے، مگر مراد ہر عاقل ہے۔

⑤ **وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ** : اکثریت کا یہ حال قرآن میں متعدد بار بیان ہوا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۳)، انعام (۱۱۶) اور سبا (۲۰) دین جمہوریت اور دین اسلام کو ایک قرار دینے والے غور فرمائیں۔

**آیت 18** ① **وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا** : یعنی اپنی جان پر ظلم کرنے والے بہت ہیں، مگر اس سے بڑھ کر کوئی نہیں جو جھوٹ گھڑ کر اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دے، مثلاً مخلوق کو خالق کی صفات رکھنے والا قرار دے، بتوں، ولیوں اور دیوتاؤں کو اللہ کے حضور بلا اجازت سفارش کی جرأت رکھنے والے سمجھے، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے اور مسیح علیہ السلام یا کسی اور کو اللہ کی اولاد یا اس کا حصہ یا ٹکڑا قرار دے۔ موضح میں ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنا کئی طرح سے ہے، مثلاً علم میں غلط نقل کرنا۔ (آل عمران : ۷۸) نبوت یا وحی کا جھوٹا دعویٰ کرنا۔ (انعام : ۹۳) خواب بنا لینا، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ مِنْ أَفْرَى الْفِرَى أَنْ يُرِيَ عَيْنَيْهِ مَا لَمْ تَرَ )) [ بخاري، التعبير، باب من كذب في حلمه : ۷۰۴۳ ] ’’سب سے بڑے جھوٹوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھائے جو انھوں نے نہیں دیکھی (یعنی جھوٹا خواب بیان کرے)۔‘‘ درایت یا عقل کو دین کے معاملات میں درمیان لے آنا۔ (قصص : ۵۰)

② **اُولٰٓىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ** : اللہ تعالیٰ ایسے مفتری اور جھوٹے کفار و مشرکین اور منافقین کو قیامت کے دن سب کے سامنے رسوا کرے گا اور گواہ بھی سب کے سامنے ان کے رب تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کی شہادت دیں گے۔ البتہ مومن گناہ گاروں کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا : (( إِنَّ اللّٰهَ يُدْنِي الْمُؤْمِنَ فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهُ وَيَسْتُرُهُ فَيَقُوْلُ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا ؟ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ فَيَقُوْلُ نَعَمْ أَيْ رَبِّ، حَتّٰى قَرَّرَهُ بِذُنُوْبِهِ وَرَأٰى فِيْ نَفْسِهِ أَنَّهُ هَلَكَ، قَالَ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ، فَيُعْطٰى كِتَابَ حَسَنَاتِهِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ وَالْمُنَافِقُوْنَ فَيَقُوْلُ الْأَشْهَادُ : ﴿ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [ هود : ۱۸ ] )) [ بخاري، المظالم، باب قول الله تعالى : ﴿ ألا لعنة الله على الظالمين ﴾ : ۲۴۴۱ ]

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اور آخرت کے ساتھ کفر کرنے والے بھی وہی ہیں ﴿۱۹﴾ یہ لوگ کبھی زمین میں عاجز کرنے والے نہیں اور نہ کبھی ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار ہیں، ان کے لیے عذاب دگنا کیا جائے گا۔ وہ نہ سننے کی طاقت رکھتے تھے اور نہ دیکھا کرتے تھے ﴿۲۰﴾

''اللہ تعالیٰ مومن کو قریب کرے گا اور اس پر اپنا دامن ڈال کر پردے میں کرے گا، پھر کہے گا کہ تو فلاں گناہ پہچانتا ہے؟ کیا فلاں گناہ پہچانتا ہے؟ وہ کہے گا، ہاں اے رب! یہاں تک کہ جب اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کروا لے گا اور وہ اپنے دل میں سمجھ لے گا کہ وہ ہلاک ہو گیا تو (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا، میں نے دنیا میں تجھ پر ان گناہوں پر پردہ ڈالا اور آج میں تجھے وہ بخشتا ہوں، تو اسے اس کی نیکیوں کی کتاب دے دی جائے گی۔ رہا کافر اور منافق، تو گواہ کہیں گے: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

③ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ ...... : گواہوں سے مراد ان کے پیغمبر یا وہ فرشتے جو عمل لکھتے ہیں اور علماء جنھوں نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کی۔ یہ سب گواہ کفار کے متعلق اعلان کریں گے کہ یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار سے جھوٹی باتیں منسوب کرتے تھے۔

**آیت 19** الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : یعنی اللہ کی سیدھی راہ (اسلام) میں کجی اور عیب ڈھونڈ کر لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ '' هُمْ '' کی ضمیر دو بار لانے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا انکار کرنے میں یہ لوگ اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ گویا آخرت کے اصل منکر یہی ہیں۔ '' يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا '' میں لام محذوف ہے، یعنی '' يَبْغُوْنَ لَهَا عِوَجًا '' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ﴾ [ الکہف: ۱ ] یا '' يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا '' میں '' فِیْ '' محذوف ہے، یعنی '' يَبْغُوْنَ فِيْهَا عِوَجًا '' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن زمین کے متعلق فرمایا: ﴿ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا ﴾ [ طٰہٰ: ۱۰۷ ]

**آیت 20** ① اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ ...... : یعنی یہ لوگ کبھی بھی اللہ کو عاجز کر کے اس کی گرفت سے بھاگ نہیں سکتے۔ وہ جب پکڑنا چاہے گا، اس زمین پر بھی پکڑ لے گا اور آخرت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ پھر اللہ کے سوا کبھی کوئی ان کا مددگار نہیں ہوگا جو انھیں اللہ کے عذاب اور پکڑ سے چھڑا سکے۔

② يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ : ایک اپنے گمراہ ہونے کا عذاب، دوسرا لوگوں کو اللہ کی راہ سے روک کر گمراہ کرنے کا عذاب۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۳۷، ۳۸) اور عنکبوت (۱۲، ۱۳)۔

③ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ : یعنی کان اور آنکھیں رکھنے کے باوجود حق سنتے یا دیکھتے نہیں تھے۔

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓاْ أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُواْ يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ هُمُ ٱلْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَأَخْبَتُوٓاْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُوْلَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ ٱلْفَرِيقَيْنِ كَٱلْأَعْمَىٰ وَٱلْأَصَمِّ وَٱلْبَصِيرِ وَٱلسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا اور ان سے گم ہو گیا جو کچھ وہ جھوٹ گھڑا کرتے تھے ﴿۲۱﴾ کوئی شک نہیں کہ وہ آخرت میں، وہی سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۲۲﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اپنے رب کی طرف عاجزی کی وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ دونوں گروہوں کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے والے کی طرح ہے، کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۲۴﴾

دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹) اور ایک معنی یہ ہے کہ انھیں رسول اللہ ﷺ سے اتنا بغض تھا کہ وہ آپ کی بات سن سکتے تھے نہ وہ آپ کو دیکھنا گوارا کرتے تھے۔

**آیت 22،21** وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ …… : یعنی جھوٹے دعوے سب گم ہو گئے، اللہ کی گرفت آنے پر دنیا میں کوئی داتا، کوئی دستگیر ان کی مدد کو نہیں پہنچا اور اس میں شک نہیں کہ آخرت میں بھی یہی سب سے زیادہ خسارے والے ہوں گے، کیونکہ جن کو یہ سمجھ کر پکارتے تھے کہ وہ ہمیں بچائیں گے انھیں اپنی پڑی ہو گی۔ وہ سب ان سے غائب ہو جائیں گے، اگر سامنے ہوئے بھی تو ان سے بری ہونے کا اعلان کریں گے، بلکہ ان کے دشمن بن جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۵، ۶)۔

**آیت 23** إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ …… : "أَخْبَتُوْا" "إِخْبَاتٌ" کا معنی ہے جھکنا، عاجزی کرنا، مطمئن ہونا۔ جمل ؒ نے فرمایا: "أَخْبَتَ لَهُ" کا معنی ہے "خَشَعَ وَ خَضَعَ لَهُ" وہ اس کے سامنے عاجز ہو گیا اور " أَخْبَتَ إِلَيْهِ " کا معنی ہے "اِطْمَأَنَّ إِلَيْهِ" کہ وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ سب سے بڑے ظالموں، یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کفار و مشرکین کے بعد اب اہل ایمان کا تذکرہ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالحہ کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجز اور اس کی تقدیر اور فیصلے پر مطمئن ہو گئے وہ جنت کے مالک ہوں گے۔ ''اخبات'' والوں کی کچھ صفات سورۂ حج (۳۴، ۳۵، ۵۴) میں آئی ہیں۔

**آیت 24** مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ …… : مثال سے کسی چیز کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور اس کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مومن دیکھنے اور سننے والا ہوتا ہے اور کافر اندھا اور بہرا ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور خلاف ہیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں کہ سیدھے راستے پر اندھا بہرا شخص کیسے چل سکتا ہے، جو نہ خود راستہ دیکھے، نہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۡ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، بے شک میں تمھارے لیے صاف صاف ڈرانے والا ہوں ﴿۲۵﴾ کہ تم اللہ کے سوا (کسی کی) عبادت نہ کرو۔ بے شک میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۲۶﴾

---

بتانے سے سنے۔ اسی لیے کفار کہیں گے: ﴿ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴾ [ الملك: ۱۰ ] ’’اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی آگ والوں میں نہ ہوتے۔‘‘

**آیت 25** ① **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ:** جن حالات میں نبی ﷺ مکہ میں توحید کی دعوت پیش کر رہے تھے، وہ چونکہ ویسے ہی حالات تھے جو آپ ﷺ سے پہلے دوسرے انبیاء ﷩ کو پیش آ چکے تھے، اس لیے حسب موقع یہاں سے گزشتہ انبیاء کا ذکر کیا جا رہا ہے اور باقی سورت تقریباً اسی تذکرے سے بھری ہوئی ہے، تاکہ ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی ہمت بندھے، آپ کو اور مسلمانوں کو تسلی ہو کہ انجام کار اللہ کے رسولوں اور اہل حق کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقیناً مدد ہوتی ہے اور دوسری طرف پہلی قوموں کے اعتراضات اور ان کے انبیاء کے جوابات آپ کے لیے نمونہ بنیں اور آپ کی قوم کو پہلے کفار کے انجام سے ڈرایا جائے۔

② آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، وہ اور ان کی اولاد سب موحد اور دین حق پر تھے، پھر شیطان کے بہکانے سے بزرگوں کی پوجا بت پرستی کی صورت میں شروع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر سب سے پہلے رسول نوح علیہ السلام بھیجے گئے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے اور بت پرستی کے آغاز کی تفصیل سورۂ نوح میں آئے گی۔ نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن میں ۴۳ بار آیا ہے۔

③ **اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ:** نوح علیہ السلام نے صرف ڈرانے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ان کی قوم نے سمع و طاعت کا اظہار ہی نہیں کیا کہ انھیں خوش خبری دی جاتی۔

**آیت 26** **اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ......:** یہی ہر رسول کی دعوت تھی اور یہی سب کی بعثت کا مقصد تھا، فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [ الأنبياء: ۲۵ ] ’’اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔‘‘ ’’میں تم پر دردناک عذاب سے ڈرتا ہوں‘‘ کے بجائے فرمایا: ’’دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔‘‘ یہ زیادہ ڈرانے کے لیے فرمایا کہ وہ عذاب اتنا دردناک ہے کہ جس دن وہ آئے گا وہ دن ہی سراسر الم والا، یعنی نہایت دردناک ہوگا۔ یہی بات اس سورت کی آیت (۳) میں رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

تو اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے کہا جنھوں نے کفر کیا تھا، ہم تجھے نہیں دیکھتے مگر اپنے جیسا ایک بشر اور ہم تجھے نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کے سوا کسی نے تیری پیروی کی ہو جو ہمارے سب سے رذیل ہیں، سطحی رائے کے ساتھ اور ہم تمھارے لیے اپنے آپ پر کوئی برتری نہیں دیکھتے، بلکہ ہم تمھیں جھوٹے گمان کرتے ہیں ﴿۲۷﴾

**آیت 27** ❶ **فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ:** آلوسی نے فرمایا: ''الْمَلَاُ'' کا لفظ اسم جمع ہے، جیسا کہ ''رَهْطٌ'' (گروہ) ہے۔ اس لفظ سے اس کا واحد کوئی نہیں آتا۔ '' مَلَأَ يَمْلَأُ '' کا معنی بھرنا ہے، یعنی ایک رائے پر متفق لوگوں کی جماعت، جس کے رعب و جلال اور ظاہری شکل و صورت سے آنکھیں بھر رہی ہوں۔ (راغب)

❷ **مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا:** نوح علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کی امتوں کے کافروں کی طرح مکہ کے کافر بھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہی بات کہا کرتے تھے کہ جو شخص ہماری طرح کا بشر ہو، جو کھاتا پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا، سوتا جاگتا، بیویاں اور بال بچے رکھتا ہو، آخر وہ اللہ کا رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ (دیکھیے فرقان: ۷) مطلب یہ ہے کہ رسالت اور بشریت میں تضاد ہے اور ان دونوں کا ایک شخص میں جمع ہونا ناممکن ہے، حالانکہ تمام انبیاء میں دونوں اوصاف جمع تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ [ بنی إسرائیل: ۹۳ ] ''تو کہہ میرا رب پاک ہے، میں تو ایک بشر کے سوا کچھ نہیں جو رسول ہے۔'' اور دیکھیے سورۂ فرقان (۲۰) اور مومنون (۳۳، ۳۴) کفار آپ کا بشر ہونا جانتے تھے، کیونکہ آپ انھی میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے آپ کو رسول ماننے سے انکار کر دیا۔ افسوس کہ کچھ جدی پشتی مسلمان باپ دادا سے سن کر آپ کو رسول مانتے ہیں، مگر آپ کے بشر ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی ذہن ہے کہ انسان رسول نہیں ہو سکتا۔

❸ **وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ ......:** ''اَرَاذِلُ'' ''اَرْذَلُ'' کی جمع ہے، یعنی کم تر درجے کے لوگ۔ ''بَادِیَ'' ''بَدَا يَبْدُوْ'' (ظاہر ہونا) سے اسم فاعل ہو تو معنی ہو گا ظاہر دیکھنے میں اور ''بَدَءَ يَبْدَءُ'' (شروع ہونا) سے ہو تو معنی ہو گا پہلی نظر میں، یعنی اس وجہ سے بھی ہم آپ کی پیروی اختیار نہیں کر سکتے کہ کچھ لوگ جو آپ کے متبع ہو گئے ہیں وہ تو دیکھنے ہی سے نظر آتے ہیں کہ ہمارے رذالے یعنی کم تر درجے کے لوگ ہیں۔ گویا ان کی نظر میں اس شخص کے تابع ہونا، جس کے پیروکار معاشرے میں نچلے درجے کے لوگ ہوں، ان کی شان کے منافی ہے۔ (دیکھیے شعراء: ۱۱۱) بعینہٖ یہی بات مکہ کے کھاتے پیتے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ان کی پیروی ہماری قوم کے غلام اور نچلے طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ (دیکھیے انعام: ۵۲ تا ۵۴) حالانکہ حق کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس کے ابتدائی پیروکار دنیوی لحاظ سے کمزور لوگ ہی ہوئے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہرقل اور ابوسفیان کے سوال و جواب میں مذکور ہے کہ جب ابوسفیان نے بتایا کہ اس کی پیروی ضعفاء نے کی ہے تو ہرقل نے کہا، یہی

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

اس نے کہا اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر (قائم) ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے بڑی رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تم پر مخفی رکھی گئی ہو، تو کیا ہم اسے تم پر زبردستی چپکا دیں گے، جب کہ تم اسے ناپسند کرنے والے ہو ﴿۲۸﴾

---

لوگ تمام رسولوں کے پیروی کرنے والے رہے ہیں۔ [ بخاری، بدء الوحی، باب كيف كان بدء الوحی …… : ۷ ]

④ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ: ”ہم تمھارے لیے اپنے آپ پر کوئی برتری نہیں دیکھتے“ قوم کا یہ خطاب نوح علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں سے ہے کہ کسی بھی چیز میں تم ہم سے بڑھ کر نہیں ہو۔

⑤ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ: یعنی اس بات میں کہ تم کہتے ہو نوح علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔

آیت 28 ① قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ ……: نوح علیہ السلام نے ان کے تمام اعتراضات کا جامع جواب دیا، ایک تو یہ کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت کے مضبوط دلائل اور پختہ یقین موجود ہے، یعنی ”وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ“ دوسرا یہ کہ یہ نبوت کسی کی محنت کا نتیجہ یا کسی کے آبا و اجداد کی جائداد نہیں، یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی اپنے پاس سے خاص عنایت ہے، اس کی تقسیم تمھارے ہاتھ میں نہیں۔ یہ اللہ جسے چاہے دیتا ہے، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، جیسا کہ مکہ والوں نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا تھا: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [ الزخرف : ۳۱ ] ”اور انھوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟“ اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب دیا: ﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [ الزخرف : ۳۲ ] ”کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے خود ان کے درمیان ان کی معیشت دنیا کی زندگی میں تقسیم کی۔“

② فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ: اس کا مادہ ”عَمًى“ ہے، اندھا ہونا، یعنی یہ بتاؤ کہ اگر تمھیں اس دلیل اور رحمت سے اندھا رکھا گیا ہو اور تمھاری بے وقوفی کی وجہ سے وہ تم پر ایسی مخفی رہی ہو کہ تم دیکھ ہی نہ سکے ہو تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟

③ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ: یعنی کیا ہم زبردستی تمھیں اس دلیل کا قائل کر لیں اور اس رحمت کے سائے میں دھکے سے داخل کر لیں، جب کہ تم اس سے نفرت کرتے ہو اور دور بھاگتے ہو۔ ”اَنُلْزِمُكُمُوْهَا“ میں ایک لفظ کے اندر تین ضمیروں کو ایسے طریقے سے جمع کیا ہے کہ لفظ انتہائی خوبصورت اور واضح ہو گیا ہے۔

وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر کسی مال کا سوال نہیں کرتا، میری مزدوری اللہ کے سوا کسی پر نہیں اور میں ان لوگوں کو دور ہٹانے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں، یقیناً وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور لیکن میں تمھیں ایسے لوگ دیکھتا ہوں جو جہالت برتتے ہو ۲۹ اور اے میری قوم! اللہ کے مقابلے میں کون میری مدد کرے گا اگر میں انھیں دور ہٹا دوں؟ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ۳۰

آیت 30،29 ❶ وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا …… : اور اے میری قوم! میں اللہ کا یہ پیغام تمھیں پہنچانے پر تم سے کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا، مبادا تم سمجھو کہ نوح نے مال کھینچنے کے لیے نبوت کا بہانہ کھڑا کر لیا۔ میری اجرت تو اللہ کے سوا کسی کے ذمے بھی نہیں اور نہ دنیا کی کسی چیز کا تم سے مطالبہ ہے۔

❷ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : یعنی جس طرح اللہ کی رحمت (اسلام) کے دامن میں آنے سے جب تک تم نفرت اور کراہت کرتے رہو گے، میں تمھیں زبردستی اسلام لانے پر مجبور نہیں کر سکتا، اسی طرح جیسے تم چاہتے ہو کہ جن لوگوں نے میری پیروی اختیار کی ہے، چونکہ وہ نچلے طبقے کے لوگ ہیں، اس لیے میں انھیں دھکے دے کر نکال دوں، یہ کام میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ یہ اسی قسم کا مطالبہ تھا جو قریش کے سردار نبی ﷺ سے کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا۔ دیکھیے سورۂ انعام (۵۲)، کہف (۲۸) اور سورۂ عبس۔

❸ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ : یعنی اگر میں ان کو ستاؤں یا اپنی مجلس سے نکال دوں تو وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا انصاف چاہیں گے، اس کا میں کیا جواب دوں گا۔ یا یہ کہ وہ لوگ تو اللہ کے ہاں عزت پا لیں گے اور اس بارگاہِ عالی میں ان کو ایمان و عمل کے باعث مقام و مرتبہ ملے گا، پھر تمھارے ان کو ذلیل سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ ان کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے کہ اے نوح! آپ کے متبع ہمارے رذالے ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کافروں نے مسلمانوں کو رذالہ ٹھہرایا اور چاہا کہ ان کو ہانک دو تو ہم تمھارے پاس بیٹھیں اور بات سنیں۔ سو فرمایا کہ دل کی بات اللہ تعالیٰ تحقیق کرے گا جب اسے ملیں گے، میں اگر مسلمانوں کو ہانکوں تو اللہ سے کون چھڑوائے مجھ کو۔ اور رذالہ ٹھہرایا اس پر کہ وہ کسب کرتے تھے۔ کسب سے بہتر کمائی نہیں، اس واسطے فرمایا کہ تم جاہل ہو۔'' (موضح)

❹ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ : یعنی تم کسی بات کو بھی صحیح طرح نہیں سمجھتے، تمھاری نظر صرف ظاہر چیزوں پر ہے اور انجام پر غور نہیں کرتے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ فلاں شخص نیچ قوم کا ہے، اس لیے اسے اپنے پاس نہ بیٹھنے دو؟ اللہ کے نزدیک اسی

وَ لَآ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَ لَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَ لَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّیۡ مَلَکٌ وَّ لَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ تَزۡدَرِیۡۤ اَعۡیُنُکُمۡ لَنۡ یُّؤۡتِیَہُمُ اللّٰہُ خَیۡرًا ؕ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ۚۖ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ بے شک میں ایک فرشتہ ہوں اور نہ میں ان لوگوں کے بارے میں جنھیں تمھاری آنکھیں حقیر سمجھتی ہیں، یہ کہتا ہوں کہ اللہ انھیں ہرگز کوئی بھلائی نہیں دے گا، اللہ اسے زیادہ جاننے والا ہے جو ان کے دلوں میں ہے، یقیناً میں تو اس وقت ظالموں سے ہوں گا ﴿۳۱﴾

کو عزت ہے جو ایمان دار اور پرہیز گار ہے۔ بے ایمان اور بدکار کتنے ہی اونچے خاندان کا ہو اللہ کے نزدیک چوہڑے اور چمار سے بھی بدتر ہے۔

**آیت 31** ① وَ لَآ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ ...... : یہ اس بات کا جواب ہے جو ان لوگوں نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم اپنے جیسے ایک انسان نظر آتے ہو اور یہ کہ ہم تم کو کسی بات میں اپنے سے برتر نہیں پاتے۔ اس پر نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہاں میں واقعی تم ہی جیسا ایک بشر ہوں، نہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں فرشتہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں، یعنی اس قسم کی کوئی فوقیت مجھ میں نہیں ہے۔ میرا جو بھی دعویٰ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں اور اس نے مجھے سیدھے راستے کی ہدایت بخشی ہے۔ میرا یہ دعویٰ ناقابل تردید ہے، اس کی تم جس طرح چاہو آزمائش کر لو۔

② وَ لَآ اَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ تَزۡدَرِیۡۤ اَعۡیُنُکُمۡ ...... : "تَزۡدَرِیۡۤ" اس کا مادہ "زری" ہے، "زَرَیْتُ عَلَیْہِ" میں نے اس پر عیب لگایا۔ باب افتعال میں جا کر افتعال کی تاء کو دال کے ساتھ بدلنے سے "اِزْدَرٰی یَزْدَرِیْ اِزْدِرَاءً" بن گیا، جس کا معنی حقیر جاننا ہے۔ (قاموس) یعنی مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ محض تمھیں خوش کرنے کے لیے ان لوگوں کے بارے میں اس قسم کی جاہلانہ بات کہوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ چیزیں (اللہ کے خزانوں کا مالک ہونا، عالم الغیب ہونا، فرشتہ ہونا) نبوت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتیں کہ ان کے بغیر نبوت نہیں مل سکتی اور نہ ان چیزوں کے کسی شخص کے پاس نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر خیر سے خالی ہے اور جو شخص مال دار نہ ہو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خیر بھی حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ناتوانوں کو عزت دیتا ہے اور عزت والوں کو دم بھر میں ذلیل کر دیتا ہے۔ اس وقت بھی یہ لوگ اپنے رب پر ایمان اور اس کے رسول کی پیروی کی بدولت تم سے زیادہ باعزت اور شریف ہیں۔ (روح المعانی)

③ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ : اگر ان کے دلوں میں ایمان اور اخلاص ہے تو اللہ کے ہاں ضرور اجر پائیں گے، تم اور میں مل کر بھی انھیں اس اجر سے محروم نہیں کر سکتے۔

قَالُوۡا يٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَكۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا يَاۡتِيۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ اِنۡ شَآءَ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنۡفَعُكُمۡ نُصۡحِىۡۤ اِنۡ اَرَدْتُّ اَنۡ اَنۡصَحَ لَكُمۡ اِنۡ كَانَ اللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يُّغۡوِيَكُمۡ ؕ هُوَ رَبُّكُمۡ ۟ وَ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ فَعَلَىَّ اِجۡرَامِىۡ وَ اَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ﴿۳۵﴾ ع ۳/۱۱

انھوں نے کہا اے نوح! بے شک تو نے ہم سے جھگڑا کیا، پھر ہم سے بہت جھگڑا کیا، پس لے آ ہم پر جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے، اگر تو سچوں سے ہے ﴿۳۲﴾ اس نے کہا وہ تو تم پر اللہ ہی لائے گا، اگر اس نے چاہا اور تم ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ﴿۳۳﴾ اور میری نصیحت تمھیں نفع نہ دے گی اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، اگر اللہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تمھیں گمراہ کرے، وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۳۴﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے، کہہ دے اگر میں نے اسے گھڑ لیا ہے تو میرا جرم مجھی پر ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم جرم کرتے ہو ﴿۳۵﴾

---

❹ اِنِّىۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ : یعنی اگر میں انھیں خواہ مخواہ ذلیل قرار دوں۔ یہ اشارہ ہے کہ تم انھیں رذالے کہنے میں ظالم ہو، یا یہ کہ اگر میں خزائنِ الٰہی کو جمع کرنے یا غیب کے جاننے اور فرشتہ ہونے کا دعویٰ کروں تو میں ظالموں میں سے ہوں گا۔

**آیت 32** قَالُوۡا يٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا...... : جب وہ نوح علیہ السلام کے دلائل کے سامنے بے بس ہو گئے اور نوح علیہ السلام ایک مدت دراز تک (۹۵۰ سال۔ عنکبوت : ۱۴) دن رات ایک ایک شخص کو اور پوری پوری مجلس کو (دیکھیے سورۂ نوح) اللہ کی توحید سمجھاتے رہے، نہ تھکے اور نہ ہمت ہاری تو بجائے اس کے کہ ان کی قوم ایمان لے آتی یا اللہ سے درخواست کرتی کہ اے اللہ! اگر نوح علیہ السلام کی بات سچ ہے تو اس کے لیے ہمارے سینے کھول دے، الٹا عذاب الٰہی لانے کا مطالبہ کر دیا۔ یہ اس بات کی مثال ہے کہ شرک انسان کو عقل اور فطرتِ الٰہی پر چلنے سے کس حد تک محروم کر دیتا ہے اور اس کی بھی کہ مشرک پرانے زمانے کا ہو یا آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا، دونوں ایک ہی طرح عقل سے خالی ہو جاتے ہیں۔ دیکھیے ابوجہل اور مشرکین مکہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے دعا جو سورۂ انفال (۳۲) میں مذکور ہے۔

**آیت 34،33** نوح علیہ السلام نے جواب میں کسی تلخی کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اور اللہ تعالیٰ کی حیثیت واضح فرمائی کہ عذاب لانا یا نہ لانا میرا کام نہیں، یہ تو اللہ کا اختیار ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو تم پر عذاب لے آئے گا، پھر تم اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نکل نہیں سکو گے اور جس طرح کائنات کا ایک ذرہ بھی اللہ کی مرضی کے بغیر حرکت یا سکون میں نہیں آ سکتا، انسان ہدایت اور گمراہی کی ایک حد تک اختیار رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ارادے اور اس کی توفیق کے بغیر پیغمبر کی خیر خواہی اور نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

**آیت 35** اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ......: اس آیت کی مفسرین نے الگ الگ تفسیریں کی ہیں۔ بعض نے اسے نوح علیہ السلام کے قصے ہی سے متعلق سمجھتے ہوئے اس میں خطاب نوح علیہ السلام سے قرار دیا ہے اور بعض نے اسے نوح علیہ السلام کے قصے کے

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ تیری قوم میں سے کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا مگر جو ایمان لا چکا، پس تو اس پر غمگین نہ ہو جو وہ کرتے رہے ہیں ﴿۳۶﴾ اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا

درمیان جملہ معترضہ قرار دیا ہے اور اسے مشرکین مکہ کا قول قرار دے کر رسول اللہ ﷺ سے خطاب قرار دیا ہے، یعنی کیا (مکہ کے کافر) کہتے ہیں کہ اس (محمد ﷺ) نے اس (قرآن) کو اپنے دل سے گھڑ لیا ہے۔ (اے محمد!) کہہ دے اگر میں نے اسے اپنے دل سے گھڑا ہے تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر پڑے گا اور تم جو گناہ کرتے ہو میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ علمائے تفسیر میں سے رازی اور ان کی موافقت میں شوکانی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حافظ ابن کثیر اور صاحب کشاف نے دوسری تفسیر کو راجح قرار دیا ہے، یہی رائے شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کی ہے، امکان دونوں کا ہے۔

**آیت 36** وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ...... : نوح علیہ السلام سے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات پر مجموعی نظر ڈالیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے بے مثال صبر کے ساتھ مسلسل صدیوں دعوت دینے کے باوجود قوم نے ان کے انکار اور ایذا رسانی میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ ہر نسل اپنی اولاد کو وصیت کر کے مرتی رہی کہ دیکھنا اپنے بتوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نوح (علیہ السلام) کی بات مت ماننا۔ (سورۂ نوح) اس کے باوجود نوح علیہ السلام پر امید رہ کر نہایت استقامت کے ساتھ انھیں دعوت توحید دیتے رہے، مگر جب اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ اطلاع دی کہ اب آئندہ آپ کی قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا تو انھوں نے ان پر عذاب کے لیے بددعا کی۔ جس کا ذکر سورۂ قمر (۱۰) میں ہے، فرمایا: ﴿ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ ''بے شک میں مغلوب ہوں سو تو بدلہ لے۔'' اور سورۂ نوح میں ان کی دعا کے الفاظ ہیں: ﴿ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ ''اے میرے رب! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ۔'' آیت (۲۶) سے آخر سورت تک ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 37** ① وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا : نوح علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے کفار پر عذاب کے وعدے کے ساتھ نوح علیہ السلام کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، پہلی تو یہ کہ پانی کے طوفان سے بچنے کے لیے ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق ایک بحری جہاز بناؤ۔ یاد رہے کہ "اَلْفُلْكَ" کا لفظ بڑی کشتی (بحری جہاز) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور واحد وجمع اور مذکر ومؤنث سبھی کے لیے ایک ہی لفظ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اور اس کی ہدایت کے مطابق بننے والی کشتی کتنی شان دار ہوگی، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں نے اس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی بیان کی ہے، مگر ان تمام باتوں کی کوئی پختہ دلیل نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب تم نے خود ہی دعا کی ہے کہ یا اللہ! زمین پر رہنے والا ایک کافر بھی باقی نہ چھوڑ، تو اب عذاب آنے پر ظلم کرنے والوں (مشرکوں) کے بارے میں مجھ سے کوئی بات (سفارش) مت کرنا، کیونکہ ان کے

مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور مجھ سے ان کے بارے میں بات نہ کرنا جنھوں نے ظلم کیا، یقیناً وہ غرق کیے جانے والے ہیں ﴿۳۷﴾

غرق کیے جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

❷ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا : معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے آنکھوں کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی آنکھیں بھی ہیں۔ دوسری جگہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ﴾ [ طٰہٰ : ۳۹ ] ''اور تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے۔'' بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے آنکھیں ہونے سے انکار کرتے ہیں، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ماننے سے مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے، یعنی وہ ہمارے جیسا بن جاتا ہے، کیونکہ ہماری بھی آنکھیں ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں۔ ان حضرات نے اسی بہانے سے اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات کا انکار کر دیا اور کئی ایک کی تاویل کر دی، مثلاً اللہ تعالیٰ کے چہرے، ہاتھ، پنڈلی، کان اور آنکھ کا، اس کے اترنے، چڑھنے، سننے، بولنے، دیکھنے، خوش ہونے اور ناراض ہونے کا انکار کر دیا، یا اپنے پاس سے کوئی اور مطلب بیان کر دیا، یا کہا کہ ہمیں معلوم ہی نہیں اس کا معنی کیا ہے۔ ان بے چاروں نے غور نہیں کیا کہ جب آپ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے "عَيْنٌ" کا لفظ بول رہے ہیں تو اردو میں آنکھ کہنے سے آپ کو کیا پریشانی ہے۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ کیا ''ہماری نگرانی میں کشتی بنا۔'' چلیے یہ بھی درست ہے، مگر اس کے لیے آنکھوں کے انکار کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ نگرانی بھی آنکھوں کے ساتھ ہی تھی۔ "بِاَعْيُنِنَا" کا ترجمہ نگرانی کریں، پھر بھی مشابہت والا اعتراض ختم نہیں ہوتا، کیونکہ انسان نگرانی بھی کرتا ہے، یہ بھی مشابہت ہو گئی۔ ان کو چاہیے تھا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس پر ایمان رکھتے اور اس مشکل کا حل جو اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اس کو تسلیم کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [ الشورٰی : ۱۱ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں'' کے باوجود وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی، سمع و بصر بھی رکھتا ہے، مگر اس کا سننا، دیکھنا، ہنسنا، غصے ہونا، اترنا، چڑھنا، بولنا، اس کے کان، آنکھیں اور پنڈلی سب کچھ ہونے کے باوجود کوئی چیز مخلوق جیسی نہیں۔ اگر ہم اس حد تک چلے جائیں کہ مخلوق پر بولا جانے والا کوئی لفظ اللہ تعالیٰ پر بولا جا ہی نہیں سکتا تو پھر ہم اپنے اللہ تعالیٰ ہی کو گم کر بیٹھیں گے۔ کیونکہ ہم زندہ ہیں، موجود ہیں، علم رکھتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کا انکار کر کے دیکھو تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ موجود ہی نہیں۔ ایسے خبیث عقیدے سے اللہ کی پناہ۔ یقیناً ہم زندہ و موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی زندہ و موجود ہے، مگر ہماری زندگی اور وجود اللہ تعالیٰ کی زندگی اور وجود سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ اس کی زندگی اور وجود اس کی شان کے لائق ہے، جو ازلی، ابدی اور لامحدود ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں اور ہمارا وجود اور زندگی فانی، محدود اور اللہ کے محتاج ہیں۔

یہ لوگ عجیب باتیں کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ عرش پر ہے نہ آسمان دنیا پر اترتا ہے اور نہ قیامت کے دن آئے گا، تو پھر وہ کہاں ہے؟ کہتے ہیں یہ پوچھنا ہی منع ہے، وہ نہ مکان میں ہے نہ لا مکان میں۔ پھر کبھی کہتے ہیں

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ﴿۳۸﴾

اور وہ کشتی بناتا رہا اور جب کبھی اس کے پاس سے اس کی قوم کے کوئی سردار گزرتے اس سے مذاق کرتے۔ وہ کہتا اگر تم ہم سے مذاق کرتے ہو تو یقیناً ہم تم سے مذاق کرتے ہیں، جیسے تم مذاق کرتے ہو ﴿۳۸﴾

وہ ہر جگہ ہے، کبھی کہتے ہیں کہیں بھی نہیں۔ اللہ کے بندو! جو کچھ تعارف اللہ تعالیٰ نے اپنا خود کروایا ہے وہ ہر صورت مانو، مگر یہ کہو کہ اس کی آنکھیں، کان، چہرہ، اترنا اور چڑھنا وغیرہ سب کچھ ہے مگر مخلوق میں سے کسی کی طرح نہیں، بلکہ وہ اسی طرح ہے جیسے اس کی شان کے لائق ہیں۔ دراصل یہ لوگ اللہ کی صفات پر ایمان لانے سے اس لیے محروم ہوئے کہ انھوں نے اس کے چہرے، آنکھوں، ہاتھوں اور سننے و دیکھنے وغیرہ کو اپنے جیسا سمجھا، اس لیے انکار کر دیا۔ اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے اور اس پر ایمان رکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق جو جو الفاظ بولے ہیں، سب حق ہیں، مگر مخلوق میں سے کسی کے مشابہ نہیں تو وہ ایمان سے ہاتھ نہ دھوتے۔

3 وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ...... : "اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ شرک سے بڑی ناانصافی کوئی نہیں۔ نوح علیہ السلام کی بیوی اور ایک بیٹا مشرک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کے حق میں کسی بھی قسم کی بات کرنے سے منع فرما دیا، کیونکہ مشرک کی نجات کی کوئی صورت نہیں۔

**آیت 38** 1 وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ : ماضی کے ایک واقعہ کو مضارع کے صیغے سے بیان فرمایا۔ اس سے ان کا مسلسل کئی دنوں تک اس بڑی کشتی کو بناتے رہنا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ "كَانَ" کا صیغہ جو ماضی ہے، مضارع پر آ جائے تو اس سے مراد ماضی میں استمرار ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے "اور وہ کشتی بناتا رہا۔" بعض اہل علم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مضارع کا لفظ حکایت حال، یعنی وہ نقشہ سامنے لانے کے لیے استعمال فرمایا، گویا ہم دیکھ رہے ہیں کہ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے ہیں اور قوم کے لوگ انھیں مذاق کر رہے ہیں، یہ معنی بھی جید ہے۔

2 وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ...... : وہ اس پر مذاق کرتے کہ بڑے میاں ترکھان کب سے بن گئے اور اب اس حد تک دماغ میں خلل آ گیا کہ خشک زمین پر پانی میں غرق ہونے سے بچاؤ کا بندوبست کر رہے ہیں۔ نوح علیہ السلام اس پر ہنستے کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ ایمان اور اطاعت کے ذریعے سے عذاب الٰہی سے بچاؤ حاصل کریں، الٹا کفر اور نافرمانی پر اصرار کر کے اور اللہ کے نشانات کا مذاق اڑا کر عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نوح علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ جیسے تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو، وہ وقت بالکل قریب ہے جب تم غوطے کھا رہے ہو گے اور ہم تمھارا مذاق اڑائیں گے، جیسا کہ تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یہ (نوح علیہ السلام) ہنستے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں۔" (موضح)

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾

پس تم جلد ہی جان لوگے کہ وہ کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر دائمی عذاب اترتا ہے ﴿۳۹﴾ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا اس میں ہر چیز میں سے دو قسمیں (نر و مادہ) دونوں کو اور اپنے گھر والوں کو سوار کر لے، سوائے اس کے جس پر پہلے بات ہو چکی اور ان کو بھی جو ایمان لے آئے اور اس کے ہمراہ تھوڑے سے لوگوں کے سوا کوئی ایمان نہیں لایا ﴿۴۰﴾

**آیت 39** عَذَابٌ مُّقِيْمٌ : یعنی آخرت میں جہنم کا عذاب جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

**آیت 40** ❶ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ : " فَارَ يَفُوْرُ فَوْرًا " جوش مار کر نکلنا۔ فوارہ بھی اسی سے ہے۔ "اَلتَّنُّوْرُ" (بروزن تفعول) کا معروف معنی تنور ہے جس میں روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے گھر میں طوفان کا نشان بتا رکھا تھا کہ جب اس تنور سے پانی ابلے تب کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ (موضح) اکثر مفسرین نے تنور سے یہی عام تنور مراد لیا ہے، لیکن حسب تفسیر ابن عباس (ابن جریر) " التَّنُّوْرُ " سے مراد روئے زمین ہے۔ قاموس میں بھی لکھا ہے: " وَجْهُ الْاَرْضِ وَ كُلُّ مَفْجَرِ مَاءٍ وَ مَحْفَلُ مَاءِ الْوَادِيْ " "روئے زمین، پانی پھوٹنے کی جگہ اور وادی کے پانی کے جمع ہونے کی جگہ۔" اس تفسیر کی رو سے مراد یہ ہے کہ ساری زمین پانی کا چشمہ بن گئی اور پانی ابلنے لگا، جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے: ﴿ وَ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا ﴾ [ القمر : ۱۲ ] "اور ہم نے زمین کو چشموں سے پھاڑ دیا" حتیٰ کہ تنور جو آگ کی جگہ ہوتے ہیں، پانی کے فوارے بن گئے۔ ویسے پہلا معنی زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ علامت ظاہر ہونے کے ساتھ ہی کشتی میں سوار ہونے اور ہر جانور کا جوڑا رکھنے کا زیادہ موقع ہے، لیکن جب ساری زمین سے چشمے پھوٹ نکلیں تو یہ کام مشکل ہے اور تنور روٹیاں پکانے کے لیے عام معروف بھی ہے۔ امام طبری اور رازی نے بھی اسی معنی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ معروف معنی چھوڑنے کی کوئی دلیل نہیں۔ ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « كَانَ تَنُّوْرُنَا وَ تَنُّوْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاحِدًا » [ مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة : ۸۷۳ ] "ہمارا تنور اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنور ایک ہی تھا۔" " اَمْرُنَا " سے مراد عذاب کا حکم ہے کہ آسمان سے موسلا دھار پانی برسنے لگا اور زمین سے چشموں کی طرح پانی ابلنا شروع ہو گیا، دونوں طبقے مل گئے اور زمین پانی میں غرق ہو گئی۔ دیکھیے سورۂ قمر (۱۱، ۱۲)۔

❷ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ...... : " مِنْ كُلٍّ " میں " كُلٍّ " کی تنوین مضاف الیہ محذوف کا عوض ہے: " اَيْ مِنْ كُلِّ نَوْعٍ تَحْتَاجُ اِلَيْهِ " جب عذاب کے آثار شروع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جانوروں کی ہر قسم میں سے ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لو، جن کی نسل باقی رہنا مقدر تھی۔ " وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ " یعنی اپنی

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

اور اس نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام کے ساتھ اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا رب یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۴۱﴾

بیوی جس کا ذکر سورۂ تحریم میں ہے اور اس بیٹے جس کا ذکر زیر تفسیر آیات میں آ رہا ہے (جن کے کفر کی وجہ سے ان کا ڈوبنا پہلے طے ہو چکا ہے) ان کے سوا اپنے تمام گھر والوں کو اور ان لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے ہیں، کشتی میں سوار کر لو۔

③ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ : یہ وہی تھے جن کو قوم نے اپنے اراذل کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان پر بہت تھوڑے لوگ ہی ایمان لائے۔ ان کی تعداد بہت سے مفسرین (۷۹) یا (۸۰) بیان کرتے ہیں، مثلاً آلوسی وغیرہ، جن میں وہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کا نام لیتے ہیں، کافر بیٹے کا نام کنعان تھا۔ ان چاروں کی بیویاں مسلمان تھیں اور ۷۲ مرد اور عورتیں دوسرے مسلمان تھے۔ بعض نے یہ تعداد چالیس (۴۰) بتائی ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ الفلاح رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''قرآن وحدیث میں ان کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں۔'' اور ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں کے علاوہ کوئی معتبر ذریعہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس نہیں ہے۔ [ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِعَدَدِهِمْ ]

**آیت 41** ① وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا : ''ارْكَبُوْا فِيْهَا'' عام طور پر سوار ہونے کے لیے ''رَكِبَ عَلَيْهِ'' آتا ہے، یہاں '' اِرْكَبُوْا عَلَيْهَا '' کی جگہ ''ارْكَبُوْا فِيْهَا'' اس لیے فرمایا کہ کشتی میں کمرے کی طرح داخل ہو کر بیٹھا جاتا ہے، جب کہ گھوڑے وغیرہ کے اوپر سوار ہوتے ہیں۔ (ابن عاشور) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشتی صرف تختے نہیں تھے جن کے اوپر وہ سوار ہوئے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں تیار ہونے والی وہ کشتی بہترین کمروں، آرام دہ سیٹوں اور کئی منزلوں والی تھی، جن میں وہ سوار ہوئے۔ ''مَجْرٰى'' '' جَرٰى يَجْرِىْ ''(ض) سے مصدر میمی ہے، یعنی چلنا۔ بعض قراء نے اس میں امالہ کیا ہے، یعنی الف کو یاء کی طرف اور فتحہ کو کسرہ کی طرف مائل کر کے پڑھتے ہیں۔ '' مُرْسٰى '' یہ باب افعال ''اَرْسٰى يُرْسِىْ'' ( ر س و ) سے مصدر میمی ہے، یعنی اس کا ٹھہرنا۔ کشتی میں سوار ہوتے وقت نوح علیہ السلام نے یہ دعا پڑھی، اس لیے کشتی میں سوار ہوتے وقت یہ دعا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۂ مومنون میں وہ دعا بھی مذکور ہے جو کشتی پر سوار ہو کر آرام سے بیٹھ جانے پر پڑھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ اور ﴿ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۲۸، ۲۹ ] سورۂ زخرف میں کشتی ہو یا کوئی بھی سواری، اس پر سوار ہوتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی ہے: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴾ [ الزخرف : ۱۳، ۱۴ ] ''پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے تابع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہ تھے اور بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں۔'' صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ پر سوار ہو کر یہ دعا پڑھنے کی حدیث موجود ہے، اس میں مزید الفاظ بھی ہیں۔ [ دیکھیے مسلم، الحج، باب استحباب الذکر إذا رکب دابته

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ انھیں لے کر پہاڑوں جیسی موج میں چلی جاتی تھی، اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور وہ ایک علیحدہ جگہ میں تھا، اے میرے چھوٹے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ (شامل) نہ ہو ﴿۴۲﴾ اس نے کہا میں عنقریب کسی پہاڑ کی طرف پناہ لے لوں گا، جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ کہا آج اللہ کے فیصلے سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہ رحم کرے اور دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی تو وہ غرق کیے گئے لوگوں میں سے ہو گیا ﴿۴۳﴾

متوجها...... : ۱۳٤۲ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما]

❷ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : مطلب یہ ہے کہ ہم سب جو کشتی میں سوار ہو کر عذاب سے بچے ہیں، اس لیے نہیں بچے کہ ہم گناہوں سے یکسر پاک ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا رب غفور و رحیم ہے۔ ایمان لانے کی وجہ سے اس نے ہماری لغزشوں سے درگزر فرما کر ہمیں یہ عزت بخشی ہے۔

آیت 42 ❶ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ : پہاڑوں جیسی موجوں سے طوفان کے پانی کی وسعت، اس کی طغیانی اور جوش و غضب کے اندازے کے ساتھ کشتی کے مضبوط اور مستحکم ہونے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

❷ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ ...... : باپ کی شفقت دیکھیے کتنے پیار سے ”يّٰبُنَيَّ“ (اے میرے چھوٹے سے بیٹے یا اے میرے پیارے بیٹے) کہہ کر کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔

❸ وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ اس بیٹے کی بربادی کا باعث کافروں کی مجلس اور ان کے ساتھ رہنا تھا، اگر وہ نوح علیہ السلام کی صحبت میں رہتا تو کفار کے ہتھے نہ چڑھتا۔ اتنے بڑے سیلاب کے وقت بھی وہ غرق ہو گیا مگر اس نے نوح علیہ السلام کے پاس آنا گوارا نہیں کیا۔ شیخ سعدی لکھتے ہیں ؂

پسر نوح بابداں بہ نشست خاندانِ نبوتش گم شدہ

”نوح علیہ السلام کا بیٹا بروں کے ساتھ بیٹھا تو اس سے نبوت کا خاندان ہی گم ہو گیا (وہ خاندان نبوت کا فرد ہی نہ رہا)۔“

آیت 42 ❶ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ : معلوم ہوا کہ مشرک کی نظر اسباب تک ہی رہتی ہے اور مشکل سے مشکل وقت میں بھی اسباب کے پیدا کرنے والے کی طرف نہیں جاتی۔ ”مجھے پہاڑ پانی سے بچا لے گا“ کم عقل ایک بے اختیار پہاڑ کو بچانے والا سمجھ رہا ہے۔

❷ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ : اس کا جو ترجمہ لکھا گیا ہے اس میں کچھ الفاظ محذوف شامل کیے

وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور کہا گیا اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تو تھم جا اور پانی نیچے اتار دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور وہ جودی پر جا ٹھہری اور کہا گیا ظالم لوگوں کے لیے دوری ہو ﴿۴۴﴾

جائیں تو مطلب درست ہوتا ہے، یعنی ''آج اللہ کے فیصلے سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہ رحم کرے (وہی بچے گا)۔'' بعض حضرات نے فرمایا کہ فاعل کا وزن بعض اوقات نسبت کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ "لَابِنٌ" لبن (دودھ) والا اور "تَامِرٌ" تمر (کھجور) والا، اسی طرح یہاں "عَاصِمَ" نسبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی آج بچاؤ رکھنے والا کوئی نہیں، مگر جس پر وہ (اللہ) رحم کرے۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ ﷫ لکھتے ہیں: ''یا دوسرا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے، مگر جو رحم کرنے والا ہے (یعنی خود اللہ تعالیٰ)۔'' آیت میں یہ ایک وجہ ہے جو محققین نے ذکر کی ہے اور یہی اقویٰ (زیادہ مضبوط) ہے، کیونکہ فاعل کا صیغہ زیادہ تر صفت کے لیے آتا ہے، نسبت کے لیے کم استعمال ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

③ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ : نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کی بات جاری تھی کہ پانی کی موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا، جو غرق کیے جا چکے تھے۔ اس سے ایک تو اس موج کی غیرت ایمانی ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ موحد باپ کے سامنے مشرک بیٹے کی بک بک کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی، دوسرا یہ کہ آخرت میں آدمی انھی کا ساتھی ہو گا جن کا وہ دنیا میں ساتھی تھا۔ "فَغَرِقَ" (پس وہ غرق ہو گیا) اور "فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ" (پس وہ غرق کیے گئے لوگوں میں سے ہو گیا) دونوں میں یہی فرق ہے، اس لیے اپنے بچوں کو جس قدر ہو سکے بری صحبت سے محفوظ رکھنا چاہیے۔

**آیت 44** ① وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ ..... : "بَلَعَ يَبْلَعُ" (ف) نگلنے کو کہتے ہیں اور انسان یا کوئی بھی جانور عموماً پورا لقمہ اکٹھا ہی نگلتا ہے۔ یہ لفظ استعمال کرنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ زمین نے پانی آہستہ آہستہ نہیں بلکہ ایک ہی دفعہ لقمے کی طرح اپنے اندر نگل لیا تھا۔ ادھر آسمان کو حکم ہوا کہ تھم جا، چنانچہ بارش رک گئی۔ سارا پانی زمین کے نیچے اتار دیا گیا اور تمام مشرکوں کو نیست و نابود کرنے کا کام، جس کے لیے طوفان آیا تھا، پورا ہو گیا۔

② وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ : جودی پہاڑ عراق اور ترکی کے درمیانی علاقے میں (جسے کردستان کہتے ہیں) موصل کی جانب واقع ہے۔ تورات میں نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہرنے کی جگہ ''ارارات'' بتائی گئی ہے، جو ارمینیا کے پہاڑی سلسلے کا نام ہے اور آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ چند سال ہوئے مغربی سیاحوں نے اس پہاڑ پر ایک بڑی کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے بھی دریافت کیے ہیں، اگرچہ ان کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آیا یہ نوح علیہ السلام کی کشتی ہی کے تختے ہیں یا کسی اور کشتی کے۔ واضح رہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم دجلہ اور فرات کی وادی ہی میں آباد تھی، جو بعد میں عراق کے نام سے مشہور ہوئی۔

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا، پس کہا اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا میرے گھر والوں سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۴۵﴾ فرمایا اے نوح! بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں، بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں، پس مجھ سے اس بات کا سوال نہ کر جس کا تجھے کچھ علم نہیں۔ بے شک میں تجھے اس سے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے ہو جائے ﴿۴۶﴾

③ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ : "بُعْدًا" کا لفظ دوری، ہلاکت اور لعنت کے معنی میں آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ سب ظالم ہلاک کر دیے گئے۔ بائبل (پیدائش: ۱۸:۲۴) کے بیان پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان روئے زمین میں آیا تھا، مگر بعض علماء کا کہنا ہے کہ طوفان اسی علاقے میں آیا تھا جہاں نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ گو قرآن و حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ طوفان کے زمانے میں دنیا میں دجلہ و فرات کی وادی کے علاوہ کسی اور جگہ آبادی ہی نہ ہو۔

**آیت 45** وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ...... : تمام کفار کے غرق ہونے کے بعد باپ کی شفقت نے جوش مارا تو نوح علیہ السلام نے بیٹے کے بارے میں دعا کی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ نوح علیہ السلام کے اہل کو بچانے کا تھا، اس وعدے کے حوالے سے درخواست کی۔ وہ اہل سے نسبی اور رشتہ داری کے گھر والے سمجھ بیٹھے، جب کہ کافر اور مومن کے درمیان دوستی کا رشتہ باقی نہیں رہتا۔ ایمان لانے کے بعد سب مومن دوست اور سب کافر دشمن بن جاتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ ممتحنہ (۴) بہرحال نوح علیہ السلام نے ادب ملحوظ رکھا اور صریح الفاظ میں بیٹے کو بچانے کی بات نہیں کی۔

**آیت 46** ① قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ : فرمایا اے نوح! یہ تیرے اہل میں سے نہیں، بلکہ " اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ " کے تحت کفر کی وجہ سے تمھارا اہل ہونے کے شرف سے محروم ہے اور ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہے جن کے غرق کیے جانے کا پہلے فیصلہ ہو چکا ہے۔



② اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ : عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "اس کے عمل اچھے نہیں ہیں۔" یہ معنی اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ " عَمَلٌ " مصدر کو مبالغہ کے لیے اسم فاعل ( عَامِلٌ ) کے معنی میں مانا جائے، جیسے: " زَيْدٌ عَدْلٌ " کو " زَيْدٌ عَادِلٌ " کے معنی میں لیا جاتا ہے، یعنی یہ غیر صالح عمل کرنے والا ہے۔ مگر امام المفسرین طبری رحمہ اللہ کے مطابق " اِنَّهٗ " کی ضمیر نوح علیہ السلام کی دعا کی طرف جاتی ہے کہ آپ نے اپنے مشرک بیٹے کے حق میں جو سفارش کی ہے، یہ کام اچھا نہیں ہے۔

③ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ : یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوال تو اسی چیز کا ہوتا ہے جس کا علم نہ ہو، جس چیز کا

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَ تَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے اس بات کا سوال کروں جس کا مجھے کچھ علم نہیں اور اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں خسارہ پانے والوں سے ہو جاؤں گا ﴿۴۷﴾

علم ہو اس کے سوال کی تو ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے دو جواب ہیں، دراصل عربی میں سوال کا لفظ مانگنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور پوچھنے کے بارے میں بھی۔ سو پہلا جواب یہ ہے کہ صرف وہی چیز مانگنی چاہیے جس کے متعلق اچھی طرح معلوم ہو کہ جس سے مانگ رہے ہیں وہ یہ چیز مانگنے پر ناراض نہیں ہوگا۔ جس کے متعلق یہ علم نہ ہو بلکہ اس کے ناراض ہونے کا بھی خطرہ ہو، وہ ہرگز نہیں مانگنی چاہیے۔ اب نوح علیہ السلام کے سامنے اللہ تعالیٰ کے وہ فرمان موجود تھے: ﴿ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ اور ﴿ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ﴾ پھر بھی انھیں اس کا علم نہیں ہو سکا کہ اس درخواست پر اللہ تعالیٰ کس قدر ناراض ہوں گے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی درخواست کا جواب تو " اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ " کہہ کر دے دیا تھا، اب اس سے آگے امکان تھا کہ نوح علیہ السلام بیٹے کے نجات نہ پانے اور کفر پر مستحکم رہنے کے متعلق سوال کرتے کہ اس میں کیا حکمت ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اس سے روک دیا کہ میری حکمتوں تک تمھارے علم کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس لیے مجھ سے ایسی بات مت پوچھنا۔ (الوسیط للطنطاوی) یعنی پوچھنی بھی وہی بات چاہیے جس کے متعلق علم ہو کہ جس سے پوچھ رہے ہیں وہ اس سوال پر ناراض نہیں ہوگا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''آدمی پوچھتا وہی ہے جو معلوم نہ ہو، لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیے۔ یہ کام ہے جاہل کا کہ اگلے کی مرضی نہ دیکھے پوچھنے کی، پھر پوچھے۔'' (موضح)

❹ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: مطلب یہ ہے کہ اس حقیقت کو جاننے کے بعد اگر ایسا سوال کرو گے تو جاہل بن کر رہ جاؤ گے۔ (روح المعانی)

**آیت 47** قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ......: نوح علیہ السلام شاید پدری محبت کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ بیٹا چاہے کافر ہو، گھر والوں میں شامل ہے اور اس کے لیے دعا کی جا سکتی ہے، لیکن جوں ہی اللہ تعالیٰ نے انھیں تنبیہ کی کہ ایک کافر بیٹے کو نسبی قرابت کی بنا پر اپنا اہل سمجھنا صحیح نہیں ہے تو وہ فوراً متنبہ ہوئے اور اللہ کے حضور اپنی غلطی پر معافی مانگی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''نوح علیہ السلام نے توبہ کی، لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے، بندے کو کیا مقدور ہے! اسی کی پناہ مانگے کہ مجھ سے پھر یہ نہ ہو۔'' (موضح)

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ

کہا گیا اے نوح! اتر جا ہماری طرف سے عظیم سلامتی اور بہت سی برکتوں کے ساتھ، تجھ پر اور ان جماعتوں پر جو ان لوگوں سے ہوں گی جو تیرے ساتھ ہیں۔ اور کئی جماعتیں ہیں جنھیں ہم عنقریب ساز و سامان دیں گے، پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۴۸﴾ یہ غیب کی خبروں سے ہے جنھیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے

**آیت 48** ① قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ: یعنی ہماری طرف سے اپنے آپ پر اور اپنے ساتھ والے لوگوں پر سلامتی اور بے شمار برکتیں لے کر کشتی سے زمین پر اترو۔

② وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ: یعنی ان تمام مومنوں پر جو قیامت تک تمھاری اور تمھارے ساتھ والوں کی نسل سے پیدا ہوں گے، لیکن ان ساتھ والوں سے نسل صرف نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی چلی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ﴾ [ الصافات: ۷۷ ] ”اور ہم نے اس کی اولاد ہی کو باقی رہنے والے بنا دیا۔“

③ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ ...... : حق تعالیٰ نے تسلی فرما دی کہ اس کے بعد ساری نوع انسانیت پر ہلاکت نہیں آئے گی، ہاں بعض فرقے ہلاک ہوں گے۔ (موضح) ہلاک ہونے والے فرقوں سے مراد وہ تمام کافر ہیں جو نوح علیہ السلام کی نسل سے پیدا ہوئے یا قیامت تک پیدا ہوں گے۔

**آیت 49** ① تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ ...... : اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی سے سب کچھ نہیں جانتے تھے، نہ آپ غیب دان تھے، ورنہ وحی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بعض لوگ ان تمام آیات کی تاویل کرتے ہیں جن میں ہے کہ اے نبی! یہ غیب کی خبریں ہیں، ہم آپ کو سنا رہے ہیں، آپ نہ اس وقت وہاں تھے نہ آپ کو یہ باتیں معلوم تھیں، یہ ہم نے آپ کو وحی کے ذریعے بتائی ہیں۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عالم الغیب کہتے ہیں وہ اس قسم کی آیات ”یہ غیب کی خبریں ہیں، اس سے پہلے آپ ان کو نہیں جانتے تھے“ کی تحریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ خطاب دراصل امت کے لوگوں کو ہے کہ اے امت محمد کے لوگو! تم یہ باتیں نہیں جانتے تھے، مگر ہماری اس زیر تفسیر آیت نے ان لوگوں کی اس تحریف کو واضح طور پر باطل ثابت کر دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”یہ غیب کی خبروں سے ہے جنھیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انھیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔“ معلوم ہوا کہ ان تمام آیات سے بھی یہی مراد ہے کہ صرف قوم ہی نہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غیب دان نہیں تھے۔ اگر غیب دان مانیں تو بار بار وحی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کا سارا واقعہ ان کے غیب دان ہونے کی نفی کرتا ہے، ورنہ اگر انھیں پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا تو ساڑھے نو سو سال کی محنت، اس دوران میں قوم کی بدتمیزیوں پر صبر، پھر وحی کے مطابق کشتی بنانا، پھر بیٹے کے حق میں دعا کرنا، اللہ تعالیٰ کا ناراض ہونا اور نوح علیہ السلام کا معافی مانگنا سب کچھ

ع
وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

پہلے نہ تو انھیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم، پس صبر کر، بے شک اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے ﴿۴۹﴾

افسانہ ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح اگر ابراہیم علیہ السلام کو معلوم تھا کہ آگ مجھے نہیں جلائے گی، اسماعیل علیہ السلام ذبح نہیں ہوں گے، یا سارہ علیہا السلام کا کچھ نہیں بگڑے گا تو پھر ان کی جان و مال اور اولاد و آبرو اللہ کی راہ میں قربان کر دینے کی بات بے معنی ٹھہرتی ہے۔ بدر کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آہ و زاری اور افک یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کے موقع پر پریشانی کا کچھ مطلب نہیں بنتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ رسولوں کو اتنی بات ہی معلوم ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے سے انھیں بتائی جاتی ہے۔

❷ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ : " عَاقِبَةٌ " ایک حالت کے بعد آنے والی حالت، اس پر الف لام آئے تو عموماً اچھا انجام مراد ہوتا ہے، یعنی جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا انجام بخیر رہا اور ان کے تمام مخالفین ہلاک کر دیے گئے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انجام بھی دنیا و آخرت دونوں میں بہتر رہے گا اور آپ کے مخالفین دنیا میں بھی ذلیل و برباد ہوں گے اور آخرت میں بھی انھیں دوزخ کی آگ نصیب ہوگی۔ مسلمانوں کی تعداد کا کم ہونا اور مدت دراز تک اسلام کی دعوت کا کامیاب نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ دعوت ناکام ہے، بلکہ مسلسل صبر اور دعوت کے نتیجے میں آخری کامیابی اہل اسلام ہی کو ملے گی، خواہ کچھ نسلیں گزرنے کے بعد ملے۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے لاتعداد لشکر ہیں، مثلاً آگ، ہوا، پانی، پہاڑ اور بے شمار مخلوق۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو بھی اشارہ کر دے تو کافروں کا نام و نشان باقی نہیں رہ سکتا۔ کافر یہ نہ سمجھیں کہ مسلمان ہمیشہ مغلوب و مقہور ہی رہیں گے، بلکہ مسلمان اگر صبر و استقامت سے کام لیں اور اپنی ہر مصیبت اور بے بسی کو صرف اللہ کریم کے سامنے پیش کرتے رہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے کہا: ﴿ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [ القمر : ۱۰ ] " بے شک میں مغلوب ہوں سو تو بدلہ لے۔" تو خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت کا حاصل بہت ہی کم آدمی بارہ (۱۲) یا چالیس (۴۰) یا اسی (۸۰) آدمی نکلے، مگر نوح علیہ السلام اور اہل ایمان کی محنت ناکام نہیں ہوئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی غیبی قوت کے ساتھ دنیا کو تہ و بالا کر کے ان قلیل لوگوں کو ایسی کامیابی عطا فرمائی کہ ان کے دشمنوں کا نام و نشان مٹ گیا اور یہ پوری زمین کے مالک بن گئے۔ بنی اسرائیل، موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ پڑھ لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین سو تیرہ بے سر و سامان ساتھیوں کی ایک ہزار مسلح کفار کے مقابلے میں غیب سے فرشتے بھیج کر ایسی مدد کی کہ وہ دن فیصلہ کن دن بن گیا کہ آئندہ کسے غالب ہو کر رہنا ہے۔ غرض اللہ کا فیصلہ ہے کہ اچھا انجام متقین ہی کا ہے۔ (الوسیط)

❸ اس آیت میں " تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ " سے " وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا " تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر احسان کا ذکر ہے، " فَاصْبِرْ " میں نصیحت ہے اور " اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ " میں تسلی اور خوش خبری ہے۔

❹ اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا حق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اُمّی ہونے کے باوجود نوح علیہ السلام کا واقعہ پورا پورا صحیح سنا دیا جو وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہ تھا۔

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)۔ اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تم تو محض جھوٹ باندھنے والے ہو ۝۵۰

5 یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اپنی پوری کوشش کے باوجود اگر کسی صالح آدمی کا بیٹا صالح نہ بن سکے تو باپ اس میں بے قصور ہے۔ نوح علیہ السلام جیسا مہربان اور کامل مربی بھی اگر بیٹے کو راہ راست پر نہ لا سکا تو ہماری تمھاری کیا حیثیت ہے؟ اب اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت پر صبر و رضا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ (قرطبی)

6 قرآن مجید واقعات بیان کرتے وقت ان میں سے انھی حصوں کو نمایاں کرتا ہے جن سے کوئی نصیحت اور فائدہ حاصل ہو رہا ہو۔ ان کے وہ حصے جو اس مقصد سے خاص تعلق نہیں رکھتے انھیں چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً نوح علیہ السلام کی وہ کشتی کتنی مدت میں بنی، اس کا طول و عرض کیا تھا، اس میں سوار ہونے والے جانور کیسے جمع کیے گئے، اس میں کتنے کمرے تھے، کشتی کتنے دن پانی میں رہی، ''جودی'' پر کشتی سے اترنے کے بعد نوح علیہ السلام نے کہاں اقامت اختیار فرمائی اور طوفان کتنے دن زمین پر برپا رہا۔ رہے وہ قصے کہانیاں جو عام مشہور ہیں، وہ اکثر اسرائیلیات ہیں، جن کی شرع یا عقل سے تائید نہیں ہوتی۔

7 ایک مسئلہ جس پر بہت سے علماء نے بحث کی ہے، یہ بھی ہے کہ طوفان ساری زمین پر آیا تھا یا کچھ حصے پر؟ تفسیر المنار کے مصنف نے اپنے استاذ شیخ محمد عبدہ مصری کا فتویٰ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث کے ظاہر الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طوفان نوح علیہ السلام کی پوری قوم پر آیا تھا اور ان کے علاوہ اس وقت پوری زمین پر کوئی اور آباد نہ تھا، اس لیے یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان پوری زمین پر آیا تھا، کیونکہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ پوری زمین قوم نوح سے بھری ہوئی تھی۔ یہ تاریخی مسائل قرآن کے مقاصد میں سے نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صریح الفاظ میں کوئی وضاحت نہیں فرمائی۔ اس لیے ہم کہتے ہیں قرآن کے ظاہر کا تقاضا یہی ہے جو اوپر بیان ہوا، اب اگر کسی علمی تحقیق سے اس کے خلاف کوئی بات ثابت ہو جائے تو اس سے قرآن و حدیث کی کسی قطعی و صریح بات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ (الوسیط)

**آیت 50** 1 وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ ...... : ''هُوْدًا'' عطف بیان ہے ''اَخَاهُمْ'' سے۔ تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۶۵) اے مشرکو! اے کافرو! کے بجائے ''يٰقَوْمِ'' (اے میری قوم!) سے مخاطب کرنے سے ان کے ساتھ اپنا تعلق اور خیر خواہی ظاہر کرنا مقصود ہے۔

2 اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ : ''مُفْتَرُوْنَ'' ''فَرٰی'' سے باب افتعال (اِفْتِرَاءٌ) کا اسم فاعل جمع مذکر کا صیغہ ہے۔ افترا یعنی جان بوجھ کر ایسا جھوٹ بولنا جس کے متعلق بولنے والے کو بھی معلوم ہو کہ یہ صاف جھوٹ ہے، یعنی اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی ہے ہی نہیں، تمھارا کسی غیر کو معبود بنانا محض افترا ہے۔

يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

اے میری قوم! میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا، میری مزدوری اس کے سوا کسی پر نہیں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۵۱﴾ اور اے میری قوم! اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تم پر بادل بھیجے گا، جو خوب برسنے والا ہوگا اور تمھیں تمھاری قوت کے ساتھ اور قوت زیادہ دے گا اور مجرم بنتے ہوئے منہ نہ موڑو ﴿۵۲﴾

**آیت 51** ❶ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ...... : " فَطَرَ " کا اصل معنی پھاڑنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴾ [ الانفطار : ۱ ] "اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔" " فَطَرَنِيْ " سے مراد مجھے کسی گزشتہ نمونے کے بغیر پیدا فرمایا۔

❷ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: تو کیا تم سمجھتے نہیں کہ جو شخص سچے دل سے دعوت و تبلیغ اور نصیحت کی مشقت اٹھا رہا ہے اور جسے صرف اپنے رب سے اجر لینا ہے، وہ تم سے کوئی اجرت یا دنیوی فائدہ کیوں چاہے گا؟

**آیت 52** ❶ وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ...... : " السَّمَآءَ " آسمان کے علاوہ ہر بلند چیز کو بھی "سماء" کہہ لیتے ہیں۔ کیونکہ " سَمَا يَسْمُوْ " کا معنی بلند ہونا ہے، یہاں " السَّمَآءَ " سے مراد بادل یا بارش ہے۔ " مِدْرَارًا " یہ "دَرٌّ" سے مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا معنی دودھ کا بہنا اور زیادہ ہونا ہے، پھر بہت برسنے والی بارش کے لیے بطور استعارہ استعمال ہونے لگا۔ " دَرَّتِ السَّمَاءُ بِالْمَطَرِ دَرًّا، وَ تَدِرُّ دَرًّا " جب آسمان سے بارش بہت برسے۔ ان آیات سے اور دوسرے مقامات مثلاً الاحقاف (۲۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فخر و غرور اور اپنے رسول ہود علیہ السلام کو جھٹلانے کی وجہ سے کافی عرصہ تک ان سے بارش روک لی گئی، جس کے نتیجے میں قحط کی وجہ سے ہر طرف دھول اڑنے لگی اور باوجود زبردست جسمانی ڈیل ڈول اور قوت کے سب لوگوں میں کمزوری نمایاں ہونے لگی تو ہود علیہ السلام نے انھیں سمجھایا کہ سب سے پہلے تو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو شرک اور اس کی نافرمانی کی ہے، اس کی معافی مانگو۔ بہت سے مفسرین نے یہاں " اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ " سے شرک چھوڑ کر ایک اللہ پر ایمان لانا مراد لیا ہے۔ " ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ " پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، یعنی آئندہ اس کی ہر نافرمانی ترک کرنے اور ہر حکم بجا لانے کا پختہ عزم کرو، تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تم پر ایسا بادل بھیجے گا جو خوب برسنے والا ہوگا اور تمھاری قوت کی کمی دور کر کے پہلے سے بھی زیادہ قوت عطا فرمائے گا۔ معلوم ہوا کہ استغفار اور توبہ سے قحط دور ہوتا ہے اور جسمانی، ذہنی اور مالی ہر قسم کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید فوائد کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۳) اور سورۂ نوح (۱۰ تا ۱۲)۔

❷ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ: یعنی میری اطاعت سے منہ نہ موڑو، ورنہ تم مجرم قرار پاؤ گے۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾

انھوں نے کہا اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر نہیں آیا اور ہم اپنے معبودوں کو تیرے کہنے سے ہرگز چھوڑنے والے نہیں اور نہ کسی طرح تجھ پر ایمان لانے والے ہیں ﴿۵۳﴾ ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھے کوئی آفت پہنچا دی ہے۔ اس نے کہا میں تو اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو ﴿۵۴﴾ اس کے سوا۔ سو تم سب میرے خلاف تدبیر کر لو، پھر مجھے مہلت نہ دو ﴿۵۵﴾

③ یہاں تک ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا اور اس مختصر سی تقریر میں تین دفعہ انھیں ''اے میری قوم'' کہہ کر پکارا، تاکہ شاید قرابت کے واسطے ہی سے ان کے دلوں تک رسائی حاصل کر سکیں۔ کیونکہ ہود علیہ السلام اسی قبیلے کے فرد ہو کر انھی کی بدخواہی نہیں کر سکتے تھے۔

**آیت 53** ① قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ ...... : یہ بات یقینی ہے کہ ہر پیغمبر اللہ کی طرف سے ایسے واضح دلائل اور یقینی آیات اور نشانیاں لے کر آتا ہے کہ سننے اور دیکھنے والوں کو اس کے نبی ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا، مگر یہ سب کچھ انھی کے لیے کارآمد ہوتا ہے جو دل کے کانوں اور آنکھوں سے سنتے اور دیکھتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص یا قوم ضد اور عناد کی وجہ سے یہ طے کر لے کہ ہم نے ماننا ہی نہیں تو انھیں لاکھ دلیل سامنے ہونے کے باوجود ایک بھی نظر نہیں آتی اور ان کی حالت وہ ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ (۶، ۷) میں بیان فرمائی ہے۔

② یہاں چار جملوں میں ہود علیہ السلام کی قوم نے سخت ترین لفظوں میں انھیں جھٹلا کر ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔ پہلے جملے میں ان پر نبوت کی ایک بھی دلیل پیش نہ کرنے کا بہتان لگایا۔ دوسرے اور تیسرے جملے میں ''مَا'' نافیہ کی تاکید باء کے ساتھ کر کے کچھ بھی ہو جائے اپنے معبودوں کو چھوڑنے اور ہود علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

**آیت 55،54** ① اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ : یہ چوتھی بات ہے جو انھوں نے ہود علیہ السلام کو جھٹلانے کے ساتھ مزید توہین اور مذاق کے لیے کہی۔ ''عَرَا يَعْرُوْ'' اور ''اِعْتَرٰى يَعْتَرِيْ'' پیش آنا، پہنچنا، باء کے ساتھ متعدی ہو کر پہنچانا کے معنی میں ہو گیا، یعنی ہمارے کسی ایک آدھ معبود نے تجھے کوئی آفت پہنچا دی ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، اگر سب کی مار پڑ جاتی تو معلوم نہیں تیرا کیا بنتا۔ افسوس! یہی کسی بزرگ کی مار کا تصور آج مسلمانوں میں بھی آ گیا ہے، حالانکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے سوا کوئی زندہ یا مردہ ہستی کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکتی ہے نہ بنا سکتی ہے۔

② قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ ...... : یعنی میرا تمھارے ان بتوں سے اور اللہ کے سوا کسی معبود سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ میں ہر آن

اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾

بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا، جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے۔ کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر وہ اس کی پیشانی کے بالوں کو پکڑے ہوئے ہے۔ بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے ﴿۵۶﴾

ان کا انکار اور ان سے اظہار براءت کرتا ہوں۔

③ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ: یعنی یہ جو تم کہتے ہو کہ تم پر ہمارے کسی معبود کی مار پڑ گئی ہے تو ایک آدھ کے بجائے اگر تم اور تمھارے یہ سب معبود مل کر بھی میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو بگاڑ لیں اور مجھے ذرا مہلت نہ دیں، ورنہ جان لو کہ تم بھی جھوٹے اور تمھارے یہ معبود بھی غلط۔

ہود علیہ السلام کا یہ کلام ان کی قوم کی دوسری فضول باتوں کے علاوہ اس بات کا بھی جواب ہے کہ تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل، یعنی معجزہ نہیں لایا۔ معجزہ اور نشانی کیا چیز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر معجزہ کی روح وہ چیلنج ہوتا ہے جو صاحب معجزہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ مثلاً صالح علیہ السلام کی اونٹنی، ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ان کے لیے آگ کا گلزار بن جانا، مگر یہ معجزہ بھی کیا کم ہے کہ اکیلا شخص پوری قوم کو للکار رہا ہے کہ میں تم سب کو اور تمھارے خداؤں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ تم سب مل کر میرا جو بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو اور اس قوم کو للکار رہا ہے جو نہایت سخت گیر اور رحم سے ناآشنا تھے، جن کے بارے میں آتا ہے: ﴿وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ﴾ [الشعراء: ۱۳۰] ''اور جب تم پکڑتے ہو تو بہت بے رحم ہو کر پکڑتے ہو۔'' خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اتنی قوت والے تھے کہ ان کے بعد ویسی قوم پیدا ہی نہیں کی گئی، فرمایا: ﴿الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ﴾ [الفجر: ۸] ''وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔'' جب طوفان سے ہلاک ہوئے تو: ﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ﴾ [الحاقۃ: ۷] ''گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے تھے۔'' صرف ایک شخص پوری قوم کو للکار رہا ہے، جو اس کے خون کی پیاسی ہے، جس کے معبودوں کو اور پوری قوم کو اس نے جاہل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ سب مل کر میرے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کر لو اور پوری قوم باتیں تو بناتی ہے، مگر اس کا کچھ بگاڑ نہ سکی، یہ کھلا معجزہ نہیں تو کیا ہے؟

**آیت 56** ① اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ : یہ جرأت ہود علیہ السلام میں کیسے پیدا ہوئی؟ وہ خود فرماتے ہیں کہ میرا بھروسا اللہ پر ہے، جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے۔

② مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا: '' نَاصِیَةٌ '' پیشانی کے بالوں کو کہتے ہیں، اگر کسی کو یہاں سے اچھی طرح پکڑ لیا جائے تو وہ ہل نہیں سکتا، بلکہ پوری طرح پکڑنے والے کی گرفت میں ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ﴾ [العلق: ۱۵] ''تو ہم ضرور اسے پیشانی کے بالوں کے ساتھ گھسیٹیں گے۔'' مجرموں کے متعلق فرمایا کہ وہ اپنی علامت کے ساتھ پہچانے جائیں گے: ﴿فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ﴾ [الرحمٰن: ۴۱] ''پھر (ان کو) پیشانی کے بالوں اور قدموں

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَ يَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷

پھر اگر تم پھر جاؤ تو بلاشبہ میں تمھیں وہ پیغام پہنچا چکا جسے دے کر مجھے تمھاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمھارے سوا کسی اور قوم کو تمھاری جگہ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نقصان نہ کرو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر اچھی طرح نگہبان ہے ۝۵۷

سے پکڑا جائے گا۔'' مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرعی عقیدے اور شرعی احکام میں تمھیں اختیار دیا ہے کہ مانو گے تو انعام پاؤ گے، نہ مانو گے تو مارے جاؤ گے۔ اس پر تم اکڑ گئے اور اپنے آپ کو ہر طرح مرضی کا مالک سمجھ لیا۔ سب سے پہلے تو شرعی احکام پر عمل میں اختیار دینے والے مالک کی غداری کر کے اس کی مخلوق کو اس کے شریک بنا بیٹھے، پھر اس کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی، اس کے رسول کو جھٹلایا۔ یہ نہ سوچا کہ تھوڑا سا اختیار رکھنے کے باوجود صرف تم ہی نہیں بلکہ پوری مخلوق مکمل طور پر اس کی گرفت میں ہے اور اس کی پیشانی کے بال اس نے پکڑ رکھے ہیں، وہ اس کی مرضی کے بغیر ہل بھی نہیں سکتے۔ اب تم جس طرح شرعی احکام میں اپنا اختیار غلط استعمال کرتے ہوئے اکڑ کر کہتے ہو، ہم اللہ کو نہیں مانتے، ہمارا داتا فلاں اور دستگیر فلاں ہے، ہم رسول کو نہیں مانتے، ہمارا سائیں مرشد فلاں ہے، اگر واقعی تم ایسے ہی آزاد ہو تو ان احکام پر بھی اکڑ کر دکھاؤ جن میں وہ "کُنْ" کہتا ہے تو وہ فوراً واقع ہو جاتے ہیں۔ جب بیمار ہوتے ہو تو یہ کہہ کر دکھاؤ کہ کوئی ہمیں بیمار نہیں کر سکتا، کوئی ہمیں بوڑھا نہیں کر سکتا، کوئی ہمارے بال سفید نہیں کر سکتا۔ اگر تم اور تمھارے خدا ایسے ہی زبردست ہیں تو اللہ کے حکم سے دل کی حرکت رکنے پر اسے چالو کر کے دکھاؤ۔ اسی طرح موت کے وقت بھی اکڑ جاؤ کہ جاؤ ہم نہیں مرتے۔ یا تمھارے شریک کہیں ہم اپنے بندے کو مرنے نہیں دیں گے۔ معلوم ہوا کہ تم اس تھوڑے سے اختیار کے باوجود مکمل طور پر میرے رب کے مکمل قبضے میں ہو، پھر جب خود اس نے مجھے بھیجا ہے اور وہ میرا پشت پناہ ہے اور اسی پر میرا بھروسا ہے، تو مجھے تمھارا کیا ڈر ہے، جاؤ جو مرضی کر لو۔

❸ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ ''جو سیدھی راہ پر چلے وہ اس سے ملے۔'' (موضح) سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآىِٕرٌ ﴾ [ النحل : ۹ ] ''اور سیدھا راستہ اللہ ہی پر (جا پہنچتا ہے) اور ان میں سے کچھ (راستے) ٹیڑھے ہیں۔'' دوسرا یہ کہ اگرچہ ہر جاندار پر اس کا قبضہ ہے اور وہ اس کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہے کر سکتا ہے، مگر وہ صراط مستقیم پر ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ (ابن کثیر)

**آیت 57** ❶ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ...... : "تَوَلَّوْا" اصل میں "تَتَوَلَّوْا" تھا، لغت عرب میں کسی فعل کے شروع میں اگر دو "تاء" ہوں تو عموماً ایک کو حذف کر دیتے ہیں۔ یعنی رسولوں کے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مجھ تک اللہ کا پیغام نہیں پہنچا، اس لیے میں معذور ہوں، اب اگر تم نہ مانو تو بے شک نہ مانو، مگر میرا فریضہ پورا ہو گیا اور تمھارا عذر ختم ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ کہ ''وہ پیغام پہنچائے بغیر عذاب نہیں دیتا'' تمھارے لیے بہانہ نہیں بن سکتا۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ہمراہ ایمان لائے تھے، اپنی طرف سے عظیم رحمت کے ساتھ نجات دی اور انھیں ایک بہت سخت عذاب سے بچالیا۔﴿۵۸﴾

تمھارے نہ ماننے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تمھیں ختم کر کے تمھاری جگہ اور لوگ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نقصان نہ کر سکو گے۔ آگے اس کی مرضی ہے کہ تمھاری جگہ اچھے لوگ لائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ﴾ [ محمد : ۳۸ ] ”اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگ لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔“ اور یہ بھی اس کی مرضی ہے کہ چاہے تو مزید برے لوگ لے آئے، جیسا کہ بنی اسرائیل نے جب ارض مقدس میں فساد شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں سزا دینے کے لیے ان سے بھی برے بندے ان پر مسلط کر دیے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۵ تا ۷)۔

❷ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ: یعنی جس طرح بعض جاہل فلسفی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کے قوانین بنا دیے، اب وہ ان قوانین کے مطابق خود بخود چل رہی ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ میرے رب نے کائنات کو پیدا کیا، پھر ”رب“ کا معنی ہی یہ ہے کہ تربیت اور پرورش بھی وہی کر رہا ہے۔ پھر حفیظ بھی وہی ہے۔ ہر چیز اس کی نگرانی میں چل رہی ہے۔ اس سے ان مشرکوں اور جاہل صوفیوں کا بھی رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے اس کا انتظام قطبوں، غوثوں اور اس قسم کے خود ساختہ ناموں والے ولیوں اور بزرگوں کے حوالے کر دیا ہے، جو اس کو چلا رہے ہیں اور اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اب فارغ ہے، اختیار اس نے اپنے پیاروں کو دے دیے ہیں۔ اللہ اکبر! پہلی امتوں کے مشرکوں اور ہماری امت کے مشرکوں میں کس قدر مشابہت اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔

**آیت 58** وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا ......: ہمارے حکم سے مراد عذاب کا حکم ہے، اس کی تفصیل سورۂ احقاف، سورۂ حاقہ، سورۂ قمر اور دوسری سورتوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر شدید ہوا کی تیز و تند اور سرکش آندھی بھیجی، جو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلی اور اس نے کفار میں سے ایک بھی متنفس کو باقی نہ چھوڑا۔ دیکھیے سورۂ حاقہ (۶ تا ۸) یہ تو دنیا کا عذاب تھا، آخرت میں ان کے لیے اس سے بھی سخت عذاب ”عَذَابٍ غَلِيْظٍ“ تیار ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام اور ان کے ہمراہ ایمان لانے والوں کو ان دونوں عذابوں سے بچا لیا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی خوف ناک آندھی جب چلتی ہے تو وہ مومن و کافر ہر ایک پر گزرتی ہے تو ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھی کس طرح بچ گئے؟ اسی طرح ثمود پر آنے والی صیحہ (چیخ) سے کافروں کے کان اور دل تو پھٹ گئے مگر صالح علیہ السلام اور ایمان والوں کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ ہم نے انھیں اپنی عظیم رحمت کے ساتھ بچالیا۔ ”بِرَحْمَةٍ“

وَ تِلْكَ عَادٌ ڰ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

ع ۵

اور یہ عاد تھے جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر زبردست جابر، سخت عناد والے کے حکم کی پیروی کی ﴿۵۹﴾ اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ سن لو! بے شک عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سن لو! عاد کے لیے ہلاکت ہے، جو ہود کی قوم تھی ﴿۶۰﴾

میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، پھر جو رحمت اللہ کی طرف سے ہو اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ وہ آندھی اور چیخ اللہ کے امر سے کفار پر آئی تھیں، ان کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں پر اثر انداز ہونے کا انھیں حکم ہی نہ تھا۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت کے دامن میں محفوظ تھے۔ ابابیل پرندوں کی کنکریوں سے ابرہہ اور اس کا لشکر کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو گیا، مگر مکہ والوں کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ دراصل یہ حکم اس قادر مطلق کا تھا، اگر کسی دنیا والے کا ہوتا تو کافر و مومن دونوں پس جاتے، متنبی نے کہا ہے ؎

تُسَوِّدُ الشَّمْسُ مِنَّا بِيْضَ اَوْجُهِنَا ۔۔۔ وَمَا تُسَوِّدُ بِيْضَ الْعَيْنِ وَاللِّمَمِ

وَكَانَ حَالُهُمَا فِي الْحُكْمِ وَاحِدَةً ۔۔۔ لَوِ احْتَكَمْنَا مِنَ الدُّنْيَا اِلٰى حَكَمِ

’’دھوپ ہمارے چہروں کی سفیدی کو سیاہ کر دیتی ہے، جب کہ آنکھ کی سفیدی اور بالوں کی سفیدی کو سیاہ نہیں کرتی۔ حالانکہ اگر ہم دنیا کے کسی منصف کے پاس جائیں تو فیصلے میں دونوں کا حال ایک ہی ہے۔‘‘

بیماری کے بعد شفا بھی رحمت ہے مگر بیماری آنے ہی نہ دینا یہ اس سے بھی عظیم رحمت ہے۔

**آیت 59** ① وَ تِلْكَ عَادٌ: اور یہ تھے عاد، اس سے مراد ان کے علاقے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ قوم بھی جن کا واقعہ بیان ہوا۔

② جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ: ’’جَحَدُوْا‘‘ کا معنی ہے دلیل سے ثابت شدہ بات کا انکار کر دینا۔ آیات سے مراد کائنات میں رب تعالیٰ کی توحید کی بے شمار نشانیاں، ہود علیہ السلام پر نازل ہونے والی آیات اور ان کا تنہا پوری قوم کے سامنے بے خوف ہو کر ڈٹ جانا وغیرہ ہیں۔ غرض اس بدنصیب قوم نے واضح نشانات، معجزات اور آیات سمجھ میں آ جانے کے باوجود انھیں ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

③ عَصَوْا رُسُلَهٗ: انھوں نے اگرچہ ہود علیہ السلام ہی کی نافرمانی کی، لیکن چونکہ ایک پیغمبر کی نافرمانی تمام پیغمبروں کی نافرمانی ہے، اس لیے فرمایا: ’’انھوں نے اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی۔‘‘ (شوکانی)

④ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ: ’’عَنِيْدٍ‘‘ سخت عناد والا، ہر وہ شخص جو حق قبول نہ کرے اور اس کے ساتھ شدت کے ساتھ اس کی مخالفت بھی کرے، مراد قوم کے سردار ہیں۔

**آیت 60** ① وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: لعنت کا معنی ناراض ہو کر دفع دور کر دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت سے مراد آخرت میں عذاب اور دنیا میں اپنی رحمت اور توفیق سے محروم کر دینا ہے اور انسان کی طرف سے لعنت کا

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور تمھیں اس میں آباد کیا، سو اس سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے، قبول کرنے والا ہے ﴿۶۱﴾

مطلب اس کے لیے یہ بددعا کرنا ہے۔ (راغب) یعنی دنیا میں آنے والا ہر پیغمبر اور مومن ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کرتا رہے گا اور آخرت میں وہ سب کے سامنے رسوا اور مبتلائے عذاب ہوں گے۔

❷ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ...... : "اَلَاۤ" کے ساتھ خبردار اس لیے کیا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ ان بے چاروں پر زیادتی ہوئی۔ فرمایا، سن لو! یہ لوگ تمام جرائم سے بڑے جرم رب تعالیٰ کے کفر کے مرتکب تھے۔ پھر دوبارہ فرمایا، سن لو! عاد کے لیے ہر قسم کی خیر اور اللہ کی رحمت سے دوری ہے، جو ہود علیہ السلام کی قوم تھے۔ یاد رہے کہ "كَفَرَ" کے بعد عام طور پر باء آتی ہے، مثلاً "كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ" جس کا مطلب رب کی نعمتوں کی ناشکری اور انکار ہوتا ہے۔ باء کے بغیر "كَفَرُوْا رَبَّهُمْ" کا مطلب یہ ہے کہ قوم عاد نے سرے ہی سے اپنے رب کا انکار کر دیا، جیسے دہریے رب تعالیٰ کو نہیں مانتے۔ "كَفَرُوْا رَبَّهُمْ" "كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ" سے بھی بڑا جرم ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق "كَفَرُوْا رَبَّهُمْ" میں یہ بھی ممکن ہے کہ "كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ" میں سے تخفیف کے لیے باء حذف کر دی گئی ہو اور دونوں کا معنی ایک ہی ہو۔

**آیت 61** ❶ وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا : قوم ثمود مقام حجر (حاء کے کسرہ کے ساتھ) میں رہتے تھے۔ یہ جگہ حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک پھیلی ہوئی ہے۔ آج کل یہ علاقہ مدینہ اور تبوک کے درمیان ہے، جہاں ابھی تک ان لوگوں کے پہاڑوں کے اندر تراش کر بنائے ہوئے مکانات، جن میں وہ رہتے تھے، موجود ہیں اور یہ علاقہ مدائن صالح کہلاتا ہے۔ صالح علیہ السلام کا قبیلہ عرب قبیلہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک (شام) کی طرف جاتے ہوئے یہاں سے گزرے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (وادی) حجر میں تھے تو فرمایا: (( لَا تَدْخُلُوْا عَلٰی هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ الْمُعَذَّبِيْنَ أَصْحَابِ الْحِجْرِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ ، فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَيْهِمْ أَنْ يُّصِيْبَكُمْ مَا أَصَابَهُمْ )) "ان عذاب دیے ہوئے لوگوں یعنی اصحاب حجر پر مت داخل ہو، مگر ایسی حالت میں کہ تم رونے والے ہو، اگر تمھیں رونا نہ آئے تو ان پر داخل نہ ہونا، کہیں تمھیں بھی اس جیسا عذاب نہ آ پہنچے جو ان کو پہنچا تھا۔" [ مسند أحمد : ۲/ ۵۸، ح : ۵۲۲۴، و صححہ شعیب الأرنؤوط و الألبانی ] قوم ثمود کا قصہ سورۂ اعراف، شعراء، نحل اور قمر وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔ "اَخَاهُمْ صٰلِحًا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی قبیلے کے فرد تھے، اس لیے ان کے خیر خواہ، ان کے مزاجوں کو سمجھنے والے اور ان میں مدت تک رہنے والے تھے۔

❷ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ...... : ان کی دعوت بھی وہی دعوت توحید تھی جو تمام انبیاء کی دعوت تھی۔

قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ ھٰذَاۤ اَتَنۡھٰنَاۤ اَنۡ نَّعۡبُدَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ مُرِیۡبٍ ﴿۶۲﴾

انھوں نے کہا اے صالح! یقیناً تو ہم میں وہ تھا جس پر اس سے پہلے امیدیں رکھی گئی تھیں، کیا تو ہمیں منع کرتا ہے کہ ہم ان کی عبادت کریں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں اور بے شک ہم اس بات کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں دعوت دیتا ہے، یقیناً ایک بے چین رکھنے والے شک میں ہیں ﴿۶۲﴾

③ ھُوَ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ......: ’’اِنۡشَاءٌ‘‘ کا معنی نئی چیز بنانا ہے۔ ’’اسۡتَعۡمَرَکُمۡ‘‘ ’’عَمَرَ یَعۡمُرُ‘‘ کسی جگہ کو آباد کرنا، سورۂ روم میں فرمایا: ﴿ وَعَمَرُوۡھَاۤ اَکۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡھَا ﴾ [ الروم : ۹ ] ’’اور انھوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جو انھوں نے اسے آباد کیا۔‘‘ ’’أَعۡمَرَ یُعۡمِرُ‘‘ باب افعال کسی شخص کو کسی جگہ میں آباد کرنا۔ ’’اِسۡتَعۡمَرَ‘‘ میں حروف زائد ہیں، یعنی کسی کو کسی جگہ میں خوب آباد کرنا۔ صالح علیہ السلام ان الفاظ کے ساتھ انھیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور صرف اسی کے معبود برحق ہونے کی دلیل دے رہے ہیں کہ اسی نے تمھیں زمین سے پیدا کیا، زمین کو بھی اسی نے بنایا، تمھاری ضرورت کی ہر چیز زمین سے اسی نے پیدا کی، اپنی زمین پر اس نے تمھیں خوب آباد کیا، پہاڑوں کو تراشنے کی صلاحیت اور عقل عطا فرمائی، نہایت ترقی یافتہ زراعت اور اس کے اسباب، زرخیز زمین اور چشمے عطا فرمائے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۱۴۱ تا ۱۵۰) اب تک اس کی جو ناشکری اور اس کے ساتھ شرک کر چکے ہو اس کی معافی مانگ کر اس پر ایمان لے آؤ اور آئندہ کے لیے اس کے ساتھ کفر و شرک سے توبہ کرو۔ ساتھ ہی ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ کھلا ہونے کی امید دلانے کے لیے رب تعالیٰ کی دو صفات بیان کیں کہ وہ ’’قَرِیۡبٌ‘‘ بھی ہے اور ’’مُجِیۡبٌ‘‘ بھی۔ کوئی اسے پکارے تو اسے کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ آہستہ پکارے یا بلند آواز سے، اکیلا پکارے یا مجلس میں، میرا رب قریب بھی ہے اور قبول کرنے والا بھی۔ جب اس کے سوا یہ اوصاف کسی میں بھی نہیں تو کسی اور کی عبادت کیوں؟

**آیت 62** ① قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ ......: یعنی ہم تو تمھاری ذہانت اور عقل مندی سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے تھے۔ کیوں نہ کرتے، نبی نبوت ملنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی زیر نگرانی نہایت امین، صادق، عفیف، باوقار، حلیم اور تمام اوصاف حسنہ سے متصف ہوتا ہے۔ مگر جوں ہی اس شخص نے جس کے اوصاف حسنہ سب کے نزدیک مانے ہوئے تھے، ان کی خواہش نفس اور جاہلی عقائد و رواج کے خلاف بات کی تو ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہی دانا شخص ان کے نزدیک عقل و فکر سے خالی ٹھہرا اور ان کے پاس کفر و شرک کے درست ہونے کی اور صالح علیہ السلام سے امیدیں ٹوٹنے کی دلیل کیا تھی؟ صرف یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد جن کی عبادت کرتے تھے، یہ ان کی عبادت سے منع کرتا ہے۔ تمام گمراہ اقوام کی دلیل یہی تقلید رہی ہے، کیونکہ یہ بلا نہ کسی کی بات سننے دیتی ہے، خواہ کتنی صحیح ہو اور نہ خود سوچنے سمجھنے کی طرف آنے دیتی ہے۔ دیکھیے سورۂ ملک (۱۰)۔

② وَ اِنَّنَا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ مُرِیۡبٍ: ’’شک‘‘ ذہن کی وہ کیفیت ہے جس میں آدمی دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَ اٰتٰىنِىۡ مِنۡهُ رَحۡمَةً فَمَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ عَصَيۡتُهٗ فَمَا تَزِيۡدُوۡنَنِىۡ غَيۡرَ تَخۡسِيۡرٍ ﴿۶۳﴾ وَ يٰقَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ

اس نے کہا اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی جناب سے عظیم رحمت عطا کی ہو تو کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا، اگر میں اس کی نافرمانی کروں، پھر خسارہ پہنچانے کے سوا تم مجھے کیا زیادہ دو گے؟ ﴿۶۳﴾ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمھارے

---

کو ترجیح نہ دے سکے۔ "مُرِيۡبٍ" "اَرَابَ يُرِيۡبُ اِرَابَةً" (رَيۡبٌ سے باب افعال) بے چین کر دینا، بے قرار رکھنا۔ "مُرِيۡبٍ" بے چین رکھنے والا۔ یہاں انھوں نے اپنی حقیقی حالت بیان کی ہے۔ صالح علیہ السلام کی دلیل اور حجت پر مبنی دعوت نے ان کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی اور اگرچہ انھوں نے اسے نہیں مانا مگر اس دعوت نے انھیں اپنے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر تقلید آباء کی شامت نہ ہوتی تو وہ لوگ چند لمحوں میں ہر طرح کے شک اور بے چینی سے نکل کر ایمان و یقین کی ٹھنڈک اور اطمینان سے سرفراز ہو چکے ہوتے۔ مگر دیکھیے کتنی بڑی حماقت تھی کہ شرک پر نہ تو مطمئن تھے اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہی تھی، مگر پھر بھی آبائی تقلید کی وجہ سے شرک کو چھوڑ کر توحید کی راہ اختیار کرنے کو تیار نہ تھے۔

**آیت 63** ① قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ...... : اس کی تفسیر ان آیات سے پہلے ہود علیہ السلام کے قصے میں دیکھیے۔ "مِنۡهُ رَحۡمَةً" سے مراد نبوت ہے۔

② اِنۡ عَصَيۡتُهٗ : یعنی اگر میں تم تک اس کا پیغام پہنچانے میں کوتاہی کروں تو اس کی گرفت سے مجھے کون چھڑائے گا؟

③ غَيۡرَ تَخۡسِيۡرٍ : یعنی اگر میں توحید کی راہ چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کر لوں تو یہی نہیں کہ تم مجھے اللہ کی پکڑ سے نہ بچا سکو گے، بلکہ تمھاری وجہ سے میرا جرم اور بھی بڑھ جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس بات پر مجھے دوہری سزا دے گا کہ میں نے تمھارے کہنے پر جان بوجھ کر شرک کا راستہ اختیار کیا۔ "خَسِرَ يَخۡسَرُ خُسۡرَانًا" (ع) خسارہ اٹھانا اور "خَسَّرَ يُخَسِّرُ تَخۡسِيۡرًا" (تفعیل) خسارہ پہنچانا۔

**آیت 65،64** ① وَ يٰقَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ : اس اونٹنی کی نسبت اللہ کی طرف اس کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، ورنہ ہر اونٹنی اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔ قرآن مجید میں اس کے اوصاف یہ آئے ہیں کہ قوم ثمود کے معجزہ طلب کرنے پر صالح علیہ السلام کو یہ اونٹنی ملی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے ان کے کنویں کا پانی پینے کی باری مقرر کی گئی کہ ایک دن صرف وہ پیے گی اور ایک دن دوسرے تمام لوگوں کے جانور پانی پییں گے۔ اپنی باری کے دن لوگ جتنا پانی چاہیں نکال کر رکھ لیں، مگر اونٹنی کی باری کے دن صرف وہی پیے گی۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۱۵۴ تا ۱۵۶) وہ جہاں چاہے چرے، کوئی شخص اسے اپنے کھیت سے یا کسی بھی جگہ سے چرنے سے نہیں روکے گا اور یہ کہ اگر کسی نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تو انھیں قریب ہی عذاب عظیم آ پکڑے

فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

لیے عظیم نشانی، پس اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ، ورنہ تمھیں ایک قریب عذاب پکڑ لے گا ﴿۶۴﴾ تو انھوں نے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں، تو اس نے کہا اپنے گھروں میں تین دن خوب فائدہ اٹھالو، یہ وعدہ ہے جس میں کوئی جھوٹ نہیں بولا گیا ﴿۶۵﴾

---

گا۔ (آیت زیر تفسیر) یہاں "عَذَابٌ قَرِيْبٌ" ہے جبکہ سورۂ شعراء (۱۵۶) میں "عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ" ہے۔

② لَكُمْ اٰيَةً: اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اونٹنی ایک معجزہ تھی۔ ایک پورا دن اس کے پینے کے لیے باری مقرر کرنا بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ عام اونٹنی نہ تھی، مگر وہ کیسے وجود میں آئی؟ قرآن و حدیث میں اس کا ذکر مجھے نہیں ملا۔ بہت سی تفاسیر کے مطالعے کے بعد کم از کم میری تسلی تو شیخ عبد الرحمٰن بن ناصر بن سعدی رحمہ اللہ کی تفسیر "تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان" کے کلام سے ہوئی، جو انھوں نے سورۂ اعراف میں قوم ثمود کی اونٹنی کے متعلق فرمایا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "جان لو کہ اکثر مفسرین یہ قصہ ذکر کرتے ہیں کہ وہ اونٹنی ایک نہایت سخت اور چکنی چٹان سے نکلی، جس طرح کی اونٹنی نکالنے کا انھوں نے صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ حاملہ ہو اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے حاملہ اونٹنی کی صورت میں نکلی۔ اسے حاملہ اونٹنیوں کی طرح ولادت کا درد ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ جس وقت انھوں نے اونٹنی کو کاٹا تو وہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور تین دفعہ اونٹ کی طرح بلبلایا، چنانچہ پہاڑ پھٹا اور وہ اس میں غائب ہو گیا اور یہ کہ صالح علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تمھیں جو تین دن ملے ہیں ان میں سے پہلے دن تمھارے چہرے زرد، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ انھوں نے فرمایا تھا۔" شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ تمام باتیں اسرائیلیات سے ہیں، جنھیں اللہ کی کتاب کی تفسیر میں نقل کرنا مناسب نہیں اور قرآن مجید میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ان باتوں میں سے کسی ایک پر کسی طرح دلالت کرتی ہو، بلکہ اگر یہ باتیں صحیح ہوتیں تو اللہ تعالیٰ انھیں ضرور ذکر فرماتا، کیونکہ ان میں ایسی عجیب باتیں، عبرتیں اور نشانیاں ہیں جن کا ذکر ساتھ ہی ہونا تھا۔ اب اگر یہ ایسے لوگوں کی طرف سے آئیں جن پر اعتماد ہو ہی نہیں سکتا تو کیسے قبول ہو سکتی ہیں؟ بلکہ ان میں سے بعض تو قرآن مجید کی تصریحات ہی سے درست معلوم نہیں ہوتی ہیں، مثلاً صالح علیہ السلام نے اونٹنی کی ٹانگیں کاٹنے پر ان سے فرمایا: ﴿تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ﴾ تمتع خوب فائدہ اور لذت اٹھانے کو کہتے ہیں۔ وہ لوگ صالح علیہ السلام کو اور عذاب آنے کو جھلا رہے تھے بلکہ بار بار عذاب لانے کا مطالبہ کر رہے تھے، اگر ان کے چہرے ہی زرد، سرخ اور سیاہ ہو گئے ہوں تو انھیں تین دن خوب فائدہ اور لذت اٹھانے کی مہلت کیا خاک ملی۔ یہ قرآن کے صاف خلاف نہیں تو کیا ہے؟ ہدایت کے لیے تو قرآن کافی ہے، ہاں، اگر کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، تو وہ کتاب اللہ سے نہیں ٹکرائے گی، وہ سر آنکھوں پر اور اسے ماننے کا قرآن نے حکم دیا ہے: ﴿وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [ الحشر: ۷ ] "اور رسول تمھیں جو کچھ

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ

پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی طرف سے عظیم رحمت کے ساتھ بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے بھی۔ بے شک تیرا رب ہی بے حد قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۶۶﴾ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں چیخ نے پکڑ لیا، تو انھوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں صبح کی کہ گرے پڑے تھے ﴿۶۷﴾ جیسے وہ ان میں رہے ہی نہ تھے۔ سن لو! بے شک ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سن لو! ثمود کے لیے ہلاکت ہے ﴿۶۸﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے، انھوں نے سلام کہا، اس نے کہا سلام ہو،

دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔“ اور پہلے گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر اسرائیلیات سے جائز نہیں، خواہ ان سے وہ بات نقل کرنا جائز بھی ہو، جس کا جھوٹا ہونا یقینی نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کے معانی یقینی ہیں، ان کی تفسیر ایسی باتوں سے کرنا جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُصَدِّقُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ» [بخاری، التفسیر، باب: «قولوا آمنا باللہ ......»: ۴۴۸۵] ”نہ انھیں سچا سمجھا جائے نہ جھوٹا“ ایسا کام ہے جس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔“

تمتع کے بارے میں ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

تَمَتَّعْ مِنْ شَمِيْمِ عَرَارِ نَجْدٍ  فَمَا بَعْدَ الْعَشِيَّةِ مِنْ عَرَارِ

”نجد کی ”عرار“ نامی بوٹی کی خوشبو سے خوب فائدہ اٹھا لو، کیونکہ آج سہ پہر کے بعد پھر ”عرار“ نہیں ملے گی۔“

(کیونکہ شاعر وہاں سے کوچ کر رہا تھا)

**آیت 66 تا 68** ان آیات کی تفسیر سورۂ اعراف کی آیات (۷۷ تا ۷۹) میں اور سورۂ ہود کے اس سے پچھلے رکوع کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔ ”كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا“ ”غَنِيَ يَغْنٰى“ (ع) ”فِيْ مَكَانِ كَذَا“ جب کوئی شخص لمبی مدت کسی جگہ میں یوں رہے کہ وہ اس کے سوا کسی بھی جگہ سے غنی ہو۔ ”مَغْنٰى“ مصدر بھی ہے، مکان بھی، یعنی رہنا اور رہنے کی جگہ۔ (مفردات راغب)

**آیت 69** ① وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى : ”رُسُلُنَاۤ“ ہمارے بھیجے ہوئے سے مراد فرشتے ہیں جو انسانی شکل میں ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹے اور پوتے اسحاق اور یعقوب کی خوش خبری لے کر آئے تھے۔ ان کی تعداد بعض نے تین بیان کی، جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل، بعض نے نو (۹) اور بعض نے تیرہ (۱۳)، مگر قرآن و سنت سے ان کی تعداد کا ذکر ہمیں

بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾

پھر دیر نہیں کی کہ ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔ ﴿٦٩﴾

نہیں ملا۔ سورۂ حجر (۴۹، ۵۰) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے غفور و رحیم ہونے اور اپنے عذاب کے عذاب الیم ہونے کی خبر دینے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم اور لوط علیہما السلام کے یہ واقعات ذکر فرمائے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کی ایک ہی جماعت ایک کے لیے خوش خبری اور دوسری قوم کے لیے عذاب لے کر آئی تھی۔ چنانچہ ان کے آنے سے اللہ تعالیٰ کی دونوں صفات کا اظہار ہوا تھا۔ یہاں ان فرشتوں کے آنے کو ابراہیم علیہ السلام کے لیے خوش خبری لانے والے فرمایا ہے، کیونکہ اگر ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیٹے اور پوتے کی خبر خوش خبری ہے تو لوط علیہ السلام کی ملعون قوم کی بربادی کی خبر بھی ابراہیم اور لوط علیہما السلام دونوں کے لیے خوش خبری ہے، البتہ قوم لوط کے لیے بری خبر ہے۔

❷ قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ : پہلا ''سَلٰمًا'' منصوب ہے، یہ جملہ فعلیہ ہے: '' نُسَلِّمُ سَلَامًا '' ''ہم سلام کہتے ہیں۔'' دوسرا ''سَلٰمٌ'' مرفوع ہے، یعنی ''سَلَامٌ عَلَيْكُمْ'' ''تم پر سلام ہو۔'' معلوم ہوا کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کیا جس میں کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے سلام کہنے کا حکم ہے۔ دیکھیے سورۂ نور (۲۷) بلکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے: (( اَلسَّلَامُ قَبْلَ السُّؤَالِ فَمَنْ بَدَأَكُمْ بِالسُّؤَالِ قَبْلَ السَّلَامِ فَلَا تُجِيْبُوْهُ )) [ السلسلة الصحيحة : ٤٥٨/١، ح : ٨١٦ ] ''سلام سوال سے پہلے ہے، جو تم سے سلام سے پہلے سوال کرے، اسے جواب مت دو۔'' اور ایک روایت میں فرمایا: (( مَنْ بَدَأَ بِالْكَلَامِ قَبْلَ السَّلَامِ فَلَا تُجِيْبُوْهُ )) [ صحيح الجامع : ٦١٢٢ ] ''جو سلام سے پہلے بات کرے اسے جواب مت دو۔'' ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے بہتر جواب دیا جو سورۂ نساء (۸۶) میں ہے، کیونکہ جملہ فعلیہ کچھ وقت کے لیے ہوتا ہے جب کہ جملہ اسمیہ میں استمرار یعنی ہمیشگی پائی جاتی ہے، یعنی تم پر ہمیشہ سلامتی ہو۔ ''سَلٰمًا'' کے جواب میں ''سَلٰمٌ'' بہتر جواب ہے۔

❸ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ : اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ فرشتے انسانی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ حدیث میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ معروف حدیث جبریل علیہ السلام میں فرشتے کا ایک اعرابی کی شکل میں آنا بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ [ بخاری : ٤٧٧٧۔ مسلم : ٨ ] دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام اولو العزم پیغمبر ہو کر بھی مہمانوں کو پہچان نہ سکے، ورنہ وہ کھانے کا اہتمام نہ کرتے، کیونکہ فرشتے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام علم غیب نہیں رکھتے تھے تو پھر ان لوگوں کی کیا اوقات ہے جو نہ نبی ہیں اور نہ ان کے اصلی حالات اللہ کے سوا کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی کیا حیثیت ہے؟ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام بے حد مہمان نواز تھے۔ یہ وصف ہر نبی خصوصاً ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت پایا جاتا تھا۔ ہماری ماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی وحی کے موقع پر آپ کے اوصاف میں اس وصف کا خصوصی ذکر فرمایا: (( وَتَقْرِي الضَّيْفَ )) [ بخاری : ٣ ] ''آپ مہمان کی مہمان

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝

تو جب ان کے ہاتھوں کو دیکھا کہ اس کی طرف نہیں پہنچتے تو انھیں اوپرا جانا اور ان سے ایک قسم کا خوف محسوس کیا، انھوں نے کہا نہ ڈر! بے شک ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں ۝

نوازی کرتے ہیں۔'' آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کا یہ حال تھا کہ نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: (( كَانَ ابْنُ عُمَرَ لَا يَأْكُلُ حَتّٰى يُؤْتٰى بِمِسْكِيْنٍ يَأْكُلُ مَعَهُ )) ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک کوئی مسکین ان کے ساتھ کھانے کے لیے نہ لایا جاتا۔'' [ بخاري، الأطعمة، باب المؤمن يأكل في معي واحد : ۵۳۹۳ ] پھر نبی کریم ﷺ اور ان کے والد ماجد ابراہیم علیہ السلام کی فیاضی کا کیا حال ہوگا۔ چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ مہمان نوازی میں دیر نہیں کرنی چاہیے، نہ ان سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ سورۂ ذاریات میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام چپکے سے گھر گئے اور کھانا لے آئے۔ وقت کی مناسبت سے جو حاضر ہو پیش کر دیا جائے، مہمان کی خواہش ہے تو کھا لے، ورنہ اس کی مرضی۔

پانچویں یہ کہ ابراہیم علیہ السلام پر دنیوی لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ کا فضل تھا، ورنہ بھنا ہوا بچھڑا تھوڑی دیر میں لا کر پیش کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ چھٹی یہ کہ وہ احادیث جن میں گائے کے گوشت کو بیماری کہا گیا ہے، بظاہر اچھی سند کی بھی ہوں تو شاذ ہیں، کیونکہ قرآن میں گائے کے گوشت کو بطور انعام ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی قربانی اور مختلف موقعوں پر ذبح کرنا قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ یا اس کا رسول ﷺ بیماری والی چیز کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟

ساتویں یہ کہ ابراہیم علیہ السلام، ہمارے نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء بشر تھے اور کھانا کھاتے تھے۔ وہ نہ اللہ تعالیٰ یا اس کا کوئی جزو تھے اور نہ فرشتے، بلکہ وہ انسان تھے، کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ (دیکھیے فرقان : ۲۰) اور ان کی بیویاں تھیں اور اولادیں بھی۔ (دیکھیے رعد : ۳۸) جب کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے ان سب سے پاک ہیں۔ آٹھویں یہ کہ صوفیاء جو جان دار یا اس سے نکلنے والی چیزیں اپنے خودساختہ وظیفوں اور چلّوں کے دوران میں یا ہمیشہ کے لیے کھانا ترک کر دیتے ہیں وہ ملت ابراہیمی کے نہیں بلکہ ہندو مذہب کے پیروکار ہیں۔

**آیت 70** ① **فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ** ...... : ابراہیم علیہ السلام نے صرف کھانا پیش ہی نہیں کیا بلکہ انھیں کھانے کے لیے اصرار بھی کیا: ﴿ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ [ الذاريات : ۲۷ ] ''فرمایا کیا تم کھاتے نہیں ہو؟'' پھر بھی جب انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو دل میں ایک قسم کا خوف محسوس کیا۔ ''خِيْفَةً'' کی تنوین کی وجہ سے ''ایک قسم کا خوف'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ خوف کی وجہ یہ تھی کہ ان کے علاقے میں اگر کوئی اجنبی آتا اور وہ مہمانی میں پیش کیا ہوا کھانا قبول نہ کرتا تو اس کے متعلق سمجھا جاتا کہ وہ کسی برے ارادے سے آیا ہے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے اور شاید یہی زیادہ موقع کے مناسب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی نے ان کے کھانا تناول نہ کرنے کی وجہ سے ان کے فرشتے ہونے کو بھانپ لیا ہو اور وہ اس بنا پر ڈر

وَ امۡرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتۡ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتۡ يٰوَيۡلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوۡزٌ وَّ هٰذَا بَعۡلِىۡ شَيۡخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ عَجِيۡبٌ ﴿۷۲﴾

اور اس کی بیوی کھڑی تھی، سو ہنس پڑی تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی ﴿۷۱﴾ اس نے کہا ہائے میری بربادی! کیا میں جنوں گی، جب کہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا خاوند ہے بوڑھا، یقیناً یہ تو ایک عجیب چیز ہے ﴿۷۲﴾

گئے ہوں کہ یہ ان کی بستی پر عذاب کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ (شوکانی) فرشتوں نے ان کے خوف کو بھانپ لیا، بلکہ سورۂ حجر (۵۲) میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے صاف کہہ دیا: ﴿اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ﴾ ''ہم تو تم سے خوف زدہ ہیں۔''

② قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰى قَوۡمِ لُوۡطٍ: فرشتوں نے کہا، آپ مت ڈریں، ہمیں (آپ کی بستی پر نہیں بلکہ) لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس سے انبیائے کرام علیہم السلام کے عالم الغیب ہونے کی اور ان کے کائنات پر اختیار رکھنے کی صاف نفی ہو رہی ہے۔

**آیت 71** ① وَامۡرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتۡ: ان کی بیوی سارہ علیہا السلام مہمانوں کی خدمت کے لیے پردے کے پیچھے ساتھ ہی کھڑی تھی اور خوف زدہ تھی۔ جب اس نے یہ بات سنی تو ہنس پڑی، یا تو اس لیے کہ ہم انھیں ڈاکو سمجھے تھے یہ تو فرشتے نکلے، یا اس خوشی میں کہ ہم تو خوف زدہ تھے کہ اس طرح فرشتوں کی آمد خطرے سے خالی نہیں ہوتی (دیکھیے حجر: ۸) مگر یہ تو ہم پر عذاب کے بجائے ہمارے عزیز پیغمبر لوط علیہ السلام کی نافرمان قوم پر عذاب کی خوش خبری لے کر آئے ہیں اور دشمن کی ہلاکت کی خبر سے یقیناً خوشی ہوتی ہے۔

② فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ......: سارہ علیہا السلام کے لیے ایک خوشی کی خبر وہ تھی جو اوپر گزری، جس پر وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔ فرشتوں نے انھیں مزید دو خوش خبریاں دیں، ایک بیٹا عطا ہونے کی، پھر اس بیٹے سے پوتا یعقوب عطا ہونے کی اور ان کے ضمن میں یہ خوش خبری تھی کہ تم دونوں میاں بیوی ابھی اتنی عمر اور پاؤ گے کہ بیٹا ملے گا، وہ جوان ہوگا، پھر اس کی شادی ہوگی اور اسے یعقوب عطا ہوگا، گویا مسلسل چار خوش خبریاں۔ یہ چاروں خوش خبریاں فرشتوں نے دی تھیں، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسے یہ خوش خبریاں دیں، کیونکہ فرشتوں کا کام تو صرف پہنچانا تھا، اصل خوش خبری تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی جو کسی صورت غلط نہیں ہو سکتی۔

**آیت 72** ① قَالَتۡ يٰوَيۡلَتٰٓى: امام طبری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''یَا وَیۡلَتَا'' کا کلمہ عرب کسی چیز پر تعجب اور اسے انوکھا سمجھنے کے وقت بولتے ہیں، چنانچہ تعجب کے وقت کہتے ہیں: ''وَیۡلُ اُمِّہٖ مَا اَرۡجَلَہٗ'' ''اس کی ماں ہلاک ہو، وہ کس قدر مرد ہے۔'' باقی الف کے متعلق طبری کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ الف ''ندبہ'' کا ہے اور تاء کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ''وَیۡلَ'' کے بعد والا الف ندبہ اتنا واضح اور لمبا نہیں ہو سکتا جتنا درمیان میں تاء کے اضافے سے ہو سکتا ہے۔

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝۷۳

انھوں نے کہا کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے گھر والو! بے شک وہ بے حد تعریف کیا گیا، بڑی شان والا ہے ۝۷۳

---

② ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ ...... : پہلی خوش خبری کا ردعمل وہ ہنسی تھی جو سارہ علیہا السلام کے چہرے پر نمودار ہوئی، اب ایک ایسی چیز کی خوش خبری ملی جو ساری زندگی کی آرزو کا خلاصہ تھی اور اس وقت ملی جب دنیاوی اسباب کے لحاظ سے اس کی امید ہی نہ تھی تو سارہ علیہا السلام کی ہنسی حیرت اور وحشت میں بدل گئی۔ کہا کیا ایسا ہو گا کہ میرے ہاں بچہ ہو گا؟ جب کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے، یقیناً یہ تو ایک عجیب چیز ہے۔ یہ خوش خبری فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بھی دی تھی، جیسا کہ سورۂ ذاریات میں ہے: ﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [ الذاریات : ۲۸ ] ”اور انھوں نے اسے (ابراہیم علیہ السلام) کو ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دی۔“ مگر یہاں خصوصاً ان کی بیوی کو خوش خبری دینے اور ان سے گفتگو کا ذکر کیا ہے، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کے ہاں تو ہاجرہ علیہا السلام سے اسماعیل پیدا ہو چکے تھے، لیکن سارہ علیہا السلام ابھی تک بے اولاد تھیں۔ قدیم مفسرین اور اسرائیلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال اور سارہ علیہا السلام کی عمر نوے سال تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کی عمر کے تعین کا کوئی با اعتماد ذریعہ ہمارے پاس نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بیان سارہ علیہا السلام کا ”عَجُوْزٌ“ ہونا اور ان کے خاوند کا ”شَيْخًا“ ہونا ہی ”لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ“ سمجھنے کے لیے کافی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ ضرور ان کی عمر بھی بیان فرما دیتا۔

③ یہ آیت دلیل ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام تھے، کیونکہ اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری کے ساتھ ہی یعقوب پوتے کی خوش خبری بھی تھی، ان کے ذبح کے حکم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (قرطبی)

**آیت 73** ① قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ : یعنی وہ تو ماں باپ کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے، پھر بوڑھی عورت کو بچہ عطا کرنا اسے کیا مشکل ہے۔ جب اللہ کے امر کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں تو تعجب کیسا۔ پھر اس گھر میں شروع سے اللہ کی رحمت و برکت کے جو معجزے ظاہر ہوتے رہے ہیں، مثلاً آگ کا گلزار ہونا، اسماعیل علیہ السلام کا ذبح سے محفوظ رہنا، مصر کے اس ظالم جبار سے سارہ علیہا السلام کی عصمت کا محفوظ رہنا وغیرہ، ان کے بعد تو اللہ کے حکم سے کسی بھی ناممکن کام کے ہو جانے پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

② رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ : ”اَهْلَ الْبَيْتِ“ سے پہلے حرف ندا ”یا“ مقدر ہے، اس لیے یہ منصوب ہے، یعنی ”اے گھر والو!“ پہلے ”سَلٰمًا“ کہا تھا، اب ”رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ“ کے ساتھ وہ مکمل ہو گیا، اس سے زائد الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ اس وقت فرشتوں کی مخاطب صرف اکیلی سارہ علیہا السلام تھیں، ان کے لیے فرشتوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان میں سے دو الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں، ایک تو یہ کہ اکیلی عورت کو ”عَلَيْكُمْ“ جمع مذکر حاضر کے لفظ سے خطاب کیا ہے، حالانکہ وہ مؤنث تھیں۔ دوسرا انھیں ”اَهْلَ الْبَيْتِ“ کہہ کر خطاب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کے اہل بیت (گھر

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾ وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾

پھر جب ابراہیم سے گھبراہٹ دور ہوئی اور اس کے پاس خوش خبری آگئی تو وہ ہم سے لوط کی قوم کے بارے میں جھگڑنے لگا ﴿۷۴﴾ بے شک ابراہیم تو نہایت بردبار، بہت آہ وزاری کرنے والا، رجوع کرنے والا ہے ﴿۷۵﴾ اے ابراہیم! اسے رہنے دے، بے شک حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا حکم آچکا اور یقیناً یہ لوگ! ان پر وہ عذاب آنے والا ہے جو ہٹایا جانے والا نہیں ﴿۷۶﴾ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے، وہ ان کی وجہ سے مغموم ہوا اور ان سے دل تنگ ہوا اور اس نے کہا یہ بہت سخت دن ہے ﴿۷۷﴾

والے) اس کی بیوی ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ سلام اور رحمت و برکت کہتے وقت عورتوں کو بھی مذکر کے صیغے سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ یہ آیت فیصلہ کن ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ [ الأحزاب : ۳۳ ] ''اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے گھر والو! اور تمھیں پاک کر دے خوب پاک کرنا۔'' اس آیت میں اہلِ بیت کا ذکر کرتے ہوئے پہلے بھی اور بعد میں بھی نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کا ذکر ہے، تو یہاں اس آیت میں بھی "عَنْكُمْ" اور "اَهْلَ الْبَيْتِ" اور "يُطَهِّرَكُمْ" تینوں میں رسول اللہ ﷺ کی بیویاں مراد ہیں۔ اس کی نفی کرنے والے ایک واضح اور ثابت شدہ حقیقت کی نفی کر رہے ہیں، جس کی وجہ نبی ﷺ کی محبوب ازواج مطہرات سے بغض و عناد کے سوا کچھ نہیں اور جو نبی ﷺ کے پیاروں سے بغض رکھے وہ نبی ﷺ کی محبت سے کیسے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

**آیت 74** فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ ...... : ابراہیم علیہ السلام کی قومِ لوط سے متعلق بحث فرشتوں سے ہوئی تھی، جیسا کہ سورۂ عنکبوت (۳۲) میں صراحت ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے ساتھ جھگڑا فرمایا، کیونکہ فرشتے تو جو کچھ کر رہے تھے اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے کر رہے تھے۔ "يُجَادِلُنَا" مضارع کا صیغہ حکایت حال یعنی اس وقت کی منظر کشی کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

**آیت 75** اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ : اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی بحث و تکرار کا برا نہ مانا، بلکہ نہایت پیار سے ان کا ذکر فرمایا۔

**آیت 75** يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ...... : یہ فرشتوں کی بات ہے جو بالآخر انھوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہی کہ اب بحث و تکرار کا کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آ جانے کے بعد عذاب ٹلنے کی کوئی صورت نہیں۔

**آیت 77** ① وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ ...... : یہاں سے لوط علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے جو کئی سورتوں میں

وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

اور اس کی قوم (کے لوگ) اس کی طرف بے اختیار دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے اور وہ پہلے سے برے کام کیا کرتے تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ ہیں، تو اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی نہیں؟ ﴿۷۸﴾

---

مختلف انداز سے ذکر ہوا ہے، مثلاً سورۂ اعراف، حجر، شعراء، نمل، عنکبوت، صافات، ذاریات اور قمر۔ ان سورتوں میں بھی تفسیر دیکھیں۔ لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے صحیح سلامت باہر نکل آنے پر ان پر ایمان لے آئے تھے اور انھوں نے ان کے ساتھ ہی شام کی طرف ہجرت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوت سے سرفراز فرمایا اور وادی اردن میں ''سدوم'' نامی بستی اور اس کے گرد و نواح کے لیے مبعوث فرمایا۔ یہ قوم شرک و کفر کے ساتھ ساتھ ایسے فعل بد کی مرتکب تھی جس کا ارتکاب ان سے پہلے دنیا بھر میں کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ بدفعلی کے عادی تھے۔ اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا برائی کرنا اور ڈاکے مارنا ان کا عام رویہ تھا۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۲۹) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۸۰ تا ۸۴) کی تفسیر۔

② **سِيْٓءَ بِهِمْ** ...... : ''سَاءَهٗ يَسُوْءُهٗ'' سے ماضی مجہول ہے، غمگین کرنا، برا لگنا۔ یہاں ''**سِيْٓءَ**'' کا نائب فاعل لوط علیہ السلام کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہے اور فاعل محذوف ہے، گویا عبارت یوں ہے کہ ''سَاءَهٗ مَجِيْئُهُمْ'' یعنی ان کے آنے نے اسے مغموم کر دیا۔ فعل مجہول کا معنی ہوگا، وہ ان کی وجہ سے مغموم ہوا۔ ''**وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا**'' ''ذَرْعٌ'' اور ''ذِرَاعٌ'' بازو یا جانور کی اگلی ٹانگوں کو کہتے ہیں، اونٹ یا کسی بھی جان دار پر اگر بوجھ نہ ہو تو وہ کھلا قدم اٹھاتا ہے اور اگر اس کی استعداد سے زیادہ بوجھ ہو تو وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتا ہے اور وہ بھی بالکل تنگ سا، اس لیے ''ضَاقَ ذَرْعًا'' سے مراد دل تنگ ہونا لیا جاتا ہے۔ لوط علیہ السلام کے ان کے آنے کی وجہ سے مغموم ہونے کی وجہ مہمان نوازی میں بخل نہ تھا، نبی سے بڑھ کر کون فراخ دل اور سخی ہو سکتا ہے، بلکہ انھیں اپنی قوم کی عادتِ بد کا علم تھا۔ ظاہر ہے فرشتے انسانی شکل میں آئے ہوں تو وہ کس قدر خوبصورت ہوں گے۔ لوط علیہ السلام کو معلوم نہ تھا کہ یہ فرشتے ہیں، کیونکہ غیب تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور لوط علیہ السلام کو یہ بات بتائی نہیں گئی تھی، اس لیے ان کے دل پر جو گزری، اللہ تعالیٰ نے اس کا کمال نقشہ کھینچا ہے۔ پہلے غم ہوا، پھر اپنی بے بسی پر تنگ دل ہوئے، پھر جس طرح کوئی شخص کوئی لفظ کہہ کر دل کو کچھ نہ کچھ تسلی دیتا ہے، یہ کہا کہ یہ دن تو بہت سخت ہے۔ [التحریر والتنویر]

**آیت 78** ① **وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ** : ''هَرَعَ'' (ف) کا معنی کسی کو تیزی سے دھکیلنا ہے۔ فعل مجہول کا مطلب یہ ہے کہ جب اس خبیث قوم کو لوط علیہ السلام کے گھر ایسے حسینوں کے آنے کی خبر ملی تو وہ ان کی طرف تیزی سے اس طرح بے اختیار دوڑتے ہوئے آئے جیسے کوئی انھیں پیچھے سے دھکیل رہا ہے۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

انھوں نے کہا بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں اور بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے ہم کیا چاہتے ہیں ﴿۷۹﴾

---

❷ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ : فعل مضارع پر " كَانَ " آئے تو استمرار اور ہمیشگی کا معنی دیتا ہے، الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی دلیل ہو۔ اس لیے زمخشری نے اس کا معنی کیا ہے: " وَ مِنْ قَبْلِ ذٰلِكَ الْوَقْتِ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ الْفَوَاحِشَ وَيُكْثِرُوْنَهَا فَضَرُوْا بِهَا وَ مَرَنُوْا عَلَيْهَا " ''اس سے پہلے وہ یہ برے کام کثرت سے کرتے تھے، حتیٰ کہ یہ ان کی عادت بن چکی تھی۔'' یعنی کوئی آدمی شروع شروع میں ایسا غلیظ فعل کرنے سے کچھ جھجکتا ہے مگر یہ لوگ بے اختیار تیزی سے اس لیے آئے کہ کثرت سے اس فعل بد کے ارتکاب نے ان کی حیا اور جھجک بالکل ختم کر دی تھی۔

❸ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ...... : جب وہ گھس آئے اور شدت سے مہمانوں کو اپنے حوالے کرنے کا مطالبہ کرنے لگے تو لوط علیہ السلام نے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی تواضع کی انتہا کر دی، کہا یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ ہیں، اللہ سے ڈرو! مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی نہیں؟ یہاں مفسرین نے بیٹیاں پیش کرنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ اشرف الحواشی میں ہے کہ " بَنَاتِيْ " (بیٹیوں) سے مراد ان لوگوں کی اپنی عورتیں ہیں، کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے اور قوم کی ساری عورتیں نبی کی بیٹیاں ہوتی ہیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے: ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ [ الأحزاب : ٦ ] ''یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔'' یہی تفسیر راجح ہے، گو بعض نے لوط علیہ السلام کی اپنی بیٹیاں بھی مراد لی ہیں کہ ان سے شادی کر لو۔ ( کمافی الموضح ) اس تفسیر کے راجح ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ لوط علیہ السلام کی بیٹیاں معروف قول کے مطابق صرف دو تھیں، اگر کم و بیش بھی ہوں تو پوری قوم سے تو ان کی شادی نہیں ہو سکتی، اس لیے بیٹیوں سے مراد قوم کی بیٹیاں یعنی ان کی بیویاں ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد اپنی ہی بیٹیاں تھیں، مگر نہ انھیں ان کے حوالے کرنا مقصود تھا نہ ان کی ان سے شادی کرنا، بلکہ محض انھیں شرمندہ کر کے اپنے مہمانوں کی عزت بچانا مقصود تھا، کیونکہ وہ بھی جانتے تھے اور قوم بھی کہ اپنی بیٹیاں کوئی کسی کے حوالے نہیں کرتا۔ یہ صرف اپنی عاجزی کے اظہار اور انھیں شرمندہ کرنے کے لیے ہے، جیسا کہ سلیمان علیہ السلام نے فیصلہ کیا تھا کہ لاؤ بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں دعویدار عورتوں کو ایک ایک حصہ دے دیتے ہیں، حالانکہ ان کی مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ واقعی بچے کو درمیان سے کاٹ دیا جائے، بلکہ وہ حقیقت اگلوانا چاہتے تھے۔ آیت کے ظاہر الفاظ سے یہ معنی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

❹ " هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ " کا مطلب یہ نہیں کہ مردوں سے یہ فعل بھی کچھ طہارت رکھتا ہے، مگر عورتیں زیادہ طاہر ہیں، بلکہ یہاں یہ بہت پاکیزہ کے معنوں میں ہے۔

آیت 79 قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ...... : یعنی ہمارا تمھاری بیٹیوں میں کوئی حق نہیں ( گویا آنے والے مہمان

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

اس نے کہا کاش! میرے پاس تمھارے مقابلہ کی کچھ طاقت ہوتی، یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ﴿۸۰﴾

مردوں سے بدفعلی ان کا پورا حق ہے)، یا یہ مطلب ہے کہ ہمیں عورتوں یا بیویوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ہم جو چاہتے ہیں وہ تجھے معلوم ہی ہے کہ ہم کس بدفعلی کے عادی ہیں، اس لیے تم ہماری راہ میں رکاوٹ نہ بنو۔ ان کے اس جواب سے ان کی خباثت کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کیوں ان کو اس عذاب کا مستحق سمجھا گیا جو ان کے علاوہ کسی قوم پر نازل نہیں کیا گیا۔

آیت 80 قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً ...... : لوط علیہ السلام اس قوم میں ایک طرح سے اجنبی تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں اہل سدوم کی اصلاح کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے اس تمنا کا اظہار کیا کہ کاش! مجھ میں تمھارے مقابلے کی قوت ہوتی، یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لیتا، یعنی میرا خاندان یہاں ہوتا تو میں تم سے نمٹ لیتا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَأْوِيْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قوله عزو جل : ﴿ و نبئهم عن ضيف إبراهيم ﴾ : ۳۳۷۲ ] ”اللہ تعالیٰ لوط پر رحم کرے، یقیناً وہ بہت مضبوط سہارے کی پناہ رکھتے تھے۔“ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا سہارا رکھتے تھے جو سب سے مضبوط ہے اور اس وقت ان کے پاس فرشتوں کی شکل میں بھی مضبوط سہارا موجود تھا، اگرچہ انھیں معلوم نہ تھا۔ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے ” اَلْفِصَلُ فِي الْمِلَلِ “ میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں لوط علیہ السلام کی شان میں کمی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ اسباب کا مہیا کرنا یا ان کی خواہش کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کے خلاف نہیں ہے۔ لوط علیہ السلام یقیناً اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا سمجھتے تھے مگر اس وقت وہ ساتھی مہیا ہونے کی صورت میں فوری طور پر اس خبیث قوم کا راستہ قوت بازو کے ساتھ روکنے کے خواہش مند تھے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی لوگوں اور قبیلوں سے کہا کہ کون میری مدد کرتا اور مجھے جگہ دیتا ہے کہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچاؤں۔ آخر کار انصار مدینہ نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اپنی جان و مال اور اولاد کی طرح آپ کی حفاظت اور آپ کا دفاع کیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾ [ الصف : ۱٤ ] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کے مددگار بن جاؤ، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔“ اس لیے دنیاوی اسباب مہیا ہونے کی کوشش و خواہش جائز بلکہ مستحب ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَمَا بَعَثَ اللّٰهُ بَعْدَهُ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا فِيْ ثَرْوَةٍ مِنْ قَوْمِهِ )) [ السلسلة الصحيحة : ۱۵۲/٤، ح : ۱٦۱۷ ] ”پھر لوط علیہ السلام کے بعد اللہ نے جو نبی بھی بھیجا وہ اس کی قوم کے کثیر لوگوں میں سے بھیجا۔“

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

انھوں نے کہا اے لوط! بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ پائیں گے، سو اپنے گھر والوں کو رات کے کسی حصے میں لے کر چل نکل اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس پر وہی مصیبت آنے والی ہے جو ان پر آئے گی۔ بے شک ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، کیا صبح واقعی قریب نہیں ﴿۸۱﴾

آیت 81 ① قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ ...... : قوم کے بدمعاش جب باز نہ آئے بلکہ دیواریں پھلانگ کر یا دروازہ توڑ کر اندر آ گئے تو فرشتے نے پر مارا، جس سے سب اندھے ہو کر بھاگ اٹھے۔ سورۂ قمر میں اس کی طرف اشارہ ہے، فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴾ [ القمر : ۳۷ ] ''اور بلاشبہ یقیناً انھوں نے اسے اس کے مہمانوں سے بہکانے کی کوشش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، پس چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔'' آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب فرشتوں نے دیکھا کہ لوط علیہ السلام بالکل عاجز آ گئے ہیں اور اپنی قوم کے بدکاروں کو نہ روک سکنے کی وجہ سے سخت رنجیدہ ہیں تو انھوں نے ظاہر کر دیا کہ ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ وہ تھا جو انھوں نے ان بدکاروں کی آنکھیں مٹا کر کیا، مزید تسلی یہ دی کہ یہ لوگ کبھی آپ کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔

② فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ ...... : یعنی رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے۔ صرف گھر والوں کو لے کر نکلنے کا حکم اس لیے دیا کہ کوئی اور شخص ان کے سوا مسلمان ہی نہیں ہوا تھا۔ دیکھیے سورۂ ذاریات (۳۵، ۳۶)۔

③ اِلَّا امْرَاَتَكَ : اس کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ "فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ" سے استثنا ہے، یعنی اپنی بیوی کے سوا دوسرے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ۔ دوسری یہ کہ تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے، مگر تمھاری بیوی مڑ کر دیکھے گی اور اپنے کفر اور قوم کی ہمدردی کی وجہ سے ان پر عذاب دیکھ کر آہ و پکار کرے گی تو اسے بھی وہی عذاب آ پہنچے گا جو ان کو پہنچا۔ پہلا معنی زیادہ قریب ہے۔ (واللہ اعلم) قدرتی بات ہے کہ انسان کو اپنے دشمن کی جلد از جلد بربادی کی خواہش ہوتی ہے، فرشتوں نے بتایا کہ ان پر عذاب صبح کے وقت آئے گا۔ لوط علیہ السلام کے مزید جلدی کے مطالبے پر انھوں نے کہا: ﴿ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴾ ''کیا صبح واقعی قریب نہیں ہے؟'' صبح کا وقت شاید اس لیے مقرر کیا گیا ہو کہ وہ آرام کا وقت ہوتا ہے اور لوگ کچھ کچھ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ آرام کے وقت عذاب زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اور ایسے وقت میں عذاب دیکھنے والوں کے لیے باعث عبرت بھی ہوتا ہے۔ (آلوسی)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر والے حصے کو اس کا نیچا کر دیا اور ان پر تہ بہ تہ کھنگر کے پتھر برسائے ﴿۸۲﴾ جو تیرے رب کے ہاں سے نشان لگائے ہوئے تھے اور وہ ان ظالموں سے ہرگز کچھ دور نہیں ﴿۸۳﴾ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)۔ اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول کم نہ کرو، بے شک میں تمھیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور بے شک میں تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۸۴﴾

---

”اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ“ پر شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ہمارے نبی ﷺ کو مکہ فتح ہوا صبح کے وقت، شاید وہی اشارہ ہو۔“ (موضح)

**آیت 82** ① فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا ...... : یعنی جب ہمارے عذاب کا حکم آیا تو ہم نے اس بستی کے اوپر کا حصہ اس کا نیچے کا حصہ کر دیا، یعنی پوری بستی الٹ دی۔ یہ عذاب ان کے فعل شنیع سے مناسبت رکھتا تھا کہ انھوں نے بھی فطرت کو بدل کر عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کو اپنی شہوت رانی کا ذریعہ بنا لیا۔

② سِجِّيْلٍ: سنگ و گل (پتھر اور مٹی کے ملے ہوئے ڈھیلے) یا سنگِ گل (مٹی کے پتھر یعنی پختہ اینٹوں کے روڑے یا کھنگر) مزید عذاب کے طور پر بستی الٹنے کے بعد اس پر اینٹوں اور پتھروں کی ایسی مسلسل بارش برسائی کہ ان کی تہیں لگ گئیں۔

**آیت 83** ① مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ : ”نشان لگے ہوئے“ یعنی ان میں سے ہر پتھر پر کوئی علامت بنائی گئی تھی کہ اس سے کس کو ہلاک کرنا ہے۔ (ابن کثیر)

② وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ : اس کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ جو لوگ بھی ظلم کی روش پر چلیں گے (مثلاً مغربی اقوام اور ان کے پرستار جو دھڑلے سے اس فعل بد کا ارتکاب اور اس کی اشاعت کر رہے ہیں) ان پر بھی یہ عذاب آنا کچھ دور نہیں، یا الف لام عہد کا ہو تو ان ظالموں (یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے کافروں) پر بھی نزول عذاب بعید از قیاس نہیں۔ اگر قوم لوط پر عذاب آ سکتا ہے تو ان پر بھی آ سکتا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ الٹی ہوئی بستیاں ان مکہ کے ظالموں سے کچھ دور نہیں، بلکہ ملک شام کو جاتے ہوئے دائیں آباد راستے میں ہیں، جن کی بے مثال بربادی یہ لوگ صبح و شام آتے جاتے دیکھتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حجر (۷۶) اور صافات (۱۳۷، ۱۳۸) کے حواشی۔

**آیت 84** ① وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۸۵ تا ۹۳) اور

وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

اور اے میری قوم! ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ ﴿۸۵﴾ اللہ کا باقی بچا ہوا تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو اور میں ہرگز تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں ﴿۸۶﴾

سورۂ شعراء (۱۷۶ تا ۱۹۰) مکیال اور کیل سے مراد کسی مقرر پیمانے کے برتن مثلاً صاع (ٹوپہ وغیرہ) میں ڈال کر غلے وغیرہ کو ماپنا اور میزان اور وزن کا معنی ترازو وغیرہ سے تولنا ہے۔

❷ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ : یعنی تم اچھے خاصے خوش حال ہو، پھر اس قسم کی بے ایمانی اور فریب کاری کی کیا ضرورت ہے۔

❸ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ : یعنی آخرت کا عذاب یا دنیا ہی میں اس دن کا عذاب جس کے گھیرے سے کوئی نکل نہ سکے گا۔

آیت 85 ❶ وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ : پہلے فرمایا کہ ماپ اور تول میں کمی نہ کرو، اب اس کی مزید تاکید فرمائی کہ ماپ اور تول پورا کرو، نہ دیتے وقت کم دو، نہ لیتے وقت زیادہ لو۔ مزید دیکھیے سورۂ مطففین (۱ تا ۳)۔

❷ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ : پہلے ماپ تول کا خاص طور پر ذکر فرمایا، اب لینے دینے کے ہر طریقے کو ان الفاظ کے ذریعے سے شامل کر لیا، مثلاً کسی بھی طرح کے میٹروں کے ذریعے، یا گننے کے ذریعے، غرض کسی بھی طرح لوگوں کو ان کی چیز کم مت دو، نہ زیادہ لو۔

❸ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ : "عَثِيَ يَعْثٰى" بروزن "رَضِيَ يَرْضٰى" حد سے بڑھ کر فساد کرنا، مثلاً ان کی عادت تھی کہ اگر کم ماپ تول کے خلاف کوئی شخص احتجاج کرتا تو سب مل کر اس پر حملہ آور ہو جاتے۔ اسی طرح موقع ملتا تو ڈاکے مارتے اور لوگوں سے چیزیں چھین لیتے۔ خلاصہ یہ کہ شعیب علیہ السلام نے انھیں ہر قسم کے فساد سے منع فرمایا۔

آیت 86 ❶ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ ...... : یعنی بے ایمانی سے جمع کردہ مال سے اتنی بچت اور منافع ہر طرح سے بہتر ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق حاصل ہو۔ "اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (بشرطیکہ تم مومن ہو) کیونکہ کافر کے نیک اعمال بھی قیامت کے دن اس کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ دیکھیے سورۂ کہف (۱۰۵)۔

❷ وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ : یعنی میں تم پر نگران تو نہیں ہوں جو ہر وقت تمھارے ناپ تول کو دیکھتا رہوں اور نہ یہ میرے بس میں ہے۔ ہر ایک کے ایک ایک لحہ پر نظر تو صرف رب تعالیٰ کی ہے، میرا کام تو تمھیں سمجھا دینا اور اللہ کے عذاب سے ڈرا دینا ہے، ماننا نہ ماننا تمھارا کام ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ

انھوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے، یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں کریں جو چاہیں، یقیناً تو تو نہایت بردبار، بڑا سمجھ دار ہے ﴿۸۷﴾ اس نے کہا اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے

آیت 87 ① قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ ......: یعنی کیا تو اپنی نماز کا دائرۂ عمل اس قدر وسیع سمجھتا ہے کہ دوسروں کے مذہبی اور مالی معاملات میں بھی دخل دینے لگا ہے۔ ہماری مرضی ہے جس کی چاہیں پوجا اور جس کی چاہیں بندگی کریں اور یہ مال جو ہمارے اپنے ہیں، ان میں جس طرح چاہیں تصرف کریں، جائز و ناجائز جیسے چاہیں کمائیں، کوئی ہمیں کیوں ٹوکے! یہ وہی سیکولر سوچ ہے جو آج کل بھی چل رہی ہے کہ نماز اور دین ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے۔ مملکت اور دنیا کے معاملات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے ہم پابند نہیں۔ بے شک دین سود سے روکتا ہے مگر ساری دنیا کی معیشت اس پر چل رہی ہے، دین کا اس میں کیا دخل؟ پھر کوئی شرک کرے، کفر کرے یا موحد ہو، اللہ تعالیٰ کو مانے یا نہ مانے، کسی کو اس سے کیا غرض۔ بس مملکت کے جو قانون خود لوگوں نے اکثریت سے بنائے ہیں، ان کی پابندی لازم ہے، باقی کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی بغاوت ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی دعا نہ ہوتی کہ یا اللہ! میری امت (دعوت و اجابت) کو عام عذاب سے ہلاک نہ کرنا تو کب کا عذاب آ چکا ہوتا۔

② اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ: اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ تم تو خاندان میں بڑے بردبار اور نہایت سمجھ دار سمجھے جاتے ہو، تمھیں کیا ہو گیا کہ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگے ہو۔ دوسرا یہ کہ دراصل وہ انھیں ٹھٹھے اور مذاق سے یہ کہہ رہے تھے، مقصد ان کا انھیں نہایت بے حوصلہ اور نادان کہنا تھا۔ صاحب کشاف نے اس کی مثال دی کہ جیسے کوئی شخص کسی سخت بخیل آدمی کو کہے کہ تمھاری سخاوت کا کیا کہنا، اگر تمھیں حاتم طائی دیکھے تو وہ بھی تمھارے آگے سر جھکا دے۔ ایک معنی یہ ہے کہ بس تو ہی ایک عقل مند اور نیک چلن رہ گیا ہے؟ باقی ہم اور ہمارے باپ دادا جاہل اور احمق ہی رہے؟ یہ بھی استہزا اور تمسخر کی ایک صورت تھی۔ (ابن کثیر) شاہ عبد القادر ؒ لکھتے ہیں: ”جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکوں کے کام آپ نہ کر سکیں تو انھی کو لگیں چڑانے، یہی خصلت ہے کفر کی۔“ (موضح)

آیت 88 ① قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ ......: ”بَيِّنَةٍ“ وہ دلیل جس کے ساتھ حق اور باطل واضح اور الگ الگ ہو جائے۔ ”رِزْقًا حَسَنًا“ یہ لفظ تین چیزوں کے لیے آیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نبوت، حلال روزی اور صاف ستھری پاکیزہ زندگی۔ یہاں ”اَرَءَيْتُمْ“ کا جواب محذوف ہے، یعنی اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح

وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰی مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴿۸۸﴾

اچھا رزق عطا کیا ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمھاری بجائے میں (خود) اس کا ارتکاب کروں جس سے تمھیں منع کرتا ہوں، میں تو اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا، جتنی کر سکوں اور میری توفیق اللہ کے سوا کسی سے نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ﴿۸۸﴾

دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے رزق حسن دیا ہو تو کیا میں اسے چھوڑ کر تمھاری طرح حرام کھانے لگوں اور تمھیں نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا چھوڑ دوں؟ ”رِزْقًا حَسَنًا“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ شعیب علیہ السلام عطائے نبوت کے ساتھ ساتھ حلال روزی کے ذریعے سے اچھے خاصے مال دار آدمی تھے۔

② وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ ...... : یعنی میں جو تمھیں اللہ کے ساتھ شرک سے اور ماپ تول میں کمی سے منع کر رہا ہوں، اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ تمھیں تو اس سے باز رہنے کی تلقین کروں اور خود اس کا ارتکاب کرتا رہوں، بلکہ میں تم سے جو بات بھی کہتا ہوں، پہلے خود اس پر عمل کرتا ہوں۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا اور سلف صالحین کا بھی یہی شیوہ رہا ہے۔ اس کے برعکس کرنے والوں کا انجام حدیث میں یوں ہے، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يُجَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقَى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُهُ فِي النَّارِ، فَيَدُوْرُ كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ فَيَجْتَمِعُ أَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ يَا فُلَانُ! مَا شَأْنُكَ ؟ أَلَيْسَ كُنْتَ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ؟ قَالَ كُنْتُ آمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا آتِيْهِ، وَأَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَآتِيْهِ » [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة : ۳۲۶۷ ] ”ایک آدمی کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کی انتڑیاں تیزی سے باہر نکل پڑیں گی تو وہ اس طرح گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد گھومتا ہے، تو جہنمی اس پر اکٹھے ہو جائیں گے اور کہیں گے، اے فلاں! تیرا کیا معاملہ ہے؟ کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور ہمیں برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا، میں تمھیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود وہ نیکی نہیں کرتا تھا اور تمھیں برائی سے منع کرتا تھا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔“

③ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ : تا کہ تمھارا دنیا و آخرت میں بھلا ہو۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہ خصلت ہے اللہ کے نیک لوگوں کی کہ چڑانے سے برا نہ مانا اور اپنے مقدور بھر سمجھاتے رہے۔“

④ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ : یعنی آج میں تمھیں جو نصیحت کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں، اس کو جاری رکھنے اور اس کی کامیابی کا دارومدار اللہ ہی پر ہے۔

وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ٛ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

اور اے میری قوم! میری مخالفت تمھیں اس کا مستحق ہرگز نہ بنادے کہ تمھیں اس جیسی مصیبت آپہنچے جو نوح کی قوم، یا ہود کی قوم، یا صالح کی قوم کو پہنچی اور لوط کی قوم (بھی) ہرگز تم سے کچھ دور نہیں ہے ﴿۸۹﴾ اور اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب نہایت رحم والا، بہت محبت والا ہے ﴿۹۰﴾ انھوں نے کہا اے شعیب! ہم اس میں سے بہت سی باتیں نہیں سمجھتے جو تو کہتا ہے اور بے شک ہم تو تجھے اپنے درمیان بہت کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم ضرور تجھے سنگسار کر دیتے اور تو ہم پر ہرگز کسی طرح غالب نہیں ﴿۹۱﴾

**آیت 89** ① وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ ...... : "شِقَاقٌ شِقٌّ" سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، بمعنی جانب، یعنی دونوں ایک دوسرے کے مخالف سمت میں آمنے سامنے ہو جائیں، یعنی صاف مخالفت اور مقابلے پر اتر آنا۔ "لَا يَجْرِمَنَّكُمْ" تمھیں آمادہ نہ کر دے، تمھیں ابھار نہ دے، تمھیں اس بات کا مجرم نہ بنادے، تمھارے لیے اس کا باعث نہ بن جائے، یہ تمام معانی ہو سکتے ہیں۔

② وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ : یعنی اگر تمھیں قوم نوح کے غرق ہونے، قوم ہود کے آندھی کے ساتھ ہلاک ہونے اور قوم صالح کے چیخ اور زلزلے سے نیست و نابود ہونے سے عبرت نہیں ہوئی، کیونکہ ان کا علاقہ یا زمانہ تم سے دور تھا، تو لوط علیہ السلام کی قوم تو تم سے کچھ دور نہیں، نہ اسے زیادہ وقت گزرا ہے اور نہ ان کا علاقہ تمھارے علاقے سے کچھ دور ہے۔ واضح رہے کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی مدین کا علاقہ اس زمین سے متصل واقع تھا جہاں لوط علیہ السلام کی قوم بستی تھی۔

**آیت 90** اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ : یعنی میرا رب اپنے بندوں پر نہایت رحم کرنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے، اسی لیے اس نے تمھیں پہلے خبردار کرنے کا انتظام فرمایا کہ تم آئندہ کے لیے باز آجاؤ اور پچھلے کی معافی مانگو اور اپنے اعمال کے انجام بد سے بچ جاؤ۔

**آیت 91** ① قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ ...... : "فَقِهَ يَفْقَهُ" (ع) متکلم کی بات کا مطلب سمجھنا۔ یہ بات انھوں نے استہزا اور تحقیر، یعنی شعیب علیہ السلام اور ان کے کلام کو بے وقعت قرار دینے کے لیے کہی، یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے کرتے ان کے ذہن اس قدر مسخ ہو چکے تھے کہ شعیب علیہ السلام کی سیدھی باتیں بھی واقعتاً ان کے ذہن میں نہیں آتی تھیں، حالانکہ شعیب علیہ السلام نہ کسی غیر زبان میں گفتگو کرتے تھے اور نہ ان کا انداز بیان ہی پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا، بلکہ شعیب علیہ السلام کی گفتگو سے صاف پتا چل رہا ہے کہ وہ کتنے بڑے فصیح اللسان خطیب تھے۔ مفسر ابو السعود کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ بات کہ "ہم تیری بات کا

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ۝۹۲ وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ۝۹۳

اس نے کہا اے میری قوم! کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ غالب ہے اور اسے تم نے اپنی پیٹھ پیچھے پھینکا ہوا بنا رکھا ہے، بے شک میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کا احاطہ کرنے والا ہے (۹۲) اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک میں (بھی) عمل کرنے والا ہوں۔ تم جلد ہی جان لوگے کہ کون ہے جس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا اور کون ہے جو جھوٹا ہے، اور انتظار کرو، بے شک میں (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں (۹۳)

مطلب ہی نہیں سمجھتے'' اس وقت کہی جب وہ بہترین اور بلیغ ترین طریقے سے شعیب علیہ السلام سے حق اور اس کے ایسے واضح دلائل سن چکے جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اب اس سے آگے ان کے پاس کوئی بات باقی ہی نہ تھی جو وہ کہہ سکتے، تو جس طرح کوئی بندہ لاجواب ہو کر بدزبانی، گالی گلوچ اور دھمکیوں پر اتر آتا ہے، یہی کام انھوں نے کیا۔

❷ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا : یعنی نہ تیرے پاس فوج ہے، نہ حکومت اور نہ کرّ و فر۔

❸ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ : جو ہمارے دین پر ہیں، لیکن تیری پشت پناہی کر رہے ہیں۔

❹ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ : ''عَزِيْزٌ'' معزز، محبوب اور قوی، یعنی تو ہم پر کسی طرح بھی عزیز نہیں ہے، نہ ہم تمھاری کچھ عزت سمجھتے ہیں، نہ ہمیں تجھ سے کوئی محبت ہے اور نہ تو ہم سے طاقت میں بڑھ کر ہے۔ غرض تجھے سنگسار کرنا ہمیں کچھ بھی مشکل نہیں، اگر تیرے قبیلے کے لوگ جو ہمارے ہی دین پر ہیں، تیری پشت پر نہ ہوتے تو ہم ضرور تجھے سنگسار کر دیتے۔ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئیں بالکل وہی صورت حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ میں درپیش تھی۔ قریش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور ہر ممکن طریقے سے آپ کی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، لیکن چونکہ بنو ہاشم آپ کی پشت پر تھے اور خاص طور پر آپ کے چچا ابوطالب آپ کی پوری طرح حفاظت کر رہے تھے، اس لیے قریش کو آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

**آیت 92** ❶ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ ...... :''ظِهْرِيًّا'' ''ظَهْرٌ'' کی طرف منسوب ہے، نسبت کی وجہ سے ظاء پر کسرہ آ گیا ہے۔ یہاں سے شعیب علیہ السلام کا لہجہ کچھ سختی میں بدل جاتا ہے، فرماتے ہیں، کیا میری برادری تمھارے نزدیک اللہ سے بھی زیادہ معزز اور قوی ہے، جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس ہر شے کے مالک کو تو تم نے ایسے سمجھ رکھا ہے جیسے کوئی بے وقعت چیز پیٹھ پیچھے پھینک دی گئی ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اللہ کے بھیجے ہوئے کی پروا نہ کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کی بے وقعتی اور بے قدری کرنا ہے۔

❷ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ : وہ تمھارے تمام اعمال (جن میں ان کے اقوال، ارادے، سازشیں اور وہ سب کچھ شامل ہے جو وہ شعیب علیہ السلام کے خلاف کر رہے تھے) سے پوری طرح واقف ہے، کوئی چیز اس کے احاطے سے باہر نہیں۔

**آیت 93** وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ...... : اس آیت میں لہجہ پچھلی آیت سے بھی سخت ہے، کیونکہ شعیب علیہ السلام ان کے

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

اور جب ہمارا حکم آیا ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ہمراہ ایمان لائے تھے، اپنی خاص رحمت سے بچا لیا اور ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا تھا، چیخ نے پکڑ لیا، تو انھوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں صبح کی کہ گرے پڑے تھے ﴿۹۴﴾ جیسے وہ ان میں نہیں رہے تھے۔ سن لو! مدین کے لیے ہلاکت ہے، جیسے ثمود ہلاک ہوئے ﴿۹۵﴾

اللہ تعالیٰ کی سطوت و عزت سے بے بس انسانوں کی عزت و سطوت زیادہ سمجھنے اور ان کے ایمان لانے سے ناامید ہونے پر انھیں اللہ کے عذاب کی دھمکی دے رہے ہیں کہ تم اپنی جگہ عمل کرو، میں بھی اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے پر دعوت کا کام جاری رکھوں گا۔ نتیجہ بہت جلد سامنے آجائے گا۔ ان دونوں آیات میں کفار کی ان تمام باتوں کا جواب موجود ہے جو پچھلی آیت میں ذکر ہوئی ہیں کہ تمھاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں، ہم تجھے اپنے میں کمزور دیکھتے ہیں، صرف اپنی برادری کی وجہ سے تو سنگسار ہونے سے بچا ہوا ہے، ورنہ ہمارے ہاں تیری نہ کوئی عزت ہے نہ طاقت۔ فرمایا بہت جلد ان تمام باتوں کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کس کی قوت زیادہ ہے، کون سنگسار ہوتا ہے، کون سچا ہے اور کون جھوٹا، فیصلہ ہو چکا، اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ فیصلہ کس طرح عمل میں آتا ہے۔ سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔

**آیت 95،94** ① وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا ...... : یہ اللہ تعالیٰ کے ہر قوم پر آنے والے عذاب کی عجیب صفت ہے کہ اس نے اہل ایمان کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا، نہ آندھی نے، نہ چیخ نے اور نہ زلزلے نے۔ صرف کفار اور ظالم مشرک ہی اس سے برباد ہوئے۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۵۷) کی تفسیر۔

② اللہ کے حکم سے آنے والے اس عذاب کو سورۂ اعراف (۹۱) اور عنکبوت (۳۷) میں "اَلرَّجْفَةُ" یعنی زلزلہ فرمایا، یہاں "اَلصَّيْحَةُ" یعنی چیخ فرمایا اور سورۂ شعراء (۱۸۹) میں "عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ" سائبان کے دن والا عذاب فرمایا۔ اس لیے زیادہ واضح بات یہی نظر آتی ہے کہ پہلے "اَلصَّيْحَةُ" چنگھاڑ یا سخت چیخ بلند ہوئی، جب وہ حد سے گزری تو شدید زلزلہ آگیا جس نے پہاڑوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا اور اس آواز سے کفار کے دل اور جگر پھٹ گئے اور جو جہاں تھا وہیں پڑا رہ گیا۔ زلزلے نے باقی کسر پوری کر دی اور تمام کفار کا نام و نشان اس طرح مٹا جیسے وہ یہاں کبھی رہے ہی نہ تھے۔ آج بھی مدین کے علاقے میں سیکڑوں میل تک جو پہاڑ پائے جاتے ہیں، ان پر زلزلے کے آثار واضح ہیں۔ تمام پہاڑ اس طرح پھٹے ہوئے ہیں جیسے کسی زبردست زلزلے نے انھیں کھیل کھیل کر دیا ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ تمام عذاب ان پر آئے مگر آیات کے سیاق میں ہر مقام کے مطابق جو عذاب تھا اس کا ذکر ہوا۔ سورۂ اعراف (۸۸) میں کفار کا قول ذکر ہوا تھا: ﴿لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر بھیجا ﴿۹۶﴾ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ تو انھوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم ہرگز کسی طرح درست نہ تھا ﴿۹۷﴾

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ ﴾ "اے شعیب! ہم تجھے اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔" وہاں "الرَّجْفَةُ" کا ذکر ہے کہ یہ ہے وہ بستی جہاں سے تم نبی کو نکالنا چاہتے تھے۔ یہاں سورۂ ہود میں جب انھوں نے پیغمبر کی گستاخی کی تو اس کی مناسبت سے چیخ کا ذکر فرمایا اور سورۂ شعراء میں ان کا مطالبہ تھا کہ ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے تو وہاں سائبان والے عذاب کا ذکر فرمایا۔

③ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ : یعنی قوم شعیب پر ویسی ہی ہلاکت مسلط ہوئی جیسی ثمود پر ہوئی، ان کے علاقے بھی ایک دوسرے کے قریب تھے اور کفر و سرکشی میں بھی دونوں قومیں ایک جیسی تھیں اور دونوں عرب تھے۔

آیت 96 ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ : اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی جو آیات اور "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" (واضح دلیل) دے کر بھیجا تھا، ان سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو آیات بینات دی تھیں (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۱) جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوئیں: ① عصائے موسیٰ ② ید بیضا ③ سنین (قحط سالیاں) ④ نقص من الثمرات ⑤ طوفان ⑥ جراد ⑦ قمل ⑧ ضفادع ⑨ دم، انھی کو "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" کہا گیا ہے۔ واؤ ہمیشہ مغایرت کے لیے نہیں ہوتی، جیسا کہ سورۂ عصر میں فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ اس میں ہر بعد والی چیز اپنے سے پہلے والی تمام چیزوں میں داخل اور اس کا حصہ ہے۔

ایک جواب یہ ہے کہ "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد عصائے موسیٰ اور ید بیضا ہیں، جو سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیے۔ ان کی خصوصیت کے پیش نظر انھیں علیحدہ بھی ذکر فرمایا، حالانکہ یہ آیات میں داخل تھے اور ایک جواب یہ کہ "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام ہے جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس لے کر گئے اور وہ عقلی اور فطری دلائل ہیں جو لاٹھی پھینکنے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے بحث کے دوران پیش فرمائے اور وہ ان دلائل سے لاجواب ہو کر قید کی دھمکی دینے لگا اور معجزے کا مطالبہ کرنے لگا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۴۷ تا ۵۵) اور شعراء (۱۵ تا ۲۹) یہ تینوں تفسیریں صحیح ہیں۔ بعض حضرات نے "بِاٰيٰتِنَا" سے مراد نو معجزے اور "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد تورات بیان کی ہے، مگر تورات تو فرعون کے غرق ہونے کے بعد نازل ہوئی، اس لیے یہ تفسیر صحیح نہیں۔

آیت 97 ﴿ ① اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡىِٕهٖ ...... : یہاں فرعون کے ساتھ اس کے سرداروں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہی اس کے احکام کو نافذ کرنے والے تھے۔ بقول زمخشری ان کی جہالت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ فرعون کے احکام کے پیچھے لگے

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا، پس انھیں پینے کے لیے آگ پر لے آئے گا اور وہ پینے کی بری جگہ ہے، جس پر پینے کے لیے آیا جائے ﴿۹۸﴾ اور ان کے پیچھے اس (دنیا) میں لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ برا عطیہ ہے جو کسی کو دیا جائے ﴿۹۹﴾

رہے، حالانکہ وہ احکام عقل کے صریح خلاف تھے، مثلاً اپنے جیسے ایک انسان کے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ مان لینا جس میں ہر انسانی کمزوری پائی جاتی ہے اور حد سے بڑھ کر ظلم وستم، مثلاً معصوم بچوں کو قتل کرنے وغیرہ کے حکم پر عمل کرنا، مگر فرعون نے انھیں اس قدر ہلکا اور ذلیل کیا ہوا تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود فرعون ہی کے پیچھے لگے رہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے میں انھیں اپنا فسق (نافرمانی) چھوڑنا پڑتا تھا، فرمایا: ﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾ [ الزخرف : ۵٤ ] ”غرض اس نے اپنی قوم کو ہلکا (اور بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔“

❷ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ : ” رَشَدَ “ (ن، ف) سے ” رَشِيْدٌ “ وہ شخص جس کی رائے درست اور سوچ اچھی ہو، یہاں فرعون کے حکم کو فرمایا کہ وہ ہرگز کسی طرح درست نہ تھا، بلکہ واضح طور پر گمراہی پر مبنی تھا۔ اتنی تاکید نفی کی باء اور ”بِرَشِيْدٍ“ کی تنوین سے حاصل ہو رہی ہے۔

**آیت 98** ❶ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...... : ” قَدِمَ يَقْدَمُ “ (ع) آنا اور ” قَدَمَ يَقْدُمُ “ (ن) آگے ہونا ”فَاَوْرَدَهُمْ“ ” وِرْدٌ “ (واؤ کے کسرہ کے ساتھ) وہ پانی جسے پینے کے لیے لوگ اور جانور آتے ہوں، یعنی گھاٹ۔ ” اَوْرَدَ “ باب افعال سے ماضی معلوم ہے، یعنی جس طرح دنیا میں وہ اپنے لوگوں کا پیشوا تھا، اسی طرح آخرت میں بھی ان کا پیشوا ہوگا اور پینے کے لیے انھیں لے کر پانی کے گھاٹ پر جانے کے بجائے خود آگے ہو کر سب کو آگ میں لے جائے گا۔ یہی حال ان تمام لوگوں کا ہوگا جو کسی قوم کی رہنمائی کفر اور معصیت کی طرف کرتے ہیں کہ وہ انھی کی قیادت میں چل کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ ”يَقْدُمُ“ مضارع ہے، آگے ہوگا، اس کے بعد مضارع ” يُوْرِدُهُمْ “ (انھیں آگ پر لے آئے گا) کے بجائے ”فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ“ (وہ انھیں آگ پر لے گیا) ماضی کا لفظ یقین کے لیے استعمال فرمایا۔

❷ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ : پینے کی جگہ تو لوگ پیاس بجھانے کے لیے جاتے ہیں، مگر وہاں پانی کے بجائے آگ سے ان کی مہمان داری کی جائے گی۔ (والعیاذ باللہ)

**آیت 99** ❶ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً ...... : یعنی آگ کے علاوہ انھیں یہ سزا بھی دی گئی کہ رہتی دنیا تک لوگ ان پر پھٹکار بھیجتے رہیں گے اور قیامت کے دن ان پر جو پھٹکار پڑے گی اس کا حال تو معلوم ہی ہے۔ ان آیات میں فرعون کو صریح دوزخی

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

یہ ان بستیوں کی چند خبریں ہیں جو ہم تجھے بیان کرتے ہیں، ان میں سے کچھ کھڑی ہیں اور کچھ کٹ چکی ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا، پھر ان کے وہ معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے، جب تیرے رب کا حکم آ گیا اور انھوں نے ہلاک کرنے کے سوا انھیں کچھ زیادہ نہ دیا ﴿۱۰۱﴾

بتایا گیا ہے، مگر بعض لوگوں نے اسلام کو مٹانے کے لیے تصوف کے پردے میں وحدت الوجود کا عقیدہ ایجاد کیا اور کہا کہ ہر چیز ہی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، سو فرعون "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کہنے میں غلط نہ تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک حسین بن منصور حلاج، جسے عام طور پر منصور کہتے ہیں، کامل ولی تھا، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ میں خدا ہوں۔ وہ اصل حقیقت کو پا گیا تھا اور صاف کہتا تھا کہ " اَنَا الْحَقُّ " مگر اس وقت اسلام کے محافظ خلیفۂ وقت نے اس کفریہ عقیدے کے ثابت ہونے پر اسے سولی پر چڑھا دیا۔ ان وجودی ملحدوں کے کہنے کے مطابق وہ سولی پر چڑھ گیا، مگر حق کہنے سے باز نہ آیا۔ ایسے کفریہ الفاظ اور عقیدے پر اللہ کی پھٹکار جس کے نتیجے میں خالق و مخلوق کا فرق ختم، جنت و دوزخ کا فرق ختم اور شریعت کا ہر حکم ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جب کہا جائے کہ فرعون اپنی سرکشی کی پاداش میں سمندر میں غرق کر دیا گیا تو وہ کہتے ہیں کہ فرعون دراصل بحرِ توحید میں غرق تھا۔ غرض اس طرح کی صریح کفر کی باتیں جو صاف قرآن کے خلاف ہیں، کہتے ہیں، مگر مسلمانوں میں شامل رہنے اور انھیں گمراہ کرنے کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھے رکھتے ہیں، حالانکہ یہ عقیدہ اس اسلام کے صریح مخالف ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آیا اور قرآن و حدیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس عقیدے کی رو سے نیکی و بدی، شرک و توحید، نکاح و زنا، غرض ہر اطاعت اور نافرمانی کا فرق ہی مٹ جاتا ہے اور انبیاء و رسل اور کتب الٰہیہ سب بے کار ٹھہرتے ہیں۔ [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةِ الْمَلْعُوْنَةِ ] قرآن مجید میں صراحت ہے کہ آل فرعون کو مرتے ہی آگ نے گھیر لیا اور قیامت کو وہ سخت ترین عذاب میں داخل ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ مومن (۴۵، ۴۶)۔

② "اَلرِّفْدُ" کا معنی عطیہ، "اَلْمَرْفُوْدُ" جو انھیں دیا گیا، یعنی دنیا اور آخرت میں لعنت کا عطیہ۔ لعنت کو عطیہ اور انعام بطور مذاق فرمایا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [ آل عمران : ۲۱ ] "سو انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے۔"

**آیت 100** ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى ...... : "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی گزشتہ بستیوں کی یہ چند خبریں ہیں جو ہم آپ کو بیان کر رہے ہیں۔ اس سورت میں انبیاء کے حالات زمانے کی ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، یعنی نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، شعیب اور موسیٰ علیہم السلام۔ "قَآىِٕمٌ" کھڑی (کھیتی)، "حَصِيْدٌ" وہ کھیتی جو کاٹی جا چکی ہو، یعنی ان بستیوں میں سے بعض کے نشانات اب بھی قائم ہیں، مثلاً صالح علیہ السلام کی قوم کے پہاڑوں میں تراشے ہوئے مکانات اور بعض کے نام و نشان تک مٹ چکے ہیں، جیسے کٹی ہوئی کھیتی کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔

**آیت 101** ① وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ ......: یعنی ہم نے جو ان پر عذاب بھیجے اس میں ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ انھوں نے

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾

اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک، بہت سخت ہے ﴿۱۰۲﴾ بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرے، یہ وہ دن ہے جس کے لیے (سب) لوگ جمع کیے جانے والے ہیں اور یہ وہ دن ہے جس میں حاضری ہوگی ﴿۱۰۳﴾

خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اپنی جانوں پر ان کا سب سے بڑا ظلم اللہ کے ساتھ شرک اور پھر رسولوں کو جھٹلانا تھا، جس کی انھیں سزا ملی۔

② فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ ...... : پھر اللہ کا عذاب آنے پر ان کے معبود، حاجت روا، مشکل کشا، گنج بخش اور دستگیر ان کے کسی کام نہ آسکے، بلکہ وہ ان کے لیے ہلاک کیے جانے میں اور عذاب میں اضافے ہی کا سبب بنے، کیونکہ انھی کی وجہ سے ان پر تباہی اور بربادی آئی۔ ”تَتْبِیْبٍ“ فعل ”تَبَّ“ (وہ ہلاک ہوا) سے باب تفعیل ہے، ہلاک کرنا۔

آیت 102 وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ ...... : ”اَخذ“ کا معنی اچانک جلدی سے پکڑ لینا، جیسا کہ کہتے ہیں: ”فُلَانٌ اَخَذَهُ الْمَوْتُ“ فلاں کو موت نے آدبوچا۔ یعنی جس طرح گزشتہ سات انبیاء علیہم السلام کی اقوام پر ظلم کی وجہ سے پکڑ آئی، کسی بھی ظالم بستی (والوں) پر تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ﴾» [ بخاری، التفسیر، باب: ﴿و كذلك أخذ ربك ......﴾: ٤٦٨٦۔ مسلم: ٢٥٨٣ ] ”اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے، لیکن آخر کار جب اسے پکڑتا ہے تو ایسا پکڑتا ہے کہ وہ اس سے چھوٹ کر کہیں جا نہیں سکتا۔“ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ یہ آیت ہر زمانے میں ہر ظالم کو شامل ہے۔ سلف میں سے کسی نے کہا ہے: ”کفر کے ساتھ سلطنت قائم رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔“

آیت 103 ① اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ : یعنی ان آیات و واقعات سے وہی عبرت حاصل کرے گا جس کا آخرت پر ایمان ہے، مگر جس کا آخرت پر ایمان نہیں وہ ان تمام واقعات کی کوئی نہ کوئی سائنسی توجیہ کرے گا کہ زمین و آسمان کے تغیرات کی وجہ سے ایسا ہوا، ظلم یا عدل سے اس کا کیا تعلق؟

② ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ : یعنی وہ قیامت کا دن ایسا ہے جس کے لیے تمام لوگ جمع کیے ہوئے ہوں گے۔ زمخشری نے فرمایا کہ فعل مجہول ”يُجْمَعُ لَهُ“ (جمع کیے جائیں گے) کے بجائے اسم مفعول ”مَجْمُوْعٌ لَّهُ“ (جمع کیے ہوئے ہوں گے)

وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

اور ہم اسے مؤخر نہیں کر رہے، مگر ایک گنے ہوئے وقت کے لیے ﴿۱۰۴﴾ جس دن وہ (وقت) آئے گا، کوئی شخص اس کی اجازت کے سوا بات نہیں کرے گا، پھر ان میں سے کوئی بد بخت ہوگا اور کوئی خوش قسمت ﴿۱۰۵﴾

اس لیے استعمال فرمایا کہ اسم میں دوام اور ہمیشگی پائی جاتی ہے جب کہ فعل میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

③ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ : یعنی اس میں سب لوگ حاضر کیے ہوئے ہوں گے، کوئی چھپ سکے گا نہ ادھر ادھر ہو سکے گا۔ ایک معنی یہ ہے کہ اس دن ہر نیکی یا بدی کی شہادت موجود ہوگی اور پیش بھی کی جائے گی۔ یہ بھی مراد ہے کہ اس دن پہلے، پچھلے انسان اور جن سب حاضر ہوں گے، فرشتے بھی اور خود ذات الٰہی بھی فیصلے کے لیے تشریف لائیں گے، فرمایا: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ [ الفجر : ۲۲ ] ''اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔''

آیت 104 وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ : ''مَعْدُوْدٍ'' کا معنی ہے گنا ہوا۔ گنی ہوئی چیز آخر ختم ہو جاتی ہے، یعنی قیامت کی مہلت گنتی کے چند دن ہیں، جیسے روزوں کے متعلق فرمایا: ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ [ البقرۃ : ۱۸۴ ] ''گنے ہوئے چند دنوں میں'' اور وہ گنتی صرف اللہ کے علم میں ہے، قیامت نہ اس سے پہلے آسکتی ہے، نہ اس سے مؤخر ہو سکتی ہے۔

آیت 104 ① يَوْمَ يَاْتِ : یہاں چند آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس دن کا کچھ نقشہ بیان فرمایا ہے۔ ''يَاْتِ'' اصل میں ''يَاْتِيْ'' ہی ہے۔ زمخشری نے لکھا ''يَوْمَ يَاْتِ'' کی طرح ''لَا أَدْرِ'' بھی کہہ دیتے ہیں۔ سیبویہ اور خلیل نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یاء کو حذف کر کے اس کی جگہ کسرہ پر اکتفا کرنا ہذیل کی لغت میں بہت ہے (یعنی دوسری لغات میں بھی ہے مگر کم ہے)۔ ''يَاْتِ'' کا فاعل وہی ہے جو اوپر گزرا ''يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ۔'' ''يَوْمٌ'' کا لفظ عربی میں وقت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''التحریر والتنویر لابن عاشور''۔ یعنی جس دن وہ وقت آئے گا، یا جس وقت وہ دن آئے گا۔ زمخشری نے ایک معنی یہ لکھا ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ آئے گا، یعنی ''يَاْتِ'' کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ [ الفجر : ۲۲ ] ''اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔''

② لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ : یہاں سے نصرانیوں کی اور بعض مسلمانوں کی اس سفارش کا رد ہو گیا جو ان کے خیال میں کچھ ہستیوں کے اختیار میں ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہونے یا بڑے زبردست ہونے کی وجہ سے جسے چاہیں گے چھڑا لیں گے، حالانکہ وہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کو بات کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوگی۔ دیکھیے سورۂ نبا (۳۸)۔

③ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ : ''شَقِيٌّ'' بروزن ''فَعِيْلٌ'' مبالغہ کے لیے ہے۔ قاموس میں ہے ''اَلشَّقَا'' کو کبھی ''اَلشَّقَاءُ'' بھی کہا جاتا ہے، سختی، تنگی۔ ''شَقِيَ يَشْقٰى'' (ع) یہ ''رَضِيَ يَرْضٰى'' کی طرح ہے، یعنی ناقص واوی ہے۔ زمخشری نے فرمایا: ''اَلَّذِيْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ بِإِسَاءَتِهٖ'' یعنی وہ بد بخت جس کے لیے اس کی بدعملی کی وجہ سے آگ واجب ہو گئی۔ ''سَعِيْدٌ'' وہ

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا

تو وہ جو بدبخت ہوئے سو وہ آگ میں ہوں گے، ان کے لیے اس میں گدھے کی طرح آواز کھینچنا اور نکالنا ہے ﴿۱۰۶﴾ ہمیشہ اس میں رہنے والے، جب تک سارے آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے ﴿۱۰۷﴾ اور رہ گئے وہ جو خوش قسمت بنائے گئے تو وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں

خوش قسمت جس کے لیے اس کے نیک اعمال کی وجہ سے جنت واجب ہوگئی۔

**آیت 106** ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا ...... ﴾: "زَفِيْرٌ" اور "شَهِيْقٌ" دونوں گدھے کی آوازیں ہیں۔ "زَفِيْرٌ" اس کے شروع کی آواز اور "شَهِيْقٌ" اس کے آخر کی آواز، یعنی نہایت بری چیخنے چلانے کی آوازیں نکالیں گے۔

**آیت 107، 108** ﴿ ❶ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ﴾: "جب تک سارے آسمان و زمین قائم ہیں" مراد ہمیشہ کا عذاب ہے، کیونکہ جب کسی چیز کی ہمیشگی ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو عرب "مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ" کا محاورہ استعمال کرتے ہیں، ورنہ تعلیق نہیں، یعنی یہ معنی نہیں کہ جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے عذاب رہے گا پھر نہیں۔ ہاں آسمان و زمین سے مراد آخرت کے آسمان و زمین ہوں تو محاورے کے بغیر ہی ہمیشگی مراد ہے، کیونکہ دنیا کے زمین و آسمان تو اس دن بدل دیے جائیں گے، فرمایا: ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [ إبراهيم : ٤٨ ] "جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور سب آسمان بھی اور لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، جو اکیلا ہے، بڑا زبردست ہے۔" آخرت کے آسمان و زمین میں جنت واقع ہوگی اور وہ ہمیشہ رہنے والی ہے۔ لہٰذا وہ زمین و آسمان بھی دائمی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کا قول ذکر فرمایا: ﴿ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ﴾ [ الزمر : ٧٤ ] "اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں جگہ بنا لیں۔" تو مطلب یہ ہوگا کہ جہنمی جہنم میں اور جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ابن کثیر)

❷ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ: یہ لفظ "شَقِيٌّ" اور "سَعِيْدٌ" دونوں کے تذکرے میں آئے ہیں، یعنی بدبخت آگ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ اسی طرح سعادت مندوں کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ دونوں آیتوں میں "مگر جو تیرا رب چاہے" کا تعلق اہل توحید سے ہے۔ پہلی آیت میں مطلب یہ ہوگا کہ مومن موحد گناہ گار جب اپنی سزا بھگت لیں گے تو انھیں جہنم سے نکال لیا جائے گا، جیسا کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَخْرِجُوْا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ، فَيُخْرَجُوْنَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوْا فَيُلْقَوْنَ فِيْ

فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

، رہنے والے، جب تک سارے آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ ایسا عطیہ جو قطع کیا جانے والا نہیں ﴿۱۰۸﴾

نَهَرِ الْحَيَا أَوِ الْحَيَاةِ، شَكَّ مَالِكٌ فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِيْ جَانِبِ السَّيْلِ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً ؟» [ بخاری، الإیمان، باب تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال : ۲۲ ۔ مسلم : ۱۸٤ ] ”اہل جنت، جنت میں اور اہل نار آگ میں داخل ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”جس شخص کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر ایمان ہے اسے اس سے نکال لو!“ تو وہ اس سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ سیاہ ہو چکے ہوں گے، پھر انھیں ”نَهَرُ الْحَيَا“ (بارش کے پانی کی نہر) یا ”نَهَرُ الْحَيَاةِ“ (زندگی کی نہر) میں ڈال دیا جائے گا (امام مالک کو شک ہے) تو وہ اس طرح اگ آئیں گے جیسے بوٹیوں کا بیج سیلاب کی جانب میں اگ آتا ہے۔ تم نے نہیں دیکھا کہ وہ زرد لپٹا ہوا اگتا ہے؟“

اس مفہوم کی بہت سی احادیث آئی ہیں کہ سزا پا کر یا شفاعت سے یا محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے گناہ گار مسلمان آخر کار جہنم سے نکل کر جنت میں چلے جائیں گے، اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔ گو بعض نے اس سے دوزخ کے بالآخر فنا ہونے پر استدلال کیا ہے اور اس سلسلے میں ایک ضعیف حدیث اور کچھ غریب اقوال بھی نقل کیے ہیں، مگر یہ مطلب قرآن کی دوسری آیات کے خلاف ہے، جن میں جہنمیوں کے متعلق ”خٰلِدِيْنَ“ اور ”اَبَدًا“ کے الفاظ مذکور ہیں اور ان احادیث کے بھی صریح خلاف ہے، جن میں ہے: « يُجَاءُ بِالْمَوْتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُ كَبْشٌ أَمْلَحُ حَتّٰى يُجْعَلَ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، ثُمَّ يُذْبَحُ، ثُمَّ يُنَادِيْ مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ ! لَا مَوْتَ، يَا أَهْلَ النَّارِ! لَا مَوْتَ، فَيَزْدَادُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَرَحًا إِلٰى فَرَحِهِمْ، وَيَزْدَادُ أَهْلُ النَّارِ حُزْنًا إِلٰى حُزْنِهِمْ » [ مسلم، الجنة و نعیمها، باب النار یدخلها الجبارون : ۲۸٤۹، ۲۸۵۰/٤۳ ۔ بخاری : ٦٥٤٨ ] ”موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں جنت اور جہنم کے درمیان لا کر ذبح کر دیا جائے گا اور اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ اے اہل جنت! (اب) موت نہیں اور اے اہل نار! اب موت نہیں! تو جنتیوں کی خوشیوں کے ساتھ مزید خوشی کا اور جہنمیوں کے غم کے ساتھ مزید غم کا اضافہ ہو جائے گا۔“ اور مسلم کی ایک روایت (۲۸۵۰/٤۲) میں ہے: « كُلٌّ خَالِدٌ فِيْمَا هُوَ فِيْهِ » کہ ہر ایک جس جگہ میں ہے اس میں ہمیشہ رہے گا۔ ایسی بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں، اس لیے جہنم کے بالآخر فنا ہونے کی کوئی واضح اور پختہ دلیل موجود نہیں۔

۞ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ : یہ ان لوگوں پر رد ہے جو ہر عمل کی تاثیر ذاتی سمجھتے ہیں، جیسا کہ زہر کھانے کا لازمی نتیجہ موت ہے، چنانچہ معتزلہ اور خارجیوں کا کہنا ہے کہ جو مسلمان کبائر کا مرتکب ہو اور توبہ نہ کی ہو، وہ بھی ابدی جہنمی ہے۔ ایک دفعہ جو آگ میں چلا گیا وہ وہاں سے کبھی نہیں نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل شقاوت (جو جہنم میں جائیں گے، جن میں کافر اور گناہ گار مسلمان دونوں شامل ہیں) کے متعلق فرمایا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، مگر جو تیرا رب چاہے۔ کیونکہ بلاشبہ تیرا رب جو

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا

پس تو اس کے بارے میں جس کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں، کسی شک میں نہ رہ، یہ لوگ عبادت نہیں کرتے مگر جیسے

چاہے کر گزرنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز کی تاثیر اللہ کے حکم ہی سے ہوتی ہے، وہ چاہے تو آگ جلاتی ہے، پانی غرق کرتا ہے، زہر موت کا باعث بنتا ہے، اگر وہ اس کے برعکس چاہے تو نہ آگ جلاتی ہے، نہ پانی غرق کرتا ہے، نہ زہر کھانا موت کا باعث ہوتا ہے، حالانکہ یہ ان کی اپنی تاثیر کے خلاف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اہل کبائر مسلمانوں کو جہنم سے نکال لے گا، وہ جو چاہے کر گزرنے والا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔

④ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا...... : اس دوسری آیت میں اہل سعادت (اہل جنت) کے متعلق بھی ''مگر جو تیرا رب چاہے'' کے الفاظ فرمائے ہیں۔ یہاں بھی ان سے مراد گناہ گار مسلمان ہی ہیں، یعنی جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے، تاہم کچھ لوگ اللہ کی مشیت کے تحت جہنم سے نکال کر جنت میں لائے جائیں گے۔ گویا وہ ہمیشہ جنت میں نہ رہے مگر جنت میں داخل ہونے کے بعد چونکہ کوئی بھی اس سے نہیں نکلے گا، اس لیے آخر میں فرمایا: ﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ یعنی جنت ایسا عطیہ ہے جو قطع کیا جانے والا نہیں۔ (روح المعانی)

⑤ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ اپنے فوائد میں لکھتے ہیں کہ اس کے یعنی آیت: ﴿ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ﴾ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ رہیں گے آگ میں جتنی دیر رہ چکے ہیں آسمان و زمین دنیا میں، مگر جتنا اور چاہے تیرا رب، وہ اسی کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ رہیں گے آگ میں جب تک رہے آسمان و زمین اس (آخری) جہان کا، یعنی ہمیشہ مگر جو چاہے رب تو موقوف کر دے، لیکن وہ چاہ چکا کہ موقوف نہ ہو۔ اس کہنے میں فرق نکلا اللہ کے ہمیشہ رہنے میں اور بندے کے کہ بندے کے ہمیشہ رہنے پر ساتھ یہ بات لگی ہے کہ اللہ چاہے تو فنا کر دے۔'' (موضح) گویا شاہ صاحب نے اس مشہور اعتراض کا بھی جواب دے دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ہمیشہ رہنے والی ہے، جنتی اور جہنمی بھی ہمیشہ جنت اور جہنم میں رہنے والے ہوئے تو دونوں ایک دوسرے کی مثل ابدی ہو گئے، جب کہ فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ [ الشورٰی : ۱۱ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' جواب یہ ہے کہ بندے کا جہنم یا جنت میں ہمیشہ رہنا اور ابدی ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا ابدی ہونا کسی کی مشیت پر موقوف نہیں۔ وہ خود ہی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔

**آیت 109** ① فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ : یعنی ان کے معبودوں کے باطل ہونے یا نفع نقصان کا مالک نہ ہونے میں کسی قسم کا شک نہ کر۔ ''مِمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ '' (جن کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں) میں ''یہ لوگ'' سے مراد مشرکین قریش ہیں۔ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ میں نے قرآن کی اس اصطلاح کی جستجو کی تو تقریباً گیارہ مقامات میں ایسا ہی پایا۔ یہ بات میرے دل میں اللہ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اور میں نے آیت: ﴿ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ [ النساء : ۴۱ ] کی تفسیر میں اس کی وضاحت کی ہے۔ [ التحریر و التنویر ] یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کو اس قسم کا کوئی شک

لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ ﴿۱۰۹﴾

ان سے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے اور بے شک ہم یقیناً انھیں ان کا حصہ پورا پورا دینے والے ہیں، جس میں کوئی کمی نہ کی گئی ہوگی ﴿۱۰۹﴾

تھا جس سے اللہ تعالیٰ منع فرما رہا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا: ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ [ هود: ۱۱٤ ] ''نماز قائم کر۔'' اسی طرح فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ [ الأحزاب: ۱ ] ''اے نبی! اللہ سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کر۔'' تو کیا نبی ﷺ پہلے نماز قائم نہیں کرتے تھے؟ یا کیا آپ اس سے پہلے اللہ سے نہیں ڈرتے تھے؟ اور کیا آپ کفار و منافقین کی اطاعت کیا کرتے تھے؟ نہیں، ہرگز نہیں، اس قسم کے احکام جن پر نبی ﷺ اور مخلص اہل ایمان پہلے ہی کار بند ہوں، نازل کرنے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ نبی ﷺ اور پہلے سے عمل کرنے والے ہمیشہ ان پر کار بند رہیں اور استقامت اختیار کریں اور دوسرے تمام انسان بھی نبی ﷺ کے واسطے سے اپنے آپ کو مخاطب سمجھ کر ان احکام پر عمل کریں کہ جب نبی کو یہ حکم ہے تو ہماری کیا اوقات ہے کہ ہم اس پر عمل نہ کریں۔

❷ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ: '' اٰبَآؤُهُمْ '' سے مراد عاد و ثمود ہیں، کیونکہ عدنانی عربوں کی ماں بنو جرہم سے تھی جو اسماعیل علیہ السلام کی بیوی تھی۔ بنو جرہم ثمود سے تھے اور قریش کی ماں بنو خزاعہ سے تھی، جو قصی کی بیوی تھی اور عرب میں بت پرستی عمرو بن لحی نے شروع کی تھی جو خزاعی تھا۔ (ابن عاشور) یعنی ان کی غیر اللہ کی پرستش کی بنیاد سوائے باپ دادا کی اندھی تقلید کے اور کچھ نہیں ہے۔ (ابن کثیر) آبا و اجداد کی غیر اللہ کی عبادت کیا تھی؟ یہی کہ وہ اپنے بزرگوں یا ان کے بتوں یا قبروں کو مصیبت کے وقت پکارتے تھے، انھیں اللہ کا بیٹا یا جز یا عین قرار دیتے تھے۔ اسی طرح عبادت میں ان کے نام کی نذر و نیاز ماننا، اللہ کے حصے کے ساتھ جانوروں اور کھیتیوں میں ان کا حصہ رکھنا، ان کو اللہ کی صفات، مثلاً علم غیب کا مالک، دور سے فریاد سننے اور مدد کرنے والا سمجھنا بھی شامل ہیں۔ ہر زمانے کے مشرک ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں: ﴿ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [ المؤمنون: ۸۱ ] ''بلکہ انھوں نے کہا جیسے پہلوں نے کہا تھا'' اور ان کے پاس تقلید آباء کے سوا کوئی دلیل نہیں ہوتی اور ان پر وہی محاورہ صادق آتا ہے کہ ''مَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ'' ''آج کی رات کل کی رات کے کس قدر مشابہ ہے۔''

❸ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ: انھیں ان کا حصہ پورا پورا دینے سے مراد ایک تو یہ ہے کہ کسی شخص کا تقدیر میں دنیا کا جو رزق اور آسائشیں لکھی گئی ہیں، وہ مسلمان ہو یا کافر ہر ایک کو ملیں گی، کافروں کو بھی ان کا حصہ پورا ملے گا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۲۰) دوسری یہ کہ ان کی نیکیاں جو انھوں نے دنیا میں کی ہیں ان کا پورا بدلہ ہم انھیں دنیا ہی میں دے دیں گے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۲۰) اور تیسری یہ کہ ہم ان کی غیر اللہ کی عبادت اور شرک کا پورا پورا بدلہ دنیا میں نہیں بلکہ قیامت کے دن ضرور دینے والے ہیں۔ یہاں یہ آخری معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ان لوگوں کو نبی ﷺ کی برکت سے پہلی قوموں کی طرح دنیا میں آسمانی عذاب نہیں دیا گیا، جس سے ان کا نام و نشان مٹ جاتا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پھر اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف

آیت 110 ① وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ: سورۂ ہود واحد سورت ہے جس میں ایک ہی رسول کا ذکر دو بار ہوا ہے۔ اس سے پہلے یہ ذکر ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جائیں، آیات اور سلطان مبین پیش کریں اور جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ذکر ہے، اس سے مطالبہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو عذاب دینا چھوڑ دے اور انھیں آزادی دے کر میرے ساتھ بھیج دے۔ اگرچہ اس کے ساتھ توحید و رسالت کی دعوت بھی تھی، مگر وہ مسلمان ہی نہیں ہوا کہ اس کے لیے مفصل احکام نازل ہوتے۔ اس وقت تمام احکام زبانی تھے، تورات نازل نہیں ہوئی تھی، اس لیے ساتھ ہی اس کا انجام ذکر کر دیا: ﴿ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ﴾ [ ھود : ۹۸ ] یعنی وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے چلتا ہوا انھیں جہنم میں لے جائے گا۔

موسیٰ علیہ السلام کی دوسری بعثت بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ چنانچہ آزادی حاصل ہونے اور سمندر سے بخیریت نکل جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے طور پر چالیس راتوں کا اعتکاف کروایا اور اس کے بعد انھیں تورات عطا فرمائی۔ اب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون یا اس کے سردار نہیں تھے، ان کے ساتھ بنی اسرائیل تھے یا فرعون کی قوم میں سے مصر سے آنے والے چند نوجوان۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ ﴾ کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) عطا فرمائی، مگر موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں اور اس کے بعد اس میں اختلاف کیا گیا۔ کسی نے تسلیم کیا، کسی نے انکار کر دیا، یا کسی نے کچھ احکام مان لیے کچھ نہیں، حتیٰ کہ بنی اسرائیل کی غالب اکثریت نے موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر ارضِ مقدس (شام) کے حصول کے لیے جہاد پر نکلنے سے بھی صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جا تو اور تیرا رب لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۲۴) پھر موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان پر بہت سے دور آئے، کبھی غالب رہے، مثلاً یوشع بن نون علیہ السلام کا دور، داؤد و سلیمان علیہما السلام کا دور، کبھی مغلوب رہے، پھر آہستہ آہستہ انھوں نے اللہ کی کتاب میں ایسا اختلاف کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق بہتر (۷۲) گروہوں میں بٹ گئے۔ انھوں نے اپنی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کے معانی میں تحریف کی، غلط تاویلیں کیں، معانی بدلے، پھر الفاظ میں بھی تحریف کر دی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ [ المائدۃ : ۱۳ ] ”وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں۔“ پھر اپنے احبار و رہبان (علماء و درویش) کو اللہ تعالیٰ کی کرسی پر بٹھا دیا۔ ان کی فقہ اور ان کے اقوال و فتاویٰ کو یہ درجہ دیا کہ وہ حرام کو حلال کہتے تو حلال سمجھ لیتے، حلال کو حرام کہہ دیتے تو حرام سمجھ لیتے، فرمایا: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ﴾ [ التوبۃ : ۳۱ ] ”انھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔“ ان کے دنیا پرست علماء اللہ کی کتاب لوگوں کو سناتے ہوئے زبانوں کو ایسا پیچ دیتے کہ لوگ سمجھیں یہ اللہ ہی کی کتاب سنا رہے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی کتاب نہ ہوتی، پھر صاف دعویٰ کر دیتے کہ یہ اللہ کی طرف سے شرع کا حکم ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتا،

وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

سے پہلے ہو چکی تو ان کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک یہ لوگ یقیناً اس کے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں ہیں ﴿۱۱۰﴾

فرمایا: ﴿وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ١ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ١ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ [ آل عمران : ۷۸ ] ''اور بے شک ان میں سے یقیناً کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب (پڑھنے) کے ساتھ اپنی زبانیں مروڑتے ہیں، تاکہ تم اسے کتاب میں سے سمجھو، حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں اور اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔'' پھر کچھ ایسے بدنصیب تھے جو اپنے ہاتھوں سے فتوے لکھ کر کہتے یہ اللہ کا حکم ہے، حالانکہ وہ سب کچھ انھوں نے اپنی کسی دنیوی خواہش کو پورا کرنے کے لیے لکھا ہوتا، اللہ کا حکم ہرگز نہ ہوتا اور جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھ دیتے، فرمایا: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ١ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا١ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ [ البقرۃ : ۷۹ ] ''پس ان لوگوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت حاصل کریں۔ پس ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو وہ کماتے ہیں۔''

ہاں کچھ لوگ صراط مستقیم پر قائم رہے۔ یہ وہ تھے جو موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اور سنت پر کسی تبدیلی یا تحریف کے بغیر قائم رہے۔ یہ نجات پانے والے تھے، مگر ان کے بہت سے لوگ اللہ کے احکام کے نافرمان ہو گئے اور اوپر مذکور ہیرا پھیریاں کرنے والے بن گئے، یا ایسی ہیرا پھیریاں کرنے والوں کے پیروکار بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ١ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ﴾ [ المائدۃ : ٦٦ ] ''ان میں سے ایک جماعت درمیانے راستے والی ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ، برا ہے جو کر رہے ہیں۔'' اس وقت یہ سارا نقشہ آنکھوں سے دیکھنا چاہیں تو ہماری امت مسلمہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

② اوپر اہل سعادت اور اہل شقاوت کا حال بیان کرنے کے بعد آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر آج یہ لوگ آپ پر نازل شدہ کتاب قرآن کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں تو آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے تورات کے ساتھ بھی لوگ یہی معاملہ کر چکے ہیں۔

③ ﴿وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ......: موسیٰ علیہ السلام سے پہلے جہاد کا حکم نہ تھا، اس لیے رسول کی نافرمانی پر آسمان سے عذاب اترآتا تھا۔ فرعون کے غرق ہونے کے بعد جہاد کا حکم ہوا، اب یا تو کفار کو مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دیا جائے گا، جیسے فرمایا: ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ﴾ [ التوبۃ : ١٤ ] ''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔'' چنانچہ

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور بے شک ان سب کو جب (وقت آئے گا) تو یقیناً تیرا رب انھیں ان کے اعمال ضرور پورے پورے دے گا، بے شک وہ اس سے جو وہ کر رہے ہیں، پوری طرح باخبر ہے ﴿۱۱۱﴾

یوشع بن نون، طالوت، داؤد اور سلیمان علیہم السلام وغیرہم کے جہاد اس بات کی دلیل ہیں۔ اگر مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب نہ ہوا تو پھر آخرت کو ہوگا۔ اگر یہ بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان پر پہلی قوموں کی طرح عذاب آ چکا ہوتا۔ ہاں محدود پیمانے پر اللہ تعالیٰ کی سزا کا تازیانہ اب بھی برس سکتا ہے، جیسا کہ ''اصحاب سبت'' پر برسا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہماری امت میں بھی ایسے واقعات پیش آئیں گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ دنیا میں سچ اور جھوٹ صاف نہ ہو۔'' (موضح)

④ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ : بعض مفسرین نے اس کی تفسیر کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم تورات کے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہے، نہ اسے اس کے سچا ہونے کا یقین ہے نہ جھوٹا ہونے کا اور حق کا انکار کرنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کا دل اسے سچا مانتا ہے، مگر دنیاوی خواہشات اسے ماننے کی اجازت نہیں دیتیں، اسی تذبذب میں کفر ہی پر دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ بعض نے یہ تفسیر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ایمان نہ لانے والے قرآن کے متعلق بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہیں۔ مگر پہلی تفسیر زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ذکر موسیٰ علیہ السلام، تورات اور ان کی قوم کا ہو رہا ہے۔ (واللہ اعلم)

**آیت 111** ① وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ ...... : ''كُلًّا'' میں تنوین عوض کی ہے، یعنی اس کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ اصل میں تھا ''كُلُّهُمْ'' یا ''كُلُّ هٰؤُلَاءِ'' (یہ سب لوگ) ''لَمَّا'' کا معنی ''جب'' ہے، یہ حرف شرط ہے جس کی شرط محذوف ہے۔ ''لَيُوَفِّيَنَّهُمْ'' اس کی جزا ہے۔ وہ محذوف شرط ''لَمَّا'' کے معنی کے مطابق نکالی جائے گی، یعنی ''لَمَّا جَاءَ أَجَلُهُمْ'' یعنی بے شک یہ سب لوگ (جب ان کا وقت آئے گا) تو یقیناً انھیں ان کا رب ان کے اعمال کا ضرور پورا پورا بدلہ دے گا۔ چونکہ وہ لوگ قیامت کے منکر تھے، اس لیے اس جملے میں کئی طرح سے تاکید آئی ہے۔ ''اِنَّ''، لام تاکید اور نون ثقیلہ۔ ''لَمَّا'' کا مابعد حذف کرنے سے بھی ایک ہیبت پیدا ہو رہی ہے، کیونکہ خود لفظ ''لَمَّا'' میں وقت کا مفہوم شامل ہے، یعنی جب وہ وقت آئے گا۔ (''اِنَّ كُلًّا لَّمَّا'' کی یہ سب سے واضح اور آسان توجیہ ہے) دیکھیے تفسیر الشعراوی۔ تفسیر نسفی میں ہے: ''قَالَ صَاحِبُ الْإِيْجَازِ "لَمَّا" فِيْهِ مَعْنَى الظَّرْفِ وَقَدْ دَخَلَ فِي الْكَلَامِ اخْتِصَارٌ كَأَنَّهُ قِيْلَ "وَإِنَّ كُلًّا لَمَّا بُعِثُوْا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ" مطلب وہی ہے جو اوپر گزرا، البتہ انھوں نے ''لَمَّا جَاءَ أَجَلُهُمْ'' کے بجائے ''لَمَّا بُعِثُوْا'' محذوف نکالا ہے۔

② اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ : اس میں اعمال کی جزا پوری پوری دینے کی وجہ بیان کی ہے کہ وہ ان کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے، اس لیے عمل نیک ہو یا بد اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

پس تو خوب ثابت قدم رہ، جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک وہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۱۲﴾

آیت 112 ① فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ : " فَاسْتَقِمْ " میں سین اور تاء کا اضافہ یا تو طلب کے لیے ہے، معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح سیدھا اور قائم رہنے کی درخواست کرتا رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا ہے اور یہ اضافہ مبالغے اور تاکید کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ قرطبی نے فرمایا، استقامت دائیں یا بائیں طرف جائے بغیر ایک طرف کو سیدھے چلتے چلے جانا ہے۔ یہ معنی یہاں زیادہ مناسب ہے۔ پہلا معنی بھی درست ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے ہی ہم ہر رکعت میں صراط مستقیم کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔ استقامت کا معنی باطل کے دونوں کناروں افراط اور تفریط (زیادتی اور کمی) سے بچ کر ان کے عین درمیان سیدھا رہنا ہے۔ یہ نہایت مشکل کام ہے۔ پہلے تو ہر وقت اس کا خیال رکھنا ہی مشکل ہے کہ عین صحیح راستہ کیا ہے؟ پھر اس پر قائم رہنا اس سے بھی مشکل ہے۔ رازی نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ دھوپ اور چھاؤں کے درمیان ایک جگہ ہے۔ اس کا معلوم کرنا اور ہر وقت اس کا خیال رکھنا کس قدر مشکل ہو گا۔ اس لیے اہل علم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا: (( شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ )) [ترمذی: ۳۲۹۷] "مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا۔" اس کا سبب انبیاء علیہم السلام کی قوموں پر عذاب کے واقعات کے بجائے یہ حکم ہے: ﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ﴾

② " فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ " سے معلوم ہوا کہ سیدھا راستہ جس پر خوب ثابت رہنے کا حکم ہے، صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی طرف وحی فرمایا۔ یہاں استقامت کا حکم نبی ﷺ اور ان تمام لوگوں کو ہے جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ساتھ اہل ایمان میں داخل ہوئے، مگر سب کو کس چیز پر استقامت کا حکم ہے، صرف اس پر جسے " كَمَاۤ اُمِرْتَ " کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی صرف اس پر جس کا حکم نبی ﷺ کو دیا گیا ہے، کیونکہ اللہ کی طرف سے امر صرف نبی ﷺ کو ہوا ہے، آپ کے سوا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر امت کے آخری شخص تک ایک بھی شخص ایسا نہیں جو مامور من اللہ ہو اور جسے وحی کے ذریعے سے حکم ملتا ہو۔ آپ ﷺ کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کی رائے اللہ کا حکم یا دین ہو، جس پر امت کو قائم رہنے کا حکم ہو۔ اس سے تمام تقلیدی گروہوں کا استقامت سے ہٹ جانا ثابت ہوا۔ نجات چاہتے ہیں تو تمام لوگوں کی رائے، قیاس اور تقلیدی گروہ بندی چھوڑ کر صرف کتاب و سنت کو لازم پکڑنا ہو گا۔

③ استقامت (اللہ کے حکم پر پوری طرح قائم رہنا) ایک نہایت جامع لفظ ہے، جس میں پوری شریعت آ جاتی ہے۔ عقائد میں اللہ کی صفات پر اس طرح ایمان جس طرح اس نے حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نہ کسی صفت کا انکار کرنا (تعطیل)، نہ اسے مخلوق کی صفات جیسا سمجھنا (تشبیہ) بلکہ جیسا اللہ کی شان کے لائق ہے۔ اعمال میں نہ کسی حکم پر عمل چھوڑنا (نافرمانی) اور نہ آپ ﷺ سے آگے بڑھنا یا آپ سے الگ راستہ نکالنا (رہبانیت اور بدعت)۔ اخلاق میں، مثلاً نہ بخل کرنا نہ بے جا خرچ کرنا۔ غرض ہر چیز میں عین نبی ﷺ کا صحیح راستہ معلوم کر کے اس پر قدم بہ قدم چلنا استقامت ہے۔ سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ

وَ لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ

اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تمھیں آگ آ لپٹے گی اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی

کہتے ہیں کہ میں نے کہا، یا رسول اللہ! آپ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتلائیں کہ آپ کے بعد مجھے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے؟ فرمایا: « قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ » [ مسلم، الإیمان، باب جامع أوصاف الإسلام : ۳۸ ] ''کہو میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر خوب ثابت قدم رہ۔'' استقامت کے اجر اور فضیلت کے لیے دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۳۰) اور احقاف (۱۳)۔

④ وَلَا تَطْغَوْا : '' طَغٰی یَطْغٰی طُغْیَانًا '' حد سے بڑھنا، یعنی شریعت کی اطاعت کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جو حدیں مقرر کر دی ہیں اپنے آپ کو انھی کے اندر رکھو، ان سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ زندگی کے کسی معاملے میں بھی ان سے تجاوز حرام ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین آدمی نبی ﷺ کی بیویوں کے گھروں کی طرف آئے۔ وہ نبی ﷺ کی عبادت کے بارے میں پوچھ رہے تھے، جب انھیں بتایا گیا تو گویا انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے: « وَأَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ؟ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَأَخَّرَ، قَالَ أَحَدُهُمْ أَمَّا أَنَا فَإِنِّيْ أُصَلِّي اللَّیْلَ أَبَدًا ، وَ قَالَ آخَرُ أَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ وَ لَا أُفْطِرُ، وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ إِلَیْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَ کَذَا؟ أَمَا وَاللّٰهِ ! إِنِّيْ لَأَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَ أَتْقَاکُمْ لَهُ لٰکِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ، وَ أُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ، وَ أَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَیْسَ مِنِّيْ » [ بخاری، النکاح، باب الترغیب في النکاح : ۵۰۶۳ ] ''ہماری رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے پہلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا: ''میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔'' دوسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔'' تیسرے نے کہا: ''میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا۔'' جب رسول اللہ ﷺ آئے تو آپ نے فرمایا: ''تم لوگوں نے اس اس طرح کہا ہے؟ یاد رکھو، اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ کی خشیت رکھنے والا اور تم سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہوں، لیکن میں تو روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو شخص میری سنت (میرے طریقے) سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔'' رہے روزانہ ایک ہزار رکعتیں پڑھنے والے، چالیس سال تک عشاء اور فجر ایک وضو سے پڑھنے والے، بارہ سال بھوکے جنگل میں عبادت کرنے والے حضرات، تو یا تو صاف ان پر جھوٹ باندھا گیا ہے، کیونکہ یہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں، یا پھر وہ اسی طغیانی کا شکار تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

⑤ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ : یعنی استقامت اختیار کرو یا طغیانی، اللہ تعالیٰ تمھارا عمل سب دیکھ رہا ہے۔

**آیت 113** ① وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا : '' رَکَنَ '' (ن، ع، ف) مائل ہونا۔ ① ''اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا'' اور ''اَلظّٰلِمِیْنَ'' میں فرق ہے۔ ''اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا'' وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، خواہ کبھی کبھار کیا ہو اور ''اَلظّٰلِمِیْنَ'' ظلم کرنے والے، جن کی روش ہی یہ ہے۔ جب پہلی قسم کے لوگوں کی طرف مائل ہونے سے منع فرمایا تو دوسری قسم کی طرف مائل ہونے کا آپ خود

ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

دوست نہیں ہوں گے، پھر تمھیں مدد نہ دی جائے گی ﴿۱۱۳﴾

اندازہ کر لیں۔ ② جب ان کی طرف مائل ہونا منع ہے جنھوں نے ظلم کیا تو خود کسی پر ظلم کرنا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کس قدر قبیح ہوگا۔ حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (( يَا عِبَادِيْ ! إِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ وَ جَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالَمُوْا )) [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم : ۲۵۷۷، عن أبي ذر رضی اللہ عنہ ] ''اے میرے بندو! میں نے کسی پر ظلم کرنا خود اپنے آپ پر حرام کر رکھا ہے اور اسے تمھارے درمیان بھی حرام کر دیا، سو تم ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ )) [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم : ۲۵۷۸، عن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما ] ''ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن کئی اندھیرے ہوگا۔'' ③ ظلم میں شرک اور دوسرے تمام ظلم شامل ہیں، یعنی جو لوگ ظلم کی طرف مائل ہوں ان سے کوئی دوستی اور محبت نہ رکھو، چاہے وہ کافر ہوں یا نام کے مسلمان۔ (شوکانی) ④ ان کی طرف مائل ہونے میں ان کے ساتھ محبت، ان کے ساتھ مجلس آرائی، ان کے پاس بیٹھنا، انھیں ملنے کے لیے جانا، ان کے ظلم پر چپ رہنا، ان کے کاموں پر خوش ہونا، ان جیسا بننا، ان کا فیشن اختیار کرنا، ان کا ذکر عزت اور تعظیم کے ساتھ کرنا، سب کچھ شامل ہے۔ "رُكُوْنٌ" (مائل ہونے) کا کم از کم مرتبہ پاس رہ کر چپ رہنا اور آخری مرتبہ ظلم پر ان کی حوصلہ افزائی اور مدد ہے۔

② فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ...... : "لَا تَرْكَنُوْٓا" نہی کے جواب میں فاء نے "تَمَسَّ" مضارع کو نصب دیا ہے۔ اس آیت سے ظالم حکمرانوں، سرداروں اور چودھریوں سے ربط و تعلق کی ممانعت نکلتی ہے۔ ہاں ان کے شر سے بچنے کے لیے یا مصلحت عامہ یا دعوت دین یا دینی ضرورت کے تقاضے کے پیش نظر ان سے میل جول رکھے تو اس کی اجازت ہے، بشرطیکہ دل میں ان کے ظلم کی وجہ سے نفرت رکھے، جیسا کہ سورۂ آل عمران (۲۸) اور بعض احادیث میں آیا ہے۔ غرض ظلم کرنے والوں سے دلی محبت یا میلان کسی صورت جائز نہیں، البتہ مجبوری کی وجہ سے ان کے پاس جانا، نصیحت کرنا، ان کے ظلم پر مجبوراً خاموش رہنا یا دین کی مصلحت اور حق کی دعوت و تاکید کے لیے ربط و تعلق رکھنا الگ بات ہے۔

③ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ: اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حاکم اگر ظالم اور بدکار ہو تو اس کی اطاعت اسی وقت ہے جب وہ ظلم یا شریعت کی نافرمانی کا حکم نہ دے۔ اگر وہ شریعت کے خلاف حکم دے تو اس کی اطاعت جائز نہیں، الا یہ کہ اس کے ضرر سے بچنے کے لیے بظاہر اطاعت کا اظہار کرے اور دل میں برا سمجھے، جیسا کہ اوپر سورۂ آل عمران کے حوالے سے گزرا۔ حاکم کی اطاعت اس وقت فرض ہے: ① جب وہ مسلمان ہو۔ دیکھیے سورۂ نساء (۵۹)۔ ② مسلمانوں میں اقامت صلوٰۃ جاری رکھے۔ دیکھیے مسلم (۱۸۵۵)۔ ③ اس سے کھلم کھلا کفر کا ظہور نہ ہو۔ دیکھیے بخاری (۷۰۵۶)۔ ④ اور وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دے۔ دیکھیے بخاری (۷۱۴۴)۔ "وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ" سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ظالم حکمرانوں کی حمایت اور ان کی طرف میلان کا نتیجہ آخرت کے عذاب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ولایت (دوستی و حمایت) اور اس کی نصرت (مدد) سے محرومی بھی ہے۔ آج یہ حقیقت ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ یاد کرنے والوں کے لیے یاد دہانی ہے ﴿۱۱۴﴾

آیت 114 ① اس آیت اور اس کے بعد والی آیات میں استقامت کا اور طغیانی اور ظالموں کی طرف میلان سے اجتناب کا طریقہ بتایا ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق جو نماز سے حاصل ہوتا ہے اور صبر کرنا اور برائی اور فساد فی الارض سے منع کرتے رہنا۔

② وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ : اقامت کا معنی سیدھا کرنا، مراد نماز کو اس کے اوقات پر سنت کے مطابق پورے ارکان اور خشوع و اخلاص کے ساتھ ادا کرنا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (( صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ )) [ بخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا ...... : ٦٣١ ] ”نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے دیکھا ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں۔“ قرطبی نے فرمایا کہ مفسرین میں سے کسی کا اختلاف نہیں کہ یہاں اس سے مراد فرض نماز ہے۔

③ ایمان کے بعد سب سے زیادہ زور اقامتِ صلاۃ پر دیا گیا ہے اور اسے کفر و ایمان کے درمیان فرق قرار دیا گیا ہے، کیونکہ روزانہ پانچ دفعہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے حاضری میں ارکانِ اسلام کا کچھ نہ کچھ حصہ آ جاتا ہے۔ کلمۂ اسلام تشہد میں موجود ہے، پوری نماز کے دوران میں کھانے پینے سے بلکہ دنیا کے ہر کام سے پرہیز روزے کا عکس ہے، اپنے کاروبار کو چھوڑ کر آنا اس شخص کے بس کی بات نہیں جو زکوٰۃ نہ دے سکتا ہو اور قبلے کی طرف رخ حج کی یاد دلاتا ہے۔

④ طَرَفَيِ النَّهَارِ : دن کے دو کنارے۔ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک نہار (دن) ہوتا ہے، اس میں تین نمازیں آ جاتی ہیں۔ زوال سے پہلے والے کنارے میں فجر اور زوال کے بعد والے میں ظہر اور عصر۔ ”زُلَفًا“ ”زُلْفَةٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”غُرْفَةٌ“ کی جمع ”غُرَفٌ“ ہے، اس سے مراد دن کے آخری حصے کے قریب کے اوقات ہیں، کیونکہ ”اِزْلَافٌ“ کا معنی قرب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۹۰ ] ”اور جنت متقی لوگوں کے لیے قریب لائی جائے گی۔“ اور فرمایا: ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [ الزمر : ۳ ] ”ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔“ اس سے مراد مغرب اور عشاء ہیں، کیونکہ وہ دن کے قریب ہوتی ہیں۔ اس طرح اس آیت میں پانچوں نمازیں آ جاتی ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر ان آیات کا نزول معراج کے بعد ہوا ہو تو اجمالی طور پر ان میں پانچوں نمازیں آ جاتی ہیں، البتہ چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ آیات معراج میں پانچ نمازیں فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہوں اور ان آیات سے دن کے دونوں کنارے سورج نکلنے سے پہلے (فجر) اور غروب ہونے سے پہلے (عصر) کی نماز ہی فرض ہو اور رات کی گھڑیوں سے مراد تہجد ہو جو پہلے آپ ﷺ پر اور تمام امت پر فرض تھی، پھر اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی، البتہ اس کی تاکید اور فضیلت باقی رہی۔ اصل یہ ہے کہ تفصیلی طور پر نماز پنج گانہ کے اوقات کی تعیین اور تفصیل حدیث ہی سے

وَ اصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾

اور صبر کر کہ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۱۱۵﴾

ملتی ہے اور قرآن مجید پر عمل حدیث کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ منکرین حدیث میں سے پہلے کچھ لوگ قرآن میں تین نمازیں مانتے تھے، پھر دو پر آ گئے، بعد والے ایک پر آ گئے اور پرویز نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے لے کر اب تک متواتر احادیث اور متواتر عمل کے ساتھ آنے والے نماز کے طریقے کا سرے ہی سے انکار کر دیا اور حقیقت یہی ہے کہ صرف قرآن سے نہ نماز کے مکمل اوقات معلوم ہو سکتے ہیں، نہ اس کے ارکان، نہ ارکان کی ترتیب، نہ رکعات کی تعداد اور نہ شروع یا ختم کرنے کا طریقہ، غرض حدیث ترک کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن پر عمل سے جان چھوٹ جائے اور یہی ان بدنصیب لوگوں کی دلی خواہش ہے جو ان شاء اللہ کبھی پوری نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے۔

⑤ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ: پچھلے جملے میں اللہ کے حکم پر استقامت میں اور ظالموں کی طرف میلان سے محفوظ رہنے میں مدد کرنے والی سب سے مضبوط چیز بتائی تھی کہ فلاں فلاں وقت میں نماز قائم کرو، اب اس کی وجہ بتائی۔ عموماً "اِنَّ" تعلیل یعنی وجہ بتانے کے لیے آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نیکی گناہ کو مٹا دیتی ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا » [ مسند أحمد : ۱۵۳/۵، ح : ۲۱۴۱۲۔ ترمذی : ۱۹۸۷۔ صحیح الجامع : ۹۷، وحسنه الألبانی ] "برائی کے بعد ساتھ ہی نیکی کر تو یہ اسے مٹا دے گی۔" نماز بھی ایک ایسی ہی نیکی ہے جس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لیا، پھر (ازراہ ندامت) نبی ﷺ کے پاس آ کر سوال کرنے لگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ﴿ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ﴾ تو اس آدمی نے کہا: "یا رسول اللہ! یہ صرف میرے لیے ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: « لِجَمِيعِ أُمَّتِي كُلِّهِمْ » "یہ میری ساری امت کے لیے ہے۔" [ بخاری، مواقیت الصلوۃ، باب الصلاۃ کفارۃ : ۵۲۶ ]

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح: ① جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں۔ ② اور جو نیکیاں پکڑے اس سے خو برائی کی چھوٹے۔ ③ اور جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے اور گمراہی مٹے، لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہیے، جتنا میل اتنا صابن۔" (موضح) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: « أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهَرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا، مَا تَقُولُ ذٰلِكَ يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ؟ قَالُوْا لَا يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ شَيْئًا، قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا » [ بخاری، مواقیت الصلوۃ، باب الصلوات الخمس کفارۃ : ۵۲۸ ] "اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ دفعہ غسل کرے تو تمھارا کیا کہنا ہے کہ یہ اس کی میل میں سے کچھ باقی چھوڑے گا؟" انھوں نے کہا: "وہ اس کی میل میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑے گا۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "یہی پانچوں نمازوں کی مثال ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔"

**آیت 115** وَ اصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ ......: نماز کے ساتھ دوسری چیز جو استقامت علی الحق میں اور ظلم کی طرف میلان سے

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

پھر ان امتوں میں سے جو تم سے پہلے تھیں، کچھ بچی کھچی بھلائی والے لوگ کیوں نہ ہوئے، جو زمین میں فساد سے منع کرتے، سوائے تھوڑے سے لوگوں کے جنھیں ہم نے ان میں سے نجات دی اور وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، وہ ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جن میں انھیں عیش و آرام دیا گیا تھا اور وہ مجرم تھے ﴿۱۱۶﴾

روکنے میں بے حد مددگار ہے وہ صبر ہے، فرمایا: ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ [ البقرۃ: ۴۵ ] ''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔'' مفردات راغب میں ہے: ''صبر کا معنی کسی کو تنگی میں روک کر رکھنا ہے، کہا جاتا ہے: ''صَبَرْتُ الدَّابَّةَ'' ''میں نے جانور کو چارے کے بغیر باندھ رکھا'' اور ''صَبَرْتُ فُلَانًا'' ''میں نے اس کا ایسا پیچھا کیا جس سے وہ کسی طرح نکل نہ سکے۔'' صبر نفس کو اس چیز پر روک کر اور باندھ کر رکھنا ہے جس کا تقاضا عقل اور شرع کرتی ہیں، یا اس چیز سے باندھ کر اور روک کر رکھنا ہے جس سے روکنے کا عقل اور شرع تقاضا کرتی ہیں۔'' اہل علم عموماً صبر کی تین قسمیں بتاتے ہیں: ① اپنے آپ کو نیکی پر باندھ کر اور ہمیشہ کے لیے اس کا پابند بنا کر رکھنا۔ ② اپنے آپ کو ہمیشہ اللہ کی نافرمانی سے روک کر رکھنا۔ ③ مصیبت پر جزع فزع کے بجائے اللہ کی تقدیر پر راضی رہنے کا پابند بنانا۔ استقامت کے لیے صبر کی ضرورت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیت کی طرح قرآن میں بہت سی جگہوں پر صبر کا ذکر فرمایا، حتیٰ کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ الزمر: ۱۰ ] ''صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔''

**آیت 116** فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ...... : '' لَوْ لَا '' کے دو معانی ہیں، پہلا یہ کہ ''اگر یہ نہ ہوتا'' مثلاً '' لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ '' ''اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے۔'' دوسرا معنی '' هَلَّا '' یعنی ''ایسا کیوں نہ ہوا'' یہ ترغیب کے لیے ہوتا ہے، یعنی ایسا ہونا چاہیے تھا، یہاں یہی معنی مراد ہے۔ '' قَرْنٌ '' ''ایک نسل کے لوگ۔ یہ لفظ عموماً ایک صدی پر بولا جاتا ہے۔ '' اُولُوْا بَقِيَّةٍ '' اچھی عادات و خصائل اور عقل والے لوگ۔ اصل میں '' بَقِيَّةٍ '' ان نفیس اور منتخب چیزوں کو کہا جاتا ہے جنھیں انسان اپنے فائدے کے لیے بچا بچا کر باقی رکھتا ہے، جیسے کہتے ہیں: '' بَقِيَّةُ السَّلَفِ '' یعنی پہلے لوگوں میں سے بہترین آدمی۔

پہلی تمام قوموں کے واقعات کے بعد اب خلاصہ بیان ہو رہا ہے کہ تم سے پہلے ان لوگوں میں ایسے اصحاب خیر کیوں نہ ہوئے جو اہل شر اور اہل فساد کو فساد فی الارض سے روکتے، یعنی ایسے لوگوں کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ پھر فرمایا، ایسے لوگ تھے تو سہی مگر نہایت تھوڑے، جن کی کچھ پیش نہ چلی، چنانچہ جب دوسروں پر عذاب آیا تو ان قلیل لوگوں کو ہم نے عذاب سے بچا لیا۔ اس میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے کہ جب تک ان میں ایسے اصحاب خیر موجود رہیں گے جو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور ایسے اصحاب خیر بالکل تھوڑے اور بے اثر نہیں ہوں گے تو اس وقت تک عذاب نہیں آئے گا۔ پھر پہلوں کی

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ

اور تیرا رب ایسا نہ تھا کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے، اس حال میں کہ اس کے رہنے والے اصلاح کرنے والے ہوں ﴿۱۱۷﴾ اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے ﴿۱۱۸﴾ مگر جس پر تیرا

ہلاکت کا سبب بیان فرمایا کہ وہ ان نعمتوں اور خوش حالیوں میں پڑ کر اپنی خسیس خواہشات کے پیچھے ایسے لگے کہ وہ عذاب کے قابل مجرم بن گئے۔

**آیت 117** وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ...... : یعنی اگر وہ لوگ مجرم ہونے کے بجائے مصلح ہوتے، پھر انھیں عذاب کے ساتھ ہلاک کیا جاتا تو یہ صاف ظلم تھا اور اللہ تعالیٰ کبھی ایسا ظلم نہیں کرتا کہ کسی بستی والے لوگ فساد نہ کریں بلکہ اصلاح کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان پر عذاب بھیج دے، کیونکہ یہ ظلم ہوگا اور اللہ تعالیٰ کسی صورت بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ بعض اہلِ علم نے ظلم سے مراد شرک لے کر یہ معنی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی بستی کو صرف شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا، جب کہ اس کے رہنے والے زمین میں فساد نہ کرتے ہوں، بلکہ آپس کے تعلقات میں اصلاح رکھتے ہوں۔ ہلاک اسی وقت کرتا ہے جب وہ حد سے بڑھ کر زمین میں فساد پھیلانے لگیں، مگر پہلا معنی زیادہ درست ہے۔

**آیت 119،118** ① وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً : یعنی اے میرے رسول! تیری خواہش تو یہ ہے کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں، ایک بھی کافر نہ رہے (دیکھیے شعراء: ۳) اور یہ بات تیرے رب پر کچھ مشکل بھی نہیں، جب اس نے جن وانس کے سوا باقی پوری مخلوق کو اپنی اطاعت کا پابند بنا رکھا ہے تو وہ جن وانس کو بھی ایک ہی امت بنا سکتا تھا کہ کوئی کفر کر ہی نہ سکتا، فرمایا: ﴿ وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ یونس: ۹۹ ] مگر تیرے رب کی حکمت کا تقاضا کچھ اور تھا، اس لیے اس نے کسی کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، سمع و بصر دے کر اور راستہ بتا کر اختیار دے دیا کہ حق و باطل میں سے جو چاہو اختیار کرو۔ اس لیے یہ سب لوگ کبھی ایمان پر متفق نہیں ہو سکتے، بلکہ ان میں ہمیشہ اختلاف رہے گا، کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی فرماں بردار کوئی نافرمان، فرمایا: ﴿ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ﴾ ''اور اس نے انھیں اسی (آزمائش کے) لیے پیدا فرمایا ہے۔'' مائدہ میں ہے: ﴿ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ﴾ [ المائدۃ: ۴۸ ] ''اور لیکن تاکہ وہ تمھیں اس میں آزمائے جو اس نے تمھیں دیا ہے۔'' اور یہ بات اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی طے کر دی ہے کہ میں جہنم کو اس آزمائش میں ناکام ہونے والے جن وانس سے بھروں گا اور اس بات کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں کہ آزمائش میں کامیاب ہونے والوں کو اپنی جنت سے نوازوں گا۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

رب رحم کرے اور اس نے انھیں اسی لیے پیدا کیا اور تیرے رب کی بات پوری ہو گئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا ﴿۱۱۹﴾ اور ہم رسولوں کی خبروں میں سے ہر وہ چیز تجھ سے بیان کرتے ہیں جس کے ساتھ ہم تیرے دل کو ثابت رکھتے ہیں اور تیرے پاس ان میں حق اور مومنوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی آئی ہے ﴿۱۲۰﴾

② وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ: معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو فرمایا: « أَلَا إِنَّ مَنْ قَبْلَكُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوْا عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَ سَبْعِيْنَ مِلَّةً، وَإِنَّ هٰذِهِ الْمِلَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَ سَبْعِيْنَ، ثِنْتَانِ وَ سَبْعُوْنَ فِي النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَ هِيَ الْجَمَاعَةُ » زَادَ ابْنُ يَحْيٰى وَعَمْرٌو فِيْ حَدِيْثِهِمَا: « وَ إِنَّهُ سَيَخْرُجُ فِيْ أُمَّتِيْ أَقْوَامٌ تَجَارٰى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلَبُ لِصَاحِبِهِ، وَقَالَ عَمْرٌو: الْكَلَبُ بِصَاحِبِهِ لَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَ لَا مَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ » [ أبو داوٗد، السنة، باب شرح السنة: ۴۵۹۷۔ السلسلة الصحيحة: ۴۰۴/۱، ح ۲۰۴ ] ''یاد رکھو! تم سے پہلے اہل کتاب بہتر (۷۲) ملتوں میں جدا جدا ہو گئے اور یہ ملت تہتر (۷۳) میں جدا جدا ہو جائے گی۔ بہتر (۷۲) آگ میں اور ایک جنت میں ہو گا اور وہ ''الجماعۃ'' ہے۔'' ابن یحییٰ اور عمرو نے اپنی روایتوں میں مزید کہا: ''میری امت میں ایسی قومیں نکلیں گی جن میں یہ خواہشات و بدعات اس طرح رگ رگ میں جاری ہو جائیں گی جیسے باؤلے پن کی بیماری، اس بیماری کے مریض کے رگ و ریشے میں جاری ہو جاتی ہے۔''

③ اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ کسی امت کا اتفاق اور اجتماع رحمت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگ ہمیشہ مختلف رہیں گے مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور صاف ظاہر ہے کہ امتِ مسلمہ صرف اسی چیز پر جمع ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی اور وہ کتاب و سنت ہے۔ یہی طریق مستقیم ہے اور اسی پر چلنے والے ''الجماعۃ'' ہیں، باقی سب فرقے بعد میں اس سیدھے راستے سے ہٹنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

④ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عام لوگوں میں مشہور روایت '' اِخْتِلَافُ أُمَّتِيْ رَحْمَةٌ '' یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صاف جھوٹ ہے۔ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے اسے موضوع ثابت کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات یہ بھی لکھی کہ اگر اسے صحیح مانا جائے تو پھر امت کا اتفاق زحمت ہو گا، کیونکہ اختلاف رحمت ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر اپنے رحم کا ذکر کیا ہے جو اختلاف کرنے والے نہیں ہوں گے۔ اس لیے سب فرقے چھوڑ کر کتاب و سنت کو مضبوطی سے تھام لینا ہی راہ نجات ہے۔

وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۙ﴿۱۲۱﴾ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع ۱۰

اور ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے، کہہ دے تم اپنی جگہ عمل کرو، یقیناً ہم (بھی) عمل کرنے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾ اور انتظار کرو، یقیناً ہم (بھی) انتظار کرنے والے ہیں ﴿۱۲۲﴾ اور اللہ ہی کے پاس آسمانوں اور زمین کا غیب ہے اور سب کے سب کام اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر اور تیرا رب اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۲۳﴾

**آیت 122** وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ: یعنی تم بھی اللہ کے حکم کی راہ دیکھتے رہو ہم بھی راہ دیکھ رہے ہیں، یا تم ہمارے انجام کی راہ دیکھتے رہو، ہم تمھارے انجام کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

**آیت 122** وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ: سب کو اسی کے پاس جانا ہے، پھر وہی ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔

سُورَةُ یُوسُف ۱۲ مکیۃ ۵۳ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — ایاتھا ۱۱۱ رکوعاتھا ۱۲

الٓرٰ ۟ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۟﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓرٰ۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ﴿۱﴾

یہ سورت مکی ہے، مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمانوں پر جس طرح اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، آپ اس سے نہایت غم زدہ رہتے تھے۔ بعض اوقات اللہ کے حکم سے انھیں یہ بھی فرماتے کہ تم اگر میری بات نہیں مانتے تو تمھاری مرضی مگر اس قرابت کا تو خیال رکھو جو میرے اور تمھارے درمیان ہے، فرمایا: ﴿قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی﴾ [ الشوریٰ : ۲۳ ] ''کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر رشتہ داری کی وجہ سے دوستی۔'' ایسے ہی کسی موقع پر سورۂ یوسف نازل ہوئی جس میں آپ ﷺ کے لیے تسلی کا بے حد سامان موجود ہے کہ دشمن خواہ جس حد تک چلا جائے، اپنے بھائی اور عزیز حسد میں انصاف اور انسانیت کی تمام حدیں پار کر جائیں، پھر بھی ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، اس لیے آپ بے فکر رہیں۔ اس سورت میں کمال درجے کا غم، پھر اسی درجے یا اس سے بڑھ کر خوشی، انتہائی درجے کی بے بسی اور پھر کمال درجے کا اقتدار۔ نابینا کر دینے والی جدائی اور آنکھیں روشن کر دینے والی ملاقات کی خوش خبری، انتہائی درجے کی ہوس اور دعوت گناہ اور اس کے مقابلے میں حد درجے کی پاک دامنی، بے انتہا ظلم اور کمال درجے کی معافی، غرض عجیب وغریب واقعات اور مضامین ہیں جو غمگین بھی کرتے ہیں اور خوش بھی۔ اہل علم فرماتے ہیں اور تجربے سے بھی ثابت ہے کہ اس سورت کو اس کے معانی کا خیال کر کے پڑھنے والا غمگین اور ناامید شخص بھی خوش ہو جاتا ہے اور اللہ کی رحمت کی امید کا چراغ اس کے دل میں روشن ہو جاتا ہے۔ امیر المومنین عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما اکثر صبح کی نماز میں سورۂ یوسف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن شداد کہتے ہیں، میں نے عمر رضی اللہ عنہ کی ہچکیوں کے ساتھ رونے کی آواز سنی جب کہ میں صفوں کے آخر میں تھا، وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿اِنَّمَاۤ اَشۡكُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ [ یوسف : ۸۶ ] ''(یعقوب علیہ السلام نے کہا) میں تو اپنی ظاہر ہونے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں۔'' [ بخاری، قبل الحدیث: ۷۱٦ ]

اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے دل کی تسلی کا بہت سا سامان موجود ہے کہ جس طرح کنویں میں پھینکنے والے بھائی یوسف علیہ السلام کے تقویٰ اور صبر کے نتیجے میں اللہ غالب کے نظر نہ آنے والے اسباب کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دن ان کے سامنے جھک کر معافی کے خواستگار ہوئے، آپ ﷺ کے یہ اعزہ و اقارب بھی اسی طرح ایک دن آپ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہوں گے اور صاف لفظوں میں آپ کی برتری تسلیم کریں گے، فرمایا: ﴿قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیۡنَا وَ اِنۡ كُنَّا لَخٰطِـِٕیۡنَ﴾ [ یوسف : ۹۱ ] ''انھوں نے (یوسف علیہ السلام سے) کہا، اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت بخشی ہے اور بلاشبہ ہم واقعی خطا کار تھے۔''

**آیت 1** الٓرٰ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ: ''الٓرٰ'' کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔ ''الۡمُبِیۡنِ'' ''اَبَانَ یُبِیۡنُ'' باب

﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝۲ ﴾

بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو ۝۲

افعال سے اسم فاعل ہے، لازم بھی آتا ہے، جیسے: ﴿ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴾ [ البقرۃ : ۱۶۸ ] ''بے شک وہ تمھارا کھلا (واضح) دشمن ہے۔'' متعدی بھی، یعنی بیان کرنے والا، واضح کرنے والا۔ ''الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ'' یعنی جس کا انداز بیان واضح اور ہر ایک کی سمجھ میں آنے والا ہے، یا جس کا اللہ کا کلام ہونا بالکل عیاں اور ہر شک و شبہ سے بالا ہے۔

آیت 2 ① اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا ...... ''اَنْزَلْنٰهُ'' میں ''ہٗ'' ضمیر ''الْکِتٰبِ'' کی طرف جا رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف اہل عرب کے لیے ہے، دوسروں کے لیے نازل نہیں کی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے جو کتاب اتاری جائے گی وہ کسی ایک ہی انسانی زبان میں ہوگی اور فطری طریقہ یہ ہے کہ یا تو اس کتاب کی زبان سیکھی جائے یا اس کا دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے، چنانچہ یہی طریقہ قرآن کے بارے میں ملحوظ رکھا گیا۔ اس لیے عربوں سے، جو اس کے اولین مخاطب ہیں، کہا جا رہا ہے کہ ہم نے یہ کتاب تمھاری اپنی زبان میں نازل کی ہے، کسی اور زبان میں نہیں اتاری کہ تم اسے ٹھیک طرح سے سمجھ نہ سکنے کا عذر پیش کر سکو۔ یہ کتاب عربی قرآن ہے، قرآن کا معنی پڑھنا ہے، بمعنی اسم مفعول، یعنی یہ ایسی کتاب ہے جو اتنی پڑھی جانے والی ہے کہ سراسر اس کا وجود ہی پڑھا جانا ہے۔ اس میں عقل والوں کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے۔

② ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴾ اس لیے کہ لغت عرب تمام زبانوں سے زیادہ فصیح، سب سے واضح اور وسیع ہے، انسانی نفس میں آنے والے احساسات و جذبات اور مضامین و معانی کو سب سے زیادہ اور بہتر ادا کرنے والی ہے، اس لیے یہ تمام کتابوں سے اشرف (زیادہ بلندی اور شرف رکھنے والی) کتاب ہے۔ یہ کتاب تمام زبانوں سے زیادہ باشرف زبان میں، تمام رسولوں سے زیادہ شرف رکھنے والے رسول پر، تمام فرشتوں سے زیادہ شرف رکھنے والے فرشتے کی سفارت کے ذریعے سے اتری اور زمین کے تمام قطعوں اور علاقوں سے زیادہ باشرف علاقے مکہ میں، سال کے سب سے باشرف مہینے رمضان اور اس کے سب سے باشرف وقت لیلۃ القدر میں اتری۔ سو اس کا باشرف ہونا اور سب کتابوں سے اشرف ہونا ہر لحاظ سے کامل ہے۔'' مختصر سی تفصیل اس کی یہ ہے کہ کئی زبانوں کے حروف تہجی پچاس (۵۰) سے لے کر اسی (۸۰) تک ہیں، جب کہ عربی زبان کے حروف تہجی کل انتیس (۲۹) ہیں، جنھیں سیکھنا آسان ہے۔ سیکھنے میں نہایت آسان ہونے کے باوجود اپنا مقصد اور دل کی بات ادا کرنے کے لیے اس زبان کی وسعت دنیا کی ہر زبان سے زیادہ ہے، مثلاً اکثر زبانوں میں فعل کے صیغوں میں فاعل مذکر یا مؤنث کے لیے الگ الگ الفاظ نہیں ہیں، مثلاً وہ گیا، وہ گئی، دونوں کے لیے فارسی میں ''رفت'' اور انگریزی میں ''went'' ہے۔ ان زبانوں میں مذکر و مؤنث کی وضاحت کے لیے الگ الفاظ لانا پڑیں گے، نہ ہی ان زبانوں میں تثنیہ اور جمع کی وضاحت فعل کے لفظ سے ہوتی ہے، اس کے لیے بھی الگ

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖۗ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۳

ہم تجھے سب سے اچھا بیان سناتے ہیں، اس واسطے سے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن وحی کیا ہے اور بے شک تو اس سے پہلے یقیناً بے خبروں سے تھا۝۳

الفاظ کی ضرورت ہے۔ غرض عربی زبان کی خوبیاں ایک مستقل مضمون ہے جس پر اہل علم کی کتابیں موجود ہیں۔

عرب قوم پہاڑوں اور صحراؤں میں رہنے اور ہر وقت تقریباً حالت سفر میں رہنے کی وجہ سے نہایت جفاکش اور خود دار قوم تھی اور وہ ہمیشہ غیروں کی غلامی سے آزاد رہی تھی، اگرچہ ان میں بے شمار خرابیاں اور گمراہیاں موجود تھیں، مثلاً بت پرستی، شرک، ظلم و ستم، باہمی لڑائی، چوری، ڈاکے، جوا، شراب نوشی اور زنا وغیرہ، ان میں عام تھے، اس کے باوجود وہ بہت سی خوبیوں کی حامل بھی تھی، مثلاً غیرت، قبائلی زندگی کی وجہ سے حمیت اور دفاع کا جذبہ، کسی صورت غلامی قبول نہ کرنا، ایفائے عہد، سخاوت، صدق، ان پڑھ ہونے کی وجہ سے کمال درجے کا حافظہ۔ غرض وہ قوم بہت سی خوبیوں کی بھی حامل تھی، اپنی زبان کی خوبی، وسعت اور حسن ادا کی وجہ سے اپنے آپ کو عرب (اپنے مطلب کا واضح اظہار کرنے والے) اور دوسری تمام اقوام کو عجم (گونگے) قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار مصلحتوں کے ساتھ ساتھ ان خوبیوں کی بنا پر بھی تمام اقوام عالم تک اپنا دین پہنچانے کے لیے عربوں کا انتخاب فرمایا، کیونکہ آخری نبی کا قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ قرآن مجید اپنی دوسری بے شمار خوبیوں کے ساتھ ادائے مطلب کے حسن میں بھی لاجواب تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے عربی زبان میں اتارا اور چیلنج کر دیا کہ اس جیسی کتاب لاؤ، پھر دس سورتیں لانے کا اور آخر میں صرف تین آیات کی چھوٹی سی سورت کی مثال پیش کرنے کا چیلنج کیا، جس کا جواب آج تک نہ عرب دے سکے، نہ عجم اور نہ قیامت تک دے سکیں گے۔

**آیت 3** ❶ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ: "اَلْقَصَصِ" "قَصَّ يَقُصُّ" کا مصدر ہے، قصہ کی جمع نہیں۔ (دیکھیے جواب اہل العلم، ص: ۱ تا ۴۰) قصہ کی جمع قصص قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ فرمایا: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ﴾ ''ہم بیان کرتے ہیں'' اللہ تعالیٰ جہاں اپنے لیے جمع کا صیغہ لاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام ایک الگ صفت کا تقاضا کرتا ہے، مثلاً بیان کرنا صفت کلام کا تقاضا کرتا ہے، زمین و آسمان بنانا صفت خلق کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ہے ہی نہیں جس میں تمام صفات کمال موجود ہوں اور وہ اپنے آپ کو ''ہم'' کہنے کا صحیح حق رکھتا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنی اس حیثیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے لیے ''ہم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور جہاں وہ واحد کا لفظ استعمال کریں، مثلاً: ﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا﴾ [طٰہٰ: ۱۴] وہ اپنی توحید کے اظہار کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ اسی کی ذات واحد، احد، لاشریک لہ ہے۔ اس سورت میں چونکہ اللہ کے اپنی مرضی کے ہر کام پر غالب ہونے کا اظہار کرنے والی بہت سی صفات مذکور ہیں، اس لیے "نَحْنُ" (ہم) سے بات شروع کی ہے۔

اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوۡكَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ﴿۴﴾

جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! بے شک میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کرنے والے ہیں ﴿۴﴾

② بِمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ : یعنی یہ قرآن وحی کرنے کے ذریعے سے ہم تجھے سب سے اچھا بیان سناتے ہیں۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ سورۂ یوسف قرآن کی تمام سورتوں سے احسن ہے، بلکہ قرآن سارا ہی احسن القصص، یعنی تمام بیانوں سے بہتر بیان ہے، جس میں یہ سورت بھی شامل ہے۔

③ وَ اِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ : یہ "اِنْ" دراصل "اِنَّكَ" تھا، تخفیف کے لیے کاف کو حذف کر دیا اور "اِنَّ" کو "اِنْ" کر دیا۔ اس کی دلیل "لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ" پر آنے والا لام ہے اور یہ عربی کا مسلمہ قاعدہ ہے، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ "اِنْ" اور لام کے ساتھ تاکید اس لیے کی ہے کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ آپ یہ سب کچھ پہلے ہی جانتے تھے، جیسا کہ ہمارے کئی نادان بھائی کہتے ہیں، بلکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهَاۤ اِلَیۡكَ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَ لَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا ﴾ [ ھود : ۴۹ ] "یہ غیب کی خبروں سے ہے جنھیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انھیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔"

④ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ : یعنی آپ کو اس سے پہلے اس کی کچھ خبر نہ تھی، آپ اُمّی تھے، نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ ایسے شخص پر ایسی بے مثال کتاب کا نزول کہ بڑے بڑے باخبر لوگ اس اُمّی کے شاگرد بن جائیں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے اور آپ کے رسول برحق ہونے کی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ عالم الغیب نہ تھے، جتنی وحی ہوتی وہ معلوم ہو جاتا، باقی خبر عالم الغیب کے پاس رہتی، جو کسی کے بتائے بغیر سب کچھ جاننے والا ہے، عالم الغیب کہتے ہی ایسی ہستی کو ہیں اور وہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔

**آیت 4** ① اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡهِ : یوسف علیہ السلام کے باپ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام تھے اور یہ چاروں نبی تھے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا: (( اَلْكَرِیْمُ ابْنُ الْكَرِیْمِ ابْنِ الْكَرِیْمِ ابْنِ الْكَرِیْمِ یُوْسُفُ بْنُ یَعْقُوْبَ بْنِ إِسْحَاقَ بْنِ إِبْرَاهِیْمَ )) [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ و یتم نعمته علیك ...... ﴾ : ۴٦٨٨، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] "کریم بن کریم بن کریم بن کریم، یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔"

② یٰۤاَبَتِ : یہ اصل میں "یَا أَبِیْ" تھا "اے میرے باپ!" یاء حذف کر کے اس کی جگہ تائے تانیث لائی گئی اور باء کا کسرہ اس کی طرف منتقل کر دیا۔ یہ اظہار محبت کا ایک طریقہ ہے، جیسے اردو میں "ابا" کو "ابو" کہہ دیتے ہیں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ

اس نے کہا اے میرے چھوٹے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، ورنہ وہ تیرے لیے تدبیر کریں گے،

آیت 5 ❶ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ...... یعنی اس کی تعبیر ظاہر ہے، سنتے ہی سمجھ لیں گے۔ گیارہ بھائی تھے اور ایک باپ اور ایک ماں، یہ سب ان کی طرف محتاج ہوں گے، پھر شیطان ان کے دل میں حسد ڈالے گا۔ (موضح) اس وقت ان کی عمر کیا تھی، اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمائی۔ معالم میں ہے کہ بارہ سال تھی، کچھ لوگ بائبل کے حوالے سے سترہ سال بیان کرتے ہیں، مگر تعیین کی کوئی پختہ دلیل نہیں۔ اگر کوئی اسرائیلی روایت ہو بھی تو اسے نہ ہم سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔ ویسے سترہ سالہ جوان جو صحرا میں پلا ہو، اس کے متعلق بھیڑیے کے کھا جانے کا خدشہ کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ظاہر ہے کہ اس وقت وہ بچے تھے، مگر سمجھ بوجھ رکھتے تھے: "يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ" (چرے، کھائے پیے اور کھیلے) اور "هٰذَا غُلٰمٌ" (یہ لڑکا ہے) اور "اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا" (یا ہم اسے بیٹا بنا لیں گے) سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اگر عمر بتانے کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور بیان فرما دیتا۔ "یوسف" عربی زبان کا نام نہیں کہ اس کا اشتقاق عربی میں سے تلاش کیا جائے، بلکہ عبرانی یا اس زبان کا نام ہے جو یعقوب علیہ السلام استعمال کرتے تھے۔ اس خواب کی تعبیر کافی عرصہ بعد جا کر پوری ہوئی، بعض چالیس برس بتاتے ہیں، بعض کم و بیش، مگر بچپن سے جوانی کا عرصہ جو عزیز مصر کے گھر گزرا، پھر قید خانے کے سات یا نو سال، پھر خوش حالی کے سات سال، جس کے بعد قحط شروع ہوا اور بھائی مجبور ہو کر آئے اکیس بائیس سال سے کم عرصہ کسی صورت نہیں بنتا، زیادہ ہو تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر ظاہر ہونے میں لمبی مدت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

❷ يٰبُنَيَّ : "بُنَيّ" "اِبْنِي" کی تصغیر ہے، محبت اور شفقت سے فرمایا، اے میرے چھوٹے سے بیٹے، یا اے میرے پیارے بیٹے۔

❸ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا، کیونکہ تعبیر ظاہر تھی اور یعقوب علیہ السلام نے مختصراً بیان بھی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں چنے گا اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے گا۔ قدرتی طور پر جس شخص کو نعمت ملتی ہے اس پر حسد ہوتا ہے اور شیطان بھی انسان کی اس کمزوری، یعنی حسد کو استعمال کر کے بھائیوں کے درمیان اور دوستوں کے درمیان دشمنی پیدا کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ﴾ [ بني إسرائيل : ٥٣ ] "بے شک شیطان ان (میرے بندوں) کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے۔" اور یہ اس کے نزدیک سب سے زیادہ قرب کا ذریعہ ہوتا ہے، جیسا کہ ایک لمبی حدیث میں ہے کہ شیطان اپنے لشکر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بھیجتا ہے: (( ثُمَّ يَجِيْءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ مَا تَرَكْتُهُ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ )) [ مسلم، صفات المنافقين، باب تحريش الشيطان...... : ٦٧ / ٢٨١٣ ] "پھر ان میں سے ایک شیطان آ کر (اپنی کارکردگی بیان کرتے ہوئے) کہتا ہے: "میں نے اس آدمی کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہیں ڈال دی۔" اس لیے بھائیوں کو خواب کا علم ہونے پر یوسف علیہ السلام کو ان کی کسی خفیہ تدبیر سے ڈرایا، ساتھ ہی "اِنَّ" کے ساتھ اس کی وجہ بیان فرمائی کہ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور یہی بات یوسف علیہ السلام

عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾

کوئی بری تدبیر۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ﴿۵﴾

نے اپنے والدین اور بھائیوں کے مصر آنے کے موقع پر کہی تھی: ﴿ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ﴾ [ يوسف : ۱۰۰ ] ''اس کے بعد کہ شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ڈال دیا تھا۔'' قرآن کے بیان کا تقاضا بھی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے والد ماجد کے کہنے کے مطابق وہ خواب بیان نہیں کیا، کیونکہ بھائیوں نے قتل کے مشورے کے وقت بھی خواب کا ذکر نہیں کیا اور یوسف علیہ السلام کے کمال اطاعت کا تقاضا بھی یہی ہے، مگر اسرائیلی روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو وہ خواب سنا دیا تھا اور اس پر کئی کہانیوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس سے اسرائیلی روایات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

﴿4﴾ یہاں یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یعقوب نبی کا فرمان وحی پر مبنی تھا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فرمان ہے: (( اِسْتَعِيْنُوْا عَلٰی إِنْجَاحِ الْحَوَائِجِ بِالْكِتْمَانِ فَإِنَّ كُلَّ ذِيْ نِعْمَةٍ مَحْسُوْدٌ )) [ السلسلة الصحيحة : ۳/ ۴۳۶، ح : ۱۴۵۳ ] ''اپنی حاجتوں کو کامیاب کرنے میں چھپانے سے مدد لو، کیونکہ ہر نعمت والا محسود ہوتا ہے۔'' یعنی اس پر حسد کیا جاتا ہے۔ اس خواب میں بھی اتمام نعمت کی خوش خبری تھی، اسے کامیاب بنانے کے لیے اسے چھپانے کا حکم دیا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ [ الضحٰی : ۱۱ ] ''اور لیکن اپنے رب کی نعمت، پس (اسے) بیان کر۔'' اس حکم کو اور یعقوب علیہ السلام کے منع کرنے کے حکم کو کیسے جمع کریں گے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر ابھی نعمت مکمل ہونا باقی تھی، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نعمت پوری ہو چکی تھی۔ ہمارے لیے بھی دونوں چیزوں میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے، تاکہ نعمت مکمل ہونے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ دوسرا جواب جو کتب تفسیر میں ہے، وہ یہ ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ بعض اوقات نعمت کا اظہار نہ کرنا بلکہ اسے چھپانا جائز ہے، جیسا کہ اوپر سلسلہ صحیحہ کے حوالے سے حدیث گزر چکی ہے، چنانچہ جب نعمت کے ظاہر کرنے سے اپنے خلاف حسد وغیرہ کی بنا پر سازش یا نقصان کا خطرہ ہو تو اسے چھپائے اور اگر یہ خطرہ نہ ہو تو رب تعالیٰ کی نعمت بیان کرے۔

﴿5﴾ اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہوتا ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ، قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ )) [ بخاري، التعبير، باب المبشرات : ۶۹۹۰ ] ''نبوت میں سے مبشرات کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔'' لوگوں نے پوچھا: ''مبشرات (خوش خبریاں) کیا ہیں؟'' فرمایا: ''اچھے خواب۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّ أَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ )) [ بخاري، التعبير، باب رؤيا الصالحين : ۶۹۸۳، عن أنس رضی اللہ عنہ ] ''صالح آدمی کا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔'' ابو سلمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں خواب دیکھا کرتا جو (پریشانی پیدا کر کے) مجھے بیمار کر دیتے، یہاں تک کہ میں نے ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے سنا کہ میں بھی خواب دیکھا کرتا تھا جو مجھے بیمار کر دیتے، یہاں تک کہ میں نے

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۠ ﴿۶﴾

اور اسی طرح تیرا رب تجھے چنے گا اور تجھے باتوں کی اصل حقیقت سمجھنے میں سے کچھ سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوب پر پوری کرے گا، جیسے اس نے اس سے پہلے وہ تیرے دونوں باپ دادا ابراہیم اور اسحاق پر پوری کی۔ بے شک تیرا رب سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ۶

رسول اللہ ﷺ سے سنا: (( اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ اللّٰهِ، فَإِذَا رَأٰى أَحَدُكُمْ مَا يُحِبُّ فَلَا يُحَدِّثْ بِهِ إِلَّا مَنْ يُحِبُّ، وَ إِذَا رَأٰى مَا يَكْرَهُ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهَا، وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَلْيَتْفِلْ ثَلَاثًا وَلَا يُحَدِّثْ بِهَا أَحَدًا فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ )) [ بخاري، التعبير، باب إذا رأى ما يكره ...... : ٧٠٤٤ ] "اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تو جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جو اسے پسند ہو تو وہ اس کے سوا اسے بیان نہ کرے جو محبت رکھتا ہو اور جب ایسا خواب دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس کے شر سے اور شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور تین دفعہ (بائیں طرف) تھوک دے اور وہ کسی کو بیان نہ کرے، تو وہ خواب اسے ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔" ایک روایت میں یہ بھی ہے: (( وَلْيَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِهِ الَّذِيْ كَانَ عَلَيْهِ )) کہ وہ اپنی کروٹ بدل لے۔ [ مسلم، الرؤيا، باب في كون الرؤيا من الله ...... : ٢٢٦٢ ] اور یہ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کو ہر قسم کے ضرر سے سلامتی کا سبب بنا دے، جیسا کہ صدقہ و خیرات مصیبتیں دور کرنے کے سبب بن جاتے ہیں۔

❻ یعقوب علیہ السلام کے اپنے دوسرے بیٹوں کے متعلق خیال کے اظہار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی خاص اس موضوع پر کتاب میں ہے کہ قرآن، لغت اور واقعات کی دلالت یہی ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ نہ ہی قرآن یا حدیث میں ان کی نبوت کی طرف کوئی اشارہ موجود ہے۔ (سید طنطاوی) البتہ بعد میں ان کی اولاد (اسباط) سے کئی انبیاء و رسل گزرے۔

**آیت 6** ❶ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ : "يَجْتَبِيْ" "جَبٰى يَجْبِيْ" (ض) کے باب افتعال "اِجْتِبَاءٌ" کا فعل مضارع ہے، جس کا معنی جمع کرنا، کسی خوبی کی بنا پر چن لینا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کے "اِجْتِبَاءٌ" (چن لینے) سے مراد اسے اپنے ایسے فیض کے ساتھ خاص کر لینا ہے جس سے اس کو اپنی کسی کوشش کے بغیر مختلف قسم کی نعمتیں حاصل ہو جائیں، یہ چیز انبیاء کو حاصل ہوتی ہے یا انھیں جو ان کے قریب ہوں، مثلاً صدیقین، شہداء۔ (مفردات) بے شک اعلیٰ درجے کا اجتباء انبیاء، صدیقین اور شہداء کو حاصل ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے چننے کے بھی کئی درجے ہیں، جیسا کہ آپ اپنے متعلق سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس طرح چنا کہ پتھر یا نباتات یا جانوروں کے بجائے انسان بنایا، پھر کافر نہیں بلکہ مسلمان بنایا، پھر کبیرہ گناہوں سے بچایا، پھر مشرک کلمہ گو کے بجائے موحد اور بدعتی کے بجائے متبع سنت بنایا، اگر علم کتاب کی نعمت بھی حاصل

لَقَدۡ كَانَ فِیۡ یُوۡسُفَ وَ اِخۡوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیۡنَ ۞

بلاشبہ یقیناً یوسف اور اس کے بھائیوں میں سوال کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں تھیں ۞

ہے تو آپ ان لوگوں میں جا ملے جن کے متعلق فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ﴾ [ فاطر : ۳۲ ] ”پھر اس کتاب کے وارث ہم نے وہ لوگ بنائے جنھیں ہم نے چن لیا۔“ اگر دعوت الی اللہ کی توفیق مل گئی تو مزید فیض مل گیا۔ غرض اصطفاء اور اجتباء کے کئی درجے ہیں اور جتنا حصہ مل جائے اس پر اللہ کا بے حد شکر ادا کرنا چاہیے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡلَاۤ اَنۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ ﴾ [ الأعراف : ۴۳ ] ”(جنتی کہیں گے) اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی۔“ یا اللہ! تو اپنے فضل سے ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جو جنت میں داخل ہو کر ان الفاظ میں تیرا شکر ادا کریں گے۔ (آمین)

2 اس آیت میں ”وَ كَذٰلِكَ“ (اور اسی طرح) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھے یہ خواب دکھلایا، اور کسی کو اس طرح کا خواب نہیں دکھایا، اسی طرح تیرا رب تجھے چنے گا اور تجھے...... چننے سے مراد اعلیٰ درجے کا چننا ہے، جیسا کہ اوپر امام راغب سے نقل ہوا، یعنی نبوت و صدیقیت سے نوازے گا اور گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کے سجدہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اعلیٰ مقام پر پہنچا کر تمھیں اپنے عہد کے سب بندوں پر فوقیت بخشے گا۔

3 وَ یُعَلِّمُكَ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ: ”الۡاَحَادِیۡثِ“ ”حَدِیۡثٌ“ کی جمع ہے جس کا معنی بات ہے۔ ”تَاۡوِیۡلِ“ کا معنی بات کا صحیح مطلب سمجھنا اور اس کی تہ تک پہنچنا ہے، کیونکہ ”تَاۡوِیۡلِ“ ”اَوۡلٌ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی لوٹنا ہے اور تاویل کا معنی کسی چیز کو اس کے اصل مقصد کی طرف لوٹانا ہے، یعنی جو اس سے مراد ہے۔ یہاں ”تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ“ سے مراد بات سمجھنے کی تیز بصیرت اور کمال فہم کے ساتھ خوابوں کی تعبیر بھی ہے۔

4 وَ یُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَیۡكَ وَ عَلٰۤی اٰلِ یَعۡقُوۡبَ...... : تم پر اپنی نعمت تمام کرے گا جیسے اس سے پہلے تمھارے (دو باپوں) دادا اور پردادا پر پوری کی، یعنی تمھیں نبوت و رسالت اور حکومت عطا فرمائے گا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”(اَبَوَیۡكَ یعنی تیرے دونوں باپوں پر) ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام کا نام لیا، اپنا نہ لیا عاجزی سے۔“ (موضح) آل یعقوب پر نعمت تمام کرنے کا مطلب وہ تمام نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل پر ہوئیں اور جن کا ذکر تفصیل سے قرآن مجید میں موجود ہے۔

5 اِنَّ رَبَّكَ عَلِیۡمٌ حَكِیۡمٌ : کہ اس کے بندوں میں سے کون سرفرازی کے لائق ہے۔

**آیت 7** 1 لَقَدۡ كَانَ فِیۡ یُوۡسُفَ...... : یہاں سے یوسف علیہ السلام کے قصے کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ ”اٰیٰتٌ“ ”آیَةٌ“ کی جمع ہے۔ یہاں آیات سے مراد وہ عبرتیں، نصیحتیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں جو اس واقعہ میں ذکر ہوئی ہیں، چونکہ وہ بہت سی ہیں اور بہت سے لوگوں سے متعلق ہیں، مثلاً ایک طرف بھائیوں کی نفرت، حسد، بدگمانی، اس زمانے کے لوگوں کے حالات، آزاد لوگوں کو غلام بنالینا، ان کا انداز حکومت، ان کے قوانین، شیطان کا بہکانا، اپنوں کے ظلم، پیاروں سے

جدائی، بے وطنی، غلامی کے صدمے، حسن کی وجہ سے آنے والی آزمائشیں، عزیز کی بیوی کے عشق کی شورش اور طغیانی اور یوسف علیہ السلام کی عفت کا امتحان، پھر قید خانے کی آزمائش ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کا اپنے کام پر غالب ہونے کا مظاہرہ ہے، یوسف علیہ السلام کا تمام دشمنوں، حاسدوں اور مخالفوں کی خواہش کے برعکس اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ کمالات علم و حکمت، اخلاص نیت، حسن عمل اور صبر و تقویٰ کی بدولت جیل اور غلامی سے نکل کر قرب شاہی اور حکومت کے وسیع اختیارات کا حصول ہے۔ جابر و ظالم بھائیوں کی ان کے سامنے بے بسی اور ان سے صدقے کے سوال پر مجبور ہونا ہے۔ پھر اس سارے عرصے میں یوسف علیہ السلام کا ہر زیادتی کرنے والے سے انتقام کے بجائے حسن سلوک، بے مثال صبر اور عفو و درگزر ہے اور آخر میں یوسف علیہ السلام کے خواب گیارہ ستاروں اور سورج و چاند کے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی تعبیر کا ظہور ہے اور اس تمام عظمت و رفعت کے باوجود یوسف علیہ السلام کا آخرت کی فکر میں اللہ تعالیٰ سے اسلام پر موت اور صالحین کے ساتھ ملانے کی دعا ہے۔ غرض ایک ایک بات اپنے اندر بہت سی نشانیاں اور عبرتیں رکھتی ہے۔

❷ لِلسَّآىِٕلِیْنَ : یہ سوال کرنے والے کون تھے، اشرف الحواشی میں ہے: ”منقول ہے کہ قریش نے یہود کے اشارے پر امتحان کی غرض سے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا وطن شام تھا تو بنی اسرائیل مصر میں کیسے آباد ہو گئے، حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کے دور میں فرعون سے نجات حاصل کی؟ اس پر یہ سورت اتری اور فرمایا کہ سوال کرنے والوں کے لیے اس قصہ میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ انھوں نے ایک بھائی پر حسد کیا تو آخر کار اسی کے محتاج ہوئے، اسی طرح یہود حسد کر رہے ہیں اور قریش نے آپ ﷺ کو نکالا تو آخر کار آپ ہی کا عروج ہوا۔ (موضح) مگر یہ روایات اسرائیلی ہیں (اور مکہ میں یہود تھے بھی نہیں، نہ اہلِ مکہ کا ان سے خاص رابطہ تھا) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایسی کسی روایت کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کے بالمقابل دوسری ایک دو روایات بحوالہ ابن جریر بیان کی ہیں کہ صحابہ کے سوال پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول یہ روایت بھی منقطع ہے، کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرنے والے راوی عمرو بن قیس نے انھیں پایا ہی نہیں۔ دیکھیے الاستیعاب فی بیان الاسباب) بہرحال اگر اسرائیلی روایات کو معتبر مان لیا جائے تو نشانیوں سے مراد آپ ﷺ کی نبوت کی نشانیاں ہیں اور پوچھنے والوں سے مراد یہودی یا کفار مکہ ہیں اور اگر ان کا اعتبار نہ کیا جائے تو آیات سے مراد وہ عبرتیں ہیں جو یوسف علیہ السلام کے قصے میں پائی جاتی ہیں اور پوچھنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ صاحب معالم نے ان عبرتوں کو خوب تفصیل سے لکھا ہے۔“ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ اہلِ عرب کی بلاغت کا یہ ایک اسلوب ہے کہ وہ متوجہ کرنے کے لیے سائل کا ذکر کرتے ہیں۔ مراد اس بات کو سننے کا شوق دلانا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا:
﴿ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۱۰ ] ”اور اس نے اس میں اس کے اوپر سے گڑے ہوئے پہاڑ بنائے اور اس میں بہت برکت رکھی اور اس میں اس کی غذائیں اندازے کے ساتھ رکھیں، چار دن میں، اس حال میں کہ سوال کرنے والوں کے لیے برابر (جواب) ہے۔“ اور جیسا کہ سموئل نے کہا ؎

سَلِیْ اِنْ جَهِلْتِ النَّاسَ عَنَّا وَ عَنْهُمْ فَلَیْسَ سَوَاءٌ عَالِمٌ وَ جَهُوْلُ

اِذۡ قَالُوۡا لَيُوۡسُفُ وَ اَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيۡنَا مِنَّا وَ نَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنِۚ ۖ ۚ﴿۸﴾

جب انھوں نے کہا یقیناً یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے ہاں ہم سے زیادہ پیارے ہیں، حالانکہ ہم ایک قوی جماعت ہیں۔ بے شک ہمارا باپ یقیناً کھلی غلطی میں ہے ﴿۸﴾

''اے مخاطب! اگر تجھے معلوم نہیں تو لوگوں سے ہمارے اور ان کے متعلق سوال کر لے، کیونکہ جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر نہیں ہوتے۔''

اور انیف بن زبان نے کہا ہے ؎

فَلَمَّا الْتَقَيْنَا بَيَّنَ السَّيْفُ بَيْنَنَا     لِسَائِلَةٍ عَنَّا حَفِيٍّ سُؤَالُهَا

''تو جب ہم آپس میں مقابل ہوئے تو تلوار نے ہمارے درمیان واضح فیصلہ کر دیا، اس سوال کرنے والی کے لیے جس کا سوال بہت اصرار کے ساتھ تھا۔''

عرب شاعر عموماً سوال کرنے والی عورتوں کا ذکر کرتے ہیں، یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے یہ انداز بدل کر سوال کرنے والیوں کے بجائے مردوں کو سوال کرنے والے قرار دے کر جواب دیا۔ (التحریر والتنویر)

**آیت 8** ① اِذۡ قَالُوۡا لَيُوۡسُفُ وَ اَخُوۡهُ...... : یعنی انھوں نے آپس میں کہا۔ دراصل انھوں نے اپنے ظلم کے جواز کے لیے یوسف علیہ السلام کا یہ جرم تجویز کیا، ورنہ اگر یہ جرم تھا تو والد کا تھا جو انھوں نے والد کو بھی معاف نہیں کیا، اس کا ذکر آگے آ رہا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں کہیں اشارہ بھی نہیں کہ اس میں یعقوب علیہ السلام کی کوئی غلطی تھی، اگر یہ غلطی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یعقوب علیہ السلام کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا، کیونکہ وہ نبی تھے۔ بعض مفسرین نے بھی یہ لکھ دیا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ کو بیٹوں کے درمیان محبت میں بھی برابری رکھنی چاہیے، حالانکہ نہ ان حضرات نے خیال فرمایا، نہ برادران یوسف نے کہ والدین کے بعض اولاد کی طرف میلان کے کیا مراتب و اسباب ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ چھوٹے بچے والدین کی شفقت اور محبت زیادہ حاصل کرتے ہیں، جو یوسف علیہ السلام کے بڑے بھائیوں میں سے ہر ایک اپنی اس عمر میں حاصل کر چکا تھا، پھر اولاد کی طبیعت کی سرکشی اور اطاعت ماں باپ کی محبت کھینچنے میں فرق کا باعث بن جاتی ہے۔ اسی طرح بیمار بچے اور پردیس میں رہنے والے بچے کی طرف والدین کی توجہ زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ اس قدیم عرب نے کہا تھا جس سے پوچھا گیا کہ تمھیں اپنے بیٹوں میں سب سے پیارا کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ''چھوٹا، یہاں تک کہ بڑا ہو، غائب یہاں تک کہ آ جائے اور بیمار یہاں تک کہ تندرست ہو جائے۔'' (شعراوی) اس لیے شریعت نے اولاد کے درمیان عطیے میں برابری اور بیویوں کے درمیان عدل کا حکم دیا ہے، دلی میلان اور محبت نہ بندے کے اختیار میں ہے اور نہ اس کے کم و بیش ہونے میں ماں باپ کا کوئی جرم ہے، نہ اولاد کا۔ یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کا جرم بھی یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چھوٹے بھائی کا نام بتایا نہ بڑوں کا، کیونکہ یہ بات قرآن کے مقصود سے خاص تعلق نہیں رکھتی۔ اب اگر ہم اہل کتاب سے سن کر چھوٹے کا نام

اقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا یَّخۡلُ لَکُمۡ وَجۡہُ اَبِیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ ﴿۹﴾

یوسف کو قتل کر دو، یا اسے کسی زمین میں پھینک دو، تمھارے باپ کا چہرہ تمھارے لیے اکیلا رہ جائے گا اور اس کے بعد تم نیک لوگ بن جانا ﴿۹﴾

بنیامین لکھیں یا بڑوں کا نام لکھیں تو جس بات کو ہم رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق سچا یا جھوٹا نہیں کہہ سکتے، اس کا علم سے کیا تعلق ہے اور اس کا اعتبار ہی کیا ہے؟ علم یقین کا نام ہے، شک کا نہیں۔

② وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ : یہ جملہ حالیہ ہے۔ لفظ "عُصۡبَةٌ" ایک قوی جماعت پر بولا جاتا ہے، جو عموماً دس سے لے کر چالیس پر مشتمل ہوں۔ یہ "عَصۡبٌ" سے مشتق ہے جو بمعنی "شَدٌّ" (باندھنا) ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو قوت اور سہارا دیتا ہے، یعنی ہم تمام کام سنبھالنے والے اور وقت پر کام آنے والے ہیں، جب کہ یوسف اور اس کا بھائی کم عمر ہونے کی وجہ سے والد کے کسی کام نہیں آ سکتے اور ہم ایک قوی جتھا ہیں جو اس بدوی ماحول میں وقت پر کام آ سکتے ہیں۔

③ اِنَّ اَبَانَا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنِ : یہاں انھوں نے باپ کو بھی نہیں بخشا۔ "ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ" سے مراد رائے کی غلطی ہے جو دنیوی معاملات میں ہوتی ہے، یہاں ضلالت سے مراد دینی ضلالت یا عام گمراہی نہیں ہے، ایسا کہتے تو یہ لوگ کافر ہو جاتے۔ (قرطبی) بعض اوقات کسی خاص کام میں غلطی پر بھی یہ لفظ آ جاتا ہے، جیسا کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہونے کی وجہ بتائی، فرمایا: ﴿ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى ﴾ [ البقرة : ۲۸۲ ] "(اس لیے) کہ دونوں میں سے ایک بھول جائے تو ان میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے۔" دراصل وہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ آئندہ کیے جانے والے سلوک میں اپنے آپ کو بے قصور باور کروا کر ساری غلطی والد کے ذمے ڈالنا چاہتے تھے، جنھوں نے اولاد کی محبت میں فرق کیا تھا۔

**آیت 9** ① اقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا: دیکھیے حسد انسان کو کہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ آدمی صغیرہ گناہ کو کبیرہ اور کبیرہ کو صغیرہ سمجھنے لگتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا باپ کی نظر میں زیادہ محبوب ہونا بھائیوں کی نظر میں اتنا بڑا جرم بن گیا کہ اس کی وجہ سے قتل ناحق جو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے، ان کی نگاہ میں معمولی بن گیا۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے قصے میں بھی حسد نے ایک بے گناہ کا قتل قاتل کی نگاہ میں جائز بلکہ خوش نما بنا دیا۔ دوسری تجویز بھی کم خطرناک نہ تھی۔ "طَرۡحٌ" کا معنی ہے دور پھینک دینا۔ "اَرۡضًا" نکرہ ہے، یعنی اسے کسی نامعلوم زمین میں پھینک دو، تاکہ وہیں مر جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمُ الۡجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمۡ فِي الدُّنۡيَا ﴾ [ الحشر : ۳ ] "اور اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ان (بنونضیر) پر جلاوطن ہونا لکھ دیا تھا تو وہ یقیناً انھیں دنیا میں سزا دیتا۔" معلوم ہوا کہ جلاوطنی اور وہ بھی نامعلوم سرزمین میں، کم عذاب نہیں ہے۔

② یَخۡلُ لَکُمۡ ...... : "یَخۡلُ" اصل میں "یَخۡلُوۡ" تھا۔ "اقۡتُلُوۡا" (امر) کے جواب میں مجزوم ہونے کی وجہ سے اس کی واؤ اور "تَکُوۡنُوۡنَ" کا نون گر گئے، یعنی یوسف کے قتل یا غائب کر دینے سے تمھارے والد صاحب کی توجہ صرف تمھارے لیے رہ

قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے کسی اندھے کنویں کی گہرائی میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا قافلہ اسے اٹھا لے گا، اگر تم کرنے ہی والے ہو ۝۱۰

جائے گی۔ "وَجْهُ" کا معنی چہرہ ہے اور چہرے کے ساتھ ہی توجہ ہوتی ہے۔ والد کی محبت میں شریکِ غالب کا کانٹا نکلنے کی دیر ہے، وہ تمھارے ہی ہو جائیں گے۔ حسد نے انھیں ایسا اندھا کیا کہ یہ بھی نہ سوچا کہ اس بوڑھی جان پر کیا گزرے گی، انھیں یوسف علیہ السلام کی عداوت میں نہ باپ پر گزرنے والی حالت کا کوئی خیال آیا نہ یوسف پر رحم آیا۔

③ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ : اتنے بڑے جرم پر ملامت کرنے والے ضمیر کو انھوں نے یہ تسلی دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی کہ یوسف کا قصہ تمام کرکے تم نیک لوگ بن جانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی سنگ دلی کے باوجود انھیں اپنے مجرم ہونے کا احساس تھا۔ یہ شیطان کا بندے کو گناہ میں مبتلا کرنے کے لیے بہت بڑا ہتھیار ہے کہ گناہ کر لو، بعد میں توبہ کر لینا، لیکن شیطان کے اس وار سے بچنا نہایت ضروری ہے، کیا خبر کہ اس کے بعد توبہ کا موقع ہی نہ ملے، پہلے ہی موت آ جائے، جس کا وقت کسی کو بتایا ہی نہیں گیا، تاکہ ہر شخص موت کے کسی بھی وقت آ جانے کے خیال سے گناہ سے باز رہے، فرمایا: ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [ آل عمران : ۱۰۲ ] "اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔" پھر اس کی بھی کیا خبر کہ وقت ملنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے اس کی طرف سے توبہ کی توفیق ہی نہ ملے۔ فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ [ الأنفال : ۲۴ ] "اور جان لو کہ بے شک اللہ بندے اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے۔"

ایک معنی "وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ" کا یہ بھی کیا گیا ہے کہ یوسف کے بعد تم درست معاملے والے لوگ بن جانا، یعنی والد کو راضی کر لینا اور آپس میں شیر و شکر ہو جانا۔ یہ معنی ہو تو بھی وہ دھوکے ہی میں مبتلا تھے۔ اپنے لختِ جگر کو غائب کرنے والوں سے ظاہری صلح ہو بھی جائے تو ہر وقت غم سے بھرا ہوا دل پہلی حالت میں کیسے آ سکتا ہے۔

**آیت 10** قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ ...... : "غَيٰبَتِ" کا معنی لغت میں ہے: "غِيَابَةُ كُلِّ شَيْءٍ مَا سَتَرَكَ مِنْهُ" یعنی ہر چیز کی غیابت وہ ہے جو تمھیں اس سے پردے میں کر لے، یعنی اسے تم سے چھپا لے۔ اس لیے قبر کو بھی "غِيَابَةٌ" کہتے ہیں۔ "الْجُبِّ" کا معنی کنواں، بہت پانی اور گہرائی والا کنواں یا مٹی کا کھودا ہوا کنواں جس میں پتھروں اور اینٹوں کی دیوار نہ بنائی گئی ہو، "السَّيَّارَةِ" قافلہ۔ (قاموس) ان بھائیوں میں سے ایک نے جو فطرتاً دوسروں سے بہتر اور رحم دل تھا، جب انھیں حد سے گزرتے دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ یہ کسی طرح ٹلنے والے نہیں، انھیں ایسا مشورہ دیا جسے وہ بھی قبول کر سکیں اور اسے یوسف کا طرف دار بھی قرار نہ دیں۔ وہ یہ تھا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، قتل تو بہت ہی بڑا جرم ہے۔ (مفسرین فرماتے ہیں کہ یوسف کا نام اس نے ان کے دل میں نرمی، شفقت اور رحم ابھارنے کے لیے لیا، تاکہ وہ کچھ سوچیں کہ ہم کسے قتل کرنے

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! تجھے کیا ہے کہ تو یوسف کے بارے میں ہم پر اعتبار نہیں کرتا، حالانکہ بے شک ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں (۱۱) اسے کل ہمارے ساتھ بھیج کہ چرے چگے اور کھیلے کودے اور بے شک ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں (۱۲)

جارہے ہیں، یوسف کو؟ جو ہمارا بھائی ہے) اگر ضرور ہی کچھ کرنا ہے تو اسے کسی اندھے کنویں کی گہرائی میں پھینک دو۔ اس سے تمھارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا کہ کوئی قافلہ اسے اٹھا کر لے جائے گا، تم اپنے مقصد یعنی والد کی نگاہوں سے دور کرنے میں بھی کامیاب ہو جاؤ گے اور ایک معصوم جان کے قتل سے بھی بچ جاؤ گے۔ "قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ" مطلب یہ کہ اگر قتل کا مشورہ دینے والے بھائی تھے تو یہ بھی ایک بھائی ہی تھا۔ یہ بات کس بھائی نے کہی تھی، قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہیں، کیونکہ ہدایت کے مقصد کے لیے اس کی ضرورت نہ تھی اور پہلی کتابوں کے سچ یا جھوٹ کا کچھ پتا نہیں کہ ان پر بھروسا کر کے کوئی نام بتایا جائے۔

**آیت 12:11** قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا ...... : اب یہ مرحلہ درپیش تھا کہ یوسف علیہ السلام کو ساتھ کیسے لے جائیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی کوشش کر چکے تھے، مگر والد نے اجازت نہیں دی تھی اور یہ کہ والد کو پہلے بھی ان کے متعلق اعتبار نہ تھا کہ وہ یوسف کے خیر خواہ ہیں، یا انھیں کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ اس مرتبہ دس کے دس بھائیوں نے منت، خوشامد اور دھونس دھاندلی کا ہر حربہ استعمال کر کے یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی۔ سب سے پہلے تو نہایت ادب اور منت کے ساتھ بات کی، ابتدا دیکھیے "يٰۤاَبَانَا" "اے ہمارے باپ!" اس سے قریب تر رشتہ کون سا ہوگا جو درمیان میں لا کر درخواست کی جائے اور دل نرم نہ ہو، پھر ساتھ ہی دھونس دیکھیے "آپ کو کیا ہے کہ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد ہی نہیں کرتے" (گویا سارا قصور ابا جی کا ہے) "حالانکہ بے شک ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں۔" "اِنَّا" کے "اِنَّ" اور "لَنٰصِحُوْنَ" کے لام کے ساتھ خیر خواہی کا یقین دلانا ملاحظہ فرمائیں، اہل عرب کے ہاں اس میں قسم کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ پھر یوسف کی مزید خیر خواہی کا ذکر ہوتا ہے کہ کبھی باہر جنگل میں جا کر اسے سیر و تفریح کا موقع ہی نہیں ملا۔ کل آپ اسے ہمارے ساتھ بھیجیں، جنگل کے پھل وغیرہ کھائے پیے گا، کھیلے کودے گا، خوش دل ہوگا۔ رہا جنگل اور صحرا میں وحشی جانوروں وغیرہ کا خطرہ تو اس کی فکر نہ کیجیے۔ "بے شک" ہم اس کی "یقیناً" حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ وہی قسم کے مفہوم والے الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنی خیر خواہی کا یقین دلاتے ہوئے کہے تھے کہ "وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ" اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا پیشہ جنگل میں بکریاں وغیرہ چرانا تھا۔

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

اس نے کہا بے شک میں، یقیناً مجھے یہ بات غمگین کرتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو ﴿۱۳﴾ انھوں نے کہا واقعی اگر اسے بھیڑیا کھا جائے، حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں تو بلاشبہ ہم اس وقت یقیناً خسارہ اٹھانے والے ہوں گے ﴿۱۴﴾ پھر جب وہ اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنویں کی گہرائی میں ڈال دیں اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو ضرور ہی انھیں ان کے اس کام کی خبر دے گا، اس حال میں کہ وہ سوچتے نہ ہوں گے ﴿۱۵﴾

**آیت 13** ① قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ ...... : یعقوب علیہ السلام نے نہ بھیجنے کے لیے دو عذر پیش کیے، ایک تو نہایت تاکید کے الفاظ "اِنَّ" اور "لام تاکید" کے ساتھ کہا کہ مجھے تمھارا اسے اپنے ساتھ لے جانا غمگین کرتا ہے۔ (حالانکہ یہی بات تو ان کے غصے کا باعث تھی) دوسرا یہ کہ مجھے خوف ہے کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے گا۔ ساتھ ہی ان کے جذبات ٹھنڈے رکھنے کے لیے یہ کہنے کے بجائے کہ "اور تم بیٹھے رہو گے" یہ کہا کہ "تم اس سے غافل ہو گے۔" گویا تم میرے غم اور خوف دونوں کا سامان کر رہے ہو۔
② ان کو بھیڑیے کا بہانہ کرنا تھا وہی ان کے دل میں خوف آیا۔ (موضح) یا یعقوب علیہ السلام کے منہ سے یہ بات نکلنا تھی کہ انھوں نے اسی کا بہانہ بنا لیا۔

**آیت 14** ① قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ ...... : یعنی پھر ہماری قوت کس دن کام آئے گی، ہم دس مضبوط جوان ہیں۔
② اب یعقوب علیہ السلام ان کے اصرار کے سامنے بے بس ہو گئے، کیونکہ اللہ کی تقدیر ہو کر رہنی تھی، جس کے واقع ہو کر رہنے میں کوئی احتیاط کام نہیں آ سکتی، پھر یوسف علیہ السلام کو خواب میں دکھائے جانے والے کمال و عروج کی منزل کے راستے پر بھی روانہ ہونا تھا اور اس راستے میں نہایت کٹھن گھاٹیوں سے گزرے بغیر چارہ ہی نہیں اور نہ ان بلند مقامات پر پہنچنے والوں کے لیے راستے میں کوئی قالین یا کہکشاں بچھی ہوتی ہے۔

**آیت 15** ① فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ ...... : "اَجْمَعُوْۤا" باب افعال ہے، کسی کام کا مصمم عزم کر لینا، یعنی آخر وہ باپ کے کسی عذر کی پروا نہ کرتے ہوئے ان کے خاموش ہونے پر اسے اپنے ساتھ لے ہی گئے۔ اب یہاں قرآن کریم کا کمال اعجاز دیکھیے، فرمایا: "پھر جب وہ اسے لے گئے اور طے کر لیا کہ اسے کسی اندھے کنویں کی گہرائی میں پھینک دیں" تو پھر کیا ہوا؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ذکر ہی نہیں فرمایا، تاکہ سننے والے خود ہی سمجھ لیں کہ قتل تک کا منصوبہ بنانے والے ان دس تیر جوانوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کنویں میں پھینکنے کے وقت اور اس سے پہلے کیا سلوک کیا ہو گا۔ قرآن اشارہ کرتا ہے، پھر سمجھنے والے پر

وَ جَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ عِشَآءً یَّبۡكُوۡنَ ﴿۱۶﴾

اور وہ اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے آئے (۱۶)

چھوڑ دیتا ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کا سلوک تصور میں تو آ سکتا ہے، اسے الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے، یا پھر بات اتنی لمبی ہو جائے گی جو قرآن کا طریقہ نہیں۔ مفسر آلوسی نے فرمایا: ''انھیں کنویں میں پھینکنے کی کیفیت اور اس وقت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے جو کچھ کہا اور جو کچھ انھوں نے اس سے کہا، اس کے متعلق کتب تفسیر میں بہت سی روایات ہیں جنھیں سن کر پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جس کی سند پر اعتماد ہو سکتا ہو۔'' کیونکہ ان مفسرین میں سے کوئی چشم دید بیان کرنے والا ہے ہی نہیں اور وہ عالم الغیب جو سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے یہ بات ہمارے خود سوچنے کے لیے بلاتفصیل چھوڑ دی ہے۔

② وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ ...... : یعنی اس مشکل وقت میں یوسف علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے تسلی دی گئی کہ ایک ایسا وقت ہر صورت آئے گا جب تم ان بھائیوں کو ان کا یہ کام بتاؤ گے، جب کہ طویل مدت اور آج اور اس وقت کے حالات کے فرق کی وجہ سے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم اسی بھائی سے پورا غلہ دینے اور صدقہ کرنے کی درخواست کر رہے ہیں جسے ہم کنویں میں پھینک کر اس سے فارغ ہو چکے تھے۔ یہاں ''لَتُنَبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا'' (تو ضرور ہی انھیں ان کے اس کام کی خبر دے گا) میں ''ان کے اس کام'' کے الفاظ میں بھی ان کے یوسف علیہ السلام کے ساتھ سلوک کی لمبی و دلخراش داستان دو تین لفظوں میں سمٹی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

③ کچھ لوگ یعقوب علیہ السلام کے ان الفاظ سے کہ ''میں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا'' ان کے لیے علم غیب ثابت کرتے ہیں، مگر چند میل کے فاصلے پر کنویں میں یوسف علیہ السلام پر گزرنے والی حالت، ان کی غلامی، عفت کی آزمائش، قید خانے کے سال، بادشاہ کے خواب کا قید سے نکلنے کا ذریعہ بننا، خوش حالی اور قحط کے سال، قید سے نکل کر قرب شاہی اور وزارت خزانہ کا حصول، یہ سب کچھ یعقوب علیہ السلام کو کیوں معلوم نہ ہو سکا؟ آنکھیں غم سے سفید کیوں ہو گئیں؟ کیا علم غیب یہی ہوتا ہے؟ ہاں، پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ جتنی بات وحی کے ذریعے سے بتاتا ہے وہ انھیں معلوم ہو جاتی ہے، جیسے بشارت دینے والے کے مصر سے قمیص لے کر چلنے کے ساتھ ہی انھیں یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنے لگی اور قمیص آنکھوں پر ڈالنے سے بینائی واپس آ گئی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ یہ نہ یوسف علیہ السلام کے بس کی بات تھی اور نہ ان کے والد ماجد یعقوب علیہ السلام کے بس کی۔ اللہ تعالیٰ جتنی بات بتا دے وہ معلوم، باقی کی خبر نہیں، ایسا شخص عالم الغیب نہیں ہوتا، ورنہ غیب کی کئی باتیں ہمیں بھی رسول کے بتانے سے معلوم ہیں، تو کیا ہم بھی عالم الغیب ہو گئے؟ نہیں، آسمان و زمین میں عالم الغیب صرف اکیلا اللہ تعالیٰ ہے، جیسے فرمایا: ﴿ قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [ النمل : ٦٥ ] ''کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا۔''

آیت 16 ① وَ جَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ عِشَآءً : اتنا بڑا ظلم کرنے کے بعد انھیں دن کی روشنی میں باپ کے پاس جانے کی ہمت

قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَکۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ جَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِهٖ بِدَمٍ کَذِبٍ ؕ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ

کہا اے ہمارے باپ! بے شک ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلتے چلے گئے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تو اسے کوئی بھیڑیا کھا گیا اور تو ہرگز ہمارا اعتبار کرنے والا نہیں، خواہ ہم سچے ہوں ﴿۱۷﴾ اور وہ اس کی قمیص پر ایک جھوٹا خون لگا لائے۔ اس نے کہا بلکہ تمھارے لیے تمھارے دلوں نے ایک کام مزین بنا دیا ہے، سو

نہیں ہوئی، کیونکہ دن کے وقت چہرے کے اثرات، جسم کا اضطراب اور زبان کا لڑکھڑانا ہی سب کچھ ظاہر کر دیتا ہے۔ اس لیے وہ عشاء کے وقت باپ کے پاس آئے۔ اکثر جرائم کے وقوع اور انھیں چھپانے کا ذریعہ رات کا اندھیرا ہی بنتا ہے، اس لیے ہم سب کو حکم ہوا کہ کہو: ﴿ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴾ [ الفلق : ۳ ] ”اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے (پناہ مانگتا ہوں)۔“

❷ يَبۡكُوۡنَ : ”روتے ہوئے“ معلوم ہوا ہر رونے والا سچا نہیں ہوتا۔ میں نے ایک عالم کا قول پڑھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے رونے کے بعد سے ہمارا اعتبار رونے والوں سے اٹھ گیا ہے، اللہ جانے کون سچا رو رہا ہے اور کون جھوٹا۔ حسین رضی اللہ عنہ کی بہن زینب رضی اللہ عنہا نے کوفے والوں کو روتے پیٹتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیوں رو رہے ہیں؟ انھیں بتایا گیا کہ یہ لوگ حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت پر رو رہے ہیں تو وہ بے ساختہ کہنے لگیں کہ یہ لوگ ہم پر رو رہے ہیں تو ہمیں قتل کرنے والے کون ہیں؟ (یعنی کیا وہ کوفہ سے باہر کی کوئی مخلوق تھی؟ یہی تو قتل کرنے والے تھے)۔

**آیت 17** قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ …… : ”اِسۡتِبَاقٌ“ باب افتعال کا مصدر ہے، آگے نکلنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ، وہ پیدل دوڑ میں آگے نکلنے کا ہو یا گھوڑوں پر (اِسۡتِبَاقُ الۡخَيۡلِ) یا نشانہ بازی میں (اِسۡتِبَاقُ الرَّمۡيِ) یعنی ہم دوڑ کے مقابلے میں دور نکل گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ ”الذِّئۡبُ“ کا الف لام تخصیص کے لیے نہیں، جنس کے لیے ہے، یعنی کوئی بھیڑیا اسے کھا گیا۔ ساتھ ہی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے والد پر چڑھائی کر دی کہ آپ تو ہم سے اس قدر بدظن ہیں کہ کسی صورت ہم پر اعتبار کرنے والے ہی نہیں، خواہ ہم بالکل سچے ہوں۔ مگر سننے والا یہ تو ضرور سوچتا ہے کہ بھیڑیا انھیں ہڈیوں سمیت کھا گیا اور ایک ذرہ بھی باقی نہیں چھوڑا جو ساتھ لے آتے، خصوصاً اس لیے کہ نہ وہ ان کا کچھ بچا کھچا جسم واپس لائے نہ یہ کہا کہ ہم نے اسے دفن کر دیا۔

**آیت 18** ❶ وَ جَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِهٖ بِدَمٍ کَذِبٍ …… : یہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کی ایک اور چال تھی کہ وہ یوسف علیہ السلام کی قمیص پر ایسا خون لگا کر لائے جو ”كَذِبٍ“ تھا، جس کا معنی جھوٹ ہے، یا یہ بمعنی ”مَكۡذُوۡبٌ“ ہے، جیسے ”خَلۡقٌ“ بمعنی ”مَخۡلُوۡقٌ“ یعنی جھوٹا بنایا ہوا، یا مصدر مبالغے کے لیے ہے کہ وہ خون سراسر جھوٹ تھا، یوسف علیہ السلام کا ہرگز نہ تھا، بلکہ وہ بھیڑ بکری یا جنگل سے شکار کیا ہوا کوئی جانور ذبح کر کے اس کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ والد ساری حقیقت سمجھ گئے، کیونکہ ان کی

اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾

(میرا کام) اچھا صبر ہے اور اللہ ہی ہے جس سے اس پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۸﴾

گھڑی ہوئی کہانی خود ہی اپنی حقیقت بتا رہی تھی اور فرمایا: ''بَلْ'' (بلکہ) یعنی جو کچھ تم کہہ رہے ہو سب جھوٹ ہے، بھیڑیے نے یوسف کو ہرگز نہیں کھایا، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمھارے دلوں نے تمھارے لیے کوئی بات خوشنما بنا دی جو تم کر گزرے ہو۔ اب وہ چونکہ کئی چیزیں ہو سکتی تھیں، اس لیے کسی کی تعیین نہیں فرمائی اور وہ یوسف کو کہیں پھینک آنا، اسے کسی جگہ لے جا کر بیچ آنا، اسے کہیں چھپا دینا وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مرنے کا یقین ہو جائے تو صبر آ جاتا ہے مگر جب خبر ہی نہ ہو کہ بیٹا اس وقت کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ تو یہ بہت ہی بڑی آزمائش اور ہر وقت دل میں سلگتی رہنے والی چنگاری ہوا کرتی ہے۔ ادھر خواب کے مطابق ابھی یوسف علیہ السلام پر اتمام نعمت ہونا تھا اور ''تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ'' کی تعلیم بھی باقی تھی۔ سو کس طرح مان لیتے کہ اسے بھیڑیا کھا گیا۔

❷ اہل علم نے لکھا ہے کہ اس سورت میں یوسف علیہ السلام کی قمیص کا تین دفعہ ذکر ہے اور ہر دفعہ اس کا انوکھا ہی اثر ہے۔ ایک تو یہ خون آلود قمیص تھی جس کے نتیجے میں یعقوب علیہ السلام کی بینائی ختم ہو گئی، دوسرا یوسف علیہ السلام کو تہمتِ دست درازی سے ان کی قمیص دیکھ کر بری قرار دیا گیا اور تیسرا یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو آنا اور یعقوب علیہ السلام پر اسے ڈالنے سے ان کی بینائی کا واپس آنا۔ سبحان اللہ! اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کمال نشانیاں ہیں۔

❸ تفسیر "التحرير والتنوير" کے مصنف ابن عاشور لکھتے ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے قمیص کو خون آلود کرنے کی جعل سازی میں اور اسے چیر پھاڑ کر ایسی قمیص کی صورت میں پیش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہو گی جس کے پہننے والے کو بھیڑیے نے کھا لیا ہو۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ سمجھ دار تھے کہ اتنی سی بات بھی ان میں سے کسی کے ذہن میں نہ آئی ہو، جب کہ وہ دس جوان تھے۔ سو بعض اہل تفسیر نے جو لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں نے آج کی طرح کا کوئی بھیڑیا نہیں دیکھا جو اس بھیڑیے سے زیادہ حلیم (بردبار) ہو کہ میرے بیٹے کو کھا گیا اور اس کی قمیص نہیں پھاڑی، تو یہ قصہ گوئی کی ایک ظرافت ہے۔'' اگر قمیص کے سالم رہنے کی بات قرآن و حدیث یا کسی صحیح ذریعے سے آئی ہوتی تو میرے خیال کے مطابق ابن عاشور رحمہ اللہ اتنے واضح الفاظ میں اسے قصہ گو حضرات کی کارستانی قرار نہ دیتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں، بالکل ممکن ہے اور جرم یقیناً اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے مگر بات ثابت تو ہونی چاہیے۔ یہاں ان کے جھوٹے ہونے کے اور دلائل ہی میں کچھ کمی نہ تھی کہ ہم قمیص کا سالم رہنا کسی صحیح ذریعۂ خبر کے بغیر ہی تسلیم کر لیں۔

❹ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ: جملہ فعلیہ ''أَصْبِرُ صَبْرًا جَمِيْلًا'' (یعنی اب میں صبر جمیل اختیار کروں گا) کے بجائے جملہ اسمیہ ارشاد فرمایا: ''فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ'' کیونکہ اس میں دوام ہوتا ہے۔ گویا اس میں مبتدا یا خبر محذوف ہے، یعنی ''فَأَمْرِيْ صَبْرٌ جَمِيْلٌ'' یا ''فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ أَمْرِيْ'' یعنی اب میرا کام صبر جمیل ہے۔ کسی بھی چیز کا جمال یہ ہے کہ وہ اپنے جیسی دوسری چیزوں سے بہتر اور

وَ جَآءَتۡ سَيَّارَةٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَهُمۡ فَاَدۡلٰى دَلۡوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشۡرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوۡهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾

اور ایک راہ چلتا قافلہ آیا تو انھوں نے اپنے پانی لانے والے کو بھیجا، سو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔ کہا اوہ! خوشخبری ہو! یہ ایک لڑکا ہے۔ اور انھوں نے اسے سامان تجارت بنا کر چھپا لیا اور اللہ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے ﴿۱۹﴾

خوبصورت ہو۔ چنانچہ صبر بھی دو طرح کا ہوتا ہے، ایک صبر جمیل، جس میں حسن ہو اور دوسرا غیر جمیل جو حسن سے خالی ہو۔ پہلا وہ جس کے ساتھ جزع فزع اور واویلا وغیرہ نہ ہو بلکہ اللہ کی تقدیر پر صبر کیا جائے۔ دوسرا وہ جو یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہو اور جو ہر ایک کو آخر کرنا ہی پڑتا ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کے پاس سے گزرے جو اپنے ایک بچے پر رو رہی تھی۔ (عبد الصمد کی روایت میں ہے کہ وہ ایک قبر کے پاس رو رہی تھی) تو آپ نے اس سے کہا: (( اِتَّقِي اللّٰهَ وَاصْبِرِيْ، فَقَالَتْ وَمَا تُبَالِيْ بِمُصِيْبَتِيْ ؟ فَلَمَّا ذَهَبَ، قِيْلَ لَهَا إِنَّهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَخَذَهَا مِثْلُ الْمَوْتِ، فَأَتَتْ بَابَهُ، فَلَمْ تَجِدْ عَلٰى بَابِهِ بَوَّابِيْنَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لَمْ أَعْرِفْكَ، فَقَالَ إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ أَوَّلِ صَدْمَةٍ )) [ مسلم، الجنائز، باب الصبر على المصيبة عند الصدمة الأولى : ۹۲۶/۱۵ ] ”اللہ سے ڈر اور صبر کر۔“ اس نے کہا: ”آپ کو میری مصیبت کی کیا پروا ہے؟“ جب آپ چلے گئے تو اسے بتایا گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو اس کی حالت تو موت جیسی ہو گئی۔ وہ آپ کے دروازے پر آئی تو اس نے آپ کے دروازے پر کوئی دربان نہیں دیکھے۔ کہنے لگی: ”یا رسول اللہ! میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔“ آپ نے فرمایا: ”اصل صبر تو صرف پہلی چوٹ کے وقت ہوتا ہے۔“

﴿5﴾ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ : یہاں ”الْمُسْتَعَانُ“ خبر پر الف لام کی وجہ سے حصر کا معنی پیدا ہو گیا، یعنی صرف اللہ ہے یا اللہ ہی ہے جس سے مدد مانگی جاتی ہے اور اللہ سے مدد مانگنے کا طریقہ بھی اس نے خود ہی سکھایا، جس پر یعقوب علیہ السلام نے عمل کیا، فرمایا: ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ [ البقرۃ : ٤٥ ] ”اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔“

﴿6﴾ ہمارے جو بھائی کہتے ہیں کہ فلاں حضرت صاحب کی نظر لوح محفوظ پر ہے اور فلاں صاحب کے دل کا آئینہ انھیں کل عالم کی خبر دیتا ہے، وہ غور فرمائیں کہ چند میل کے فاصلے پر کنویں میں اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہو سکی۔ نہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دل میں کھٹکا تک ہوا کہ والد ماجد سے تو کوئی چیز چھپی رہتی نہیں، ہمارا مکر کیسے کامیاب ہو گا؟ تو ان کے حضرت صاحبان لوح محفوظ تک کیسے پہنچ گئے؟ یہاں ایک سوال ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اس وقت یوسف علیہ السلام کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ جواب یہ ہے کہ وجہ یہ تھی کہ ان کی تلاش بھی انھی بھائیوں ہی نے کرنا تھی، وہ خود تو عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کمزور تھے۔ چنانچہ جب موقع مناسب جانا انھی بھائیوں کو حکم دیا کہ جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، فرمایا: ﴿ فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ ﴾ [ یوسف : ۸۷ ] ”یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ۔“

آیت 19 ﴿1﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ ...... : یہ قافلہ مصر کی طرف جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام پر یہ احسان ہوا

وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۲

اور انھوں نے اسے تھوڑی قیمت، چند گنے ہوئے درہموں میں بیچ دیا اور وہ اس میں رغبت نہ رکھنے والوں سے تھے ﴿۲۰﴾

کہ قافلے والوں کی توجہ کنویں سے پانی لانے کی طرف ہوگئی اور یوسف علیہ السلام کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہاں بات خود بخود سمجھ میں آرہی ہے کہ ڈول والے نے ڈول لٹکایا تو یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ لٹک گئے اور اوپر آگئے۔

② وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً: "بِضَاعَةً" کا معنی سامان تجارت ہے، یعنی قافلے والوں پر لازم تھا کہ وہ اردگرد اعلان کرتے، یا یوسف علیہ السلام کے بتانے کے مطابق انھیں ان کے والد کے پاس پہنچا دیتے، مگر وہ ظالم بے دین تھے۔ انھوں نے زبردستی غلام بنا کر سامانِ تجارت کے طور پر چھپا لیا کہ مصر جا کر فروخت کریں گے، حالانکہ کسی آزاد کو غلام بنانا یا اسے فروخت کرنا حرام ہے۔ اس سارے سلسلۂ کلام میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ صاف ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام کے نکلنے پر اہلِ قافلہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے سامانِ تجارت کے طور پر انھیں چھپا لیا، کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی۔

③ ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ بھائیوں کا یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنا آخر ان کی عظمت و رفعت کا ذریعہ بن گیا۔ آپ بھی اپنے خاندان کے لوگوں کے ظلم و ستم سے بددل نہ ہوں۔ یہ سب بھی آخر کار برادرانِ یوسف کی طرح آپ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

**آیت 20** وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ......: "بَخْسٍ" کا معنی اصل قیمت سے کم قیمت ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ ﴾ [ الأعراف : ۸۵ ] "اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔" یعنی قافلے والوں نے اسے تھوڑی قیمت، چند گنے ہوئے درہموں میں بیچ دیا، کیونکہ زیادہ درہم ہوتے تو وہ گننے کے بجائے تول لیے جاتے تھے۔ "اور وہ اس میں رغبت نہ رکھنے والوں میں سے تھے" اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قانونی طور پر حقیقی غلام کو نہیں بیچ رہے تھے، اس لیے جو کچھ مل گیا اسے انھوں نے غنیمت سمجھا۔ بے رغبت ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ جلد اس سے خلاصی حاصل کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی ایسا شخص نہ آجائے جو انھیں اس جرم میں پکڑ لے کہ وہ اس کے آزاد بیٹے کو غلام بنا کر پکڑ لائے ہیں، تو ہر وقت چھپا کر رکھنا اور یوسف علیہ السلام کو کسی سے اپنی حقیقت بیان کرنے کا موقع ہی نہ دینا ان کے لیے مصیبت تھا۔ اس سے ان لوگوں کی داستان گوئی کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی جو یوسف علیہ السلام کے خریداروں کے ہجوم کا اور سوت کی اٹی لانے والی عورت کا اور آخر کار سونے میں تول کر فروخت کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ ویسے بھی "شَرٰى يَشْرِيْ" بیچنے اور "اِشْتَرٰى يَشْتَرِيْ" خریدنے کے معنوں میں آتا ہے، الا یہ کہ کوئی خاص قرینہ اس کے خلاف ہو، کیونکہ اصل یہی ہے کہ "فَعَلَ" کسی حدث (کام) کے لیے آتا ہے اور "اِفْتَعَلَ" اس کی مطاوعت (اس کام کا اثر قبول کرنے) کے لیے ہوتا ہے، جیسے "بَاعَ" اس نے بیچا اور "اِبْتَاعَ" اس نے خریدا۔ "رَهَنَ" اس نے گروی دیا اور "اِرْتَهَنَ" اس نے گروی لیا۔ "كَرٰى" اس نے کرایہ پر دیا اور "اِكْتَرٰى" اس نے کرایہ پر لیا۔ اس کے خلاف اول تو آتا ہی نہیں، آئے تو کوئی قرینہ موجود ہوتا ہے۔ جو لوگ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا آکر قافلے

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ٝ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور جس شخص نے اسے مصر سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کی رہائش باعزت رکھ، ہوسکتا ہے کہ ہمیں فائدہ دے، یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اور اسی طرح ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ دی اور تاکہ ہم اسے باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھائیں اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۲۱﴾

والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا ذکر کرتے ہیں ان کی بات کا قرآن کی کسی آیت میں ذکر چھوڑ کر اشارہ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی اسرائیلی روایت ہے تو اس کا اعتبار نہیں اور وہ قرآن کے بیان کے بھی خلاف ہے۔

**آیت 21** ❶ وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ : قرآن نے اس شخص کے نام اور عہدے کا کہیں ذکر نہیں کیا، البتہ آگے چل کر مصر کی عورتوں نے ”عزیز“ کے لقب سے اس کا ذکر کیا ہے اور یہی لقب بعد میں یوسف علیہ السلام کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر کے بادشاہ کا کوئی وزیر یا بہت بڑے عہدے پر فائز شخص تھا۔ اس کی بیوی کا نام بھی قرآن نے کہیں ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہ تھا، بلکہ یہ پردہ پوشی کے بھی خلاف تھا۔ اس لیے جو لوگ اس خاتون کا نام ”زلیخا“ (زاء کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ) یا ”راعیل“ بتاتے ہیں، ان کے پاس محض اسرائیلی روایات ہیں، کوئی پختہ دلیل نہیں اور ان کا یہ عمل ستر کے بھی خلاف ہے۔

❷ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ : عزیز مصر نے اپنی بیوی کو یوسف علیہ السلام کی رہائش باعزت رکھنے اور ہر ضرورت مہیا رکھنے کی تاکید کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا اور اس کا تعلق مالک اور غلام والا ہونے کے بجائے گھر کے ایک معزز رکن کا ہونا چاہیے، بچہ نہایت ذہین اور اچھی عادات والا ہے، امید ہے ہمیں فائدہ دے گا۔ عزیز مصر مملکت کے کسی بھی شخص سے کام کروا سکتا تھا اور مطلوبہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا، مگر ماتحت نوکر جس طرح فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہایت عزت و محبت سے پالے ہوئے اپنے گھر کے ایک فرد سے جس خیر خواہی اور فائدے کی امید ہوتی ہے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

❸ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا : اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ماں باپ، بہن بھائی یا بیٹا بیٹی منہ کے کہہ دینے سے نہیں بنتے۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۴، ۵) اور مجادلہ (۲) ورنہ عزیز کی بیوی کا سگا بیٹا ہوتا تو وہ اس سے وہ معاملہ کبھی نہ کرتی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اکثر گھروں میں اللہ کی اس نافرمانی کے ایسے ہی نتائج رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت تاکید کے ساتھ اس سے منع فرمایا ہے۔

❹ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ ...... : اس کی دو تفسیریں ہیں، ایک یہ کہ اس طرح یعنی عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کروا کر اور مصر

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے بڑا حکم اور بڑا علم عطا کیا اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ﴿۲۲﴾

کے اتنے عظیم مقام والے گھر میں باعزت رہائش دے کر ہم نے یوسف علیہ السلام کو سرزمین مصر میں جگہ دی (تاکہ وہ باعزت زندگی بسر کرے) تاکہ ایک حکمران کے گھر میں رہ کر سرداروں کی مجلسیں دیکھے اور حکمرانی اور سیاست کے اسرار و رموز سیکھے، جو صحرا میں رہنے سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور آخر میں ان کی وجہ سے بنی اسرائیل مصر میں آ کر آباد ہوں۔ دوسری یہ کہ جیسے ہم نے اس سے پہلے یوسف کو بھائیوں کے شر سے بچایا اور کنویں سے نکلوایا، اسی طرح ہم نے اسے سرزمین مصر میں جگہ بخشی۔

⑤ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ: "غَلَبَ" کا لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی مقابلے میں ہو۔ دیکھیے یوسف علیہ السلام کے بھائی کیا چاہتے تھے اور کنویں میں پھینکنے کے بعد اپنے خیال میں وہ کس قدر کامیاب ہو چکے تھے، مگر اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔ وہ جو کرنا چاہے کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ کنویں سے نکال کر حکومت تک پہنچانا اور پھینکنے والوں کو سائل بنا کر اس کے سامنے لا کھڑا کرنا اس کے ادنیٰ اشارے کا کام ہے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر نے بدر کے موقع پر کیا خوب کہا تھا ؎

جَاءَتْ سَخِيْنَةُ كَيْ تُغَالِبَ رَبَّهَا وَلَيُغْلَبَنَّ مُغَالِبُ الْغَلَّابِ

"قریش اس لیے آئے تھے کہ اپنے رب کے ساتھ غالب آنے کا مقابلہ کریں گے اور قسم ہے کہ اس زبردست غالب کا مقابلہ کرنے والا ہر صورت مغلوب ہو کر رہے گا۔" (قریش کو سخینہ اس لیے کہتے تھے کہ وہ حاجیوں کی ضیافت گرم کھانے سے کرتے تھے)۔

⑥ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ ہر قسم کا اختیار اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس لیے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی ظلم و ستم کی کمی نہیں کرتے، مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، بخلاف تھوڑے لوگوں کے، جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے غالب رہنے پر اور اس کی تقدیر پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ نہ خوشی میں پھولتے ہیں نہ مصیبت میں حد سے زیادہ غم میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ کسی صورت اللہ کے حکم سے سر پھیرتے ہیں۔

**آیت 22** ① وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا: "اَشُدَّ" بعض اہل علم کے مطابق مفرد ہے جو جمع کے وزن پر آیا ہے۔ بعض نے فرمایا جمع ہے، مگر اس کے لفظ میں سے اس کا واحد نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا "شِدَّةٌ" کی جمع ہے، جس طرح "نِعْمَةٌ" کی جمع "أَنْعُمٌ" ہے، یعنی اپنی پوری قوتوں اور جوانی کو پہنچ گئے۔ اسی "بَلَغَ" کے لفظ ہی سے بلوغت کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس کے آتے ہی انسان پر نیکی اور بدی لکھنے والا وہ قلم مقرر ہو جاتا ہے جو بچپن میں اس پر مقرر نہیں تھا۔ اب وہ اپنے جیسے انسان کی پیدائش کا ذریعہ بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں جو لوگ اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر کی تعیین پچیس یا تیس یا چالیس سال بیان کرتے ہیں ان کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ بہرحال جس قسم کی خوش حالی اور ناز و نعمت میں یوسف علیہ السلام کی پرورش ہو رہی تھی، اس میں یہ عمر طوفان بن کر آتی ہے، مگر ان پر اللہ کا فضل تھا جس کی وجہ سے رعونت،

وَرَاوَدَتۡهُ الَّتِیۡ هُوَ فِیۡ بَیۡتِهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ وَ قَالَتۡ هَیۡتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ

اور اس عورت نے، جس کے گھر میں وہ تھا، اسے اس کے نفس سے پھسلایا اور دروازے اچھی طرح بند کر لیے اور

شہوت اور حسن و عشق کی آفات کے بجائے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم اور علم عطا فرمایا۔ "حُکۡمٌ" اور "حِکۡمَۃٌ" تقریباً ہم معنی ہیں، اس کا مطلب ہے ایک دوسرے کے مخالف اور ٹکرانے والے دو معاملات حق اور باطل میں سے حق کا فیصلہ کرنے کی اہلیت۔ یہ اہلیت عطا ہونے کے بعد آدمی صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں علم عطا فرمایا، یعنی نیکی و بدی کی پہچان اور وہ باتیں جاننے اور ان پر عمل کی استعداد جو عام لوگ نہیں جانتے، جس میں خواب کی تعبیر اور وہ علم بھی شامل ہے جس کا اظہار انھوں نے وزارت کی پیش کش پر خزانے کا شعبہ طلب کرنے پر کیا تھا: ﴿ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴾ [ یوسف : ۵۵ ] "بے شک میں پوری طرح حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں۔"

❷ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ : انسان خوش حال ہو یا خستہ حال، اگر وہ نیکی اور اچھائی پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے ہی جزا دیتے ہیں، مثلاً کوئی بھی تنگ دست جو اللہ کا شکوہ کرنے اور اپنی حالت پر ناراض رہنے کے بجائے اس کی تقدیر پر شاکر ہو کر صبر کرے، اس پر خوش رہے اور غلط سمت میں قدم نہ اٹھائے تو اسے اللہ تعالیٰ ایسے ہی بدلہ دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نوازش صرف یوسف علیہ السلام ہی پر نہیں تھی بلکہ احسان پر کاربند رہنے والے ہر شخص کو ایسے ہی جزا ملتی ہے۔

**آیت 23** ❶ وَرَاوَدَتۡهُ الَّتِیۡ هُوَ فِیۡ بَیۡتِهَا : " رَاوَدَ " باب مفاعلہ سے ہے، نرمی اور ملائمت سے بار بار مطالبہ کرنا، پھسلانا، فریب سے غلط کام پر آمادہ کرنا۔ یہاں باب مفاعلہ مشارکت کے لیے نہیں بلکہ مبالغہ کے لیے ہے، یعنی بار بار اور ہر طریقے سے پھسلایا۔ کیونکہ ایک ہی گھر میں رہ کر خدمت کرنے والے غلام سے ہزار انداز سے اور بار بار اپنے شوق کا اظہار ہو سکتا ہے، مثلاً غلام کھانا لایا ہے تو حکم ہو، دور کیوں بیٹھے ہو؟ ادھر میرے ساتھ آ کر بیٹھو وغیرہ۔ "بَیۡتٌ" "بَاتَ یَبِیۡتُ" (رات گزارنا) سے ہے، اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں آدمی رات رہتا ہو، پھر گھر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اب بھی اس کا اصل استعمال اینٹ پتھر کے مکان یا اون، پشم اور کپڑے وغیرہ کے خیمے پر ہوتا ہے۔ صحن سمیت پورے گھر کو عموماً "دَارٌ" کہتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام جب تک بچے تھے، عزیز کی بیوی کی نظر بچے پر شفقت و محبت والی تھی، اب جب جوانی آئی تو وہ نگاہ نہ رہی۔ یہی اصل بیٹے اور متبنّٰی کا فرق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بے مثال حسن سے نوازا تھا۔ حدیث معراج میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوسف علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (( وَ إِذَا هُوَ قَدۡ أُعۡطِيَ شَطۡرَ الۡحُسۡنِ )) [ مسلم، الإیمان، باب الإسراء ...... : ۱٦۲ ] "انھیں حسن کا شطر عطا کیا گیا تھا۔" شطر کا معنی نصف بھی ہے اور ایک حصہ بھی۔ ( قاموس ) یعنی یوسف علیہ السلام کو حسن کا خاصا بڑا حصہ عطا ہوا تھا۔ عزیز کی بیوی کے غلط راستے پر چل نکلنے کا ایک باعث ترمذی (۲۱٦۵) میں موجود اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی نافرمانی بھی تھی کہ کوئی عورت کسی غیر محرم مرد کے ساتھ اکیلی نہ ہو، ورنہ ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوگا (جو دونوں کو ایک دوسرے کی نگاہ میں خوبصورت بنا کر دکھائے گا)۔ یہاں یوسف علیہ السلام تو ویسے ہی شیطان سے محفوظ تھے،

اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

کہنے لگی جلدی آ۔ اس نے کہا اللہ کی پناہ، بے شک وہ میرا مالک ہے، اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ ظالم فلاح نہیں پاتے ﴿۲۳﴾

اگرچہ غلام ہونے کی وجہ سے پردہ لازم نہ تھا، مگر ایک ہی گھر اور کمرے میں سال ہا سال کی خلوت عزیز مصر کی بیوی کو لے ڈوبی۔ افسوس! مسلمان اب بھی اس کی پروا نہیں کرتے، حالانکہ آپ ﷺ نے خاوند کے بھائی کے ساتھ خلوت سے بھی منع کیا، فرمایا: (( اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ )) [ بخاری، النکاح، باب لا یخلون رجل ... : ۵۲۳۲ ] ''خاوند کا بھائی تو موت ہے۔''

② اللہ تعالیٰ نے اس عورت کا نام نہیں لیا جس کے گھر میں یوسف علیہ السلام تھے۔ حق یہی ہے کہ ہم بھی نہ لیں، خصوصاً جب ہمیں اس کا نام کسی صحیح ذریعے سے معلوم ہی نہ ہو اور نام لینے میں کسی گناہ گار خصوصاً عورت کی پردہ دری ہو رہی ہو۔ اس لیے بار بار زلیخا کہنے والے قرآن سے سبق سیکھیں اور اپنے اس رویے کو ترک کریں۔

③ عَنْ نَّفْسِهٖ : قرآن مجید کے بیان کی پاکیزگی ملاحظہ فرمائیے، پوری بات سمجھ میں آ رہی ہے اور کوئی ناشائستہ لفظ بھی استعمال نہیں ہوا۔

④ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ...... : '' غَلَّقَ '' باب تفعیل میں سے ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''دروازے اچھی طرح بند کر لیے'' کیا ہے۔ ''هَيْتَ لَكَ'' اسم فعل ہے جس کا معنی ہے ''آ، جلدی کر۔'' ''لَكَ'' خطاب کی صراحت کے لیے ہے، جیسے کہتے ہیں: ''شُكْرًا لَكَ، سَقْيًا لَكَ '' اہل علم فرماتے ہیں کہ اس وقت یوسف علیہ السلام کو گناہ پر آمادہ کرنے والی ہر چیز موجود تھی اور روکنے والی دنیا کی کوئی چیز نہ تھی۔ یوسف علیہ السلام کی صحت، جوانی، قوت، خلوت، فریق ثانی کا حسن، پیش کش، اس پر اصرار، غرض ہر چیز ہی بہکا دینے والی تھی، جب کہ انسان کو روکنے والی چیز اس کی اپنی جسمانی یا جنسی کمزوری ہو سکتی ہے، یا فریق ثانی کے حسن کی کمی، یا اس کی طرف سے انکار یا مزاحمت کا امکان یا راز فاش ہونے کا خطرہ یا اپنے خاندان، قوم اور لوگوں میں رسوائی کا خوف، ان میں سے کوئی چیز ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔ اٹھتی جوانی تھی، بے مثال حسن تھا، دروازے بند تھے، دوسری طرف سے پیش کش بلکہ درخواست اور اس پر اصرار تھا، اپنے وطن سے دور تھے کہ قبیلے یا قوم میں رسوائی کا ڈر ہو۔ یہاں کتنے ہی لوگ باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو اپنوں سے دور ہونے کی وجہ سے بہک جاتے ہیں، پھر دروازے خوب بند تھے، راز فاش ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی اور جب مالکہ خود کہہ رہی ہو تو سزا کا کیا خوف؟

⑤ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ : یوسف علیہ السلام کے سامنے جب بچنے کی کوئی راہ نہ رہی تو انھوں نے اس ذات پاک کی پناہ مانگی جس کی پناہ ملنے کے بعد کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ''مَعَاذَ'' مصدر میمی ہے، معنی ہے ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مَعَاذًا مِمَّا تُرِيْدِيْنَ'' یعنی تم جو چاہتی ہو میں اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے کر اس سے بچا لے۔

⑥ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور مفسرین میں سے ہر ایک نے اپنے ذوق کے مطابق کسی ایک معنی کو ترجیح دی ہے۔ ایک تو یہ کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، بے شک وہ اللہ میرا مالک ہے، اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا، اس

وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ

اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی۔ اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک

کی نافرمانی کر کے میں ظالموں میں شامل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا معنی ہے کہ میں اس کام سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، تم اس عزیز مصر کی بیوی ہو جو میرا مالک ہے، میں اس کا غلام ہوں، اس نے میرے لیے رہنے کا ایسا اچھا انتظام کیا ہے، میں اپنے مالک کی خیانت کیسے کر سکتا ہوں، یہ تو سراسر ظلم ہے۔ پہلے معنی میں عزیز کی بیوی کو اللہ سے ڈرایا اور اس کے احسان یاد دلائے ہیں، دوسرے معنی میں اسے خاوند کی شرم دلائی ہے، شاید اس طرح ہی وہ باز آ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں معنی درست ہیں، دونوں بیک وقت مراد بھی ہو سکتے ہیں، مگر دوسرا معنی زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کی تقدیر پر شاکر ہو کر اپنے آپ کو عزیز مصر کا غلام سمجھتے تھے اور ہر طرح اس کی خدمت اور اطاعت کرتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے مالک اور مربی کے احسان کا بدلہ اس پر ظلم کے ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے اور لفظ "رب" غلام کے مالک کے لیے یوسف علیہ السلام کی زبانی اسی سورت میں کئی جگہ آیا ہے، فرمایا: ﴿ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ ﴾ [ یوسف : ۵۰ ] اور فرمایا: ﴿ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ﴾ [ یوسف : ۴۱ ] اور فرمایا: ﴿ اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ ﴾ [ یوسف : ۴۲ ]

⑦ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ : یعنی زنا ظلم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔ زنا اپنے آپ پر ظلم ہے، اس عورت پر ظلم ہے، اس کے خاوند پر ظلم ہے، اپنے خاندان اور اس کے خاوند کے خاندان دونوں پر ظلم ہے کہ کسی خاندان کا بچہ دوسرے خاندان کا بچہ شمار ہوگا، نسب برباد ہوگا۔ زنا پوری انسانیت پر ظلم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ۳۲ ] "اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔" یعنی زنا بے حیائی ہونے کے ساتھ ایک برا راستہ ہے جو آج تمھیں دوسرے کی عزت برباد کرنے کے لیے لے گیا ہے تو کل کسی کو تمھارے گھر بھی لے آئے گا، مثلاً شریعت نے جب آپ کو چوری سے روکا ہے تو اس نے صرف آپ کو نہیں روکا بلکہ کروڑوں، اربوں کو آپ کی چوری کرنے سے روکا ہے۔ اگر آپ باز نہ آئے تو دوسرے کیوں باز آئیں گے؟ مسلمانوں کے نسب کے محفوظ رہنے اور ان کے معاشرے کی پاکیزگی پر کفار کو بے حد حسد ہے۔ وہ اس شرف سے محروم ہو جانے کے بعد اب ہم میں بھی بے حیائی پھیلا کر ہمیں اس شرف سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کا طرز عمل اس معاملے میں ہمارے لیے بہترین چراغ راہ ہے۔

**آیت 24** ① وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا : عزیز کی بیوی کا یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادۂ بدی تو "لام" اور "قَدْ" سے (جو دونوں تحقیق کے لیے بمعنی قسم آتے ہیں) بلکہ سارے واقعہ ہی سے ظاہر ہے، البتہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا یا نہیں، اس میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جس طرح روزہ دار کو ٹھنڈا پانی دیکھ کر اس کی رغبت ہوتی ہے مگر وہ

وَ الْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا۔﴿۲۴﴾

روزے کی وجہ سے اس پر قابو پالیتا ہے اور یہ ایک طبعی چیز ہے۔ اس قسم کا خیال یوسف علیہ السلام کے دل میں آ گیا ہو تو کچھ بعید نہیں مگر "بُرْهَانَ رَبِّهٖ" دیکھنے کی برکت سے یوسف علیہ السلام نے اسے جھٹک دیا۔ مگر دوسری تفسیر جس پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے، وہ یہی ہے جو ترجمے سے ظاہر ہے اور قرآن مجید میں "لَوْلَاۤ" شرط کی جزا اس سے پہلے آنے کی مثال بھی موجود ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے متعلق فرمایا: ﴿اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ [ القصص: ۱۰ ] "بے شک وہ قریب تھی کہ اسے ظاہر کر ہی دیتی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے اس کے دل پر بند باندھ دیا تھا۔" اگر یوسف علیہ السلام ارادہ کر چکے ہوتے اور برہانِ رب کے ذریعے سے ان کو ہٹایا جاتا تو آیت کے الفاظ یہ نہ ہوتے: ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ﴾ "اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں" بلکہ یہ ہوتے: "كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَهٗ عَنِ السُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ" کہ اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اسے برائی اور بے حیائی سے ہٹا دیں۔ پھر اس واقعہ سے تعلق رکھنے والے ہر شخص نے جس طرح یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کی شہادت دی اس کا تقاضا بھی یہی ہے، مثلاً ① خود اللہ تعالیٰ: ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ﴾ ② یوسف علیہ السلام: ﴿هِيَ رَاوَدَتْنِيْ﴾ ③ شاہد "قمیص کا معائنہ" ④ عزیز مصر: ﴿اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ﴾ ⑤ شاہ مصر: ﴿اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ﴾ ⑥ زنانِ مصر: ﴿مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ ⑦ اور خود عزیز کی بیوی: ﴿وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ⑧ خود یوسف علیہ السلام نے بعد میں فرمایا: ﴿وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ﴾ کہ اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، یہ صریح دلیل ہے کہ وہ مائل نہیں ہوئے تھے۔ سب کی شہادتیں ہمارے سامنے ہیں۔ رہے وہ مفسرین جو یوسف علیہ السلام کو بلا دلیل گناہ کے عین کنارے پر پہنچا کر پیچھے ہٹاتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کو خود جواب دہ ہوں گے اور جو مفسرین ان بند دروازوں میں ہونے والی گفتگو بھی بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں وہ شاید وہاں چھپ کر سنتے رہے ہوں گے، یا ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحی آئی ہوگی، کیونکہ قرآن وحدیث اور عقل وفطرت میں سے تو کوئی چیز ان مکالموں کی تائید نہیں کرتی۔

② لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ : وہ رب کی دلیل کیا تھی؟ اس کی تعیین میں رسول اللہ ﷺ سے صحت کے ساتھ کوئی چیز ثابت نہیں ہے، البتہ مفسرین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں جو محض اقوال ہیں۔ ہمارے استاذ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کے اخلاق کی بلندی اس کی اجازت نہ دیتی ہو کہ زنا جیسے برے کام پر آمادہ ہوں اور اسی کو یہاں "بُرْهَانَ رَبِّهٖ" سے تعبیر فرمایا ہو۔"

③ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ : "اَلْمُخْلِصِيْنَ" لام کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اخلاص والے، نیک بخت بندے مراد ہوں گے اور "الْمُخْلَصِيْنَ" لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا وہ جنھیں چن لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے۔

وَ اسۡتَبَقَا الۡبَابَ وَ قَدَّتۡ قَمِيۡصَهٗ مِنۡ دُبُرٍ وَّ اَلۡفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الۡبَابِ ؕ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ يُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۲۵﴾

اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے اس کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے کے پاس پایا، اس عورت نے کہا کیا جزا ہے اس کی جس نے تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا، سوائے اس کے کہ اسے قید کیا جائے، یا دردناک سزا ہو ﴿۲۵﴾

یہاں لام کے فتحہ کے ساتھ ہے، یعنی وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے چنے جانے کا شرف حاصل ہوا۔ مخلص بندہ ہونا ان دونوں باتوں کی علت ہے کہ یوسف علیہ السلام نے برائی کا ارادہ بھی نہیں کیا اور یہ کہ ہم نے برائی و بے حیائی کو ان سے ہٹا کر رکھا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھے، جن کے متعلق شیطان نے خود اعتراف کیا تھا کہ میں انھیں گمراہ نہیں کر سکوں گا، اس نے کہا تھا: ﴿ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴾ [ الحجر : ۴۰ ] ''مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں۔'' اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی طہارت چار بار بیان کی ہے: ① ''لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ'' ② ''وَالۡفَحۡشَآءَ'' ③ ''اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا'' ④ ''الۡمُخۡلَصِيۡنَ''

**آیت 25** **وَ اسۡتَبَقَا الۡبَابَ** ...... : علماء نے لکھا ہے کہ اس جملے کا تعلق ''وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ......'' کے ساتھ ہے اور ''كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ ......'' درمیان میں جملہ معترضہ ہے جو یوسف علیہ السلام کی پاک بازی کو ثابت کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورت نے زنا کا عزم کیا، مگر یوسف علیہ السلام نے انکار کیا، چنانچہ اسی کشمکش میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، آگے یوسف علیہ السلام اور پیچھے عزیز کی بیوی۔ یوسف علیہ السلام اس لیے کہ جلدی سے دروازہ کھول کر بھاگ جائیں اور عزیز کی بیوی دوڑی کہ پہلے پہنچ کر انھیں دروازہ کھول کر بھاگنے نہ دے۔ یہاں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ دروازے جو عزیز کی بیوی نے بہت اچھی طرح بند کیے جب یوسف علیہ السلام گناہ سے بچنے کے لیے بند دروازوں کی پروا نہ کرتے ہوئے بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے کھولنے میں بھی مدد فرما دی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے پیچھے سے قمیص پکڑی کہ روک لے مگر قمیص پھاڑ کر بھی روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یوسف دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے، ساتھ ہی وہ بھی نکلی تو اچانک دونوں نے اس کے خاوند کو سامنے پایا۔ اب وہ سارا ''عشق حقیقی'' جس کی داستان ہمارے قصہ گو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور اسے ایک رسولِ خدا کا عشق صادق ہونے کی وجہ سے معرفتِ الٰہی کی ایک منزل قرار دیتے ہیں، ایک لحہ میں بہتان کے سانچے میں ڈھل گیا۔ کہنے لگی، اس شخص کی کیا جزا ہے جس نے تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا، سوائے اس کے کہ قید کیا جائے یا دردناک سزا ہو؟ سبحان اللہ! خاوند کو بھڑکانے کے لیے، جو غلام کو ورغلانے والی تھی وہ خاوند کی عفت مآب گھر والی بن گئی، دعویٰ کرنے والی بھی خود ہی بن گئی اور دعویٰ یہ نہیں کہ اس نے کوئی چھیڑ چھاڑ کی یا دست درازی کی

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ

اس (یوسف) نے کہا اسی نے مجھے میرے نفس سے پھسلایا ہے اور اس عورت کے گھر والوں سے ایک گواہ نے گواہی دی اگر اس کی قمیص آگے سے پھاڑی گئی ہو تو عورت نے سچ کہا اور یہ جھوٹوں سے ہے ﴿۲۶﴾ اور اگر اس کی قمیص پیچھے

ہے، بلکہ صرف یہ کہ برائی کا ارادہ کیا ہے، اب کسی کے سینے کے اندر جا کر کون تحقیق کرے کہ ارادہ تھا بھی یا نہیں اور تھا تو کیا تھا؟ پھر اس الزام کے ثبوت کے لیے کوئی گواہ یا قرینہ پیش نہیں کیا، اس کے باوجود خود ہی سزا سنانے والی جج بن گئی کہ اس کے لیے ان دو سزاؤں میں سے ایک کے سوا ہو ہی کیا سکتی ہے؟

آیت 26، 28 ① قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ : یوسف علیہ السلام اب تک خاموش تھے اور انھوں نے خاموش ہی رہنا تھا، کیونکہ اللہ کے بندوں کی صفت پردہ پوشی ہے، مگر تہمت کے بعد خاموش رہنے کا مطلب اس الزام کو قبول کرنا تھا، اس لیے یوسف علیہ السلام نے اپنی صفائی پیش کرنا ضروری سمجھا، فرمایا اسی نے مجھے میرے نفس سے پھسلایا ہے۔

② وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ...... : عزیز مصر اور گھر کے خصوصی افراد دونوں کی بات سن کر پس و پیش میں پڑ گئے کہ کسے سچا کہیں اور کسے جھوٹا؟ کیونکہ وقوعہ کے وقت کوئی شخص پاس موجود ہی نہ تھا۔ ایسے وقت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ موقع دیکھ کر قرائن سے فیصلہ کیا جائے، اسے قرینے کی شہادت بھی کہتے ہیں۔ دیکھا گیا تو عورت کے جسم یا لباس پر دست درازی کا کوئی نشان نہ تھا۔ ہاں، یہ بات سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ یوسف کی قمیص پھٹی ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کے گھر والوں میں سے ایک سمجھ دار آدمی نے فیصلہ کیا (یہاں شہادت کا لفظ قرینے پر فیصلہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے) کہ قمیص کو دیکھ کر فیصلہ کر لو۔ ظاہر ہے کہ اس آدمی نے ابھی تک قمیص دیکھی نہ تھی، ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ قمیص دیکھو کدھر سے پھٹی ہے، بلکہ اس نے ایک مسلمہ قاعدے کے طور پر یہ فیصلہ دیا۔ جب عزیز مصر نے قمیص دیکھی کہ پیچھے سے پھٹی ہے تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور پھر صرف اپنی بیوی ہی نہیں سب عورتوں کے متعلق کہہ دیا کہ یقیناً یہ تمھارے فریب میں سے ایک فریب ہے، یقیناً تم عورتوں کا فریب بہت بڑا ہے۔ یہ شاہد کون تھا؟ مستدرک حاکم اور بعض دوسری کتب میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ان چار بچوں میں سے ایک تھا جنھوں نے گود میں کلام کیا۔ اس حدیث کو بہت سے اصحاب نے صحیح یا حسن کہا ہے، مگر بہت سے اصحاب نے ضعیف بھی کہا ہے۔ جن میں سے شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ سرفہرست ہیں۔ دیکھیے: ”سلسلة الأحاديث الضعيفة (۲/۲۷۱، ح: ۸۸۰)“ پوری بحث وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی ”الجواب الکافی“ میں اسے ضعیف کہا ہے۔ میری دانست میں یہی بات درست ہے کہ وہ ایک سمجھ دار آدمی تھا، کیونکہ ① خود ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ثقہ راویوں کے ساتھ تفسیر طبری میں ہے کہ وہ شاہد داڑھی والا مرد تھا۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود

الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

سے پھاڑی گئی ہو تو عورت نے جھوٹ کہا اور یہ سچوں سے ہے ﴿۲۷﴾ تو جب اس نے اس کی قمیص دیکھی کہ پیچھے سے پھاڑی گئی ہے تو اس نے کہا یقیناً یہ تم عورتوں کے فریب سے ہے، بے شک تم عورتوں کا فریب بہت بڑا ہے ﴿۲۸﴾

ہوتا تو وہ کبھی اس کے خلاف نہ فرماتے، جب کہ ان کا یہ قول صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ ④ اگر دودھ پیتے بچے نے گواہی دی تھی تو یہ معجزہ خود اکیلا ہی یوسف علیہ السلام کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا، اس بچے کو عزیز مصر کی بیوی کا رشتہ دار بتائے جانے کی اور قمیص آگے یا پیچھے سے پھٹی ہونے کی پڑتال کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہمارے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ اگرچہ اس بچے کا بول اٹھنا ہی بہت بڑا تھا، جس نے کلام کرنا سیکھا ہی نہیں، مگر قرآن نے اس پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ قرآن بنیادی طور پر دلیل یا تحقیق اور جستجو کو معیار ماننا یا منوانا چاہتا ہے۔ وہ نری تقدیس پر نہیں، تحقیق پر بنیاد رکھتا ہے۔ چنانچہ بچے نے دلیل اور مشاہدہ کو فیصلے کی بنیاد قرار دیا اور کہا: ''(قمیص) دیکھ لو......'' اگر یہ بات درست مانی جائے تو پھر مریم علیہا السلام کی پاک بازی کے ثبوت کے لیے بچے کے معجزۂ کلام کے سوا تحقیق کی کیا بنیاد تھی؟ اور صحیح بخاری میں مذکور جریج پر جس بچے کا باپ ہونے کا الزام لگا تھا، وہاں صرف اس بچے کے بولنے کے سوا تحقیق کی بنیاد کیا تھی؟ دونوں جگہ بچے کا بولنا ہی کافی دلیل تھا۔
③ یہاں بعض لوگ عورتوں کی مذمت کے طور پر عجیب صغریٰ کبریٰ ملاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کا مکر وفریب شیطان کے مکر وفریب سے بھی بڑا ہے، دلیل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے کید (مکر) کو عظیم قرار دیا، جب کہ شیطان کے کید کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ [النساء: ۷٦] ''بے شک شیطان کی چال (کید) ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے۔'' حالانکہ یہاں سورۂ یوسف میں یہ عزیز مصر کا قول نقل ہوا ہے اور اس نے بھی اپنی بیوی کا جرم ہلکا کرنے کے لیے تمام عورتوں کو اس میں لپیٹ لیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے نقل کر کے اس پر رد نہیں فرمایا، مگر یہ قرآن کا طریقہ نہیں کہ بات سننے والے کی سمجھ میں آ رہی ہو کہ کون کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے تو اس کا رد ضرور ہی کرے۔ پھر دیکھیے حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کا کید (مکر) مردوں کے مقابلے میں عظیم ہے، جب کہ شیطان کا (مکر) اللہ تعالیٰ اور اس کی راہ میں لڑنے والوں کے مقابلے میں ضعیف ہے۔ یہاں قوت وضعف کے فریق ہی الگ الگ ہیں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے فتنے سے ہوشیار رہنے کی تاکید صحیح احادیث سے ثابت ہے، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ» [بخاري، النكاح، باب ما يتقي من شؤم المرأة....: ۵۰۹٦] ''میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑا کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔'' ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ!» [بخاري، الزكوة، باب الزكاة على الأقارب: ۱٤٦۲] ''میں نے عقل اور دین کی ناقص شخصیات میں

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَ اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ۟۠ وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۟

یوسف! اس معاملے سے درگزر کر اور (اے عورت!) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی (۲۹) اور شہر میں کچھ عورتوں نے کہا عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس کے نفس سے پھسلاتی ہے، بلاشبہ وہ محبت کی رو سے اس کے دل کے اندر داخل ہو چکا ہے۔ بے شک ہم تو اسے صریح غلطی پر دیکھتی ہیں (۳۰)

سے کسی کو تمھاری کسی ایک سے زیادہ ہوشیار آدمی کی عقل کو لے جانے والا نہیں دیکھا، اے عورتو کی جماعت!'' اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانیوں کے اپنے بادشاہ کی بیٹی کو بادشاہ مقرر کرنے پر فرمایا: «لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً» [ بخاری، المغازی، باب كتاب النبی ﷺ إلى كسرى و قيصر : ٤٤٢٥ ] ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جنھوں نے اپنا امر (سلطنت) کسی عورت کے حوالے کر دیا۔''

**آیت 29** ① **يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا** ...... : عزیز مصر نے حقیقت حال جان لینے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا کہ یوسف! اس معاملے سے درگزر کرو (تاکہ بات نہ پھیلے، بلاشبہ تمھاری سچائی اور پاک بازی ثابت ہو گئی ہے)۔ ادھر اپنی بیوی سے کہا کہ تو اپنے گناہ کے لیے استغفار کر، معافی مانگ، یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی۔ "مُخْطِئٌ" اور "خَاطِئٌ" کا یہی فرق ہے، پہلا وہ شخص ہے جس سے بھول کر خطا ہو جائے نہ کہ دانستہ طور پر اور "خَاطِئٌ" وہ ہے جو جان بوجھ کر غلط کام کرے، جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ﴾ [ القصص : ۸ ] ''بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطا کار تھے۔''

② بظاہر یہ عزیز مصر کا حلم و تحمل ہے، مگر درحقیقت اس سے اس کا بے غیرت اور دیوث ہونا ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اسے معمول کی ایک بات قرار دے کر معاملہ نمٹا دیا۔ نہ بیوی کو کوئی سزا دی اور نہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کا کوئی اہتمام ضروری سمجھا۔ اس سے اس وقت کے مصر کے اونچے طبقے کی اخلاقی حالت معلوم ہوتی ہے جو اب مسلمانوں کے طبقۂ اشراف کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ (الا ما شاء اللہ)

③ **وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ** : اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے لوگوں میں خواہ نیک ہوں یا بد، گناہ اور نیکی کی پہچان پائی جاتی ہے اور ایسی ہستی پر بھی کسی نہ کسی حد تک ایمان پایا جاتا ہے جس کی نافرمانی کے بعد اس سے بخشش مانگنی چاہیے۔

**آیت 30** **وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ** ...... : "نِسْوَةٌ، نِسَاءٌ" اور "نِسْوَانٌ" سب "اِمْرَأَةٌ" کی جمع ہیں، مگر "اِمْرَأَةٌ" لفظ سے نہیں۔ (قاموس) "نِسْوَةٌ" کے "اِمْرَأَةٌ" کی جمع حقیقی نہ ہونے کی وجہ ہی سے فعل "قَالَتْ نِسْوَةٌ" کے بجائے "قَالَ نِسْوَةٌ" آیا ہے، کیونکہ غیر حقیقی جمع ہونے کی صورت میں ایسا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ "نِسَاءٌ" آیا ہے، صرف

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ

تو جب اس عورت نے ان کے فریب کے بارے میں سنا تو ان کی طرف پیغام بھیجا اور ان کے لیے ایک تکیہ دار مجلس تیار کی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی اور کہا ان کے سامنے نکل۔ پھر جب انھوں نے اسے دیکھا تو

اس آیت یا اسی سورت کی آیت (۵۰) میں کل دو مرتبہ " نِسْوَةٌ " آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "نِسْوَةٌ" جمع قلت کا وزن ہے، جو تین سے دس تک استعمال ہوتا ہے، بخلاف " نِسَاءٌ " وغیرہ کے کہ وہ کثرت کے لیے بھی آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عزیز کی بیوی نے چند ایک خاص عورتوں ہی کو اس مجلس کی دعوت دی تھی۔ "شَغَفَهَا" شغاف دل کے پردے کو کہتے ہیں، یعنی دل کے پردے کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ بعض نے شغاف کا معنی ''سویداء القلب'' (دل کا مرکز) بھی کیا ہے۔ ''تُرَاوِدُ فَتٰهَا'' (اپنے غلام کو پھسلاتی ہے) ان عورتوں نے ماضی کا صیغہ " رَاوَدَتْ "(اس نے پھسلایا ہے) کے بجائے مضارع کا صیغہ استعمال کیا کہ وہ اب بھی اس سے باز نہیں آتی، بلکہ پھسلاتی رہتی ہے۔

**آیت 31** **فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ**...... : اس آیت کی تفسیر اکثر بلکہ تقریباً سبھی مفسرین نے یہ کی ہے اور اس کے لیے جس تاویل کی ضرورت پڑی وہ بھی کرتے گئے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب شہر میں اس واقعہ کی شہرت ہوئی تو عورتوں نے طعن و تشنیع اور ملامت کے تیر برسانا شروع کر دیے کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام کو پھسلا رہی ہے اور اس کی اتنی دیوانی ہوگئی ہے جو اس کی حیثیت کے خلاف ہے۔ جب عزیز کی بیوی نے ان کی ملامت کو سنا۔ (قرآن میں لفظ ہے کہ جب اس نے ان کے مکر کو سنا۔ مکر کا سیدھا سا معنی ''فریب، سازش، خفیہ تدبیر'' ہوتا ہے، مگر ہمارے مفسرین نے اسے درست کرنے کے لیے کہا کہ وہ ظاہر تو ملامت کر رہی تھیں مگر حقیقت میں وہ یوسف کا حسن دیکھنا چاہتی تھیں، ان کے مکر سے مراد یہ ہے) خیر جب اس نے ان کی ملامت کو سنا تو اس نے ان کی ملامت کے جواب میں اپنے فعل کا جواز پیش کرنے اور اپنے بے اختیار ہو جانے کے سبب کا مشاہدہ کروانے کے لیے چند خاص عورتوں کو دعوت دی اور ان کے لیے یہ مجلس آراستہ کی۔ اب جب مجلس جوبن پر تھی، چھریوں سے گوشت اور پھل کاٹے جا رہے تھے، تو یوسف علیہ السلام سے کہا، ان کے سامنے آؤ۔ جب انھوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے حسن کو دیکھ کر ایسی بے خود ہوئیں کہ انھیں خیال ہی نہ رہا کہ ہم پھل کاٹ رہی ہیں یا اپنے ہاتھ، وہ انھیں دیکھتی ہی رہ گئیں اور چھریاں ان کے ہاتھوں پر چل گئیں، جس سے انھوں نے اپنے ہاتھ بری طرح کاٹ لیے (**قَطَّعْنَ** باب تفعیل مبالغہ کے لیے ہے) اور محویت میں انھیں درد کا احساس ہی نہیں ہوا اور کہنے لگیں، اللہ کی پناہ یہ کوئی آدمی نہیں، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ (یعنی حسن میں فرشتہ قرار دیا جس طرح بدصورتی میں شیطان کہا جاتا ہے) عزیز کی بیوی نے کہا کہ پھر یہی ہے وہ جس کے متعلق تم نے مجھے ملامت کی ...... عام تفاسیر کا خلاصہ یہ ہے، مگر اصل صورت واقعہ کچھ اور معلوم ہوتی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام بچے تھے، جب وہ ان کے گھر میں غلام کی حیثیت سے آئے تھے۔ غلام کا خدمت کے لیے اپنے آقا سے تعلق رکھنے والے تمام گھروں میں لین دین یا پیغام وغیرہ پہنچانے کے لیے عام آنا جانا ہوتا ہے۔ کئی سال بعد

سِكِّيْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ

اسے بہت بڑا پایا اور انھوں نے اپنے ہاتھ بری طرح کاٹ ڈالے اور کہا اللہ کی پناہ! یہ کوئی آدمی نہیں ہے،

جب وہ پورے جوان ہوئے تو یہ واقعہ پیش آیا۔ اب آیا یہ ممکن ہے کہ اتنے سالوں تک عزیز مصر کی بیوی کی اتنی قریب ترین سہیلیوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا ہی نہ ہو اور عزیز کی بیوی نے انھیں دکھانے کا اہتمام اب ہی کیا ہو؟ میں نے بیسیوں تفسیریں پڑھیں، بڑے بڑے باریک بین اہل علم جن کے علم و فضل کا یہ عاجز دل سے نہایت معترف ہے اور انھی کا خوشہ چین ہے، وہ اس سوال کے پاس سے خاموشی سے گزر گئے ہیں اور حسن یوسف سے بے خودی ہی کو ہاتھ کٹنے کا باعث قرار دیتے چلے گئے ہیں۔ البتہ چند ایک نے اس کی طرف توجہ کی ہے، انھوں نے اس کا جواب یہ تراشا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی ہمیشہ یوسف علیہ السلام کو برقع پہنا کر رکھتی تھی، تاکہ کوئی انھیں دیکھ نہ لے۔ مجھے تعجب ہوا کہ بعض مفسرین نے حسن یوسف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب وہ مصر کی گلیوں میں چلتے تھے تو ان کے چہرے کے حسن اور نور کا عکس دیواروں پر پڑتا تھا۔ اب کہاں برقع اور کہاں دیواروں پر چہرے کے حسن و نور کا عکس پڑنا۔ "ضِدَّانِ مُفْتَرِقَانِ اَیُّ تَفَرُّقٍ" سیدھی سی بات ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے گھر اسی لیے جگہ دی تھی کہ وہ مشورے کی مجلسوں میں خدمت کرنے والے غلام یا عزیز مصر کے بیٹے کی حیثیت سے شریک ہو کر رموز مملکت سیکھیں، فرمایا: ﴿وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ [ یوسف : ۲۱ ] "اور تاکہ ہم اسے باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھائیں۔" اس معاشرے میں مردوں اور عورتوں کا بے پردہ مل کر بیٹھنا معمول کی بات تھی، جس طرح آج کل مسلمانوں کی پارلیمنٹ اور دوسرے اداروں اور گھروں کا حال ہو گیا ہے، غیر مسلموں کا حال تو قابل بیان ہی نہیں۔ ایسے حالات میں اتنے سال تک ان خواتین کو کوشش کے باوجود یوسف علیہ السلام کے دیکھنے کا موقع نہ ملنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اصل بات جو صاف نظر آ رہی ہے، یہ تھی کہ جب ان چند عورتوں تک اندر کی یہ خبر کسی طرح پہنچی تو انھوں نے عزیز کی بیوی پر طعن و ملامت کی کہ اس کی نادانی دیکھو کہ اپنے غلام پر فریفتہ ہو چکی ہے اور اب تک کی مسلسل کوشش اور پھسلانے کے باوجود حصول مقصد میں ناکام ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے حسن کا اور کسی کو اپنا دیوانہ بنانے کی چالوں میں مہارت کا دعویٰ بھی کیا کہ ہمارے پاس وہ مکر ہیں کہ کوئی بھی ہمارے مکر و فریب سے بچ کر نہیں جا سکتا، ایک غلام کی کیا مجال ہے۔ ﴿فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ﴾ تو جب عزیز مصر کی بیوی نے ان کے مکر و فریب اور چالوں کا دعویٰ سنا تو انھیں دعوت دی کہ تم بھی اپنا ہنر آزما دیکھو، اگر وہ کسی ایک کو بھی دل دے بیٹھا تو میرے لیے بھی وجہ جواز بن جائے گی۔ باقاعدہ ان کی چال کی تفصیل سن کر ہر عورت کو دعوت کے لوازمات کے ساتھ خصوصاً ایک ایک چھری بھی دی۔ اب یوسف علیہ السلام عزیز کی بیوی کے کہنے پر شہر کی منتخب حسیناؤں کے سامنے آئے تو ان میں سے ہر ایک نے انھیں اپنے حسن اور ناز و انداز سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ جب کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی تو انھوں نے بے بس عاشقوں کا آخری حربہ آزمایا کہ اگر تم نے ہمارا دل توڑا تو ہم یہ کر لیں گی۔ یہ ایسا مرحلہ ہوتا ہے کہ آدمی رحم کے جذبے کے ہاتھوں پھنس جاتا ہے۔ کئی لڑکیاں اسی طرح برباد ہوئیں اور

مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝۳۱

یہ نہیں ہے مگر کوئی نہایت معزز فرشتہ ۝۳۱

کئی لڑکے بھی۔ ضروری نہیں کہ سب عورتوں نے ایسا کیا ہو، بہرحال ان میں سے کچھ نے اپنے ہاتھ بری طرح زخمی کر کے اپنی خودکشی کی دھمکی دی۔ حسن و جمال کے ساتھ عفت و حیا کے اس پیکر نے اس کی بھی پروا نہ کی تو وہ بولیں، اللہ کی پناہ! اس شخص کے سینے میں آدمی کا دل نہیں، یہ تو ایک معزز فرشتہ ہے، جو عشق و حسن کے فتنوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا، جسے عشق کے معاملات سے کوئی واسطہ ہی نہیں، اس پر ہماری خودکشی کا بھی کیا اثر؟ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

عاشق نہ شدی محنت الفت نہ کشیدی      کس پیش تو از قصۂ ہجراں چہ کشاید

”نہ تو عاشق ہوا، نہ تو نے عشق کی مصیبت اٹھائی۔ تیرے سامنے کوئی جدائی کا قصہ کھول کر کیا سنائے۔“ یہ حقیقت ہے کہ فرشتوں سے تشبیہ پاک بازی میں دی جاتی ہے، حسن میں نہیں، جس طرح ایک اردو شاعر نے ڈینگ ماری ہے ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو      دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اس کی کئی دلیلیں آئندہ آیات میں آ رہی ہیں، میں ان کا ترتیب وار ذکر کرتا ہوں: ① یوسف علیہ السلام نے دعا کی: ﴿ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ ﴾ [ یوسف: ۳۳ ] ”اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ سب مجھے دعوت دے رہی ہیں۔“ معلوم ہوا وہ عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ دعوت گناہ دینے کے لیے آئی تھیں۔ ② یوسف علیہ السلام نے مزید دعا کی: ﴿ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [ یوسف: ۳۳ ] ”اور اگر تو مجھ سے ان کے (مکر) فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں سے ہو جاؤں گا۔“ معلوم ہوا وہ سب عورتیں یوسف علیہ السلام کو اپنے مکر و فریب میں پھنسانے کے لیے آئی تھیں نہ کہ صرف جمال یوسف کے دیدار کے لیے۔ ③ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ﴾ [ یوسف: ۳٤ ] ”تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول فرمائی، اس نے اس (یوسف) سے ان (عورتوں) کا فریب ہٹا دیا۔“ اللہ تعالیٰ نے بھی اس دعوت کی کارروائی کو ان سب عورتوں کا مکر و فریب قرار دیا ہے۔ ④ یوسف علیہ السلام نے جب بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتائی اور بادشاہ نے انھیں بلوایا تو یوسف علیہ السلام نے اس کے قاصد سے کہا کہ اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو: ﴿ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴾ [ یوسف: ٥٠ ] ”ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، یقیناً میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے۔“ یہ آیت خصوصاً قابل غور ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ جہاں بھی عورتوں کے مکر کا ذکر ہے مراد صرف عزیز مصر کی بیوی ہے، دوسری عورتیں چونکہ اس کی ساتھی تھیں، اس لیے ان کا ذکر ساتھ آ گیا۔ اب اس آیت پر غور کریں، عزیز کی بیوی نے تو ہاتھ کاٹے ہی نہیں تھے، وہ تو دوسری ہی عورتوں نے کاٹے تھے، یوسف علیہ السلام ان کے ہاتھ کاٹنے کو ان کا مکر و فریب قرار دے رہے ہیں۔ ⑤ بادشاہ نے ان تمام عورتوں کو بلا کر پوچھا: ﴿ مَا خَطْبُكُنَّ

﴿اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ [ یوسف : ٥١ ] ''تمھارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اس کے نفس سے پھسلایا؟'' معلوم ہوا کہ بادشاہ نے بھی ان کے ہاتھ کاٹنے کو یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال سے بے خود ہو کر ہاتھ کاٹنے کے بجائے اسے ان کی سوچی سمجھی پھسلانے کی سازش قرار دیا۔

اگر کوئی صاحب فرمائیں کہ یہ تفسیر تم نے اپنے پاس سے کی ہے، تو جواب یہ ہے کہ جہاں قرآن و حدیث کی تفسیر کی کوئی نص صریح نہ ہو وہاں قرآن مجید کے عجائبات و نکات قیامت تک ظاہر ہوتے رہیں گے۔ ویسے مجھ سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ نے یہی تفسیر کی ہے، مولانا امین احسن اصلاحی نے (ان کے تفسیر میں منہج کے تفرد سے قطع نظر) یہی تفسیر کی ہے اور تفسیر مواہب الرحمان کے مصنف علامہ امیر علی ملیح آبادی رحمہ اللہ نے دوسری تفسیروں کے ساتھ یہ تفسیر بھی لکھی ہے، ان کے الفاظ ہیں: ''اور شاید کہ (عزیز کی بیوی نے) ان عورتوں سے اپنی مراد کے لیے استعانت چاہی ہو، اس طرح کہ آنحضرت (یوسف) علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ یعنی اپنی پرورش کرنے والے عزیز مصر کی جورو سے بلحاظ مربی ہونے کے یہ کام نہ کریں تو یہ عورتیں طالب ہوں، پھر ان کی تکویث کے بعد کام آسان ہو۔ چنانچہ بعض مفسرین نے قصہ روایت کیا کہ ان عورتوں میں ہر ایک نے زلیخا کی حیلہ گری و اشارہ سے آنحضرت (یوسف) علیہ السلام سے تخلیہ میں یہ خواہش ظاہر کی اور ہر طرح کی زینت و مکر اور لجاجت و حیلہ کا خاتمہ کر دیا تھا اور کلام مابعد میں اس کی طرف اشارہ بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ جب یہ صورت معاملہ نظر آئی تو یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے، یعنی وہی مجھے منظور ہے ﴿مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ﴾ اس کام سے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں۔'' آیت کی یہ تفسیر اور بھی کئی مفسرین نے کی ہو گی مگر مجھے قدیم مفسرین میں سے جن بزرگوں سے یہ تفسیر ملی ہے وہ ہیں سلطان العلماء، شیخ الاسلام عزالدین ابن عبدالسلام رحمہ اللہ، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جس مرض میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے اس مرض کا واقعہ ہے کہ نماز کا وقت ہو گیا، اذان ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر سے کہو وہ نماز پڑھائیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: ''ابوبکر غمگین آدمی ہیں، جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو نماز نہیں پڑھا سکیں گے۔'' آپ نے دوبارہ یہی حکم دیا تو انھوں نے دوبارہ یہی کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری دفعہ یہی حکم دیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوْسُفَ مُرُوْا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ )) [ بخاری، الأذان، باب حد المريض أن يشهد الجماعة : ٦٦٤ ] ''تم یوسف کے ساتھ والیاں ہو، ابوبکر سے کہو نماز پڑھائے۔'' صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت (٦٧٩) میں ہے کہ پہلی دو دفعہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات کہی تھی، تیسری بار ان کے کہنے کے مطابق حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہی تھی۔

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے '' إِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوْسُفَ '' کی شرح عام مفسرین کے مطابق کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے: '' وَ وَقَعَ فِيْ أَمَالِي ابْنِ عَبْدِ السَّلَامِ أَنَّ النِّسْوَةَ أَتَيْنَ امْرَأَةَ الْعَزِيْزِ يُظْهِرْنَ تَعْنِيْفَهَا وَ مَقْصُوْدُهُنَّ فِي الْبَاطِنِ أَنْ يَّدْعُوْنَ يُوْسُفَ إِلٰى أَنْفُسِهِنَّ '' كَذَا قَالَ وَلَيْسَ فِيْ سِيَاقِ الْآيَةِ مَا يُسَاعِدُ مَا قَالَ'' [ فتح الباری ٢/ ١٥٣، ح : ٦٦٥ ] ''ابن عبدالسلام کی امالی میں آیا ہے کہ وہ عورتیں عزیز کی بیوی کے پاس آئیں، وہ ظاہر تو

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

اس عورت نے کہا تو وہ یہی ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے ملامت کی تھی اور بلاشبہ یقیناً میں نے اسے اس کے نفس سے پھسلایا، مگر یہ صاف بچ گیا اور واقعی اگر اس نے وہ نہ کیا جو میں اسے حکم دیتی ہوں تو اسے ضرور ہی قید کیا جائے گا اور یہ ضرور ہی ذلیل ہونے والوں سے ہوگا ﴿۳۲﴾

اس پر طعن و ملامت اور سختی کر رہی تھیں، حالانکہ ان کا مقصود باطن میں یہ تھا کہ وہ یوسف کو اپنی اپنی طرف دعوت دیں۔'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عبد السلام نے ایسے فرمایا، حالانکہ سیاق میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کی تائید کرتی ہو۔''

ظاہر ہے کہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو سلطان العلماء کی بات سے اتفاق نہیں، کیونکہ ان کے خیال میں سیاق ان کی موافقت نہیں کرتا، مگر اس بندۂ عاجز نے سیاق قرآن میں سے پانچ دلیلیں اسی تفسیر کے صحیح ہونے کی بیان کی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ''صَوَاحِبُ يُوْسُفَ'' بھی اس کی تائید کر رہا ہے۔ (واللہ اعلم وعلمہ اتم)

**آیت 32** ❶ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ ...... : ''ذٰلِكُنَّ'' میں اسم اشارہ ''ذَا'' ہی ہے، جس کے ساتھ مخاطب کی ضمیر یہ دیکھ کر لگائی جاتی ہے کہ مخاطب مرد ہے یا عورت، ایک ہے یا دو یا زیادہ، مثلاً آپ ایک شخص سے مخاطب ہیں اور اسے کسی آدمی کی طرف اشارہ کر کے کچھ بتانا چاہتے ہیں تو کہیں گے: ''ذٰلِكَ الرَّجُلُ الْمَذْكُوْرُ'' یہ وہ مذکور آدمی ہے۔ اگر کسی عورت سے بات کر رہے ہوں گے تو کہیں گے: ''ذٰلِكِ الرَّجُلُ الْمَذْكُوْرُ'' یہ وہ مذکور آدمی ہے۔ اگر آپ یہی بات کہنا چاہتے ہوں اور آپ کے مخاطب دو ہوں تو کہیں گے: ''ذٰلِكُمَا الرَّجُلُ الْمَذْكُوْرُ'' یہ وہ مذکور آدمی ہے۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے قید کے دو ساتھیوں سے فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ﴾ [ یوسف: ۳۷ ] ''یہ وہ چیز ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی۔'' یہ معنی نہیں کہ یہ دو چیزیں ہیں۔ زیر تفسیر آیت میں عزیز کی بیوی کی مخاطب کئی عورتیں تھیں، اس لیے اس نے کہا: ﴿ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ﴾ اب ''ذٰلِكُنَّ'' کا معنی یہ سب عورتیں نہیں بلکہ اس کا معنی ہے یہ ہے وہ شخص۔ صرف مخاطب جمع مؤنث ہونے کی وجہ سے ''ذٰلِكُنَّ'' آیا ہے۔ اگر مخاطب بہت سے آدمی ہوتے تو اسی مفہوم کے لیے ''ذٰلِكُمْ'' آتا، جیسے فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ [ البقرۃ: ۵۴ ] ''یہ چیز تمھارے لیے بہتر ہے۔''

❷ ''فَاسْتَعْصَمَ'' سین اور تاء کے اضافے سے طلب کا معنی بھی حاصل ہوتا ہے اور مبالغے کا بھی۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے ''وہ صاف بچ گیا'' یا کہہ لیں 'بالکل بچ گیا'۔ ''لَيُسْجَنَنَّ'' میں نون تاکید ثقیلہ ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے ''اسے ضرور ہی قید کیا جائے گا۔'' ''وَلَيَكُوْنًا'' یہ نون تاکید خفیفہ ہے، جسے عام طور پر لکھا جاتا ہے ''وَلَيَكُوْنَنْ'' مگر عربی رسم الخط وقف کے مطابق ہوتا ہے، چونکہ نون خفیفہ وقف میں الف ہو جاتا ہے، مثلاً یہی لفظ اگر اس پر وقف کریں تو اسے

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ سب مجھے دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں سے ہو جاؤں گا ﴿۳۳﴾

"لَيَكُوْنَنْ" نہیں پڑھا جائے گا بلکہ "لَيَكُوْنًا" الف کے ساتھ پڑھا جائے، اس لیے اس نون کو الف کی شکل میں لکھا جاتا ہے، جیسا کہ "خَبِيْرًا" اور "بَصِيْرًا" وغیرہ میں نون تنوین "خَبِيْرَنْ، بَصِيْرَنْ" کے بجائے الف کی شکل میں ہے کہ وقف نہ ہو تو نون پڑھو، وقف ہو تو الف پڑھو۔ سورۂ علق میں "لَنَسْفَعًا" میں بھی نون تاکید خفیفہ ہے جو الف کی شکل میں لکھا گیا ہے۔
③ بعض مفسرین نے "لَيُسْجَنَنَّ" میں نون تاکید ثقیلہ یعنی تشدید کے ساتھ اور "لَيَكُوْنًا" میں خفیفہ یعنی جزم کے ساتھ ہونے کی توجیہ فرمائی ہے کہ ثقیلہ میں تاکید زیادہ ہوتی ہے، تو عزیز کی بیوی کے خیال میں اس کے لیے یوسف علیہ السلام کو قید کروانا تو یقینی تھا، مگر ان کے ذلیل ہونے کا پورا یقین اسے بھی نہ تھا، بھلا ایسے کریم بن کریم بن کریم کو ذلیل کیا جا سکتا ہے؟ اس لیے اس نے لفظ نرم کر دیا۔

**آیت 33** ① قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ ...... : یوسف علیہ السلام کے لیے یہ سخت امتحان کا وقت تھا، ان کے سامنے ایک طرف معصیت، یعنی اللہ کی نافرمانی ہے جس کے نتیجے میں ان کی ہر طرح ناز برداری ہوتی۔ دوسری طرف مصیبت ہے جو قید کی صورت میں ہے اور عزیز مصر کی بیوی قسم کھا کر (لام تاکید اور نون تاکید قسم کا فائدہ دیتے ہیں) اپنی حکم عدولی کی صورت میں قید کروانے کا عزم ظاہر کر رہی ہے۔ اس امتحان میں اللہ کے خاص بندے کبھی معصیت الٰہی کو ترجیح نہیں دیتے، بلکہ مصیبت قبول کر کے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ : الْإِمَامُ الْعَادِلُ، وَ شَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ رَبِّهِ، وَ رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَ رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلٰى ذٰلِكَ وَ تَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَ رَجُلٌ طَلَبَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَ جَمَالٍ فَقَالَ إِنِّيْ أَخَافُ اللّٰهَ، وَ رَجُلٌ تَصَدَّقَ أَخْفٰى حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهُ، وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ )) [ بخاري، الأذان، باب من جلس في المسجد ينتظر الصلاة ...... : ٦٦٠۔ مسلم : ١٠٣١ ] "سات آدمی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس (کے عرش) کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا: ① عادل حکمران۔ ② وہ نوجوان جس نے اللہ کی عبادت میں نشو و نما پائی۔ ③ وہ آدمی جس کا دل مسجدوں سے اٹکا ہوا ہے۔ ④ وہ دو آدمی جنھوں نے اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کی، اسی پر جمع ہوئے اور اسی محبت پر جدا ہوئے۔ ⑤ وہ آدمی جسے کسی اثر و رسوخ اور حسن و جمال والی عورت نے اپنی طرف بلایا مگر اس نے کہا: میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ⑥ وہ آدمی

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی، پس اس سے ان (عورتوں) کا فریب ہٹا دیا۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۳۴﴾ پھر اس کے بعد کہ وہ کئی نشانیاں دیکھ چکے، ان کے سامنے یہ بات آئی کہ اسے ایک وقت تک ضرور ہی قید کر دیں ﴿۳۵﴾

جس نے صدقہ کیا اور اس قدر چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہوئی کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔ ⑦ وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہ پڑے۔" یا اللہ! تو اپنے فضل سے ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرما۔ (آمین)

② "يَدْعُوْنَنِيْٓ" اور "كَيْدَهُنَّ" (جمع مؤنث کے صیغوں) سے پوری مجلس دعوت گناہ دینے کے لیے آراستہ کرنا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ بالتفصیل اوپر گزرا۔ "اَصْبُ" "صَبَا يَصْبُوْ" سے ہے جس کا معنی مائل ہونا ہے۔ اصل میں "اَصْبُوْ" تھا، "اِلَّا تَصْرِفْ" کا جواب ہونے کی وجہ سے واؤ گر گئی۔ اس آیت سے دو نہایت اہم سبق ملتے ہیں، ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ مدد نہ کرے اور اس کی دستگیری نہ ہو تو کوئی شخص بھی اپنے آپ کو گناہ سے، خصوصاً عورتوں کے فتنے سے نہیں بچا سکتا، دوسرا یہ کہ جب کوئی شخص اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا تو وہ اور جاہل برابر ہیں۔ یہ ہے یوسف علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان، اپنی طہارت اور پاک دامنی کا قطعاً دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اپنے آپ کو حالات کا مقابلہ کرنے سے عاجز قرار دیتے ہوئے یہی فرمایا کہ عفت و پاک دامنی پر ثابت قدم رکھنا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ اگر توفیق نہ دے گا تو میں نفس اور شیطان کے فریب میں آ کر گناہ کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔

**آیت 34** فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ ...... : اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کر کے ان سب عورتوں کا مکر و فریب اس سے ہٹا دیا، چنانچہ اس کے بعد کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی عورت نے انھیں پھسلانے کی کوشش کی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ جمال یوسفی پر ہیبت نبوت کی زرہ ڈال دی گئی، جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی دعوت دینے کی کسی عورت کو کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی، حالانکہ ان کے حسن و جمال کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔

**آیت 35** ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ...... : جب شہر میں ان واقعات کا چرچا ہوا اور عزیز مصر کی بیوی کی محبت میں دیوانگی اور یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر استقامت کی شہرت پھیلی تو اہل حل و عقد اس نتیجے پر پہنچے کہ یوسف علیہ السلام کو ہر صورت کچھ وقت کے لیے قید کر دیں، تاکہ ایک گھر میں رہنے کی وجہ سے میل ملاقات ختم ہو جائے اور آہستہ آہستہ اس واقعہ کی شہرت بھی ختم ہو جائے۔ اس فیصلے سے عزیز مصر پر اس کی بیوی اور دوسری عورتوں کا تسلط اور اس کی بے غیرتی اور دیوثی بھی صاف ظاہر ہوتی

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۳۶﴾

اور قید خانے میں اس کے ساتھ دو جوان داخل ہوئے، دونوں سے ایک نے کہا بے شک میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ کچھ شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا بے شک میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر کچھ روٹی اٹھائے ہوئے ہوں، جس سے پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں اس کی تعبیر بتا۔ بے شک ہم تجھے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں ﴿۳۶﴾

ہے کہ اس نے یوسف علیہ السلام کو تو قید میں ڈال دیا مگر عورتوں سے پوچھا تک نہیں کہ تمھارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ اس سے اس وقت کے معاشرے کی اخلاقی حالت معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں پہلے مغرب کے کفار کا یہ حال تھا اب مسلم ممالک کی اشرافیہ کا یہی رنگ ہے۔ (الا ما شاء اللہ) اور تمام کفار اور ان کے ایجنٹ سب مسلمانوں کو ایسا ہی بے غیرت بنانا چاہتے ہیں۔

اب اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ انھوں نے قید میں ڈالنے کے لیے ان کے کچھ جرائم تجویز کیے، جس طرح حکومتیں فرضی دفعات جرم لگا دیتی ہیں اور انھوں نے عزیز مصر کی بیوی کے الزام (عزیز کے اہل کے ساتھ برائی کے ارادہ) کی حقیقت جاننے کے باوجود اسی کو یوسف علیہ السلام کا جرم قرار دے دیا، یا ویسے ہی خاموشی سے انھیں قید میں ڈال دیا، جس کا لازمی نتیجہ اصل حقیقت نہ جاننے والوں کے لیے یہی تاثر تھا کہ آخر اس معاملے میں یوسف علیہ السلام کا کوئی قصور تو ہوگا جس کی وجہ سے انھیں جیل میں ڈالا گیا۔ یوسف علیہ السلام کو اپنے متعلق اس تاثر سے شدید قلق تھا، اس لیے آگے آپ دیکھیں گے کہ بادشاہ کے اپنے پاس بلانے کے پیغام کے باوجود یوسف علیہ السلام اس وقت تک قید خانے سے نہیں نکلے جب تک تمام متعلقہ عورتوں کو بادشاہ کے پاس حاضر کروا کے ان کی زبانی اپنی بے گناہی کی تصدیق نہیں کروائی۔ ایک مفسر نے لکھا ہے کہ اب اگر حکومت کسی داعی یا خطیب کو حق بیان کرنے کے جرم میں قید کر دے اور پھر اللہ کی مدد سے کوئی حاکم اسے جیل سے نکالنے کا حکم دے تو اسے جیل میں اڑ کر نہیں بیٹھنا چاہیے، کیونکہ اس پر کوئی ایسا الزام نہیں جو اس کی بدنامی کا باعث ہو۔ رہی حق کی دعوت و تبلیغ تو وہ کوئی جرم نہیں بلکہ اس کا فرض ہے جو اس نے بعد میں بھی ادا کرتے رہنا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے احسان، تقویٰ، صبر، وفا، خدمت، پاک بازی، عبادت الٰہی اور دوسری بے شمار خوبیوں کی وجہ سے عزیز مصر کے دل میں ان کی محبت یقیناً موجود تھی جس کی وجہ سے اس نے قید پر اکتفا کیا، ورنہ وہ کسی حیلے سے انھیں غائب بھی کروا سکتا تھا، جیسا بھائیوں نے کیا تھا اور قتل بھی کروا سکتا تھا، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا پہلا منصوبہ تھا، مگر ایک تو یوسف علیہ السلام کا تقویٰ اور صبر تھا اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا جو سب پر غالب ہے۔ جس کی وجہ سے قید ہی کا فیصلہ ہوا جس میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں تھیں۔

**آیت 36** وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ...... : "فَتَيٰنِ" "فَتًى" کی تثنیہ ہے، دو نو جوان، یہ لفظ عام طور پر غلام یا خادم پر

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اس نے کہا تمھارے پاس وہ کھانا نہیں آئے گا جو تمھیں دیا جاتا ہے، مگر میں تمھیں اس کی تعبیر اس سے پہلے بتا دوں گا کہ وہ تمھارے پاس آئے۔ یہ اس میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا۔ بے شک میں نے اس قوم کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے ساتھ بھی کفر کرنے والے ہیں ﴿۳۷﴾

بھی بول لیا جاتا ہے۔ یہ دونوں بادشاہ کے خاص خادم تھے، بہت جلد دونوں یوسف علیہ السلام کے حسن اخلاق سے متاثر اور ان سے مانوس ہو گئے۔ یوسف علیہ السلام کے ہر ایک کی بے لوث خدمت کرنے نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ بندہ ہر ایک کی خیر خواہی اور خدمت کسی بھی معاوضے کی امید یا کسی طمع کے بغیر کرتا ہے، اسی کا نام احسان ہے اور ایسا کرنے والا محسن ہوتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل نے قارون سے کہا تھا: ﴿ وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ [ القصص : ۷۷ ] ”اور احسان کر جیسے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے۔“ اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی نیکی اور ہمدردی کی وجہ سے ایسا شخص خود بخود ہی ہر ایک کی نگاہ میں آ جاتا ہے کہ یہ نیک اور اچھا آدمی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ صفت بطور خاص پائی جاتی تھی، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات مثلاً دوسروں کا بوجھ اٹھانا، مہمان نوازی کرنا، مصیبت میں لوگوں کی مدد کرنا، لوگوں کے لیے ذریعۂ معاش تلاش اور مہیا کرنا، سچ کہنا وغیرہ کی تصدیق ہماری ماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صفات کی تصدیق ابن دغنہ نے کی۔ [ بخاری، الوحي، کیف بدء الوحي : ۳، و مناقب الأنصار، باب ھجرۃ النبي ﷺ...... : ۳۹۰۵ ] یہ لوگ صرف نماز روزے ہی کے نیک نہ تھے، بلکہ اس کے ساتھ لوگوں کے خیر خواہ بھی تھے، یہی بندوں کے ساتھ احسان ہے۔ اب ان دونوں نے خواب دیکھا تو پوری جیل میں ان کی نگاہ صرف یوسف علیہ السلام پر پڑی اور انھوں نے تعبیر کے لیے انھی کو منتخب کرنے کی وجہ بھی صاف لفظوں میں بیان کر دی: ﴿ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیں، کیونکہ بے شک ہم آپ کو احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خواب کی تعبیر بہت اچھی کرتے ہیں، شاید اس سے پہلے بھی یوسف علیہ السلام نے کچھ تعبیریں کی ہوں جو درست نکلی ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ علم خاص طور پر دیا تھا۔ احسان کے یہ دونوں معنی بندوں پر احسان کے ہیں، ایک احسان اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی ہوتا ہے جس کا ذکر حدیث جبریل میں ہے، فرمایا: « اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ » [ بخاری، الإیمان، باب سؤال جبریل النبي ﷺ : ۵۰ ] ”تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھتا ہے۔“ ہو سکتا ہے ان قیدیوں نے یوسف علیہ السلام کی نماز، عبادت اور ذکر الٰہی میں اللہ سے تعلق کو دیکھ کر ان کے محسن اور نیک ہونے کا یقین کر لیا ہو کہ ان کی عبادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص واقعی اس طرح توجہ اور محویت سے عبادت کر رہا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔

آیت 37 ① قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ ......: یوسف علیہ السلام اس سے پہلے بھی اللہ کے دین اور توحید پر قائم تھے، قید میں

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے، ہمارے لیے ممکن ہی نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کے فضل سے ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۳۸﴾

---

اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی کہ دنیا کے معاملات سے فراغت اور خلوت نصیب ہوئی، ذکر و فکر کا موقع زیادہ ملا، کفار کے تعلق سے دل خالی ہوا تو سینہ علم نبوت کے نور سے اور زیادہ روشن ہو گیا۔ اب ان دونوں کو یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھنے کی ضرورت پڑی تو یوسف علیہ السلام نے ضروری سمجھا کہ پہلے انھیں توحید اور آخرت پر ایمان کی دعوت دیں، بعد میں خواب کی تعبیر بتائیں، اس لیے ان سے بات کا کچھ وقت لے لیا، مگر ساتھ ہی ان کی تسلی کر دی تاکہ وہ گھبرا نہ جائیں، کہا کہ کھانا جو تمھیں دیا جاتا ہے، اس کے آنے سے پہلے پہلے میں تمھیں ہر حال میں تعبیر بتا دوں گا۔ کھانا آنے سے پہلے پہلے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کا وقت قریب ہی تھا۔

❷ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ...... : "ذٰلِكُمَا" کی تفسیر کے لیے دیکھیں آیت (۳۲) یعنی خواب کی تعبیر ان علوم میں سے ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے سکھائے ہیں، مثلاً شریعت، حکمت، معیشت، امانت وغیرہ۔ مطلب یہ کہ میں تعبیر اندازے اور انکل سے نہیں بلکہ حقیقی علم کے ساتھ کروں گا۔ مصر کے کاہن اور درباری مشیر علم تعبیر میں مہارت رکھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو یہ علم خاص طور پر عطا فرمایا، تاکہ وقت آنے پر ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کو عطا کردہ علم میں اور دوسرے کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کے علم میں کیا فرق ہوتا ہے، گویا یہ یوسف علیہ السلام کو عطا کردہ ایک معجزہ بھی تھا۔ یہاں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا تھا کہ یہ علوم جن میں سے علم تعبیر بھی ہے، آپ کو کیسے حاصل ہوئے؟ اس کے جواب میں یوسف علیہ السلام نے اس پورے معاشرے میں سے اپنے پر اس نعمت کے اسباب بیان فرمائے، پھر ان کو نہایت حکیمانہ طریقے سے دعوت توحید دی۔ چنانچہ پہلی بات یہ فرمائی کہ یہ علوم مجھے میرے رب تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں، ("اِنِّیْ تَرَكْتُ" میں "اِنَّ" سبب بیان کرنے کے لیے ہے) اس لیے کہ میں نے ان لوگوں کی ملت اور ان کے دین کو ان میں رہنے اور جوان ہونے کے باوجود چھوڑے رکھا، کبھی اختیار ہی نہیں کیا، جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی وہ منکر ہیں، کیونکہ ایسے لوگ ان علوم کے لائق ہی نہیں ہوتے۔

آیت 38 ❶ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْ ...... : پھر انھیں اپنا اور اپنے آباء کا تعارف کروایا، کیونکہ داعی کی شخصیت بھی دعوت قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا کہ میں نے اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی ملت اور ان کے دین کی پیروی کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم کسی صورت اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک کریں، خواہ وہ آدمی ہو یا فرشتہ، جن ہو یا بھوت پری، بت ہو یا قبر، پتھر ہو یا درخت، چاند سورج ہوں یا ستارے، غرض کسی کو بھی ہم ہرگز اللہ کا شریک نہیں بنا سکتے۔ "مَا كَانَ لَنَاۤ" میں نفی کی "كَانَ" کے ساتھ تاکید کا یہی معنی ہے۔ نیک آباء کی پیروی سعادت ہے،

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا

اے قید خانے کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، نہایت زبردست ہے؟ ﴿۳۹﴾ تم اس کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند ناموں کی، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے بارے

جب کہ گمراہ آبا کی تقلید ضلالت ہے، جیسا کہ ان قیدیوں کو فرمایا: ﴿ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ ﴾ یعنی اللہ کے سوا جس کی بھی تم عبادت کرتے ہو وہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباء نے رکھ لیے ہیں، ایسے آباء کی پیروی گمراہی ہے۔

② ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا ...... : یعنی توحید کی یہ سمجھ عطا کرنا ہم پر اللہ کے بے شمار احسانوں میں سے ایک احسان ہے۔ "وَ عَلَى النَّاسِ" اور لوگوں پر بھی احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے سے ان کو توحید سمجھانے کا انتظام فرمایا، لیکن اکثر لوگ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے۔

**آیت 39** ① يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ: "صَاحِبَيِ" اصل میں "صَاحِبَيْنِ" تھا جو "صَاحِبٌ" (ساتھی) کی تثنیہ ہے۔ "السِّجْنِ" کی طرف مضاف کیا تو نون تثنیہ گر گیا اور یاء کو کسرہ دے کر آگے ملا دیا گیا، یہ یاء متکلم کی نہیں، اس لیے معنی ہے "اے قید خانے کے دو ساتھیو!" یہ الفاظ اکٹھے رہنے کی وجہ سے انس کا بھی اظہار کر رہے ہیں، کیونکہ کوئی قریب ہوتا ہے تو انس ہی سے ہوتا ہے جو دعوت کے لیے ضروری ہے، مگر درحقیقت ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کا بھی کہ ہم تم قید خانے میں اکٹھے رہنے والے ساتھی ہیں، اس کے باوجود اصل ساتھی نہیں، کیونکہ وہ تعلق صرف ایمان والوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

② ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ ...... : مصر کے لوگوں کا دین اکثر زمانوں میں شرک یعنی متعدد معبودوں کی عبادت ہی رہا ہے، جیسا کہ تاریخ سے اور مصر کے آثار قدیمہ سے ظاہر ہوتا ہے اور اگر وہ بقول شخصے ایک رب کو مانتے بھی تھے تو دوسری تمام مشرک اقوام کی طرح اس کے تحت مختلف کاموں کا اختیار رکھنے والے کئی ارباب کی عبادت بھی کرتے تھے، کیونکہ ان کے ذہن اس شاہی نظام اور اس کے تحت جاگیرداری نظام سے آگے نہیں سوچ سکتے تھے جو ان پر مسلط تھا، جیسا کہ یونانیوں کے پاس ہر کام کی الگ دیوی تھی۔ عراق والے بادشاہ کے ساتھ ساتھ سورج، چاند، ستاروں اور بتوں کی پرستش بھی کرتے تھے، جن سے ابراہیم علیہ السلام کو سابقہ پڑا، اس لیے یوسف علیہ السلام نے سب سے پہلے قید کے ساتھیوں کی عقل کو جھنجوڑتے ہوئے یہی سوال کیا کہ بتاؤ کہ یہ الگ الگ رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو اکیلا ہے اور سب پر غالب اور زبردست ہے، کوئی اس کے آگے دم نہیں مار سکتا، نہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتا ہے؟ مزید دیکھیے سورۂ زمر (۲۹)، انبیاء (۲۲) اور بنی اسرائیل (۴۲) ظاہر ہے کہ عقل اگر درست ہو تو اکیلے، زبردست اور غالب رب ہی کو بہتر قرار دے گی۔

**آیت 40** مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً ...... : ان کے ذہن میں ایک رب اور کئی ارباب کے موازنے کی سوچ ابھارنے کے بعد اب صاف لفظوں میں کئی ارباب کا باطل ہونا بیان فرمایا کہ تم جن معبودوں کی عبادت کرتے ہو حقیقت میں وہ کہیں موجود ہی نہیں ہیں، محض فرضی اور خیالی چیزیں ہیں، جن کے نام تم نے اور تمھارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ حکم تو

لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ﴿ؕ۴۱﴾ وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ﴿ؕ۴۲﴾ ع ۵

کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۴۰﴾ اے قید خانے کے دو ساتھیو! تم میں سے جو ایک ہے سو وہ اپنے مالک کو شراب پلائے گا اور جو دوسرا ہے سو اسے سولی دی جائے گی، پس پرندے اس کے سر میں سے کھائیں گے۔ اس کام کا فیصلہ کر دیا گیا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو ﴿۴۱﴾ اور اس نے اس سے کہا جس کے متعلق اس نے سمجھا تھا کہ وہ دونوں میں سے رہا ہونے والا ہے کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا۔ تو شیطان نے اسے اس کے مالک سے ذکر کرنا بھلا دیا تو وہ کئی سال قید خانے میں رہا ﴿۴۲﴾

---

اللہ کے سوا کسی کا ہے ہی نہیں، نہ قدری حکم نہ شرعی، یعنی نہ کائنات کے نظام میں اس کے سوا کسی کا کوئی حکم چلتا ہے، مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ سورج کو چلنے کا حکم دے اور یہ اسے روک دے، یا وہ کسی کو مارنا چاہے اور یہ اسے مرنے نہ دے اور نہ شریعت اور عبادت میں اس کے سوا کسی کو اپنا حکم چلانے کی اجازت ہے، اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا اور محکم و مضبوط دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، اس لیے وہ شرک کے گورکھ دھندے میں پڑے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی یہ تقریر ملت ابراہیم، یعنی اسلام کی بہترین مختصر ترجمانی ہے۔

**آیت 41** ❶ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ...... : تعبیر بیان کرتے وقت یوسف علیہ السلام کے حسن ادا کو ملاحظہ فرمائیں، ایک تو دونوں میں سے ایک کو متعین کر کے نہیں فرمایا کہ تیرے خواب کا یہ نتیجہ ہے اور تیرے خواب کا یہ، حالانکہ جواب سے ظاہر تھا کہ ساقی نے عہدے پر بحال ہونا ہے اور دوسرے نے سولی چڑھنا ہے، بلکہ فرمایا تم میں سے ایک کی تعبیر یہ ہے اور ایک کی یہ۔ پھر اس بات کو بھی سامنے رکھیے کہ پہلے وہ تعبیر بتائی جو خوش خبری والی تھی، دوسری بعد میں بتائی۔ مقصد یہ تھا کہ دل شکنی میں جتنی بھی دیر ہو سکے کی جائے اور خوشی کی خبر جتنی جلد ہو سکے پہنچائی جائے۔

❷ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ : یعنی یہ فیصلہ ہو چکا جو اب ٹل نہیں سکتا ہے۔ یہاں لفظ "قُضِیَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلی آیت میں جو لفظ "ظَنَّ" آ رہا ہے وہ یہاں یقین کے معنی میں ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ خواب کی تعبیر اجتہادی ظن تھا، لہٰذا یہ ظن اصلی معنی میں ہے۔ (ابن کثیر، روح المعانی) موضح میں ہے: "ظَنَّ" فرمایا، معلوم ہوا کہ تعبیر خواب یقین نہیں انکل ہے، مگر پیغمبر انکل کرے تو بے شک ہے، یعنی انکل نہیں ہے۔"

**آیت 42** ❶ وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ ......: اس سے معلوم ہوا کہ قید خانے میں رہنا جو بقول بعض زندوں کا قبرستان

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور بادشاہ نے کہا بے شک میں سات موٹی گائیں دیکھتا ہوں، جنھیں سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے اور کچھ دوسرے خشک (دیکھتا ہوں)، اے سردارو! مجھے میرے خواب کے بارے بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر کیا کرتے ہو ﴿۴۳﴾

ہے، کس قدر تکلیف دہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیسے صابر شخص نے اس آدمی سے کہا جس کے متعلق انھوں نے سمجھا تھا کہ وہ رہا ہونے والا ہے کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا کہ کس طرح ایک شخص بلا جرم قید میں بند ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت سے نکلنے کے لیے دنیا کے جو اسباب اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں انھیں اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں، جیسا کہ: ﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ﴾ [ المائدۃ : ۲ ] (نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو) سے ظاہر ہے اور جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [ آل عمران : ۵۲ ] ''اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہیں؟'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے واپسی پر مطعم بن عدی کی طرف پیغام بھیجا، پھر اس کی پناہ میں مکہ میں داخل ہوئے، بلکہ مسلمان کو دنیا کا ہر جائز سبب اختیار کرنا چاہیے، فرمایا: ﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾ [ الأنفال : ۶۰ ] یعنی ان کفار کے لیے جس قدر تمھاری استطاعت ہے تیاری رکھو، البتہ بھروسا اس کے بعد بھی اللہ ہی پر ہوگا۔

② شیطان نے اس ساقی کو اپنے مالک یعنی بادشاہ کے پاس یہ ذکر کرنا بھلا دیا، سو یوسف علیہ السلام کئی سال قید میں رہے۔ شیطان کی آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے دشمنی کا تو قرآن شاہد ہے: ﴿ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [ البقرۃ : ۱۶۸ ] ''بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔'' اور قرآن نے صراحت کی ہے کہ ساقی کو بھلانا شیطان کا کام تھا، اس کے باوجود بعض اہل علم نے ساقی کو بادشاہ کے پاس اپنا ذکر کرنے کے لیے کہنا یوسف علیہ السلام کی عزیمت اور شانِ پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے اور اتنے سال جیل میں رہنے کا باعث یہ قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ یوسف علیہ السلام کا دل اسباب پر نہ ٹھہرے۔ اس سلسلے میں یہ حضرات وہ روایت بھی پیش کرتے ہیں جو ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر یوسف علیہ السلام وہ بات نہ کہتے جو انھوں نے کہی تو اتنی لمبی مدت قید میں نہ رہتے، کیونکہ انھوں نے غیر اللہ کے ہاں سے مصیبت دور کروانا چاہی۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہ روایت نہایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کا راوی سفیان بن وکیع ضعیف ہے اور (اس کا شیخ) ابراہیم بن یزید (الجوزی) اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔''

③ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ : '' بِضْعَ '' کا لفظ تین سے لے کر نو تک کے لیے آتا ہے۔ قرآن و سنت میں اس مدت کی تعیین کہیں نہیں آئی۔ تابعین میں سے کسی نے سات سال کہا، کسی نے کم و بیش، مگر اب ان سے کون پوچھے کہ آپ کو کس نے یہ مدت بتائی، اگر بنی اسرائیل سے آئی ہے تو اس پر تو اعتبار ممکن نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہم نہ اسے سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔ سو اصل یہی ہے کہ وہ مدت دس سال سے کم تھی اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی تھی۔

آیت 43 ① وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى...... : مصر کے بادشاہ کا یہ خواب اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں یوسف علیہ السلام کی قید سے

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَ قَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

انھوں نے کہا یہ خوابوں کی پریشان باتیں ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر بالکل جاننے والے نہیں ﴿۴۴﴾ اور ان دونوں میں سے جو رہا ہوا تھا اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا میں تمھیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں، سو مجھے بھیجو ﴿۴۵﴾

عزت و تکریم کے ساتھ رہائی کا سبب تھا، اس خواب نے شاہِ مصر کو نہایت خوف زدہ اور پریشان کر دیا، چنانچہ اس نے اپنے علم تعبیر کے تمام ماہروں اور سب سرداروں کو جمع کر کے خواب سنایا اور تعبیر کی فرمائش کی۔

② یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْیَایَ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بھی فتویٰ کا حکم رکھتی ہے، جس طرح فتویٰ علم کے بغیر جائز نہیں، خواب کی تعبیر کا بھی اگر فی الواقع علم ہو تو بتانی چاہیے، ورنہ علم کے بغیر تعبیر کرنے والے اس حدیث کے مصداق ہوں گے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَ أَضَلُّوْا )) [ بخاری، العلم، باب کیف یقبض العلم: ۱۰۰ ] ”اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح قبض نہیں کرے گا کہ اسے علماء کے سینے سے نکال لے، بلکہ علم کو علماء کے فوت کر لینے کے ساتھ قبض کرے گا، یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو باقی نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہل سردار بنا لیں گے، پھر ان سے سوال کیے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتویٰ دیں گے، سو خود گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو گمراہ کریں گے۔“ اس حدیث سے تک بندی اور انگل پچو سے تعبیر بتانے والے اپنا انجام سوچ لیں۔

③ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے درباریوں سے امید نہ تھی کہ وہ اس خواب کی تعبیر کر سکیں گے، اسی لیے کہا: ”اگر تم خواب کی تعبیر کیا کرتے ہو۔“

**آیت 44** قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ...... : ”اَضْغَاثٌ“ ”ضِغْثٌ“ کی جمع ہے، آپ گھاس کا ایک مٹھا اکھاڑیں، اس میں ملا جلا جو کچھ ہاتھ میں آئے اسے ”ضِغْثٌ“ کہتے ہیں، یعنی یہ خوابوں کی ملی جلی پریشان باتیں ہیں، کوئی مرتب یا واضح خواب نہیں اور ایسے خوابوں کی تعبیر ہم نہیں جانتے۔ علم تعبیر میں مہارت کے دعووں کو قائم رکھنے کے لیے انھوں نے خواب ہی کو پریشان خیالوں کا مجموعہ قرار دے دیا، جیسا کہ کہاوت ہے ”ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔“

**آیت 45** وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ ...... : ”اِدَّكَرَ“ ”ذَكَرَ يَذْكُرُ“ (ن) سے باب افتعال ہے، اصل میں ”اِذْتَكَرَ“ تھا، پھر افتعال کی تاء کو دال اور اس کے ساتھ ہی ذال کو بھی دال میں بدل کر ”اِدَّكَرَ“ کر دیا، بمعنی یاد کیا۔ ”اُمَّةٍ“ کے کئی معانی ہیں جن میں سے ایک معنی مدت بھی ہے، تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اس وقت ساقی کو جس نے یوسف علیہ السلام کی تعبیر کے بعد قید سے رہائی پائی تھی اور یوسف علیہ السلام کے کہنے کے باوجود سرے سے ان کی بات بھول چکا تھا، اتنی لمبی مدت کے بعد یوسف علیہ السلام اور ان کی علم تعبیر میں مہارت یاد آئی اور اس نے کہا میں تمھیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں، آپ مجھے بھیجیں، چنانچہ

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

یوسف! اے نہایت سچے! ہمیں سات موٹی گائیوں کی تعبیر بتا، جنھیں سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشوں اور دوسرے خشک خوشوں کی بھی، تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں، تاکہ وہ جان لیں ﴿۴۶﴾

اسے اجازت مل گئی اور وہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا۔

② اس ساقی کے رویے سے سرکاری و درباری کارندوں کے کردار پر بھی بڑی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ہمیشہ کریڈٹ کے چکر میں رہتے ہیں۔ (الا ماشاء اللہ) اس کا یہ کہنا حقیقت سے کس قدر دور تھا کہ میں تمھیں تعبیر بتاتا ہوں، اس کا حق تھا کہ اپنے محسن کا ذکر کرتا، انھیں عزت سے بلواتا اور بادشاہ سے درخواست کرتا کہ ان سے تعبیر پوچھیں، مگر وہ اس چکر ہی سے نہیں نکلا کہ ”میں تمھیں بتاتا ہوں۔“ کتنے ہی سرکاری افسر اور سرمایہ دار ہیں جو دوسروں کی علمی محنت کو اپنے نام لگا کر ڈگریاں حاصل کرتے یا اپنی علمی شان کا سکہ جماتے ہیں، مگر یہ سب بے چارے اسی مرض کے مریض ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بعض اہل کتاب کا بتایا ہے:
﴿ وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [ آل عمران : ۱۸۸ ]
”اور وہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ان (کاموں) پر کی جائے جو انھوں نے نہیں کیے، پس تو انھیں عذاب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہرگز خیال نہ کر اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

آیت 46 ① يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ...... : ”يُوْسُفُ“ سے پہلے حرف ندا ”یا“ وغیرہ محذوف ہے، جس کی وجہ سے یہ مبنی علی الضم ہے۔ ”الصِّدِّيْقُ“ ”صدق“ کے اسم فاعل میں مبالغہ ہے جو ہر حال میں اپنے قول، فعل اور حال کا سچا ہو، جس کی عادت ہی ہر حال میں سچ ہو، اس کا قول سچ ہو اور اس کا فعل اور حال بھی اس کے مطابق ہو۔ صدیقیت کے کئی درجے ہیں، مومن بھی صدیق ہے بمقابلہ کافر (دیکھیے حدید : ۱۹) اور ابوبکر بھی صدیق ہیں اور امت میں اس درجے کا کوئی صدیق نہیں۔ ابراہیم اور ادریس علیہما السلام کے بارے میں سورۂ مریم (۴۱، ۵۶) میں ”صِدِّيْقًا نَّبِيًّا“ آتا ہے، یوسف علیہ السلام بھی صدیق ہیں۔ ساقی کو ان کا صدیق ہونا تعبیر سے پہلے بھی مشاہدے سے ثابت ہو چکا تھا، اسی لیے انھوں نے کہا: ﴿ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [ یوسف : ۳۶ ] پھر تعبیر کے بعد عین اسی طرح واقع ہونے سے ان کے صدیق ہونے کی مزید تصدیق ہو گئی۔

② یہاں ساقی کا رویہ دیکھیں کہ اس کی طرف سے بھول جانے کی معذرت کا کوئی ذکر نہیں اور یوسف علیہ السلام کے سینے کی وسعت دیکھیں، پوچھا ہی نہیں کہ تمھیں اتنی دیر یوسف صدیق یاد نہ آیا، اب کیا لینے آئے ہو۔ غرض کے بندوں اور محسنین کا یہی فرق ہے۔

③ ساقی نے خواب دیکھنے والے کا ذکر نہیں کیا، البتہ خواب عین انھی الفاظ میں بیان کیا جو بادشاہ کے تھے، کیونکہ ایک لفظ کے فرق سے بھی مطلب کچھ اور بن جاتا ہے۔ قرآن میں دونوں جگہ خشک گائیوں کے موٹی گائیوں کو کھانے کا ذکر تو ہے مگر خشک خوشوں کے سبز خوشوں پر لپٹنے کا ذکر مفسرین نے کہاں سے لیا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ساقی نے درخواست کی کہ آپ

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اس نے کہا تم سات سال پے در پے کاشت کرو گے تو جو کاٹو اسے اس کے خوشے میں رہنے دو، مگر تھوڑا سا وہ جو تم کھالو ﴿۴۷﴾ پھر اس کے بعد بہت سخت سات برس آئیں گے، جو کھا جائیں گے جو کچھ تم نے ان کے لیے پہلے رکھا ہوگا مگر تھوڑا سا وہ جو تم محفوظ رکھو گے ﴿۴۸﴾ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر بارش ہوگی اور وہ اس میں نچوڑیں گے ﴿۴۹﴾

---

ہمیں اس خواب کے بارے میں فتویٰ دیں (تعبیر بتائیں) لوگ منتظر ہیں، تاکہ میں جا کر انھیں بتاؤں اور وہ بھی جان لیں۔

**آیت 47** ① قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ......: "دَاَبًا" "تَزْرَعُوْنَ" کی ضمیر سے حال ہے، یعنی "دَائِبِيْنَ" مسلسل پے در پے محنت سے کاشت کرنے والے۔ یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے ساتھ ہی حل بھی بتایا۔ یہاں "تَزْرَعُوْنَ" بمعنی "اِزْرَعُوْا" ہے، یعنی "سات سال مسلسل محنت سے کاشت کرو" کیونکہ آگے آ رہا ہے کہ جو کچھ کاٹو اسے سٹوں میں رہنے دو۔ زیادہ تاکید کرنی ہو تو امر کو مضارع کی صورت میں لاتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [ البقرۃ : ۸۳ ] "اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے۔" آج سے ہزاروں سال پہلے یوسف علیہ السلام نے گندم کو گھن، سسری اور کیڑے وغیرہ سے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ بتایا، جدید ترین تحقیقین بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

② اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ: یعنی خوشوں سے صرف اتنی گندم صاف کرو جو کھانی ہے اور وہ بھی کم از کم، تاکہ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہ سکے اور ان سات سالوں میں آدمیوں کے علاوہ بھس بھی جانوروں کے کام آ سکے۔ کم کھانے کی تاکید پر طب اور شرع دونوں متفق ہیں۔ اس کی حد ہمارے رسول کریم ﷺ نے تو چند لقمے بیان فرمائی، فرمایا: (( فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهٖ وَثُلُثٌ لِشَرَابِهٖ وَثُلُثٌ لِنَفَسِهٖ )) [ ترمذی، الزھد، باب ما جاء في كراهية كثرة الأكل : ۲۳۸۰، و صححه الألباني ] "اگر ضرور ہی زیادہ کھانا ہو تو پیٹ کا ایک حصہ کھانے، ایک پینے اور ایک سانس کے لیے رکھو۔"

**آیت 48** ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ ......: "تُحْصِنُوْنَ" "حِصْنٌ" قلعے کو کہتے ہیں، مراد حفاظت سے رکھنا ہے، یعنی خوش حالی کے سات سالوں کا ذخیرہ تم لوگ قحط کے سات سالوں میں چٹ کر جاؤ گے، مگر وہ تھوڑا سا جو تم آئندہ سال کے بیج کے لیے بڑی محنت سے بچا کر محفوظ رکھو گے۔

**آیت 49** ① ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ ......: "يُغَاثُ" "غَيْثٌ" سے بھی ہو سکتا ہے اور "غَوْثٌ" سے بھی۔ "غَيْثٌ" سے ہو تو بارش برسائے جائیں گے اور "غَوْثٌ" سے ہو تو مدد کیے جائیں گے۔ "يَعْصِرُوْنَ" "نچوڑیں گے" یعنی اس سال

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۰

اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ، تو جب قاصد اس کے پاس آیا تو اس نے کہا اپنے مالک کے پاس واپس جا، پھر اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، یقیناً میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے ۝۵۰

---

وہ پھل جن سے رس نکلتا ہے، مثلاً انگور، لیموں وغیرہ اور وہ بیج جن سے تیل نکلتا ہے، مثلاً زیتون، سرسوں وغیرہ کثرت سے پیدا ہوں گے اور جانور بھی اچھا چارا ملنے کی وجہ سے خوب دودھ دیں گے۔ اس بنا پر بعض نے "يَعْصِرُوْنَ" کے معنی "يَحْلِبُوْنَ" (دودھ دوہیں گے) کیے ہیں۔ یہ بات کہ قحط کے سات سالوں کے بعد ایک خوش حالی کا سال آئے گا، خواب سے زائد بتائی، یا تو وحی الٰہی کے ذریعے سے، یا خشک سالوں کی گنتی سات ہونے سے استدلال فرمایا کہ وہ سات تبھی رہتے ہیں جب ان کے بعد کم از کم ایک خوش حالی کا سال ہو اور اس سے بھی کہ اللہ کی رحمت کا تقاضا بھی شدت کے بعد آسانی کا ہے۔

② اس سے معلوم ہوا کہ کبھی کافر کا خواب بھی سچا ہوتا ہے، اگر بادشاہ کا کافر ہونا ثابت ہو۔ اس سے پہلے دونوں قیدی جو مشرک تھے، ان کے خواب بھی سچے نکلے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی " كِتَابُ التَّعْبِيْرِ " میں اس سے یہ استدلال فرمایا ہے: " بَابُ رُؤْيَا أَهْلِ السُّجُوْنِ وَالْفَسَادِ وَالشِّرْكِ " "قیدیوں اور اہل شرک وفساد کے خواب کا بیان۔"

**آیت 50** ① وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ : یعنی جب ساقی نے جا کر تعبیر بتائی تو بادشاہ نے کہا: "اسے میرے پاس لاؤ" اس سے علم کی فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ حسن بے مثال قید اور مصیبت کا باعث بنا اور علم رہائی کا۔ دنیا میں جب یہ حال ہے تو آخرت میں علم نافع کی برکتوں کا آپ خود اندازہ فرما لیں۔

② قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ ...... : یوسف علیہ السلام نے قید سے نکل کر قاصد کے ساتھ جانے کے بجائے مطالبہ کیا کہ واپس جاؤ اور بادشاہ سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، یقیناً میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کا خیال تھا کہ شاید بادشاہ کو میرے قید میں بھیجے جانے یا عورتوں کے فریب کے معاملے کا علم ہی نہ ہو، دوسرے وزیروں نے از خود ہی یہ سب کچھ کیا ہو، یا اگر علم ہو تو جس طرح بدنام کر کے قید کیا گیا اسی کے مطابق علم ہو۔ اسی طرح عام لوگوں میں بھی ممکن ہے کچھ لوگ ان کا قصور سمجھتے ہوں، اس لیے انھوں نے جب تک تحقیق کے ساتھ تہمت سے ہر طرح صفائی نہ ہو، قید سے نکلنے سے انکار کر دیا۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف فرمائی، چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ ثُمَّ أَتَانِي الدَّاعِيْ لَأَجَبْتُهُ )) [ بخاري، التعبير، باب رؤيا أهل السجون والفساد والشرك : ۶۹۹۲ ] "اگر میں اتنی مدت قید خانے میں رہتا جتنی مدت یوسف علیہ السلام رہے، پھر میرے پاس بلانے والا آتا تو میں ضرور اس کی دعوت قبول کرتا۔"

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ

اس نے کہا تمھارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اس کے نفس سے پھسلایا؟ انھوں نے کہا اللہ کی پناہ! ہم نے اس پر کوئی برائی معلوم نہیں کی۔ عزیز کی بیوی نے کہا اب حق خوب ظاہر ہوگیا، میں نے ہی اسے اس کے نفس سے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً سچوں سے ہے ﴿۵۱﴾ یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ میں نے عدم موجودگی میں اس کی

---

③ یوسف علیہ السلام نے جو مطالبہ کیا کہ ''بادشاہ سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کا یہ فعل (عزیز کی بیوی ہاتھ کاٹنے والیوں میں شامل نہیں تھی) یوسف علیہ السلام کے حسن سے بے خود ہو کر بے اختیاری میں نہیں ہوا، بلکہ یہ باقاعدہ ان کی سازش اور فریب تھا، جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔

**آیت 51** قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ ...... : بادشاہ نے ان تمام خواتین کو طلب کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں وہ معاملے کی پوری تحقیق کر چکا تھا اور یوسف کی بے گناہی اور عورتوں کے فریب سے آگاہ ہو چکا تھا، اس لیے اس نے یہ نہیں کہا کہ تمھارا قصور تھا یا یوسف کا، بلکہ ان سے پہلا سوال ہی یہ کیا کہ جب تم نے یوسف علیہ السلام کو اس کے نفس سے پھسلایا تھا، تمھارے اس معاملے کی حقیقت کیا تھی؟ یعنی آخر اس کا کیا جرم تھا جس کی وجہ سے اسے اتنی دیر قید خانے میں رکھا گیا؟ وہ سب بیک زبان بولیں: ''اللہ کی پناہ! ہم نے اس پر کوئی برائی معلوم نہیں کی۔'' ہاتھ کاٹنے والیوں نے جب یوسف علیہ السلام کو کسی بھی قسم کی برائی سے پاک قرار دیا تو ہاتھ نہ کاٹنے والی عزیز مصر کی بیوی کو بھی بولنا پڑا، اس نے کہا، اب تو حق بالکل ظاہر ہو گیا، میں نے ہی اسے اس کے نفس سے پھسلایا تھا اور یقیناً وہ سچوں سے ہے۔

**آیت 52** ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ...... : عزیز مصر کی بیوی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں یہ اعتراف اس لیے کر رہی ہوں کہ اس کو (میرے خاوند کو) معلوم ہو جائے کہ اس کی عدم موجودگی میں میں نے فی الواقع اس کی خیانت نہیں کی اور نہ بڑی برائی واقع ہوئی ہے، ہاں، میں نے اس جوان کو پھسلایا تھا، مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس لیے میں اعتراف کر رہی ہوں، تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ میں نے بڑی خیانت کا ارتکاب نہیں کیا اور اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا۔ ہاں، میں اپنے آپ کو بالکل بری بھی نہیں کہتی، کیونکہ نفس برائی کی خواہش کرتا اور اس پر ابھارتا ہے، سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم کرے اور اسے بچا لے، بے شک میرا رب غفور و رحیم ہے۔ جس پر میرا رب رحم کرے، مراد یوسف علیہ السلام ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہی قول زیادہ مشہور اور قصے کے سیاق اور کلام کے معنی و مفہوم کے زیادہ لائق اور مناسب ہے۔'' ماوردی نے اپنی تفسیر میں یہی بیان کیا ہے اور علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی کی تائید کی ہے اور اس پر ایک

كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

خیانت نہیں کی اور یہ کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا ﴿۵۲﴾

مستقل کتاب لکھی ہے۔

بعض اہل علم نے فرمایا کہ یہ قول عزیز کی بیوی ہی کا ہے مگر "لِيَعْلَمَ" سے مراد یہ ہے کہ یوسف کو معلوم ہو جائے، جب کہ وہ قید خانے میں ہے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی، نہ اسے کسی طرح مجرم بنایا ہے، بلکہ اپنی کوتاہی کا ہی اعتراف کیا ہے۔ یہ معنی ایک لحاظ سے زیادہ قریب ہے کہ عزیز کا اس سارے سلسلۂ کلام میں ذکر ہی نہیں۔ البتہ قریب ترین شخص جس کا ذکر اس نے کیا وہ یوسف علیہ السلام ہیں: ﴿ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ ﴾ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کلام ﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ ﴾ یوسف علیہ السلام کا کلام ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے صرف یہی قول بیان کیا ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کے ہر برائی سے پاک ہونے کی شہادت دی اور عزیز کی بیوی نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس معاملے کی تحقیق تک قید خانے سے اس لیے نہیں نکلا تا کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی، ساتھ ہی تواضع کے طور پر فرمایا کہ میں اپنے آپ کو بالکل گناہ سے پاک نہیں کہتا، کیونکہ نفس تو یقیناً برائی پر ابھارتا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''پہلا قول (یعنی "الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ" سے "غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" تک یہ سارا کلام عزیز کی بیوی کا ہے) ہی زیادہ قوی اور ظاہر ہے، کیونکہ (ان خواتین اور) عزیز کی بیوی کی ساری گفتگو بادشاہ کی مجلس میں ہوئی ہے اور اس وقت یوسف علیہ السلام وہاں موجود نہیں تھے، بلکہ بادشاہ نے اس کے بعد انھیں بلوایا ہے۔''

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے اعتراف کیا تو ایک شخص نے قید خانے میں جا کر یوسف علیہ السلام کو یہ بات بتائی تو انھوں نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ ...... ﴾ مگر یہ بات ہمارے پاس نہ قرآن مجید میں ہے، نہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اور اگر ان دونوں کے علاوہ اس خبر کا کوئی اور ذریعہ ہے تو اس کے سچ جھوٹ معلوم ہونے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

رہی یہ بات کہ عزیز کی بیوی رب تعالیٰ اور اس کی صفات غفور و رحیم ہونے کا ذکر کیسے کر سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے زمانے کا بادشاہ مصر کے فرعونوں سے پہلے کا ہے اور ساری سورت میں بادشاہ یا اس کے وزراء میں سے کسی کے کفر کی تصریح کہیں نہیں، ہاں عوام میں شرک موجود تھا، جیسا کہ جیل کے خواب دیکھنے والے تھے۔ عزیز مصر نے بھی اپنی بیوی کو گناہ سے استغفار کرنے کی تلقین کی تھی اور ایک مشرک جبار بادشاہ یوسف علیہ السلام جیسے شخص کا کبھی اتنا اکرام و اعزاز نہیں کر سکتا، جس کا کھلم کھلا کہنا ہو کہ میں نے اس قوم کی ملت کو ترک کر رکھا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام میں حسن ظاہر کے استثنا کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے کمالات سے کچھ زیادہ ہی کمالات ہوں گے، مگر اسی مصر کے ایک بادشاہ (فرعون) نے انھیں اور ان کی قوم کو مسلسل عذاب میں رکھا، حتیٰ کہ فرعون کو سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ [ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ أَتَمُّ ]

وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵۳﴾ وَ قَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ ۚ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ الۡیَوۡمَ لَدَیۡنَا مَکِیۡنٌ اَمِیۡنٌ ﴿۵۴﴾

اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے۔ بے شک میرا رب بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۳﴾ اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے لیے خاص الخاص کرلوں، پھر جب اس نے اس سے بات کی تو کہا بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار، امانت دار ہے ﴿۵۴﴾

آیت 53 ❶ وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ...... : یہ عزیز مصر کی بیوی کے کلام کا آخری حصہ ہے۔ گویا عزیز مصر کی بیوی یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اپنے خاوند کی کوئی بڑی خیانت نہیں کی، بے شک میں نے یوسف کو پھسلانا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکی، ہاں میں اپنے آپ کو پاک باز قرار نہیں دیتی، مجھ سے جتنی غلطی ہوئی اس کا اقرار و اعتراف کرتی ہوں، نفس کی شرارتوں سے تو وہی محفوظ رہ سکتا ہے جس پر اللہ کی خاص رحمت ہو (مراد یوسف علیہ السلام ہیں)۔

❷ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اللہ تعالیٰ کو اور اس کی صفات غفور و رحیم کو مانتی تھی اور نیکی اور گناہ کو بھی سمجھتی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کا قول نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو کافرہ تھی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو اس کے کفر کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں اور اگر ہو بھی تو مکہ کے کافر اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے، زنا اور دوسرے قبائح کو گناہ سمجھتے تھے، پھر بھی مشرک تھے۔ آج کل بے شمار کلمہ گو آپ کو ایسے مل جائیں گے جو اللہ کو مانتے، اس سے استغفار کرتے اور گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں، مگر پھر بھی سرتاپا شرک میں مبتلا ہیں۔

آیت 54 اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ : یہاں سے یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے، جب غلامی و قید ختم ہوئی اور آزادی اور حکومت و سلطنت عطا ہوئی۔ " اَسۡتَخۡلِصۡہُ " یہاں بادشاہ "اُخۡلِصۡہُ" بھی کہہ سکتا تھا، جیسا کہ ﴿ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴾ [ یوسف : ۲٤ ] میں باب افعال استعمال ہوا ہے۔ " اَسۡتَخۡلِصۡہُ " میں سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہیں کہ "میں اس کو زیادہ سے زیادہ اپنے لیے خاص کرلوں۔" بادشاہ نے جب یوسف علیہ السلام سے اپنے خواب کی صحیح تعبیر سنی، پھر بلانے کے باوجود کئی سال بے گناہ قید رہ کر بھی اپنی بے گناہی ثابت ہونے سے پہلے قید خانے سے نکلنے سے انکار دیکھا، پھر تمام متعلقہ خواتین حتیٰ کہ عزیز کی بیوی سے ان کی پاک دامنی اور بے گناہی کی تصدیق سنی تو ان کی شخصیت کا اتنا مشتاق ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ، میں اسے اپنے لیے خاص کرلوں گا۔ پھر جب یوسف علیہ السلام نے بنفس نفیس اس سے گفتگو کی تو بادشاہ نے ان کے علم کی وسعت، اخلاق کی خوبی اور دوسرے اوصاف حسنہ کا عین الیقین ہونے کے بعد کہا کہ آج سے تم ہمارے ہاں

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾

اس نے کہا مجھے اس زمین کے خزانوں پر مقرر کر دے، بے شک میں پوری طرح حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں ﴿۵۵﴾

مکین وامین، یعنی صاحب اقتدار اور امانت دار ہو۔ "مَكِیْنٌ" اس "مَكَانَةٌ" (مرتبے) والے کو کہتے ہیں جو صرف ایک یا چند ایک کے سوا کسی کو حاصل نہ ہو۔ قرآن مجید میں اس کا استعمال دیکھیے، جب وحی کے سلسلے میں جبریل علیہ السلام کا ذکر آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ﴾ [ التکویر : ۱۹ تا ۲۱ ] "بے شک یہ یقیناً ایک ایسے پیغام پہنچانے والے کا قول ہے جو بہت معزز ہے۔ بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے۔ وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، امانت دار ہے۔" اور آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں میں جبریل علیہ السلام کو کیا مرتبہ حاصل ہے کہ بنی آدم کے تمام انبیاء و رسل کی طرف اللہ کی جانب سے انھیں رسول چنا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی بہت بڑی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا، فرمایا: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی﴾ [ النجم : ۱۸ ] "بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔" ان سے بڑھ کر اللہ کا قرب رکھنے والا کوئی فرشتہ ہمیں معلوم نہیں۔ "اَمِیْنٌ" یعنی اپنی ذات، مملکت کے معاملات و اسرار اور سب لوگوں کے جان و مال اور ان کے درمیان عدل و انصاف میں تم ہمارے ہاں مکمل قابل اعتماد ہو، تمھاری امانت پر ہمیں پورا بھروسا ہے۔

آیت 55 ❶ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ...... : "الْاَرْضِ" میں الف لام عہد کا ہے "اس زمین" یعنی مجھے سرزمین مصر کے خزائن پر مقرر کر دیجیے، کیونکہ میں ان کی پوری طرح حفاظت کر سکتا ہوں اور اس کام کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ "خَزَآئِنِ" "خِزَانَةٌ" کی جمع ہے، اس سے مراد یا تو ان گوداموں کا نظام ہے جو خوش حالی کے سالوں کے لیے تعمیر کیے جائیں گے اور غلہ سنبھالیں گے اور قحط کے سالوں میں ان سے غلہ تقسیم کیا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے بہت بڑی منصوبہ بندی، محنت و امانت اور حساب کتاب میں مہارت کی ضرورت ہے، یا مراد سلطنت کے تمام ذرائع آمدنی و پیداوار ہیں۔ قرآن میں "خزائن" کا لفظ عموماً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [ المنافقون : ۷ ] "حالانکہ آسمانوں کے اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔" اور دیکھیے سورۂ انعام (۵۰)، بنی اسرائیل (۱۰۰)، ص (۹)، طور (۳۷) اور حجر (۲۱) اور یہی معنی یہاں صحیح ہے، کیونکہ خوش حالی کے سالوں میں گوداموں کی تعمیر، پھر سات سال تک پورے ملک کے لوگوں سے ضرورت سے زائد گندم خریدنا، حکومت کی آمدنی کے تمام ذرائع پر مکمل اختیار کے بغیر ممکن نہ تھا، تاکہ ملک بھی چلتا رہے اور جنس کی خریداری کے لیے رقم بھی مہیا ہو سکے اور گودام بھی تعمیر ہو سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ بادشاہ کی نگاہ میں ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے اور وہ انھیں ہر طرح کے اختیارات سونپنے کو تیار ہے تو اپنی اہلیت پر اعتماد کرتے ہوئے یہ پیش کش مناسب سمجھی کہ سلطنت کے تمام ذرائع آمدنی و پیداوار میرے حوالے کر دیے جائیں، بلکہ آئندہ آیات (۱۰۰، ۱۰۱) سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار مصر میں یوسف علیہ السلام ہی تخت نشین ہو گئے تھے، یا کم از کم عملاً حکومت انھی کی

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

اور اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اقتدار عطا فرمایا، اس میں سے جہاں چاہتا جگہ پکڑتا تھا۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچا دیتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (۵۶) اور یقیناً آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے (۵۷)

تھی اور یہ پیش کش اس لیے بھی تھی کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، اس ملک کے تمام اختیارات پر قبضہ ان کے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ توحید کی اشاعت اور شرک کا استیصال کر سکیں۔

(2) یہاں ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے خود عہدہ مانگا جب کہ رسول اللہ ﷺ نے عہدہ مانگنے یا اس کی حرص رکھنے والے کے متعلق فرمایا: « لَا نَسْتَعْمِلُ عَلٰى عَمَلِنَا مَنْ أَرَادَهُ » [ بخاري، الإجارة، باب استئجار الرجل الصالح ... : ۲۲۶۱ ] ''ہم ایسے شخص کو ہرگز عہدہ نہیں دیں گے جو اس کا ارادہ رکھے۔'' اس کے کئی جواب ہیں جن میں سے سب سے صحیح اور مضبوط جواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو عہدے پر تو فائز کر ہی دیا تھا: ﴿ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴾ [ یوسف : ۵۴ ] ''بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار، امانت دار ہے۔'' جس طرح آج کل پہلے وزیر چن لیے جاتے ہیں اور پھر وہ اپنے لیے شعبے کا انتخاب خود کرتے ہیں، اسی طرح جب بادشاہ نے انھیں اپنے ہاں پوری طرح صاحب اقتدار اور امانت دار قرار دے دیا تو یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اس منصب کے تقاضے خزانے پر مکمل اختیار کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے، سو ان کے لیے یہ اختیار طلب کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے عہدہ ہرگز نہیں مانگا، بلکہ انھیں جب عہدے سے نوازا گیا تو انھوں نے اس کی عملی صورت پیش فرمائی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر کسی کو اصرار ہو کہ انھوں نے عہدہ مانگا ہے تو ٹھیک ہے جو شخص یوسف علیہ السلام جیسے مقام پر فائز ہو وہ بے شک عہدہ مانگ لے، جو ان جیسے اوصاف رکھتا ہو، انسان کی سب سے منہ زور قوت (جنس) سمیت تمام بہیمانہ قوتوں مثلاً غصے، خیانت اور ظلم وغیرہ پر ان کی طرح قابو رکھتا ہو اور نبوت سے بھی سرفراز ہو، کیونکہ ایسی صورت میں نہ اس عہدے کی ذمہ داری کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے نہ خیانت کا۔ دوسرا شخص رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرے اور آرام سے رہے، خود اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہ ڈالے جس کا انجام رسول اللہ ﷺ نے ہمیں واضح طور پر بتا دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا مِنْ أَمِيْرِ عَشَرَةٍ إِلَّا يُؤْتٰى بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَغْلُوْلًا لَا يَفُكُّهُ إِلَّا الْعَدْلُ أَوْ يُوْبِقُهُ الْجَوْرُ » [ مسند أحمد : ۴۳۱/۲، ح : ۹۵۸۶۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۲۳۷/۶، ح : ۲۶۲۱ ] ''کوئی بھی دس آدمیوں کا امیر ہو اسے طوق پہنا کر لایا جائے گا، عدل کے سوا کوئی چیز اسے نہیں چھڑائے گی، یا ظلم اسے ہلاک کر دے گا۔''

آیت 57،56 (1) وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ: اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو سلطنت مصر

وَ جَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور یوسف کے بھائی آئے، پھر اس کے پاس داخل ہوئے تو اس نے انھیں پہچان لیا اور وہ اسے نہ پہچاننے والے تھے ﴿۵۸﴾

میں ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے اور وہ ایک کافر بادشاہ کے وزیر و ملازم نہیں تھے، ہو سکتا ہے کہ بادشاہ نے از خود ہی زمام حکومت ان کے سپرد کر دی ہو۔ ایک مشرک بادشاہ اور ایک نبی کا اتنا قرب ممکن ہی نہیں، اگر بادشاہ کو کافر فرض کیا جائے تو ممکن ہی نہیں کہ انسانوں میں سے اللہ کا سب سے بڑا دشمن (کافر بادشاہ) اللہ کے اس وقت کے سب سے بڑے دوست (نبی) سے اتنی دلی محبت رکھ کر نباہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فیصلہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴾ [ النساء: ۱۰۱ ] ''بے شک کافر لوگ ہمیشہ سے تمھارے کھلے دشمن ہیں۔'' سورۂ کافرون پر نظر ڈال لیں اور سورۂ مجادلہ کی آخری آیت پر بھی۔ سورۂ ممتحنہ کی آیت (۴) میں یوسف علیہ السلام کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے تو مسلم و کافر کے درمیان واضح ابدی بغض و عداوت کی صراحت فرما دی ہے۔ کافر بادشاہ اور نبی کے درمیان عداوت و محبت کا منظر دیکھنا ہو تو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کو دیکھ لیں، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس گھر میں بیٹے کی حیثیت سے پرورش پائی تھی۔ بادشاہ تو دور کی بات ہے کافر سرداران قوم ایک لحہ انبیاء اور مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔ سوائے ایسے مسلمانوں کے جوان کے ہر عمل بد پر ان کی مدد کریں، یا کم از کم خاموش رہیں۔ اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام سے اس کی توقع وہی شخص کر سکتا ہے جو یوسف علیہ السلام کا خواتین مصر کے مطالبے کے مقابلے میں سال ہا سال کی قید گوارا کرنا اور بادشاہ کے بلانے کے باوجود تحقیق کے بغیر قید خانے سے نکلنے سے انکار نہ جانتا ہو۔

❷ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ...... : لفظ ''يَتَبَوَّاُ'' سے یوسف علیہ السلام کو مصر میں حاصل ہونے والا اختیار و اقتدار سمجھنے کے لیے اس آیت کو ملاحظہ فرمائیں جس میں ذکر ہے کہ جنتی جنت میں داخلے کے بعد کیا کہیں گے: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ﴾ [ الزمر: ۷۴ ] ''اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم (اس) جنت میں سے جہاں چاہیں جگہ بنا لیں۔'' جنت جیسا اختیار نہ سہی مگر اس سے اس لفظ کی وسعت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ عزیز مصر کی بیوی سے یوسف علیہ السلام کا نکاح ہو گیا تھا، مگر محدثین کے نزدیک یہ روایات قابل اعتبار نہیں۔

❸ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ ...... : یعنی دنیا و آخرت دونوں میں انھیں اپنے نیک اعمال کا بدلہ ملتا ہے، اس آیت کے سلسلے میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ جواب ہوا ان کے سوالوں کا کہ اولاد ابراہیم اس طرح شام سے مصر آئی اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا، تاکہ ذلیل ہو، اللہ نے زیادہ عزت دی اور ملک پر زیادہ اختیار دیا ویسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا۔'' (موضح)

آیت 58 ❶ وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ : یہاں اللہ تعالیٰ نے خوش حالی کے سالوں کا، ان میں یوسف علیہ السلام کے حسن انتظام کا اور اس سے متعلق سب باتوں کا ذکر چھوڑ دیا، کیونکہ اصل مقصود یہ تھا کہ انبیاء کو اپنوں کے ہاتھوں کیا کچھ اٹھانا پڑتا ہے اور

وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾

اور جب اس نے انھیں ان کے سامان کے ساتھ تیار کر دیا تو کہا میرے پاس اپنے اس بھائی کو لے کر آنا جو تمھارے باپ سے ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ماپ پورا دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں ﴿۵۹﴾ پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمھارے لیے میرے پاس نہ کوئی ماپ ہوگا اور نہ میرے قریب آنا ﴿۶۰﴾

---

آخر کار کس طرح ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور حسن انجام کا اہتمام ہوتا ہے۔ درمیان میں گزرنے والے عرصے کا اندازہ خود بخود ہو رہا ہے، اس لیے اب خوش حالی کے سالوں کے ختم ہونے کے بعد قحط کے دوران بھائیوں کی آمد کی بات شروع فرمائی۔ جس سے بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ قحط کی وسعت مصر سے نکل کر اردگرد کے ممالک فلسطین و شام وغیرہ تک پہنچ گئی تھی اور مصر کے سوا کہیں سے غلہ نہیں ملتا تھا، اس لیے یہ بھائی غلہ خریدنے کے لیے مصر آئے تھے۔

② فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کتنی احتیاط سے غلہ تقسیم کر رہے تھے کہ وہ غلہ لینے کے لیے آنے والوں سے خود ملتے اور قیمت وصول کرنے کے باوجود ایک اونٹ فی کس سے زیادہ غلہ نہیں جانے دیتے تھے۔ چھوٹے بھائی کو چھوڑ کر سب کے آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ دس اونٹوں کا غلہ مل جائے گا اور شاید یہ بھی ہو کہ راستے میں دشمن سے محفوظ رہ سکیں۔

③ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ: "فَعَرَفَهُمْ" جملہ فعلیہ ہے جس میں تجدد و حدوث ہوتا ہے، یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنی یادداشت اور ذکاوت سے دیکھتے ہی انھیں پہچان لیا اور دوسرا جملہ اسمیہ ہے جس میں دوام ہوتا ہے کہ بھائی واپسی تک ان سے ناواقف رہے، کیونکہ بہت مدت گزر گئی تھی، چھوٹی عمر میں ان سے الگ ہوئے تھے۔ دوسرے یہ چیز تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ جس بھائی کو وہ کنویں میں ڈال گئے تھے وہ آج مصر کا مختار مطلق ہوگا۔

**آیت 60،59** ① وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ ......: "جَهَاز" وہ سامان جس کی مسافر کو ضرورت ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ﴾ یہ نہیں کہا "بِاَخِيْكُمْ" کہ اپنے بھائی کو جو تمھارے باپ سے ہے لے کر آنا، بلکہ "بِاَخٍ لَّكُمْ" کہا، یعنی "اَخٍ" کو نکرہ رکھا، تاکہ بھائیوں کے سامنے یہی ظاہر ہو کہ عزیز مصر اس بھائی کو نہیں جانتا۔ یہ سب سے چھوٹے اور یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی تھے۔ ان کا نام بنیامین مشہور ہے، جس کی کوئی پختہ دلیل نہیں، جیسا کہ عزیز مصر کا نام "قوطیفار"، اس کی بیوی کے نام "زلیخا" یا "راعیل"، بادشاہ کا نام "ریان بن ولید" اور یوسف علیہ السلام کے دوسرے بھائیوں کے ناموں کی دلیل اسرائیلی روایات کے سوا کچھ نہیں، جن پر اعتبار ممکن نہیں۔ یوسف علیہ السلام کی اس فرمائش سے معلوم ہوتا ہے کہ خود بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے خاندان کا تعارف کرواتے ہوئے اس بھائی کا ذکر کیا۔

② اَلَا تَرَوْنَ ......: چھوٹے بھائی کو بلوانے کے لیے یوسف علیہ السلام نے اپنی تجارتی ایمان داری "اُوْفِي الْكَيْلَ" اور بہترین مہمان نوازی کا ذکر بھی کیا اور اگلی آیت میں دھمکی بھی دی کہ اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو نہ غلہ ملے گا اور نہ مجھ سے ملاقات کی

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

انھوں نے کہا ہم اس کے باپ کو اس کے بارے میں ضرور آمادہ کریں گے اور بے شک ہم ضرور کرنے والے ہیں ﴿۶۱﴾ اور اس نے اپنے جوانوں سے کہا ان کا مال ان کے کجاووں میں رکھ دو، تاکہ وہ اسے پہچان لیں جب اپنے گھر والوں کی طرف واپس جائیں، شاید وہ پھر آجائیں ﴿۶۲﴾ تو جب وہ اپنے باپ کی طرف لوٹے تو انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہم سے ماپ روک لیا گیا ہے، سو تو ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج کہ ہم (غلے کا) ماپ لائیں اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں ﴿۶۳﴾

امید رکھنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے غلہ لینے کے لیے آنے والے تمام لوگوں کے لیے مہمان نوازی کا، ان کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا بہترین انتظام کر رکھا تھا اور بھائی تو پھر بھائی تھے۔

آیت 61 قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ...... : یعنی ہم اس کے باپ کو ہر طرح سے آمادہ کریں گے۔ ''سین'' مستقبل کا معنی دینے کے علاوہ تاکید کے لیے بھی آتا ہے، اس لیے ترجمہ ''ضرور'' کیا گیا ہے۔ ''وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ'' میں یہ کام کرنے کا وعدہ تین طرح کی تاکید سے کیا ہے، ''اِنَّ''، لام تاکید اور جملہ اسمیہ سے۔

آیت 62 وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ...... : ''فِتْيَانٌ'' ''فَتًى'' کی جمع ہے، دیکھیے (آیت ۳۶) ''رِحَالٌ'' ''رَحْلٌ'' کی جمع ہے، وہ کجاوہ جو اونٹ پر سوار ہونے کے لیے رکھا جاتا ہے اور اس سامان کو بھی کہہ لیتے ہیں جو اونٹ پر رکھا جائے، اس لیے اونٹ کو ''رَاحِلَةٌ'' کہہ لیتے ہیں۔ ''بِضَاعَةٌ'' وہ رقم یا سامان جس کے ساتھ کوئی چیز خریدی جائے، یعنی اپنے جوانوں کو وہ رقم یا ساز و سامان جو وہ غلہ خریدنے کے لیے قیمت کے طور پر لائے تھے، ان کو بتائے بغیر بطور احسان ان کی بوریوں میں رکھ دینے کا حکم دے دیا اور اس لیے بھی کہ بھائیوں کی حالت دیکھ کر گھر کی تنگ دستی کا اندازہ ہو گیا، جس کا ذکر تیسری دفعہ آنے پر انھوں نے خود کیا۔ دیکھیے آیت (۸۸) ''لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ'' شاید وہ ان درہموں وغیرہ کو ان کی ساخت یا مہر یا تھیلیوں سے پہچان لیں اور اس احسان اور رقم کی موجودگی کی وجہ سے دوبارہ آجائیں۔

آیت 63 ❶ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ ...... : قحط میں سب سے پہلی فکر جان بچانے کی تھی اور نظر آ رہا تھا کہ یہ غلہ کتنی دیر چلے گا، اس لیے واپس جاتے ہی ابھی سامان نہیں کھولا اور سب سے پہلے یہ بات کی کہ ابا جان آئندہ ہمیں غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے، اس کے بعد سارا قصہ سنایا اور بتایا اب غلہ ملنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں تو ہمیں غلہ مل جائے گا۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَ نَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

اس نے کہا میں اس پر اس کے سوا تمھارا کیا اعتبار کروں جس طرح میں نے اس کے بھائی پر اس سے پہلے تمھارا اعتبار کیا، سو اللہ بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ﴿۶۴﴾ اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنے مال کو پایا کہ ان کی طرف واپس کر دیا گیا ہے، کہا اے ہمارے باپ! ہم کیا چاہتے ہیں، یہ ہمارا مال ہماری طرف واپس کر دیا گیا ہے اور ہم گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ ماپ زیادہ لائیں گے، یہ بہت تھوڑا ماپ ہے ﴿۶۵﴾

---

② وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ : اس میں بھی تین تاکیدیں ہیں، یعنی یوسف کی طرح اس کے بارے میں فکر نہ کیجیے، ہمیں پورا احساس ہے، اس لیے ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

**آیت 64** ① قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ...... : فرمایا، تم جب یوسف علیہ السلام کو لے گئے تھے تب بھی تم نے یہی کہا تھا کہ "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" پھر تم نے اس کی اچھی حفاظت کی کہ آج تک اس بے چارے کی کوئی خیر خبر نہیں، تو کیا اس کے متعلق بھی تمھاری حفاظت کا ایسا ہی اعتماد کروں، جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے متعلق تم پر اعتبار کیا تھا۔

② فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا...... : یعنی میں اسے بحالت مجبوری غلہ کی ضرورت کے پیش نظر تمھارے ساتھ بھیج رہا ہوں، سو میں اسے تمھاری حفاظت میں نہیں بلکہ اللہ کی حفاظت میں دیتا ہوں، وہ ارحم الراحمین ہی اپنی مہربانی سے اس کی حفاظت فرمائے گا۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ بھیجتے وقت صرف یہ کہا تھا: ﴿وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ﴾ [ یوسف : ۱۳ ] (اور میں ڈرتا ہوں کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے) اب جو اس کے بھائی کو "فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ" کہتے ہوئے اللہ کی حفاظت میں دیا تو نہ صرف یوسف کا بھائی بلکہ یوسف علیہ السلام بھی مل گئے۔

**آیت 65** ① وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ...... : جب انھوں نے اپنا سامان کھولا اور دیکھا کہ جو کچھ وہ بطور قیمت لے کر گئے تھے پورا ہی انھیں واپس دے دیا گیا ہے، تو انھیں اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ بھیجنے کے لیے مزید اصرار کرنے اور اطمینان دلانے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ انھوں نے کہا، ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے، ہمارا مال ہمیں واپس مل گیا، اب قیمت موجود ہے، چھوٹا بھائی ساتھ جائے تو ہم سارے اہل خانہ کے لیے غلہ لے آئیں گے، ایک اونٹ زائد بھی مل جائے گا، ورنہ گیارہ کہاں ایک بھی نہیں ملے گا، ایسی صورت میں ہم بھائی کو کیوں نقصان پہنچائیں گے۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾ وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ

اس نے کہا میں اسے تمھارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا، یہاں تک کہ تم مجھے اللہ کا پختہ عہد دو گے کہ تم ہرصورت اسے میرے پاس لاؤ گے، مگر یہ کہ تمھیں گھیر لیا جائے ﴿۶۶﴾ پھر جب انھوں نے اسے اپنا پختہ عہد دے دیا تو اس نے کہا اللہ اس پر جو ہم کہہ رہے ہیں، ضامن ہے۔ اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور الگ

❷ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ : اس کے دو معنی کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ دس اونٹ غلہ جو ہم لائے ہیں کب تک چلے گا، یہ تو بہت تھوڑا ہے، اس لیے ہمیں ہرصورت دوبارہ جانا پڑے گا اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس طرح ہمارے لیے ایک اونٹ بھر غلہ مزید لانا بالکل آسان ہوگا۔

آیت 66 قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ : "وَكِيْلٌ" بروزن "فَعِيْلٌ" بمعنی مفعول ہے، یعنی "مَوْكُوْلٌ اِلَيْهِ" جس کے سپرد اپنا کام کر دیا جائے۔ یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف بیٹوں سے پختہ عہد، یعنی قسمیں لے لیں اور ظاہری اسباب سے پورا وثوق حاصل کر لیا اور دوسری طرف معاملہ اللہ کے سپرد کر کے بھروسا اسی پر رکھا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اسے پورا کرنا اسی کے اختیار میں ہے اور جو جان بوجھ کر بدعہدی یا خیانت کرے گا وہ خود اسے سزا دے گا، اللہ پر توکل کا صحیح مطلب بھی یہی ہے۔

آیت 67 ❶ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا...... : نہ تو آیت کے الفاظ میں اس چیز کی وضاحت ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی سے اس کا پتا چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو یہ حکم کیوں دیا کہ وہ ایک دروازے سے نہیں بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صحرا کے پروردہ تنومند گیارہ نوجوان ایک ہی دروازے سے اکٹھے گزریں گے تو ان کی پڑتال زیادہ ہوگی۔ انھیں رہزنوں کا گروہ بھی سمجھا جا سکتا ہے، اگر شک یا حسد کی بنا پر گرفتار ہوئے تو یوسف علیہ السلام تک ایک بھی نہیں پہنچ سکے گا، پھر گرفتار شدگان کی رہائی کی جدوجہد اجنبی وطن میں کون کرے گا، غرض کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مگر اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اپنے صحت مند، قوی، جوان اور خوب صورت بیٹوں کے اکٹھے داخل ہونے پر نظر بد لگنے کا خطرہ تھا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ ٹوک (نظر بد) سے بچنے کا طریقہ بتایا اور توکل اللہ پر کیا، ٹوک لگنی غلط نہیں اور نظر بد سے بچاؤ کرنا درست ہے۔" (موضح) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْعَيْنُ حَقٌّ وَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ وَإِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فَاغْسِلُوْا )) [ مسلم، السلام، باب الطب والمرض والرقی : ۲۱۸۸ ] "نظر لگنا ثابت شدہ بات ہے اور اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے نکل سکتی تو نظر اس سے آگے نکل جاتی اور جب تم سے غسل کے لیے کہا جائے تو غسل کرو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو نظر بد سے نقصان کا پہنچنا ثابت ہے۔ دراصل نظر لگانے والے کی آنکھ سے کوئی ایسی تاثیر رکھنے والی شعاع نکلتی ہے جو نشانہ بننے والے کو نقصان پہنچاتی ہے، جیسا کہ اب لیزر (شعاع) سے پتھر بھی توڑ

بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ

الگ دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اللہ کی طرف سے (آنے والی) کوئی چیز نہیں ہٹا سکتا، حکم اللہ کے سوا

دیا جاتا ہے۔ یہ حسد کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اور اپنے پیاروں کو بھی لگ جاتی ہے، کسی کی آنکھ میں یہ تاثیر زیادہ ہوتی ہے کسی میں کم۔ بچوں پر یہ زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک ہدایت تو یہ دی ہے کہ کوئی چیز اچھی لگے تو اس کے لیے برکت کی دعا کرے، مثلاً: «تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ» یا اپنی زبان میں کہہ دے "یا اللہ! اس میں برکت فرما۔" قرآن مجید سے ثابت ہے کہ کوئی اپنے خوب صورت باغ وغیرہ میں داخل ہو تو یہ کہے: ﴿مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ [ الكهف : ۳۹ ] اس آیت سے یہی الفاظ اپنی ہر پیاری چیز پر پڑھنے کی ترغیب بھی ملتی ہے، اس سے وہ چیز نظر بد سے محفوظ رہے گی۔ اگر نظر لگ جائے تو رسول اللہ ﷺ سے اسے دور کرنے کے دو طریقے ثابت ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اگر معلوم ہو جائے کہ کس کی نظر لگی ہے تو اس سے غسل کروا کر وہ پانی نظر کے مریض پر ڈالا جائے، جیسا کہ اوپر صحیح مسلم کی حدیث میں گزرا، یا کم از کم اس کا چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں کہنیاں، دونوں گھٹنے، پیروں کی انگلیاں اور تہ بند کے اندر کا حصہ کسی برتن میں دھو کر وہ پانی مریض پر ڈالا جائے (تو وہ تندرست ہو جائے گا)۔ [ الموطأ، العين، باب الوضوء من العين : ۲ ]
دوسرا طریقہ توحید پر مبنی دم ہے۔ عوف بن مالک راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا بَأْسَ بِالرُّقٰى مَا لَمْ يَكُنْ فِيْهِ شِرْكٌ » [ مسلم، السلام، باب لا بأس بالرقى...... : ۲۲۰۰ ] "دموں میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ وہ شرک نہ ہوں۔" مشرک صوفیوں اور گدی نشینوں کے بجائے خود ہی مسنون دم کر لیا کریں، یہاں چند مسنون دم ضرورت اور فائدے کے لیے نقل کیے جاتے ہیں: ① عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو پناہ دلواتے (دم کرتے) اور فرماتے: "تم دونوں کا باپ (ابراہیم علیہ السلام) اسماعیل اور اسحاق (علیہما السلام) کو ان کلمات کے ساتھ پناہ دلواتا (دم کرتا) تھا: «أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ» [ بخاری، أحاديث الأنبياء، باب : ۳۳۷۱ ] "میں پناہ طلب کرتا ہوں اللہ کے کامل کلمات کے ساتھ ہر شیطان اور زہریلے جانور سے اور ہر اس آنکھ سے جو نظر لگانے والی ہے۔" ابوداؤد (۴۷۳۷) اور ترمذی (۲۰۶۰) میں شروع کے لفظ یہ ہیں: « أُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ » یعنی میں تم دونوں کو دم کرتا ہوں۔ اگر ایک کو دم کرے تو " أُعِيْذُكَ " کہہ لے۔ ② ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس آئے، کہا: "اے محمد! آپ بیمار ہو گئے ہیں؟" کہا: "ہاں!" تو انھوں نے کہا: « بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيْكَ » [ مسلم، باب الطب والمرض والرقى : ۲۱۸۶ ] "میں اللہ ہی کے نام کے ساتھ تجھے دم کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو تجھے تکلیف دے رہی ہے اور ہر حسد کرنے والے نفس یا آنکھ کے شر سے، اللہ تجھے شفا دے۔ اللہ ہی کے نام سے میں تجھے دم کرتا ہوں۔" مسند احمد (۵/۳۲۳، ح: ۲۲۸۴۶) میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ہے کہ آپ ﷺ کو بخار تھا، پچھلے پہر جبریل علیہ السلام نے دم کیا، شام کو آپ بہترین

الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

کسی کا نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں ﴿۶۷﴾

حالت میں ہو گئے۔ ③ آسمان سے اترنے والی تمام کتابوں میں سے سورۂ فاتحہ سب سے عظیم سورت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے، ایک قبیلے کے سردار کو (جنھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قافلے کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا تھا) سانپ نے ڈس لیا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر اسے دم کیا، وہ بالکل ٹھیک ہو گیا تو صحابہ نے ان سے طے کی ہوئی تیس بکریاں وصول کیں۔ [ بخاری، الإجارة، باب ما يعطي في الرقية على أحياء العرب...... : ۲۲۷۶ ] ابوداؤد میں ہے کہ خارجہ بن صلت کے چچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر مسلمان ہو گئے، واپسی پر ان کا گزر ایک قوم پر ہوا، جہاں ایک پاگل لوہے کی زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا، انھوں نے ان سے دم کی درخواست کی تو انھوں نے صرف سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا۔ صبح و شام تین دن سورۂ فاتحہ پڑھ کر جمع شدہ تھوک اس پر پھینکتے رہے تو وہ تندرست ہو گیا اور ایسا گویا اسے رسیوں سے کھول دیا گیا ہو، تو انھوں نے ان کو سو بکریاں دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كُلْ فَلَعَمْرِيْ مَنْ أَكَلَ بِرُقْيَةِ بَاطِلٍ لَقَدْ أَكَلْتَ بِرُقْيَةِ حَقٍّ )) [أبو داوٗد، الطب، باب كيف الرقى : ۳۹۰۱ ] ''کھا لو، میری عمر کی قسم! لوگ تو باطل دم کے ساتھ کھاتے ہیں، تم نے حق دم کے ساتھ کھایا ہے۔'' اس لیے ہر بیماری، نظر ہو یا کوئی اور سورۂ فاتحہ جیسا عظیم دم موجود ہونے کی صورت میں اگر کوئی مشرکوں بدعتیوں کے پاس جائے تو اس پر افسوس ہے۔ ④ سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (( يَا عُقْبَةُ! تَعَوَّذْ بِهِمَا فَمَا تَعَوَّذَ مُتَعَوِّذٌ بِمِثْلِهِمَا )) [ أبو داوٗد، الوتر، باب في المعوذتين : ۱۴۶۳ ] ''اے عقبہ! ان دونوں کے ساتھ پناہ پکڑ، کیونکہ کسی پناہ پکڑنے والے نے ان جیسی سورتوں کے ساتھ پناہ نہیں پکڑی۔'' کتب احادیث میں اور بھی دم موجود ہیں جو حصن المسلم اور ادعیہ و اذکار کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

② وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ ...... : اور میں اللہ کی طرف سے آنے والی کوئی چیز تم سے ہٹا نہیں سکتا، بلکہ اس نے جو کچھ تمھاری تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہے گا، مگر چونکہ آدمی کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خرابی سے بچنے کی تدبیر کرے، اگرچہ اصل بھروسا تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر ہونا چاہیے، کیونکہ اسباب بھی تب ہی کام آتے ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہے۔ سو تدبیر کرنا بھی دراصل اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگنے کا نام ہے۔ ''الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا'' تدبیر ہے اور ''میں اللہ سے آنے والی کوئی چیز تم سے ہٹا نہیں سکتا'' تقدیر پر ایمان ہے، جس کا نتیجہ اسی پر توکل ہے۔

③ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ...... : یہاں حکم سے مراد کونی اور قدری حکم ہے جس پر یہ کائنات چل رہی ہے، اس میں بندے کا کچھ اختیار نہیں۔ ''عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ'' یعنی میری طرح تم پر اور سب لوگوں پر بھی لازم ہے کہ صرف اسی پر بھروسا کریں، اپنی تدبیر پر غرور نہ کریں، اگرچہ شرعی حکم بھی اللہ ہی کا ماننا لازم ہے مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے امتحان کے لیے بندے کو کچھ اختیار دیا ہے جس پر باز پرس ہوگی۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۸ ع
وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۹

اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے انھیں حکم دیا تھا، وہ ان سے اللہ کی طرف سے آنے والی کسی چیز کو ہٹا نہ سکتا تھا مگر یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی جو اس نے پوری کر لی اور بلاشبہ وہ یقیناً بڑے علم والا تھا، اس وجہ سے کہ ہم نے اسے سکھایا تھا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۝۶۸ اور جب وہ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی، کہا بلاشبہ میں ہی تیرا بھائی ہوں، سو تو اس پر غم نہ کر جو وہ کرتے رہے ہیں ۝۶۹

❹ پہلی دفعہ یعقوب علیہ السلام نے انھیں مختلف دروازوں سے داخل ہونے کا حکم نہیں دیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت قحط کی وجہ سے تمام بھائیوں کی صحت اچھی نہیں ہوگی، اب وہ بہترین صحت کے ساتھ تھے اور مزید یہ کہ وہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جا رہے تھے جو یوسف علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام کو سب سے زیادہ پیارے اور یوسف علیہ السلام کی ماں کے بطن سے تھے۔

**آیت 68** ❶ وَلَمَّا دَخَلُوْا...... : ”حَاجَةً“ ”خواہش“ کیونکہ انسان اس کا محتاج ہوتا ہے۔

❷ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی اکثر لوگ اس سرِ الٰہی (تقدیر) کی حقیقت کو نہیں جانتے اور اپنی تدبیر پر نازاں رہتے ہیں، یا پھر اللہ پر بھروسا کرنے کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ سرے سے کوئی تدبیر اختیار ہی نہ کی جائے، جیسا کہ اکثر صوفیوں کا حال یا دعویٰ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یعقوب علیہ السلام نے تدبیر اور توکل کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی تو وہ دراصل ہماری اس تعلیم کا نتیجہ تھا جو ہم نے اسے دی تھی، یعنی بذریعہ وحی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”تقدیر پھر بھی ان پر آ گئی، دفع نہ ہوئی، سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں ہو سکتے ہیں اور بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو۔“ (موضح)

**آیت 69** ❶ وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ ...... : اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی حسنِ تدبیر سے دوسرے بھائیوں کو اس طرح ٹھہرایا کہ چھوٹا بھائی اکیلا رہ گیا تو اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ مفسرین نے عام طور پر لکھا ہے کہ بھائیوں کو دو، دو کر کے ایک ایک جگہ ٹھہرایا، مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں پانچ پانچ کر کے ایک ایک جگہ ٹھہرا دیا ہو یا کوئی اور ترتیب بنائی ہو۔ (واللہ اعلم) کیونکہ دو، دو والی ترتیب قرآن و حدیث میں نہیں آئی۔

❷ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ...... : ظاہر ہے کہ جب یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کے ساتھ علیحدہ ہوئے اور اسے بتایا کہ میں تمھارا سگا بھائی ہوں تو اس نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی بدسلوکی کے قصے بیان کیے ہوں گے اور یقیناً یوسف علیہ السلام کے فراق میں اپنا اور

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿۷۰﴾ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ﴿۷۱﴾

پھر جب اس نے انھیں ان کے سامان کے ساتھ تیار کر دیا تو پینے کا برتن اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھ دیا، پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا اے قافلے والو! بلاشبہ تم یقیناً چور ہو ﴿۷۰﴾ انھوں نے کہا، جب کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے، تم کیا چیز گم پاتے ہو؟ ﴿۷۱﴾

والد کا حال بھی بیان کیا ہوگا۔ اس پر یوسف علیہ السلام نے انھیں تسلی دی کہ اب تم اپنے بھائی کے پاس پہنچ گئے ہو، لہٰذا ان بھائیوں کی بدسلوکی کا رنج نہ کرو، اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے تمام غم غلط ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں راحت و عزت عطا فرمائے۔

**آیت 71،70** فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ ...... : ان آیات کی تفسیر میں اکثر لوگوں کو ٹھوکر لگی ہے جس کی وجہ سے وہ یوسف علیہ السلام کے ذمے لگاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کے لیے اس کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا، پھر اس کے سامان میں پیمانہ رکھ کر سب بھائیوں کے متعلق ان کے چور ہونے کا اعلان کروایا، پھر خود ہی تلاشی لی اور آخر میں بھائی کے سامان سے پیمانہ نکال کر اسے چور قرار دے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس پر جو اعتراض آتا ہے کہ یہ ایک نبی کی شان کے لائق نہیں، اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ﴾ [ یوسف : ۷۶ ] ''اس طرح ہم نے یوسف کے لیے یہ تدبیر کی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے کیا، اس لیے یہ جائز تھا اور یہ کہ جائز مقصد کے لیے حیلہ کرنا (خواہ ناجائز ہو) جائز ہے۔ حالانکہ اگر غور سے آیات کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں یوسف علیہ السلام کے کسی حیلے یا سازش کا کوئی دخل ہی نہیں، یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تدبیر تھی جس کا پہلے یوسف علیہ السلام کو بھی علم نہیں تھا۔ واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ پہلی دفعہ جب بھائی آئے تو یوسف علیہ السلام نے ان پر احسان کیا اور اپنے جوانوں سے کہہ کر ان کی رقم ان کی بوریوں میں ان کے علم کے بغیر رکھوا دی، جس کا علم انھیں گھر جا کر ہوا۔ اب ان کا سگا بھائی آیا تو انھوں نے اس کی خاص مدد کے لیے خاموشی سے کسی کو بھی بتائے بغیر اس کے سامان میں وہ پیمانہ خود ہی رکھ دیا کہ اس میں وہ مشقت نہ تھی جو دس بھائیوں کا سارا سامان واپس رکھنے میں تھی اور بھائیوں کے علم میں آنے سے حسد کا بھی خطرہ تھا، اس لیے اس چیز سے صرف وہ آگاہ تھے، دوسرا کوئی بھی آگاہ نہ تھا، قافلہ روانہ ہونے سے پہلے گودام کے محافظوں میں سے کسی کو پیمانے کی ضرورت پڑی، جب وہ نہ ملا تو تلاش شروع ہوئی، غور و فکر کیا گیا، کون چور ہو سکتا ہے، یہاں کون کون آیا ہے؟

ان بھائیوں کے سوا وہاں کوئی آیا ہی نہ تھا، اس لیے ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا کہ قافلے والو! تم چور ہو۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ چنانچہ ان کی آئندہ ساری گفتگو اس اعلان کرنے والے اور اس کے ساتھی گودام کے محافظوں سے ہوئی، جس میں انھوں نے خود ہی چور کی سزا بھی بتا دی جو ان کے ہاں رائج تھی، پھر ان محافظوں میں سے ایک

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

انھوں نے کہا ہم بادشاہ کا پیمانہ گم پاتے ہیں اور جو اسے لے آئے اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) ہوگا اور میں اس کا ضامن ہوں ﴿۷۲﴾ انھوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً تم جان چکے ہو کہ ہم اس لیے نہیں آئے کہ اس ملک میں فساد کریں اور نہ ہم کبھی چور تھے ﴿۷۳﴾ انھوں نے کہا پھر اس کی کیا جزا ہے، اگر تم جھوٹے ہوئے؟ ﴿۷۴﴾

نے تلاشی لی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدبیر ہوئی کہ اس نے اتفاق سے پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان کی پڑتال کی، پھر یوسف علیہ السلام کے بھائی کے سامان سے وہ پیمانہ نکال لیا اور بھائیوں ہی کی بتائی ہوئی سزا کے مطابق اس بھائی کو روک لیا۔ یوسف علیہ السلام اس معاملے سے بالکل بے خبر تھے مگر جب بات یہاں تک پہنچی اور یوسف علیہ السلام کو اطلاع ملی تو انھوں نے اسے اللہ کی طرف سے تدبیر سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی، بھائی کے سامان سے مدعا برآمد ہونے کے بعد وہ اس کی صفائی دے بھی نہیں سکتے تھے، ورنہ الزام آتا کہ ایک ثابت شدہ مجرم کی طرف داری اور اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، جب کہ یوسف علیہ السلام جیسا شخص تہمت کا نشانہ بننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دو انصاری صحابیوں کو بلا کر اپنے پاس کھڑی ہوئی خاتون کے متعلق بتانا کہ یہ صفیہ (میری بیوی) ہے، اس کی دلیل ہے۔ البتہ اپنی زبان سے اس بھائی کو چور بھی نہیں کہا۔ ان کی طبیعت کی پاکیزگی اور صدق کا اندازہ ان کی اس بات سے لگائیے کہ جب بھائیوں نے کہا کہ اس کے والد بہت بوڑھے بزرگ ہیں، آپ اسے جانے دیں اور ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ رکھ لیں تو یوسف علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تو چور ہی کو پکڑیں گے بلکہ فرمایا کہ ہم تو اسی کو پکڑیں گے جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے۔ یہ تفسیر آیات کے بالکل مطابق صاف اور سادہ ہے اور اس میں یوسف علیہ السلام پر کوئی اعتراض نہیں آتا، جس کا جواب دینے کی ضرورت ہو۔

**آیت 72** ❶ صُوَاعَ الْمَلِكِ : غلہ ماپنے کے آلے کو "صاع" یا "صواع" کہتے ہیں، اسی کو آیت (۷۰) میں "السِّقَايَةَ" (پینے کا برتن) کہا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلے کی نایابی کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کے لیے شاہی پیالہ گندم کے پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اکثر مفسرین نے اسے چاندی کا لکھا ہے، بعض کہتے ہیں کہ سونے کا تھا، جس پر جواہر لگے تھے، لیکن صحیح اتنی بات ہی ہے کہ وہ کوئی قیمتی پیمانہ تھا۔

❷ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ : یعنی جو شخص تفتیش سے پہلے خود بخود وہ پیمانہ لے آئے اسے ایک اونٹ غلہ انعام ملے گا۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝۷۵ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۷۶ قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ

انھوں نے کہا اس کی جزا وہ شخص ہے جس کے کجاوے میں وہ پایا جائے، سو وہ شخص ہی اس کی جزا ہے۔ اسی طرح ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں ۝۷۵ تو اس نے اس کے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں سے ابتدا کی، پھر اسے اس کے بھائی کے تھیلے سے نکال لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی، ممکن نہ تھا کہ بادشاہ کے قانون میں وہ اپنے بھائی کو رکھ لیتا مگر یہ کہ اللہ چاہے، ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک سب کچھ جاننے والا ہے ۝۷۶ انھوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو بے شک اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ تو یوسف نے اسے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اسے ان کے لیے ظاہر نہیں کیا، کہا تم مرتبے میں

آیت 75 ﴿ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ﴾: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے ہاں چور کی سزا یہ تھی کہ وہ مسروقہ چیز کے مالک کا ہمیشہ یا کچھ مدت کے لیے غلام یا قیدی بن جاتا۔ آیت میں مدت کی وضاحت نہیں ہے۔

آیت 76 ﴿ ➊ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ ...... ﴾: یعنی پیمانے کی گم شدگی کا اعلان کرنے والے نے (اللہ کی تدبیر کے مطابق) اتفاق سے پہلے دوسرے بھائیوں کی بوریوں کی تلاشی لی اور آخر میں اس (یوسف) کے بھائی کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں سے پیمانہ نظر آ گیا جو اس تلاشی لینے والے نے نکال لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یوسف کے لیے یہ تدبیر ہم نے کی، بادشاہِ مصر کے قانون کی رو سے وہ کسی طرح اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ خود بھائیوں کے ہاں رائج قانون کے مطابق جو انھوں نے خود بتایا، ان کے لیے بھائی کو یوسف علیہ السلام کے پاس چھوڑے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

➋ ﴿ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ﴾: یعنی ہم جسے چاہتے ہیں علم عطا فرما کر اس کے درجے بلند کرتے ہیں، جیسے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں یوسف علیہ السلام کے درجے بلند کیے۔

➌ ﴿ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴾: یعنی ہر جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والا ہے۔ اس لیے کوئی شخص اس غرور میں مبتلا نہ ہو کہ مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں، اللہ تعالیٰ کو موسیٰ علیہ السلام کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والا یہ لفظ بھی پسند نہ آیا، فرمایا، کیوں نہیں ہمارا بندہ خضر تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ غرض ہر عالم سے بڑا عالم موجود ہے، یہاں تک کہ تمام جاننے والوں کے اوپر وہ ذات پاک ہے جو حاضر و غائب ہر چیز کو پوری طرح جاننے والی ہے اور اس سے کوئی بات مخفی نہیں۔

آیت 77 ﴿ ➊ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ﴾: ان کا یہ اشارہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھا، پہلے کہہ چکے تھے: ﴿ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴾ کہ ہم کبھی چور نہیں تھے، لیکن اب جو دیکھا کہ چھوٹے بھائی کے پاس سے چوری کا مال نکل آیا ہے تو اپنی خفت مٹانے اور اپنی

نَفۡسِهٖ وَلَمۡ يُبۡدِهَا لَهُمۡ ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الۡعَزِيۡزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيۡخًا كَبِيۡرًا فَخُذۡ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰٮكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۷۸﴾

زیادہ برے ہو اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۷۷﴾ انھوں نے کہا اے عزیز! بے شک اس کا ایک بڑا بوڑھا باپ ہے، سو تو ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ رکھ لے، بے شک ہم تجھے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں ﴿۷۸﴾

پاک بازی ظاہر کرنے کے لیے فوراً اپنے آپ کو اس بھائی سے الگ کر لیا اور اس کے جرم کو بہانہ بنا کر اس کے بھائی پر بھی چوری کی جھوٹی تہمت لگا دی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے گم ہو جانے کے بعد اس بھائی کے ساتھ یہ بھائی کیا سلوک کرتے رہے ہوں گے؟

یہاں مفسرین نے اسرائیلی روایات سے بچپن میں یوسف علیہ السلام کی چوری کے کچھ واقعات لکھے ہیں، جن کا قرآن و حدیث میں کوئی ذکر نہیں اور جن سے یوسف علیہ السلام بالکل پاک ہیں، پھر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے کہنے پر یوسف علیہ السلام کی چوری کے واقعات کی تلاش تو تب کی جائے جب برادران یوسف نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، باپ کے پاس جھوٹ بولنے سے لے کر یہاں اپنے تمام بھائیوں کی قسم دے کر کہ ہم میں سے کبھی کوئی چور نہیں رہا، فوراً ہی مدت سے گم شدہ بھائی پر بھی چوری کا بہتان لگا دیا اور ہمارے بعض مفسرین کو فکر ہے کہ ان بھائیوں کے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے یوسف علیہ السلام کی کوئی نہ کوئی چوری ضرور ڈھونڈ نکالی جائے۔ [اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ]

② فَاَسَرَّهَا يُوۡسُفُ فِىۡ نَفۡسِهٖ وَلَمۡ يُبۡدِهَا لَهُمۡ : کیونکہ اگر ظاہر کرتے تو وہ سمجھ لیتے کہ یہی یوسف ہے اور ابھی یہ راز کھولنے کا وقت نہ آیا تھا۔ اتنے اونچے مقام پر ہونے کے باوجود اتنی تلخ تہمت کو دل میں چھپا کر صبر کرنا یوسف علیہ السلام ہی کا حوصلہ ہے۔

③ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّكَانًا : یعنی یوسف نے چوری کی ہو یا نہ کی ہو مگر تمھارے چور ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ تم نے اسے باپ سے چرا کر کنویں میں پھینک دیا۔ مزید یہ غضب ڈھا رہے ہو کہ الٹا اپنے آپ کو پاک باز اور یوسف کو چور بتاتے ہو؟

④ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ : یعنی تم جو یوسف پر چوری کا الزام لگا رہے ہو اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، تم جھوٹ بول کر لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہو مگر اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

آیت 78 قَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الۡعَزِيۡزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا ...... : اس کا باپ بہت بوڑھا ہے، وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا، پہلے بھی آپ نے ہم پر بہت سے احسان کیے ہیں، بس اب اتنا احسان اور کر دیں کہ ہم میں سے کسی ایک کو اس کے بجائے رکھ لیں، امید ہے کہ آپ ہمیں اپنے کرم سے مایوس نہیں کریں گے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾

اس نے کہا اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، یقیناً ہم تو اس وقت ظالم ہوں گے ﴿۷۹﴾ پھر جب وہ اس سے بالکل ناامید ہوگئے تو مشورہ کرتے ہوئے الگ جا بیٹھے، ان کے بڑے نے کہا کیا تم نے نہیں جانا کہ تمھارا باپ تم سے اللہ کا عہد لے چکا ہے اور اس سے پہلے تم نے یوسف کے بارے میں جو کوتاہی کی، اب میں اس زمین سے ہرگز نہ ہلوں گا یہاں تک کہ میرا باپ مجھے اجازت دے، یا اللہ میرے لیے فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۸۰﴾

**آیت 79** **قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ......** : یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو پاس رکھنا بھی چاہتے تھے اور چور بھی نہیں کہنا چاہتے تھے، ان کی کمال ذہانت اور کمال صدق دیکھیے کہ دونوں معنوں پر مشتمل الفاظ میں بھائی کو ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ فرمایا کہ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ اس شخص کے سوا کسی اور کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، اس صورت میں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے اور ہم ظلم نہیں کر سکتے۔

**آیت 80** ① **فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا** : "**اسْتَيْـَٔسُوْا**" یہاں "يَئِسُوْا" (ناامید ہو گئے) کے معنی ہی میں ہے۔ باب استفعال مبالغہ کے لیے ہے، یعنی بالکل ناامید ہو گئے، جیسا کہ "عَجِبَ" اور "اِسْتَعْجَبَ"، "سَخِرَ" اور "اِسْتَسْخَرَ" میں سین اور تاء محض مبالغہ کے لیے ہیں، معنی ایک ہی ہے۔ اس سے پہلے (آیت ۳۲) "اِسْتَعْصَمَ" میں بھی یہی نکتہ ہے۔ "**خَلَصُوْا**" یعنی کوئی اور ان میں موجود نہ تھا، اکیلے ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ "**نَجِيًّا**" "فَعِيْلٌ" کے وزن پر ہے، مشورہ، سرگوشی کرنے والے وغیرہ، یہ وزن واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے اسی طرح آتا ہے، اس لیے "**خَلَصُوْا**" کے ساتھ واحد ہی آیا ہے۔

② **قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ ......** : ان کے بڑے نے کہا (مراد عمر میں بڑا ہے یا جو علم و فہم میں ان کا بڑا اور امیر تھا) کیا تمھیں معلوم نہیں کہ والد نے تم سے قسموں کے ساتھ پختہ عہد لیا تھا کہ بھائی کو اپنے ساتھ ضرور واپس لانا اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں جو کوتاہی تم نے کی، اب میں والد کے سامنے کیسے جاؤں گا، اپنے متعلق تو میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اس سرزمین سے ہرگز جدا نہیں ہوں گا جب تک میرے والد مجھے واپسی کی اجازت نہ دیں، یا اللہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرے کہ بھائی کی رہائی کی کوئی صورت نکل آئے یا میری موت آ جائے۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝۸۱ وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۸۲ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۸۳

اپنے باپ کی طرف واپس جاؤ، پس کہو اے ہمارے باپ! بے شک تیرے بیٹے نے چوری کر لی اور ہم نے شہادت نہیں دی مگر اس کے مطابق جو ہم نے جانا اور ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہ تھے ۝۸۱ اور اس بستی سے پوچھ لے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں اور بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں ۝۸۲ اس نے کہا بلکہ تمھارے لیے تمھارے دلوں نے ایک کام مزین کر دیا ہے، سو (میرا کام) اچھا صبر ہے، امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا، یقیناً وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ۝۸۳

**آیت 81** ① اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ ...... : البتہ تم واپس جا کر والد کو بتاؤ کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، اگر تم بھی واپس نہ گئے تو والد اور زیادہ پریشان ہوں گے کہ شاید تمام بیٹے ہی گرفتار ہو گئے، یا ان کا کیا بنا، اس لیے واپس جا کر انھیں حقیقت حال سے آگاہ کرو۔

② وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ ہم نے بھائی کے چور ہونے کی شہادت اپنے علم ہی کے مطابق دی ہے، کیونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کے سامان سے پیمانہ نکلتا ہوا دیکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے عزیز مصر کو جو مسئلہ بتایا کہ چور کی یہ سزا ہے تو وہ ہم نے اپنے علم ہی کے مطابق بتایا کہ ہمارے باپ دادا کی شریعت کے مطابق اس کا یہ حکم ہے۔

③ وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ : یعنی جب ہم نے آپ کو قسم کھا کر عہد دیا تھا، ہمیں غیب کا علم تو نہیں تھا کہ بھائی مصر میں جا کر چوری کرے گا، ورنہ ہم اسے اپنے ساتھ کیوں لے جاتے، یا آپ کو یہ پختہ عہد کیوں دیتے کہ اسے اپنے ساتھ ضرور واپس لائیں گے۔

**آیت 82** وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا ...... : اس میں انھوں نے اپنی صفائی کے لیے تین چیزیں بتائیں: ① اس بستی (والوں) سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے۔ ② اس قافلے (والوں) سے بھی جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ③ اور (قسم ہے کہ) بے شک ہم یقیناً سچے ہیں۔ اپنی صفائی میں اتنی شہادتیں پیش کرنے کا باعث یہ تھا کہ انھیں معلوم تھا کہ والد ہماری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔

**آیت 82** ① قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ ...... : جب بڑے بھائی کی تجویز کے مطابق باقی بھائیوں نے کنعان پہنچ کر اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے یہ سب کچھ بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اصل بات یہ نہیں بلکہ تمھارے دلوں نے تمھارے

وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اور وہ ان سے واپس پھرا اور اس نے کہا ہائے میرا غم یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہوگئیں، پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔﴿۸۴﴾

لیے ایک کام مزین کر دیا ہے، اب میرا کام صبر جمیل ہے۔ وہی لفظ منہ سے نکلا جو یوسف کو بھیڑیے کے کھائے جانے کی خبر سن کر نکلا تھا۔ اللہ اپنے بندوں خصوصاً رسولوں کو کتنا بڑا حوصلہ دیتا ہے کہ جگر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی خبر سن کر بھی نہ شکوہ نہ شکایت، نہ جزع فزع نہ واویلا۔ پہلے ایک بیٹے کی خبر پر بھی صبر جمیل، اب مزید دو بیٹوں کی خبر پر بھی وہی صبر جمیل۔ پہلے بھی اللہ ہی سے مدد مانگی: ﴿وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ [ یوسف : ۱۸ ] اب بھی اسی کے سہارے پر دل میں امید کا چراغ روشن رکھا: ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا﴾ امید ہے کہ اللہ ان تینوں کو میرے پاس لے آئے گا، یقیناً وہی علیم و حکیم ہے، وہ سب کچھ جانتا بھی ہے اور اس کی حکمتوں کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

❷ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے کی سچی بات کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ رہی یہ بات کہ یعقوب علیہ السلام کس طرح ان سب کی ملاقات کی امید ظاہر فرما رہے ہیں، تو ایک تو یہ کہ وہ اللہ کے نبی تھے اور دوسرے یہ کہ انھیں یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر سامنے آنے کا بھی یقین تھا، مگر پیارے بیٹے کی جدائی پھر لخت جگر کے حال سے بے خبری اور تعبیر کے ظہور کا وقت نامعلوم ہونے اور اب مزید دو بیٹوں کی گم شدگی کے پیہم صدمات اور انھیں دل ہی دل میں پی جانے کی کوشش نے یعقوب علیہ السلام کی طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر ڈالا۔

**آیت 84** ❶ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى ...... : "يٰۤاَسَفٰى" اصل میں یائے متکلم کے ساتھ "يَا اَسَفِيْ" تھا، تخفیف اور اظہار غم کے لیے یاء کو الف سے بدل دیا ہے۔ ﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ﴾ "غم سے اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں" یعنی آنسوؤں کے متواتر بہنے سے آنکھوں کی سیاہی پر سفیدی چھا گئی اور بینائی خراب ہو گئی۔ "كَظِيْمٌ" بمعنی "مَكْظُوْمٌ" ہے جو غم سے بھرا ہوا ہو، لیکن لوگوں سے چھپائے اور اظہار نہ کرے۔ اسی سے ہے: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ [ آل عمران : ۱۳۴ ] یعنی غصے کو روک لینے والے۔ "كَظَمَ فُلَانٌ السِّقَاءَ" یعنی فلاں نے بھرے ہوئے مشکیزے کا منہ بند کر دیا۔ یعنی یعقوب علیہ السلام نے جب بیٹوں کی بات سن لی اور انھیں جواب دے دیا تو ان پر غموں کا سیلاب امڈ آیا اور دل کے تمام زخم تازہ ہو گئے، چنانچہ انھوں نے بیٹوں کو چھوڑا اور مجلس سے چلے گئے اور کہنے لگے: "ہائے میرا یوسف کا غم" اور ان کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں، مگر غم سے بھرے ہوئے ہونے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ رہ گیا دل کا غم اور مصیبت میں رونا اور آنسو بہانا تو یہ جائز ہے اور انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ابراہیم فوت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: (( إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا وَ إِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيْمُ ! إِنَّا لَمَحْزُوْنُوْنَ )) [ بخاري، الجنائز، باب قول النبي صلی اللہ علیہ وسلم إنا بك لمحزونون : ۱۳۰۳ ]۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم! تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتا رہے گا، یہاں تک کہ گھل کر مرنے کے قریب ہو جائے، یا ہلاک ہونے والوں سے ہو جائے ﴿۸۵﴾ اس نے کہا میں تو اپنی ظاہر ہو جانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۸۶﴾

مسلم: ۲۳۱۵] ''بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے اور ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہو اور بے شک ہم تیری جدائی سے اے ابراہیم! یقیناً غم زدہ ہیں۔'' ہاں مصیبت کے وقت نوحہ کرنا، گریبان پھاڑنا اور منہ پر طمانچے مارنا سخت ممنوع ہے۔

② اگرچہ خبر دوسرے دو بیٹوں کی آئی تھی مگر یعقوب علیہ السلام کے منہ سے یوسف پر غم کی شدت کے الفاظ نکلے، اس کی وجہ یہ تھی کہ زخم کے اوپر جب زخم لگے تو پہلا زخم زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ ''وَلٰكِنْ نَكْأُ الْجُرْحِ بِالْجُرْحِ أَوْجَعُ'' ''لیکن زخم کا نئے زخم سے چھل جانا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔''

آیت 85 قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا...... : تا قسم کے لیے ہوتی ہے، لفظ ''اللہ'' پر آتی ہے اور عموماً ایسے موقع پر قسم کے لیے آتی ہے جس میں کوئی تعجب ہو۔ ''فَتِئَ يَفْتَؤُ'' ہٹ جانا، بھول جانا۔ اس سے پہلے عموماً ''مَا'' آتا ہے اور معنی ہمیشہ رہنا، نہ بھولنا ہوتا ہے، یہاں بھی اصل ''مَا تَفْتَؤُ'' تھا، ''مَا'' کو معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا ہے، یعنی تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتا رہے گا، اسے نہیں بھولے گا، اسے یاد کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ بیٹوں اور پوتوں کو، باپ کی حالت زار دیکھ کر رحم آتا تھا، جب ان کا غم اس حد تک پہنچ گیا تو انھوں نے باپ سے کہا کہ اللہ کی قسم! آپ یوسف کو اسی طرح ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے حتیٰ کہ گھل گھل کر مرنے کے قریب ہو جائیں گے، یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ گویا وہ انھیں صبر کی تلقین اور اس قدر غم پر ملامت کر رہے تھے۔

آیت 85 ① اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ...... : ''بَثَّ يَبُثُّ'' کا لفظی معنی پھیلانا ہے، فرمایا: ﴿ وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ﴾ [النساء: ۱] ''اور ان دونوں میں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔'' ''بَثَّ الرِّيْحُ التُّرَابَ'' ''ہوا نے مٹی اڑائی۔'' آدمی پر جب مصائب آئیں تو ان سے پیدا ہونے والے جس غم کو وہ چھپا سکے وہ حزن کہلاتا ہے اور جو چھپا نہ سکے ''بَثٌّ'' کہلاتا ہے۔ اس آیت پر شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی تم کیا مجھے صبر سکھاؤ گے، بے صبر وہ ہے جو خلق کے آگے شکایت کرے خالق کی، میں تو اسی سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ پر آزمائش ہے، دیکھوں کس حد کو پہنچ کر بس ہو۔'' (موضح)

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں ﴿۸۷﴾

حقیقت یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے غم کا جو حال اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے وہ پڑھ اور سن کر ہی دل سخت غم زدہ ہو جاتا ہے، پھر خود ان کا کیا حال ہوگا۔ عبد اللہ بن شداد کہتے ہیں کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے روتے ہوئے دھاڑیں مارنے کی آواز سنی، حالانکہ میں صفوں کے آخر میں تھا، وہ یہ پڑھ رہے تھے: ﴿ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [ بخاري، الأذان، باب إذا بكى الإمام في الصلاة، قبل ح : ۷۱۶ ]

❷ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ : یعنی یوسف زندہ ہیں اور ایک دن ایسا آئے گا کہ میرے اور تمھارے سجدہ کرنے کا خواب جو انھوں نے دیکھا تھا، سچا ہوگا۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے اور اللہ تعالیٰ میری یہ امید بر لائے گا۔ اتنی مدت گزرنے اور اتنے غم کے باوجود جس میں یوسف علیہ السلام کی زندگی کی امید باقی رہنا بھی ممکن نظر نہیں آتا، ان کی ملاقات کی امید رکھنا یعقوب علیہ السلام کے کمال ایمان کا نتیجہ ہے۔

**آیت 87** ❶ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا ...... : " بَنِيْنَ " " اِبْنٌ " کی جمع ہے، یاء کی طرف مضاف ہوا تو نون گر گیا، یاء کو یائے متکلم میں ادغام کر کے آخر میں نصب دے دی۔ " تَحَسُّسٌ " کا معنی ہے کسی چیز کو باریکی، حکمت اور صبر کے ساتھ بذریعہ حواس تلاش کرنا۔ (الوسیط) " رَوْحِ اللّٰهِ " " رَوْحٌ " کا اصل معنی سانس لینا ہے، کہا جاتا ہے " أَرَاحَ الْإِنْسَانُ " " انسان نے سانس لیا۔" (مفردات) مراد اللہ کی طرف سے کشادگی و رحمت ہے، گلا گھٹ جانے اور سانس بند ہونے کے بعد سانس آنے میں جو راحت ولذت ہے وہ اللہ کی رحمت کا ایک نمونہ ہے، یعنی جاؤ اور اس بھائی کے ساتھ مل کر جو وہاں رہ گیا ہے، یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کی پوری کوشش کرو اور اللہ کی رحمت سے نا امید مت ہو۔

❷ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ : جو اس کی قدرت کا صحیح علم نہیں رکھتے، اس کے برعکس مومن کو خواہ کیسے ہی حوصلہ شکن اور مایوس کن حالات پیش آئیں وہ کبھی اپنے مالک کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کافر کی صفت ہے، مومن کی نہیں۔ یہ نہیں کہ مایوس ہو جانے والا کافر اور مرتد ہو جاتا ہے، بلکہ جس طرح جھوٹ منافق کی ایک صفت ہے، مومن کی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ [ النحل : ۱۰۵ ] " جھوٹ تو وہی لوگ باندھتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے۔" مگر جھوٹ سے انسان کا کفر اس کفر سے کم تر ہے جو اسے ایمان سے خارج کر کے مرتد بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی رحمت سے مایوسی کافر کی ایک صفت ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

پھر جب وہ اس کے پاس داخل ہوئے تو انھوں نے کہا اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں، سو ہمارے لیے ماپ پورا دے دے اور ہم پر صدقہ کر، یقیناً اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے ﴿۸۸﴾ اس نے کہا کیا تم نے جانا کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا، جب تم نادان تھے؟ ﴿۸۹﴾

آیت 88 فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ ...... : "مُّزْجٰىةٍ" " أَزْجٰى يُزْجِيْ إِزْجَاءً " (ناقص واوی) دفع کرنا، ہٹانا، دھکیلنا، یعنی (غلے کے لیے) ایسی قیمت جسے کوئی خوشی سے قبول نہیں کرتا۔ باپ کے حکم پر تیاری کر کے بیٹے تیسری مرتبہ مصر کے لیے روانہ ہو گئے اور عزیز مصر سے ملے، جس نے ان کے بھائی کو روک رکھا تھا۔ اسے ادب کے ساتھ لقب سے مخاطب کر کے اپنی اور اپنے گھر والوں کی خستہ حالی اور بے چارگی بیان کی کہ ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر قحط، خشک سالی، بیٹوں کی جدائی سے والد کی حالت اور کئی مصیبتوں کی وجہ سے سخت تکلیف آ پڑی ہے اور غلے کے لیے ہم صحیح قیمت کا بندوبست نہیں کر سکے، محض اتنی سی پونجی لے کر آئے ہیں جو خوشی سے کوئی قبول نہیں کرتا اور وہ نہ اس قابل ہے کہ آپ اس کے بدلے ہمیں غلہ دیں، اس لیے آپ ہم پر احسان کریں کہ اس قیمت کا جتنا غلہ بنتا ہے وہ پورا دے کر اس سے زیادہ دے دیں، یا قیمت سے چشم پوشی کر کے ایک ایک اونٹ غلہ پورا ہی دے دیں، تو یہ آپ کا ہم پر صدقہ ہوگا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''قحط میں اسباب گھر کا بک گیا، اب کی بار اون اور پنیر اور ایسی چیزیں لائے تھے اناج خریدنے کو، یہ حال سن کر یوسف علیہ السلام کو رحم آیا، اپنے تئیں (اپنے آپ کو) ظاہر کیا اور سارے گھر کو بلوا لیا۔'' (موضح)

آیت 89 ❶ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ : بھائیوں کی بے بسی و درماندگی دیکھ کر اور صدقے کے سوال پر یوسف علیہ السلام کا دل بھر آیا اور معاملے کو مزید طول دینے کی تاب نہ رہی اور وہ وقت آ گیا جس کے متعلق کنویں میں اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی تھی کہ یہ لوگ جو کچھ اب کر رہے ہیں ایک وقت ضرور آئے گا جب تم انھیں اس کی خبر دو گے اور یہ سوچتے بھی نہ ہوں گے۔ چنانچہ کچھ ناراضگی کا اظہار اور زیادہ تر ان کی غلطی کا عذر خود ہی کرتے ہوئے فرمایا، کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا، جب تم نادان تھے؟

❷ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ: یعنی جو کچھ تم نے کیا اس کی وجہ تمھاری نادانی اور بے وقوفی تھی۔ یوسف علیہ السلام بھائیوں کو ان کی حرکت یاد دلاتے ہوئے کہہ سکتے تھے: "وَاَنْتُمْ ظَالِمُوْنَ" کہ جب تم ظلم کر رہے تھے، مگر اس خیال سے کہ وہ شرمندہ نہ ہوں خود ہی

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

انھوں نے کہا کیا یقیناً واقعی تو ہی یوسف ہے؟ کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، یقیناً اللہ نے ہم پر احسان فرمایا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۹۰﴾ انھوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے اور بلاشبہ ہم واقعی خطا کار تھے ﴿۹۱﴾

ان کے لیے معذرت کا پہلو نکال دیا۔ یہ انتہائی مروت کا مقام ہے جس کی توقع ایک نبی ہی سے ہو سکتی ہے۔

**آیت 90** ❶ **قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ** : بھائیوں کو یہ سن کر دھچکا لگا کہ برسوں پرانی بات جو ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا، اس اجنبی سرزمین میں جاننے والا یہ کون نکل آیا؟ پھر ان کے نقوش پر غور کرتے ہوئے فوراً نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ تو ہمارا وہی ستم رسیدہ بھائی یوسف ہے، پھر حیرت، تعجب اور دہشت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس بات کا سوال کیا جسے تاکید کے تین طریقوں سے یقینی بھی قرار دیا ''کیا یقیناً واقعی تو ہی یوسف ہے۔'' '' اِنَّ ''، لام تاکید اور '' اِنَّكَ '' کے بعد پھر '' اَنْتَ '' کے ساتھ تاکید، اتنے یقین کے باوجود سوال ہے جس میں کچھ شک بھی ہوتا ہے۔

❷ **قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ** : فرمایا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ ان دو لفظوں میں یوسف علیہ السلام نے وہ ساری داستان دو لفظوں میں دہرا دی جو ان بھائیوں کے ہاتھوں ان پر گزری تھی، جو پوری طرح بیان میں آ بھی نہیں سکتی تھی اور یوسف علیہ السلام کے عفو و درگزر کے مطابق نہ اس کا موقع تھا۔

❸ **قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا** : کہ مصیبت سے نجات دے کر دونوں کو ملا دیا اور اس بلند مرتبہ مقام پر پہنچا دیا جسے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

❹ **اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ** : یعنی حرام کام اور نافرمانی سے بچتا رہے اور اللہ کے احکام کی پابندی اور پیش آنے والی مصیبتوں اور اللہ کی تقدیر پر صبر کرے۔

❺ **فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ** : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جس پر تکلیف پڑے اور وہ شرع سے باہر نہ ہو اور گھبرائے نہیں تو آخر بلا (تکلیف) سے زیادہ عطا ہے۔'' (موضح)

**آیت 91** **قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ ......** : بھائیوں کے سامنے اپنے ظلم و ستم کا وہ سارا منظر آ گیا جو ان کے ہاتھوں ہوا تھا تو انھوں نے قسم کھا کر اعتراف کیا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر، تقویٰ اور دوسری صفات حسنہ کی وجہ سے ہم پر برتری اور فوقیت عطا فرمائی ہے۔ ''وَ اِنْ كُنَّا'' اصل میں ''اِنَّا كُنَّا'' تھا، جس کی دلیل ''خَاطِئِيْنَ'' پر آنے والا لام ہے۔ ''اِنَّ'' اور لام کے ساتھ تاکید بھی قسم ہی کی ایک صورت ہے کہ یقیناً ہم آپ پر ظلم کر کے جانتے بوجھتے ہوئے غلط اور گناہ کا کام کرنے

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَ اْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع

اس نے کہا آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھیں بخشے اور وہ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ﴿۹۲﴾ میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، وہ بینا ہو جائے گا اور اپنے گھر والوں کو، سب کو میرے پاس لے آؤ ﴿۹۳﴾

والے تھے۔ ”خَاطِئِيْنَ“ اور ”مُخْطِئِيْنَ“ کے فرق کے لیے دیکھیے آیت (۲۹) کی تفسیر۔ بھائیوں کے اعتراف گناہ کے بعد یوسف علیہ السلام کی سینے کی وسعت اور حوصلہ مندی دیکھیے، ابھی انھوں نے صرف گناہ کا اعتراف اور عذر ہی کیا ہے، معافی مانگنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی بول اٹھے: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔

**آیت 92** ① قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ: ”تَثْرِيْبَ“ کے معنی ملامت، ڈانٹ ڈپٹ، گناہ یاد دلانا سبھی آتے ہیں۔ فرمایا تمھیں ہرگز کوئی ملامت نہیں کرتا، نہ ڈانٹ ڈپٹ، نہ تمھیں کوئی یہ زیادتی یاد دلائے گا۔ ”اَلْيَوْمَ“ کا معنی صرف آج کا دن نہیں بلکہ مطلق زمانے کے لیے ہے، یعنی اب آئندہ تم پر کوئی ملامت نہیں۔

② یہ ہے شان نبوت، اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو ایسے قصور واروں پر قابو پا لینے کے بعد انھیں ہرگز معاف نہ کرتا۔ یہی سلوک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد وہاں کے رہنے والوں سے فرمایا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (فتح مکہ کے دن) قریش کے سرداروں اور بڑے بڑے لوگوں نے کعبہ میں پناہ لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، بیت اللہ کا طواف کیا اور ان (۳۶۰) بتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے انھیں کمان کے کنارے کے ساتھ ٹھوکا مارتے گئے اور یہ فرماتے گئے: ﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾ [ بنی إسرائیل: ۸۱ ] جب فارغ ہوئے اور نماز پڑھ لی تو آ کر دروازے کی چوکھٹ کے دونوں کناروں کو پکڑا، پھر فرمایا: ”اے معشر قریش! (بولو) کیا کہتے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”ہم کہتے ہیں (آپ) رحیم و کریم بھتیجے اور چچا زاد (بھائی) ہیں۔“ آپ نے پھر ان کے سامنے اپنی بات دہرائی، انھوں نے وہی جواب دیا، تو آپ نے فرمایا: ”پھر میں وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا تھا: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ چنانچہ وہ سب نکل کر آئے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی۔ [ سنن الکبری للنسائي: ۳۸۲/۶، ۳۸۳، ح: ۱۱۲۹۸ ] یہ ہے اصل صلہ رحمی، عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِيْ إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا )) [ بخاري، الأدب، باب لیس الواصل بالمکافئ: ۵۹۹۱ ] ”صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو صلہ رحمی کے مقابلے میں صلہ رحمی کرتا ہے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کی رشتہ داری قطع کی جائے تو وہ اسے ملائے۔“

③ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ...... : یوسف علیہ السلام نے نہ صرف انھیں معاف فرما دیا بلکہ ان کی درخواست کے بغیر ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت و رحم کی دعا بھی کر دی۔

**آیت 93** اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ ...... : بھائیوں کو معاف کر دینے کے بعد گھر کے حالات کا تذکرہ ہوا، والد کے نابینا ہونے

وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

اور جب قافلہ جدا ہوا، ان کے باپ نے کہا بے شک میں تو یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں، اگر یہ نہ ہو کہ تم مجھے بہکا ہوا کہو گے ﴿۹۴﴾

کی خبر پر ان کے علاج کے لیے اپنی قمیص بھیجی اور اپنے سارے گھر والوں کو اپنے پاس مصر میں لانے کا حکم دیا۔ یہ قمیص بھی عجیب تھی، کبھی یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے کے کھا جانے کے ثبوت پر پیش کی گئی اور والد کو نابینا کر گئی اور کبھی یوسف علیہ السلام پر ارادۂ زنا کی تہمت لگی تو یہ ان کی صفائی بن گئی، اب اللہ کا حکم ہوا تو یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس ملنے کا ذریعہ بن گئی۔ یہ سب میرے مالک کی قدرت و مشیت ہے: ﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [ یٰسٓ : ۸۳ ] ''سو پاک ہے وہ کہ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی کامل بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔'' شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی ہر مرض کی اللہ کے ہاں دوا ہے، ایک شخص کے فراق میں یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں ضائع ہو گئیں، اس کے بدن کی چیز ملنے سے درست ہو گئیں، یہ یوسف علیہ السلام کی کرامت تھی۔'' (موضح) اور خوشی کی شدت سے بینائی میں قوت پیدا ہو جانا طبی طور پر ثابت ہے۔ (رازی) مگر طبی طور پر اس کی کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں کہ خوشی سے نابینا بینا ہو جائے، اس لیے اسے معجزہ ہی کہا جائے گا۔

**آیت 94** ① وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ ...... : اس سے انبیاء کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کا اندازہ ہوتا ہے اور اس حقیقت کا بھی کہ خود ان کے پاس کتنا علم ہوتا ہے۔ یہی قمیص تھی، اسی راستے سے آئی تھی، چند میل دور کنویں میں پڑے ہوئے لخت جگر کا علم نہ ہو سکا، نہ اس کی خوشبو آئی اور جب اللہ تعالیٰ نے بتایا تو قافلے کے نکلتے ہی یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنا شروع ہو گئی۔ یہ واقعہ ان بے شمار دلائل میں سے ایک واضح دلیل ہے کہ انبیاء عالم الغیب نہیں ہوتے، ہاں جتنی بات انھیں وحی کے ذریعے سے بتائی جاتی ہے وہ انھیں معلوم ہو جاتی ہے اور یہی عام آدمی اور نبی کا فرق ہے کہ نبی کو وحی الٰہی ہوتی ہے، دوسرے اس نعمت سے محروم ہیں۔ اس بات کو شیخ سعدی نے کمال خوبی کے ساتھ ''گلستان'' میں نظم کیا ہے ؎

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند     کہ اے روشن گہر پیر خردمند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی     چرا درچاہ کنعانش ندیدی
بگفت احوال ما برقِ جہان است     دمے پیدا و دیگردم نہان ست
گہے برطارمِ اعلیٰ نشینم     گہے برپشتِ پائے خود نہ بینم

''یعنی کسی نے اس فرزند کو گم کر دینے والے سے پوچھا کہ اے روشن نسب والے عقل مند بزرگ! تو نے مصر سے اس کی قمیص کی خوشبو پالی، تو نے اسے کنعان کے کنویں میں کیوں نہ دیکھا، اس نے کہا ہمارے (انبیاء کے) احوال کوندنے والی بجلی کی طرح ہیں، ایک دم ظاہر ہوتے اور دوسرے لمحے پوشیدہ ہو جاتے ہیں، کبھی ہم اعلیٰ و بلند مقام پر بیٹھے ہوتے ہیں، کبھی ہم اپنے

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۙۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً تو اپنی پرانی بھول ہی میں ہے ﴿۹۵﴾ پھر جیسے ہی خوش خبری دینے والا آیا اس نے اسے اس کے چہرے پر ڈالا تو وہ پھر بینا ہوگیا۔ کہنے لگا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ بے شک میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۹۶﴾ انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کر، یقیناً ہم خطا کار تھے ﴿۹۷﴾

---

پاؤں کی پشت پر (لگی چیز) نہیں دیکھتے۔" آخری شعر کے پہلے مصرع میں رسول اللہ ﷺ کے معراج کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے میں جبریل علیہ السلام کے نماز کے دوران میں آکر بتانے کی طرف کہ آپ ﷺ کے جوتے پر نجاست لگی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جوتے نماز ہی میں اتار دیے۔

❷ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ: یعنی اگر یہ نہ ہو کہ تم کہو گے کہ بڑھاپے اور یوسف کی محبت کی وجہ سے میری عقل میں خلل پڑ گیا ہے۔

آیت 95 قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ ......: یعقوب علیہ السلام کے پاس اس وقت بیٹوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا، پوتوں نے بھی باپوں والا رویہ اختیار کیا۔ اب ان الفاظ کو ان کی طرف سے بابا کے لیے تسلی کہا جائے یا ملامت؟ واللہ! ان کا حق نہ تھا کہ دادا کو جو اللہ کے پیغمبر بھی تھے، یہ لفظ کہتے۔ ہاں ان کی طرف سے ایک عذر ہو سکتا ہے کہ بادیہ کے معاشرے میں باہمی بے تکلفی حتیٰ کہ والدین اور اولاد کے درمیان بھی بے تکلفی نے ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلوا دیے ہوں اور وہ اپنے خیال میں تسلی دے رہے ہوں کہ بابا! پرانی بات بھول بھی جاؤ، مگر جو اتنے سال بھلایا نہیں جا سکا اب ایسی باتوں سے کیسے بھلایا جا سکے گا۔

آیت 96 ❶ "فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ" اور "فَلَمَّا جَاءَ الْبَشِيْرُ" کے ترجمے کے فرق کی تفصیل کے لیے دیکھیے اسی مترجم قرآن کے عرض مترجم میں سے فائدہ (۸) خوش خبری لانے والے نے آتے ہی چہرے پر قمیص ڈالی اور یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے کی خوش خبری دی تو اسی وقت آنکھیں دوبارہ روشن ہوگئیں۔

❷ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: یوسف علیہ السلام کی قمیص سے آنکھیں روشن ہونے اور ان کے زندہ ہونے کی خوش خبری آنے پر فرمایا کہ میں نے تمھیں کہا نہ تھا: ﴿اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی مجھے وحی الٰہی سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو تم نہیں جانتے۔ مراد اپنے بچوں کو ملامت کرنا نہ تھا بلکہ تربیت کرنا تھا، تاکہ وہ نبوت کے مقام کو سمجھیں اور نبی کی بات کو محبت کے غلو پر یا عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے خرابی عقل پر محمول نہ کریں، مثلاً یہ یقین کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے ضرور ملائے گا، یا یہ بات کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

آیت 97 قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ......: یہ کہنے والے بیٹے بھی تھے اور پوتے بھی، انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے

قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّيۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰى يُوۡسُفَ اٰوٰۤى اِلَيۡهِ اَبَوَيۡهِ وَ قَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ ﴿ؕ۹۹﴾

اس نے کہا میں عنقریب تمھارے لیے اپنے رب سے بخشش کی دعا کروں گا۔ بے شک وہی بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے (۹۸) پھر جب وہ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو جاؤ، امن والے، اگر اللہ نے چاہا (۹۹)

دانستہ اور عمداً خطا وار ہونے کا اقرار کر کے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں، کیونکہ آپ معاف کر بھی دیں اگر اس نے نہ بخشا تو ہمارا کہاں ٹھکانا ہے۔

**آیت 98** قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّيۡ ...... : یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی طرح درخواست کے بغیر فوراً استغفار کے بجائے صرف وعدہ کیا کہ میں تمھارے لیے استغفار کروں گا جو یقیناً انھوں نے پورا کیا ہوگا۔ اہل علم نے اس کی کئی وجہیں بیان فرمائی ہیں، ایک تو یہ کہ بھائی کا حق بھائی پر اتنا نہیں ہوتا جتنا باپ کا بیٹے پر ہوتا ہے، اس لیے والد کو ناراضگی زیادہ تھی۔ دوسری یہ کہ بے شک یوسف علیہ السلام پر بے پناہ آزمائشیں آئیں مگر غم اور صدمے کا اثر والد پر زیادہ تھا۔ تیسری یہ کہ والد معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یوسف نے انھیں معاف کیا ہے یا نہیں، کیونکہ مظلوم کے معاف کرنے کے بعد ہی ظالم کے لیے استغفار ہو سکتا ہے۔ بعض مفسرین نے بعض تابعین وصحابہ کے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے ان سے پچھلی رات دعا کرنے کا وعدہ کیا تھا، کیونکہ وہ قبولیت کا وقت ہے، مگر انھوں نے یہ بات قرآن مجید یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان نہیں کی جب کہ ہزاروں سال پہلے کی بات کا کوئی پختہ ذریعہ ان دونوں کے علاوہ ہے ہی نہیں۔ مفسر ابن جریر اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے ایک روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ان سے جمعہ کی رات کو استغفار کا وعدہ کیا تھا، مگر اس کی سند میں تین خرابیاں ہیں، ایک ابن جریج کا اسے لفظ "عَنْ" سے روایت کرنا، جب کہ وہ مدلس ہیں، دوسری ولید بن مسلم قرشی حدیث مرفوع بیان کرنے کی غلطی کر جاتے ہیں اور تدلیس تسویہ کرتے ہیں، تیسری سلیمان بن عبد الرحمان میں حافظے کی بنا پر کلام ہے۔ قرآن مجید بھولنے والی حدیث بھی اسی سند کے ساتھ ہے۔ (سامی بن محمد بن عبد الرحمان محقق ومحشی تفسیر ابن کثیر)

**آیت 99** فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰى يُوۡسُفَ ...... : یعنی یعقوب علیہ السلام کنعان سے سارے اہل خانہ سمیت روانہ ہو کر مصر پہنچے۔ آیت کے الفاظ "مصر میں داخل ہو جاؤ" سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے شہر سے باہر نکل کر عمائدین حکومت اور عوام سے مل کر اپنے والدین اور افراد خانہ کا شان وشوکت سے استقبال کیا، والدین کو خصوصاً دوسرے خیموں سے جو استقبال کے لیے لگائے گئے تھے، الگ اپنے خیمے میں رکھا اور فرمایا، اب آپ لوگ مصر میں داخل ہو جائیں۔ آپ ان شاء اللہ یہاں نہایت امن سے رہیں گے۔ قحط، غربت، دشمن، غرض کسی چیز کی فکر مت کریں۔ بعض نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ الفاظ مصر میں داخل ہونے کے بعد کہے۔ "اَبَوَيۡهِ" سے مراد ماں باپ ہیں، کئی مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ کا چھوٹے بھائی کی ولادت کے

وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ

اور اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے اور اس نے کہا اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے، بے شک میرے رب نے اسے سچا کر دیا اور بے شک اس نے مجھ پر

وقت انتقال ہو گیا تھا، یہ ماں یوسف علیہ السلام کی خالہ تھیں جن سے یعقوب علیہ السلام نے بعد میں نکاح کیا تھا۔ دلیل اس کی اسرائیلی روایات کے سوا کچھ نہیں، جن کی صحت کا یقین نہیں۔ البتہ بعض نے لکھا ہے کہ ان کی والدہ زندہ تھیں اور وہی یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر پہنچی تھیں۔ (معالم) ابن جریر رحمہ اللہ نے اس دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی تائید کی ہے اور سب سے بڑھ کر قرآن مجید کے الفاظ کا ظاہر معنی یہی ہے۔ یہاں ان مفسرین کی بات پر افسوس ہوتا ہے جو قرآن مجید کی صراحت کے بعد آزر کو باپ کے بجائے چچا اور یوسف علیہ السلام کی والدہ کو ان کی خالہ بتانے پر اصرار کرتے ہیں۔ صرف ان کتابوں میں پڑھ کر جن کی بات کو سچا سمجھنے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا ہے، اگرچہ جھوٹا کہنے سے بھی منع کیا ہے، مگر ایسی ناقابلِ یقین بات کے ساتھ قرآن کی بات کو توڑنے مروڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

**آیت 100** ① وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ ...... مصر پہنچ کر جب مجلس آراستہ ہوئی تو یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تخت پر اونچا بٹھانے کا حکم دیا اور دوسرے تمام اہل مجلس کرسیوں یا قالینوں پر نیچے بیٹھے تھے۔ جب یوسف علیہ السلام مجلس میں آئے تو ساری مجلس نے جن میں ان کے والدین بھی شامل تھے، ان کی تعظیم کے لیے سجدہ کیا۔ بعض حضرات اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ سب لوگ جھک کر تعظیم بجا لائے، مگر "خَرُّوْا" کا لفظ اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتا، کیونکہ "وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا" کا معنی ہے "اور وہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے۔" حقیقت یہ ہے کہ پہلی امتوں میں تعظیم کے لیے سجدہ جائز تھا، جس میں مسجود کو اللہ کے کسی اختیار میں شریک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہاں عبادت کا سجدہ ہمیشہ غیر اللہ کے لیے حرام رہا ہے اور وہ ایسا سجدہ ہے کہ کسی کو غیبی علم اور قوت و اقتدار اور نفع نقصان کا مالک سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کے ساتھ شرک ہے، اس مقصد کے لیے قیام اور سینے پر ہاتھ باندھنا بھی شرک ہے۔ ایک سجدہ جبراً کروایا جاتا ہے، وہ نہ عبادت ہے نہ تعظیم، وہ مجبوری ہے۔ پہلی امتوں میں تعظیم کے لیے سجدہ جائز تھا، جیسا کہ فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو سجدہ اور برادران یوسف اور ان کے والدین کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ تھا۔ یہ رواج عیسیٰ علیہ السلام کی امت تک جاری رہا۔ ہماری امت میں شرک کے ذرائع کے سدباب کے لیے تعظیمی سجدہ بھی قیامت تک کے لیے حرام کر دیا گیا اور قیام بھی، ہاں آگے بڑھ کر استقبال کرنا مسنون ہے اور وہ اس عجمی رسم میں شامل نہیں جس میں کسی کے آنے پر سب لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ سجدۂ تعظیمی سے بھی صاف الفاظ میں منع فرمایا، چنانچہ عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب شام سے آئے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا هٰذَا يَا مُعَاذُ !؟ قَالَ أَتَيْتُ الشَّامَ فَوَافَقْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ

الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

احسان کیا جب مجھے قید خانے سے نکالا اور تمھیں صحرا سے لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ڈال دیا۔ بے شک میرا رب جو چاہے اس کی باریک تدبیر کرنے والا ہے، بلاشبہ وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۰۰﴾

لِأَسَاقِفَتِهِمْ وَبِطَارِقَتِهِمْ فَوَدِدْتُ فِيْ نَفْسِيْ أَنْ تَفْعَلَ ذٰلِكَ بِكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فَلَا تَفْعَلُوْا، فَإِنِّيْ لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَّسْجُدَ لِغَيْرِ اللّٰهِ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا ﴾ [ ابن ماجه، النكاح، باب حق الزوج على المرأة : ۱۸۵۳ ـ ابن حبان : ۴۱۷۱، و قال الألباني حسن صحيح ] ''معاذ! یہ کیا ہے؟'' کہا: ''میں شام گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں اور سرداروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو میں نے اپنے دل میں چاہا کہ ہم آپ کے ساتھ ایسا ہی کریں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم ایسا مت کرو، کیونکہ اگر میں کسی کو حکم دینے والا ہوتا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔'' سورۂ حٰم السجدہ (۳۷) میں بھی اللہ کے سوا سجدہ منع کر دیا گیا ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''پہلے وقت میں سجدۂ تعظیمی تھا، فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا ہے، اس وقت اللہ نے وہ رواج موقوف کیا، فرمایا: ﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ﴾ [ الجن : ۱۸ ] اس وقت پہلے رواج پر چلنا دیا ہے کہ کوئی اپنی بہن سے نکاح کرے کہ آدم علیہ السلام کے وقت ہوا ہے۔'' (موضح)

② وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ...... : یوسف علیہ السلام نے یاد دلایا کہ یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو کئی سال پہلے میں نے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے سچا کر دیا، محض پریشان خواب نہیں رہنے دیا۔ خواب اور اس ملاقات کے درمیان کی مدت کسی نے چالیس سال بتائی، کسی نے اسی (۸۰) سال، ابن اسحاق نے اٹھارہ سال بتائی اور کہا کہ اہل کتاب کا خیال ہے کہ وہ چالیس سال یا اس کے لگ بھگ تھی۔ ''التحریر و التنویر'' میں ابن عاشور رحمہ اللہ نے بائیس سال لکھی ہے۔ اصل حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، مگر چالیس اور اسی (۸۰) سال والی بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی اور وحی الٰہی کے فیصلے کے بغیر تعیین کرنا اندھیرے میں تیر چلانا ہے۔

③ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ : اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان کئی سال کا وقفہ ہو سکتا ہے، کنویں میں پھینکے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا احسان بذریعہ وحی حوصلہ دلانا تھا، پھر کنویں سے نکلوانا، پھر باعزت جگہ دینا، علم و حکمت عطا کرنا، غرض اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام پر بے شمار احسانات کیے تھے، مگر انھوں نے اللہ کے احسان کا تذکرہ قید خانے سے نکالنے سے شروع کیا، کیونکہ اس سے پہلے ساتھ آزمائشیں بھی تھیں اور ان کے تذکرے سے بھائیوں کی شرمندگی بھی ممکن تھی۔ یہ انبیاء ہی کا حوصلہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی کسی زیادتی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ان

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫

اے میرے رب! بے شک تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا اور باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھایا، آسمانوں

کے سارے برے سلوک کو شیطان کی کارستانی قرار دے کر انھیں شرمندگی سے بچانے کی کوشش کی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”جو اللہ کے احسان تھے سو ذکر فرمائے اور جو تکلیف تھی دخل شیطان سے، اس کو منہ پر نہ لائے، مجمل سنا دیا۔“ (موضح)

④ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ ...... : بدو، بادیہ نشینی حضر یعنی شہر میں رہنے کے بالمقابل ہے۔ ”بَدْوٌ“ ”بَدَا يَبْدُوْ“ کا مصدر ہے، یعنی ظاہر ہونا، کیونکہ بادیہ نشینوں کے گھر ہر ایک کو نظر آتے ہیں۔ مصر کے مقابلے میں کنعان کی حیثیت بدو کی تھی۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان کے شہر میں آنے کو بھی اپنے آپ پر احسان کہا، کیونکہ شہر کے لوگ اکثر سلیقہ شعار، میل جول کی وجہ سے نرم طبیعت اور حصول علم کے مواقع کی وجہ سے علم سے آراستہ ہوتے ہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ سَكَنَ الْبَادِيَةَ جَفَا )) [ ترمذي، الفتن، باب من أتي أبواب السلطان افتتن : ٢٢٥٦۔ نسائي : ٤٣١٤۔ أبو داؤد : ٢٨٥٩۔ أحمد : ٣٥٧/١، ح : ٣٣٦١ و صححه الألباني عن ابن عباس رضي الله عنهما ] ”جو بادیہ میں رہائش رکھے وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔“ اور تمام انبیاء شہروں اور بستیوں ہی میں سے بھیجے گئے، جیسا کہ آگے آیت (۱۰۹) میں آ رہا ہے، بلکہ رسول ایسی بستی میں بھیجے گئے جو دوسری بستیوں کے مرکز تھے۔ (دیکھیے قصص : ۵۹) ”لَطِيْفٌ“ ایسی چیز جو حواس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت لطیف اس لحاظ سے ہے کہ وہ باریک سے باریک چیز کی خبر رکھنے والا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی تدبیر نہایت باریک ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی اور اس لحاظ سے اس کا معنی لطف و کرم کرنے والا بھی ہے کہ وہ ایسے باریک طریقے سے مہربانی فرماتا ہے کہ نظر ہی نہیں آتا کہ یہ کیسے ہو گئی۔ (مفردات)

⑤ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ : یعنی یہ جو کچھ ہوا اسی کے کمال علم و حکمت کا کرشمہ ہے۔

**آیت 101** ① رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ ...... : پچھلی آیت میں یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کیا ہے، یہاں سے وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی صفت ربوبیت کے ساتھ مخاطب کر کے اور مزید نعمتوں کا ذکر کر کے اس چیز کی دعا کرتے ہیں جو ان تمام نعمتوں سے بڑی ہے اور اتنی نعمتوں کے باوجود یوسف علیہ السلام سب سے زیادہ اسی کے متعلق فکر مند ہیں اور فی الواقع اصل فکر اسی کی ہونا لازم ہے۔ عرض کیا اے ہر لمحے میری نگہداشت کر کے، میری ہر ضرورت پوری کر کے مجھے پالنے والے! تو نے مجھے حکومت میں سے حصہ بھی دیا (”مِنْ“ بمعنی بعض ہے، کیونکہ وہ وزیر خزانہ تھے اور اگر کوئی بادشاہ ہے تو اس کے پاس بھی بادشاہی کا ایک حصہ ہی ہے، کل بادشاہی تو ایک ہی ہستی کی ہے۔ ”تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ“) اور مجھے باتوں کی اصل حقیقت سمجھنے میں سے کچھ سکھایا (یہاں بھی ”مِنْ“ بعض کے معنی میں ہے، کیونکہ ہر بات کی اصل حقیقت تو ایک ہستی ہی جانتی ہے۔ ”وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ“، یہاں ”تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ“ میں خوابوں کی تعبیر، مقدمات کے فیصلے، وحی الٰہی کا علم سب شامل ہیں)، دنیا و آخرت میں میرا یار و مددگار صرف تو ہے، میری آخری درخواست یہ ہے کہ جب تو مجھے فوت کرے تو

اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

اور زمین کو پیدا کرنے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا یار و مددگار ہے، مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے ﴿۱۰۱﴾

میں اس وقت تیرا فرماں بردار ہوں، کیونکہ ہمیشہ کی زندگی کا سارا دارو مدار اسی پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ )) [ بخاري، الرقاق، باب الأعمال بالخواتيم ..... : ٦٤٩٣ ] ''اعمال کا دارومدار ان کے خاتموں ہی پر ہے۔'' اس میں ہمارے لیے سبق ہے کہ آدمی دنیا کے جتنے بھی اونچے مرتبے پر پہنچ جائے اسے ہر وقت فکر آخرت ہی کی لازم ہے، کیونکہ وہ باقی ہے اور دنیا کا ہر منصب فانی ہے۔

❷ وَ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ: صالحین میں عام صالحین کے ساتھ اعلیٰ درجے کے صالح، یعنی انبیاء بھی داخل ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ آل عمران : ٣٩ ] ''اور وہ سردار اور اپنے آپ پر بہت ضبط رکھنے والا اور نبی ہوگا، صالحین (نیک لوگوں) میں سے۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: (( مَا مِنْ نَبِيٍّ يَمْرَضُ إِلَّا خُيِّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَ كَانَ فِيْ شَكْوَاهُ الَّذِيْ قُبِضَ فِيْهِ أَخَذَتْهُ بُحَّةٌ شَدِيْدَةٌ، فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: ﴿ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ فَعَلِمْتُ أَنَّهُ خُيِّرَ )) [ بخاري، التفسير، باب ﴿ فأولئك مع الذين ..... ﴾ : ٤٥٨٦ ] ''کوئی نبی (مرض الموت) میں بیمار نہیں ہوتا حتیٰ کہ اسے دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ جس بیماری میں فوت ہوئے، آپ کو گلے کی سخت تکلیف ہوگئی تو میں نے آپ سے سنا، آپ کہہ رہے تھے: ﴿ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ النساء : ٦٩ ] ''میں ان کا ساتھ چاہتا ہوں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالح لوگوں میں سے'' تو میں سمجھ گئی کہ اب آپ کو اختیار دیا گیا ہے۔'' معلوم ہوا قیامت کے دن صالحین کے ساتھ شامل ہونے کی خواہش اور دعا صرف یوسف علیہ السلام ہی نے نہیں بلکہ ساری اولاد آدم کے سردار نے بھی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں فضل و کرم سے ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔ (آمین)

❸ ''تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا'' سے بعض لوگوں نے دلیل پکڑی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے موت کی دعا کی، اس لیے موت کی دعا جائز ہے، حالانکہ یہ مطلب درست نہیں۔ کسی بھی امر یا نہی کے ساتھ کوئی قید مثلاً حال یا صفت وغیرہ ہو تو وہ قید مقصود ہوتی ہے، مثلاً ''لَا تَشْرَبْ قَائِمًا'' کے یہ معنی نہیں کہ مت پیو، بلکہ معنی یہ ہے کہ کھڑے ہو کر مت پیو اور '' كُلْ بِيَمِيْنِكَ وَ كُلْ مِمَّا يَلِيْكَ'' میں یہ حکم نہیں کہ کھانا کھاؤ، بلکہ یہ ہے کہ کھاؤ تو دائیں ہاتھ سے اور ادھر ادھر سے نہیں بلکہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔ اسی طرح ''تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا'' کا معنی ہے کہ مجھے جب بھی فوت کرے مسلم (فرماں بردار) ہونے کی حالت میں فوت کرنا۔ اسی طرح ''فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ'' میں نماز اور قربانی کا حکم نہیں، وہ دوسری بہت سی آیات میں موجود ہے، بلکہ مراد ہے کہ نماز پڑھو تو

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہ تھا جب انھوں نے اپنے کام کا پختہ ارادہ کیا اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے ﴿۱۰۲﴾

صرف اپنے رب کے لیے اور اسی طرح قربانی بھی اسی کے لیے کرو، اس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔

④ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا کسی تکلیف کی وجہ سے ہرگز نہ کرے، جو اس پر آئے، اگر اسے ضرور ہی یہ تمنا کرنی ہے تو یوں کہے: « اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَ تَوَفَّنِيْ إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ »[ بخاري، المرضى، باب تمنى المريض الموت : ۵۶۷۱۔ مسلم : ۲۶۸۰ ] ''اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندہ رہنا میرے لیے بہتر ہے اور مجھے اس وقت فوت کر لے جب موت میرے لیے بہتر ہو۔'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی تکلیف یا بیماری کی وجہ سے موت کی دعا کرنا منع ہے، البتہ جب دین میں فتنے کا خوف ہو تو یہ دعا کر سکتا ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے محمد! جب تو نماز پڑھے تو یوں کہا کر: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَ إِذَا أَرَدْتَّ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِيْ إِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ » [ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة صٓ : ۳۲۳۳، و صححه الألباني ] ''اے اللہ! میں تجھ سے نیکیاں کرنے اور برائیوں کو چھوڑنے کا اور مساکین کی محبت کا سوال کرتا ہوں اور جب تو اپنے بندوں کے متعلق کسی فتنے ( آزمائش ) کا ارادہ کرے تو مجھے اس فتنے میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے پاس فوت کر لے۔'' اور جیسا کہ مریم علیہا السلام نے کہا: ﴿ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴾ [ مریم : ۲۳ ] ''اے کاش! میں اس سے پہلے مر جاتی اور بھولی بھلائی ہوتی۔'' حافظ ابن کثیر نے یہاں علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنی امارت کے آخر وقت میں جب دیکھا کہ معاملات ان کے حق میں جمع نہیں ہو رہے اور معاملہ زیادہ سخت ہوتا جاتا ہے تو کہا: '' اَللّٰهُمَّ خُذْنِيْ إِلَيْكَ فَقَدْ سَئِمْتُهُمْ وَ سَئِمُوْنِيْ '' ''اے اللہ! مجھے اپنے پاس لے جا، کیونکہ میں ان سے اکتا گیا ہوں اور یہ لوگ مجھ سے اکتا گئے ہیں۔'' اور امام بخاری پر جب آزمائشیں آئیں اور امیر خراسان کے ساتھ ان کا معاملہ بگڑا تو انھوں نے دعا کی: '' اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنِيْ إِلَيْكَ '' ''اے اللہ! مجھے اپنے پاس لے جا۔'' ان تاریخی روایات کی سند حافظ ابن کثیر نے ذکر نہیں فرمائی۔ ( واللہ اعلم )

⑤ یہاں یوسف علیہ السلام کا قصہ ختم ہوا۔ یہ واحد قصہ ہے جو قرآن مجید میں اکٹھا ایک ہی مقام پر بیان کیا گیا ہے، مگر لطف یہ ہے کہ اس میں سے ہر وہ تفصیل ترک کر دی گئی ہے جس کی اس موقع پر ہدایت کے مقصد کے لیے ضرورت نہیں تھی۔ اب آگے اس قصے سے حاصل ہونے والے چند اسباق ذکر ہوں گے۔

**آیت 102** ① ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ : یعنی غیب کی یہ خبریں اپنی صحیح تفصیلات کے ساتھ ہم نے آپ کو

وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ۝۱۰۳ وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۝۱۰۴ؒ

ع ۱۱ ۵

اور اکثر لوگ، خواہ تو حرص کرے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں ۱۰۳ حالانکہ تو ان سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا۔ یہ تو جہانوں کے لیے ایک نصیحت کے سوا کچھ نہیں ۱۰۴

وحی کے ذریعے سے بتائیں، ہماری وحی کے بغیر آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتی تھیں۔ اس سے مقصود کفارِ مکہ کو متنبہ کرنا تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں، اگر سچے پیغمبر نہ ہوتے تو ہزاروں برس پہلے کے یہ واقعات کیسے معلوم کر سکتے تھے اور تمھیں کیسے سنا سکتے تھے۔

2 وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ ...... : یعنی اگر ہم آپ کو نہ بتاتے تو آپ کو کچھ خبر نہ تھی، کیونکہ آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے۔ قرآن مجید نے ”وَمَا كُنْتَ“ کے ساتھ یہ بات کئی جگہ دہرائی ہے اور اپنا احسان جتلایا ہے کہ آپ کو گزشتہ واقعات کا کچھ علم نہ تھا، نہ آپ وہاں موجود تھے جب یہ سب کچھ ہوا، یہ ہم ہی ہیں جنھوں نے وحی کے ذریعے سے آپ کو یہ واقعات بتائے۔ اس لیے اہلِ مکہ اور دوسرے کفار کو آپ کی نبوت میں ہرگز شک نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ان مسلمانوں کے لیے بھی سبق ہے جو کہتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ کو ہر بات کا پہلے ہی علم تھا، اگر ایسا ہی تھا تو وحی کی کیا ضرورت تھی۔ قرآن مجید کی ”وَمَا كُنْتَ“ والی تمام آیات آپ کے علم غیب کی نفی کرتی ہیں۔ ”وَمَا كُنْتَ“ کے مقامات کی سیر کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۂ آل عمران (۴۴)، ہود (۴۹)، یوسف (۱۰۲)، قصص (۴۴، ۴۵، ۴۶، ۸۶)، عنکبوت (۴۸) اور شوریٰ (۵۲)۔

3 اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کا قصہ اہل کتاب سے جن تفصیلات کے ساتھ منقول ہے وہ تمام کی تمام صحیح نہیں، کیونکہ اگر صحیح ہوتیں تو ان کی کوئی بات قرآن مجید کے خلاف نہ ہوتی جو ان کی کتابوں پر نگران اور ان کے صحیح مضامین کا محافظ ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۴۸) اس لیے صحیح و غلط کے گڈمڈ ہو جانے کی وجہ سے ان کی معلومات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

آیت 103 وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ...... : سورۂ یوسف کے نزول کے بعد، جو آپ کی نبوت کی واضح دلیل تھی، جب آپ کی یہ خواہش اور توقع پوری نہ ہوئی کہ اسے سننے والے ایمان لے آئیں گے تو اس پر آپ کا غم زدہ ہونا فطری بات تھی، اللہ تعالیٰ نے اس پر تسلی دی کہ آپ کی خواہش کے باوجود اکثر لوگ شیطان کے غلبے اور اپنی نفسانی خواہشات، حرص، حسد وغیرہ کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کی حکمتیں پوری طرح وہی جانتا ہے۔ اس سے جمہوریت، یعنی اکثریت کے نمائندوں کو قانون سازی کا حق دینے کی حیثیت بھی خوب واضح ہوتی ہے، خصوصاً جب وہ صاف اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف قانون بناتے اور چلاتے ہوں۔

آیت 104 1 وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ : یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ آپ ان سے اس تبلیغ پر اجرت مانگ کر ان پر بوجھ بن رہے ہوں، سو یہ بات ہے ہی نہیں۔

2 اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ : اور یہ بھی نہیں کہ یہ نہ مانیں گے تو دین کا کچھ بگاڑ لیں گے، یہ قرآن اور اسلام صرف انھی

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں ﴿۱۰۵﴾

کے لیے تو نہیں، یہ تو سارے جہانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اور بندے لے آئے گا جو اس کا علم اٹھالیں گے، باقی رہ گئے یہ لوگ تو اگر مانیں گے تو اپنے آپ کو فائدہ پہنچائیں گے اور نہ مانیں گے تو اپنا نقصان کریں گے، آپ ان کے رویے سے ہرگز رنجیدہ نہ ہوں۔

**آیت 105** وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ ...... : " كَاَيِّنْ " کاف تشبیہ اور " اَيٌّ " کا مرکب ہے، معنی اس کا ہے کتنی ہی، مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد ذکر ہونے والی چیز اتنی زیادہ ہے کہ اس کا شمار نہیں ہو سکتا۔ " اٰيَةٍ " نشانی سے مراد ایسی عجیب چیز ہے جو توجہ کو اپنی طرف کھینچ لے، اس طرح کہ وہ بھولنے نہ پائے، جیسے کہتے ہیں: " فُلَانٌ آيَةٌ فِي الذَّكَاءِ " یعنی فلاں شخص ذہانت میں آیت ہے، یعنی اتنا ذہین ہے کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے۔ توحید کی کچھ آیات تنزیلیہ ہیں جو نبی ﷺ پر اتریں اور بے شمار کونیہ ہیں جو کائنات کے ذرے ذرے میں بکھری پڑی ہیں۔ " يَمُرُّوْنَ " گزرنے سے مراد صرف یہی نہیں کہ چلتے ہوئے گزرتے ہیں، کیونکہ آسمان کی نشانیوں پر گزر کیسے ہو سکتا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ کتنی ہی بے شمار عجیب و غریب چیزیں ہیں جو روزانہ ان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں، مگر یہ ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ موٹی سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس دعوے کے مقابلے میں کہ "میں نے ہر چیز پیدا کی ہے، کوئی اور ہے جس نے ایک مکھی یا اس کا پر بھی پیدا کیا ہے تو سامنے لاؤ" جب کوئی بھی سر نہیں اٹھاتا اور تمھیں بھی یہ مانے بغیر چارہ نہیں تو اس کائنات میں اختیارات کا مالک یا اللہ تعالیٰ سے زبردستی منوا لینے والا کوئی دوسرا کیوں بنالیتے ہو؟ اور ہر چیز کے خالق و مالک کو چھوڑ کر اس کی مخلوق کو کس دلیل سے مشکل کشا سمجھتے اور پکارتے ہو۔ وہ نشانیاں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت جگہ ذکر کی ہیں۔ مثال کے طور پر دو تین مقامات ذکر کیے جاتے ہیں: ﴿ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [ الذاریات : ۲۰، ۲۱ ] "اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں اور تمھارے نفسوں میں بھی، تو کیا تم نہیں دیکھتے۔" اور دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۴ تا ۱۶۷) کائنات میں پھیلی ہوئی ان بے شمار نشانیوں میں سے کافی نشانیاں ان آیات میں بھی آگئی ہیں، بلکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہر اختیار ہونے کو بھی کمال طرز سے بیان فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ روم (۱۷ تا ۲۸) تھوڑی سی زحمت فرما کر ان مقامات کا مطالعہ کر لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر پوری طرح غور کرنے والا شخص یقیناً توحید، آخرت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت تک پہنچ جائے گا، ورنہ کم از کم کائنات کی چیزوں پر غور کرنے سے کسی نہ کسی مفید نتیجے یا ایجاد تک ضرور پہنچ جائے گا جو کم از کم دنیا میں اسے اور دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچائے گی۔ جیسا کہ دیگچی کی بھاپ سے ڈھکنا اٹھنے پر غور نے بھاپ کی قوت کو دریافت کر کے ریل اور کتنی ایجادات کیں۔ بجلی، گیس، لیزر، ایٹم یہ سب اللہ کی آیات کونیہ پر غور ہی کا نتیجہ ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے، اگر کوئی توحید تک نہ پہنچ سکے تو محنت اس کی بھی ضائع نہیں کرتا، کافر کو بھی اس کی سوچ اور فکر کے

وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں ﴿۱۰۶﴾

نتیجے میں کوئی نہ کوئی انعام دنیوی ہی سہی، ضرور دے دیتا ہے، مگر اصل کامیاب وہ ہے کہ یہ غور وفکر اسے اپنے خالق و مالک کی پہچان، اس اکیلے کی عبادت اور اس کے رسول پر ایمان تک پہنچا دے۔

آیت 106 وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ...... : اللہ پر ایمان کے دعوے کے ساتھ شرک کرنے والوں کی پہلی مثال کفار قریش ہیں جو آسمان و زمین کو پیدا کرنے والے، خود ان مشرکین کو پیدا کرنے والے اور ہر چیز کی مکمل ملکیت رکھنے والے اللہ تعالیٰ کو جانتے اور مانتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [ الزخرف : ۸۷ ] ”اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [ لقمان : ۲۵ ] ”اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔“ اس کے علاوہ دیکھیے سورۂ مومنون (۸۴ تا ۸۹) اور یونس (۳۱ تا ۳۵) اور ساتھ ہی کچھ ہستیوں کو اللہ کے ہاں اپنے سفارشی، اللہ کے قریب کرنے والے اور اپنے کام نکلوانے والے سمجھتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [ یونس : ۱۸ ] ”اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [ الزمر : ۳ ] ”اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مشرکین کہتے تھے: « لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ » تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: « وَيْلَكُمْ قَدْ قَدْ » ”تمھاری بربادی ہو، اس سے آگے مت کہنا“ (مگر وہ کہتے) « إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ ، يَقُوْلُوْنَ هٰذَا وَهُمْ يَطُوْفُوْنَ بِالْبَيْتِ » [ مسلم، الحج، باب التلبية وصفتها ووقتها : ۱۱۸۵ ] ”مگر ایک شریک جو تیرا ہی ہے، تو ہی اس کا مالک ہے، وہ مالک نہیں۔“ وہ یہ الفاظ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے کہتے تھے۔“ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، اس طرح بھی وہ اللہ پر ایمان کے دعوے کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَعَلُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ﴾ [ الزخرف : ۱۹ ] ”اور انھوں نے فرشتوں کو، وہ جو رحمٰن کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی گواہی ضرور لکھی جائے گی اور وہ پوچھے جائیں گے۔“ مشرکین مکہ اللہ پر ایمان کے ساتھ ہی بزرگوں کے بتوں کی بھی پوجا کرتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ﴾ [ النجم : ۱۹ تا ۲۳ ] ”پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسری ایک

اور (دیوی) منات کو۔ کیا تمھارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں؟ یہ تو اس وقت ناانصافی کی تقسیم ہے۔ یہ (بت) چند ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔'' انھوں نے عین کعبہ کے اندر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی صورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ [ بخاري، الحج، باب من کبّر في نواحي الکعبۃ : ۱۶۰۱ ] اہل کتاب بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان کے دعوے دار تھے، اس کے باوجود عزیر اور مسیح علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ کبھی کہتے تھے، اللہ تعالیٰ خود ہی مسیح کی شکل میں آ گیا، اصل میں دونوں ایک ہیں: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ [ المائدۃ : ۷۲ ] کبھی تین کو ایک کہتے، کبھی اللہ کو تین کا تیسرا کہتے: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ﴾ [ المائدۃ : ۷۳ ] اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا حلال و حرام کرنے کا اختیار رکھنے والے رب سمجھتے: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [ التوبۃ : ۳۱ ] ان کی قبروں پر مسجدیں بنا کر ان کی پرستش کرتے، فرمان رسول ہے: (( لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ )) [ بخاري، المغازي، باب مرض النبي صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ : ۴۴۴۳، ۴۴۴۴ ] ''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

افسوس کہ عرصۂ دراز سے اکثر کلمۂ اسلام پڑھنے والوں کا بھی یہی حال ہو گیا ہے، ان میں سے بہت سے لوگ اللہ پر ایمان کے دعوے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں زمین پر اتر آیا ہے۔ بعض اپنے پیر کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بعض اپنے بزرگوں کی عبادت کرتے کرتے ان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ہی ہو جانے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بے شمار بڑے بڑے نام والے عالموں، پیروں اور ان کے معتقدین نے ہندوؤں کی طرح ہر چیز کو اللہ تعالیٰ قرار دے کر اس کا نام وحدت الوجود رکھ دیا ہے اور اس صریح کفر و شرک کو معرفت کا نام دے رکھا ہے، حالانکہ اس عقیدے سے اسلام کا ہر حکم ہی ختم ہو جاتا ہے اور یہی وہ الحاد اور صریح کفر ہے جس پر اسلام کا نقاب ڈال کر یہ لوگ زبردستی مسلمان بلکہ اسلام کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ عام مسلمانوں میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو زندہ یا مردہ بزرگوں کو حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں، مصیبت میں ان کو پکارتے ہیں، ان سے اولاد اور عزت و مال کے لیے فریاد کرتے ہیں، ان کے نام کے وظیفے کرتے اور نیازیں دیتے ہیں، ان کی پختہ قبریں بنا کر ان کا طواف اور انھیں سجدے کرتے ہیں۔ غرض کہ جو کچھ مکہ کے مشرک اپنے بتوں کے ساتھ کرتے تھے یہ جھوٹے مسلمان اپنے داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کے ساتھ کرتے ہیں اور دعویٰ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور ہم سب کو شرک سے بچائے اور توحید پر قائم رکھے۔ (آمین)

ایمان لانے کے باوجود شرک کرنے کی کچھ اور صورتیں بھی ہیں جن سے بچنا لازم ہے، مثلاً غیر اللہ کی قسم کھانا، ریاکاری یعنی دکھلاوا کرنا، بیماری سے بچنے کے لیے دھاگے، کڑے، منکے وغیرہ لٹکانا، بدشگونی لینا، کاہنوں، یعنی آئندہ کی خبریں بتانے والوں کے پاس جانا، ان سب کاموں کو صحیح احادیث میں شرک قرار دیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے توحید کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابیں، مثلاً تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

تو کیا وہ بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب میں سے کوئی ڈھانک لینے والی آفت آپڑے، یا ان پر قیامت اچانک آجائے اور وہ سوچتے بھی نہ ہوں ﴿۱۰۷﴾ کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں ﴿۱۰۸﴾

**آیت 107** ① اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ ...... : "غَشِيَ يَغْشٰى غَشْيًا وَ غَشَيَانًا" ہر جانب سے گھیر لینا، ڈھانک لینا، جیسے فرمایا: ﴿ وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ ﴾ [ لقمان : ۳۲ ] "اور جب انھیں سائبانوں جیسی عظیم موج ڈھانک لیتی ہے۔" غاشیہ وہ حادثہ جو چاروں طرف سے گھیر لے۔ عرب ایسے حوادث کو مؤنث ہی استعمال کرتے ہیں، مثلاً "اَلطَّامَّةُ، اَلصَّاخَّةُ، اَلدَّاهِيَةُ، اَلْمُصِيْبَةُ، اَلْكَارِثَةُ، اَلْحَادِثَةُ، اَلْوَاقِعَةُ، اَلْحَاقَّةُ" اس آیت میں مشرکین کے لیے سخت وعید ہے کہ کچھ بعید نہیں کہ کسی بھی وقت ان پر ہر طرف سے گھیرنے والا عذاب آجائے، مثلاً زلزلہ، طاعون، سیلاب اور طوفان وغیرہ۔

② "بَغْتَةً" "بَغَتَ" (ف) سے مصدر بمعنی اسم فاعل حال ہے (بَاغِتًا) اچانک۔

**آیت 108** ① قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ : لفظ "سَبِيْلٌ" مؤنث بھی آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے اور مذکر بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ﴾ [ الأعراف : ۱٤٦ ] معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیروکاروں کا راستہ اکیلے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت ہے، یعنی صرف اللہ کی عبادت اور اسی کے احکام کی اطاعت جو بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ پر اترے، اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی دعوت دے، یا رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی طرف سے اترنے والے احکام و مسائل کے بجائے کسی اور کی پیروی، مثلاً کسی امام یا پیر وغیرہ کی تقلید کی دعوت دے تو وہ نہ اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر چل رہا ہے، کیونکہ جس چیز کی طرف وہ بلا رہا ہے وہ اللہ کی طرف سے اتری ہی نہیں، وہ محض انسانی رائے یا خیال ہے۔

② عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ...... : "بَصَارَةٌ" آنکھوں کا دیکھنا اور "بَصِيْرَةٌ" دل سے اچھی طرح سمجھنا، یعنی میں اور میرے پیروکار خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے راستے پر قائم ہیں۔ "وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ" کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور خطا سے پاک ہے۔ اس اکیلے کی عبادت ہی حق ہے اور اس اکیلے کی وحی پر چلنا ہی حق ہے اور جو اس راہ کو چھوڑتا ہے وہ ایسی ہستیوں کی عبادت اور اطاعت کی وجہ سے مشرک ہے جو عیب اور خطا سے پاک نہیں ہیں۔ اس لیے میں کبھی ایسے مشرکوں میں شامل نہیں ہوسکتا۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر کچھ مرد، جن کی طرف ہم ان بستیوں والوں میں سے وحی کیا کرتے تھے، تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے۔ تو کیا تم نہیں سمجھتے ﴿۱۰۹﴾

آیت 109 ① وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ ...... : اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو آپ ﷺ کو انسان ہونے کی وجہ سے نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اترے۔ (دیکھیے فرقان: ۲۱) یہ رسول تو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ (دیکھیے فرقان: ۷) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے تمام رسول "رِجَالٌ" (مرد) ہی بھیجے۔ دوسرے مردوں سے ان کا فرق یہ تھا کہ ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے جس سے دوسرے لوگ محروم تھے۔

② اِلَّا رِجَالًا: اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ کچھ عورتیں بھی پیغمبر ہوئی ہیں، مثلاً حوا، آسیہ، سارہ، ام موسیٰ اور مریم علیہن السلام۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان عورتوں کو فرشتوں کے ذریعے سے وحی یا بشارت تو ضرور ملی ہے مگر اس سے ان کا معروف معنی میں نبی ہونا لازم نہیں آتا۔ نبی وہ ہے جس پر شرع کے احکام اتریں اور اس قسم کی وحی کسی عورت پر نہیں اتری، یہ شرف رجال (مردوں) ہی کو حاصل رہا ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے صراحت فرما دی تھی کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا، مگر اس آیت میں ان عورتوں کے جھوٹے دعوے کا پیشگی مزید رد ہے جنھوں نے آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا تھا، مثلاً سجاح نامی عورت۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ سے پہلے ہم نے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا، عورتوں کا اس میں کچھ دخل نہیں، کیونکہ رسول نے مردوں کو بھی دعوت دینا ہوتی ہے، الجھنا بھی پڑتا ہے، جنگ بھی ہوتی ہے اور یہ کام عورت کے بس کے نہیں ہیں۔

③ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى: اکثر اہل علم اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نبی ہمیشہ شہروں اور بستیوں کے رہنے والوں میں سے آئے ہیں، بادیہ یا صحرا نشینوں سے نہیں آئے، کیونکہ بادیہ نشین قدرتی طور پر غیر سنجیدہ اور سخت طبع ہوتے ہیں۔ مگر ابن عاشور رحمہ اللہ نے فرمایا: "یہ حصر اضافی ہے حقیقی نہیں۔" یعنی جو بات تم کہہ رہے ہو کہ آسمان سے فرشتہ اترنا چاہیے، یہ بات درست نہیں، تمام پیغمبر انسان ہی تھے اور زمین کی بستیوں ہی کے رہنے والے تھے، آسمان سے نہیں اترے تھے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام بدو میں رہتے تھے اور پیغمبر تھے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ﴾ [ یوسف: ۱۰۰ ] یا پھر یہ کہا جائے کہ یعقوب علیہ السلام بھی بستی ہی میں رہتے تھے، مگر ترقی یافتہ اور متمدن شہر مصر کے مقابلے میں اس بستی کنعان کی حیثیت بھی بدو اور صحرا کی تھی، جیسا کہ پیچھے گزرا۔

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

یہاں تک کہ جب رسول بالکل ناامید ہوگئے اور انھوں نے گمان کیا کہ ان سے یقیناً جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کے پاس ہماری مدد آگئی، پھر جسے ہم چاہتے تھے وہ بچالیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا ﴿۱۱۰﴾

④ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ...... : کفار آخرت کو تو مانتے نہیں تھے، اس لیے انھیں سمجھانے کے لیے دنیا میں گزرنے والے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے شام کو جاتے ہوئے پہاڑوں کو کھود کر بنائے ہوئے قوم ثمود کے مکانات اور قوم لوط کی بستیوں کی جگہ والا خرابہ اور پھر مصر کے اہرام نہیں دیکھے کہ انھیں عبرت ہوتی۔

⑤ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ...... : اگرچہ پچھلے کلام کا تقاضا تھا کہ کہا جاتا کہ ان کفار سے آخرت میں ہونے والا معاملہ اس سے بھی کہیں برا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے ان کا ذکر ہی چھوڑ کر متقی لوگوں کا انجام ذکر فرمایا، جس سے ان کا انجام خود بخود ظاہر ہو رہا ہے، اسے بلاغت کی اصطلاح میں احتباک کہتے ہیں۔

**آیت 110** ① حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ ...... : "اسْتَيْـَٔسَ" "يَئِسَ" میں مبالغہ ہے، یعنی بالکل مایوس ہو گئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس "حَتّٰۤى" (یہاں تک) کا تعلق پیچھے کس سے ہے، جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق گزشتہ آیت: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ ﴾ سے ہے، یعنی ہم نے تجھ سے پہلے فرشتے یا جن نہیں بلکہ آدمی بھیجے، وہ مدتوں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے رہے مگر ان کی قومیں ان پر ایمان نہیں لائیں، یہاں تک کہ جب رسول ان کے ایمان لانے سے بالکل ناامید ہو گئے۔ "ظَنُّوْۤا" "ظَنَّ" کے معنی وسوسہ، گمان اور یقین تینوں آتے ہیں، یعنی انھوں نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ "ظَنُّوْۤا" کے فاعل کے متعلق تین قول ہیں، ایک یہ کہ کفار ہیں، یعنی ان کی قوم کے کفار نے یقین کر لیا کہ رسولوں نے ہم سے جو کہا تھا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب آجائے گا، یہ بات ہم سے جھوٹ ہی کہی گئی تھی، کوئی عذاب وغیرہ نہیں آئے گا۔ اس وقت ان رسولوں کے پاس ہماری مدد آگئی اور مجرموں سے ہمارا عذاب ہٹایا نہیں جاتا۔ یہ معنی ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دوسرا یہ کہ "ظَنُّوْۤا" کے فاعل اہل ایمان ہیں، یعنی رسول کفار کے ایمان لانے سے ناامید ہو گئے اور مومنوں کو بھی وسوسہ پیدا ہونے لگا کہ شاید کفار پر عذاب آنے کی بات ان سے جھوٹ ہی کہی گئی تھی۔ یہ معنی بھی درست ہے، کیونکہ وسوسہ پیدا ہونا ایمان کے منافی نہیں، شیطان کا کام ہی لوگوں کے سینے میں وسوسے ڈالنا ہے، مگر اس پر مؤاخذہ نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِيْ عَنْ أُمَّتِيْ مَا وَسْوَسَتْ بِهِ صُدُوْرُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَكَلَّمْ » [ بخاري، العتق، باب الخطأ والنسيان في العتاقة...... : ۲۵۲۸۔ مسلم : ۱۲۷ ] "اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ان باتوں سے درگزر فرمایا ہے جن کا وسوسہ ان کے سینے ڈالیں، جب تک وہ انھیں منہ سے نہ نکالیں یا ان پر عمل نہ کریں۔"

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ع ۱۲

بلاشبہ یقیناً ان کے بیان میں عقلوں والوں کے لیے ہمیشہ سے ایک عبرت ہے، یہ ہرگز ایسی بات نہیں جو گھڑ لی جائے اور لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۱۱۱﴾

تیسرا وہ جو شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یعنی وعدۂ عذاب کو دیر لگی یہاں تک کہ رسول لگے ناامید ہونے کہ شاید ہماری زندگی میں نہ آیا پیچھے آوے اور ان کے اصحاب خیال کرنے لگے کہ شاید وعدہ خلاف تھا۔ اتنے خیال سے آدمی کافر نہیں ہوتا، مگر جانتا ہے کہ یہ خیال بد ہے۔'' (موضح) اگر ''ظن'' سے مراد وسوسہ ہو تو ''ظَنُّوْا'' سے مراد رسول بھی بعید نہیں، كَذَا قَالَ ابْنُ تَيْمِيَةَ (روح المعانی) کیونکہ لمبی آزمائشوں اور مصیبتوں میں خیال آ ہی جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [ البقرة : ۲۱۴ ] ''یا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگی اور تکلیف پہنچی اور وہ سخت ہلائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔'' اس آیت کی روشنی میں یہ معنی بھی قرین عقل ہے۔ مراد اس آیت سے رسولوں پر آنے والی آزمائشوں کی مدت کی لمبائی اور ان کے صبر کے پیمانے کے لبریز ہونے کے قریب تک پہنچ جانے پر اللہ کی مدد کا آنا ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔

❷ جَآءَهُمْ نَصْرُنَا : یعنی پیغمبروں کو ہماری مدد پہنچ گئی۔

❸ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ : لہٰذا اب اگر عذاب آنے میں دیر ہو رہی ہے تو دھوکا نہ کھاؤ کہ یہ محض ڈراوا ہی ہے۔

**آیت 111** لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ ...... : یعنی رسولوں اور گزشتہ قوموں خصوصاً یوسف علیہ السلام اور ان سے متعلق تمام لوگوں مثلاً والد، بھائی، قافلے والے، عزیز مصر، اس کی بیوی، زنان مصر، قید کے ساتھی اور شاہ مصر ان سب کے بیان میں عقل مندوں کے لیے بڑی عبرت ہے، یہ کوئی گھڑی ہوئی کہانیاں نہیں، بلکہ پہلی آسمانی کتابوں کی صحیح باتوں کی تصدیق، ان کی کمی بیشی کو کھول کر بیان کرنے والی، ان کے صحیح مضامین کی محافظ اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

سورۃ الرعد بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ① اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓرٰ۔ یہ کامل کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے اور لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ① اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنھیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ

**آیت 1** ① **الٓمّٓرٰ** : یہ حروفِ مقطعات ہیں، ان کی تفصیل سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ شعراوی رحمہ اللہ نے یہاں ایک فائدہ ذکر فرمایا ہے کہ قرآن مجید سارا وصل پر مبنی ہے، یعنی ہر لفظ دوسرے سے ملا ہوا ہے، سوائے اس مقام کے جہاں وقف کرنا ہو، جیسا کہ آیت کا آخر وغیرہ، مثلاً اسی سورت کو لے لیں: ﴿ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ﴾ اس میں ہر لفظ پر اعراب پڑھیں گے، مگر حروف مقطعات "الٓمّٓرٰ" کو ملا کر نہیں پڑھیں گے، بلکہ چاروں حرفوں کو الگ الگ پڑھیں گے، کیونکہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی پڑھایا، پھر آپ نے ایسے ہی پڑھا اور ہم تک تواتر سے ایسے ہی پہنچا۔

② **تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ** : کوئی لفظ جب مطلق بولا جائے تو اس سے کامل فرد مراد ہوتا ہے، مثلاً کہتے ہیں: "فُلَانٌ الرَّجُلُ" یعنی فلاں شخص مرد ہے، مطلب واقعی سچ مچ کامل مرد ہے، بخیل، بزدل، جھوٹا یا لولا لنگڑا نہیں۔ اسی طرح دین و عقائد میں "اَلْكِتَابُ" سے مراد کامل کتاب قرآن مجید لیا جاتا ہے۔ نحو میں سیبویہ کی کتاب کو "اَلْكِتَابُ" اور شہروں میں سے "مَدِيْنَةُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم" کو "اَلْمَدِيْنَةُ" کہا جاتا ہے۔

③ **وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ** : یعنی آپ کی طرف جو کچھ نازل کیا گیا وہی عین حق ہے، مگر اکثر لوگ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔ اس میں انسانوں کی اکثریت کی رائے کے پرستاروں کے لیے سبق ہے اور ان لوگوں کی تعریف بھی ہے جو ایمان سے بہرہ ور ہیں، وہ قلیل بھی ہو سکتے ہیں کثیر بھی، مگر اکثریت انھی کی ہے جو ایمان کی سعادت سے محروم ہیں۔

**آیت 2** ① **اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ** : لفظ "اَللّٰہُ" اس پاک ہستی کا ذاتی نام ہے جس نے سب کچھ بنایا اور اسے چلا رہا ہے۔ اس ایک لفظ میں اس کی ساری صفات آ جاتی ہیں۔ ایمان اس ہستی کی توحید، اس کے رسولوں کی تصدیق اور اس کے سامنے قیامت کو پیش ہونے کے عقیدے کا نام ہے۔ یہاں سے اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے آسمان و زمین میں اپنی قدرت کی کچھ نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے، تاکہ وہ توحید و رسالت اور قیامت پر ایمان لے آئے۔ سب سے پہلے آسمان کا ذکر فرمایا، سورۂ نازعات (۲۷) میں فرمایا: "کیا تمھیں (پہلی بار یا دوبارہ) پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کو؟" اپنے وجود اور آسمان کے وجود کا مقابلہ کر کے تو دیکھو، اور فرمایا: ﴿ لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ ﴾ [ المؤمن : ۵۷ ] "یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے۔"

وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۲

عرش پر بلند ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک ایک مقرر وقت کے لیے چل رہا ہے، وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، کھول کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرلو ۲

② بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا : "عَمَدٍ" اسم جمع ہے، جمع نہیں، اس کا مفرد "عَمُوْدٌ" یا "عِمَادٌ" ہے۔ (شعراوی) اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس قدر وسیع اور عظیم آسمانوں کو کسی بھی قسم کے ستونوں کے بغیر بلند کر دیا، تم خود انھیں دیکھ رہے ہو کہ ان کے نیچے کوئی ستون نہیں، جب کہ تم چھوٹی سے چھوٹی چھت بھی دیواروں یا ستونوں کے بغیر نہیں بنا سکتے۔ محض اپنی قدرت اور بے پناہ قوت کے ساتھ اتنا اونچا بنانے کے بعد وہیں تھام کر رکھنا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [ الحج : ٦٥ ] "اور وہ آسمان کو تھام کر رکھتا ہے، اس سے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کے اذن سے۔" مزید دیکھیے سورۂ فاطر (۴۱) اس صورت میں "تَرَوْنَهَا" (تم انھیں دیکھتے ہو) میں ضمیر کا مرجع لفظ "السَّمٰوٰتِ" ہوگا اور "تَرَوْنَهَا" الگ نیا جملہ ہوگا کہ تم خود آسمانوں کو اس حالت میں دیکھ رہے ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ "تَرَوْنَهَا" کو "عَمَدٍ" کی صفت قرار دیا جائے، پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ اس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند فرمایا جنھیں تم دیکھتے ہو، گویا ستون ہیں مگر تمھیں نظر نہیں آتے، نہ کہیں نگاہ کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں۔ آیت دونوں معنوں کا امکان رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے دونوں ممکن ہیں، اس لیے ترجمہ میں بھی دونوں معنوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ علمائے تفسیر میں سے کسی نے پہلے معنی کو ترجیح دی اور کسی نے دوسرے کو۔ امام المفسرین طبری رحمہ اللہ نے فرمایا، حق یہ ہے کہ ہم بھی اسی طرح کہیں جیسے اللہ نے فرمایا۔ (خلاصہ) یعنی پورے علم کے بغیر ایک معنی کو ترجیح نہ دیں۔ (واللہ اعلم) (یہاں طبری کے فیصلے کی پوری عبارت نہایت پر لطف ہے) کیا معلوم کہ کسی وقت تجربے سے ثابت ہو جائے کہ فضا میں نظر نہ آنے والی کوئی چیز موجود ہے جس پر آسمان قائم ہیں۔

③ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ : قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا سات جگہ آتا ہے، سورۂ اعراف (۵۴)، یونس (۳)، رعد (۲)، طٰہٰ (۵)، فرقان (۵۹)، سجدہ (۴) اور حدید (۴) اللہ تعالیٰ کے تعلق سے عرش کا ذکر اکیس (۲۱) مرتبہ اور ملکہ سبا کے تعلق سے چار (۴) مرتبہ آیا ہے۔ مستوی علی العرش کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴) اور سورۂ حاقہ (۱۷)۔

④ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی چند نہایت واضح نعمتیں ذکر فرمائیں۔ تسخیر کا معنی ہے کسی کو اپنے تابع اور قابو میں کر لینا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو اپنے تابع اور پوری طرح پابند کر رکھا ہے، اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جس طرح جس کام پر لگا دیا ہے وہ اس سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ جو مدت مقرر کی ہے اس کے عین مطابق مقرر وقت پر چل رہے ہیں، یعنی قیامت تک یا اپنے دورے کے مقرر وقت کے مطابق، نہ ان کی رفتار بدلتی

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۳

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور ندیاں بنائیں اور اس میں تمام پھلوں میں سے ایک ایک جوڑا دو، دو قسم کا بنایا، وہ رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں ۳

---

ہے نہ طلوع وغیرہ کے نظام میں فرق آتا ہے۔ سورج اپنا دورہ سال میں پورا کرتا ہے، چاند ایک ماہ میں۔ کسی بھی سیارے یا سورج اور چاند کا آپس میں نہ کوئی ٹکراؤ ہے نہ حادثہ۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت و حکمت کی کتنی بڑی نشانی ہے۔

5 يُدَبِّرُ الْاَمْرَ : کسی کام کی تدبیر کا معنی اسے اس کے سب سے اچھے، مضبوط اور مکمل طریقے پر چلانا ہے۔ مختصر سے عطا کردہ اختیار سے تم جو تدبیریں کرتے ہو ان کا نتیجہ بھی دیکھ لو، کوئی پوری ہوتی ہے کوئی نہیں اور کوئی کسی حادثے کی نذر ہو جاتی ہے اور اس عزیز و حکیم کی تدبیر امور کو دیکھو۔

6 يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ: اس میں کائنات میں موجود نشانیاں بھی شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل شدہ آیات بھی کھول کر بیان کرنا ہے کہ دونوں کس قدر واضح ہیں، جن کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

7 لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ : یعنی ان تمام آیات کی تفصیل کا مقصد تمھیں یہ یقین دلانا ہے کہ ایسی عظیم مخلوقات کو پیدا کرنے اور ان کی تدبیر کرنے والے پروردگار کے لیے تمھیں دوبارہ پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں اور ہر حال میں تمھیں اس کے سامنے پیش ہونا ہے۔

آیت 3 1 وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ...... : "مَدَّ" کا معنی پھیلانا ہے۔ "رَوَاسِيَ" "رَاسِيَةٌ" کی جمع ہے، "رَسَا يَرْسُوْ" کا معنی زمین میں گڑا ہوا ہونا ہے، لفظی معنی زمین میں گڑے ہوئے، مراد پہاڑ ہیں۔ پہلے اوپر کے جہان کا تذکرہ فرمایا، پھر زمین، آسمان، سورج، چاند وغیرہ کا، اب نیچے کے جہان میں اللہ تعالیٰ کی چند قدرتوں کا ذکر ہے کہ زمین ایک کرہ ہونے کے باوجود اتنی وسیع بنائی کہ طول و عرض میں آدمی کی نگاہ اس کی انتہا کو نہیں پاتی، انسان اور حیوان کسی تکلیف کے بغیر اس پر چلتے پھرتے ہیں، انسان عظیم الشان عمارتیں بناتے ہیں۔ زمین کا توازن قائم رکھنے کے لیے اور ہر وقت زلزلے کی کیفیت سے محفوظ رکھنے کے لیے اس میں بہت نیچے تک گڑے ہوئے اور بہت اوپر تک اٹھے ہوئے پہاڑ بنا دیے اور تمھاری زندگی کی بقا کے لیے دریا اور ندی نالے بنا دیے۔ ندی نالوں کا ذکر پہاڑوں کے ساتھ فرمایا، کیونکہ دریا عموماً پہاڑوں ہی سے نکلتے ہیں۔

2 وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ...... : اس جملے میں ایک ایسی حقیقت بیان فرمائی ہے جس کا پوری طرح انکشاف کچھ مدت پہلے ہی ہوا ہے۔ پہلے لوگوں کو صرف چند درختوں کے جوڑا یعنی نر اور مادہ ہونے ہی کا علم تھا جن کے نر درخت الگ اور مادہ الگ ہوتے ہیں، مثلاً کھجور اور پپیتا وغیرہ۔ پھر ثابت ہوا کہ ہر درخت ہی کا پھل نر اور مادہ پھولوں کا بور ملنے سے وجود میں آتا ہے،

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے مختلف ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت کئی تنوں والے اور ایک تنے والے، جنھیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو پھل میں بعض پر فوقیت دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ④

یعنی ہر پھل میں جوڑا موجود ہے، پھر نر و مادہ دونوں پھول بعض اوقات ایک ہی پودے میں موجود ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ایک درخت کے ایک ہی پھول میں نر و مادہ دونوں حصے پائے جاتے ہیں۔ کتنی عظیم قدرتوں کا مالک ہے وہ جس کی صرف ایک تخلیق کی ایک حقیقت جو خود اس نے سیکڑوں برس پہلے بیان فرما دی تھی، اب کہیں انسان اسے کسی حد تک پا سکے ہیں۔ عموماً قدیم مفسرین نے اس کا معنی ہر پھل میں سے دو قسمیں کیا ہے، مثلاً میٹھا اور کھٹا، گرم اور سرد، چھوٹا اور بڑا، سیاہ اور سفید وغیرہ، یہ معنی بھی درست ہے۔

③ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ : یہ اس کی قدرت کا اور اپنے بندوں پر رحمت کے ایک اور نمونے کا بیان ہے۔ "غَشِيَ يَغْشٰى" (ع) کا معنی ڈھانپنا ہے۔ "يُغْشِيْ" باب افعال "أَغْشٰى يُغْشِيْ" سے ہے، معنی ہے کسی چیز کو دوسری چیز کے لیے ڈھانپنے والی بنا دینا۔ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے، اگلی بات خود سمجھ میں آ رہی ہے، اس لیے حذف کر دی، یعنی دن کو رات پر اڑھا دیتا ہے تو روشنی ہو جاتی ہے، دونوں ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں۔ دونوں کے فوائد کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۷۱ تا ۷۳)۔

④ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ...... : یعنی جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں ان کے لیے ان چیزوں میں بہت سے دلائل ہیں کہ وہ اللہ کہ مکان و زمان کی ہر حرکت و سکون اور ہر تبدیلی مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں ہے، وہ انسان کو بھی دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ موضح میں ہے: ''رنگا رنگ چیزیں بنانا نشان ہے کہ اپنی خوشی سے بنایا، اگر ہر چیز خاصیت سے ہوتی تو ایک سی ہوتی۔'' رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاں عالم سفلی، یعنی زمین کے دلائل کا ذکر ہے اس کے آخر میں: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ یا اس کا ہم معنی جملہ لایا گیا ہے، جس سے اشارہ ہے کہ ان چیزوں پر غور و فکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اختلاف طبعی اسباب کے تحت نہیں (یعنی خود بخود ایسا نہیں ہو رہا بلکہ ایک کرنے والا سب کچھ کر رہا ہے)۔

**آیت 4** ① وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ ...... : "قِطَعٌ" "قِطْعَةٌ" کی جمع ہے، بمعنی ٹکڑے۔ "مُّتَجٰوِرٰتٌ" "جِوَارٌ" (ہمسائیگی) سے باب تفاعل کا اسم فاعل ہے، یعنی ساری زمین ایک جیسی نہیں، کوئی ٹکڑا زرخیز زمین کا ہے کوئی شور کا، کوئی نرم زمین ہے کوئی پتھریلی اور یہ سب قطعے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، اب اسی زمین میں کسی علاقے میں کوئی کھیتی اور پھل

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الۡاَغۡلٰلُ فِيۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝۵

اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم یقیناً ایک نئی پیدائش میں ہوں گے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝۵

پیدا ہوتا ہے کسی میں کوئی، اور اسی میں انگوروں (اور دوسرے پھلوں) کے باغات ہیں (قرآن کا اختصار دیکھیے کہ صرف انگوروں کا ذکر کر کے باقی باغات سننے والے کی سمجھ پر چھوڑ دیے) اور کھیتی ہے (اس میں ہر کھیتی آ گئی) اور کھجوروں کے درخت دو قسم کے ہیں ( "صِنۡوَانٌ" "صِنۡوٌ" کی جمع ہے، تثنیہ بھی یہی ہے، اس کا اصل معنی مثل ہے، جیسے فرمایا: "عَمُّ الرَّجُلِ صِنۡوُ أَبِيۡهِ" یعنی آدمی کا چچا اس کے باپ کی مثل ہے۔ کھجور کا تنا نیچے سے ایک ہو اور اوپر اس تنے سے کئی تنے نکلیں تو وہ "صِنۡوَانٌ" ہے اور اگر یہ ایک ہی تنا رہے تو یہ "غَيۡرُ صِنۡوَانٍ" ہے) اس قسم کے دوسرے درخت اس سے خود سمجھ لیں۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں، پھر اسی زمین اور اسی پانی سے کوئی پھل کڑوا پیدا ہو رہا ہے کوئی میٹھا، کوئی بدمزہ کوئی مزیدار اور کوئی اس سے بھی بڑھ کر لذت والا۔ پھر دیکھیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ آدَمَ مِنۡ قُبۡضَةٍ قَبَضَهَا مِنۡ جَمِيۡعِ الۡأَرۡضِ فَجَاءَ بَنُوۡ آدَمَ عَلٰى قَدۡرِ الۡأَرۡضِ جَاءَ مِنۡهُمُ الۡأَبۡيَضُ وَالۡأَحۡمَرُ وَالۡأَسۡوَدُ وَبَيۡنَ ذٰلِكَ الۡخَبِيۡثُ وَالطَّيِّبُ وَالسَّهۡلُ وَالۡحَزۡنُ وَبَيۡنَ ذٰلِكَ )) [ مسند أحمد : ۴/۴۰۰، ح : ۱۹۶۰۱۔ ترمذی : ۲۹۵۵۔ أبو داوٗد : ۴۶۹۳، و صححه الألبانی ] "آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے لیے پوری روئے زمین سے اللہ تعالیٰ نے ایک مٹھی لی (جس میں سفید، سیاہ، سرخ ہر رنگ اور نرم، سخت، شور، زرخیز ہر قسم کی مٹی آ گئی) اور آدم کی اولاد اسی کے مطابق کوئی سرخ، کوئی سفید، کوئی سیاہ، کوئی اس کے درمیان، کوئی نرم کوئی سخت اور کوئی خبیث کوئی طیب پیدا ہوتی ہے۔" ایک ہی زمین، ایک ہی پانی، ایک ہی باپ اور اسی کے نطفے سے بے شمار رنگا رنگ انسان پیدا ہوئے۔



❷ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ : معلوم ہوا کوئی کمال کاریگر اور پوری قدرت والا مدبر ہے جس کے کرنے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، قرآن نے ان دلائل کا ذکر مختلف مقامات پر کیا ہے۔ عقل سے کام لینے والوں کے لیے اس میں بے شمار نشانیاں ہیں اور جو عقل سے کام نہیں لیتے ان کے لیے کوئی نشانی نہیں۔

آیت 5 ❶ وَاِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ...... "فَعَجَبٌ" میں تنوین تعظیم و تہویل کے لیے ہے، اسی لیے اہل علم نے ترکیب میں اسے نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا بنانا جائز رکھا ہے، گویا یہ نکرہ موصوفہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ان

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۞

اور وہ تجھ سے بھلائی سے پہلے برائی کو جلدی طلب کرتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے کئی عبرت ناک سزائیں گزر چکیں اور بے شک تیرا رب یقیناً لوگوں کے لیے ان کے ظلم کے باوجود بڑی بخشش والا ہے اور بلاشبہ تیرا رب یقیناً بہت سخت سزا والا ہے ۞

نشانیاں دیکھ کر بھی ان کے ایمان نہ لانے پر تعجب کریں تو بہت ہی عجیب بات ان کا دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہونے کو ناممکن قرار دینا ہے، حالانکہ جو شخص معمولی علم اور معمولی عقل رکھتا ہے بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اتنی قدرتوں کے مالک اور پہلی دفعہ انھیں پیدا کرنے والے کے لیے انھیں دوبارہ نئے سرے سے پیدا کرنا کیوں مشکل ہے۔

② اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ : یعنی جب انھوں نے آخرت سے انکار کیا تو گویا اللہ کی قدرت سے انکار کیا اور یہ کہا کہ اللہ اتنا عاجز اور بے بس ہے کہ انھیں دوبارہ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ [ اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ ]

③ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ ...... : "اَلْاَغْلَالُ" "غُلٌّ" کی جمع ہے، لوہے کا کڑا یا زنجیر جو مجرم کے گلے میں ڈال کر اسے باندھا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کے ساتھ ہی ہاتھ بھی گردن کے ساتھ باندھ دیتے ہیں، یہ قید کی سخت ترین صورت ہے۔ یعنی ان کی گردنوں میں وہی آبائی کفر و شرک کے طوق پڑے ہوئے ہیں جو انھیں کفر سے ہلنے نہیں دیتے اور انجام ان کا یہ ہے کہ یہ آگ والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں۔ بعض مفسرین نے "اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ" کو بھی آخرت کے انجام میں شامل کیا ہے کہ جہنم میں ان کی گردنوں میں لوہے کے طوق ( کڑے ) ہوں گے، جن میں پڑی ہوئی زنجیروں سے بندھے ہوں گے۔ آیت کے الفاظ سے تو زیادہ ظاہر معنی یہی معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ۞ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴾ [ المؤمن : ۷۱، ۷۲ ] "جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، گھسیٹے جا رہے ہوں گے۔ کھولتے پانی میں، پھر وہ آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

**آیت 6** ① وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ...... : "اَلسَّيِّئَةُ" سے مراد بری حالت مثلاً عذاب اور "اَلْحَسَنَةُ" سے مراد اچھی حالت مثلاً عافیت اور خوش حالی ہے۔ "اَلْمَثُلٰتُ" کی واحد "مَثُلَةٌ" بروزن "سَمُرَةٌ" ہے، معنی ہے سخت سزا اور رسوا کن عذاب جو انسان پر اترے اور اسے دوسروں کے لیے برے کاموں سے باز رکھنے کے لیے مثال اور عبرت بن جائے۔ "اِسْتِعْجَالٌ" کسی چیز کا وقت آنے سے پہلے اسے لانے کا مطالبہ کرنا، یعنی ان کی سرکشی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جھٹلانے اور مذاق اڑانے کے لیے تندرستی اور عافیت کے بجائے پہلے عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مشرکین کے اس قسم کے مطالبوں کا قرآن میں کئی جگہ ذکر ہے، مثلاً سورۂ انفال (۳۲)، سورۂ عنکبوت (۵۳، ۵۴) اور سورۂ نمل (۴۶) ان آیات کا ترجمہ و تفسیر پڑھ لیں۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۠ ⑦ ع

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ تو تو صرف ایک ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے ایک راستہ بتانے والا ہے ⑦

② وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ : جن میں ان کے لیے عبرت کا کافی سامان موجود ہے۔ موضح میں ہے کہ پہلے ہو چکیں ہیں کہاوتیں، یعنی ایسے عذاب آئے ہیں کہ ان کی کہاوتیں چلی ہیں۔

③ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ : "مَغْفِرَةٍ" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اللہ اتنی بڑی مغفرت والا ہے کہ لوگوں کے ظلم پر گرفت کرے تو زمین پر کوئی جان دار باقی نہ رہے، فرمایا: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ [ النحل : ٦١ ] "اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑے تو اس کے اوپر کوئی چلنے والا نہ چھوڑے اور لیکن وہ انھیں ایک مقرر وقت تک ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔" اور دیکھیے سورۂ فاطر کی آخری آیت۔ وہ مہلت ہی دیے جاتا ہے کہ شاید باز آ جائیں، توبہ کر لیں اور اس کا عذاب بھی نہایت سخت ہے۔ معلوم ہوا کہ سلامتی اور امن کی راہ امید اور خوف میں اعتدال ہے، انسان اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید بھی رکھے اور اس کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کی امید نہ ہو تو کسی شخص کی زندگی خوش گوار نہ ہو اور اگر اس کے عذاب کا ڈر نہ ہو تو ہر شخص بے کھٹکے گناہ کرتا رہے۔

آیت 7 ① وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی ایک اور کمینگی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ کفار تمام انبیاء کی آیات (معجزوں) سے بڑی آیت (بڑا معجزہ یعنی قرآن مجید) دیکھنے کے باوجود کہہ رہے ہیں کہ اس پر کوئی آیت (معجزہ) نازل کیوں نہیں ہوئی۔ ان کے مطالبوں کی مثال دیکھنی ہو تو دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) آیت یعنی نشانی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک تنزیلی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والے احکام و آیات اور دوسری تکوینی یعنی جن کا مقابلہ کرنے سے ساری کائنات عاجز ہو۔ قرآن میں دونوں خوبیاں ہیں، اس میں ہدایت کی آیات بھی ہیں اور ساری دنیا کو پہلے پوری کتاب، پھر اس جیسی دس سورتیں اور پھر صرف ایک سورت جیسی سورت لانے کا چیلنج قیامت تک کے لیے ہے، جس کا جواب کافر آج تک نہیں دے سکے، کفار کی خست دیکھو پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔

② اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ : نبی کریم ﷺ مبشر بھی تھے اور منذر بھی، مگر یہاں آپ کی صفت صرف منذر بیان فرمائی، کیونکہ ذکر کفار کا ہے۔ "مُنْذِرٌ" اور "هَادٍ" پر تنوین تعظیم کی ہے، یعنی اللہ پر ایمان نہ لانے والوں کے لیے دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرانے والے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر قوم کے لیے ایک عظیم رہنما ہوتا ہے۔ آپ کا کام کرشمے دکھانا نہیں بلکہ آپ کی ذمہ داری لوگوں کو کفر کے برے انجام سے ڈرانا ہے، اس لیے آپ کرشمے دکھانے والے نہیں بلکہ صرف

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿۸﴾

اللہ جانتا ہے جو ہر مادہ اٹھائے ہوئے ہے اور جو کچھ رحم کم کرتے ہیں اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازے سے ہے ﴿۸﴾

ایک عظیم ہادی، یعنی ڈرانے اور آگاہ کرنے والے ہیں۔ (" اِنَّمَآ " کے ساتھ یہ حصر اضافی ہے، یعنی معجزہ دکھانے والے کے بجائے منذر ہیں، یہ نہیں کہ آپ منذر کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں) پھر قوموں کو رہنما کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ عظیم رہنما بھی ہیں، لہٰذا ان کے بے جا مطالبے سے پریشان نہ ہوں۔ مستدرک حاکم (۱۲۹/۳، ح: ۴۶۴۶) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ کے ضمن میں فرمایا: "رسول اللہ ﷺ منذر ہیں اور میں ہادی ہوں۔" مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے، پھر خلافت بلافصل پر اس سے استدلال بھی غلط ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی اللہ کی طرف سے منذر ہیں اور وہی ہادی ہیں، پھر وہ لوگ جنھوں نے آپ ﷺ کے علم اور دین یعنی خالص کتاب وسنت کو (نہ کہ لوگوں کی رائے اور قیاس کو) دعوت و جہاد کے ذریعے آگے پہنچایا، پہنچا رہے ہیں اور پہنچاتے رہیں گے، مثلاً خلفائے اربعہ، صحابہ کرام، مجاہدین اسلام، محدثین اور عادل قاضی اور خلفاء (اللہ سب پر راضی ہو) سب آپ کے خلف صدق ہیں۔

آیت 8 ① اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى ...... : " تَغِيْضُ " "غَاضَ يَغِيْضُ" سے ہے اور یہ "نَقَصَ يَنْقُصُ" کا ہم معنی ہے۔ لازم اور متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے، یعنی کم ہونا، کم کرنا۔ اسی طرح " تَزْدَادُ " باب افتعال "زَادَ يَزِيْدُ" کی طرح ہے، معنی ہے زیادہ ہونا اور زیادہ کرنا۔ یعنی حمل قرار پانے سے لے کر بچہ پیدا ہونے تک ہر چیز کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور ارحام (بچہ دانیوں) کا یہ علم اللہ تعالیٰ کی خاص صفات میں سے ہے، یعنی اس بات کا علم کہ مذکر ہے یا مؤنث، خوب صورت ہے یا بدصورت، بدبخت ہے یا نیک بخت، لمبی عمر والا ہے یا کم عمر۔ مزید دیکھیے سورۂ نجم (۳۲)، زمر (۶) اور مومنون (۱۲ تا ۱۴)۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَفَاتِحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ )) "غیب کی کنجیاں پانچ ہیں (جنھیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا)۔" (پھر سورۂ لقمان کی آخری آیت میں مذکور چیزیں بیان فرمائیں)۔ [ بخاري، التفسير، باب: ﴿ وعنده مفاتح الغيب ...... ﴾ : ۴٦۲۷ ] مزید وضاحت کے لیے سورۂ لقمان کی آخری آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ الٹرا ساؤنڈ کی حقیقت بھی وہیں ملاحظہ فرمائیں۔

② وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ : اور جو رحم کم کرتے ہیں یا زیادہ کرتے ہیں، یعنی بچہ ضائع ہو جاتا ہے یا نامکمل پیدا ہوتا ہے یا مدتِ ولادت میں اضافہ یا کمی ہوتی ہے کہ بعض کے ہاں چھ یا نو ماہ بعد، بعض کے ہاں دس ماہ یا اس سے بھی زیادہ مدت کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴿۹﴾ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾

وہ غیب اور حاضر کو جاننے والا، بہت بڑا، نہایت بلند ہے ﴿۹﴾ برابر ہے تم میں سے جو بات چھپا کر کرے اور جو اسے بلند آواز سے کرے اور وہ جو رات کو بالکل چھپا ہوا ہے اور (جو) دن کو ظاہر پھرنے والا ہے ﴿۱۰﴾

**③ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ** : اللہ تعالیٰ کو ازل سے ابد تک ہر چیز کا علم ہے، اس نے ہر چیز کے متعلق پہلے ہی سب کچھ طے کر کے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے اور یہی تقدیر ہے۔ اس پر ایمان نہ ہو تو آدمی مسلمان نہیں ہوتا، فرمایا: ﴿ **اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ** ﴾ [ القمر : ٤٩ ] ”بے شک ہم نے جو بھی چیز ہے، ہم نے اسے ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔“ یعنی وہی جانتا ہے کہ کون سی چیز کتنی ہوگی اور کیسے ہوگی، اس اندازے میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

**آیت 9** **عٰلِمُ الْغَيْبِ** ...... : ”**الْكَبِيْرُ**“ میں بھی مبالغہ ہے اور ”**الْمُتَعَالِ**“ (جو اصل میں ”عَلَا يَعْلُوْ“ کے باب تفاعل سے ”مُتَعَالِوٌ“ تھا) میں حروف زیادہ ہونے سے معنی میں مبالغہ مراد ہے۔ ”مُتَعَالِوٌ“ کی ”واو“ کو ”یاء“ سے بدلا تو ”مُتَعَالِيٌ“ ہوا، پھر ”یاء“ کو آیات کے آخری الفاظ (جنھیں اصطلاح میں فاصلہ، فواصل کہتے ہیں) کی موافقت اور تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت اور اس کی کبریائی اور بلندی کا بے حد و حساب ہونا بیان ہوا ہے، جو در حقیقت پچھلی بات ہی کی تاکید ہے۔ ”**الْغَيْبِ**“ مصدر ہے، بمعنی اسم فاعل، یعنی غائب جو حواس اور بدیہ عقل سے غائب ہو۔ ”**الشَّهَادَةِ**“ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی جو شاہد و حاضر ہے۔ اسم فاعل کو مصدر کی صورت میں لانے سے مبالغہ مقصود ہے، جیسے ”زَيْدٌ عَادِلٌ“ کے بجائے ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ کہتے ہیں۔

**آیت 10** **① سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ** ...... : یہ اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کی ایک اور تاکید ہے، یعنی تمھارا کوئی آدمی چھپا کر بات کرے یا بلند آواز سے اللہ کے نزدیک دونوں برابر ہیں، وہ دونوں کو یکساں سنتا ہے، جبکہ تم اور ساری مخلوق چھپی بات کو تو سن ہی نہیں سکتے، البتہ بلند آواز سے کی ہوئی ایک شخص کی بات تم سن اور سمجھ سکتے ہو، مگر جب چار چھ آدمی اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیں تو کسی کے پلے کچھ نہیں پڑے گا، اب اللہ تعالیٰ کے علم کا اندازہ کر لو کہ اس کے ہاں یہ سب برابر ہیں، وہ ایک ہی وقت میں سب کی سنتا اور سمجھتا اور سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔

**② ”مُسْتَخْفٍ“** ”خَفِيَ يَخْفٰى“ (چھپنا) کے باب استفعال سے اسم فاعل برائے مبالغہ ہے، بالکل چھپنے والا۔ ”**بِالَّيْلِ**“ رات کو، کیونکہ رات کی تاریکی چھپنے میں مزید مدد دیتی ہے۔ ”**سَارِبٌ**“ یعنی ظاہر، ”سَرَبَ فِي الْاَرْضِ اَيْ ذَهَبَ فِيْ طَرِيْقِهٖ“ وہ اپنے راستے میں گیا، یعنی گھر کے کسی کمرے یا کونے کے بجائے راستے یا گلی بازار میں پھرنے والا اور وہ بھی دن کو ہر ایک کے سامنے ہوتا ہے۔ دن کا ذکر خصوصاً اس لیے کیا کہ وہ ہر چیز کو خوب ظاہر کر دیتا ہے۔ اس لیے بعض اہل علم نے ”**سَارِبٌ**“ کا معنی گلیوں میں پھرنے والا، یعنی بالکل ظاہر کیا ہے۔ یعنی یہ سب اس کے علم میں برابر ہیں۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪

اس کے لیے اس کے آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، یہاں تک کہ وہ اسے بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لے تو اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مددگار نہیں ⑪

**آیت 11** ① لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ ...... : "مُعَقِّبٰتٌ" (باری باری ایک دوسرے کے بعد آنے والے) یہ ملائکہ کی صفت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی نگرانی و حفاظت کا جو انتظام کر رکھا ہے اس کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے ہر انسان پر کتنے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، کیونکہ دو فرشتے تو نیک و بد عمل لکھنے والے دائیں اور بائیں ہیں۔ (قٓ: ۱۷، ۱۸) حفاظت کرنے والوں کی تعداد یہاں بیان نہیں فرمائی جو چاروں طرف سے انسان کی ہر آفت و مصیبت سے حفاظت کرتے ہیں، سوائے اس مصیبت کے جو اللہ نے اس کے لیے لکھی ہے۔ فرشتوں کی ایک اور قسم کے متعلق عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِيْنُهُ مِنَ الْجِنِّ ، قَالُوْا وَ إِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !؟ قَالَ وَإِيَّايَ إِلَّا أَنَّ اللّٰهَ أَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ فَلَا يَأْمُرُنِيْ إِلَّا بِخَيْرٍ » [ مسلم، صفات المنافقين، باب تحريش الشيطان ... : ۲۸۱٤ ] "تم میں سے جو بھی شخص ہے اس کے ساتھ اس کا ایک قرین (ساتھ رہنے والا) جنوں سے مقرر کیا گیا ہے اور ایک قرین فرشتوں سے۔" لوگوں نے پوچھا: "یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ بھی (جن مقرر ہے)؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "(ہاں) میرے ساتھ بھی، مگر اللہ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی ہے تو وہ تابع ہو گیا ہے، سو وہ مجھے خیر کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا۔" رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ باری والے فرشتے صبح اور عصر کے وقت تبدیل ہوتے ہیں، ان وقتوں میں آنے اور جانے والوں کی ملاقات ان دونوں نمازوں میں ہوتی ہے۔ [ بخاري، مواقيت الصلاة، باب فضل صلاة العصر : ۵۵۵۔ مسلم : ٦٣٢ ] اس حقیقت کے اظہار کا مقصد یہ ہے کہ انسان ہر آن اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتا ہے اور اس کی کوئی حرکت اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں۔

② اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ ...... : یعنی جب تک نیکی کے بجائے برائی اور اطاعت کے بجائے نافرمانی نہ کرنے لگیں، البتہ جب وہ ایسا کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ ان سے اپنی نعمت چھین لیتا ہے اور ان پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کی مثال کے ساتھ سورۂ انفال (۵۳، ۵۴) میں بیان فرمائی۔ مزید مثال کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۱۱۲) اور سبا (۱۵ تا

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَ هُمْ

وہی ہے جو تمھیں بجلی دکھاتا ہے، ڈرانے اور امید دلانے کے لیے اور بھاری بادل پیدا کرتا ہے ⑫ اور (بادل کی) گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف سے۔ اور وہ کڑکنے والی بجلیاں بھیجتا ہے، پھر انھیں

۱۷) واضح رہے کہ یہاں قوموں کی تباہی کا قانون بیان کیا گیا ہے، افراد کا نہیں۔ کسی قوم کی اچھی یا بری حالت کا تعین اسی لحاظ سے کیا جائے گا کہ آیا اس میں اچھے لوگوں کا غلبہ ہے یا برے لوگوں کا؟ رہے افراد تو ضروری نہیں کہ ایک شخص گناہ کرے تبھی اس پر عذاب نازل ہو، بلکہ ایک بے گناہ شخص دوسروں کے گناہ کی لپیٹ میں آ سکتا ہے، جیسا کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے پوچھا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! أَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ، قَالَ نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ )) [ بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قصة يأجوج و مأجوج : ٣٣٤٦ ] ''اے اللہ کے رسول! کیا نیک لوگوں کے ہم میں موجود ہونے کے باوجود ہم ہلاک ہو جائیں گے؟'' فرمایا: ''ہاں! جب خباثت (گناہ) زیادہ ہو جائے۔''

③ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا ...... : ہم چاہے کتنی سائنسی تدبیریں اور حفاظت کا بندوبست کر لیں، یا کسی پیر، بزرگ، بت یا جن یا فرشتے کی پناہ پکڑ لیں، اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مقابلے میں کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔

آیت 12 هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ایسے نشان بیان فرمائے ہیں جو بیک وقت امید اور ڈر کے حامل ہیں، جو رحمت کا پیش خیمہ بھی بن سکتے ہیں اور موجب زحمت بھی۔ مثلاً جب بجلی چمکتی ہے تو امید بندھتی ہے کہ بارش ہوگی مگر ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں تباہی کا موجب نہ بن جائے، بادل دیکھ کر رحمت کی بارش کی امید بندھ جاتی ہے مگر ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں سیلاب نہ آ جائے۔ پس انسان کو چاہیے کہ اللہ کی رحمت کا امیدوار رہے اور اس کے عذاب سے بھی ڈرتا رہے۔

آیت 13 ① وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ ...... : ''الرَّعْدُ'' یعنی بادل کی گرج، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت، جلال اور عظمت کے بیان کے لیے بادل کی گرج، گرنے والی بجلیوں اور ان کی کڑک کا ذکر فرمایا۔ یہ اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر کمی اور ہر عیب سے پاک اور ہر کمال اور ہر خوبی کا مالک ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف کی وجہ سے تسبیح و تحمید کرتے ہیں، بلکہ کائنات کی ہر چیز کا یہی وظیفہ ہے، فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ [ بنی إسرائيل : ٤٤ ] ''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔'' قرآن مجید میں کئی چیزوں کا صاحب احساس ہونا اور بولنا مذکور ہے، جنھیں ہم بے زبان سمجھتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں چیونٹی کی بات اور سلیمان علیہ السلام کا اسے سمجھنا، اسی طرح ہدہد سے ان کی گفتگو سورۂ نمل میں مذکور ہے۔ سورۂ بقرہ میں پتھروں کا اللہ کے

يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ؕ﴿۱۳﴾

ڈال دیتا ہے جس پر چاہتا ہے، جب کہ وہ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور وہ بہت سخت قوت والا ہے﴿۱۳﴾

خوف سے گرنا، پھٹ جانا اور ان سے پانی بہ نکلنا مذکور ہے۔ جہنم اور جنت کی گفتگو قرآن وحدیث میں آئی ہے اور اب تو سائنس نے نباتات میں شعور واحساس تجربے سے ثابت کیا ہے۔ کفار کے مرنے پر آسمان وزمین کا نہ رونا سورۂ دخان (۲۹) میں ہے۔ پرندوں اور پہاڑوں کا داؤد علیہ السلام کے ساتھ مل کر صبح وشام تسبیح کا ذکر کرنا سورۂ ص (۱۸، ۱۹) میں ہے۔ "اَلرَّعْدُ" کے متعلق چند احادیث معروف ہیں۔ ایک لمبی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: "اَلرَّعْدُ" فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مقرر ہے، اس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہے، جس کے ساتھ وہ بادل کو ہانکتا ہے اور جو آواز اس سے سنائی دیتی ہے وہ اس کے بادل کو ہانکنے کی آواز ہے، جب وہ اسے ہانکتا ہے یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اسے حکم دیتا ہے۔" یہ حدیث ترمذی (۳۱۱۷)، مسند احمد (۲۷۴/۱، ح: ۲۴۸۳) اور سنن کبریٰ للنسائی (۳۳۶/۹، ح: ۹۰۷۲) وغیرہ میں ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے سلسلہ صحیحہ (۴۹۱/۴، ح: ۱۸۷۲) میں ذکر فرمایا ہے اور لمبی بحث کے بعد فرمایا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث کم از کم حسن ضرور ہے۔ البتہ مسند احمد کی تخریج میں شعیب ارنؤوط نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس لمبی حدیث کو حسن کہا ہے، مگر اس کے اس رعد والے حصے کو منکر کہا ہے۔ (واللہ اعلم)

اگر کوئی کہے کہ سائنس تو اسے بادل کے ٹکڑوں کی رگڑ کا نتیجہ قرار دیتی ہے تو اسے کہیں کہ یہ بات حدیث کے خلاف نہیں، وہ رگڑ بھی تو کسی کے حکم سے بادلوں کے چلنے کے نتیجے ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ کائنات کی کوئی بھی چیز خود بخود نہیں چل رہی۔ قبیلہ بنو غفار کے ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ فَيَنْطِقُ أَحْسَنَ النُّطْقِ وَيَضْحَكُ أَحْسَنَ الضَّحِكِ )) [ السلسلة الصحيحة : ۴۰۹/۲، ح : ۱۶۶۵ ] "اللہ تعالیٰ بادل کو پیدا کرتا ہے تو وہ بولتا ہے، بہترین بولنا اور ہنستا ہے، بہترین ہنسنا۔" شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیحہ میں اسے مسند احمد اور کئی کتب حدیث کے حوالے سے ذکر کر کے اس کی سند کو صحیح کہا اور شعیب ارنؤوط نے بھی مسند احمد (۹۱/۳۹، ۹۲، ح: ۲۳۶۸۲) میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ گرج اور چمک بادل ہی کی گفتگو اور اسی کا ہنسنا ہے۔ رہی یہ بات کہ "رعد" فرشتے کی آواز ہے یا بادل کی گفتگو، تو حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں ہی درست ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں۔

❷ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ ......: مفردات راغب میں ہے کہ "صاعقہ" تین معنوں میں آتا ہے: ① موت، جیسے: ﴿ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ [ الزمر : ۶۸ ] ② عذاب، جیسے: ﴿ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ [ حٰم السجدة : ۱۳ ] ③ آگ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ ﴾ [ الرعد : ۱۳ ] کیونکہ صاعقہ کا معنی فضا میں پیدا ہونے والی نہایت سخت آواز (بجلی کی کڑک) ہے، پھر اس کے نتیجے میں مذکورہ تین چیزوں میں سے کوئی بھی چیز واقع ہو سکتی

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

برحق پکارنا صرف اسی کے لیے ہے اور جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کچھ بھی قبول نہیں کرتے، مگر اس شخص کی طرح جو اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلانے والا ہے، تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، حالانکہ وہ اس تک ہرگز پہنچنے والا نہیں اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سراسر بے سود ﴿۱۴﴾

ہے، گویا حقیقت میں صاعقہ ایک ہی چیز ہے، باقی اس کے اثرات ہیں۔ صاعقہ کے ساتھ نکلنے والی بجلی کی چمک نہایت تیز ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کڑکنے والی بجلیوں کو بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہتا ہے بجلی گرا دیتا ہے، جبکہ وہ بے فکر ہو کر اللہ تعالیٰ کے متعلق جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔

❸ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ : یعنی اتنی نشانیاں دیکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، کبھی اس کے کمال علم و قدرت اور اکیلے معبود ہونے کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ زندہ کیسے کرے گا اور کبھی اس کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور کبھی اس کے عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔

❹ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ: امام راغب نے ''الْمِحَالِ'' کا مادہ '' مَحْلٌ '' بتایا ہے اور ''شَدِيْدُ الْمِحَالِ'' کا معنی کیا ہے: ''شَدِيْدُ الْأَخْذِ بِالْعُقُوْبَةِ'' یعنی وہ سخت سزا میں پکڑنے والا ہے۔ امام راغب ہی نے بعض اہل علم کا قول لکھا ہے کہ اس کا مادہ ''حَوْلٌ'' ہے، بمعنی '' قُوَّةٌ '' یعنی وہ بہت سخت قوت والا ہے۔ اس صورت میں میم زائد ہے۔

**آیت 14** ❶ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ : یہاں موصوف اپنی صفت کی طرف مضاف ہے، یعنی سچا اور برحق پکارنا صرف اسی کو پکارنا ہے، دوسرے کسی کو بھی پکارنا باطل ہے۔ کیونکہ دور و نزدیک سے ہر ایک کی پکار سنتا بھی وہی ہے، ہر ایک کے احوال سے واقف بھی وہی ہے اور ہر ایک کی حاجت پوری کرنے کی قدرت بھی صرف وہی رکھتا ہے، کسی اور میں ان صفات میں سے کوئی صفت بھی نہیں۔

❷ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ...... : ''يَدْعُوْنَ'' کی ضمیر مشرکین کے لیے ہے، یعنی اللہ کے سوا کسی کو بھی پکارنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، اب پانی نہ اس کی بات سنتا ہے، نہ سمجھتا ہے اور نہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ خود بخود اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ان خود ساختہ خداؤں کی بے بضاعتی اور بے بسی بڑی تفصیل سے بیان فرمائی۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۹۱ تا ۱۹۸)، سبا (۲۲)، فاطر (۱۳، ۱۴)، احقاف (۵) اور حج (۷۳) قارئین سے درخواست ہے کہ وہ یہ مقامات نکال کر ترجمہ ضرور پڑھیں، ان شاء اللہ توحید کی ٹھنڈک دل میں محسوس کریں گے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة

اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ ہی کو سجدہ کر رہا ہے، خوشی اور ناخوشی سے اور ان کے سائے بھی پہلے اور پچھلے پہر ﴿۱۵﴾

③ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ: یعنی کافروں کا غیر اللہ کو پکارنا سراسر بے سود ہے، جس سے کچھ حاصل نہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''کافر جن کو پکارتے ہیں بعض محض خیال ہیں، بعض جن اور بعض ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں کچھ خواص ہیں، لیکن وہ اپنے خواص کی مالک نہیں، پھر ان کے پکارنے سے کیا حاصل۔ جیسے آگ یا پانی اور شاید ستارے بھی اسی قسم میں ہوں، یہ اس کی مثال فرمائی۔'' (موضح) اس کی مختصر سی تفصیل سمجھ لیں کہ فرشتے ہر وقت ہمارے ساتھ ہیں، سنتے بھی ہیں، طاقت بھی رکھتے ہیں مگر وہ اللہ کے اذن کے بغیر کچھ بھی نہ کر سکتے ہیں اور نہ کرتے ہیں۔ تو انھیں پکارنا ایسے ہی ہے جیسے پانی کو اشارے سے یا زبان سے کہا جائے کہ وہ منہ میں آ جائے، حالانکہ اس میں یہ قدرت ہی نہیں اور بالفرض ہو بھی تو وہ یہ اختیار نہیں رکھتا۔

آیت 15 ① وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ......: سجدے کا معنی ہے جسم کے سب سے اونچے اور باعزت حصے کو کسی کے سامنے نیچے سے نیچا لے جا کر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی کا اظہار کرنا۔ تو کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی طرح اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کر رہی ہے۔ اس میں مسلمان اور کافر کا کوئی فرق نہیں، ہاں انسان کو تھوڑا سا اختیار جنت یا جہنم کے راستے پر چلنے کا دیا ہے، اس کے علاوہ اللہ کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی ہر طرح سجدہ ریز ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیار کے مقابلے میں اپنے آپ پر اس کا اختیار ایک فی صد کیا ایک فی ہزار بھی نہیں، اگر کسی کو شک ہے تو ذرا اپنا سانس روک کر دکھائے، بھوک پیاس روک لے، پیشاب یا پاخانہ روک لے، بیماری آئے تو ڈٹ جائے کہ میں بیمار نہیں ہوتا، بڑھاپے کو آنے سے اور بالوں کو سفید ہونے سے روک دے، حرکت قلب بند ہو جائے تو اسے چلا کر دکھائے، گردے فیل ہو جائیں تو چالو کر کے دکھائے، ایک ٹانگ اٹھا سکتا ہے دوسری بھی اٹھا کر دکھائے، موت کے فرشتے کے سامنے اکڑ جائے، غرض ہر عاقل و غیر عاقل اور ان کے سائے خوشی و ناخوشی سے اللہ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ پھر ایسے بے بس سے فریاد کرنا، کسی کو داتا، کسی کو دستگیر، کسی کو غریب نواز، کسی کو مشکل کشا کہنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ یہاں سورۂ حج کی آیت (۱۸) کا ترجمہ و تفسیر بھی ملاحظہ فرما لیں۔

② وَظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ: یعنی ان کے سایوں کا گھٹنا اور بڑھنا بھی اسی کے ارادہ و مشیت سے ہے۔ پہلے اور پچھلے پہر کا ذکر اس لیے کیا کہ ان وقتوں میں زمین پر ہر چیز کا سایہ نمایاں ہوتا ہے اور عبادت کے لحاظ سے یہ دونوں عمدہ وقت ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اور پرچھائیاں صبح و شام کے وقت زمین پر پسر (پھیل) جاتی ہیں، یہی ان کا سجدہ ہے۔'' (موضح)

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ

کہہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ کہہ دے اللہ۔ کہہ پھر کیا تم نے اس کے سوا کچھ کارساز بنا رکھے ہیں جو اپنی جانوں کے لیے نہ کسی نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے؟ کہہ دے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہوتے ہیں؟ یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہے، تو پیدائش ان پر گڈمڈ ہوگئی ہے؟ کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے ﴿۱۶﴾ اس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو کئی نالے اپنی اپنی وسعت کے مطابق بہ نکلے، پھر اس ریلے نے ابھرا ہوا جھاگ اٹھا لیا۔ اور جن چیزوں کو کوئی زیور یا سامان بنانے کی غرض سے آگ پر تپاتے ہیں ان سے بھی اسی

آیت 16 ① قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... : یعنی اگر ایسا ہوتا کہ دنیا میں کچھ چیزیں تو اللہ نے پیدا کی ہوتیں اور کچھ دوسروں نے، یا بعض کی پرورش اور روزی کا سامان کرنے والا رب اللہ تعالیٰ ہوتا اور بعض کا کوئی دوسرا، یا کسی نفع نقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہوتا اور کسی کا مالک دوسرا، تب تو ان مشرکوں کے شرک کی کوئی بنیاد ہو سکتی تھی کہ یہ بھی خالق ہونے کی وجہ سے مستحق عبادت ہیں، مگر جب یہ خود مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کی ہر چیز پیدا کرنے والا اللہ اور صرف اللہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک قرار دیں۔

② قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ...... : یہ مشرک اور موحد کی مثال ہے، کیونکہ موحد دیکھنے والی آنکھ، سوچنے والا دل رکھتا ہے، جبکہ مشرک بصارت اور بصیرت دونوں سے خالی سراسر اندھا ہے۔ موحد نور توحید سے روشن ہوتا ہے، جبکہ مشرک ایک نہیں ہزاروں اندھیروں میں ہے۔ نور کو واحد اور ظلمات کو جمع لائے، کیونکہ ہدایت اور سیدھا راستہ ایک اور گمراہی کے راستے بے شمار ہیں۔

③ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ : وہی ہے جو ایک ہے، سب پر غالب ہے، کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

آیت 17 ① اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ...... : "اَوْدِيَةٌ" (نالے) وادی کی جمع ہے جو اصل میں پانی بہنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ دو پہاڑوں کے درمیان خالی جگہ کو بھی کہہ لیتے ہیں، کبھی راستے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ پہاڑوں میں عموماً راستے پہاڑی نالوں کے کناروں کے ساتھ چلتے ہیں۔ "زَبَدًا" وہ کوڑا کرکٹ اور جھاگ جو پانی کی تیز رفتاری کے

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾

طرح کا جھاگ (ابھرتا) ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے، پھر جو جھاگ ہے سو بے کار چلا جاتا ہے اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو نفع دیتی ہے، سو زمین میں رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے ﴿۱۷﴾

باعث اس کی سطح پر ابھر آتا ہے، یا ہانڈی کے اوپر ابھر آتا ہے۔ "رَابِيًا" " رَبَا يَرْبُوْ رَبْوًا " (ن) سے اسم فاعل ہے، بمعنی بڑھنے والا، ابھرنے والا۔ "حِلْيَةٍ" سونے چاندی وغیرہ کا زیور جس سے انسان زینت حاصل کرتا ہے۔ "جُفَآءً" نالہ یا ہانڈی جو خس و خاشاک یا جھاگ وغیرہ کناروں پر پھینک دیتے ہیں، اسے "جُفَآءً" کہتے ہیں۔

شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ دو مثالیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی بیان فرمائی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ باطل بعض اوقات حق کے اوپر غالب آ جائے، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا ہے اور بے قدر و قیمت بنا دیتا ہے، حسن انجام حق اور اہل حق ہی کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ جھاگ اور خس و خاشاک بے شک پانی کو ڈھانپ لیتے ہیں، مگر آخر کار پانی انھیں کناروں پر پھینک کر بے کار کر دیتا ہے اور خالص پانی سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح سونا چاندی اور دوسری دھاتوں کو پگھلایا جائے تو ان کا میل کچیل بھی اوپر آ جاتا ہے مگر آخر کار کچھ اتار کر پھینک دیا جاتا ہے اور کچھ جل جاتا ہے۔ غرض، سارا میل کچیل بے کار جاتا ہے اور لوگوں کے لیے نفع مند دھات خالص حالت میں باقی رہ جاتی ہے، جیسے سونا اور چاندی، جس سے وہ زیور بناتے ہیں، یا لوہا، تانبا اور پیتل وغیرہ جس سے برتن، اسلحہ اور دوسرا سامان بنتا ہے۔ استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں مثالوں میں حق (قرآن) کو پانی سے تشبیہ دی ہے اور نالوں سے مراد انسانوں کے دل ہیں جو اپنے اپنے ظرف و استعداد کے مطابق حق سے فیض حاصل کرتے ہیں، یا حق وہ زیور ہے جس سے نفوسِ انسانی آراستہ ہوتے ہیں اور لوگ معاش و معاد میں اس سے انواع و اقسام کے منافع اور فوائد حاصل کرتے ہیں۔ باطل کی مثال جھاگ کی سی ہے جو حق سے کشمکش کے موقع پر وقتی طور پر ابھر کر اوپر آ جاتا ہے مگر آخر کار مٹ جاتا ہے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ أَصَابَ أَرْضًا، فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ، قَبِلَتِ الْمَاءَ، فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا، وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرٰى، إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ » [ بخاری، العلم، باب فضل من علم و علم : ۷۹ ] "اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم اور ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی مثال بہت زیادہ بارش کی ہے جو ایک زمین پر برسی۔ اس زمین کا ایک حصہ بہت عمدہ (زرخیز) تھا، اس نے پانی قبول کیا (جذب کر لیا)، پھر بہت سی گھاس اور چارا اگایا اور اس کے کچھ حصے سخت زمین کے گڑھے تھے جنھوں نے پانی روک لیا تو اللہ

لِلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمُ الۡحُسۡنٰی ؕؔ وَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَہٗ لَوۡ اَنَّ لَہُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ لَافۡتَدَوۡا بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ ۬ۙ وَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمِہَادُ ﴿۱۸﴾

ع۲ / ۸

جن لوگوں نے اپنے رب کی بات قبول کر لی انھی کے لیے بھلائی ہے اور جنھوں نے اس کی بات قبول نہ کی اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا اور ہو تو وہ ضرور اسے فدیہ میں دے دیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا بچھونا ہے ﴿۱۸﴾

نے اس کے ساتھ لوگوں کو نفع پہنچایا، چنانچہ انھوں نے پیا اور پلایا اور کھیتی باڑی کی اور اس کے بعض حصے چٹیل میدان تھے جو نہ پانی روکتے تھے اور نہ گھاس اگاتے تھے، تو یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین کی سمجھ حاصل کی اور اسے اس (علم و ہدایت) نے نفع دیا جسے دے کر مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی طرف نہ سر اٹھایا اور نہ اللہ کی وہ ہدایت قبول کی جو دے کر مجھے بھیجا گیا (ان تینوں میں سے آخری مثال کافر کی ہے)۔‘‘

② کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ : یعنی بات سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے جیسے یہاں دو مثالیں بیان فرمائیں، ایک صحرائی اور پہاڑی لوگوں کو پیش آنے والی (نالوں کی) اور ایک شہری لوگوں کو پیش آنے والی (دھاتوں کی)۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کے شروع میں منافقین کی دو مثالیں اور سورۂ نور (۳۹، ۴۰) میں کافروں کی دو مثالیں بیان فرمائیں۔ غرض قرآن و حدیث میں بہت سی مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔

**آیت 18** ① لِلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا ...... : ’’اَلْحُسْنٰی‘‘ ’’اَلْاَحْسَنُ‘‘ کی مؤنث ہے، بمعنی سب سے اچھی، جیسے ’’حَسَنٌ‘‘ اور ’’اَحْسَنُ‘‘ ہے، اسی طرح ’’حَسَنَةٌ‘‘ اور ’’حُسْنٰی‘‘ ہے، اس کا موصوف محذوف ہے، یعنی ’’اَلْجَزَاءُ الْحُسْنٰی‘‘ کہ رب کی بات قبول کرنے والوں کے لیے سب سے اچھی جزا، یعنی جنت ہے۔ ’’وَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَہٗ‘‘ مبتدا ہے اور ’’لَوۡ اَنَّ لَہُمۡ‘‘ پورا جملہ شرطیہ اس کی خبر ہے، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حق سے عناد رکھتے ہیں قیامت کے دن ان پر جو مصیبت آئے گی وہ اس سے رہائی کے لیے اس قدر مال و دولت کی بھی پروا نہیں کریں گے اور فدیہ میں دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

② اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ : یہ اس کے مقابلے میں ہے جو فرمایا تھا کہ اپنے رب کی بات قبول کرنے والوں کے لیے بھلائی (بہترین بدلہ) ہے، یعنی یہ دعوت قبول نہ کرنے والوں کا بہت برا حساب ہو گا، انھیں کسی قسم کی معافی نہیں دی جائے گی اور ان کے ایک ایک گناہ پر بری طرح محاسبہ ہو گا۔ یہی مناقشہ فی الحساب ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ، قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ أَوَ لَيْسَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ [الانشقاق: ۸] قَالَتْ، فَقَالَ إِنَّمَا ذٰلِكَ الْعَرْضُ، وَلٰكِنْ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ يَهْلِكْ )) [بخاري، العلم، باب من سمع شيئا

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۹ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝۲۰

پھر کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی جانب سے تیری طرف اتارا گیا وہی حق ہے، اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے؟ نصیحت تو عقلوں والے ہی قبول کرتے ہیں ⑲ جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور پختہ عہد کو نہیں توڑتے ⑳

فراجع ...... : ۱۰۳ ] ''جس کا حساب کیا گیا اسے عذاب دیا جائے گا۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس پر میں نے عرض کیا: ''اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ یعنی جسے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا گیا اس کا حساب آسان ہوگا (مطلب یہ ہے کہ یہاں حساب کے باوجود عذاب نہیں ہوگا تو اس کا مطلب کیا ہے)؟'' فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صرف پیش کیا جانا ہے اور لیکن جس سے مناقشہ ہوا (یعنی ایک ایک چیز کی پڑتال ہوئی) وہ ہلاک ہو جائے گا۔''

③ وَبِئْسَ الْمِهَادُ : مہد اور مہاد اصل میں بچے کے لیے تیار کردہ جگہ کو کہتے ہیں، گود ہو یا بچھونا، اسی طرح ہر اچھی طرح آرام کے لیے بنائی ہوئی جگہ کو مہاد کہتے ہیں۔ آپ سوچیں کہ بچے کو آرام کے لیے آگ پر لٹا دیا جائے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ اسی طرح اللہ کی دعوت قبول نہ کرنے والے کی آرام گاہ جہنم ہوگی۔ [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهَا ]

آیت 19 اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ ...... : یہاں یہ کہنے کے بجائے کہ کیا وہ شخص جو جانتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو نہیں جانتا، یوں فرمایا کہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے؟ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اللہ کی طرف سے آنے والی نشانیاں آنکھوں سے نظر آ رہی ہیں، جو ان کا علم اور یقین نہیں رکھتا در حقیقت وہ اندھا ہے اور اس کا یہ اندھا پن قیامت کو اچھی طرح ظاہر ہو جائے گا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۲۴ تا ۱۲۶) یہ مومن اور کافر کی مثال ہے۔ ''اُولُوا'' ''ذُوْ'' کی جمع ہے، بمعنی والے۔ ''الْاَلْبَابِ'' ''لُبٌّ'' کی جمع ہے، ہر چیز میں سے جو خالص ہو، خالص عقل جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو۔ (مفردات) اس لیے ترجمہ ''عقل والوں'' کے بجائے ''عقلوں والے'' کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ نصیحت صرف خالص اور پاکیزہ عقل والے حاصل کرتے ہیں، الٹے دماغ والے نہیں۔

آیت 20 الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ ...... : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عقلوں والوں کی چند صفات بیان فرمائیں۔ ان میں سب سے پہلی صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہد توحید کو پورا کرنا ہے، جیسا کہ سورۂ اعراف (۱۷۲) میں ہے۔ ''وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ'' سے ہر اس عہد کو توڑنے سے اجتناب کرنا مراد ہے جسے پورا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ پہلے خاص اپنے عہد کے بعد اب عام عہد کا ذکر فرمایا۔ ان منافقین کی طرح نہیں جن میں سے کوئی جب عہد کرتا ہے تو اس کی

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً

اور وہ جو اس چیز کو ملاتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں ﴿۲۱﴾ اور وہ جنھوں نے اپنے رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور

---

خلاف ورزی کرتا ہے، جب جھگڑتا ہے تو بدکلامی پر اتر آتا ہے، جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب اسے کوئی امانت سونپی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے۔

**آیت 21** ① **وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ** : یعنی صلہ رحمی کرتے ہیں، رشتوں کو نزدیک کے ہوں یا دور کے، ان کے مراتب کے مطابق ملاتے ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ عزوجل، رسول کریم ﷺ، عام مسلمانوں، ہمسایوں، رشتہ داروں، دوستوں، یتیموں، بیواؤں، الغرض ہر ایک کا حق پہچانتے اور ادا کرتے ہیں۔

② **وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ** ...... : اس کے عائد کردہ فرائض کو بجالاتے اور اس کے منع کردہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ راغب نے کہا: ''خشیت ایسا خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو، اکثر اس کا باعث علم ہوتا ہے۔'' جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [ فاطر : ۲۸ ] ''اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں۔'' خوف سے مراد کوئی بھی ڈر ہے، بعض نے کہا، دونوں (خشیت اور خوف) ہم معنی ہیں، فرق اغلبی ہے، کلی نہیں۔ (آلوسی)

③ **وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ** : لہٰذا وہ اس وقت سے پہلے ہی اپنا محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔ ''**سُوْٓءَ الْحِسَابِ**'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ رعد کی آیت (۱۸) کی تفسیر۔

**آیت 22** ① **وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ** : یعنی ہر اس مقام پر جہاں صبر قابل تعریف ہے وہ محض اللہ کے چہرے کی خاطر صبر کرتے ہیں، تاکہ وہ راضی ہو جائے۔ نہ ریا (دکھاوے) کے لیے، نہ سُمعہ (شہرت) کے لیے کہ لوگ کہیں واہ کیا صابر شخص ہے۔ صبر کا معنی روکنا، باندھنا ہے۔ اپنے آپ کو اللہ کے احکام کی پابندی پر قائم رکھنا ''صَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ'' ہے، اس کی نافرمانی سے رکنا ''صَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَةِ'' ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی مصیبت، مثلاً بیماری، فاقہ، خوف یا اموات وغیرہ پر اپنے آپ کو جزع فزع سے روکنا اور اسے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی تقدیر سمجھ کر کسی شکوہ و شکایت کے بغیر برداشت کرنا ''صَبْرٌ عَلَى الْمُصِيْبَةِ'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر صبر کی یہ تمام صورتیں ''**اُولُوا الْاَلْبَابِ**'' کی صفت ہیں۔

② **وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ** : اس کی تفسیر کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳) ملاحظہ فرمائیں۔

③ **وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً** : فرض زکوٰۃ علانیہ دینا افضل ہے، تاکہ کفر کی تہمت سے بچے، نفل صدقہ دوسروں کو ترغیب دلانے کے لیے علانیہ ہو اور ریا سے پاک ہو تو بہت ہی اچھا ہے، مگر علانیہ صدقے میں ریا کا امکان ہے، اس لیے پوشیدہ صدقے کا جواب ہی نہیں ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۷۱) قیامت کے دن عرش کا سایہ پانے والوں میں سے ایک وہ بھی

وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا اور برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹاتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے اس گھر کا اچھا انجام ہے ﴿۲۲﴾

ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے تو بائیں کو خبر بھی نہ ہو۔ [ بخاري، الأذان، باب من جلس في المسجد...... : ٦٦٠ ]

④ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ : "دَرَءَ يَدْرَءُ دَرْءًا " (ف) ہٹانا، دفع کرنا، دور کرنا، یعنی "اُولُوا الْاَلْبَابِ" کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹاتے ہیں، یعنی برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ [ حٰم السجدة : ٣٤، ٣٥ ] "اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) سے ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہوگا جیسے وہ دلی دوست ہے۔ اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انھی کو جو صبر کریں اور یہ نہیں دی جاتی مگر اسی کو جو بہت بڑے نصیب والا ہے۔" یہ طریقہ ذاتی عداوتوں اور زیادتیوں کے جواب کا ہے کہ زیادتی کے جواب میں صبر کرے اور معاف کر دے۔ رہا اللہ کے دین پر زیادتی اور اللہ کے احکام کے مقابلے میں سرکشی اور عناد کا جواب بہترین طریقے سے دینا تو اس کی صورت دوسری ہے۔ وہاں برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹانے کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کافر یا اللہ کا باغی دین پر زیادتی کر رہا ہو تو آپ اسے برداشت کریں اور صبر کریں، بلکہ اس برائی کو بہترین طریقے سے ہٹانا نہ اسے آزاد چھوڑنا ہے نہ معاف کرنا، بلکہ یہاں اسے ہٹانے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا اور اس کا حکم دیا کہ جو شخص تم میں سے کوئی منکر (برائی) دیکھے اسے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کام کی قوت نہیں تو زبان سے روکے اور اگر اتنی بھی قوت نہیں تو (کم از کم) اسے دل میں برا سمجھے۔ [ مسلم، الإيمان، باب بيان كون النهي...... : ٤٩ ] یہاں سب سے اچھا طریقہ ﴿ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ یک لخت ہی جانی دشمن دلی دوست بن جاتے ہیں۔ دیکھیے ثمامہ بن اثال، ہندہ، عکرمہ بن ابی جہل، خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اور عرب کے وہ سردار جو کسی صورت ایمان قبول کرنے والے نظر نہ آتے تھے، جہاد کی نیکی کی برکت سے رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار دوست بن گئے۔ "برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹاتے ہیں" کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ نیک عمل کرکے برے عمل کو مٹا دیتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ [ هود : ١١٤ ] "بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔" اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَأَتْبِعْهَا حَسَنَةً تَمْحُهَا )) [ أحمد : ٥/ ١٦٩، ح : ٢١٥٤٣، صحيح ] "جب تم کوئی برائی کرو تو اس کے بعد کوئی نیکی کرو، وہ اسے مٹا دے گی۔" اور فرمایا: (( وَ إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَاعْمَلْ بِجَنْبِهَا حَسَنَةً السِّرُّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِيَةُ بِالْعَلَانِيَةِ )) [ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٣/ ٤٦٢، ح : ١٤٧٥ ] "جب تم کوئی برائی کرو تو اس کے ساتھ ہی نیکی کر لو، وہ اسے مٹا دے گی، پوشیدہ برائی کو پوشیدہ نیکی کے ساتھ اور علانیہ برائی کو علانیہ نیکی کے ساتھ مٹاؤ۔"

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

ہمیشگی کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولادوں میں سے جو نیک ہوئے اور فرشتے ہر دروازے میں سے ان پر داخل ہوں گے ﴿۲۳﴾ سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا۔ سو اچھا ہے اس گھر کا انجام ﴿۲۴﴾

⑤ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ : "عُقْبٰى" "عَاقِبَةٌ" کی طرح مصدر ہے، وہ چیز جو کسی چیز کے پیچھے آئے، عام طور پر یہ لفظ اچھے انجام کے معنی میں آتا ہے۔ "الدَّارِ" میں الف لام عہد کا ہے، یہ گھر یعنی دنیا، یعنی ان صفات والوں کے لیے دنیا کے گھر کے بعد کا انجام بہت اچھا ہے۔

آیت 23 ① جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا...... : یہ "عُقْبَى الدَّارِ" سے بدل الکل ہے، یعنی وہ اچھا انجام ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور جنت میں داخل ہونے کے لائق ان کے باپ دادا، بیویاں اور اولادیں بھی ان کے ساتھ جنت عدن میں داخل ہوں گی۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "عدن" جنت میں ایک مقام ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا "عدن کے باغات" اور اس صورت میں یہ "عُقْبَى الدَّارِ" سے بدل البعض ہوگا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت پر فرمایا، یعنی انھیں اور ان کے پیاروں کو جنت میں اکٹھا کر دیا جائے گا، خواہ باپ ہوں یا گھر والے یا اولاد جو مومن ہونے کی وجہ سے جنت میں داخلے کے لائق ہوں گے، تاکہ ان کی آنکھیں ان کے ساتھ ٹھنڈی ہوں، یہاں تک کہ نیچے درجے والے کو اونچے درجے والے کی طرف بلند کر دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ اونچے درجے والے کا درجہ کم کیا جائے، محض اللہ تعالیٰ کے امتنان اور احسان کی وجہ سے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ [الطور: ۲۱] "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان سے ان کے عمل میں کچھ کمی نہ کریں گے۔"

② وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ...... : جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آکر انھیں مبارک باد اور خوش خبریاں دیں گے۔

آیت 24 ① سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ : "سَلٰمٌ" کا مطلب ہے کہ اب تم ہر مصیبت، رنج و غم اور پریشانی سے محفوظ ہو گئے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی مناسبت سے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « هَلْ تَدْرُوْنَ أَوَّلَ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ ؟ قَالُوا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ ، قَالَ أَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ الْفُقَرَاءُ وَالْمُهَاجِرُوْنَ الَّذِيْنَ تُسَدُّ بِهِمُ الثُّغُوْرُ وَيُتَّقٰى بِهِمُ الْمَكَارِهُ، وَ يَمُوْتُ أَحَدُهُمْ وَ حَاجَتُهُ فِيْ صَدْرِهِ، لَا يَسْتَطِيْعُ لَهَا قَضَاءً، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ مَلَائِكَتِهِ ائْتُوْهُمْ فَحَيُّوْهُمْ

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو کاٹ دیتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور انھی کے لیے اس گھر کی خرابی ہے ﴿۲۵﴾

فَتَقُوْلُ الْمَلَائِكَةُ نَحْنُ سُكَّانُ سَمَائِكَ وَ خِيَرَتُكَ مِنْ خَلْقِكَ، أَفَتَأْمُرُنَا أَنْ نَأْتِيَ هٰؤُلَاءِ فَنُسَلِّمَ عَلَيْهِمْ؟ قَالَ إِنَّهُمْ كَانُوْا عِبَادًا يَعْبُدُوْنِيْ، لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا، وَتُسَدُّ بِهِمُ الثُّغُوْرُ وَ يُتَّقَى بِهِمُ الْمَكَارِهُ، وَ يَمُوْتُ أَحَدُهُمْ وَ حَاجَتُهُ فِيْ صَدْرِهِ، لَا يَسْتَطِيْعُ لَهَا قَضَاءً، قَالَ فَتَأْتِيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ ذٰلِكَ، فَيَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ: ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ » [ مسند أحمد : ۲/۱٦۸، ح : ٦۵۷۸۔ ابن حبان : ۷٤۲۱۔ قال شعيب الأرنؤط و إسناده جيد ] ”کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کی مخلوق میں سے جنت میں سب سے پہلے کون لوگ جائیں گے؟“ لوگوں نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔“ فرمایا: ”اللہ کی مخلوق میں سے جنت میں سب سے پہلے فقراء اور مہاجرین داخل ہوں گے، جن کے ذریعے سے سرحدیں محفوظ کی جاتی تھیں اور ناپسندیدہ حالات سے بچا جاتا تھا اور ان میں سے کوئی فوت ہوتا تو اس کی دلی خواہش اس کے سینے ہی میں باقی ہوتی تھی، وہ اسے پورا نہیں کر سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں میں سے جنھیں چاہے گا حکم دے گا کہ ان کے پاس جاؤ اور انھیں سلام کرو۔ فرشتے کہیں گے: ”ہم تیرے آسمان کے رہنے والے اور تیری مخلوق میں سے تیرے چنے ہوئے ہیں، کیا تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور انھیں سلام پیش کریں۔“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”یہ میرے بندے تھے، میری بندگی کرتے تھے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتے تھے، ان کے ساتھ سرحدیں محفوظ رکھی جاتی تھیں اور ان کے ذریعے سے ناپسندیدہ حالات سے بچا جاتا تھا، ان میں سے کوئی فوت ہوتا تو اس حال میں کہ اس کی دلی خواہش اس کے سینے ہی میں ہوتی، وہ اسے پورا نہیں کر سکتا تھا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”چنانچہ فرشتے اس وقت ان کے پاس آئیں گے اور ہر دروازے سے ان کے پاس داخل ہوں گے (اور کہیں گے ): ”سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا، سو اچھا ہے اس گھر کا انجام۔“

❷ **بِمَا صَبَرْتُمْ** ...... : معلوم ہوا ایمان قبول کرنے کے بعد ہر حکم بجا لانے پر ہمیشگی، ہر برائی سے اجتناب، اللہ کی ہر تقدیر پر قناعت کرتے ہوئے ہر مصیبت و راحت میں اللہ تعالیٰ پر خوش رہنا، غرض دین کی ہر بات پر استقامت کی بنیاد صبر ہی ہے اور اس کی جزا کا بھی کوئی حساب نہیں، فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [ الزمر : ۱۰ ] ”صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر بغیر حساب دیا جائے گا۔“

**آیت 25** **وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ** ...... : قرآن مجید نے اپنے اسلوب کے مطابق کہ وہ ایمان کے ساتھ کفر، نیکی کے ساتھ

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں تھوڑے سے سامان کے سوا کچھ نہیں ﴿۲۶﴾

بدی، جنت کے ساتھ جہنم کا ذکر کرتا ہے، عہد وفا کرنے والوں کی صفات اور ان کے اچھے انجام کے بعد عہد توڑنے والوں کی صفات بد اور ان کا برا انجام ذکر فرمایا ہے۔

آیت 26 ① اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ ...... : بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب یہ شبہ بن جاتا ہے کہ اللہ کے نافرمان دنیا میں خوش حال کیوں ہیں؟ اس کا جواب دیا، یعنی دنیا میں رزق کی فراوانی یا تنگی کوئی معیار نہیں ہے، جس کے لحاظ سے کسی شخص کے اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ یا غیر پسندیدہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے، بسا اوقات وہ کافر کو خوب سامانِ عیش دیتا ہے اور مومن پر تنگ دستی وارد کرتا ہے، تاکہ دونوں کی آزمائش کی جائے، مومن اپنے صبر و شکر کی وجہ سے آخرت میں بلند درجات پاتا ہے اور کافر ناکام رہتا ہے، اس لیے آخرت میں اس کا ٹھکانا برا ہوتا ہے، لہٰذا گمراہ لوگوں کی بداعمالیوں کے باوجود ان کے عیش و عشرت سے کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ محض مہلت ہے جو کافر کو دنیا میں دی جاتی ہے۔ (روح المعانی)

② وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ...... : "مَتَاعٌ" کی تنوین تقلیل و تحقیر کے لیے ہے، یعنی معمولی، تھوڑا سا بے قدر و قیمت سامان، یعنی کفار دنیا کی زندگی کی آسائشوں پر پھول رہے ہیں، حالانکہ یہ آخرت کے مقابلے میں محض معمولی اور بے حقیقت تھوڑی دیر کا سامان ہے۔ مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَاللّٰهِ! مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ هٰذِهِ ـ وَأَشَارَ يَحْيٰى بِالسَّبَّابَةِ ـ فِي الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ بِمَ تَرْجِعُ » [ مسلم، الجنة وصفة نعيمها، باب فناء الدنيا...... : ۲۸۵۸ ] "اللہ کی قسم! دنیا آخرت کے مقابلے میں اس مثال کے سوا کچھ نہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی یہ انگلی۔" اور راوی یحییٰ نے شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ کیا "سمندر میں ڈالے، پھر دیکھے کہ وہ کیا چیز لے کر واپس آتی ہے۔" عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « نَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ أَثَّرَ فِيْ جَنْبِهِ، فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لَوِ اتَّخَذْنَا لَكَ وِطَاءً، فَقَالَ مَا لِيْ وَ لِلدُّنْيَا، مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ، ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا » [ ترمذی، الزهد، باب حديث ما الدنيا إلا كراكب استظل : ۲۳۷۷ ] "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر سوئے، اٹھے تو چٹائی نے آپ کے پہلو پر اپنے نشان لگا دیے تھے۔ ہم نے عرض کی: "یا رسول اللہ! اگر ہم آپ کے لیے (بستر وغیرہ) بنا دیں تو؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرا اور دنیا کا کیا تعلق! میں تو دنیا میں محض اس سوار کی طرح ہوں جس نے ایک درخت کے سائے میں آرام کیا، پھر اسے چھوڑ کر آگے چل دیا۔"

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۚۖ (۲۷) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ (۲۸)

اور جن لوگوں نے کفر کیا کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی۔ کہہ دے بے شک اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف اسے راستہ دیتا ہے جو رجوع کرے (۲۷) وہ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں۔ سن لو! اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں (۲۸)

---

آیت 27 (1) وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : ایسی نشانی کیوں نہیں اتری جسے دیکھ کر ہم اسے اللہ کا رسول ماننے پر مجبور ہو جاتے، مثلاً دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں ان کی فرمائشیں۔

(2) قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ ...... : یعنی نشانی کے اترنے سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ تمھارے اب تک ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تم نے کوئی نشانی نہیں دیکھی، نشانیاں تو بے حد و حساب موجود ہیں، مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کمال حکمت والا ہے اور اپنی رحمت کا خود مالک ہے، جسے چاہے اپنی حکمت کی بنا پر اپنی رحمت و ہدایت سے محروم، یعنی گمراہ رکھے اور جسے چاہے اپنی رحمت و ہدایت سے نواز دے۔ دوسری بات یہ کہ تم اللہ کے راستے کی طرف آتے ہی نہیں، اگر تمھاری سیدھے راستے کی طرف آنے کی خواہش اور جستجو ہوتی تو تم صرف قرآن کی نشانی کو دیکھ کر راہ حق کو پا لیتے، کیونکہ یہ کتاب واضح دلائل سے لبریز ہے۔ اب اگر تم اپنی خواہشات اور شیطان ہی کے پیچھے چلتے جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف لوٹ کر آنے کی رغبت ہی نہ رکھو تو تمھیں اللہ کے راستے پر چلنا کیسے نصیب ہو، وہ تو اپنی طرف آنے کے راستے پر چلنے کی توفیق انھی کو دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع رکھیں اور لوٹ کر آنا چاہیں۔

آیت 28 اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ ...... : یہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں کی صفت ہے، ذکر کا معنی نصیحت بھی ہے اور یاد کرنا بھی۔ اس لحاظ سے آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ انھی کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل کو وحی الٰہی سے ملنے والی نصیحت سے پوری تسلی ہو جاتی ہے، اس کے سوا انھیں کہیں سے تسلی نہیں ہوتی، کوئی دوسرا اپنے خیال میں کیسی اچھی بات کیوں نہ کہے انھیں اس پر یقین نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بھی ان جیسا انسان ہے، اس کی بات درست بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی، اس لیے اس پر انھیں اطمینان نہیں ہوتا، صرف اللہ کی بات ایسی ہے جو غلط نہیں ہوتی، اس لیے اسی پر ان کے دل کو یقین و اطمینان ہوتا ہے۔ ''ذکر اللہ'' یعنی اللہ کی نصیحت صرف رسول پر نازل ہوئی، قرآن کی صورت میں بھی اور حدیث کی صورت میں بھی، پھر اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا، فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [ الحجر : ۹ ] ''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ۝۲۹ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ

جولوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے خوشحالی اور اچھا ٹھکانا ہے ۝۲۹ اسی طرح ہم نے تجھے

حفاظت کرنے والے ہیں۔'' کافر اس نعمت سے محروم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہدایت کی نعمت صرف اسی کو ملتی ہے جو اس کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرے، ایمان لائے اور وحی الٰہی سے اسے پوری تسلی حاصل ہو جائے۔ کوئی شخص اگر ایمان کا دعویٰ کرے مگر اسے قرآن و حدیث کے بجائے تسلی کسی اور کی بات سے ہوتی ہو تو وہ بدنصیب بھی ہدایت الٰہی سے محروم ہے۔

''ذکر اللہ'' کا دوسرا معنی یاد الٰہی ہے۔ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ ایمان کے خالص اور پختہ ہونے کی علامت ہے کہ ذہن خواہ کتنی ہی فکروں میں الجھا ہوا ہو لیکن جوں ہی نماز شروع کرے یا اللہ کو یاد کرے تو تمام فکر بھول جائیں اور انسان حقیقی اطمینان قلب سے بہرہ ور ہو جائے۔'' یہاں اگرچہ دونوں معنوں کی گنجائش ہے مگر پہلا معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ کافر نشانی مانگ رہے ہیں جبکہ سب سے بڑی نشانی قرآن موجود ہے۔ اہل ایمان کو اسی سے اطمینان ہو جاتا ہے، جبکہ کافر بدنصیب شک ہی میں مارا جاتا ہے اور مزید معجزے مانگتا رہتا ہے۔

**آیت 29** **طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ** : ''**طُوْبٰى**'' اصل میں ''طَابَ يَطِيْبُ'' (اچھا اور عمدہ ہونا) سے ''طُيْبٰى'' تھا، مصدر بروزن ''بُشْرٰى'' بمعنی خوشی، مبارک باد۔ ''**مَاٰبٍ**'' ''اٰبَ يَؤُوْبُ أَوْبًا'' کا معنی ہے لوٹنا اور ''**مَاٰبٍ**'' کا معنی لوٹ کر جانے کی جگہ، ٹھکانا یعنی ایمان اور عمل صالح کی برکت سے عمدہ ترین زندگی حاصل ہوتی ہے اور آخری ٹھکانا بھی بہترین ملے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** ﴾ [ النحل : ۹۷ ] ''جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انھیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے۔'' مسند احمد کی ایک حدیث میں جو عتبہ بن عبد السلمی سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے جنت کے ایک درخت کا نام بھی طوبیٰ بتایا ہے۔ [ مسند أحمد : ۴/ ۱۸۳، ح : ۱۷۶۶۰، وقال شعيب الأرنؤوط إسناده قابل للتحسين ]

**آیت 29** ❶ **كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ** : امت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ لوگ جن کی طرف رسول بھیجا جائے، وہ مسلمان ہوں یا کافر، جیسے قوم ثمود کا ہر مسلم و کافر صالح علیہ السلام کی امت تھا اور عاد کا ہر فرد ہود علیہ السلام کی امت میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد قیامت تک ہر مسلم و کافر، یہودی، نصرانی، ہندو اور دہریہ، غرض ہر شخص آپ ﷺ کی امت میں سے ہے، اسے امتِ دعوت کہا جاتا ہے، پھر جو لوگ رسول کی دعوت کو قبول کر لیں وہ امتِ اجابت کہلاتے ہیں، اس آیت میں امتِ دعوت مراد ہے۔

❷ **قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ** : یعنی نہ آپ پہلے رسول ہیں نہ آپ کی امتِ دعوت کوئی پہلی امت ہے۔ اس سے مقصود آپ کی امت کو پہلی جھٹلانے والی امتوں کے انجام بد سے ڈرانا ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

ایسی امت میں بھیجا جس سے پہلے کئی امتیں گزر چکیں، تاکہ تو انھیں وہ وحی پڑھ کر سنائے جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے، اس حال میں کہ وہ اس بے حد مہربان سے کفر کر رہے ہیں۔ کہہ دے وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے ﴿۳۰﴾

③ لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ : یعنی آپ کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ انھیں وہ آیات واحکام پڑھ کر سنائیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیے۔ " عَلَيْهِمْ " سے اولین مراد قریش مکہ ہیں اور پھر بعد میں قیامت تک آنے والے تمام لوگ بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [ الجمعة : ۲، ۳ ] ''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔ اور ان میں سے کچھ اور لوگوں میں بھی (آپ کو بھیجا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' ''جو ابھی تک ان سے نہیں ملے'' سے مراد قیامت تک کے لوگ ہیں۔

④ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ : یعنی اللہ نے اپنی رحمت سے ان لوگوں پر کرم فرمایا کہ آپ کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا، مگر ان کی ناشکری کا حال یہ ہے کہ اس کا حق پہچاننے سے منکر ہو گئے ہیں۔ کفار مکہ اللہ کے خالق ہونے کا تو اقرار کرتے تھے، مگر اس کے ''رحمان'' ہونے کے منکر تھے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ کے رحمان ہونے اور اسے اس نام سے پکارنے کی دعوت دی جاتی تو اس سے چڑتے اور کہتے: ﴿ وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴾ [ الفرقان : ۶۰ ] ''رحمان کیا چیز ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو ہمیں حکم دیتا ہے اور یہ بات انھیں بدکنے میں بڑھا دیتی ہے۔'' نیز حدیبیہ کے صلح نامہ پر جب نبی ﷺ نے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' لکھوانا چاہا تو کفار کے نمائندے سہیل بن عمرو نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں رحمان کو نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، آپ ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھوایے۔'' [ بخاري، الشروط، باب الشروط في الجهاد ....: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲ ] ''الرَّحْمٰنُ'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور اسم اللہ کے بعد سب سے محترم نام ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَی اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ )) [ مسلم، الآداب، باب النهي عن التكني بأبي القاسم ....: ۲۱۳۲ ] ''اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پیارے نام عبداللہ اور عبدالرحمان ہیں۔''

وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا ؕ اَفَلَمْ یَایْـَٔسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۳۱﴾

ع ۱۰ ۵

اور واقعی اگر کوئی ایسا قرآن ہوتا جس کے ذریعے پہاڑ چلائے جاتے، یا اس کے ذریعے زمین قطع کی جاتی، یا اس کے ذریعے مُردوں سے کلام کیا جاتا۔ بلکہ کام سارے کا سارا اللہ کے اختیار میں ہے، تو کیا جو لوگ ایمان لائے ہیں مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہے تو یقیناً سب کے سب لوگوں کو ہدایت دے دے، اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ہمیشہ اس حال میں رہیں گے کہ انھیں اس کی وجہ سے جو انھوں نے کیا، کوئی نہ کوئی سخت مصیبت پہنچتی رہے گی، یا ان کے گھر کے قریب اترتی رہے گی، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آ جائے۔ بے شک اللہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ﴿۳۱﴾

آیت 31 ① وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ ...... : "قُرْاٰنًا" نکرہ ہے، کوئی قرآن، یعنی پڑھی جانے والی کوئی کتاب۔ "لَوْ" شرطیہ ہے، اس کا جواب محذوف ہے، جو آیت کے سیاق و سباق سے خود بخود معلوم ہو رہا ہے اور قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر موجود بھی ہے۔ تفاسیر میں دو جواب مذکور ہیں اور دونوں درست ہیں، ایک تو یہ کہ اگر واقعی کوئی ایسا قرآن ہوتا جس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے، یا اس کے ذریعے سے زمین قطع کی جاتی، یا اس کے ذریعے سے مُردوں سے کلام کیا جاتا تو پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے، کیونکہ یہ ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں۔ ان تین چیزوں کا خصوصاً ذکر اس لیے کیا کہ قرآن مجید کے معجزے کے بعد، جس کے چیلنج کے مقابلے میں سب لاجواب ہو چکے تھے، اب وہ لوگ خصوصاً انھی تین چیزوں کے دکھانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب لاجواب ہونے کے باوجود یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہیں لائے تو اگر کوئی ایسا قرآن بھی آ جائے جس سے ان کے مطالبے پورے ہوں، پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ تمام کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور یہ لوگ جب عناد کی وجہ سے اس قرآن پر ایمان نہ لا کر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نشانہ بن چکے ہیں، جو سب معجزوں سے بڑا معجزہ ہے، تو اپنے مطلوبہ معجزے دیکھ لینے کے بعد بھی اللہ کی ناراضگی کی وجہ سے ان کو ایمان لانے کی توفیق کیسے ملے گی اور کہاں سے ملے گی۔ جب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں ہی بند کر لے تو کوئی اسے کس طرح دکھا سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یَجْهَلُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۱۱۱ ] "اور اگر واقعی ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیتے اور ان سے مُردے گفتگو کرتے اور ہم ہر چیز ان کے پاس سامنے لا جمع کرتے تو بھی وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لے آتے مگر یہ کہ اللہ چاہے اور لیکن ان کے اکثر جہالت برتتے ہیں۔" اس آیت سے "لَوْ" کا جواب صراحت کے ساتھ معلوم ہو رہا ہے۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۳۲

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے ان لوگوں کو مہلت دی جنھوں نے کفر کیا، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا تو میرا عذاب کیسا تھا؟ ۳۲

دوسرا جواب اس "لَوْ" کا یہ ہے کہ ان صفات کا حامل اگر کوئی قرآن ہوتا تو وہ یہی قرآن تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [ الحشر : ۲۱ ] "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا، ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا دیکھتا۔" اس میں اس قرآن کی عظمت کا بیان ہے کہ تم جو مطالبے کر رہے ہو قرآن کے لیے ان میں سے کوئی بھی پورا کرنا مشکل نہیں، مگر سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایسا کرنا اس کی حکمت کے خلاف ہے، کیونکہ اس کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں تمھیں عذاب سے ملیامیٹ کر دیا جاتا، جیسا کہ پہلی امتوں کے ساتھ ہوا۔

② اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا: مفسرین نے "اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ" کے دو معنی لکھے ہیں، ایک معنی ہے کہ "أَفَلَمْ يَعْلَمْ" کہ کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں انھیں معلوم نہیں ہوا کہ جن نشانیوں کا یہ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دکھانے پر قادر ہے، کیونکہ اسے ہر چیز کا اختیار ہے، مگر اس توقع پر ان نشانیوں کا دکھانا بے سود ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ اتنے سرکش اور ضدی ہیں کہ یہ نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور "اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ" کا دوسرا معنی یہ ہے کہ کیا ابھی مسلمان ان کے ایمان لانے سے مایوس نہیں ہوئے، حالانکہ وہ جانتے ہیں......۔

③ اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا : یعنی ہدایت تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے جو ان نشانات کے دکھائے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ (شوکانی)

④ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... : یعنی یہ کفار مکہ نشانیوں کو دیکھ کر مان لینے والے نہیں ہیں۔ یہ مانیں گے تو اس طرح کہ ان کے کرتوتوں کی سزا میں آئے دن کوئی نہ کوئی آفت ان پر نازل ہوتی رہے، جیسے قتل، قید، قحط یا بیماری وغیرہ۔ چنانچہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "لیکن کافر مسلمان یوں ہوں گے کہ ان پر آفت پڑتی رہے گی، ان پر پڑے یا ہمسائے پر، جب تک سارے عرب ایمان میں آ جائیں۔ وہ آفت یہی تھی جہاد مسلمانوں کے ہاتھ سے۔" (موضح)

⑤ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ : یعنی وہ آفت ان کے آس پاس والوں پر اترے گی اور وہ ان کا حال دیکھ کر عبرت حاصل کریں گے۔

⑥ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ : چنانچہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا، قریش میں سے بعض لوگ مارے گئے اور بعض قید ہوئے، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ پورا ہوا، یعنی مکہ فتح ہوا۔

آیت 32 وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ...... : "عِقَابِ" اصل میں "عِقَابِيْ" تھا۔ آیات کی موافقت کے لیے یاء حذف کر کے

اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۳

تو کیا وہ جو ہر جان پر اس کا نگران ہے جو اس نے کمایا (کوئی دوسرا اس کے برابر ہو سکتا ہے؟) اور انھوں نے اللہ کے کچھ شریک بنا لیے۔ کہہ دے ان کے نام لو، یا کیا تم اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا، یا ظاہری بات سے (کہہ رہے ہو؟) بلکہ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، ان کا مکر خوشنما بنا دیا گیا اور وہ سیدھے راستے سے روک دیے گئے اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۝۳۳

کسرہ رہنے دیا گیا۔ "أَمْلَيْتُ" باب افعال (ناقص واوی) بمعنی مہلت دینا، اس سے مقصود نبی ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ آپ ان کافروں کے ٹھٹھا مذاق کرنے اور ناجائز اور ناممکن مطالبات کرنے سے بد دل نہ ہوں، پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے تو ہر گزرنے والا ان سے ٹھٹھا کرتا۔ [ ھود : ۳۸ ] شعیب علیہ السلام سے ان کی قوم نے کہا: "ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو۔" [ الشعراء : ۱۸۷ ] ہود علیہ السلام کی قوم نے کہا: "ہم یقیناً تجھے بے وقوفی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔" [ الأعراف : ٦٦ ] فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو "مَهِيْنٌ" (حقیر) کہا اور زبان کی لکنت کا طعنہ دیا۔ [ الزخرف : ٥٢ ] فرمایا، اس کے باوجود میں نے کفار کو مہلت دی، تاکہ ان کا عذر ختم ہو جائے، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا تو آپ بھی ان کی حرکتوں سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِيْ لِلظَّالِمِ حَتّٰى إِذَا أَخَذَهٗ لَمْ يُفْلِتْهُ » "اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اسے پکڑتا ہے تو اسے چھوڑتا نہیں۔" پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴾ [ ھود : ۱۰۲ ] "اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک، بہت سخت ہے۔" [ بخاري، التفسير، باب قوله: ﴿ و كذلك أخذ ربك إذا أخذ القرى... ﴾ : ٤٦٨٦، عن أبي موسى رضی اللہ عنہ ۔ مسلم : ۲۵۸۳ ]

**آیت 33** ❶ **اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ** : یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے ثبوت اور شرک کے رد کا بیان فرمایا ہے۔ "قَآىِٕمٌ" سے مراد یہاں نگران اور محافظ ہے۔ "اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ" مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے اور وہ ہے "كَمَنْ لَيْسَ كَذٰلِكَ" اور یہ حذف شدہ خبر کلام کے پہلے اور پچھلے حصے سے خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے۔ یعنی کیا وہ معبود برحق جو ہر جان کا ہر لمحہ اور ہر حالت کا نگران اور محافظ ہے اور اس کے ہر عمل سے، نیک ہو یا بد، پوری طرح واقف ہے، وہ تمھارے ان جھوٹے معبودوں کی طرح ہے جو سرے سے اس وصف سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس وصف کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۵۹)، ہود (٦) اور آیت الکرسی وغیرہ۔

❷ **وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ** : اس سے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ضمیر "هُوَ" کے ساتھ تھا، یہاں ضمیر کے

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

ان کے لیے ایک عذاب دنیا کی زندگی میں ہے اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے اور انھیں اللہ سے کوئی بھی بچانے والا نہیں ﴿۳۴﴾

بجائے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ان کے شرک کی قباحت ظاہر کی کہ کتنے ظالم ہیں کہ انھوں نے ''اللہ'' کے شریک بنا لیے، جس کا کوئی شریک ہو ہی نہیں سکتا۔ فرمایا ان شریک بنانے والوں سے کہو ذرا ان شریکوں کے نام تو بتاؤ، انھیں سامنے تو لاؤ۔ اگر تم بالفرض نام لے بھی دو، تو ایسی ہستیوں کا نام لو گے جو محض خیالی ہیں، حقیقت میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں، وہ خود اپنے وجود اور بقا میں دوسروں کی محتاج ہیں، نہ اپنے نفع نقصان کا اختیار رکھتی ہیں نہ کسی دوسرے کا، ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتیں۔ پھر ان کا نام اللہ کے شریک کے طور پر لینا کس قدر نادانی اور جہالت کی بات ہے۔

③ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ : یا تم اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا، حالانکہ اسے زمین کے چپے چپے کی خبر ہے، تو اگر ان شرکاء کا کہیں وجود ہوتا تو وہ انھیں ضرور جانتا۔ اس تفسیر کی رو سے ''لَا يَعْلَمُ'' میں ''هُوَ'' کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہو گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''لَا يَعْلَمُ'' میں ضمیر ''مَا'' کے لیے ہو اور مطلب یہ ہو کہ کیا اللہ تعالیٰ کو ان بے جان بتوں کے معبود ہونے کی خبر دیتے ہو جن کو ذرا بھی علم نہیں ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں، اس سے مقصود تو زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کی نفی کرنا ہے، لہٰذا ''فِي الْاَرْضِ'' کی قید محض اس لیے لگائی ہے کہ کفار یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کے یہ شریک زمین میں ہیں۔ (روح، ابن کثیر)

④ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ : یا ظاہری بات ہے، جو تم صرف منہ سے کہہ رہے ہو، دل سے تمھیں بھی یقین نہیں کہ کوئی اللہ کا شریک ہے، کیونکہ اگر غور و فکر کرو تو انسانی فطرت بھی اللہ کا کوئی شریک ہونا تسلیم نہیں کرتی۔

⑤ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ : مکر سے مراد کفر اور اس کے لیے باطل دلیلیں گھڑنا اور لوگوں کو دھوکا دے کر مشرک بنانا ہے۔ ''خوش نما بنا دیا گیا'' خوش نما بنانے والی کئی چیزیں ہیں، اس لیے فعل مجہول استعمال کیا گیا، مثلاً: ① ان کے اعمالِ بد کی نحوست ② نفسانی خواہشات ③ شیطان ④ ان کے فسق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر لگنے والی مہر، غرض بہت سی چیزیں ان کے کفر کو خوش نما بنانے کا باعث بنیں۔

⑥ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ...... : ''مِنْ هَادٍ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں ہدایت نہیں لکھی۔ اب ایسے لوگ سیدھی راہ پر کیسے آ سکتے ہیں۔

آیت 34 لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ...... : یعنی دنیا ہی میں بعض اوقات آسمانی آفات، بیماریوں، فاقوں اور مختلف مصیبتوں کے ذریعے سے عذاب ہو گا اور بعض اوقات مجاہدین اسلام کے ہاتھوں قید، قتل یا ذلیل ہوں گے اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے۔ اس کی ایک جھلک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « نَارُكُمْ هٰذِهِ الَّتِيْ يُوْقِدُ ابْنُ آدَمَ جُزْءٌ مِنْ

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

اس جنت کی صفت جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں بہ رہی ہیں، اس کا پھل ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس کا سایہ بھی۔ یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو متقی بنے اور کافروں کا انجام آگ ہے ﴿۳۵﴾ اور وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا ہے اور کچھ گروہ وہ ہیں جو اس کے بعض کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دے مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے ﴿۳۶﴾

---

سَبْعِيْنَ جُزْءًا مِنْ حَرِّ جَهَنَّمَ ...... كُلُّهَا مِثْلُ حَرِّهَا» [ مسلم، الجنة وصفة نعيمها، باب جهنم أعاذنا الله منها : ۲۸۴۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''تمھاری یہ آگ جو ابن آدم جلاتا ہے، جہنم کی گرمی کے ستر (۷۰) حصوں میں سے ایک حصہ ہے...... سب کی گرمی اس کی مثل ہے۔'' اور آخرت کے عذاب کے بہت زیادہ سخت ہونے کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ فجر (۲۵، ۲۶) اور سورۂ فرقان (۱۱ تا ۱۵)۔

**آیت 35** مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ ...... : ''مَثَلُ'' کا معنی یہاں صفت یا حال ہے، اہل جہنم کے ذکر کے بعد متقی لوگوں کو ملنے والی جنت کا حال اور اس کی صفت بیان فرمائی کہ اس کے درختوں اور مکانوں کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اس کا پھل دائمی ہے، یہ نہیں کہ کبھی ہو اور کبھی نہ ہو، اسی طرح اس کا سایہ بھی دائمی ہے، اس کے پھل نہ ختم ہوں گے، نہ کسی جنتی کو ان سے کوئی رکاوٹ ہو گی۔ (دیکھیے واقعہ: ۳۳) جنت کی نہروں کی صفت کے لیے سورۂ محمد (۱۵) اور سائے کی حالت کے لیے سورۂ دہر (۱۴)، نساء (۵۷) اور طٰہٰ (۱۱۸، ۱۱۹) ملاحظہ فرمائیں۔ مزید تفصیل کے لیے اس مقام پر تفسیر ابن کثیر اور کتب احادیث میں جنت اور جہنم کے احوال کے ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 36** ❶ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ...... : ''الْكِتٰبَ'' سے مراد یا تو پہلی کتابیں ہیں، یعنی تورات و انجیل، مطلب یہ ہوگا کہ پہلی کتب میں چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کے بہت سے شواہد اور بشارتیں موجود ہیں، اس لیے جن لوگوں کو وہ کتابیں دی گئی ہیں وہ آپ کی طرف اترنے والی آیات پر خوش ہوتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۷) اور آل عمران (۱۱۳) کیونکہ وہ آپ کو پہچان کر ایمان لا چکے ہیں، ہاں ان کے کئی گروہ قرآن کی بعض چیزوں کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی ان باتوں کا رد کرتا ہے جو انھوں نے اپنے پاس سے داخل کر لی تھیں، یا ان میں تبدیلی اور تحریف کر دی تھی، مثلاً یہود

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع

اور اسی طرح ہم نے اسے عربی فرمان بنا کر اتارا ہے اور یقیناً اگر تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس کے بعد جو تیرے پاس علم آ چکا تو اللہ کے مقابلے میں نہ تیرا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا ﴿۳۷﴾

---

کا عزیر علیہ السلام اور نصاریٰ کا مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دینا اور وہ باتیں ظاہر کرنا ہے جو وہ چھپاتے تھے، مثلاً رجم کی حد، سود کی حرمت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات وغیرہ، لہٰذا وہ پہچاننے کے باوجود عناد کی وجہ سے ان باتوں کا انکار کرتے اور اپنے کفر پر اڑے ہوئے تھے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۳۰، ۳۱) یا پھر "اَلْكِتٰبَ" سے مراد قرآن مجید ہے اور ''جن لوگوں کو یہ کتاب دی'' سے مراد مسلمان ہیں کہ وہ آپ پر اترنے والی آیات پر دل سے خوش ہوتے ہیں اور "الْاَحْزَابِ" سے مراد عرب کے وہ جاہل اور ضدی لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کی بعض باتیں اپنی مرضی کے خلاف ہونے کی وجہ سے نہ مانیں اور مسلمان نہ ہوئے۔ یہ لوگ خوش ہونے کے بجائے ناراض اور پیچ پا ہوتے ہیں۔

② قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ ...... : تو جو شخص نہیں مانتا وہ گویا اللہ تعالیٰ اور اس کی عبادت سے انکار کرتا ہے۔

③ وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ: "مَاٰبِ" یہ " اٰبَ يَؤُوْبُ " (ن، اجوف واوی) سے مصدر میمی ہے، اصل " مَاٰبِيْ " تھا، یعنی میرا لوٹنا، ''یاء'' حذف کر کے کسرہ اس پر دلالت کے لیے باقی رکھا ہے۔

**آیت 37** ① وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا : یعنی جس طرح پہلے انبیاء کی طرف کتابیں اتریں اسی طرح ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا اور جس طرح ہر نبی پر اس کی قوم کی زبان میں وحی اور کتاب نازل کی اسی طرح عربوں پر بھی انھی کی زبان میں کتاب اتاری، کسی دوسری زبان میں نہیں، تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم تو یہ زبان جانتے ہی نہیں۔ "اَنْزَلْنٰهُ" (ہم نے اسے اتارا) سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید اور وحی الٰہی اوپر کی جانب سے آئی ہیں۔ اس سے ان لوگوں کا صاف رد ہو گیا جو اللہ تعالیٰ کے لیے اوپر کی جانب ہونے یا عرش پر ہونے کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ کبھی کہتے ہیں کہ وہ لامکان ہے، یعنی کہیں بھی نہیں اور کبھی کہتے ہیں وہ ہر جگہ ہے، حالانکہ قرآن نے کئی جگہ صراحت فرما دی ہے کہ وہ اوپر کی جانب ہے اور عرش پر ہے، فرمایا: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ [ البقرة : ۱٤٤ ] ''یقیناً ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ [ الأعراف : ٥٤ ] ''پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔'' اور دیگر متعدد آیات۔ پھر آپ کے مخاطب اگرچہ قیامت تک کے تمام جن و انس ہیں، تاہم سب سے اول مخاطب عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کی رہنمائی کے لیے ان کا اور ان کی زبان کا انتخاب ان کی فطری خوبیوں اور ان کی زبان کی جامعیت، فصاحت و بلاغت، حُسنِ ادا، آسان ہونے اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے فرمایا اور اسے اہل عرب پر احسان قرار دیا: ﴿وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ ۚ وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ﴾ [ الزخرف : ٤٤ ] ''اور بے شک وہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے نصیحت (یا شہرت کا

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے کئی رسول تجھ سے پہلے بھیجے اور ان کے لیے بیویاں اور بچے بنائے اور کسی رسول کے لیے ممکن

باعث ) ہے اور عنقریب تم سے پوچھا جائے گا۔'' پھر اس قرآن نے عربی زبان کو ایسا محفوظ کیا کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود عربی زبان اصل صورت میں موجود ہے، جبکہ دوسری تمام زبانیں کچھ عرصہ بعد بدل جاتی ہیں، حتیٰ کہ پہلے لفظ بالکل ہی متروک ہو جاتے ہیں، جیسا کہ انگریزی وغیرہ کا حال ہے۔ خود عربی کو دیکھ لیجیے کہ قرآن کی وجہ سے فصیح عربی محفوظ ہے، مگر عام لوگوں کی عربی بھی مختلف علاقوں اور مختلف ادوار کے لحاظ سے اتنی مختلف ہے کہ ایک علاقے کا عرب دوسرے علاقے کی عامی زبان نہیں سمجھتا۔ البتہ اصل عربی کو قرآن نے صدیوں سے اصل صورت میں باندھ رکھا ہے، وہ دنیا بھر میں ایک ہی ہے۔

② وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ ...... : یہ خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن مراد ہر وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب اور اس کے غصے سے ڈرنے والا ہے اور اس میں وعید ہے ان علماء کے لیے جو جانتے بوجھتے سنت کی راہ چھوڑ کر بدعت و ضلالت اور قرآن و حدیث چھوڑ کر اقوالِ رجال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ (ابن کثیر)

**آیت 38** ① وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ ...... : نبی کریم ﷺ کی نبوت پر مشرکین یہ بھی اعتراض کرتے کہ یہ عجیب پیغمبر ہیں کہ دوسرے انسانوں کی طرح نکاح کرتے ہیں، ان کی اولاد بھی ہے، حالانکہ پیغمبر کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟! بلکہ انھیں اس پر بھی اعتراض تھا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ (دیکھیے فرقان: ۷) اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب ہے کہ نبوت عورتوں سے نکاح کے منافی نہیں، آپ سے پہلے جتنے بھی اللہ کے پیغمبر ہو گزرے ہیں وہ سب بشر ہی تھے اور ان میں اکثریت ان پیغمبروں کی ہے جو بیوی بچے رکھتے تھے۔ وہ سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ (دیکھیے فرقان: ۲۰) تمھیں ابراہیم اور اسماعیل ؑ کی اولاد ہونے پر فخر ہے تو کیا تم ان کی شادی کے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہو؟! اسی طرح بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کو دیکھ لو۔ سلیمان علیہ السلام کی بیویوں اور لونڈیوں کی تعداد کی طرف دھیان کرو! غرض تمھارا یہ اعتراض سرے سے ہے ہی لغو۔ ہمارے زمانے میں بھی کئی لوگ انھی لوگوں کو اللہ والے، ولی اور بزرگ سمجھتے ہیں جو نہ شادی کریں، نہ کمائی، راہب بن کر دین کی دعوت اور جہاد کے بجائے گوشہ نشینی اور خود محنت کر کے کھانے کے بجائے دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کریں، حالانکہ اسلام میں یہ کام حرام ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلٰى بُيُوْتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَمَّا أَنَا فَأَنَا أُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا، وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا أُفْطِرُ، وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ إِلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللّٰهِ! إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ،

يَّأْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ

نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی لے آتا، مگر اللہ کے اذن سے۔ ہر وقت کے لیے ایک کتاب ہے ۝ اللہ مٹا دیتا ہے جو چاہتا

فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ » [ بخاری، النکاح، باب الترغیب فی النکاح : ۵۰۶۳۔ مسلم : ۱۴۰۱ ] ”تین آدمی نبی ﷺ کی بیویوں کے گھروں کی طرف آئے، وہ نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ جب انھیں بتایا گیا تو گویا انھوں نے اسے کم سمجھا، کہنے لگے: ”ہماری نبی ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہیں۔“ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا: ”میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا۔“ دوسرے نے کہا: ”میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی روزے کے بغیر نہیں رہوں گا۔“ تیسرے نے کہا: ”میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔“ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے (انھیں بلوایا) اور فرمایا: ”تم لوگوں نے یہ یہ باتیں کی ہیں، یاد رکھو! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ کی خشیت والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ کے تقویٰ والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو میرے طریقے سے بے رغبتی کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔“

2 **وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ :** مخالفین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر یہ (محمد ﷺ) واقعی اللہ کے سچے پیغمبر ہیں تو ہماری طلب کے مطابق معجزے اور نشانیاں کیوں نہیں لاتے۔ ان کے جواب میں فرمایا کہ پہلے پیغمبر جتنے معجزے لائے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم سے لائے ہیں، اب اگر اللہ کا حکم ہوگا تو وہ اپنے اس پیغمبر سے بھی معجزے ظاہر کروے گا، ورنہ پیغمبر میں از خود یہ ہمت کہاں ہے کہ اپنی مرضی سے جو معجزہ چاہے ظاہر کر دے۔ یہی حال اولیاء کی کرامتوں کا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کرامت دکھلانے پر قادر نہیں ہوتے۔ یہاں آیت سے مراد قرآن کی آیت بھی ہو سکتی ہے جس میں ان کی مرضی کے مطابق کوئی حکم نازل ہو جائے۔ (ابن کثیر)

3 **لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ :** یعنی ہر وقت کے لیے ایک لکھا ہوا فیصلہ ہے جو اس وقت ہو کر رہے گا۔

**آیت 39** **يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ......** بظاہر یہ آیت اس حدیث کے خلاف ہے: « جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ » [بخاری، النکاح، باب ما یکرہ من التبتل والخصاء : ۵۰۷۶ ] ”جس چیز یا حال کو تم ملنے والے ہو قلم اس کے ساتھ خشک ہو چکا ہے۔“ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فیصلہ ہو چکا وہ اب مٹنے والا نہیں، اس سوال کے حل کے لیے اس آیت کی تفسیر اہل علم نے دو طرح سے کی ہے، ایک تو یہ کہ جس طرح معجزہ اور کرامت اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے، کسی دوسرے کا اس میں کچھ دخل نہیں، اسی طرح کسی حکم کو باقی رکھنا یا اسے منسوخ کر دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ کون سا حکم کب تک باقی رکھنا ہے اور کون سا حکم منسوخ کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔ گویا یہ یہود پر رد ہے جو نسخ کے قائل نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں بھی ان پر رد فرمایا: ﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ﴾ [ البقرۃ : ۱۰۶ ] یعنی جو بھی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس جیسی اور لے آتے

أُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

ہے اور ثابت رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے ﴿۳۹﴾

ہیں اور یہ سب باقی رکھنا یا منسوخ کرنا (محو و اثبات) ام الکتاب میں درج ہے، جو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۰۶) کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمالیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جب تک چاہتا ہے ایک رسول کے احکام پر عمل قائم رکھتا ہے، پھر جس وقت چاہتا ہے بعد میں آنے والے رسول کے احکام پر عمل فرض کر دیتا ہے اور پہلے پر عمل ختم کر دیتا ہے۔ ”یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ“ میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی بندے کے نامۂ اعمال میں کوئی بھی نیک یا بدعمل اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو باقی رکھتا ہے، چاہتا ہے تو مٹا دیتا ہے اور یہ نہیں کہ پہلے اسے علم نہیں تھا کہ میں نے کیا ثابت رکھنا ہے اور کیا مٹانا ہے، بلکہ اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اسے قضائے مبرم کہتے ہیں اور یہ وہی ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (( جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ )) [ بخاري، النكاح، باب ما يكره من التبتل والخصاء : ٥٠٧٦ ] ”تم جس چیز یا حال کو ملنے والے ہو اس کے ساتھ قلم خشک ہو چکا ہے۔“ اور ایک تقدیر وہ ہے جس میں تبدیلی ہوتی ہے، اسے تقدیر معلق کہتے ہیں اور وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ چنانچہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعض اسباب ظاہر ہیں اور بعض چھپے ہیں۔ اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ مقرر ہے، جب اللہ چاہے ان کی تاثیر اندازے سے کم یا زیادہ کر دے اور جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے، وہ ہرگز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہیں، یہ دو تقدیریں ہوئیں، ایک بدلتی ہے (تقدیر تاثیر اسباب) اور ایک نہیں بدلتی (یعنی علم الٰہی)۔“ (موضح)

شیخ ناصر الدین البانی نے سلسلة الاحاديث الضعيفة (۵۴۴۸) میں فرمایا: ”قرطبی نے بھی اپنی تفسیر ”الجامع (۳۳۲/۵)“ میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اور عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے (قضا) میں تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ محو و اثبات بھی ان چیزوں میں شامل ہے جن کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ قضا میں سے کچھ چیزیں وہ ہیں جو لازماً ہو کر رہتی ہیں، یہ وہ ہیں جو ثابت (مبرم) ہیں اور کچھ وہ ہیں جن میں بعض اسباب سے تبدیلی ہو جاتی ہے، یہ محو (مٹائی ہوئی) ہیں۔ (واللہ اعلم) غزنوی رحمہ اللہ نے فرمایا: ”میرے نزدیک یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ ہے وہ غیب سے نکل چکا ہے، کیونکہ بعض فرشتے بھی اس سے واقف ہیں، اس لیے وہ تبدیل ہو سکتا ہے، کیونکہ مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے پورے علم سے واقف ہونا محال ہے اور اس کے علم میں اشیاء کی جو تقدیر اور طے شدہ بات ہے وہ کبھی نہیں بدلتی۔“ (سلسلہ ضعیفہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ غزنوی سے مراد عالی بن ابراہیم بن اسماعیل ہیں جن کا لقب ”تاج الشریعہ“ ہے، یہ ایک حنفی فقیہ مفسر ہیں، ان کی کتاب تفسیر التفسیر ہے جو بہت عمدہ ہے، جیسا کہ کئی علماء نے فرمایا ہے، ۵۸۲ھ میں فوت ہوئے۔ الاعلام) خلاصہ یہ کہ اس ”محو و اثبات“ کا اس ”بدا“ کے غلط عقیدے سے کوئی تعلق نہیں جو بعض گمراہ لوگوں نے اختیار کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ

اور اگر کبھی ہم واقعی تجھے اس کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا واقعی تجھے اٹھا لیں تو تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے ﴿۴۰﴾ اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کی طرف آتے ہیں، اسے اس کے کناروں سے کم کرتے آتے ہیں اور اللہ فیصلہ فرماتا ہے، اس کے فیصلے پر کوئی نظر ثانی

---

کہ تم کوئی کام کرو، پھر اس کا غلط ہونا تمھیں معلوم ہو تو اسے بدل دو۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا حرام ہے، کیونکہ وہ پہلے ہی جانتا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط ہے۔

اس تفصیل سے اللہ کے فیصلے کے بدل نہ سکنے کے عقیدے اور ان تمام احادیث و اقوال صحابہ کے متعلق اشکال ختم ہو جاتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات تقدیر بدل سکتی ہے، خصوصاً دعا سے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (( لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ )) [ ترمذي، القدر، باب ما جاء لا يرد القدر إلا الدعاء : ۲۱۳۹۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۱/ ۱۵۳، ح : ۱۵۴ ] ''تقدیر کو دعا کے سوا کوئی چیز نہیں ٹالتی اور عمر کو نیکی کے سوا کوئی چیز زیادہ نہیں کرتی۔'' اسی طرح بعض صحابہ کی دعائیں کہ یا اللہ! اگر تو نے مجھے شقی لکھا ہے تو اسے بدل کر سعید لکھ دے۔

**آیت 40** وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ...... : ''مَا'' شرط کے معنی کی تاکید کے لیے ہے جو ''اِنْ'' کا مفہوم ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا ہے ''اور اگر کبھی ہم واقعی تجھے دکھا دیں۔'' یہاں ''نُرِيَنَّكَ'' کا معنی آنکھوں سے دکھانا ہے، دل سے یا گمان اور خیال سے نہیں۔ شرط میں مذکور ''نُرِيَنَّكَ'' اور ''اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ'' دونوں کا جواب محذوف ہے، یعنی ضروری نہیں کہ دنیا میں انھیں دی جانے والی سزا ہم آپ کی زندگی ہی میں آپ کو دکھا کر دیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد ان کی سزا کا وقت آئے، اگر ہم آپ کو آنکھوں سے ان کی کچھ دنیوی سزا دکھا دیں تو یہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے سینوں اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوگا اور اگر پہلے فوت کر لیں تب بھی آپ فکر نہ کریں، کیونکہ آپ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ رہا ان کے اعمال پر محاسبہ اور مؤاخذہ تو وہ ہمارے ذمے ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ کچھ وعدے تو آپ کی زندگی میں پورے ہوں گے اور کچھ آپ کی وفات کے بعد۔ باغبان پودے لگاتا ہے، کچھ اس کی زندگی میں پھل دے دیتے ہیں اور کچھ کئی سالوں کے بعد آنے والی نسل کو پھل دیتے ہیں، لہٰذا آپ کو اس کے لیے جلدی نہیں کرنی چاہیے اور انھیں بے فکر اور غافل نہیں رہنا چاہیے۔

**آیت 41** ① اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ ...... : یہ کفار کے لیے وعید اور مسلمانوں کے لیے خوش خبری ہے، یعنی کیا ان کفار نے نہیں دیکھا کہ ہم ان کی زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کے شہر اور علاقے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آتے جا رہے ہیں، ایک وقت آ رہا ہے کہ انھیں زمین کے مرکز ام القریٰ یعنی مکہ سے بھی بے دخل ہونا

لِحُكْمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

کرنے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے ﴿۴۱﴾

پڑے گا۔ چونکہ مکہ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، اس لیے بعض مفسرین نے اس سورت کو مدنی قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی پیش قدمی کو اپنی پیش قدمی قرار دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کا دین آگے بڑھ رہا تھا اور مسلمانوں کا آگے بڑھنا صرف اللہ ہی کی مدد سے تھا، ورنہ وہ کفار کی متحدہ قوتوں کے سامنے اکیلے اپنی طاقت سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے مسلمانوں کی پیش قدمی کو "اَنَّا نَاْتِي" (اپنے آنے) کے الفاظ کے ساتھ بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال کا جو اظہار ہو رہا ہے وہ اللہ کے کلام ہی کی خصوصیت ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [ النحل : ٢٦ ] "(یعنی ان کفار سے پہلے لوگوں نے سازشیں کیں) تو اللہ ان کی عمارت کو بنیادوں سے آیا، پس ان پر ان کے اوپر سے چھت گر پڑی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا کہ وہ سوچتے نہ تھے۔" یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار رسول اللہ ﷺ نے صفا اور مروہ پر کھڑے ہو کر ان الفاظ میں کیا: (( لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَ نَصَرَ عَبْدَهُ وَ هَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ )) [ مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ : ١٢١٨ ] "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے ہی نے تمام جماعتوں کو شکست دی۔" کفار پر تعجب ہے کہ یہ دیکھ کر بھی کہ دن بدن اسلام کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور کفر و شرک سمٹ رہا ہے، یہ لوگ اسلام نہیں لاتے۔ اللہ تعالیٰ کی بشارت کے مطابق پھر وہ وقت آیا کہ مشرق اور مغرب کے آخر تک اسلام کا علم لہرانے لگا اور رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ہر صورت وہ وقت آنے والا ہے جو مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، فرماتے تھے: (( لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ أَوْ ذُلِّ ذَلِيْلٍ أَمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا )) [ أحمد : ٦/٤، ح : ٢٣٨٧٦ وصححه الألباني ] "زمین کی پشت پر اینٹوں یا بالوں کا بنا ہوا کوئی گھر (یا خیمہ) باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمۂ اسلام کو داخل کر دے گا، عزت والے کو عزت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر، یا تو انھیں عزت دے گا اور انھیں یہ کلمہ پڑھنے والوں میں داخل کر دے گا، یا انھیں ذلیل کرے گا اور وہ اس کے محکوم بن جائیں گے۔" مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۴۴)۔

❷ وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ: کیونکہ اس کے فیصلے پر نظر ثانی کر کے اسے وہی بدل سکتا ہے جو اس پر غالب ہو، جب کہ ایسی کسی ہستی کا کہیں وجود ہی نہیں۔

❸ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ : یعنی اس کے حساب لینے کا وقت نہایت تیزی کے ساتھ آ رہا ہے، حتیٰ کہ اس کے آنے پر مجرم قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہم دنیا میں صرف ایک گھڑی رہے ہیں۔ (روم : ۵۵) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسے حساب لینے میں

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ ع ۱۴

اور بلاشبہ ان لوگوں نے تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے، سو اصل تدبیر تو سب اللہ ہی کی ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ ہر شخص کر رہا ہے اور عنقریب کفار جان لیں گے کہ اس گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے ﴿۴۲﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں تو کسی طرح رسول نہیں ہے۔ کہہ دے میرے درمیان اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ شخص بھی جس کے پاس کتاب کا علم ہے ﴿۴۳﴾

ذرہ برابر دیر نہیں لگتی بلکہ قیامت کے دن پل بھر میں سارا حساب سامنے آ جائے گا۔

**آیت 42** وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ ...... : یعنی ان سے پہلے کفار نے بھی اپنے رسولوں کو ستانے اور اسلام کو نیچا دکھانے کی بہت تدبیریں کیں، یہ کوئی نئی بات آپ ہی کو پیش نہیں آ رہی، پھر کوئی تدبیر اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ اختیار ہر چیز کا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ سو اگر ان کی کوئی تدبیر کامیاب ہوئی تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی کا تقاضا تھا، لہٰذا آپ پریشان نہ ہوں۔ ان کافروں کو بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس دنیا کے گھر کا اچھا انجام کس کے حق میں ہوتا ہے۔

**آیت 42** ① لَسْتَ مُرْسَلًا : "مُرْسَلًا" کی تنوین کی وجہ سے ترجمہ "کسی طرح رسول" کیا گیا ہے۔

② وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ : یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء جیسے عبد اللہ بن سلام، سلمان فارسی، تمیم داری رضی اللہ عنہم اور ان میں سے دوسرے ایمان لانے والے۔ اہل کتاب کے علماء کی طرف رجوع کا حکم اس لیے دیا کہ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں عموماً انھی کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان کے علماء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور آپ کے متعلق بشارتوں سے آپ کے سچا رسول ہونے کو خوب سمجھتے تھے، جیسے فرمایا: ﴿ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ [ البقرة : ۱٤٦ ] "وہ آپ کو پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔" مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷) اور شعراء (۱۹۷)۔

سورۃ ابراہیم — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — آیاتہا ۵۲ رکوعاتہا ۷

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ۬ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَوَيۡلٌ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِيۡدِ ۙ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓرٰ۔ ایک کتاب ہے جسے ہم نے تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے، ان کے رب کے اذن سے، اس کے راستے کی طرف جو سب پر غالب، بے حد تعریف والا ہے ① اس اللہ کے (راستے کی طرف) کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافروں کے لیے سخت عذاب کے باعث بڑی ہلاکت ہے ②

آیت 2,1 ① الٓرٰ : حروف مقطعات کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔

② كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ : "كِتٰبٌ" کو "الٓرٰ" کی خبر بنائیں تو معنی ہوگا کہ "الٓرٰ" ایک کتاب ہے، یعنی وہ حروف تہجی جن سے تمھارا کلام وجود میں آتا ہے، انھی سے یہ کتاب وجود میں آئی ہے، اگر مقابلے کی ہمت ہے تو آؤ انھی حروف سے تم صرف ایک سورت ہی بنا دو۔ ایک صورت یہ ہے کہ اسے مبتدا محذوف "هٰذَا" کی خبر بنالیں، پھر معنی ہوگا، یہ ایک کتاب ہے۔ ''نازل کیا'' کے لفظ سے اس کا بلندی سے اترنا اور اللہ تعالیٰ کا بلندی پر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کو نہ لامکان کہہ سکتے ہیں اور نہ ہر جگہ میں کہہ سکتے ہیں، بلکہ وہ بلند ہے، عرش پر ہے۔ ''ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا'' سے اس کی عظمت ظاہر ہو رہی ہے۔

③ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ : یعنی یہ کتاب آپ پر نازل کی، تاکہ آپ اس کے ذریعے سے لوگوں کو گمراہی سے نکالیں۔ معلوم ہوا کہ منکرین حدیث جو کتاب یعنی قرآن ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور رسول کو محض ڈاکیا قرار دیتے ہیں ان کی بات درست نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل فرما کر اس میں بار بار رسول کے اتباع اور اطاعت کا حکم دیا ہے، مثلاً دیکھیے آل عمران (۳۱، ۳۲)۔

④ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ : یعنی کفر کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی طرف۔ "اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ" یہ "اِلَى النُّوۡرِ" ہی سے بدل ہے اور اسی کی وضاحت ہے، یعنی وہ نور کیا ہے، اس عزیز و حمید کا راستہ ہے جس کا نام نامی اللہ ہے، وہ جو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب کا اکیلا مالک ہے۔ لفظ "الظُّلُمٰتِ" کو جمع اور "النُّوۡرِ" کو واحد لانے سے صاف ظاہر ہے کہ نور یعنی راہ ہدایت صرف ایک ہے یعنی اسلام، جبکہ تاریکیاں اور گمراہیاں بے شمار ہیں جو سب کی سب کفر کی مختلف صورتیں ہیں۔

⑤ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ : اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی مبلغ، چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، لوگوں کو اگر اسلام کی سیدھی راہ کی طرف لا سکتا ہے تو اللہ ہی کی دی ہوئی توفیق سے لا سکتا ہے۔ ابو طالب، آزر، ابن نوح اور نوح و لوط علیہما السلام کی بیویاں اس کی

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ③ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

وہ جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں بہت زیادہ محبوب رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں، یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں ہیں ③ اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ ان کے لیے کھول کر بیان کرے، پھر اللہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ④

---

واضح مثالیں ہیں کہ رب کا اذن نہ ہونے کی وجہ سے کفر کے اندھیروں سے نہیں نکل سکے۔

⑥ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ: "وَيْلٌ" پر تنوین تعظیم کی ہے، معنی ہے بڑی ہلاکت، یعنی دنیا میں بھی ان کے لیے بربادی ہی بربادی ہے۔ (دیکھیے توبہ: ۵۵۔ طٰہٰ: ۱۲۴ تا ۱۲۷) اور قیامت کے دن تو ان کی اس سے بھی بڑھ کر شامت آنے والی ہے۔ دنیا میں کفار کے لیے "وَيْلٌ" کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ خودکشی کی شرح آپ سب سے زیادہ کفار میں پائیں گے، خصوصاً جو ان میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں، مثلاً جاپان وغیرہ۔

آیت 3 ① الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ: "يَسْتَحِبُّوْنَ" سین اور تاء کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی اللہ تعالیٰ کو تو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو محبوب رکھنا ہی پسند نہیں جبکہ یہ کفار آخرت کے مقابلے میں دنیا کو بہت زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دنیا کی چیزوں سے محبت اس وقت بربادی کا باعث ہے جب وہ اللہ کی محبت کے مقابلے میں غالب ہو، ورنہ دنیا سے فائدہ مومن کے لیے بھی جائز ہے، بلکہ اللہ کی محبت کے تحت اور اس کے احکام کے تحت اپنے بیوی بچوں، دوستوں اور مال وغیرہ سے محبت فطری چیز ہے اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے اجر ملتا ہے۔ اس کے برعکس رہبانیت اس فطرت سے جنگ ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

② وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : یعنی اللہ کی راہ جو بالکل سیدھی اور بے عیب ہے، کافر اس میں عیب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے ٹیڑھی بتاتے ہیں، تاکہ لوگوں کو اس کے اختیار کرنے سے باز رکھ سکیں۔ (ابن کثیر)

آیت 4 ① لِيُبَيِّنَ لَهُمْ: تاکہ وہ ان کے لیے کھول کر بیان کرے اور وہ اچھی طرح سمجھ سکیں اور ان پر حجت قائم ہو سکے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے گئے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے، وہ پیغمبر اس قوم کا ایک فرد ہوتا تھا اور وہ انھی کی زبان بولتا تھا، آپ ﷺ کی بعثت گو عام ہے اور قیامت تک کے تمام جن و انس کے لیے ہے، لیکن آپ کی قوم، جس میں آپ ﷺ پیدا ہوئے اور جو آپ ﷺ کی اولین مخاطب تھی، عربی زبان بولتی تھی، اس لیے طبعی ترتیب کے مطابق آپ نے ان

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال اور انھیں اللہ کے دن یاد دلا، بلاشبہ اس میں ہر ایسے شخص کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو بہت صبر کرنے والا، بہت شکر کرنے والا ہے ﴿۵﴾

---

کو اللہ کا پیغام عربی زبان میں پہنچایا، مقصد یہ تھا کہ پہلے یہ قوم اس پیغام کو سمجھے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانے اور سمجھانے کا ذریعہ بنے۔ اگر قرآن تمام زبانوں میں نازل کیا جاتا تو تنازع، اختلاف اور تحریف احکام کے دروازے کھل جاتے اور دعوتِ اسلام کے لیے کسی مقام پر بھی مرکزیت قائم نہ ہو سکتی۔ عربی زبان میں نازل ہونے کے بعد دوسری اقوام کا عربی سیکھنا (جو تمام زبانوں سے آسان ہے) یا اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو جانا تمام اقوام کی ہدایت کے لیے کافی ہے، جیسا کہ الحمد للہ ہو رہا ہے۔

❷ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ ...... یعنی گو ہر پیغمبر اپنی دعوت اسی زبان میں پیش کرتا ہے جسے ساری قوم سمجھتی ہے، تاہم ہدایت و ضلالت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے۔ آج بھی بہت سی عجمی قومیں اسلام کی حامی اور مددگار نظر آتی ہیں اور عرب ممالک باوجود عربی زبان کی خدمت و اشاعت کے اسلام سے منحرف اور دور ہو رہے ہیں۔ (الا ما شاء اللہ)

**آیت 5** ❶ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ ...... : اللہ تعالیٰ نے شروع سورت میں ہمارے نبی ﷺ کی طرف نازل کردہ کتاب کا ذکر فرمایا اور اس کا مقصد بتایا کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالیں۔ اب پہلے انبیاء کی اپنی اقوام کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانے کی کوششوں اور ان کی اقوام کے سلوک کا ذکر فرمایا۔ سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کا، پھر دوسری اقوام اور ان کے رسولوں کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کچھ آیات کونیہ عطا فرمائیں، یعنی کائنات کے معمول کے خلاف معجزے، جن کے مقابلے سے دشمن عاجز تھا۔ جن میں سے چند کا تعلق فرعون اور اس کی قوم سے تھا، مثلاً عصائے موسیٰ، ید بیضاء (طٰہٰ: ۱۷ تا ۲۲)، قحط سالی، پھلوں کی کمی، طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک اور خون۔ (اعراف: ۱۳۳) یہ سب معجزے نبوت کی دلیل کے طور پر دیے گئے، کیونکہ مخاطب فرعون بے حد ضدی، سرکش، خدائی کا دعوے دار اور نہایت بے رحم تھا۔ جب کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو نبوت کی دلیل کے طور پر صرف ایک معجزہ ''قرآن'' عطا ہوا، باقی تمام معجزات برکت اور اہل ایمان کا ایمان بڑھانے کے لیے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے کئی معجزوں کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا، مثلاً سمندر کا پھٹنا، فرعون سے نجات، بادلوں کا سایہ، من و سلویٰ کا اترنا، بارہ چشمے پھوٹنا، پہاڑ اکھیڑ کر عہد لیا جانا، گائے کا گوشت لگنے سے مردے کا زندہ ہونا وغیرہ اور کچھ وحی الٰہی کی آیات تھیں جنھیں ''تنزیلی آیات'' کہتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر سب سے پہلی وحی تورات سے بہت پہلے مدین سے واپسی پر

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۟﴿۶﴾ ع ۱۴

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب اس نے تمھیں فرعون کی آل سے نجات دی، جو تمھیں برا عذاب دیتے تھے اور تمھارے بیٹے بری طرح ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی ﴿۶﴾

اتری، پھر اسی طرح کسی کتابی صورت کے بغیر سالہا سال اترتی رہی۔ فرعون اسی وحی کے احکام کی نافرمانی کی وجہ سے غرق ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلا کر تورات عطا فرمائی۔ غرض موسیٰ علیہ السلام کو تو آیات کے علاوہ بھی بہت سی آیات عطا فرمائیں، کیونکہ دشمن نہایت سخت تھا اور اپنی قوم خوئے غلامی کی وجہ سے بے حد متلون مزاج، کافرانہ عقائد و رسوم سے متاثر اور بار بار مطالبے کرنے والی تھی۔ اوپر تقریباً سترہ آیات (نشانیوں) کا ذکر ہوا ہے، مقصد سب کا یہی تھا کہ وہ فرعون کو اور اپنی قوم کو کفر کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی طرف نکالیں۔

② وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ...... : "أَيَّام" سے مراد وہ دن ہیں جن میں کوئی نادر واقعہ مصیبت یا نعمت کی صورت میں پیش آیا ہو، جیسے یوم بدر وغیرہ۔ "أَيَّام" کی اللہ کی طرف اضافت سے ان کی اہمیت بے حد بڑھ گئی۔ اگلی آیت میں چند "أَيَّام" کا ذکر ہے، مگر ان واقعات سے عبرت صرف انھی کو ہوتی ہے جو بہت صابر اور بہت شاکر ہوں، کیونکہ ہر نیکی کی بنیاد صبر ہے اور شکر بھی اسی کو نصیب ہوتا ہے جو صابر ہو، شکوہ شکایت اور بے صبری کرنے والوں کو شکر کی توفیق کہاں؟

آیت 6 ① وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا...... : یہاں موسیٰ علیہ السلام چند نعمتیں گنوا رہے ہیں۔ "يَسُوْمُوْنَكُمْ" کے بعد "وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ" میں واؤ عطف سے معلوم ہوا کہ وہ لڑکوں کو ذبح کرنے اور عورتوں کو زندہ رکھنے کے علاوہ اور بھی کئی بدترین عذاب دیتے تھے، مثلاً بیگار لینا، ذلیل کرنا اور مار پیٹ وغیرہ۔

② وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ : "بَلَآءٌ" کا لفظ مصیبت پر بھی آتا ہے اور نعمت پر بھی، فرمایا: ﴿ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ [ الأنبياء : ۳۵ ] "اور ہم تمھیں برائی اور بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں، آزمانے کے لیے۔" آل فرعون کے عذاب بلائے مصیبت تھے اور ان سے نجات بلائے نعمت تھی، عذاب بھی آزمائش اور اس سے رہائی کا انعام بھی آزمائش۔ "ذٰلِكُمْ" سے اشارہ "سُوْٓءَ الْعَذَابِ" کی طرف ہو تو مصیبت کے ساتھ آزمائش مراد ہے اور "اِذْ اَنْجٰىكُمْ" یعنی نجات کی طرف ہو تو نعمت کے ساتھ آزمائش مراد ہو گی اور قرآن کا اعجاز ہے کہ آیت کے ایک لفظ میں دونوں چیزیں آ گئی ہیں۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿۷﴾ وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۸﴾

اور جب تمھارے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمھیں زیادہ دوں گا اور بے شک اگر تم ناشکری کرو گے تو بلاشبہ میرا عذاب یقیناً بہت سخت ہے ﴿۷﴾ اور موسیٰ نے کہا اگر تم اور وہ لوگ جو زمین میں ہیں، سب کے سب کفر کرو تو بے شک اللہ یقیناً بڑا بے پروا، بے حد تعریف والا ہے ﴿۸﴾

آیت 7 ① وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ : "آذَنَ يُؤْذِنُ" کا معنی اطلاع دینا، اعلان کرنا ہے۔ باب تفعل میں جانے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا ہے "صاف اعلان کر دیا۔"

② لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ : کیونکہ کسی کے بھی احسان کی قدر دانی اور اس کا شکریہ ادا کرنے سے اس کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کا تو کہنا ہی کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « وَلَا شَخْصَ أَحَبُّ إِلَيْهِ الْمِدْحَةُ مِنَ اللّٰهِ، مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ وَعَدَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ » [ مسلم، اللعان : ۱۴۹۹ ] "کوئی شخص ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنی تعریف پسند ہو، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔" جب اللہ تعالیٰ کو زبانی شکر اتنا پسند ہے تو عملاً شکر اور اطاعت پر اس کی نوازش کس قدر ہو گی۔

③ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ : اس کا جواب تو یہ تھا "لَأُعَذِّبَنَّكُمْ" کہ اگر تم کفر کرو گے تو میں تمھیں ضرور عذاب دوں گا، مگر اسے حذف کر کے ایسا جملہ استعمال فرمایا جو اس جملے کا مفہوم بھی ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کی نہایت شدت کو بھی، یعنی فرمایا: ﴿ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴾ اور یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے۔

آیت 8 وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا ...... : یعنی اگر تم اور زمین و آسمان کے تمام لوگ ناشکری کرو تو اس ناشکری کا نقصان خود تمھی کو پہنچے گا، اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑے گا، اسے نہ تمھارے شکر کی ضرورت ہے اور نہ تمھاری ناشکری کی پروا۔ اس کی ذات ہر تعریف کی حامل ہے، چاہے کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حدیث قدسی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَا عِبَادِيْ ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَ آخِرَكُمْ، وَ إِنْسَكُمْ وَ جِنَّكُمْ، كَانُوْا عَلٰی أَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا، يَا عِبَادِيْ ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَ آخِرَكُمْ، وَ إِنْسَكُمْ وَ جِنَّكُمْ، كَانُوْا عَلٰی أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَ آخِرَكُمْ، وَ إِنْسَكُمْ وَ جِنَّكُمْ، قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُوْنِيْ، فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ » [ مسلم، البر والصلة، باب تحریم الظلم : ۲۵۷۷ ] "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے، تمھارے پچھلے اور تمھارے انسان اور تمھارے جن تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والے آدمی کے دل والے ہو جائیں تو یہ چیز میری سلطنت میں کسی شے کا اضافہ نہیں کرے گی اور اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور تمھارے پچھلے، تمھارے انسان اور تمھارے جن تم میں سب سے زیادہ فاجر شخص کے دل والے ہو جائیں تو یہ چیز میری

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۛ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۹ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ

کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، نوح کی قوم کی (خبر) اور عاد اور ثمود کی اور ان کی جو ان کے بعد تھے، جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ان کے رسول ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں لوٹا لیے اور انھوں نے کہا بے شک ہم اسے نہیں مانتے جو تم دے کر بھیجے گئے ہو اور بے شک ہم تو اس چیز کے بارے میں جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو، ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہیں ⑨ ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟

سلطنت میں کسی شے کی کمی نہیں کرے گی اور اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے، تمھارے پچھلے اور تمھارے انسان اور تمھارے جن ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں، پھر مجھ سے مانگیں اور میں ہر شخص کو جو اس نے مانگا ہے دے دوں تو یہ چیز اس میں سے جو میرے پاس ہے کچھ کمی نہیں کرے گی، مگر جتنا سوئی جب وہ سمندر میں داخل کی جائے۔‘‘

**آیت 9** ① لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ : یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان کی تعداد اور تمام حالات سے واقف ہے اور ان کے نسب کو بھی صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

② فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ : یعنی غصے کے مارے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے، جیسا کہ دوسری آیت میں منافقین کے متعلق فرمایا: ﴿وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ [ آل عمران : ۱۱۹ ] ’’اور (یہ منافقین) جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے انگلیوں کی پوریں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔‘‘ یا ہنسی اور تعجب کے مارے منہ پر ہاتھ رکھ لیے، یا ہاتھ منہ کی طرف لے جا کر اشارہ کیا کہ بس چپ رہو۔ پہلے معنی کو اکثر مفسرین نے ترجیح دی ہے، ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ہاتھ رسولوں کے منہ پر رکھ دیے کہ وہ خاموش رہیں۔

③ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ ...... : ’’بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ‘‘ کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کی نشانیاں دیکھ کر وہ یہ ضرور جان چکے تھے کہ ان رسولوں کو یہ معجزے دے کر بھیجا گیا ہے، یہ رسول خود یہ معجزے نہیں لے آئے۔ اس لیے اگرچہ انھوں نے توحید کی دعوت ماننے سے انکار کر دیا، مگر اپنے کفر پر بھی ان کا یقین متزلزل ہو گیا اور انھوں نے کہا کہ ہم تمھاری دعوت کے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہیں۔

**آیت 10** ① قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ ...... : رسولوں نے یہاں کوئی منطقی و فلسفی بحث نہیں چھیڑی، بلکہ ان کی فطرت کو جھنجوڑا کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز حتیٰ کہ سوئی یا کوئی کھلونا بھی بنانے والے کے بغیر نہیں بنتا۔ رازی نے اس کی ایک مثال دی کہ دو بچوں میں سے ایک بچہ دوسرے کو پیچھے سے سر پر ایک چپت لگا کر چھپ جائے تو وہ کبھی یہ نہیں مانے گا

شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۰

تمھیں اس لیے بلاتا ہے کہ تمھارے لیے تمھارے کچھ گناہ بخش دے اور تمھیں ایک مقرر مدت تک مہلت دے۔ انھوں نے کہا تم نہیں ہو مگر ہمارے جیسے بشر، تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روک دو جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے، تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لاؤ۔ ۝۱۰

---

کہ یہ چپت خود بخود لگ گئی ہے، بلکہ اسے یقین ہوگا کہ یہ کسی نے ماری ہے۔ تو کسی بھی کام کے خود بخود ہو جانے کو تو ایک بچے کی فطرت بھی تسلیم نہیں کرتی، تو عاقل و بالغ ہو کر تمھیں اس اللہ کے متعلق شک ہے جس نے اتنے عظیم آسمان و زمین بنائے، جن کے مقابلے میں تمھارا بنانا کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ اللہ ہے بھی یا نہیں؟ اور ایک ہے یا کئی ہیں؟ "شَكٌّ" کی تنوین تنکیر کے لیے ہے، یعنی کیا اللہ کے بارے میں کوئی بھی شک ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی اس کے متعلق کسی قسم کے شک کی تو گنجائش ہی نہیں۔

❷ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ : "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی تاکہ تمھارے بعض یا کچھ گناہ بخش دے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام لانے سے پہلے کے گناہ اسلام لانے سے معاف ہو جائیں گے، آئندہ کے گناہ تمھارے عمل اور توبہ کے مطابق دیکھے جائیں گے۔ کفار کے گناہوں کی معافی کا ذکر ہر جگہ "مِنْ" (بعض) کے ساتھ آیا ہے، جیسا کہ یہاں اور سورۂ نوح اور احقاف میں ہے، البتہ اہل ایمان کی مغفرت کا ذکر "مِنْ" کے بغیر ہے، جیسا کہ سورۂ صف میں جہاد کا اجر بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ [ الصف : ۱۲ ] "وہ تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا۔"

❸ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى : یعنی دنیا میں موت کے وقت تک تمھیں عذاب سے محفوظ رکھے۔ (قرطبی)

❹ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا : یعنی تم ظاہری شکل و صورت میں، کھانے پینے میں اور دوسری انسانی ضروریات کے اعتبار سے ہمارے جیسے بشر ہو، ہم اپنے آپ پر تمھاری برتری کیسے تسلیم کر لیں۔ مقصد تمھارا ہمیں ہمارے آبا و اجداد کے معبودوں کی عبادت سے روکنا ہے۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ یہی کفار جو دین اور آخرت کے معاملے میں اپنے آباء کی تقلید کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید سے انکار پر اصرار کر رہے ہیں، اتنا سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ دنیا کے کاموں میں بھی وہ آباء کی تقلید کرتے تو دنیا کے ہر دور میں انھوں نے جو ترقی کی، حتیٰ کہ اب ایٹم بم تک پہنچ گئے، یہ ترقی کبھی نہ ہو سکتی، مگر ان کی ڈھٹائی دیکھو کہ انبیاء کے واضح معجزات دیکھ کر اور "اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" جیسی لاجواب دلیلیں سن کر بھی، جنھوں نے انھیں اندر سے ہلا دیا اور وہ اپنے بے چین رکھنے والے شک کا خود اقرار کر رہے ہیں، تقلید پر اڑے ہوئے ہیں اور مزید واضح دلیل کا مطالبہ کر رہے ہیں، مگر دنیوی معاملات میں وہ آباء کی تقلید پر اکتفا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

قَالَتۡ لَهُمۡ رُسُلُهُمۡ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدۡ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيۡتُمُوۡنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِرُسُلِهِمۡ لَنُخۡرِجَنَّكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوۡحٰۤى اِلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ لَنُهۡلِكَنَّ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾

ان کے رسولوں نے ان سے کہا ہم نہیں ہیں مگر تمھارے جیسے بشر اور لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اور ہمارے لیے کبھی ممکن نہیں کہ تمھارے پاس کوئی دلیل اللہ کے اذن کے سوا لے آئیں اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ﴿۱۱﴾ اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں، حالانکہ اس نے ہمیں ہمارے راستے دکھا دیے ہیں اور ہم ہر صورت اس پر صبر کریں گے جو تم ہمیں تکلیف پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں ﴿۱۲﴾ اور ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا، اپنے رسولوں سے کہا ہم ہر صورت تمھیں اپنی زمین سے نکال دیں گے، یا لازماً تم ہماری ملت میں واپس آؤ گے، تو ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ یقیناً ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے ﴿۱۳﴾

**آیت 11** ❶ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ...... : معلوم ہوا دلیل دیکھنے سے ایمان نہیں آتا، اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے آتا ہے۔ (موضح)

❷ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبوت سراسر وہبی، یعنی اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ اس کے لائق افراد کا انتخاب وہ خود کرتا ہے، فرمایا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِيۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ﴾ [آل عمران : ۱۷۹] ''اور لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔'' نبوت کسی کو محنت اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتی، جیسا کہ بعض گمراہ لوگوں کا خیال ہے، جن میں قادیانی دجال بھی شامل ہے۔

❸ وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ ...... : یعنی معجزات ہمارے اختیار میں نہیں، وہ اللہ کے حکم کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے، اس لیے ہمارا بھروسا اللہ ہی پر ہے اور تمام اہل ایمان کو اسی پر بھروسا لازم ہے۔

**آیت 12** وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں ہدایت دے دی تو اس کے بعد ہمارے پاس کیا عذر ہے کہ ہم اس کے بھروسے پر استقامت اختیار نہ کریں۔ رہا تمھارا ہمیں ایذا دینا تو ہم ہر حال میں اس پر صبر کریں گے اور اپنے رب پر بھروسا رکھیں گے، کیونکہ بھروسا رکھنے والوں کو اسی پر بھروسا رکھنا لازم ہے۔

**آیت 13** ❶ وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِرُسُلِهِمۡ لَنُخۡرِجَنَّكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ : کفار نے اپنی کثرت اور اہل ایمان کی قلت

وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾

اور یقیناً ان کے بعد ہم تمھیں اس زمین میں ضرور آباد کریں گے، یہ اس کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور میری وعید سے ڈرا ﴿۱۴﴾ اور انھوں نے فیصلہ مانگا اور ہر سرکش، سخت عناد رکھنے والا نامراد ہوا ﴿۱۵﴾

دیکھ کر اپنے رسولوں کو یہ دھمکی دی کہ تمھارے سامنے صرف دو راستے ہیں یا تو ہم تمھیں اپنی زمین سے نکال دیں گے، یا پھر تم اسلام چھوڑ کر واپس آ جاؤ گے، جیسا کہ اس وقت ہند کے کافر مسلمانوں کو قتل یا ارتداد یا نکل جانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

② اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا : ''یا تم ہماری ملت میں واپس آؤ گے'' کفار کا یہ کہنا ان کے اپنے گمان کے مطابق تھا، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے اپنی گمراہ قوم کے دین کی پیروی کرتے تھے، بلکہ بات یہ تھی کہ نبوت سے پہلے انبیاء علیہم السلام ان کے بتوں کے معاملہ میں خاموش رہتے تھے، جس پر انھوں نے بطور خود یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ان کے مذہب پر ہیں، یا اس "لَتَعُوْدُنَّ" کا معنی "لَتَصِيْرُنَّ" ہے، یعنی تم ہماری ملت میں آ جاؤ گے۔ (دیکھیے اعراف : ۸۸) یا خطاب ان لوگوں سے ہے جو کفر کو چھوڑ کر پیغمبروں پر ایمان لے آئے تھے۔ (رازی)

آیت 14 وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے انھیں حوصلہ دیا کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کریں گے اور اس سرزمین پر تمھیں آباد کریں گے۔ انبیاء کے پیروکاروں کا آخر کار کفار کے علاقوں پر قابض ہونا بھی درحقیقت انبیاء ہی کا غلبہ ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ایک مدت بعد شام اور مصر وغیرہ پر قابض ہوئے، فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [ الشعراء : ۵۹ ] ''ایسے ہی ہوا اور ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔'' اور مسلمان اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں جزیرۂ عرب پر قابض ہو گئے تھے، جیسا کہ یہود کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴾ [ الأحزاب : ۲۷ ] ''اور (اے مسلمانو!) تمھیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث بنا دیا اور اس زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا تھا اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔'' مگر زمین کے مشارق و مغارب کی فتوحات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوئیں اور یہ بھی درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی فتوحات تھیں، کیونکہ ان کے دین اور ان کے پیروکاروں کی فتوحات تھیں۔ "وَعِيْدِ" اصل میں "وَعِيْدِيْ" تھا، 'میری وعید' آیات کے آخری حصوں کی موافقت کے لیے یاء حذف کر کے کسرہ باقی رکھا گیا۔

آیت 15 وَ اسْتَفْتَحُوْا...... : فتح کا معنی قرآن مجید میں ''فتح و نصرت'' بھی آیا ہے اور ''فیصلہ'' بھی۔ "اسْتَفْتَحُوْا" کا معنی انھوں نے فتح و نصرت مانگی، یا انھوں نے فیصلہ مانگا اور اس کا فاعل پیغمبر بھی ہو سکتے ہیں اور کفار بھی۔ اگر معنی فتح و نصرت ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ پیغمبروں نے بے شمار آزمائشیں آنے پر اپنے رب سے فتح و نصرت کی دعا کی جو قبول ہوئی، فرمایا: ﴿ حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [ البقرة : ۲۱۴ ] ''یہاں تک کہ رسول اور

مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ

اس کے پیچھے جہنم ہے اور اسے اس پانی سے پلایا جائے گا جو پیپ ہے ⑯ وہ اسے بمشکل گھونٹ گھونٹ پیے گا اور قریب

جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے کہہ اٹھے، اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو بے شک! اللہ کی مدد قریب ہے۔'' اگر ''اسْتَفْتَحُوْا'' کا فاعل کفار ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ ''کافروں نے اپنے داتاؤں اور دستگیروں سے فتح و نصرت کی دعا مانگی مگر وہ ناکام ہوئے۔'' اگر فتح کا معنی فیصلہ ہو تو مطلب ہوگا کہ پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، فرمایا: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ﴾ [ الأعراف : ۸۹ ] ''اے ہمارے رب! تو ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سرکش و سخت عناد رکھنے والا ناکام و نامراد ہوا۔ یا مطلب یہ ہے کہ کفار نے اللہ تعالیٰ سے فیصلے کی دعا کی، فرمایا: ﴿وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [ الأنفال : ۳۲ ] ''اور جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔'' ''اسْتَفْتَحُوْا'' کے ان چاروں معنوں میں سے جو معنی بھی کریں وہ درست ہے اور قرآن مجید کے مختلف مقامات پر چاروں معانی موجود ہیں۔ قرآن کا اعجاز دیکھیے کہ ایک ہی لفظ ایسا بولا جو چاروں پر صادق آتا ہے۔ غرض دنیا میں نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سرکش اور سخت عناد رکھنے والا کافر ناکام اور نامراد ہوا۔ رہا آخرت کا انجام تو وہ آئندہ آیت میں مذکور ہے۔

**آیت 16** مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ : ''وَرَآءَ'' کے متعدد معانی آئے ہیں: ① پیچھے یا بعد، جیسے فرمایا: ﴿وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ [ هود : ۷۱ ] ''اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔'' ② غیر یعنی سوا، جیسے فرمایا: ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ [ المؤمنون : ۷ ] ''پھر جو اس کے سوا تلاش کرے تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔'' ③ آگے، جیسا کہ سورۂ کہف (۷۹) میں ''وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ'' کا معنی ''ان کے آگے ایک بادشاہ تھا'' کیا گیا ہے۔ یہاں مراد بعد بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کی ناکامی کے بعد اس کے لیے جہنم ہے اور آگے بھی کہ آئندہ جہنم اس کے انتظار میں ہے۔ ''صَدِيْدٍ'' وہ رقیق پانی جو زخم سے نکلتا ہے، مراد اہل جہنم کے جلنے سے ان کے جسموں سے نکلنے والی پیپ، خون اور رطوبت ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ ص (۵۷، ۵۸)، محمد (۱۵) اور کہف (۲۹) ''مَّآءٍ صَدِيْدٍ'' مبدل منہ اور بدل ہے، یعنی ایسا پانی جو ''صدید'' ہوگا۔

**آیت 16** ① يَّتَجَرَّعُهٗ : یہ باب تفعل سے ہے، جس میں تکلف کا معنی ہوتا ہے، یعنی مشکل سے ایک ایک گھونٹ کر کے اسے پیے گا اور وہ اتنا کڑوا، بدذائقہ، بدبودار اور گرم ہوگا کہ قریب نہیں کہ گلے سے اتار سکے، مگر پیاس کا عذاب اسے پینے پر مجبور کرے گا اور اندر جا کر وہ ان کی انتڑیاں کاٹ دے گا۔ دیکھیے سورۂ محمد (۱۵)۔

② وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ ...... : اور ہر جگہ سے اسے موت آتی دکھائی دے گی، کیونکہ جہنم کی ایک ایک چیز موت کے لیے کافی ہے، مگر وہ کسی صورت مرنے والا نہیں، کیونکہ وہاں موت ہوگی ہی نہیں۔ ''بِمَيِّتٍ'' کی باء سے نفی کی تاکید ہوئی، اس

مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

نہ ہوگا کہ اسے حلق سے اتارے اور اس کے پاس موت ہر جگہ سے آئے گی، حالانکہ وہ کسی صورت مرنے والا نہیں اور اس کے پیچھے ایک بہت سخت عذاب ہے ﴿۱۷﴾ ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جس پر آندھی والے دن میں ہوا بہت سخت چلی۔ وہ اس میں سے کسی چیز پر قدرت نہ پائیں گے جو انھوں نے کمایا، یہی بہت دور کی گمراہی ہے ﴿۱۸﴾

لیے ترجمہ میں ''کسی صورت'' کا اضافہ ہو گیا۔ دیکھیے سورۂ فاطر (۳۶) اور سورۂ اعلیٰ (۱۳)۔

③ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ : یعنی اس کے بعد اور سخت عذاب ہے۔ اب اس کی مختلف صورتیں تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، جن میں سے بہت سی چیزیں قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، البتہ عذاب کے طور پر مسلط ہونے والی بھوک اور زقوم کے کھانے کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴾ [ الدخان : ۴۳ تا ۴۹ ] ''بے شک زقوم کا درخت۔ گناہ گار کا کھانا ہے۔ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح، پیٹوں میں کھولتا ہے۔ گرم پانی کے کھولنے کی طرح۔ اسے پکڑو، پھر اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک دھکیل کر لے جاؤ۔ پھر کھولتے پانی کا کچھ عذاب اس کے سر پر انڈیلو۔ چکھ، بے شک تو ہی وہ شخص ہے جو بڑا زبردست، بہت باعزت ہے۔''

جہنم کے سخت عذاب کا اندازہ دنیا میں کسی طرح نہیں ہو سکتا جس کی آگ ہی یہاں کی آگ سے ستر (۷۰) گنا گرم ہے، البتہ جہنم کے سب سے کم عذاب کا بیان جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، اس سے سخت عذاب کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر لیں، حقیقی علم تو ممکن ہی نہیں، نہ وہ بیان میں آ سکتا ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ أَهْوَنَ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مَنْ لَهُ نَعْلَانِ وَ شِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ، يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهُ، كَمَا يَغْلِي الْمِرْجَلُ مَا يَرَى أَنَّ أَحَدًا أَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا، وَ إِنَّهُ لَأَهْوَنُهُمْ عَذَابًا )) [ مسلم، الإیمان، باب أهون أهل النار عذابا : ۳۶۴/ ۲۱۳ ] ''اہل نار میں سب سے ہلکے عذاب والا وہ ہوگا جس کے لیے آگ کے دو جوتے اور دو تسمے ہوں گے، ان دونوں سے اس کا دماغ اس طرح ابل رہا ہوگا جیسے ہانڈی ابلتی ہے، وہ نہیں خیال کرے گا کہ اس سے زیادہ بھی کسی کو عذاب ہو رہا ہے، حالانکہ وہ ان سب سے کم عذاب والا ہوگا۔'' [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ جَمِيْعِ عَذَابِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ]

آیت 18 مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ...... : کفار دنیا میں جو بھی اچھے کام کرتے ہیں، مثلاً کمزوروں کی مدد اور صدقہ وغیرہ، وہ آخرت میں ان کے کسی کام نہیں آئیں گے، کیونکہ ان کا بدلا انھیں دنیا ہی میں دیا جا چکا ہوگا۔ (دیکھیے الاحقاف : ۲۰)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۙ﴿۱۹﴾ وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ﴿۲۰﴾ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ﴿۲۱﴾ ع ۳ ۱۵

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے ﴿۱۹﴾ اور یہ اللہ پر ہرگز کچھ مشکل نہیں ﴿۲۰﴾ اور وہ سب کے سب اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، تو کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو بڑے بنے تھے کہ بے شک ہم تمھارے تابع تھے، تو کیا تم ہمیں اللہ کے عذاب سے بچانے میں کچھ بھی کام آنے والے ہو؟ وہ کہیں گے اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمھیں ضرور ہدایت کرتے، ہم پر برابر ہے کہ ہم گھبرائیں، یا ہم صبر کریں، ہمارے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ﴿۲۱﴾

”عَاصِفٍ“ ”عَصَفَ یَعْصِفُ“ سے ہے، بمعنی توڑنا۔ ”كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ“ کا معنی ہے ریزہ شدہ بھس، یعنی تیز و تند ہوا جو ہر چیز کو توڑتی جائے۔ اس آیت میں قیامت کے دن کفار کے اعمال کے بے کار ہونے کی مثال دی ہے کہ ایک تند و تیز ہوا والے دن میں کسی راکھ پر بہت سخت ہوا چلے تو اس ہوا میں راکھ کا ایک ذرہ بھی ہاتھ میں آنا مشکل ہے، اسی طرح کفار کے اعمال صالحہ اس دن بے کار ہوں گے، کیونکہ ان کا کوئی عمل اس دن کے لیے تھا ہی نہیں، نہ اس دن پر ان کا ایمان تھا۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان (۲۳)، کہف (۱۰۳ تا ۱۰۶) اور آل عمران (۱۱۷)۔

**آیت 20،19** ① اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ ...... : ”اَلَمْ تَرَ“ کا معنی ”اَلَمْ تَعْلَمْ“ ہے، یعنی کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، یعنی اس صحیح اندازے کے مطابق جس کے مطابق اسے ہونا چاہیے تھا اور جو اپنے خالق کی کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کسی چیز میں کوئی نہ نقص نکال سکتا ہے نہ کوئی ایسی صورت پیش کر سکتا ہے جو اس سے بہتر ہو۔ ہاں وہ خود اس سے بھی بہتر بنانے پر پوری طرح قادر ہے۔

② وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ : اس کے لیے کوئی چیز مشکل نہیں ہے، وہ چاہے تو ایسے کروڑوں عالم دم بھر میں مٹا کر نئے پیدا کر دے۔ ”وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ“ کا ایک معنی بعض اہل علم نے یہ بھی کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تم سب کو دفعتاً ختم کر کے تمھیں دوبارہ نئے سرے سے پیدا کر دے۔ آگے آنے والی آیات جو حشر اور قیامت کے واقعات پر مشتمل ہیں اس معنی کی تائید کرتی ہیں۔

**آیت 21** وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا ...... : ”تَبَعًا“ یہ ”تَابِعٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”خَادِمٌ“ کی جمع ”خَدَمٌ“ ہے، یعنی اس دن دنیا میں چھپاؤ کی تمام جگہیں ختم ہو جائیں گی۔ پہاڑوں کی بلندیاں، سمندروں کی گہرائیاں اور سطح زمین کی کرویت ختم ہو کر

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا

اور شیطان کہے گا، جب سارے کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا، سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے تم سے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمھیں بلایا

روئی کی طرح صاف زمین پر ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگی۔ دنیا میں کمزور اور طاقت ور مرید و مرشد، رعایا اور سردار ایک جیسی عاجزی اور بے بسی کے ساتھ اللہ کے سامنے ہوں گے، تو کمزور لوگ اپنے گمراہ کرنے والے بڑوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمھارے پیچھے چلنے والے تھے اور اس وجہ سے ہم نے انبیاء کو جھٹلایا اور اللہ سے کفر کیا، اب کیا تم اللہ کے عذاب سے بچانے میں ہمارے کسی کام آ سکتے ہو؟ "مِنْ شَيْءٍ" کا مطلب یہ ہے کہ سارا عذاب نہیں تو اس میں سے جتنا ہو سکے کم کروا دو۔ وہ سارا گناہ اللہ کے ذمے ڈال کر خود بری ہو کر ان کی کسی بھی قسم کی مدد سے معذرت کریں گے۔ چنانچہ کہیں گے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمھیں ہدایت دیتے، گویا سارا قصور اللہ تعالیٰ کا ہے جس نے ہمیں ہدایت نہیں دی۔ [ اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ ] جیسا کہ شیطان نے سجدے سے انکار کر کے اپنے گمراہ ہونے کو اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا، فرمایا: ﴿ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ ﴾ [ الأعراف : ۱۶ ] "کہا، چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا" حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ہدایت دی تھی، دونوں راستے دکھا دیے تھے، فرمایا: ﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴾ [ الدھر : ۳ ] "بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا" اب تمھارا اختیار تھا، نہ اس نے تمھیں بدی پر مجبور کیا نہ نیکی پر اور یہی آزمائش کی حکمت جن و انس کی پیدائش کا باعث تھی۔ خیر اب ایسے عذاب میں پھنس جانے کے بعد جس سے بھاگ نکلنے کی کوئی صورت نہیں، ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، گھبراہٹ کا اظہار کریں یا صبر کریں۔ دونوں کا کچھ فائدہ ہے نہ یہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ظاہر یہ ہے کہ ان کی یہ باہمی قیل و قال جہنم میں داخلے کے بعد ہوگی۔ دیکھیے سورۂ مومن (۴۷)، سورۂ اعراف (۳۸) اور سورۂ سبا (۳۲، ۳۳) بہر حال ان کا یہ جھگڑا میدان حشر اور جہنم دونوں میں بھی ہو سکتا ہے۔

**آیت 22** ❶ **بِمُصْرِخِكُمْ**: "صُرَاخٌ" کا معنی چیخنا چلانا ہے جو مصیبت سے بچانے کے لیے بطور فریاد ہوتا ہے۔ "اَصْرَخَ يُصْرِخُ" باب افعال میں ہمزہ ازالۂ ماخذ کے لیے ہے، یعنی اس مصیبت کو جو چیخنے کا باعث ہے دور کرنا، جیسے "شَكَانِيْ فَأَشْكَيْتُهٗ" کہ اس نے مجھ سے شکایت کی تو میں نے اس کی شکایت دور کر دی۔ اسی لیے عام طور پر "صُرَاخٌ" کا معنی فریاد اور "اِصْرَاخٌ" کا معنی فریاد رسی کر لیا جاتا ہے۔ "**بِمُصْرِخِيَّ**" اصل میں "بِمُصْرِخِيْنَ" جمع مذکر سالم تھا، یائے متکلم کی طرف مضاف ہوا تو نون اعرابی گر گیا اور یاء کے یاء میں ادغام کے ساتھ "**بِمُصْرِخِيَّ**" ہو گیا۔

❷ **وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ ......** : فیصلے کے بعد جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے اور جہنمی جہنم میں اور ہر

أَنْفُسَكُمْ ۚ مَآ أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۖ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَآ أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ ۗ إِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

تو تم نے فوراً میرا کہنا مان لیا، اب مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو، نہ میں تمھاری فریاد کو پہنچنے والا ہوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچنے والے ہو، بے شک میں اس کا انکار کرتا ہوں جو تم نے مجھے اس سے پہلے شریک بنایا۔ یقیناً جو لوگ ظالم ہیں انھی کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۲۲﴾

طرف سے شیطان پر ملامت کی بوچھاڑ ہوگی تو شیطان اس کے جواب میں کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ حق تھا، کیونکہ وہ ان تمام چیزوں کا مالک تھا جن کا وعدہ کیا تھا، مثلاً مرنے کے بعد زندہ کرنا، جنت، جہنم اور دعا کی قبولیت وغیرہ، اس لیے اس نے وہ وعدہ پورا کیا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا وہ جھوٹا تھا کہ اس طرح کرو گے تو یہ ہو جائے گا، داتا کو پکارو گے تو یہ ہوگا، دستگیر کو پکارو گے تو یہ ہوگا، کیونکہ ان میں سے کوئی کسی چیز کا مالک ہی نہ تھا اور جو آرزوئیں میں نے تمھارے دل میں ابھاری تھیں کہ فلاں کی نیاز دینے سے معشوق قدموں میں آ گرتا ہے، فلاں کے نام کا بکرا دینے سے دشمن کا ستیاناس ہو جاتا ہے، ان کا وجود ہی نہ تھا۔ فرمایا: ﴿يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُوْرًا﴾ [ النساء : ۱۲۰ ] ’’وہ انھیں وعدے دیتا ہے اور انھیں آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انھیں دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتا۔‘‘ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ہمیں تعلیم یہ ہے کہ تم جب بھی وعدہ کرو تو اس چیز کا کرو جو تم کر سکتے ہو، پھر بھی ساتھ ان شاء اللہ ضرور کہو، کیونکہ تمھارا اختیار اللہ تعالیٰ کے تابع ہے، فرمایا: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ إِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [ الكهف : ۲۳، ۲۴ ] ’’اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں کل یہ کام ضرور کرنے والا ہوں، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔‘‘

③ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ...... : ’’ سُلْطَةٌ ‘‘ اور ’’سُلْطٰنٌ‘‘ کا مطلب زبردستی کسی پر غلبہ حاصل کر لینا، مسلط ہو جانا ہے۔ یہ تسلط دو طرح کا ہوتا ہے، ایک حکومت کے ذریعے سے ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ شیطان کی ان پر کوئی حکومت نہ تھی کہ وہ ان پر کوئی فوج چڑھا لایا تھا اور ایک سلطان اور غلبہ صحیح دلیل کا ہوتا ہے، کیونکہ وہ دلیل دل پر قابو پا لیتی ہے اور آدمی اس کے مطابق عمل پر مجبور ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ شیطان کے پاس ڈنڈا بھی نہ تھا اور کوئی معقول دلیل بھی نہ تھی، چنانچہ وہ کہے گا میں نے تو بس اتنا کیا تھا کہ تمھیں کچھ کاموں کی دعوت دی، وہ تمھاری کمزوریوں، مثلاً حرص، شہوت، غصے، بزدلی وغیرہ کے عین مطابق تھی اور اس میں تمھاری خواہشات کو ابھارا گیا تھا، تم نے فوراً اسے قبول کر لیا (أَجَبْتُمْ اور اِسْتَجَبْتُمْ کے فرق کو ملحوظ رکھیں) اس لیے مجھے ملامت مت کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو، کیونکہ اپنی مرضی سے گناہ تم نے کیا، میں نے تم پر کوئی زبردستی نہیں کی۔ اب نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو نہ میں تمھاری۔ سورۂ نحل کی آیت (۱۰۰) میں شیطان کے سلطان کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

④ إِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ أَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ : اس سے پہلے تم نے جو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا تھا میں اس کا انکار کرتا ہوں، کیونکہ عبادت تو صرف اللہ کا حق تھا، اسی طرح حکم ماننا تم پر صرف اللہ کا حق تھا اور وہ بھی اس کی عبادت میں شامل تھا، تم

وَ اُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ان کی آپس کی دعا اس میں سلام ہو گی ﴿۲۳﴾

نے اس کے بجائے میرا حکم مانا، میری عبادت کی، مجھے اس کا شریک بنایا، اب میں اس سے صاف لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔ تم نے میری نہیں بلکہ اپنی خواہش کی پیروی کی اور تم اللہ کے بجائے مجھے نہیں بلکہ اپنے وہم و گمان کے بنائے ہوئے دستگیروں اور داتاؤں کو پکارتے رہے ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ﴾ [ النجم : ۲۳ ] ”یہ لوگ (مشرکین) صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں۔“

⑤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : یہ بطور اعتراف شیطان کی بات کا آخری حصہ بھی ہو سکتا ہے جس سے پہلے وہ چھ باتیں کہہ کر ان سے بری ہو چکا ہے: ① میرا وعدہ جھوٹا تھا۔ ② میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا۔ ③ تم نے دلیل سے خالی دعوت قبول کی۔ ④ مجھے ملامت کے بجائے اپنے آپ کو ملامت کرو۔ ⑤ میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ⑥ تم نے مجھے جو شریک بنایا میں اسے نہیں مانتا۔ ⑦ یہ آخری بات ہے کہ ظالموں (مشرکوں) کے لیے عذاب الیم ہے۔ (خلاصہ از شوکانی) اور یہ جملہ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہو سکتا ہے جو اظہار حقیقت ہے۔

**آیت 23** ① وَ اُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... : اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق یہاں بھی مشرکین اور شیطان کے ذکر کے بعد ایمان اور عمل صالح والوں کا انجام ذکر فرمایا کہ وہ جنتوں میں داخل کر دیے گئے۔ مراد یہ ہے کہ کیے جائیں گے، مگر بات اتنی یقینی ہے کہ اسے ماضی کے لفظ سے بیان کیا کہ سمجھو یہ کام ہو چکا۔ اس سے پہلے شیطان اور مشرکین، کمزور اور سرداروں کی گفتگو میں بھی ماضی کا صیغہ یہی حکمت رکھتا ہے۔

② وَ اُدْخِلَ : ”داخل کیے جائیں گے“ داخل کون کرے گا؟ اس کی تین جہتیں ہیں، اصل تو اللہ تعالیٰ ہے جو جنت میں بھیجنے کا حکم دے گا، پھر فرشتے ہیں جو اس کے حکم سے انھیں جنت میں لے جائیں گے، تیسرے ان کا ایمان اور عمل صالح ہیں جو اللہ کی رحمت اور ان کے جنت میں جانے کا ذریعہ بنیں گے، اس لیے مجہول کا صیغہ استعمال کیا۔ ”بِاِذْنِ رَبِّهِمْ“ یعنی یہ سب کچھ ان کے رب کی توفیق اور مہربانی سے ہو گا۔

③ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ : یعنی آپس میں ملتے وقت وہ ”السلام علیکم“ کہیں گے۔ فرشتے ان سے کہیں گے: ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ﴾ [ الرعد : ۲٤ ] ”سلام ہو تم پر اس کے بدلے میں جو تم نے صبر کیا۔“ یعنی تم پر سلامتی ہو، پھر رب رحیم انھیں سلام کہے گا: ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ [ یٰس : ۵۸ ] ”سلام ہو۔ اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔“ اس میں مبارک باد کا مفہوم بھی ہے، سلامتی کی دعا بھی اور اللہ کی طرف سے سلامتی کا عطیہ بھی۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے ایک پاکیزہ کلمہ کی مثال کیسے بیان فرمائی (کہ وہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح (ہے) جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی چوٹی آسمان میں ہے ۲۴ وہ اپنا پھل اپنے رب کے حکم سے ہر وقت دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۲۵

**آیت 25،24** ① اَلَمْ تَرَ: یہ خطاب اولاً رسول اللہ ﷺ سے ہے اور پھر ہر اس شخص سے ہے جو خطاب کے لائق ہے۔ استفہام سے مراد پوچھنا نہیں بتانا ہے۔ اسے استفہام تقریری کہتے ہیں۔ ''کیا تو نے نہیں دیکھا؟'' یہاں دیکھنے سے مراد علم اور جاننا ہے جو کائنات کو دیکھنے اور اس میں غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ مفسر آلوسی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اَلَمْ تَرَ'' کا مخاطب بعض اوقات وہ شخص ہوتا ہے جو پہلے سے اس بات سے واقف ہو، ایسی صورت میں مراد تعجب کا اظہار ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کا مخاطب وہ شخص ہوتا ہے جو اس سے واقف نہ ہو، اس وقت مراد ایک تو اسے بتانا ہوتا ہے اور ایک اس بات پر تعجب کا اظہار ہوتا ہے کہ اتنی مشہور بات بھی تمھیں معلوم نہیں، جو سب لوگ دیکھی ہوئی بات کی طرح جانتے ہیں۔ پھر اس مخاطب سے بات اس طرح کی جاتی ہے گویا وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔

② ''مَثَلًا'' یہ ''ضَرَبَ'' کا مفعول بہ ہے، ''كَلِمَةً'' اس سے بدل ہے یا عطف بیان۔ مثل کا لفظ کسی چیز کی وضاحت کے لیے اس سے زیادہ واضح چیز کے ساتھ مثال دے کر سمجھانے کے لیے آتا ہے۔

③ كَلِمَةً طَيِّبَةً: اس میں ہر پاکیزہ کلام، مثلاً تسبیح، تقدیس، تحمید اور تہلیل وغیرہ شامل ہے اور ہر پاکیزہ کلام کا خلاصہ ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے، کیونکہ ہر پاکیزہ کلام یا عمل کا مدار یہی ہے۔ اس لیے مفسرین نے عموماً اس سے کلمۂ اسلام اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا ہر پاکیزہ قول و عمل مراد لیا ہے۔

④ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ......: پاکیزہ اور عمدہ درخت کی چند خوبیاں بیان فرمائیں، پہلی یہ کہ اس کی جڑ مضبوط ہے، جس کی وجہ سے اس کا اکھڑنا مشکل ہے اور وہ زمین سے غذا بخوبی حاصل کر لیتا ہے اور ڈٹ کر کھڑا رہتا ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی چوٹی بہت اونچی ہے، جس کی وجہ سے اسے نقصان پہنچانا مشکل ہے، وہ آلودگی سے محفوظ دھوپ اور صاف ہوا سے بھی اپنی پوری خوراک حاصل کرتا ہے۔ مفسر طنطاوی نے ''الوسیط'' میں لکھا ہے کہ جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ درخت اپنی غذا کا صرف پانچ فیصد زمین سے حاصل کرتے ہیں، باقی فضا سے۔ تیسری یہ کہ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے۔ اس صفت کی تفسیر میں مفسرین کو مشکل پیش آئی ہے۔ صحیح بخاری (۶۱۲۲، ۶۱۴۴) میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے درخت کو مومن سے تشبیہ دی ہے کہ اس کے پتے کبھی نہیں گرتے اور وہ ہر وقت اپنا پھل اپنے رب کے حکم سے

وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اور گندی بات کی مثال ایک گندے پودے کی طرح ہے، جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا گیا، اس کے لیے کچھ بھی قرار نہیں ﴿۲۶﴾

دیتا ہے، مگر آپ نے اسے کلمہ طیبہ سے تشبیہ نہیں دی۔ ترمذی (۳۱۱۹) میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہاں کلمہ طیبہ ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾ سے مراد کھجور ہے، مگر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے مرفوعاً ضعیف اور موقوفاً صحیح فرمایا ہے۔ بہرحال جو مفسرین اس سے مراد کھجور کا درخت لیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ کھجور کے درخت سے پھل کی ابتدا سے لے کر اس کے گودے، کچی کھجور، نیم پختہ، تازہ پکی ہوئی غرض ہر مرحلے کے پھل کو تقریباً چھ ماہ تک کھایا جاتا ہے، پھر اسے محفوظ کر کے سارا سال کھایا جاتا ہے۔ مفسر طنطاوی نے فرمایا کہ میرے خیال میں "تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا" کو صرف پھل میں محدود کرنا ٹھیک نہیں، مراد یہ ہے کہ وہ درخت ہر وقت فائدہ پہنچاتا رہتا ہے، پھل کی صورت میں، سائے کی صورت میں، خوشبو کی صورت میں، عمارتی لکڑی یا ایندھن کی صورت میں، پتوں اور ٹہنیوں اور گوند کی مصنوعات کی صورت میں اور دوا کی صورت میں، اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہوا کو آلودگی سے صاف کر کے آکسیجن بنانے کی صورت میں ہر وقت وہ اپنا فائدہ پہنچاتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کھجور کے علاوہ وہ تمام درخت بھی اس میں آ جاتے ہیں جن میں یہ تینوں خوبیاں ہوں۔ اسی طرح کلمہ اسلام دنیا اور آخرت کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مومن کو مختلف قسم کے بے شمار فوائد پہنچاتا رہتا ہے اور ہر وقت مومن کا کوئی نہ کوئی نیک عمل آسمان کی طرف چڑھتا رہتا ہے۔ چونکہ مثال سے بات خوب سمجھ میں آ جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کی نصیحت اور سمجھانے کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے۔

**آیت 26** وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ...... : اور خبیث کلمہ (گندی بات) سے مراد کفر و شرک کی بات ہے۔ اس کی مثال اس بے کار پودے کی ہے جسے جڑ سے اکھیڑ پھینک دیا گیا ہو اور وہ اتنا کمزور ہو کہ اس کی جڑ زمین میں قائم ہی نہ رہ سکتی ہو۔ معمولی سا ہوا کا جھونکا ہی اسے اکھیڑ پھینکنے کے لیے کافی ہو۔ اسی طرح کلمہ کفر دنیا یا آخرت میں ہر طرح بے کار ہے، کسی کام نہیں آئے گا۔ انس رضی اللہ عنہ نے اس سے مراد حنظل (تماں، اندرائن) لیا ہے۔ [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة إبراهيم : ۳۱۱۹ ] البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مرفوعاً ثابت نہیں۔ [ ضعیف سنن الترمذی للألبانی : ۳۱۱۹ ] طنطاوی نے فرمایا، یہ صرف بطور مثال ایک فرضی پودا ہے جس کا حقیقت میں وجود نہیں، صرف سمجھانے کے لیے اسے بیان کیا گیا ہے۔ تفسیر طبری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول مذکور ہے، مگر اس میں قابوس بن ابی ظبیان ایک راوی ضعیف ہے۔ کیونکہ تماں ہو یا اور کوئی پودا بہرحال اس کے پھر بھی کچھ نہ کچھ غذائی نہ سہی دوائی فائدے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بے کار فرضی پودے والا حال شرک و کفر کا ہے جس کی نہ کوئی دلیل ہوتی ہے نہ دل پر اس کا اثر ہوتا ہے، نہ اس کے ساتھ کوئی عمل قبول ہوتا ہے۔ بودا اتنا ہوتا ہے کہ ذرا سے غور و فکر سے اس کا بے حقیقت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ کافر کا کوئی عمل نہ آسمان کی طرف چڑھتا ہے نہ اللہ کے ہاں قبول ہوتا ہے۔ یہ تفسیر مناسب حال معلوم ہوتی ہے، کیونکہ کفر و شرک کا حقیقی وجود ہے ہی نہیں، بلکہ یہ صرف وہم و گمان کی پیروی کا نام

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۫ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے، پختہ بات کے ساتھ خوب قائم رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۲۷﴾

ہے،اس لیے اس کی مثال بھی ایسے ہی پودے سے مناسب ہے جس کا وجود فرضی ہو۔

آیت 27 ❶ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : قولِ ثابت سے مراد کلمہ شہادت اور عقیدۂ توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو دنیا میں سخت سے سخت آزمائشوں اور سزاؤں میں بھی اسلام پر قائم رکھتا ہے۔ اصحاب الاخدود کو دیکھ لیجیے، ان انبیاء و شہداء کو دیکھ لیجیے جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے، مگر انھوں نے اسلام کا دامن نہیں چھوڑا۔ ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں پھینکے جانے کو دیکھ لیجیے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً بلال، عمار، یاسر، خباب، سمیہ، خبیب وغیرہم رضی اللہ عنہم پر آنے والی تنگیوں اور تکلیفوں کو دیکھ لیجیے۔ اس آیت میں فرمایا کہ ان لوگوں کا کلمہ شہادت پر قائم رہنا اللہ تعالیٰ کے ثابت رکھنے سے ہے، وہی ان میں اس قدر عزم و ہمت اور استقامت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ سخت سے سخت حالات ہوں یا دنیاوی آسائشوں کی آزمائش ہو، ہر حال میں پختہ بات (کلمہ اسلام) پر خوب قائم رہتے ہیں۔ "يُثَبِّتُ" کا ترجمہ باب تفعیل کی وجہ سے "خوب قائم رکھتا ہے" کیا ہے۔

❷ وَ فِي الْاٰخِرَةِ : اس سے مراد قبر میں سوال و جواب ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِذَا أُقْعِدَ الْمُؤْمِنُ فِيْ قَبْرِهِ أُتِيَ ثُمَّ شَهِدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ : ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ ﴾ » [ إبراھیم : ۲۷ ] "جب مومن کو قبر میں بٹھایا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آتے ہیں، پھر وہ شہادت دیتا ہے: "أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" چنانچہ اللہ کے اس فرمان: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ کا یہی مطلب ہے۔" [ بخاري، الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر : ۱۳۶۹ ] صحیح بخاری ہی میں اس کے بعد والی روایت میں یہ لفظ ہیں کہ یہ آیت عذاب قبر کے بارے میں اتری۔

❸ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ : انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهِ وَتَوَلّٰى عَنْهُ أَصْحَابُهُ، وَإِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ، أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهِ فَيَقُوْلَانِ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ، فَيُقَالُ لَهُ انْظُرْ إِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ أَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ، فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا، أَنَّهُ يُفْسَحُ لَهُ فِيْ قَبْرِهِ، وَأَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُوْلُ لَا أَدْرِيْ، كُنْتُ أَقُوْلُ مَا يَقُوْلُهُ النَّاسُ، فَيُقَالُ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ، وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ » [ بخاري،

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝۲۸ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ۝۲۹

کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اتارا (۲۸) جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے (۲۹)

الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر : ۱۳۷٤ ] ''بندہ جب اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس چل پڑتے ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کے جوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے، تو اس کے پاس دو فرشتے آ جاتے ہیں، وہ اسے بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''تو اس آدمی محمد ﷺ کے متعلق کیا کہتا تھا؟'' اگر وہ مومن ہے تو کہتا ہے: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں'' تو اس سے کہا جاتا ہے کہ آگ میں اپنی جگہ دیکھ، اللہ تعالیٰ نے اسے بدل کر تجھے جنت میں جگہ دے دی ہے۔ چنانچہ وہ ان دونوں کو دیکھتا ہے، تو اس کے لیے اس کی قبر کو وسیع کر دیا جاتا ہے اور منافق اور کافر، اس سے کہا جاتا ہے: ''تو اس آدمی (محمد ﷺ) کے متعلق کیا کہا کرتا تھا؟'' وہ کہتا ہے: ''میں نہیں جانتا، جو کچھ لوگ کہتے تھے میں وہی کہا کرتا تھا'' تو اس سے کہا جاتا ہے: ''نہ تو نے کچھ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔'' پھر اسے لوہے کے ہتھوڑوں کے ساتھ ایک ضرب ماری جاتی ہے تو وہ ایسا چیختا ہے کہ دو بھاری مخلوقوں (جن و انس) کے سوا سب چیزیں جو اس کے قریب ہوتی ہیں، اس آواز کو سنتی ہیں۔''

قبر کا عذاب حق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کئی آیات و احادیث سے اسے ثابت فرمایا ہے، دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۲۰)، سورۂ انعام (۹۳)، سورۂ توبہ (۱۰۱)، سورۂ مومن (۴۵، ۴۶) اور زیر تفسیر آیت۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: (( اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ )) [ بخاري، الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر : ۱۳۷۷ ] بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص تشہد سے فارغ ہو تو چار چیزوں سے پناہ مانگے: (( اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَفِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ )) اس کے بعد اپنے لیے جو چاہے دعا کرے۔'' [ السنن الكبرى للنسائي : ۱ / ۳۸۹، ۳۹۰، ح : ۱۲۳۳، عن أبي هريرة رضي الله عنه۔ صحيح ] اس لیے بعض ائمہ نے یہ دعا پڑھنا تشہد کے بعد واجب قرار دیا ہے، دوسری دعائیں اس کے بعد پڑھے۔ اتنی واضح آیات و احادیث کے باوجود بہت سے بدنصیب عذاب قبر کے منکر ہیں۔ وہ ان شاء اللہ بہت جلد اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں گے۔

④ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ : اہل ایمان کو ثابت رکھنا، ظالموں کو ہدایت سے محروم رکھنا، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اگر وہ چاہتا تو اپنی دوسری ساری مخلوق کی طرح جن و انس کو بھی اپنے احکام بجا لانے پر مجبور کر دیتا، مگر اس کی مرضی کہ اس نے ان دونوں کو ہدایت یا ضلالت، کفر یا ایمان کا اختیار دیا۔ اب جو جدھر جانا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے وہی راستہ آسان کر دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ دہر (۳) اور سورۂ لیل (۱ تا ۱۰)۔

آیت 29,28 ① اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا ...... : ''الْبَوَارِ'' یہ ''بَارَ يَبُوْرُ'' (ن) کا مصدر ہے، معنی ہے '' فَرْط

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝۳۰

اور انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے، تاکہ اس کے راستے سے گمراہ کریں۔ کہہ دے فائدہ اٹھالو، پس بے شک تمھارا لوٹنا آگ کی طرف ہے ۝۳۰

الْكَسَادِ" یعنی انتہائی بے قدر و قیمت ہونا، پھر ہلاکت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ (راغب)

② انسان کو اپنے وجود کی نعمت سب سے پہلے مفت ملی، اس نے اس کا شکر اپنے خالق کی اطاعت کے بجائے کفر، یعنی ناشکری اور اس کے وجود یا اطاعت و عبادت سے انکار کے ساتھ کیا اور جو شخص جس قدر سرداری اور نعمت سے بہرہ ور تھا اس نے اتنا ہی اپنی قوم کو غلط راستے پر لگا کر جہنم میں پہنچایا۔ اس لحاظ سے آیت عام ہے مگر سیاق و سباق اور مفسرین کے مطابق یہاں مراد کفار قریش ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں پیدا فرما کر اپنے مقدس گھر کا متولی بنا دیا۔ امن و اطمینان اور دنیا کا ہر پھل اور نعمت مہیا فرمائی، انھوں نے اس کا بدلہ توحید اور اطاعتِ الٰہی کے بجائے عین کعبہ میں اور اس کے اردگرد تین سو ساٹھ بت رکھ کر اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتار کر دیا، فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [ القصص : ۵۷ ] "اور کیا ہم نے انھیں ایک با امن حرم میں جگہ نہیں دی؟ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔" اور دیکھیے سورۂ قریش۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں مبعوث فرما کر دنیا اور آخرت میں سرداری کی نعمت حاصل کرنے کا موقع دیا، مگر انھوں نے آپ پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کے بجائے کفر کو اختیار کیا اور آپ کو ہر ایذا دی، حتیٰ کہ آپ کو حرم میں قتل کر دینے کا منصوبہ بنالیا، جس کے نتیجے میں ان کے پیروکاروں کو دنیا میں جنگوں، خصوصاً بدر وغیرہ اور آخر میں فتح مکہ کی صورت میں رسوائی اور بربادی ملی، شدید قحط اور مکہ میں قافلوں کی آمد رک جانے کی صورت میں آمدنی ختم ہونے سے انھیں بھوک اور خوف نے گھیر لیا اور آخرت میں جہنم میں جانے کی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ [ النحل : ۱۱۲، ۱۱۳ ] "اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس انھی میں سے ایک رسول آیا تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، تو انھیں عذاب نے اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ ظالم تھے۔"

③ اَلَمْ تَرَ : اس کے اولین مخاطب اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جو مخاطب ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کے ساتھ انسان خصوصاً کفار قریش کی نعمت کے مقابلے میں ناشکری اور کفر پر تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔

**آیت 30** وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا...... : "اَنْدَادًا" "نِدٌّ" کی جمع ہے۔ راغب نے لکھا ہے: "نَدِيْدُ الشَّيْءِ مُشَارِكُهٗ فِيْ

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

میرے بندوں سے جو ایمان لائے ہیں، کہہ دے کہ وہ نماز قائم کریں اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا ہے، پوشیدہ اور ظاہر خرچ کریں، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی اور نہ کوئی دلی دوستی ﴿۳۱﴾

جَوْهَرِهٖ " کہ جو کسی چیز کے اصل میں شریک ہو، جبکہ مثل کا لفظ ہر مشارک پر بولا جاتا ہے، چنانچہ ہر "ند" مثل ہے مگر ہر مثل "ند" نہیں۔ (اس لیے اس کا ترجمہ شریک کیا جاتا ہے) یعنی وہ ان کی پوجا کرنے لگے اور دکھ درد میں انھیں پکارنے لگے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا جرم شرک کا ارتکاب اور لوگوں میں اس کی اشاعت کے ذریعے سے انھیں اسلام سے روکنا اور گمراہ کرنا قرار دیا ہے۔ "تَمَتُّعٌ" کچھ وقت تک فائدہ اٹھانے کو کہتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ "تَمَتَّعْ" یا "تَمَتَّعُوْا" (یعنی فائدہ اٹھاؤ) آیا ہے، اس کا مطلب اس کی اجازت دینا نہیں بلکہ اس پر ڈانٹنا اور ڈرانا ہے، یعنی اچھا اگر تم باز نہیں آتے تو چند روز کے مزے اڑا لو، مگر کب تک؟ آخر کار تمھیں ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے۔

آیت 31 ① قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : انسان سارے ہی اللہ کے بندے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا "عِبَادِيْ" (میرے بندے) کہنا بہت بڑی عزت افزائی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا﴾ [ بنی إسرائیل : ۱ ] "پاک ہے وہ جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا۔" اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے کہہ دیں جن میں دو وصف ہیں، ایک تو یہ کہ وہ صرف میرے بندے ہیں، کسی غیر کے نہیں، جو اپنے نام عبداللہ، عبد الرحمن اور ان جیسے رکھتے ہیں، نہ کہ عبد الحسین، عبد النبی، پیراں دتہ، غوث بخش وغیرہ اور جو قولاً وعملاً صرف میری عبادت اور بندگی کرتے ہیں، نہ کہ کسی غیر کی اور دوسرا وصف یہ کہ وہ ایمان لے آئے ہیں۔

② يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا ...... : یہ دونوں فعل لام امر مقدر کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ اقامت کا معنی ہے سیدھا کرنا، یعنی نماز کو درست کر کے پڑھیں، اس میں ہمیشگی، وقت پر ادا کرنا، تمام ارکان کو صحیح ادا کرنا اور خشوع کے ساتھ ادا کرنا سب کچھ آ جاتا ہے۔ نماز میں بندگی کی ہر قسم کا کچھ نہ کچھ حصہ آ جاتا ہے، قبلہ کی طرف رخ حج سے مناسبت رکھتا ہے، قیام، رکوع، سجود اور دو زانو ہونا غلامی اور بندگی کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں، نماز کے دوران میں کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب روزے سے مناسبت رکھتا ہے، کاروبار چھوڑ کر آنا اس شخص کے لیے ممکن ہی نہیں جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرنے پر تیار ہی نہیں اور کئی اور چیزیں ایسی ہیں جو صرف نماز ہی میں ہیں، کسی اور عبادت میں نہیں۔ قرآن مجید میں اکثر نماز اور زکوٰۃ یا خرچ کرنا اکٹھا آیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی ان دونوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

③ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً : اس میں دو باتوں کی طرف توجہ لازم ہے۔ ایک تو لفظ "مِنْ" ہے کہ اللہ نے ہمیں جو کچھ دیا ہے جان، مال، اولاد، قوت، علم، عزت، غرض جو شمار ہی نہیں ہو سکتا، وہ سارے کا سارا ہم سے خرچ کرنے کا مطالبہ نہیں کیا،

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ تمھارے لیے پھلوں میں سے کچھ رزق نکالا اور تمھارے لیے کشتیوں کو مسخر کیا، تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور تمھاری خاطر دریاؤں کو مسخر کر دیا ﴿۳۲﴾ اور تمھاری خاطر سورج اور چاند کو مسخر کر دیا کہ پے در پے چلنے والے ہیں اور تمھاری خاطر رات اور دن کو مسخر کر دیا ﴿۳۳﴾

کیونکہ اسے ہماری کمزوری کا علم ہے جو اس نے سورۂ محمد کی آیت (۳۶، ۳۷) میں ذکر فرمائی ہے۔ دوسرا لفظ "رَزَقْنٰا" ہے کہ تم نے جو کچھ خرچ کرنا ہے ہمارے دیے ہوئے میں سے کرنا ہے، اگر یہ سوچو گے تو دل میں بخل نہیں آئے گا اور اگر سب کچھ اپنا سمجھو گے تو مشکل ہی سے خرچ کر سکو گے۔ "سِرًّا" یعنی پوشیدہ اس لیے کہ وہ ریا سے پاک ہے اور "عَلَانِيَةً" یعنی علانیہ اس لیے کہ دوسروں کو رغبت ہو، یا فرض زکوٰۃ ہو تو علانیہ دو، کیونکہ چھپا کر دینے سے زکوٰۃ نہ دینے کی تہمت کا خطرہ ہے۔

❹ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ : "خِلٰلٌ" یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، بمعنی دلی دوستی، مراد ہے قیامت کا دن کہ جس میں نیک اعمال خریدے جا سکیں گے نہ کسی کی دوستی اور محبت کام آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچا سکے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یعنی نیک عمل بکتے نہیں اور کوئی دوستی سے رعایت نہیں کرتا۔" (موضح) اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ الزخرف : ٦٧ ] "سب خلیل (دلی دوست) اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔"

**آیت 32** ❶ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ...... : یعنی وہ اللہ جس کی ناشکری پر تم کمربستہ ہو، جس کی اطاعت اور بندگی سے روگردانی کر رہے ہو اور جس کے ساتھ بلا دلیل شریک بنا رہے ہو، وہ تو وہ ذات ہے...... اس کے بعد ان تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی دس نعمتیں شمار کی گئی ہیں اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں شمار کرنے کی تم میں طاقت ہی نہیں۔

❷ الْفُلْكَ: واحد جمع ایک ہی طرح ہے، بڑی کشتیاں، بحری جہاز۔

❸ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ : "الْاَنْهٰرَ" "نَهْرٌ" کی جمع ہے، ندی، نالے اور دریا۔ تم ان سے اپنی کھیتیاں سیراب کرتے ہو اور ان میں جہاز اور کشتیاں چلاتے ہو، مچھلیاں پکڑتے ہو، بجلی پیدا کرتے ہو، ان کے کناروں پر پہاڑوں میں راستے بناتے ہیں، غرض بے شمار فائدے اٹھاتے ہو۔

**آیت 32** دَآىِٕبَيْنِ : یہ "دَأَبَ يَدْأَبُ دَأْبًا" سے اسم فاعل کا تثنیہ ہے، مسلسل چلنا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے چلنے کے لیے جو

وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

ع ۵ / ۱۷

اور تمھیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔ بلاشبہ انسان یقیناً بڑا ظالم، بہت ناشکرا ہے ﴿۳۴﴾

نظام اور ضابطہ مقرر کر دیا ہے اس پر لگا تار چلے جا رہے ہیں، نہ کبھی تھمتے ہیں اور نہ بگڑتے ہیں اور نہ رفتار میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

آیت 34 ① وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ : یعنی یہ سب کچھ اور بہت کچھ تمھارے مانگے بغیر دیا۔ علاوہ ازیں جو کچھ تم نے مانگا اس میں سے بھی جتنا چاہا اس نے تمھیں دیا۔ ”مِنْ“ تبعیضیہ ہے۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ زبان حال یا قال سے تم نے جو مانگا، یعنی اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے تمھاری حالت جو تقاضا کرتی تھی اور جو بھی تمھاری ضرورت ہو سکتی تھی اس نے اس میں سے جتنا چاہا تمھیں دیا۔

② وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا : یعنی مختصر طور پر بھی نہیں گن سکو گے، کجا یہ کہ تم لامحدود نعمتوں کو شمار کر سکو، تو سوچو تم اس کا شکر کس طرح ادا کر سکتے ہو۔ (شوکانی) ”كَفَّارٌ“ بہت ناشکرا۔ ”أَحْصٰی يُحْصِيْ إِحْصَاءً“ (افعال) شمار کرنا، کیونکہ ”اَلْحَصٰی“ کا معنی کنکری ہے اور عرب کنکریوں کے ذریعے سے شمار کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ کنکریوں سے محدود شمار ہی ہو سکتا ہے۔

③ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ : انسان پر اللہ تعالیٰ کے کتنے احسانات ہیں اور ہر آن ہوتے رہتے ہیں، مگر وہ ہے کہ ذرا تکلیف پہنچتی ہے تو ناشکری پر اتر آتا ہے۔ ”لَظَلُوْمٌ“ سے یہی مراد ہے، یا ”الْاِنْسَانَ“ میں الف لام عہد کا ہے اور مراد کافر انسان ہے کہ وہ اللہ کا حق دوسروں کو دے کر، یعنی غیر اللہ کی عبادت کر کے بہت بڑا ظلم کر رہا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان : ۱۳ ] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ کیونکہ ظلم کا معنی ہے ”وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ“ کہ کسی چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ رکھ دینا۔ تو کافر انسان اللہ کی نعمتیں استعمال کر کے نہ اس کی عبادت کرتا ہے نہ اطاعت بلکہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کو مخلوق کے احسانات شمار کرتا ہے، کبھی کسی کو جھولی بھرنے والا کہتا ہے، کبھی کسی کو داتا کہتا ہے، کبھی کسی کو دستگیر، کبھی کسی کو مشکل کشا۔ ”الْاِنْسَانَ“ سے مراد یہاں کافر انسان ہونے کی دلیل اس سلسلۂ آیات کی ابتدا بھی ہے، فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ [ إبراهيم : ۲۸، ۲۹ ] ”کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اتارا، جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔“ یہ اس کی زبردست ناشکری ہے۔ اے کافر انسان! افسوس تیری اس کافری اور ناشکری پر۔ کاش! تو اپنے اصل داتا اور دستگیر کا احسان مانتا، اسی کا شکر ادا کرتا ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں ﴿۳۵﴾

آیت 35 ① وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ...... : عام احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب خاص اس احسان کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں پر کیا تھا اور وہ تھا ان کے باپ ابراہیم علیہ السلام کا ان کے جد اعلیٰ اسماعیل علیہ السلام کو یہاں لا کر آباد کرنا۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام نے کن تمناؤں کے ساتھ تمھیں یہاں لا کر بسایا تھا اور کس طرح اس شہر کے پر امن بنانے کی اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے بت پرستی سے محفوظ رہنے کی دعا کی تھی، مگر آج تم ان احسانات کو بھول گئے اور بت پرستی کو اپنا دین قرار دے دیا۔

② اٰمِنًا: یہ "ذَا أَمْنٍ" (امن والا) کے معنی میں ہے، جیسے "لَابِنٌ" (دودھ والا) اور "تَامِرٌ" (کھجور والا) ہے۔ سورۂ بقرہ (۱۲۶) میں "هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا" اور یہاں "هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا" میں فرق یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں "هٰذَا" پہلا مفعول اور "بَلَدًا اٰمِنًا" دوسرا مفعول ہے، جب کہ یہاں "هٰذَا الْبَلَدَ" پہلا مفعول اور "اٰمِنًا" دوسرا مفعول ہے۔ دونوں جگہ ترجمے کا فرق ملاحظہ فرمائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ (۱۲۶) میں موجود پہلی دعا "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا" اس وقت کی ہے جب شہر نہیں بنا تھا، تو دعا کی کہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے اور دوسری دعا اس وقت کی جب شہر بن چکا تھا، اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو چکے تھے کہ پروردگارا! اس شہر کو امن والا بنا دے۔ امن ایک بہت بڑی نعمت ہے اور خوف بہت بڑی آزمائش ہے۔ رازی فرماتے ہیں، ایک عالم سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کو بیماری اور خوف میں سے ایک کے انتخاب پر مجبور کیا جائے تو آپ کیا اختیار کریں گے؟ انھوں نے فرمایا، میں بیماری کو اختیار کروں گا کہ اس میں آدمی کھا پی اور سو تو سکتا ہے، خوف میں اس سے بھی محروم ہو جاتا ہے، آپ ایک بکری کا تصور کریں جس کی ٹانگ ٹوٹ جائے، وہ کھاتی پیتی رہے گی، سو بھی جائے گی، مگر ایک تندرست بکری جس کے سامنے بھیڑیا ہو، وہ نہ کھا سکے گی، نہ پی سکے گی اور نہ آرام کر سکے گی، حتیٰ کہ نوبت موت تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ قریش میں بھوک سے کھلانے اور خوف سے امن دینے کی نعمت کا ذکر فرما کر قریش کو خاص اپنی عبادت کا حکم دیا ہے۔

③ وَ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ : "جَنَبَ يَجْنُبُ" یہ "نصر" سے اور افعال اور تفعیل سے ایک ہی معنی میں آتا ہے۔ "صنم" اس پتھر یا لکڑی یا کسی دھات کے بنائے ہوئے بت، تصویر یا مجسمے کو کہتے ہیں جو کسی انسان یا فرشتے یا دیوتا کی حقیقی یا خیالی صورت پر پوجا کے لیے بنایا گیا ہو، جب کہ "وثن" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو غیر اللہ کی عبادت کے لیے مختص ہو، خواہ قبر ہو یا درخت یا دریا یا بت یا کوئی جانور یا انسان وغیرہ۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم اور اپنے والد کی صنم پرستی اور اس پر اصرار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے وہ اپنے یا اپنی اولاد کے اس میں مبتلا ہونے سے سخت خوف زدہ تھے، سو انھوں نے یہ دعا کی۔ "بَنِيَّ" میں ساری اولاد شامل ہے، جیسے بنی آدم یا بنی اسرائیل۔ بیٹوں کی حد تک تو دعا قبول ہوئی، مگر ساری اولاد کے حق

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ

اے میرے رب! بے شک انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، پھر جو میرے پیچھے چلا تو یقیناً وہ مجھ سے ہے

میں بعینہٖ قبول نہیں ہوئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴾ [ الصافات : ۱۱۳ ] ''اور ان دونوں (ابراہیم اور اسحاق) کی اولاد میں سے کوئی نیکی کرنے والا ہے اور کوئی اپنی جان پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔'' یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کا مالک ہے، وہ اپنی حکمت کے مطابق دعا کرنے والے کی دعا کا جتنا حصہ چاہتا ہے اس کی خواہش کے مطابق پورا کر دیتا ہے اور جو حصہ چاہتا ہے کسی اور صورت میں عطا کر دیتا ہے۔ دعا کسی صورت بھی ضائع نہیں جاتی، البتہ مرضی اسی کی چلتی ہے، کسی دوسرے حتیٰ کہ انبیاء کی بھی نہیں۔ ہمیں بھی ہر وقت اس بات کی فکر رہنی چاہیے کہ ہم یا ہماری اولاد کسی طرح شرک میں مبتلا نہ ہو جائیں، ہمیں اپنی اولاد کے لیے دعا بھی کرنی چاہیے اور اسے توحید کی تعلیم بھی دینی چاہیے۔

آیت 36 ❶ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ...... : صنم پرستی عام ہونے اور لوگوں کے بہت جلد اس میں مبتلا ہونے کی بڑی وجہیں دو ہیں، ایک تو یہ کہ ان دیکھے معبود (اللہ تعالیٰ) پر یقین رکھنے کے بجائے انسان چاہتا ہے کہ وہ ایسی چیز کی عبادت کرے جو اسے نظر آئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ ظاہر کوئی چیز نہیں، کیونکہ کائنات کی ہر چیز اپنے بنانے والے کے وجود اور توحید کی شہادت دے رہی ہے اور لطف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا یہ دعویٰ نہیں کہ یہ زمین و آسمان اور ساری کائنات میں نے بنائی ہے، اگر کوئی یہ دعویٰ کرے تو ہر شخص اسے جھوٹا کہے گا، بلکہ خود اس کا دل اسے جھٹلائے گا کہ آسمان و زمین تو تجھ سے اور تیرے باپ دادا سے لاکھوں برس پہلے کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ اگرچہ ظاہر ہے مگر اس کی ذات سے زیادہ کوئی چیز آنکھوں سے غائب بھی نہیں، کیونکہ کسی میں اسے دیکھنے کی تاب ہی نہیں۔ [ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ] اس لیے وہ پہلا تقاضا ہی ایمان بالغیب کا کرتا ہے، کوئی اس کے دیدار کا شوق رکھے یا درخواست کرے، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کی تو وہ ناراض نہیں ہوتا بلکہ جنت میں اپنے دیدار کا وعدہ کرتا ہے، مگر کوئی ایمان لانے کے لیے دیکھنے کی شرط لگائے، جیسے بنی اسرائیل نے کہا: ﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ [ البقرۃ : ۵۵ ] ''(اے موسیٰ!) ہم تیرے لیے ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ کو صاف سامنے نہ دیکھ لیں'' تو پھر اس کی آتش غضب بھڑک اٹھتی ہے، پھر کبھی تو وہ بجلی گرا کر بھسم کر دیتا ہے اور اکثر کو اس نے مہلت دے رکھی ہے، قیامت کو انھیں ان کے مطالبے کا جواب دے گا۔ غرض یہی انسان کی بے وقوفی ہے کہ جب وہ اپنی کمزوری کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا تو ایمان بالغیب کے بجائے نظر آنے والا رب گھڑ کر اس کی پوجا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سبب محبت میں غلو بھی شامل ہو جاتا ہے، یعنی جس ہستی سے بھی اس کو حد سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اسے نیک سمجھتا ہے یا اس کی ہیبت سے ڈرتا ہے، اس کا بت بنا کر اسے پوجنا شروع کر دیتا ہے۔ قوم نوح میں صنم پرستی کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نوح۔ بے شمار قوموں کے صنم پرستی میں مبتلا ہونے کی

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

اور جس نے میری نافرمانی کی تو یقیناً تو بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۶﴾

وجہ سے ابراہیم علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ اے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، مراد یہ ہے کہ یہ ان کی گمراہی کا باعث بن گئے، جیسے کہتے ہیں کہ سڑک لاہور لے جاتی ہے، وہ تو صرف ذریعہ ہے، جانے والا جاتا تو خود ہے۔

❷ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : یہاں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نافرمانی کرنے والوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کی، حالانکہ ان الفاظ سے یہ بات نہیں نکلتی، بلکہ صرف یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا معاملہ تیرے سپرد ہے، تو چاہے تو بخش دے، چاہے تو عذاب دے اور ساتھ ہی عرض کی: ''پس بے شک تو غفور و رحیم ہے۔'' بلاشبہ اس میں نہایت ادب، عجز اور سلیقے سے ایک قسم کی سفارش ہے، مگر اسے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا نہیں کہا جا سکتا، ہاں انھوں نے اپنے والد کے لیے وعدہ کی وجہ سے بخشش کی دعا کی تھی، پھر اللہ کا دشمن ثابت ہو جانے پر اس سے براءت کا اظہار فرما دیا۔ (دیکھیے توبہ: ۱۱۴) قرآن میں ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام سے منقول دعاؤں میں ہر نافرمان کا معاملہ، خواہ مشرک ہو یا عام گناہ گار، اللہ کے سپرد کیا گیا ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کے ذکر کے ساتھ ایک قسم کی سفارش کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ ان دونوں پیغمبروں کی بے شمار تکلیفیں اٹھانے کے باوجود حد درجے کی نرم دلی ہے، عیسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [ المائدة : ۱۱۸ ] سورۂ مائدہ میں اس آیت کا ترجمہ اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے برعکس نوح علیہ السلام کی دعا تھی: ﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ [ نوح : ۲۶ ] ''اے میرے رب! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ۔'' اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا یہ تھی: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴾ [ يونس : ۸۸ ] ''اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔'' ان دونوں نبیوں کی یہ دعائیں بھی بلاسبب نہ تھیں۔ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ اب تمھاری قوم میں سے مزید کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ (دیکھیے ہود: ۳۶) اور فرعونیوں نے بہت سے معجزے دیکھ کر بھی کہہ دیا تھا کہ موسیٰ! تم جو بھی معجزہ لے آؤ ہم کسی صورت تم پر ایمان لانے والے نہیں۔ (دیکھیے الاعراف: ۱۳۲) اب اگر وہ یہ دعا نہ کرتے تو کیا کرتے؟ ایسے موقع پر تو ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے والد سے صاف لاتعلق ہو گئے تھے، فرمایا: ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ [ التوبة : ۱۱۴ ] ''پس جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔''

رَبَّنَاۤ اِنِّيۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِيۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں آباد کیا ہے، جو کسی کھیتی والی نہیں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ سو کچھ لوگوں کے دل ایسے کر دے کہ ان کی طرف مائل رہیں اور انھیں پھلوں سے رزق عطا کر، تاکہ وہ شکر کریں۔ ﴿۳۷﴾

آیت 37 ① رَبَّنَاۤ اِنِّيۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ : ”مِنۡ“ تبعیض کے لیے ہے۔ ”کچھ اولاد“ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تو اس وقت اسحاق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے۔ انھیں اور ان کی والدہ سارہ علیہا السلام کو ابراہیم علیہ السلام نے دوسری جگہ (شام میں) ٹھہرایا ہوا تھا۔

② بِوَادٍ غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ : وادی نیچی جگہ کو کہا جاتا ہے، جہاں کبھی پانی بہتا ہو، خصوصاً پہاڑوں کے درمیان گہری جگہ کو ”وادی“ کہتے ہیں۔ ”غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ“ مکہ اور اس کے گرد و نواح بلکہ ارضِ عرب میں کھیتی باڑی نہیں تھی، کیونکہ بارش کے علاوہ وہاں پانی نہیں ملتا تھا اور زمین بھی پتھریلی یا ریتلی تھی، خصوصاً مکہ والی جگہ میں تو بالکل نہ پانی تھا نہ کھیتی باڑی۔ ان غیر آباد بیابان پہاڑوں کے درمیان اسماعیل اور ان کی والدہ ہاجرہ علیہا السلام کو لا کر چھوڑ جانے کا، پھر ہاجرہ علیہا السلام کے صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کا اور پانی تلاش کرنے اور زم زم کے پھوٹ نکلنے کا لمبا واقعہ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے۔ [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب ﴿ يزفون ﴾ النسلان في المشي : ۳۳٦٤، ۳۳٦٥ ] ہزاروں سال بعد ابھی تک وہ ”غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ“ ہی ہے، البتہ طائف میں کچھ کھیتی باڑی اور پھل وغیرہ ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی يَكْثُرَ الْمَالُ وَيَفِيْضَ، حَتّٰی يَخْرُجَ الرَّجُلُ بِزَكَاةِ مَالِهٖ فَلَا يَجِدُ أَحَدًا يَقْبَلُهَا مِنْهُ، وَحَتّٰی تَعُوْدَ أَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَأَنْهَارًا » ”قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ مال بہت زیادہ نہ ہو جائے، حتیٰ کہ آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر نکلے گا، لیکن وہ کوئی ایسا شخص نہیں پائے گا جو اس سے اس کی زکوٰۃ لے لے اور جب تک ارضِ عرب دوبارہ مروج (سبزہ زار، کھلے کھیت) اور ندیوں نالوں کی صورت میں نہ بدل جائے۔“ [ مسلم، الزكاة، باب الترغيب في الصدقة قبل أن...... : ۱۵۷/٦۰، قبل ح : ۱۰۱۳ ] لفظ ”تَعُوْدَ“ (دوبارہ نہ بدل جائے) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی کبھی یہ پہاڑ کشمیر کے پہاڑوں کی طرح سرسبز اور ندیوں نہروں والے تھے، قیامت کے قریب پھر اسی طرح ہو جائیں گے۔

③ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ : اس سے بعض مفسرین نے اخذ کیا ہے کہ یہ دعا ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ تعمیر کرنے کے بعد کی، ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر بیت اللہ تو ابراہیم علیہ السلام کے وہاں جانے سے بھی بہت پہلے تعمیر ہو چکا تھا، کیونکہ وہ زمین پر اللہ کی عبادت کے لیے بنایا جانے والا پہلا گھر ہے اور سب جانتے ہیں کہ زمین پر اللہ کی عبادت آدم علیہ السلام سے یا اس سے بھی پہلے سے شروع ہے، اس کے بانیٔ اول آدم علیہ السلام ہیں یا اس سے بھی پہلے کی کوئی مخلوق، مثلاً فرشتے یا جن وغیرہ۔ ہاں ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِیۡ وَ مَا نُعۡلِنُ ؕ وَ مَا یَخۡفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

اے ہمارے رب! یقیناً تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز نہیں چھپتی زمین میں اور نہ آسمان میں ﴿۳۸﴾

سیلابوں کی وجہ سے یہ ایک ٹیلے کی شکل میں بدل چکا تھا، وہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بتائی اور انھی پہلی بنیادوں پر دوبارہ کعبہ تعمیر ہوا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۸) اور سورۂ حج (۲۶) "الْمُحَرَّمِ" اس لیے کہ کئی کام جو دوسری جگہ حلال ہیں مثلاً شکار کرنا، درخت کاٹنا وغیرہ، وہ یہاں حرام ہیں اور اس گھر کی عزت نہ کرنے والے کا یہاں طاقت کے ذریعے سے قبضہ حرام ہے، ممکن نہیں۔ اس لیے اس گھر کا لقب "اَلْبَيْتُ الْعَتِيْقُ" بھی ہے، یعنی جو ہمیشہ سے آزاد رہا۔ عتیق کا ایک معنی قدیم بھی ہے۔

❹ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ : معلوم ہوا کہ آدمی کو خود بھی اور اولاد کو بھی ایسی جگہ ٹھہرانا چاہیے جہاں اہل توحید کی مسجد پہلے سے موجود ہو، یا جب آدمی وہاں سکونت اختیار کرے تو سب سے پہلا کام اپنا مکان اور مسجد بیک وقت بنانے کا کرے، خواہ کچی اینٹوں کی چار دیواری ہی ہو، جیسا کہ ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آتے ہی کیا تھا، تاکہ اقامت صلاۃ میں کوئی مشکل پیش نہ آئے اور وہ آبادیاں تو رہنے کے قابل ہی نہیں جو نہایت عالی شان ہونے کے باوجود اکیلے اللہ کی عبادت کے لیے بنائی ہوئی مسجدوں سے خالی ہیں، یا وہاں ایسی مسجدیں گھر سے اتنی دور ہیں کہ نماز کے لیے وقت پر پہنچنا مشکل ہے۔

❺ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ : "اَفْئِدَةً" "فُؤَادٌ" کی جمع ہے، یعنی دل، یا "وُفُوْدٌ" کی یعنی آنے والے۔ (بغوی) "مِنَ النَّاسِ" کچھ لوگوں کے دل۔ "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے۔ "تَهْوِيْۤ" "هَوٰى يَهْوِيْ" (ض) سے گرنا اور "هَوِيَ يَهْوٰى" (ع) سے چاہنا اور محبت کرنا مراد ہوتا ہے۔ کوئی چیز جب بلندی سے گرتی ہے تو نہایت تیزی سے گرتی ہے اور بے اختیار ہو کر گرتی ہے، یعنی کچھ لوگوں کے دل ایسے بنا دے کہ بے اختیار اس کی طرف دوڑتے چلے آئیں۔ تفاسیر میں بعض صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اگر دعا میں "کچھ لوگوں" کی قید نہ لگاتے تو سب لوگوں کے دل، خواہ مسلم ہوتے یا یہود و نصاریٰ، اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔ اس دعا کی قبولیت کا نظارہ ہر مسلمان اپنے دل میں اس گھر کے شوق سے اور وہاں حج وغیرہ کے لیے بار بار جانے والوں کی کثرت سے کر سکتا ہے۔

❻ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ : مکہ میں دنیا کے تمام خطوں سے ہر موسم کا تازہ پھل دیکھ کر اس دعا کی قبولیت آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ اس دعا کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۴ تا ۱۲۷)۔

آیت 38 ❶ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ ...... : یعنی ہماری چھپی ہوئی دلی خواہشوں کو اور جو کچھ ہم زبان سے مانگ رہے ہیں تو سب جانتا ہے۔ یہ مانگنے کا بہترین طریقہ ہے کہ صرف تعریف پر اکتفا کیا جائے۔ "کتاب الاغانی (۳۴۴/۸)" میں ہے کہ امیہ بن ابی الصلت نے عبد اللہ بن جدعان کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

أَأَذْكُرُ حَاجَتِيْ أَمْ قَدْ كَفَانِيْ حَيَاؤُكَ إِنَّ شِيْمَتَكَ الْحَيَاءُ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ وَهَبَ لِيۡ عَلَى الۡكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيۡ لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔ بے شک میرا رب تو بہت دعا سننے والا ہے ﴿۳۹﴾

إِذَا أَثْنَى عَلَيْكَ الْمَرْءُ يَوْمًا كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ

"کیا میں اپنی حاجت ذکر کروں یا یقیناً مجھے تیری حیا ہی کافی ہے، کیونکہ تیری عادت ہی حیا ہے، جب آدمی کسی دن تیری تعریف کر دے تو اسے ضرورت پیش کرنے کے بجائے تعریف ہی کافی ہو جاتی ہے۔"

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "جب مخلوق کا یہ حال ہے تو خالق کا کیا حال ہوگا۔" اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ )) [ ابن ماجه، الأدب، باب فضل الحامدين : ۳۸۰۰۔ ترمذي : ۳۳۸۳، عن جابر رضی اللہ عنہ ] "سب سے بہتر ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے۔" مقصد یہ ہے کہ پروردگارا! ہم جو مانگ رہے ہیں اور جو کچھ ہمارے دل میں ہے تو سب کچھ جانتا ہے، بے شک اللہ پر آسمان میں کوئی چیز ہو یا زمین میں، مخفی نہیں رہتی۔ سو ہماری ظاہر درخواستوں کے ساتھ دلی مرادیں بھی پوری کر دے۔ یاد رہے کہ وہ مشہور روایت جس میں ذکر ہے کہ آگ میں پھینکے جانے کے وقت بارش کے فرشتے نے ابراہیم علیہ السلام کو مدد کی پیش کش کی تو یہ جاننے کے بعد کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجنے کے بجائے اپنی مرضی سے آیا ہے، تو انھوں نے مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جب اس نے کہا کہ پھر آپ خود ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو فرمایا: (( حَسْبِيْ عَنْ سُؤَالِيْ عِلْمُهُ بِحَالِيْ )) یا فرمایا: (( عِلْمُهُ بِحَالِيْ يُغْنِيْ عَنْ سُؤَالِهِ )) "مجھے سوال کرنے کے بجائے یہی کافی ہے کہ وہ میرے حال کو جانتا ہے۔" سو یہ محض ایک اسرائیلی روایت ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ لَّمْ يَدْعُ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ غَضِبَ عَلَيْهِ )) "جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا نہ کرے اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔" [ ابن ماجه، الدعاء، باب فضل الدعاء : ۳۸۲۷۔ السلسلة الصحيحة : ۳۲۳/۶، ح : ۲۶۵۴ ] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [ المؤمن : ۶۰ ] "اور تمھارے رب نے فرمایا مجھے پکارو (مجھ سے دعا کرو) میں تمھاری دعا قبول کروں گا، بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔" ایسی روایات صوفی لوگ اپنے خود ساختہ وظائف و چلہ جات کو رائج کرنے اور دعا سے محروم کرنے کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔

❷ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اہل مکہ کے لیے صحیح عقیدے اور امن اور کھانے پینے کی چیزیں عطا کرنے کی دعا کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام سے جدائی کے وقت گزرنے والی کیفیت، جو آنکھوں کے آنسوؤں یا دل کی بے قراری کی وجہ سے دونوں میاں بیوی پر گزر رہی تھی، وہ پیش کی ہے، مگر شکوے کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لائے، یہ حوصلہ پیغمبروں اور ان کے اہل بیت ہی کا ہوتا ہے۔

آیت 39 ❶ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ وَهَبَ لِيۡ ...... : " وَهَبَ يَهَبُ هِبَةً " کا معنی کسی معاوضے کے بغیر عطا کر دینا ہے۔

رَبِّ اجۡعَلۡنِيۡ مُقِيۡمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی، اے ہمارے رب! اور میری دعا قبول کر ﴿۴۰﴾

معلوم ہوا اولاد اللہ تعالیٰ کا ہبہ ہے، یہ صرف اسباب جمع ہو جانے سے نہیں ہوتی، ورنہ ہر تندرست جوڑے کے ملنے سے اولاد ہو جاتی، بلکہ یہ محض عطائے الٰہی ہے، وہ بھی اس کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے، چاہے تو لڑکے ہی دے، چاہے لڑکیاں، چاہے دونوں ملا کر دے اور چاہے تو بے اولاد رکھے۔ (مزید دیکھیے الشوریٰ: ۵۰) رازی نے فرمایا، قرآن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ دونوں بیٹے بڑی عمر اور بڑھاپے میں عطا کیے گئے، لیکن یہ بات کہ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی معلوم نہیں ہوتی، اس کے لیے صرف اسرائیلی روایات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام ننانویں (۹۹) برس کے تھے اور اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ایک سو بارہ (۱۱۲) برس تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہم اس کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتے۔

② لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ: لفظی معنی ہے ”دعا کو بہت سننے والا“ مگر مراد قبول کرنے والا ہے، جیسے کہا جاتا ہے، فلاں کی تو سنی گئی، یعنی مراد پوری ہو گئی۔

**آیت 40** ① رَبِّ اجۡعَلۡنِيۡ مُقِيۡمَ الصَّلٰوةِ: یہ ابراہیم علیہ السلام کی عاجزانہ دعاؤں کا آخری حصہ ہے، جس میں انھوں نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے اس چیز پر پابند رہنے کی دعا کی ہے جو توحید و رسالت کے یقین و اقرار کے بعد اسلام میں سب چیزوں سے زیادہ ضروری ہے، یعنی نماز جو خاشعین (عاجزی کرنے والوں) کے سوا سب لوگوں کے لیے نہایت دشوار ہے (دیکھیے بقرہ: ۴۵، ۴۶) اور جس کے متعلق موسیٰ علیہ السلام (جَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا وَ عَنْ جَمِيْعِ اُمَّتِنَا اَحْسَنَ الْجَزَاءِ) نے کہا تھا کہ میں نے بنی اسرائیل کو بہت زیادہ بھگتا ہے، آپ کی امت پانچ نمازوں کی طاقت بھی نہیں رکھے گی۔ سو جو ایمان و کفر کے درمیان فرق کرنے والی سب سے نمایاں چیز ہے، ابراہیم علیہ السلام کو اس کی اتنی فکر تھی کہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے اس کی پابندی کی خاص طور پر دعا کی۔

② وَمِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ: ”اور میری اولاد میں سے بھی“ بظاہر یہ ”مِنۡ“ تبعیض کے لیے ہے، یعنی مجھے اور میری اولاد میں سے بھی کچھ نماز کے پابند بنا، مگر اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے ساری اولاد کے لیے یہ دعا کیوں نہ کی؟ اس کا جواب اکثر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو انسانی تاریخ سے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ”لَا يَنَالُ عَهۡدِي الظّٰلِمِيۡنَ“ سے اندازہ تھا کہ ساری اولاد نمازی نہیں ہو سکے گی، اس لیے انھوں نے یہ دعا کی کہ ایسا نہ ہو کہ اولاد میں سے کوئی بھی نمازی نہ رہے، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ انھوں نے دعا کی تھی: ﴿رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ﴾ [ البقرة: ۱۲۸ ] ”اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا۔“ ابن عاشور صاحب ” التحریر والتنویر“ نے لکھا ہے: ”یہ ”مِنۡ“ ابتدائیہ ہے، تبعیض کے لیے نہیں اور ”مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ“

رَبَّنَا اغۡفِرۡلِيۡ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾ وَ لَا تَحۡسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعۡمَلُ الظّٰلِمُوۡنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمۡ لِيَوۡمٍ تَشۡخَصُ فِيۡهِ الۡاَبۡصَارُ ﴿۴۲﴾

اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہوگا ﴿۴۱﴾ اور تو اللہ کو ہرگز اس سے غافل گمان نہ کر جو ظالم لوگ کر رہے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی ﴿۴۲﴾

محذوف کی صفت ہے جس کا عطف یائے متکلم پر ہے۔ مقدر عبارت اس طرح ہوگی: " رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَاجْعَلْ مُقِيْمِيْنَ لِلصَّلَاةِ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ " یعنی مجھے نماز کا پابند بنا اور نماز کا پابند ان کو بھی بنا جو میری اولاد میں سے ہوں۔ " وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ " کی ترکیب بھی اسی طرح ہوسکتی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ دعا مانگتے وقت یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بت پرستی سے بچنے کی دعا تو اپنے اور اپنی ساری اولاد کے لیے کریں، فرمایا: ﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾ [ إبراهيم : ٣٥ ] (اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بت پوجنے سے بچائے رکھ ) مگر نماز کا پابند بنانے کی دعا سب کے لیے کرنے کے بجائے بعض کے لیے کریں۔ جب ہم خود دعا کرتے وقت یہ پسند نہیں کرتے کہ یہ دعا کریں کہ یا اللہ! ہماری کچھ اولاد کو نمازی بنا تو ابراہیم علیہ السلام یہ کیسے پسند کر سکتے ہیں؟" ابن عاشور کی بات دل کو لگتی ہے۔ (واللہ اعلم )

③ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ: دعا کے بعد پھر قبولیت کی درخواست اپنے عجز کا اظہار اور قبولیت پر اصرار ہے۔ "دُعَآءِ" پر کسرہ اس لیے ہے کہ یہ اصل میں " دُعَائِيْ " تھا، آیات کے فواصل کی موافقت کے لیے یاء حذف کر کے کسرہ اس پر دلالت کے لیے باقی رکھا گیا ہے۔

آیت 41 رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ...... : والد کے لیے بخشش کی دعا وہ وعدہ پورا کرنے کے لیے تھی جو انھوں نے گھر سے نکلتے وقت اس سے کیا تھا، مگر جب وہ شرک ہی پر فوت ہوگیا اور اللہ سے اس کی دشمنی ختم ہونے کی امید ہی نہ رہی تو وہ اس سے صاف بری ہو گئے۔ (دیکھیے توبہ: ١١٤ ) رہی اپنی والدہ کے لیے دعا تو شاید وہ پہلے ہی مسلمان ہو چکی ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق تفصیل سے کچھ بیان نہیں فرمایا۔ تمام مومنین کے حق میں مغفرت کی دعا نوح علیہ السلام (نوح: ٢٨ ) سے لے کر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ( بخاری: ٧٥١٠ ) تک انبیاء اور اہل ایمان کرتے چلے آئے ہیں۔ (دیکھیے حشر: ١٠ )

آیت 42 ① وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا ...... : "الظّٰلِمُوْنَ" سے مراد یہاں کفار اور مشرکین ہیں اور یہ بات اس سورت کی آیت ( ٤٤ ) سے صاف واضح ہو رہی ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان کفار کو مہلت دے رہا ہے تو مت سمجھو کہ وہ ان کے اعمال سے بے خبر ہے۔

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾ وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾

اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے، ان کی نگاہ ان کی طرف نہیں لوٹے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے ﴿۴۳﴾ اور لوگوں کو اس دن سے ڈرا جب ان پر عذاب آئے گا، تو وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں قریب وقت تک مہلت دے دے، ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ اور کیا تم نے اس سے پہلے قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تمھارے لیے کوئی بھی زوال نہیں ﴿۴۴﴾

② اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ ……: ''تَشْخَصُ'' باب ''مَنَعَ'' سے ہے، ''شُخُوْصٌ'' کا معنی ہے خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے آنکھوں کا کھلا رہ جانا، حرکت نہ کرنا۔

**آیت 43** ''مُهْطِعِيْنَ'' تیز دوڑنے والے۔ ''أَهْطَعَ يُهْطِعُ'' (افعال) کا معنی ہے تیز دوڑنا۔ یہ لفظ سورۂ قمر (۸) اور سورۂ معارج (۳۶) میں بھی انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے، یعنی قبروں سے نکل کر صور کی آواز کی طرف تیزی سے اس طرح دوڑ کر جا رہے ہوں گے کہ سر اوپر کی طرف اٹھے ہوئے اور آنکھیں کھلی، ٹکٹکی بندھی ہوگی۔ ''مُقْنِعِيْ'' یہ لفظ اصل میں باب افعال سے مذکر اسم فاعل ''مُقْنِعِيْنَ'' تھا، ''رُءُوْسِهِمْ'' کی طرف مضاف ہونے سے نون گر گیا، اس کا معنی ہے دائیں بائیں دیکھے بغیر اوپر کو سر اٹھانا، بعض نے اس کا معنی سر جھکانا بھی کیا ہے۔ (طنطاوی) ''أَفْئِدَةٌ'' ''فُؤَادٌ'' کی جمع ہے، بمعنی دل۔ ''هَوَآءٌ'' کا معنی ہے خالی، یعنی ان کے دل گھبراہٹ کی وجہ سے سوچ سمجھ سے خالی ہوں گے۔

**آیت 44** ① وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ ……: یعنی لوگوں کو اس دن سے ڈرایے۔ لوگوں سے مراد تمام لوگ ہیں، کیونکہ ڈرانے کی ضرورت تو نیک و بد ہر شخص کو ہے۔ اگرچہ اہل ایمان کی جزا کا بھی وہی دن ہے مگر یہاں مقام ڈرانے کا ہے، اس لیے اسی کا ذکر فرمایا، یا ''النَّاسَ'' سے خصوصاً کفار مراد ہیں۔ عذاب کا دن ظالموں کے لیے دنیا میں کسی وقت اور کسی صورت میں ہو سکتا ہے، موت کا وقت بھی مراد ہے اور قیامت کا بھی۔ اس وقت کفار اللہ تعالیٰ کی دعوت قبول کرنے اور رسولوں کی پیروی کرنے کے لیے مہلت مانگیں گے، مگر مہلت کہاں۔ اس مفہوم کی آیات قرآن مجید میں بہت ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون (۹۹، ۱۰۰)، سورۂ سجدہ (۱۲) اور منافقون (۹، ۱۰)۔

② اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ ……: ''زَوَالٍ'' کا معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ، یا ایک حالت سے دوسری کی طرف منتقل ہونا ہے، یہاں مراد دوبارہ زندہ ہو کر اور قبروں سے نکل کر آخرت کی زندگی کی طرف منتقل ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی

وَ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿٤٥﴾ وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿٤٦﴾

اور تم ان لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں آباد رہے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور تمھارے لیے خوب واضح ہو گیا کہ ہم نے ان کے ساتھ کس طرح کیا اور ہم نے تمھارے لیے کئی مثالیں بیان کیں ﴿٤٥﴾ اور بے شک انھوں نے تدبیر کی، اپنی تدبیر اور اللہ ہی کے پاس ان کی تدبیر ہے اور ان کی تدبیر ہرگز ایسی نہ تھی کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں ﴿٤٦﴾

طرف سے فرشتے انھیں کہیں گے کہ تم نے تو دنیا میں قسمیں کھائی تھیں کہ مرنے کے بعد ہمیں کبھی دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کا مقصد انھیں ان کا ماضی یاد دلا کر مزید ذلیل و خوار کرنا ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ النحل : ٣٨ ] ”اور انھوں نے اپنی پکی قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے۔ کیوں نہیں! وعدہ ہے اس کے ذمے سچا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تم تو ایسے متکبر بن گئے اور موت کو بھول بیٹھے تھے کہ قسمیں اٹھاتے تھے کہ ہمارے عروج کو کبھی زوال نہیں۔

**آیت 45** وَ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ...... : یعنی تم لوگ اسی عرب، یمن، عراق اور مصر وغیرہ میں رہ رہے ہو جہاں تم سے پہلے عاد، ثمود، قوم نوح و ابراہیم، قوم لوط اور قوم فرعون رہتے تھے اور ان کے گناہوں کی سزا میں ہم نے ان پر جو عذاب نازل کیے وہ سب تمھیں اچھی طرح معلوم ہو چکے، گو تم زبان سے اقرار نہیں کرتے۔ ہم نے تو تمھیں اپنی کتابوں میں اور اپنے پیغمبروں کی زبانی مثالیں دے دے کر بھی سمجھایا، مثلاً مکھی کی مثال (حج : ٧٣ )، عنکبوت یعنی مکڑی کی مثال۔ ( عنکبوت : ٤١ )، کتے کی مثال (اعراف : ١٧٦ ) اور سراب کی مثال (نور : ٣٩ ) وغیرہ۔ اس کے علاوہ پہلے کفار کے انجام بطور مثال بھی مراد ہو سکتے ہیں، مثلاً عاد و ثمود، فرعون، قوم نوح وغیرہم۔ دیکھیے سورۂ رعد (٦) اور یونس (١٠٢)۔

**آیت 46** ❶ وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ ...... : یعنی ان پہلے کفار اور موجودہ کفار نے اپنے انبیاء اور اہل ایمان کے خلاف اپنی زیادہ سے زیادہ اور خطرناک سے خطرناک جو بھی خفیہ تدبیر اور سازش وہ کر سکتے تھے کی۔ ” مَكْرَهُمْ “ سے یہی مراد ہے اور اللہ کو ان کی ہر سازش کا علم تھا۔ اس آیت کے تحت تفسیروں میں نمرود کا قصہ بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو صحت کے ساتھ ثابت نہیں۔ (رازی)

❷ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ : یہ ” اِنْ “ نافیہ (یعنی نہیں کے معنی میں ) ہے، اس کے بعد لام پر کسرہ ہے، اسے لام جحد کہتے ہیں جو نفی کی تاکید کے لیے آتا ہے اور اس کے بعد فعل مضارع ” اَنْ “ کے ساتھ منصوب ہوتا ہے جو لام جحد

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

پس تو ہرگز گمان نہ کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا ہے۔ یقیناً اللہ سب پر غالب، بدلہ لینے والا ہے ﴿۴۷﴾ جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور سب آسمان بھی اور لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، جو اکیلا ہے، بڑا زبردست ہے ﴿۴۸﴾

کے بعد وجوباً محذوف ہوتا ہے۔ عام قراءت یہی ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ ’’ان کی تدبیر ہرگز ایسی نہ تھی کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں‘‘ یعنی اللہ کا دین جو پہاڑوں کی طرح مستحکم ہے ان کی سازشیں کسی صورت اسے نقصان نہ پہنچا سکتی تھیں۔

کسائی کی قراءت اس سے مختلف ہے، وہ ’’لَتَزُوْلَ‘‘ کو لام کے فتح کے ساتھ اور ’’تَزُوْلُ‘‘ کو مرفوع پڑھتے ہیں۔ اس صورت میں ’’اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ‘‘ میں ’’اِنْ‘‘ ’’اِنَّهٗ‘‘ کا (یعنی حرف مشبہ بالفعل ’’اِنَّ‘‘ اور اس کے اسم ضمیر شان ’’ہٗ‘‘ کا قائم مقام) مخفف ہے اور ’’لَتَزُوْلُ‘‘ میں لامِ ابتدا تاکید کے لیے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ یقیناً ان کی تدبیر اور سازش ایسی خطرناک اور شدید خوف ناک تھی کہ پہاڑ بھی (اگر کسی طرح اپنی جگہ سے ٹل سکتے تو) ان سازشوں سے ضرور ہی ٹل جاتے۔

یاد رہے کہ یہ ترجمہ ’’لَتَزُوْلُ‘‘ یعنی لامِ ابتدا مفتوح اور آخری لام مرفوع پڑھنے کی صورت میں ہوگا، پہلی قراءت (یعنی پہلا لام مکسور اور آخری منصوب) کا یہ ترجمہ اگر کوئی کرلے تو وہ درست نہیں ہوگا۔ معنوی طور پر دوسری قراءت بھی بہت عمدہ ہے اور پہلی بھی۔

**آیت 47** فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ......: اللہ کے وعدے سے مراد دنیا و آخرت میں اللہ کے رسولوں اور اہل ایمان کی نصرت و عزت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [ المؤمن : ۵۱ ] ’’بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔‘‘ مزید دیکھیے سورۂ مجادلہ (۲۱) اور سورۂ ابراہیم (۱۳، ۱۴) کی تفسیر۔ اس سے مقصود ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا اور دوسری طرف آپ کے مخالفین کو متنبہ کرنا ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام سے جو ہم نے وعدے کیے وہ سب پورے کیے اسی طرح اپنے آخری رسول ﷺ سے تائید و نصرت کا جو وعدہ کر رہے ہیں اسے بھی یقیناً پورا کریں گے اور ان لوگوں کو تباہ و برباد کریں گے جو آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں، کیونکہ اللہ سب پر غالب ہے، انتقام والا ہے۔

**آیت 48** ① يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ: اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز زمین و آسمان کی موجودہ

وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

اور تو مجرموں کو اس دن زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہوئے دیکھے گا۔

ل وصورت بدل جائے گی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( تَكُوْنُ الْأَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُبْزَةً وَاحِدَةً يَتَكَفَّؤُهَا الْجَبَّارُ بِيَدِهِ كَمَا يَكْفَؤُ أَحَدُكُمْ خُبْزَتَهُ فِي السَّفَرِ نُزُلًا لِأَهْلِ الْجَنَّةِ )) [ بخاري، الرقاق، باب يقبض الله الأرض يوم القيامة : ۶۵۲۰۔ مسلم : ۲۷۹۲ ] ''قیامت کے دن زمین ایک روٹی بن جائے گی، جبار (اللہ تعالیٰ) اسے اپنے ہاتھ میں الٹ پلٹ کرے گا جس طرح تم میں سے کوئی شخص سفر میں اپنی روٹی الٹ پلٹ کرتا ہے، اہل جنت کی مہمان نوازی کے لیے۔''

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے: (( يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى أَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ كَقُرْصَةِ نَقِيٍّ، لَيْسَ فِيْهَا مَعْلَمٌ لِأَحَدٍ )) [ بخاري، الرقاق، باب يقبض الله الأرض يوم القيامة : ۶۵۲۱۔ مسلم : ۲۷۹۰ ] ''لوگ قیامت کے دن سفید مٹیالی زمین پر اکٹھے کیے جائیں گے، جیسے میدے کی روٹی ہوتی ہے، اس میں کسی کا کوئی نشان نہیں ہوگا۔'' قرآن مجید میں بھی ہے کہ قیامت کے دن زمین صاف چٹیل میدان بن جائے گی جس میں کوئی بلندی یا پستی نظر نہیں آئے گی۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۱۰۵ تا ۱۰۷) رہا یہ سوال کہ یہ تبدیلی زمین و آسمان کی ذات میں ہوگی یا ان کی صفات میں، تو اس کے بارے میں قرآن مجید یا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز ثابت نہیں، اس لیے ہمیں اسی پر یقین رکھنا ہوگا جو قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

② وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ : یہ ان مشرکین کے رد کے لیے فرمایا جو اپنے شرکاء کا بھی کچھ اختیار سمجھتے ہیں کہ اس دن سب لوگ اس اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے جو اکیلا ہے، بڑا زبردست ہے، کوئی دوسرا کسی اختیار کا مالک نہ ہوگا۔

آیت 49 ① وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ : ''قَرَنٌ'' قاف اور راء کے فتحہ کے ساتھ، وہ رسی جس میں دو بیل یا دو آدمی اکٹھے بندھے ہوتے ہیں۔ ''مُقَرَّنِيْنَ'' کئی آدمی جو آپس میں اکٹھے جکڑے ہوتے ہوں۔ سورۂ ص (۳۸) میں ہے: ﴿وَاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ یعنی سلیمان علیہ السلام کے تابع کئی جن کر دیے جو زنجیروں میں باہم جکڑے ہوئے تھے۔ لسان العرب میں ہے کہ ''مُقَرَّنِيْنَ'' یا تو ''مَقْرُوْنِيْنَ'' کے معنی میں ہے، یا باب تفعیل تکثیر کے لیے ہے، یعنی کئی مجرم آپس میں زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہوں گے۔

② فِي الْاَصْفَادِ : ''الْاَصْفَادِ'' ''صَفَدٌ'' (فاء کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے جو اس زنجیر کو کہتے ہیں جو پاؤں میں ڈالی جائے، یا وہ طوق جس کے ساتھ ہاتھ پاؤں کو گردن کی طرف باندھ دیا جاتا ہے۔ [ الوسيط للطنطاوي ] یعنی اے مخاطب! تو

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

ان کی قمیصیں رال (بیروزا) کی ہوں گی اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپے ہوگی ﴿۵۰﴾

اس دن کئی مجرموں کو ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں بندھے ہوئے دیکھے گا۔ ہر قسم کا مجرم اپنے جیسے مجرموں کے ساتھ جکڑا ہوا ہوگا۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۱۳) اور سورۂ حاقہ (۳۰ تا ۳۳) اور ہر فاسق اپنے جیسے فاسق کے ساتھ ہوگا۔ دیکھیے سورۂ صافات (۲۲، ۲۳) اور مریم (۶۸)۔

**آیت 50** سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ : "سَرَابِيْلُ" "سِرْبَالٌ" کی جمع ہے، بمعنی قمیص۔ "قَطِرَانٍ" کا معنی قاموس اور لسان العرب میں ہے ابہل، صنوبر (چلغوزہ) اور اس قسم کے درختوں مثلاً چیڑ یا دیار وغیرہ سے نکلنے والی گوند، یعنی رال یا گندہ بیروزا جو تیزی سے جلتا ہے اور سخت بدبودار ہوتا ہے، خارش زدہ اونٹوں کو ملا جاتا ہے۔ تمام مترجمین کی طرح میں نے بھی پہلے اس کا ترجمہ گندھک کیا تھا، مگر تفسیر کے وقت مختلف لغات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ "قَطِرَانٍ" رال (بیروزا) ہے۔ بعض اہل علم نے اس کا ترجمہ تارکول کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس کا مادہ "قَطْرٌ" ٹپکنے کا مفہوم رکھتا ہے، اس لیے اس میں وہ تمام مائع چیزیں مراد ہو سکتی ہیں جو اشتعال پذیر یعنی شعلہ پکڑنے والی ہیں۔ (واللہ اعلم) ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلنَّائِحَةُ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِنْ قَطِرَانٍ، وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ » [ مسلم، الجنائز، باب التشدید فی النیاحة : ۹۳۴ ] "نوحہ یعنی ماتم و بین کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گی کہ اس پر "قَطِرَانٌ" کی قمیص اور خارش کا کرتہ ہوگا۔" ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے "مِنْ قَطِرٍ آنٍ" یعنی ان کی قمیصیں کھولتے ہوئے تانبے سے ہوں گی، مگر پہلی قراءت "قَطِرَانٍ" متواتر اور راجح ہے۔ چہروں کو آگ سے ڈھانپنے کا خصوصاً ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ جسم کا سب سے باعزت حصہ ہے، اس کا حال یہ ہوگا تو دوسرے حصوں کا کیا حال ہوگا۔

یہ معاملہ کفار کے ساتھ ہوگا، کیونکہ مومنوں کے سجدے کے آثار (نشانات) کو جلانا اللہ تعالیٰ نے آگ پر حرام کر دیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی حدیث، جس میں قیامت کے کچھ احوال بیان ہوئے ہیں، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « حَتّٰى إِذَا فَرَغَ اللّٰهُ مِنَ الْقَضَاءِ بَيْنَ الْعِبَادِ، وَ أَرَادَ أَنْ يُخْرِجَ بِرَحْمَتِهِ مَنْ أَرَادَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، أَمَرَ الْمَلَائِكَةَ أَنْ يُخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا، مِمَّنْ أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَرْحَمَهُ مِمَّنْ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَيَعْرِفُوْنَهُمْ فِي النَّارِ بِأَثَرِ السُّجُوْدِ، تَأْكُلُ النَّارُ ابْنَ آدَمَ إِلَّا أَثَرَ السُّجُوْدِ، حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ أَنْ تَأْكُلَ أَثَرَ السُّجُوْدِ » [ بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ وجوہ یومئذ ناضرة...... ﴾ : ۷۴۳۷ ] "جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلے سے فارغ ہوں گے اور اہل نار میں سے اپنی رحمت کے ساتھ جسے نکالنا چاہیں گے تو فرشتوں کو حکم دیں

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۱/۱۹

تاکہ ہر جان کو اس کا بدلہ دے جو اس نے کمایا بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۵۱﴾ یہ لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے اور تاکہ انھیں اس کے ساتھ ڈرایا جائے اور تاکہ وہ جان لیں کہ حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور تاکہ عقلوں والے نصیحت حاصل کریں ﴿۵۲﴾

گے کہ وہ ان لوگوں کو آگ سے نکال لائیں جنھوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تھا، ان لوگوں میں سے جن پر اللہ رحم کرنا چاہتا ہوگا، جو ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شہادت دیتے ہوں گے تو وہ انھیں آگ میں سجدے کے نشان کے ساتھ پہچانیں گے۔ آگ ابن آدم کو کھا جائے گی مگر سجدے کے نشان کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آگ پر حرام کر دیا ہے کہ وہ سجدے کے نشان کو کھائے۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والے وہ ہوں گے جو شرک سے پاک ہوں گے اور جن کے جسم پر سجدے کے نشان ہوں گے۔ بے نماز اس نشان سے محروم ہوتے ہیں، انھیں اپنا انجام سوچ لینا چاہیے۔

**آیت 51** ① **لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ** : یعنی قیامت کے دن کا یہ سارا سلسلہ اس لیے ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی کمائی کی جزا دے، نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد جزا دے۔

② **اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ** : اس میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک تو یہ کہ یوم حساب بہت جلد آنے والا ہے، فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ ﴾ [ الأنبیاء : ۱ ] ''لوگوں کے لیے ان کا حساب بہت قریب آ گیا'' اور فرمایا: ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [ النحل : ۱ ] ''اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔'' دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگتی، آنکھ جھپکنے میں سب کچھ سامنے آ جائے گا، فرمایا: ﴿ وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ۱۳، ۱۴ ] ''اور ہر انسان کو، ہم نے اسے اس کا نصیب اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا۔ اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب کافی ہے۔''

**آیت 52** **هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ** ...... : اس آیت میں قرآن مجید نازل کرنے کے چار مقصد بیان ہوئے ہیں: ① اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچ جائے۔ ② اس کے ذریعے سے وہ آگاہ ہو جائیں اور ڈر جائیں۔ ③ لوگوں کو علم ہو جائے کہ عبادت صرف ایک اللہ کی کرنی ہے۔ ④ عقلوں والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ رازی نے فرمایا، معلوم ہوا کہ انسان میں عقل ہی اصل ہے، یہ نہ ہو تو وہ کبھی نصیحت حاصل نہیں کر سکتا۔

سُوْرَۃُ الْحِجْر ۱۵ مکیۃ ۵۴ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ۹۹ رُكُوْعَاتُهَا ۶

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓرٰ۔ یہ کامل کتاب اور واضح قرآن کی آیات ہیں ①

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ②

بہت بار چاہیں گے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کاش! وہ کسی طرح کے مسلم ہوتے ②

**آیت 1** الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ: "اَلْكِتٰبِ" الف لام کی وجہ سے "کامل کتاب" ترجمہ کیا گیا ہے۔ "اَلْكِتٰبِ" اور "قُرْاٰنٍ" دونوں مبالغہ کے لیے مصدر ہیں (جن کا معنی ہے لکھنا اور پڑھنا) جو اسم مفعول کے معنی میں ہیں، یعنی یہ اس کلام کی آیات ہیں جو بے شمار بار لکھا ہوا اور بے حد و حساب پڑھا ہوا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴾ [ الواقعۃ : ۷۷، ۷۸ ] "بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے، جو ایک ایسی کتاب میں ہے جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔" لوح محفوظ میں لکھے جانے اور جبریل علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک نہ اس کے لکھنے والوں کا شمار ہے نہ پڑھنے والوں کا۔ پھر خوبی یہ کہ یہ کتاب ہے تو کامل (الف لام کی وجہ سے) اور قرآن ہے تو ہر بات کو کھول کر بیان کرنے والا۔ قیامت تک کوئی اس جیسی ایک سورت بھی بنا کر نہیں لا سکتا۔

**آیت 2** ① رُبَمَا: "رُبَّ" حرف جر ہے، "مَا" بمعنی وقت۔ "رُبَّ" کا لفظ تقلیل کے لیے آتا ہے، یعنی کسی وقت، جیسے: "رُبَّ اَخٍ لَمْ تَلِدْهُ اُمُّكَ" "کئی بھائی ہیں جنھیں تیری ماں نے نہیں جنا" اور تکثیر کے لیے بھی، مثلاً "رُبَّمَا يَنْجُو الذَّكِيُّ" "بہت دفعہ ذہین آدمی کامیاب ہو جاتا ہے۔" فرق موقع کو ملحوظ رکھ کر ہوتا ہے، مثلاً یہی مثال اگر اس طرح ہو کہ "رُبَّمَا يَنْجُ الْكَسُوْلُ" تو معنی ہوگا "کسی وقت سست آدمی بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔" اس آیت میں بعض علماء نے یہ لفظ تقلیل کے لیے قرار دیا ہے، یعنی "کسی وقت" اور بعض نے تکثیر کے لیے، یعنی بہت بار، صاحب مغنی اللبیب کے بقول یہاں یہی معنی راجح ہے، کیونکہ مرنے کے بعد کفار کا ہر لحہ اسی حسرت میں گزرے گا۔ "لَوْ" تمنی کے لیے ہے۔ ایسی چیز کی خواہش جو ناممکن ہو تمنی کہلاتی ہے، ممکن کی خواہش "ترجّی" کہلاتی ہے۔

② يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یہ سورت مکی ہے، جب مسلمان ہر طرح کمزور اور مغلوب تھے تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی کہ وہ وقت آ رہا ہے جب یہ کافر چاہیں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے، مگر وقت نکل جانے کے بعد کسی کام کی خواہش کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت سے مراد دنیا میں ایسے مواقع بھی ہیں جب مسلمانوں کو فتح و کامرانی اور کفار کو شکست و رسوائی حاصل ہوگی، جیسے بدر، خیبر اور فتح مکہ وغیرہ اور کفار چاہیں گے کہ اس وقت مسلمان ہوتے تو ہمیں بھی یہ عزت و غنیمت ملتی اور موت کے وقت بھی اس تمنا کا اظہار کریں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ③

انھیں چھوڑ دے، وہ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور انھیں امید غافل رکھے، پھر جلدی جان لیں گے ③

لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ﴾ [ المؤمنون : ۹۹، ۱۰۰ ] ''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے تو کہتا ہے اے میرے رب! مجھے واپس بھیجو، تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کرلوں۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک بات ہے جسے وہ کہنے والا ہے۔'' پھر موت کے بعد کی سختیوں میں، خصوصاً جب آگ میں داخل ہونے کو ہوں گے، فرمایا: ﴿وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ وُقِفُوْا عَلَي النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ الأنعام : ۲۷ ] ''اور کاش! تو دیکھے جب وہ آگ پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش! ہم واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔'' اور سب سے زیادہ حسرت کے ساتھ یہ خواہش اس وقت کریں گے جب مسلمانوں میں سے جہنم میں جانے والے سب کے سب جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔

ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اہل نار آگ میں جمع ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ اہل قبلہ میں سے بھی وہ لوگ ہوں گے جنھیں اللہ چاہے گا تو کفار مسلمانوں سے کہیں گے: ''کیا تم مسلم نہیں تھے؟'' وہ کہیں گے: ''کیوں نہیں؟'' کفار کہیں گے: ''پھر تمھارے اسلام نے تمھیں کیا فائدہ دیا کہ تم بھی ہمارے ساتھ آگ میں پہنچ گئے؟'' وہ کہیں گے: ''ہمارے کچھ گناہ تھے جن کی وجہ سے ہم پکڑے گئے۔'' انھوں نے جو کچھ کہا اللہ تعالیٰ اسے سنے گا اور جو اہل قبلہ میں سے ہوں گے ان کے متعلق حکم دے گا اور وہ نکال لیے جائیں گے، تو جب جہنمی یہ دیکھیں گے تو کہیں گے: ''کاش! ہم بھی مسلم ہوتے اور ہم بھی اسی طرح نکل جاتے جیسے یہ نکلے ہیں۔'' (ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے) کہا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ الۗرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [ السنة لابن أبي عاصم، باب ذكر من يخرج الله بتفضله من النار : ۸۴۳۔ مستدرك حاكم : ۲/ ۲۴۲، ح : ۲۹۵۴ ] شیخ البانی رحمہ اللہ نے ''ظلال السنۃ'' میں اسے صحیح کہا ہے اور اس مفہوم کی کئی احادیث بیان کی ہیں۔

③ ''مُسْلِمِيْنَ'' نکرہ ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ ''کاش! وہ کسی طرح کے مسلمان ہوتے'' یعنی گناہ گار بھی ہوتے تو آخر جہنم سے نکل ہی جاتے۔

**آیت 3** ① ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا: ''ذَرْ'' مثال واوی سے فعل امر ہے، اس کا صرف امر اور مضارع استعمال ہوتا ہے، اس کے باقی صیغوں کی جگہ ''تَرَكَ'' کے مشتقات استعمال ہوتے ہیں۔ ''يُلْهِهِمُ'' ''لَهْوٌ'' سے باب افعال کا مضارع ''يُلْهِيْ'' ہے جو ''ذَرْ'' کا جواب ہونے کی وجہ سے یا لام امر مقدر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، اس کی ''یاء'' اور ''يَاْكُلُوْا'' اور ''يَتَمَتَّعُوْا'' کا نون بھی اسی وجہ سے گر گئے ہیں۔ یہ سارے امر انھیں ڈانٹنے کے لیے ہیں، یہ نہیں کہ انھیں اجازت دی جا رہی ہے۔ اس معنی کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ مرسلات (۴۶)، سورۂ زخرف (۸۳) اور سورۂ طور (۴۵) وغیرہ۔ ''يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا'' سے معلوم ہوا کہ کفار کی زندگی کا مقصد ہی بس یہ ہے۔ ''الْاَمَلُ'' امید، کسی چیز کے حصول کی آرزو، عموماً جس کا حصول بعید ہو۔

وَ مَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝۴ مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ۝۵ وَ قَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الَّذِىۡ نُزِّلَ عَلَيۡهِ الذِّكۡرُ اِنَّكَ لَمَجۡنُوۡنٌ ۝۶

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس حال میں کہ اس کے لیے ایک مقرر لکھا ہوا وقت تھا ④ کوئی امت اپنے مقرر وقت سے نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ وہ پیچھے رہتے ہیں ⑤ اور انھوں نے کہا اے وہ شخص جس پر یہ نصیحت نازل کی گئی ہے! بے شک تو تو دیوانہ ہے ⑥

② وَيُلۡهِهِمُ الۡاَمَلُ: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَرَزَ بَيْنَ يَدَيْهِ غَرْزًا ثُمَّ غَرَزَ إِلٰى جَنْبِهِ آخَرَ ثُمَّ غَرَزَ الثَّالِثَ فَأَبْعَدَهُ، ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا هٰذَا؟ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ ، قَالَ هٰذَا الْإِنْسَانُ وَهٰذَا أَجَلُهُ وَهٰذَا أَمَلُهُ يَتَعَاطَى الْأَمَلَ يَخْتَلِجُهُ دُوْنَ ذٰلِكَ »[ مسند أحمد : ۱۸/۳، ح : ۱۱۱۳۸، إسناده جيد ] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آگے ایک لکڑی گاڑی، پھر ایک اس کے پہلو میں گاڑی، پھر تیسری اس سے دور گاڑی، پھر فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟“ لوگوں نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔“ فرمایا: ”یہ انسان ہے اور یہ اس کی اجل (موت) ہے اور وہ اس کی آرزو ہے۔ وہ آرزو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اس کے حصول سے پہلے اس کے راستے میں اجل رکاوٹ بن جاتی ہے۔“ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں: « صَلَاحُ أَوَّلِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بِالزُّهْدِ وَالْيَقِيْنِ وَيُهْلَكُ آخِرُهَا بِالْبُخْلِ وَالْأَمَلِ »[ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۱۵/۳، ح : ۳۴۲۷ ] ”اس امت کے اول کی درستگی زہد اور یقین کے ساتھ ہے اور اس کا آخری حصہ بخل اور امل (امید) کے ساتھ ہلاک ہوگا۔“

**آیت 4** اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ : وہ مقرر لکھا ہوا وقت جب تک باقی رہا اللہ تعالیٰ نے انھیں مہلت دی، لیکن جونہی مدت پوری ہوئی فوراً انھیں پکڑ لیا گیا۔ اس سے مقصود کفار مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ تم نے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے اور ٹھٹھا اڑانے کی جو روش اختیار کر رکھی ہے اور اس پر ابھی تک ہم نے گرفت نہیں کی تو اس سے تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ تمھاری گرفت ہوگی ہی نہیں؟

**آیت 5** وَمَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ : یعنی نہ وہ وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے اور نہ وقت مقرر پر ہلاک ہونے سے بچ سکتی ہے۔ نیز دیکھیے سورۂ انعام (۲)۔

**آیت 6** ① وَقَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الَّذِىۡ نُزِّلَ عَلَيۡهِ الذِّكۡرُ : وہ یہ بات بھی استہزا کے لیے کہہ رہے ہیں، یہ نہیں کہ وہ اسے مانتے تھے۔ ”الذِّكۡرُ“ سے ہر وہ چیز مراد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، اس میں قرآن مجید بھی شامل ہے اور حدیث بھی۔

② اِنَّكَ لَمَجۡنُوۡنٌ : پچھلی آیات میں کفار کو کتاب اللہ کے جھٹلانے پر ڈانٹا گیا تھا، اب ان کی سرکشی کا بیان ہے اور ان کے رسول کے ساتھ استہزا اور آپ کو جھٹلانے کا بیان ہے۔ وہ لوگ مذاق کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پاگل اور دیوانہ کہتے تھے، حالانکہ

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا، اگر تو سچوں میں سے ہے ⑦ ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے ⑧ بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں ⑨

---

آپ سب سے زیادہ عقل مند تھے۔ یہ ان کے کفر و استہزا کی بدترین صورت تھی اور انھوں نے یہ بات اس قدر مشہور کر رکھی تھی کہ صحیح مسلم میں ضماد ازدی کا قصہ مذکور ہے کہ وہ ازد قبیلے کا ایک فرد تھا، مکہ آیا تو اس نے مکہ کے بے وقوفوں سے سنا کہ آپ مجنون ہیں، وہ آپ کے پاس آیا اور آپ کو آپ کا علاج کرنے کی پیش کش کی، آپ نے خطبہ مسنونہ پڑھا، اس نے درخواست کی کہ آپ اسے پھر پڑھیں، آپ نے تین دفعہ یہ خطبہ پڑھا، اس نے اس کی بے حد تعریف کی اور اسی پر مسلمان ہو گیا۔ [ مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة و الخطبة : ۸۶۸ ] سبحان اللہ! علاج کے لیے آنے والے کا خود علاج ہو گیا۔

**آیت 7** لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ : کہ فرشتے سامنے آ کر گواہی دیں کہ یہ واقعی اللہ کا سچا پیغمبر ہے، اس کی پیروی اختیار کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے، فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ﴾ [ الأنعام : ۸ ] ''اور انھوں نے کہا اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا؟'' اور دیکھیے سورۂ زخرف (۵۳) اور سورۂ فرقان (۲۱، ۲۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آپ ﷺ ان کو عذاب سے ڈراتے تو انھوں نے ''لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ'' کہہ کر عذاب کا مطالبہ کیا ہو۔ (کبیر)

**آیت 8** مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ ...... : یعنی فرشتے تو عین اس وقت نازل ہوتے ہیں جب کسی شخص کی موت کا وقت آ گیا ہو، یا کسی قوم پر عذاب کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہو، اس کے بعد انھیں مہلت نہیں دی جاتی۔

**آیت 9** ❶ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ ...... : یہاں اللہ تعالیٰ نے لفظ ''قرآن'' کے بجائے لفظ ''ذکر'' استعمال فرمایا، جس میں سب سے پہلے قرآن آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ [ یوسف : ۲ ] ''بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو۔'' اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال یعنی حدیث بھی ذکر (نصیحت) ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ کو اپنا نازل کردہ ذکر قرار دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ ﴾ [ الطلاق : ۱۰، ۱۱ ] ''یقیناً اللہ نے تمھاری طرف ایک ذکر (نصیحت) نازل کیا ہے، جو ایسا رسول ہے کہ تمھارے سامنے اللہ کی واضح بیان کرنے والی آیات پڑھتا ہے۔'' علاوہ ازیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بار بار آپ ﷺ جو کریں اسے کرنے کا اور جو کہیں اسے ماننے کا حکم دیا، پہلے کا نام اتباع ہے، دوسرے کا اطاعت ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ﴾ [ آل عمران : ۳۱ ] ''کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ﴾ [ آل عمران : ۳۲ ] ''کہہ دے اللہ اور رسول کا حکم مانو۔''

2 إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا: اس جملے میں اللہ تعالیٰ نے بے حد تاکید کے لیے لفظ ''ہم نے'' کو تین دفعہ دہرایا "إِنَّا" میں "نَا" (ہم نے)، دوسرا "نَحْنُ" (ہم نے) اور تیسرا "نَزَّلْنَا" میں "نَا" (ہم نے)۔ بہت کوشش سے بھی تینوں تاکیدوں کا ترجمہ فصیح اردو میں مشکل ہے۔

3 یعنی یہ ''ذکر'' جس کے لانے والے کو تم دیوانہ کہہ رہے ہو، یہ تو خود ہم ہی نے نازل کیا اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ قاضی اسماعیل بصری سے پوچھا گیا کہ اس میں کیا راز ہے کہ پہلی کتابیں قرآن کی طرح محفوظ نہ رہ سکیں؟ انھوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت انسانوں کے ذمے لگائی تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَا ٱلتَّوْرَىٰةَ ...... بِمَا ٱسْتُحْفِظُوا۟ مِن كِتَٰبِ ٱللَّهِ﴾ [ المائدة : ٤٤ ] ''بے شک ہم نے تورات اتاری...... اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے تھے'' جب کہ قرآن کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی۔ (الوسیط) ایک حکمت یہ بھی ہے کہ قرآن وحدیث قیامت تک کے لیے تمام لوگوں کے لیے ہیں، جب کہ اس سے پہلے ہر کتاب ایک قوم اور ایک وقت تک کے لیے تھی۔ جس طرح قرآن اپنے الفاظ اور معانی کے اعتبار سے معجزہ ہے کہ جن وانس جمع ہو کر بھی اس جیسی ایک سورت نہیں بنا سکتے، اسی طرح یہ بھی اس کا معجزہ ہے کہ اس میں رد و بدل نہیں ہو سکے گا۔ قرآن کی حفاظت کا یہ وعدہ حیرت انگیز طور پر پورا ہو رہا ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس طرح محفوظ ہو کہ اس کے کسی ایک حرف میں رد و بدل نہ ہوا ہو۔ دنیا بھر میں قرآن کے جتنے نسخے موجود ہیں ان میں معمولی سا بھی اختلاف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ مسلمانوں پر زوال اور غلامی کے ایام بھی آئے، مگر قرآن کی حفاظت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت جو کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوئی اور قرآن کی اس طرح حفاظت کے غیر مسلم مخالف بھی معترف ہیں۔

4 منکرینِ حدیث عموماً حدیث سے انکار کے لیے کہتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا، مگر حدیث کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا، اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ ان سے پوچھیے کہ اس کی کیا دلیل ہے؟ تو وہ یہ آیت پڑھیں گے، حالانکہ اس میں لفظ ''قرآن'' نہیں بلکہ "الذِّكْرَ" ہے، جس میں حدیث بھی شامل ہے اور اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے اتنا زبردست اور عجیب و غریب انتظام فرمایا کہ دنیا میں کسی شخص کے اقوال و افعال اور احوال اس طرح محفوظ نہیں ہیں جس طرح ہمارے نبی کریم ﷺ کے محفوظ ہیں۔ اس کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور محدثین نے اتنی محنت کی کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی ہمارے لیے محفوظ فرما دی، جس کی پیروی اور اطاعت ہمارے لیے لازم تھی۔ اس حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں رجال اور اصول حدیث کے علوم کا الہام فرمایا اور انھوں نے ایک لاکھ سے زائد افراد کی زندگی کے حالات، ان کا قابل اعتماد ہونا یا نہ ہونا، ان کا سن پیدائش و وفات محفوظ فرما دیا، جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت جو آپ ﷺ کی طرف منسوب ہے، صحیح ہے یا نہیں۔ کسی نبی کی زندگی کے حالات اور اقوال و افعال کے لیے نہ یہ اہتمام کسی امت کو نصیب ہوا اور نہ کسی نبی کے حالات اس کا ہزارواں حصہ بھی ملتے ہیں جس قدر محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات بحفاظت دنیا تک پہنچے ہیں۔ حقیقت یہ

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے اگلے لوگوں کے گروہوں میں رسول بھیجے ⑩ اور ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا تھا مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے ⑪ اسی طرح ہم یہ بات مجرموں کے دلوں میں داخل کر دیتے ہیں ⑫ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور یقیناً (یہی) پہلے لوگوں کا طریقہ گزرا ہے ⑬

ہے کہ اگر حدیث محفوظ نہ ہو تو قرآن پر عمل ناممکن ہے، نماز، زکوۃ، روزہ، حج وغیرہ غرض کوئی چیز بھی حدیث کی تفصیل کے بغیر ادا کرنا ناممکن ہے۔ رہی یہ بات کہ احادیث میں ضعیف روایات کی آمیزش ہے تو جواب یہ ہے کہ جب اس کا حل موجود ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ محدثین نے صحیح وضعیف کو الگ الگ کر دیا ہے۔ جس طرح شیعہ کے عقیدے سے کہ یہ قرآن وہ نہیں جو علی رضی اللہ عنہ یا اہل بیت کے پاس تھا، قرآن مجید کی صحت وعظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ بے دلیل دعویٰ کچھ وزن نہیں رکھتا اور آج تک ان کے مزعوم قرآن کا کہیں وجود نہیں ملا، اسی طرح منکرین حدیث کے اعتراض سے حدیثوں کی حفاظت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ یہ سب اعتراض لاعلمی یا الحاد کا نتیجہ ہیں اور ان سب کا جواب علمائے اسلام نے بہترین طریقے سے دے دیا ہے۔

**آیت 10، 11** وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ ...... : ”شِيَعِ“ ”شِيْعَةٌ“ کی جمع ہے، معنی ہے لوگوں کا ایسا گروہ جو ایک طریقے اور مذہب پر متفق ہو، خواہ نیک ہوں یا بد۔ یہاں یہ لفظ برے شیعہ یعنی بری جماعت کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ۱۵۹] ”بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر لیا اور کئی گروہ بن گئے، تو کسی چیز میں بھی ان سے نہیں۔“ البتہ صافات میں نیک معنی میں ہے: ﴿وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ﴾ [الصافات: ۸۳] ”اور بے شک اس کے گروہ میں سے ابراہیم بھی ہے۔“ نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان کے جھٹلانے اور استہزا سے رنجیدہ نہ ہوں، ہر زمانے میں کفار نے انبیاء کی اسی طرح ہنسی اڑائی ہے۔

**آیت 12، 13** كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ...... : ”نَسْلُكُهٗ“ میں ”ہٗ“ ضمیر کے متعلق مفسرین نے دو وجہیں بیان کی ہیں، بعض نے کہا کہ ”ہٗ“ کی ضمیر ”الذِّكْرَ“ کی طرف جا رہی ہے، یعنی ہم مجرموں کے دلوں کے اندر ذکر کو داخل کر دیتے ہیں اور وہ اسے اچھی طرح سنتے اور سمجھتے ہیں، مگر اس طرح کہ وہ باوجود دل سے سمجھنے کے اس پر ایمان بالکل نہیں لاتے اور پہلے لوگوں میں بھی یہی طریقہ گزر چکا ہے اور وہ اسی کی پاداش میں تباہ کیے جاتے رہے ہیں۔ زمخشری، رازی اور سید طنطاوی کی تفسیر کے مطابق ”نَسْلُكُهٗ“ اور ”لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ“ میں ضمیر غائب کا مرجع ایک رہتا ہے۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ

وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾ ع وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا

اور اگر ہم ان پر آسمان سے کوئی دروازہ کھول دیں، پس وہ دن بھر اس میں چڑھتے رہیں ﴿۱۴﴾ تو یقیناً کہیں گے کہ بات یہی ہے کہ ہماری آنکھیں سختی سے باندھ دی گئی ہیں، بلکہ ہم جادو کیے ہوئے لوگ ہیں ﴿۱۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آسمان میں کئی

نے بھی یہی تفسیر ذکر فرمائی ہے۔

دوسری تفسیر امام المفسرین طبری رحمہ اللہ کی ہے کہ "نَسْلُكُهٗ" میں ضمیر "هٗ" "استہزا و کفر" کی طرف جاتی ہے، یعنی ہم مجرموں کے جرائم کی پاداش میں ان کے دلوں میں کفر و استہزا داخل کر دیتے ہیں، اس طرح کہ وہ اللہ کے نازل کردہ ذکر پر بالکل ایمان نہیں لاتے، بلکہ اس سے استہزا کرتے ہیں اور پہلے لوگوں کا طریقہ بھی یہی رہا ہے۔ دونوں تفسیروں کا نتیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔

**آیت 14** وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ ......: "ظَلَّ" اور "بَاتَ" میں وقت بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ "ظَلَّ" دن کو ہونا، "بَاتَ" رات کو ہونا۔ اب ایک عجیب انداز میں ان کی ہٹ دھرمی اور ہر دلیل دیکھ کر بھی ایمان نہ لانے کا بیان ہوتا ہے، یعنی ان کا مطالبہ تو صرف فرشتے لانے کا ہے، اگر اس سے بڑھ کر عین دن کے بارہ بجے روشنی میں سب کے سامنے ہم آسمان کے دروازے کھول دیں اور یہ لوگ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھنے لگیں تو پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

**آیت 14** لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ......: "سَكَرَ يَسْكُرُ سَكْرًا" باندھنا، روکنا اور بند کرنا۔ "سَكَرْتُ الْبَابَ" "میں نے دروازہ بند کیا۔" "سُكِّرَتْ" باب تفعیل مبالغہ کے لیے ہے، یعنی یہی کہیں گے کہ جادو کے زور سے ہماری آنکھیں بالکل بند کر دی گئی ہیں، اس لیے جادو زدہ ہونے کی وجہ سے ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں محض خیال ہے اور فی الواقع انھوں نے یہ کام کر بھی دکھایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ﴾ [القمر: ۱، ۲] "قیامت بالکل قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ) ایک جادو ہے جو گزر جانے والا ہے (یا ہمیشہ سے چلا آنے والا ہے)۔"

**آیت 14** ❶ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا: "بُرُوْجًا" "بُرْجٌ" کی جمع ہے، جو اصل میں بڑے بلند و بالا اور مزین قلعہ یا محل کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ [النساء: ۷۸] "تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔" اس کا اصل معنی نمایاں اور ظاہر ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا: ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ [الأحزاب: ۳۳] "اور پہلی جاہلیت کے زینت لگا کر نمایاں ہونے کی طرح زینت لگا کر ظاہر نہ ہو۔" مزید دیکھیے سورۂ بروج کی پہلی آیت۔ پچھلی

لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ

برج بنائے اور اسے دیکھنے والوں کے لیے مزین کر دیا ہے ﴿۱۶﴾ اور ہم نے اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ کر دیا ہے ﴿۱۷﴾ مگر

آیاتِ رسالت کے بعد اب توحید کا بیان شروع ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل کے لیے پہلے عالم بالا کا ذکر فرمایا ہے، پھر زمین کا، پھر ان کے درمیان کی چیزوں کا اور اس کے بعد آدم و ابلیس کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہم نے آسمان میں عظیم الشان اور نمایاں برج بنائے ہیں، یعنی ستاروں کے نمایاں جھرمٹ، سورج اور چاند کی منازل جس سے رات کو ٹھنڈک والی روشنی اور دن کو تیز روشنی اور حرارت کے حصول کے علاوہ وقت، دنوں، مہینوں اور سالوں کا تعین ہوتا ہے۔ انسانوں، حیوانوں اور پودوں کی نشوونما، ان کی بقا اور بے انتہا ضرورتوں کا بندوبست ہوتا ہے، سمندر کا مدوجزر اور بے شمار فوائد جو تمھارے وہم و گمان میں بھی نہیں، انھی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان سب کو بنانے والا، چلانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے؟ کسی کا دعویٰ ہے تو اسے سامنے لاؤ۔ بعض اہل علم نے "بُرُوْجًا" ان مقامات کو بھی بتایا ہے جہاں آسمان کے محافظ فرشتے رہتے ہیں۔

② وَ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ : اللہ تعالیٰ کی قدرت و توحید کے دلائل میں سے ایک بہت بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اس نے آسمان کو چاند، ستاروں اور سورج سے مزین کر دیا ہے۔ رات کو ستاروں اور چاند کے ساتھ آسمان کی زینت کا نظارہ صحیح طرح وہاں ہوتا ہے جہاں مصنوعی روشنیاں نہ ہوں۔ یہ صرف ایک آسمان ہی پر موقوف نہیں، اس لامحدود قدرت والے نے جو چیز بھی پیدا کی خوب صورت پیدا کی اور اس میں زینت کا خاص اہتمام فرمایا، چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق سب کچھ ہی کمال خوبصورت بنایا، فرمایا: ﴿ الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴾ [ السجدۃ : ۷ ] ''جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش تھوڑی سی مٹی سے شروع کی۔'' اسی لیے رسول اللہ ﷺ صاف ستھرا اور بن سنور کر رہنے کو پسند کرتے تھے، فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ )) [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانہ : ۹۱ ] ''بے شک اللہ خوب صورت ہے، خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔'' وہ سادھوؤں، جوگیوں یا راہبوں اور بے وقوف صوفیوں کی طرح گندے اور بدزیب ہو کر رہنے کو پسند نہیں کرتا۔ وہ دس چیزیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے فطرت کا حصہ قرار دیا، مثلاً کلی، مسواک، زیر ناف کی صفائی وغیرہ، یہ اسی نظافت اور جمال کو کامل رکھتی ہیں۔

**آیت 18،17** ① وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ : یعنی آسمان کو ہم نے ہر مردود شیطان سے محفوظ رکھنے کا زبردست انتظام کر رکھا ہے۔

② اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ...... : سرقہ چوری کو کہتے ہیں، باب افتعال سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی مگر جو نہایت کوشش سے، یا نہایت خفیہ رہ کر چوری کرے۔ "السَّمْعَ" مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، یعنی سنی ہوئی چیز چرا لے۔ "شِهَابٌ" ہر روشنی کرنے والی چیز جو آگ سے پیدا ہو، عموماً ستارہ جو شعلے کی طرح پیچھا کرتا نظر آتا ہے۔ "شِهَابٌ مُّبِيْنٌ" روشن شعلہ۔

شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

جو سنی ہوئی بات چرا لے تو ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ﴿۱۸﴾

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: (( إِذَا قَضَى اللّٰهُ الْأَمْرَ فِي السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَالسِّلْسِلَةِ عَلٰى صَفْوَانٍ ، فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا لِلَّذِيْ قَالَ الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ، فَيَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُو السَّمْعِ وَمُسْتَرِقُو السَّمْعِ هٰكَذَا، وَاحِدٌ فَوْقَ آخَرَ - وَوَصَفَ سُفْيَانُ بِيَدِهِ وَفَرَّجَ بَيْنَ أَصَابِعِ يَدِهِ الْيُمْنٰى ، نَصَبَهَا بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ فَرُبَّمَا أَدْرَكَ الشِّهَابُ الْمُسْتَمِعَ قَبْلَ أَنْ يَرْمِيَ بِهَا إِلٰى صَاحِبِهِ فَيُحْرِقَهُ، وَرُبَّمَا لَمْ يُدْرِكْهُ حَتّٰى يَرْمِيَ بِهَا إِلَى الَّذِيْ يَلِيْهِ، إِلَى الَّذِيْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْهُ حَتّٰى يُلْقُوْهَا إِلَى الْأَرْضِ، فَتُلْقٰى عَلٰى فَمِ السَّاحِرِ فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ، فَيُصَدَّقُ كَذَا وَ كَذَا؟ فَوَجَدْنَاهُ حَقًّا لِلْكَلِمَةِ الَّتِيْ سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ )) [ بخاری، التفسیر، باب قولہ: ﴿ إلا من استرق السمع ...... ﴾ : ۴۷۰۱ ] ”جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم صادر فرماتا ہے تو اس کا کلام سن کر فرشتے اظہار اطاعت و عجز کے لیے اپنے بازو (پر) پھڑ پھڑانے لگتے ہیں، (اس کلام کی آواز ایسی ہوتی ہے) جیسے کسی چٹان پر زنجیر کی آواز۔ پھر جب ان کے دلوں کا خوف جاتا رہتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ اس نے جو فرمایا حق فرمایا اور وہ بلند اور بڑا ہے۔ (اس وقت) فرشتوں سے سنائی دینے والی بات کو چوری سننے والے شیطان سننے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ چوری چھپے سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں“ اور راوی حدیث سفیان نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کھول کر ایک دوسرے کے اوپر کرکے دکھائیں ”پھر بعض اوقات وہ شعلہ سننے والے کو اس سے پہلے جا پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کو جلدی سے بتائے اور اسے جلا دیتا ہے اور بعض اوقات اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے ساتھ والے کو جلدی سے بتا چکا ہوتا ہے، جو اس سے نیچے ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے زمین تک پہنچا دیتے ہیں، تو وہ بات کاہن (نجومی) یا جادوگر کو پہنچا دی جاتی ہے، وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا لیتا ہے تو اس کی بات کو سچا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں، کیا اس نے ہمیں فلاں فلاں دن ایسے ایسے نہیں بتایا تھا اور ہم نے دیکھا کہ وہ بالکل درست تھا، اس بات کے متعلق جو آسمان سے سنی گئی تھی۔“ مزید دیکھیے سورۂ صافات (۶، ۵) اور سورۂ طارق (۱ تا ۴)۔

یاد رہے کہ شیطان صرف وہ بات چرا سکتے ہیں جس کا تعلق آئندہ ہونے والے ان کاموں سے ہوتا ہے، جن کے متعلق فرشتے آسمان کے نیچے آپس میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ فرشتے بادل میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ [ بخاری : ۴۷۰۱ ] مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کی طرف جو وحی ہوتی ہے، اس کی حفاظت کا اتنا زبردست انتظام ہوتا ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شیطان اسے سن سکے یا چرا سکے، دیکھیے سورۂ جن کی ابتدائی اور آخری آیات کی تفسیر۔

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور زمین، ہم نے اسے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ رکھے اور اس میں ہر نپی تلی چیز اگائی ﴿۱۹﴾ اور ہم نے تمھارے لیے اس میں روزیاں بنائی ہیں اور ان کے لیے بھی جنھیں تم ہرگز روزی دینے والے نہیں ﴿۲۰﴾

آیت 19 ❶ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا: اب زمین اور اس پر پیدا کردہ اشیا، کو توحید کی دلیل کے لیے بیان کیا جا رہا ہے۔ "مَدَدْنٰهَا" "مَدَّ يَمُدُّ" (ن) کا معنی ہے کھینچنا، پھیلانا۔ جب ہم زمین کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتے ہیں تو وہ اتنی ہے کہ اس پر چلنے پھرنے، رہنے، کاشت کرنے، مکان یا سڑکیں بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی، مگر آنکھوں کو اس کی انتہا نظر نہیں آتی، خواہ کتنا سفر کر لیں۔ یہ پھیلاؤ اور مد دلیل ہے کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے گول بنایا ہے، ورنہ اگر یہ مربع یا کسی اور شکل کی ہوتی تو یہ پھیلاؤ کسی جگہ جا کر ختم ہو جاتا، اب تو گول زمین کی تصویریں بھی آ چکی ہیں اور تجربے سے بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے، اس کے باوجود اس کا جھکاؤ ایسا عجیب ہے کہ نہ نظر آتا ہے اور نہ اس کلیے میں کوئی فرق پڑتا ہے کہ "پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے" مگر سیکڑوں برس پہلے اس حقیقت کو وہی بیان کر سکتا تھا جس نے اسے پیدا کیا اور پھیلایا ہے۔

❷ وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ: "رَوَاسِيَ" "رَاسِيَةٌ" کی جمع ہے جو "رَسَا يَرْسُوْ" (ن) کا اسم فاعل ہے، جس کا معنی کسی بھاری چیز کا گڑا ہوا ہونا ہے۔ مراد پہاڑ ہیں جن کا اکثر حصہ زمین کے اندر اور باقی باہر ہوتا ہے۔ اس سے ایک دوسری حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ زمین کو متحرک بنایا گیا ہے، تبھی اس پر بھاری پہاڑ زمین کی گردش میں توازن رکھنے کے لیے گاڑ دیے گئے، تاکہ تیز رفتاری کے باوجود اس میں لرزش اور تھرتھراہٹ پیدا نہ ہو، جیسا کہ گاڑی کے پہیوں کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ان کی مختلف جگہوں پر ضرورت کے مطابق لوہے وغیرہ کے ٹکڑے لگا دیے جاتے ہیں۔ ایک اور آیت میں بھی یہ اشارہ موجود ہے: ﴿ وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ [ النمل : ۸۸ ] "اور تو پہاڑوں کو دیکھے گا، انھیں گمان کرے گا کہ وہ جمے ہوئے ہیں، حالانکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے۔"

❸ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ: "فِيْهَا" یعنی زمین میں ہر چیز اتنی اگائی اور پیدا کی جتنی اس کی ضرورت تھی، نہ کسی چیز کو بلاضرورت پیدا کیا اور نہ ایک خاص حد سے بڑھنے دیا۔ "فِيْهَا" میں ضمیر جبال (پہاڑوں) کے لیے بھی ہو سکتی ہے، یعنی پہاڑوں کے اندر ہر چیز یعنی معدنیات وغیرہ پورے اندازے سے پیدا کیں۔ (شوکانی)

آیت 20 وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ...... : "مَعَايِشَ" "مَعِيْشَةٌ" کی جمع ہے، "عَاشَ يَعِيْشُ عَيْشًا وَ مَعَاشًا وَمَعِيْشَةً" کا معنی زندہ رہنا ہے، جیسے "مَاتَ يَمُوْتُ مَوْتًا" کا معنی مرنا ہے۔ پھر یہ لفظ زندگی کی ضرورتوں کے لیے استعمال ہونے لگا، یعنی تمھاری زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے، رہنے، علاج، راحت، سواری، الغرض ہر ضرورت کی چیز تمھارے لیے بھی پیدا کی اور ان کے لیے بھی جنھیں تم روزی دینے والے نہیں۔ اس سے دو قسم کی چیزیں مراد ہیں، ایک تو وہ جن کا تم

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۱﴾

اور کوئی بھی چیز نہیں مگر ہمارے پاس اس کے کئی خزانے ہیں اور ہم اسے نہیں اتارتے مگر ایک معلوم اندازے سے ﴿۲۱﴾

سے تعلق ہی نہیں، سمندر کی گہرائیوں میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، صحراؤں کی وسعتوں میں، زمین کی تہوں میں، آباد اور بے آباد زمین کی سطح پر اور فضاؤں میں بے شمار مخلوق ہے جنھیں تم ہرگز روزی دینے والے نہیں۔ ''لَسْتُمْ'' نفی کی تاکید ''بِرٰزِقِیْنَ'' کی باء کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''ہرگز'' کیا گیا ہے۔ دوسری وہ تمام چیزیں جو تمھاری خدمت کے لیے ہیں، مثلاً چوپائے، سواریاں، بیوی بچے اور نوکر چاکر وغیرہ، جن کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ ہم انھیں کھانے کو دے رہے ہیں، خوب سمجھ لو کہ تم ہرگز انھیں روزی نہیں دے رہے، زمین میں ان کی معیشت بھی ہم ہی نے بنائی ہے اور ہم ہی انھیں رزق دے رہے ہیں، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ [ الذاریات : ۵۸ ] ''بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، قوت والا، نہایت مضبوط ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ [ هود : ٦ ] ''اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے۔''

**آیت 21** وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا ...... : یعنی کوئی بھی چیز، قیمتی سے قیمتی ہو یا معمولی سے معمولی، ہمارے پاس اس کے کئی خزانے ہیں، مگر ہم اس کو معلوم اندازے کے مطابق ہی ظاہر کرتے ہیں، مثلاً جلانے اور روشنی کے لیے لکڑی استعمال ہوتی تھی، جب آبادی زیادہ ہوئی تو کوئلہ نکل آیا، مزید بڑھی تو پٹرولیم عطا ہوا، اس سے بھی بڑھی تو گیس نکل آئی، بجلی کے اوون ایجاد ہو گئے۔ توانائی اور سواری کے لیے جانور استعمال ہوتے تھے، پھر پہیہ ایجاد ہوا، پھر کوئلہ استعمال ہونے لگا، پھر پٹرولیم، گیس، بجلی اور ایٹم، الغرض! ایجادات بھی ضرورت کے مطابق اپنے اپنے وقت پر ہوئیں۔ اس سے ان ملحد لوگوں، خصوصاً حکمرانوں کی بات کا غلط ہونا صاف واضح ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ آبادی زیادہ بڑھ رہی ہے، جب کہ ہمارے پاس وسائل کم ہیں، ہم سب کی خوراک کا بندوبست نہیں کر سکتے، اس لیے آبادی کم کرو، ضبط ولادت کرو، ایک یا دو بچے پیدا ہونے دو۔ یہ لوگ درحقیقت اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، جس نے فرمایا کہ ہمارے پاس ہر چیز کے بے شمار خزانے ہیں، مگر ہم مقرر اندازے کے ساتھ ہی اسے نازل کرتے ہیں۔ ان حکمرانوں نے کسی کو خوراک کیا دینی ہے، یہ تو خود عوام کی کمائی پر پلتے ہیں۔ اللہ کا کرم دیکھو، جو زمین پہلے دس من غلہ پیدا کرتی تھی اب سو من نکالتی ہے، بجلی اور دوسری ایجادات سے جو آسائشیں آج عام آدمی کو میسر ہیں وہ چند سو سال پہلے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی میسر نہ تھیں، بلکہ ان کے خیال میں بھی نہ تھیں، الا یہ کہ وہ سلیمان علیہ السلام جیسا ہو، پیدل سفر اور اونٹوں، گھوڑوں کی جگہ گاڑیاں اور جہاز اور لق و دق صحراؤں کی جگہ آبادیاں اور نہایت صاف اور کشادہ سڑکیں اور ریلویز۔ اون اور کپاس کی جگہ پٹرولیم کے کپڑے۔ الغرض! کس کس نئی نعمت اور خزانے کا ذکر کیا جائے۔ رہا آبادی اور وسائل کا تناسب، تو وہ اللہ تعالیٰ سے بہتر کون جانتا ہے، اگر آبادی کم کرنے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی غیبی تدبیر سے خود ہی کم کر لیتا ہے، کبھی طوفانوں سے، کبھی جنگوں سے، کبھی زلزلوں سے، کبھی وباؤں کے ذریعے سے۔ الغرض ہر جان دار کا

وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم نے ہواؤں کو بار آور بنا کر بھیجا، پھر ہم نے آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے تمھیں وہ پلانے کے لیے عطا فرمایا اور تم ہرگز اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ﴿۲۲﴾

رزق اللہ کے ذمے ہے اور ہر شخص کو اللہ تعالیٰ دنیا میں ایک منہ کھانے کے لیے اور دو ہاتھ کمانے کے لیے دے کر بھیجتا ہے اور ایک ایک شخص کئی کئی افراد کی ضروریات مہیا کرتا ہے۔ دراصل یہ حکمران اس بہانے سے بدکاری اور بے حیائی پھیلانا چاہتے ہیں اور بے حیائی پھیلانے کے خواہش مند لوگوں کی سزا اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور (۱۹) میں بیان کی ہوئی ہے۔ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کا یہی حکم ہے کہ آبادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرو، دنیا میں غلبے کا یہ ایک مضبوط ذریعہ بھی ہے اور قیامت کے دن ہمارے نبی ﷺ کے لیے دوسرے انبیاء سے اپنی امت کے زیادہ ہونے کی خوشی اور فخر کا باعث بھی، جیسا کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے: (( تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ )) [ أبو داوٗد، النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء: ۲۰۵۰۔ نسائي: ۳۲۲۹، و صححه الألباني ] "ایسی عورت سے نکاح کرو جو (خاوند سے) بہت محبت کرنے والی ہو اور بہت بچے جننے والی ہو، کیونکہ میں دوسری امتوں کے مقابلے میں تمھاری کثرت پر فخر کرنے والا ہوں گا۔"

**آیت 22** ① وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ ......: "لَوَاقِحَ" "لَاقِحٌ" کی جمع بھی ہو سکتی ہے، یہ لفظ مذکر ہونے کے باوجود مؤنث ہے، جیسے "حَائِضٌ" اور "حَامِلٌ"، "لِقَاحٌ" نر جانور کے مخصوص پانی کو کہتے ہیں۔ "لَاقِحٌ" وہ اونٹنی جس نے "لِقَاحٌ" کو قبول کر لیا ہو، یعنی حاملہ ہو چکی ہو اور اپنے پیٹ میں جنین اٹھائے پھرتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کو حمل اٹھانے والی اس لیے قرار دیا کہ وہ اپنے اندر حاملہ اونٹنیوں کی طرح ایسے آبی بخارات اور بادلوں کا بوجھ اٹھا کر چلتی ہیں جو بارش برسانے کا ذریعہ بنتے ہیں اور یہ "لَاقِحٌ" بمعنی "مُلْقِحٌ" (باب افعال سے اسم فاعل، یعنی وہ نر جو حاملہ کرتا ہے) کی جمع بھی ہو سکتی ہے، یعنی یہ ہوائیں بادلوں پر اور مادہ درختوں پر، مثلاً کھجور وغیرہ، یا مادہ پھولوں پر عمل کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں کہ ہواؤں کے ذریعے سے بادل برسنے کے قابل ہوتے ہیں، ہواؤں ہی کے ذریعے سے نر درختوں اور نر پھولوں کا بُور ان کے مادہ درختوں اور پھولوں تک پہنچتا ہے، جس سے ان کے پھل لانے کا عمل وجود میں آتا ہے۔ آیت کا کمال بلاغت یہ ہے کہ "لَوَاقِحَ" کا لفظ استعمال فرمایا جو حاملہ ہونے اور حاملہ کرنے کے دونوں مفہوم ادا کرتا ہے۔



② فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ: "سَقٰى يَسْقِيْ" پلانا، "أَسْقٰى يُسْقِيْ" پلانے کے لیے دینا، مہیا کرنا، یعنی ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور تمھیں ایک دوسرے کو پلانے اور اپنے جانوروں اور پودوں کو پلانے کے لیے عطا فرمایا۔

③ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ: یعنی نہ اوپر آسمان میں بارش کا خزانہ تمھارے قبضے میں ہے اور نہ نیچے زمین میں کنووں، چشموں، تالابوں کے خزانے پر تمھارا کوئی اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی پانی کو جس مقدار میں چاہتا ہے رکھتا ہے، وہ جب چاہے بارش برسائے تم اسے روک نہیں سکتے، یا جب چاہے روک لے تم اسے اپنی مرضی سے برسا نہیں سکتے۔ اسی طرح اگر وہ چاہے تو

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

اور بے شک ہم، یقیناً ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں ﴿۲۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جان رکھا ہے جو تم میں سے بہت آگے جانے والے ہیں اور بلاشبہ ہم نے ان کو بھی جان رکھا ہے جو بہت پیچھے آنے والے ہیں ﴿۲۴﴾ اور بے شک تیرا رب ہی انھیں اکٹھا کرے گا۔ یقیناً وہ کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، جو بدبودار، سیاہ کیچڑ سے تھی ﴿۲۶﴾

چشموں اور کنووں میں تمام جمع شدہ پانی زمین میں جذب ہو جائے اور تمھیں ایک قطرہ بھی پینے کو نہ ملے۔

**آیت 23** وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ...... : اس آیت میں زندگی اور موت اور وراثت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہونے کی تاکید "اِنَّ"، لام تاکید، "نا" ضمیر متکلم، "نَحْنُ" ضمیر متکلم، "نُحْيٖ" اور "نُمِيْتُ" میں ضمیر متکلم کے ساتھ کی ہے اور آخر میں پھر "نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ" میں "نَحْنُ" کے ساتھ اور "الْوٰرِثُوْنَ" خبر کو الف لام برائے حصر کے ساتھ لا کر تاکید کی انتہا کر دی ہے کہ زندگی اور موت کا مالک صرف اللہ ہے اور صرف وہی وارث ہے۔ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں اتنی تاکید کا سامان ہی موجود نہیں اور اتنی تاکید کی ضرورت اس لیے ہے کہ کفار کا طرز عمل بتاتا ہے کہ وہ یہ تینوں باتیں نہیں مانتے، ورنہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے۔ جتنا انکار سخت ہو گا اتنی ہی زیادہ تاکید کے ساتھ بات کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ سب فنا ہو جائیں گے، مال و متاع جو کچھ بچ رہے گا وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔

**آیت 23** وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ...... : اس میں بہت سی چیزیں آ جاتی ہیں: ① وہ لوگ جو ہم سے پہلے گزر چکے اور جو ہمارے بعد آنے والے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے۔ اس کا علم ازلی اور ابدی ہے۔ ② وہ لوگ جو اذان کا پہلا لفظ "اللہ اکبر" سنتے ہی اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا سمجھتے ہوئے سب سے پہلے نماز کے لیے چل پڑتے ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے۔ ③ مستقدمین و مستاخرین، یعنی جہاد اور دوسری نیکیوں میں آگے بڑھنے والے اور پیچھے رہنے والے سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

**آیت 25** وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ...... : کفار دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے، توحید کے دلائل کے بعد نہایت تاکید کے ساتھ قیامت کا یقین دلایا، کیونکہ یہ اللہ کے حکیم و علیم ہونے کا لازمی نتیجہ ہے اور اس کے بغیر بندہ نہ مومن ہوتا ہے، نہ باز پرس کے یقین کے بغیر کوئی نیکی ہو سکتی ہے اور نہ گناہ سے بچا جا سکتا ہے۔

**آیت 26** ① وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ...... : اس سورت میں آیت (۱۶) ﴿ وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا ﴾ سے

وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

اور جان (یعنی جنوں) کو اس سے پہلے لُو کی آگ سے پیدا کیا ﴿۲۷﴾

دلائلِ توحید کا بیان چلا آ رہا ہے، جب اوپر کی آیات میں مختلف چیزوں کی تخلیق کو بطور دلیل ذکر کیا تو اب انسان کے پیدا کیے جانے کو بطور دلیل ذکر کیا جا رہا ہے، الغرض یہ دلائلِ توحید میں ساتویں قسم ہے۔ (کبیر)

● **مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ:** عربی زبان میں خشک مٹی کو "تُرَابٌ" کہتے ہیں، جب اسے بھگو دیا جائے تو وہ "طِيْنٌ" کہلاتی ہے، پھر جب مدت تک پڑی رہنے سے وہ سیاہ ہو جائے تو اسے "**حَمَاٍ**" کہتے ہیں، بدبو بھی آنے لگے تو "**حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ**" (بدبودار کیچڑ) کہتے ہیں، پھر جب وہ خشک ہو کر کھن کھن بجنے لگے تو وہ "**صَلْصَالٍ**" کہلاتی ہے۔ "**مَسْنُوْنٍ**" کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جس کی تصویر بنائی گئی ہو، جیسا کہ "سُنَّةُ الْوَجْهِ" کا معنی "صُوْرَةُ الْوَجْهِ" آتا ہے اور "**مَسْنُوْنٍ**" کا معنی ملائم و نرم بھی ہے۔ آیات و تفاسیر سے آدم علیہ السلام کی پیدائش کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پوری زمین سے خشک مٹی لی، جیسا کہ سورۂ آل عمران (۵۹) میں آدم علیہ السلام کو "**تُرَابٍ**" سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے اور جیسا کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُوْ آدَمَ عَلٰى قَدْرِ الْأَرْضِ جَاءَ مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذٰلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَبَيْنَ ذٰلِكَ» [أبوداؤد، السنة، باب في القدر: ۴۶۹۳۔ ترمذی: ۲۹۵۵۔ أحمد: ۴۰۰/۴، ح: ۱۹۶۰۱، و صححه الألباني] "اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک مٹھی سے پیدا فرمایا، جو اس نے ساری زمین سے لی، تو بنی آدم اس زمین کے اندازے کے مطابق وجود میں آئے، ان میں سرخ، سفید، سیاہ اور اس کے مابین لوگ ہیں اور نرم، سخت، خبیث، طیب اور اس کے مابین بھی ہیں۔" پھر اس میں پانی ڈالا تو وہ "طِيْنٌ" ہو گئی، پھر اسے مدتوں پڑا رہنے دیا، جب وہ کالی سیاہ اور ملائم و نرم ہو گئی تو آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ اور شکل و صورت بنائی، فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ﴾ [الأعراف: ۱۱] جب وہ سوکھ کر کھن کھن بجنے لگا تو اس میں اپنی خاص پیدا کردہ روح پھونکی، جیسا کہ اس جگہ "**صَلْصَالٍ**" کا ذکر ہے اور اس کے خوب خشک ہونے کا ذکر سورۂ رحمٰن (۱۴) میں ہے، فرمایا: ﴿ **مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ** ﴾ کہ وہ کھنکھنانے والی مٹی آگ میں پکی ہوئی مٹی کی طرح کھنکھنانے والی تھی۔

● **وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ:** یہاں "**الْجَآنَّ**" سے مراد اکثر مفسرین نے جنوں کا باپ لیا ہے، بعض جنوں کی جنس مراد لیتے ہیں، بعض نے ابلیس مراد لیا ہے۔ اسے "**الْجَآنَّ**" یا جن (جَنَّ يَجُنُّ بمعنی ڈھانپنا، چھپانا) انسان کی آنکھوں سے چھپنے کی وجہ سے کہتے ہیں، جیسا کہ جنین اور جنون وغیرہ سب میں ڈھانپنے کا مفہوم شامل ہے۔ جنوں کے بارے میں فرمایا: ﴿ **اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ** ﴾ [الأعراف: ۲۷] "بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔"

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں ایک بشر ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، جو بدبودار، سیاہ کیچڑ سے ہوگی ﴿۲۸﴾ تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ ﴿۲۹﴾ تو فرشتوں نے سب کے سب نے، تمام نے سجدہ کیا ﴿۳۰﴾ مگر ابلیس، اس نے انکار کر دیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو ﴿۳۱﴾ فرمایا اے ابلیس! تجھے کیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا؟ ﴿۳۲﴾ اس نے کہا میں کبھی ایسا نہیں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے، جو بدبودار، سیاہ کیچڑ سے ہے ﴿۳۳﴾ فرمایا پھر اس سے نکل جا، کیونکہ یقیناً تو مردود ہے ﴿۳۴﴾

② مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ : "السَّمُوْمِ" دراصل سخت گرم ہوا (لُو) کو کہتے ہیں، ایک تو اس کے زہریلے ہونے کی وجہ سے (مِنَ السَّمِّ) اور ایک اس لیے کہ وہ جسم کے مسامات کے اندر پہنچ جاتی ہے (مِنَ الْمَسَامِ)۔ مراد خالص آگ جو دھوئیں سے خالی اور اپنی تیزی کی وجہ سے لُو کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

**آیت 28** وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ...... : اولاً انسان کی تخلیق کو بطور دلیل ذکر فرمایا، اب اس کے بعد اس کا قصہ ذکر فرمایا۔ (رازی) "وَ اِذْ قَالَ" سے پہلے "اُذْكُرْ" مقدر مانتے ہیں کہ اے مخاطب عاقل! وہ وقت یاد کر جب......

**آیت 29** ① فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ...... : یعنی جب میں اسے برابر کر لوں، مکمل بنا لوں۔ "مِنْ رُّوْحِيْ" اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں۔ یہاں "رُوْحِيْ" میں "رُوْحٌ" کی "یاء" کی طرف اضافت، اضافت تشریفی کہلاتی ہے، یعنی اس کا عز و شرف بڑھانے کے لیے اسے اپنی روح قرار دیا، یہاں "میری روح" سے مراد اللہ تعالیٰ کی مخلوق روح ہے، کیونکہ اس کی ذات کی مثل تو کوئی چیز نہیں، وہ "لَمْ يَلِدْ ڏ وَ لَمْ يُوْلَدْ" ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذاتی روح تو کسی صورت مراد نہیں ہو سکتی، صرف آدم ہی نہیں دوسری جگہ ہر انسان کی روح کو اللہ نے اپنی روح قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ﴾ [ دیکھیے السجدۃ : ۷ تا ۹ ] اور ظاہر ہے کہ انسان مخلوق ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ ساری زمین اور اس کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، مگر مسجد حرام کو بیت اللہ (اللہ کا گھر) اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو اللہ کی اونٹنی قرار دیا ہے۔

وَ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾

اور بے شک تجھ پر قیامت کے دن تک خاص لعنت ہے ﴿۳۵﴾ اس نے کہا اے میرے رب! پھر مجھے اس دن تک مہلت دے جب وہ اٹھائے جائیں گے ﴿۳۶﴾ فرمایا تو بے شک تو مہلت دیے گئے لوگوں سے ہے ﴿۳۷﴾ ایسے وقت کے دن تک جو معلوم ہے ﴿۳۸﴾ اس نے کہا اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں ضرور ہی ان کے لیے زمین میں مزین کروں گا اور ہر صورت میں ان سب کو گمراہ کردوں گا ﴿۳۹﴾ مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں ﴿۴۰﴾ فرمایا یہ راستہ ہے جو مجھ تک سیدھا ہے ﴿۴۱﴾

﴿۲﴾ اس آیت سے آیت (۳۹) تک کی مفصل تفسیر کے لیے سورۂ اعراف (۱۱ تا ۱۸) اور سورۂ بقرہ (۳۰ تا ۳۴) تک کے فوائد ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 35** وَ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ : اس کا ترجمہ ''خاص لعنت'' الف لام کی وجہ سے کیا گیا ہے اور اس کی وضاحت سورۂ ص (۷۸) میں آئی ہے، فرمایا: ﴿ وَ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْۤ ﴾ یعنی تجھ پر میری لعنت ہے۔

**آیت 35** لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ : میں ان کے لیے زمین میں مزین کروں گا، کیا چیز، آیت کے سیاق و سباق سے عبارت یہ بنتی ہے کہ میں ان کے لیے زمین میں بھی خواہش نفس اور اللہ کی نافرمانی کو مزین اور خوش نما بنا کر پیش کروں گا، جیسا کہ آسمان میں ان کو ممنوعہ پودے کا کھانا خوش نما بنا کر پیش کیا اور گمراہ کر دیا تھا، فرمایا: ﴿ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۱۲۱ ] دوسرا معنی یہ ہے کہ میں انھیں تمام زینت زمین ہی میں دکھاؤں گا کہ جو کچھ ہے یہیں ہے، تاکہ وہ نہ آخرت کی طرف توجہ کریں اور نہ اس کا یقین کریں، سو اس طرح میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ﴾ [ الأعراف : ۱۷۶ ] ''اور لیکن وہ زمین ہی کی طرف چمٹ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، سو اس کی مثال کتے کی سی ہے۔''

**آیت 40** اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ : یعنی تیرے وہ بندے جو خالص تیرے لیے چن لیے گئے اور جنھیں تو نے خاص اپنا بنا لیا میں انھیں گمراہ نہیں کر سکوں گا۔

**آیت 41** قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ : یعنی یہی صراط مستقیم اور درست بات ہے جو مجھ پر لازم ہے کہ تو میرے مخلص بندوں کو گمراہ نہ کر سکے گا اور جو میرے لیے خالص ہوگا اس کی حفاظت میں خود کروں گا، جیسے بعد میں فرمایا: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾

بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں، مگر جو گمراہوں میں سے تیرے پیچھے چلے ﴿۴۲﴾ اور بلاشبہ جہنم ضرور ان سب کے وعدے کی جگہ ہے ﴿۴۳﴾ اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک تقسیم کیا ہوا حصہ ہے ﴿۴۴﴾ بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۴۵﴾

لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ [ الحجر : ۴۲ ] اور ایک معنی یہ بھی ہے کہ "هٰذَا" سے اخلاص کی طرف اشارہ ہو، یعنی یہی اخلاص کی راہ مجھ تک سیدھی پہنچتی ہے اور میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہوگا۔ (روح المعانی) دوسرا معنی واضح ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت 42 اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ...... : یہ پچھلی بات ہی کی وضاحت ہے اور مستثنیٰ منقطع ہے اور اگر "عِبَادٌ" سے مراد عام ہو تو مستثنیٰ متصل ہوگا، مطلب یہ کہ جو خود ہی بھٹکے ہوں اور جہالت کی بنا پر خود ہی تیری پیروی کرنا چاہیں۔

آیت 44 ❶ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ : یہ سات دروازے مختلف قسم کے گناہ گاروں کے لیے ہوں گے، جو جہنمیوں کو جہنم کے مختلف درجوں کی طرف پہنچائیں گے۔ قرآن مجید میں جہنم کے درجوں کو "درکات" کہا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [ النساء : ۱۴۵ ] "بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔" ابوطالب کے متعلق صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آگ اس کے ٹخنوں تک پہنچ رہی ہوگی۔ سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: (( إِنَّ مِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ النَّارُ إِلٰى كَعْبَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلٰى حُجْزَتِهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلٰى عُنُقِهِ )) [ مسلم، الجنة وصفة نعيمها، باب جهنم أعاذنا الله منها : ۲۸۴۵ ] "ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنھیں آگ ٹخنوں تک پکڑے گی اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنھیں ان کی کمر تک پکڑے گی اور ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جنھیں ان کی گردن تک پکڑے گی۔"

❷ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ : تقسیم کیے ہوئے حصے سے مراد بدکاروں کے سات حصوں میں تقسیم شدہ مجرموں کا ایک حصہ ہے، یعنی جس طرح ایک خاص عمل والے لوگ جنت میں ایک خاص دروازے سے داخل ہوں گے، اسی طرح برے عمل والے لوگ بھی اپنے اعمال کے مطابق جہنم کے مختلف دروازوں سے داخل ہوں گے، جیسے اوپر ذکر ہوا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [ النساء : ۱۴۵ ] "بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔" شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ اس لیے ہے کہ بعض موحدین صرف اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے، بغیر عمل کے۔" (موضح)

آیت 45 ❶ "الْمُتَّقِيْنَ" "اِتَّقٰى" باب افتعال سے اسم فاعل "مُتَّقِيْ" کی جمع ہے۔ مجرد "وَقٰى يَقِيْ وِقَايَةً" ہے، بمعنی

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝۴۶ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۴۷

اس میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہوکر داخل ہو جاؤ ۝۴۶ اور ہم ان کے سینوں میں جو بھی کینہ ہے نکال دیں گے، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ۝۴۷

بچانا اور نقصان دہ چیزوں سے محفوظ رکھنا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲)۔

❷ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ : گمراہ لوگوں کے برے انجام کے ساتھ ہی متقی لوگوں کے بہترین انجام کا ذکر ہے اور یہ قرآن مجید کا عام انداز ہے کہ وہ دونوں پہلوؤں کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے۔ "جَنّٰتٍ" "جَنَّةٌ" کی جمع ہے، گھنے درختوں کا باغ جو زمین کو چھپائے ہوئے ہو۔ "جَنَّ يَجُنُّ" کا معنی ہے چھپانا۔ "عُيُوْنٍ" کا معنی ہے چشمے، مراد وہ چشمے ہیں جن سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں، یا الگ چشمے، کیونکہ چشموں کا حسن ایک الگ ہی چیز ہے۔ سورۂ دہر میں کافور اور زنجبیل کی آمیزش والے چشمے، سلسبیل نامی چشمے اور سورۂ مطففین میں تسنیم نامی چشمے کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ جنت سے مراد صرف باغ ہی نہیں، بلکہ سونے چاندی کی اینٹوں کے مکانات اور ایک ایک موتی یا لعل سے بنے ہوئے میلوں لمبے اور اونچے خیموں کے ساتھ ملے ہوئے باغات ہیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں جنت کے اوصاف میں مذکور ہے۔

**آیت 46** اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ...... : یعنی انھیں یہ کہا جائے گا۔ "بِسَلٰمٍ" یعنی ہر قسم کے آفات و مصائب سے سلامتی کے ساتھ، ایک دوسرے کو سلام کہتے ہوئے، فرشتوں کے سلام سنتے ہوئے اور پروردگار عالم کے "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" کے ساتھ۔ (دیکھیے یٰس : ۵۸) اسی لیے جنت کا ایک نام "دار السلام" بھی ہے، فرمایا: ﴿ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ [ الأنعام : ۱۲۷ ] "اٰمِنِيْنَ" ہر خوف خطرے سے محفوظ۔

**آیت 47** وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ...... : "نَزْعٌ" کا معنی کھینچ کر، اکھاڑ کر نکالنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کینہ اور دشمنی دل میں کتنی گہری جڑ پکڑتی ہے۔ "غِلٍّ" کینہ، کھوٹ، یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں اہل جنت کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ہر کینے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے گا، کیونکہ جس سینے میں کوئی کدورت ہو وہ مکمل خوشی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ دلوں کی صفائی کے بعد وہ بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ محبت ہو تو خود بخود چہرے آپس میں مل جاتے ہیں، جب کہ دلوں میں کدورت ہو تو چہرے بھی ادھر ادھر ہو جاتے ہیں ؎

دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اہل جنت کے متعلق) فرمایا: (( قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَلَا تَبَاغُضَ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة : ۳۲۴۶ ] "ان کے دل ایک

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

اس میں انھیں نہ کوئی تھکاوٹ چھوئے گی اور نہ وہ اس سے کبھی نکالے جانے والے ہیں ﴿۴۸﴾

آدمی کے دل کی طرح ہوں گے، نہ ان میں کوئی اختلاف ہوگا، نہ آپس میں کوئی بغض۔'' ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَخْلُصُ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ فَيُحْبَسُوْنَ عَلٰى قَنْطَرَةٍ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، فَيُقْتَصُّ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ مَظَالِمُ كَانَتْ بَيْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا، حَتّٰى إِذَا هُذِّبُوْا وَ نُقُّوْا أُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ )) [ بخاري، الرقاق، باب القصاص يوم القيامة : ۶۵۳۵ ] ''مومن آگ سے بچ کر آئیں گے تو جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر روک لیے جائیں گے، پھر دنیا میں ان کے ایک دوسرے پر مظالم کا قصاص ایک دوسرے کو دلوایا جائے گا، یہاں تک کہ جب ان کی پوری تراش خراش کر دی جائے گی اور خوب پاک صاف کر دیے جائیں گے تو انھیں جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اور صلحائے امت باہمی لڑائیوں اور رنجشوں کے باوجود جنت میں جائیں گے، مگر اس سے پہلے ان کے دلوں کی باہمی کدورتیں بالکل دور کر دی جائیں گی اور وہ صاف دل بھائی بھائی ہو کر جنت میں جائیں گے۔

**آیت 48** ① لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ: دنیا میں کوئی شخص دکھ، مصیبت، مشقت اور تھکن سے خالی نہیں، بلکہ یہ ساری زندگی ہی محنت اور مشقت کی ہے، یہاں زیادہ سے زیادہ خوشی اور لذت کے ساتھ بھی کوئی نہ کوئی مشقت، محنت، تھکن یا غم ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بلد کے شروع میں کئی قسمیں کھا کر فرمایا: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴾ [ البلد : ۴ ] ''بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے'' اور سورۂ انشقاق میں فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴾ [ الانشقاق : ۶ ] ''اے انسان! بے شک تو مشقت کرتے کرتے اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، سخت مشقت، پھر اس سے ملنے والا ہے۔'' جب کہ جنت میں نہ کوئی دکھ ہوگا نہ تھکاوٹ۔ ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يُنَادِيْ مُنَادٍ إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَصِحُّوْا فَلَا تَسْقَمُوْا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَحْيَوْا فَلَا تَمُوْتُوْا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَشِبُّوْا فَلَا تَهْرَمُوْا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَنْعَمُوْا فَلَا تَبْأَسُوْا أَبَدًا فَذٰلِكَ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ : ﴿ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ۴۳ ] )) [ مسلم، الجنة وصفة نعيمها، باب في دوام نعيم أهل الجنة...... : ۲۲ / ۲۸۳۷ ] ''ایک منادی ندا دے گا (اے جنت والو!) بے شک تمھارے لیے یہ ہوگا کہ تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے اور تمھارے لیے یہ ہوگا کہ تم زندہ رہو گے کبھی تمھیں موت نہیں آئے گی اور تمھارے لیے یہ ہوگا کہ تم جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمھارے لیے طے ہو چکا کہ تم خوش حال رہو گے کبھی تنگی اور تکلیف نہیں اٹھاؤ گے۔'' چنانچہ یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ ''اور انھیں آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے جس کے وارث تم اس کی وجہ سے بنائے گئے ہو جو تم کیا کرتے تھے۔''

② وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا صَارَ أَهْلُ الْجَنَّةِ

نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہوں ﴿۴۹﴾ اور یہ بھی کہ بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے ﴿۵۰﴾

---

إِلَى الْجَنَّةِ، وَصَارَ أَهْلُ النَّارِ إِلَى النَّارِ، أُتِيَ بِالْمَوْتِ حَتّٰى يُجْعَلَ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، ثُمَّ يُذْبَحُ، ثُمَّ يُنَادِيْ مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! لَا مَوْتَ، يَا أَهْلَ النَّارِ! لَا مَوْتَ، فَيَزْدَادُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَرَحًا إِلٰى فَرَحِهِمْ، وَيَزْدَادُ أَهْلُ النَّارِ حُزْنًا إِلٰى حُزْنِهِمْ » [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب النار يدخلها الجبارون..... : ۲۸۵۰/۴۳ ] ”جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے تو موت کو (ایک مینڈھے کی شکل میں) لایا جائے گا اور اسے جنت اور جہنم کے درمیان رکھ دیا جائے گا، پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر ایک منادی اعلان کرے گا اے جنت والو! اب موت نہیں اور اے آگ والو! اب موت نہیں، تو جنت والے اپنی خوشی کے ساتھ اور زیادہ خوش ہو جائیں گے اور آگ والے اپنے غم کے ساتھ اور زیادہ غم زدہ ہو جائیں گے۔“

**آیت 50،49** ① نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ...... : ”نَبَأٌ“ خاص اور اہمیت والی خبر کو کہتے ہیں۔ ”نَبِّئْ“ باب تفعیل سے امر ہے، یعنی یہ بات اچھی طرح بتا دو، تاکہ وہ امید بھی رکھیں اور خوف بھی، کیونکہ ایمان ان دونوں کے درمیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ، مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهِ أَحَدٌ، وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ، مَا قَنِطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ » [ مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى...... : ۲۷۵۵ ] ”اگر مومن جان لے کہ اللہ کے پاس کتنی عقوبت ہے تو کوئی اس کی جنت کا طمع نہ رکھے اور اگر کافر جان لے کہ اللہ کے پاس کس قدر رحمت ہے تو کوئی اس کی جنت سے ناامید نہ ہو۔“ ان آیات میں رحمت و مغفرت کا بیان پہلے اور عذاب الیم کا ذکر بعد میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اصل اور غالب صفت رحمت ہے، عذاب تو محض عدل کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف کی آیت (۱۵۶) کی تفسیر۔

یہاں رحمت کے اظہار کے لیے پہلے ”عِبَادِيْ“ سے خطاب، پھر ”اَنِّيْ“، ”اَنَا“ ضمیر فصل اور ”الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ“ کو الف لام کے ساتھ لا کر تاکید پر تاکید فرمائی، دوسری آیت میں ”هُوَ“ ضمیر فصل اور ”الْعَذَابُ“ کو معرف باللام لا کر تاکید فرمائی۔ پہلی آیت میں فرمایا کہ میری صفات رحمت یہ ہیں اور ان کا مالک میرے سوا کوئی نہیں، دوسری آیت میں فرمایا اور میرے عذاب کی صفت یہ ہے، یہ نہیں فرمایا: ” وَ إِنِّيْ أَنَا الْمُعَذِّبُ..... “ کہ میں ہی ایسا عذاب دینے والا ہوں، بلکہ اپنے عذاب کی صفت بیان فرمائی کہ میرا عذاب ہی ایسا ہے جو عذاب الیم ہے۔

② یہ آیات تمہید ہیں ان واقعات کی جو آگے آ رہے ہیں، جن میں فرشتوں کی ایک جماعت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی

وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور انھیں ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں خبر دے ﴿۵۱﴾ جب وہ اس کے پاس داخل ہوئے تو انھوں نے سلام کہا، اس نے کہا ہم تو تم سے ڈرنے والے ہیں ﴿۵۲﴾ انھوں نے کہا ڈر نہیں، بے شک ہم تجھے ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں ﴿۵۳﴾ اس نے کہا کیا تم نے مجھے اس کے باوجود خوشخبری دی ہے کہ مجھے بڑھاپا آپہنچا ہے، تو تم کس بات کی خوشخبری دیتے ہو؟ ﴿۵۴﴾ انھوں نے کہا ہم نے تجھے حق کی خوشخبری دی ہے، سو تو ناامید ہونے والوں سے نہ ہو ﴿۵۵﴾ اس نے کہا اور گمراہوں کے سوا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے ﴿۵۶﴾ اس نے کہا تو اے بھیجے ہوؤ! تمھارا معاملہ کیا ہے؟ ﴿۵۷﴾

رحمت کا ظہور ہوا اور انھی کے ذریعے سے اس کے عذاب الیم کا ظہور ہوا۔

**آیت 51** وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ : "ضَيْف" یہ "ضَافَ يَضِيْفُ" کا مصدر ہے، جو مائل ہونے کے معنی میں آتا ہے، مہمان چونکہ کسی کی طرف مائل ہو کر ہی آتا ہے، اس لیے اسے "ضَيْفٌ" کہتے ہیں، یہ واحد، تثنیہ اور جمع سبھی کے لیے "ضَيْفٌ" واحد ہی آتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں جمع کے لیے آیا ہے۔ بعض لوگ اس کی جمع "اَضْيَافٌ" یا "ضُيُوْفٌ" بھی استعمال کرتے ہیں۔

**آیت 52** اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ : "وَجِلُوْنَ" "وَجِلَ يَوْجَلُ" (س) سے "وَجِلٌ" (صفت مشبہ) کی جمع ہے، بمعنی ڈرنے والے۔ ڈرنے کی وجہ، مکمل واقعہ اور اس کے فوائد کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۶۹) سے واقعہ کے آخر تک۔

**آیت 52** قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖ...... یعنی میں نے دنیا کا عام دستور اور اپنا بڑھاپا دیکھ کر محض تعجب کا اظہار کیا ہے، ورنہ یہ مقصد نہیں ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کا اظہار کر رہا ہوں۔

**آیت 57** قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ : غالباً ابراہیم علیہ السلام قرائن سے سمجھ گئے کہ فرشتوں کے آنے کا مقصد محض مجھے خوش خبری دینا نہیں، کیونکہ عموماً فرشتے کسی بڑی مہم ہی کے لیے آیا کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ [ الحجر : ۸ ] "ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق کے ساتھ۔"

قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَۙ۝۵۸ اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِیْنَۙ۝۵۹ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ۠۝۶۰ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِالْمُرْسَلُوْنَۙ۝۶۱ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ۝۶۲ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ۝۶۳ وَ اَتَیْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۝۶۴

انھوں نے کہا بے شک ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں ۵۸ سوائے لوط کے گھر والوں کے کہ یقیناً ہم ان سب کو ضرور بچا لینے والے ہیں ۵۹ مگر اس کی عورت، ہم نے طے کر دیا ہے کہ بے شک وہ یقیناً پیچھے رہنے والوں سے ہے ۶۰ پھر جب لوط کے گھر والوں کے پاس بھیجے ہوئے آئے ۶۱ تو اس نے کہا تم تو ایسے لوگ ہو جن کی جان پہچان نہیں ۶۲ انھوں نے کہا بلکہ ہم تیرے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ شک کیا کرتے تھے ۶۳ اور ہم تیرے پاس حق لے کر آئے ہیں اور بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں ۶۴

**آیت 62** قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ : جن کی جان پہچان نہ ہو، اجنبی، اوپرے۔ ابراہیم علیہ السلام کی طرح لوط علیہ السلام بھی انھیں پہچان نہ سکے۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ دوسری ساری مخلوق کی طرح یہ دونوں جلیل القدر انبیاء بھی عالم الغیب نہ تھے، ورنہ وہ ان کے آنے سے پہلے ہی انھیں جانتے ہوتے اور ان کے آنے سے باخبر ہوتے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہی معلوم ہوتا کہ مجھے اتنی عمر میں اسحاق عطا ہوں گے اور لوط علیہ السلام کو پہلے ہی اپنی قوم کا انجام معلوم ہوتا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام کا اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر صبر، آگ میں ڈالے جانے پر بھی استقامت کا اظہار، جبار مصر کی زیادتی کی آزمائش پر صبر، ہاجرہ اور اسماعیل کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑنے پر صبر، غرض ان کی کوئی آزمائش، آزمائش نہیں رہے گی، کیونکہ اگر پہلے علم ہو کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا تو ہر شخص آگ میں کود سکتا ہے اور بیٹے کی گردن پر چھری چلانے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ شیعہ حضرات نے تو انبیاء کے علاوہ اپنے بارہ اماموں کو ہر گزری ہوئی اور آنے والی بات جاننے والا قرار دیا۔ دیکھیے ان کی کتاب ''الکافی'' کی فہرست، جسے وہ اتنا معتبر سمجھتے ہیں جتنا اہل سنت صحیح بخاری کو۔

**آیت 64،63** قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ...... : '' اِمْتِرَاءٌ '' سے مضارع معلوم ہے، ایسا شک جو انسان کو ایسی بات پر جھگڑنے کے لیے آمادہ کرے جس کی حقیقت کچھ نہ ہو، بلکہ وہ صرف وہم و گمان پر مبنی ہو۔ (طنطاوی) اس لیے اس میں جھگڑے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ فرشتوں نے لوط علیہ السلام کو تسلی دینے کے لیے یہ بات کہی کہ ہم تمھیں پریشان کرنے کے لیے نہیں آئے، بلکہ وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کرتے اور جھگڑتے رہے ہیں اور واقعی ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ ''بِالْحَقِّ'' سے مراد عذاب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ ﴾

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ اتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَ قَضَيْنَاۤ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ جَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾

پس تو اپنے گھر والوں کو رات کے کسی حصے میں لے چل اور خود ان کے پیچھے پیچھے چل اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تمھیں حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۵﴾ اور ہم نے اس کی طرف اس بات کی وحی کر دی کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جانے والی ہے ﴿۶۶﴾ اور اس شہر کے رہنے والے اس حال میں آئے کہ بہت خوش ہو رہے تھے ﴿۶۷﴾

"ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق (یعنی عذاب) کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے۔" [ الحجر : ۸ ]

**آیت 65** ① وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ : لوط علیہ السلام کو ان کے پیچھے چلنے کا حکم اس لیے دیا کہ وہ ان کی اچھی طرح حفاظت کر سکیں، کوئی پیچھے نہ رہ جائے، سب مسلسل چلتے رہیں اور ٹھہر کر آنے والوں کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ ہماری نبی کریم ﷺ کا طریقہ بھی یہی تھا، چنانچہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں پیچھے رہتے، کمزوروں کو آگے چلاتے اور سواری پر اپنے پیچھے بٹھاتے اور ان کے لیے دعا فرماتے۔ [ أبو داؤد، الجهاد، باب لزوم الساقة : ۲۶۳۹ ]

② وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ : کیونکہ مڑ کر دیکھنے میں وہ تیزی باقی نہیں رہے گی جو اللہ کے عذاب کی جگہ سے بھاگنے میں ہونی چاہیے اور وطن چھوڑتے وقت حسرت سے اسے بار بار دیکھنے کے بجائے بس آگے بڑھتے جاؤ، تاکہ نہ دل کسی اور طرف متوجہ ہو اور نہ اللہ کے ذکر و شکر اور تمھاری رفتار میں کوئی کمی واقع ہو، نہ قوم کی بدترین بربادی دیکھتے ہوئے دل میں کوئی رقت پیدا ہو۔

③ وَامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ : وہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمائی، نہ رسول اللہ ﷺ نے۔ تعجب ہوتا ہے کہ بعض مفسرین اس کے بغیر ہی "قِيْلَ" (کہا جاتا ہے) کہہ کر کبھی شام، کبھی اردن اور کبھی مصر کا نام لیتے ہیں، یہ اندھیرے میں تیر پھینکنے والی بات ہے۔

**آیت 66** ① وَقَضَيْنَاۤ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ ...... : "اِلَيْهِ" کی وجہ سے "قَضَيْنَاۤ" کا معنی "ہم نے وحی کی" کیا جاتا ہے۔ "دَابِرَ" سب سے پیچھے رہ جانے والا، کسی چیز کا وہ حصہ جو سب کے بعد بچ گیا ہو۔ کسی درخت کو اکھاڑتے وقت آخری چیز جڑ ہوتی ہے، اسے بھی "دَابِرَ" کہہ لیتے ہیں۔ یعنی یہ سب لوگ ہلاک کر دیے جائیں گے، ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔

② مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ : "أَصْبَحَ" کا معنی ہے "دَخَلَ فِي الصُّبْحِ" کہ وہ صبح کے وقت آیا۔ قوم لوط کی ہلاکت کے لیے صبح کا وقت مقرر کیا گیا تھا، جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے: ﴿ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴾ [ هود : ۸۱ ] "بے شک ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، کیا صبح واقعی قریب نہیں ہے۔"

**آیت 67** ① وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ : "الْمَدِيْنَةِ" کا ترجمہ "اس شہر" الف لام برائے عہد کی وجہ سے کیا ہے۔ مفسرین

قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝۶۸ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ ۝۶۹ قَالُوْۤا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۰

اس نے کہا یہ لوگ تو میرے مہمان ہیں، سو مجھے ذلیل نہ کرو ۝۶۸ اور اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوانہ کرو ۝۶۹ انھوں نے کہا اور کیا ہم نے تجھے سارے جہانوں سے منع نہیں کیا ۝۷۰

نے اس کا نام ''سدوم'' بتایا ہے۔قومِ لوط کا عمل کرنے والوں کو بہت سی زبانوں میں ''سدومی'' کہا جاتا ہے، اس لیے عربی یا اردو میں اس کے لیے ''لوطی'' کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ مناسب نہیں۔ اس میں لوط علیہ السلام کی ایک طرح سے توہین ہے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ بروں کے ساتھ رہنے میں بھی بدنامی ہے، خواہ کتنا نیک ہو، اب لوط علیہ السلام کے اس بدبخت قوم کے پیغمبر ہونے کے باعث کتنے برے فعل کی نسبت ان کے مبارک نام کی طرف کی جاتی ہے۔

❷ يَسْتَبْشِرُوْنَ : " بَشَرَ " (ض، س)، " أَبْشَرَ " اور " اِسْتَبْشَرَ " تینوں کا معنی خوش ہونا ہے، صرف حروف کے اضافے کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہوتا جائے گا، اس لیے معنی کیا گیا ہے ''بہت خوش ہو رہے تھے'' یعنی لوط علیہ السلام کے گھر نہایت خوبصورت لڑکوں کے آنے کی خبر سن کر نہایت خوش خوش بے اختیار دوڑتے ہوئے آئے۔ (دیکھیے ہود: ۷۸) اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ شرم و حیا سے خالی ہو کر کتنی پستی میں گر چکے تھے۔ واضح رہے کہ "وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ" میں ''واؤ'' ترتیب کے لیے نہیں، بلکہ صرف واقعہ کے مختلف حصوں کو ملانے کے لیے ہے، کیونکہ اگر پہلے وحی آ چکی ہوتی اور لوط علیہ السلام مہمانوں کو جان چکے ہوتے کہ یہ فرشتے ہیں تو انھیں پریشان ہونے کی، قوم کی منتیں کرنے کی اور اپنی یعنی قوم کی بیٹیاں پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام غیب دان نہیں ہوتے، انھیں صرف وہی معلوم ہوتا ہے جو انھیں وحی کے ذریعے سے بتا دیا جائے۔ سورۂ ہود (۷۷ تا ۸۱) میں لوط علیہ السلام کی پریشانی کا نقشہ اور فرشتوں کا انھیں تسلی دینا ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 69،68** قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَيْفِيْ ...... : "ضَيْفٌ" کی تشریح کے لیے دیکھیے اس سورت کی آیت (۵۱) " فَلَا تَفْضَحُوْنِ " اور " لَا تُخْزُوْنِ " دونوں " فَلَا تَفْضَحُوْنِيْ " اور " لَا تُخْزُوْنِيْ " تھے، آیات کے آخر کی مناسبت کے لیے یاء حذف کر کے نون وقایہ مکسور رکھا گیا، یعنی مہمان پر زیادتی اور اس کی بے عزتی درحقیقت میزبان کی ذلت و رسوائی ہوتی ہے، تو لوط علیہ السلام نے دو طریقوں سے انھیں اس فعل بد سے ہٹانے کی کوشش کی، پہلی کوشش ان کی مہمانی کا حق ذکر کر کے اور آخری کوشش "وَاتَّقُوا اللّٰهَ" کہہ کر اللہ تعالیٰ سے ڈرانے کے ذریعے سے، مگر بے سود۔

**آیت 70** قَالُوْۤا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ : "لَمْ نَنْهَكَ" " نَهٰى يَنْهٰى " سے جمع متکلم جحد معلوم ہے، " نَنْهٰى " کا الف ''لَمْ'' کی وجہ سے حذف ہو گیا، کاف ضمیر مفعول بہ ہے۔ یعنی تم سارے جہان کو مہمان بنا لیا کرو گے تو کیا ہم سب ہی کو چھوڑ دیں گے، کیا ہم نے تمھیں منع نہیں کیا کہ ہمارے ہوتے اجنبی مسافروں کو مہمان نہ بنایا کرو اور ہمارے مقابلے میں کسی

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

اس نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں، اگر تم کرنے والے ہو ﴿۷۱﴾ تیری عمر کی قسم! بے شک وہ یقیناً اپنی مدہوشی میں بھٹکے پھرتے تھے ﴿۷۲﴾ پس انھیں چیخ نے روشنی ہوتے ہی پکڑ لیا ﴿۷۳﴾

کی حمایت نہ کرو۔ کیسے خبیث اور مسخ شدہ فطرت والے لوگ تھے، جو اپنے شہر میں آنے والے مہمان یا گزرنے والے کو بھی نہیں چھوڑتے تھے، نہ اس میں کوئی شرم محسوس کرتے تھے۔

**آیت 71** قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود کی آیت (۷۸) کی تفسیر۔

**آیت 72** لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ...... : ”عَمْرٌ“ عین کے فتحہ کے ساتھ ”عُمْرٌ“ ہی کی ایک لغت ہے، اس کا معنی دنیا میں زندگی کی مدت ہے۔ قسم کے وقت ”عین“ ہمیشہ مفتوح ہوتا ہے۔ لام ابتدا کا ہے جو قسم کے معنی میں ہے۔ ”عَمْرٌ“ مبتدا ہے اور اس کی خبر ”قَسَمِيْ“ یا ”يَمِيْنِيْ“ ہے جو لازماً حذف ہوتی ہے، یعنی مجھے تیری عمر کی قسم۔ ”سَكْرَةٌ“ نشے میں ہونا، مدہوش ہونا۔ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی اور آپ کی اتنی تکریم فرمائی کہ آپ کے علاوہ کسی انسان کی زندگی کی قسم نہیں کھائی۔ لوط علیہ السلام کے قصے کے درمیان یہ جملہ معترضہ ہے، جس سے ان کا گمراہی سے کسی صورت باز نہ آنا بیان کرنا مقصود ہے۔ قسم اور جوابِ قسم میں مناسبت یہ ہے کہ اے نبی! آپ کی پوری پاکیزہ زندگی اور عفت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگ جو اس کے بالکل برعکس چلنے والے تھے وہ دراصل ہوش میں نہ تھے اور اسی مدہوشی میں ایسے بھٹکے پھرتے تھے کہ ان کے لیے راہِ راست پر آنا ممکن ہی نہ تھا۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ یہ فرشتوں کا کلام ہے اور انھوں نے لوط علیہ السلام کی زندگی کی قسم کھائی ہے۔ ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم کھانا منع ہے، صحیح احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کی چاہے قسم کھا سکتا ہے۔ قسم کے متعلق مفصل بات ان شاء اللہ آگے کسی مقام پر ہوگی۔

**آیت 72** فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ : ”اَشْرَقَتِ الشَّمْسُ“ ”سورج طلوع ہوا“۔ اس سے پہلے آیت (۶۶) میں ”مُصْبِحِيْنَ“ کا لفظ ہے، یعنی صبح کے وقت۔ سورۂ قمر (۳۸) میں ”بُكْرَةً“ کا لفظ ہے، جس کا معنی دن کا پہلا حصہ ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ صبح کے وقت عذاب شروع ہوا اور سورج چڑھنے تک جاری رہا۔ ایک تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ صبح نمودار ہونے سے لے کر سورج چڑھنے کے کچھ بعد تک سارے وقت کو عرف میں صبح کہہ لیتے ہیں اور ایک تطبیق یہ بھی ہے کہ ”أَشْرَقَ يُشْرِقُ“ مطلقاً تاریکی میں روشنی ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے، جو ظاہر ہے کہ صبح کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے اور سورج نکلنے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا﴾ [ الزمر : ۶۹ ] ”اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ روشن ہو جائے گی۔“ میں نے ترجمہ میں یہی معنی اختیار کیا ہے، تاکہ ”مُصْبِحِيْنَ“ کے ساتھ مطابقت رہے۔

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿٧٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿٧٨﴾

تو ہم نے اس کے اوپر کا حصہ اس کا نیچے کا حصہ کر دیا اور ان پر کھنگر کے پتھروں کی بارش برسائی ﴿٧٤﴾ بے شک اس میں گہری نظر سے دیکھنے والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿٧٥﴾ اور بے شک وہ (بستی) یقیناً ایک دائمی (آباد) راستے پر ہے ﴿٧٦﴾ بے شک اس میں ایمان والوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے ﴿٧٧﴾ اور بے شک ''ایکہ'' والے یقیناً ظالم تھے ﴿٧٨﴾

**آیت 74** اس آیت کی تفسیر سورۂ ہود (۸۲) میں دیکھیے۔ قرآن مجید نے قوم لوط پر تین طرح کا عذاب ذکر فرمایا ہے، پہلے ان پر ''صَیْحَةٌ'' (چیخ) کا عذاب آیا، پھر ان کی بستیوں کو الٹ دیا گیا اور آخر میں ان پر پتھروں کی بارش برسائی گئی۔

**آیت 75** اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ...... : ''لِلْمُتَوَسِّمِيْنَ'' یہ ''وَسْمٌ، سِمَةٌ'' سے باب تفعل کا اسم فاعل ہے۔ ''وَسْمٌ'' کا معنی نشان ہے، خصوصاً جو گرم لوہے کے ساتھ اونٹ یا گھوڑے پر لگایا جاتا ہے۔ ''مِيْسَمٌ'' گرم کر کے نشان لگانے کا آلہ۔ نشانات کو دیکھ کر بات کی تہ تک پہنچنا ''تَوَسُّم'' کہلاتا ہے، یعنی غور و فکر کرنے والوں اور گہری نظر والوں کے لیے ان بستیوں میں عبرت کے بہت سے نشان موجود ہیں۔

**آیت 76** وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ : ''مُقِيْمٍ'' ''ہمیشہ رہنے والا، دائمی'' یعنی جو قافلے حجاز سے شام یا عراق سے مصر جاتے ہیں یہ بستی ان کے راستے میں پڑتی ہے، مگر لوگ ہیں کہ اس میں تباہی کے آثار دیکھ کر کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَ بِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۱۳۷، ۱۳۸ ] ''اور بلاشبہ تم یقیناً صبح جاتے ہوئے ان پر سے گزرتے ہو اور رات کو بھی، تو کیا تم سمجھتے نہیں؟'' جدید محققین کا خیال ہے کہ یہ بستی بحر میت (جسے بحر لوط یا اردو میں بحر مردار بھی کہتے ہیں) کے جنوب مشرق میں واقع تھی، بلکہ اس زمانہ میں اردن کی حکومت بحر میت کے جنوبی حصہ سے اس کے تباہ شدہ آثار برآمد کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہے۔

**آیت 77** اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ : یعنی ابراہیم اور لوط ؑ کے قصے میں ایمان والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت اور عذاب الیم کی بہت بڑی نشانی ہے۔ ''لَاٰيَةً'' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، یہاں ''لَاٰيَةً'' واحد اس لیے ذکر فرمایا کہ ایمان والوں کے یقین کے لیے یہ ایک نشانی ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مومنوں کی تعریف بھی ہے۔

**آیت 78** ① وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ...... : یہ ''اِنْ'' اصل میں ''اِنَّ'' تھا، اس کا اسم ضمیر شان ''ہٗ'' محذوف ہے، اس کی دلیل اور سبب وہ لام ہے جو ''ظَالِمِيْنَ'' پر آیا ہے، جو ''كَانَ'' کی خبر ہے۔ ''اَلْاَيْكَةُ'' اسم جنس ہے، درختوں کے جھنڈ،

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾ وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾

تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور بے شک وہ دونوں (بستیاں) یقیناً ظاہر راستے پر موجود ہیں ﴿۷۹﴾ اور بلاشبہ یقیناً "حجر" والوں نے رسولوں کو جھٹلا دیا ﴿۸۰﴾ اور ہم نے انھیں اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان سے منہ پھیرنے والے تھے ﴿۸۱﴾

زیادہ ہوں یا ایک، جیسے "تَمْرٌ" اسم جنس ہے۔ تاء وحدۃ کے اظہار کے لیے ہے، اس لیے "الْاَيْكَةِ" کا معنی ہے ایک جھنڈ، جیسے "تَمْرَةٌ" ایک کھجور۔

② بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قبیلہ تھا اور کئی مفسرین انھیں الگ الگ قوم شمار فرماتے ہیں۔ ان کا ظلم یہ تھا کہ وہ شرک میں گرفتار تھے، ناپ تول میں کمی بیشی کرتے تھے، راہ چلتے مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ان دونوں کی طرف شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا، تاکہ وہ ظلم کی ان تمام صورتوں سے باز آ جائیں۔ مدین والوں کی تفصیل سورۂ ہود (۸۴ تا ۹۵) میں ہے اور اصحاب الایکہ کی تفصیل سورۂ شعراء (۱۷۶ تا ۱۹۱) میں ہے۔ بعض کے مطابق اصحاب مدین اسی قوم کے شہری لوگ تھے اور اصحاب الایکہ انھی کے باہر جنگل میں رہنے والے لوگ تھے۔

آیت 79 وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ : "اِمَامٌ" کے کئی معنی ہیں، یہاں مراد واضح راستہ ہے، جس طرح امام کے پیچھے چلا جاتا ہے، اسی طرح صاف واضح راستے پر چل کر مسافر منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ (طنطاوی) وہ دونوں سے مراد قوم لوط اور اصحاب الایکہ کی بستیاں ہیں کہ وہ ایک ہی راستے پر قریب قریب واقع ہیں۔ مدین اور ایکہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ (قرطبی)

آیت 80 ① وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ : "الْحِجْرِ" اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جسے پتھروں سے گھیرا گیا ہو، جیسا کہ حطیم کو بھی حجر کہہ لیتے ہیں۔ "حَجَرَ يَحْجُرُ" کا معنی روکنا بھی ہے، تو "الْحِجْرِ" وہ جگہ جہاں عام لوگوں کا آنا جانا ممنوع ہو۔ یہ اس سورت میں چوتھا قصہ ہے۔ "الْحِجْرِ" شام اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک مقام ہے، جو صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کے لوگوں کا مرکز تھا، یہ جگہ خیبر سے تبوک جانے والی سڑک پر واقع ہے اور اب "مدائن صالح" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ علاقہ "العلاء" سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حجاز سے شام کو جو قافلے جاتے ہیں وہ لازماً یہاں سے گزر کر جاتے ہیں اور یہ اس ریلوے لائن کا ایک سٹیشن بھی ہے جو ترکوں کے زمانہ میں مدینہ سے دمشق کو جاتی تھی۔ اس قوم کے مفصل حالات سورۂ ہود (۶۵ تا ۶۸)، سورۂ اعراف، سورۂ قمر اور سورۂ شعراء میں ملاحظہ فرمائیں۔

② الْمُرْسَلِيْنَ : ایک رسول کو جھٹلانا چونکہ سب کو جھٹلانا ہے، اس لیے ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلا دیا۔ (روح المعانی)

آیت 81 ① وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا : "اٰيٰتِنَا" ہماری نشانیاں، ان نشانیوں میں اونٹنی کا معجزہ ہی کئی معجزوں پر مشتمل تھا۔ پیغمبر پر نازل شدہ آیات بھی اور ان کی وادی میں زراعت کا عمدہ انتظام اور پہاڑ تراش کر مکان بنانے کا سلیقہ جن کا ذکر سورۂ شعراء

وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾

اور وہ پہاڑوں سے مکان تراشتے تھے، اس حال میں کہ بے خوف تھے ﴿۸۲﴾ پس انھیں صبح ہوتے ہی چیخ نے پکڑ لیا ﴿۸۳﴾ پھر ان کے کسی کام نہ آیا، جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۸۴﴾ اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ اور یقیناً قیامت ضرور آنے والی ہے۔ پس درگزر کر، خوبصورت طریقے سے درگزر کرنا ﴿۸۵﴾

میں ہے، سب شامل ہیں۔ وہ عقلی دلائل بھی ان نشانیوں میں شامل ہیں جو توحید کی طرف رہنمائی کا کام دیتے ہیں۔

② فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ : یعنی انھوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی، بلکہ اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور صالح علیہ السلام کو چیلنج دیا کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو لے آؤ۔

آیت 82 تا 84 وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ...... : یعنی اس سے پہلی قوم عاد آندھی سے برباد ہوئی تھی تو انھوں نے اپنے خیال میں پہاڑوں کو تراش کر محفوظ مکان بنا لیے، جن میں کوئی خوف و خطرہ نہ تھا، مگر صبح کے وقت ایسی چیخ آئی کہ سب کے کلیجے پھٹ گئے اور ایک حد سے بڑھی ہوئی خوفناک آواز (اَلطَّاغِيَةُ) کے ساتھ پیدا ہونے والے زلزلے نے باقی کسر نکال دی، پھر ان کی تعمیراتی اور زرعی ترقی اور مہارت ان کے کسی کام نہ آئی۔

آیت 85 وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ...... : "بِالْحَقِّ" کا معنی صحیح، با مقصد کام جو ہو کر رہنے والا ہو، جو بے کار، بے مقصد نہ ہو اور جسے کوئی روک نہ سکے۔ اس کے بالمقابل باطل ہے، فرمایا: ﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ ﴾ [ الأنبیاء : ۱۸ ] "بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں۔" چار انبیاء کے واقعات کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق آسمان و زمین اور ان کے درمیان بے شمار مخلوقات کی طرف توجہ دلائی، جن میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عظمت و قدرت پر دلالت کرتی ہے۔ فرمایا کہ یہ سب ہم نے بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ یہ سب کچھ تمھاری ضروریات کے لیے ہے اور ان میں سے ہر چیز کے لیے اللہ کا حکم ماننا ہر حال میں لازم ہے، کسی کو اختیار ہی نہیں کہ وہ سرتابی کر سکے۔ صرف انسانوں اور جنوں کو آزمائش کے لیے کچھ اختیار دیا ہے، اگر اس کا صحیح استعمال کریں گے تو دنیا و آخرت میں اللہ کے انعامات کے مستحق ہوں گے، جیسے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر ہوا ہے، غلط استعمال کریں گے تو یا تو دنیا ہی میں اللہ کی گرفت میں آ جائیں گے، جیسے لوط، شعیب اور صالح علیہم السلام کی قومیں اللہ کے عذاب کی گرفت میں آئیں۔ اس کے بعد یقیناً قیامت آنے والی ہے، اس میں نیکوں کو ان کی نیکی کا پورا بدلہ دے گا، اگر دنیا میں بدلہ نہیں ملا تو وہاں کسر نکال دی جائے گی، اسی طرح بروں کو ان کی بدی کا پورا بدلہ ملے گا اور اگر دنیا میں انھیں مہلت ملی رہی تو وہاں کسر پوری کر دی جائے گی۔ اس لیے آپ اور آپ کے ساتھی ان کفار کی زیادتی پر صبر

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ

بے شک تیرا رب ہی کمال درجے کا پیدا کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۸۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھے بار بار

کریں اور ان کی زبان درازی سے درگزر فرمائیں (دیکھیے آل عمران : ۱۸۶) اور درگزر بھی خوبصورت طریقے سے، تاکہ قطع تعلق سے دعوت کا راستہ بند نہ ہو جائے۔ یہ سارا بیان نبی ﷺ کی تسلی کے لیے ہے۔

آیت 86 اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ : تو پھر اس کے لیے انھیں دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ دیکھیے سورۂ یٰس (۸۱)۔

آیت 87 ❶ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ: "اَلْمَثَانِيْ" "ثَنٰى يَثْنِيْ" (ض) کے اسم مفعول "مَثْنِيَّةٌ" (بروزن مَضْرُوْبَةٌ، مَرْمِيَّةٌ) کی جمع ہے، معنی دوہرا کرنا، دوہراتا ہے، یعنی بار بار دہرائی جانے والی۔

❷ کافروں کی زیادتی سے درگزر کی تلقین کے ساتھ اپنی ایک عظیم نعمت سبع مثانی اور قرآن عظیم یاد دلائی، تاکہ اتنی بڑی دولت کا مالک ہونے کے احساس سے کفار سے درگزر میں آسانی رہے۔

❸ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ: ''لام'' اور ''قَدْ'' کی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ ہم نے آپ کو سات بار بار دہرائی جانے والی عطا فرمائیں۔ یہ آیت اس بات کی بھی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآن کے ساتھ حدیث پر بھی ایمان اور عمل واجب ہے، اس کے بغیر قرآن نہ صحیح سمجھا جا سکتا ہے نہ اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں نہیں بتایا کہ وہ سبع مثانی سات سورتیں ہیں یا سات آیتیں، نہ یہ بتایا کہ وہ سورتیں ہیں تو کون سی اور آیتیں ہیں تو کون سی؟ بلکہ ایک جگہ سارے قرآن ہی کو مثانی فرما دیا، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ [ الزمر : ۲۳ ] ''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، وہ کتاب جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی اور بار بار دہرائی جانے والی ہے۔'' اب لازم ہے کہ پورے قرآن میں سے جو سارا ہی مثانی ہے، یہ متعین کیا جائے کہ ان سبع مثانی سے مراد کیا ہے۔ اپنے پاس سے متعین کریں تو کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا، اس لیے کسی مفسر نے سات سورتیں بتائیں، کسی نے سات آیتیں، تو کسی نے کچھ اور بتایا۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بغیر قرآن کی اس آیت کا مفہوم متعین کرنا ممکن ہی نہیں، چنانچہ ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( كُنْتُ أُصَلِّيْ فَمَرَّ بِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَانِيْ، فَلَمْ آتِهِ حَتّٰى صَلَّيْتُ، ثُمَّ أَتَيْتُهُ، فَقَالَ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَأْتِيَ؟ أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ : ﴿ اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ﴾ [الأنفال : ۲٤] ؟ ثُمَّ قَالَ لِيْ لَأُعَلِّمَنَّكَ سُوْرَةً هِيَ أَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِيْ فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَّخْرُجَ قُلْتُ لَهُ أَلَمْ تَقُلْ لَأُعَلِّمَنَّكَ سُوْرَةً هِيَ أَعْظَمُ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قَالَ : ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ أُوْتِيْتُهُ )) [ بخاري، التفسير، باب ما جاء في فاتحة الكتاب : ٤٤٧٤، ٤٦٤٧ ]

''نبی ﷺ میرے پاس سے گزرے اور میں نماز پڑھ رہا تھا، تو آپ نے مجھے بلایا، میں آپ کے پاس نہیں آیا، یہاں تک کہ

# الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾

دہرائی جانے والی سات آیتیں اور بہت عظمت والا قرآن عطا کیا ہے ﴿۸۷﴾

میں نے نماز پڑھ لی، پھر میں آیا تو آپ نے فرمایا: ''تمھیں میرے پاس آنے سے کس چیز نے روکے رکھا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: ﴿ اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ﴾ [ الأنفال : ۲٤ ] اللہ کی اور رسول کی دعوت قبول کرو جب وہ تمھیں بلائیں۔'' پھر مجھے فرمایا: ''میں تمھارے مسجد سے نکلنے سے پہلے ضرور تمھیں ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی تمام سورتوں سے بڑی (اعظم) ہے۔'' پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، جب آپ نے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے آپ سے کہا: ''کیا آپ نے فرمایا نہیں تھا کہ میں تمھیں ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی تمام سورتوں سے بڑی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ سبع مثانی سے سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں مراد ہیں، کیونکہ وہ ہر نماز کی ہر رکعت میں بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ دوسری تفسیریں مثلاً یہ کہ سات لمبی سورتیں مراد ہیں وغیرہ نبی کریم ﷺ کی صراحت کے بعد کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے بھی کہ لمبی سات سورتوں کی اکثریت تو اتری ہی مدینہ میں ہے، جب کہ یہ آیت مکی ہے۔

④ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ : بہت سے مفسرین نے سبع مثانی سے مراد فاتحہ اور قرآن عظیم سے مراد باقی قرآن لیا ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت میں مذکور سبع مثانی بھی اور القرآن العظیم بھی سورۂ فاتحہ ہی کو کہا ہے۔ بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں آپ کے الفاظ ہیں: « أُمُّ الْقُرْآنِ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ » [ بخاري، التفسیر، باب قوله : ﴿ و لقد آتيناك سبعا من المثاني...... ﴾ : ٤٧٠٤ ] ''ام القرآن ہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔'' کیونکہ قرآن ہونے کے لیے پورا قرآن ہونا ضروری نہیں، ایک آیت ہو تو وہ بھی قرآن ہے۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ جب قرآن کی سب سے بڑی سورت ہے تو قرآن عظیم (بہت بڑا قرآن) یہی ہے۔ رہی ''واؤ'' تو وہ ایک ہی چیز کی دو مختلف صفات کے درمیان آجاتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ وَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ﴾ [ الأعلٰی : ۱ تا ٤ ] ''اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے، وہ جس نے پیدا کیا، پس درست بنایا اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر ہدایت کی اور وہ جس نے چارا اگایا۔'' اور اس لحاظ سے بھی فاتحہ کو ''الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ'' فرمایا کہ قرآن مجید کے تمام مضامین اس میں اجمالی طور پر موجود ہیں۔

ایک دفعہ گوجرانوالہ میں ایک منکر حدیث نے بہت اودھم مچایا اور بہت سے لوگوں کے عقیدے خراب کیے، مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ (دال بازار والے) کی اس سے گفتگو ہوئی تو مولانا نے سورۂ توبہ کی آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾ [ التوبة : ٣٦ ] ''بے شک مہینوں کی گنتی، اللہ کے نزدیک، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہے، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَ قُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾

اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف ہرگز نہ اٹھا جس کے ساتھ ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو فائدہ دیا ہے اور نہ ان پر غم کر اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے ﴿۸۸﴾ اور کہہ دے بے شک میں تو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۸۹﴾

حرمت والے ہیں" اور فرمایا کہ جب حدیث کی ضرورت نہیں تو آپ قرآن سے بتائیں کہ حرمت والے وہ چار ماہ کون سے ہیں؟ اسے بالکل کوئی جواب نہ آیا اور حق بات بہت سے لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔

**آیت 88** ① **لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ** : "**مَتَّعْنَا**" متاع معمولی اور عارضی ساز و سامان۔ "**اَزْوَاجًا**" زوج ایک قسم، مثلاً نر اور مادہ میں سے ہر ایک ایک زوج ہے، دونوں ہوں تو "زَوْجَانِ" (ایک جوڑا) ہے۔ ان ازواج کی بہت سی قسمیں ہیں، مثلاً سرمایہ دار، حاکم، فوجی، زمیندار، کارخانے دار، مذہبی پیشوا وغیرہم، یعنی سبع مثانی اور قرآن عظیم کی دولت رکھتے ہوئے آپ کفار کے مختلف قسم کی دنیاوی نعمتیں رکھنے والوں کی طرف ہرگز نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیے، خصوصاً جب وہ نعمتیں ان کے لیے فتنہ و عذاب ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۵۵) اور سورۂ طٰہٰ (۱۳۰ تا ۱۳۲) کی تفسیر۔

② **وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ** : ان کے بڑے بڑے سردار اور کفر کے ٹھیکیدار اور ان کے پیروکار اگر ایمان نہیں لاتے تو آپ ان کے ایمان نہ لانے اور جہنم میں جانے پر غمگین نہ ہوں، آپ نے بات پہنچا کر حق ادا کر دیا تو غم کی کیا ضرورت ہے۔

③ **وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ** : "جَنَاحٌ" بازو، پر، پہلو۔ یہ دراصل ایک استعارہ ہے کہ پرندہ جس طرح اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے لے کر سمیٹ لیتا ہے اور انھیں سرد و گرم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح آپ بھی اہل ایمان کے لیے اپنا بازو یا پہلو جھکا دیں، مراد ان کے لیے نرمی، شفقت، محبت اور حفاظت ہے۔ یہی صفت اصحاب رسول ﷺ کی تھی، فرمایا: ﴿ **اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ** ﴾ [ الفتح : ۲۹ ] "کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔"

**آیت 89** **وَقُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ** : یہاں صرف ڈرانے کا ذکر ہے، خوش خبری کا نہیں، اس لیے کہ بات منکروں کے متعلق ہو رہی ہے۔ "**النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ**" (کھلم کھلا ڈرانے والا) کی تفسیر میں وہ حدیث عین حسب حال ہے جو ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے بیان فرمائی: (( إِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتٰى قَوْمًا فَقَالَ يَا قَوْمِ! إِنِّيْ رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ، وَإِنِّيْ أَنَا النَّذِيْرُ الْعُرْيَانُ، فَالنَّجَاءَ، فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَدْلَجُوْا فَانْطَلَقُوْا عَلٰى مَهْلِهِمْ فَنَجَوْا، وَكَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوْا مَكَانَهُمْ، فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَاحَهُمْ، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِيْ فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهِ، وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِيْ وَكَذَّبَ بِمَا جِئْتُ بِهِ مِنَ الْحَقِّ )) [ بخاري، الاعتصام بالكتاب و السنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ : ۷۲۸۳ ] "میری مثال اور اللہ نے جو کچھ دے کر مجھے بھیجا اس کی مثال اس آدمی کی مثال جیسی ہے جو اپنی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا: "اے میری قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر دیکھا

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝۹۰ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۝۹۱

(ایسے عذاب سے) جیسا ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر اتارا ﴿۹۰﴾ جنھوں نے کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا (کوئی مان لیا، کوئی نہ مانا) ﴿۹۱﴾

ہے اور میں ننگا ڈرانے والا ہوں (پہلے زمانے میں لوگ دشمن سے ڈرانے کے لیے چیخنے چلانے کے ساتھ کپڑے بھی اتار دیتے تھے، ان سے تشبیہ دی ہے) سو تم بچ جاؤ، بچ جاؤ، اس کی قوم میں سے ایک گروہ نے اس کا کہنا مان لیا، وہ اندھیرے ہی میں چل پڑے اور آرام سے چلتے ہوئے بچ نکلے اور ایک گروہ نے اسے جھٹلا دیا اور صبح تک اسی جگہ رہے۔ صبح کے وقت لشکر نے ان پر حملہ کیا اور انھیں ہلاک اور نیست و نابود کر دیا، سو یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری اطاعت کی اور جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس کی پیروی کی اور اس کی (مثال) جس نے میری نافرمانی کی اور اس حق کو جھٹلا دیا جو لے کر میں آیا ہوں۔"

**آیت 91-90** ① كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ...... : "اَلْمُقْتَسِمِيْنَ" یہ "قَسْمٌ" سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، "تقسیم کرنے والے۔" قرطبی نے فرمایا: "عِضِيْنَ" "عِضَةٌ" کی جمع ہے، جس کا معنی کسی چیز کا جز یا ٹکڑا ہے۔ "عَضَا يَعْضُوْ عَضْوًا الشَّيْءَ" اور "عَضَّى يُعَضِّي الشَّيْءَ" "کسی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔" ہر ٹکڑا "عِضَةٌ" کہلاتا ہے، اس کے آخر سے واؤ حذف کر کے تاء لائی گئی ہے۔ "اَلْقُرْاٰنَ" قرآن مجید کا نام ہے، پہلے انبیاء کی کتابوں کو بھی "قرآن" کہہ لیتے ہیں، کیونکہ وہ بھی پڑھی جاتی تھیں، گویا کتاب اور قرآن کا لفظ سب کے لیے ہے۔ ہمارے قرآن کے لیے عموماً "هٰذَا الْقُرْآنُ" یا "ذٰلِكَ الْكِتَابُ" وغیرہ کا اشارہ ساتھ موجود ہوتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( خُفِّفَ عَلٰى دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْقُرْآنُ فَكَانَ يَأْمُرُ بِدَوَابِّهِ فَتُسْرَجُ فَيَقْرَأُ الْقُرْآنَ قَبْلَ أَنْ تُسْرَجَ دَوَابُّهُ )) [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول الله تعالى : ﴿ و آتینا داود زبورا ﴾ : ۳۴۱۷ ] "داؤد علیہ السلام پر قرآن (پڑھنا) بہت ہلکا کر دیا گیا تھا، چنانچہ وہ اپنی سواریوں کے متعلق حکم دیتے تو ان پر زین ڈالی جاتی اور آپ سواریوں پر زین ڈالے جانے سے پہلے قرآن پڑھ لیتے تھے۔"

② ان آیات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو امام المفسرین طبری رحمہ اللہ نے پسند فرمائی ہے۔ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ " كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ " (جیسا ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر اتارا) کا تعلق پچھلی کس آیت اور کس لفظ کے ساتھ ہے اور اس مشبہ بہ کا مشبہ کیا ہے اور " اَنْزَلْنَا " (ہم نے اتارا) سے کیا چیز اتارنا مراد ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ " اَنْزَلْنَا " کا مفعول محذوف ہے "اَلْعَذَابَ" یعنی ہم نے عذاب اتارا اور " كَمَآ اَنْزَلْنَا " کا تعلق اس سے پہلی آیت: ﴿ وَقُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴾ کے ساتھ ہے اور معنی یہ ہے، اے نبی! کہہ دے کہ بے شک میں تو تمھیں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، اس قسم کے عذاب سے جیسا ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر نازل کیا تھا جنھوں نے (اپنی) کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ یعنی اس کے بعض حصوں کو مان لیا اور بعض کو نہ مانا۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرح کے بعض کاموں کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ [ البقرة : ۸۵ ] "پھر کیا تم کتاب کے

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

سو تیرے رب کی قسم ہے! یقیناً ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے ﴿۹۲﴾ اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۳﴾

بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟'' اور اس کی جزا دنیا کی رسوائی اور آخرت میں سخت ترین عذاب بیان فرمائی۔ اب یہاں آپ کے زمانے کے اسرائیلیوں کو اس قسم کے عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے جو ان سے پہلوں پر آیا تھا، کیونکہ وہ بھی تورات کے بعض حصوں کا صاف انکار کرتے تھے، مثلاً نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی تاکید والی آیات۔ اور قریش کو بھی کہ کتاب اللہ کے بعض حصوں کو جھٹلانے والوں پر جس طرح عذاب آیا میں تمھیں بھی ویسے ہی عذاب سے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، کیونکہ تم نے بھی جھٹلانے کی روش اختیار کر رکھی ہے اور تم قرآن کے بعض حصوں کو ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہو، چنانچہ تم بھی بتوں کی مذمت کی آیات نکال دینے پر ایمان لانے کی پیش کش کرتے ہو، فرمایا: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴾ [ القلم : ۹ ] ''وہ چاہتے ہیں کاش! تو نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کریں۔'' اسی طرح ان کا یہ مطالبہ بھی ذکر فرمایا کہ اس قرآن کے علاوہ اور قرآن لے آؤ، یا اس میں تبدیلی کر دو۔ (دیکھیے یونس : ۱۵) دوسری تفسیر یہ ہے کہ " كَمَاۤ اَنْزَلْنَا " کا تعلق آیت (۸۷) ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴾ سے ہے اور " اَنْزَلْنَا " کا مفعول محذوف "اَلْكِتَابَ" ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم عطا فرمائے، جیسے ان لوگوں پر کتاب نازل کی تھی جنھوں نے اپنی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، کسی حصے کو مان لیا کسی کو نہ مانا، جب ہم ان پر کتاب نازل کر سکتے ہیں تو آپ پر، جن کی پاکیزہ زندگی کے یہ لوگ چالیس سالہ گواہ ہیں، ہم سبع مثانی اور قرآن عظیم کیوں نازل نہیں کر سکتے! یہ تفسیر بھی اچھی ہے۔

**آیت 92، 93** ❶ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ...... " يَعْمَلُوْنَ " میں دل، زبان اور جسم کے تمام حصوں کے افعال شامل ہیں۔ اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ " اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ " (بے شک قیامت آنے والی ہے)، اب اسی بات کو آگے بڑھایا کہ تیرے رب کی قسم! ہم ان سب سے سوال کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا کسی سے سوال کرنا ہی نہایت خوفناک بات ہے، خصوصاً جب زبان، دل اور اعضا کے ہر ہر عمل کے متعلق ہو۔ آسان حساب صرف انھی کا ہوگا جن کا دفتر پیش ہونے پر کسی سوال و جواب کے بغیر نجات ہو جائے گی۔ دیکھیے سورۂ انشقاق (۷ تا ۹) کی تفسیر۔ قسم کھا کر تمام کفار سے باز پرس کا یقین دلانے سے مقصود نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دینا ہے۔

❷ ان آیات میں ذکر ہے کہ قیامت کے دن تمام کفار سے سوال کیا جائے گا، جب کہ سورۂ رحمن میں ہے: ﴿ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴾ [ الرحمٰن : ۳۹ ] ''پھر اس دن نہ کسی انسان سے اس کے گناہ کے متعلق سوال کیا جائے گا اور نہ کسی جن سے۔'' ایک آیت میں ہے سوال کیا جائے گا، دوسری میں ہے کہ نہیں کیا جائے گا، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا جواب یہ دیا کہ کسی سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم نے کیا کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بندوں سے بھی زیادہ یہ بات جانتا ہے۔ سوال یہ ہوگا کہ کیوں کیا؟ اور ظاہر ہے کہ یہ سزا کی تمہید ہے۔ (ابن کثیر)

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾

پس اس کا صاف اعلان کر دے جس کا تجھے حکم دیا جاتا ہے اور مشرکوں سے منہ پھیر لے ﴿۹۴﴾ بے شک ہم تجھے مذاق اڑانے والوں کے مقابلے میں کافی ہیں ﴿۹۵﴾

**آیت 94** ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ ...... : " صَدَعَ يَصْدَعُ، الْأَمْرَ " کسی معاملے کو خوب کھول کر بیان کرنا اور "صَدَعَ بِالْحَقِّ" کھلم کھلا بلند آواز سے حق کا اظہار کرنا۔ شروع میں نبی ﷺ خفیہ اسلام کی دعوت دیتے تھے، اس کے بعد ان آیات میں چھپ کر دعوت دینے کے بجائے صاف اعلانیہ طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام سنانے کا اور مشرکین کی پروا نہ کرتے ہوئے ان سے اعراض کرنے کا حکم ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے خود نمٹنے کا ذمہ اٹھایا جو آپ سے استہزا کرتے اور ٹھٹھا اڑاتے تھے۔ یہ حکم مکہ میں نازل ہوا، مدینہ گئے تو وہاں کفار اور اہل کتاب سے جنگ شروع ہوئی اور خطرے کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کا پہرا دیتے تھے، جب سورۂ مائدہ کی آیت (۶۷) ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو تو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا) اتری تو آپ نے خیمہ سے سر نکال کر پہرے داروں سے فرمایا: (( يَا أَيُّهَا النَّاسُ! انْصَرِفُوْا، فَقَدْ عَصَمَنِيَ اللّٰهُ )) [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة المائدة : ۳۰۴۶۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۶۴۴/۵، ح : ۲۴۸۹ ] "لوگو! چلے جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ کر دیا ہے۔"

**آیت 95** ﴿اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ﴾ : ہم ان سے نبٹ لیں گے، آپ بے خوف و خطر دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے رہیے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ نبی ﷺ کا مذاق اڑانے والے (بڑے بڑے یہ پانچ) آدمی تھے، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث زہری، ابوزمعہ اسود بن مطلب، حارث بن عیطل سہمی اور عاص بن وائل۔ جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے مذاق اڑانے والوں کی شکایت کی۔ حدیث لمبی ہے، خلاصہ یہ کہ جبریل علیہ السلام نے ان کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کی طرف اشارہ کیا اور وہ پانچوں بری طرح فوت ہوئے۔ [ السنن الكبرىٰ للبيهقي : ۸/۹، ح : ۱۸۱۸۷ ] جو مذاق اڑانے والے باقی رہے ان کا انجام عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: (( أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ عِنْدَ الْبَيْتِ، وَ أَبُوْ جَهْلٍ وَأَصْحَابٌ لَهُ جُلُوْسٌ، إِذْ قَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ أَيُّكُمْ يَجِيْءُ بِسَلٰى جَزُوْرِ بَنِيْ فُلَانٍ فَيَضَعُهُ عَلٰى ظَهْرِ مُحَمَّدٍ إِذَا سَجَدَ؟ فَانْبَعَثَ أَشْقَى الْقَوْمِ، فَجَاءَ بِهِ فَنَظَرَ حَتّٰى إِذَا سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضَعَهُ عَلٰى ظَهْرِهِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ وَأَنَا أَنْظُرُ، لَا أُغْنِيْ شَيْئًا، لَوْ كَانَتْ لِيْ مَنْعَةٌ، قَالَ فَجَعَلُوْا يَضْحَكُوْنَ وَ يُحِيْلُ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاجِدٌ لَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ حَتّٰى جَاءَتْهُ فَاطِمَةُ فَطَرَحَتْهُ عَنْ ظَهْرِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَشَقَّ عَلَيْهِمْ إِذْ دَعَا عَلَيْهِمْ، قَالَ وَ كَانُوْا يَرَوْنَ أَنَّ الدَّعْوَةَ فِيْ ذٰلِكَ الْبَلَدِ مُسْتَجَابَةٌ، ثُمَّ سَمّٰى اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

جو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بناتے ہیں، سو عنقریب جان لیں گے ﴿۹۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ تیرا سینہ اس سے تنگ ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں ﴿۹۷﴾

بِأَبِيْ جَهْلٍ، وَعَلَيْكَ بِعُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ، وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ، وَالْوَلِيْدِ بْنِ عُتْبَةَ، وَأُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ، وَعُقْبَةَ بْنِ أَبِيْ مُعَيْطٍ، وَعَدَّ السَّابِعَ فَلَمْ نَحْفَظْهُ، قَالَ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَقَدْ رَأَيْتُ الَّذِيْنَ عَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَرْعَى فِي الْقَلِيْبِ قَلِيْبِ بَدْرٍ ﴾ [ بخاری، الوضوء، باب إذا ألقي على ظهر المصلي قذر...... : ۲٤۰ ] ”ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور ابوجہل اور اس کے کچھ ساتھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے آپس میں کہا کہ تم میں سے کون ہے جو بنو فلاں کی ذبح کردہ اونٹنی کی اوجھڑی و بچہ دانی وغیرہ اٹھا کر لائے اور محمد (ﷺ) جب سجدہ کرے تو اس کی پیٹھ پر رکھ دے۔ تو ان میں سے سب سے بدبخت شخص اٹھا اور اس نے وہ اوجھڑی وغیرہ لا کر آپ کے کندھوں کے درمیان رکھ دی۔ میں دیکھ رہا تھا مگر کچھ نہ کر سکتا تھا، کاش! مجھ میں آپ کے دفاع کی طاقت ہوتی۔ تو وہ سب ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ رسول اللہ ﷺ سجدے ہی میں رہے، سر نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور اسے آپ کی کمر سے اتار پھینکا، تو آپ نے سر اٹھایا اور کہا: ”یا اللہ! قریش کو پکڑ۔“ آپ کی یہ بددعا ان پر بڑی شاق گزری، وہ سمجھتے تھے کہ اس شہر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ نے نام لے کر فرمایا: ”اے اللہ! ابوجہل کو پکڑ، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ۔“ ایک ساتواں بھی گنا جو ہمیں یاد نہیں رہا۔“ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”پھر اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے ان تمام آدمیوں کو جو رسول اللہ ﷺ نے گنے تھے، بدر کے کنویں میں ہلاک شدہ گرے ہوئے دیکھا۔“

**آیت 96** الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ ...... : نبی کریم ﷺ سے استہزا کے ساتھ ساتھ ان کا سب سے بڑا جرم شرک ذکر کر کے فرمایا، یہ لوگ عنقریب انجام دیکھ لیں گے۔ دنیا میں ان کے انجام کا ذکر اوپر گزرا، آخرت کا معاملہ تو بیان ہی میں نہیں آ سکتا۔

**آیت 97** وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ ...... : اللہ تعالیٰ نے کفار کے استہزا اور کفر و شرک پر اصرار سے متعلق نبی ﷺ کو نہایت تاکید والے الفاظ میں تسلی دی۔ چنانچہ لام تاکید اور ”قَدْ“ برائے تحقیق کے ساتھ اس بات کا اظہار فرمایا کہ ہم آپ کے حالات سے بے خبر نہیں، بلکہ ہر وقت ہماری توجہ آپ کی طرف ہے، اب بھی اور آئندہ بھی اور ہم جانتے ہیں کہ یقیناً آپ کا سینہ ان کی باتوں سے تنگ پڑ جاتا ہے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

ركوع ۶

پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا ﴿۹۸﴾ اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آ جائے ﴿۹۹﴾

آیت 98 ① فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ : کفار کی زیادتیوں اور استہزا کی وجہ سے سینہ کی اس تنگی کا علاج بیان فرمایا کہ اگر آپ کا سینہ اس سے تنگ ہو تو آپ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد کریں۔ تسبیح کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو ہر عیب، نقص اور ایسی چیزوں سے پاک قرار دینا جو اس کے لائق نہیں اور حمد کا معنی اللہ کی ان تمام صفات کمال کے ساتھ تعریف کرنا جو اس کی شان کے لائق ہیں۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ تسبیح اور حمد میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال آ جاتی ہیں، کیونکہ تسبیح میں تمام صفات سلبیہ (یعنی ہر عیب اور کمی سے پاک ہونا) آ گئیں اور حمد میں تمام صفات ثبوتیہ (یعنی ہر خوبی کا مالک ہونا) آ گئیں، چنانچہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ہر مصیبت اور تنگی میں صبر اور تسبیح و حمد کا حکم دیا، جیسا کہ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۰)، فرقان (۵۸)، مومن (۵۵)، طور (۴۸) اور سورۂ نصر (۳) وغیرہ۔

② وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ : یعنی نماز پڑھنے والوں میں سے ہو جا، جس طرح قیام اور "رَكْعَةٌ" (رکوع) سے مراد پوری نماز لی جاتی ہے، حالانکہ قیام اور "رَكْعَةٌ" (رکوع) نماز کا جز ہیں، کل نہیں، مگر جز سے مراد کل ہے، اسی طرح یہاں سجدہ سے مراد نماز ہے، اسی لیے اس آیت پر سجدہ نہیں۔ سجدے کا ذکر خصوصاً اس لیے کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَ هُوَ سَاجِدٌ ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ )) [ مسلم ، الصلاۃ ، باب ما يقال في الركوع و السجود : ۴۸۲ ، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] "بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے تو (سجدے میں) دعا کثرت سے کیا کرو۔" اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر پیش آنے والی مصیبت کا علاج اللہ کا ذکر، خصوصاً تسبیح و تحمید اور نماز ہے، ان کی برکت سے دل کو تسلی بھی ہو گی اور فکر و غم کے بادل بھی چھٹ جائیں گے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے چکی پیسنے اور مشک میں پانی ڈھونے کی مشقت کی وجہ سے خادمہ کے لیے درخواست پر انھیں سوتے وقت تسبیحات فاطمہ کا حکم دیا اور ان تسبیحات کو خادمہ سے بہتر قرار دیا اور خود آپ ﷺ کا عمل تھا کہ جب آپ کو کوئی معاملہ پیش آتا تو نماز میں مصروف ہو جاتے۔ [ أبو داؤد، التطوع، باب وقت قيام النبي ﷺ في الليل : ۱۳۱۹۔ مسند أحمد : ۳۸۸/۵، ح : ۲۳۳۶۱ ]

آیت 99 وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ : یعنی موت آنے تک اپنے رب کی عبادت پر قائم رہیں۔ موت کو "یقین" اس لیے فرمایا کہ ہر جان دار کے لیے اس کا آنا یقینی ہے۔ قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی "یقین" کا لفظ موت کے معنی میں آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ حَتّٰى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴾ [ المدثر : ۴۷ ] "یہاں تک کہ ہمیں یقین آ پہنچا (یعنی موت

سورۃ النحل ﴿ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴾

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو، وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ①

آ گئی)۔'' اس لیے سب قابل ذکر مفسرین نے اس آیت میں یقین کو بمعنی موت مراد لیا ہے۔ تو جب تک ہوش رہے نماز اور دوسری عبادات زندگی کے آخری دم تک حسب طاقت کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا پہلو کے بل لیٹ کر ادا کرنا فرض ہے۔ بعض جاہل اور بے عمل پیر اس آیت کی رو سے کہتے ہیں کہ عبادت کرتے کرتے جب یقین حاصل ہو جائے تو پھر عبادت کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے وہ اپنے آپ کو نماز، روزہ اور عبادات سے مستثنیٰ قرار دے لیتے ہیں۔ یہ تفسیر کتاب اللہ کے ساتھ کھیل ہے۔ کیا یہ جس یقین کا نام لیتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل نہ ہو سکا کہ وہ آخر وقت تک نماز، روزہ اور دوسری عبادات کی پابندی کرتے رہے۔ بہر حال آیت میں یقین سے مراد یقین قلبی لینا اور نماز روزہ چھوڑ دینا صریح بے دینی ہے۔

## سورۃ النحل

**آیت 1** ① اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ: ''اَمۡرُ اللّٰہِ'' سے مراد قیامت ہے اور مشرکین پر مختلف قسم کے عذاب کا نزول بھی ہے اور ''اَتٰۤی'' (آ گیا) سے مراد بالکل قریب آنا ہے، کیونکہ آ ہی چکا ہو تو پھر کفار کی طرف سے اسے جلدی لانے کا مطالبہ بے معنی ہے۔

② فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ: مشرکین قیامت یا عذاب کا ذکر آنے پر مذاق اڑانے کے لیے اسے فوراً لانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ دیکھیے سورۂ انفال (۳۲) اور سورۂ عنکبوت (۵۳ تا ۵۵) لفظ ماضی ''اَتٰۤی'' (آ گیا) کا مطلب ہے کہ اس کا آنا اتنا یقینی ہے کہ سمجھو آ ہی چکا، اس لیے جلدی نہ مچاؤ، وہ بالکل قریب ہے اور طے شدہ وقت پر آ جائے گا۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ مسلمان بھی بعض اوقات پریشان ہو کر مسلمانوں کے لیے اللہ کی نصرت اور کفر پر عذاب میں تاخیر پر اس کے جلدی آنے کی دعا کرتے تھے، انھیں بھی تسلی دی کہ سمجھو اللہ کا حکم آ ہی گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ﴾ [ البقرۃ : ۲۱٤ ] ''یہاں تک کہ وہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہو گی؟ سن لو، بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔''

③ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ: عذاب کے جلدی نہ آنے کی وجہ سے وہ کہتے تھے اللہ تعالیٰ وہ عذاب لا ہی نہیں سکتا، ورنہ فوراً کیوں نہیں لے آتا۔ فرمایا ان کا اللہ تعالیٰ کو اپنا حکم نافذ کرنے سے اور عذاب لانے سے عاجز قرار دینا، یا وعدہ خلافی کرنے والا سمجھنا کفر و شرک کا نتیجہ ہے، جس سے اللہ تعالیٰ ہر طرح پاک اور نہایت بلند ہے۔ وہ نہ عاجز ہے نہ وعدہ خلاف، مگر

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳

وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے کہ خبردار کردو کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو مجھ سے ڈرو ۝۲ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ اس سے بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ۝۳

وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، ان کی فرمائشوں کا پابند نہیں۔ دیکھیے سورۂ حج (۴۷)۔

❹ آیت کے شروع میں مخاطب کر کے فرمایا: ﴿فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ ”تم اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو“ اور آیت کے آخر میں مشرکین کا ذکر غائب کے لفظ سے کیا: ﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ ”وہ اس سے پاک اور بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں“ اسے التفات کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ اس قابل ہی نہیں کہ انھیں مخاطب کیا جائے۔

**آیت 2** ❶ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ : ملائکہ سے مراد جبریل علیہ السلام اور ان کے ساتھ وحی کے محافظ فرشتے ہیں۔ صرف جبریل علیہ السلام بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ کسی بڑی شخصیت کے لیے جمع کا لفظ بھی بول لیا جاتا ہے۔ ”اَلرُّوْحُ“ سے مراد وہ چیز جس سے زندگی حاصل ہوتی ہے، یہاں مراد وحی ہے، کیونکہ حقیقی زندگی اسی سے حاصل ہوتی ہے، دل کی زندگی بھی اور آخرت کی زندگی بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشورٰی: ۵۲] ”اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی۔“ یہاں بھی ”رُوْحًا“ سے مراد وحی ہے۔ ”اَمْرِهٖ“ یعنی فرشتے اس کے حکم کے بغیر نہیں اترتے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۶۴)۔

❷ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ : معلوم ہوا نبوت وہبی چیز ہے جو محض اللہ کی مشیت اور اس کے انتخاب سے عطا ہوتی ہے، فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۷۵] ”اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔“ اور فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] ”اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔“ یہ اپنی ریاضت یا چلہ کشی سے حاصل ہونے والی چیز نہیں، جیسا کہ قادیانی دجال اور بعض گمراہ لوگوں کا دعویٰ ہے۔

❸ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ : آیت کے اس ٹکڑے میں فرشتوں کو وحی دے کر اپنے تمام رسولوں کی طرف بھیجنے کا مقصد بیان فرمایا کہ وہ اللہ کی توحید، اس کے ساتھ کسی بھی قسم کے شرک سے بچنا اور اسی سے ڈرتے رہنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الأنبياء: ۲۵] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“

**آیت 3** ❶ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ...... : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور قدرت کے بہت سے دلائل نہایت

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴﴾ وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۵﴾

اس نے انسان کو ایک قطرے سے پیدا کیا، پھر اچانک وہ کھلم کھلا بہت جھگڑنے والا ہے ④ اور چوپائے، اس نے انھیں پیدا کیا، تمھارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان اور بہت سے فائدے ہیں اور انھی سے تم کھاتے ہو ⑤

عمدہ اور انوکھے انداز سے شروع فرمائے ہیں۔ فرمایا اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ خالق ہے اور زمین و آسمان کی ہر ہستی اور ہر چیز مخلوق ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، پھر خالق و مخلوق یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟

② بِالْحَقِّ : باطل کے مقابلے میں حق کا لفظ آتا ہے، یہاں بمعنی حکمت ہے، یعنی زمین و آسمان کی پیدائش بے شمار حکمتوں پر مبنی ہے، یہ کوئی کھیل یا فضول اور بے کار کام نہیں۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۹، ۲۰)، سورۂ ص (۲۷) اور سورۂ دخان (۳۸، ۳۹) سب سے پہلے اپنی وحدانیت کی دلیل کے لیے زمین و آسمان کا ذکر فرمایا، کیونکہ یہ دوسری اکثر مخلوقات سے عظیم اور ان پر حاوی ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ [ المومن : ۵۷ ] ”یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بڑا ہے۔“

آیت 4 : خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ ...... : ”نَطَفَ“ (ض، ن) ٹپکنا۔ ”نُطْفَةٍ“ قطرہ۔ تا تحقیر کے لیے ہے، یعنی حقیر اور معمولی قطرے سے۔ ”خَصِيْمٌ“ مبالغے کا صیغہ ہے۔ زمین و آسمان کے بعد ان میں پیدا کردہ چیزیں توحید کی دلیل کے طور پر پیش فرمائیں، سب سے پہلے انسان کا ذکر فرمایا، یہی بات سورۂ یٰس میں تفصیل سے بیان فرمائی، فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ﴾ [ یٰس : ۷۷، ۷۸ ] ”اور کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑنے والا ہے اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا، کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جبکہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟“ ”اِذَا“ فجائیہ ”اچانک“ کے معنی میں آتا ہے، یعنی ایسی عجیب چیز کا وجود میں آنا جس کا وہم و گمان بھی نہ ہو، یعنی اگر یاد رکھتا تو ایک حقیر قطرے سے مختلف اطوار سے گزر کر وجود میں آنے والے انسان سے اس جھگڑے کی توقع ہی نہ کی جا سکتی تھی، بلکہ حق یہ تھا کہ وہ اپنی پیدائش کو یاد رکھتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت کے دونوں حصوں سے اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت پر استدلال مقصود ہو، یعنی نطفہ سے پیدا کیا، پھر اس میں کامل طور پر ساری قوتیں یعنی سوچنے سمجھنے کی اور بولنے کی پیدا کر دیں کہ حجت و استدلال اور بحث کے قابل ہو گیا۔ (روح المعانی)

آیت 5 : وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ ...... : ”اَلْاَنْعَامَ“ ”نَعَمٌ“ (ن اور ع کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے، اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریاں۔ ”دِفْءٌ“ گرمی، یہ سردی سے ٹھٹھرنے کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، ”مَا يُدْفَأُ بِهٖ“ جس

وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ﴿۶﴾ وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷﴾ وَّ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ

اور تمھارے لیے ان میں ایک جمال ہے، جب تم شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب صبح چرانے کو لے جاتے ہو﴿۶﴾ اور وہ تمھارے بوجھ اس شہر تک اٹھا کر لے جاتے ہیں جس میں تم کبھی پہنچنے والے نہ تھے، مگر جانوں کی مشقت کے ساتھ، بے شک تمھارا رب یقیناً بہت نرمی کرنے والا، نہایت رحم والا ہے﴿۷﴾ اور گھوڑے اور خچر اور گدھے، تاکہ تم ان

کے ساتھ گرمی حاصل کی جائے، جیسا کہ ''مِلْأٌ'' جس کے ساتھ کسی چیز کو بھرا جائے۔ چوپاؤں کا ایک خاص فائدہ ان کی اون اور بالوں سے گرمی مہیا کرنے والا لباس اس کی اہمیت کے پیش نظر پہلے ذکر فرما کر عام فوائد کا ذکر بعد میں فرمایا۔ ''وَمَنَافِعُ'' اور بہت سے فائدے ہیں، مثلاً سواری کرتے ہو، ہل چلاتے ہو، پانی کھینچتے ہو، ان کا گوبر جلاتے ہو، کھیتوں میں بطور کھاد ڈالتے ہو، انھیں بیچ کر ضرورت کا ہر سامان خریدتے ہو۔ ان منافع میں ''دِفْءٌ'' بھی شامل ہے اور یہ بھی کہ ان کی نسل بڑھنے سے تمھاری دولت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور آخر میں ان منافع میں سے پھر خاص طور پر ایک نفع ذکر فرمایا کہ انھی سے تم کھاتے ہو، یعنی دودھ، دہی، ان سے بننے والی بے شمار چیزیں اور گوشت، الغرض، ان میں تمھارے کھانے کا سامان بھی ہے۔ یہ آیت اسی سورت کی آیت (۶۶) اور (۸۰) کے مشابہ ہے۔

**آیت 6** ① وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ ...... : ''جَمَالٌ'' خوبصورتی، یہ ''كَرُمَ'' سے مصدر ہے۔ ''رَجُلٌ جَمِيْلٌ'' ''خوبصورت آدمی''۔ ''تُرِيْحُوْنَ'' یہ ''اِرَاحَةٌ'' (افعال) سے مضارع ہے، شام کو لانا۔ ''تَسْرَحُوْنَ'' (ف) صبح چرانے کے لیے لے جاتے ہو۔

② تُرِيْحُوْنَ : شام کو گھر لانے کا منظر زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، کیونکہ جانوروں کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں اور وہ تروتازہ اپنے مالک کی خوشی کا باعث ہوتے ہیں، اس لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔ ایک جمال یہ بھی ہے کہ ان کی کثرت سے ان کے مالک کی دولت مندی کا اظہار ہوتا ہے اور دنیا میں دولت خود ایک جمال ہے۔

**آیت 7** وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ ...... : یہ بات قرآن میں کئی جگہ آئی ہے، مثلاً سورۂ مومنون (۲۱، ۲۲)، سورۂ مومن (۷۹ تا ۸۱)، سورۂ یٰس (۷۱ تا ۷۳) اور سورۂ زخرف (۱۲ تا ۱۴)۔

**آیت 8** ① وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا ...... : ''زِيْنَةً'' مفعول لہ ہے۔ ''وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ'' یعنی ان جانوروں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ تمھارے لیے وہ چیزیں پیدا کرتا رہے گا جو تم نہیں جانتے۔ اس میں وہ بے شمار حیوانات بھی شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نئے سے نئے پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی مختلف نسلوں کے ملاپ سے، کبھی از سر نو صحراؤں، جنگلوں، سمندروں میں اور انسانوں کی تجربہ گاہوں میں اور قیامت تک ایجاد ہونے والی سواریاں اور مشینیں بھی جو

وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً ؕ وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸

پر سوار ہو اور زینت کے لیے، اور وہ پیدا کرے گا جو تم نہیں جانتے ۝۸

آیت کے نزول کے وقت موجود نہ تھیں، جن میں گاڑیاں، ہوائی جہاز اور انجنوں سے چلنے والے بحری جہاز وغیرہ سب شامل ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مزید کیا کیا ایجادات ہوں گی؟ قرآن نے ان چیزوں کا ذکر کیا مگر انھیں مبہم رکھا، کیونکہ اگر نام لیتے تو بہت سے لوگ شاید انکار ہی کر دیتے۔ کہا جاتا ہے: ''اَلنَّاسُ أَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا'' ''کہ لوگ جس بات کا علم نہ رکھتے ہوں اس کے مخالف ہوا کرتے ہیں'' اور ذکر نہ کرتے تو جانوروں سے بھی تیز رفتار، آرام دہ اور مزین سواریوں کا توحید و احسانِ الٰہی کی دلیل کے طور پر ذکر رہ جاتا جو ''سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا'' کی جانوروں سے بھی بڑھ کر مصداق ہیں اور صاحب ظلال القرآن نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ اس لیے بھی کر دیا کہ لوگ نئی ایجادات پر سواری میں حرج نہ سمجھیں کہ ہمارے بزرگ تو اونٹوں گھوڑوں ہی پر سواری کرتے رہے ہیں اور قرآن میں انھی کا ذکر ہے۔

❷ خچر اور گدھے کے گوشت کی حرمت پر تو سب کا اتفاق ہے، البتہ گھوڑے کے گوشت میں اختلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحیح احادیث میں اس کا حلال ہونا ثابت ہے۔ بعض لوگ جو اسے حرام سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان تینوں جانوروں کو سواری کے لیے دوسرے جانوروں سے الگ ذکر فرمایا ہے، اگر ان کا کھانا حلال ہوتا ہے تو سواری کے ساتھ انھیں کھانے کی نعمت کا ذکر ضرور ہوتا۔ یہ دلیل اگر درست مانی جائے تو پہلے جانوروں کے فوائد میں سواری کا ذکر نہیں تو ان پر سواری جائز نہیں ہونی چاہیے۔ (طبری) بغوی نے فرمایا کہ یہ آیات حلال و حرام کے بیان سے تعلق ہی نہیں رکھتیں۔ علامہ شام جمال الدین قاسمی ؒ فرماتے ہیں کہ سب کو معلوم ہے کہ یہ سورت مکی ہے، اگر اس سے گھوڑے کی حرمت ثابت ہوتی تو گدھے کی بھی ضرور ثابت ہوتی، جب کہ گدھے کا گوشت ان آیات کے بعد بھی حلال رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے موقع پر اسے حرام فرمایا اور اسی موقع پر گھوڑے کے حلال ہونے کو برقرار رکھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں جابر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑوں کی اجازت دی۔ [ بخاري، المغازي، باب غزوة خيبر : ۴۲۱۹ ] اسماء ؓ فرماتی ہیں، ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک گھوڑا نحر کیا اور اسے کھایا۔ [ بخاري، الذبائح والصيد، باب النحر و الذبح : ۵۵۱۰۔ مسلم، الصيد و الذبائح، باب إباحة أكل لحم الخيل : ۱۹۴۲ ] اسی طرح جابر ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں گھوڑے کا گوشت کھانے کی اجازت دی اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا۔ [ ترمذي، الأطعمة، باب ما جاء في أكل لحوم الخيل : ۱۷۹۳۔ نسائي : ۴۳۳۳ ]

علامہ قاسمی فرماتے ہیں کہ ابوداؤد اور نسائی وغیرہ میں خالد بن ولید ؓ سے جو حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے درندوں میں سے ہر کچلی والے جانور اور گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا، اس کی سند میں صالح بن یحییٰ

وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹ ع

اور سیدھا راستہ اللہ ہی پر (جا پہنچتا) ہے اور ان میں سے کچھ (راستے) ٹیڑھے ہیں اور اگر وہ چاہتا تو ضرور تم سب کو ہدایت دے دیتا ۝۹

ہے جس میں مقال ہے، امام بخاری نے فرمایا: "فِيْهِ نَظَرٌ" اور ایسے راوی کی حدیث لینا درست نہیں ہوتا، پھر اگر صحیح بھی فرض کریں تو یہ اوپر ذکر کردہ صحیح احادیث کے مقابلے میں پیش کرنے کے قابل نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حکم خیبر سے پہلے کا ہو اور منسوخ ہو۔

تنبیہ: صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ سے گھوڑے کی کراہت نقل فرمائی ہے، حرمت نہیں اور لکھا ہے: "بعض نے کہا ان کے نزدیک کراہت تحریمی ہے اور بعض نے کہا تنزیہی ہے۔ (صاحب ہدایہ کے خیال میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے) البتہ اس کے دودھ سے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس سے آلۂ جہاد (گھوڑوں) میں کمی واقع نہیں ہوتی۔" اس سارے کلام سے گھوڑے کا اور گدھے اور خچر کا فرق واضح ہو رہا ہے اور یہ بھی کہ امام ابوحنیفہ کا گھوڑوں کے گوشت کو مکروہ کہنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ آلۂ جہاد ہیں، ذبح کرنے سے کمی واقع ہو جائے گی۔

❸ وَزِيْنَةً: پچھلی آیات میں جمال اور اس آیت میں زینت کے ذکر سے معلوم ہوا کہ انسانی ضروریات صرف کھانا پینا، پہننا اور سواری ہی نہیں بلکہ حسن و جمال اور زینت کا احساس بھی انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے اور اگر حرام طریقے سے نہ ہو تو اس سے فائدہ اٹھانا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

آیت 9 ❶ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ...... : چند انسانی ضروریات کا ذکر فرما کر سب سے ضروری چیز یعنی صحیح راستہ بتانے کے اہتمام کا خاص طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے ہم ہر نماز میں یہی دعا کرتے ہیں: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ [ الفاتحۃ: ۵ ] "ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔" "قَصْدُ" کا معنی سیدھا ہونا۔ "السَّبِيْلِ" کا معنی راستہ، تو "قَصْدُ السَّبِيْلِ" سیدھا راستہ جس میں کوئی کجی نہ ہو۔ اسے "سبیل قصد" بھی کہتے ہیں اور "سبیل قاصد" بھی۔ گویا "قَصْدُ" مصدر بمعنی اسم فاعل ہے جو موصوف کی طرف مضاف ہے۔ یہ بات طے ہے کہ دو نقطوں کے درمیان سب سے مختصر خط مستقیم ہی ہوتا ہے، یعنی اپنے بندوں کی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرنا اللہ ہی کے ذمے ہے اور یہ ذمہ خود اس نے اپنے فضل سے اٹھایا ہے، کسی کا اس پر جبر نہیں۔ یا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیدھا راستہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والا ہے، یعنی انسان فطرت پر قائم رہے تو خود بخود توحید الٰہی کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جسمانی ضروریات پوری کرنے کا سامان بہم پہنچایا ہے، اسی طرح اس کی ہدایت کا راستہ بھی متعین کر دیا ہے۔

❷ جب زندگی عطا کرنے والے نے خود راستہ متعین کر دیا تو مفکروں، فلسفیوں اور قانون سازوں کو دستور سازی یا قانون سازی

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ⑩

وہی ہے جس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، تمھارے لیے اسی سے پینا ہے اور اسی سے پودے ہیں جن میں تم چراتے ہو ⑩

کی تکلیف سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ ان کا علم ہر چیز کا احاطہ نہیں کرتا، اس لیے ان کے بنائے ہوئے دستور و قانون بدلتے رہتے ہیں اور ہمیشہ انسان کی بربادی ہی کا باعث بنتے ہیں۔ حکام کا کام دستور سازی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے دستور و قانون کو عملاً نافذ کرنا ہے۔ افسوس کہ کفار کی کئی سو سالہ محنت کے نتیجے میں مسلمانوں نے آخر اللہ تعالیٰ کا منصب خود سنبھال لیا اور خلافت ختم کر کے جمہوریت کے نام پر خود دستور ساز اور قانون ساز بن بیٹھے۔ اب نام ان کا مسلم ہے، مگر نظام ان کا اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور کفار کے حکم یا اپنی خواہش پر عمل ہے۔

③ وَمِنْهَا جَآئِرٌ: "جَارَ عَنِ الطَّرِيْقِ" راستے سے ہٹ گیا۔ "جَآئِرٌ" اسم فاعل ہے، وہ تمام راستے جو اللہ کی طرف سے نہیں ہیں، یعنی نہ قرآن سے ثابت ہیں نہ حدیث سے، وہ سب صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں اور انھیں اختیار کرنے والے گمراہ ہیں۔

④ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ: مگر اس سے انسان کو پیدا کرنے کا اصل مقصد جو آزمائش ہے، وہ فوت ہو جاتا، اس لیے کہ جس حد تک راہ دکھانے کا تعلق تھا وہ تو پیغمبر بھیج کر اور کتابیں اتار کر پورا کر دیا، مگر اس راہ پر چلنا انسان کے اختیار پر چھوڑ دیا، تاکہ اس کے اعمال کے مطابق اسے جزا یا سزا دی جا سکے۔

**آیت 10** ① هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: "اَلسَّمَآءُ" کا لفظی معنی بلند چیز ہے، کیونکہ یہ "سُمُوٌّ" سے مشتق ہے، جس کا معنی بلندی ہے، اس لیے یہ لفظ بادل، بارش، چھت (دیکھیے انبیاء: ۳۲) اور آسمان سب کے لیے بولا جاتا ہے اور ہر جگہ قرینے سے اس کا معنی متعین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدت و قدرت کے دلائل میں حیوانات کے بعد اب پانی اور نباتات کا ذکر فرمایا، کیونکہ انسان کی غذا الحسیات، نشاستے، شکر وغیرہ زمین سے پیدا ہونے والی بے شمار چیزوں اور پانی سے مکمل ہوتی ہے۔ زمین کا ستر (۷۰) فیصد حصہ نہایت تلخ سمندر ہے، جس کا پانی انسان کے پینے کے لائق نہیں، مگر زمین اور سمندر کو تعفن سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کا نمکین ہونا نہایت ضروری ہے، ورنہ بدبو اور تعفن سے نہ سمندر میں کوئی چیز زندہ رہتی، نہ زمین پر۔ انھیں بخارات کی صورت میں اڑا کر بادلوں سے میٹھا پانی برسانے والی ایک ہی ذات پاک ہے، اگر وہ پانی نہ برساتا تو انسان، حیوان، نباتات سب کا نام و نشان مٹ جاتا اور اگر وہ سمندر کی طرح شدید کڑوا ہی برسا دیتا تو پھر بھی خشکی کی ہر زندہ چیز انسان، حیوان اور نباتات معدوم ہو جاتے، فرمایا: ﴿ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴾ [ الواقعۃ : ۷۰ ] "اگر ہم چاہیں تو اسے سخت نمکین بنا دیں، پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟"

يُنۡۢبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَ الزَّيۡتُوۡنَ وَ النَّخِيۡلَ وَ الۡاَعۡنَابَ وَ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ

وہ تمھارے لیے اس کے ساتھ کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے جو غور وفکر کرتے ہیں ﴿۱۱﴾ اور اس نے تمھاری خاطر رات اور دن اور سورج اور

---

② لَكُمۡ مِّنۡهُ شَرَابٌ...... : اسی پانی میں سے کچھ حصہ تمھارے پینے کے کام آتا ہے اور کچھ پودے اگانے کے، جن میں تم اپنے جانور چراتے ہو۔ یہ نہ ہو تو نہ تم رہو، نہ تمھارے پودے اور نہ ان میں چرنے والے جانور۔ "شَجَرٌ" اگرچہ تنے والے درخت کو کہتے ہیں مگر یہاں زمین سے اگنے والی ہر چیز مراد ہے، دلیل اس کی "فِيۡهِ تُسِيۡمُوۡنَ" (اس میں تم چراتے ہو) ہے۔

آیت 11 يُنۡۢبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَ الزَّيۡتُوۡنَ ...... : ایک ہی پانی، ایک ہی زمین، ایک ہی ہوا اور ایک ہی سورج کی تپش سے گندم اور جو وغیرہ کے زمین میں سیدھے یا الٹے دفن شدہ دانے سے کھیتی، گٹھلی سے زیتون، قلم سے انگور اور بے شمار کھیتیاں اور پھل پیدا فرمائے۔ لحمیات، نشاستہ، شکر، وٹامنز، دوائیں، لکڑی، الغرض! زندگی کی ہر ضرورت کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ تم تو زمین میں دانے یا گٹھلیاں پھینک کر آگئے تھے اور کئی بیج تم نے ڈالے بھی نہیں تھے، یہ سب اگانے والا کون ہے؟ اپنے اس باپ اور مشکل کشا کا نام تو بتاؤ۔ لطف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان چیزوں اور آئندہ ذکر ہونے والی چیزوں کا خالق ہونے کا کوئی دعوے دار بھی نہیں۔ ان تمام چیزوں میں اللہ کے بے شمار انعامات اور اس کی توحید اور قدرت کی بہت بڑی نشانی موجود ہے (لَاٰيَةً کی تنوین تعظیم کے لیے ہے) مگر ان کے لیے جو غور وفکر کریں، ان کے لیے نہیں جو سوچنے کی زحمت ہی نہ کریں۔ دیکھیے سورۂ رعد (۳، ۴) اور سورۂ واقعہ (۶۳ تا ۶۷)۔

آیت 12 ① وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَ النَّهَارَ ...... : تسخیر کا معنی کسی چیز کو اس کا اختیار اور مرضی ختم کر کے اپنا تابع بنا کر اپنی مرضی کے مطابق چلانا ہے۔ رات اور دن کے ساتھ سورج اور چاند کے تعلق کی بنا پر چاروں کا ذکر اکٹھا کیا۔ "لَكُمۡ" (تمھارے لیے) کا یہ مطلب نہیں کہ رات دن اور سورج چاند تمھارے تابع فرمان کر دیے ہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے زبردست حکم ہی کے تابع ہیں، اس کے مقرر کردہ نظام سے نہ بال برابر ادھر ادھر ہو سکتے ہیں نہ آنکھ جھپکنے کے برابر ادھر ادھر۔ (دیکھیے فاطر: ۴۱) "لَكُمۡ" کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تمھاری بقا، ضروریات اور منافع کے لیے پابند کر رکھا ہے۔ اسے لام انتفاع کہتے ہیں اسی لیے ترجمہ "تمھاری خاطر" کیا گیا ہے۔ "سَخَّرَ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی یا اختیار استعمال ہی نہیں کر سکتے، صرف انسان کو آزمائش کے لیے کچھ اختیار دیا ہے، وہ بھی صحیح یا غلط راستہ اختیار کرنے کا، باقی وہ بھی اللہ تعالیٰ کے زبردست حکم کے آگے بے بس ہے، زندگی اور موت پر، فقر و غنا پر، صحت و بیماری پر، الغرض بے شمار چیزیں ہیں جن پر انسان کا کچھ اختیار نہیں۔ باقی تمام مخلوق کو جو مکمل مسخر کر دیا اور ان کی مرضی بالکل ختم کر دی تو یہ ان سے پوچھ کر ہی کیا، اگر وہ بھی

وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۙ﴿۱۲﴾

چاند کو مسخر کر دیا اور ستارے اس کے حکم کے ساتھ مسخر ہیں۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿۱۲﴾

آزمائش قبول کر کے کچھ اختیار چاہتے تو انھیں مل جاتا، مگر انھوں نے جرأت ہی نہیں کی اور مکمل خود سپردگی اختیار کی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ [ الأحزاب : ۷۲ ] ''بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت ظالم، بہت جاہل ہے۔'' اور انسان کے فائدے کی مثالوں کے لیے دیکھیے سورۂ نبا کی ابتدائی آیات اور سورۂ قصص (۷۱، ۷۲)۔

❷ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ......: ''الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ'' یہ ''سَخَّرَ'' کے مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب تھے، ''النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ'' کو مرفوع اور مبتدا و خبر کی صورت میں الگ فرمایا، کیونکہ سیاروں کا معاملہ سورج چاند سے بھی بے حد وسیع ہے۔ انسان کو اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کے مطابق ایک ایک سیارہ اتنا عظیم ہے کہ سورج چاند اس کے مقابلے میں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتے اور ایسی بے شمار کہکشائیں ہیں جن کا ہر سیارہ ہمارے سورج سے بھی بڑا ہے اور ہم سے اتنے دور ہیں کہ لاکھوں نوری سالوں میں بعض کی روشنی اب زمین تک پہنچی ہے اور بعض کی اب بھی نہیں، حالانکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ ہمیں تو ان کے یہی فوائد معلوم ہیں کہ یہ رات کی تاریکی میں چراغ، آسمان کے لیے زینت، شیاطین سے آسمان کی حفاظت کا ذریعہ اور بر و بحر کی ظلمتوں میں راستہ بتانے والے ہیں، مگر جب چاند کی اتنی تاثیر ہے کہ اس کے عروج و زوال سے سمندر جیسی عظیم مخلوق مد و جزر کا شکار ہو جاتی ہے تو ان ستاروں کی کائنات پر تاثیر تو انھیں پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''(پہلی) چار چیزوں سے تو بندوں کے کام صریح طور پر وابستہ نظر آتے ہیں، مگر ستاروں سے انسانی فوائد کا تعلق ہونا صریح نہ تھا، اس لیے ان کو جدا کر دیا۔ (فتدبّر)'' ہاں سورج، چاند یا ستاروں کا تقدیر سے یا غیب کی بات معلوم کرنے سے کوئی تعلق نہیں، نہ ان کے پاس بارش برسانے یا نفع نقصان کا کچھ اختیار ہے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھے وہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۱۰۳۸) ستاروں کی تسخیر میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی ایک نہیں بہت سی نشانیاں ہیں، اس لیے لفظ آیات جمع ذکر فرمایا، مگر ان کے لیے جو عقل کو استعمال کرتے ہیں، ان کے لیے نہیں جن کا ذکر سورۂ انفال (۲۲) یا سورۂ حج (۴۶) وغیرہ میں آیا ہے۔

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور جو کچھ اس نے تمھارے لیے زمین میں پھیلا دیا ہے، جس کے رنگ مختلف ہیں، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۳﴾ اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا، تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زینت کی چیزیں کثرت سے نکالو، جنھیں تم پہنتے ہو۔ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے، اس میں پانی کو چیرتی چلی جانے والی ہیں اور تاکہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۴﴾

آیت 13 وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ ...... "ذَرَاَ" کا اصل معنی کسی چیز کو توالد و تناسل کے ذریعے سے پھیلانا ہے، اسی سے "ذُرِّيَّة" کا لفظ نکلا ہے، جیسے آدم اور حوا علیہما السلام سے بے شمار انسان، ہر حیوان سے بے شمار حیوان، ہر پودے سے بے شمار پودے، الغرض رنگا رنگ مخلوق کا اس طرح تمھارے فائدے کے لیے پھیلانا اللہ تعالیٰ کی توحید کی بہت بڑی نشانی ہے، ان کے لیے جو نصیحت حاصل کریں۔ ویسے "ذَرَاَ" کا معنی "خَلَقَ" بھی آتا ہے، یعنی زمین میں جو کچھ اللہ نے پیدا کر کے پھیلا دیا، مثلاً انسان، حیوان، نباتات، معدنیات، سیالات، گیسیں، بجلی، بھاپ اور کئی قسم کی شعاعیں، الغرض! مختلف رنگوں اور قسموں والی چیزوں میں، جو سب انسان کے فائدے کے لیے ہیں، خالق کی پہچان اور اس کے وحدہ لا شریک لہ ہونے کے یقین کی بہت سی نشانیاں ہیں، مگر ان کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہوں، جو برتن ہی الٹا ہو جائے اس میں کوئی چیز کیسے ڈالی جا سکتی ہے۔ کائنات کی رنگا رنگی اللہ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۲)۔

آیت 14 وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ ......: اور وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے سمندر جیسی عظیم مخلوق کو، اگر بپھر جائے تو خشکی پر چڑھ کر ہر قسم کی زندگی درہم برہم کر ڈالے، کو پابند فرما دیا کہ اپنی حدود میں رہے اور انسان کو اپنی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے دے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سمندر سے حاصل ہونے والی چار نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ وہ نعمتیں جو سمندر میں بنی اسرائیل کو راستہ دینے یا موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو کنارے پر پہنچانے کی صورت میں ہوئیں، وہ ان کے علاوہ ہیں۔ یہ چار نعمتیں درج ذیل ہیں:

① لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا: "طَرِيًّا" کا مصدر "طَرَاوَةٌ" ہے، اس کا فعل "قَرُبَ" اور "شَرُفَ" کے وزن پر آتا ہے، یہ "يَابِسٌ" کی ضد ہے، یعنی تر و تازہ۔ مراد مچھلیاں اور پانی کا ہر وہ جانور ہے جو پانی کے بغیر زندہ نہ رہ سکے۔ سمندر کا مردار بھی حلال ہے اور محرم کو بھی سمندری شکار کی اجازت ہے۔ بعض لوگوں نے تمام سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال قرار دیا ہے، جو پکڑتے وقت زندہ ہو، لیکن یہ بات درست نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۹۶) اس میں اشارہ ہے کہ سمندری جانور تازہ حالت ہی میں لذیذ اور مفید ہوتا ہے، باسی ہو تو ضرر رساں ہوتا ہے۔ علامہ قاسمی نے فرمایا: "لَحْمًا طَرِيًّا" سے مچھلی کی بناوٹ کا حسن، لچک، ملائمت اور تری مراد ہے، ورنہ اس کا گوشت خشک کر کے محفوظ بھی کیا جاتا ہے۔" میں کہتا

وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَ عَلٰمٰتٍ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ تمھیں ہلا نہ دے اور نہریں اور راستے بنائے، تاکہ تم منزل تک پہنچ جاؤ ﴿۱۵﴾ اور علامتیں (بنائیں) اور ستاروں کے ساتھ وہ راستہ معلوم کرتے ہیں ﴿۱۶﴾

ہوں غزوہ سیف البحر میں سمندر کے پانی کی چھوڑی ہوئی بہت بڑی مچھلی صحابہ کرام ایک ماہ تک کھاتے رہے اور بچا کر مدینہ بھی لے گئے۔ یہ اسے نمک وغیرہ لگا کر خشک کرنے کے عمل کے بغیر کیسے ممکن ہے، اسی طرح اب برف یا فریزر میں مچھلی ایک عرصہ تک محفوظ رہتی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کمال ہے کہ سخت نمکین کڑوے پانی میں لذیذ گوشت تیار فرمایا، بتاؤ اس میں کون سے گنج بخش یا دستگیر کا حصہ ہے اور کتنا حصہ ہے؟

② وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً : ”تُخْرِجُوْا“ کے بجائے ”تَسْتَخْرِجُوْا“ سے کثرت کے ساتھ نکالنے کی طرف اشارہ ہے۔ ”حِلْيَةً“ جس سے آرائش و زینت حاصل ہو، تاکہ تم اس سے زیور، موتی، مرجان، سونا اور اس میں چھپے ہوئے بے شمار خزانے اور دھاتیں کثرت سے نکالو۔ اس میں اللہ کی یہ نعمت بھی آگئی کہ سمندر کو ایسا بنایا کہ انسان اس میں غوطہ لگا سکے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ترغیب بھی ہے کہ وہ غوطہ خوری میں مہارت حاصل کریں، خود بھی اور مشینوں کے ساتھ بھی اور سمندر کے خزانوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ کفار کو کھلا نہ چھوڑیں کہ وہ اس کے خزانوں اور تیل، گیس اور دوسری معدنیات اور نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں اور مسلمان ان کی محتاجی ہی پر قانع رہیں۔

③ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ: ”مَوَاخِرَ“ ”مَاخِرَةٌ“ کی جمع ہے، اپنے سینے سے پانی کو چیرنے والی۔ اس لیے تمام بحری جہازوں کا سامنے کا حصہ نوک دار رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت ہے کہ پانی جس میں ہر چیز غرق ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ سوئی بھی اس میں ڈوب جاتی ہے، اسے اس طرح بنایا کہ جب وزن اور حجم کی خاص نسبت رکھنے والی کوئی چیز اس میں ڈالی جائے تو وہ اسے اٹھا لیتا ہے، حتیٰ کہ لاکھوں ٹن وزن اٹھانے والے بحری جہاز پانی کو چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، مگر پانی اللہ کے حکم سے انھیں اٹھاتا بھی ہے، راستہ بھی دیتا ہے اور خوراک بھی مہیا کرتا ہے۔

④ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: دور دراز کے کم خرچ اور آسان سفر، دنیا کی سیر، علم کا حصول، حج و عمرہ، تجارت، جہاد، مال غنیمت، الغرض، کوئی ایک فائدہ اور فضل ہو تو گنا جائے، یہ سب کچھ اکیلے اللہ نے بنایا، کسی داتا یا دیوتا کا اس میں کچھ دخل نہیں اور اس نے یہ اس لیے بنایا کہ تم ان نعمتوں کی قدر کرو اور اس کے احکام پر عمل کرکے زبانی اور عملی طور پر شکر ادا کرو۔

آیت 15 وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ...... اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۱۹) اور سورۂ رعد (۳) یہاں پہاڑوں اور نہروں کے ساتھ راستوں کا بھی ذکر فرمایا، کیونکہ پہاڑوں میں دریا ہی راستہ بناتے ہیں اور انھی کے کناروں پر وسیع سڑکیں بنتی ہیں۔

آیت 15 ① وَعَلٰمٰتٍ: یعنی راستوں میں چھوٹے بڑے پہاڑ، دریاؤں کے موڑ، ریت کے ٹیلے، سبزہ زار، باغات، شہر،

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۱۷﴾ اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک اللہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۸﴾

آبادیاں، الغرض! بے شمار علامتیں رکھیں جن کے ساتھ لوگ صحیح راستے پر رواں دواں رہتے ہیں۔

② وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ: ''اَلنَّجْمُ'' سے مراد یہاں جنس ہے، کوئی ایک ستارہ نہیں، یعنی رات کے وقت سمندر یا خشکی میں جہاں دوسری نشانیاں کام نہیں دیتیں، لوگ ستاروں کے ذریعے سے راستہ معلوم کرتے ہیں۔ راستوں کے علاوہ سمت، قبلہ اور اوقات کی پہچان بھی ستاروں سے حاصل ہوتی ہے۔ ''يَهْتَدُوْنَ'' میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ (روح المعانی) ''هُمْ'' کی ضمیر خشکی اور سمندر میں چلنے والے ہر مسافر کو شامل ہے، البتہ سب سے پہلے اہل مکہ اس میں داخل ہیں، کیونکہ وہ تجارت کے لیے کثرت سے سفر کرتے تھے اور ستاروں کے ذریعے سے راستے معلوم کرنے میں مشہور تھے۔ دیکھیے سورۂ قریش کی تفسیر۔ اس سے پہلے کفار سے خطاب چلا آ رہا تھا، یہاں ان کا ذکر غائب کی ضمیر سے فرمایا، یہ التفات اتنی بڑی نعمتوں کے باوجود ان کے شرک پر اظہارِ ناراضگی کے لیے ہے کہ تم لوگ خطاب کے قابل ہی نہیں، مگر اگلی آیت میں پھر خطاب ہے، کیونکہ اس میں ان کو لاجواب کرنے کے لیے ان سے براہِ راست سوال ہے۔

آیت 17: اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ...... : یہ سب نعمتیں جو ذکر ہوئیں، سب جانتے اور مانتے ہیں کہ ایک اللہ کی پیدا کردہ ہیں اور جنھیں مشرکین پکارتے ہیں انھوں نے نہ کچھ پیدا کیا ہے، نہ کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اس کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے (دیکھیے سورۂ حج: ۷۳) تو یہ بتاؤ کہ ہر چیز کے خالق کو تم نے ان بے بس ہستیوں کے برابر کر دیا جو مکھی کا پر بھی نہیں بنا سکتیں، تو کیا یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ سچ ہے: ﴿ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ ﴾ [ الأنعام: ۹۱ ] ''انھوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں کی جو اس کی قدر کا حق تھا۔'' یہ مضمون مفصل سورۂ رعد (۱۶) میں ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ زمخشری نے یہاں سوال اٹھایا ہے کہ ''مَنْ'' کا لفظ تو ذوی العقول کے لیے ہوتا ہے، یہاں بتوں کے لیے کیوں استعمال ہوا، پھر جواب دیا ہے کہ چونکہ مشرکین انھیں حاجت روا، مشکل کشا سمجھتے تھے، اس لیے ان کے عقیدے کے مطابق ''كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ'' فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کا سادہ اور صحیح جواب یہ ہے کہ وہ محض پتھروں کو نہیں پوجتے تھے، بلکہ ان ہستیوں کو پکارتے تھے جن کے وہ بت بناتے تھے، مثلاً انھوں نے مریم، ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کے مجسمے بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں فال کے تیر پکڑائے ہوئے تھے۔ [ دیکھیے بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالٰی: ﴿ و اتخذ اللہ إبراھیم خلیلا ﴾ : ۳۳۵۱، ۳۳۵۲ ] قوم نوح کے بت بھی اولیاء اللہ ہی کے مجسمے تھے۔ دیکھیے تفسیر سورۂ نوح (۲۳) یہ سب ذوی العقول تھے، بلکہ ذوی العقول کے استاد تھے، اس لیے زمخشری نے جو سوال اٹھایا ہے وہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

آیت 18: ① وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا: شمار ہی نہیں کر سکتے تو شکر کس طرح ادا کر سکتے ہو؟ دیکھیے سورۂ

وَ اللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّ هُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ ﴿ؕ۲۰﴾

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو ⑲ اور وہ لوگ جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں ⑳

ابراہیم (۳۴) کی تفسیر۔

② اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ : یعنی یہ اس کی بخشش اور مہربانی ہے کہ تمھاری ناشکری کے باوجود تمھیں بے شمار نعمتیں عطا کرتا ہے اور توبہ کرنے اور پلٹ آنے پر تمھارے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ، ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ » [ بخاري، المغازي، باب حديث الإفك : ٤١٤١۔ مسلم : ٢٧٧٠ ] ”بندہ جب اعتراف کر لے، پھر توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہو جاتا ہے۔“ پھر تھوڑے سے شکر پر بہترین جزا دیتا ہے، مقصد امید کا دروازہ کھلا رکھنا ہے۔

آیت 19 وَ اللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ : اللہ کے سوا کوئی بھی سب لوگوں کے اعمال نہیں جان سکتا، چھپے ہوئے عمل تو بہت دور کی بات ہے، علانیہ بھی نہیں جان سکتا۔ چند لوگوں کے چند اعمال اس کے دیکھنے سننے میں آ بھی جائیں تو بے شمار انسانوں کے اعمال کیسے جان سکتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ تمام جنوں اور انسانوں کے علانیہ کاموں کے علاوہ ان کے چھپ کر کیے ہوئے کام بھی جانتا ہے، بلکہ سینے کے راز تک جانتا ہے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۷) اور سورۂ اعلیٰ (۷) کی تفسیر۔ لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ تمھارے شرک و کفر کے باوجود تم پر جو رحم فرما رہا ہے اور نعمتوں پر نعمتیں دے رہا ہے یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ وہ تمھارے اعمال سے ناواقف ہے، بلکہ اس تمام ناشکری اور نافرمانی کے باوجود اس کی مہربانی اس لیے ہے کہ شاید تمھاری آنکھیں کھلیں اور تم اپنے کرتوتوں سے باز آ جاؤ۔ اس میں کافروں کے لیے یہ تنبیہ ہے کہ معبود تو وہی ہونا چاہیے اور ہو سکتا ہے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کا جاننے والا ہو۔

آیت 20 وَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ...... : اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کی بے بسی اور عجز کے بیان کے لیے تین اوصاف بیان فرمائے، پہلا یہ کہ وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، خالق صرف ایک ہی ہے، کیونکہ اگر ان کے معبود نیک یا بد فوت شدہ لوگ ہیں تو ان کا خالق اللہ ہے اور وہ نہ زندگی میں کچھ پیدا کر سکتے تھے نہ اب کر سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل اسی سورت کی آیت (۱۷)، سورۂ رعد (۱۶) اور سورۂ حج (۷۳) میں دیکھیں اور اگر ان کے مجسمے یا ان کی قبریں ہیں تو وہ بھی کچھ پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ انھیں تم خود اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ﴾ [ الصافات : ٩٥ ] ”کیا تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے خود تراشتے ہو۔“ اگر تمھارے معبود تراشے ہوئے بت ہیں یا قبریں، تو خالق ان کا بھی اللہ تعالیٰ ہے تم نہیں، جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ

أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٢١﴾ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٢٢﴾

مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں اور وہ نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے ﴿٢١﴾ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ بہت تکبر کرنے والے ہیں ﴿٢٢﴾

---

وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۹٦ ] ”حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم بناتے ہو۔“

**آیت 21** ① أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَآءٍ : دوسرا وصف یہ کہ وہ مردہ ہیں زندہ نہیں۔ اس آیت میں ”أَمْوَاتٌ“ سے مراد وہ (نیک یا بد) مردہ لوگ ہیں جن کی مشرک لوگ عبادت کرتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ ”اور وہ یہ شعور نہیں رکھتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔“ اٹھائے جانے کے شعور کا لفظ جمادات (بتوں اور قبروں) پر صادق نہیں آتا، بلکہ صاحب عقل انسانوں، جنوں اور فرشتوں ہی پر صادق آتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے صرف مردہ کہنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: ﴿ غَيْرُ أَحْيَآءٍ ﴾ ”زندہ نہیں ہیں۔“ اس سے قبر پرستوں کا واضح رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ قبروں میں دفن شدہ بزرگ مردہ نہیں زندہ ہیں اور ہم زندوں ہی کو پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ثابت ہو گیا کہ موت وارد ہونے کے بعد دنیوی زندگی کسی کو نصیب نہیں ہوتی، نہ دنیا سے ان کا کوئی تعلق ہی باقی رہتا ہے، پھر ان سے کسی نفع یا نقصان کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ ② وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ : یہ تیسرا وصف ہے کہ انھیں اپنے اٹھائے جانے کا وقت بھی معلوم نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ معبود کے لیے یوم بعث کا جاننا ضروری ہے۔ (روح المعانی) اور یہ بات کہ مردے کب اٹھائے جائیں گے اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۷)۔

**آیت 22** إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ...... : گزشتہ تمام دلائل اور احسانات بیان کرنے کے بعد ان کا نتیجہ اور خلاصہ بیان فرمایا کہ تمھارا معبود جس کی عبادت حق ہے، وہ ایک ہی ہے۔ ”وَاحِدٌ“ کا مطلب ہے کہ وہ ایک ہے، کوئی اس کا ثانی یا شریک نہیں، نہ ذات میں نہ صفات میں۔ آگے وہ اسباب بیان کیے جو انسان کو توحید سے پھسلا کر شرک کی طرف لے جاتے ہیں، یہ اسباب درج ذیل ہیں: ① ان میں سے پہلا سبب آخرت پر ایمان نہ ہونا ہے۔ آیت میں مشرکین ہی کو ”فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ“ فرمایا ہے، اگر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے زندہ کر کے باز پرس کرنی ہے اور وہاں جزا و سزا صرف اس کے ہاتھ میں ہو گی، کسی دوسرے کا دخل نہ ہو گا تو آدمی کسی اور کو کس طرح اس کے ساتھ شریک کر سکتا ہے۔ اس لیے آخرت کے منکر اللہ اکیلے کا ذکر سن ہی نہیں سکتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [ الزمر : ٤٥ ] ”اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔“ ② دوسرا سبب یہ کہ ان کے دل انکار کرنے والے ہیں، وہ نہ کسی دلیل کو مانتے ہیں نہ اللہ کی تمام نعمتیں جاننے

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

کوئی شک نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۲۳﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے؟ تو کہتے ہیں پہلے لوگوں کی بے اصل کہانیاں ہیں ﴿۲۴﴾

---

کے باوجود کوئی نعمت تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ﴾ [ النحل : ۸۳ ] ''وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں۔'' وہ مسخ ہو چکے ہیں اور ان پر مہر لگ چکی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ [ البقرۃ : ۷ ] ''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی نگاہوں پر بھاری پردہ ہے۔'' حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان کی مثال الٹے کوزے کی دی گئی ہے، جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہوتی، چنانچہ وہ دل نہ نیکی کو نیکی سمجھتے ہیں نہ برائی کو برائی، سوائے ان کی اپنی خواہش کے جس کی محبت انھیں پلا دی گئی ہے۔ [ مسلم، الإیمان، باب رفع الأمانۃ و الإیمان...... : ۱۴۴ ]

﴿۳﴾ تیسرا سبب ان کا استکبار یعنی اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنا ہے۔ ان کا تکبر انھیں کوئی خیر خواہی کی بات نہ سننے دیتا ہے نہ ماننے دیتا ہے اور یہی ان کی تمام بیماریوں کی جڑ ہے اور یہ ایسی خطرناک چیز ہے کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: « لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا، وَنَعْلُهُ حَسَنَةً. قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ » [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانہ : ۹۱ ] ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر کبر ہوگا۔'' ایک آدمی نے کہا: ''آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو۔'' آپ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، کبر حق کو تسلیم نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔''

**آیت 23** لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ ...... : جس طرح کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو میں دیکھ رہا ہوں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اس کی سزا پا کر رہو گے، اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ کے علم کا ذکر ان کے ظاہر اور پوشیدہ اعمال کی سزا کی وعید کے لیے ہے اور یہ سزا کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت نہیں، بلکہ بغض رکھتا ہے، ''اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ'' کہ وہ تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

**آیت 23** وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْۤا ...... : ''اَسَاطِيْرُ'' ''أُسْطُوْرَةٌ'' کی جمع ہے، جیسے ''اَعَاجِيْبُ'' ''أُعْجُوْبَةٌ'' کی۔ مراد بے اصل جھوٹی کہانیاں اور افسانے ہیں، یہ ان متکبر کفار کا قرآن مجید کے متعلق تبصرہ ہے جو وہ آپس میں کرتے اور اس کو پھیلاتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پچھلے لوگوں کے کچھ قصے کہیں سے سن لیے ہیں،

لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ

تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ پورے اٹھائیں اور کچھ بوجھ ان کے بھی جنھیں وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔ سن لو! برا ہے جو بوجھ وہ اٹھا رہے ہیں۔﴿۲۵﴾ یقیناً ان لوگوں نے تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے تو اللہ ان کی عمارت کو

انھی کو جوڑ جاڑ کر اللہ کے کلام کے نام سے لوگوں پر پیش کر رہے ہیں۔

**آیت 25** ① لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۳۸، ۳۹) اور سورۂ عنکبوت (۱۲، ۱۳) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى، كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَ مَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ، كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا» [ مسلم، العلم، باب من سن سنة حسنة أو سيئة...... : ۲٦٧٤ ] ”جو شخص ہدایت کے کسی کام کی طرف دعوت دے اس کے لیے ان لوگوں کے اجر جتنا اجر ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے اجروں میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا اور جو شخص گمراہی کے کسی کام کی طرف دعوت دے اس پر ان لوگوں کے گناہوں جتنا گناہ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا۔“ آدم علیہ السلام کے قاتل بیٹے پر قیامت تک کے ہر ناجائز قتل کا بوجھ اس کی مثال ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۳۱، ۳۲)۔

② یہ اللہ تعالیٰ کا عین عدل ہے کہ گمراہ کرنے والے اپنے گناہوں کا (جو انھوں نے خود کیے) کامل بوجھ اٹھائیں گے اور جن کو گمراہ کیا ان کے سارے بوجھ نہیں بلکہ کچھ بوجھ اٹھائیں گے۔ ”وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ“ میں ”مِنْ“ تبعیض کے لیے ہے، یعنی ان کے صرف ان گناہوں کو جو انھوں نے ان کے کہنے پر کیے۔ (شعراوی)

③ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ : اس سے تقلید کا رد نکلتا ہے، کیونکہ تقلید علم کی ضد ہے اللہ اور رسول کی بات دین میں دلیل اور علم ہے، اس کے خلاف جو بھی ہے تقلید اور جہل ہے۔ یہاں بغیر علم گمراہ کرنے والوں اور ان کے پیچھے چل کر گمراہ ہونے والوں میں سے کسی کا عذر تقلید قبول نہیں ہوگا۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا:

اَلْعِلْمُ مَعْرِفَةُ الْهُدٰى بِدَلِيْلِهِ ‏ مَا ذَاكَ وَالتَّقْلِيْدُ يَسْتَوِيَانِ
إِذْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ أَنَّ مُقَلِّدًا ‏ لِلنَّاسِ وَالْأَعْمٰى هُمَا سِيَّانِ

”علم ہدایت کو اس کی دلیل (قرآن وسنت) کے ساتھ پہچاننے کا نام ہے۔ یہ اور تقلید کبھی برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لوگوں کی تقلید کرنے والا اور اندھا دونوں برابر ہیں۔“

**آیت 26** ① قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ : مکر کا معنی خفیہ اور مضبوط تدبیر یا کسی دوسرے کو حیلے کے ساتھ اس کے مقصد سے روکنا ہے، یہ خیر کے لیے ہو تو قابل تعریف ہے، شر کے لیے ہو تو قابل مذمت۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

عَلَيۡهِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَ اَتٰىهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

بنیادوں سے آیا۔ پس ان پر ان کے اوپر سے چھت گر پڑی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا کہ وہ سوچتے نہ تھے ﴿۲۶﴾

اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اس سے پہلے لوگوں نے بھی رسولوں کے خلاف خفیہ تدبیریں اور سازشیں جتنی کر سکتے تھے کیں مگر بری طرح ناکام ہوئے۔

❷ فَاَتَى اللّٰهُ بُنۡيَانَهُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ...... "بُنۡيَانٌ بَنٰى يَبۡنِيۡ" (ض) کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، بنائی ہوئی عمارت۔ "الۡقَوَاعِدِ" "قَاعِدَةٌ" کی جمع ہے، بنیادیں۔ اس کی تفسیر دو طرح سے کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ ایک تمثیل ہے، یعنی ایک معنوی چیز کو نظر آنے والی چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر بات سمجھائی گئی ہے، یعنی جس طرح کوئی شخص ایک عمارت بنائے تو دوسرا کوئی شخص خفیہ طریقے سے اس کی بنیادوں کو اس طرح کھوکھلا کر دے کہ عمارت کی چھت گر پڑے اور بنانے والے اپنے ہی مکان کی چھت کے نیچے آ کر ہلاک ہو جائیں۔ اسی طرح کفار نے رسولوں اور اہل ایمان کے خلاف مکر (سازش) کے محل تعمیر کیے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ان محلوں کی بنیادیں اس طرح ہلا دیں کہ ان کی چھتیں بھی انھی پر گر پڑیں۔ جس طرح کہتے ہیں کہ جو دوسرے کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گر پڑتا ہے۔ یہاں واقعی کنواں ہونا ضروری نہیں۔ کئی مفسرین نے یہ معنی کیا ہے اور رازی نے اسے ترجیح دی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ رسولوں کے خلاف سازشیں کرنے والے جن عمارتوں میں رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بنیادوں کو زلزلے کا ایسا جھٹکا دیا، یا سیلاب میں ایسا گھیرا کہ ان کی چھتیں ان کے اوپر گر پڑیں اور وہ ان کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئے، اس طرح اللہ کے عذاب نے انھیں ایسی جگہ سے آ گھیرا جہاں سے وہ گمان بھی نہ رکھتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذۡنَا بِذَنۡۢبِهٖ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ اَخَذَتۡهُ الصَّيۡحَةُ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ خَسَفۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اَغۡرَقۡنَا ﴾ [ العنکبوت : ۴۰ ] "تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا۔" امام المفسرین طبری رحمہ اللہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے اور فرمایا کہ جب الفاظ کے ظاہر معنی مراد لیے جا سکتے ہیں اور اس میں کوئی خرابی نہیں، تو تمثیل کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے، چنانچہ اس میں کیا چیز ناممکن ہے کہ کئی کفار اپنے مکانوں کی چھتوں کے نیچے آ کر مر گئے ہوں، جنھیں وہ نہایت مضبوط سمجھتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے رمضان ۱۴۲۶ھ میں کشمیر کے ہولناک زلزلے میں بے شمار کئی منزلہ مکان زمین میں دھنس گئے، بہت سے اپنے مکینوں پر گر پڑے اور اس کے بعد رمضان ۱۴۳۱ھ میں پاکستان میں سیلاب کی وجہ سے شہروں کے شہر بری طرح متاثر ہوئے، حتیٰ کہ تقریباً نصف پاکستان سیلاب کی زد میں آ گیا، یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ [ اَللّٰهُمَّ لَا تَقۡتُلۡنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهۡلِكۡنَا بِعَذَابِكَ وَ عَافِنَا قَبۡلَ ذٰلِكَ ]

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰۤى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

پھر قیامت کے دن وہ انھیں رسوا کرے گا اور کہے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم لڑتے جھگڑتے تھے؟ وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا کہیں گے کہ بے شک کامل رسوائی آج کے دن اور برائی کافروں پر ہے ﴿۲۷﴾ جنھیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، تو وہ فرماں برداری پیش کرتے ہیں کہ ہم کوئی برا کام نہیں کیا کرتے تھے۔ کیوں نہیں! یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾

**آیت 27** ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ......: "يُخْزِيْ" "خِزْيٌ" سے باب افعال کا مضارع ہے، بمعنی رسوائی۔ یہ جسمانی عذاب سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ آدمی جسمانی سزا کے آثار چہرے پر ظاہر نہ ہونے دے، مگر رسوائی کے آثار پورے جسم اور چہرے پر واضح ہوتے ہیں۔ "ثُمَّ" نسبتاً ترتیب کے لیے لایا گیا ہے کہ دنیا میں ہلاکت و بربادی کے بعد آخرت کی رسوائی اور عذاب کہیں سخت اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہوگا اور اللہ تعالیٰ خود ان سے پوچھے گا کہ تم نے جو میرے شریک بنا رکھے تھے اور تم کہتے تھے کہ فلاں کو قبر میں سوال ہوا تو اس نے فلاں بزرگ کا دھوبی ہونے کا حوالہ دیا اور چھوڑ دیا گیا، فلاں بزرگ کے دم کے باوجود بچہ مر گیا تو اس بزرگ نے چوتھے آسمان پر جاتے ہوئے ملک الموت سے روحوں کا تھیلا چھین کر سب روحوں کو آزاد کر دیا اور وہ دوبارہ زندہ ہو گئے۔ فلاں صاحب کے لیے لوح محفوظ میں بھی بچہ قسمت میں نہ تھا تو فلاں بزرگوں نے انھیں بارہ بیٹے عطا کر دیے۔ اس قسم کے تمام مشرکوں سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا بتاؤ وہ جو تم نے میرے شریک بنا رکھے تھے اور جھوٹ پر بنیاد کے باوجود تم مسلمان موحدوں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، انھیں اب لاؤ، پیش کرو، وہ کہاں ہیں؟ اس کا جواب وہ کیا دیں گے، البتہ اہل علم (فرشتے، انبیاء اور صالحین) یک زبان ہو کر کہیں گے کہ آج کامل رسوائی اور برائی ایمان نہ لانے والوں پر وارد ہوگی۔ اہل ایمان گناہ گاروں سے بھی باز پرس ہوگی، مگر کامل رسوائی صرف کفار کا مقدر ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۱۸) "الْخِزْيَ" اور "السُّوْٓءَ" کے الف لام کی وجہ سے "کامل رسوائی" ترجمہ کیا گیا ہے۔

**آیت 28** ① الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ...... : "فَاَلْقَوُا" "اَلْقٰى يُلْقِيْ" (افعال) سے ماضی معلوم کا جمع مذکر غائب ہے۔ مراد مستقبل ہے، کیونکہ وہ ماضی کی طرح یقینی ہے۔ "اِلْقَاءٌ" کا لفظ اجسام کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "فُلَانٌ اَلْقَى السِّلَاحَ" کہ فلاں نے ہتھیار پھینک دیے، یعنی اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ "السَّلَمَ" کا معنی "اِسْتِسْلَامٌ" ہے، یعنی مکمل طور پر تابع اور مطیع ہونا۔

فَادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ فَلَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَکَبِّرِیۡنَ ﴿۲۹﴾ وَ قِیۡلَ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ ؕ قَالُوۡا خَیۡرًا ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ لَدَارُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ ؕ وَ لَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۰﴾

پس جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہو، سو بلاشبہ وہ تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے ﴿۲۹﴾ اور جو لوگ ڈر گئے ان سے کہا گیا کہ تمھارے رب نے کیا نازل فرمایا؟ تو انھوں نے کہا بہترین بات۔ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے بھلائی کی اس دنیا میں بڑی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو کہیں بہتر ہے اور یقیناً وہ ڈرنے والوں کا اچھا گھر ہے ﴿۳۰﴾

② ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ : اس سے مراد کفار ہیں، کیونکہ "الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰهُمُ" پچھلی آیت میں مذکور "الۡکٰفِرِیۡنَ" کی صفت ہے اور اپنی جان پر سب سے بڑا ظلم کفر و شرک ہی ہے۔ (دیکھیے انعام : ۲۲) ظالم ہونے کی حالت میں انھیں فرشتوں کے فوت کرنے میں اس سختی کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس وقت ان ظالموں پر گزرتی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۹۳) اور سورۂ انفال (۵۰) براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں مومن اور کافر کی موت کے وقت فرشتوں کا ان سے سلوک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ [ مسند أحمد : ۲۸۷/۴، ۲۸۸، ح : ۱۸۵٦۱۔ أبو داوٗد : ۴۷۵۳ ]

③ مَا کُنَّا نَعۡمَلُ مِنۡ سُوۡٓءٍ : یعنی ساری عمر تو اہل ایمان سے مخالفت اور لڑنے میں گزار دی، اب حقیقت واضح ہونے پر اپنی فرماں برداری کا اظہار کریں گے کہ ہم تو کوئی برا کام کیا ہی نہ کرتے تھے۔ وہاں صاف جھوٹ بول کر سمجھیں گے کہ دنیا کی طرح یہاں بھی ہمارا جھوٹ چل جائے گا، بلکہ اس پر قسمیں بھی اٹھائیں گے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۲، ۲۳) اور سورۂ مجادلہ (۱۸)۔

**آیت 29** فَادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ : جہنم کے دروازوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۴۴)۔

**آیت 30** ① وَ قِیۡلَ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا...... : "خَیۡرًا" "خَیۡرٌ" اور "شَرٌّ" اصل میں اسم تفضیل کے صیغے ہیں، یعنی "أَخۡیَرُ" اور "أَشَرُّ"، تخفیف کے لیے "خَیۡرٌ" اور "شَرٌّ" بنا دیا گیا، اس لیے ترجمہ کیا ہے "بہترین بات" یعنی سب سے اچھی بات۔ یہاں زمخشری نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ یہی سوال اس سورت کی آیت (۲۴) میں کفار سے کیا گیا تو ان کا جواب تھا "اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ" جو مرفوع ہے اور یہاں متقین سے یہی سوال ہوا تو انھوں نے کہا "خَیۡرًا" جو منصوب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ "اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ" مبتدا "هِيَ" کی خبر ہے، اس لیے مرفوع ہے، یعنی کفار نے مانا ہی نہیں کہ رب تعالیٰ نے کچھ نازل فرمایا، ورنہ "اَسَاطِیۡرَ الۡاَوَّلِیۡنَ" منصوب ہوتا، اس کے برعکس متقین کا قول "خَیۡرًا" "أَنۡزَلَ" مقدر کا مفعول ہے، یعنی اسی نے خیر نازل فرمائی ہے۔ گویا متقین نے وحی الٰہی کا نزول بھی تسلیم کیا اور اس کے بہترین ہونے کی شہادت بھی دی۔ اس کے

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾

ہیشگی کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان کے لیے ان میں جو وہ چاہیں گے (موجود) ہوگا۔ اسی طرح اللہ ڈرنے والوں کو جزا دیتا ہے ﴿۳۱﴾

برعکس کافروں نے دونوں باتوں کا انکار کیا۔

② لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ : "حَسَنَةٌ" کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ مومن کو دنیا کی زندگی میں بھی وہ سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے جو کافر کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ)) [مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹] "مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر کام ہی بہترین ہے اور یہ مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے، تو وہ اس کے لیے بہترین ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے بہترین ہوتا ہے۔" قرآن مجید میں مومن سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ حیات طیبہ عطا کرنے کا ہے۔ دیکھیے سورۂ نحل (۹۷)۔

③ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ...... : اس میں "دار" موصوف اپنی صفت "الْاٰخِرَةِ" کی طرف مضاف ہے۔ آخری گھر اس لیے فرمایا کہ اس کے بعد اور کوئی گھر نہیں، ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہنا ہے۔ "وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ" "نِعْمَ" فعل ماضی ہے، یہ مدح کے لیے ہے، مخصوص بالمدح "هِيَ" ہے، اس کی ضد "بِئْسَ" ہے جو مذمت کے لیے ہے۔ لام تاکید کا معنی "تو" کے ساتھ اور "خَيْرٌ" کا معنی تفضیل کی وجہ سے "کہیں بہتر" کے ساتھ کیا ہے۔

**آیت 31** ① جَنّٰتُ عَدْنٍ : ہمیشہ رہنے کے باغات، کیونکہ ان میں ضرورت اور چاہت کی ہر چیز موجود ہوگی۔ دنیا میں بڑی سے بڑی تفریح گاہ اور اچھے سے اچھے گھر سے بھی دل بھر جاتا ہے، مگر جنت میں ہمیشہ رہنے کے باوجود دل نہیں بھرے گا، کیونکہ دل جو کچھ چاہے گا وہ حاضر ہو جائے گا، فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدة: ۱۷] "پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے، اس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔"

② كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ : یعنی اللہ سے ڈرنے اور اس کی منع کردہ چیزوں سے بچنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسے ہی جزا دیتا ہے، جیسا کہ سونا اور ریشم مردوں پر حرام کر دیا اور فرمایا، یہ چیزیں ان (کافروں) کے لیے دنیا میں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں۔ دیکھیے سورۂ ذاریات (۱۵، ۱۶) اور سورۂ قمر (۵۴، ۵۵)۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

جنھیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ پاک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں سلام ہو تم پر، جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۳۲﴾ وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں، یا تیرے رب کا حکم آجائے۔ ایسے ہی ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے ﴿۳۳﴾ پس ان کے پاس اس کے برے نتائج آپہنچے جو انھوں نے کیا اور انھیں اس چیز نے گھیر لیا جسے وہ مذاق کیا کرتے تھے ﴿۳۴﴾

**آیت 32** الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے حٰم السجدہ (۳۰ تا ۳۲) اور زمر (۷۳، ۷۴) "بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۴۳)۔

**آیت 32** ❶ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ ...... : یہاں استفہام انکار کے لیے ہے اور "يَنْظُرُوْنَ" بمعنی "يَنْتَظِرُوْنَ" ہے۔ اس میں پھر کفار کا حال بیان کیا ہے کہ ہر قسم کی دلیل واضح ہونے کے بعد ان کے ایمان نہ لانے کا مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے لیے آجائیں، یا تیرے رب کا حکم، یعنی عذاب یا قیامت آجائے، تب وہ ایمان لا کر اپنی حالت درست کریں گے، حالانکہ اس وقت توبہ کرنا یا ایمان لانا انھیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ اس سے مراد ان کی ہٹ دھری بیان کرنا ہے، یہ نہیں کہ واقعی وہ انتظار کر رہے ہیں۔ "تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ" میں "اَوْ" مانعۃ الخلو ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ دونوں چیزیں نہ آئیں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک آجائے اور یہ بھی کہ دونوں اکٹھی آجائیں۔

❷ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی پہلے لوگوں نے بھی کفر کی روش اختیار کی اور نبیوں کو جھٹلایا۔ (شوکانی)

❸ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ ...... : یعنی وہ خود ایسے برے عمل کرتے تھے جن کی سزا جہنم تھی اور یہ احمقانہ ظلم ہے، کیونکہ وہ اپنے فائدے کے لیے کسی دوسرے پر ظلم کرتے تو شاید انھیں کچھ فائدہ ہوتا، خواہ عارضی ہی سہی، مگر اپنے آپ پر ظلم تو حماقت کی انتہا ہے۔

**آیت 34** ❶ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ ...... : "سَيِّاٰتُ" کا مضاف محذوف ہے، یعنی "عَوَاقِبُ" اس لیے "سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا" کا ترجمہ کیا ہے "اس کے برے نتائج جو انھوں نے کیا۔"

❷ وَحَاقَ بِهِمْ : "حَاقَ يَحِيْقُ حَيْقًا" بروزن "بَاعَ يَبِيْعُ بَيْعًا" بمعنی احاطہ کیا، گھیر لیا۔ اس کا استعمال برے گھیراؤ ہی

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَآ اٰبَآؤُنَا

اور جن لوگوں نے شریک بنائے انھوں نے کہا اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی بھی چیز کی عبادت کرتے اور نہ

کے لیے ہوتا ہے۔ ﴿مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ ''اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے'' ظاہر ہے کہ وہ رسولوں کی رسالت کا، اپنے دوبارہ زندہ ہونے، حساب کتاب ہونے اور عذاب میں گرفتار ہونے کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ عذاب جلدی لاؤ جس کی دھمکیاں تم ہمیں دیتے ہو۔ بتایئے دشمن سے جلد از جلد عذاب کا مطالبہ اس عذاب کا مذاق اڑانا نہیں تو کیا ہے۔ الغرض! اسی عذاب نے اور اللہ کے حضور پیش ہونے کی مشکل گھڑی نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

آیت 35 ❶ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا...... : کفار اپنے شرک اور کفریہ اعمال، مثلاً بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ وغیرہ کو حرام قرار دینے کے جواز کے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا سہارا لیتے اور اس بہانے سے رسالت پر طعن کرتے اور کہتے کہ اگر یہ شرک اور تحریمات اللہ کی رضا کے خلاف ہوتے تو ہم نہ کرتے اور ہمیں روک دیا جاتا، جب اللہ نے نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ہم اس کی مشیت کے تحت کر رہے ہیں، مگر اولاً تو بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کے شرک اور برے اعمال پر راضی ہوتا تو ان کاموں سے منع کرنے کے لیے نہ پیغمبر بھیجتا اور نہ کتابیں نازل کرتا، جب مسلسل پیغمبروں کے ذریعے سے ان باتوں سے منع کیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اس کی رضا کے خلاف ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر گرفت نہ ہونے کو سند جواز نہیں بنا سکتے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۸)۔

❷ تفسیر ثنائی میں ہے: ''غرض ان کی دلیل سے یہ ہے کہ اللہ ہمارے افعال پر خوش ہے تو ہم کرتے ہیں، بھلا اگر وہ ناراض ہوتا تو کیا ہم کر سکتے تھے، پھر تو کیوں ہم کو ہمارے ان کاموں پر وعید سناتا ہے، مگر حقیقت میں ان کو سمجھ نہیں، وہ اللہ کی مشیت (چاہنے) میں اور رضا (خوش ہونے) میں فرق نہیں جانتے، بے شک جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مشیت سے ہو رہا ہے، مجال نہیں کہ اس کی مشیت کے سوا کوئی ہو سکے، کیونکہ مشیت اس کے قانون کا نام ہے، جب تک کسی کام کو حسب قانون فطرت نہ کرو گے کبھی کامیاب نہ ہو گے۔ جب تک گرمی حاصل کرنے کے لیے آگ نہ جلاؤ گے پانی سے وہ کام نہیں نکل سکے گا، جو کام فطرت نے پانی سے متعلق کیا ہے وہ آگ سے نہیں ہوگا۔ یہی تلوار جس کا کام سر اتار دینا ہے، جہاں اس کو چلاؤ گے اپنا اثر دکھا دے گی، خواہ کسی مظلوم پر ہو یا ظالم پر، چنانچہ ہر روز دنیا میں ناحق خون بھی ہوتے ہیں، لیکن ان سب کاموں پر رضائے الٰہی لازمی نہیں ہے، بلکہ رضا اس صورت میں ہوگی کہ ان سب اشیاء کو شریعت کی ہدایت کے مطابق استعمال کرو گے۔ پس یہ بے سمجھی نہیں تو اور کیا ہے کہ مشیت اور رضا میں فرق نہیں کرتے۔''

❸ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی پہلے لوگوں نے بھی اللہ کی تقدیر اور مشیت کو اپنے کفر و شرک کا بہانا بنایا۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ لوگ جو قرآن کو ''اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ'' (پہلوں کی کہانیاں) کہہ رہے ہیں تو اللہ کی مشیت اور

وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بغیر کسی بھی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے تو رسولوں کے ذمے صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کیا ہے؟ ﴿۳۵﴾

تقدیر کو بہانا بنانا کون سی نئی بات ہے جو انھوں نے کی ہے، یہ بھی تو وہی گھسی پٹی پرانی بات ہے جو پہلے کفار کرتے آئے ہیں۔

④ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ : "اَلْبَلٰغُ" اسم مصدر ہے، بمعنی "إِبْلَاغٌ" یعنی پہنچا دینا، یعنی رسولوں کے ذمے صاف واضح پیغام پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اگر کافر کج بحثی یا ہٹ دھرمی کرتے رہیں اور ایمان نہ لائیں تو پیغمبروں سے اس پر باز پرس نہ ہوگی۔ ہدایت و گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ نادانوں کی باتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں کام برا لگتا تو کیوں کرنے دیتا، آخر ہر فرقے کے نزدیک بعض کام برے ہیں، پھر وہ کیوں ہوتے ہیں۔ یہاں جواب مجمل فرمایا کہ رسول تو برے کاموں سے منع کرتے آئے ہیں مگر جس کی قسمت تھی اسی نے ہدایت پائی اور جس کو خراب ہونا تھا خراب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہی ہوا ہے۔'' (موضح)

⑤ علامہ قاسمی رحمہ اللہ نے یہاں ''منہاج السنہ'' کی دوسری جلد کے شروع سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ایک عبارت نقل کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: ''اپنے ذمے واجب حقوق ادا نہ کرنے اور حرام کاموں کے ارتکاب کے جواز کے لیے اکثر لوگ تقدیر کو دلیل بناتے ہیں، حالانکہ یہ دلیل بالکل غلط اور بے کار ہے، اس کے باطل ہونے پر دنیا کے تمام عقلاء کا اتفاق ہے، خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتے ہوں۔ جو شخص یہ دلیل پیش کرتا ہے اگر کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں یہی دلیل پیش کرے جس نے اس کا کوئی حق ادا نہ کیا ہو یا اس کا کوئی عزیز قتل کیا ہو، یا اس کا مال چھین لیا ہو، اس کی بیوی کی عزت لوٹی ہو تو وہ اس کی یہ دلیل کبھی قبول نہیں کرے گا، بلکہ اپنا حق لینے کی اور زیادتی کا بدلہ لینے کی پوری کوشش کرے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ کوئی بھی شخص زیادتی کرنے والے کی یہ دلیل نہیں مانے گا۔ دراصل یہ ان سوفسطائیوں کی باتوں جیسی بات ہے، جو کہتے ہیں کہ معلوم نہیں ہم موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اس کا نتیجہ جھوٹ، ظلم، زیادتی اور ہر غلط کام کا جواز ہوگا۔ کوئی شخص اپنے دل سے پوچھے تو وہ بھی اسے ایک باطل بات قرار دے گا۔ اس لیے تحقیق کے وقت کسی عدالت میں یہ دلیل قبول نہیں کی جاتی، کیونکہ یہ سراسر جہالت ہے، علم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے جب مشرکوں نے کہا: ﴿ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ﴾ (اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۱۴۸ ] (کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جو ہمارے سامنے پیش کر سکو، تم تو محض گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہو اور صرف اٹکل بازی کر رہے ہو) پھر فرمایا: ﴿ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ الأنعام : ۱۴۹ ] ''کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے کچھ وہ تھے جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ پس زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۞

ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا۔''

معلوم ہوا یہ علم نہیں محض اٹکل پچو ہے، اس کے ہوتے ہوئے عادل و ظالم، صادق و کاذب، عالم و جاہل، نیک و بد کا کوئی فرق ہی نہیں رہتا، یہ لوگ جو رسولوں کی مخالفت کرنے اور کفر و شرک پر ڈٹے رہنے کی دلیل تقدیر کو بنا رہے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کے حقوق مار جاتے اور اپنے خلاف چلنے پر کبھی یہ دلیل نہیں مانتے، بلکہ یہی مشرک ایک دوسرے کی مذمت کرتے، دشمنی رکھتے اور لڑائی کرتے ہیں۔ "قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ" (کہہ دے پس کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے) میں اللہ تعالیٰ نے شرعی حجت کا ذکر فرمایا اور "فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ" (اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا) میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر والی مشیت کا ذکر فرمایا اور یہ دونوں حق ہیں۔

❻ اس بات کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا جاتا ہے۔ علامہ قاشانی نے فرمایا کہ ان مشرکین نے یہ بات انتہائی جہل کی وجہ سے اور موحدین کو چپ کروانے کے لیے صرف ضد اور عناد سے کہی ہے، کیونکہ اگر وہ علم و یقین سے یہ بات کہتے تو وہ موحد بن جاتے، مشرک رہ ہی نہیں سکتے تھے، کیونکہ جس کو یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کچھ ہو ہی نہیں سکتا، وہ یقیناً یہ بھی جان لے گا کہ دنیا کے سب لوگ بھی کوئی کام کرنا چاہیں، جو اللہ تعالیٰ نہ چاہتا ہو، تو وہ کام ہونا کبھی ممکن ہی نہیں، تو جب اس نے اعتراف کر لیا کہ اللہ کے سوا نہ کسی کے ارادے کی کچھ حیثیت ہے اور نہ کسی کے پاس کوئی قدرت ہے، تو یہ بندہ تو مشرک رہا ہی نہیں، حالانکہ وہ لوگ تو اللہ کے ساتھ شریک بنا رہے تھے اور رسولوں کو جھٹلا رہے تھے۔ معلوم ہوا اپنی اس دلیل کو وہ خود بھی نہیں مانتے تھے۔ (تفسیر قاسمی)

❼ مفتی محمد عبدہ نے فرمایا: ''ترک عمل پر تقدیر کو بطور دلیل پیش کرنا ملحدین کا عقیدہ ہے، قرآن کریم نے ان کے اس عقیدے کی مذمت فرمائی اور اسے معیوب قرار دیا ہے اور ہمارے لیے ان مشرکوں کا یہ قول بطور مذمت نقل فرمایا، اس لیے ہم میں سے کسی شخص کو، جبکہ وہ قرآن پر ایمان رکھنے کا مدعی ہو، کسی صورت جائز نہیں کہ وہ یہ دلیل پیش کرے جو مشرکین پیش کیا کرتے تھے۔'' (قاسمی)

آیت 36 ❶ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا ...... : "اَلطَّاغُوْتَ" یہ "طَغٰى يَطْغٰى طَغْوًا" (ف) سے ہے، آخر میں واؤ اور تاء مبالغہ کے لیے آتی ہیں، جیسا کہ ''ملکوت'' بہت بڑا ملک۔ ''طاغوت'' کا لفظ ''طُغْيَانٌ'' سے مشتق ہے جس کے

اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰى هُدٰىهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ مَنۡ يُّضِلُّ وَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۳۷﴾ وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ ۙ لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ ؕ بَلٰى وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا وَّ لٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳۸﴾

اگر تو ان کی ہدایت کی حرص کرے تو بے شک اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے وہ گمراہ کر دے اور نہ کوئی ان کی مدد کرنے والے ہیں ﴿۳۷﴾ اور انھوں نے اپنی پکی قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے۔ کیوں نہیں! وعدہ ہے اس کے ذمے سچا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۳۸﴾

معنی اپنی حد سے بڑھنے کے ہیں۔ یہ شیطان، معبود باطل اور ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو گمراہی کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ (شوکانی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے، کچھ سند نہ رکھے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں۔ بت، شیطان اور زبردست ظالم سب ہی طاغوت ہیں۔'' (موضح)

2 اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ...... : چونکہ مشرکین نے دعویٰ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شرک پر راضی ہے، ورنہ وہ ہمیں شرک کیوں کرنے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے لام تاکید اور ''قَدۡ'' برائے تحقیق لا کر نہایت تاکید کے ساتھ ان کی تردید فرماتے ہوئے یہ بات کہی کہ ہم نے تو ہر امت میں رسول بھیجا ہی توحید کی دعوت اور شرک کی تردید کے لیے ہے۔ (دیکھیے انبیاء: ۲۵) مگر ہم نے کسی کو توحید یا شرک پر مجبور نہیں کیا، بلکہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کر کے کفر و ایمان کے دونوں راستے بتا کر اختیار دے دیا۔ (دیکھیے دہر: ۲، ۳) اشرف الحواشی میں ہے، یعنی ہر پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے اور طاغوت سے بچتے رہنے کی دعوت دی، پھر بعض نے تو دعوت کو قبول کر لیا اور ہدایت پا گئے، مگر بعض نے اپنے کفر و شرک پر اصرار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر گمراہی ثبت کر دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی اس کے امر سے موافقت ضروری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایمان کا حکم تو سب کو دیتا ہے مگر اللہ کے ارادہ کے مطابق ہدایت بعض کو ہوتی ہے۔ (شوکانی)

3 فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ...... : یعنی ان کے تباہ شدہ آثار دیکھ کر بتاؤ کہ کیا رسولوں کو جھٹلانے والوں پر اللہ کا عذاب نہیں آیا، لہٰذا یہ سمجھنا انتہائی حماقت ہے کہ کفر و شرک کا ارتکاب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعے سے اپنی رضامندی کا راستہ بتایا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے پیغمبروں کی پیروی ضروری ہے۔

آیت 37 اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰى هُدٰىهُمۡ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ہدایت اور گمراہی کے دونوں راستے واضح کر دیے، اب جو لوگ اس کی عطا کردہ استعداد سے کام نہ لیں اور حق پر باطل کو ترجیح دیں اور اللہ تعالیٰ انھیں باطل میں پڑے رہنے کی سزا دے تو آپ کا ان پر حرص کرنا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس آیت میں نبی ﷺ کی لوگوں کی ہدایت کے لیے حرص بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۲۸)۔

آیت 38 1 وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ ...... : قسم ''حلف'' کو کہتے ہیں، کیونکہ یہ اس وقت اٹھائی جاتی ہے جب

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾

تا کہ وہ ان کے لیے وہ چیز واضح کر دے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور تا کہ جن لوگوں نے کفر کیا جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے ﴿۳۹﴾

لوگ تقسیم ہو جائیں، کچھ لوگ بات کو صحیح کہتے ہیں کچھ غلط۔ "جَهْدَ" کا معنی مشقت ہے، "جَهَدَ فُلَانٌ دَابَّتَهٗ وَأَجْهَدَهَا" جب اپنی سواری پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ ڈال دے۔ "جَهَدَ الرَّجُلُ فِيْ كَذَا" جب آدمی کسی کام میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر دے۔ اس کا باب "فَتَحَ يَفْتَحُ" ہے۔ (طنطاوی) "أَيْمَانٌ" "يَمِيْنٌ" کی جمع ہے "قسمیں"۔ یعنی انھوں نے زیادہ سے زیادہ تاکید کے ساتھ نہایت پکی قسم کھائی کہ جو مر جائے اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔ مرنے کے بعد نہ کوئی دوسری زندگی ہے نہ حساب کتاب، اس لیے عذاب کا کیا ڈر؟ مشرکین کی عقل پر تعجب ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی اتنی تعظیم کہ اس کے نام کی پکی قسمیں کھائی جا رہی ہیں، دوسری طرف اس کی اتنی بے قدری کہ اسے اتنا بے بس اور عاجز کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پہلی دفعہ بنائی ہوئی چیز کو بھی دوبارہ نہیں بنا سکتا۔

② بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا : "بَلٰى" کا لفظ کسی نفی کی نفی کے لیے ہوتا ہے، جس سے مراد اس چیز کا اثبات ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا، قیامت نہیں آئے گی۔ فرمایا، کیوں نہیں! یعنی ضرور آئے گی۔ "وَعْدًا" "وَعَدَ" مقدر کا مفعول مطلق ہے، برائے تاکید اور "حَقًّا" اس کی صفت ہے، یعنی "وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا حَقًّا"۔ "عَلَيْهِ" کا لفظ اس وعدے کی مزید تاکید کے لیے ہے کہ یہ اس پر لازم ہے۔ مگر یہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے اپنے آپ پر لازم کیا ہے، ورنہ کس کی مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم کرے۔ یعنی تمھارے انکار کرنے اور زور دار قسمیں کھانے سے اللہ کا پکا وعدہ ٹل نہیں سکتا، وہ تو ضرور پورا ہو کر رہے گا، البتہ تم ایسی واضح حقیقت کا انکار کر کے اپنی جہالت کا ثبوت دے رہے ہو۔

③ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ : اس میں اس اقلیت کی تعریف ہے جو علم رکھتے ہیں اور جن کا ایمان ہے کہ آخرت اور حساب کتاب حق ہے اور اس اکثریت کی مذمت ہے، جو یہ ایمان نہیں رکھتے، اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ان کی تردید فرمائی۔ دیکھیے سورۂ تغابن (۷) اور سورۂ یٰس (۷۸)۔

**آیت 39** وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ : یعنی وہ کافر اپنا جھوٹا ہونا جان لیں جو قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اور یہ کہ حساب کتاب، جنت و دوزخ سب بے حقیقت چیزیں ہیں۔ مطلب یہ کہ جب دنیا میں سب باتوں کا فیصلہ نہیں ہوتا تو سب اختلافات کو دور کرنے کے لیے دوسرے جہاں، یعنی آخرت کا ہونا "لابد" (جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں) ہے، تا کہ حق و باطل میں امتیاز ہو جائے اور منکرین اپنا کیا پائیں۔ "كَانُوْا كٰذِبِيْنَ" لفظ "كَانُوْا" میں، یعنی زمانۂ ماضی میں دوام اور استمرار پایا جاتا ہے، اس کے بجائے "إِنَّهُمْ كَذَبُوْا" یا "إِنَّهُمْ كَاذِبُوْنَ" میں یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾ وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

ہمارا کہنا کسی چیز کو، جب ہم اس کا ارادہ کر لیں، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ ہم اسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے ﴿۴۰﴾ اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، بلاشبہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔ کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿۴۱﴾

**آیت 40** اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ...... : یعنی جس کی قدرت کا یہ حال ہو اس کے لیے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا بھی ثابت ہوا۔ قرآن و حدیث میں بہت سی جگہ اللہ کے کلام کرنے کا صریح الفاظ میں ذکر ہے۔ (دیکھیے نساء: ۱۶۴۔ توبہ: ۶) یونان کے کافرانہ فلسفے سے متاثر لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کلام نہیں کر سکتا، نہ سن سکتا ہے، نہ دیکھتا ہے۔ ہمارے کچھ مسلمانوں نے جو قرآن کو بھی ماننا چاہتے ہیں اور یونانی فلسفے کو بھی، انھوں نے اللہ کے کلام کو مخلوق کہہ دیا اور سننے اور دیکھنے کا معنی یہ کیا کہ وہ جانتا ہے، حالانکہ کلام، خلق، سمع، بصر اور علم سب الگ الگ صفات ہیں اور اللہ نے خود اپنی یہ صفتیں بیان فرمائی ہیں، البتہ اس کی یہ صفات مخلوق کی طرح نہیں، بلکہ فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [ الشورٰی : ۱۱ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' اسی طرح اللہ کلام بھی کرتا ہے مگر جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کی مثل نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس کی ثابت شدہ صفات سمع، بصر اور کلام وغیرہ کا بھی انکار کر دو، یا ایسا مطلب بیان کرو جس کا نتیجہ انکار ہو۔

**آیت 41** ① وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ...... : "هَاجَرُوْا" "هَجَرَ يَهْجُرُ" سے باب مفاعلہ ہے۔ "هَجَرَ" اور "هَاجَرَ" کے مفہوم میں فرق ہے۔ "هَجَرَ الْمَكَانَ" ''اس نے فلاں جگہ چھوڑ دی'' ہو سکتا ہے اسے وہ پسند نہ رہی ہو اور وہ اپنے خیال میں اس سے بہتر جگہ چلا گیا ہو، جگہ نے اسے جانے پر مجبور نہیں کیا، وہ اپنی مرضی سے اسے چھوڑ گیا ہے، لیکن "هَاجَرَ" یعنی باب مفاعلہ میں مقابلہ پایا جاتا ہے، یعنی قوم کی طرف سے مزاحمت اور مقابلے نے اسے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، وہ اپنی جگہ چھوڑنے پر از خود راضی نہ تھا۔ (شعراوی)

② اللہ کی توحید اور قیامت پر ایمان لانے والوں کا توحید اور قیامت کے منکروں کے ساتھ خوشی سے مل جل کر رہنا ممکن ہی نہ تھا، خصوصاً جب اہل ایمان تعداد اور قوت میں کمزور بھی تھے۔ اپنے وطن کو جہاں بیت اللہ بھی ہو، کون خوشی سے چھوڑ سکتا ہے؟ اس لیے انھوں نے وطن چھوڑا تو دو وجہوں سے، ایک تو قوم کے ظلم کی وجہ سے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ﴾ اور دوسرا اس لیے کہ اللہ کے دین پر عمل کرنا وطن میں ممکن نہ رہا، تو انھوں نے گھر بار، خویش، قبیلے، جائداد، غرض ہر چیز کو اللہ کی خاطر چھوڑ دیا اور ایسی جگہ چلے گئے جہاں وہ ظلم سے بھی بچ جائیں اور اللہ کے دین پر بھی عمل کر سکیں۔ چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لیے اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی تعداد مردوں،

الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَ عَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ

وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب ہی پر بھروسا کرتے ہیں ﴿۴۲﴾ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر مرد، جن کی

عورتوں اور بچوں سمیت ایک سو یا کم و بیش تھی، جن میں عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی رقیہ رضی اللہ عنہا (بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تھے، مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے اس میں ہر مہاجر شامل ہے، خواہ مکہ سے حبشہ کی طرف ہو یا مدینہ کی طرف، یا کسی بھی ظالم بستی سے امن کی بستی کی طرف۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں حبشہ کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کا پیشگی اشارہ ہو۔

③ لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ...... : " بَوَّءَ يُبَوِّئُ " (تفعیل) رہنے کی جگہ دینا، ٹھکانا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے لام اور نون ثقیلہ دو تاکیدوں کے ساتھ یہ وعدہ فرمایا، چنانچہ اس نے ان ناتواں اور غریب الوطن مہاجرین کو دنیا میں عزت، شرف، عظمت، حکومت، دولت غرض ہر چیز عطا فرمائی۔ وہ جزیرۂ عرب ہی کے نہیں، شام، مصر، عراق، فارس کے مالک بنے اور نصف صدی گزری تھی کہ وہ تمام دنیا پر غالب تھے۔ یہ بھی کوئی اجر صغیر نہیں، اجر کبیر ہے، جو دین کی اشاعت اور آخرت کی تیاری میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کبیر ہی کے مقابلے میں اکبر ہوتا ہے، نہ کہ صغیر کے مقابلے میں، اس لیے فرمایا، یقیناً آخرت کا اجر اکبر ہے، یعنی اس سے بھی بڑا، بلکہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۸)، آل عمران (۱۹۵) اور سورۂ نساء (۱۰۰)۔

④ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ : اس سے مراد تین طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں: ① کافر کہ وہ علم رکھتے ہوتے تو ایمان لے آتے۔ ② مہاجر کہ وہ ہجرت کی فضیلت جانتے ہوتے تو انھیں بے حد خوشی ہوتی۔ ③ وہ مومن جنھوں نے ہجرت نہیں کی کہ وہ ہجرت کی فضیلت جانتے ہوتے تو ضرور ہجرت کرتے۔

آیت 42 الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ : صبر اور اللہ پر توکل ہی سے وطن چھوڑنے کی جرأت پیدا ہوتی ہے، ورنہ بندہ مستقبل کے خوف سے کہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں گیا تو کہاں سے کھاؤں گا، اپنی جگہ سے نہیں ہلتا اور نہ ہلنے کی وجہ سے چکی کے نچلے پاٹ کی طرح ہمیشہ اپنے سینے پر اوپر کے پاٹ کا بوجھ برداشت کرتا رہتا ہے اور آخر کار یا تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے یا جان سے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۹۷)۔

آیت 43 ① وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۹)۔

② فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ : " اَهۡلَ الذِّكۡرِ " سے مراد اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں، یعنی یہ بات اگر تمھیں معلوم نہیں کہ پہلے تمام رسول مرد (انسان) ہی تھے تو یہود و نصاریٰ سے پوچھ لو جو انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں اور تم ان پر اعتماد بھی مسلمانوں کی نسبت زیادہ کرتے ہو کہ موسیٰ، عیسیٰ، داؤد اور سلیمان وغیرہم علیہم السلام فرشتے تھے یا بشر؟ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیوں کہ یہ نبی انسان کیوں ہے، فرشتہ کیوں نہیں؟

③ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ : "اگر تم نہیں جانتے" یہ دراصل تعریض ہے کہ "جانتے تم بھی ہو" کیا اپنے باپ ابراہیم اور

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

طرف ہم وحی کرتے تھے۔ سو ذکر والوں سے پوچھ لو، اگر تم شروع سے نہیں جانتے ﴿۴۳﴾

اسماعیل علیہ السلام کو تم نہیں جانتے کہ وہ فرشتہ رسول تھے یا بشر؟ یقیناً تم جانتے ہو، خیر اگر نہیں جانتے تو یہود و نصاریٰ سے پوچھ لو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام اور سارے بنی اسرائیل کے انبیاء بشر تھے یا فرشتے؟ تم پر حقیقت واضح ہو جائے گی۔

❹ بعض لوگ اس آیت سے تقلید کے وجوب یا جواز پر استدلال کرتے ہیں، حالانکہ آیت کے سیاق و سباق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب مشرکین ہیں اور "اَهْلَ الذِّكْرِ" سے مراد اہل کتاب ہیں اور آیت میں ایک خاص اعتراض کے حل میں ان کی طرف رجوع کا حکم دیا جا رہا ہے، اس کا تقلید ائمہ سے کیا تعلق؟

❺ اگر آیت کو عام بھی سمجھ لیا جائے تو غیر عالم مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے کسی بھی موجود عالم سے کتاب و سنت کا حکم معلوم کر لیں، کیونکہ فوت شدہ شخص سے پوچھا ہی نہیں جا سکتا۔ ظاہر ہے چاروں امام بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فوت ہو چکے ہیں، ان سے سوال تو ممکن ہی نہیں۔ ہاں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کتاب و سنت میں محفوظ ہیں اور اماموں کے اقوال ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اب کوئی شخص دونوں میں سے جو بھی پوچھے گا کسی زندہ عالم ہی سے پوچھے گا، وہ عالم مکمل طور پر محفوظ کتاب و سنت سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی بتا سکتا ہے اور کسی معتبر یا غیر معتبر کتاب سے امام کا قول بھی۔ اس لیے سائل کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی بھی عالم سے یہ پوچھے کہ اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے، کیونکہ دین صرف کتاب و سنت کا نام ہے۔ جب بڑے سے بڑے امتی کا قول بھی دین نہیں تو پھر سائل عالم سے کسی امام کا قول کیوں پوچھے؟ کیا وہ امام نبی تھا، یا اللہ تعالیٰ نے اس کی اطاعت کا حکم دیا ہے، یا وحی کے ذریعے سے اس کی خطا کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہو گی کہ مسلمانوں نے علماء سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پوچھنے کے بجائے اپنے فرقے کے بنائے ہوئے امام کے اقوال پوچھنا اور ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ اس کا علاج اب بھی سب فرقے چھوڑ کر کتاب و سنت پر متحد ہونا ہے۔ خصوصاً آگے صاف لفظ بھی آ رہے ہیں کہ "بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ" یعنی اہل ذکر سے سوال کرو کہ وہ بینات (دلائل) اور آسمانی کتابوں کے ساتھ جواب دیں، نہ کہ اپنے یا کسی امتی کے قیاس یا عقل سے نکالی ہوئی کسی بات کے ساتھ۔ گویا اس آیت کو اگر تقلید کے متعلق مان بھی لیا جائے تو یہ تقلید کو جڑ سے اکھیڑنے والی اور کتاب و سنت کا پابند بنانے والی ہے۔

❻ "اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" سے معلوم ہوا کہ اہل ذکر سے پوچھنے کی ضرورت اسے ہے جو لاعلم ہو۔ کیا بڑے بڑے مدارس میں دس، دس سال پڑھنے کے بعد اور چالیس پچاس سال پڑھانے کے بعد بھی مقلد حضرات "لَا تَعْلَمُوْنَ" ہی رہتے ہیں، حالانکہ وہ قرآن و سنت پر عمل سے بچنے اور اپنے امام کی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اتنے علمی و عقلی دلائل جمع کرتے اور پیش

بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝۴۴

واضح دلائل اور کتابیں دے کر۔ اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری، تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔ (۴۴)

کرتے ہیں جو شاید ان کے امام کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ میں اپنے ان بھائیوں سے نہایت دردمندی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ قیامت کے دن کسی دھڑے یا فرقے میں کھڑے ہونے کے بجائے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چلنے والی قطار میں شامل ہو جائیں۔ نجات کا بس یہی ایک راستہ ہے۔

**آیت 44** ❶ **بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ** : "الزُّبُرِ" "اَلزَّبُوْرُ" کی جمع ہے، بمعنی "مَزْبُوْرٌ" یعنی مکتوب۔ "**بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ**" یہ جار مجرور گزشتہ آیت کے دو افعال میں سے کسی ایک کے متعلق ہو سکتا ہے، یا تو "**وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا**" میں "**اَرْسَلْنَا**" کے متعلق، یعنی ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے مگر مرد واضح دلائل اور کتابیں دے کر، یا "**فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ**" میں "**فَسْـَٔلُوْۤا**" کے متعلق، یعنی اگر تم نہیں جانتے تو ذکر والوں سے واضح دلائل اور کتابوں کے ساتھ پوچھ لو۔ (طنطاوی)

❷ **وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ** ...... : "**الذِّكْرَ**" کی تفسیر کے لیے سورۂ حجر کی آیت (۹) کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

❸ اس آیت میں "**الذِّكْرَ**" یعنی وحی الٰہی کو رسول اللہ ﷺ پر نازل کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمائیں، ایک تو یہ کہ لوگوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آنے پر آپ ان کے لیے اس کی وضاحت فرما دیں، بلکہ خود اس پر عمل کر کے انھیں اس کی عملی تصویر دکھا دیں، کیونکہ آپ کی وضاحت اور نمونے کے بغیر وحی الٰہی میں بیان کردہ چیزوں کو سمجھنا ممکن ہی نہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر احکام۔ قرآن مجید کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا ہر قول، فعل اور حال وحی الٰہی اور اس کی وضاحت ہی ہے، فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [ الأحزاب : ۲۱ ] "بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے۔" مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَلَا، إِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ، أَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی أَرِيْكَتِهِ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوْهُ وَ مَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ أَلَا وَ إِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِثْلُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ، أَلَا، لَا يَحِلُّ لَكُمُ الْحِمَارُ الْأَهْلِيُّ وَ لَا كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السَّبُعِ وَ لَا لُقَطَةُ مُعَاهِدٍ إِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِيَ عَنْهَا صَاحِبُهَا)) [ أبوداؤد، السنة، باب في لزوم السنة : ۴۶۰۴۔ ابن ماجه : ۱۲، و صححه الألباني ] "سنو! مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس کی مثل دی گئی ہے، یاد رکھو! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا ہوا آدمی اپنی شاندار چارپائی پر بیٹھا ہوا یہ کہے کہ اس قرآن کو لازم پکڑو، جو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ سن لو! بے شک جو کچھ اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے وہ اسی طرح ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ یاد رکھو! تمھارے لیے گھریلو گدھے کا گوشت حلال نہیں اور نہ درندوں میں سے کوئی کچلی والا اور نہ کسی ذمی (کافر) کی گری ہوئی چیز، الا یہ کہ اس کے مالک کو اس کی ضرورت نہ رہے۔"

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

تو کیا وہ لوگ جنھوں نے بری تدبیریں کی ہیں، اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ انھیں زمین میں دھنسا دے، یا ان پر عذاب آجائے جہاں سے وہ سوچتے نہ ہوں ﴿۴۵﴾ یا وہ انھیں ان کے چلنے پھرنے کے دوران پکڑ لے۔ سو وہ کسی طرح عاجز کرنے والے نہیں ﴿۴۶﴾ یا وہ انھیں خوف زدہ ہونے پر پکڑ لے۔ پس بے شک تمھارا رب یقیناً بہت نرمی کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۴۷﴾

دوسری حکمت ”وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ“ اور تاکہ لوگ وحی الٰہی میں غور و فکر کریں اور اس سے نصیحت حاصل کریں۔

**آیت 45** اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ ...... : فاء عاطفہ ہے، لیکن ہمزۂ استفہام عربی میں کلام کے شروع میں آتا ہے، اس لیے عطف کی فاء ہو یا واؤ، ہمزۂ استفہام کے بعد لائی جاتی ہے، لہٰذا ترجمے میں حرف عطف کا معنی پہلے کیا جاتا ہے۔ ان تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح دلائل اور کتاب دیکھنے سننے کے باوجود رسول اور اہل ایمان کے خلاف سازشیں کرنے والوں کو چار قسم کے عذاب سے خبردار کیا ہے، پہلا یہ کہ کیا وہ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے متعلق فرمایا: ﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ [ القصص : ۸۱ ] ”تو ہم نے اسے اور اس کے مکان کو زمین میں دھنسا دیا۔“ خود ہمارے دیکھنے میں آزاد کشمیر کے اندر آنے والے زلزلے میں کئی جگہوں پر زمین پھٹی اور کئی آدمی اور مکان اس کے اندر دھنس گئے، پھر دوسرے جھٹکوں کے ساتھ زمین کے وہ شگاف دوبارہ مل گئے اور دھنسنے والوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ دوسرا یہ کہ انھیں عذاب ایسی جگہ سے آ پکڑے جہاں سے وہ سوچتے بھی نہ ہوں کہ یہاں سے بھی عذاب آ سکتا ہے اور اچانک آ جانے کی وجہ سے نہ اس کا دفاع کر سکیں اور نہ اس سے بھاگ کر بچ سکیں۔ اس کے مشابہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا﴾ [ الحشر : ۲ ] ”تو اللہ ان کے پاس آیا جہاں سے انھوں نے گمان نہیں کیا تھا۔“

**آیت 46** اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ ...... : ”تَقَلُّبٌ“ چلنا پھرنا، یعنی زندگی کی مصروفیات میں چلتے پھرتے، آتے جاتے اپنے شہر یا سفر میں کہیں بھی پکڑ لے۔ ”بِمُعْجِزِيْنَ“ یہ ”أَعْجَزَ يُعْجِزُ إِعْجَازًا“ باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، لفظی معنی ہے عاجز کرنے والے، یعنی اگر اللہ چاہے تو انھیں چلتے پھرتے مصروفیت کی حالت میں پکڑ لے، پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر نکل جائیں اور اللہ تعالیٰ کو پکڑنے سے عاجز کر دیں۔ ”بِمُعْجِزِيْنَ“ پر باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”کسی طرح عاجز کرنے والے نہیں“ کیا گیا ہے۔

**آیت 47** ① اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ : ”تَخَوُّفٍ“ کا ایک معنی خوف زدہ ہونا ہے اور ایک معنی ”تَنَقُّص“ یعنی

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ

اور کیا انھوں نے اس کو نہیں دیکھا جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، جو بھی چیز ہو کہ اس کے سائے دائیں طرف سے اور بائیں

آہستہ آہستہ کم ہونا ہے۔ یعنی عذاب کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں پہلے ہی سے نظر آ رہا ہو کہ عذاب آ رہا ہے، جس کے آنے سے وہ ہر وقت خوف زدہ رہیں اور اس کے نتیجے میں دن بدن ان کی جانیں، مال اور پیداوار کم ہوتی چلی جائیں، حتیٰ کہ دیکھتے دیکھتے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں۔ یہ بھی عذاب کی نہایت تکلیف دہ صورت ہے، کیونکہ انسان خوف کی وجہ سے نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے، بلکہ گھلتا چلا جاتا ہے۔ اس تفسیر میں "تَخَوُّفٍ" اور "تَنَقُّص" (خوف زدہ ہونا اور آہستہ آہستہ کم ہونا) دونوں معنی آ گئے ہیں۔

❷ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس اگرچہ عذاب کی بے شمار صورتیں ہیں، مگر وہ تمھیں مہلت دیتا ہے اور درگزر فرماتا ہے، تاکہ تم نافرمانی چھوڑ کر واپس پلٹ آؤ۔ یہ اس کی بے حد شفقت اور نہایت مہربانی ہے کہ تم گناہ کرتے رہتے ہو، اس کے باوجود وہ تمھیں رزق دیتا ہے اور تندرستی بخشتا ہے اور اس کی طرف سے تمھاری فوری گرفت نہیں ہوتی۔ ورنہ اگر وہ تمھیں تمھاری نافرمانیوں کی وجہ سے پکڑے تو زمین پر کوئی چلنے والی چیز باقی نہ رہے۔ دیکھیے سورۂ فاطر کی آخری آیت۔

آیت 48 ❶ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ ...... : "يَتَفَيَّؤُا" "فَاءَ يَفِيْءُ فَيْئًا" (لوٹنا) سے باب تفعل ہے۔ سایوں کے لوٹنے سے مراد سورج نکلنے کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ حتیٰ کہ زوال کے بعد بالکل ہی دوسری طرف منتقل ہونا ہے۔ "دٰخِرُوْنَ" "دَخَرَ يَدْخَرُ دُخُوْرًا" (ع) سے ہے، "دَخَرَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ" فلاں شخص دوسرے کا بالکل مطیع اور اس کے سامنے عاجز اور ذلیل ہو گیا۔ "اَوَلَمْ يَرَوْا" میں استفہام پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ ڈانٹنے کے لیے ہے کہ کیا ان مشرکوں کو نظر نہیں آتا، یقیناً یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کے سامنے سجدہ ریز اور عاجز و مطیع ہے، مگر یہ اللہ کے دیے ہوئے اختیار کو اس کی ساری مخلوق کی طرح عاجزی، اطاعت اور عبادت کے بجائے سرکشی اور کفر و شرک میں استعمال کر رہے ہیں۔

❷ اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ...... : یعنی دنیا کی کوئی بھی چیز جو اللہ نے پیدا فرمائی ہے، مثلاً پہاڑ، درخت اور انسان وغیرہ، جس کا سایہ بڑھتا، گھٹتا اور ڈھلتا ہے، ہر ایک تکوینی طور پر (اپنے اختیار کے بغیر) اللہ تعالیٰ ہی کی فرماں برداری میں مصروف ہے اور وہ قانونِ قدرت سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہو سکتی۔ یہاں تمام چیزوں پر ذوی العقول کو غلبہ دے کر "دٰخِرُوْنَ" فرمایا ہے۔ (روح المعانی) شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ اس سجدہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہر چیز ٹھیک دوپہر میں کھڑی ہے، اس کا سایہ بھی کھڑا ہے، جب دن ڈھلا، سایہ بھی جھکا، پھر جھکتے جھکتے شام تک زمین پر پڑ گیا، جیسے نماز میں قیام سے رکوع اور رکوع سے سجدہ، اسی طرح ہر چیز اپنے سائے سے نماز ادا کرتی ہے۔'' (موضح) "الْيَمِيْنِ" کو اختصار کے لیے واحد اور "الشَّمَآئِلِ" کو تفصیل کے لیے جمع لائے۔ پہلے سے مراد جنس ہے، اس میں بھی تمام افراد شامل ہیں، دوسرے سے مراد بائیں جانب کے تمام اطراف ہیں۔

وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ

طرفوں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں، اس حال میں کہ وہ عاجز ہیں ﴿۴۸﴾ اور اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، کوئی بھی چلنے والا (جانور) ہو اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے ﴿۴۹﴾ وہ اپنے

**آیت 49** وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ...... : پہلے ان چیزوں کا سجدہ بیان فرمایا جو زمین میں پائی جاتی ہیں، اب یہاں زمین و آسمان میں پائے جانے والے تمام جان دار، خصوصاً فرشتوں کا سجدہ بیان کر کے متنبہ فرمایا کہ ایسی مقرب ہستیاں بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہیں اور ان میں کوئی تکبر یا غرور نہیں پایا جاتا، لہٰذا ان کے متعلق یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور ان کا اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں کوئی حصہ ہے۔ (شوکانی)

**آیت 50** ❶ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ...... : ”مِنْ فَوْقِهِمْ“ ”رَبَّهُمْ“ سے حال ہے، یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ ان کے اوپر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے اور تمام اہل السنہ کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، درست نہیں، کیونکہ یہ ”اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى“ کے خلاف ہے۔ ہاں، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن و حدیث کی رو سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے، مگر کس طرح ہے، یہ معلوم نہیں، نہ صحابہ میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی کیفیت پوچھی، اس لیے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت معلوم نہیں، اس لیے اس کی کیفیت کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔“ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ دائیں نہ بائیں، نہ آگے نہ پیچھے، بلکہ وہ لا مکان ہے، یعنی کسی جگہ بھی نہیں، کیونکہ عرش اور مکان تو اس کی مخلوق ہے، اگر اسے عرش پر یا کسی مکان میں مانیں تو وہ اپنی مخلوق کا محتاج ٹھہرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اوپر کی جانب ہونے یا عرش پر ہونے کے منکرین میں سے بعض لوگ تو یہاں تک بڑھ گئے کہ انھوں نے کہا یہ کہنا ہی جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دے، ان کی بات قرآن کی ان متعدد آیات جن میں اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا یا اوپر کی جانب ہونا بیان ہوا ہے، کے صریح خلاف ہے۔ ان کی بات کا نتیجہ تو یہی ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ موجود ہی نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس سے اللہ کا عرش یا مکان کا محتاج ہونا لازم آتا ہے تو یہ بات فضول ہے، کیونکہ بہت سی نیچے والی چیزیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اوپر والی چیز کی محتاج ہوتی ہیں، مثلاً چھت کے نیچے پنکھا یا بلب وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی مثل تو کوئی چیز نہیں، سو عرش اور مکان اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہو کر بھی اپنی پیدائش اور وجود میں اللہ کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، کیونکہ وہ ان کے پیدا کرنے سے پہلے بھی ہمیشہ سے موجود ہے۔ ہاں، اس کی کوئی صفت یا اس کی ذات کسی مخلوق کی صفت یا ذات کی مثل نہیں۔ جن لوگوں نے اس سوال پر کہ ”اللہ کہاں ہے“ ناجائز ہونے کا فتویٰ لگایا وہ سوچ لیں کہ ان کا فتویٰ کس کس ہستی پر لگتا ہے۔

مَا يُؤْمَرُوْنَ ۩ ﴿۵۰﴾

رب سے، جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور وہ کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے ﴿۵۰﴾

صحیح مسلم میں معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: « كَانَتْ لِيْ جَارِيَةٌ تَرْعَى غَنَمًا لِيْ قِبَلَ أُحُدٍ وَالْجَوَّانِيَّةِ، فَاطَّلَعْتُ ذَاتَ يَوْمٍ فَإِذَا الذِّئْبُ قَدْ ذَهَبَ بِشَاةٍ عَنْ غَنَمِهَا، وَأَنَا رَجُلٌ مِنْ بَنِيْ آدَمَ، آسَفُ كَمَا يَأْسَفُوْنَ، لٰكِنِّيْ صَكَكْتُهَا صَكَّةً، فَأَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَظَّمَ ذٰلِكَ عَلَيَّ، قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَفَلَا أُعْتِقُهَا ؟ قَالَ ائْتِنِيْ بِهَا، فَأَتَيْتُهُ بِهَا، فَقَالَ لَهَا أَيْنَ اللّٰهُ ؟ قَالَتْ فِي السَّمَاءِ قَالَ مَنْ أَنَا؟ قَالَتْ أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، قَالَ أَعْتِقْهَا، فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ » [ مسلم، المساجد، باب تحریم الكلام في الصلاة...... : ٥٣٧ ] ”میری ایک لونڈی تھی جو احد اور جوانیہ (پہاڑ) کی طرف میری بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ میں نے ایک دن دیکھا کہ بھیڑیا اس کی بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ لے گیا تھا، میں بنی آدم ہی میں سے ایک آدمی ہوں، مجھے اسی طرح غصہ آتا ہے جیسے انھیں غصہ آتا ہے، لیکن میں نے اسے (بس) ایک تھپڑ مارا، پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے اسے مجھ پر بہت بڑا (گناہ) قرار دیا۔ میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا میں اسے آزاد نہ کر دوں؟“ فرمایا: ”اسے میرے پاس لے کر آؤ۔“ میں اسے آپ کے پاس لے کر آیا، آپ نے اس سے فرمایا: ”اللہ کہاں ہے؟“ اس نے کہا: ”آسمان میں۔“ آپ نے فرمایا: ”میں کون ہوں؟“ اس نے کہا: ”آپ اللہ کے رسول ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے۔“ اس صحیح حدیث کے مطابق یہ سوال کرنے والے کہ ”اللہ کہاں ہے“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس لونڈی کو مومنہ قرار دے رہے ہیں، جس کا جواب یہ ہے کہ آسمان پر ہے۔ اب اس سوال کو ناجائز کہنے والے اور اللہ تعالیٰ کو لا مکان کہنے والے سوچ لیں کہ ان کا فتویٰ کس کس پر لگتا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی سمجھتے ہیں تو فوراً ان غلط عقائد سے توبہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہیں۔ اہل علم نے اللہ تعالیٰ کے لیے اوپر کی جانب ہونے کے ثبوت کے لیے قرآن و حدیث کے دلائل پر مشتمل کئی کتابیں لکھی ہیں۔ دیکھیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب ”اَلْعُلُوُّ لِلْعَلِيِّ الْغَفَّارِ“ اور ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ”اَلْجُيُوْشُ الْإِسْلَامِيَّةُ“، اسی طرح مشہور مسلم فلسفی ابن رشد نے ”مَنَاهِجُ الدَّوْلَةِ“ میں اس موضوع پر بہت لمبی تفصیل لکھی ہے۔

② ربیعہ بن عبد اللہ بن ہدیر کہتے ہیں کہ وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ خطبہ جمعہ میں حاضر تھے۔ انھوں نے منبر پر سورۃ النحل پڑھی، سجدے کا مقام آیا تو اترے اور سجدہ کیا، لوگوں نے بھی سجدہ کیا، یہاں تک کہ اگلا جمعہ آیا تو انھوں نے وہی سورت پڑھی، سجدے کا مقام آیا تو فرمایا: ”لوگو! ہم سجدے کی آیت پڑھتے ہیں تو جس نے سجدہ کیا اس نے درست کیا اور جس نے سجدہ نہیں کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔“ اور عمر رضی اللہ عنہ نے سجدہ نہیں کیا۔ [ بخاري، سجود القرآن، باب من رأى أن اللّٰه عز و جل لم يوجب السجود : ١٠٧٧ ] اس سے معلوم ہوا کہ سجدہ والی آیت پر سجدہ کریں تو ثواب ہے، مگر یہ ضروری اور فرض نہیں۔ البتہ

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اللہ نے فرمایا تم دو معبود مت بناؤ، وہ تو صرف ایک ہی معبود ہے، سو مجھی سے پس تم ڈرو ﴿۵۱﴾ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور عبادت بھی ہمیشہ اسی کی ہے، پھر کیا اللہ کے غیر سے ڈرتے ہو ﴿۵۲﴾

اس میں شک نہیں کہ سجدہ نہ کرنے سے سجدہ کرنے کا ثواب حاصل نہ ہوگا۔

**آیت 51** ❶ وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ...... : اوپر بتایا کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز اور اس کی مطیع و فرماں بردار ہیں، اس مناسبت کے ساتھ اب انسانوں کو اس مالک الملک کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانے سے منع فرمایا ہے۔

❷ یہاں ایک سوال ہے کہ "اِلٰهَيْنِ" کا معنی ہی دو معبود ہے، پھر "اثْنَيْنِ" کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی قباحت میں زور پیدا کرنے کے لیے بات تاکید کے ساتھ کی جاتی ہے، یہاں "اثْنَيْنِ" کا مقصد یہی ہے۔ تو جب دو معبود نہیں بن سکتے تو زیادہ کس طرح بن سکتے ہیں؟ صرف اللہ ہے جو اکیلا ہی عبادت کے لائق ہے۔ قرآن میں یہ بات کئی جگہ بیان فرمائی، چنانچہ فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [ الأنبیاء : ۲۲ ] "اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔" اور دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۳۹)۔

❸ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ : " رَهْبَةٌ " اس خوف کو کہتے ہیں جس میں ساتھ بچا بھی جائے، باب "عَلِمَ" سے ہے۔ "فَاِيَّايَ" پہلے لانے میں اور پھر "فَارْهَبُوْنِ" (جو اصل میں فَارْهَبُوْنِيْ تھا) میں دوبارہ یاء لانے میں تاکید پر تاکید ہے کہ صرف میری عبادت کرو۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر غائب کے ساتھ تھا، اب متکلم کے ساتھ ہو گیا، اس التفات کے لیے پہلی فاء آئی ہے۔ اور "فَاِيَّايَ" اور "فَارْهَبُوْنِ" دونوں پر فاء آئی ہے، پہلی عطف کے لیے ہے اور دوسری محذوف شرط کی جزا کے لیے ہے، گویا عبارت یوں ہے کہ صرف اللہ ہے جو اکیلا ہی عبادت کے لائق ہے (اور وہ میں ہوں) پس صرف مجھ سے (اگر کسی سے ڈرنا ہے) تو مجھ سے ڈرو، کسی دوسرے سے نہیں۔

**آیت 52** وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : "الدِّيْنُ" کا معنی یہاں فرماں برداری، مطیع ہونا اور عبادت ہے۔ "وَاصِبًا" (ہمیشہ) "وَصَبَ يَصِبُ (وَعَدَ يَعِدُ) وُصُوْبًا" جیسے فرمایا: ﴿دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ﴾ [ الصافات : ۹ ] "بھگانے کے لیے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے۔" یعنی آسمان و زمین صرف اللہ کے پیدا کردہ اور اس کی ملکیت ہیں اور اطاعت و عبادت بھی اسی کا دائمی حق ہے تو پھر ہر چیز کے مالک اللہ کے بجائے اس کے غیر سے ڈرتے ہو؟ کس قدر نادانی اور حماقت کی بات ہے۔

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٙ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ يَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَ لَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور تمھارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کی طرف تم گڑگڑاتے ہو ﴿۵۳﴾ پھر جب وہ تم سے اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے تو اچانک تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک بنانے لگتے ہیں ﴿۵۴﴾ تاکہ وہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انھیں دیا ہے۔ سو تم فائدہ اٹھالو، پس عنقریب تم جان لوگے ﴿۵۵﴾ اور وہ ان (معبودوں) کے لیے جن کے بارے میں وہ نہیں جانتے، ایک حصہ اس میں سے مقرر کرتے ہیں جو ہم نے انھیں دیا ہے۔ اللہ کی قسم! تم اس کے بارے میں ضرور ہی پوچھے جاؤ گے جو تم جھوٹ باندھتے تھے ﴿۵۶﴾ اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، وہ پاک ہے اور اپنے لیے وہ جو وہ چاہتے ہیں ﴿۵۷﴾

**آیت 53 تا 55** وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ ......: "نِعْمَةٍ" (نعمت) نکرہ ہونے کی وجہ سے عام تھی، "مِنْ" کے ساتھ عموم کی مزید تاکید ہوگئی کہ جو بھی نعمت تمھارے پاس ہے، یعنی تمھارا وجود، صحت، عافیت، مال، غرض چھوٹی یا بڑی جو بھی نعمت ہے، وہ سب اللہ کی عطا کردہ ہے۔ "تَجْـَٔرُوْنَ" "جَاَرَ يَجْاَرُ جُوَارًا" (ف) مدد طلب کرنے کے لیے اونچی آواز نکالنا، گڑگڑانا۔ اصل میں یہ لفظ جنگلی جانوروں کے چیخنے چلانے کے لیے آتا ہے، جیسا کہ گائے کی آواز کے لیے "خُوَارٌ"، بکری کے لیے "ثُغَاءٌ" اونٹ کے لیے "رُغَاءٌ" اور بھیڑیے اور کتے کے لیے "عُوَاءٌ" آتا ہے۔ "فَتَمَتَّعُوْا" سو تم فائدہ اٹھا لو، یہ امر ڈانٹنے کے لیے ہے۔ ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۲۱ تا ۲۳)۔

**آیت 56** وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ......: "لَا يَعْلَمُوْنَ" کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ مشرک لوگ ہمارے دیے ہوئے رزق کا حصہ ان خداؤں کے لیے مقرر کر دیتے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے، کیونکہ عالم الغیب والشہادہ تو صرف اللہ ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کے لیے مقرر کر دیتے ہیں جن کے متعلق یہ کچھ نہیں جانتے۔ نہ انھیں ان کی حقیقت معلوم ہے نہ ان کا بے اختیار ہونا، محض گمان اور سنی سنائی باتوں پر بنیاد رکھ کر ہمارا دیا ہوا ان کے نام کر دیتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۳۶ تا ۱۳۸) اور سورۂ یونس (۶۶) شروع آیت میں ان مشرکین کا ذکر سارے کا سارا غائب کے صیغوں کے ساتھ کرنے کے بعد آخر میں (بطور التفات) انھیں براہِ راست ڈانٹنے کے لیے مخاطب کر لیا اور قسم کھا کر فرمایا کہ مجھے اپنی قسم کہ تم جو کچھ طوفان باندھتے رہے ہو ہر صورت اس کے متعلق پوچھے جاؤ گے۔

**آیت 57** وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ......: یہ ان کے اللہ تعالیٰ پر دو عیب لگانے کا بیان ہے، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ دن بھر کالا رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے ﴿۵۸﴾ وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، اس خوش خبری کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی گئی۔ آیا اسے ذلت کے باوجود رکھ لے، یا اسے مٹی میں دبا دے۔ سن لو! برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ﴿۵۹﴾

اولاد قرار دی، حالانکہ وہ اولاد سے پاک ہے۔ دوسرا عیب یہ کہ فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی اولاد قرار دیا اور اولاد بھی مؤنث، جبکہ وہ اپنے لیے لڑکے پسند کرتے ہیں، لڑکیوں کو اپنے لیے باعث ذلت قرار دیتے ہیں، یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے۔ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے "سُبْحٰنَهٗ" (وہ پاک ہے) کہہ کر اپنی ذات سے ہر قسم کی اولاد کی نفی فرمائی، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، کیونکہ پھر اس کی بیوی بھی ماننا پڑے گی، جب کہ خاوند بیوی کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد باپ کی شریک اور جانشین ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ محتاجی، شرکت اور زوال تینوں سے پاک ہے، کیونکہ یہ تینوں اس کے لیے عیب ہیں، وہ "لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ" ہے اور وہ اکیلا ہی غنی ہے، باقی سب اس کے محتاج ہیں، فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ [ فاطر : ۱۵ ] "اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔" صرف اسی کے لیے بقا ہے، باقی سب کچھ فانی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۱۰۱)، سورۂ بنی اسرائیل (۴۰)، سورۂ صافات (۱۵۱ تا ۱۵۴)، سورۂ زخرف (۱۱) اور سورۂ نجم (۲۱، ۲۲)۔

**آیت 59،58** وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ...... : بشارت اچھی خبر جس سے بشرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوں، یہاں بطور استہزا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [ آل عمران : ۲۱ ] "سو انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے۔" "ظَلَّ كَذَا" وہ سارا دن اس طرح رہا۔ یہ "صَارَ" کے معنی میں بھی آتا ہے کہ وہ اس طرح ہو گیا۔ "كَظِيْمٌ" کا معنی "كَتَمَ" (چھپانا) ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۴ ] "اور غصے کو پی جانے والے۔" یہ "كَظَمَ الْقِرْبَةَ" سے لیا گیا ہے۔ جب مشکیزہ پانی سے بھر جائے، پھر اس کا منہ باندھ دیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی پھٹ جائے گا، مراد غم سے بھرا ہوا ہے، یعنی لڑکی کی پیدائش کی خبر سن کر سارا دن غم کی وجہ سے اس کا منہ کالا رہتا ہے، مگر وہ غم سے بھرا ہونے کے باوجود اظہار نہیں کرتا۔ اپنے خیال میں اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، اس لیے اس خوش خبری کو وہ اتنا برا سمجھتا ہے کہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے، آیا اسے اپنے پاس رکھے اور جاہل معاشرے کی نظر میں ذلیل ہو کر رہنا برداشت کرے یا اسے مٹی میں چھپا دے، یعنی زندہ دفن کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصاً متوجہ کرنے کے لیے فرمایا "اَلَا" سن لو، خبردار ہو جاؤ، یہ دونوں فیصلے ہی بہت برے ہیں۔ لڑکی کو حقیر اور ذلیل کر کے رکھنا بھی اور اسے زندہ درگور کرنا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد دینے یا نہ دینے کے متعلق چار قسمیں بنائیں، سب سے پہلے لڑکیوں کو اپنا ہبہ اور عطیہ

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

ان لوگوں کا جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، بہت برا حال ہے اور اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۰﴾ اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑے تو اس کے اوپر کوئی چلنے والا نہ چھوڑے اور لیکن وہ انھیں ایک مقرر وقت تک ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں ﴿۶۱﴾

قرار دیا، فرمایا: ﴿ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴾ [ الشورٰی : ۴۹، ۵۰ ] ”وہ جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے، یا انھیں ملا کر بیٹے اور بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے، یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“ اسلام میں بیٹیوں کی پرورش کا اجر بہت بیان کیا گیا، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ شوریٰ کی آیت (۵۰) کی تفسیر۔

**آیت 60** لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ...... : ”مَثَلٌ“ کا معنی کسی چیز کے مشابہ چیز بھی ہے، ضرب المثل، یعنی کہاوت بھی اور صفت اور حال بھی۔ یہاں اکثر مفسرین نے صفت معنی کیا ہے، یعنی وہ مشرکین جن کا اوپر ذکر ہوا، آخرت، حساب کتاب اور جزا و سزا پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بہت برا حال ہے جو قباحت کی انتہائی مثال ہے، اسی وجہ سے وہ اتنے بے وقوف اور سنگ دل ہو گئے ہیں کہ فرضی خداؤں کے لیے اپنی آمدنی کا ایک حصہ مقرر کرتے ہیں، بیٹیوں کو نہایت حقارت سے دیکھتے ہیں، انھیں زندہ درگور کر دیتے ہیں، حالانکہ بڑھاپے اور کمزوری میں انھی کے محتاج ہوتے ہیں، اپنے لیے بیٹوں کی پیدائش پر فخر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں بتاتے ہیں۔ فرشتوں کی عبادت کرتے اور انھیں اللہ کی بیٹیاں بتاتے ہیں۔ یہ چند روزہ زندگی سے دھوکا کھانے اور آخرت پر ایمان نہ ہونے کا نتیجہ ہے، اگر انھیں اللہ کے سامنے پیش ہونے کا اور آخرت کی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی کا یقین ہوتا تو ظلم کی ان صورتوں میں سے ایک کی بھی جرأت نہ کرتے۔ اور اللہ کی صفت تو سب سے اونچی ہے، اس کی مثل کوئی چیز نہیں، وہ واحد ہے، احد ہے، اولاد اور والدین سے پاک ہے۔ صرف وہی تمام صفاتِ کمال، جمال اور جلال کا مستحق ہے اور وہی سب پر غالب ہے، زبردست ہے، مگر کمال درجے کا حکیم بھی ہے، وہ اپنے غلبے کو اندھے کی لاٹھی کی طرح نہیں بلکہ نہایت حکمت سے عمل میں لاتا ہے۔

**آیت 61** ❶ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ...... : ”يُؤَاخِذُ“ یہاں ”يَأْخُذُ“ کے معنی میں ہے، باب مفاعلہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس میں پوچھ گچھ کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے۔ ظلم سے مراد کسی چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ رکھنا ہے، سب

وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور وہ اللہ کے لیے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جسے وہ (خود) ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ بے شک اُنھی کے لیے بھلائی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اُنھی کے لیے آگ ہے اور یہ کہ وہ سب سے پہلے (اس میں) پہنچائے جانے والے ہیں ﴿۶۲﴾

سے بڑا ظلم شرک ہے، پھر اللہ کی کسی حد سے تجاوز کرنا اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنا ظلم کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہی بات سورۂ فاطر کی آخری آیت میں بیان فرمائی ہے۔

② "اَلنَّاسَ" سے مراد یا تو کافر و مشرک ہیں، یا سارے ہی انسان مراد ہیں، خواہ کتنے نیک ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر اور اس کے احکام کی پوری ادائیگی کوئی بھی نہ کر سکا ہے نہ کر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ﴾ [ عبس : ۲۳ ] "ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔" یہ اللہ کا کرم ہے کہ دنیا میں نیک و بد سب کو ایک وقت تک مہلت ملی ہوئی ہے۔ لیکن اگر کبھی دنیا میں اللہ کی گرفت آ جائے تو سب نیک و بد، حتیٰ کہ چرند پرند وغیرہ بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں، سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے، پھر قیامت کے دن ہر ایک سے اس کے اپنے ایمان اور نیت و عمل کے مطابق معاملہ ہوگا۔ اس مفہوم کی حدیث کے لیے دیکھیے صحیح بخاری کی "کِتَابُ الْبُیُوْعِ، بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الْأَسْوَاقِ (۲۱۱۸)" میں اس لشکر کا ذکر جو کعبہ پر حملہ کے لیے آئے گا۔

**آیت 62** ① وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ : مثلاً یہ مشرک اپنے لیے پسند نہیں کرتے کہ ان کی ملکیت کا کوئی دوسرا بھی مالک بنے، مگر اللہ کی ملکیت میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ (دیکھیے روم : ۲۸) اپنے قاصد کی تکریم چاہتے ہیں مگر اللہ کا پیغام لانے والوں سے ٹھٹھا کرتے ہیں، اپنے لیے گالی برداشت نہیں کرتے مگر اللہ کو گالی دیتے ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ اللہ کی اولاد ہے، اس کے لیے گالی ہے اور کئی بدبخت ایسے ہیں کہ اللہ نے انھیں سب کچھ دیا اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کو صاف گالیاں دیتے ہیں، پھر اپنے لیے بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ غرض جو کچھ وہ اپنے غلاموں کی طرف سے اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اللہ کے غلام بلکہ مخلوق ہو کر وہ ساری بدتمیزیاں اس کے ساتھ کرتے ہیں، وہ پھر بھی صبر کرتا ہے اور مہلت دیتا ہے۔ (سبحان اللہ)

② وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ : کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں چین اور خوش حالی ملی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کا ہم پر خوش ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے اگر آخرت واقعی ہوئی تو وہاں ہمیں یہ سب کچھ ملے گا۔ دیکھیے سورۂ مریم (۷۷ تا ۸۰)، سورۂ حم السجدہ (۵۰) اور سورۂ کہف (۳۶)۔

③ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ: "مُفْرَطُوْنَ" بابِ افعال سے اسم مفعول ہے۔ "فَرَطٌ" اسے کہتے ہیں جسے کوئی قوم اپنے سے پہلے

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوشنما بنا دیے۔ سو وہی آج ان کا دوست ہے اور انھی کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۶۳﴾ اور ہم نے تجھ پر کتاب نازل نہیں کی، مگر اس لیے کہ تو ان کے لیے وہ بات واضح کر دے جس میں انھوں نے اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں کی ہدایت اور رحمت کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۶۴﴾

بھیج دے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ » [ بخاری، الرقاق، باب في الحوض : ۶۵۷۵، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ] ”میں حوض پر تم سے پہلے جا کر تمھارے لیے ضروریات کا بندوبست کرنے والا ہوں۔“ یعنی کوئی شک نہیں کہ انھی کے لیے آگ ہے اور یہ مشرک دوسرے گناہ گاروں سے پہلے وہاں پہنچائے جانے والے ہیں۔ ”مُفْرَطُوْنَ“ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ وہ دوزخ میں جھونک دیے جانے کے بعد وہیں چھوڑ دیے جائیں گے اور انھیں قطعی فراموش کر دیا جائے گا، وہیں پڑے سڑتے رہیں گے، فرمایا: ﴿ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ﴾ [ الجاثیۃ : ۳۴ ] ”اور کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمھیں بھلا دیں گے جیسے تم نے اپنے اس دن کے ملنے کو بھلا دیا۔“ عرب کہتے ہیں: ” مَا أَفْرَطْتُ وَرَائِيْ أَحَدًا “ ”میں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا۔“ مفسرین نے دونوں معانی بیان کیے ہیں اور دونوں باتیں ایک ہی وقت میں ہو سکتی ہیں۔

**آیت 63** ❶ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ ...... : اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرمایا اور اپنی عظمت کے اظہار کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا کہ ”ہم“ نے رسول بھیجے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو ایک ہے۔

❷ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ : تو شیطان جو ازلی دشمن تھا، اس نے ان کے وہی برے اعمال جو وہ کرتے تھے، مثلاً کفر و شرک اور دوسری کمینگیاں، وہ ان کے لیے ایسے خوش نما اور خوبصورت بنا دیے کہ انھوں نے سمجھا ہم بہت اچھے کام کر رہے ہیں، چنانچہ اسی دھوکے میں انھوں نے رسولوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

❸ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ ...... : تو وہی جو ہمیشہ کا دشمن تھا آج ان کا دوست بن گیا اور ظاہر ہے کہ جہاں ان کا دوست جائے گا اس کے ساتھ ہی وہ بھی عذاب الیم میں جائیں گے۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ شیطان جو پہلی کافر قوموں کا دوست بنا تھا آج ان کفار عرب کا بھی وہی دوست ہے اور ان کا نتیجہ بھی وہی ہے جو ان کا ہوا۔ مقصد آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ آپ ان کفار کی حرکتوں سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہ ہوں، پہلے بھی ایسے ہوتا رہا ہے۔

**آیت 64** وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ...... : پہلی امتوں کی طرح اس وقت بھی جو لوگ شیطان کے خوش نما پھندوں میں

وَ اللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾ ع

اور اللہ نے آسمان سے کچھ پانی نازل کیا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو سنتے ہیں ﴿۶۵﴾

گرفتار ہیں، ان کے لیے ہر اختلاف کا فیصلہ کر کے اصل حقیقت کھول کر بیان کرنے ہی کے لیے ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ان تمام چیزوں کی تبیین و وضاحت بھی ہے جس میں لوگ خود فیصلہ نہیں کر سکتے، اس لیے قرآن کی ہر بات کی تفصیل رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل اور تقریر سے فرمائی، ورنہ اللہ کی عبادت نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ غرض سب کچھ اختلاف کی نذر ہو جاتا، لوگ ایک طریقے پر متفق ہی نہ ہو سکتے، نہ کتاب اللہ پر عمل ہو سکتا۔ منکرینِ حدیث نبی ﷺ کی وضاحت کو ماننے کے لیے تیار نہیں، اس لیے وہ اس ہدایت اور رحمت سے بھی محروم ہیں جو اس کتاب سے اور نبی ﷺ کی تبیین و وضاحت سے اہل ایمان "لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ" کو حاصل ہوتی ہے اور درحقیقت وہ قرآن کو بھی نہیں مانتے، ورنہ قرآن کی متعدد آیات میں رسول اللہ ﷺ کو ہر جھگڑے اور اختلاف میں فیصل ماننے، ان کا اتباع کرنے اور ان کی اطاعت کرنے کا حکم موجود ہے۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۸۹)۔

**آیت 65** ❶ وَ اللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً …… "السَّمَآءِ" "سمو" سے مشتق ہے جس کا معنی بلندی ہے، اس لیے ہر اونچی چیز کو "سماء" کہہ لیتے ہیں۔ یہاں مراد بلندی سے اتارنا بھی ہو سکتا ہے اور بادل سے بھی۔ یہاں پانی کی نعمت کی طرف توجہ دلائی ہے جو زندگی کا اصل ہے، فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ [ الأنبیاء: ۳۰ ] "اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔" یعنی زمین مُردے کی طرح خشک پڑی تھی، نہ اس میں زندگی کے کوئی آثار تھے، نہ گھاس پھونس، نہ پھول پتیاں اور نہ کیڑے مکوڑے، اتنے میں بارش ہوئی اور وہ دیکھتے دیکھتے چند دنوں میں ہری بھری اور تروتازہ ہو گئی اور اس میں ہر قسم کی سرسبزی اور شادابی آ گئی اور جگہ جگہ پانی کے چشمے پھوٹنے لگے، گویا مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔ یہ مضمون سورۂ حج کی آیت (۵، ۶) میں تفصیل سے بیان ہوا ہے، وہاں اس کی تین حکمتیں بیان ہوئی ہیں اور دیکھیے سورۂ روم (۵۰) اور سورۂ یٰس (۳۳، ۳۴)۔

❷ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ: اس سے وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ جو مالک زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندگی عطا فرما سکتا ہے، وہ انسانوں کو بھی ان کے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر سکتا ہے، اس کے لیے کوئی چیز مشکل نہیں۔ سننے سے مراد انصاف اور غور سے سننا ہے، کیونکہ جو دل سے نہ سنے سمجھو بہرا ہے، جسے سنائی نہیں دیتا، فرمایا: ﴿ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ [ الأعراف :

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور بلاشبہ تمھارے لیے چوپاؤں میں یقیناً بڑی عبرت ہے، ہم ان چیزوں میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہیں، گوبر اور خون کے درمیان سے تمھیں خالص دودھ پلانے کے لیے دیتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے حلق سے آسانی سے اتر جانے والا ہے ﴿۶۶﴾

۱۷۹ ] ''ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔''

**آیت 66** ❶ وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً...... :"الْاَنْعَامِ" لفظاً مفرد ہے، افعال کا وزن یہاں جمع کے لیے نہیں بلکہ یہ اسم جمع ہے، جیسے "رَهْطٌ"، "قَوْمٌ" اور "بَقَرٌ" وغیرہ۔ یہاں لفظ کی رعایت سے اس کے لیے واحد مذکر کی ضمیر "بُطُوْنِهٖ" لائی گئی ہے، سورۂ مومنون (۲۱) میں "نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا" جمع کے معنی کی رعایت سے مؤنث کی ضمیر لائی گئی ہے۔ "الْاَنْعَامِ" اصل میں اونٹوں کو کہتے ہیں، کیوں وہ بہت بڑی نعمت ہیں، اس کے ساتھ گائے اور بھیڑ بکری کو بھی "الْاَنْعَامِ" کہہ لیتے ہیں۔ سورۂ انعام (۱۴۳، ۱۴۴)، میں ان کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ "لَعِبْرَةً" میں تنوین تعظیم کی ہے، بہت بڑی عبرت، معنی ہے عبور کرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا، ایک چیز سے ایسی نصیحت حاصل کرنا جو دوسری جگہ کام دے۔ "نُسْقِيْكُمْ" قرآن میں "سَقٰی" اور "أَسْقٰی" دونوں لفظ آئے ہیں، اکثر لوگ ان کا ایک ہی معنی کر دیتے ہیں، جبکہ ان میں فرق ہے، "سَقٰی يَسْقِيْ" پلانا اور "أَسْقٰی يُسْقِيْ" پلانے کے لیے دینا، یعنی ہم تمھیں پلانے کے لیے دیتے ہیں، خود پی لو یا کسی کو پلا دو۔ "فَرْثٍ" چوپاؤں کی ہضم شدہ خوراک جب تک اوجھڑی میں رہے، جب باہر نکلے تو اسے "رَوْثٌ" کہتے ہیں۔ "لَبَنًا خَالِصًا" گوبر کی بو اور رنگ اور خون کی سرخی دونوں سے خالص، سفید اور لذیذ دودھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کتنی عظیم نشانی ہے، کوئی ہے جو گوبر اور خون میں سے خالص دودھ کشید کر سکے؟ "سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ" "سَاغَ يَسُوْغُ" جو آسانی سے حلق میں اتر جائے۔ دودھ ایک مکمل غذا ہے، اس لیے بچے کی مکمل پرورش کے لیے دودھ ہی کافی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ پھر میرے پاس شراب کا ایک برتن اور دودھ کا ایک برتن اور شہد کا ایک برتن لایا گیا تو میں نے دودھ کو پسند کیا تو جبریل علیہ السلام نے فرمایا، یہ فطرت ہے، آپ بھی اس پر ہیں اور آپ کی امت بھی۔ [ بخاري، الأشربة، باب شرب اللبن...... : ۵۶۱۰، عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ ] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( ثَلَاثٌ لَا تُرَدُّ الْوَسَائِدُ وَالدُّهْنُ وَاللَّبَنُ )) [ ترمذي، الأدب، باب ما جاء في كراهية رد الطيب : ۲۷۹۰، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۱۱۸/۲، ح : ۶۱۹ ] ''تین چیزیں رد نہیں کی جاتیں، گاؤ تکیے، تیل (خوشبو) اور دودھ۔''

❷ اللہ تعالیٰ نے اپنے اکیلے معبود ہونے اور مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل کے لیے چوپاؤں میں سے ایک چیز کا ذکر

وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا

اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، جس سے تم نشہ آور چیز اور اچھا رزق بناتے ہو۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو سمجھتے ہیں ﴿۶۷﴾ اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ کچھ پہاڑوں میں سے گھر

فرمایا۔ دیکھیے وہ گھاس اور چارا جو حیوان کھاتے ہیں، وہ پانی اور مٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ مٹی اور پانی کو گھاس اور چارے میں بدلنا، پھر جانور کے پیٹ میں اسے خون سے بدلنا، پھر اسے دودھ میں بدلنا کس قدر باعث عبرت ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری طرح قادر ہے کہ تمام چیزوں کو ایک حالت سے دوسری جس حالت میں چاہے بدل دے۔

**آیت 67** ❶ وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ..... : "النَّخِيْلِ" اور "اَلنَّخْلُ" اسم جنس ہیں، کھجور کا درخت۔ اگر ایک درخت واضح کرنا ہو تو "تاء" لگا دیتے ہیں، "نَخِيْلَةٌ" اور "نَخْلَةٌ"۔ "نَخَلَ يَنْخُلُ" کا معنی ہے چھان کر عمدہ حصہ الگ کرنا، چھاننا۔ اس لیے بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ چونکہ کھجور پھلوں میں منتخب ترین پھل ہے، اس لیے اسے "نَخِيْل" کہتے ہیں۔ اس کے پھل کے مختلف وقتوں کے لحاظ سے الگ الگ نام ہیں، "اَلْبَلَحُ" پھر "اَلْبُسْرُ" پھر "اَلرُّطَبُ" پھر "اَلتَّمْرُ"۔ اس لیے اس کے درخت کا نام لیا اور انگور کے پھل کا نام جمع کے ساتھ "اَلْاَعْنَابِ" لیا، کیونکہ انگور کی بے شمار قسمیں ہیں، البتہ اس کی بیل کو عربی میں "اَلْكَرْمُ" کہتے ہیں۔ "سَكَرًا" نشہ آور چیز، یہ "سَكَرٌ" اور "سُكْرٌ" دونوں طرح پڑھا جاتا ہے، جیسے "رَشَدٌ" اور "رُشْدٌ"

❷ دودھ والے جانوروں کے بعد پھلوں کی نعمت ذکر فرمائی۔ عرب میں یہ دو پھل زیادہ تھے، پھر یہ تازہ بھی کھائے جاتے ہیں اور ذخیرہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سے بے شمار مصنوعات بھی بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بنائی ہوئی چیزوں کو دو قسمیں قرار دیا، ایک نشہ آور اور ایک رزق حسن۔ اس سے اشارہ فرمایا کہ نشہ بھی اگرچہ فائدے سے خالی نہیں مگر وہ اچھا رزق نہیں۔ یہ آئندہ شراب کی حرمت کی تمہید ہے اور بطور نعمت اس لیے ذکر کیا کہ مکہ میں شراب حلال تھی اور یہ سورت مکی ہے۔

❸ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ : رزق حسن میں لذت و قوت تو ہے، مگر سکر کی طرح عقل سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا نقصان نہیں، یہ بات عقل والے ہی سمجھتے ہیں۔

**آیت 69،68** ❶ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ : وحی کا اصل معنی تو اشارۂ سریعہ ہے، یعنی خفیہ طریقے سے بات سمجھا دینا، جو دوسرا نہ سمجھے۔ یہاں مراد الہام ہے، یعنی دل میں ڈال دینا۔ شہد کی مکھی اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، اس لیے عرب زبان میں اس کا نام ہی "النَّحْلِ" رکھا گیا، جو "نَحَلَ يَنْحَلُ" (ف) کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، اس کا معنی عطیہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ﴾ [ النساء : ۴ ] "اور عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ (خوش دلی سے) دو۔" اللہ تعالیٰ نے انسان بلکہ ہر مخلوق کی طبیعت اور فطرت میں اس کے فائدے اور نقصان کی پہچان رکھ دی ہے۔

وَ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ

بنا اور کچھ درختوں میں سے اور کچھ اس میں سے جو لوگ چھپر بناتے ہیں ﴿۶۸﴾ پھر ہر قسم کے پھلوں سے کھا، پھر اپنے رب

یہی وہ فطری رہنمائی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ شمس میں فرمایا: ﴿وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا﴾ [ الشمس : ۷، ۸ ] ''اور نفس کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ٹھیک بنایا! پھر اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیز گاری (کی پہچان) اس کے دل میں ڈال دی۔'' البتہ انسان اور دوسری مخلوق کا فرق یہ ہے کہ دوسرے سب فطری ہدایت کے پابند رہتے ہیں، مثلاً جانوروں کو دیکھ لیں، جب ان کا پیٹ بھر جائے تو مجال نہیں کہ ایک لقمہ بھی کھائیں۔ گدھا جسے سب سے کند ذہن سمجھا جاتا ہے، اللہ کی فطری ہدایت کے تحت بچے کو بھی سوار کر لیتا ہے اور پانی کا نالہ آنے پر ٹھہر کر اندازہ کرتا ہے، اگر پار کر سکتا ہو تو چھلانگ لگائے گا ورنہ نہیں۔ یہ انسان ہی ہے جو فطرت کی ہدایت کو جب چاہتا ہے عمل میں لاتا ہے، نہیں چاہتا تو عمل میں نہیں لاتا، کئی دفعہ اتنا کھا جاتا ہے کہ بدہضمی یا ہیضے کا شکار ہو جاتا ہے۔

❷ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا ...... : ''يَعْرِشُوْنَ'' چھپر بنانے سے مراد گھروں کے باہر یا کھیتوں میں بیٹھنے کے لیے سائے والے چھپر بھی ہیں اور بانسوں اور سرکنڈوں وغیرہ کے وہ کھلے چھپر بھی جو انگوروں کی بیلیں چڑھانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ ''مِنْ'' تینوں جگہ تبعیض کے لیے ہے، یعنی ہر پہاڑ، درخت اور چھپر گھر بنانے کے قابل نہیں، ان میں سے مناسب جگہوں کا انتخاب کرو۔ اس کے بعد کھانے پر کوئی پابندی نہیں، ہر پھل میں سے کھاؤ، یعنی ''ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ'' یہ امر اباحت کے لیے ہے، وجوب کے لیے نہیں کہ ضرور ہی ہر پھل میں سے کھاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ جو چاہو کھاؤ، جیسے کہتے ہیں حرام چھوڑ کر ہر چیز کھاؤ، یعنی تمھیں اجازت ہے۔ اس حکم کی تعمیل مشاہدے میں بھی آئی ہے کہ مکھیاں پہلے اپنا چھتا بناتی ہیں، پھر خوراک کے لیے نکلتی ہیں۔

❸ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی فطرت میں اس کے نفع نقصان کی سمجھ رکھ دی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿رَبُّنَا الَّذِيْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ [ طٰہٰ : ۵۰ ] ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راستہ دکھایا۔'' مگر شہد کی مکھی کا خاص طور پر الگ ذکر بھی فرمایا: ﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ ''اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی فرمائی۔'' اس لیے اہل علم نے اس کے گھر بنانے، اس کے نظام زندگی اور شہد بنانے کے عمل پر بہت تحقیق کر کے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ یہ چھوٹا سا جانور باقاعدہ ایک منظم حکومت کے تحت رہتا ہے۔ پورے چھتے کی ایک ہی ملکہ ہوتی ہے، جس کے حکم اور تقسیم کار کے مطابق تمام مکھیاں عمل کرتی ہیں۔ یہ ملکہ دوسری مکھیوں سے قد و قامت اور وضع قطع میں ممتاز ہوتی ہے۔ مکھیاں اس کے لیے خاص غذا مہیا کرتی ہیں، جسے ''غذاء الملکہ'' کہتے ہیں، جو نہایت مقوی ہوتی ہے۔ یہ ملکہ تین ہفتوں میں چھ ہزار سے بارہ ہزار تک انڈے دیتی ہے۔ اس کے حکم اور فرائض کی تقسیم کے مطابق تمام مکھیاں الگ الگ کام سرانجام دیتی

ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

کے راستوں پر چل جو مسخر کیے ہوئے ہیں۔ ان کے پیٹوں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، اس

ہیں۔ کچھ دربان ہوتی ہیں جو کسی اجنبی کو اندر نہیں آنے دیتیں، کچھ انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں، کچھ نئے نکلنے والے بچوں کی تربیت کرتی ہیں، کچھ موم کے ساتھ چھتا بنانے کے لیے معماری کا کام کرتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو انھیں موم پہنچاتی ہیں۔ بعض سپاہی ہوتی ہیں، جن کا کام چھتے کی حفاظت اور دشمن کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، کچھ پھولوں اور پھلوں سے رس چوستی ہیں جو ان کے پیٹوں کے کارخانے میں شہد بنتا ہے، وہ مکھیوں اور ان کے بچوں کے لیے خوراک اور انسان کے لیے غذا و دوا بنتا ہے، جب کہ موم انسان کی متعدد ضروریات، مثلاً روشنی، علاج وغیرہ کے کام آتا ہے۔ ان کا چھتا بھی قدرت کی کاریگری کا عجیب نمونہ ہے، ہر خانہ مسدس (چھ ضلعوں والا) ہوتا ہے جو مکھی کے جسم کے عین مطابق (گول اور لمبا) ہوتا ہے اور ہر ضلع ایسا برابر کہ پرکار اور مسطر سے بھی کوئی فرق نہیں نکلے گا۔ مسدس بنانے میں یہ حکمت ہے کہ گول یا مربع یا کسی بھی اور شکل کا ہوتا تو یا گھر کے اندر مکھی کے جسم سے زائد جگہ بچ جاتی یا گھروں کے باہر درمیان میں جگہ بچ جاتی۔ یہ مکھیاں صفائی کا نہایت اہتمام رکھتی ہیں، اپنے فضلے کے لیے الگ جگہ مقرر رکھتی ہیں۔ چھتے سے فضلہ ساتھ ہی ساتھ باہر نکالتی رہتی ہیں۔ ہمیشہ صاف پانی پیتی ہیں۔ کوئی گندگی سے آلودہ مکھی آ جائے تو دربان اندر نہیں جانے دیتے، بلکہ انھیں مار دیا جاتا ہے۔ بے کار مکھیوں کو بھی قتل کر دیا جاتا ہے، اگر کوئی مکھی مر جائے تو فوراً اسے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ گرمی کی شدت سے شہد گرنے کا خطرہ ہو تو پروں سے ہوا دے کر اسے ٹھنڈا رکھتی ہیں۔ ملکہ مکھی کے علاوہ کوئی اور ملکہ ظاہر ہو تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے، تاکہ نظام میں خرابی پیدا نہ ہو۔ جیسا کہ ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے دعوے دار کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ [ دیکھیے مسلم، الأمارۃ، باب حکم من فرق أمر المسلمین ..... : ۱۸۵۲/۶۰ ] غرض ایک عجیب منظم سلطنت ہے جو انسان کے فائدے کی خاطر مصروف عمل ہے۔

④ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا : ”ذُلُلًا“ ”ذَلُوْلٌ“ کی جمع ہے، جس کا معنی مطیع اور مسخر ہے اور یہ ”سُبُلَ“ سے حال ہے، یعنی گھر بنانے کے بعد شہد بنانے والی مکھیاں دن کو نکلتی ہیں اور بعض اوقات پھولوں اور پھلوں کی تلاش میں بہت دور نکل جاتی ہیں، پھر پیٹ میں پھلوں کا رس اور پاؤں میں موم کا مادہ لے کر دن بھر میں کئی چکر اپنے گھر کی طرف لگاتی ہیں۔ رات کو دوبارہ اپنے چھتے میں واپس آ جاتی ہیں۔ اتنی دور سے ٹھیک اسی جگہ واپس آنا ممکن نہ تھا، مگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے کھیتوں، شہروں، صحراؤں اور پہاڑوں کے دور دراز اور بے نشان راستے اس کے لیے ایسے آسان اور مسخر کر دیے ہیں کہ وہ انھی پر واپس پلٹ کر عین اپنے چھتے میں پہنچ جاتی ہے، کبھی دوسرے چھتے میں نہیں جاتی۔ ”فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا“ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ تیرے رب نے شہد بنانے کے لیے جو جو مرحلے اور طریقے رکھے ہیں، وہ سب تیری دسترس میں کر دیے ہیں، سو تو ان پر چلتے ہوئے شہد تیار کر۔

⑤ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ : ”شَرَابٌ“ یعنی مشروب، اس سے معلوم ہوا کہ شہد اصل میں پینے کی

لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

میں لوگوں کے لیے ایک قسم کی شفا ہے۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿۶۹﴾

چیز ہے، خالص پی لو یا دودھ یا پانی وغیرہ ملا کر۔ پھلوں، پھولوں، موسم اور علاقے کے لحاظ سے شہد مختلف رنگوں، ذائقوں اور خاصیتوں کا حامل ہوتا ہے، جبکہ دودھ سفید ہی ہوتا ہے، یہ بھی پروردگار کی کاریگری ہے۔

⑥ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ : اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت ہے کہ ایک زہریلے کیڑے کے پیٹ میں تیار ہونے والے مشروب میں لوگوں کے لیے شفا رکھ دی ہے۔ یہاں "شِفَآءٌ" نکرہ ہے جو اثبات کے تحت آیا ہے، اس لیے اس کا ہر مرض کے لیے شفا ہونا تو واضح نہیں ہوتا۔ اسی طرح "لِلنَّاسِ" کا الف لام بھی جنس یا استغراق کے لیے مانیں تو سب لوگوں کے لیے شفا مراد ہوگی، عہد کے لیے مانیں تو پھر انھی کے لیے شفا ہوگی جن کا علاج شہد سے ہو سکتا ہے۔ "شِفَآءٌ" میں تنوین کا ترجمہ بڑی شفا بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال شہد چونکہ بے شمار پھولوں اور پھلوں کا خلاصہ ہے، جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی بیماری کا علاج ہے، اس لیے شہد میں ہر بیماری کا علاج ہونا کچھ بعید نہیں۔ جس طرح اب کئی ہومیو اور دوسرے ڈاکٹر ایک ہی وقت میں بہت سی دواؤں کا مجموعہ دے دیتے ہیں کہ کوئی دوا تو بیماری کے مطابق ہوگی۔ غرض شہد اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، اس میں لذت بھی ہے اور شفا بھی۔ شہد میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ نمی کو جذب کرتا ہے اور اس میں جراثیم زندہ نہیں رہ سکتے، اس لیے زخم اور پھوڑے پر لگانے سے وہ درست ہو جاتا ہے۔ آنکھوں اور پیٹ کی بیماریوں کا علاج ہے، رسول اللہ ﷺ کے اسہال (دستوں) کے مریض کو بار بار شہد پلانے اور آخر کار اس کے تندرست ہونے کی حدیث صحیح بخاری (۵۷۱۶) میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت اور احادیث سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ شہد ہر بیماری کا علاج ہے، مگر ہر بیماری کے لیے اس کی مقدار، خوراک اور طریق استعمال تجربے اور تحقیق ہی سے طے ہو سکتے ہیں جو اطباء کا کام اور ان کی ذمہ داری ہے، مگر افسوس کہ اس پر مسلمان اطباء نے اتنی محنت نہیں کی کہ اس خزانے سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکتے، البتہ اس کی ایک خاصیت سے تمام مسلم اطبا شروع سے فائدہ اٹھاتے آئے ہیں، وہ یہ کہ اس میں رکھی ہوئی چیز محفوظ ہو جاتی ہے، خراب نہیں ہوتی، اس لیے وہ تمام معجونیں، خمیرے اور جوارشیں محفوظ رکھنے کے لیے سیکڑوں برس سے شہد میں بناتے آ رہے ہیں، جس سے وہ دواؤں کو محفوظ رکھنے کے لیے الکحل جیسی حرام چیز کے محتاج نہیں ہوئے۔ (والحمد للہ)

⑦ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ...... : شہد کی مکھی کے احوال سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کا علم غور و فکر کرنے والوں ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "تین چیز بتائے برے میں سے بھلا نکلنے کے: ① جانور کے پیٹ سے دودھ۔ ② نشے کے انگور اور کھجور سے پاک روزی۔ ③ اور مکھی کے پیٹ سے شہد۔ یعنی اس قرآن سے جاہلوں کی اولاد عالم نکلے گی، رسول اللہ ﷺ کے وقت میں یوں ہی ہوا، کافروں کی اولاد کامل ہوئی۔" (موضح)

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۰﴾ ع ٥ ١٥

اور اللہ نے تمھیں پیدا کیا، پھر وہ تمھیں فوت کرتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تاکہ وہ جان لینے کے بعد کچھ نہ جانے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قادر ہے ﴿۷۰﴾

آیت 70 ① وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ...... : بارش اور اس کے اثرات، چوپاؤں اور ان سے حاصل ہونے والے دودھ، کھجور اور انگور اور ان سے حاصل ہونے والی اشیاء اور شہد کی مکھی کی عجیب و غریب کارکردگی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب خود انسان کے اندر پائے جانے والے دلائل میں سے چند کا بیان فرمایا۔ اس آیت میں انسان کی زندگی کے چار پانچ دور مذکور ہیں۔ سب سے پہلے پیدائش، اس کے ساتھ فوت کرنے کا ذکر فرمایا، باقی ادوار کا بعد میں ذکر فرمایا، کیونکہ پیدائش کے بعد ہر شخص پر ان تمام ادوار کا گزرنا ضروری نہیں۔ وفات کبھی پیٹ ہی میں ہو جاتی ہے، کبھی زندگی کے کسی اور مرحلے میں۔ کچھ لوگ سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، جس میں انسان پھر بالکل بچپن والی حالت کی طرح کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کی بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کے ہوش و حواس سلب ہو جاتے ہیں اور جو کچھ سیکھا پڑھا تھا، یا زندگی میں گزرا تھا سب بھول جاتا ہے۔ ہر کام میں دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ بچپن اور ارذل العمر کے درمیان کے مرحلے ذکر نہیں فرمائے، کیونکہ وہ خود بخود سمجھ میں آ رہے ہیں۔ بچپن، لڑکپن جوانی، کمال قوت کو پہنچنا، ادھیڑ عمر، بڑھاپا اور آخر میں ارذل العمر۔ اگر اللہ چاہے تو ان میں سے کسی مرحلے کو بھی ارذل العمر میں بدل دے۔ اس آیت کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ روم (۵۴) اور سورۂ یٰس (۶۸)۔

② ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ : یہاں پیدائش کے بعد وفات کو بھی بطور آیت و نعمت ذکر فرمایا۔ آیت (نشانی) تو مومن و کافر ہر ایک کے لیے ہے، البتہ نعمت صرف مومن کے لیے ہے، خواہ وہ زندگی کے کسی مرحلے میں فوت ہو، کیونکہ نکمی عمر سے اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں اور زندگی کے جس دور میں بھی فوت ہو قید خانے سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْكَافِرِ )) [ مسلم، الزهد والرقائق، باب الدنيا سجن للمؤمن و جنة للكافر : ۲۹۵۶، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔“ پھر موت کے نعمت ہونے میں کیا شک ہے۔

③ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ان کلمات کے ساتھ پناہ مانگا کرو جن کے ساتھ نبی ﷺ پناہ مانگا کرتے تھے: (( اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ )) [ بخاري، الدعوات، باب الاستعاذة من أرذل العمر..... : ۶۳۷۴ ] ”اے اللہ! میں بزدلی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ مجھے ارذل العمر (سب سے نکمی عمر) کی طرف لوٹایا جائے اور میں دنیا کی آزمائشوں اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فوقیت بخشی ہے، پس وہ لوگ جنھیں فوقیت دی گئی ہے کسی صورت اپنا رزق ان (غلاموں) پر لوٹانے والے نہیں جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں، تو کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ﴿۷۱﴾ اور اللہ نے تمھارے لیے خود تمھی میں سے بیویاں بنائیں اور تمھارے لیے

④ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ : زندگی کے یہ تمام ادوار اور موت کمال علم و قدرت کے بغیر کوئی پیدا نہیں کر سکتا اور وہ ہستی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

⑤ بعض اہل علم نے فرمایا کہ باعمل علماء ارذل العمر سے محفوظ رہتے ہیں، اگر ان کی عمر زیادہ ہو تب بھی ان کی عقل اور حافظہ قائم رہتے ہیں۔ اس کا اشارہ اس آیت کی بعض تفسیروں سے نکلتا ہے: ﴿ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [ التين : ٥، ٦ ] ”پھر ہم نے اسے لوٹا کر نیچوں میں سے سب سے نیچا کر دیا، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔“ شنقیطی رحمہ اللہ اور بہت سے محدثین کا سو سے زیادہ عمر کے باوجود عقل و حافظہ محفوظ رہا۔

آیت 71 ① وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ...... : یعنی جب تم اپنے غلاموں کو اپنے رزق اور اختیار کا کوئی حصہ دے کر اپنے برابر کرنے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ انسان ہونے میں وہ بالکل تمھاری طرح ہیں، پھر اللہ کے عبید (غلاموں) کو اس کے شریک کیوں بناتے ہو؟ مکہ کے مشرکوں کی عقل کا ماتم کیجیے جو حج و عمرہ پر لبیک کہتے ہوئے یہ اقرار کرنے کے بعد کہ تیرا کوئی شریک نہیں، پھر کہتے سوائے ایک شریک کے، جس کا مالک بھی تو ہے، وہ مالک نہیں۔ [ مسلم، الحج، باب التلبية و صفتها...... : ١١٨٥ ] جب وہ مملوک ہے تو شریک کیسے بن گیا؟ تم اپنے لیے جو بات پسند نہیں کرتے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کیوں تسلیم کرتے ہو۔

② اس آیت سے کمیونسٹوں (اشتراکیوں) کے قول کی بھی واضح تردید ہوتی ہے کہ تمام لوگوں کے پاس ایک جیسا رزق ہونا چاہیے، جس کے پاس زائد ہو وہ چھین لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یہ ممکن ہی نہیں، نہ کائنات کا نظام اس سے چل سکتا ہے نہ کبھی ایسا ہوا ہے، حتیٰ کہ کمیونسٹ حکام اور عوام کے معیار زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مزید کئی آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے، دیکھیے سورۂ روم (۲۸) اور سورۂ زخرف (۳۲)۔

آیت 72 ① وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ...... : ”حَفَدَةً“ ”حَفَدَ يَحْفِدُ“ (ض) سے ”حَافِدٌ“ کی جمع ہے، خدمت اور اطاعت میں جلدی کرنے والا، جیسا کہ قنوت کی ایک دعا میں ہے: « وَ إِلَيْكَ نَسْعٰى وَ نَحْفِدُ » [ ابن خزيمة : ١٥٥/٢، ح : ١١٠٠ ] ”حَفِيْدٌ“ کی جمع ”حُفَدَاءُ“ آتی ہے۔ ”حَافِدٌ“ اور ”حَفِيْدٌ“ بیٹوں کو اور اولاد کی اولاد کو کہتے ہیں،

الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

تمھاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے بنائے اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا تو کیا وہ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا وہ انکار کرتے ہیں ﴿۷۲﴾ اور وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں آسمانوں اور زمین سے کچھ بھی رزق دینے کے مالک ہیں اور نہ وہ طاقت رکھتے ہیں ﴿۷۳﴾

خادم کو بھی کہہ لیتے ہیں۔ (قاموس) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کئی احسان ذکر فرمائے ہیں، ایک تو تنہائی اور وحشت دور کرنے کے لیے ساتھی دیا، مرد کے لیے عورت، عورت کے لیے مرد۔ دوسرا یہ کہ وہ ساتھی اس کی جنس انسان سے دیا، کیونکہ دوسری جنس سے نہ انس حاصل ہو سکتا تھا، نہ سکون اور نہ موافقت۔ (دیکھیے روم: ۲۱) ہمارے والد ماجد آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے کے باوجود سکون تبھی حاصل ہوا جب انھیں اپنی جنس سے بیوی ملی۔ (دیکھیے نساء: ۱) اس سے اہل علم نے یہ بات بھی اخذ کی ہے کہ جن و انس کے درمیان نکاح کی اور ان سے اولاد ہونے کی تمام باتیں محض افسانہ ہیں۔ تیسرا یہ کہ میاں بیوی سے اولاد اور اولاد کی اولاد (بیٹے اور پوتے و نواسے) عطا فرمائے، جو بڑھاپے میں خوشی کا باعث اور سہارا بنتے ہیں اور خوش دلی سے بابا کی خدمت کرتے اور اس کے نام اور نسل کی بقا کا ذریعہ بنتے ہیں۔ چوتھا یہ کہ پھر ان سب کی زندگی کی ہر ضرورت کے لیے پاکیزہ رزق عطا فرمایا۔

② اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ : یعنی کیا اپنے بنائے ہوئے خداؤں، حاجت رواؤں، مشکل کشاؤں اور داتاؤں کا احسان مانتے ہیں کہ انھوں نے ہی بیماری سے شفا دی، بیٹا دیا، یا روزی بخشی، حالانکہ وہ سب باطل ہیں اور وہم و خیال کے سوا ان کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۶)۔

③ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ : یعنی اللہ تعالیٰ جو سچا معبود ہے اور تمام احسانات اسی کے ہیں، اس کی نعمتوں کی ناشکری اور انکار کرتے ہیں، اس کے بجائے بتوں اور بزرگوں کے احسان مانتے ہیں کہ تندرستی، بیٹے اور روزی یہ دیتے ہیں، حالانکہ یہ سب باطل (جھوٹ) ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کے مشرک شکر گزار نہیں ہوتے۔

آیت 73 ① وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... : "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" میں ہر بت، تھان، آستانہ، زندہ و مردہ بزرگ، غرض ہر چیز آ گئی جسے وہ پوجتے اور پکارتے ہیں اور ان سب کے لیے "مَا" کا لفظ استعمال فرمایا جو عام طور پر ان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں عقل نہیں۔ "رِزْقًا" میں تنوین تنکیر کے لیے ہے کہ جو کسی معمولی سے معمولی رزق کے مالک بھی نہیں۔ اسی طرح "شَيْـًٔا" نکرہ ہے کہ کسی بھی رزق کی ملکیت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہیں، یعنی ان مشرکوں کی جہالت دیکھو کہ ان معبودوں کو پوجتے اور پکارتے ہیں جو نہ تو آسمان و زمین میں سے کسی بھی طرح کے رزق کی کچھ بھی ملکیت رکھتے ہیں، نہ آسمان سے بارش برسانے کے مالک، نہ زمین سے کچھ اگانے کے قابل، نہ کوئی چیز پیدا کرنے کے قابل، نہ جو چیز اگے اسے

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

**پس اللہ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۷۴﴾ اللہ نے ایک مثال بیان کی، ایک غلام ہے جو کسی کی ملکیت ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ شخص جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دیا ہے تو وہ اس میں سے پوشیدہ اور کھلم کھلا خرچ کرتا ہے، کیا وہ برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۷۵﴾**

باقی رکھنے کے قابل، پھر وہ معبود کیسے بن گئے؟

② **وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ** : یہ اس غلط گمان کی تردید ہے کہ مالک تو واقعی اللہ تعالیٰ ہے، مگر ہمارے یہ دستگیر اس سے دلوانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ سے جو چاہیں منوا سکتے ہیں، جیسا کہ ایک صاحب نے کہا ؂

اولیاء راہست قدرت از الٰہ تیر جستہ باز آرندش زراہ

''اولیاء کو اللہ کی طرف سے یہ طاقت ملی ہوئی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو راستے سے واپس لے آتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے پاس کسی طرح بھی کوئی طاقت نہیں، نہ خود کچھ دینے کی، نہ اللہ تعالیٰ کو اپنی محبت یا طاقت اور دھونس کے ساتھ مجبور کر کے دلوانے کی، بلکہ انھیں معلوم ہی نہیں کہ کوئی ہمیں پکار بھی رہا ہے۔ (دیکھیے احقاف: ۵، ۶) ان کے اس عقیدے کی تردید سورۂ یونس (۱۸) اور سورۂ زمر (۳) میں بھی واضح الفاظ میں کی گئی ہے۔ ''**وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ**'' میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ ایسا اختیار حاصل کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے مجبور محض ہیں۔

**آیت 74** ① **فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ** : مشرک کہتے ہیں کہ جس طرح بادشاہوں کے وزیر اور درباری اس کی سلطنت میں دخیل ہوتے ہیں اور بادشاہ کو ان کی سننا پڑتی ہے، اسی طرح ہمارے یہ معبود، اوتار اور ٹھاکر بھی اللہ کی سرکار میں صاحب اختیار ہیں، اس واسطے ہم ان کو پوجتے ہیں، سو یہ مثال غلط ہے۔ بادشاہ تو سب کام خود نہیں کر سکتے مگر اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے اور اس پر کسی کا رتی برابر بھی دباؤ نہیں ہے۔

② **وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** : یعنی یہ تمھاری بے علمی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اللہ ان کی سفارش رد نہیں کر سکتا، کبھی چھت پر چڑھنے کے لیے سیڑھی کی ضرورت کی طرح اپنے داتاؤں کو سیڑھی قرار دیتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لیے سیڑھی کی ضرورت ہی نہیں، وہ بالکل قریب ہے اور کسی کا محتاج نہیں کہ اس کی سفارش رد نہ کر سکتا ہو۔ یہ سب تمھاری بے عقلی اور بے سمجھی ہے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے لیے اس قسم کی مثالیں بیان نہ کرو۔ اب آگے دو مثالیں بیان کی جاتی ہیں، ان پر غور کرو۔

**آیت 75** ① **ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا**...... : ''**عَبْدًا**'' کا معنی ہی غلام ہے، پھر بھی ''**مَّمْلُوْكًا**'' کی تصریح اس لیے فرمائی کہ ایک لحاظ سے آسمان و زمین کا ہر شخص ہی ''**عَبْدًا**'' ہے، فرمایا: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

ع ۱۲

اور اللہ نے ایک مثال بیان کی، دو آدمی ہیں جن میں سے ایک گونگا ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے، وہ اسے جہاں بھی بھیجتا ہے، کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا، کیا یہ اور وہ شخص برابر ہیں جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے راستے پر ہے ﴿۷۶﴾

عَبْدًا﴾ [ مریم : ۹۳ ] ”آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس عبد (غلام) بن کر آنے والا ہے۔“ سو یہاں مراد وہ عبد ہے جو کسی آدمی کی ملکیت میں ہے۔

② وَمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا ...... : یہاں ”مَمْلُوْكًا“ کے مقابلے میں ”مَالِكًا“ کہنے کے بجائے ”مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا“ اس لیے فرمایا کہ انسان مالک بھی ہو تو اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ہمارا عطا کردہ ہے، ساتھ اسے یہ بھی یاد دلا دیا کہ ہمارا عطا کردہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے رہو، اپنا سمجھ کر چھپا کر نہ بیٹھ جاؤ۔

③ هَلْ يَسْتَوٗنَ : یعنی کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے میں ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک عاجز مملوک غلام کو، جو اپنے مالک کی اجازت کے بغیر ایک کوڑی خرچ نہیں کر سکتا، ایک آزاد شخص کے برابر کر دے جو اپنے مال کا مالک ہے اور جہاں چاہے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتا رہتا ہے۔ تو کیا یہ بے بس غلام اور وہ آزاد مالک کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ حالانکہ یہ دونوں انسان ہوتے ہیں، ذہنی اور جسمانی ساخت اور قوتوں میں تقریباً ایک جیسے ہیں، پھر بھی یہ ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ تو جب یہ برابر نہیں ہو سکتے تو کوئی بھی بت یا بزرگ، نبی یا فرشتہ، زندہ یا مردہ، جو سب اللہ کی مخلوق و مملوک ہیں، وہ ساری کائنات کے خالق اور ہر چیز کے مالک کے برابر ہو سکتے ہیں!؟ (قاسمی)

④ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ : اوپر اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کہ ”کیا یہ برابر ہو سکتے ہیں“ ذکر کرنے کے بعد خود کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ اس کا جواب سوال کے اندر ہی موجود ہے اور ہر سننے والا یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ”ہرگز نہیں۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تعریف فرمائی کہ ایسی عمدگی سے تمھیں کوئی نہیں سمجھائے گا۔

⑤ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ : معلوم ہوا کہ اہل کتاب اور مشرکین مکہ میں سے کچھ لوگ توحید کی حقیقت کو پہچانتے تھے، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے تثلیث اور مردہ پرستی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کسی موقع پر ایمان لانے کا ارادہ رکھتے تھے، البتہ ان کے اکثر شرک کی قباحت جانتے ہی نہ تھے، بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں شرک کی راہ پر چلے جاتے تھے، اکثریت کا حال یہی رہا ہے۔

آیت 76 ① وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ ...... : ”اَبْكَمُ“ گونگا، اس کے ساتھ اس کا بہرا ہونا بھی لازم ہوتا ہے،

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾

اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ہی کے پاس ہے اور قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر آنکھ جھپکنے کی طرح، یا وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۷۷﴾

کیونکہ آدمی سن کر ہی بولنا سیکھتا ہے۔ یہ مثال پہلی مثال سے بھی واضح ہے۔ دو آدمی ہیں، ایک میں چار خامیاں ہیں: ① وہ "اَبْكَمُ" ہے کہ نہ سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ ② "لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ" یعنی وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، چلو بول نہیں سکتا تو کسی ہنر ہی کا مالک ہو، ہاتھ پاؤں ہلا کر یا سر پر بوجھ اٹھا کر ہی کچھ کما سکے، نہیں، کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ③ وہ آزاد نہیں بلکہ غلام ہے اور غلام بھی ایسا بے کار کہ مالک ہی کو اس کا سارا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ ④ مالک اسے جہاں بھی بھیجے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بے چارہ راستہ ہی معلوم نہیں کر سکتا، نہ پوچھ سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شخص میں چار خامیوں کے بجائے دو خوبیاں ہیں: ① وہ لوگوں کو عدل کا حکم دیتا ہے۔ معلوم ہوا وہ سنتا، بولتا اور سمجھتا ہے، وہ نہ "اَبْكَمُ" ہے اور نہ "لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ" ہے۔ ② "هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" یعنی وہ صحیح ترین راستے پر قائم ہے، جو سب سے مختصر اور منزل پر پہنچا دینے والا ہے، یعنی وہ نہ کسی پر بوجھ ہے، نہ راستے سے سراسر ناواقف۔ تو کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اسی طرح بندوں کے خود ساختہ معبود بت ہوں یا قبریں یا کچھ اور، وہ نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں، نہ کچھ کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے ہیں۔ اپنے مالک پر بوجھ ہیں، یعنی بجائے اس کے کہ یہ اپنے پجاریوں کے کسی کام آئیں خود ان کے پجاری مصیبت اٹھا کر پتھر، اینٹیں، سیمنٹ اور مستری لا کر انھیں بنواتے ہیں۔ پھر ان کی حفاظت اور مرمت کرتے، پہرا دیتے اور صفائی کرتے ہیں۔ یہ دونوں کیسے برابر ہو گئے؟ جب وہ دونوں آدمی برابر نہیں، حالانکہ مخلوق ہونے میں اور آدمی ہونے میں دونوں برابر ہیں، تو مشرکین کے بنائے ہوئے بت اور آستانے جو بے جان ہیں اور ان کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے ہو گئے اور اس کے شریک کس طرح بن گئے؟

② بعض اہل علم نے دونوں آیتوں میں مذکور دو، دو آدمیوں کو مومن و کافر کی مثال قرار دیا ہے۔ بری صفات والے غلام سے مراد کافر اور اچھی صفات والے سے مراد آزاد مومن ہے، مگر اوپر بیان کردہ تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

**آیت 77** : ① وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : "غَيْبُ" جو نہ حواس خمسہ سے معلوم ہو سکے، نہ عقل سے، مخلوق سے پوشیدہ ہو۔ "لِلّٰهِ" خبر ہے "غَيْبُ السَّمٰوٰتِ" کی۔ بعد میں آنے کے بجائے پہلے آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ "اللہ ہی کے پاس ہے" کیا گیا۔ صرف اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کے دلائل میں سے یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ ساتھ ہی ایک ایسے غیب کا ذکر فرما دیا جو اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، کیونکہ وہ غیب کا علم کسی کو بتایا ہی نہیں گیا اور وہ قیامت ہے اور اس کا علم ہونا سچا معبود ہونے کی دلیل اور علم نہ ہونا باطل ہونے کی دلیل ہے۔ دیکھیے سورۂ نحل (۲۱)۔

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے، تاکہ تم شکر کرو ۝

❷ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ ...... : "السَّاعَةِ" زمانے کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ، مراد قیامت ہے، کیونکہ وہ اچانک اتنے کم وقت میں قائم ہو جائے گی۔ "اَوْ هُوَ اَقْرَبُ" میں "اَوْ" بمعنی "بَلْ" ہے، جیسا کہ یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۱۴۷ ] "اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا، بلکہ وہ زیادہ ہوں گے۔" دوسری جگہ اپنے امر (کُنْ) کے متعلق فرمایا: ﴿ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴾ [ القمر : ۵۰ ] "اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے آنکھ کی ایک جھپک۔" اور یہاں "اَوْ هُوَ اَقْرَبُ" فرمایا، کیونکہ آنکھ جھپکنا بھی کچھ وقت چاہتا ہے، قیامت اس سے بھی کم وقت میں قائم ہو جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں، کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

بعض علماء نے اس کا معنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ تم قیامت کو بہت دور سمجھ رہے ہو، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ قریب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴾ [ المعارج : ۶، ۷ ] "بے شک وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔"

**آیت 78** ❶ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ......: اس سورت کی آیت (۶۵) ﴿ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر اور اس کے اکیلے معبود ہونے کے جو دلائل شروع ہوئے تھے وہی سلسلۂ کلام جاری ہے۔ اس آیت میں پہلا انعام ماؤں کے پیٹوں سے نکالنا ہے۔ اس سے پہلے بہت سے مراحل خود بخود اس میں آ جاتے ہیں۔ نو ماہ تک پیٹ میں مکمل بچہ بنانے کے بعد اسے نکلنے کا راستہ مہیا کرنا اور ماں اور بچے دونوں کی خیریت کے ساتھ بچے کو باہر لے آنا کیا معمولی بات ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے اتنے بڑے احسان کے باوجود انسان کے ناشکری اور شرک اختیار کرنے پر اس کے لیے بہت سخت الفاظ استعمال فرمائے، فرمایا: ﴿ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴾ [ عبس : ۱۷ تا ۲۰ ] "مارا جائے انسان! وہ کس قدر ناشکرا ہے، اس نے اسے کس چیز سے پیدا کیا۔ ایک قطرے سے، اس نے اسے پیدا کیا، پس اس کا اندازہ مقرر کیا، پھر اس کے لیے (ماں کے شکم سے نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا۔"

❷ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا: انسان ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو اسے کچھ علم نہیں ہوتا، پھر کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ اسے فطری طور پر سکھا دیتا ہے، مثلاً ماں کا دودھ تلاش کر لینا، اسے چوسنا، جو چیز ملے منہ میں ڈالنا وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ کھانے پینے اور زندگی قائم رکھنے کی دوسری ضروریات کے حصول کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ ہر چیز کی فطرت میں رکھ دیا ہے،

اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾

کیا انھوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا، آسمان کی فضا میں مسخر ہیں، انھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں تھامتا۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۷۹﴾

ورنہ کوئی چیز زندہ نہ رہتی۔

③ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَۃَ...... : کان، آنکھیں اور دل اگرچہ ہر جاندار کو عطا ہوئے ہیں، مگر دوسرے تمام جاندار ان سے اتنا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں جتنا ان کی فطرت میں ہے۔ بطخ آج سے لاکھوں سال پہلے جس طرح تیرتی تھی اب بھی اس میں کوئی تبدیلی یا ترقی نہیں ہوئی، یہی حال پرندوں کا اور چوپاؤں اور سمندری جانوروں کا ہے، درندے اور کیڑے مکوڑے بھی ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں، جب کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کچھ اختیار سے بھی نوازا ہے کہ وہ ہدایت اور گمراہی میں سے کسی بھی چیز کو اختیار کر سکتا ہے، پھر اس کو عطا کردہ کان، آنکھیں اور دل پچھلی نسلوں کے تجربے قلم سے محفوظ رکھتے ہیں، انھیں بعد والوں تک پہنچاتے اور نئی سے نئی ایجاد میں لگے رہتے ہیں، حتیٰ کہ انسان ان کی بدولت اتنی دنیاوی ترقی کر چکا ہے کہ رہائش، سفر، کھانے پینے، غرض ہر چیز میں پہلے انسان اور آج کے انسان کی آسائشوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ اسی طرح توانائی کے حصول میں وہ ایٹم تک پہنچ گیا ہے، جس سے وہ بربادی کا بے حساب سامان بھی تیار کر چکا ہے اور انسانی فوائد کا بھی۔ غرض اگر انسان اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں پر غور کرے تو کبھی نہ اس کے وجود کا انکار کرے، نہ اس کا کوئی شریک بنائے، نہ اس کے علاوہ کسی کو حاجت روا، مشکل کشا، داتا یا غریب نواز قرار دے کر پکارے، کیونکہ کسی نعمت میں کسی اور کا کوئی حصہ ہی نہیں اور نہ اس کی بندگی اور فرماں برداری میں کوتاہی کرے، بلکہ ہر دم اپنے دل، زبان اور ہر عضو کے ساتھ قولاً و عملاً اس کا شکر ادا کرے۔

④ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ : اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ اس لیے بنایا کہ تم شکر کرو۔ یہاں اگرچہ ذکر نہیں فرمایا کہ انسان نے شکر ادا کیا یا نہیں، مگر دوسرے کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اکثر لوگ شکر نہیں کرتے، جیسے فرمایا: ﴿ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴾ [ المؤمن : ٦١ ] ''اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَقَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ﴾ [ سبا : ١٣ ] ''اور میرے بندوں میں سے بہت کم شکر کرنے والے ہیں۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی پہچان کے لیے نہ اپنے ان کانوں سے کام لیتے ہیں، نہ آنکھوں سے اور نہ دلوں سے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹)۔

آیت 79 اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ...... : ''اَلطَّیۡرِ'' ''طَائِرٌ'' کی جمع ہے، اڑنے والا، اگرچہ بعض لوگ '' فَاعِلٌ '' کی جمع '' فَعۡلٌ '' کا انکار کرتے ہیں، مگر شنقیطی رحمہ اللہ نے اس کی کئی مثالیں ذکر فرمائی ہیں، جیسا کہ ''صَاحِبٌ'' کی جمع ''صَحۡبٌ''۔ امرء القیس نے کہا ؎

وُقُوۡفًا بِہَا صَحۡبِیۡ عَلَیَّ مَطِیَّہُمۡ ۔۔۔ یَقُوۡلُوۡنَ لَا تَہۡلِکۡ اُسًی وَ تَجَمَّلِ

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾

اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں سے رہنے کی جگہ بنا دی اور تمھارے لیے چوپاؤں کی کھالوں سے ایسے گھر بنائے جنھیں تم اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو اور ان کی اونوں سے اور ان کی پشموں سے اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانے کی چیزیں بنائیں ﴿۸۰﴾

”رَاكِبٌ“ کی جمع ”رَكْبٌ“، ”شَارِبٌ“ کی ”شَرْبٌ“ اور ”سَافِرٌ“ کی ”سَفْرٌ“ وغیرہ۔ کیا ان مشرکوں نے آسمان و زمین کے درمیان اڑتے ہوئے پرندوں پر غور نہیں کیا، وہ کون سی ہستی ہے جس نے ان کے پروں، بازوؤں اور دموں کی ساخت اڑنے کے قابل بنائی اور زمین و آسمان کے درمیان اڑتے ہوئے انھیں گرنے سے تھامے رکھا، کوئی دعوے دار ہی سامنے لائیں، پھر بھی یہ اللہ کے ساتھ شریک بنا رہے ہیں، سچ ہے کہ ان نشانیوں سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو بات سمجھ جائیں تو مان لیں، جو ماننے پر آمادہ ہی نہ ہوں ان کے لیے ہر نشانی بے فائدہ ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ ملک (۱۹)۔

**آیت 80** ① وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا : ”بُيُوْتٌ“ ”بَيْتٌ“ کی جمع ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا، جو تمھارے اوپر ہو، سایہ کر رہی ہو اسے سقف، چھت اور سماء کہتے ہیں، جو نیچے ہو اسے ارض کہتے ہیں اور جو چاروں طرف سے تمھارے لیے پردہ کر رہی ہو اسے جدار (دیوار) کہتے ہیں اور جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ ترتیب کے ساتھ منظم ہو جائیں تو وہ بیت (گھر) ہے۔ ”سَكَنًا“ مصدر ہے، اس کا معنی کسی جگہ میں رہنا بھی ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ [ الطلاق : ٦ ] ”انھیں (یعنی مطلقہ بیویوں کو) وہاں سے رہائش دو جہاں تم رہتے ہو، اپنی طاقت کے مطابق۔“ اس کا معنی سکون اور راحت بھی ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا﴾ [ الأعراف : ١٨٩ ] ”اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس کی طرف (جا کر) سکون حاصل کرے۔“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رہائش کے متعلق اپنی کئی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر میں رہنے کی قدر اور اس میں آ کر ملنے والی راحت، عافیت اور سکون کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کے پاس گھر نہ ہو۔ اس آیت سے مکان کی قدر و قیمت اور اس نعمت کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ گھر جسمانی اور نفسیاتی سکون کی جگہ ہے۔ اسلام گھر کو سکون کی جگہ دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ باہمی جھگڑے اور اختلاف کی، کیونکہ یہ ”گھر“ کی حکمت اور مقصد کے خلاف ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے گھر کی حرمت رکھی۔ فرمایا کہ بلا اجازت کوئی دوسرے کے گھر میں داخل نہ ہو، حتیٰ کہ جھانکنے سے بھی منع فرمایا اور تجسس سے بھی۔ گھر کی حرمت سورۂ نور (۲۷ تا ۲۹ اور ۵۸، ۵۹) میں دیکھیں۔ علاوہ ازیں سورۂ احزاب کی آیت (۵۳) بھی ملاحظہ فرما لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ، يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ وَنَوْمَهُ، فَإِذَا قَضَى نَهْمَتَهُ فَلْيُعَجِّلْ إِلَى أَهْلِهِ» [ بخاری، العمرۃ، باب

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور اللہ نے تمھارے لیے ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کیں، سائے بنا دیے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں سے چھپنے کی جگہیں بنائیں اور تمھارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ قمیصیں جو تمھیں تمھاری لڑائی میں بچاتی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے، تاکہ تم فرماں بردار بن جاؤ ﴿۸۱﴾

السفر قطعة من العذاب : ۱۸۰۴، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ''سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے جو تمھارے ایک کو اس کے کھانے اور پینے اور اس کی نیند سے روک لیتا ہے، تو جب تم میں سے کوئی شخص اپنی حاجت پوری کر لے تو جلدی اپنے گھر آ جائے۔''

② وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا : اگرچہ گھر کوئی بھی ہو بڑی نعمت ہے، مگر اینٹوں، پتھروں کا گھر بنانے میں نعمت ہونے کے باوجود مشقت، بوجھ اور خرچ زیادہ ہے، سب سے پہلے زمین حاصل کرنا، اینٹیں، پتھر، مصالحہ، مٹی، لکڑی، لوہا، غرض سب کچھ مہیا کرنا، پھر مستریوں کے ناز اٹھانا، سارے مراحل مشکل ہیں، پھر وہ مکان کہیں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا انعام دیکھیے کہ اس نے ہماری آسانی کے لیے جانوروں کے چمڑوں سے خیمے بنا دیے، چند لکڑیاں اور رسیاں اور بنا بنایا مکمل گھر، جہاں چاہا میخیں ٹھونک کر رسیاں باندھ کر خیمہ بنا لیا، اسی چمڑے کی قناتیں کھڑی کر کے چار دیواری بنا لی۔ پھر جب چاہا اکھاڑ کر تہ کر کے ساتھ رکھ لیا اور اگلی منزل پر روانہ ہو گئے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان سے بھی ہلکے پلاسٹک اور المونیم کے خیمے عطا فرما دیے۔

③ تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ...... : ''تَسْتَخِفُّوْنَهَا'' ''خَفَّ يَخِفُّ'' سے باب استفعال جمع مذکر حاضر ہے۔ ''يَوْمَ ظَعْنِكُمْ'' یہاں ''يَوْمَ'' سے مراد وقت ہے۔ ''أَصْوَافٌ'' ''صُوْفٌ'' کی جمع ہے، بھیڑ کی اون۔ ''أَوْبَارٌ'' ''وَبَرٌ'' کی جمع، اونٹ کی پشم۔ ''أَشْعَارٌ'' ''شَعْرٌ'' کی جمع ہے، بکریوں کے بال۔ ''اَثَاثًا'' گھر کا ساز و سامان جو بہت ہو۔ ''أَثَّ يَؤُثُّ'' (ن) جب کوئی چیز بہت اور گھنی ہو۔ امرء القیس نے بالوں کی چوٹی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے

وَ فَرْعٍ يَزِيْنُ الْمَتْنَ أَسْوَدَ فَاحِمٍ أَثِيْثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ

''أَثِيْثٍ'' یعنی گھنے، ''مَتَاعًا'' گھر کی ضرورت کی خاص چیزیں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ''اَثَاثًا'' میں ''مَتَاعًا'' بھی داخل ہے، مگر اس کی اہمیت کی بنا پر الگ بھی ذکر فرمایا۔ ''اِلٰى حِيْنٍ'' ایک وقت تک، یعنی جو اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھا ہے، مثلاً نیا سامان آنے تک، یا اس کے پرانا ہونے تک، یا دنیا سے رخصت ہونے تک۔

آیت 81 ① وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا ...... : ''ظِلٰلًا'' ''ظِلٌّ'' کی جمع ہے، سائے۔ ''اَكْنَانًا'' اور ''اَكِنَّةً''

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۸۲﴾

پھر اگر وہ پھر جائیں تو تیرے ذمے تو صرف واضح پیغام پہنچا دینا ہے ﴿۸۲﴾

دونوں "كِنٌّ" کی جمع ہیں، چھپاؤ کی جگہ یا چیز، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِيۡۤ اَكِنَّةٍ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۵ ] "اور انھوں نے کہا ہمارے دل پردے میں ہیں۔" "سَرَابِيۡلَ" "سِرْبَالٌ" کی جمع ہے، قمیص یا جو لباس بھی پہنا جائے۔ "تَقِيۡكُمُ" "وَقٰى يَقِيْ" سے مضارع معلوم واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ فاعل اس کا ضمیر جمع ہے، اس لیے واحد مؤنث ہے۔ چوپاؤں، مکانوں اور خیموں کے بعد گھر سے باہر سردی گرمی اور دشمن سے بچاؤ کرنے والی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ اس آیت میں ان لوگوں کے لیے جن کے پاس مکان یا خیمہ نہیں، یا وہ سفر میں ہیں تو گرمی وغیرہ سے بچاؤ کے لیے مختلف سایوں کا ذکر کیا، مثلاً درختوں کا سایہ، مکانوں، دیواروں اور پہاڑوں کا سایہ، آبادیوں کا سایہ، چھتریوں کا سایہ، غرض یہی سائے گرمی سردی اور بارش سے بچانے کے کام آتے ہیں۔

② وَجَعَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَكۡنَانًا : اس میں پہاڑوں کی قدرتی غاریں، کھود کر بنائے ہوئے مکان اور پہاڑوں میں کھود کر بنائی ہوئی لمبی سرنگیں، جن میں فوجی سامان، اسلحہ، جہاز اور فوج محفوظ رکھی جاتی ہے، سب شامل ہیں۔

③ وَجَعَلَ لَكُمۡ سَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمُ الۡحَرَّ : وہ لباس جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں، بعض اہل علم نے فرمایا کہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے، وہاں گرمی زیادہ تھی، اس لیے صرف گرمی سے بچانے والے لباس ذکر فرمائے۔ مگر اکثر مفسرین نے فرمایا کہ گرمی کا ذکر کافی سمجھ کر سردی کا الگ ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ لباس گرمی سے بچاتا ہے تو سردی سے بھی بچاتا ہے۔ رہا عرب میں گرمی کا زیادہ ہونا تو اسی سورت کے شروع میں جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ لَكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ ﴾ [ النحل : ۵ ] "تمھارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے۔" معلوم ہوا عربوں کو بھی سردی سے بچنے کی ضرورت تھی، اس لیے یہ بات زیادہ قوی ہے کہ قرآن مجید نے صرف گرمی کا ذکر کر کے سردی سے بچانے کی نعمت پر غور کرنا سننے والوں پر چھوڑ دیا، یا سورت کے شروع میں "لَكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ" (تمھارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے) میں سردی سے بچاؤ کا ذکر پہلے ہو چکنے کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ "وَسَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمۡ بَاۡسَكُمۡ" اس میں زرہ، خود، بلٹ پروف (گولی سے محفوظ) جیکٹیں، گاڑیاں اور ٹینک وغیرہ سب شامل ہیں۔

④ لَعَلَّكُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ : یعنی تاکہ تم فرماں بردار اور اللہ تعالیٰ کے تابع بن جاؤ، اس لیے کہ جو شخص ان بے پایاں نعمتوں پر غور کرے گا ضروری ہے کہ وہ ایمان لا کر اس کی اطاعت اختیار کرے۔

آیت 82 فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ : اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے جو بعد والے جملے سے سمجھ میں آ رہا ہے، یعنی اگر وہ پھر جائیں، نہ مانیں تو آپ کا کوئی نقصان ہے نہ آپ پر کوئی ملامت، کیونکہ آپ کے ذمے صرف واضح پیغام پہنچا دینا ہے، آپ اپنا فریضہ ادا کرتے جائیں، ایمان کی توفیق دینا یا نہ

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ وَ يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝

وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں (٨٣) اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، پھر ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، نہ اجازت دی جائے گی اور نہ ان سے معافی کی درخواست لی جائے گی (٨٤)

دینا ہمارے ہاتھ میں ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ [ القصص : ٥٦ ] ”بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے۔“ پھر ان کا محاسبہ بھی ہمارے ذمے ہے، فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [ الرعد : ٤٠ ] ”پس تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔“

**آیت 83** ❶ **يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا** : یعنی خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات عنایت فرما رہی ہے، مگر جب عملاً شکر گزاری کا وقت آتا ہے تو انکار کر دیتے ہیں۔ ” **ثُمَّ** “ یہاں تعجب کے لیے ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے پھر اللہ کی نعمتوں کا انکار کر دیتے ہیں، گویا دل میں نعمتوں کا اقرار اور اپنے عمل سے انکار کرتے ہیں، بلکہ پوچھنے پر اللہ کی نعمتوں کا اقرار زبان سے بھی کرتے ہیں، مثلاً تمھیں کس نے پیدا کیا؟ جواب دیں گے اللہ نے۔ (دیکھیے زخرف : ٨٧) اسی طرح سورۂ مومنون (٨٤ تا ٨٩) میں ان کے اعترافات ذکر فرمائے ہیں۔ مگر وہ ایمان لانے پر تیار نہ تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ صرف ”لا الٰہ الا اللہ“ کہنے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اپنی مرضی چھوڑ کر ہر کام میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننا پڑے گا اور اس کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ ہمارے ہاں بس ”لا الٰہ الا اللہ“ کہنا جنت کے لیے کافی سمجھا گیا ہے، خواہ پوری زندگی اس کے خلاف ہو۔ وجہ اس کی محض طوطے کی طرح کہنا اور مفہوم سے مکمل لاتعلقی ہے۔ بعض اہل علم نے ” **نِعْمَتَ اللّٰهِ** “ سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی لی ہے، یعنی یہ لوگ آپ ﷺ کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے بھی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

❷ **وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ** : ” **اَكْثَرُهُمْ** “ اس لیے فرمایا کہ ان کے اکثر جانتے ہوئے کافر تھے۔ کچھ جہل کی وجہ سے بھی انکار کرتے تھے، کچھ دل میں ایمان کا ارادہ بھی رکھتے تھے، کچھ چھوٹے بچے تھے، جو فطرتاً مسلمان تھے مگر کفار کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کا شمار دنیوی لحاظ سے کفار میں ہوتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کا اور انتہائی احتیاط کا ایک نمونہ ہے کہ ان سب کو نعمت پہچان کر پھر کفر کرنے والے قرار نہیں دیا، بلکہ یہ حکم ان کے اکثر پر لگایا۔

**آیت 84** ❶ **وَ يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا** : یعنی قیامت کے دن ہر امت کا پیغمبر اللہ کے سامنے کھڑا ہو گا اور ان تک حق پہنچا دینے کی شہادت دے گا، ساتھ ہی اگر انھوں نے تصدیق کی ہو گی تو اس کی اور اگر جھٹلایا ہو گا تو اس کی بھی شہادت دے گا۔ پیغمبروں کی وفات کے بعد جن لوگوں نے حق پہنچایا وہ یہ شہادت دیں گے۔ اس میں نعمت کے منکروں کے

وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور جب وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، عذاب کو دیکھ لیں گے تو نہ وہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی ﴿۸۵﴾

لیے وعید ہے۔ شہادت کے مفہوم کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۳)، نساء (۴۱)، حج (۷۸) اور سورۂ زمر (۶۹)۔

② ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا : پھر کافروں کو اجازت نہیں دی جائے گی۔ کس چیز کی؟ دوسری جگہ اس کی وضاحت آئی ہے، اس میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس دن نہ وہ بول سکیں گے اور نہ انھیں عذر کرنے کی اجازت دی جائے گی، جیسے فرمایا: ﴿هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ﴾ [ المرسلات : ۳۵، ۳۶ ] ”یہ دن ہے کہ نہ وہ بولیں گے اور نہ انھیں اجازت دی جائے گی کہ وہ عذر کریں۔“ دوسری یہ کہ جب وہ کہیں گے : ﴿رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ﴾ [ المؤمنون : ۹۹، ۱۰۰ ] (اے میرے رب! مجھے واپس بھیجو، تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کرلوں) تو انھیں واپس جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، کیونکہ واپس جانے پر بھی وہ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں۔ (دیکھیے انعام : ۲۸) قرآن کی بلاغت دیکھیے، یہ فرمایا کہ اجازت نہیں دی جائے گی، یہ ذکر نہیں کیا کہ کس چیز کی؟ کیونکہ وہ کئی چیزیں ہیں۔

③ وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ : ”عَتَبَ يَعْتُبُ عَتْبًا“ (ن، ض) ناراض ہونا۔ ”أَعْتَبَ يُعْتِبُ“ ناراضگی دور کرنا۔ ”اَلْعُتْبٰى“ راضی کرنا، منانا۔ ”اِسْتَعْتَبَ فُلَانٌ فُلَانًا“ یعنی فلاں نے دوسرے پر اپنی ناراضگی ظاہر کی، تاکہ وہ اس کی ناراضگی دور کر سکے، یا معافی مانگ سکے۔ ”وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ“ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سامنے اس لیے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا جائے گا کہ وہ معافی کی درخواست کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دور کر سکیں، یعنی انھیں اللہ کو راضی کرنے کی درخواست کا موقع ہی نہیں دیا جائے گا۔

**آیت 85** ① وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ...... : ”وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا“ سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ موحدین تو اپنے گناہوں کی سزا پا کر، یا شفاعت سے، یا محض اللہ کی رحمت سے عذاب سے نکل آئیں گے، فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [ النساء : ۱۱۶ ] ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔“ جب کہ ان ظالموں کے عذاب دیکھ لینے کے بعد نہ اس میں کمی کی جائے گی، نہ ایک لمحے کی مہلت دی جائے گی، بلکہ اسی وقت عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ”الْعَذَابَ“ سے مراد کفار کے ہر طبقے کے لیے خاص عذاب مراد ہے۔

② اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی، جب کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، جب آپ کے پاس آپ کے چچا کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: «لَعَلَّهُ تَنْفَعُهُ شَفَاعَتِيْ

وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾

اور جب وہ لوگ جنھوں نے شریک بنائے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے رب! یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنھیں ہم تیرے سوا پکارا کرتے تھے۔ تو وہ ان کی طرف یہ بات پھینک ماریں گے کہ بلاشبہ یقیناً تم جھوٹے ہو ﴿۸۶﴾

يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُجْعَلُ فِيْ ضَحْضَاحٍ مِنَ النَّارِ يَبْلُغُ كَعْبَيْهِ يَغْلِيْ مِنْهُ دِمَاغُهُ » [ بخاري، مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب : ۳۸۸۵۔ مسلم : ۲۱۰ ] ''امید ہے کہ قیامت کے دن اسے میری شفاعت پہنچے گی تو اسے ہلکی آگ میں ڈالا جائے گا جو اس کے ٹخنوں تک پہنچے گی، اس سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔'' صحیح بخاری ہی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « وَلَوْ لَا أَنَا لَكَانَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ » [ بخاري، مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب : ۳۸۸۳ ] ''اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے درک اسفل میں ہوتا۔'' ان دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ کفار کے حق میں کوئی سفارش آگ سے نکلنے کے لیے قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی سفارش ان کے والد کے حق میں قبول نہیں ہوگی اور سورۂ شعراء (۱۰۰) اور سورۂ مدثر (۴۸) میں کفار کے متعلق سفارش نہ ہونے کا ذکر ہے۔ ہاں صحیح بخاری کی اس حدیث سے بظاہر کفار کے حق میں سفارش سے عذاب کی تخفیف ثابت ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ جنت کے طبقات کی طرح جہنم کے بھی درکات ہیں۔ جنت کا سب سے اعلیٰ طبقہ فردوس ہے اور جہنم کا سب سے نچلا حصہ درک اسفل ہے۔ یہ فیصلہ ہونے کے بعد کہ کس کافر کو کون سا عذاب ہوگا جب انھیں جہنم کی طرف روانہ کیا جائے گا تو جہنم کے سات دروازوں میں سے ہر ایک کے لیے جو دروازہ اور جو عذاب مقرر ہے وہ وہاں پہنچیں گے، اسے دیکھنے کے بعد پھر انھیں کوئی تخفیف یا مہلت نہیں ملے گی۔ نبی ﷺ کی خیر خواہی، خدمت اور سفارش کی وجہ سے ابوطالب کا فیصلہ پہلے ہی سب سے ہلکے عذاب کا ہو چکا ہوگا، اب وہاں جانے کے بعد اسے مزید تخفیف یا جہنم سے خلاصی حاصل نہیں ہو سکے گی۔

**آیت 86** **وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ......** : کفار جب اپنے ان شریکوں کو دیکھیں گے جنھیں وہ مدد کے لیے پکارتے رہے اور اللہ کا شریک بناتے رہے، یا جن کے بتوں یا قبروں کو پوجتے اور سجدہ و طواف کرتے رہے، جیسا کہ صحیح بخاری (۴۲۸۸) میں ذکر ہے کہ مشرکین مکہ نے کعبہ کے اندر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے بت بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ قیامت کے دن مشرکین ان بزرگوں کو دیکھیں گے تو اپنے جرم کو ہلکا کرنے اور اپنے بنائے ہوئے داتاؤں و دستگیروں کو اس جرم میں ساتھی بنانے کے لیے کہیں گے، پروردگارا! یہ لوگ ہیں جنھیں ہم تیرے سوا پکارا کرتے تھے۔ وہ سب کے سب فوراً سختی سے کہیں گے، بلاشک و شبہ یقیناً تم جھوٹے ہو۔ فوراً کا مفہوم ''فَاَلْقَوْا'' کی فاء سے ظاہر ہو رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرک انھیں پکارتے تو رہے ہیں، پھر وہ انھیں جھوٹا کیوں کہیں گے؟ جواب اس کا ایک تو یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے سوا کسی کو پکارتا ہے اسے یعنی اس کے

وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىٕذِ ِ السَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور اس دن وہ اللہ کے سامنے فرماں بردار ہونا پیش کریں گے اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس کے بدلے جو وہ فساد کیا کرتے تھے ﴿۸۸﴾

بنائے ہوئے داتا و دستگیر کو معلوم ہی نہیں کہ کوئی اسے پکار رہا ہے، نہ انھیں ان کا پکارنا سنائی دیتا ہے، تو وہ انھیں جھوٹا نہ کہیں تو کیا کہیں؟ دیکھیے سورۂ فاطر (۱۳، ۱۴) اور سورۂ احقاف (۵، ۶) دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا شریک کہیں موجود ہی نہیں، ہر مشرک خواہ بت پرست ہو یا قبر پرست، ولی پرست ہو یا نبی پرست، وہ محض اپنے خیالی بنائے ہوئے حاجت رواؤں، مشکل کشاؤں کو پکارتا ہے، حقیقت میں ان کا کہیں کوئی وجود نہیں، اس لیے وہ انبیاء و اولیاء اور ان کے بنائے ہوئے داتا و دستگیر انھیں صاف جھوٹا کہیں گے کہ تم ہمیں نہیں بلکہ اپنے وہم و گمان اور خیال کو پکارتے اور پوجتے رہے ہو۔ دیکھیے سورۂ یونس (۲۸) اور سورۂ نجم (۲۳) رہا شیطان تو اس نے واقعی انھیں شرک کی دعوت دی تھی، مگر وہ نہایت بے حیائی کے ساتھ ان سے صاف بے تعلق ہو جائے گا۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۲۲)۔

**آیت 87** وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىٕذِ ِ السَّلَمَ ...... : "السَّلَمَ" کا معنی مطیع ہونا، فرماں بردار ہونا ہے۔ یعنی پہلے تو قسمیں کھا کر اپنے مشرک ہونے کا انکار کرتے رہیں گے، جیسا کہ سورۂ انعام (۲۲، ۲۳) اور سورۂ مجادلہ (۱۸) میں ہے، پھر اپنے بنائے ہوئے شرکاء کو دیکھ کر انھیں اپنے ساتھ پھنسانے کی کوشش کریں گے، جیسا کہ پچھلی آیت میں گزرا۔ جب وہ بھی انھیں صاف جھوٹا کہیں گے اور ان کے پاس کوئی جواب نہیں رہ جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ کھڑے کر کے ہر طرح فرماں بردار اور سرتا پا عجز و انکسار بن جائیں گے اور وہ تمام حاجت روا، مشکل کشا، داتا اور دستگیر جو انھوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی مشکل کشائیوں کی جھوٹی کہانیاں انھوں نے گھڑ رکھی تھیں، سب ان سے گم ہو جائیں گے، کوئی نظر نہیں آئے گا۔ بعض لوگوں کو یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام کی طرح قرآن کی بہت سی آیات میں مشرکین کا بولنا، عذر کرنا، قسمیں اٹھانا مذکور ہے اور کئی آیات میں ان کے مونہوں پر مہر لگنا یا انھیں بولنے کی اجازت نہ ملنا مذکور ہے۔ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تطبیق یہ دی ہے کہ یہ سب الگ الگ مواقع کا بیان ہے، کیونکہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، کبھی ان کا حال کچھ ہوگا کبھی کچھ۔ [ مسلم، الزکوۃ، باب إثم مانع الزکوۃ : ۹۸۷ ]

**آیت 88** ① اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا ...... : ان لوگوں کو ہم عذاب پر عذاب زیادہ کرتے جائیں گے، کیونکہ وہ دوہرے مجرم ہوں گے۔ ایک عذاب ان کے کفر کی وجہ سے اور ایک دوسروں کو اللہ کی راہ، یعنی اسلام سے روکنے کی وجہ سے۔ ان کے گمراہ کردہ لوگوں کو جتنا عذاب ہوگا، ان کے اپنے عذاب کے ساتھ وہ بھی شامل ہو جائے گا، بلکہ قیامت تک ان کے گمراہ کردہ

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں ان پر انھی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے۔ اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی، اس حال میں کہ ہر چیز کا واضح بیان ہے اور فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری ہے ﴿۸۹﴾

---

لوگوں کی جد و جہد کے نتیجے میں جب بھی کوئی گمراہ ہوگا، تو اس کو دیے جانے والے عذاب جتنا عذاب ان سب لوگوں کے عذاب میں بھی بڑھا دیا جائے گا جو اس کی گمراہی کا باعث بنے۔ یہ آیت بھی دلیل ہے کہ اہل جہنم کے عذاب کے لحاظ سے کئی درجے ہوں گے۔

② **بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ** : اس فساد کی وجہ سے جو وہ پھیلاتے رہے اور اپنے ساتھ کئی دوسروں کو بھی لے ڈوبے، جیسے ناحق قتل کی رسم کی ابتدا کرنے والا آدم علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۳۲)، سورۂ اعراف (۳۸) اور سورۂ عنکبوت (۱۲، ۱۳)۔

**آیت 89** ① **وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ ......** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۴۳) اور سورۂ نساء کی آیت (۴۱) "**مِنْ اَنْفُسِهِمْ**" سے مراد خود ان کے چمڑوں اور دوسرے اعضاء کی شہادت بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۲۰، ۲۱)۔

② **وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا ......** : "**تِبْيَانًا**" مصدر ہے، بیان میں مبالغہ ہے، بہت اچھی طرح بیان کرنا، یعنی حلال و حرام اور ہر اس چیز کا واضح بیان ہے جس پر دنیا و آخرت میں انسان کی ہدایت و گمراہی اور کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے، پھر جن احکام کو قرآن نے مختصر طور پر بیان کیا ہے، یا ان کا بیان چھوڑ دیا ہے ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع فرض قرار دے کر سنت و حدیث کی طرف رجوع کا حکم دیا ہے۔

③ **لِكُلِّ شَيْءٍ** : قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا: ((لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُوْتَشِمَاتِ، وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ، الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ امْرَأَةً مِنْ بَنِيْ أَسَدٍ يُقَالُ لَهَا أُمُّ يَعْقُوْبَ، فَجَاءَتْ فَقَالَتْ إِنَّهُ بَلَغَنِيْ أَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَكَيْتَ، فَقَالَ وَمَا لِيْ لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟ فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَمَا وَجَدْتُ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ، فَقَالَ لَئِنْ كُنْتِ قَرَأْتِيْهِ لَقَدْ وَجَدْتِيْهِ، أَمَا قَرَأْتِ: ﴿ وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ قَالَتْ بَلٰى، قَالَ فَإِنَّهُ قَدْ نَهٰى عَنْهُ)) [ بخاری، التفسیر، سورة الحشر، باب : ﴿ وما اتاكم الرسول فخذوه...... ﴾ : ۴۸۸۶ ] "اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو جلد میں سوئی کے ذریعے سے نیل کے ساتھ نقش و نگار

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ وَ إِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ

بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت والے کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور سرکشی سے منع کرتا

بناتی ہیں اور جو بنواتی ہیں اور جو چہرے کے بال اکھڑواتی ہیں اور جو دانتوں کے درمیان فاصلہ کرواتی ہیں، اللہ کی پیدا کردہ چیز کو بدلتی ہیں۔'' بنو اسد کی ایک خاتون ام یعقوب نامی کو یہ بات پہنچی تو وہ آئی اور کہنے لگی: ''مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے ایسی ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے اور جو اللہ کی کتاب میں بھی ہے۔'' اس نے کہا: ''میں نے دونوں تختیوں کے درمیان (پورا قرآن) پڑھا ہے، اس میں تو تمھاری یہ بات مجھے نہیں ملی۔'' فرمایا: ''اگر تو نے اسے پڑھا ہوتا تو تجھے مل جاتا، کیا تم نے یہ نہیں پڑھا: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷] ''اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔'' اس نے کہا: ''کیوں نہیں؟'' فرمایا: ''پھر بات یہ ہے کہ ان کاموں سے آپ ﷺ نے منع کیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے اپنے الفاظ کے مطابق اس میں ہر چیز کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ دین کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے ہر حکم پر عمل کرنا اور ہر نہی سے باز رہنا بھی قرآن ہی کا حصہ ہے۔ مفسر شعراوی نے یہاں شیخ محمد عبدہ مصری کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں پیرس میں تھا، ایک مستشرق (غیر مسلم عربی عالم) نے مجھ سے کہا کہ قرآن میں ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ۳۸] ''ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔'' میں نے کہا، ہاں ٹھیک ہے۔ اس نے کہا، اچھا یہ بتاؤ کہ ایک اردب (تقریباً ۴۸ کلو) آٹے کی کتنی روٹیاں بنتی ہیں؟ میں نے کہا، یہ معمولی بات ہے، آؤ کسی روٹیاں پکانے والے سے پوچھ لیتے ہیں۔ اس نے کہا نہیں، میں قرآن میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا، قرآن نے تو بتا دیا ہے: ﴿فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [الأنبیاء: ۷] ''اگر تم نہیں جانتے تو اہل الذکر (اسے سمجھنے والے) سے پوچھ لو۔'' غرض قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ مزید تفصیل اسی سورت کی آیت (۶۴) اور اس کے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

④ وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ: یہاں تینوں لفظ اسم فاعل کے بجائے مصدر ذکر فرمائے ہیں، مثلاً ''هَادِيٌ'' کے بجائے ''هُدًى'' اور اسی طرح ''رَحْمَةً'' اور ''بُشْرٰى'' فرمایا ہے، ایسا مبالغہ کے لیے کیا جاتا ہے، مثلاً زید کو بہت ہی زیادہ عادل کہنا ہو تو ''زَيْدٌ عَادِلٌ'' کے بجائے کہتے ہیں ''زَيْدٌ عَدْلٌ'' یعنی زید عین عدل ہے۔ مقصد یہ کہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

**آیت 90** ① اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ: عدل کا معنی اپنے عقیدے اور عمل میں زیادتی یا کمی سے بچ کر اعتدال اور درمیانہ راستہ اختیار کرنا ہے۔ انصاف بھی یہی ہے اور قسط بھی۔ ''اَلْاِحْسَانِ'' کا لفظ دو طرح آتا ہے، ایک ''إِلٰى'' یا کسی اور حرف کے واسطے کے بغیر، اس کا معنی کام کو بہت اچھی طرح اور پختگی و مضبوطی سے کرنا ہوتا ہے، مثلاً ''أَحْسَنْتُهُ'' کہ میں نے یہ کام بہت اچھی طرح کیا، اور ایک ''إِلٰى'' وغیرہ کے واسطے کے ساتھ، جیسے ''أَحْسَنْتُ إِلَيْهِ'' کہ میں نے اس سے

الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

ہے، وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ ﴿۹۰﴾

اچھا سلوک کیا، یعنی اس ''اِحْسَانٌ'' کا معنی اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساری مخلوق کو پیدا کرنے اور ہر نعمت عطا فرمانے کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تو اس کے حق میں تفریط (کمی) کی جائے نہ افراط (زیادتی)۔ کمی یہ ہے کہ اس کی ذات کا انکار کیا جائے، یا اس کی صفات (جس طرح اس نے بیان فرمائی ہیں) میں سے کسی صفت کا انکار کیا جائے، اسے تعطیل کہتے ہیں، یا اسے مخلوق کے مشابہ کہا جائے، اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ یا اس کا مطلب ایسا نکالا جائے جس سے اس صفت کا انکار لازم آتا ہو، اسے باطل تاویل یا تحریف کہتے ہیں۔ یا کہا جائے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ اللہ کی صفات مثلاً سمیع یا بصیر وغیرہ کا مطلب کیا ہے، یہ اللہ ہی جانتا ہے، یہ بھی انکار ہی کی ایک صورت ہے، اسے تفویض کہتے ہیں۔ یہ سب اس رحمٰن کے حق میں تفریط (کمی) ہے اور عدل و قسط کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں افراط (زیادتی) یہ ہے کہ کسی مخلوق کو اس کی ذات یا کسی صفت میں اس کا شریک مانا جائے، یہ اس اکیلے خالق و مالک کے ساتھ سخت ناانصافی اور ظلم عظیم ہے۔ اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں مذکور عدل کا معنی ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شہادت قرار دیا ہے۔ (طبری بسند حسن: ۲۱۹۹۵)

مخلوق کے بارے میں عدل یہ ہے کہ کسی کو اس کے حق سے نہ کم دیا جائے نہ زیادہ، بلکہ ہر ایک کو اس کا حق پورا پورا دیا جائے، خواہ اپنی ذات پر بوجھ آتا ہو، یا جن کے درمیان آپ فیصلہ کر رہے ہیں ان میں سے کسی ایک سے آپ کی دشمنی یا دوستی ہو، تو کسی کا حق پورا دینے میں وہ دشمنی یا دوستی حائل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ [النساء: ۵۸] ''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔'' اور فرمایا: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ [المائدۃ: ۸] ''اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں ہرگز اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔'' اور فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا﴾ [النساء: ۱۳۵] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر پوری طرح قائم رہنے والے، اللہ کے لیے شہادت دینے والے بن جاؤ، خواہ تمھاری ذاتوں یا والدین اور زیادہ قرابت والوں کے خلاف ہو، اگر کوئی غنی ہے یا فقیر تو اللہ ان دونوں پر زیادہ حق رکھنے والا ہے۔''

② ''اَلْاِحْسَانِ'' کا مطلب اگر کام کو اچھی طرح کرنا ہو تو اس کی وضاحت حدیثِ جبریل میں ہے کہ نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے سوال کہ احسان کیا ہے؟ اس کے جواب سوال میں فرمایا: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ

يَرَاكَ ﴾ [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ عن الإيمان و الإسلام..... : ۵۰۔ مسلم : ۸ ] ”احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہ دیکھتے ہو تو وہ تمھیں دیکھتا ہے۔“ ظاہر ہے نگرانی کے احساس کے ساتھ ہر کام کرنے والا کام کو اچھے سے اچھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ہر کام نماز، روزہ، صدقہ، حج، تجارت، صنعت، زراعت اور مزدوری کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی نگرانی دل میں حاضر ہو کہ پروردگار عالم مجھے دیکھ رہا ہے، تو یقیناً انسان ہر عمل بہترین طریقے سے کرے گا اور ہر گناہ سے بچے گا۔

اور اگر ”إِلَى“ کی وجہ سے کسی دوسرے پر احسان مراد ہو تو اس کی بہترین مثال بنی اسرائیل کا قارون سے یہ کہنا ہے: ﴿ وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ ﴾ [ القصص : ۷۷ ] ”اور احسان کر جیسے اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔“ اللہ نے انسان کو جو کچھ دیا ہے کسی بدلے کی خاطر نہیں دیا، بلکہ یہ اس کا احسان اور بے حد لطف و کرم ہے کہ اس نے مخلوق کے کسی حق کے بغیر جو اللہ کے ذمے ہو، ہر نعمت انھیں مفت دی۔ مقصد یہ کہ انسان مخلوق کے ساتھ اس سے کسی معاوضے کی امید کے بغیر اچھا سلوک کرے، اسے اس کے حق سے زیادہ دے دے۔ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کے ساتھ بھی احسان کا حکم دیا اور بتایا کہ کس طرح ایک فاحشہ عورت کتے کو پانی پلانے کے عوض جنت میں گئی اور ایک عورت بلی کو باندھ کر بھوکا مارنے کی پاداش میں جہنم میں گئی۔ (دیکھیے بخاری: ۳۳۲۱، ۲۳۶۵) حتیٰ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، فَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ » [ مسلم، الصيد والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح والقتل... : ۱۹۵۵، عن شداد بن أوس ﷺ ] ”اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، تو جب قتل کرو تو اس کا اچھا طریقہ اختیار کرو (یعنی ایذا دے دے کر نہ مارو اور نہ مثلہ کرو) اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے کرو، اپنی چھری کو تیز کر لو اور اپنے ذبیحے کو آرام پہنچاؤ۔“ قرآن مجید میں کئی جگہ احسان کا حکم اور اس کی فضیلت مذکور ہے، فرمایا: ﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾ [ البقرة : ۸۳۔ بني إسرائيل : ۲۳ ] ”اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔“ اور فرمایا: ﴿ وَأَحْسِنُوْا ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [ البقرة : ۱۹۵ ] ”اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ۵٦ ] ”بے شک اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [ العنكبوت : ٦٩ ] ”اور بلاشبہ اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

③ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى: اگرچہ یہ بھی احسان میں شامل تھا، مگر اس کی خاص تاکید کے لیے اسے الگ بھی بیان فرمایا، کیونکہ قرابت والوں کا حق زیادہ ہے اور انھیں دینا ویسے بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ وہ کم ہی احسان مند ہوتے ہیں اور باہمی رنجش بھی دینے لینے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ”ذِي الْقُرْبٰى“ کو دینے کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ روم (۳۸)، بنی اسرائیل (۲۶)، بقرہ (۱۷۷) اور سورۂ بلد (۱۴، ۱۵) وغیرہ۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

اور اللہ کا عہد پورا کرو جب آپس میں عہد کرو اور قسموں کو ان کے پختہ کرنے کے بعد مت توڑو، حالانکہ یقیناً تم نے اللہ کو اپنے آپ پر ضامن بنایا ہے۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔﴿۹۱﴾

④ وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ : "اَلْفَحْشَآءِ" وہ گناہ جو برائی میں حد سے بڑھے ہوئے ہوں، مثلاً زنا اور قوم لوط کا عمل، سورۂ بقرہ میں شدید بخل کو بھی "اَلْفَحْشَآءِ" فرمایا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۸) "اَلْمُنْكَرِ" ایسی برائیاں جن کا عقل انکار کرتی ہو اور فطرت انسانی بھی انھیں برا سمجھتی ہو۔ "اَلْبَغْيِ" کسی پر ظلم، زیادتی، زبان درازی یا دست درازی کرنا، سرکشی کرنا۔

⑤ اس آیت میں تین بھلائیوں (عدل، احسان، ایتاء ذی القربیٰ) کا حکم دیا گیا ہے، جن میں تمام بنیادی نیکیاں آ جاتی ہیں اور تین برائیوں (فحشاء، منکر، بغی) سے منع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات کو بگاڑ کر رکھ دینے والی ہیں، اس لیے یہ قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں سے ہے۔

آیت 91 ① وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ : احکام الٰہی پورے کرنے کا عہد جو ایمان لانے کی صورت میں کیا ہے، یا آپس میں ایک دوسرے سے جائز طور پر کیے گئے عہد و پیمان۔ (شوکانی) "عٰهَدْتُّمْ" باب مفاعلہ سے ہے، مراد کسی دوسرے کے ساتھ کیا ہوا عہد ہے۔

② وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا...... : پکا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ جن قسموں کو پکا نہ کیا گیا ہو ان کا توڑنا جائز ہے، کیونکہ ہر وہ عہد جس پر قسم کھائی جائے اس پر اللہ تعالیٰ کو ضامن بنایا جاتا ہے اور وہ پکا ہو جاتا ہے اور اسے بلا عذر توڑنا جائز نہیں، بلکہ عہد توڑنا نفاق کی علامت ہے۔ بعض قسمیں انسان خود اٹھا لیتا ہے کہ میں ایسا کروں گا یا نہیں کروں گا۔ اگر انھیں پورا نہ کر سکے تو اس کا کفارہ سورۂ مائدہ (۸۹) میں مذکور ہے۔ اسی طرح لغو قسم کا حکم سورۂ بقرہ (۲۲۵) اور سورۂ مائدہ (۸۹) میں گزر چکا ہے۔

③ جس قسم کے متعلق معلوم ہو جائے کہ اس کا پابند نہ رہنا دینی لحاظ سے بہتر ہے تو وہ قسم توڑ دے اور وہ کام کرے جو بہتر ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنٍ فَرَاٰى غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا، فَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِهِ وَلْيَفْعَلْ )) [ مسلم، الأيمان و النذور، باب ندب من حلف يمينا فرأى غيرها خيرا منها أن يأتي ...... : ۱۶۵۰/۱۲ ] "جو شخص کسی بات پر قسم کھائے، پھر اس کے علاوہ دوسرے کام کو اس سے زیادہ اچھا سمجھے تو وہ (دوسرا) کام اختیار کرے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔"

④ اگر کسی ناجائز کام کا عہد کرے یا قسم اٹھائے تو اسے پورا کرنا جائز نہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۲۴)۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کرنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ ڈالا، تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان فریب کا ذریعہ بناتے ہو، اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھی ہوئی ہو، اللہ تو تمھیں اس کے ساتھ صرف آزماتا ہے اور یقیناً قیامت کے دن وہ تمھارے لیے ضرور واضح کرے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۹۲﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو یقیناً تمھیں ایک ہی امت بنا دیتا اور لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور یقیناً تم اس کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۹۳﴾

**آیت 92** ① وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا ...... : ”غَزْلٌ“ مصدر بمعنی مفعول ہے، فعل ”غَزَلَ يَغْزِلُ“ (ض) آتا ہے، روئی یا اون کا سوت (دھاگا) بنانا۔ ”اَنْكَاثًا“ ”نِكْثٌ“ (نون کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، ٹکڑے۔

② یہ ایک تشبیہ ہے جو قسموں کو پختہ کرنے کے بعد ان کو توڑنے والوں کے لیے بیان کی گئی ہے، ضروری نہیں کہ ایسی عورت کہیں پائی بھی گئی ہو، جو عورت بھی ایسا کرے گی اسے یہی کہا جائے گا کہ یہ کتنی احمق ہے۔ اسی طرح قسمیں توڑنے والوں کا حال بھی اس عورت کا سا ہے، اگرچہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی بعض روایات میں ہے کہ مکہ میں ایک پاگل عورت تھی جو سوت کاتتی تھی اور پھر اسے بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی تھی۔

③ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا ...... : ”دَخَلًا“ سے مراد دھوکا، فریب اور کھوٹ ہے۔ اصل میں ”دَخَلًا“ اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز میں داخل کر دی جائے، جب کہ وہ اس میں سے نہ ہو، مثلاً چائے کی پتی میں چنے کے چھلکے ملا دیے جائیں۔ ”اَرْبٰى“ ”رَبَا يَرْبُوْ“ (ن) سے اسم تفضیل ہے، کسی چیز کا زیادہ ہونا، بڑھنا۔

④ یعنی کسی گروہ سے اس لیے بدعہدی نہ کرو کہ جب تم نے عہد باندھا اس وقت تم کمزور تھے اور وہ گروہ طاقتور تھا اور اب تم طاقتور اور وہ کمزور ہو گیا ہے، یا اب تمھیں اس سے زیادہ طاقتور کوئی دوسرا حلیف مل گیا ہے، جیسا کہ اہل جاہلیت کرتے تھے۔ (شوکانی، قرطبی) اور جیسا کہ اس زمانے میں اہل مغرب بلکہ تمام کفار کا عام دستور ہے۔

⑤ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ : کہ تم اپنے عہد پر قائم رہتے ہو یا دوسرے گروہ کو طاقتور یا کمزور پا کر اپنے عہد کا خیال چھوڑ دیتے ہو۔ (قرطبی)

**آیت 93** ① وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کو قدرت حاصل تھی کہ تمھارے درمیان

وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور اپنی قسموں کو اپنے درمیان فریب کا ذریعہ نہ بناؤ، (ایسا نہ ہو) کہ کوئی قدم اپنے جمنے کے بعد پھسل جائے اور تم برائی کا مزہ چکھو، اس کے بدلے جو تم نے اللہ کی راہ سے روکا اور تمھارے لیے بہت بڑا عذاب ہو ﴿۹۴﴾ اور اللہ کے عہد کے بدلے کم قیمت نہ لو، بے شک وہ چیز جو اللہ کے پاس ہے وہی تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۹۵﴾

---

اختلافات نہ رہنے دیتا۔ (دیکھیے یونس: ۹۹۔ ہود: ۱۱۸، ۱۱۹) مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ تمھیں اپنا اختیار استعمال کرنے کا پورا موقع دے، پھر جو گمراہی پر اصرار کرے اس کی رسی گمراہی کی طرف دراز کر دے اور جو حق کی جستجو کرے اسے ہدایت سے سرفراز کر دے۔ دیکھیے سورۂ لیل (۵ تا ۱۰)۔

❷ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ کافر کو بدعہدی کر کے نہ مارے، ایسی باتوں سے کفر تو مٹتا نہیں الٹا وبال آتا ہے۔ (موضح)

**آیت 94** ❶ وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ......: یعنی ایسا نہ ہو کہ تمھاری دھوکا دہی اور بدعہدی دیکھ کر کوئی شخص مرتد ہو جائے، یا عہد توڑنے والا شخص خود کفر میں مبتلا ہو جائے۔ زمخشری نے فرمایا کہ " قَدَمٌ " کو واحد اور نکرہ اس لیے رکھا کہ بدعہدی کے نتیجے میں ایک شخص کا قدم پھسلنا اور اسلام سے دور ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑی بات ہے، کجا یہ کہ اس حرکت سے بہت سے لوگ مرتد ہو جائیں۔ پہلے " تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ " میں قسم کھا کر دھوکا دینے کا سبب بیان فرمایا، تو اس آیت میں "لَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا" فرما کر اس کا برا نتیجہ بیان فرمایا۔

❷ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور تم لوگوں کو اسلام سے روکنے کا ذریعہ بن جاؤ اور تم پر دنیا ہی میں اس کا وبال آ جائے۔

❸ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور پھر آخرت کے عذاب عظیم میں مبتلا کر دیے جاؤ۔ مطلب یہ کہ اسلام کو بدنام نہ کرو کہ ایمان لانے والے شک میں پڑ جائیں، جس کا گناہ تم پر پڑے گا۔ (موضح)

**آیت 95** ❶ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اوپر کی آیات میں باہمی معاہدوں کی پابندی پر زور دیا، اب بتایا کہ ایمان لا کر جو اللہ سے عہد باندھا ہے اسے مت توڑو، یعنی مال کے طمع میں آ کر شریعت کی خلاف ورزی نہ کرو (جس میں باہمی معاہدوں کو توڑنا بھی ہے) جو مال خلاف شرع ہاتھ آئے وہ موجب وبال ہے۔ (موضح) کم قیمت سے مراد یہ نہیں کہ زیادہ قیمت لے لو، بلکہ مراد دنیا کا مال ہے، جو قلیل ہی ہے، خواہ پوری دنیا ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ [النساء: ۷۷] "کہہ دے دنیا کا سامان بہت ہی تھوڑا ہے۔"

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور یقیناً ہم ان لوگوں کو جنھوں نے صبر کیا، ضرور ان کا اجر بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۶﴾ جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انھیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۷﴾

② اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ : یہ ''اِنَّمَا'' کلمہ حصر نہیں بلکہ ''اِنَّ مَا'' ہے، جو مصحف عثمانی کے رسم الخط کے مطابق اکٹھا لکھا گیا ہے۔ ''مَا'' موصولہ میں مقدر ضمیر کی تاکید ''هُوَ'' کے ساتھ کرنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی جو مال شریعت کے مطابق ہاتھ آئے وہی تمھارے حق میں بہتر ہے، دوسرا کوئی نہیں، جیسا کہ شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [ ھود : ۸۶ ] ''اللہ کا باقی بچا ہوا تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو۔'' ''جو اللہ کے پاس ہے'' میں جنت بھی شامل ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ رہنے والی ہے اور دنیا فانی ہے۔

**آیت 96** ① مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ: چاہے وہ مقدار کے لحاظ سے کتنا ہی زیادہ ہو، بلکہ خواہ ساری دنیا ہو۔

② وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا...... : لام تاکید اور نون ثقیلہ کی تاکید اکٹھے ہوں تو قسم جیسی تاکید کا فائدہ دیتے ہیں۔ صبر کا معنی اپنے آپ کو کسی چیز پر باندھنا اور روک کر رکھنا ہے، یعنی جنھوں نے دنیوی طمع کے مقابلے میں اپنے آپ کو حق پر قائم رکھا۔ صبر بہترین عمل ہے، کیونکہ یہ تمام اعمال کی بنیاد ہے، اس کی تین قسمیں ہیں، اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر قائم رہنا اور طبیعت کو ان کا پابند رکھنا صبر ہے، اسی طرح اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے روکنا صبر ہے اور تیسری قسم مصیبت کے وقت جزع فزع اور اللہ تعالیٰ کے شکوے سے اپنے آپ کو روکنا صبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا کہ ہم صبر کرنے والوں کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق بدلہ دیں گے۔ بہترین عمل سے مراد صبر ہے، یعنی ان کے صبر کے مطابق اجر دیں گے۔ ایک معنی یہ بھی ہے کہ ہم انھیں ان کے عمل سے بہت زیادہ اچھا اجر دیں گے، جو کم از کم دس گنا اور زیادہ سے زیادہ بے حساب ہو گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ الزمر : ۱۰ ] ''صرف کامل صبر کرنے والوں کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔''

**آیت 97** ① مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى : لفظ ''مَنْ'' (جو بھی) میں مرد اور عورت دونوں آ جاتے ہیں، مگر پھر دونوں کا خاص الگ الگ ذکر فرمایا، تاکہ نہ عورتیں اپنے آپ کو کمتر یا محروم سمجھیں، نہ کوئی اور انھیں ایسا خیال کرے۔ اسلام

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

پس جب تو قرآن پڑھے تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کر ﴿۹۸﴾ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کا ان لوگوں پر کوئی غلبہ نہیں جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں ﴿۹۹﴾

کے سوا کہیں عورت کو یہ عزت نہیں ملی۔

② حَيٰوةً طَيِّبَةً : پاکیزہ زندگی میں حلال روزی، قناعت (اللہ نے جس حال میں رکھا ہے اسی پر خوش رہنا)، سچی عزت، سکون و اطمینان، دل کا غنی ہونا، اللہ کی محبت، ایمان کی لذت سبھی چیزیں شامل ہیں، جو ایمان اور عمل صالح کی بدولت نصیب ہوتی ہیں، ایمان یا عمل صالح یا دونوں سے محروم لوگوں کو یہ چیزیں کبھی حاصل نہیں ہوتیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح سے اخروی زندگی ہی نہیں بلکہ دنیوی زندگی بھی نہایت سکھ اور چین سے گزرے گی۔ مہائمی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایسا شخص دنیا میں اپنے عمل سے ایسی لذت پاتا ہے جو مال و جاہ کی لذت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس کی قسمت پر راضی کر کے اسے قناعت عطا فرما دیتا ہے، جس کے نتیجے میں مال بچا بچا کر رکھنے اور بڑھانے کی حرص کم ہو جاتی ہے۔ کافر کی زندگی مال و جاہ کے باوجود خوشگوار نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی حرص اور دولت کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف دونوں بڑھتے جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کو آخرت میں اس سے بھی بہت بہتر اجر بدلے میں دیا جائے گا۔ چنانچہ ان سے یہ نہیں کہا جائے گا: ﴿ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا ﴾ [ الأحقاف : ۲۰ ] "تم اپنے اچھے اعمال کا بدلہ اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے۔" بلکہ ان کے ادنیٰ اعمال بھی مکمل کر کے اعلیٰ کے ساتھ ملا دیے جائیں گے۔

**آیت 98** ﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ...... : ہدایت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے، ادھر گمراہی کا سرچشمہ شیطان ہے، جو انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اسے کسی صورت آدمی کا قرآن پڑھنا برداشت نہیں، سو وہ ہر حال میں اسے قرآن پڑھنے سے باز رکھتا ہے اور اگر کوئی پڑھنے لگے تو اس کے دل میں وسوسے ڈال کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے فرمایا کہ جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ لو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پڑھنے سے پہلے "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ اللہ کی پناہ کی دعا کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہی ہمیں اس ظالم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ شیطان انسان بھی ہوتے ہیں، جن بھی۔ (دیکھیے انعام : ۱۱۲) ان سے پناہ کی دعا کے ساتھ ان سے بچنے کے ذرائع اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ان سے میل جول اور دلی دوستی رکھے اور "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ" پڑھ کر اپنے آپ کو ان سے محفوظ سمجھے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو توپ کے گولوں سے اوٹ لیے بغیر اللہ سے پناہ مانگتا رہے اور اپنے آپ کو گولوں سے محفوظ سمجھے۔

**آیت 99** ﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى...... : شیطان کا صحیح ایمان اور توکل والوں پر تسلط اور غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں فرما دیا تھا: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴾ [ الحجر : ۴۲ ]

عٓ ۱۴ | ۱۹ — اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اس کا غلبہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور جو اس کی وجہ سے شریک بنانے والے ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور جب ہم کوئی آیت کسی دوسری آیت کی جگہ بدل کر لاتے ہیں اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو وہ نازل کرتا ہے، تو وہ کہتے ہیں تو تو گھڑ کر لانے والا ہے، بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۱۰۱﴾

’’بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں، مگر جو گمراہوں میں سے تیرے پیچھے چلے۔‘‘ البتہ وہ انھیں گمراہ کرنے کی کوشش سے باز نہیں آتا اور بعض اوقات وہ کچھ متاثر بھی ہو سکتے ہیں، مگر وہ اللہ سے ڈر کی برکت سے فوراً آگاہ ہو کر اس کے پنجے سے نکل جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴾ [ الأعراف: ۲۰۱ ] ’’یقیناً جو لوگ ڈر گئے، جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی (برا) خیال چھوتا ہے وہ ہشیار ہو جاتے ہیں، پھر اچانک وہ بصیرت والے ہوتے ہیں۔‘‘ اور دیکھیے سورۂ حج (۵۲)۔

**آیت 100** وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ: ’’بِهٖ‘‘ میں ’’ہٗ‘‘ کی ضمیر شیطان کی طرف جائے تو باء سببیہ ہوگی اور معنی ہوگا کہ وہ لوگ جو اس (شیطان) کی وجہ سے شریک بنانے والے ہیں۔ متن میں ترجمہ اس کے مطابق کیا گیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جائے، پھر معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اس (اللہ) کے ساتھ شریک بنانے والے ہیں، یہ معنی بھی درست ہے۔

**آیت 101** ① وَاِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ: یعنی پہلی آیت کا حکم منسوخ کر کے نیا حکم نازل فرماتے ہیں۔ نسخ پر بحث کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۰۶) اب یہاں سے کفار کے شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے۔ (شوکانی)

② بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی ان کے اکثر لوگ نسخ کی وجہ سے آپ ﷺ کو مفتری اس لیے کہتے ہیں کہ انھیں پہلی شریعتوں کا علم نہیں، اگر ہوتا تو سمجھ لیتے کہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے کہ وہ ایک حکم اتارتا ہے اور پھر جب چاہتا ہے اسے منسوخ کر کے دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ ’’اَكْثَرُهُمْ‘‘ اس لیے فرمایا کہ کچھ لوگ سب کچھ جاننے کے باوجود ضد اور عناد کی وجہ سے آپ کو مفتری کہتے ہیں۔

③ اس آیت کے دو مفہوم ہیں، ایک وہ جو اوپر گزرا، وہاں ’’اٰيَةً‘‘ سے مراد شرعی آیت اور حکم ہے، دوسرا معنی نشانی اور معجزہ ہے۔ اس وقت ’’اٰيَةً‘‘ سے مراد آیت کونیہ ہوگی، مثلاً ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں نہ جلنا، عصائے موسیٰ، ید بیضا، اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کرنا وغیرہ۔ امت محمد ﷺ میں اللہ تعالیٰ نے آیات کونیہ کا نظام بھی بدل دیا اور بطور معجزہ بھی قرآن ہی نازل فرمایا اور صرف کسی ایک سورت کے مقابلے کا چیلنج دیا، جس کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا، نہ دے سکے گا۔ باقی انبیاء کی آیات یعنی معجزوں کے بدلے یہ آیت یعنی معجزہ ایسا نازل ہوا جو آپ کے بعد قیامت تک موجود ہے۔ جب کچھ جواب نہ آیا تو آپ کو مفتری کہہ دیا، فرمایا نبی مفتری نہیں بلکہ یہ بے چارے بے علم ہیں۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

کہہ دے اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے، تاکہ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھے جو ایمان لائے اور فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور خوش خبری ہو ﴿۱۰۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں اسے تو ایک آدمی ہی سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان، جس کی طرف وہ غلط نسبت کر رہے ہیں، عجمی ہے اور یہ واضح عربی زبان ہے ﴿۱۰۳﴾

**آیت 102** ① قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ : "نَزَّلَ" میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کا معنی پایا جاتا ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۶) "رُوْحُ الْقُدُسِ" یعنی جبریل علیہ السلام۔ یہاں "رُوْحُ" (موصوف) "الْقُدُسِ" (صفت) کی طرف مضاف ہے جو مصدر ہے۔ اس کا معنی طہر اور پاکیزگی ہے، مگر یہاں مصدر بمعنی اسم مفعول "مُقَدَّسٌ" ہے، یعنی "اَلرُّوْحُ الْمُقَدَّسُ" مبالغے کے لیے اسم مفعول کی جگہ مصدر لائے ہیں، یعنی وہ روح جو سراپا پاکیزگی و طہارت ہے، جیسے "رَجُلُ صِدْقٍ" اور "خَبَرُ سُوْءٍ" ہے، جو اصل میں "اَلرَّجُلُ الصَّادِقُ" اور "اَلْخَبَرُ السَّيِّءُ" تھا۔ "مِنْ رَّبِّكَ" کا مطلب ہے کہ قرآن نازل کرنا اللہ کی طرف سے ہے، کسی مخلوق کا کلام نہیں اور اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے، ورنہ تربیت مکمل نہ ہو سکتی اور "بِالْحَقِّ" کا مطلب ہے کہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو باطل ہو، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک کے تمام ادوار کے تقاضوں کے عین مطابق اور حق ہے۔

② لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : تاکہ وہ ایمان والوں کو ایمان پر خوب قائم رکھے اور وہ ناسخ و منسوخ دونوں کو اللہ کی طرف سے سمجھیں۔ اس لیے جب وہ اس حکمت کو سمجھیں گے جو بعض احکام کے ناسخ و منسوخ ہونے میں پائی جاتی ہے تو ایمان پر ان کے قدم جمیں گے اور ان کے عقائد پختہ ہوں گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''قرآن پاک میں اکثر اللہ تعالیٰ نے نسخ فرمایا ہے، اس پر کافر شبہ کرتے ہیں، اس کا جواب سمجھا دیا، یعنی ہر وقت پر موافق اس وقت کے حکم بھیجے تو یقین والوں کا ایمان قوی ہو کہ ہمارا رب ہر حال سے خبر رکھتا ہے۔'' (موضح)

③ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ : "هُدًى" یعنی ہر حال میں اس کے مطابق راہ سمجھا دے اور "بُشْرٰى" ہر کام پر دل کی خوش خبری سنا دے۔ (موضح) اس کا صحیح اور مکمل مطلب سمجھنے کے لیے سورۂ عنکبوت کی آیات (۵۰، ۵۱) کی تفسیر ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 103** ① وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ ...... : یہ قرآن پر ان کا دوسرا طعن تھا۔ اس شخص کی تعیین میں کئی روایات ہیں، بعض میں اس کا نام بلعام بتایا گیا ہے، بعض میں مقیس، بعض میں ابن الحضرمی کا ایک غلام۔ مگر ان میں سے صحیح روایت

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اللہ انھیں ہدایت نہیں دیتا اور انھی کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾ جھوٹ تو وہی لوگ باندھتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی لوگ اصل جھوٹے ہیں ﴿۱۰۵﴾

وہ ہے جو عبداللہ بن مسلم الحضرمی نے بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے دو عیسائی غلام تھے جو ''عین التمر'' کے باشندے تھے۔ ایک کا نام یسار تھا، دوسرے کا جبر، وہ دونوں اپنی کوئی کتاب پڑھا کرتے تھے، بعض اوقات رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو ٹھہر جاتے۔ مشرکین کہنے لگے، محمد (ﷺ) ان دونوں سے سیکھتا ہے، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (طبری: ۲۲۰۷۳) ''الاستیعاب فی بیان الاسباب'' میں اسے صحیح اور دوسری روایات کو ضعیف کہا گیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی "الاصابة" میں اسے صحیح کہا ہے۔ بہرحال صرف چند لمحے اس شخص کے پاس ٹھہرنے سے انھوں نے آپ ﷺ کو اس کا شاگرد اور قرآن کو اس کا کلام ہونے کا بہتان جڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جس کی طرف یہ لوگ غلط نسبت کر رہے ہیں وہ خود عجمی ہے، جبکہ قرآن فصیح ترین عربی ہے۔

② آلوسی نے فرمایا: ''قرآن نے اس شخص کے نام کی تصریح نہیں کی، حالانکہ اس میں کفار کا جھوٹ زیادہ واضح ہوتا، اس لیے کہ بتانا یہ مقصود ہے کہ ان کی اصل غلطی کسی خاص شخص کو آپ کا معلم قرار دینا نہیں بلکہ کسی بھی بشر کو آپ کا معلم قرار دینا ہے۔'' روح القدس کے ذریعے سے نازل شدہ اللہ کے کلام کی اس سے بڑھ کر کیا توہین ہوگی کہ اسے کسی آدمی کا کلام کہا جائے، خواہ وہ کتنا بڑا عالم ہو۔

**آیت 104** اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ...... : ہدایت کا معنی سیدھی راہ دکھانا بھی ہے اور اس پر چلنے کی توفیق دینا بھی۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ انھیں راہ راست کی ہدایت نہیں دیتا۔ وہی اس قسم کی بے سروپا باتیں کیا کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ قرآن جیسی فصیح و بلیغ کتاب کو ایسا شخص تصنیف کر ڈالے جس کی اپنی زبان عربی نہیں ہے۔

**آیت 105** ① اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ...... : کفار کا قول جو اوپر آیت (۱۰۱) میں ذکر ہوا ہے " اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ " (تو تو گھڑ کر لانے والا ہے) یہ اس کا رد ہے کہ جھوٹ تو ان لوگوں کا کام ہے جو ایمان نہیں رکھتے، کیونکہ انھیں اللہ کا خوف نہیں ہوتا، جسے اللہ کا خوف ہو وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ باقی رہا نبی تو وہ اہل ایمان کا سردار ہوتا ہے، اس سے قطعی بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایک لفظ بھی جھوٹ باندھے۔

② وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ : " اُولٰٓئِكَ " سے مراد اللہ پر ایمان نہ رکھنے والے ہیں، یعنی انھی کی عادت جھوٹ ہوتی ہے، کیونکہ وہ ایمان ہی سے محروم ہیں، جو آدمی کو گناہ سے باز رکھتا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ

جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان کے بعد، سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن

③ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ» [ بخاري، الإيمان، باب علامات المنافق : ۳۳ ] ”منافق کی نشانیاں تین ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وہ وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔“

شیخ عبد الرحمان معلمی نے ”التنکیل“ میں لکھا ہے کہ اگر غور کیا جائے تو منافق کی تینوں نشانیوں کی بنیاد جھوٹ ہی ہے، کیونکہ وعدہ خلافی پر مؤاخذہ اس وقت ہے جب وعدہ کرتے وقت اسے پورا کرنے کی نیت نہ ہو، اگر وعدہ کرتے وقت پورا کرنے کی نیت ہو، پھر کسی عذر سے پورا نہ کر سکے تو اس پر مؤاخذہ نہیں اور خیانت ہضم نہیں ہو سکتی جب تک جھوٹ نہ بولے۔

**آیت 106** ① مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ ...... : طبری نے معتبر سند کے ساتھ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «مَنْ كَفَرَ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهِ فَعَلَيْهِ غَضَبٌ مِنَ اللّٰهِ وَلَهُ عَذَابٌ عَظِيْمٌ فَأَمَّا مَنْ أُكْرِهَ فَتَكَلَّمَ بِهِ لِسَانُهُ وَ خَالَفَهُ قَلْبُهُ بِالْإِيْمَانِ لِيَنْجُوَ بِذٰلِكَ مِنْ عَدُوِّهِ فَلَا حَرَجَ عَلَيْهِ لِأَنَّ اللّٰهَ تَأْخُذُ الْعِبَادَ بِمَا عُقِدَتْ عَلَيْهِ قُلُوْبُهُمْ» [ طبری : ۱۷/ ۳۰۵ ] ”جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے اس پر اللہ تعالیٰ کا بھاری غضب ہے اور اس کے لیے عذاب عظیم ہے، لیکن جسے مجبور کر دیا جائے اور وہ زبان سے کوئی بات کہہ دے، جب کہ اس کا دل ایمان کی وجہ سے اس کے خلاف ہو، تاکہ اس کے ساتھ دشمن سے جان بچا لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اللہ سبحانہ بندوں کو صرف اس چیز پر پکڑتا ہے جو ان کے دلوں کا پکا عقیدہ ہو۔“

③ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «كَانَ أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ إِسْلَامَهُ سَبْعَةٌ : رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبُوْ بَكْرٍ، وَعَمَّارٌ، وَأُمُّهُ سُمَيَّةُ، وَصُهَيْبٌ، وَبِلَالٌ، وَالْمِقْدَادُ، فَأَمَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِعَمِّهِ أَبِيْ طَالِبٍ، وَأَمَّا أَبُوْ بَكْرٍ فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِقَوْمِهِ، وَأَمَّا سَائِرُهُمْ، فَأَخَذَهُمُ الْمُشْرِكُوْنَ وَأَلْبَسُوْهُمْ أَدْرَاعَ الْحَدِيْدِ وَ صَهَرُوْهُمْ فِي الشَّمْسِ، فَمَا مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَاتَاهُمْ عَلٰى مَا أَرَادُوْا، إِلَّا بِلَالًا، فَإِنَّهُ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ فِي اللّٰهِ، وَهَانَ عَلٰى قَوْمِهِ، فَأَخَذُوْهُ، فَأَعْطَوْهُ الْوِلْدَانَ، فَجَعَلُوْا يَطُوْفُوْنَ بِهِ فِيْ شِعَابِ مَكَّةَ وَهُوَ يَقُوْلُ : أَحَدٌ، أَحَدٌ» [ ابن ماجه، السنة، باب فضل سلمان و أبي ذر و المقداد رضی اللہ عنہم : ۱۵۰۔ قال البوصيري رجاله ثقات و قال الحاكم صحيح الأسناد و أقره الذهبي، وقال الألباني حسن ] ”سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا وہ سات آدمی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمار، ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعے سے محفوظ رکھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے ذریعے سے محفوظ رکھا۔ باقی سب کو مشرکین نے پکڑا اور انھیں لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں جھلنے کے لیے پھینک دیا، چنانچہ وہ جتنے تھے سب نے اس

مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

ہو اور لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے تو ان لوگوں پر اللہ کا بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۰۶﴾

کے مطابق کہہ دیا جو کفار چاہتے تھے سوائے بلال رضی اللہ عنہ کے۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اس کے نزدیک اس کی جان بے قدر و قیمت ٹھہری (اور اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی) اور وہ ان لوگوں کی نظر میں ایسا بے قدر و قیمت ٹھہرا کہ انھوں نے اسے پکڑ کر بچوں کو دے دیا، وہ اسے لے کر مکہ کی گھاٹیوں میں گھومتے پھرتے اور وہ احد احد (اللہ ایک ہے، ایک ہے) کہتا رہتا۔''

❸ اوپر کفار کے شبہات ذکر کرکے اس شخص کا حکم بیان فرمایا جو ایسے شبہات سے متاثر ہو کر ایمان سے پھر جائے اور شرح صدر کے ساتھ کفر قبول کر لے کہ اس پر رب تعالیٰ کا بھاری غضب ہے اور اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔ '' اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ '' کے ساتھ اس شخص کے بارے میں فرمایا جس پر کوئی ظالم جبر کرے اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر زبان سے کہہ دے، یہ رخصت ہے، لیکن اگر کوئی شخص مرنا قبول کر لے اور منہ سے بھی کلمۂ کفر یا خلاف اسلام کوئی بات نہ نکالے تو یہ عزیمت ہے اور ایسا شخص بہت بڑا شہید ہوگا، جیسا کہ اللہ کے پیغمبروں مثلاً ابراہیم اور مسیح علیہما السلام نے موت کے خوف سے کلمۂ کفر نہیں کہا اور شہادت قبول کی، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بچا لیا۔ اسی طرح اصحاب الاخدود کا اور سورۂ یٰس میں مذکور شہید ہونے والے شخص کا واقعہ ہے اور اسلام میں تو اس کی بے شمار مثالیں ہیں، جیسا کہ بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرے اصحاب و تابعین۔

❹ بعض لوگوں نے جو ابوبکر، عمر، عثمان اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے ہیں، جب دیکھا کہ علی، حسن، حسین اور دوسرے بنی ہاشم رضی اللہ عنہم نے تینوں خلفاء کی بیعت کر لی، جو ان کے خلیفہ برحق ہونے کی دلیل ہے تو ان دشمنانِ صحابہ نے یہ بات بنائی کہ انھوں نے یہ کام مجبوری کی بنا پر تقیہ سے کیا تھا، حالانکہ تقیہ تو ایک رخصت ہے جو کمزور لوگوں کا کام ہے، شیرِ خدا بھی تقیہ کرے تو حق کا اعلان اور عزیمت پر عمل کون کرے گا۔ پھر تقیہ کا بہانہ بنانے والوں کی کتاب ''الکافی'' میں لکھا ہے کہ ان کے امام اپنی موت کا وقت جانتے ہیں اور ان کی مرضی ہوتی ہے تو مرتے ہیں۔ تو ان کے قول کے مطابق پہلے امام علی رضی اللہ عنہ کو جب اپنی موت کا علم تھا کہ عبد الرحمن بن ملجم کے ہاتھوں ہوگی تو انھیں کون سی مجبوری تھی کہ خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے، یا عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے اپنی لختِ جگر ام کلثوم کا نکاح کرتے؟

❺ علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ زبردستی کروایا ہوا کوئی قول یا فعل معتبر نہیں، اس سے نہ طلاق واقع ہوتی ہے، نہ نکاح، نہ غلام آزاد کرنا، نہ کسی کے نام جائداد لگوانا، نہ کوئی اقرار یا انکار یا کفریہ بات کرنا، ہاں جو کچھ وہ شرح صدر کے ساتھ کرے وہ معتبر ہوگا۔ (سیوطی فی الاکلیل)

❻ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ : دنیا میں اللہ کا بڑا غضب یہ ہے کہ مرتد ہونے والا مرد ہو یا عورت اگر توبہ نہ کرے تو اس کا قتل واجب ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ » [ بخاري، استتابة المرتدين والمعاندين و قتالهم، باب حكم المرتد...... : ٦٩٢٢ ] ''جو شخص اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو۔'' اور آخرت میں

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۰۷ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۰۸ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۰۹ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱۰

یہ اس لیے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں محبوب رکھا اور اس لیے کہ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۝۱۰۷ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور یہی لوگ ہیں جو بالکل غافل ہیں ۝۱۰۸ کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ، آخرت میں وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں ۝۱۰۹ پھر بے شک تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ فتنے میں ڈالے گئے، پھر انھوں نے جہاد کیا اور صبر کیا، یقیناً تیرا رب اس کے بعد ضرور بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ۝۱۱۰

عذاب عظیم کی عظمت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

۞ بعض لوگوں نے اپنے پاس سے کہا کہ عورت مرتد ہو جائے تو قتل نہیں کی جائے گی، یہ بات درست نہیں، کیونکہ "مَنْ" میں مرد و عورت سبھی شامل ہیں اور عورت کے مستثنیٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

**آیت 107** ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا ...... : عذاب عظیم کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور کفر اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے توفیق ہدایت سے بھی محروم ہو گئے۔

**آیت 108** اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ...... : دیکھنے اور سننے سے حق دکھائی اور سنائی دیتا ہے اور سوچنے سے سمجھ میں آتا ہے، مگر ان کے عناد اور ضد کی وجہ سے ان تینوں چیزوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی، سو وہ حق کی طلب میں انھیں استعمال ہی نہیں کرتے، بلکہ آخرت سے بالکل بے خبر اور بے فکر ہیں۔

**آیت 109** لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ...... : انسان دنیا میں آخرت کے حصول کی تجارت کے لیے آیا ہے، جب وہی حاصل نہ ہوئی تو اس کے خسارے میں کیا شک ہے۔ دیکھیے سورۂ عصر۔

**آیت 110** ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا ...... : مکہ کے بعض مسلمان کافروں کے مظالم سے تنگ آ کر بظاہر کچھ لچک کھا گئے، یا بعض ناجائز الفاظ منہ سے کہنے پر مجبور ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے، مگر اس کے بعد انھوں نے ایمان کے تقاضے ممکن حد تک پورے کیے، یعنی ہجرت کی، جہاد میں حصہ لیا اور اپنے موقف پر خوب ڈٹے رہے، اس پر

يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

جس دن ہر شخص اس حال میں آئے گا کہ اپنی طرف سے جھگڑ رہا ہوگا اور ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کیا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا (۱۱۱) اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے (۱۱۲)

اللہ تعالیٰ نے ان کی وہ غلطی معاف فرما دی۔

**آیت 111** ① يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ : یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے غفور و رحیم ہے اس دن جب......۔

② تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى ......: یعنی اس دن ہر مرد و عورت صرف اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوگا، نہ اسے کسی کی فکر ہوگی نہ کسی کو اس کی۔ ہر ایک بس اپنی ذات کے دفاع کے لیے بحث اور عذر بہانے کر رہا ہوگا، پھر ہر ایک نے جو کیا اسے اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا، کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

**آیت 112** ① وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً ......: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے آخرت کے عذاب کا ذکر فرمایا، اس کے بعد دنیا میں بھی کفران نعمت کی سزا خوف اور بھوک کا ذکر کیا، اس لیے آیت کی ابتدا میں واؤ عطف آئی ہے۔ (قاسمی)

② كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً ......: یعنی اس بستی کو نہ باہر سے دشمن کا کھٹکا تھا، نہ اندر سے کسی طرح کی فکر و تشویش۔ اس سے مراد کوئی بھی ایسی بستی ہو سکتی ہے، جیسے عاد و ثمود اور فرعون کی قوم کی بستیاں، مگر مکہ معظمہ میں یہ اوصاف سب سے زیادہ موجود تھے۔ پورے عرب میں کسی کو امن میسر نہ تھا، کسی بھی وقت کسی بھی قبیلے پر حملہ ہو سکتا تھا۔ مرد قتل، عورتیں اور بچے لونڈی و غلام اور مال مویشی غنیمت بن جاتے۔ کوئی سفر کرتا تو اسے اغوا کر کے بیچ دیا جاتا یا قتل کر دیا جاتا۔ ان کی معیشت بھی نہایت تنگ تھی، وہ اپنے ریوڑ لے کر پانی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے۔ صرف مکہ میں بیت اللہ کی حرمت کی وجہ سے مکمل امن تھا اور پوری دنیا سے لوگ حج و عمرہ کے لیے آتے تو اہل مکہ کو ان سے خرید و فروخت اور کرایہ مکان وغیرہ کی صورت میں وافر رزق مل جاتا اور ہر قسم کا پھل اور سبزی اور ضرورت کی ہر چیز میسر رہتی۔ اہل مکہ سردی میں یمن کو تجارتی قافلے لے جاتے اور گرمی میں شام کو۔ ان کے قافلوں کو حرم کے احترام میں کوئی کچھ نہ کہتا، جب کہ دوسرے کسی قافلے کا زبردست جنگجوؤں کی معیت کے بغیر سفر کرنا ہی ناممکن تھا۔ ہاں حرمت کے چار مہینوں میں پورے عرب میں امن ہوتا، وہ بھی بیت اللہ کے حج و عمرہ کے احترام کی خاطر۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قریش، سورۂ قصص (۵۷)، عنکبوت (۶۷)، آل عمران

وَ لَقَدۡ جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡهُمۡ فَكَذَّبُوۡهُ فَاَخَذَهُمُ الۡعَذَابُ وَ هُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس انھی میں سے ایک رسول آیا تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، تو انھیں عذاب نے اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ ظالم تھے ﴿۱۱۳﴾

(۹۷) اور سورۂ بقرہ (۱۲۵)۔

③ فَكَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰهِ ...... : "أَنْعُمٌ" "نِعْمَةٌ" کی جمع ہے، جیسا کہ "أَشُدٌّ" "شِدَّةٌ" کی۔ بعض کہتے ہیں "نُعْمٰی" کی جمع ہے، جیسے "بُؤْسٰی" کی جمع "أَبْؤُسٌ" ہے۔ (قرطبی) اس بستی والوں کی ناشکری اور احسان ناشناسی کی وجہ سے امن و اطمینان کی جگہ خوف و ہراس نے اور فراخی رزق کی جگہ بھوک نے انھیں اس طرح گھیر لیا جیسے کپڑا اپنے پہننے والے کو گھیر لیتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام میں عجیب جامعیت ہے، بھوک اور خوف کی تلخی کے اظہار کے لیے "فَاَذَاقَهَا" (اس کو چکھایا) کا لفظ استعمال فرمایا اور اس عذاب کے چمٹ جانے کو لباس بن جانے کے ساتھ تعبیر کیا اور ایک لمبی بات کو دو لفظوں میں سمیٹ دیا۔ اس استعارے کی لذت مومن عالم ہی اٹھا سکتا ہے، اس جاہل و ملحد کو اس لذت کی کیا خبر جس نے کہا کہ بھلا لباس بھی چکھا جاتا ہے؟

آیت 113 وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡهُمۡ ...... : یہ ان احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھی میں سے ایک رسول ان کی طرف بھیجا۔ غالباً اسی لفظ کو بنیاد بنا کر اکثر مفسرین نے اس بستی سے مراد مکہ معظمہ لیا ہے، ورنہ اس کی تعیین کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ پہلے رسولوں کی کوئی بستی بھی مراد ہو سکتی ہے اور ان کی طرف آنے والا رسول بھی۔ البتہ اس سے مکہ بالاولیٰ مراد ہے۔ یہاں جس بھوک اور خوف کا لباس چکھانے کا ذکر ہے اس کی تفصیل عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں (کے ایمان لانے) سے گریز کو دیکھا تو آپ نے عرض کیا: (( اَللّٰهُمَّ سَبْعًا كَسَبْعِ يُوْسُفَ )) "اے اللہ! یوسف (علیہ السلام) کے سات سالوں جیسے سات سال مسلط فرما۔" تو انھیں ایسی قحط سالی نے آ پکڑا جس نے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیا، یہاں تک کہ وہ چمڑے، مردار اور لاشیں بھی کھا گئے، بھوک کی وہ شدت تھی کہ ان میں سے کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تو اسے دھواں نظر آتا۔ [ بخاری، الاستسقاء، باب دعاء النبي صلی اللہ علیہ وسلم : اجعلها سنين... : ۱۰۰۷ ] ادھر مسلمانوں کے ساتھ ہر وقت حالت جنگ کی وجہ سے باہر سے آنے والے لوگوں کی آمد بھی رک گئی اور خوف کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر وقت مکہ میں اور مکہ سے باہر بھی مسلمانوں کے حملے سے خوف زدہ رہتے تھے۔ بہر حال شوکانی اور کئی مفسرین کہتے ہیں کہ ان آیات میں کسی متعین بستی کا ذکر نہیں ہے، محض ایک تباہ شدہ بستی کی مثال دے کر اہل مکہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر تم نے ہماری نعمتوں خصوصاً رسول بھیجنے کی ناشکری کی تو تمھارے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے گا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "ایسے بہت سے شہر ہوتے ہیں، پر احوال فرمایا مکے کا۔" (موضح)

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

سو کھاؤ اس میں سے جو اللہ نے تمھیں حلال، پاکیزہ رزق دیا ہے اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو ﴿۱۱۴﴾ اس نے تو تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ چیزیں حرام کی ہیں جن پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے گزرنے والا، تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۱۵﴾

**آیت 114** فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا...... : مشرکین نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اس کے ساتھ شریک بنائے تو اے ایمان والو! اگر تم واقعی صرف اللہ کی بندگی کرتے ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے تو لازم ہے کہ اپنی عقل اور مصلحت کے بل بوتے پر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار نہ دو، جیسا کہ مشرکوں نے اپنے پاس سے بحیرہ اور سائبہ وغیرہ کو حرام قرار دے رکھا ہے، حالانکہ یہ کہیں اللہ کا حکم نہیں اور مردار اور خون وغیرہ کو حلال کر رکھا ہے جنھیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ سو تم صرف انھی چیزوں کو کھاؤ جنھیں اللہ نے حلال اور طیب قرار دیا ہے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

**آیت 115** ❶ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ : یعنی جس جانور کو بھی غیر اللہ کے نام کے ساتھ شہرت دی جائے، مثلاً گنج بخش کا بکرا، چشتی اجمیری کی گائے یا فلاں شاہ کا مرغا، تو یقیناً وہ جانور حرام ہو گیا اور "اُهِلَّ" کا لفظ ذبح کے علاوہ اس کو بھی شامل ہے، کیونکہ "اُهِلَّ" کا معنی آواز بلند کرنا ہے، لہٰذا جس پر غیر اللہ کا نام آ گیا اس میں ایسی خباثت آ گئی جو مردار میں بھی نہیں، کیونکہ مردار پر تو صرف اللہ کا نام نہیں لیا گیا مگر "مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" (جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے) میں اس جانور کی روح اس کے خالق کے سوا دوسرے کے نام پر بھینٹ چڑھا دی گئی۔ یہ آیت شریفہ قرآن میں چار مرتبہ آئی ہے، سورۂ بقرہ (۱۷۳)، مائدہ (۳)، انعام (۱۴۵) اور یہاں سورۂ نحل (۱۱۵) میں، تمام مقامات پر نظر ڈال لیں۔ اس کے معنی "مَا رُفِعَ الصَّوْتُ بِهٖ لِغَيْرِ" ہیں (یعنی جس پر غیر اللہ کا نام بلند کیا جائے)، نہ کہ "مَا ذُبِحَ بِاسْمِ غَيْرِ اللّٰهِ" (یعنی جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے)۔ گو یہ اس میں بطریقِ اولیٰ داخل ہے، جس کی بنا پر بعض مفسرین نے "اُهِلَّ" کی تفسیر "ذُبِحَ" کی ہے، جو اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر اور بیان واقعہ کے لیے ہے۔ ہمارے دور میں اس نئے شرک کا وقوع ہوا ہے، اس برصغیر پاک و ہند کے علماء نے اسے خوب حل فرمایا ہے اور شاہ عبد العزیز کی تفسیر عزیزی اس پر شاہد عدل ہے۔

❷ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۳)، مائدہ (۳) اور سورۂ انعام (۱۴۵)۔

وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ اَلۡسِنَتُکُمُ الۡکَذِبَ ہٰذَا حَلٰلٌ وَّ ہٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ؕ مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ۪ وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَ عَلَی الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا حَرَّمۡنَا مَا قَصَصۡنَا عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَ مَا ظَلَمۡنٰہُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

اور اس کی وجہ سے جو تمھاری زبانیں جھوٹ کہتی ہیں، مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ اللہ پر جھوٹ باندھو۔ بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے ﴿۱۱۶﴾ بہت تھوڑا فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۱۷﴾ اور ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے وہ چیزیں حرام کیں جو ہم نے تجھ پر اس سے پہلے بیان کی ہیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۱۸﴾

**آیت 117،116** وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ...... : " اَلۡسِنَۃٌ " " لِسَانٌ " کی جمع ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال و حرام کو خود واضح فرما دیا ہے تو اب اسی کے پابند رہو اور یہ جرأت مت کرو کہ تمھاری زبانیں جسے جھوٹ سے حلال کہہ دیں اسے حلال اور جسے حرام کہہ دیں اسے حرام قرار دے لو، اگر ایسا کرو گے تو یہ اللہ پر جھوٹ باندھنا ہو گا اور یہ بات یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے، اگر اس کے بدلے انھیں دنیا میں کچھ فائدہ حاصل بھی ہو جائے، خواہ پوری دنیا مل جائے، وہ بہت ہی تھوڑا سا سامان ہے، کیونکہ یہ سامان ہر حال میں ختم ہو جانے والا ہے، پھر ان کا ہمیشہ کا ٹھکانا جہنم ہے۔ مشرکین کے اپنے پاس سے حلال و حرام بنانے کی مثالوں کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۰۳، ۱۰۴)، انعام (۱۳۸ تا ۱۴۰) اور سورۂ یونس (۵۹، ۶۰)۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، اس آیت میں ہر وہ شخص داخل ہے جو دین میں کوئی نئی بات (بدعت) ایجاد کرے، جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو، یا محض اپنی عقل اور رائے سے اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام یا حرام کردہ چیز کو حلال ہونے کا فتویٰ دے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے صحیح ہونے پر تو ساری امت کا اتفاق ہے: (( مَنۡ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلۡيَتَبَوَّأۡ مَقۡعَدَهُ مِنَ النَّارِ )) " [ بخاري، العلم، باب إثم من كذب على النبي ﷺ : ۱۰۷۔ مسلم، المقدمة : ۳ ] " جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے ( کیونکہ یہ درحقیقت اللہ پر جھوٹ ہے )۔"

**آیت 118** ① وَعَلَى الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا...... : حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جب مسلمان پر حرام کردہ چیزوں مردار اور خون وغیرہ کا ذکر فرمایا اور صرف مجبوری کے وقت انھیں جائز قرار دینے کا ذکر فرمایا، تاکہ امت پر آسانی رہے تو اس کے بعد یہودیوں پر ان چیزوں کے حرام کرنے کا ذکر فرمایا، جن کا ذکر پہلے سورۂ نساء (۱۶۰) اور سورۂ انعام (۱۴۶) میں گزر چکا ہے، جو پاکیزہ اور حلال ہونے کے باوجود ان کی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے ان پر حرام کی گئی تھیں اور اس اصر و اغلال میں

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

پھر بے شک تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے جہالت سے برے عمل کیے، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور اصلاح کر لی، بلاشبہ تیرا رب اس کے بعد یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۱۹﴾ بے شک ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار، ایک اللہ کی طرف ہو جانے والا اور وہ مشرکوں سے نہ تھا ﴿۱۲۰﴾

شامل تھیں جو ان کی سرکشی کی وجہ سے ان پر لادے گئے تھے۔ پھر ہمارے نبی کریم ﷺ کے آنے پر ان کی حرمت ختم ہوئی اور صرف وہ چیزیں حرام کی گئیں جن کا حرام کرنا بطور سزا نہیں بلکہ بطور مصلحت و رحمت تھا۔

② **وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا ......** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۶۰، ۱۶۱) اس سے یہودیوں کے اس دعویٰ کی بھی تردید ہو گئی کہ ان پر حرام کردہ چیزیں ہمیشہ سے حرام چلی آ رہی ہیں، اس لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۳)۔

**آیت 119** **ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ ......** : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام گناہ گاروں کو، وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا مشرک یا مسلمان، سب کو توبہ اور اصلاح کے بعد بے انتہا مغفرت اور رحمت کی نوید سنائی ہے۔ یاد رہے کہ یہاں جہالت کا معنی لاعلمی نہیں بلکہ بے وقوفی اور اکھڑ پن ہے، جو آدمی سے بے عقلی کے کاموں کا ارتکاب کرواتا ہے، جیسا کہ گھر سے نکلنے کی لمبی دعا میں ہے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ...... أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ » [ أبو داوٗد، الأدب، باب ما یقول إذا خرج من بیته : ۵۰۹۴۔ ابن ماجه : ۳۸۸۴، و صححه الألباني ] ”اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ...... میں کسی پر جہالت کروں یا کوئی مجھ پر جہالت کرے۔“ اور عمرو بن کلثوم نے کہا ؎

أَلَا لَا يَجْهَلَنْ أَحَدٌ عَلَيْنَا فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِيْنَا

”خبردار! ہم پر کوئی جہالت کا ارتکاب ہرگز نہ کرے، ورنہ ہم جاہلوں کی جہالت سے بڑھ کر جہالت کریں گے۔“ اس حدیث اور شعر سے جہل کا مفہوم واضح ہوتا ہے جو یہاں مراد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر گناہ لاعلمی سے ہو یا جان بوجھ کر، ہوتا ہی بے وقوفی اور جہالت سے ہے، اسلام سے پہلے والے زمانے کو اسی لیے زمانہ جاہلیت کہتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۵۴)، نساء (۱۸، ۱۹) اور سورۂ فرقان (۶۳)۔

**آیت 120** ① **اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا ......** : ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی: ﴿ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۸۴ ] ”اور پیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ۔“ اس لیے مشرکین مکہ، یہود اور نصاریٰ میں سے ہر ایک ابراہیم علیہ السلام کی عزت و تکریم کرنے والا اور ان کی ملت کا متبع ہونے کا دعوے دار تھا، چنانچہ فرمایا:

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۲۱ وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۲۲ؕ

اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا۔ اس نے اسے چن لیا اور اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی (۱۲۱) اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی اور بے شک وہ آخرت میں بھی یقیناً نیک لوگوں سے ہے (۱۲۲)

﴿ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ [ الصافات : ۱۰۸، ۱۰۹ ] ''اور پیچھے آنے والوں میں اس کے لیے یہ بات چھوڑی کہ ابراہیم پر سلام ہو۔'' یعنی بعد میں آنے والے سب لوگ ان پر سلام بھیجیں گے، اس لیے اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی صفات اور ان کا منہج بیان فرمایا، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی ملت ابراہیم پر قائم نہیں ہے۔

(2) اُمَّةً : اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی پہلی صفت '' اُمَّةً '' بیان فرمائی۔ اس آیت میں لفظ '' اُمَّةً '' کا معنی پیشوا اور امام بھی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ [ البقرۃ : ۱۲۴ ] ''بے شک میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔'' اور یہ بھی کہ وہ اکیلے ہی ایک امت ( جماعت ) تھے، کیونکہ اکیلے ہی میں اتنے کمالات تھے جو ایک جماعت میں ہوتے ہیں اور اکیلے شخص نے اتنا کام کیا جو ایک امت کے برابر تھا۔ تیسرا معنی یہ کہ ایک مدت تک اکیلے ہی وہ اور ان کی بیوی امت مسلمہ تھے، جیسا کہ جبار مصر اور سارہ علیہا السلام کے واقعہ میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سارہ علیہا السلام سے کہا کہ اس وقت اس سرزمین میں میرے اور تمھارے سوا کوئی مومن نہیں، سو تم ایمان میں میری بہن ہو۔ [ بخاری : ۳۳۵۸ ]

(3) دوسری صفت ''قَانِتًا لِّلّٰهِ'' بیان فرمائی، یعنی اللہ کے فرماں بردار نہایت عاجزی کے ساتھ، کیونکہ ان دونوں کے مجموعی مفہوم کو قنوت کہتے ہیں۔

(4) ''حَنِيْفًا'' تیسری صفت ہے، ''حَنَفٌ'' کا معنی ہے ایک طرف جھک جانا، یعنی تمام باطل دینوں سے ہٹ کر حق کی طرف مائل ہونے والا، تمام خداؤں کا انکار کر کے صرف ایک اللہ کی طرف ہو جانے والا۔ جس کی قولی، بدنی اور مالی عبادت، زندگی اور موت سب ایک اللہ کے لیے تھے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۱ تا ۱۶۳)۔

(5) وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: یہ مشرکین مکہ اور یہود و نصاریٰ پر تعریض اور ان سب کے ابراہیمی ہونے کے دعویٰ کی نفی کا اظہار ہے کہ وہ تو مشرکوں میں سے نہیں تھے، جب کہ تم سب بتوں کو یا قبروں کو، عزیر یا عیسیٰ علیہما السلام کو اور اپنے احبار و رہبان کو رب بنا کر شرک میں گرفتار ہو چکے ہو۔

**آیت 121** شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ : شکر نعمت زبان سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے شکر نعمت، اس کے احکام کی اطاعت، اس کے امتحانات میں کامیابی اور اس کے حقوق کی ادائیگی سب کو پورا کر دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴾ [ النجم : ۳۷ ] ''اور ابراہیم جس نے پورا حق ادا کر دیا۔'' اور دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۴)۔

**آیت 122** (1) وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً : یعنی دنیا میں حیاتِ طیبہ کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ انھیں عطا

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کر، جو ایک اللہ کی طرف ہو جانے والا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا ﴿۱۲۳﴾ ہفتے کا دن تو صرف ان لوگوں پر مقرر کیا گیا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا اور بے شک تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن یقیناً اس کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾

فرمائیں، مثلاً دین حق کی ہدایت، نبوت کی نعمت، صالح اولاد، سیرت حسنہ، وافر مال و دولت اور سچی ناموری وغیرہ۔

② وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ : خود ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی: ﴿وَ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ [ الشعراء : ۸۳ ] ''مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دے۔'' یوسف علیہ السلام نے بھی یہی دعا کی تھی: ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ [ یوسف : ۱۰۱ ] ''مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔''

③ معلوم ہوا کہ نیک ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، مگر قیامت کو صالحین کا ساتھ ملنا ایک مزید نعمت ہے، اس لیے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہوتے وقت آخری الفاظ یہی تھے: « اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَ أَلْحِقْنِيْ بِالرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى »

[ ترمذی، أبواب الدعوات، باب : ۳۴۹۶۔ ابن ماجه : ۱۶۱۹۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۶۴۱/۶، ۶۴۲، ح : ۲۷۷۵ ]

''اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھے سب سے اونچے ساتھی کے ساتھ ملا دے۔''

**آیت 123** ① ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ ...... : یعنی حلال و حرام اور دین سے متعلق تمام معاملات میں اصل نہ یہودیت ہے، نہ نصرانیت ہے اور نہ شرک کہ جس کا ارتکاب یہ کفار مکہ کر رہے ہیں، بلکہ اصل ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے جو خالص توحید سے عبارت تھی اور اس میں وہ چیزیں حرام نہ تھیں جو بعد میں یہودیوں پر ان کی شرارت کی وجہ سے حرام کر دی گئیں، اس لیے آپ کے لیے پیروی کے لائق اگر کوئی ملت ہے تو وہ صرف ملت ابراہیمی ہے۔ (ابن کثیر)

② لفظ ''ثُمَّ'' یہاں حقیقی ترتیب کے لیے نہیں بلکہ ترتیب ذکری کے لیے ہے اور آخر میں ابراہیم علیہ السلام کے فضائل میں سے یہ ایک بہت بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، یعنی ان فضائل کے ساتھ پھر ابراہیم علیہ السلام کی اس فضیلت کو دیکھو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (جو اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، مگر ساری اولاد آدم کے سردار ہیں) کو بھی یہی حکم دیا گیا کہ آپ نے ملتِ ابراہیم کی پیروی کرنی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ملتِ ابراہیم کے پیروکار ہونے میں جہاں ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر ہے وہیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بھی ظاہر ہے کہ آپ کو ملتِ ابراہیم کی پیروی کا حکم ابراہیم علیہ السلام کے لیے باعث فضیلت ٹھہرا۔

**آیت 124** اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ ...... : یعنی ہفتے کے دن کی تعظیم جیسے ملت اسلام میں نہیں ہے، ابراہیم علیہ السلام

# اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَ الۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَ جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ؕ

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو

کی شریعت میں بھی نہ تھی۔ یہ دن تو بعد میں صرف ان لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا تھا، اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان پر جمعہ کے دن کی تعظیم واجب کی تھی، مگر انھوں نے اس میں اختلاف کر کے ہفتے کا دن مقرر کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر اسی دن کی تعظیم فرض کر دی کہ اس میں شکار مت کرو۔ اس کی تائید ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، بَيْدَ أَنَّهُمْ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِيْ فُرِضَ عَلَيْهِمْ فَاخْتَلَفُوْا فِيْهِ فَهَدَانَا اللّٰهُ فَالنَّاسُ لَنَا فِيْهِ تَبَعٌ، الْيَهُوْدُ غَدًا وَالنَّصَارٰى بَعْدَ غَدٍ )) [ بخاری، الجمعة، باب فرض الجمعة : ۸۷۶ ] ''ہم سب سے بعد میں آنے والے ہیں، جو قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں گے، باوجود اس کے کہ ان لوگوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی، پھر یہ ان کا دن جو ان پر فرض کیا گیا تو انھوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس (جمعہ کے دن) کی ہدایت دی، سو لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں، یہودی ہم سے بعد والے دن اور عیسائی اس سے بھی اگلے دن۔'' صحیح مسلم کی حدیث میں اس فرض کردہ دن کی تعیین موجود ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا جس سے اختلاف کر کے یہود نے ہفتہ اور نصاریٰ نے اتوار مقرر کر لیا۔ [ دیکھیے مسلم، الجمعة، باب هداية هذه الأمة ليوم الجمعة : ۸۵۵ ]

**آیت 125** ❶ اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ : ''اُدْعُ'' کا مفعول یہاں مذکور نہیں کہ کسے دعوت دے، اس لیے مراد عام ہوگا، یعنی غیر مسلم اور مسلم سب کو دعوت دے۔ یا اسے فعل لازم کے قائم مقام قرار دیا جائے، اس وقت مراد یہ ہوگی کہ ہمیشہ دعوت دیتا رہ۔ رب کے راستے سے مراد اسلام اور اس کی تفصیلات ہیں۔ ''بِالۡحِكۡمَةِ'' ''حِكۡمَةٌ'' کا لفظ موقع کے مطابق کئی چیزوں پر بولا جاتا ہے، چنانچہ قاموس میں اس کے یہ معانی لکھے ہیں: '' اَلْعَدْلُ وَالْعِلْمُ وَالْحِلْمُ وَالنُّبُوَّةُ وَالْقُرْآنُ وَالْإِنْجِيْلُ '' اور لکھا ہے کہ ''أَحْكَمَهُ'' کا معنی ''أَتْقَنَهُ'' ہے، یعنی اس نے اسے خوب پختہ اور مضبوط کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دو چیزوں سے خالی نہیں ہونی چاہیے، ان میں سے ایک حکمت ہے، یعنی ایسی محکم اور پختہ دلیل جو حقیقت کے عین مطابق ہو، جس میں کوئی غلطی نہ ہو اور مخاطب کے نزدیک بھی مسلم ہو، خواہ وہ عناد کی وجہ سے اسے نہ مانے۔ اسے برہان بھی کہتے ہیں: ﴿ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴾ [ البقرة : ۱۱۱ ] ''کہہ دے لاؤ اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو۔'' اس لیے حکمت کو دلیل برہانی کہتے ہیں۔

❷ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ : ''اچھی نصیحت'' سے مراد ایسی بات ہے جو مخاطب کے دل کو نیکی کے عمل کے لیے نرم کرے، یا بدی کے خلاف ابھار دے، ترغیب کے ذریعے سے یا ترہیب (ڈرانے) کے ساتھ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَعِظۡهُمۡ وَقُلۡ لَّهُمۡ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًاۢ بَلِيۡغًا ﴾ [ النساء : ۶۳ ] ''سو تو ان سے دھیان ہٹا لے اور انھیں وعظ (نصیحت) کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں بہت اثر کرنے والی ہو۔'' اسے دلیل خطابی کہتے ہیں۔ دعوت کے اس اسلوب میں حسن و

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

سب سے اچھا ہے۔ بے شک تیرا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا اور وہی ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿۱۲۵﴾

خوبی اور نرمی و ملائمت کو ملحوظ رکھنا اور بدزبانی و سخت کلامی سے پرہیز لازم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو حکم دیا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ [ طٰہٰ : ٤٤ ] ''پس اس سے بات کرو، نرم بات، اس امید پر کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔''

③ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ: دعوت کے دوران میں اگر حکمت اور موعظہ حسنہ کے باوجود مخاطب بحث اور مجادلے (جھگڑے) پر اتر آئیں تو آپ بھی ان سے مجادلہ کریں، کیونکہ پھر اس کے بغیر چارہ نہیں، مگر یہ ہر حال میں احسن (زیادہ اچھا) ہونا چاہیے۔ کس سے احسن؟ جواب یہ ہے کہ سب سے بہتر یا کم از کم ان کے مجادلے سے بہتر طریقے کے ساتھ ہو، کیونکہ باب مفاعلہ میں دو فریق ہوتے ہیں، یہاں ایک تم ہو اور ایک وہ، اس لیے احسن کا مطلب یہ ہوگا ان کے طریقے سے بہتر، جس میں گالی گلوچ اور ذاتی حملے وغیرہ نہ ہوں، بلکہ ایسی بات ہو جس سے وہ لاجواب ہو جائیں۔ انبیاء اور ان کے حقیقی وارث علماء کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے خاص طور پر نوازتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی والد کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت (دیکھیے مریم: ۴۲)، پھر بت توڑ کر بت پرستوں کے ساتھ بحث میں ان کو لاجواب کرنا (دیکھیے انبیاء: ۵۱ تا ۶۸)، پھر سورج، چاند اور ستاروں کے پوجنے والوں کو بحث میں لاجواب کرنا (دیکھیے انعام: ۷۶ تا ۸۳)، پھر بادشاہ وقت کو رب ہونے کے دعویٰ میں لاجواب کرنا (دیکھیے بقرہ: ۲۵۸) اور نوح علیہ السلام کی قوم کا مجادلہ و بحث میں لاجواب ہو کر عذاب لانے کا مطالبہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ (دیکھیے ہود: ۳۲) موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مکالمے بھی اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ قرآن مجید مشرکین اور اہل کتاب سے مجادلہ احسن پر مشتمل آیات سے بھرا پڑا ہے، بلکہ یہ قرآن مجید کے بنیادی مضامین میں سے ایک ہے۔ دیکھیے ''الفوز الکبیر'' از شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ۔

④ بعض لوگوں نے کہا کہ اس قسم کی آیات مکی سورتوں میں ہیں، اس لیے یہ جہاد کے احکام کے ساتھ منسوخ ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ احکام اب بھی مؤثر ہیں اور اگر کوئی شخص حکمت، موعظہ حسنہ اور مجادلہ احسن کے بعد بھی نہ مانے تو اس کے لیے جہاد کا استثنا مکی سورتوں ہی میں موجود ہے۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ﴾ [ العنکبوت : ٤٦ ] ''اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، مگر وہ لوگ جنھوں نے ان میں سے ظلم کیا۔'' ظاہر ہے کہ مجادلہ احسن کے بعد بھی ظلم پر قائم رہنے والوں کے لیے جہاد کے سوا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ یہ ایک فطری حقیقت ہے جیسا کہ فِند زِمّانی نے کہا ہے ؎

فَلَمَّا صَرَّحَ الشَّرُّ وَ اَمْسٰى وَهُوَ عُرْيَانُ

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَ لَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے اور بلاشبہ اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے ﴿۱۲۶﴾

وَلَمْ يَبْقَ سِوَى الْعُدْوَانِ دِنَاهُمْ كَمَا دَانُوا

''پھر جب لڑائی بالکل ظاہر ہو گئی اور ننگی ہو کر سامنے آ گئی اور زیادتی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو ہم نے بھی بدلے میں ان سے وہی کیا جو انھوں نے کیا تھا۔'' بلکہ اس آیت سے اگلی آیت میں بھی جہاد کا ذکر موجود ہے، صرف غور کی ضرورت ہے۔

⑤ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ ...... : اس آیت کے فوائد میں سے دو فائدے زیادہ ظاہر ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کسی شخص کے ایمان نہ لانے پر اسے دعوت دینا ترک نہ کریں، آپ کو علم نہیں، ہو سکتا ہے وہ ان خوش نصیبوں میں سے ہو جنھیں ہدایت نصیب ہونی ہے، یہ علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا ''اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ'' (بے شک تیرا رب ہی اسے زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے بھٹکا ہوا ہے) تو آگے بظاہر اتنا ہی کہنا کافی تھا ''بِالْمُهْتَدِيْنَ'' (اور ہدایت پانے والوں کو بھی) مگر اللہ تعالیٰ نے ''وَهُوَ اَعْلَمُ'' کو دوبارہ ذکر فرمایا۔ مقصد یہ ہے کہ کافر لوگ بے شک اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور مسلمانوں کو گمراہ سمجھتے رہیں، مگر اصل گمراہ کون ہے اور اصل ہدایت یافتہ کون ہے، یہ علم تیرے رب ہی کے پاس ہے۔

**آیت 126** ① وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ: واؤ عطف سے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق پچھلی آیت سے ہے کہ اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو بدلے میں اتنی زیادتی تم بھی کرو۔ اس آیت سے دو مسئلے واضح طور پر ثابت ہوتے ہیں، ایک یہ کہ قتل وغیرہ کا قصاص اسی طریقے سے لینا جس طریقے سے قاتل نے قتل کیا ہے، جائز ہے اور اس کی تائید اس یہودی سے قصاص والی حدیث سے بھی ہوتی ہے جس نے ایک بچی کا سر دو پتھروں میں کچل دیا تھا، تو آپ ﷺ نے اسے بھی اسی طرح قتل کرنے کا حکم دیا۔ [ دیکھیے مسلم، القسامۃ والمحاربین، باب ثبوت القصاص فی القتل ...: ۱۷/۱۶۷۲ ] اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپ کے چرواہوں کو قتل کرنے والے اور اونٹنیاں لے جانے والے مجرموں کو بھی قصاص میں اسی طرح آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں، جیسا کہ انھوں نے کیا تھا۔ [ دیکھیے بخاری، الحدود، باب المحاربین من أهل الکفر و الردۃ: ۶۸۰۲ ] اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ظالم کے ظلم کے برابر بدلہ جائز ہے زیادہ نہیں، فرمایا: ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [ البقرۃ: ۱۹۴ ] ''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے زیادتی کی۔'' نبی ﷺ نے جو مثلہ کرنے سے منع فرمایا اس سے مراد قصاص کے علاوہ صورتیں ہیں اور ابن ماجہ کی روایت (۲۶۶۷) « لَا قَوَدَ إِلَّا بِالسَّيْفِ » (قصاص تلوار کے سوا جائز نہیں) ثابت نہیں، بلکہ ضعیف ہے، تفصیلی بحث ارواء الغلیل (۷/۲۸۵، ۲۸۹، ح: ۲۲۲۹) میں ملاحظہ فرمائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کے مال میں

وَاصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور صبر کر اور نہیں تیرا صبر مگر اللہ کے ساتھ اور ان پر غم نہ کر اور نہ کسی تنگی میں مبتلا ہو، اس سے جو وہ تدبیریں کرتے ہیں ﴿۱۲۷﴾

خیانت کرے، یا اس کا مال یا کوئی چیز لے کر واپس نہ دے، پھر مظلوم کو اس کا مال یا کوئی چیز ہاتھ آ جائے، یا وہ اس کے پاس امانت رکھے تو اسے اپنے مال کے برابر اس میں سے رکھ لینا جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "كِتَابُ الْمَظَالِمِ" میں "بَابُ قِصَاصِ الْمَظْلُوْمِ إِذَا وَجَدَ مَالَ ظَالِمِهِ" (مظلوم کا قصاص لینا جب اسے اس پر ظلم کرنے والے کا مال مل جائے) میں اسی آیت سے ابن سیرین رحمہ اللہ کا یہ استدلال نقل فرمایا ہے اور مزید احادیث سے اسے مدلل کیا ہے۔ بعض لوگ ایک روایت کی بنا پر اسے منع کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلٰى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ » [ أبو داوٗد، البیوع، باب في الرجل یأخذ حقه من تحت یده : ۳۵۳۵ ] "جو شخص تمھارے پاس امانت رکھے اس کی امانت ادا کرو اور جو تمھاری خیانت کرے اس کی خیانت مت کرو۔" اگرچہ اس حدیث پر کلام ہے، مگر صحیح ماننے کی صورت میں بھی اپنا مال واپس لینے کو خیانت نہیں کہا جا سکتا۔ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے "المحلی" کی "كتاب التفليس" کے آخر میں اس مسئلہ پر نہایت عمدہ بحث تحریر فرمائی ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

② وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ: کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالم سے انھیں ان کا بدلہ خود لے کر دے گا اور اپنے ہاں سے انھیں صبر کا اجر عظیم عطا فرمائے گا، اللہ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [ الشوریٰ : ۳۹، ۴۰ ] "اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی واقع ہوتی ہے وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔" صحیح بخاری میں ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ وہ (صحابہ کرام) ذلت قبول کرنے کو ناپسند کرتے تھے، مگر جب قدرت پا لیتے تو معاف کر دیتے تھے۔ [ دیکھیے بخاری، المظالم، باب الانتصار من الظالم، بعد ح : ۲۴۴۶ ]

③ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ" سے لے کر یہاں تک کا خلاصہ بیان فرمایا: "پہلے جو فرمایا سمجھاؤ بھلی طرح سے، اس میں رخصت دی کہ بدی کے بدلے بدی بری نہیں، مگر صبر زیادہ بہتر ہے۔" (موضح)

آیت 127 ① وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ: آخر میں پھر صبر کا حکم دیا، ساتھ ہی متنبہ فرمایا کہ اگر صبر جیسا مشکل اور عظیم کام کر لو تو اسے اپنا کمال مت سمجھنا، بلکہ یقین رکھنا کہ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ممکن ہوا، تمھیں اس کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ کی نعمت سے غافل نہ ہو، اس کے سامنے عاجز و منکسر رہو اور ہر وقت اس سے دعا کرتے رہو۔

② وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ ...... : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے ایمان نہ لانے پر اتنا غم ہوتا کہ شاید اپنی جان گھلا لیں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ نہ آپ ان پر غم کریں اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہوں۔ "ضَيْقٍ" اور "ضِيْقٌ" دونوں کا

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ڈر گئے اور ان لوگوں کے جو نیکی کرنے والے ہیں ﴿۱۲۸﴾

ایک ہی معنی ہے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۳) اور سورۂ کہف (۲)۔

آیت 128 ① إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا...... : یعنی دل تنگ وہ ہو جس کا کوئی ساتھی و مددگار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تو ہر متقی اور محسن کا ساتھی اور مددگار ہے اور آپ اللہ کے فضل سے تمام متقی اور محسن لوگوں کے سردار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (( أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ )) [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة بني إسرائيل : ۳۱۴۸، و صححه الألباني ] ''میں قیامت کے دن تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں۔'' پھر آپ دل تنگ کیوں ہوں؟ احسان کی تفصیل کے دیکھیے سورۂ نحل کی آیت (۹۰)، احسان کا مقام تقویٰ سے اونچا ہے۔

② معیت (ساتھ) دو قسم کی ہے، ایک معیت عامہ، یہ ہر شخص بلکہ ہر مخلوق کو حاصل ہے اور اس کے بغیر کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی، فرمایا: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾ [ الحدید : ۴ ] ''اور وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو۔'' ایک معیت خاصہ ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ﴿ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ [ التوبة : ۴۰ ] ''غم نہ کر بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' اور جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ [ الشعراء : ۶۲ ] ''ہرگز نہیں، بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے ضرور راستہ بتائے گا۔'' یہ خاص معیت ہے، یعنی ہمارا مددگار ہے۔ اس آیت میں معیت خاصہ مراد ہے۔
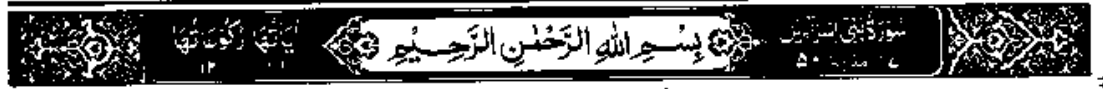
سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

پاک ہے وہ جو رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا جس

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم کے متعلق فرمایا: « إِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْأُوَلِ، وَ هُنَّ مِنْ تِلَادِيْ » [ بخاري، التفسير، سورة بني إسرائيل : ۴۷۰۸ ] ''یہ پہلی قدیم سورتوں میں سے ہیں اور یہ میرے قدیم مال میں سے ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت مکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ زمر پڑھا کرتے تھے۔[ مسند أحمد : ۶۸/۶، ح : ۲۴۴۴۲، عن عائشة رضی اللہ عنہا۔ ترمذی : ۲۹۲۰، و صححه الألباني ]

آیت 1 ① سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ: اس سورت کی ابتدا اللہ تعالیٰ کو ہر ایسی چیز سے پاک قرار دینے سے کی جو اس کے جلال کے لائق نہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ طنطاوی نے فرمایا، اس کی سب سے اچھی نحوی ترکیب یہ ہے کہ ''سُبْحٰنَ'' اسم مصدر ہے اور فعل محذوف ''سَبَّحْتُ'' یا ''أُسَبِّحُ'' کا مفعول مطلق ہے اور ''الَّذِيْٓ'' کی طرف مضاف ہے، یعنی میں اس (اللہ) کا ہر عیب اور کمی سے پاک ہونا بیان کرتا ہوں جو اپنے بندے...... (التفسیر الوسیط) معلوم ہوا کہ آگے کوئی ایسا کام بیان ہونے والا ہے جس کا واقع ہونا انسانی طاقت سے باہر ہے، اس لیے بات یہیں سے شروع فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان تمام عیبوں، کمزوریوں اور نارسائیوں سے پاک ہے جو مخلوق میں پائی جاتی ہیں اور وہ ان کاموں پر قادر ہے جن پر اس کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

② اَسْرٰى : شیخ سلیمان الجمل نے فرمایا: ''اَسْرٰى'' اور ''سَرٰى'' دونوں کا معنی ہے، وہ رات کو چلا، دونوں فعل لازم ہیں، پہلے کا مصدر ''اَلْإِسْرَاءُ'' ہے اور دوسرے کا ''اَلسُّرٰى'' بروزن ''اَلْهُدٰى''۔ اس لیے اسے متعدی بنانے کے لیے ''بِعَبْدِهٖ'' میں باء لائی گئی ہے، جس سے معنی ''وہ رات کو چلا'' کے بجائے ''اس نے (اپنے بندے کو) رات کو چلایا'' ہو گیا۔ اس سے رات کی فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راتوں کو قیام، دعائیں، اسراء و معراج، راتوں کا سفر سب اس کی دلیل ہیں۔

③ بِعَبْدِهٖ: ''اپنے بندے'' کا لفظ اس محبت اور تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ اگر پیار و محبت اور آپ کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ یہاں کوئی لفظ موزوں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسی کو ذکر فرماتا، لفظ ''عَبْدٌ'' منتخب ہی اس لیے فرمایا کہ تمام مخلوقات کی صفات میں سب سے اونچی اور بڑی صفت اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی ہے، پھر خاص اپنی طرف نسبت کر کے مزید رتبہ بڑھا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا عبد (بندہ، غلام) قرار دینے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مالک اور معبود صرف اللہ تعالیٰ ہے، باقی سب اس کے بندے، غلام، اس کے سامنے عاجز اور مطیع ہیں، کیونکہ ''عَبْدٌ'' کا معنی یہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ

بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①

کے اردگرد کو ہم نے بہت برکت دی ہے، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ①

وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [ مریم : ۹۳ ] ''زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔'' مقصد یہ ہے کہ عبودیت اور الوہیت، یعنی بندگی اور خدائی کے مقام کا فرق بالکل واضح ہو جائے، انھیں ایک نہ سمجھ لیا جائے، جیسا کہ مسیحیت میں ہوا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو، عیسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی والدہ کو ایک ہی معبود قرار دے دیا، انھوں نے عبودیت اور الوہیت کے فرق کو نہ سمجھا۔ بعض جھوٹے مسلمانوں نے بھی احد اور احمد کو ایک قرار دے لیا۔ یہ آیت ان کی واضح تردید کرتی ہے۔ علامہ قاسمی نے امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''طَرِيْقُ الْهِجْرَتَيْنِ'' سے نقل فرمایا کہ تمام مخلوق میں سے کامل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبودیت (بندگی) میں سب سے کامل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب اور بلند مرتبہ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: (( وَاللّٰهِ! مَا أُحِبُّ أَنْ تَرْفَعُوْنِيْ فَوْقَ مَنْزِلَتِيَ الَّتِيْ أَنْزَلَنِيَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ )) ''اللہ کی قسم! اے لوگو! میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے میرے اس مرتبے سے بلند قرار دو جو مجھے اللہ عزوجل نے عطا کیا ہے۔'' [ مسند ۱۲۵۵۸، ح : سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۱۰۹۷، عن أنس رضی اللہ عنہ ] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: (( لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ واذكر في الكتاب مريم ...... ﴾ : ۳۴۴۵ ] ''مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھاؤ جیسا کہ نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا، میں تو صرف ایک عبد (بندہ) ہوں، سو تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔'' اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر آپ کے بلند ترین مقام اسراء و معراج میں عبودیت کے نام سے فرمایا، چنانچہ فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ اور دعوت کے مقام میں فرمایا: ﴿ وَ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ ﴾ [ الجن : ۱۹ ] اور چیلنج کے مقام میں فرمایا: ﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ﴾ [ البقرة : ۲۳ ]

④ لَيْلًا : زمخشری نے فرمایا، اگر تم کہو کہ '' اِسْرَاءٌ '' کا معنی ہی رات کو چلنا ہے، پھر ''لَيْلًا'' کہنے کا مقصد کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ ''لَيْلًا'' کا لفظ نکرہ کی صورت میں لانے سے رات کی اس مدت کو جس میں سفر کیا، کم بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رات کے ایک تھوڑے سے حصے میں مکہ سے شام تک کا چالیس راتوں کا فاصلہ طے کروا دیا، کیونکہ تنکیر یہاں بعضیہ (بلکہ بقول بعض تقلیل و تحقیر) کا معنی دے رہی ہے (یہ بات ترجمہ میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے)۔ یاد رہے! چالیس راتوں یا ایک مہینے سے زائد دنوں کا سفر ایک طرف کا ہے، آنے جانے کا دگنا سمجھ لیں۔

⑤ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا : مسجد حرام کعبہ کے اردگرد والی مسجد، کیونکہ اسے کئی طرح کی حرمت حاصل ہے۔ بعض علماء پورے حرم کو مسجد حرام کہتے ہیں۔ جس رات یہ سفر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر سوئے ہوئے تھے۔ وہاں

سے آپ کو حطیم کعبہ میں لایا گیا اور پھر آپ حطیم سے براق پر سوار ہو کر مسجد اقصیٰ (دور ترین مسجد) یعنی بیت المقدس پہنچے، اس وقت مکہ سے سب مسجدوں سے دور پائی جانے والی مسجد یہی تھی، چونکہ سفر کی ابتدا حطیم سے ہوئی، اس لیے کئی علماء صرف مسجد کے حصے ہی کو مسجد حرام کہتے ہیں۔ بیت المقدس سے معراج (سیڑھی) کے ذریعے سے اوپر ساتوں آسمانوں سے گزر کر سدرۃ المنتہیٰ پہنچے، راستے میں متعدد جلیل القدر انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں، جنت و دوزخ کا مشاہدہ بھی کیا، سدرہ کے پاس ہی جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا، وہیں آپ کو پہلے پچاس نمازوں اور آخر میں روزانہ پانچ نمازوں کا حکم ہوا، پھر پلٹ کر بیت المقدس آئے تو آپ نے امام بن کر تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، لیکن قاضی عیاض وغیرہ کا خیال ہے کہ انبیاء کی امامت آپ نے واپسی پر نہیں بلکہ معراج کو جاتے ہوئے کروائی ہے۔ بہرحال اس کے بعد مسجد حرام تشریف لائے۔ واقعۂ اسراء و معراج کی تفصیلات کے لیے تفسیر ابن کثیر اور کتب احادیث کا مطالعہ فرمائیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بڑی تفصیل، ترتیب اور سلیقے سے روایات جمع فرما دی ہیں۔

6 مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کا نام ''اسراء'' ہے، جو یہاں مذکور ہے اور وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر ''معراج'' کہلاتا ہے۔ اس کا ذکر سورۂ نجم اور کتب احادیث میں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سی احادیث مع سند ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے بعض روایات کے آخر میں فرمایا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس حدیث کے الفاظ دلیل ہیں کہ معراج اسی رات ہوئی ہے جب آپ مکہ سے بیت المقدس گئے ہیں اور یہی حق ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔''

7 قرطبی نے فرمایا کہ اسراء کا واقعہ حدیث کی تمام کتابوں میں ثابت ہے اور اسلام کے زیر نگیں تمام علاقوں کے صحابہ سے مروی ہے، اس لحاظ سے یہ متواتر ہے۔ نقاش نے اسے نقل کرنے والے بیس صحابہ ذکر کیے ہیں۔ گو بعض جزئیات میں اختلاف ہے مگر اصل واقعہ بلاشک و شبہ ثابت ہے۔ (قرطبی)

8 علمائے سلف و خلف رحمہم اللہ کا عقیدہ ہے کہ یہ واقعہ بیداری میں روح اور جسم سمیت پیش آیا اور قرآن میں لفظ " بِعَبْدِهٖ " سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے، کیونکہ عبد صرف روح کو نہیں کہتے، بلکہ روح مع جسد کو کہتے ہیں۔ پھر اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو کفار قریش اسے نہ جھٹلاتے، کیونکہ خواب میں تو ہر ایک کو عجیب و غریب واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور نہ قرآن ہی " سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ " کی تمہید کے ساتھ اسے بیان کرتا، کیونکہ ان تمہیدی الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہم اور خرق عادت واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، پھر " لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا " اور " مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى " (نجم: ۱۷) میں بھی سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا ذکر ہے، پھر براق پر سواری بھی جسمانی معراج کی دلیل ہے۔ بعض علماء نے آیت کریمہ: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [ بنی إسرائیل : ٦٠ ] میں لفظ " الرُّءْيَا " سے استدلال کیا ہے کہ یہ خواب کا واقعہ ہے، مگر محققین علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ لفظ " الرُّءْيَا " (جو " رَأٰی يَرٰی " کا مصدر ہے) بیداری میں آنکھوں کے دیکھنے پر بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں یہی مراد ہے اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے تصریح فرمائی ہے: (( هِيَ رُؤْيَا عَيْنٍ أُرِيَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِهِ إِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ )) [ بخاری، مناقب الأنصار، باب المعراج : ۳۸۸۸ ] ''یہ آنکھوں کا دیکھنا

تھا جو رسول اللہ ﷺ کو اس رات دکھایا گیا جس رات آپ کو بیت المقدس لے جایا گیا۔‘‘ معلوم ہوا کہ اس آیت سے ان علماء کا استدلال درست نہیں ہے، تمام صحابہ روایتاً و درایتاً اس پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ کو معراج بیداری کی حالت میں ہوئی اور جسم کے ساتھ ہوئی۔ صرف عائشہ اور معاویہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ معراج خواب میں ہوئی، مگر ایک تو یہ روایت سنداً منقطع ہے اور پھر ان کی اپنی رائے اور آیت کریمہ ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ﴾ [ بنی إسرائیل : ٦٠ ] سے استدلال ہے جو صحابہ کے متفقہ فیصلے کے مقابلے میں توجہ کے قابل نہیں۔ (شوکانی، ابن کثیر)

9 علامہ جمال الدین قاسمی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر اہل علم کا کہنا ہے کہ اسراء بعثت نبوی کے بعد ہوا ہے اور یہ کہ وہ ہجرت سے ایک سال پہلے تھا۔ زہری اور ابن سعد وغیرہ کا یہی کہنا ہے، امام نووی نے بھی یہ بات یقین سے کہی ہے، ابن حزم رحمہ اللہ نے مبالغہ کرتے ہوئے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے اور کہا ہے کہ یہ (اسراء و معراج) رجب ۱۲ نبوی میں ہوئی ہے۔ طبیعت کو اطمینان اس بات پر ہوتا ہے کہ اسراء و معراج کے واقعات ابوطالب اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ہوئے ہیں، کیونکہ اس دوران میں مشرکین کی ایذا بہت بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ انعام ان کی طرف سے پیش آنے والی ایذا سے تسلی دینے کے لیے اور آپ کی عزت افزائی اور تکریم کے لیے عطا فرمایا۔ اشرف الحواشی میں ہے کہ اکثر روایات کے مطابق یہ قصہ ہجرت سے ایک سال قبل کا ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور ملا امین عمری نے اسے قطعی قرار دیا ہے۔ بعض روایات میں تین سال قبل بھی مذکور ہے۔

علامہ شنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیحین میں ’’شریک عن انس‘‘ کی سند سے جو مذکور ہے کہ اسراء مذکور خواب میں واقع ہوا، وہ کتاب و سنت کی صریح نصوص اور اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے (کہ اسراء و معراج بیداری میں جسمانی ہوئی) کے خلاف نہیں، کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ پہلے یہ سب کچھ آپ کو خواب میں دکھایا گیا ہو اور پھر اس کی تصدیق بیداری میں دکھا کر کی گئی ہو، جیسا کہ آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا: ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ﴾ [ الفتح : ٢٧ ] ’’تم مسجد حرام میں ضرور بضرور داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا، امن کی حالت میں، اپنے سر منڈاتے ہوئے اور کتراتے ہوئے۔‘‘ پھر بیداری میں اس کی تصدیق بالفعل بھی فرما دی گئی۔ اس کی تصدیق عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ صبح کے طلوع ہونے کی طرح دن کو سامنے آ جاتا۔ علاوہ ازیں انس رضی اللہ عنہ سے شریک کے علاوہ بہت سے حفاظ نے یہ روایت بیان کی ہے، لیکن کسی نے بھی شریک کے خواب میں دیکھنے والے الفاظ بیان نہیں کیے۔ اہل علم کی ایک جماعت نے فرمایا کہ شریک بن عبد اللہ بن ابی نمر نے انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صحیح یاد نہیں رکھی۔ امام مسلم نے فرمایا کہ شریک نے یہ حدیث ثابت بنانی (انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد) کی طرح بیان کی اور اس میں کچھ چیزیں آگے پیچھے کر دیں اور کچھ کم زیادہ کر دیں۔ دوسرے تمام حفاظ کی روایت صحیح ہے اور اس میں شریک والے الفاظ نہیں ہیں۔

10 بعض لوگ معراج کی رات میں لیلۃ القدر کی طرح خصوصی قیام اور تلاوت و ذکر کا اہتمام کرتے ہیں، اگر اس کی کوئی حقیقت ہوتی تو کم از کم کسی صحیح سند کے ساتھ اس مہینے اور دن کی تعیین ضرور معلوم ہوتی، جس میں یہ واقعہ ہوا اور صحابہ بھی اس رات

اس کا اہتمام کرتے، جبکہ ستائیس (۲۷) رجب کی کوئی صحیح روایت موجود نہیں اور نہ نبی کریم ﷺ یا صحابہ سے اس رات کی خاص عبادت کا کہیں ذکر ہے، رہی آتش بازی اور چراغاں تو وہ آتش پرستوں کے ساتھ مشابہت ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔

⑪ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی ہے یا نہیں، یہ بحث سورۂ نجم (۹) ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ میں آئے گی اور معراج کے واقعہ کا بقدر ضرورت ذکر بھی وہیں ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

⑫ اَلَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ : یعنی وہاں ظاہری اور مادی برکات بھی ہیں کہ وہاں چشموں، نہروں اور ہر قسم کے غلے اور پھلوں کی بہتات ہے اور معنوی و باطنی اعتبار سے بھی وہ خطہ بابرکت ہے کہ بیت المقدس میں چاروں مقدس کتابیں پڑھی گئیں، بہت سے انبیاء و رسل وہاں مبعوث ہوئے، وہاں دنیا میں کعبۃ اللہ کے بعد بنائی جانے والی دوسری مسجد ہے، جو ان تین مساجد میں شامل ہے جن کے علاوہ کسی جگہ ثواب کی نیت سے کجاوے کس کر جانا منع ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ یہ اصطلاح بیت المقدس اور شام کے لیے آئی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ [ الأنبياء : ۷۱ ] ''اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے جہانوں کے لیے برکت رکھی۔'' اور فرمایا: ﴿وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا﴾ [ الأنبياء : ۸۱ ] ''اور سلیمان کے لیے ہوا (مسخر کر دی) جو تیز چلنے والی تھی، اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی۔'' ان تمام آیات سے مراد سرزمین شام ہے۔

⑬ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا : اسراء میں پیش آنے والی نشانیاں، مثلاً آپ کے مکان کی چھت کا کھولا جانا، جبریل علیہ السلام کا آپ کا سینہ مبارک چاک کر کے دل کو زم زم سے دھو کر ایمان و حکمت سے بھر کر پھر ملا دینا، براق کی سواری جس کا قدم حد نگاہ پر پڑتا تھا، مہینوں کا سفر لمحوں میں طے ہونا، بیت المقدس میں دودھ اور شراب کا پیش کیا جانا اور آپ کا دودھ کو پسند فرمانا، انبیاء علیہم السلام کی ملاقات اور امامت وغیرہ، پھر سفر معراج کی بے شمار نشانیاں ان کے علاوہ ہیں جن کے متعلق فرمایا: ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى﴾ [ النجم : ۱۸ ] ''بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

⑭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ''سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى'' میں اپنا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ فرمایا، پھر ''بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ'' اور ''لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا'' میں تین مرتبہ جمع متکلم برائے تعظیم کے ساتھ، پھر اس آیت کے آخر میں ''اِنَّهٗ هُوَ'' غائب کے ساتھ اور اس سے اگلی آیت میں پھر جمع متکلم کے ساتھ فرمایا ہے، پھر بھی سمجھنے میں کسی جگہ کوئی الجھن پیش نہیں آئی بلکہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ کلام کا یہ اسلوب بلاغت کا کمال ہے، اسے عربی میں التفات کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ واقعۂ اسراء سن کر اہل ایمان کے اسے تسلیم کرنے کو اور کفار کے اس سے انکار کو اور دونوں نے اس پر جو کچھ کہا اور کیا یقیناً وہ صرف وہی (اللہ) ہے جو سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا اور اس کے مطابق ہر ایک سے معاملہ کرنے والا اور جزا و سزا دینے والا ہے۔

وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳ وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا کہ تم میرے سوا کوئی کارساز نہ پکڑو ② اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا! بے شک وہ بہت شکر گزار بندہ تھا ③ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں فیصلہ سنا دیا تھا کہ بے شک تم زمین میں ضرور دو بار فساد کرو گے اور بے شک تم ضرور سرکشی کرو گے، بہت بڑی سرکشی ④

**آیت 2** ① وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ : یعنی جس طرح نبی کریم ﷺ کو اسراء کا شرف عطا فرمایا، اسی طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو "الْكِتٰبَ" (تورات) سے نوازا۔ قرآن مجید میں عموماً نبی کریم ﷺ کے ذکر کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا ذکر ہوتا ہے، تاکہ رسول اللہ ﷺ کو دعوت میں پیش آنے والی مشکلات کی مثال پیش نظر رہے اور آپ کی امت کو رسول کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کے نتائج پیش نظر رہیں۔

② وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ : اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا، یعنی تورات کو یا موسیٰ علیہ السلام کو۔ یہ آیت سورۂ سجدہ کی آیت (۲۳) کے مشابہ ہے۔

③ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا : "اَلَّا تَتَّخِذُوْا" اصل میں "اَنْ لَا تَتَّخِذُوْا" ہے۔ یہاں "اَنْ" کو مصدریہ مان کر اس سے پہلے لام محذوف مانیں گے، یعنی "لِئَلَّا تَتَّخِذُوْا" (تاکہ تم ...) یا "اَنْ" بمعنی "اَيْ" (تفسیریہ) ہے، یعنی ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جس کا خلاصہ اور مطلب یہ ہے کہ ...... "وَكِيْلًا" "وَكَلَ يَكِلُ" (سپرد کرنا) سے "فَعِيْلٌ" بمعنی مفعول ہے، جس کے سپرد اپنا کام کیا جائے، یعنی میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ سمجھو، نہ اپنے کام کسی اور کے سپرد کرو۔

**آیت 3** ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ...... "ذُرِّيَّةَ" سے پہلے "یا" حرف ندا محذوف ہے، "اے ان لوگوں کی اولاد ......!" یعنی تم ان صالح لوگوں کی اولاد ہو جنھیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کر کے نجات بخشی۔ مقصد بنی اسرائیل کو ایمان اور عمل صالح پر ابھارنا ہے کہ دیکھو تم کن لوگوں کی اولاد ہو، تمھارے لیے اپنے صالح آباو اجداد کے نقش قدم پر چل کر ایک اللہ کی عبادت کا پابند رہنا، اپنے باپ نوح علیہ السلام کی طرح ہر وقت اسی کا شکر گزار رہنا اور اس کے سوا کسی کو اپنا وکیل، کارساز اور بھروسے کے قابل نہ سمجھنا لازم ہے۔

**آیت 4** وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ ...... "لَتُفْسِدُنَّ" اور "لَتَعْلُنَّ" اصل میں "لَتُفْسِدُوْنَنَّ" اور "لَتَعْلُوْنَنَّ" تھے۔ اللہ تعالیٰ کا علم بندوں کی طرح محدود نہیں کہ اسے صرف گزشتہ اور موجودہ باتوں ہی کا علم ہو، بلکہ اسے

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ

پھر جب ان دونوں میں سے پہلی کا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے کچھ بندے بھیجے، پس وہ گھروں

آئندہ کسی بھی وقت ہونے والی ہر بات کا اسی طرح علم ہے جس طرح گزشتہ یا موجودہ کا پوری طرح علم ہے اور ہر گزشتہ یا آنے والا کام اس کے کمال علم و حکمت کے مطابق طے شدہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی محکم و مضبوط تدبیر و تقدیر کی وجہ سے کوئی خرابی، کوئی حادثہ پیش نہیں آتا۔ اسی تقدیر کے مطابق انسان کو کچھ اختیار دے کر آزمایا گیا ہے اور وہ اپنے اختیار کو کس طرح استعمال کرے گا، اللہ تعالیٰ کو اس کا بھی پہلے سے علم ہے۔ اس علم کے مطابق اس نے بنی اسرائیل کو تورات سے پہلے ہی آگاہ کر دیا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بہت بڑی سرکشی کرو گے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو پہلے بتانے کا اور ہماری امت کو یہ خبر دینے کا کیا فائدہ؟ تو جواب یہ ہے کہ مقصد انھیں بتانے کا اور ہمیں اس کی خبر دینے کا یہ ہے کہ فساد اور سرکشی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، تاکہ ہر شخص اس سے بچنے کی پوری جدوجہد کرے۔ ’’الْاَرْضِ‘‘ سے مراد سرزمین شام ہے اور لام عہد کا ہے۔ پچھلی تفسیری آیات یعنی سورۂ انبیاء (۸۱) میں مذکور ’’الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا‘‘ سے بھی شام ہی مراد ہے، یا مراد ساری زمین ہے اور یہودیوں کا فساد اور ان کو ملنے والی سزا شام میں بھی واقع ہوئی اور دوسرے علاقوں میں بھی۔

**آیت 5، 6** ❶ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا ......: اس دو مرتبہ کے فساد اور اس کی سزا کی تعیین کا کوئی مضبوط اور قابل اعتماد ذریعہ ہمارے پاس قرآن و سنت کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ تاریخ خصوصاً قبل مسیح کی تاریخ کی نہ کوئی سند ہے نہ اس کے ثبوت کی کوئی اور پختہ دلیل، رہا ان کا فساد تو اس کا شمار ہی نہیں۔ قرآن مجید میں ان کے مذکور فسادات ہی دیکھ لیں، سمندر سے پار ہوتے ہی معبود بنانے کا مطالبہ، پھر سامری کا بچھڑا بنانا اور اس کی عبادت، پھر موسیٰ علیہ السلام سے مسلسل مختلف تقاضے، حتیٰ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھنے کو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی شرط قرار دے دیا۔ پھر جہاد کے لیے نکلنے کی دعوت پر ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدة: ٢٤] کہنا، پھر ان کا سود کھانا، رشوت لینا، سبت (ہفتے کے دن) کی تعظیم کے بجائے حیلے کے ساتھ اس میں شکار کرنا۔ ہمسایہ قوموں کے اثر سے بت پرستی اور زنا کا عام ہونا، کتاب اللہ میں تحریف کرنا، لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانا، اپنے بزرگوں اور نبیوں کو خدا کا درجہ دینا، احبار و رہبان کی تقلید کرنا، احبار و رہبان کا لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھانا اور صحیح دین سے لوگوں کو ہٹانا، اللہ کے نبیوں کو اور نیکی کا حکم دینے والے صالحین کو قتل کرنا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود ان پر ایمان نہ لانا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے درپے ہونا۔ غرض ان کے فسادات کا کوئی شمار ہی نہیں، اسی طرح ان پر اللہ کے عذاب کا کوڑا مسلسل برستے رہنا بھی صرف دو دفعہ تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک بار بار بدترین عذابوں کا نشانہ بنتا قرآن مجید میں مذکور ہے، فرمایا: ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ [الأعراف: ١٦٧] ’’اور جب تیرے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسا آدمی ضرور بھیجتا رہے گا جو انھیں برا عذاب دے۔‘‘ اس لیے ان دو مرتبہ کی تعیین ایک مشکل کام ہے۔

وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ

کے اندر گھس گئے اور یہ ایسا وعدہ تھا جو (پورا) کیا ہوا تھا۝ پھر ہم نے تمھیں دوبارہ ان پر غلبہ دیا اور تمھیں مالوں اور

مفسرین کا اس تعیین میں اختلاف بھی اس کی دلیل ہے۔ کوئی بابل کے بادشاہ سخاریب اور اس کے جنگجو ساتھیوں کو اس کا مصداق قرار دیتا ہے، کوئی عمالقہ کو، کوئی بخت نصر کو، بعض جدید مفسرین نے یہاں بائبل سے لمبی چوڑی عبارتیں نقل کیں اور ان میں مذکور بعض واقعات اور شخصیتوں کو اس کا مصداق قرار دیا، حالانکہ بائبل کی کسی بات پر یقین جائز نہیں، سوائے ان باتوں کے جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، رسول اللہ ﷺ نے صاف الفاظ میں فرمایا: « لَا تُصَدِّقُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوْا: ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ ﴾ [ البقرة : ١٣٦ ] » [ بخاري، الشهادات، باب لا يسأل أهل الشرك ..... قبل ح : ٢٦٨٥، تعليقاً عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”اہل کتاب کو نہ سچا کہو اور نہ انھیں جھوٹا کہو، بلکہ یہ کہہ لیا کرو کہ ہم اللہ پر اور جو کچھ اس نے نازل کیا سب پر ایمان لائے۔“ اسی باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: « يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ، كَيْفَ تَسْأَلُوْنَ أَهْلَ الْكِتَابِ؟ وَ كِتَابُكُمُ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلٰی نَبِيِّهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْدَثُ الْأَخْبَارِ بِاللّٰهِ تَقْرَءُوْنَهُ لَمْ يُشَبْ وَقَدْ حَدَّثَكُمُ اللّٰهُ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ وَغَيَّرُوْا بِأَيْدِيْهِمُ الْكِتَابَ فَقَالُوْا : ﴿ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [ البقرة : ٧٩ ] أَفَلَا يَنْهَاكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مُسَاءَلَتِهِمْ؟ وَلَا وَاللّٰهِ ! مَا رَأَيْنَا مِنْهُمْ رَجُلًا قَطُّ يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ » [ بخاري، الشهادات، باب لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة وغيرها : ٢٦٨٥ ] ”اے مسلمانوں کی جماعت! تم اہل کتاب سے کس طرح سوال کرتے ہو، حالانکہ تمھاری کتاب جو اس کے نبی ﷺ کی طرف نازل کی گئی وہ تمام خبروں میں سے اللہ کی طرف سے نئی ہے۔ تم اسے ایسی حالت میں پڑھتے ہو کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں بتا دیا ہے کہ اللہ نے جو کچھ لکھا تھا اہل کتاب نے اسے بدل دیا اور اپنے ہاتھوں سے کتاب کو تبدیل کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت خرید یں۔ کیا وہ علم جو تمھارے پاس آیا ہے تمھیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا؟ اور نہیں، قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی آدمی کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ تم سے اس کے متعلق سوال کرتا ہو جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔“ اب ایسی بات جسے سچا کہا ہی نہیں جا سکتا اس پر یقین کیسے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ تعیین نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ قرآن مجید محض تاریخ کی کتاب نہیں، نہ ہر جگہ اس میں واقعات پوری ترتیب اور تفصیل کے ساتھ مذکور ہوتے ہیں بلکہ اس میں واقعات کا صرف وہی حصہ بیان ہوتا ہے جو نصیحت و عبرت سے تعلق رکھتا ہے، تاہم اگر کسی معتبر ذریعے سے اس کی تفصیل معلوم ہو جائے تو نصیحت و عبرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

❷ قرآن مجید کے مطابق مصر سے نکلنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ارض مقدس میں داخلے کے لیے جہاد کا حکم دیا اور بتایا کہ اس سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے تمھاری ملکیت بنانا طے فرما دیا ہے، مگر غلامی کی خوگر اس نسل نے نہایت گستاخانہ الفاظ میں

# وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ⑥

بیٹوں سے مدد دی اور تمھیں تعداد میں زیادہ کر دیا⑥

جہاد کے لیے نکلنے سے انکار کر دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۲۰ تا ۲۶) اس کے نتیجے میں وہ چالیس سال وہیں صحرا میں سرگرداں رہے۔ موسیٰ علیہ السلام اس دوران وفات پا گئے، اللہ کے اس جلیل القدر پیغمبر کو ارضِ مقدس میں جانے کی اس قدر حسرت تھی کہ انھوں نے وفات کے وقت دعا کی کہ یا اللہ! مجھے ارضِ مقدس سے اتنا قریب کر دے کہ پتھر پھینکنے سے اس زمین میں پہنچ جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں وہاں ہوتا تو تمھیں ان کی قبر راستے کی ایک جانب سرخ ٹیلے کے نیچے دکھاتا۔'' [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب وفاة موسٰی و ذکره بعد : ۳۴۰۷ ] جب وہ نسل جوان ہوئی جو آزادی کے دور میں پیدا ہوئی تھی تو انھوں نے ارضِ شام اور بیت المقدس کو فتح کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں آزادی کے ساتھ حکومت کی نعمت بھی عطا فرمائی۔ یہ دور کتنے عرصے پر محیط تھا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دین سے دوری اور دنیا کی محبت کی بنا پر وہ آپس میں لڑنے لگے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو پس پشت پھینک دیا اور اس قدر فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے وہ سخت جنگ والے بندے بھیجے جن کا یہاں اس آیت میں ذکر ہے۔ وہ ان کے گھروں کے اندر گھس گئے اور ان کے گھروں، زمینوں، عورتوں اور بچوں پر قابض ہو گئے اور انھیں بیت المقدس اور ارضِ شام سے نکال باہر کیا، بیت المقدس میں داخل ہو کر اس کی جتنی بے حرمتی کر سکتے تھے انھوں نے کی۔ یہ پہلے فساد کی سزا تھی۔ اس وقت ان حملہ آوروں کا بادشاہ کون تھا، اللہ تعالیٰ نے واضح نہیں فرمایا۔ اس کے ایک عرصہ بعد بنی اسرائیل کے کچھ سرداروں نے ارضِ مقدس اور اپنے اسیروں کی واپسی کے لیے وقت کے نبی سے کوئی بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق طالوت مقرر کیے گئے۔ یہ مفصل واقعہ سورۂ بقرہ (۲۴۶ تا ۲۵۱) اور اس کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ اس وقت کفار کا بادشاہ جالوت تھا، ممکن ہے بنی اسرائیل پر عذاب کا کوڑا بھی اسی کے ہاتھوں برسا ہو۔ بہر حال کفار کو شکست ہوئی اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔ ارضِ مقدس پر پھر بنی اسرائیل قابض ہو گئے اور اللہ کا دین پھر غالب ہو گیا۔ طالوت کے بعد داؤد علیہ السلام نے جہاد کے ذریعے سے اس سلطنت کو مزید وسیع کیا، ان کے بعد سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا ہوئی جو ان کی دعا کے مطابق ان کے بعد کسی کے لائق ہی نہیں۔ اس کی تفصیل سورۂ نمل (۱۵ تا ۴۴)، سورۂ ص (۱۷ تا ۴۰)، سورۂ انبیاء (۷۷ تا ۸۲) اور سورۂ سبا (۱۰ تا ۱۴) میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سب آیات زیر تفسیر آیت: ﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا﴾ کی تفسیر ہیں۔ ان کی وفات کے بعد پھر اخلاقی زوال اور دنیا پرستی کا دور شروع ہوا، حتیٰ کہ کئی انبیاء و صلحاء، جو گناہ سے منع کرتے تھے، شہید کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ختم ہو گیا، مشرک قوموں کی ہمسائیگی اور دوستی کے نتیجے میں شرک، جادو، قتل ناحق، زنا، ڈاکے وغیرہ پھیل گئے اور اللہ کی حدود معطل ہو گئیں، حتیٰ کہ مسیح علیہ السلام کو بھی انھوں نے اپنے خیال میں سولی پر چڑھا دیا۔ اس سے پچھلے حاشیے میں بھی کئی خرابیاں ذکر ہوئی ہیں۔ وہ آئیں

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ⑦

اگر تم نے بھلائی کی تو اپنی جانوں کے لیے بھلائی کی اور اگر برائی کی تو انھی کے لیے، پھر جب آخری بار کا وعدہ آیا (تو ہم نے اور بندے تم پر بھیجے) تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ وہ مسجد میں داخل ہوں، جیسے وہ پہلی بار اس میں داخل ہوئے اور تاکہ جس چیز پر غلبہ پائیں اسے برباد کر دیں، بری طرح برباد کرنا۔⑦

میں لڑ کر کئی فرقوں اور کئی سلطنتوں میں بٹ گئے۔ انبیاء کو قتل کرنے اور مسیح علیہ السلام کو اپنے خیال میں سولی دینے کے بعد پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سخت ترین کوڑا برسا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ ان پر اللہ کے سخت لڑاکا لوگ حملہ آور ہوئے اور ان سے وہ سلوک کیا جو اس سے اگلی آیت "فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ" میں مذکور ہے۔

**آیت 7** ❶ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ ......: "لِيَسُوْٓءٗا" "سَاءَهٗ يَسُوْءُهٗ" کا فعل مضارع ہے، جو اصل میں "يَسُوْءُوْنَ" تھا۔ "لامِ كَیْ" کے بعد "اَنْ" مقدر کی وجہ سے نون گر گیا۔ یہ فعل متعدی ہے، غمگین کرنا، برا کر دینا، بگاڑ دینا۔ خوشی ہو یا غم، جسمانی یا قلبی راحت ہو یا اذیت، اس کا اثر چہرے پر نمایاں ہوتا ہے، خوشی میں چہرہ چمک اٹھتا ہے اور غم سے کالا ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [ الملك : ۲۷ ] "پس جب وہ اس (عذاب) کو قریب دیکھیں گے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے (بگاڑ دیے جائیں گے) جنھوں نے کفر کیا۔" لوط علیہ السلام کے غمگین ہونے کے متعلق فرمایا: ﴿سِيْٓءَ بِهِمْ﴾ [ هود : ۷۷ ] "وہ ان (مہمانوں) کی وجہ سے مغموم ہو گیا۔" اور فرمایا: ﴿ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ﴾ [النحل : ۵۸] "(لڑکی پیدا ہونے کی بشارت ملنے پر) اس کا منہ سارا دن کالا رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے۔" "عَلَوْا" "عَلَا يَعْلُوْ" سے ماضی معلوم جمع مذکر غائب ہے، اس کا مفعول محذوف ہے، یعنی "مَا عَلَوْهُ"۔ "تَتْبِيْرًا" ویران کرنا، برباد کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دینا۔ "لِيُتَبِّرُوْا" کی تاکید "تَتْبِيْرًا" سے کی ہے، اس لیے ترجمہ میں اس کا معنی بری طرح برباد کرنا کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی دفعہ کا عذاب مکمل "تَتْبِيْرًا" یعنی دوسری مرتبہ جیسا بری طرح برباد کرنا نہیں تھا، جب کہ دوسری مرتبہ کا عذاب دشمن کے گھروں میں گھسنے اور مسجد کی بے حرمتی سے کہیں بڑھ کر تھا، اس سے بنی اسرائیل بری طرح خوف و غم میں مبتلا ہوئے، حتیٰ کہ ان کے چہرے بگڑ گئے اور دشمن نے بنی اسرائیل کو اس بری طرح برباد کیا کہ وہ مدتوں اٹھ نہیں سکے۔

❷ اس دوسری دفعہ والے بندوں سے مراد کون لوگ ہیں، اگرچہ قرآن نے ان کی تعیین نہیں فرمائی، تاہم اگر دیکھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت یہودی بیت المقدس سے مکمل بے دخل تھے، وہاں نصرانیوں کا قبضہ تھا اور یہودیوں کو داخلے تک کی اجازت نہیں تھی، وہ مدینے، خیبر اور دنیا کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے تھے تو اللہ کی طرف سے ان

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ⑧

تمھارا رب قریب ہے کہ تم پر رحم کرے اور اگر تم دوبارہ کرو گے تو ہم (بھی) دوبارہ کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہے ⑧

زبردست بندوں کے ان پر مسلط ہو کر انھیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر کے قدس سے نکال دینے کا اندازہ ہوتا ہے۔ مؤرخین دوسری مرتبہ کا حملہ آور طیطوس (ٹیوٹس) رومی کو قرار دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی تعیین کا کوئی معتبر ذریعہ نہیں۔ یہاں آ کر اسرائیلیوں کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے بعد وہ دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے، چنانچہ اس کے بعد ان ممالک کی تاریخ کے ضمن ہی میں یہود کی تاریخ کا ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بیت المقدس پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں نصرانیوں کی حکومت تھی جنھوں نے مقابلے کی تاب نہ لا کر ۱۶ ھ میں صلح کے ذریعے سے شہر کی چابیاں امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیں۔ قدس سے نکلنے کے بعد تقریباً دو ہزار سال تک یہودی بیت المقدس سے بے دخل رہے۔ مگر جب مسلمانوں نے اللہ کے احکام سے بغاوت اختیار کی، شرک و بدعت، فرقہ پرستی، عیش و عشرت، زنا، شراب، موسیقی، کفار سے دوستی اور ان کی تقلید اختیار کر لی، اپنے ہی دستور و قانون بنا کر کتاب و سنت پر عمل ترک کر دیا۔ دنیا کی محبت میں جہاد چھوڑ بیٹھے تو ان کی بدعملیوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمن یہودیوں کو دوسرے کفار کی مدد (بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ) کے ساتھ پھر ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر قبضے کا موقع دے دیا، مگر یہ سمجھ لینا کہ اب یہ یہودیوں کے قبضے ہی میں رہے گا درست نہیں، مسلمان اپنے دین کی طرف پلٹیں گے، بلکہ پلٹنا شروع ہو چکے ہیں اور مسلمانوں اور یہودیوں کی جنگ ہوگی، اس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی نصرت عطا ہوگی جس کا ذکر اس حدیث میں ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُوْنَ الْيَهُوْدَ، فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُوْنَ، حَتّٰی يَخْتَبِئَ الْيَهُوْدِيُّ مِنْ وَرَاءِ الْحَجَرِ أَوِ الشَّجَرِ، فَيَقُوْلُ الْحَجَرُ أَوِ الشَّجَرُ يَا مُسْلِمُ! يَا عَبْدَ اللّٰهِ! هٰذَا يَهُوْدِيٌّ خَلْفِيْ، فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ، إِلَّا الْغَرْقَدَ، فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرِ الْيَهُوْدِ » [ مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة حتی یمر الرجل.... : ۲۹۲۲ ]
''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے جنگ کریں گے اور مسلمان انھیں قتل کریں گے، یہاں تک کہ یہودی پتھر اور درخت کے پیچھے چھپے گا تو پتھر یا درخت کہے گا: ''اے مسلم! اے اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے ہے تو اسے قتل کر دے۔'' سوائے ''غرقد'' نامی درخت کے، کیونکہ وہ یہود کے درختوں میں سے ہے۔''

**آیت 8** ① عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ : یہ اللہ کی رحمت کا بیان ہے کہ اتنی سرکشی اور سزا کے بعد بھی اگر تم واپس پلٹ آؤ اور حد سے بڑھی ہوئی اس دوسری سرکشی اور اس کی وجہ سے ناقابلِ بیان تباہی سے دو چار ہونے کے بعد بھی تورات و انجیل میں مذکور نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کر لو تو پوری امید ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف کی آیات (۱۵۶، ۱۵۷) میں فرمایا کہ میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو

اس رسول کی پیروی کریں گے جو امی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ چنانچہ اس بشارت کے مطابق جو اسرائیلی، مثلاً عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ رحمت الٰہی کے حق دار بن گئے۔

② وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا : یعنی اگر تم پھر دوبارہ حد سے بڑھے اور فساد کبیر کے مرتکب ہوئے تو ہم دوبارہ تمھارے ساتھ وہی پہلے جیسا سلوک کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو آپ نے یہود مدینہ کے ساتھ صلح کے ساتھ رہنے کا اور متحد ہو کر حملہ آور دشمن کا مقابلہ کرنے کا معاہدہ کیا، مگر بنو قینقاع نے ایک مسلم خاتون کی بے حرمتی کی، پھر معاہدہ توڑ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا اور آخر کار انھیں مدینہ سے جلا وطن کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ کسی معاملے کے لیے بنو نضیر قبیلہ میں تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ کو چھت سے پتھر گرا کر شہید کرنے کی سازش کی، جو آپ کے علم میں آ گئی، آپ نے ان کا محاصرہ کر لیا، وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کی کتاب تورات میں مذکور سزا دینے کا ارادہ کیا، مگر ان کے ہمدرد عبد اللہ بن ابی منافق کے حد سے بڑھے ہوئے اصرار پر آپ نے ان کی جاں بخشی کر کے انھیں بھی جلا وطن کر دیا۔ پھر تیسرے قبیلے بنو قریظہ نے خندق کے موقع پر جب دس ہزار کفار کے لشکر جرار نے مدینہ جیسی چھوٹی سی بستی پر یلغار کر کے محاصرہ کیا ہوا تھا، انھوں نے عین حالت جنگ میں معاہدہ توڑ کر دشمن کا ساتھ دیا، تو حملہ آوروں سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہ مقابلہ نہ کر سکے تو مسلمانوں میں سے اپنے پرانے خیر خواہ اور ہمدرد سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا، اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر حوالے ہوتے تو شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پہلے قبیلوں کی طرح رعایت فرماتے، مگر جب انھوں نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم مانا، اس امید پر کہ وہ عبد اللہ بن ابی منافق کی طرح ہماری پرانی دوستی کا خیال رکھیں گے تو سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اب وقت آ گیا ہے کہ سعد کو اللہ کا حکم نافذ کرنے کے راستے میں کوئی دوستی حائل نہ ہو۔'' چنانچہ انھوں نے وہ فیصلہ کیا جو تورات میں مذکور تھا اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ کا فیصلہ قرار دیا۔ چنانچہ ان کے تمام بالغ مرد جو سات سو تھے، قتل کر دیے گئے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی و غلام بنا لیا گیا۔ [ دیکھیے بخاری، المغازی، باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الأحزاب ...... : ۴۱۲۲ ] یہ ''وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا'' کی ایک تفسیر تھی۔ پھر خیبر والوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے تو امیر المومنین عمر بن خطاب نے تمام یہود و نصاریٰ کو پورے جزیرۂ عرب سے جلا وطن کر دیا۔ پھر اللہ کے وعدے کے مطابق ان کی ہر سرکشی پر ان کی سرکوبی کرنے والا کوئی نہ کوئی فرماں روا ہمیشہ ان کا بندوبست کرتا رہا۔ (دیکھیے اعراف : ۱۶۷) قریب زمانے میں ہٹلر نے انھیں عبرت ناک انجام سے دو چار کیا۔ اب تمام کفار نصاریٰ، کمیونسٹوں اور بت پرست ہندوؤں کی پشت پناہی سے، پھر یہ لوگ فلسطین میں قدس پر قبضہ کر کے اپنی ریاست اسرائیل کے نام سے بنا کر فلسطین کے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اور مسلم دشمنی کی وجہ سے تمام کفار ان کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کے وعدے کے مطابق عنقریب ان کے ساتھ دوبارہ وہی کچھ ہونے والا ہے جو پہلے ہوتا رہا ہے۔ پھر وہ وقت بھی آ کر رہے گا جب مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں پتھر اور درخت بھی ان کے قتل کے لیے مسلمانوں کو ان کی اطلاع دیں گے، جیسا کہ اس سے پہلے صحیح مسلم کی حدیث میں گزرا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جسے نافذ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بنی اسرائیل کی یہ ساری داستان مسلمانوں کو عبرت کے لیے سنائی گئی ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾ ع

وَ يَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾

بلاشبہ یہ قرآن اس (راستے) کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں، بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے ﴿۹﴾ اور یہ کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۰﴾ اور انسان برائی کی دعا کرتا ہے اپنے بھلائی کی دعا کرنے کی طرح اور انسان ہمیشہ سے بہت جلد باز ہے ﴿۱۱﴾

---

تو تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔

❸ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا: "حَصِيْرًا" یا تو "حَصَرَ يَحْصُرُ حَصْرًا" (ن) سے ہے، جس کا معنی قید کرنا، گھیرنا ہے، یعنی قید خانہ، یا مراد وہ حصیر (چٹائی) ہے جو بچھائی جاتی ہے، یعنی جہنم ان کا بچھونا بنے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ ﴾ [ الأعراف : ٤١ ] "ان کے لیے جہنم کے بستر ہوں گے۔"

**آیت 9، 10** ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ...... : یعنی یہ قرآن تمام دینی اور دنیوی معاملات میں سب سے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھنے کا وہ طریقہ سکھایا گیا ہے جس سے اچھا کوئی طریقہ نہیں، مگر ترک دنیا اور رہبانیت اختیار کرنے اور انسانی فطرت کے تقاضوں کو پامال کرنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، بلکہ اس کے بجائے دنیا میں باعزت اور غالب ہو کر رہنے کا اور انسان کے فطری تقاضوں اور دنیا کی آسائشوں سے بہرہ ور ہونے کا بھی ایسا عمدہ طریقہ سکھایا گیا ہے جو ہر قسم کی زیادتی، سرکشی اور ہوس پرستی سے پاک ہے اور دنیا میں ہر مسلم اور غیر مسلم کے لیے امن و سلامتی کا ضامن ہے۔

ہاں جو لوگ اس پر ایمان لے آئیں اور اس کے مطابق عمل صالح کریں انھیں وہ اجر کبیر کی بھی بشارت دیتا ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہ لائیں انھیں اس بات سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ دنیا میں وہ بظاہر کتنے ہی خوش حال اور صاحب مال و اولاد ہوں دنیا میں بھی ان کے لیے عذاب ہے (دیکھیے توبہ: ۵۵۔ طٰہٰ: ۱۲۴ تا ۱۲۷) اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذابِ الیم ہے جو دنیا کے عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ آیات کے آخر میں فرمایا: ﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ﴾ "اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔" مسلمانوں کے لیے ان دو آیتوں میں دو بشارتیں ہیں، ایک ان کے لیے اجر کبیر کی، دوسری ان کے دشمنوں کا عذاب الیم میں مبتلا ہونا بھی ان کے لیے خوشی کی خبر ہے۔

**آیت 11** ﴿ ❶ وَ يَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ: "يَدْعُ" اصل میں "يَدْعُوْ" تھا، مگر مصحف عثمانی کے خط میں اسے پڑھنے کے مطابق لکھ دیا گیا، کیونکہ یہ واو پڑھنے میں نہیں آتی، جیسا کہ: ﴿ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴾ [ العلق : ١٨ ] میں بھی واو نہیں لکھی گئی،

وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ﴿۱۲﴾

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا، تاکہ تم اپنے رب کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اور ہر چیز، ہم نے اسے کھول کر بیان کیا ہے، خوب کھول کر بیان کرنا ﴿۱۲﴾

---

اسی لیے مسلمانوں نے اسی مصحف کے خط کی حفاظت کرتے ہوئے واؤ نہیں لکھی۔ فراء نے فرمایا کہ اگر یہ واؤ کے ساتھ لکھا جائے تو بھی درست ہوگا۔ (ابن عاشور)

❷ ”دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ“ یہ ”كَدُعَائِهٖ بِالْخَیْرِ“ تھا، کاف حذف کرنے سے منصوب ہو گیا۔ مفعول مطلق کا بھی یہی معنی ہے، یعنی انسان بعض اوقات غصے میں یا اکتا کر اپنے لیے یا اپنے اہل و عیال کے لیے اللہ تعالیٰ سے بد دعائیں کرتا ہے، مثلاً اللہ کرے میں مر جاؤں، اللہ کرے تمھارا بیڑہ غرق ہو جائے، تمھارا خانہ خراب ہو جائے وغیرہ۔ انسان اسی طرح اصرار سے بددعا کرتا ہے جس طرح حالت اعتدال میں اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے خیر کی دعا کرتا ہے، مثلاً یا اللہ! ہمیں بخش دے، یا اللہ! ہماری حفاظت فرما وغیرہ۔ اسی طرح وہ کفار کے ایمان نہ لانے پر ان کے لیے تباہی و بربادی کی فوراً بددعا کرنے لگتا ہے، حالانکہ اسے کیا خبر کہ ان میں سے کئی لوگوں نے آگے چل کر ایمان لے آنا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں شروع سے بہت جلد بازی پائی جاتی ہے۔ ”كَانَ“ جلد بازی کے استمرار اور تمکن کو ظاہر کر رہا ہے اور ترجمہ بھی اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ ”عَجُوْلًا“ مبالغے کا صیغہ ہے، بہت جلد باز۔ اپنے حق میں بددعا کی ایک بدترین مثال ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی وہ دعا ہے جس میں انھوں نے اپنے آپ پر پتھر برسانے یا عذاب الیم لانے کی بددعا کی تھی۔ دیکھیے سورۂ انفال (۳۲، ۳۳)۔

❸ مگر اللہ تعالیٰ ایسا مہربان ہے کہ بددعاؤں کو فوراً قبول نہیں فرماتا اور اگر وہ قبول کرے تو انسان تباہ و برباد ہو جائے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس کی آیت (۱۱)۔

**آیت 12** ❶ وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ: ان دونوں کو نشانیاں اس لیے قرار دیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا، اس کی کمال کاریگری اور قدرت کا اور اس اکیلے کے عبادت کا حق دار ہونے کا پتا چلتا ہے۔ رات اور دن کو بطور دلیل اور نعمت کے قرآن نے متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۳۷)، یٰس (۳۷)، یونس (۶)، آل عمران (۱۹۰)، بقرہ (۱۶۴)، فرقان (۶۲)، سورۂ زمر (۵) اور دیگر آیات۔

❷ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ ...... : ”مَحَا یَمْحُوْ مَحْوًا“ (ن) کسی چیز کا نشان ختم کر دینا، مٹا دینا، یعنی رات اور دن جس طرح نشانیاں ہیں اسی طرح ان کا وجود اور ان کا کم یا زیادہ ہوتے ہوئے مسلسل روزانہ ایک دوسرے کے پیچھے آنا بھی نعمت ہیں، کیونکہ رات کی تاریکی اور خاموشی انسان کے سکون، راحت اور نیند کے لیے ضروری ہے اور دن کی روشنی ہر کام کے لیے اور اللہ کا فضل

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾

اور ہر انسان کو، ہم نے اسے اس کا نصیب اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا ﴿۱۳﴾ اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب بہت کافی ہے ﴿۱۴﴾

تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ اللہ کا انعام ہے کہ آرام کے لیے رات بنا دی، پھر اسے مٹا کر کام کے لیے دن بنا دیا، اگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ رات یا ہمیشہ دن بنا دیتا تو زندگی کا سلسلہ کس طرح قائم رہ سکتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۷۱ تا ۷۳)، سورۂ نبا (۹ تا ۱۱) اور سورۂ روم (۲۳)۔

③ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ : یعنی اگر نہ دن رات ہوتے اور نہ رات اور دن کے بتدریج روزانہ چھوٹے یا بڑے ہونے کا سلسلہ ہوتا، نہ چاند کے ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال بننے کی منزلیں ہوتیں تو ہمیشہ ایک جیسا موسم رہتا اور سال اور مہینوں کا کچھ پتا نہ چلتا، نہ وقت کا وجود ہوتا جس پر کئی دینی معاملات، مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ، حج، عید، عدت وغیرہ کا اور تمام دنیوی معاملات کا انحصار ہے۔

④ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا : یعنی ہر وہ چیز جس میں تمھاری دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، اسے ہم نے خوب کھول کر بیان کر دیا ہے۔ "تَفْصِيْلًا" مصدر تاکید کے لیے ہے، اس لیے معنی کیا ہے خوب کھول کر بیان کرنا۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۳۸) اور سورۂ نحل (۸۹)۔

⑤ ان آیات (۱۰ تا ۱۳) کی باہمی مناسبت ابن عاشور اور شاہ عبد القادر رحمہما اللہ کے کلام کو ملا کر یہ ہے کہ آیت (۱۰) میں جب کفار کے لیے عذاب الیم تیار کرنے کا ذکر فرمایا تو آیت (۱۱) میں کفار کے اس عناد پر مبنی مطالبے کی وجہ بتائی جو وہ مسلمانوں سے کرتے تھے کہ وہ عذاب الیم ابھی لاؤ، چلو ہم پر آسمان گرا دو، اللہ تعالیٰ ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے۔ فرمایا انسان جلد بازی سے بغیر سوچے سمجھے اپنے نقصان کی دعا کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور خود انسان کی مصلحت کا تقاضا اس کی بددعا کو قبول نہ کرنا ہے۔ (ابن عاشور) آیت (۱۲) میں بتایا کہ کفار کے جلد عذاب کے مطالبے سے یا مسلمانوں کے کفار کو فوراً برباد کرنے کی بددعا سے کچھ حاصل نہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "گھبرانے سے فائدہ نہیں، ہر چیز کا وقت اور اندازہ مقرر ہے، جیسے رات اور دن، کسی کے گھبرانے سے رات کم نہیں ہو جاتی، اپنے وقت پر آپ صبح ہو جاتی ہے۔" (موضح)

**آیت 14،13** ① وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ ...... : "طائر" کا لفظی معنی اڑنے والا ہے۔ مراد کسی بھی چیز کا وہ جز ہے جو انسان کے حصے میں آئے، گویا وہ اڑ کر اس کے پاس آتا ہے۔ شگون لینے یا قرعہ ڈالنے کی صورت میں اس کے حق میں نکلنے والا نتیجہ خواہ اچھا ہو یا برا۔ انسان کے حصے میں آنے والی چیز یا اس کا عمل جو اس نے کرنا ہے اور اس کا رزق جو اسے ملنا ہے، سب پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و تمیز دے کر یہ اختیار دیا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر چلے یا غلط راستے پر، نیک عمل کرے یا بد، پھر بھی اس نے جو کچھ کرنا ہے، خواہ اس کے اختیار میں ہے، جیسے نیکی یا بدی

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَ لَا تَزِرُ

جس نے ہدایت پائی تو وہ اپنی ہی جان کے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو اسی پر گمراہ ہوتا ہے اور کوئی بوجھ

اور خواہ اس کے اختیار میں نہیں ہے، جیسے اس کی عمر، اسے پیش آنے والے اچھے یا برے حوادث، سب اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم ہے اور وہ ہر انسان نے کرنا ہی کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اندازہ (تقدیر) غلط نہیں ہو سکتے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ ہر انسان کے نصیب اور حصے میں جو کچھ آنے والا ہے وہ ہم نے اس کی گردن کے ساتھ لازم کر دیا ہے، جیسے گردن میں پڑا ہوا طوق یا ہار۔ جو چیز کسی کو لازم کر دی جائے اور وہ اس سے جدا نہ ہو سکے اس کے متعلق کہا جاتا ہے: "اَلْزَمْتُهٗ فِيْ عُنُقِهٖ" کہ میں نے اسے اس کی گردن میں چپکا دیا ہے۔

❷ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...... : آیت کا پہلا حصہ تقدیر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور یہ حصہ انسان کے ان اعمال سے متعلق ہے جو اس نے دنیا میں کیے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تحریر کرنے کے لیے فرشتے مقرر فرما رکھے ہیں۔ دیکھیے سورۂ قٓ (۱۶ تا ۱۸) اور انفطار (۱۰ تا ۱۲) ان کی تیار کردہ کتاب اعمال قیامت کے دن ہر انسان کے سامنے آ جائے گی، ایسی صورت میں کہ خود بخود کھلی ہو گی، آدمی خواہ پڑھا ہوا ہے یا ان پڑھ، ہر ایک کو حکم ہو گا کہ اپنے اعمال کی کتاب پڑھ لے اور ہر شخص اسے پڑھ لے گا، گویا اس کی زندگی کی مکمل تصویر اس کے سامنے آ جائے گی، جسے وہ پہلے بھی بہانہ سازیوں کے باوجود خوب جانتا ہو گا۔ (دیکھیے قیامہ: ۱۳ تا ۱۵) اس کتاب اعمال میں اس کا کوئی چھوٹا یا بڑا عمل درج ہونے سے رہ نہیں جائے گا۔ دیکھیے سورۂ کہف (۴۹)۔

❸ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا : اس کی ترکیب یہ کی جاتی ہے "كَفٰى" فعل، باء زائدہ، "نَفْسِكَ" فاعل، "حَسِيْبًا" تمیز اور "عَلَيْكَ" اس کے متعلق ہے۔ یہ ترکیب درست ہے، مگر اس میں کمی صرف یہ ہے کہ باء کو محض زائدہ کہہ دیا گیا ہے، حالانکہ قرآن مجید میں ایک حرف بھی بے مقصد و زائد نہیں، چنانچہ شنقیطی، طنطاوی اور کئی مفسرین نے صراحت فرمائی ہے کہ یہ "كَفٰى" کی تاکید کے لیے ہے، یعنی آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب بہت کافی ہے۔ یہی بات "وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا" (بنی اسرائیل: ۶۵) میں بھی ملحوظ رکھیں۔

❹ نفس کے بطور محاسب کافی ہونے میں وہ صورت بھی شامل ہے کہ جب انسان اس کتاب اعمال کو جھٹلا دے گا، پھر اللہ کے حکم سے زبان پر مہر لگ جائے گی اور خود انسان کے جسم کا ہر حصہ اپنے اعمال کی شہادت دے گا۔ اب خود اپنے جسم سے زیادہ کافی محاسب کون ہو سکتا ہے۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۶۵)، حٰم السجدہ (۱۹ تا ۲۳) اور سورۂ مجادلہ (۱۸)۔

**آیت 15** ❶ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ...... : مطلب یہ ہے کہ جو شخص سیدھے راستے پر چلتا ہے وہ کسی پر احسان نہیں کرتا، بلکہ اس کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے اور جو اس سے ہٹ کر غلط راستے پر چلتا ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر ہو گا۔

❷ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ...... : "تَزِرُ" "وَزَرَ يَزِرُ وِزْرًا" (ض) بوجھ اٹھانا۔ "وَازِرَةٌ" اسم فاعل ہے اور "نَفْسٌ" کی صفت ہے جو یہاں پوشیدہ ہے، یعنی کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھاتی اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں ﴿۱۵﴾

اس مفہوم کی کئی آیات ہیں، دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۴) اور سورۂ فاطر (۱۸) وغیرہ۔

③ بعض آیات میں کچھ لوگوں کے اپنے گناہوں کے ساتھ دوسروں کے گناہ بھی اٹھانے کا ذکر ہے، جیسا کہ سورۂ نحل (۲۵) اور عنکبوت (۱۳) میں ہے: ”وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے بھی جن کو وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے رہے۔“ تو یہ دراصل دوسروں کا بوجھ نہیں بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے خود ان کا اپنا بوجھ ہے، گناہ کرنے والے اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے۔ سورۂ مائدہ (۳۲) میں آدم علیہ السلام کے قاتل بیٹے پر ہر قتل کے گناہ کا ایک حصہ ڈالے جانے کا مطلب بھی یہی ہے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کہ ”میت کو اس کے گھر والوں کے اس پر رونے سے عذاب ہوتا ہے“ کا مطلب بھی اہل علم نے یہ بیان فرمایا کہ جب مرنے والا اس کی وصیت کر گیا ہو، یا اسے معلوم ہو کہ گھر والے ایسا کریں گے، مگر اس نے انھیں منع نہ کیا ہو، کیونکہ اس پر لازم تھا کہ گھر والوں کو بھی اللہ کی نافرمانی سے بچاتا۔ (دیکھیے تحریم: ۶) اگر اس کے منع کرنے کے باوجود کوئی شخص بین کرتا ہے، یا گریبان چاک کرتا ہے تو وہ اس سے بری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ”كِتَابُ الْجَنَائِزِ“ میں باب باندھا ہے: ” بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَذَّبُ الْمَيِّتُ بِبَعْضِ بُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ “ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ میت کو اس کے گھر والوں کے بعض قسم کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ” إِذَا كَانَ النَّوْحُ مِنْ سُنَّتِهِ“ یعنی یہ اس وقت ہے جب بین کرنا اور سننا میت کا طریقہ اور معمول ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ [ التحريم : ٦ ] ”اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔“ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ » [ بخاري، النكاح، باب المرأة راعية...... : ٥٢٠٠ ] ”تم میں سے ہر ایک حکمران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہونے والا ہے۔“ تو جب یہ میت کا معمول اور طریقہ نہ ہو تو وہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے فرمانے کے مطابق ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [ الأنعام : ١٦٤ ] (اور کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی) کا مصداق ہوگا، یعنی اسے عذاب نہیں ہوگا اور وہ اس فرمانِ الٰہی کی طرح ہوگا: ﴿وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ﴾ [ فاطر : ١٨ ] ”اور اگر کوئی بوجھ سے لدی ہوئی (جان) اپنے بوجھ کی طرف بلائے گی تو اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا جائے گا۔“ [ بخاري، الجنائز، باب قول النبي صلی اللہ علیہ وسلم : يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه...... قبل ح : ١٢٨٤ ]

④ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا : یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے عدل کا بیان ہے، فرمایا کہ جب تک ہم کوئی پیغام پہنچانے والا نہ بھیجیں جو ان تک اللہ کے احکام پہنچا دے اور حجت پوری ہو جائے ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں۔ یہاں

بعض مفسرین نے بچپن یا زمانۂ جاہلیت میں فوت ہونے والوں کے متعلق مختلف اقوال اور ان کے دلائل کے ساتھ لمبی بحث کی ہے، مگر ایسی کہ آدمی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا، اس لیے میں اس بحث کو واضح طریقے سے تحریر کرتا ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں فوت ہو جانے والے بچے، خواہ مسلمانوں کے ہوں یا مشرکین کے، ان کو عذاب نہیں ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "بَابُ مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ " میں اس کے متعلق پہلے ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی روایات ذکر کی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ » [ بخاری، الجنائز : ۱۳۸۳، ۱۳۸٤ ] ''اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ عمل کرنے والے تھے۔'' اس کے بعد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ، كَمَثَلِ الْبَهِيْمَةِ تُنْتَجُ الْبَهِيْمَةَ، هَلْ تَرٰى فِيْهَا جَدْعَاءَ؟ » [ بخاری : ۱۳۸۵ ] ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا اسے نصرانی بنا دیتے ہیں، یا اسے مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسے چوپایہ پیدا ہوتا ہے (تو مکمل اعضا والا ہوتا ہے) کیا تم ان میں کوئی کان کٹا دیکھتے ہو۔'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث بیان فرمائی ہے، جس میں ہے کہ جبریل اور میکائیل علیہما السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک رات اپنے ساتھ لے جا کر بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کروایا، اس حدیث میں ہے کہ ہم ایک سرسبز باغ میں پہنچے جس میں ایک بہت بڑا درخت تھا، اس کی جڑ کے پاس ایک بزرگ اور بہت سے بچے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشاہدات کی حقیقت پوچھی تو فرشتوں نے تمام مشاہدات کے آخر میں سب کی حقیقت بیان کی اور اس مشاہدے کے متعلق بتایا کہ یہ بزرگ ابراہیم علیہ السلام تھے اور وہ بچے لوگوں کے بچے تھے۔ [ بخاری : ۱۳۸٦ ] امام بخاری رحمہ اللہ نے "كِتَابُ التَّعْبِيْرِ، بَابُ تَعْبِيْرِ الرُّؤْيَا بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ (۷۰٤۷) " میں یہی حدیث زیادہ تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔ اس میں ہے کہ فرشتوں نے بتایا کہ باغ میں جو لمبے قد کے بزرگ تھے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور وہ بچے جو ان کے اردگرد تھے وہ ایسے بچے تھے جو فطرت پر فوت ہوئے۔ سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ مسلمانوں نے پوچھا: « يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ أَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ » ''یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے بچے بھی؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور مشرکوں کے بچے بھی۔'' امام بخاری رحمہ اللہ کی اس ترتیب سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشرکوں کے بچوں کے متعلق کوئی بات نہیں بتائی گئی، آپ نے یہ بات اللہ کے علم کے سپرد فرمائی، مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا گیا تو آپ نے مسلم و مشرک تمام لوگوں کے بچوں کے جنتی ہونے کی صراحت فرما دی۔ البتہ دنیوی احکام میں مشرکوں کے بچوں کا حکم ان کے باپوں والا ہی ہوگا۔ اس لیے جہاد کے دوران حملے میں یا لونڈی و غلام بناتے وقت ان کا حکم مشرکین ہی کا ہوگا۔ ہاں، وہ کلمہ پڑھ لیں تو انھیں مسلمان سمجھا جائے گا۔

رہ گئے اہلِ فترت و جاہلیت، یعنی عرب کے وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے تو ان تمام کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں اللہ کی طرف سے توحید کا پیغام نہیں پہنچا، بلکہ وہ اپنے آپ کو ملت ابراہیم پر قرار دیتے تھے اور

وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور امت تھے۔ ایک لمبی مدت گزرنے کی وجہ سے ممکن ہے دین کے تفصیلی احکام ان کو معلوم نہ رہے ہوں، تاہم اکثریت بلکہ تمام لوگوں کے بت پرستی میں مبتلا ہونے کے باوجود توحید اور دین ابراہیم کا پیغام پہنچانے والے کچھ لوگ ان میں ضرور موجود رہے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے سے پہلے بھی کچھ لوگ بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے، یہ لوگ ''حنفاء'' کہلاتے تھے، ان میں زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل بھی شامل ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: (( أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِيَ زَيْدَ بْنَ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلٍ بِأَسْفَلِ بَلْدَحٍ قَبْلَ أَنْ يَنْزِلَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَحْيُ، فَقُدِّمَتْ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُفْرَةٌ فَأَبَى أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا، ثُمَّ قَالَ زَيْدٌ إِنِّي لَسْتُ آكُلُ مِمَّا تَذْبَحُونَ عَلَى أَنْصَابِكُمْ، وَلَا آكُلُ إِلَّا مَا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، فَإِنَّ زَيْدَ بْنَ عَمْرٍو كَانَ يَعِيبُ عَلَى قُرَيْشٍ ذَبَائِحَهُمْ وَيَقُولُ الشَّاةُ خَلَقَهَا اللّٰهُ وَأَنْزَلَ لَهَا مِنَ السَّمَاءِ الْمَاءَ، وَأَنْبَتَ لَهَا مِنَ الْأَرْضِ، ثُمَّ تَذْبَحُونَهَا عَلَى غَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ ؟ إِنْكَارًا لِذٰلِكَ وَ إِعْظَامًا لَهُ )) [ بخاري، مناقب الأنصار، باب حديث زيد بن عمرو بن نفيل : ٣٨٢٦ ] ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت ملنے سے پہلے زید بن عمرو بن نفیل کو مقام بلدح کے نچلے حصے میں ملے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک دستر خوان پیش کیا گیا تو اس نے اس سے کھانے سے انکار کر دیا، زید نے کہا: ''میں اس میں سے نہیں کھاتا جو تم اپنے نصب کردہ بتوں وغیرہ پر ذبح کرتے ہو اور میں اس کے سوا نہیں کھاتا جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔'' زید بن عمرو قریش پر ان کے ذبیحوں پر عیب لگاتے تھے اور کہتے تھے: ''بھیڑ بکری جو ہے اسے اللہ نے پیدا فرمایا اور اسی نے اس کے لیے آسمان سے پانی اتارا اور زمین سے اس کے لیے پودے اگائے، پھر تم اسے اللہ کے غیر کے نام پر ذبح کرتے ہو۔'' ان کے اس فعل کا انکار کرتے ہوئے اور اسے بہت بڑا گناہ قرار دیتے ہوئے یہ بات کہتے تھے۔'' ورقہ بن نوفل بت پرستی سے بے زار ہو کر نصرانی ہو گئے تھے۔'' [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : ٢ ] اور ظاہر ہے کہ وہ موحد نصرانی بنے ہوں گے، تثلیث والے مشرک نہیں، کیونکہ پھر انھیں بت پرستی چھوڑ کر نصرانی بننے کی ضرورت نہ تھی اور اسی توحید کی وجہ سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم کی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں: (( رَأَيْتُ زَيْدَ بْنَ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلٍ قَائِمًا مُسْنِدًا ظَهْرَهُ إِلَى الْكَعْبَةِ يَقُولُ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ ! وَاللّٰهِ ! مَا مِنْكُمْ عَلَى دِيْنِ إِبْرَاهِيْمَ غَيْرِيْ )) [ بخاري، مناقب الأنصار، باب حديث زيد بن عمرو بن نفيل : ٣٨٢٨ ] ''میں نے زید بن عمرو بن نفیل کو دیکھا وہ کعبے کے ساتھ پیٹھ کا سہارا لے کر کھڑے کہہ رہے تھے: ''اے قریش کی جماعت! اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص میرے سوا دین ابراہیم پر نہیں ہے۔''

الغرض جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام سے سیکڑوں سال بعد بھی توحید پر قائم اور اس کا پیغام کھلم کھلا کعبہ میں کھڑے ہو کر دینے والے موجود تھے تو ان سے پہلے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانے کے جس قدر قریب جائیں توحید والے اور اپنے آپ کو دین ابراہیم پر قائم کہنے والے یقیناً موجود رہے ہیں۔ یہ تو یمن سے آنے والے عمرو بن لحی خزاعی کا بیڑا غرق ہوا کہ اس نے کعبہ میں بت لا کر رکھ دیے، جس کے بعد قریش بھی بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ

﴿ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ [ فاطر : ٢٤ ] ’’اور کوئی امت نہیں مگر اس میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا گزرا ہے۔‘‘ یہ ڈرانے والا کوئی امتی بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ آج رسول اللہ ﷺ کی وفات کو تقریباً ۱۴۲۱ برس گزر چکے مگر آپ کی دعوت مسلسل دنیا کے ہر خطے میں جاری ہے اور داعیان اسلام بشارت و نذارت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانۂ فترت میں دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں، بلکہ آج بھی یہ دونوں قسمیں موجود ہیں، ایک وہ جنھیں کسی ذریعے سے توحید کی دعوت پہنچ گئی، خواہ وہ کسی توحید پر قائم شخص کے ذریعے سے پہنچی ہو یا اس کے مخالف کے ذریعے سے، جیسا کہ ابوسفیان نے اپنے زمانۂ کفر میں ہرقل کے سامنے دین اسلام کا بہترین خلاصہ پیش کیا تھا، پھر انھوں نے نہ توجہ سے سنا، نہ سوچنے کی زحمت کی، نہ اسے تسلیم کیا تو ان کے جہنمی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ انھیں صرف اہل فترت ہونے کی وجہ سے جنتی نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلَّمَاۤ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ۬ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴾ [ الملک : ۸ تا ۱۱ ] ’’جب بھی اس (جہنم) میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا تو اس کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں؟ یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو۔ اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں سے نہ ہوتے۔ پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، سو دوری ہے بھڑکتی ہوئی آگ والوں کے لیے۔‘‘

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَفْتَخِرُوْنَ بِآبَائِهِمُ الَّذِيْنَ مَاتُوْا، إِنَّمَا هُمْ فَحْمُ جَهَنَّمَ، أَوْ لَيَكُوْنُنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِيْ يُدَهْدِهُ الْخِرَاءَ بِأَنْفِهِ » [ ترمذي، المناقب، باب في فضل الشام واليمن : ٣٩٥٥، حسنه الألباني ] ’’کچھ لوگ جو اپنے ان آباء پر فخر کرتے ہیں جو فوت ہو چکے، جو محض جہنم کے کوئلے ہیں، ان پر فخر کرنے سے باز آ جائیں گے ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پاخانے کے اس کیڑے سے بھی ذلیل ہوں گے جو اپنی ناک کے ساتھ پاخانے کو دھکیلتا جاتا ہے۔‘‘ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے زمانۂ جاہلیت میں فوت ہونے والوں کو جہنم کے کوئلے قرار دیا۔ مزید تفصیل سورۂ توبہ کی آیت (۱۱۳) کی تشریح میں تفسیر کی کسی بھی کتاب سے دیکھ لیں۔

اب اہل فترت کے صرف وہ لوگ رہ گئے جنھیں واقعی دعوت نہیں پہنچی تو یہ صرف اہل فترت ہی کے ساتھ خاص نہیں، اب بھی اگر دنیا کے کسی خطے میں واقعی کوئی ایسا شخص موجود ہے جسے بالکل دعوت نہیں پہنچی تو اس آیت ’’ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ‘‘ کے تحت حجت پوری کیے بغیر اسے عذاب نہیں ہو گا، خواہ وہ حجت قیامت کے دن پوری کی جائے۔ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے ان لوگوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے آنے والی احادیث میں سے سب سے صحیح حدیث وہ ہے جو اسود بن سریع اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’چار آدمی قیامت کے دن اپنی حجت (دلیل) پیش

وَ اِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں حکم نہیں مانتے تو اس پر بات ثابت ہو جاتی ہے، پھر ہم اسے برباد کر دیتے ہیں، بری طرح برباد کرنا ﴿۱۶﴾

کریں گے، ایک بہرا آدمی جو کچھ نہیں سنتا، ایک احمق آدمی، ایک حد سے بوڑھا اور ایک وہ آدمی جو فترت میں فوت ہوا۔ جو بہرا ہے وہ کہے گا، اے میرے رب! اسلام آیا تو مجھے کچھ سنائی نہ دیتا تھا، احمق کہے گا، اے میرے رب! اسلام آیا اور میں کچھ عقل نہ رکھتا تھا اور بچے مجھے مینگنیاں مارتے تھے، حد سے بوڑھا کہے گا، اے میرے رب! اسلام آیا اور میں کچھ سمجھتا نہ تھا اور جو فترت میں فوت ہوا وہ کہے گا، اے میرے رب! میرے پاس تیرا کوئی پیغام لانے والا نہیں آیا۔ تو اللہ تعالیٰ ان سے ان کے پختہ عہد لے گا کہ وہ جو کہے گا اس کی اطاعت کریں گے؟ تو ان کی طرف پیغام بھیجا جائے گا کہ آگ میں داخل ہو جاؤ، تو جو داخل ہو جائے گا وہ اس پر ٹھنڈک اور سلامتی بن جائے گی اور جو داخل نہیں ہوگا اسے گھسیٹ کر اس میں ڈال دیا جائے گا۔'' [ مسند أحمد : ۲۴/۴، ح : ۱۶۳۰۷۔ ابن حبان : ۷۳۵۷ ] صحیح الجامع (۸۸۱) میں شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح فرمایا ہے، ابن کثیر نے فرمایا کہ اسے اسحاق بن راہویہ نے معاویہ بن ہشام سے ایسے ہی روایت کیا اور بیہقی نے اسے کتاب الاعتقاد میں ''حنبل عن علی بن عبد اللہ'' کی سند سے روایت کیا اور فرمایا یہ اسناد صحیح ہے۔ محترم زبیر علی زئی صاحب نے اردو تفسیر ابن کثیر کی تخریج میں اس کی ایک ہم معنی حدیث کو جو اہل جاہلیت کے متعلق ہے، حاکم (۴/۴۴۹، ۴۵۰) کے حوالے سے حسن لکھا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اگر پیغام پہنچ جاتا تو کوئی شخص کیا کرتا، مگر ان چاروں کا عذر بھی باقی نہیں رہنے دیا جائے گا، بلکہ قیامت کے دن ان کے امتحان کے بعد اس کے نتیجے کے مطابق ان سے سلوک ہوگا، البتہ بچوں کے امتحان کی کوئی روایت صحیح نہیں۔ [ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَعِلْمُهُ أَتَمُّ ]

**آیت 16** ① وَ اِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ ...... : ''اَمَرْنَا'' امر نہی کی ضد ہے، حکم دینا ''مُتْرَفٌ'' وہ شخص جسے نعمت اور خوش حالی عطا کی گئی ہو اور کھلا چھوڑ دیا گیا ہو کہ جو چاہے کرے۔ کہا جاتا ہے: ''أَتْرَفَتْهُ النِّعْمَةُ'' اسے نعمت نے سرکش اور باغی بنا دیا۔ ''تَدْمِيْرًا'' تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''بری طرح برباد کرنا۔''

② یہ پچھلی آیت کے مفہوم ہی کی تکمیل ہے کہ اللہ تعالیٰ حجت تمام کیے بغیر عذاب نہیں دیتا۔ فرمایا، ہم اس بستی کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ ''اَمَرْنَا'' کا مفعول محذوف ہے، وہ یا تو ''بِأَمْرٍ'' ہے، یعنی ہم انھیں کوئی حکم دیتے ہیں، یا ''بِالْإِيْمَانِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ'' ہے، یعنی ہم اس بستی کے رسول یا دوسرے مصلح لوگوں کے ذریعے سے اس کے خوش حال لوگوں کو ایمان اور عمل صالح کا حکم دیتے ہیں۔ ''فَفَسَقُوْا'' تو وہ اس حکم کو یا ایمان اور عمل صالح کے حکم کو نہیں مانتے، بلکہ ملک بھر میں فسق و فجور بپا کر دیتے ہیں تو ان کا عذاب کا حق دار ہونا ثابت ہو جاتا ہے، تو پھر ہم صرف خوش حال لوگوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے پیچھے

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

اور ہم نے نوح کے بعد کتنے ہی زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں کی پوری خبر رکھنے والا، سب کچھ دیکھنے والا بہت کافی ہے ﴿۱۷﴾

چلنے والے ضعفاء کو بھی بلکہ بستی کی عمارتوں کو بھی بری طرح برباد کر دیتے ہیں۔ ضعفاء کی ہلاکت کے سبب کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)، احزاب (۶۴ تا ۶۸) اور اعراف (۳۸، ۳۹) اور بستی کی بربادی لفظ "قَرْيَةً" سے ظاہر ہو رہی ہے۔

③ بعض مفسرین نے "فَفَسَقُوْا فِيْهَا" کی مناسبت سے "اَمَرْنَا" کا محذوف مفعول "بِالْفِسْقِ" نکالا ہے، یعنی جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو فسق کا حکم دیتے ہیں...... مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو نیکی کا حکم دیتا ہے اور نافرمانی سے منع کرتا ہے، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ﴾ [ الأعراف : ۲۸ ] "کہہ دیجیے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔" اور دیکھیے سورۂ نحل (۹۰) اور سبا (۳۴، ۳۵) ہاں اگر یہ تاویل کی جائے تو الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شرعی حکم تو نیکی ہی کا ہوتا ہے مگر کونی حکم (جس کے تحت کائنات چل رہی ہے، کافر کفر کر رہے ہیں، ظالم ظلم کر رہے ہیں، مظلوموں پر ظلم ہو رہا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں ہیں) ہر قسم کا ہو سکتا ہے، اگرچہ یہ کونی حکم بھی شرعی احکام کی نافرمانی اور اللہ اور اس کے رسول کو بھلا دینے کے نتیجے ہی میں ہوتا ہے، چنانچہ ان نافرمانوں کی رسی دراز کر دی جاتی ہے اور دنیا کی نعمتوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جاتے ہیں کہ جتنی چاہو نافرمانی کر لو، پھر جب قرار داد جرم مکمل ہو جاتی ہے تو اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ (دیکھیے انعام: ۴۲ تا ۴۵) بعض نے "اَمَرْنَا" کا معنی "اَكْثَرْنَا" بھی کیا ہے کہ ہم اس کے "مترفین" کو بہت بڑھا دیتے ہیں تو وہ فخر میں آ کر نافرمانی پر اتر آتے ہیں۔ ان تینوں معنوں میں سے پہلا معنی زیادہ صحیح ہے جو حاشیہ نمبر (۲) میں ذکر ہوا، اگرچہ دوسرے معنوں کی بھی گنجائش ہے۔

آیت 17 ① وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ : یہ "كَمْ" خبریہ ہے، جس کا معنی ہے "بہت۔" قرن ایک زمانے کے لوگ، عام طور پر یہ مدت ایک سو سال بتائی جاتی ہے۔ رسولوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم آنے کے بعد ان کی نافرمانی (فسق) کی وجہ سے نوح علیہ السلام کے بعد ہلاک ہونے والی قوموں اور نسلوں کا بطور مثال ذکر فرمایا کہ مت پوچھو کہ کتنی نسلوں کو ہم نے ہلاک کر دیا، مثلاً عاد، ثمود، شعیب اور لوط علیہما السلام کی قومیں اور قوم فرعون وغیرہ۔ نوح علیہ السلام کے بعد اس لیے فرمایا کہ اس سے پہلے لوگ سب توحید پر تھے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۳)۔

② وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ...... : اس جملے کا یہاں دو طرح سے تعلق ہے، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام قرون کو ان کے گناہوں کی پاداش ہی میں ہلاک کیا، کیونکہ وہ اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے اور دیکھنے والا ہونے میں بہت ہی کافی ہے۔ "كَفٰى بِرَبِّكَ" کی ترکیب کے لیے اسی سورت کی آیت (۱۴) ملاحظہ فرمائیں۔ دوسرا تعلق یہ ہے کہ کفار قریش اور پوری

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہوگا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا ﴿۱۸﴾ اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی، جو اس کے لائق کوشش ہے، جبکہ وہ مومن ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی کوشش ہمیشہ سے قدر کی ہوئی ہے ﴿۱۹﴾

امت کو تنبیہ فرمائی کہ یہ مت سمجھنا کہ یہ معاملہ صرف انھی قوموں کے ساتھ ہوا، بلکہ اگر تم بھی اللہ کے رسول ﷺ اور اس کے احکام نہیں مانو گے اور فسق و فجور کا ارتکاب کرو گے تو تمھارے ساتھ بھی اسی طرح ہوگا، اس لیے اپنی اصلاح کر لو۔ اس میں نافرمانوں کو وعید کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جانشینوں کے لیے تسلی بھی ہے۔

**آیت 18** ❶ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ ...... : صاحب کشاف نے فرمایا، وہ شخص جس کا مقصود جلدی حاصل ہونے والی (یعنی دنیا) ہو اور اس کے سوا اس کا کچھ مقصد نہ ہو، جیسا کہ کفار اور اکثر فاسقوں کا حال ہے تو ہم دنیا کے فوائد میں سے جس قدر چاہتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں دو قیدیں لگا دیں، ایک یہ کہ ہم دنیا کی وہ چیز اتنی دیتے ہیں جتنی ہم چاہتے ہیں، دوسری قید یہ کہ صرف اسے دیتے ہیں جس کا ہم ارادہ کرتے ہیں۔ اور واقعی ایسا ہی ہے، آپ ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ جتنی بھی تمنا رکھیں انھیں اس کا کچھ حصہ ہی ملتا ہے اور بعض اوقات کچھ بھی نہیں ملتا، سو ان کے لیے دنیا کا فقر اور آخرت کا فقر دونوں جمع ہو گئے۔ رہا متقی مومن تو اس کا مقصود صرف آخرت ہوتا ہے، چنانچہ آخرت میں اس کا غنی ہونا یقینی ہے، اسے پروا نہیں ہوتی کہ دنیا کی آسائش اسے ملتی ہے یا نہیں، اگر اسے دنیا میں بھی مل جائے تو وہ شکر کرتا ہے، اگر نہ ملے تو صبر کرتا ہے، پھر کئی دفعہ فقر اس کے لیے بہتر اور اس کی مراد کے حصول میں زیادہ مددگار ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ ہود (۱۵، ۱۶) اور سورۂ شوریٰ (۲۰)۔

❷ "مَذْمُوْمًا" "ذَمٌّ" سے اسم مفعول ہے جو مدح کی ضد ہے۔ "مَدْحُوْرًا" "دُحُوْرٌ" سے ہے، جس کا معنی دور کرنا، دفع کرنا ہے، یعنی آخرت میں اس کے عمل کسی طرح بھی قبول نہیں کیے جائیں گے۔

**آیت 19** وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ ...... : اس آیت میں عمل کی قبولیت کی تین شرطیں بیان ہوئی ہیں، جن میں بنیادی شرط "وَهُوَ مُؤْمِنٌ" یعنی ایمان ہے، یہ بات بہت سی آیات میں بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۲۴)، نحل (۹۷) اور مومن (۴۰) وغیرہ۔ کافر کے نیک اعمال قیامت کے دن بے کار ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۸)، فرقان (۲۳) اور نور (۳۹)

كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی اور ان کی بھی، تیرے رب کی بخشش سے اور تیرے رب کی بخشش کبھی بند کی ہوئی نہیں ﴿۲۰﴾ دیکھ ہم نے ان کے بعض کو بعض پر کس طرح فضیلت دی ہے اور یقیناً آخرت درجوں میں بہت بڑی اور فضیلت دینے میں کہیں بڑی ہے ﴿۲۱﴾

وغیرہ۔ کیونکہ کافر کی نیکیوں کا بدلہ دنیا ہی میں اسے دے دیا جاتا ہے۔ دیکھیے ہود (۱۵، ۱۶)، شوریٰ (۲۰) احقاف (۲۰) وغیرہ۔ کافر کی نیکیوں کی مثال صدقہ، صلہ رحمی، مہمان نوازی اور مظلوموں کی مدد وغیرہ ہے۔

دوسری شرط اخلاص ہے، جو "اَرَادَ الْاٰخِرَةَ" سے ظاہر ہے اور تیسری شرط آخرت کے لائق عمل صالح ہے، جو "سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا" سے ظاہر ہو رہی ہے اور یہ وہ عمل ہے جو کتاب و سنت کے مطابق ہو، ایسے عمل کا بدلہ ضرور ملے گا اور کئی گنا یا بے حساب ملے گا، جیسا کہ کئی آیات میں مذکور ہے: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ الزمر : ۱۰ ] "صرف کامل صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔" تو جس سعی کو اللہ تعالیٰ مشکور قرار دے وہ ایسی ہی ہوتی ہے۔

**آیت 20** ﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ ...... : "مَحْظُوْرًا" "حَظَرَ يَحْظُرُ" (ن) سے اسم مفعول ہے، بمعنی روکنا، یعنی ہم مومن و کافر، نیک و بد ہر ایک کو رزق اور دنیا کی نعمتوں سے نوازتے ہیں، ایسا نہیں کہ گناہ یا کفر کی وجہ سے اس کا رزق بند کر دیں، کیونکہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، نیکی یا بدی کی وجہ سے رزق بند کرنے سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ہاں! اللہ کی تقدیر کے مطابق مومن کا رزق کم یا زیادہ ہو سکتا ہے اور کافر کا بھی۔

**آیت 21** ﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ...... : یعنی دنیا میں سب لوگ رزق، حسن، ذہانت، قوت، اقتدار، غرض کسی چیز میں ایک جیسے نہیں، خواہ مومن ہوں یا کافر، یہ چیزیں مومن کے پاس بھی ہو سکتی ہیں اور کافر کے پاس بھی۔ مگر یہ دنیائے فانی ساری کی ساری بھی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ )) [ ترمذی، الزهد، باب ما جاء في هوان الدنيا على الله عزوجل : ۲۳۲۰، صححه الألباني ] "اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی پینے کو نہ دیتا۔" اور دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۵) اور سورۂ زخرف (۳۲)۔

آخرت میں جہنم کے درکات اور جنت کے درجات کا فرق اس سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ، كَمَا تَتَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الْغَابِرَ فِي الْأُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَاءِ لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُهُمْ ؟ قَالَ بَلٰى ، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ رِجَالٌ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ صَدَّقُوا الْمُرْسَلِيْنَ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ما

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ﴿۲۲﴾ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ اِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوۡ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا وَ قُلۡ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا ﴿۲۳﴾

اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود مت بنا، ورنہ مذمت کیا ہوا، بے یار ومددگار ہوکر بیٹھا رہے گا ﴿۲۲﴾ اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرو۔ اگر کبھی تیرے پاس دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ ہی جائیں تو ان دونوں کو ''اف'' مت کہہ اور نہ انھیں جھڑک اور ان سے بہت کرم والی بات کہہ ﴿۲۳﴾

جاء في صفة الجنة و أنها مخلوقة : ۳۲۵٦۔ مسلم : ۲۸۳۱ ] ''اہل جنت اپنے اوپر بالا خانوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح مشرق و مغرب میں دور کسی چمک دار ستارے کو دیکھتے ہیں، باہمی درجات کی کمی بیشی کی وجہ سے۔'' لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ تو انبیاء کی منازل ہوں گی، جہاں کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا؟'' فرمایا: ''کیوں نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ وہ مرد ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔''

**آیت 22** لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ...... : ''مَخۡذُوۡلًا'' وہ ہے جس کی مدد وہ چھوڑ دے جس سے اسے مدد کی امید ہو۔ اس آیت میں تمام اعمال کی بنیاد شرک سے پاک ہونا بیان فرمائی گئی ہے۔ بظاہر مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں، مگر درحقیقت ہر انسان اس کا مخاطب ہے، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ سے شرک کا صدور کیسے ہو سکتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ بالفرض اگر اللہ کے ساتھ شریک بنانے کا فعل رسول اللہ ﷺ سے بھی سرزد ہو جائے تو پھر آپ کی بھی کوئی تعریف کرنے والا ہوگا نہ کوئی مدد کرنے والا، بلکہ ہر ایک مذمت ہی کرے گا۔ دیکھیے سورۂ زمر (٦۴ تا ٦٧)، حج (۳١)، مائدہ (٧۲) اور نساء (١١٦)۔

**آیت 23** ① وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ: پچھلی آیت میں شرک سے منع فرمانے کے بعد صرف اپنی عبادت کی تاکید کے لیے لفظ ''قَضٰى'' استعمال فرمایا، جس میں انتہائی تاکید پائی جاتی ہے، کیونکہ فیصلہ قطعی ہوتا ہے اور وہ بدلا نہیں جاتا، چنانچہ فرمایا ''قَضٰى'' یعنی قطعی حکم اور فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یعنی صرف اس کے بندے بن کر رہو، غیبی قوتوں کا مالک صرف اس کو سمجھ کر اس سے مانگو۔ انتہائی درجے کی محبت اور خوف کے ساتھ انتہائی عاجزی صرف اس کے لیے اختیار کرو۔ تمھارے دل، زبان اور جسم کے ہر حصے کا اس طرح کا ہر فعل مثلاً قیام، سجدہ، رکوع اور قربانی بلکہ پوری زندگی ایسی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔

② وَ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا : ''اِحۡسَانًا'' امر ''أَحۡسِنُوۡا'' کا مصدر ہے، جو تاکید کے لیے ہے اور امر کی جگہ آتا ہے۔ اس کے ساتھ امر کا لفظ ذکر نہیں ہوتا مگر مراد امر تاکیدی ہوتا ہے، یعنی والدین کے ساتھ بہت نیکی کرو۔ ③ ''اِمَّا'' اصل میں ''اِنۡ مَا''

وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾

اور رحم دلی سے ان کے لیے تواضع کا بازو جھکا دے اور کہہ اے میرے رب! ان دونوں پر رحم کر جیسے انھوں نے چھوٹا ہونے کی حالت میں مجھے پالا ﴿۲۴﴾

ہے، ''مَا'' شرط کی تاکید کے لیے ہے، یعنی ''اگر کبھی۔'' ان آیات کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کے والد اور والدہ دونوں فوت ہو چکے تھے، ان دونوں یا ایک کا بڑھاپے میں پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بظاہر نبی ﷺ کو حکم دینے کے باوجود اصل حکم ہر شخص کو ہے۔ ماں باپ خواہ بوڑھے ہوں یا جوان، ہر حال میں ان کا ادب کرنا اور ان سے نرمی سے بات کرنا فرض اور انھیں جھڑکنا گناہ ہے، مگر چونکہ بڑھاپے میں خدمت کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات زیادہ بڑھاپے کی وجہ سے ہوش و حواس بھی ٹھکانے نہیں رہتے، اس لیے خاص طور پر بڑھاپے کا ذکر فرمایا۔

③ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر صرف اپنی عبادت کی تاکید کے ساتھ والدین سے احسان کا ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۳۶) اور سورۂ بقرہ (۸۳) دوسرے مقامات پر واضح فرمایا کہ ان سے حسن سلوک لازم ہے، خواہ وہ کافر و مشرک ہوں، بلکہ اگرچہ شرک و کفر کی دعوت بھی دیتے ہوں۔ دیکھیے سورۂ لقمان (۱۵) اور سورۂ عنکبوت (۸) احادیث میں بھی والدین سے حسن سلوک کی بہت تاکید آئی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، قِيْلَ مَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !؟ قَالَ مَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ، أَحَدَهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ )) [ مسلم، البر والصلة، باب رغم من أدرك أبويه...... : ۱۰/ ۲۵۵۱ ] ''اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو۔'' پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! کس کی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے میں پایا، ان میں سے ایک کو یا دونوں کو، پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔''

④ ''عِنْدَكَ'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تم والدین کے پاس تھے اور ان کے محتاج تھے، اب وہ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے تمھارے پاس اور تمھارے محتاج ہیں۔ چنانچہ انھیں ''اف'' بھی نہ کہو، جو اکتاہٹ اور بے ادبی کا ہلکے سے ہلکا لفظ ہے، پھر اس سے زیادہ کوئی سخت لفظ بولنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

⑤ قَوْلًا كَرِيْمًا: بعض اہل علم نے اس کی تفسیر میں قول کریم کی نقشہ کشی یوں فرمائی کہ ان سے ایسے بات کر جیسے ایک خطا کار غلام اپنے سخت مزاج آقا سے بات کرتا ہے اور بعض نے فرمایا کہ بچپن میں جس طرح تمھارے پیشاب پاخانہ کو صاف کرتے وقت وہ کوئی کراہت محسوس نہ کرتے تھے، بلکہ محبت ہی سے پیش آتے تھے، اب تم بھی ان سے وہی سلوک کرو۔ (بغوی)

**آیت 24** ① وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ : ''جَنَاحَ'' پرندے کے پر کو کہتے ہیں اور بازو کو بھی۔ مطلب یہ کہ جس طرح پرندہ اپنے بچوں کے اوپر اپنے پر جھکا کر انھیں اپنی آغوش میں لے کر ہر سرد و گرم سے محفوظ کر لیتا ہے اس طرح تو بھی رحم کی بنا پر تواضع کے بازو ان پر جھکا دے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے حقوق کی

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾

تمھارا رب زیادہ جاننے والا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک ہوگے تو یقیناً وہ بار بار رجوع کرنے والوں کے لیے ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا ہے ﴿۲۵﴾ اور رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو اور مت بے جا خرچ کر، بے جا خرچ کرنا ﴿۲۶﴾

والدین کے حقوق کی طرح تاکید نہیں فرمائی، کیونکہ اولاد کے لیے ماں باپ کے دل میں قدرتی طور پر شفقت و محبت موجود ہوتی ہے۔ ہاں جو ظلم وہ اولاد پر کرتے تھے اس سے منع فرمایا۔ اس کا ذکر آگے اسی سورت کی آیت (۳۱) میں آ رہا ہے۔

② وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا: معلوم ہوا کہ والدین کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحم کی دعا کرنا فرض ہے، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے، اس لیے روزانہ ان کی زندگی میں اور فوت ہونے کے بعد اپنی دعا کے ساتھ ان الفاظ میں یا دوسرے الفاظ میں ان کے لیے دعا ضرور کرنی چاہیے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ [ ابراھیم : ۴۱ ] ”اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہوگا۔“ الا یہ کہ ان میں سے کسی کی وفات کفر پر ہو تو مرنے کے بعد ان کے لیے استغفار جائز نہیں۔ ”رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا“ دعا میں یہ خوبی ہے کہ اس کے ساتھ دعا کرتے ہوئے والدین کے بچپن میں پرورش کا احساس ان کے لیے زیادہ اخلاص اور کوشش کے ساتھ دعا کا تقاضا کرتا ہے۔

**آیت 25** رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ...... : ان الفاظ میں والدین کے لیے دل میں شفقت و رحمت نہ رکھنے پر وعید بھی ہے اور ایسی صالح اولاد کے لیے تسلی بھی جن کے والدین کسی جائز وجہ کے بغیر ہی ناراض رہتے ہوں اور اولاد کی ہر قسم کی کوشش کے باوجود کسی طرح خوش نہ ہوتے ہوں، تو فرمایا کہ اگر تم نیک ہو اور تمھارے دل میں والدین کے لیے شفقت و رحمت موجود ہے تو ایسے رجوع کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا ہے۔ بعض اہل علم نے یہ معنی بیان فرمایا کہ اگر تم سے خدمت میں کوتاہی ہوگئی یا کوئی زیادتی ہوگئی، پھر تم نے رجوع کیا اور توبہ کر لی تو اللہ معاف فرما دے گا۔

**آیت 26** ① وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ...... : قرابت والے سے مراد قریبی رشتے دار ہیں، ماں کی طرف سے ہوں یا باپ کی طرف سے، محرم ہوں یا غیر محرم۔ ان کو پہلے اس لیے رکھا کہ ان کو دینے میں دو اجر ہیں، ایک صلہ رحمی کا اور دوسرا صدقے کا۔ ان کا حق یہ ہے کہ ہر صورت ان سے میل جول اور تعلق قائم رکھا جائے، انھیں دین کی دعوت جاری رکھی جائے، ان کی خوشی اور غم میں شرکت کی جائے۔ جب بھی انھیں مدد کی ضرورت ہو مال و جان سے ان کی مدد کی جائے۔ مسکین اور ابن السبیل (مسافر) کی تفسیر سورۂ توبہ (۶۰) میں دیکھیں۔

② وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا : ”تَبْذِيْرًا“ ”بَذْرٌ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی بیج ہے، یعنی بیج کی طرح بکھیرنا۔ اللہ تعالیٰ نے

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

بے شک بے جا خرچ کرنے والے ہمیشہ سے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان ہمیشہ سے اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے ﴿۲۷﴾ اور اگر کبھی تو ان سے بے توجہی کر ہی لے، اپنے رب کی کسی رحمت کی تلاش کی وجہ سے، جس کی تو امید رکھتا ہو تو ان سے وہ بات کہہ جس میں آسانی ہو ﴿۲۸﴾

قرابت دار، مسکین اور ابن السبیل کو اس کا حق دینے کے ساتھ ہی بے جا خرچ کرنے سے منع فرمایا۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جائز خرچ کرنے میں بھی میانہ روی کی تاکید فرمائی، خواہ گھر میں خرچ کرے یا صدقہ وغیرہ میں دے۔ آگے آیت (۲۹) میں اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ بے جا خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ناجائز کاموں میں خرچ کیا جائے (چاہے ایک پیسہ ہی ہو)، یا جائز کاموں میں بغیر سوچے سمجھے اتنا خرچ کیا جائے جو حق داروں کے حقوق ضائع کرنے اور حرام کے ارتکاب کا سبب بنے۔

**آیت 27** اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ...... : بے جا خرچ کرنے والوں کو ہمیشہ سے شیطانوں کے بھائی، یعنی شیطانوں کے ساتھی اور ان جیسے قرار دیا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ شیطان ہمیشہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کی ناشکری کرتے ہوئے انھیں غلط جگہ میں خرچ کرتا ہے، اسی طرح جو شخص مالک کے دیے ہوئے مال کو مالک کی نافرمانی میں خرچ کرتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ ترجمے میں ''ہمیشہ'' کا مفہوم ''كَانُوْۤا'' اور '' كَانَ '' سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مفسر طنطاوی لکھتے ہیں: '' وَكَانَ الشَّيْطَانُ فِيْ كُلِّ وَقْتٍ وَفِيْ كُلِّ حَالٍ جَحُوْدًا لِنِعَمِ رَبِّهٖ لَا يَشْكُرُهٗ عَلَيْهَا ''

**آیت 28** ① وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ...... : '' اِمَّا '' '' اِنْ '' اور '' مَا '' سے مرکب ہے، جس میں ''مَا'' ''اِنْ'' کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''اگر کبھی'' کیا گیا ہے، یعنی ذی القربیٰ، مسکین اور ابن السبیل سے اعراض (بے رخی) بخل کرتے ہوئے ہرگز جائز نہیں، صرف ایک صورت میں جائز ہے کہ تمھارے پاس دینے کے لیے اس وقت کچھ نہ ہو، ہاں تمھیں اللہ کی رحمت (حلال اور وافر رزق) کے حصول کی امید ہو (جس سے ناامید ہونا بھی جائز نہیں) تو ان سے ایسے الفاظ میں معذرت کر لو جن میں نرمی اور آسانی ہو۔ ''مَیْسُوْرًا'' لفظ عموماً مجہول ہی آتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: '' يُسِرَ فُلَانٌ فَهُوَ مَيْسُوْرٌ، عُسِرَ فُلَانٌ فَهُوَ مَعْسُوْرٌ، نُحِسَ فُلَانٌ فَهُوَ مَنْحُوْسٌ، سُعِدَ فُلَانٌ فَهُوَ مَسْعُوْدٌ '' اس آیت کی مزید وضاحت سورۂ بقرہ (۲۶۱) میں دیکھیں اور ایسے موقع پر رسول اللہ ﷺ کیا فرماتے تھے، اس کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۹۲)۔

② مہائمی رحمہ اللہ نے اس کا ایک اور مفہوم بیان کیا ہے کہ اگر تم مذکورہ لوگوں سے اعراض اس وجہ سے کرو کہ ان سے اعراض کرنے میں تمھیں رب تعالیٰ کی رحمت کے حصول کی امید ہو، مثلاً تمھیں معلوم ہو کہ اگر اسے مال دیا تو یہ اسے نشے پر، زنا پر یا کسی گناہ پر صرف کرے گا تو تب بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے اس سے معذرت کرو۔ آیت کے الفاظ میں اس مفہوم کی بھی گنجائش ہے۔

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ ع

اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا کر لے اور نہ اسے کھول دے، پورا کھول دینا، ورنہ ملامت کیا ہوا، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے گا ﴿۲۹﴾ بے شک تیرا رب رزق فراخ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، بے شک وہ ہمیشہ سے اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۳۰﴾

**آیت 29** وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً ...... : "مَغْلُوْلَةً" "غُلٌّ" سے مشتق ہے، جس کا معنی گردن کا طوق ہے، جس کے ساتھ ہاتھ بھی باندھ دیے جائیں، جیسا کہ مجرموں اور قیدیوں سے کیا جاتا ہے، مراد بخل اور کنجوسی ہے اور "الْبَسْطِ" (کھولنا) سے مراد سخاوت ہے۔ "مَحْسُوْرًا" جو تھک ہار کر چلنے سے رہ جائے۔ یعنی بالکل بخیلی کرو گے تو خالق و مخلوق دونوں کے ہاں ملامت کیے ہوئے بن جاؤ گے اور پورا ہاتھ کھول دو گے اور سب کچھ دے کر خالی ہاتھ ہو جاؤ گے تو اہل و عیال کی ملامت کے ساتھ ساتھ زندگی کی دوڑ میں تھک ہار کر بیٹھ رہو گے، پھر ممکن ہے کہ بھیک مانگنے تک کی نوبت آ جائے۔ سب سے بہتر میانہ روی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ [ الفرقان: ٦٧ ] "اور وہ لوگ (عباد الرحمان ہیں) کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور (ان کا خرچ) اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔" ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ )) [ بخاري، الزكوة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى : ١٤٢٦ ] "بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد غنا موجود رہے (انسان فقیر نہ ہو جائے) اور ابتدا ان سے کرو جن کی تم پرورش کر رہے ہو۔"

**آیت 30** ① اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ : یعنی اگر حد سے زیادہ خرچ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کسی کا فقر دور کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کے اختیار میں نہیں، آپ جتنا بھی دے لیں اگر رب تعالیٰ اس کے رزق کا دروازہ کشادہ نہ کرے تو کوئی اسے نہیں کھول سکتا، آپ اللہ کے حکم کے مطابق اعتدال سے خرچ کریں، اس کے فقر و غنا کی فکر آپ کا کام نہیں اور نہ یہ آپ کے بس کی بات ہے۔

② اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا : یعنی وہ خوب جانتا ہے کہ کسے کتنا رزق دینا ہے۔ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم رزق دینا اس کی حکمت ہے۔ (دیکھیے شوریٰ: ۲۷) اگر سب لوگ برابر ہوتے تو دنیا کے کام چل ہی نہ سکتے۔ (دیکھیے زخرف: ۳۲) دولت مند ہونا یا فقیر ہونا نیکی یا بدی پر منحصر نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ (دیکھیے زخرف: ۳۳ تا ۳۵) زبردستی اس فرق کو مٹایا نہیں جا سکتا، جیسا کہ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی خواہش اور کوشش تھی، جس کے لیے انھوں نے لاکھوں لوگ تہ تیغ کیے مگر منہ کی کھائی۔ کیونکہ یہ فطرت سے جنگ ہے جو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ رہی سرمایہ داری کہ سود اور دوسرے

وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے ﴿۳۱﴾

ناجائز طریقوں سے تمام اموال کے مالک صرف چند لوگ بن بیٹھیں اور باقی سب ان کے محتاج ہوں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں اور جہاں یہ نظام ہوگا وہ معاشرہ بھی لامحدود ظلم و ستم اور حرص و ہوس کا شکار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر و فقیر کے اس فرق کو ختم کرنا نہیں بلکہ اعتدال پر رکھنا ضروری ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کو حرام قرار دیا، چوری ڈاکے، غصب، دھوکے اور سود کی تمام صورتیں حرام قرار دیں، تو دوسری طرف جائز طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو زکوٰۃ، صدقات، میراث اور دوسرے احکام کے ذریعے سے معاشرے میں پھیلا دینے کا حکم دیا۔ ان احکام پر عمل کرنے کی صورت میں معاشرے میں امیری و غریبی میں اعتدال قائم رہے گا، پھر نہ سرمایہ دارانہ طریقے کی وجہ سے امریکہ اور یورپی ممالک کی طرح دولت چند آدمیوں کی مٹھی میں جمع ہونے سے پیدا ہونے والے مظالم ہوں گے اور نہ اس فطری فرق کو زبردستی اور مصنوعی طریقوں سے ختم کرنے کی کوشش سے وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو روس، چین اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں پیدا ہوئیں کہ انسان انسانیت کے مرتبے سے گر کر محض ایک حیوان بن گیا، لوگوں کو ان کی فطری آزادی سے محروم کر دیا گیا، حتیٰ کہ اس نظام پر مبنی تمام ممالک آخر کار ناکام ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور وہاں کے رہنے والے مظلوم مسلم اور غیر مسلم سب لوگوں کو مسلمانوں کے جہاد کی برکت سے اس نظام سے نجات اور آزادی کی زندگی نصیب ہوئی۔ (فالحمد للہ) اب بھی اگرچہ وہاں اس کی باقیات موجود ہیں، جن کی وجہ سے ظلم و ستم کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا، اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ تمام دنیا کو سرمایہ داری، کمیونزم اور دوسرے تمام ظالمانہ نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کا نظام عدل نافذ کریں۔ یہ کام اللہ کے فضل سے شروع ہو چکا ہے اور جہاد اسلامی کی برکت سے تمام دنیا پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ (ان شاء اللہ) جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۳۳ ] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک لوگ برا جانیں۔“

**آیت 31** وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ...... : اگرچہ اولاد میں لڑکے لڑکیاں دونوں شامل ہیں، مگر عرب کی تاریخ میں اکثر لڑکیوں ہی کو قتل کرنے کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ﴾ [ التکویر : ۸ ] ”اور جب زندہ دفن کی گئی سے پوچھا جائے گا۔“ ”اَلْمَوْءٗدَةُ“ مؤنث لانے سے ظاہر یہی ہے کہ زندہ درگور لڑکی ہی ہوتی تھی، لیکن اگر اسے ”نفس موء ودہ“ کہا جائے تو پھر لڑکا لڑکی دونوں مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ ”نفس“ کا لفظ زبان عرب میں مؤنث ہے، سو معنی ہوگا:

وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے ﴿۳۲﴾

''اور جب زندہ درگور کی ہوئی جان سے سوال کیا جائے گا۔'' اور اگرچہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ وہ لڑکی کو غیرت کی وجہ سے قتل کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہو سکتا۔ اس نے مطلق اولاد لڑکے لڑکی دونوں کا ذکر فرمایا ہے اور قتل کا سبب موجودہ فقر یا آئندہ فقر کا خوف بیان فرمایا ہے، ہاں یہ درست ہے کہ اولاد کو قتل کا باعث فقر کے علاوہ بے جا غیرت بھی تھا۔ ''نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ'' اور ''نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ'' میں تقدیم و تاخیر کی حکمت اور دوسرے فوائد کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۵۱) ''خِطْأً'' اور ''اِثْمٌ'' کا وزن اور معنی ایک ہی ہے، یعنی دانستہ گناہ۔

آیت 32 وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى......: ① ''فَاحِشَةً'' ایسا قول و فعل جو نہایت قبیح ہو۔ پچھلی آیت میں قتلِ اولاد سے منع فرمایا، جو نسلِ انسانی فنا کرنے کا باعث ہے اور اس آیت میں زنا کے قریب جانے سے منع فرمایا، کیونکہ یہ حد سے بڑھی ہوئی برائی کے ساتھ نسب کا نظام خراب کرنے کا باعث ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاوند کو نہ بیوی پر اعتماد رہے گا اور نہ اسے اولاد کے اپنا ہونے کا یقین ہوگا، وہ غیرت کی وجہ سے بیوی بچوں کو قتل بھی کر سکتا ہے، جیسا کہ اکثر خبریں آتی رہتی ہیں۔ اگر یہ رسم بد عام ہو جائے تو رشتہ داری کا سارا نظام، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، ختم ہو جائے گا، نہ باپ کا پتا، نہ کوئی چچا نہ دادا، نہ ان کی اولاد کا علم، نہ ان سے کوئی تعلق نہ رشتہ داری، بلکہ انسان اور حیوان کا فرق ہی ختم ہو جائے گا۔ اس خبیث فعل کی سزا اس وقت مغربی اقوام بھگت رہی ہیں اور انھیں مسلمانوں کے نظام نسب پر شدید حسد ہے، جس کی وجہ سے وہ ان میں بھی بے حیائی اور زنا پھیلانے کا ہر حربہ استعمال کر رہے ہیں۔

② اللہ تعالیٰ نے زنا اور بعض دوسرے کاموں کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے اور بعض کاموں کا ارتکاب کرنے سے منع کیا ہے۔ آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کام کی رغبت طبعی طور پر آدمی کے دل میں ہو اس کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا، جیسے زنا کہ جنسی جذبہ آدمی کا سب سے غالب جذبہ ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى﴾ [ بنی إسرائیل : ۳۲ ] اور فرمایا: ﴿وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ [ البقرۃ : ۲۲۲ ] ''اور ان کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔'' اسی طرح یتیم کے مال کے قریب احسن طریقے سے جانے کے سوا منع فرما دیا، کیونکہ مال کی حرص طبعی جذبہ ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [ بنی إسرائیل : ۳٤ ] البتہ قتل کے ارتکاب سے منع کیا، فرمایا: ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ [ بنی إسرائیل : ۳۱ ] اور فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ [ بنی إسرائیل : ۳۳ ] کیونکہ کسی کو قتل کرنا انسان کا طبعی تقاضا نہیں ہے۔

③ اللہ تعالیٰ نے زنا کے تمام راستے بھی بند فرما دیے جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے: ① اجنبی عورت کے ساتھ خلوت حرام فرما دی، اسی طرح مردوں کو عورتوں سے عام میل جول سے بھی منع فرما دیا۔ چنانچہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ وَلَا يَدْخُلُ عَلَيْهَا رَجُلٌ إِلَّا وَ مَعَهَا مَحْرَمٌ » [ بخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء : ۱۸٦۲ ] ''کوئی عورت سفر نہ کرے مگر کسی محرم کے ساتھ اور اس کے پاس کوئی مرد نہ جائے مگر اس صورت میں کہ اس عورت کے پاس کوئی محرم موجود ہو۔'' مسلم کی اسی روایت میں ہے: « لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ » [ مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره : ۱۳٤۱ ] ''کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ اکیلا نہ ہو۔'' اسی طرح عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِيَّاكُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَى النِّسَاءِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! أَفَرَأَيْتَ الْحَمْوَ؟ قَالَ الْحَمْوُ الْمَوْتُ » [ بخاري، النكاح، باب لا يخلون رجل بامرأة...... : ٥٢٣٢۔ مسلم : ۲۱۷۲ ] ''عورتوں کے پاس جانے سے بچو۔'' ایک انصاری آدمی نے پوچھا: ''آپ ''حَمْوٌ'' (خاوند کے قریبی مثلاً اس کے بھائی یا چچا زاد یعنی کزن وغیرہ) کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟'' فرمایا: ''حمو'' تو موت ہے (مطلب یہ کہ اس کا زنا تو بعض اوقات موت تک پہنچا دیتا ہے)۔'' ② مردوں اور عورتوں دونوں کو نگاہ نیچی رکھنے اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کا حکم دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نور (۳۰، ۳۱) کیونکہ آنکھیں اور کان دل کا دروازہ ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا، أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ، وَ زِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ، وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِيْ، وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ كُلَّهُ وَ يُكَذِّبُهُ » [ بخاري، الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج : ٦٢٤٣۔ مسلم: ۲٦٥۷ ] ''اللہ نے ابن آدم پر زنا میں سے اس کا حصہ لکھ دیا ہے، جسے وہ لامحالہ پانے والا ہے، پس آنکھوں کا زنا ان کا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا ان کا سننا ہے، زبان کا زنا بولنا ہے اور نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب۔'' ③ عورتوں کو پردے کا حکم دیا اور زینت کے اظہار سے سخت منع فرمایا۔ دیکھیے سورۂ نور (۳۱) اور سورۂ احزاب (۳۳) اس کے ساتھ ہی مردوں اور عورتوں کے نکاح کی تاکید فرمائی اور نکاح کو نہایت آسان بنا دیا، اگر وسائل مہیا نہ ہوں تو پاک دامن رہنے کی انتہائی کوشش کا حکم دیا۔ دیکھیے سورۂ نور (۳۲، ۳۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَ أَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ » [ بخاري، الصوم، باب الصوم لمن خاف على نفسه العزبة : ۱۹۰٥۔ مسلم : ۱٤۰۰ ] ''تم میں سے جو شخص ضروریات نکاح رکھتا ہو وہ نکاح کرے، کیونکہ یہ نظر کو نیچا رکھنے اور شرم گاہ کو (زنا سے) محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے اور جو طاقت نہ رکھے وہ روزے کو لازم پکڑے، کیونکہ وہ اس کے لیے (شہوت کو) کچلنے کا باعث ہے۔'' ④ زنا کرنے والوں پر، مرد ہوں یا عورت، انتہائی احتیاط کے ساتھ ثبوت قائم کرنے اور پوری شدت کے ساتھ حد نافذ کرنے کا حکم دیا۔ کنواری اور کنوارے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی کی حد مقرر فرمائی، جو رجم سے بہت کم ہے اور غیر کنوارے مرد اور عورت کے لیے سو کوڑے اور رجم کی سزا مقرر فرمائی جو انتہائی سخت سزا ہے۔ اس کی واضح احادیث صحیحین وغیرہ میں معروف ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اللہ کی حد نافذ ہو تو معاشرہ اس گندگی سے بالکل پاک ہو جائے۔

❺ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً: ''كَانَ'' دوام کے معنی کے لیے ہے۔ طنطاوی رحمہ اللہ نے اس جگہ ''كَانَ'' کو ''مَا زَالَ'' (ہمیشہ سے)

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ

اور اس جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو شخص قتل کر دیا جائے، اس حال میں کہ

سے) کے معنی میں لیا ہے اور "فَاحِشَةً" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔" ظاہر ہے کہ زنا بے حیائی میں حد سے بڑھا ہوا کام ہے جو خاندانوں، نسلوں اور معاشروں کو برباد کر دیتا ہے اور خوفناک جسمانی اور روحانی بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔

5 وَسَآءَ سَبِيْلًا : برا راستہ اس لیے ہے کہ اگر یہ کھل جائے تو اس پر چل کر لوگ آپ کے گھر بھی آ پہنچیں گے، پھر کسی کی ماں، بیٹی، بیوی یا بہن کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ یہی بات آپ ﷺ نے اس نوجوان کو سمجھائی تھی جس نے آپ سے زنا کی اجازت مانگی تھی۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "ایک نوجوان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے زنا کی اجازت چاہی۔ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے، اسے ڈانٹا اور کہا کہ خاموش ہو جا، تاہم آپ ﷺ نے فرمایا: « اُدْنُهْ » (میرے) قریب آ۔" وہ قریب آیا اور جب بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: « أَتُحِبُّهُ لِأُمِّكَ؟ » "کیا تو اس کام کو اپنی ماں کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے (ہرگز نہیں)۔" آپ نے فرمایا: « وَلَا النَّاسُ يُحِبُّوْنَهُ لِأُمَّهَاتِهِمْ » "تو لوگ بھی اس کام کو اپنی ماں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ نے فرمایا: « أَفَتُحِبُّهُ لِابْنَتِكَ؟ » "اچھا تو اسے اپنی بیٹی کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے (ہرگز نہیں)۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَلَا النَّاسُ يُحِبُّوْنَهُ لِبَنَاتِهِمْ » "لوگ بھی اس کام کو اپنی بیٹیوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: « أَفَتُحِبُّهُ لِأُخْتِكَ؟ » "کیا تو اس کام کو اپنی بہن کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَلَا النَّاسُ يُحِبُّوْنَهُ لِأَخَوَاتِهِمْ » "لوگ بھی اس کام کو اپنی بہنوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے پوچھا: « أَفَتُحِبُّهُ لِعَمَّتِكَ » "کیا تو اس کام کو اپنی پھوپھی کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: « وَلَا النَّاسُ يُحِبُّوْنَهُ لِعَمَّاتِهِمْ » "لوگ بھی اس کام کو اپنی پھوپھیوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے پوچھا: « أَفَتُحِبُّهُ لِخَالَتِكَ؟ » "کیا تو اس کام کو اپنی خالہ کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے (ہرگز نہیں)۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَلَا النَّاسُ يُحِبُّوْنَهُ لِخَالَاتِهِمْ » "لوگ بھی اس کام کو اپنی خالاؤں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور یہ دعا کی: « اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهُ، وَ طَهِّرْ قَلْبَهُ وَ حَصِّنْ فَرْجَهُ » "الٰہی! اس کے گناہ بخش، اس کے دل کو پاک کر اور اسے عصمت والا بنا۔" پھر تو یہ حالت تھی کہ یہ نوجوان ایسے کسی کام کی طرف نہیں جھانکتا تھا۔" [ مسند أحمد : ۵/ ۲۵۶، ۲۵۷، ح : ۲۲۲۷۴ ]

آیت 33 1 وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ...... : انسانی جان اور عزت کی حفاظت کے لیے قتل اولاد اور زنا کے

سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

مظلوم ہو تو یقیناً ہم نے اس کے ولی کے لیے پورا غلبہ رکھا ہے۔ پس وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے، یقیناً وہ مدد دیا ہوا ہوگا ﴿۳۳﴾

قریب جانے سے منع کرنے کے بعد اب کسی بھی شخص کو ناحق قتل کرنے سے منع فرمایا۔ قتل مسلم کب ناحق ہے اور کب حق؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَّا بِإِحْدٰى ثَلَاثٍ النَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالثَّيِّبُ الزَّانِيْ، وَالْمُفَارِقُ لِدِيْنِهِ التَّارِكُ لِلْجَمَاعَةِ » [ بخاري، الديات، باب قول الله تعالٰى : ﴿ إن النفس بالنفس ...... ﴾ : ۶۸۷۸، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ ] ”کسی مسلمان کو، جو کلمہ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ پڑھتا ہو، قتل کرنا حلال نہیں، مگر تین چیزوں میں سے کسی ایک کے ساتھ، جان کے بدلے جان، غیر کنوارا زانی اور اپنے دین کو ترک کرنے والا، جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والا۔“ مگر یہ حصر حقیقی نہیں ہے، کیونکہ بعض دوسرے جرائم میں بھی قتل کا جواز ثابت ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو گالی دینا اور محرم کے ساتھ نکاح کرنا وغیرہ۔ ( بخاری: ۱۸۴۶۔ ابوداؤد: ۴۴۵۶ ) اس قتل میں خودکشی بھی داخل ہے، یعنی اپنے آپ کو قتل کرنا بھی جائز نہیں۔ (دیکھیے نساء: ۲۹ ) قتل عمد کی قباحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۂ نساء ( ۹۳ )۔

② وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا : اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دے تو مقتول کے ولی کو اللہ تعالیٰ نے پورا اختیار دیا ہے کہ چاہے تو قصاص لے لے، چاہے دیت لے لے، یا دیت کے بغیر معاف کر دے۔ ”سُلْطٰنًا“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلم حکمران پر لازم ہے کہ وہ اسے ان تینوں باتوں کا اختیار دے، پھر اگر وہ قصاص لینا چاہے تو اسے قصاص دلوائے، اگر قاتل یا اس کے ساتھی مزاحمت کریں تو شریعت کی بغاوت پر ان سے جنگ کرے۔ یہ قصاص معاشرے میں سے قتل ناحق کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ ( ۱۷۸، ۱۷۹ ) کفار کے معاشروں میں بدامنی اور بے شمار قتل قصاص نہ ہونے ہی کی وجہ سے ہیں۔ اب مسلم حکمرانوں نے بھی ایک آدھ کے علاوہ قصاص کے حکم اور اس کے شرعی طریقے کو چھوڑ کر کفار کا قانون اپنایا تو اس کے نتیجے میں وہ بھی امن کے بجائے خوف اور بدامنی کا شکار ہوگئے۔ کفار کے ملکوں کی طرح نہ وہاں کسی کی جان محفوظ ہے، نہ مال، نہ عزت و آبرو اور اسے ترقی قرار دیا جا رہا ہے۔

③ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ : قصاص لیتے وقت قتل میں زیادتی یہ ہے کہ قاتل کے بجائے کسی اور کو قتل کر دے، یا قاتل کے ساتھ انھیں بھی قتل کرے جو قتل میں شریک نہیں ہیں، یا قتل سے پہلے مثلہ کرے، یعنی اس کے اعضا کاٹے یا مختلف طریقوں سے تکلیف دے دے کر مار دے۔ اس میں صرف یہ استثنا ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے قتل کیا ہے اس طریقے سے اسے قتل کر سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ ( ۱۹۴ )، سورۂ نحل ( ۱۲۶ ) اور سورۂ بقرہ کی آیات قصاص ( ۱۷۸، ۱۷۹ )۔

④ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا : یعنی مسلم حکومت اور تمام مسلمان اس کی مدد کریں گے، ان سب پر اس کی مدد لازم ہے، بلکہ اللہ

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کا سوال ہوگا ﴿۳۴﴾ اور ماپ کو پورا کرو، جب ماپو اور سیدھی ترازو کے ساتھ وزن کرو۔ یہ بہترین ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت زیادہ اچھا ہے ﴿۳۵﴾ اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک، اس کے متعلق سوال ہوگا ﴿۳۶﴾

تعالیٰ بھی دنیا اور آخرت میں اس کی نصرت فرمائے گا۔

**آیت 34** ❶ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ...... : احسن یہ کہ ہر طرح اس کی حفاظت کرو، اسے کسی کاروبار میں لگا کر بڑھانے کی کوشش کرو، جب جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے سپرد کر دو، یا اس سے اجازت لے کر کاروبار کرو۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ نساء (۲ تا ۱۴) میں ملاحظہ فرمائیں۔

❷ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ...... : اس میں وہ عہد شامل ہے جو اللہ تعالیٰ سے یا بندوں سے کیا جائے، کیونکہ عہد کے متعلق سوال ہوگا اور جو عہد و اقرار توڑے گا اسے سزا ملے گی۔

**آیت 35** وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ ...... : "الْكَيْلَ" سے مراد کسی برتن وغیرہ کو پیمانہ بنا کر غلہ وغیرہ کو ماپنا، مثلاً صاع (ٹوپا) اور مد (پڑوپی) وغیرہ۔ وزن کا معنی تولنا، مثلاً کلو وغیرہ۔ "اَلْقِسْطَاسُ" ترازو۔ مجاہد نے فرمایا، رومی میں قسطاس عدل کو کہتے ہیں۔ "تَاْوِيْلًا" (انجام) یہ "اَوْلٌ" سے مشتق ہے جس کا معنی رجوع ہے، یعنی کوئی کام جس نتیجہ کی طرف پلٹتا ہے، تعبیر کو بھی تاویل کہتے ہیں اور کسی چیز کے اصل مفہوم و مطلب کو بھی۔ انجام کے لحاظ سے بہتر اس لیے کہ پورے ماپ اور تول کی وجہ سے سب لوگوں کا اس پر اعتماد قائم ہو جائے گا، اس کے کاروبار میں برکت اور ترقی ہوگی اور یہ شخص قیامت کے دن کی رسوائی اور لوگوں کے حقوق کے مطالبہ سے محفوظ رہے گا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مطففین کی ابتدائی آیات۔

**آیت 35** ❶ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ : "لَا تَقْفُ" "قَفَا يَقْفُوْ" (ن) سے نہی کا صیغہ ہے، جس کا معنی پیچھے چلنا ہے۔ "قَفَوْتُ اَثَرَ فُلَانٍ" "میں فلاں کے نقش قدم پر چلا۔" "قَفَا" گردن کے پچھلے حصے (گدی) کو کہتے ہیں، قافیہ ہر شعر کے آخر میں آنے والا لفظ۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک مبارک نام "اَلْمُقَفِّيْ" بھی ہے، یعنی سب سے پیچھے آنے والا۔ (مستدرک حاکم: ۲؍۱۸۵) یعنی جس قول یا فعل کے درست ہونے کا علم یعنی یقین نہ ہو اس کا پیچھا مت کرو، مطلب یہ کہ نہ خود اس پر عمل کرو نہ

وَ لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک تو نہ کبھی زمین کو پھاڑے گا اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچے گا ﴿۳۷﴾

آگے کسی کو بتاؤ۔ علم وہ ہے جس کا یقین ہو، صرف گمان کے پیچھے چلنا منع ہے، کیونکہ گمان علم نہیں ہوتا، فرمایا: ﴿ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ﴾ [ النجم : ۲۸ ] ”حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں۔“ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ » [ بخاری، الأدب، باب : ﴿ يأيها الذين امنوا اجتنبوا كثيرا من الظن...... ﴾ : ۶۰۶۶ ] ”گمان سے بچو، یقیناً گمان سب سے جھوٹی بات ہے۔“ اسی طرح سنی سنائی بات بلا تحقیق بیان کرنا بھی منع ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ » [ مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع : ۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر وہ بات آگے بیان کر دے جو اس نے سنی ہو۔“ علاوہ ازیں جھوٹی گواہی، کوئی بھی تہمت، جھوٹا خواب بیان کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس کے صحیح ہونے کا علم ہونے کے بغیر بیان کرنا، قرآن و حدیث کی موجودگی میں کسی کی شخصی رائے یا قیاس پر عمل کرنا (تقلید کرنا) یہ سب چیزیں اس میں شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب سے منع فرمایا ہے۔

❷ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ ...... : یہاں ”كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا“ سے مراد وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس کے کان، آنکھیں اور دل ہیں، یعنی آدمی سے ان تینوں چیزوں میں سے ہر ایک کے بارے میں سوال کیا جانے والا ہے کہ تو نے ان اعضا کو کہاں استعمال کیا ہے؟ جس چیز کا علم نہیں تھا اس کا پیچھا کرنے میں اللہ کے عطا کردہ اعضا کیوں استعمال کیے؟ (دیکھیے حجر : ۹۲، ۹۳) اور ”كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا“ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کان، آنکھیں اور دل میں سے ہر ایک سے خود اس کے متعلق سوال ہونے والا ہے کہ بتاؤ تمھیں اس شخص نے کہاں اور کیسے استعمال کیا۔ دیکھیے سورۂ یٰسٓ (۶۵) اور حٰمٓ السجدہ (۱۹ تا ۲۳) بہرحال قرآن کی آیات میں یہ دونوں مفہوم موجود ہیں، دونوں صورتوں میں قیامت کے دن کی اس ہولناک پیشی سے ڈرایا گیا ہے۔ اس آیت کی ہم معنی یہ آیات بھی ملاحظہ فرمائیں سورۂ اعراف (۳۳) اور سورۂ بقرہ (۱۶۸، ۱۶۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ چند الفاظ اسلام کے مکمل منہج کی ترجمانی کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اس بات کی اپنی حد تک پوری تحقیق کر لے کہ میری زبان جو بات کہہ رہی ہے، یا واقعہ بیان کر رہی ہے، یا روایت نقل کر رہی ہے، یا میری عقل جو فیصلہ کر رہی ہے، یا جو کچھ میں نے قطعی طے کیا، یا جو کام میں کرنے جا رہا ہوں اس کا مجھے پورا علم ہے اور میں اس کے نتائج کو پوری طرح جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے بات کا رخ تکبر سے ممانعت کی طرف موڑ دیا، کیونکہ یہ انسان کے اپنی حقیقت سے حد سے زیادہ لاعلم ہونے کی دلیل ہے۔

آیت 37 ❶ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا : ”مَرَحًا“ اصل میں حد سے بڑھی ہوئی خوشی کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ تکبر اور لوگوں سے اونچا ہونے کا اظہار ہو۔ ”فِي الْاَرْضِ“ سے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ تو اسی زمین سے پیدا ہوا اور اسی کی آغوش میں سمٹ جائے گا۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۵۵۔ مرسلات : ۲۵ تا ۲۷) پھر اس پر یہ تکبر کیسا؟ اسلام کے سکھائے ہوئے

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

یہ سب کام، ان کا برا تیرے رب کے ہاں ہمیشہ سے ناپسندیدہ ہے ﴿۳۸﴾

ادب کے مطابق اپنی چال میں تواضع اور میانہ روی اختیار کر۔ دیکھیے سورۂ لقمان (۱۸، ۱۹) اور فرقان (۶۳)۔

❷ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ...... : اس میں انسان کو مذاق کے انداز میں اس کی حیثیت یاد دلائی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے تکبر کا برا انجام بہت سی احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا، وَنَعْلُهٗ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر وبيانه : ۹۱ ] ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر کبر ہوگا۔“ ایک آدمی نے کہا: ”آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا خوبصورت ہو اور اس کا جوتا خوبصورت ہو؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے، کبر تو حق کا انکار اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔“ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ )) [ بخاري، اللباس، باب من جر إزاره...... : ۵۷۸۴۔ مسلم : ۲۰۸۵ ] ”اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو نہیں دیکھے گا جو اپنی چادر تکبر سے کھینچے۔“

افسوس کہ مسلمان مردوں نے کفار کی تقلید میں اپنی شلواریں، پتلونیں ٹخنوں سے نیچے رکھنے کو عادت بنا لیا ہے اور عذر یہ کرتے ہیں کہ ہم تکبر سے ایسا نہیں کرتے، حالانکہ اگر بے دھیانی میں بے اختیار کپڑا لٹک جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے تکبر سے ایسا نہیں کیا، لیکن جان بوجھ کر لمبی شلوار سلوانا اور اسے جان بوجھ کر ٹخنوں سے نیچے رکھنا صاف رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور واضح تکبر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے از خود چادر لٹکانے ہی کو تکبر میں شمار کیا ہے، چنانچہ جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( وَارْفَعْ إِزَارَكَ إِلٰى نِصْفِ السَّاقِ فَإِنْ أَبَيْتَ فَإِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِيَّاكَ وَإِسْبَالَ الْإِزَارِ فَإِنَّهَا مِنَ الْمَخِيْلَةِ وَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيْلَةَ )) [ أبو داؤد، اللباس، باب ما جاء في إسبال الإزار : ۴۰۸۴ ] ”اور اپنی چادر نصف پنڈلی تک اٹھاؤ، پھر اگر تم نہیں مانتے تو ٹخنوں تک اور (ٹخنوں سے نیچے) چادر لٹکانے سے بچو، کیونکہ یقیناً یہ تکبر سے ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔“ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ بے دین لوگوں کا تو کہنا ہی کیا ہے، آج کل بہت سے لوگ بلکہ کئی جماعتیں جو پاکستان ہیں، بلکہ دنیا بھر میں اقامت دین کا علم اٹھائے ہوئے ہیں، ان کے مرد دھڑلے سے اپنے ٹخنے سے نیچے کپڑا رکھتے ہیں، بلکہ کپڑا اٹھانے والوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں، اس کے برعکس مسلم عورتوں کی اکثریت جنھیں اپنے پاؤں تک چھپانے تھے وہ کپڑا اٹھا کر اپنے حسن کی نمائش کر کے اللہ تعالیٰ کی لعنت کا نشانہ بن رہی ہے۔

**آیت 38** ❶ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ...... : ”لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ“ سے لے کر ”وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا“ تک پچیس چیزیں بیان فرمائی ہیں، جن میں سے بعض کا حکم دیا گیا ہے اور بعض سے منع کیا گیا ہے۔ ان میں ”سَيِّئٌ“ (بری) وہ ہیں جن سے منع کیا گیا ہے اور وہ چیزیں جن پر عمل کا حکم ہے انھیں بجا نہ لانا بھی ”سَيِّئٌ“ (برا) ہے۔ ان تمام چیزوں میں

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ ع

یہ اس میں سے ہیں جو تیرے رب نے حکمت میں سے تیری طرف وحی کی اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود مت بنا، پس تو ملامت کیا ہوا، دھتکارا ہوا جہنم میں ڈال دیا جائے گا ﴿۳۹﴾ پھر کیا تمھارے رب نے تمھیں بیٹوں کے ساتھ چن لیا اور خود فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالی ہیں؟ بے شک تم یقیناً ایک بہت بڑی بات کہہ رہے ہو ﴿۴۰﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر بیان کیا، تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں اور وہ انھیں نفرت کے سوا کچھ زیادہ نہیں کرتا ﴿۴۱﴾

سے جو بری ہیں وہ ہمیشہ سے اللہ کے ہاں مکروہ (ناپسندیدہ) ہیں۔ ہمیشگی کا مفہوم "کَانَ" ادا کر رہا ہے۔

② مَكْرُوْهًا : مکروہ کا لفظ فقہاء کی اصطلاح میں حرام سے کم تر درجے کا ہے، یعنی جس کا نہ کرنا اس کے کرنے سے بہتر ہو مگر قرآن و سنت کی اصطلاح میں مکروہ کا لفظ اکثر حرام کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ ان آیات میں منع کردہ تمام چیزیں حرام ہیں، فقہی اصطلاح والی مکروہ نہیں ہیں۔ اس لیے صحیح بخاری اور ترمذی وغیرہ میں باب قائم کرتے وقت لفظ کراہیت لکھا جاتا ہے مگر مراد اس سے حرمت ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات کتاب و سنت میں مکروہ کا لفظ فقہاء والے مکروہ کے معنی میں آتا ہے، مگر اکثر مقامات پر مکروہ کا لفظ حرام ہی کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ زیر تفسیر تمام آیات میں ہے۔

آیت 39 ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ ...... : نصیحت کی ابتدا "لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ" سے ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ بات ختم فرمائی۔ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۲۲) کی تفسیر۔

آیت 40 اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ ...... : اس آیت میں مشرکین عرب کی جہالت پر طنز ہے، جو یہ کہہ کر فرشتوں کی عبادت کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ دیکھیے سورۂ نجم (۲۱، ۲۲، ۲۷، ۲۸)، زخرف (۱۹) اور نحل (۵۷، ۵۸) فرمایا کتنی بڑی بات کہہ رہے ہو کہ وہ جو ہر شے کا خالق و مالک ہے، اس نے تمھیں اولاد میں سے بیٹوں کے لیے خاص کر لیا جو افضل ہیں اور اپنے لیے بیٹیاں بنالیں جنھیں تم نہایت ردی اور باعث عار سمجھتے ہو اور بعض اوقات زندہ دفن کرنے سے بھی باز نہیں آتے، یقیناً یہ بہت بڑی گستاخی کی بات ہے۔ اگر اس نے اولاد بنانی ہی تھی تو وہ جس طرح کی چاہتا بنا لیتا، پھر وہ محض بیٹیاں ہی کیوں رکھتا؟ (دیکھیے زمر: ۴) وہ تو بیٹے بیٹیوں سے ہے ہی پاک، کیونکہ یہ محتاجی کی دلیل ہے۔ دیکھیے سورۂ اخلاص کی تفسیر، سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت اور مریم کی آیات (۸۸ تا ۹۵)۔

آیت 41 وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ ...... : "نُفُوْرًا" کا معنی نفرت، بدکنا، دور بھاگنا ہے۔ اس قرآن میں پھیر پھیر

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ

کہہ دے اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش والے کی طرف کوئی راستہ ضرور ڈھونڈتے ﴿۴۲﴾ پاک ہے وہ اور بہت بلند ہے اس سے جو یہ کہتے ہیں، بہت زیادہ بلند ہونا ﴿۴۳﴾ ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھی جو ان میں ہیں اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور

کر بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ضروری بات کو تکرار کے ساتھ مختلف طریقوں سے بار بار بیان کیا ہے، تاکہ ان لوگوں کو نصیحت ہو، مگر نصیحت تو سننے سے ہوتی ہے، جب کہ یہ لوگ جس قدر سنانے کی کوشش کی جائے اسی قدر دور بھاگتے ہیں، سننا ہی نہیں چاہتے، پھر مانیں گے کیسے؟

**آیت 42** ❶ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ ...... : یعنی اس سے لڑنے اور اس کا تخت الٹ دینے کے لیے جاتے، کیونکہ وہ بھی اپنے کو معبود سمجھتے ہوتے اور جب ایسا نہیں ہوا اور تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا نظام خالص اپنی مرضی سے چلا رہا ہے اور یہ نظام اپنی پوری ہم آہنگی اور تناسب سے چل رہا ہے تو معلوم ہوا کہ اس کے مقابلے میں تم نے جتنی زندہ یا مردہ ہستیوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، وہ سب باطل و بے حقیقت چیزیں ہیں۔ اس آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون (۹۱، ۹۲) اور انبیاء (۲۲)۔

❷ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عرش پر ہونا صرف رب تعالیٰ کی صفت ہے، کوئی بھی مخلوق عرش پر نہیں جا سکتی، جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ عرش پر گئے ان کی بات درست نہیں، کیونکہ یہ آیت اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی شخصیت کے عرش پر جانے کی کوئی دلیل ثابت نہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں؟ اس کی بحث سورۂ نجم کے شروع میں آئے گی۔ (ان شاء اللہ)

**آیت 43** سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا : یعنی مشرکین جو اللہ کے ساتھ کوئی معبود بناتے ہیں، یا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی باتوں سے ہر طرح پاک اور بے حد بلند ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کی کوئی مجال نہیں، وہی اس کائنات کا بلا شرکت غیر خود مختار مالک و حاکم ہے۔

**آیت 44** ❶ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ...... : زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہی ہے۔ "سَبَحَ يَسْبَحُ" (ف) کا معنی پانی یا ہوا میں تیزی سے چلنا ہے۔ "سَبَحَ سَبْحًا وَ سِبَاحَةً" ستاروں کا افلاک میں تیز چلنا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [ یٰسٓ : ۴۰ ] "اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔" گھوڑے کا تیز چلنا، فرمایا: ﴿ وَ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا ﴾ [ النازعات : ۳ ] البتہ باب تفعیل "اَلتَّسْبِيْحُ" کا معنی

مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ ہمیشہ سے بے حد بردبار، نہایت بخشنے والا ہے ﴿۴۴﴾

اللہ تعالیٰ کی تنزیہ، یعنی اسے ہر عیب اور کمی سے پاک قرار دینا ہے۔ اصل اس کا بھی اطاعت، عبادت اور پاکیزگی بیان کرنے میں مستعدی و تیزی دکھانا ہے۔ (ملخص از راغب) بعض مفسرین نے کہا، مراد یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہی ہیں، یعنی ان کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انھیں بنانے والا ہر قسم کے عیب سے یا عاجز ہونے سے پاک ہے۔ مگر اس تاویل کی ضرورت تب ہے کہ یہ تمام چیزیں اپنی زبان سے تسبیح نہ کر سکتی ہوں، حالانکہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ہر چیز میں ادراک اور سمجھ موجود ہے اور اسے اپنی عبادت اور تسبیح کا طریقہ بھی معلوم ہے، لیکن ان کی اپنی زبان ہے جسے ہم نہیں سمجھتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں موجود ہر شخص اور پر پھیلاتے ہوئے پرندوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں اور اس کے بعد فرمایا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ﴾ [النور: ٤١] ''ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے۔'' اور فرمایا: ﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ۝ وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗ اَوَّابٌ﴾ [ص: ١٨، ١٩] ''بے شک ہم نے پہاڑوں کو اس کے ہمراہ مسخر کر دیا، وہ دن کے پچھلے پہر اور سورج چڑھنے کے وقت تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی، جب کہ وہ اکٹھے کیے ہوتے، سب اس کے لیے رجوع کرنے والے تھے۔'' داؤد اور سلیمان ؑ کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولی بھی سکھا دی تھی۔ (دیکھیے نمل: ۱۶) بلکہ چیونٹیوں اور پرندوں کے ساتھ ان کی گفتگو بھی سورۂ نمل (۱۷ تا ۲۸) میں ذکر فرمائی۔ اس مقام پر بھی فرمایا: ''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔'' معلوم ہوا کہ مراد زبانِ حال سے تسبیح نہیں، کیونکہ یہ زبان تو ہر شخص سمجھتا ہے اور فی الواقع کائنات کے ہر ذرے کی حالت اپنے پیدا کرنے والے کی لامحدود قدرت کی اور اس کے ہر کمزوری اور ہر عیب سے پاک ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس لیے یہاں ہر چیز کا صرف اپنی زبانِ حال ہی سے نہیں بلکہ اپنی زبانِ قال سے بھی تسبیح کرنا مراد ہے اور یہ کچھ بعید نہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( وَلَقَدْ كُنَّا نَسْمَعُ تَسْبِيْحَ الطَّعَامِ وَهُوَ يُؤْكَلُ )) [ بخاري، المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام: ٣٥٧٩ ] ''ہم (رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں) کھانے کی تسبیح سنتے تھے، جب کہ وہ کھایا جا رہا ہوتا تھا۔'' جمادات و نباتات کے سمجھ رکھنے، محبت اور بغض رکھنے اور تسبیح کے مزید واقعات کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۷۴)۔

❷ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا : اسی لیے وہ تمھاری سب گستاخیاں اور نافرمانیاں دیکھتا ہے، مگر قدرت رکھنے کے باوجود تم سے درگزر فرماتا ہے اور تم پر کوئی عذاب نہیں بھیجتا، بلکہ نہ تمھارا رزق بند کرتا ہے اور نہ تمھیں اپنی نعمتوں سے محروم کرتا ہے، اگر اس کا حد سے بڑھا ہوا یہ حلم اور پردہ پوشی نہ ہوتی تو تمھارا کام کب کا تمام ہو چکا ہوتا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۶۱) اور سورۂ فاطر (۴۵)۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

اور جب تو قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک پوشیدہ پردہ بنا دیتے ہیں ﴿۴۵﴾ اور ہم نے ان کے دلوں پر کئی پردے بنا دیے ہیں، (اس سے) کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ۔ اور جب تو قرآن میں اپنے رب کا، اکیلے اسی کا ذکر کرتا ہے تو وہ بدکتے ہوئے اپنی پیٹھوں پر پھر جاتے ہیں ﴿۴۶﴾

**آیت 45، 46** ① وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا ...... : "اَكِنَّةً" "كِنَانٌ" کی جمع ہے، چھپانے والی چیز، پردہ۔ "وَقْرًا" بوجھ، مراد بہرا پن ہے۔ "نُفُوْرًا" "نَافِرٌ" کی جمع ہے، بدکتے ہوئے۔ مصدر بھی ہو سکتا ہے، نفرت کی وجہ سے، یعنی جب انھوں نے آخرت سے انکار کیا اور پھر ضد اور ہٹ دھرمی میں اس قدر بڑھ گئے کہ ہزار سمجھانے کے باوجود انکار کرتے ہی چلے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اور آپ ﷺ کے درمیان ایک گہرا پردہ حائل ہو گیا، ان کے دلوں پر غلاف چڑھ گئے، مگر ایسے جو کسی کو نظر نہیں آتے، نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور ان کے کان ہر نصیحت کرنے والے کی بات سننے سے بہرے ہو گئے، مگر وہ بدبخت ان پردوں کے حائل ہونے اور قرآن کی تاثیر سے محروم ہونے پر فکر کے بجائے فخر ہی کرتے رہے اور مذاق اڑاتے رہے۔ یہود کا بھی یہی حال تھا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۸۸) مشرکین کا حال اللہ تعالیٰ نے سورۂ حٰم السجدہ (۵) میں بیان فرمایا ہے۔ اگرچہ اس پردے کا باعث ان کی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی تھی مگر چونکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے فرمایا کہ آپ کے قرآن پڑھتے وقت ہم یہ پردہ بنا دیتے ہیں۔

ایک معنی اس آیت کا یہ بھی ہے کہ آپ جب قرآن پڑھتے ہیں اور بعض کفار آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے آتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان کے درمیان ایک ایسا پردہ حائل کر دیتے ہیں جو نظر نہیں آتا، اس پردے کی وجہ سے وہ آپ کو دیکھ نہیں سکتے اور نہ آپ کو کوئی نقصان یا تکلیف ہی پہنچا سکتے ہیں۔ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب سورۂ لہب اتری تو عوراء ام جمیل (ابولہب کی بیوی) بڑے جوش سے ہاتھ میں پتھر پکڑے ہوئے آئی اور وہ یہ کہہ رہی تھی: " مُذَمَّمًا أَبَيْنَا، وَأَمْرَهُ عَصَيْنَا وَ دِيْنَهُ قَلَيْنَا " (ہم مذمم کو نہیں مانتے اور اس کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے اور اس کے دین سے دشمنی رکھتے ہیں) رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! یہ عورت آ رہی ہے، مجھے خوف ہے کہ یہ آپ کو دیکھ لے گی۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ مجھے ہرگز نہیں دیکھے گی" اور آپ نے اس سے بچنے کے لیے قرآن کی چند آیات پڑھیں، ان میں سے ایک آیت یہ بھی تھی: ﴿ وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴾ غرض وہ آئی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہو گئی، مگر اس نے رسول اللہ ﷺ کو

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝

ہم اس (نیت) کو زیادہ جاننے والے ہیں جس کے ساتھ وہ اسے غور سے سنتے ہیں، جب وہ تیری طرف کان لگاتے ہیں اور جب وہ سرگوشیاں کرتے ہیں، جب وہ ظالم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تم پیروی نہیں کرتے مگر ایسے آدمی کی جس پر جادو کیا گیا ہے ۝ دیکھ انھوں نے کس طرح تیرے لیے مثالیں بیان کیں۔ پس گمراہ ہوگئے، سو وہ کسی راہ پر نہیں آ سکتے ۝ اور انھوں نے کہا کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم ضرور نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جانے والے ہیں ۝

نہیں دیکھا۔ مختصر یہ کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے چند باتوں کے بعد وہ چلی گئی۔ [ مسند أبي يعلى : ۲۵۔ مستدرك حاكم : ۳۶۱/۲، ح : ۳۳۷۶ ] حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت فرمائی، اس کے کئی شواہد ہیں، ارنووط کی ابن حبان (۶۵۱) پر تعلیق ملاحظہ فرمائیں۔ بہر حال پہلا معنی اور دوسرا دونوں درست ہیں کہ آپ کے قرآن پڑھتے وقت اگر وہ پاس ہوتے ہیں تو قرآن سننے کے باوجود اس پردے کی وجہ سے جس طرح قرآن سننے کا حق ہے نہ اسے سن سکتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں اور نہ اثر قبول کرتے ہیں اور اگر وہ ایذا رسانی کی نیت سے آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس پردے کے ذریعے سے ان کی نگاہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

❷ وَ اِذَا ذَكَرْتَ...... : اس آیت کی بہترین تفسیر سورۂ زمر کی آیت (۴۵) ہے، اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 47 نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ...... : اللہ تعالیٰ اپنے کمال علم کا ذکر فرما رہے ہیں کہ ہمیں خوب علم ہے جس نیت سے یہ اکیلے اکیلے کان لگا کر آپ کی باتیں سنتے ہیں کہ آپ پر اعتراض کریں یا مذاق اڑائیں، پھر جب وہ آپس کی مجلس میں ان پر تبصرے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے آپ کو جادو زدہ قرار دیتے ہیں۔ اپنے علم کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا ہے کہ ہم ان کی حرکتوں سے بے خبر نہیں کہ یہ ہماری گرفت سے بچ جائیں گے۔

آیت 48 اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا...... : یعنی ایک بات نہیں جو آپ کے بارے میں کہتے ہوں، بلکہ مختلف اوقات میں مختلف باتیں کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ آپ جادوگر ہیں، کبھی کہتے ہیں کسی دوسرے نے آپ پر جادو کر دیا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ آپ شاعر ہیں، کبھی کاہن اور کبھی مجنون (دیوانہ) کہتے ہیں۔ ان کی متضاد باتیں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ انھیں حقیقت کا کچھ پتا نہیں، اس حال میں کیسے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ انھیں ہدایت کا صحیح راستہ مل سکے، یا مطلب یہ ہے کہ ان باتوں سے دوسروں کو ہدایت سے روکنے کے لیے کوئی راستہ نہیں پاتے۔ (قرطبی)

آیت 49 وَقَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا...... : "رُفَاتًا" "رَفَتَ يَرْفُتُ" (ن، ض) سے "فُتَاتًا" کی طرح ہے، وہ

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿50﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿51﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿52﴾

ع ۱۲

کہہ دے تم کسی قسم کے پتھر بن جاؤ، یا لوہا ﴿50﴾ یا کوئی ایسی مخلوق جو تمھارے سینوں میں بڑی (معلوم) ہو۔ تو عنقریب وہ کہیں گے کون ہمیں دوبارہ پیدا کرے گا؟ کہہ دے وہی جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا، تو ضرور وہ تیری طرف اپنے سر تعجب سے ہلائیں گے اور کہیں گے یہ کب ہوگا؟ کہہ امید ہے کہ وہ قریب ہو ﴿51﴾ جس دن وہ تمھیں بلائے گا تو تم اس کی تعریف کرتے ہوئے چلے آؤ گے اور سمجھو گے کہ تم نہیں رہے مگر تھوڑا ﴿52﴾

---

چیز چورہ ریزہ کر کے مٹی کی طرح کر دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بعد قیامت پر کفار کے اعتراض کا ذکر کر کے اس کا جواب دیا۔

**آیت 51،50** ① قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً ...... : مطلب یہ کہ مٹی میں تو پھر بھی نباتات کی صورت میں زندگی کے آثار نظر آجاتے ہیں، تم کوئی ایسی چیز بن کر دیکھ لو جو کسی طرح بھی زندگی قبول نہ کر سکتی ہو، مثلاً پتھر، لوہا یا کوئی بھی مخلوق جس کا زندہ ہونا تمھارے دلوں میں ان سے بھی بڑی بات ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ تمھیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھا لے گا۔

② قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ : یعنی جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا وہی تمھیں دوبارہ زندہ کرے گا، کیونکہ پہلی بار کسی چیز کا پیدا کرنا مشکل اور دوبارہ آسان ہوتا ہے، تو پھر اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ تمھیں دوبارہ زندگی دے۔ (دیکھیے روم: ۱۹) جبکہ اس کے لیے پہلی اور دوسری مرتبہ پیدا کرنا دونوں یکساں آسان ہیں۔

③ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ ...... : ''أَنْغَضَ يُنْغِضُ'' (افعال) کا معنی تعجب یا مذاق کے طور پر سر ہلانا ہے، یعنی لاجواب ہو کر پوچھیں گے، اچھا تو وہ قیامت کب ہوگی؟ آپ ان سے کہہ دیں کہ جب اس کا آنا یقینی ہے تو تمھارا یہ سوال بے کار ہے، جب اس نے آ کر ہی رہنا ہے تو چاہے وہ کتنی دور ہو اسے قریب ہی سمجھو اور اپنی نجات کی فکر کرو۔ اس کی مثال اس نالائق طالب علم کی ہے جسے معلوم ہو کہ امتحان لازماً ہونا ہے، مگر وہ اس کا ہونا اس لیے تسلیم نہ کرے یا اس کے لیے تیاری نہ کرے کہ اس کے منعقد ہونے کی تاریخ معلوم نہیں، یا اس لیے کہ وہ ابھی فوراً کیوں منعقد نہیں ہو رہا۔ ظاہر ہے یہ سراسر حماقت ہے۔

**آیت 52** ① يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ : یعنی اس کے بلانے پر تم اس کے مطیع و فرماں بردار بن کر اور اس کی حمد کرتے ہوئے قبروں سے اٹھ آؤ گے۔ دنیا کی طرح کسی قسم کی سرکشی اور انکار کے بجائے اللہ کی حمد کرو گے اور اس کے سامنے مکمل اطاعت کا اظہار کرو گے۔ (دیکھیے نحل: ۸۷) یا یہ مطلب ہے کہ تم اس کے بلانے پر حاضر ہو جاؤ گے۔ ''بِحَمْدِهٖ''

وَ قُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ یَنۡزَغُ بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ كَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا ﴿۵۳﴾

اور میرے بندوں سے کہہ دے وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان ان کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے۔ بے شک شیطان ہمیشہ سے انسان کا کھلا دشمن ہے ﴿۵۳﴾

کا معنی " وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ " ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے بلانے پر تمھارا قبروں سے اٹھ کر حاضر ہو جانا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی خوبی ہے، جس پر صرف وہی مستحق حمد وثنا ہے۔

② یَوۡمَ یَدۡعُوۡكُمۡ فَتَسۡتَجِیۡبُوۡنَ بِحَمۡدِهٖ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس کی آیت (۴۵) کی تفسیر۔

آیت 53 وَ قُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ...... : " نَزَغَ یَنۡزَغُ " (ف) کا معنی چوکا مارنا، فساد اور بگاڑ پیدا کرنا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے جو عہد لینے کا ذکر فرمایا اس میں یہ حکم تھا: ﴿ وَ قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا ﴾ [ البقرۃ : ۸۳ ] "اور لوگوں کے لیے اچھی بات کہو۔" یہاں ہماری امت کو احسن یعنی سب سے اچھی بات کہنے کا حکم دیا۔ "میرے بندوں" سے مراد امت مسلمہ ہے، کیونکہ وہی اس کی غلامی اور بندگی کرنے والے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس سے احسن بات کہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلم ہو یا کافر، دوست ہو یا دشمن، ہر ایک سے ایسی بات کرنا لازم ہے جس سے بہتر بات آدمی نہ کہہ سکتا ہو۔ اس کے لیے لازماً اسے بولنے سے پہلے سوچنا ہوگا۔ ایک عالم نے کہا کہ میں نے جب بھی اپنی طرف سے اچھی سے اچھی بات کہی، پھر اس پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس سے بھی بہتر بات کہی جا سکتی تھی۔ یہاں احسن بات نہ کہنے کا نقصان بیان فرمایا کہ زبان سے ناہموار بات نکلنے پر شیطان آپس میں جھگڑا اور دشمنی ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کا ایک دوسرے سے دلی بغض یا قطع تعلق سخت ناپسند ہے۔ بہت سی احادیث میں اس کی وعید موجود ہے۔ اسی طرح کافر سے احسن بات نہ کہنے کا نتیجہ اس کا اسلام سے مزید دوری ہوگا۔ اس لیے اس کی طرف سے برائی کا جواب بھی احسن طریقے سے دینا لازم ہے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۹۶ تا ۹۸) جب کافر کی طرف سے برائی کا جواب احسن طریقے سے دینا لازم ہے تو پھر مسلمان کی طرف سے ہونے والی برائی کا دفاع احسن طریقے سے کرنا تو بالاولیٰ لازم ہوگا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ احسن بات اور احسن رویے سے جواب کا فائدہ یہ ہوگا کہ دشمن بھی دلی دوست بن جائے گا۔ مگر یہ نعمت اسی کو ملتی ہے جو صبر کرے اور بڑا صاحب نصیب ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ وہ شیطان کی ہر اکساہٹ اور غصہ دلانے پر اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے گا اور غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے گا۔ دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۳۴ تا ۳۶) شیطان کی انسان سے کھلی عداوت کے ذکر کے لیے دیکھیے سورۂ فاطر (۶)، اعراف (۱۱ تا ۲۷) اور سورۂ بقرہ میں قصۂ آدم و ابلیس۔ ہمیشہ سے دشمنی کا مفہوم "كَانَ" سے ظاہر ہے اور آدم کو سجدہ نہ کرنے کے وقت سے لے کر قیامت تک اس کی دشمنی کا دوام اس کا شاہد ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

تمھارا رب تمھیں زیادہ جاننے والا ہے، اگر وہ چاہے تو تم پر رحم کرے، یا اگر چاہے تو تمھیں عذاب دے اور ہم نے تجھے ان پر کوئی ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ﴿۵۴﴾ اور تیرا رب ان کو زیادہ جاننے والا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ﴿۵۵﴾

**آیت 54** ① رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کو تمھارے متعلق علم اس سے بھی کہیں زیادہ ہے جتنا خود تمھیں اپنے متعلق ہے، اب اگر وہ چاہے تو تمھاری نامناسب باتوں اور کاموں کے باوجود اپنے فضل سے تم پر رحم فرمائے، چاہے تو تمھارے گناہوں کی پاداش میں اپنے عدل کی بنا پر عذاب دے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے، اپنی ملکیت کے ساتھ جو چاہے کرے، نہ اس میں کوئی ظلم ہے اور نہ کسی کو اس سے پوچھنے کی جرأت ہے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۲۳)۔

② وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا : ”وَكِيْلًا“ بمعنی ”اَلْمَوْكُوْلُ اِلَيْهِ“ ہے، یعنی جس کے سپرد کیا جائے، ذمہ دار بنایا جائے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ سے کوئی باز پرس نہیں، نہ آپ ان کے ذمہ دار ہیں، آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے۔

**آیت 55** ① وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : لوگوں کے احوال کا ان سے بڑھ کر علم رکھنے کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ زمین و آسمان میں موجود ہر شخص (انسان ہو یا جن یا فرشتہ) سے زیادہ اس کا علم رکھنے والا ہے۔ اس لیے وہ بہتر جانتا ہے کہ کس کو نبوت و رسالت کا شرف عطا کرنا ہے، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ﴾ [ الحج : ۷۵ ] ”اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔“

② وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ : اس لیے اس کے کمال علم کا تقاضا ہے کہ وہ انبیاء و رسل میں سے جسے چاہتا ہے بعض پر فضیلت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے سب پر فضیلت عطا فرما کر آخری نبی بنا دیتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۳) اس کے نزدیک انتخاب کا معیار دنیا کی دولت یا حکومت نہیں۔ داؤد علیہ السلام بکریاں چرانے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے نبی اور بادشاہ بنا دیا، پھر مزید فضیلت بخشی تو بطور فضیلت بادشاہی کے بجائے زبور عطا فرمانے کا ذکر کیا، کیونکہ اللہ کے ہاں فضیلت کا معیار دنیا کی کوئی چیز نہیں، بلکہ آخرت کا علم اور اس کے مطابق عمل ہے۔ دراصل یہ کفار کے اس اعتراض کا جواب ہے جو وہ عموماً رسول اللہ ﷺ پر کیا کرتے تھے کہ انھی کو رسالت کے لیے کیوں چنا گیا؟ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ زخرف (۳۱ تا ۳۵)۔

③ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا : زبور کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے اور اس امت کے سب

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا ﴿٥٦﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿٥٧﴾

کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے ﴿٥٦﴾ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے ﴿٥٧﴾

سے افضل ہونے پر زبور کے مضامین شہادت دے رہے ہیں۔ (دیکھیے انبیاء: ۱۰۵) ہو سکتا ہے کہ کفار سے جہاد میں مشابہت کی وجہ سے داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کر دیا ہو۔

④ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ اور سورۂ بقرہ (۲۵۳) میں یہ فرمان: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ صحیح بخاری (۳۴۱۵) اور مسلم (۲۳۷۳) کی ان صحیح روایات کے منافی نہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انبیاء کو آپس میں ایک دوسرے پر برتری (فضیلت) مت دو۔“ کیونکہ اس سے مراد محض اپنی خواہش یا تعصب کی بنا پر فضیلت دینا ہے، دلیل کی بنا پر فضیلت دینا نہیں، کیونکہ جب دلیل سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو اسے ماننا ضروری ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول انبیاء سے افضل ہیں۔

آیت 56 ① قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ...... : آلوسی نے فرمایا، زعم ظن (یعنی گمان) کے قریب ہے، کبھی جس بات میں شک ہو اس پر بھی ”زعم“ بولا جاتا ہے۔ بعض اوقات کذب (غلط بیانی) کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور کبھی ثابت شدہ سچی بات پر بھی بول لیا جاتا ہے جس میں کوئی شک نہ ہو، جیسا کہ کئی احادیث میں ہے، ایسے تمام مقامات میں زعم کا معنی ”قَالَ“ ہوگا۔ زعم ان افعال میں سے ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں۔ یہاں دونوں مفعول محذوف ہیں، یعنی ”زَعَمْتُمُوْهُمْ آلِهَةً“ کہ ان لوگوں کو بلاؤ جنھیں تم نے معبود گمان کر رکھا ہے، یعنی فرشتے، جن، بزرگ، بت، غرض تمام وہ لوگ جن کی تم عبادت کرتے ہو اور مشکلات میں انھیں پکارتے ہو اور انھیں اپنے معبود گمان کرتے اور حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہو، انھیں پکارو۔

② فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا: پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ تم سے ہٹا کر کسی اور کی طرف منتقل کر دینے کے مالک ہیں، پھر کیوں انھیں سجدہ کرتے اور مدد کے لیے پکارتے ہو؟ یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے، دیکھیے سورۂ انعام (۱۷، ۴۰، ۴۱)، یونس (۱۰۷) اور سورۂ نمل (۶۲)۔

آیت 57 اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ...... : ”اَلْوَسِيْلَةَ“ ”قُرْبٌ“ (قریب ہونا) وسیلہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ

وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

اور کوئی بھی بستی نہیں مگر ہم قیامت کے دن سے پہلے اسے ہلاک کرنے والے ہیں، یا اسے عذاب دینے والے ہیں، بہت سخت عذاب۔ یہ (بات) ہمیشہ سے کتاب میں لکھی ہوئی ہے ﴿۵۸﴾

(۳۵) یعنی وہ تمام لوگ جنھیں یہ مشرک پکارتے ہیں، مثلاً فرشتے، انبیاء اور صلحاء وغیرہ وہ خود اپنے رب کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں، یعنی ان میں سے وہ جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب رکھنے والے ہیں (وہ اس کا قرب مزید چاہتے ہیں) اور وہ اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، تو جب وہ سب لوگ جنھیں مشرکین مدد کے لیے پکارتے ہیں، وہ خود اللہ کے زیادہ سے زیادہ قرب کے متلاشی ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، تو پھر انھیں پکارنے کا اور ان سے مدد مانگنے کا کیا فائدہ۔ وہ جس کا قرب چاہتے اور جس کی رحمت کے امیدوار اور جس کے عذاب سے ڈرتے ہیں تم بھی اسی کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرو، اسی کی رحمت کی امید رکھو اور اسی کے عذاب سے ڈرو۔ افسوس کہ آج کل کے مسلمان بھی اولیاء و صلحائے امت، پیروں، بزرگوں اور شہیدوں کے متعلق وہی عقیدہ رکھتے اور اسی طرح ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جو عقیدہ مشرکین اپنے بتوں کے متعلق رکھتے تھے اور جس طرح وہ اپنے بتوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے تھے، یا یہ سمجھ کر انھیں پکارتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مشکل حل کروا سکتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۸) اور سورۂ زمر (۳) اور نام اس کا وسیلہ رکھتے ہیں، جب کہ حقیقی وسیلہ سے ان اعمال کا کوئی تعلق نہیں، یہ اعمال تو صریح شرک ہیں۔ قرآن و سنت میں مذکور وسیلہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کے ذریعے سے اس کا تقرب حاصل کرنا ہے۔

**آیت 58** وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا ...... : ابن کثیر رحمہ اللہ اور کئی مفسرین نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں شروع سے لکھ دیا ہے کہ ہر بستی جو ظلم پر اتر آئے، قیامت سے پہلے یا تو ہم اسے ہلاک کر دینے والے ہیں کہ اس کے تمام رہنے والوں کو تباہ و برباد کر دیں، یا انھیں سخت عذاب دینے والے ہیں، باہمی قتل و غارت کے ساتھ، یا دشمن کے حملے سے، یا جس مصیبت سے ہم چاہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ اقوام کا ذکر فرمایا، سورۂ طلاق میں ہے: ﴿ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴾ [ الطلاق : ۸، ۹ ] ''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا، بہت سخت محاسبہ اور انھیں ایسی سزا دی جو دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی۔ تو انھوں نے اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام خسارہ تھا۔'' سورۂ ہود میں ہے: ﴿ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾ [ ہود : ۱۰۲ ] ''اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو اس حال میں پکڑتا ہے کہ وہ ظالم ہوتی ہیں، بلاشبہ اس کی پکڑ بڑی دردناک، نہایت سخت ہے۔''

وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ ہم نشانیاں دے کر بھیجیں مگر اس بات نے کہ پہلے لوگوں نے انھیں جھٹلا دیا اور ہم نے ثمود کو اونٹنی واضح نشانی کے طور پر دی تو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشانیاں دے کر نہیں بھیجتے مگر ڈرانے کے لیے ﴿۵۹﴾

دوسرے مفسرین نے اس کی تفسیر اور طرح سے کی ہے، ان میں صاحب روح المعانی بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں ''وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ'' (جو بھی بستی ہے) سے مراد ظاہر ہے کہ عام ہے، کیونکہ ''اِنْ'' نافیہ ہے اور ''مِنْ'' تمام بستیوں کو شامل کرنے کے لیے ہے، خواہ مومنوں کی ہوں یا کفار کی اور مطلب یہ ہے کہ بستیوں میں سے جو بھی بستی ہے ہم قیامت سے پہلے اسے یا تو اس کے رہنے والوں کی طبعی موت کے ساتھ ویران کر دینے والے ہیں، یا اسے قتل اور مختلف مصائب کے ساتھ سخت عذاب دینے والے ہیں، نیکوں کے لیے ہلاکت اور بروں کے لیے عذاب۔

پہلی تفسیر زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد کفار اور ظالموں کی بستیاں ہیں، کیونکہ بہت سی آیات اس کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ﴾ [ القصص : ۵۹ ] ''اور ہم کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر اس صورت میں کہ اس کے رہنے والے ظالم ہوں۔'' اور فرمایا: ﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ﴾ [ الأنعام : ۱۳۱ ] ''یہ اس لیے کہ بے شک تیرا رب کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں، جبکہ اس کے رہنے والے بے خبر ہوں۔'' اور فرمایا: ﴿وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ﴾ [ هود : ۱۱۷ ] ''اور تیرا رب ایسا نہ تھا کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے، اس حال میں کہ اس کے رہنے والے اصلاح کرنے والے ہوں۔'' آیت سے مقصود کفار اور ظالموں کو ان کے انجام بد سے ڈرانا ہے کہ خواہ تم کتنے ہی امن سے رہتے ہو مگر ایک نہ ایک دن تم پر ہماری گرفت ضرور آنے والی ہے۔ آیت میں ان نشانیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو قیامت سے پہلے رونما ہونے والی ہیں۔

**آیت 59** ① وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ پر، جو آخری امت ہے، اپنے خاص فضل اور رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سی چیزیں نشانی کے طور پر دکھانے کا مطالبہ کیا (دیکھیے بنی اسرائیل : ۹۰ تا ۹۳) مگر اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سنت رہی ہے کہ نشانی دکھانے کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہ لائے تو اسے عذاب کے ساتھ نیست و نابود کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ قوم ثمود کے مطالبے پر بطور نشانی اونٹنی دی گئی، انھوں نے اس پر ظلم کیا تو ''صَيْحَةٌ'' (چیخ) اور ''رَجْفَةٌ'' (زلزلے) سے تمام کفار ہلاک کر دیے گئے۔ ہمارے رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی نشانی نہیں دی، تاکہ اس امت کے لیے ایمان لانے کی مہلت باقی رہے۔ اگر موجودہ کفار ایمان نہ لائیں تو ان

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾

اور جب ہم نے تجھ سے کہا کہ بے شک تیرے رب نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے اور ہم نے وہ منظر جو تجھے دکھایا، نہیں بنایا مگر لوگوں کے لیے آزمائش اور وہ درخت بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔ اور ہم انھیں ڈراتے ہیں تو یہ انھیں بہت بڑی سرکشی کے سوا زیادہ نہیں کرتا ﴿۶۰﴾

کی اولاد میں سے لوگ ایمان لاسکیں۔ ہماری امت کو عطا ہونے والی نشانی میں دو وصف ہیں، جو پہلے کسی نبی کی نشانی میں نہیں تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۰، ۵۱)۔

② وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا: یعنی عذاب سے ڈرانے کے لیے، کیونکہ اگر وہ نہیں ڈریں گے تو ان پر عذاب نازل ہو جائے گا۔

آیت 60 ① وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ : لوگوں سے مراد کفار مکہ ہیں اور ان کا احاطہ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنا پورا زور لگانے کے باوجود محمد ﷺ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور نہ آپ کی دعوت کو پھیلنے سے روک سکے۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کو حوصلہ دلانا ہے کہ آپ بے خوف و خطر اپنی دعوت پیش کرتے رہیے، ان لوگوں کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کیجیے، یہ آپ کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ سب پوری طرح ہماری گرفت میں ہیں۔

② وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ: "الرُّءْيَا" "رَأٰى يَرٰى" (ف) کا مصدر ہے، آیت میں مذکور "الرُّءْيَا" سے مراد زمین اور آسمانوں کی وہ عجیب و غریب چیزیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اسراء و معراج کی رات اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے اسراء و معراج کی رات جو کچھ دیکھا ہم نے اسے لوگوں کے لیے فتنہ اور آزمائش ہی بنایا، تاکہ آزمائش ہو جائے کہ کون قوی ایمان والا اور سلیم القلب ہے اور کون ضعیف ایمان والا اور مریض القلب۔ سو مضبوط ایمان والوں کو اسے ماننے میں کوئی تردد نہیں ہوا، چنانچہ وہ امتحان میں کامیاب ہو گئے اور کمزور ایمان والے اور ایمان سے محروم لوگ کہنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ ایک ہی رات میں مکہ سے بیت المقدس اور ساتوں آسمانوں کے عجائبات دیکھ کر واپس بھی آ جائیں؟ یہ ناممکن ہے۔ سو وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔

③ "الرُّءْيَا" کا لفظ اکثر خواب میں دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی آنکھوں سے دیکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں بیداری میں آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے اور اس کی دلیل خود یہ آیت ہے۔ کیونکہ اگر آپ ﷺ کہتے کہ میں نے یہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہے تو نہ کسی کو تعجب ہوتا اور نہ کوئی فتنہ و امتحان ہوتا، کیونکہ خواب میں ہر شخص کو ناممکن و محال چیزیں دکھائی دے سکتی ہیں۔ امتحان یہی تھا کہ صرف مضبوط اہل ایمان تسلیم کر سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یہ سب کچھ رات کے ایک تھوڑے سے حصے میں دکھانے پر قادر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تصریح فرمائی: (( هِيَ رُؤْيَا عَيْنٍ أُرِيَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ٞ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے کہا کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا (۶۱) اس نے کہا کیا تو نے دیکھا، یہ شخص جسے تو نے مجھ پر عزت بخشی، یقیناً اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا اس کی اولاد کو ہر صورت جڑ سے اکھاڑ دوں گا (۶۲)

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِهِ إِلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ ))[ بخاري، المناقب، باب المعراج …… : ۳۸۸۸ ] ''یہ آنکھوں سے دیکھا ہوا منظر تھا جو رسول اللہ ﷺ کو اس رات دکھایا گیا جب آپ کو راتوں رات بیت المقدس لے جایا گیا۔''

④ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ : ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو اس سے پہلے فائدے میں بیان ہوئی اس میں انھوں نے اس کی تفسیر زقوم کے درخت سے کی ہے۔ قرآن مجید میں " شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ " کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے، سورۂ صافات (۶۲ تا ۶۶) اور سورۂ دخان (۴۳ تا ۴۶) میں۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر لوگوں کے لیے آزمائش کے طور پر کیا گیا، کیونکہ ایمان سے محروم لوگ مان ہی نہیں سکتے کہ بھڑکتی ہوئی آگ کی تہ میں کوئی درخت اگ سکتا ہے، اس کے برعکس اہلِ ایمان کو اسے ماننے میں کوئی تردد نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ، جبریل امین اور رب العالمین کبھی غلط بیانی نہیں کرتے اور آگ میں درخت پیدا کرنا، یا ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو ٹھنڈی اور سلامتی والی بنا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ یہاں زقوم کو شجرۂ ملعونہ کہا گیا ہے، اس کا معنی شجرۂ مذمومہ ہے، یعنی قرآن میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

⑤ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ …… : یعنی ہم کفار کو مختلف طریقوں سے ڈراتے ہیں، مگر اس سے انھیں بہت بڑی سرکشی میں اضافے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

آیت 61 ① وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ …… : مہائمی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ گزشتہ آیت میں مذکور کفار کی سرکشی کی اصل وجہ شیطان کی پیروی ہے، کیونکہ وہ بھی تکبر اور سرکشی ہی کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا تھا، اس لیے آگے اس کے آدم علیہ السلام کو بہکانے کا ذکر فرمایا۔

② فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ……: اس سجدے کی حقیقت اور ابلیس کے بہتر ہونے کے دعوے کے متعلق دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۴)، سورۂ اعراف (۱۱) اور اس کے بعد کی آیات۔ "طِيْنًا" اصل میں "مِنْ طِيْنٍ" تھا، "مِنْ" حذف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو گیا۔

آیت 62 ① قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ …… : "اَرَءَيْتَكَ" اصل "أَرَأَيْتَ" ہی ہے، کاف حرف خطاب ہے، جو مخاطب کے مطابق بدلتا رہتا ہے، مثلاً مخاطب واحد مذکر ہو تو "أَرَأَيْتَكَ"، تثنیہ مذکر ہو تو "أَرَأَيْتَكُمَا" اور جمع مذکر ہو تو "أَرَأَيْتَكُمْ"، معنی سب کا یہی ہے کہ ''کیا تو نے دیکھا'' مگر مراد ہوتی ہے " أَخْبِرْنِيْ " یعنی ''مجھے بتا۔'' "لَاَحْتَنِكَنَّ" یہ اصل

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

فرمایا جا، پھر ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا تو بے شک جہنم تمھاری جزا ہے، پوری جزا ﴿۶۳﴾ اور ان میں سے جس کو تو اپنی آواز کے ساتھ بہکا سکے بہکا لے اور اپنے سوار اور اپنے پیادے ان پر چڑھا کر لے آ اور اموال اور اولاد میں ان کا حصہ دار بن اور انھیں وعدے دے اور شیطان دھوکا دینے کے سوا انھیں وعدہ نہیں دیتا ﴿۶۴﴾

میں "حَنَكٌ" سے مشتق ہے جس کا معنی جبڑا ہے۔ عرب کہتے ہیں "حَنَكْتُ الْفَرَسَ أَحْنُكُهُ" (باب ضرب و نصر) "وَاحْتَنَكْتُهُ" میں نے گھوڑے کے (نچلے) جبڑے میں رسی باندھی اور اسے اپنے پیچھے چلایا۔ مراد یہ ہے کہ میں اس کی اولاد کو لگام کی طرح جبڑے میں رسی باندھ کر اپنے پیچھے چلاؤں گا۔ مگر یہ لفظ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے "لَأَسْتَوْلِيَنَّ" "میں ضرور ان پر غالب ہوں گا" اور "لَأَسْتَأْصِلَنَّ" جو "اِسْتَأْصَلَتِ السَّنَةُ أَمْوَالَهُمْ" سے اخذ کیا گیا ہے، یعنی قحط نے ان کے اموال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، ہلاک کر دیا۔

② یعنی نہایت جرأت و تکبر سے اللہ تعالیٰ سے کہنے لگا کہ مجھے بتا کہ یہ شخص جسے تو نے مجھ پر عزت بخشی، یعنی جب بہتر میں ہوں تو تو نے اسے مجھ پر عزت کیوں بخشی؟! اس میں آدم علیہ السلام پر حسد کا اظہار بھی ہے، اللہ کے فرمان کے مقابلے میں اپنے عقلی ڈھکوسلے قیاس سے تعمیل حکم کا انکار بھی اور تکبر و سرکشی کا اظہار بھی اور ان میں سے کوئی بات بھی اللہ تعالیٰ کو گوارا نہیں۔

③ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ...... : اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیات (۱۴ تا ۱۷) میں دیکھیں۔ "اِلَّا قَلِيْلًا" سے مراد اللہ کے مخلص بندے ہیں۔

**آیت 63** قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ ...... : شیطان کی درخواست قبول ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ نافرمان کی دعا بھی قبول کر لیتا ہے اور اس بات کی بھی کہ دعا کی قبولیت اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی علامت نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ ناراضگی کی وجہ سے دعا قبول کر لیتا ہے، مثلاً حرام کمائی اور عشق و بدکاری میں کامیابی کی دعا قبول ہونا رضائے الٰہی کی دلیل نہیں، بلکہ اس کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

**آیت 64** ① وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ ...... : "اِسْتَفْزِزْ" "فَزٌّ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہلکا و خفیف ہے۔ "رَجُلٌ فَزٌّ أَيْ خَفِيْفٌ" "ہلکا آدمی"، یعنی تو جسے اپنی آواز سے ہلکا اور بے وقعت بنا سکے بنا لے۔ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "اور بہکا جس کو بہکا سکے" کیونکہ آدمی ہلکا اور بے قدر و قیمت ہو کر ہی بہکتا ہے۔

② بِصَوْتِكَ : شیطان کی آواز سے مراد ہر وہ آواز ہے جو اللہ کی نافرمانی کی دعوت دے، اس میں گانا بجانا، بدکاری اور ہر

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں اور تیرا رب کافی کارساز ہے ﴿۶۵﴾

برے کام کی دعوت اور ترغیب شامل ہے۔

③ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ ...... : جلب چیخ کر ہانکنے کو کہتے ہیں اور اس شور کو بھی جس سے گھوڑے کو تیز دوڑانا مقصود ہو۔ ”خَیْلٌ“ گھوڑوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور گھڑ سواروں کی جماعت کو بھی۔ ”رَجِلٌ“ ”رَاجِلٌ“ کی جمع ہے، پیادے۔

④ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ : اموال میں شیطان کی شراکت یہ ہے کہ حرام طریقے سے کمایا جائے، یا حرام کاموں میں خرچ کیا جائے، مثلاً سود، رشوت، چوری ڈاکے اور دھوکے وغیرہ سے مال کمایا جائے اور اسے غیر اللہ کے نام پر یا بدکاری و بے حیائی اور نافرمانی کے کاموں میں خرچ کیا جائے۔ اولاد میں شراکت یہ ہے کہ شیطان انھیں دین حنیف کی تعلیمات کے خلاف پرورش دلانے میں کامیاب ہو جائے، ان کے لیے زنا اور اللہ کی نافرمانی کے مواقع میسر کر دے، انھیں اپنے سلف صالحین سے متنفر کر دے، میاں بیوی کی صحبت کے وقت دونوں کو شیطان سے بچانے کی دعا مانگنا فراموش کروا دے، تاکہ پیدا ہونے والی اولاد میں اس کا حصہ ہو جائے، یا ان کے نام ایسے رکھوا دے جن سے ظاہر ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور نے عطا کیے ہیں۔ مشرکین عرب اپنی اولاد کے نام عبد العزیٰ، عبد شمس اور عبد وَدّ وغیرہ رکھتے تھے۔ ہمارے زمانے میں رسول بخش، حسین بخش، پیر بخش، غلام جیلانی اور پیراں دتہ وغیرہ مشرکانہ نام رکھے جاتے ہیں۔ مزید وہ آیات جن میں مذکور اشیاء میں شیطان کی مشارکت کا ذکر ہے وہ یہ ہیں سورۂ انعام (۱۳۶، ۱۳۸) اور سورۂ یونس (۵۹)۔

⑤ وَعِدْهُمْ : یعنی انھیں جھوٹے وعدے دلا، مثلاً یہ کہ اگر شرک کرو گے تو یہ فائدہ ہوگا، سودی کاروبار سے یہ نفع ہوگا اور یہ کہ دنیا میں تمھیں مال و دولت ملی ہے، آخرت میں بھی ملے گی اور یہ کہ ابھی بہت وقت ہے عیش کر لو، پھر توبہ کر لینا وغیرہ۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پانچ حکم دیے ہیں: ”اِذْهَبْ“ ”اسْتَفْزِزْ“ ”اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ“ ”شَارِكْهُمْ“ اور ”عِدْهُمْ“ یہ تمام احکام تہدید، یعنی ڈانٹنے کے لیے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ﴾ [ حٰم السجدۃ : ۴۰ ] ”جو چاہو کرو۔“ یہ احکام تعمیل کے لیے نہیں ہیں، کیونکہ یہ سب گناہ ہیں اور اللہ تعالیٰ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔

⑥ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا : یعنی شیطان کے سب وعدے محض دھوکا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مفہوم کئی اور مقامات پر بھی بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۲۰)، حدید (۱۴) اور ابراہیم (۲۲) اس سے پہلے شیطان کو مخاطب کر کے بات ہو رہی تھی، یہاں شیطان کو غائب کے صیغے سے ذکر کیا، یہ التفات شیطان کی تحقیر کے لیے ہے۔

**آیت 65** اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ...... : اللہ تعالیٰ نے اس سلسلۂ کلام کو سچے ایمان والوں کے اطمینان کے لیے اس بات پر ختم کیا کہ میرے خاص بندوں پر تو غالب نہیں آ سکے گا، کیونکہ انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے سپرد کر دیا ہے اور رب تعالیٰ بہت کافی وکیل ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ حجر (۴۲، ۴۳) اور سورۂ نحل (۹۸ تا ۱۰۰)۔

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۶۶ وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝۶۷

تمھارا رب وہی ہے جو تمھارے لیے سمندر میں کشتیاں چلاتا ہے، تاکہ تم اس کا کچھ نہ کچھ فضل تلاش کرو۔ یقیناً وہ ہمیشہ سے تم پر بے حد مہربان ہے (۶۶) اور جب تمھیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے سوا تم جنھیں پکارتے ہو گم ہو جاتے ہیں، پھر جب وہ تمھیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان ہمیشہ سے بہت ناشکرا ہے (۶۷)

**آیت 66** ① رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ ...... : " أَزْجٰى يُزْجِيْ إِزْجَاءً " کا معنی آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ " أَزْجٰى فُلَانٌ الْإِبِلَ " فلاں نے اونٹوں کو آہستہ آہستہ ہانکا۔ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلانے کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (دیکھیے نور: ۴۳) " اَلْفُلْكَ " واحد، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، بہت بڑی کشتی یعنی بحری جہاز۔ " مِنْ فَضْلِهٖ " قرآن مجید میں روزی کو اکثر فضل فرمایا ہے، کیونکہ دنیا میں جو بھی نعمتیں انسان کو میسر ہیں، یا آخرت میں عطا ہوں گی، وہ محض اللہ کا فضل ہیں، کسی کا اللہ پر کوئی حق واجب نہیں اور اگر کہیں بندوں کا حق کہا گیا ہے تو وہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے کہ اس نے اسے اپنے ذمے لازم فرما لیا۔

زمین کا تقریباً ستر فیصد حصہ سمندر ہے، اس میں انسان کے کھانے پینے اور استعمال کے لیے بے حساب رزق موجود ہے۔ سمندر کے پانی میں ہزاروں ٹن وزنی جہاز اٹھانے کی صلاحیت اور صرف ہوا کے ذریعے سے جہازوں کو سیکڑوں ہزاروں میل دھکیل کر لے جانا صرف اللہ تعالیٰ کے مسخر کرنے کی وجہ سے ہے۔ اب اس کا مزید فضل ہوا تو انجن ایجاد ہو گئے، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [ النحل: ۸ ] (اور وہ پیدا کرے گا جو تم نہیں جانتے) میں فرمایا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو سمندر کے بے شمار منافع، مثلاً نہایت آسان اور کم خرچ ذریعے سے تعلیم، تجارت اور دوسرے مقاصد کے لیے سفر کی سہولت، گوشت، زینت کی اشیاء، معدنیات، گیس اور تیل وغیرہ حاصل کرنے کی ترغیب بھی ہے، جن سے کفار فائدہ اٹھا رہے ہیں، کیونکہ سمندروں پر ان کا غلبہ ہے اور ظاہر ہے تیس فیصد خشکی پر بھی وہی غالب ہوگا جو ستر فیصد سمندر پر غالب ہے اور امت مسلمہ بری و بحری جہاد چھوڑنے کی وجہ سے دین و دنیا دونوں میں پیچھے رہنے پر قانع ہو چکی ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو نشانہ بازی، شہ سواری اور تیراکی سیکھنے کی بہت ترغیب دلائی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سلسلہ صحیحہ (۶۲۵/۱، ح: ۳۱۵) اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی اسلام کو تمام دنیا کے ادیان پر غالب کرنا بیان فرمایا۔

② اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا: سمندر میں جہازوں کو چلانے کی پہلی وجہ اللہ کے فضل کی تلاش بیان فرمائی، یہ دوسری وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے۔ ہمیشہ کا مفہوم " كَانَ " سے ظاہر ہو رہا ہے۔ طنطاوی کے الفاظ ہیں: " وَلِأَنَّهٗ سُبْحَانَهٗ كَانَ أَزَلًا وَ أَبَدًا بِكُمْ دَائِمَ الرَّحْمَةِ وَ الرَّأْفَةِ " " کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنے بندوں کے ساتھ نرمی و رحمت کرنے والا ہے۔ "

**آیت 67** وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ...... : زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ نبوت کے کفار کی بت پرستی کے باوجود ان کی فطرت

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾

تو کیا تم بے خوف ہوگئے کہ وہ تمھیں خشکی کے کنارے دھنسا دے، یا تم پر کوئی پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے، پھر تم اپنے لیے کوئی کارساز نہ پاؤ﴿۶۸﴾ یا تم بے خوف ہوگئے کہ وہ تمھیں دوسری بار اس میں پھر لے جائے، پھر تم پر توڑ دینے والی آندھی بھیج دے، پس تمھیں غرق کر دے، اس کی وجہ سے جو تم نے کفر کیا، پھر تم اپنے لیے ہمارے خلاف اس کے بارے میں کوئی پیچھا کرنے والا نہ پاؤ﴿۶۹﴾

میں رکھی گئی توحید کا ذکر بطور دلیل ہو رہا ہے کہ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو پہاڑوں جیسی موجوں میں جہاز گھر جاتا ہے اور موت صاف نظر آنے لگتی ہے تو تم اپنے تمام خداؤں، داتاؤں، مشکل کشاؤں اور حاجت رواؤں کو بھول کر اپنی فطرت میں رکھی ہوئی توحید کی وجہ سے صرف ایک اللہ کو پکارتے ہو، پھر جب وہ تمھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہو، جیسے اپنے رب سے تمھاری کوئی آشنائی ہی نہ تھی اور پھر اپنے خود ساختہ خداؤں کو پکارنے لگتے ہو اور انھی کا احسان ماننے لگتے ہو۔ کس قدر احسان ناشناسی اور ناشکری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مشرک انسان ہمیشہ سے بے حد ناشکرا رہا ہے۔ "اَلْاِنْسَانُ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے اس سے مراد کفار ہیں، کیونکہ مومن شکر گزار ہوتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ [ سبا : ۱۳ ] "اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔" کفار کا یہ رویہ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۲۲، ۲۳)، عنکبوت (۶۵)، لقمان (۳۲) اور زمر (۸) یہ تو زمانۂ جاہلیت کے ان لوگوں کا حال تھا جو مشرک تھے اور اللہ اور رسول نے انھیں مشرک قرار دیا، حالانکہ وہ سخت مصیبت میں صرف اللہ کو پکارتے تھے، مگر ہمارے زمانے کے بعض مسلمان کہلانے والوں کا کمال یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی اللہ کے ساتھ یا اللہ کے علاوہ دوسروں کو مدد کے لیے پکارنا نہیں بھولتے، پھر بھی نہ ان کی توحید میں کوئی خلل آتا ہے، نہ اسلام کا کچھ بگڑتا ہے۔

**آیت 69،68** اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ ...... : "خَسْفٌ" کا معنی زمین میں دھنسا دینا ہے۔ "جَانِبَ الْبَرِّ" خشکی کا کنارا، یہ اس لیے فرمایا کہ زمین میں پانی کا کنارا خشکی اور خشکی کا کنارا پانی ہے۔ "حَاصِبًا" سنگریزے اڑانے والی آندھی، یا وہ بادل جس سے اولے برسیں۔ "قَاصِفًا" "ضَرَبَ" سے اسم فاعل ہے، درختوں، کشتیوں اور ہر چیز کو توڑ دینے والی آندھی۔ "تَبِيْعًا" قرض یا انتقام کا مطالبہ کرنے والا جو پیچھا نہ چھوڑے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی نادانی اور کم عقلی بیان فرمائی ہے کہ تم جب خشکی پر پہنچ جاتے ہو تو اللہ کے عذاب اور

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾ ع

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو بہت عزت بخشی اور انھیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا اور انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے جو مخلوق پیدا کی اس میں سے بہت سوں پر انھیں فضیلت دی، بڑی فضیلت دینا۔﴿۷۰﴾

اس کی گرفت سے بے خوف ہو کر دوبارہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہو، کیا تمھیں اس بات کا کوئی خوف نہیں آ رہا کہ تمھیں اللہ تعالیٰ پانی میں ڈبو سکتا ہے تو خشک زمین میں بھی دھنسا سکتا ہے؟ اس کا حکم ہو تو پانی کی طرح زمین تمھیں نگل لے، یا وہ پتھر اڑا کر لانے والی تند و تیز آندھی بھیج کر تمھیں ہلاک کر دے، پھر تمھیں کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ یا تمھیں یہ بھی خوف نہیں رہا کہ تمھیں اللہ کی طرف سے پھر کبھی سمندری سفر پیش آ جائے اور وہ تمھاری ناشکری کی سزا کے لیے ہر چیز کو توڑ دینے والی طوفانی ہوا کے ذریعے سے تمھیں غرق کر دے؟ پھر تمھیں کوئی ایسی ہستی نہیں ملے گی جو اللہ تعالیٰ سے انتقام کا مطالبہ اور پیچھا کرے۔ معلوم ہوا کہ انسان کو کسی آزمائش سے نجات کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر اور دوبارہ گرفت سے بے پروا ہرگز نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ سراسر خسارے کی بات ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ [ الأعراف : ۹۹ ] ”پھر کیا وہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں، تو اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو خسارہ اٹھانے والے ہیں۔“ ان آیات میں مذکور معنی اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح فرمایا ہے، دیکھیے سبا (۹)، انعام (۶۵) اور سورۂ ملک (۱۶، ۱۷)۔ ”ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا“ کی ہم معنی آیت سورۂ شمس (۱۴، ۱۵) میں دیکھیے۔

**آیت 70** ① وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ......: اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو بے شمار نعمتوں کے ساتھ عزت بخشی کہ ان کے جد امجد کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا فرمایا، جب کہ دوسری ساری مخلوق کو کلمہ ”كُنْ“ سے پیدا فرمایا، پھر انھیں سیدھا قد عطا فرمایا، ہاتھوں سے کھانے کا طریقہ سکھایا، احسن تقویم (بہترین شکل و صورت) میں پیدا کیا، عقل و اختیار سے نوازا، لکھ کر اپنا علم اور تجربہ اگلی نسل کو منتقل کرنا سکھایا، ہر لحہ نئی سے نئی ایجاد کی لیاقت بخشی۔ زمین کی ہر چیز اور ہر جانور کو اپنے کام میں لانے کا سلیقہ بخشا۔ سمندر میں جہازوں پر، زمین میں سواریوں پر اور فضا میں طیاروں پر (جن کا ذکر سورۂ نحل: ۵ تا ۸ میں ہے) سوار کیا۔

② وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ : ”اَلرِّزْقُ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ“ (قاموس) رزق کا معنی ہے وہ چیزیں جن سے فائدہ اٹھایا جائے، مثلاً کھانا پینا، میاں بیوی کا تعلق، لباس اور مکان وغیرہ۔ ”اَلطَّيِّبٰتُ“ ”اَلْحَلَالُ وَالْأَفْضَلُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ“ (قاموس) طیب کا معنی ہے ہر چیز میں سے جو حلال اور سب سے بہتر ہو۔ یعنی ان کے فائدے کی ہر حلال، لذیذ اور بہترین چیز عطا فرمائی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی فطرت مسخ ہو جائے اور وہ طیب کے بجائے خبیث سے فائدہ اٹھانے لگیں، مثلاً مردار، خنزیر وغیرہ کھانے لگ جائیں، نکاح کے بجائے زنا یا قومِ لوط کے عمل کا ارتکاب کرنے لگیں اور اپنے حق کے بجائے دوسروں کا حق استعمال کرنے لگیں، بہر حال اللہ تعالیٰ نے طیبات عطا کرنے میں کمی نہیں فرمائی۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾

جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے، پھر جسے اس کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی گئی تو یہ لوگ اپنی کتاب پڑھیں گے اور ان پر کھجور کی گٹھلی کے دھاگے برابر (بھی) ظلم نہ ہوگا۔ ﴿۷۱﴾

③ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا: اوپر تکریم میں ذکر کردہ اشیاء اور بنی آدم کی اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بہت سی مخلوق پر بہت بڑی برتری عطا فرمائی۔ اپنی بہت سی مخلوق پر برتری عطا فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی مخلوق بھی ہے جس پر انسان کو برتری عطا نہیں ہوئی۔ بعض نے فرشتوں کو وہ مخلوق قرار دیا، بعض اہلِ علم نے بعض انسانوں کو بعض فرشتوں سے اور بعض فرشتوں کو بعض انسانوں سے افضل قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ)) [ ترمذی، المناقب، باب سلوا اللہ لی الوسیلۃ : ۳۶۱۵ ] ”میں روزِ قیامت تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں۔“ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا علم بہت ہی تھوڑا ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۸۵) اس لیے ایسے معاملات میں خاموشی ہی باعثِ عافیت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی ساری مخلوق کا علم عطا نہیں فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کو کیا خبر تھی کہ کوئی خضر بھی ہے اور ہمیں کیا معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کون کون سی ہے، فرمایا: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ [ المدثر : ۳۱ ] ”اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ اس لیے بات اپنی حیثیت کے مطابق سوچ سمجھ کر کرنا لازم ہے۔

**آیت 71** ① يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ: امام کا معنی پیشوا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ [ الفرقان : ۷۴ ] ”اور ہمیں متقی لوگوں کا پیشوا بنا۔“ دوسرا معنی کتاب ہے، فرمایا: ﴿ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [ یٰس : ۱۲ ] ”اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔“ پہلا معنی مراد ہو تو اہلِ ایمان کے امام انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور کفار و مشرکین کے امام ان کے باطل سردار ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ [ القصص : ۴۱ ] ”اور ہم نے انھیں ایسے سردار بنایا جو آگ کی طرف دعوت دیتے تھے۔“ وہ لوگ جنھوں نے کتاب و سنت کے سوا کسی کی پیروی نہیں کی وہ اپنے امام محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بلائے جائیں گے اور ان سے بڑھ کر کون خوش نصیب ہو سکتا ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہوں اور جنھوں نے کتاب و سنت کو چھوڑ کر کسی اور کی پیروی کی ہوگی، نیک ہو یا بد، وہ ان کے ساتھ بلائے جائیں گے، مگر وہ سب اپنے پیروکاروں سے صاف بری ہو جائیں گے، حتیٰ کہ شیطان بھی اپنے پیروکاروں سے بری ہونے کا اعلان کر دے گا۔ (دیکھیے ابراہیم: ۲۲) وہ نیک ائمہ اور بزرگ جو زندگی میں اپنی تقلید سے منع کرتے رہے اور کتاب و سنت کی پیروی کی تاکید کرتے رہے، وہ بھی اپنے ان جھوٹے پیروکاروں سے بالکل بری ہو جائیں گے، جنھوں نے اپنے اماموں کی بات مانی نہ کتاب و سنت پر عمل کیا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۵ تا ۱۶۷) اور احقاف (۶)

وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾ وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖۗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

اور جو اس میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور راستے سے بہت زیادہ بھٹکا ہوا ہوگا ﴿۷۲﴾ اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے اس سے ضرور ہی بہکا دیں جو ہم نے تیری طرف وحی کی، تا کہ تو ہم پر اس کے سوا جھوٹ باندھ دے اور اس وقت وہ ضرور تجھے دلی دوست بنا لیتے ﴿۷۳﴾

اور اگر دوسرا معنی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس دن ہر شخص کو اس کی کتاب اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا۔ یہاں یہ معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ آگے کتاب کو دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیے جانے کی بات کی گئی ہے۔

② فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ : دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملنے ہی سے انھیں آنے والی خیر و سعادت کا پتا چل جائے گا، چنانچہ وہ خوشی خوشی اسے پڑھیں گے اور دوسروں کو بھی دکھائیں گے۔ دیکھیے سورۂ حاقہ (۱۹)۔

③ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا : کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں باریک دھاگے کو "فَتِيْلًا" کہتے ہیں، یعنی تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

آیت 72 ① وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى ...... : اس سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے، کیونکہ دنیا میں تو آنکھیں مسلم و کافر دونوں کو دی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ [ الحج : ٤٦ ] "پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔"

② وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا : زیادہ گمراہ اس لیے کہ دنیا میں گمراہ کے راہِ راست پر آنے کی امید ہے، قیامت کو اس کا موقع نہیں ہوگا۔

③ یہاں اندھے اٹھائے جانے کا ذکر ہے اور دوسرے مقامات پر ان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ﴾ [ الکہف : ٥٣ ] "اور مجرم لوگ آگ کو دیکھیں گے۔" دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ قیامت کے پچاس ہزار سال کے برابر دن میں مجرموں پر مختلف احوال گزریں گے، وہ قبروں سے اٹھتے وقت اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے، بعد میں دیکھنے، سننے اور بولنے کے مراحل سے بھی گزریں گے۔ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تطبیق یہی ہے۔

آیت 73 ① وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ ...... : "وَ اِنْ كَادُوْا" اصل میں "وَ اِنَّهُمْ كَادُوْا" تھا، دلیل وہ لام ہے جو بعد میں آ رہا ہے۔ "فَتَنَ يَفْتِنُ" (ض) سونے کو کھرا کھوٹا معلوم کرنے کے لیے آگ میں ڈالنا، آزمائش۔ "فَتَنَهٗ عَنْ رَأْيِهٖ" کسی کو کسی کی رائے سے ہٹانا۔ کفار مکہ خود تو راہ پر کیا آتے ان کی برابر یہ کوشش رہی کہ کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم خالص توحید پیش کرنے سے باز آ جائیں، یا ان احکام کا ایک حصہ چھوڑ دیں یا بدل دیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو دیے جا رہے ہیں، یا قرآن سے وہ حصہ حذف کر دیں جس میں شرک اور بت پرستی کی مذمت ہے تو ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ کو مقصد سے پھیرنے کے لیے کبھی فریب کاریوں سے، کبھی لالچ سے اور کبھی دھمکیوں سے انھوں نے بے شمار جتن کیے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انھیں صاف کہہ دیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے ذمے وہ بات نہیں لگا سکتا جو اس نے میری طرف

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۗ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھے ثابت قدم رکھا تو بلاشبہ یقیناً تو قریب تھا کہ کچھ تھوڑا سا ان کی طرف مائل ہو جاتا ﴿۷۴﴾ اس وقت ہم ضرور تجھے زندگی کے دگنے اور موت کے دگنے (عذاب) کا مزہ چکھاتے، پھر تو اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتا ﴿۷۵﴾ اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے ضرور ہی اس سرزمین سے پھسلا دیں، تاکہ تجھے اس سے نکال دیں اور اس وقت وہ تیرے بعد نہیں ٹھہریں گے مگر کم ہی ﴿۷۶﴾

وحی نہ کی ہو۔ ان کے تقاضے اور آپ کے جواب کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۱۵ تا ۱۷)۔

② وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا: کیونکہ توحید کی دعوت سے پہلے وہ آپ سے دلی محبت رکھتے تھے، آپ کو صادق اور امین کہتے تھے۔ اب آپ ان کی طرف مائل ہونے کے تھوڑے سے بھی قریب ہو جائیں تو وہ آپ سے پھر وہی دلی دوستی رکھنے کے لیے تیار ہیں۔ خلیل وہ دوست جس کی دوستی دل کے اندر ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ [ النساء : ۱۲۵ ] ''اور اللہ نے ابراہیم کو خاص دوست بنا لیا۔''

**آیت 74** وَلَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ ......: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ثابت رکھنے کی وجہ سے آپ ان کی طرف مائل ہونے کے تھوڑا سا قریب بھی نہیں ہوئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کی فطرت اتنی سلیم تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر آپ کو ثابت رکھنا نہ ہوتا تو پھر بھی آپ زیادہ سے زیادہ ان کی طرف مائل ہونے کے تھوڑے سے قریب ہی ہوتے، پوری طرح مائل چھوڑ کر مائل ہونے کے پوری طرح قریب بھی نہ ہوتے۔ اس کے باوجود آپ کبھی اپنے آپ پر بھروسا نہیں کرتے تھے، انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دعا کیا کرتے تھے: « يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ » [ ترمذي، القدر، باب ما جاء أن القلوب بين أصبعي الرحمان : ۲۱٤۰، صححه الألباني ] ''اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔'' اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کا کفار کی طرف مائل ہونے کے قریب ہونا بھی گوارا نہیں۔

**آیت 75** اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ ......: اس لیے کہ کسی کا مرتبہ جتنا بلند ہوتا ہے گناہ کرنے پر اسے اتنی ہی سخت سزا ملتی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے متعلق فرمایا: ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ [ الأحزاب : ۳۰ ] ''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی برائی کا ارتکاب کرے گی اسے دگنا عذاب دیا جائے گا۔''

**آیت 76** ① وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ ......: '' اِسْتَفَزَّ '' کا معنی کسی کو گھبراہٹ میں ڈال کر پھسلا دینا ہے۔ '' الْاَرْضِ ''

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

ان کے طریقے (کی مانند) جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا اور تو ہمارے طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا ﴿۷۷﴾ نماز قائم کر سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور فجر کا قرآن (پڑھ)۔ بے شک فجر کا قرآن ہمیشہ سے حاضر ہونے کا وقت رہا ہے ﴿۷۸﴾

میں الف لام عہد کا ہے، مراد ارض مکہ ہے، یعنی جب قریش کی نبی ﷺ کو توحید سے روکنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو انھوں نے آپ کو سخت تنگ اور پریشان کرنا شروع کر دیا، تاکہ آپ گھبرا جائیں اور مکہ سے نکل جائیں۔

❷ وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا: چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بعد میں جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تو ڈیڑھ سال کے بعد ان کے بڑے بڑے سردار بدر میں مارے گئے، آپ کی بددعا سے اہل مکہ قحط اور خوف کا شکار ہو گئے، حتیٰ کہ آٹھ (۸) ہجری میں خود مکہ بھی فتح ہو گیا، جس سے ان کی شان و شوکت اور حکومت خاک میں مل گئی۔ ایک مغرور قوم کے لیے یہ عذاب ہی کیا کم ہے کہ وہی شخص جسے انھوں نے نکالا تھا، ان پر فتح پا کر شہر کا مالک بن جائے۔

**آیت 77** سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ ......: یعنی پہلے رسولوں کے زمانے میں بھی ہمارا یہ طریقہ رہا کہ جوں ہی ان کی قوم نے انھیں نکالا ان پر عذاب آ گیا اور وہ تباہ ہو گئی، البتہ مکہ میں چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے کے بعد بھی کئی مسلمان موجود تھے جو استغفار کرتے تھے اور بعض کفار اور ان کی آئندہ اولاد کے مسلمان ہونے کی امید تھی، اس لیے مکہ کو پہلی قوموں کی بستیوں کی طرح تباہ نہیں کیا گیا۔ دیکھیے سورۂ فتح (۲۵) اور انفال (۳۳)۔

**آیت 78** ❶ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ......: شروع سورت سے توحید و رسالت اور آخرت کے دلائل اور ان پر اعتراضات کے جوابات کے بعد اعمال کا ذکر فرمایا۔ (رازی) پچھلی آیات کے ساتھ ایک اور مناسبت یہ ہے کہ دشمنوں کے مقابلے کے لیے نماز قائم کیجیے، یہ آپ کے لیے ان سے مقابلے کی قوت کا ذریعہ بنے گی، اسی لیے آپ ﷺ کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو نماز پڑھتے۔ [ أبو داؤد، التطوع، باب وقت قیام النبي ﷺ من اللیل: ۱۳۱۹ ] اعمال میں سب سے افضل نماز ہے، کیونکہ کلمۂ اسلام کے بعد یہ مسلمان ہونے کی پہلی شرط اور علامت ہے (دیکھیے توبہ: ۵، ۱۱) اور اس میں دوسرے ارکان اسلام کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہے۔ زکوٰۃ اس طرح کہ مالی منفعت قربان کیے بغیر آدمی نماز کے لیے جا ہی نہیں سکتا، روزہ اس طرح کہ دوران نماز روزے کی تمام پابندیاں عائد ہوتی ہیں، حج اس طرح کہ قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے اور کلمۂ اسلام تشہد میں شامل ہے اور نماز کا مغز یہ ہے کہ پوری دنیا سے تعلق توڑ کر ایک اللہ سے پوری طرح تعلق جوڑ لے۔ ان آیات میں اقامتِ صلاۃ کے حکم کے ساتھ اس کے پانچ اوقات بھی بیان فرمائے، یہ اوقات قولاً و فعلاً رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں اور پوری امت مسلمہ چودہ صدیوں سے ان اوقات پر نماز پڑھتی آئی ہے۔ نمازوں کے اوقات کے لیے مزید دیکھیے

وَ مِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾

اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ، اس حال میں کہ تیرے لیے زائد ہے۔ قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے ﴿۷۹﴾

سورۂ ہود (۱۱۴)، سورۂ روم (۱۷، ۱۸) اور سورۂ طٰہٰ (۱۳۰) تین نمازوں کا صراحت سے ذکر سورۂ نور (۵۸) میں ہے، لیکن نمازوں کے اوقات کے اول و آخر کی مکمل حد بندی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اور آپ کو جبریل علیہ السلام نے دو دن نماز پڑھ کر سکھائی۔ [ دیکھیے بخاری، مواقیت الصلوٰۃ، باب مواقیت الصلوٰۃ و فضلھا : ۵۲۱۔ مسلم : ۶۱۳، ۶۱۴ ]

❷ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ: قاموس میں ہے: " دَلَكَتِ الشَّمْسُ أَيْ غَرَبَتْ أَوِ اصْفَرَّتْ أَوْ مَالَتْ أَوْ زَالَتْ عَنْ كَبِدِ السَّمَاءِ" یعنی "دَلَكَتِ الشَّمْسُ" کا معنی ہے کہ سورج غروب ہو گیا، یا زرد ہو گیا، یا مائل ہو گیا، یا آسمان کے وسط سے ڈھل گیا۔" اس میں تین نمازوں کا ذکر ہے، کیونکہ مشترک لفظ ایک سے زیادہ معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ سورج ڈھلنے کے وقت ظہر، زردی کی (غیر محسوس) ابتدا کے وقت عصر کی نماز ہے (پوری طرح زرد ہونے پر نماز مکروہ ہے) اور سورج غروب ہونے کے ساتھ مغرب کی نماز ہے۔ "غَسَقِ الَّيۡلِ" کا معنی شروع رات کا اندھیرا ہے۔ شفق غائب ہونے کے ساتھ اندھیرا مکمل ہوتے ہی عشاء کا وقت ہو جاتا ہے۔ " اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ" (سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک) کا معنی تو یہ ہے کہ یہ تمام وقت مسلسل نماز قائم رکھو، مگر یہ اس لیے فرمایا کہ آدمی نماز پڑھ کر اگلی نماز کے انتظار میں ہو تو وہ نماز ہی میں مشغول شمار ہوتا ہے، گویا یہ تمام وقت نماز ہی میں گزرا۔ اس میں ہر وقت نماز کی طرف توجہ رکھنے کی ترغیب ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّكُمْ لَمْ تَزَالُوْا فِيْ صَلَاةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلَاةَ )) [ ابو داؤد، الصلاۃ، باب وقت العشاء الآخرۃ : ۴۲۲۔ ترمذی : ۳۳۰ ] "تم اس وقت تک نماز میں رہو گے جب تک نماز کا انتظار کرتے رہو گے۔" پھر رات کی نیند کے وقفے کے بعد صبح کی نماز کا وقت ہے، اس لیے اسے الگ ذکر فرمایا۔ (نظم الدرر للبقاعی)

❸ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ : " أَيْ وَأَقِمْ قُرْآنَ الْفَجْرِ " یعنی فجر کی نماز قائم کر۔ یہاں نماز کو قرآن فرمایا، کیونکہ قرآن نماز کا اہم جز ہے اور یہاں جز بول کر کل مراد لیا ہے، جیسا کہ قیام یا "رَكْعَةٌ" یا "سَجْدَةٌ" سے پوری نماز مراد ہوتی ہے۔ یہاں نماز کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صبح کی نماز میں قرآن زیادہ پڑھا جاتا ہے بہ نسبت دوسری نمازوں کے۔

❹ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا : "مَشۡهُوۡدًا" جس میں حاضر ہوا جائے، یعنی اس میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ [ دیکھیے بخاری، الأذان، باب فضل صلاۃ الفجر في جماعۃ : ۶۴۸ ] یہ معنی بھی ہے کہ رات بھر کے آرام کے بعد طبیعت قرآن پڑھنے اور سننے کے لیے حاضر ہوتی ہے۔

آیت 79 ❶ وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ...... : "مِنۡ" بعض کے معنی میں ہے۔ "هُجُوْدٌ" نیند کو کہتے ہیں۔ تہجد ترک ہجود، یعنی نیند ترک کرنے کا نام ہے، خواہ رات سونے کے بعد اٹھ کر ہو یا عشاء کے فوراً بعد نیند کے بجائے قیام کیا جائے۔ تہجد کے

لیے سو کر اٹھنا ضروری نہیں۔ سورۂ مزمل میں فرمایا، رات کا کچھ حصہ قرآن کی تلاوت پر مشتمل نماز کے ساتھ نیند کو ترک کیجیے۔ تفصیل سورۂ مزمل کی ابتدائی اور آخری آیات میں ملاحظہ فرمائیں۔

❷ نَافِلَةً لَّكَ : "نَافِلَةً" جو فرض سے زائد ہو، جمع نوافل۔ بعض لوگ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے لیے تہجد ایک زائد فرض ہے، باقی عوام کے لیے نفل ہے۔ مگر "اَقِمِ الصَّلٰوةَ" سے لے کر آیات کے آخر تک کے اول مخاطب اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہیں مگر ان تمام احکام کا مخاطب امت کا ہر فرد بھی ہے۔ اس لیے تحقیق یہی ہے کہ تہجد نبی ﷺ پر بھی فرض نہیں تھی۔

❸ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ...... : "عَسٰى" کا معنی "امید ہے"، "قریب ہے" ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ یہ لفظ فرمائے تو وہ کام واقع ہونا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ "عَسٰى" طمع اور امید دلانے کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے، جو ملک الملوک ہے، عار ہے کہ امید دلا کر اسے پورا نہ کرے۔ "مَقَامًا مَّحْمُوْدًا" کے لفظی معنی ہیں "ایسا مقام جس کی تعریف کی جائے" اور حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلص تہجد پڑھنے والے کو اس کی صلاحیت کے مطابق دنیا اور آخرت میں یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ دنیا میں لوگ اس سے محبت رکھتے اور تعریف کرتے ہیں اور آخرت میں بھی اسے یہ نعمت اس کی حیثیت کے مطابق حاصل ہوگی۔ دیکھیے سورۂ مریم (۹۶) اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائے۔ سب سے اونچا "مقام محمود" جو صرف ایک ہی شخص کو ملے گا اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول کریم ﷺ سے کیا ہے، وہ مقام شفاعت ہے، جس پر سب پہلے اور پچھلے آپ کی تعریف کریں گے۔ ایک شفاعت میدان محشر کی تنگی سے خلاصی دلا کر حساب کتاب شروع کرنے کی عام شفاعت ہے کہ اس پر سب پہلے اور پچھلے آپ کی تعریف کریں گے اور ایک اپنی امت کے لیے خاص شفاعت ہے جس پر پوری امت آپ کی احسان مند ہوگی اور تعریف کرے گی۔ آپ کے نام "احمد" اور "محمد" کی شان اس وقت پوری طرح ظاہر ہوگی۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگ گروہوں کی شکل میں ہوں گے، ہر امت اپنے نبی کا پیچھا کرے گی کہ اے فلاں! آپ سفارش کیجیے، یہاں تک کہ آخر میں شفاعت (کی درخواست) نبی ﷺ تک آ پہنچے گی تو یہ وہ دن ہے جب اللہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔ [ بخاري، التفسير، سورة بني إسرائيل، باب قوله : ﴿عسى أن يبعثك ربك مقاما محمودا﴾ : ٤٧١٨ ]

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اذان سنے، پھر یہ دعا پڑھے: (( اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ، آتِ مُحَمَّدَا نِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهُ )) تو اسے قیامت کے دن میری شفاعت نصیب ہوگی۔" [ بخاري، الأذان، باب الدعاء عند النداء : ٦١٤ ] شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "نیند سے جاگ کر قرآن پڑھا کر، یہ حکم سب سے زیادہ تجھ کو دیا ہے کہ تجھ کو بڑا مرتبہ دینا ہے، وہ تعریف کا مقام ہے، شفاعت (کبریٰ) کا کہ جب کوئی پیغمبر نہ بول سکے گا تب آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ سے عرض کر کے خلق کو چھڑوائیں گے تکلیف سے۔" (موضح)

❹ بعض لوگوں نے مقام محمود کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو عرش پر اپنے ساتھ بٹھائے گا۔ طبری نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے۔ بعض روایات رسول اللہ ﷺ سے بھی نقل کی جاتی ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اَلْعُلُوُّ لِلّٰهِ الْعَظِيْمِ"

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

**اور کہہ اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور میرے لیے اپنی طرف سے ایسا غلبہ بنا جو مددگار ہو ﴿۸۰﴾ اور کہہ دے حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے والا تھا ﴿۸۱﴾**

میں محمد بن مصعب کے ترجمہ میں فرمایا: ''رہا ہمارے نبی ﷺ کے عرش پر بیٹھنے کا معاملہ تو اس کے متعلق کوئی نص (آیت یا حدیث) ثابت نہیں، بلکہ اس باب میں ایک ضعیف و کمزور روایت ہے اور مجاہد نے آیت کی جو تفسیر کی ہے بعض اہل کلام نے اس کا انکار کیا ہے۔'' (ملخص از تفسیر قاسمی) ظاہر ہے کہ تابعی کے قول سے دین خصوصاً عقیدہ سے متعلق کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۴۲) امام ذہبی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا: ''بدعت اور غلو کا نتیجہ دیکھیے کہ ایک طرف ایک منکر اثر کو لے کر نبی ﷺ کو عرش پر بٹھایا جا رہا ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے عرش اور بلندی پر ہونے کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کے صریح فرمان: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ کو رد کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔'' (ملخص از قاسمی)

**آیت 80** ① **وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ......** : اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ اور آپ کے ہر امتی کو یہ دعا سکھائی کہ اے میرے رب! تو مجھے دنیا و آخرت میں جس جگہ بھی داخل کرے باعزت اور آبرومندانہ طریقے سے داخل کر اور جس جگہ سے بھی نکالے باعزت طریقے سے نکال اور میرے لیے دلیل و برہان کے ساتھ قوت و سلطنت کا ایسا غلبہ عطا فرما جو میرا مددگار ہو۔ دلیل کے غلبے کے لیے دعوت اور سلطنت کے غلبے کے لیے جہاد ضروری ہے، جس کا پہلا قدم دار الکفر سے ہجرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت اس وقت اتری جب آپ ﷺ کو ہجرت کا حکم دیا گیا، چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی اور آپ آبرومندانہ طور پر مدینہ وارد ہوئے، انصار سے اور مہاجرین سے دین کی مدد بھی ہوئی۔

② ''سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا'' سے اس آیت میں مراد قوت و سلطنت کا غلبہ ہے، کیونکہ دلیل و برہان میں تو آپ مکہ میں بھی ہر وقت غالب تھے۔ کوئی شخص سورۂ کوثر جیسی ایک سورت بھی نہ بنا سکا تھا، اب عناد اور ضد سے اکڑی ہوئی گردنوں کے لیے جہاد کی ضرورت تھی، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے ساتھ ساتھ لوہا بھی نازل فرمایا۔ دیکھیے سورۂ حدید (۲۵) کی تفسیر۔ اہل حق کے لیے حق سے دشمنی رکھنے والوں پر غلبہ حاصل کرنا فرض ہے، تب ہی وہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر سکتے ہیں اور اپنی سلطنت ہی میں وہ پورے اسلام پر عمل کر سکتے ہیں جو اب صرف مسجد، نکاح اور جنازے وغیرہ تک رہ گیا ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا: '' اِنَّ اللّٰهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْآنِ '' ''اللہ تعالیٰ سلطان کے ذریعے سے ان فواحش اور گناہوں سے روک دیتا ہے جن کے ارتکاب سے بہت سے لوگ قرآن سننے کے باوجود باز نہیں آتے۔''

**آیت 81** ① **وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ......** : اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ بشارت سنا دینے کا حکم دیا جو تھوڑے ہی عرصے کے بعد پوری ہو گئی اور آپ ﷺ فاتحانہ شان کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور ہم قرآن میں سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے کے سوا کسی چیز میں زیادہ نہیں کرتا ﴿۸۲﴾

نبی ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بت تھے، آپ ﷺ انھیں ایک لکڑی کے ساتھ کچو کے مارتے جاتے تھے جو آپ کے ہاتھ میں تھی اور یہ کہتے جاتے تھے: ﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾ ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل ہمیشہ سے مٹنے والا ہے۔'' ﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴾ [ سبا : ۴۹ ] ''حق آ گیا اور باطل نہ پہلی دفعہ کچھ کرتا ہے اور نہ دوبارہ کرتا ہے۔'' [ بخاري، التفسیر، سورة بني إسرائیل، باب : ﴿ و قل جاء الحق وزهق الباطل ﴾ : ۴۷۲۰ ]

❷ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا : ''ہمیشہ سے'' کا مفہوم ''كَانَ'' سے ظاہر ہو رہا ہے۔ طنطاوی نے لکھا ہے: ''أَيْ كَانَ غَيْرَ مُسْتَقِرٍّ وَلَا ثَابِتٍ فِيْ كُلِّ وَقْتٍ'' کہ باطل ہر دور میں یعنی ہمیشہ سے ناپائیدار ہے۔

**آیت 82** ❶ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ ...... : یعنی قرآن میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ نازل کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اہل ایمان کے دل میں اگر شک وشبہ یا کفر ونفاق کی کوئی بیماری پیدا ہو جائے تو قرآنی آیات کے ساتھ وہ تمام بیماریاں دور ہو کر ان کے دل اور روح کو مکمل شفا و رحمت حاصل ہو جائے۔ (''سراسر شفا'' کا مفہوم مصدر اور تنوین سے ظاہر ہو رہا ہے) مگر ظالموں کو یعنی کفار و مشرکین کو اس سے خسارے ہی میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ پہلی آیات کے ساتھ ان آیات کے انکار سے ان کا کفر اور بڑھ جاتا ہے۔ یہاں شفا سے مراد روحانی شفا، یعنی ایمان و یقین کی دولت مراد ہے، جو کفار کو حاصل نہیں ہوتی۔ دیکھیے سورۂ یونس (۵۷)، حٰم السجدہ (۴۴) اور توبہ (۱۲۴، ۱۲۵)۔

❷ اگرچہ اس آیت میں شفا سے اولین مراد روحانی شفا یعنی کفر ونفاق، شکوک وشبہات اور جہل سے شفا ہے، مگر اس کے احکام پر عمل کرنے سے انسان جسمانی بیماریوں سے بھی شفا پاتا ہے اور ان سے محفوظ بھی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ قرآن دم کے لیے پڑھا جائے تو اس سے مسلم و کافر دونوں کی جسمانی بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک قبیلہ جنھوں نے کچھ مسافر صحابہ رضی اللہ عنہم کی مہمانی سے انکار کر دیا تھا، اتفاق سے اس قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، وہ لوگ اپنی ساری کوشش کے بعد صحابہ کے پاس دم کی درخواست لے کر آئے، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے تیس بکریوں کی شرط پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ بالکل تندرست ہو گیا، رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ [ بخاري، الإجارة، باب ما يعطي في الرقية...... : ۲۲۷۶، ۵۰۰۷ ] اسی طرح خارجہ بن صلت رضی اللہ عنہ کے چچا نے سفر کے دوران ایک قبیلے کے لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک پاگل کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا اور ان لوگوں نے انھیں سو بکریاں دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « خُذْهَا فَلَعَمْرِيْ لَمَنْ أَكَلَ بِرُقْيَةِ بَاطِلٍ لَقَدْ أَكَلْتَ بِرُقْيَةِ حَقٍّ » [ أبو داوٗد، الطب، باب کیف الرقی : ۳۸۹۶، صححه الألباني ] ''(بکریاں) لے لو، مجھے اپنی عمر کی قسم!

وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰبِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ع وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں وہ منہ پھیر لیتا ہے اور اپنا پہلو دور کر لیتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت ناامید ہو جاتا ہے ﴿۸۳﴾ کہہ دے ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے، سو تمھارا رب زیادہ جاننے والا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر ہے ﴿۸۴﴾ اور وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے روح

---

جس نے باطل دم کے ساتھ کھایا (وہ کھاتا رہے) بلاشبہ یقیناً تو نے حق دم کے ساتھ کھایا ہے۔"

**آیت 83** وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ......: "اَلْاِنْسَانِ" سے مراد یہاں کافر یا فاسق انسان ہے، صحیح مومن ایسا نہیں ہوتا۔ صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ » [ مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير : ۲۹۹۹ ] "مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر معاملہ ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو وہ شکر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے، سو وہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔" مزید دلیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۂ ہود (۹ تا ۱۱) اور سورۂ معارج (۱۹ تا ۳۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر احسان کے باوجود بے وفائی اور ناشکری کرے تو محسن کو احسان چھوڑنا نہیں چاہیے۔ تمام کفار و فساق کی ناشکری کے باوجود اللہ تعالیٰ دنیا میں ان پر بھی بے شمار انعامات جاری رکھے ہوئے ہے۔

**آیت 84** ① قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ: "شَاكِلَةٌ" وہ طریقہ جو کسی کا ہم شکل اور حسب حال ہو، یعنی ہر شخص اپنے اس طریقہ پر عمل کرتا ہے جو ہدایت یا گمراہی میں سے اس کے مطابق اور حسب حال ہوتا ہے، کوئی نیک ہے، کوئی بد اور کوئی بین بین، سب ایک طریقے پر نہیں، نہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے موافق ہے، کیونکہ پھر امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۱۱۸، ۱۱۹)۔

② فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا: یعنی ہر شخص اسی طریقے پر خوش ہے جس پر چل رہا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [ المؤمنون : ۵۳ ] "ہر گروہ کے لوگ اسی پر خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔" اور ہر شخص اپنے آپ کو سب سے زیادہ صحیح راستے پر سمجھتا ہے، مگر سب سے زیادہ صحیح راستے پر چلنے والوں کا علم صرف تیرے رب کو ہے جو قیامت کے درمیان اپنے بندوں کے تمام اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا۔ دیکھیے سورۂ زمر (۴۶)۔

**آیت 85** ① وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ......: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض یہود کے روح سے متعلق سوال کرنے پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [ دیکھیے بخاری، العلم، باب قول الله تعالى : ﴿ وما أوتيتم من العلم إلا قليلا ﴾ : ۱۲۵ ۔ مسلم : ۲۷۹۴ ] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے، مگر یہ سورت مکی ہے اور

الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۵﴾

میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں علم میں سے بہت تھوڑے کے سوا نہیں دیا گیا۞

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قریش نے یہود سے کہا: «أَعْطُونَا شَيْئًا نَسْأَلُ عَنْهُ هٰذَا الرَّجُلَ، فَقَالُوْا سَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ، فَسَأَلُوْهُ، فَنَزَلَتْ : ﴿وَ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا﴾ [ الإسراء : ۸۵ ]قَالُوْا أُوْتِينَا عِلْمًا كَثِيْرًا، أُوْتِينَا التَّوْرَاةَ، وَمَنْ أُوْتِيَ التَّوْرَاةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا، قَالَ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : ﴿قُلۡ لَّوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ﴾ [الكهف : ۱۰۹ ] » ’’ہمیں کوئی چیز دو جس کے متعلق ہم اس آدمی سے سوال کریں؟‘‘ تو انھوں نے کہا: ’’اس سے روح کے متعلق پوچھو۔‘‘ چنانچہ انھوں نے آپ سے پوچھا تو یہ آیت اتری: ﴿وَ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا﴾ انھوں نے کہا: ’’ہمیں تو کثیر علم عطا کیا گیا ہے، کیونکہ ہمیں تورات دی گئی ہے اور جسے تورات دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی۔‘‘ ابن عباس نے فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿قُلۡ لَّوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ﴾ [ مسند أحمد : ۲۵۵/۱، ح : ۲۳۱۳، وصححه الألباني ] ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ یہ آیت پہلے مکہ میں اتری ہو (کیونکہ یہ سورت مکی ہے) پھر دوبارہ مدینہ میں اتری ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ میں جب یہودیوں نے یہ سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی ہو کہ آپ یہ آیت پڑھ کر سنائیں۔

② روح کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے، مثلاً وحی (مومن : ۱۵)، قوت و ثابت قدمی (مجادلہ : ۲۲) جبریل علیہ السلام (شعراء : ۱۹۳)، قرآن (شوریٰ : ۵۲) اور مسیح علیہ السلام (نساء : ۱۷۱) زیر تفسیر آیت میں روح سے مراد وہ چیز ہے جس سے بدن کو زندگی حاصل ہوتی ہے، ہر شخص اس کا مشاہدہ کرتا ہے، کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ فرمایا ان سے کہہ دیجیے روح میرے رب کے حکم سے ہے، یعنی اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آ پڑی، وہ جی اٹھا جب نکل گئی وہ مر گیا۔ اس کے علاوہ روح کی حقیقت کو صرف وہی جانتا ہے۔ اس میں نکتہ یہ بھی ہے کہ جب آدمی اللہ کے حکم سے پیدا ہونے والی اس مخلوق کی حقیقت نہیں جانتا، جو خود اس میں رہتی ہے تو وہ خالق کی حقیقت کیسے جان سکتا ہے؟

③ وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا: اس مفہوم کی طرف سورۂ کہف (۱۰۹) اور لقمان (۲۷) میں بھی اشارہ ہے۔

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو صرف وہ باتیں بتائی ہیں جن کی انھیں ضرورت ہے اور جو انسانی عقل و فکر میں آ سکتی ہیں، اگرچہ انسانی فکر کے سوچنے پر کوئی پابندی نہیں، مگر اسے اپنی حدود میں رہنا لازم ہے۔ انسان نے ایسی ایسی ایجادات کیں جو بیان سے باہر ہیں مگر وہ اس راز (روح) کی حقیقت کو پانے سے عاجز رہا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک راز اور غیب کی چیز ہے، جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے؟ کیسے آئی؟ اور کس طرح جاتی ہے؟ کہاں سے آئی اور کہاں جاتی ہے؟ مخلوق کو صرف اتنا معلوم ہے جتنا اس علیم و خبیر نے بتایا ہے، اس سے آگے سب بے بس ہیں اور سب کا علم اللہ کے

وَ لَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾

اور یقیناً اگر ہم چاہیں تو ضرور ہی وہ وحی (واپس) لے جائیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے، پھر تو اپنے لیے اس کے متعلق ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہیں پائے گا ﴿۸۶﴾ مگر تیرے رب کی رحمت سے۔ یقیناً اس کا فضل ہمیشہ سے تجھ پر بہت بڑا ہے ﴿۸۷﴾ کہہ دے اگر سب انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کا بعض بعض کا مددگار ہو ﴿۸۸﴾

مقابلے میں اتنا ہے جتنا سمندر میں سے پرندے کی چونچ میں آنے والا پانی۔

آیت 87،86 ① وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک اور قدرت کا بیان فرمایا کہ اگر ہم چاہیں تو جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا ہے سب لے جائیں، نہ آپ کے سینے میں رہے، نہ آپ کے کسی صحابی یا امتی کے سینے میں، نہ کسی کاغذ یا دوسری چیز میں، پھر اسے حاصل کرنے کے لیے ہمارے مقابلے میں آپ کو کوئی حمایتی نہیں ملے گا۔

② اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ : لیکن یہ تیرے رب کی رحمت ہے کہ وہ اسے لے نہیں گیا، بلکہ اسے تیرے پاس ہی رہنے دیا ہے۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ معلوم ہوا قرآن قیامت تک باقی رہے گا، کوئی شخص اس کے تمام اوراق ختم کر کے بھی اسے ختم نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کا اصل ٹھکانا اہل علم کے سینے ہیں، (دیکھیے عنکبوت : ۴۹) اور رب کا وعدہ بھی ہے کہ وہ اسے نہیں لے جائے گا، بلکہ اس کی حفاظت کرے گا، فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [ الحجر : ۹ ] ''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

③ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا : یہاں فضل کبیر اور دوسری جگہ فضل عظیم فرمایا: ﴿ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ﴾ [ النساء : ۱۱۳ ] ''اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر ہمیشہ سے (عظیم) بہت بڑا ہے۔'' اس فضل کبیر و عظیم میں سے چند یہ ہیں کہ آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی، اسے آپ کے اور آپ کی امت کے پاس قیامت تک کے لیے باقی رکھا، آپ کو اولادِ آدم کا سردار بنایا، تمام لوگوں کے لیے رسول اور آخری نبی بنایا، تمام نبیوں کی امامت اور معراج کا شرف بخشا، شفاعتِ کبریٰ اور مقامِ محمود عطا فرمایا۔ جس فضل کو اللہ تعالیٰ عظیم و کبیر فرمائے اسے کوئی کیسے شمار کر سکتا ہے۔

آیت 88 قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ ...... : اس آیت میں پورے قرآن کی مثل لانے کا چیلنج ہے، سورۂ ہود (۱۳) میں دس سورتوں کا، بقرہ (۲۳) اور یونس (۳۸) میں ایک سورت کا اور سورۂ طور (۳۴) میں اس کے بھی بعض حصے کا، مگر

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾ وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۙ﴿۹۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال پھیر پھیر کر بیان کی مگر اکثر لوگوں نے کفر کے سوا (ہر چیز سے) انکار کر دیا ﴿۸۹﴾ اور انھوں نے کہا ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کرے ﴿۹۰﴾ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پس تو اس کے درمیان نہریں جاری کر دے، خوب جاری کرنا ﴿۹۱﴾ یا آسمان کو ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے، جیسا کہ تو نے دعویٰ کیا ہے، یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے ﴿۹۲﴾

قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ نہ اس زمانے میں کفار اس کا جواب دے سکے اور نہ آئندہ قیامت تک اس کا جواب ممکن ہے۔ یہاں انسانوں کے ساتھ جنات کو بھی شامل کر دیا ہے، اس لیے کہ کفار یہ اتہام لگاتے تھے کہ کوئی جن اس (محمد ﷺ) پر القا کر جاتا ہے اور پھر جنوں کو اپنے سے اعلیٰ اور عالم الغیب بھی سمجھتے تھے۔

**آیت 89** ❶ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ...... : اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے ہر طرح سے چیلنج کیا ہے اور یہ بھی کہ ہم نے توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے لیے ہر قسم کے دلائل پیش کیے ہیں، یا ہر معنی کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ ایسے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے کہ وہ مثال کی طرح ذہن میں اترتا چلا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس حد تک بیان اور سمجھانے کا تعلق ہے ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے بنی اسرائیل (۴۱) اور کہف (۵۴)۔

❷ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا : یعنی کسی طرح بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہیں۔

**آیت 91,90** ❶ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا...... : "يَنْۢبُوْعًا" "نَبَعَ يَنْبُعُ" (ض، ن، ع) پھوٹ نکلنا، بروزن "يَفْعُوْلٌ" یاء مبالغہ کے لیے بڑھائی گئی ہے، وہ چشمہ جو ہمیشہ جاری رہے۔ "الْاَرْضِ" میں الف لام عہد کا ہے، یعنی اس مکہ کی سنگلاخ زمین سے جہاں پانی کا نشان نہیں۔ "يَنْۢبُوْعًا" کے مطالبے کا مقصد یہ ہے کہ انھیں صرف اتنا پانی کافی نہیں جو ان کی ضرورت پوری کرے، بلکہ بہت بڑا اور ہمیشہ جاری رہنے والا چشمہ جاری ہونا چاہیے۔

❷ کفار جب قرآن کے معجزے کا جواب نہ دے سکے تو انھوں نے اپنے ایمان لانے کے لیے مزید معجزوں کا مطالبہ داغ دیا، جیسا کہ لاجواب ہونے والے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ان تمام مطالبات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہنے کا حکم دیا وہ آگے آ رہا ہے۔

**آیت 92** اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ...... : "كِسَفًا" "كِسْفَةٌ" کی جمع ہے، ٹکڑے۔ "قَبِيْلًا" بمعنی "مُقَابِلًا"،

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، یہاں تک کہ تو ہم پر کوئی کتاب اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ تو کہہ میرا رب پاک ہے، میں تو ایک بشر کے سوا کچھ نہیں جو رسول ہے ﴿۹۳﴾ اور لوگوں کو کسی چیز نے نہیں روکا کہ وہ ایمان لائیں، جب ان کے پاس ہدایت آئی مگر اس بات نے کہ انھوں نے کہا کیا اللہ نے ایک بشر کو پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے؟ ﴿۹۴﴾

جیسا کہ "عَشِیْر" بمعنی "مُعَاشِر" ہوتا ہے، یعنی آنکھوں کے سامنے۔ اس آیت میں ان کے دو مطالبے ذکر ہوئے۔ پہلے مطالبے میں ان بدنصیبوں کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے جس میں ارشاد ہے: ﴿ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [ سبا : ۹ ] "اگر ہم چاہیں تو انھیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں۔" اس وعید سے خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ جلد از جلد عذاب لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، جیسا کہ سورۂ انفال (۳۲) میں مذکور ہے۔ دوسرے مطالبے یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے لانے کی تفصیل سورۂ فرقان (۲۱، ۲۲) میں دیکھیے۔

آیت 93 ① اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ ...... : "زُخْرُفٍ" اصل میں زینت کو کہتے ہیں، یہاں یہ لفظ سونے کے معنی میں ہے، کیونکہ جو چیزیں زینت کے لیے استعمال ہوتی ہیں ان میں سونا بہت قیمتی اور خوبصورت ہے۔ "تَرْقٰى" "رَقٰى يَرْقِيْ رُقْيَةً" (ض) دم کرنا اور "رَقِيَ يَرْقٰى رُقِيًّا" (ع) چڑھنا۔

② قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ ...... : یہاں قرآن نے کفار کے چھ مطالبوں کا ذکر کیا ہے، جن کے ضمن میں کئی اور مطالبے ہیں۔ فرمایا، میرا رب ہر عیب اور عجز سے پاک ہے، وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اپنی مرضی سے۔ رہا مجھ سے مطالبے کرنا تو میں تو محض ایک بشر ہوں جو پیغام پہنچانے والا ہے، کیا تم کسی بشر کے متعلق بتا سکتے ہو کہ وہ اس قسم کے تصرفات کی طاقت رکھتا ہو اور پھر میرا کوئی اختیار بھی نہیں، نہ کوئی بات میری اپنی ہے، میں تو محض اللہ کا رسول، یعنی اس کی طرف سے پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا ہوا ہوں اور اس کے حکم کا تابع ہوں، تو میں اس کے اذن کے بغیر یہ چیزیں کیسے لا سکتا ہوں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ رسول کے سچا ہونے کے لیے تو ایک معجزہ ہی کافی ہوتا ہے اور آپ کو وہ معجزہ قرآن دیا گیا۔ اب اس کے بعد اگر متعدد معجزات کو معیار صدق قرار دیا جائے تو یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہو سکے گا، اس لیے آپ ﷺ اور پہلے تمام رسولوں نے ایسے موقع پر معذرت کر دی کہ یہ اللہ کا کام ہے، ہم تو محض بشر اور رسول ہیں۔

آیت 94 وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا ......: یعنی یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ ایک شخص بشر ہوتے ہوئے اللہ کا رسول

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾ وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ

کہہ دے اگر زمین میں فرشتے ہوتے، جو مطمئن ہو کر چلتے (پھرتے) تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام پہنچانے والا اتارتے ﴿۹۵﴾ کہہ دے میرے درمیان اور تمھارے درمیان گواہ کے طور پر اللہ کافی ہے، بے شک وہ ہمیشہ سے اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۹۶﴾ اور جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا

کیسے ہوسکتا ہے، اگر اللہ کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی فرشتے کو بھیج دیتا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے بشر ہونے کو جانتے تھے، آپ کے آبا و اجداد اور ازواج و اولاد، کھانے پینے، چلنے پھرنے اور دوسری تمام انسانی ضروریات کو دیکھتے تھے، اس لیے آپ کو رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب بہت سے مسلمان کہلانے والے جو باپ دادا سے مسلمان چلے آ رہے ہیں، محمد ﷺ کو رسول مانتے ہیں، مگر آپ کو بشر ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں، کیونکہ مشرکین عرب اور ان لوگوں کا ذہن ایک ہے۔ انھوں نے کہا، بشر رسول نہیں ہوسکتا اور انھوں نے کہا، رسول بشر نہیں ہوسکتا۔ " فَمَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ " (سو آج کی رات کل رات سے کس قدر ملتی جلتی ہے) اللہ تعالیٰ نے کفار کا یہ شبہ کئی آیات میں بیان فرمایا ہے، دیکھیے سورۂ یونس (۲)، تغابن (۶)، سورۂ قٓ (۱، ۲) اور انعام (۸، ۹) حقیقت یہ ہے کہ ان سب لوگوں نے اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں بشر کے مقام اور عزت و کرامت کو پہچانا ہی نہیں۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۷۰)۔

**آیت 95** قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ ...... : "مُطْمَئِنِّيْنَ" یعنی اگرچہ فرشتے اب بھی زمین پر آتے جاتے ہیں، لیکن اگر وہ انسانوں کی طرح اطمینان سے زمین پر رہ رہے ہوتے تو ہم ان کی طرف کسی فرشتے ہی کو رسول بھیجتے، مگر جب زمین پر ہم نے انسانوں کو بسایا ہے تو ان کی طرف ایک فرشتے کو رسول بنا کر بھیجنے سے کیا فائدہ؟ رسول کا کام صرف اس پیغام کو پہنچا دینا ہی نہیں بلکہ وہ لوگوں کے لیے عملی نمونہ بھی ہوتا ہے، تاکہ وہ اس کی پیروی کر سکیں۔ یہ مفہوم کہ رسول کا اپنی امت کا ہم جنس ہونا ضروری ہے، کئی آیات میں بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۷)، ابراہیم (۴) اور سورۂ انعام (۸، ۹)۔

**آیت 96** قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ ...... : " كَفٰى بِاللّٰهِ " کی ترکیب اور تفسیر کے لیے دیکھیے بنی اسرائیل (۱۵) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہوئے ان سے بحث اور جھگڑا ترک کرنے کا حکم دیا، یعنی آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں اپنے دعوائے نبوت میں جھوٹا ہوتا تو وہ میری سخت گرفت کرتا۔ (دیکھیے حاقہ: ۴۴ تا ۴۶) اور پھر اسے ہمیشہ سے خوب معلوم ہے کہ کون شخص انعام و احسان اور ہدایت پانے کے لائق ہے اور کون عقاب و عذاب اور گمراہی کے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور کفار کے لیے وعید۔

**آیت 97** ① وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ...... : نبوت پر ان کے شبہات کا جواب دینے کے بعد اب انھیں وعید سنائی۔

وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾

ہے اور جنھیں گمراہ کر دے تو تو ان کے لیے اس کے سوا ہرگز کوئی مدد کرنے والے نہیں پائے گا اور قیامت کے دن ہم انھیں ان کے چہروں کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب کبھی بجھنے لگے گی ہم ان پر بھڑکانا زیادہ کر دیں گے ﴿۹۷﴾

مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے بل بوتے پر یا اپنی عقل، علم یا کسی اور چیز کی بنیاد پر راہِ حق نہیں پا سکتا اور نہ اس پر ثابت قدم رہ سکتا ہے، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور دستگیری ہے جو کسی کو راہ حق دکھاتی ہے اور اگر انسان کی بدبختی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی توفیق انسان کے شامل حال نہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اسے راہِ راست پر نہیں لا سکتی۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ (رازی) "وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ" میں ہدایت یافتہ کو واحد کے صیغے سے اور "وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ" میں گمراہ کردہ لوگوں کو جمع کے صیغے سے بیان فرمایا، اس میں حکمت یہ ہے کہ ہدایت کا راستہ ایک ہے، اس پر چلنے والے ایک ہی جماعت ہیں، جبکہ ضلالت کے بے شمار راستے ہیں اور ان پر چلنے والے گروہ بے شمار ہیں۔ (واللہ اعلم)

❷ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...... : یعنی منہ کے بل چلیں گے، جیسے دنیا میں پاؤں کے بل چلتے تھے۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: "لوگ اپنے چہروں پر کس طرح اکٹھے کیے جائیں گے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: « أَلَيْسَ الَّذِيْ أَمْشَاهُ عَلَى الرِّجْلَيْنِ فِي الدُّنْيَا قَادِرًا عَلٰى أَنْ يُّمْشِيَهُ عَلٰى وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ؟ » [ بخاري، التفسير، سورة الفرقان، باب قوله : ﴿ الذين يحشرون على وجوههم الى جهنم ﴾ : ۴۷۶۰۔ مسلم : ۲۸۰۶ ] "جس نے انھیں ان کے پاؤں کے بل چلایا ہے وہ انھیں ان کے چہروں کے بل چلانے پر بھی قادر ہے۔" ایک مطلب یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن انھیں منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈالا جائے گا، جیسے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴾ [ القمر : ۴۸ ] "جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں پر گھسیٹے جائیں گے، چکھو آگ کا چھونا۔" دونوں صورتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ حشر کے دن وہ منہ کے بل الٹے چلتے ہوئے آئیں گے، پھر فرشتے چہروں کے بل گھسیٹتے ہوئے انھیں جہنم میں پھینک دیں گے۔

❸ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا : اندھے، گونگے اور بہرے۔ بعض آیات میں ان کے قیامت کے دن دیکھنے، بولنے اور سننے کا ذکر آیا ہے، تو ایک تطبیق یہ ہے کہ قیامت کے پچاس ہزار سال کے برابر دن کے مختلف اوقات میں ان کی مختلف حالتیں ہوں گی۔ دوسری یہ کہ وہ جمالِ الٰہی کے دیدار اور جنت کی نعمتوں کے دیکھنے سے محروم ہوں گے، کوئی خوش کن خبر نہیں سنیں گے اور نہ کوئی دلیل بیان کرنے کی طاقت ہوگی، ورنہ حواس خمسہ ظاہرہ کے اعتبار سے تو وہ بہت سننے اور دیکھنے والے ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۳۸) اور سورۂ طور (۱۴، ۱۵)۔

❹ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا : "خَبَتْ" اصل میں "خَبَوَتْ" ہے، "خَبَا يَخْبُوْ" سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

یہی ان کی جزا ہے، کیونکہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو گئے تو کیا واقعی ہم ضرور نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جانے والے ہیں؟ ﴿۹۸﴾ اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے، جس میں کچھ شک نہیں، پھر (بھی) ظالموں نے کفر کے سوا (ہر چیز سے) انکار کر دیا ﴿۹۹﴾

---

ہے، مصدر "خَبْوًا وَ خُبُوًّا" ہے، آگ کی تیزی کا ہلکا ہونا یا بجھنا، یعنی عذاب کبھی ہلکا نہ ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ [ البقرۃ : ۸۶ ] "سو نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔"

**آیت 98** ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ ...... : اس آیت میں ان کی سزا کا سبب بیان فرمایا۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۴۹)۔

**آیت 99** ① "اَوَلَمْ يَرَوْا" کا معنی "اَوَلَمْ يَعْلَمُوْا" ہے، یعنی "کیا انھیں معلوم نہیں؟" دیکھیے سورۂ فیل اور ابراہیم (۲۴) مطلب یہ کہ انھیں معلوم ہے۔ "لَمْ" کے اوپر ہمزہ استفہام برائے توبیخ آیا تو اثبات کا مفہوم پیدا ہو گیا، کیونکہ نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے۔

② اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ ...... : یہ ان کے قیامت کے انکار کا عقلی جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا، وہ ان جیسوں کو بھی پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، کیونکہ زمین و آسمان کی پیدائش ان کی پیدائش سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۸۱)، احقاف (۳۳)، مومن (۵۷) اور نازعات (۲۷)۔

③ اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ : "ان جیسوں" سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کو دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ "مِثْلَهُمْ" کا لفظ تحقیر کے لیے ہے، جیسے کہا جاتا ہے، تیرے جیسے ذلیل ہی ہوتے ہیں، تیرے جیسوں کی کیا مجال ہے؟ مطلب یہ کہ تمھاری کیا مجال ہے؟ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان کی جگہ ان جیسے اور لوگ پیدا کر دے جو اسے ایک مانیں، اس قسم کے فاسد شبہات سے پاک ہوں اور قیامت برپا کرنے میں اس کی کمال حکمت کے قائل ہوں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ [ محمد : ۳۸ ] "اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمھاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔" دونوں معنی ہی درست ہیں۔

④ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا ...... : "جَعَلَ" کا عطف "قَادِرٌ" پر ہے جو "قَدَرَ" کی طرح ہے، یعنی وہ ان جیسے لوگ پیدا کرنے پر قادر ہے اور اس نے ان سب کے مرنے اور دوبارہ اٹھائے جانے کا وقت مقرر کر رکھا ہے، جس کی آمد میں کوئی شبہ نہیں، لہٰذا محض تاخیر کو دیکھ کر دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار سراسر حماقت ہے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۱۰۳، ۱۰۴)۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۠(۱۰۰) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا (۱۰۱)

کہہ دے اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس وقت تم خرچ ہو جانے کے ڈر سے ضرور روک لیتے اور انسان ہمیشہ سے بہت بخیل ہے (۱۰۰) اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں، سو بنی اسرائیل سے پوچھ، جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا یقیناً میں تو تجھے اے موسیٰ! جادو زدہ سمجھتا ہوں (۱۰۱)

آیت 100 ① قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ...... : یعنی اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے، جن کے ختم ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں، تب بھی تم کسی کو پھوٹی کوڑی نہ دیتے۔ اس شدید بخل کا نتیجہ ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کا بھی کسی کو نعمت عطا کرنا برداشت نہیں، نہ تمھیں یہ برداشت ہے کہ اللہ نے محمد ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا، اس لیے کہ تم محمد ﷺ کی نبوت و رسالت پر حسد و بخل کرتے ہو۔ یہ دونوں صفات بے حد قبیح ہیں۔ اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۵۳ تا ۵۵) روح المعانی میں ہے کہ ماقبل سے ربط میں مختلف اقوال ہیں مگر ان میں تکلف ہے۔

② وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا: "قَتَرَ يَقْتُرُ قَتْرًا وَ قُتُوْرًا" (ن، ض) خرچ میں تنگی کرنا، شدید بخل، حتیٰ کہ اپنی ذات پر خرچ کرنے میں بھی بخل کرے۔ اس میں انسان کی طبعی اور جبلّی خصلت بیان فرمائی ہے، جو ہمیشہ سے اس میں پائی جاتی ہے اور جس سے چھٹکارا انھی اعمال کی بدولت ہو سکتا ہے جو "مرد ہلوع" (تھڑدلا مرد) کے علاج کے لیے سورۂ معارج کی آیات (۱۹ تا ۳۵) میں بیان ہوئے ہیں۔

آیت 101 ① وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ...... : یعنی ہم موسیٰ علیہ السلام کو ایسے نو (۹) معجزے دے چکے ہیں جو ان کی نبوت پر کھلی نشانی تھے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور قریش کو اس مطالبے کا جواب دیا ہے جو انھوں نے نبی ﷺ سے کیا تھا کہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ یہ کام کر کے نہ دکھا دیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ سے تو چھ معجزوں کا مطالبہ کیا گیا ہے، ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزے دیے، مگر نہ ماننے والوں نے پھر بھی نہ مانا۔ ان نو (۹) معجزوں کا ذکر سورۂ اعراف کی آیات (۱۰۷، ۱۰۸، ۱۳۰، ۱۳۳) میں ہے۔ بعض نے ان سے شریعت کے نو (۹) احکام مراد لیے ہیں جو تمام شریعتوں میں ثابت تھے، مگر صحیح یہی ہے کہ یہاں نو (۹) معجزات ہی مراد ہیں وہ نو احکام دراصل تورات میں مذکور نو وصیتیں ہیں جو بنی اسرائیل کو دی گئیں، ان کا فرعون کے سامنے پیش کیے گئے معجزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی دلیل سورۂ نمل کی آیات (۱۰ تا ۱۲) ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے عصائے موسیٰ اور ید بیضا کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿ فِیْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ﴾ [النمل: ۱۲] یعنی یہ دونوں ان نو (۹) معجزوں میں شامل تھے جو موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو اور معجزات بھی دیے گئے، مثلاً پتھر سے بارہ چشمے جاری ہونا، گائے کا حصہ مارنے سے مردہ زندہ ہونا، من و سلویٰ، بادلوں کا سایہ، پہاڑ کا اکھڑ کر ان پر آ کھڑا ہونا وغیرہ، مگر یہ بنی اسرائیل کے لیے تھے۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۙ﴿۱۰۳﴾ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ؕ﴿۱۰۴﴾

اس نے کہا بلاشبہ یقیناً تو جان چکا ہے کہ انھیں آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا کسی نے نہیں اتارا، اس حال میں کہ واضح دلائل ہیں اور یقیناً میں تو اے فرعون! تجھے ہلاک کیا ہوا سمجھتا ہوں ﴿۱۰۲﴾ تو اس نے ارادہ کیا کہ انھیں اس سرزمین سے پھسلا دے تو ہم نے اسے اور جو اس کے ساتھ تھے، سب کو غرق کر دیا ﴿۱۰۳﴾ اور ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس سرزمین میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا ہم تمھیں اکٹھا کر کے لے آئیں گے ﴿۱۰۴﴾

② اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا : یہ بالکل اسی قسم کا الزام ہے جو کفار مکہ آپ ﷺ کو دیتے تھے، جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ٤٧ ] ”تم پیروی نہیں کرتے مگر ایسے آدمی کی جس پر جادو کیا گیا ہے۔“ ہر زمانے میں باطل پرست ناقابل تردید دلائل سن کر حق پرستوں کے بارے میں ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔

**آیت 102** قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ ...... : یعنی مجھ پر تو کسی نے جادو نہیں کیا، مگر تو جو ان معجزات کو دیکھ لینے اور ان کے اللہ کی طرف سے ہونے کے یقین کے باوجود اپنی ضد پر قائم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیری تباہی کے دن قریب آ گئے ہیں۔ ” ثُبُوْرٌ “ کا معنی ہلاکت ہے۔ دیکھیے فرقان (۱۴) اس مفہوم کی آیت سورۂ نمل کی آیت (۱۳) ہے۔

**آیت 103** ① فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ...... : ”اَلْاَرْضِ“ میں الف لام عہد کا ہے، یعنی زمین مصر۔ یعنی فرعون کا ارادہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو بے دریغ قتل کر کے اتنا خوف زدہ کر دے کہ وہ ایک ایک کر کے ملک سے نکل جائیں۔ وہ انھیں اطمینان سے اکٹھے ہجرت کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا، مگر اس کے منصوبے دھرے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ نے سارے بنی اسرائیل کو اکٹھے خیریت سے نکال لیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا۔ ان کے غرق ہونے کا واقعہ سورۂ یونس (۸۸ تا ۹۲) میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

② ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، اس آیت میں فتح مکہ کی طرف بھی اشارہ ہے، اگرچہ سورت مکی ہے۔ یہاں فرعون کا ارادہ ہے: ﴿ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ اور وہاں مکہ والوں کا: ﴿ وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا ﴾ [ بنی إسرائیل : ٧٦ ] ”اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے ضرور ہی اس سرزمین سے پھسلا دیں، تاکہ تجھے اس سے نکال دیں۔“ فرعون اپنی قوم سمیت غرق ہوا اور بنی اسرائیل وارث بنے، ادھر مشرکین مکہ مغلوب ہوئے اور رسول اللہ ﷺ وارث بنے۔

**آیت 104** ① وَقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ : ”اَلْاَرْضَ“ سے مراد ارض شام بیان کی جاتی ہے، مگر سورۂ شعراء کی آیت (۵۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار بنی اسرائیل کی حکومت فلسطین و شام کے بعد مصر پر بھی قائم ہو گئی

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

اور ہم نے اسے حق ہی کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا ﴿۱۰۵﴾ اور عظیم قرآن، ہم نے اس کو جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ تو اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور ہم نے اسے نازل کیا، (تھوڑا تھوڑا) نازل کرنا ﴿۱۰۶﴾

تھی، فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [ الشعراء : ۵۹ ] ”ایسا ہی ہوا اور ہم نے اس (مصر) کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔“ اگرچہ یہ سب فتوحات موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں نہ ہو سکیں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۲۰ تا ۲۶)۔

② فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا: ”لَفِيْفًا“ ”لَفُّ الشَّيْءِ بِالشَّيْءِ أَيْ ضَمُّهُ إِلَيْهِ وَ وَصَلُهُ بِهِ۔“ ”جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا“ ”أَيْ مُجْتَمِعِيْنَ، مُخْتَلِطِيْنَ مِنْ كُلِّ قَبِيْلَةٍ“ (قاموس) یعنی ہم اچھے و برے، مومن و کافر سب کو حشر کے میدان میں جمع کریں گے، تاکہ ان کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دیا جائے۔

آیت 105 ① وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ : یعنی اس میں جو بات بھی ہے سراسر حق ہے۔ ”وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ“ اور جیسے ہم نے اتارا ویسے ہی وہ اترا ہے، درمیان میں کسی کا دخل نہیں ہوا کہ وہ کوئی کمی بیشی یا تبدیلی کر سکے۔ وحی الٰہی کی حفاظت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ جن کی آیات (۲۶ تا ۲۸) اور اس مفہوم کے قریب سورۂ انعام کی آیت (۱۱۵) ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر کر کے جو قرآن کا ذکر فرمایا تو اس سے مقصود کفار قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے الٹی سیدھی فرمائشیں کرنے کے بجائے اسی قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

② وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا : یعنی ہم نے آپ کو یہ قدرت دے کر نہیں بھیجا کہ لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیں، بلکہ آپ کا کام صرف دعوت دینا، قبول کرنے والے کو خوش خبری دینا اور انکار کرنے والے کو جہنم سے ڈرانا ہے۔ دیکھیے سورۂ غاشیہ (۲۲،۲۱)۔

آیت 106 وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ ...... : ”قُرْاٰنًا“ پر تنوین تعظیم کی ہے اور یہ فعل محذوف ”اٰتَيْنَا“ کا مفعول ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو یہ عظیم قرآن دیا، ہم نے اسے جدا جدا کر کے نازل کیا، یعنی اس کی سورتیں اور آیتیں جدا جدا رکھیں اور تقریباً تیئیس برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔ اس میں کئی حکمتیں ہیں، مثلاً یہ کہ اس کے پڑھنے، یاد کرنے، سمجھنے اور عمل کرنے میں آسانی ہو، موقع محل کے اعتبار سے اس کے مطالب ذہن نشین ہو جائیں، تاکہ آئندہ کسی آیت کے بے موقع استعمال کی گنجائش نہ رہے۔ جب بھی کفار کے طرزِ عمل سے کوئی پریشانی یا گھبراہٹ ہو تو اس کی آیات کے ساتھ آپ کے دل کو قائم رکھا جائے اور مسلمانوں کو کوئی مسئلہ پیش آئے یا کفار کی طرف سے کوئی اعتراض ہو تو اس کا جواب موقع پر دیا جا سکے۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان کی آیت (۳۳،۳۲)۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾ وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَ يَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۩﴿۱۰۹﴾

السجدۃ ۵

کہہ دے تم اس پر ایمان لاؤ، یا ایمان نہ لاؤ، بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں﴿۱۰۷﴾ اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہمارے رب کا وعدہ یقیناً ہمیشہ پورا کیا ہوا ہے﴿۱۰۸﴾ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں، روتے ہیں اور وہ (قرآن) انھیں عاجزی میں زیادہ کر دیتا ہے﴿۱۰۹﴾

**آیت 107-109** ① قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا : یعنی تمھارے ماننے یا نہ ماننے سے اس کی عظمت نہ بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے۔ یہ تہدید و انکار کے طور پر ان لوگوں سے خطاب ہے جو قرآن کے واضح دلائل کی موجودگی میں معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔

② اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ : یعنی تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، تم سے اچھے اور نیک اہل علم جو پچھلی آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے واقف ہیں اور وحی و نبوت کی حقیقت کو سمجھتے ہیں، جیسے ورقہ بن نوفل، عبد اللہ بن سلام، سلمان فارسی اور نجاشی، وہ آپ کو رسول مانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس کی بشارت تورات و انجیل میں دی گئی ہے۔

③ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ...... : "اَذْقَانٌ" "ذَقَنٌ" کی جمع ہے، ٹھوڑیاں۔ "اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا" اصل میں "اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا" تھا، یعنی حنفاء اور اہل کتاب علماء کے سامنے جب قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں کہ اس اللہ کا احسان ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کا زمانہ پا لیا اور قرآن پر ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں کہ ہمارا رب وعدہ خلافی اور ہر عیب سے پاک ہے، یقیناً ہمارے رب کا وعدہ ہمیشہ پورا ہو کر رہتا ہے، اس لیے اس نے اپنے وعدے کے مطابق آپ ﷺ کو مبعوث فرما دیا۔

④ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال کیا کہ "سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا" کو سجدۂ تلاوت میں پڑھنا مستحب ہے۔ (اکلیل)

⑤ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ...... : قرآن کریم میں مذکور نصیحت سن کر شدت تاثر سے ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور قرآن سننا ان کے خشوع اور عجز و انکسار میں اور اضافہ کر دیتا ہے، ایسے اہل کتاب کی یہ کیفیت قرآن میں کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے مائدہ (۸۳، ۸۴) اور قصص (۵۲ تا ۵۴)۔

ٹھوڑیوں کے بل گرنے کے تکرار سے مقصود دو مختلف حالتوں کو ظاہر کرنا ہے، یعنی سجدہ ریز ہو کر اللہ کی تسبیح کرنا اور سجدے میں گر کر رونا۔ یا یہ سجدے کے تکرار کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ بار بار سجدہ کرتے ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''نماز میں سجدہ

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾

کہہ دے اللہ کو پکارو، یا رحمان کو پکارو، تم جس کو بھی پکارو گے سو یہ بہترین نام اسی کے ہیں اور اپنی نماز نہ بلند آواز سے پڑھ اور نہ اسے پست کر اور اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کر ﴿۱۱۰﴾

دو بار ہوتا ہے، اس واسطے دو بار فرمایا کہ پہلی بار قرآن کی اعجازی تاثیر کے نتیجے میں اور دوسری بار خشوع و خضوع کے لیے۔'' (موضح) واضح رہے کہ احادیث میں اللہ کے ذکر کے وقت (جس میں قرآن بھی شامل ہے) رونے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں عرش کا سایہ حاصل کرنے والے سات خوش بختوں میں ایک وہ بندہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ» [ مسلم، الزکاۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ : ۱۰۳۱۔ بخاری : ٦٤٧٩ ] ''جس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھیں بہ پڑیں۔''

**آیت 110** ❶ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ...... : کفار مکہ ''رحمان'' نام سے نفرت کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس نام سے ان کی نفرت کا تذکرہ کئی آیات میں کیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴾ [ الفرقان : ٦٠ ] ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں اور رحمان کیا چیز ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو ہمیں حکم دیتا ہے اور یہ بات بدکنے میں انھیں اور بڑھا دیتی ہے۔'' ان کی اس نفرت کا ذکر سورۂ انبیاء (۳٦) میں بھی ہے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے کاتب سے فرمایا: ''لکھو ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' تو (کفار کے نمائندے) سہیل بن عمرو نے کہا: ''رحمان! اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا رحمان کیا ہے؟ بلکہ لکھو ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' جیسا کہ (پہلے) لکھا کرتے تھے۔'' [ بخاری، الشروط، باب الشروط فی الجهاد...... : ۲۷۳۱، ۲۷۳۲ ] اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اللہ کو پکارو یا رحمان کو، اللہ تعالیٰ کو اس کے جس نام سے بھی پکارا جائے وہ سب ہی بہترین ہیں، جب سب ہی بہترین ہیں تو یہ دونوں کیوں بہترین نہ ہوں گے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۰) کی تفسیر۔

❷ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ...... : ''صَلَاةٌ'' سے مراد نماز میں قرآن مجید کی قراءت ہے، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت اس وقت اتری جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں چھپے ہوئے تھے۔ آپ جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتے تو قرآن پڑھتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے، جب مشرکین اسے سنتے تو قرآن کو اور اس کے اتارنے والے کو گالی دیتے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا: «﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ ﴾ أَيْ بِقِرَاءَتِكَ فَيَسْمَعَ الْمُشْرِكُوْنَ فَيَسُبُّوا الْقُرْآنَ، ﴿ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا ﴾ عَنْ أَصْحَابِكَ فَلَا تُسْمِعُهُمْ ﴿ وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴾» [ بخاری، التفسیر، سورۃ بنی إسرائیل باب : ﴿ ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها ﴾ : ٤٧٢٢ ] ''وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قراءت کے ساتھ آواز بلند نہ کرو کہ مشرکین اسے سنیں گے تو اسے گالی دیں گے اور نہ اسے اپنے اصحاب سے چھپا کر پڑھو، کیونکہ آپ اسے ان کو سنا نہیں سکیں گے اور اس کے درمیان کا کوئی راستہ تلاش کرو۔'' ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ آیت

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

ع ۱۲/۱۱

اور کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ عاجز ہو جانے کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے اور اس کی بڑائی بیان کر، خوب بڑائی بیان کرنا ﴿۱۱۱﴾

دعا کے متعلق نازل ہوئی۔ [ بخاري، التفسير، سورة بني إسرائيل باب : ﴿ ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها ﴾ : ۴۷۲۳ ] ابوداؤد میں صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیام اللیل میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پست آواز اور عمر رضی اللہ عنہ کو بلند آواز سے قراءت کرتے ہوئے سنا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کچھ بلند اور عمر رضی اللہ عنہ کو کچھ آہستہ پڑھنے کے لیے فرمایا۔ [ أبو داوٗد، التطوع، باب رفع الصوت بالقراءة في صلاة الليل : ۱۳۲۹ ] آیت کے الفاظ قراءت اور دعا دونوں معنوں کی گنجائش رکھتے ہیں۔

آیت 111 ﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ...... ﴾ : یعنی ہر خوبی جس کی تعریف ہو سکتی ہے، خواہ وہ صفت جمال ہو یا جلال یا کمال، صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس کے سوا کسی اور میں کوئی خوبی ہے تو اسی کی عطا کردہ ہے، اس لیے وہ بھی اسی کی خوبی ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس کے سوا کوئی خواہ کتنا ہی بڑا ہے یا تو اولاد کا محتاج ہے، کیونکہ اسے بوڑھا ہونا اور فوت ہونا ہے، اس لیے زندگی میں اسے مدد کے لیے اور مرنے کے بعد وارث کے طور پر اولاد کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا، وہی سب کا وارث ہے، وہ اولاد کی محتاجی سے پاک ہے۔ پھر والد اور اولاد ایک جنس سے ہوتے ہیں، اگر اس کی اولاد ہو تو اس کا " وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ " ہونا باقی نہیں رہتا۔ پھر ایک جیسے دو یا کئی الٰہ ماننا پڑیں گے، جس کا نتیجہ سورۂ انبیاء (۲۲) میں مذکور ہے۔ " لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا " میں یہود و نصاریٰ کا رد ہو گیا جو عزیر یا مسیح علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے اور مشرکین عرب کا بھی جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اسلام کے پردے میں چھپے ہوئے ان لوگوں کا بھی جو نبی کریم ﷺ کو یا علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو اللہ کے ذاتی نور کا ٹکڑا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

خدا کے نور سے پیدا ہوئے پانچوں تن — محمد است و علی، فاطمہ، حسن و حسین

یا پھر اللہ کے سوا جو بھی ہے وہ اکیلا ہر کام سرانجام نہیں دے سکتا، اس لیے بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی اپنے ولی عہد یا وزیر و مشیر کو حکومت میں شریک کرنا پڑتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اکیلا ہی پوری کائنات کا ایسا بادشاہ ہے جسے کسی شریک کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس کے سوا ہر ایک کی زندگی میں ایسا مرحلہ آتا ہے جب اسے اپنی کمزوری یا عاجزی کی وجہ سے کسی مددگار اور حمایتی کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ عزیز ہے، سب پر غالب ہے، نہ اسے کوئی کمزوری یا بے بسی لاحق ہوتی ہے، نہ کوئی ایسا ہے جو اس کی بے بسی اور عاجزی میں اس کا پشت پناہ بنے۔ اللہ نے فرمایا کہ اے نبی! اور اے ہر مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کے ہر خوبی اور ہر تعریف کے مالک ہونے کا اعلان کر دے، کیونکہ اس میں یہ تینوں کمزوریاں نہیں ہیں اور اس کی بڑائی جتنی ہو سکتی ہے زیادہ سے زیادہ بیان کر۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت جامع آیت ہے، جس میں اللہ کی حمد، تسبیح، تہلیل اور تکبیر تمام چیزیں دلیل کے ساتھ ذکر ہوئی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہ رکھی ①

کہف کا معنی پہاڑ میں کھلی اور وسیع غار ہے، تنگ غار کو "غَارٌ" یا "مَغَارَۃٌ" کہتے ہیں۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے کہف والوں کا قصہ بیان فرمایا ہے، جس میں اللہ پر ایمان کی برکات بیان ہوئی ہیں کہ اس کی بدولت کس طرح آدمی دشمن سے محفوظ اور تمام دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس میں حق کہنے کی کتنی جرأت پیدا ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کیسے عجیب طریقوں سے عزت و کرامت عطا فرماتا ہے۔ (مہائمی) اس کی فضیلت میں متعدد احادیث ثابت ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُوْرَةِ الْكَهْفِ، عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ )) [ مسلم، صلاۃ المسافرین، باب فضل سورۃ الکھف و آیۃ الکرسی : ۸۰۹ ] "جو شخص سورۂ کہف کی شروع کی دس آیات حفظ کر لے وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔" مسلم کی اس حدیث میں اس سورت کی آخری دس آیات کی بھی یہی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اس سورت کے پڑھنے سے گھر میں سکینت اور برکت کا نزول ہوتا ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: (( كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْكَهْفِ وَإِلٰى جَانِبِهِ حِصَانٌ مَرْبُوْطٌ بِشَطَنَيْنِ، فَتَغَشَّتْهُ سَحَابَةٌ فَجَعَلَتْ تَدْنُوْ وَ تَدْنُوْ، وَجَعَلَ فَرَسُهُ يَنْفِرُ، فَلَمَّا أَصْبَحَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ، فَقَالَ تِلْكَ السَّكِيْنَةُ تَنَزَّلَتْ بِالْقُرْآنِ )) [ بخاری، فضائل القرآن، باب فضل سورۃ الکھف : ۵۰۱۱ ] ایک آدمی سورۂ کہف پڑھ رہا تھا، اس کے ایک طرف ایک گھوڑا تھا جو دو رسیوں سے بندھا ہوا تھا، تو اسے بادل کے ایک ٹکڑے نے ڈھانپ لیا، پھر اس نے قریب آنا شروع کر دیا اور مزید قریب آتا گیا، چنانچہ اس کا گھوڑا ابدکنے لگا، جب صبح ہوئی تو وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ سکینت تھی جو قرآن کے ساتھ اتری۔"

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَضَاءَ لَهُ مِنَ النُّوْرِ مَا بَيْنَ الْجُمُعَتَيْنِ )) [ مستدرک حاکم : ۲/ ۳۶۸، ح : ۳۳۹۲، صححہ الألبانی فی صحیح الجامع : ۶۴۷۰ ] "جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھے تو دو جمعوں کے درمیان اس کے لیے نور روشن رہے گا۔"

**آیت 1** ① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ ...... : یہ سورت ان پانچ سورتوں میں شامل ہے جن کی ابتدا "اَلْحَمْدُ" کے ساتھ ہوئی ہے، دوسری چار سورتیں فاتحہ، انعام، سبا اور فاطر ہیں۔ پچھلی سورت کا خاتمہ بھی "اَلْحَمْدُ" کے ساتھ ہوا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر کام کی ابتدا اور انتہا اللہ کے پاکیزہ نام کے ساتھ یا اس کی حمد کے ساتھ کرنی چاہیے۔ ان تمام سورتوں میں سے ہر سورت کا طریقہ اگرچہ مختلف ہے مگر مقصود لوگوں کو اس بات کا یقین دلانا ہے کہ حمد کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، اور کوئی نہیں، کیونکہ کسی میں کوئی خوبی ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے۔

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾

بالکل سیدھی، تاکہ وہ اس کی جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے اور ان مومنوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں، خوش خبری دے کہ بے شک ان کے لیے اچھا اجر ہے ۲

② اَلَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ : سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کے تمام حمد کا مالک ہونے کی دلیل کے لیے چار صفات بیان ہوئی ہیں، یہاں اللہ تعالیٰ کے تمام حمد اور خوبیوں کا مالک ہونے کی ایک ہی دلیل بیان کی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر "الْكِتٰبَ" نازل فرمانا ہے۔ کیونکہ دوسرے تمام انعامات اگرچہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں مگر یہ نعمت سب سے اہم ہے، کیونکہ اس پر ہمیشہ کی زندگی یعنی اخروی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔

③ عَلٰى عَبْدِهٖ: "اپنے بندے پر، اپنے غلام پر" اس میں رسول اللہ ﷺ کو اپنا خاص عبد قرار دینے میں آپ ﷺ کی بے انتہا شان بیان ہوئی ہے، اگرچہ زمین و آسمان میں رہنے والی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی غلام ہے، مگر "اپنا غلام" کہنے میں آپ ﷺ کو جو عزت ملی وہ بہت کم لوگوں کو ملی ہے، جیسا کہ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ [ بنی إسرائیل : ۱ ] میں ہے اور اس کتاب کی بھی تعریف ہے جو نازل کی گئی۔ "الْكِتٰبَ" میں الف لام عہد کا ہے، یعنی یہ کتاب، مراد قرآن کریم ہے، کیونکہ جب صرف "الْكِتٰبَ" کہا جائے تو قرآن کریم ہی مراد ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے سوا کسی اور میں یہ کمال ہی نہیں کہ اسے "الْكِتٰبَ" کہا جا سکے۔

④ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا : "عِوَجًا" کجی، ٹیڑھا پن۔ "عِوَجًا" پر تنوین عموم کے لیے ہے جو نفی کے بعد آ کر مزید عام ہو گیا ہے، یعنی اس کتاب میں کسی بھی قسم کا کوئی ٹیڑھا پن نہیں، نہ الفاظ میں، نہ معانی میں، نہ فصاحت و بلاغت میں، نہ یہ کہ اس کی آیات کا آپس میں کوئی اختلاف ہو، یا اس کی کوئی خبر غلط نکلے، یا کوئی حکم حکمت سے خالی ہو۔ دیکھیے زمر (۲۸)، بنی اسرائیل (۹ تا ۱۰) اور نساء (۸۲)۔

**آیت 2** ① "قَيِّمًا" میں مبالغہ ہے، یعنی بالکل سیدھی، پہلے فرمایا تھا کہ اس میں کوئی کجی نہیں رکھی، اب فرمایا بالکل سیدھی ہے۔ بات ایک ہی ہے مگر اس تاکید کا فائدہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک چیز میں بظاہر کوئی کجی نہیں ہوتی، مگر حقیقت میں اور باریکی سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی نہ کوئی کجی ہوتی ہے، اس سے اس کی بھی نفی ہو گئی۔ جیسے ایک جگہ ہموار نظر آتی ہے مگر آلہ رکھ کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ہموار نہیں۔ "قَيِّمًا" کا معنی نگران بھی ہے، "مُهَيْمِنٌ" کا بھی یہی معنی ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۴۸) اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ یہ کتاب پچھلی تمام کتابوں پر نگران ہے، یعنی ان کے مضامین کا درست یا تحریف شدہ ہونا اس کتاب کی تصدیق یا تکذیب سے معلوم ہوتا ہے۔

② لِّيُنْذِرَ بَاْسًا...... : یہاں یہ بتایا کہ اس کتاب کو اپنے بندے پر اس لیے نازل فرمایا کہ وہ اس سخت عذاب سے ڈرائے جو

مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ وَّ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵

جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ③ اور ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے ④ نہ انھیں اس کا کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو۔ بولنے میں بڑی ہے، جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے، وہ سراسر جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہتے ⑤

اس کی جانب سے ہوگا، مگر یہ نہیں بتایا کہ کسے ڈرائے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ مراد عموم ہے، یعنی کافر و مومن ہر ایک کو اللہ کی جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے، یا یہ کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں بتائی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ [ الكهف : ٤ ] ”اور (تاکہ) ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔“ اس آیت (۴) میں یہ نہیں بتایا کہ کس چیز سے ڈرائے، اس کا ذکر زیر تفسیر آیت (۲) میں ہے کہ اس کی جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے۔ دونوں آیات کو ملائیں تو مضمون یہ بنے گا: ”تاکہ ان لوگوں کو اپنی جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔“ دونوں آیتوں میں ڈرانے کا ذکر دو بار آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کتاب اور پیغمبر کے فرائض میں ڈرانے کا فریضہ زیادہ اہم ہے، کیونکہ ایمان نہ لانے والے زیادہ ہیں، جن میں سے کوئی مسیح علیہ السلام کو اور کوئی عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتا ہے، کوئی فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتا ہے، کوئی اپنے انبیاء و اولیاء کو اللہ کے نور کا ٹکڑا اور کوئی انھیں عین اللہ تعالیٰ قرار دیتا ہے، جیسا کہ نصرانیوں نے کہا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [ المائدة : ٧٢ ] ”بے شک اللہ مسیح ابن مریم ہی تو ہے۔“ اور ہماری امت کے ایک ظالم نے کہا ہے ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر     اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ کتاب ان سب کو اس کی جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈراتی ہے، خواہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں ہو یا صرف آخرت میں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد رکھنے کی تردید کے لیے دیکھیے سورۂ مریم (۸۸ تا ۹۵) ”مِنْ لَّدُنْهُ“ سے عذاب کی ہولناکی بیان کرنا مقصود ہے۔

**آیت 5** ❶ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ...... : یعنی اللہ کی اولاد ہونے کی کوئی دلیل نہ ان کے پاس ہے اور نہ ان کے آباء کے پاس، کیونکہ علم وہ ہے جس کی کوئی دلیل ہو۔ ان کے باپ دادا نے کسی علم کے بغیر محض جہل سے یہ بات نکالی اور انھوں نے محض جہالت کی بنا پر ان کی تقلید کی۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے تقلید کے بارے میں کیا خوب کہا ؎

اَلْعِلْمُ قَالَ اللّٰهُ قَالَ رَسُوْلُهٗ     مَا ذَاكَ وَالتَّقْلِيْدُ يَسْتَوِيَانِ

اِذْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ أَنَّ مُقَلِّدًا     لِلنَّاسِ وَالْأَعْمٰى هُمَا سِيَّانِ

”علم وہ ہے جو اللہ نے فرمایا اور اس کے رسول نے فرمایا۔ یہ اور تقلید برابر نہیں ہیں، کیونکہ علماء کا اتفاق ہے کہ لوگوں کی تقلید

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶

پس شاید تو اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والا ہے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے ⑥

کرنے والا اور اندھا دونوں برابر ہیں۔''

② كَبُرَتْ كَلِمَةً ...... : ''كَبُرَتْ'' مذمت کے لیے فعل ماضی ہے، گویا افعال مدح و ذم کے قبیل سے ہے۔ ''كَبُرَتْ'' فعل ذم ہے، اس کا فاعل ''هِيَ'' محذوف ہے، ''كَلِمَةً'' تمیز ہے، یعنی یہ جو کچھ انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، یہ بطور کلمہ (یعنی منہ سے بولنے کے لحاظ سے) ہی بہت بڑی بات ہے، کجا یہ کہ اس کا عقیدہ رکھا جائے۔ اس میں کچھ تعجب کا اظہار بھی ہے کہ کتنی بڑی بات انھوں نے اپنے منہ سے نکال دی۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ [ مریم : ۸۸ تا ۹۵ ] ''اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا لی ہے۔ بلاشبہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات کو آئے ہو۔ آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں کہ انھوں نے رحمان کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا، حالانکہ رحمان کے لائق نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔ بلاشبہ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے۔''

آیت 6 ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ ...... : ''بَاخِعٌ'' ''بَخَعَ يَبْخَعُ نَفْسَهُ'' اس نے اپنے آپ کو غم سے مار ڈالا۔ ''لَعَلَّ'' کا لفظ محبوب چیز کے لیے بولا جائے تو ترجی، یعنی امید کرنا مراد ہوتا ہے اور ایسی چیز کے لیے بولا جائے جس کا خطرہ ہو تو اسے اشفاق یعنی ڈرنا کہا جاتا ہے، یہاں یہی مراد ہے۔ اس آیت سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر آپ اپنے آپ کو رنج و غم سے کیوں گھلا رہے ہیں؟ اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے ایمان نہ لانے کا کس قدر صدمہ تھا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ''بَاخِعٌ نَّفْسَكَ'' (اپنے آپ کو ہلاک کر لینے والے) کے الفاظ استعمال فرمائے۔ مزید دیکھیے سورۂ شعراء (۳) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُ النَّاسِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِيْ تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيْهَا، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَنْزِعُهُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ، فَيَقْتَحِمْنَ فِيْهَا، فَأَنَا آخُذُ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَقْتَحِمُوْنَ فِيْهَا )) [ بخاری، الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی : ٦٤٨٣۔ مسلم : ٢٢٨٤/١٦ ] ''میری اور لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ خوب بھڑکائی، جب اس نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو پروانے اور اس قسم کے جانور اس آگ میں گرنے لگے۔ وہ اس میں گرتے تھے اور وہ شخص انھیں روکتا تھا اور وہ اس سے زبردستی آگ میں گھستے تھے۔ تو میں آگ سے بچانے کے

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ⑦ وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ⑧ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ⑨

بے شک ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اس کے لیے زینت بنایا ہے، تاکہ ہم انھیں آزمائیں ان میں سے کون عمل میں بہتر ہے ⑦ اور بلاشبہ ہم جو کچھ اس پر ہے، اسے ضرور ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں ⑧ یا تو نے خیال کیا کہ غار اور کتبے والے ہماری نشانیوں میں سے ایک عجیب چیز تھے؟ ⑨

لیے تمھاری کمروں کو پکڑنے والا ہوں اور تم زبردستی اس میں گھستے ہو۔'' مزید دیکھیے سورۂ فاطر (۸)، نمل (۷۰) اور نحل (۱۲۷) ''عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ '' ان کے قدموں کے نشانات پر، یعنی ان کے پیچھے۔ ''اَسَفًا'' بہت زیادہ فکر و غم، یہ مفعول لہٗ ہے، یعنی غم کی وجہ سے۔

**آیت 7** اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا ...... : یعنی ہم نے زمین پر جو کچھ بھی ہے، حیوان، انسان، پودے، ندی نالے، سمندر اور پہاڑ، غرض ہر چیز اس زمین کی زینت بنائی ہے۔ زینت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے آل عمران (۱۴) مقصد انسانوں کی آزمائش ہے کہ ان میں سے عمل میں کون زیادہ اچھا ہے، کون دنیا کی سج دھج کی طرف دوڑتا ہے اور کون اس کو چھوڑ کر آخرت کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔

**آیت 8** وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا ...... : ''صَعِيْدًا'' مٹی، کیونکہ وہ سمندر سے اوپر اٹھی ہوئی ہے۔ '' صَعِدَ يَصْعَدُ '' چڑھنا۔ ''جُرُزًا'' چٹیل زمین، جس میں کوئی سبزہ نہ ہو۔ ''جُرِزَتِ الْأَرْضُ'' قحط یا ٹڈی دل کی وجہ سے زمین پر کوئی اگی ہوئی چیز نہ رہ گئی۔ سورۂ سجدہ میں فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ [ السجدۃ : ۲۷ ] ''اور کیا اس بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم پانی کو چٹیل زمین کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں، پھر اس کے ذریعے کھیتی نکالتے ہیں جس میں سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں اور وہ خود بھی، تو کیا وہ نہیں دیکھتے؟'' ان دونوں آیتوں میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ کفار جن چیزوں پر اترا رہے ہیں وہ سب چند دن کے لیے زمین کی زینت ہیں، پھر ایک وقت آنے والا ہے کہ نہ اس پر کوئی مکان رہے گا نہ باغ، نہ سبزہ، نہ جانور، نہ آدمی، یعنی یہ ساری چہل پہل ختم ہو جائے گی۔

**آیت 9** ① اَمْ حَسِبْتَ ...... : ''الْكَهْفِ'' پہاڑ میں وسیع غار۔ ''الرَّقِيْمِ'' بمعنی ''مَرْقُوْمٌ'' یعنی لکھی ہوئی تختی یا سل یا کتاب والے۔ ان لوگوں کو ''اصحاب الرقیم'' اس لیے کہتے ہیں کہ جب وہ اچانک غائب ہو گئے اور بہت تلاش کے باوجود نہ ملے تو ان کے نام ایک تختی یا سل پر لکھ کر خزانے میں محفوظ کر دیے گئے، یا یہ کہ ان کے پاس شریعت کے احکام پر مشتمل لکھی ہوئی کتاب تھی۔ (شنقیطی) یا یہ کہ ان کے جاگنے کے بعد لوگوں نے غار پر ایک تختی نصب کر دی جس پر ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔

② اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ ...... : اس آیت کی تفسیر جو اکثر مفسرین، مثلاً طبری، ابن کثیر، شنقیطی رحمہ اللہ نے کی ہے، یہ

اِذۡ اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَہۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ ہَیِّیٴۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾

جب ان جوانوں نے غار کی طرف پناہ لی تو انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے کوئی رحمت عطا کر اور ہمارے لیے ہمارے معاملے میں کوئی رہنمائی مہیا فرما ﴿۱۰﴾

ہے کہ "اَمْ" منقطعہ انکار کے لیے ہے۔ شنقیطی رحمہ اللہ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرما رہے ہیں کہ کیا تم نے اصحاب کہف کے قصے کو ہماری نشانیوں میں بڑی عجیب نشانی سمجھ لیا ہے۔ بے شک لوگ اسے بہت بڑی اور عجیب بات سمجھیں، مگر یہ ہماری قدرت اور عظیم نشانیوں کے سامنے کچھ عجیب نہیں، کیونکہ ہمارا آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنا، پھر زمین میں اس کی زینت کی ہر چیز پیدا کرنا، پھر قیامت کے دن اسے چٹیل میدان بنا دینا اصحاب کہف کے معاملے سے بہت زیادہ عجیب ہے، جنھیں ہم نے تین سو نو (۳۰۹) سال سلائے رکھا، پھر دوبارہ اٹھا دیا۔ اس کی دلیل بہت سی آیات ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے ذکر سے پہلے زمین اور اس کی زینت پیدا کرنے، پھر اسے چٹیل میدان بنانے کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قصہ ان چیزوں کے مقابلے میں کچھ عجیب نہیں جو اس سے کہیں بڑی ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سی جگہ لوگوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ آسمان و زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے بہت بڑی بات ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ﴾ [ المؤمن: ۵۷ ] "یقیناً آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے بہت بڑا ہے۔" اور دیکھیے نازعات (۲۷ تا ۳۳) یاد رہے کہ "اصحاب کہف" اور "اصحاب رقیم" ایک ہی گروہ کے نام ہیں اور صحیح بخاری میں مذکور غار کے اندر پناہ لینے والے تین آدمیوں کا اس واقعہ سے تعلق بہت بعید ہے، جن میں سے ایک والدین سے حسن سلوک کرنے والا، ایک پاک دامن رہنے والا اور ایک اجرت پر مزدور رکھنے والا تھا۔ اور یہ بات یاد رکھیں کہ اصحاب کہف کے قصے، ان کے ناموں اور یہ کہ وہ زمین کے کس حصے میں تھے؟ اس سب سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے علاوہ کوئی بات ثابت نہیں جو قرآن سے زائد ہو۔ مفسرین نے ان کے متعلق بہت سی اسرائیلی روایات بیان کی ہیں جن کے قابلِ اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔" (شنقیطی ملخصاً)

ایک اور تفسیر جو پہلی تفسیر کے علاوہ صاحب روح المعانی اور ابن عاشور رحمہما اللہ وغیرہ نے ذکر فرمائی ہے، یہ ہے کہ "حَسِبْتَ" گمان اور علم دونوں معنوں میں آتا ہے، ہاں "اَمْ" انکار کے لیے نہیں بلکہ تقریری ہے، یعنی یہ بتانے کے لیے ہے کہ یقیناً یہ لوگ واقعی عجیب تھے۔ گویا یہ کہا گیا: "اِعْلَمْ اَنَّهُمْ عَجَبٌ" "جان لے کہ یقیناً وہ لوگ بڑے عجیب تھے۔" جیسا کہ تم کہتے ہو: "أَعَلِمْتَ أَنَّ فُلَانًا فَعَلَ كَذَا" "کیا تمھیں معلوم ہے کہ فلاں نے اس طرح کیا۔" یعنی یقیناً اس نے اس طرح کیا ہے۔ ان مفسرین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے واقعے کا عجیب ہونا ذکر کرنے کے بعد تفصیل سے واقعہ بیان کر رہے ہیں، تاکہ مخاطب کو سننے کا شوق پیدا ہو جائے۔ یہ تفسیر بھی ہو سکتی ہے۔

آیت 10 اِذۡ اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَہۡفِ ...... : "اَوٰی" (ض) جگہ پکڑی، پناہ لی۔ "الۡفِتۡیَۃُ" "فَتًی" کی جمع قلت ہے،

فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

تو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئی سال پردہ ڈال دیا ﴿۱۱﴾ پھر ہم نے انھیں اٹھایا، تاکہ ہم معلوم کریں دونوں گروہوں میں سے کون وہ مدت زیادہ یاد رکھنے والا ہے جو وہ ٹھہرے ﴿۱۲﴾

جوان جو آغاز شباب میں ہوں۔ "هَيِّئْ" باب تفعیل سے امر ہے، مہیا فرما، میسر فرما، "رَشَدًا" بھلائی، رہنمائی۔ "اِذْ" یا تو "كَانُوْا" کی ظرف ہے، یا "عَجَبًا" کی اور یا "اُذْكُرْ" کی جو محذوف ہے، یعنی جب چند نو جوان جو اپنی مشرک قوم اور مشرک بادشاہ کے سامنے توحید کا برملا اظہار و اعلان کرنے کی وجہ سے انھیں مطلوب تھے، اپنے گھروں سے نکلے اور انھوں نے ایک پہاڑ کے کھلے غار میں پناہ لی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے، یعنی محض اپنے فضل اور اپنی جناب سے کوئی بھی رحمت جو تو چاہے عطا فرما، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا: ﴿رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ﴾ [ القصص : ۲٤ ] "اے میرے رب! بے شک میں، جو بھلائی بھی تو میری طرف نازل فرمائے، اس کا محتاج ہوں۔" رحمت میں کھانا پینا، امن و اطمینان اور ضرورت کی ہر چیز شامل ہے۔ "هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا" اور ہمارے لیے اس معاملے میں کوئی رہنمائی عطا فرما کہ ہم کیا کریں۔

**آیت 11** فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ ......: "فَضَرَبْنَا" کا مفعول مقدر ہے، یعنی "حِجَابًا" "تو ہم نے ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا" یعنی ہم نے انھیں سلا دیا، تاکہ ان کی پریشانی اور گھبراہٹ ختم ہو جائے، کیونکہ نیند اس کا سب سے اچھا علاج ہے اور وہ اپنی مشرک قوم سے بھی محفوظ ہو جائیں۔ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے، کوئی سو جائے تو اسے کہتے ہیں "ضُرِبَ عَلٰى اٰذَانِهٖ" "اس کے کانوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔" اگرچہ نیند میں آنکھوں اور دوسرے اعضا پر بھی پردہ ہوتا ہے اور انھیں بیرونی دنیا کا کچھ احساس نہیں ہوتا، مگر سب سے آخر میں کانوں کا سننا بند ہوتا ہے اور انسان گہری نیند سو جاتا ہے۔ "سِنِيْنَ عَدَدًا" گنتی کے کئی سال، جن کا شمار آگے آ رہا ہے۔

**آیت 12** ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ......: "بَعَثَ" کا معنی کسی ساکن چیز کو حرکت میں لانا ہے۔ یہ لفظ مردہ کو زندہ کرنے اور سوئے ہوئے کو جگانے کے لیے آتا ہے، یعنی پھر ہم نے انھیں اٹھایا، تاکہ ہم معلوم کریں کہ ان سونے والوں کے دو گروہوں میں سے کون سا گروہ ہے جو اپنے وہاں ٹھہرنے کی مدت کو زیادہ یاد رکھنے والا ہے۔ یہ ترجمہ اس وقت ہے جب "اَحْصٰى" کو اسم تفضیل مانیں اور یہ معنی راجح ہے، کیونکہ باب افعال سے بھی "اَفْعَلُ" کے وزن پر اسم تفضیل آ جاتا ہے۔ دوسرا معنی اس صورت میں ہے کہ "اَحْصٰى" کو ماضی معروف قرار دیں، اس وقت معنی یہ ہوگا کہ دونوں گروہوں میں سے کون ہے جس نے اس مدت کو یاد رکھا ہے جو وہ ٹھہرے ہیں۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کو گزشتہ، موجودہ اور آئندہ ہر چیز کا علم ہے کہ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا، مگر ظاہر ہے کہ یہ علم کہ فلاں کام واقع ہو چکا ہے، اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ کام واقع

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

ہم تجھ سے ان کا واقعہ ٹھیک بیان کرتے ہیں، بے شک وہ چند جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ کر دیا ﴿۱۳﴾ اور ہم نے ان کے دلوں پر بند باندھ دیا، جب وہ کھڑے ہوئے تو انھوں نے کہا ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی معبود کو ہرگز نہ پکاریں گے، بلاشبہ یقیناً ہم نے اس وقت حد سے گزری ہوئی بات کہی ﴿۱۴﴾

ہو جائے، یعنی تاکہ ہم اپنے علم کے مطابق اس کا واقع ہونا جان لیں۔

**آیت 13** ① نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مشہور تھا، مگر اس میں بہت سی خرافات اور غلط باتیں شامل تھیں، اس لیے فرمایا کہ ہم تجھ سے ان کا واقعہ ٹھیک بیان کرتے ہیں۔

② اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ ......: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے، اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ چند نوجوان تھے اور نوجوان بوڑھوں کی نسبت حق کو زیادہ قبول کرنے والے ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہنے والے اکثر نوجوان تھے۔ قریش کے بوڑھے بزرگ اپنے دین ہی پر باقی رہے، ان میں سے بہت کم ہی ایمان لائے۔ کئی ایک ائمہ مثلاً بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے ”وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى“ (اور ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ کر دیا) سے استدلال فرمایا کہ ایمان زیادہ ہوتا ہے اور کم بھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے لیے آٹھ آیات اور بہت سی احادیث بیان فرمائی ہیں۔ اتنی واضح آیات و احادیث کو پڑھ کر بھی کئی حضرات اڑے ہوئے ہیں کہ اصل ایمان میں سب برابر ہیں، وہ نہ کم ہوتا ہے نہ بڑھتا ہے، ہمارا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور جبرائیل علیہ السلام سب کا ایمان برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے نبی کی بات پر ”سَمِعْنَا وَ اٰمَنَّا“ کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

③ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ: یعنی یہ چند جوان تھے جو اپنی قوم کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جیسا کہ ان کے کھانا منگواتے ہوئے سب سے ستھرا کھانا رکھنے والے شخص سے کھانا منگوانے کی فرمائش سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کی قوم اور بادشاہ مشرک بت پرست تھے، مگر یہ نوجوان بت پرستی چھوڑ کر اپنے رب کی توحید پر پختہ اور خالص ایمان لے آئے اور اس پر ڈٹ گئے اور اللہ کی خاطر خویش و اقارب، مال و منال اور وطن کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اور زیادہ ہدایت و ایمان سے نواز دیا۔

**آیت 14** ① وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: ”رَبْطٌ“ کا معنی باندھنا ہے، یعنی بادشاہ اور قوم کے ڈر سے جس گھبراہٹ اور پریشانی کا خطرہ تھا اس سے بچانے کے لیے ہم نے ان کے دلوں پر بند باندھ دیا، جس سے وہ مضبوط ہو گئے، جس طرح بکھری

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَی الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

یہ ہماری قوم ہے، جنھوں نے اس کے سوا کئی معبود بنا لیے، یہ ان پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے، پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ﴿۱۵﴾ اور جب تم ان سے الگ ہو چکے اور ان چیزوں سے بھی جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں تو کسی غار کی طرف (جا کر) پناہ لے لو، تمھارا رب تمھارے لیے اپنی کچھ رحمت کھول دے گا اور تمھارے لیے تمھارے کام میں کوئی سہولت مہیا کر دے گا ﴿۱۶﴾

ہوئی چیزیں گٹھڑی میں ڈال کر ان کو گرہ لگا کر مضبوطی سے باندھ دیا جائے تو وہ بکھرنے سے بچ جاتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ان کے دلوں پر بند باندھ دینے سے وہ حق گوئی کے وقت ہر قسم کے خوف سے محفوظ ہو گئے۔

❷ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ …… : یعنی جب وہ بادشاہ کے سامنے اس کے بھرے دربار میں کھڑے ہوئے اور انھوں نے صاف اعلان کر دیا کہ ہم نہ بادشاہ کو اپنا رب مانتے ہیں نہ تمھارے بتوں کو، بلکہ ان سے ہزاروں لاکھوں سال پہلے موجود آسمانوں اور زمین کے رب کو اپنا رب مانتے ہیں۔ یہ توحید ربوبیت کا اعلان تھا کہ رب صرف ایک ہے۔ ''اور ہم اس کے سوا کسی معبود کو ہرگز نہ پکاریں گے'' یہ توحید الوہیت کا اعلان ہے کہ ہم عبادت بھی صرف اسی کی کریں گے، اسی سے دعا، اسی سے امید اور اسی سے خوف رکھیں گے۔ اگر ہم بادشاہ کو یا اس کے بتوں کو رب یا معبود مانیں تو اس وقت ہم بہت بڑی زیادتی کی بات کہیں گے۔ ''شَطَطًا'' پر تنوین تعظیم کی ہے، کیونکہ شرک سے بڑھ کر نہ کوئی ظلم ہے نہ زیادتی۔ گویا یہ آیت اور سورۂ لقمان (۱۳) میں لقمان علیہ السلام کا قول: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ ہم معنی ہیں۔ ''اِذْ قَامُوْا'' کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کے باطل عقائد و اعمال چھوڑنے کا پختہ عزم کر لیا اور توحید کی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ تقریر کی جو آگے مذکور ہے۔

آیت 15 ❶ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً …… : انھوں نے صرف توحید کے اعلان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کے فعل کا رد بھی فرمایا کہ یہ ہماری قوم کے لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی کوئی دلیل کیوں نہیں پیش کرتے۔ معلوم ہوا یہ اپنے دعویٰ میں سراسر جھوٹے ہیں۔ چند آیات جن میں مشرکین سے شرک کی دلیل کا مطالبہ کیا گیا ہے، دیکھیے انعام (۱۴۸) اور احقاف (۴)۔

❷ فَمَنْ اَظْلَمُ …… : یعنی اللہ کے سوا دوسروں کو پکارنا محض جھوٹ ہے اور جو اللہ پر جھوٹ باندھے اس سے بڑا ظالم کون ہے؟

آیت 16 ❶ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ …… : ''مِرْفَقًا'' ''اَلْاِرْتِفَاقُ'' کا معنی فائدہ اٹھانا ہے، یعنی کوئی سہولت،

وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۠ ﴿۱۷﴾ ع ۲ / ۱۴

اور تو سورج کو دیکھے گا جب وہ نکلتا ہے تو ان کی غار سے دائیں طرف کنارہ کر جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ اس (غار) کی کھلی جگہ میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے گمراہ کر دے، پھر تو اس کے لیے ہرگز کوئی رہنمائی کرنے والا دوست نہ پائے گا ﴿۱۷﴾

آسانی۔ ان کی قوم اور بادشاہ میں سے کسی نے ان کی دعوت قبول نہ کی تو انھوں نے مشورہ کیا کہ جب تم ان لوگوں سے اور ان کے معبودوں سے علیحدہ ہو چکے تو اب یہاں رہ کر جان یا ایمان بچانا مشکل ہے، اس لیے کسی پہاڑ کے کھلے غار میں پناہ لے لو۔ رہا کھانا پینا اور دوسری ضروریات زندگی تو جب تم اپنے رب کی راہ میں ہجرت کر رہے ہو تو وہ خود اپنی رحمت کا دامن پھیلا دے گا اور ہر معاملے میں تمھارے لیے آسانی مہیا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی اس کا وعدہ فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۰۰) باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کر کے وہ ایک پہاڑ کے کھلے غار میں جا بیٹھے، نیند غالب آئی تو سو گئے۔ معلوم ہوا کہ جب معاشرے میں رہ کر دین پر عمل ممکن نہ رہے تو ہجرت کے لیے پہاڑ ہی بہترین مقام ہیں، چنانچہ ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا: « يُوْشِكُ أَنْ يَّكُوْنَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ، وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ، يَفِرُّ بِدِيْنِهِ مِنَ الْفِتَنِ » [ بخاري، الإيمان، باب من الدين الفرار من الفتن : ١٩، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ ] ”قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال چند بکریاں ہوں گی، جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات کے پیچھے پھرتا رہے گا، اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے بھاگتا پھرے گا۔“ جب کفار مکہ نے ہمارے نبی ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ طے کر لیا تو آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تین راتیں غار ثور میں چھپے رہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفار سے محفوظ رکھا۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۴۰)۔

② بعض لوگوں نے اس سے عزلت یعنی لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے کا استدلال کیا ہے، حالانکہ اصحاب کہف نے کفار سے علیحدگی اختیار کی، اپنوں سے نہیں، بلکہ آپس میں تو وہ اکٹھے ہی رہے۔ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ (قاسمی)

**آیت 17** ① وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ ...... : یعنی ان کے غار کا منہ شمال کی طرف تھا، جب سورج چڑھتا تو دھوپ دائیں طرف ہو جاتی اور غروب کے وقت بائیں طرف ہو جاتی تھی۔ ان کے بدن غار کے کشادہ حصے میں سورج کی تیز شعاعوں سے محفوظ تھے۔

② مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ : ”هُوَ“ معرفہ کے بعد خبر ”الْمُهْتَدِ“ بھی معرفہ ہے، اس سے حصر کا معنی حاصل ہوا، یعنی جسے اللہ سیدھی راہ پر چلائے سو وہی سیدھی راہ پانے والا ہے، جیسا کہ اصحاب کہف کو ایمان کی نعمت، پھر اعلان حق کی ہمت،

وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝۱۸ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ

اور تو انھیں جاگتے ہوئے خیال کرے گا، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم دائیں اور بائیں ان کی کروٹ پلٹتے رہتے ہیں اور ان کا کتا اپنے دونوں بازو دہلیز پر پھیلائے ہوئے ہے۔ اگر تو ان پر جھانکے تو ضرور بھاگتے ہوئے ان سے پیٹھ پھیر لے اور ضرور ان کے خوف سے بھر دیا جائے ۱۸ اور اسی طرح ہم نے انھیں اٹھایا، تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا تم کتنی دیر رہے؟ انھوں نے کہا ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے، دوسروں نے کہا تمھارا رب زیادہ جاننے والا ہے جتنی مدت تم رہے ہو، پس اپنے میں سے ایک کو اپنی یہ

پھر ہجرت کی توفیق اور غار میں جانے کا راستہ عطا فرمایا، جہاں زندہ رہنے کے لیے دھوپ اور ہوا کی جس مقدار میں ضرورت تھی موجود تھی اور وہ لوگوں کی نگاہوں اور دشمن کی دسترس سے بھی محفوظ رہے۔

**آیت 18** ❶ وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ : "اَيْقَاظًا" جمع ہے "يَقِظٌ" کی اور "رُقُوْدٌ" جمع ہے "رَاقِدٌ" کی، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ تم انھیں دیکھو تو سمجھو گے کہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، یعنی سوتے میں آنکھیں کھلی ہونے اور کروٹیں بدلنے کی وجہ سے تم انھیں جاگتے ہوئے سمجھو گے۔ اور ہم دائیں اور بائیں ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں، تاکہ ایک ہی پہلو پر پڑے رہنے سے مٹی ان کے بدنوں کو نہ کھا جائے اور ان کا کتا اپنے دونوں بازو دہلیز پر پھیلائے ہوئے ہے، جیسے پہرا دے رہا ہے۔ ایک الگ تھلگ غار میں ان کا اس طرح لیٹا ہونا اور چوکھٹ پر کتے کا بیٹھا ہونا ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص اندر جھانکنے کی کوشش بھی کرتا تو خوف کے مارے بھاگ کھڑا ہوتا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں ایک لمبی مدت تک آرام و سکون سے سلائے رکھنے کا انتظام تھا۔

❷ کتے کے دہلیز پر بیٹھے رہنے اور غار میں نہ جانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيْرُ )) [ بخاري، اللباس، باب التصاوير: ۵۹۴۹ ] "فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں کتا یا تصویر ہو۔" البتہ کھیتی کے لیے، مویشیوں کی حفاظت کے لیے اور شکار کے لیے کتا رکھنے کی اجازت ہے۔

**آیت 20،19** ❶ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ ...... : یعنی جیسے ہم نے انھیں ایک حیرت انگیز طریقے سے غار کے اندر سلایا تھا اسی طرح انھیں اٹھا دیا کہ ان کے جسم صحیح سالم تھے، ان میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال کریں اور جب انھیں پتا چلے کہ وہ اتنی لمبی مدت سونے کے بعد بیدار ہوئے ہیں تو انھیں ہماری قدرت کا اور مُردوں کو زندہ کرنے کا

اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

چاندی دے کر شہر کی طرف بھیجو، پس وہ دیکھے کہ اس میں کھانے کے لحاظ سے زیادہ ستھرا کون ہے، پھر تمھارے پاس اس سے کچھ کھانا لے آئے اور نرمی و باریک بینی کی کوشش کرے اور تمھارے بارے میں کسی کو ہرگز معلوم نہ ہونے دے ﴿۱۹﴾ بے شک وہ اگر تم پر قابو پالیں گے تو تمھیں سنگسار کر دیں گے، یا تمھیں دوبارہ اپنے دین میں لے جائیں گے اور اس وقت تم کبھی فلاح نہیں پاؤ گے ﴿۲۰﴾

اپنی ذات میں عملی مشاہدہ ہو جائے، ان کا ایمان و یقین مزید مضبوط ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔

❷ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ...... : حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے کہ وہ غار میں دن کے پہلے پہر داخل ہوئے تھے اور دن کے آخری حصے میں بیدار ہوئے۔ اس لیے اس سوال کے جواب میں کہ تم کتنی مدت یہاں ٹھہرے، کسی نے ایک دن اور کسی نے دن کا کچھ حصہ کہا، مگر جب غار کے اردگرد کا عالم بالکل ہی بدلا ہوا نظر آیا تو کہنے لگے، تمھارا رب زیادہ جانتا ہے کہ تم کتنی مدت ٹھہرے ہو۔''

❸ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نہ پہلے سوال کرنے والے ولی کو وہاں ٹھہرنے کی مدت کا علم تھا، نہ دوسرے ولیوں کو، جب کہ کئی لوگ اپنے ائمہ اور اولیاء کو ''مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ'' (جو ہو چکا اور جو ہوگا) کا جاننے والا سمجھتے ہیں۔

❹ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندے بھی بعض اوقات اندازے اور گمان سے کوئی بات کہہ دیتے ہیں، مگر ایسی بات میں وہ اصل علم اللہ کے حوالے کرنے سے غفلت نہیں کرتے۔

❺ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ ...... : غار میں ٹھہرنے کی مدت پر بحث کے بعد جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو انھوں نے اصل مدت کے اندازے کے لیے اپنے کسی ایک ساتھی کو چاندی (کا سکہ) دے کر شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اسے چند باتوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ ایک یہ کہ کھانا لاتے وقت یہ دیکھ لے کہ شہر میں سب سے ستھرا کھانا کس کا ہے، اس سے تمھارے لیے کچھ کھانا لے آئے۔ ''اَزْكٰى'' کا معنی سب سے پاکیزہ، سب سے ستھرا ہے، اس میں کھانے کا حلال و طیب ہونا بھی شامل ہے اور سب سے صاف ستھرا ہونا بھی۔ معلوم ہوا کہ یہ نوجوان شہزادے تھے، یا امراء و وزراء کے چشم و چراغ تھے، جو شہر کے سب سے ستھرے ہوٹل سے کم پر راضی نہ تھے۔ دوسری بات یہ کہ نرمی اور باریک بینی کی کوشش کرے، کیونکہ سختی سے کام بگڑ جاتے ہیں اور باریک بینی اختیار نہ کرنے سے راز کھل جاتے ہیں اور مطلوبہ معلومات بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ کوشش کا مفہوم ''وَلْيَتَلَطَّفْ'' (باب تفعل) سے ظاہر ہو رہا ہے اور ''لطف'' کے مفہوم میں نرمی اور باریک بینی دونوں شامل ہیں۔ تیسری تاکید

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ

اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو) ان پر مطلع کر دیا، تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت، اس

یہ کی کہ تمھارے بارے میں کسی کو ہرگز معلوم نہ ہونے دے۔ کیونکہ اگر مشرکین کو تمھارا پتا چل گیا تو وہ تمھیں سنگ سار کر دیں گے، یا جبراً تمھیں دوبارہ اپنے مشرکانہ دین میں واپس لے آئیں گے۔ ایسی صورت میں تم کبھی فلاح نہ پا سکو گے، کیونکہ مشرکوں پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔

آیت 21 ❶ وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ ...... : یعنی جس طرح ہم نے انھیں ثابت قدم رکھا اور حیرت انگیز طریقے سے سلائے رکھا اسی طرح ہم نے شہر والوں کو ان کی حقیقتِ حال اور جگہ سے مطلع کر دیا۔ بہت سے مفسرین کا بیان ہے اور واقعہ کی صورت خود بخود بھی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے روانہ ہوا تو اس نے دیکھا کہ شہر کے راستے، لوگوں کی تہذیب، رہن سہن، زبان اور لباس ہر چیز بدل چکی ہے، اس نے خیال کیا کہ شاید میں پاگل ہو گیا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ بالآخر وہ شہر پہنچا اور ایک دکاندار سے کھانا خریدنے لگا اور اس نے سکہ نکالا تو دکاندار ششدر رہ گیا اور اس نے ایک دوسرے دکاندار کو بلایا، بالآخر کچھ لوگ جمع ہو گئے اور انھیں شک گزرا کہ شاید اس شخص کو کہیں سے پرانا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ مگر جب اس نے بتایا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں اور کل ہی یہاں فلاں بادشاہ کو چھوڑ کر گیا ہوں تو لوگوں کی حیرت اور بڑھ گئی اور وہ اسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ وہاں جب پوچھ گچھ ہوئی تو سب معاملہ کھل گیا، اس لیے اصحابِ کہف کو دیکھنے اور انھیں سلام کرنے کے لیے بادشاہ اور اس کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ شہر جانے والا ساتھی اندر داخل ہو گیا اور سارے ساتھی دوبارہ لیٹ گئے، اسی حال میں اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کر لی۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وہاں تین سو نو (۳۰۹) سال ٹھہرنا بیان فرمایا ہے، اگر وہ اس کے بعد بھی زندہ ہوتے تو ان پر عمارت بنانے یا مسجد بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کی کرامت دیکھنے والے خوش عقیدہ لوگ انھیں شہر لے جاتے اور ہر طرح ان کی خدمت بجا لاتے۔

❷ اس آیت سے کئی ساتھیوں کا مال برابر جمع کر کے کھانے وغیرہ کے لیے اکٹھا خرچ کرنا ثابت ہوتا ہے، خواہ کوئی کم کھاتا ہو یا زیادہ اور یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کسی کو اپنا نائب یا وکیل بنایا جا سکتا ہے۔

❸ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ...... : یعنی ان پر مطلع ہونے والے شہر کے لوگوں کو یقین آ جائے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں۔

❹ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ ...... : یعنی ہم نے شہر والوں کو ان پر اس وقت مطلع کیا جب وہ آپس میں اپنے معاملے میں جھگڑ رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ مر کر جی اٹھنا برحق ہے، کوئی اس کا انکار کرتا تھا، کوئی کہتا کہ حشر صرف روح کا ہو گا بدن کا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں اصحابِ کہف کا حال آنکھوں سے دکھا کر یقین دلا دیا کہ قیامت آئے گی اور حشر بدن اور روح دونوں کا ہو گا۔ "اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ" کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب شہر والے اصحابِ کہف کے بارے میں جھگڑ رہے

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

میں کوئی شک نہیں۔ جب وہ ان کے معاملے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے تو انھوں نے کہا ان پر ایک عمارت بنا دو۔ ان کا رب ان سے زیادہ واقف ہے، وہ لوگ جو ان کے معاملے پر غالب ہوئے انھوں نے کہا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے (۲۱)

تھے کہ یہ کون لوگ تھے؟ غار میں کب آئے؟ کتنی دیر سوئے رہے؟ اب ان کے مرنے پر ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟ بعض نے کہا، ان پر دیوار بنا کر غار کا منہ بند کر دیں۔ بعض نے کہا، ان پر ایک عمارت ان کی یادگار کے طور پر بنا دیں۔

5 رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ : یعنی اصحاب کہف اور شہر والوں کے احوال ان کا رب بہتر جانتا ہے۔

6 قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ ...... : جن لوگوں کے پاس غلبہ و اقتدار تھا وہ کہنے لگے کہ ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے اور اس طرح ان کی یادگار کو باقی رکھیں گے۔ گزشتہ قوموں میں اسی راستے سے شرک داخل ہوتا رہا اور اب بھی شرک کے سب سے بڑے مراکز انھی قبروں پر تعمیر شدہ عمارتیں مثلاً خانقاہیں وغیرہ یا مسجدیں ہی ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس بیماری میں فرمایا جس میں آپ فوت ہوئے: « لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ » [ بخاری، الجنائز، باب ما یکرہ من اتخاذ المساجد.... : ۱۳۳۰۔ مسلم : ۵۲۹ ] ”اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔“ جندب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے فوت ہونے سے پانچ دن پہلے سنا، آپ نے فرمایا: « اَلَا وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، اِنِّيْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ » [ مسلم، المساجد، باب النہی عن بناء المساجد علی القبور...... : ۵۳۲ ] ”جان لو! جو لوگ تم سے پہلے تھے وہ اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے، سن لو کہ تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا، میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں۔“

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والوں کو اللہ کے ہاں سب سے بدتر مخلوق قرار دیا، فرمایا: « فَاُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » [ بخاری، الصلاۃ، باب هل تنبش قبور مشرکی الجاهلية ...... : ۴۲۷۔ مسلم : ۵۲۸، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ]

ان احادیث میں قبروں پر مسجدیں بنانے سے مراد ان کے پاس مسجدیں بنانا ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے ان کے انبیاء و اولیاء کی قبروں کے پاس ہوا کرتے تھے۔ افسوس کہ بعض مسلمانوں نے یہ تکلف بھی ختم کر کے اپنے بزرگوں کی قبریں عین مسجدوں کے اندر بنانا شروع کر دیں۔ ان لوگوں کی کوئی مسجد کم ہی کسی نہ کسی قبر سے خالی نظر آئے گی، ان کے مولویوں نے اس بدترین فعل کے جواز کے لیے زیر تفسیر آیت کو دلیل بنا لیا، حالانکہ اس میں صرف یہ ذکر ہے کہ ان کے غالب اور با اثر لوگوں نے یہ کہا۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے درست کہا یا غلط، اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی، چنانچہ

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۫۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

عنقریب وہ کہیں گے تین ہیں، ان کا چوتھا ان کا کتا ہے اور کہیں گے پانچ ہیں، ان کا چھٹا ان کا کتا ہے، بن دیکھے پتھر پھینکتے ہوئے اور کہیں گے سات ہیں، ان کا آٹھواں ان کا کتا ہے۔ کہہ دے میرا رب ان کی تعداد سے زیادہ واقف ہے، انھیں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا، سو تو ان کے بارے میں سرسری بحث کے سوا بحث نہ کر اور ان لوگوں میں سے کسی سے ان کے بارے میں فیصلہ طلب نہ کر ﴿۲۲﴾

---

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ ))[ مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر...... : ۹۷۰ ] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ قبر چونا گچ (سیمنٹڈ) بنائی جائے اور اس سے کہ اس پر بیٹھا جائے اور اس سے کہ اس پر عمارت بنائی جائے۔“ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ابو الہیاج الاسدی، علی رضی اللہ عنہ کے داماد فرماتے ہیں کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: (( أَلَا أَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِيْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ أَنْ لَّا تَدَعَ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ ))[ مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر : ۹٦۹ ] ”کیا میں تمھیں اس کام پر مقرر نہ کروں جس پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا؟ وہ یہ ہے کہ کوئی مورتی نہ چھوڑ جسے تو مٹا نہ دے اور نہ کوئی اونچی قبر جسے تو برابر نہ کر دے۔“ اللہ کی حکمت دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبریں برابر کرنے پر اس شخص کو مقرر فرمایا جس کے نام لیواؤں نے سب سے زیادہ قبروں کو پختہ اور اونچا بنانا تھا، تاکہ کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

**آیت 22** ① سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ...... : اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت اہل کتاب میں اور ان کے ذریعے سے مشرکین عرب میں اصحاب کہف سے متعلق طرح طرح کی باتیں موجود تھیں، مگر مستند معلومات کسی کے پاس نہ تھیں۔

② اصحاب کہف کے ناموں کے بارے میں کوئی صحیح مرفوع روایت نہیں ہے۔ ناموں کی صراحت غالباً اسرائیلی کتب تواریخ سے ماخوذ ہے اور ان اسماء کے تلفظ میں بھی بہت اختلاف ہے، کسی قول پر بھی اعتماد نہیں ہو سکتا۔ (فتح الباری) پھر بعض لوگ ان ناموں کے خواص اور فائدے بیان کرتے ہیں اور مختلف بیماریوں کے لیے ان کو لکھتے ہیں جو کسی صورت بھی صحیح نہیں، بلکہ اگر ”یا“ حرف ندا کے ساتھ لکھے جائیں، یا ان ناموں میں نفع پہنچانے یا نقصان سے بچانے کی تاثیر کا عقیدہ رکھا جائے تو صاف شرک ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس بارے میں بعض روایات بھی گھڑ لی گئی ہیں جو ابن عباس اور دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم کی

وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ٘ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں یہ کام کل ضرور کرنے والا ہوں ﴿۲۳﴾ مگر یہ کہ اللہ چاہے اور اپنے رب کو یاد کر جب تو بھول جائے اور کہہ امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے قریب تر بھلائی کی ہدایت دے گا ﴿۲۴﴾

طرف منسوب ہیں، مگر ان میں سے کوئی روایت بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما یا سلف صالحین سے ثابت نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ان ناموں کے ساتھ علاج کی تردید کی ہے۔

③ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے اہل کتاب یہ تو جانتے تھے کہ کسی زمانے میں یہ واقعہ ہوا ہے، مگر وہ اس کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ اس لیے محض اٹکل سے اس کی تفصیلات بیان کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کے متعلق ان کے دو قول ذکر فرما کر ان کی تردید فرمائی، البتہ تیسرے قول کا ذکر فرما کر کہ وہ سات تھے، اس کی تردید نہیں فرمائی، بلکہ فرمایا، کہہ دے میرا رب ان کی تعداد سے متعلق زیادہ جانتا ہے اور انھیں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر اس بحث کے بے فائدہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں سے سرسری بحث کے سوا کوئی بحث کریں، نہ ان کے متعلق ان میں سے کسی سے کچھ پوچھیں، کیونکہ ان کے پاس اس کا کچھ علم نہیں۔ اکثر اہل علم نے، جن میں ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں، آخری قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس بات میں مختلف اقوال ہوں اسے بیان کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام اقوال ذکر کیے جائیں اور صحیح قول کی طرف اشارہ کر دیا جائے اور بحث کا فائدہ بھی بیان کیا جائے کہ اس سے کیا حاصل ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تینوں باتیں بیان فرما دیں۔ (قاسمی ملخصاً)

**آیت 24،23** ① وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ ...... : یہاں شان نزول میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف، روح اور ذوالقرنین سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''میں تمھیں کل جواب دوں گا'' اور ''ان شاء اللہ'' نہ کہا، تو پندرہ (۱۵) دن وحی رکی رہی، پھر یہ آیت اتری: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قاضی نے اسے کئی وجہوں سے بے کار قرار دیا ہے۔ قاسمی نے فرمایا کہ ان کی بات حق ہے، کیونکہ محمد بن اسحاق نے یہ روایت ایک مجہول شیخ سے بیان کی ہے، جیسا کہ ابن کثیر (اور طبری) میں اس کی سندیں موجود ہیں۔ (محاسن التاویل)

② اس آیت کا ایک معنی تو مشہور ہے کہ کسی کام کے متعلق یہ مت کہو کہ میں کل یہ کام کرنے والا ہوں، مگر اس کے ساتھ ''ان شاء اللہ'' ضرور کہو، کیونکہ اللہ نے چاہا تو کام ہوگا، ورنہ نہیں۔ اس کی مثال سلیمان علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ انھوں نے کہا: (( لَأَطُوْفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلٰى مِائَةِ امْرَأَةٍ أَوْ تِسْعٍ وَّتِسْعِيْنَ، كُلُّهُنَّ يَأْتِيْ بِفَارِسٍ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ لَهُ صَاحِبُهُ قُلْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، فَلَمْ يَقُلْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، فَلَمْ تَحْمِلْ مِنْهُنَّ إِلَّا امْرَأَةٌ وَاحِدَةٌ جَاءَتْ بِشِقِّ رَجُلٍ، وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ ! لَوْ قَالَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، لَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فُرْسَانًا أَجْمَعُوْنَ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب من طلب الولد للجهاد :

وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو (سال) زیادہ رہے ﴿۲۵﴾

۲۸۱۹] ''آج رات میں اپنی سو (۱۰۰) یا فرمایا ننانوے (۹۹) عورتوں کے پاس جاؤں گا اور ہر عورت ایک بیٹا جنے گی، جو جہاد فی سبیل اللہ کا شہ سوار ہوگا۔'' ان کے ایک ساتھی نے کہا: ''ان شاء اللہ کہیے۔'' مگر سلیمان علیہ السلام نے (مشغولیت وغیرہ کی وجہ سے) ان شاء اللہ نہ کہا، تو ان عورتوں میں سے صرف ایک عورت کو حمل ہوا اور وہ بھی ادھورا بیٹا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو سب عورتوں کے بیٹے ہوتے جو شہ سوار ہوتے اور سب اللہ کے راستے میں جہاد کرتے۔''

دوسرا معنی یہ ہے کہ اے نبی! کسی کام کے بارے میں (اپنی مرضی سے) یہ مت کہیے کہ کل میں یہ کام کرنے والا ہوں، مگر یہ کہ اللہ چاہے، یعنی اللہ چاہے گا کہ آپ وہ کام کریں تو وہ آپ کو اجازت دے گا، پھر آپ اس کے اذن سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ (قاسمی) یہ معنی ''اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ'' الفاظ کے زیادہ قریب ہے اور سورۂ نجم کی آیات (۳، ۴): ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؁ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ میں بھی یہی مفہوم ہے۔

③ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ : یعنی جب بھول جائیں تو یاد آنے پر ''ان شاء اللہ'' کہہ لیں۔ یاد رہے کہ قسم کے ساتھ ''ان شاء اللہ'' کہہ لے تو قسم پوری نہ کرنے پر کوئی کفارہ نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر قسم سے متصل ''ان شاء اللہ'' نہ کہے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، مگر یہ آیت دلیل ہے کہ اگر اس کا ارادہ ''ان شاء اللہ'' کہنے کا تھا مگر بھول کر نہیں کہہ سکا اور یاد آتے ہی اس نے کہہ لیا تو اس کا اعتبار ہوگا۔ مستدرک حاکم (۳۰۳/۴، ح: ۷۸۳۳) میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول مروی ہے کہ ''جب آدمی کسی بات پر قسم کھالے تو وہ ایک سال تک ''ان شاء اللہ'' کہہ سکتا ہے۔'' ابن قیم رحمہ اللہ نے مدارج السالکین میں فرمایا: ''یہ نسیان کی صورت میں ہے۔'' (محاسن التاویل ملخصاً)

④ وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ ...... : اور کہہ دیجیے کہ مجھے اپنے رب سے امید ہے کہ وہ مجھے اصحاب کہف کی خبر سے بھی قریب تر لوگوں کی ہدایت کا باعث بننے والی خبریں بتائے گا جن سے میری رسالت ثابت ہوگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غیب کی بہت سی خبریں آپ کو بتائیں جن کی کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔

**آیت 25** وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ......: بعض مفسرین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نو سالوں کا ذکر الگ اس لیے فرمایا کہ اگر شمسی سال ہوں تو تین سو سال اور قمری ہوں تو ان کے ٹھہرنے کی مدت تین سو نو سال تھی۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ''ثَلَاثَمِائَةٍ وَ تِسْعَ سِنِيْنَ'' (یعنی تین سو نو سال) کہنا کافی بھی تھا اور مختصر بھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شمسی اور قمری کے اس فرق کی کوئی دلیل نہیں۔ نو سالوں کو الگ ذکر کرنے کی وجہ آیات کے فواصل (آخری الفاظ) ہیں، جن سے کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے اور بلاغت کے لحاظ سے قرآن کے الفاظ ''ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا'' کے درمیان اور ''ثَلَاثَمِائَةٍ وَ تِسْعَ سِنِيْنَ'' کے درمیان فرق زمین و آسمان کا ہے۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کبھی اختصار میں حسن ہوتا ہے اور کبھی تطویل میں۔ اس

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ۫ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

کہہ دے اللہ زیادہ جاننے والا ہے جتنی مدت وہ رہے، اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی باتیں ہیں، وہ کس قدر دیکھنے والا اور کس قدر سننے والا ہے، نہ اس کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے ﴿۲۶﴾ اور اس کی تلاوت کر جو تیری طرف تیرے رب کی کتاب میں سے وحی کی گئی ہے، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور نہ اس کے سوا تو کبھی کوئی پناہ کی جگہ پائے گا ﴿۲۷﴾

لیے ان کے ٹھہرنے کی مدت تین سو نو سال ہی تھی، قمری سال تھے تو سب قمری اور شمسی تھے تو سب شمسی۔ تین سو شمسی اور تین سو نو قمری کی تفریق ایک ذہنی اُپج کے سوا کچھ نہیں۔ (محاسن التاویل)

**آیت 26** ❶ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا...... : یعنی اگر اہلِ کتاب آپ سے اس مدت میں اختلاف کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کا علم تم سے زیادہ ہے، لہٰذا جو مدت اس نے بتائی ہے وہی صحیح ہے، تمھاری بات کا اعتبار نہیں۔

❷ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ...... : یہ اللہ کے "اَعْلَمُ" ہونے کی دلیل ہے کہ آسمانوں کا اور زمین کا غیب صرف اس کے پاس ہے۔ رہا دیکھنے اور سننے کے ذریعے سے علم تو وہ کس قدر دیکھنے والا اور کس قدر سننے والا ہے، اس پر تعجب تو ہو سکتا ہے، بیان میں نہیں آ سکتا۔ تو پھر اس کی بات درست ہے یا ان کی جو ان صفات سے خالی ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اس کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں اور اس کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلے میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا۔

**آیت 27** ❶ وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ : یعنی اصحابِ کہف کے بارے میں جو بات آپ کو اس کتاب میں بتائی جا رہی ہے وہ بالکل کافی اور جامع مانع ہے۔ آپ اسی کو جوں کا توں پڑھ کر سناتے رہیے، یا یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے، یہی ان کو پڑھ کر سنائیں اور ان کی مخالفت کی پروا نہ کریں۔

❷ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ۫ وَ لَنْ تَجِدَ...... : "مُلْتَحَدًا" کا معنی التحاد کی جگہ ہے، جو "لَحْدٌ" سے باب افتعال ہے، جس کا معنی مائل ہونا ہے۔ قبر کو بھی اسی لیے لحد کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف ہٹی ہوتی ہے۔ چنانچہ "مُلْتَحَدًا" سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں آدمی ایک طرف جا کر پناہ لے لے۔ یعنی اگر آپ کسی کی خاطر داری سے اس کتاب کی تبلیغ میں کوتاہی کریں گے، یا اس میں کوئی رد و بدل کریں گے تو آپ کو اس کے سوا کہیں پناہ نہ ملے گی۔ اس مفہوم کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۶۷) اور یونس (۱۵) یہ خطاب بظاہر آپ ﷺ سے ہے مگر مقصود اہلِ کتاب اور کفار مکہ سب کو متنبہ کرنا ہے کہ تمھاری خاطر آپ ﷺ اپنے مالک کی کتاب میں کوئی رد و بدل کرنے والے نہیں۔

❸ اس آیت پر اور بعض علمائے تفسیر کے قول کے مطابق اوپر کی آیت پر اصحابِ کہف کا قصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں اور تیری آنکھیں ان سے آگے نہ بڑھیں کہ تو دنیا کی زندگی کی زینت چاہتا ہو اور اس شخص کا کہنا مت مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہے ﴿۲۸﴾ اور کہہ دے یہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے سو ایمان لے آئے اور جو چاہے سو کفر کرے۔ بے شک ہم نے ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی قناتوں نے انھیں گھیر رکھا ہے اور اگر وہ پانی مانگیں گے تو انھیں پگھلے ہوئے تانبے جیسا پانی دیا جائے گا، جو چہروں کو بھون ڈالے گا، برا مشروب ہے اور بری آرام گاہ ہے ﴿۲۹﴾

مضمون شروع ہو رہا ہے جس میں ان حالات پر تبصرہ ہے جو نبی ﷺ اور مسلمانوں کو ان دنوں مکہ میں درپیش تھے۔

**آیت 28** وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ : ”لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ“ ”عَدَا يَعْدُوْ“ (ن) سے نہی کا صیغہ ہے، تجاوز نہ کریں تیری آنکھیں۔ یہ وہی حکم ہے جو اس سے پہلے سورۂ انعام (۵۲) میں گزر چکا ہے۔ مراد وہ کمزور مسلمان ہیں جن کے پاس قریش کے چودھریوں کو بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ چھ آدمی تھے تو مشرکین نے آپ سے کہا، ان لوگوں کو دور ہٹا دیں کہ یہ لوگ ہم پر جرأت نہ کریں۔ میں تھا، ابن مسعود، قبیلہ ہذیل کا ایک آدمی، بلال اور دو آدمی اور جن کا میں نام نہیں لیتا۔ تو رسول اللہ ﷺ کے دل میں آیا جو اللہ نے چاہا کہ آئے، تو آپ ﷺ نے اپنے دل میں کوئی بات سوچی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ [ الأنعام : ٥٢ ] ”اور ان لوگوں کو دور نہ ہٹا جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔“ [ مسلم، فضائل الصحابة، باب في فضل سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ: ٢٤١٣/٤٦ ] اس آیت میں بھی آپ کو ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے آپ کو روک کر رکھنے کا حکم ہے جن میں مذکورہ صفات پائی جاتی ہیں، کیونکہ ان صفات کی وجہ سے وہی اس قابل ہیں کہ آپ ان کے ساتھ رہیں۔ ان کو چھوڑ کر آپ کی نگاہیں آگے مت بڑھیں کہ آپ دنیا کی زندگی کی زینت کا ارادہ رکھتے ہوں اور ایسے لوگوں کی بات مت مانیں جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چل رہے ہیں۔

**آیت 29** ① وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ : ”اَلْحَقُّ“ پر الف لام عہد کا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ ”یہ حق“ کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَّکِـِٕیۡنَ فِیۡہَا عَلَی الۡاَرَآئِکِ ؕ نِعۡمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۳۱﴾ وَ اضۡرِبۡ لَہُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَیۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِہِمَا جَنَّتَیۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّ حَفَفۡنٰہُمَا بِنَخۡلٍ وَّ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمَا زَرۡعًا ﴿ؕ۳۲﴾ کِلۡتَا الۡجَنَّتَیۡنِ اٰتَتۡ اُکُلَہَا وَ لَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡہُ شَیۡئًا ۙ وَّ فَجَّرۡنَا خِلٰلَہُمَا نَہَرًا ﴿ۙ۳۳﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، بے شک ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جو اچھا عمل کرے ﴿۳۰﴾ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ہمیشگی کے باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں انھیں کچھ کنگن سونے کے پہنائے جائیں گے اور وہ باریک اور گاڑھے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، ان میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔ اچھا بدلہ ہے اور اچھی آرام گاہ ہے ﴿۳۱﴾ اور ان کے لیے ایک مثال بیان کر، دو آدمی ہیں، جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ہم نے ان دونوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا اور دونوں کے درمیان کچھ کھیتی رکھی ﴿۳۲﴾ دونوں باغوں نے اپنا پھل دیا اور اس سے کچھ کمی نہ کی اور ہم نے دونوں کے درمیان ایک نہر جاری کر دی ﴿۳۳﴾

❷ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ …… : یعنی مجھے تمھاری کوئی پروا نہیں، مانو گے تو اپنا بھلا کرو گے اور نہ مانو گے تو اپنی شامت لاؤ گے، میں مومنوں کو اپنی مجلس سے نہیں اٹھا سکتا۔

❸ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِیۡنَ نَارًا : "اَعۡتَدۡنَا" میں تاء اصلی ہے۔ "لِلظّٰلِمِیۡنَ" سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔

❹ اَحَاطَ بِہِمۡ سُرَادِقُہَا …… : "سُرَادِقٌ" وہ پردہ جو خیمے کے اردگرد لگایا جاتا ہے، یعنی قنات، جمع "سُرَادِقَاتٌ" (قاموس) "اَلۡمُہۡلُ" پگھلی ہوئی دھات، وہ تانبہ ہو یا سیسہ وغیرہ اور نہایت گرم تیل کی تلچھٹ۔ "مُرۡتَفَقًا" ظرف مکان ہے، ارتفاق کی جگہ، اصل اس کا یہ ہے کہ آدمی اپنی مرفق (کہنی) پر ٹیک لگا کر آرام کرتا ہے۔ جہنم کو آرام کی جگہ بطور طنز کہا ہے، ورنہ وہاں کہنی پر سر رکھ کر کیسے سو سکتا ہے۔ یعنی چاروں طرف آگ کی دیوار ہوگی، کہیں بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔

**آیت 31,30** اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا …… : ظالمین یعنی کفار کے بعد اہل ایمان اور ان کے اجر کا ذکر فرمایا۔ اس مفہوم کی آیات کہ جو اچھا عمل کرے ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے، کے لیے دیکھیے آل عمران (۱۷۱، ۱۹۵)۔

**آیت 33,32** وَ اضۡرِبۡ لَہُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَیۡنِ …… : کفار کو مسلمان فقراء کے مقابلے میں اپنے اموال و انصار پر فخر تھا، اس بنا

وَ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ﴿۳۵﴾ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

اور اس کے لیے بہت سا پھل تھا تو اس نے اپنے ساتھی سے، جب اس سے باتیں کر رہا تھا، کہا میں تجھ سے مال میں زیادہ اور نفری کے لحاظ سے زیادہ باعزت ہوں ﴿۳۴﴾ اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہا میں گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہوگا ﴿۳۵﴾ اور نہ میں قیامت کو گمان کرتا ہوں کہ قائم ہونے والی ہے اور واقعی اگر مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو یقیناً میں ضرور اس سے بہتر لوٹنے کی جگہ پاؤں گا ﴿۳۶﴾

پر وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھتے اور مجلس میں ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ بیان فرما کر سمجھایا کہ یہ چیزیں فخر کے لائق نہیں ہیں، کیونکہ ایک لمحہ میں فقیر غنی ہوسکتا ہے اور غنی فقیر۔ دنیا میں اگر فخر کی کوئی چیز ہے تو وہ ہے اللہ کی اطاعت اور اس کی عبادت اور یہ ان فقراء کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافر و مومن کی ایک مثال بیان فرمائی کہ دو آدمی تھے (ان کے نام یا زمانہ معلوم نہیں، نہ ہی اس میں کوئی فائدہ ہے) ان میں سے ایک کو، جو کافر تھا، اللہ تعالیٰ نے انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے تھے، جو بہت ہی خوب صورت اور نفع آور تھے۔ انگوروں کے باغوں کو کھجوروں نے گھیر رکھا تھا، دونوں باغوں کے درمیان کھیتی تھی اور دونوں باغوں کے درمیان اللہ کے حکم سے نہر چل رہی تھی۔ باغوں اور کھیتوں کو پانی کی کوئی کمی نہ تھی، چنانچہ دونوں باغوں نے پوری پیداوار دی اور کسی قسم کی کمی نہیں کی۔

**آیت 34** وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ ...... : "ثَمَرٌ" کی تنوین تکثیر کے لیے ہے، یعنی اس کے علاوہ بھی اس کے پاس بہت سا پھل تھا یا بہت نفع تھا، کیونکہ نفع کو بھی ثمر کہہ لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد اولاد لی ہے کہ کھیتوں اور باغوں کے علاوہ اس کی اولاد بھی بہت تھی۔ اس کی دلیل آگے مومن کا قول ہے: ﴿ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴾ [ الکھف : ۳۹ ] "اگر تو مجھے دیکھتا ہے کہ میں مال اور اولاد میں تجھ سے کم تر ہوں۔" دوسرا آدمی مومن تھا مگر نادار تھا، اب اس کافر نے فخر سے گفتگو کرتے ہوئے اسے کہا، میرے پاس تم سے مال بھی زیادہ ہے اور آدمی بھی، یعنی اولاد، نوکر چاکر اور دوست۔ الغرض! اس بے ایمان نے اپنے مال و جاہ کے بھروسے پر مومن بھائی پر فخر کیا اور اسے اپنے باغات کا مشاہدہ کرانے کے لیے ساتھ لے چلا۔ ( کبیر )

**آیت 36,35** وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ...... : اپنی جان پر ظلم کرنے والا اس لیے کہ اس نے تین باتیں کہیں جو تینوں کفر ہیں، اگرچہ وہ رب تعالیٰ کے وجود کو مانتا تھا، جیسا کہ "وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ" سے ظاہر ہے۔ پہلی یہ کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہوگا، حالانکہ اللہ کے سوا کسی بھی چیز کو ہمیشہ سے یا ہمیشہ کے لیے باقی سمجھنا نری جہالت اور دہریت

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۳۹﴾

اس کے ساتھی نے، جب کہ وہ اس سے باتیں کر رہا تھا، اس سے کہا کیا تو نے اس کے ساتھ کفر کیا جس نے تجھے حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر تجھے ٹھیک ٹھاک ایک آدمی بنا دیا ﴿۳۷﴾ لیکن میں، تو وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ﴿۳۸﴾ اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہ کہا ''جو اللہ نے چاہا، کچھ قوت نہیں مگر اللہ کی مدد سے'' اگر تو مجھے دیکھتا ہے کہ میں مال اور اولاد میں تجھ سے کم تر ہوں ﴿۳۹﴾

ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیار اور ارادے کا انکار ہے، وہ جب چاہے کسی بھی چیز کو ''کُنْ'' کہہ کر فنا کر سکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ دوسری یہ کہ میں قیامت کو قائم ہونے والی نہیں سمجھتا، حالانکہ یہ اللہ کی قدرت کا انکار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو دوبارہ بھی قادر ہے۔ تیسری بات یہ کہ اگر بالفرض میں اپنے رب کی طرف دوبارہ لے جایا گیا تو مجھے یہاں سے بہتر جگہ ملے گی، کیونکہ یہ میرا حق ہے۔ دیکھیے حٰم السجدہ (۵۰) اور سورۂ مریم (۷۷) یہ اعمال کی جزا و سزا سے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و عدل سے انکار ہے اور مذکورہ تینوں باتیں کفر ہیں۔ (مہائمی)

**آیت 37** قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗ ...... : ''تُرَابٍ'' اور ''نُّطْفَةٍ'' کی تنوین تحقیر کے لیے ہے۔ اس کے مومن ساتھی نے، جسے وہ اپنے مال و جاہ پر فخر کرتے ہوئے فقر کا طعنہ دے رہا تھا، اس سے گفتگو کرتے ہوئے اسے جواب میں کفر کا طعنہ دیا اور کہا کیا تو نے اس ہستی سے کفر کیا جس نے تجھے حقیر مٹی سے، پھر ایک قطرے سے پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھاک ایک آدمی بنا دیا۔ دیکھیے حج (۵)، بقرہ (۲۸) اور مومنون (۱۲ تا ۱۴) تفسیر وحیدی میں ہے: ''افسوس کہ اکثر مسلمان مال دار بھی اسی غرور میں مبتلا ہیں، مساکین بلکہ علماء و صلحاء تک کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔''

**آیت 38** لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ ...... : ''لٰكِنَّا'' اصل میں ''لٰكِنْ اَنَا'' (لیکن میں) ہے، یعنی تم کفر کرتے ہو تو کرتے رہو، لیکن میں یہ ظلم کبھی نہیں کروں گا، بلکہ وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ساتھی مشرک تھا۔ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کلمات سکھائے جنھیں میں پریشانی اور بے چینی کے وقت کہوں: (( اَللّٰهُ اَللّٰهُ رَبِّيْ لَا أُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا )) [ أبو داوٗد، الوتر، باب في الاستغفار: ۱۵۲۵ ] ''اللہ، اللہ ہی میرا رب ہے، میں اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بناتی (بناتا)۔''

**آیت 39** وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنی کوئی چیز اچھی لگے تو اسے یہ کلمات کہنے چاہییں: ﴿ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ﴾ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: (( يَا أَبَا هُرَيْرَةَ ! أَفَلَا أَدُلُّكَ عَلٰی كَنْزٍ مِنْ كَنْزِ الْجَنَّةِ تَحْتَ الْعَرْشِ ، قَالَ قُلْتُ نَعَمْ فِدَاكَ أَبِيْ وَ أُمِّيْ ، قَالَ أَنْ تَقُوْلَ لَا قُوَّةَ إِلَّا

فَعَسٰی رَبِّیۡۤ اَنۡ یُّؤۡتِیَنِ خَیۡرًا مِّنۡ جَنَّتِکَ وَ یُرۡسِلَ عَلَیۡہَا حُسۡبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصۡبِحَ صَعِیۡدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوۡ یُصۡبِحَ مَآؤُہَا غَوۡرًا فَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ لَہٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِہٖ فَاَصۡبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیۡہِ عَلٰی مَاۤ اَنۡفَقَ فِیۡہَا وَ ہِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِہَا وَ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُشۡرِکۡ بِرَبِّیۡۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

تو قریب ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا کر دے اور اس پر آسمان سے کوئی عذاب بھیج دے تو وہ چٹیل میدان ہو جائے ﴿۴۰﴾ یا اس کا پانی گہرا ہو جائے، پھر تو اسے کبھی تلاش نہ کر سکے گا ﴿۴۱﴾ اور اس کا سارا پھل مارا گیا تو اس نے اس حال میں صبح کی کہ اپنی ہتھیلیاں ملتا تھا اس پر جو اس میں خرچ کیا تھا اور وہ اپنی چھتوں سمیت گرا ہوا تھا اور کہتا تھا اے کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ﴿۴۲﴾

بِاللّٰهِ، قَالَ أَبُوْ بَلْجٍ وَأَحْسِبُ أَنَّهُ قَالَ : فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ أَسْلَمَ عَبْدِيْ وَاسْتَسْلَمَ، قَالَ فَقُلْتُ لِعَمْرٍو قَالَ أَبُوْ بَلْجٍ قَالَ عَمْرٌو قُلْتُ لِأَبِيْ هُرَيْرَةَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ فَقَالَ: لَا إِنَّهَا فِيْ سُوْرَةِ الْكَهْفِ : ﴿وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَکَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ ۙ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ﴾ ﴾ [ مسند أحمد : ۲/ ۳۳۵، ح : ۸٤٤۷ ] ”اے ابو ہریرہ! کیا میں تمھیں عرش کے نیچے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ بتاؤں؟“ میں نے کہا: ”ہاں! آپ پر میرے ماں باپ قربان!“ فرمایا: ”تم کہو ”لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“ ابو بلج راوی کہتے ہیں، میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا بندہ مطیع ہو گیا اور اس نے اپنا آپ میرے سپرد کر دیا۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان کے شاگرد نے پوچھا: ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“ تو انھوں نے فرمایا: ”نہیں، یہ کلمہ سورۂ کہف میں ہے: ﴿وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَکَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ ۙ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ﴾ شعیب ارنؤوط نے کہا کہ یہ روایت عرش کے لفظ کے بغیر صحیح ہے۔ صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ نے ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“ کی یہی فضیلت رسول اللہ ﷺ سے بیان کی ہے۔ [ بخاري، القدر، باب لا حول ولا قوة إلا بالله : ٦٦١٠ ] باقی وہ روایات جن میں یہ کلمات پڑھنے سے نظر بد یا کسی بھی نقصان سے محفوظ رہنے کا ذکر ہے، وہ سب ضعیف ہیں۔ (البانی) مگر ان کی فضیلت کے لیے آیت ہی کافی ہے۔

**آیت 41،40** ”صَعِيْدًا“ میدان، ”زَلَقًا“ جس میں قدم پھسلتا ہو۔ اس مومن نے اپنے مغرور ساتھی سے کہا کہ اگر تم مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کم دیکھتے ہو تو یہ کوئی ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں، عین قریب ہے کہ میرا رب دنیا میں یا آخرت میں مجھے تمھارے باغ سے بہتر عطا کر دے اور تمھارے باغ پر آسمان سے کوئی عذاب بھیج کر زمین کو چٹیل میدان بنا دے۔ جہاں قدم پھسلتا ہو، یا وہ چشمہ جس سے اس کی نہر نکلتی ہے، اس کا پانی گہرا چلا جائے اور تم کسی صورت اسے حاصل نہ کر سکو۔ دیکھیے سورۂ ملک کی آخری آیت۔

**آیت 42** وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ...... : لفظی معنی ہے اس کے پھل کو گھیر لیا گیا، یعنی سب مارا گیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا اس

وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع ۱۷

اور اللہ کے سوا اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کرتے اور نہ وہ (خود) بچنے والا تھا﴿۴۳﴾ وہاں ہر طرح کی مدد اللہ سچے کے اختیار میں ہے، وہ ثواب دینے میں بہتر اور انجام کی رو سے زیادہ اچھا ہے﴿۴۴﴾

مومن نے کہا تھا کہ رات اللہ کی طرف سے کسی عذاب مثلاً طوفانی بارش، یا سردی کی شدید لہر، یا آگ لگنے سے اس کا سارا باغ برباد ہو گیا، انگور چھتوں سمیت گر گئے اور صبح ہوئی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کافر کی عجیب تصویر کھینچی ہے، کیونکہ جب یک لخت صدمہ پہنچتا ہے تو آدمی پہلے گنگ رہ جاتا ہے، پھر کچھ سنبھلتا ہے تو بات کرتا ہے، یہ مشرک بھی اپنے باغ کی حالت دیکھتے ہی اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیرنے لگا۔ اس سے دو صورتیں مراد ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ایک دوسری پر ملنے لگا اور دوسری یہ کہ حسرت و افسوس سے الگ الگ ہی ان کو الٹ پلٹ کرنے لگا کہ ہائے ہائے! میں نے اس میں کس قدر رقم خرچ کی تھی، نفع کے بجائے اصل بھی گیا۔ اب اسے یاد آیا کہ مومن بھائی کی بات سچی تھی اور کہنے لگا، کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، غرور و تکبر کی راہ سے اپنے نفس کی پیروی نہ کرتا، بلکہ بھائی کی بات مان لیتا اور اپنی ساری شان و شوکت کو اللہ ہی کا عطیہ سمجھتا۔

**آیت 43** وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ ...... : ”مُنْتَصِرًا“ کا معنی انتقام لینے والا بھی ہے اور خود بچنے والا بھی، یعنی عذاب آیا تو اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کرتے، سوائے اللہ کے اور نہ وہ خود بچنے والا تھا۔ ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ کا ایک مطلب یہ ہے جو ترجمے میں گزرا۔ زمخشری اور کئی مفسرین نے یہی معنی کیا ہے، یعنی اس ”وقت اللہ کے سوا“ اسے کوئی بچانے والا نہ تھا، مگر اس کو وہ ناراض کر چکا تھا۔

”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ پھر ”اللہ کے مقابلے میں“ اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کو پہنچتا...... یہ معنی بھی کئی مفسرین نے کیا ہے۔ کسی بھی کافر کو جب یہ معاملہ پیش آتا ہے تو وہ اس وقت ہر طرف سے ناامید اور مجبور ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، مگر تب وقت گزر چکا ہوتا ہے اور اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا، جیسا کہ فرعون غرق ہوتے وقت ایمان لے آیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے یونس (۹۰ تا ۹۲) انبیاء علیہم السلام کے مخالفین نے اللہ کا عذاب دیکھا تو کہنے لگے، ہم اللہ اکیلے پر ایمان لے آئے۔ (دیکھیے مومن: ۸۴) اور قارون کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے بعینہٖ یہ الفاظ فرمائے جو زیر تفسیر قصے والے شخص کے متعلق فرمائے، فرمایا: ﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ﴾ [ القصص : ۸۱ ] ”تو ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر نہ اس کے لیے کوئی جماعت تھی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کرنے والوں میں سے تھا۔“ مگر ان میں سے کسی کے ایمان نے اسے فائدہ نہ دیا۔

**آیت 44** ❶ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ : ”هُنَالِكَ“ کا معنی اس وقت بھی ہے اور اس جگہ بھی، اس لیے دونوں کو ملحوظ

وَ اضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ فَاَصۡبَحَ هَشِیۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّیٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ مُّقۡتَدِرًا ﴿۴۵﴾

اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کر، جیسے پانی، جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے ساتھ زمین کی نباتات خوب مل جل گئی، پھر وہ چورا بن گئی، جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ﴿۴۵﴾

رکھ کر ترجمہ اس موقع پر کیا گیا ہے۔ ’’اَلْوَلَايَةُ‘‘ واؤ کے فتح کے ساتھ معنی ہے ’’مدد‘‘ اور واؤ کے کسرہ کے ساتھ معنی ہے ’’حکومت، اختیار‘‘ یعنی اس موقع پر صرف اللہ سچے ہی کی مدد کار آمد ہو سکتی ہے، جیسا کہ پچھلی آیت کی تفسیر میں گزرا۔

② هُوَ خَیۡرٌ ثَوَابًا وَّ خَیۡرٌ عُقۡبًا : اہل علم متفق ہیں کہ ’’خَيْرٌ‘‘ اور ’’شَرٌّ‘‘ دونوں اسم تفضیل ہیں، یعنی اصل میں ’’اَخْيَرُ‘‘ اور ’’اَشَرُّ‘‘ تھے، تخفیف کے لیے انھیں ’’خَيْرٌ‘‘ اور ’’شَرٌّ‘‘ کر دیا گیا۔ یعنی بدلہ دینے میں اللہ سب سے بہتر ہے، اس جیسا یا اس سے اچھا بدلہ کسی کے پاس نہیں اور اچھے انجام کے لحاظ سے بھی وہی سب سے بہتر ہے۔ اس کے عطا کردہ انجام جیسا انجام بھی کسی کے پاس نہیں۔ ’’خَیۡرٌ‘‘ کا لفظ دوبارہ تاکید اور مبالغہ کے لیے ہے۔

**آیت 45** وَ اضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ...... : ’’هَشِیۡمًا‘‘ یہ ’’فَعِيْلٌ‘‘ بمعنی ’’مَفْعُوْلٌ‘‘ ہے، یعنی چورا چورا کیا ہوا۔ ’’تَذۡرُوۡهُ‘‘ ’’ذَرَا يَذْرُوْ‘‘ (ن) ہواؤں کا اڑانا۔ ’’مُّقۡتَدِرًا‘‘ ’’قَدَرَ يَقْدِرُ‘‘ سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، حروف زیادہ ہونے سے معنی زیادہ ہو گیا، یعنی پوری قدرت رکھنے والا۔ یہ دنیا کی بے ثباتی کی ایک اور مثال ہے، یعنی دنیا کی مثال اس پانی کی سی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا، اس کے ساتھ زمین سے پودے اگے، پھر اتنے گھنے ہو گئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہایت خوب صورت منظر پیش کرنے لگے، جسے دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے، پھر وہ کھیتی پک کر زرد ہو گئی، پھر ایسی خشک ہوئی کہ ٹوٹ پھوٹ کر چورا ہو گئی۔ اسی طرح آسمان سے روح اتری، زمین سے بننے والے بدن سے مل کر انسان بڑھنا شروع ہو گیا، بچپن کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے جوانی آ گئی، ماں باپ جوان اولاد کو دیکھ کر کھل اٹھے، پھر تھوڑی ہی مدت بعد بڑھاپا آ گیا۔ اب اس نے فنا ہونا ہی ہونا ہے، جس طرح پکی ہوئی فصل کو پانی دیا جائے یا کھاد، اسے ریزہ ریزہ ہونا ہی ہے، اسی طرح بوڑھے کو مقوی غذا دی جائے یا کشتے، اس نے قبر میں جا کر مٹی کے ذرات میں بدلنا ہی ہے۔ پھر کئی پودے اگتے ہی اکھاڑ لیے جاتے ہیں، کئی سرسبز پودے جوبن پر کاٹ لیے جاتے ہیں، پھر اگر کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو پکنے پر کاٹ لیے جاتے ہیں، یا خود ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کوئی بچپن میں، کوئی جوانی یا ادھیڑ عمر میں فوت ہو جاتے ہیں، اگر یہ مدت خیریت سے گزر جائے تو بڑھاپے کے بعد یہاں رہنے کا معاملہ ہر حال میں ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام مرحلوں کے درمیان ’’فاء تعقیب‘‘ رکھی، یعنی ’’فَاخۡتَلَطَ‘‘ اور ’’فَاَصۡبَحَ‘‘ یعنی یہ مرحلے ایک دوسرے کے پیچھے جلد از جلد آتے چلے جاتے ہیں۔ اس مفہوم کی آیات کے لیے دیکھیے یونس (۲۴)، زمر (۲۱) اور حدید (۲۰)۔

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب میں بہتر اور امید کی رو سے زیادہ اچھی ہیں ﴿۴۶﴾

**آیت 46** ❶ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ ...... : اس آیت سے مقصود لوگوں کو نیک اعمال کی طرف توجہ دلانا ہے، تاکہ وہ باقی رہنے والے نیک اعمال کو چھوڑ کر، جو آخرت میں کام آنے والے ہیں، محض دنیا کی زندگی کی زینت والی چیزوں میں مشغول نہ رہیں، کیونکہ دنیا کی زندگی بے ثبات اور عارضی ہے، جیسا کہ پچھلی آیت میں مثال سے واضح فرمایا، تو اس کی چمک دمک اور زینت اس سے بھی زیادہ بے ثبات اور عارضی ہے۔ سو باقی کو فانی پر ترجیح دینا ہی کامیابی ہے۔ اس آیت میں مال اور بیٹوں ہی کا ذکر فرمایا، کیونکہ مال میں انسان کی ملکیت کی ہر چیز آ جاتی ہے، مکان، مویشی اور سونا چاندی وغیرہ۔ دوسری آیات میں ان کی تفصیل اور ان کا فتنہ و آزمائش ہونا تفصیل سے ذکر فرمایا، دیکھیے آل عمران (۱۴، ۱۵)، منافقون (۹) اور تغابن (۱۴، ۱۵)۔

❷ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ: ان الفاظ میں وہ تمام نیک اعمال آ جاتے ہیں جو اللہ کو راضی کرنے والے ہیں اور ان کا اجر قیامت کے دن کے لیے باقی ہے۔ عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ "اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ" کیا ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: « لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ » [ مسند أحمد : ۱/ ۷۱، ح : ۵۱۵ ] "اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ" کا ایک خاص مفہوم بھی ہے، یعنی وہ اعمال جن کا ثواب آدمی کو فوت ہونے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ » [ مسلم، الوصیة، باب ما یلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته : ۱۶۳۱ ] "جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے، ایک وہ صدقہ جو جاری رہنے والا ہو (مثلاً مسجد، شفا خانہ، کنواں وغیرہ)، ایک وہ علم جس سے نفع اٹھایا جائے (مثلاً تدریس، تصنیف، تبلیغ وغیرہ) اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے (یا شاگرد وغیرہ جو دعا کرتے رہیں)۔" سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَإِنْ مَاتَ، جَرٰی عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُهُ، وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ، وَأَمِنَ الْفَتَّانَ » [ مسلم، الإمارة، باب فضل الرباط في سبيل اللّٰه عز و جل : ۱۹۱۳۔ ترمذي : ۱۶۶۵۔ نسائي : ۳۱۶۹، ۳۱۷۰ ] "اللہ کے راستے میں ایک دن اور ایک رات کا رباط (سرحد پر دشمن کے مقابلے کے لیے رہنا) ایک ماہ کے روزے اور اس کے قیام سے بہتر ہے، پھر اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کا وہ عمل اس کے لیے جاری رکھا جاتا ہے جو وہ کرتا تھا اور اس کے لیے اس کا رزق جاری رکھا جاتا ہے اور آزمائش کرنے والوں (منکر و نکیر) سے امن میں رہتا ہے۔" مسلم میں ایک دن اور ایک رات کے لفظ ہیں اور اس میں " فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ " کے الفاظ نہیں ہیں۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ جاریہ، تعلیم

وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۫ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تو زمین کو صاف میدان دیکھے گا اور ہم انھیں اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے ﴿۴۷﴾ اور وہ تیرے رب کے سامنے صفیں باندھے ہوئے پیش کیے جائیں گے، بلاشبہ یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح آئے ہو جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ ہم تمھارے لیے کبھی وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے ﴿۴۸﴾

دین، دعا کرنے والی اولاد صالح اور جہاد فی سبیل اللہ خاص باقیات صالحات ہیں، جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔
③ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان اعمال کا بدلہ تیرے رب کے ہاں تمام بدلوں سے بہتر ہے اور ان کے اجر کی امید بھی سب امیدوں سے بہتر ہے۔

آیت 47 ① وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ...... : "يَوْمَ" "اُذْكُرْ" محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے اجر کی پائیداری کی مناسبت سے اب قیامت کے دن کا ذکر فرمایا، یعنی اس دن کو یاد کیجیے جب پہاڑوں کو چلایا جائے گا اور وہ مختلف حالتوں سے گزرتے ہوئے آخر سراب کی طرح رہ جائیں گے، زمین کے سمندر، پہاڑ اور اونچی نیچی تمام جگہیں ہموار ہو جائیں گی اور پوری زمین پر نگاہ کے لیے کوئی رکاوٹ یا اوٹ باقی نہیں رہے گی۔ پہاڑوں پر گزرنے والی کیفیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نبا (۲۰)، حاقہ (۱۳ تا ۱۵)، طور (۹، ۱۰)، تکویر (۳)، نمل (۸۸)، معارج (۸، ۹)، قارعہ (۴، ۵)، مزمل (۱۴) اور واقعہ (۵، ۶) زمین کے ہموار ہونے کے ذکر کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۰۵ تا ۱۰۷)۔
② وَ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا : اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے سب لوگوں کو اکٹھا کرے گا، کسی کو باقی نہیں چھوڑے گا۔ دیکھیے سورۂ واقعہ (۴۹، ۵۰) دوسرے مقام پر وضاحت فرمائی کہ اس حشر میں جن و انس کے علاوہ دوسری تمام مخلوقات بھی شامل ہوں گی، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۳۸ ] "اور زمین میں کوئی چلنے والا جان دار نہیں اور نہ کوئی پرندہ ہے جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر تمھاری طرح امتیں ہیں، ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی، پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوْقَ إِلٰى أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ )) [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم : ۲۵۸۲ ] "قیامت کے دن حق والوں کو ان کے حقوق ہر صورت ادا کیے جائیں گے، حتیٰ کہ بغیر سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے بدلہ دلوایا جائے گا۔"

آیت 48 لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ...... : یعنی اللہ تعالیٰ ان سے یہ بات فرمائے گا۔ دیکھیے سورۂ انعام (۹۴)

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

ع ۵/ ۱۸

اور کتاب رکھی جائے گی، پس تو مجرموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو اس میں ہوگا اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے، اور انھوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا ﴿۴۹﴾

یہ خطاب آخرت کے منکروں سے ہوگا، جیسا کہ اس آیت کے آخر میں ہے: ﴿ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴾ ”بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ ہم تمھارے لیے کبھی وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے۔“ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « تُحْشَرُوْنَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ؟ فَقَالَ الْأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يُهِمَّهُمْ ذَاكِ » [ بخاری، الرقاق، باب الحشر : ۶۵۲۷ ] ”تم قیامت کے دن ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بغیر ختنے کے اکٹھے کیے جاؤ گے۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”معاملہ اس سے کہیں سخت ہوگا کہ انھیں اس بات کی سوچ آئے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ حدیث آئی ہے، اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۱۰۴ ] ”جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کی ابتدا کی (اسی طرح) ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں۔“ اس حدیث میں یہ بھی ہے: « ثُمَّ إِنَّ أَوَّلَ الْخَلَائِقِ يُكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِبْرَاهِيْمُ » [ بخاری، التفسیر، سورۃ الأنبیاء، باب : ﴿ كما بدأنا أول خلق نعيده وعدا علينا ﴾ : ۴۷۴۰، ۶۵۲۶ ] ”پھر سب سے پہلے جسے لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم (علیہ السلام) ہوں گے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ مسلسل بے لباس کفار ہی رہیں گے۔

آیت 49 ① مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ : بقاعی رحمہ اللہ نے رسم عثمانی میں لام جارہ کو الگ لکھنے کا ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ مجرم اتنے خوف زدہ ہوں گے کہ وہ بعض کلمات پر رک جایا کریں گے۔ علامہ قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بقاعی کے لطیف نکتوں میں سے ایک ہے۔

② لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً ...... : اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے آل عمران (۳۰) اور زلزال (۷، ۸)۔

③ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا : یعنی کسی کو بے قصور سزا نہیں دے گا اور نہ ایسا ہوگا کہ اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو اور اس کے نامۂ اعمال میں درج کر دیا جائے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ جنوں میں سے تھا، سو اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، تو کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں، وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے ﴿۵۰﴾ میں نے انھیں نہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں حاضر کیا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے میں اور نہ ہی میں گمراہ کرنے والوں کو بازو بنانے والا تھا ﴿۵۱﴾

**آیت 50** ① وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا ......: اس سلسلۂ کلام میں آدم و ابلیس کا قصہ ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ کفار کو متنبہ کیا جائے کہ تم جس غرور و تکبر کی راہ پر چل رہے ہو اور فقراء مسلمین کو حقیر سمجھتے ہو یہ وہی راہ ہے جس پر تم سے پہلے شیطان نے قدم رکھا تھا، پھر دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوا؟

② كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ : "فَفَسَقَ" میں فاء تعلیل یعنی وجہ بیان کرنے کے لیے ہے، جیسے کہتے ہیں: "سَرَقَ فَقُطِعَتْ يَدُهٗ" "اس نے چوری کی، تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔" یعنی شیطان جنوں میں سے تھا، اس لیے اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ اگر فرشتوں سے ہوتا تو کبھی نافرمانی نہ کرتا، کیونکہ فرشتے نہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں نہ اس کے حکم کے بغیر کوئی کام کرتے ہیں۔ دیکھیے انبیاء (۲۶ تا ۲۸) اور تحریم (۶) معلوم ہوا کہ ابلیس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اصل میں فرشتہ تھا، نام اس کا عزازیل تھا، یا جن تھا مگر کثرت عبادت کی وجہ سے فرشتوں کا استاد بن گیا، بالکل بے اصل بات ہے۔ رہا یہ سوال کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو تھا، جنوں کو تھا ہی نہیں تو اس کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۲) اور سورۂ بقرہ (۳۴) کی تفسیر۔

③ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗ ......: اس سے معلوم ہوا کہ ابلیس کی اولاد ہے، مگر ان کی نسل کیسے بڑھی اور کیسے بڑھتی ہے اس کے متعلق صحیح ذریعے سے ہمارے پاس کوئی علم نہیں۔

④ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا : "بِئْسَ" کا فاعل "هُوَ" ضمیر ہے، جو ابلیس کی طرف لوٹتی ہے، یعنی اللہ کے بدلے میں ابلیس کو دوست بنایا تو تم نے بہت برا بدل حاصل کیا۔

**آیت 51** ① مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ......: اللہ تعالیٰ نے اپنے معبود برحق ہونے کی سب سے بڑی دلیل جو قرآن میں بیان فرمائی ہے اور بار بار بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر چیز کا خالق میں ہوں، میرے سوا کوئی مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتا تو پھر میری بندگی اور دوستی چھوڑ کر مخلوق کی بندگی اور دوستی کیوں؟ مثلاً دیکھیے سورۂ نحل (۱۷)، رعد (۱۶)، لقمان (۱۱)، فاطر (۴۰)

وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَ لَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ ع وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

اور جس دن فرمائے گا پکارو میرے ان شریکوں کو جو تم نے گمان کر رکھے تھے، سو وہ انھیں پکاریں گے تو وہ انھیں کوئی جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہلاکت کی جگہ بنا دیں گے ﴿۵۲﴾ اور مجرم لوگ آگ کو دیکھیں گے تو یقین کر لیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور اس سے پھرنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے ﴿۵۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر مثال پھیر پھیر کر بیان کی ہے اور انسان ہمیشہ سے سب چیزوں سے زیادہ جھگڑنے والا ہے ﴿۵۴﴾

---

اور احقاف (۴) وغیرہ۔ اس آیت میں فرمایا کہ جب میں نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تو ان شیاطین کا کوئی وجود نہ تھا کہ وہ ان کے بنانے میں میرے شریک ہوتے اور نہ میں نے انھیں ان کی اپنی پیدائش میں شریک کیا۔ مطلب یہ کہ یہ خود میرے پیدا کردہ ہیں، پھر یہ میرے شریک اور تمھاری بندگی اور اطاعت کے مستحق کیسے بن گئے؟ اور مخلوق خالق کی ہمسر کیسے بن گئی؟

② وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا : یعنی نہ میں نے کسی بھی مخلوق سے پیدا کرنے میں کوئی مشورہ یا مدد لی اور نہ میں کبھی اس طرح کے شریروں اور نافرمانوں کو، جن کا کام دوسروں کو گمراہ کرنا اور شرارت پھیلانا ہے، اپنا بازو، یعنی مددگار بنانے والا تھا۔ میں نے کسی کی بھی مدد یا مشورے کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق ساری مخلوق پیدا کی۔ گویا "الْمُضِلِّيْنَ" پر الف لام عہد کا ہے، مراد شیطان اور اس کی اولاد ہے۔ اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورۂ سبا (۲۲، ۲۳)۔

**آیت 52** ① وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ...... : یعنی ان مشرکوں سے اس دن کا ذکر کیجیے جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے شریکوں کو آواز دو جنھیں تم نے میرے شریک سمجھ رکھا تھا، وہ انھیں پکاریں گے مگر مدد تو کجا، وہ انھیں جواب بھی نہیں دیں گے۔ دیکھیے قصص (۶۲ تا ۶۴)، فاطر (۱۳، ۱۴)، احقاف (۵، ۶)، مریم (۸۱، ۸۲)، انعام (۹۴) اور ابراہیم (۲۲)۔

② وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا : "وَبَقَ يَبِقُ" (ض، ع) بروزن "وَرِثَ" ہلاک ہونا، یعنی ہم ان مشرکوں اور ان لوگوں کے درمیان جنھیں وہ دنیا میں اپنا معبود سمجھتے تھے ہلاکت کی ایک جگہ بنا دیں گے جس سے ان کا ایک دوسرے تک پہنچنا ممکن نہ رہے گا۔

**آیت 53** وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ...... : آگ میں جانے سے پہلے آگ کو دیکھنا اور اس بات کا یقین کہ اب اس میں جائے بغیر کوئی چارہ نہیں، بجائے خود ایک بہت بڑا عذاب ہے۔ مزید دیکھیے شوریٰ (۴۴ تا ۴۷)۔

**آیت 54** ① وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ...... : مثال سے بات بہت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ اس سورت میں

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

اور لوگوں کو کسی چیز نے نہیں روکا کہ وہ ایمان لائیں، جب ان کے پاس ہدایت آگئی اور اپنے رب سے بخشش مانگیں، مگر اس بات نے کہ ان کو پہلے لوگوں کا سا معاملہ پیش آجائے، یا ان پر عذاب سامنے آموجود ہو ﴿۵۵﴾

اللہ تعالیٰ نے کئی مثالیں بیان فرمائی ہیں، مثلاً دنیا کی زندگی کی مثال اور آخرت پر ایمان رکھنے والے مسکین اور ایمان نہ رکھنے والے دو باغوں کے مالک کی مثال وغیرہ۔ اس کے علاوہ دوسری سورتوں میں بھی مختلف دلیلوں، کئی طریقوں اور مثالوں سے بات سمجھائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی باتیں مچھر (بقرہ: ۲۶)، مکھی (حج: ۷۳) کتے (اعراف: ۱۷۶) اور گدھے (جمعہ: ۵) کی مثالیں دے کر سمجھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مختار مطلق اور مخلوق کے بے اختیار ہونے کے لیے مالک اور غلام کی مثالیں کئی جگہ بیان ہوئی ہیں۔ دیکھیے نحل (۷۵، ۷۶) اور روم (۲۸) قرآن و حدیث کی تمام مثالوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگ بات پر غور و فکر کریں اور اسے سمجھیں، مگر انھیں جاننے والے ہی سمجھتے ہیں۔ (دیکھیے حشر: ۲۱۔ عنکبوت: ۴۳) پھر ان مثالوں سے کچھ لوگ فائدہ اٹھا کر ہدایت پا لیتے ہیں اور کچھ الٹی سمجھ سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۶۔ رعد: ۱۷، ۱۸) آیت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے بنی اسرائیل (۸۹) اس آیت میں "فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ" پہلے ہے، کیونکہ اس سورت کی ابتدا ہی قرآن کے ذکر سے ہوئی ہے اور یہ سورت قرآن کے وصف میں سے ہے اور بنی اسرائیل میں "لِلنَّاسِ" پہلے ہے، کیونکہ اس سورت کا بنیادی مضمون "اَلنَّاسُ" (لوگوں) کے احوال کی طرف توجہ ہے، جو فی الحقیقت "اَلنَّاسُ" (لوگ) ہیں، جن میں تقویٰ اور احسان پایا جاتا ہے۔ (بقاعی)

② وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا : یعنی جو چیزیں جھگڑا کر سکتی ہیں، انسان ان میں سب سے زیادہ جھگڑنے والا ہے، اس لیے خواہ مخواہ حیل و حجت کیے جاتا ہے اور حق بات کی طرف نہیں آتا۔ قرآن میں جا بجا ہمارے نبی ﷺ اور دوسرے انبیاء کے ساتھ کفار کے جھگڑے مذکور ہیں۔ جھگڑے کی ایک مثال سورۂ زخرف (۵۷، ۵۸) میں دیکھیے۔

**آیت 55** وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا ...... : اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں کی تائید میں آیات موجود ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے واضح نشانیاں لانے کے باوجود لوگوں کو ایمان لانے اور استغفار سے روکا تو صرف اس بات نے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ لوگ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ان پر ہمارا عذاب اسی طریقے سے نہ آجائے جس طرح پہلے لوگوں، مثلاً قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ پر آیا، جس نے انھیں جڑ سے اکھیڑ دیا، یا قیامت کے دن کا عذاب ان کے سامنے نہ آجائے، یعنی ان کی تقدیر ہی میں ایمان لانا نہیں ہے۔ یہ قضیہ "مَانِعَةُ الْخَلُوِّ" ہے۔ یعنی ان دونوں چیزوں میں سے ایک ضرور ہوگی کہ اگر دنیا میں پہلے لوگوں جیسے عذاب سے بچے رہے تو قیامت کا عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے ضرور آئے گا اور دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں پہلے لوگوں کی طرح عذاب بھی آئے گا اور آخرت میں بھی عذاب کو سامنے دیکھ لیں گے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بھی نہ ہو۔ اس معنی کی تائید میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَ مَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، باطل کو لے کر جھگڑا کرتے ہیں، تاکہ اس کے ساتھ حق کو پھسلا دیں اور انھوں نے میری آیات کو اور ان چیزوں کو جن سے انھیں ڈرایا گیا، مذاق بنالیا ﴿۵۶﴾ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی تو اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور اسے بھول گیا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا، بے شک ہم نے ان کے دلوں پر پردے بنا دیے ہیں، اس سے کہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ رکھ دیا ہے اور اگر تو انھیں سیدھی راہ کی طرف بلائے تو اس وقت وہ ہرگز کبھی راہ پر نہ آئیں گے ﴿۵۷﴾

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [ یونس : ۹۶، ۹۷ ] ”بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی، وہ ایمان نہیں لائیں گے، خواہ ان کے پاس ہر نشانی آجائے، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“ اس معنی کی مزید آیات کے لیے دیکھیے یونس (۱۰۱) اور مائدہ (۴۱)۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے ایمان لانے اور استغفار کرنے سے روکا تو صرف ان کے اس مطالبے نے کہ ان پر پہلے لوگوں جیسا جڑ سے اکھاڑ دینے والا عذاب آجائے، یا قیامت کا عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے، یعنی وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے اسی مطالبے پر ڈٹے رہے، نہ ایمان لائے نہ اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اس مفہوم کی آیات بہت ہیں، مثلاً شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرا دے، اگر تو سچوں سے ہے۔ (شعراء : ۱۸۷) اسی طرح قوم ہود کا مطالبہ (احقاف : ۲۲)، ثمود کا مطالبہ (اعراف : ۷۷)، قوم لوط (عنکبوت : ۲۹)، قوم نوح (ہود : ۳۲) اور مشرکین مکہ کا مطالبہ (انفال : ۳۲) آیت میں دونوں معنی کی گنجائش ہے اور دونوں درست ہیں۔

**آیت 56** ① وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ ...... : یعنی رسولوں کا کام بشارت و نذارت ہے، عذاب لانا یا نہ لانا ان کے اختیار میں نہیں اور کافر لوگ باطل کے ذریعے سے جھگڑا کر کے حق کو شکست دینا چاہتے ہیں، مثلاً یہ کہ تم رسول ہو تو صفا پہاڑ سونے کا بنا دو وغیرہ، حالانکہ یہ نہ رسول کا کام ہے نہ اس کے اختیار میں ہے۔ دوسرے کئی مقامات پر فرمایا کہ کافروں کی یہ خواہش نہ کبھی پوری ہوگی اور نہ اللہ کا نور پھونکوں سے بجھایا جا سکے گا۔ دیکھیے توبہ (۳۲) اور شوریٰ (۱۶)۔

② وَاتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ ...... : اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کو مذاق بنا لینا جھٹلانے کی بدترین صورت ہے۔

**آیت 57** ① وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ...... : یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جس

وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ

اور تیرا رب نہایت بخشنے والا، خاص رحمت والا ہے، اگر وہ انھیں اس کی وجہ سے پکڑے جو انھوں نے کمایا ہے تو یقیناً ان کے لیے جلد عذاب بھیج دے، بلکہ ان کے لیے وعدے کا ایک وقت ہے جس سے بچنے کی وہ ہرگز کوئی پناہ گاہ نہ پائیں گے ﴿۵۸﴾ اور یہی بستیاں ہیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، جب انھوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک مقرر وقت رکھ دیا تھا ﴿۵۹﴾ اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا میں نہیں ہٹوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں

---

جس کے متعلق آیا ہے وہ سب ایسے ہیں کہ ان سے بڑا ظالم کوئی نہیں، مثلاً اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ دیکھیے سورۂ کہف (۱۵)۔

② اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً ...... : "اَكِنَّةً" "كِنَانٌ" کی جمع ہے، پردے۔ "وَقْرًا" کا معنی ہے بوجھ، بہرا پن۔ یعنی جب کوئی شخص کسی کے سیدھی طرح سمجھانے سے کوئی اثر نہیں لیتا، بلکہ جانتے بوجھتے ہٹ دھرم اور جھگڑالو بن جاتا ہے، اللہ کی واضح آیات کا مذاق اڑاتا ہے اور اپنے کرتوتوں اور ان کے برے نتائج سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتا تو آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے کان حق بات سننے سے بہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص اسے سیدھی راہ کی طرف بلائے بھی تو ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس کی یہ کیفیت اگرچہ اس کے اپنے عمل سے پیدا ہوتی ہے، مگر خالق چونکہ ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کیفیت کے پیدا کرنے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔

**آیت 58** ① وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۶)، سورۂ نجم (۳۲) اور زمر (۵۳)۔

② لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۶۱) اور فاطر (۴۵)۔

③ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا ...... : "مَوْىِٕلًا" "وَأَلَ يَئِلُ اِلٰى مَكَانٍ" کسی جگہ کی طرف پناہ لینا۔ "مَوْىِٕلًا" پناہ کی جگہ، یعنی ان کے عذاب کے وعدے کا ایک وقت ہے، دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ جب ان کی گرفت ہوگی تو اس سے بچنے کے لیے وہ کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔ تو اے کفار قریش! تمھیں بھی ڈرتے رہنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ آخر کار تمھارا بھی وہی حشر ہو جو ان بستیوں کا ہوا۔

**آیت 59** وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ ...... : مراد ہیں سبا، ثمود، مدین اور قوم لوط کی تباہ شدہ بستیاں، جن کی سرگزشت سے عرب کے تمام لوگ واقف تھے اور جن پر قریش کا اپنے سفروں میں آتے جاتے ہمیشہ گزر ہوتا تھا۔

**آیت 60** ① وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ ...... : یہاں سے تیسرا قصہ شروع ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خضر کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے گئے۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ ایک مستقل قصہ ہے، تاہم اس میں اس بات کی تائید بھی ہے جو پہلے دونوں قصوں میں

اَمۡضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

کے ملنے کے مقام پر پہنچ جاؤں، یا مدتوں چلتا رہوں ﴿۶۰﴾

گزری۔ اوپر ذکر فرمایا کہ کافر اپنے مال و جاہ پر مغرور رہتے اور مسلمانوں کو ذلیل سمجھ کر آپ ﷺ سے کہتے کہ اگر ان کو اپنے پاس نہ بٹھاؤ تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں۔ اس پر دو بھائیوں کا قصہ بیان فرمایا اور پھر دنیا کی مثال بیان فرمائی اور بتایا کہ ابلیس غرور کے سبب ہی ہلاک ہوا اور اب خضر اور موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ بیان فرمایا کہ دیکھو موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اولو العزم پیغمبر اتنے زیادہ علم و عمل کے باوجود خضر علیہ السلام سے علم حاصل کرنے کے لیے گئے اور ان کے سامنے تواضع اختیار کرتے ہوئے ان کی ہر شرط قبول کی۔ (رازی و موضح)

② "لِفَتٰىهُ" "فَتٰی" کا معنی نوجوان ہے، خادم کو بھی "فَتٰی" کہہ لیتے ہیں، کیونکہ بہتر خدمت نوجوان ہی کر سکتے ہیں۔ یہ یوشع بن نون تھے جو موسیٰ علیہ السلام سے بہت محبت رکھتے تھے، ان کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ رہتے تھے، موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے جانشین بنے اور انھی کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر خوش دلی سے خدمت کرے تو اس سے خدمت لی جا سکتی ہے۔

③ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَيۡنِ : "بَحۡر" کا لفظ عربی زبان میں نمکین پانی والے سمندر پر بھی بولا جاتا ہے اور میٹھے پانی والے دریا پر بھی۔ (قاموس) فارسی میں بھی دریا کا لفظ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ دو بحر ذکر نہیں فرمائے، کیونکہ مراد قصہ گوئی نہیں، نصیحت ہے اور وہ ان دو دریاؤں کی تعیین کے بغیر بھی پوری ہے۔ بعض مفسرین نے ان سے بحر فارس اور بحر روم مراد لیے ہیں، مگر یہ ملتے نہیں۔ بعض نے بحر ابیض اور بحر احمر مراد لیے ہیں۔ بعض نے افریقہ کے اور بعض نے اندلس کے دو دریا مراد لیے ہیں۔ بعض نے دجلہ و فرات مراد لیے ہیں، مگر مصر کو مدنظر رکھیں تو سوڈان کی طرف سے مصر میں آنے والے دریائے نیل میں ملنے والے کئی دریاؤں کے نیل کے ساتھ ملنے کی کوئی جگہ مراد ہو سکتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے وہاں گم ہونے کی علامت کے ساتھ متعین فرمایا۔ اب اندازے سے ان جگہوں میں سے دو دریاؤں کے جمع ہونے کی کوئی ایک جگہ متعین کرنا ممکن نہیں اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ "حُقُبًا" "حَقۡبَةٌ" کی جمع ہے، لمبی مدت کو "حَقۡبَةٌ" کہتے ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمائی ہے، قارئین اس پوری حدیث کو غور سے پڑھیں، آئندہ فوائد میں اس کا بار بار ذکر آئے گا۔

④ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں کھڑے خطبہ دے رہے تھے کہ ان سے پوچھا گیا: "لوگوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟" انھوں نے فرمایا: "میں ہوں۔" تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ناراضگی کا اظہار فرمایا، کیونکہ انھوں نے یہ بات اللہ کے سپرد نہیں کی (کہ اللہ بہتر جانتا ہے)۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میرا ایک بندہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ ہے، وہ تم سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: "اے میرے رب! پھر میری اس سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟" فرمایا: "اپنے ساتھ ایک مچھلی لے لو اور اسے کسی مکتل (کھجور کے

نرم چتوں کی بنی ہوئی ٹوکری) میں رکھ لو، تو جہاں مچھلی کو گم پاؤ، وہ وہیں ہوگا۔'' تو انھوں نے ایک مچھلی لی، اسے ایک ٹوکری میں رکھا اور چل پڑے اور اپنے ساتھ اپنے جوان یوشع بن نون کو بھی لے لیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک خاص قسم کی چٹان کے پاس پہنچے تو دونوں لیٹ گئے اور سو گئے۔ مچھلی تڑپی اور دریا میں جا گری اور اس نے دریا میں اپنا راستہ سرنگ کی صورت میں بنا لیا اور اللہ تعالیٰ نے مچھلی سے پانی کا بہاؤ روک دیا تو وہ اس پر طاق کی طرح ہو گیا۔ جب (موسیٰ علیہ السلام) جاگے تو ان کا ساتھی انھیں مچھلی کے متعلق بتانا بھول گیا، چنانچہ وہ دونوں دن کا باقی حصہ اور رات بھر چلتے رہے۔ اگلا دن ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان سے کہا: ''ہمارا دن کا کھانا لاؤ، ہمیں اپنے اس سفر میں بہت تھکاوٹ ہوئی ہے۔'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تک کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی جب تک وہ اپنی اس جگہ سے آگے نہیں گزرے جس کا انھیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا۔'' تو ان کے جوان نے ان سے کہا: ''کیا آپ نے دیکھا کہ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی بھول گیا اور مجھے اس کا ذکر کرنا شیطان ہی نے بھلایا ہے اور اس نے دریا میں اپنا عجیب راستہ بنا لیا۔'' سو مچھلی کے لیے سرنگ بنی اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے جوان کو تعجب ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''یہی تو ہم ڈھونڈ رہے تھے۔'' چنانچہ وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں کا پیچھا کرتے ہوئے واپس پلٹے، یہاں تک کہ اس چٹان تک آ پہنچے، تو اس وقت (وہاں) ایک آدمی کپڑا اوڑھ کر لیٹا ہوا تھا۔ اسے موسیٰ علیہ السلام نے سلام کہا تو خضر نے کہا: ''اور تیری (اس) سرزمین میں سلام کیسا؟'' کہا: ''میں موسیٰ ہوں۔'' اس نے کہا: ''بنی اسرائیل والے موسیٰ؟'' کہا: ''ہاں، میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کو جو کچھ سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ بھلائی مجھے سکھا دیں۔'' اس نے کہا: ''تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکے گا، اے موسیٰ! میں اللہ کے علم میں سے ایک ایسے علم پر ہوں جسے تم نہیں جانتے اور تم اللہ کے علم میں سے ایک ایسے علم پر ہو جسے میں نہیں جانتا۔'' تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''تم مجھے اگر اللہ نے چاہا تو صبر کرنے والا پاؤ گے اور میں تمھارے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔'' تو خضر نے اس سے کہا: ''پھر اگر تو میرے پیچھے چلا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں مت پوچھنا، یہاں تک کہ میں تیرے لیے اس کا کچھ ذکر شروع کروں۔'' چنانچہ وہ دونوں چل پڑے، دریا کے کنارے پر جا رہے تھے کہ ایک کشتی گزری، انھوں نے ان سے بات کی کہ وہ انھیں سوار کر لیں۔ ان لوگوں نے خضر کو پہچان لیا، اس لیے انھوں نے ان کو کسی اجرت کے بغیر سوار کر لیا۔ جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو اچانک ہی خضر نے کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ تیشے کے ساتھ اکھیڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا: ''ایسے لوگ جنھوں نے ہمیں اجرت کے بغیر سوار کر لیا، تم نے بڑھ کر ان کی کشتی کا تختہ اکھیڑ دیا، تاکہ اس میں سوار لوگوں کو غرق کر دو، بلاشبہ یقیناً تو ایک بڑے کام کو آیا ہے۔'' کہا: ''کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ یقیناً تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا؟'' کہا: ''مجھے اس پر نہ پکڑ جو میں بھول گیا اور مجھے میرے معاملے میں کسی مشکل میں نہ پھنسا۔'' (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے) کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ پہلی دفعہ موسیٰ علیہ السلام سے بھول ہوئی تھی۔'' فرمایا: ''اور ایک چڑیا آئی اور کشتی کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی، اس نے دریا میں ایک ٹھونگا مارا تو خضر نے اس سے کہا: ''میرا علم اور تیرا علم اللہ کے علم میں سے اتنا ہی ہے جتنا اس چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے۔'' پھر وہ دونوں کشتی سے نکلے، ابھی وہ کنارے پر چل ہی رہے تھے کہ خضر نے ایک لڑکا دیکھا جو لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

تو جب وہ دونوں ان کے آپس میں ملنے کے مقام پر پہنچے تو وہ دونوں اپنی مچھلی بھول گئے، تو اس نے اپنا راستہ دریا میں سرنگ کی صورت بنالیا ﴿۶۱﴾ پھر جب وہ آگے گزر گئے تو اس نے اپنے جوان سے کہا ہمارا دن کا کھانا لا، بے شک ہم نے اپنے اس سفر سے تو بڑی تھکاوٹ پائی ہے ﴿۶۲﴾

تھا، تو خضر نے اس کا سر پکڑا اور اسے اپنے ہاتھ سے اکھیڑ کر قتل کر دیا۔ موسیٰ نے اس سے کہا: ''کیا تو نے ایک بے گناہ جان کو کسی جان کے بدلے کے بغیر قتل کر دیا، بلاشبہ یقیناً تو ایک بہت برے کام کو آیا ہے۔'' کہا: ''کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اور یہ پہلی سے سخت (تنبیہ) تھی۔'' کہا: ''اگر میں تجھ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً تو میری طرف سے پورے عذر کو پہنچ چکا ہے۔'' پھر وہ دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس آئے، انھوں نے اس کے رہنے والوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے انکار کر دیا کہ ان کی مہمان نوازی کریں، پھر انھوں نے اس میں ایک دیوار پائی جو چاہتی تھی کہ گر جائے۔ فرمایا، ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ تو خضر اٹھے اور اسے اپنے ہاتھ سے سیدھا کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''ایسے لوگ جن کے پاس ہم آئے تو نہ انھوں نے ہمیں کھانا کھلایا اور نہ ہماری مہمان نوازی کی، اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔'' (خضر نے) کہا: ''یہ میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے۔'' اس کے بعد پورا واقعہ بیان فرمایا جو آیت (۷۸) سے آیت (۸۲) کے آخر تک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما پڑھا کرتے تھے: ''وَ اَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ كَافِرًا وَ كَانَ اَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ'' یعنی وہ لڑکا کافر تھا اور اس کے ماں باپ مومن تھے۔ [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ و إذ قال موسى لفتاه لا أبرح ...... ﴾ : ۴۷۲۵ ]

**آیت 61** ❶ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا : مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی، معلوم ہوا وہ مچھلی مردہ تھی، پھر اگر اسے نمک لگا کر خشک نہ کیا جائے تو وہ شدید بدبودار ہو جاتی ہے اور کیڑوں سے بھر جاتی ہے۔ معلوم ہوا اسے نمک لگا کر خشک کیا گیا تھا۔ اس مردہ مچھلی کا زندہ ہونا معجزہ تھا۔

❷ پانی کو موسیٰ علیہ السلام کے لیے پہاڑوں کی شکل دینا (شعراء: ۶۳) یا سرنگ کی، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور معجزۂ ربانی۔ جس طرح پانی کے ایک قطرے (نطفہ) سے احسن تقویم میں انسان کی صورت گری اس خلاق علیم کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

**آیت 62** ❶ اٰتِنَا غَدَآءَنَا : معلوم ہوا سفر کے لیے کھانا ساتھ لے جانا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور توکل کے منافی نہیں اور یہ کہ بھوک، پیاس، تھکاوٹ، بھول چوک، غرض انسان کو پیش آنے والی چیزیں انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آتی ہیں، کیونکہ وہ بھی انسان ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ آدمی کو جو عارضہ پیش آئے، اس کا ذکر کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے شکوے کا نہ ہو۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۫ وَ مَاۤ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖۗ عَجَبًا ۝۶۳ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖۗ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۝۶۴ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ

اس نے کہا کیا تو نے دیکھا جب ہم اس چٹان کے پاس جا کر ٹھہرے تھے تو بے شک میں مچھلی بھول گیا اور مجھے وہ نہیں بھلائی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے اپنا راستہ دریا میں عجیب طرح سے بنا لیا۝۶۳ اس نے کہا یہی ہے جو ہم تلاش کر رہے تھے، سو وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے۝۶۴ تو ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنے ہاں سے ایک رحمت عطا کی اور اسے

② لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا: شاید اس تھکاوٹ کی وجہ اس نعمت کا احساس دلانا ہو کہ صحیح راستے پر طلب علم کے لیے جاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خاص مدد شامل ہوتی ہے، جس سے تھکن نہیں ہوتی اور جب اس کی مدد نہ ہو تو انسان تھک کر رہ جاتا ہے۔

آیت 64 فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا: یہ واقعہ انبیاء و اولیاء، خصوصاً موسیٰ، یوشع بن نون اور خضر ﷩ کے غیب نہ جاننے کی کئی طرح سے دلیل ہے: ① موسیٰ ﷤ کا کہنا کہ مجھ سے زیادہ کوئی عالم نہیں، حالانکہ ان سے زیادہ علم والے موجود تھے۔ ② اللہ تعالیٰ کا ناراض ہونا۔ ③ موسیٰ ﷤ کا اللہ تعالیٰ سے خضر کا پتا پوچھنا۔ ④ مجمع البحرین اور مچھلی کی نشانی کی ضرورت عالم الغیب کو نہیں ہوتی۔ ⑤ مچھلی کے نکل جانے کا علم نہ ہونا۔ ⑥ اگلا سفر، تھکاوٹ کے احساس کی وجہ معلوم نہ ہونا۔ ⑦ قدموں کے نشانوں کو دیکھتے ہوئے واپسی کی اسے کیا ضرورت ہے جس کی نگاہ سے کچھ اوجھل نہ ہو۔ مزید اگلی آیات میں ملاحظہ فرمائیے۔

آیت 65 ① عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ: اس سے مراد خضر ﷤ ہیں (خاء کے فتحہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ، یا خاء کے کسرہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ)۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا سُمِّيَ الْخَضِرُ لِأَنَّهُ جَلَسَ عَلٰى فَرْوَةٍ بَيْضَاءَ فَإِذَا هِيَ تَهْتَزُّ مِنْ خَلْفِهِ خَضْرَاءَ» [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب حديث الخضر...... : ۳۴۰۲ ] ''ان کا نام خضر اس لیے پڑا کہ وہ سفید زمین کے ایک قطعے پر بیٹھے تو وہ ان کے پیچھے سرسبز ہو کر لہلہانے لگا۔'' یہ اللہ کے نبی تھے، اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے آخر میں فرمایا کہ میں نے یہ اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ (کہف: ۸۲) بلکہ یہ سب اللہ کے حکم سے تھا جو وحی کی صورت میں انبیاء کو صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کا اوپر مفصل حدیث میں یہ کہنا کہ میرے پاس ایک علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سکھایا ہے، تم اسے نہیں جانتے...... ولی کتنا بھی مقرب ہو اس کا الہام حجت نہیں، نہ وہ الہام سے کسی کو قتل کر سکتا ہے، ورنہ ہر مومن اللہ کا ولی ہے۔ (بقرہ: ۲۵۷) وہ اللہ کے امر کا بہانہ بنا کر جسے چاہے گا قتل کر دے گا، جب کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

محقق علماء جن میں امام بخاری، ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر ﷭ جیسے عظیم ائمہ شامل ہیں، فرماتے ہیں کہ خضر ﷤ فوت ہو چکے ہیں، کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو سورۂ آل عمران کی آیت (۸۱) کے مطابق ان پر لازم تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر آپ پر ایمان لاتے اور آپ کے ساتھ مل کر جہاد کرتے، جب کہ ان کے آنے کا کہیں ذکر نہیں، نہ کسی صحابی سے ان کے

لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا۔﴿۶۵﴾

ملنے کا کوئی ذکر ہے۔ صحیح بخاری کی وہ حدیث بھی اس کی دلیل ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا: (( أَرَأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهِ، فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ )) [ بخاري، العلم، باب السمر في العلم : ١١٦، عن ابن عمر رضي الله عنهما ] ''آج رات سے ایک سو سال پورے ہونے تک زمین کی پشت پر جو بھی ہے کوئی باقی نہیں رہے گا۔'' جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ دریاؤں اور سمندروں میں رہتے ہیں، ان کا رد جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہوتا ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے ایک ماہ قبل فرمایا: (( مَا مِنْ نَفْسٍ مَنْفُوسَةٍ الْيَوْمَ، تَأْتِي عَلَيْهَا مِائَةُ سَنَةٍ، وَ هِيَ حَيَّةٌ يَوْمَئِذٍ )) [ مسلم، فضائل الصحابة، باب بيان معنى قوله ﷺ : على رأس مائة...... : ٢٥٣٨ ] ''کوئی بھی جان جو آج پیدا ہو چکی ہے اس پر سو سال نہیں آئیں گے کہ وہ اس وقت زندہ ہو۔'' جو لوگ خضر علیہ السلام کے زندہ ہونے کے قائل ہیں ان کے پاس کوئی صحیح دلیل نہیں ہے، ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ تمام روایات جن میں خضر علیہ السلام کے اب تک زندہ ہونے کا ذکر ہے سب جھوٹی ہیں۔ سب سے بڑی دلیل جو وہ حضرات بیان کرتے ہیں، یہ ہے کہ بہت سے صالحین سے ان کی ملاقات ہوئی ہے، حالانکہ اسے دلیل کہنا دلیل کی توہین ہے، کیونکہ جنھوں نے انھیں دیکھا ہے انھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خضر ہیں؟ کیا انھوں نے پہلے خضر علیہ السلام کو دیکھا ہے کہ ملاقات پر وہ انھیں پہچان گئے؟ رہا کسی ملنے والے کے کہنے سے کہ ''میں خضر ہوں'' اسے خضر مان لینا سادہ لوحی کی انتہا ہے، جس سے فائدہ اٹھا کر شیطان نے بے شمار لوگوں کو گمراہ کیا ہے، مگر وہ سب وہی ہیں جو صحابہ کے بعد آئے، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم آسانی سے شیطان کے فریب میں آنے والے نہیں تھے۔ صحیح بخاری اور ترمذی میں جس عین الحیاۃ (آب حیات) کا ذکر ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں اور آپ کے سوا کسی دوسرے کے قول سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔

❷ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ...... : قرآن مجید میں ''رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ'' سے مراد نبوت کئی جگہ لی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ [ الزخرف: ٣١، ٣٢ ] ''اور انھوں نے کہا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟ کیا وہ تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) تقسیم کرتے ہیں؟'' مزید دیکھیے سورۂ دخان (۵، ۶) اور قصص (۸۶) اور ''اللہ کی طرف سے علم'' بول کر وحی اور نبوت مراد لی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۳) اگرچہ یہ الفاظ نبوت کے ساتھ خاص نہیں، مگر ان کے ساتھ ''وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ'' واضح دلیل ہے کہ یہاں ان الفاظ سے مراد نبوت اور وحی الٰہی ہی ہے اور بلاشک وشبہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ (شنقیطی)

علم لدنی سے صرف اولیاء کا علم مراد لینا اور انھیں نبیوں سے بھی اونچا درجہ دینا صاف الحاد اور بے دینی ہے، جس کے ذریعے سے زندیق لوگ شریعت کا طوق گردن سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ اللہ کے احکام جو شیطان کے ہر قسم کے دخل سے محفوظ ہوں، صرف انبیاء کے ذریعے سے نازل ہوتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ جن (۲۶ تا ۲۸) اور سورۂ حج (۵۲) جو شخص کسی اور کو یہ درجہ دے وہ کافر ہے، اسے توبہ کروائی جائے، اگر نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ (قرطبی ملخص)

❸ خضر علیہ السلام کے عالم الغیب نہ ہونے کی دلیل ان کا موسیٰ علیہ السلام سے یہ پوچھنا ہے کہ اس سرزمین میں سلام کیسا؟ پھر موسیٰ علیہ السلام

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَ لَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾

موسیٰ نے اس سے کہا کیا میں تیرے پیچھے چلوں؟ اس (شرط) پر کہ تجھے جو کچھ سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ بھلائی مجھے سکھا دے ﴿۶۶﴾ اس نے کہا بے شک تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا ﴿۶۷﴾ اور تو اس پر کیسے صبر کرے گا جسے تو نے پوری طرح علم میں نہیں لیا ﴿۶۸﴾ اس نے کہا اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے ضرور صبر کرنے والا پائے گا اور میں تیرے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا ﴿۶۹﴾ کہا پھر اگر تو میرے پیچھے چلا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں مت پوچھنا، یہاں تک کہ میں تیرے لیے اس کا کچھ ذکر شروع کروں ﴿۷۰﴾ سو دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اسے پھاڑ دیا۔ کہا کیا تو نے اسے اس لیے پھاڑ دیا ہے کہ اس کے سواروں کو غرق کر دے، بلاشبہ یقیناً تو ایک بہت بڑے کام کو آیا ہے ﴿۷۱﴾ کہا کیا میں نے نہ کہا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا ﴿۷۲﴾ کہا مجھے اس پر نہ پکڑ جو میں بھول گیا اور مجھے میرے معاملے میں کسی مشکل میں نہ پھنسا ﴿۷۳﴾

کے اپنا نام بتانے پر ان کا یہ پوچھنا کہ بنی اسرائیل والے موسیٰ؟ پھر ان کا موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہنا کہ آپ کے پاس جو علم ہے وہ میں نہیں جانتا...... پھر اپنے اور موسیٰ علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم سے چڑیا کی چونچ کے پانی کو دریا سے نسبت کی طرح قرار دینا ہے۔ کس قدر بدنصیب ہیں وہ لوگ جو خضر علیہ السلام کو نبی کے بجائے ولی قرار دیتے ہیں، پھر ان کے چند واقعات کو سامنے رکھ کر اولیاء کو علم لدنی کا ضمیمہ لگا کر عالم الغیب بنا دیتے ہیں۔

**آیت 66 تا 70** ان آیات اور گزشتہ آیات میں اپنے علم پر عجب سے پرہیز، طلب علم کے لیے سفر، آخری دم تک حصول علم کا عزم مصمم، استاذ کے سامنے طلب علم کے لیے درخواست کا طریقہ، استاذ کا ادب، اس کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرنا، اپنے کسی بھی کام یا عہد میں اپنے آپ پر بھروسے کے بجائے ان شاء اللہ کہہ کر اسے اللہ کے سپرد کرنا سکھایا گیا ہے اور یہ کہ استاذ تعلیم کے لیے شاگرد پر بعض شرطیں عائد کر سکتا ہے۔

**آیت 71 تا 73** ان آیات سے اولوالعزم پیغمبروں سے بھول کا صادر ہونا ثابت ہوتا ہے اور کامل استاذ کا شاگرد کی غلطی پر

فَانْطَلَقَا ٙ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

پھر وہ دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب وہ ایک لڑکے سے ملے تو اس نے اسے قتل کر دیا۔ کہا کیا تو نے ایک بے گناہ جان کو کسی جان کے بدلے کے بغیر قتل کر دیا، بلاشبہ یقیناً تو ایک بہت برے کام کو آیا ہے ﴿۷۴﴾

مؤاخذہ، پہلی غلطی پر مؤاخذہ میں نسبتاً نرمی کرنے (''اَلَمْ اَقُلْ'' ''اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ'' سے نرم ہے) اور بھول کے عذر پر درگزر کرنے کا سبق حاصل ہوتا ہے۔

**آیت 74** ❶ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ : اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکا جوان تھا، اگرچہ وہ اپنے جیسے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کیونکہ گزشتہ حدیث میں ہے کہ وہ کافر تھا جب کہ اس کے والدین مومن تھے، اگر وہ بچہ ہوتا تو اسے کافر نہ کہا جاتا، کیونکہ مومنوں کی اولاد کو بچپن میں کافر نہیں کہا جاتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسے کسی کو قتل نہ کرنے کی وجہ سے بے گناہ کہا ہے، بچہ ہونے کی وجہ سے نہیں۔ اس لیے خضر علیہ السلام کا اللہ کے حکم سے ایک کافر کو قتل کرنا کوئی جائے اعتراض نہیں۔ ''غلام'' کا لفظ بچے کے علاوہ جوان اور ادھیڑ عمر پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث معراج میں موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے نبی ﷺ کو ''هٰذَا الْغُلَامُ'' کہا ہے۔ [ بخاری : ۳۲۰۷ ]

❷ بعض حضرات نے اس سوال کے جواب میں کہ خضر علیہ السلام کے لیے اس لڑکے کا قتل کیونکر جائز تھا، خضر علیہ السلام کو فرشتوں میں سے قرار دیا ہے جو اللہ کے حکم سے تکوینی امور سرانجام دیتے ہیں، مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ کارکنانِ قضا و قدر نہ کھاتے ہیں، نہ مہمان نوازی کے طور پر کھانے کا سوال کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا بھنا ہوا بچھڑا پیش کرنے کا واقعہ اس کی دلیل ہے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿٧٦﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿٧٧﴾

کہا کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا ﴿٧٥﴾ کہا اگر میں تجھ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً تو میری طرف سے پورے عذر کو پہنچ چکا ہے ﴿٧٦﴾ پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس آئے، انھوں نے اس کے رہنے والوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے انکار کر دیا کہ ان کی مہمان نوازی کریں، پھر انھوں نے اس میں ایک دیوار پائی جو چاہتی تھی کہ گر جائے تو اس نے اسے سیدھا کر دیا۔ کہا اگر تو چاہتا تو ضرور اس پر کچھ اجرت لے لیتا ﴿٧٧﴾

**آیت 75، 76** قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ : ''کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا'' ان الفاظ میں تنبیہ پہلے سے سخت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ درگزر دو دفعہ ہوتی ہے، تیسری دفعہ کوئی معاف نہ کرے تو وہ حق بجانب اور معذور ہے اور یہ کہ استاذ اگر سمجھے کہ میں طالب علم کو نہیں پڑھا سکتا تو وہ عذر کر سکتا ہے۔

**آیت 77** اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا : بعض صوفیوں نے اس آیت سے گدائی کے مستحب ہونے کا استدلال کیا ہے اور اسے باقاعدہ سالک کے آداب میں شمار کیا ہے، اس لیے عموماً صوفی لوگ روزی کمانے کے بجائے گدائی کو اور دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے کو کمال ولایت و توکل سمجھتے ہیں اور اس کام میں مہارت رکھتے ہیں، حالانکہ یہ ان کی جہالت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا زَالَ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ » [ بخاري، الزكوة، باب من سأل تكثرا : ١٤٧٤۔ مسلم : ١٠٤ / ١٠٤٠ ] ''آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے منہ پر گوشت کی بوٹی نہیں ہوگی۔'' ان دونوں انبیاء نے اپنے حق کا سوال کیا ہے جو بطور ضیافت بستی والوں پر فرض تھا۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم نے نبی ﷺ سے عرض کیا: « إِنَّكَ تَبْعَثُنَا فَنَنْزِلُ بِقَوْمٍ لَا يَقْرُوْنَنَا، فَمَا تَرٰى فِيْهِ؟ فَقَالَ لَنَا إِنْ نَزَلْتُمْ بِقَوْمٍ فَأُمِرَ لَكُمْ بِمَا يَنْبَغِيْ لِلضَّيْفِ فَاقْبَلُوْا، فَإِنْ لَّمْ يَفْعَلُوْا فَخُذُوْا مِنْهُمْ حَقَّ الضَّيْفِ » [ بخاري، المظالم، باب قصاص المظلوم إذا وجد مال ظالمه : ٢٤٦١۔ مسلم : ١٧٢٧ ] ''آپ ہمیں بھیجتے ہیں اور ہم کسی قوم کے پاس جاتے ہیں اور وہ ہماری ضیافت نہیں کرتے، تو آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے ہمیں فرمایا: ''اگر تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور تمھارے لیے ان چیزوں کا حکم دیا جائے جو مہمان کے لیے چاہییں تو قبول کر لو، اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے مہمان کا حق لے لو۔''

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ

کہا یہ میرے درمیان اور تیرے درمیان جدائی ہے، عنقریب میں تجھے اس کی اصل حقیقت بتاؤں گا جس پر تو صبر نہیں کر سکا ﴿۷۸﴾ رہی کشتی تو وہ چند مسکینوں کی تھی، جو دریا میں کام کرتے تھے، تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی چھین کر لے لیتا تھا ﴿۷۹﴾ اور رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے تو ہم ڈرے کہ وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں پھنسا دے گا ﴿۸۰﴾ تو ہم نے چاہا کہ ان دونوں کو ان کا رب اس کے بدلے ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر اور شفقت میں زیادہ قریب ہو ﴿۸۱﴾ اور رہ گئی دیوار تو وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کے لیے ایک خزانہ تھا اور ان کا باپ نیک تھا تو تیرے رب

**آیت 78** هٰذَا فِرَاقُ : اس پر اصل میں تنوین تھی، پھر تخفیف کے لیے مضاف کر دیا۔

**آیت 79** فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ ...... : اس آیت میں کشتی کا مالک ہونے اور اسے کرایہ پر چلانے کے باوجود ان لوگوں کو مسکین کہا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ مسکین وہ ہے جس کی آمدنی اس کی ضروریات سے کم ہو، یعنی وہ ضرورت مند لوگ جو نہ مانگتے ہیں اور نہ کسی کو ان کی حالت کی خبر ہوتی ہے کہ ان پر صدقہ کریں۔ [ دیکھیے بخاري، الزکوٰۃ، باب قول اللہ عز و جل : ﴿ لا یسئلون الناس إلحافا ...... ﴾ : ۱۴۷۹۔ مسلم : ۱۰۳۹، عن أبي ہریرۃ رضی اللہ عنہ ] فقیر کی حالت مسکین سے بدتر ہوتی ہے۔ ”وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ “ کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”ان کے آگے“ کیا ہے۔ [ بخاري، التفسیر، باب قوله : ﴿ فلما بلغا مجمع بينهما نسيا ...... ﴾ : ۴۷۲۶ ]

**آیت 81،80** وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ ...... : ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے مومن بندوں کی آنے والے فتنوں سے بھی حفاظت کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [ الحج : ۳۸ ] ”بے شک اللہ ان لوگوں کی طرف سے دفاع کرتا ہے جو ایمان لائے۔“

**آیت 82** ❶ وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا : اللہ تعالیٰ اپنے صالح بندوں کی وفات کے بعد بھی ان کی مومن اولاد کی خاص نگہداشت فرماتا ہے اور قیامت کو بھی انھیں خاص رعایت دے گا۔ دیکھیے سورۂ طور (۲۱)۔

اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ؕ۝۸۲ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ ع

نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، تیرے رب کی طرف سے رحمت کے لیے اور میں نے یہ اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ یہ ہے اصل حقیقت ان باتوں کی جن پر تو صبر نہیں کر سکا (۸۲) اور وہ تجھ سے

② ان تینوں واقعات کی اصل حقیقت بیان کرتے ہوئے خضر علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حُسنِ ادب کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ کشتی کو عیب دار کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے، لڑکے کے قتل کے ارادہ کی نسبت اپنی طرف اور اس کے صالح باپ کو بہتر اولاد عطا کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے اور یتیم لڑکوں کے بالغ ہو کر اپنا خزانہ سنبھالنے کے ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے۔

③ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ : یہ خضر علیہ السلام کے نبی ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ کسی ولی کو اللہ کی طرف سے الہام کی بنا پر کسی بد سے بد کو بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ اس کے الہام میں شیطان دخیل ہو سکتا ہے۔ "لَمْ تَسْطِعْ" اصل میں "لَمْ تَسْتَطِعْ" تھا، تخفیف کے لیے تاء کو حذف کر دیا۔ خضر علیہ السلام کے کلام کی ابتدا میں "لَمْ تَسْتَطِعْ" ہے، کیونکہ وہاں بات شروع ہو رہی ہے، اختصار کی ضرورت نہیں، بات ختم ہونے پر قصہ مختصر کیا جاتا ہے، اس لیے یہاں "لَمْ تَسْطِعْ" فرمایا۔ ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی بوجھ تھا تو ثقیل لفظ بولا اور وضاحت کے بعد بوجھ اتر جانے پر خفیف لفظ بولا ہے۔

آیت 83 ① وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ : واؤ کے ساتھ ذوالقرنین کے قصے کا موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر عطف ہے۔ بقاعی رحمہ اللہ نے فرمایا، موسیٰ علیہ السلام کے خضر علیہ السلام کے ساتھ قصہ میں علم کے حصول کے لیے سفروں کا ذکر تھا اور ذوالقرنین کے قصہ میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سفروں کا ذکر ہے۔ چونکہ علم عمل کی بنیاد ہے، اس لیے اس کا ذکر پہلے فرمایا۔ ایک مناسبت یہ ہے کہ دو باغوں والے شخص اور ابلیس کے تکبر اور ان کے انجام کے بعد موسیٰ علیہ السلام جیسے اولو العزم پیغمبر کا اتنے مرتبے کے باوجود اور ذوالقرنین جیسے عظیم بادشاہ کا مشرق و مغرب کی سلطنت کے باوجود ہر قسم کے کبر و غرور سے پاک ہونے کا اور حد درجہ کی تواضع اختیار کرنے کا ذکر فرمایا، تاکہ ان کے نقش قدم پر چلا جائے۔

② ذوالقرنین کون تھا، کس ملک کا تھا، قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہیں۔ البتہ اتنا واضح ہے کہ عرب کے لوگ اس سے واقف تھے۔ ان کے شعروں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، اس لیے انھوں نے اس کے متعلق سوال کیا، مگر ان سے گزشتہ فاتح فرماں رواؤں میں سے کسی ایک کی تعیین نہیں ہوتی، اس لیے مفسرین میں اس کے متعلق بہت ہی اختلاف ہے۔ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب "اَلْآثَارُ الْبَاقِيَةُ عَنِ الْقُرُوْنِ الْخَالِيَةِ" میں ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین (یمن کا) ابوکرب حمیری ہے، جس کی اولاد ہونے پر، مشرق و مغرب کا بادشاہ ہونے پر اور مسلم ہونے پر تُبّع یمنی نے اپنے اشعار میں فخر کا

عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْکُمْ مِّنْهُ ذِکْرًا ﴿۸۳﴾

ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ میں تمھیں اس کا کچھ ذکر ضرور پڑھ کر سناؤں گا ﴿۸۳﴾

اظہار کیا ہے، جو روح المعانی میں منقول ہیں۔ البیرونی نے اس قول کے حقیقت کے سب سے زیادہ قریب ہونے کا ایک قرینہ یہ لکھا ہے کہ یمن کے بادشاہوں کے لقب لفظ "ذو" سے شروع ہوتے تھے، جیسے ذونواس اور ذویزن وغیرہ۔ بعض نے یونانی فاتح سکندر مقدونی کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے، جیسے علامہ قاسمی رحمہ اللہ وغیرہ، جب کہ بہت سے مفسرین مثلاً ابن قیم، طنطاوی اور آلوسی وغیرہ نے شدت سے اس کی تردید کی ہے، کیونکہ یہ سکندر ارسطو کا شاگرد اور بت پرست تھا، جب کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین مومن، موحد اور متقی تھا۔ برصغیر کے ایک مفسر نے ذوالقرنین کے متعلق قرآن میں مذکور صفات ایرانی بادشاہ خورس پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے بعد آنے والے ایک صاحب نے تاریخ اور بائبل سے خورس ہی کو سب سے زیادہ ذوالقرنین کا مصداق ٹھہرانے کا حق دار قرار دیا ہے۔ اشرف الحواشی میں ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد ایک اور بادشاہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا اور ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہی سے اللہ تعالیٰ نے اسے خارق عادت اسباب و وسائل عطا فرمائے۔ اس کے وزیر خضر تھے، اس لیے خضر کے قصے کے ساتھ اس کا قصہ بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کو ترجیح دی ہے۔ ابن کثیر نے اس کا نام بھی اسکندر بیان کیا ہے۔

یہ ہیں بڑے بڑے اہل علم یا متجددین کے اقوال جن کا ماخذ جاہلی اشعار ہیں، جن کی کوئی سند نہیں، یا زمانۂ قبل مسیح کی تاریخ، جس کے مؤرخین کا حال قابل اعتماد ذرائع سے معلوم ہے نہ ان کی ثقاہت، یا آثار قدیمہ ہیں جن کی معدوم زبانیں یورپی کفار نے اندازے سے پڑھیں، جو کسی طرح بھی اعتماد کے قابل نہیں، یا بائبل جس میں مذکور باتوں کو (جو نہ قرآن و حدیث کے مطابق ہوں نہ مخالف) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق نہ سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔ پھر ایسی باتوں پر یقین کیسے ہو سکتا ہے!؟ لطف یہ ہے کہ جو بھی نیا مفسر نئی سے نئی بات نکال کر قدیم تاریخ، آثار قدیمہ، جاہلی اشعار، بائبل کے اقوال کا ڈھیر لگا دیتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا صاحب کمال گنا جاتا ہے، حالانکہ ان میں سے کسی سے بھی یقین کی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کسی قصے کو تاریخ کے طور پر بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کے ان حصوں کو اجاگر کرتا ہے جن سے عبرت اور سبق حاصل ہو۔ قرآن کے مطابق ذوالقرنین اللہ کا نیک بندہ تھا جس نے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے مشرق سے مغرب تک اللہ کے دین کو غالب کیا اور اپنے محروسہ (ماتحت) ممالک میں امن قائم کیا اور انھیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی نہایت عمدہ تدبیر کی۔ اگر ہم کسی قابل یقین ذریعے سے اس کی تعیین نہ کر سکیں یا اس کے مفصل حالات معلوم نہ کر سکیں تو قرآن کے منشا و مقصد میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ آخر کتنے ہی نبی ہیں جن کے نام قرآن و حدیث میں نہیں۔ دیکھیے سورۂ مومن (۷۸) تو کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر امت میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا گزرا ہے، ہم ان ناقابل اعتماد ذرائع سے ہند، چین، روس، یورپ اور افریقہ میں آنے والے نبیوں کے نام متعین کرنے کی بے کار کوششوں میں وقت ضائع کریں گے، تا کہ لوگ کہیں واہ! کیا بات نکالی ہے۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ۬ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾

بے شک ہم نے اسے زمین میں اقتدار دیا اور اسے ہر چیز میں سے کچھ سامان عطا کیا ﴿۸۴﴾ تو وہ کچھ سامان ساتھ لے کر چلا ﴿۸۵﴾ یہاں تک کہ جب وہ سورج غروب ہونے کے مقام پر پہنچا تو اسے پایا کہ وہ دلدل والے چشمے میں غروب ہو رہا ہے اور اس کے پاس ایک قوم کو پایا۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! یا تو یہ ہے کہ تو (انھیں) سزا دے اور یا یہ کہ تو ان کے بارے میں کوئی نیک سلوک اختیار کرے ﴿۸۶﴾

③ ذوالقرنین کے اس لقب کی مختلف وجہیں بیان کی گئی ہیں، کیونکہ قرن کے کئی معانی ہیں، سینگ، کنارا، بالوں کی مینڈھی۔ دو سینگوں والا سے مراد مرد شجاع ہے، کیونکہ عرب شجاع آدمی کو کبش کہتے ہیں، کیونکہ مینڈھا اپنے سینگوں سے ٹکر مارتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے تاج پر دو سینگ بنے ہوئے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ زمین کے مشرق و مغرب کے دونوں کناروں تک پہنچا۔ چوتھی یہ کہ اس کے سر کے بالوں کی دو مینڈھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ چاروں باتیں بیک وقت بھی وجہ تسمیہ ہو سکتی ہیں۔

④ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا : "ذِكْرًا" تنوین کی وجہ سے ترجمہ "کچھ ذکر" کیا گیا ہے، یعنی اس کی پوری تاریخ نہیں بلکہ کچھ ذکر بیان کروں گا، جس سے تم نصیحت اور سبق حاصل کر سکو۔

**آیت 84** اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ ...... : "مَكَّنَّا" سے مراد حکومت و اقتدار ہے۔ دیکھیے سورۂ حج (۴۱) ہر چیز میں سے کچھ سامان سے مراد وہ تمام وسائل ہیں جن کی اقتدار کے لیے ضرورت ہوتی ہے، مثلاً شجاعت، قوت، تدبیر و رائے، فوج، دولت، اسلحہ، سامان سفر، تعمیر و ترقی کے ذرائع وغیرہ۔ ان اسباب کی تفصیل میں بعض مفسرین کی اسرائیلی روایات پر مبنی عجیب و غریب روایات کی کچھ حیثیت نہیں اور نہ کسی صحیح حدیث میں ان کا پتا ملتا ہے۔

**آیت 86،85** ① فَاَتْبَعَ سَبَبًا : "تَبِعَ" ساتھ گیا، "اَتْبَعَ" (افعال) ساتھ لے گیا، یعنی اس نے اپنے اقتدار کو مضبوط اور وسیع کرنے کے لیے اور پوری زمین پر اللہ کا کلمہ غالب کرنے کے لیے ایک لمبے سفر کی تیاری کی اور اس کے لیے درکار افواج، اسلحہ اور سامان سفر ساتھ لے کر مغرب کی طرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکل پڑا۔ راستے میں ہر مقابل کو زیر کرتا ہوا اور ہر رکاوٹ کو روندتا ہوا زمین کے اس حصے تک جا پہنچا جہاں تک اس وقت آبادی موجود تھی اور سفر ممکن تھا، اس سے آگے سمندر سے پہلے وسیع و عریض دلدلی علاقہ تھا، جس میں نہ خشکی کے ذرائع سے سفر ہو سکتا تھا، نہ بحری ذرائع سے۔ وہاں اس نے سورج غروب ہونے کا مشاہدہ کیا تو وہ اسے ایک کیچڑ والے چشمے میں غروب ہوتا ہوا نظر آیا، کیونکہ آگے سمندر کے اثر سے اور چشموں کی کثرت سے زمین دلدل اور کیچڑ بنی ہوئی تھی۔ جس طرح سمندر، صحرا یا میدان میں سے جو چیز بھی سامنے ہو سورج اسی میں غروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض لوگوں نے جو اعتراض کیا ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق سورج کیچڑ والے چشمے

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾

اس نے کہا جو شخص تو ظلم کرے گا سو ہم اسے جلدی سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے عذاب دے گا، بہت برا عذاب ﴿۸۷﴾ اور رہا وہ جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا تو اس کے لیے بدلے میں بھلائی ہے اور عنقریب ہم اسے اپنے کام میں سے سراسر آسانی کا حکم دیں گے ﴿۸۸﴾

میں غروب ہوتا ہے، انھوں نے غور ہی نہیں کیا کہ قرآن نے ذوالقرنین کا مشاہدہ بیان فرمایا ہے اور اب بھی دیکھنے والے کو ایسے ہی نظر آئے گا۔ اصل حقیقت دوسری جگہ بیان فرمائی ہے، فرمایا: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ [ یٰس : ۳۸ ] ''اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے۔ (جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے)۔''

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ...... : یعنی مغرب کی طرف آبادی کے آخری حصے میں اس نے ایک قوم کو پایا تو ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین! تمھیں اختیار ہے، چاہو تو انھیں قتل، قید یا غلامی کی صورت میں یا جس طرح چاہو سزا دو، یا ان کے بارے میں کوئی نیک سلوک اختیار کرو۔

③ اللہ تعالیٰ کے فرمان ''قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ'' (ہم نے کہا اے ذوالقرنین!) کو بعض مفسرین نے ذوالقرنین کے نبی ہونے کی دلیل قرار دیا ہے، مگر یہ الفاظ اس مفہوم کے لیے صریح نہیں ہیں، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ طالوت کی طرح کوئی نبی ہو، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اسے یہ پیغام دیا ہو، جیسے فرمایا: ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ [ البقرۃ : ۷۳ ] ''تو ہم نے کہا اس پر اس کا کوئی ٹکڑا مارو۔'' یا اس قوم کو مکمل طور پر ذوالقرنین کے اختیار میں دینے کی حالت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہو، اس لیے اکثر سلف اس کے نبی ہونے کے قائل نہیں۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اللہ کا نیک، مخلص اور مجاہد بندہ تھا، جس نے اپنے آرام کو چھوڑ کر ساری زندگی غلبۂ اسلام کے لیے جہاد میں صرف کر دی۔

**آیت 87، 88** قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ ...... : ذوالقرنین نے اپنی فتح و قوت کے نشے میں آ کر سب کو تہ تیغ کرنے یا غلام بنانے کے بجائے ہر ایک سے وہ سلوک کرنے کا اظہار کیا جس کے وہ لائق تھا۔ ''اَمَّا مَنْ ظَلَمَ'' (جو شخص ظلم کرے گا) سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۸۲) اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں ایمان اور عمل صالح والوں کا ذکر ہے، یعنی کفار و مشرکین میں سے ہر ایک سے اس کے حسب حال سخت سزا کا سلوک کروں گا، جنگ پر آمادہ لوگوں کو قتل اور قید کروں گا اور غلام بناؤں گا۔ دوسروں سے جزیہ لے کر غلام بنا کر رکھوں گا، پھر قیامت کے دن وہ اپنے کفر و شرک کی بہت بری سزا پائیں گے۔ رہے ایمان اور عمل صالح والے تو ان کے لیے بدلے میں بھلائی ہی بھلائی ہے اور ہم ان کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں آسانی کا سلوک کریں گے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی اپنی جنگوں میں اسی پر عمل فرمایا۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

پھر وہ کچھ اور سامان ساتھ لے کر چلا ﴿۸۹﴾ یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کے مقام پر پہنچا تو اسے ایسے لوگوں پر طلوع ہوتے ہوئے پایا جن کے لیے ہم نے اس کے آگے کوئی پردہ نہیں بنایا تھا ﴿۹۰﴾ ایسے ہی تھا اور یقیناً ہم نے جو کچھ اس کے پاس تھا اس کا علم کی رو سے احاطہ کر رکھا تھا ﴿۹۱﴾

**آیت 90،89** ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ...... : مغرب کی طرف انسانی آبادی کے آخری حصے تک تمام علاقے فتح کر کے اسلام کے زیر نگیں لانے کے بعد اب اس نے مشرق کی طرف آبادی کے آخری حصے تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے ایک نہایت طویل اور دشوار سفر کے لیے ہر قسم کا ساز و سامان مہیا کیا اور اپنی زبردست افواج اور جنگی ساز و سامان ساتھ لے کر بے شمار دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں اور صحراؤں کو عبور کرتا ہوا اور تمام بادشاہوں کو شکست دیتا ہوا مشرق کی طرف آبادی کی ابتدا تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع ہوتا ہے جن کے پاس سورج کی تپش سے بچنے کے لیے کوئی پردہ تھا نہ مکان، نہ کوئی عمارت، نہ خیمہ، نہ لباس۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے ذکر نہیں فرمایا، مگر اہلِ مغرب کے ساتھ اس کے سلوک سے ظاہر ہے کہ اس نے انھیں بھی اسلام کی دعوت دی اور ہر ایک کے ساتھ اس کے رویے کے مطابق سلوک کیا ہے اور انھیں وحشی زندگی کے بجائے تہذیب و تمدن کی تعلیم دی۔

**آیت 91** ① كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا ...... : یعنی اہل مشرق سے اس کا سلوک بھی اہلِ مغرب جیسا تھا، یا مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کے مغرب و مشرق اور اس کے درمیان تمام علاقوں کے پامال کرنے کو ناممکن نہ سمجھے، یقیناً ایسے ہی ہوا اور اس مقصد کے لیے اس نے جو افواج اور ساز و سامان مہیا کیا اور اپنا عیش و آرام ترک کر کے مسلسل سفر اور جنگوں کی جو تکالیف برداشت کیں اس کی پوری خبر ہم ہی کو ہے، کسی دوسرے کو کیا خبر؟

② ذوالقرنین کی زندگی سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں ان میں سے پہلا سبق یہ ہے کہ اقتدار حاصل ہوتے ہی بلند ہمت مسلم حکمران نوعمری ہی میں تمام دنیا کو فتح کرنے کا عزم کر لیتے ہیں، کیونکہ ذوالقرنین کے اتنی بے پناہ افواج کو لے کر اتنے طویل اور دشوار گزار سفر اور پیش آنے والے معرکوں کے لیے طویل عرصے کی بھی ضرورت تھی۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اگرچہ شاہی محلات، طاؤس و رباب، قالین و کمخواب، حسیناؤں اور حاشیہ نشینوں کے جھرمٹ میں زندگی گزارنے میں بھی لذت اور لطف ہے، مگر گھوڑے کی پشت پر پہاڑوں، صحراؤں، جنگلوں اور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے اور زخم کھانے کے بعد فتح میں جو سرور اور اسلام کو سربلند کرنے میں جو لذت ہے عیش پرستی کی لذت کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

③ اقتدار حاصل ہونے کے بعد ہمارے نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفاء کا مشن بھی مسلسل جہاد کے ذریعے سے مشرق سے

مغرب تک اسلام پھیلانا تھا اور آپ ﷺ کو اس وقت تک تمام دنیا کے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں، یا جزیہ دے کر محکوم و مقہور نہ بن جائیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام مشارق و مغارب دکھا دیے اور بتا دیا کہ آپ کی امت کی سلطنت یہاں تک پہنچے گی۔ [ ابن ماجه، الفتن، باب ما یکون من الفتن : ۳۹۵۲ ] اور فی الواقع چند ہی سال میں مشرق کے آخر تک قتیبہ بن مسلم رضی اللہ عنہ پہنچ چکے تھے اور مغرب کے آخر تک عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ۔ جنوب و شمال کی طرف جو علاقے رہ گئے ان کے متعلق بھی آپ ﷺ نے فرمایا: « لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْأَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيزٍ أَوْ ذُلِّ ذَلِيلٍ إِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِينُوْنَ لَهَا » [ مسند أحمد : ۶/۴، ح : ۲۳۸۷۶، عن المقداد و عائشة رضی اللہ عنہما ] ’’زمین کی پشت پر اینٹوں یا بالوں کا بنا ہوا کوئی گھر (یا خیمہ) باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمۂ اسلام کو داخل کر دے گا، عزت والے کو عزت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر، یا تو انھیں عزت دے گا اور انھیں یہ کلمہ پڑھنے والوں میں داخل کر دے گا، یا انھیں ذلیل کرے گا اور وہ اس کے محکوم بن جائیں گے۔‘‘ اب دیکھیے وہ محمدی ذوالقرنین کب اٹھتا ہے جو یہ کارنامہ سرانجام دے گا؟ بہرحال ہم سب کو کسی ذوالقرنین کا انتظار کرنے کے بجائے جتنا ہو سکے خود ہی اسلام کی سربلندی اور کفر کو مٹانے کے لیے جہاد کی ضروریات مہیا کرنے اور دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے مسلسل جہاد میں مصروف رہنا لازم ہے، کیا خبر اللہ کس کو یہ سعادت بخش دے!! یہی ذوالقرنین کا مشن اور عمل تھا اور یہی ہمارے پیارے پیغمبر اور آپ کے خلفاء کا مشن اور عمل تھا اور یہی کام ہمارے ذمے ہے۔

4 جیسا کہ شروع سورت کی تفسیر میں گزرا کہ اس سورت کی ابتدائی یا آخری آیات کا حفظ کرنا دجال کے فتنے سے محفوظ رکھتا ہے، جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا بَيْنَ خَلْقِ آدَمَ إِلٰی قِيَامِ السَّاعَةِ خَلْقٌ أَكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ » [ مسلم، الفتن، باب في بقیة من أحادیث الدجال : ۲۹۴۶، عن عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ] ’’آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت قائم ہونے تک کوئی مخلوق دجال سے بڑی نہیں ہوئی۔‘‘ پھر جو شخص اس سے محفوظ رہا وہ دوسرے فتنوں سے تو بالاولیٰ محفوظ رہے گا۔ اصحاب کہف اور ذوالقرنین دونوں کے قصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فتنے میں مبتلا کرنے والے کفار کے ساتھ مومن گزارا نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے پاس اقتدار نہیں تو وہ ایمان بچانے کے لیے غاروں اور پہاڑوں میں چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی جان و ایمان دونوں کی حفاظت فرماتا ہے اور اگر صاحب اقتدار ہے تو پوری عمر کفر اور کفار کی کمر توڑنے میں مصروف رہتا ہے، تاکہ وہ غالب آ کر اس کے ایمان کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف اس سورت یا اس کی چند آیات کا پڑھنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں پر عمل بھی فتنوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ سے دوستی گانٹھ لے، اپنی ایمانی غیرت کو تھپکیاں دے کر سلا دے، کفر و شرک پر زبان بند رکھ کر کافر معاشرے میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا رہے اور ہر جمعہ کو سورۂ کہف کی تلاوت کر لیا کرے، بلکہ حفظ آیات میں ان پر عمل بھی شامل ہے۔ تفصیل کے لیے

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ

پھر وہ کچھ اور سامان ساتھ لے کر چلا ﴿۹۲﴾ یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان کے اس طرف کچھ

دیکھیے سورۂ کہف (۱۰۲ تا ۱۰۴)۔

آیت 93،92 ❶ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا …… : مغرب و مشرق کے سفر کے بعد ذوالقرنین کا یہ تیسرا سفر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی جہت بیان نہیں فرمائی کہ وہ شمال ہے یا جنوب یا چاروں جہتوں کا کوئی کونا۔ معلوم ہوتا ہے اسے پوشیدہ رکھنے ہی میں اللہ کی حکمت ہے۔ چنانچہ مدت دراز سے لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی دو پہاڑوں کے درمیان اس جیسی بلندی والی یہ دیوار کسی نے نہیں دیکھی۔ دیوار چین یا داغستان میں دربند اور خوزامہ کے درمیان کسی زمانے میں پائی جانے والی دیوار یا کسی اور دیوار کی نہ یہ ہیئت ہے، نہ ان کے پار رہنے والوں میں کہیں یاجوج ماجوج کا وجود ہے۔

❷ بہت سے مفسرین نے ذوالقرنین کا یہ سفر شمال کی طرف قرار دیا ہے، کوئی اسے روس کا علاقہ قرار دیتا ہے، کوئی تاتاریوں کو یاجوج ماجوج کا مصداق ٹھہراتا ہے، جنھوں نے شمال کی جانب سے نکل کر دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ بعض انھیں مغل یا ترک قرار دیتے ہیں، مگر سب بلا دلیل اندھیرے میں پتھر پھینکتے چلے جاتے ہیں۔ بعض حضرات اپنے دعوے کے کسی جز کی دلیل کے طور پر بائبل سے کچھ نقل کر کے پورے دعوے کی دلیل کے فریضے سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، حالانکہ موجودہ بائبل پر یقین ممکن ہی نہیں۔ ان حضرات کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ ذوالقرنین کی دیوار ختم ہو چکی اور اس کے پیچھے رکے ہوئے یاجوج ماجوج، جو نکلنے تھے، نکل چکے، حالانکہ قرآن و سنت دونوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کی تفصیل کی ضرورت ہو تو وہ قرآن مجید کی کسی دوسری آیت ساتھ ملانے سے پوری ہو جاتی ہے، اگر پھر بھی ضرورت باقی رہے تو صحیح حدیث ملانے سے وہ بھی پوری ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یاجوج ماجوج کے نکلنے کا ذکر ایک اور مقام پر بھی آتا ہے، فرمایا: ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾ [ الأنبیاء : ۹۶، ۹۷ ] ''یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر اونچی جگہ سے دوڑتے ہوئے آئیں گے اور سچا وعدہ بالکل قریب آ جائے گا تو اچانک یہ ہو گا کہ ان لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی جنھوں نے کفر کیا۔ ہائے ہماری بربادی! بے شک ہم اس سے غفلت میں تھے، بلکہ ہم ظلم کرنے والے تھے۔'' سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء دونوں کی آیات کو ملانے سے صاف واضح ہے کہ اس دیوار کے زمین کے برابر ہونے اور یاجوج ماجوج کے موجیں مارتے ہوئے نکلنے کا وقت ایک ہی ہے اور اس کے بعد نفخ صور اور قیامت بالکل قریب ہوں گی۔ اس کی مزید تفصیل صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کی زبانی موجود ہے کہ یہ سب کچھ دجال کے نکلنے اور مسیح علیہ السلام کے زمین پر نازل ہونے کے بعد ہو گا۔ چنانچہ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی لمبی حدیث میں دجال کے نکلنے، فتنہ و فساد پھیلانے، پھر مسیح علیہ السلام کے نازل ہو کر اسے قتل کرنے کا ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

# لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

لوگوں کو پایا جو قریب نہ تھے کہ کوئی بات سمجھیں ﴿۹۳﴾

”عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح (مصروف) ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائے گا کہ میں نے اپنے کچھ ایسے بندے نکالے ہیں کہ کسی میں ان سے لڑنے کی طاقت نہیں، اس لیے میرے بندوں کو طور کی طرف لے جا کر محفوظ کر لو، تو اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا اور وہ ہر اونچی جگہ سے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ ان کے پہلے لوگ طبریہ جھیل پر پہنچیں گے تو اس میں جو بھی (پانی) ہے پی جائیں گے اور ان کے آخری لوگ گزریں گے اور کہیں گے کہ یہاں کبھی ضرور پانی رہا ہے۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی محصور رہیں گے، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک کے نزدیک بیل کا سر آج تمھارے نزدیک سو دینار (تین سو گرام سونے) سے بہتر ہوگا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں کیڑے ڈال دے گا تو وہ سب ایک شخص کی موت کی طرح ہلاک ہو جائیں گے، پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتریں گے تو زمین میں ایک بالشت جگہ بھی نہیں پائیں گے جسے ان کی سڑاند اور گندگی نے نہ بھر رکھا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کی گردنوں جیسے پرندے بھیجے گا جو انھیں اٹھا کر وہاں پھینک دیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایسی بارش برسائے گا کہ کوئی مکان یا خیمہ اس کے بغیر نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ بارش زمین کو دھو دے گی، یہاں تک کہ اسے آئینے کی طرح صاف کر دے گی۔ پھر زمین کو حکم ہوگا کہ اپنے پھل اُگا اور اپنی برکت واپس لا تو ان دنوں ایک جماعت انار کا ایک حصہ کھائے گی اور اس کے چھلکے سے سایہ حاصل کرے گی اور دودھ والے جانوروں میں برکت دی جائے گی، یہاں تک کہ دودھ والی اونٹنی لوگوں کی کئی جماعتوں کو کافی ہوگی اور دودھ والی گائے لوگوں کے ایک قبیلے کو کافی ہوگی اور دودھ والی بکری لوگوں کے ایک خاندان کو کافی ہوگی۔ تو وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک طیب ہوا بھیجے گا جو ان کی بغلوں کے نیچے اثر کرے گی اور ہر مومن اور ہر مسلم کی روح قبض کر لے گی اور بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے، جو گدھوں کی طرح ایک دوسرے سے جنسی ملاپ کریں گے تو ان پر قیامت قائم ہوگی۔“ [ مسلم، الفتن، باب ذکر الدجال : ۲۹۳۷ ]

اس صحیح حدیث سے ذوالقرنین کی دیوار کا زمین کے برابر ہو چکا ہونا اور یاجوج ماجوج کا روسی، چینی یا تاتاری ہونا اور ان کے خروج کا واقع ہو چکا ہونا صاف غلط ثابت ہوتا ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن مجید اور صحیح حدیث کے خلاف جو بات بھی ہے وہ باطل اور جھوٹ ہے، خواہ وہ بات کہنے والا کتنا بڑا ہو اور خواہ وہ بائبل کی کسی کتاب میں موجود ہو، کیونکہ بائبل کے محفوظ نہ رہنے اور اس میں اضافہ اور تبدیلی کی شہادت قرآن مجید میں کئی جگہ موجود ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۳)، انعام (۹۱)، بقرہ (۷۹) اور آل عمران (۷۸) اس کے مقابلے میں قرآن و سنت کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر (۹)، قیامہ (۱۶، ۱۷)، حم السجدہ (۴۲) اور نجم (۳، ۴) بلکہ اس میں کئی ایسی عبارتیں ہیں کہ کوئی یہودی یا عیسائی انھیں عام مجمع میں پڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، مثلاً لوط، داؤد اور سلیمان علیہم السلام پر تہمتوں کے طوفان والی عبارتیں۔ اور اس بات پر امت کا اتفاق

ہے کہ اہل کتاب کی کوئی بات قرآن و سنت کے خلاف ہو تو وہ جھوٹ ہے اور اگر نہ خلاف ہو نہ موافق تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انھیں نہ سچا کہو نہ جھوٹا۔ زیر تفسیر آیات کے بارے میں اسرائیلی روایات قرآن مجید اور صحیح احادیث کے خلاف ہیں، اس لیے بے بنیاد اور باطل ہیں۔

3 یاجوج اور ماجوج عجمی نام ہیں، اس لیے عجمہ اور تانیث (مجوس کی طرح قبیلہ ہونے) کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔ اگر انھیں عربی مانا جائے تو یاجوج بروزن "يَفْعُوْلٌ" مثلاً "يَرْبُوْعٌ" اور ماجوج بروزن "مَفْعُوْلٌ" مثلاً "مَعْقُوْلٌ" ہوگا اور ان کا ماخذ "أَجَّ يَؤُجُّ" ہوگا۔ "أَجَّ الظَّلِيْمُ" کا معنی نر شتر مرغ تیز دوڑا اور "أَجَّتِ النَّارُ" آگ بھڑک اٹھی۔ غرض یاجوج اور ماجوج کا اشتقاق ایک ہی مادے سے ہے اور اس کے مفہوم میں تیزی اور اشتعال شامل ہے اور یہ لفظ معرفہ اور تانیث کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔ (قاسمی)

4 یاجوج اور ماجوج آدم علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں، جیسا کہ صحیحین میں ہے: « يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يَا آدَمُ! فَيَقُوْلُ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ قَالَ يَقُوْلُ أَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ، قَالَ وَمَا بَعْثُ النَّارِ؟ قَالَ مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَمِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ، قَالَ فَذَاكَ حِيْنَ يَشِيْبُ الصَّغِيْرُ ﴿وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾ قَالَ فَاشْتَدَّ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّنَا ذَاكَ الرَّجُلُ؟ فَقَالَ أَبْشِرُوْا فَإِنَّ مِنْ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ أَلْفٌ، وَمِنْكُمْ رَجُلٌ » [ مسلم، الإيمان، باب قوله : يقول الله لآدم...... : ۲۲۲۔ بخاري : ٦٥٣٠ ] "اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "اے آدم! وہ عرض کریں گے: "لبیک وسعدیک اور ہر خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "آگ والی جماعت کو نکالو۔" وہ عرض کریں گے: "اور آگ والی جماعت کیا ہے؟" فرمائیں گے: "ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "تو یہ وہ وقت ہوگا کہ بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشے میں دیکھے گا، حالانکہ وہ ہرگز نشے میں نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔" راوی نے کہا، تو یہ بات ان پر بہت شاق گزری، انھوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! ہم میں وہ ایک آدمی کون ہوگا؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "خوش ہو جاؤ کہ یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار اور تم میں سے ایک آدمی ہوگا۔" بعض مفسرین نے یاجوج ماجوج کی شکل وصورت، قد کے لمبے اور چھوٹے ہونے اور ان کے کانوں کے متعلق عجیب وغریب اقوال و روایات لکھی ہیں جن میں سے کوئی بھی قرآن وسنت سے ثابت نہیں۔ (ابن کثیر)

5 اس حقیقت پر بعض کم فہم لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یورپی اقوام نے زمین کا ہر کونا چھان مارا ہے مگر انھیں نہ کہیں یاجوج ماجوج نظر آتے ہیں نہ پہاڑوں جیسی بلند لوہے اور تانبے کی کوئی دیوار نظر آتی ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے مخفی رکھنا چاہے کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ بنی اسرائیل میدان تیہ میں چالیس سال تک چند میل کے دائرے میں گھومتے رہے، نہ وہ اس دائرے سے نکل سکے اور نہ کسی اور کو ان کا پتا چل سکا، ورنہ وہ انھیں نکلنے کا راستہ بتا کر وہاں سے نکال لیتا۔ ایمان ہو تو اس دیوار، یاجوج ماجوج، نزول مسیح، دجال، دابۃ الارض سب پر یقین آ جاتا ہے اور اگر ایمان نہ ہو تو انسان "ایک جمع ایک، جمع ایک، برابر تین"

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾

انھوں نے کہا اے ذوالقرنین! بے شک یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد کرنے والے ہیں، تو کیا ہم تیرے لیے کچھ آمدنی طے کر دیں، اس (شرط) پر کہ تو ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دے ﴿۹۴﴾ اس نے کہا جن چیزوں میں میرے رب نے مجھے اقتدار بخشا ہے وہ بہتر ہیں، اس لیے تم قوت کے ساتھ میری مدد کرو کہ میں تمھارے درمیان اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار بنا دوں ﴿۹۵﴾

---

کے بجائے ''برابر ایک'' جیسی صریح خلاف عقل بات پر اڑ جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے رازوں تک اپنی نارسائی کو تسلیم نہیں کرتا۔

**آیت 94** ❶ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ ...... جب وہ قریب نہ تھے کہ کوئی بات سمجھیں تو ذوالقرنین سے ان کی گفتگو کیسے ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ اشاروں کی زبان میں، جو بین الاقوامی زبان ہے، یا ذوالقرنین کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان کی زبان سمجھا دی ہوگی، جیسا کہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولی سکھا دی تھی۔

❷ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا ......: اس قوم اور یاجوج ماجوج کے درمیان دو پہاڑ تھے جن کے درمیان ایک درہ تھا، جہاں سے آ کر وہ لوگ لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ دو پہاڑوں کے درمیان ان کے برابر ایک بلند دیوار کوئی اولو العزم بادشاہ ہی بنا سکتا تھا، جس کے پاس ہر قسم کے وسائل ہوں۔ کوئی قوم کتنی بھی مال دار ہو، یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ اس لیے انھوں نے اخراجات ادا کرنے کی پیش کش کر کے اپنے اور یاجوج ماجوج کے درمیان رکاوٹ بننے والی دیوار بنانے کی درخواست کی جو پہاڑوں کی طرح ان کا راستہ روک سکے۔

**آیت 95** ❶ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ: ذوالقرنین نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میری دسترس میں دیا ہے وہ تمھارے دیے ہوئے اخراجات سے کہیں بہتر ہے، سو تم خرچ کی فکر مت کرو۔ ہاں، تم عملی طور پر آدمیوں اور محنت کے ساتھ میری مدد کرو، تاکہ میں تمھارے اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار بنا دوں۔ اس سے ذوالقرنین کی سیر چشمی، فراخ دلی اور سخاوت نفس کے ساتھ ساتھ رعایا کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لیے مضبوط ترین دفاع کا بندوبست کرنا واضح ہوتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے بھی ملکہ سبا کو ہدیے بھیجنے پر ایسا ہی جواب بھیجا تھا: ﴿فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ﴾ [ النمل : ۳٦ ] ''جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے۔'' رعایا کی زندگی کے ایک ایک لمحے تک پر ٹیکس لگا دینے والے جمہوری حکمران، جو ملوکیت کو گالی قرار دیتے ہیں، رعایا کے لیے اللہ کی رحمت بننے والے ملوک کے طرز عمل سے سبق حاصل کریں۔

❷ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ ......: ''رَدْمًا'' کا معنی خالی جگہ کو پتھروں سے پر کرنا اور پتھروں کی بنی ہوئی موٹی دیوار ہے، ''سَحَابٌ مُرْدَمٌ'' تہ بہ تہ بادل۔

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝۹۶ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝۹۷ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝۹۸

تم میرے پاس لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ، یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کا درمیانی حصہ برابر کر دیا تو کہا "دھونکو" یہاں تک کہ جب اس نے اسے آگ بنا دیا تو کہا لاؤ میرے پاس کہ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل دوں ۝۹۶ پھر نہ ان میں یہ طاقت رہی کہ اس پر چڑھ جائیں اور نہ وہ اس میں کوئی سوراخ کر سکے ۝۹۷ کہا یہ میرے رب کی طرف سے ایک رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آ گیا تو وہ اسے زمین کے برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ ہمیشہ سے سچا ہے ۝۹۸

---

**آیت 96** **اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى** ...... : "زُبَرَ" "زُبْرَةٌ" کی جمع ہے، جیسا کہ "غُرْفَةٌ" کی جمع "غُرَفٌ" ہے، معنی ہے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ پہاڑوں کے درمیان ان کی بلندی کے برابر لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے مہیا کرنا، انھیں اوپر پہنچانا اور جوڑنا ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں بھی امر محال نظر آتا ہے، مگر اہرام مصر کو دیکھیں تو ماننا پڑتا ہے کہ ہم سے ہزاروں سال پہلے جر ثقیل (وزنی اشیاء کو کھینچنے اور اوپر لے جانے) کا علم آج سے بہت آگے تھا۔ چنانچہ ذوالقرنین نے پہاڑوں کے دونوں کناروں کے برابر لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے جوڑنے کے بعد یک جان کرنے کے لیے انھیں آگ سے سرخ کرنے کا حکم دیا، ادھر تانبے کو پگھلانے کا بندوبست کیا۔ جب لوہے کی اینٹیں اور تختے سراسر آگ بن گئے تو اس نے کہا، اب پگھلا ہوا تانبا لاؤ، تاکہ میں اس پر ڈالوں۔ اس طرح وہ لوہے اور تانبے کی بہت موٹی، مضبوط اور پہاڑوں کے برابر بلند اور چکنی دیوار بن گئی، جس پر نہ یاجوج ماجوج چڑھ سکتے تھے، نہ اس میں سوراخ کر سکتے تھے۔ ہزاروں فٹ اونچی اس دیوار کو بنانے میں سائنس کے کیا کیا علوم استعمال ہوئے، لوہے اور تانبے کی کتنی مقدار صرف ہوئی، اتنی بلندی پر لوہے کو کیسے سرخ کیا گیا اور تانبے کی اتنی مقدار اس قدر بلندی پر پہنچانے تک کیسے پگھلی ہوئی حالت میں رکھی گئی اور اتنی موٹی دیوار جب سرخ ہوئی ہو گی تو اس کے پاس کھڑا ہو کر پگھلا ہوا تانبا کیسے ڈالا گیا ہو گا، پھر یہ کام کتنی مدت میں مکمل ہوا، یہ سب کچھ اب صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس سارے عمل میں ذوالقرنین بنفس نفیس کام میں شریک رہا، بلکہ اپنے ہاتھوں سے کام کرتا رہا۔ یہی سنت ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ کی ہے کہ آپ کعبہ کی تعمیر میں، مسجد نبوی بنانے اور خندق کھودنے میں بنفس نفیس شریک رہے۔

**آیت 97** **فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ** ...... : "اسْطَاعُوْۤا" بھی اصل میں "اسْتَطَاعُوْا" تھا، تخفیف کے لیے تاء حذف کر دی۔ چڑھنے کے لیے ہلکا لفظ "اسْطَاعُوْۤا" اور نقب کے لیے بھاری لفظ "اسْتَطَاعُوْا" استعمال فرمایا، کیونکہ ایسی دیوار پر چڑھنا اس میں نقب کی بہ نسبت آسان ہے۔

**آیت 98** ① **قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ** : ذوالقرنین نے دیوار بنا کر اسے اپنا کارنامہ قرار دینے کے بجائے اپنے رب

وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾

اور اس دن ہم ان کے بعض کو چھوڑیں گے کہ بعض میں ریلا مارتے ہوں گے اور صور میں پھونکا جائے گا تو ہم ان کو جمع کریں گے، پوری طرح جمع کرنا ﴿۹۹﴾

کی رحمت قرار دیا، جس کی بدولت وہ لوگ یاجوج ماجوج کے حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مضبوطی کے باوجود اسے لازوال قرار دینے کے بجائے فرمایا کہ جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اسے زمین کے برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ ہمیشہ سے سچا ہے۔ ذوالقرنین کی بات اور دو باغوں والے بے ایمان کی بات کا موازنہ کریں، جو اپنے باغوں کو کبھی برباد نہ ہونے والا کہہ رہا تھا، تو مومن و کافر کی سوچ کا فرق صاف واضح ہو جاتا ہے۔

② فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ...... : ذوالقرنین کی اس بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ساری دنیا کی بادشاہت ملنے کے باوجود آخرت کی فکر ہر وقت رہنی چاہیے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس وعدے سے مراد قیامت کے قریب یاجوج ماجوج کے نکلنے کا وقت ہے، جیسا کہ سورۂ انبیاء (۹۶، ۹۷) میں ہے۔ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « اِسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ النَّوْمِ مُحْمَرًّا وَجْهُهُ وَهُوَ يَقُوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ مِثْلُ هٰذِهِ وَعَقَدَ سُفْيَانُ تِسْعِيْنَ أَوْ مِائَةً قِيْلَ أَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ ؟ قَالَ نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ » [ بخاري، الفتن، باب قول النبي ﷺ: ويل للعرب...... : ۷۰۵۹ ] ''رسول اللہ ﷺ نیند سے لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے بیدار ہوئے، جب کہ آپ کا چہرہ سرخ تھا، فرمایا: ''عرب کے لیے بہت بڑی تباہی ہے، اس شر سے جو بہت قریب آ گیا ہے، آج یاجوج ماجوج کی دیوار میں اتنا حصہ کھول دیا گیا۔'' اور سفیان نے نوے (۹۰) یا سو (۱۰۰) کی گرہ بنائی، یعنی انگوٹھے اور شہادت کی انگلی ملا کر گول دائرہ بنا کر دکھایا۔ پوچھا گیا: ''کیا ہم اپنے آپ میں صالحین کے موجود ہوتے ہوئے ہلاک ہو جائیں گے۔'' فرمایا: ''ہاں، جب برائی زیادہ ہو جائے گی۔''

آیت 99 ① وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ : اس دن سے مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کے مسمار ہونے کے وقت یاجوج ماجوج سمندر کی موجوں کی طرح بے حساب تعداد میں یلغار کرتے ہوئے نکلیں گے۔ اسی کیفیت کو ﴿ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴾ [ الأنبياء: ۹۶ ] میں بیان کیا گیا ہے۔

② وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا : "اَلصُّوْرِ" سے مراد وہ سینگ ہے جس میں فرشتہ پھونک مارے گا تو حشر برپا ہو جائے گا۔ یہ تفسیر خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: « اَلصُّوْرُ قَرْنٌ يُنْفَخُ فِيْهِ » [ أبو داوٗد، السنة، باب في ذكر البعث والصور: ۴۷۴۲۔ الصحيحة: ۱۰۸۰ ] ''صور وہ قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔'' اس آیت میں مذکور نفخہ سے مراد دوسرا نفخہ ہے جس سے سب لوگ قبروں سے نکل کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

وَّ عَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَا ۙ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيۡنَ كَانَتۡ اَعۡيُنُهُمۡ فِىۡ غِطَآءٍ عَنۡ ذِكۡرِىۡ وَكَانُوۡا لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَمۡعًا ﴿۱۰۱﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا عِبَادِىۡ مِنۡ دُوۡنِىۡۤ اَوۡلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ؕ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾

اور اس دن ہم جہنم کو کافروں کے عین سامنے پیش کریں گے ﴿۱۰۰﴾ وہ لوگ کہ ان کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سن ہی نہ سکتے تھے ﴿۱۰۱﴾ تو کیا جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے گمان کر لیا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو حمایتی بنا لیں گے۔ بے شک ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے بطور مہمانی تیار کر رکھا ہے ﴿۱۰۲﴾ کہہ دے کیا ہم تمھیں وہ لوگ بتائیں جو اعمال میں سب سے زیادہ خسارے والے ہیں ﴿۱۰۳﴾ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں ﴿۱۰۴﴾

**آیت 100** وَعَرَضۡنَا جَهَنَّمَ ...... یہ پیش کرنا بھی عذاب سے پہلے عذاب ہوگا۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۵۳) کی تفسیر۔

**آیت 101** الَّذِيۡنَ كَانَتۡ اَعۡيُنُهُمۡ ...... : "غِطَآءٍ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، معنی ہے سخت گاڑھا پردہ، یعنی اپنی عقل کی آنکھ نہ تھی کہ قدرتیں دیکھ کر یقین لاتے اور ضد کی وجہ سے کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے کہ سمجھانے سے سمجھ جاتے۔ مزید دیکھیے سورۂ ملک (۱۰)۔

**آیت 102** ① اَفَحَسِبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا ...... : سورت کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد بتانے والوں کو ڈرانے اور اصحاب کہف کے اعلانِ توحید کے ذکر سے ہوئی تھی، آخر میں پھر وہی بات دہرائی، یعنی کیا ان کفار نے میرے خاص بندوں، جیسے مسیح، عزیر، روح القدس اور فرشتوں وغیرہ کو اپنا معبود بنا کر یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں میرے مقابلے میں لا کھڑا کریں گے اور اپنا حمایتی بنا لیں گے۔ استفہام انکاری ہے، یعنی یہ گمان سراسر غلط ہے، بلکہ وہ سب ان کی عبادت سے بے زاری کا اعلان کریں گے اور ان کے مقابل مدعی بن کر کھڑے ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۸۲) اور احقاف (۶،۵) اگرچہ "عِبَادِىۡ" سے نیک و بد بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ سب اللہ کے بندے ہیں (دیکھیے مریم : ۹۳) مگر پہلا معنی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ "میرے بندے" کہہ کر اپنا بنا لینے میں جو عزت افزائی ہے وہ خاص بندوں ہی کا حصہ ہے۔

② اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا : "نُزُلًا" کا معنی وہ چیزیں ہیں جو مہمان نوازی کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ جہنم بطور مہمانی کفار کو مذاق ہے۔ "نُزُلًا" کا ایک معنی منزل بھی ہے، یعنی ہم نے جہنم کو کافروں کی منزل کے طور پر تیار کر رکھا ہے۔

**آیت 104** اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ ...... : یعنی جتنے نیک اعمال انھوں نے کیے سب کفر کی شامت سے رائگاں گئے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے، سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے ﴿١٠٥﴾ یہ ان کی جزا جہنم ہے، اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کو مذاق بنایا ﴿١٠٦﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے فردوس کے باغ مہمانی ہوں گے ﴿١٠٧﴾ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وہ اس سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے ﴿١٠٨﴾

دیکھیے سورۂ ابراہیم (١٨)، نور (٣٩، ٤٠) اور فرقان (٢٣) یہ مطلب بھی درست ہے کہ ”جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی“ یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کی پروا نہ کی اور دنیا کی خوش حالیوں اور کامیابیوں کو اپنا اصل مقصد بنائے رکھا۔

**آیت 105** أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات اور آخرت کو مانتے ہی نہ تھے، سو انھوں نے اس کے لیے کوئی نیکی کی ہی نہیں کہ پلڑے میں کچھ ہے ہی نہیں تو صرف ایک پلڑے کا وزن کیا جائے؟

**آیت 107** اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... : کفار کے بعد ان کے مقابل اہل ایمان کی مہمانی کا ذکر فرمایا۔ فردوس کا معنی وہ باغ ہے جس میں تمام باغوں کے درخت، پھول اور پودے ہوں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَسَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ، وَفَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ، وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ » [ بخاري، كتاب الجهاد، باب و كان عرشه على الماء : ٧٤٢٣ ] ”جب تم اللہ سے مانگو تو اس سے فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے افضل اور جنت کا سب سے اونچا مقام ہے اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔“

**آیت 108** لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا : ایک جگہ زیادہ دیر رہنے سے آدمی اکتا جاتا ہے، مگر جنتی جنت سے کبھی دوسری جگہ منتقل ہونا نہیں چاہیں گے، کیونکہ اس سے بہتر عیش کی کوئی جگہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ؕ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ٣١، ٣٢ ] ”اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تمھارے دل چاہیں گے اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے۔ یہ بے حد بخشنے والے، نہایت مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔“ اور حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: « أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ » [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة ...... : ٣٢٤٤ ۔ مسلم : ٢٨٢٤ ]

قُلۡ لَّوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيۡ وَ لَوۡ

کہہ دے اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ

”میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا۔“ اور ان سب نعمتوں سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگی، پھر جنت کی نعمتیں ہر آن نئی سے نئی ہوتی رہیں گی، نہ ختم ہوں گی نہ کہیں رکیں گی، کیونکہ وہ اللہ کے کلمۂ کن سے وجود میں آئیں گی اور اللہ کے کلمات کی کوئی انتہا نہیں، دیکھیے اس سے اگلی آیت۔

**آیت 109** ① قُلۡ لَّوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا ...... : کیونکہ سمندر مخلوق ہے جس کی حد اور انتہا ہے، جب کہ اللہ کا کلام اس کی صفت ہے، مخلوق نہیں، نہ اللہ کی ذات کی کوئی انتہا ہے نہ اس کی صفات کی۔ اگر اللہ کے کلمات لکھنے کے لیے سارے سمندر سیاہی بن جائیں اور زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں، پھر اتنی سیاہی ہم اور لے آئیں، بلکہ مزید سات سمندر سیاہی بن جائیں تو سب ختم ہو جائیں گے، مگر اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ (دیکھیے لقمان: ۲۷) کیونکہ محدود چیز لا متناہی اور غیر محدود کا احاطہ کبھی نہیں کر سکتی۔ ② اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اسی طرح اس کی دوسری صفات کی طرح صفت کلام بھی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ جب چاہے، جس سے چاہے، جو چاہے کلام کرتا ہے، اس کے کلام کی کوئی انتہا نہیں، وہ ہمیشہ کلام پر قادر رہے گا، جیسے رسولوں کے متعلق فرمایا: ﴿مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ [البقرة: ۲۵۳] ”ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام فرمایا۔“ اور فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا﴾ [النساء: ۱٦٤] ”اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔“ اور فرمایا: ﴿وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ [التوبة: ٦] ”اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔“ اتنی واضح آیات کے باوجود مسلمانوں کے بہت سے گمراہ فرقے اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کے منکر ہیں۔ ان کے مطابق اللہ کا کلام وہ معانی ہیں جو اس کی ذات میں ہیں۔ وہ بول نہیں سکتا، نہ اس کے الفاظ ہیں نہ آواز۔ الفاظ اور آواز کو اس نے پیدا کیا ہے، اس لیے یہ قرآن بھی مخلوق ہے، اللہ کا کلام نہیں۔ صرف اس کا مفہوم و معنی اللہ کی صفت ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے کہا کہ نماز میں قرآنی آیت کا مفہوم عربی الفاظ کے بجائے فارسی، اردو یا کسی اور زبان میں ادا کر دیا جائے تو نماز ہو جائے گی، کیونکہ قرآن کی تلاوت ہو گئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قرآن عربی ہے۔ دیکھیے سورۂ یوسف (۲) وغیرہ۔ امام اہل السنہ احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے انھی گمراہ فرقوں کی طرف سے بے شمار عذاب برداشت کیے، مگر قرآن کو اللہ کا کلام کہتے رہے، اسے مخلوق نہیں مانا اور امت کو صراط مستقیم سے ہٹنے نہیں دیا۔ بھلا کوئی شخص اپنے آپ کو تو کلام پر قادر سمجھے اور اپنے لیے گونگا ہونے کو عیب جانے، حالانکہ گونگے کے دل میں بھی معانی موجود ہوتے ہیں، مگر تمام صفات حسنہ کے مالک کے متعلق کہے کہ وہ نہ بولتا ہے نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کوئی اس کا کلام سن سکتا ہے۔ ایسا عاجز رب انھی کو مبارک ہو قرآن و حدیث میں مذکور ہمارا رب تو بولتا بھی ہے، سنتا بھی اور وہ تمام صفات کمال کا مالک ہے۔ بعض پیغمبروں نے خود اس کا کلام سنا، بعض کو فرشتے کے ذریعے

جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے برابر اور سیاہی لے آئیں ﴿۱۰۹﴾

سے پہنچا، رسولوں کی معرفت آیا ہوا کلام ہم پڑھتے بھی ہیں اور سنتے بھی۔ [ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى نِعَمِهِ الشَّامِلَةِ وَ آلَائِهِ الْكَامِلَةِ ]

③ یہاں انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ان عقل پرستوں نے صفات کا انکار کیوں کیا؟ پھر قرآن کے الفاظ کو مخلوق کہنے پر اتنا اصرار کیوں کیا کہ جو بھی قرآن کو مخلوق نہ کہے وہ ہر قسم کے سرکاری عہدے سے معزول ہے، حتیٰ کہ وہ نہ کسی مسجد کا خطیب ہو سکتا ہے نہ امام، نہ اپنے طور پر کسی مسجد میں پڑھا سکتا ہے، نہ درس دے سکتا ہے اور اہل السنہ، خصوصاً ان کے امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے اس کے انکار میں اتنی شدت کیوں کی اور اتنا عذاب کیوں جھیلا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ خیر القرون گزرنے کے بعد عملی کمزوریوں کی وجہ سے طبائع قرآن و سنت پر عمل کی پابندیوں کو بوجھ سمجھنے لگیں، حکمرانوں کی مطلق العنانی میں بھی یہ دونوں چیزیں رکاوٹ تھیں، جیسا کہ ہم آج کل کے اکثر حکمرانوں اور ان کی اسلامی نظریاتی کونسلوں کے علماء کو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ علمائے سوء نے عقل کا نام لے کر آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی ہر چیز کو راستے سے ہٹا دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انھی دنوں مامون الرشید نے یونانی کتابوں کے تراجم کروائے تھے۔ دنیاوی معاملات میں اپنے پیش رو لوگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، مگر ساتھ ہی یونانی فلسفے کا بھی ترجمہ ہوا تو اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی ان کے عقائد ان لوگوں پر اثر انداز ہوئے۔ چنانچہ معتزلہ، یعنی عقل پرستوں نے ان کے کچھ بنیادی اصول تسلیم کر لیے، مثلاً ایک سے ایک ہی چیز کا صدور ہو سکتا ہے۔ محلِ حوادث حادث ہوتا ہے، یعنی جس سے کوئی نئی چیز وجود میں آئے وہ ذات قدیم، یعنی اللہ تعالیٰ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ حرکت کر سکتا ہے، نہ وہ عرش پر ہے، نہ آسمان پر اترتا ہے، نہ قیامت کے دن زمین پر آئے گا، کیونکہ یہ سب حوادث ہیں۔ یہ عقائد قرآن و حدیث کا صاف انکار تھے، کیونکہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر وقت نئی سے نئی حالت میں ہے، فرمایا: ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ [ الرحمٰن : ۲۹ ] ''ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔'' وہ سمیع ہے، بصیر ہے، قیامت کے دن زمین پر آئے گا وغیرہ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں مسلم علماء میں سے ایک تو متکلمین اٹھے جنھوں نے ان کا جواب دیا، مگر بدقسمتی سے ان کے اصول مان بیٹھے، چنانچہ انھوں نے فلاسفہ کے اصول بچانے کے لیے قرآن و حدیث کی تاویل بلکہ تحریف کی۔ کلام بھی چونکہ حادث ہے، یعنی ہر لفظ پہلے کے بعد نئے سے نیا آتا ہے اور ان کے بقول اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کا محل نہیں، لہٰذا انھوں نے اللہ کے کلام کا انکار کرنے کے لیے تاویل کا سہارا لیا اور کہا کہ قرآن کے معانی قدیم ہیں، وہ تو اللہ کی ذات میں ہیں، مگر الفاظ مخلوق ہیں، اصل مفہوم جس زبان اور جن الفاظ میں بھی ادا ہو جائے وہی قرآن ہے۔ حدیث سے وہ پہلے ہی یہ کہہ کر جان چھڑا چکے تھے کہ حدیث سے قرآن پر اضافہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ ان کے کہنے کے مطابق غیر فقیہ صحابی کی روایت کردہ حدیث قیاس کے خلاف ہو تو رد کر دی جائے گی۔ رہا قرآن، تو اس میں من مانی تبدیلی کے لیے اس کے الفاظ کو اللہ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا، صرف معنی و مفہوم کو قرآن قرار دیا۔ یہود و نصاریٰ میں بھی تحریف کا دروازہ یہیں سے کھلا کہ تورات و انجیل کے تراجم کو اللہ کا کلام کہہ دیا گیا، حتیٰ کہ اصل زبان والی کتابیں دنیا

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ

کہہ دے میں تو تم جیسا ایک بشر ہی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، پس

سے مفقود ہو گئیں۔ تراجم میں تبدیلی کچھ مشکل نہ تھی، لہٰذا اب وہ کتب اس قابل ہی نہیں رہیں کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ ان کے عقلی ڈھکوسلوں کے مقابلے میں کہتے تھے کہ کوئی آیت یا حدیث پڑھو جس میں ہو کہ قرآن مخلوق ہے، ہم مان لیں گے۔ امام صاحب اسی پر قائم رہے۔ قرآن کے الفاظ ہی کو اللہ کا کلام کہنے پر ڈٹے رہے، جس کے نتیجے میں قرآن محفوظ رہا اور حدیث بھی حجت رہی۔ یہ ﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴾ [ الحجر : ۹ ] کے وعدے کی تکمیل تھی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں سے ان کی معنوی قوت ختم کرنے کے لیے ایمان کو بھی صرف دل کا فعل قرار دیا، اقرار کو بھی صرف مسلمان تسلیم ہونے کے لیے ضروری قرار دیا، اقرار نہ بھی کرے تو لوگوں کے نزدیک نہ سہی اللہ کے ہاں پکا مومن ہے۔ اقرار کر لے، عمل نہ بھی کرے تو اللہ کے ہاں اور مسلمانوں کے ہاں پکا مومن ہے۔ یہ اہل سنت محدثین ہی تھے جنھوں نے اسلام پر ان حملوں کا دفاع کیا اور جو سختی بھی ان پر گزری اسے برداشت کیا۔ کتنے ہی اس امتحان میں ناکام ہوئے، کتنے شہادت پا کر سرخرو ہوئے۔ اب بھی قرآن و حدیث پر قائم رہنے والوں کا ایسے لوگوں سے مقابلہ جاری ہے جو قرآن کے الفاظ کو اللہ کا کلام نہیں مانتے، اللہ تعالیٰ کی صفات، سننے، دیکھنے، رحم کرنے، اترنے، چڑھنے، عرش پر ہونے کو نہیں مانتے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے ٹھیکیدار بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ قرآن و سنت پر قائم علماء صریح دلائل سے ان لوگوں کے عقائد کا باطل ہونا بیان کرتے رہتے ہیں اور قرآن و حدیث پر ذرہ برابر آنچ آنے دیتے ہیں نہ ان میں کوئی لفظی یا معنوی تحریف برداشت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَرِثُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ » [ السنن الکبرٰی للبیہقی : ۲۰۹/۱۰، ح : ۲۱۴۳۹ ] ”قرآن و حدیث کے اس علم کے وارث بعد میں آنے والے تمام لوگوں میں سے ان کے وہ عادل لوگ ہوں گے جو اس سے جاہلوں کی تاویل، باطل پرستوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ اور غلو کرنے والوں کی تحریف کو دور کریں گے۔“ [ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ ]

**آیت 110** ❶ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ...... : اللہ کے کبھی ختم نہ ہونے والے کلمات میں سے تمام پیغمبر اور ہمارے نبی ﷺ جو کلمات لے کر آئے، کفار نے ان پر ایمان لانے سے اس لیے انکار کر دیا کہ انھیں لانے والے بشر تھے۔ ان کے خیال میں بشر اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا تھا۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۱) اور بنی اسرائیل (۹۴) کی تفسیر۔ عقل کے ان اندھوں کو دیکھو کہ احسن تقویم والے انسان کو اللہ کا رسول ماننے کے لیے تیار نہیں، مگر بے جان پتھروں کو معبود مان رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہہ دیجیے کہ میں تمھاری طرح ایک بشر ہونے کے سوا کچھ نہیں، نہ میں رب ہوں، نہ رب ہونے میں میرا کوئی حصہ ہے، نہ عالم الغیب ہوں، نہ اپنے یا تمھارے لیے کسی نفع یا نقصان کا مالک ہوں، بلکہ میں تمھاری طرح صرف ایک بشر ہوں، آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں۔ میرے والدین بھی ہیں، بیوی بچے بھی، کھانے پینے کی اور دوسری بے شمار اشیاء کی محتاجی میں بھی تمھارا شریک ہوں۔ پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپے، تندرستی، بیماری اور وفات سب میں تمھاری طرح ہوں، ہاں اللہ تعالیٰ

ع ۱۲ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے ﴿۱۱۰﴾

کا مجھ پر احسان ہے کہ اس نے اپنے کلمات پہنچانے کے لیے مجھے وحی کا شرف عطا فرمایا ہے، جس کا اصل الاصول ایک اللہ کی عبادت ہے۔ سو تم میری نبوت مانو اور اللہ کی توحید پر ایمان لے آؤ۔

واضح رہے کہ قرآن مجید کے مطابق رسول بشر ہوتا ہے، جسے اللہ رسالت کے لیے چن لیتا ہے۔ کوئی یہ کہے کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا، یا یہ کہے کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا، دونوں کا عقیدہ ایک ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ''ان مشرکین سے جو آپ کی رسالت کو جھٹلاتے ہیں، کہہ دیجیے کہ میں محض تمھارے جیسا ایک بشر ہوں، پھر جو شخص سمجھتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں تو جیسا کلام میں لے کر آیا ہوں وہ لے کر آئے، دیکھو میں نے عالم الغیب نہ ہوتے ہوئے ماضی کے جو واقعات (اصحاب کہف، ذوالقرنین وغیرہ کے) عین واقعہ کے مطابق تمھیں بتائے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ مجھے اطلاع نہ دیتا تو میں تمھیں کبھی نہ بتا سکتا۔'' یہ تفسیر بھی اچھی ہے۔

② فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ ...... : ''يَرْجُوْا'' ''رَجَاءٌ'' کا معنی امید ہے، اس کے ضمن میں خوف بھی ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ امید پوری نہ ہو۔ غرض اس کے معنی امید اور خوف دونوں کر لیے جاتے ہیں۔ بندے اور اس کے رب کے تعلق کو نمایاں کر کے فرمایا کہ جو اپنے رب کی ملاقات اور دیدار کی امید رکھتا ہے، یا اس سے ملاقات کے وقت اس کے عذاب سے ڈرتا ہے، اس کے لیے دو کام ضروری ہیں، پہلا یہ کہ وہ صالح عمل کرے اور صالح عمل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے سے بتایا ہے، اس کے علاوہ سب بدعت اور گمراہی ہے۔ دوسرا یہ کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے، نہ کسی دوسرے کی عبادت کرے اور نہ ریا کاری کرے، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت اگر شرک اکبر ہے تو ریا کاری (دکھاوا) شرک اصغر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهُ وَ شِرْكَهُ » [ مسلم، الزهد، باب تحريم الرياء : ۲۹۸۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، میں تمام حصے داروں سے کہیں زیادہ (ہر قسم کے) حصے سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے سوا کسی اور کو حصے دار بنایا تو میں اس عمل کو اور اس کے حصے کو چھوڑ دیتا ہوں۔'' یعنی میں وہ حصہ بھی قبول نہیں کرتا جو اس عمل میں سے اس نے میرے لیے کیا ہے، کیونکہ اس میں دوسرا بھی حصے دار ہوتا ہے، تو میں اپنا حصہ بھی چھوڑ کر اسی کو دے دیتا ہوں، اب وہ اس کا اجر اسی سے لے، میں تو صرف وہ عمل قبول کرتا ہوں جو سارے کا سارا میرے لیے ہو، کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہ ہو۔ جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: « مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ، وَ مَنْ يُرَائِيْ يُرَائِي اللّٰهُ بِهٖ » ''جو شخص سنانے (شہرت) کی خاطر عمل کرے اللہ تعالیٰ (اس کی بدنیتی) سب کو سنا دے گا اور جو لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی کام کرے گا اللہ تعالیٰ اسے سب لوگوں کو دکھلا دے گا۔'' [ بخاري، الرقاق، باب الرياء والسمعة : ۶۴۹۹ ]

سورۂ مریم ۱۹ مکیہ ۴۴ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — آیاتھا ۹۸ رکوعاتھا ۶

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّكَ عَبۡدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ تیرے رب کی اپنے بندے زکریا پر رحمت کا ذکر ہے ﴿۲﴾ جب اس نے اپنے رب کو چھپی آواز سے پکارا ﴿۳﴾

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے، جو عیسائی تھا، جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''جو کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے اس کا کوئی حصہ تمھیں یاد ہے تو مجھے پڑھ کر سناؤ۔'' چنانچہ جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا، اللہ کی قسم! اسے سن کر نجاشی رونے لگا، حتیٰ کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی اور جتنے پادری اس کے پاس بیٹھے تھے وہ بھی رونے لگے، یہاں تک کہ ان کی کتابیں تر ہوگئیں، پھر نجاشی نے کہا: (( إِنَّ هٰذَا وَاللّٰهِ! وَالَّذِيْ جَاءَ بِهِ مُوْسٰى لَيَخْرُجُ مِنْ مِشْكَاةٍ وَاحِدَةٍ )) [ مسند أحمد : ۱/ ۲۰۲، ۲۰۳، ح : ۱۷٤٥، حسنه محققوه ] ''اللہ کی قسم! یہ کلام اور وہ کلام جو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے ایک ہی مشکاۃ (روشنی کے طاق) سے نکل رہا ہے۔''

**آیت 1** كٓهٰيٰعٓصٓ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

**آیت 2** ① ذِكۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّكَ عَبۡدَهٗ زَكَرِيَّا : یہاں ''هٰذَا'' محذوف ہے، یعنی یہ تیرے رب کی اپنے بندے زکریا پر رحمت کا ذکر ہے۔ رحمت سے مراد یہاں زکریا علیہ السلام کی دعا قبول کرنا اور انھیں سخت بڑھاپے اور بیوی بانجھ ہونے کے باوجود یحییٰ علیہ السلام جیسا عظیم مرتبے والا بیٹا عطا فرمانا ہے۔

② ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَانَ زَكَرِيَّاءُ نَجَّارًا )) [ مسلم، الفضائل، باب من فضائل زکریا علیہ السلام : ۲۳۷۹ ] ''زکریا علیہ السلام نجار (ترکھان) تھے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ وہ داؤد علیہ السلام کی طرح اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ وَ إِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ )) [ بخاري، البيوع، باب كسب الرجل و عمله بيده : ۲۰۷۲، عن المقدام رضی اللہ عنہ ] ''کسی شخص نے کبھی اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں کھایا اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔''

**آیت 3** ① اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا : اس آیت میں اس جگہ اور وقت کا ذکر نہیں جب ان کے دل میں اس دعا کا داعیہ پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۳۷، ۳۸)۔

② نِدَآءً خَفِيًّا : چھپی آواز سے آہستہ آواز بھی مراد ہو سکتی ہے اور لوگوں سے الگ جگہ میں دعا بھی۔ اس کی وجہ بعض اہل علم نے یہ لکھی ہے کہ بڑھاپے میں بیٹا مانگنا لوگوں کی ہنسی کا باعث ہوتا، پھر اگر نہ ملتا تو لوگ مزید ہنستے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ خفیہ دعا ریا کا امکان نہ ہونے کی وجہ سے افضل ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿اُدۡعُوۡا رَبَّكُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡيَةً﴾ [ الأعراف : ٥٥ ] ''اپنے رب کو گڑ گڑا کر اور خفیہ طور پر پکارو۔'' اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز کو قرار

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا ④ وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ⑤

کہا اے میرے رب! یقیناً میں ہوں کہ میری ہڈی کمزور ہوگئی اور سر بڑھاپے سے شعلے مارنے لگا اور اے میرے رب! میں تجھے پکارنے میں کبھی بے نصیب نہیں ہوا ④ اور بے شک میں اپنے پیچھے قرابتداروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی شروع سے بانجھ ہے، سو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا کر ⑤

دیا۔[ مسلم، الصیام، باب فضل صوم المحرم : ۱۱۶۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] اور اس شخص کو عرش کا سایہ پانے والے سات خوش نصیبوں میں شمار فرمایا جس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہ پڑیں، حدیث کے الفاظ ہیں: « ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ » اسی طرح اس شخص کو بھی جس نے اس طرح چھپا کر صدقہ کیا کہ بائیں ہاتھ کو معلوم نہیں کہ دایاں کیا خرچ کر رہا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں:« تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ » [ بخاري، الزكوة، باب الصدقة باليمين : ۱۴۲۳ ]

**آیت 4** ① قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ ...... : " اَلْعَظْمُ " اگرچہ واحد ہے مگر مراد جنس ہے، یعنی میری جو ہڈی بھی ہے کمزور ہوگئی ہے۔ اگر جمع کا لفظ بولتے " اَلْعِظَامُ " یعنی ہڈیاں، تو اس سے ہڈیوں کا کوئی مجموعہ بھی مراد ہو سکتا تھا۔ " اِشْتَعَلَ الرَّاْسُ " سارے سر کے بال سفید ہونے کو آگ کے شعلے مارنے سے تشبیہ دے کر آگ کا لفظ حذف کر دیا اور بڑھاپے کی وجہ سے سر کو شعلے مارنے والا بنا دیا، اسے استعارہ کہتے ہیں۔ ان الفاظ میں اپنی انتہائی کمزوری کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے، کیونکہ وہ کمزوروں پر زیادہ رحم فرماتا ہے۔ یہ دعا کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

② وَلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا : " كَانَ " ہمیشگی کے لیے ہوتا ہے، اس پر نفی آنے سے نفی کی ہمیشگی مراد ہوتی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا، اس لیے ترجمہ "میں کبھی بے نصیب نہیں ہوا" کیا گیا ہے۔ اس میں اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ لطف و کرم کا واسطہ دے کر دعا کی ہے، خصوصاً اس بات کا واسطہ دے کر کہ تو نے مجھے ہمیشہ دعا قبول ہو جانے کی عادت ڈال دی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا ذکر کر کے دعا کرنا بھی دعا کے آداب میں شامل ہے، جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں عرض مطلب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ﴾ [ الأعراف : ۱۸۰ ] "اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو اسے ان کے ساتھ پکارو۔"

**آیت 5** ① وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ ...... : " اَلْمَوَالِیَ " " مولٰی " کی جمع ہے۔ یہاں مراد قریبی رشتے دار اور چچوں کے بیٹے ہیں جو اولاد نہ ہونے کی صورت میں وارث بنتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے ان میں سے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو اس لائق ہو کہ میرے مرنے کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکے اور میرا اور آل یعقوب کا علمی و

يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖۗ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ⑥

جو میرا وارث بنے اور آل یعقوب کا وارث بنے اور اے میرے رب! اسے پسند کیا ہوا بنا⑥

عملی وارث بن سکے، جس سے تیرے دین پر عمل اور اس کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہ سکے، بلکہ مجھے ان سے خطرہ ہے کہ وہ دین کو بگاڑیں گے اور اپنی من مانیاں کریں گے، جیسا کہ سورۂ اعراف (۱۶۹) میں بنی اسرائیل میں سے کتاب کے وارث بننے والے بعض لوگوں کا حال ذکر ہوا ہے۔

② بعض لوگ اس آیت کو انبیاء کی دنیاوی جائداد کی وراثت کی دلیل بناتے ہیں، حالانکہ ان آیات ہی میں اس کا رد موجود ہے، کیونکہ زکریا علیہ السلام ایسے وارث کی دعا کر رہے ہیں جو ان کا اور آل یعقوب کا وارث بنے۔ ظاہر ہے کہ اولاد تو اپنے باپ کی دنیوی جائداد کی وارث ہوتی ہے، پورے خاندان اور قوم کی وارث نہیں ہوتی، اس لیے یہاں علمی ورثہ ہی مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ )) [ بخاري، فرض الخمس، باب فرض الخمس: ۳۰۹۳، عن أبي بكر رضی اللہ عنہ ] ”ہمارا (یعنی انبیاء کا) کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔“ جو لوگ کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک اور دوسری جائدادوں میں سے ورثہ نہیں دیا، انھیں سوچنا چاہیے کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو اور اپنی بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری ازواج مطہرات کو بھی تو حصہ نہیں دیا اور دلیل کے طور پر یہ (مذکورہ بالا) حدیث پڑھی۔ پھر اگر انھوں نے حصہ نہیں دیا تو علی رضی اللہ عنہ ہی اپنی خلافت میں عباس اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو اور امہات المومنین کو وہ حصہ دے کر اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے، مگر ان کا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر کاربند رہنا اس حدیث کی عملی تائید و تصدیق ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نمل کی آیت (۱۶)۔

③ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا : ”عَاقِرًا“ وہ ہے جس کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو۔ یہ لفظ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ”كَانَتْ“ کا لفظ ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے، اس لیے ترجمہ ”شروع سے بانجھ ہے“ کیا گیا ہے۔ اتنے الحاح و اصرار سے اپنی ضرورت بیان کرنے کے بعد اپنی صلب سے وارث عطا کرنے کی دعا کی، جو ان کی اور آل یعقوب علیہ السلام کی نبوت، علم اور اوصاف حمیدہ کا وارث بنے۔

**آیت 6** ① وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا : ”رَضِيًّا“ ”فَعِيْلٌ“ بمعنی ”مَفْعُوْلٌ“ ہے، مطلب پسند کیا ہوا، یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں، سب کا پسندیدہ ہو۔ اللہ جسے پسند کر لے لوگ بھی اس سے محبت کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ نَادٰى جِبْرِيْلَ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحْبِبْهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ فَيُنَادِيْ جِبْرِيْلُ فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات اللّٰه عليهم: ۳۲۰۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام سے کہتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت کر، تو جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرتے ہیں، پھر

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۣ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝

اے زکریا! بے شک ہم تجھے ایک لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں، جس کا نام یحییٰ ہے، اس سے پہلے ہم نے اس کا کوئی ہم نام نہیں بنایا۔ کہا اے میرے رب! میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا جب کہ میری بیوی شروع سے بانجھ ہے اور میں تو بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچ گیا ہوں۔ کہا ایسے ہی ہے، تیرے رب نے فرمایا ہے یہ میرے لیے آسان ہے اور یقیناً میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا کیا جب کہ تو کچھ بھی نہ تھا۔

---

جبریل علیہ السلام آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں، سو تم بھی اس سے محبت کرو، تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔"

2 زکریا علیہ السلام کی بیٹے کے لیے دعا ایک تو یہاں آئی ہے، ایک سورۂ آل عمران (۳۸) میں اور ایک سورۂ انبیاء (۸۹) میں۔ تینوں جگہ ہی الفاظ معانی کا خزینہ اور موتیوں کا نگینہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور بانجھ اور بوڑھی بیوی کو اولاد کے قابل بنا کر یحییٰ علیہ السلام عطا فرما دیے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۹۰)۔

**آیت 7** 1 يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۣ اسْمُهٗ يَحْيٰى ...... : یہ بشارت دوران نماز ہی فرشتوں کے ذریعے سے مل گئی تھی۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۳۹) اس میں یحییٰ علیہ السلام کی فضیلت دو پہلوؤں سے بیان کی گئی ہے، ایک یہ کہ ان کا نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھا، دوسرے یہ کہ ان کا نام ایسا رکھا جو اس سے پہلے کسی کا نہیں تھا۔ عربی زبان میں "يَحْيٰى" کا معنی "زندہ رہے" ہے۔

2 اس سے معلوم ہوا کہ پیدائش سے پہلے بھی بچے کا نام رکھا جا سکتا ہے، ساتویں دن نام رکھنے کا حکم آخری حد ہے۔

**آیت 8** قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ ......: "عِتِيًّا" "عَتَا يَعْتُوْ عِتِيًّا" بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ جانا۔ خشک لکڑی کو "عاتٍ" اور "عاسٍ" کہتے ہیں، جو بھی بڑھاپے یا فساد یا کفر کی انتہا کو پہنچ جائے اسے "عاتٍ" (عَتَا يَعْتُوْ سے اسم فاعل) کہا جاتا ہے۔ (طبری)

یہاں خیال پیدا ہوتا ہے کہ خود ہی دعا کی، پھر یہ پوچھنے کا کیا مطلب کہ میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ زکریا علیہ السلام نے یہ سوال عام دستور کے خلاف بیٹے کی خوش خبری سن کر مزید اطمینان حاصل کرنے کے لیے غیر اختیاری طور پر کیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال بے پناہ خوشی اور تعجب کے اظہار کی ایک شکل بھی ہو سکتا ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "انوکھی چیز مانگنے پر تعجب نہ ہوا، جب سنا کہ ملے گی تب تعجب کیا۔" (موضح) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ پوچھنا دراصل معلوم کرنے کے لیے تھا کہ بیٹا اسی بانجھ بیوی سے ہوگا یا کسی اور بیوی سے اور میرے بڑھاپے کا کیا بنے گا؟

**آیت 9** قَالَ كَذٰلِكَ...... : یعنی ایسے ہی ہے کہ تیرے بڑھاپے اور تیری اسی بیوی کے بانجھ پن کے باوجود تیرے ہاں

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ⑩ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ⑪ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ⑫

کہا اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تندرست ہوتے ہوئے لوگوں سے تین راتیں بات نہیں کرے گا ⑩ تو وہ عبادت خانے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آیا، پس انھیں اشارے سے کہا کہ پہلے اور پچھلے پہر تسبیح کرو ⑪ اے یحییٰ! کتاب کو قوت سے پکڑ اور ہم نے اسے بچپن ہی میں فیصلہ کرنا عطا فرمایا ⑫

---

لڑکا ہوگا، کیونکہ جس نے تجھے اس وقت پیدا کر لیا جب تو کچھ بھی نہ تھا تو اس کے لیے یہ کام تو بہت آسان ہے۔

**آیت 10** ❶ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً: یعنی کوئی ایسی نشانی بتا دے کہ ان حالات میں ہمارے ہاں لڑکے کی پیدائش ہونے والی ہو تو مجھے پہلے سے اس کا پتا چل جائے۔

❷ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ......: "سَوِيًّا" تندرست، صحیح اعضاء والا، نہ گونگا نہ بہرا۔ یہاں تین راتوں کا ذکر ہے، جبکہ سورۂ آل عمران میں تین دنوں کا ذکر ہے، یعنی نشانی یہ ہے کہ تین دن رات صحیح سالم، تندرست ہوتے ہوئے تم لوگوں سے بات چیت نہ کر سکو تو سمجھ لو کہ حمل قرار پا گیا۔ لوگوں کے ساتھ کلام سے زبان بند ہوگئی تھی، اللہ کے ذکر اور تسبیح و تحمید سے نہیں۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۴۱)۔

**آیت 11** ❶ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ: "الْمِحْرَابِ" نماز کی جگہ، یا وہ کمرہ جس میں وہ عبادت کیا کرتے تھے، یا مسجد، کیونکہ بنی اسرائیل کی مساجد کو "مَحَارِيْبُ" کہا جاتا تھا، کیونکہ وہ ایسے مقامات ہیں جن میں شیطانوں سے حرب (جنگ) کی جاتی ہے۔ (طنطاوی)

❷ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا: یعنی حمل کی نشانی کے طور پر زبان بند ہوگئی تو اشارے سے لوگوں کو پہلے اور پچھلے پہر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کا حکم دیا، کیونکہ خود انھیں علامت ظاہر ہونے پر اللہ کی طرف سے یہی حکم تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴾ [ آل عمران : ٤١ ] "اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح بیان کر۔"

**آیت 12** يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ......: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بہت سی وہ باتیں چھوڑ دیں جو خود ہی سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، کچھ سمجھدار ہوئے تو والد کے جانشین کے طور پر تیار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ اے یحییٰ! تورات کو قوت کے ساتھ پکڑو، یعنی اسے حفظ کرو، معانی و مطالب سمجھو، اس پر عمل کرو اور اس کے احکام پوری قوت کے ساتھ اپنے آپ پر اور پوری قوم پر نافذ کرو۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں بچپن ہی میں فیصلہ کرنے کی

وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ ع

اور اپنی طرف سے بڑی شفقت اور پاکیزگی (عطا کی) اور وہ بہت بچنے والا تھا ﴿۱۳﴾ اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بہت نیک سلوک کرنے والا تھا اور وہ سرکش، نافرمان نہ تھا ﴿۱۴﴾ اور سلام اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن فوت ہوگا اور جس دن زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا ﴿۱۵﴾

قوت عطا فرما دی اور وہ نوعمری ہی میں اپنے والد کے علم و فضل، بنی اسرائیل کی سیادت اور وحی و نبوت کے وارث بن گئے اور پوری قوت سے بنی اسرائیل کو تورات پڑھانے اور فیصلے کرنے لگے۔ والد کمزور تھے اور یہ نوجوان، سو والد کی جگہ لوگوں کو کتاب کا علم سکھانے لگے۔ اگر کوئی کہے کہ بچپن میں یہ کیسے ہو سکتا ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ نبوت کا سارا معاملہ خرقِ عادت یعنی دنیا کے عام معمول، عادت اور دستور کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اس خرقِ عادت پر بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

**آیت 13** وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا ...... : "حَنَانًا" کا عطف "اَلْحُكْمَ" پر ہے، یعنی ہم نے اسے حکم (قوتِ فیصلہ) اور بڑی شفقت اور پاکیزگی عطا کی۔ "حَنَانًا" اور "زَكٰوةً" پر تنوین تفخیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "بڑی شفقت اور پاکیزگی" کیا ہے۔ پاکیزگی سے مراد اخلاق و کردار کی پاکیزگی ہے جو گناہوں سے بچنے سے حاصل ہوتی ہے۔ "تَقِيًّا" "وَقٰى يَقِيْ" سے "فَعِيْلٌ" کے وزن پر ہے، پہلی واؤ کو تاء سے بدل دیا گیا ہے، یعنی اللہ کی نافرمانی سے بہت بچنے والا تھا۔ "مِنْ لَّدُنَّا" اپنے پاس سے، یعنی یہ حکم حنان اور زکوٰۃ کسی اور کے پاس ہیں ہی نہیں، صرف ہمارے پاس ہیں اور ہم ہی نے اپنے پاس سے انھیں عطا کیے۔

**آیت 14** وَبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ ...... : آرزوؤں اور امنگوں سے پیدا ہونے والی اولاد عموماً مغرور، سرکش اور نافرمان ہوتی ہے، یحییٰ علیہ السلام ایسے نہ تھے، بلکہ ماں باپ کے ساتھ بہت نیک سلوک کرنے والے تھے۔ وہ نہ سرکش تھے اور نہ اپنے والدین یا اپنے رب کی نافرمانی کرنے والے تھے۔ ظاہر یہ ہے کہ "عَصِيًّا" "عَصٰى يَعْصِيْ" سے "فَعُوْلٌ" کے وزن پر ہے، تعلیل کے بعد "عَصِيًّا" بن گیا۔ "فَعِيْلٌ" کے وزن پر بھی ہو سکتا ہے، دونوں وزن مبالغہ کے لیے ہیں۔ (شنقیطی)

**آیت 15** ① وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ ...... : یعنی ان تینوں وقتوں میں وہ ہر پریشانی سے سلامت رہیں گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "اللہ جو بندے پر سلام کہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس پر کچھ پکڑ نہیں۔" (موضح) سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "أَوْحَشُ مَا يَكُوْنُ الْخَلْقُ فِيْ ثَلَاثَةِ مَوَاطِنَ يَوْمَ يُوْلَدُ فَيَرٰى نَفْسَهٗ خَارِجًا مِمَّا كَانَ فِيْهِ وَيَوْمَ يَمُوْتُ فَيَرٰى قَوْمًا لَمْ يَكُنْ عَايَنَهُمْ وَيَوْمَ يُبْعَثُ فَيَرٰى نَفْسَهٗ فِيْ مَحْشَرٍ عَظِيْمٍ قَالَ فَأَكْرَمَ اللّٰهُ فِيْهَا يَحْيَى بْنَ زَكَرِيَّا فَخَصَّهٗ بِالسَّلَامِ عَلَيْهِ" [ طبري : ۲۳۷۵۱، بسند صحيح ] "آدمی سب سے زیادہ خوف زدہ تین مواقع پر ہوتا ہے، جس دن پیدا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اس جگہ سے نکلتے ہوئے دیکھتا ہے جہاں وہ تھا اور جس دن فوت ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جنھیں اس نے نہیں

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾

اور کتاب میں مریم کا ذکر کر، جب وہ اپنے گھر والوں سے ایک جگہ میں الگ ہوئی جو مشرق کی جانب تھی ﴿۱۶﴾ پھر اس نے ان کی طرف سے ایک پردہ بنا لیا تو ہم نے اس کی طرف اپنا خاص فرشتہ بھیجا تو اس نے اس کے لیے ایک پورے انسان کی شکل اختیار کی ﴿۱۷﴾

دیکھا تھا اور جس دن وہ زندہ کیا جائے گا اور اپنے آپ کو بہت بڑے محشر (اکٹھ) میں دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں وقتوں میں یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو عزت بخشی اور انھیں سلامت رکھنے کی خاص نعمت عطا فرمائی۔"

② یحییٰ علیہ السلام کے کچھ اوصاف حمیدہ اس سے پہلے سورۂ آل عمران (۳۹) میں گزر چکے ہیں۔

**آیت 16** ① وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ : زکریا اور مریم علیہما السلام کے واقعات میں مناسبت کی وجہ سے ان کا ذکر سورۂ آل عمران (۳۵ تا ۴۰)، سورۂ انبیاء (۸۹ تا ۹۱) اور یہاں اکٹھا آیا ہے، کیونکہ ان میں کئی طرح سے مناسبت ہے۔ مریم علیہا السلام کی کرامت بے موسم پھل دیکھ کر زکریا علیہ السلام کے دل میں بے وقت اولاد کی خواہش اور امید پیدا ہوئی۔ پھر زکریا علیہ السلام کو خلاف عادت بیٹا عطا ہوا اور مریم علیہا السلام کے ہاں ان سے بھی بڑھ کر خلاف عادت بیٹا پیدا ہوا۔ دونوں قصے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی دلیل ہیں۔

② اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا : "نَبْذٌ" کا معنی پھینکنا ہے۔ "اِنْتَبَذَتْ" الگ ہوئی، یعنی بالکل الگ ہو گئی، گویا اس نے اپنے آپ کو گھر والوں سے دور پھینک دیا۔ یاد رہے کہ مریم علیہا السلام کو ان کی والدہ نے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کیا تھا اور وہ اپنے بہنوئی زکریا علیہ السلام کی کفالت میں وہاں مصروف عبادت رہتی تھیں۔ حدیث معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو خالہ زاد بھائی فرمایا۔ مریم علیہا السلام کی نیکی، پاکیزگی اور شرافت ضرب المثل تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَمَلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا آسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَ إِنَّ فَضْلَ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قوله تعالى : ﴿ وضرب الله مثلا ...... ﴾ : ۳۴۱۱۔ مسلم : ۲۴۳۱ ] "مردوں میں بہت سے کامل ہوئے ہیں اور عورتوں میں سے کامل نہیں ہوئیں مگر فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنت عمران اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر اس طرح ہے جیسے ثرید (گوشت کے سالن میں بھگوئی ہوئی روٹی) کی فضیلت تمام کھانوں پر۔" علیحدہ ہونے کا مطلب بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ایام آنے کی وجہ سے الگ ہوئیں اور بعض نے فرمایا کہ عبادت کے لیے مکمل تنہائی کی خاطر الگ ہوئیں، بظاہر ان دونوں میں سے کوئی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وجہ بیان نہیں فرمائی۔ اصل حقیقت وہی بہتر جانتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نصاریٰ نے مشرق کو اسی لیے قبلہ بنا لیا کہ مریم علیہا السلام کے ہاں مسیح علیہ السلام کی پیدائش بیت المقدس کی مشرقی جانب میں ہوئی۔ [ طبري و صححه ابن حجر : ۲۳۷۵۶ ]

**آیت 17** ① فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا : ایام سے فارغ ہونے پر غسل کے لیے پردہ تان لیا، یا عبادت میں

قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖۗ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ﴿۱۹﴾

اس نے کہا بے شک میں تجھ سے رحمان کی پناہ چاہتی ہوں، اگر تو کوئی ڈر رکھنے والا ہے ﴿۱۸﴾ اس نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں ﴿۱۹﴾

مکمل تنہائی کے لیے۔

❷ فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا : روح سے مراد یہاں جبریل علیہ السلام ہیں، جیسا کہ سورۂ شعراء (۱۹۳) اور سورۂ قدر (۴) میں انھی کے متعلق روح کا لفظ آیا ہے۔ اگرچہ ہر روح کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر جبریل علیہ السلام کو خاص طور پر اپنا قرار دینے میں ان کی شان کی بلندی کا اظہار ہے، جیسا کہ ہر گھر اور ہر اونٹنی اللہ کی ملکیت ہے، مگر بیت اللہ اور ناقۃ اللہ کی شان انوکھی ہے۔ اس لیے "رُوْحَنَا" کا ترجمہ "اپنا خاص فرشتہ" کیا ہے۔

❸ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا : "سَوِیًّا" پورے اعضا والا تندرست (انسان)۔ جبریل علیہ السلام انسان کی شکل میں اس لیے آئے کہ مریم علیہا السلام کے لیے انھیں ان کی اصل صورت میں دیکھنا شدید خوف کا باعث یا ناقابل برداشت ہوتا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زندگی میں جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں صرف دو بار دیکھا ہے۔ دیکھیے سورۂ نجم (۵ تا ۱۸) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتے اللہ کے حکم سے اپنی شکل بدل سکتے ہیں۔

**آیت 18** قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ...... : تنہائی میں ایک کامل حسین و جوان مرد کو دیکھ کر مریم علیہا السلام سخت گھبرا گئیں کہ کہیں اس کی نیت بری نہ ہو۔ اس لیے بچاؤ کا کوئی اقدام کرنے سے پہلے اس ذات کی پناہ پکڑی جس کے رحم کی کوئی حد نہیں، تاکہ وہ اپنی بندی پر رحم فرما کر اس کی عصمت محفوظ رکھے۔ ساتھ ہی اس مرد کو اللہ کا خوف دلایا کہ اگر تجھ میں اللہ تعالیٰ کا ذرا برابر بھی ڈر ہے تو میں تجھ سے رحمان کی پناہ پکڑتی ہوں۔ "تَقِیًّا" کو نکرہ لانے سے یہ مفہوم پیدا ہوا کہ اگر تجھ میں کسی بھی قسم کا اللہ کا خوف ہے، کیونکہ اللہ کا خوف انسان کو برائی سے ہٹا دیتا ہے۔

**آیت 19** قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ...... : جبریل علیہ السلام نے کہا کہ میں تو تیرے اسی رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں جس کی تو پناہ پکڑ رہی ہے، تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ بعض شرک کے بیمار یہاں سے کشید کرتے ہیں کہ دیکھو! جبریل بیٹا دے سکتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو لفظ "رَسُوْلُ" میں ان کی غلط فہمی کا علاج موجود ہے۔ قاصد کا اپنا کچھ نہیں ہوتا، اسے جو پیغام یا جو چیز دے کر بھیجا جاتا ہے وہ اسے وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں اسے حکم ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ صاف الفاظ میں عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلمہ "كُنْ" کے ساتھ پیدا کرنے کا ذکر فرمایا، دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۹) چونکہ وہ چیز قاصد کے ہاتھ بھیجی گئی ہوتی ہے، اس لیے بعض اوقات وہ اس کی نسبت اپنی طرف کر دیتا ہے، جیسا کہ یہاں جبریل علیہ السلام نے پاکیزہ لڑکا عطا کرنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی، حالانکہ عطا وہ بھیجنے والے ہی کی تھی۔ مشہور سات قراء میں سے ابو عمرو بن

قَالَتۡ اَنّٰی یَكُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ وَّ لَمۡ اَكُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجۡعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِیًّا ﴿۲۱﴾

اس نے کہا میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا، جب کہ مجھے نہ کسی بشر نے چھوا ہے اور نہ میں کبھی بدکار تھی ﴿۲۰﴾ اس نے کہا ایسے ہی ہے، تیرے رب نے کہا ہے یہ میرے لیے آسان ہے اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی اور اپنی طرف سے عظیم رحمت بنائیں اور یہ شروع سے ایک طے کیا ہوا کام ہے ﴿۲۱﴾

---

العلاء بصری کی قراءت "لِيَهَبَ لَكِ" ہے، جس کا معنی ہے کہ میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ وہ تجھے ایک لڑکا عطا کرے۔ (ابن کثیر) جس طرح دوسرے چھ قاریوں کی قراءت کے صحیح ہونے پر امت کا اتفاق ہے اسی طرح ابوعمرو بن العلاء بصری کی قراءت صحیح ہونے پر بھی امت کا اتفاق ہے۔ اس قراءت سے دوسری قراءت کی بھی تفسیر ہوگئی کہ اصل عطا اللہ تعالیٰ کی ہے۔ رسول ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت جبریل علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔

**آیت 20** قَالَتۡ اَنّٰی یَكُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ ...... : "بَغِيًّا" کا معنی زانیہ ہے، اس کی جمع "بَغَايَا" اور مصدر "بِغَاءٌ" ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ﴾ [ النور : ۳۳ ] "اور اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔" مریم علیہا السلام نے کہا کہ اولاد کے لیے تو مرد اور عورت کا ملنا ضروری ہے، جبکہ مجھے نہ کسی بشر نے نکاح کے ساتھ چھوا ہے اور نہ میں بدکار ہوں۔ "لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ" میں اگرچہ نکاح یا زنا کسی بھی طریقے سے کسی مرد کے چھونے کی نفی ہے اور یہی معنی سورۂ آل عمران (۴۷) میں مراد ہے، مگر یہاں زنا کے مقابلے میں آنے کی وجہ سے چھونے کا مطلب نکاح کے ساتھ چھونا ہے۔

**آیت 21** ① قَالَ كَذٰلِكِ : جبریل علیہ السلام نے کہا، ایسے ہی ہوگا کہ نکاح یا زنا کے بغیر ہی تمھیں بیٹا عطا ہوگا۔

② قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ : مزید کہا کہ تیرے رب نے فرمایا ہے کہ کسی مرد کے بغیر تجھے بیٹا دینا میرے لیے بالکل آسان ہے۔

③ وَ لِنَجۡعَلَهٗۤ ...... : واؤ کے بعد یہاں الفاظ محذوف ہیں، یعنی اور (ہم نے اس طرح کیا) تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی بہت بڑی نشانی اور معجزہ بنائیں کہ ہم صرف عورت سے بھی انسان پیدا کر سکتے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے تین نشانیاں موجود ہیں کہ ماں باپ کے بغیر انسان (آدم علیہ السلام)، ماں کے بغیر انسان (حوا علیہا السلام) اور ماں باپ دونوں کے ساتھ انسان۔ تینوں ہماری قدرتِ کاملہ کا اظہار ہیں، اب اس سے ہماری قدرت کی چوتھی نشانی بھی پوری ہوگئی۔ چاروں میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا، انسان تو دور، ایک مکھی پیدا کرنا بھی کسی کے بس میں نہیں۔ دیکھیے سورۂ حج (۷۳) اس لحاظ سے ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کی دلیل ہے ؎

وَ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ    تَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ وَاحِدٌ

شرک کے بیماروں کو دیکھیے، وہ مسیح علیہ السلام کا خالق جبریل علیہ السلام کو قرار دے رہے ہیں۔ [ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَافَانَا مِنْ

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

پس وہ اس (لڑکے) کے ساتھ حاملہ ہوگئی تو اسے لے کر ایک دور جگہ میں الگ چلی گئی ﴿۲۲﴾ پھر دردِ زہ اسے کھجور کے تنے کی طرف لے آیا، کہنے لگی اے کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بھلائی ہوتی ﴿۲۳﴾

بِلِلّٰهِ الْاِشْرَاكِ بِهٖ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ]

۵ وَ رَحْمَةً مِّنَّا : اور اسے اپنی طرف سے عظیم رحمت بنائیں بنی اسرائیل کے لیے اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے بھی، کیونکہ مسیح علیہ السلام نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی اور آپ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی کا حکم دیا، اس طرح وہ ان کے لیے جہنم سے نجات اور جنت میں داخلے کا باعث بنے۔ "اٰيَةً" اور "رَحْمَةً" میں تنوین تعظیم و تفخیم کے لیے ہے، لہٰذا ترجمہ بہت بڑی نشانی اور عظیم رحمت کیا گیا ہے۔

۶ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا : "مَقْضِيًّا" "قَضٰى يَقْضِيْ" کا اسم مفعول ہے، جو اصل میں "مَقْضُوْيٌ" تھا، معنی فیصلہ کیا ہوا۔ "كَانَ" ہمیشگی کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "شروع سے طے کیا ہوا" کیا ہے، یعنی یہ بات تقدیر میں طے ہو چکی ہے، کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔

**آیت 22** فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا : "قَصِيًّا" "قَصِيَ يَقْصَى قُصُوًّا" "رَضِيَ يَرْضَى" کی طرح ناقص واوی "عَلِمَ يَعْلَمُ" سے ہے۔ "قَصِيًّا" أَيْ بَعِيْدًا " یعنی دور۔ "فَحَمَلَتْهُ" جبریل علیہ السلام کے یہ کہنے اور ان میں روح پھونکنے کے بعد وہ حاملہ ہو گئیں۔ روح پھونکنے کی کیفیت کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۹۱) اور سورۂ تحریم (۱۲) حاملہ ہونے کے بعد فطری تقاضے کے مطابق حمل کی مدت پوری کرنے کے دوران لوگوں کے طعن و ملامت سے بچنے کے لیے وہ بیت المقدس سے دور ایک مقام پر منتقل ہو گئیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے وہب کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ بیت اللحم میں منتقل ہوئیں، جو بیت المقدس سے آٹھ میل دور تھا اور وہیں عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ نصاریٰ اس میں کوئی شک نہیں کرتے۔ مگر وہب کا قول اسرائیلیات ہی سے ماخوذ ہے، نہ اس کے صحیح ہونے کا یقین ہو سکتا ہے اور نہ نصاریٰ کے کہنے کا۔ البتہ اکثر علماء کا کہنا یہی ہے۔ حمل کے کتنا عرصہ بعد عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ بس حمل ہونے کی دیر تھی کہ اس کے ساتھ ہی ولادت ہو گئی۔ [illegible] تو مشکل نہیں مگر یہ بات کسی قابل اعتماد ذریعے سے نہیں آئی اور وحی الٰہی کے بغیر کسی واقعہ کے متعلق سیکڑوں برس بعد اگر کوئی شخص سنی سنائی بات بیان کرے تو خواہ وہ کتنا عظیم ہو، وہ بات یقین کی ٹھنڈک نہیں پہنچا سکتی۔ اس لیے ظاہر یہی ہے کہ حمل کی عام مدت پوری ہوئی اور جمہور مفسرین کا قول بھی یہی ہے۔

**آیت 23** ① فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ ...... : "جَاءَ يَجِيْءُ مَجِيْئًا" کا معنی ہے آنا اور "أَجَاءَ يُجِيْءُ" (افعال) کا معنی ہے لانا، مگر اس کے مفہوم میں مجبور کر کے لانا پایا جاتا ہے۔ (زمخشری) "اَلْمَخَاضُ" عورت کو بچے کی پیدائش کے وقت ہونے

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

تو اس نے اسے اس کے نیچے سے آواز دی کہ غم نہ کر، بے شک تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی (جاری) کر دی ہے ﴿۲۴﴾

والا درد، یعنی درد زہ۔ "مَخِضَتِ الْمَرْأَةُ" (ع) جب عورت کے ہاں پیدائش کا وقت قریب ہو۔ یہ "مَخْضٌ" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی شدید حرکت ہے اور یہ نام رکھنے کی وجہ ولادت کے قریب ماں کے پیٹ میں بچے کا شدت سے حرکت کرنا ہے۔ یعنی درد زہ کی شدت سے مجبور ہو کر وہ کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور آنے والے وقت کا تصور کر کے، جب ہر طرف سے برائی کی تہمت لگے گی، طعنے ملیں گے، گزشتہ زندگی کی ساری نیکی، پاک بازی اور شرافت کا خاکہ اڑایا جائے گا، کہنے لگیں کہ اے کاش! میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور کسی کو یاد ہی نہ ہوتا کہ کوئی مریم بھی تھی۔

❷ یہ آیت دلیل ہے کہ دین میں فتنے کے وقت موت کی تمنا جائز ہے۔ حدیث میں کسی تکلیف مثلاً مرض یا فقر وغیرہ کی وجہ سے موت کی تمنا سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا کسی تکلیف کی وجہ سے جو اسے پہنچے، ہرگز نہ کرے، اگر اسے ضرور ہی کرنی ہے تو یوں کہے: « اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ » [ بخاري، المرضى، باب تمني المريض الموت : ٥٦٧١ ] "اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندہ رہنا میرے لیے بہتر ہو اور مجھے فوت کر لے جب وفات میرے لیے بہتر ہو۔"

**آیت 24** فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ ......: "سَرِيًّا" "سَرٰى يَسْرِيْ" (ض) (چلنا) سے ہو تو معنی ہے ندی، کیونکہ اس میں پانی چلتا ہے اور "سَرُوَ يَسْرُوْ" (شَرُفَ يَشْرُفُ) سے ہو تو معنی ہے سردار۔ مریم علیہا السلام کو ان کے نیچے سے کس نے آواز دی؟ اس کے متعلق مفسرین کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے قوم کے طعن و ملامت کے وقت ہی بات کی تھی۔ طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ یہ جبریل تھے اور عیسیٰ علیہ السلام نے قوم کے پاس لے جانے سے پہلے کلام نہیں کیا۔ مگر یہ روایت عوفی کے طریق سے ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ سعید بن جبیر، ضحاک، عمرو بن میمون اور قتادہ کا کہنا بھی یہی ہے کہ انھیں نیچے سے جبریل علیہ السلام نے آواز دی تھی اور ان کے نیچے ایک ندی چلنے کی بشارت دی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ انھیں ان کے نیچے سے عیسیٰ علیہ السلام نے آواز دی تھی۔ ابن جریر نے اسے ترجیح دی ہے۔ اس کی تین وجہیں ہیں، ایک یہ کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو ضمیر قریب ترین مرجع کی طرف لوٹتی ہے اور یہاں اس سے پہلے قریب ترین ذکر عیسیٰ علیہ السلام کا ہے، یعنی "فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ" اور اگر جبریل علیہ السلام نے آواز دی ہوتی تو ان کا نام آنا تھا۔ دوسری یہ کہ اس وقت مریم علیہا السلام کا حوصلہ مضبوط کرنے کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا اس وقت بولنا ایک معجزہ تھا، جس سے انھیں اطمینان حاصل ہوا۔ تیسری یہ کہ قوم کے پاس جانے سے پہلے ان کے کلام کرنے سے مریم علیہا السلام کو یقین ہو جائے کہ قوم کے لوگوں کی ملامت کے وقت بھی یہ بول کر ان کی تسلی کر دیں گے۔ بظاہر ابن جریر کی بات زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گی ﴿۲۵﴾ پس کھا اور پی اور ٹھنڈی آنکھ سے رہ، پھر اگر کبھی تو آدمیوں میں سے کسی کو دیکھے تو کہہ میں نے تو رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، سو آج میں ہرگز کسی انسان سے بات نہیں کروں گی ﴿۲۶﴾

آیت 26،25 ① وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ ...... : "قَرِّيْ عَيْنًا" مشہور نحوی فراء نے فرمایا کہ قریش اور ان کے آس پاس کے لوگ "قَرَّ يَقَرُّ" (قاف کے فتحہ کے ساتھ) کہتے ہیں اور قیس، تمیم اور اہل نجد "قَرَّ يَقِرُّ" (قاف کے کسرہ کے ساتھ) کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں "قَرِّيْ" قاف کے فتحہ کے ساتھ ہوگا جو مشہور قراءت ہے، دوسری صورت میں قاف کے کسرہ کے ساتھ "قِرِّيْ" ہوگا جو شاذ قراءت ہے۔ مصدر "قُرَّةٌ وَ قُرُوْرٌ" ہے، ٹھنڈا ہونا۔ (بقاعی) تنہائی، بھوک، پیاس، ولادت کی تکلیف، ولادت کے بعد کی کمزوری اور بدنامی کے خوف میں سے ہر چیز کا اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر بہترین علاج فرما دیا۔ ایک کمزور خاتون جو ابھی ولادت کے جان شکن مرحلے سے نکلی ہو، کھجور کے تنے کو کس قدر حرکت دے سکتی ہے؟ مگر فرمایا کہ اسے حرکت دو، وہ تازہ پکی ہوئی کھجوریں تم پر گرائے گی۔ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ وہ کھجوروں کے پھل دینے کا وقت نہ تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو، کیونکہ مریم علیہا السلام کو ان کے کمرے میں بے موسم رزق ملتا تھا، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۳۷) لیکن اگر کھجوروں کے پھل کا موسم بھی مانا جائے تو کوئی جوان اور مضبوط آدمی کھجور کا تنا ہلا کر دیکھ لے کہ کتنی کھجوریں گرتی ہیں؟ ولادت کی کمزوری کے لیے تمام اطباء تازہ پکی ہوئی کھجور کے مفید ہونے پر متفق ہیں۔ پینے کے لیے ان کے نیچے رب تعالیٰ نے ندی جاری فرما دی۔ تنہائی اور پریشانی کے علاج کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک، خوبصورت اور عظیم المرتبت بیٹا عطا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تمام عنایات عام عادت کے خلاف معجزانہ طور پر ہوئیں۔ رہی آئندہ کی ملامت جو قوم کے پاس جانے کی صورت میں پیش آنے والی تھی، اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ اگر کسی بھی وقت کوئی آدمی دیکھو تو اسے اشارے سے کہہ دو کہ میں نے رحمان کی خاطر روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے میں کسی انسان سے کسی صورت بات نہیں کروں گی۔ کسی بھی وقت کسی انسان کو دیکھنے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے عمل کے دوران وہ تنہا رہیں۔

② اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا : چونکہ شادی کے بغیر بچہ پیدا ہونے پر ملامت کرنے والوں کا کسی طرح کی صفائی دینے سے بھی مطمئن ہونا ممکن نہ تھا، اس لیے ان کے جواب میں مکمل خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ جاہلوں کے جواب میں دانش مند لوگوں کا یہی وتیرہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ [ الفرقان : ۶۳ ] "اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔" عربی کا مقولہ ہے: "أَذَلُّ النَّاسِ سَفِيْهٌ لَا يَجِدُ مُسَافِهًا" کہ سب

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

پھر وہ اسے اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس لے آئی، انھوں نے کہا اے مریم! یقیناً تو نے تو بہت انوکھا کام کیا ہے ﴿۲۷﴾ اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں کوئی بدکار تھی ﴿۲۸﴾

سے زیادہ ذلیل وہ بے وقوف ہے جسے اپنے جواب میں کوئی بے وقوفی کرنے والا نہ ملے۔

❸ فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا : اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں خاموشی کا روزہ رکھنا جائز تھا، مگر ہماری شریعت میں اس سے منع کر دیا گیا، بلکہ اس طرح کی نذر ماننا بھی منع ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: « بَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ إِذَا هُوَ بِرَجُلٍ قَائِمٍ فَسَأَلَ عَنْهُ فَقَالُوْا أَبُوْ إِسْرَائِيْلَ نَذَرَ أَنْ يَّقُوْمَ وَلَا يَقْعُدَ وَلَا يَسْتَظِلَّ وَلَا يَتَكَلَّمَ وَيَصُوْمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَقْعُدْ وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ » [ بخاري، الأيمان والنذور، باب النذر فيما لا يملك و في معصية : ۶۷۰۴ ] ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، اس دوران میں آپ نے ایک آدمی کو کھڑے ہوئے دیکھا تو اس کے متعلق پوچھا، لوگوں نے بتایا کہ یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ دھوپ میں کھڑا رہے گا، سائے میں نہیں جائے گا اور کلام نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسے حکم دو کہ بیٹھ جائے اور سائے میں بھی جائے اور کلام کرے اور اپنا روزہ پورا کرے۔“ ”فَاِمَّا“ میں ”اِنْ“ شرطیہ اور ”مَا“ ابہامیہ برائے تاکید ہے، اس لیے ترجمہ ”اگر کبھی“ کیا ہے۔



آیت 27 ❶ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ : اپنے بچے کی بات سن کر اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ کرامات دیکھ کر مریم علیہا السلام کو اطمینان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل نہیں ہونے دے گا۔ چنانچہ وہ ایام نفاس گزرنے اور طبیعت بحال ہونے کے بعد کسی جھجک کے بغیر اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے اپنے لوگوں کے پاس آ گئیں۔

❷ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔا فَرِيًّا : ” فَرٰى يَفْرِىْ “ (ض) کا معنی چمڑے کو قطع کرنا ہے۔ ”فَرِيًّا“ بروزن ”فَعِيْلٌ“ بمعنی فاعل یا مفعول ہے، قطع کرنے والی یا قطع کی ہوئی، یعنی عام عادت اور معمول کے خلاف چیز، اس لیے اس کا معنی بعض نے عظیم، بعض نے عجیب اور بعض نے منکر یعنی انوکھی کیا ہے۔ بہتان کو بھی افترا کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی واقعہ کے خلاف ہوتا ہے۔ لفظی معنی ہے ”تو ایک انوکھی چیز کو آئی ہے“ یعنی تو نے ایک انوکھا کام کیا ہے۔ مراد کنواری کے ہاں بچے کی پیدائش ہے۔

آیت 28 ❶ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ...... : مریم علیہا السلام کے بھائی کا نام ہارون تھا جو اپنی نیکی اور شرافت میں مشہور تھا، یعنی ایسے صالح بھائی کی بہن، ایسے باپ کی بیٹی جو کسی طرح برا نہ تھا اور ایسی ماں کی بیٹی جس میں بدکاری کی کوئی خصلت نہ تھی، تو نے یہ کیا گل کھلا دیا؟ ان الفاظ میں وہ مریم علیہا السلام کو اشارتاً برائی سے متہم کر رہے تھے۔ ”کسی طرح برا“ اور ”بدکاری کی کسی خصلت والی“ کا مفہوم ”امْرَاَ سَوْءٍ“ اور ”بَغِيًّا“ کے نکرہ ہونے سے واضح ہو رہا ہے، جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝۲۹ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝۳۰

تو اس نے اس کی طرف اشارہ کر دیا، انھوں نے کہا ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے ۝۲۹ اس نے کہا بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے ۝۳۰

② عظیم پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا اور وہ بھی نبی تھے۔ اس آیت میں مذکور ہارون کو بعض اہل کتاب نے موسیٰ علیہ السلام کا بھائی ہارون سمجھ لیا اور اعتراض جڑ دیا کہ مریم علیہا السلام ہارون علیہ السلام کی بہن کیسے ہو سکتی ہیں، ان کے درمیان تو مدت دراز ہے۔ علمائے اسلام نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں، مثلاً یہ کہ ہارون علیہ السلام کی بہن سے مراد ہارون علیہ السلام جیسی نیک اور صالح خاتون ہے وغیرہ۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بعد وہ سب جواب محض تکلف ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس آیت میں مذکور ہارون مریم علیہا السلام کے بھائی تھے۔ یہ ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد بھی عمران تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ مریم اور ان کے بھائی ہارون کے والد بھی عمران تھے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران بھیجا تو وہاں کے لوگوں (نصاریٰ) نے کہا، یہ بتاؤ کہ تم جو پڑھتے ہو "يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ" (اے ہارون کی بہن!) موسیٰ علیہ السلام تو عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی مدت پہلے تھے۔ میں واپس آیا اور اس بات کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَلَا أَخْبَرْتَهُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا يُسَمُّوْنَ بِأَنْبِيَائِهِمْ وَالصَّالِحِيْنَ قَبْلَهُمْ» [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ مریم: ۳۱۵۵۔ مسلم: ۲۱۳۵ ] "تم نے انھیں یہ کیوں نہ بتایا کہ وہ لوگ اپنے سے پہلے انبیاء اور صالحین کے ناموں پر (اپنے بچوں کے) نام رکھتے تھے (یعنی مریم علیہا السلام کے بھائی کا نام ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا تھا)۔"

**آیت 29** فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ...... : مریم علیہا السلام نے خاموشی کے روزے کی وجہ سے اپنی پاکدامنی کی شہادت کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو۔ وہ سب کہنے لگے کہ ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے؟ یہاں "كَانَ" زمانہ حال تک استمرار (ہمیشگی) کے معنی میں ہے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ آئندہ آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کی گفتگو گود کے وقت کی گفتگو ہے۔ معجزات کے بعض منکروں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کی جوانی کی گفتگو قرار دیا ہے، مگر یہ آیات اور سورۂ آل عمران کی آیت (۴۶) عیسیٰ علیہ السلام کی گود میں گفتگو کی صریح دلیل ہیں۔ علاوہ ازیں صحیح حدیث میں تین بچوں کی گود میں گفتگو کا ذکر ہے جن میں سے ایک عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ [ بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب: ﴿ و اذکر فی الکتاب مریم...... ﴾ : ۳۴۳۶، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ]

**آیت 30** ① قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ : گویا سب سے پہلا کلمہ جو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان سے ادا کیا وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اعتراف تھا، جو ان کے خود اللہ تعالیٰ ہونے یا اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہونے یا تین معبودوں میں سے ایک ہونے کی صاف نفی ہے۔

② اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ: ظاہر ہے کہ کتاب اور نبوت کا ملنا کچھ مدت بعد ہی ہوا ہو گا، کیونکہ دودھ پیتا بچہ نبوت کے فرائض دعوت و

وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝۳۱ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۫ وَ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝۳۲

اور مجھے بہت برکت والا بنایا جہاں بھی میں ہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کی خاص تاکید کی، جب تک میں زندہ رہوں ۝۳۱ اور اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا (بنایا) اور مجھے سرکش، بدبخت نہیں بنایا ۝۳۲

تبلیغ، اصلاح امت وغیرہ کیسے ادا کر سکتا ہے؟ اس لیے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ ایک تو یہ کہ ازل سے اللہ تعالیٰ نے میرا نبی ہونا اور مجھے کتاب ملنا لکھ دیا ہے، جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: « كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ » [ صحيح الجامع للألباني : ٤٥٨١، عن ميسرة الفجر رضی اللہ عنہ ] ''میں اس وقت نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔'' حالانکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کو چالیس برس کی عمر میں نبوت عطا ہوئی، اس لیے مراد تقدیر میں نبی لکھا ہونا ہے۔ دوسرا معنی یہ کہ ماضی کا لفظ بول کر مستقبل مراد لیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اتنے یقینی ہیں کہ سمجھو واقع ہو چکے ہیں۔ یہ انداز بیان قرآن مجید میں عام ہے، جیسے قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [ النحل : ١ ] ''اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلدی آنے کا مطالبہ مت کرو۔'' اسی طرح سورۂ زمر کی آیت (۶۸) میں ماضی کے چاروں صیغے مستقبل کے معنی میں ہیں۔

**آیت 31** ❶ وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ : ''مُبٰرَكًا'' یہاں باب مفاعلہ مقابلے کے معنی میں نہیں بلکہ مبالغہ کے لیے ہے، یعنی بہت برکت والا۔ برکت کا معنی خیر کثیر ہے جو ''بِرْكَةٌ'' سے ہے، جس کا معنی تالاب ہے جس میں بہت پانی ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے لوگوں کے لیے بہت خیر و برکت اور نفع پہنچانے والا بنایا ہے۔

❷ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ : نماز اور زکاۃ کی خاص تاکید کی وجہ کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۵، ۱۱) اس آیت سے معلوم ہوا کہ نماز، زکاۃ اور شریعت کے دوسرے احکام موت تک کسی کو معاف نہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی فوت ہونے تک عبادت کا حکم ہوا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [ الحجر : ۹۹ ] ''اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین (موت) آ جائے۔'' موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملی تو توحید کی تاکید کے بعد نماز کا حکم ہوا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۴) ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے نماز کا پابند رہنے کی دعا کی۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۴۰) جب اولوالعزم پیغمبروں کو کسی صورت نماز معاف نہیں ہوئی تو بعض صوفیوں کو کیسے معاف ہو گئی اور پیغمبروں کو صرف دل کی نماز کافی نہیں ہوئی تو انھیں کیسے کافی ہو گئی؟ درحقیقت یہ لوگ اسی سورۂ مریم کی آیت (۵۹) کی حقیقی تصویر ہیں۔

❸ چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے یہ بات موجود تھی کہ کچھ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنائیں گے، اس لیے انھیں ساری زندگی نماز اور زکاۃ کا حکم دیا، تاکہ سب لوگ جان لیں کہ جو خود کسی معبود کے سامنے نماز پڑھتا ہے وہ کسی صورت معبود نہیں ہو سکتا۔ (بقاعی)

**آیت 32** ❶ وَ بَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ...... : دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۴) وہاں ''عَصِيًّا'' فرمایا اور یہاں ''شَقِيًّا''، معلوم ہوا کہ

وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور خاص سلامتی ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن فوت ہوں گا اور جس دن زندہ ہو کر اٹھایا جاؤں گا ﴿۳۳﴾ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم۔ حق کی بات، جس میں یہ شک کرتے ہیں ﴿۳۴﴾

---

والدین سے بدسلوکی کرنے والا شقی اور بدنصیب ہے، خصوصاً ایسی والدہ سے جو باپ اور ماں دونوں کی جگہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( رَغِمَ أَنْفُ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ قِيْلَ مَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ أَحَدَهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ )) [ مسلم، البر والصلة، باب رغم من أدرك أبويه أو أحدهما ...... : ۲۵۵۱، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ''اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو!'' پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! کون؟'' فرمایا: ''جس نے اپنے والدین میں سے ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا پھر جنت میں داخل نہ ہوا۔'' جنت میں داخلے سے محروم ہو جانے سے بڑھ کر کیا بدبختی ہوگی؟

② عیسیٰ علیہ السلام نے صرف والدہ کا نام لیا، تاکہ لوگوں کو ان کے باپ کے بغیر پیدا ہونے کا یقین ہو جائے اور والدہ کا ہر تہمت سے پاک ہونا ثابت ہو جائے۔

**آیت 33** ﴿ وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ ...... : دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۵) وہاں ''سَلٰمٌ'' اور یہاں ''السَّلٰمُ'' ہے، اس لیے ترجمہ ''خاص سلامتی'' کیا ہے۔ اس خاص سلامتی میں وہ خصوصیت بھی شامل ہے جو صرف عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو حاصل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ إِلَّا وَالشَّيْطَانُ يَمَسُّهُ حِيْنَ يُوْلَدُ فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ إِيَّاهُ إِلَّا مَرْيَمَ وَابْنَهَا ثُمَّ يَقُوْلُ أَبُوْ هُرَيْرَةَ وَاقْرَؤُوْا إِنْ شِئْتُمْ : ﴿ وَ اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ و إني أعيذها بك ...... ﴾ : ۴۵۴۸، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ''کوئی بچہ نہیں مگر اس کا حال یہ ہے کہ شیطان اسے پیدا ہوتے وقت چھوتا ہے تو وہ اس کے چھونے کی وجہ سے چلاتے ہوئے اونچی آواز سے روتا ہے، سوائے مریم کے اور اس کے بیٹے کے۔'' پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے: ''اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿ وَ اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ '' (یعنی مریم علیہا السلام کی والدہ نے دعا کی تھی کہ یا اللہ!) میں اس (مریم) کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔''

**آیت 34** ﴿ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ...... : ''قَوْلَ الْحَقِّ'' اصل میں ''اَلْقَوْلَ الْحَقَّ'' تھا، یعنی وہ بات جو حق اور سچ ہے، تخفیف کے لیے موصوف کو صفت کی طرف مضاف کر دیا، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سچ بات صرف وہ ہے جو یہاں خود ان کی زبانی بیان کر دی گئی کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے سچے رسول ہیں اور ان کا نسب ہر شک و شبہ اور ہر عیب سے پاک ہے۔ رہے ان کی والدہ اور ان پر تہمت تراشنے والے یہود اور انھیں رب قرار دینے والے نصاریٰ، تو ان کی بات محض شکوک و

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾

کبھی اللہ کے لائق نہ تھا کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے، وہ پاک ہے، جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس سے صرف یہ کہتا ہے کہ ''ہوجا'' تو وہ ہوجاتا ہے ﴿۳۵﴾ اور بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے، سو اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۳۶﴾ پھر ان گروہوں نے اپنے درمیان اختلاف کیا تو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، ایک بہت بڑے دن کی حاضری کی وجہ سے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۷﴾

---

شبہات پر مبنی ہے، اس میں حق کا کوئی شائبہ نہیں۔

**آیت 35** ① مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ...... : ''كَانَ'' استمرار کے لیے ہے، یعنی اللہ کے لائق نہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہے کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے۔ ''وَلَدٍ'' نکرہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ تھا ''کوئی اولاد'' لیکن اس سے پہلے ''مِنْ'' آنے کی وجہ سے عموم اور زیادہ ہوگیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے'' لڑکا یا لڑکی، کسی فرشتے کو یا جن کو، یا انسان کو یا کسی اور مخلوق کو۔

② يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ : یعنی جسے یہ قدرت حاصل ہو کہ کلمہ ''كُنْ'' سے ہر چیز وجود میں لا سکتا ہو، اسے بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے کی ضرورت تو اسے ہے جو بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے محتاج ہو، یا فنا ہونے والا ہو اور اسے وارث کی ضرورت ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت۔ پھر جب وہ آدم کو ''كُنْ'' کہہ کر پیدا کر سکتا ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی آدم علیہ السلام کی طرح ''كُنْ'' کہہ کر پیدا کر سکتا ہے، دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۹، ۶۰)۔

**آیت 36** وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ ...... : یہ گود میں عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا آخری حصہ اور خلاصہ ہے۔ اس کا عطف ''قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ'' پر ہے، یعنی انھوں نے کہا کہ بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس کے بعد اللہ کی عطا کردہ نعمتیں بیان کیں، درمیان میں ''ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ'' سے ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی اس بات ''وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ ......'' پر ان کا کلام مکمل ہوتا ہے۔ یعنی عبادت اسی کا حق ہے جو ہمارا رب ہے، میری اور تمھاری پرورش کرنے والا ہے، سو اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

**آیت 37** ① فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ : عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق حق بات تفصیل سے بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ پھر بنی اسرائیل سے باہر کے کسی گروہ نے نہیں بلکہ خود ان کے اپنے گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ ''مِنْۢ بَيْنِهِمْ'' میں اسی طرف اشارہ ہے۔ یہود نے انھیں ولد الزنا اور جادوگر قرار دیا اور نصاریٰ کئی گروہوں میں بٹ گئے، کسی نے کہا اللہ مسیح ہی تو

اَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَ اَبۡصِرۡ ۙ یَوۡمَ یَاۡتُوۡنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوۡنَ الۡیَوۡمَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۸﴾

کس قدر سننے والے ہوں گے وہ اور کس قدر دیکھنے والے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے، لیکن یہ ظالم آج کھلی گمراہی میں ہیں ﴿۳۸﴾

ہے۔ (مائدہ: ۷۲) کسی نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ (توبہ: ۳۰) کسی نے کہا مسیح تین (معبودوں) میں سے تیسرا ہے وغیرہ۔ مائدہ (۷۳) یہود نے ان کی شان گھٹانے کی کوشش کی تو نصاریٰ نے انھیں ان کی حد سے بڑھا دیا۔ ہاں اہلِ حق نے یہی کہا کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہود ان کی شان گھٹانے اور ان پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے کافر ہو گئے اور نصاریٰ ان کی شان میں غلو کی وجہ سے کافر ہو گئے، البتہ اہل حق ایمان پر قائم رہے۔

❷ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ...... : "فَوَیۡلٌ" پر تنوین (تہویل) یعنی اس کی ہولناکی کے اظہار کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "بڑی ہلاکت" کیا ہے۔ "مَّشۡهَدِ" یہاں راجح قول میں مصدر میمی ہے، یعنی اس عظیم دن میں حاضری کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے بہت بڑی ہلاکت ہے جنھوں نے کفر کیا، اگر اس دن کی حاضری نہ ہوتی تو یہ لوگ اس ہلاکت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف "ان لوگوں کے لیے" کہنے کے بجائے صراحت سے فرمایا: "ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا بہت بڑی ہلاکت ہے۔" معلوم ہوا کہ اس ویل کا باعث کفر ہے۔ یوم عظیم پچاس ہزار سال کا دن (معارج: ۴) اور اللہ کے سامنے حساب کے لیے پیش ہونے کا دن ہے۔ [ اَللّٰهُمَّ حَاسِبۡنَا حِسَابًا یَّسِیۡرًا ]

آیت 38 اَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَاَبۡصِرۡ ...... : یہ دونوں فعل تعجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ تعجب سے فرماتے ہیں کہ جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے تو وہ کس قدر سننے والے اور کس قدر دیکھنے والے ہوں گے۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے تعجب کرنے کو نہیں مانتے، کیونکہ تعجب تو انسان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ انسان جیسا تو نہیں کہ تعجب کرے۔ اس لیے وہ اس کی تاویل کرتے ہیں کہ ان کی حالت ایسی ہوگی کہ اس پر تعجب کیا جائے، اگرچہ ان کی حالت واقعی ایسی ہوگی مگر جب انسان کے سننے، دیکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کو بھی سننے دیکھنے والا مانتے ہیں تو اس کے تعجب کرنے میں کیا تعجب ہے۔ ہاں انسان کا سننا، دیکھنا اور تعجب اس کی ہستی کے مطابق ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا اس کی شان کے مطابق، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَیۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴾ [ الشورٰی: ۱۱ ] "اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔" لطف کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعجب کرنے کے منکر اس کے سمیع و بصیر ہونے اور دوسری صفات کے بھی منکر ہیں، مگر انکار ایسی تاویل کے پردے میں کرتے ہیں جو درحقیقت آیات و احادیث کی تحریف ہے۔ یعنی آج تو حق سے اندھے اور بہرے ہو رہے ہیں مگر آخرت میں ان کے کان اور آنکھیں خوب کھلی ہوں گی اور کہیں گے: ﴿ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَ سَمِعۡنَا ﴾ [ السجدۃ: ۱۲ ] "اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا" مگر اس وقت کا دیکھنا اور سننا کسی کام نہ آئے گا۔ "الظّٰلِمُوۡنَ" پر الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ "یہ ظالم" کیا گیا ہے۔

وَ اَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ اِذۡ قُضِيَ الۡاَمۡرُ ۘ وَ هُمۡ فِيۡ غَفۡلَةٍ وَّ هُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۹﴾
اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَ مَنۡ عَلَيۡهَا وَ اِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۴۰﴾

اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب (ہر) کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۳۹﴾ بے شک ہم، ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے اور ان کے بھی جو اس پر ہیں اور وہ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۴۰﴾

**آیت 39** ❶ وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ ...... : مراد قیامت کا دن ہے جس میں حسرت اور پچھتاوے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ زمر (۵۶)، انعام (۳۱) اور بقرہ (۱۶۷)۔

❷ اِذۡ قُضِيَ الۡاَمۡرُ وَهُمۡ فِيۡ غَفۡلَةٍ ...... : ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يُؤْتٰى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فَيُنَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا ؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ هٰذَا الْمَوْتُ وَكُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ ثُمَّ يُنَادِي يَا أَهْلَ النَّارِ ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا ؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ، هٰذَا الْمَوْتُ وَ كُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ فَيُذْبَحُ ثُمَّ يَقُوْلُ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ وَ يَا أَهْلَ النَّارِ ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ : ﴿ وَ اَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ اِذۡ قُضِيَ الۡاَمۡرُ وَهُمۡ فِيۡ غَفۡلَةٍ ﴾ وَهٰؤُلَاءِ فِيْ غَفْلَةٍ أَهْلُ الدُّنْيَا ﴿ وَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴾ » [ بخاري، التفسير، باب قوله عز وجل: ﴿ و أنذرهم يوم الحسرة ﴾: ۴۷۳۰ ]
”موت کو ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: ”اے جنت والو!“ تو وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے۔ وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے“ اور وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے، پھر وہ آواز دے گا: ”اے آگ والو!“ تو وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے، وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے“ اور وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے تو اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر وہ کہے گا: ”اے جنت والو! (اب) ہمیشگی ہے، کوئی موت نہیں اور اے آگ والو! (اب) ہمیشگی ہے، کوئی موت نہیں۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ اِذۡ قُضِيَ الۡاَمۡرُ وَهُمۡ فِيۡ غَفۡلَةٍ ﴾ (اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں) یعنی وہ سراسر دنیا کی غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔“
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موت کے ذبح کے ذکر کے بعد اس آیت کو پڑھنا دلیل ہے کہ ”قُضِيَ الۡاَمۡرُ“ (فیصلہ کر دیے جانے) سے مراد موت کا ذبح کر دیا جانا ہے۔ مسند احمد (۹/۳، ح: ۱۱۰۷۲) میں اسی حدیث کے شروع میں ہے کہ جب (تمام) جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے۔

**آیت 40** اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ ...... : اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ذکر تین دفعہ جمع متکلم کی ضمیر سے کیا ہے۔ دنیا کے بادشاہ بھی حکم دیتے وقت یا اپنی شان و شوکت کے اظہار کے وقت کہا کرتے ہیں کہ ”ہم حکم دیتے ہیں“ ”ہم یہ کریں گے“ وغیرہ، حالانکہ وہ اکیلے حکم دے رہے ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ جس کی عظمت کی کوئی حد نہیں، اکیلا

وَ اذۡكُرۡ فِي الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَ لَا يُبۡصِرُ وَ لَا يُغۡنِيۡ عَنۡكَ شَيۡـًٔا ﴿۴۲﴾

اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، بے شک وہ بہت سچا تھا، نبی تھا ﴿۴۱﴾ جب اس نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! تو اس چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تیرے کسی کام آتی ہے؟ ﴿۴۲﴾

ہونے کے باوجود اپنی عظمت کے اظہار کے لیے کیوں نہ فرمائے گا کہ بے شک ہم، ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے۔ اردو ترجمے میں ''ہی'' کا لفظ تیسرے ''ہم'' کی جگہ لگایا گیا ہے، جو لفظ ''نَرِثُ'' میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب فنا ہو جائیں گے اور ہمارے سوا ان کا وارث (پیچھے رہنے والا) کوئی نہ ہوگا۔

**آیت 41** ① وَ اذۡكُرۡ فِي الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ : اس سورت کا اصل موضوع توحید و نبوت اور حشر کے واقعات بیان کرنا ہے۔ توحید کے منکر دو قسم کے لوگ تھے، ایک یہود و نصاریٰ جنھوں نے عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے لیا اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو گئے، چنانچہ پچھلی آیات میں مریم اور مسیح علیہما السلام کا قصہ بیان کرکے ان کے غلط عقائد کی تردید فرمائی۔ دوسرے مشرکین عرب، جو بت پرستی میں مبتلا تھے اور اس غلط عقیدے کے باوجود ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم ہونے کے دعوے دار تھے۔ یہاں سے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرکے ان کی تردید مقصود ہے، تاکہ معلوم ہو کہ کس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم کو بت پرستی سے نکالنے کی کوشش کی اور بالآخر وطن اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر اللہ کی راہ میں ہجرت کی، مگر تم ہو کہ ایک طرف تو ان کی اولاد میں سے ہو اور ان کے دین پر ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہو، لیکن دوسری طرف بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو اور توحید کی آواز اٹھانے والوں کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر رہے ہو۔ اگر واقعی تم ابراہیم علیہ السلام کے دین کے پیرو ہو تو اس شرک پر عمل پیرا ہونے اور توحید پرستوں سے دشمنی کا کیا مطلب؟

② اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا : ''صِدِّيۡقًا'' ''صِدۡقٌ'' سے مبالغہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو صدیق اس لیے فرمایا کہ وہ بات میں بہت سچے تھے اور اپنے رب کے ساتھ معاملے میں بھی سچے تھے۔ اللہ کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا، آگ میں جلنے کو گوارا کرنا، وطن سے بے وطن ہونا، پردیس میں اپنی عزت و ناموس کے خطرے میں ہونے کو برداشت کرنا، بیوی بچے کو بے آباد سنگلاخ وادی میں چھوڑنا، اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم کی تعمیل، اسی (۸۰) برس کی عمر میں ختنے کا حکم ہونے پر فوراً عمل کرنا، یہ ان کے ہر معاملہ میں صدق کی چند مثالیں ہیں۔ ''صِدِّيۡقًا'' کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۶۹) اور یوسف (۴۶)۔

**آیت 42** ① ''يٰۤاَبَتِ'' کے معنی کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۴)۔

② اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ...... : اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا والد بت پرست تھا۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۷۴) ابراہیم علیہ السلام نے اسے نہایت ادب، نرمی، حسن اخلاق اور بہترین دلائل کے ساتھ بت پرستی ترک کرنے کی نصیحت کی کہ کہیں وہ بڑے پن اور ضد میں آکر حق سے انکار نہ کر دے۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے اس سے ان بتوں کو پوجنے کی وجہ پوچھی

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾

اے میرے باپ! بے شک میں، یقیناً میرے پاس کچھ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، اس لیے میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھے راستے پر لے جاؤں گا ﴿۴۳﴾ اے میرے باپ! شیطان کی عبادت نہ کر، بے شک شیطان ہمیشہ سے رحمان کا سخت نافرمان ہے ﴿۴۴﴾

---

کہ جن کی کسی عقل مند کے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، کجا یہ کہ ان کی عبادت کی جائے، جو تعظیم، محبت اور عاجزی کا انتہائی مرتبہ ہے۔ کیونکہ عبادت تو اس کی ہونی چاہیے جو ہر طرح سے دوسروں سے غنی ہو، کسی کا محتاج نہ ہو، سب نعمتوں کا مالک ہو، سب کو پیدا کرنے والا، رزق دینے والا ہو، زندگی، موت، ثواب اور عذاب کا مالک ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسے توجہ دلائی کہ صاحبِ عقل کو لازم ہے کہ جو بھی کرے کسی صحیح مقصد کے لیے کرے۔ کوئی بھی چیز یا شخص جو زندہ ہو، صاحب عقل ہو، سنتا دیکھتا ہو، کوئی فائدہ یا نقصان بھی پہنچا سکتا ہو مگر عدم سے وجود میں آیا ہو اور اس کا اختیار کسی اور کا عطا کردہ ہو تو عقل سلیم اس کی عبادت میں عار محسوس کرے گی، خواہ وہ کتنی اونچی مخلوق مثلاً انسان ہو یا فرشتہ، کیونکہ وہ خود اپنی ضروریات کے لیے اس ہستی کا محتاج ہے جو نہ اپنے وجود میں کسی کی محتاج ہے اور نہ اپنی بقا میں۔ پھر پتھر، لکڑی یا دھات کے بنے ہوئے بت یا مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی قبریں کہ جن میں زندہ لوگوں والی کوئی خوبی ہے ہی نہیں، جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں، نہ کسی کے کام آسکیں، ان کی عبادت کیوں؟

**آیت 43** ❶ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ ......: "مِنَ الْعِلْمِ" میں "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی کچھ علم۔ دوسری بات میں بھی ان کی نرمی، دانائی اور حسن ادب دیکھیے۔ ''ابا جی'' کے لقب کے ساتھ مخاطب کیا، یہ نہیں کہا کہ آپ حد درجہ کے جاہل ہیں اور مجھے اللہ تعالیٰ نے صدیقیت اور نبوت کا عظیم مرتبہ عطا کیا ہے، بلکہ یہ کہا کہ میرے پاس کچھ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا اور وہ ہے سیدھے راستے کا علم، اس لیے اس میں میرے پیچھے چلنے میں عار محسوس نہ کریں۔ بے شک آپ باپ ہیں مگر یوں سمجھیں کہ میں اور آپ ایک سفر پر ہیں، مجھے راستے کا علم ہے اور آپ کو نہیں، تو آپ کو باپ ہونے کے باوجود میرے پیچھے چلنا ہوگا، تاکہ میں آپ کو صحیح منزل تک پہنچا دوں اور آپ غلط راستے پر چل کر بھٹکتے نہ پھریں۔ (زمخشری)

❷ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا : "سَوِيًّا" "سَوِيَ يَسْوٰى" (ع) سے "فَعِيْلٌ" کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے، سیدھا برابر راستہ جس میں نہ زیادتی ہے کہ اس کی عبادت ہو جو اس کا حق دار نہیں اور نہ کمی کہ حق دار کی عبادت بھی نہ کی جائے۔ (قاسمی)

**آیت 44** يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ......: تیسری بات کی ابتدا بھی محبت اور ادب میں ڈوبے ہوئے الفاظ ''ابا جان'' سے کی اور اسے بت پرستی سے منع کرنے اور ہٹانے کے لیے اس کی حقیقی تصویر ایسی کھینچی کہ ہر عقلمند کو اس سے نفرت ہو جائے، یعنی

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝۴۵ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝۴۶

اے میرے باپ! بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تجھ پر رحمان کی طرف سے کوئی عذاب آ لگے، پھر تو شیطان کا ساتھی بن جائے ۝۴۵ اس نے کہا کیا بے رغبتی کرنے والا ہے تو میرے معبودوں سے اے ابراہیم!؟ یقیناً اگر تو باز نہ آیا تو میں ضرور ہی تجھے سنگسار کر دوں گا اور مجھے چھوڑ جا، اس حال میں کہ تو صحیح سالم ہے ۝۴۶

یہی نہیں کہ بت پرستی کسی بھی نفع سے خالی ہے، بلکہ اس میں بے حد نقصان ہے، کیونکہ یہ درحقیقت شیطان کی عبادت ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۷) کیونکہ وہی اس پر آمادہ کرتا اور اسے خوش نما بنا کر دکھاتا ہے، خود شیطان کی عبادت تو کوئی نہیں کرتا۔ "اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا" میں "اِنَّ" کے ساتھ شیطان کی عبادت سے منع کرنے کی وجہ بیان فرمائی، جو یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ سے تمھارے اس رب کا سخت نافرمان ہے جس کی رحمت کی کوئی حد نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناشکرے اور سخت نافرمان کی بات ماننے والا بھی سخت نافرمان ہوگا۔ ہمیشہ کا معنی "كَانَ" سے واضح ہو رہا ہے۔

**آیت 45** يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ ...... : چوتھی بات یہ کہ اسے بت پرستی کے برے انجام اور اس کے وبال اور عذاب سے ڈرایا اور اس میں بھی حسن ادب کو ملحوظ رکھا۔ صاف الفاظ میں یہ نہیں کہا کہ تم پر عذاب آ پڑے گا، بلکہ فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب آ لگے اور پھر تو شیطان کا ساتھی بن جائے۔ یہاں ''میں ڈرتا ہوں'' اور ''کوئی عذاب آ لگے'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں کہ وہ کتنی سخت بات کو کس قدر نرمی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔ پھر یہ بات کہ عذاب کا نتیجہ شیطان کا دوست اور ساتھی بننا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ شیطان کا ساتھی بننا عذاب سے بھی بدتر ہے۔ یہ آخری نصیحت بھی "يٰۤاَبَتِ" کے پیارے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ (زمخشری)

**آیت 46** ❶ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ : "رَغِبَ فِيْهِ" کا معنی رغبت کرنا اور "رَغِبَ عَنْهُ" کا معنی بے رغبتی کرنا ہوتا ہے۔ والد نے جواب میں بیٹے کی بات کا انکار کرتے ہوئے ہمزہ استفہام سے بات شروع کی کہ ''کیا بے رغبتی کرنے والا ہے تو میرے معبودوں سے اے ابراہیم!؟'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک بتوں سے بے رغبتی زیادہ قابل گرفت تھی، اس لیے "رَاغِبٌ" کا ذکر خبر ہونے کے باوجود پہلے کیا، رہا بیٹا تو شرک سے منع کرنے کی وجہ سے اسے "اَنْتَ" کے ساتھ مبتدا ہونے کے باوجود بعد میں مخاطب کیا اور ابراہیم کا نام ایسا قابلِ نفرت ٹھہرا کہ اسے سب سے آخر میں لیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیے کہ وہ ہر بات "يٰۤاَبَتِ" سے شروع کرتے ہیں، ادھر مشرک باپ کی خصوصی مہربانی دیکھیے کہ اس نے مخاطب کیا بھی تو آخر میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقیدے کی بنا پر پیدا ہونے والی دوستی اور دشمنی نسب کی وجہ سے پیدا ہونے والی دوستی اور دشمنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

❷ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ ...... : "تَنْتَهِ" اصل میں "تَنْتَهِيْ" تھا، "لَمْ" کی وجہ سے یاء گر گئی۔ "مَلِيًّا" کا معنی ہے صحیح

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

کہا تجھ پر سلام ہو، میں اپنے رب سے تیرے لیے ضرور بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ ہمیشہ سے مجھ پر بہت مہربان ہے ﴿۴۷﴾

سالم اور ایک دوسرا معنی ہے لمبی مدت۔ اگر تو بتوں کی تردید اور نفرت سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا، یعنی پتھر مار مار کر ختم کر دوں گا۔ تو مجھے چھوڑ کر صحیح سلامت نکل جا، ایسا نہ ہو کہ مجھ سے اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ لمبی مدت تک مجھے چھوڑ کر نکل جا کہ میں تمھاری شکل نہ دیکھوں۔

③ اس واقعہ میں ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے تسلی کا سامان موجود ہے، کیونکہ آپ کو بھی اپنے اقارب کی طرف سے ایسے ہی سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح حق کے ہر داعی کے لیے بھی تسلی ہے کہ اعلان حق پر اسے اپنے قریب ترین عزیزوں کی طرف سے شدید مخالفت کے سامنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ خصوصاً جب کفار دلیل کے سامنے لاجواب ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا غیظ و غضب حد سے گزر جاتا ہے، جیسے یہاں ابراہیم علیہ السلام سے لاجواب ہو کر باپ نے سنگسار کرنے کی دھمکی دے کر گھر سے نکال دیا۔ بتوں کو توڑنے کے بعد ان کے پروہت لاجواب ہوئے تو انھوں نے کہا: ﴿حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ﴾ [ الأنبياء : ٦٨ ] ”اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔“ لوط علیہ السلام کی قوم لاجواب ہوئی تو کہا: ﴿اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ﴾ [ الأعراف : ۸۲ ] ”انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔“ نوح علیہ السلام کی قوم نے لاجواب ہو کر کہا: ﴿لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾ [ الشعراء : ١١٦ ] ”اے نوح! یقیناً اگر تو باز نہ آیا تو ہر صورت سنگسار کیے گئے لوگوں میں سے ہو جائے گا۔“ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کے سامنے بے بس ہونے پر کہا تھا: ﴿لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ﴾ [الشعراء : ۲۹ ] ”یقیناً اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور ہی قید کیے ہوئے لوگوں میں شامل کر دوں گا۔“ کفار کی ان تمام دھمکیوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے دلائل ذکر فرمائے ہیں جو قابل دید ہیں اور ان کے جواب میں کفار کی بے بسی بالکل واضح ہے۔ ہمارے پیارے پیغمبر کے سامنے بھی جب کفار کی کوئی پیش نہ گئی تو انھوں نے آپ کو قتل، قید یا جلا وطن کرنے کی سازش کی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ﴾ [ الأنفال : ۳۰ ] ”اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے، تاکہ تجھے قید کر دیں، یا تجھے قتل کر دیں، یا تجھے نکال دیں۔“

**آیت 47** ① قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ : ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جاہل باپ کے اس سنگ دلانہ جواب کے مقابلے میں پھر انتہائی نرمی کا مظاہرہ کیا اور اسے ”سَلٰمٌ عَلَيْكَ“ کہا کہ آپ سلامت رہیں۔ جاہلوں کے جواب میں ہمیں بھی یہی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۶۳) اور قصص (۵۵) جب کوئی ضد اور عناد پر تل جائے تو یہ رخصت ہونے اور ترک تعلق کا سلام ہے اور یہ جائز ہے، البتہ عام حالات میں کفار کو سلام میں پہل جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا تَبْدَءُوا الْيَهُوْدَ

وَ اَعۡتَزِلُكُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّيۡ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّيۡ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾ فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَ مَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

اور میں تم سے اور ان چیزوں سے جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، کنارہ کرتا ہوں اور اپنے رب کو پکارتا ہوں، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکارنے میں بے نصیب نہیں ہوں گا ﴿۴۸﴾ تو جب وہ ان سے اور ان چیزوں سے جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے، الگ ہوگیا تو ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور ہر ایک کو ہم نے نبی بنایا ﴿۴۹﴾

وَلَا النَّصَارٰى بِالسَّلَامِ )) [ مسلم، السلام، باب النهي عن ابتداء أهل الكتاب...... : ۲۱٦۷، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ”یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل مت کرو۔“

② سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيۡ : ابراہیم علیہ السلام نے اس وعدے کو نبھایا، دیکھیے سورۂ شعراء (۸٦) اور ابراہیم (۴۱) مگر اب فوت شدہ مشرک دوستوں یا رشتہ داروں کے لیے استغفار جائز نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۱۱۳) اور سورۂ ممتحنہ (۴)۔

③ اِنَّهٗ كَانَ بِيۡ حَفِيًّا : ”حَفِيًّا“ ”حَفِيَ حِفَاوَةً“ (رَضِيَ) سے ہے، کسی پر بہت مہربان ہونا، اس کے معاملات کی فکر رکھنا، اس کے متعلق کثرت سے پوچھتے رہنا۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۷) ”كَانَ“ سے ہمیشہ کا معنی واضح ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے مجھ پر بہت مہربان رہا ہے اور اس نے مجھے دعا قبول ہونے کی عادت ڈال دی ہے۔

آیت 48 ① وَ اَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ...... : یعنی تم سے اور تمھارے معبودوں سے تعلق توڑ کر جب میں اپنے اکیلے رب کو پکاروں گا تو مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکارنے میں بے نصیب نہیں رہوں گا اور وہ کسی بھی مرحلے پر مجھے بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اشارے سے یہ بھی کہہ دیا کہ میرا رب تمھارے بتوں کی طرح نہیں ہے کہ انھیں کتنا ہی پکارتے رہو، وہ خاک نفع نہیں پہنچا سکتے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار بھی کہ اس پر میرا یا کسی کا زور نہیں، محض اس کے فضل سے امید ہے، کیونکہ اس اکیلے کو پکارنے والا کبھی بے نصیب نہیں رہتا۔

② ابراہیم علیہ السلام کی کفار سے اور ان کے بتوں سے علیحدگی اور ایمان لانے تک واضح دشمنی کا ذکر قرآن میں کئی جگہ ہے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۵۱ تا ٦۷)، سورۂ شعراء (۷۵ تا ۷۷) اور سورۂ ممتحنہ (۴)۔

آیت 49 ① فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ...... : وطن سے ہجرت اور مشرکین سے کنارہ کشی کے عوض اللہ تعالیٰ نے انھیں جو بے شمار نعمتیں عطا کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ انھیں بڑی شان والا بیٹا اور پوتا یعنی اسحاق اور یعقوب (علیہما السلام) عطا کیے، تاکہ ان کا دل لگ جائے اور بے وطنی سے وحشت نہ ہو۔

② وَ كُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا : یہ آیت دلیل ہے کہ اسحاق اور یعقوب علیہما السلام ان کی زندگی ہی میں نبی بن چکے تھے، کیونکہ اگر بعد میں نبی بننا مراد ہوتا تو یوسف علیہ السلام کا بھی ذکر ہوتا، کیونکہ وہ بھی نبی تھے۔ بیٹے اور پوتے کی خوشی ہی کچھ کم نہیں ہوتی، کجا یہ کہ ان کی

وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

اور ہم نے انھیں اپنی رحمت سے حصہ عطا کیا اور انھیں سچی ناموری عطا کی، بہت اونچی ﴿۵۰﴾ اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کر، یقیناً وہ خالص کیا ہوا تھا اور ایسا رسول جو نبی تھا ﴿۵۱﴾

پہلے ہی خوش خبری بھی مل جائے (ہود: ۷۱) اور اپنی آنکھوں سے انھیں نبوت کے عالی مقام پر فائز بھی دیکھ لیا جائے۔ یہاں اسماعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ ان کے پاس نہیں رہے۔ ان کا ذکر الگ آگے آ رہا ہے۔

③ یہ آیت اس حقیقت کی بھی ایک مثال ہے کہ جو شخص اللہ کی خاطر کوئی چیز چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اس سے کہیں بہتر چیز اسے عطا فرماتا ہے۔

**آیت 50** ① وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا : "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "حصہ" کیا ہے۔ اس رحمت سے مراد نبوت اور دینی و دنیوی بے شمار برکتیں ہیں، مثلاً اموال و اولاد کی کثرت، ارض مقدس کی خلافت، نسل در نسل نبوت و امامت وغیرہ۔

② وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر "ثَنَاءٌ حَسَنٌ" (اچھی شہرت) فرمائی۔ [ طبری بسند ثابت ] "لِسَانٌ" بول کر وہ چیز مراد لی ہے جو زبان کے ساتھ ہوتی ہے، یعنی شہرت و ناموری، جیسا کہ "یَدٌ" بول کر احسان مراد لیتے ہیں، کیونکہ وہ ہاتھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ "لِسَانَ صِدْقٍ" سچی ناموری کا مطلب یہ ہے کہ وہ واقعی اس ناموری اور شہرت کے حق دار تھے اور ان کا عمل اس شہرت کو سچا ثابت کرتا تھا، اس لیے ان کا ذکر خیر ہمیشہ کے لیے لوگوں کی زبان پر جاری کر دیا۔ چنانچہ یہودی، عیسائی اور مسلمان سب ان کی تعظیم کرتے ہیں اور نماز میں درود ابراہیمی بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی مقبولیت ہی کا ثمر ہے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۸۴)۔

**آیت 51** ① وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا : "مُخْلَصًا" کا معنی ہے "خالص کیا ہوا، چنا ہوا" اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ [ طٰہٰ: ۴۱ ] (اور میں نے تجھے خاص طور پر اپنے لیے بنایا ہے)، طٰہٰ کی آیت (۱۳) اور اعراف کی آیت (۱۴۴) سے ہوتی ہے۔

② وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا : "رَسُوْلًا" کا لفظی معنی بھیجا ہوا ہے اور "نَبِيًّا"، "نَبَأٌ" سے "فَعِيْلٌ" کے وزن پر ہے جو فاعل اور مفعول دونوں معنوں میں آتا ہے۔ مفعول ہو تو وہ جسے اللہ کی طرف سے خبر دی جائے اور اگر فاعل ہو تو وہ جو اللہ کی طرف سے خبر دینے والا ہو۔ "نَبَأٌ" عام خبر کو نہیں بلکہ اس خبر کو کہتے ہیں جو بڑی عجیب یا اہم ہو۔ قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ عموماً ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئے ہیں، تاہم بعض مقامات ایسے ہیں جن سے دونوں کے مرتبہ یا کام کی نوعیت کے اعتبار سے کافی فرق پایا جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ حج (۵۲) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "جس کو اللہ تعالیٰ کی وحی آئی وہ نبی، ان میں سے جو

# وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾

اور ہم نے اسے پہاڑ کی دائیں جانب سے آواز دی اور سرگوشی کرتے ہوئے اسے قریب کر لیا ﴿۵۲﴾

خاص ہیں اور امت رکھتے ہیں یا کتاب، وہ رسول ہیں۔" (موضح)

③ یہاں "رَسُوْلًا" کے بعد "نَبِيًّا" لانے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پیغام پہنچانے کے لیے کوئی بھی بھیجا جائے اسے رسول کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھیجے تو اس کا رسول، کوئی اور بھیجے تو اس کا رسول۔ جیسا کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق سورۂ یٰسٓ میں مذکور مرسلین کسی نبی کی طرف سے بھیجے ہوئے داعی تھے اور جیسا کہ یزید بن شیبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم عرفات میں ایک جگہ وقوف کیے ہوئے تھے (ان کے شاگرد عمرو بن عبداللہ وہ جگہ امام کی جگہ سے دور بیان کرتے تھے) تو ہمارے پاس ابن مربع انصاری آئے اور انھوں نے کہا: « إِنِّيْ رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْكُمْ » [ أبو داوٗد، المناسك، باب موضع الوقوف بعرفة : ۱۹۱۹۔ ابن ماجه : ۳۰۱۱ و صححه الألباني ] "میں تمھاری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول یعنی پیغام لانے والا ہوں۔" اس آیت میں "رَسُوْلًا" کی تاکید "نَبِيًّا" کے ساتھ اس لیے فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام کو کسی کی طرف سے بھیجا ہوا محض ایک داعی نہ سمجھا جائے، بلکہ وہ نبی بھی تھے جو وحی الٰہی سے سرفراز تھے۔

**آیت 52** ① وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ...... : طور کا معنی پہاڑ ہے، بعض خاص پہاڑوں کا نام بھی طور ہے، جیسے ایلہ کے قریب صحرائے سینا کے ایک پہاڑ کو طورِ سینا یا طورِ سینین کہتے ہیں۔ صاحب قاموس نے چند اور مقامات پر واقع پہاڑوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھیں طور کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کے مدین سے واپس مصر جاتے ہوئے پیش آیا۔ اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ (۹ تا ۳۶)، نمل (۷ تا ۱۴) اور قصص (۲۹ تا ۳۵) میں موجود ہے۔ ابن کثیر نے سورۂ قصص کی آیت (۳۰) ﴿ نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: "یعنی وادی کی اس جانب سے جو موسیٰ علیہ السلام کے دائیں طرف پہاڑ کے مغربی کنارے سے ملتی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ ﴾ [ القصص : ۴۴ ] "اور اس وقت تو مغربی جانب نہیں تھا جب ہم نے موسیٰ کی طرف حکم کی وحی کی۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آگ کی طرف رخ قبلہ کی جانب کیا تھا اور انھوں نے پہاڑ کے مغربی حصے کو اپنی دائیں طرف کیا ہوا تھا۔" آلوسی نے فرمایا: "مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ" سے مراد پہاڑ کی وہ جانب ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھی، کیوں کہ خود پہاڑ کا کوئی دایاں ہوتا ہے نہ بایاں۔ "الْاَيْمَنِ" "يُمْنٌ" سے بھی ہو سکتا ہے جس کا معنی برکت ہے، یعنی اس کی مبارک جانب سے، اس معنی کے لحاظ سے پہاڑ کی مبارک جانب بھی مراد ہو سکتی ہے، مگر پہلا معنی بہتر ہے۔ "نَادَيْنٰهُ" (ہم نے اسے آواز دی) آواز دینے سے مراد اس جانب سے اللہ کا کلام ظاہر ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام الفاظ کی صورت میں سنا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو سنا تھا اس میں نہ حرف تھے، نہ آواز تھی۔ انھوں نے صرف کانوں سے نہیں بلکہ تمام اعضاء کے ساتھ سنا تھا، جس سے انھیں یقین ہو گیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے اسے طور کی مبارک

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝۵۳ وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ٞ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۴

اور ہم نے اسے اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بنا کر عطا کیا ۝۵۳ اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، یقیناً وہ وعدے کا سچا تھا اور ایسا رسول جو نبی تھا ۝۵۴

---

جانب سے آتے ہوئے آواز دی، مگر یہ بات عقل کی دسترس سے باہر ہے اور احادیث کے دلائل اس کے صاف خلاف ہیں۔

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا آواز دینا اور کلام کرنا ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے منکر اس کے کلام کے بھی منکر ہیں، اس لیے وہ نہ اس میں حروف مانتے ہیں، نہ آواز اور نہ اس کا کانوں سے سنا جانا۔ مگر الفاظ اور آواز سے خالی چیز کو کلام کہنا جس طرح عقل سے بعید ہے اسی طرح قرآن و حدیث کے بھی صریح خلاف ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۴۳)، کہف (۱۰۹) اور توبہ (۶)۔

② وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا : "نَجِيًّا" "فَعِيْلٌ" بمعنی "مُفَاعِلٌ" ہے، جیسے "جَلِيْسٌ" بمعنی "مُجَالِسٌ" اور "نَدِيْمٌ" بمعنی "مُنَادِمٌ" ہے۔ "مُنَاجَاةٌ" ایک دوسرے سے چھپی آواز میں بات کرنا، سرگوشی کرنا، یعنی ہم نے اسے سرگوشی کرتے ہوئے قریب کر لیا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ان سے کلام ہوا، بیچ میں فرشتہ نہ تھا۔'' (موضح) اللہ تعالیٰ نے جس طرح واضح الفاظ میں موسیٰ علیہ السلام سے خود کلام کرنے کا ذکر فرمایا ہے کسی اور کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔

**آیت 53** هٰرُوْنَ نَبِيًّا : موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تو انھوں نے اپنی مدد کے لیے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا کرنے کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا اور اپنی خاص رحمت سے ان کے بھائی کو نبی بنا کر انھیں ہبہ فرما دیا۔ آج تک موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی بھائی نے اپنے بھائی کے لیے اتنے اونچے مرتبے کی دعا نہیں کی اور نہ ہارون علیہ السلام کے سوا کسی کو سفارش سے یہ مقام حاصل ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کا ذکر سورۂ طٰہٰ (۲۹ تا ۳۵)، شعراء (۱۲، ۱۳) اور قصص (۳۴، ۳۵) میں ہے۔

**آیت 54** ① وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ...... : یہ پانچواں قصہ اسماعیل علیہ السلام کا ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے اور تمام حجاز کے باپ۔ (ابن کثیر) گو تمام انبیاء وعدے کے سچے ہوتے ہیں مگر اسماعیل علیہ السلام میں یہ صفت خاص طور پر پائی جاتی تھی۔ سب سے پہلے تو ان میں یہ وصف تھا کہ وہ وعدے کے ساتھ ''ان شاء اللہ'' کہہ لیا کرتے تھے، جیسا کہ انھوں نے والد سے وعدہ کرتے وقت کہا تھا: ﴿ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [ الصافات : ۱۰۲ ] ''اگر اللہ نے چاہا تو تُو ضرور مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔'' پھر یہ وعدے کی سچائی ہی تھی کہ انھوں نے اپنے والد سے وعدہ کیا کہ ذبح ہوتے وقت صبر کروں گا، پھر بے دھڑک چھری کے نیچے لیٹ گئے اور اف تک نہ کیا۔ اس سے بڑھ کر وعدہ وفائی کیا ہو گی؟ وعدہ پورا کرنا ایمان ہے اور وعدہ خلافی نفاق۔ ابوسفیان نے ہرقل کے پاس اقرار کیا تھا: (( يَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ وَالْعَفَافِ وَالْوَفَاءِ

وَ كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور وہ اپنے رب کے ہاں پسند کیا ہوا تھا ﴿۵۵﴾

بِالْعَهْدِ وَأَدَاءِ الْأَمَانَةِ » [ بخاري، الجهاد، والسير، باب دعاء النبي ﷺ إلى الإسلام...... : ۲۹۴۱ ] کہ نبی (ﷺ) ہمیں نماز، سچ، پاک دامنی، وعدہ پورا کرنے اور امانت ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے وعدہ خلافی کو منافق کی تین نشانیوں میں سے ایک قرار دیا۔ [ بخاري، الإيمان، باب علامات المنافق : ۳۳، عن أبي هريرة رضي الله عنه ]

❷ یہاں طبری اور ابن کثیر نے سہل بن عقیل سے نقل کیا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام نے ایک آدمی سے اس کے آنے تک ایک جگہ میں رہنے کا وعدہ کیا، وہ بھول گیا تو ایک دن رات اس کے آنے تک وہیں ٹھہرے رہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ ﴾ اور سفیان ثوری سے نقل کیا ہے کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ ایک سال وہیں ٹھہرے رہے۔ مگر یہ دونوں روایات بعض علماء کے اقوال ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہرگز بیان نہیں فرمائیں۔ ظاہر ہے ان دونوں بزرگوں نے یہ روایات بنی اسرائیل سے لی ہیں اور ہم اہل کتاب کی کسی بات کو سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔

❸ سنن ابی داؤد وغیرہ میں اسی طرح کا واقعہ ہمارے نبی ﷺ کے متعلق بھی مروی ہے کہ نبوت سے پہلے ایک آدمی کے آنے تک ٹھہرنے کے وعدے کی وجہ سے آپ ﷺ تین دن رات وہیں ٹھہرے رہے، مگر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

❹ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا : اللہ تعالیٰ نے اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کو صرف نبی (مریم : ۴۹) اور اسماعیل علیہ السلام کو "رَسُوْلًا نَّبِيًّا" فرمایا، اس سے ان کے بلند مرتبے کا اظہار ہوتا ہے۔ اسماعیل علیہ السلام بنو جرہم کی طرف رسول تھے، جن کے وہ داماد بھی تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى مِنْ وَلَدِ إِبْرَاهِيْمَ إِسْمَاعِيْلَ » [ ترمذي، المناقب عن رسول الله ﷺ، باب ما جاء في فضل النبي ﷺ : ۳۶۰۵ ] "اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا۔"

**آیت 55** ❶ وَ كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ : اسماعیل علیہ السلام کے اس عمل کی پابندی کا حکم ہمارے نبی ﷺ کو اور ان کے ذریعے سے ہمیں بھی دیا گیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۱۳۲ ] "اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ، ہم تجھ سے کسی رزق کا مطالبہ نہیں کرتے، ہم ہی تجھے رزق دیں گے اور اچھا انجام تقویٰ کا ہے۔" اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کا حکم دیا۔ دیکھیے سورۂ تحریم (۶)۔

❷ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا : رب تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہونے کا باعث سب سے پہلے تو خود اس ذات پاک کا کسی کو منتخب فرما لینا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ﴾ [ الحج : ۷۵ ] "اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔" اور فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ [ الشورٰی : ۱۳ ] "اللہ اپنی طرف چن لیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف راستہ اسے دیتا ہے جو رجوع کرے۔" پھر اللہ تعالیٰ

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

اور کتاب میں ادریس کا ذکر کر، بے شک وہ ایسا نہایت سچا تھا، جو نبی تھا ﴿۵۶﴾ اور ہم نے اسے بہت اونچے مقام پر بلند کیا ﴿۵۷﴾

کے ہاں پسندیدہ (مَرْضِيًّا) ہونے کا ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق کسی بندے کا فرائض کی ادائیگی اور نوافل کی کثرت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ [ دیکھیے بخاري، الرقاق، باب التواضع : ۶۵۰۲، عن أبي هريرة ﷺ ] اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ نَادَى جِبْرِيْلَ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلاَنًا فَأَحْبِبْهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ فَيُنَادِيْ جِبْرِيْلُ فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلاَنًا فَأَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ » [ بخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم : ۳۲۰۹ ] ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو آواز دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے سو تو بھی اس سے محبت کر، تو جبریل اس سے محبت کرتا ہے، پھر جبریل آسمان والوں میں اعلان کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔'' ''مَرْضِيًّا'' کا حقیقی مصداق ایسا شخص ہوتا ہے۔

**آیت 56** وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ...... : یہ چھٹا قصہ ادریس علیہ السلام کا ہے، بعض مفسرین نے ادریس علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے انبیاء میں شمار کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ معراج کے موقع پر جب نبی ﷺ کی ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے نبی ﷺ کو '' مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْأَخِ الصَّالِحِ '' (صالح نبی اور صالح بھائی کو مرحبا) کہہ کر خطاب کیا اور آدم اور ابراہیم علیہما السلام کی طرح ''مَرْحَبًا بِالْوَلَدِ الصَّالِحِ '' (صالح بیٹے کو مرحبا) نہیں کہا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے مطابق امام بخاری رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے، کیونکہ ''بَابُ ذِكْرِ إِدْرِيْسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ '' میں وہ حدیث معراج لائے ہیں۔ دیکھیے فتح الباری '' بَابُ ذِكْرِ إِدْرِيْسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ '' اس سے پہلے باب میں امام بخاری نے فرمایا: ''ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ذکر کیا جاتا ہے کہ الیاس ہی ادریس ہیں۔'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس قول کے لانے کو بھی امام بخاری کی اس رائے کا اظہار کہا ہے کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں ہوئے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں الیاس علیہ السلام کو نوح یا ابراہیم علیہما السلام کی اولاد میں شمار فرمایا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۸۴، ۸۵) لیکن اکثر مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ ان کا زمانہ نوح علیہ السلام سے بھی پہلے کا ہے، چنانچہ بخاری نے ''بَابُ ذِكْرِ إِدْرِيْسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ '' کے ترجمۃ الباب میں فرمایا: '' وَ هُوَ جَدُّ أَبِيْ نُوْحٍ وَ يُقَالُ جَدُّ نُوْحٍ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ '' یعنی وہ نوح علیہ السلام کے والد کے دادا ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کے دادا ہیں۔ ابن جریر، قرطبی اور ابن کثیر رحمہم اللہ کی رائے بھی یہی ہے، دلیل اسی سورت کی آیت (۵۸) کی تفسیر میں آ رہی ہے۔

**آیت 57** وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا : حدیث معراج میں رسول اللہ ﷺ کی چوتھے آسمان پر ان سے ملاقات مذکور ہے۔

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ٚ وَّ مِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْرَآءِيْلَ ٚ وَ مِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے، آدم کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد سے اور ان لوگوں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور ہم نے چن لیا۔

---

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس مقام کے "مَكَانًا عَلِيًّا" (بہت اونچا مقام) ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بعض لوگوں نے جو کہا ہے کہ انھیں زندہ آسمان پر اٹھایا گیا، تو یہ رسول اللہ ﷺ سے کسی قوی سند کے ساتھ ثابت نہیں بلکہ صرف کعب کا قول ہے جو اسرائیلی روایات بیان کرتے ہیں۔

**آیت 58** ❶ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ...... : مراد وہ انبیاء ہیں جن کا اس سورت میں ذکر ہے۔ یہ دس ہیں جن میں پہلے زکریا اور آخری ادریس علیہم السلام ہیں۔ ابن کثیر نے فرمایا، سدی اور ابن جریر اور قرطبی (رحمہم اللہ) نے فرمایا: "یہاں آدم کی اولاد سے مراد ادریس ہیں اور نوح کے ساتھ سوار ہونے والوں کی اولاد سے مراد ابراہیم ہیں اور ابراہیم کی اولاد سے مراد اسحاق، یعقوب اور اسماعیل ہیں اور اسرائیل کی اولاد سے مراد موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام ہیں۔" ابن جریر فرماتے ہیں: "اسی لیے ان کے نسب الگ الگ ذکر فرمائے ہیں، ورنہ آدم کی اولاد تو سب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں وہ بھی ہیں جو ان لوگوں کی اولاد میں سے نہیں جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں تھے اور وہ ادریس ہیں جو نوح علیہ السلام کے دادا ہیں۔" ابن کثیر نے فرمایا: "یہی بات زیادہ ظاہر ہے کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام کے آبائی نسب میں شامل ہیں۔"

رہا ادریس علیہ السلام کا ہمارے نبی ﷺ کو بیٹے کے بجائے بھائی کہنا، تو یہ تواضع سے بھی ہو سکتا ہے اور امام بخاری کا حدیث معراج کو لانا "وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا" کی تفسیر کے طور پر بھی ہو سکتا ہے اور جو ادریس اور الیاس علیہما السلام کو ایک قرار دینا ہے تو صحابہ کرام اگر رسول اللہ ﷺ سے بیان کریں تو وہ بات یقینی ہے، ورنہ وحی الٰہی کے بغیر ہزاروں سال پہلے کے متعلق ان کی بات یقینی کیسے ہو سکتی ہے؟ خصوصاً جب یہ بھی امکان ہو کہ وہ بات اہل کتاب میں سے کسی سے سن کر بیان ہوئی ہے۔ اس لیے امام بخاری کا ادریس علیہ السلام کو جزم کے ساتھ نوح علیہ السلام کے والد کا دادا قرار دینا ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

❷ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ...... : چند انبیاء علیہم السلام کے نام ذکر کرنے کے بعد ان الفاظ کے ساتھ تمام انبیاء کو بھی شامل فرما دیا، جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت (۸۷) میں ہے۔ اس آیت میں جو فرمایا: ﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا﴾ اس میں صراحت فرمائی کہ ان انبیاء کے سامنے جب رحمان کی آیات پڑھی جاتیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے۔ "بُكِيًّا" "بَكٰى يَبْكِيْ بُكَاءً" (ض) سے اسم فاعل "بَاكٍ" کی جمع ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اہل علم کا اجماع ہے کہ انبیاء کی اقتدا میں یہاں سجدہ کرنا مشروع ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ذکر فرمایا: « قَرَأَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ سُوْرَةَ مَرْيَمَ فَسَجَدَ وَقَالَ هٰذَا السُّجُوْدُ فَأَيْنَ الْبُكِيُّ؟ » "عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم پڑھی تو سجدہ کیا اور فرمایا: "یہ تو سجدہ ہوا

اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ﴿۵۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ

جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی تھیں وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے ﴿۵۸﴾ پھر ان کے بعد ایسے نالائق

مگر رونے والے کہاں ہیں؟'' حکمت بن بشیر نے اسے صحیح کہا ہے۔ آیاتِ الٰہی سن کر رونا، دل کا ڈر جانا، رونگٹے کھڑے ہونا اور روتے ہوئے سجدے میں گر جانا، یہ صفات اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی اور نیک بندوں کی بیان کی ہیں۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۰۷ تا ۱۰۹)، مائدہ (۸۳)، انفال (۲) اور زمر (۲۳) وغیرہ۔

آیت 59 ① فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ : لفظ "خَلْفٌ" لام کے سکون کے ساتھ ''اولاد''، واحد و جمع دونوں کے لیے ایک ہی لفظ آتا ہے اور اکثر بری اولاد اور مذمت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور لام کے فتحہ کے ساتھ " خَلَفٌ" ''جانشین'' کے معنی میں آتا ہے، وہ چاہے اولاد ہو یا کوئی اور۔ اس کا استعمال اکثر مدح و تعریف کے لیے ہوتا ہے اور دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

② اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ : نماز ضائع کرنے میں سب سے پہلے اس عقیدے کی ایجاد ہے کہ ایمان صرف دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے اور ان دونوں چیزوں سے ایمان مکمل ہو جاتا ہے۔ عمل کرے تو اچھا ہے، درجہ بڑھ جائے گا، ورنہ ایمان میں نہ کمی ہوتی ہے نہ اضافہ، جب کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کو ایمان قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ [ البقرۃ : ۱٤۳ ] ''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔'' مگر ان لوگوں نے نماز کو ایمان ماننے سے انکار کر دیا، پڑھنے والا بھی مومن، نہ پڑھنے والا بھی، جو انکار نہ کرے پکا مومن۔ پھر اس عقیدے کی ایجاد کہ نماز تو دل کی ہوتی ہے، قیام، سجدے اور رکوع کی کیا ضرورت ہے اور اسے طریقت اور معرفت قرار دینا نماز ضائع کرنے کا عام بہانہ ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو صحیح وقت پر نہ پڑھنا، یا اسے رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ پڑھنا، کبھی پڑھنا، کبھی نہ پڑھنا، یا سرے سے اسے ترک کر دینا، سب نماز ضائع کرنے کی صورتیں ہیں۔ نماز ترک کر دینے سے انسان کے پاس اسلام کی آخری عملی شہادت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے امام احمد کے قول اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق نماز کا تارک کافر ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، دیکھیے سورۂ توبہ کی آیات (۵) اور (۱۱) کی تفسیر۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث اس بحث کے لیے فیصلہ کن نظر آتی ہے، ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَتُنْتَقَضَنَّ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً فَكُلَّمَا انْتَقَضَتْ عُرْوَةٌ تَشَبَّثَ النَّاسُ بِالَّتِيْ تَلِيْهَا فَأَوَّلُهُنَّ نَقْضًا الْحُكْمُ وَ آخِرُهُنَّ الصَّلَاةُ )) [ صحیح ابن حبان، التاریخ، باب ذکر الأخبار بأن أول ما یظهر...... : ٦٧١٥۔ مسند أحمد : ٥/ ٢٥١، ح : ٢٢٢٢٢ ] ''اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی جائیں گی، جب بھی کوئی کڑی ٹوٹے گی تو لوگ اس کے بعد والی کو مضبوطی سے پکڑ لیں گے، چنانچہ سب سے پہلے ٹوٹنے والی کڑی ''حکم'' ہو گی (یعنی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلے کرنا) اور سب سے آخری کڑی نماز ہو گی۔''

وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾

جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے ﴿۵۹﴾

❸ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ : انسان میں کئی شہوات و خواہشات پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر خواہش کی تکمیل کے لیے جائز طریقے بتائے ہیں، مثلاً عبادت کی جبلی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے ایک ہی رب اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کے رسول ﷺ کے طریقے کے مطابق کرنا، جنسی خواہش کے لیے نکاح کرنا اور لونڈیاں رکھنا۔ مالی حرص کے لیے جائز طریقے سے مال کمانا، خرچ کرنا اور اس کی زکاۃ دینا، غصے کی جبلت کا رخ کفار اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ جہاد کی طرف موڑنا، غرض ہر فطری جذبے کو پورا کرنے کا سامان بھی فرمایا اور اللہ کے حکم سے تجاوز پر حد بھی نافذ فرمائی۔ شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دیا، زنا پر حد رکھی، قوم لوط کے عمل کو حرام قرار دیا، سود کو حرام قرار دیا، ڈاکے اور چوری کی حد مقرر کی، قتل یا زخمی کرنے والوں پر قصاص یا دیت لازم فرمائی۔ پہلے انبیاء کے نالائق جانشینوں نے جس طرح اللہ کے احکام کی پیروی کے بجائے اپنی خسیس خواہشات کی پیروی کی، رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ہماری امت کے خواہش پرستوں نے بھی وہی کام کیا، بلکہ انھوں نے اپنے پاس سے ایسے فقہی ضابطے بنائے اور انھیں اللہ کا حکم باور کروایا کہ جن سے اللہ کی حدود سرے سے باطل ہو گئیں۔ ساتھ ہی ہر حرام کام کی سزا سے بچنے کے لیے اس کا نام بدل دیا، یا اس کی حد سے بچنے کا حیلہ ایجاد کر دیا۔ وحدت الوجود اور تصور شیخ کے شرکیہ عقیدے اور عمل کو طریقت اور معرفت کا خوش نما نام دے لیا۔ زنا کی سزا سے بچنے کے لیے کہہ دیا کہ اجرت پر لا کر عورت سے زنا کرنے پر حد نہیں۔ زنا کا نام حلالہ اور متعہ رکھ دیا۔ ماں، بہن، بیٹی اور دوسری محرمات سے، یہ جانتے ہوئے کہ حرام ہیں، نکاح کر کے زنا کرے تو حد معاف قرار دی۔ کانوں اور آنکھوں کے زنا کو سماع، روح کی غذا یا آرٹ اور فنون لطیفہ کہہ دیا۔ سود حلال کر لیا مگر نام اس کا منافع رکھ دیا۔ دار الحرب میں سود کو بالکل ہی جائز قرار دے لیا۔ جان بوجھ کر زکوٰۃ سے بچنے کے لیے کوئی بھی حیلہ کرنا جائز کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ مکروہ بھی نہیں۔ کوئی خوبصورت لڑکی پسند آجائے اور جھوٹے گواہ بھگتا کر قاضی سے اپنے حق میں فیصلہ کروا کر اس سے زنا کرلے تو اسے اللہ کے ہاں بھی گرفت سے بری قرار دیا۔ زنا پر پکڑا جائے، چار گواہ بھی بھگت جائیں مگر زانی کے صرف یہ کہہ دینے سے کہ یہ میری بیوی ہے، حد ختم کر دی، خواہ وہ بیوی ہونے کا کوئی ثبوت بھی پیش نہ کر سکے اور خواہ وہ عورت چیختی چلاتی رہے کہ میں اس کی بیوی نہیں بلکہ فلاں کی بیوی ہوں۔ انگور اور کھجور کے سوا کسی بھی چیز سے بنی ہوئی شراب حلال قرار دی اور نشہ آنے کے باوجود بھی اس سے حد ساقط کر دی اور نام بدل کر نبیذ، طلا یا کوئی اور رکھ لیا۔ قتل جان بوجھ کر کرے مگر تیز دھار آلے سے نہ کرے، یا آگ اور فائر سے نہ کرے تو قصاص ختم کر دیا، خواہ جان بوجھ کر اس سے بدفعلی کر کے مار دے، یا پتھروں سے مار دے، یا برف کے بلاک میں رکھ کر یا ڈبو کر مار دے، یا اسے قید کر کے بھوکا مار دے، یا دیوار میں چن کر مار دے، قصاص ختم کر دیا، صرف دیت لی جا سکتی ہے۔ چوری شہادتوں

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾
جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا ﴿۶۰﴾ ہمیشگی کے باغات میں، جن کا رحمان نے اپنے بندوں سے (ان کے) بن دیکھے وعدہ کیا ہے۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا وعدہ ہمیشہ سے پورا ہو کر رہنے والا ہے ﴿۶۱﴾

سے ثابت ہو جائے مگر صرف چور کے دعویٰ کر دینے سے کہ میں اس کا مالک ہوں، خواہ وہ مالک ہونے کی کوئی دلیل بھی نہ دے، حد موقوف کر دی گئی۔ غرض یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ہاں جان، مال اور عزت و آبرو اس قدر برباد نہیں تھی جس قدر مسلمانوں نے خواہش پرستی میں آ کر اسے برباد کیا اور نام اس کا قوانین اسلام رکھ دیا۔ ان لوگوں نے تو یہ سب کچھ حیلے ایجاد کر کے کیا مگر موجودہ اکثر مسلم حکمرانوں نے حیلے کا تکلف بھی چھوڑ دیا اور صاف الفاظ میں حکم الٰہی کو وحشیانہ کہہ کر اسلام کی آخری کڑی نماز سے بھی فارغ ہو گئے۔ غرض رسول اللہ ﷺ کی وہ بات سچی ہو گئی: « لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ » [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب نزول عيسى ابن مريم عليهما السلام : ۳۴۵۶، عن أبي سعيد رضی اللہ عنہ ] ”تم اپنے سے پہلوں کے طریقوں پر چل نکلو گے (جس طرح) بالشت بالشت کے ساتھ اور ہاتھ ہاتھ کے ساتھ (برابر ہوتا ہے) حتیٰ کہ اگر وہ سانڈے کے بل میں داخل ہوئے ہیں تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہو گے۔“ نتیجہ مسلمانوں کی غلامی اور اللہ کے دشمنوں کے ان پر مسلط ہونے کی صورت میں سب کے سامنے ہے، جسے اللہ نے ”غَيًّا“ (گمراہی) فرمایا ہے۔ علاج اس کا بھی وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

**④ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا:** ”گمراہی کو ملیں گے“ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں میں جنت کی راہ نہیں پا سکیں گے اور اس سے بھٹکے ہی رہیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”غَيًّا“ کی تفسیر خسارا فرمائی ہے۔ [ طبري بسند ثابت ] ”غَيًّا“ کی تفسیر جہنم کی ایک وادی یا کنواں صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے یا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ ہاں، یہ درست ہے کہ ساری کی ساری جہنم ہی گمراہی کا انجام بد ہے، جسے مجرم جا ملیں گے۔

**آیت 60** **اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ ......:** نماز ضائع کرنے اور خواہشات کی پیروی جیسی بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا توبہ، ایمان اور عمل صالح ہے۔ توبہ، ایمان اور عمل صالح، یعنی نماز کی پابندی اور اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم کے تابع کرنے والا شخص جنت میں داخل ہو گا اور اس کا کوئی اجر مارا نہ جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ » [ ابن ماجه، الزهد، باب ذكر الذنوب : ۴۲۵۰، عن أبي عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ و حسنه الألباني ] ”گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔“

**آیت 61** **جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ......:** ہمیشگی کی جنتوں کا وعدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اپنے رحمان ہونے اور

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے مگر سلام اور ان کے لیے اس میں ان کا رزق صبح و شام ہوگا ﴿۶۲﴾ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو بہت بچنے والا ہو ﴿۶۳﴾

بندوں کو اپنا بندہ کہنے کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی رحمت کس قدر بے حساب و بے کنار ہے اور فرماں بردار بندوں سے اس کا تعلق کتنا گہرا اور پیارا ہے۔ ''بن دیکھے'' کا مطلب یہ ہے کہ بندوں سے اس رحمان نے وعدہ کیا ہے جس رحمان کو انھوں نے نہیں دیکھا، یعنی بن دیکھے اس پر ایمان لائے ہیں۔ دوسرا معنی ہے کہ رحمان نے ان سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے جو انھوں نے دیکھی نہیں مگر انھیں دیکھے بغیر ہی ان کے ملنے کا یقین ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ رحمان کا وعدہ ہمیشہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ ''اِنَّ'' تعلیل کے لیے ہے۔ ''مَاْتِيًّا'' ''اَتٰى يَاْتِيْ'' سے اسم مفعول ہے۔ اللہ کا وعدہ جنت ہے اور اس کے بندے یقیناً اس میں آنے والے ہیں، یہ بات اس لیے فرمائی کہ عموماً لوگ ان دیکھی چیزوں کے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کرتے۔ (بقاعی) اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہنے پر مشتمل آیات کے لیے دیکھیے سورۂ رعد (۳۱)، آل عمران (۱۹۴، ۱۹۵)، بنی اسرائیل (۱۰۸)، مزمل (۱۷، ۱۸) اور فرقان (۱۵، ۱۶)۔

**آیت 62** ❶ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا : اہل ایمان کے لیے دنیا میں ایک شدید تکلیف لغو کلام سننا ہے، جسے وہ سننا نہیں چاہتے۔ اس تکلیف کا اندازہ اور اس سے بچے رہنے کی نعمت کی قدر صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس سے سابقہ پڑا ہو۔ جنت میں انھیں ایسی باتوں کے بجائے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا فرشتوں کی طرف سے یا ایک دوسرے کی طرف سے سلام کی آواز آئے گی۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۵۸) اور سورۂ رعد (۲۳، ۲۴) یا ایسی بات سنائی دے گی جو ہر طرح کی تکلیف سے پاک اور سراسر سلامتی والی ہوگی، یعنی کوئی لغو یا تکلیف دہ بات ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔

❷ بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا : بظاہر معنی یہ ہے کہ اتنی دیر کے بعد جتنی دیر کے بعد دنیا میں صبح سے شام ہوتی ہے مگر یہ معنی راجح نہیں، کیونکہ اتنی دیر تو دنیا میں کھانے پینے سے صبر کرنا مشکل ہے، تو وہ جنت ہی کیا ہوئی جس میں صرف صبح و شام راشن ملے۔ اس لیے اس کا معنی ہر وقت اور ہمیشہ ہے، یعنی ہر وقت جب بھی انھیں کھانے کی یا لذت کی کسی بھی چیز کی خواہش ہوگی، کیونکہ جنت میں دنیا کی طرح کا نہ دن ہوگا اور نہ رات۔ صبح شام بول کر ہمیشگی مراد لینا صرف عربی ہی نہیں ہر زبان کا عام محاورہ ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی انھیں خواہش ہوگی، خواہ کسی وقت خواہش ہو۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۷۱)۔

**آیت 63** تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ...... : یعنی جنت کا وارث وہ ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور کفر و شرک اور گناہوں سے بہت بچنے والا ہو۔ اس آیت میں متقی لوگوں کو جنت کا وارث بنانے کا ذکر ہے۔ یہی بات سورۂ مومنون (۱ تا ۱۰) اور اعراف (۴۲، ۴۳) میں بیان کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اہل جنت کس کے وارث بنیں گے؟ اس کا ایک جواب

وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَ مَا خَلْفَنَا وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ

اور ہم نہیں اترتے مگر تیرے رب کے حکم کے ساتھ۔ اسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے اور تیرا رب کبھی کسی طرح بھولنے والا نہیں ﴿۶۴﴾ جو آسمانوں کا اور زمین کا اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کا رب ہے، سو اس کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر خوب صابر رہ۔ کیا تو اس

یہ ہے کہ ان کے باپ آدم کو جنت ملی تھی اور اولاد اپنے باپ کی جائداد کی وارث ہوتی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم دونوں میں بنی آدم کی جگہ بنائی ہے۔ اہل جہنم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جنت میں اپنی جگہ سے محروم ہو جائیں گے تو اس کے وارث جنتی ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( كُلُّ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَرٰى مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ فَيَقُوْلُ لَوْلَا أَنَّ اللّٰهَ هَدَانِيْ فَيَكُوْنُ لَهٗ شُكْرٌ، وَ كُلُّ أَهْلِ النَّارِ يَرٰى مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ لَوْلَا أَنَّ اللّٰهَ هَدَانِيْ فَيَكُوْنُ عَلَيْهِ حَسْرَةٌ )) [ صحيح الجامع : ٤٥١٤ـ مسند أحمد : ٥١٢/٢، ح : ١٠٦٦٣ـ مستدرك حاكم : ٤٣٦/٢، ح : ٣٦٢٩، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ”تمام اہل جنت آگ میں اپنا ٹھکانا دیکھیں گے تو کہیں گے، اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے مجھے ہدایت دی (تو میں یہاں ہوتا)، تو وہ بہت شکر کرے گا اور تمام اہل نار جنت میں اپنی جگہ دیکھیں گے تو کہیں گے، اگر ایسا ہوتا کہ مجھے اللہ تعالیٰ ہدایت دے دیتا (تو میں یہاں ہوتا)، تو اس کے لیے بہت حسرت ہوگی۔“ مگر اس جواب میں یہ خیال گزرتا ہے کہ جنتیوں کو صرف جہنمیوں والی جگہ بطور میراث ملے گی، حالانکہ جنت میں ان کا اپنا حصہ بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۳ ] ”(یہ جنت) ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“ لہٰذا یہ معنی مرجوح ہے۔ اس لیے اکثر مفسرین نے ”نُوْرِثُ“ کا معنی یہ کیا ہے کہ ہم متقی لوگوں کو ہر طرح سے اس کا مالک بنا دیں گے، وہ کبھی ان سے واپس نہ لی جائے گی، بلکہ وہ میراث کی طرح انھی کی ہو جائے گی، کیونکہ کسی چیز کی ملکیت حاصل ہونے کی سب سے پکی صورت میراث ہے، اس لیے کہ ملکیت حاصل ہونے کی دوسری تمام صورتوں میں ملکیت چھننے کی گنجائش ہوتی ہے، بیع ہو یا ہبہ یا غصب، اس کا مالک اسے واپس لے سکتا ہے، یا بدل سکتا ہے، مگر وارث کو یہ فکر نہیں ہوتی۔ یہ معنی بھی مضبوط ہے۔

**آیت 65،64** ❶ وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ : ”نَنْزِلُ“ کے بجائے ”نَتَنَزَّلُ“ اس لیے فرمایا کہ باب تفعل میں ٹھہر ٹھہر کر کام کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم وقفے وقفے سے، ٹھہر ٹھہر کر تیرے رب ہی کے حکم سے اترتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: (( قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِجِبْرِيْلَ : مَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَزُوْرَنَا أَكْثَرَ مِمَّا تَزُوْرُنَا فَنَزَلَتْ : ﴿ وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَ مَا خَلْفَنَا ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ وما نتنزل إلا بأمر ربك...... ﴾ : ٤٧٣١ ] ”ایک مرتبہ نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے کہا: ”آپ ہماری ملاقات کے لیے جتنا آتے ہیں اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟“ تو یہ آیت اتری: ﴿ وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ﴾ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ

ع ۸

تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾

کا کوئی ہم نام جانتا ہے؟ ﴿٦٥﴾

نے یہ کلام سکھایا جبریل علیہ السلام کو کہ جواب میں یوں کہو۔ سو یہ کلام ہے اللہ کا جبریل کی طرف سے، جیسا کہ ''اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ'' ہم کو سکھایا۔

② لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا...... : یعنی صرف یہی نہیں کہ ہم اپنی مرضی سے اترنے کا اختیار نہیں رکھتے، بلکہ ہم اپنی مرضی سے کسی کام کا اختیار بھی نہیں رکھتے، کیونکہ جو کچھ ہمارے آگے ہے، یا ہمارے پیچھے ہے، یا اس کے درمیان ہے، یعنی دائیں اور بائیں ہے، چاروں جہتوں کی ہر چیز کا مالک صرف اللہ ہے۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ آسمان و زمین اور ان کے مابین اشیاء کا رب بھی وہی ہے۔ اس میں اوپر نیچے کی جہتیں اور ان کے درمیان کی ہر چیز بھی آ گئی، اس کے علاوہ جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے بھی آ گئے، یعنی جس ہستی کا قبضہ، ملکیت اور ربوبیت اتنی مستحکم اور وسیع ہے کہ زمان و مکان میں سے کوئی چیز اس سے باہر نہیں، تو اس کی مرضی کے بغیر زمین پر اترنا تو کجا ہم کوئی حرکت بھی نہیں کر سکتے۔

③ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا : ''نَسِيًّا'' ''فَعِيۡلٌ'' کے وزن پر مبالغہ ہے، بہت بھولنے والا۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ بہت بھولنے والا تو نہیں مگر کم بھولتا ہے، بلکہ اس طرح مبالغے کا لفظ آئے تو مبالغے کی نفی مراد نہیں ہوتی بلکہ نفی میں مبالغہ مراد ہوتا ہے، اس لیے معنی یہ ہوگا کہ تیرا رب کبھی کسی طرح بھولنے والا نہیں۔ کبھی کا مفہوم ''كَانَ'' سے واضح ہو رہا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ﴾ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۸۲) اور انفال (۵۱) کی تفسیر۔ یہاں رب تعالیٰ سے بھولنے کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام اگر دیر سے اتریں تو یہ مطلب نہیں کہ آپ کے رب نے آپ کو بھلا دیا ہے، جیسا کہ یہ مشرکین باتیں بنا رہے ہیں، وہاں بھولنے کا تو کسی طرح سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا جبریل علیہ السلام کا اجازت کے ساتھ وقفے سے آنا ہی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ ضحیٰ کی تفسیر۔ ابودرداء رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَا أَحَلَّ اللّٰهُ فِيۡ كِتَابِهٖ فَهُوَ حَلَالٌ وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ وَمَا سَكَتَ عَنۡهُ فَهُوَ عَافِيَةٌ فَاقۡبَلُوۡا مِنَ اللّٰهِ الۡعَافِيَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُنۡ نَسِيًّا، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الۡآيَةَ : ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ » [ مستدرك حاكم : ۳۷۵/۲، ح : ۳۴۱۹ و سنده حسن (حكمت بن بشير) ] ''اللہ نے جو کچھ اپنی کتاب میں حلال کیا وہ حلال ہے اور جسے حرام کیا وہ حرام ہے اور جس سے خاموشی اختیار فرمائی وہ معاف ہے، کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز بھول جائے۔'' پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾۔''

④ ''وَاصۡطَبِرۡ'' ''صَبَرَ يَصۡبِرُ'' سے باب افتعال کا فعل امر ہے۔ ''تاء'' کو ''طاء'' کر دیا اور حرف زیادہ ہونے سے معنی زیادہ ہو گیا، خوب صابر رہ، یعنی اس کی بندگی کرتے رہیے اور اس راہ میں جو مصائب و مشکلات پیش آئیں ان کا پورے صبر کے ساتھ مقابلہ کیجیے، اگر ہماری طرف سے کبھی یاد فرمائی یا مدد یا تسلی دینے میں کچھ تاخیر ہو جائے تو گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَ اِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿۶۷﴾ فَوَ رَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَ الشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾

اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مرگیا تو کیا واقعی عنقریب مجھے زندہ کر کے نکالا جائے گا؟ ﴿۶۶﴾ اور کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے ہی اسے اس سے پہلے پیدا کیا، جب کہ وہ کوئی چیز نہ تھا ﴿۶۷﴾ تو قسم ہے تیرے رب کی! بے شک ہم ان کو اور شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے، پھر بے شک ہم انھیں جہنم کے گرد ضرور گھٹنوں کے بل گرے ہوئے حاضر کریں گے ﴿۶۸﴾

5 هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا: وہ دو شخص جن کا نام ایک ہو، ایک دوسرے کے ”سَمِيٌّ“ (ہم نام) کہلاتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کے جتنے نام ہیں سب اس کی صفت ہیں، یعنی کوئی ہے اس کی صفت کا؟“ (موضح) یہاں ”سَمِيًّا“ کا معنی ”نظیر“ اور ”مثیل“ ہے۔ گویا اس آیت اور دوسری آیت: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشورٰی: ۱۱] کا معنی ایک ہی ہے، یعنی جب اس جیسا آپ کسی کو نہیں سمجھتے تو پھر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ اس کے راستے پر چلتے رہیے۔

6 ”وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ“ کے ربط کے لیے دیکھیے سورۂ قیامہ کی آیت (۱۶): ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 66** وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ ...... : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یٰس (۷۷ تا ۷۹)۔

**آیت 67** اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ ...... : تو کیا جس ذات پاک نے اس وقت اسے پیدا فرمایا جب یہ کچھ بھی نہ تھا، اس کے لیے یہ مشکل ہے کہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندگی دے سکے؟ دوبارہ زندہ کرنے کی یہ سب سے قوی دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن مجید میں بیان فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ دہر (۱، ۲)، واقعہ (۵۷ تا ۶۲)، روم (۲۷)، حج (۵)، بنی اسرائیل (۵۱) اور انبیاء (۱۰۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، وَشَتَمَنِي وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، فَأَمَّا تَكْذِيْبُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ : لَنْ يُعِيْدَنِيْ كَمَا بَدَأَنِيْ، وَلَيْسَ أَوَّلُ الْخَلْقِ بِأَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ إِعَادَتِهِ، وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا، وَأَنَا الْأَحَدُ الصَّمَدُ، لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لِّيْ كُفُوًا أَحَدٌ » [بخاري، التفسير، باب تفسير سورة ﴿قل هو اللّٰه أحد﴾: ۴۹۷۴، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا اور ابن آدم نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا، اس کا مجھے جھٹلانا تو اس کا یہ کہنا ہے کہ جس طرح اس نے مجھے پہلے پیدا کیا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ مجھے پہلی دفعہ پیدا کرنا دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں اور رہا اس کا مجھے گالی دینا، تو اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ نے اولاد بنا رکھی ہے، حالانکہ میں ایک ہوں، بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا، نہ کسی نے مجھے جنا اور نہ ہی کبھی میرا کوئی ہمسر ہے۔“

**آیت 68** 1 فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ ......: ”جِثِيًّا“ ”جَثَا يَجْثُوْ جُثُوًّا“ اور ”جَثٰى يَجْثِيْ جَثْيًا“ (ن، ض) سے اسم فاعل

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ﴿٧١﴾

پھر بے شک ہم ہر گروہ میں سے اس شخص کو ضرور کھینچ نکالیں گے جو ان میں سے رحمان کے خلاف زیادہ سرکش ہے ﴿٦٩﴾ پھر یقیناً ہم ان لوگوں کو زیادہ جاننے والے ہیں جو اس میں جھونکے جانے کے زیادہ حقدار ہیں ﴿٧٠﴾ اور تم میں سے جو بھی ہے اس پر وارد ہونے والا ہے۔ یہ ہمیشہ سے تیرے رب کے ذمے قطعی بات ہے، جس کا فیصلہ کیا ہوا ہے ﴿٧١﴾

”جِثِیٌّ“ (اَلْجَاثِیْ) کی جمع ہے، گھٹنوں کے بل گرنے والے۔ قیامت کے منکروں کو اس کا یقین دلانے کے لیے قسم اٹھا کر فرمایا کہ تیرے رب کی قسم ہے کہ ہم انھیں اور ان کو گمراہ کرنے والے شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے۔ شیطانوں میں قرین بھی شامل ہیں (دیکھیے سورۂ ق: ۲۳) اور ابلیس کی اولاد اور انسانوں میں سے گمراہ کرنے والے شیطان بھی۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۲) جہنم کے گرد ان کی حاضری کی تصویر دکھانے کے لیے فرمایا کہ وہ جہنم کے گرد نہایت ذلیل و خوار اور خوف زدہ ہو کر گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے اور ان میں کھڑا ہونے کی طاقت نہیں ہوگی۔ دیکھیے سورۂ جاثیہ (۲۸)۔

② ”تیرے رب کی قسم“ اس میں دو فائدے حاصل ہو رہے ہیں، ایک تو قسم کی وجہ سے بات کی تاکید، دوسرا رسول اللہ ﷺ کی شان کی رفعت، جیسا کہ سورۂ ذاریات کی آیت (۲۳): ﴿فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ﴾ سے آسمان و زمین کی عظمت ظاہر ہو رہی ہے۔ (طنطاوی)

**آیت 69** ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ ...... : ”عِتِيًّا“ ”عَتَا يَعْتُوْ“ سے ”عُتُوًّا“ کی طرح مصدر ہے، تکبر، سرکشی، حد سے گزرنا۔ ”شِيعَةٍ“ وہ گروہ جو ایک ہی قسم کا ہو، یعنی پھر ہم ہر باغی گروہ میں سے اس کے سب سے بڑے سرکش اور پیشوا کو، جس نے انھیں کفر و شرک میں پھنسایا اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی کی راہ دکھائی، نکال کر الگ کھڑا کریں گے اور ایسے لوگوں کو سب سے پہلے جہنم میں جھونکیں گے، کیونکہ انھوں نے دو جرم کیے، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، پھر درجہ بدرجہ ان کے پیروکاروں کی باری آئے گی۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۳۸، ۳۹)، نحل (۲۵) اور عنکبوت (۱۳)۔

**آیت 70** ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ ...... : ”صِلِيًّا“ ”صَلِيَ يَصْلَى“ بروزن ”رَضِيَ يَرْضَى“ کا مصدر ہے، آگ میں داخل ہو کر اس کی تپش کی تکلیف اٹھانا، یعنی پھر ہمیں خوب معلوم ہے کہ اس جہنم میں جھونکے جانے کے زیادہ لائق کون ہے اور وہ گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [ الأعراف : ۳۸ ] ”اللہ فرمائے گا سبھی کے لیے دگنا (عذاب) ہے اور لیکن تم نہیں جانتے۔“ کیونکہ گمراہ ہونے والوں نے بھی کئی لوگوں کو گمراہ کیا۔

**آیت 71** وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ...... : لغت کے اعتبار سے ”وارد ہونے“ کے معنی ”داخل ہونا“ اور ”اوپر سے گزرنا“ دونوں ہو سکتے ہیں، اس لیے ترجمہ ”وارد ہونے والا“ ہی کر دیا ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں ”وارد ہونے“ سے مراد

# ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

*پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو ڈر گئے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے ﴿۷۲﴾*

جسر (پل) سے گزرنا ہے، جسے بعض احادیث میں ''صراط'' بھی کہا گیا ہے۔ عام لوگوں نے فارسی اور عربی کو جمع کر کے اس کا نام ''پل صراط'' رکھ لیا ہے۔ یہ پل چونکہ جہنم کے اوپر رکھا جائے گا، اس لیے یہ جہنم پر سے گزرنا ہی ہے۔ متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ ہر نیک و بد اور ہر کافر و مومن کو اس پل پر سے گزرنا پڑے گا۔ جن مفسرین نے اس کے معنی ''داخل ہونا'' کیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حدیث کے مطابق ''تَحِلَّةَ الْقَسَمِ'' یعنی قسم پوری کرنے کے لیے ہر مومن و کافر ایک مرتبہ جہنم میں داخل ہوگا، مگر مومنوں پر وہ آگ ٹھنڈی اور باعث رحمت بنا دی جائے گی۔ مگر پہلا معنی راجح ہے، اگر کسی حدیث میں لفظ ''دخول'' (داخل ہونا) آیا ہے تو صراط والی حدیث کے مطابق اس سے مراد بھی گزرنا ہے۔ اس معنی سے کتاب و سنت کے دلائل کے درمیان تطبیق ہو جاتی ہے۔

**آیت 72** ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا...... یعنی پھر ہم پرہیز گاروں کو جہنم سے بچا لیں گے (صراط سے سلامت گزار کر یا صراط سے جہنم میں گرنے کے بعد) اور کافروں کو ہمیشہ کے لیے اسی میں گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین اور عام مسلمان جہنم کے اوپر صراط سے اپنے اعمال کے مطابق تیزی سے یا گرتے پڑتے گزر جائیں گے اور کافر اور زیادہ گناہ گار مسلمان پل پر سے جہنم میں گر پڑیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو سزا پوری ہونے کے بعد یا شفاعت سے یا محض اپنے فضل سے جہنم سے نکال لے گا اور صرف کافر و مشرک ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اس کی دلیل ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت میں رب تعالیٰ کو دیکھنے کا ذکر فرمایا، اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( ثُمَّ يُؤْتٰى بِالْجَسْرِ فَيُجْعَلُ بَيْنَ ظَهْرَيْ جَهَنَّمَ، قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَمَا الْجَسْرُ؟ قَالَ مَدْحَضَةٌ مَزِلَّةٌ عَلَيْهِ خَطَاطِيْفُ وَ كَلَالِيْبُ، وَحَسَكَةٌ مُفَلْطَحَةٌ لَهَا شَوْكَةٌ عُقَيْفَةٌ تَكُوْنُ بِنَجْدٍ، يُقَالُ لَهَا السَّعْدَانُ، الْمُؤْمِنُ عَلَيْهَا كَالطَّرْفِ وَكَالْبَرْقِ وَكَالرِّيْحِ وَكَأَجَاوِيْدِ الْخَيْلِ وَالرِّكَابِ، فَنَاجٍ مُسَلَّمٌ، وَنَاجٍ مَخْدُوْشٌ، وَمَكْدُوْسٌ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ، حَتّٰى يَمُرَّ آخِرُهُمْ يُسْحَبُ سَحْبًا، فَمَا أَنْتُمْ بِأَشَدَّ لِيْ مُنَاشَدَةً فِي الْحَقِّ، قَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِ يَوْمَئِذٍ لِلْجَبَّارِ، وَ إِذَا رَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ نَجَوْا فِيْ إِخْوَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا إِخْوَانُنَا كَانُوْا يُصَلُّوْنَ مَعَنَا وَيَصُوْمُوْنَ مَعَنَا وَيَعْمَلُوْنَ مَعَنَا، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى : اذْهَبُوْا فَمَنْ وَجَدْتُّمْ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالَ دِيْنَارٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرِجُوْهُ ...... فَيَشْفَعُ النَّبِيُّوْنَ وَالْمَلَائِكَةُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ فَيَقُوْلُ الْجَبَّارُ بَقِيَتْ شَفَاعَتِيْ، فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ فَيُخْرِجُ أَقْوَامًا قَدِ امْتُحِشُوْا )) [ بخاري، التوحيد، باب : ﴿ وجوه يومئذ ناضرة...... ﴾ : ۷۴۳۹، عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه ] ''پھر جسر (پل) کو لایا جائے گا اور اسے جہنم کے درمیان رکھ دیا جائے گا۔'' ہم نے کہا: ''یا رسول اللہ! اور وہ جسر (پل) کیا چیز

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا١ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا۝۷۳

اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان لوگوں سے کہتے ہیں جو ایمان لائے کہ دونوں گروہوں میں سے کون مقام میں بہتر اور مجلس کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے ۝۷۳

ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''وہ بہت پھسلانے والا ہے، اس پر کنڈے اور آنکڑے ہیں اور بہت چوڑے گوکھرو (ایک کانٹا جو سہ گوشہ ہوتا ہے)، جن میں مڑے ہوئے کانٹے ہیں، جو نجد میں ہوتے ہیں، انھیں سعدان کہتے ہیں، مومن اس پر سے نگاہ کی طرح اور بجلی کی طرح اور آندھی کی طرح اور بہترین گھڑ سواروں اور اونٹ کے سواروں کی طرح گزر جائیں گے، پھر کوئی صحیح سلامت بچ کر نکلنے والا ہو گا، کوئی زخمی ہو کر بچ نکلنے والا، کوئی جہنم کی آگ میں گرا دیا جانے والا، یہاں تک کہ ان کا آخری شخص گھسٹتا ہوا گزر جائے گا۔ تو تم مجھ سے اس حق کا، جو بالکل واضح ہو چکا ہو، اس سے زیادہ مطالبہ کرنے والے نہیں جس قدر مومن اپنے بھائیوں کے بارے میں اس دن جبار (اللہ تعالیٰ) سے مطالبہ کرے گا اور اس وقت جب وہ دیکھیں گے کہ وہ بچ نکلے ہیں، کہیں گے، اے ہمارے رب! ہمارے بھائی ہیں جو ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور ہمارے ساتھ عمل کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، جاؤ اور جسے پاؤ کہ اس کے دل میں دینار کے برابر ایمان ہے اسے نکال لو...... (لمبی حدیث ہے جس میں نصف دینار کے برابر ایمان والوں کو، پھر ذرہ برابر ایمان والوں کو آگ سے نکالنے کا ذکر ہے) چنانچہ انبیاء، فرشتے اور مومن شفاعت کریں گے، پھر جبار فرمائے گا، میری شفاعت باقی رہ گئی تو وہ آگ میں سے ایک مٹھی بھرے گا اور ایسے لوگوں کو نکالے گا جو کوئلہ ہو چکے ہوں گے۔''

**آیت 73** وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ...... : ''مَقَامًا'' جائے قیام، یعنی رہنے کی جگہ، گھر وغیرہ۔ ''نَدِيًّا'' ''نَدَوْتُ الْقَوْمَ اَنْدُوْهُمْ'' (میں نے قوم کو جمع کیا) سے ہے۔ ''اَلنَّادِيْ'' ''اَلنَّدِيُّ'' اور ''اَلْمُنْتَدٰى'' کا معنی لوگوں کی مجلس، اکٹھے ہونے کی جگہ۔ کفار جب اللہ تعالیٰ کی واضح آیات سنتے اور ان کا حق ہونا اس قدر واضح ہوتا کہ وہ کسی صورت نہ ان کا جواب دے پاتے اور نہ غلط کہہ سکتے، تو اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کے لیے دنیوی لحاظ سے کمزور ایمان والوں سے کہتے کہ اپنی حالت اور ہماری حالت دیکھو! کس کے رہنے کے مکانات بہتر اور کس کی مجلس زیادہ شان و شوکت والی اور سجی ہوئی ہے؟ گویا انھوں نے دنیوی ساز و سامان اور شان و شوکت کو اپنے حق پر ہونے اور اللہ تعالیٰ کے ان پر راضی ہونے کی دلیل قرار دیا۔ قرآن مجید میں تمام انبیاء کے زمانے کے کفار کی یہی سوچ بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۱۱)، انعام (۵۳)، سبا (۳۵)، مومنون (۵۵، ۵۶)، مریم (۷۷)، کہف (۳۵، ۳۶) اور حٰم السجدہ (۵۰)۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ۞ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ۞

اور ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے جو ساز و سامان میں اور دیکھنے میں کہیں اچھے تھے ۞ کہہ دے جو شخص گمراہی میں پڑا ہو تو لازم ہے کہ رحمان اسے ایک مدت تک مہلت دے، یہاں تک کہ جب وہ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، یا تو عذاب اور یا قیامت کو، تو ضرور جان لیں گے کہ کون ہے جو مقام میں زیادہ برا اور لشکر کے اعتبار سے زیادہ کمزور ہے ۞

**آیت 74** وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ...... : "اَثَاثًا" گھر کا ساز و سامان جس میں اونٹ، گھوڑے، بھیڑ بکریاں اور غلام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ "رِءْيًا" "رَاٰى يَرٰى" (ف) کا مصدر ہے، بمعنی مفعول یعنی دیکھنے کی چیزیں۔ مصدری معنی بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ترجمہ میں کیا گیا ہے۔ یعنی جب نافرمانی کے بعد ان سے کہیں بڑھ کر ساز و سامان اور شان و شوکت والوں کو ان کی دنیوی خوش حالی ہمارے عذاب سے نہ بچا سکی تو یہ بے چارے کس شمار و قطار میں ہیں؟ حقیقت میں دنیا کے ٹھاٹھ باٹ اور جاہ و جلال پر پھولنا اور نادار مسلمانوں کو حقیر جاننا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

**آیت 75** ❶ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ ...... : اس سوال کے جواب میں کہ ہم کفار سے کیا کہیں؟ حکم ہوا کہ ان سے کہو، آؤ! مباہلہ کر لیں اور ہم تم دونوں مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم دونوں میں سے جو فریق گمراہی پر ہے اسے اللہ تعالیٰ ایک مدت تک مہلت دے اور اسے اس کی اسی حالت میں رکھے، تاکہ کفار جب اس استدراج اور مہلت کی وجہ سے کفر کی حالت میں فوت ہوں تو انھیں پتا چل جائے کہ کس کے رہنے کی جگہ بدترین اور کس کا لشکر اور جتھا کمزور ترین ہے۔ اس تفسیر میں "فَلْيَمْدُدْ" کو اصل معنی "امر" پر رکھا گیا ہے۔ ابن کثیر اور ابن جریر نے صرف یہی تفسیر فرمائی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال سورۂ آل عمران کی آیت (۶۱) اور سورۂ بقرہ کی آیت (۹۴) ہے۔ (شنقیطی)

❷ دوسری تفسیر اس آیت کی یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں کہ ہم کفار کی اس دلیل کا کیا جواب دیں؟ حکم ہوا کہ ان سے کہو کہ جو لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھا ہے کہ انھیں کچھ نہ کچھ مہلت دے، تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے۔ یہ نہ کہیں کہ ہمیں سوچنے کا وقت نہیں ملا۔ پھر جب دنیا ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوں گے، یا موت کے وقت اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے، تو خود ہی اچھی طرح جائزہ لے لیں گے کہ کس کی رہنے کی جگہ زیادہ بری اور کس کا جتھا اور لشکر زیادہ کمزور ہے۔ آیت میں لفظ "الرَّحْمٰنُ" کی حکمت یہ ہے کہ گمراہوں کو مہلت دینا اللہ تعالیٰ کی بے انتہا رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کفر سے توبہ کر لیں۔ قرآن مجید میں کئی آیات میں یہ بات

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿ؕ۷۷﴾

اور اللہ ان لوگوں کو جنھوں نے ہدایت پائی، ہدایت میں زیادہ کرتا ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے بہتر اور انجام کے لحاظ سے کہیں اچھی ہیں ﴿۷۶﴾ تو کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا مجھے ضرور ہی مال اور اولاد دی جائے گی ﴿۷۷﴾

مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۷۸)، انعام (۴۴)، سبا (۱۷) اور قلم (۴۴، ۴۵) اس تفسیر کی صورت میں "فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ" میں امر بمعنی خبر ہے۔ یہ معنی زیادہ قوی ہے، کیونکہ اس کے بعد والی آیت: ﴿ وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ﴾ میں فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کافروں کو ان کی گمراہی میں مہلت دیتا ہے، اسی طرح ہدایت والوں کی ہدایت میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔

**آیت 76** ❶ وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى: یعنی جس طرح گمراہوں کو ڈھیل دیتا ہے اور وہ بدی کے راستے میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی طرح ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی مزید نیک کام کرنے کی توفیق دیتا جاتا ہے، جس سے وہ اس کی خوشنودی کے راستوں پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایمان کے بعد اخلاص کی دولت سے نوازنا بھی "زَادَهُمْ هُدًى" (انھیں ہدایت کی مزید توفیق دینا) میں داخل ہے۔ (کبیر)

❷ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ کہف کی آیت (۴۶)۔

**آیت 77** اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا...... : اوپر کی آیات میں حشر کے یقینی ہونے کے دلائل بیان فرمائے اور کفار کے شبہات کا جواب دیا تھا، اب ان لوگوں کا قول نقل فرمایا جو حشر میں طعن کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ صحیحین میں ہے، خباب ابن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «كُنْتُ قَيْنًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَ كَانَ لِيْ عَلَى الْعَاصِ بْنِ وَائِلٍ دَيْنٌ فَأَتَيْتُهُ أَتَقَاضَاهُ، قَالَ: لَا أُعْطِيْكَ حَتّٰى تَكْفُرَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ لَا أَكْفُرُ حَتّٰى يُمِيْتَكَ اللّٰهُ ثُمَّ تُبْعَثَ، قَالَ دَعْنِيْ حَتّٰى أَمُوْتَ وَ أُبْعَثَ فَسَأُوْتٰى مَالًا وَ وَلَدًا فَأَقْضِيَكَ فَنَزَلَتْ: ﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ؕ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾» [ بخاري، البيوع، باب ذكر القين والحداد : ۲۰۹۱۔ مسلم : ۳۵، ۳۶/ ۲۷۹۵ ] "میں زمانۂ جاہلیت میں لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور میرا عاص بن وائل (ایک مال دار کافر) پر کچھ قرض تھا۔ میں (ایک دن) تقاضے کے لیے اس کے پاس گیا، وہ کہنے لگا: "میں تمھارا قرض اس وقت تک ادا نہیں کروں گا جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت سے انکار نہ کرو۔" خباب رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ کی قسم! میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے) ہرگز انکار نہیں کروں گا، یہاں تک کہ تو مر کر دوبارہ زندہ ہو جائے۔" کافر کہنے لگا: "جب میں مر کر دوبارہ زندہ ہوں گا تو تم میرے پاس آنا،

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾

کیا اس نے غیب کو جھانک کر دیکھ لیا ہے؟ یا اس نے رحمان کے ہاں کوئی عہد لے رکھا ہے؟ ﴿۷۸﴾ ہرگز نہیں! ہم ضرور لکھیں گے جو کچھ یہ کہتا ہے اور اس کے لیے عذاب میں سے بڑھائیں گے، بہت بڑھانا ﴿۷۹﴾

اس وقت میرے پاس خوب مال بھی ہوگا اور اولاد بھی، میں تمھارا قرض ادا کردوں گا۔'' اس پر اللہ نے یہ (چار آیات ''فَرْدًا'' تک) نازل فرمائیں۔'' اس واقعہ میں کفار کا قیامت سے مذاق کی صورت میں انکار کرنا بھی ہے اور اس کے خیال میں بالفرض قائم ہونے کی صورت میں دنیا پر قیاس کرتے ہوئے وہاں بھی مال و اولاد ملنے کے یقین کا اظہار بھی ہے۔ ایک ہی سانس میں اللہ تعالیٰ کے قیامت قائم کرنے پر قادر ہونے سے انکار ہے اور اسی سانس میں قیامت کے دن اسے مال و اولاد دینے پر قادر ہونے کا اظہار ہے۔ مشرک ایسے ہی جاہل ہوتے ہیں۔ یہاں چونکہ زیادہ نمایاں قیامت کے دن دنیا کی طرح مال و اولاد ملنے کے یقین کا اظہار ہے، اس لیے اس سے پہلے آیات (۷۳، ۷۴) میں اس کا رد کیا ہے، اب مزید تین آیات میں اس کا رد فرمایا ہے۔

**آیت 78** اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ ...... : یعنی یہ بات تو ''کہ وہ جنت میں جائے گا اور خوب مال و دولت پائے گا'' وہی کرسکتا ہے جس نے غیب پر اطلاع پائی ہو، یا اس بے حد رحم والی ذات پاک سے کوئی عہد لے رکھا ہو جس نے اپنی بے حد رحمت کی بنا پر اپنے فرماں بردار بندوں سے انعام کا عہد کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم غیب جب پوری مخلوق میں سے کسی کے پاس نہیں تو اسے کیسے حاصل ہو گیا؟ رہا قیامت کے دن نعمتوں کا عہد، تو وہ رحمت کے حق داروں ہی سے ہے، جو ایمان دار ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۸) اس کافر سے وہ عہد کب اور کیسے ہوا؟

**آیت 79** ❶ ''كَلَّا'' یہ لفظ انکار اور ڈانٹ کے لیے آتا ہے، یعنی یہ دونوں باتیں ہرگز نہیں ہیں، تو پھر ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ اس نے اپنے پاس سے ایک جھوٹی بات اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دی ہے۔ یہاں سورۂ مریم میں اس تیسری بات کا ذکر نہیں، کیونکہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ میں یہود کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے یہ بات گزر چکی ہے اور قرآن کی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں، فرمایا: ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة: ۸۰] ''اور انھوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنے ہوئے چند دن۔ کہہ دے کیا تم نے اللہ کے پاس کوئی عہد لے رکھا ہے؟ تو اللہ کبھی اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔'' (شنقیطی)

❷ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا : یعنی ہم اسے کئی گنا زیادہ عذاب دیں گے، ایک عذاب کفر کا، ایک استہزا اور مذاق اڑانے کا، ایک اللہ کی راہ سے روکنے کا، ایک دوسروں کو کفر کی راہ پر لگانے کا، ایک فساد پھیلانے کا۔ مزید دیکھیے سورۂ نحل (۸۸)، اعراف (۳۸) اور عنکبوت (۱۳) اسی طرح دنیا میں بھی مال و اولاد اور ہر قسم کی زیب و زینت کے ذریعے سے اسے عذاب

وَ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع

اور ہم اس کے وارث ہوں گے ان چیزوں میں جو یہ کہہ رہا ہے اور یہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا ﴿۸۰﴾ اور انھوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے، تاکہ وہ ان کے لیے باعث عزت ہوں ﴿۸۱﴾ ہرگز ایسا نہ ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف مدمقابل ہوں گے ﴿۸۲﴾

دیں گے، پھر موت اور آخرت میں مزید عذاب دیں گے، فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا﴾ [ التوبۃ : ۸۵ ] ''اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان (اموال و اولاد) کے ذریعے سے دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔''

**آیت 80** ❶ وَ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ : یعنی جس مال و اولاد پر یہ فخر کر رہا ہے اس کے ہلاک ہونے کے بعد ان سب کے وارث ہم بنیں گے، جیسا کہ اسی سورت میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ﴾ [ مریم : ۴۰ ] ''بے شک ہم، ہم ہی اس زمین کے وارث ہوں گے اور ان کے بھی جو اس پر ہیں اور وہ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔''
❷ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا : یعنی قیامت کے دن جب ہمارے پاس آئے گا تو اس کے ساتھ نہ اولاد ہوگی، نہ مال اور نہ کوئی جتھا۔ دیکھیے سورۂ انعام (۹۴)۔

**آیت 81** وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً ...... : حشر و نشر کے بیان کے بعد اب ان کے بنائے ہوئے معبودوں کی نفی ہے، خواہ انسان ہوں یا فرشتے یا جن یا بت یا آستانے یا قبریں۔ یعنی اللہ کے سوا انھوں نے اس لیے معبود بنا رکھے ہیں کہ ضرورت اور حاجت کے وقت اللہ تعالیٰ سے سفارش کر کے کام کروا سکیں، مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے کہہ کر اسے ٹال دیں، یا وہ موت اور قیامت کے وقت ان کو عذاب سے بچا لیں اور اس طرح وہ ان کے لیے قوت و عزت کا باعث بن جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس (۱۸) اور سورۂ زمر (۳) میں مشرکین کا یہی عقیدہ بیان فرمایا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کر ہی نہیں سکتا اور نہ کر سکے گا، آیت الکرسی میں ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۵ ] ''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟''

**آیت 82** ❶ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ : انکار اس معنی میں کریں گے کہ وہ کہیں گے، ہم نے کبھی ان سے نہیں کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو، یا ہمیں مصیبت کے وقت پکارو اور نہ ہمیں یہ خبر تھی کہ وہ ہماری عبادت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کئی جگہ بیان فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۲۸، ۲۹)، نحل (۸۶)، قصص (۶۳)، فاطر (۱۳، ۱۴) اور احقاف (۵، ۶) اسی طرح کفار بھی اپنے معبودوں کی عبادت سے مکر جائیں گے اور ان کے خلاف ہو جائیں گے، بلکہ قسم کھا کر کہیں گے کہ اللہ کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۳) بلکہ وہ اور ان کے معبود ایک دوسرے کو لعنت کریں گے۔ دیکھیے عنکبوت

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے، وہ انھیں ابھارتے ہیں، خوب ابھارنا ﴿۸۳﴾ پس تو ان پر جلدی نہ کر، ہم تو بس ان کے لیے گن رہے ہیں، اچھی طرح گننا ﴿۸۴﴾

(۳۵) اور سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)۔

② وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا : یعنی بجائے اس کے کہ وہ ان کے لیے بچاؤ یا عزت کا سبب بنیں، الٹا ان کی پکڑ کا سبب بنیں گے اور قیامت کے دن ان کے شدید مخالف اور ان کے لیے باعث حسرت ہوں گے۔ بے شمار معبودوں کے لیے "ضِدًّا" واحد کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ "ضِدًّا" کا لفظ مصدر ہے، جو واحد وجمع اور مذکر ومؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان پوجنے والوں کے خلاف ان کے معبودوں کے اتحاد و اتفاق کی وجہ سے ان کو "شَيْءٌ وَاحِدٌ" (ایک ہی چیز) فرض کر کے واحد کا صیغہ لایا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام مسلمانوں کے متعلق فرمایا: « وَ هُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ » [ أبوداوٗد، الديات، باب أيقاد المسلم من الكافر؟ : ۴۵۳۰۔ نسائي : ۴۷۳۸۔ صحيح الجامع : ۶۶۶۶ ] "وہ اپنے سوا سب کے مقابلے میں ایک ہاتھ ہوتے ہیں۔"

**آیت 83** اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ ...... : "اَزًّا" قاموس میں ہے: "أَزَّ يَئِزُّ" اور "أَزَّ يَؤُزُّ أَزًّا" (ض، ن) "أَزَّ الشَّيْءَ" اس نے کسی چیز کو سخت حرکت دی۔ "أَزَّ النَّارَ" اس نے آگ کو بھڑکایا۔ "أَزَّتِ الْقِدْرُ" ہانڈی سخت ابلنے لگی۔ "أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ" ہانڈی ابلنے جیسی آواز۔ یعنی کیا تمھیں معلوم نہیں کہ کافر لوگ، جنھوں نے طے کر رکھا ہے کہ انھوں نے کسی صورت حق کو تسلیم نہیں کرنا، ہم نے ان پر شیاطین کو مسلط کر دیا ہے، جو انھیں برائی پر شدت سے ابھارتے رہتے ہیں اور انھیں گناہوں کی آگ میں اس طرح مسلسل جھونکے رکھتے ہیں کہ وہ اسی پیچ و تاب میں ہانڈی کی طرح ابلتے اور شعلوں کی طرح بھڑکتے رہتے ہیں۔ (بقاعی) اس آیت کی ہم معنی اور وضاحت کرنے والی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ زخرف (۳۶، ۳۷)، حٰم السجدہ (۲۵)، اعراف (۲۰۲) اور بنی اسرائیل (۶۴)۔

**آیت 84** ① فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ : یعنی ایسا نہ کریں کہ جس طرح وہ شیاطین کے ابھارنے سے برائیوں میں جلدی کرتے ہیں کہ آپ بھی ان پر جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرنے لگیں، بلکہ صبر اور حوصلے سے انتظار کریں اور ان پر حجت پوری ہونے دیں۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۳۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلتَّأَنِّيْ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ » [ مسند أبي يعلٰى : ۴۲۵۶۔ السنن الكبرٰى للبيهقي : ۲۰۷۶۷۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۴/ ۴۰۴، ح : ۱۷۹۵، عن أنس رضی اللہ عنہ ] "اناۃ (بردباری، وقار، آہستہ روی) اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔"

② اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا : آدمی کے اطمینان، صبر و ثبات اور خوشی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس کا سب

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾

جس دن ہم متقی لوگوں کو رحمان کی طرف مہمان بنا کر اکٹھا کریں گے ﴿۸۵﴾ اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے ہانک کر لے جائیں گے ﴿۸۶﴾

سے زیادہ قوت والا مددگار مسلسل اس کے دشمن کی نگرانی کر رہا ہو اور نہ دشمن کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز پریشان کن ہو سکتی ہے۔ فرمایا، ہم تو بس ان کو دی ہوئی مہلت کا ایک ایک سانس گن رہے ہیں اور گنی ہوئی چیز نے آخر ختم ہونا ہے، پھر یہ کسی صورت بچ نہیں سکیں گے، تو پھر جلدی کیسی؟ دیکھیے سورۂ ہود (۸) روزوں کے جلدی گزرنے کی وجہ بھی "اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ" فرمائی۔ بعض سلف یہ آیت پڑھتے تو روتے اور کہتے کہ گنتی ختم ہونے کا نتیجہ تیری جان کا نکلنا ہے، تیرا قبر میں داخل ہونا اور تیرا اہل و عیال سے جدا ہونا ہے۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا، ہر سانس جو تجھے زندگی بخش رہا ہے تیری زندگی کے سانسوں کی گنتی کم کرتا جا رہا ہے، پھر اس شخص کی زندگی کا کیا حال ہے جسے زندہ رکھنے والی چیز ہی اس کی زندگی کے زوال کا باعث ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

إِنَّ الْحَبِيْبَ مِنَ الْأَحْبَابِ مُخْتَلَسٌ لَا يَمْنَعُ الْمَوْتَ بَوَّابٌ وَلَا حَرَسٌ
وَكَيْفَ يَفْرَحُ بِالدُّنْيَا وَلَذَّتِهَا فَتًى يُعَدُّ عَلَيْهِ اللَّفْظُ وَالنَّفَسُ

"ہر دوست اپنے دوستوں سے اچانک چھین لیا جانے والا ہے۔ موت کو کوئی دربان روک سکتا ہے، نہ کوئی پہرے دار۔ دنیا اور اس کی لذت کے ساتھ کیسے خوش ہو سکتا ہے وہ جوان جس کا ایک ایک لفظ اور سانس گنا جا رہا ہو۔" (روح المعانی)

**آیت 86,85** يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ ...... : "وَفْدًا" "وَافِدٌ" کی جمع ہے۔ "وَفَدَ يَفِدُ وَفْدًا وَ وُفُوْدًا" بروزن "وَعَدَ يَعِدُ" کسی کے پاس جانا۔ وفد چند آدمیوں کی جماعت کو کہتے ہیں جو کسی اہم کام کے لیے یا کوئی عطیہ حاصل کرنے کے لیے کسی بادشاہ یا بڑی شخصیت کے پاس جائے۔ "نَسُوْقُ" "سَاقَ يَسُوْقُ سَوْقًا" بروزن "قَالَ يَقُوْلُ" جانوروں کو ہانکنا۔ بعض اوقات کسی کو بھی چلانے کے معنی میں آ جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ [ الزمر: ۷۳ ] "اور وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔" "الْمُجْرِمِيْنَ" جرم وہ گناہ جسے کرنے والا سزا کا حق دار ہو۔ "وِرْدًا" "وَارِدٌ" کی جمع ہے۔ "وَرَدَ يَرِدُ وُرُوْدًا" پانی پینے کے لیے جانا، چونکہ اس مقصد کے لیے پیاسا ہی جاتا ہے، اس لیے "وِرْدًا" کا معنی "پیاسے" ہے۔ ان آیات میں متقین اور مجرمین کا انجام بیان ہوا ہے۔ پہلی آیت میں رحمان کی طرف جانے کا ذکر فرمایا، جنت وغیرہ کا ذکر نہیں فرمایا، یعنی متقی لوگ رحمان کے معزز مہمان بن کر جائیں گے۔ دنیا میں شاہی مہمانوں کے قدم زمین پر نہیں لگتے، اس دن بے حد و بے انتہا رحم والے، شاہوں کے شاہ کے معزز مہمانوں کے اعزاز و اکرام کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ دوسری آیت میں جہنم کا ذکر ہے، رحمان کا ذکر نہیں۔ کیونکہ آخر دم تک جرم

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

وہ سفارش کے مالک نہ ہوں گے مگر جس نے رحمان کے ہاں کوئی عہد لے لیا﴿۸۷﴾ اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنالی ہے ﴿۸۸﴾ بلاشبہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات کو آئے ہو ﴿۸۹﴾ آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں ﴿۹۰﴾ کہ انھوں نے رحمان کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا ﴿۹۱﴾ حالانکہ رحمان کے لائق

سے باز نہ آنے والے مجرم اس رحمان کے کسی رحم کے مستحق نہیں جو زمین و آسمان سے بھی زیادہ گناہوں کو سچے دل سے معافی کی ایک درخواست پر معاف کر دیتا ہے۔ سورۂ زمر (۷۱ تا ۷۳) میں متقین اور کفار کے اس مرحلے کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔

**آیت 87** لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ...... : یعنی شفاعت کا حق دار وہ ہوگا جسے رحمان کے ہاں عہد نجات حاصل ہو۔ اس عہد سے مراد کلمۂ شہادت کا اقرار ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ (ابن کثیر مع حاشیہ حکمت بن بشیر) ایک حدیث میں پنجگانہ نماز کی پابندی کو بھی عہد قرار دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ ))[ مسند أحمد : ۳۴۶/۵، ح : ۲۳۰۰۱۔ ترمذي : ۲۶۲۱۔ ابن ماجه : ۱۰۷۹، عن بريدة رضی اللہ عنہ و صححه الألباني ] ”وہ عہد جو ہمارے اور ان (مشرکین) کے درمیان ہے نماز ہے، جس نے اسے ترک کر دیا تو وہ بلاشبہ کافر ہو گیا۔“ معلوم ہوا کہ کبیرہ گناہوں کے مرتکب ایمان والوں کی تو شفاعت ہوگی مگر کافر کی کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ پس ”لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ“ کے معنی یہ ہیں کہ شفاعت کے مستحق صرف وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے رحمان کے ہاں عہد حاصل کر رکھا ہے، کفار نہیں۔ اس معنی کی شاہد کئی آیات ہیں۔ دیکھیے سورۂ مدثر (۴۸)، شعراء (۱۰۰، ۱۰۱)، مومن (۱۸)، انبیاء (۲۸) اور دوسری آیات۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب مجرمین کے حق میں کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا تو وہ خود دوسروں کے حق میں شفاعت کا اختیار بالاولیٰ نہیں رکھیں گے۔ دوسرا مطلب آیت کا یہ ہے کہ شفاعت کا اختیار صرف اسی کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دے گا، کوئی نبی یا فرشتہ اپنی مرضی سے کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا، فرمایا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [ البقرة : ۲۵۵ ] ”کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔“ اس آیت میں تمام مشرکین کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ مشرک بت پرست ہوں یا قبر پرست، زندہ پرست ہوں یا مُردہ پرست، ہر قسم کی شفاعت سے محروم رہیں گے۔ گویا یہ ”لِيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا“ کا جواب ہے۔ (کبیر، شوکانی، شنقیطی)

**آیت 88 تا 95** ① پہلی آیات سے مناسبت یہ ہے کہ جب شفاعت کی نفی فرمائی اور سب سے بڑھ کر شفاعت کی حق دار اولاد ہوتی ہے، اس لیے ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رکھی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کی نفی فرمائی، تاکہ خاص

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ عَدَّهُمْ

نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے ﴿۹۲﴾ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے ﴿۹۳﴾ بلاشبہ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے ﴿۹۴﴾ اور ان میں سے ہر

وعام ہر سفارشی کی نفی ہو جائے اور ہر اس عزت کی نفی ہو جائے جس کے حصول کا باعث وہ اپنے معبودوں کو سمجھتے تھے۔ (بقاعی)

② وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا : اللہ تعالیٰ نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے ساتھ ہی اس کے باطل ہونے کی دلیل بھی ذکر فرما دی کہ وہ کہتے ہیں کہ اس رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے جس کی بے پناہ رحمت سے ساری کائنات وجود میں آئی ہے اور ہر چیز اپنی بقا کے لیے اسی کی محتاج ہے، جبکہ وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ [ فاطر : ۱۵ ] ''اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔'' بیٹا باپ کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ باپ اپنی کمزوری کی وجہ سے اولاد کا محتاج ہوتا ہے اور جس عقیدے، یعنی مسیح کو کفارہ بنانے کے لیے اسے اللہ کا بیٹا قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کو رحمان ماننے کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

③ یہود عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے تھے اور مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، جبکہ امت مسلمہ کے کئی نادان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا جزو قرار دیتے ہیں۔

④ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا...... اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد قرار دینے والوں کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شدت غضب میں ان ظالموں کو مخاطب فرما کر بات کی اور تاکید کے دو لفظوں "لام" اور "قَدْ" کے ساتھ، جن کے جمع ہونے سے قسم کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، فرمایا قسم ہے کہ تم ایک بہت ہی بھاری بات تک آ پہنچے ہو، جو اس قدر خوفناک اور بھاری ہے کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے تصور اور اس بات کے بوجھ سے "سَبْعٌ شِدَادٌ" یعنی ساتوں نہایت مضبوط آسمان پھٹ پڑیں، یہ وسیع اور محکم زمین شق ہو جائے اور انتہائی ٹھوس اور سخت پہاڑ مٹی کی بوسیدہ دیوار کی طرح ڈھے کر گر پڑیں کہ ان لوگوں نے (یہاں پھر نفرت سے مشرکوں کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ کیا ہے) رحمٰن کے لیے اولاد کا دعویٰ کر دیا، حالانکہ رحمان کے لائق ہی نہیں کہ وہ (کسی کو بھی، خواہ پیغمبر ہو یا فرشتہ) اولاد بنائے۔ قوسین کے الفاظ مفعول اول ہیں جو محذوف ہیں، "وَلَدًا" مفعول ثانی ہے، یعنی اس کی اولاد ہونا ناممکن اور محال ہے، اس لیے کہ اولاد ہم جنس ہوتی ہے اور اللہ کا کوئی ہم جنس نہیں۔ پھر اولاد کمزوری میں سہارے کے لیے ہوتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر کمزوری سے پاک اور اپنی ذات و صفات میں ہر ایک سے بے نیاز ہے۔ وہ ہمیشہ سے عزیز و غالب ہے اور ہمیشہ عزیز و غالب رہے گا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت کی تفسیر۔ اس کے علاوہ اولاد بیوی سے ہوتی ہے اور خاوند بیوی کا محتاج ہوتا ہے، جب اللہ کی بیوی ہی نہیں اور وہ کسی کا محتاج ہی نہیں تو اولاد کیسی؟ فرمایا: ﴿ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ﴾ [ الأنعام : ۱۰۱ ] ''اس کی اولاد کیسے ہوگی، جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔''

عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے ﴿۹۵﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل

⑤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا : آسمان و زمین میں جو بھی ہے اس کا غلام بن کر حاضر ہونے والا ہے۔ اگر کوئی اولاد ہوتی تو غلام کیسے ہوتی؟

⑥ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا : اللہ تعالیٰ نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے، ایک ایک اس کے شمار میں ہے اور سب اکیلے اکیلے اس کے پاس آنے والے ہیں، اگر زمین و آسمان میں کوئی بھی اس کی اولاد ہوتا تو یقیناً اسے معلوم ہوتا۔ کیا تم اللہ سے بھی زیادہ باخبر ہو، فرمایا: ﴿ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ﴾ [ یونس : ۱۸ ] ''کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟'' نیز دیکھیے سورۂ یونس (۶۸)، بنی اسرائیل (۴۰) اور نجم (۱۹ تا ۲۲) ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَيْسَ أَحَدٌ أَصْبَرَ عَلٰى أَذًى سَمِعَهُ مِنَ اللّٰهِ إِنَّهُمْ لَيَدْعُوْنَ لَهُ وَلَدًا وَ إِنَّهُ لَيُعَافِيْهِمْ وَ يَرْزُقُهُمْ )) [ بخاري، الأدب، باب الصبر في الأذى : ۶۰۹۹ ] ''اللہ تعالیٰ سے زیادہ تکلیف دہ بات پر صبر کرنے والا، جسے وہ سن رہا ہو اور کوئی نہیں۔ لوگ اس کے لیے اولاد بتاتے ہیں اور وہ (اس کے باوجود) انھیں عافیت دیتا ہے اور رزق دیتا ہے۔''

**آیت 96** سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا : ''وُدٌّ'' اور ''حُبٌّ'' ہم معنی ہیں۔ ''وُدًّا'' کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ کافروں کے برے عقائد و اعمال اور ان کے انجام بد کا ذکر کرنے کے بعد ایمان اور عمل صالح والوں پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا۔ اس آیت کے تین معنی ہو سکتے ہیں اور تینوں درست ہیں، جن کی قرآن و حدیث سے تائید ہوتی ہے۔ اللہ کے کلام سے بڑھ کر جامع کلام کوئی نہیں کہ جس کے تھوڑے سے کلمات میں بہت سے معانی جمع ہیں۔ پہلا معنی یہ ہے کہ جو لوگ صدق دل سے ایمان لائے اور انھوں نے اس دعویٰ کی تصدیق کے لیے کتاب و سنت کے مطابق اخلاص کے ساتھ عمل کیے (کیونکہ عمل صالح کے تین اجزا ہیں: ایمان، اخلاص اور اتباع کتاب و سنت) تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایمان والوں کے دلوں میں ان کے لیے عظیم محبت رکھ دے گا، جب کہ دشمنوں کے دلوں میں ان کی ہیبت اور رعب ڈال دے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب ایک مہینے کی مسافت پر دور دشمن پر پڑ جاتا تھا۔ اصبہانی نے فرمایا کہ یہ محبت انھیں لوگوں کی محبت حاصل کرنے کی کسی کوشش یا لوگوں کی دوستی کے اسباب میں سے کسی سبب، مثلاً قرابت، کسی پر احسان، مروت یا خوش اخلاقی وغیرہ کے بغیر محض رحمان کی عنایت سے حاصل ہوتی ہے (جن لوگوں سے وہ ملا بھی نہیں ہوتا وہ بھی اس سے محبت رکھتے ہیں)۔ (بقاعی) صفت رحمان اور دلوں میں محبت پیدا کرنے کے درمیان مناسبت بالکل واضح ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال موسیٰ علیہ السلام کو محبوب خلائق بنانا ہے، فرمایا: ﴿ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ﴾ [ طٰہٰ : ۳۹ ] ''اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے عظیم محبت ڈال دی۔'' اسی طرح ''رَبُّنَا اللّٰهُ'' (ہمارا رب اللہ ہی ہے) کہہ کر استقامت اختیار کرنے والوں کو فرشتے بشارت دیتے ہیں: ﴿ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۳۱ ] ''ہم تمھارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔'' اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

کہ عنقریب ان کے لیے رحمان عظیم محبت پیدا کر دے گا ﴿۹۶﴾

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ نَادَى جِبْرِيْلَ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلاَنًا فَأَحْبِبْهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ فَيُنَادِيْ جِبْرِيْلُ فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلاَنًا فَأَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ » [ بخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات اللّٰه عليهم: ۳۲۰۹، ۷۴۸۵ ] ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو بلاتا ہے (اور کہتا ہے کہ ) بے شک اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت کر، تو جبریل بھی اس سے محبت کرتا ہے اور آسمان والوں میں اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے، اس لیے تم سب اس سے محبت کرو، تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔''

صحیح مسلم میں مزید یہ الفاظ ہیں: « وَإِذَا أَبْغَضَ اللّٰهُ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيْلَ فَيَقُوْلُ إِنِّيْ أُبْغِضُ فُلاَنًا فَأَبْغِضْهُ، قَالَ: فَيُبْغِضُهُ جِبْرَئِيْلُ ، ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ فُلاَنًا فَأَبْغِضُوْهُ، قَالَ فَيُبْغِضُوْنَهُ، ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَاءُ فِي الْأَرْضِ » ''اور جب وہ کسی بندے سے بغض رکھتا ہے تو جبریل کو بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں، تم بھی اس سے بغض رکھو۔'' فرمایا: ''تو جبریل اس سے بغض رکھتا ہے، پھر وہ آسمان والوں میں اعلان کر دیتا ہے کہ اللہ فلاں سے بغض رکھتا ہے، اس لیے تم بھی اس سے بغض رکھو۔'' فرمایا: ''تو وہ اس سے بغض رکھتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں دلی دشمنی رکھ دی جاتی ہے۔'' [ مسلم، البر و الصلة، باب إذا أحب اللّٰه عبدا، أمر جبرئيل ..... : ۲۶۳۷ ] واضح رہے کہ یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی جہاں مسلمان انتہائی مظلومیت و کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، گویا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ عنقریب حالات بدلیں گے (لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے ) اور تم ذلیل و رسوا ہونے کے بجائے محبوبِ خلائق بن کر زندگی گزارو گے۔ چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور رہتی دنیا تک لوگوں کے دلوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ محبت پیدا ہوئی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

دوسرا معنی اس آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے آپس میں محبت پیدا فرما دے گا، جو پہلے جانی دشمن تھے ایمان کے بعد دلی دوست بن جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [ الأنفال : ۶۲، ۶۳ ] ''وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قوت بخشی اور ان کے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی۔ اگر تو زمین میں جو کچھ ہے، سب خرچ کر دیتا ان کے دلوں میں الفت نہ ڈالتا اور لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی، بے شک وہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' یہ رحمان کی اس رحمت ہی کا نتیجہ ہے کہ مدتوں لڑنے والے اوس و خزرج بھائی بھائی بن گئے، حبش کے بلال، روم کے صہیب، ایران کے سلمان، مدینہ کے انصار اور مکہ کے

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

سو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے، تاکہ تو اس کے ساتھ متقی لوگوں کو خوشخبری دے اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرائے جو سخت جھگڑالو ہیں ﴿۹۷﴾

قریش آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" کا عملی نقشہ دنیا کے سامنے آ گیا۔ اگر ان کی کوئی باہمی رنجش رہ بھی گئی تو اللہ تعالیٰ نے جنت میں جانے سے پہلے اسے دور کرنے کا وعدہ فرمایا۔ دیکھیے سورۂ حجر (۴۷) جیسا کہ اوپر گزرا، یہ محبت ایمان داروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے، کفار کے دلوں میں نہیں، اس کی مثال ثمامہ بن اثال اور ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہما ہیں جنھوں نے شہادت دی کہ اسلام لانے سے پہلے ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مبغوض کوئی نہ تھا، لیکن پھر ایمان لانے کے بعد آپ سے بڑھ کر محبوب کوئی نہ تھا۔

تیسرا معنی یہ ہے کہ "وُدًّا" مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، محبوب چیز، یعنی ایمان اور عملِ صالح والے جو چیز محبوب رکھیں گے، پسند کریں گے رحمان جنت میں انھیں وہی عطا فرمائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۳۱ ] "اور تمھارے لیے اس (جنت) میں وہ کچھ ہے جو تمھارے دل چاہیں گے اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے۔" یہ معنی ابو مسلم نے بیان فرمایا ہے۔ (قاسمی)

**آیت 97** فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ...... : یہ ساری سورت بلکہ پورا قرآن متقین کو خوش خبری اور منکرین کو ڈرانے کے لیے ہے۔ اس آیت سے پہلی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی اولاد بتانے والوں کی تردید اور ان کا انجام بد مذکور ہے اور ایمان اور عملِ صالح والوں کو حصولِ محبت کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے قرآن مجید میں تین خوبیاں رکھنے کا ذکر فرمایا، تاکہ بشارت و نذارت بہترین طریقے سے ہو سکے۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسان کر دیا ہے اور اللہ کی آسان کی ہوئی چیز سے زیادہ آسان کیا چیز ہو گی۔ دیکھیے سورۂ قمر (۱۷) دوسری یہ کہ اسے رسول اللہ ﷺ کی زبان "عربی" میں اتارا جس سے زیادہ بات واضح کرنے کی خوبی کسی زبان میں نہیں اور جس کے اولین مخاطب یہ زبان بولنے والے تھے، جو اس زبان کے باریک سے باریک اشاروں کو بھی سمجھتے تھے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۱۹۲ تا ۱۹۵)، یوسف (۱، ۲)، زخرف (۱ تا ۳) اور نحل (۱۰۳)۔

تیسری یہ کہ اس کے ساتھ خوش خبری دینے اور ڈرانے کے لیے نبی کریم ﷺ کو یہ دے کر بھیجا گیا، جو خود اہل عرب سے تھے، تاکہ وہ اسے پڑھ کر سنائیں اور عمل کر کے دکھائیں۔ دیکھیے سورۂ نحل (۴۴) پہلی خوبی لفظ "يَسَّرْنٰهُ" میں، دوسری "بِلِسَانِكَ" میں اور تیسری "لِتُبَشِّرَ بِهِ" اور "تُنْذِرَ بِهٖ" کے صیغہ خطاب میں بیان ہوئی ہے۔

"لُدًّا" "اَلَدُّ" کی جمع ہے، سخت جھگڑالو اور ضدی شخص، جو کسی طرح حق بات کو نہ مانے۔ اس سے مراد قریش اور دوسرے

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

اور ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانے کے لوگوں کو ہلاک کر دیا، کیا تو ان میں سے کسی ایک کو محسوس کرتا ہے، یا ان کی کوئی بھنک سنتا ہے؟ ﴿۹۸﴾

معاند کفار ہیں۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۵۷، ۵۸)۔

**آیت 98** وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ...... یہاں گزشتہ آیت میں مذکور سخت جھگڑالو قوم کو ان سے پہلی سخت جھگڑالو قوموں کی ہلاکت کا ذکر کر کے ڈرایا گیا ہے کہ ہم نے ان سے پہلے ایسی کتنی ہی سخت ضدی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ غور سے دیکھو! ان میں سے کوئی تمھیں کہیں کھٹکتا ہے، یا اس کی بھنک ہی کان میں پڑتی ہے؟ یہی حال اس زمانے کے کافروں کا ہونے والا ہے۔

سورۂ طٰہٰ ۲۰ مکیۃ ۴۵ ﴿ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴾ اٰیاتھا ۱۳۵ رکوعاتھا ۸

# طٰهٰ ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

طٰہٰ۔ ① ہم نے تجھ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تو مصیبت میں پڑ جائے ②

**آیت 1** طٰهٰ : ظاہر یہی ہے کہ یہ حروف مقطعات میں سے ہیں، کیونکہ یہ دونوں حرف دوسری جگہ مقطعات میں استعمال ہوئے ہیں، ''طا'' ''طٰسٓمٓ'' (شعراء) میں اور ''ھا'' ''کٓهٰیٰعٓصٓ'' (مریم) میں۔ مقطعات کی تفسیر کے لیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر دیکھیے۔ عبد الرزاق نے اپنی صحیح سند کے ساتھ قتادہ اور حسن کا قول نقل کیا ہے کہ ''طٰهٰ'' کا معنی ہے ''یَا رَجُلُ!'' اے آدمی! کیونکہ قبیلہ بنو عک میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا تھا، مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے، کیونکہ قرآن مجید قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے۔

**آیت 2** مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی : ''شَقِيَ یَشْقٰی شَقَاوَۃً وَ شَقَاءً'' بروزن ''رَضِیَ یَرْضٰی'' یہ سعادت کی ضد ہے۔ سعادت کی دو قسمیں ہیں، دنیوی اور اخروی۔ اسی طرح شقاوت کی بھی دو قسمیں ہیں، دنیوی اور اخروی۔ اخروی شقاوت بدبختی و بدنصیبی ہے، جیسا کہ کفار کہیں گے: ﴿ رَبَّنَا غَلَبَتۡ عَلَیۡنَا شِقۡوَتُنَا ﴾ [ المؤمنون : ۱۰۶ ] ''پروردگارا! ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی۔'' دنیوی شقاوت ایسے کاموں میں پھنس جانا جو مشقت اور تھکاوٹ کا باعث ہوں، جیسے کہتے ہیں ''فُلَانٌ اَشْقٰی مِنْ رَائِضِ مُهْرٍ'' ''فلاں گھوڑی کے بچھیرے کو سدھانے والے سے بھی زیادہ مشقت اور مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔'' مفسرین نے اس آیت کے دو معنی بیان فرمائے ہیں اور دونوں درست ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نزول وحی کے بعد ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں، اس کے لیے آپ دن رات دعوت و تبلیغ کے لیے اتنی مشقت اٹھاتے اور کفار کی بے رخی پر اس قدر غم زدہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اتنی بھی مشقت اور فکر کیا کہ آپ مصیبت ہی میں پڑ جائیں، ہم نے آپ پر یہ قرآن شقاوت کے لیے نہیں بلکہ آپ کی سعادت کے لیے اتارا ہے۔ آپ کے ذمے یہ نہیں کہ تمام لوگوں کو مسلمان کر کے چھوڑیں۔ آپ کا کام نصیحت ہے، پھر جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ قبول کر لے گا، دوسروں کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ لوگوں کے مسلمان نہ ہونے پر رسول اللہ ﷺ کے غم و افسوس کا اور آپ کو تسلی دینے کا ذکر بہت سی آیات میں ہے، مثلاً: ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ﴾ [ الکہف : ۶ ] ''پس شاید تو اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والا ہے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔'' اور فرمایا: ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا یَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴾ [ الشعراء : ۳ ] ''شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔'' دوسرا معنی اس آیت کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عبادت خصوصاً قیام میں بہت محنت کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس میں میانہ روی کا

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝

بلکہ نصیحت کرنے کے لیے، اس کو جو ڈرتا ہے ③ اس کی طرف سے اتارا ہوا ہے جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا ④

---

حکم دیا اور فرمایا: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ [ المزمل : ۲۰ ] یعنی اے نبی! آپ جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہیں کریں۔ تفصیل کے لیے سورۂ مزمل کا آخری رکوع ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 3** اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى : "اِلَّا" کے ساتھ استثنا منقطع ہے، کیونکہ "تَذْكِرَةً" شقاوت میں شامل نہیں ہے، لہٰذا یہاں "اِلَّا" بمعنی "لٰكِنْ" ہے، چنانچہ یہاں اس کا ترجمہ "بلکہ" کیا گیا ہے اور یہ جو فرمایا کہ اس قرآن کو اس شخص کی نصیحت کے لیے اتارا جو ڈرتا ہے، اس سے مراد یہ نہیں کہ قرآن دوسرے لوگوں کی نصیحت کے لیے نہیں اترا، کیونکہ قرآن بلکہ پورا دین ہر انس و جن تک پہنچانے کے لیے اتارا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ [ المائدۃ : ۶۷ ] "اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔" اور نبی ﷺ قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ (دیکھیے سبا: ۲۸) بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس سے فائدہ وہی اٹھائے گا جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، جسے اللہ اور آخرت کا ڈر نہیں اسے صحیح راستے پر ڈال دینا آپ کے ذمے نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى﴾ [ الأعلٰی : ۱۰، ۱۱ ] "عنقریب نصیحت حاصل کرے گا جو ڈرتا ہے اور اس سے علیحدہ رہے گا جو سب سے بڑا بدنصیب ہے۔" علاوہ ازیں دیکھیے سورۂ بقرہ (۱ تا ۵)، سورۂ ق (۴۵) اور نازعات (۴۵)۔

**آیت 4** "تَنْزِيْلًا" فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے جو "مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ" سے معلوم ہو رہا ہے، یعنی "نَزَّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ تَنْزِيْلًا۔" تنزیل کا معنی تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ہے، اس کی حکمت کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان کی آیت (۳۲) "الْعُلٰى" "عُلْيَا" کی جمع ہے جو "أَعْلٰى" کی مؤنث ہے، جیسے "كُبْرٰى" کی جمع "كُبَرٌ" ہے، یعنی یہ قرآن کسی جادوگر، کاہن، شاعر، شیطان، جن، انسان، فرشتے یا کسی بھی مخلوق کا کلام نہیں، بلکہ اس خالق کا نازل کردہ ہے جو صرف تمھارا ہی خالق نہیں بلکہ اس عظیم الشان زمین کا، جس کے اوپر اور ان بے حد بلند و بالا آسمانوں کا، جن کے نیچے تم رہتے ہو، سب کا خالق وہی ہے۔ دیکھیے سورۂ نازعات (۲۷ تا ۳۳) اس سے اس قرآن کی عظمت سمجھ لو کہ کیا یہ اپنے لانے والے یا اپنے ماننے والوں کے لیے کسی طرح بھی باعث شقاوت ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ ان کے لیے سراسر سعادت ہی سعادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَأَبْشِرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ » [ بخاري، الإيمان، باب الدين يسر : ۳۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] "بے شک یہ دین آسان ہے اور کوئی بھی شخص دین میں جب بھی بے جا سختی کرے گا تو وہ اس پر غالب آجائے گا۔ تو تم سیدھے چلو اور قریب رہو اور (اللہ سے ملنے

# اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵

وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا ۝۵

والے اجر پر) خوش ہو جاؤ اور صبح و شام اور رات کے کچھ حصے (میں عبادت) کے ساتھ مدد حاصل کرو۔"

**آیت 5** ① **اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى:** یعنی آپ پر قرآن کا نازل کرنا اور زمین اور بلند آسمان کو پیدا کرنا جس بے حد رحم والے کی رحمت کا نتیجہ ہے وہ رحمان عرش پر بلند ہے۔ عرش کا لفظی معنی تخت ہے اور "اَسْتَوٰى" کا معنی "اِرْتَفَعَ" (بلند ہوا) ہے۔ عرش کے اوپر اللہ تعالیٰ ہے اور پوری کائنات کی تدبیر فرما رہا ہے، فرمایا: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ﴾ [ یونس : ۳ ] "پھر وہ عرش پر بلند ہوا، ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔" اس آیت اور دوسری آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے، مگر یہ بات کہ وہ عرش کے اوپر کس طرح ہے؟ کھڑا ہے یا بیٹھا ہے یا کس کیفیت میں ہے؟ کوئی نہیں جانتا، نہ جان سکتا ہے، کیونکہ مخلوق محدود ہے اور وہ لامحدود۔ مخلوق میں سے کوئی بھی خالق کو تو کجا اس کی معلومات میں سے بھی کوئی چیز پوری طرح نہیں جان سکتا، مگر جو وہ چاہے، فرمایا: ﴿ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۵ ] "اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرتے مگر جتنا وہ چاہے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے، جو انبیاء علیہم السلام کے بعد اللہ تعالیٰ کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال نہیں کیا کہ وہ اپنے تخت پر کس طرح ہے؟ اسی لیے کسی شخص نے امام مالک رحمہ اللہ سے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کے متعلق پوچھا کہ کس طرح؟ تو انھوں نے فرمایا: "اَلْإِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ" "یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ عرش کے اوپر ہے، مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کس طرح ہے اور اس کے متعلق سوال بدعت ہے۔" مزید فرمایا: "میں تمھیں برا آدمی خیال کرتا ہوں، اسے میرے پاس سے نکال دو۔" تو سوال کرنے والا یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ اے ابو عبد اللہ! میں نے اس کے متعلق اہل عراق اور اہل شام سے پوچھا مگر کسی کو آپ (کے صحیح جواب) جیسی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ (تفسیر بغوی)

خلاصہ یہ کہ جو بات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بتائی ہے اس پر ایمان رکھنا فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، اللہ تعالیٰ کے عرش کو قیامت کے دن آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے (دیکھیے حاقہ : ۱۷) اس کے پائے بھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلنَّاسُ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَكُوْنُ أَوَّلَ مَنْ يُّفِيْقُ فَإِذَا أَنَا بِمُوْسٰى آخِذٌ بِقَائِمَةٍ مِنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ فَلَا أَدْرِيْ أَفَاقَ قَبْلِيْ أَمْ جُوْزِيَ بِصَعْقَةِ الطُّوْرِ » [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ وواعدنا موسٰی ثلاثین...... ﴾ : ۳۳۹۸، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ ] "لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے تو سب سے پہلا شخص جو ہوش میں آئے گا میں ہوں گا۔ اچانک میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ وہ عرش کے پایوں میں سے ایک پائے کو پکڑے ہوئے ہوں گے، تو میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے، یا انھیں طور کی بے ہوشی کا بدلہ دیا گیا۔" مگر اللہ کا عرش پر ہونا

یا اس کی کوئی بھی صفت مخلوق کی صفت کے مشابہ نہیں، فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [ الشوریٰ: ۱۱ ] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ تمام سلف کا اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے اور دوسری صفات کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ خیر القرون گزرنے کے بعد جب عقیدہ واعمال کی بدعات شروع ہوئیں تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آیات واحادیث کی بھی اپنی اپنی بدعات کے مطابق تاویل بلکہ تحریف کی جانے لگی۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے کہا کہ عرش کے اوپر ہونے کا مطلب زمین و آسمان کی حکومت کا مالک ہونا ہے، ورنہ نہ کوئی عرش ہے اور نہ اللہ تعالیٰ اس کے اوپر ہے۔ وہ نہ اوپر ہے نہ نیچے اور نہ کسی اور جہت میں، نہ وہ آسمان دنیا پر اترتا ہے اور نہ قیامت کے دن زمین پر آئے گا۔ غرض تاویل کے نام پر صریح آیات و احادیث کا انکار کر دیا۔ مگر اتنے بڑے بڑے علماء پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اتنی جرأت کے ساتھ اس عرش عظیم وکریم کا انکار کیسے کر دیا کہ جس پر اپنے بلند ہونے کا ذکر خود رحمان نے فرمایا اور جسے قیامت کے دن تمام لوگوں کے اوپر آٹھ فرشتوں کے اٹھانے کا ذکر قرآن کریم نے فرمایا ہے اور جس کے پایوں کا ذکر اس کے حبیب ﷺ نے فرمایا ہے۔ [ فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْاَهْوَاءِ الْمُضِلَّةِ وَالْعَقَائِدِ الْبَاطِلَةِ وَ خُذْلَانِ رَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی ] مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴)، حاقہ (۱۷) اور سورۂ فجر (۲۲) مفسر جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں: ”فلکیات کے جدید ماہرین کی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ عرش ایک حقیقی وجود ہے جس کا باقاعدہ جسم ہے، کائنات کے جتنے عالم ہیں وہ سب کا مرکز ہے، یعنی جذب، تاثیر، تدبیر اور نظام سب کا مرکز ہے (تمام کہکشائیں جن کا ایک ایک سیارہ سورج سے بھی ہزاروں گنا بڑا ہے، اسی کے گرد گردش کر رہی ہیں اور اس کے انکار یا تاویل کی گنجائش ہی نہیں)۔“ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”کہ ہم انصاف کے ترازو قیامت کے دن رکھیں گے“ کے متعلق جب عقل پرستوں کی عقل میں یہ بات نہ آسکی کہ اعراض کا وزن کیسے ہوگا تو انھوں نے وزن اعمال کا انکار کر دیا، یا تاویل کر دی۔ جب کہ جدید ایجادات میں تقریباً ہر چیز کا میٹر تیار ہو چکا ہے، بجلی، بخار، حرارت، سردی، کثافت، نمی، خشکی غرض بے شمار اعراض کے ماپنے تولنے کے پیمانے وجود میں آچکے ہیں جن کی وجہ سے عقل پرستوں کے انکار اور تاویل کا تارو پود بکھر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے زمین پر قرآن نازل فرمایا، اس لیے پہلے اس کا ذکر فرمایا، پھر بلند آسمان کا، پھر رحمان کے عرش پر ہونے کا کہ دیکھو یہ رحمت کہاں سے نازل ہوئی اور کس عظیم شخصیت پر نازل ہوئی۔ اس میں قرآن کی رفعت و عظمت کا بھی بیان ہے اور صاحب قرآن کی عظمت کا بھی۔ مزید آپ ﷺ کو اور آپ کی امت کو اس نعمت کی قدر کا احساس دلانا بھی ہے اور کفار کی طرف سے پیش آنے والی مزاحمت اور مصائب و تکالیف کے مقابلے میں تسلی اور خوش خبری بھی کہ اس رحمان کی پشت پناہی حاصل ہونے کے بعد تمھیں کس بات کی پروا ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تفصیل سے کیا کہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کس کس طرح حاصل ہوتی ہے اور انھیں کیا کیا آزمائشیں پیش آتی ہیں۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ۞ وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ۞ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۞ وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۞ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ اٰتِيْكُمْ

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو گیلی مٹی کے نیچے ہے ⑥ اور اگر تو اونچی آواز سے بات کرے تو وہ تو پوشیدہ اور اس سے بھی پوشیدہ بات کو جانتا ہے ⑦ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب سے اچھے نام اسی کے ہیں ⑧ اور کیا تیرے پاس موسیٰ کی خبر پہنچی ہے ⑨ جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو، بے شک میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں تمھارے پاس اس

آیت 6 لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ...... : "الثَّرٰى" گیلی مٹی کے نیچے سے مراد زمین کا سب سے نچلا حصہ ہے، یعنی وہ عرش پر مستوی ہو کر آسمانوں سے لے کر زمین کی آخری گہرائی تک ہر چیز کی تدبیر ہی نہیں کر رہا بلکہ ان سب کا مالک بھی وہ اکیلا ہی ہے۔ ملک بھی اسی کا ہے، ملکیت بھی اسی کی۔ حاکم بھی وہی ہے، مالک بھی وہی۔ ہر چیز کا وجود، حرکت، سکون، تغیر یا ثبات سب کچھ اسی کے امر سے ہے۔

آیت 7 وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ...... : یعنی اگر تم اونچی آواز سے بات کرو تو وہ اسے بالاولیٰ سنتا ہے، کیونکہ وہ تو سِرّ (پوشیدہ بات) کو جانتا ہے اور اخفیٰ (اس سے زیادہ پوشیدہ) کو بھی۔ سِرّ سے مراد وہ بات ہے جو تنہائی میں چپکے سے کہی جائے اور اخفیٰ (اس سے زیادہ چھپی بات) وہ ہے جو ابھی دل میں ہو اور زبان پر نہ آئی ہو۔

آیت 8 اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ...... : یعنی جس ہستی کی یہ صفات بیان ہوئی ہیں وہ اللہ ہے جس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ "لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۰)۔

آیت 9 تا 11 ① وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى : قرآن کی عظمت کے ذکر اور دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی مشقت اور تکلیف کی طرف اشارہ فرما کر اب یہاں سے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے، اس سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے، کیونکہ جن دنوں یہ سورت نازل ہوئی مکہ میں نبی ﷺ کو ایسے ہی حالات درپیش تھے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کو پیش آ چکے تھے۔ اس کے علاوہ گزشتہ آیت میں "اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" کے ساتھ توحید کا جو بیان ہوا تھا اس کی مزید وضاحت مقصود ہے کہ ہر نبی یہی دعوت لے کر آیا۔ خصوصاً گزشتہ انبیاء میں سے جس نبی کے واقعات سب سے زیادہ مشہور ہیں انھیں بھی پہلی وحی میں آگاہ کر دیا گیا: ﴿ اِنَّنِيْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ﴾ [ طٰہٰ : ۱۴ ] اور سورت کے آخر میں بھی یہی بات دہرائی: ﴿ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ [ طٰہٰ : ۹۸ ] "تمھارا معبود تو اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے۔"

مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿۱۰﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوۡدِىَ يٰمُوۡسٰى ﴿۱۱﴾

سے کوئی انگارا لے آؤں، یا اس آگ پر کوئی رہنمائی حاصل کرلوں ﴿۱۰﴾ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے آواز دی گئی اے موسیٰ! ﴿۱۱﴾

"وَهَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى" یہ "مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤى" پر عطف ہے، یعنی نزول وحی آپ کے لیے باعث شقاوت نہیں بلکہ باعث سعادت ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ نعمت باعث سعادت تھی۔ اور کیا آپ کو موسیٰ کی خبر پہنچی کہ ان کو یہ سعادت ملنے کا آغاز کیسے ہوا؟ استفہام ان کی خبر سننے کا شوق دلانے کے لیے ہے، پوچھنے کے لیے نہیں۔ آگ دیکھنے کا ذکر مزید شوق دلانے کے لیے ہے کہ معلوم ہو آگ دیکھنے کے بعد کیا ہوا؟ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب مدین میں دس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل و عیال سمیت مصر آ رہے تھے۔ اس قصے کا کچھ حصہ سورۂ یونس اور سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ یہاں جو بات ذکر ہوئی ہے اس سے پہلے کی سرگزشت کا ذکر سورۂ قصص میں ہے۔

② "جب اس نے آگ دیکھی" سے معلوم ہوا کہ یہ رات کا وقت تھا اور سردی کا موسم تھا۔ گھر والے ساتھ تھے اور سب کو رات گزارنے کے لیے آگ کی ضرورت تھی۔ سورۂ قصص (۲۹) اور سورۂ نمل (۷) میں ہے: ﴿لَعَلَّكُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ﴾ "تاکہ تم تاپ لو۔" "اَوۡ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى" سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول گئے تھے، آگ جلانے کا چقر (چقماق) پاس نہیں تھا، اگر تھا تو سردی کی شدت یا لکڑیوں کی نمی کی وجہ سے آگ نہیں جل رہی تھی۔ اندھیرے میں آگ کے ذریعے سے متوجہ کرنے میں ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام گمراہی کی تاریکی میں ہدایت کی روشنی کا باعث بنیں گے۔ [ التحریر و التنویر ]

③ اِنِّىۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا: " آنَسَ " (افعال) اس نے واضح طور پر دیکھا، اسی لیے آنکھ کی پتلی کو "انسان العین" کہتے ہیں، کیونکہ اسی سے کوئی چیز واضح معلوم ہوتی ہے۔ "اِنَّ" کے ساتھ تاکید اور لفظ "اٰنَسۡتُ" کے استعمال سے ظاہر ہو رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پورے یقین کے ساتھ ایک بہت بڑی آگ دیکھنے کا ذکر فرما رہے ہیں، کیونکہ "نَارًا" کی تنوین بھی تعظیم کے لیے ہے۔ یہ آگ موسیٰ علیہ السلام کو متوجہ کرنے کے لیے تھی جو انھیں ایک درخت میں لگی ہوئی نظر آئی اور درخت ہی سے آواز آئی کہ بے شک میں تیرا رب ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور نہیں تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کی تو جواب "لَنۡ تَرٰىنِىۡ" ملا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۴۳)۔

④ لَّعَلِّىۡۤ اٰتِيۡكُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ: " قَبَسٌ " مصدر بمعنی مفعول، اخذ کی ہوئی چیز۔ آگ جلانے کے لیے جلتی ہوئی آگ میں سے لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ کے سرے پر آگ کا شعلہ لیا جائے تو اسے "قَبَسٌ" کہتے ہیں اور "جَذۡوَةٌ" بھی۔ "جَذۡوَةٌ" کا ایک معنی انگارا بھی ہے۔ (قاموس)

⑤ هُدًى: یعنی کوئی راستہ بتانے والا مل جائے، یا آگ کی روشنی میں راستے کے آثار مل جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾

بے شک میں ہی تیرا رب ہوں، سو اپنی دونوں جوتیاں اتار دے، بے شک تو پاک وادی طویٰ میں ہے ﴿۱۲﴾

زبان پر وہی چیز جاری فرما دی جو فی الواقع وجود میں آنے والی تھی، چنانچہ انھیں کفر کی برودت سے بچانے والا ایمان کا شعلہ بھی مل گیا اور صراط مستقیم کی رہنمائی بھی حاصل ہو گئی۔

❻ "نُوْدِيَ" (آواز دی گئی) یہ آواز ایک درخت سے آ رہی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۳۰) فعل مجہول لانے میں بھی یہ جاننے کا شوق ابھارنا مقصود ہے کہ آواز دینے والا کون تھا اور اس نے کیا آواز دی؟

آیت 12 ❶ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ: غالباً اسی سے یہودیوں نے یہ مسئلہ بنا لیا ہے کہ جوتا پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا: « خَالِفُوا الْيَهُوْدَ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّوْنَ فِيْ نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ » [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب الصلاۃ في النعل : ٦٥٢، و صححه الألباني ] "یہودیوں کے خلاف عمل کرو، کیونکہ وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔" اگر دوسری حدیث نہ ہوتی تو اس حدیث کی رو سے جوتوں سمیت نماز پڑھنا فرض تھا۔ وہ حدیث یہ ہے، عبد اللہ عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: « رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ حَافِيًا وَ مُتَنَعِّلًا » [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب الصلاۃ في النعل : ٦٥٣ ] "میں نے رسول اللہ ﷺ کو ننگے پاؤں اور جوتا پہن کر (دونوں طرح) نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

❷ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "طویٰ اس وادی کا نام ہے۔" [ طبري بسند حسن ] یہ الفاظ دلیل ہیں کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے ناپاک تھے، اگر وہ پاک ہوتے تو اس وادی کو پاک بتا کر جوتے اتارنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: « بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ بِأَصْحَابِهِ إِذْ خَلَعَ نَعْلَيْهِ فَوَضَعَهُمَا عَنْ يَسَارِهِ، فَلَمَّا رَأَى ذٰلِكَ الْقَوْمُ أَلْقَوْا نِعَالَهُمْ، فَلَمَّا قَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاتَهُ قَالَ مَا حَمَلَكُمْ عَلٰى إِلْقَائِكُمْ نِعَالَكُمْ ؟ قَالُوْا رَأَيْنَاكَ أَلْقَيْتَ نَعْلَيْكَ فَأَلْقَيْنَا نِعَالَنَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَتَانِيْ فَأَخْبَرَنِيْ أَنَّ فِيْهِمَا قَذَرًا، أَوْ قَالَ أَذًى، وَقَالَ إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَسْجِدِ فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأٰى فِيْ نَعْلَيْهِ قَذَرًا أَوْ أَذًى فَلْيَمْسَحْهُ وَلْيُصَلِّ فِيْهِمَا » [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب الصلاۃ في النعل : ٦٥٠، و صححه الألباني ] "رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے، دوران نماز آپ نے اپنے جوتے اتارے اور اپنی بائیں طرف رکھ دیے۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے جوتے اتار دیے۔ جب آپ نے اپنی نماز پوری کی تو فرمایا: "تمھارے جوتے اتارنے کا باعث کیا ہوا؟" انھوں نے کہا: "ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے جوتے اتارے تو ہم نے بھی اتار دیے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میرے پاس جبریل آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ ان میں گندگی لگی ہے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی مسجد کو آئے تو دیکھ لے، پھر اگر اپنے جوتوں میں کوئی گندگی

## وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾

اور میں نے تجھے چن لیا ہے، پس غور سے سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے ﴿۱۳﴾

دیکھے تو اسے مل کر صاف کر لے اور انھیں پہن کر نماز پڑھ لے۔“

یہ حدیث دلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کے حکم کی وجہ وادی کا پاک ہونا اور جوتوں کا ناپاک ہونا تھا۔ یہ وجہ نہ تھی کہ کسی مقدس جگہ میں جوتے پہن کر جانا منع ہے، کیونکہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ مسجد پاک ترین جگہ ہے اور اسے پاک رکھنے کا حکم بھی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۵) اور سورۂ حج (۲۶) اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: « أَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ وَأَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَيَّبَ » [ أبو داؤد، الصلاۃ، باب اتخاذ المساجد في الدور : ۴۵۵۔ ترمذی : ۵۹۴۔ ابن ماجہ : ۷۵۸، صحیح ] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ انھیں صاف ستھرا رکھا جائے اور خوشبو دار بنایا جائے۔“ جوتے پاک ہوں تو مسجد میں جا سکتے ہیں تو کسی اور جگہ کیوں نہیں جا سکتے؟ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مردار گدھے کے چمڑے کے تھے، اس لیے انھیں اتارنے کا حکم ہوا، مگر یہ روایات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ اس لیے یہ بات اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے جوتوں میں کیا چیز تھی جو وادی مقدس کے لائق نہ تھی، کیونکہ پاک جوتے جب مسجد نبوی میں پہنے جا سکتے ہیں تو تین مسجدوں سے زیادہ مقدس جگہ کون سی ہوگی؟

➌ اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ نہ موسیٰ علیہ السلام غیب جانتے تھے اور نہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ورنہ جبریل علیہ السلام کو جوتوں میں نجاست کی اطلاع کے لیے دوران نماز آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہ تھی اور اگر موسیٰ علیہ السلام غیب جانتے ہوتے تو نہ راستہ بھولتے اور نہ آگ کو عام آگ سمجھتے، نہ اللہ تعالیٰ کو وادی مقدس کا بتا کر انھیں جوتے اتارنے کا حکم دینا پڑتا اور نہ یہ کہہ کر تعارف کروانا پڑتا کہ میں تیرا رب تجھ سے مخاطب ہوں اور نہ اس کے بعد جبریل علیہ السلام کو بار بار آ کر وحی پہنچانا پڑتی۔ مگر افسوس کہ ولیوں اور نبیوں کو غیب دان کہنے والے ذرہ برابر نہیں سوچتے۔

➍ اوپر کی حدیث سے معلوم ہوا کہ جوتے پاک کرنے کے لیے کپڑے کو پاک کرنے کی طرح دھونا ضروری نہیں، بلکہ صرف مٹی سے مل کر صاف کر دینا کافی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث ہر اس بہانے کا جواب ہے جو جوتوں سمیت نماز سے روکنے والے کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ یہ سفر کے لیے ہے، یا یہ کسی میدان وغیرہ میں نماز کے لیے ہے مسجد کے لیے نہیں، یا یہ کہ جوتا نیا ہو تو جائز ہے، یا یہ کہ دھویا ہوا ہو تو ٹھیک ہے، یا یہ کہ جوتا پہننا اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کے ادب کے خلاف ہے وغیرہ، ان تمام باتوں کا جواب اسی حدیث پر غور کرنے سے مل جاتا ہے۔

➎ جیسا کہ اوپر گزرا جوتوں سمیت نماز پڑھنا فرض نہیں مستحب ہے۔ اس لیے اگر لاعلم لوگوں کے فتنے میں پڑنے کا خوف ہو تو جوتوں سمیت نماز پڑھنے سے پہلے انھیں اچھی طرح سمجھانا لازم ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ متنفر ہو کر نماز پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔

**آیت 13** وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى: نبوت کے حصول میں کسی کی جدوجہد یا محنت کا کچھ دخل نہیں، یہ صرف اور صرف

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾

بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر ﴿۱۴﴾

اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے۔ دیکھیے سورۂ حج (۷۵) قادیانی دجال نے اسے مجاہدہ وکسب سے حاصل ہو سکنے کا دعویٰ کیا، چنانچہ اس کی زندگی ہی میں اس کے پیروکاروں میں سے تیرہ آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ دیکھیے قادیانیت از ابوالحسن علی ندوی۔

آیت 14 ① اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ نے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو اس تعلق سے آگاہ کیا جو اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تھا کہ بلاشبہ میں تیرا رب ہوں جو تجھ سے مخاطب ہوں، یعنی تجھے پیدا کرنے والا، تیری پرورش کرنے والا اور تیری ہر ضرورت پوری کرنے والا میں ہی ہوں۔ پھر جوتے اتارنے کے حکم کے بعد وحی کو غور سے سننے کی تاکید فرمائی، کیونکہ چننے سے مقصود ہی وحی کے ذریعے سے رسالت کی ذمہ داریاں سونپنا تھا۔ اب ضمیر متکلم " " کے بعد اپنا ذاتی نام بتایا، کیونکہ ملاقات میں پہلی چیز یہی ہے کہ ایک دوسرے کا نام معلوم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ میں تو اپنے کلیم کا نام جانتا ہی ہوں، میرا نام اللہ ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے باقی سب نام صفاتی ہیں جن میں اس کے ننانوے نام بھی شامل ہیں اور وہ بے شمار نام بھی جن سے اس نے ابھی تک کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ لفظ ''اللہ'' عربی زبان میں اس ذات پاک کا نام ہے۔ جب ''اللہ'' کہہ دیا تو اس میں اس کے تمام نام بھی آ گئے اور تمام صفات بھی۔ "اِنَّ" کے ساتھ تاکید موسیٰ علیہ السلام سے شک کا امکان دور کرنے کے لیے ہے، کیونکہ انوکھی بات سن کر جلدی یقین نہیں آتا۔

② لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا: "اِنَّنِيْ" کی پہلی خبر "اَنَا اللّٰهُ" تھی، " " دوسری خبر ہے۔ یہ سب سے پہلی بات ہے جسے جاننا، اس پر یقین رکھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر جن وانس پر واجب ہے۔ اسی بات کی تعلیم کے لیے تمام انبیاء مبعوث فرمائے گئے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۲۵) "فَاعْبُدْنِيْ" یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے جن وانس کو پیدا کیا گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاریات: ۵۶] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' یعنی جب میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو میری عبادت کر۔ عبادت میں ہر وہ عمل آ جاتا ہے جو انتہائی محبت کے ساتھ انتہائی درجے کی عاجزی اور تعظیم پر دلالت کرتا ہو، اس میں قول، فعل اور دل کا اخلاص سب شامل ہیں۔

③ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ: "فَاعْبُدْنِيْ" میں اگرچہ ہر قسم کی بدنی و مالی عبادت کا ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ نماز تمام عبادتوں کی جامع اور سب سے اہم عبادت ہے اور اسلام قبول کرنے کے بعد ایمان کی سب سے پہلی شرط اور علامت ہے کہ جس سے مسلمان کی پہچان ہو کر اس کا خون اور مال محفوظ ہو جاتا ہے (دیکھیے توبہ: ۵، ۱۱) اس لیے اس کا خاص طور پر الگ ذکر بھی فرمایا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''موسیٰ علیہ السلام کو پہلی وحی میں نماز کا حکم ہے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی " " فرمایا گیا۔'' (موضح)

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾

یقیناً قیامت آنے والی ہے، میں قریب ہوں کہ اسے چھپا کر رکھوں، تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے ﴿۱۵﴾

"لِذِكْرِيْ" کی دو تفسیریں ہیں اور دونوں درست ہیں۔ پہلی یہ کہ نماز کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو، ایک نماز سے فارغ ہو تو اگلی کے انتظار میں مشغول رہے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے: «وَ رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ» [ بخاري : ٦٨٠٦ ] اس طرح اس کا سارا وقت ہی نماز میں شمار ہوگا جو اللہ کی یاد کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۷۸) کی تفسیر۔ ہر وقت یاد رکھنے کا نتیجہ اللہ کی نافرمانی سے اجتناب ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ﴾ [ العنکبوت : ٤٥ ] "بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔" دوسری تفسیر یہ کہ اگر بھول جائے تو یاد آنے پر نماز پڑھ لے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَهَا لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذٰلِكَ ﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾» [ بخاري، مواقيت الصلاة، باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر...... : ٥٩٧، عن أنس رضی اللہ عنہ ] "جو شخص کوئی نماز بھول جائے تو جب اسے یاد آئے پڑھ لے، اس کا کفارہ اس کے سوا کچھ نہیں۔" اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ "اور نماز میری یاد کے وقت قائم کر۔" ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا» [ مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة...... : ٣١٥/٦٨٤، عن أنس رضی اللہ عنہ ] "جو شخص کوئی نماز بھول جائے، یا اس سے سویا رہ جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے یاد آئے پڑھ لے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ ﴾ [ الکہف : ٢٤ ] "اور اپنے رب کو یاد کر جب تو بھول جائے۔"

**آیت 15** ① اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ : توحید، عبادت اور نماز کی تاکید کے بعد ایمان کے ایک اور بنیادی رکن قیامت کے یقینی ہونے کا ذکر فرمایا، تاکہ ہر شخص کو اس کی سعی و کوشش کی جزا دی جائے۔ اس صورت میں "لِتُجْزٰى" "اٰتِيَةٌ" کے متعلق ہوگا۔ قیامت کا یقین ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت پر آمادہ کرتی ہے، ورنہ باز پرس اور اللہ کے سامنے پیش ہونے کا یقین نہ ہو تو جائز و ناجائز کی تمیز کون کرتا ہے؟

② اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى ...... : یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ جس کام کے متعلق "كَادَ يَكَادُ" استعمال ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ واقع ہونے کے قریب ہے مگر واقع نہیں ہوا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۲۰): ﴿ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ﴾ (بجلی قریب ہے کہ ان کی نگاہوں کو اُچک لے) میں ہے۔ مفسرین نے اس کے بہت سے جواب دیے ہیں، مگر مجھے ابن جزی رحمہ اللہ کے جواب پر اطمینان ہوتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقت کو پوشیدہ رکھا ہے اور کسی کو نہیں بتایا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ قیامت کے واقع ہونے کو بھی چھپا کر رکھتا اور کسی کو اس کی خبر نہ دیتا، مگر یہ اس کا کرم ہے کہ اس

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾ وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا

سو تجھے اس سے وہ شخص کہیں روک نہ دے جو اس پر یقین نہیں رکھتا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگا ہوا ہے، پس تو ہلاک ہو جائے گا ﴿۱۶﴾ اور یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ!؟ ﴿۱۷﴾ کہا یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں

---

نے اسے پوشیدہ نہیں رکھا، بلکہ اس کے واقع ہونے کی بات سب کو بتا دی ہے، تاکہ لوگ بالکل غافل نہ رہیں۔ اس صورت میں "کَادَ" اور "أُخْفِيْ" دونوں اپنے اصل معنی پر رہتے ہیں کہ قریب تھا کہ قیامت کا واقع ہونا چھپا لیا جاتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔" (التسہیل)

**آیت 16** فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا ...... : اس آیت سے حاصل ہونے والے فوائد میں سے ایک فائدہ مفسر زمخشری کے الفاظ میں یہ ہے: "جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ جم غفیر ہیں، کیونکہ کفار کے لیے قیامت کو تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں، نہ ہی وہ اس سے زیادہ کسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ سو ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی طرف سے آنے والے مصائب کی کثرت اور ان کی بہت بڑی تعداد تمھیں خوف زدہ کر دے اور ان کی کثرت تمھارے قدم پھسلنے کا باعث بن جائے۔ یاد رکھو کہ وہ جس قدر بھی تعداد میں زیادہ ہوں، وہ صرف اور صرف اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے چل رہے ہیں، کسی دلیل و برہان کے پیچھے نہیں اور اس میں بہت بڑی ترغیب ہے کہ دلیل کا علم اور اس کی پیروی لازم ہے اور تقلید سے بچنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ تقلید اور اہلِ تقلید کا انجام ہلاکت ہے۔" دوسرا فائدہ یہ ہے کہ دنیا پرست لوگوں، خصوصاً کفار کی مجلس اور ان سے نرمی اور مداہنت اختیار کرنے سے پرہیز لازم ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "نہ روک دے اس سے" یعنی قیامت کے یقین لانے سے یا نماز سے۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو برے کی صحبت سے منع کیا تو اور کوئی کیا ہے؟" (موضح)

**آیت 17** وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى : اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں کیا ہے، بلکہ اس میں حکمت یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کے عصا ہونے کا یقین ہو جائے، بعد میں سانپ بننے پر انھیں یہ شک پیدا نہ ہو کہ شاید میں نے کوئی اور چیز پکڑی ہوئی تھی۔ (واللہ اعلم) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے دل سے ہیبت دور کرنے اور مانوس کرنے کے لیے لاٹھی کے متعلق سوال فرمایا ہو، تاکہ انھیں اگلا حکم دیں۔

**آیت 18** ① قَالَ هِيَ عَصَايَ ...... : جواب میں اگرچہ اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ "یہ میری لاٹھی ہے" مگر موسیٰ علیہ السلام نے یہ بتانے کے بعد اس کے کئی فوائد بھی بیان کر دیے۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خیال کیا کہ یہ بات ظاہر ہے کہ میرے ہاتھ میں لاٹھی ہے اور ظاہر بات کے متعلق سوال نہیں ہوتا، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اس لیے پوچھا ہے کہ میں بتاؤں کہ میں نے لاٹھی کیوں پکڑ رکھی ہے؟ اس لیے جواب میں "یہ لاٹھی ہے" کہہ کر اس کے چند فوائد بیان کیے، مگر آخر میں بات مختصر کر دی کہ اگر مزید وضاحت کی ضرورت ہوئی تو پھر پوچھ لیا جائے گا۔ (ابن عاشور)

# مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾

اور اس کے ساتھ اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لیے اس میں کئی اور ضرورتیں ہیں ﴿۱۸﴾

دوسری توجیہ علمائے معانی نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی لذت میں بے اختیار بات لمبی ہوتی گئی، مگر ایک طرف فرط محبت کا تقاضا تھا کہ بات لمبی سے لمبی ہوتی جائے، تو دوسری طرف ادب زیادہ بات کرنے سے مانع تھا، اس لیے ایک اپنی ضرورت ''ٹیک لگانا'' اور ایک اپنی بکریوں کی ضرورت ''پتے جھاڑنا'' بیان کر کے آخر میں یہ کہہ کر بات مختصر کر دی کہ ''وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى'' یہ توجیہ بھی بہترین ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی کے بہت سے دیگر فوائد بھی بیان کیے ہوں جن کا ماحصل اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں بیان فرما دیا ہو۔ اس صورت میں یہ اختصار موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ہو گا۔ (واللہ اعلم)

❷ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ ...... : حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے ''هَشّ'' کا معنی یہ نقل کیا ہے کہ لاٹھی کے ساتھ ٹہنی کو ہلانا، تاکہ پتے گر پڑیں مگر شاخ نہ ٹوٹے۔ یہ لفظ لاٹھی مار کر پتے جھاڑنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ''مَاٰرِبُ'' ''مَأْرُبَةٌ'' (را کے فتحہ، کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) کی جمع، حاجت یعنی وہ کام جن کی ضرورت پڑتی ہے۔ لاٹھی کے فوائد پر جاحظ نے ''کتاب العصا'' لکھی ہے جس میں لاٹھی کے فوائد اور عربوں کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ ابن الاعرابی سے پوچھا گیا کہ ''وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى'' سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ''میں موسیٰ علیہ السلام کی تمام ضروریات تو بیان نہیں کر سکتا، البتہ لاٹھی کی ضرورت کی چند چیزیں تمھیں بتاتا ہوں، وہ یہ کہ لاٹھی سانپ، بچھو، بھیڑیے، بپھرے ہوئے سانڈ اور کھیت اجاڑنے والے جانوروں کے لیے ساتھ رکھی جاتی ہے۔ بڑی عمر کے بوڑھے، کمزور و بیمار لوگ، کٹی ہوئی ٹانگ والے اور لنگڑے اس کا سہارا لیتے ہیں، یہ انھیں دوسری ٹانگ کا کام دیتی ہے۔ اندھے کو قائد کا کام دیتی ہے۔ دھوبی، رنگ ریز اور تنور اور چولھے کی راکھ ہلانے والوں کے کام آتی ہے۔ چونا کوٹنے، تل وغیرہ چھڑنے کے کام آتی ہے۔ ڈاک لے جانے والوں اور کرائے کے جانوروں کے ساتھ جانے والوں کے کام آتی ہے کہ فاصلہ لمبا ہو تو وہ لاٹھی کے سہارے چھلانگ لگاتے جاتے ہیں۔ فالج زدہ کے جھکاؤ کو سیدھا کرتی ہے اور رعشہ کے مریض کے لرزہ کو کنٹرول کرتی ہے۔ چرواہے اسے بکریوں کے لیے اور تمام سوار اپنی سواری کے لیے ساتھ رکھتے ہیں۔ کوئی بھاری بوجھ ہو تو اس میں داخل کر کے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات دو آدمی اس کا ایک ایک کنارہ پکڑ لیتے ہیں۔ چاہو تو دیوار میں ٹھونک کر میخ بنا لو یا کھلی جگہ میں گاڑ کر سترہ بنا لو یا چھتری بنا لو۔ اگر نوک لگا دو تو برچھی بن جائے گی، کچھ اور بڑھا دو تو نیزہ بن جائے گی۔ لاٹھی کوڑے کا کام بھی دیتی ہے اور اسلحہ بھی ہے۔ کندھے پر رکھ کر اس کے ساتھ کمان، ترکش اور پانی یا دودھ وغیرہ کا برتن بھی لٹکا سکتے ہو۔ کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے رسی چھوٹی ہو تو لاٹھی ساتھ ملا کر پانی نکال سکتے ہو۔ چادر اس کے اوپر ڈال کر سایہ حاصل کر سکتے ہو اور درندوں کا مقابلہ کر سکتے ہو وغیرہ۔''

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾

فرمایا اسے پھینک دے اے موسیٰ! ﴿۱۹﴾ تو اس نے اسے پھینکا تو اچانک وہ ایک سانپ تھا جو دوڑتا تھا ﴿۲۰﴾ فرمایا اسے پکڑ اور ڈر نہیں، عنقریب ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے ﴿۲۱﴾ اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو کی طرف ملا، وہ کسی عیب کے بغیر سفید (چمکتا ہوا) نکلے گا، اس حال میں کہ ایک اور نشانی ہے ﴿۲۲﴾

**آیت 21-19** ① اللہ تعالیٰ کے حکم پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو اچانک وہ سانپ بن گیا جو دوڑتا تھا، یعنی حقیقی اور زندہ سانپ تھا۔ قرآن مجید میں اس کے لیے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں "حَيَّةٌ" (سانپ)، "جَآنٌّ" (پتلا چھڑی جیسا چمکتا ہوا سانپ) اور "ثُعْبَانٌ" (بہت بڑا اژدہا)۔ معلوم ہوا کہ لاٹھی پھینکتے ہی پتلے سانپ جیسی بنی، پھر بڑھتے بڑھتے بہت بڑا اژدہا بن گئی۔ موسیٰ علیہ السلام خوف زدہ ہو کر بے اختیار بھاگ اٹھے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ دیکھیے سورۂ نمل (۱۰) اور قصص (۳۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسے پکڑو اور ڈرو نہیں، ہم اسے دوبارہ پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔

② اہل علم نے لاٹھی کے ایک لمحہ میں سانپ اور پھر دوبارہ لاٹھی بننے میں کئی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے جدامجد ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنی قدرت کا عین الیقین عطا فرما دیا کہ کس طرح اس کے حکم سے ایک بے جان چیز اتنی خطرناک ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی اور پھر کس طرح اتنی خطرناک چیز اس کے حکم سے بے جان لکڑی بن جاتی ہے، جو حرکت بھی نہیں کر سکتی۔ مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ فرعون اپنی تمام تر قہرمانیوں کے باوجود اللہ کے حکم کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ دوسری حکمت یہ کہ اس زمانے میں جادو اپنے عروج پر تھا، اس کے توڑ کے لیے یہ معجزہ دیا اور انھیں مشاہدہ بھی کروا دیا، تاکہ میدان میں لاٹھی کے سانپ بننے سے موسیٰ علیہ السلام خوف زدہ ہو کر بھاگ نہ اٹھیں، بلکہ انھیں آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوت کا ہر وقت احساس رہے۔ تیسری حکمت بقاعی رحمہ اللہ نے ربط آیات کے ضمن میں لکھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے آغاز سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے آنے کا ذکر فرمایا ہے، جسے "اَلسَّاعَةُ" کہتے ہیں، یعنی ایک لمحہ، ایک گھڑی، قیامت کا ذکر کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو ایک لمحے میں لاٹھی کو سانپ اور سانپ کو لاٹھی بنا کر ایک گھڑی میں قیامت قائم ہونے کا مشاہدہ کروا دیا۔ (نظم الدرر)

**آیت 22** وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ ...... : دوسری جگہ اس کی تفصیل آئی ہے کہ حکم ہوا کہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے پہلو کے ساتھ لگاؤ گے تو وہ چمکتا ہوا سفید نکلے گا، مگر وہ سفیدی برص وغیرہ جیسا عیب نہیں ہوگی، بلکہ ایک معجزہ ہوگی۔ "کسی عیب کے بغیر" کی تصریح اس لیے فرمائی کہ برص کو بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَ يَسِّرْلِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾

تا کہ ہم تجھے اپنی چند بڑی نشانیاں دکھائیں ﴿۲۳﴾ فرعون کی طرف جا، بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے ﴿۲۴﴾ اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے ﴿۲۵﴾ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے ﴿۲۶﴾ اور میری زبان کی کچھ گرہ کھول دے ﴿۲۷﴾ کہ وہ میری بات سمجھ لیں ﴿۲۸﴾ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک بوجھ بٹانے والا بنادے ﴿۲۹﴾ ہارون کو، جو میرا بھائی ہے ﴿۳۰﴾

**آیت 23** لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى: یہاں ”مِنْ“ بعض کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے عصا اور ید بیضا تمھیں اپنے چند بڑے معجزے دکھانے کے لیے عطا کیے ہیں۔ یہ معنی بھی ہے کہ ہم نے یہ معجزے تمھیں اپنے کچھ مزید بڑے معجزے دکھانے کے لیے دیے ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۰۱)۔

**آیت 24** اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ...... : نبوت اور معجزات عطا کرنے کے بعد حکم ہوا کہ یہ معجزات لے کر فرعون کے پاس جاؤ جو تکبر اور سرکشی میں ہر حد سے تجاوز کر گیا ہے، حتیٰ کہ بندہ ہو کر رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ اس حکم کی مزید تفصیل آگے آیات (۴۲ تا ۴۸) میں آ رہی ہے۔

**آیت 25، 26** قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ...... : دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ يَضِيْقُ صَدْرِيْ وَ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ ﴾ [ الشعراء: ۱۳ ] ”اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان چلتی نہیں۔“ یعنی اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے سے میرے دل میں جو تنگی محسوس ہوتی ہے وہ دور فرما دے اور اس منصب عظیم کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس ہمت، پامردی اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے وہ میرے دل میں پیدا فرما دے اور میرا تبلیغ رسالت کا کام میرے لیے آسان فرما دے۔

**آیت 27 تا 30** ❶ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ...... : سورۂ شعراء کی آیت (۱۳): ﴿ وَ يَضِيْقُ صَدْرِيْ وَ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں وہ روانی نہ تھی جسے وہ اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ فرعون کو بھی ان پر طعن کے لیے یہی کمزوری ملی کہ کہا: ﴿ وَ لَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴾ [ الزخرف: ۵۲ ] ”اور یہ (موسیٰ) قریب نہیں کہ بات واضح کرے۔“ اگرچہ فرعون کی بات کا کچھ اعتبار نہیں، کیونکہ جھوٹا الزام لگا دینا اس سے کچھ بعید نہ تھا۔ الغرض! اس کے لیے انھوں نے دو دعائیں کیں، ایک تو یہ کہ اے میرے رب! میری زبان کی کچھ گرہ کھول دے، تا کہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔ کچھ گرہ کا مفہوم ”عُقْدَةً“ کی تنوین سے ظاہر ہو رہا ہے۔ زبان سے مکمل گرہ دور کرنے کی دعا کے بجائے انھوں نے یہ کہہ کر اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لیے نبوت کی درخواست کر دی کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں اور میرے اہل خانہ میں سے میرا بوجھ بٹانے والے ہوں گے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ کسی بھائی نے اپنے بھائی کے لیے موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ بہتر دعا نہیں کی۔ بعض تفاسیر میں موسیٰ علیہ السلام

اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَ اَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى ﴿۳۷﴾

اس کے ساتھ میری پشت مضبوط کر دے ﴿۳۱﴾ اور اسے میرے کام میں شریک کر دے ﴿۳۲﴾ تاکہ ہم تیری بہت تسبیح کریں ﴿۳۳﴾ اور تجھے بہت یاد کریں ﴿۳۴﴾ بے شک تو ہمیشہ ہمارے حال کو خوب دیکھنے والا رہا ہے ﴿۳۵﴾ فرمایا بے شک تجھے تیرا سوال عطا کر دیا گیا اے موسیٰ! ﴿۳۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ پر ایک اور بار بھی احسان کیا ﴿۳۷﴾

کے بچپن میں انگارا منہ میں ڈالنے کا ذکر ہے، مگر وہ اسرائیلی روایات میں سے ہے، جن سے کسی بات کا یقین حاصل نہیں ہوتا۔

② وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا...... : یعنی مددگار جو اس عظیم بوجھ کو اٹھانے میں میرا شریک ہو۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ایسے بڑے پیغمبروں کو (ساری) خلق کی طرف بہت (یعنی مکمل) خیال نہیں ہوتا، ایک پیش کار چاہیے کہ خلق کو سمجھ میں سمجھائے، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، ابتدا میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تبلیغ ہی سے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں، جن کا شمار کبار صحابہ میں ہے۔“ (موضح)

آیت 32،31 اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ...... : ”اُشْدُدْ“ اکثر قراء کی قراءت کے مطابق یہ ”شَدَّ يَشُدُّ“ (ن) سے ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ فعل امر ہے۔ اسی طرح ”اَشْرِكْهُ“ ”اَشْرَكَ يُشْرِكُ“ (افعال) سے فعل امر ہے۔

آیت 34،33 كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا...... : یعنی ان دعاؤں سے ہمیں کوئی دنیاوی مفاد مقصود نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے تعاون سے تیری تسبیح اور تیرا ذکر بہت زیادہ کر سکیں گے، مثلاً دنیوی ضروریات آپس میں تقسیم کر لیں گے تو تسبیح و ذکر اور دعوت کے لیے زیادہ وقت نکل سکے گا۔

آیت 35 اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا : ”كُنْتَ“ میں ”كَانَ“ استمرار کے لیے ہے کہ ”بے شک تو ہمیشہ ہمارا نگران اور نگہبان رہا ہے۔“ یعنی جب ہم بچے تھے اس وقت بھی تو نے ہماری پرورش کی اور ہمیں دشمنوں سے محفوظ رکھا، اب بھی تیری اسی رحمت کے وسیلے سے تیری جناب میں درخواست ہے کہ ہماری یہ دعائیں قبول فرما۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور پہلی نوازشوں کے وسیلے سے دعا کا سبق بھی ہے۔

آیت 36 قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ...... : یعنی تم نے منہ مانگی مراد پالی اور ہم نے تمھاری ہر درخواست کو منظور فرما لیا۔ سینہ کھل گیا، کام آسان ہو گیا، زبان کی گرہ بھی مکمل یا بقدر ضرورت کھل گئی۔ چنانچہ اس کے بعد ہر جگہ موسیٰ علیہ السلام نے خود ہی فرعون اور جادوگروں سے بحث کی ہے، کہیں ہارون علیہ السلام کا ذکر نہیں آیا اور ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنا کر وزیر بنا دیا گیا۔

آیت 37 ① وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى : اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی، نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہونے، عصا و

## اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى ﴿۳۸﴾

جب ہم نے تیری ماں کو وحی کی، جو وحی کی جاتی تھی ﴿۳۸﴾

ید بیضا کے معجزے عطا ہونے، ان کا آنکھوں سے مشاہدہ کرنے اور اس موقع پر کی ہوئی چاروں دعاؤں کی قبولیت میں سے ہر ایک عظیم احسان تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے کیے گئے آٹھ احسانات کا ذکر فرمایا۔ مقصد یہ کہ میں نے تم پر پہلے بھی احسان کیے، اب بھی کیے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا، کیونکہ میں نے تمھیں بنایا ہی خاص اپنے لیے ہے، فرمایا: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ [ طٰہٰ : ۴۱ ] ''اور میں نے تجھے اپنے لیے خاص طور پر بنایا ہے۔'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو آئندہ کے وعدے کا یقین دلانے کے لیے پچھلے احسانات یاد دلائے، فرمایا: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰى﴾ [ الضحیٰ : ۵ تا ۸ ] ''اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا۔ کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا، پس جگہ دی اور اس نے تجھے راستے سے ناواقف پایا تو راستہ دکھا دیا اور اس نے تجھے تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔'' (ابن عاشور)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ پر ایک اور بار بھی احسان کیا'' اس میں احسان کو مجمل رکھا ہے، تاکہ شوق پیدا ہو کہ وہ کیا احسان تھا، پھر چار آیات (۳۸ تا ۴۱) میں پے در پے آٹھ احسان ذکر فرمائے: ① ''اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى'' ② ''وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ'' ③ ''وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ'' ④ ''فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ'' ⑤ ''وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ'' ⑥ ''وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا'' ⑦ ''فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى'' ⑧ ''وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ''

**آیت 38** ❶ **اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى** : جب کسی چیز کی عظمت بیان کرنا مقصود ہو تو یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے ''جو وحی کی جاتی تھی'' یعنی اس کی عظمت محدود الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ﴿فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ﴾ [ طٰہٰ : ۷۸ ] اور ﴿فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى﴾ [ النجم : ۱۰ ] میں ہے۔

❷ یہاں موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بتانے اور مطمئن کرنے کے لیے ''اَوْحَيْنَاۤ'' (ہم نے وحی کی) اور ''يُوْحٰۤى'' (جو وحی کی جاتی تھی) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وحی کے لفظی معنی اشارۂ سریعہ یا دل میں کوئی بات ڈال دینے کے ہیں۔ اصطلاح میں جب یہ لفظ کسی نبی کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی فرشتے کے ذریعے سے پیغام بھیجنا ہوتے ہیں۔ قرآن میں دونوں معنوں کے اعتبار سے وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف جو وحی بھیجی گئی وہ بھی لفظی معنی کے اعتبار سے تھی، یعنی خواب میں یا کسی خفیہ طریقے سے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی جس سے ان کو یقین و اطمینان حاصل ہو گیا، کیونکہ اس بات پر تقریباً علماء کا اتفاق ہے کہ اللہ کے جتنے نبی ہوئے ہیں مردوں میں سے ہوئے ہیں، عورتوں میں سے کسی عورت کو نبی نہیں بنایا گیا۔ دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۹) اور انبیاء (۷) لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہیں تھیں کہ ان کے لیے

اَنِ اقۡذِفِيۡهِ فِى التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِيۡهِ فِى الۡيَمِّ فَلۡيُلۡقِهِ الۡيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاۡخُذۡهُ عَدُوٌّ لِّىۡ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلۡقَيۡتُ عَلَيۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّىۡ ۚ وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰى عَيۡنِىۡ ۞ اِذۡ تَمۡشِىۡۤ اُخۡتُكَ فَتَقُوۡلُ هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى مَنۡ يَّكۡفُلُهٗ ؕ فَرَجَعۡنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَىۡ تَقَرَّ عَيۡنُهَا وَ لَا تَحۡزَنَ ؕ وَ قَتَلۡتَ نَفۡسًا فَنَجَّيۡنٰكَ مِنَ الۡغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوۡنًا ۚ فَلَبِثۡتَ سِنِيۡنَ فِىۡۤ اَهۡلِ مَدۡيَنَ ۙ ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوۡسٰى ۞ وَ اصۡطَنَعۡتُكَ لِنَفۡسِىۡ ۞

یہ کہ تو اسے صندوق میں ڈال، پھر اسے دریا میں ڈال دے، پھر دریا اسے کنارے پر ڈال دے، اسے ایک میرا دشمن اور اس کا دشمن اٹھالے گا اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے ایک محبت ڈال دی اور تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے ۞ جب تیری بہن چلی جاتی تھی، پس کہتی تھی کیا میں تمھیں اس کا پتا دوں جو اس کی پرورش کرے؟ پس ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا، تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور وہ غم نہ کرے۔ اور تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تجھے غم سے نجات دی اور ہم نے تجھے آزمایا، خوب آزمانا، پھر کئی سال تو مدین والوں میں ٹھہرا رہا، پھر تو ایک مقرر اندازے پر آیا اے موسیٰ! ۞ اور میں نے تجھے اپنے لیے خاص طور پر بنایا ہے ۞

وحی کے وہ معنی مراد لیے جائیں جو کسی نبی کے لیے ہوتے ہیں۔ (کبیر)

آیت 39 ❶ اَنِ اقۡذِفِيۡهِ فِى التَّابُوۡتِ ...... : یعنی تمھارا کام بس اتنا ہے کہ صندوق میں ڈال کر دریا (نیل) میں ڈال دو۔ آگے دریا کو ہمارا حکم یہ ہے کہ اسے راستے میں روکنے یا لے جا کر سمندر میں ڈالنے کے بجائے عین فرعون کے محل کے پاس ساحل پر لگا دے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل سورۂ قصص (۷ تا ۱۳) میں ہے۔

❷ وَ اَلۡقَيۡتُ عَلَيۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّىۡ ...... : یعنی تمھاری صورت ایسی بنائی اور اس میں اپنی طرف سے ایسی انوکھی دل ربائی رکھی کہ جو کوئی تمھیں دیکھتا بے اختیار محبت کرنے لگتا۔ "وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰى عَيۡنِىۡ" کا عطف "اَلۡقَيۡتُ عَلَيۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّىۡ" سے حاصل ہونے والے مفہوم پر ہے، جس کی تقدیر یوں ہوگی: "وَ أَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ لِتُحَبَّ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ" "اور میں نے تجھ پر ایک انوکھی محبت ڈال دی، تاکہ تجھ سے محبت کی جائے اور تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے۔" اس عطف کی مزید توجیہات مفصل کتب میں دیکھیں۔ "مَحَبَّةً" میں تنوین تنکیر کے لیے ہے، اس لیے "ایک انوکھی محبت" ترجمہ کیا ہے، یعنی جو اسباب کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ بلا اسباب خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔

آیت 41،40 ❶ "اِذۡ تَمۡشِىۡۤ اُخۡتُكَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۱۱ تا ۱۳) اور "وَ قَتَلۡتَ نَفۡسًا" سے آخر آیت تک کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۱۴ تا ۲۸)۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾

تو اور تیرا بھائی میری آیات لے کر جاؤ اور میری یاد میں سستی نہ کرنا ﴿۴۲﴾ دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ سرکش ہوگیا ہے ﴿۴۳﴾

② وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا : "فُتُوْنًا" "فَتَنَ يَفْتِنُ" کا مصدر ہے، جیسا کہ "قُعُوْدٌ" اور "خُرُوْجٌ" وغیرہ ہیں۔ اس کی تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے "اور ہم نے تجھے آزمایا، خوب آزمانا۔" اس آزمائش میں شاہ زادگی کی آسائشوں کے بعد ان کے ہاتھوں قبطی کا نادانستہ قتل، پھر اپنے قتل ہونے کا خوف، پھر بے سروسامانی میں فوری ہجرت، بھوکے پیاسے اور شدید خوف کی حالت میں کئی دن رات کا سفر، پردیس اور دس سالہ مزدوری سب شامل ہیں، جن سب میں زبردست تربیت کا سامان تھا۔ حافظ ابن کثیر نے ایک لمبی حدیث "حدیث فتون" مکمل ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے۔

③ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى : یعنی تمھارا راہ بھول کر وادی طویٰ میں آنا اور میرے ساتھ کلام اور نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا، کسی طے شدہ منصوبے کے بغیر اور اچانک نہیں تھا، بلکہ عین میرے مقرر کردہ وقت اور فیصلے کے مطابق تھا۔ اگرچہ ہر کام ہی اللہ کی تقدیر سے ہے، مگر اس "قَدَرٍ" سے مراد خاص طور پر طے کرنا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ "صَنَعَ يَصْنَعُ" کا معنی بنانا ہے، "اِصْطَنَعَ" باب افتعال سے ہے، صاد کی مناسبت سے تاء کو طاء سے بدل دیا اور حروف کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہوگیا، یعنی میں نے تجھے خاص طور پر اپنے کام یعنی رسالت و نبوت کے لیے تیار کیا ہے۔ یہ تمام احسانات کا خلاصہ ہے۔

**آیت 42** ① اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ : یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے گھر میں اور پھر مدین میں کی گئی، چونکہ اس وقت وہاں ہارون علیہ السلام موجود نہیں تھے، اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو مصر پہنچ کر انھیں ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔ "بِاٰيٰتِيْ" یعنی تم فرعون کے پاس خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے بلکہ میری نشانیاں عصا اور ید بیضا تمھارے پاس ہوں گی، اس لیے بلا جھجک جاؤ اور میرا پیغام پہنچاؤ۔

② وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ : "لَا تَنِيَا" "وَنٰى يَنِيْ وَنْيًا" بروزن "وَعَدَ يَعِدُ" سستی کرنا، کوتاہی کرنا، تھک کر رہ جانا۔ یعنی میری یاد میں کمی نہ کرنا، اس سے تمھارا عزم قوی اور قدم ثابت رہے گا، کیونکہ جب تم مجھے یاد کرو گے تو میرے بے شمار عظیم احسانات تمھارے سامنے رہیں گے، جس سے ادائے رسالت میں کوئی ضعف نہیں آئے گا۔ (طبری) اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی دشمن کے مقابلے کے وقت اپنے ذکر کثیر کا حکم دیا (دیکھیے انفال: ۴۵) اور ہر حال میں ذکر کرنے والوں کی تعریف فرمائی اور انھیں "اُولُوا الْاَلْبَابِ" قرار دیا۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۹۰)۔

**آیت 43** اِنَّهٗ طَغٰى : "طُغْيَانٌ" کا اصل معنی حد سے بڑھ جانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِيْ

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

پس اس سے بات کرو، نرم بات، اس امید پر کہ وہ نصیحت حاصل کرلے، یا ڈر جائے ﴿۴۴﴾

الْجَارِيَةِ ﴾ [ الحاقة : ۱۱ ] ''بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمھیں کشتی میں سوار کیا۔'' فرعون کی طغیانی اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ذکر فرمائی ہے کہ وہ اپنے رب اعلیٰ ہونے کا دعوے دار تھا۔ (نازعات : ۲۴) وہ بلا شرکت غیرے معبود (الٰہ) ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ (قصص : ۳۸) اس نے بنی اسرائیل کو یہ باتیں نہ ماننے کی وجہ سے غلامی اور بدترین عذاب کا نشانہ بنا رکھا تھا، ان کے بیٹے نہایت بے رحمی سے قتل کرتا، عورتوں کو زندہ رکھ کر اپنی اور اپنی قوم کی زیادتیوں کا نشانہ بناتا اور مردوں سے بے گار لیتا تھا۔ (قصص : ۴) جسے چاہتا انکار پر جیل میں ڈال دیتا تھا۔ (شعراء : ۲۹)

**آیت 44** ❶ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا : اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ فرعون کو دعوت دیتے وقت نرم بات کہیں، جس میں ترغیب ہو، اسے غصہ دلانے والی نہ ہو۔ ہر داعی کو یہی اسلوب اختیار کرنا لازم ہے، کیونکہ دعوت الی اللہ سے مقصود مخاطب کی ہدایت اور اصلاح ہوتی ہے نہ کہ اپنی برتری ثابت کرنا، یا سخت کلامی سے دل کا غصہ نکالنا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۱۲۵) اور آل عمران (۱۵۹) اللہ تعالیٰ نے وہ نرم بات بھی خود ہی سکھا دی، جیسا کہ آگے آیت (۴۷) میں آ رہا ہے اور دیکھیے سورۂ نازعات (۱۸، ۱۹) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَا عَائِشَةُ ! إِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِيْ عَلَى الْعُنْفِ وَمَا لَا يُعْطِيْ عَلٰى مَا سِوَاهُ » [ مسلم، البر والصلة، باب فضل الرفق : ۲۵۹۳، عن عائشة رضی اللہ عنہا ] ''اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ بہت نرمی والا ہے، نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو نہ سختی پر عطا کرتا ہے اور نہ اس (نرمی) کے سوا کسی اور چیز پر عطا کرتا ہے۔'' اور یہ بھی فرمایا: « إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ إِلَّا زَانَهٗ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهٗ » [ مسلم، ایضًا : ۲۵۹۴ ] ''نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے اسے زینت بخشتی ہے اور جس سے بھی نکال لی جائے اسے عیب دار بنا دیتی ہے۔'' ہاں اگر کہیں نرمی بالکل ہی بے اثر ٹھہرے اور کوئی شخص ہٹ دھرمی اور تکبر سے کسی طرح باز نہ آئے تو اس سے حق بات سختی کے ساتھ کہنے کی بھی اجازت ہے، کیونکہ وہاں ''حکمت'' کا تقاضا یہی ہے، جیسا کہ سورۂ عنکبوت (۴۶) میں ہے اور زیر تفسیر آیات میں آیت (۴۸) میں موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔

❷ لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى : '' لَعَلَّ '' کا لفظ ترجی (امید کرنے) کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں امید کا ذکر آئے تو وہ بات یقینی ہوتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ فرعون نصیحت یا ڈرنے سے محروم رہے گا، پھر ''لَعَلَّ'' کا لفظ کیوں فرمایا؟ اس کی دو توجیہیں ہیں اور دونوں درست ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ''لَعَلَّ'' موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی نسبت سے ہے کہ تم اس سے نرم بات اس امید کے ساتھ کہو کہ وہ نصیحت حاصل کرے گا، یا ڈر جائے گا۔ ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو تو علم نہیں تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ اسی طرح مخاطب کتنا بھی سرکش ہو، داعی کو ہمیشہ امید کا

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴿۴۶﴾

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! یقیناً ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا، یا کہ حد سے بڑھ جائے گا ﴿۴۵﴾ فرمایا ڈرو نہیں، بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں ﴿۴۶﴾

چراغ دل میں روشن رکھنا لازم ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ "لَعَلَّ" کا لفظ "امید ہے" کے علاوہ "کَیْ" یعنی "تاکہ" کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے سورۂ بقرہ (۲۱) میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ "تاکہ تم بچ جاؤ۔" "يَتَذَكَّرُ" نصیحت حاصل کرکے ایمان لے آئے یا کم از کم ڈر کر ظلم سے باز آ جائے، کیونکہ ایک سرکش آدمی سے یہی امید کی جا سکتی ہے۔

**آیت 45** قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ...... : موسیٰ علیہ السلام نے مصر پہنچ کر ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور دونوں بھائیوں نے اپنی بے سروسامانی اور فرعون کی سرکشی، حاکمانہ تسلط اور ظلم وستم پر غور کیا تو انسانی فطرت کے مطابق ڈرے اور اپنے رب سے اس کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہم تو ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرتے ہوئے ہمیں قید یا قتل نہ کر دے، یا کوئی اور خوف ناک سزا نہ دے، یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے اور وہ کفر اور گمراہی میں مزید بڑھ جائے، یا تیری ذات وصفات کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہہ گزرے، جس سے ہمیں ہر تکلیف سے زیادہ تکلیف پہنچے۔

**آیت 45** ❶ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ : بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ ہے، فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [ الحدید : ٤ ] "اور وہ تمھارے ساتھ ہے، تم جہاں کہیں بھی ہو۔" مگر یہاں اس سے مراد خاص معیت (ساتھ) ہے، یعنی میں تمھاری ہر طرح سے حفاظت ونصرت کروں گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [ التوبۃ : ٤٠ ] "غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" غور کیجیے پورے مصر کے وسائل کے مالک، بے پناہ فوج کے پہرے میں رب اور معبود ہونے کے دعوے دار کے پاس مقہور ومجبور اور غلام قوم کے دو آدمی جاتے ہیں، جن کے پاس بظاہر ایک لاٹھی کے سوا کچھ نہیں، نہ انھیں کوئی پہرے دار روک سکتا ہے اور نہ فوج کو روکنے کی جرأت ہوتی ہے۔ وہ سیدھے فرعون کے بھرے دربار میں بلاخوف وخطر جا کر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اس کے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں اور اس کے ہر مغالطے کا پردہ چاک کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ لاجواب ہو کر قید کی دھمکی دیتا ہے، مگر اسے نہ قید کرنے کی جرأت ہوتی ہے اور نہ کسی اور زیادتی کی، اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا مظاہرہ اور کیا ہوگا؟

❷ اَسْمَعُ وَ اَرٰى : میں دوسرے بھیجنے والوں کی طرح نہیں جو اپنا قاصد بھیج کر نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس کی بات سن سکتے ہیں، بلکہ میں ہر وقت تمھارے ساتھ ہوں، تمھاری اور سب کی ہر بات سن رہا ہوں اور ہر عمل دیکھ رہا ہوں۔ ایسی کوئی بات اور ایسا کوئی کام نہ ہونے دوں گا جس کا تمھیں خوف ہے۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۴۸﴾

تو اس کے پاس جاؤ اور کہو بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، پس تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انھیں عذاب نہ دے، یقیناً ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں اور سلام اس پر جو ہدایت کے پیچھے چلے ﴿۴۷﴾ بے شک ہم، یقیناً ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ عذاب اس پر ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا ﴿۴۸﴾

آیت 47 ❶ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ...... : اللہ تعالیٰ نے فرعون کو تین چیزوں کی دعوت پہنچانے کا حکم دیا، ایک دعوت توحید کہ رب تو نہیں بلکہ وہ ہے جو تیرا بھی رب ہے اور جب وہ تیرے جیسے رب کہلانے والوں کا رب ہے تو باقی تمام مخلوق کا رب ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ دوسری دعوت رسالت کہ ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں اور اس کا پیغام لے کر تیرے پاس آئے ہیں اور تیسری قوم کی آزادی کا مطالبہ کہ رب تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت پر ایمان کی دعوت کے بعد خاص تیری طرف یہ پیغام بھی لے کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزادی دے کر میرے ساتھ بھیج دے کہ وہ اللہ کی زمین میں جہاں آزاد رہ سکیں چلے جائیں اور یہ کہ انھیں ان مختلف قسم کے عذابوں سے رہا کر دے جن سے تو نے انھیں دو چار کر رکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام کی دعوت میں غلام اور مظلوم اقوام کو غلامی سے نجات دلانا بھی شامل ہے۔ یہ کہنا کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں، غلط ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۴۶ تا ۲۵۲)۔

❷ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ : یہ اس بات کی تفصیل ہے کہ ''ہم تیرے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے آئے ہیں'' یعنی یقین جانو کہ ہم تمھارے رب کی طرف سے اپنی رسالت کی نشانی اور دلیل بھی لے کر آئے ہیں، اگر تم اسے دیکھے بغیر ہی ایمان لے آؤ تو بہت ہی اچھا ہے، ورنہ ہم وہ بھی پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔

❸ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى : اس میں ہدایت کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ ساتھ فرعون کو بھی سلام ہے، اگر وہ ہدایت قبول کر لے۔ معلوم ہوا کہ اگر وہ ہدایت قبول نہ کرے تو اسے کوئی سلام نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی کافر بادشاہوں قیصر و کسریٰ وغیرہ کو جو خط لکھے ان میں یہی لکھا: « اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى » [ بخاري : ٦٢٦٠ ] ''سلام ہو اس شخص پر جو اسلام کو قبول کرے'' یعنی ایمان نہ لانے والوں کے لیے نہ سلامتی کی دعا ہے اور نہ ان کے لیے اللہ کی گرفت سے سلامتی کی کوئی صورت ہے۔ آپ ﷺ نے ان سب کو لکھا: « أَسْلِمْ تَسْلَمْ » [ بخاري : ۷ ] ''مسلمان ہو جاؤ تو سلامت رہو گے۔''

آیت 48 اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَاۤ...... : توحید و رسالت اور بنی اسرائیل کو اپنے ظلم و ستم اور غلامی سے آزاد کرنے کی دعوت کے

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾
قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾

اس نے کہا تو تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ!؟ ﴿۴۹﴾ کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی، پھر راستہ دکھایا ﴿۵۰﴾ اس نے کہا تو پہلے زمانوں کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ ﴿۵۱﴾

ساتھ ہی خوش خبری بھی سنائی کہ جو ہدایت کی پیروی کرے گا سلامت رہے گا۔ اس آیت میں ڈرانے کا فریضہ سرانجام دیا کہ ہمیں وحی کے ذریعے سے بتایا گیا ہے کہ جو جھٹلائے گا اور منہ پھیرے گا اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ اس ڈرانے میں بھی نرم سے نرم الفاظ، جو ممکن تھے، ملحوظ رکھے، یہ نہیں فرمایا کہ تم پر عذاب نازل ہوگا۔ اس سلامتی اور عذاب دونوں کو عام رکھا، اس میں دنیا اور آخرت دونوں کی سلامتی اور عذاب شامل ہیں۔ یہ مضمون سورۂ نازعات (۳۰ تا ۳۹) اور سورۂ قیامہ (۳۱ تا ۳۵) وغیرہ میں بھی بیان ہوا ہے۔

**آیت 49** قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى : یعنی وہ کون ہے جسے تم نے مجھے چھوڑ کر رب بنا رکھا ہے؟ واضح رہے کہ فرعون اپنے رب اعلیٰ ہونے کا دعوے دار تھا (نازعات: ۲۴) اور اپنے ''الٰہ'' یعنی معبود ہونے کا بھی۔ (قصص: ۳۸)

**آیت 50** ① قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ : یعنی صرف یہی نہیں کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، بلکہ اس نے ہر چیز کو پیدا کرتے ہوئے اسے اس کی حسب ضرورت اور حسب حال شکل وصورت عطا فرمائی۔ چلنے والے، اڑنے والے اور تیرنے والے ہر جاندار کو، ہر درخت، پہاڑ اور دریا کو اور زمین و آسمان غرض ہر مخلوق کو ایسی شکل وصورت عطا فرمائی کہ کوئی دوسرا نہ اسے بنا سکتا ہے، نہ کوئی نقص یا عیب نکال سکتا ہے اور نہ اس سے بہتر شکل پیش کر سکتا ہے۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۷) اور سورۂ ملک (۳)۔

② ثُمَّ هَدٰى : یعنی اس کے حسب حال شکل وصورت عطا فرما کر اسے زندگی گزارنے اور اپنی بناوٹ سے کام لینے کا راستہ بھی بتایا ہے، چنانچہ پرندے کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی دانہ چگنے لگتا ہے، بطخ کا بچہ تیرنے لگتا ہے، جبکہ جانور اور انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ پینے لگتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ نہ سکھاتا تو کون سکھا سکتا تھا؟ الغرض، اس کائنات میں ہر چیز جو بھی کام کر رہی ہے اس کی دی ہوئی ہدایت اور تعلیم ہی سے کر رہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا رب تو نہیں بلکہ وہ بزرگ و برتر اللہ ہے جس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے عموماً وہی دلائل پیش کیے جو ان کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیے تھے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۲۳ تا ۲۹)۔

**آیت 51** قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى : یہ سوال پوچھنے کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں سب کا حل موجود ہے۔ پہلی وجہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کے الفاظ میں یہ ہے: ''فرعون شاید دہریہ مزاج تھا۔ آدمیوں کی پیدائش کو سمجھتا تھا جیسے

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

کہا ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں ہے، میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے ﴿۵۲﴾

برسات کا سبزہ، نہ اول کسی نے پیدا کیا، آپ ہی پیدا ہو گیا، نہ آخر باقی رہا، گل کر مٹی ہو گیا۔ جب سنا کہ سب کے سر پر ایک رب ہے تب یہ پوچھا کہ اگلی خلق کہاں گئی؟ بتایا ان کا حساب لکھا ہوا موجود ہے کہ ایک ایک آدمی پھر حاضر ہو گا۔" (موضح) دوسری وجہ اس کے یہ پوچھنے کی کہ پھر پہلے زمانوں کے لوگوں کا کیا حال ہے، یہ ہو سکتی ہے کہ وہ یہ کہلوانا چاہتا تھا کہ جو لوگ سیکڑوں برس سے نسلاً بعد نسل دوسروں کو اپنا رب سمجھتے اور ان کی بندگی کرتے رہے ہیں، وہ سب گمراہ اور مستحق عذاب تھے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کو گمراہ اور مستحق عذاب قرار دیں گے تو ان کے خلاف تمام لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور وہ ان کی دعوت سے متنفر ہو جائیں گے۔ اہل حق کے خلاف اہل باطل جاہلوں کو مشتعل کرنے کا یہ ہتھکنڈا ہمیشہ سے استعمال کرتے رہے ہیں اور آج بھی اسے کارگر حربہ سمجھتے ہیں۔ سورۂ شعراء کی آیات (۲۳ تا ۲۹) کی روشنی میں یہ مطلب سب سے واضح نظر آتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس معاملے کو اللہ کے علم کے سپرد کر دیا، چنانچہ فرعون کا وار خالی گیا۔

تیسری وجہ یہ کہ فرعون یہ باور کروانا چاہتا تھا کہ رسول تو عالم الغیب ہوتے ہیں، اگر تم واقعی رسول ہو تو پہلے یہ بتاؤ کہ پہلے زمانوں کے لوگوں کا کیا حال ہے، ان کا حال ہمیں بتاؤ۔ مقصد یہ تھا کہ جب نہیں بتا سکیں گے تو ہم کہہ دیں گے کہ یہ کیسا رسول ہے جو پہلے زمانوں کے لوگوں کے احوال بھی نہیں جانتا؟ جواب یہ دیا کہ یہ جاننا رسولوں کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ رب تعالیٰ کا کام ہے۔

**آیت 52** ① قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ : یعنی مجھے ان کے حال سے کوئی بحث نہیں۔ وہ اپنے اس رب کے پاس پہنچ گئے جس کے پاس ان کے تمام اعمال اور نیتوں کا ریکارڈ موجود ہے، جیسے ان کے اعمال ہوں گے ویسا ہی بدلہ ان کو مل جائے گا۔ ہمیں فکر اپنے حال کی ہونی چاہیے کہ ہم کس طرح اپنے آپ کو عذاب کا مستحق ہونے سے بچا سکتے ہیں؟ یہ نہایت ہی حکیمانہ جواب ہے، جو صحیح بھی ہے اور اس سے فرعون بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

② فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى : چونکہ لکھی ہوئی بات زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے کراماً کاتبین مقرر فرمائے، جو ہر ایک کی کتاب تیار کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی آگاہ فرما دیا کہ کتاب میں لکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ غلطی یا بھول سے بچنے کے لیے لکھنے کا محتاج ہے، نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ ہر نقص کی طرح ان دونوں نقصوں سے بھی پاک ہے۔ اس میں ایک چوٹ بھی ہے، کیونکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر چیز کا خالق و ہادی نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے، دراصل یہ فرعون سے کہا جا رہا ہے کہ تو، جس کی سرشت میں بھٹکنا اور بھولنا رکھ دیا گیا ہے، کیا تجھے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے حیا نہیں آئی؟ سبحان اللہ ۔

بت کریں آرزو خدائی کی　　شان ہے تیری کبریائی کی

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾ ع ۱۱

وہ جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور تمھارے لیے اس میں راستے جاری کیے اور آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ کئی قسمیں مختلف نباتات سے نکالیں ﴿۵۳﴾ کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ، بے شک اس میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۵۴﴾ اسی سے ہم نے تمھیں پیدا کیا اور اسی میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمھیں ایک اور بار نکالیں گے ﴿۵۵﴾

---

**آیت 54،53** ① الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ......: یہ دونوں آیات موسیٰ علیہ السلام کا کلام بھی ہو سکتی ہیں، جسے نقل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے زمین سے مختلف نباتات نکالنے کا ذکر آنے پر اپنے لیے غائب کے صیغوں کے بعد جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرما دیا، یعنی ”فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا“ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ”وَلَا يَنْسَى“ پر ختم ہو گیا ہو اور ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مقام کی مناسبت سے اپنی مزید نعمتیں بیان فرمائی ہوں۔ اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا ذکر غائب کے صیغے سے فرمایا اور ”فَاَخْرَجْنَا“ میں اپنی عظمت کے اظہار کے لیے جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا۔

② ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چار نعمتیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی نعمت زمین کو انسان کے لیے بچھونا بنانا۔ اس کا ذکر کئی آیات میں فرمایا۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۹، ۱۰)، سورۂ نبا (۶)، ذاریات (۴۸) اور رعد (۳) وغیرہ۔ دوسری نعمت زمین میں راستے بنانا سکھایا۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۹)، انبیاء (۳۱)، نوح (۱۹) اور نحل (۱۵) تیسری نعمت آسمان سے پانی اتارنا، اس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے۔ چوتھی نعمت بنی آدم اور ان کے مویشیوں کے لیے بے شمار قسم کی کھانے اور استعمال کی چیزیں اگانا۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۲۷)، نازعات (۳۱ تا ۳۳)، عبس (۲۵ تا ۳۲) اور سورۂ نحل (۱۰)۔ (شنقیطی)

③ ”شَتّٰى“ ”شَتِيْتٌ“ کی جمع ہے، مختلف، جیسا کہ ”مَرِيْضٌ“ کی جمع ”مَرْضٰى“ ہے۔ ”النُّهٰى“ ”نُهْيَةٌ“ کی جمع ہے، جس کا معنی عقل ہے، کیونکہ عقل انسان کو نامناسب کاموں سے منع کرتی ہے۔ ”نَهٰى يَنْهٰى“ کا معنی ہے منع کرنا۔

**آیت 55** مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ ......: یعنی تم سب کے باپ آدم علیہ السلام کا پتلا مٹی سے بنایا گیا اور تمھاری غذائیں اور ضرورت کی تمام چیزیں بھی مٹی سے نکلتی ہیں۔ یہ پہلا مرحلہ ہے جو موت تک چلتا ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ کہ موت کے بعد دوبارہ مٹی میں جاؤ گے، پھر کوئی انسان قبر میں دفن ہو یا نہ ہو، بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے اجزا مٹی میں جائیں گے۔ تیسرے مرحلے میں قیامت کے دن انھی اجزا کو دوبارہ روح پھونک کر زندہ کر دیا جائے گا، فرمایا: ﴿قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ﴾ [ الأعراف : ۲۵ ] ”فرمایا تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔“

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے اپنی نشانیاں سب کی سب دکھلائیں، پس اس نے جھٹلایا اور انکار کر دیا ﴿۵۶﴾ کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری سرزمین سے اپنے جادو کے ذریعے نکال دے اے موسیٰ! ﴿۵۷﴾

بعض روایات میں دفن کے وقت مٹی کی پہلی مٹھی ڈالتے ہوئے "**مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ**"، دوسری مٹھی ڈالتے ہوئے "**وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ**" اور تیسری مٹھی ڈالتے وقت "**وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى**" پڑھنے کا ذکر ہے، مگر وہ روایات ضعیف ہیں، البتہ آیت پڑھے بغیر تین مٹھی مٹی ڈالنا مسنون ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: « أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى عَلٰى جِنَازَةٍ ثُمَّ أَتٰى قَبْرَ الْمَيِّتِ فَحَثٰى عَلَيْهِ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهِ ثَلَاثًا » [ ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في حثو التراب في القبر: ۱۵٦۵، صحیح ] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازے پر نماز پڑھی، پھر میت کی قبر پر آئے اور اس کے سر کی طرف (مٹی کی) تین مٹھیاں ڈالیں۔"

**آیت 56** **وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا ......** : یہ آیت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی باہمی گفتگو ذکر کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو دوبارہ آگے بیان کرنے سے پہلے جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہے، یعنی فرعون کفر میں اتنا پکا تھا کہ ہماری تمام نشانیاں دیکھنے اور موسیٰ علیہ السلام کو دل سے سچا سمجھنے کے باوجود ایمان نہیں لایا، حتیٰ کہ اس نے آخری نشانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کہ سمندر پھٹ گیا اور اس کے پانی کا ہر حصہ ایک بہت بڑے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل ان راستوں سے بخیریت گزر گئے (شعراء: ٦۳ تا ٦٦)، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لایا، بلکہ اپنے رب ہونے کے جھوٹے دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے پوری فوج کو لے کر سمندر میں داخل ہو کر غرق ہوا، مگر غرق ہونے سے پہلے تک وہ جھٹلاتا اور انکار ہی کرتا رہا۔ دیکھیے سورۂ قمر (۴۲،۴۱) اور یونس (۹۰ تا ۹۲)۔

**آیت 57** ① **قَالَ اَجِئْتَنَا ......** : فرعون نے یہ بات تمام نشانیاں دیکھنے کے بعد نہیں کہی، کیونکہ اگر ایسا ہوتو جادوگروں سے ہونے والا یہ مقابلہ طوفان، جراد، قمل وغیرہ حتیٰ کہ سمندر پھٹنے کے واقعہ کے بعد ماننا پڑے گا، کیونکہ "**اٰيٰتِنَا كُلَّهَا**" میں یہ سب شامل ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی صراحت کے مطابق فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا والا معجزہ دیکھ کر یہ بات کہی۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۰٦ تا ۱۲٦) اور شعراء (۳۰ تا ۵۱)۔ (ابن عاشور)

② **لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا** : ہر باطل پرست اور جابر و ظالم حکمران جب داعیٔ حق کے سامنے لاجواب ہو جاتا ہے تو اس کی دعوت ٹھکرانے کے لیے یہی ہتھکنڈا استعمال کرتا ہے، یعنی اسے اقتدار کا بھوکا ہونے کا طعنہ دیتا ہے، گویا اقتدار پر قابض رہنا اس کا تو پیدائشی حق ہے مگر کسی دوسرے کے لیے اس کے قریب پھٹکنا بھی جائز نہیں۔

③ "**بِسِحْرِكَ**" میں "جادو" کی اضافت موسیٰ علیہ السلام کے لیے آنے والی ضمیر (کاف) کی طرف کرنے میں ان معجزوں کی تحقیر

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

تو ہم بھی ہر صورت تیرے پاس اس جیسا جادو لائیں گے، پس تو ہمارے درمیان اور اپنے درمیان وعدے کا ایک وقت طے کر دے کہ نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تو، ایسی جگہ میں جو مساوی ہو ﴿۵۸﴾ کہا تمھارے وعدے کا وقت زینت کا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے جمع کیے جائیں ﴿۵۹﴾ پس فرعون واپس لوٹا، پس اس نے اپنے داؤ پیچ جمع کیے، پھر آ گیا ﴿۶۰﴾

مراد ہے کہ تو اپنے اس بے قدر و قیمت جادو کے ذریعے سے ہمیں سرزمین مصر سے نکالنا چاہتا ہے۔ تیرے اس جادو کی ہمارے کامل اور ماہر فن جادوگروں کے جادو کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے؟

**آیت 58** فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا ...... : "مَوْعِدًا" ظرف زمان بھی ہو سکتا ہے، مکان بھی اور مصدر میمی بھی، یعنی ہمارے ساتھ وہ وقت بھی طے کر لو جس میں مقابلہ ہو گا اور جگہ بھی، البتہ جگہ ایسی ہونی چاہیے جو قبطیوں اور بنی اسرائیل دونوں کے لیے برابر ہو، تاکہ کسی کو آنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ "مَكَانًا سُوًى" کا مطلب برابر اور ہموار زمین ہے، جہاں سب مقابلہ دیکھ سکیں۔

**آیت 59** قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ...... : "ضُحًى" وہ وقت جب سورج نکلنے کے بعد اس کی حرارت کا آغاز ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام تو خود چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں، تاکہ ان تک حق کا پیغام پہنچے اور وہ معجزاتِ الٰہی کو اور حق کی فتح کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ چنانچہ "يَوْمُ الزِّيْنَةِ" اور دوپہر کا وقت مقرر کر دیا گیا، تاکہ لوگ چھٹی کی وجہ سے فارغ ہوں اور دوپہر تک تمام علاقوں سے ہر شخص آسانی سے پہنچ جائے، دن کی روشنی زیادہ سے زیادہ ہو اور اگر مقابلہ طول پکڑ جائے تو مغرب تک لمبا وقت مل جائے۔ "يَوْمُ الزِّيْنَةِ" مصریوں کے ہاں معروف دن تھا، یہ اس دن منایا جاتا جب نیل کی طغیانی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی اور دور تک پانی پھیل جاتا، جس کے بعد فصلوں کی کاشت کا آغاز ہوتا۔ ابن عاشور رحمہ اللہ نے اس کا اندازہ پندرہ ستمبر لگایا ہے۔ تفصیل "التحرير والتنوير" میں دیکھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے جگہ کا ذکر نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "يَوْمُ الزِّيْنَةِ" میں تمام لوگوں کا جشن منانے کے لیے کسی خاص جگہ جمع ہونا معروف تھا، جیسا کہ حکومتوں نے بڑے بڑے سٹیڈیم بنا رکھے ہوتے ہیں، اس لیے زینت کا دن اور وقت طے کرنے کے بعد جگہ کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

**آیت 60** فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ ...... : یعنی فرعون نے مجلس برخاست کر دی اور پھر اپنے سرداروں سے مشورے اور سب کے اتفاق کے بعد پوری کوشش سے ایک طرف تو سلطنت کے ہر علاقے سے ماہر جادوگر جمع کر لیے اور انھیں انعام و اکرام اور

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

موسیٰ نے ان سے کہا تمھاری بربادی ہو! اللہ پر کوئی جھوٹ نہ باندھنا، ورنہ وہ تمھیں عذاب سے ہلاک کر دے گا اور یقیناً ناکام ہوا جس نے جھوٹ باندھا ﴿۶۱﴾ تو وہ اپنے معاملے میں آپس میں جھگڑ پڑے اور انھوں نے پوشیدہ سرگوشی کی ﴿۶۲﴾ کہا بے شک یہ دونوں یقیناً جادوگر ہیں، چاہتے ہیں کہ تمھیں تمھاری سرزمین سے اپنے جادو کے ذریعے نکال دیں اور تمھارا وہ طریقہ لے جائیں جو سب سے اچھا ہے ﴿۶۳﴾

قرب شاہی کا وعدہ کر کے مقابلے کے لیے تیار کیا اور دوسری طرف عام لوگوں کو دیکھنے کی ترغیب دی کہ مقابلہ دیکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہوں۔ پھر فرعون سب کچھ ساتھ لے کر میدان مقابلہ میں آ گیا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۰۹، ۱۱۰)، شعراء (۳۴، ۳۵) اور نازعات (۲۲، ۲۳)۔

**آیت 61** ❶ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا : "وَيْلَكُمْ" "تمھاری بربادی ہو" نصیحت کرتے ہوئے سختی کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے اور محبت اور بے تکلفی کا بھی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا: « وَيْلُ أُمِّهِ مِسْعَرَ حَرْبٍ » [ بخاري، الشروط، باب الشروط في الجهاد...... : ۲۷۳۱، ۲۷۳۲ ] "اس کی ماں مرے! یہ تو لڑائی بھڑکانے والا ہے۔" موسیٰ علیہ السلام نے پہلے فرعون کو نصیحت کی تھی، اب اس کے امراء اور جادوگروں کو بھی نصیحت کرنا ضروری تھا، چنانچہ انھیں سمجھایا بھی اور ڈرایا بھی۔

❷ فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ : "أَسْحَتَ يُسْحِتُ" أَيْ "اِسْتَأْصَلَ" جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔ "بِعَذَابٍ" کی تنوین تنکیر کے لیے ہو تو "کسی عذاب کے ساتھ" ترجمہ ہو گا اور تعظیم کے لیے ہو تو "بڑے عذاب کے ساتھ" ہو گا۔

**آیت 62** فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ...... : نصیحت بعض پر مؤثر ہوئی، بعض پر نہیں۔ چنانچہ وہ آپس میں چپکے چپکے جھگڑنے لگے، تاکہ فرعون یا موسیٰ یا عوام میں سے کسی کو ان کے باہمی اختلاف کی خبر نہ ہونے پائے۔ "النَّجْوٰى" آپس کی خفیہ بات، سرگوشی۔ "اَسَرُّوْا" انھوں نے پوشیدہ کیا۔ "النَّجْوٰى" (سرگوشی) خود پوشیدہ ہوتی ہے، پھر "اَسَرُّوْا" سے اس کی مزید پوشیدگی کا اندازہ کریں اور اس سے پہلے "بَيْنَهُمْ" (آپس میں) کا لفظ بتاتا ہے کہ اس جھگڑے کی خبر اس محدود گروہ کے درمیان ہی رہی، باہر نہیں نکلی۔ (ابن عاشور) کوئی کہنے لگا، موسیٰ جادوگر ہے اور کوئی کہنے لگا، یہ چہرہ جادوگر کا نہیں ہو سکتا۔

**آیت 63** ❶ قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ...... : یہ "اِنْ" اصل میں "إِنَّ" حرف تاکید ہے، جس کی علامت خبر "لَسٰحِرٰنِ" پر لام تاکید ہے۔ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ "إِنَّ" اپنے اسم کو نصب دیتا ہے، اس لیے "هٰذٰنِ" کے بجائے "هٰذَيْنِ"

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

سو تم اپنی تدبیر پختہ کرو، پھر صف باندھ کر آجاؤ اور یقیناً آج وہ کامیاب ہوگا جس نے غلبہ حاصل کر لیا ﴿٦٤﴾

ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ "اِنْ" کے نون کو جزم دینے کے بعد اس کا عمل ختم کر دیا گیا اور "هٰذٰنِ" مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، دوسرا یہ کہ "اِنْ" (نون ساکن کے ساتھ) "اِنَّهٗ" یعنی "اِنَّ" اور ضمیر شان کی جگہ آیا ہے، چنانچہ "اِنْ" کا اسم ضمیرِ شان تھی اور "هٰذٰنِ" اگلے جملے کا مبتدا ہے اور وہ جملہ "اِنْ" کی خبر بن رہا ہے۔ (ابن جزی) مزید جواب لمبی تفسیروں میں دیکھیں۔ "الْمُثْلٰى" "اَمْثَلُ" اسم تفضیل کا مؤنث ہے، بمعنی "اَفْضَلُ" سب سے اچھا۔

② آخر باہمی مشورے کے بعد مال و دولت اور جاہ و منصب کی حرص نے ان سب کو مقابلے پر متفق کر دیا اور فیصلہ یہ ٹھہرا کہ یہ دونوں یقیناً جادوگر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اقتدار حاصل کر کے تمھیں تمھارے وطن سے نکال دیں اور تمھارے دین و مذہب کو، جو سب سے اچھا ہے اور تمھاری عیش و عشرت والی بہترین زندگی کو حکومت پر قبضہ کر کے ختم کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلاَ فِيْ غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهِ » [ ترمذی، الزھد، باب حدیث ما ذئبان جائعان ...... : ٢٣٧٦۔ ابن حبان : ٣٢٢٨، عن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، صحیح ] "دو بھوکے بھیڑیے، جو بھیڑ بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں، وہ انھیں اس قدر برباد کرنے والے نہیں جس قدر آدمی کی مال اور بلند مرتبہ (شہرت) کی حرص اس کے دین کو برباد کرنے والی ہے۔"

**آیت 64** ① فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ...... : "جَمَعَ يَجْمَعُ" (ف) جمع کرنا اور "أَجْمَعَ" (افعال) پختہ کرنا، پختہ ارادہ کرنا، اتفاق کرنا۔ لہٰذا "فَاَجْمِعُوْا" (افعال) کا ترجمہ "جمع کرو یا اکٹھا کرو" درست نہیں۔ یعنی یہ تذبذب اور اختلاف چھوڑو کہ موسیٰ (علیہ السلام) کا مقابلہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، تم اپنا ارادہ اور اپنی خفیہ تدبیر پختہ اور مستحکم کرو اور پھر صف کی صورت میں اکٹھے ہو کر میدان میں آؤ، تاکہ سب پر تمھارا رعب پڑے اور دفعتاً ایسا حملہ کرو کہ حریف کے قدم اکھڑ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جادوگر بہت بڑی تعداد میں تھے اور انھوں نے ایک بے ہنگم ہجوم کی صورت میں سامنے آنے کے بجائے باقاعدہ فوجی ترتیب سے آگے پیچھے صفیں باندھ کر اپنی ہیبت اور شان و شوکت کے اظہار کا فیصلہ کیا۔ "صَفًّا" یہاں جنس کے معنی میں ہے اور اس سے ایک صف مراد نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ [ النبا : ٣٨ ] "جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے۔" فرعون کے حکم سے مصر کے تمام شہروں میں سے ہر ماہر جادوگر وہاں لایا گیا تھا، اس لیے مراد کئی صفیں ہیں۔

② وَ قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى : "اِسْتَعْلٰى" "عَلَا يَعْلُوْ" سے استفعال ہے۔ زائد حروف مبالغے کے لیے ہیں، یعنی آج کے مقابلے کی اتنی اہمیت ہے کہ جس نے اس میں واضح اور نمایاں غلبہ حاصل کر لیا اس کا سکہ ہمیشہ کے لیے بیٹھ گیا اور جو اس میں رہ گیا پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے گا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴿۷۰﴾

انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو یہ کہ تو پھینکے اور یا یہ کہ ہم پہلے ہوں جو پھینکے ﴿۶۵﴾ کہا بلکہ تم پھینکو، تو اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں، اس کے خیال میں ڈالا جاتا تھا، ان کے جادو کی وجہ سے کہ واقعی وہ دوڑ رہی ہیں ﴿۶۶﴾ تو موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا ﴿۶۷﴾ ہم نے کہا خوف نہ کر، یقیناً تو ہی غالب ہے ﴿۶۸﴾ اور پھینک جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے، وہ نگل جائے گا جو کچھ انھوں نے بنایا ہے، بے شک انھوں نے جو کچھ بنایا ہے وہ جادوگر کی چال ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی آئے ﴿۶۹﴾ تو جادوگر گرا دیے گئے، اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے تھے، انھوں نے کہا ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے ﴿۷۰﴾

**آیت 65** قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ...... : فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے عصا کو سانپ بنتے ہوئے دیکھا تو لوگوں کی نگاہ میں اسے بے وقعت بنانے کے لیے اسے جادو قرار دے کر کہا کہ ہم بھی مقابلے میں ایسا ہی جادو لائیں گے، چنانچہ اس کے مطابق جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بننے کے شعبدے کی تیاری کی اور میدان میں آ کر یہ پیش کش کی جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اس پیش کش کے الفاظ سے اپنے جادو پر ان کے اعتماد کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اس بات کا بھی کہ اگر تم پہل پر تیار نہیں ہو تو ہم اس کے لیے بالکل تیار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس خیال سے بھی یہ پیش کش کی ہو اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ ان کے جادو کا سارا کمال لوگوں کے سامنے آنے کے بعد اسے حق کے مقابلے میں بے حقیقت ثابت کیا جائے، جیسا کہ اس سے پہلے خود فرعون کے منہ سے موسیٰ علیہ السلام کو اختیار دلوایا گیا کہ مقابلے کا مقام اور دن وہ مقرر کریں۔

**آیت 66** فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ ...... : ''اچانک'' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسی زبردست تیاری کر رکھی تھی کہ ان کے لاٹھیوں اور رسیوں کو پھینکنے کے بعد ان کے دوڑنے اور حرکت کرنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ صف در صف کھڑے ہوئے جادوگروں کی بیک وقت پھینکی ہوئی لاٹھیوں اور رسیوں سے میدان دوڑتے ہوئے سانپوں کی شکل میں بدل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں ان کے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کرنے کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے جادو کو سحر عظیم قرار دیا ہے۔ اس آیت سے لے کر آیت (۷۰) تک کی تفسیر کے لیے سورۂ اعراف کی آیت (۱۱۵) سے (۱۲۶) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں چند مختصر سے اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَاۤ

کہا تم اس پر اس سے پہلے ایمان لے آئے کہ میں تمھیں اجازت دوں، یقیناً یہ تو تمھارا بڑا ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے، پس یقیناً میں ہر صورت تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف سمت سے بری طرح کاٹوں گا اور ضرور ہر صورت تمھیں کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا اور یقیناً تم ضرور جان لو گے کہ ہم میں سے کون عذاب دینے میں زیادہ سخت اور زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۷۱﴾ انھوں نے کہا ہم تجھے ہرگز ترجیح نہ دیں گے ان واضح دلائل پر جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اس پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، سو فیصلہ کر جو تو فیصلہ کرنے والا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ تو اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کرے گا ﴿۷۲﴾ بے شک ہم اپنے رب پر اس لیے ایمان لائے ہیں کہ وہ ہمارے لیے ہماری خطائیں

**آیت 71** ① اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ : یعنی یہ تمھارا ''گرو'' ہے اور تم اس کے چیلے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم آپس میں طے کر کے آئے ہو کہ پہلے چیلے ایک شعبدہ دکھائیں گے، پھر وہ سب کے سامنے ''گرو'' سے شکست کھا لیں گے، تاکہ دیکھنے والے ان کے ''گرو'' کا کہنا مان لیں اور اس کے معتقد بن جائیں۔ فرعون نے یہ شبہ اسی وقت پیدا کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام بھی ان کے متبع ہو جائیں۔

② فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ ...... : شبہ پیدا کرنے کے بعد اوپر سے دھمکی بھی دے دی، تاکہ ان کو ایمان پر قائم رہنے سے پھیر دیا جائے اور دوسرے لوگ بھی مرعوب ہو جائیں۔

③ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ : ''جُذُوْعٌ'' ''جِذْعٌ'' (جیم کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے ''تنے''۔ سولی دینے کے لیے اونچے سے اونچا میسر کھمبا اس وقت کھجور کا تنا تھا۔ ظاہر ہے کہ سولی تنے کے اوپر دی جاتی ہے، مگر یہاں ''فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ'' (کھجوروں کے تنوں میں) فرمایا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ ''فِيْ'' ''عَلٰى'' کے معنی میں ہے، مگر ''فِيْ'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ تمھیں کھجوروں کے تنوں کے اوپر لے جا کر کیلوں یا رسیوں کے ساتھ تنوں میں پیوست کر دوں گا اور اس طرح تم عبرت ناک انجام کو پہنچو گے۔ سولی کی تفصیل سورۂ اعراف (۱۱۵ تا ۱۲۶) میں دیکھیں۔

④ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى : یعنی وہ عذاب جس سے موسیٰ (علیہ السلام) نے تمھیں مقابلے سے پہلے ڈرایا تھا کہ ''وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ'' وہ زیادہ سخت اور دیرپا ہے یا میرا عذاب؟ فرعون حقیقت حال سے واقف تھا، مگر اپنی شکست فاش پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ دھمکیاں دے رہا تھا۔

**آیت 72، 73** قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا ...... : مگر جادوگروں کا ایمان تو ایک لمحہ میں اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ نہ ان

اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

بخش دے اور جادو کے وہ کام بھی جن پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے اور اللہ بہتر اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۷۳﴾ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو اپنے رب کے پاس مجرم بن کر آئے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم ہے، نہ وہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا ﴿۷۴﴾ اور جو اس کے پاس مومن بن کر آئے گا کہ اس نے اچھے اعمال کیے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے سب سے بلند درجے ہیں ﴿۷۵﴾ ہمیشگی کے باغات، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہ اس کی جزا ہے جو پاک ہوا ﴿۷۶﴾

کے دل میں مال و دولت اور دنیوی جاہ و منصب کی کچھ قدر باقی رہ گئی، جس کے لیے انھوں نے یہ مقابلہ کیا تھا اور نہ اب فرعون کی دھمکیوں کا ان پر کچھ اثر ہوا۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ تو اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کہ ہماری چند روزہ دنیاوی زندگی کا خاتمہ کر دے؟ سو ہمیں اس کی پروا نہیں۔ مگر آج ایک شخص ساٹھ سال قرآن پڑھ کر بھی حقیر دنیا کے بدلے اپنے ایمان کو فروخت کر دیتا ہے۔

**آیت 74** لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَمَّا أَهْلُ النَّارِ الَّذِيْنَ هُمْ أَهْلُهَا، فَإِنَّهُمْ لَا يَمُوْتُوْنَ فِيْهَا وَلَا يَحْيَوْنَ، وَلٰكِنْ نَاسٌ مِنْكُمْ أَصَابَتْهُمُ النَّارُ بِذُنُوْبِهِمْ فَأَمَاتَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى إِمَاتَةً، حَتّٰى إِذَا كَانُوْا فَحْمًا أُذِنَ بِالشَّفَاعَةِ، فَجِيْءَ بِهِمْ ضَبَائِرَ ضَبَائِرَ، فَبُثُّوْا عَلٰى أَنْهَارِ الْجَنَّةِ، ثُمَّ قِيْلَ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ أَفِيْضُوْا عَلَيْهِمْ، فَيَنْبُتُوْنَ نَبَاتَ الْحِبَّةِ تَكُوْنُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ » [ مسلم، الإيمان، باب إثبات الشفاعة و إخراج الموحدين من النار : ۱۸۵، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ ] ”آگ والے، جو اسی میں رہنے والے ہیں، وہ تو اس میں نہ مریں گے اور نہ جییں گے اور لیکن کچھ لوگ، جنھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے آگ لگ جائے گی تو اللہ تعالیٰ انھیں ایک طرح کی موت دے دے گا، یہاں تک کہ جب وہ کوئلہ ہو جائیں گے تو شفاعت کا اذن ہو جائے گا۔ سو انھیں ڈھیروں کی صورت میں لایا جائے گا اور وہ جنت کی نہروں (کے کناروں) پر بکھیر دیے جائیں گے، پھر کہا جائے گا کہ اے جنتیو! ان پر پانی انڈیلو، تو وہ اس طرح اگ آئیں گے جیسے سیلاب کی لائی مٹی میں جڑی بوٹیوں کے بیج (فوراً) اگ آتے ہیں۔“ ”نہ مرے گا اور نہ جیے گا“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ فاطر (۳۶)، ابراہیم (۱۵ تا ۱۷)، نساء (۵۶)، اعلیٰ (۱۱ تا ۱۳) اور زخرف (۷۷)۔

**آیت 76،75** فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ...... : ”الْعُلٰى“ ”عُلْيَا“ کی جمع ہے، جو اسم تفضیل ”أَعْلٰى“ کی مؤنث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « فِي الْجَنَّةِ مِائَةُ دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَالْفِرْدَوْسُ أَعْلَاهَا دَرَجَةً وَمِنْهَا تُفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ الْأَرْبَعَةُ وَمِنْ فَوْقِهَا يَكُوْنُ الْعَرْشُ فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ »

وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ﳔ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ۝

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا، پس ان کے لیے سمندر میں ایک خشک راستہ بنا، نہ تو پکڑے جانے سے خوف کھائے گا اور نہ ڈرے گا۝

[ ترمذي، صفة الجنة، باب ما جاء في صفة درجات الجنة : ۲۵۳۱، عن عبادة بن الصامت ﷺ ] ''جنت میں سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ ان میں سب سے اعلیٰ درجہ فردوس ہے، اسی سے جنت کی چاروں نہریں جاری ہوتی ہیں اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے تو جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگا کرو۔'' ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ كَمَا تَتَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الْغَابِرَ فِي الْأُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ ، قَالُوْا : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَاءِ لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُهُمْ؟ قَالَ بَلٰى وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ ! رِجَالٌ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِيْنَ » [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة و أنها مخلوقة : ۳۲۵٦، عن أبي سعيد الخدري ﷺ ] ''جنت والے اپنے سے اوپر بالاخانوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم اس چمک دار ستارے کو دیکھتے ہو جو آسمان کے مشرقی یا مغربی کنارے میں باقی رہ گیا ہو، ان کے ایک دوسرے سے درجات زیادہ ہونے کی وجہ سے۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! یہ انبیاء کے مقام ہوں گے کہ ان کے سوا کوئی ان تک نہیں پہنچ سکے گا؟'' آپ نے فرمایا: ''کیوں نہیں؟ مجھے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ وہ آدمی ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔'' جنت کی نہروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ محمد (۱۵)۔

**آیت 77** ❶ وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى...... : فرعون کے جادوگروں کے مقابلے میں ناکام ہونے اور ان کے ایمان قبول کر لینے کے بعد ایک لمبی مدت گزری، جس میں بنی اسرائیل پر ظلم کے کئی پہاڑ ٹوٹتے رہے، ساتھ ہی فرعون اور اس کی قوم پر قحط، طوفان، ٹڈی دل، جوؤں، مینڈکوں اور خون کی صورت میں معجزے کے طور پر کئی عذاب آئے، جن میں سے ہر عذاب آنے پر وہ لوگ اپنے ایمان لانے کا اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کا وعدہ کرتے مگر عذاب ٹل جانے پر صاف مکر جاتے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو راتوں رات بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔ اس کا ذکر سورۂ اعراف (۱۳۰ تا ۱۳۵) میں تفصیل سے ہے۔ یہاں وہ ساری بات حذف کر کے فرعون کا انجام ذکر فرما دیا۔ اس لیے اس آیت کا عطف آیت (۵٦) ﴿ وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴾ پر ہے کہ فرعون کے تمام آیات (نشانیوں) کو جھٹلانے اور انکار کا انجام کیا ہوا؟ اس کا عطف موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلے کے واقعہ پر نہیں۔ (بقاعی)

❷ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ...... : یہ قصہ تفصیل کے ساتھ سورۂ شعراء (۵۲ تا ٦٦) اور یونس (۹۰ تا ۹۲) میں مذکور ہے۔ یہاں

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

پس فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو انھیں سمندر سے اس چیز نے ڈھانپ لیا جس نے انھیں ڈھانپا ﴿۷۸﴾ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے پر نہ ڈالا ﴿۷۹﴾

" فَاجْعَلْ لَهُمْ طَرِيْقًا " (پس ان کے لیے راستہ بنا) کے بجائے " فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا " (پس ان کے لیے سمندر میں ایک خشک راستہ مار) فرمایا، مقصود لمبی بات کو مختصر کرنا ہے، یعنی " اِجْعَلْ لَهُمْ بِضَرْبِ الْبَحْرِ بِعَصَاكَ طَرِيْقًا " (سمندر پر اپنی لاٹھی مارنے کے ساتھ ان کے لیے اس میں خشک راستہ بنا)۔ گویا "اِضْرِبْ" میں "اِجْعَلْ" کا معنی سمو دیا ہے، اسے تضمین کہتے ہیں۔

③ لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى : " لَا تَخْشٰى " کا مفعول ذکر نہیں فرمایا، تاکہ وہ عام رہے۔ معنی یہ ہوگا کہ نہ تو پکڑے جانے سے خوف کھائے گا اور نہ کسی بھی دوسری چیز سے ڈرے گا، مثلاً غرق ہونے، راستہ بھول جانے، بھوک پیاس سے ہلاک ہونے یا کسی اور دشمن کے حملے سے، غرض کسی بھی خطرے کا تجھے ڈر نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس کا مفعول "غَرَقًا" محذوف مانا ہے، یعنی تو غرق ہونے سے نہیں ڈرے گا، مگر محذوف مفعول مقام کی مناسبت سے کوئی بھی ہو سکتا ہے، اس لیے اسے عام رکھنا بہتر ہے اور پھر اس میں غرق ہونا بھی آ جاتا ہے۔

**آیت 78** فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ : یعنی ان کو سمندر سے ایسی عظیم چیز نے ڈھانپ لیا جو انسانی بیان میں نہیں آ سکتی اور اگر اللہ تعالیٰ اسے اس طرح بیان فرمائے جس طرح اسے بیان کرنے کا حق ہے تو انسان کی کوتاہ عقل میں وہ سما نہیں سکتی، اس لیے اس کی تفصیل مت پوچھو۔ مراد ان سب کا سمندر میں غرق ہونا، پانی کی راہ سے آگ کا ایندھن بننا اور مرتے وقت اور بعد میں فرشتوں کی مار بے حساب و بے شمار ہے جو بیان سے باہر ہے۔ دیکھیے سورۂ مومن (۴۵، ۴۶) اس کی مزید مثالیں یہ ہیں: ﴿ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴾ [ النجم : ۱۶ ] اور: ﴿ وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۝ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴾ [ النجم : ۵۳، ۵۴ ] اور: ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴾ [ النجم : ۱۰ ]

**آیت 79** وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى : یہاں ایک سوال ہے کہ " اَضَلَّ " (گمراہ کیا) اور " مَا هَدٰى " (سیدھے راستے پر نہ ڈالا) دونوں کا مطلب ایک ہی ہے تو تکرار کا کیا فائدہ؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں، ایک تو یہ کہ یہ تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ﴾ [ النحل : ۲۱ ] "مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں۔" دوسرا یہ کہ "فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا" میں امکان تھا کہ اگر بعض چیزوں میں اس نے اپنی قوم کو غلط راستے پر ڈالا تو بعض میں درست سمت پر بھی چلایا ہو، چلو دنیا ہی کا کچھ فائدہ پہنچایا ہو۔ فرمایا، نہیں! کسی چیز میں بھی درست راستے پر نہیں ڈالا، بلکہ انھیں اتنا بے وقوف اور بے وقعت بنا دیا کہ وہ اس کی سراسر حماقتوں میں بھی اس کے پیچھے ہی چلتے رہے۔ (زخرف : ۵۴) (بقاعی) جیسا کہ آج کل دہریہ ملک چین میں حکومت کے حکم پر ایک یا دو بچوں سے زیادہ بچے پیدا ہونے پر عموماً انھیں ہسپتال ہی میں زہر کا ٹیکہ لگا کر مار

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ﴿۸۰﴾

اے بنی اسرائیل! بے شک ہم نے تمھیں تمھارے دشمن سے نجات دی اور تمھیں پہاڑ کی دائیں جانب کا وعدہ دیا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا ﴿۸۰﴾

دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اپنا بچہ مرنے سے بچا لے تو اس کا پیدائش کے رجسٹر میں اندراج ہو سکتا ہے نہ اسے رجسٹرڈ شہری کی مراعات حاصل ہو سکتی ہیں۔ کوئی اولاد والا ہی اس دردناک کیفیت کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود پوری قوم خوشی یا بے بسی سے ان احکام کے پیچھے چل رہی ہے، اس سے بڑھ کر ”مَا هَدٰى“ کیا ہوگا؟

تیسرا جواب یہ کہ دراصل یہ فرعون کے اس دعویٰ پر طنز ہے جو اس نے کیا تھا: ﴿مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ [ المومن : ۲۹ ] ”میں تو تمھیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود رائے رکھتا ہوں اور میں تمھیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں۔“ اور زیر تفسیر سورت کی آیت (۶۳) میں بھی اس کے چیلوں نے اپنے طریقے کو سب سے افضل قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے رد میں فرمایا کہ ”فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور انھیں سیدھے راستے پر نہ ڈالا۔“ (زمخشری)

**آیت 80** ❶ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ ...... : یہ تین آیتیں موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے دو آیات (۵۵، ۵۶) گزر چکی ہیں۔ اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بنی اسرائیل مخاطب ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہود کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کروائی جا رہی ہوں، جیسا کہ: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ [ البقرۃ : ۴۰، ۴۷، ۱۲۲ ] میں ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تین نعمتیں یاد دلائیں۔ سب سے پہلے غلامی سے نجات کی عظیم نعمت، اس کے بعد طور پر بلا کر دینی احکام پر مشتمل کتاب عطا کرنے کی نعمت اور آخر میں بلا مشقت من و سلویٰ کا پاکیزہ اور لذیذ ترین رزق عطا کرنے کی نعمت۔ من و سلویٰ کی تفسیر کے لیے دیکھیں سورۂ بقرہ (۵۷)۔

❷ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ ...... : اس واقعہ کا ذکر سورۂ بقرہ (۵۲) میں بھی ہے اور اس کی تفصیل سورۂ اعراف (۱۴۲ تا ۱۴۷) میں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہاڑ کی دائیں جانب سے مراد کیا ہے؟ کیونکہ پہاڑ کی ہر جانب ہی کھڑے ہونے والے شخص کے لحاظ سے دائیں بھی ہو سکتی ہے اور بائیں بھی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت اور اسلام میں جغرافیہ اور محل وقوع میں جہتوں کے تعین کے لیے مشرق کو اصل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ یمن اور شام کے نام اسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں کہ کعبہ سے مشرق کی طرف رخ کریں تو دائیں طرف یمن ہے، جس کا معنی دایاں ہے اور بائیں طرف شام۔ امرؤ القیس نے بھی ایک بادل کے برسنے کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے کہا ہے ؎

عَلٰى قَطَنٍ بِالشَّيْمِ اَيْمَنُ صَوْبِهٖ وَ اَيْسَرُهٗ عَلَى السِّتَارِ فَيَذْبُلِ

”غور سے دیکھنے پر اس کی بارش کا دایاں حصہ قطن مقام پر تھا اور اس کا بایاں حصہ ستار پھر یذبل نامی مقام پر تھا۔“

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمھیں دی ہیں اور ان میں حد سے نہ بڑھو، ورنہ تم پر میرا غضب اترے گا اور جس پر میرا غضب اترا تو یقیناً وہ ہلاک ہوگیا ﴿۸۱﴾ اور بے شک میں یقیناً اس کو بہت بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھے راستے پر چلے ﴿۸۲﴾

اس صورت میں اگر "اَلْاَيْمَنَ" سے مراد دائیں جانب لیں تو موسیٰ علیہ السلام کے طور کی مغربی جانب اس کی طرف رخ کرکے کھڑے ہونے پر پہاڑ کی دائیں طرف (جنوب) مراد ہوگی، جیسا کہ مدین سے مصر کو آتے ہوئے پہلی وحی کے وقت وہ پہاڑ کی مغربی جانب میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ﴾ [ القصص : ۴۴ ] "اور اس وقت تو مغربی جانب میں نہیں تھا جب ہم نے موسیٰ کی طرف حکم کی وحی کی۔" اور اگر "اَلْاَيْمَنَ" کو "يَمِيْنٌ" (دائیں) کے بجائے "يُمْنٌ" (برکت) سے اسم تفضیل مانیں تو دائیں بائیں کی تعیین کی ضرورت ہی نہیں بلکہ طور کی جانب ایمن (بابرکت جانب) اور اس سورت کی آیت (۱۲): ﴿اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ میں مذکور وادی مقدس دونوں سے مراد وادی طویٰ ہوگی۔ (ابن عاشور)

**آیت 81** ① وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ : طغیانی کا معنی حد سے بڑھنا ہے۔ رزق میں حد سے تجاوز یہ ہے کہ دوسرے کا حق کھا جائے، ناشکری یا فضول خرچی کرنے لگے، نعمت پر اترانے لگے، رزق میں واجب حقوق ادا نہ کرے، اسے اللہ کی نافرمانی میں خرچ کرنے لگے، یا جس جگہ یا جس وقت اسے جوڑ کر رکھنے سے منع کیا گیا ہے وہاں جوڑنے کے پیچھے پڑ جائے۔ غرض حکم یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو اللہ کی حدود سے تجاوز اور نافرمانی کا ذریعہ مت بناؤ۔

② فَقَدْ هَوٰى: "هَوٰى يَهْوِيْ" (ض) اونچی جگہ سے گرنا۔ چونکہ ایسا گرنا جس کے بعد اٹھنا نہ ہو، ہلاک ہونے کی صورت ہی میں ہوتا ہے، اس لیے یہاں "هَوٰى" کا معنی "ہلاک ہوگیا" کرتے ہیں۔

**آیت 82** وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ ...... : نافرمانی اور طغیانی کی وعید کے بعد توبہ کی ترغیب دی۔ معلوم ہوا مغفرت کے لیے چار چیزیں شرط ہیں، ایک توبہ یعنی کفر و شرک اور نافرمانی سے باز آ جانا، دوسری ایمان یعنی اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، یوم آخرت اور دوسری ایمانیات پر صدق دل سے اعتقاد رکھنا، تیسری عمل صالح یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کے مطابق نیک عمل کرنا اور چوتھی آخر دم تک سیدھے راستے پر قائم رہنا۔ "اهْتَدٰى" سے یہی مراد ہے اور یہی چیز سب سے مشکل ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ "ثُمَّ" (پھر) کے بعد ذکر فرمایا، جیسا کہ: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ [ البلد : ۱۷ ] میں ہے۔ گویا یہ آیت سورۂ حٰم السجدہ کی آیات (۳۰ تا ۳۲)

وَ مَاۤ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمۡ اُولَاۤءِ عَلٰۤى اَثَرِىۡ وَ عَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿۸۴﴾

اور تجھے تیری قوم سے جلد کیا چیز لے آئی اے موسیٰ!؟ ﴿۸۳﴾ کہا وہ یہ میرے نشان قدم پر ہیں اور میں تیری طرف جلدی آگیا اے میرے رب! تاکہ تو خوش ہو جائے ﴿۸۴﴾

کی ہم معنی ہے۔

**آیت 83** وَمَاۤ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى : اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام سے طور کے دائیں جانب میں آنا اور موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کرنا طے فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خود قوم کے ساتھ آنے کے بجائے ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کر کے انھیں طور کی طرف سفر جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود اپنے رب سے کلام اور ملاقات کے شوق میں نہایت تیزی کے ساتھ وعدے کے مقام پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مناجات اور تورات عطا کرنے کے بعد پوچھا کہ موسیٰ! تجھے کیا چیز تیری قوم سے جلدی لے آئی؟

**آیت 84** قَالَ هُمۡ اُولَاۤءِ عَلٰۤى اَثَرِىۡ : یہاں ایک سوال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں جلدی کی وجہ بتانے کے بجائے کہ پروردگارا! میں تجھے راضی کرنے کے لیے جلدی آ گیا، یہ کیوں ضروری سمجھا کہ پہلے یہ عرض کریں کہ قوم کے لوگ میرے پیچھے میرے نشان قدم پر آ رہے ہیں، یعنی نشان مٹنے سے بھی پہلے وہ اس پر چلے آ رہے ہیں، یعنی میں کوئی زیادہ جلدی نہیں آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ وہ کیوں جلدی آ گئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عتاب قوم کے ساتھ نہ آنے پر تھا اور یہ سوال اپنے کلیم کی تربیت کے لیے تھا کہ تمھارا پہلے آنا مناسب نہ تھا، بلکہ غلامی سے تازہ تازہ نکلی ہوئی قوم کے ساتھ رہنا ضروری تھا، تاکہ کتاب ملنے سے پہلے ہر قدم پر ان کی رہنمائی کرتے اور ان کی غلطیوں پر سرزنش کرتے۔ ویسے بھی کسی قوم کے رئیس کا حق یہ ہے کہ وہ ان کے پیچھے رہ کر ان کے ہر فرد کا خیال رکھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو اہل و عیال سمیت رات کو نکلنے کا حکم دیتے ہوئے یہ ادب سکھایا: ﴿وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَهُمۡ﴾ [ الحجر : ٦٥ ] ''اور خود ان کے پیچھے پیچھے چل۔'' اور جیسا کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ذکر فرمایا: « كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَلَّفُ فِي الْمَسِيْرِ فَيُزْجِي الضَّعِيْفَ وَيُرْدِفُ وَيَدْعُوْ لَهُمْ » [ أبو داوٗد، الجهاد، باب في لزوم الساقة : ٢٦٣٩۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٢١٢٠ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں پیچھے رہتے، کمزور (کی سواری) کو ہانکتے اور (پیدل کو) پیچھے بٹھا لیتے اور ان کے لیے دعا کرتے۔'' موسیٰ علیہ السلام کا وفور شوق میں جلدی آنا اگرچہ بری بات نہ تھی مگر بادشاہوں کے حضور پیش ہونے کے کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاہوں کے شاہ کا ادب تو سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کی ایک مثال ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی جلدی ہے کہ وہ مسجد میں پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں تھے، انھوں نے صف میں ملنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ » [ بخاري، الأذان، باب إذا ركع دون الصف : ٧٨٣ ] ''اللہ تعالیٰ تمھاری حرص زیادہ کرے اور دوبارہ ایسا نہ کرنا۔'' [ قاسمی، بقاعی، ابن عاشور ]

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ۬ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾

فرمایا پھر بے شک ہم نے تو تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور انھیں سامری نے گمراہ کر دیا ہے ﴿۸۵﴾ تو موسیٰ اپنی قوم کی طرف پلٹا غصے سے بھرا ہوا، افسوس کرتا ہوا، کہا اے میری قوم! کیا تمھارے رب نے تمھیں اچھا وعدہ نہ دیا تھا؟ پھر کیا وہ مدت تم پر لمبی ہوگئی، یا تم نے چاہا کہ تم پر تمھارے رب کی طرف سے کوئی غضب اترے؟ تو تم نے میرے وعدے کی خلاف ورزی کی ﴿۸۶﴾

**آیت 85** ❶ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ...... : یہ فاء تعلیل کے لیے ہے، یعنی تمھارا قوم کو چھوڑ کر چلے آنا اور مفسدوں کے لیے موقع فراہم کر دینا اس کا باعث بنا کہ تمھارے بعد ہم نے تمھاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انھیں گمراہ کر دیا۔ یہاں ایک بات یاد رہنی چاہیے کہ انھیں بچھڑا بنا کر سامری نے گمراہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی صراحت بھی فرما دی کہ انھیں سامری نے گمراہ کر دیا، مگر تمام اسباب کا خالق چونکہ اللہ تعالیٰ ہے اور تمام دل اس کے ہاتھ میں ہیں، اس لیے آزمائش میں ڈالنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی۔

❷ مِنْۢ بَعْدِكَ: موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو تیس دنوں کے اعتکاف کا بتا کر گئے تھے، جسے اللہ تعالیٰ نے چالیس دنوں کے ساتھ مکمل فرمایا تو قوم اس سے بے خبر تھی، انھیں معلوم نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کب آئیں گے؟ اس مدت سے فائدہ اٹھا کر سامری نے کیا جو کچھ کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے "بَعْدِكَ" سے پہلے "مِنْ" کا لفظ زیادہ فرمایا، جو "بعض" کے معنی میں ہے، یعنی تمھارے بعد کے عرصے میں سے کچھ عرصے میں سامری نے انھیں گمراہ کر دیا۔ (بقاعی)

**آیت 86** ❶ فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ ...... : "غَضْبَانَ" مبالغہ کے وزن پر ہے، اس لیے "غصے سے بھرا ہوا" ترجمہ کیا ہے۔ "اَسِفًا" "أَسِفَ يَأْسَفُ" (ع) سے صفت کا صیغہ ہے، اس کا معنی سخت غم و افسوس کرنے والا بھی ہے اور غصے والا بھی۔ (قاموس) یہاں "غَضْبَانَ" کے بعد افسوس زیادہ مناسب ہے۔ حرفِ "فاء" سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے مکالمہ اور کتاب دینے کے آخر میں انھیں قوم کے گمراہ ہونے کی اطلاع دی۔ "فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ" تو یہ خبر سنتے ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔

❷ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا : اس وعدے سے مراد توبہ، ایمان اور عمل صالح کے بعد اس پر استقامت اختیار کرنے والے کے لیے مغفرت کا وعدہ، طور کی جانب ایمن پر موسیٰ علیہ السلام سے کلام اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے تورات عطا کرنے کا وعدہ اور من و سلویٰ نازل کرنے کا وعدہ ہے۔ (طبری)

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا

انھوں نے کہا ہم نے اپنے اختیار سے تیرے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی اور لیکن ہم پر لوگوں کے زیوروں کے

③ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ ...... : " الْعَهْدُ " کا معنی ہے وصیت، کسی آدمی سے کوئی بات طے کر لینا، پختہ وعدہ، قسم، حرمت کا خیال رکھنا، امان، ذمہ، ملاقات، پہچان، زمانہ، وفا، اللہ تعالیٰ کی توحید وغیرہ۔ (قاموس) یہاں ملاقات بھی معنی ہو سکتا ہے اور مدت بھی کہ کیا تمھیں میری ملاقات کو بہت لمبی مدت ہو چکی تھی کہ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی؟ تیس دنوں سے دس دن ہی تو زیادہ گزرے تھے، یہ کون سی لمبی مدت تھی کہ تم نے مجھ سے کیے ہوئے سب وعدے توڑ ڈالے۔ وعدہ خلافی سے مراد ان کا طور کے دامن تک جانے کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چلتے رہنے کے بجائے راستے میں ٹھہر جانا، بچھڑے کی پرستش اور مجاوری پر اڑ جانا اور ہارون علیہ السلام کے انھیں چلتے رہنے کی تاکید اور بچھڑے کی عبادت ترک کرنے کی نصیحت پر یہ کہنا کہ " لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ " یعنی ہم اسی پر مجاور بن کر بیٹھے رہیں گے یہاں تک کہ موسیٰ ہمارے پاس آئیں۔ یہ تمام باتیں وعدے کی خلاف ورزی تھیں۔ (طبری)

آیت 87 ① قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا : انھوں نے وعدہ خلافی کا نہایت ہی بودا عذر پیش کیا کہ اس وعدہ خلافی میں ہمارا کوئی اختیار ہی نہ تھا۔ سامری نے ہمیں پھسلایا ہی اس طرح کہ ہم میں نیک و بد کی پہچان ہی نہ رہ گئی۔ کوئی پوچھے کہ سامری نے تم پر کوئی فوج کشی کی تھی یا تلوار تان رکھی تھی کہ تمھارا اختیار ختم ہو گیا تھا؟ قیامت کے دن ہر مجرم اپنے آپ کو بے قصور اور بے اختیار ٹھہرائے گا اور اپنے تمام جرائم کا ذمہ دار شیطان کو ٹھہرائے گا مگر وہ صاف کہہ دے گا کہ میں نے تم پر کوئی فوج کشی نہیں کی تھی، صرف دعوت دی تھی، تم نہ مانتے تو میں تمھارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۲۲)۔

② وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا ...... : اس آیت کی تفسیر اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے نکلنے سے پہلے فرعون کی قوم کے لوگوں سے ان کے زیورات ادھار مانگ لیے تھے، بعض نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کام انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر کیا تھا۔ اب وہ ان کے لیے بوجھ بن گئے تھے، کیونکہ وہ مالِ غنیمت کے حکم میں تھے اور پہلی امتوں کے لیے غنیمت حلال نہ تھی۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام یا سامری کے کہنے پر کہ ان زیورات کو اپنے پاس رکھنا گناہ ہے، سب زیور ایک گڑھے میں پھینک کر انھیں آگ لگا دی گئی اور سامری نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس سونے یا چاندی سے بچھڑا بنا دیا۔ بعض نے یہ لکھا ہے کہ فرعون کی قوم جب غرق ہوئی اور ان کی لاشیں کنارے پر آئیں تو بنی اسرائیل نے ان کے زیور اتار لیے، اس زمانے میں عورتوں کی طرح مرد بھی سونے چاندی کے کنگن اور زیور وغیرہ پہنتے تھے۔ " زِيْنَةِ الْقَوْمِ " سے قوم فرعون کے زیور مراد ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ اصرار ہے کہ یہ سلف کی تفسیر ہے اور اس سے انحراف سلف سے انحراف ہے۔ مگر قرآن و حدیث سے یا کسی صحابی سے صحیح سند کے ساتھ اس کی طرف معمولی اشارہ بھی نہیں ملتا کہ ہجرت کے وقت پوری قوم کو، حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کو دھوکے سے قوم فرعون کے زیورات حاصل کرنے کی فکر پڑی ہوئی تھی، نہ آیات ہی میں کوئی اشارہ ہے کہ " زِيْنَةِ الْقَوْمِ " میں " الْقَوْمِ "

فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

کچھ بوجھ لاد دیے گئے تھے تو ہم نے انھیں پھینک دیا، پھر اس طرح سامری نے (بنا) ڈالا ﴿۸۷﴾

سے مراد قوم فرعون ہے۔ دراصل یہ بات تورات اور پہلے صحیفوں سے لی گئی ہے، جن میں یہود نے اتنی تحریف کر دی ہے کہ انبیاء پر تہمتیں لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ داؤد اور لوط علیہما السلام پر ان کی تہمتیں معروف ہیں۔ اس واقعہ میں بھی انھوں نے ہارون علیہ السلام پر تہمت لگائی ہے کہ بچھڑا بنا کر لوگوں کو اس کی عبادت پر لگانے والے وہ تھے۔ [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هَفَوَاتِهِمْ ] اس کے برعکس قرآن مجید میں دوسرے مقام پر تصریح ہے کہ وہ تمام زیور بنی اسرائیل کے اپنے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾ [ الأعراف : ۱۴۸ ] ”اور موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا جو ایک جسم تھا، جس کی گائے جیسی آواز تھی۔“ ”مِنْ حُلِيِّهِمْ“ (اپنے زیوروں سے) کی تصریح کے باوجود انھیں قوم فرعون کے زیور قرار دینا عجیب بات ہے۔

اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں نوٹ وغیرہ تو تھے نہیں، نقدی سونے یا چاندی ہی کی صورت میں ہوتی تھی، جسے زیورات کی صورت میں لوگ پہن لیتے یا گھروں میں محفوظ رکھتے، ان کا کافی بوجھ بن جاتا تھا، خصوصاً جب ان کے ساتھ تانبے وغیرہ کی آمیزش اور پہننے کے لیے چمڑے، دھاگے یا لوہے کی زنجیریں وغیرہ بھی ساتھ ہوتیں۔ اس لیے اس سفر میں ذمہ داریاں تقسیم کرتے وقت ہر ایک کے اپنے اپنے بوجھ اٹھانے کے بجائے کچھ لوگوں کے ذمے اسے اٹھانے کی ذمہ داری لگائی گئی۔ ظاہر ہے کہ اتنی اہم ذمہ داری قوم کے سربرآوردہ لوگوں ہی کی ہو سکتی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام بھی انھی لوگوں سے مخاطب تھے، کیونکہ وہ ایک وقت میں ساری قوم کے ہزاروں، یا بقول بعض لاکھوں لوگوں سے تو بات نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے یہ وجہ بتائی کہ ہم پر لوگوں کے زیوروں کا بوجھ تھا، ہم نے اسے جس قدر ہو سکے ہلکا کرنے کے لیے آگ میں پھینکا کہ زائد چیزیں جل جائیں اور خالص سونے اور چاندی کی اینٹیں بنالی جائیں اور منزل پر پہنچ کر ہر ایک کو اس کے نام لکھے ہوئے کے مطابق اس کے حصے میں آنے والا خالص چاندی یا سونا دے دیا جائے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سامری نے اس سے بچھڑے کا مجسمہ بنا دیا۔

③ اللہ تعالیٰ نے سونے اور چاندی میں یہ وصف رکھا ہے کہ یہ بطور قیمت شروع سے مقرر چلے آ رہے ہیں۔ دینار و درہم بھی ان کے بنتے تھے اور یہی فطری طریقہ تھا جس سے ہر شخص کا مال خود اس کے پاس ہوتا تھا۔ چالاک یہودیوں نے بینک بنا کر لوگوں کا سونا چاندی اپنے پاس جمع کر لیا اور انھیں رسیدیں جاری کر دیں کہ جب چاہو یہ دکھا کر اپنا سونا چاندی لے لو۔ لوگوں نے صرف اتنی سہولت کی خاطر کہ بوجھ نہ اٹھانا پڑے، ان رسیدوں سے لین دین شروع کر دیا، جس نے آگے نوٹوں کی صورت اختیار کر لی۔ اب صرف بوجھ سے بچنے کی خاطر سارا کاروبار یا تو نوٹ پر چلتا ہے یا بینک کے چیکوں پر۔ لوگوں کے پاس کاغذ کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس کاغذ کی حیثیت یہ ہے کہ حکومتیں جب چاہتی ہیں اس کی قیمت کبھی آدھی کم کر دیتی

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۙ۬ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

پس اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا نکالا، جو محض جسم تھا، اس کے لیے گائے کی آواز تھی، تو انھوں نے کہا یہی تمھارا معبود اور موسیٰ کا معبود ہے، سو وہ بھول گیا ﴿۸۸﴾

---

ہیں، کبھی چوتھا حصہ۔ جو شخص ایک کروڑ روپے کے سونے کا مالک تھا، صرف ایک اعلان کے بعد پچاس لاکھ کے وعدے والے کاغذ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں رہتا اور اگر نئے نوٹ جاری ہو جائیں اور یہ بر وقت نہ بدلوا سکے تو بالکل ہی خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ بینک دیوالیہ ہو جائے تو اس کا چیک کسی کام کا نہیں رہتا اور ساری رقم ہی برباد ہو جاتی ہے۔ ضروری بوجھ سے جان چھڑانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو اس کے مخلص بندے یہود کے شکنجے کو توڑ کر سود اور بینکوں کو ختم کر کے سونے یا چاندی کے سکے جاری کریں گے، تاکہ کوئی کسی کا حق نہ مار سکے۔ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ بوجھ سے جان چھڑانے میں بنی اسرائیل کو کتنا نقصان ہوا اور اب مسلم اور غیر مسلم صرف بوجھ اٹھائے پھرنے سے بچنے کی خاطر کتنے بڑے خسارے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں درحقیقت کچھ بھی نہیں، سب یہودی سود خوروں یا ان کے گماشتوں کے پاس ہے۔ ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی مالیت سونے چاندی کی صورت میں محفوظ رکھے، صرف اتنا چھ لے جتنے استعمال کی ضرورت ہے۔ سونے کی قیمت ہمیشہ ایک رہی ہے اور رہے گی۔ دیکھیے صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے ایک دینار میں بکری خریدنا منقول ہے، ہجرت کو چودہ سو تیس سال گزرنے کے باوجود آج بھی بکری کی قیمت یہی ہے۔

**آیت 88** ❶ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا ...... : مصری لوگ ہندوؤں کی طرح گائے کی پرستش کرتے تھے اور اس کی تقدیس کے قائل تھے۔ بنی اسرائیل میں بھی مسلمان ہونے کے باوجود قبطی مشرکوں کی غلامی اور ان سے میل جول کی وجہ سے یہ عقیدہ سرایت کر گیا تھا، جس کا وقتاً فوقتاً اظہار ہوتا رہتا تھا، جیسا کہ اس وقت ہوا جب موسیٰ علیہ السلام نے انھیں کوئی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۷) اب موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل کے زیوروں سے گائے کا بچھڑا بنایا جو بے جان تھا، مگر ایسی کاری گری سے بنایا گیا تھا کہ اس میں رکھے گئے سوراخوں کی وجہ سے خود بخود گائے کی سی آواز نکلتی تھی۔ وہ لوگ جنھوں نے سمندر سے پار ہوتے ہی چند بت پرستوں کے پاس سے گزرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام سے ان کے معبودوں جیسا معبود بنانے کا مطالبہ داغ دیا تھا، انھی جاہلوں نے فوراً اسے اپنا معبود تسلیم کر لیا اور کہنے لگے، تمھارا اور موسیٰ کا اصل معبود تو یہ ہے، موسیٰ بھول میں پڑ گئے جو طور پر کسی معبود سے کلام کے لیے گئے ہیں۔ ہمارے بعض صوفی حضرات بھی تصور شیخ کے شرک میں اس حد تک بڑھ گئے کہ جو محبت اپنے رب سے کرنی تھی اور جس طرح ہر وقت اسی کو اپنے سامنے رکھنا تھا، وہ محبت اور یاد شیخ کی نذر کر دی اور یہاں تک کہہ دیا ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید     معشوق دریں جا ست کجائید کجائید

”اے حج کو گئے ہوئے لوگو! تم کہاں ہو، تم کہاں ہو؟ معشوق تو یہاں ہے، تم کہاں ہو، تم کہاں ہو؟“

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ۬ وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾

تو کیا وہ دیکھتے نہیں کہ وہ نہ ان کی کسی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے کسی نقصان کا مالک ہے اور نہ کسی نفع کا ﴿۸۹﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہارون نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم! بات یہی ہے کہ اس کے ساتھ تمھاری آزمائش کی گئی ہے اور یقیناً تمھارا رب رحمان ہی ہے، سو میرے پیچھے چلو اور میرا حکم مانو ﴿۹۰﴾

② جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ...... : بعض مفسرین نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وہ گوشت پوست کا بچھڑا بن گیا، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ وہ محض دھات کا بنا ہوا ایک بے جان مجسمہ تھا۔ "خُوَارٌ" گائے کی آواز۔

**آیت 89** اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ...... : یہ وہی دلیل ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کی تھی: ﴿ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴾ [ مریم : ۴۲ ] "اے میرے باپ! تو اس چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تیرے کسی کام آتی ہے۔" موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ اکثر دلائل وہی ہیں جو ان کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیے تھے، دیکھیے سورۂ شعراء۔ بنی اسرائیل کی عجائب پرستی دیکھیے کہ دھات کے بنے ہوئے بچھڑے کے بے جان مجسمے کو صرف آواز کی وجہ سے معبود، حاجت روا اور مشکل کشا مان بیٹھے۔ مجسمہ بھی اس جانور کا جسے تمام جانوروں سے سادہ لوح سمجھا جاتا ہے اور جو خود انسان کا خدمت گار اور اس کی خوراک ہے۔ یہ نہ سوچا کہ اس مجسمے سے تو وہ خود ہزار گنا با اختیار ہیں کہ بول سکتے ہیں، اپنی مرضی سے چل پھر سکتے ہیں اور بقدر استطاعت کچھ نہ کچھ فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں، جب کہ بت بچھڑے کا ہو یا انسان کا، بات کرنے، چلنے پھرنے، سننے دیکھنے، ہر چیز سے عاری ہے۔ سورۂ اعراف کی آیات (۱۹۴، ۱۹۵) میں یہ بات نہایت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔

**آیت 90** ① وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ ...... : موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے ہارون علیہ السلام نے نہایت اچھے طریقے سے نصیحت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہارون علیہ السلام کے خطاب کا ذکر "وَلَقَدْ" (بلاشبہ یقیناً) کے ساتھ شروع فرمایا، اس میں بائبل کا رد ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ بچھڑا ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ فرمایا، یقینی بات یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام نے تو اپنی قوم کو اس کی عبادت سے منع فرمایا تھا۔ ہارون علیہ السلام کے خطاب کا حسن دیکھیے کہ سب سے پہلے یہ کہہ کر انھیں اپنا اور ان کا باہمی تعلق بتایا کہ "يٰقَوْمِ" (اے میری قوم!) یعنی اپنے ایک فرد کی بات سنو، جو تمھارا ایک فرد ہے اور تم سب کی اس سے رشتہ داری ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ [ الشورٰی : ۲۳ ] "میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، مگر رشتہ داری کی وجہ سے دوستی۔" پھر باطل معبود کی نفی کے بعد صرف معبود برحق "رحمان" کو اپنا رب ماننے کی تاکید فرمائی جو ہر حال میں انسان پر رحم فرماتا ہے، جیسا کہ "لا الٰہ الا اللہ" میں پہلے ہر معبود کی نفی اور آخر میں اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کا اثبات ہے۔ آخر میں اپنی نبوت اور موسیٰ علیہ السلام کی خلافت کی وجہ سے اپنے پیچھے چلنے اور اپنا حکم ماننے کی

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝۹۱ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ۝۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝۹۳

انھوں نے کہا ہم اسی پر مجاور بن کر بیٹھے رہیں گے، یہاں تک کہ موسیٰ ہماری طرف واپس آئے (۹۱) کہا اے ہارون! تجھے کس چیز نے روکا، جب تو نے انھیں دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں (۹۲) کہ تو میری پیروی نہ کرے؟ تو کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ (۹۳)

تلقین فرمائی۔ نصیحت کی یہ بہترین ترتیب ہے۔

② یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے کہ شیعہ حضرات رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بجائے علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کی دلیل کے طور پر ایک حدیث بڑے زور و شور سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (( أَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ )) [ مسلم، فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ: ۲۴۰۴/۳۱، عن سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ ] ''تم مجھ سے اسی مقام پر ہو جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا، سوائے اس بات کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' ان حضرات کو دیکھنا چاہیے کہ اپنے مخالفین کے اتنے بڑے مجمع میں، جو ہارون علیہ السلام کے قتل تک پر تیار تھا، ہارون علیہ السلام نے تقیہ اختیار نہیں کیا، بلکہ سب لوگوں کے سامنے واضح الفاظ میں حق بیان فرمایا اور لوگوں کو اپنے اتباع اور اطاعت کی دعوت دی اور دوسروں کی پیروی اور اطاعت سے منع فرمایا، تو اگر امت محمد ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے میں خطا پر ہوتی تو علی رضی اللہ عنہ پر لازم تھا کہ وہی کرتے جو ہارون علیہ السلام نے کیا تھا اور کسی بھی تقیہ اور خوف کے بغیر اپنی خلافت کا اعلان کرتے اور صاف الفاظ میں کہتے ''فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ'' تو جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ امت کا فیصلہ درست تھا۔ (رازی)

**آیت 91** ﴿ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ ...... ﴾: '' عَكَفَ يَعْكُفُ عُكُوْفًا '' (ن) کا معنی عبادت اور تقرب کے ارادے سے کسی جگہ بیٹھ رہنا ہے۔ ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت چھوڑنے اور اپنے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے طور کی طرف جانے کے لیے کہا تو انھوں نے نہایت ڈھٹائی سے ان کی دونوں باتوں کا انکار کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واپس آنے تک ہم نہ تمھارے ساتھ جائیں گے اور نہ بچھڑے کی مجاوری چھوڑیں گے۔

**آیت 93،92** ﴿ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ ...... ﴾: آیت (۸۶) سے (۸۹) تک موسیٰ علیہ السلام کی شدید غصے اور افسوس کے ساتھ واپسی اور قوم کو ڈانٹنے اور ان سے سوال جواب کا ذکر ہے۔ اس کے بعد دو آیات میں اس عرصے میں ہارون علیہ السلام کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی اور قوم کے ان کی کوئی بھی بات نہ ماننے کا ذکر ہے، جس سے مقصود ہارون علیہ السلام کا دامن ہر کوتاہی سے پاک قرار دینا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو بچھڑے کی عبادت کرتے دیکھا تھا، انھیں ہارون علیہ السلام کی اصلاح کی کوشش اور نصیحت کا علم نہ تھا، اس لیے قوم کو ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ہی انھوں نے شدید غصے کی حالت میں تورات کی تختیوں کو پھینک دیا

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَ لَا بِرَأْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ

اس نے کہا اے میری ماں کے بیٹے! نہ میری ڈاڑھی پکڑ اور نہ میرا سر، میں تو اس سے ڈرا کہ تو کہے گا تو نے

اور ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے (اعراف : ۱۵۰، ۱۵۱) اور کہنے لگے کہ جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو گئے ہیں تو تمھیں کس چیز نے روکا کہ میرے پیچھے چلے آؤ اور آ کر مجھے ان کے گمراہ ہونے کی خبر دو، تو کیا تم نے میرا حکم نہیں مانا؟

آیت 94 ❶ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ ...... : "يَبْنَؤُمَّ" اصل میں "يَا ابْنَ أُمِّيْ" تھا، یاء کو الف سے بدلنے کے بعد حذف کر دیا۔ ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کا دل نرم کرنے کے لیے انھیں ماں کا بیٹا کہہ کر مخاطب کیا، کیونکہ ماں کی جانب والی قرابت باپ کی جانب والی قرابت سے زیادہ شفقت، نرمی اور پیار کا تقاضا کرتی ہے۔ (شنقیطی)

❷ اِنِّيْ خَشِيْتُ ...... : ہارون علیہ السلام نے سفر جاری نہ رکھنے کا یہ عذر بیان کیا کہ یہ لوگ راستے میں بچھڑا بنا کر وہیں بیٹھ رہنے پر اڑ گئے تھے، اگر میں توحید پر قائم لوگوں کو لے کر آپ کی طرف آتا تو قوم دو حصوں میں بٹ جاتی اور اگر میں انھیں لے کر بچھڑا پوجنے والوں سے لڑتا تو پھر بھی دو دھڑے بن جاتے، جن کی ایک دوسرے کو قتل کرنے کی وجہ سے نہ مٹنے والی شدید دشمنی بن جاتی۔ غالب دھڑا بچھڑے والوں کا تھا اور وہ اس قدر قوت میں تھے کہ انھوں نے مجھے بالکل کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھے قتل کر دیتے، اس لیے میں نے آپ کے آنے کا انتظار کیا، تاکہ آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا انتظار نہ کیا، کیونکہ آپ کے احسانات اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معجزات کی وجہ سے آپ کی ہیبت اور آپ کا اکرام ان کے دلوں میں موجود ہے۔ مجھے امید تھی کہ آپ آ کر انھیں سنبھال لیں گے۔

❸ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ : بعض صلح کُل سیاسی حضرات، جو ووٹ لینے کی خاطر بدعتی اور مشرک لوگوں کے سامنے شرک کی تردید سے اجتناب کرتے ہیں، بلکہ قبروں پر چادریں بھی چڑھا دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اگر شرک کو برداشت کرنا پڑے تو وہ بھی کر لینا چاہیے، مگر پھوٹ ڈال کر سیٹ ضائع کرنے سے بچنا چاہیے۔ ان حضرات نے غور نہیں کیا کہ ہارون علیہ السلام نے شرک کے مقابلے میں کسی نرمی یا سمجھوتے سے کام نہیں لیا، بلکہ انھوں نے صاف الفاظ میں شرک کی تردید، توحید کی تبلیغ اور اپنی اتباع و اطاعت کی تاکید فرمائی۔ دیکھیے آیت (۹۰) اگر وہ شرک کی تردید نہ کرتے تو قوم کو ان کے قتل کے درپے ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ ہاں انھوں نے حالات کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کی آمد تک علیحدہ ہونے یا لڑنے کے بجائے ان کے فرمان کا انتظار ضروری سمجھا اور اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

❹ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ : اس سے معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی تھی، کیونکہ وہ اگر ڈاڑھی منڈے ہوتے تو انھیں ڈاڑھی پکڑنے کا کیا خوف تھا۔ قرآن مجید کی دوسری آیت ساتھ ملانے سے امت مسلمہ کے ہر فرد پر ڈاڑھی رکھنا فرض ثابت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۸۴ ] "اور اس

## بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا انتظار نہ کیا ﴿۹۴﴾

(ابراہیم) کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (ہم نے ہدایت دی)۔" اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے کئی اور پیغمبروں اور ان کے آباء، اولاد اور بھائیوں میں سے ہدایت یافتہ لوگوں کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [ الأنعام : ٩٠ ] "یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔" نبی ﷺ کو ہارون علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی پیروی کا حکم آپ کی امت کے لیے بھی پیروی کا حکم ہے۔ دیکھیے سورۂ ص (۲۴) ڈاڑھی بڑھانا فطرت ہے، کسی نبی سے ڈاڑھی منڈوانا یا کتروانا ثابت نہیں۔ یہود و نصاریٰ ڈاڑھی منڈواتے ہیں تو صرف ہمارے رسول ہی کی نہیں، اپنے پیغمبر کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ : قَصُّ الشَّارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَالسِّوَاكُ وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَ قَصُّ الْأَظْفَارِ وَ غَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ، قَالَ زَكَرِيَّاءُ قَالَ مُصْعَبٌ وَ نَسِيْتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةَ » [ مسلم، الطهارة، باب خصال الفطرة : ٢٦١ ] "دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: ① مونچھیں کترنا۔ ② ڈاڑھی بڑھانا۔ ③ مسواک کرنا۔ ④ ناک میں پانی ڈالنا۔ ⑤ ناخن کاٹنا۔ ⑥ پوروں کو دھونا۔ ⑦ بغلوں کے بال اکھیڑنا۔ ⑧ زیر ناف صفائی کرنا۔ ⑨ پانی سے استنجا کرنا۔" زکریا نے کہا کہ حدیث کے راوی مصعب نے کہا کہ میں دسویں چیز بھول گیا، شاید وہ کلی کرنا ہو۔" مرد اور عورت کے درمیان فرق کی سب سے بڑی ظاہری نشانی ڈاڑھی ہے۔ کسی مرد کے خصیے نکال دیے جائیں تو اس کی ڈاڑھی بھی معدوم ہو جائے گی۔ یہ خلق اللہ (اللہ کی پیدائش) میں شامل ہے، جس کے متعلق شیطان نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں بنی آدم کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی پیدا کردہ شکل کو بدل ڈالیں گے۔ ڈاڑھی بڑھانے کے حکم کی احادیث معروف ہیں: " أَعْفُوا اللُّحٰى، أَرْخُوا اللُّحٰى، وَفِّرُوا اللُّحٰى، أَوْفُوا اللُّحٰى " اور " لَا تُشَبَّهُوْا بِالْمَجُوْسِ " اس کے متعلق بہت سی تصانیف موجود ہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی گھنی ڈاڑھی تھی۔ [ مسند أحمد : ٨٩/١، ح : ٦٨٧، عن علي بن أبي طالب و حسنه شعيب الأرنؤوط ] جو آپ کے بے مثال حسن کا حصہ تھی۔ آپ سے ساری زندگی اس کا ایک بال کاٹنا بھی ثابت نہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین، جنھوں نے قیصر و کسریٰ کے خزانے فتح کیے اور زمین کے مشرق و مغرب کو اپنا تابع فرمان بنایا، ان میں کوئی ڈاڑھی منڈا نہ تھا۔ افسوس ہے ان مسلمانوں پر! جن کی فطرت اس حد تک مسخ ہو چکی کہ وہ شیطان کے پیچھے لگ کر انبیاء اور صحابہ و تابعین کی وضع اور مردانگی کے اس عظیم شرف سے محروم ہی نہیں ہوئے بلکہ مرد ہوتے ہوئے عورتوں اور مخنثوں والا حلیہ بنا کر اس پر فخر کرنے لگے اور الٹا ڈاڑھی کا مذاق اڑانے لگے، جیسے ناک کٹے لوگ ناک والے کو نکو کہنا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کی اطاعت کی طرف پلٹنے اور اپنی گم کردہ عظمت و مردانگی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ

کہا تو اے سامری! تیرا معاملہ کیا ہے؟ ﴿۹۵﴾ اس نے کہا میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی، سو میں نے

**آیت 95** ① قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ : ہارون علیہ السلام سے جس زبانی اور عملی شدت کے ساتھ سوال ہوا تھا سامری سے سوال کرتے ہوئے وہ شدت نظر نہیں آتی، کیونکہ اپنوں پر غصہ زیادہ آتا ہے اور ان کے معقول عذر بیان کرنے پر غصہ ہی نہیں دل کا ملال بھی ختم ہو جاتا ہے، بلکہ ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام کی بات سن کر موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ [ الأعراف : ۱۵۱ ] ''اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم والا ہے۔''

اس کے برعکس سامری کی بدطینتی پہلے ہی معلوم تھی، سو سوال میں وہ شدت نہیں مگر اس کا عذر گناہ سن کر، جو بدتر از گناہ تھا، اسے ایسی سزا سنائی جو شاید کسی کو بھی نہ دی گئی ہو۔ اس کی مثال جنگ تبوک میں تین مخلص مسلمانوں کے لشکر سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ان سے بائیکاٹ ہے، جس کا نتیجہ ان کے اخلاص و امانت کی بدولت ان کی توبہ کی قبولیت اور قرآن میں ہمیشہ کے لیے ذکر خیر کی صورت میں نکلا۔ اس کے برعکس منافقین کا عذر بظاہر قبول کر لیا جاتا ہے، مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں کسی جنگ میں ساتھ لے جانے، ان کا جنازہ پڑھنے، ان کی قبر پر کھڑا ہونے سے منع کر دیا جاتا ہے اور آخرت کے بدترین عذاب کی نوید سنا دی جاتی ہے۔

**آیت 96** قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ ...... : میں نے اس آیت کی تفسیر کے لیے بہت زیادہ تفاسیر کا مطالعہ کیا، کئی اہل علم سے بھی پوچھا، جو کچھ تفاسیر میں لکھا ہے، میں وہ نقل کرتا ہوں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ'' (میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی) یعنی میں نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا، جب وہ فرعون کو ہلاک کرنے کے لیے آئے تو ''فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ'' (سو میں نے رسول کے پاؤں کے نشان سے ایک مٹھی اٹھالی) یعنی جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے پاؤں کے نشان سے۔ یہی بات بہت سے مفسرین یا زیادہ تر مفسرین کے ہاں مشہور ہے۔'' (ابن کثیر) جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا، اکثر مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے، بلکہ بعض نے تو اس کے علاوہ کسی تفسیر کو سلف کی تفسیر سے انحراف قرار دیا ہے، یعنی سامری نے مٹی کی وہ مٹھی بچھڑے کے مجسمے میں ڈالی تو اس سے گائے کی آواز آنے لگی۔ مگر اس تفسیر کی قرآن، حدیث یا آیات کے سیاق میں کوئی دلیل نہیں۔ شروع سورت سے یہاں تک جبریل علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں کہ الف لام عہد کا مان کر جبریل علیہ السلام مراد لیے جائیں۔ نہ پورے قرآن میں جبریل علیہ السلام کے متعلق ''الرَّسُوْلِ'' (معرف باللام) آیا ہے کہ ان کا لقب مان لیا جائے۔ پھر گھوڑی کا تو دور دور تک کچھ پتا نہیں۔ بعض تابعین کے اقوال یہاں دلیل نہیں بن سکتے، کیونکہ نہ وہ موقع پر موجود تھے اور نہ انھوں نے بتایا کہ یہ تفسیر انھوں نے کہاں سے لی۔ اگر انھوں نے پہلی کسی کتاب سے لی ہے،

اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾

رسول کے پاؤں کے نشان سے ایک مٹھی اٹھالی، پھر میں نے وہ ڈال دی اور میرے دل نے اسی طرح کرنا میرے لیے خوشنما بنا دیا ﴿۹۶﴾

---

جیسا کہ ظاہر ہے، تو ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصدیق یا تکذیب دونوں سے منع فرمایا ہے۔ شک والی بات علم نہیں ہو سکتی اور نہ قرآن مجید (جس میں کوئی شک نہیں) کی تفسیر شک والی بات کے ساتھ کرنا علم تفسیر ہے۔ اس تفسیر سے پیدا ہونے والے سوالات، مثلاً تمام لوگوں میں سے سامری نے جبریل علیہ السلام کو کیسے پہچانا؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ اس مٹھی میں کیا کرشمہ ہے وغیرہ، سب کے جوابات کے لیے مزید کہانیاں درج کی گئی ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں۔

کئی مفسرین نے ابومسلم اصفہانی (معتزلی) کی تفسیر اختیار کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے جو کچھ فرمایا قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی اور توجیہ ہو سکتی ہے کہ "الرَّسُوْلِ" سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں اور رسول کے پاؤں کے نشان سے ایک مٹھی پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ میں نے ان کی سنت اور ان کے طریقے سے کچھ حصہ اخذ کیا۔ بعض اوقات آدمی کہتا ہے: "فُلَانٌ يَقْفُوْ أَثَرَ فُلَانٍ وَ يَقْتَصُّ أَثَرَهٗ" "فلاں شخص فلاں کے نشان قدم کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے نشان قدم کے پیچھے جاتا ہے۔" جب وہ اس کے طریقے پر چلتا ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب سامری کو ملامت کی اور اس سے قوم کو گمراہ کرنے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا "بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ" یعنی مجھے معلوم ہو گیا کہ تم لوگ جس راہ پر ہو وہ حق نہیں تو "فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (وَقَدْ كُنْتُ)" اس سے پہلے اے رسول! میں نے آپ کے دین اور طریقے کا کچھ حصہ اختیار کیا تھا، "فَنَبَذْتُهَا" پھر میں نے اس طریقے کو پھینک دیا اور اسے چھوڑ کر بچھڑے کی پرستش میرے نفس نے میرے لیے خوشنما بنا دی۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب کی اطلاع دی اور اس نے رسول کو غائب کے صیغے سے اسی طرح ذکر کیا جیسے آدمی اپنے سردار سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امیر صاحب اس بارے میں کیا فرماتے ہیں اور امیر صاحب کیا حکم دیتے ہیں؟ رہا اس کا موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا منکر ہونے کے باوجود انھیں رسول کہنا، تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کفار کا قول ذکر فرمایا: ﴿وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ﴾ [ الحجر : ٦ ] "اور انھوں نے کہا اے وہ شخص جس پر یہ نصیحت نازل کی گئی ہے! بے شک تو تو دیوانہ ہے۔" حالانکہ وہ لوگ آپ پر نصیحت کا نزول تسلیم نہیں کرتے تھے۔ رازی لکھتے ہیں کہ ابومسلم نے جو ذکر کیا ہے وہ تحقیق کے زیادہ قریب ہے اور اس میں (پہلے) مفسرین کی مخالفت کے سوا کوئی خرابی نہیں۔ پھر رازی نے اس کی تائید میں کئی چیزیں ذکر کی ہیں۔ بہت سے بعد میں آنے والے مفسرین نے بھی یہ تفسیر اختیار کی ہے، مگر "بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ" کے بعد "فَقَبَضْتُ قَبْضَةً" کی تفسیر "وَقَدْ كُنْتُ قَبَضْتُ" کے ساتھ کرنا تکلف ہے، اسی طرح کسی کی پیروی کے لیے "يَقْفُوْ" اور "يَقْتَصُّ أَثَرَهٗ" تو معروف ہے مگر اس

مفہوم کے لیے ” يَقْبِضُ قَبْضَةً مِنْ أَثَرِهٖ “ کے استعمال کی لغت عرب میں کوئی نظیر نہ ابو مسلم نے پیش کی ہے، نہ رازی نے اور نہ بعد میں آنے والے کسی بزرگ نے۔ پہلی تفسیر پر ابو مسلم کا اعتراض کہ اس کی قرآن میں تصریح نہیں، اس تفسیر پر بھی وارد ہوتا ہے کہ اس کی تصریح بھی قرآن میں نہیں، محض کھینچ کھانچ کر یہ مطلب نکالا گیا ہے۔

ایک اردو مفسر نے یہ بات نکالی ہے کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا۔ اس نے بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی۔ پھر مزید جسارت یہ کی کہ خود موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک پر فریب داستان گھڑ کر رکھ دی، اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آیا تھا اور ساتھ ہی یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے جبریل ہی ہوں، یا اس نے رسول کا لفظ خود موسیٰ علیہ السلام کے لیے استعمال کیا تھا تو یہ اس کی ایک اور مکاری تھی، وہ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ذہنی رشوت دینا چاہتا تھا۔ (ملخص) مگر ساری قوم کے سامنے اس کے جھوٹ پر موسیٰ علیہ السلام جیسے پرجلال پیغمبر کا ذہنی رشوت لے کر خاموش رہنا اور صرف اسے سزا سنانے پر اکتفا کرنا اور قوم کے سامنے اس کے جھوٹ اور فریب کو واضح نہ کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

ایک اور عقلی بزرگ نے ” بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ “ کی یہ توجیہ کی ہے کہ اس نے کہا کہ مجھے کشفی مشاہدہ ہوا جو صرف مجھی کو ہوا کہ جبریل علیہ السلام کے آتے ہی میں نے ان کے (یا ان کے گھوڑے کے) نقش قدم سے ایک مٹھی خاک اٹھالی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اس میں ڈال دی ہے، جس سے وہ بولنے لگا، مگر اب آپ کے ڈانٹنے سے معلوم ہوا کہ یہ محض میرے نفس کا دھوکا تھا۔ (ملخص) تعجب ہوتا ہے کہ یہ حضرات بات بناتے بناتے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دیکھنے کی تفسیر کشفی مشاہدہ قادیانی طرز تفسیر کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام قوم کے سامنے اس فریب کا پردہ چاک نہ کریں؟

مجھے تو سلامتی اسی میں نظر آتی ہے کہ جس آیت کی تفصیل قرآن مجید کے الفاظ سے واضح نہ ہو اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہو، اہل کتاب کی کسی روایت پر یقین کرنے یا زبردستی کوئی مطلب نکالنے کے بجائے متشابہات میں سے سمجھ کر اس پر مجمل ایمان رکھا جائے اور اس کی تفصیل اللہ کے سپرد کر دی جائے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ؔ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [ آل عمران : ۷ ] ”وہی ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری، جس میں کچھ آیات محکم ہیں، وہی کتاب کی اصل ہیں اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، پھر جن لوگوں کے دلوں میں تو کجی ہے وہ اس میں سے ان کی پیروی کرتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور ان کی اصل مراد کی تلاش کے لیے، حالانکہ ان کی اصل مراد نہیں جانتا مگر اللہ اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر جو عقلوں والے ہیں۔“ آخر ہم حروف مقطعات، اللہ تعالیٰ کی صفات، سد ذوالقرنین، دابۃ الارض،

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

کہا پس جا کہ بے شک تیرے لیے زندگی بھر یہ ہے کہ کہتا رہے "ایک دوسرے کو چھونا نہیں" اور بے شک تیرے لیے ایک اور بھی وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی تجھ سے ہرگز نہ کی جائے گی اور اپنے معبود کو دیکھ جس پر تو مجاور بنا رہا، یقیناً ہم اسے ضرور اچھی طرح جلائیں گے، پھر یقیناً اسے ضرور سمندر میں اڑا دیں گے، اڑانا اچھی طرح ﴿۹۷﴾

یاجوج ماجوج اور قرآن مجید کی کتنی ہی باتوں کی تفصیل نہیں جانتے، مگر ہمارا ان پر ایمان ہے۔ سامری کے جواب کی تفصیل میں اگر ہمارا کوئی فائدہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ذکر فرما دیتا۔ سو ہمارا ایمان ہے کہ اگرچہ ہم تفصیل نہیں جانتے مگر جو ہمارے رب نے فرمایا وہ حق ہے۔

**آیت 97** ❶ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ......: "مِسَاسَ" "قَاتَلَ يُقَاتِلُ مُقَاتَلَةً وَ قِتَالًا" کی طرح باب مفاعلہ کا مصدر ہے جس میں مشارکت پائی جاتی ہے، یعنی ایک دوسرے کو چھونا، ہاتھ لگانا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ زندگی بھر کے لیے ایسی بیماری اور عذاب میں مبتلا ہوا کہ وہ کسی کو ہاتھ لگاتا یا کوئی اسے ہاتھ لگاتا، دونوں صورتوں میں اسے شدید تکلیف ہوتی، جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ وہ اس سے بچنے کے لیے خود ہی کہتا پھرتا کہ نہ میں تمھیں ہاتھ لگاتا ہوں اور نہ تم مجھے ہاتھ لگاؤ۔ بعض تابعین نے کہا ہے کہ ہاتھ لگنے کی صورت میں سامری اور دوسرے شخص دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا، مگر انھوں نے اس خبر کا ذریعہ نہیں بتایا۔ زندگی ہی میں تمام انسانوں سے اس کا تعلق کاٹ دیا گیا اور وہ تنہائی کے بدترین عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے عمل سے سزا کی مناسبت اہل علم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ گائے کی آواز والا بچھڑا بنا کر اسے معبود کی صورت میں پیش کرنے سے اس کا مقصد شہرت اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کی خواہش تھی، اللہ تعالیٰ نے ایسی سزا دی کہ کسی ایک شخص سے بھی نہ مل سکے۔

❷ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ : مراد موت، قبر اور آخرت کا عذاب ہے۔

❸ وَ انْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ...... : "ظَلْتَ" "ظَلَّ يَظَلُّ" (ع) سے واحد مذکر حاضر ہے، جو اصل میں "ظَلِلْتَ" تھا (پہلے لام کے کسرہ کے ساتھ)، بولنے میں دشواری ختم کرنے کے لیے پہلا لام حذف کر دیا گیا۔ وزن "فَعِلْتَ" کے بجائے "فَلْتَ" رہ گیا۔ "لَنُحَرِّقَنَّهٗ" جلانے میں شدت کے اظہار کے لیے باب تفعیل استعمال ہوا ہے۔ "نَسَفَ يَنْسِفُ نَسْفًا" (ض) اڑانا، بکھیرنا۔ "الْيَمِّ" نمکین سمندر اور میٹھے دریا دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ سونے یا چاندی کے بچھڑے کو آگ میں جلانے سے وہ دھات اڑانے اور بکھیرنے کے قابل تو نہیں ہوتی بلکہ زیادہ خالص اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ وہ گوشت پوست کا بچھڑا بن گیا تھا، مقصد یہ تھا کہ ہم اسے ذبح کر کے اچھی

اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

تمھارا معبود تو اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے ﴿۹۸﴾

طرح جلا کر دریا یا سمندر میں اڑا کر بکھیر دیں گے، مگر گوشت پوست کا بچھڑا بننے کی بات بالکل بے اصل ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہم اسے خوب گرم کریں گے، تاکہ وہ نرم ہو جائے، پھر ریتی کے ساتھ اسے ذرہ ذرہ کر کے دریا میں بکھیر دیں گے، مگر قرآن مجید میں ریتی کا ذکر نہیں۔ اس لیے بعض مفسرین نے فرمایا کہ "حَرَقَ يَحْرُقُ" (ن) کا معنی پیسنا بھی آتا ہے اور باب تفعیل میں مزید مبالغہ ہو گیا۔ یہ جواب بھی زبردستی پر مبنی ہے، کیونکہ "تَحْرِيْقٌ" کا معنی جلانا ہی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل سے مجھے اس کا بالکل واضح جواب مل گیا، وہ یہ کہ حکیم جس دھات کا چاہتے ہیں کشتہ بنا لیتے ہیں، جو راکھ کی صورت میں اتنا باریک ہو جاتا ہے کہ پھونک سے اڑ جاتا ہے۔ اطباء کو انبیاء کے کمال سے تو کوئی نسبت ہی نہیں، لہٰذا ان کے لیے دھات کو راکھ بنانا کیا مشکل ہے؟

④ موسیٰ علیہ السلام کا عمل اس بات کی دلیل ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کے لیے جو چیز بھی استعمال ہو رہی ہو اسے مسمار کرنا، جلانا اور اس کا نام و نشان مٹا دینا لازم ہے، خواہ وہ کوئی بت ہو یا درخت یا قبر۔ ابوالہیاج الاسدی (علی رضی اللہ عنہ کے داماد) فرماتے ہیں کہ مجھے علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: « أَلَا أَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِيْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ لَّا تَدَعَ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ » [ مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر : ۹٦۹ ] ''کیا میں تمھیں اس کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا؟ وہ یہ ہے کہ کسی مجسمے کو نہ چھوڑ و جسے مٹا نہ دو اور کسی اونچی قبر کو نہ چھوڑو جسے برابر نہ کر دو۔'' اللہ کی شان دیکھیے، اونچی قبریں برابر کرنے پر علی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا جنھیں تمام قبر پرست، اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی و اخروی ذلت و رسوائی کا باعث اہل کتاب کی پیروی میں قبر پرستی اور شرک کی دوسری صورتوں میں مبتلا ہونا اور توحید سے منہ موڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنی توحید کی طرف پلٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) "لَنُحَرِّقَنَّهٗ" اور "لَنَنْسِفَنَّهٗ" میں لام تاکید اور نون ثقیلہ کے ساتھ اور پھر "نَسْفًا" مفعول مطلق کے ساتھ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر صورت اسے جلائیں گے اور ہر صورت دریا میں اڑا کر بکھیریں گے۔ کسی طرح ایسا کرنے سے نہیں ٹلیں گے، خواہ کوئی مقابلے پر آ جائے، یا منت و سماجت کرے، یا اپنے اس معبود کے غیظ و غضب سے ڈراتا رہے، یہ کام ہو کر رہے گا۔

**آیت 98** ﴿ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ ...... ﴾ : یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے جنھوں نے سامری سے خطاب کے بعد اپنی امت کے لوگوں کو مخاطب فرمایا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ اس صفت میں ساری صفات آ جاتی ہیں، تفصیل اس کی علم کلام کی کتابوں میں ''لا الٰہ الا اللہ'' کی تشریح میں مذکور ہے۔ دوسری دلیل خاص صفت علم ہے جس کے گھیرے سے کوئی چیز باہر نہیں۔ "وَسِعَ"

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَ قَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَ سَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾

اسی طرح ہم تجھ سے کچھ وہ خبریں بیان کرتے ہیں جو گزر چکیں اور یقیناً ہم نے تجھے اپنے پاس سے ایک نصیحت عطا کی ہے ﴿۹۹﴾ جو اس سے منہ پھیرے گا تو یقیناً وہ قیامت کے دن ایک بڑا بوجھ اٹھائے گا ﴿۱۰۰﴾ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے اور وہ ان کے لیے قیامت کے دن برا بوجھ ہوگا ﴿۱۰۱﴾ جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس دن اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے ﴿۱۰۲﴾

کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ گھیرا ڈالنے والی چیز میں اس کے اندر والی چیز سے زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ (ابن عاشور) جو "كُلَّ شَيْءٍ" سے بھی وسیع ہے، اس کی وسعت کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

**آیت 99** كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ ...... : یعنی جیسے ہم نے آپ کو موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل، فرعون اور اس کی قوم کے حالات بتائے ہیں، ایسے ہی ہم آپ کو ان چیزوں کی کچھ خبریں سناتے ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکیں۔ جنھیں نہ آپ نے دیکھا تھا اور نہ آپ کو یا آپ کی قوم کو ان کا علم تھا۔ دیکھیے ہود (۴۹) ان سے مقصود محض وقت گزاری یا لطف اٹھانا نہیں بلکہ مقصود نصیحت ہے اور ہم نے اپنے پاس سے آپ کو یہ عظیم نصیحت عطا کی ہے۔ اس عظیم نصیحت سے مراد وحی الٰہی کے ذریعے سے نازل ہونے والی کتاب و حکمت (قرآن و سنت) ہے۔ اس کے سوا بڑے سے بڑے آدمی کی بات نہ اللہ کے پاس سے ہے اور نہ اس پر عمل کی اجازت ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۳) "ذِكْرًا" کی تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "عظیم نصیحت" کیا ہے اور "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "کچھ خبریں" کیا ہے، تمام خبریں سننے کی نہ ضرورت ہے اور نہ سنی جا سکتی ہیں۔ "مَا" اکثر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے، اس لیے ترجمہ ان لوگوں کے بجائے "ان چیزوں کی کچھ خبریں" کیا گیا ہے، "ان احوال کی کچھ خبریں" بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔

**آیت 101،100** مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ ...... : منہ پھیرنے سے مراد اس نصیحت پر ایمان نہ لانا اور عمل نہ کرنا ہے۔ "وِزْرًا" پر تنوین تعظیم و تہویل کے لیے ہے، بڑا بوجھ، بھاری بوجھ۔ "حِمْلًا" بمعنی "مَحْمُوْلٌ" ہے، جیسے "ذِبْحٌ" بمعنی "مَذْبُوْحٌ" ہے، اٹھایا ہوا (بوجھ)۔ "سَآءَ" فعل ذم ہے، جس کا فاعل ضمیر مبہم "هُوَ" ہے اور جس کے ابہام کی توضیح "حِمْلًا" تمیز کے ساتھ کی گئی ہے۔

**آیت 102** يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ...... : یہ پچھلی آیات میں مذکور "يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" سے بدل ہے جو قیامت کے دن کی وضاحت کر رہا ہے۔ "الصُّوْرِ" کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۷۳) اور کہف (۹۹)۔ "زُرْقًا" "اَزْرَقُ" کی جمع ہے،

يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾

آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے ہوں گے کہ تم دس راتوں کے سوا نہیں ٹھہرے ﴿۱۰۳﴾ ہم زیادہ جاننے والے ہیں جو کچھ وہ کہہ رہے ہوں گے، جب ان کا سب سے اچھے طریقے والا کہہ رہا ہوگا کہ تم ایک دن کے سوا نہیں ٹھہرے ﴿۱۰۴﴾ اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھیں گے تو کہہ دے میرا رب انھیں اڑا کر بکھیر دے گا ﴿۱۰۵﴾ پھر انھیں ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا ﴿۱۰۶﴾

---

جس کا معنی نیلے رنگ والا ہے۔ یہاں اس کے دو معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک نیلے جسم اور نیلے چہروں والے، مراد سیاہ رنگ والے، کیونکہ جلی ہوئی جلد نیلگوں کالی ہو جاتی ہے۔ اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۰۶)۔ دوسرا معنی ”اندھے“ ہے، کیونکہ بہت نیلی آنکھ اندھے آدمی کی ہوتی ہے، یعنی قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے، اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۲۴، ۱۲۵)۔ طبری نے صرف یہی معنی بیان فرمایا ہے۔

**آیت 103** يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ ......: اسمائے عدد میں قاعدہ ہے کہ تین سے دس تک کی گنتی میں اگر کوئی چیز مذکر ہو تو عدد مؤنث آئے گا اور اگر کوئی چیز مؤنث ہو تو عدد مذکر ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا﴾ [ الحاقۃ : ۷ ] ”اس نے اس (آندھی) کو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھا۔“ اس لیے یہاں ”عَشْرًا“ کا معنی دس راتیں ہوگا۔ ” تَخَافُتٌ “ (تفاعل) کا معنی خوف وغیرہ کی وجہ سے آہستہ آواز سے بات کرنا ہے۔ ان کی یہ حالت قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے ہوگی۔

**آیت 104** نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ......: ”اَمْثَلُ“ بمعنی ”اَفْضَلُ“ ہے۔ ” اَلْمَثَالَةُ “ یعنی ” اَلْفَضْلُ “۔ ”طَرِيْقَةً“ سب سے اچھے طریقے والا سے مراد یہاں سب سے اچھی رائے والا ہے۔ اسے زیادہ اچھی رائے والا اور عقل مند اس لیے فرمایا کہ اس نے دنیا کے عارضی اور ختم ہونے کو اور آخرت کے ہمیشہ اور باقی رہنے کو دوسروں سے زیادہ سمجھا، اس لیے اس نے کہا کہ دس راتیں کہاں، تم تو ایک دن سے زیادہ دنیا میں نہیں ٹھہرے۔ طبری نے فرمایا کہ قیامت کی ہولناکی انھیں دنیا کا عیش و عشرت ایسا بھلائے گی کہ وہ دنیا میں رہنے کی صحیح مدت بھی نہیں بتا سکیں گے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۱۱۲ تا ۱۱۴) اور روم (۵۵)۔

**آیت 106،105** ① وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ ......: قرطبی نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جہاں بھی کسی سوال کا ذکر آیا ہے اس کے لیے جواب میں ”قُلْ“ کا لفظ آیا ہے۔ صرف اس مقام پر فاء کے ساتھ ”فَقُلْ“ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام مقامات پر ان سوالات کا جواب ہے جو ہو چکے تھے، یہاں فاء اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ ہونے والے

لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری جگہ ﴿۱۰۷﴾ اس دن وہ پکارنے والے کے پیچھے چلے آئیں گے، جس کے لیے کوئی کجی نہ ہوگی اور سب آوازیں رحمان کے لیے پست ہو جائیں گی، سو تو ایک نہایت آہستہ آواز کے سوا کچھ نہیں سنے گا ﴿۱۰۸﴾

سوال کا جواب دیا کہ " فَاِنْ سَاَلُوْكَ فَقُلْ..... "یعنی اگر وہ تجھ سے پوچھیں تو کہہ دینا..... یعنی فاء دلیل ہے کہ اس سے پہلے شرط محذوف ہے۔

② فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا..... : صور پھونکنے کے ساتھ قیامت قائم ہونے اور تمام لوگوں کے جمع کرنے کے ذکر پر منکرین قیامت کی طرف سے سوال آنے والا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب پہلے ہی دے دیا کہ ان کے خیال میں اتنے بلند و بالا اور محکم پہاڑوں کو ان کی جگہ سے کوئی ہلا نہیں سکتا، اس لیے وہ پوچھیں گے کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ پوچھیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ میرا رب انھیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ "يَنْسِفُهَا" کی تاکید "نَسْفًا" کے ساتھ فرمائی، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ "يَنْسِفُ" اپنے اصل معنی میں نہیں ہے بلکہ مجاز ہے۔ یعنی فی الحقیقت اللہ تعالیٰ انھیں ریزہ ریزہ کر کے اڑا دے گا۔ پہاڑوں پر گزرنے والی حالتوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نبا (۲۰) کی تفسیر۔ "قَاعًا" میدان۔ "صَفْصَفًا" ہموار۔

**آیت 107** لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا : "عِوَجًا" کجی، مراد نیچی جگہ ہے۔ "اَمْتًا" معمولی ابھری ہوئی جگہ، یعنی ہر بلندی اور پستی، حتیٰ کہ سمندروں کی گہرائی اور پہاڑوں کی بلندی ختم ہو کر پوری زمین بالکل ہموار ہو جائے گی، جس میں ذرہ برابر نیچی یا اونچی جگہ دکھائی نہ دے گی۔

**آیت 108** ① يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ..... : یعنی قیامت کے دن سب لوگ حشر کے لیے قبروں سے نکل کر پکارنے والے کی آواز کی طرف نہایت تیزی کے ساتھ سر اٹھائے ہوئے دوڑتے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ ﴾ [ ابراھیم : ۴۳ ] "اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے۔" اس کی طرف جانے میں کوئی کجی نہ ہوگی، یعنی تیر کی طرح سیدھے جائیں گے اور ذرہ بھر ادھر ادھر نہ ہوں گے۔ اس حالت کا نقشہ سورۂ ابراہیم (۴۲، ۴۳)، سورۂ قمر (۶ تا ۸) اور سورۂ قٓ (۴۱، ۴۲) میں دیکھیے۔ "لَا عِوَجَ لَهٗ" کا دوسرا معنی یہ ہے کہ پکارنے والے کی پکار میں کوئی کجی نہ ہوگی کہ کسی تک پہنچے اور کسی تک نہ پہنچے، ہر شخص تک سیدھی پہنچے گی۔

② وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ..... : یعنی اتنی بے شمار مخلوق کے دوڑنے اور اکٹھے ہونے پر کوئی شور و غل نہ ہوگا۔ سب آوازیں رحمان کے لیے پست ہو جائیں گی۔ "رحمان" کے لیے پست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس بے حد رحم والے رب کی رحمت اور

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر جس کے لیے رحمان اجازت دے اور جس کے لیے وہ بات کرنا پسند فرمائے ﴿۱۰۹﴾ وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے ﴿۱۱۰﴾

اس کے کرم کی طلب میں سب عاجزی سے خاموش ہوں گے۔ "هَمْسًا" ہلکی سے ہلکی آواز یا قدموں کی ہلکی سے ہلکی آہٹ، کھسکھساہٹ۔

آیت 109 ❶ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ ...... : اس آیت میں اس دن کی مزید ہیبت اور عظمت بیان ہوئی ہے کہ مشرکین کا کہنا کہ ہمارے معبود ہماری سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے، بالکل غلط ہے۔ وہاں کوئی سفارش نفع نہ دے گی۔

❷ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ...... : اس کے دو مطلب ہیں، دونوں مراد ہیں اور دونوں کی تائید آیات قرآن سے ہوتی ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ نہایت مختصر لفظوں میں بہت زیادہ معانی ہوتے ہیں۔ ایک معنی یہ ہے کہ اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر اس کی جس کو رحمان سفارش کرنے کی اجازت دے اور جس کے بات کرنے کو پسند فرمائے۔ دوسرا یہ کہ اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر اس کو جس کے حق میں رحمان سفارش کی اجازت دے اور جس کے حق میں بات کرنے کو پسند فرمائے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۸۷)، سبا (۲۳)، زخرف (۸۶)، نجم (۲۶) اور نبا (۳۸)۔

آیت 110 ❶ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ : دیکھیے آیت الکرسی (بقرہ: ۲۵۵) کی تفسیر۔

❷ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا : "بِهٖ" کی ضمیر کے مرجع کے لحاظ سے اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ "بِهٖ" میں "ہ" ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے قرار دی جائے۔ معنی یہ ہوگا کہ کسی کا علم اتنا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا احاطہ کر سکے، مخلوق کا محدود علم خالق کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے؟ دوسرا یہ کہ یہ ضمیر "يَعْلَمُ" کے مصدر "عِلْمٌ" کے لیے قرار دی جائے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کوئی شخص اللہ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا اور اس صورت میں یہ آیت الکرسی کے جملہ "وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ" کا ہم معنی ہوگا۔ تیسرا یہ ہے کہ "ہ" ضمیر "مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ" میں موجود "مَا" کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے کسی کا علم بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا، جو لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو (چاہے وہ فرشتے ہوں یا جن یا انسان یا کوئی اور) لوگوں کے اگلے پچھلے حال کا پورا علم نہیں ہے کہ جان سکیں کہ کس کے حق میں شفاعت کرنی چاہیے اور کس کے حق میں نہیں کرنی چاہیے، اس لیے شفاعت کو اللہ تعالیٰ کے اذن (اجازت) پر موقوف رکھا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو فرشتوں یا انبیاء و اولیاء اور بزرگوں کی پرستش اس امید پر کرتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن ہماری سفارش کریں گے۔

وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

اور سب چہرے اس زندہ رہنے والے، قائم رکھنے والے کے لیے جھک جائیں گے اور یقیناً ناکام ہوا جس نے بڑے ظلم کا بوجھ اٹھایا ﴿۱۱۱﴾ اور جو شخص کچھ نیک اعمال کرے اور وہ مومن ہو تو وہ نہ کسی بے انصافی سے ڈرے گا اور نہ حق تلفی سے ﴿۱۱۲﴾

**آیت 111** ❶ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ : "عَنَتْ" "عَنَا يَعْنُوْ عُنُوًّا" (ن) سے واحد مؤنث غائب، ماضی معلوم ہے، اصل میں "عَنَوَتْ" تھا، ذلیل اور عاجز ہو کر جھک جانا۔ اس میں سے اسم فاعل "عَانٍ" یا "اَلْعَانِيْ" آتا ہے، جس کا معنی قیدی ہے، کیونکہ قیدی بے حد عاجز، بے بس اور ذلیل ہوتا ہے۔ یعنی اس دن صرف تمام آوازیں ہی رحمان کے لیے پست نہیں ہوں گی بلکہ تمام چہرے، حتیٰ کہ ان سرکش متکبر لوگوں کے چہرے بھی اس حی و قیوم کے سامنے ذلیل قیدیوں کی طرح جھکے ہوں گے جن کی پیشانی دنیا میں کبھی اللہ کے سامنے جھکی نہ تھی۔ کیونکہ وہ سب فانی و محتاج ہیں اور انھیں حی و قیوم کے سامنے جھکے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ "لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ" کی تفسیر آیت الکرسی (بقرہ: ۲۵۵) میں دیکھیے۔

❷ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا: یہاں "ظُلْمًا" پر تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ "بڑے ظلم کا بوجھ اٹھایا" کیا ہے۔ بڑے ظلم سے مراد مشرک ہونا اور مسلمان نہ ہونا ہے۔ (طبری) اس کا ترجمہ "کسی ظلم کا بوجھ اٹھایا" درست نہیں، کیونکہ گناہ گار مومن و موحد سزا پا کر یا سزا کے بغیر اللہ کے اذن سے جنت میں چلے جائیں گے اور جنت میں پہنچ جانے والا ناکام نہیں۔ دلیل اور تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۸۲)، بقرہ (۲۵۴) اور یونس (۱۰۶) کی تفسیر۔

**آیت 112** ❶ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ : "مِنَ الصّٰلِحٰتِ" میں "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "کچھ نیک اعمال" کیا ہے۔ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے تمام اعمال صالحہ تو کر ہی نہیں سکتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴾ [ عبس : ۲۳ ] "ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا۔" اس لیے وہ اتنے عمل ہی کا مکلف ہے جتنی اس میں طاقت ہے، فرمایا: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [ البقرۃ : ۲۸۶ ] "اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔" اور فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [ التغابن : ۱۶ ] "سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔" مفسرین نے اس سے مراد فرائض لیے ہیں۔

❷ عمل کی قبولیت کے لیے دو شرطیں بیان فرمائیں۔ عمل کا صالح ہونا یعنی کتاب و سنت کے مطابق ہونا اور عمل کرنے والے کا صاحب ایمان ہونا۔ نہ کافر کا کوئی عمل قبول ہے اور نہ وہ عمل جو کتاب و سنت سے ثابت نہ ہو۔ دیکھیے سورۂ کہف کی آخری آیت۔

❸ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا: بے انصافی یہ ہے کہ کسی کو ان گناہوں پر سزا دی جائے جو اس نے نہیں کیے اور حق تلفی یہ ہے کہ کی ہوئی نیکیوں پر پانی پھیر دیا جائے۔ اسی کو سورۂ جن (۱۳) میں "بَخْسًا" اور "رَهَقًا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ

اور اسی طرح ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا اور اس میں ڈرانے کی باتیں پھیر پھیر کر بیان کیں، شاید کہ وہ ڈر جائیں، یا یہ ان کے لیے کوئی نصیحت پیدا کر دے ﴿۱۱۳﴾ پس بہت بلند ہے اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے، اور قرآن پڑھنے میں

متعدد آیات میں جزا و سزا میں عدل و انصاف کا اعلان کیا ہے، مگر گناہ گار مومنوں کو معاف کر دینا فضل ہے جو عدل کے منافی نہیں۔

**آیت 113** ❶ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا : ''اسی طرح'' کا اشارہ اس سورت میں مذکور آیات کی طرف ہے کہ ہم نے پورا قرآن ہی ان آیات کی طرح نازل کیا ہے۔ ''قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا'' کی تفسیر سورۂ یوسف (۲) میں دیکھیے۔

❷ وَ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ: یعنی بار بار اور مختلف طریقوں کے ساتھ دنیا اور آخرت میں اپنی گرفت اور عذاب سے ڈرایا ہے۔

❸ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ...... : تاکہ وہ ڈر جائیں، یا کم از کم یہ ان کے دل میں کسی طرح کی عبرت و نصیحت پیدا کر دے اور وہ سوچیں کہ پچھلی امتوں کا کیا انجام ہوا؟ اگر ہم بھی گناہ کریں گے تو انھی کی طرح تباہ و برباد ہوں گے۔ (ابن کثیر) ''ذِكْرًا'' کی تنوین تنکیر کی وجہ سے ''کسی طرح کی نصیحت'' ترجمہ کیا ہے۔

**آیت 114** ❶ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ...... : ''فَتَعٰلَى'' ''عَلَا يَعْلُوْ عُلُوًّا'' بلند ہونا۔ باب تفاعل میں تاء اور الف کے اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ''پس بہت بلند ہے۔'' ''اَلْمَلِكُ الْحَقُّ'' ''حَقَّ يَحِقُّ'' ثابت ہونا۔ لفظ حق باطل کے مقابلے میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی حقیقی، سچی اور پائدار ہے۔ دوسرے تمام بادشاہ دنیا میں نہایت محدود اختیارات کے مالک ہیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی سے، وہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں کر سکتے اور آخرت میں ان کے وہ اختیار بھی ختم ہو جائیں گے۔ پھر اس میں کیا شک ہے کہ حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہی ہے اور باقی سب باطل ہیں ۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے　　　حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

صحیح بخاری (۱۱۲۰) میں تہجد کے لیے اٹھتے وقت رسول اللہ ﷺ کی ایک لمبی دعا مذکور ہے، اس دعا میں ہے: (( وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ الْحَقُّ وَ وَعْدُكَ الْحَقُّ، وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ )) دعاؤں کی کسی کتاب یا اصل صحیح بخاری سے یہ مکمل دعا یاد کر لیں، یہ دعا تہجد کے وقت پڑھنا مسنون اور بے حد برکت کا باعث ہے۔

❷ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ...... : یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ قیامہ (۱۶ تا ۱۹) میں بیان ہوا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک دفعہ جلدی کرنے اور جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے منع فرما دیا، تو دوبارہ اس حکم کی کیا ضرورت تھی؟ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اسے یوں حل فرمایا ہے: ''جبرئیل جب قرآن لاتے آپ ﷺ ان کے پڑھنے کے ساتھ پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جاویں۔ اس کو پہلے منع فرمایا تھا سورۂ قیامہ میں اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں تک پہنچوانا ذمہ ہمارا ہے، لیکن بندہ بشر ہے، شاید بھول گئے ہوں، پھر تقید کیا اور بھولنے پر مثل فرمائی آدم علیہ السلام کی۔'' (موضح)

يُقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

جلدی نہ کر، اس سے پہلے کہ تیری طرف اس کی وحی پوری کی جائے اور کہہ اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر ﴿۱۱۴﴾

③ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا : رسول اللہ ﷺ کے جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ جلدی پڑھنے کے پیچھے اصل جذبہ زیادہ سے زیادہ علم کے حصول اور حفظ کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف جلدی کرنے سے منع فرمایا، مگر اصل جذبے کی تعریف کی اور اس کی تکمیل کے لیے دعا سکھائی، جیسا کہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھاتے ہوئے رکوع کی حالت میں پایا تو صف میں ملنے سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے اور پھر اسی حالت میں رکوع میں مل گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ » [ بخاري، الأذان، باب إذا ركع دون الصف : ۷۸۳ ] ''اللہ تمھاری حرص زیادہ کرے اور دوبارہ ایسا نہ کرنا۔'' دوبارہ ایسی جلدی سے منع کرنے کے ساتھ نیکی میں حرص کی تعریف فرمائی۔ ''رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا'' میں ''عِلْمًا'' عام ہے اور اس سے مراد علم نافع ہے۔ دین یعنی قرآن و حدیث کا علم ہو یا دنیا کا ایسا علم جو دنیا و آخرت دونوں میں نافع ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے: « اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِيْ بِمَا عَلَّمْتَنِيْ وَ عَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ وَ زِدْنِيْ عِلْمًا » [ ترمذي، الدعوات، باب سبق المفردون ..... : ۳۵۹۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ و صححه الألباني ] ''اے اللہ! مجھے اس کے ساتھ نفع دے جس کا تو نے مجھے علم دیا اور مجھے اس کا علم دے جو مجھے نفع دے اور مجھے علم میں زیادہ کر۔'' انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کی اکثر دعا یہ تھی: « اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ » [ بخاري، الدعوات، باب قول النبي ﷺ : ربنا آتنا ..... : ۶۳۸۹ ] ''اے اللہ! اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھلائی عطا کر اور ہمیں دوزخ سے بچا۔'' مسلمانوں پر دنیا کی ہر ضرورت کا علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، تاکہ انھیں غیر مسلموں کا محتاج نہ ہونا پڑے اور وہ دنیا میں اسلام کو غالب رکھ سکیں، مثلاً طب، زراعت، ہیئت، جغرافیہ، ہندسہ، سائنس، اسلحہ سازی وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ کو جو بھی نئی چیز معلوم ہوتی اس سے جہاد میں فائدہ اٹھایا کرتے تھے، جیسا کہ جنگ احزاب میں خندق تیار فرمائی اور صحابہ اور تابعین مجاہدین نے جنگوں میں منجنیق کا استعمال فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے بحری جہاد کی خوش خبری دی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحری بیڑا تیار کیا، جس کے نتیجے میں بحر روم پر مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا اور جدید سے جدید ایجادات اور تدابیر کے نتیجے میں سلطان محمد الفاتح رحمہ اللہ نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ ظاہر ہے کہ تیس فیصد خشکی پر بھی اسی کی حکومت ہو گی جو ستر فیصد سمندر پر اپنا تسلط منوا سکے۔ داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زرہ سازی کا فن سکھایا اور اسے بطور احسان قرآن مجید میں ذکر فرمایا۔ قرآن مجید میں احکام کی آیات اتنی نہیں جتنی زمین و آسمان، سورج، چاند، بحر و بر، نباتات و جمادات و حیوانات اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور کرنے کی تاکید والی آیات ہیں۔ مسلمانوں نے اس میں غفلت کی اور کفار نے ان پر محنت کر کے جدید سے جدید ایجادات، مثلاً مشین، موٹر، ریل، ہوائی جہاز، بجلی، بارود، بم، میزائل، ایٹم، کمپیوٹر وغیرہ تیار کر کے مسلمانوں کو اپنا محتاج بلکہ غلام بنا لیا۔ اب مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان تمام علوم میں مہارت حاصل کریں جو کفار کے ساتھ جہاد کے لیے ضروری ہیں اور اس طرح یہ سب کچھ علم دنیا ہونے کے باوجود علم آخرت بن جائے گا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم ''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ''

وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آدم کو اس سے پہلے تاکید کی، پھر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادے کی کچھ پختگی نہ پائی ﴿۱۱۵﴾

کی تعمیل ہو گی۔ البتہ اس بات کا اہتمام نہایت ضروری ہے کہ یہ علوم سیکھنے والے قرآن و حدیث کے علم سے آراستہ اور یقین و ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے سرشار ہوں، تاکہ وہ سائنس پڑھتے پڑھتے کفار سے متاثر ہو کر محض دنیا پرست اور ملحد نہ بن جائیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس وقت مذموم ہو جائے گا جب اس سے مقصود صرف دنیا ہو اور آخرت سے غفلت اختیار کی جائے۔ ایسی صورت میں یہ تمام علوم رکھنے والا اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق بے علم ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖۚ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [ الروم : ۶، ۷ ] ''اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (علم نہیں رکھتے )۔ وہ دنیا کی زندگی کے ظاہر کا علم رکھتے ہیں اور وہ آخرت سے وہی غافل ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ [ البقرۃ : ۲۰۰ ] ''پھر لوگوں میں سے کوئی تو وہ ہے جو کہتا ہے، اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے دے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔'' ان لوگوں کا علم، علم نافع نہیں، اس لیے اس سے پناہ مانگنی چاہیے، جیسا کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے: (( اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَ مِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا )) [ مسلم، الذکر و الدعاء، باب في الأدعیة : ۲۷۲۲ ] ''اے اللہ! بے شک میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو خشوع نہ رکھے اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ کی جائے۔''

**آیت 115** ❶ وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ ...... : '' عَهِدَ إِلَيْهِ '' کا معنی '' أَوْصَاهُ '' ہے کہ اس نے اسے تاکید کی۔ تاکید سے مراد مخصوص درخت کے قریب نہ جانے کا حکم ہے۔ '' نَسِيَ '' کا معنی عام طور پر '' وہ بھول گیا '' آتا ہے، مگر یہاں مراد جان بوجھ کر عمل ترک کرنا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابلیس نے آدم و حوا علیہما السلام کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا اور ان دونوں کے لیے اپنے خیر خواہ ہونے کی قسم اٹھائی تھی: ﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ﴾ [ الأعراف : ۲۰ ] ''تم دونوں کے رب نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا مگر اس لیے کہ کہیں تم دونوں فرشتے بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔'' معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو وہ درخت کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا حکم یاد تھا، مگر شیطان کے وسوسے سے لالچ میں آ کر حکم عدولی کر بیٹھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کو عصیان (نافرمانی) قرار دیا، فرمایا: ﴿وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ [ طٰہٰ : ۱۲۱ ] ''اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ بھٹک گیا۔'' بھول کر کیے ہوئے عمل کو نافرمانی نہیں کہا جاتا۔ طبری نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ ''فَنَسِيَ يَقُوْلُ فَتَرَكَ'' یعنی ''فَنَسِيَ'' کا معنی ''اس نے عمل ترک کر دیا'' ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

❷ قرآن میں آدم علیہ السلام کا یہ قصہ چھٹی بار بیان ہو رہا ہے، اول سورۂ بقرہ، دوم اعراف، سوم حجر، چہارم بنی اسرائیل، پنجم کہف

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی ﴿۱۱۶﴾ فَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ ہٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَ لِزَوۡجِکَ فَلَا یُخۡرِجَنَّکُمَا مِنَ الۡجَنَّۃِ فَتَشۡقٰی ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِیۡہَا وَ لَا تَعۡرٰی ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّکَ لَا تَظۡمَؤُا فِیۡہَا وَ لَا تَضۡحٰی ﴿۱۱۹﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے انکار کیا ﴿۱۱۶﴾ تو ہم نے کہا بے شک یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے، سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے کہ تو مصیبت میں پڑ جائے گا ﴿۱۱۷﴾ بے شک تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا ﴿۱۱۸﴾ اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کھائے گا ﴿۱۱۹﴾

اور شتم یہاں اور ہر جگہ ایک خاص مقصد کے تحت مختلف انداز سے اس قصے کو دہرایا گیا ہے۔ یہاں ماقبل سے اس کی مناسبت کے سلسلہ میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا تعلق آیت: ﴿ کَذٰلِکَ نَقُصُّ عَلَیۡکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ مَا قَدۡ سَبَقَ ﴾ [ طٰہٰ : ۹۹ ] (اسی طرح ہم تجھ سے ان چیزوں کی کچھ خبریں بیان کرتے ہیں جو پہلے گزر چکیں) سے ہے، یعنی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے کہ ہم قصے بیان فرمائیں گے، چنانچہ اس کے تحت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرما دیا۔ ایک مناسبت یہ ہے کہ "رَبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا" کہنے کا حکم دینے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں اضافے کے لیے آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا اور ایک مناسبت وہ ہے جو اوپر شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کی توضیح میں گزر چکی ہے۔

**آیت 116** وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۴ تا ۳۶) اور اعراف (۱۱، ۱۲)۔

**آیت 117** فَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ ہٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ ...... : عداوت کا اظہار سجدے سے انکار کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۲۲) "فَتَشۡقٰی" تو مصیبت میں پڑ جائے گا، یعنی روزی کے لیے محنت مشقت کرنا پڑے گی اور جنت کی تمام آسائشیں اور نعمتیں چھین لی جائیں گی۔ آدم علیہ السلام کی طرف خاص شقاوت کی نسبت اس لیے ہے کہ مرد کو عورت کا منتظم اور اس کے اخراجات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لیے اصل آدم علیہ السلام ہی ہیں اور حوا علیہا السلام ان کے تابع۔

**آیت 119،118** ❶ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوۡعَ ...... : گویا آدم اور حوا علیہما السلام کو بتا دیا گیا کہ تمھاری تمام بنیادی ضروریات کا یہاں انتظام کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں یہی چار چیزیں ہیں: بھوک دور کرنے کے لیے کھانا، پیاس بجھانے کے لیے پانی، ستر ڈھانپنے کے لیے لباس اور سردی گرمی سے بچنے کے لیے مکان۔ یہ دراصل شقاوت کی تفسیر ہے اور اس شقاوت سے مراد دنیوی شقاوت ہے نہ کہ اخروی۔ شقاوت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۲)۔

❷ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے بھوک کے بعد پیاس کے بجائے ننگا ہونے کا ذکر کیا اور پیاس کے بعد دھوپ میں جلنے کا ذکر فرمایا۔ اس میں ایک تو آیات کے آخری الفاظ کی مناسبت مقصود ہے اور ایک یہ کہ اگر بھوک، پیاس اور ننگے ہونے اور

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

پس شیطان نے اس کے دل میں خیال ڈالا، کہنے لگا اے آدم! کیا میں تجھے دائمی زندگی کا درخت اور ایسی بادشاہی بتاؤں جو پرانی نہ ہو؟ ﴿۱۲۰﴾ پس دونوں نے اس میں سے کھا لیا تو دونوں کے لیے ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور وہ دونوں اپنے آپ پر جنت کے پتے چپکانے لگے اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ بھٹک گیا ﴿۱۲۱﴾

دھوپ میں جلنے کو اکٹھا ذکر کیا جاتا تو پہلی دونوں اور دوسری دونوں کا مجموعہ ہم شکل ہونے کی وجہ سے ایک ایک نعمت نظر آتا، الگ الگ ذکر کرنے سے چار نعمتیں نمایاں ہو گئیں۔ (قاسمی)

**آیت 121،120** ① فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ ...... : قرآن میں شیطان کے وسوسہ انداز ہونے اور پھسلانے کی نسبت بعض آیات میں صرف آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے اور بعض میں آدم و حوا دونوں کی طرف۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں تو شیطان آدم علیہ السلام ہی کے دل میں وسوسہ انداز ہوا ہے، حوا علیہا السلام کا ذکر ان کے تابع ہونے کی حیثیت سے ہے، لہٰذا عوام میں جو یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ شیطان نے پہلے حوا علیہا السلام کو پھسلایا اور پھر ان کے ذریعے سے آدم علیہ السلام کو قابو کیا، وہ قطعی غلط اور لغو ہے اور اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ دونوں آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۲۰، ۲۱)۔

② وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ...... : آدم علیہ السلام کا واقعہ نہایت عجیب ہے کہ اتنا عظیم شخص، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا، فرشتوں سے اس کو سجدہ کروایا، کمال عقل بخشی، اپنی جنت میں ہر نعمت عطا فرمائی، اسے صاف لفظوں میں شیطان کی دشمنی سے آگاہ کر دیا اور دشمن کی بات ماننے پر جنت سے نکلنے کی تنبیہ بھی فرما دی، اتنے عظیم شخص کو اس کے اتنے مہربان پروردگار نے صرف ایک چیز سے منع فرمایا، مگر وہ اپنے رب کی اتنی عنایتوں اور شیطان کی واضح دشمنی کے علم کے باوجود اس کے ورغلانے سے اپنے رب کی حکم عدولی کیسے کر گزرا؟ جو شخص بھی اس واقعہ میں غور و فکر کرے گا اس کا تعجب بڑھتا ہی جائے گا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اللہ کی تقدیر کو نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہٹا سکتا ہے اور یہ کہ دلیل جتنی بھی واضح اور مضبوط ہو اس سے تبھی فائدہ حاصل ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو اور اسے مقدر فرمایا ہو۔ (رازی) صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں موسیٰ علیہ السلام کے آدم علیہ السلام سے سوال اور ان کے جواب سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اس حدیث سے اگر کوئی یہ استدلال کرے کہ گناہ جب اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے تو ہمارا کیا قصور ہے اور ہمیں ملامت کیوں کی جاتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے توبہ قبول ہونے اور گناہ معاف ہونے کے بعد یہ جواب دیا ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جب ان سے پوچھا: ﴿ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ ﴾ [ الأعراف : ۲۲ ] کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا

# ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴿۱۲۲﴾

پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، تو اس پر مہربانی فرمائی اور ہدایت دی ﴿۱۲۲﴾

تھا تو انھوں نے نہ تقدیر کا بہانہ بنایا اور نہ اپنا قصور اللہ تعالیٰ کے ذمے لگایا، بلکہ صاف تسلیم کیا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [ الأعراف : ۲۳ ] ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔'' اس کے برعکس ابلیس نے اپنا گناہ ماننے کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا: ﴿قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [ الأعراف : ۱۶ ] ''اس نے کہا پھر اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں ضرور ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔'' گناہ کی معافی کے بغیر تقدیر کا عذر غلط ہے۔ ایک اور جواب جو اس سے بھی قوی ہے، یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آدم علیہ السلام سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ آپ نے نافرمانی کیوں کی تھی؟ بلکہ انھوں نے انھیں اپنی اولاد کو جنت سے نکالنے اور مصیبت میں ڈالنے پر ملامت کی تھی، حالانکہ مصیبت پر ملامت نہیں کی جاتی، خواہ وہ کسی غلطی کی وجہ سے آئی ہو، بلکہ تسلی دی جاتی ہے، مثلاً اگر کسی کی غلطی کی وجہ سے کوئی حادثہ ہو جائے تو اسے غلطی پر ملامت کے بجائے مصیبت میں تعزیت کی جاتی ہے کہ اللہ کی تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا، اس لیے غم مت کرو۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِحْتَجَّ آدَمُ وَ مُوْسٰى، فَقَالَ مُوْسٰى يَا آدَمُ! أَنْتَ أَبُوْنَا، أَنْتَ خَيَّبْتَنَا وَأَخْرَجْتَنَا مِنَ الْجَنَّةِ، فَقَالَ لَهُ آدَمُ أَنْتَ مُوْسٰى، اصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِكَلَامِهِ، وَخَطَّ لَكَ بِيَدِهِ، أَتَلُوْمُنِيْ عَلٰى أَمْرٍ قَدَّرَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَنِيْ بِأَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰى، فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰى )) [ مسلم، القدر، باب حجاج آدم و موسٰی صلی اللہ علیہما وسلم : ۲۶۵۲ ] ''آدم اور موسیٰ علیہما السلام کی بحث ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا، تم ہمارے باپ ہو، تم نے ہمیں نامراد کر دیا اور ہمیں جنت سے نکال دیا۔'' تو آدم علیہ السلام نے ان سے کہا: ''اے موسیٰ! اللہ عز و جل نے تمھیں اپنے کلام کے لیے چنا اور تمھارے لیے اپنے ہاتھ سے (کتاب) لکھی۔ اے موسیٰ! کیا تم مجھے ایک ایسے کام پر ملامت کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے مجھ پر طے کر دیا تھا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو آدم، موسیٰ پر دلیل میں غالب آ گئے، تو آدم، موسیٰ پر دلیل میں غالب آ گئے۔''

**آیت 122** ① ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ: ''جَبَى يَجْبِيْ'' (ض) کا معنی کھینچ کر لانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [ القصص : ۵۷ ] ''اور کیا ہم نے انھیں ایک باامن حرم میں جگہ نہیں دی؟ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔'' ''اِجْتَبٰى'' (افتعال) کا معنی کسی چیز کو اپنے لیے لے لینا، چن لینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آدم علیہ السلام کو اپنے لیے کھینچ لینے اور چن لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل میں توبہ کا خیال ڈالا، انھیں توبہ کی توفیق دی اور توبہ کے کلمات کی تعلیم دی، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [ البقرة : ۳۷ ] ''پھر آدم نے اپنے رب

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ۬ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

فرمایا تم دونوں اکٹھے اس سے اتر جاؤ، تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہے، پھر اگر کبھی واقعی تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پوری طرح پیروی کی تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا ﴿۱۲۳﴾

سے چند کلمات سیکھ لیے تو اس نے اس کی توبہ قبول فرمالی۔'' قرآن کے مطابق وہ کلمات یہ تھے: ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ٢٣ ] ''اِجْتَبٰهُ رَبُّهٗ'' میں لفظ ''رَبُّهٗ'' اس چننے کے سبب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

❷ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى : یعنی اس کی توبہ قبول فرمائی اور ہدایت دی، یعنی صراط مستقیم پر گامزن کر دیا اور اس پر ثابت قدمی عطا فرمائی۔ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں ''اِجتبا'' اور ''ہدایت'' کے الفاظ اکٹھے آئیں وہاں نبوت عطا کرنا مراد ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [ الأنعام : ٨٧ ] اور فرمایا: ﴿ اِجْتَبٰهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [ النحل : ١٢١ ] اور تیسری آیت یہ ہے۔

❸ آدم علیہ السلام کا گناہ توبہ و استغفار کی وجہ سے ان کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بلند مقام کا ذریعہ بن گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی حکمت ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے انبیاء سے غلطی کا صادر ہونا ناممکن کیوں نہیں بنا دیا اور وہ ہے رسول کا غلطی سرزد ہونے کے بعد توبہ و استغفار میں اپنی امت کے لیے اسوہ اور نمونہ بننا۔ کیونکہ غلطی کے بعد والی ندامت، آہ و زاری، آئندہ نہ کرنے کا عزم اور پچھلی غلطی پر دن رات استغفار اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اگر انسان سے غلطی نہ ہو، جس کے بعد وہ توبہ و استغفار کرے، تو اللہ تعالیٰ بنی آدم کی صف لپیٹ کر گناہ کرنے والی کوئی اور قوم لے آئے، جو گناہ کرے، پھر استغفار کرے اور اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔ [ مسلم، التوبة، باب سقوط الذنوب بالاستغفار والتوبة : ٢٧٤٩، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] پھر اس مہربان رب کی رحمت اور لطف و کرم کی کیا حد ہے جو توبہ کے بعد پہلے گناہوں کو بھی نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (٧٠) اللہ تعالیٰ ہم گناہ گاروں کو بھی ایسی ہی توبہ کرنے والوں میں شامل فرمالے۔ ( آمین )

❹ درخت میں سے کھانے کے بعد یہاں توبہ قبول کرنے کا ذکر پہلے ہے اور زمین پر اترنے کا حکم بعد میں، حالانکہ اصل ترتیب یہ تھی کہ درخت میں سے کھاتے ہی انھیں جنت سے نکال دیا گیا، مگر یہاں آدم علیہ السلام کی توبہ کا قبول ہونا اور نبوت عطا ہونا پہلے اس لیے ذکر فرمایا کہ سننے والوں کو آدم علیہ السلام کا انجام معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر اچھا ہوا۔

**آیت 123** ❶ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : اس کی تفسیر سورۂ بقرہ کی آیت (٣٦) میں دیکھیے، یعنی توبہ قبول ہونے کے باوجود زمین پر رہنے کا فیصلہ قائم رہا، کیونکہ انھیں پیدا ہی زمین کی خلافت کے لیے کیا گیا تھا۔

❷ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ...... : سورۂ بقرہ (٣٨) میں ''فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ'' ہے، یعنی جس نے میری ہدایت کی پیروی کی اور

وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے ﴿۱۲۴﴾

یہاں "اِتَّبَعَ" (افتعال) ہے، اس میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے تکلف اور مبالغہ ہے، یعنی جس نے میری ہدایت کی پوری طرح پیروی کی تو وہ نہ دنیا میں جنت کے راستے سے بھٹکے گا اور نہ آخرت میں جنت سے محروم رہ کر بدنصیب ہوگا، بلکہ سیدھا چلتا ہوا اپنے گھر جنت میں پہنچ جائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «ضَمِنَ اللّٰهُ لِمَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ أَلَّا يَضِلَّ فِي الدُّنْيَا وَلَا يَشْقٰى فِي الْآخِرَةِ ثُمَّ تَلَا: ﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى﴾» [ مصنف ابن أبي شيبة: ۴۶۷/۱۰، ح: ۳۰۵۷۵۔ مستدرك حاكم: ۳۸۱/۲، ح: ۳۴۳۸ و صححه ووافقه الذهبي ] "جو شخص قرآن کی پیروی کرے اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے کہ وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں بدنصیب۔" پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "تو جو میری ہدایت کے پیچھے چلا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔" معلوم ہوا ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے آئے، اللہ تعالیٰ نے ہدایت خود بھیجنے کا وعدہ کیا اور اسے پورا فرمایا ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی رہنمائی منزل پر نہیں پہنچا سکتی، خواہ کوئی عالم ہو یا درویش، انسان ہو یا جن یا کوئی اور اللہ کی کتاب کے مطابق زندگی گزارنا دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب زندگی کا ضامن ہے، فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [ النحل: ۹۷ ] "جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انھیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کرتے تھے۔"

**آیت 124** ❶ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ: ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی نصیحت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [ الحجر: ۹ ] "بے شک ہم، ہم نے ہی یہ ذکر یعنی نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔"

❷ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا: "مَعِيْشَةً" زندگی، وہ چیزیں جن پر زندگی گزرتی ہے، مثلاً کھانا پینا اور دوسری ضروریات۔ (قاموس) "ضَنْكًا" "ضَنُكَ يَضْنُكُ ضَنْكًا وَضُنَاكًا وَ ضَنَاكَةً" مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، اس لیے "مَعِيْشَةً" کی صفت ہونے کے باوجود لفظ میں تبدیلی نہیں ہوئی، یہ واحد و جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے ایک ہی رہتا ہے، یعنی وہ تنگی والی زندگی گزارے گا۔ اس کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، اس لیے وہ سب سے راجح ہے۔ صحیح ابن حبان میں ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ عزوجل کے اس قول "فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا" کے متعلق روایت کیا، آپ نے فرمایا: «عَذَابُ الْقَبْرِ» "(مراد) عذاب قبر ہے۔" "اَلتَّفْسِيْرُ الصَّحِيْحُ الْمَسْبُوْرُ" میں اسے الاحسان (۳۱۱۹)، مستدرک حاکم (۳۸۱/۱، ح: ۱۴۰۵) اور کئی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے اور مختلف ائمہ سے اس کا حسن، جید یا صحیح ہونا بھی نقل کیا گیا ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا ﴿۱۲۵﴾ وہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انھیں بھول گیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا ﴿۱۲۶﴾

امام طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند کے ساتھ اس کی تفسیر ''الشقاء'' فرمائی ہے۔ ''الشقاء'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۲) ''مَعِيْشَةً ضَنْكًا'' کے الفاظ میں دنیا اور قبر دونوں کی تنگ زندگی شامل ہے۔ اللہ کی نصیحت سے منہ موڑنے والا شخص اللہ پر توکل اور اس کے عطا کردہ پر قناعت سے محرومی کی وجہ سے ہر وقت زیادہ سے زیادہ مال و جاہ کی ہوس میں مبتلا رہتا ہے۔ مال کی دو وادیاں ملنے پر تیسری کی تلاش میں چل نکلتا ہے۔ باؤلے کتے کی پیاس کی طرح اس کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ اربوں کھربوں کا مالک ہونے کے باوجود فقیر ہوتا ہے، حرص اور بخل کی کمینگی کی وجہ سے اسے کسی کی دلی محبت حاصل نہیں رہتی۔ اموال و اولاد اس کے لیے راحت بننے کے بجائے اللہ کی طرف سے عذاب بن جاتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۵۵، ۸۵) پھر وہ وقت آ جاتا ہے کہ اسے گولیوں کے بغیر نیند نہیں آتی اور ہر آسائش حاصل ہوتے ہوئے بھی اسے اس رنج و الم سے بھری ہوئی زندگی سے چھٹکارے کی کوئی صورت خودکشی کے سوا نظر نہیں آتی۔ یقین نہ ہو تو جاپان، سویڈن، ناروے وغیرہ میں خودکشی کا تناسب دیکھ لیں۔

③ وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى : دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آیات سے کان اور آنکھیں بند کر لینے اور حق کو تسلیم نہ کرنے کی پاداش میں قیامت کے دن اسے اندھا، گونگا اور بہرا کر کے اٹھایا جائے گا۔ (بنی اسرائیل : ۹۷) قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہے۔ دیکھیے سورۂ معارج (۴) اس کے مختلف اوقات میں لوگوں کے احوال مختلف ہوں گے۔ قبر سے اٹھتے وقت وہ اندھا ہوگا، پھر جہنم کی ہولناکی اور اہلِ ایمان کی عزت دکھانے کے لیے بینا کر دیا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ طور (۱۴، ۱۵) اور سورۂ مریم (۳۸)۔

**آیت 126** ① قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ ...... : '' كَذٰلِكَ '' (اسی طرح) سے مراد ''اندھا ہونا'' ہے، جس کا ذکر سوال میں ہے کہ پروردگارا! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ جواب ملے گا: ﴿ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ﴾ کہ اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انھیں بھول گیا۔ دونوں آیتوں کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ایک لمبی بات کو اس طرح مختصر کیا گیا ہے کہ حذف شدہ الفاظ خود بخود سمجھ میں آ رہے ہیں۔ سوال میں اندھے ہونے کا ذکر ہے، جواب میں بھلانے کا ذکر ہے۔ یہ اختصار تین جگہوں پر ہے، پہلا اختصار ''وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (وَ نَنْسَاهُ)'' ''ہم قیامت کے دن اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے (اور اسے بھلا دیں گے)'' دوسرا اور تیسرا اختصار '' قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا (وَ عَمِيْتَ عَنْهَا) وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ (وَ تُحْشَرُ اَعْمٰى)'' ''وہ فرمائے گا، اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انھیں بھول گیا (اور ان سے اندھا بن گیا) اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا (اور اندھا کر کے اٹھایا جائے گا)۔'' اسے بلاغت کی اصطلاح میں ''اِحْتِبَاكٌ'' کہتے ہیں۔ (ابن عاشور)

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

اور اسی طرح ہم اس شخص کو جزا دیتے ہیں جو حد سے گزرے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۱۲۷﴾

② واضح رہے کہ آیات کو بھلانے سے مراد یہاں ان پر ایمان نہ لانا اور عمل نہ کرنا ہے، حفظ کرنے کے بعد بھول جانا مراد نہیں۔ اس کی دلیل اگلی آیت ہے: ﴿ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ﴾ [ طٰهٰ : ۱۲۷ ] ''اور اسی طرح ہم اس شخص کو جزا دیتے ہیں جو حد سے گزرے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے۔'' ایمان لانے والا شخص جو حفظ کے بعد کسی بیماری یا مصروفیت کی وجہ سے کچھ آیات بھول جائے، وہ اس میں داخل نہیں ہے۔

③ قرآن یاد کرنے کے بعد بھول جانے پر وعید کی کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ چند ضعیف روایات درج ذیل ہیں: ① مسند احمد (۲۸۵/۵، ح: ۲۲۵۲۴) میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « وَمَا مِنْ رَجُلٍ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَنَسِيَهُ إِلَّا لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ يَلْقَاهُ وَهُوَ أَجْذَمُ » ''اور کوئی بھی شخص جو قرآن پڑھے پھر اسے بھول جائے، وہ اللہ تعالیٰ سے جس دن ملے گا تو اس حال میں ملے گا کہ کوڑھی ہو گا۔'' اس کی ایک سند میں عیسیٰ بن فائد مجہول راوی ہے، اس کا شیخ بھی مجہول ہے۔ دوسری سند میں بھی عیسیٰ بن فائد مجہول ہے۔ ② سنن ابو داؤد (۴۶۱) اور ترمذی (۲۹۱۶) میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُوْرُ أُمَّتِيْ حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ ذُنُوْبُ أُمَّتِيْ فَلَمْ أَرَ ذَنْبًا أَعْظَمَ مِنْ سُوْرَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ أُوْتِيَهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِيَهَا » ''میرے سامنے میری امت کے اجر پیش کیے گئے، یہاں تک کہ وہ تنکا بھی جسے آدمی مسجد سے نکالے اور میرے سامنے میری امت کے گناہ پیش کیے گئے، تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت عطا کی گئی پھر اس نے اسے بھلا دیا۔'' شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی سند ضعیف ہے، کیونکہ ابن جریج اور مطلب بن عبد اللہ دونوں مدلس ہیں اور اسے ''عن'' کے لفظ سے روایت کرتے ہیں اور بخاری اور ترمذی نے اسے ضعیف قرار دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں ضعیف ابی داؤد (۷۱)۔

④ ضعیف اور موضوع روایات نے امت کو کس قدر نقصان پہنچایا، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا کہ وہ ان روایات ہی کی وجہ سے قرآن حفظ کرنے سے محروم رہے، حالانکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جسے کسی مصروفیت یا بیماری یا غفلت کی وجہ سے قرآن بھول جائے وہ اس شخص سے ہزار گنا بہتر ہے جس نے قرآن پڑھا ہی نہیں، یا یاد ہی نہیں کیا، کیونکہ وہ اس سے تو ہر حال میں قرآن کا علم زیادہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اسے سب سے بڑے گناہ شرک کے قائم مقام قرار دینا یا کوڑھی ہونے کا باعث قرار دینا راویوں کی جہالت اور تدلیس ہی کا کارنامہ ہے۔

آیت 127 ① وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ ...... : یعنی اسی طرح ہر ایک مجرم کو اس کے جرم کے موافق جزا دی جائے گی۔

اَفَلَمۡ یَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰكِنِهِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۱۲۸﴾

پھر کیا اس بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں، بے شک اس میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً کئی عظیم نشانیاں ہیں ﴿۱۲۸﴾

② مَنْ اَسْرَفَ...... : حد سے گزرنے والا سب سے بڑھ کر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے، پھر وہ ہے جو عبودیت (بندگی) کے مقام سے بڑھ کر اتنا بڑا (متکبر) بنے کہ اپنی خواہش نفس کے پیچھے لگ کر اپنے خالق و مالک کی کوئی بات نہ مانے۔

③ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ...... : یعنی اگرچہ دنیا اور قبر کی تنگی والی زندگی اور محشر میں اندھا کر کے اٹھایا جانا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا فراموش کر دینا، ان میں سے ہر ایک بہت بڑا عذاب ہے، مگر آخرت یعنی سب سے آخری مرحلے کا عذاب (جہنم) سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ سخت اتنا کہ اس کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا تیز اور باقی رہنے والا ایسا کہ جہنمی اس سے خلاصی کے لیے موت کی تمنا کریں گے، مگر موت ذبح کی جا چکی ہوگی، اسی لیے فرمایا: ﴿لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی﴾ [طٰہٰ: ۷۴] ''نہ وہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا۔'' جہنم سے ان کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

**آیت 128** ① اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ...... : ''هَدٰی یَهْدِیْ'' راہنمائی کرنا۔ ''الْقُرُوْنِ'' ''قَرْنٌ'' کی جمع ہے۔ قرن کا معنی متعین کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا فرمان سب سے زیادہ معتبر ہے، جو آپ نے عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا، آپ نے فرمایا: «یَعِیْشُ هٰذَا الْغُلَامُ قَرْنًا، فَعَاشَ مِائَةَ سَنَةٍ» [سلسلة الأحادیث الصحیحة: ۱۵۹/۶، ح: ۲٦٦۰] ''یہ لڑکا ایک قرن زندہ رہے گا'' تو وہ سو سال زندہ رہے۔'' سلسلہ صحیحہ کی اس روایت میں ابن عساکر کے حوالے سے مزید یہ ہے کہ عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ قربان! قرن کتنا ہوتا ہے؟'' فرمایا: ''سو سال۔'' عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں پچانوے برس جی چکا ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی بات پوری ہونے میں پانچ برس رہ گئے ہیں۔ محمد بن قاسم کہتے ہیں کہ ہم نے بعد میں پانچ سال گنے، پھر وہ فوت ہو گئے۔

② قرون سے مراد عاد و ثمود ہیں، کیونکہ عرب لوگ یمن، نجران اور اس کے گرد و نواح کی طرف جاتے ہوئے قوم عاد کے رہنے کی جگہوں سے گزرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تبوک کے سفر میں ثمود کے مکانات سے گزرے تھے۔ اسی طرح ان سفروں میں قوم لوط اور اہل مدین کی تباہ شدہ بستیاں سب سے بڑی شاہراہ پر واقع تھیں، جہاں سے وہ صبح و شام گزرتے تھے۔ دیکھیے سورۂ حجر (۷٦ تا ۷۹) اور صافات (۳۳ تا ۳۸)۔



③ اس سورت میں پیغمبروں کو جھٹلانے والے لوگوں کا اور ان کے بدترین انجام کا ذکر گزر چکا ہے۔ حق یہ تھا کہ اہل عرب تاریخ سے سبق حاصل کرتے اور کفر و شرک سے باز آ جاتے، مگر وہ اپنی سرکشی پر جمے رہے۔ اس لیے بطور تعجب فرمایا کہ کیا اس

وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے پہلے ہو چکی اور ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو وہی (پہلے لوگوں والا عذاب) لازم ہو جاتا ﴿۱۲۹﴾

بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر ڈالا، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں اور جنھیں دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ لوگ قد و قامت، صنعت و زراعت اور قوت و مہارت میں ان سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مدائن صالح، اہرام مصر اور دوسرے آثار قدیمہ شاہد ہیں کہ اس قوت کے لوگ پھر پیدا نہیں ہوئے۔ دیکھیے سورۂ فجر (۶ تا ۱۴) اور سورۂ روم (۹، ۱۰) ان لوگوں کے آثار آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے آباؤ اجداد سے تواتر کے ساتھ ان کی قوت و ہیبت اور عذاب الٰہی سے بربادی کے واقعات سن کر بھی کیا ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ لوگ بھی ان کی روش پر اڑے رہے تو ان کا انجام کیا ہوگا؟

④ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى : "النُّهٰى" کی تفسیر اسی سورت کی آیت (۵۴) میں دیکھیے۔ "النُّهٰى" جمع ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''عقلوں والے'' کیا ہے اور "لَاٰيٰتٍ" پر تنوین تعظیم کی وجہ سے ترجمہ ''کئی عظیم نشانیاں'' کیا ہے۔

**آیت 129** ① وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ...... اصل میں " وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى لَكَانَ (الْعَذَابُ) لِزَامًا" ہے، فواصل (آیات کے آخری حروف) کی مطابقت کے لیے "وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى" کو مؤخر کر دیا گیا۔

② "لِزَامًا" بروزن "قِتَالٌ" باب مفاعلہ کا مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی میں برائے مبالغہ ہے، لازم ہونے والا۔

③ "لَكَانَ" میں ضمیر "هُوَ" اس کا اسم ہے جو پچھلی آیات کے مضمون "اَلْعَذَابُ" (وہی عذاب) کی طرف لوٹ رہی ہے۔

④ جب پہلی قوموں کی ہلاکت کا ذکر فرمایا تو سوال پیدا ہوا کہ اب ان جھٹلانے والوں کو کیوں ہلاک نہیں کیا جا رہا؟ فرمایا کہ اس کے دو سبب ہیں، ایک تو وہ بات جو رب تعالیٰ کی طرف سے پہلے طے ہو چکی اور دوسرا وہ وقت جو مقرر ہو چکا۔ پہلے طے شدہ بات سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اس کے غضب پر غالب ہونا ہے، جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِيْ كِتَابِهِ وَ هُوَ يَكْتُبُ عَلٰى نَفْسِهِ وَهُوَ وَضْعٌ عِنْدَهُ عَلَى الْعَرْشِ اِنَّ رَحْمَتِيْ تَغْلِبُ غَضَبِيْ» [بخاري، التوحيد، باب قول الله : ﴿ و يحذركم الله نفسه ﴾ : ۷۴۰۴ ] ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا فرمائی تو اپنے آپ پر یہ بات لکھ دی، اور وہ خود ہی اپنے آپ پر لکھتا ہے، اور اسے اپنے پاس عرش پر رکھ لیا کہ بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔'' اور اس نے اپنی رحمت سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ پیغام پہنچانے اور حجت پوری کرنے کے بغیر عذاب نہیں دیتا۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۱۵) اور نساء (۱۶۵) اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ کفار کی نسل سے بے شمار مسلمان پیدا ہوں گے، اس لیے اس نے فوراً عذاب نازل کرنے کے بجائے کفار کو مہلت دے رکھی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہر ایک کا وقت مقرر شدہ ہے، جس سے پہلے کوئی قوم یا شخص جتنی بھی نافرمانی کرے، اسے مہلت دی جاتی ہے، تاکہ وہ یہ نہ کہہ

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ

سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد

سکے کہ مجھے وقت نہیں ملا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ٣٤ ] ''اور ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں۔'' اگر یہ دو باتیں نہ ہوتیں تو وہی پہلی قوموں والا عذاب لازم ہو جاتا۔

**آیت 130** ① فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ: یعنی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں مہلت دینا طے فرما دیا ہے تو اب خواہ وہ کتنی تکلیف دہ باتیں کہیں، ساحر کہیں یا شاعر، کاہن کہیں یا مجنون، مذاق اڑائیں یا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ باتیں کہیں، آپ کے پاس صبر اور اللہ سے فریاد کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ ہر مصیبت میں دو ہی چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں، ایک صبر اور دوسری اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح و تحمید، جس کی جامع صورت نماز ہے، اس لیے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ﴾ [ البقرة : ١٥ ] ''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔''

② وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ: اس کا لفظی معنی اگرچہ یہ ہے کہ ''اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر'' مگر مراد نماز ہے، جیسا کہ جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے، رکعت یا سجدہ بول کر پوری نماز مراد لی جاتی ہے، اسی طرح تسبیح و حمد بول کر پوری نماز مراد لی ہے، کیونکہ رکوع اور سجدہ کی طرح تسبیح و حمد بھی نماز کا جز ہے۔ دلیل اس کی جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر فرمایا: (( إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهِ فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾ )) [ ق : ٣٩ ] [ بخاري، التفسير، باب قوله ﴿ وسبح بحمد ربك ...... ﴾ : ٤٨٥١ ] ''تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جیسے اسے دیکھ رہے ہو، اسے دیکھنے میں تمھیں کوئی بھیڑ پیش نہیں آئے گی۔ تو اگر تم یہ کر سکو کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے کی نماز کی ادائیگی میں کوئی تم پر غالب نہ آئے (رکاوٹ نہ بنے) تو ایسا کرو۔'' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾۔''

سورۂ قٓ کی اس آیت اور زیر تفسیر آیت کے الفاظ ایک ہیں، اس لیے یہاں بھی ''وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ'' سے مراد نماز ہی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں، ان کے اوقات کے اول و آخر کی تعیین، ان کی رکعات، ان کے ادا کرنے کا طریقہ سب کچھ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، حدیث کے انکار کا مطلب درحقیقت قرآن کا انکار ہے۔ صرف قرآن مجید سے ان میں سے کسی بات پر عمل ممکن نہیں، بلکہ نماز کے علاوہ زکوٰۃ، صیام، حج غرض کسی بھی حکم پر پوری طرح عمل ممکن نہیں۔ اس لیے کسی بھی مسلمان کو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ قرآن مجید نے بھی انھی پانچ نمازوں کو فرض قرار دیا ہے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن رات میں فرض بتایا ہے اور اپنے قول و عمل سے ان کا نمونہ پیش فرمایا ہے۔ اس لیے سلف صالحین نے ایسی تمام آیات کی تفسیر، جن

اٰنَآئِ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡ وَ اَطۡرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرۡضٰى ﴿۱۳۰﴾

کے ساتھ تسبیح کر اور رات کے کچھ اوقات میں بھی پس تسبیح کر اور دن کے کناروں میں، تاکہ تو خوش ہو جائے ﴿۱۳۰﴾

میں نماز کے اوقات کی طرف اشارہ ہے، حدیث کو مدنظر رکھ کر ہی کی ہے۔

اس آیت سے پانچ نمازوں کا حکم کس طرح ثابت ہوتا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کا بیان مختلف ہے۔ مجھے بقاعی رحمہ اللہ کی تفسیر بہتر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ "قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ" سے مراد فجر کی نماز ہے۔ "قَبۡلَ غُرُوۡبِهَا" سے مراد ظہر اور عصر کی نماز ہے۔ "وَ مِنۡ اٰنَآئِ الَّيۡلِ" سے مراد مغرب اور عشاء ہے اور "وَ اَطۡرَافَ النَّهَارِ" (دن کے کناروں) سے مراد فجر اور عصر ہے، کیونکہ فجر دن کے پہلے کنارے میں ہے اور عصر دن کے آخری کنارے میں، رہی مغرب تو وہ رات میں شامل ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو نمازوں (فجر اور عصر) کا ذکر "قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ" میں ہو چکا ہے، اس تفسیر کے مطابق ان کا ذکر دوبارہ لازم آتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ان دونوں نمازوں کی مزید تاکید کے لیے ان کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى ۚ وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِيۡنَ﴾ [ البقرة : ۲۳۸ ] (سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو) میں "صلاۃ وسطیٰ" کا ذکر اس کی فضیلت و اہمیت کے پیش نظر دوبارہ کیا گیا ہے۔ فجر اور عصر کے فضائل کے پیش نظر ان کی مزید تاکید کے لیے انھیں دوبارہ ذکر فرمایا، کیونکہ حدیث کے مطابق ان دونوں نمازوں میں رات اور دن کے فرشتے شامل ہوتے ہیں اور جیسا کہ اوپر گزرا کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کے حصول کے لیے ان دونوں نمازوں کا خاص دخل ہے۔ نمازوں کے اوقات کے لیے مزید دیکھیں سورۂ بنی اسرائیل (۷۸)۔

❸ لَعَلَّكَ تَرۡضٰى : یہ اشارہ ہے اس طرف کہ صبر اور نماز کی برکت سے آپ کو مقام محمود حاصل ہوگا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۷۹) سورۂ ضحیٰ میں فرمایا: ﴿وَ لَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى﴾ [ الضحی : ۵ ] "اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا۔" حدیث میں ہے کہ اہل جنت کو بھی راضی کیا جائے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ يَقُوۡلُ لِأَهۡلِ الۡجَنَّةِ يَا أَهۡلَ الۡجَنَّةِ ! فَيَقُوۡلُوۡنَ لَبَّيۡكَ رَبَّنَا وَ سَعۡدَيۡكَ وَالۡخَيۡرُ فِيۡ يَدَيۡكَ، فَيَقُوۡلُ هَلۡ رَضِيۡتُمۡ؟ فَيَقُوۡلُوۡنَ وَمَا لَنَا لَا نَرۡضٰى يَا رَبِّ ! فَقَدۡ أَعۡطَيۡتَنَا مَا لَمۡ تُعۡطِ أَحَدًا مِنۡ خَلۡقِكَ؟ فَيَقُوۡلُ أَلَا أُعۡطِيۡكُمۡ أَفۡضَلَ مِنۡ ذٰلِكَ ؟ فَيَقُوۡلُوۡنَ يَا رَبِّ ! وَأَيُّ شَيۡءٍ أَفۡضَلُ مِنۡ ذٰلِكَ؟ فَيَقُوۡلُ : أُحِلُّ عَلَيۡكُمۡ رِضۡوَانِيۡ فَلَا أَسۡخَطُ عَلَيۡكُمۡ بَعۡدَهُ أَبَدًا )) [ بخاري، التوحيد، باب كلام الرب مع أهل الجنة : ۷۵۱۸، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ ] "اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا، اے اہل جنت! وہ کہیں گے، بار بار تیری جناب میں حاضر ہیں اے ہمارے رب! اور بار بار حاضر ہیں! تو وہ فرمائے گا، کیا تم راضی (خوش) ہو گئے؟ وہ کہیں گے، ہمیں کیا ہے کہ ہم خوش نہ ہوں، جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا۔ وہ فرمائے گا، کیا میں تمھیں اس سے بھی افضل چیز عطا کروں؟ وہ کہیں گے، اے رب! اور اس سے افضل کیا ہے؟ وہ فرمائے گا، میں تمھیں اپنی رضا عطا کرتا ہوں، سو اس کے بعد میں تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔"

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾

اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں، تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں اور تیرے رب کا دیا ہوا سب سے اچھا اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۱۳۱﴾

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: « إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ، قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى تُرِيْدُوْنَ شَيْئًا أَزِيْدُكُمْ؟ فَيَقُوْلُوْنَ أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوْهَنَا؟ أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَ تُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ فَيَكْشِفُ الْحِجَابَ، فَمَا أُعْطُوْا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلٰى رَبِّهِمْ » [ مسلم، الإیمان، باب إثبات رؤیة المؤمنین ...... : ١٨١، عن صهیب ﷺ ] ”جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: ”تم کوئی چیز چاہتے ہو کہ میں تمھیں مزید دوں؟“ تو وہ کہیں گے: ”کیا تو نے ہمارے چہرے سفید نہیں کیے؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا اور ہمیں آگ سے نجات نہیں دی؟“ فرمایا: ”تو اس وقت اللہ حجاب اٹھا دے گا، تو انھیں کوئی چیز عطا نہیں کی گئی ہوگی جو انھیں اپنے رب عزوجل کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو۔“

**آیت 131** ❶ وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ ...... : ” مَدَّ يَمُدُّ “ (ن) پھیلانا، لمبا کرنا۔ آنکھیں پھیلانے سے مراد تعجب سے دیر تک دیکھتے رہنا ہے۔ ” مَدَّ يَمُدُّ “ عام طور پر پاؤں یا ہاتھ پھیلانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ” مَدَّ يَدَهٗ “ یا ” مَدَّ رِجْلَهٗ “ اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا یا اپنا پاؤں پھیلایا۔ یہاں آنکھیں پھیلانا استعارہ ہے، یعنی جس طرح پسندیدہ چیز کی طرف شوق اور حرص سے ہاتھ پھیلایا جاتا ہے آپ اپنی آنکھیں مت پھیلائیں۔ معلوم ہوا دیکھنے پر پابندی نہیں، دیکھتے چلے جانے پر پابندی ہے، کیونکہ اس سے دل میں اس چیز کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔ ” اَزْوَاجًا “ کی تنوین تقلیل کے لیے ہے، یعنی دنیا کی وہ زیب و زینت ہم نے ہر کافر کو نہیں دی، بلکہ ان کے چند قسم کے لوگوں ہی کو دی ہے، کیونکہ بہت سے کفار نہایت بدحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ” زَهْرَةٌ “ ” زَهْرٌ “ کی واحد ہے، پھول، جیسے ” تَمْرَةٌ “ ” تَمْرٌ “ کی واحد ہے۔ استعارے کے طور پر زیب و زینت کو بھی ” زَهْرَةٌ “ کہتے ہیں، کیونکہ پھول کی طرح زینت بھی نگاہ و دل کو لے جاتی ہے۔ ” زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا “ دنیا کی زندگی کی زینت۔ دنیا کی زینت کے جامع بیان کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۴) اور سورۂ توبہ (۲۴) بلکہ انسان کو ملنے والی ہر چیز ہی دنیا کی زندگی کی زینت ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ﴾ [ القصص : ٦٠ ] ”اور تمھیں جو کچھ بھی دیا گیا ہے سو دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے۔“ معلوم ہوا کفار کو ملنے والی کسی بھی چیز کی طرف نگاہ پھیلانا جائز نہیں، کیونکہ یہ سب کچھ ان کے فتنہ و آزمائش کے لیے ہے اور حقیقت میں ان کی زندگی دشوار کرنے کا باعث ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ [ طٰہٰ : ١٢٤ ] ”تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے۔“ اور دیکھیے سورۂ توبہ (۵۵)۔

وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ، ہم تجھ سے کسی رزق کا مطالبہ نہیں کرتے، ہم ہی تجھے رزق دیں گے اور اچھا انجام تقویٰ کا ہے ﴿۱۳۲﴾

② وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى : ''تیرے رب کا رزق'' سے مراد حلال رزق ہے، کیونکہ وہ رب کے حکم کے مطابق کمایا گیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی شان کی بلندی کے لیے اس کی نسبت اپنی طرف کی، ورنہ کافروں کو ملنے والا رزق بھی اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حلال روزی اور آخرت میں اس کا عطا کردہ اجر و ثواب کفار کو ملنے والی نعمتوں سے کہیں بہتر اور پائیدار ہے، کیونکہ دنیا فانی اور آخرت باقی ہے۔

آیت 132 ① وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ...... : ''اصْطَبِرْ'' ''صَبَرَ يَصْبِرُ'' سے باب افتعال کا امر ہے، تاء کو طاء سے بدل دیا ہے اور حروف کے اضافے سے مبالغہ مقصود ہے، اس لیے ترجمہ ''خوب پابند رہ'' کیا گیا ہے۔ ان آیات میں بظاہر تمام اوامر کے مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر امت کا ہر فرد نبی کریم ﷺ کے تابع ہونے کی وجہ سے ان کا مخاطب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِيْنَ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ )) [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ : ۴۹۵، عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ] ''اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہوں اور انھیں اس کی وجہ سے مارو جب وہ دس برس کے ہوں اور آپس میں ان کے بستر الگ کر دو۔'' یعنی بجائے اس کے کہ آپ کے گھر والے دنیاداروں کے عیش و آرام کی طرف نگاہیں بڑھائیں، آپ انھیں نماز کی تاکید کریں اور خود بھی اس پر خوب پابندی کریں۔ کیونکہ یہ چیز ان کا اور آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑ دے گی اور تم میں حلال روزی پر، چاہے وہ مقدار میں کتنی ہی تھوڑی ہو، صبر و قناعت کا جذبہ پیدا کرے گی اور اصل غنا صبر و قناعت سے ہے، نہ کہ مال و دولت سے۔

② لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا...... : عام طور پر روزی کمانے کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز میں سستی کرتا ہے، اس لیے فرمایا، ہمارا مطالبہ آپ سے روزی کمانے کا نہیں عبادت اور نماز کا ہے، روزی تمھیں ہم دیں گے۔ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام عبادت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو روزی کمانے کے لیے پیدا نہیں فرمایا، بلکہ اپنے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اگر وہ اللہ کا بندہ (غلام) بن کر اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے تو اسے رزق کی کوئی کمی نہیں آئے گی، فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ [ الذاریات : ۵۶ تا ۵۸ ] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ میری عبادت کریں، نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے۔'' انسان کی بے صبری اور بخل و حرص کا علاج نماز کی

وَ قَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَ لَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

اور انھوں نے کہا یہ ہمارے پاس اپنے رب سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتا اور کیا ان کے پاس وہ واضح دلیل نہیں آئی جو پہلی کتابوں میں ہے؟ ﴿۱۳۳﴾ اور اگر ہم انھیں اس سے پہلے کسی عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیتے تو یہ لوگ ضرور کہتے اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل ہوں اور رسوا ہوں ﴿۱۳۴﴾

محافظت اور اس پر دوام ہے۔ دیکھیے سورۂ معارج (۱۹ تا ۳۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ يَا ابْنَ آدَمَ! تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِيْ أَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى وَأَسُدَّ فَقْرَكَ وَإِلَّا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَيْكَ شُغْلًا وَلَمْ أَسُدَّ فَقْرَكَ » [ ترمذي، صفة القيامة، باب أحاديث ابتلينا بالضراء...... : ۲۴۶۶، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابن آدم! میری عبادت کے لیے پوری طرح فارغ ہو جا، (تو) میں تیرا سینہ غنا سے بھر دوں گا اور تیری فقیری دور کر دوں گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیرے دونوں ہاتھ مشغولیت سے بھر دوں گا اور تیری فقیری دور نہیں کروں گا۔''

③ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى : یعنی چاہے دنیا میں ان کے دن تکلیف سے گزریں مگر آخرت میں ہمیشہ رہنے والا عیش و آرام انھی کا حصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ كَانَتِ الْآخِرَةُ هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهِ وَجَمَعَ لَهُ شَمْلَهُ وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا قُدِّرَ لَهُ » [ ترمذي، صفة القيامة، باب أحاديث ابتلينا بالضراء...... : ۲۴۶۵، عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ ] ''جس شخص کی فکر صرف آخرت ہو اللہ تعالیٰ اس کی دولت مندی اس کے دل میں رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے اس کے تمام معاملات جمع کر دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے اور جس کی فکر صرف دنیا ہو اللہ تعالیٰ اس کا فقر اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس کے تمام معاملات کو بکھیر دیتا ہے اور دنیا اسے اتنی ہی ملتی ہے جو اس کے مقدر میں ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت دونوں میں اچھا انجام تقویٰ ہی کا ہے۔

**آیت 133** وَقَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا...... : کفار کہا کرتے تھے کہ اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں تو گزشتہ انبیاء کی طرح اپنے سچا ہونے کی کوئی نشانی کیوں پیش نہیں کرتے؟ فرمایا، اس سے زیادہ آپ کی سچائی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ پہلی آسمانی کتابیں آپ کے آنے کی خبر دے رہی ہیں۔ یقیناً یہ خبر اہل کتاب کو معلوم ہے اور ان کے واسطے سے کفار مکہ تک پہنچ چکی ہے۔ پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کے ذکر خیر کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷)، فتح (۲۹) اور صف (۶)۔

**آیت 134** وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو عذاب دینے سے پہلے انبیاء کو مبعوث

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾

کہہ دے ہر ایک منتظر ہے، سو تم انتظار کرو، پھر تم جلد ہی جان لو گے کہ سیدھے راستے والے کون ہیں اور کون ہے جس نے ہدایت پائی ﴿١٣٥﴾

کرنے اور کفار کو مہلت دینے کی حکمت دوبارہ بیان فرمائی۔ اس سے مقصود ان کا عذر ختم کرنا اور ان پر حجت تمام کرنا ہے اور یہی ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا دستور رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ قصص (۵۹) اور بنی اسرائیل (۱۵)۔

**آیت 135** ❶ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا...... : "كُلٌّ" کی تنوین اس کے محذوف مضاف الیہ کی جگہ آئی ہے، یعنی "كُلُّ وَاحِدٍ" ہر ایک، مطلب یہ ہے کہ اگر پہلی کتابوں میں موجود واضح دلائل تمھارے لیے نبی ﷺ پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں اور تمھیں اپنی مرضی کی نشانی دیکھنے پر اصرار ہے تو تم ایمان لانے کے لیے نشانی کا انتظار کرتے رہو، ہم تمھارے لیے دنیا میں اللہ کی گرفت اور آخرت میں اس کے عذاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ جلد ہی تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ سیدھے راستے والے کون ہیں اور وہ کون ہے جس نے ہدایت پالی ہے؟ اس سے رسول اللہ ﷺ کے اپنے راہ حق پر ہونے کے یقین کا اظہار ہوتا ہے، کیونکہ اتنے دعوے سے یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا مکمل یقین ہو۔

❷ فَتَرَبَّصُوْا : امر کے ساتھ اگر قرینہ بھی ہو تو وہ دوام کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں قرینہ یہ ہے کہ انتظار اس وقت تک جاری رہنا ہے جب تک وہ چیز وجود میں نہ آئے جس کا انتظار ہے۔ انتظار کا یہ حکم وعید اور خبردار کرنے کے لیے ہے۔ اسے متارکہ کہتے ہیں، یعنی ہم نے تمھیں تمھاری انتظار کی حالت پر چھوڑ دیا ہے، کیونکہ ہمیں تمھارے برے انجام کا یقین ہے۔ اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ سجدہ (۳۰) اور سورۂ توبہ (۵۲) تاریخ شاہد ہے کہ بہت جلد کفار کو مسلمانوں کا راہ راست پر ہونا معلوم ہو گیا۔ بدر کے دن ان کو جو اسلام نہیں لائے، مثلاً ابوجہل اور کفر و شرک کے دوسرے ہلاک ہونے والے سردار اور ان کو بھی جو مسلمان ہو گئے، مثلاً ابوسفیان اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما اور ان سب کو جنھوں نے جزیرۂ عرب، شام، عراق، ایران، مصر اور پھر زمین کے مشرق و مغرب پر اسلام کا غلبہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی بات پوری ہوئی۔ "جلد ہی جان لو گے" میں یہ بھی شامل ہے کہ بہت جلد قیامت کے دن تمھیں اس بات کا علم الیقین اور عین الیقین حاصل ہو جائے گا۔ کیونکہ "كُلُّ آتٍ قَرِيْبٌ" کہ آنے والی ہر چیز قریب ہی ہے۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

لوگوں کے لیے ان کا حساب بہت قریب آ گیا اور وہ بڑی غفلت میں منہ موڑنے والے ہیں ①

یہ سورت مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۂ بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ اور سورۂ انبیاء کے متعلق فرمایا: «هُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْأُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تَلَادِيْ» [ بخاري، التفسیر، سورۃ الأنبیاء : ۴۷۳۹ ] ”یہ پہلی قدیم سورتوں میں سے ہیں اور یہ میرے قدیم مال میں سے ہیں۔“

آیت 1 ① اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ : ”اِقْتَرَبَ“ ”قَرُبَ يَقْرُبُ“ (ع، ک) میں سے باب افتعال کا ماضی معلوم ہے۔ حروف میں اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”بہت قریب آ گیا۔“ ”غَفْلَةٍ“ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بھاری غفلت“ کیا گیا ہے۔

② ”اَلنَّاسُ“ کا لفظ عام ہے، یعنی سب لوگوں کے لیے ان کا حساب بہت قریب آ گیا، اس کے باوجود انھیں اس کی کچھ فکر نہیں، بلکہ وہ بھاری غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، یعنی دنیا کی دلچسپیوں میں محو ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”فِيْ غَفْلَةٍ“ کی تفسیر ”غَفْلَةُ أَهْلِ الدُّنْيَا“ (دنیا والوں کی غفلت) فرمائی ہے۔ [ بخاری : ۴۷۳۰ ] مزید دیکھیے سورۂ مریم (۳۹)۔

③ حِسَابُهُمْ : حساب کے لفظ میں دنیا و آخرت دونوں کا محاسبہ شامل ہے۔ دنیا میں محاسبہ جیسا کہ کفار قریش کو بدر اور فتح مکہ کی صورت میں پیش آیا اور ہر انسان کو سال میں ایک دو دفعہ پیش آتا رہتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۱۲۶ ] ”اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔“ دنیا کے محاسبے کے فوراً بعد موت کی صورت میں محاسبہ پیش آئے گا، فرشتے کفار کی جانیں نکالتے ہوئے کہہ رہے ہوں گے:
﴿ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۹۳ ] ”نکالو اپنی جانیں، آج تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، اس کے بدلے جو تم اللہ پر ناحق (باتیں) کہتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے۔“ موت کے بعد قبر کے سوال و جواب کی صورت میں محاسبہ اور آخر میں قیامت کے دن حساب ہوگا۔ حساب کے لفظ میں یہ تمام محاسبے شامل ہیں مگر یوم حساب کے طور پر قیامت کا دن مشہور ہے، اس لیے اکثر مفسرین نے یہاں صرف اسی کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حساب کے یہ تمام مرحلے بالکل قریب ہیں۔ حساب کی کچھ صورتیں تو زندگی ہی میں ہر روز پیش آتی رہتی ہیں، پھر موت کے قرب میں کسی کو شک نہیں، رہی قیامت تو اگرچہ وہ لوگوں کو دور دکھائی دیتی ہے مگر ہر آنے والی چیز قریب ہے، خواہ کتنے انتظار کے بعد آئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ

مَا يَأْتِيهِمْ مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٢﴾

ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی جو نئی ہو مگر وہ اسے مشکل سے سنتے ہیں اور وہ کھیل رہے ہوتے ہیں ﴿۲﴾

---

بَعِيدًا ۝ وَنَرَاهُ قَرِيبًا﴾ [ المعارج : ۶، ۷ ] ”بے شک وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔“ نیز دیکھیے سورۂ نحل (۱)، حج (۴۷) اور قمر (۱) اس لحاظ سے بھی یوم حساب بہت قریب آ گیا ہے کہ دنیا کی مدت کا اکثر حصہ گزر چکا۔ اب آخری نبی ﷺ کے آنے کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا، بلکہ قیامت ہی آئے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ يَعْنِيْ إِصْبَعَيْنِ » ”میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح (قریب قریب) بھیجے گئے ہیں۔“

[ بخاري، الرقاق، باب قول النبي ﷺ : بعثت أنا والساعة كهاتين : ۶۵۰۵، عن أنس رضي الله عنه ]

❹ مُعْرِضُونَ : یعنی لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنا حساب نہایت قریب آنے کے باوجود ایسی بھاری غفلت میں پڑے ہیں کہ ہر نصیحت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ”اَلنَّاسُ“ کے لفظ سے تمام لوگوں کو حساب کے بہت قریب آنے سے ڈرایا مگر آئندہ آیات میں کفار و مشرکین کی غفلت اور اعراض کو زیادہ اجاگر فرمایا ہے۔ اس آدمی کی غفلت و اعراض میں کیا شک ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی خبردار نہیں ہوتا کہ مجھے یقیناً مرنا ہے، صرف اس لیے کہ موت یا قیامت کا دن اسے متعین کر کے نہیں بتایا گیا۔ اس کی مثال اس نکمے طالب علم کی سی ہے جسے معلوم ہے کہ امتحان یقیناً ہونا ہے مگر وہ اس لیے بے پروا ہے کہ ابھی امتحان کی تاریخ کا اعلان نہیں ہوا۔ ابن کثیر نے یہاں ابوالعتاہیہ کا ایک شعر نقل فرمایا ہے۔

اَلنَّاسُ فِيْ غَفَلَاتِهِمْ ۔۔۔ وَ رَحَى الْمَنِيَّةِ تَطْحَنُ

”لوگ اپنی غفلتوں میں پڑے ہوئے ہیں، جب کہ موت کی چکی پیستی چلی جا رہی ہے۔“

**آیت 2** ❶ مَا يَأْتِيهِمْ مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم ...... اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ : ”سَمِعَ يَسْمَعُ“ کا معنی سننا ہے، باب افتعال میں تاء کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، جو موقع کی مناسبت سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے۔ عام طور پر ”اِسْتَمَعَ“ کا معنی کان لگا کر سننا آتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ کفار کے لیے نصیحت کو کان لگا کر سننا مشکل ہے، خصوصاً جب وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں، اس لیے معنی کیا گیا ہے ”مگر وہ اسے مشکل سے سنتے ہیں۔“

❷ پچھلی آیت میں لوگوں کے غفلت میں گرفتار ہونے اور منہ موڑنے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں بتایا کہ انھیں اس غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ان کے رب کی طرف سے قرآن و سنت کی صورت میں نئی سے نئی نصیحت آتی رہتی ہے، مگر قبول کرنا تو دور کی بات، وہ اسے توجہ اور اطمینان سے سنتے بھی نہیں، بلکہ کھیلتے اور مذاق اڑاتے ہوئے بڑی مشکل اور گرانی سے سنتے ہیں۔

❸ ”ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِمْ“ (ان کے رب کی طرف سے نصیحت) سے معلوم ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ صرف کھانے پینے اور دنیوی ضرورتیں پوری کرنے والا رب اور پروردگار ہی نہیں بلکہ انسان کی روحانی ضرورتیں اور آخرت کی نجات کی ضامن

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖۗ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③

اس حال میں کہ ان کے دل غافل ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں نے خفیہ سرگوشی کی جنھوں نے ظلم کیا تھا، یہ تم جیسے ایک بشر کے سوا ہے کیا؟ تو کیا تم جادو کے پاس آتے ہو، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو؟ ③

چیزوں کو مہیا کرنے والا رب بھی ہے۔

④ "مُحْدَثٍ" کا معنی "نیا" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں سے لوگوں کی طرف قرآن اور حدیث کی صورت میں نئی سے نئی نصیحت آتی رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اور جو چاہے کلام کر سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ اسے مخلوق قرار دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا ناممکن ہے۔ اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۴۳)، توبہ (۶) اور کہف (۱۰۹)۔

**آیت 3** ① لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى...... : "لَاهِيَةً" "لَهِيَ يَلْهٰى" (ع) یا "لَهَا يَلْهُوْ" (ن) سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ "لَهْوٌ" وہ چیز ہے جو انسان کو اس کے ضروری اور اہم کاموں سے کسی اور کام میں مشغول کر دے۔ (راغب) جیسا کہ مادہ پرست لوگ آخرت کی فکر چھوڑ کر صرف دنیا کی طلب میں مشغول ہیں۔ آج کل کے علوم وفنون سائنس، آرٹ وغیرہ میں کوئی چیز ایسی نہیں جو آخرت کی یاد دلانے والی ہو، بلکہ یہ سب روشن خیالیاں دن بدن موت اور آخرت کی فکر سے دور لے جا رہی ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ روم (۶، ۷)۔

② وَاَسَرُّوا النَّجْوَى : یہاں نحو کا ایک مشہور سوال ہے کہ جب فاعل ظاہر ہو تو خواہ وہ واحد ہو یا تثنیہ یا جمع فعل واحد کے صیغے کے ساتھ آتا ہے۔ یہاں "الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" فاعل ظاہر ہونے کے باوجود فعل جمع کے صیغے کے ساتھ کیوں آیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ "اَسَرُّوْا" کا فاعل ضمیر جمع ہے اور "الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" اس سے بدل ہے، یعنی کفار نے باہمی خفیہ مشورے سے لوگوں کو آپ ﷺ سے دور رکھنے کے لیے خفیہ مشاورت کر کے طے کیا کہ لوگوں سے یہ کہو اور خفیہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر لوگوں کو پتا چل گیا کہ یہ ان کی طے کردہ بات ہے تو وہ اس سے متاثر نہیں ہوں گے۔

③ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ...... : یعنی یہ کوئی فرشتہ نہیں ہے، بلکہ تمھاری طرح کا ایک انسان ہے، اب جو یہ معجزات دکھاتا ہے اور اس کلام کو سن کر لوگ گرویدہ ہو رہے ہیں تو یہ سب جادو ہے۔ کفار نے آپ ﷺ کی نبوت پر دو طرح سے طعن کیا، ایک یہ کہ آپ بشر ہیں اور بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کئی جگہ بیان فرمائی ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۴)، تغابن (۶)، قمر (۲۴)، مومنون (۳۳، ۳۴)، فرقان (۷) اور ابراہیم (۱۰) پہلے کفار ومشرکین کہتے تھے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا، آج کل کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا، بات ایک ہی ہے، ﴿ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۸۱ ] "بلکہ انھوں نے کہا جیسے پہلوں نے کہا تھا۔" اللہ تعالیٰ نے آگے اس کا رد فرمایا۔ دوسرا طعن یہ تھا کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۫ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ④ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ⑤

اس نے کہا میرا رب آسمان و زمین میں ہر بات کو جانتا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے④ بلکہ انھوں نے کہا یہ خوابوں کی پریشان باتیں ہیں، بلکہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ شاعر ہے، پس یہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جیسے پہلے (رسول) بھیجے گئے تھے⑤

---

بلکہ جادو ہے۔ کفار کا یہ طعن بھی اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ مدثر (۲۴) اور ذاریات (۵۲)۔

**آیت 4** قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ...... : یعنی پیغمبر ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تم نے خفیہ مشورے سے جو بات طے کی ہے وہ میرے رب سے مخفی نہیں۔ وہ آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے، کیونکہ وہ سمیع بھی ہے اور علیم بھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ”يَعْلَمُ السِّرَّ“ (وہ چھپی بات کو جانتا ہے) کے بجائے ”يَعْلَمُ الْقَوْلَ“ فرمایا، یعنی وہ ہر بات جانتا ہے، تمھاری خفیہ سرگوشیاں بھی اور بلند آواز سے گفتگو بھی۔ اس لیے اس کے پیغمبر کے خلاف تمھاری یہ خفیہ مجلسیں یا علانیہ مخالفت تمھارے کسی کام نہیں آئیں گی اور تم غلبۂ اسلام کو کسی طرح نہیں روک سکو گے۔ ایک قراءت میں ”قُلْ رَّبِّيْ“ ہے، یعنی کہہ دے کہ میرا رب آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات جانتا ہے۔

**آیت 5** ❶ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ...... : ”اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۴۴)۔

❷ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو جھٹلانے والے کفار کے مختلف اقوال ذکر کر کے ثابت کیا کہ یہ خوب جانتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس لیے سخت بدحواس اور مذبذب ہیں کہ قرآن کو کیا کہہ کر جھٹلائیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ خوابوں کی پریشان باتیں ہیں، پھر کہتے ہیں کہ نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے اسے خود تصنیف کر کے اللہ کے ذمے لگا دیا ہے۔ پھر اس پر تسلی نہیں ہوتی تو کہتے ہیں کہ نہیں، اصل یہ ہے کہ آپ شاعر ہیں اور یہ قرآن آپ کے شاعرانہ تخیل کا نتیجہ ہے۔ سورۂ مدثر (۱۸ تا ۲۵) میں کفار کے ایک کھڑپینچ کی اسی طرح کی پریشان خیالی کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی تمام باتوں کا جواب دے رکھا تھا کہ اگر تمھیں اس قرآن کے اللہ کا کلام ہونے میں شک ہے تو اس جیسی کتاب بنا کر لے آؤ، یا دس سورتیں بنا کر لے آؤ، چلو! یہ بھی نہیں تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ اگر یہ بھی نہ کر و اور کر بھی نہیں سکو گے، تو جہنم کی آگ سے ڈر کر اس پر ایمان لے آؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا گیا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ کفار کے پاس اس کا کوئی جواب نہ اس وقت تھا اور نہ قیامت تک اس کا جواب لا سکتے ہیں۔ مگر وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے، اس لیے کہنے لگے کہ اس معجزے کو دیکھ کر ہم ایمان نہیں لائیں گے، ہمارے پاس تو یہ رسول وہ معجزے لے کر آئے جو پہلے رسولوں کو دیے گئے تھے، مثلاً صالح علیہ السلام کی اونٹنی، موسیٰ علیہ السلام کا عصا، عیسیٰ علیہ السلام کا مردہ کو زندہ کرنا، نابینا کو بینا کرنا وغیرہ۔

مَآ اٰمَنَتۡ قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا ۚ اَفَهُمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ۝ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِيۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَ مَا

ان سے پہلے کوئی بستی، جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہیں لائی تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟ ⑥ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر کچھ مرد، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، پس ذکر والوں سے پوچھ لو، اگر تم نہیں جانتے ہو ⑦ اور ہم نے

آیت 6 مَآ اٰمَنَتۡ قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ ...... : اس آیت میں تین باتیں نہایت اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایمان لانے کی شرط کے طور پر تم نے پہلے رسولوں جیسا معجزہ لانے کا مطالبہ کیا ہے، سو پہلی امتوں کو ایسے معجزات دکھائے گئے، وہ ان پر ایمان نہیں لائے، تو تم جو ان سے کہیں بڑھ کر سرکش اور ضدی ہو، کیسے ایمان لاؤ گے؟ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۵۹) دوسری یہ کہ جو قومیں معجزات دیکھ کر ایمان نہیں لائیں انھیں ہلاک کر دیا گیا، کیونکہ صریح معجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان نہ لانے والی قوم ہلاک کر دی جاتی ہے، تو تم ایسا مطالبہ کیوں کرتے ہو جس کا نتیجہ تمھاری ہلاکت ہے؟ تیسری یہ کہ تمھیں معجزہ نہ دکھانا اللہ تعالیٰ کی تم پر رحمت ہے کہ اس نے تمھیں مہلت دے رکھی ہے اور اس کے علم میں تمھاری کئی نسلوں کا مسلمان ہونا مقدر ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۸ تا ۵۱) کی تفسیر۔

آیت 7 ❶ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا ...... : یہ "هَلۡ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ" (یہ تم جیسے ایک بشر کے سوا ہے کیا) کا جواب ہے، یعنی وہ تمام رسول جو آپ سے پہلے آئے، جن کے رسول ہونے کو یہ بھی مانتے ہیں، مثلاً ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق وغیرہم علیہم السلام، وہ سب بشر تھے، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ تو یہ لوگ آپ کو بشر ہونے کی وجہ سے رسول کیوں نہیں مانتے؟ دیکھیے سورۂ انعام (۹۱) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ يَفْلِيْ ثَوْبَهُ وَ يَحْلِبُ شَاتَهُ وَيَخْدِمُ نَفْسَهُ » [ مسند أحمد : ٦/٢٥٦، ح : ٢٦٢٤٨۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٦٧١ ] ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان تھے، اپنا کپڑا خود ٹٹول لیا کرتے تھے اور اپنی بکری کا دودھ خود دوہ لیتے تھے اور اپنا کام خود کر لیتے تھے۔“ زمین میں اگر فرشتے رہا کرتے تو رسول بھی فرشتہ آتا، اب انسان بستے ہیں تو ان کے لیے نمونہ اور ان کی رہنمائی کرنے والا انسان ہی ہو سکتا ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۴، ۹۵)۔

❷ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ ...... : اس جملے کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۴۳)۔

آیت 8 ❶ وَ مَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا ......: ”جَسَدًا“ کا معنی بے جان جسم ہے، یہ جُثّہ کا ہم معنی ہے۔ محقق ائمۂ لغت کا یہی قول ہے، جیسا کہ ابواسحاق زجاج نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ فَاَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾ [ طٰہٰ : ۸۸ ] کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ [ التحریر و التنویر ] یہ ان کے اس اعتراض کا جواب ہے: ﴿ مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِيۡ فِي الۡاَسۡوَاقِ ﴾ [ الفرقان : ۷ ] ”اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ان کا

جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ⑧

انھیں محض جسم نہیں بنایا تھا جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے ⑧

ایک اعتراض یہ بھی تھا: ﴿ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ [ الأنبياء : ٣ ] ''یہ تمھارے جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔'' ان اعتراضوں کے ساتھ مطالبہ یہ تھا: ﴿ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ٥ ] ''پس یہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جس طرح پہلے رسول بھیجے گئے۔'' ''فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ'' کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں دوسرے دونوں اعتراضوں کا جواب دیا کہ اس سے پہلے تمام رسول جو ہم نے بھیجے، بشر تھے فرشتے نہ تھے، مرد تھے عورتیں نہ تھے۔ اسی طرح وہ بے جان جسم نہ تھے جو نہ کھاتے ہوں اور نہ بازاروں میں چلتے پھرتے ہوں، بلکہ وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔ (فرقان : ٢٠) ان کی بیویاں بھی تھیں اور اولاد بھی۔ (رعد : ٣٨) جیسے تمھارے جد امجد ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اور بنی اسرائیل کے جد امجد یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام۔ تو جب ان سب کو بشر ہونے، کھانے پینے، بازاروں میں چلنے پھرنے اور صاحب آل واولاد ہونے کے باوجود رسول مانتے ہو تو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کیوں نہیں مانتے؟

② مشرکین خواہ پہلے زمانے کے ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یا ہمارے زمانے کے، سب کا ذہن یہی ہوتا ہے کہ بزرگ کھانے پینے سے بے نیاز اور بیوی بچوں سے مستغنی ہوتے ہیں اور دنیا کے دھندوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کی نگاہ میں بزرگ اور پیر بننے والے حضرات کمائی وغیرہ چھوڑ کر کٹیاؤں اور خانقاہوں میں ڈیرے لگا لیتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بعض عقیدت مندان کے متعلق عجیب وغریب قصے مشہور کر دیتے ہیں، جن کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو ''تذکرۃ الاولیاء'' پڑھ لیں، مثلاً فلاں بزرگ نے پہلے ایک دن کھانے کا ناغہ کیا، پھر ایک ماہ کا، پھر ایک سال کا اور پھر ساری عمر کا۔ پنجاب کے ایک بزرگ کے متعلق ان کے عقیدت مندوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ انھوں نے بارہ سال کچھ کھائے بغیر جنگل میں عبادت کرتے ہوئے گزار دیے، صرف ایک لکڑی کی روٹی ان کے پاس تھی، جسے کبھی کبھار وہ دانتوں سے کاٹتے تھے۔ پھر بارہ سال انھوں نے ایک کنویں میں الٹے لٹک کر اللہ کی عبادت کرتے ہوئے گزار دیے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ الٹا لٹکنا کون سی عبادت ہے؟ اور اس عرصے کی نمازیں، روزے اور وضو وغسل سب کہاں گئے؟ ان لوگوں کے ہاں یہ بزرگی ہے، جب کہ وہ تین صحابہ، جن میں سے ایک نے کہا تھا کہ میں ہمیشہ ساری ساری رات قیام کیا کروں گا، کبھی سوؤں گا نہیں، دوسرے نے کہا تھا کہ میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا، کبھی روزے کے بغیر نہیں رہوں گا اور تیسرے نے کہا تھا کہ میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا: (( وَاللّٰهِ ! إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَ أُصَلِّيْ وَ أَرْقُدُ وَ أَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ )) [ بخاري، النكاح، باب الترغيب في النكاح : ٥٠٦٣ ] ''اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ پرہیز گار ہوں، لیکن میں قیام کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزے رکھتا ہوں کبھی نہیں بھی رکھتا اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جس نے میرے طریقے سے بے رغبتی کی وہ مجھ سے نہیں۔''

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۹﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع ۱

پھر ہم نے ان سے وعدہ سچا کر دیا تو ہم نے انھیں نجات دی اور اسے بھی جسے ہم چاہتے تھے اور ہم نے حد سے بڑھنے والوں کو ہلاک کر دیا۹ بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے، جس میں تمھارا ذکر ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟۱۰

❸ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ : یہ بھی کفار کے ایک غلط عقیدے کا رد ہے کہ اللہ کے رسول اور خاص بندے مرتے نہیں۔ کئی جاہلوں نے ایک عبارت بنا رکھی ہے جسے وہ قرآن کی آیت قرار دے کر سناتے ہیں: " اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا يَمُوْتُوْنَ وَلٰكِنَّهُمْ مِنْ دَارٍ اِلٰى دَارٍ يَنْتَقِلُوْنَ " "یاد رکھو! اللہ کے ولی مرتے نہیں، بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔" اگر کوئی شخص کہہ بیٹھے کہ اللہ کے رسول ﷺ یا فلاں بزرگ فوت ہو گئے ہیں تو یہ لوگ اسے گستاخ قرار دے کر اس پر حملہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ پہلے گزرے ہوئے رسول ہمیشہ رہنے والے نہ تھے، بلکہ اپنی طبعی زندگی گزار کر فوت ہو گئے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ﴾ [ الأنبياء : ۳٤ ] "اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی، سو کیا اگر تو مر جائے تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ زمر (۳۰، ۳۱)۔

**آیت 9** ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ ...... : " صَدَقَ يَصْدُقُ " لازم بھی آتا ہے، یعنی سچ کہنا اور متعدی بھی، یعنی سچا کر دکھانا، "پھر ہم نے ان سے وعدہ سچا کر دیا۔" " ثُمَّ " (پھر) کا لفظ یہ بتانے کے لیے ہے کہ رسولوں کی مخالفت ہوئی، انھیں ستایا گیا، جنگیں بھی ہوئیں مگر پھر آخر کار ہم نے ان سے مدد کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا، سو ہم نے رسولوں کو نجات دی اور ان کو بھی جنھیں ہم چاہتے تھے۔ اس میں رسولوں کے پیروکار بھی شامل ہیں اور کفار میں سے وہ بھی جنھیں آئندہ ایمان لانا تھا، یا جن کی اولاد کو ایمان کی توفیق ملنا تھی۔ عربوں پر سب کو ہلاک کرنے والا عذاب نہ آنے میں یہی حکمت تھی۔ "اور حد سے بڑھنے والوں کو ہلاک کر دیا" اس میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیروکاروں کے لیے خوش خبری ہے اور کفار کے لیے وعید۔ رسولوں سے کیے گئے مدد کے وعدے اور اسے پورا کرنے کے ذکر پر مشتمل آیات سورۂ مجادلہ (۲۱)، صافات (۱۷۱ تا ۱۷۳)، ابراہیم (۱۳، ۱۴) اور یوسف (۱۱۰) میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 10** لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا ...... : اس آیت میں کفار کی ان تمام پریشان کن باتوں کا اکٹھا جواب ہے جو وہ نبی ﷺ اور قرآن کے متعلق کہتے تھے کہ یہ خوابوں کی پراگندہ باتیں ہیں، یا من گھڑت باتیں ہیں، یا جادو ہے، یا شاعری ہے، تو فرمایا کہ قرآن کا ان میں سے کسی بات سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ ہم نے تو تمھاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمھارا ہی ذکر ہے، تمھارے ہی حالات اور زندگی کے معاملات پر بحث کی گئی ہے اور انھی کے متعلق تمھاری راہنمائی کی گئی ہے۔ اس

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہم نے توڑ کر رکھ دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد اور لوگ نئے پیدا کر دیے ﴿۱۱﴾ تو جب انھوں نے ہمارا عذاب محسوس کیا اچانک وہ ان (بستیوں) سے بھاگ رہے تھے ﴿۱۲﴾ بھاگو نہیں اور ان (جگہوں) کی طرف واپس آؤ جن میں تمھیں خوش حالی دی گئی تھی اور اپنے گھروں کی طرف، تاکہ تم سے پوچھا جائے ﴿۱۳﴾

میں خواب، جادو یا شاعری کی کون سی بات ہے، تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ " فِيْهِ ذِكْرُكُمْ " کا ایک معنی یہ ہے کہ ایمان لانے کی صورت میں یہ کتاب ساری دنیا میں تمھاری ناموری، شہرت اور عزت و شرف کا باعث ہے، جیسا کہ دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ ﴾ [ الزخرف : ٤٤ ] یعنی بے شک یہ قرآن تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے عزو شرف کا باعث ہے۔ ذکر کا ایک معنی نصیحت بھی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ الذاریات : ٥٥ ] ''اور نصیحت کر، کیونکہ یقیناً نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے۔'' تو آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ''بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمھاری نصیحت کا سامان ہے۔'' آیت میں ذکر کے تینوں معنی بیک وقت مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ ان میں کوئی باہمی تعارض نہیں۔

**آیت 11** ❶ وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً : " قَصْمٌ " کا معنی کسی سخت چیز کو توڑنا ہے۔ کہا جاتا ہے: "فُلَانٌ قَصَمَ ظَهْرَ فُلَانٍ" کہ فلاں نے فلاں کی کمر توڑ دی۔ "اِنْقَصَمَتْ سِنُّهٗ" فلاں کا دانت ٹوٹ گیا۔ " كَمْ " یہاں تکثیر کے لیے ہے، ''کتنی ہی بستیاں'' سے مراد بہت سی بستیاں ہیں، اس سے کوئی خاص بستی مراد نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب وہ روایت موضوع ہے جس میں ان سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یمن کے شہروں کے لوگ ہیں۔ [ الاستیعاب فی بیان الأسباب ] آیت کے الفاظ کے مطابق بھی وہ بستیاں عام ہیں اور کوئی خاص علاقہ مراد نہیں۔

❷ وَ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ : " اَلْاِنْشَاءُ " کا معنی نئی چیز بنانا ہے۔ " بَعْدَهَا " بعض مقامات پر " مِنْ بَعْدِهَا " ہوتا ہے، اس میں کچھ دیر بعد مراد ہوتا ہے، یہاں " بَعْدَهَا " کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان بستیوں کی ہلاکت کے بعد ساتھ ہی نئے سرے سے اور قومیں وہاں لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت اور بعد والی آیات میں اپنا ذکر جمع کے صیغے سے کیا ہے۔ مراد اس سے اپنی عظمت کا اظہار ہے۔

**آیت 12** فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ ...... : احساس کا معنی حواس سے معلوم کرنا، مثلاً دیکھنا یا سننا وغیرہ۔ " يَرْكُضُوْنَ " " رَكَضَ يَرْكُضُ " (ن) کا معنی سواری کو تیز دوڑانے کے لیے ایڑ لگانا ہے، مراد تیزی سے بھاگنا ہے، یعنی جب انھوں نے ہمارے عذاب کو اپنے حواس یعنی آنکھوں یا کانوں وغیرہ سے محسوس کیا تو بہت تیزی کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔

**آیت 12** لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ ...... : یعنی ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں کہا جائے یا فرشتے ان سے

قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝١٤ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝١٥ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝١٦ لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖۗ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝١٧

انھوں نے کہا ہائے ہماری بربادی! یقیناً ہم ظالم تھے ⑭ تو ان کی پکار ہمیشہ یہی رہی، یہاں تک کہ ہم نے انھیں کٹے ہوئے، بجھے ہوئے بنا دیا ⑮ اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کھیلتے ہوئے نہیں بنایا ⑯ اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھیل بنائیں تو یقیناً اسے اپنے پاس سے بنا لیتے، اگر ہم کرنے والے ہوتے ⑰

کہتے ہیں کہ بھاگو نہیں، بلکہ ان جگہوں کی طرف جن میں تمھیں خوشحالی دی گئی تھی اور اپنے گھروں کی طرف واپس آؤ، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ ان تمام نعمتوں کی تم نے کیا قدر کی؟ ایک معنی یہ ہے کہ اپنی انھی مجلسوں میں دوبارہ واپس آؤ، تاکہ پہلے کی طرح تمھارے نوکر چاکر ہاتھ باندھ کر تم سے سوال کریں کہ سرکار کیا حکم ہے؟ تیسرا معنی یہ ہے کہ بھاگو نہیں، بلکہ اپنی وہی پنچایتیں اور کونسلیں جما کر بیٹھو، تاکہ لوگ اپنے مسائل کا حل تم سے پوچھنے کے لیے آئیں اور مانگنے والے تم سے مانگنے کے لیے آئیں، جنھیں تم فخر و ریا کے لیے دیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ سب کچھ انھیں ڈانٹنے اور ان کا مذاق اڑانے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

**آیت 14** قَالُوْا يٰوَيْلَنَا ...... : جب اللہ کا عذاب آ گھیرتا ہے تو بدکار سے بدکار قومیں بھی گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اسی طرح واویلا مچاتی ہیں، مگر اس وقت گناہوں کے اعتراف اور توبہ کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۸۵)۔

**آیت 15** فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ ...... : "حَصِيْدًا" "حَصَدَ يَحْصُدُ" (درانتی سے کاٹنا) سے "فَعِيْلٌ" بمعنی مفعول (مَحْصُوْدٌ) ہے۔ فعیل کا وزن مذکر و مؤنث اور واحد، تثنیہ، جمع سب کے لیے ایک ہی آتا ہے، معنی کٹے ہوئے۔

**آیت 16** وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ ...... : پچھلی آیات میں ظالم بستیوں کو برباد کرنے کا ذکر فرمایا تھا، اب اس کی حکمت بیان فرمائی کہ ایسا نہیں ہے کہ ہم نے اس زمین و آسمان کو کھیلتے ہوئے پیدا کر دیا ہے کہ لوگ جیسے چاہیں ظلم و ستم کرتے پھریں اور ان سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ بلکہ ان کے پیدا کرنے میں ہماری بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں ہیں اور کائنات میں ہر عمل کی جزا یا سزا کا عمل جاری ہے۔ لہٰذا اگر ان ظالموں کو ہلاک کیا گیا تو یہ عدل و انصاف اور جزا و سزا کے قانون کے عین مطابق تھا۔ تمھیں چاہیے کہ آنے والی دوسری زندگی میں جوابدہی کے لیے تیاری کرو۔

**آیت 17** ① لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا ...... : یعنی بفرض محال اگر ہم اپنی دل لگی اور کھیل کے لیے کھیلنے کی کوئی چیز بناتے تو اپنے پاس بنا لیتے اور تمھیں اس کا پتا نہ چلنے دیتے، کیونکہ لہو و لعب تو نقص اور خامی کی بات ہے، اس لیے ہم اسے کسی کی نگاہ کے سامنے نہ آنے دیتے۔ تو یہ آسمان و زمین جو ہر وقت تمھارے سامنے ہیں، ہم کھیل اور دل لگی کے لیے کیسے بنا سکتے ہیں؟ یہ ساری بات بطور فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کس قدر رحیم و کریم ہے کہ اس نے انسان کی چھوٹی عقل کو سمجھانے اور ہر طرح سے مطمئن

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ﴿١٩﴾

بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ اس کا دماغ کچل دیتا ہے، پس اچانک وہ مٹنے والا ہوتا ہے اور تمھارے لیے اس کی وجہ سے بربادی ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۸﴾ اور اسی کا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اس کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں اور نہ ذرہ برابر تھکتے ہیں ﴿۱۹﴾

---

کرنے کے لیے اس کی ذہنی سطح کے مطابق بات کی ہے، ورنہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا ارادہ کرے، کیونکہ لفظ "لَوْ" ہوتا ہی محال چیز کے بیان کے لیے ہے۔

❷ طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد سے "لَاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ" کا معنی نقل کیا ہے کہ ہم اس لہو ولعب کو اپنے پاس بنا لیتے، نہ جنت اور جہنم پیدا کرتے اور نہ ہی موت اور قیامت۔ یعنی پھر زمین و آسمان، انسان، جن اور ان کی جزا و سزا کے سلسلے کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۱۱۵)، سورۂ ص (۲۷) اور سورۂ ملک (۲)۔

**آیت 18** ❶ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ...... : "قَذَفَ يَقْذِفُ" (ض) کا معنی کسی چیز کو سختی کے ساتھ پھینک مارنا۔ "فَيَدْمَغُهُ" "دَمَغَ يَدْمَغُ" (ف) کسی چیز کا دماغ کو توڑنا، یہاں تک کہ اس کی وہ جھلی پھٹ جائے جس کے پھٹنے سے روح نکل جاتی ہے۔ "زَاهِقٌ" "زُهُوْقٌ" کا معنی کسی چیز کا مکمل طور پر ختم ہو جانا ہے۔ یعنی ہم نے اس کائنات کو بے مقصد نہیں بنایا، بلکہ اس میں حق و باطل کا معرکہ جاری ہے اور اس کا نظام ہم نے اس طرح بنایا ہے کہ باطل نے جب بھی سر اٹھایا حق نے ضرب کاری لگا کر اسے نیست و نابود کر دیا۔ اسی طرح اب بھی بالآخر باطل فنا ہو جائے گا اور حق قائم و دائم رہے گا۔

❷ "فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ" میں "إِذَا" فجائیہ یعنی اچانک کے معنی میں ہے اور "هُوَ زَاهِقٌ" جملہ اسمیہ ہے جو استمرار کے لیے ہے اور جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ باطل نہایت تیزی کے ساتھ مٹتا ہے اور اس کا مٹنا عارضی نہیں، دائمی ہوتا ہے۔ (آلوسی)

❸ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ : یعنی اگر تم یہ کہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا یہ سلسلہ ایک کھیل بنایا ہے اور دوبارہ زندہ ہونا، حساب کتاب اور جنت و دوزخ سب فرضی قصے کہانیاں ہیں تو تمھارے اس بیان کا نتیجہ تمھاری بربادی کی صورت میں ظاہر ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

**آیت 19** ❶ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ : "مَنْ" کا لفظ عموماً عقل والی مخلوقات کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگرچہ یہاں زمین و آسمان کے عقلاء کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے مگر اس میں آسمان و زمین، ان کے اندر پائے جانے والے تمام اجرام فلکی اور دوسری تمام مخلوقات بھی شامل ہیں اور وہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔ کیونکہ یہ زمین آسمانوں کے اندر ہے اور ہر آسمان اپنے سے اوپر والے آسمان کے اندر ہے اور سب سے اوپر والا آسمان عرش کے اندر ہے اور اللہ سبحانہ عرش عظیم کا مالک ہے، جیسا کہ آگے آیت (۲۲) میں آ رہا ہے: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ تو اس سے عقلاً یہ بات ثابت

# يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝۲۰

وہ رات اور دن تسبیح کرتے ہیں، وقفہ نہیں کرتے ۝۲۰

ہوئی کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور ملک یعنی بادشاہ بھی۔ (بقاعی)

② وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ : یعنی عرش اٹھانے والے (حاقہ : ۱۷) اور دوسرے فرشتے اور اللہ کی وہ مخلوق جسے وہی جانتا ہے۔ یعنی اتنی عظمت والے فرشتے جب ہمیشہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے بڑا نہیں سمجھتے تو پھر انسان کی کیا بساط ہے کہ اپنے آپ کو اس کی عبادت سے بالاتر سمجھے؟

③ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ : "حَسَرَ يَحْسِرُ حُسُوْرًا (ض)" تھک کر رہ جانا۔ سورۂ ملک میں ہے: ﴿يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ﴾ [ الملك : ٤ ] "نظر ناکام ہو کر تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔" یہاں ایک سوال ہے کہ "يَسْتَحْسِرُوْنَ" باب استفعال سے ہے جس میں طلب کا معنی پایا جاتا ہے، یا حروف میں اضافے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ ہو جاتا ہے، یہاں باب استفعال لانے میں کیا نکتہ ہے؟ اہل علم نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ "وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ أَيْ لَا يَطْلُبُوْنَ أَنْ يَّنْقَطِعُوْا عَنْ ذٰلِكَ فَأَنْتَجَ ذٰلِكَ قَوْلُهٗ "يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ" "یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تھکنا چاہتے ہی نہیں اور انھیں اس کی طلب ہی نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ رات دن اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں، وقفہ نہیں کرتے۔" (بقاعی) اس کا سب سے اچھا جواب وہ ہے جو ابوالسعود اور آلوسی رحمہما اللہ نے دیا ہے کہ جب حرفِ نفی مبالغہ کے لفظ پر آئے تو مراد مبالغہ کی نفی نہیں ہوتی بلکہ نفی میں مبالغہ ہوتا ہے، جیسا کہ "وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" کا معنی یہ نہیں ہوگا کہ "تیرا رب بندوں پر بہت زیادہ ظلم کرنے والا نہیں" بلکہ یہ ہوگا کہ "تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔" دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۸۲) اور انفال (۵۱) چنانچہ "وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ" کا معنی ہوگا "اور وہ ذرا برابر نہیں تھکتے۔" "لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ" کی بھی یہی توجیہیں ہیں۔ اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۴۹، ۵۰) اور نساء (۱۷۲)۔

آیت 20 يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ : "اَلْفُتُوْرُ" کا معنی کسی کام سے رک جانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ﴾ [ المائدة : ١٩ ] "بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد۔" یعنی فرشتے رات دن اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، کبھی نہیں رکتے، وقفہ نہیں کرتے۔ یہاں ایک سوال ہے جو عبداللہ بن حارث بن نوفل نے کعب احبار سے کیا کہ آپ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے متعلق فرمایا: ﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ تو کیا انھیں آپس کی بات چیت، پیغمبروں کو وحی پہنچانا اور دوسرے کام تسبیح میں رکاوٹ نہیں بنتے؟ انھوں نے فرمایا: "بیٹا! اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تسبیح ایسے ہی کر دی ہے جیسے تمھارے لیے سانس لینا کر دیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ تم بات کرتے ہوئے سانس لیتے جاتے ہو اور چلتے ہوئے سانس لیتے رہتے ہو؟" [ طبري من طرق يقوي أحدهما الآخر . حكمت بن بشير ] دن رات بغیر وقفے کے تسبیح سے مراد مبالغہ بھی ہو سکتا ہے کہ

اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

یا انھوں نے زمین سے کوئی معبود بنا لیے ہیں، جو زندہ کریں گے ﴿۲۱﴾

وہ بہت زیادہ تسبیح کرتے ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں تمھاری ہر وقت تعریف کرتا ہے، یا میں دن رات تمھیں یاد کرتا ہوں وغیرہ۔ مفسر آلوسی نے اس توجیہ کی تعریف کی ہے۔ (روح المعانی) یا جس طرح ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا: «كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهِ» [ مسلم، الحیض، باب ذکر اللہ في حال الجنابة وغيرها : ۳۷۳ ] ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔'' ظاہر ہے آپ اپنی انسانی ضروریات، دعوت و تبلیغ اور جہاد کے لیے بات بھی کرتے تھے، کھاتے پیتے اور سوتے بھی تھے، اس کے باوجود اللہ کی یاد سے دل غافل نہیں ہوتا تھا۔ یہ توجیہ کعب احبار کی توجیہ سے ملتی جلتی ہے۔

**آیت 21** ❶ اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً ...... : ''اَمْ'' کسی جملہ استفہامیہ کے بعد آتا ہے، جو ہر مقام پر سیاق و سباق سے سمجھ میں آ رہا ہوتا ہے۔ یہاں پہلی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے مفسر بقاعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''کیا یہ لوگ جان چکے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کی ہر ہستی اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس میں اسی کا امر نافذ ہے اور یہ جان کر اپنی گمراہی سے باز آ چکے ہیں یا (جاننے کے باوجود اپنی ہٹ پر قائم ہیں اور) انھوں نے زمین سے کچھ معبود بنا لیے ہیں جو اکیلے زندگی کی روح پھونک سکتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ ایسے بے چاروں کو معبود کیوں مان رہے ہیں؟''

❷ ''اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے معبود سب زمین سے تعلق رکھتے ہیں، بت ہوں یا قبریں، درخت ہوں یا دریا، جانور ہوں یا انسان یا جن، مردہ داتا و دستگیر ہوں یا زندہ، سب اسی مٹی سے ہیں جو قدموں تلے روندی جاتی ہے۔ ان کی کوڑھ مغزی دیکھو کہ انھوں نے کس قدر بے وقعت ہستیوں کو اس رب کے ہوتے ہوئے حاجت روا اور مشکل کشا بنا لیا جو زمین ہی کا نہیں عرش کا بھی رب ہے۔ اگلی آیت میں اسی مناسبت سے فرمایا: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ ''سو پاک ہے اللہ جو عرش کا رب ہے، ان چیزوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔'' جو زمین و آسمان دونوں کا مالک ہے اور دونوں میں اسی کی عبادت ہوتی ہے۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۸۵،۸۴)۔

❸ هُمْ يُنْشِرُوْنَ: ماوردی نے فرمایا: ''اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس کا معنی ''يَخْلُقُوْنَ'' ہے، یعنی وہ پیدا کرتے ہیں، یہ قطرب کا قول ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا معنی ''يُحْيُوْنَ'' ہے، یعنی وہ دوبارہ زندہ کریں گے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ دونوں معنوں میں آتا ہے۔ پہلے معنی کی تائید سورۂ روم کی آیت (۲۰) سے ہوتی ہے اور دوسرے معنی کی سورۂ عبس کی آیت (۱۹) سے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا انھوں نے کوئی ایسے معبود بنائے ہیں جو پہلی دفعہ پیدا کرتے ہیں یا دوبارہ زندہ کریں گے؟ یہ شان تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، فرمایا: ﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [ الروم : ۲۷ ] ''اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے۔'' اس کے سوا کوئی نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۳)۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔ سو پاک ہے اللہ جو عرش کا رب ہے، ان چیزوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۲۲﴾

④ هُمْ يُنْشِرُوْنَ : یعنی کیا ان کے کوئی ایسے معبود ہیں کہ وہی زندگی بخشتے ہیں اور دوبارہ بھی وہی زندہ کریں گے؟ یہ ان کے معبودوں سے مذاق ہے کہ ذرا ان کی اوقات تو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اکیلے ہی یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔

⑤ ابن جزی رحمہ اللہ نے "مِنَ الْاَرْضِ" کو "يُنْشِرُوْنَ" کے متعلق کیا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ یا انھوں نے کوئی ایسے معبود بنا رکھے ہیں جو (لوگوں کو) زمین سے دوبارہ زندہ کریں گے۔

**آیت 22** لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ...... : یعنی ان لوگوں نے تو زمین سے لے کر کئی معبود بنا رکھے ہیں، جب کہ زمین اور آسمان دونوں میں ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ﴾ [الزخرف: ۸٤] ''اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہی کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔'' کیونکہ معبود برحق تو وہ ہے جو پوری قدرت اور مکمل اختیار رکھنے والا ہو اور کسی معاملے میں عاجز نہ ہو۔ اب اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی قادر و مختار ہوتے تو کائنات کا یہ سلسلہ کبھی کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ ان سب کی ہمیشہ کشمکش رہتی اور کوئی چیز اپنی مرتب شکل میں نہ بن سکتی اور نہ چل سکتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۹۱] ''نہ اللہ نے (اپنی) کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی اس کے ساتھ کوئی معبود تھا، اس وقت ضرور ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا تھا، اسے لے کر چل دیتا اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔ پاک ہے اللہ اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔'' اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنی قوت و اختیار منوانے کے لیے پوری کائنات کا اختیار حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور عرش پر قبضے کی جدوجہد کرتا، نتیجہ پوری کائنات کی تباہی ہوتا، فرمایا: ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾ [بني إسرائيل: ٤٢] ''کہہ دے اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش والے کی طرف کوئی راستہ ضرور ڈھونڈتے۔''

خلاصہ یہ کہ زمین و آسمان میں کسی فساد کا نہ ہونا اور پوری کائنات میں زبردست ترتیب اور ہم آہنگی کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا مالک اور انھیں چلانے والا ایک ہی ہے۔ یہ دلیل بہت زبردست، نہایت ہی سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے۔ ایک چھوٹے سے گھر کا نظام کبھی درست نہیں چل سکتا اگر اس کا ذمہ دار ایک نہ ہو اور نہ ایک مملکت میں دو فرماں روا رہ سکتے ہیں، تو اتنی بڑی کائنات کا نظام دو فرماں رواؤں کی صورت میں کیسے چل سکتا ہے؟ علمائے اسلام نے اس دلیل کی کئی طرح سے تشریح فرمائی ہے، میں ان میں سے صرف دو تشریحات نقل کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ اگر ہم دو معبود فرض

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝۲۳ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ

اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے ۝۲۳ یا انھوں نے اس کے سوا کوئی معبود

کریں تو کسی چیز کو حرکت دینے یا ساکن رکھنے میں اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو یہ ناممکن ہے کہ دونوں کا ارادہ پورا ہو جائے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کا ارادہ بھی پورا نہ ہو (کیونکہ پھر وہ قادر و مختار ہی کیا ہوئے؟) اگر صرف ایک کا ارادہ پورا ہو تو دوسرا عاجز ٹھہرا، جو کسی صورت معبود برحق نہیں ہو سکتا اور دونوں کے اختلاف کا ممکن ہونا اس کے واقع ہونے کے قائم مقام ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ عدم سے وجود میں آنے والا ہر جز ناممکن ہے کہ دو قدرتوں کے نتیجے میں پیدا ہو۔ جب وہ دونوں میں سے ایک کی قدرت سے وجود میں آیا، تو دوسرا زائد اور بے کار ٹھہرا، جس کا اس جز میں کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح کائنات کے ہر جز اور ہر ذرے میں غور کرتے جائیں، نتیجہ صرف ایک قادر و مختار نکلے گا۔ [ ابن عطیه فی المحرر الوجیز ]

**آیت 23** لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ ..... : اللہ تعالیٰ کی اس صفت کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ ہر چیز کا مالک اور سلطان وہ خود ہے، کسی کی کیا جرأت کہ اس کے کسی کام کے متعلق پوچھے کہ ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ اپنی ملکیت میں وہ جو چاہے کرے۔ اگر وہ زمین و آسمان کی تمام مخلوق کو عذاب دے تو بھی عین عدل ہوگا، کیونکہ وہ مالک ہے اور اپنی چیز سے جو چاہے کرے۔ جس طرح انسان اپنی خریدی ہوئی ایک اینٹ کو مکان کی پیشانی پر لگا دیتا ہے، دوسری کو چولھے یا بھٹی میں لگا دیتا ہے اور کوئی اسے ظالم نہیں کہتا، حالانکہ وہ اینٹ کا خالق بھی نہیں، صرف عارضی مالک ہے اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق پر رحم فرمائے تو اس کا فضل ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا ہر کام اتنا محکم اور درست ہے کہ اس میں کوئی خامی یا خلل نہیں، اس نے جو کیا اور جو فرمایا سب نہایت عمدہ اور کمال حسن و خوبی والا ہے۔ اس لیے اس کے کسی کام کے متعلق سوال یا اعتراض کی گنجائش نہیں۔ مفسر بقاعی نے ایک قدیم فلسفی سے نقل کیا ہے کہ کسی نے اس سے پوچھا، جب اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور اس کے سوا کوئی چیز نہ تھی تو اس نے یہ جہان کیوں بنایا؟ اس نے جواب دیا کہ اس سے ''کیوں'' کا سوال ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ کوئی اس سے اوپر ہو تو یہ سوال کرے۔ اس کے برعکس لوگوں سے دونوں وجہوں سے سوال ہو سکتا ہے اور ہوگا، کیونکہ وہ مالک نہیں غلام ہیں اور مالک غلام سے پوچھ سکتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اس نے کوئی کام کیوں کیا اور اس لیے کہ ان کے ہر کام میں خامی اور خلل موجود ہے۔ قیامت کے دن سوال کا ذکر کئی آیات میں ہے، دیکھیے سورۂ حجر (۹۲) اور صافات (۲۴)۔

**آیت 24** ❶ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً : یہ بات شرک کے نہایت قبیح اور باطل ہونے کے بیان کے لیے پھر دہرائی۔

❷ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ : اس سے پہلے شرک کے باطل ہونے کی دو عقلی دلیلیں بیان فرمائیں، ایک ''لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ'' اور دوسری ''لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ''، اس آیت میں اس کی دو نقلی دلیلیں بیان فرمائیں اور کفار سے مطالبہ فرمایا کہ تم بھی اپنی کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرو۔ ظاہر ہے کفار کے پاس شرک کی کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی، ان کا سرمایہ محض وہم و گمان اور نفس کی خواہشیں ہیں (سورۂ نجم: ۲۳، ۲۸۔ یونس: ۶۶) یا آبا و اجداد کی تقلید (زخرف: ۲۱ تا ۲۴) اور دونوں میں سے کوئی بھی دلیل

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾

بنا لیے ہیں؟ کہہ دے لاؤ اپنی دلیل۔ یہی ان کی نصیحت ہے جو میرے ساتھ ہیں اور ان کی نصیحت بھی جو مجھ سے پہلے تھے، بلکہ ان کے اکثر حق کو نہیں جانتے، سو وہ منہ پھیرنے والے ہیں ﴿۲۴﴾

یا برہان نہیں ہے۔

③ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ : یہ توحید کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کی دو نقلی دلیلیں ہیں۔ "مَنْ مَّعِيَ" (جو میرے ساتھ ہیں) سے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے مسلم مراد ہیں اور ان کے ذکر سے مراد قرآن کریم ہے جو اس امت کے لیے نصیحت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [ الأنبیاء : ۱۰ ] ”بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمھارا ذکر (تمھاری نصیحت) ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟“ "وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ" (اور مجھ سے پہلے لوگوں کی نصیحت) سے مراد پہلی امتوں پر نازل ہونے والی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور صحف ابراہیم وغیرہ ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن مجید اور پہلی کتابیں تمھاری دسترس میں ہیں، کسی میں شرک کی کوئی دلیل ہے تو دکھا دو۔ پہلے پچھلے تمام اہل علم کی شہادت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فرمایا: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [ آل عمران : ۱۸ ] ”اللہ نے اس بات کی شہادت دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب ہے، کمال حکمت والا ہے۔“ قرآن مجید میں کفار سے شرک کی نقلی دلیل پیش کرنے کا مطالبہ کئی آیات میں آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۴) اور زخرف (۴۵)۔

④ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ : لفظ "بَلْ" کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے عقلی یا نقلی دلیلیں پیش کر کے یہ امید نہ رکھیں کہ وہ قبول کر لیں گے، کیونکہ یہ جاہل ہیں اور انھیں حق کا علم ہی نہیں۔ " وَالنَّاسُ أَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا " (لوگ جس چیز کا علم نہ رکھتے ہوں اس کے دشمن ہوتے ہیں)۔ "اَكْثَرُهُمْ" سے معلوم ہوا کہ وہ سب ایسے نہیں بلکہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حق جانتے ہیں مگر عناد کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے اور کچھ ایسے لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جن کی طبیعتیں حق جان کر اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو چکی ہوتی ہیں، جیسے عمر بن خطاب اور ان جیسے دیگر اصحاب (رضی اللہ عنہم) تھے اور ایسے لوگوں کی امید پر ہی داعیانِ حق کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔

⑤ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ : اس میں ان کے جہل کا سبب بیان فرمایا کہ وہ حق معلوم کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور نہ کسی دلیل پر غور کرتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ﴾ [ یوسف : ۱۰۵ ] ”اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں۔“

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو ﴿۲۵﴾ اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے ﴿۲۶﴾

**آیت 25** ❶ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ ...... : پچھلی آیت میں "هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ" کہہ کر جو بات اختصار کے ساتھ کہی گئی تھی اب وہ واضح الفاظ میں تاکید کے ساتھ دہرائی گئی ہے اور جس بات کا حوالہ صرف چند کتابوں کے ساتھ خاص تھا اب تمام رسولوں کے ذکر کے ساتھ اسے عام کر کے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ سے پہلے جو بھی رسول ہم نے بھیجا، خواہ اسے کتاب دی یا نہ دی، اسے یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، سو میری عبادت کرو۔ مزید دیکھیے سورۂ نحل (۳۶) معلوم ہوا تمام رسول توحید الوہیت کی دعوت دینے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے کہ عبادت صرف اللہ کی کرو اور اسی سے دعا اور فریاد کرو، کیونکہ توحید ربوبیت کے تو اکثر کفار بھی قائل تھے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو خالق، مالک اور رازق مانتے تھے، مگر پکارتے وقت غیر اللہ کو بھی پکارتے اور انھیں نفع نقصان کا مالک سمجھتے تھے، یا یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اپنی بات اللہ تعالیٰ سے منوا سکتے ہیں اور ہماری حاجتیں پوری کروا سکتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۸) اور سورۂ زمر (۳)۔
❷ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر پہلے اپنی صفات کے تعدد کی بنا پر جمع متکلم کے ساتھ کیا ہے، مراد اپنی عظمت کا اظہار ہے، پھر جب توحید کا ذکر آیا تو اپنا ذکر واحد متکلم کے ساتھ فرمایا کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ" اس میں "اَنَا" (میں) بھی واحد ہے اور "فَاعْبُدُوْنِ" (جو اصل میں "فَاعْبُدُوْنِيْ" تھا) کی یائے متکلم بھی واحد ہے، یہاں جمع کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا، تاکہ شبہ بھی پیدا نہ ہو کہ معبود ایک سے زیادہ ہیں۔

**آیت 26** ❶ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ...... : عقلی اور نقلی دلیلوں سے شرک کی تردید کے بعد اب ان لوگوں کا رد کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے صاحبِ اولاد ہونے کے قائل تھے۔ عرب کے بعض مشرکین کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ بعض یہود کا کہنا تھا کہ (نعوذ باللہ) جنات اللہ تعالیٰ کے سسرال ہیں، جن سے فرشتے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا۔ نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اور بعض مسلمان کہلانے والوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور کا ٹکڑا قرار دیا اور بعض نے کہا ؎

خدا کے نور سے پیدا ہوئے ہیں پانچوں تن محمد است، علی، فاطمہ، حسین و حسن

چونکہ یہ شرک کی بدترین صورت اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی گستاخی تھی (دیکھیے مریم: ۸۸ تا ۹۰۔ بقرہ: ۱۱۶۔ نساء: ۱۷۱) اس لیے اللہ تعالیٰ نے کئی طرح سے اس کا رد فرمایا۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں ﴿۲۷﴾

② سب سے پہلے یہ کہہ کر رد فرمایا کہ " وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا " (اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے ) یعنی باپ اور اولاد ایک جنس ہوتے ہیں، اب کہاں رحمان کہ جس کی کمال رحمت سے یہ کائنات وجود میں آئی اور مسلسل چل رہی ہے اور جس کے سوا ''رحمان'' نام کا مصداق تم بھی کسی کو نہیں سمجھتے۔ اگر اس کی اولاد مانو تو والد اور اولاد کے ایک جنس ہونے کی وجہ سے فرشتوں کو اور عزیر و مسیح علیہما السلام کو اور ایک ہی نور سے ہونے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پنجتن کو اسم رحمان کا مصداق ماننا پڑے گا۔ خود ہی سوچ لو کیا یہ رحمان تھے؟

③ پھر "سُبْحٰنَهٗ" کہہ کر رد فرمایا، یعنی جن کمزوریوں کی وجہ سے اولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان سے پاک ہے۔ انسان کو اولاد کی ضرورت اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہوتی ہے، تاکہ وہ مشکل میں اس کی مدد کرے، بڑھاپے میں اس کا سہارا (عصائے پیری) بنے اور مرنے کے بعد اس کی جانشین بنے۔ پھر اولاد کے لیے بیوی کا ہونا لازم ہے، انسان اپنی خواہشِ نفس کی وجہ سے بیوی کا محتاج ہوتا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۰۱) رحمان ان تمام کمزوریوں سے پاک ہے، اگر اس میں یہ کمزوریاں ہوں تو وہ رحمان نہیں ہوگا، بلکہ خود رحم کے قابل ہوگا، جس طرح تمام انسان، جن، فرشتے اور تمام مخلوقات ہیں۔ پھر وہ نہ رحمان ہوگا اور نہ تمام عیوب اور کمزوریوں سے پاک۔ [ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ]

④ پھر "بَلْ عِبَادٌ" کہہ کر رد فرمایا، یعنی جنھیں یہ لوگ اولاد کہہ رہے ہیں وہ بندے (غلام) ہیں۔ غلام اپنے مالک کی اولاد نہیں ہوتا اور اولاد اپنے باپ کی غلام نہیں ہوتی۔ بندگی اور ولدیت جمع نہیں ہو سکتیں۔ اہلِ علم نے اس آیت سے استدلال فرمایا کہ اگر کسی کا بیٹا غلامی کی حالت میں اس کی ملکیت میں آئے تو آزاد ہو جائے گا، کیونکہ ولدیت اور عبدیت جمع نہیں ہو سکتیں۔

⑤ "مُكْرَمُوْنَ" کفار نے ان ہستیوں کی عظمت شان کی وجہ سے انھیں اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہے کو یہ کہہ کر دور فرمایا کہ ان ہستیوں کی تمام عظمت و رفعت صرف اس لیے ہے کہ انھیں عزت عطا کی گئی ہے۔ اس میں ان کا اپنا کمال کچھ نہیں، جب کہ والد اور اولاد اوصاف میں یکساں اور برابر کا جوڑ ہوتے ہیں۔

آیت 27 ① لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ : یعنی ان کی بندگی اور فرماں برداری کا یہ حال ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر بات تک نہیں کرتے۔

② وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ : "بِاَمْرِهٖ" کو پہلے لانے سے دو باتیں واضح ہوئیں، ایک یہ کہ وہ جو کرتے ہیں اس کے حکم سے کرتے ہیں، اس کے حکم کے بغیر نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ وہ ہر کام صرف اس کے حکم سے کرتے ہیں، کسی اور کے حکم سے نہیں۔ غور کرو، بندگی اور غلامی کی انتہا ہے کہ مولا کی مرضی کے بغیر نہ بولتے ہیں نہ کچھ کرتے ہیں، بھلا اولاد بھی اس طرح ہوتی ہے؟ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ سے اولاد کی نفی فرمائی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

ع ٢

وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں ﴿۲۸﴾ اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں اس کے سوا معبود ہوں تو یہی ہے جسے ہم جہنم کی جزا دیں گے۔ ایسے ہی ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں ﴿۲۹﴾

**آیت 28** ❶ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ : یعنی جو کام وہ کر چکے یا جو آئندہ کریں گے وہ ان سب کو جانتا ہے۔ اس میں ان کے اس قدر اطاعت گزار اور فرماں بردار ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے، یعنی وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری پہلی، پچھلی، ظاہر اور پوشیدہ ہر بات جانتا ہے، اس لیے وہ اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

❷ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى : یعنی وہ اسی کے حق میں سفارش کرتے ہیں جسے وہ پسند کرے اور جس کے حق میں سفارش کو پسند کرے اور اس کی اجازت دے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۵) اور سبا (۲۳) مراد اس سے اہل ایمان اور اہل توحید ہیں، کیونکہ کافر و مشرک نہ اللہ کو پسند ہیں اور نہ اسے ان کے حق میں سفارش پسند ہے۔ یہ سفارش دنیا میں بھی ہے، جیسا کہ فرشتے اہل ایمان کے حق میں دعا اور استغفار کرتے ہیں (دیکھیے سورۂ مومن: ۷ تا ۹) اور انبیاء و رسل بھی ان کے حق میں دعا کیا کرتے تھے۔ آخرت میں بھی فرشتے اور انبیاء سفارش کریں گے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « شَفَاعَتِيْ لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِيْ » [ مستدرك حاكم : ٦٩/١، ح : ٢٢٨، و صححه الذهبي ] ”میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں والے لوگوں کے لیے ہوگی۔“ اس میں بھی اولاد کی نفی ہے، کیونکہ اولاد والد کی مرضی کے خلاف بھی سفارش کر سکتی ہے۔

❸ وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ : اس میں فرشتوں اور رسولوں کی اللہ تعالیٰ کے لیے انتہائی تعظیم کا ذکر فرمایا کہ وہ اس کے خوف کی وجہ سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی اولاد نہ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ والد اور اولاد کا یہ حال نہیں ہوتا۔

**آیت 29** ❶ وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ ...... : یعنی بالفرض اگر ان فرشتوں یا انبیاء میں سے کوئی یہ کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو، تو ہم اسے اس کی جزا جہنم دیں گے۔ فرشتوں اور انبیاء سے یہ بات کبھی سرزد نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کو شرک کرنے کی صورت میں تمام اعمال ضائع ہونے کی وعید سنائی ہے، حالانکہ انھوں نے شرک کرنا ہی نہیں تھا۔ دیکھیے سورۂ انعام (۸۳ تا ۸۸) اور زمر (۶۵)۔

❷ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ : اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ ہر لحاظ سے ناقص اور فقیر مخلوق اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں رب اور

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰

اور کیا جن لوگوں نے کفر کیا یہ نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے تو ہم نے انھیں پھاڑ کر الگ کیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی، تو کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے ۝۳۰

معبود ہونے کا دعویٰ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرک سے بڑا ظلم اور بے انصافی کوئی نہیں۔ (لقمان: ۱۳) اور اسی لیے آخرت میں اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۸، ۱۱۶) اور مائدہ (۷۲)۔

آیت 30 ① اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا ...... : "رَتْقًا" کا معنی دو یا کئی چیزوں کا آپس میں سختی سے جڑا اور چپکا ہوا ہونا ہے، خواہ وہ فطری ہو (جیسے پتھر) یا کسی کے بنانے سے۔ (راغب) یہ مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے، یعنی بالکل بند۔ "فَتْقٌ" کا معنی ایسی جڑی ہوئی چیزوں کو الگ الگ کرنا ہے۔ "اَوَلَمْ يَرَ" کا معنی ہے "اور کیا دیکھا نہیں" اور جہاں دیکھی جانے والی چیز نہ ہو وہاں معنی ہے "اور کیا جانا نہیں۔" (دیکھیے سورۂ فیل) اس آیت کے دو معنی ہیں اور دونوں درست ہیں۔ طبری نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: « كَانَتَا مُلْتَزِقَتَيْنِ » "سارے آسمان اور زمین آپس میں سختی سے ملے ہوئے تھے۔" یعنی کیا یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ بے بس ہستیوں کو شریک بنا رہے ہیں، انھیں معلوم نہیں کہ سارے آسمان اور زمین ایک ٹھوس تودہ تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پناہ قوت اور کمالِ قدرت کے ساتھ ان کو الگ الگ کر کے درمیان میں ہوا اور خلا کا فاصلہ کر دیا اور آسمانوں کو سات آسمان اور زمین کو سات زمینیں بنا دیا۔ دیکھیے سورۂ طلاق (۱۲) بھلا اس کے سوا کسی کی یہ مجال ہے؟ آج کل سائنس بھی تسلیم کرتی ہے کہ کائنات پہلے ایک تودے کی شکل میں تھی، پھر ایک بہت بڑے دھماکے کے ساتھ جدا جدا ہوئی، مگر بے چارے سائنس دان وہ دھماکا کرنے والے سے ناآشنا ہی رہے۔ (الا ماشاء اللہ)

دوسرا معنی یہ ہے کہ کیا اللہ کی توحید کے منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان بند تھا، اس سے ایک قطرہ نہیں برستا تھا اور زمین بند تھی، اس سے ایک پتا نہیں اگتا تھا؟ ہم نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ اپنی مخلوق کے فائدے کے لیے بارش کے ساتھ آسمان کے دہانے کھول دیے اور اس کے ساتھ زمین کے مسام کھول کر طرح طرح کی نباتات پیدا فرما دیں۔

② وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ : اس میں انسان، حیوان، پودے اور درخت سب شامل ہیں۔ پانی سے جاندار چیز کی پیدائش کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نور (۴۵) اور نباتات کی پیدائش کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۹۹)۔

③ ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ امام رازی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یعنی جن چیزوں میں جان ہے، جیسے حیوانات اور نباتات، ان سب کی پیدائش پانی سے ہے، لیکن فرشتے اور جن یا دوسری کوئی چیز جس کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اس کے مادہ میں پانی کو دخل نہیں ہے، وہ اس سے مستثنیٰ قرار پائیں گی۔" (کبیر) دراصل یہ اس سوال کا جواب ہے کہ فرشتے اور جن تو پانی

وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۪ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے کہ وہ انھیں ہلا نہ دے اور ہم نے ان میں کشادہ راستے بنادیے، تاکہ وہ راہ پائیں ﴿۳۱﴾

سے نہیں بلکہ نور اور آگ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی پیدائش پانی سے کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے؟ اس جواب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ " کُلٌّ " سے مراد کائنات کی ہر چیز نہیں ہوتی، بلکہ ہر موقع کی مناسبت سے "کُلٌّ" کا معنی کیا جاتا ہے، جیسا کہ ملکہ سبا کے متعلق ہدہد نے کہا تھا: ﴿ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [ النمل : ۲۳ ] "اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔" اور قوم عاد پر آنے والی آندھی کے متعلق اللہ نے فرمایا: ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا ﴾ [ الأحقاف : ۲۵ ] "جو ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی۔" مفسر رازی کا یہ جواب معقول ہے۔ تاہم اگر "كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" ہر زندہ چیز کا وجود پانی سے مان لیا جائے، جس میں انسان کے ساتھ جن اور فرشتے بھی شامل ہوں تو کچھ بعید نہیں، جب مٹی سے بننے والے انسان کا اصل پانی ہے تو آگ اور نور سے بننے والے جنوں اور فرشتوں کا اصل بھی پانی ہو سکتا ہے۔ آج جب ایٹم کو پھاڑنے کی صورت میں مادے کا توانائی میں بدلنا مشاہدے سے ثابت ہو چکا ہے، جس سے انسان کو بے پناہ تعمیری اور تخریبی قوت حاصل ہوئی ہے اور قیامت کے دن سمندر کے پانی آگ کی صورت اختیار کر جائیں گے (دیکھیے سورۂ تکویر : ۶) تو اللہ کے حکم سے پانی آگ کے علاوہ نور کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

④ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ : یعنی زمین و آسمان میں حیرت انگیز نظام قائم کرنے والے ہم ہیں، کوئی اور نہیں، کیا اس پر بھی یہ لوگ توحید کا راستہ اختیار نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کو ہمارا شریک سمجھ رہے ہیں؟

⑤ رازی فرماتے ہیں: "اس آیت (۳۰) سے آیت (۳۳) تک چار آیات میں کائنات کو بنانے والے کے وجود اور اس کے صرف ایک ہونے کے چھ قسم کے دلائل مذکور ہیں۔" (کبیر)

**آیت 31** ① وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ : "رَوَاسِيَ" "رَاسِيَةٌ" کی جمع ہے جو "رَسَا يَرْسُوْ رُسُوًّا" سے اسم فاعل ہے، یعنی زمین میں گڑے ہوئے۔ ارضیات کے ماہروں پر اب یہ حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ پہاڑوں کا بہت بڑا حصہ زمین کے نیچے گڑا ہوا ہے۔

② اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ : "مَادَ يَمِيْدُ مَيْدًا وَ مَيَدَانًا" حرکت کرنا، ٹیڑھا ہونا۔ (قاموس) "اَنْ تَمِيْدَ" اصل میں "اَنْ لَا تَمِيْدَ" ہے۔ یہ تیسری دلیل ہے، یعنی اگر زمین میں یہ بھاری پہاڑ نہ گاڑ دیے جاتے تو اس میں ہر وقت زلزلے اور حرکت کی حالت رہتی، اس میں نہ وہ توازن ہوتا اور نہ سکون جو مخلوق کے رہنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ کسی وقت بھی ایک طرف جھک جاتی، یا زلزلے سے دوچار رہتی جس سے زمین کے ستر فیصد حصے پر پھیلا ہوا سمندر کا پانی خشکی پر چڑھ دوڑتا اور زمین پر ایک متنفس بھی باقی نہ رہتا۔ اب بھی کبھی کبھار اللہ تعالیٰ زلزلے کے ذریعے سے اپنی نعمت یاد دلاتا رہتا ہے، جس سے سمندر کا پانی خشکی پر چڑھ دوڑتا ہے اور میلوں تک آبادیوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚۖ وَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کی نشانیوں سے منہ پھیرنے والے ہیں ﴿۳۲﴾ اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے، سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں ﴿۳۳﴾

③ **وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا** : "فِجَاجًا" "فَجٌّ" کی جمع ہے، یعنی پہاڑوں کے درمیان کھلا راستہ۔ زمخشری نے "فِجَاجًا" کو "سُبُلًا" سے حال قرار دیا ہے، کیونکہ یہ نکرہ "سُبُلًا" کی صفت ہے جو پہلے آئی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴾ [ نوح: ۲۰ ] "تاکہ تم اس کے کھلے راستوں پر چلو۔" یعنی اگر یہ بلند اور ٹھوس پہاڑ اس طرح واقع ہوتے کہ ان میں کوئی راستہ نہ ہوتا، یا ان میں ڈھلوان نہ ہوتی بلکہ سیدھے کھڑے ہوتے تو نہ زمین کی ایک طرف کے لوگ دوسری طرف جا سکتے، نہ ایک شہر کے لوگ دوسرے شہر کے لوگوں سے مل سکتے اور نہ خود پہاڑوں پر آبادی ہو سکتی۔ یہ ہماری قدرت کا کمال ہے کہ ہم نے پہاڑوں میں ندی نالوں، دروں اور ڈھلوانوں کی صورت میں آنے جانے کے کشادہ راستے بنا دیے ہیں، جس سے پہاڑ بھی میدانوں کی طرح آباد ہیں۔

④ **لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ** : تاکہ وہ زمین میں جہاں جانا چاہیں اس کے لیے راہ پائیں اور تاکہ وہ زمین و آسمان اور پہاڑوں کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے دیکھ کر اس کی توحید کی راہ پائیں۔ "يَهْتَدُوْنَ" میں دونوں مفہوم شامل ہیں۔

**آیت 32** ① **وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا** : زمین کے چند عجائب کے ذکر کے بعد آسمان کے عجائب کی طرف متوجہ فرمایا۔ لوگوں کی بنائی ہوئی چھوٹی سی چھتیں بھی دیواروں یا ستونوں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتیں اور پھر ان میں ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان سے گرنے والی چیزیں کسی نہ کسی نقصان کا باعث بنتی ہیں، وہ جتنی دیر بھی رہیں آخر گر پڑتی ہیں۔ چور ان میں نقب لگا کر مال و متاع چرا کر لے جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے آسمان کو زمین کے لیے ایسی چھت بنایا جو ستونوں کے بغیر قائم ہے۔ دیکھیے سورۂ رعد (۲) اور لقمان (۱۰) اور گرنے سے محفوظ ہے۔ دیکھیے سورۂ فاطر (۴۱) اور سورۂ حج (۶۵) اس سے کوئی نقصان دہ چیز نیچے آنے سے بچانے، زندگی کو قائم رکھنے والی چیزیں، مثلاً سورج کی تیز روشنی (ضیا) اور حرارت، چاند اور ستاروں کا نور، رات دن کا آنا جانا، بادل، بارش، ہوائیں، فرشتے اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نظر نہ آنے والی رحمتیں اترتی ہیں۔ پھر نقب تو بہت دور، راز چرانے کی کوشش کرنے والے شیاطین سے بھی شہاب ثاقب کے ذریعے سے اس کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر (۱۶ تا ۱۸) اور صافات (۶ تا ۱۰)۔

② **وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ** : یعنی مشرک لوگ آسمان اور اس میں پائی جانے والی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، مثلاً سورج، چاند، ستارے، رات، دن، بارش، بادل، بجلی، ہوائیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بے شمار چیزیں۔ کیونکہ اگر وہ عبرت کی نظر سے ان تمام چیزوں کو دیکھیں تو یقین کر لیں کہ ان کا بنانے والا موجود ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

**آیت 33** ① **وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ** : پچھلی آیت میں مشرکوں کے زمین و آسمان کی نشانیوں سے منہ موڑنے

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی، سو کیا اگر تو مر جائے تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۳۴﴾

کا ذکر فرمایا، اس آیت میں ان میں سے چند نشانیاں ذکر فرمائی ہیں، یعنی رات، دن، سورج اور چاند۔ بڑی نشانیوں کے ذکر کے بعد چھوٹی نشانیوں، مثلاً ستاروں وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۲)، قصص (۷۱، ۷۲)، یونس (۵، ۶)، فرقان (۶۱، ۶۲)، انعام (۹۶) اور یٰسٓ (۳۷ تا ۴۰)۔

❷ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ : "فَلَكٌ" دراصل چرخے کے دھاگا بنانے والے تکلے پر گھومنے والے گول چمڑے کو کہتے ہیں، پھر ہر دائرے کو فلک کہہ لیتے ہیں۔ "سَبَحَ يَسْبَحُ" (ف) کا معنی تیرنا ہے۔ نہایت تیزی سے چلنے کو بھی تیرنے سے تشبیہ دیتے ہیں، جیسا کہ متنبی نے کہا ہے ؎

أَعَزُّ مَكَانٍ فِي الدُّنْيَا سَرْجُ سَابِحٍ وَ خَيْرُ جَلِيْسٍ فِي الزَّمَانِ كِتَابُ

"دنیا میں سب سے زیادہ باعزت جگہ تیرنے والے گھوڑے کی زین ہے اور زمانے میں سب سے بہتر ہم نشین کتاب ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ سورج، چاند اور تمام سیارے اپنے اپنے دائرے میں نہایت تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ کوئی اپنے مقرر کردہ مدار سے نہ اِدھر اُدھر ہوتا ہے اور نہ خراب ہو کر رکتا ہے۔ نہ کسی میں کوئی حادثہ رونما ہوتا ہے اور نہ تصادم، فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [ یٰسٓ : ۳۸ ] "یہ اس کا مقرر کردہ اندازہ ہے جو سب پر غالب، سب کچھ جاننے والا ہے۔"

**آیت 34** ❶ وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ : اس سے پہلے چار آیات میں خالق کائنات کے وجود اور اس کی توحید کے چھ دلائل بیان فرمائے۔ اب یہاں سے بیان فرمایا کہ یہ نظام ہمیشہ قائم رہنے کے لیے نہیں بلکہ امتحان اور آزمائش کے لیے بنایا گیا ہے۔ (کبیر)

❷ بقاعی نے پچھلی آیت کے ساتھ یہ مناسبت ذکر کی ہے کہ اس میں رات دن کے آنے جانے کا ذکر ہے، جس سے ہر انسان کی عمر کا سلسلہ آخر منقطع ہو جاتا ہے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی، خواہ نیک ہو یا بد۔ یہ آیت خضر علیہ السلام کے زندہ نہ ہونے کی بھی ایک بہت مضبوط دلیل ہے۔ رہے عیسیٰ علیہ السلام، تو ان کی عمر بہت طویل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں ہمیشہ کی زندگی حاصل ہے، کیونکہ قیامت کے قریب زمین پر اترنے کے بعد انھوں نے بھی فوت ہونا ہے۔ [ بخاري، العلم، باب السمر في العلم : ۱۱۶، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] وہ حدیث بھی اس کی صریح دلیل ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَإِنَّ رَأْسَ مِئَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقٰی مِمَّنْ هُوَ عَلٰی ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ )) [ بخاري، العلم، باب السمر في العلم : ۱۱۶۔ مسلم : ۲۵۳۸ ] "جو لوگ آج زمین کی پشت پر موجود ہیں آج سے ایک سو سال کے سرے پر ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔"

❸ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ : اس میں ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب مر جائیں گے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ دیکھیے سورۂ طور (۳۰) فرمایا، اس میں ان کے لیے خوشی کا موقع تو تب ہو جب

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۵

ہر جان موت کو چکھنے والی ہے اور ہم تمھیں برائی اور بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں، آزمانے کے لیے اور تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے ۝۳۵

ہمیں ہمیشہ زندہ رہنا ہو۔

آیت 35 ➊ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: "ذَآئِقَةُ" "ذَاقَ يَذُوْقُ" (ن) سے اسم فاعل ہے، یعنی چکھنے والی۔ اس میں تمام بت پرستوں کی تردید ہے جو اپنے دیوی دیوتاؤں کے ہمیشہ زندہ رہنے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اسی طرح ان قبر پرستوں کا بھی جو اپنے داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کے لیے موت کا لفظ گالی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی رسول کریم ﷺ یا کسی بزرگ کے بارے میں موت یا فوت کا لفظ آئے وہ اس کے بجائے انتقال (جگہ بدلنے) کا لفظ استعمال کریں گے، یا کہیں گے وہ پردے میں ہو گئے ہیں یا پردہ فرما گئے ہیں۔ اللہ کے بندے یہ نہیں سوچتے کہ موت تو مومن کا تحفہ ہے، جس کے بغیر اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کا دیدار ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں دو شعر نقل فرمائے ہیں جو امام شافعی رحمہ اللہ نے ایسے ہی کسی موقع پر پڑھے ؎

تَمَنّٰى رِجَالٌ اَنْ اَمُوْتَ وَ اِنْ اَمُتْ ‏ فَتِلْكَ سَبِيْلٌ لَسْتُ فِيْهَا بِاَوْحَدِ

فَقُلْ لِلَّذِيْ يَبْغِيْ خِلَافَ الَّذِيْ مَضٰى ‏ تَهَيَّأْ لِاُخْرٰى مِثْلِهَا فَكَاَنْ قَدِ

"کچھ لوگوں نے میری موت کی تمنا کی ہے اور اگر میں مرجاؤں تو یہ ایسا راستہ ہے جس میں میں اکیلا نہیں ہوں۔ سو اس شخص سے کہہ دو جو جانے والے کے بعد اس کی جگہ کا طلب گار ہے کہ تو بھی اس جیسی ایک اور (موت) کے لیے تیار ہو جا اور سمجھ لے کہ وہ بس آ ہی چکی۔" ایک فارسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

بے فنائے خود میسر نیست دیدارِ شما ‏ مے فروشد خویش را اول خریدارِ شما

"اپنے فنا ہونے کے بغیر تمھارا دیدار میسر نہیں ہو سکتا، اس لیے تمھارا خریدار پہلے اپنے آپ کو فروخت کرتا ہے۔" مزید دیکھیے سورۂ زمر (۳۰)، آل عمران (۱۸۵)، عنکبوت (۵۶، ۵۷) اور نساء (۷۸)۔

➋ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً: "نَبْلُوْكُمْ" "بَلَا يَبْلُوْ" اور "اِبْتَلٰى يَبْتَلِيْ" کا معنی ایک ہی ہے، آزمانا، مبتلا کرنا۔ "فِتْنَةً" آزمائش۔ "فِتْنَةً" لفظ کی تبدیلی کے ساتھ "نَبْلُوْكُمْ" کا مفعول مطلق ہے، مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے۔ ترجمہ مفعول لہ کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ شر سے مراد دنیا میں بدحالی اور سختی ہے اور خیر سے مراد خوشحالی اور آسانی ہے۔ یعنی ہم تمھیں کبھی سختی سے دوچار کرتے ہیں، کبھی نرمی کا سلوک کرتے ہیں۔ کبھی تم پر بیماری آتی ہے، کبھی صحت۔ کبھی دولت وافر ہوتی ہے کبھی فقیری، غرض ان تمام حالتوں سے مقصود تمھاری آزمائش ہے کہ تم نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کرتے ہو یا نہیں۔ کافر اور فاسق خوشحالی میں بخل اور تکبر کرنے لگتا ہے اور مصیبت میں بے صبری اور جزع فزع۔ دیکھیے سورۂ معارج (۱۹ تا ۲۱) مومن

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۶

اور جب تجھے وہ لوگ دیکھتے ہیں جنھوں نے کفر کیا تو تجھے مذاق ہی بناتے ہیں، کیا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے، اور وہ خود رحمان کے ذکر ہی سے منکر ہیں ۝۳۶

کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ » [ مسلم، الزھد، باب المؤمن أمرہ کلہ خیر : ۲۹۹۹، عن صہیب رضی اللہ عنہ ] ”مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا سارا معاملہ ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے، سو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، وہ بھی اس کے لیے بہتر ہے۔“ اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کو آزمانے کا ذکر کئی آیات میں آیا ہے، دیکھیے سورۂ اعراف (۹۴، ۹۵، ۱۶۸) اور سورۂ انعام (۴۲ تا ۴۵)۔

❸ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ : ”اِلَيْنَا“ پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہم تمھیں تمھارے اعمال کے مطابق اچھی یا بری جزا دیں گے۔ ”لوٹائے جاؤ گے“ اس لیے فرمایا کہ ہمارے والد ماجد آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد جنت میں رکھا گیا، پھر ان کی خطا سے انھیں جنت سے نکالا گیا۔ معلوم ہوا ہمارا اصل وطن جنت ہے، آزمائش کے لیے کچھ مدت زمین پر گزارنے کے بعد ہمیں دوبارہ اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہوگا، اگر کامیاب ہوئے تو دوبارہ جنت ملے گی اور ناکام ہوئے تو جہنم۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۸، ۳۹)۔

**آیت 36** ❶ وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا ...... : ”هُزُوًا“ مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی جسے مذاق کیا جائے۔ پچھلی آیت میں لوگوں کو خیر و شر کے ساتھ آزمانے کا ذکر فرمایا۔ بنی نوع انسان کے لیے سب سے بڑی خیر رسول کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور آپ کی آمد لوگوں کے لیے سب سے بڑی آزمائش بھی ہے کہ کون نعمت کی قدر کرتے ہوئے آپ پر ایمان لاتا ہے اور کون ناشکری اور کفر کرتا ہے۔ اس آیت میں اس نعمت کے عطا ہونے پر ناشکری کرنے والے لوگوں یعنی کافروں کے رویے کا ذکر فرمایا کہ جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو مذاق ہی بناتے ہیں، سنجیدگی سے نہ کوئی بات سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔

❷ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ : یہ جملہ ان کے ٹھٹھے کی تفسیر ہے، یعنی وہ آپ کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ کیا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے؟ ذکر کرنے سے مراد اچھائی سے ذکر کرنا بھی ہوتا ہے اور برائی سے بھی، تعین اس کا حال کے قرینے سے ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص آپ سے آپ کے کسی دوست کے متعلق بیان کرتا ہے کہ وہ آپ کا ذکر کر رہا تھا، تو ظاہر ہے اس کی مراد یہی ہے کہ وہ آپ کی تعریف کر رہا تھا اور اگر آپ کے کسی مخالف کے متعلق بیان کرے کہ وہ آپ کا ذکر کر رہا تھا تو اس سے مراد یہی ہوگی کہ وہ برائی کے ساتھ آپ کا ذکر کر رہا تھا۔ جیسا کہ بت توڑنے والے کو تلاش کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کی

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾

انسان سراسر جلد باز پیدا کیا گیا ہے، میں عنقریب تمھیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، سو مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو ﴿۳۷﴾

قوم کے لوگوں نے کہا تھا: ﴿سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ﴾ [الأنبياء: ٦٠] ''ہم نے ایک جوان کو سنا ہے، وہ ان کا ذکر کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔'' ''اَهٰذَا'' (کیا یہی ہے) میں ہمزہ تعجب کے اظہار کے لیے اور ''هٰذَا'' تحقیر کے لیے استعمال ہوا ہے۔

③ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ : یعنی ان کے معبودوں کا برائی سے ذکر کرنے پر آپ کا مذاق اڑانا انھیں کس طرح زیب دیتا ہے، جب کہ خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ رحمان کے ذکر ہی سے منکر ہیں؟ انھیں اس بے حد رحم والے کا ذکر گوارا نہیں جس نے انھیں پیدا کیا، ان پر انعام فرمایا اور جس اکیلے کے ہاتھ میں ان کا نفع اور ان کا نقصان ہے۔ پھر مذاق کے حق دار یہ لوگ ہیں یا ہمارا رسول؟ ''بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ'' کی تفسیر بعض مفسرین نے قرآن مجید فرمائی ہے کہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ [الحجر: ٩] یعنی وہ خود رحمان کے نازل کردہ ذکر کے منکر ہیں۔

**آیت 37** ① خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ : کسی چیز کے وقت سے پہلے اس کا ارادہ عجلہ (جلد بازی) ہے، یعنی جلد بازی انسان کی فطرت میں شامل ہے، وہ پیدا ہی جلد باز کیا گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ [بني إسرائيل: ١١] ''اور انسان ہمیشہ سے بہت جلد باز ہے۔'' ''جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے'' سے مراد مبالغہ ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ﴾ [الروم: ٥٤] ''اللہ وہ ہے جس نے تمھیں ضعف سے پیدا کیا۔''

② سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ : ''فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ'' اصل میں ''فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِيْ'' ہے۔ آیات کے آخری حروف کی موافقت کے لیے نون پر کسرہ باقی رکھ کر ''یاء'' حذف کر دی گئی۔ اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے، ایک یہ کہ کفار کی شدید مخالفت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانے پر مسلمان سخت غم زدہ اور پریشان تھے اور کفار پر جلد از جلد عذاب کے منتظر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو جلد بازی قرار دے کر تسلی دی کہ میں تمھیں اپنی نشانیاں ضرور دکھاؤں گا، مگر ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے، اس سے پہلے اس کا مطالبہ مت کرو۔ نشانیوں سے مراد کفار پر آنے والی آفات و مصائب ہیں، مثلاً بدر، احد، خندق، حدیبیہ اور فتح مکہ میں کفر کی شکست اور ان کے اقتدار کا خاتمہ۔ اس مطلب کا قرینہ یہ ہے کہ کفار کے عذاب جلدی لانے کے مطالبے کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے، وہ کسی سے ناراض ہو اور اس کے پاس طاقت ہو تو وہ فوراً انتقام لیتا ہے۔ اپنی اس سرشت کے مطابق انھوں نے اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی یہ خیال کیا کہ اگر اس کے پاس انتقام کی طاقت ہوتی تو وہ فوراً عذاب نازل کر دیتا، چنانچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑاتے اور عذاب میں دیر کی وجہ سے بار بار اس کے جلد لانے کا مطالبہ کرتے۔ فرمایا، تم عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اب تک جو ہم نے تمھیں ڈھیل دی ہے اس میں ہماری کئی حکمتیں ہیں، جن میں سے تم پر حجت پوری کرنا اور تم میں سے کئی لوگوں کا

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو ﴿۳۸﴾ کاش! وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اس وقت کو جان لیں جب وہ نہ اپنے چہروں سے آگ کو روک سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۳۹﴾ بلکہ وہ ان پر اچانک آئے گی تو انھیں مبہوت کر دے گی، پھر وہ نہ اسے ہٹا سکیں گے اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی ﴿۴۰﴾

اسلام قبول کرنا بھی ہے۔ اس سے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہمیں تمھاری کارستانیاں اور شرارتیں گوارا ہیں؟ ذرا ٹھہرو! ابھی تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم تم سے کیسے انتقام لیتے ہیں۔ دنیا میں بھی قتل ہو گے اور ذلت و رسوائی برداشت کرنا پڑے گی اور آخرت میں بھی تمھیں جہنم کی آگ کا ایندھن بنایا جائے گا۔

**آیت 38** وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ ...... : یہ ان کے عذاب طلب کرنے میں جلدی کی تفصیل ہے۔ کفار رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے اور آپ کا اور مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے بار بار پوچھتے کہ عذاب کا وہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ جھٹلانے کے ساتھ ساتھ چڑانے اور عاجز کرنے کے لیے طنزاً یہ بھی کہتے کہ "اگر تم سچے ہو۔" "كُنْتُمْ" ہمیشگی کا اظہار کرتا ہے اور "صٰدِقِيْنَ" اسم فاعل بھی سچ کے دوام کا اظہار کرتا ہے، یعنی تم جو ہمیشہ سچ بولتے ہو، تمھاری صفت ہی صادق ہے تو عذاب کا جو وعدہ تم نے کیا تھا وہ کب پورا ہوگا؟ (بقاعی)

**آیت 39** ❶ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : یعنی ان لوگوں کے عذاب کو جھٹلانے اور اسے ناممکن سمجھنے کی اصل وجہ ان کا جہل ہے، انھیں اس وقت کا علم ہی نہیں جب آگ انھیں چاروں طرف سے گھیر لے گی۔ یہ نہ اپنے چہروں سے آگ کو روک سکیں گے، جو ان کے جسم کا سب سے اہم اور خوبصورت حصہ ہے اور نہ پشتوں سے، جو جسم کا سب سے مضبوط حصہ ہے۔ جب ان اعضا کو آگ سے نہ بچا سکے تو دوسرے اعضا کو کیسے بچا سکیں گے؟ کفار کو آگ کے چاروں طرف سے گھیرنے کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ کہف (۲۹)، اعراف (۴۱)، زمر (۱۶)، ابراہیم (۵۰)، مومنون (۱۰۴) اور دوسری آیات۔ "لَوْ" کی دو تفسیریں ہیں، ایک یہ کہ یہ حرف شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے، جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے، یعنی اگر کافر لوگ اس وقت کو جان لیں تو نہ کبھی اسے جلدی طلب کریں، نہ اس کا مذاق اڑائیں اور نہ اس کا انکار کریں۔ دوسری تفسیر یہ کہ یہ حرف تمنی ہے، یعنی "کاش کہ کافر لوگ اس وقت کو جان لیں۔" اس صورت میں جزا کی ضرورت نہیں۔

❷ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ : کوئی ان کی مدد کو نہیں آئے گا اور نہ وہ اپنی یا ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے۔ دیکھیے سورۂ طارق (۱۰)، صافات (۲۵، ۲۶) اور شعراء (۹۲ تا ۹۵)۔

**آیت 40** ❶ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً ...... : "بلکہ وہ ان کے پاس اچانک آئے گی۔" "تَاْتِيْهِمْ" کی ضمیر سے مراد

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو ان میں سے جن لوگوں نے مذاق اڑایا انھیں اسی چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۴۱﴾ کہہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمان سے تمھاری حفاظت کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرنے والے ہیں ﴿۴۲﴾

قیامت ہے، کیونکہ آگ کا چاروں طرف سے گھیرنا قیامت کے دن ہوگا۔ اچانک آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آنے سے پہلے اس کا وقت معلوم ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ نے وہ کسی کو بتایا ہے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۵)، اعراف (۱۸۷) اور نازعات (۴۲ تا ۴۶) نہ قیامت آہستہ آہستہ بتدریج آئے گی کہ اس کے آنے کا علم ہو جائے۔ (بقاعی) بلکہ اچانک آئے گی، اسی لیے اس کا ایک نام "اَلسَّاعَةُ" ہے، اس لیے کہ وہ ایک ساعت (گھڑی) میں قائم ہو جائے گی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ نَشَرَ الرَّجُلَانِ ثَوْبَهُمَا فَلَا يَتَبَايَعَانِهِ وَلَا يَطْوِيَانِهِ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدِ انْصَرَفَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ لِقْحَتِهِ فَلَا يَطْعَمُهُ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَهُوَ يَلِيْطُ حَوْضَهُ فَلَا يَسْقِيْ فِيْهِ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ رَفَعَ أَحَدُكُمْ أُكْلَتَهُ إِلٰى فِيْهِ فَلَا يَطْعَمُهَا » [ بخاري، الرقاق، باب : ۶۵۰۶۔ مسلم : ۲۹۵۴ ] "قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ دو آدمیوں نے اپنا کپڑا پھیلایا ہوگا، پھر نہ اس کی خرید و فروخت کر سکیں گے اور نہ اسے لپیٹ سکیں گے اور قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ آدمی اپنے دودھ والے جانور کا دودھ لائے گا تو اسے پی نہیں سکے گا اور قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ وہ اپنے حوض کی لپائی کر رہا ہوگا تو اس میں اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکے گا اور قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ اس نے لقمہ اپنے منہ کی طرف اٹھایا ہوگا تو کھا نہیں سکے گا۔"

❷ فَتَبْهَتُهُمْ : "بَهَتَ يَبْهَتُ بَهْتًا" (ع، ن، ک) اچانک آ پکڑنا، لاجواب کر دینا، حیران کر دینا۔ (قاموس) "یعنی وہ انھیں مبہوت (حیرت زدہ) کر دے گی۔" "فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا" کیونکہ نہ وہ اسے ہٹا سکیں گے اور نہ اس پر صبر کر سکیں گے۔ "وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ" اور نہ انھیں کوئی مہلت ملے گی کہ ایک لمحہ آرام کر لیں، کیونکہ مہلت کی مدت تو اس سے پہلے پوری ہو چکی ہوگی۔ (قاسمی)

**آیت 41** وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ ... : "حَاقَ يَحِيْقُ" گھیر لینا۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ کفار کے مذاق اڑانے اور جھٹلانے سے بددل نہ ہوں، آپ سے پہلے پیغمبروں کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا۔ انھوں نے اللہ کے جس عذاب سے ڈرایا اس کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ آخر کار ان مذاق اڑانے والوں کو اسی عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ آپ کا مذاق اڑانے والوں کا انجام بھی یہی ہوگا۔

**آیت 42** ❶ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ ... : "كَلَأَ يَكْلَأُ" (ف) پہرا دینا، حفاظت کرنا۔ (قاموس) "مِنَ الرَّحْمٰنِ"

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَ لَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

یا ان کے لیے ہمارے سوا کوئی اور معبود ہیں، جو انھیں بچاتے ہیں؟ وہ نہ خود اپنی جانوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری طرف سے ان کا ساتھ دیا جاتا ہے ﴿۴۳﴾

---

سے مراد "مِنْ أَمْرِ الرَّحْمٰنِ" یا "مِنْ عَذَابِ الرَّحْمٰنِ" ہے۔ (طبری وغیرہ) پچھلی آیت میں رسولوں کا مذاق اڑانے والی گزشتہ اقوام کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے گھیر لینے کا ذکر تھا، اس آیت میں موجود کفار سے خطاب ہے کہ وہ کون ہے جو رات یا دن کسی وقت آنے والے رحمان کے عذاب سے تمھاری حفاظت کرتا ہے؟ درحقیقت یہ سوال کفار کو لاجواب کرنے کے لیے ہے، کیونکہ اگر وہ اس کا جواب دیں تو انھیں ماننا پڑے گا کہ دن رات پیش آنے والی بے شمار آفات و مصائب سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ان کی حفاظت کرتا ہے اور نہ بچا سکتا ہے، اس لیے وہ اس سوال کا جواب ہی نہیں دیں گے۔ "**بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ**" بلکہ وہ یہ جواب دینے سے گریز کریں گے جس میں ان کے رب کا ذکر آئے۔ (التسہیل) زمخشری نے فرمایا: "بلکہ انھوں نے اپنے رب کے ذکر یا اس کی نصیحت ہی سے منہ موڑ رکھا ہے، وہ اس کے عذاب سے کیا ڈریں گے۔"

❷ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "**مِنَ الرَّحْمٰنِ**" کا معنی "بَدَلَ الرَّحْمٰنِ" فرمایا ہے، یعنی وہ کون ہے جو دن رات میں آنے والی بے شمار آفات سے رحمان کے بجائے تمھاری حفاظت کرتا ہو؟ ظاہر ہے ایسا کوئی نہیں۔

❸ "**الرَّحْمٰنِ**" کے لفظ میں اشارہ ہے کہ رات دن میں پیش آنے والی بے شمار آفات و حوادث سے تمام انسانوں حتیٰ کہ کفار کی بھی ایک وقت تک حفاظت کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا نتیجہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ **لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ** ﴾ [الرعد: ۱۱] "اس کے لیے اس (انسان) کے آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم (یعنی عذاب اور دوسری آفات) سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔"

❹ "**قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ**" میں کفار کو مخاطب فرمایا، پھر نفرت کے اظہار کے لیے انھیں غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا کہ "**بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ**" یعنی یہ خطاب کے قابل ہی نہیں۔ اسے التفات کہتے ہیں، اس کی ایک اور مثال کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۲۲)۔

**آیت 43** ❶ **اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا** : "اَمْ" کا عطف اس سے پہلے محذوف جملہ استفہامیہ پر ہوتا ہے۔ (بقاعی) یعنی کیا حقیقت وہی ہے جو اوپر گزری کہ ہمارے عذاب سے انھیں کوئی بچانے والا نہیں، یا ہمارے سوا ان کے کوئی ایسے معبود ہیں جو ان کو بچاتے اور ان کا دفاع کرتے ہیں؟ "**مِنْ دُوْنِنَا**" کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "یا ان کے کوئی ایسے معبود ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کو بچاتے اور ان کا دفاع کرتے ہیں۔"

❷ **لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ** : یہ اس کا رد ہے کہ ان کے معبود انھیں بچا سکتے ہیں، یعنی ان کے بنائے ہوئے معبود اپنی مدد نہیں کر سکتے تو ان کی یا کسی اور کی کیا مدد کریں گے؟

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

بلکہ ہم نے انھیں اور ان کے باپ دادا کو ساز و سامان دیا، یہاں تک کہ ان پر لمبی عمر گزر گئی، پھر کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو آتے ہیں، اسے اس کے کناروں سے گھٹاتے آتے ہیں، تو کیا یہی غالب آنے والے ہیں؟ ﴿۴۴﴾

③ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ : "اور نہ ہماری طرف سے ان کا ساتھ دیا جاتا ہے۔" یہ کفار کے اس عقیدے کا رد ہے کہ ہمارے معبود ہمیں بچانے کی طاقت نہ بھی رکھتے ہوں تو انھیں اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کا ساتھ حاصل ہے، جس کی بدولت وہ جو چاہیں کروا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے معبود نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ انھیں ہماری طرف سے ساتھ یا تائید حاصل ہے۔ اس کے قریب معنی والی آیت دیکھیے سورۂ زمر [illegible]

**آیت 44** ① بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ : یعنی ان کے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے پروا ہونے، پیغمبر کا مذاق اڑانے اور جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان پر جو مہربانی کی، انھیں اور ان کے آباؤ اجداد کو دنیا کے ساز و سامان سے فائدہ اٹھانے کا جو موقع دیا تو اس پر احسان مند ہونے کے بجائے اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ یہ نعمت ہمیشہ رہے گی، کبھی زائل نہ ہوگی، جیسا کہ فرمایا: « اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ » [ ابراہیم : ۴۴ ] "اور کیا تم نے اس سے پہلے قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تمھارے لیے کوئی بھی زوال نہیں۔" اور کچھ ہوتے ہوتے اپنی خوش حالی میں اس قدر مست ہو گئے کہ سرے سے بھول ہی گئے کہ ان کے اوپر کوئی ان کا رب بھی ہے، جو جب چاہے عذاب بھیج کر ان کا نام و نشان مٹا سکتا ہے۔

② اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا : یعنی یہ مشرکین جو عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں اس عذاب کے آثار اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ ہم ان کی زمین کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اسے مسلسل کم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مسلمان شہروں پر شہر اور علاقوں پر علاقے فتح کرتے چلے جا رہے ہیں اور وہ وقت آ رہا ہے کہ ان کی مقبوضہ زمین گھٹتے گھٹتے ساری کی ساری ان کے قبضے سے نکل جائے گی، تو کیا پھر بھی یہی غالب ہوں گے؟ زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ زمین سے مراد زمین کے رہنے والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: « وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا » [ یوسف : ۸۲ ] "اور اس بستی سے پوچھ لیجیے جس میں ہم تھے۔" یہاں بستی سے مراد بستی میں رہنے والے ہیں۔ یعنی کیا یہ کافر ہماری زبردست قدرت اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ بے سروسامان اور مظلوم و مقہور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے اور ان سرداروں کے ساتھی مسلمان ہوتے جا رہے ہیں، جس سے کفار کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے، جو آخر کار ختم ہو جانے والی ہے۔ تیسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ کیا یہ لوگ ہماری زبردست قدرت نہیں دیکھتے کہ ہم آسمانی اور زمینی آفات مثلاً طوفانوں، بیماریوں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں کی بدولت، قحطوں، وباؤں اور دوسرے عذابوں کی صورت میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کو ہلاک کر کے آباد بستیوں کو ویران کر دیتے ہیں۔ ان کے اردگرد ہود علیہ السلام

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَ لَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ لَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

کہہ دے میں تو تمھیں صرف وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں اور بہرے پکار کو نہیں سنتے، جب کبھی ڈرائے جاتے ہیں ﴿۴۵﴾ اور یقیناً اگر انھیں تیرے رب کے عذاب کی ایک لپٹ چھو جائے تو ضرور ہی کہیں گے ہائے ہماری بربادی! بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے ﴿۴۶﴾

صالح علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور قوم سبا کی برباد شدہ بستیاں ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں، بھلا ہماری اس عظیم الشان قوت کے مقابلے میں یہ لوگ غالب آسکتے ہیں؟ پہلا مطلب الفاظ کے بہت قریب ہے، مگر سورت مکی ہونے کی وجہ سے آخری دو مطلب بیان کیے گئے ہیں، کیونکہ مکہ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ مزید دیکھیے سورۂ رعد (۴۱)۔

**آیت 45** ❶ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ : یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ میرا کام تو وحی کے مطابق تمھیں اللہ کے عذاب سے ڈرانا ہے، عذاب لانا نہیں۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور فوراً عذاب لانا اس کی کونی اور شرعی حکمتوں کے خلاف ہے، کیونکہ اس سے آزمائش کا مقصد فوت ہوتا ہے۔

❷ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ : بہروں سے مراد کفار ہیں جنھیں حق سنائی ہی نہیں دیتا۔ الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ''یہ بہرے'' کیا گیا ہے۔ آیت کے شروع میں کفار کو مخاطب فرمایا کہ ''میں تو تمھیں وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں'' پھر فرمایا ''یہ بہرے پکار نہیں سنتے''، بعد میں انھیں غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا کہ یہ لوگ مخاطب کرنے کے اہل ہی نہیں، یہ التفات ہے۔

❸ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ : ''جب ڈرائے جاتے ہیں'' کے الفاظ سے ان کے بہرا پن کی شدت بیان کرنا مقصود ہے، کیونکہ بہرہ تو کوئی بھی بات نہیں سنتا، خواہ ڈرانے کی ہو یا خوش خبری کی، مگر عام دستور ہے کہ ڈرانے کے وقت زیادہ سے زیادہ اونچی آواز کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ تو جو بہرہ اتنی بلند پکار نہ سنے وہ کوئی اور آواز کیا سنے گا؟

**آیت 46** ❶ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ ...... : ''نَفْحَةٌ'' کسی چیز کا ایک دفعہ کا تھوڑا سا حصہ، مثلاً ہوا کا ہلکا سا جھونکا، آگ یا گرمی کی معمولی سی لپٹ، خوشبو کی ہلکی سی لپٹ۔ یعنی آج تو یہ لوگ تکبر کی وجہ سے بہرے ہو رہے ہیں مگر جلد ہی ان کی یہ حالت بدل جائے گی اور عذاب کا تو ذکر ہی کیا، اگر صرف ایک مرتبہ اس کی ذرا سی لپٹ انھیں چھو بھی گئی تو ساری شیخی ختم ہو جائے گی اور واویلا کرنے لگیں گے، مگر اس وقت چیخ پکار کچھ فائدہ نہ دے گی۔ کفار کا عذاب دیکھتے ہی اپنے ظالم ہونے کا اقرار قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہے۔ دیکھیے سورۂ مومن (۸۴، ۸۵)۔

❷ ہلکے سے ہلکے عذاب سے ان کی یہ حالت ہونے کی تصویر کشی کے لیے تین مبالغے استعمال کیے گئے۔ لفظ ''مَسّ'' (چھونا) اور ''نَفْحَةٌ'' کا لفظ، جس کا معنی کسی بھی چیز کا کم از کم ہونا ہے اور ''نَفْحَةٌ'' میں ''تاء'' جو ایک مرتبہ کے مفہوم کو واضح کرتی ہے۔ (زمخشری)

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف ہوں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے ایک دانہ کے برابر عمل ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں ﴿۴۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون کو خوب فرق کر دینے والی چیز اور روشنی اور نصیحت عطا کی ان متقی لوگوں کے لیے ﴿۴۸﴾

**آیت 47** ❶ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ ...... : پچھلی آیات میں ذکر ہوا ہے کہ کفار کے پاس جب تک قدرت رہتی ہے وہ عدل و انصاف سے کنارہ کش اور ظلم و جور پر تلے رہتے ہیں اور اختیار ختم ہوتے ہی حق کا اعتراف کرنے لگتے ہیں، اس آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس طرح نہیں، وہ ہمیشہ "قَائِمًا بِالْقِسْطِ" انصاف پر قائم ہے، حتیٰ کہ قیامت کے دن بھی وہ انصاف کے ترازو قائم فرمائے گا، پھر کسی جان پر کچھ ظلم نہیں ہوگا۔ (بقاعی)

❷ "اَلْمَوَازِيْنَ" "مِيْزَانٌ" کی جمع ہے۔ "اَلْقِسْطَ" مصدر ہے جو اسم فاعل "مُقْسِطٌ" کے معنی میں ہے اور "اَلْمَوَازِيْنَ" کی صفت ہے، جیسے مبالغے کے لیے عادل آدمی کو "رَجُلٌ عَدْلٌ" کہہ لیتے ہیں، یعنی اتنا عادل آدمی کہ سراپا عدل ہے۔ یعنی ہم ایسے ترازو رکھیں گے جو اتنے انصاف والے ہیں گویا عین انصاف ہیں۔ موصوف واحد ہو یا تثنیہ یا جمع، مذکر ہو یا مؤنث، اگر اس کی صفت مصدر ہو تو وہ سب کے لیے ایک جیسی ہوتی ہے۔ "اَلْقِسْطَ" مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے، یعنی ہم انصاف کے لیے بہت سے ترازو رکھیں گے۔

❸ "اَلْمَوَازِيْنَ" سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن متعدد ترازو ہوں گے، جن کے ساتھ اعمال کا وزن کیا جائے گا، پھر یا تو ہر آدمی کے لیے الگ ترازو ہوگا یا ہر عمل کے لیے۔ نیز دیکھیے سورۂ اعراف (۷)۔

❹ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا : "پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا" یعنی نہ نیکیوں میں کچھ کمی آئے گی اور نہ برائیوں میں کوئی اضافہ ہوگا۔

❺ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ زلزال (۷، ۸) اور لقمان (۱۶)۔

❻ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ : ہم حساب لینے والے کافی ہیں، ہمیں کسی مددگار کی ضرورت نہیں، پھر نہ ہمارے حساب کے بعد کسی پڑتال کی گنجائش ہے اور نہ کہیں اپیل ہو سکتی ہے۔

**آیت 48** ❶ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ...... : سورت کے شروع سے توحید، نبوت اور قیامت پر بات چلی آ رہی ہے، اب چند انبیاء کے واقعات کا آغاز ہوتا ہے۔ مقصد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ ان انبیاء کی طرح آپ بھی پوری

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ هُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے ڈرنے والے ہیں ﴿۴۹﴾ اور یہ ایک بابرکت نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، تو کیا تم اسی سے منکر ہو؟ ﴿۵۰﴾

تن دہی سے دعوت کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں اور اس راہ میں آنے والی ہر مشکل میں صبر و استقامت سے کام لیں، اس کے علاوہ اس بات کی تفصیل ہے کہ پہلے تمام انبیاء بشر تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر فرمایا۔ قرآن مجید میں اکثر موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور دونوں کی کتابوں کا ذکر اکٹھا آتا ہے، کیونکہ دعوت کے ساتھ جہاد کا سلسلہ موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور دعوت کے سلسلے میں دونوں کے درمیان بڑی مماثلت ہے۔

② الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ : "الْفُرْقَانَ" اور "الْفَرْقُ" کا معنی ایک ہی ہے، الف اور نون کی وجہ سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے، یعنی حق و باطل کے درمیان خوب فرق کرنے والی چیز۔ اس سے مراد تورات بھی ہے، معجزے اور جادو کے درمیان فرق کرنے والے معجزے بھی اور موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل کو فرعونیوں پر حاصل ہونے والی فتح و نصرت بھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یوم بدر کو یوم الفرقان قرار دیا۔ گویا "الْفُرْقَانَ" کتاب، معجزات اور نصرتِ الٰہی تینوں کی صفت ہو سکتی ہے، کیونکہ تینوں ہی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہیں۔ اسی طرح "ضِيَآءً" اور "ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ" بھی تینوں کی صفت ہیں، کیونکہ تورات، معجزات اور نصرتِ الٰہی تینوں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی بھی ہیں، ایمان کی روشنی بھی ہیں اور نصیحت بھی۔ مگر کتاب، معجزات اور نصرتِ الٰہی کے مشاہدے سے حق و باطل کے درمیان فرق، ایمان کی روشنی اور نصیحت اسی کو نصیب ہوتی ہے جو متقی ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲) کی تفسیر۔

**آیت 49** ① الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ : اس کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے رب کو دیکھے بغیر اس کا شدید خوف رکھتے ہیں اور دوسرا یہ کہ لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہونے کی حالت میں بھی وہ اپنے رب سے بہت ڈرتے ہیں۔ ان کے کسی عمل سے مقصود نہ ریا ہے اور نہ لوگوں کی طعن تشنیع سے بچنا، بلکہ ان کے ہر عمل کا باعث صرف اپنے رب کی خشیت ہے۔

② وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ : یہ جملہ اسمیہ ہے جس میں دوام پایا جاتا ہے، "اشفاق" کا معنی ہے کسی آنے والے حادثے کا شدید کھٹکا، یعنی انھیں ہر وقت قیامت کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

**آیت 50** ① وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ : "هٰذَا" (یہ) سے مراد قرآن مجید ہے، سامعین کے ذہن میں حاضر ہونے کی وجہ سے اس کی طرف "هٰذَا" کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے۔ "ذِكْرٌ" یعنی یہ نصیحت ہے اور یاد دہانی بھی۔ "مُّبٰرَكٌ" جس میں بہت برکت، یعنی بے شمار بھلائیاں ہیں اور ہم نے (اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کے اظہار کے لیے جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا ہے) اسے نازل کیا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس سے پہلے ابراہیم کو اس کی سمجھ بوجھ عطا فرمائی تھی اور ہم اسے جاننے والے تھے ﴿۵۱﴾ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو؟ ﴿۵۲﴾

② اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ : ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو تورات اور معجزات عطا کیے، تم لوگ انھیں مانتے ہو تو یہ بابرکت ذکر یعنی قرآن بھی ہم نے ہی نازل کیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تم اسے نہیں مانتے؟

آیت 51 ① وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ...... : ”رُشْدٌ“ ہدایت اور سیدھا راستہ، یہ لفظ ”غَيٌّ“ کے مقابلے میں آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۶ ] ”بلاشبہ ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی۔“ اور سمجھ بوجھ اور ہوش مندی کے معنی میں بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا﴾ [ النساء : ٦ ] ”پھر اگر تم ان سے کچھ سمجھ داری معلوم کرو۔“ ”رُشْدَهٗ“ یعنی وہ سمجھ بوجھ جو اس کے لائق تھی۔

② مِنْ قَبْلُ : یعنی موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے پہلے یا نبوت عطا کرنے سے پہلے۔ بعض نے کہا غار سے نکلنے کے بعد۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۷۵ تا ۷۹)۔

③ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ : یعنی ہم اسے جانتے تھے کہ ہم نے اس میں کیا کیا خوبیاں اور صلاحیتیں رکھی تھیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی جتنی بھی خوبیاں بیان کر لی جائیں اللہ تعالیٰ کی یہ شہادت ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ منصب عطا ہی اسے ہوتا ہے جو اللہ کے علم میں اس کا اہل ہو، فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [ الأنعام : ۱۲۴ ] ”اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔“

آیت 52 ① اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ...... : ”اَلتَّمَاثِيْلُ“ ”تِمْثَالٌ“ کی جمع ہے، اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کی مثل بنائی ہوئی صورت، مجسمہ۔ بت پرست عموماً انسانوں کے مجسموں کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ سمجھ بوجھ جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا حق ہونا اور بتوں اور دوسرے تمام معبودوں کا باطل ہونا۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرست بھی تھی، ستارے، چاند اور سورج کی پرستش بھی کرتی تھی اور بادشاہ کو بھی رب مانتی تھی۔ ستارے، چاند اور سورج کے معبود نہ ہونے کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی نہایت مدلل، مؤثر اور لاجواب دعوت سورۂ انعام (۷۶ تا ۸۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔ بادشاہ کے رب نہ ہونے کی دعوت سورۂ بقرہ (۲۵۸) میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں بتوں کے بے اختیار ہونے کی تبلیغ اور اس کا عملی اظہار فرمایا ہے۔

② مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ...... : ”هٰذِهٖ“ کا اشارہ بتوں کی تحقیر کے لیے ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے نادان بنتے ہوئے اپنے باپ اور اپنی قوم سے بتوں کا تذکرہ نہایت تحقیر کے ساتھ کرتے ہوئے پوچھا: ”یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو، کیا چیز

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾

انھوں نے کہا ہم نے اپنے باپ دادا کو انھی کی عبادت کرنے والے پایا ہے ﴿۵۳﴾ کہا بلاشبہ یقیناً تم اور تمھارے باپ دادا کھلی گمراہی میں تھے ﴿۵۴﴾ انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے، یا تو کھیلنے والوں سے ہے؟ ﴿۵۵﴾ کہا بلکہ تمھارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے انھیں پیدا کیا ہے اور میں اس پر گواہی دینے والوں سے ہوں ﴿۵۶﴾

ہیں؟'' گویا ابراہیم علیہ السلام ان کو کوئی چیز ماننے ہی پر تیار نہ تھے، کیونکہ وہ نہ سنتے تھے اور نہ کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۴۲)۔

**آیت 53** قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا ...... : ابراہیم علیہ السلام کے والد اور ان کی قوم کے پاس بتوں کی عبادت کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ تھی، اس لیے انھوں نے تقلید کا سہارا لیا اور کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرنے والے پایا ہے، حالانکہ باپ دادا سیدھے راستے پر ہوں تو بے شک ان کے پیچھے چلو، لیکن اگر وہ غلط راستے پر ہوں تو غلط راستے پر چلتے جانا کہاں کی دانش مندی ہے؟

**آیت 54** قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ : اس کا یہ معنی نہیں کہ تم اور تمھارے باپ دادا ماضی میں گمراہی میں مبتلا تھے اب نہیں، بلکہ ''كَانَ'' دوام اور استمرار کے لیے ہے اور ''فِيْ'' ان کے گمراہی میں بری طرح پھنسے ہونے کے اظہار کے لیے ہے، جیسا کہ ابوالسعود نے فرمایا: '' وَ مَعْنَى "كُنْتُمْ" مُطْلَقُ اسْتِقْرَارِهِمْ عَلَى الضَّلَالِ لَا اسْتِقْرَارُهُمُ الْمَاضِيْ الْحَاصِلِ قَبْلَ زَمَانِ الْخِطَابِ الْمُتَنَاوِلِ لَهُمْ وَلِآبَائِهِمْ '' خلاصہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے واشگاف الفاظ میں فرما دیا کہ بلاشبہ یقیناً تم اور تمھارے باپ دادا پہلے بھی کھلی گمراہی میں مبتلا تھے اور اب بھی مسلسل ایسے ہی چلے آ رہے ہو۔ کیونکہ بت پرستی سے بڑھ کر کھلی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے؟

**آیت 55** قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ ...... : قوم کو بت پرستی کے حق ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ سوچ ہی نہ سکتے تھے کہ کوئی شخص اسے کھلی گمراہی قرار دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ابراہیم علیہ السلام جیسے حسن اخلاق والے شخص سے (جو کوئی ایسی بات کہتا ہی نہیں جو کسی کو ناگوار گزرے) صاف گمراہی کا فتویٰ سن کر انھیں یقین نہ آیا کہ ابراہیم علیہ السلام یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھے کہ آپ مذاق کر رہے ہیں، اس لیے انھوں نے پوچھا کہ آپ یہ حقیقت بیان کر رہے ہیں یا دل لگی کر رہے ہیں؟

**آیت 55** ❶ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ ...... : ''بَلْ'' (بلکہ) سے پہلے کلام کا کچھ حصہ محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے، یعنی میں یہ بات مذاق سے نہیں بلکہ پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ یہ مورتیاں اور مجسمے رب نہیں ہیں بلکہ تمھارا رب صرف وہ

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور اللہ کی قسم! میں ضرور ہی تمھارے بتوں کی خفیہ تدبیر کروں گا، اس کے بعد کہ تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے ﴿۵۷﴾ پس اس نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، سوائے ان کے ایک بڑے کے، تاکہ وہ اسی کی طرف رجوع کریں ﴿۵۸﴾

ہے جو تمام آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے۔ "رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" مبتدا اور خبر دونوں کے معرفہ ہونے سے حصر کا معنی پیدا ہو رہا ہے۔

② وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ : یعنی میں یہ بات دلیل سے ثابت کر سکتا ہوں، تمھاری طرح نہیں کہ آبا و اجداد کی تقلید کے سوا میرے پاس کوئی دلیل ہی نہ ہو (کیونکہ شہادت اسی بات کی دی جاتی ہے جس کا انسان کو یقینی علم ہو، جب کہ تقلید اور علم ایک دوسرے کے منافی ہیں)۔ (رازی)

**آیت 57** ① وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ...... : ابراہیم علیہ السلام نے زبان سے بتوں کی تردید کے بعد سمجھا کہ ان لوگوں کو زبانی سمجھانا کافی نہیں بلکہ ان کے دماغوں میں ان بتوں کی خدائی اور مشکل کشائی کا جما ہوا عقیدہ ختم کرنا ایک زبردست عملی کارروائی کے بغیر ممکن نہیں، جس سے ان کی بے بسی صاف واضح ہو جائے۔ چونکہ ان تک پہنچنا اور کارروائی کرنا آسان نہ تھا، تو اس کام کے لیے انھوں نے اس دن کا انتخاب فرمایا جب سب لوگوں کے جشن پر جانے سے کارروائی کا موقع مل سکتا تھا۔ دیکھیے سورۂ صافات (۸۸ تا ۹۰)۔

② ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کے باطل ہونے کو عمل سے ثابت کرنے سے پہلے اللہ کی قسم کھا کر اپنے ارادے کا اعلان فرمایا۔ کچھ لوگ پختہ قبروں یا آستانوں اور بتوں کو خفیہ طریقے سے توڑ دیتے ہیں اور روپوش ہو جاتے ہیں اور اپنے اس عمل کو سنت ابراہیمی قرار دیتے ہیں، لیکن اگر واقعی وہ سنت ابراہیمی کے پیروکار ہیں تو انھیں چاہیے کہ اعلان کر کے یہ کام کریں، تاکہ اس کے نتیجے کے ذمہ دار بھی خود بنیں اور ابراہیم علیہ السلام جیسی استقامت دکھائیں۔ یہ نہیں کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔

③ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات دل میں کہی۔ بعض نے لکھا ہے کہ جب سب لوگ چلے گئے تو انھوں نے ایک آدھ آدمی کی موجودگی میں یہ بات کہی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اسرائیلیات ہیں۔ قرآن مجید نے صاف الفاظ میں ان کے اپنے والد اور قوم کے سامنے یہ بات کہنے کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر قوم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، اس لیے انھوں نے اس کی پروا نہیں کی۔

**آیت 58** ① فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا: "جُذٰذًا" "جَذَّ يَجُذُّ" (قطع کرنا اور ریزہ ریزہ کرنا) میں سے "فُعَالٌ" بمعنی مفعول (مَجْذُوْذٌ) ہے، یعنی ریزہ ریزہ، ٹکڑے ٹکڑے۔ اسی کے ہم وزن اور ہم معنی "حُطَامٌ" اور "فُتَاتٌ" ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ اپنے خاص جشن کے موقع پر گھروں سے باہر نکلتے اور سارا دن جشن مناتے، چنانچہ انھوں نے

# قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

انھوں نے کہا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ بلاشبہ وہ یقیناً ظالموں سے ہے ﴿۵۹﴾

ابراہیم علیہ السلام کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی مگر انھوں نے بیماری کا عذر کر لیا۔ (صافات: ۸۸ تا ۹۰) ابراہیم علیہ السلام موقع پا کر بت خانے کے اندر داخل ہو گئے، پہلے ان سے کچھ خطاب کیا، جس کا تذکرہ سورۂ صافات میں ہے، جواب نہ پا کر پوری قوت سے انھیں توڑنا شروع کر دیا اور ایک کے سوا سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہاں اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سب کو توڑ کر کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا، مگر یہ محض اسرائیلی روایت ہے، قرآن یا حدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ پھر پتھر کے بت توڑنے کے لیے کلہاڑے کے بجائے ہتھوڑا استعمال ہوتا ہے۔ ہاں اگر لکڑی کے بت ہوں تو الگ بات ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو کیسے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اس کے لیے صرف ایک ہتھیار استعمال کیا یا جس جس اوزار کی ضرورت تھی سب استعمال فرمائے۔

② اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ : "كَبِيْرًا" نکرہ ہے، سوائے ان کے ایک بڑے کے۔ معلوم ہوا کہ ان کے بڑے بت کئی تھے، مگر ابراہیم علیہ السلام نے ایک بڑے کے سوا چھوٹے بڑے تمام بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کی تائید آئندہ آیت (۶۳) "بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا" سے بھی ہوتی ہے کہ "یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہے۔" معلوم ہوا کہ اس بڑے کے سوا اور بھی بڑے بت تھے جو اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ (بقاعی) جو لوگ اسے ان کے سب بتوں سے بڑا بت قرار دیتے ہیں قرآن کے الفاظ ان کا ساتھ نہیں دیتے۔

③ "سوائے ان کے ایک بڑے کے" سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں یا ان کے معبودوں کو "کبیر" نہیں فرمایا، ہاں "ان کے ہاں کبیر" فرمایا ہے، کیونکہ وہ اسے کبیر مانتے تھے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت کا خط بھیجتے ہوئے لکھا: « اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ » دیکھیے ہرقل کو صرف رومیوں کے ہاں عظیم فرمایا ہے، کافر کو مطلقاً عظیم نہیں فرمایا۔ (سعدی)

④ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ : ان کے ایک بڑے بت کو کچھ نہیں کہا، تاکہ جب وہ سب بتوں کو ٹوٹا ہوا اور اسے صحیح سلامت دیکھیں تو اس سے پوچھیں کہ جناب آپ کے غصے کا باعث کیا ہوا کہ آپ نے ان سب خداؤں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اگر آپ نے یہ کام نہیں کیا تو آپ کے ہوتے ہوئے کوئی ظالم یہ کام کیسے کر گیا؟ ایک معنی اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایک بڑے کے سوا تمام بت ٹکڑے ٹکڑے کر دیے کہ وہ لوگ جب یہ ماجرا دیکھیں گے تو فوراً ان کا ذہن ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرف جائے گا، پھر جب وہ ان سے پوچھیں گے تو انھیں شرک کی تردید کا بہترین موقع مل جائے گا۔

آیت 59 ① قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ : مشرکوں کے عقل سے عاری ہونے کی کیسی زبردست تصویر ہے۔ کہنے لگے، ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے؟ سوچا ہی نہیں کہ وہ معبود ہی کیا جو اپنا دفاع بھی نہ کر سکے؟ لطف یہ کہ سب نے یہی کہا کہ کوئی اور ان کے خداؤں کا یہ حال کر گیا ہے۔ قبر پرستوں کا بھی یہی حال ہے ؎

جو کروٹ بدلنا نہیں جانتے ہیں انھیں آپ مشکل کشا مانتے ہیں

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ؕ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

لوگوں نے کہا ہم نے ایک جوان کو سنا ہے، وہ ان کا ذکر کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے ﴿۶۰﴾ انھوں نے کہا پھر اسے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہ ہو جائیں ﴿۶۱﴾

② اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ : "اِنَّ" اور لام کی تاکید کے ساتھ، بے شک وہ یقیناً ظالموں سے ہے کہ اس نے مشکل کشاؤں کی تعظیم کے بجائے ان کا یہ حال کر دیا ہے۔ یا اس لیے کہ مارنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، اس ظالم نے تو انھیں اتنا مارا ہے کہ ان کا کچھ باقی ہی نہیں چھوڑا اور نہ انھیں ذلیل کرنے میں کوئی کسر رہنے دی ہے۔ (رازی)

آیت 60 قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ ...... : بتوں کو توڑنے کا مجرم تلاش کرنے میں انھیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ جن لوگوں نے وہ تقریر سنی تھی، جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے کی تھی اور جس میں انھوں نے صاف اعلان کیا تھا کہ اللہ کی قسم! میں ضرور تمھارے بتوں کی خفیہ تدبیر کروں گا، انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو سنا ہے جو ان (بتوں) کا ذکر کر رہا تھا، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔ ان مشرکوں کا ابراہیم علیہ السلام کی تحقیر کا انداز دیکھیے، وہ انھیں ابراہیم نامی ایک غیر معروف جوان بتا رہے ہیں، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام جیسی شخصیت گم نام ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بھلا سورج یا چاند بھی چھپے رہ سکتے ہیں؟ پھر وہ اس عمل کا باعث ان کی جوانی کو قرار دے رہے ہیں، حالانکہ ان جاہلوں کو معلوم ہی نہیں کہ اس جوان کی جوانی دیوانی نہیں بلکہ ایسی ہوش مند ہے جس پر بے شمار پختہ عمروں کی پختہ عمری قربان ہے۔ "يَذْكُرُهُمْ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۳۶)۔

آیت 61 ① قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ : کہنے لگے، اگر ایسا ہے تو اسے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لاؤ۔

② لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ : اس کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ اسے لوگوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہ ہو جائیں کہ یہی شخص ہے جو بتوں کی برائی بیان کرتا تھا اور ان کا بندوبست کرنے کی قسمیں اٹھاتا تھا اور اس کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے کہ یہ کام بھی اسی کا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی موقع کا گواہ بھی مل جائے، جس نے اسے بت توڑتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرک ہونے کے باوجود وہ لوگ ملزم پر جرم ثابت کرنا ضروری سمجھتے تھے، جو ان کے نزدیک جرم تھا۔ بقاعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اب اللہ تعالیٰ کی جناب ہی میں ان لوگوں کی شکایت ہے جو (مسلمان ہو کر) اپنے دین کے اکابر کو بغیر کسی دلیل یا تہمت کے پکڑ کر بند کر دیتے ہیں (نہ فرد جرم، نہ کوئی گواہ اور نہ کوئی اور ثبوت، بلکہ اکثر اوقات انھیں بے گناہی کے جرم میں پکڑ لیتے ہیں)۔'' دوسرا معنی یہ ہے کہ اسے لوگوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہ ہو جائیں اور آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس کے ساتھ کیسا عبرتناک سلوک کیا جاتا ہے، تاکہ آئندہ کسی کو ایسی حرکت کی جرأت نہ ہو۔ وہ تو ابراہیم علیہ السلام کو مجرم ثابت کرنے کے لیے لوگوں

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا

انھوں نے کہا کیا تو نے ہی ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کیا ہے اے ابراہیم!؟﴿۶۲﴾ اس نے کہا بلکہ ان کے اس بڑے

کو اکٹھا کر رہے تھے مگر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کی دلی تمنا پوری ہونے کا سامان ہو رہا تھا کہ کسی طرح سب لوگ جمع ہوں تو وہ ان کے سامنے بتوں کی بے بسی اور مشرکوں کی بے عقلی واضح کریں، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے عید کے دن دوپہر کے وقت تمام لوگوں کو کھلے میدان میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۵۸، ۵۹)۔

آیت 63،62 ① قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا...... : لوگوں کے سوال کے جواب میں کہ اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کی بے بسی و بے چارگی واضح کرنے کے لیے شدید طنز کرتے ہوئے فرمایا: ''بلکہ یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہے، سو ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں۔'' مراد خود ان کے منہ سے اس بات کا اقرار کروانا تھا کہ بت نفع یا نقصان تو دور کی بات ہے بول کر بتا بھی نہیں سکتے کہ ان کا یہ حال زار کون کر گیا ہے۔ ''فَسْـَٔلُوْهُمْ'' (سو ان سے پوچھ لو) یعنی صحیح سالم رہنے والے ان کے اس بڑے سے پوچھو کہ اس نے بت کیوں توڑے اور اگر کسی اور نے توڑے ہیں تو اس نے اپنے ساتھیوں کا دفاع کیوں نہیں کیا؟ اور ٹوٹے ہوئے خداؤں سے بھی پوچھو کہ کس نے ان کا یہ حال کیا اور یہ بھی کہ وہ خود یا ان کا بڑا ان کا دفاع کیوں نہیں کر سکے؟ ان کے ایک بڑے بت کو سالم چھوڑنے میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا اپنے ساتھ کسی بڑے یا چھوٹے مدمقابل کو برداشت نہیں کرتا تو رب تعالیٰ جس کی صفت ہی ''اللہ اکبر'' ہے، اپنے ساتھ کسی شریک کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟

② ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَمْ يَكْذِبْ إِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ إِلَّا ثَلَاثَ كَذَبَاتٍ: ثِنْتَيْنِ مِنْهُنَّ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، قَوْلُهُ: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ [ الصافات: ۸۹] وَ قَوْلُ: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾ [ الأنبياء: ۶۳] وَقَالَ بَيْنَا هُوَ ذَاتَ يَوْمٍ وَسَارَةُ إِذْ أَتٰی عَلٰی جَبَّارٍ مِنَ الْجَبَابِرَةِ، فَقِيْلَ لَهُ إِنَّ هَاهُنَا رَجُلًا مَعَهُ امْرَأَةٌ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ فَسَأَلَهُ عَنْهَا فَقَالَ مَنْ هٰذِهِ؟ قَالَ أُخْتِيْ فَأَتٰی سَارَةَ فَقَالَ يَا سَارَةُ! لَيْسَ عَلٰی وَجْهِ الْأَرْضِ مُؤْمِنٌ غَيْرِيْ وَ غَيْرُكِ، وَإِنَّ هٰذَا سَأَلَنِيْ عَنْكِ فَأَخْبَرْتُهُ أَنَّكِ أُخْتِيْ فَلَا تُكَذِّبِيْنِيْ» [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالٰی: ﴿ واتخذ الله إبراهيم خليلا ﴾: ۳۳۵۸۔ مسلم: ۲۳۷۱ ] ''ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ کے سوا کبھی جھوٹ نہیں کہا، جن میں سے دو اللہ تعالیٰ کی ذات کی خاطر تھے۔ ان کا کہنا: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ [ الصافات: ۸۹] ''میں بیمار ہوں'' اور ان کا یہ کہنا: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾ [ الأنبياء: ۶۳ ] ''بلکہ اسے ان کے اس بڑے نے کیا ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور ایک دفعہ وہ اور (ان کی بیوی) سارہ سفر کر رہے تھے کہ وہ جابر لوگوں میں سے ایک جابر (کی بستی) کے پاس آئے۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں ایک آدمی ہے جس کے ساتھ ایک عورت ہے جو حسین ترین لوگوں سے ہے۔ اس نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور اس کے متعلق پوچھا اور کہا: ''وہ کون ہے؟'' کہا: ''وہ میری بہن ہے۔''

فَسۡـَٔلُوۡهُمۡ اِنۡ كَانُوۡا يَنۡطِقُوۡنَ ﴿۶۳﴾

نے یہ کیا ہے، سو ان سے پوچھ لو، اگر وہ بولتے ہیں ﴿۶۳﴾

پھر سارہ کے پاس آئے تو کہا، اے سارہ! اس سرزمین پر میرے اور تمھارے سوا کوئی مومن نہیں اور اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اسے بتایا ہے کہ تو میری بہن ہے، سو مجھے مت جھٹلانا۔"

بعض لوگوں نے اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹوں کے ذکر کی وجہ سے اس حدیث کا انکار ہی کر دیا کہ ایک صدیق نبی جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟ ایک روشن خیال بزرگ نے تو امام بخاری اور تمام ائمہ حدیث کے ساتھ اس حدیث کو صحیح کہنے والے حضرات کے متعلق یہاں تک لکھ دیا ہے: "ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔" ان بزرگوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس حدیث کے روایت کرنے والے ائمہ کرام یعنی بخاری، عمرو بن حفص، ان کے والد، سلیمان الاعمش، ابراہیم نخعی، علقمہ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی صداقت کو عزیز نہ رکھنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جب ان کی صداقت ہی عزیز نہ رہی تو امت کے اتفاق کے ساتھ " أَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ " اور دوسری کتب حدیث کی کیا حیثیت رہ جائے گی اور امت کے پاس باقی کیا رہ جائے گا؟ لطف یہ کہ ان بزرگوں نے ائمہ حدیث کے صدق پر یہ مہربانی بزعم خود منکرین حدیث کے فتنے کے سد باب کے لیے فرمائی ہے۔ بھلا اس کرم فرمائی کے بعد منکرین حدیث کو کسی مزید محنت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ ایک بزرگ نے یہ تک کہہ دیا کہ "نبی کو جھوٹا کہنے سے بہتر ہے کہ اس حدیث کے راویوں کو جھوٹا کہہ دیا جائے۔" سبحان اللہ! ابراہیم علیہ السلام کو جھوٹا کس نے کہا ہے؟ اور آپ حضرات کی دلیری کا کیا کہنا کہ جن راویوں کو پوری امت بالاتفاق سچا قرار دیتی ہے آپ انھیں جھوٹا قرار دے رہے ہیں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اچھے خاصے ذہین حضرات صحیح حدیث اور ائمہ حدیث پر اتنی جرأت کرتے ہوئے یہ بات نہ سمجھ سکے کہ اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کو جھوٹا نہیں کہا گیا بلکہ اعلیٰ درجے کا سچا (صدیق) ثابت کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس شخص نے پوری زندگی میں ان تین باتوں کے سوا کوئی جھوٹ نہ بولا ہو، جو حقیقت میں جھوٹ ہیں ہی نہیں، بلکہ صرف ظاہر میں جھوٹ ہیں، وہ کس قدر سچا ہوگا۔ بلاغت میں اسے "تَأْكِيْدُ الْمَدْحِ بِمَا يُشْبِهُ الذَّمَّ" کہا جاتا ہے، یعنی ایسی تعریف جو بظاہر مذمت ہو، جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ أَنَّ سُيُوْفَهُمْ　　بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

"یعنی ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ ان کی تلواروں میں لشکروں کو کھٹکھٹانے کی وجہ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ دشمنوں کے مقابلے کی وجہ سے تلواروں میں دندانے پڑ جانا کوئی عیب نہیں، تو جن کا عیب یہ ہے ان کی خوبیوں کا حال کیا ہوگا۔

اب آپ ان تینوں واقعات پر غور کریں۔ وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے

ساتھ تو نے یہ کام کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں، بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ کام کیا ہے۔ ''بلکہ'' کا معنی یہی ہے کہ میں نے نہیں کیا، حالانکہ ابراہیم کو خوب معلوم تھا کہ انھوں نے ہی یہ کام کیا ہے۔ یہ بظاہر صاف جھوٹ ہے مگر حقیقت میں یہ ایک تدبیر تھی جس کے ذریعے سے وہ ان کے منہ سے اقرار کروانا چاہتے تھے کہ بت بول نہیں سکتے، نفع نقصان کا مالک ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مشرکین بھی ابراہیم علیہ السلام کے مقصد کو سمجھ رہے تھے اور ان کے پاس یہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بت بولتے نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا اقرار کیا۔ اب جس شخص کا جھوٹ دشمنوں کے مونہوں سے کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اقرار کروالے کہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں کچھ نہیں، اس شخص کے صدیق ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ [ الصافات : ٨٩ ] کہ میں بیمار ہوں، وہ سمجھے کہ اتنے بیمار ہیں کہ ساتھ نہیں جا سکتے، حالانکہ جو شخص اتنا بیمار ہو وہ پتھروں وغیرہ کے اتنے مجسموں کا ستیاناس کیسے کر سکتا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام کے ذہن میں کفر و شرک سے نفرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی تکلیف یا کوئی بیماری تھی، اسے عربی زبان میں تعریض کہتے ہیں کہ کہنے والا اپنے الفاظ سے کچھ مراد لے اور سننے والے کچھ اور سمجھیں۔ سننے والوں کے لحاظ سے واقعہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر کذب کا لفظ بولا جاتا ہے، مگر یہ حقیقت میں جھوٹ نہیں ہوتا، بلکہ جھوٹ سے بچنے کا ایک طریقہ ہے، جیسا کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: « إِنَّ فِي الْمَعَارِيْضِ لَمَنْدُوْحَةً عَنِ الْكَذِبِ » [ الأدب المفرد : ٨٥٧ ] ''بے شک معاریض میں کذب سے بچنے کی گنجائش ہے۔'' اسی طرح سارہ علیہا السلام کو بہن کہنا بظاہر واقعہ کے خلاف تھا مگر انھیں بہن کہتے وقت اپنی مراد ابراہیم علیہ السلام نے خود بیان فرما دی جو بالکل درست ہے۔ ان دونوں واقعوں میں ابراہیم علیہ السلام نے تعریض سے کام لیا ہے۔ غور کیجیے وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ساری زندگی میں ان تین کے سوا کوئی جھوٹ نہیں بولا، ابراہیم علیہ السلام کو سچا ثابت کر رہی ہے یا جھوٹا؟ چلیں مان ہی لیں کہ اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کا تین دفعہ جھوٹ بولنا واقعی بیان ہوا ہے، پھر بھی اس میں ابراہیم علیہ السلام پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا اور نہ ان کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے، کیونکہ وہ حالت جنگ میں تھے اور جنگ میں جھوٹ بولنا جائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ » [ بخاري، الجهاد و السير، باب الحرب خدعة : ٣٠٢٩ ] ''جنگ دھوکے کا نام ہے۔'' بتایئے! اس میں ابراہیم علیہ السلام کے صدق پر کیا حرف آتا ہے؟

اوپر مذکور بزرگوں نے بڑے زور شور سے یہ بات کہی ہے کہ سند صحیح ہونا کافی نہیں، متن بھی صحیح ہونا ضروری ہے۔ یہ بات فی الواقع درست ہے اور خود محدثین نے اسے حدیث کی صحت کے لیے شرط قرار دیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری اور دوسرے محدثین کو اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کی توہین نظر آتی تو وہ کبھی اسے صحیح قرار نہ دیتے۔ افسوس! ہمارے ان بزرگوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ محدثین ہی بنتے ہیں، اپنی رائے اور قیاس سے ایک نئی شریعت ایجاد کر لینے والے حضرات کے متعلق ان کے دلوں اور قلموں میں بہت نرم گوشہ ہے۔ [ فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى ]

بائبل کے حوالے سے ابراہیم علیہ السلام کی عمر ٧٥ سال اور سارہ کی عمر ٦٥ سال نقل کر کے بھی اس حدیث پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس عمر میں عورت میں کیا حسن باقی رہ جاتا ہے جو شاہ مصر اس پر فریفتہ ہو۔ افسوس! ہمارے یہ حضرات ائمۂ محدثین پر

فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۶۴ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ۝۶۵

تو وہ اپنے دلوں کی طرف لوٹے اور کہنے لگے یقیناً تم خود ہی ظالم ہو ۝۶۴ پھر وہ اپنے سروں پر الٹے کر دیے گئے، بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ۝۶۵

اس قدر خفا ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب کی حدیث انھیں غلط نظر آئی اور وہ کتاب جس میں تحریف کی خود اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور جس کی داخلی شہادتیں اس کے بے شمار جھوٹوں کی نشان دہی کر رہی ہیں، وہ انھیں اس قابل نظر آئی کہ انھوں نے اس کے ساتھ صحیح حدیث رسول ﷺ کو رد کر دیا۔ [ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ]

③ یہاں ایک اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ صحیح بخاری میں مذکور حدیثِ شفاعت میں ہے کہ لوگ جب ابراہیم علیہ السلام کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر جائیں گے تو وہ اپنے تین کذبات کا ذکر کر کے شفاعت سے عذر کر دیں گے۔ اگر یہ جھوٹ نہیں تو ابراہیم علیہ السلام شفاعت سے معذوری کیوں ظاہر کریں گے؟ اہل علم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو جو مرتبہ عطا فرمایا تھا ان کے خیال کے مطابق اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان موقعوں پر بھی تعریض کے بجائے صاف کہتے کہ ہاں، میں نے بت توڑے ہیں اور مشرکین کی عید پر جانے سے بیماری کے عذر کے بجائے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے کہ میں نہیں جاتا۔ اسی طرح جبار مصر کے سامنے صاف کہہ دیتے کہ سارہ میری بیوی ہے، پھر جو آزمائش آتی اس پر صبر کرتے، جس طرح دوسری بہت سی آزمائشوں پر انھوں نے صبر کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں امامت کے رتبے پر سرفراز فرمایا۔ اپنے اس عمل کو اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کے مقابلے میں کمتر سمجھ کر وہ شفاعت سے معذوری ظاہر کریں گے۔ [ أحكام القرآن لابن العربي ] دیکھیے اسی حدیث شفاعت میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام شفاعت سے یہ کہہ کر عذر کر دیں گے کہ لوگوں نے میری پرستش کی، اس لیے مجھے شفاعت کے لیے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔

**آیت 64** فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ...... : ابراہیم علیہ السلام کی اس زبردست چوٹ نے انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سب نے اپنے دل میں غور کیا تو کہہ اٹھے کہ تم اس جوان کو خواہ مخواہ ظالم کہہ رہے ہو، ظالم تو تم خود ہو جو ایسی بے حقیقت چیزوں کو اپنا معبود قرار دے کر پوجتے پکارتے اور انھیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا قرار دیتے ہو، جن کی بے بسی اور بے چارگی کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنے اوپر آنے والی مصیبت کو بھی دفع نہیں کر سکتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے آپ پر گزری ہوئی مصیبت کسی دوسرے کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتے، تو پھر اس سے بڑھ کر ظلم اور حماقت کیا ہو سکتی ہے؟ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان : ۱۳ ] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تم ہی ظالم ہو کہ تم نے اپنے بتوں کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوبست نہیں کیا، مگر پہلا معنی ہی صحیح اور مقام کے مناسب ہے۔

**آیت 65** ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ...... : ” نَكْسٌ “ کا معنی سر کے بل الٹا کرنا ہے، یعنی سر نیچے اور پاؤں اوپر کر دینا،

قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنۡفَعُکُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا یَضُرُّکُمۡ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّکُمۡ وَ لِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَ انۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۶۸﴾

کہا پھر کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمھیں کچھ نفع دیتی ہے اور نہ تمھیں نقصان پہنچاتی ہے؟ ﴿۶۶﴾ اف ہے تم پر اور ان چیزوں پر جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، تو کیا تم سمجھتے نہیں ﴿۶۷﴾ انھوں نے کہا اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو، اگر تم کرنے والے ہو ﴿۶۸﴾

یہ کسی بھی شخص کی بدترین حالت ہے۔ ”نُكِسَ الْوَلَدُ“ جب بچے کی ٹانگیں سر سے پہلے باہر آئیں۔ ”نُكِسَ فِي الْمَرَضِ“ تندرست ہو کر پھر بیمار ہو جانا۔ یعنی اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کا جواب سنتے ہی ان کے دلوں نے فیصلہ کر دیا کہ ظالم تم خود ہو جو ایسے بے حس اور بے بس بتوں کو معبود بنا بیٹھے ہو جو بول کر یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان پر کیا گزری، مگر پھر حق تسلیم کرنے کے بجائے ان پر ضد اور جہالت سوار ہوگئی، جس سے ان کی عقل الٹی ہوگئی اور وہ بغیر کسی حیا کے وہ بات کہنے لگے جس سے ان کی بے وقوفی اور حماقت بالکل واضح ہو رہی تھی۔ ”نُكِسُوْا“ الٹے کر دیے گئے، جیسے کسی چیز نے زبردستی انھیں سر کے بل اوندھا کر دیا ہو، چنانچہ کہنے لگے: ﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ ﴾ ”بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں۔“

**آیت 66** قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... : ابراہیم علیہ السلام اتنے بڑے مجمع میں ان کی زبان سے یہی کہلوانا چاہتے تھے اور سب کچھ اسی ترتیب سے ہو رہا تھا جو ابراہیم علیہ السلام کی توقع اور خواہش کے مطابق تھی۔ ان کے لیے توحید کی دعوت اور شرک کے رد کا ایسا سنہرا موقع شاید اس سے پہلے کبھی نہ آیا ہو، چنانچہ فرمایا کہ جب یہ بول ہی نہیں سکتے تو فائدہ یا نقصان پہنچانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو پھر کیا تم ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو تمھیں نہ کچھ فائدہ پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان؟ ”مَا“ کا لفظ عموماً ان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں عقل نہیں ہوتی۔

**آیت 67** اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ ...... : ”اُفٍّ“ کا اصل معنی ہر گندی سمجھی جانے والی چیز ہے، مثلاً میل، گندگی، ناخن کے تراشے اور اس قسم کی چیزیں۔ یہی لفظ ہر اس شخص یا چیز کے لیے بولا جاتا ہے جس سے اکتاہٹ کا اظہار کرنا اور اسے گندا اور نہایت حقیر قرار دینا مقصود ہو۔ (راغب) ”اُفٍّ“ کی تنوین سے نفرت کی شدت کا اظہار ہو رہا ہے، یعنی میری زبردست نفرت، اکتاہٹ اور تحقیر تم جیسے بے عقلوں کے لیے اور تمھارے بنائے ہوئے معبودوں کے لیے ہے، کیا تم نہیں سمجھتے کہ ایسے بے حس اور بے بس پتھر وغیرہ بھی کبھی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ کوئی ہوش مند انسان ساری کائنات کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرے؟

**آیت 68** ① قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ : یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان دلیل سے لاجواب ہو جاتا ہے تو یا تو نیکی

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾

ہم نے کہا اے آگ! تو ابراہیم پر سراسر ٹھنڈک اور سلامتی بن جا ﴿۶۹﴾

اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے یا بدی غالب آ جاتی ہے۔ بدی کے غلبے کی صورت میں جب اس کے پاس کوئی دلیل نہیں رہتی اور وہ مکمل طور پر لاجواب ہو جاتا ہے تو اپنے مخالف کو دھمکیاں دیتا ہے۔ دیکھیے نوح علیہ السلام کی قوم (شعراء : ۱۱۶)، ابراہیم علیہ السلام کو ان کے والد کی دھمکی (مریم : ۴۶)، لوط علیہ السلام کی قوم (شعراء : ۱۶۷)، شعیب علیہ السلام کی قوم (اعراف : ۸۸)، فرعون کی موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی (شعراء : ۲۹) اور جادوگروں کو دھمکی (شعراء : ۴۹)۔ پھر اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنے لاجواب کر دینے والے حریف کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی جب دلیل میں ہر طرح لاجواب ہو گئی تو ابراہیم علیہ السلام کی جان کے درپے ہو گئی۔ مشورہ ہوا کہ اسے قتل کر دو یا جلا دو۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۲۴) آخر فیصلہ یہ ٹھہرا کہ اپنے معبودوں کا انتقام لینے کی اور ان کی نصرت کی یہی صورت ہے کہ اسے جلا کر راکھ بنا دو۔

❷ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ : یہ الفاظ ان کے ضمیر کی کشاکش کا اظہار کر رہے ہیں کہ اول تو ابراہیم کو نقصان پہنچانے والے تمھارے کسی اقدام کا کوئی جواز نہیں۔ دلیل کا جواب دلیل ہے، مار ڈالنا نہیں، لیکن اگر تمھارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں اور تم نے ضرور ہی اس کے خلاف کچھ کرنا ہے تو پھر معمولی سزا مت سوچو۔ اپنے معبودوں کی مدد کرتے ہوئے اس کا قصہ نہایت عبرت ناک سزا کے ساتھ ختم کرو، تاکہ آئندہ کوئی اس بحث کی جرأت ہی نہ کرے۔ (بقاعی)

آیت 69 ❶ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا...... : "بَرْدًا" ٹھنڈک، "سَلٰمًا" سلامتی۔ مبالغہ کے طور پر مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ اپنے فیصلے کے مطابق انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا زبردست انتظام کیا، چنانچہ لکڑیاں جمع کرنے کے لیے باقاعدہ ایک چار دیواری بنائی گئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴾ [ الصافات : ۹۷ ] "انھوں نے کہا، اس کے لیے ایک عمارت بناؤ، پھر اسے بھڑکتی آگ میں پھینک دو۔" پھر جب آگ خوب بھڑک اٹھی اور اس کی تپش چاروں طرف پھیل گئی تو انھوں نے منجنیق کے ذریعے سے یا جیسے بھی ہو سکا، ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا تو ہم نے حکم دیا کہ اے آگ! ابراہیم پر سراسر ٹھنڈک ہو جا، مگر تکلیف دینے والی ٹھنڈک نہیں، بلکہ ایسی کہ سراسر سلامتی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ صرف "بَرْدًا" (سراسر ٹھنڈک) فرماتے تو شدید ٹھنڈک ابراہیم علیہ السلام برداشت نہ کر سکتے، اس لیے آگ کو ٹھنڈک کے ساتھ سلامتی والی بن جانے کا حکم دیا۔

❷ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کے لیے معجزہ یعنی فطرت کے عام قوانین کے برعکس معاملہ تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سمندر پر اپنی لاٹھی مارنے کا حکم دیا تو سمندر پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ ایک بہت بڑے پہاڑ کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا، فرمایا: ﴿ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴾ [ الشعراء : ۶۳ ] "پس وہ پھٹ گیا تو ہر ٹکڑا بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا۔" جب کہ پانی کی فطرت بہنا ہے، ایسے ہی آگ کی فطرت جلانا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد وہ ابراہیم علیہ السلام

کے لیے گلزار بن گئی۔ اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھ لے: ﴿ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [ آل عمران : ٤٧ ] ''جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے یہی کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔'' اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے آگ کو ''كُوْنِيْ'' (ہو جا) سے خطاب فرمایا، پھر آگ کی کیا مجال تھی کہ ٹھنڈی اور سلامتی والی نہ ہوتی۔ (ثنائی) اگر کسی کو پھر بھی اصرار ہے کہ آگ کا کام جلانا ہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھی ٹھنڈی نہیں ہو سکتی تو اسے قرآن مجید پر ایمان کے دعوے کا تکلف نہیں کرنا چاہیے۔

③ ام شریک رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپکلی کو مار دینے کا حکم دیا اور فرمایا: « وَ كَانَ يَنْفُخُ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ » [ بخاري، الأنبياء، باب قوله تعالٰى: ﴿ واتخذ الله إبراهيم خليلا ..... ﴾ : ٣٣٥٩ ] ''یہ ابراہیم علیہ السلام پر پھونکیں مارتی تھی۔'' محدث عبد الرزاق نے اپنی مصنف (۸۳۹۲) میں معمر عن الزہری عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَانَتِ الضِّفْدَعُ تُطْفِئُ النَّارَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ وَ كَانَ الْوَزَغُ يَنْفُخُ فِيْهِ فَنَهٰى عَنْ قَتْلِ هٰذَا وَ أَمَرَ بِقَتْلِ هٰذَا » ''مینڈک ابراہیم علیہ السلام سے آگ بجھاتے تھے اور چھپکلی اس میں پھونکیں مارتی تھی، سو انھیں قتل کرنے سے منع فرمایا اور اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔'' مسند احمد کے محقق نے لکھا ہے کہ یہ سند شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: « أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ لِلْوَزَغِ الْفُوَيْسِقُ وَلَمْ أَسْمَعْهُ أَمَرَ بِقَتْلِهِ » ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپکلی کو 'فویسق' (بہت نافرمان) فرمایا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے قتل کرنے کا حکم دیتے ہوئے نہیں سنا۔'' اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: « أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَمَرَ بِقَتْلِهِ » ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔'' [ بخاري : ٣٣٠٦ ] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے چھپکلی کو قتل کرنے کی حدیث کسی صحابی کے واسطے سے سنی ہے، اس صورت میں بھی حدیث صحیح ہے، کیونکہ تمام صحابہ روایت حدیث میں معتبر ہیں۔

④ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کا آخری قول، جب انھیں آگ میں پھینکا گیا ''حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ'' تھا، یعنی مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ الذين قال لهم الناس..... ﴾ : ٤٥٦٤ ]

⑤ بغوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ کعب احبار سے روایت کی گئی ہے کہ جب انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں رکھ کر آگ کی طرف پھینکا تو جبریل علیہ السلام آپ کے سامنے آئے اور کہا: ''ابراہیم! تمھیں کوئی حاجت ہے؟'' فرمایا: ''تمھاری طرف تو نہیں۔'' انھوں نے کہا: ''پھر اپنے رب سے سوال کرو۔'' فرمایا: « حَسْبِيْ مِنْ سُؤَالِيْ عِلْمُهٗ بِحَالِيْ » ''مجھے میرے سوال کرنے سے اس کا میری حالت کو جاننا ہی کافی ہے۔'' بغوی نے یہ کہہ کر اس کے ضعف کی طرف اشارہ کر دیا ہے: '' رُوِيَ عَنْ كَعْبٍ '' کہ کعب سے روایت کی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس روایت کا کوئی سر پیر نہیں، اس لیے شیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا: '' لَا أَصْلَ لَهٗ '' [ سلسلة الأحاديث الضعيفة : ٢١ ] اور ابن عراق نے '' تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعة الموضوعة '' میں یہ روایت ذکر کر کے فرمایا: ''ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ روایت موضوع ہے۔'' علاوہ ازیں یہ روایت ان

آیات واحادیث کے بھی خلاف ہے جن میں دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [ المؤمن : ٦٠ ] ''اور تمھارے رب نے فرمایا، مجھے پکارو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ لَمْ يَدْعُ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ » [ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ١٥٣/٦، ح : ٢٦٥٤۔ ترمذی : ٣٣٧٣۔ ابن ماجه : ٣٨٢٧ ] ''جو اللہ تعالیٰ سے دعا نہ کرے اللہ تعالیٰ اس پر غصے ہو جاتا ہے۔''

کعب احبار والی باطل روایت صحیح بخاری کی اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو اوپر گزری کہ ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں پھینکے جانے کے وقت آخری الفاظ '' حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ '' کہے تھے۔ قرآن میں ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی دعائیں مذکور ہیں، اگر دعا کے بجائے اللہ تعالیٰ کا علم ہی کافی ہو تو اللہ تعالیٰ کو تو ہر شخص کی ہر حالت کا علم ہے، پھر اس سے دعا اور سوال کا معاملہ تو سرے سے ختم ہے، حالانکہ دعا اس لیے نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری حالت کا علم نہیں بلکہ دعا خود ایک عبادت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ » [ ترمذي، التفسير، باب ومن سورة البقرة : ٢٩٦٩ ] ''دعا ہی عبادت ہے۔'' اسی حدیث میں ہے کہ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [ المؤمن : ٦٠ ] ''اور تمھارے رب نے فرمایا مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' بعض صوفیاء نے جو اس باطل روایت کو دلیل بنا کر کہا ہے کہ تمھارا اس سے سوال کرنا تمھاری طرف سے اس پر تہمت لگانا ہے، یہ ان کی بہت بڑی گمراہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کو اللہ تعالیٰ پر تہمت لگانا قرار دے رہے ہیں۔ (خلاصہ سلسلہ صحیحہ) شیخ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ ''اضواء البیان'' میں فرماتے ہیں: ''ابو العالیہ سے روایت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ''وَ سَلٰمًا'' نہ فرماتے تو اس کی سردی ان کے لیے اس کی گرمی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور اگر ''عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ'' نہ فرماتے تو اس کی ٹھنڈک ہمیشہ تک باقی رہتی۔ اور سدی سے ہے کہ اس دن جو آگ بھی تھی بجھ گئی۔ اور کعب اور قتادہ سے ہے کہ آگ نے صرف ابراہیم علیہ السلام کو باندھنے والی رسیاں جلائیں۔ اور نہال بن عمرو سے ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''میں ان ایام جیسا خوش حال کبھی نہیں رہا جن دنوں میں آگ میں تھا۔'' اور شعیب حمانی سے ہے کہ انھیں آگ میں ڈالا گیا تو ان کی عمر سولہ (۱۶) سال تھی۔ اور ابن جریج سے ہے کہ اس وقت وہ چھبیس (۲۶) برس کے تھے۔ اور کلبی سے ہے کہ جتنی آگیں تھیں سب ٹھنڈی ہو گئیں، چنانچہ کسی آگ نے ایک کھری تک نہیں پکائی۔ اور بعض نے قصے میں ذکر کیا ہے کہ نمرود نے اپنے محل میں سے جھانکا تو دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام تخت پر ہیں اور سایوں کا فرشتہ ان کا دل لگا رہا ہے، تو اس نے کہا، تیرا رب بہت اچھا رب ہے، میں اس کے لیے چار ہزار گائیں قربانی کروں گا اور پھر اس نے ابراہیم علیہ السلام کو کچھ نہیں کہا۔''

شیخ شنقیطی رحمہ اللہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: ''یہ سب اسرائیلیات ہیں اور مفسرین اس قصے میں اور دوسرے

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾ وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

اور انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال کا ارادہ کیا تو ہم نے انھی کو انتہائی خسارے والے کر دیا ﴿۷۰﴾ اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے جہانوں کے لیے برکت رکھی ﴿۷۱﴾

بہت سے قصوں میں ایسی بہت سی باتیں بیان کر دیتے ہیں۔'' یہاں تھوڑا سا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ سب تابعین اور راوی اس وقت تو موجود ہی نہ تھے جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا، نہ ان پر وحی اتری اور نہ وہ درمیان کی کوئی سند بیان کرتے ہیں، پھر انھیں ان باتوں کا پتا کیسے چلا؟ ظاہر ہے یہ وہی سنی سنائی باتیں ہیں جنھیں تفسیر قرآن میں کسی طرح بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مزید دیکھیے اس تفسیر کا مقدمہ۔

⑥ یہ واقعہ حق کی طرف دعوت اور اس پر استقامت کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ اس میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امتِ مسلمہ کے لیے حق کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کا سبق ہے اور یہ بھی کہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو تمام اسباب ختم ہونے کے باوجود اپنے بندے کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیتا۔

**آیت 70** وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا...... : ''الْاَخْسَرِيْنَ'' اگرچہ اسم تفضیل ہے، مگر یہاں کسی سے زیادہ خسارا اٹھانے والے مراد نہیں، بلکہ یہ خاسرین میں مبالغہ ہے، اس لیے ترجمہ ''انتہائی خسارے والے'' کیا گیا ہے۔ اگر تفضیل کا معنی لیں تو ''اَخْسَرِيْنَ مِنْ كُلِّ خَاسِرٍ'' مراد ہوگا، یعنی ہر خسارے والے سے زیادہ خسارے والے۔ ''كَيْدًا'' خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی سازش ان سے خفیہ رکھی تھی۔ شاید ان کا مقصد یہ ہو کہ ابراہیم علیہ السلام ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ (ابن عاشور) ''فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ'' میں ''هُمْ'' اور ''الْاَخْسَرِيْنَ'' دونوں کے معرفہ ہونے سے قصر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ بس وہی انتہائی خسارے والے ہوئے، ابراہیم علیہ السلام کو ذرہ بھر خسارا نہیں ہوا۔ انھیں خسارے والے (ناکام) اس لیے قرار دیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی کسی بھی دلیل کا جواب نہ دے سکے جس کے ساتھ انھوں نے سورج، چاند اور ستاروں کو بے بس ثابت کیا، یا جس کے ساتھ انھوں نے بادشاہ کا بے اختیار ہونا ثابت کیا، یا بتوں کا معبود نہ ہونا ثابت کیا۔ پھر نہ ان سے بت توڑنے کا انتقام لے سکے اور نہ انھیں آگ میں جلا سکے، بلکہ وہ سب کچھ جو انھوں نے انھیں سزا دینے کے لیے تیار کیا تھا ان کے لیے معجزہ اور ان کی عظمتِ شان کا باعث بن گیا اور انتہائی خسارا یہ کہ اس واقعہ کے بعد اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا، جیسا کہ سورۂ حج میں ان قوموں کا ذکر فرمایا جن پر اللہ کا عذاب آیا، تو ان میں قومِ ابراہیم کا بھی ذکر ہے، آخر میں فرمایا: ﴿ فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ [ الحج : ۴۴ ] ''تو میں نے ان کافروں کو مہلت دی، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا تو میرا عذاب کیسا تھا؟''

**آیت 71** وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا...... : اس واقعہ کو دیکھ کر لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۲۶)

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝

اور ہم نے اسے اسحاق اور زائد انعام کے طور پر یعقوب عطا کیا اور سبھی کو ہم نے نیک بنایا ۝ اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیاں کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے کی وحی بھیجی اور وہ صرف ہماری عبادت کرنے والے تھے ۝

اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھا تھا اسی طرح ابراہیم اور لوط علیہما السلام دونوں کو ان ظالموں کے پنجے سے بحفاظت نکال کر شام کی طرف ہجرت کرنے کی آسانی عطا فرمائی۔ یہ بھی عظیم احسان تھا، کیونکہ وہاں سے ان کا نکلنا آسان نہ تھا۔ شام کی طرف ہجرت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے۔ برکت والی زمین کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱) کی تفسیر۔

آیت 72 ❶ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً : "نَافِلَةً" کا معنی زائد عطیہ ہے۔ اس آیت کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ہم نے اسے اسحاق عطا کیا اور زائد انعام کے طور پر یعقوب (پوتا) عطا کیا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب دونوں زائد انعام کے طور پر عطا کیے۔ مفسر ابن عاشور رحمہ اللہ نے اس کی بہت عمدہ توجیہ فرمائی ہے کہ سورۂ صافات (۱۰۰) میں مذکور ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام ہجرت کے لیے روانہ ہوئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ "اے میرے رب! مجھے (لڑکا) عطا کر جو نیکوں سے ہو۔" فرمایا: ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ [ الصافات : ۱۰۱ ] "تو ہم نے اسے ایک بہت بردبار لڑکے کی بشارت دی۔" یہ بردبار لڑکا اسماعیل علیہ السلام تھے جن کی قربانی کا واقعہ بھی اس مقام پر مذکور ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا تو اسماعیل علیہ السلام کی ولادت سے قبول ہو گئی تھی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسحاق اور یعقوب علیہما السلام جو عطا کیے تو وہ بغیر دعا اور بغیر امید کے عطا فرمائے، اس لیے دونوں کو زائد عطیہ قرار دیا جو اسماعیل علیہ السلام کے بعد بلا طلب عطا ہوئے۔ دونوں کی خوش خبری بھی اکٹھی دی گئی تھی: ﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ [ ھود : ۷۱ ] "تو ہم نے اس (سارہ) کو اسحاق کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی۔"

❷ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ : "كُلًّا" سے مراد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام ہیں، کیونکہ آخری بات انھی کی ذکر ہوئی ہے۔ لوط علیہ السلام کا ذکر ابراہیم علیہ السلام کی معیت کے طور پر آیا ہے، ان کا الگ ذکر آگے آ رہا ہے۔ [ التحریر والتنویر ] "صٰلِحِيْنَ" صلاح فساد کی ضد ہے۔ "صَلَحَ" (ف، ک) درست ہونا، یعنی ہم نے ان تمام پیغمبروں کو درست عقیدے اور درست عمل والا اپنا مکمل فرماں بردار بنایا۔

آیت 73 ❶ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا : یعنی وہ صرف خود ہی ہر لحاظ سے درست اور ہمارے مکمل فرماں بردار

وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىِٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَ اَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور لوط، ہم نے اسے حکم اور علم عطا فرمایا اور اسے اس بستی سے نجات دی جو گندے کام کیا کرتی تھی۔ یقیناً وہ برے لوگ تھے جو نافرمان تھے ﴿۷۴﴾ اور ہم نے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیا، یقیناً وہ نیک لوگوں سے تھا ﴿۷۵﴾ اور نوح کو بھی جب اس نے اس سے پہلے پکارا تو ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، پھر اسے اور اس کے گھر والوں کو بہت بڑی گھبراہٹ سے بچا لیا ﴿۷۶﴾ اور ہم نے ان لوگوں کے خلاف اس کی مدد کی جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، بے شک وہ برے لوگ تھے تو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا ﴿۷۷﴾

---

نہ تھے، بلکہ وہ اپنی قوم کے پیشوا بھی تھے جو ہماری وحی کے مطابق دوسروں کو بھی حق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ معلوم ہوا اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اور جو ائمہ اللہ کے حکم کے بغیر حکم دیں تو وہ ہدایت کے امام نہیں، گمراہی کے امام ہیں۔

② وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ ...... : یعنی صالحیت اور امامت کے علاوہ ہم نے انھیں اپنی وحی سے بھی سرفراز فرمایا۔ ”فِعْلَ الْخَيْرٰتِ“ میں اگرچہ تمام نیک اعمال آ جاتے ہیں مگر اسلام لانے کے بعد اللہ کے حقوق میں سے سب سے اہم عمل نماز اور بندوں کے حقوق میں سے سب سے اہم حق زکوٰۃ کا ذکر خاص طور پر فرمایا، کیونکہ اگر یہ نہیں تو اسلام بھی معتبر نہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۵)۔

③ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ : ”لَنَا“ پہلے آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی وہ صرف ہماری عبادت کرنے والے تھے، کسی اور کو ہمارے ساتھ شریک کرنے والے نہ تھے۔

**آیت 75،74** وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ...... : لوط علیہ السلام کا ذکر الگ کرنے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انھیں پہلے تینوں انبیاء کے علاقے اور قوم کے علاوہ کسی دوسرے علاقے اور قوم کی طرف بھیجا گیا تھا۔ لوط علیہ السلام کا قصہ سورۂ اعراف (۸۰)، ہود (81) اور حجر (61) میں گزر چکا ہے۔ ان کی بستی کے خبیث اعمال کا ذکر گزشتہ سورتوں کے علاوہ سورۂ عنکبوت (۲۸ تا ۳۵) اور سورۂ قمر (۳۳ تا ۳۷) وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ اس بستی کا نام سدوم مشہور ہے۔

**آیت 77،76** ① ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے نجات دینے کے بعد نوح علیہ السلام کو پانی کے طوفان سے نجات دینے کا ذکر فرمایا۔

② وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ...... : نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر سورۂ نوح (۲۶ تا ۲۸) میں تفصیل سے مذکور ہے، اسی طرح سورۂ قمر

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ

اور داؤد اور سلیمان کو، جب وہ کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے، جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے ﴿۷۸﴾ تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا

میں ہے: ﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ [القمر: ۱۰] ”تو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں سو تو بدلہ لے۔“

3 فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ : ”اَهْلَهٗ“ سے مراد ان کے مشرک بیٹے اور بیوی کے سوا باقی گھر والے ہیں۔ بیٹے کے متعلق دیکھیے سورۂ ہود (۴۰ تا ۴۳) اور بیوی کے متعلق سورۂ تحریم (۱۰)۔

4 مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ : ”اَلْكَرْبِ“ کا معنی ہے ”اَقْصَى الْغَمِّ“ یعنی آخری حد کو پہنچا ہوا غم۔ ”اَلْكَرْبِ الْعَظِيْمِ“ سے مراد کفار کی نوح علیہ السلام سے ساڑھے نو سو برس کی مسلسل مخالفت، بدسلوکی، ایذا رسانی، استہزا اور سنگسار کرنے کی دھمکیاں بھی ہیں، جن کا شکوہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور کیا، جو سورۂ نوح کی آیت (۵) سے آیت (۲۴) تک میں مذکور ہے اور جن کا ذکر سورۂ ہود (۳۸) اور شعراء (۱۱۶) میں ہے۔ پہاڑوں جیسی موجوں والا طوفان بھی مراد ہے، جس نے اللہ کے حکم سے زمین پر بسنے والا ایک مشرک بھی باقی نہ چھوڑا۔

5 فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ : اس کی تفصیل سورۂ ہود (۳۷ تا ۴۹) میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 78، 79** 1 وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ...... : ”نَفَشَتْ“ کا معنی ہے جانوروں کا رات کو کھیت میں پھیل جانا اور اس کی کھیتی اور پودوں کو کھا جانا۔ ”غَنَمٌ“ کا لفظ بھیڑ بکری دونوں پر آتا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو عطا کردہ نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلے وہ نعمت ذکر فرمائی جو دونوں کو عطا ہوئی تھی اور جو بعد میں آنے والی تمام نعمتوں سے افضل ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ ”حُكْمًا“ سے مراد قوت فیصلہ ہے اور ”عِلْمًا“ سے مراد علم شریعت ہے۔

2 ان آیات کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں آئی، البتہ ابن جریر نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت کے متعلق فرمایا: «كَرْمٌ قَدْ أَنْبَتَتْ عَنَاقِيْدُهٗ فَأَفْسَدَتْهُ الْغَنَمُ قَالَ فَقَضٰى دَاوٗدُ بِالْغَنَمِ لِصَاحِبِ الْكَرْمِ فَقَالَ سُلَيْمَانُ غَيْرُ هٰذَا يَا نَبِيَّ اللّٰهِ ! قَالَ وَمَا ذٰلِكَ؟ قَالَ تَدْفَعُ الْكَرْمَ إِلٰى صَاحِبِ الْغَنَمِ فَيَقُوْمُ عَلَيْهِ حَتّٰى يَعُوْدَ كَمَا كَانَ وَتَدْفَعُ الْغَنَمَ إِلٰى صَاحِبِ الْكَرْمِ فَيُصِيْبُ مِنْهَا حَتّٰى إِذَا عَادَ الْكَرْمُ كَمَا كَانَ دَفَعْتَ الْكَرْمَ إِلٰى صَاحِبِهٖ وَدَفَعْتَ الْغَنَمَ إِلٰى صَاحِبِهَا قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ : ﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾» [مستدرك: ۲/ ۵۸۸، ح: ۴۱۳۸] ”یہ انگور کی بیلیں تھیں جن کے گچھے نکل چکے تھے، جنھیں بھیڑ بکریوں نے اجاڑ دیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ بھیڑ بکریاں انگور کی بیلوں کے مالک کو دے دی جائیں، تو سلیمان علیہ السلام نے کہا: ”اے اللہ کے نبی! اس کا فیصلہ اور ہے۔“ انھوں نے پوچھا: ”وہ کیا ہے؟“ عرض کی: ”آپ انگور کی بیلیں بھیڑ بکریوں والے کے حوالے کر دیں، وہ ان کی نگہداشت کرے جب تک وہ دوبارہ پہلے جیسی نہ ہو جائیں اور بھیڑ بکریاں انگور کی بیلوں والے کے حوالے کر دیں وہ اس وقت

دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۷۹

کیا اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا، جو تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی اور ہم ہی کرنے والے تھے ۝۷۹

تک ان سے فائدہ اٹھاتا رہے اور جب انگوروں کی بیلیں پہلی حالت پر لوٹ آئیں تو آپ انگوروں کی بیلیں اس کے مالک کے سپرد اور بھیڑ بکریاں اس کے مالک کے سپرد کر دیں۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا۔'' ابن کثیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا: ''حاکم نے اسے روایت کر کے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ (اس سند میں ابو اسحاق کی تدلیس موجود ہے)۔'' دکتور حکمت بن بشیر لکھتے ہیں: ''طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد کا یہی قول نقل فرمایا ہے اور قتادہ اور ابن زید کا یہی قول صحیح سند کے ساتھ مسند عبد الرزاق میں بھی مروی ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم داؤد اور سلیمان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے، یعنی ہمیں اس کی ایک ایک جزئی کا پورا علم ہے۔ اگرچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کی صراحت نہیں کی، تاہم واقعہ کی صورت وہی معلوم ہوتی ہے جو انھوں نے بیان کی ہے۔ اس لیے بھی کہ بائبل میں اس واقعہ کا ذکر نہیں اور نہ یہ یہودی لٹریچر میں معروف ہے اور پھر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسرائیلیات بیان کرنے میں معروف بھی نہیں ہیں۔

③ داؤد اور سلیمان علیہما السلام دونوں میں سے ہر ایک کا فیصلہ ان کا اجتہاد تھا، کیونکہ اگر وہ وحی سے ہوتا تو داؤد علیہ السلام کے فیصلے کے بعد اور فیصلے کی گنجائش نہ ہوتی۔ انبیاء بھی اجتہاد فرماتے ہیں مگر ان کے اجتہاد اور دوسرے لوگوں کے اجتہاد میں یہ فرق ہے کہ انبیاء کے اجتہاد میں اگر کوئی خطا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کر دیتا ہے، جیسا کہ یہاں سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کے ساتھ اس کی اصلاح فرما دی اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ﴾ [ التوبة : ۴۳ ] ''اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انھیں کیوں اجازت دی۔'' اور فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ﴾ [ التحريم : ۱ ] ''اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟'' اگر کسی بات پر اللہ تعالیٰ خاموشی اختیار فرمائے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی موافقت کی وجہ سے حق ہوتی ہے اور وحی کا حکم رکھتی ہے، یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [ النجم : ۳، ۴ ] کا۔ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی مجتہد کی خطا کی بذریعہ وحی اصلاح نہیں ہوتی، اس لیے ان کے اجتہادات شریعت میں حجت نہیں ہیں۔

④ مسئلہ: اگر کسی کے جانور دن کے وقت کسی دوسرے کے کھیت یا باغ کو چر جائیں تو جانور والے پر کوئی تاوان نہیں ہے اور اگر رات کے وقت چر جائیں تو جس قدر نقصان ہو اس قدر تاوان جانور والے کے ذمے ہوگا، جیسا کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری ایک اونٹنی تھی جو بہت نقصان کیا کرتی تھی، ایک دفعہ وہ ایک باغ میں داخل ہو گئی اور وہاں نقصان کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں بات کی گئی تو آپ نے فیصلہ فرمایا: ''دن کے وقت باغات کی نگرانی اور حفاظت ان کے مالکوں کے ذمے ہے اور رات کے وقت جانوروں کی نگرانی ان کے مالکوں کے ذمے ہے اور رات کے وقت جانور جو نقصان کر جائیں تو وہ ان کے مالکوں کے ذمے ہے (کہ اسے پورا کریں)۔'' [ أبو داوٗد، الإجارة، باب المواشي تفسد زرع

قوم : ٣٥٧٠۔ ابن ماجه : ٢٣٣٢۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٢٣٧/٦، ح : ٢٣٨ ] بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جانور والے پر کسی صورت تاوان نہیں ہے اور دلیل میں "اَلْعَجْمَاءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ" (جانور کا کسی کو زخمی کر دینا معاف ہے ) پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس حدیث میں صرف زخم کے معاف ہونے کا ذکر ہے، کھیت کے نقصان کے معاف ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا براء بن عازب رضی اللہ عنہ والی حدیث میں اور اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ براء رضی اللہ عنہ کی حدیث کو منسوخ کہا جائے۔ (قرطبی)

5 اس آیت سے اس حدیث کی تائید ہوتی ہے جو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ » [ بخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب أجر الحاكم إذا اجتهد...... : ٧٣٥٢ ] ''جب حاکم فیصلہ کرے اور پوری کوشش کرے، پھر درست فیصلہ کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جب وہ فیصلہ کرے اور پوری کوشش کرے، پھر خطا کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔'' یہاں اللہ تعالیٰ نے اگرچہ "فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ" (ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا) کہہ کر سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کی تائید فرمائی، مگر داؤد اور سلیمان دونوں کے متعلق فرمایا: ﴿ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾ کہ ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا۔

6 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سلیمان علیہ السلام کے کمال فہم و ذکاوت کا ایک اور واقعہ روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَانَتِ امْرَأَتَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا جَاءَ الذِّئْبُ فَذَهَبَ بِابْنِ إِحْدَاهُمَا فَقَالَتْ صَاحِبَتُهَا إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ، وَقَالَتِ الْأُخْرٰى إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ، فَتَحَاكَمَتَا إِلَى دَاوٗدَ فَقَضٰى بِهِ لِلْكُبْرٰى، فَخَرَجَتَا عَلٰى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوٗدَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ فَأَخْبَرَتَاهُ فَقَالَ ائْتُوْنِيْ بِالسِّكِّيْنِ أَشُقُّهُ بَيْنَهُمَا، فَقَالَتِ الصُّغْرٰى لَا تَفْعَلْ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، هُوَ ابْنُهَا، فَقَضٰى بِهِ لِلصُّغْرٰى » [ بخاري، الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ : ﴿ ووهبنا لداوٗد سليمان ...... ﴾ : ٣٤٢٧۔ مسلم : ١٧٢٠۔ نسائي : ٥٤٠٥ ] ''دو عورتیں تھیں جن کے پاس ان کے بیٹے تھے۔ بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کے بیٹے کو لے گیا۔ وہ اپنی ساتھی عورت سے کہنے لگی کہ وہ تو تمھارا بیٹا لے گیا ہے۔ دوسری کہنے لگی، وہ تمھارا بیٹا ہی لے گیا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں فیصلے کے لیے داؤد علیہ السلام کے پاس آگئیں۔ انھوں نے اس کا فیصلہ بڑی کے حق میں کر دیا۔ دونوں جاتے ہوئے سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے پاس سے گزریں تو انھیں یہ بات بتائی، انھوں نے فرمایا: ''میرے پاس چاقو لاؤ، میں اسے دونوں کے درمیان چیر دوں۔'' تو چھوٹی نے کہا: ''ایسا نہ کریں، اللہ آپ پر رحم کرے، یہ اسی کا بیٹا ہے۔'' چنانچہ انھوں نے اس کا فیصلہ چھوٹی کے حق میں کر دیا۔'' امام نسائی نے اس حدیث پر باب باندھا ہے کہ حاکم کے لیے گنجائش ہے کہ جو کام اس نے نہیں کرنا، اس کے متعلق کہے کہ میں ایسا کرتا ہوں، تاکہ حق واضح ہو جائے۔

7 اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات بیٹا باپ سے زیادہ بات سمجھ لیتا ہے، اس میں کفار عرب کے لیے بھی سبق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے باوجود آبا و اجداد کی رسوم چھوڑنے پر تیار نہ تھے اور ان مقلدین کے لیے بھی جنھوں نے چار اماموں کے بعد اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند کر دیا ہے۔ بتائیے اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے فیض عام کی توہین اور کیا ہو گی؟

8 وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ : اس سے پہلے ابراہیم اور نوح علیہما السلام کی خاطر آگ اور پانی کو مسخر کرنے کا ذکر فرمایا تھا۔ اب داؤد اور سلیمان علیہما السلام دونوں پر مشترکہ نعمت حکم و علم کا ذکر کرنے کے بعد دونوں کو عطا کردہ نعمتیں الگ الگ

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝۸۰ وَ لِسُلَيْمٰنَ

اور ہم نے اسے تمھارے لیے زرہ بنانا سکھایا، تاکہ وہ تمھاری لڑائی سے تمھارا بچاؤ کرے۔ تو کیا تم شکر کرنے

ذکر فرمائیں۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر اور پابند کر دیا اور انھیں اتنی خوبصورت آواز عطا فرمائی کہ جب وہ اللہ کی کتاب زبور پڑھتے یا تسبیح کرتے تو پہاڑ اور پرندے بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے۔ سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ ﴾ [ سبا : ۱۰ ] ''اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کو دہراؤ اور پرندوں کو بھی (یہی حکم دیا)۔'' سورۂ صٓ میں فرمایا: ﴿ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ۝ وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾ [ صٓ : ۱۸، ۱۹ ] ''بے شک ہم نے پہاڑوں کو اس کے ہمراہ مسخر کر دیا، وہ دن کے پچھلے پہر اور سورج چڑھنے کے وقت تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی، جب کہ وہ اکٹھے کیے ہوتے، سب اس کے لیے رجوع کرنے والے تھے۔'' سبحان اللہ! وہ کیسا حسین منظر ہوگا جب اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی مصروف تسبیح ہوتے ہوں گے۔ بعض لوگوں نے پہاڑوں کی تسبیح کا مطلب داؤد علیہ السلام کی بلند اور سریلی آواز سے ان کا گونج اٹھنا اور پرندوں کی تسبیح سے مراد ان کا ٹھہر جانا قرار دیا ہے، مگر درحقیقت یہ پہاڑوں اور پرندوں کی ان کے ہمراہ تسبیح کو ناممکن سمجھ کر اس کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز داؤد علیہ السلام پر خاص نعمت کے طور پر ذکر فرمائی ہے، پہاڑوں کی گونج تو ہر بلند آواز سے پیدا ہوتی ہے، اچھی ہو یا بری، اس میں داؤد علیہ السلام کی خصوصیت کیا ہوئی؟ اس لیے صحیح معنی یہی ہے کہ پہاڑ اور پرندے فی الواقع ان کے ہمراہ تسبیح کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴۴)۔

❾ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ: یعنی تعجب مت کرو کہ وہ پہاڑ اور پرندے کیسے بولتے اور تسبیح کرتے تھے، یہ سب کچھ ہمارے کرنے سے ہوتا تھا۔ (کبیر)

**آیت 80** وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ......: ''لَبُوْسٍ'' اور ''لِبَاسٌ'' ایک ہی ہے جو موقع کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، چنانچہ لڑائی کا لباس زرہ ہے۔ یہ داؤد علیہ السلام پر تیسرا انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہمراہ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کرنے کے علاوہ ان کے لیے لوہے کو بھی نرم کر دیا اور انھیں اس کی تاروں اور حلقوں سے زرہیں بنانے کا ہنر سکھایا۔ چنانچہ اتنی ہلکی اور عمدہ زرہیں بنانے کے موجد وہی ہیں۔ انھی سے دوسروں نے یہ فن سیکھا۔ یہ نعمت صرف انھی پر نہیں تھی، بلکہ قیامت تک تمام لڑنے والوں کے لیے نعمت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر لازم ہے، تو کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ یہ سوال دراصل شکر کے حکم کی تاکید ہے۔ داؤد علیہ السلام کے متعلق مزید دیکھیے سورۂ سبا (۱۰، ۱۱) اور سورۂ صٓ (۱۷ تا ۲۶)۔

**آیت 81** ❶ وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً: اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا تو اس نے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو چھوڑ کر ان کی ساری قوم کو غرق کر دیا۔ آگ کو حکم دیا تو وہ ابراہیم علیہ السلام پر برد و سلام بن گئی۔ داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا، فرمایا: ﴿ وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ﴾ [ الأنبیاء : ۷۹ ] مگر پانی یا آگ کو نوح

الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾

والے ہو؟ ﴿۸۰﴾ اور سلیمان کے لیے ہوا (مسخر کر دی) جو تیز چلنے والی تھی، اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے ﴿۸۱﴾

---

یا ابراہیم علیہ السلام کے تابع فرمان نہیں کیا، نہ پہاڑوں یا پرندوں کو داؤد علیہ السلام کے حکم کا پابند کیا، مگر سلیمان علیہ السلام کا خاصہ یہ ہے کہ ہوا ان کے حکم کے تابع کر دی گئی، فرمایا: ﴿ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ ﴾ کہ وہ اس کے حکم سے چلتی تھی۔

❷ ”عَاصِفَةً“ کا معنی ہے ”شَدِيْدَةُ الْهُبُوْبِ“ بہت سخت تیز چلنے والی ہوا۔ سورۂ صٓ میں فرمایا: ﴿ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴾ [ صٓ : ۳۶ ] ”تو ہم نے اس کے لیے ہوا کو تابع کر دیا، جو اس کے حکم سے بہت نرم چلتی تھی، جہاں کا وہ ارادہ کرتا تھا۔“ اور سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿ وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ﴾ [ سبا : ۱۲ ] ”اور (ہم نے) ہوا کو سلیمان کے (تابع کر دیا) پہلے پہر اس کا چلنا ایک ماہ کا تھا اور پچھلے پہر اس کا چلنا بھی ایک ماہ کا۔“ یہاں ایک سوال ہے کہ ایک جگہ اس کو تند و تیز بتایا، دوسری جگہ نہایت نرم؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس ہوا میں دونوں خوبیاں موجود ہوتی تھیں، تند و تیز اتنی کہ صبح کے وقت چند گھنٹوں میں ایک ماہ کا سفر طے کر لیتی، اسی طرح پچھلے پہر بھی چند گھنٹوں میں اتنا ہی سفر طے کر لیتی اور نرم اور ہموار اتنی کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں کو کوئی تکلیف یا جھٹکا محسوس نہ ہوتا۔

❸ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا: قرآن مجید میں ارض مبارک شام کو کہا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل۔ اس آیت میں سلیمان علیہ السلام کے اپنے کسی بھی سفر سے ان کے دار الحکومت شام کی طرف واپسی کا ذکر ہے، کیونکہ بعض اوقات آدمی سفر میں جاتے ہوئے بہت دور پہنچ جاتا ہے اور واپسی اس کے لیے مشکل ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہوا سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ارض مبارک کی طرف چلتی تھی۔ رہا سلیمان علیہ السلام کا دوسرے مقامات کی طرف جانا، تو اس کا ذکر سورۂ صٓ (۳۶) میں ہے کہ ہوا ان کے حکم سے اسی طرف چل پڑتی تھی جہاں ان کا ارادہ ہوتا، جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا ہے۔

❹ ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کرنے سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس سے ہوا کا ان کے بحری بیڑوں کے موافق چلنا مراد لیا ہے، کیونکہ اس زمانے میں بحری جہازوں کا چلنا موافق ہوا پر موقوف تھا۔ یہ حضرات بائبل کا حوالہ دیتے ہیں۔ بعض تابعین نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کی افواج لکڑی کے بہت لمبے چوڑے چبوترے پر بیٹھ جاتے تو سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ہوا انھیں اٹھا کر ان کی منزل مقصود کی طرف چل پڑتی۔ بعض نے اس طرح کے ایک مربع میل قالین کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے ان میں سے کوئی صاحب بھی موقع پر موجود نہیں تھا اور نہ انھوں نے اپنی معلومات کا کوئی ذریعہ بیان کیا ہے۔ رہی بائبل، تو اس کی حیثیت مقدمے میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ صٓ میں ذکر فرمایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے دعا کی تھی: ﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ﴾ [ صٓ : ۳۵ ] ”اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔“ اس دعا کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ہوا ان کے تابع کر دی کہ ان

وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۟ۙ

اور کئی شیطان جو اس کے لیے غوطہ لگاتے تھے اور اس کے علاوہ کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے ﴿۸۲﴾

کے حکم سے وہ جہاں کا ارادہ کرتے چل پڑتی تھی۔ آج کل انسان مہینوں کا سفر گھنٹوں میں ہوائی جہاز کے ذریعے سے طے کر رہا ہے، اگر سمندری سفر کی تیزی ہی مراد ہو تو یہ وہ سلطنت تو ہرگز نہیں جو سلیمان علیہ السلام کے بعد کسی کے لائق ہی نہیں۔ کیونکہ ہوائی جہاز سمندر ہی نہیں خشکی کو بھی عبور کرتے چلے جا رہے ہیں اور وہ تقریباً ہر ملک میں موجود ہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان کے لیے ہوا کی وہ تسخیر ہوائی جہازوں اور اس قسم کے آلات کی محتاج نہ تھی، بلکہ وہ اس سے بہت اعلیٰ چیز تھی جس کی بدولت وہ ہوا کے ذریعے سے سمندروں اور خشکی پر مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے ہوئے جہاں چاہتے چلے جاتے تھے۔ اس کی تفصیل اگر انسان کی سمجھ میں آ سکتی یا اس کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ بیان فرما دیتا، ہمیں اتنا ہی کافی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا۔

5 وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ: یہ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تند و تیز ہوا نہایت نرمی سے چلتی ہوئی سلیمان علیہ السلام کو لے کر مہینوں کا سفر پہروں میں طے کر لے؟ فرمایا، ہم ہمیشہ سے ہر چیز کا علم رکھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔

**آیت 82** 1 وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ: اللہ تعالیٰ نے ہوا کے علاوہ کئی شیطان جن بھی سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیے۔ گویا عناصر اربعہ میں سے ہوا کے علاوہ آگ سے بنی ہوئی کچھ مخلوق بھی ان کے تابع فرمان کر دی گئی، پھر اس مخلوق کے ذریعے سے غوطہ خوری کے ساتھ بہت سے سمندری منافع حاصل کرنے کی استطاعت بخشی اور انھی کے ذریعے سے مٹی اور اس سے نکلنے والے پتھر وغیرہ سے ہر وہ چیز بنانا ان کی دسترس میں کر دیا جو وہ بنانا چاہتے تھے۔ گویا تسخیر عناصر کی عجیب نعمت انھیں عطا فرمائی گئی۔ (بقاعی) بعض منحرف مفسرین کا کہنا ہے کہ شیاطین کا لفظ جن و انس دونوں پر آ جاتا ہے، جیسا کہ سورۂ انعام (۱۱۲) میں "شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ" کا ذکر ہے، اس لیے دراصل یہ سرکش اور قوی قسم کے دیہاتی لوگ تھے، جن سے سلیمان علیہ السلام غوطہ خوری اور عمارات کی تعمیر کا کام لیتے تھے۔ مگر سورۂ سبا میں صراحت ہے: ﴿ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [ سبا : ۱۲، ۱۳ ] "اور جنوں میں سے کچھ وہ تھے جو اس کے سامنے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے کجی کرتا ہم اسے بھڑکتی آگ کا کچھ عذاب چکھاتے تھے۔ وہ اس کے لیے بناتے تھے جو وہ چاہتا تھا، بڑی بڑی عمارتیں، مجسمے اور حوضوں جیسے لگن اور ایک جگہ جمی ہوئی دیگیں۔ اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے عمل کرو۔ اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔" سورۂ سبا (۱۴) ہی میں ذکر ہے کہ ان جنوں کے متعلق بعض لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ غیب دان ہیں

مگر جنوں کو سلیمان علیہ السلام کی وفات کا علم اس وقت تک نہ ہوا جب تک دیمک نے ان کی لاٹھی کو کھا نہیں لیا، پھر جب سلیمان علیہ السلام گرے تو جنوں کی حقیقت کھل گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلیل عذاب (عمارتیں وغیرہ بنانے کے کام) میں نہ رہتے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غوطہ خوری اور دوسرے دشوار کاموں کے لیے جنوں میں سے کچھ شیاطین کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کیا تھا، ورنہ دیہاتی سرکش اور قوی انسان تو سلیمان علیہ السلام سے پہلے بھی عمارتیں بناتے تھے اور اب بھی بناتے ہیں، پھر سلیمان علیہ السلام کی وہ بے مثال سلطنت کیا ہوئی جس جیسی سلطنت ان کے بعد کسی کے لائق ہی نہیں ہے۔

❷ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذٰلِكَ : اس کی تفصیل کچھ پچھلے فائدے میں گزری ہے، کچھ سورۂ سبا (۱۲ تا ۱۴) میں آئے گی۔

❸ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ : یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی قدرت سے سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا اور خود ان کی حفاظت فرمائی کہ نہ وہ بھاگ سکتے تھے، نہ ان کی نافرمانی کر سکتے تھے، نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے تھے اور نہ کوئی چیز یا کوئی کام خراب کر سکتے تھے، کیونکہ جو ان کے حکم سے ذرا بھی سرتابی کرتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بھڑکتی ہوئی آگ سے سزا دی جاتی، فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ [ سبا : ۱۲ ] ''اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے کجی کرتا ہم اسے بھڑکتی آگ کا کچھ عذاب چکھاتے تھے۔'' اور جو زیادہ ہی سرکشی دکھانے والے تھے انھیں بیڑیوں میں اکٹھے جکڑنے کا بندوبست موجود تھا، فرمایا: ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ [ ص : ۳۸ ] ''اور کچھ اوروں کو بھی (تابع کر دیا) جو بیڑیوں میں اکٹھے جکڑے ہوئے تھے۔'' ظاہر ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا، ورنہ انسان کی کیا بساط کہ اتنی خوفناک قوتوں کو قابو میں رکھ سکے۔

❹ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کے تابع جو جن کیے گئے تھے وہ کافر تھے، کیونکہ شیطان کا کفر معلوم ہے۔ اگر وہ مسلمان ہوتے تو خود ہی اللہ کے پیغمبر کے تابع ہو جاتے، پھر ان کی خاص حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔

❺ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد اگر کوئی شخص کوئی جن پکڑ لے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ فطر کی حفاظت کرتے ہوئے تین دفعہ شیطان کو پکڑا تھا، تو اللہ کی طرف سے اس کے لیے ان کے نقصان سے حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سرکش جن کو پکڑ کر چھوڑ دیا تھا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرماتے ہیں: «إِنَّ عِفْرِيْتًا مِّنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ عَلَيَّ الْبَارِحَةَ لِيَقْطَعَ عَلَيَّ صَلَاتِيْ فَأَمْكَنَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ فَأَخَذْتُهُ فَأَرَدْتُ أَنْ أَرْبُطَهُ عَلٰى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ حَتّٰى تَنْظُرُوْا إِلَيْهِ كُلُّكُمْ ، فَذَكَرْتُ دَعْوَةَ أَخِيْ سُلَيْمَانَ : ﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ﴾ [ ص : ۳۵ ] فَرَدَدْتُهُ خَاسِئًا» [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ ووهبنا لداوٗد سليمان ...... ﴾ : ۳٤۲۳ ] ''ایک سرکش جن گزشتہ رات مجھ پر حملہ آور ہوا، تاکہ مجھ پر میری نماز قطع کر دے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو دے دیا اور میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں، تاکہ تم سب اسے دیکھو، پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی دعا یاد آ گئی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ﴾ ''اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔'' تو میں نے اسے دفع دور کرتے ہوئے پیچھے دھکیل دیا۔''

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا

اور ایوب، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک میں، مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہے ﴿۸۳﴾ تو ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، پس اسے جو بھی تکلیف تھی دور کر دی اور اسے اس کے گھر

آیت 84،83 ❶ وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ ...... : یعنی ایوب کو یاد کرو۔ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی آزمائش ان نعمتوں کے ساتھ ہوئی جن پر شکر واجب تھا، جبکہ ایوب علیہ السلام کی آزمائش ایسی تکالیف کے ساتھ ہوئی جن پر صبر لازم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شکر اور صبر لازم وملزوم ہیں۔ صبر وہی کر سکتا ہے جو شاکر ہو اور شکر وہی کرتا ہے جو صابر ہو۔ بے صبرا شاکر نہیں ہوتا اور ناشکرا صابر نہیں ہوتا۔ ان کا واقعہ قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک یہاں سورۂ انبیاء میں اور ایک سورۂ ص (۴۱ تا ۴۴) میں۔ ایک دفعہ زیر تفسیر آیات کا ترجمہ ملاحظہ کریں، ساتھ ہی سورۂ ص کی آیات کا ترجمہ دیکھیں، وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کر جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک شیطان نے مجھے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے۔ اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے اور ہم نے اسے اس کے گھر والے عطا کر دیے اور ان کے ساتھ اتنے اور بھی، ہماری طرف سے رحمت کے لیے اور عقلوں والوں کی نصیحت کے لیے۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایوب علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اللہ کی طرف سے ان پر ایسی آزمائش آئی کہ وہ شدید اور لمبی بیماری میں مبتلا ہو گئے، ان کے اہل وعیال بھی جدائی یا فوت ہونے کی وجہ سے ان سے جدا ہو گئے۔ (ثنائی) جب کمانے والے ہی نہ رہے تو مال مویشی بھی ہلاک ہو گئے، مگر ایوب علیہ السلام نے ہر مصیبت پر صبر کیا، نہ کوئی واویلا کیا اور نہ کوئی حرف شکایت لب پر لائے۔ جب تکلیف حد سے بڑھ گئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ ایک یہ کہ اے میرے رب! مجھے شیطان نے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے۔ دوسری یہ کہ اے میرے رب! مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہے۔ اس دعا میں انھوں نے اپنی حالت زار بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ارحم الراحمین ہونے کے بیان ہی کو کافی سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا کہ زمین پر اپنا پاؤں مارو۔ انھوں نے پاؤں مارا تو ٹھنڈے پانی کا چشمہ نمودار ہو گیا۔ حکم ہوا کہ اسے پیو اور اس سے غسل کرو۔ وہ مبارک پانی پینے اور اس کے ساتھ غسل کرنے سے ان کی ساری بیماری دور ہو گئی اور وہ پوری طرح صحت مند ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے گھر والے بھی عطا فرما دیے اور اتنے ہی اور عطا فرما دیے۔ بیماری کے دوران انھوں نے کسی پر ناراض ہو کر اسے کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی، اب وہ سزا زیادہ سمجھ کر پریشان تھے کہ اسے اتنے کوڑے ماروں تو زیادتی ہوتی ہے، نہ ماروں تو قسم ٹوٹتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ مشکل بھی حل فرما دی کہ اتنے تنکوں کا مٹھا لے کر ایک دفعہ مار دو، جتنے کوڑے مارنے کی تم نے قسم کھائی تھی، اس سے تمھاری قسم پوری ہو جائے گی، قسم توڑنے کا گناہ نہیں ہوگا۔

❷ ''اَلضَّرُّ'' اور ''اَلضُّرُّ'' میں فرق یہ ہے کہ ضاد کے فتحہ کے ساتھ ''ضَرٌّ'' نفع کی ضد ہے، اس سے مراد کوئی بھی نقصان ہے،

مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّ اٰتَيۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَ مِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَ ذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ ﴿۸۴﴾

والے اور ان کے ساتھ ان کی مثل (اور) عطا کر دیے، اپنے پاس سے رحمت کے لیے اور ان لوگوں کی یاددہانی کے لیے جو عبادت کرنے والے ہیں ﴿۸۴﴾

مالی ہو یا جانی یا کوئی اور، جبکہ ضاد کے ضمہ کے ساتھ "ضُرٌّ" سے مراد آدمی کی جسمانی بدحالی ہے، مثلاً بیماری، لاغری یا بڑھاپا وغیرہ۔ (اعراب القرآن از درویش)

③ ایوب علیہ السلام نے شدید تکلیف دہ بیماری اور اموال و اولاد کی ہلاکت جیسے مصائب کی آزمائش میں جس طرح صبر کیا، پھر جس طرح انھوں نے اللہ کی جناب میں اپنی حالت زار کا ذکر کر کے اس کے ارحم الراحمین ہونے کے واسطے سے دعا کی اور جسے شرف قبولیت عطا ہوا، اس سے چند اسباق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شدید بیماری اور مال و اہل کی تباہی کے ساتھ آزمائش اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی، اسی طرح اس پر صبر کی توفیق دینا، پھر دعا قبول فرما کر صحت سے نوازنا اور دگنے اہل و عیال عطا فرمانا، سب کچھ اللہ کی عظیم رحمت تھی۔ دوسرا یہ کہ اس میں عبادت گزار بندوں کے لیے یاددہانی ہے کہ اگر اللہ کے بندوں کا مصائب کے ذریعے سے امتحان ہو اور وہ اس پر صبر کریں اور اللہ تعالیٰ ہی کی جناب میں اپنی فریاد پیش کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ملتا ہے اور آدمی کے گمان سے بھی بہت زیادہ ملتا ہے۔ یہاں "ذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ" فرمایا، جبکہ سورۂ ص (۴۳) میں "ذِكۡرٰى لِاُولِي الۡاَلۡبَابِ" فرمایا، معلوم ہوا عبادت کرنے والے ہی عقل والے ہیں، جو بندگی نہیں کرتے وہ کتنے ہی ہوشیار نظر آئیں، عقل سے خالی ہیں۔ تیسرا یہ کہ آزمائش میں صبر اور اللہ تعالیٰ ہی سے بار بار رجوع اور استغاثہ و فریاد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کی تعریف میں تین جملے ارشاد فرمائے: ① ﴿ اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا ﴾ "ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا۔" ② ﴿ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ﴾ "وہ بہت اچھا بندہ تھا۔" ③ ﴿ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾ "یقیناً وہ بہت رجوع کرنے والا تھا۔" اس سے معلوم ہوا کہ آزمائش میں کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شاباش بھی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تحسین و آفرین ایوب علیہ السلام کے حق میں بہت ہی بڑی شہادت ہے۔

④ دکتور محمد بن محمد ابو شہبہ رحمہ اللہ اپنی کتاب "اَلۡاِسۡرَائِيۡلِيَاتُ وَالۡمَوۡضُوۡعَاتُ فِيۡ كُتُبِ التَّفۡسِيۡرِ" میں لکھتے ہیں کہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت فرمایا: "وہب بن منبہ سے ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں ایک لمبا قصہ روایت کیا گیا ہے، جسے ابن جریر نے اور ابن ابی حاتم نے سند کے ساتھ اس (وہب بن منبہ) سے نقل کیا ہے۔ بعد میں آنے والے کئی ایک مفسرین نے بھی اسے ذکر کیا ہے۔ اس واقعہ میں غرابت ہے، ہم نے لمبا ہونے کی وجہ سے اسے ترک کر دیا ہے۔" ابو شہبہ فرماتے ہیں: "عجیب بات یہ ہے کہ روایات پر نقد کرنے والے حافظ ابن کثیر بھی ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں انھی باتوں میں پڑ گئے ہیں جن میں دوسرے حضرات پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہاں بہت سی اسرائیلیات ذکر فرمائی ہیں، جن پر کوئی تعاقب نہیں فرمایا، حالانکہ ان کے متعلق ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ ایسی جو بات بھی ذکر فرماتے ہیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ

کہاں سے آئی اور اسلامی روایات میں کیسے داخل ہوئی؟ میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان روایات کو (بلانقد) بیان کرنا جائز سمجھتے ہوں۔ چنانچہ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ”ان کے سارے بدن میں جذام (کوڑھ) ہوگیا اور ان کے دل اور زبان کے سوا کوئی چیز سلامت نہ رہی، جن کے ساتھ وہ اللہ عزوجل کا ذکر کرتے تھے، یہاں تک کہ پاس بیٹھنے والوں کو ان سے نفرت ہوگئی اور انھیں شہر کے ایک کونے میں الگ رہائش رکھنا پڑی۔ ان کی بیوی کے سوا ان پر شفقت کرنے والا کوئی نہ رہا، جس نے ان کی آزمائش کے دوران ناقابل بیان مصیبتیں اٹھائیں، حتیٰ کہ وہ محنت مزدوری کرنے لگیں، بلکہ انھوں نے اسی وجہ سے اپنے بال بھی فروخت کر دیے۔“ پھر ذکر فرماتے ہیں: ”بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس آزمائش میں بہت لمبی مدت تک مبتلا رہے۔ پھر اختلاف ہے کہ انھیں اس دعا کے لیے بے قرار کرنے کا باعث کیا تھا؟ چنانچہ حسن بصری اور قتادہ نے کہا، ایوب علیہ السلام سات سال اور کچھ مہینے آزمائش میں مبتلا رہے، اس عرصے میں انھیں کوڑا پھینکنے کی جگہ میں ڈال دیا گیا اور ان کے بدن میں کیڑے پڑ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف دور فرمائی اور انھیں اجر عظیم عطا فرمایا اور ان کی بہت اچھی تعریف فرمائی۔ اور وہب بن منبہ نے کہا کہ آپ تین سال تکلیف میں مبتلا رہے، نہ زیادہ نہ کم۔ سُدّی نے کہا، ایوب علیہ السلام کا گوشت جھڑ گیا، صرف ہڈیاں اور پٹھے باقی رہ گئے۔“ پھر ایک لمبا قصہ ذکر کیا، پھر ابن کثیر نے وہ واقعہ ذکر فرمایا جو ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے عن الزہری عن انس بن مالک روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نبی ایوب علیہ السلام پر ان کی آزمائش اٹھارہ برس رہی۔ دور و نزدیک کے سب لوگوں نے انھیں چھوڑ دیا۔ ان کے دوستوں بھائیوں میں سے صرف دو آدمی صبح اور شام ان کے پاس آتے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا، جانتے ہو! اللہ کی قسم! ایوب نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جو دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ ساتھی نے کہا، وہ کیا ہے؟ اس نے کہا، اٹھارہ سال ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم نہیں کیا کہ اس کی تکلیف دور کر دیتا۔ جب شام کو دونوں ان کے پاس گئے تو اس آدمی نے اس بات کا ذکر کر دیا۔ ایوب علیہ السلام نے کہا، مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہاں یہ بات اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرتا جو جھگڑ رہے ہوتے، جس میں وہ اللہ کا ذکر کرتے تو میں گھر آ کر ان کی طرف سے کفارہ دے دیتا کہ کہیں وہ ناحق اللہ کا ذکر نہ کر رہے ہوں۔ اور وہ حاجت کے لیے باہر جایا کرتے تھے، جب فارغ ہو جاتے تو ان کی بیوی ہاتھ پکڑ کر لے آتی۔ ایک دن اس نے آنے میں دیر کی تو اسی جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی:

﴿ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴾ [ صٓ : ۴۲ ] ”اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے۔“

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایوب علیہ السلام کے قصے میں سب سے صحیح روایت وہ ہے جو ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بیان کی ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، پھر یہ روایت بیان کی۔ شیخ ناصر الدین البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ (سلسلہ صحیحہ: ۱۷) مگر صحیح بات یہی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر کے قول سے اس کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہوتا، صرف دوسری روایتوں سے اس کا بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان کی مراد اس حدیث کا صحیح ہونا ہو تب بھی ان کی بات محل نظر ہے۔

ابن کثیر نے ” اَلْبِدَايَةُ وَالنِّهَايَةُ “ میں ایوب علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا: ”هٰذَا غَرِيْبٌ رَفْعُهُ جِدًّا وَالْأَشْبَهُ أَنْ يَّكُوْنَ مَوْقُوْفًا“ ”اس روایت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہونا بہت ہی غریب ہے، زیادہ قریب یہی ہے کہ یہ صحابی کا قول ہے۔“

اس روایت کی تمام سندوں میں زہری کی روایت ''عن'' کے لفظ کے ساتھ آئی ہے اور زہری کا اپنی تمام تر عظمت وجلالت کے باوجود مدلس ہونا معروف ومشہور ہے۔ اس لیے صحیحین کے سوا ان کی تدلیس والی روایت کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

ایوب علیہ السلام کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ایک صحیح حدیث آئی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « بَيْنَمَا أَيُّوْبُ يَغْتَسِلُ عُرْيَانًا خَرَّ عَلَيْهِ رِجْلُ جَرَادٍ مِنْ ذَهَبٍ فَجَعَلَ يَحْثِيْ فِيْ ثَوْبِهِ فَنَادَاهُ رَبُّهُ يَا أَيُّوْبُ ! أَلَمْ أَكُنْ أَغْنَيْتُكَ عَمَّا تَرٰى؟ قَالَ بَلٰى يَا رَبِّ ! وَلٰكِنْ لَا غِنٰى لِيْ عَنْ بَرَكَتِكَ » [ بخاري، احاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ و أيوب إذ نادى ربه...... ﴾ : ۳۳۹۱ ] ''ایوب علیہ السلام کپڑے اتار کر غسل کر رہے تھے، غسل کے دوران ہی ان پر سونے کی ٹڈیوں کا ایک دَل (لشکر) آ گرا۔ ایوب علیہ السلام لپوں کے ساتھ اسے اپنے کپڑے میں بھرنے لگے تو انھیں ان کے رب نے آواز دی: ''اے ایوب! کیا میں نے تمھیں اس سے غنی نہیں کر دیا جو تم دیکھ رہے ہو؟'' انھوں نے عرض کی: ''کیوں نہیں، تیری عزت کی قسم! لیکن میرے لیے تیری برکت سے کسی طرح بے پروائی ممکن نہیں۔''

اس کے علاوہ ایوب علیہ السلام کے متعلق تمام اقوال تابعین یا صحابہ سے مروی ہیں اور سب وہب بن منبہ کے بیان ہی کا خلاصہ یا تفصیل ہیں، جو صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سے لیے گئے ہیں۔ حقیقت صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے اور جس کا خلاصہ اس آیت کے فائدہ نمبر (۱) میں گزر چکا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر اپنے پاس سے یا ان اہلِ کتاب سے لے کر اضافہ کرے جنھوں نے انبیاء پر تہمتیں باندھیں، بلکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں بخشا اور کہہ دیا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۸۱) اور یہ کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ﴾ [ المائدة : ٦٤ ] ''انھی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کی باتوں کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے۔''

⑤ ابو شہبہ فرماتے ہیں، ہمیں جو عقیدہ رکھنا واجب ہے وہ یہ ہے کہ ایوب علیہ السلام کی آزمائش یقیناً ہوئی، ان پر جسم اور اہل و مال کی شدید تکلیف آئی، جس پر انھوں نے ایسا صبر کیا کہ صبر میں ضرب المثل بن گئے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر ان کی تعریف فرمائی، مگر ان کی آزمائش اس حد تک نہیں پہنچی جو ان جھوٹی داستانوں میں بیان ہوئی ہے کہ انھیں جذام (کوڑھ) ہو گیا، ان کے سارے جسم پر پھوڑے بن گئے، انھیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔ ان کے جسم میں کیڑے رینگتے پھرتے تھے اور ہڈیوں اور پٹھوں کے سوا سارا گوشت جھڑ گیا تھا اور ان سے دور ہی سے بد بو آتی تھی وغیرہ۔ ایوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ہاں اس سے کہیں معزز و مکرم تھے کہ انھیں کوڑے پر پھینک دیا جائے، یا وہ ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس سے لوگ ان کی دعوت سے متنفر ہوں۔ اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہی اس قدر معیوب حالت میں ہو تو ایسی دعوت کا کیا فائدہ اور اس سے حاصل کیا ہو گا؟ پھر انبیاء ہمیشہ اپنی قوم کے اونچے نسب میں سے مبعوث کیے جاتے رہے ہیں (جیسا کہ حدیثِ ہرقل میں ہے)۔ ایوب علیہ السلام کی ایسی حالت میں ان کا قبیلہ کہاں تھا کہ ان کی حفاظت کرتا، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرتا، بجائے اس کے کہ ان کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کرے، بلکہ اپنے سر کے بال فروخت کرتی پھرے اور ان پر ایمان لانے والے کہاں گئے، کیا سب انھیں چھوڑ گئے، کیا ایمان کا تقاضا یہی ہے؟

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو۔ ہر ایک صبر کرنے والوں سے تھا ﴿۸۵﴾

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی ساری داستانیں بے بنیاد ہیں، نہ عقل سلیم انھیں تسلیم کرتی ہے اور نہ صحیح نقل۔ ایوب علیہ السلام پر آنے والی بیماری ایسی ہرگز نہ تھی جس سے نفرت پیدا ہو، کیونکہ یہ ان کے منصب ہی کے خلاف تھا، بلکہ وہ اس قسم کی کوئی بیماری تھی جس کا جسم پر کوئی نشان ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً کوئی جسمانی درد، ریو ماٹزم، جوڑوں یا ہڈیوں وغیرہ کی تکلیف۔ جب اللہ کا فضل ہوا تو زمین پر پاؤں مارنے کے نتیجے میں نمودار ہونے والے چشمے کا ٹھنڈا پانی پینے اور اس کے ساتھ غسل کرنے سے مکمل شفایاب ہو گئے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ کی بات دل کو بہت لگتی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''ایوب علیہ السلام کے معاملے میں کوئی بات ثابت نہیں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی کتاب میں دو مقامات پر بتائی ہے، ایک: ﴿ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ ﴾ [ الأنبياء : ۸۳ ] اور دوسری: ﴿ رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ﴾ [ صٓ : ۴۱ ] رہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! تو آپ سے اس حدیث کے سوا ایوب علیہ السلام کے متعلق ایک حرف بھی ثابت نہیں جس میں ان پر غسل کے دوران سونے کی ٹڈیاں گرنے کا ذکر ہے۔ پھر جب اس کے سوا قرآن اور حدیث میں کوئی بات ثابت ہی نہیں تو وہ کون صاحب ہیں جنھوں نے ایوب علیہ السلام کا حال آنکھوں سے دیکھا یا کانوں سے سنا؟ رہی اسرائیلی روایات! تو وہ علماء کے نزدیک قطعی طور پر متروک ہیں، اس لیے ان کے پڑھنے سے اپنی نگاہیں بچا کر رکھو اور ان کے سننے سے اپنے کان بند رکھو۔ کیونکہ وہ تمھاری سوچ میں محض خیال کا اور دل میں صرف خرابی کا اضافہ کریں گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: « يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ ! كَيْفَ تَسْأَلُوْنَ أَهْلَ الْكِتَابِ؟ وَكِتَابُكُمُ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلٰى نَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْدَثُ الْأَخْبَارِ بِاللّٰهِ تَقْرَؤُوْنَهُ لَمْ يُشَبْ، وَقَدْ حَدَّثَكُمُ اللّٰهُ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ وَغَيَّرُوْا بِأَيْدِيْهِمُ الْكِتَابَ فَقَالُوْا: ﴿ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [ البقرة : ۷۹ ] أَفَلَا يَنْهَاكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مُسَاءَلَتِهِمْ؟ وَلَا وَاللّٰهِ ! مَا رَأَيْنَا رَجُلًا مِنْهُمْ قَطُّ يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ »[ بخاري، الشهادات، باب لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة وغيرها : ۲۶۸۵ ] ''اے مسلمانو کی جماعت! تم اہل کتاب سے کس طرح سوال کرتے ہو، جب کہ تمھاری کتاب، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی خبروں میں سے سب سے تازہ ہے۔ تم اسے اس حال میں پڑھتے ہو کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھا تھا اہل کتاب نے اسے بدل دیا اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اللہ کی کتاب میں تبدیلی کر دی اور کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ بہت تھوڑی قیمت حاصل کریں۔ تو کیا تمھارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمھیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا؟ نہیں! قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی آدمی کو کبھی تم سے اس کے متعلق سوال کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔'' آخر میں ابوشہبہ نے آلوسی، طبری اور دوسرے علماء سے اس مفہوم کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ ایوب علیہ السلام کے متعلق مزید دیکھیے سورۂ صٓ (۴۱ تا ۴۴)۔

آیت 85 ① وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ : یعنی ان تینوں کو یاد کرو۔ ایوب علیہ السلام کے صبر اور ان کے حسن انجام

وَ اَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۶﴾ وَ ذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا

اور ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ یقیناً وہ نیک لوگوں سے تھے (۸۶) اور مچھلی والے کو، جب وہ غصے سے بھرا

کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے تین پیغمبروں کا ذکر فرمایا جو خاص طور پر صبر کی صفت سے آراستہ تھے۔ اسماعیل علیہ السلام نے ذبح کے متعلق اپنے والد ماجد کے پوچھنے پر کہا: ﴿سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ﴾ [ الصافات : ۱۰۲ ] ''اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے ضرور صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔'' اور اس نے واقعی صبر کر کے دکھایا۔ اسی طرح وادی غیر ذی زرع میں مستقل رہائش پر اور شکار اور زمزم کے ساتھ زندگی گزارنے پر صبر کیا، پھر بیت اللہ کی تعمیر میں ہر طرح کی مشقت برداشت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا۔ اسماعیل اور ادریس علیہما السلام کا ذکر سورۂ مریم (۵۴ تا ۵۷) میں گزر چکا ہے۔ ذوالکفل کے متعلق قرآن و حدیث میں تفصیل نہیں آئی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ انبیاء کے ساتھ ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔ (واللہ اعلم) اس کے علاوہ تفاسیر میں ان کے متعلق بیان کردہ تمام باتیں اسرائیلیات پر مبنی اور بے اصل ہیں۔

❷ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ : صبر کا لفظی معنی باندھنا ہے، یہ تین طرح کا ہوتا ہے: ① اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر، یعنی اپنے آپ کو اس کی فرماں برداری کا پابند رکھنا۔ ② اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے صبر، یعنی اپنے آپ کو اس سے روک کر رکھنا۔ ③ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقدیر میں لکھے ہوئے آلام و مصائب آنے پر اپنے آپ کو جزع فزع اور اللہ تعالیٰ یا مخلوق کے شکوہ و شکایت سے روک کر رکھنا۔ کوئی بھی شخص صابر نہیں کہلا سکتا جب تک وہ صبر کی ان تینوں قسموں سے پوری طرح آراستہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام پیغمبروں کے متعلق شہادت دی کہ انھوں نے صبر کا پورا حق ادا کیا۔

**آیت 86** وَ اَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ : ''صَلَحَ يَصْلُحُ صَلَاحًا'' (ف، ن، ک) درست ہونا۔ یہ فساد کی ضد ہے۔ (قاموس) اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کی تعریف فرمائی کہ وہ پوری طرح صالح تھے، ان کا دل اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کی محبت اور ہر وقت اس کے ذکر سے درست تھا۔ ان کی زبان اس کے ذکر، اس کے دین کی دعوت اور ہر وقت سچ کہنے سے درست تھی اور دوسرے تمام اعضاء اس کے احکام کی اطاعت اور منع کردہ چیزوں سے اجتناب کی وجہ سے درست تھے، کیونکہ ان تینوں کے درست ہوئے بغیر کوئی شخص صالح نہیں کہلا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صبر و صالحیت کی وجہ سے ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا اور انھیں نبوت عطا کی۔ دنیا و آخرت کی نعمتیں عطا فرمائیں، یہی کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کی تعریف فرمائی اور قیامت تک کے لیے انھیں حقیقی ناموری عطا فرمائی۔ (سعدی)

**آیت 87** ❶ وَ ذَا النُّوۡنِ : یعنی مچھلی والے کو یاد کرو۔ ''النُّوْنُ'' کی جمع ''نِيْنَانٌ'' ہے، جیسے ''حُوْتٌ'' کی جمع ''حِيْتَانٌ'' ہے۔ اس سے مراد یونس بن مَتّٰی (بروزن شَتّٰی) ہیں جو نینوی (پہلے نون کے کسرہ اور دوسرے کے فتحہ کے ساتھ) کے رہنے والے تھے، جو موصل (عراق) کے قریب تھا۔

❷ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا : ''مُغَاضِبًا'' باب مفاعلہ سے اسم فاعل ہے جس میں مشارکت ہوتی ہے، یا معنی میں مبالغہ مراد ہوتا

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ

ہوا چلا گیا، پس اس نے سمجھا کہ ہم اس پر گرفت تنگ نہ کریں گے تو اس نے اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی

ہے۔ یونس علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دعوت دی اور وہ مسلسل کفر کرتے رہے تو آخر اکتا کر تخت غصے کی حالت میں ان کے حق میں بددعا کی اور عذاب کی دھمکی دے کر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر انھیں چھوڑ کر نکل پڑے۔ جب کہ منصب رسالت کا تقاضا تھا کہ ان کے تمام تر غیظ و غضب اور کفر و طغیان کے باوجود انھی میں رہتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ہرگز انھیں چھوڑ کر نہ جاتے، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال دعوت میں گزار دیے، نہ اکتائے اور نہ ان کے حق میں بددعا کی، جب تک اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ آئندہ ان کی قوم میں سے کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا۔ دیکھیے سورۂ ہود (۳۶) اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ [ القلم: ۴۸ ] ''پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ﴾ [ الأحقاف: ۳۵ ] ''پس اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر کر اور ان کے لیے جلدی (عذاب کا) مطالبہ نہ کر۔'' اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کے بلا اجازت نکلنے کو غلام کا بھاگ جانا قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴾ [ الصافات: ۱۴۰ ] ''جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر گیا۔'' یونس علیہ السلام کے واقعہ کے لیے مزید دیکھیے سورۂ یونس (۹۸) اور سورۂ صافات (۱۳۹ تا ۱۴۸)۔

③ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ : ''اَنْ'' اصل میں ''أَنَّا'' سے مخفف ہے، ''نَا'' کو حذف کر کے ''أَنَّ'' کے نون کو ساکن کر دیا گیا ہے، یا ''أَنْ'' حرف تفسیر ہے جو ''أَيْ'' کے معنی میں ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ ''قَدَرَ يَقْدِرُ'' کا معنی قادر ہونا، قابو پانا ہے، تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کا جلیل القدر پیغمبر یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر قابو نہیں پا سکے گا؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے یہ ہرگز نہیں سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر قابو نہیں پا سکے گا، بلکہ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی معمولی کوتاہی پر بھی سخت خفگی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اس آیت میں ان کی حالت کا بیان ہے کہ بلا اجازت ان کے چلے جانے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ سمجھ رہے ہوں کہ مجھے کوئی پکڑ نہیں سکے گا۔ دوسرا جواب اس سے بہتر ہے کہ یہاں ''لَنْ نَّقْدِرَ'' قادر ہونے کے معنی میں نہیں، بلکہ تنگی کرنے اور گرفت کرنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ [ الرعد: ۲۶ ] ''اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ﴾ [ الطلاق: ۷ ] ''اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔'' آیت کا معنی یہ ہو گا کہ یونس علیہ السلام نے سمجھا کہ ان کے بلا اجازت قوم سے نکل جانے پر ہم ان پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔ بعض اہل علم نے پہلے معنی کو سرے سے غلط قرار دیا ہے۔

④ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ : یہاں ایک لمبی بات حذف کر دی گئی ہے، جو سورۂ صافات (۱۳۹ تا ۱۴۸) میں مذکور ہے۔ خلاصہ

# كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں ﴿۸۷﴾

اس کا یہ ہے کہ وہ قوم سے نکلے تو سمندری سفر کے لیے ایک کشتی میں سوار ہوئے جو ضرورت سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ طوفان آیا اور سب کے ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہوا تو کشتی ہلکی کرنے کے لیے سامان پھینکنے کے بعد کچھ آدمیوں کو سمندر میں پھینکنے کا فیصلہ ہوا۔ قرعہ ڈالا گیا تو کئی اور آدمیوں کے ساتھ یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا، چنانچہ دوسروں کے ساتھ انھیں بھی سمندر میں پھینک دیا گیا، جہاں اللہ کے حکم سے ایک بہت بڑی مچھلی نے انھیں سالم ہی نگل لیا۔ اب وہ ایسی جگہ تھے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہ ایسا قید خانہ تھا جہاں نہ کوئی ملاقاتی، نہ مقدمہ لڑنے والا، نہ پیروی کرنے والا، نہ قید کی کوئی میعاد، بلکہ تا قیامت قید کا فیصلہ (اگر وہ تسبیح نہ کریں) اور نہ اللہ کے سوا امید کی کوئی روشنی۔ ان کئی اندھیروں میں انھوں نے اپنے رب کو اس حال میں آواز دی کہ وہ غم سے بھرے ہوئے تھے، فرمایا: ﴿ اِذْ نَادٰى وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ ﴾ [ القلم: ۴۸ ] ”جب اس نے پکارا، اس حال میں کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔“

⑤ قرآن مجید میں ”الظُّلُمٰتِ“ کا لفظ ہر جگہ جمع ہی آیا ہے، واحد کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ (ابن عاشور) پھر سمندر کی تاریکیوں کا کوئی حساب ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ﴾ [ النور: ۴۰ ] ”یا (کفار کے اعمال کی مثال) ان اندھیروں کی طرح ہے جو نہایت گہرے سمندر میں ہوں، جسے ایک موج ڈھانپ رہی ہو، جس کے اوپر ایک اور موج ہو، جس کے اوپر ایک بادل ہو، کئی اندھیرے ہوں، جن میں سے بعض بعض کے اوپر ہوں۔“ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق سمندر کے اندھیرے جب صرف ”الظُّلُمٰتِ“ ہی نہیں بلکہ ”ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ“ ہیں تو ”الظُّلُمٰتِ“ کی جمع کا صیغہ مکمل کرنے کے لیے رات کا اندھیرا شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یونس علیہ السلام کی دعا دن کے وقت ہو تب بھی ”فِي الظُّلُمٰتِ“ ہی ہے۔ [ التفسیر القرآنی للشیخ عبد الکریم الخطیب ]

⑥ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ: یہ ”اَنْ“ بھی اصل میں ”اَنَّهٗ“ سے مخفف ہے، یا حرف تفسیر بمعنی ”أَيْ“ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اگلی آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ﴾ ”تو ہم نے اس کی دعا قبول کی۔“ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یونس علیہ السلام نے کچھ مانگا ہی نہیں، نہ رہائی اور نہ اس مصیبت سے چھٹکارا، تو اللہ تعالیٰ نے کون سی دعا قبول فرمائی؟ جواب اس کا یہ ہے (واللہ اعلم) کہ انھوں نے اپنی حالت کے مطابق بہترین دعا کی ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میرا مالک و معبود ہے، میں تیرا بندہ اور تیرا غلام ہوں، میں اور میرا سب کچھ تیرے سپرد اور تیرے تابع ہے۔ پھر اس کی تسبیح کی کہ تو ہر عیب اور کمی سے پاک ہے، میری اس آزمائش اور مصیبت میں تیرا کوئی ظلم ہے نہ زیادتی، تیری ذات ظلم سے یکسر پاک ہے۔ تو نے جو کیا مالک اور معبود ہونے کی وجہ سے تیرا حق ہے اور اس میں تیری بے شمار حکمتیں ہیں۔ آخر میں اپنے ظلم کا اعتراف کیا کہ یقیناً مجھ پر جو کچھ گزرا یہ میرے اپنی جان پر ظلم کی وجہ سے ہے۔ یہ دعا بہترین اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے اعتراف

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَ زَكَرِيَّاۤ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾

تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے ﴿۸۹﴾

میں درخواست ہو رہی ہے کہ تیرے سوا کوئی مجھے اس مصیبت سے نجات نہیں دے سکتا، تسبیح کے ضمن میں اظہار ہو رہا ہے کہ تو مجھے اس مصیبت سے نکالنے سے عاجز نہیں کہ جس سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں اور ہمیشہ سے اپنے ظالموں میں سے ہونے کا اعتراف معافی اور بخشش مانگنے کی لطیف ترین صورت ہے۔ ایوب علیہ السلام نے بھی دعا کے لیے عرض حال اور اللہ کی رحمت کا واسطہ دینے پر اکتفا کیا ہے۔ مزید سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کے بہترین دعا ہونے کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ یونس علیہ السلام کے واقعہ کی مزید تفصیل سورۂ صافات اور سورۂ قلم میں دیکھیں۔

**آیت 88** وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ : اس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں، ایک یہ کہ جس طرح ہم نے یونس علیہ السلام کی دعا قبول کر کے انھیں غم سے نجات دی اسی طرح ہم ایمان والوں کو ان کی دعائیں قبول کر کے غم سے نجات دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ جس طرح اس دعا کے ساتھ ہم نے یونس علیہ السلام کو غم سے نجات دی اسی طرح ایمان والوں کو ہم اس دعا کے ساتھ غم سے نجات دیتے ہیں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «دَعْوَةُ ذِي النُّوْنِ إِذْ دَعَا وَهُوَ فِيْ بَطْنِ الْحُوْتِ ﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ فَإِنَّهُ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِيْ شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا اسْتَجَابَ اللّٰهُ لَهُ» [ ترمذي، الدعوات، باب [ في دعوة ذي النون ] : ۳۵۰۵۔ مسند أحمد : ۱۷۰/۱، ح : ۱٦٤٤، و صححه الألباني ] "ذو النون (یونس علیہ السلام) کی دعا، جو اس نے مچھلی کے پیٹ میں کی "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" کوئی مسلم آدمی اس کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں دعا نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے۔"

**آیت 89** ① وَ زَكَرِيَّاۤ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ ...... : یہ اس سورت میں مذکور نواں قصہ ہے، اس کی تفصیل سورۂ آل عمران (۳۹ تا ۴۱) اور سورۂ مریم (۱ تا ۱۵) میں ملاحظہ فرمائیں۔

② وَ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ : وارث وہ ہے جو کسی مالک کے فوت ہونے کے بعد اس کی ملکیت کا مالک بنے۔ اصل وارث سب کا اللہ تعالیٰ ہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا﴾ [ مریم : ۴۰ ] "بے شک ہم، ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے اور ان کے بھی جو اس پر ہیں۔" زکریا علیہ السلام نے اپنے علم و نبوت کا وارث عطا کرنے کی درخواست کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صفت "خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ" کا وسیلہ پکڑا۔ قرآن و سنت میں مذکور دعاؤں میں ہر دعا کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی صفت کا ذکر ہے، جیسا کہ ایوب علیہ السلام نے "وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ" کہا اور یونس علیہ السلام نے "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ"

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَ وَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ﴿۹۰﴾

تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا، بے شک وہ نیکیوں میں بہت جلدی کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف سے پکارتے تھے اور وہ ہمارے ہی لیے عاجزی کرنے والے تھے ﴿۹۰﴾

ہے، اگر تو مجھے اولاد نہ بھی دے گا تب بھی میرے بعد اپنے دین کا انتظام ضرور کرے گا۔ (قرطبی)

آیت 90 ① فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَ وَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ : بیوی کو درست کرنے سے مراد ان کا بانجھ پن دور کر کے انھیں اولاد کے قابل بنانا ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ بظاہر ترتیب تو یہ ہونی چاہیے کہ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کے لیے اس کی بیوی کو درست کر دیا اور اسے یحییٰ عطا کیا، کیونکہ بیوی درست ہونے کے بعد بچے کا مرحلہ آتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ واؤ ہمیشہ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی۔ یہاں یحییٰ علیہ السلام عطا کرنے کا ذکر پہلے اس لیے ہے کہ دعا بیٹا عطا کرنے کی تھی، اس کی قبولیت کے بیان کے لیے پہلے یحییٰ عطا کرنے کا ذکر ہوا، پھر اس سوال کا جواب دے دیا گیا کہ اتنی بوڑھی اور بانجھ بیوی سے بیٹا کیسے پیدا ہو گیا؟

② اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ : یعنی زکریا علیہ السلام، ان کی بیوی اور یحییٰ علیہ السلام نیکیوں میں جلدی کرتے اور رغبت اور خوف کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور صرف ہمارے لیے عاجزی کرنے والے تھے۔ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ان تمام انبیاء میں، جن کا ذکر اس سے پہلے گزرا، یہ تینوں صفات پائی جاتی تھیں۔ معلوم ہوا دعا کی قبولیت کے لیے یہ تینوں باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان بڑے لوگوں میں یہ بات نہ تھی کہ شفا بخش سکیں یا مشکل کشائی کر سکیں یا اولاد عطا کر دیں، بلکہ وہ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور خوف اور طمع کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ بندگی میں ان کے عظیم مرتبے کے پیش نظر معجزانہ طریقے سے ان کی دعا قبول فرماتا تھا۔

③ وَ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا : یعنی وہ ہمیں اس طرح پکارتے تھے کہ ایک طرف انھیں ہمارے اجر کی توقع رہتی تھی اور دوسری طرف ہمارے عذاب کا ڈر اور یہی بندگی کا اعلیٰ ترین مقام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ﴾ [ السجدۃ : ۱۶ ] ''وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور طمع کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔'' بعض صوفی حضرات کہا کرتے ہیں کہ جنت کے لالچ یا جہنم کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا تو سودے بازی ہے، عبادت تو بس اللہ کی رضا کے لیے کرنی چاہیے، اس آیت میں ان کا رد ہے، انبیائے کرام اللہ کے قرب کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوتے ہیں، ان کے متعلق فرمایا: ﴿ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ﴾ یعنی وہ ہمیں اس طرح پکارتے تھے کہ ایک طرف انھیں ہمارے اجر کی توقع رہتی تھی اور دوسری طرف ہمارے عذاب کا ڈر اور یہی بندگی کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ جاہل صوفیوں کو علم نہیں کہ جنت اللہ کی رضا سے ملے گی اور جہنم اللہ کے غضب کا نتیجہ ہے۔ رہی سودے بازی، تو وہ خود اللہ تعالیٰ نے بندوں سے کی ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ

وَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور اس عورت کو جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا، تو ہم نے اس میں اپنی روح سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو جہانوں کے لیے عظیم نشانی بنا دیا (۹۱)

اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ [ التوبة : ۱۱۱ ] ''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے۔''

آیت 91 ① وَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا : یعنی اس خاتون کا بھی ذکر کر جس پر ناپاک لوگ (یہودی) تہمتیں لگاتے ہیں، حالانکہ اس نے اپنی شرم گاہ کو حرام سے محفوظ رکھا، بلکہ عبادت میں ایسی مشغول رہی کہ حلال سے بھی محفوظ رکھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ﴾ [ آل عمران : ٤٧ ] ''حالانکہ کسی بشر نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔'' اللہ تعالیٰ نے اس کی نیک شہرت کے اظہار کے لیے اس کا نام نہیں لیا، کیونکہ سب جانتے ہیں اس سے مراد مریم بنت عمران علیہا السلام ہیں۔

② فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا : مراد عیسیٰ علیہ السلام کی روح ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اس کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے پھونکی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو عزت و شرف بخشنے کے لیے اسے اپنی روح قرار دیا اور جبریل علیہ السلام کے پھونکنے کو اپنا پھونکنا قرار دیا، جیسے ''بیت اللہ'' اور ''ناقۃ اللہ'' میں کعبہ کو اپنا گھر اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو اپنی اونٹنی قرار دیا۔ شیخ ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''عیسائی لوگ اس آیت اور اس قسم کی اور آیات سے عموماً دلیل لایا کرتے ہیں کہ حضرت مسیح (معاذ اللہ) خدا تھا، کیونکہ اس کو ''روح اللہ'' کہا گیا ہے، مگر وہ قرآن شریف کے محاورے کو غور سے نہیں دیکھتے کہ اس قسم کی اضافات سے مطلب کیا ہوتا ہے؟ سورۂ سجدہ میں عام انسانوں کے لیے بھی یہی اضافت روح کی اللہ کی طرف آئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ﴾ [ السجدة : ۷ تا ۹ ] ''(یعنی اللہ نے) انسان کی پیدائش تھوڑی سی مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصے سے بنائی، پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی ایک روح پھونکی۔'' اس جگہ عام انسانی پیدائش کی ابتدا اور سلسلے کا ذکر ہے۔ پس اگر آیت زیر تفسیر سے مسیح علیہ السلام کی الوہیت (خدا ہونا) ثابت ہوتی ہو تو اس قسم کی آیات سے تمام انسانوں کی الوہیت ثابت ہوگی، پھر اگر مسیح بھی ایسے ہی خدا اور الٰہ تھے جیسے کہ سب انسان ہیں تو خیر اس کے ماننے میں کسی کو کلام نہیں۔ پس آیت موصوفہ کے معنی وہی ہیں جو ہم نے لکھے ہیں (کہ وہ روح مخلوق تھی) (فافهم)۔''

③ وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ : مریم اور مسیح علیہما السلام کا جہانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانی ہونا سورۂ آل عمران (۳۶ تا ۶۳)، نساء (۱۵۶ تا ۱۵۹، ۱۷۱) اور مائدہ (۴۶، ۱۱۰ تا ۱۲۰) میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

آیت 92 اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ...... : بہت سے مفسرین نے یہاں امت سے مراد دین لیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَ تَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾

بے شک یہ ہے تمھاری امت جو ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمھارا رب ہوں، سو میری عبادت کرو ﴿۹۲﴾ اور وہ اپنے معاملے میں آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۹۳﴾

نے کفار کا قول نقل فرمایا: ﴿ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ ﴾ [ الزخرف : ۲۲ ] "بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک امت (یعنی ایک دین) پر چلتے پایا۔" یعنی تمھارا دین اور ملت ایک ہی ہے اور وہ ہے دینِ توحید، اور "هٰذِهٖۤ" سے مراد اس سے پہلے مذکور انبیاء، نوح، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، لوط، داؤد، سلیمان، ایوب، اسماعیل، ادریس، ذوالکفل، یونس، زکریا، مسیح ابن مریم علیہم السلام ہیں کہ سب کا ایک ہی دین تھا اور سب توحید پر قائم تھے۔ کسی اور کو معبود، مشکل کشا، شفا دینے والا، بگڑی بنانے والا یا اولاد عطا کرنے والا نہیں سمجھتے تھے، یہ سب لوگ ایک ہی دین پر تھے کہ میں تمھارا رب ہوں، سو میری ہی عبادت کرو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ » [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب ﴿ واذكر في الكتاب مريم ...... ﴾ : ۳۴۴۳۔ مسلم : ۲۳۶۵/۱۴۵ ] "ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں، جن کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔" امت کا معنی جماعت بھی ہے، مگر ایسی جماعت جس کے لوگوں کے درمیان انھیں اکٹھا رکھنے والی کوئی چیز ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ﴾ [ آل عمران : ۱۰۴ ] "اور لازم ہے کہ تمھاری صورت میں ایک جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں۔" یعنی یہ تمام انبیاء ایک ہی جماعت تھے جن کا رب ایک اور دین ایک تھا۔

آیت 93 ① وَ تَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ : "تَقَطَّعُوْۤا" باب تفعل سے ہے جو لازم ہے۔ اصل میں "تَقَطَّعُوْا فِيْ اَمْرِهِمْ" تھا، یعنی وہ اپنے دین کے معاملے میں آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ "فِيْ" کو حذف کرنے کی وجہ سے "اَمْرَهُمْ" پر نصب آ گیا۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں "تَقَطَّعُوْۤا" باب تفعیل (قَطَّعُوْا) کے معنی میں ہے جو متعدی ہے، یعنی انھوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اس معنی کی بھی گنجائش ہے، مگر پہلا معنی راجح ہے۔ یعنی سب کا دین ایک اور رب ایک ہے، اس لیے لازم تھا کہ سب ایک جماعت رہتے اور اپنے نبی کی کتاب اور سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھتے، مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے محض باہمی ضد اور عناد کی وجہ سے دین کے بارے میں کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۳) اور سورۂ شوریٰ (۱۴،۱۳) ہماری امت کا بھی یہی حال ہوا کہ وہ کتاب وسنت پر متحد ہونے کے بجائے فقہ وتصوف کے الگ الگ پیشوا بنا کر بہت سے فرقوں میں بٹ گئے، جن میں سے ہر فرقہ اپنے آپ ہی کو حق پر قرار دیتا ہے۔ سیاسی طور پر خلافتِ اسلامیہ کو ختم کر کے چھپن (۵۶) خود مختار ملکوں میں تقسیم ہو گئے، جن میں سے ایک بھی حقیقت میں خود مختار نہیں ہے، نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾

پس جو شخص کوئی نیک اعمال کرے اور وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی کوئی ناقدری نہیں اور یقیناً ہم اس کے لیے لکھنے والے ہیں ﴿۹۴﴾ اور لازم ہے اس بستی پر جسے ہم ہلاک کر دیں کہ وہ واپس نہیں لوٹیں گے ﴿۹۵﴾

② اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو مخاطب کرکے فرمایا تھا: ﴿اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ﴾ یعنی یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، سو میری ہی عبادت کرو۔ اب اس آیت میں انھیں مخاطب کرنے کے بجائے ان کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ کیا اور " تَقَطَّعْتُمْ اَمْرَكُمْ بَيْنَكُمْ " (تم اپنے دین کے معاملے میں آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے) کے بجائے فرمایا: " وَ تَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ " کہ وہ اپنے معاملے میں آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ مخاطب سے غائب کی طرف التفات ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے انھیں مخاطب کرنے کے بعد ان کی گروہ بندی کی وجہ سے انھیں اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے خطاب کیا جائے، اس لیے ان کا ذکر غائب کے صیغے سے فرمایا۔

③ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ : یعنی یہ لوگ جتنے گروہ چاہیں بنا لیں، آخر سب نے ہمارے پاس آنا ہے، پھر ہم سب کا فیصلہ کریں گے، فرمایا: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [ الزمر : ٤٦ ] "تو کہہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! ہر چھپی اور کھلی کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔"

**آیت 94** ① فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ ...... : یعنی ان مختلف گروہوں میں سے جو بھی اس کے مطابق کچھ عمل کرے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، جب کہ وہ اللہ تعالیٰ پر، اس کی توحید پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، خیر و شر تقدیر پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا ہو، تو اس کی کوشش کی کوئی ناقدری نہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کو اس کے نامۂ اعمال میں درج فرمائے گا۔

② "مِنَ الصّٰلِحٰتِ" میں "مِنْ" بعض کے معنی میں ہے۔ (ابوالسعود) یعنی جو شخص صالح اعمال میں سے کچھ اعمال کرے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "پس جو شخص کچھ نیک اعمال کرے۔" اللہ تعالیٰ کی کریمی دیکھیے کہ ایمان کے بعد بعض اعمال صالحہ کی بھی قدردانی ہو رہی ہے۔

**آیت 94** وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ...... : اس آیت کے تین معنی ہو سکتے ہیں اور تینوں درست ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا اعجاز ہے کہ ایک آیت کئی معانی کی گنجائش رکھتی ہے۔ پہلے معنی کی صورت میں "حَرٰمٌ" کا معنی "ممنوع" اور "ناممکن" ہے اور "لَا يَرْجِعُوْنَ" میں "لَا" کا حرف زائد ہے، نفی کا معنی نہیں دے رہا، مگر بے فائدہ نہیں بلکہ "حَرٰمٌ" کے معنی میں

# حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾

یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر اونچی جگہ سے دوڑتے ہوئے آئیں گے ﴿۹۶﴾

جو نفی پائی جاتی ہے اس میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ ﴾ [ ص : ۷۵ ] ''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ کرے؟'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ ﴾ [ الأعراف : ۱۲ ] ''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا؟'' اس سے ظاہر ہے کہ ''اَلَّا تَسْجُدَ'' میں '' لَا '' زائد ہے اور ''مَنَعَكَ'' کے معنی میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں ناممکن ہے کہ وہ (دنیا میں) واپس لوٹیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ [ یٰسٓ : ۳۱ ] ''کیا انھوں نے نہیں دیکھا، ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے کہ وہ ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔'' دوسرے معنی کی صورت میں ''حَرٰمٌ'' کا معنی ''ممنوع'' اور ''ناممکن'' ہی ہوگا، مگر ''لَا يَرْجِعُوْنَ'' میں ''لَا'' نفی کے معنی میں ہوگا جو اس کا اصل ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں، ناممکن ہے کہ وہ (قیامت کے دن ہماری طرف) واپس نہ آئیں، بلکہ وہ ضرور ہماری طرف واپس لوٹیں گے۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ یہاں ''حَرٰمٌ'' کا لفظ لازم اور واجب کے معنی میں ہے، جیسا کہ ابن کثیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے فتح الباری (۵۰۳/۱۱) اس صورت میں معنی یہ ہے کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں لازم ہے کہ وہ (دنیا میں) واپس نہیں لوٹیں گے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر رحمہما اللہ نے بھی اسی مفہوم کو اختیار فرمایا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو تینوں معنوں کا نتیجہ ایک ہی ہے، البتہ اس میں سے وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنھیں اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد زندہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً بنی اسرائیل کا مقتول جو گائے کا کوئی حصہ مارنے سے زندہ ہوا وغیرہ۔

**آیت 96** حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ ...... : ''حَدَبٍ'' زمین کا ابھرا ہوا حصہ، اونچی جگہ، جیسے کسی کی پیٹھ ابھری ہوئی ہو تو اسے ''حَدَبَةُ الظَّهْرِ'' کہتے ہیں۔ ''نَسَلَ'' (ض، ن) قریب قریب قدم رکھ کر نیچے کی طرف تیز دوڑنا، یعنی ہلاک ہونے والی بستیوں کے لوگوں کا دوبارہ زندہ ہونا اس وقت تک ناممکن رہے گا جب تک قیامت قائم نہ ہو، جس کی بالکل قریب نشانیوں میں سے ایک یاجوج ماجوج کا نکلنا بھی ہے۔ ان کے نکلنے کے بعد بہت جلد قیامت قائم ہو جائے گی۔

حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ایک دفعہ ہم آپس میں قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''تم آپس میں کیا ذکر کر رہے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ ، فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ، وَالدَّابَّةَ، وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا، وَنُزُوْلَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَيَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ، وَثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ : خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ ، وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ ، وَخَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ ، وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾

اور سچا وعدہ بالکل قریب آجائے گا تو اچانک یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی جنھوں نے کفر کیا۔ ہائے ہماری بربادی! بے شک ہم اس سے غفلت میں تھے، بلکہ ہم ظلم کرنے والے تھے ﴿۹۷﴾

---

مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلٰى مَحْشَرِهِمْ ﴾[ مسلم، الفتن، باب في الآيات التي تكون قبل الساعة : ۲۹۰۱ ] ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔'' پھر آپ نے دخان (دھوئیں)، دجال، دابۃ الارض، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، عیسیٰ علیہ السلام کے نزول، یاجوج ماجوج اور تین خسوف (زمین میں دھنس جانے) کا ذکر فرمایا۔ ایک خسف مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرۂ عرب میں ہوگا اور ان کے آخر میں ایک آگ یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو ان کے حشر کی جگہ کی طرف ہانکے گی۔'' یاجوج ماجوج کے کھولے جانے سے مراد قیامت کے قریب اس دیوار کا ٹوٹنا ہے جو ذوالقرنین نے لوگوں کو یاجوج ماجوج کی غارت گری سے بچانے کے لیے بنائی تھی۔ اس وقت ان کے نکلنے کا نقشہ بیان ہوا ہے کہ وہ اتنی کثرت اور تیزی سے نکلیں گے کہ ہر بلندی و پستی پر چھا جائیں گے، کسی میں ان کے مقابلے کی طاقت نہ ہوگی۔ [ مسلم، الفتن، باب ذکر الدجال : ۲۹۳۷ ] یاجوج ماجوج کی تفصیل سورۂ کہف (۹۳ تا ۹۹) کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 97** ❶ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ : ''اِقْتَرَبَ'' ''قَرُبَ'' میں ہمزہ اور تاء کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی بہت یا بالکل قریب ہو گیا۔ ''سچے وعدے'' سے مراد قیامت ہے۔ یاجوج ماجوج کی ہلاکت کے بعد مسیح علیہ السلام مسلمانوں کو لے کر پہاڑ سے اتریں گے، پھر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو زمین کی بے شمار برکتیں عطا فرمائے گا۔ صحیح مسلم (۲۹۳۷) میں ہے کہ وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک طیب ہوا ان کی بغلوں کے نیچے بھیجے گا، جو ہر مومن کی روح قبض کر لے گی اور بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے، جو شہوت رانی کے لیے گدھوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھیں گے، انھی پر قیامت قائم ہوگی۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ﴿ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ إِلَّا عَلٰى شِرَارِ الْخَلْقِ هُمْ شَرٌّ مِنْ أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَدْعُوْنَ اللّٰهَ بِشَيْءٍ إِلَّا رَدَّهُ عَلَيْهِمْ ﴾[ مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۴ ] ''قیامت ان لوگوں پر قائم ہوگی جو اللہ کی مخلوق میں سے بدترین لوگ ہوں گے، وہ جاہلیت والوں سے بھی بدتر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے جو بھی مانگیں گے اللہ تعالیٰ انھیں وہ چیز دے دے گا۔''

❷ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا : ''شُخُوْصٌ'' کا معنی حیرت یا خوف سے کھلا رہ جانا ہے، یعنی قیامت کا منظر دیکھ کر اس وقت تمام موجود لوگوں کی، جو بدترین کافر ہوں گے، آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ اس کی ہم معنی آیت: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴾ [ إبراهيم : ۴۲، ۴۳ ] ''اور تو اللہ کو ہرگز اس سے غافل گمان نہ کر جو ظالم لوگ کر رہے

اِنَّكُمۡ وَ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ ﴿۹۸﴾ لَوۡ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوۡهَا ؕ وَ كُلٌّ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۹۹﴾

بے شک تم اور جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں، تم اسی میں داخل ہونے والے ہو ﴿۹۸﴾ اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور یہ سب اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۹۹﴾

ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے، ان کی نگاہ ان کی طرف نہیں لوٹے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔“

❸ يٰوَيۡلَنَا قَدۡ كُنَّا فِيۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا بَلۡ كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ : اس وقت وہ اپنی بربادی اور ہلاکت کو آواز دیں گے اور پہلے غفلت کا عذر کریں گے، پھر خود ہی صاف اعتراف کریں گے کہ انبیاء نے ہمیں اس دن سے خبردار کیا تھا، اس لیے ہم غافل نہیں بلکہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے۔ دیکھیے سورۂ ملک (۵ تا ۱۱)۔

آیت 98 ❶ اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ : یعنی اس وقت ان کے اعتراف جرم اور توبہ کا انھیں کچھ فائدہ نہ ہوگا (سورۂ مومن: ۸۵) بلکہ کہا جائے گا کہ تم اور جن چیزوں کی تم عبادت کرتے تھے، سب جہنم کا ایندھن ہو۔ اس میں ان کے بت بھی شامل ہیں اور وہ تمام انسان یا جن بھی جو اپنی عبادت کروا کر خوش ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو جہنم کا ایندھن قرار دیا۔ بتوں کو آگ میں پھینکنے کا مقصد ان مشرکین کو ذلیل کرنا ہے کہ اپنے خداؤں کا حال دیکھ لو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ﴾ [ البقرۃ : ٢٤ ] کہ جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ ”مَا“ کا لفظ عموماً غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے، گویا اپنی عبادت پر خوش ہونے والے انسانوں اور جنوں کو غیر ذوی العقول قرار دیا گیا۔ اگر ”مَا“ کو عاقل و غیر عاقل سب کے لیے عام مانا جائے، جیسا کہ بعض اوقات استعمال ہوتا ہے، تب بھی اللہ کے پیغمبر اور مقبول بندے اس میں شامل نہیں ہوں گے، کیونکہ آیت (۱۰۱) میں تمام مومنوں کے لیے جہنم سے دور رکھے جانے کی بشارت آ رہی ہے۔

❷ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ : ”لَهَا“ کا لفظ ”وٰرِدُوۡنَ“ سے پہلے آنے سے حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ ”اس میں“ کے بجائے ”اسی میں“ داخل ہونے والے ہو گا۔ اس جملے کا فائدہ یہ ہے کہ جہنم کا ایندھن بننے کے بعد یہ مت سمجھو کہ موحدین کی طرح اس سے نکل کر جنت میں چلے جاؤ گے، نہیں! بلکہ تم اسی میں داخل رہو گے۔ اس کے علاوہ ”وٰرِدُوۡنَ“ کو بعد میں لانے سے دوسری آیات کے فواصل (آخری حروف) کے ساتھ موافقت بھی ہو گئی۔

آیت 99 لَوۡ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوۡهَا...... : ”وَرَدُوۡا“ کی ضمیر پوجنے والوں اور ان کے بنائے ہوئے معبودوں سب کی طرف جاتی ہے، اس لیے اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اگر لات، منات، عزیٰ یا شیاطین وغیرہ معبود ہوتے تو ان کو پوجنے والے جہنم میں داخل نہ ہوتے، بلکہ ان کے معبود ان کو بچا لیتے۔ دوسری یہ کہ اگر یہ معبود ہوتے تو کم از کم خود ہی جہنم میں داخل نہ ہوتے، مگر جب ”كُلٌّ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ“ یعنی پوجنے والے اور جنھیں پوجا گیا سب جہنم کا ایندھن

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

ان کے لیے اس میں گدھے جیسی آواز ہوگی اور وہ اس میں نہیں سنیں گے ﴿۱۰۰﴾ بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی طے ہو چکی، وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں گے ﴿۱۰۱﴾

ہیں تو ان کے بنائے ہوئے خدا معبود کیسے ہو گئے؟ اس آیت پر مشرکین کے اعتراض کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ زخرف (۵۷ تا ۵۹)۔

**آیت 100** ❶ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ: ”زَفِيْرٌ“ کے معنی کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۱۰۶)۔

❷ وَ هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ: اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ وہ اتنی اونچی آواز سے گدھے کی طرح رینگیں گے کہ اپنے چیخ پکار کے شور میں کوئی بات نہیں سنیں گے۔ دوسری تفسیر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ جب وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جنھیں ہمیشہ آگ میں رکھا جائے گا، تو انھیں آگ کے تابوتوں میں ڈال دیا جائے گا، جن میں آگ کی میخیں ہوں گی، تو ان میں سے کسی کو نظر نہیں آئے گا کہ اس کے سوا کسی کو عذاب ہو رہا ہے۔ پھر عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم، دکتور حکمت بن بشیر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ گویا آگ کے عذاب کے ساتھ تنہائی کا شدید عذاب مزید ہوگا کہ نہ کسی کو دیکھیں گے اور نہ کوئی آواز سنیں گے۔

**آیت 101** اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى......: ”اَلْحُسْنٰى“ ”اَلْاَحْسَنُ“ کی مؤنث ہے، معنی ہے سب سے اچھی چیز۔ مراد وہ سعادت اور خوش قسمتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کی تقدیر میں لکھ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کی وجہ سے جہنم میں جانے والوں کے ذکر کے بعد اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والوں کا ذکر فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سعادت اور نیک اعمال کی توفیق یا معافی مقدر کر دی ہے اور وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ بعض مفسرین نے اس آیت سے مراد وہ صالحین، انبیاء اور فرشتے لیے ہیں جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔ ان کے مطابق یہ آیت مشرکین کے جواب میں اتری ہے جنھوں نے اعتراض کیا تھا کہ اگر اللہ کے علاوہ جن کی عبادت کی گئی ہے وہ جہنم میں جائیں گے تو لوگوں نے عبادت فرشتوں اور پیغمبروں کی بھی کی ہے۔ جواب یہ دیا گیا کہ یہ لوگ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اگرچہ اس آیت میں اس اعتراض کا جواب بھی موجود ہے، تاہم آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے اس میں فرشتوں، پیغمبروں اور صالحین کے ساتھ تمام سعادت مند مومن بھی شامل ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص اسلوب ہے کہ وہ جنت و جہنم اور نیک و بد دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ فرماتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سعادت مند لوگوں کو عطا ہونے والی پانچ نعمتیں ذکر فرمائی ہیں، جن میں سے پہلی یہ ہے کہ وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَ هُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ

وہ اس کی آہٹ نہیں سنیں گے اور وہ اس میں جسے ان کے دل چاہیں گے، ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۰۲﴾ انھیں سب سے

آیت 102 ① لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا : یہ دوسری نعمت ہے کہ جہنم کی ہلکی سے ہلکی محسوس ہونے والی آواز بھی ان کے کانوں میں نہیں آئے گی کہ انھیں کسی طرح بھی تکلیف پہنچ سکے۔ مراد جنت میں جانے کے بعد ہے۔ (قرطبی)

② وَ هُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ : یہ تیسری نعمت ہے، یعنی اہل جنت کے دل کی ہر خواہش نہ صرف یہ کہ پوری ہوگی (حٰم السجدہ: ۳۰ تا ۳۲) بلکہ ان کی من پسند ہر نعمت دائمی اور ابدی بھی ہوگی، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

آیت 103 ① لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ : یہ چوتھی نعمت ہے کہ پہلے کوئی گھبراہٹ ہو تو ہو، آگ سے نجات اور جنت میں داخلے کے بعد وہ ہر گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے، حتیٰ کہ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انھیں غمگین نہیں کرے گی، پھر چھوٹی موٹی گھبراہٹوں کی کیا مجال ہے کہ انھیں غم زدہ کر سکیں؟

② الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ : ابن عطیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہ نعمت جنت میں داخلے کے بعد حاصل ہوگی۔'' کیونکہ صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ساتھ بہت سے اہل ایمان کا جہنم سے نکلنا اور جنت میں جانا ثابت ہے، اس لیے "الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ" سے مراد وہ وقت معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يُؤْتٰى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَيَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ، هٰذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، ثُمَّ يُنَادِيْ يَا أَهْلَ النَّارِ، فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَيَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا؟ فَيَقُوْلُوْنَ : نَعَمْ، هٰذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، فَيُذْبَحُ، ثُمَّ يَقُوْلُ : يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ وَهٰؤُلَاءِ فِيْ غَفْلَةٍ أَهْلُ الدُّنْيَا، ﴿ وَ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾» [ بخاري، التفسير، باب قوله عز و جل : ﴿ وأنذرهم يوم الحسرة ﴾ : ۴۷۳۰ ] ''موت کو ایک سیاہ و سفید مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: ''اے جنت والو!'' وہ گردن اٹھائیں گے اور دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں! یہ موت ہے'' اور ان سب نے اسے دیکھا ہوگا، پھر وہ آواز دے گا: ''اے آگ والو!'' تو وہ گردن اٹھائیں گے اور دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں! یہ موت ہے'' اور ان سب نے اسے دیکھا ہوگا، پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر وہ کہے گا: ''اے جنت والو! (اب) ہمیشگی ہے اور موت نہیں ہے اور اے آگ والو! (اب) ہمیشگی ہے اور موت نہیں ہے۔'' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ [ مریم : ۳۹ ] (اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب (ہر) کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں) یعنی وہ سراسر دنیا کی غفلت میں ہیں ﴿ وَ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ ''اور وہ ایمان نہیں لاتے۔'' ابن کثیر نے ''عبد الرزاق عن یحییٰ بن ربیعہ عن عطاء'' یہ قول ذکر فرمایا

الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

بڑی گھبراہٹ غمگین نہ کرے گی اور انھیں (آگے سے) لینے کے لیے فرشتے آئیں گے۔ یہ ہے تمھارا وہ دن جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے ﴿۱۰۳﴾

ہے: ”گویا ”یَوْمَ الْحَسْرَةِ“ اور ”اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ“ ایک ہی چیز ہے۔“ اکثر حضرات نے اس سے مراد صور میں آخری پھونک کا وقت مراد لیا ہے۔ بعض نے میدانِ حشر میں پیش آنے والے ہولناک واقعات مراد لیے ہیں، مگر جو غم یا گھبراہٹ ختم ہو جائے اسے ”اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ“ نہیں کہا جا سکتا۔ ابن کثیر میں ہے کہ سعید بن جبیر نے فرمایا: « حِيْنَ تُطْبَقُ النَّارُ عَلٰى أَهْلِهَا » ”اس سے مراد وہ وقت ہے جب جہنم والوں کے اوپر جہنم کو بند کر دیا جائے گا۔“ دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا: ”اسے طبری نے حسن سند سے ذکر کیا ہے۔“ یہ قول اور موت کو ذبح کرنے کا قول ایک ہی ہے، کیونکہ جہنم کو اسی وقت اوپر سے بند کیا جائے گا جب اس میں وہی لوگ رہ جائیں گے جنھیں ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جنت میں جانے کے بعد جنتی ہر قسم کی گھبراہٹ اور خوف سے محفوظ رہیں گے، حتیٰ کہ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انھیں غم زدہ نہیں کرے گی، بلکہ وہ صرف اور صرف جہنمیوں کے لیے مخصوص ہوگی۔

③ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ...... : یہ استقبال جنت میں داخلے کے وقت ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ [ الزمر: ۷۳ ] ”اور وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے، اس حال میں کہ اس کے دروازے کھول دیے گئے ہوں گے اور اس کے نگران ان سے کہیں گے تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، پس اس میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ رہنے والے۔“ اس سے پہلے موت کے وقت بھی فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور بشارتیں دیں گے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْۤ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴾ [ حٰم السجدۃ: ۳۰ تا ۳۲ ] ”بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ ہم تمھارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تمھارے دل چاہیں گے اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے۔ یہ بے حد بخشنے والے، نہایت مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ النحل: ۳۲ ] ”جنھیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ پاک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں سلام ہو تم پر، جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے۔“

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

جس دن ہم آسمان کو کاتب کے کتابوں کو لپیٹنے کی طرح لپیٹ دیں گے۔ جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کی ابتدا کی (اسی طرح) ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں ﴿۱۰۴﴾

آیت 104 ❶ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ : " طَوٰی یَطْوِیْ طَیًّا " لپیٹنا۔ "اَلسِّجِلّ" کا معنی ہے صحیفہ، کتاب بھی ہے اور کاتب بھی۔ (قاموس) یہاں کاتب معنی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ کاتب کاغذات لکھنے کے بعد آخر میں لپیٹ کر اکٹھے کر لیتا ہے۔ (ابن عاشور) بعض لوگوں نے ایک فرشتے کا نام "سجل" بتایا ہے اور بعض نے نبی ﷺ کے ایک کاتب کا نام "سجل" بتایا ہے، مگر یہ دونوں درست نہیں، نہ کسی فرشتے کا نام "سجل" ثابت ہے اور نہ کسی صحابی کا۔

❷ "یَوْمَ" یعنی جن چیزوں کا ذکر اوپر گزرا یہ سب اس دن ہوں گی جس دن...... (أَيْ تَكُوْنُ هٰذِهِ الْأَشْيَاءُ يَوْمَ)۔ (بقاعی)

❸ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ : یعنی جس طرح کاتب اپنے اوراق لپیٹ لیتا ہے اسی طرح ہم آسمانوں کو لپیٹ دیں گے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بات کچھ تفصیل سے آئی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ [ الزمر : ٦٧ ] "اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے، حالانکہ ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔" اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ يَقْبِضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْأَرْضَ وَتَكُوْنُ السَّمَاوَاتُ بِيَمِيْنِهِ » [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالٰی : ﴿ لما خلقت بيدی ﴾ : ٧٤١٢ ] "بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام زمینوں کو مٹھی میں لے لے گا اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے۔" مزید تفصیل سورۂ زمر (٦٧) میں دیکھیے۔ سلف صالحین کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح قرآن و حدیث میں آئی ہیں ان کا اسی طرح عقیدہ رکھنا چاہیے اور انھیں اسی طرح بیان کرنا چاہیے، نہ ان کا انکار کیا جائے اور نہ تاویل، نہ یہ کہا جائے کہ ان الفاظ کے معنی ہی ہمیں معلوم نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ نہ سمجھا جائے۔

❹ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ...... : ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں نصیحت کی خاطر خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: « يَا أَيُّهَا النَّاسُ ! إِنَّكُمْ تُحْشَرُوْنَ إِلَى اللّٰهِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا » [ مسلم، الجنة وصفة نعيمها، باب فناء الدنيا : ٥٨/٢٨٦٠۔ بخاري : ٤٧٤٠ ] "اے لوگو! تم اللہ کی طرف اس حال میں اٹھائے جاؤ گے کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن، ختنے کے بغیر ہوگے۔" پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ یہ زمین، اس کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے ﴿۱۰۵﴾

آیت 105 وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ …… : زبور کا معنی کتاب ہے، یہاں زبور سے مراد داؤد علیہ السلام کی کتاب ہے اور ذکر سے مراد نصیحت ہے، جیسا کہ ترجمہ کیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ زبور میں یہ بات موجود ہے۔ یا پھر زبور سے مراد گزشتہ آسمانی کتابیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے، یعنی پہلے لوح محفوظ میں یہ بات درج ہے اور اس کے بعد آسمانی کتابوں میں بھی یہ بات لکھی جاتی رہی ہے کہ زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کا کونی فیصلہ بھی ہے اور شرعی بھی۔ اس زمین سے کیا مراد ہے؟ آیات کے سیاق و سباق کو دیکھنے سے بات صاف سمجھ میں آ رہی ہے کہ اس سے مراد زمین و آسمان کی بساط لپیٹنے کے بعد وجود میں آنے والی زمین ہے، جو بطور انعام اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کو عطا کی جائے گی اور وہ ان کی دائمی اور ابدی وراثت ہوگی۔ چنانچہ موجودہ زبور اگرچہ تحریف سے خالی نہیں مگر یہ حوالہ اس میں بھی موجود ہے: ''صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔'' [ زبور، باب : ۳۷، آیت : ۲۹ ] قرآن مجید میں بھی بطور انعام ملنے والی اس وراثت کا ذکر ہے جو ہمیشہ رہے گی، چنانچہ فلاح پانے والے مومنوں کے اوصاف ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۱۰، ۱۱ ] ''یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں، جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴾ [ الزمر : ۷۴ ] ''اور وہ (جنتی) کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں سے جہاں چاہیں جگہ بنا لیں، سو یہ عمل کرنے والوں کا اچھا اجر ہے۔''

زبور اور قرآن دونوں سے معلوم ہوا کہ صالحین کو بطور انعام ملنے والی وراثت ارضِ جنت ہے، کیونکہ ہمیشہ کا بسیرا وہی ہے۔ رہی موجودہ زمین، تو اس کی وراثت صالح و طالح، کافر و مسلم دونوں کو ملتی ہے اور صرف انعام کے طور پر نہیں، بلکہ امتحان کے لیے ملتی ہے اور ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ عارضی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ۱۲۸، ۱۲۹ ] ''موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اس کا وارث اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے بناتا ہے اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے۔ انھوں نے کہا، ہمیں اس سے پہلے ایذا دی گئی کہ تو ہمارے پاس آئے اور اس کے بعد بھی کہ تو ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا، تمھارا رب قریب ہے کہ تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور

## اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک پیغام ہے جو عبادت کرنے والے ہیں ﴿۱۰۶﴾

تمھیں زمین میں جانشین بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔'' اس زمین کی وراثت نہ نیکی و بدی پر موقوف ہے اور نہ ابدی اور دائمی ہے، فرمایا: ﴿ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ [ آل عمران : ۱٤۰ ] ''اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔'' البتہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر مسلمان صحیح مومن ہوں تو دنیا میں بھی آخر وہی غالب رہیں گے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [آل عمران : ۱۳۹ ] ''اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [ النور : ۵۵ ] ''اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور ہی اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ہر صورت انھیں ان کے خوف کے بعد بدل کر امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ نافرمان ہیں۔'' ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى زَوَى لِيَ الْأَرْضَ فَأُرِيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَإِنَّ مُلْكَ أُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا وَأُعْطِيْتُ الْكَنْزَيْنِ الْأَحْمَرَ وَالْأَبْيَضَ )) [ أبوداوٗد، الفتن والملاحم، باب ذکر الفتن و دلائلها : ٤٢٥٢، و صححه الألباني ] ''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین تہ کر دی تو میں نے اس کے مشرق اور مغرب دیکھ لیے اور میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وہ میرے لیے تہ کی گئی ہے اور مجھے سرخ اور سفید (سونا اور چاندی) دو خزانے دیے گئے ہیں۔'' اور واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق چند ہی سالوں میں مسلمان زمین کے مشرق و مغرب کے مالک بن گئے، مگر جب ان میں ایمان اور عمل صالح کی کمی ہوئی، انھوں نے ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ میں کوتاہی کی اور عیش و عشرت میں پڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے اور اپنے دشمن سزا دینے کے لیے مسلط کر دیے، جس طرح بنی اسرائیل پر بخت نصر کو مسلط کیا تھا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۵ تا ۷) معلوم ہوا ایسا نہیں ہے کہ جو بھی اس زمین کے کسی حصے کا مالک بن جائے وہ صالحین میں شمار ہو گیا، ورنہ فرعون، ہامان، قارون، شداد، نمرود، چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، نپولین، بش، کمیونسٹ، گائے اور بتوں کے پجاری اور تثلیث کے فرزند اللہ کے صالح بندے شمار ہوں گے اور آج کل کے روشن خیال یہی چاہتے ہیں کہ مغرب کے مشرکوں، بدکاروں اور ہم جنس پرستوں کو صالح شمار کیا جائے، تاکہ انھیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرنے سے چھٹکارا مل جائے۔

**آیت 106** ﴿ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا ﴾...... یعنی اس قرآن میں یا اس سورت میں توحید، آخرت، انبیاء کے واقعات اور جو دوسرے

# وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾

اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر رحم کرتے ہوئے ﴿۱۰۷﴾

مضامین بیان ہوئے ہیں ان میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑا پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے والے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی عبادت پر آمادہ ہی نہیں، بلکہ شیطان اور نفس کی پیروی پر ڈٹے ہوئے ہیں انھیں اس قرآن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آنکھوں میں روشنی ہو تو سورج یا چراغ کی روشنی کا فائدہ ہوتا ہے، اندھے کو چراغ سے کچھ دکھائی نہ دے تو اس میں چراغ کا کوئی قصور نہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲) میں "هُدًى لِّلۡمُتَّقِیۡنَ" کی تفسیر۔

**آیت 107** وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ: اعراب القرآن (قرآن کی ترکیب نحوی) کے موضوع پر لکھی ہوئی تقریباً تمام کتابوں میں "رَحۡمَةً" کو "اَرۡسَلۡنٰكَ" کا مفعول لہ بیان کیا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں دوسری تراکیب بھی بیان ہوئی ہیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ نحو کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ مفعول لہ جس فعل کی علت بیان کر رہا ہو اس فعل کا اور مفعول لہ کا فاعل ایک ہوتا ہے، مثلاً "ضَرَبۡتُ زَيۡدًا تَأۡدِيۡبًا" (میں نے زید کو ادب سکھانے کے لیے مارا) اس میں مارنے والا اور ادب سکھانے والا ایک ہی ہے، اس طرح یہاں بھیجنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے اور رحم کرنے والا بھی۔ چنانچہ معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر رحم کرنے کے لیے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ﷺ کو بھیجنے کی وجہ اللہ تعالیٰ کا جہانوں پر رحم کرنا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''ونفرستادیم ترا مگر از روئے مہربانی بر عالمہا'' (اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر مہربانی کی وجہ سے) اور شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے: ''اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہر (یعنی مہربانی) کر کر جہان کے لوگوں پر۔'' مفسر ابوالسعود نے فرمایا: "أَيۡ مَا أَرۡسَلۡنَاكَ بِمَا ذُكِرَ لِعِلَّةٍ مِنَ الۡعِلَلِ إِلَّا لِرَحۡمَتِنَا الۡوَاسِعَةِ لِلۡعَالَمِيۡنَ قَاطِبَةً" ''اور ہم نے تجھے مذکورہ وحی دے کر کسی بھی وجہ سے نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں پر اپنی وسیع رحمت کی وجہ سے۔'' امام المفسرین طبری نے فرمایا: "وَمَا أَرۡسَلۡنَاكَ يَا مُحَمَّدُ! إِلَّا رَحۡمَةً لِمَنۡ أَرۡسَلۡنَاكَ إِلَيۡهِ مِنۡ خَلۡقِيۡ" ''اور ہم نے اے محمد! تجھے نہیں بھیجا مگر اپنی مخلوق میں سے ان لوگوں پر رحم کے لیے جن کی طرف ہم نے تجھے بھیجا ہے۔'' پھر امام طبری نے "لِّلۡعٰلَمِیۡنَ" کی تفسیر میں اس قول کو ترجیح دی ہے کہ آپ ﷺ کو بھیجنے کی وجہ مومن و کافر سب پر رحم ہے کہ جو آپ پر ایمان لائے گا اس کے لیے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں رحمت لکھی جائے گی اور جو آپ پر ایمان نہیں لائے گا وہ دنیا میں ان عذابوں سے محفوظ رہے گا جو پہلی امتوں پر نبی کو جھٹلانے کی وجہ سے نازل ہوتے تھے، مثلاً زمین میں دھنس جانا، شکلیں بدل جانا وغیرہ۔

ایک ترکیب نحوی یہ ہے کہ "رَحۡمَةً" حال بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے۔ جس طرح کہتے ہیں "زَيۡدٌ عَدۡلٌ" کہ زید عدل ہے، یعنی اتنا عادل ہے گویا سراپا عدل ہے۔ پھر یہ "اَرۡسَلۡنٰكَ" میں ضمیر فاعل ''ہم'' سے بھی حال ہو سکتا ہے اور "اَرۡسَلۡنٰكَ" میں ضمیر ''کاف'' سے بھی۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس حال میں کہ ہم جہانوں کے لیے سراسر رحمت ہیں۔ دوسری صورت میں معنی ہوگا کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس حال میں کہ تو جہانوں کے لیے سراسر

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٨﴾

کہہ دے میری طرف صرف یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم فرماں برداری کرنے والے ہو؟ ﴿١٠٨﴾

رحمت ہے۔ پہلا معنی مفعول لہ والے معنی کے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ کو جہانوں پر رحم کی وجہ سے مبعوث کرنا اور اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں بھیجنا کہ اس کی ذات پاک تمام جہانوں کے لیے سراسر رحمت ہے، دونوں کا مفہوم ایک ہے جو سورۂ فاتحہ میں "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اور "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے اکٹھے بیان سے واضح ہے۔ دوسرا معنی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں بھیجا کہ آپ جہانوں کے لیے سراسر رحمت ہیں، بھی درست ہے کہ آپ مومنوں کے لیے تو دنیا و آخرت دونوں میں سراسر رحمت ہیں، فرمایا: ﴿ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ التوبة : ١٢٨ ] "مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ﴾ [ التوبة : ٦١ ] "اور ان کے لیے ایک رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں۔" اور کفار کے لیے بھی دنیا میں سراسر رحمت ہیں کہ آپ کی وجہ سے وہ دنیا میں پہلی قوموں جیسے عذابوں سے محفوظ ہو گئے اور آپ کی شریعت میں صلح و جنگ دونوں حالتوں میں ان پر وہ ظلم و جور روا نہیں رکھا جاتا جو دوسری تمام اقوام اپنے مخالفین پر روا رکھتی ہیں اور آپ کو کفار کے ایمان نہ لانے اور ان کے جہنم کا ایندھن بننے کا اتنا غم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ٣ ] "شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔" آپ ﷺ جانوروں پر رحم فرماتے اور اس کا حکم دیتے اور ان پر ظلم سے منع فرماتے تھے، فرمایا: (( فِيْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ )) [ بخاري، المظالم، باب الآبار على الطرق إذا لم يتأذ بها : ٢٤٦٦ ] "ہر تر جگر (زندگی) والی چیز (پر رحم) میں اجر ہے۔" حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر ایک بدکار عورت کو مغفرت کی نوید سنائی۔ شریعت اسلامیہ اور رسول اللہ ﷺ کی یہ رحمت بھی رب العالمین ہی کی رحمت ہے کہ اس نے اپنے محبوب رسول میں یہ وصف رکھا۔ چنانچہ ابن جُزَی "التسہیل" میں اعراب کی یہ تینوں وجہیں لکھ کر فرماتے ہیں: "وَالْمَعْنٰى عَلٰى كُلِّ وَجْهٍ أَنَّ اللّٰهَ رَحِمَ الْعَالَمِيْنَ بِإِرْسَالِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ" "ان تمام صورتوں میں معنی ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کو بھیجنے کے ساتھ جہانوں پر رحم فرمایا۔"

**آیت 108** ﴿ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ...... ﴾ : اس آیت میں "اِنَّمَا" کلمۂ حصر دو دفعہ آیا ہے۔ فرمایا، آپ کہہ دیں کہ میری طرف صرف یہ وحی ہوتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک معبود ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر تو اس کے علاوہ بھی بہت سی وحی آتی تھی، مثلاً رسالت، قیامت، نماز، روزہ اور دوسرے احکام، تو یہ کیوں فرمایا کہ میری طرف صرف ایک وحی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہے؟ جواب یہ ہے کہ پوری شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا کام صرف ایک معبود کی عبادت یعنی ایک مالک کی غلامی ہے۔ وہ جو حکم دے اسے کرنا ہے، جس سے منع کرے اس

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُکُمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾

پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دے میں نے تمھیں اس طرح خبردار کر دیا ہے کہ (ہم تم) برابر ہیں اور میں نہیں جانتا آیا قریب ہے یا دور، جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو ﴿۱۰۹﴾

سے باز رہنا ہے۔ اپنی ہر ضرورت اسی سے مانگنی ہے، کیونکہ اسے وہی پورا کر سکتا ہے، یہ تمام انبیاء کی دعوت ہے، فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ﴾ [ الأنبیاء : ۲۵ ] ''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔'' یہی ملت ابراہیم ہے، فرمایا: ﴿اِذۡ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ [ البقرۃ : ۱۳۱ ] ''جب اس سے اس کے رب نے کہا، فرماں بردار ہو جا، اس نے کہا، میں جہانوں کے رب کے لیے فرماں بردار ہو گیا۔'' شریعت کے تمام احکام اس مالک کی بندگی بجا لانے کی مختلف صورتیں ہیں اور سب ''اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ'' کی تفصیل ہیں۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

داستانِ حُسن جب پھیلی تو لامحدود تھی　　　اور جب سمٹی تو تیرا نام بن کر رہ گئی

اس لیے یہاں جب اس حقیقت کے اعلان کا حکم دیا کہ میری طرف صرف یہ وحی ہوتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک معبود ہے اور تمھارا کام اسی کی عبادت یعنی اس سے انتہا درجے کی محبت اور اس کے لیے انتہا درجے کی عاجزی کے ساتھ پوری طرح اس کا بندہ اور غلام بن جانا اور اسلام یعنی اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے سپرد کر دینا اور اپنی مرضی چھوڑ کر صرف اس کی مرضی پر چلنا ہے۔ تو آخر میں انھیں ایک اللہ کی عبادت اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے حوالے کرنے کا حکم دینے کے لیے استفہام کا طریقہ اختیار فرمایا کہ جب مجھے یہی وحی ہوتی ہے تو کیا اس کے مطابق تم اس کے لیے مسلم یعنی اس کے سپرد ہونے والے اور مکمل فرماں بردار بننے والے ہو؟ مقصد یہ ہے کہ ضرور بننا چاہیے، چنانچہ ہمارے نبی کو حکم ہوا: ﴿قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾ۙ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ [ الأنعام : ۱۶۲، ۱۶۳ ] ''کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔''

**آیت 109** ➊ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُکُمۡ ...... : ''اِنْ'' کا لفظ شک کے لیے آتا ہے، یعنی اول تو اتنے یقینی دلائل کے بعد ممکن نہیں کہ وہ مسلم نہ بنیں، لیکن اتنے واضح اور قطعی دلائل کے بعد بھی اگر وہ منہ موڑیں اور مسلم نہ بنیں تو ان سے کہہ دیجیے کہ تمھارے اسلام اور توحید سے منہ موڑنے کے بعد میں تمھیں صاف آگاہ کر رہا ہوں کہ تم نے توحید سے منہ موڑا تو میں نے بھی تمھارے شرک سے منہ موڑا، تاکہ یہ بات جاننے میں ہم تم دونوں برابر ہو جائیں۔ سورۂ کافرون میں بھی یہ اعلان صاف الفاظ میں سنا دیا گیا ہے۔

اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَ يَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ وَ اِنۡ اَدۡرِيۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۱۱۱﴾

بے شک وہ بلند آواز سے کی ہوئی بات کو جانتا ہے اور وہ بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو ﴿۱۱۰﴾ اور میں نہیں جانتا شاید یہ تمھارے لیے ایک آزمائش ہو اور ایک وقت تک کچھ فائدہ اٹھانا ہو ﴿۱۱۱﴾

﴿2﴾ وَ اِنۡ اَدۡرِيۡۤ اَقَرِيۡبٌ ...... : یعنی توحید سے منہ موڑنے کی وجہ سے عذاب کا تم پر آنا لازم ہے، مگر مجھے معلوم نہیں کہ تم سے جس دنیوی یا اخروی عذاب کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور؟ کیونکہ اس کا ٹھیک وقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ سورۂ جن میں فرمایا: ﴿قُلۡ اِنۡ اَدۡرِيۡۤ اَقَرِيۡبٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ اَمۡ يَجۡعَلُ لَهٗ رَبِّيۡۤ اَمَدًا﴾ [ الجن : ۲۵ ] ”کہہ دے میں نہیں جانتا آیا وہ چیز قریب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، یا میرا رب اس کے لیے کچھ مدت رکھے گا۔“

آیت 110 ﴿1﴾ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ ...... : سب کے سامنے کھلم کھلا عمل بھی ہوتا ہے اور قول بھی، اس لیے فرمایا کہ کوئی بھی کھلم کھلی اور بلند آواز میں ہونے والی بات ہو، اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے اور جو بات تم دل میں چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ یہ تنبیہ اور خبردار کرنے کا مؤثر ترین طریقہ ہے کہ کسی کو غلط کام سے روکنا ہو تو اسے روکنے کے بجائے کہا جائے کہ میں تمھاری سب حرکتیں دیکھ رہا ہوں، مطلب یہ کہ تم سے نمٹ لوں گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمھاری بلند آواز کی باتیں بھی جانتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی جانتا ہوں۔ مطلب یہ کہ تمھارا کفر بھی مجھے معلوم ہے اور تمھارا نفاق بھی، اس لیے کفر بھی چھوڑ دو اور نفاق بھی، ورنہ میری گرفت کے لیے تیار رہو۔

﴿2﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ چھپی ہوئی بات جاننا تو واقعی کمال ہے اور یہ اللہ ہی کی شان ہے، مگر جہر اور بلند آواز سے کی ہوئی بات تو ہر شخص سن سکتا ہے اور جان سکتا ہے، اس صفت کو خاص طور پر کیوں ذکر فرمایا گیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بلند آواز سے ایک آدمی بات کرے تو واقعی وہ سمجھ میں آ جاتی ہے مگر جب ایک ہی وقت میں دو چار یا دس پندرہ آدمی اپنی پوری بلند آواز کے ساتھ بات کرنا شروع کر دیں تو آدمی کو کسی کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، یہ اللہ مالک الملک، سمیع و بصیر کی شان ہے کہ دس پندرہ نہیں کروڑوں، اربوں انسان، جن، فرشتے اور حیوانات اپنی پوری آواز کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں، تو وہ ان سب کی پکار سنتا ہے، جو کچھ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں اسے جانتا ہے اور ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ مخلوق میں یہ وصف کہاں؟ (بقاعی)

آیت 111 وَ اِنۡ اَدۡرِيۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ ...... : یعنی مجھے معلوم نہیں کہ شاید عذاب میں یہ تاخیر تمھارے لیے آزمائش ہو کہ تم اس سے فائدہ اٹھا کر حق کی طرف پلٹتے ہو، یا اپنی سرکشی میں مزید ترقی کرتے ہو، جس کے بعد یہ مہلت دنیا میں کچھ دیر تک فائدہ اٹھانے کے لیے دی گئی ہو۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اس نے کہا اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما اور ہمارا رب ہی وہ بے حد مہربان ہے جس سے ان باتوں پر مدد طلب کی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۱۲﴾

آیت 112 ❶ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ...... : پہلے انبیاء کی امتوں نے جب حق کو جھٹلایا تو انھوں نے حق تعالیٰ سے اس دعا سے ملتی جلتی دعا کی جو اس آیت میں مذکور ہے، چنانچہ شعیب علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ﴾ [ الأعراف : ۸۹ ] ''اے ہمارے رب! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔'' اور ان سب پیغمبروں کے متعلق فرمایا جنھیں ان کی قوم نے کفر اختیار نہ کرنے کی صورت میں اپنی بستی سے نکالنے کی دھمکی دی تھی: ﴿وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ [ إبراهيم : ١٥ ] ''اور انھوں نے (حق تعالیٰ سے) فیصلہ مانگا اور ہر سرکش، سخت عناد رکھنے والا نامراد ہوا۔''

''قٰلَ رَبِّ احْكُمْ '' کے ''قٰلَ '' میں دو قراء تیں ہیں، ایک امر کے صیغے کے ساتھ '' قُلْ '' ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ یہ کہیں جو اس آیت میں مذکور ہے۔ دوسری قراءت، جو ہمارے ہاں رائج ہے، اس کے مطابق یہ ماضی کا صیغہ '' قَالَ '' ہے، جس کا معنی ہے، اس نے کہا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے اس رسول نے بھی کفار کے جھٹلانے اور جلاوطن کرنے کی کوششوں کی وجہ سے ہم سے یہ کہا جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کوئی بھی داعی جب ایسے حالات سے دو چار ہو تو اسے یہ دعا کرنی چاہیے۔

❷ قرآن مجید کے رسم الخط میں اس آیت کا پہلا لفظ الف کے بغیر '' قٰلَ '' لکھا گیا ہے، جسے '' قُلْ '' اور '' قَالَ '' دونوں طرح پڑھنے کی گنجائش ہے، جس طرح ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' میں '' مَلِكِ '' اور '' مَالِكِ '' دونوں طرح پڑھنے کی گنجائش ہے اور یہ قرآن مجید کے رسم الخط کا کمال ہے۔

سُورَةُ الحَجِّ ۲۲ | آیاتہا ۷۸ | رکوعاتہا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے ① جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ

---

**آیت 2,1** ① يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ : "النَّاسُ" کے ساتھ مسلم و کافر اور آیت کے نزول کے وقت موجود یا بعد میں قیامت تک آنے والے تمام لوگ مخاطب ہیں۔ بعض لوگ "يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ" کے ساتھ سورت کے آغاز کو اس کے مکی ہونے کی دلیل بناتے ہیں، مگر یہ قاعدہ کلی نہیں، کیونکہ مدنی سورتوں میں بھی "يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ" کے ساتھ خطاب آیا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ﴾ [ البقرۃ : ۲۱ ] مفسرین کے مطابق اس سورت میں مدنی آیات بھی ہیں، مثلاً آیت (۳۹): ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴾ اور مکی بھی، مگر وہ ملی جلی ہیں، الگ الگ ہر ایک کے مکی یا مدنی ہونے کی تعیین معلوم نہیں۔ (قرطبی)

② اتَّقُوْا رَبَّكُمْ : تقویٰ کا معنی بچنا بھی ہے اور ڈرنا بھی، کیونکہ آدمی جس سے ڈرتا ہے اس سے بچتا ہے، یعنی اپنے اس محسن کے عذاب سے بچو جو پیدا کرنے سے لے کر اب تک تمھاری پرورش کر رہا ہے اور تم پر بے شمار احسان کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر اس چیز سے بچو جو تمھیں اس کی سزا کا حق دار بنا سکتی ہے، خواہ وہ اس کے فرائض کا ترک ہو یا اس کے حرام کردہ کاموں کا ارتکاب، ان دونوں سے بچنا ہی اس کا تقویٰ ہے۔

③ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ : "زَلْزَلَةَ" "زَلْزَلَ يُزَلْزِلُ" سے "فَعْلَلَةٌ" کے وزن پر مصدر ہے، بہت سخت ہلانا۔ "السَّاعَةِ" کا لفظی معنی گھڑی اور لمحہ ہے۔ قیامت کو "السَّاعَةِ" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک لمحے میں برپا ہو جائے گی۔ "اِنَّ" ایسے موقع پر اس سے پہلے والی بات کی وجہ بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یعنی اپنے رب سے اس لیے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔ اس میں مزید خوف کی بات یہ ہے کہ وہ صرف انسانی پیمانے کے مطابق عظیم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اسے عظیم فرما رہے ہیں، اب اس کی عظمت اور ہولناکی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟

④ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ : "تَرَوْنَهَا" میں "هَا" کی ضمیر "زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ" میں "زَلْزَلَةَ" کی طرف بھی جا سکتی ہے، معنی یہ ہوگا کہ جس دن تم اس زلزلے کو دیکھو گے اور "السَّاعَةِ" کی طرف بھی، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس دن تم اس قیامت کو دیکھو گے۔ "ذُهُوْلٌ" کا معنی ہے ایسی غفلت جس کے ساتھ دہشت یا خوف بھی ہو۔ "مُرْضِعَةٍ" عورت جس وقت بچے کو دودھ پلا رہی ہو اس وقت اسے "مُرْضِعَةٌ" کہتے ہیں۔ وہ صفات جو صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ساتھ "تاء" نہیں لگائی جاتی، مثلاً "حَائِضٌ، حَامِلٌ، مُرْضِعٌ" ان کے ساتھ "تاء" اس وقت لگائی جاتی ہے جب وہ اس کام میں مصروف ہوں، مثلاً کوئی بھی عورت جو کسی بھی وقت دودھ پلاتی ہے "مُرْضِعٌ" کہلائے گی، "مُرْضِعَةٌ"

# كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى

پلانے والی اس سے غافل ہو جائے گی جسے اس نے دودھ پلایا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشے

اس وقت ہوگی جس وقت وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ مطلب اس وقت کی ہولنا کی بیان کرنا ہے کہ دودھ پلانے والی عورت، جسے اپنے بچے سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی، اس زلزلہ کی وجہ سے عین دودھ پلاتے ہوئے ایسی دہشت زدہ ہوگی کہ اسے اپنے بچے تک کی ہوش نہیں ہوگی۔

⑤ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا : حاملہ عورت کو "حَامِلٌ" کہتے ہیں، مگر یہ لفظ بوجھ اٹھانے والے کسی بھی شخص پر بولا جا سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے "حَامِلٌ" کی جگہ "ذَاتِ حَمْلٍ" (حمل والی) کا لفظ استعمال فرمایا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [ الطلاق : ۴ ] "حمل والی (عورتوں کو طلاق ہو جائے) تو ان کی عدت یہ ہے کہ وہ حمل وضع کر لیں۔" مراد قیامت یا قیامت کے زلزلے کی شدت کا بیان ہے کہ ہر حمل والی اپنا حمل (جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق "فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ" بہت محفوظ ٹھکانے میں ہے) اس دن کی شدت کی وجہ سے گرا دے گی۔

⑥ وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى...... : "سُكٰرٰى" "سَكْرَانُ" یا "سَكِرٌ" کی جمع ہے، جیسے "كَسْلَانُ" کی جمع "كُسَالٰى" ہے، یعنی تم لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ نشے میں ہیں، انھیں کچھ ہوش نہیں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے، جس کی وجہ سے انھیں کوئی ہوش نہیں رہے گا۔ مفسر قاسمی رحمہ اللہ نے "سُكٰرٰى" کو مجاز کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں، مجاز وہ ہوتا ہے جو کسی چیز پر بولا بھی جا سکے اور اس کی نفی بھی ہو سکے، مثلاً حمزہ، سعد اور علی شیر تھے، یہ بھی درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وہ شیر نہیں تھے۔ اسی طرح کسی کو بے سمجھی کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ فلاں گدھا ہے، جب کہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ گدھا نہیں ہے۔

⑦ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ : مفسرین میں اختلاف ہے کہ قیامت کے اس زلزلے سے کیا مراد ہے؟ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کی سب سے معتبر تفسیر وہ ہے جو خود قرآن میں آئی ہو، اس کے بعد وہ جو صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس زلزلے کا موقع جو صحیح حدیث میں بیان ہوا ہے، وہ ہے جو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، اے آدم! وہ عرض کریں گے، لبیک وسعدیک! بار بار حاضر ہوں، بار بار حاضر ہوں اور بھلائی ساری تیرے ہاتھ میں ہے۔ اللہ فرمائیں گے، آگ والی جماعت نکال کر الگ کر دو۔ وہ کہیں گے، اور آگ والی جماعت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ تو اس وقت بچہ بوڑھا ہو جائے گا: ﴿وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾ "اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشے والے دیکھے گا، حالانکہ وہ نشے والے نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔" تو یہ بات صحابہ پر بہت سخت گزری، انھوں نے کہا: "یا رسول اللہ! وہ آدمی ہم میں سے کون ہوگا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خوش ہو جاؤ کہ

وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝

میں دیکھے گا، حالانکہ وہ ہرگز نشے میں نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے ۝

یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار ہوں گے اور تم میں سے ایک ہوگا۔'' پھر فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تو امید رکھتا ہوں کہ تم اہل جنت کا تہائی حصہ ہوگے۔'' راوی نے کہا، یہ سن کر ہم نے اللہ کی حمد کی اور تکبیر کہی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً میں امید رکھتا ہوں کہ تم اہل جنت کا نصف ہوگے۔ دوسری امتوں کے مقابلے میں تمھاری مثال سیاہ بیل کی جلد میں ایک سفید بال کی سی ہے یا جس طرح گدھے کے بازو کے اندرونی جانب ایک گول نشان ہوتا ہے۔'' [ بخاري، الرقاق، باب ﴿ ان زلزلة الساعة شيء عظيم ﴾ ...... : ٦٥٣٠۔ مسلم، الإيمان، باب قوله : يقول الله لآدم أخرج بعث النار...... : ٢٢٢ ]

یہ صحیح حدیث دلیل ہے کہ اس آیت میں مذکور زلزلے سے مراد وہ وقت ہے جب آدم علیہ السلام کو ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے آدمی جہنم کے لیے نکال کر الگ کرنے کا حکم ہوگا۔ اس وقت لوگوں پر ایسا زلزلہ طاری ہوگا، وہ ایسے شدید ہلائے جائیں گے اور اس قدر خوف زدہ ہوں گے کہ جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ بعض لوگ اس حدیث کو آیت کا مصداق قرار دینے پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس وقت نہ کوئی حاملہ ہوگی اور نہ دودھ پلانے والی، تو حاملہ حمل کیسے گرائے گی اور دودھ پلانے والی اپنے بچے سے کیسے غافل ہوگی؟ اس لیے اس آیت سے وہ وقت مراد نہیں، بلکہ ایک صاحب نے تسلیم کرکے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے، اسے ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ کوئی ایسے حضرات کو سمجھائے کہ کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو اس بات کا علم نہیں تھا، پھر انھوں نے یہ کیوں فرمایا؟ دراصل ایسے حضرات نے کلام کے اسلوب کو سمجھا ہی نہیں، یہ تو اس وقت کی ہولناکی اور شدت سے استعارہ ہے کہ اگر اس وقت حاملہ عورتیں ہوں تو سب کا حمل گر جائے گا اور اگر دودھ پلانے والیاں ہوں تو وہ اپنے بچے سے غافل ہو جائیں گی۔ اس سوال کا اس سے بھی مضبوط جواب یہ ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: (( يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَا مَاتَ عَلَيْهِ )) [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب الأمر بحسن الظن بالله...... : ٢٨٧٨ ] ''ہر بندہ اس حالت پر اٹھے گا جس پر فوت ہوا تھا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ دودھ پلانے والیاں اور حمل والیاں صرف پہلے نفخہ کے وقت ہی اس حال میں نہیں ہوں گی بلکہ قیامت والے دن اٹھتے وقت بھی ان کی یہی حالت ہوگی۔ اس سے منکرینِ حدیث کا سوال سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ ابن جریر، بقاعی اور بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ صحیح حدیث کے بعد کوئی اور تفسیر معتبر نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا مصداق قیامت کا پہلا نفخہ لیا ہے اور صور میں تین نفخے بتائے ہیں، ایک نفخۂ فزع، ایک نفخۂ صعق اور ایک نفخۂ بعث۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے وہ زلزلہ مراد ہے جو پہلے نفخہ یعنی نفخۂ فزع سے پیدا ہوگا، کیونکہ قیامت کو تو نہ کوئی حاملہ ہوگی اور نہ دودھ پلانے والی۔ اس نفخے سے ہر چیز درہم برہم ہو جائے گی، اس وقت جو بھی دودھ پلانے والی عورت ہوگی وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے سے غافل ہو جائے گی۔ علقمہ اور شعبی کا بھی یہی قول ہے۔ طبری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس قول پر مشتمل مرفوع حدیث یہ کہہ کر نقل کی ہے کہ اس کی اسناد میں نظر ہے (کیونکہ اس میں دو راوی

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں کچھ جانے بغیر جھگڑتا ہے اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتا ہے۔ ③ اس پر لکھ دیا گیا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ جو اس سے دوستی کرے گا تو وہ اسے گمراہ کرے گا اور اسے بھڑکتی ہوئی آگ کا راستہ دکھائے گا۔ ④

مجہول ہیں)۔ طبری فرماتے ہیں: ''یہ قول ہی اصل قول ہوتا اگر صحیح احادیث اس کے خلاف نہ آتیں، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی وحی اور قرآن کے معانی کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔'' علاوہ ازیں تحقیق یہی ہے کہ نفخے دو ہی ہیں، تین نفخوں والی یہ روایت ثابت نہیں۔ امام بقاعی اور صاحب احسن التفسیر نے ایک بہت اچھی بات فرمائی ہے: ''عین ممکن ہے کہ ''زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ'' سے یہ زلزلہ بھی مراد ہو جو آدم علیہ السلام کو اہل نار کے الگ نکالنے کے حکم کے وقت پیدا ہوگا اور اس سے پہلے کے زلزلے بھی (یعنی صور میں پہلی پھونک کا زلزلہ اور دوبارہ پھونک کا زلزلہ، جس سے سب لوگ زندہ ہو کر محشر کی طرف دوڑیں گے) کیونکہ قیامت کا دن بہت لمبا (پچاس ہزار سال کا) ہے تو ہر زلزلے کی نسبت قیامت کی طرف درست ہے۔'' اب اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس طویل دن میں کتنے زلزلے برپا ہوں گے جو سب کے سب ''زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ'' ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و کرم سے اپنی پناہ میں رکھے۔

**آیت 3** ① وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ ...... : واؤ عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کچھ لوگوں کا ذکر محذوف ہے جو آیات کے مطابق یہ ہے کہ لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے اور قیامت پر اور دوبارہ زندہ ہو کر پیش ہونے پر یقین رکھتا ہے۔

② اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو قیامت کا منکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں کچھ جانے بغیر خواہ مخواہ جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ جو لوگ ہڈیاں اور مٹی ہو چکے اللہ تعالیٰ انھیں دوبارہ زندہ کیسے کرے گا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے مقابلے میں اپنے قیاس اور عقل کے ڈھکوسلے پیش کرتا ہے اور اپنے اس جھگڑے میں پوری کوشش سے ہر سرکش شیطان یعنی ابلیس اور اس کی اولاد کے اور انسانوں میں سے کفر کے سرداروں کے پیچھے چلتا ہے، جو لوگوں کو حق سے روکتے ہیں۔ ''تَبِعَ يَتْبَعُ'' (ع) کا معنی پیروی کرنا ہے۔ ''يَتَّبِعُ'' باب افتعال میں مبالغہ ہے، یعنی پوری کوشش کر کے ہر شیطان کے پیچھے چلتا ہے۔ (بقاعی)

③ اس آیت سے معلوم ہوا کہ علم کے ساتھ جھگڑا درست بلکہ لازم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [ النحل : ١٢٥ ] ''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔''

**آیت 4** كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ ...... : ''تَوَلّٰى يَتَوَلّٰى'' دوست بنانا۔ ''عَلَيْهِ'' میں ضمیر ''ہ'' شیطان کی طرف لوٹ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ

اے لوگو! اگر تم اٹھائے جانے کے بارے میں کسی شک میں ہو تو بے شک ہم نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر کچھ جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی، تاکہ ہم تمھارے لیے واضح کریں اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک

رہی ہے۔ پہلے ”اَنَّهٗ“ میں ضمیر شان کی ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ واقعہ یہ ہے۔ اس سے مراد بات میں پختگی پیدا کرنا پیدا کرنا ہوتا ہے، یعنی شیطان کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ جو اس سے دوستی کرے گا شیطان اسے گمراہ کرے گا۔ مطلب یہ کہ قضائے الٰہی میں اس کے متعلق یہ طے کیا جا چکا ہے۔ ”لکھنے“ کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ بات لکھے جانے کے بعد پکی ہو جاتی ہے، یا یہ کہ لوح محفوظ میں لکھا جا چکا ہے۔

**آیت 5** ❶ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ ...... : یعنی اگر تمھیں آخرت کو دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے تو اسے دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی پیدائش کی ابتدا پر غور کرو، اس سے تم جان لوگے کہ جس نے تمھیں پہلی دفعہ پیدا کیا وہ دوسری دفعہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور جو زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد نباتات پیدا کرتا ہے وہ تمھیں تمھاری قبروں سے نکالنے پر بھی قادر ہے۔

❷ مِّنْ تُرَابٍ : اس میں تنوین تحقیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ حقیر مٹی کیا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش کی طرف اشارہ ہے اور سب لوگوں کے مٹی سے پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، جو اس بے جان اور قدموں میں پامال ہونے والی مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [ السجدۃ : ۷، ۸ ] ”وہ (ذات پاک) جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش حقیر مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصہ سے بنائی۔“ زیر تفسیر آیت میں انسانی زندگی پر گزرنے والے سات مراحل ذکر ہوئے ہیں۔

❸ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ : پھر پانی کے ایک قطرے سے۔ جدید سائنس نے ثابت کیا ہے کہ منی کے ایک قطرے میں کروڑوں جرثومے ہوتے ہیں، جن میں سے صرف ایک جرثومہ عورت کے بیضہ سے مل کر حمل کا حصہ بنتا ہے۔ یہ معاملہ مٹی سے بھی عجیب ہے کہ ایک سیال لیس دار خوردبینی ذرے سے ایک حسین و جمیل انسان پیدا ہو جاتا ہے، اسے پیدا کرنے والے کے لیے اسے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

دھد نطفہ را صورتے چوں پری  ۔۔۔  کہ کرد است بر آب صورت گری

”یعنی اللہ تعالیٰ ایک قطرے کو پری جیسی صورت عطا فرما دیتا ہے، بھلا اس کے سوا کون ہے جو پانی پر صورت گری کر سکتا ہے۔“

فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَ تَرَى

رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر ہم تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو قبض کر لیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تاکہ

④ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ : "عَلَقَةٍ" کا معنی جما ہوا خون بھی ہے اور جونک بھی، یعنی پھر وہ سیال مادہ جمے ہوئے خون کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے، جس کی شکل جونک سے ملتی جلتی ہے۔

⑤ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ ...... : "مَضَغَ يَمْضَغُ" (ف) چبانا۔ "مُضْغَةٍ" گوشت کا ٹکڑا جو چبایا جاتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "جب نطفہ عورت کے رحم میں قرار پکڑتا ہے تو چالیس دن اسی حالت میں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، پھر وہ اللہ کے حکم سے سرخ رنگ کا جما ہوا خون بن جاتا ہے، پھر وہ چالیس دن تک اسی حالت میں رہتا ہے۔ پھر وہ بدل کر "مُضْغَةٍ" یعنی گوشت کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے، جس میں نہ کوئی نقش ہوتا ہے نہ شکل و صورت، پھر اس میں نقش اور شکل و صورت بننا شروع ہوتی ہے، چنانچہ اس کے سر، ہاتھوں، سینے، پیٹ، ٹانگوں، پاؤں اور باقی اعضاء کی شکل بنتی ہے، پھر کبھی شکل و صورت بننے سے پہلے عورت اسے گرا دیتی ہے اور کبھی شکل و صورت بننے کے بعد، جیسا کہ بچوں کے اسقاط کی صورت میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ ﴾ کہ جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی۔" سورۂ مومنون (۱۲ تا ۱۴) میں بھی یہ تفصیل مذکور ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِيْ بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا وَأَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَهُ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَهُ ذٰلِكَ ثُمَّ يُبْعَثُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيُؤْذَنُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ رِزْقَهُ وَ أَجَلَهُ وَعَمَلَهُ وَ شَقِيٌّ أَمْ سَعِيْدٌ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحُ )) [ بخاري، التوحيد، باب ﴿ ولقد سبقت كلمتنا ..... ﴾ : ٧٤٥٤۔ مسلم : ٢٦٤٣ ] "تم میں سے ہر ایک کی پیدائش اس کی ماں کے پیٹ میں (نطفہ کی صورت میں) چالیس دن اور چالیس راتیں جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر وہ اتنی دیر تک جما ہوا خون رہتا ہے، پھر اتنی دیر ہی مضغہ رہتا ہے، پھر اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے، تو اسے چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے، اس کا رزق اور اس کی مدت اور اس کا عمل اور یہ بات کہ بدبخت ہے یا نیک بخت لکھ دیتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔"

⑥ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ : تاکہ ہم تمھارے لیے واضح کریں کہ ہم جب پانی کے ایک قطرے کو پوری شکل و صورت والا گوشت کا ٹکڑا بنا دیتے ہیں تو ہمارے لیے تمھیں دوبارہ بنانا اور قبروں سے نکال کر زندہ کر کے حساب کتاب لینا کیا مشکل ہے۔

⑦ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ ...... : یعنی جسے ہم چاہتے ہیں ساقط ہونے سے محفوظ کر کے رحم میں قائم رکھتے ہیں۔ "اِلٰٓى

الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ⑤

وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔ اور تو زمین کو مُردہ پڑی ہوئی دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر خوبصورت قسم میں سے اگاتی ہے ⑤

اَجَلٍ مُّسَمًّى" یعنی کم از کم چھ ماہ اور زیادہ جتنا ہم چاہتے ہیں۔ یہ ہماری مرضی پر موقوف ہے کہ ہم نے اسے کتنی دیر رحم میں رکھنا ہے۔ "ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا" پھر ہم اسے بچے کی صورت میں شکم مادر سے نکالتے ہیں۔

⑧ ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ...... : "ثُمَّ" کے بعد کچھ عبارت محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے، یعنی پھر ہم تمھیں بچہ ہونے کی حالت میں ماں کے پیٹ سے نکالتے ہیں جو اپنے بدن، کانوں، آنکھوں، قوت اور عقل میں کمزور ہوتا ہے۔ "ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ" پھر اللہ تعالیٰ اسے آہستہ آہستہ قوت بخشتا ہے، اس کے والدین دن رات اس پر شفقت اور اس کی خدمت کرتے ہیں، وہ بڑھتا جاتا ہے، تاکہ بچپن، لڑکپن سے گزرتا ہوا اپنی پوری قوت کو پہنچ کر جوانی کا حُسن و کمال حاصل کرلے۔

⑨ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى ...... : یعنی تم میں سے کچھ وہ ہیں جو جوانی کو پہنچ کر یا اس سے پہلے فوت کر لیے جاتے ہیں۔ "وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا" یہ ساتواں مرحلہ ہے، یعنی کچھ وہ ہیں جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، یعنی انتہائی بڑھاپا جس میں عقل و فکر اور بدن کی تمام قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ جو شخص کسی وقت بہت بڑا عالم تھا اسے کچھ یاد نہیں رہتا، نہ حافظہ باقی رہتا ہے اور نہ عقل کام کرتی ہے۔ دوبارہ بچوں کی طرح کمزور اور عقل و فکر سے عاری ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ﴾ [ یٰس : ٦٨ ] "اور جسے ہم زیادہ عمر دیتے ہیں اسے بناوٹ میں الٹا کر دیتے ہیں۔" اور فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً ﴾ [ الروم : ٥٤ ] "اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنا دیا۔" نبی کریم ﷺ ارذل العمر سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، جیسا کہ عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے بیٹوں کو یہ کلمات سکھاتے تھے جس طرح معلم لڑکوں کو لکھنا سکھاتا ہے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد ان کلمات کے ساتھ پناہ مانگا کرتے تھے: (( اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أُرَدَّ إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب ما يتعوذ من الجبن : ٢٨٢٢ ] "اے اللہ! میں بزدلی سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاؤں اور میں دنیا کے فتنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور میں قبر کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔" مصعب بن سعد کی روایت میں " اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ " کے بعد " وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ " بھی ہے کہ میں بخل سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ [ بخاري، الدعوات، باب الاستعاذة من أرذل العمر...... : ٦٣٧٤ ]

⑩ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً ...... : "اهْتَزَّتْ" "هَزَّ يَهُزُّ هَزًّا" حرکت دینا، ہلانا۔ "اِهْتَزَّ يَهْتَزُّ اِهْتِزَازًا" (افتعال)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور (اس لیے) کہ وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور (اس لیے) کہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ⑥ اور (اس لیے) کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور (اس لیے) کہ یقیناً اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں ⑦

حرکت کرنا، کھیتی کا لہلہانا۔ "رَبَتْ" "رَبَا يَرْبُوْ" (ن) بڑھنا، پھولنا۔ یہ موت کے بعد زندگی کی دوسری دلیل ہے۔ مختلف قسم کی نباتات اور اجناس کے بیج زمین میں بکھرے پڑے ہوتے ہیں، جنھیں ہواؤں نے یا پرندوں نے جگہ جگہ پھیلا دیا تھا۔ اسی طرح بے شمار چیزوں کی جڑیں بھی جگہ جگہ مٹی میں دفن ہوتی ہیں، جن میں زندگی کا نشان تک نہیں ہوتا، مگر جوں ہی ان پر بارش کے چھینٹے پڑے تو ہر طرف زندگی لہلہانے لگی۔ ہر مُردہ جڑ اپنی قبر سے جی اٹھی اور ہر بے کار پڑا ہوا بے جان بیج ایک زندہ پودے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ مُردوں کے زندہ ہونے کا ایسا عمل ہے جسے ہر انسان موسم بہار میں اور موسم برسات میں خود مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ یہی صورت انسان کے جسم کی ہے، اس کے اٹھنے کا بھی ایک موسم ہے، جو صور کا دوسرا نفخہ ہے، جب یہ موسم آ جائے گا تو ہر انسان اپنے دفن ہونے کی جگہ سے زندہ اٹھا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ (تیسیر القرآن)

**آیت 6، 7** ❶ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ...... : اس آیت کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ "باء" سببیہ ہے جو "كَائِنٌ" وغیرہ سے متعلق ہے، جو افعال عامہ سے مشتق ہیں۔ یعنی بنی آدم کو پیدا کرنے اور مُردہ زمین کو زندہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہمیشہ ثابت اور موجود ہے، سو وہی ان دونوں کا اور ہر چیز کا موجد ہے۔ "وَ اَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى" اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہی مُردوں کو زندہ کرے گا، اگر وہ مُردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہ رکھتا تو بے جان مٹی اور نطفے کو اور مُردہ زمین کو زندگی کیسے بخشتا؟ "وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" اور اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، سو وہ نطفے اور مُردہ زمین کو زندگی بخشنے پر بھی قادر ہے۔ "وَ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ ......" اور اس کا سبب یہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ قبروں میں دفن لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، تاکہ ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ ملے، ورنہ نطفے سے لے کر جوانی اور پھر بڑھاپے تک پہنچانے کا کوئی مقصد نہ ہوتا، جب کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث اور بے مقصد نہیں۔ قدیم مفسرین یہ معنی بیان کرتے ہیں۔

❷ دوسرا مطلب یہ ہے کہ "باء" کو ایسے لفظ کے متعلق کیا جائے جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، مثلاً "شَاهِدٌ" وغیرہ، "أَيْ ذٰلِكَ شَاهِدٌ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ" مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو کچھ گزرا، یعنی انسان کا مٹی سے، پھر نطفے سے (آخر تک) پیدا ہونا اور مُردہ زمین کا پانی سے زندہ ہو جانا اس بات کا شاہد اور اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرے گا...... متاخرین اس معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ۸ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۹

اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم کے اور بغیر کسی ہدایت کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتا ہے ⑧ اس حال میں کہ اپنا پہلو موڑنے والا ہے، تاکہ اللہ کے راستے سے گمراہ کرے، اس کے لیے دنیا میں ایک رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اسے آگ کا عذاب چکھائیں گے ⑨

**آیت 9، 8** ① وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ ...... : یہاں ایک سوال ہے کہ یہی الفاظ اس سے پہلے آیت (۳) میں گزرے ہیں، پھر انھیں دوبارہ لانے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وہاں قیامت کے قیام پر اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے متعلق ان کج بحث جھگڑالوؤں کا ذکر ہے جو علم سے سراسر عاری اور محض مقلد ہیں اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتے ہیں۔ جبکہ یہاں ان جھگڑالوؤں کا ذکر ہے جو گمراہی کے پیشوا ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ جس طرح پہلی آیت: "وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ" میں واؤ سے پہلے کچھ لوگوں کا ذکر محذوف ہے (آیت: ۳ کی تفسیر ایک بار پھر دیکھ لیں) اسی طرح موقع کی مناسبت سے یہاں بھی "وَ مِنَ النَّاسِ" کی واؤ سے پہلے کچھ لوگوں کا ذکر محذوف ہے، یعنی جو لوگ انسان کی پیدائش اور مردہ زمین کو زندہ کرنے کے دلائل سے پہلے قیامت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان نہیں لا رہے تھے ان قطعی دلائل کے بعد ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ایمان لے آتے ہیں اور کچھ ایسے ہٹ دھرم اور عقل و شعور سے عاری ہیں جو کسی بھی دلیل کے بغیر محض تکبر کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ خود ایمان نہیں لاتے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

② بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى ...... : علم سے مراد بدیہی اور فطری دلیل ہے جو کسی غور و فکر کے بغیر ہر ایک کی سمجھ میں آتی ہے۔ "هُدًى" سے مراد غور و فکر اور نظر و استدلال سے حاصل ہونے والی عقلی دلیل ہے اور "كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ" سے مراد آسمان سے نازل ہونے والی کتابوں میں صحیح ثابت ہونے والی کوئی دلیل نقلی ہے۔ یعنی اس کے پاس قیامت کے انکار یا اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کی قدرت کے انکار کی کوئی فطری دلیل ہے نہ عقلی اور نہ نقلی۔ اس کے جھگڑے کا باعث صرف تکبر ہے۔

③ ثَانِيَ عِطْفِهٖ : "ثَنٰى يَثْنِيْ ثَنْيًا" بروزن "لَوٰى يَلْوِيْ لَيًّا" (ض) موڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ "ثَنٰى عِنَانَ فَرَسِهٖ" اس نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی۔ جھکانے کے معنی میں بھی آتا ہے: ﴿ اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ ﴾ [ هود : ٥ ] "سن لو! بلاشبہ وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں۔" "عِطْفٌ" کا معنی کندھا بھی ہے اور پہلو بھی۔ یہ اس کے تکبر کی تصویر ہے کہ وہ کس طرح پہلو موڑتے ہوئے اور گردن کشی کرتے ہوئے حق سے اعراض کرتا ہے۔

④ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ : مراد مسلمانوں کے ہاتھوں قتل، شکست، اسیری یا محکومی ہے، جیسا کہ بدر، احد، خندق، فتح خیبر، فتح مکہ اور فتح طائف اور دوسری بے شمار جنگوں میں ہوا۔ مزید ذلت و رسوائی یہ کہ مال و اولاد کی فراوانی کے باوجود "مَعِيْشَةً

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ⑩ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪

یہ اس کی وجہ سے ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور (اس لیے) کہ اللہ ہرگز اپنے بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے ⑩ اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے، پھر اگر اسے کوئی بھلائی پہنچ جائے تو اس کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش آپہنچے تو اپنے منہ پر الٹا پھر جاتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا، یہی تو صریح خسارہ ہے ⑪

ضَنْكًا" (طٰہٰ: ۱۲۴) اور اموال و اولاد کے ذریعے سے مسلسل عذاب ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۵۵) جو دنیا میں کفار کا اور حق تعالیٰ کی یاد سے منہ موڑنے والے ہر شخص کا مقدر ہے۔

**آیت 10** وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۸۲) اور انفال (۵۱) بعض اہل علم نے اس کی ایک اور توجیہ لکھی ہے کہ "فَعَّالٌ" کا وزن ہمیشہ مبالغہ کے لیے نہیں آتا، بلکہ بعض اوقات صرف نسبت کے لیے یعنی "ذُوْ شَيْءٍ" (کسی چیز والا) کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے "سَمَّانٌ" (گھی والا)، "قَطَّانٌ" (روئی والا)، "حَدَّادٌ" (لوہار)، تَمَّارٌ (کھجوروں والا)، مطلب یہ ہے کہ یہاں "ظَلَّامٌ" مبالغے کے لیے نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات عالی ہے جس کی طرف ظلم کی نسبت بھی نہیں ہو سکتی۔

**آیت 11** ① وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ...... : "حَرْفٍ" کا معنی کنارا ہے، یعنی وہ دین کے دائرے کے وسط میں داخل نہیں ہوتا، بلکہ کنارے ہی پر رہتا ہے، یا اس کے دل میں ایمان جاگزیں نہیں ہوتا، صرف زبان اسلام کا اقرار کرتی ہے، جیسے کوئی شخص کسی لشکر کے کنارے پر رہے، اگر فتح نظر آ رہی ہو تو جا ملے، ورنہ فرار اختیار کرے۔ یہ آیت ان اعراب (بادیہ نشین) لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو صحرا سے ہجرت کر کے آتے۔ پھر اگر جان و مال میں برکت ہوتی تو اسلام پر بڑے اطمینان کا اظہار کرتے اور اگر تکلیف اور دکھ میں مبتلا ہو جاتے تو مرتد ہو کر واپس بھاگ جاتے۔ بعض "مؤلفة القلوب" کی بھی یہی حالت تھی۔ (کبیر) اور دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷ تا ۲۰)۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: « كَانَ الرَّجُلُ يَقْدَمُ الْمَدِيْنَةَ، فَيُسْلِمُ، فَإِنْ وَلَدَتِ امْرَأَتُهُ غُلَامًا وَنُتِجَتْ خَيْلُهُ قَالَ هٰذَا دِيْنٌ صَالِحٌ وَ إِنْ لَّمْ تَلِدِ امْرَأَتُهُ وَ لَمْ تُنْتَجْ خَيْلُهُ قَالَ هٰذَا دِيْنُ سُوْءٍ » [ بخاري، التفسير، باب ﴿ و من الناس من يعبد الله على حرف ﴾ : ٤٧٤٢ ] "آدمی مدینے آتا، پھر اگر اس کی بیوی لڑکے کو جنم دیتی اور اس کی گھوڑیاں بچے دیتیں تو کہتا، یہ اچھا دین ہے اور اگر بیوی کے ہاں بچہ نہ ہوتا اور نہ گھوڑیاں بچے دیتیں تو کہتا یہ دین برا ہے۔"

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَ مَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَ لَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

وہ اللہ کے سوا اس چیز کو پکارتا ہے جو اسے نقصان نہیں پہنچاتی اور اس چیز کو جو اسے نفع نہیں دیتی، یہی تو دور کی گمراہی ہے ﴿۱۲﴾ وہ اسے پکارتا ہے کہ یقیناً اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، بلاشبہ وہ برا دوست ہے اور بلاشبہ وہ برا ساتھی ہے ﴿۱۳﴾ بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۱۴﴾

❷ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ : یعنی مرتد ہو گیا اور پھر کفر و شرک کی طرف پلٹ گیا۔

❸ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یعنی دنیا کا فائدہ اور بھلائی دیکھے تو بندگی پر قائم رہے اور اگر آزمائش آ جائے اور کوئی تکلیف پہنچے تو بندگی چھوڑ دے۔ ادھر (تکلیف اور مصیبت سے) دنیا گئی ادھر (بندگی چھوڑ کر مرتد ہونے سے) دین گیا۔ کنارے پر کھڑا ہے، یعنی دل ابھی نہ اس طرف ہے اور نہ اس طرف، جیسے کوئی مکان کے کنارے کھڑا ہے، جب چاہے نکل جائے۔ (موضح)

**آیت 12** يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ...... : بعض لوگ "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" سے مراد بت لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" نہیں ہیں۔ حالانکہ "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا ہر چیز ہے، خواہ بت ہوں یا قبریں، درخت ہوں یا جانور، مثلاً گائے وغیرہ، خواہ انسان ہوں یا جن یا فرشتے، زندہ ہوں یا مردہ، نیک ہوں یا بد، سب "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ہیں، کیونکہ جو بھی موجود ہے یا اللہ ہے یا "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ"۔ اگر ولیوں اور نبیوں کو "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" نہ مانیں تو انھیں اللہ ماننا پڑے گا۔ پھر 'وحدہ لا شریک لہ' اور "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کا مطلب کیا ہو گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب کچھ "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (اللہ کے سوا) ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نحل (۲۰، ۷۳)۔

**آیت 13** يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ...... : یعنی نفع تو درکنار ان کے پکارنے میں الٹا نقصان ہے، کیونکہ جو شخص انھیں پکارتا ہے وہ ایمان سے تو یقیناً اور فوراً ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اب رہا ظاہری فائدہ، تو وہ محض ایک خیالی امید ہے جو اس نے اپنے دماغ میں پال رکھی ہے۔ حاصل ہو تو ہو، نہ ہو تو نہ ہو۔ ہو بھی تو ان معبودوں کی طرف سے نہیں ہو گی، انھیں پکارنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

**آیت 14** ❶ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... : کافروں اور مطلب پرست بے یقین مسلمانوں کے بعد سختی اور نرمی یعنی ہر حال میں اسلام پر قائم رہنے والے مسلمانوں کا ذکر فرمایا، جو یقین و ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہیں اور ہر عمل خلوص نیت

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾

جو شخص یہ گمان کرتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں کبھی اس کی مدد نہیں کرے گا تو وہ ایک رسی آسمان کی طرف لٹکائے، پھر کاٹ دے، پھر دیکھے کیا واقعی اس کی تدبیر اس چیز کو دور کر دے گی جو اسے غصہ دلاتی ہے ﴿۱۵﴾

کے ساتھ سنت نبوی کے مطابق بجالاتے ہیں، کیونکہ عمل صالح کے لیے یہ دونوں چیزیں لازم ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایسی جنتوں کا وعدہ فرمایا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

❷ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ: یعنی اللہ تعالیٰ غیر محدود اختیارات کا مالک ہے، دنیا یا آخرت میں جسے جو چاہے دے دے۔ تھوڑے سے عمل پر وہ جنت عطا کر دے کہ جس کا عرض زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہے، فرمایا: ﴿عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ﴾ [ آل عمران : ۱۳۳ ] ''جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔'' جبکہ کفار و مشرکین کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں پھینک دے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم میں چون و چرا کر سکے، وہ جو دینا چاہے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو روک لے کوئی وہ دے نہیں سکتا اور نہ دلوا سکتا ہے۔

**آیت 15** ❶ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا...... : '' سَبَبٌ '' رسی۔ ''السَّمَآءِ'' ''سَمَا يَسْمُوْ'' (ن) سے ہے جس کا معنی ہے بلند ہونا۔ آسمان کو اس کی بلندی کی وجہ سے ''سماء'' کہتے ہیں، اس لیے بادل کو بھی ''سماء'' کہہ لیتے ہیں اور چھت کو بھی۔

❷ ''مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ'' کی ایک تفسیر وہ ہے جو طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں محمد ﷺ کی مدد نہیں کرے گا، وہ چھت سے ایک رسی باندھے، پھر اس کے ساتھ پھانسی لے کر اپنا گلا گھونٹ لے اور مر جائے اور دیکھے، کیا اس کے ایسا کرنے سے اس کے غصے اور حسد کی آگ بجھتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد ﷺ کی نصرت پر اس کے سینے میں بھڑک رہی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا وہ بے شک پھانسی لے کر مر جائے، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اپنے رسول کی نصرت یقیناً فرمائے گا۔ چونکہ ہر چیز کا اللہ کے ہاں ایک وقت مقرر ہے، اس لیے نصرت میں دیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد کبھی کرے گا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یقیناً اپنے تمام رسولوں اور اہل ایمان کی دنیا اور آخرت میں مدد فرماتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [ المؤمن : ۵۱ ] ''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔'' اس تفسیر پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے یا بعد میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر نہیں آیا تو ''اس کی مدد نہیں کرے گا'' میں ''اس'' سے رسول اللہ ﷺ کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟ جواب اس کا یہ دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

اور اسی طرح ہم نے اسے روشن آیات کی صورت میں نازل کیا ہے اور یہ کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ﴿۱۶﴾

طرف ضمیر لوٹانے کے لیے پہلے آپ کا ذکر ہونا ضروری نہیں، کیونکہ آپ کا ذکر ہر مومن کے ذہن میں موجود ہے۔ اس لیے الفاظ میں پہلے آپ ﷺ کا ذکر نہ بھی ہو تو حرج نہیں۔

دوسری تفسیر وہ ہے جو طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد سے نقل کی ہے کہ جو شخص (اپنے متعلق) یہ گمان کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں (اس کی کبھی مدد نہیں کرے گا) اسے کبھی رزق نہیں دے گا، وہ اوپر کی طرف رسی لٹکا کر اپنا گلا گھونٹ لے، پھر دیکھے...... یعنی جو شخص اللہ کی نصرت پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ایسے ناامید شخص کو چاہیے کہ وہ پھانسی لے کر مر جائے، پھر دیکھے کہ کیا اس سے اس کی امید برآتی ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے کہ اگر تم فلاں بات پر یقین نہیں کرتے تو جاؤ دیوار سے ٹکر مار کر مر جاؤ۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اس آیت کی ایک بہت عمدہ تفسیر فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''دنیا کی تکلیف میں جو اللہ تعالیٰ سے ناامید ہو کر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزوں کی پوجا کرے، جن کے ہاتھ نہ برا ہے نہ بھلا، وہ اپنے دل کو سمجھانے اور تسلی دینے کے لیے یہ صورت قیاس کر لے کہ جیسے ایک شخص اونچی لٹکتی رسی سے لٹک رہا ہے، اگر چڑھ نہیں سکتا تو توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے۔ جب رسی توڑ دی پھر کیا توقع؟ رسی کہا اللہ کی امید کو اور اس رسی کو آسمان کی طرف تانے یعنی اونچان کی طرف۔'' (موضح) اس تفسیر اور اس سے پہلی تفسیر دونوں میں اس آیت کا تعلق گزشتہ آیت: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ سے بھی واضح ہو رہا ہے۔

**آیت 16** ❶ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ: طبری نے فرمایا: ''اور جس طرح ہم نے مختلف دلائل کے ساتھ ان لوگوں کے لیے اپنی حجت واضح کی ہے جو لوگوں کے مرنے کے بعد انھیں زندہ کرنے پر ہمیں قادر نہیں مانتے اور ہم پر ایمان نہیں لاتے، اسی طرح ہم نے یہ پورا قرآن ہی نہایت روشن آیات کی صورت میں اتارا ہے۔''

❷ وَ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ: اس جملے کا پچھلے جملے سے کیا تعلق ہے اور درمیان میں واؤ لانے کی کیا حکمت ہے؟ اس سوال کے حل کے لیے اہل علم نے آیت کی کئی نحوی ترکیبیں کی ہیں، مگر مجھے سب سے قریب بقاعی کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ''وَ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ'' میں ''واؤ'' سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس کا کسی محذوف پر عطف ہے جو ''وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ'' سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ پوری عبارت یوں ہوگی: '' وَ كَذٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُعْلَمَ أَنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَ أَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ '' ''اور اسی طرح ہم نے اسے روشن آیات کی صورت میں نازل کیا ہے، تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ بے شک اللہ ہدایت دیتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـِٕيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا ١ۖۗ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور وہ لوگ جنھوں نے شرک کیا یقیناً اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۱۷﴾

جسے چاہتا ہے۔'' یعنی گو قرآن میں ایمان و توحید کی روشن دلیلیں موجود ہیں مگر سب لوگوں کے اس سے ہدایت نہ پانے کی وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ گمراہی اور ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ کوئی شخص اپنے بل بوتے پر یہ نعمت حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ علم و عقل اور تجربہ تو حقیقت تک پہنچنے کا ایک امکانی ذریعہ ہے، لیکن اس تک رسائی صرف اللہ کی توفیق پر موقوف ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کی یہ ترکیب کی ہے: ''وَالْاَمْرُ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ '' ''اور اصل معاملہ یہ ہے کہ بے شک اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔'' شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

آیت 17 ❶ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا...... : گزشتہ آیات میں ایمان والوں کے علاوہ مختلف لوگوں کا ذکر ہوا، کچھ قیامت کے منکر، کچھ کنارے پر رہ کر عبادت کرنے والے، کچھ اللہ کے ساتھ شریک بنانے والے وغیرہ۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ اتنے مختلف عقائد کے لوگ جو اپنی اپنی بات پر اس قدر پختہ ہیں کہ واضح دلائل کے باوجود اپنی بات نہیں چھوڑتے، آخر کبھی ان کے جھگڑے کا فیصلہ بھی ہوگا؟ فرمایا، ان کے جھگڑے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن فرمائے گا، جب مومن جنت اور کافر جہنم میں جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں ان کے حق یا باطل پر ہونے کا فیصلہ نہیں ہوا۔ یقیناً ہوا ہے اور قرآن مجید کا نام فرقان اسی لیے ہے۔ یہ کلام ایسے ہی ہے جیسے بحث ختم کرنے کے لیے بات اللہ کے سپرد کر دی جاتی ہے، حالانکہ بات کرنے والے کو اپنے سچا ہونے کا اور فریق مخالف کے خطا پر ہونے کا یقین ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
﴿ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ [ الشوریٰ : ۱۵ ]
''ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ ہمیں آپس میں جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

❷ مومنین، یہود، نصاریٰ اور صابئین کا بیان سورۂ بقرہ (۶۲) میں گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں، یہاں مجوس اور مشرکین کا مزید ذکر ہے۔ مجوس سے مراد آتش پرست ہیں جو دو خالق مانتے ہیں، ایک خالق خیر (یزدان) اور ایک خالق شر (اہرمن) یہ لوگ اپنے آپ کو زرتشت کا پیرو کہتے ہیں اور کسی نبی کا نام بھی لیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ بعد میں گمراہ ہوئے یا شروع ہی سے غلط تھے۔ مزدک نے ان کے مذہب اور اخلاق کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا، حتیٰ کہ حقیقی بہن سے نکاح بھی ان کے ہاں جائز قرار دیا گیا۔ ''وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا'' (وہ لوگ جنھوں نے شرک کیا) سے مراد عرب اور دوسرے ملکوں کے وہ مشرک ہیں

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ۔ اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب

جنھوں نے مندرجہ بالا گروہوں میں سے کسی کا نام اختیار نہیں کیا تھا، مثلاً گائے اور بتوں کے پجاری ہندو۔ قرآن مجید انھیں مشرکین اور ”وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا“ کے نام سے ذکر کرتا ہے، اگرچہ موحد مسلمانوں کے سوا مندرجہ بالا سب مذاہب میں شرک کی کوئی نہ کوئی قسم ضرور پائی جاتی ہے۔

③ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ : یعنی ان تمام گروہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حاکمانہ اختیار کی وجہ سے اندھا فیصلہ نہیں ہوگا، بلکہ عین عدل و انصاف ہوگا، کیونکہ ہر چیز اس کے سامنے ہے، وہ ہر چیز پر گواہ ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے عین مطابق جزا یا سزا دے گا۔

آیت 18 ① اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ ...... : پچھلی آیت میں جن گروہوں کا ذکر ہوا اہلِ ایمان کے علاوہ سب نے اللہ کے ساتھ شریک بنا رکھے ہیں۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے رکھا ہے۔ صابی ستارہ پرست، مجوس آتش پرست اور مشرکین بت پرست ہیں۔ اس آیت میں فرمایا کہ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی عبادت اور اسے سجدہ کرنے پر متفق ہے؟ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے عقل جیسی نعمت عطا فرمائی، اس کا حق تو یہ تھا کہ اس کے سارے افراد اوروں سے زیادہ اس کی عبادت اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر متفق ہوتے، مگر اس کے بہت سے افراد غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے عذابِ الٰہی کے حق دار ٹھہرے ہیں۔

② ”اَلَمْ تَرَ“ سے مراد ”أَلَمْ تَعْلَمْ“ ہے، یعنی کیا تجھے معلوم نہیں؟ کیونکہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والے تمام افراد کو اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ مزید دیکھیے سورۂ فیل کی آیت (۱): ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ﴾ کی تفسیر۔ ”اَلَمْ تَرَ“ کے اولین مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کے بعد آپ کی امت کا ہر فرد۔

③ بعض مفسرین نے یہاں سجدے سے مراد انقیاد لیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے ساری مخلوق عاجز اور بے بس ہے۔ چاہے یا نہ چاہے، اسے اس کے سامنے گردن جھکانا اور اس کے ”كُنْ فَيَكُوْنُ“ والے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ ”كُنْ“ کہے اور کوئی اس سے منہ پھیر سکے۔ مگر یہاں سجدے کا صرف یہ معنی مراد لینا درست نہیں، کیونکہ یہ سجدہ تو ساری مخلوق کے ساتھ ساتھ ہر انسان اور جن بھی کرتا ہے، بلکہ یہاں مراد وہ سجدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق بہت سے لوگ کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں پر عذاب واجب ہو چکا ہے، یعنی وہ سجدہ نہیں کرتے۔ اگر تکوینی سجدہ مراد ہو تو مومن و کافر کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کرے۔ آدمی ایک ٹانگ اٹھا سکتا ہے، ذرا دونوں اٹھا کر تو دکھائے؟ اپنی بھوک یا پیاس کو روک لے۔

الْعَذَابُ ۭ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۞ﶝ

ثابت ہو چکا اور جسے اللہ ذلیل کر دے پھر اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ۱۸

پیشاب پاخانہ کی حاجت سے بے نیاز ہو کر دکھائے۔ دل کی دھڑکن، خون کی گردش، بچپن، جوانی، بڑھاپا، بیماری، ضعف، انحطاط، موت، غرض اللہ کے کسی تکوینی حکم کے مقابلے میں سجدے سے سر اٹھا کر دکھائے؟ معلوم ہوا اس سجدے سے وہ سجدہ مراد ہے جو انسان اپنی خوشی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق وہ تمام چیزیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے اپنی خوشی سے اللہ کے لیے سجدہ کرتی ہیں، جب کہ لوگوں میں سے بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے یہ سجدہ خوشی سے کرتے ہیں اور بہت سے نہیں کرتے۔ جن و انس کے علاوہ باقی ساری مخلوق دونوں طرح سے اللہ کے لیے سجدہ ریز ہے، تکوینی طور پر بھی اور اطاعت و عبادت کے لیے بھی، جبکہ انسان تکوینی طور پر اللہ کے حکم کے سامنے سجدہ ریز ہے، اطاعت و عبادت کے طور پر بہت سے انسان سجدہ کرتے ہیں، بہت سے نہیں کرتے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا تکوینی حکم کے تابع ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر عبادت کے لیے باقاعدہ سجدہ کرنا سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ پہاڑ، درخت، سورج، چاند اور ستارے تو بے جان چیزیں ہیں، وہ سجدہ کیا کریں گی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں میں احساس اور شعور رکھا ہے اور اس نے ہر چیز کو اپنے سامنے رکوع و سجود اور قیام و تسبیح کا طریقہ بھی سکھا رکھا ہے، حتیٰ کہ جب اس نے زمین و آسمان کو حکم دیا کہ خوشی یا ناخوشی سے حاضر ہو جاؤ تو دونوں نے کہا، ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۱۱) اور فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ [ النور : ٤١ ] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز (جس میں قیام اور رکوع و سجود سب کچھ ہوتا ہے) اور اپنی تسبیح جان لی ہے اور اللہ اسے خوب جاننے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔'' اور دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴۴)، احزاب (۷۲)، حشر (۲۱)، نحل (۴۸)، حم السجدہ (۲۱) اور سورۂ بقرہ (۷۴) خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ''النَّاسِ'' کے سجدے سے مراد عبادت کا سجدہ ہے، جو کچھ لوگ کرتے ہیں اور کچھ لوگ نہیں کرتے اور ''النَّاسِ'' کے علاوہ باقی تمام چیزوں کے سجدے سے دونوں سجدے مراد ہیں، تکوینی بھی اور عبادت کا سجدہ بھی۔

❹ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار مخلوق میں سے چند کا خاص طور پر نام لے کر ذکر فرمایا کہ وہ اللہ کے لیے سجدہ کرتی ہیں۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام اشیاء میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی مشرک نے اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش صابئین کرتے ہیں۔ عرب کے مشرکین شعریٰ اور دوسرے ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو ان کی عبادت سے منع فرمایا تھا۔ پہاڑوں کے پتھروں کی پوجا بت پرست کرتے ہیں، اسی طرح کئی درختوں کی بھی عبادت ہوتی ہے، جیسے کئی قبر پرست اور بت پرست اپنے اپنے دربار کے درختوں کو بھی کرنی والا سمجھتے ہیں اور ان کے پتے یا

هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّهِمۡ ۫ فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِیَابٌ مِّنۡ نَّارٍ ؕ یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِیۡمُ ﴿۱۹﴾

یہ دو جھگڑنے والے ہیں، جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جا چکے، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا ﴿۱۹﴾

---

ٹہنی توڑنے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ کئی جانوروں کو بھی معبود بنایا گیا ہے، جیسے ہندو گائے، سانپ، بندر اور کئی جانوروں کی پوجا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب تو اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتے اور اسے اپنا رب مانتے ہیں، پھر عقل سے کس قدر عاری ہیں وہ لوگ جو اللہ کو سجدہ کرنے کے بجائے ان کو سجدہ کرتے ہیں جو خود اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر انسان کی اور ذلت کیا ہوگی؟

⑤ وَمَنۡ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ : "یُّهِنِ" پر "مَنۡ" آنے کی وجہ سے نون پر جزم آ گئی، دو ساکنوں کی وجہ سے "یاء" گر گئی تو "یُھِنۡ" ہو گیا، پھر آگے ملانے کے لیے نون کو کسرہ دے دیا۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ اس کے شرک و کفر کی شامت کے نتیجے میں انسانی عز و شرف سے محروم کر کے جانوروں سے بھی بدتر بنا دے (اعراف: ۱۷۹) اور جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا کر کے ہمیشہ کے لیے ذلیل و رسوا کر دے تو اسے اس ذلت سے نکال کر کوئی عزت عطا کرنے والا نہیں، فرمایا: ﴿وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ﴾ [ آل عمران : ۲۶ ] "اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے۔"

⑥ اِنَّ اللّٰهَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ : "اِنَّ" (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) اپنے سے پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو عزت اور کسی کو ذلت کیوں دیتا ہے؟ فرمایا، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۲۳) کی تفسیر۔

⑦ اس آیت پر سجدہ ہے اور سورۂ حج کے اس سجدہ پر سب کا اتفاق ہے۔

**آیت 19** ① هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّهِمۡ : یہاں دو جھگڑنے والوں میں ایک فریق مسلمان اور دوسرا فریق وہ پانچوں گروہ ہیں جن کا پچھلی آیت میں ایمان والوں کے بعد ذکر ہوا ہے اور جنھیں اس آیت میں کافر قرار دیا گیا ہے۔ رب تعالیٰ کے بارے میں جھگڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی توحید کے قائل ہیں اور یہ تمام لوگ توحید کے بارے میں طرح طرح کے خیالات رکھتے ہیں جو کفر ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس مخالفت کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کی طرف سے جہاد ہے۔ پہلا غزوہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں دو بدو جنگ ہوئی غزوۂ بدر تھا، جس میں سب سے پہلے میدان میں نکلنے والے حمزہ بن عبد المطلب، عبیدہ بن حارث اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم تھے، جو اپنے قریب ترین رشتہ داروں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ کے مقابلے میں نکلے تھے۔ چنانچہ اس آیت کا اولین مصداق یہی تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے: ((أَنَّهُ کَانَ یُقْسِمُ قَسَمًا إِنَّ هٰذِهِ الْآیَةَ : ﴿هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّهِمۡ﴾

يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ ع ۱۳

اس کے ساتھ پگھلا دیا جائے گا جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اور چمڑے بھی ﴿۲۰﴾ اور انھی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں ﴿۲۱﴾ جب کبھی ارادہ کریں گے کہ سخت گھٹن کی وجہ سے اس سے نکلیں، اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور چکھو جلنے کا عذاب ﴿۲۲﴾

---

نَزَلَتْ فِيْ حَمْزَةَ وَصَاحِبَيْهِ وَعُتْبَةَ وَصَاحِبَيْهِ يَوْمَ بَرَزُوْا فِيْ يَوْمِ بَدْرٍ ﴾ [ بخاري، التفسير، باب ﴿ هذان خصمان ...... ﴾: ٤٧٤٣۔ مسلم: ٣٠٣٣ ] "وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ آیت: ﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ﴾ ان چھ آدمیوں حمزہ اور ان کے دو ساتھی، عتبہ اور اس کے دو ساتھیوں کے بارے میں اتری تھی جو بدر کے دن ایک دوسرے کے مقابلے میں نکلے تھے۔" اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں پہلا شخص ہوں جو قیامت کے دن اس جھگڑے کے لیے رحمان کے سامنے دونوں زانوؤں کے بل بیٹھوں گا اور اپنا مقدمہ پیش کروں گا۔" [ بخاري، التفسير، باب ﴿ هذان خصمان اختصموا في ربهم ﴾: ٤٧٤٤ ] ان تینوں حضرات کے بعد قیامت تک آنے والے وہ تمام مجاہد بھی اس آیت میں شامل ہیں جنھوں نے توحید کی خاطر کفار سے جہاد کیا یا کریں گے۔

❷ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ : یعنی کافروں کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جا چکے۔ یہاں قیامت کے دن ہونے والے کام کو ماضی کے لفظ کے ساتھ بیان فرمایا، یعنی یہ کام اتنا یقینی ہے کہ بس ہو ہی چکا۔ آگ کے یہ کپڑے قمیصوں کی صورت میں بھی ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ ﴾ [ إبراهيم: ٥٠ ] "ان کی قمیصیں گندھک کی ہوں گی۔" اور نیچے اور اوپر والے بچھونوں اور لحافوں کی صورت میں بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ﴾ [ الأعراف: ٤١ ] "ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا اور ان کے اوپر کے لحاف ہوں گے۔"

❸ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ : "اَلْحَمِيْمُ" انتہائی گرم (کھولتا ہوا) پانی۔ مزید دیکھیے سورۂ دخان (۴۸)۔

**آیت 20** يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ : "صَهَرَ (مَنَعَ) الشَّحْمَ" اس نے چربی پگھلائی، یعنی ان کے سروں پر ایسا جلتا اور کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا کہ جس کے ساتھ ان کے پیٹ کے اندر کی تمام چیزیں پگھل کر باہر نکل جائیں گی اور ان کے چمڑے بھی پگھل جائیں گے اور یہ عذاب مسلسل جاری رہے گا۔ جب بھی ان کے چمڑے گل سڑ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں ان کے علاوہ اور چمڑے بدل دے گا۔ دیکھیے سورۂ نساء (۵۶)۔

**آیت 21** وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ : "مَقَامِعُ" "مِقْمَعٌ" کی جمع ہے، ہتھوڑے۔

**آیت 22** ❶ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا ...... : اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ آگ کی لپٹ کے ساتھ اوپر آئیں گے اور چاہیں گے کہ جہنم کی شدید گھٹن سے نکل جائیں تو آگ کی لپٹ کے نیچے جانے کے ساتھ وہ بھی دوبارہ نیچے چلے جائیں

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، انھیں اس میں کچھ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور موتی بھی اور ان کا لباس اس میں ریشم ہوگا ﴿۲۳﴾

گے۔ یہ مطلب اس لیے ہے کہ جہنمی تو زنجیروں میں جکڑے اور پروئے ہوئے ہوں گے، وہ خود کس طرح نکلنے کا ارادہ کر سکتے ہیں؟ فرمایا: ﴿وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ [ إبراهيم : ٤٩ ] ''اور تو مجرموں کو اس دن زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہوئے دیکھے گا۔'' اور فرمایا: ﴿ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴾ [ الحاقة : ٣٢ ] ''پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، پس اس (کافر) کو داخل کر دو۔''

❷ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ : یعنی ان سے یہ کہا جائے گا کہ جلنے کے عذاب کا مزا چکھو۔

**آیت 23** ❶ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... : ''يُحَلَّوْنَ'' ''حَلّٰى يُحَلِّيْ تَحْلِيَةً'' (تفعیل) سے مضارع مجہول ہے۔ اسی سے ''حِلْيَةٌ'' بمعنی زیور ہے۔ ''اَسَاوِرَ'' ''أَسْوِرَةٌ'' کی جمع ہے جو خود ''سِوَارٌ'' کی جمع ہے۔ جمع الجمع ان کنگنوں کی کثرت اور حسن و خوبی کے بیان کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ ''مِنْ اَسَاوِرَ'' میں ''مِنْ'' تبعیض کے لیے ہے، یعنی کچھ کنگن سونے اور موتیوں کے ہوں گے اور کچھ ایسے ہوں گے جو تم نہیں جانتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ [ السجدة : ١٧ ] ''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔'' توحید ربانی کے بارے میں باہمی معرکہ آرا گروہوں میں سے ''الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کے عذاب کے ذکر کے بعد ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کے ثواب کا ذکر ہو رہا ہے۔ ابتدا اس کی حرف تاکید ''اِنَّ'' سے ہے اور کفار کے ہر عذاب کے مقابلے میں اہل ایمان کے لیے کسی نہ کسی نعمت کا ذکر ہے۔ چنانچہ ''يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا''، ''كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا'' کے مقابلے میں ہے۔ ''تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ''، ''يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ'' کے مقابلے میں ہے۔ ''وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ''، ''قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ'' کے مقابلے میں ہے۔ ''يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ''، ''وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ'' کے مقابلے میں ہے اور ''هُدُوْۤا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ''، ''وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ'' کے مقابلے میں ہے، کیونکہ جنتیوں کے لیے طیب بات ''سلام'' ہے تو جہنمیوں کے لیے بری بات ''جلنے کا عذاب چکھو'' ہے۔

❷ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا : عورتوں کے لیے سونے اور موتیوں کے زیور تو معروف بات ہے، رہے مرد تو گزشتہ زمانے میں بادشاہ اور بڑے بڑے رئیس زینت اور اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لیے کنگن اور موتی پہنا کرتے تھے۔ اس آیت

وَ هُدُوْۤا اِلَى الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَ هُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِیْدِ ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

اور انھیں پاکیزہ بات کی طرف ہدایت کی گئی اور انھیں تمام تعریفوں کے مالک کے راستے کی طرف ہدایت کی گئی ﴿۲۴﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور وہ اللہ کے راستے سے اور اس حرمت والی مسجد سے روکتے ہیں جسے ہم نے

سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اہلِ ایمان کو جنت میں شاہانہ لباس پہنایا جائے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ کہف (۳۱)۔

③ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ : "حَرِیْرٌ" سے مراد خالص ریشم ہے، جس کا استعمال مردوں کے لیے دنیا میں حرام ہے۔ انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا فَلَنْ يَلْبَسَهُ فِي الْآخِرَةِ)) [ بخاري، اللباس، باب لبس الحرير للرجال ... : ۵۸۳۲۔ مسلم: ۷۳ ] "جس شخص نے دنیا میں ریشم پہنا وہ اسے آخرت میں ہرگز نہیں پہنے گا۔"

**آیت 24** ① وَ هُدُوْۤا اِلَى الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ : یعنی دنیا میں انھیں پاکیزہ بات کلمۂ توحید "لا الٰہ الا اللہ" کی ہدایت عطا ہوئی اور انھیں تمام تعریفوں والے پروردگار کے راستے اسلام کی ہدایت ملی۔ اسی طرح آخرت میں انھیں اس مقام کی طرف لے جایا جائے گا جہاں وہ پاکیزہ کلام ہی سنیں گے، کوئی لغو یا گناہ کی بات کان میں نہیں پڑے گی۔ نہ جھگڑا ہو گا اور نہ کوئی بک بک، ہر طرف سے سلام کی آواز آئے گی، فرمایا: ﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِیْمًا ۙ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ [ الواقعة : ۲۵، ۲۶ ] "وہ اس میں نہ بے ہودہ گفتگو سنیں گے اور نہ گناہ میں ڈالنے والی بات، مگر یہ کہنا کہ سلام ہے، سلام ہے۔" سلام کے علاوہ اللہ کی حمد ہو گی اور اس کی تسبیح۔ دیکھیے سورۂ فاطر (۳۳ تا ۳۵) اور زمر (۷۳، ۷۴)۔

② وَ هُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِیْدِ : اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اہلِ جنت کو یہ سعادت حمدِ الٰہی کی وجہ سے حاصل ہو گی، فرمایا: ﴿دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [ یونس : ۱۰ ] "ان کی دعا ان میں یہ ہو گی "پاک ہے تو اے اللہ!" اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہو گی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہو گا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔"

**آیت 25** ① اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ : ابن عاشور رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ "هُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِیْدِ" کے مقابلے میں ہے کہ اہلِ ایمان کو اللہ (الْحَمِیْدِ) کے راستے کی ہدایت عطا ہوئی، جب کہ کفار کا یہ حال ہے کہ وہ خود بھی راہ ہدایت اختیار کرنے کا انکار کر چکے ہیں اور لوگوں کو بھی اللہ کے راستے (اسلام) اور مسجد حرام سے مسلسل روک رہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مومنوں کے لیے جنت اور کافروں کے لیے عذاب الیم ہے۔ "كَفَرُوْا" ماضی ہے اور "یَصُدُّوْنَ" مضارع، یعنی وہ کافر تو گزشتہ زمانے سے ہو چکے، البتہ ان کا لوگوں کو اسلام سے اور مسجد حرام سے روکنے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ ماضی پر مضارع کے عطف کی ایک اور مثال اس آیت میں ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [ الرعد : ۲۸ ] کفار مسلمانوں کو ہجرت سے پہلے بھی مسجد حرام میں آنے، نماز پڑھنے اور طواف کرنے سے روکتے تھے، (علق: ۹، ۱۰) اور ہجرت کے بعد بھی جب وہ سن ۶ ہجری میں عمرہ کرنے کے لیے آئے تو کفار نے انھیں عمرہ کرنے

وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ

سب لوگوں کے لیے اس طرح بنایا ہے کہ اس میں رہنے والے اور باہر سے آنے والے برابر ہیں اور جو بھی اس میں

سے منع کر دیا۔ دیکھیے سورۂ فتح (۲۵، ۲۶) اور بقرہ (۲۱۷) نتیجہ یہ کہ اللہ کے راستے سے روکنے کی وجہ سے کفار عذاب الیم کے حق دار ٹھہرے جب کہ مسلمان اللہ کے راستے (صِرَاطِ الْحَمِيْدِ) پر چلنے کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

2 وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ...... : اگرچہ اللہ کے راستے سے روکنے میں مسجد حرام سے روکنا بھی شامل تھا مگر اسے علیحدہ ذکر فرمایا۔ مقصود مسجد حرام کی عظمت کو نمایاں کرنا ہے اور اس مناسبت سے اس کی تعمیر، حج کی ابتدا، طواف اور دوسرے چند احکام، پھر قربانی، اس کی حکمت اور اہمیت کی طرف منتقل ہونا ہے۔

3 "الْعَاكِفُ" کا لفظی معنی "اپنے آپ کو روک کر رکھنے والا" ہے اور مراد مکہ کا باشندہ ہے، کیونکہ اس کے مقابلے میں "الْبَادِ" آ رہا ہے، یعنی "بادیہ" (باہر) سے آنے والا۔ کفار کے ظلم کا بیان ہے کہ وہ اس مسجد سے لوگوں کو روکتے ہیں جس میں عبادت، طواف، عمرہ اور حج کے لیے آنا سب لوگوں کا برابر حق ہے، خواہ مکہ کے رہائشی ہوں یا باہر سے آنے والے۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( يَا بَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ ! لَا تَمْنَعُوْا أَحَدًا طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ وَصَلّٰى أَيَّةَ سَاعَةٍ شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ )) [ ترمذي، الحج، باب ما جاء في الصلاة بعد العصر : ۸۶۸ ] "اے بنی عبد مناف! کسی شخص کو مت روکو جو رات یا دن کی کسی گھڑی میں اس گھر کا طواف کرنا چاہے یا (اس میں) نماز پڑھنا چاہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ مسجد حرام میں نماز کے ممنوعہ اوقات میں بھی نماز اور طواف جائز ہے۔

4 تیسیر القرآن میں ہے کہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حقوق ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ مکہ اور باہر سے آنے والے لوگوں کو برابر کے حصے دار قرار دیا ہے اور آیا ان حقوق کا اور ان کی برابری کا تعلق صرف بیت الحرام یا کعبہ سے ہے یا پورے حرم مکہ سے؟ جہاں تک صرف بیت اللہ کا تعلق ہے اور اس میں نماز، طواف اور ارکانِ حج بجا لانے کا تعلق ہے تو اس میں اہلِ مکہ اور بیرونی حضرات کے اس حق عبادت میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اہلِ مکہ کو قطعاً یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیرونی حضرات کو حرم میں داخل ہونے، نمازیں ادا کرنے، طواف کرنے یا ارکان حج وعمرہ بجا لانے سے روکیں، کیونکہ اس حق میں اہلِ مکہ اور بیرونی حضرات سب برابر کے حصے دار ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا اس حق کا تعلق پورے حرم مکہ سے بھی ہے یا نہیں؟ یعنی کیا پورے حرم مکہ کے دروازے باہر سے آنے والے حضرات کے لیے کھلے رہنے چاہییں کہ وہ جب چاہیں حرم مکہ کے اندر موجود جس جگہ چاہیں آ کر ڈیرے ڈال دیں اور رہیں سہیں اور ان سے کوئی کرایہ وغیرہ بھی وصول نہ کیا جائے؟ اس اختلاف کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ ارکان حج میں سے بیشتر کا تعلق صرف بیت اللہ سے نہیں بلکہ حرم مکہ سے ہے۔ صفا، مروہ، منیٰ، مزدلفہ، مشعر حرام سب بیت اللہ کی حدود سے باہر ہیں، جب کہ حرم مکہ میں داخل ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود بعض مقامات پر مسجد حرام کا ذکر کر کے اس سے حرم مکہ مراد لیا ہے، مثلاً ارشاد باری ہے: ﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ

﴿فِيْهِ وَ الْبَادِ ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (۲۵) ع ۱۰

کسی قسم کے ظلم کے ساتھ کسی کج روی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک عذاب سے مزہ چکھائیں گے (۲۵)

يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۶ ] ''یہ (رعایت) اس شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔'' اور یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص مسجد حرام کے اندر رہائش پذیر نہیں ہوتا، یہاں لازماً مسجد حرام سے مراد حرم مکہ ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [ البقرۃ : ۲۱۷ ] ''اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک (ماہ حرام میں جنگ کرنے سے) زیادہ بڑا ہے۔''

پھر اس سے اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا حرم میں زمین اور مکان کی خرید و فروخت اور اس سے آگے ان کی ملکیت و وراثت بھی جائز ہے یا نہیں؟ تو یہ بات تو صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اسلام سے پہلے مکہ کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے ملکیت و وراثت اور بیچنے اور کرایہ پر دینے کے حقوق قائم تھے جو اسلام کے بعد بھی قائم رہے، اسلام نے انھیں منسوخ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد عقیل نے آپ ﷺ کے مکان پر قبضہ کر لیا، پھر اسے بیچ بھی دیا، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَهَلْ تَرَكَ عَقِيْلٌ مِنْ رِبَاعٍ أَوْ دُوْرٍ » [ بخاري، الحج، باب توريث دور مكة و بيعها و شرائها...... : ۱۵۸۸ ] ''کیا عقیل نے ہمارا کوئی مکان چھوڑا بھی ہے (جس میں ہم رہیں)؟'' نیز عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نافع بن عبد الحارث نے مکہ میں صفوان بن امیہ سے ایک گھر جیل خانہ بنانے کے لیے اس شرط پر خریدا کہ اگر عمر رضی اللہ عنہ اس خریداری کو منظور کریں گے تو بیع پوری ہو گی، بصورت دیگر صفوان کو چار سو دینار مل جائیں گے۔ [ بخاري، في الخصومات، باب الربط والحبس في الحرم، قبل ح : ۲۴۲۳ ] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حرم میں مکانوں کی خرید و فروخت جائز ہے (وہ چار سو دینار عمر رضی اللہ عنہ کا حکم آنے تک کے عرصے کا کرایہ شمار ہوں گے یا اتنی دیر تک فروخت سے روک رکھنے کا زرِ تلافی)۔ کچھ حضرات نے بخاری کی صحیح روایات کے مقابلے میں ضعیف روایات کے ساتھ مکہ کے مکانات کی خرید و فروخت اور انھیں کرایہ پر دینے کو حرام ٹھہرایا ہے، ان روایات میں سے ایک بھی صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، کوئی منقطع ہے، کوئی مرسل اور کسی میں کوئی راوی ضعیف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کے قول سے دین کا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مکہ کے مکانوں کا کرایہ نہ لینا مستحب ہے، تاہم اس کے جواز سے انکار مشکل ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کا اپنا موقف یہ ہے کہ حرم مکہ میں مکانوں کی خرید و فروخت اور وراثت وغیرہ جائز ہے، جیسا کہ عنوان ''بَابُ تَوْرِيْثِ دُوْرِ مَكَّةَ وَ بَيْعِهَا وَ شِرَائِهَا'' (اس بات کا بیان کہ مکہ میں موجود مکانات میراث ہو سکتے ہیں اور ان کی خرید و فروخت جائز ہے) سے معلوم ہو رہا ہے۔

(5) وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ ...... : ''اِلْحَادٌ'' سیدھے راستے سے ہٹ جانا۔ ظلم کا لفظ عام ہے جس میں سب سے پہلے کفر و شرک آتا ہے، پھر کوئی بھی کام کرنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، یا کوئی کام ترک کرنا جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ

اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین کر دی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف

دیا ہے، اس میں بدعت بھی شامل ہے اور گناہ کا کوئی اور کام بھی، مثلاً حرم کی حرمت کا خیال نہ رکھنا، یعنی حرم کے جانوروں کو ذبح کرنا، اس کے درختوں کو کاٹنا، کسی کی گم شدہ چیز اٹھانا، الا یہ کہ اسے استعمال نہ کرے اور اس کا اعلان ہمیشہ کرتا رہے، اس میں ذخیرہ اندوزی کرنا۔ غرض دوسری جگہوں میں ٹیڑھی راہ اختیار کرنا عذاب الیم کا باعث ہے مگر حرم مکہ میں اس کا ارادہ بھی عذابِ الیم کا باعث ہے۔

آیت 26 ① وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ: "بَوَّاْنَا" (تفعیل) جگہ دینا، جگہ مقرر کرنا، یعنی وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین کی۔ بیت اللہ اس سے پہلے تعمیر ہو چکا تھا، بلکہ زمین پر اللہ کا سب سے پہلا گھر یہی تھا اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے آدم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ اب اللہ بہتر جانتا ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی یا اس سے پہلے فرشتوں نے اسے تعمیر کیا تھا۔ ایک ٹیلے پر اس کی بنیادیں موجود تھیں جس پر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی عمارت تعمیر فرمائی۔ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی لمبی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ایک اونچی جگہ تعمیر ہوا تھا۔ چنانچہ اس حدیث میں زمزم کے نمودار ہونے کے بعد فرشتے کے ام اسماعیل علیہا السلام کو تسلی دینے کا ذکر ہے: « فَقَالَ لَهَا الْمَلَكُ لَا تَخَافُوا الضَّيْعَةَ فَإِنَّ هٰهُنَا بَيْتَ اللّٰهِ، يَبْنِيْ هٰذَا الْغُلَامُ وَ أَبُوْهُ وَ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَهْلَهُ وَ كَانَ الْبَيْتُ مُرْتَفِعًا مِنَ الْأَرْضِ كَالرَّابِيَةِ تَأْتِيْهِ السُّيُوْلُ فَتَأْخُذُ عَنْ يَمِيْنِهِ وَ عَنْ شِمَالِهِ فَكَانَتْ كَذٰلِكَ حَتّٰى مَرَّتْ بِهِمْ رُفْقَةٌ مِنْ جُرْهُمَ » [ بخاري، الأنبياء، باب ﴿ يزفون ﴾: ٣٣٦٤ ] ''تو فرشتے نے اس سے کہا، تم ضائع ہونے سے مت ڈرو، کیونکہ یہاں اللہ کا گھر ہے، یہ لڑکا اور اس کا باپ اسے بنائے گا اور اللہ اس کے رہنے والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ بیت اللہ زمین سے ٹیلے کی طرح بلند تھا، سیلاب آتے اور اس کے دائیں بائیں طرف ہو جاتے۔ ام اسماعیل ایسے ہی رہیں، حتیٰ کہ جرہم قبیلے کے کچھ لوگ ان کے پاس سے گزرے۔'' اس حدیث کے آخر میں بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمزم کے نمودار ہونے کے وقت بھی ایک ٹیلے پر بیت اللہ موجود تھا مگر اس کی از سرِ نو تعمیر اسماعیل علیہ السلام کے جوان ہونے پر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے کی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۷) کی تفسیر۔

② اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا ...... : "اَلرُّكَّعِ" "رَاكِعٌ" کی جمع ہے، جیسے "سُجَّدٌ" ہے۔ "اَلسُّجُوْدِ" "سَاجِدٌ" کی جمع ہے، جیسے "رَاقِدٌ" اور "جَالِسٌ" کی جمع "رُقُوْدٌ" اور "جُلُوْسٌ" ہے۔ طواف کا معنی کسی چیز کے گرد پھرنا، چکر لگانا ہے۔ یعنی اس گھر کی بنیاد خالص توحید پر رکھو، ہر شخص یہاں آ کر صرف اللہ کی عبادت کرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ مگر

وَ الْقَآىِٕمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ

کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع، سجود کرنے والوں کے لیے پاک کر ﴿٢٦﴾ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے،

کفار مکہ نے اس کے گرد تین سو ساٹھ بت رکھ دیے جن کا وہ طواف کرتے تھے، اب بھی کئی مسلمان کہلانے والے قبروں اور آستانوں کا طواف کرتے ہیں، حالانکہ طواف اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ایک گھر کا رکھا ہے، جسے کعبۃ اللہ کہتے ہیں، اس کے سوا کسی جگہ کا یا شخص کا طواف جائز نہیں۔ کعبہ کو "بَيْتِيَ" (میرا گھر) کہنے میں اس کی جو شان بیان ہوئی ہے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی بیت اللہ کی تعمیر کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور میرے گھر کو طواف، قیام، سجدہ اور رکوع کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔ بیت اللہ کو صاف ستھرا رکھنے سے مراد عام صفائی کے علاوہ شرک و بت پرستی سے پاک صاف رکھنا ہے۔ اس سے مشرکین کو عار دلانا مقصود ہے کہ یہ شرط تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلی آتی ہے کہ اس میں بت پرستی حرام ہے۔ نیز دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۵) کی تفسیر۔

**آیت 27** ① **وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ......** : حج کا لفظی معنی قصد ہے، مراد اللہ کے گھر کا قصد ہے، اس نیت سے کہ وہ قولی، بدنی اور مالی عبادات ادا کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں مقرر فرمائی ہیں۔ "**رِجَالًا**" "راجل" کی جمع ہے، جیسے "نَائِمٌ" کی جمع "نِيَامٌ" ہے، یعنی پیدل چلنے والے۔ "**ضَامِرٍ**" سواری کا وہ جانور جسے چارے کی قلت اور سفر نے تھکا کر دبلا کر دیا ہو۔ "**فَجٍّ**" دو پہاڑوں کے درمیان کھلے راستے کو کہتے ہیں، مکہ کے راستے میں اکثر پہاڑوں سے گزر ہوتا ہے، اس لیے اس کے راستوں کو "**فَجٍّ**" کہہ دیا ہے۔ "**عَمِيْقٍ**" کا لفظی معنی گہرا ہے، مراد دور کا سفر ہے، دور کی مسافت کو کنویں کی گہرائی سے مشابہت دی ہے۔ پنجابی میں اسے "ڈونگھے پینڈے" کہتے ہیں۔

② حج کے اعلان سے پہلے اپنے گھر کو طواف، قیام، رکوع اور سجدہ کرنے کے لیے آنے والوں کی خاطر پاک صاف کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا مہمانوں کی آمد سے پہلے گھر کی صفائی ہونی چاہیے۔

③ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو کعبہ کی تعمیر کے بعد حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو، وہ تمھارے پاس پیدل اور ان بے شمار سواریوں پر سوار ہو کر آئیں گے، جو بہت گہرے اور دور دراز راستوں کو طے کرتی ہوئی آئیں گی اور سفر کی دوری کی وجہ سے لاغر ہو چکی ہوں گی۔ "**كُلِّ ضَامِرٍ**" سے مراد لاغر سواریوں کی کثرت ہے، کیونکہ ہر لاغر سواری تو مکہ نہیں جاتی۔ عربی میں "كُلٌّ" کا لفظ کثرت کے لیے بھی آتا ہے، جیسا کہ عنترہ کے ان شعروں میں "كُلٌّ" کا لفظ تین دفعہ کثرت کے معنی میں آیا ہے۔

جَادَتْ عَلَيْهِ كُلُّ بِكْرَةٍ حُرَّةٍ فَتَرَكْنَ كُلَّ قَرَارَةٍ كَالدِّرْهَمِ
سَحًّا وَ تَسْكَابًا فَكُلَّ عَشِيَّةٍ يَجْرِيْ عَلَيْهَا الْمَاءُ لَمْ يَتَصَرَّمِ

(ابن عاشور)

ابراہیم علیہ السلام نے یہ اعلان کیسے کیا؟ اس کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں ہے: "جب اللہ تعالیٰ نے حج کی دعوت کے لیے اعلان

ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾

پیدل اور ہر لاغر سواری پر آئیں گے، جو ہر دور دراز راستے سے آئیں گی ﴿۲۷﴾

کرنے کا حکم دیا تو ذکر کیا جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی، پروردگارا! میں لوگوں تک یہ پیغام کیسے پہنچاؤں، میری تو آواز ہی ان تک نہیں پہنچے گی؟ فرمایا، تم منادی کرو، پیغام پہنچانا ہمارا کام ہے۔ تو آپ نے اپنے مقام پر، بعض نے کہا پتھر پر، بعض نے کہا صفا پر اور بعض نے کہا جبل ابی قبیس پر کھڑے ہو کر اعلان کیا: ''لوگو! تمھارے رب نے گھر بنایا ہے، تم اس کا حج کرو۔'' کہا جاتا ہے کہ پہاڑ جھک گئے، حتیٰ کہ یہ آواز زمین کے کناروں تک پہنچ گئی اور جو ماؤں کے شکم یا باپوں کی پشت میں تھے ان کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ ہر پتھر، اینٹ یا درخت جس نے اسے سنا اس نے بھی اور جس شخص کے متعلق اللہ نے قیامت تک حج کرنا لکھا تھا، سب نے جواب میں کہا: '' لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ '' یہ ان روایتوں کا مضمون ہے جو ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر اور کئی ایک سلف سے آئی ہیں۔ (واللہ اعلم) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے انھیں پورے طول سے نقل کیا ہے۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان سے ظاہر ہے کہ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات مروی نہیں، اوپر نقل کردہ روایات میں ''ذکر کیا جاتا ہے''، ''بعض نے کہا''، ''کہا جاتا ہے'' اور ''واللہ اعلم'' کے الفاظ ابن کثیر کی ان روایات کی صحت میں تردد کو ظاہر کر رہے ہیں۔ تابعین نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس اعلان کے وقت وہاں موجود نہیں تھے اور نہ انھوں نے اپنا ذریعہ بتایا ہے۔ رہی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس کے متعلق تفسیر ابن کثیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر لکھتے ہیں کہ اسے ابن ابی شیبہ (مصنف: ۵۱۸/۱۱) اور حاکم (المستدرک: ۳۸۸/۲) دونوں نے جریر عن قابوس عن ابیہ عن ابن عباس کے طریق سے مختصراً بیان کیا ہے، حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، لیکن قابوس '' لَيِّنُ الْحَدِيْثِ '' (کمزور حدیث والا) ہے، جیسا کہ تقریب میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ثابت بھی ہو تو معلوم نہیں انھوں نے یہ کہاں سے لی ہے؟ کیونکہ نہ خود اس وقت موجود تھے اور نہ انھوں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی آواز ساری دنیا اور تمام ارواح تک پہنچانا کچھ مشکل نہیں، مگر یہ بات کسی معتبر طریقے سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ ابن عاشور رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام ''رَحَّالَةٌ'' تھے، یعنی بہت سفر کیا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے حسب استطاعت اس حکم پر عمل کیا اور ہر اس مقام پر حج کا اعلان کیا جہاں وہ اپنے سفروں کے دوران گزرے یا پہنچے۔ پھر ان کے بعد ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا، اب دنیا کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں یہ اعلان نہ پہنچا ہو اور جہاں سے لوگ سفر کر کے حج کے لیے نہ پہنچتے ہوں۔ سعودی حکومت کا اندازہ ہے کہ دس پندرہ سال تک حاجیوں کی تعداد سالانہ ایک کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ سارا سال عمرہ کے لیے آنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ '' يَاْتُوْكَ رِجَالًا '' (تیرے پاس آئیں گے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ہر سال حج کے موقع پر خود وہاں موجود ہوتے تھے، یا مراد ہے کہ حج پر جانے والا ہر شخص ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر گویا انھی کے پاس جاتا ہے۔

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ

تاکہ وہ اپنے بہت سے فائدوں میں حاضر ہوں اور چند معلوم دنوں میں ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو

آیت 28 ① لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ : یعنی لوگ پیدل اور سوار ہو کر حج کے لیے آئیں گے، تاکہ وہ اپنے بہت سے فائدوں میں حاضر ہوں۔ حج کا اصل مقصد تو عبادت کے ذریعے سے دینی اور اخروی فوائد حاصل کرنا ہے، لیکن ضمناً اس میں بہت سے دنیوی اور ملی فوائد بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حج وعمرہ کے دینی و دنیوی فوائد دونوں ذکر فرمائے ہیں، چنانچہ فرمایا: « تَابِعُوْا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ » [ ترمذي، الحج، باب ما جاء في ثواب الحج والعمرة : ۸۱۰، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ ] ''حج اور عمرہ پے در پے کیا کرو، کیونکہ یہ فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔'' دینی فوائد میں بہت بڑا فائدہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کا حصول ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: « اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ » [ بخاري، الحج، باب وجوب العمرة وفضلها : ۱۷۷۳۔ مسلم : ۱۳۴۹ ] ''عمرہ سے لے کر عمرہ، دونوں کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں۔'' گناہوں کی معافی بھی بہت بڑا نفع ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: « مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ » [ بخاري، الحج، باب فضل الحج المبرور : ۱۵۲۱، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ۔ مسلم : ۱۳۵۰ ] ''جو شخص حج کرے، نہ کوئی شہوانی فعل کرے اور نہ کوئی نافرمانی کرے تو واپس اس طرح ( گناہوں سے پاک ہو کر ) جائے گا جس طرح اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔'' رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: « أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ » [ مسلم، الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله ...... : ۱۲۱ ] ''کیا تمھیں یہ بات معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے ( گناہوں ) کو گرا دیتا ہے اور یہ کہ ہجرت اپنے سے پہلے ( گناہوں ) کو گرا دیتی ہے اور یہ کہ حج اپنے سے پہلے ( گناہوں ) کو گرا دیتا ہے۔''

حج کے فوائد میں سے سب سے بڑا فائدہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا جمع ہونا اور اس بات کا مظاہرہ ہے کہ ہم سب ایک امت ہیں، کالے، گورے، سرخ اور زرد کسی کو کسی پر رنگ یا زبان کی وجہ سے برتری حاصل نہیں، سب بھائی بھائی ہیں۔ اس موقع پر سب کا ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہونا اور مشکل میں گرفتار اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے سوچنا اور اس کا بندوبست کرنا ہے۔ ان فوائد میں سے ایک فائدہ اس موقع پر تجارت، صنعت، مزدوری وغیرہ کے ذریعے سے حلال روزی کمانا بھی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [ البقرة : ۱۹۸ ] ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب کا کوئی فضل تلاش کرو۔'' یہ مسلمانوں کی بین الاقوامی مصنوعات اور پیداوار سے آگاہی اور تمام دنیا کی باہمی تجارت منظم کرنے کا بہترین موقع ہے۔ اسی طرح اس موقع پر دنیا بھر کے علماء سے ملاقات اور دین و دنیا کے علوم میں اضافہ

الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾

اس نے انھیں دیے ہیں، سو ان میں سے کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو کھلاؤ ﴿۲۸﴾

بھی حج کے فوائد میں سے بہت بڑا فائدہ ہے۔ پھر اس سفر کے دوران دنیا کے مختلف علاقوں اور لوگوں کے حالات سے واقفیت بھی بہت بڑا علم ہے جو حج کی برکات میں سے عظیم برکت ہے۔ خلاصہ یہ کہ حج مسلمانوں کے بے شمار سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تمدنی فوائد کا جامع ہے۔

② وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ ...... : قرآن مجید کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ چوپاؤں پر اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے مراد انھیں "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" پڑھ کر ذبح کرنا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۸ تا ۱۲۱) یہاں حج کا ایک مقصد یہ بیان فرمایا کہ حج کرنے والے حضرات چند معلوم دنوں میں ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کی نعمت بھی یاد دلائی ہے۔ یہ "اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ" (چند معلوم دن) کون سے ہیں؟ بعض بڑے بڑے جلیل القدر حضرات نے اس سے مراد ذوالحجہ کے پہلے دس دن اور سورۂ بقرہ (۲۰۳) میں "اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ" سے مراد ایام تشریق لیے ہیں؟ مگر بقول مفسر امین شنقیطی صاحب اضواء البیان: ''ان حضرات کی جلالت قدر کے باوجود ان کا موقف درست نہیں، بلکہ درست بات ان حضرات کی ہے جو اس سے یوم النحر (دس ذوالحجہ) اور اس کے بعد والے دو یا تین دن مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں چند معلوم دنوں میں قربانی کا ذکر ہے، جب کہ ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں میں صرف ایک دن (دس ذوالحجہ) کو قربانی ہوتی ہے (حالانکہ "مَّعْلُوْمٰتٍ" کم از کم تین ہونے چاہییں)۔ خلاصہ یہ کہ ان "اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ" سے مراد وہ دن ہیں جن میں قربانی کی جاتی ہے اور وہ یوم النحر اور اس کے بعد دو دن یا تین دن ہیں۔'' یوم النحر کے بعد پورے ایام تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳) یعنی چار دن میں قربانی کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: (( كُلُّ أَيَّامِ التَّشْرِيْقِ ذَبْحٌ )) ''ایام تشریق سارے ذبح کے دن ہیں۔'' شیخ البانی رحمہ اللہ نے "مَنَاسِكُ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ" میں فرمایا کہ اسے احمد نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے اور یہ میرے نزدیک اپنے مجموع طرق کے ساتھ قوی ہے، اسی لیے میں نے اسے سلسلہ صحیحہ (۲۴۷۶) میں درج کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان چار دنوں میں اللہ کی عطا کردہ بہت بڑی نعمت پالتو جانوروں کو اس کے نام پر قربان کرنا حج کے مقاصد میں سے ایک بہت بڑا مقصد ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: (( أَيُّ الْحَجِّ أَفْضَلُ؟ قَالَ الْعَجُّ وَ الثَّجُّ )) [ ترمذي، الحج، باب ما جاء في فضل التلبية والنحر : ۸۲۷ ] ''حج کی کون سی چیز افضل ہے؟'' فرمایا: ''(لبیک کے ساتھ) آواز بلند کرنا اور خون بہانا (قربانی کرنا)۔''

③ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوْا ...... : اس سے پہلے حج کرنے والوں کا ذکر غائب کے صیغوں کے ساتھ ہے، اب انھیں مخاطب کر لیا ہے کہ چوپائے جو میں نے تمھیں عطا کیے اور تم نے میرے نام پر قربان کیے، اب میری اس نعمت کا تقاضا ہے کہ خود بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیر کو بھی کھلاؤ۔ "الْبَآىِٕسَ" کا معنی ہے جو مالی طور پر تنگدست ہو۔ فقیر بھی وہی ہے، صرف فقیر کی بدحالی

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا خوب طواف کریں ﴿۲۹﴾

پر رحم کو ابھارنے کے لیے "الْفَقِيْرَ" سے پہلے "الْبَآئِسَ" ذکر فرمایا، کیونکہ فقیر کا لفظ تو عام استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غنی کو نہیں کھلا سکتے، بلکہ یہ فقراء کو کھلانے کی تاکید کے لیے ہے، اغنیاء کو کھلانے کا ذکر آیت (۳۶) میں آ رہا ہے۔ خود کھانے کا حکم اس لیے دیا کہ مشرکین اپنی قربانی میں سے نہیں کھاتے تھے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ خود کھانے کا حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب یا رخصت کے لیے ہے، یعنی تمھیں خود بھی کھانے کی اجازت ہے، ضروری نہیں کہ کھاؤ۔ بہر حال امر کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہو سکے تو اپنی قربانی کا گوشت خود بھی کھانا چاہیے، جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « أَنَّ الْبُدْنَ الَّتِيْ نَحَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ مِائَةَ بَدَنَةٍ نَحَرَ بِيَدِهٖ ثَلَاثًا وَّ سِتِّيْنَ وَنَحَرَ عَلِيٌّ مَا غَبَرَ وَأَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ كُلِّ بَدَنَةٍ بِبَضْعَةٍ فَجُعِلَتْ فِيْ قِدْرٍ ثُمَّ شَرِبَا مِنْ مَرَقِهَا » [ مسند أحمد : ۳۳۱/۳، ح : ۱۴۵۶۱ ] "وہ اونٹ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کیے، ایک سو اونٹ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے تریسٹھ (۶۳) اونٹ نحر کیے اور باقی علی رضی اللہ عنہ نے کیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اونٹ کا ایک ایک ٹکڑا لینے کا حکم دیا جو ایک دیگ میں ڈالے گئے، پھر دونوں نے اس کا کچھ شوربا پیا۔" شعیب ارناؤوط نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

**آیت 29** ① ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ : "تَفَثٌ" کے دو معنی کیے گئے ہیں، ایک میل کچیل اور دوسرا مناسک حج۔ پہلے معنی کے مطابق ترجمہ ہوگا "پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ احرام باندھنے کے ساتھ ہی سلے ہوئے کپڑے پہننا، بال یا ناخن کٹوانا اور خوشبو لگانا حرام ہو جاتا ہے۔ صرف دو چادریں ہوتی ہیں، سر ننگا ہوتا ہے اور زیادہ مل مل کر غسل نہیں کرنا ہوتا، اس مسافرانہ اور فقیرانہ حالت میں بدن پر میل کچیل چڑھ جاتا ہے۔ دس محرم کو جمرہ عقبہ کو کنکر مارنے کے بعد بیوی سے مباشرت کے سوا احرام کی تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ میل کچیل دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پھر وہ سر کے بال منڈوائیں یا کتروائیں اور ناخن وغیرہ صاف کریں، پھر غسل کر کے سلے ہوئے کپڑے پہن لیں۔ اگر کسی نے قربانی کرنی ہو تو بہتر ہے احرام کھولنے سے پہلے کر لے، اگر احرام کھول کر قربانی کرے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ احرام کھول کر، سلے ہوئے کپڑے پہن کر بیت اللہ کے طواف کے لیے روانہ ہو جائیں۔ اس طواف کا نام طواف زیارت اور طواف افاضہ ہے، یہ حج کا رکن ہے اور اس کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ اس طواف کے بعد احرام کی آخری پابندی بھی ختم ہو جاتی ہے اور بیوی سے مباشرت حلال ہو جاتی ہے۔ دوسرے معنی کے مطابق ترجمہ ہوگا "پھر وہ اپنے حج کے اعمال پورے کریں اور اپنی نذریں پوری کریں۔"

② وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ : یعنی فریضۂ حج کے اعمال سے زائد کسی عمل کی نذر مانی ہو تو وہ پوری کریں، مثلاً زائد طواف یا مسجد حرام میں اعتکاف یا زائد قربانی یا نفل نماز یا صدقہ یا قرآن کی تلاوت وغیرہ۔

③ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ : "طَافَ يَطُوْفُ طَوَافًا" (ن) کسی چیز کے گرد پھرنا، چکر لگانا۔ "وَلْيَطَّوَّفُوْا" باب تفعل

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾

یہ اور جو کوئی اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بہتر ہے اور تمھارے لیے مویشی حلال کر دیے گئے ہیں سوائے ان کے جو تمھیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بچو ﴿۳۰﴾

---

سے ہے جو اصل میں "لِيَتَطَوَّفُوْا" تھا، حروف کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی بیت اللہ کا خوب طواف کریں، فرض طواف کے علاوہ نفل طواف بھی کثرت سے کریں۔ یا باب تفعل سے طواف کی مشکل کی طرف اشارہ ہے، جو اس دن حاجیوں کے بے پناہ ہجوم کی وجہ سے پیش آتی ہے کہ اسے برداشت کرتے ہوئے کعبۃ اللہ کا طواف کریں۔

④ بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ : عتیق کا معنی قدیم ہے۔ زمین پر اللہ کا پہلا تعمیر کیا جانے والا گھر ہونے کی وجہ سے اس کا نام "اَلْبَيْتُ الْعَتِيْقُ" ہے۔ عتیق کا دوسرا معنی آزاد ہے، یعنی اللہ کے سوا اس کا مالک کوئی نہیں جو اس میں آنے سے کسی کو روک سکے۔ یہ ہر آقا کے تسلط سے آزاد ہے۔ یہ مشرکین کا ظلم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے آنے والے مسلمانوں کو اس سے روکتے ہیں۔ آزاد کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس پر کبھی کوئی جابر مسلط نہیں ہو سکا، جیسا کہ اصحاب الفیل کا واقعہ معروف ہے۔ جو ظالم بھی اس گھر پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرے گا اس کا یہی حال ہوگا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَغْزُوْ جَيْشٌ الْكَعْبَةَ فَإِذَا كَانُوْا بِبَيْدَاءَ مِنَ الْأَرْضِ يُخْسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَآخِرِهِمْ )) [ بخاري، البيوع، باب ما ذكر في الأسواق : ۲۱۱۸ ] "ایک لشکر کعبہ سے جنگ کے لیے آئے گا، جب وہ بیداء ( مکہ کے باہر کھلے میدان ) میں پہنچیں گے تو سب کے سب اول سے آخر تک زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَيُحَجَّنَّ الْبَيْتُ وَلَيُعْتَمَرَنَّ بَعْدَ خُرُوْجِ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ )) [ بخاري، الحج، باب قول الله تعالى : ﴿ جعل الله الكعبة ...... ﴾ : ۱۵۹۳ ] "یاجوج ماجوج کے خروج کے بعد بھی بیت اللہ کا حج اور عمرہ جاری رہے گا۔" علاماتِ قیامت بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يُخَرِّبُ الْكَعْبَةَ ذُو السُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ )) [ بخاري، الحج، باب قول الله تعالى : ﴿ جعل الله ...... ﴾ : ۱۵۹۱ ] "(قیامت کے قریب) ایک پتلی پنڈلیوں والا حبشی بیت اللہ کو گرا دے گا۔" مزید فرمایا: (( كَأَنِّيْ بِهِ أَسْوَدَ أَفْحَجَ يَقْلَعُهَا حَجَرًا حَجَرًا )) [ بخاري، الحج، باب هدم الكعبة : ۱۵۹۵ ] "گویا میں وہ دیکھ رہا ہوں، کالا ٹیڑھے پاؤں والا ہے، اسے ایک ایک پتھر کر کے اکھیڑ رہا ہے۔"

**آیت 30** ① ذٰلِكَ : یہ لفظ دو کلاموں کے درمیان فاصلے کے لیے آتا ہے اور اس سورت میں تین دفعہ آیا ہے، ایک یہ، ایک آیت (۳۲) میں: ﴿ ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ ﴾ اور ایک آیت (۶۰) میں: ﴿ ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ﴾ اس کا مبتدا محذوف مانتے ہیں "اَلْاَمْرُ ذٰلِكَ" یعنی حج کا معاملہ تو یہ ہوا اور......

② وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ : یعنی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حرمتوں کی تعظیم خود بندے کے لیے بہتر

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

اس حال میں کہ اللہ کے لیے ایک طرف ہونے والے ہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہیں اور جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اُچک لیتے ہیں، یا اسے ہوا کسی دور جگہ میں گرا دیتی ہے ﴿۳۱﴾

ہے، کیونکہ یہ اس کے لیے اس کے رب کی رضا حاصل کرنے کا باعث ہے، جس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ "حُرُمٰتِ اللّٰهِ" سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کے احترام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، جیسے حرم، مسجد حرام، حرمت والے مہینے، ہدایا یعنی مکہ میں قربانی کے لیے جانے والے اونٹ، قلائد یعنی وہ بھیڑ بکریاں اور گائیں جن کے گلے میں قلادے (پٹے اور ہار) ڈالے ہوئے ہوں وغیرہ۔ ان سب کی تکریم ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلی آ رہی ہے، مگر مشرکین نے اپنے ملت ابراہیم کے پیروکار ہونے کے دعوے کے باوجود ان حرمتوں کو پامال کیا اور خود ساختہ چیزوں کو حرمت والا قرار دے لیا، جیسے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ۔ "وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ" کا مطلب یہ بھی ہے کہ احرام میں جو کام اللہ تعالیٰ نے حرام کیے ہیں، مثلاً شکار کرنا، شہوانی افعال، لڑائی جھگڑا، فسق و فجور وغیرہ، تو ان کے ارتکاب کو جو شخص بہت بڑا گناہ سمجھ کر ان سے اجتناب کرے تو یہ اس کے رب کے ہاں اس کے لیے بہتر ہے۔

③ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۳) اور سورۂ نحل (۱۱۵)۔

④ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ...... : "اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ" کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان چوپاؤں کے حلال ہونے کا حکم دیا جو مشرکین نے حرام کر رکھے تھے، مثلاً بحیرہ، سائبہ وغیرہ اور "اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ" کے ساتھ ان جانوروں کو حرام قرار دیا جو مشرکین نے حلال کر رکھے تھے، مثلاً غیر اللہ کے نام پر ذبح کردہ جانور اور مُردار وغیرہ۔ مشرکین کے بعض جانوروں کو حرام اور بعض کو حلال کرنے کا باعث بتوں کی عبادت تھی اور یہ ان کا اللہ پر صاف جھوٹ اور بہتان تھا کہ حلال و حرام کا یہ حکم اس کا حکم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرک اور جھوٹ دونوں سے بچنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس گندگی سے بچو جو بتوں کی صورت میں ہے اور جھوٹی بات سے بچو۔ یعنی مشرکین نے اللہ کے ساتھ جو بتوں کو شریک بنا رکھا ہے اور اللہ کے ذمے بعض چیزوں کو حلال یا حرام کرنے کا بہتان باندھ رکھا ہے تم اس شرک سے اور اس جھوٹ اور بہتان سے اجتناب کرو۔ "قَوْلَ الزُّوْرِ" کا لفظ عام ہے، اس لیے اس میں جھوٹی شہادت دینا، کسی پر بہتان لگانا، غرض کوئی بھی جھوٹ بولنا شامل ہے اور سب سے اجتناب کا حکم ہے۔ "الرِّجْسَ" کا معنی گندگی ہے، "مِنَ" بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی گندگی ظاہری بھی ہوتی ہے مگر خاص طور پر حکم دیا کہ اس معنوی گندگی سے بچو جو بتوں کی صورت میں ہے۔ ابن جزی فرماتے ہیں: "مِنْ لِبَيَانِ الْجِنْسِ كَأَنَّهُ قَالَ الرِّجْسُ الَّذِيْ هُوَ الْأَوْثَانُ."

آیت 31 ① حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ : "أَيْ كُوْنُوْا حُنَفَاءَ" یعنی تمام معبودوں سے ہٹ کر صرف اللہ کی

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى

یہ اور جو اللہ کے نام کی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یقیناً یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے ﴿۳۲﴾ تمھارے لیے ان میں ایک مقرر

خالص عبادت کرنے والے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے والے ہو۔ "حُنَفَآءَ" پر نصب "اجْتَنِبُوْا" کی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۰ تا ۱۶۳)۔

② وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ...... : جو شخص توحید پر قائم ہے وہ بلندی اور عزو شرف میں گویا آسمان پر ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا اور اسی کا حکم مانتا ہے۔ جب اس نے شرک کیا تو اس بلند مقام سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے راستے ہی میں اچک لیں گے، یعنی وہ بتوں کے پجاریوں یا ان زندہ یا مردہ پیروں بزرگوں کے مجاوروں کے ہتھے چڑھ جائے گا جنھوں نے ان پیروں بزرگوں کو خدا بنا رکھا ہے، یا ہوا اسے بہت دور جگہ میں گرا دے گی، یعنی اگر کسی کے قابو نہ آیا تو اللہ سے تو بدظن ہو ہی چکا ہے، پھر اسے اس کی خواہش بہت دور گہری جگہ میں گرا دے گی، یعنی سب سے منکر ہو کر دہریہ ہو جائے گا۔ دونوں صورتوں میں اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

**آیت 32** ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ ......: "ذٰلِكَ" کی تفسیر آیت (۳۰) میں ملاحظہ فرمائیں۔ "شَعَآىِٕرَ" "شَعِيْرَةٌ" کی جمع ہے، اسم فاعل بمعنی "مُشْعِرَةٌ" ہے، جس سے کسی چیز کا شعور ہو (نشانیاں)، یعنی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کا شعور دلانے کے لیے مقرر کر رکھی ہیں، جو شخص ان کی تعظیم کرے گا تو اس کا باعث دلوں کا تقویٰ ہے، یعنی جس کے دل میں اللہ کا ڈر ہوگا وہ ان کی تعظیم ضرور کرے گا۔ ہر وہ چیز جس کی زیارت کا اللہ نے حکم دیا ہے یا اس میں حج کا کوئی عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہ "شعائر اللہ" میں داخل ہے۔ قربانی کے جانور بھی "شعائر اللہ" میں داخل ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ﴾ [ الحج : ٣٦ ] "اور قربانی کے بڑے جانور، ہم نے انھیں تمھارے لیے اللہ کی نشانیوں سے بنایا ہے۔" ان کی تعظیم کا مطلب یہ ہے کہ ان کے آتے ہوئے انھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے، جانور قیمتی خریدے اور عیب دار جانور نہ خریدے۔ ان پر جھول اچھی ڈالے، انھیں خوب کھلائے پلائے اور سجا کر رکھے، جیسا کہ گلے میں قلادے ڈالنے سے ظاہر ہے، مجبوری کے بغیر ان پر سواری نہ کرے، جیسا کہ آگے حدیث آ رہی ہے اور قربانی کے بعد ان کے جھول وغیرہ بھی صدقہ کر دے۔ "شعائر اللہ" کی تعظیم اگرچہ اس سے پہلے "حُرُمٰتِ اللّٰهِ" کی تعظیم میں آ چکی ہے مگر "حُرُمٰتِ" کا مفہوم وسیع اور عام ہے جب کہ "شَعَآىِٕرَ" خاص ہے، اس لیے "شعائر اللہ" کی تعظیم کی تاکید کے لیے اسے دوبارہ الگ ذکر فرمایا۔

**آیت 33** ① لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى: فائدوں سے مراد ان کی سواری کرنا، ان کا دودھ پینا، ان سے نسل اور اون حاصل کرنا ہے، اسی طرح ان کے گوبر وغیرہ کو ایندھن یا کھاد کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ مشرکین جس طرح قربانی کا گوشت نہیں کھاتے تھے اسی طرح قربانی کے جانوروں سے اون، دودھ یا سواری وغیرہ کا فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ قربانی کے جانوروں سے اس وقت تک فائدہ اٹھانا جائز ہے جب تک انھیں قربانی کے لیے نامزد نہ

اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

وقت تک کئی فائدے ہیں، پھر ان کے حلال ہونے کی جگہ اس قدیم گھر کی طرف ہے ﴿۳۳﴾

کیا جائے، اس کے بعد سواری یا دودھ یا اون کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ''شعائر اللہ'' سے فائدہ اٹھانا بطور احسان ذکر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ قربانی کے لیے نامزد ہونے کے بعد ہی جانور ''شعائر اللہ'' میں شامل ہوتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: (( أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا يَسُوْقُ بَدَنَةً فَقَالَ ارْكَبْهَا فَقَالَ إِنَّهَا بَدَنَةٌ فَقَالَ ارْكَبْهَا قَالَ إِنَّهَا بَدَنَةٌ قَالَ ارْكَبْهَا وَيْلَكَ )) [ بخاري، الحج، باب ركوب البدن : ۱٦۸۹۔ مسلم : ۱۳۲۲ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک بدنہ (قربانی کے لیے مکہ جانے والا اونٹ) ہانک کر لے جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اس پر سوار ہو جاؤ۔'' اس نے کہا: ''یہ بدنہ ہے۔'' فرمایا: ''اس پر سوار ہو جاؤ۔'' اس نے کہا: ''یہ بدنہ ہے۔'' فرمایا: ''اس پر سوار ہو جاؤ، افسوس ہو تم پر۔'' جابر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( ارْكَبْهَا بِالْمَعْرُوْفِ إِذَا أُلْجِئْتَ إِلَيْهَا حَتّٰى تَجِدَ ظَهْرًا )) [ مسلم، الحج، باب جواز ركوب البدنة...... : ۱۳۲٤ ] ''اس پر اس طرح سوار ہو جاؤ کہ اسے تکلیف نہ دو، جب تمھیں اس کی ضرورت پڑ جائے، یہاں تک کہ تمھیں کوئی اور سواری مل جائے۔''

ابن کثیر نے شعبہ عن زہیر بن ابی ثابت الاعمی عن مغیرہ بن حذف کی سند سے علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو بدنہ ہانک کر لے جاتے ہوئے دیکھا، جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا، فرمایا: ''اس کا دودھ صرف اتنا پیو جو اس کے بچے سے زائد ہو اور جب یوم النحر ہو تو اسے اور اس کے بچے کو ذبح کر دو۔'' یہ علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا، مجھے مغیرہ بن حذف کے حالات نہیں ملے اور متن میں بچے کو ذبح کرنے کی بات غریب (انوکھی) ہے۔

❷ ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ : ''مَحِلُّهَا'' اترنے کی جگہ۔ حلال ہونے کی جگہ سے مراد یہ ہے کہ جہاں آخر قربانی کے جانوروں کو پہنچنا ہے اور نحر یا ذبح ہونا ہے وہ بیت عتیق (کعبہ) ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ﴾ [ المائدۃ : ۹۵ ] یعنی قربانی کا ایسا جانور جو کعبہ تک پہنچنے والا ہو۔ ان دونوں آیتوں میں کعبہ سے مراد حرم کعبہ ہے، کیونکہ عین کعبہ میں تو قربانی نہیں کی جاتی، قربانی تو اس کے باہر کی جاتی ہے، چنانچہ پورے مکہ یا منیٰ میں جہاں بھی قربانی کی جائے درست ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كُلُّ عَرَفَةَ مَوْقِفٌ وَكُلُّ مِنًى مَنْحَرٌ وَكُلُّ الْمُزْدَلِفَةِ مَوْقِفٌ وَكُلُّ فِجَاجِ مَكَّةَ طَرِيْقٌ وَمَنْحَرٌ )) [ أبو داوٗد، المناسك، باب الصلاۃ بجمع : ۱۹۳۷ ] ''عرفہ پورا وقوف کی جگہ ہے، منیٰ پورا نحر کی جگہ ہے اور مزدلفہ پورا وقوف کی جگہ ہے اور مکہ کی تمام سڑکیں راستہ ہیں اور نحر کی جگہ ہیں۔'' ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ '' مَحِلُّهَاۤ '' میں ''ھا'' ضمیر سے مراد سارے شعائر ہوں، تو مطلب یہ ہوگا کہ آخر ان تمام مناسک کا خاتمہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ معنی زیادہ مناسب ہے، ورنہ خصوصیت کے ساتھ ''بیت عتیق'' کہنے کا فائدہ واضح نہیں رہے گا۔ (قرطبی)

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کی ہے، تاکہ وہ ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔ سو تمھارا معبود ایک معبود ہے تو اسی کے فرماں بردار ہو جاؤ اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دے ﴿۳۴﴾

آیت 34 ① وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا : "مَنْسَكًا" کے تین معنی ہو سکتے ہیں، عبادت، عبادت کی جگہ اور قربانی۔ یہاں آخری معنی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ آگے جانوروں پر اللہ کا نام لینے کا ذکر آ رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے بطور نیاز قربانی کرنا تمام آسمانی شریعتوں کے نظام عبادت کا لازمی جز رہا ہے۔ اسلام میں بھی یہ بطور عبادت مقرر کی گئی ہے، اس میں حاجی، غیر حاجی کی کوئی قید نہیں ہے۔ چنانچہ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « ضَحَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ فَرَأَيْتُهُ وَاضِعًا قَدَمَهُ عَلٰى صِفَاحِهِمَا يُسَمِّيْ وَيُكَبِّرُ فَذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ » [ بخاري، الأضاحي، باب من ذبح الأضاحي بيده : ۵۵۵۸۔ مسلم : ۱۹۶۶ ] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگوں والے دو چتکبرے مینڈھے قربانی کیے، میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پہلوؤں پر اپنا پاؤں رکھا اور "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" پڑھ کر ان دونوں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کیا۔" یاد رہے مکہ میں حج یا عمرہ پر کی جانے والی قربانی کو ہدی اور دوسرے مقامات پر کی جانے والی قربانی کو اضحیہ کہا جاتا ہے۔
② تفسیر ثنائی میں ہے: "قرآن مجید کے اس دعویٰ (کہ ہر قوم میں قربانی کا حکم ہے) کا ثبوت آج بھی مذہبی کتب میں ملتا ہے۔ عیسائیوں کی بائبل تو قربانی کے احکام سے بھری پڑی ہے۔ تورات کی دوسری کتاب سفر خروج میں عموماً یہی احکام ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ہندوؤں اور آریوں کے مسلمہ پیشوا منوجی کہتے ہیں: "یگیہ (قربانی) کے واسطے اور نوکروں کے کھانے کے واسطے اچھے ہرن اور پرند مارنا چاہیے۔ اگلے زمانے میں رشیوں نے یگیہ کے لیے کھانے کے لائق ہرن اور پکشیوں کو مارا ہے۔ شری برہماجی نے آپ سے آپ یگیہ (قربانی) کے واسطے پشو (حیوانوں) کو پیدا کیا۔ اس سے یگیہ جو قتل ہوتا ہے وہ بدھ نہیں کہلاتا۔ حیوان، پرند، کچھوا وغیرہ، یہ سب یگیہ کے واسطے مارے جانے سے اعلیٰ ذات کو دوسرے جنم میں پاتے ہیں۔" [ ادھیائی : ۵۔ شلوک : ۲۲، ۲۳، ۳۹، ۴۰ ] گو آج کل کے ہندو یا آریہ ایسے مقامات کی تاویل یا تردید کریں مگر صاف الفاظ کے ہوتے ہوئے ان کی تاویل کون سنتا ہے۔ اس جگہ ہم نے صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن شریف نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بحمد اللہ اپنا ثبوت رکھتا ہے، باقی قربانی کی علت اور وجہ کے لیے ہماری کتب مباحثہ، حق پرکاش، ترک اسلام وغیرہ ملاحظہ ہوں۔"
③ لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ...... : یعنی ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کی ہے، تاکہ وہ ہمارے عطا کردہ پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام لے کر انھیں قربان کریں، نہ کہ کفار کی طرح ہمارے عطا کردہ چوپاؤں کو بتوں اور غیر اللہ کے آستانوں پر انھیں خوش کرنے کی نیت سے ذبح کریں۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَ الْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ

وہ لوگ کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور ان پر جو مصیبت آئے اس پر صبر کرنے والے

④ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا : پہلی امتوں پر قربانی مقرر کرنے کے ذکر کے بعد اب ہماری امت کو خطاب ہے کہ پہلی امتوں کا الٰہ اور تمھارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، سو تم بھی پوری طرح اسی کے فرماں بردار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے سپرد کر دو اور اپنی ہر عبادت، جس میں قربانی بھی ہے، صرف اسی کے لیے کرو۔ اگر کسی اور کے لیے کرو گے تو اس کی عبادت میں شرک کے مجرم ٹھہرو گے۔ مگر اب بعض مسلمان کہلانے والوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عید الاضحیٰ پر قربانی کو بھی عبد القادر جیلانی کی گیارھویں قرار دے کر ان کے نام کا ختم دیتے ہیں، اس سے بڑھ کر شرک کیا ہوگا؟

⑤ وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ: "الْمُخْبِتِيْنَ" باب افعال ( اِخْبَاتٌ ) سے اسم فاعل ہے۔ "خَبْتٌ" نیچی جگہ کو کہتے ہیں۔ "مُخْبِتٌ" کا معنی نیچی جگہ میں چلنے والا ہے، پھر یہ لفظ استعارہ کے طور پر تواضع اور عاجزی کرنے والے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ بعض حضرات نے اسے "خَبَتِ النَّارُ" ( آگ بجھ گئی ) سے مشتق مانا ہے، حالانکہ اس کا اصل "خ ب و" ہے، جبکہ "الْمُخْبِتِيْنَ" کا اصل "خ ب ت" ہے۔ یعنی ان عاجزی کرنے والوں کو بشارت دے دے کہ جن کے ہاں اللہ کے حضور عاجزی ہی عاجزی ہے اور ذرہ بھر تکبر نہیں۔ یہاں مراد حج و عمرہ کے لیے آنے والے ہیں کہ ان کی کفن جیسی ان سلی چادروں، ننگے سروں، ان کی وضع قطع، ان کی لبیک کی صداؤں، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں وقوف، ان کے طواف، سعی اور ان کی قربانیوں، غرض ہر چیز سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے پامال ہو چکے ہیں۔

**آیت 35** ① الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ : " وَجِلَ يَوْجَلُ وَجَلًا " (ع) شدید خوف۔ اس آیت میں "الْمُخْبِتِيْنَ" (تواضع اور عاجزی کرنے والوں) کے اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات یا اس کے کسی حکم کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل سخت ڈر جاتے ہیں اور وہ اللہ کی حمد و ثنا اور اس سے استغفار کرتے ہیں اور دل و جان سے اس کا حکم بجا لاتے ہیں۔ کفار کی طرح نہیں کہ جن کے دل اکیلے اللہ کا ذکر ہونے پر تنگ پڑ جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [ الزمر : ٤٥ ] "اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔" اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو نہایت تکبر سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں جیسے انھوں نے وہ سنی ہی نہیں، فرمایا: ﴿ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْۤ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [ لقمان : ٧ ] "اور جب اس پر ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس نے وہ سنی ہی نہیں، گویا اس کے

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور نماز قائم کرنے والے ہیں اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۳۵﴾

دونوں کانوں میں بوجھ ہے، سوائے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔‘‘ ایسے متکبروں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ بھی مہر لگا دیتا ہے، فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ [ المؤمن : ۳۵ ] ’’اسی طرح اللہ ہر متکبر، سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔‘‘

❷ وَ الصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ : یہ آیات چونکہ حج کے بیان میں آئی ہیں اور حج میں سفر کی صعوبتوں کے علاوہ بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں، بعض ساتھیوں کے مزاج کی شدت، خود غرضی یا ضروریات کی کمی کی وجہ سے لڑائی جھگڑے کی نوبت آتی ہے، خصوصاً جب ان میں بدعقیدہ اور مشرک لوگ بھی ہوں، کیونکہ یہ سورت مکہ میں اتری اور اب بھی بہت سے حاجی وہ ہوتے ہیں جو شرک و بدعت میں گرفتار ہوتے ہیں اور توحید و سنت کی بات سننا برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات بھوک، بیماری، راستے کی رکاوٹیں اور قدرتی آفات پیش آ جاتی ہیں، تو اللہ کے وہ متواضع بندے ان سب مواقع پر ﴿ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۷ ] اور ﴿ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۵۵، ۱۵۶ ] پر عمل کرتے ہوئے اتنا صبر کرتے ہیں کہ صابرین کے لقب سے سرفراز ہوتے ہیں۔

❸ وَ الْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ : ’’اَلْمُقِيْمِيْنَ‘‘ کا نون ’’الصَّلٰوةِ‘‘ کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے گر گیا ہے۔ مضاف پر اگرچہ الف لام نہیں آتا مگر اسم فاعل یا صفت کا کوئی صیغہ اپنے معمول کی طرف مضاف ہو تو اس پر الف لام آ جاتا ہے۔ سفرِ حج کی صعوبتوں کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ نماز میں سستی ہو جائے، یا وہ صحیح طریقے سے ادا نہ کی جا سکے، مگر اللہ کے وہ عاجز بندے اللہ سے اتنی محبت رکھتے اور نماز میں غفلت سے اس قدر خوف زدہ رہتے ہیں کہ ہر وقت اس کی فکر میں رہتے ہیں اور اسے اتنی پابندی سے بروقت اور صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی طرف سے انھیں ’’نماز قائم کرنے والے‘‘ کا لقب عطا ہوتا ہے، گویا وہ ہر وقت نماز ہی میں ہیں۔

❹ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ : اس سفر میں چونکہ خرچ بہت ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ ہمارے وہ بندے سفر کے خرچ میں، یا کھانے پینے کے خرچ میں، یا اپنے ساتھیوں پر خرچ کرنے میں، یا قربانی وغیرہ پر خرچ کرنے میں بخل نہیں کرتے، بلکہ ہم نے جو کچھ انھیں دیا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اسی کا عطا کردہ ہے، فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں۔

❺ اس آیت کی مندرجہ بالا تفسیر مفسر بقاعی نے سیاق و سباق کے لحاظ سے کی ہے۔ الفاظ عام ہونے کا تقاضا ہے کہ ’’اَلْمُخْبِتِيْنَ‘‘ (اللہ کے متواضع بندوں) کی یہ صفات ان میں صرف حج کے دوران میں نہیں بلکہ دوسرے تمام اوقات میں بھی پائی جاتی ہیں، جس سے وہ بشارتِ الٰہی ’’بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ‘‘ کے مستحق بنتے ہیں۔

وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا

اور قربانی کے بڑے جانور، ہم نے انھیں تمھارے لیے اللہ کی نشانیوں سے بنایا ہے، تمھارے لیے ان میں بڑی خیر ہے۔ سو ان پر اللہ کا نام لو، اس حال میں کہ گھٹنا بندھے کھڑے ہوں، پھر جب ان کے پہلو گر پڑیں تو ان سے

آیت 36 ① وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ : "اَلْبُدْنَ" "بَدَنَةٌ" کی جمع ہے، بڑے بدن والا جانور۔ یہ لفظ بڑے جسم کی وجہ سے اونٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے پہلے قربانی کے لیے سورۂ انعام (۱۴۳، ۱۴۴) میں "بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ" یعنی پالتو چوپاؤں کا ذکر فرمایا تھا جو بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے ہیں۔ اس آیت میں بڑے جانوروں کا ذکر خصوصاً فرمایا، کیونکہ چوپاؤں میں بطور "شعائر اللہ" وہ زیادہ نمایاں ہوتے ہیں، خاص طور پر اونٹ اپنے بلند قد کی وجہ سے اور اشعار کی وجہ سے زیادہ ہی نمایاں ہوتا ہے۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ جب مکہ میں قربانی کے اونٹ روانہ کیے جاتے ہیں تو ان کے کوہان کے دائیں طرف برچھی وغیرہ سے زخم کر کے خون جلد پر مل دیا جاتا ہے، جو علامت ہوتا ہے کہ یہ جانور مکہ معظمہ قربانی کے لیے جا رہے ہیں اور جس سے ہر دیکھنے والا ان کی تعظیم و تکریم اور خدمت کرتا ہے۔ گائے کو بھی "بَدَنَةٌ" کہہ لیتے ہیں، قاموس میں ہے: " اَلْبَدَنَةُ مُحَرَّكَةً مِنَ الْإِبِلِ وَالْبَقَرِ كَالْأُضْحِيَةِ مِنَ الْغَنَمِ " "یعنی جس طرح بھیڑ بکری کی قربانی کو اضحیہ کہتے ہیں اسی طرح اونٹ اور گائے کو بدنہ کہتے ہیں۔" حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: (( خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُهِلِّيْنَ بِالْحَجِّ فَأَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَشْتَرِكَ فِي الْإِبِلِ، وَالْبَقَرِ، كُلُّ سَبْعَةٍ مِنَّا فِيْ بَدَنَةٍ )) [ مسلم، الحج، باب جواز الاشتراك في الهدى......: ۱۳۱۸/۳۵۱ ] "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کا احرام باندھے ہوئے نکلے تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم اونٹوں اور گائیوں میں شریک ہو جائیں، ہم میں سے ہر سات آدمی ایک بدنہ میں شریک ہو جائیں۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونٹ اور گائے دونوں کو بدنہ کہتے ہیں اور یہ کہ حج کے موقع پر اونٹ اور گائے دونوں میں سات سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ دوسری روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں: (( كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَحَضَرَ الْأَضْحٰى فَاشْتَرَكْنَا فِي الْبَقَرَةِ سَبْعَةً وَفِي الْجَزُوْرِ عَشَرَةً )) [ ترمذي، الحج، باب ما جاء في الاشتراك في البدنة والبقرة: ۹۰۵، وقال حديث حسن صحيح وقال الألباني صحيح ] ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے تو نحر ( قربانی کا وقت ) آ گیا تو ہم نے گائے سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کی اور اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے۔" ترمذی کے علاوہ اسے احمد، نسائی اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کے علاوہ دوسرے مقامات پر عید الاضحیٰ کے موقع پر اونٹ میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ ہاں، حج کے موقع پر سات آدمی شریک ہوں گے، جیسا کہ مسلم کی حدیث میں گزرا ہے۔ البتہ ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے: "ایک اونٹ کی قربانی میں دس اور ایک گائے کی قربانی میں سات شریک ہو سکتے ہیں، جیسا کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے اور صحیح مسلم میں جو جابر رضی اللہ عنہ والی روایت میں "اَلْجَزُوْرُ عَنْ سَبْعَةٍ"

صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا

کچھ کھاؤ اور قناعت کرنے والے کو کھلاؤ اور مانگنے والے کو بھی۔ اسی طرح ہم نے انھیں تمھارے لیے مسخر کر دیا،

(اونٹ سات کی طرف سے ) آیا ہے وہ اس کے منافی نہیں ہے، کیونکہ دس والی روایت جواز پر محمول ہے۔“

❷ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ : ”خَيْرٌ“ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”تمھارے لیے ان میں بڑی خیر ہے۔“ اس خیر میں وہ منافع بھی شامل ہیں جو آیت (۳۳) کی تفسیر میں گزرے ہیں اور ذبح کرنے کے بعد ان کے گوشت، چمڑے، ہڈیوں اور جسم کے ہر حصے سے فائدہ اٹھانا بھی شامل ہے۔ آخرت میں ملنے والا اجر و ثواب اس کے علاوہ ہے اور وہ ایسی خیر ہے جو شمار سے باہر ہے۔

❸ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا : یہ کہنے کے بجائے کہ انھیں ذبح کرو، فرمایا، ان پر اللہ کا نام لو۔ اس لفظ کو بار بار دہرانے سے یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ اللہ کے پیدا کیے یہ چوپائے اسی کے نام پر ذبح ہونے چاہییں، نہ کسی غیر سے کوئی مراد برلانے کی نیت پر اور نہ کسی غیر کے نام پر۔

❹ ”صَوَآفَّ“ ”صَافَّةٌ“ کی جمع ہے بروزن ”فَوَاعِلَ“۔ صف کا معروف معنی قطار ہے، یعنی اونٹوں کو قربان گاہ میں قطار کی صورت میں کھڑا کر کے باری باری نحر کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے قربانی کے جمال و جلال میں اضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی لمبی حدیث میں ہے: «ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنْحَرِ فَنَحَرَ ثَلَاثًا وَ سِتِّيْنَ بِيَدِهِ ثُمَّ أَعْطَى عَلِيًّا فَنَحَرَ مَا غَبَرَ» [ مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ : ۱۲۱۸۔ مسند أحمد : ۳/ ۳۲۰، ۳۲۱، ح : ۱۴۴۵۳ ] ”پھر رسول اللہ ﷺ قربان گاہ کی طرف پلٹے اور اپنے ہاتھ سے تریسٹھ (۶۳) اونٹ نحر کیے، آپ انھیں ایک برچھے کے ساتھ زخم لگاتے تھے، پھر آپ نے وہ برچھا علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا تو انھوں نے باقی کو نحر کر دیا اور وہ کل سو اونٹ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت بھی منیٰ میں باقاعدہ قربان گاہ تھی، جیسا کہ آج کل حکومت نے باقاعدہ جگہیں مقرر کر رکھی ہیں اور یہ بھی کہ سب اونٹ وہاں قریب قریب جمع تھے۔ (ابن عاشور) مگر حبر الامہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر فرمائی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹوں کو تین ٹانگوں پر کھڑا کر کے نحر کیا جائے، اس طرح کہ ان کی اگلی بائیں ٹانگ اکٹھی کر کے باندھی ہوئی ہو۔ [ طبري بسند ثابت ] جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: « أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ كَانُوْا يَنْحَرُوْنَ الْبَدَنَةَ مَعْقُوْلَةَ الْيُسْرٰى قَائِمَةً عَلٰى مَا بَقِيَ مِنْ قَوَائِمِهَا » [ أبوداؤد، المناسك، باب كيف تنحر البدن : ۱۷۶۷، و صححه الألباني ] ”رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب اونٹوں کو اس طرح نحر کرتے تھے کہ ان کے اگلے بائیں پاؤں کا گھٹنا بندھا ہوتا اور وہ باقی ٹانگوں پر کھڑے ہوتے۔“ ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک آدمی کے پاس سے گزرے جس نے اپنی اونٹنی بٹھا رکھی تھی اور اسے نحر کر رہا تھا تو فرمایا: ”اسے کھڑا کر کے پاؤں باندھ کر نحر کرو، یہ محمد ﷺ کی سنت ہے۔“ [ بخاري، الحج، باب نحر الإبل مقيدة : ۱۷۱۳ ] قرآن مجید کے الفاظ ”فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا“ (جب ان کے پہلو گر پڑیں) سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اونٹوں کو کھڑا کر کے نحر کرنا چاہیے،

# لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾

## تاکہ تم شکر کرو ﴿۳۶﴾

کیونکہ اگر ان کے پہلو پہلے ہی زمین پر ہوں تو وہ کیسے گریں گے؟

❺ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا: نحر یہ ہے کہ اونٹ کو اگلی بائیں ٹانگ بندھی ہونے کی حالت میں کھڑا کر دیا جاتا ہے، پھر اس کے سینے کے گڑھے میں، جہاں سے گردن شروع ہوتی ہے، کوئی برچھا یا نیزہ یا چھرا "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" پڑھ کر مارا جاتا ہے جس سے خون کا پرنالہ بہ نکلتا ہے، بہت سا خون نکل جانے پر اونٹ دائیں یا بائیں کروٹ پر گر پڑتا ہے۔ اس کی جان پوری طرح نکلنے سے پہلے اس کی کھال اتارنا یا گوشت کا کوئی ٹکڑا کاٹنا منع ہے، کیونکہ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ فَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ » [ مسلم، الصيد و الذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح ..... : ١٩٥٥ ] "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان یعنی اس سے اچھا سلوک کرنا فرض فرمایا ہے، سو تم جب قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور لازم ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی چھری تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچائے۔" اور ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَا قُطِعَ مِنَ الْبَهِيْمَةِ وَهِيَ حَيَّةٌ فَهِيَ مَيْتَةٌ » [ أبو داوٗد، الضحايا، باب إذا قطع من الصيد قطعة : ٢٨٥٨۔ ترمذي : ١٤٨٠ ] "جانور کا جو حصہ اس وقت کاٹا جائے جب وہ زندہ ہو تو وہ (گوشت) مردار ہے۔" شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

❻ فَكُلُوْا مِنْهَا......: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے اس سے پہلے آیت (۲۸) کی تفسیر۔ "اَلْقَانِعَ" "قَنِعَ يَقْنَعُ" (ع) سے اسم فاعل ہے، قناعت کرنے والا، اللہ نے جو دیا ہے اس پر صبر کرکے سوال سے بچنے والا۔ "اَلْمُعْتَرَّ" (سوال کے لیے) سامنے آنے والا۔ "فَكُلُوْا" میں "فاء" سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے جانور کی جان پوری طرح نکلنے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے اس کا گوشت کھانے اور کھلانے کا اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ قربانی کے گوشت ہی سے ناشتہ کرنا مستحب ہے۔ معلوم ہوا قربانی کا گوشت خود بھی کھانا چاہیے، دوست احباب، خویش واقارب اور ان مساکین کو بھی کھلانا چاہیے جو سوال نہیں کرتے اور ان فقراء و مساکین کو بھی جو سوال کے لیے آجاتے ہیں۔ گویا قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں اور ضروری نہیں کہ تینوں برابر ہوں۔

❼ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: یعنی یہ ہم ہیں جنھوں نے اس طرح بے بس کرکے اتنے بڑے قوی ہیکل اونٹ اور بیل، جو طاقت میں تم سے کہیں زیادہ ہیں، تمھارے تابع کر دیے ہیں۔ تم ان سے جو فائدہ چاہتے ہو اٹھاتے ہو، ان پر بوجھ لادتے ہو، سواری کرتے ہو، دودھ پیتے ہو اور جب چاہتے ہو ذبح کر لیتے ہو، وہ اف نہیں کرتے۔ مقصد یہ ہے کہ تم ہمارا شکر ادا کرو، نہ کہ مشرکین کی طرح ان کا جن کا نہ ان چوپاؤں کے پیدا کرنے میں کوئی دخل ہے اور نہ تمھارے لیے تابع کرنے میں۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچیں گے اور نہ ان کے خون اور لیکن اسے تمھاری طرف سے تقویٰ پہنچے گا۔ اسی طرح اس نے انھیں تمھارے لیے مسخر کر دیا، تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور نیکی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دے ﴿۳۷﴾

آیت 37 ❶ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا...... : یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ قربانیوں کے گوشت پہنچیں گے، جو کھا لیے گئے اور نہ ان کے خون، جو بہا دیے گئے۔ یہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے غنی ہے، اس کے پاس تو تقویٰ یعنی تمھارے دل کا وہ خوف پہنچے گا جو اللہ کی ناراضگی سے بچاتا ہے، جو دل پر غالب ہو جاتا ہے تو آدمی اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا اور ہر منع کردہ کام سے باز آ جاتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰی صُوَرِكُمْ وَ أَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰی قُلُوْبِكُمْ وَ أَعْمَالِكُمْ )) [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم و خذله...... : ۳۴/ ۲۵٦٤ ] ”اللہ تعالیٰ تمھاری شکلوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں اور تمھارے عملوں کو دیکھتا ہے۔“ اس آیت اور حدیث سے دل کے تقویٰ اور نیت کے اخلاص کی اہمیت ظاہر ہے، اس لیے قربانی خالص اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیے، نہ دکھاوا مقصود ہو اور نہ شہرت، نہ فخر اور نہ یہ خیال کہ لوگ قربانی کرتے ہیں تو ہم بھی کریں۔ نیت کے بغیر عمل کا کچھ فائدہ نہیں۔ نیت خالص ہو تو بعض اوقات عمل کے بغیر ہی بلند مقامات تک پہنچا دیتی ہے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس آئے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا: (( إِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ أَقْوَامًا مَا سِرْتُمْ مَسِيْرًا وَلَا قَطَعْتُمْ وَادِيًا إِلَّا كَانُوْا مَعَكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَهُمْ بِالْمَدِيْنَةِ؟ قَالَ وَ هُمْ بِالْمَدِيْنَةِ حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ )) [ بخاري، المغازي، باب : ٤٤٢٣ ] ”مدینہ میں کئی لوگ ہیں کہ تم نے کوئی سفر نہیں کیا اور نہ کوئی وادی طے کی ہے مگر وہ تمھارے ساتھ رہے ہیں۔“ لوگوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! مدینہ میں رہتے ہوئے؟“ فرمایا: ”ہاں! مدینہ میں رہتے ہوئے، انھیں عذر نے روکے رکھا۔“ نیت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی زندگی جتنی بھی ہو محدود ہے، یعنی صرف چند سال، اگر اس میں نیک عمل کرے تو ہمیشہ ہمیشہ جنت میں اور برے عمل کرے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ محدود عمل پر غیر محدود جزا نیت کی وجہ سے ہے کہ نیک کی نیت ہمیشہ نیکی کرتے رہنے کی اور بد کی نیت ہمیشہ بدی کرتے رہنے کی تھی۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۷، ۲۸)۔

❷ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ : یہاں تاکید کے لیے قربانی کے جانوروں کو مسخر کرنے کا احسان دوبارہ یاد دلایا اور تکبیر یعنی ”اللہ اکبر“ کہہ کر اللہ کی بزرگی بیان کرنے کا ذکر فرمایا، اس سے پہلے قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت ” بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ “ کہنا اللہ کو مطلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝ ﴿٣٨﴾

بے شک اللہ ان لوگوں کی طرف سے دفاع کرتا ہے جو ایمان لائے، بے شک اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو بڑا خائن، بہت ناشکرا ہو ﴿٣٨﴾

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اونٹ کو اشعار (کوہان کی ایک طرف زخم) کرتے ہوئے "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" پڑھتے تھے۔ [ الموطا لإمام مالك : ٨٤٥ ] انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چتکبرے مینڈھے قربانی کیے، انھیں اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" پڑھا اور اپنا پاؤں ان کے پہلوؤں پر رکھا۔ [ بخاري، الأضاحي، باب التكبير عند الذبح : ٥٥٦٥ ] "لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ" کے لفظ عام ہونے کی وجہ سے چوپاؤں کو مسخر کرنے کی نعمت پر دوسرے اوقات میں بھی اللہ کی کبریائی بیان کرنی چاہیے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کے لیے روانہ ہوتے وقت اونٹ پر سوار ہوتے تو تین دفعہ "اللہ اکبر" کہتے، پھر "سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ" پڑھتے (آگے سفر کی مکمل دعا مذکور ہے)۔ [ مسلم، الحج، باب استحباب الذكر إذا ركب دابته...... : ١٣٤٢ ]

③ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ: "الْمُخْبِتِيْنَ" کو بشارت دینے کے حکم کے بعد "الْمُحْسِنِيْنَ" کو بشارت دینے کا حکم دیا۔ احسان کا تعلق "وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ" سے ہے۔ تقویٰ ہر وقت اللہ کے خوف سے اس کے احکام پر عمل اور اس کی نافرمانی سے بچنے کا نام ہے۔ احسان بھی یہی ہے کہ ہر وقت یہ بات دل و دماغ میں حاضر رکھے کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حدیث جبریل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تفسیر فرمائی: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ )) [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل...... : ٥٠ ] "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ یقیناً تمھیں دیکھ رہا ہے۔" تواضع اور احسان کی صفات رکھنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں ہر خیر کی بشارت ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (١١٢)، نساء (١٢٥) اور لقمان (٢٢) اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔ (آمین)

④ مفسر بقاعی نے "وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ" کی واؤ کا ایک نکتہ بیان فرمایا ہے کہ دین کا مدار نذارت و بشارت دونوں پر ہے، اس مقام پر چونکہ حج اور اس کے اعمال قربانی وغیرہ کا ذکر ہے، جو بشارت سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، اس لیے نذارت کو حذف کرکے واؤ عطف کے بعد بشارت کا واضح الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ گویا اصل عبارت یوں تھی: "فَأَنْذِرْ أَيُّهَا الدَّاعِيْ! الْمُسِيْئِيْنَ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ" "سو اے دعوت دینے والے! برائی کرنے والوں کو ڈرا اور نیکی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دے۔"

**آیت 38** ① اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: پچھلی آیات کے ساتھ اس مضمون کا تعلق یہ ہے کہ اس سورت میں اس سے پہلے کفار کا اور ان کے لیے عذاب الیم کا ذکر ہوا ہے، جو اسلام اور مسجد حرام سے لوگوں کو روکتے ہیں کہ جس میں اللہ کی عبادت کرنا ہر ایک کا حق ہے۔ پھر آیت (١٩) "هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ" میں مشرکین اور موحدین کی کشمکش کا ذکر فرمایا ہے، اس کے بعد بیت اللہ کی تعمیر، حج کی ابتدا اور قربانی اور حج کے دوسرے اعمال کی فضیلت کا بیان ہوا ہے جس سے

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾

ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے ﴿۳۹﴾

مہاجر مسلمانوں کے دل میں اپنے وطن کو دیکھنے، بیت اللہ کی زیارت اور اس کے عمرہ و حج کا شوق پیدا ہونا قدرتی تھا اور یہ خیال بھی کہ کافر کب تک ظلم کرتے رہیں گے اور مسلمانوں کو اللہ کے گھر سے روکتے رہیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار مت سمجھیں، اللہ تعالیٰ ان کا دفاع کر رہا ہے اور کرے گا۔ بہت جلد مسلمانوں کو غلبہ عطا ہو گا اور کفار، جنھوں نے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے اور انھیں ان کے وطن مکہ معظمہ سے ہجرت پر مجبور کیا، وہ مغلوب ہوں گے۔

② اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ : "خَوَّانٍ" "خَانَ يَخُوْنُ" سے اسم فاعل مبالغے کا صیغہ ہے اور "كَفُوْرٍ" "كَفَرَ يَكْفُرُ" سے اسم فاعل مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کے دفاع کی وجہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو بے حد خیانت کرنے والا، بہت ناشکرا ہے، جبکہ کفار میں یہ دونوں صفات پائی جاتی ہیں۔

③ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو بے حد خیانت کرنے والا، بہت ناشکرا ہو، تو کیا وہ عام خیانت کرنے والے اور عام ناشکرے کو پسند فرماتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی خیانت کرنے والے اور کسی بھی ناشکرے کو پسند نہیں کرتا، خواہ وہ صرف خائن و کافر ہو یا خوان و کفور ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآىِٕنِيْنَ﴾ [ الأنفال : ٥٨ ] "بے شک اللہ خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔" اور فرمایا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [ آل عمران : ٣٢ ] "بے شک اللہ کفر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔" یہاں مبالغے کے صیغے لانے کے دو فائدے ہیں، ایک یہ کہ کفار مکہ کا حال بیان کرنا مقصود ہے کہ انھیں بیت اللہ کی تولیت کی امانت اور حرم میں سکونت کی نعمت عطا کی گئی مگر انھوں نے شرک و کفر پر اصرار کر کے اور مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھا کر، انھیں خانہ بدر کر کے اور آئندہ حج و عمرہ، نماز و طواف اور دوسری عبادات کے لیے اللہ کے گھر میں آنے سے روک دیا۔ یہ امانت میں حد سے بڑھی ہوئی خیانت اور نعمت کی بہت بڑی ناشکری ہے۔ یاد رہے کہ "خَوَّانٍ" میں "كَفُوْرٍ" سے زیادہ مبالغہ ہے۔ "خَوُوْنٌ" کے بجائے "خَوَّانٍ" اس لیے لایا گیا ہے کہ کفر اور دوسرے نقائص کی اصل بھی خیانت ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ممکن نہیں کہ انسان میں پائے جانے والے نقائص مبالغہ سے خالی ہوں۔ خیانت ہی کو لے لیجیے! آدمی جب کسی کی خیانت کی نیت کرتا ہے، پھر اس پر عمل کرتا ہے تو درحقیقت وہ پہلے اپنی جان کی خیانت کرتا ہے، پھر لوگوں کی اور رب تعالیٰ کی بھی، کفر کا بھی یہی حال ہے۔

آیت 39 ① اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ …… : "أَيْ فِي الْقِتَالِ" اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کے دفاع

کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کام مسلمانوں سے لے گا، وہ اگر چاہے تو قومِ نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور اصحابِ مدین کی طرح آسمانی عذاب کے ذریعے سے کفار کو تباہ و برباد کر سکتا ہے، مگر فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے اللہ تعالیٰ نے کفار کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے سزا دلوانے کا طریقہ اختیار فرمایا، کیونکہ اس میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [ التوبة : ۱۴، ۱۵ ] ”ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔“ جہاد کی چند حکمتوں کے لیے دیکھیے سورۂ محمد (۴)، آل عمران (۱۴۰ تا ۱۴۲، ۱۷۹) اور توبہ (۱۶)۔

❷ یہ پہلی آیت ہے جس میں کفار سے لڑائی کی اجازت دی گئی ہے، کیونکہ مکہ میں کفار کی بے شمار زیادتیوں کے باوجود مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ ہاتھ روک کر رکھنے کا حکم تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ [ النساء : ۷۷ ] ”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔“ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: « لَمَّا أُخْرِجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مَكَّةَ قَالَ أَبُوْ بَكْرٍ أَخْرَجُوْا نَبِيَّهُمْ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ! لَيُهْلَكُنَّ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴾ وَهِيَ أَوَّلُ آيَةٍ نَزَلَتْ فِي الْقِتَالِ » [ مستدرك حاكم : ۲/ ۲۴۶، ح : ۲۹۶۸۔ مسند أحمد : ۱/ ۲۱۶، ح : ۱۸۷۰ ] ”جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا گیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”انھوں نے (مکہ والوں نے) اپنے نبی کو نکال دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، وہ ضرور ہلاک کر دیے جائیں گے۔“ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴾ [ الحج : ۳۹ ] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”یہ وہ پہلی آیت ہے جو قتال کے بارے میں نازل ہوئی۔“ جب مسلمان مدینہ منتقل ہو گئے تو چھوٹی سی اسلامی مملکت قائم ہو گئی۔ کفار نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا تو اس آیت میں مسلمانوں کو بھی لڑائی کی اجازت مل گئی۔ یہ تقریباً ہجرت کے پہلے سال کے آخر کا واقعہ ہے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے خلاف کئی مہمیں بھیجیں، جن کے نتیجے میں پہلا فیصلہ کن معرکہ بدر کے مقام پر ہوا، جسے اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا اور جس میں فرشتوں کے ذریعے سے مسلمانوں کی مدد کی گئی۔

❸ قتال (لڑائی) ایک نہایت مشکل کام ہے، بے شک موت کا وقت مقرر ہے مگر آدمی جان بچانے کے لیے لڑائی سے جان بچاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قتال فرض کرنے میں تدریج سے کام لیا، پہلے اس آیت کے ذریعے سے قتال کا اذن ملا، پھر ”قَاتِلُوْا“ کے حکم کے ساتھ قتال فرض ہوا، مگر صرف ان لوگوں سے جو لڑائی کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ

يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ﴾ [ البقرة : ١٩٠ ] ”اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو۔“ اس کے بعد تمام کفار سے لڑنا فرض کر دیا گیا، فرمایا: ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾ [البقرة : ٢١٦ ] ”تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ﴾ [ التوبة : ٥ ] ”پس جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو۔“ اور فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [ التوبة : ٢٩] ”لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔“ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ » [ بخاري، الإيمان، باب ﴿ فإن تابوا و أقاموا الصلاة...... ﴾ : ٢٥ ] ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمام لوگوں سے قتال (لڑائی) کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر جب وہ یہ کام کر لیں تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے محفوظ کر لیے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔“ لڑائی کی تدریجاً فرضیت ایسے ہی ہے جیسے شراب تین مرحلوں میں مکمل حرام ہوئی۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (٩٠) کی تفسیر۔ اسی طرح روزہ تین مرحلوں میں موجودہ صورت میں فرض ہوا۔

❹ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا : یعنی مسلمانوں کو قتال کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، یہ ظلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کیا گیا اور مسلمانوں پر بھی۔ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں: « سَأَلْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو عَنْ أَشَدِّ مَا صَنَعَ الْمُشْرِكُوْنَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، قَالَ رَأَيْتُ عُقْبَةَ بْنَ أَبِيْ مُعَيْطٍ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّيْ، فَوَضَعَ رِدَاءَهُ فِيْ عُنُقِهِ فَخَنَقَهُ بِهَا خَنْقًا شَدِيْدًا، فَجَاءَ أَبُوْ بَكْرٍ حَتّٰى دَفَعَهُ عَنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ » [ بخاري، فضائل أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم، باب : ٣٦٧٨ ] ”میں نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ”مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ سخت تکلیف کیا پہنچائی تھی؟“ انھوں نے فرمایا: ”میں نے (بدبخت) عقبہ بن ابی معیط کو دیکھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے، اس نے اپنی چادر آپ کی گردن میں ڈالی اور آپ کا گلا بہت سختی سے گھونٹ دیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور اسے دھکیل کر

پیچھے ہٹایا اور کہا: ﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [ المؤمن : ۲۸ ] ''کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے، حالانکہ یقیناً وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے۔'' عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( كَانَ أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ إِسْلَامَهُ سَبْعَةٌ : رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَأَبُوْ بَكْرٍ ، وَعَمَّارٌ ، وَأُمُّهُ سُمَيَّةُ ، وَصُهَيْبٌ ، وَبِلَالٌ ، وَالْمِقْدَادُ ، فَأَمَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ وَ عَلَيْهِ سَلَّمَ فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِعَمِّهِ أَبِيْ طَالِبٍ وَ أَمَّا أَبُوْ بَكْرٍ فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِقَوْمِهِ وَ أَمَّا سَائِرُهُمْ ، فَأَخَذَهُمُ الْمُشْرِكُوْنَ وَأَلْبَسُوْهُمْ أَدْرَاعَ الْحَدِيْدِ وَصَهَرُوْهُمْ فِي الشَّمْسِ ، فَمَا مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَاتَاهُمْ عَلٰى مَا أَرَادُوْا ، إِلَّا بِلَالًا ، فَإِنَّهُ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ فِي اللّٰهِ ، وَهَانَ عَلٰى قَوْمِهِ ، فَأَخَذُوْهُ ، فَأَعْطَوْهُ الْوِلْدَانَ ، فَجَعَلُوْا يَطُوْفُوْنَ بِهِ فِيْ شِعَابِ مَكَّةَ وَهُوَ يَقُوْلُ : أَحَدٌ ، أَحَدٌ )) [ ابن ماجه، السنة، باب فضل سلمان و أبي ذر والمقداد : ۱۵۰ و صححه الحاكم والذهبي وابن حبان وغيرهم و الألباني ] ''سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا وہ سات آدمی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمار، ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابو طالب کے ذریعے سے محفوظ رکھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے ذریعے سے محفوظ رکھا۔ باقی سب کو مشرکین نے پکڑ لیا اور انھیں لوہے کی قمیصیں پہنا کر دھوپ میں جھلنے کے لیے پھینک دیا۔ چنانچہ ان میں سے جو بھی تھا اس نے اس کے مطابق کہہ دیا جو وہ چاہتے تھے سوائے بلال رضی اللہ عنہ کے۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اس کے نزدیک اس کی جان بے قدر و قیمت ٹھہری (اس نے اپنی جان کی کوئی پروا نہ کی ) اور وہ ان لوگوں کی نظر میں ایسا بے قدر و قیمت ٹھہرا کہ انھوں نے اسے پکڑا اور لڑکوں کو دے دیا۔ وہ اسے مکہ کی گھاٹیوں میں پھراتے تھے اور وہ کہتا تھا: اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشرکین کی بے تحاشا مار کا تذکرہ بھی کتب سیرت میں موجود ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِعَمَّارٍ وَأَهْلِهِ وَهُمْ يُعَذَّبُوْنَ فَقَالَ أَبْشِرُوْا آلَ عَمَّارٍ وَآلَ يَاسِرٍ فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ )) [ مستدرك حاكم : ۳۸۳/۳، ح : ۵۶۶۶ و صححه الحاكم و وافقه الذهبي ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمار اور اس کے خاندان کے پاس سے گزرے، جب انھیں عذاب دیا جا رہا تھا تو فرمایا: ''اے آل عمار اور آل یاسر! خوش ہو جاؤ، تمھارے وعدے کی جگہ جنت ہے۔'' خباب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ کعبہ کے سائے میں چادر کی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ہمیں مشرکین کی طرف سے بہت سخت تکلیف پہنچی تھی۔ میں نے کہا: ''کیا آپ اللہ سے دعا نہیں کرتے؟'' آپ (سیدھے ہو کر) بیٹھ گئے اور آپ کا چہرہ (غصے سے) سرخ تھا، فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا کہ لوہے کی کنگھیوں کے ساتھ ان کی ہڈیوں سے گوشت اور پٹھے چھیل دیے جاتے تھے، یہ چیز انھیں ان کے دین سے نہیں پھیرتی تھی اور انھیں سر کی چوٹی پر آرا رکھ کر دو حصوں میں چیر دیا جاتا، یہ چیز انھیں ان کے دین سے پھیرتی نہ تھی اور (اللہ کی قسم!) یہ کام ضرور پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا اور اسے کسی کا خوف نہیں ہوگا سوائے اللہ کے، یا سوائے بھیڑیے کے اس کی

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ

وہ جنھیں ان کے گھروں سے کسی حق کے بغیر نکالا گیا، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر

بھیڑ بکریوں پر اور لیکن تم جلدی کرتے ہو۔" [ بخاري، مناقب الأنصار، باب ما لقي النبي ﷺ و أصحابه من المشركين بمكة : ٣٨٥٢، ٦٩٤٣ ] کفار نے مسلمانوں پر اس قدر ظلم کیا اور اتنی ایذائیں دیں کہ ان میں سے کچھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور کچھ مکہ ہی میں ظلم کی چکی میں پستے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کی اور رسول اللہ ﷺ بھی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ایک دفعہ ہجرت کرنے کے لیے نکلے مگر ابن الدغنہ برک الغماد سے انھیں واپس لے آئے، پھر بعد میں وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

5 وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ: یعنی اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے، مگر اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر اور انھیں غالب کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ اس وقت مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں مسلمانوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں تھی، مقابلے میں قریش تھے، جن کی سرداری پورے عرب میں مسلم تھی اور عرب کے تمام مشرک قبائل ان کی پشت پر تھے، بعد میں یہودی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اس موقع پر کائنات کے مالک اور شہنشاہ کا یہ فرمان کہ "بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے" یہ جملہ ان مسلمانوں کو قوی اور قائم کر دینے والا تھا جنھیں پورے عرب کے مقابلے کے لیے کہا جا رہا تھا اور کفار کو بھی تنبیہ ہے کہ ان کا مقابلہ چند مسلمانوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے، کیونکہ مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان نہیں بلکہ مراد نصرت کا وعدہ ہے۔

آیت 40 1 الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ ......: یہ آیت دلیل ہے کہ اس سورت کا یہ حصہ مدینہ میں نازل ہوا ہے۔

2 اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دو ظلم بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا، جب کہ یہ تمام دنیا کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جو شخص جہاں رہتا ہے وہاں رہنے میں اور اس کی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں وہاں کے تمام لوگوں کے ساتھ برابر حق رکھتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اسے اس کے گھر سے نکال باہر کرے۔ دوسرا ظلم یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو صرف اس جرم کی وجہ سے ان کے گھروں سے نکالا کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب صرف اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جرم ہے ہی نہیں بلکہ عین عدل ہے اور یہ گھروں سے نکالنے کا باعث نہیں بلکہ امن و سکون سے اپنے گھروں میں سکونت کا ضامن ہے۔ دراصل اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ایسے طریقے سے تعریف فرمائی ہے کہ ان سے ہر جرم کی نفی کر کے اس چیز کو ان کا جرم بیان کیا ہے جو حقیقت میں جرم نہیں خوبی ہے، جیسا کہ عرب کے ایک شاعر نے کچھ لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا ؎

وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ أَنَّ سُيُوْفَهُمْ ... بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾

اللہ کا لوگوں کو ان کے بعض کو بعض کے ذریعے ہٹانا نہ ہوتا تو ضرور ڈھا دیے جاتے (راہبوں کے) جھونپڑے اور (نصرانیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا جاتا ہے اور یقیناً اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۴۰﴾

’’ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ ان کی تلواروں میں دشمن کے لشکروں سے کھٹکھٹانے کی وجہ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔‘‘ ظاہر ہے کہ جسے وہ عیب کہہ رہا ہے وہ دراصل بہت بڑی خوبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقامات پر بھی کفار کا یہ ظلم یاد دلا کر مسلمانوں کو ان کی دوستی سے منع فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ﴾ [ الممتحنۃ : ۱ ] ’’وہ رسول کو اور خود تمھیں اس لیے نکالتے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان لائے ہو۔‘‘

﴿۵﴾ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ...... : ’’صَوَامِعُ‘‘ ’’صَوْمَعَةٌ‘‘ کی جمع ہے، وہ عبادت خانہ جو عیسائی راہب آبادیوں سے دور اونچے مینار کی شکل میں بناتے تھے، جس کی اوپر کی منزل میں وہ اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہتے اور مینار کی چوٹی پر عموماً رات کو چراغ جلاتے، تاکہ مسافر راستہ معلوم کر سکیں اور نچلی منزل میں قیام کر سکیں۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

تُضِيْءُ الظَّلَامَ بِالْعَشِيِّ كَأَنَّهَا مَنَارَةُ مُمْسٰى رَاهِبٍ مُتَبَتِّلِ

’’بِيَعٌ‘‘ ’’بِيْعَةٌ‘‘ کی جمع ہے، آبادیوں میں نصرانیوں کے گرجے۔ ’’صَلَوٰتٌ‘‘ یہودیوں کے عبادت خانے، یہ ’’صَلَاةٌ‘‘ کی جمع ہے۔ شاید ان کا نام ’’صَلَوٰتٌ‘‘ اس لیے رکھا گیا ہو کہ یہودیوں کو صرف اپنے عبادت خانے میں نماز پڑھنا لازم تھا۔ بعض کہتے ہیں یہ ’’صلوتا‘‘ کی جمع ہے جو غیر عربی لفظ ہے اور یہودیوں کے معبد خانے پر بولا جاتا ہے۔ ’’لَّهُدِّمَتْ‘‘ باب تفعیل کی وجہ سے ترجمہ ہوگا ’’بری طرح ڈھا دیے جاتے‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ ہر چیز، ہر شخص اور ہر جماعت، دوسری چیز، یا شخص یا جماعت کے مقابلے میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے جنگ کرتی رہے، اگر ایسا نہ ہوتا اور نیکی کو اللہ تعالیٰ اپنی حمایت میں لے کر بدی کے مقابلے میں کھڑا نہ کرتا تو نیکی کا نشان تک زمین پر باقی نہ رہتا۔ بے دین اور شریر لوگ، جن کی ہر زمانے میں کثرت رہی ہے، تمام مقدس مقامات اور شعائر اللہ کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ بدی کی طاقتیں کتنی ہی جمع ہو جائیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وقت آئے جب نیکی کے ہاتھوں بدی کے حملوں کا دفاع کرایا جائے اور حق تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی خود مدد فرما کر ان کو دشمنانِ حق پر غالب کرے۔ بہرحال اس وقت مسلمانوں کو ظالم کافروں کے مقابلے میں جہاد و قتال کی اجازت دینا اسی قانون قدرت کے ماتحت تھا اور یہ وہ عام قانون ہے جس کا انکار کوئی عقل مند نہیں کر سکتا۔ اگر دفاع و حفاظت کا یہ قانون نہ ہوتا تو اپنے اپنے زمانے میں نہ نصرانی راہبوں کے صوامع قائم رہتے اور نہ نصاریٰ کے گرجے، نہ یہود کے عبادت خانے اور نہ مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ

وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے

اللہ کا ذکر بڑی کثرت سے ہوتا ہے، یہ سب عبادت گاہیں گرا کر اور بری طرح ڈھا کر ملیامیٹ کر دی جاتیں۔ تو اس عام قانون کے تحت کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک مناسب وقت پر اپنے دشمنوں سے لڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس مضمون کی ایک اور آیت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۱)۔

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے، ان کو مسمار نہ کیا جائے، کیونکہ ان میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، البتہ بت خانے اور آتش کدے صرف اس صورت میں باقی رکھے جائیں گے جب کسی قوم سے معاہدے میں انھیں باقی رکھنا شامل ہو۔

⑤ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ : اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے دین کی مدد ہے، کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ [ فاطر : ۱۵ ] ”اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔“ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خود بھی اس کے دین کو فروغ دینے کی کوشش کرے۔ دین کی مدد دلیل و برہان کے ساتھ بھی ہے اور سیف و سنان کے ساتھ بھی، اسی طرح جان کے ساتھ بھی ہے اور مال کے ساتھ بھی، پھر ہاتھوں کے ساتھ بھی ہے اور زبان کے ساتھ بھی، غرض ہر طرح سے اللہ کے دین کی مدد لازم ہے اور جو بھی یہ فریضہ سرانجام دے گا اللہ تعالیٰ اس کی یقیناً ضرور مدد فرمائے گا، خواہ اس کے لیے نصرت کے دنیوی اسباب مہیا فرما دے یا غیب سے اپنے لشکروں میں سے کسی لشکر کے ساتھ مدد کر دے، فرمایا: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ [ المدثر : ۳۱ ] ”اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ جیسے بدر میں فرشتوں کے ذریعے سے مدد فرمائی (انفال : ۹) اور خندق میں آندھی اور ان لشکروں کے ذریعے سے مدد فرمائی جو تم نے نہیں دیکھے۔ (احزاب : ۹)

⑥ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ : بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے۔ جس کی وہ مدد کرے یقیناً وہی غالب ہو گا اور اس کا مدمقابل مغلوب ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا اور اپنے دین کی مدد کرنے والے انصار و مہاجرین اور ان کے پیروکاروں کے ہاتھوں زمین کے جابر و قاہر بادشاہوں کو مغلوب و مقہور کر کے مشرق سے مغرب تک اسلام کا بول بالا کر دیا۔ ﴿ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ [ النساء : ۸۷ ] ”اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے؟“

**آیت 41** ① اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ...... : اس سے پہلے جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے کہ انھیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا اور وہ گھروں سے صرف توحید الٰہی کے جرم میں نکالے گئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد کرے گا، انھی کے متعلق اللہ تعالیٰ پیشگی بیان فرما رہے ہیں کہ اگر ہم نے انھیں زمین میں اقتدار بخشا تو وہ چار کام سرانجام

نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

اور برے کام سے روکیں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے ﴿۴۱﴾

دیں گے۔ پہلا اور دوسرا یہ کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد میں اقامت صلاۃ کا ایسا مضبوط نظام قائم تھا کہ حدیث و سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں دوسرے گناہوں کے ارتکاب کا اور ان کی سزا کا ذکر آپ پڑھیں گے مگر ایک بھی شخص نہیں پائیں گے جو نماز نہ پڑھتا ہو یا زکوٰۃ نہ دیتا ہو اور اسے مسلمان سمجھا جاتا ہو، حتیٰ کہ منافقین کو بھی اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے مسجدوں میں آ کر نماز پڑھنا پڑتی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ [ النساء : ۱۴۲ ] ''بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم۔'' اور سب جانتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: (( وَاللّٰهِ ! لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ )) [ بخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة : ۱۴۰۰ ] ''اللہ کی قسم! میں ہر صورت اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے گا۔'' مسلمانوں کے زوال کا آغاز اس دن سے ہوا جب کچھ حکمرانوں نے ان لوگوں کا موقف اختیار کیا جو کہتے تھے کہ کوئی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، زکوٰۃ دے یا نہ دے، اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، وہ پکا مسلمان ہے۔ کچھ لوگ یہاں تک پہنچ گئے کہ ایمان سب کا ایک جیسا ہے، اس میں کمی یا اضافہ نہیں ہوتا، اس لیے ہمارا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اور ہمارا اور جبریل علیہ السلام کا ایمان برابر ہے۔ آج کل بعض حضرات کی جماعتیں پوری دنیا میں نماز کی دعوت دیتی پھرتی ہیں مگر خود ان کے خویش و اقارب اور بیویاں اور اولاد بے نماز ہیں، اس کے باوجود وہ انھیں سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اپنا کاروبار اور جائداد انھی کے سپرد رکھتے ہیں۔ اصل سبب عقیدے کی خرابی ہے کہ وہ بے نماز اور نمازی دونوں کے ایمان کو برابر سمجھتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ایمان صرف تصدیق اور اقرار کا نام ہے، اگر آج ''اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ'' کا فریضہ سرانجام دینے والے صدیق و فاروق اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم ہوتے تو ہم دیکھتے کہ یہ لوگ کس طرح نماز اور زکوٰۃ کے بغیر مسلمان کی حیثیت سے دندناتے پھرتے، بلکہ اپنے آپ کو نمازیوں سے بہتر مسلمان قرار دیتے رہتے۔

تیسرا اور چوتھا وصف یہ بیان فرمایا کہ وہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اس آیت سے خلفائے راشدین کی خلافت برحق ثابت ہوتی ہے، کیونکہ انھوں نے صلاۃ و زکوٰۃ کے علاوہ صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا۔ اللہ کی حدود قائم کیں، جن کی برکت سے حیرہ سے چل کر اکیلی خاتون نے بیت اللہ کا حج کیا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا۔ جہاد کے ذریعے سے دنیا کو توحید کی دعوت دی اور شرک و کفر سے منع کیا اور قیصر و

کسریٰ اور عرب کے بڑے بڑے جابروں کو شکست فاش دے کر ان کے خزانے فتح کیے اور ان کی اقوام کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔ جو خوشی سے اس دائرے میں نہیں آیا اسے زبردستی مسلمان نہیں بنایا مگر اس سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جب تک اس نے جزیہ ادا کرنے کا اقرار کر کے اسلام کا محکوم بننا قبول نہیں کیا۔ خلفائے راشدین کے بعد وہ خلفاء بھی اس بشارت میں شامل ہیں جنھوں نے یہ چاروں امور پوری طرح سرانجام دیے۔ کس قدر بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ان عظیم ہستیوں سے بغض رکھتے ہیں کہ جن کے اوصاف حسنہ اور اعمالِ صالحہ کی شہادت اللہ تعالیٰ انھیں اقتدار عطا کرنے سے پہلے دے رہا ہے۔

❷ آج بھی اللہ تعالیٰ کا نصرت کا وعدہ انھی لوگوں سے ہے جنھیں اللہ تعالیٰ اقتدار عطا فرمائے تو وہ یہ چاروں کام سرانجام دیں۔ اس کے نتیجے میں انھیں اقوام عالم پر غلبہ حاصل ہو گا، اسی کے نتیجے میں معاشی بدحالی ختم ہو کر فلاحی مملکت قائم ہو گی اور اسی کے نتیجے میں امن قائم ہو گا۔ افسوس! مسلمان حکام ان چاروں چیزوں کو چھوڑ کر کفار کے طریقوں جمہوریت، سود، بے حیائی کے فروغ، آخرت سے دوری اور صرف دنیا طلبی کے پیچھے لگ کر یہ توقع کر رہے ہیں کہ اس سے دنیا پر غلبہ حاصل ہو گا، خوش حالی آئے گی اور امن قائم ہو گا، حالانکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہر بیماری کا علاج صرف اور صرف اللہ کے فرمان پر عمل ہے۔

❸ اللہ کا یہی وعدہ اور بشارت سورۂ نور میں بھی مذکور ہے، فرمایا: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ١۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا١ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا١ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [ النور : ٥٥ ]
''اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور ہی اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ہر صورت انھیں ان کے خوف کے بعد بدل کر امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ نافرمان ہیں۔''

❹ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ : مفسر بقاعی نے اس ''واؤ'' کے تحت بہت خوب صورت نکتہ بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس ''واؤ'' کا جس جملے پر عطف ہے وہ یہاں ذکر نہیں ہوا، جہاد کے حکم اور اس کی حکمت " وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ " کی مناسبت سے کلام یہ ہے کہ " فَلِلّٰهِ بَادِئَةُ الْاُمُوْرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ "یعنی پہلے کفار کے مسلمانوں کو طویل عرصہ تک بے حد ایذا کی مہلت دینے اور اب مسلمانوں کو جہاد کی اجازت اور نصرت کے وعدے کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام امور کی ابتدا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ شروع میں بعض اوقات کفار کو مہلت دے دیتا ہے، جس سے ان پر اتمامِ حجت مقصود ہوتا ہے اور ایمان کے دعوے داروں کا امتحان مقصود ہوتا ہے، تاکہ سچا اور جھوٹا اور مذبذب ایمان اور مستحکم ایمان والا ظاہر ہو جائے اور بعض اوقات شروع ہی میں مسلمانوں کی مدد کر دیتا ہے۔ پس تمام کاموں کا آغاز صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تمام کاموں کا انجام بھی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ " بَادِئَةُ الْاُمُوْرِ " کے حذف اور " عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ " کے ذکر سے مسلمانوں کو حوصلہ دیا ہے کہ ابتدا

وَ اِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوۡدُ ﴿۴۲﴾ وَ قَوۡمُ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ قَوۡمُ لُوۡطٍ ﴿۴۳﴾ وَّ اَصۡحٰبُ مَدۡيَنَ ۚ وَ كُذِّبَ مُوۡسٰى فَاَمۡلَيۡتُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ ۚ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ﴿۴۴﴾

اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بے شک ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود نے جھٹلایا ﴿۴۲﴾ اور ابراہیم کی قوم نے اور لوط کی قوم نے ﴿۴۳﴾ اور مدین والوں نے۔ اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا تو میں نے ان کافروں کو مہلت دی، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا تو میرا عذاب کیسا تھا؟ ﴿۴۴﴾

میں تو بعض اوقات اللہ کے دشمنوں کو بھی موقع مل جاتا ہے مگر انجام تمھارا ہی ہے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، چاہے تو دنیا میں بھی انجام مسلمانوں کے حق میں کر دے اور چاہے تو اس وقت ان کے حق میں کر دے جب ہر کام اپنے انجام کو پہنچ جائے گا اور جب اللہ تعالیٰ کے سوا سب کا اختیار ختم ہو جائے گا (انفطار: ۱۹) بلکہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بول بھی نہیں سکے گا۔ (نبا: ۳۸) پھر جو جہنم سے بچ گیا اور جنت میں داخل ہو گیا تو وہی کامیاب ہے اور اسی کا انجام بخیر ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۸۵)۔

**آیت 44:42** ❶ وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ ...... : آیت کے شروع میں ''واؤ'' کا عطف ایک محذوف جملے پر ہے اور وہ محذوف جملہ اور یہ مذکور جملہ دونوں ترغیب و ترہیب پر مشتمل پچھلی آیات کا حاصل بیان کر رہے ہیں۔ وہ جملہ یہ ہے: '' فَاِنۡ آمَنُوۡا بِكَ مَكَّنَّاهُمۡ فِي الۡأَرۡضِ وَإِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ أَخَذۡتُهُمۡ '' ''پس اگر وہ (یہ سب کچھ سن کر) تجھ پر ایمان لے آئیں تو ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں گے اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو میں انھیں پکڑ لوں گا۔'' پہلا جملہ سننے والے کی سمجھ کے سپرد کر کے حذف کر دیا ہے اور ''وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ'' کا اس پر عطف ڈالا ہے۔ (بقاعی) قرآن مجید میں بعض مقامات پر اس حذف شدہ جملے جیسے جملے مذکور بھی ہیں، مثلاً: ﴿ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوْا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِيۡ شِقَاقٍ ﴾ [ البقرة: ۱۳۷ ] ''پھر اگر وہ اس جیسی چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے اور اگر پھر جائیں تو وہ محض ایک مخالفت میں (پڑے ہوئے) ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوْا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ ﴾ [ آل عمران: ۲۰ ] ''پس اگر وہ تابع ہو جائیں تو بے شک ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو تیرے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيۡكُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ﴾ [ النور: ۵۴ ] ''کہہ دے اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر تم پھر جاؤ تو اس کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمھارے ذمے وہ جو تم پر بوجھ ڈالا گیا اور اگر اس کا حکم مانو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔''

''وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ ......'' یہ جملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو تسلی دینے اور ان کا غم دور کرنے کے لیے فرمایا ہے، یعنی اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو میں انھیں پکڑ لوں گا، خواہ وہ کتنی قوت رکھتے ہوں، میں نے ان سے پہلے عمر، قد و قامت، قوت و شوکت، مال و متاع، خبث و نجاست اور حکومت و اقتدار میں ان سے کہیں بڑھی ہوئی قوموں کو، جب وہ باز نہ آئے تو پکڑ لیا اور وہ میری

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

سو کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے اس حال میں ہلاک کیا کہ وہ ظالم تھیں، پس وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی ہیں اور کتنے ہی بے کار چھوڑے ہوئے کنویں ہیں اور چونا گچ محل ﴿۴۵﴾

گرفت سے بچ نہ سکے، تو مکہ کے ان کافروں کی کیا بساط ہے؟ اس لیے آپ غم زدہ نہ ہوں۔ آپ سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے جھٹلایا، جن کی عمریں سب لوگوں سے زیادہ اور جن کا اقتدار نہایت مضبوط تھا اور عاد نے جو بہت لمبے اور نہایت مضبوط قد رکھتے تھے، جن کے بعد ان جیسی قوم پیدا نہیں ہوئی اور ثمود، جنھوں نے میدانوں میں اور پہاڑوں میں چٹانیں تراش کر نہایت مضبوط اور بلند و بالا عمارتیں بنا رکھی تھیں اور ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو جو جبر و تکبر میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور لوط علیہ السلام کی خبیث اور نجس قوم کو اور مدین والوں کو جنھوں نے حرام طریقے سے کمائے ہوئے مال کے خزانے جمع کر رکھے تھے۔

② وَكُذِّبَ مُوْسٰى: موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ سب لوگوں کو نظر آنے والے اتنے معجزے عطا کیے گئے جو اس سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئے تھے، اس لیے ان کی تکذیب انتہائی بعید بات تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کلام کا اسلوب بدل دیا اور اس لیے بھی بدل دیا کہ پہلے ذکر کردہ تمام انبیاء کی اقوام نے انھیں جھٹلایا تھا جب کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے انھیں چند ایک کے سوا نہیں جھٹلایا، صرف فرعون کی قوم قبطیوں نے انھیں جھٹلایا تھا۔ رہی بنی اسرائیل کی نافرمانیاں تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا سمجھنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس قوم کی بدعملی اور طبیعت کی نحست کی وجہ سے تھیں۔

③ فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ: اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو دلاسا اور تسلی دی ہے کہ میں نے مکہ کے کفار کو بھی اسی طرح مہلت دی ہے، اب جنگ کی اجازت ہے، اگر یہ ایمان لے آئیں تو خیر، ورنہ ان پر بھی میری پکڑ مہاجرین و انصار کی یلغار کی صورت میں تیار ہے۔

④ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ: "نَكِيْرِ" کی "راء" کے نیچے کسرہ ہے، کیونکہ اصل میں "نَكِيْرِيْ" تھا، میرا عذاب۔ "یاء" کو تخفیف کے لیے اور فواصل یعنی آیات کے آخری الفاظ (مثلاً كَفُوْرٍ، عَزِيْزٌ، الْاُمُوْرِ، مَشِيْدٍ، الصُّدُوْرِ وغیرہ) کی موافقت کے لیے حذف کر دیا گیا۔ ان پر آنے والے عذابوں کی تفصیل سورۂ عنکبوت میں ہے، فرمایا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ [ العنکبوت : ٤٠ ] "تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔"

آیت 45 ① فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۹) کی تفسیر۔

اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَتَكُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ يَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا‌ ۚ

پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ساتھ وہ سمجھیں، یا کان ہوں جن

”بِئْرٍ“ مؤنث سماعی ہے، اس لیے اس کی صفت ”مُعَطَّلَةٍ“ آئی ہے۔ ”مَشِيْدٍ“ ”شَادَ يَشِيْدُ شَيْدًا“ (ض) سے اسم مفعول ہے، چونے کے ساتھ مضبوط کیا ہوا۔ یہ مجرد ثلاثی سے ہے، جب کہ سورۂ نساء کی آیت (۷۸): ﴿ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ میں باب تفعیل یعنی ثلاثی مزید فیہ استعمال ہوا ہے جس میں مبالغہ ہوتا ہے، کیونکہ وہاں موت کا ذکر ہے کہ خواہ تم چونے کے ساتھ بنے ہوئے محکم سے محکم قلعوں میں ہو موت تمھیں وہاں بھی نہیں چھوڑے گی۔ موت کی دسترس کے اظہار کے لیے ”مُشَيَّدَةٍ“ (باب تفعیل) لایا گیا، جب کہ پرانے محلات خواہ کس قدر مضبوط ہوں آخر وہ پختگی باقی نہیں رہتی، اس لیے صرف ”مَشِيْدٍ“ (ثلاثی مجرد) پر اکتفا کیا گیا۔ ”مَشِيْدٍ“ کا ایک معنی بلند بھی ہے۔

② یہ سات اقوام جن کا ذکر ہوا ہے، کثرت و قوت میں تمام اقوام سے بڑھ کر تھیں۔ ان کے علاوہ ان کے عہد میں اور بعد کے زمانوں میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس طرح کی کتنی قومیں گزری ہیں؟ ان سب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت بیان فرمائی کہ پہلے انھیں مہلت دی جاتی ہے، پھر اگر وہ اس سے فائدہ اٹھا کر ایمان لے آئیں تو خیر، ورنہ انھیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ترتیب کے مطابق پہلے مہلت کا اور پھر پکڑنے کا ذکر ہونا چاہیے تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے جھٹلانے کے انجامِ بد سے ڈرانے کے لیے ایسی اقوام کی کثرت، ان کی قوت و شوکت اور ان کی تباہی و بربادی کی یاد دلانے والے آثارِ قدیمہ کا بیان پہلے فرمایا اور آیت (۴۶) میں دوبارہ انھیں مہلت دینے کے بعد پکڑنے کا ذکر فرمایا۔ سو ارشاد فرمایا کہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ان کے ظلم اور کفرانِ نعمت کی پاداش میں ہم نے ہلاکت اور تباہی کے گھاٹ اتار دیا۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ ان کی چھتیں بوسیدہ ہو کر گرنے کے بعد ان کی دیواریں بھی ان پر گری پڑی ہیں اور کتنے ہی کنویں ہیں جو کبھی آبادی کا مرکز تھے اور ان پر پانی کے لیے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اب اجاڑ اور ویران پڑے ہیں۔ عربوں کے ہاں پانی کی قلت کی وجہ سے کنوؤں کا خصوصاً ذکر فرمایا۔ اسی طرح کتنے ہی چونے کے ساتھ مضبوط بنے ہوئے بلند و بالا اور پرشکوہ ایوان اور محلات ہیں، جن میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی اور جن کی حفاظت کے لیے دن رات ہزاروں فوجیوں کا پہرا ہوتا تھا، اب ان پر کوؤں، چیلوں اور الوؤں کی حکومت ہے۔

**آیت 46** ① اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ...... : عرب کے لوگ تجارت کے لیے دور دراز سفر کرتے تھے، چنانچہ وہ گرمیوں میں شام کی طرف اور سردیوں میں یمن کی طرف جاتے تھے۔ سورۂ قریش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے اس انعام کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ یمن قومِ عاد کا مسکن تھا اور شام کے سفر میں مدائن صالح اور قومِ لوط کی تباہ شدہ بستیوں پر سے ان کا گزر ہوتا تھا، قومِ لوط کے متعلق فرمایا: ﴿ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۙ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۱۳۷، ۱۳۸ ] ”اور بلاشبہ تم یقیناً صبح جاتے ہوئے ان پر سے گزرتے ہو اور رات کو بھی۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں؟“ اور قومِ لوط اور قومِ

فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَ لٰكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ ۝۴۶

کے ساتھ وہ سنیں۔ پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں ۝۴۶

شعیب (اصحاب الایکہ) کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ﴾ [ الحجر : ۷۹ ] ''اور بے شک وہ دونوں (بستیاں) یقیناً ظاہر راستے پر موجود ہیں۔'' مدین کا علاقہ بھی حجاز کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ سفر میں آدمی کو مالی فوائد کے علاوہ علمی فوائد اور بے شمار تجربات اور عبرتیں حاصل ہوتی ہیں اور سفر کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے۔ ابوالعلاء المعری کہتا ہے ۔

وَ قِيۡلَ أَفَادَ بِالْأَسْفَارِ مَالًا فَقُلْنَا هَلْ أَفَادَ بِهَا فُؤَادًا

''لوگوں نے بتایا کہ اس نے مختلف سفروں میں بہت سا مال حاصل کیا ہے، تو ہم نے کہا، کیا اس نے ان سے کوئی دل بھی حاصل کیا ہے؟'' یعنی اسے سفروں سے کچھ عقل و دانش اور نصیحت و عبرت بھی حاصل ہوئی ہے؟ اس آیت میں ان لوگوں سے جنھوں نے یہ سفر کیے تھے، کہا جا رہا ہے کہ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ مختلف قوموں کے آثار قدیمہ دیکھ کر ان کے دل عقل کرتے اور نصیحت و عبرت حاصل کرتے، یا لوگوں سے سن کر ہی عبرت حاصل کرتے؟ مقصد یہ ہے کہ سفر کا فائدہ تو سوچنا سمجھنا اور عبرت حاصل کرنا ہے اور بے شک تم نے ان سفروں میں آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا اور کانوں سے بہت کچھ سنا مگر جب اس سے عبرت اور عقل حاصل نہیں کی تو سمجھو کہ تم آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے اور کان رکھنے کے باوجود بہرے ہو، فرمایا: ﴿ وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۷۱ ] ''اور ان لوگوں کی مثال جنھوں نے کفر کیا، اس شخص کی مثال جیسی ہے جو ان جانوروں کو آواز دیتا ہے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو وہ نہیں سمجھتے۔'' گویا جس کا دل عقل سے خالی ہے اس کی آنکھوں اور کانوں کا اسے کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اس آیت میں ان لوگوں کو جنھوں نے سفر نہیں کیا، ترغیب دی جا رہی ہے کہ دنیا میں چلو پھرو، اس سے تمھاری آنکھیں دیکھ کر اور کان سن کر عبرت و نصیحت حاصل کریں گے۔

❷ فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ ...... : '' اِنَّ '' کے بعد '' هَا '' ضمیر قصہ کہلاتی ہے، یہ مذکر بھی آتی ہے، جیسا کہ اس آیت کی ایک قراءت '' فَاِنَّهُ لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ '' بھی ہے، اس وقت اسے ضمیر شان کہتے ہیں، معنی دونوں کا ایک ہی ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ ...... بینائی دو قسم کی ہے، ایک آنکھوں کی بینائی، اسے بصارت کہتے ہیں اور ایک دل کی بینائی، اسے بصیرت کہتے ہیں۔ اسی طرح اندھا پن بھی دو قسم کا ہے، ایک آنکھوں کا اندھا ہونا اور ایک دل کا اندھا ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ یہاں آنکھوں کے اندھا نہ ہونے کا مطلب ہے کہ آنکھیں اندھی ہونے سے کچھ نقصان نہیں، اصل نقصان دل اندھا ہونے اور بصیرت سے محروم ہونے کا ہے۔

❸ بعض اہل علم نے بصارت اور بصیرت کی مثال سواری اور سوار کی بیان فرمائی ہے، اگر سوار دیکھتا ہے تو سواری اندھی ہونے

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾

اور وہ تجھ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرے گا اور بے شک ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار سال کے برابر ہے، اس گنتی سے جو تم شمار کرتے ہو ﴿۴۷﴾

کا خاص نقصان نہیں، لیکن اگر سوار اندھا ہے تو سواری کی نگاہ جتنی بھی تیز ہو کچھ فائدہ نہیں۔

④ موجودہ سائنس کا کہنا ہے کہ سوچنا سمجھنا دماغ کا کام ہے دل کا نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس دل کو عقل کا مرکز قرار دیا ہے جو سینے میں ہے، اس دماغ کو نہیں جو سر میں ہے۔ اب بعض لوگوں نے کہا کہ قرآن نے سائنس کی زبان میں بات نہیں کی، ادبی زبان میں بات کی ہے مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ سائنس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں، جب کہ اللہ کا فرمان اٹل ہے اور کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ دماغ کو خون دل ہی سے پہنچتا ہے، عین ممکن ہے کہ دماغ محض ایک سٹور ہو جس کا بٹن دل میں ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے اور بے شمار دفعہ ہوا ہے کہ یہاں بھی سائنس اصل حقیقت تک پہنچ جائے اور دل کو عقل کا مرکز تسلیم کر لے۔

**آیت 47** ① وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ : مشرکین رسول اللہ ﷺ سے جلد از جلد عذاب لانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ اس مطالبے سے ان کا مقصد عذاب آنے کا انکار اور نبی ﷺ کو جھٹلانا، آپ کا مذاق اڑانا اور آپ کو لاجواب کرنا تھا۔ قرآن مجید نے ان کے اس مطالبے کا کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [ الأنبياء : ۳۸ ] ”اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔“ اور فرمایا: ﴿وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ﴾ [ العنكبوت : ۵۳ ] ”اور وہ تجھ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو ان پر عذاب ضرور آ جاتا۔“ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست عذاب کی دعا سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے: ﴿وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ [ ص : ۱۶ ] ”اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا حصہ یوم حساب سے پہلے جلدی دے دے۔“ اور فرمایا: ﴿وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [ الأنفال : ۳۲ ] ”اور جب انھوں نے کہا اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔“

② وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ : مشرکین جس یقین کے ساتھ عذاب نازل ہونے کو جھٹلاتے تھے اسی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا، جو اس نے فرمایا ہے ہو کر رہے گا، مگر اس وقت پر جو اس نے مقرر فرمایا ہے۔

③ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ ...... : یعنی رب تعالیٰ تمھاری طرح تنگ ظرف اور جلد باز نہیں بلکہ بے حد حلیم اور وسعت والا ہے۔ اس کی دی ہوئی تھوڑی سی مہلت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، تمھارا ایک ہزار سال اس کے نزدیک صرف ایک دن ہے، وہ

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں میں نے مہلت دی، اس حال میں کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ﴿۴۸﴾ کہہ دے اے لوگو! میں تو بس تمھارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۴۹﴾

اتنا حلیم ہے کہ آدھے دن کی مہلت دے تو وہ بھی پانچ سو برس ہو گی اور ایک گھنٹے کی مہلت دے تو چالیس برس سے زیادہ ہو گی۔ اس کے حلم کی وجہ یہ ہے کہ وہ انتقام پر قادر ہے، کوئی چیز اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتی، خواہ وہ کتنی مہلت دے یا رسی دراز کرے۔

**آیت 48** ❶ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا ...... : اس آیت میں قانون مہلت کو دہرایا ہے کہ میں نے کتنی ہی بستیوں کو ان کے ظلم کے باوجود تمھاری طرح مہلت دی، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا۔

❷ وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ : یعنی اگر کسی ظالم قوم پر عذاب آنے میں دیر ہوئی، یا دنیا میں سرے سے اس پر عذاب آیا ہی نہیں تو بھی وہ ہماری گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، ہر حال میں انھیں ہماری ہی طرف آنا ہے، وہاں سب وعدے پورے ہوں گے۔

**آیت 49** ❶ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ لوگ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک جواب تو اپنا قانونِ مہلت ذکر فرمایا، یہ آیت دوسرا جواب ہے۔ فرمایا، ان سے کہہ دیجیے کہ میں تو صرف تمھیں ڈرانے والا ہوں، میرا کام کفر کے برے انجام سے خبردار اور آگاہ کرنا ہے، عذاب جلدی لانا یا دیر سے لانا میرا کام نہیں، یہ مجھے بھیجنے والے کا کام ہے۔ میں صرف پیغام پہنچانے والا ہوں، خود اللہ نہیں ہوں۔

❷ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ : یعنی تمام دنیا کے لوگوں کو پیغام پہنچا دو، خواہ کسی قوم یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ قیامت تک کسی زمانے کے لوگ ہوں۔ دیکھیے سورۂ سبا (۲۸)۔

❸ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ : یعنی میں تمھیں ڈرانے والا (اور بشارت دینے والا) ہوں، تمھیں کھول کر ہر وہ چیز بتاتا ہوں جو تمھارے لیے نقصان دہ ہے، تاکہ تم اس سے بچ جاؤ اور ہر وہ چیز بتاتا ہوں جو تمھارے فائدے کی ہے، تاکہ تم اسے اختیار کر لو۔ یہاں "نَذِيْرٌ" کے ساتھ "بَشِيْرٌ" بھی ہے مگر الفاظ میں اسے حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ مقام اس عذاب سے ڈرانے کا ہے جسے وہ جلدی مانگ رہے ہیں۔ یہاں "بَشِيْرٌ" کو الگ اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ ہر نذیر بشیر بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس کی خبردار کردہ چیزوں سے بچنے کا نتیجہ خوشی کی خبر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ "نَذِيْرٌ" کے ضمن میں "بَشِيْرٌ" کے تذکرے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد پہلی آیت میں بشارت ہے اور دوسری میں نذارت۔ (بقاعی)

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَ الَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا

تو وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے عظیم بخشش اور باعزت رزق ہے ﴿۵۰﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کے بارے میں کوشش کی، اس حال میں کہ نیچا دکھانے والے ہیں، وہی بھڑکتی آگ والے ہیں ﴿۵۱﴾ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر جب اس نے کوئی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں

---

**آیت 50** ① فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہ بشارت کی آیت ہے۔ ”مَّغْفِرَةٌ“ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ عظیم بخشش کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ایمان میں دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل تینوں چیزیں شامل ہیں، مگر اعمال صالحہ کا الگ ذکر خاص طور پر تاکید کے لیے فرمایا، کیونکہ اس میں عموماً کوتاہی ہوتی ہے۔

② لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ: اس سلسلۂ کلام کا آغاز قتال کے اذن سے ہوا ہے، اس وقت مسلمان کفار کے ظلم و ستم کی وجہ سے گھروں سے بے گھر تھے اور مالی طور پر بھی نہایت تنگی کی حالت میں تھے، اس لیے انھیں بشارت دینے کا حکم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح کے حامل مجاہد افراد کے لیے عظیم بخشش بھی ہے اور باعزت رزق بھی۔ باعزت رزق سے مراد دنیا میں مال غنیمت اور آخرت میں جنت ہے کہ دونوں میں اللہ کے سوا کسی کے احسان کا بار نہیں ہے۔

**آیت 51** وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا ......: ”مُعٰجِزِيْنَ“ باب مفاعلہ سے اسم فاعل ہے، مقابلے میں عاجز کر دینے والے، نیچا دکھانے والے۔ یہ نذارت یعنی ڈرانے کی آیت ہے، یعنی جن لوگوں کی کوشش ہے کہ ہماری آیات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں نیچا دکھا دیں یا عاجز کر دیں، کبھی انھیں جھوٹا کہتے ہیں، کبھی جادو کہتے ہیں، کبھی کہانت، کبھی شعر اور کبھی پہلے لوگوں کی فرضی کہانیاں، تاکہ لوگوں کو ان پر ایمان لانے سے روکیں، تو یہ لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، حتیٰ کہ ان کا لقب ہی ”اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ“ (بھڑکتی ہوئی آگ والے لوگ) ہے۔

**آیت 52** ① وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ......: لغت میں ”تَمَنّٰي يَتَمَنّٰي تَمَنِّيًا“ کا معنی تمنا، آرزو اور خواہش کرنا بھی ہے اور تلاوت کرنا اور پڑھنا بھی ہے، سورۂ بقرہ کی آیت (۷۸): ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ﴾ میں ”اَمَانِيَّ“ ”اُمْنِيَّةٌ“ کی جمع ہے، جس کا معنی آرزو بھی ہے اور تلاوت کرنا بھی۔ پہلے معنی کی رو سے مطلب یہ ہے کہ آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول یا نبی بھیجا شیطان اس کی ہر آرزو اور خواہش کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا رہا۔ ظاہر ہے پیغمبر کی آرزو لوگوں کے ایمان قبول کرنے اور دین حق کے غلبے کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے انبیاء و رسل کی ہر کوشش کو شیطان ناکام کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے اپنی آیات کو محکم اور اپنے دین کو غالب کرتا رہا، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [ التوبة : ۳۳ ] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر

نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾

(خلل) ڈالا تو اللہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، مٹا دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۲﴾

دے۔" دوسرے معنی کی رو سے مطلب یہ ہے کہ آپ سے پہلے بھی رسول یا نبی آیا، جب وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتا تو شیطان اس کے سننے میں رکاوٹ ڈالتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۲۶ ] "اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔" مگر اللہ تعالیٰ اس کی رکاوٹوں کو دور کر کے اپنی آیات کو محکم کر دیتا۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ پیغمبروں کے آیات کی تلاوت کے وقت شیطان ان آیات کے معانی کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈال دیتا جنھیں اللہ تعالیٰ بعد میں وضاحت کر کے دور کر دیتا، جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت (۱۱۵): ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ﴾ میں شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا حلال کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مارے ہوئے کو حرام کہتے ہیں۔ سورۂ انبیاء کی آیت (۹۸): ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ میں شبہ ڈالا کہ پھر تو مسیح علیہ السلام بھی نعوذ باللہ جہنم میں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کی وضاحت فرما کر شیطان کے ڈالے ہوئے شبہے کو دور فرما دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

❷ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ ان سب شیاطین کو خوب جانتا ہے جو انبیاء کی تمناؤں کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں، یا انبیاء کے آیات کی تلاوت کے وقت لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالتے ہیں اور ان شکوک وشبہات کو اور ان کے دفاع کے طریقوں کو بھی خوب جانتا ہے اور وہ کمال حکمت والا بھی ہے جس کے پیش نظر اس نے شیاطین کو مہلت دے رکھی ہے کہ خود بھی گمراہ رہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں۔

❸ بعض مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نجم کی تلاوت کر رہے تھے، جب آپ آیت (۲۰): ﴿وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى﴾ پر پہنچے تو لاشعوری کے عالم میں شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیے، یا آپ کے لہجے اور آواز میں پڑھ دیے: "تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى" "یہ عالی مقام دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔" اس پر کفار قریش بہت خوش ہوئے کہ آج ہمارے بتوں کی بھی تعریف ہوئی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت غم لاحق ہوا، چنانچہ سورۂ حج کی یہ آیت اتری اور آپ کو تسلی دی گئی کہ پہلے انبیاء کی وحی میں بھی شیطان اس قسم کی دخل اندازیاں کرتا رہا ہے، مگر شیطان کے یہ حربے کامیاب نہیں ہوتے وغیرہ۔ یہ قصہ ان آیات کے صریح متصادم ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کے چاروں طرف زبردست پہرا اس وقت تک رکھتا ہے جب تک وہ اللہ کے پیغامات لوگوں تک نہ پہنچا دیں (اتنے کڑے پہرے میں ممکن ہی نہیں کہ شیطان کسی طرح بھی اثر انداز

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝ وَّ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

تاکہ وہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، ان لوگوں کے لیے آزمائش بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور بے شک ظالم لوگ یقیناً دور کی مخالفت میں ہیں ﴿۵۳﴾ اور تاکہ وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا ہے، جان لیں کہ وہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے تو وہ اس پر ایمان لے آئیں، پس ان کے دل اس کے لیے عاجز ہو جائیں اور بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دینے والا ہے ﴿۵۴﴾

ہو سکے )۔ دیکھیے سورۂ جن کی آخری آیات " عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ " سے آخر سورت تک۔ محقق علماء نے اس قصے کی پر زور تردید کی ہے۔ بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں، یہ قصہ من گھڑت ہے۔ ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ قصہ زنادقہ (ملحد و بے دین لوگوں) نے گھڑا ہے۔ قاضی عیاض نے "الشفاء" میں اس کی تردید کی ہے۔ رازی نے فرمایا کہ یہ قصہ باطل ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تین مرسل روایات کی بنا پر اس واقعے کا کچھ اصل ثابت کرنے اور اس کی توجیہ کی کوشش کی ہے مگر محدث البانی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "نَصْبُ الْمَجَانِيْقِ لِنَسْفِ قِصَّةِ الْغَرَانِيْقِ" میں مضبوط علمی بحث کے ساتھ اس قصے کا بالکل بے اصل ہونا ثابت فرمایا ہے اور قدیم و جدید محدثین و فقہاء کا حوالہ دیا ہے، جنھوں نے اس واقعہ کی دلائل کے ساتھ تردید فرمائی۔

**آیت 54،53** ❶ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً ...... : " شِقَاقٍ " باب مفاعلہ کا مصدر ہے، جیسے "قِتَالٌ" ہے، مراد آمنے سامنے مقابلہ ہے، جس میں ایک فریق ایک شق میں ہوتا ہے اور دوسرا فریق دوسری شق میں۔ اس آیت میں شیطان کو انبیاء کی دعوت اور آیاتِ الٰہی میں شکوک و شبہات ڈالنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی فرصت دینے کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ شیاطین کو جو اس طرح کھل کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ابتلا و آزمائش کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے، تاکہ اس کے نتیجے میں اہل باطل اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اہل باطل کے علمبرداروں کے ساتھ ہو جائیں اور اہل حق باطل والوں کے تمام شور و غوغا کے باوجود راہ حق پر مزید پختہ ہو جائیں، کیونکہ حق کے مقابلے میں جتنا زیادہ جھگڑا کیا جائے اتنا ہی اس کے دلائل مزید نکھرتے اور واضح ہوتے ہیں اور جن لوگوں کو علم کی روشنی ملی ہوتی ہے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ آپ کو رب کی طرف سے ملنے والا علم کتاب بالکل حق ہے، پھر ان کا یہ یقین ان کے ایمان کو پختہ کرنے اور اس میں اضافے کا باعث بنتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کے دل اپنے رب کے لیے عاجزی اختیار کرتے ہیں اور پورے اطمینان کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔

❷ " لِلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ " سے مراد منافقین ہیں اور " وَ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ " سے مراد پکے کافر ہیں کہ جن کے دل کفر و عناد کی وجہ سے سخت ہو چکے ہیں۔

وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہمیشہ اس کے بارے میں کسی شک میں رہیں گے، یہاں تک کہ ان کے پاس اچانک قیامت آجائے، یا ان کے پاس اس دن کا عذاب آجائے جو بانجھ (ہر خیر سے خالی) ہے ﴿۵۵﴾

③ ”لِيَجْعَلَ“ کی ضمیر، ”فَيَنْسَخُ اللّٰهُ“ اور ”ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ“ میں مذکور لفظ ”اللّٰہ“ کی طرف جا رہی ہے۔ شیطان کی دخل اندازی اور شکوک و شبہات کو کفار و منافقین کے لیے فتنے کا باعث بنانے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا ہے کہ وہ شیطان کے اس عمل کو کفار و منافقین کے لیے فتنہ بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ کوئی مومن ہو یا کافر یا منافق ہر ایک کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ان کے ہر فعل کا خالق بھی وہی ہے، اس لیے فتنہ بنانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی ہے۔ البتہ کفار و منافقین کو فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث ان کے دلوں کے مرض نفاق کو اور ان کے دلوں کی سختی اور عناد کو قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۲٦ ] ”اور وہ اس کے ساتھ فاسقوں کے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔“

④ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : یعنی شیطان اور اس کے چیلے جتنے شکوک و شبہات پیدا کر لیں اور جتنے اعتراض کر لیں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی سیدھے راستے کی طرف ضرور ہی رہنمائی کر دیتا ہے، جس سے انھیں فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں بات فی الواقع وحی الٰہی ہے، وہ اس پر قائم ہو جاتے ہیں اور فلاں بات شیطان کا وسوسہ یا دھوکا ہے، سو وہ اس سے بچ جاتے ہیں۔ اس طرح انھیں دنیا و آخرت دونوں کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

**آیت 55** ﴿ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ...... : یعنی کفار اس قرآن کے متعلق ہمیشہ کسی نہ کسی شک میں مبتلا رہیں گے، خواہ وہ شیطان کا پیدا کردہ ہو یا خود ان کے نفس کا اور اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ان کے پاس قیامت کی گھڑی نہ آجائے، یا یومِ عقیم (بانجھ دن) کا عذاب نہ آجائے۔ بانجھ دن سے مراد قیامت کا دن ہے، اسے عقیم اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد کوئی دن نہیں ہوگا، جس طرح عقیم اسے کہا جاتا ہے جس کی اولاد نہ ہو، یا اس لیے کہ کفار کے لیے اس دن میں کوئی خیر نہیں ہوگی، جس طرح آندھی کو جو عذاب کے طور پر آئی ”الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ“ (ہر خیر سے خالی ہوا) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴾ [ الذاریات : ٤١ ] ”اور عاد میں (بھی نشانی ہے) جب ہم نے ان پر بانجھ (خیر و برکت سے خالی) ہوا بھیجی۔“ اس یومِ عقیم سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس سے مراد یومِ بدر لیا ہے کہ اس میں کفار کے لیے کوئی خیر و برکت نہیں تھی۔ مگر یہ اس لیے درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کافر اس یومِ عقیم کا عذاب آنے تک شک میں رہیں گے، گویا اس دن کے آنے کے بعد کافروں کو کوئی شک نہیں رہے گا اور ظاہر ہے کہ بدر کے بعد بھی کافر موجود ہیں اور ان کے شکوک و شبہات بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے

اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾

تمام بادشاہی اس دن اللہ کی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، پھر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے ﴿۵۶﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھلایا تو وہی ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ﴿۵۷﴾ اور جن لوگوں نے اللہ کے راستے میں وطن چھوڑا، پھر قتل کر دیے گئے، یا مر گئے یقیناً اللہ انھیں ضرور رزق دے گا اچھا رزق اور بے شک اللہ ہی یقیناً سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے ﴿۵۸﴾

خود اس دن کی تعیین فرما دی ہے، فرمایا: ﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ﴾ [ الحج : ٥٦ ] ''تمام بادشاہی اس دن اللہ کی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔'' معلوم ہوا کہ اس یوم عقیم سے مراد قیامت کا دن ہے اور مزید فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ؕ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴾ [ الانفطار : ١٧ تا ١٩ ] ''اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن سب حکم اللہ کا ہوگا۔'' اس پر یہ سوال ہے کہ اس سے تکرار لازم آتا ہے، کیونکہ ''السَّاعَةُ'' سے مراد بھی قیامت ہے۔ جواب یہ ہے کہ ''السَّاعَةُ'' میں قیامت کا ذکر ہے اور ''عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ'' میں قیامت کے دن کے عذاب کا ذکر ہے۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ کفار اس وقت سے پہلے ایمان نہیں لائیں گے جب ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

**آیت 56** ① اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ : ''اَلْمُلْكُ'' کے الف لام کی وجہ سے ''تمام بادشاہی'' ترجمہ کیا ہے، یعنی دنیا میں تو عارضی طور پر لوگوں کو بھی بادشاہت مل جاتی ہے مگر اس دن کسی اور کی بادشاہی نہیں ہوگی، فرمایا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [ المؤمن : ١٦ ] ''آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، بہت دبدبے والا ہے۔''

② يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ...... : دنیا میں ہر شخص، کافر ہو یا منافق یا مسلم، یہی سمجھ رہا ہے کہ وہ حق پر ہے، دوسرے سب غلط ہیں، اس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کرے گا۔ دیکھیے سورۂ زمر (۴۶) اس فیصلے کے نتیجے میں ایمان اور عمل صالح والے نعمت والے باغوں میں ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح اللہ کی آیات اور اس کے رسول کی تکریم تھی، بدلے میں ''جَنّٰتِ النَّعِيْمِ'' میں رہنے کی تکریم ملی۔

**آیت 57** وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ...... : ''فَاُولٰٓىِٕكَ'' کی ''فاء'' کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب کا سبب ان لوگوں کا کفر اور اللہ کی آیات کو جھلانا تھا۔ انھوں نے اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کی اہانت کی، بدلہ عذاب مہین کی صورت میں ملا، جیسا عمل ویسا نتیجہ۔

**آیت 58** ① وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : اس سے پہلے ''فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' کے ساتھ

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

یقیناً وہ انھیں ایسے مقام میں ضرور داخل کرے گا جس پر وہ خوش ہوں گے اور بے شک اللہ ضرور سب کچھ جاننے والا، بے حد بردبار ہے ﴿۵۹﴾

عام مومنوں کا ذکر فرمایا تھا، اب ان میں سے خاص لوگوں کا ذکر فرمایا جنھوں نے اللہ کی خاطر اپنے وطن، گھر بار اور خویش و اقارب کو چھوڑا۔ مقصد ہجرت کی شان اور اس کی فضیلت بیان کرنا ہے کہ یہ اتنا عظیم عمل ہے کہ ہجرت کرنے والے جہاد فی سبیل اللہ میں قتل ہوں یا لڑائی کے بغیر فوت ہو جائیں، دار الکفر سے ہجرت کے بعد آخرت کے درجات میں برابر ہیں۔ (ابن عاشور) پہلی آیات سے اس کی ایک اور مناسبت یہ ہے کہ چونکہ مشرکین ان شیطانی شبہات اور رکاوٹوں کے ساتھ، جن کا اوپر ذکر ہوا، بہت سے لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے تھے اور وہ روک صرف انھی کو سکتے تھے جو ان کے قابو میں ہوں، اس لیے اللہ سبحانہ نے ہجرت کی ترغیب دلائی اور اس کی فضیلت بیان فرمائی۔ (بقاعی)

② لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا : لام تاکید اور نون ثقیلہ کے ساتھ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انھیں برزخ میں اور جنت میں رزقِ حسن ہر صورت دے گا۔ شہداء کے متعلق دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۶۹) اور ہجرت کے بعد فوت ہونے کے متعلق دیکھیے سورۂ نساء (۱۰۰)۔

③ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ : اللہ تعالیٰ خیر الرازقین ہے، اس لیے کہ ① وہ کسی استحقاق کے بغیر رزق دیتا ہے۔ ② مانگے بغیر دیتا ہے۔ ③ بے حساب دیتا ہے۔ ④ کسی سے فائدے کی امید یا کسی سے خوف کے بغیر دیتا ہے۔ ⑤ اور صرف وہی ہے جو اپنے پاس سے دیتا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا اگر دیتا ہے تو اسی کا دیا دیتا ہے، سو حقیقت میں دینے والا وہی ہے۔ سب دینے والوں سے بہتر ان لوگوں کے لحاظ سے فرمایا جو دنیا میں ایک دوسرے کو کچھ دے دیتے ہیں، مگر ان میں "خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ" کی صفات میں سے ایک صفت بھی نہیں جو اوپر گزری ہیں۔

**آیت 59** ① لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ : مراد جنت ہے جسے دیکھ کر وہ خوش ہوں گے اور اس میں اپنی ہر خواہش موجود پائیں گے۔ پسندیدہ رہائش بھی رزقِ حسن میں شامل ہے، اس کا الگ ذکر اس لیے فرمایا کہ خوبصورت اور بہترین گھر کا اہتمام لوگ کھانے پینے سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔

② وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ : صفت "عَلِيْمٌ" کی مناسبت اس مقام کے ساتھ دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہجرت کرنے والوں کے اعمال اور ان کی نیتوں کو خوب جاننے والا ہے، وہ ہر ایک کو ان کے مطابق جزا دے گا اور اسی طرح ہجرت پر مجبور کرنے والے کفار کے اعمال اور نیتوں سے بھی خوب واقف ہے، انھیں بھی ان کے مطابق سزا دے گا۔ اسی طرح "حَلِيْمٌ" کی مناسبت بھی دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ ان مہاجرین سے جو کوتاہیاں ہوئیں اللہ تعالیٰ اپنے بے انتہا حلم کی وجہ سے ان سے چشم پوشی فرما کر انھیں رزقِ حسن اور پسندیدہ منزل عطا فرمائے گا۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ جن کفار نے انھیں

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

یہ اور جو شخص اس کی مثل بدلہ لے جو اسے تکلیف دی گئی، پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور ہی اس کی مدد کرے گا، یقیناً اللہ ضرور نہایت درگزر کرنے والا، بے حد بخشنے والا ہے ﴿۶۰﴾

نکالا، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے کمال حلم کی وجہ سے اتنے بڑے جرم کے باوجود مہلت دی اور فوراً گرفت نہیں فرمائی، جس کے نتیجے میں تقریباً وہ تمام لوگ جنھوں نے مہاجرین کو مکہ سے نکالا تھا مسلمان ہو گئے۔

**آیت 60** ﴿ ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ...... : "ذٰلِكَ" کا لفظ دو کلاموں کے درمیان فاصلے کے لیے ہوتا ہے، یعنی یہ تو ہوا، اب اگلی بات سنو کہ جو شخص اتنا ہی بدلہ لے جتنی اسے ایذا دی گئی ہے، پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ اس کی ضرور ہی مدد کرے گا۔ اس میں جہاد کی ترغیب ہے اور "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" اور "وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ" کا مضمون دہرایا گیا ہے۔ عطف اس کا "وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ......" پر ہے، جس میں ان مظلوموں کا ذکر تھا جو بدلہ نہیں لے سکے، اب ان مظلوموں کا ذکر ہے جو ظالموں کے مقابلے میں قوت استعمال کریں۔ انھیں تاکید ہے کہ وہ اتنا ہی بدلہ لیں جتنی ان پر زیادتی ہوئی ہے، اگر اتنا بدلہ لینے کے بعد پھر ان پر زیادتی کی جائے تو اللہ تعالیٰ ان کی ضرور ہی مدد کرے گا۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو بے شمار ایذائیں دیں، انھیں دین سے مرتد کرنے کے لیے مسلسل عذاب سے دو چار رکھا، جو قتل سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔ انھیں ان کے گھروں سے نکالا، اس کے بعد بھی لڑائی کے لیے چڑھ کر آتے رہے۔ ان کی ایذا کے برابر بدلے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۰ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۰، ۱۹۱ ] "اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور انھیں وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو انھیں قتل کرو، ایسے ہی کافروں کی جزا ہے۔" اسی طرح حکم دیا: ﴿ وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۱۲، ۱۳ ] "اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمھارے دین میں طعن کریں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾

یہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۶۱﴾

کرو۔ بے شک یہ لوگ، ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، تا کہ وہ باز آ جائیں۔ کیا تم ان لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا اور انھوں نے ہی پہلی بار تم سے ابتدا کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔“

❷ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ : یہاں ان صفات کے تذکرے کا مطلب یہ نہیں کہ کفار کو معاف کر دو، کیونکہ ان کے متعلق تو حکم ہے: ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [ التوبة : ١٤ ] ”ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا۔“ عفو و درگزر مسلمانوں کے باہمی معاملات میں ہے، کفار کے ساتھ نہیں، فرمایا: ﴿وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [ الفتح : ٢٩ ] ”اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں، کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔“ یہاں ان صفات کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اتنا ہی بدلہ لینے کا جو حکم دیا ہے کہ جتنی ایذا دی جائے، یہ اس کے عفو و مغفرت کی وجہ سے ہے کہ اس نے کفار پر بھی حد سے بڑھ کر زیادتی کی اجازت نہیں دی، جس سے وہ مظلوم ٹھہریں، کیونکہ مظلوم کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ )) [ بخاري، المظالم، باب الاتقاء و الحذر من دعوة المظلوم : ٢٤٤٨، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] ”مظلوم کی بددعا سے بچ، کیونکہ اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔“ دوسری مناسبت یہ ہے کہ بدلہ لینے میں سو فیصد برابری تو انسان کے بس ہی میں نہیں، اس لیے فرمایا کہ کچھ کمی بیشی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

**آیت 61** : ❶ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ جو مظلوم اور بے نوا کی مدد کرتا ہے، وہ اس لیے ہے کہ یہ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے، رات کو دن میں داخل کر کے دن کو رات پر غالب کر دیتا ہے اور دن بڑا ہو جاتا ہے اور دن کو رات میں داخل کر کے رات کو دن پر غالب کر دیتا ہے اور رات بڑی ہو جاتی ہے۔ تو اس کے لیے مظلوموں کو ظالموں پر غالب کرنا کیا مشکل ہے؟

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾

یہ اس لیے کہ اللہ ہی ہے جو حق ہے اور (اس لیے) کہ اس کے سوا وہ جسے بھی پکارتے ہیں وہی باطل ہے اور (اس لیے) کہ اللہ ہی بے حد بلند ہے، بہت بڑا ہے ﴿۶۲﴾ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ نہایت باریک بین، ہر چیز سے باخبر ہے ﴿۶۳﴾

② وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ کے مظلوم کی مدد کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے حال سے پوری طرح باخبر ہے، سب کچھ سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے، سنتے اور دیکھتے ہوئے وہ ظلم کو کس طرح برداشت کرے گا؟

**آیت 62** ① ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ...... : یہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے وعدے کو پورا کرنے کی تیسری وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سچا اور حق رب ہے۔ جس چیز کا وہ ارادہ کرے اسے کر گزرتا ہے، سو وہ اپنے دوستوں کی ضرور مدد کرے گا اور اس کے سوا جس کو بھی لوگ پکارتے ہیں وہ ناحق اور باطل ہے، وہ خود اپنی مدد نہیں کر سکتا تو ان کی مدد کیا کرے گا؟ اور اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے مقابلے میں اپنے دشمنوں کی مدد کیوں کرے گا؟

② وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ : چوتھی وجہ اس بات کی کہ ”اللہ تعالیٰ مظلوم مسلمانوں کی مدد ضرور کرے گا“ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے اونچا ہے، باقی سب نیچے ہیں اور وہی بے حد بڑا ہے، باقی سب چھوٹے ہیں اور کوئی اس کا مدمقابل نہیں۔

**آیت 63** ① اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً...... : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کی نعمت کا ذکر فرما کر اپنے حق ہونے اور دوسرے تمام معبودوں کے باطل ہونے کا اور اپنی صفات ”سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ“ اور ”الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ“ کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد اپنے ہر چیز پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر اپنی چھ نعمتیں شمار فرمائیں، جن میں سے پہلی نعمت اس آیت میں بیان فرمائی ہے۔

② ”اَلَمْ تَرَ“ کا لفظی معنی ہے ”کیا تو نے نہیں دیکھا۔“ یہاں یہ معنی بھی مراد ہو سکتا ہے، کیونکہ بارش برسنا اور زمین کا سرسبز ہونا ہر دیکھنے والے کو نظر آتا ہے۔ مگر عام طور پر قرآن مجید میں ”اَلَمْ تَرَ“ کا لفظ ”اَلَمْ تَعْلَمْ“ کے معنی میں آیا ہے، یعنی ”کیا تمھیں معلوم نہیں۔“ دیکھیے سورۂ فیل کی آیت (۱): ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ﴾ کی تفسیر۔ یہاں بھی یہی دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ دیکھنے سے مقصود علم ہی ہے اور جس دیکھنے سے علم حاصل نہ ہو وہ کالعدم ہے۔

③ ”مَآءً“ کی تنوین تقلیل کی وجہ سے ”کچھ پانی“ ترجمہ کیا گیا ہے۔ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو ”زمین سرسبز ہوگئی“ کے بجائے فرمایا ”زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔“ یعنی ماضی کے بجائے مضارع کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ بارش کا نزول

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝﴿۶۴﴾ ع ۹ / ۱۵

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ ہی یقیناً بڑا بے پروا، تمام تعریفوں والا ہے ﴿۶۴﴾

ایک دفعہ ہوتا ہے تو زمین ایک لمبا عرصہ سرسبز رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت دیکھیے کہ زمین مُردہ اور پتھر کی طرح سخت تھی، اس کے نیچے خشک بیج مدت سے دفن تھے، رحمت کی بارش برسی تو زمین پھولی اور ابھری، خشک بیج میں زندگی پیدا ہوئی اور نرم و نازک کونپل زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین کا سارا تختہ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور پہنچانے والا سبز رنگ اختیار کر گیا، جو عقل والوں کے لیے دلیل ہے کہ جس اللہ تعالیٰ نے بارش کے ذریعے سے بنجر زمین میں دفن خشک بیج سے پودا پیدا فرمایا وہی قیامت کو اس زمین سے مُردہ انسانوں کو ان کی " عَجْبُ الذَّنَبِ " (دم کی ہڈی) سے دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور کرے گا۔ [ بخاري، التفسير، باب ﴿يوم ينفخ في الصور فتأتون افواجا﴾ : ٤٩٣٥ ] بعض مفسرین نے اس میں اس اشارے کا ذکر بھی فرمایا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو بارش کے ذریعے سے زندگی بخشتا ہے، اسی طرح وہ مردہ دلوں کو وحی الٰہی کے ذریعے سے ایمان کی زندگی عطا فرماتا ہے۔

❸ زمین سے پیدا ہونے والے پودوں کے پتے، پھول، پھل اور دانے، غرض ہر چیز انسان کے لیے خوراک، لباس اور دوسری ضروریات کے کام آتی ہے اور سبھی اللہ کی نعمتیں ہیں مگر یہاں زمین کے سرسبز ہونے کو خاص طور پر ذکر فرمایا کہ اس سبزے سے آنکھوں کو جو تازگی اور دل کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ دوسری نعمتوں کا ذکر چھوڑ دیا کہ انسان خود سوچ لے۔

❹ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ : لفظ "لَطِيْفٌ" میں دو مفہوم شامل ہیں، ایک "باریک چیزوں کو دیکھنے والا" اور دوسرا "نہایت مہربانی والا۔" "اِنَّ" عموماً پہلے جملے کی وجہ بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتار کر زمین کو سرسبز اس لیے کیا کہ وہ نہایت مہربان بھی ہے، باریک بین بھی اور ہر چیز کی پوری خبر رکھنے والا بھی۔ اسے خوب معلوم ہے کہ زمین کے سینے میں کس جگہ کون سا انسان یا حیوان یا کسی پودے کا باریک سے باریک بیج دفن ہے اور اسی کے لطف و کرم سے یہ سب کچھ دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس سے اپنے بندوں کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی مادی یا اخلاقی ضرورت پوشیدہ نہیں ہے، وہ اپنی کمال مہربانی اور باریک طریقوں سے ایسے انتظام فرماتا ہے کہ ہر بندے کی بلکہ ہر مخلوق کی ضرورت، جو اس کے حسب حال ہے، پوری ہو۔

**آیت 64** ❶ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ : یہ دوسری دلیل ہے، یعنی وہ صرف آسمان سے بارش برسانے اور زمین سے سبزہ اگانے ہی کا مالک نہیں بلکہ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا وہ اکیلا مالک ہے، بارش برسانا اور سبزہ اگانا تو اس کے اختیار کا معمولی سا حصہ ہے۔ "لَهٗ" کو پہلے لانے سے قصر کا مفہوم پیدا ہوا۔ تو جب ہر چیز کا مالک وہی ہے تو عبادت کسی اور کی کیوں ہو؟

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ یُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۵﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمھاری خاطر مسخر کر دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے اور ان کشتیوں کو بھی جو سمندر میں اس کے حکم سے چلتی ہیں اور وہ آسمان کو تھام کر رکھتا ہے اس سے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کے اذن سے۔ بے شک اللہ یقیناً لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۶۵﴾

② اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ : یہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان جن چیزوں کا مالک ہوتا ہے ان کا محتاج بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ضرورت ہوتی ہیں، اس لیے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہونے کے ذکر کے ساتھ وضاحت فرمائی کہ وہ آسمان و زمین اور ان میں موجود کسی چیز کا محتاج نہیں، بلکہ سب سے بے پروا اور غنی ہے، حتیٰ کہ حمد کرنے والوں کی حمد سے بھی غنی ہے۔ اس وصف کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ حمید یعنی تمام تعریفوں والا ہے، ہر حمد اور تعریف خواہ کسی کی ہو، دراصل وہ اس اکیلے ہی کی ہے، کیونکہ مخلوق میں تعریف کے لائق جو خوبی بھی ہے اسی کی عطا کردہ ہے۔ جب سب اسی کے محتاج ہیں تو پھر مخلوق کی عبادت کیوں ہو جو خود اپنے وجود میں بھی اس کی محتاج ہے۔

③ "اِنَّ" کے اسم "اللّٰهَ" اور اس کی خبر "الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" کے درمیان ضمیر فصل "هُوَ" لانے سے اور "اِنَّ" کی خبر "الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" پر الف لام لانے سے کلام میں دو وجہوں سے حصر پیدا ہو گیا، جس سے ترجمہ یہ ہوگا کہ بلاشبہ اللہ ہی یقیناً بڑا بے پروا، تمام تعریفوں والا ہے۔

**آیت 65** ① اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ : یہ تیسری دلیل ہے۔ زمین کی ہر چیز کو انسان کے لیے مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس طرح بنایا ہے کہ آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ سورج اور چاند اس رفتار سے چل رہے ہیں جو انسان کے لیے مفید ہے۔ ہوا، پانی، آگ، بجلی، ایٹم، غرض کتنی ہی منہ زور قوتیں ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پالتو جانور ہیں تو ان پر سواری کرتا ہے، ان کا دودھ پیتا، گوشت کھاتا اور کئی ضروریات پوری کرتا ہے، غرض وہ ہر طرح سے انسان کے تابع کر دیے گئے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اونٹ، گائے، بھینس اور گھوڑے کو انسان کے تابع نہ کرتا تو انسان کبھی انھیں پالتو نہ بنا سکتا، فرمایا: ﴿وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا یَاْكُلُوْنَ﴾ [ یٰسٓ : ۷۲ ] "اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ ان کی سواری ہیں اور ان میں سے بعض کو وہ کھاتے ہیں۔" رہے جنگلی جانور، تو ان کا شکار کر کے انھیں زندہ یا مُردہ اپنے قابو میں لے آتا ہے۔

② وَ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ : یہ چوتھی دلیل ہے، اگرچہ سمندر میں چلنے والے جہاز بھی زمین کی ان چیزوں میں شامل ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے، مگر ان کا معاملہ دوسری چیزوں سے زیادہ عجیب ہے کہ پانی، جو ہر وزن والی چیز کو اپنے اندر غرق کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس طرح انسان کے فائدے کے لیے مسخر کر دیا ہے کہ وہ اللہ کی

وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَحْيَاكُمْ١ٞ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ١ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ۝۶۶

اور وہی ہے جس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر تمھیں مارے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا۔ بے شک انسان یقیناً بہت ناشکرا ہے۔ (۶۶)

مقرر کردہ ایک خاص وضع پر بنائے ہوئے ہزاروں ٹن کے پہاڑوں جیسے وزنی اور لمبے چوڑے اور اونچے بحری جہازوں کو اپنے سینے پر اٹھائے رکھتا ہے، غرق نہیں کرتا۔ یہ جہاز انسان کی ضرورت کی ہزاروں اشیاء اٹھا کر سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر کرتے ہیں اور ان میں بیٹھے ہوئے لوگ اس طرح آرام سے بیٹھے ہوتے ہیں گویا وہ اپنے گھر میں آرام کر رہے ہیں۔ "بِاَمْرِهٖ" یعنی یہ سب کچھ اس کے تکوینی حکم سے ممکن ہوا کہ اس نے سمندر کو اس طرح بنایا ہے کہ جہاز اس پر چل سکیں۔ اگر اس کا حکم نہ ہوتا تو سمندر انھیں ایک لمحے میں ڈبو کر اپنی آغوش میں لے لیتا، یا انھیں اپنے سینے پر چلنے نہ دیتا اور وہ ایک جگہ کھڑے کھڑے ہی تباہ ہو جاتے۔

❸ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ : یہ پانچویں دلیل ہے۔ آسمان کو زمین پر گرنے سے روک کر رکھنا سمندر میں جہازوں کے چلنے سے بھی عجیب ہے کہ جہازوں کے نیچے کم از کم پانی تو ہے جسے اللہ نے انھیں غرق کرنے سے منع کر دیا ہے، بلکہ اسے جہازوں کا ٹھکانا اور سہارا بنا دیا ہے مگر آسمان کو اتنی بلندی پر نیچے کسی بھی چیز کے سہارے کے بغیر تھام کر رکھنا اس بے انتہا قوتوں والے مالک ہی کا کام ہے۔ ایسے مالک کے ہوتے ہوئے بے بس مخلوق کی بندگی کرنے سے بڑی بے انصافی کیا ہو سکتی ہے؟

❹ اِلَّا بِاِذْنِهٖ : یہ اس لیے فرمایا کہ جب اس کا اذن ہوگا تو آسمان پھٹ جائے گا اور اسے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکے گی۔

❺ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ : "رَءُوْفٌ" اور "رَحِيْمٌ" دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ صفت "رَأْفَةٌ" میں نقصان سے بچانے کا اور صفت "رَحْمَةٌ" میں نفع پہنچانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی آ جاتے ہیں۔ اکٹھے آنے میں نقصان سے بچانے اور نفع پہنچانے کے دونوں مفہوم جمع ہو گئے۔ (ابن عاشور) "رَءُوْفٌ" اور "رَحِيْمٌ" بجائے خود مبالغے کے صیغے ہیں، ان پر مزید تنوین تعظیم آنے کے بعد اس کی رافت و رحمت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟

❻ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر جو یہ احسانات فرمائے ہیں اور تمھاری زندگی کے لیے جو یہ اسباب فراہم کیے ہیں یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ تمھارا حاجت مند ہے، بلکہ یہ سراسر اس کی شفقت و مہربانی کا کرشمہ ہے، تمھارا اس پر کوئی زور نہ تھا کہ وہ چاہتا یا نہ چاہتا تم اس سے یہ اسباب حاصل کر لیتے۔

آیت 66 ❶ وَهُوَ الَّذِيْۤ اَحْيَاكُمْ...... : یہ چھٹی نعمت ہے اور پہلے ذکر کی گئی تمام نعمتوں کی اصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں پیدا فرمایا، اگر پیدا ہی نہ کرتا تو دوسری تمام نعمتیں تمھارے کس کام کی تھیں؟ اس بات کو ہر ملحد شخص بھی مانتا ہے کہ ہم پہلے نہیں تھے، بعد میں پیدا ہوئے۔ "ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ" پھر وہ تمھیں موت دے گا، یہ حقیقت بھی ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ "ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ" جو شخص پہلی دونوں باتیں مانتا ہے اسے یہ بھی ماننا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد زندہ بھی کرے گا۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾

ہر امت کے لیے ہی ہم نے عبادت کا ایک طریقہ مقرر کیا ہے جس کے مطابق وہ عبادت کرنے والے ہیں، سو وہ تجھ سے اس معاملے میں ہرگز جھگڑا نہ کریں اور تو اپنے رب کی طرف دعوت دے، بے شک تو یقیناً سیدھے راستے پر ہے ﴿۶۷﴾

② بظاہر ان تینوں میں سے نعمت صرف پہلی دفعہ پیدا کرنا ہے، کیونکہ پھر مارنا اور زندہ کرنا تو محاسبے کے لیے ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی نعمتیں ہیں، کیونکہ ان دونوں کے بغیر جنت اور دیدارِ الٰہی کبھی حاصل نہیں ہو سکتے اور جو چیز جنت کی ہمیشہ کی زندگی اور مالک کے دیدار کا ذریعہ ہو اس کے نعمت ہونے میں کیا شک ہے؟

③ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ : "لَكَفُوْرٌ" "كَافِرٌ" میں مبالغہ ہے اور کفر سے مراد کفرِ نعمت یعنی نعمتوں کی ناشکری یا ان کا انکار ہے، یعنی ابن آدم ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتا جو اوپر کی آیات میں مذکور ہیں، نہ ان کا شکر ادا کرتا ہے، یعنی اس دعوت کو نہیں مانتا جو اس کی طرف سے اس کے رسول پیش کرتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [ إبراهیم : ٣٤ ] "اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے، بلاشبہ انسان یقیناً بڑا ظالم، بہت ناشکرا ہے۔"

آیت 67 ① لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ : "مَنْسَكًا" "نَسَكَ يَنْسُكُ" (ن، ک) سے مصدر میمی ہے، عبادت، قربانی، عبادت کا طریقہ یا قربانی کا طریقہ، یا یہ ظرف ہے، یعنی عبادت یا قربانی کی جگہ۔ "نُسُكٌ" اور "نُسْكٌ" عبادت، ذبیحہ۔ رسول اللہ ﷺ نے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھائی، پھر لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا: « إِنَّ أَوَّلَ نُسُكِنَا فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا أَنْ نَبْدَأَ بِالصَّلَاةِ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ » [ بخاري، العيدين، باب استقبال الإمام الناس في خطبة العيد : ٩٧٦، عن البراء رضي الله عنه ] "ہمارے آج کے دن میں ہماری پہلی عبادت یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں، پھر واپس جائیں اور قربانی کریں۔" یہاں نماز کو "نُسُكٌ" کہا گیا ہے۔ "لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا" کا جملہ اس سے پہلے آیت (۳۴) میں بھی گزرا ہے، وہاں اس کا معنی قربانی کا طریقہ کیا گیا ہے، کیونکہ وہاں آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ پالتو مویشیوں پر اللہ کا نام لینے یعنی ذبح کرنے کا ذکر ہے۔

② آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب حج کے بعض مناسک میں تبدیلی کی، اسی طرح جیسے پہلی امتوں کے لیے مقرر کردہ بعض احکام منسوخ بھی کیے اور بعض میں تبدیلی فرمائی تو کفار مکہ نے، جو دین ابراہیم کے پیروکار ہونے کے دعوے دار تھے اور یہود و نصاریٰ سب نے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اصل دین ایک ہے جو توحید ہے، مگر ہم نے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے اس زمانے کے احوال و ضروریات کے مطابق عبادت کا ایک طریقہ مقرر فرمایا، جس کے مطابق وہ عبادت کرتے تھے۔ جس میں بعض چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی امت کے لیے تورات اور عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے لیے تورات کے ساتھ انجیل تھی۔ اب قیامت تک

وَ اِنۡ جٰدَلُوۡكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝۶۸ اَللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝۶۹ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِىۡ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۝۷۰

اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں تو کہہ دے اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو تم کرتے ہو ۶۸ اللہ قیامت کے دن تمھارے درمیان اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ۶۹ کیا تو نے نہیں جانا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ بے شک یہ ایک کتاب میں درج ہے، یہ اللہ پر بہت آسان ہے ۷۰

دنیا کے تمام لوگ محمد ﷺ کی امت ہیں اور ان کا ضابطۂ حیات قرآن مجید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا ﴾ [ المائدۃ : ۴۸ ] ”تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک راستہ اور ایک طریقہ مقرر کیا ہے۔“

❸ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الۡاَمۡرِ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ اگر بعد میں آنے والے نبی کے زمانے میں کسی عبادت کے طریقے میں کوئی تبدیلی کر دے تو بندوں کا کام یہ ہے کہ وہ دل و جان سے اسے قبول کریں نہ کہ اس معاملے میں پیغمبر سے جھگڑا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو فرمایا کہ یہ لوگ ہرگز آپ سے اس معاملے میں جھگڑا نہ کریں، یعنی آپ بھی ان سے جھگڑا نہ کریں اور نہ انھیں جھگڑے کا موقع دیں اور آپ اپنے رب کی طرف دعوت دیتے چلے جائیں اور یقین رکھیں کہ آپ بالکل سیدھے راستہ پر ہیں۔ سورۂ جاثیہ میں فرمایا: ﴿ ثُمَّ جَعَلۡنٰكَ عَلٰى شَرِيۡعَةٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡهَا وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [ الجاثیۃ : ۱۸ ] ”پھر ہم نے تجھے (دین کے) معاملے میں ایک واضح راستے پر لگا دیا، سو اسی پر چل اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چل جو نہیں جانتے۔“

**آیت 69،68** وَ اِنۡ جٰدَلُوۡكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ...... : یعنی اگر دین حق کی پوری وضاحت کے بعد بھی کفار جھگڑے سے باز نہ آئیں تو آپ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں اور ان سے کہہ دیں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے، وہ تمھیں اس کا بدلہ ضرور دے گا اور دین کی جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن کرے گا۔

**آیت 70** اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ...... : یعنی کیا تمھیں واضح بات بھی معلوم نہیں کہ آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور کوئی بھی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں؟ نہ اس کے مخلص اور فرماں بردار بندوں کی فرماں برداری اس سے مخفی ہے اور نہ اس کے منکروں اور نافرمانوں کی شرارتیں اور فساد اس سے اوجھل ہے۔ اس لیے اس علم کے ساتھ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ہر شخص جو کچھ کر رہا ہے وہ پورے اہتمام کے ساتھ ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ اس لیے کوئی اس خام خیالی میں نہ رہے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں، اتنی مخلوق کے ہر عمل کا ریکارڈ کیسے رکھا جا سکتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ کیسے ہوگا؟ فرمایا بے شک یہ تمھارے لیے ایک مشکل بلکہ ناممکن کام ہے مگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں، کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ مَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿71﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿72﴾ ع

اور وہ اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہیں جس کی اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اور جس کا انھیں کچھ علم نہیں اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ﴿71﴾ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جائے تو تو ان لوگوں کے چہروں میں جنھوں نے کفر کیا، صاف انکار پہچان لے گا، قریب ہوں گے کہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں جو ان پر ہماری آیات کی تلاوت کریں۔ کہہ دے تو کیا میں تمھیں اس سے بری چیز بتاؤں؟ وہ آگ ہے جس کا اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جنھوں نے کفر کیا اور وہ برا ٹھکانا ہے ﴿72﴾

**آیت 71** ① وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی کتاب میں نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں ہستی کو فلاں فلاں اختیارات دے رکھے ہیں، لہٰذا ان کاموں کے لیے اپنی حاجات ان سے طلب کرو اور نہ اس بات کی کوئی علمی یا عقلی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو بھی کائنات میں اپنی مرضی چلانے کا اختیار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس سے مرادیں مانگی جائیں۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۴، ۵) اور فاطر (۴۰) جب شرک کی نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی، تو معلوم ہوا کہ لوگوں نے جو غیر اللہ کے آستانے بنا رکھے ہیں، یا زندہ یا فوت شدہ بزرگوں کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھ کر ان کی نذریں نیازیں چڑھا رہے ہیں اور ان کی قبروں کا یا ان کے بتوں کا طواف یا ان کے سامنے قیام، رکوع یا سجود کر رہے ہیں، یا ان کے مجاور بن کر ان کا اعتکاف کر رہے ہیں، یا انھیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کر رہے ہیں تو ان کے پاس اوہام پرستی اور باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں، جس کا رد قرآن مجید میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۰) اور مائدہ (۱۰۴)۔

② وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ : عبارت کی ترتیب کے مطابق یہ الفاظ کافی تھے کہ "وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّصِيْرٍ" یعنی ان کا کوئی مددگار نہیں، اس کے بجائے فرمایا "وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ" یعنی ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، یعنی اللہ کی نصرت سے ان کی محرومی کا باعث ان کا ظلم (شرک) ہے کہ اللہ کا حق بندوں کو دے دیا۔ یہ احمق سمجھ رہے ہیں کہ ان کے خود ساختہ معبود، حاجت روا اور مشکل کشا دنیا اور آخرت میں ان کی مدد کریں گے، حالانکہ ان کی مدد کوئی نہیں کرے گا، کیونکہ ان ظالموں نے اللہ کے لیے شریک بنا کر اسے ناراض کر لیا، سو وہ تو ان کی مدد کو آئے گا ہی نہیں اور دوسرے معبودوں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں میں طاقت ہی نہیں کہ ان کی مدد کر سکیں۔

**آیت 72** ① وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا...... : "الْمُنْكَرَ" مصدر میمی ہے، یعنی انکار، یا اسم مفعول ہے یعنی ایسی حالت جو

يَاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ

اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، سو اسے غور سے سنو! بے شک وہ لوگ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، ہرگز ایک مکھی پیدا نہیں کریں گے، خواہ وہ اس کے لیے جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے وہ اسے اس سے

مانوس اور پہچانی ہوئی نہیں بلکہ انوکھی اور بُری ہے۔ " يَسْطُوْنَ " "سَطَا يَسْطُوْ سَطْوَةً" سخت پکڑنا یا حملہ کر دینا، یعنی ان باطل کے پجاری مشرکوں کا اپنے بے حقیقت اور بے بنیاد داتاؤں اور جھوٹے خداؤں کی حمیت کا یہ حال ہے کہ جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں یعنی ان کے سامنے کوئی بھی ہماری آیات پڑھ دیتا ہے، جو ہماری توحید و صفات اور آخرت وغیرہ کے بیان میں بالکل واضح ہیں اور جو اتنی پُر حکمت اور بلیغ ہیں کہ ان کا ہمارا کلام ہونا بالکل واضح ہے، تو ان کافروں کے چہروں ہی سے ان کا صاف انکار پہچانا جاتا ہے۔ ان کی حالت بری ہو جاتی ہے جو نظر آ رہی ہوتی ہے۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، رگیں پھول جاتی ہیں، چہرے بگڑ جاتے ہیں، بھویں تن جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، قریب ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے ہماری آیات پڑھنے والوں پر حملہ ہی کر دیں۔ شوکانی نے فرمایا کہ اہلِ بدعت کا بھی قرآن و سنت کے دلائل سن کر یہی حال ہوتا ہے۔ توحید سے مشرکوں کی نفرت کا بیان سورۂ زمر کی آیت (۴۵) "وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ" میں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

❷ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ...... : یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ پھر کیا میں تمھیں تمھارے انکار، غیظ و غضب کی آگ اور چہروں کے بگڑ جانے کی حالت سے کہیں زیادہ تمھارے لیے بری اور ناگوار چیز بتاؤں؟ وہ جہنم کی آگ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات سے کفر کرنے والوں کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے اور جو بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ سو تم لوگ اہلِ حق اور آیاتِ الٰہی سے چڑنے اور غیظ و غضب کی آگ میں جلنے کے بجائے جہنم کی اس ہولناک آگ سے بچنے کی فکر کرو، ایسا نہ ہو کہ توبہ کی فرصت تمھارے ہاتھ سے نکل جائے۔

**آیت 74،73** ❶ يَاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ مشرکین کی اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی کوئی نقلی دلیل ہے نہ عقلی۔ اس سورت کی ابتدا "يَاَيُّهَا النَّاسُ" سے ہوئی تھی، اختتام کے قریب بھی "يَاَيُّهَا النَّاسُ" کے ساتھ خطاب ہے۔ "يَاَيُّهَا النَّاسُ" سے مراد یہاں مشرکین ہیں، کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کو وہی پکارتے ہیں، سب لوگ ایسا نہیں کرتے۔ یا سب لوگوں ہی کو خطاب ہے، جیسے کسی قبیلے کا ایک آدمی کوئی کام کرے تو کہہ دیا جاتا ہے، قبیلے والو! تم نے یہ کام کیا ہے۔ (روح المعانی) فرمایا، لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، اسے کان لگا کر سنو۔ یہاں مثال بیان کرنے والے کا ذکر نہیں فرمایا، تاکہ پوری طرح توجہ مثال کی طرف رہے جو اصل مقصود ہے، بیان کرنے والے کا ذکر مقصود نہیں۔ (بقائی)

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

چھڑا نہ پائیں گے۔ کمزور ہے مانگنے والا اور وہ بھی جس سے مانگا گیا ﴿۷۳﴾ انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق تھا۔ بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا ہے، سب پر غالب ہے ﴿۷۴﴾

② اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ...... : اللہ کے سوا تم جن کو بھی پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کریں گے، خواہ وہ سب اس کام کے لیے جمع ہو جائیں۔ مثال میں مستقبل میں حرف ”لَنْ“ کی تاکید کے ساتھ ایک مکھی پیدا کرنے کی نفی فرمائی ہے، یعنی نہ وہ اس سے پہلے یہ کام کر سکے، نہ اب کر رہے ہیں اور نہ آئندہ ایسا کریں گے۔ اللہ کی ایک چھوٹی سی مخلوق پیدا کرنا، جو لوگوں کی نگاہ میں بالکل حقیر ہے، جب تمھارے داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کے اختیار میں نہیں تو وہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی بے شمار عظیم الشان مخلوقات کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِيْ فَلْيَخْلُقُوْا ذَرَّةً أَوْ لِيَخْلُقُوْا حَبَّةً أَوْ شَعِيْرَةً » [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿ والله خلقكم وما تعملون ﴾ ...... : ۷۵۵۹۔ مسلم : ۲۱۱۱، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرنے چلا ہے؟ سو وہ ایک ذرہ پیدا کریں، یا ایک دانہ یا ایک جو پیدا کریں۔“

③ بعض لوگ جو فوت شدہ بزرگوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہیں وہ ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ سے مراد صرف بت لیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ انبیاء و اولیاء ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ نہیں۔ اس پر خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ (اللہ کے سوا نہیں) تو پھر وہ خود خدا ٹھہرے۔ اگر تمھارا یہ عقیدہ ہے تو اس کائنات میں تم سے بڑا کافر کوئی نہیں کہ تم نے اللہ کی پیدا کردہ مخلوق کو رب بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء ہوں، اولیاء ہوں یا فرشتے سب اللہ کی مخلوق ہیں اور ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ ہیں، خود اللہ نہیں۔ دلیل اس کی یہی آیت ہے کہ صرف بت ہی نہیں تمام زندہ یا فوت شدہ انبیاء و اولیاء اور تمھارے بنائے ہوئے مشکل کشا، داتا اور دستگیر جمع ہو کر بھی ایک مکھی نہیں بنا سکتے۔ اگر کوئی بنا سکتا ہے یا کسی نے بنائی ہے تو اس کا نام لو۔ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا: ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۬ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [ الرعد : ۱۶ ] ”کہہ دے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہوتے ہیں؟ یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہے، تو پیدائش ان پر گڈمڈ ہو گئی ہے؟ کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔“ ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ کی مزید وضاحت کے لیے سورۂ نحل (۲۰، ۲۱) ملاحظہ فرمائیں۔

④ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ : یہ ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ کی بے بسی کی ایک اور مثال ہے کہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس سے ہرگز چھڑا نہیں پائیں گے۔ اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے مراد بت ہیں جن پر

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۷۵

اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ ۷۵

ان کو پوجنے والے زعفران اور شہد وغیرہ لگاتے ہیں، یا ان کے سامنے کھانے کی اشیاء لا کر رکھتے ہیں، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کرتی تھی۔ اگر مکھی ان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ یہ تفسیر بھی ٹھیک ہے، مگر اللہ کے سوا وہ سب ہستیاں بھی اس میں شامل ہیں جنھیں پکارا جاتا ہے، اگر نہ مانو تو اس ہستی کا نام لو جس نے مکھی سے چھینی ہوئی چیز چھڑائی ہو۔ مفسر آلوسی نے فرمایا: " وَالْآيَةُ وَإِنْ كَانَتْ نَازِلَةً فِي الْأَصْنَامِ...... إِلَّا أَنَّ الْحُكْمَ عَامٌّ لِسَائِرِ الْمَعْبُودَاتِ الْبَاطِلَةِ " "آیت اگرچہ بتوں کے بارے میں اتری ہے..... مگر اس کا حکم تمام باطل معبودوں کے لیے عام ہے۔" (روح المعانی) چھیننے میں وجہ شبہ مکھی کا ڈھیٹ پن ہے۔ اگر یہ ڈھیٹ پن شیر میں ہوتا تو شاید ہی کوئی اس سے بچتا مگر یہ اللہ کی حکمت ہے کہ شیر کی قوت کے ساتھ لوگوں سے دور رہنا رکھ دیا اور مکھی کے ضعف کے ساتھ ڈھیٹ پن رکھ دیا۔ (بقاعی)

❺ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ : اس بات سے کہ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ مکھی سے چھینی ہوئی چیز واپس نہیں لے سکتے۔ مکھی کی قوت کی طرف ذہن جا سکتا تھا، اس لیے وضاحت کر دی کہ مکھی بھی کمزور، جس سے چھین کر لے جا رہی ہے وہ بھی کمزور اور جو اسے پوجتے اور پکارتے ہیں وہ بھی کمزور۔

❻ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ : نتیجہ اس ساری مثال کا یہ ہے کہ مشرک اللہ تعالیٰ سے بالکل جاہل ہے، تبھی وہ اللہ کا حق کہ صرف اسے پکارا جائے، کسی دوسرے کو دیتا ہے، خواہ کوئی بھی ہو۔ پھر اس سے بڑھ کر بے قدری کیا ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق ان ہستیوں کو دے دے جو حقیر ترین چیز مکھی بھی نہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اس سے چھینی ہوئی چیز واپس لے سکتے ہیں۔

❼ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ : یہاں سوال پیدا ہوا کہ پھر اس کی قدر کا حق کیا ہے؟ جواب میں فرمایا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا ہے۔ جو چیز پیدا کرنا چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے، جسے فنا کرنا چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ وہ سب پر غالب ہے اور کوئی اس پر غالب نہیں، جبکہ کسی دوسرے میں نہ یہ قوت ہے اور نہ غلبہ۔

❽ مکھی کی حقارت اگر ضرب المثل ہے تو اس کی جرأت بھی بے مثال ہے۔ بڑے بڑے جابر بادشاہ اس کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں، اسے چہرے سے اڑاتے ہیں، یہ پھر آ بیٹھتی ہے، حتیٰ کہ زچ ہو کر بعض اوقات کہہ اٹھتے ہیں کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے کیوں پیدا کیا ہے؟ اس پر انھیں یہ سننا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جبار لوگوں کو ذلیل کرنے کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

**آیت 75** ❶ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ : یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سب سے بہتر مخلوق مقرب فرشتے اور انبیاء مکھی بھی نہیں بنا سکتے تو ان کی عظمت کیا ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ ان کی عظمت یہ نہیں کہ وہ خالق بن کر اللہ کے شریک بن گئے ہوں، ان کی عظمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں میں سے ان فرشتوں کو اور تمام انسانوں

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۷۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ وَ افۡعَلُوا الۡخَيۡرَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۷۷﴾

وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں ﴿۷۶﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیکی کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۷۷﴾

میں سے ان انسانوں کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب فرمایا ہے، اس سے بڑھ کر مخلوق کی عظمت کیا ہو گی؟

② اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، اسے معلوم ہے کہ کس منصب کے لائق کون ہے؟ لہٰذا اس کے انتخاب میں غلطی نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے بہتر انتخاب کسی کا ہو سکتا ہے۔

**آیت 76** ① يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ : یہ جملہ قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے، سورۂ بقرہ (۲۵۵)، سورۂ طٰہٰ (۱۱۰)، سورۂ انبیاء (۲۸) اور یہاں سورۂ حج میں۔ ہر مقام پر اس جملے سے پہلے یا بعد میں سفارش یا معبودانِ باطلہ کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتوں اور انبیاء و اولیاء کو اگر بذات خود حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر نہیں بلکہ اللہ کے ہاں سفارشی سمجھ کر پکارتے ہو، تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر شخص کے ظاہر اور مخفی حالات وہی جانتا ہے، دنیا کی کھلی اور چھپی ضرورتیں اور مصلحتیں بھی وہی جانتا ہے، فرشتوں اور نبیوں سمیت کسی مخلوق کو بھی پوری طرح معلوم نہیں کہ کس وقت کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ مقرب بندوں کو بھی یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کے اذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول بھی ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵۵) ﴿ مَنۡ ذَا الَّذِيۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ﴾ کی تفسیر۔

② وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی وہ (پیغمبر خود) کوئی اختیار نہیں رکھتے، اختیار ہر چیز میں اللہ کا ہے۔'' (موضح)

**آیت 77** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا...... : یہ ساری سورت قیامت اور توحید کے حق ہونے کے دلائل اور انکارِ قیامت اور شرک کی تردید اور مذمت کے دلائل پر مشتمل ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو خطاب فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئے ہیں کہ ایمان لائے ہو تو اس کا ثبوت بھی پیش کرو۔ سب سے پہلا کام جو ایمان لانے کے بعد سب سے اہم اور ضروری ہے اور کافر و مسلم کی پہچان ہے، وہ نماز ہے، سو نماز ادا کرو۔ ''نماز ادا کرو'' کے بجائے ''رکوع کرو اور سجدہ کرو'' کے الفاظ استعمال فرمائے، کیونکہ یہ دونوں آدمی کی عام حالت مثلاً قیام و قعود وغیرہ سے مختلف ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی عاجزی کا اظہار ہوتا ہے، اسی لیے کئی متکبر لوگوں نے اس لیے اسلام لانے سے انکار کر دیا کہ انھیں اللہ کے سامنے عاجزی کی آخری حد تک جانا پڑتا ہے۔

② وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ : ایک خاص عبادت نماز کی تاکید کے بعد رب تعالیٰ کی تمام زبانی، بدنی اور مالی عبادات کا حکم دیا کہ ''اپنے

وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ

اور اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا اس کے جہاد کا حق ہے۔ اسی نے تمھیں چنا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں

رب کی عبادت کرو" اس میں دوسری عبادات کے ساتھ نماز بھی شامل ہے۔

③ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ : عبادت کے حکم کے بعد ہر خیر یعنی ہر اچھے کام کا حکم دیا۔ خیر میں نماز اور تمام عبادات بھی شامل ہیں اور وہ اچھے اعمال بھی کہ نیت ہو تو عبادت ہوتے ہیں، نیت نہ ہو تو عبادت نہیں ہوتے، مثلاً صلہ رحمی، مہمان نوازی، بیماری پرسی اور دوسرے اخلاق عالیہ۔ مقصد یہ ہے کہ خیر کے خاص اور عام کام کرتے رہو، تاکہ وہ تمھاری عادت بن جائیں اور ان کی ادائیگی میں تمھیں کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔ ابوحیان نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے پہلے خاص چیزوں کا ذکر فرمایا پھر عام کا۔" (بقاعی)

④ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ : تاکہ تمھیں دنیا اور آخرت کی کامیابی نصیب ہو۔

آیت 78 ① وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ : "جِهَادٌ" "جَهَدَ يَجْهَدُ" (ف) میں سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے کسی کے مقابلے میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا۔ یہ لفظ اصل میں اللہ کے راستے میں لڑائی کے متعلق بولا جاتا ہے، یہاں یہی مراد ہے، کیونکہ یہی سورۂ مبارکہ ہے جس میں سب سے پہلے کفار سے لڑنے کی اجازت دی گئی اور لڑنے والوں کو اللہ کی نصرت کی خوش خبری دی گئی۔ دیکھیے اس سورت کی آیت (۳۹) "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔" اب اس آیت میں اذن سے بڑھ کر جہاد کا حکم دے دیا ہے۔ (ابن عاشور) ویسے جہاد کا لفظ ہر اس کوشش پر بھی بولا جاتا ہے جو کفار کے مقابلے میں اسلام کی سربلندی کے لیے جان، مال، زبان یا قلم کے ساتھ کی جائے، بلکہ نفس کی ناجائز خواہشوں کے مقابلے پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا: «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِالْمُؤْمِنِ؟ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى أَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَالْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبَ» [ مسند أحمد : ۲۱/٦، ح : ۲٤۰۱۳ ] "کیا میں تمھیں مومن کے بارے میں بتاؤں؟ مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں بے خوف ہوں اور مسلم وہ ہے کہ لوگ اس کی زبان اور ہاتھ سے سلامت رہیں اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو خطائیں اور گناہ چھوڑ دے۔" علامہ البانی رحمہ اللہ نے سلسلہ صحیحہ (۸۱/۲) میں لکھا ہے: "اسے امام احمد نے اپنی مسند (۲۱/٦) میں روایت کیا ہے۔ سند صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔" امام المفسرین طبری نے فرمایا، اہلِ تاویل کا اللہ کے فرمان "وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" کے متعلق اختلاف ہے، ان میں سے بعض نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے کہ مشرکین سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جیسا اس کے جہاد کا حق ہے۔ پھر طبری نے اپنی سند سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر فرمایا: "﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ كَمَا جَاهَدْتُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ" "یعنی اس آیت "اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا اس کے جہاد کا حق ہے" کا مطلب ہے، جیسا کہ تم نے پہلی مرتبہ جہاد کیا تھا۔" اور بعض

حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ

رکھی، اپنے باپ ابراہیم کی ملت کے مطابق۔ اسی نے تمھارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے اور اس (کتاب) میں

نے فرمایا کہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے مت ڈرو، یہی جہاد کا حق ہے۔ پھر طبری نے یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اپنی سند سے بیان فرمایا۔ کچھ اور نے فرمایا، اس کا معنی ہے کہ حق پر عمل کرو، جیسا کہ اس پر عمل کا حق ہے۔ طبری فرماتے ہیں، یہ قول ضحاک سے بعض ایسے راویوں نے ذکر کیا ہے جن کی روایت میں نظر ہے۔ آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ بیان فرماتے ہیں: ” وَالصَّوَابُ مِنَ الْقَوْلِ فِيْ ذٰلِكَ قَوْلُ مَنْ قَالَ عُنِيَ بِهِ الْجِهَادَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لِأَنَّ الْمَعْرُوْفَ مِنَ الْجِهَادِ ذٰلِكَ، وَهُوَ الْأَغْلَبُ عَلٰى قَوْلِ الْقَائِلِ جَاهَدْتُ فِي اللّٰهِ“ ”اس آیت کی تفسیر میں درست بات اس کی ہے جس نے کہا کہ اس سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ جہاد کا معروف معنی یہی ہے اور جب کوئی کہے کہ میں نے اللہ (کے راستے) میں جہاد کیا تو اس کا اغلب معنی یہی ہے۔“ امام طبری نے یہ بہت عمدہ بات فرمائی ہے، کیونکہ اگر ہر گناہ چھوڑنے والا مہاجر کہلا سکتا ہے تو انصار و مہاجرین کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور اگر ہر دین پڑھانے والا، قرآن کا قاری، کسی دینی رسالے یا ادارے کا مدیر یا اپنے نفس سے جہاد کرنے والا مجاہد کہلا سکتا ہے تو کفار کے مقابلے میں جان و مال سب کچھ قربان کر دینے والے اور کسی مفتی و مدرس اور اپنے نفس سے جہاد کرنے والے کسی مسلم کے درمیان مجاہد کہلانے میں کوئی فرق نہیں رہے گا، بلکہ سارے مسلمان ہی مجاہد کہلائیں گے، جب کہ مجاہد صرف مجاہد ہی کو کہتے ہیں، کسی مدرس، مبلغ، مفتی، مصنف یا نفس سے جہاد کرنے والے کو کوئی مجاہد نہیں کہتا۔ رہی حدیث کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس سے جہاد کرے، تو اس میں مجاہدین کو نصیحت ہے کہ صرف کفار سے لڑنے کو کافی نہ سمجھنا، اصل مجاہد تم اس وقت بنو گے جب اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس سے جہاد کرو گے اور مہاجرین کو نصیحت ہے کہ صرف ترک وطن کو کافی نہ سمجھنا، اصل مہاجر تم اس وقت بنو گے جب خطائیں اور گناہ چھوڑ دو گے۔

② بعض لوگ کفار سے جہاد کی اہمیت کم کرنے کے لیے ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک سے واپسی پر فرمایا: (( رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ )) ”ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں۔“ گویا کفار سے لڑائی چھوٹا جہاد ہے، حالانکہ یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہرگز ثابت نہیں۔ شیخ البانی نے ”سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة (٢٤٦٠)“ میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور اسے منکر قرار دیا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مجموع الفتاویٰ (۱۱/۱۹۷) سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا کلام نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ”اس کی کوئی اصل نہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا علم رکھنے والوں میں سے کسی نے اسے روایت کیا ہے۔ کفار سے جہاد سب سے زیادہ عظمت والے اعمال میں سے ہے، بلکہ انسان اپنی خوشی سے جو عمل کرتا ہے ان سب سے افضل ہے۔“ پھر کچھ آیات و احادیث نقل فرمائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد افضل اعمال میں سے ہے۔

الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ

بھی، تاکہ رسول تم پر شہادت دینے والا بنے اور تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو۔ سو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو

③ هُوَاجْتَبٰىكُمْ : اس خطاب کے اولین مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنا دین قبول کرنے، اسے پھیلانے اور اسے نہ ماننے والوں کے ساتھ جہاد کے لیے چُن لیا ہے۔ اور یہ حقیقت سب جانتے ہیں کہ یہ صحابہ ہی تھے جنھوں نے دعوت و جہاد کے ساتھ چند سالوں میں مشرق و مغرب تک اسلام پہنچا دیا۔ پھر ان کے بعد جو لوگ بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر دعوت و جہاد کے ساتھ کفر کو مغلوب اور اسلام کو غالب کرتے رہے وہ بھی اس کے مخاطب ہیں۔ یہ آیت صحابہ اور ان کے پیروکاروں کی فضیلت کی زبردست دلیل ہے۔ وہ لوگ بہت بڑی غلطی پر ہیں جو اللہ کے ان چُنے ہوئے پیاروں سے بُغض رکھتے ہیں اور ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ یا پوری امت اس کی مخاطب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں تمام امتوں میں سے چُن لیا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس آیت کا اور ”كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ کا مفہوم ایک ہی ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۱۰) کی تفسیر۔

④ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ : امت کے چنیدہ ہونے کے ساتھ ہی اس کی افضلیت کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ اس دین میں کوئی تنگی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ » [ بخاري، الإيمان، باب الدين يسر : ۳۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”یہ دین آسان ہے۔“ اور فرمایا: « أَحَبُّ الدِّيْنِ إِلَى اللّٰهِ الْحَنِيْفِيَّةُ السَّمْحَةُ » [ بخاري، قبل ح : ۳۹ ] ”تمام دینوں میں سے اللہ کو سب سے پسند ابراہیم حنیف کی ملت ہے جو سادہ اور آسان ہے۔“ بخاری رحمہ اللہ نے پہلی حدیث سند کے ساتھ اور دوسری معلق بیان فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [ البقرة : ۱۸۵ ] ”اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ ”وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ“ سے اس جملے کا تعلق یہ ہے کہ اگر تم میں جہاد کی طاقت نہیں تو تمھیں رخصت ہے، فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ [ الفتح : ۱۷ ] ”نہیں ہے اندھے پر کوئی تنگی اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی اور نہ مریض پر کوئی تنگی۔“ اسی طرح عورتوں بوڑھوں، کمزوروں اور ناداروں کو جہاد معاف کر دیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۹۱ تا ۹۳)۔

دین میں کسی مشکل کے نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان جو جی میں آئے کرتا پھرے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے احکام ایسے رکھے ہیں جو انسانی طاقت کے اندر ہیں، اسی لیے فرمایا: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [ البقرة : ۲۸٦ ] ”اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔“ پھر کمزوری یا بڑھاپے یا کسی اور عذر کی بنا پر انجام نہ دے سکنے کی صورت میں رخصت اور تخفیف کا قاعدہ مقرر کیا ہے (جیسے سفر میں قصر نماز، سفر اور بیماری میں روزہ افطار

وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾

اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑو، وہی تمھارا مالک ہے، سو اچھا مالک ہے اور اچھا مددگار ہے ﴿۷۸﴾

کرنے کی اجازت، پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کی اجازت، ساری زمین میں جہاں وقت ہو جائے نماز کی اجازت وغیرہ) پھر گناہوں کے ارتکاب کی صورت میں توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جسے پچھلی امتوں کے فقیہوں نے اپنی موشگافیوں سے ختم کر ڈالا تھا۔ اسی طرح پہلی امتوں کے بعض سخت احکام منسوخ کر دیے اور وہ رسوم و رواج بھی ختم کر دیے جو لوگوں نے خود یا ان کے فقیہوں نے ان پر لازم کر رکھے تھے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷)۔

❺ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ : "أَيْ مُتَّبِعِيْنَ مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ" یعنی اس حال میں کہ تم اپنے باپ ابراہیم کی پیروی کرنے والے ہو۔ "اَبِيْكُمْ" سے اگر مخاطب عرب سمجھے جائیں تو ابراہیم علیہ السلام کو ان کا باپ اس لیے فرمایا کہ وہ اکثر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور اگر پوری امت مسلمہ مخاطب ہو تو ابراہیم علیہ السلام پوری امتِ مسلمہ کے اس لیے باپ ہیں کہ وہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہیں۔

❻ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا : "أَيْ مِنْ قَبْلِ الْقُرْآنِ وَ فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ" عام طور اس کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اس نے یعنی ابراہیم علیہ السلام نے قرآن سے پہلے اور اس قرآن میں تمھارا نام مسلمین رکھا۔ مگر امام طبری نے دو صحیح سندوں کے ساتھ نقل فرمایا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "هُوَ سَمّٰىكُمْ" کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے (تمھارا نام مسلم رکھا ہے)۔ یعنی یہ نام ابراہیم علیہ السلام نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ مجاہد، قتادہ، ضحاک، سدی اور مقاتل بن حیان نے بھی یہی فرمایا۔ اس کے بعد ابن کثیر نے طبری سے عبد الرحمان بن زید بن اسلم کا قول نقل فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے تمھارا نام مسلمین رکھا اور اس پر ابن جریر کا تبصرہ نقل فرمایا کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے قرآن میں اس امت کا نام مسلمین نہیں رکھا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے تمھارا نام اس سے پہلے اور اس میں مسلمین رکھا۔ مجاہد نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے گزشتہ کتابوں میں اور اس ذکر (قرآن) میں بھی۔ مجاہد کے علاوہ بھی کئی مفسرین نے یہی فرمایا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہی بات درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا: ﴿ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ ﴾ یعنی اس (اللہ) نے تمھیں چنا۔ پھر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی ترغیب یہ کہہ کر دلائی کہ یہ تمھارے باپ ابراہیم کی ملت ہے، پھر اس امت پر احسان جتلایا کہ اس نے پہلی تمام کتابوں میں اور اس قرآن میں تمھارا نام مسلمین رکھا ہے۔ آئندہ فائدے میں ایک حدیث آ رہی ہے جس میں صراحت ہے کہ ہمارا نام اللہ تعالیٰ نے مسلمین، مومنین اور عباد اللہ رکھا ہے۔ قرآن میں مسلمین نام کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۶۴) اور سورۂ زمر (۱۲)۔

7 کچھ سال پہلے ایک صاحب نے کہا کہ جو شخص ''مسلم'' کے سوا کوئی اور نام اختیار کرے وہ کافر ہے، خارج از اسلام ہے۔ اگرچہ ان کے فوت ہونے کے بعد وہ زور نہیں رہا مگر اب بھی ان کے کئی متاثرین کافر گری کا یہ شغل جاری رکھے ہوئے ہیں، اگرچہ وہ خود بھی کئی گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے پر فتوے لگا رہے ہیں۔ حالانکہ کوئی مسلم اگر اسلام کی کسی صفت کو بطور نام استعمال کرلے تو وہ ملت اسلام سے کیسے خارج ہو گیا؟ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۳۵] ''بے شک مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔'' اور حارث اشعری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنِ ادَّعٰى دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ جُثَا جَهَنَّمَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَإِنْ صَلّٰى وَصَامَ فَقَالَ وَإِنْ صَلّٰى وَصَامَ فَادْعُوْا بِدَعْوَى اللّٰهِ الَّذِيْ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ عِبَادَ اللّٰهِ)) [ترمذي، الأدب، باب ماجاء في مثل الصلاة..... : ۲۸٦۳۔ مسند أحمد: ۳٤٤/٥، ح: ۲۲۹۷٦] ''جو شخص جاہلیت کی دعوت کی آواز دے وہ جہنم کی ڈھیریوں میں سے ہے۔'' ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! خواہ وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواہ وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے۔'' پھر فرمایا: ''سو تم اللہ کی عبادت کی آواز دو جس کے ساتھ اس نے تمھارا نام ''مسلمین''، ''مومنین'' اور ''عباد اللہ'' رکھا ہے۔'' اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ مسلمین کے علاوہ صفاتی نام (مثلاً مومنین، عباد اللہ) لینے میں کوئی حرج نہیں۔

8 لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۳) یہاں رسول کا ذکر پہلے ہے اور سورۂ بقرہ میں امت کا پہلے ہے۔ کیونکہ وہاں امت کی تعریف ہو رہی ہے جبکہ یہاں ملت ابراہیم کی پیروی کی تاکید ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، اس لیے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پہلے ہے۔ (ابن عاشور)

9 فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ : یہ ''هُوَ اجْتَبٰىكُمْ'' اور ''هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ'' پر عطف ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم پر اتنے انعام کیے ہیں تو تم اس کا شکر ادا کرنے کے لیے ہمیشہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ ان دو اعمال کی تاکید اس لیے فرمائی کہ کسی اسلام لانے والے کے ایمان کا ثبوت اقرار کے بعد ان دونوں عملوں سے ملتا ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۵، ۱۱)۔

⑩ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ : اور اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے تھام لو، یعنی اس کے تمام احکام کو مضبوطی سے تھام لو، اسی طرح ہر مشکل اور مصیبت بلکہ اپنے ہر کام میں اسی کے سہارے کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور کسی غیر کی طرف نظر مت اٹھاؤ۔

⑪ هُوَ مَوْلٰىكُمْ : یہ اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ تمھارا مالک اور تمھارے تمام کاموں کا ذمہ اٹھانے والا وہی ہے۔

⑫ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ : وہ بہت اچھا مالک اور بہت اچھا مددگار ہے، کیونکہ وہ کسی کا ذمہ اٹھا لے تو اسے ہر فکر سے کافی ہو جاتا ہے اور جب کسی کی مدد کر دے تو اسے اس کے تمام دشمنوں پر غالب کر دیتا ہے۔ دعائے قنوت میں ہے: (( إِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ )) [ أبو داوٗد، الوتر، باب القنوت في الوتر : ۱٤۲٥ ] ”حقیقت یہ ہے کہ جس کا تو دوست بن جائے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا اور جس کا تو دشمن ہو جائے وہ کبھی عزت نہیں پاتا۔“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم


حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ


## جلد سوم

سورة المؤمنون تا سورة الزمر


دار الاندلس
Dar-ul-Andlus
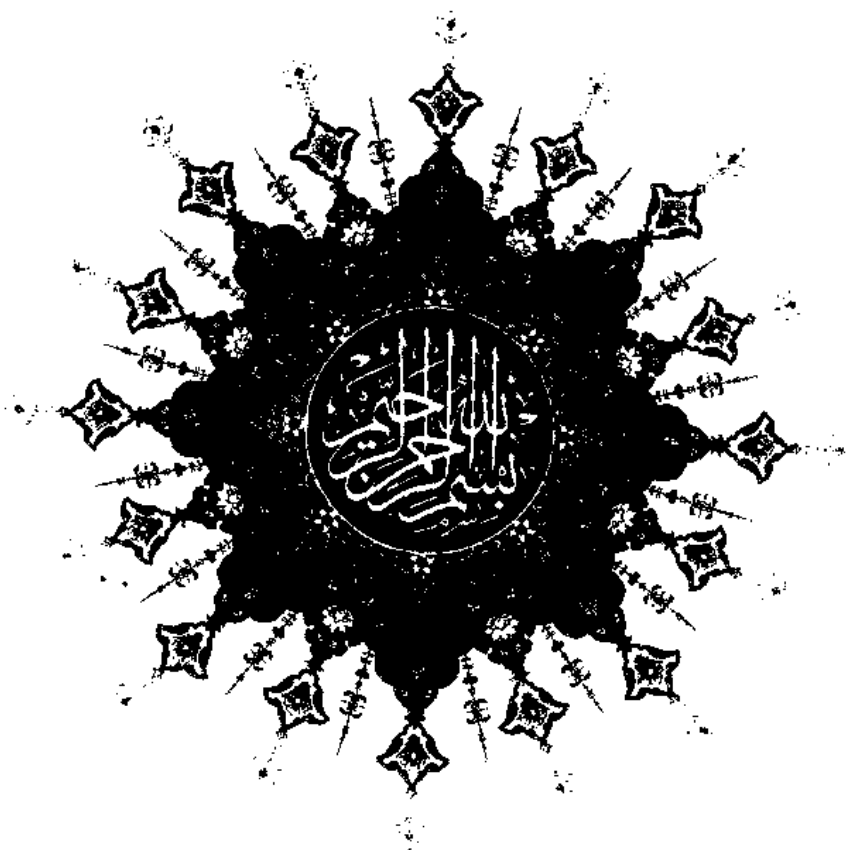
بسم الله الرحمن الرحیم

نامِ کتاب

# تفسیر القرآن الکریم

## جلد سوم

سورۃ المؤمنون تا سورۃ الزمر

تفسیر

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ

Dar-ul-Andlus

ناشر

دار الاندلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ

## جلد سوم

سورۃ المؤمنون تا سورۃ الزمر

Dar-ul-Andlus

دار الاندلس

4- لیک روڈ چوبرجی لاہور
042-37230549

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314

Head Off: +92-42-35062910 Cell: +92-322-4006412

تفسیر القرآن الکریم

# فہرست

# قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾

## اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

## یقیناً کامیاب ہوگئے مومن ﴿۱﴾

یزید بن بابنوس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: « يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ! كَيْفَ كَانَ خُلُقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ؟ قَالَتْ كَانَ خُلُقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْقُرْآنَ، ثُمَّ قَالَتْ تَقْرَأُ سُوْرَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ؟ اقْرَأْ: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ حَتّٰى بَلَغَ الْعَشْرَ، فَقَالَتْ هٰكَذَا كَانَ خُلُقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ » [ مستدرك حاكم : ۳۹۲/۲، ح : ۳٤٨١، قال الحاكم صحيح الإسناد۔ مسلم، صلاة المسافرين، باب جامع صلاة الليل و من نام عنه أو مرض : ٧٤٦ ] ”اے ام المومنین! ہمیں بتایئے کہ رسول اللہ ﷺ کا خُلق کیا تھا؟“ انھوں نے فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ کا خُلق قرآن تھا۔“ پھر انھوں نے فرمایا: ”سورۂ مومنون پڑھتے ہو؟ پڑھو: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾“ دس آیات تک تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ کا خُلق ایسے ہی تھا۔“ ذہبی نے حاکم کے فیصلے کو برقرار رکھا ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے ”صحيح الأدب المفرد (٢٣٤)“ میں اسے صحیح کہا ہے۔ خُلق کا معنی ایسی عادت ہے جو آدمی کی پیدائشی اور طبعی عادت بن جائے اور کسی مشقت کے بغیر خود بخود ادا ہوتی رہے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا مطلب یہ ہے کہ پورا قرآن ہی رسول اللہ ﷺ کی عادت بن چکا تھا اور سورۂ مومنون کے شروع کی دس آیات میں جو اوصاف بیان ہوئے ہیں رسول اللہ ﷺ ان سے اس طرح آراستہ تھے کہ وہ آپ کی طبیعت بن چکے تھے۔

**آیت 1** ﴿۱﴾ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ : ”قَدْ“ حرف ” لَمَّا “ کی نقیض ہے۔ ” لَمَّا “ کا مفہوم یہ ہے کہ متوقع کام ماضی میں ابھی تک نہیں ہوا، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَلَّا لَمَّا يَقۡضِ مَاۤ اَمَرَهٗ﴾ [ عبس : ٢٣ ] ”ہرگز نہیں، ابھی تک اس (انسان) نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا تھا۔“ جب کہ ” قَدْ “ ماضی کو حال کے قریب کر دیتا ہے اور جملہ فعلیہ میں تاکید کا وہی فائدہ دیتا ہے جو جملہ اسمیہ میں ”إِنَّ“ اور ”لام تاکید“ دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کام کی توقع تھی وہ ماضی قریب میں یقیناً واقع ہو چکا ہے۔ یعنی آگے ذکر کردہ صفات والے مومن یقیناً فلاح پا چکے ہیں۔ مستقبل میں حاصل ہونے والی کامیابی کو یقینی ہونے کی وجہ سے ”قَدْ“ اور ماضی کے صیغہ ”اَفۡلَحَ“ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ (بقاعی وابن عاشور)

”قَدْ“ کے ساتھ تاکید کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے بہت سی آیات میں ایمان والوں کو فلاح کی امید دلائی گئی تھی، جیسا کہ پچھلی سورت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَ افۡعَلُوا الۡخَيۡرَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴾ [ الحج : ٧٧ ] ”اور نیکی کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“ تو اس توقع کے پورا کرنے کی خوش خبری ”قَدۡ اَفۡلَحَ“ کے ساتھ بیان فرمائی۔ شاید نماز کی اقامت ” قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ “

# الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝

## وہی جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں ۝

میں حرف " قَدْ "اسی وجہ سے ہے کہ نمازی شوق سے جماعت کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ " قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ"اسی انتظار کا اثبات میں جواب ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:(( يَا بِلَالُ ! أَقِمِ الصَّلَاةَ أَرِحْنَا بِهَا )) [ أبو داوٗد، الأدب، باب في صلاة العتمة : ٤٩٨٥ ] ''بلال! نماز کھڑی کرو، ہمیں اس کے ساتھ راحت دلاؤ۔'' (ابن عاشور)

❷ اَفْلَحَ : "اَلْفَلَحُ" لام کے فتحہ کے ساتھ اور "اَلْفَلَاحُ" کا معنی بھلائی کے کام میں کامیابی ہے اور "اَلْفَلْحُ" لام کے سکون کے ساتھ ''پھاڑنا۔'' دونوں باب "مَنَعَ" سے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: "اَلْحَدِيْدُ بِالْحَدِيْدِ يُفْلَحُ" ''لوہا، لوہے کے ساتھ کاٹا جاتا ہے۔'' کسان کو اسی لیے "اَلْفَلَّاحُ" کہتے ہیں کہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے۔ گویا فلاح وہ کامیابی ہے جو محنت و مشقت کے نتیجے میں حاصل ہو۔ کامیابی دنیا کی بھی ہے اور آخرت کی بھی۔

❸ "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" میں یہ بتایا ہے کہ بعد میں ذکر کردہ صفات والے مومن یقیناً کامیاب ہو گئے، مگر یہ نہیں بتایا کہ کس چیز میں کامیاب ہو گئے۔ یہ بات ان آیات کے آخر میں بیان فرمائی ہے، فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ﴾ [ المؤمنون : ۱۰، ۱۱ ] ''یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہوں گے۔'' یعنی کامیابی سے مراد آخرت کی کامیابی ہے، کیونکہ حقیقی زندگی وہی ہے، فرمایا: ﴿ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ العنكبوت : ٦٤ ] ''اور بے شک آخری گھر، یقیناً وہی اصل زندگی ہے، اگر وہ جانتے ہوتے۔'' دنیا کی زندگی نہ حقیقی زندگی ہے اور نہ اس کی کامیابی حقیقی کامیابی، فرمایا: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ [ آل عمران : ۱۸۵ ] ''پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔''

❹ کامیاب ہونے والوں کے اوصاف میں سب سے پہلے ایمان کا ذکر فرمایا، کیونکہ ایمان ہی کامیابی کا اصل سبب ہے، پھر بعد کی آیات میں اہلِ ایمان کی چند مزید صفات بیان فرمائیں جو ایمان کے درست اور پختہ ہونے کی دلیل ہیں اور جن کے بغیر ایمان بے معنی ہے۔

**آیت 2** ❶ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ : طبری نے اپنی حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "خٰشِعُوْنَ" کی تفسیر "خَائِفُوْنَ سَاكِنُوْنَ" روایت کی ہے۔ (طبری : ۲۵۶۲۷) یعنی وہ نماز میں دل سے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں اور اس خوف کا ان کے جسم پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ نماز کے منافی کسی بھی حرکت سے اجتناب کرتے ہیں، نہ ادھر ادھر نگاہ پھیرتے ہیں، نہ اپنے کپڑے یا ڈاڑھی سے کھیلتے ہیں اور نہ انگلیاں چٹخاتے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں ادھر ادھر جھانکنے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ ))

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳

اور وہی جو لغو کاموں سے منہ موڑنے والے ہیں ③

[ بخاري، الأذان، باب الالتفات في الصلاة : ۷۵۱ ] ”یہ شیطان کا آدمی کی نماز سے اچک کر لے جانا ہے، جو شیطان بندے کی نماز سے اچک کر لے جاتا ہے۔“

② اس آیت کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے ایک روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو نماز میں اپنی ڈاڑھی سے کھیلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ”اگر اس کا دل خشوع کرتا تو اس کے دوسرے اعضا بھی خشوع کرتے۔“ شیخ البانی نے ”سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة (۱۱۰)“ میں اس کا موضوع (خود بنائی ہوئی) ہونا دلائل سے ذکر فرمایا ہے۔

تنبیہ: نماز میں ڈاڑھی، کپڑے یا کسی بھی چیز سے کھیلنے اور بے مقصد حرکت کرنے کا خشوع، یعنی دل کے خوف اور جسم کے سکون کے منافی ہونا واضح بات ہے، مگر یہ ہرگز جائز نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ذمے وہ الفاظ لگائے جائیں جو آپ ﷺ سے ثابت نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ )) [ بخاري، العلم، باب إثم من كذب...... : ۱۱۰۔ مسلم : ۳ ] ”جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنالے۔“

③ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک باب باندھا ہے: ”نماز میں ہاتھ سے مدد لینے کا باب، جب وہ کام نماز ہی سے متعلق ہو۔“ پھر اس عنوان کے تحت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ”آدمی نماز میں اپنے جسم سے جس طرح چاہے مدد حاصل کرے۔“ پھر لکھتے ہیں کہ ابو اسحاق نے نماز میں اپنی ٹوپی نیچے رکھی اور اسے اٹھایا اور علی رضی اللہ عنہ نے اپنی ہتھیلی اپنی بائیں کلائی کے جوڑ پر رکھے رکھی، سوائے اس کے کہ اپنی جلد کو کھجلی کریں یا اپنا کپڑا درست کریں۔“ اس کے بعد امام صاحب نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ حدیث نقل کی ہے جس میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہو کر رات کی نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے: ”آپ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا اور میرا کان پکڑ کر اسے مروڑنے لگے (یعنی مجھے کان سے پکڑ کر دائیں طرف کیا)۔“ [ بخاري، العمل في الصلاة، باب استعانة اليد في الصلاة إذا كان من أمر الصلاة : ۱۱۹۸ ]

**آیت 3** وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ: ”لغو“ ہر وہ بات یا کام جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ اس میں شرک اور ہر گناہ، بلکہ ہر بے فائدہ اور بے مقصد قول و فعل آ جاتا ہے۔ یعنی کوئی لغو بات یا کام خود کرنا تو دور کی بات ہے، وہ کوئی لغو کام ہوتا ہوا دیکھتے یا سنتے بھی نہیں، بلکہ ان کی عادت ہی لغو سے منہ موڑے رکھنا ہے۔ ”يُعْرِضُوْنَ“ کے بجائے ”مُعْرِضُوْنَ“ (اسم فاعل) کا مطلب ہے کہ لغو سے اعراض ان کی عادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ )) [ ترمذي، الزهد، باب حديث من حسن إسلام المرء ...... : ۲۳۱۷، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ”آدمی کے اسلام کے

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝

اور وہی لوگ جو (ہر عمل) پاک ہونے ہی کے لیے کرنے والے ہیں ④ اور وہی جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں ⑤ مگر اپنی بیویوں یا ان (عورتوں) پر جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں تو بلاشبہ وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں ⑥

حسن میں سے اس کا ان چیزوں کو چھوڑ دینا ہے جو اس کے مقصد کی نہیں ہیں۔'' عباد الرحمان کی صفت بیان فرمائی: ﴿ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ [ الفرقان : ۷۲ ] ''اور جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو باعزت گزر جاتے ہیں۔'' جنت کی ایک خوبی یہ ہوگی: ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا ﴾ [ الواقعة : ۲۵ ] ''وہ اس میں نہ بے ہودہ گفتگو سنیں گے اور نہ گناہ میں ڈالنے والی بات۔''

**آیت 4** وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ: زکوٰۃ کا لفظ طہارت پر بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾ [ الأعلٰی : ۱٤ ] ''بے شک وہ کامیاب ہو گیا جو پاک ہو گیا۔'' اور کسی چیز کے بڑھنے پر بھی، جیسا کہ کہا جاتا ہے: '' زَكَا الزَّرْعُ '' ''کھیتی بڑھ گئی۔'' زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن کا نام بھی ہے، جو مال میں سے ایک مخصوص حصے کی ادائیگی پر بولا جاتا ہے، کیونکہ اس عمل سے نفس کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور مال میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اس معنی کے مطابق '' لِلزَّكٰوةِ '' کا لام اسم فاعل کی تقویت کے لیے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کا عمل کرنے والے ہیں۔ (بقاعی) قرآن میں عام طور پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔

**آیت 5** وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ: پاکدامنی کی صفت اگرچہ لغو سے اعراض میں شامل ہے، مگر نفس کی سب سے منہ زور قوت پر قابو رکھنے کی اہمیت کی وجہ سے اسے الگ بھی ذکر فرمایا، جیسا کہ '' الْمُؤْمِنُوْنَ '' کے لفظ میں ایمان کے تمام اعمال شامل ہیں، مگر بعد میں سات چیزوں کو ان کی اہمیت کے پیشِ نظر الگ بھی ذکر فرمایا۔

**آیت 6** ① اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ ......: اس سے معلوم ہوا کہ اسلام جوگیوں، راہبوں اور بعض صوفیوں کی طرح جنسی خواہش کو سرے سے روک دینے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ بیویوں اور لونڈیوں سے جماع کو جائز قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کا حکم دیا ہے، فرمایا: ﴿ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ١ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ١ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [ النور : ۳۲ ] ''اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں، عورتوں کا نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور اپنی لونڈیوں سے جو نیک ہیں ان کا بھی، اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان تین صحابہ سے جن میں سے ایک نے نکاح نہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، فرمایا: (( أَمَا وَاللّٰهِ! إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَ أَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَ أُفْطِرُ وَ أُصَلِّيْ وَ أَرْقُدُ وَ أَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ )) [ بخاري، النكاح، باب الترغيب في النكاح...... : ۵۰۶۳ ] ''اللہ کی قسم! میں تم

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾

پھر جو اس کے سوا تلاش کرے تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں ﴿۷﴾ اور وہی جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں ﴿۸﴾

سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اس سے بچنے والا ہوں، لیکن (اس کے باوجود) میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، میں قیام اللیل بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، پھر جو میری سنت سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔''

② ''اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ'' سے معلوم ہوا کہ شہوت پوری کرنے کے لیے مسلمان مرد کے پاس صرف دو راستے ہیں، بیوی اور لونڈی اور عورت کے لیے صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے خاوند یا لونڈی کا مالک۔ کیونکہ جب بیوی خاوند کے لیے حلال ہوئی تو خاوند بیوی کے لیے خود بخود حلال ہو گیا۔ عورت اپنے غلام سے حاجت پوری نہیں کر سکتی، کیونکہ ''عَلٰۤى'' کا لفظ اس سے منع کرتا ہے، جو بلندی اور اوپر ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

③ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کسی عورت سے جماع کے جواز کے لیے نکاح ضروری ہے، یا اس کا مملوکہ ہونا۔ مالک کو مملوکہ لونڈی کے لیے نکاح کی ضرورت نہیں، اگر مالک کو اس سے جماع کے لیے نکاح ضروری ہوتا تو ''عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ'' ہی کافی تھا، مملوکہ لونڈیوں کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

**آیت 7** فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ ...... : یعنی بیوی اور لونڈی کے علاوہ کسی بھی طریقے سے شہوت پوری کرنے والے ہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اس آیت سے اپنی منکوحہ عورتوں اور اپنی لونڈیوں کے سوا کسی بھی عورت سے جماع حد سے بڑھنا ٹھہرا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۳۲ ] ''اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔'' اسی طرح قوم لوط کا عمل، کسی جانور سے بدفعلی اور ہاتھ یا کسی اور طریقے سے ایسا فعل بھی حد سے تجاوز ہے۔ اگرچہ تجاوز کے درجوں میں فرق ہے، مگر مومن کو کسی طرح بھی اللہ کی حدود سے تجاوز درست نہیں۔

تنبیہ : ہاتھ سے منی نکالنا اگرچہ ایک قبیح اور مروّت کے خلاف فعل ہے اور حد سے بڑھنا ہے، مگر اس کی وعید میں رسول اللہ ﷺ سے جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے کوئی بھی ثابت نہیں، مثلاً روایت: (( نَاكِحُ الْيَدِ مَلْعُوْنٌ )) ''ہاتھ سے نکاح کرنے والا ملعون ہے۔'' اور یہ روایت کہ سات آدمی ہیں جن کی طرف قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور انھیں آگ میں سب سے پہلے داخل کرے گا، ان میں سے پہلا ''نَاكِحُ الْيَدِ'' (ہاتھ سے نکاح کرنے والا) ہے اور یہ روایت کہ قیامت کے دن یہ فعل کرنے والوں کے ہاتھ حمل کی حالت میں ہوں گے، وغیرہ۔

**آیت 8** وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ : عفت اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی امانت ہے، اس کے ذکر کے بعد

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۞ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞

**اور وہی جو اپنی نمازوں کی خوب حفاظت کرتے ہیں⑨ یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں⑩ جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں⑪**

عام امانتوں کی حفاظت کا ذکر فرمایا۔ عہد بھی ایک امانت ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا الگ ذکر فرمایا۔ "رٰعُوْنَ" "رَعٰی یَرْعٰی" (ف) سے اسم فاعل ہے۔ فعل مضارع کے بجائے اسم فاعل لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی امانتوں اور عہدوں کی حفاظت کرتے ہیں، یہ ان کی عادت ہے۔ منافقوں کی طرح نہیں کہ جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ » [ بخاري، الإيمان، باب علامات المنافق : ٣٣ ] "منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔"

**آیت 9** ① وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ : فلاح پانے والے مومنوں کی پہلی صفت نماز میں خشوع بیان فرمائی اور دوسرے اوصاف بیان کرنے کے بعد آخر میں پھر نماز ہی سے تعلق رکھنے والی ایک صفت بیان فرمائی کہ وہ اپنی نمازوں کی خوب حفاظت کیا کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نماز کی کس قدر اہمیت ہے۔

② "يُحَافِظُوْنَ" باب مفاعلہ سے مبالغے کے لیے ہے، کیونکہ یہاں مقابلے کا معنی مراد نہیں ہوسکتا۔ "يَحْفَظُوْنَ" "حفاظت کرتے ہیں" اور "يُحَافِظُوْنَ" "خوب حفاظت کرتے ہیں۔" محافظت سے مراد نماز ہمیشہ ادا کرنا اور ہر نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں نے نبی ﷺ سے پوچھا: "یا رسول اللہ! کون سا عمل اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: « اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا » "نماز اس کے وقت پر ادا کرنا۔" میں نے کہا: "پھر کون سا عمل؟" فرمایا: "والدین سے حسن سلوک۔" میں نے کہا: "پھر کون سا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جہاد فی سبیل اللہ۔" [ بخاري، مواقيت الصلاة، باب فضل الصلاة لوقتها : ٥٢٧۔ مسلم : ٨٥ ] مستدرک حاکم (۱۸۸/۱، ح: ۶۷۴) میں ہے: « اَلصَّلَاةُ فِيْ أَوَّلِ وَقْتِهَا » "نماز اس کے اول وقت میں ادا کرنا۔" حاکم نے فرمایا، یہ لفظ دو ثقہ راویوں بندار بن بشار اور حسن بن مکرم کی روایت سے ثابت ہیں، جو ان دونوں نے عثمان بن عمرو سے روایت کی ہے اور یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، جب کہ شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔

**آیت 11،10** اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ...... : ان سات صفات کے مالک فردوس کے وارث ہوں گے۔ انھیں وارث کہنے کی تین وجہیں ہیں، ایک یہ کہ وراثت کسی چیز کے حق دار ہونے کا سب سے مضبوط سبب ہے، یعنی یہ لوگ جنت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ جنت ان کے والد مکرم آدم علیہ السلام کی ملکیت تھی، جب وہ وہاں سے نکلے تو ان کی اولاد جو یہ

# وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

## اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو حقیر مٹی کے ایک خلاصے سے پیدا کیا ﴿۱۲﴾

اعمال کرے گی اپنے والد کی جائداد کی وارث ہو گی۔ تیسری وجہ حدیث میں آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا لَهُ مَنْزِلَانِ، مَنْزِلٌ فِي الْجَنَّةِ، وَ مَنْزِلٌ فِي النَّارِ، فَإِذَا مَاتَ، فَدَخَلَ النَّارَ، وَرِثَ أَهْلُ الْجَنَّةِ مَنْزِلَهُ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰى: ﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ )) [ ابن ماجه، الزهد، باب صفة الجنة : ٤٣٤١۔ صححه الألباني في سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٢٢٧٩ ] ''تم میں سے ہر ایک کے لیے دو گھر ہیں، ایک گھر جنت میں اور ایک گھر آگ میں۔ پھر اگر کوئی فوت ہو جائے اور آگ میں چلا جائے تو جنت والے اس کے گھر کے وارث بن جاتے ہیں، سو یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا: ﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ﴾۔''

''اَلْفِرْدَوْسَ'' لغت میں وسیع باغ کو کہتے ہیں، جس میں کئی قسم کے باغات ہوں، جن میں ہر طرح کے پھل دار درخت خصوصاً انگور اور خوشبو دار پھول کثرت سے ہوں۔ قرآن میں مذکور فردوس کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَ أَعْلَى الْجَنَّةِ، أُرَاهُ قَالَ: وَ فَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ وَ مِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب درجات المجاهدين...... : ٢٧٩٠ ] ''جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس مانگو، کیونکہ وہ جنت کا اوسط اور جنت کا اعلیٰ (سب سے بلند) حصہ ہے۔'' راوی حدیث کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں پھر یوں فرمایا: ''اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔'' اوسط کا معنی افضل بھی ہے اور سب سے درمیان بھی۔ شاید درمیان سے مراد یہ ہو کہ وہ طول و عرض کے لحاظ سے جنت کے عین درمیان ہے اور بلندی کے لحاظ سے جنت کی سب سے بلند منزل ہے۔

**آیت 12** ① وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ : ''سُلٰلَةٍ'' ''سَلَّ يَسُلُّ'' کوئی چیز نرمی کے ساتھ کھینچتے ہوئے نکالنا۔ ''سَلَلْتُ السَّيْفَ'' ''میں نے میان سے تلوار نکالی۔'' ''اَلسُّلَالَةُ'' بمعنی '' اَلشَّيْءُ الْمَسْلُوْلُ'' یعنی کسی چیز کا خلاصہ۔ ''فُعَالَةٌ'' کے وزن میں قلت کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسے ''قُلَامَةٌ'' قلم کا تراشہ اور '' صُبَابَةٌ '' تھوڑا سا گرا ہوا پانی۔

② ان آیات کی پچھلی آیات کے ساتھ مناسبت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے والے مومنوں کے فردوس کے وارث ہونے کا ذکر فرمایا، تو ظاہر ہے کہ یہ قیامت کے دن ہی ہوگا، اس لیے قیامت اور موت کے بعد زندگی کی دلیل کے طور پر انسان کی پہلی دفعہ پیدائش کا ذکر فرمایا، پھر کائنات میں اس سے بھی بڑی مخلوقات آسمان و زمین اور ان میں موجود نعمتوں کا ذکر دلیل کے طور پر فرمایا کہ جس نے یہ سب کچھ پہلی دفعہ پیدا کیا وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ پھر اللہ کی توحید اور دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کے منکروں کے انجام بد سے ڈرایا، چنانچہ سب سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم کے انکار اور ان پر آنے والے عذاب کا ذکر فرمایا۔ واللہ اعلم (نظم الدرر للبقاعی)

③ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ : ''طِيْنٍ'' کی تنوین تحقیر کے لیے ہے اور ''سُلٰلَةٍ'' میں بھی قلت کا مفہوم موجود ہے، یعنی یہ

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝۱۳ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝۱۴

**پھر ہم نے اسے ایک قطرہ بنا کر ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا ⑬ پھر ہم نے اس قطرے کو ایک جما ہوا خون بنایا، پھر ہم نے اس جمے ہوئے خون کو ایک بوٹی بنایا، پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں کو کچھ گوشت پہنایا، پھر ہم نے اسے ایک اور صورت میں پیدا کر دیا، سو بہت برکت والا ہے اللہ جو بنانے والوں میں سب سے اچھا ہے ⑭**

انسان جسے تم چلتے پھرتے اور ہنستے مسکراتے دیکھتے ہو اس کی ابتدا حقیر مٹی کے تھوڑے سے خلاصے کے ساتھ ہوئی۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُوْ آدَمَ عَلٰى قَدْرِ الْأَرْضِ جَاءَ مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَ بَيْنَ ذٰلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ » [ أبوداؤد، السنة، باب في القدر : ۴۶۹۳ ] ”اللہ عزوجل نے آدم کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا ہے، جسے اس نے تمام روئے زمین سے جمع فرمایا تھا۔ چنانچہ آدم کی اولاد اس مٹی کے لحاظ سے ہوئی ہے، کئی سرخ ہیں اور کئی سفید، کئی سیاہ ہیں اور کئی ان کے بین بین۔ کئی نرم خو ہیں اور کئی سخت طبیعت۔ کئی بری طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور کئی اچھی اور عمدہ طبیعت والے۔“ اس آیت میں آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہے۔

**آیت 13** ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ : اس میں آدم علیہ السلام کے بعد نسلِ انسانی کی پیدائش کا ذکر ہے، یعنی پھر اس مٹی کو یا مٹی سے بنی ہوئی اس مخلوق کو پانی کا ایک قطرہ بنا کر ایک نہایت محفوظ ٹھکانے (رحم مادر) میں رکھا۔ مٹی سے پانی کا قطرہ بنانا، جس میں مٹی کا نام و نشان نہیں اور اسے ماں کے رحم کے نہایت محفوظ ٹھکانے میں رکھ کر پانی کے قطرے کو نو (۹) ماہ میں مکمل انسان بنا دینا سب اس کی قدرت کا کمال ہے۔ ” قَرَارٍ مَّكِيْنٍ “ کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مرسلات (۲۰ تا ۲۲)۔

**آیت 14** ① ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً ......: ” عَلَقَةً “ کا معنی جمے ہوئے خون کا ٹکڑا بھی ہے اور جونک بھی۔ پھر اللہ تعالیٰ پانی کے سفید سیال قطرے کو سرخ جمے ہوئے خون کے جامد ٹکڑے کی شکل دے دیتا ہے جو جونک کی شکل کا ہوتا ہے اور جونک ہی کی طرح رحم کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ حج (۵)۔

② ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ : یعنی پھر ہم اس میں روح پھونکتے ہیں تو وہ نہایت خوب صورت دیکھنے، سننے، سمجھنے اور حرکت کرنے والا انسان بن جاتا ہے۔ جس کی شکل و صورت ہی اور ہوتی ہے۔ اب پہلی صورت کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت نہیں، یعنی مٹی سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں، پہلے بے جان تھا اب جاندار ہے۔ پہلے اندھا، بہرا اور گونگا تھا اب آنکھ، کان اور زبان والا ہے۔ پہلے گوشت کا بے حس ٹکڑا تھا، اب اس کے ذرّے ذرّے میں اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب

# ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾

## پھر بے شک تم اس کے بعد ضرور مرنے والے ہو ﴿۱۵﴾

باریکیاں اور ہزاروں قسم کے احساسات ہیں۔ اس پر آنے والا ہر لحہ نئی سے نئی تبدیلی لے کر آ رہا ہے، پہلے جنین پھر دودھ پیتا بچہ، جو پیدا ہوتے ہی اپنا اختیار استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے، پھر لڑکا پھر نوجوان پھر جوان پھر ادھیڑ عمر پھر بوڑھا، پھر ایسا بوڑھا کہ بچپن کی کمزوری کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ انھی منزلوں میں سے کسی منزل میں اسے موت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

③ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ : اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے انسان کی پیدائش کا ذکر ایسے مدلل اور خوب صورت انداز میں فرمایا ہے کہ خود بخود یہ جملہ زبان پر آ جاتا ہے : ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ ''سو بہت برکت والا ہے اللہ جو بنانے والوں میں سب سے اچھا ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی کلام کی خوبی کی انتہا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے چند قصیدوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

قَصَائِدُ اِنْ تَكُنْ تُتْلٰى عَلٰى مَلَإٍ صُدُوْرُهَا عُلِمَتْ مِنْهَا قَوَافِيْهَا

''وہ ایسے قصیدے ہیں کہ لوگوں کے سامنے ان کے ابتدائی اشعار پڑھے جائیں تو ان کے آخری اشعار خود بخود معلوم ہو جاتے ہیں۔''

غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

④ الْخٰلِقِيْنَ : یہاں ''خَلْقٌ'' کا لفظ ظاہری شکل وصورت بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ ﴾ [ المائدة : ۱۱۰ ] ''اور جب تو مٹی سے پرندے کی شکل کی مانند میرے حکم سے بناتا تھا۔'' اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تصویر بنانے والوں سے فرمائے گا: (( أَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ )) [ بخاري، البيوع، باب التجارة فيما يكره...... ۲۱۰۵، عن عائشة رضی اللہ عنہا ] ''تم نے جو خَلْق کیا ہے اسے زندہ کرو۔'' پیدا کرنے اور زندگی بخشنے کے معنی میں خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

⑤ ''اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ'' کے لفظ میں انسان کے حسن و جمال کی طرف بھی واضح اشارہ ہے۔ (بقاعی)

آیت 15 ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ : اگرچہ مٹی اور نطفے سے لے کر موت تک کا ہر لحہ ہی موت کے بعد زندگی کا شاہد ہے، کیونکہ جسم کا ہر خلیہ جو موجود ہوتا ہے فنا ہوتا اور اس کی جگہ نیا خلیہ وجود میں آتا رہتا ہے اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے، جس کے دوران انسان بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی طرف بھی منتقل ہوتا رہتا ہے، مگر موت و حیات کے اس سلسلے پر غور کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے موت کا وہ مرحلہ بیان فرمایا جو ہر شخص اپنے سر کی آنکھوں کے ساتھ دیکھتا ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾

پھر بے شک تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے ﴿۱۶﴾

چنانچہ "ثُمَّ" کے ساتھ اس مہلت کی طرف اشارہ فرمایا جو انسان کو پیدا ہونے کے بعد عمل کے لیے ملتی ہے اور "اِنَّ" اور "لَام" کی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ پھر زندگی کے سارے یا کچھ ادوار گزار کر آخر تمھیں ہر حال میں مرنا ہے۔

**آیت 16** ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ : انسانی زندگی کے مراحل کو بطور دلیل بیان کر کے اصل بات بیان فرمائی، جسے کافر ناممکن خیال کرتے تھے کہ پھر ایک مدت کے بعد یقیناً تم دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے۔ سورۂ حج میں واضح طور پر فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ﴾ [ الحج : ۵ ] "اے لوگو! اگر تم اٹھائے جانے کے بارے میں کسی شک میں ہو تو بے شک ہم نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر کچھ جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی، تاکہ ہم تمھارے لیے واضح کریں اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر ہم تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو قبض کر لیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔ اور تو زمین کو مردہ پڑی ہوئی دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر خوبصورت قسم میں سے اگاتی ہے۔" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ أَرْبَعُوْنَ، قَالُوْا يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! أَرْبَعُوْنَ يَوْمًا؟ قَالَ أَبَيْتُ، قَالَ أَرْبَعُوْنَ سَنَةً؟ قَالَ أَبَيْتُ، قَالَ أَرْبَعُوْنَ شَهْرًا؟ قَالَ أَبَيْتُ، وَيَبْلَى كُلُّ شَيْءٍ مِنَ الْإِنْسَانِ إِلَّا عَجْبَ ذَنَبِهِ، فِيْهِ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ و نفخ في الصور...... ﴾ : ۴۸۱۴ ] "دو نفخوں کے درمیان چالیس کا عرصہ ہے؟" لوگوں نے کہا: "اے ابوہریرہ! چالیس دن کا؟" کہا: "میں نہیں مانتا۔" انھوں نے کہا: "چالیس سال کا؟" کہا: "میں نہیں مانتا۔" انھوں نے کہا: "چالیس ماہ کا؟" کہا: "میں نہیں مانتا۔" (کیونکہ دنیا کے ایام اور ماہ و سال کی بساط تو سورج کے ساتھ ہی لپیٹی جا چکی ہو گی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور انسان کی ہر چیز بوسیدہ ہو جائے گی، مگر اس کی دم کی ہڈی، اسی پر اس مخلوق کو جوڑا جائے گا۔"

# وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھارے اوپر سات راستے بنائے اور ہم کبھی مخلوق سے غافل نہیں ﴿۱۷﴾**

آیت 17 ﴿1﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ : اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد زندگی کی دلیل کے طور پر انسان کی اپنی پیدائش کا ذکر فرمایا، جو غور کرنے والے کے لیے کافی تھی، مگر اس کے بعد اس سے بھی کہیں بڑی مخلوق آسمانوں اور زمین کا اور ان میں رکھی ہوئی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ قیامت کی دلیل کے طور پر اللہ تعالیٰ اکثر انسان کی پیدائش کے ذکر کے بعد آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا ذکر فرماتا ہے اور اس سے پہلے یا بعد قیامت کا ذکر فرماتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا﴾ [ النازعات : ۲۷ تا ۳۰ ] ”کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا۔ اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا اور زمین، اس کے بعد اسے بچھا دیا۔“ اسی طرح دیکھیے سورۂ مومن (۵۷) اور سورۂ سجدہ کی شروع کی آیات۔

﴿2﴾ فَوْقَكُمْ : زمین کے کسی حصے پر چلے جاؤ آسمان اوپر ہی ہوگا۔

﴿3﴾ سَبْعَ طَرَآئِقَ : ”طَرَآئِقَ“ ”طَرِيْقَةٌ“ کی جمع ہے۔ ”طَارَقَ يُطَارِقُ“ اور ”أَطْرَقَ“ کا معنی ایک دوسرے پر چڑھانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم ترکوں سے لڑو گے۔“ پھر ان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: (( كَأَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطَرَّقَةُ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب قتال الترك : ۲۹۲۸ ] ”ان کے چہرے (ایسے چوڑے ہوں گے) جیسے وہ ایسی ڈھالیں ہیں جن پر چمڑا چڑھایا ہوا ہے۔“ ”طَارَقْتُ بَيْنَ الثَّوْبَيْنِ“ ”میں نے دو کپڑے اوپر تلے لیے۔“ مطلب یہ ہے کہ یہ ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا﴾ [ نوح : ۱۵ ] ”کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا فرمایا۔“ ”طَرَقَ يَطْرُقُ“ (ن) ”ضَرَبَ“ کے معنی میں بھی آتا ہے، ہتھوڑے کو ”اَلْمِطْرَقَةُ“ اسی لیے کہتے ہیں۔ ”طَرِيْقٌ“ کا ایک معنی راستہ بھی ہے، کیونکہ وہ چلنے والوں کی ٹھوکر میں ہوتا ہے۔ آسمانوں کو ”طَرِيْقَةٌ“ اس لیے بھی کہتے ہیں کہ وہ فرشتوں کی آمد و رفت اور احکام الٰہی کے نزول اور اعمال کے اوپر جانے کے راستے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ [ الطلاق : ۱۲ ] ”اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھنے والا ہے اور یہ کہ اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے۔“

﴿4﴾ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ : ”كُنَّا“ استمرار (ہمیشگی) کے لیے ہے، اسی لیے ترجمہ میں ”کبھی“ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ انسانوں اور آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد ہم ان سے بے خبر اور بے تعلق ہو گئے ہوں، یا انھیں کسی داتا، دستگیر

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖۗ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ⑱

**اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ کچھ پانی اتارا، پھر اسے زمین میں ٹھہرایا اور یقیناً ہم اسے کسی بھی طرح لے جانے پر ضرور قادر ہیں ⑱**

یا گنج بخش کے حوالے کر دیا ہو، نہیں، ایسا نہ کبھی تھا نہ ہوگا۔ ان کا وجود تو قائم ہی ہمارے علم اور ہماری قدرت کی بدولت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ [ الحديد : ٤ ] ''وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔'' اور دیکھیے سورۂ انعام (۵۹)۔

**آیت 18** ① وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ : آسمان کی پیدائش کے بعد اپنی مزید نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ پانی بذات خود بہت بڑی نعمت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ [ الأنبياء : ٣٠ ] ''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔'' اس آیت میں پانی اتارنے کی عظیم نعمت کے ذکر کے بعد اس کے متعلق تین باتیں فرمائیں، چنانچہ فرمایا کہ ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ کچھ پانی اتارا، جس سے انسان، حیوان، کھیت اور درخت سیراب ہو سکیں۔ میدانوں، صحراؤں اور پہاڑوں میں زندگی باقی رہ سکے اور سمندروں اور ندی نالوں کی ضرورت پوری ہو سکے، کیونکہ اگر اس مخصوص مقدار سے زیادہ بارش برستی تو سمندر خشکی پر چڑھ کر زندگی کا سلسلہ نیست و نابود کر دیتے اور اگر کم برستی تو انسان، حیوان، درخت اور کھیت زندہ نہ رہ سکتے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ صرف پانی ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز مخصوص مقدار میں اتارتا ہے، نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ؗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [ الحجر : ٢١ ] ''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر ہمارے پاس اس کے کئی خزانے ہیں اور ہم اسے نہیں اتارتے مگر ایک معلوم اندازے سے۔''

مستدرک حاکم میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: (( مَا مِنْ عَامٍ أُمْطَرَ مِنْ عَامٍ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ ثُمَّ قَرَأَ : ﴿ وَ لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ﴾ [ الفرقان : ٥٠ ] )) [ مستدرك حاكم : ٤٠٣/٢، ح : ٣٥٢٠۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٤٦٠/٥، ح : ٢٤٦١ ] ''کوئی سال ایسا نہیں جس میں دوسرے کسی سال کی نسبت بارش زیادہ ہوتی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے بارش میں کمی بیشی کرتا ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے ان کے درمیان پھیر پھیر کر بھیجا، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

② فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ : دوسری بات یہ کہ آسمانوں سے برسنے والا پانی اللہ کے حکم سے مختلف صورتوں میں زمین پر ٹھہر جاتا ہے۔ اس میں سے کچھ چشموں کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے، کچھ زیر زمین محفوظ ہو جاتا ہے، جسے لوگ کنوؤں وغیرہ کی صورت میں نکال کر استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ﴾

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾

**پھر ہم نے تمھارے لیے اس کے ساتھ کھجوروں اور انگوروں کے کئی باغ پیدا کیے، تمھارے لیے ان میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور انھی سے تم کھاتے ہو ﴿۱۹﴾**

[ الزمر : ۲۱ ] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر اسے چشموں کی صورت زمین میں چلایا۔'' اور کچھ پانی ندی نالوں اور دریاؤں کی صورت اختیار کر جاتا ہے جس سے لوگ اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں، خود پیتے ہیں، غسل کرتے ہیں، کپڑے وغیرہ دھوتے ہیں، جانوروں کو پلاتے ہیں، کھیتیاں اور باغات سیراب کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا﴾ [ الرعد : ۱۷ ] ''اس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو کئی نالے اپنی اپنی وسعت کے مطابق بہ نکلے۔'' اور بارش کا کچھ پانی سمندر کی صورت میں ذخیرہ ہو جاتا ہے، جو دوبارہ بارش کا اور انسان کے بے شمار منافع وفوائد کا ذریعہ بنتا ہے۔

③ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ : تیسری بات یہ کہ جس طرح ہم نے پانی اتارا ہے اسے لے جا بھی سکتے ہیں، پھر کون ہے جو اسے واپس لا سکے؟ ''ذَهَابٍۭ'' کی تنوین میں نکرہ کے عموم کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے کہ ''ہم اسے کسی بھی طرح لے جانے پر قادر ہیں۔'' مثلاً ہم بارش روک دیں، یا برسنے والا پانی گندا کر دیں جو پینے اور استعمال کے قابل ہی نہ رہے، یا جس طرح یہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے تو ''کُنْ'' کہہ کر اسے پھر گیس میں بدل دیں، یا زمین میں اتنا گہرا لے جائیں کہ تم نکال ہی نہ سکو، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ﴾ [ الملك : ۳۰ ] ''کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تمھارا پانی گہرا چلا جائے تو کون ہے جو تمھارے پاس بہتا ہوا پانی لائے گا؟'' یا اسے سخت نمکین بنا دیں جو پیا ہی نہ جا سکے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ؕ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَ﴾ [ الواقعة : ۶۸ تا ۷۰ ] ''پھر کیا تم نے دیکھا وہ پانی جو تم پیتے ہو؟ کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے، یا ہم ہی اتارنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے سخت نمکین بنا دیں، پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟'' یا اس میں سے وہ برکت نکال لیں جو ان لوگوں کو عطا ہوتی ہے جنھیں ہم عطا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آیت سورۂ ملک کی آیت (۳۰): ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا﴾ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ صاحب روح المعانی نے زیر تفسیر آیت کے سورۂ ملک کی آیت سے زیادہ بلیغ ہونے کی اٹھارہ وجہیں ''التقریب لتفسیر التحریر والتنویر للطاھر ابن عاشور'' سے نقل کرنے کے بعد مزید بارہ وجہیں ذکر کر کے انھیں تیس تک پہنچا دیا ہے۔ صاحب ذوق حضرات وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 19** ① فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ : پانی اتارنے کے ذکر کے بعد حیات بعد الموت پر دلالت کرنے والی چند چیزیں ذکر فرمائیں، پہلی یہ کہ ہم نے اس پانی کے ساتھ (اپنے لیے نہیں بلکہ) تمھارے لیے کئی قسم کے باغات پیدا فرمائے۔

وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور وہ درخت بھی جو طور سینا سے نکلتا ہے، تیل لے کر اگتا ہے اور کھانے والوں کے لیے ایک طرح کا سالن بھی ﴿۲۰﴾

② مِنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ : "نَخِيْلٍ" کھجور کے درخت، "اَعْنَابٍ" "عِنَبٌ" کی جمع ہے، انگور کا پھل۔ کھجور اور انگور کا خصوصاً ذکر ان کے بے شمار فوائد کی وجہ سے فرمایا، کیونکہ انھیں دوسرے تمام پھلوں پر برتری حاصل ہے، جیسا کہ فرشتوں میں جبریل اور میکال کا خصوصاً الگ ذکر کیا، فرمایا: ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ [ البقرة : ۹۸ ] "جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ کافروں کا دشمن ہے۔" اور اس لیے بھی کہ عرب میں یہ دونوں پھل زیادہ پائے جاتے ہیں۔ انگور کے پھل کے ذکر سے پہلے کھجور کے پھل کے بجائے اس کے درخت کا ذکر فرمایا، کیونکہ کھجور کا درخت پھل کے علاوہ بھی بہت سے فوائد رکھتا ہے۔ اس کا ہر حصہ کار آمد ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے شجرۂ طیبہ قرار دے کر کلمہ طیبہ کی مثال اس کے ساتھ دی ہے، فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾ [ ابراهيم : ٢٤ ] "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے ایک پاکیزہ کلمہ کی مثال کیسے بیان فرمائی (کہ وہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے۔" کھجور کے درخت کے ضمن میں وہ تمام درخت بھی آ گئے جن کے پھل پھول، پتے، چھال اور لکڑی ہر چیز کار آمد ہے۔

③ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ ...... : اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کی طرف توجہ دلانے کے لیے بار بار "لَكُمْ" کا لفظ دہرا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ تمھارے لیے ہے، ہمارے لیے نہیں، یعنی تمھارے لیے ان باغات میں کھجور کے درختوں اور انگوروں کے علاوہ بہت سے لذیذ پھل ہیں۔

④ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ : اس جملے کے جملہ اسمیہ پر عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ایک جملہ فعلیہ محذوف ہے: "أَيْ مِنْهَا (وَ هِيَ طَرِيَّةٌ) تَتَفَكَّهُوْنَ وَ مِنْهَا تَأْكُلُوْنَ" یعنی تم ان کے بعض سے تازہ ہونے کی حالت میں لذت حاصل کرتے ہو اور خشک کر کے یا رس اور روغن نکال کر بعد میں بھی اور یہی تمھاری خوراک کا ایک حصہ بنتے ہیں۔ (بقاعی) "مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ" میں یہ بھی شامل ہے کہ انھی کی آمدنی سے سارا سال تمھارے کھانے پینے اور دوسری ضروریات زندگی کا بند و بست ہوتا ہے۔

آیت 20 ① وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ : طُور ایک مخصوص پہاڑ کا نام ہے۔ طُور کا معنی پہاڑ بھی ہے۔ بعض نے کہا کہ طُور وہ پہاڑ ہے جس پر درخت اگتے ہوں۔ سیناء اس پہاڑ کا نام ہے، جیسا کہ جبلِ احد کہتے ہیں، یا "جَبَلَا طَيِّءٍ" (بنو طے کے دو پہاڑ) کہتے ہیں۔ امام طبری نے فرمایا: "اور ہم نے تمھارے لیے وہ درخت بھی پیدا کیا جو طُور سیناء سے نکلتا ہے، یعنی اس پہاڑ سے جس پر درخت اگتے ہیں۔ مراد زیتون کا درخت ہے۔" اعراب القرآن و بیانہ از درویش میں ہے: "سیناء ایک شبہ جزیرہ ہے، جس کی حد شمال میں بحر ابیض متوسط ہے اور مغرب میں نہر سویز اور خلیج سویز ہے اور مشرق میں فلسطین اور خلیج عقبہ ہے اور جنوب میں وہ بحر احمر میں "رأس محمد" کے پاس ختم ہوتا ہے اور سیناء ایک پہاڑ ہے جو شبہ جزیرہ سیناء میں

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾

اور بلاشبہ تمھارے لیے چوپاؤں میں یقیناً بڑی عبرت ہے، ہم تمھیں اس میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہے، پلاتے ہیں اور تمھارے لیے ان میں بہت سے فائدے ہیں اور انھی سے تم کھاتے ہو ﴿۲۱﴾

جنوب کی طرف واقع ہے اور درخت سے مراد زیتون کا درخت ہے اور اسے طور سینا ء کے ساتھ اس لیے خاص کیا گیا ہے کہ اس کا اصل وطن وہ ہے جہاں سے وہ دوسرے مقامات پر منتقل ہوا۔'' کھجور اور انگور کے بعد زیتون کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس کے کثیر فوائد کی وجہ سے فرمایا۔ شام اور فلسطین اس کا اصلی وطن ہیں اور وہاں کا زیتون بہت عمدہ ہوتا ہے۔ شام میں زیتون اتنی کثرت سے ہے کہ گھروں، کھیتوں اور سڑکوں کے کناروں وغیرہ پر خود بخود اگا ہوا ملتا ہے۔ اس درخت کی عمر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے: ''یہ ڈیڑھ دو ہزار برس تک چلتا ہے، حتیٰ کہ فلسطین کے بعض درختوں کا قد و قامت اور پھیلاؤ دیکھ کر اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے اب تک چلے آ رہے ہیں۔'' (واللہ اعلم)

سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے اسے شجرۂ مبارکہ قرار دیا ہے، اس کے تیل کی تعریف میں فرمایا: ﴿ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴾ [ النور : ۳۵ ] ''اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہو جائے، خواہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو۔'' اور سورۃ التین میں اس کی قسم کھائی ہے۔

② تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ : زیتون میں اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی قدرت کا کمال دیکھیے کہ پانی سے سیراب ہوتا ہے اور اپنے ہمراہ تیل کا خزانہ اور کھانے والوں کے لیے ایک طرح کا سالن لے کر اگتا ہے۔ ''صِبْغٍ'' نکرہ ہے، اس لیے ترجمہ ''ایک طرح کا سالن'' کیا گیا ہے، کیونکہ سالن بے شمار ہیں اور اس سے عمدہ اور لذیذ بھی ہیں۔ (بقاعی) اس کا تیل کھانا پکانے، سالن کے طور پر کھانے، جسم پر لگانے اور دوسری ضروریات میں کام آتا ہے اور اس کا پھل اچار کی صورت میں بھی کھانے کے کام آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كُلُوا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوْا بِهِ فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ )) [ ترمذي، الأطعمة، باب ما جاء في أكل الزيت : ۱۸۵۱۔ صححه الألباني في الصحيحة : ۳۷۹ ] ''زیتون کھاؤ اور اس کا تیل استعمال کرو، کیونکہ یہ ایک مبارک درخت سے ہے۔'' ابن حبان نے فرمایا: ''کھجور، انگور اور زیتون کا خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا: ''لِأَنَّهَا أَكْرَمُ الشَّجَرِ وَ أَجْمَعُهَا لِلْمُنَافِعِ'' ''کیونکہ یہ تمام درختوں سے زیادہ عمدہ ہیں اور سب سے زیادہ فوائد کے جامع ہیں۔'' [ البحر المحيط ]

③ اگرچہ یہاں صرف زیتون کا ذکر کیا گیا ہے، مگر اس کے ضمن میں وہ تمام درخت اور پودے بھی آ گئے جن سے انسان اپنی روغنیات کی ضرورت حاصل کرتا ہے اور جنھیں کھانے کے لازمہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

**آیت 21** ① وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً : پچھلی آیات میں پانی کے ساتھ پیدا ہونے والی نباتات کا ذکر فرمایا، جس میں موت کے بعد زندگی کی دلیل اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاد دہانی ہے۔ اب موت کے بعد زندگی کا یقین دلانے کے

۲۲ع وَ عَلَيۡهَا وَ عَلَى الۡفُلۡكِ تُحۡمَلُوۡنَ ﴿۲۲﴾ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۳﴾

اور انھی پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو ﴿۲۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی بھی معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۲۳﴾

لیے اور اپنی نعمتوں اور قدرتوں کا احساس دلانے کے لیے نباتات سے اعلیٰ درجے کی زندگی والی مخلوق کا ذکر فرمایا، جو روح رکھنے والے چوپائے ہیں۔ "لَعِبۡرَةً" میں تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ "بڑی عبرت" کیا ہے۔

② نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِيۡ بُطُوۡنِهَا : اس کی تفصیل سورۂ نحل (۶۶) میں دیکھیے۔

③ وَ لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ كَثِيۡرَةٌ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۲)، سورۂ نحل (۵ تا ۸، ۶۶، ۸۰)، سورۂ حج (۲۷، ۲۸، ۳۲، ۳۳، ۳۶، ۳۷) اور سورۂ مومن (۷۹)۔

④ وَ مِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ : یعنی تم ان کا گوشت کھاتے ہو اور وہ چوپائے خرید و فروخت کے ذریعے سے تمھارے کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی اشیاء حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

آیت 22 ﴿ وَ عَلَيۡهَا وَ عَلَى الۡفُلۡكِ تُحۡمَلُوۡنَ : "عَلَيۡهَا" (ان پر) سے مراد اونٹ ہیں، جو صحرا کے جہاز ہیں۔ عرب میں سواری اور بار برداری کے لیے زیادہ تر اونٹ ہی استعمال ہوتے تھے اور اونٹوں کے لیے "خشکی کے جہاز" کا استعارہ قدیم زمانے سے معروف ہے۔ ذوالرُّمّہ شاعر اپنی اونٹنی کے متعلق کہتا ہے ؎

طُرُوۡقًا وَجُلۡبُ الرَّحۡلِ مَشۡدُوۡدَةٌ بِهَا سَفِيۡنَةُ بَرٍّ تَحۡتَ خَدِّيۡ زِمَامُهَا

"رات کا وقت تھا اور "جُلۡبُ الرَّحۡلِ" (پالان کی لکڑیوں) کے ساتھ خشکی کا جہاز بندھا ہوا تھا، جس کی مہار میرے رخسار کے نیچے تھی۔" (اضواء البیان)

خشکی کے جہازوں کی مناسبت سے بحری جہازوں کی نعمت کا ذکر بھی فرما دیا ہے۔ "سوار ہوتے ہو" کے بجائے "سوار کیے جاتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ (اور ہاتھی) جیسے عظیم الجثہ جانوروں پر سوار ہونا اور انھیں اپنا تابع فرمان بنانا تمھارے بس کی بات نہیں، بلکہ ان پر سوار کرنا اور انھیں تمھارے تابع فرمان بنا دینا ہمارا کام ہے، یقین نہ ہو تو ان سے بدر جہا چھوٹے جانوروں، مثلاً ہرن، بھیڑیے، لومڑی، گیدڑ اور چیتے وغیرہ کو ان کی طرح مانوس کر کے دکھاؤ۔ اسی طرح ہماری عظیم الشان مخلوق سمندر کہ جس کے مقابلے میں تم اتنے بھی نہیں جتنا صحرا کے مقابلے میں ریت کا ذرہ، اس پر سوار ہونا اور اس کا تمھیں اپنے سینے پر اٹھائے رکھنا تمھارے بس کی بات نہیں، یہ تو ہم ہیں جو تمھیں کشتیوں میں سوار کر کے اسے تمھارے تابع کر دیتے ہیں، اگر یقین نہ ہو تو ان طوفانوں کو یاد کرو جن کی بلاخیزی سے پہاڑوں جیسے جہاز آنکھ جھپکنے میں اس کی آغوش میں ڈوب جاتے ہیں۔

آیت 23 ﴿ ① وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ : توحید و قیامت کے دلائل اور اپنی عظیم الشان نعمتوں کا ذکر کرنے کے

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ

تو اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ نہیں ہے مگر تمھارے جیسا ایک بشر، جو چاہتا ہے کہ تم پر

بعد ان کا انکار کرنے والی اور رسولوں کو جھٹلانے والی قوموں کے انجام بد کا اور اپنے رسولوں کی نصرت کا ذکر فرمایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر فرمایا، کیونکہ زمین والوں کی طرف سب سے پہلے رسول وہی تھے اور نعمتوں کے تذکرے سے بات کا رخ نوح علیہ السلام کی طرف نہایت خوب صورت طریقے سے موڑا کہ آخری نعمت جو ذکر فرمائی وہ انسانوں کو کشتیوں پر سوار کرنا تھی اور سب سے پہلے کشتی کے سوار نوح علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی تھے، بعد میں تمام کشتیاں اسی کی طرز پر بنیں۔ (دیکھیے سورۂ یٰس : ۴۱ تا ۴۴) اس لیے کشتیوں کے بعد ان کا ذکر فرمایا۔

② انعامات اور دلائل توحید بیان کرنے کے بعد آگے انبیاء اور ان قوموں کے حالات بیان فرمائے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں غور و فکر کے بجائے احسان فراموشی اور تکبر سے کام لیا، تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا۔ اس میں قریش اور دوسرے تمام کفار کو ڈرانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے۔ قرآن میں عموماً " آلَاءُ اللّٰهِ " (اللہ کی نعمتوں) کے بعد " أَيَّامُ اللّٰهِ " کا بیان ہوتا ہے، تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

③ " اِلٰى قَوْمِهٖ " سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، یہ الگ بات ہے کہ اس وقت موجود ہی ان کی قوم تھی۔ تمام انسانوں اور جنوں کی طرف مبعوث ہونا صرف ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔

④ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ : " يٰقَوْمِ " اصل میں " يَا قَوْمِيْ " ہے " اے میری قوم! " کتنی محبت اور نرمی سے خطاب فرمایا ہے، پھر فرمایا: " اللہ کی عبادت کرو۔ " ہر پیغمبر کی دعوت یہی رہی ہے۔ (دیکھیے سورۂ انبیاء : ۲۵) نوح علیہ السلام کے واقعات کے لیے سورۂ اعراف (۵۹ تا ۶۴)، یونس (۷۱ تا ۷۳)، بنی اسرائیل (۳) اور سورۂ انبیاء (۷۶، ۷۷) بھی ملاحظہ فرمائیں۔

⑤ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ : " مِنْ " کے ساتھ معبودوں کے عموم کی تاکید ہے، اس لیے ترجمہ ہوگا " اس کے سوا تمھارا کوئی بھی معبود نہیں۔ " یہ جملہ " اعْبُدُوا اللّٰهَ " کی علت ہے، یعنی اللہ کی عبادت کرو، کیونکہ اس کے سوا تمھارا کوئی بھی معبود نہیں۔ جب اور کوئی بھی معبود نہیں تو عبادت کیسی؟

⑥ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ : یعنی کیا اللہ کے ساتھ شریک بناتے ہوئے تم اس سے اور اس کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

**آیت 24** ① فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ : معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے واضح طور پر الگ الگ قبیلے تھے اور نوح علیہ السلام کا اپنا قبیلہ انکار میں پیش پیش تھا۔ اس لیے انکار اور اعتراض کے اپنوں کی طرف سے ہونے کی شناعت کو واضح کرنے کے لیے " مِنْ قَوْمِهٖ " فرمایا۔ (بقاعی) اس میں ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے، کیونکہ آپ کی سخت ترین مخالفت آپ کے قریب ترین رشتہ دار ابولہب نے کی۔ (دیکھیے سورۂ لہب) ایک شاعر نے کہا ؎

وَ ظُلْمُ ذَوِي الْقُرْبٰى أَشَدُّ مَضَاضَةً عَلَى الْمَرْءِ مِنْ وَقْعِ الْحُسَامِ الْمُهَنَّدِ

" اور قرابت والوں کا ظلم تکلیف میں آدمی پر ہندی تلوار لگنے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ "

عَلَيْكُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚ﴿۲۴﴾

برتری حاصل کر لے اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور کوئی فرشتے اتار دیتا، ہم نے یہ اپنے پہلے باپ دادا میں نہیں سنا ﴿۲۴﴾

② مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ : مفسر رازی نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے پانچ شبہات ذکر فرمائے، مگر جواب کسی کا نہیں دیا، کیونکہ معمولی سے غور کے ساتھ ان کا بے کار ہونا سمجھ میں آ جاتا ہے۔“ ان کا پہلا شبہ یہ تھا کہ یہ تو تمھارے جیسا بشر ہے۔ بقاعی نے فرمایا: ”انھوں نے کسی انسان کا نبی ہونا نہیں مانا تو لازم تھا کہ کسی مٹی کا انسان ہونا بھی نہ مانتے، پانی کے کسی قطرے کا علقہ ہونا اور خون کی کسی پھٹکی کا مضغہ ہونا بھی نہ مانتے......۔“ ابن جزیّ نے التسہیل میں فرمایا: ”کس قدر تعجب ہے کہ انھوں نے بشر کے رسول ہونے کو نہیں مانا، مگر پتھر کے رب ہونے کو مان لیا۔“ مشرک کی عقل ایسی ہی ہوتی ہے، ہمارے زمانے کے بعض لوگ جو جدّی پشتی مسلمان ہیں، آبا و اجداد سے سن کر محمد ﷺ کو نبی مانتے ہیں مگر بشر نہیں مانتے۔ پہلے لوگوں کا کہنا تھا کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا اور ان کا کہنا ہے کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔ قرآن نے بشر کے رسول نہ ہونے یا رسول کے بشر نہ ہونے کا بار بار رد فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۶۳ تا ۶۹)، یونس (۲)، ہود (۲۷ تا ۳۱)، یوسف (۱۰۹)، رعد (۳۸)، ابراہیم (۱۰، ۱۱)، نحل (۴۳)، بنی اسرائیل (۹۴، ۹۵)، کہف (۱۱۰)، انبیاء (۳)، مومنون (۳۳، ۳۴، ۴۷)، فرقان (۷ تا ۲۰)، شعراء (۱۵۴، ۱۸۶) اور سورۂ یٰس (۱۵)۔

③ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ : یہ دوسرا شبہ ہے جو کافر سرداروں نے انبیاء کو عوام میں بے وقعت بنانے کے لیے پیش کیا کہ یہ تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اکثر کفار نے اپنے اپنے انبیاء کے بارے میں یہی بات کہی کہ یہ اقتدار کے بھوکے ہیں۔ فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو یہ طعنہ دیا تھا: ﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ﴾ [ یونس : ۷۸ ] ”انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اس سرزمین میں تم دونوں ہی کو بڑائی مل جائے؟“ گویا سرداری اور برتری ان مشرکوں ہی کا مادری و پدری ورثہ ہے، یہ کسی اور کا حق نہیں۔ جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ اگر رسول اپنے منصب کی وجہ سے برتری چاہتے ہیں تو برتری کا حاصل ہونا ان کا حق ہے، تاکہ کسی کو ان کے اتباع میں عار نہ ہو اور اگر وہ تکبر اور فخر و غرور کے لیے برتری چاہتے ہیں تو یہ ان پر بہتان ہے، کیونکہ ان سے بڑھ کر کوئی متواضع نہیں ہوتا۔

④ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً : یہ تیسرا اعتراض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو مانتے تھے، مگر اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ نوح علیہ السلام کی طرف سے ایک اللہ کی عبادت کا حکم سن کر بہانہ گھڑا کہ اگر اللہ چاہتا کہ کوئی رسول بھیجے تو وہ انسان کے بجائے کوئی فرشتے بھیج دیتا۔ یہ بھی درحقیقت بشر کی نبوت سے انکار ہے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ مالک مرضی والا ہے، وہ جسے چاہے، جس کام کے لیے چاہے چن لیتا ہے۔ وہ مالک ہی کیا ہوا جو تمھارے چاہنے کا پابند ہو۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾

یہ نہیں ہے مگر ایک آدمی، جسے ایک جنون ہے، سو ایک وقت تک اس کے بارے میں انتظار کرو ﴿۲۵﴾ اس نے کہا اے میرے رب! میری مدد کر، اس لیے کہ انھوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے ﴿۲۶﴾

⑤ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ : یہ چوتھا اعتراض ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام سے پہلے جاہلیت کا طویل عرصہ گزرا تھا۔ پہلی تینوں باتوں میں نوح علیہ السلام کے رسول ہونے کا انکار تھا اور یہ اس دعوت کا انکار ہے جو نوح علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنے کی بات ہم نے نہیں سنی اور نہ یہ سنا ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے یا سفارشی بنانے کے لیے بھی کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ کفار کے سرداروں کی یہ بات بھی اس لیے جواب کے قابل نہیں کہ اس کی بنیاد تقلید ہے، جب کہ تقلید سراسر جہل ہے اور جاہلوں کا جواب خاموشی اور سلام متارکہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ [ الفرقان : ٦٣ ] ''اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔'' (دیکھیے بقرہ: ۱۷۰) بھلا بتاؤ اس سے بڑی جہالت کیا ہوگی کہ جو چیز ہم نے سنی نہیں وہ ہے ہی نہیں؟

**آیت 25** ① اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ : ''جِنَّةٌ'' جنون، دیوانگی۔ ان کی پانچویں بات یہ بہتان ہے جو انھوں نے لگایا، یعنی اس کا یہ کہنا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے رسول بنایا ہے، پھر وہ بات کہنا جو ہم نے کبھی سنی ہی نہیں کہ بتوں کی عبادت مت کرو، صرف اللہ کی عبادت کرو اور دن رات اسی کی تبلیغ میں لگے رہنا، نہ کاروبار کا خیال، نہ پوری قوم کی مخالفت کی پروا، درحقیقت اسے ایک جنون لاحق ہے، دیوانگی ہے جو اس سے یہ سب کچھ کرواتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی نظر میں کافر جو کچھ کرتا ہے سراسر دیوانگی ہے کہ ساری جد و جہد چند روزہ زندگی کے لیے کرتا ہے، ہمیشہ کی زندگی کی اسے فکر ہی نہیں اور پیدا کرنے والے کے ساتھ ان لوگوں کو پکارتا اور ان کی عبادت کرتا ہے جنھوں نے نہ کچھ پیدا کیا اور نہ وہ کچھ اختیار رکھتے ہیں۔ اسی طرح کافر کی نظر میں مومن کے کام دیوانگی ہیں کہ نقد کو چھوڑ کر ادھار کے پیچھے پڑا ہے، نظر نہ آنے والے رب سے ڈر کر اپنی محبوب خواہشیں ترک کیے ہوئے ہے۔ ''جِنَّةٌ'' میں تنوین تنکیر کی ہے، یعنی اسے ایک قسم کا جنون لاحق ہے۔ مکمل پاگل کہنے کے بجائے کچھ جنون کہا، تاکہ ہر شخص انھیں جھٹلا نہ دے کہ بھلا اتنا کامل عقل والا شخص دیوانہ ہو سکتا ہے؟ ابن جزی فرماتے ہیں: ''ان کی باتوں کا باہمی تضاد دیکھیے، ابھی کہہ رہے تھے کہ یہ شخص (اتنی صلاحیتوں کا مالک ہے کہ) تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے اور ابھی کہتے ہیں کچھ دیوانگی میں مبتلا ہے۔''

② فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ : یعنی اس کے متعلق کچھ مدت انتظار کرو، حتیٰ کہ یہ زمانے کے کسی چکر کی لپیٹ میں آ جائے، یا فوت ہو جائے اور تمھاری جان چھوٹ جائے۔

**آیت 26** قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ : درحقیقت یہ قوم پر عذاب کی دعا ہے۔ نوح علیہ السلام نے یہ بددعا کب کی اور کن الفاظ میں کی، اس کے لیے دیکھیے سورۂ قمر (۹، ۱۰)، سورۂ شعراء (۱۱۷، ۱۱۸) اور سورۂ نوح (۲۶، ۲۷)۔

فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾

تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا، پھر جب ہمارا حکم آجائے اور تنور ابل پڑے تو ہر چیز میں سے دو قسمیں (نر و مادہ) دونوں کو اور اپنے گھر والوں کو اس میں داخل کر لے، مگر ان میں سے وہ جس پر پہلے بات طے ہو چکی اور مجھ سے ان کے بارے میں بات نہ کرنا جنھوں نے ظلم کیا ہے، وہ یقیناً غرق کیے جانے والے ہیں ﴿۲۷﴾ پھر جب تو اور جو تیرے ساتھ ہیں، کشتی پر چڑھ جاؤ تو کہہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی ﴿۲۸﴾

**آیت 27** فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ ...... : اس آیت کی تفسیر سورۂ ہود (۳۷) میں دیکھیں۔

**آیت 28** ① فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ ...... : کشتی پر سوار ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد کا حکم دیا اور اس کے الفاظ خود بتائے، جیسے آدم علیہ السلام کو خود دعا سکھائی اور جیسے قیامت کے دن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حمد سکھائیں گے۔ دوسری جگہ چوپاؤں اور کشتیوں کے متعلق فرمایا: ﴿وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ [ الزخرف : ۱۲ تا ۱٤ ] ”اور تمھارے لیے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو، پھر اپنے رب کی نعمت یاد کرو، جب ان پر جم کر بیٹھ جاؤ اور کہو پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے تابع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہیں تھے۔ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہو کر یہ دعا پڑھتے تھے: « اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ وَ إِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ، اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَ مِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَ كَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَ سُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ » ”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کر دیا، حالانکہ ہم اسے ملنے والے نہیں تھے اور یقیناً ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم اپنے اس سفر میں تجھ سے نیکی اور تقویٰ کا سوال کرتے ہیں اور اس عمل کا جسے تو پسند کرے سوال کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہمارا یہ سفر ہم پر آسان فرما دے اور ہم سے اس کی

وَ قُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

**اور تو کہہ اے میرے رب! مجھے اتار، ایسا اتارنا جو بابرکت ہو اور تو سب اتارنے والوں سے بہتر ہے ﴿۲۹﴾**

دوری کم کر دے۔ اے اللہ! تو ہی سفر میں ساتھی اور گھر والوں میں نائب ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے سفر کی مشقت سے اور مال اور اہل میں منظر کے غم سے اور ناکام لوٹنے کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔'' اور جب رسول اللہ ﷺ سفر سے واپس آتے تو یہی دعا پڑھتے، البتہ یہ الفاظ زیادہ کہتے: (( آئِبُوْنَ، تَائِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ )) [ مسلم، الحج، باب استحباب الذكر إذا ركب ...... : ۱۳٤۲ ] ''ہم واپس لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے اور اپنے رب ہی کی حمد کرنے والے ہیں۔'' نوح علیہ السلام کو سوار ہو کر یہ دعا پڑھنے کا حکم ہوا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۲۸ ] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی۔'' اور انھوں نے یہ کہہ کر ساتھیوں کو کشتی میں سوار ہونے کا حکم دیا: ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ هود : ٤١ ] ''اللہ کے نام کے ساتھ اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا رب یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

② فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا ...... : ''الظّٰلِمِيْنَ'' سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے۔ ظلم کا معنی ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' (کسی چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ کہیں رکھنا) ہے اور ظلم کا معنی اندھیرا بھی ہے، گویا ظالم اندھیرے میں چیزوں کو ان کے اصل محل کے بجائے ادھر ادھر رکھ دیتا ہے۔ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے، وہ غیر کو دیا تو یہ سب سے بڑا ظلم ٹھہرا۔ (ابن عاشور)

③ ظالم لوگوں سے نجات پر اللہ کی حمد کا حکم اس لیے دیا کہ وہ نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بے شمار اذیتوں کا نشانہ بناتے تھے، اس کے علاوہ نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا ان میں رہنا، ان کے کفر و شرک اور گندے اور غلیظ کاموں کو دیکھنا بجائے خود شدید تکلیف دہ تھا۔ اب ان سے نجات ملی، دشمن غرق ہوئے، الگ رہنے کی جگہ ملی، اپنا ماحول اور اپنی مجلس بنی، تو اس پر شکر ادا کرنے کا حکم ہوا۔

④ اسی لیے مسلمان کو دعوت یا جہاد کے مقصد کے بغیر کفار میں رہائش رکھنا حرام ہے، کیونکہ مسلسل کفر و شرک اور بدکاری و بے حیائی کا ارتکاب دیکھ دیکھ کر یا تو ہمیشہ شدید تکلیف میں رہے گا، یا اس کی اپنی غیرت و حمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اگر ایسی جگہ رہتا ہے تو وہاں سے ہجرت کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَنَا بَرِيْءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيْمُ بَيْنَ أَظْهُرِ الْمُشْرِكِيْنَ )) [ أبوداوٗد، الجهاد، باب النهي عن قتل ...... : ۲٦٤٥ ] ''میں ہر اس مسلم سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہتا ہے۔''

**آیت 29** ① وَ قُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا : یہ نوح علیہ السلام کو سکھائی گئی دعا کا دوسرا حصہ ہے۔ ''مُنْزَلًا'' باب افعال میں سے مصدر میمی بھی ہے اور ظرف بھی، اتارنا اور اتارنے کی جگہ، یعنی اے میرے پروردگار! تو مجھے اتار، ایسا اتارنا جو بابرکت ہو اور ایسی جگہ اتار جو بہت برکت والی ہو۔ بابرکت اتارنے سے مراد یہ ہے کہ سوار ہوتے وقت کوئی تکلیف نہ ہو اور

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ ﴿۳۰﴾

بلاشبہ اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں اور بلاشبہ یقیناً ہم ہمیشہ سے آزمانے والے ہیں ﴿۳۰﴾

جہاں اتریں وہاں کوئی آفت نہ آئے، ہر حال میں اور ہر جگہ بڑی رحمت و برکت شامل رہے۔ ہمارے نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی: ﴿ وَ قُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۸۰ ] ''اور کہہ اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور میرے لیے اپنی طرف سے ایسا غلبہ بنا جو مددگار ہو۔'' یہ دونوں دعائیں خود اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی ہیں جنھیں ''قُلْ'' کہہ کر پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں، ان دونوں دعاؤں کو وردِ زبان رکھنا چاہیے، خصوصاً گھر جاتے اور گھر سے نکلتے وقت اور یہ دعائیں کرتے ہوئے دنیا کی باعزت اور بابرکت منزل کے ساتھ ہماری اصل منزل جنت کی نیت بھی رکھنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں وہ باعزت اور بابرکت مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

② وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ : اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو اوپر ترجمے میں ہے اور ایک وہ ہے جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: ﴿ وَ اَنَا خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ ﴾ [ یوسف : ۵۹ ] ''اور میں بہترین مہمان ٹھہرانے والا (میزبان) ہوں۔'' یعنی کشتی سے اترنے کے بعد تو ہی ہماری مہمان نوازی اور ہماری ضروریات کا بندوبست کرنے والا ہے اور تجھ سے بہتر مہمان نواز کوئی نہیں۔

آیت 30 ① اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ : نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کرنے کے بعد اس سے حاصل ہونے والی عبرتوں کی طرف توجہ دلائی کہ یقیناً اس واقعہ میں بہت سی نشانیاں ہیں، مثلاً اس میں نوح علیہ السلام کے اولو العزم پیغمبر ہونے کی کئی نشانیاں ہیں، یعنی مدت دراز تک ان کا بے مثال صبر، قوم کے ایمان نہ لانے کی اطلاع پر ان پر بددعا کا قبول ہونا، ان کے دشمنوں کا غرق ہونا، اللہ تعالیٰ کا ان کی رسالت کی تصدیق کرنا اور ان کی تعریف کرنا وغیرہ۔ نوح علیہ السلام کی قوم جیسی رسولوں کو جھٹلانے والی دیگر قوموں کے لیے بھی کئی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح اللہ کی عظیم قدرت کی بھی بہت سی نشانیاں ہیں، مثلاً اتنا عظیم طوفان جس سے پہاڑ بھی نہ بچا سکیں اور اس میں نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو محفوظ رکھ کر بابرکت طریقے سے اتار کر بابرکت جگہ دینا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کامل علم و حکمت کی بھی بہت سی نشانیاں ہیں کہ اس نے کس طرح زمین کو مکمل طور پر شرک سے پاک کرنا طے کر رکھا تھا اور اتنے تباہ کن طوفان میں بھی اس نے انسانی ضروریات اور جانوروں کی بقا کا انتظام طے کر رکھا تھا اور کیا۔ (ابن عاشور)

② وَ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ : ''اِنْ'' اصل میں ''اِنَّ'' ہے، جس کا اسم ''نَا'' محذوف ہے۔ دلیل ''لَمُبْتَلِیْنَ'' پر آنے والا لام ہے۔ ''کَانَ'' استمرار کے لیے ہے، یعنی بلاشبہ یقیناً ہم ہمیشہ سے آزمانے والے ہیں۔ ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی آزمائش کی، اسی طرح ہم ہر پیغمبر اور اس کی امت کی آزمائش کرتے چلے آئے ہیں اور اب بھی آزمائش کرتے رہتے ہیں۔ اس میں ہماری حکمت کھرے کھوٹے کو ظاہر کرنا، آزمائش میں کامیاب ہونے والوں کو نوازنا اور ناکام رہنے والوں کے ساتھ ان کے حسب حال سلوک کرنا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ۙ

پھر ان کے بعد ہم نے اور زمانے کے لوگ پیدا کیے ﴿۳۱﴾ پھر ان میں انھی سے ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۳۲﴾ اور اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہم نے انھیں دنیا کی زندگی میں خوش حال رکھا تھا، کہا یہ نہیں ہے مگر تمھارے جیسا ایک بشر، جو اس میں سے کھاتا ہے جس میں سے تم کھاتے ہو اور اس میں سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو ﴿۳۳﴾

**آیت 31** ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ: اس سے مراد اکثر مفسرین نے قومِ عاد لی ہے، کیونکہ قومِ نوح کے جانشین یہی لوگ بنے تھے۔ ہود علیہ السلام نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ﴾ [ الأعراف : ٦٩ ] ''اور یاد کرو جب اللہ نے تمھیں قومِ نوح کا جانشین بنایا۔'' مگر بہت سے مفسرین نے اس سے مراد صالح علیہ السلام کی قوم ثمود لی ہے، کیونکہ یہاں ''الصَّيْحَةُ'' (چیخ) کا ذکر ہے اور ''صیحہ'' یعنی چیخ سے ہلاک ہونے والے ثمود تھے۔ اس کے علاوہ اہل عرب کی نصیحت کے لیے قوم ثمود کا تذکرہ زیادہ موزوں تھا، کیونکہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے بنائے ہوئے مکانات مقام حجر میں ان کے سامنے موجود تھے۔ امام طبری، ابن عاشور اور مفسر سعدی وغیرہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کسی قوم کا نام نہیں لیا، کیونکہ مراد تاریخ کا بیان یا قصہ گوئی نہیں بلکہ عبرت ہے کہ بعد میں آنے والوں نے بھی پہلوں کے انجام سے کوئی سبق حاصل نہ کیا، آخر اللہ کی گرفت کا نشانہ بنے۔



**آیت 32** فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ...... : اس آیت کی تفسیر اسی سورت کی آیات (۲۳، ۲۴) میں گزر چکی ہے۔

**آیت 33** ① وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : اس آیت میں ان کے سرداروں کی اپنے رسول کو بشر کہہ کر جھٹلانے کی دو بڑی وجہیں بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ وہ آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور دوسری یہ کہ انھیں دنیا میں وسیع خوش حالی حاصل تھی۔ ''تَرَفٌ'' کا معنی وسیع خوش حالی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ مسلمہ میں سے حدیث کے منکر کا بھی یہی حال بیان کیا کہ اس کے انکار میں اس کی خوش حالی اور فارغ البالی کا دخل ہوگا۔ مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَلَا إِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ، أَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی أَرِيْكَتِهِ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ، أَلَا، لَا يَحِلُّ

وَ لَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور بلاشبہ اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کا کہنا مان لیا تو یقیناً تم اس وقت ضرور خسارہ اٹھانے والے ہو گے ﴿۳۴﴾ کیا یہ تمھیں وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں بن گئے تو تم نکالے جانے والے ہو ﴿۳۵﴾

لَكُمُ الْحِمَارُ الْأَهْلِيُّ وَلَا كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السَّبُعِ ﴾ [ أبوداؤد، السنة، باب في لزوم السنة...... : ٤٦٠٤ ] ''سنو! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل (حدیث) دی گئی ہے۔ سنو! قریب ہے کہ ایک بھرے ہوئے پیٹ والا (یعنی خوش حال) آدمی جو اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوگا، یہ کہے گا کہ اس قرآن کو لازم پکڑو، جو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ سنو! تمھارے لیے گھریلو گدھا حلال نہیں اور نہ کچلی والا درندہ حلال ہے (حالانکہ یہ قرآن میں نہیں بلکہ حدیث رسول میں ہے)۔''

② يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ...... : ''بشر رسول نہیں ہوسکتا'' پیغمبروں کو جھٹلانے والے سبھی لوگوں نے یہی کہا۔ ہمارے نبی ﷺ کے لیے اس میں تسلی ہے کہ آپ اس تکذیب میں اکیلے نہیں، کیونکہ آپ کے متعلق بھی کفار نے کہا تھا: ﴿ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [ الفرقان : ۷ ] ''اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔''

③ سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں پیغمبروں کی نصیحت کے بعد قوم کے سرداروں کی بات ''قَالَ الْمَلَاُ'' سے شروع ہوتی ہے، جب کہ اس سورت میں نوح علیہ السلام کی نصیحت کے بعد ''فَقَالَ الْمَلَؤُا'' ہے اور زیر تفسیر آیت میں ''وَقَالَ الْمَلَاُ'' ہے۔ اس فرق کی توجیہ ابن عاشور رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ان دونوں سورتوں یعنی اعراف اور ہود میں پیغمبروں کی نصیحت کے بعد قوم کے سرداروں کا پیغمبروں سے براہ راست خطاب ہے، اس لیے ''فاء'' یا ''واؤ'' کی ضرورت نہیں، جب کہ یہاں پیغمبروں کی نصیحت کے بعد قوم کے سرداروں کا پیغمبروں کو جواب مذکور نہیں، بلکہ اس کے بعد ان کا اپنے لوگوں کے پاس جا کر انھیں بہکانا مذکور ہے، تاکہ وہ پیغمبر کی بات سے متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے ''فاء'' اور ''واؤ'' لائی گئی ہیں۔

**آیت 34** ﴿ وَ لَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ...... : سورۂ قمر میں اسی قوم کے صالح علیہ السلام کے متعلق تحقیر سے بھرے ہوئے الفاظ ملاحظہ کریں، کہا: ﴿ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴾ [ القمر : ۲۴، ۲۵ ] ''پس انھوں نے کہا کیا ایک آدمی جو ہمیں سے ہے اکیلا، ہم اس کے پیچھے لگ جائیں؟ یقیناً ہم تو اس وقت بڑی گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے۔ کیا یہ نصیحت ہمارے درمیان میں سے اسی پر نازل کی گئی ہے؟ بلکہ وہ بہت جھوٹا ہے، متکبر ہے۔'' اپنے مال و جاہ پر مغرور سرداروں نے سرداری خطرے میں دیکھ کر دنیا اور آخرت کی ذلت قبول کر لی، مگر بے شمار نشان دیکھنے کے باوجود رسول پر ایمان لا کر تابع ہونا قبول نہ کیا۔ سرداری کی آفات میں سے یہ سب سے بڑی آفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بچائے رکھے۔

**آیت 35** ﴿ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ ...... : پچھلی آیات میں رسول کو جھٹلانے کا ذکر ہے اور اس آیت میں اس کی دعوت،

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ا۟فْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

دوری ہے، دوری ہے اس کے لیے جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو ﴿۳۶﴾ نہیں ہے یہ (زندگی) مگر ہماری اس دنیا کی زندگی، ہم (یہیں) مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ﴿۳۷﴾ یہ نہیں ہے مگر ایک آدمی، جس نے اللہ پر ایک جھوٹ گھڑ لیا ہے اور ہم ہرگز اسے ماننے والے نہیں ہیں ﴿۳۸﴾

یعنی قیامت کو جھٹلانے کا ذکر ہے۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ان کی نگاہ میں ناممکن تھا، حالانکہ پہلی دفعہ بنانے والے کے لیے دوبارہ بنانا کچھ مشکل نہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے شروع "وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ" سے لے کر نوح علیہ السلام کے ذکر تک موت کے بعد زندگی ہی کے دلائل ہیں۔

**آیت 36** هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ : "هَيْهَاتَ" اسم مبنی جامد غیر مشتق ہے۔ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ فعل ماضی "بَعُدَ" (دور ہوا) کے معنی میں ہے۔ "مَا تُوْعَدُوْنَ" اس کا فاعل ہے اور لام فاعل کے بیان اور وضاحت کے لیے ہے۔ معنی ہوگا: "دور ہے، دور ہے وہ جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔" زجاج نے اپنی تفسیر میں فرمایا اور زمخشری نے بھی اسی بات کو پسند کرنے کا اشارہ فرمایا ہے کہ یہ مصدر "بُعْدٌ" (دوری) کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ "دوری ہے، دوری ہے اس کے لیے جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔" اس صورت میں لام کا معنی سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آتی، میں نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ مٹی اور ہڈیاں ہونے کے بعد دوبارہ قبروں سے زندہ نکالے جانے کی بات میں بہت بُعد ہے۔

**آیت 37** ① اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا : "هِيَ" سے مراد "حَيَاةٌ" ہے، جو "حَيَاتُنَا" سے واضح ہو رہی ہے، یعنی مرنے کے بعد زندگی کہاں؟ زندگی ہے تو صرف یہ دنیا کی زندگی، باقی سب خیال ومحال ہے۔

② نَمُوْتُ وَ نَحْيَا : "ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں" اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مرنے کے بعد جینے کے قائل ہو گئے تھے، کیونکہ وہ اس دنیا کے سوا کسی زندگی کو مانتے ہی نہ تھے۔ اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہیں ہم مرتے جاتے ہیں اور پچھلے پیدا ہوتے رہتے ہیں، دنیا کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔

③ وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ : باء کی وجہ سے نفی میں تاکید پیدا ہوگئی، اس لیے ترجمہ ہے "اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں۔" اگرچہ ان سرداروں کی پچھلی تمام باتوں کا مطلب بھی رسول اور قیامت کو جھٹلانا تھا، پھر بھی کوئی کمی باقی تھی تو انھوں نے نہایت تاکید کے ساتھ صاف لفظوں میں قیامت کا انکار کر کے اور رسول کو مفتری کہہ کر پوری کر دی، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

**آیت 38** اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ا۟فْتَرٰى ...... : یعنی یہ "رَجُلٌ" (آدمی) ہو کر جو رسالت کا دعویٰ کرتا ہے اور مرنے کے بعد زندگی سے ڈراتا ہے، تو محض اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے، یا یہ کہ یہ صرف ایک آدمی ہے جو......۔ "بِمُؤْمِنِيْنَ" پر باء بھی نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ میں لفظ "ہرگز" کا اضافہ کیا ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝٣٩ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝٤٠ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٤١ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝٤٢ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝٤٣ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝٤٤

اس نے کہا اے میرے رب! میری مدد کر، اس کے بدلے کہ انھوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے ۝٣٩ فرمایا بہت ہی کم مدت میں یہ ضرور پشیمان ہو جائیں گے ۝٤٠ تو انھیں چیخ نے حق کے ساتھ آ پکڑا۔ پس ہم نے انھیں کوڑا کرکٹ بنا دیا۔ سو ظالم لوگوں کے لیے دوری ہو ۝٤١ پھر ان کے بعد ہم نے کئی اور زمانوں کے لوگ پیدا کیے ۝٤٢ کوئی امت اپنے وقت سے نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ وہ پیچھے رہتے ہیں ۝٤٣ پھر ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا انھوں نے اسے جھٹلا دیا، تو ہم نے ان کے بعض کو بعض کے پیچھے چلتا کیا اور انھیں کہانیاں بنا دیا۔ سو دوری ہو ان لوگوں کے لیے جو ایمان نہیں لاتے ۝٤٤

**آیت 39** ﴿ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴾ : ” كَذَّبُوْنِ “ اصل میں ” كَذَّبُوْنِيْ “ ہے، نون کا کسرہ اس کی دلیل ہے۔

**آیت 40** ﴿ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴾ : ” قَلِيْلٍ “ کا معنی بہت کم ہے، اس کی قلت کی مزید تاکید کے لیے ” عَنْ “ کے ساتھ ” مَا “ کا اضافہ فرمایا ہے، یعنی بہت ہی کم مدت میں۔ (بقاعی)

**آیت 41** ﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ ﴾ : یعنی جو سزا انھیں دی گئی تھی وہ عین عدل و انصاف کے مطابق تھی، ان پر کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ بعض نے ” فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ “ کا ترجمہ یہ کیا ہے: ”آخر سچے وعدے کے مطابق ایک چیخ نے انھیں آ دبوچا۔“ یعنی وہ وعدہ جو ” عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ “ کے ضمن میں پایا جاتا ہے۔ ” اَلْحَقُّ “ سے مراد قطعی امر بھی ہو سکتا ہے، جسے کوئی روک نہ سکتا ہو۔ (روح)

**آیت 42** ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴾ : یعنی قوم ثمود کے بعد ہم نے کئی اور دور پیدا کیے۔ (طبری)

**آیت 43** ﴿ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا ...... ﴾ : یعنی کسی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے زندگی کی جو مدت مقرر کر دی ہے وہ دنیا میں نہ اس سے کم ٹھہرتی ہے نہ زیادہ۔ طبری نے فرمایا: ”یہ ہمارے نبی محمد ﷺ کی قوم کے مشرکوں کے لیے وعید ہے اور انھیں آگاہ کرنا ہے کہ ان کے کفر و شرک اور رسول کو جھٹلانے کے باوجود انھیں جو مہلت دی جا رہی ہے وہ اس لیے ہے کہ وہ اپنی مقرر کردہ مدت کو پہنچ جائیں، پھر ان پر اس کی گرفت آئے گی، جیسا کہ پہلی امتوں کے ساتھ ہوا۔“

**آیت 44** ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ...... ﴾ : ” تَتْرَا “ ” دَعْوٰى “ اور ” سَلْوٰى “ (فَعْلٰى) کے وزن پر مصدر ہے، جو ” رُسُلَنَا “

# ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۬ۙ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾

پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی آیات اور واضح غلبہ دے کر بھیجا (۴۵)

سے حال ہے۔ ”تَتْرَا“ اصل میں ” وَتَرٰی“ ہے۔ واؤ کو تاء سے بدل دیا، جس طرح ”تَقْوٰی“ میں تاء واؤ کی جگہ آئی ہے۔ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی ”مُتَوَاتِرِيْنَ“ یعنی پھر ہم نے اپنے کئی رسول پے در پے بھیجے، مگر ان کی قوموں نے پہلی امتوں کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہ کی اور ہر امت اپنے رسول کے آنے پر اسے جھٹلاتی رہی، تو ہم نے بھی یکے بعد دیگرے ان کی ہلاکت کا تانتا باندھ دیا اور انھیں ایسا نیست و نابود کیا کہ قصے کہانیوں کے سوا ان کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

**آیت 45** ① ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ...... : ”ثُمَّ“ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پیغمبروں کے لمبے وقفے کے بعد مبعوث ہوئے۔ فرعون اور اس کی قوم اپنے زمانے کے نہایت قوت و شوکت اور مال و دولت والے لوگ تھے، انھوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا، چنانچہ ان کی طرف رسول بھی نہایت عظیم الشان بھیجا گیا، جس کے حالات اور معجزات قرآن میں سب سے زیادہ بیان ہوئے ہیں اور اس مقام پر نوح علیہ السلام کے بعد ذکر کردہ پیغمبروں اور امتوں کی طرح مبہم رکھنے کے بجائے موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کا اور فرعون اور اس کے سرداروں کا نام لیا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل تھی، جب کہ فرعون اور اس کی قوم قبطی تھے۔ اس لیے یہ کہنے کے بجائے کہ ہم نے موسیٰ کو ان کی قوم بنی اسرائیل کی طرف بھیجا، یہ فرمایا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ فرعون کی قوم کا نام نہیں لیا، کیونکہ وہ فرعون اور اس کے سرداروں کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ فرعون کی طرف بھیجنے کا مقصد اسے توحید کی دعوت دینا (دیکھیے نازعات: ۱۵ تا ۱۹) اور بنی اسرائیل کو آزادی دلانا تھا۔ (دیکھیے طٰہٰ: ۴۷)

② بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ : نشانیوں سے مراد وہ معجزات اور نشانیاں ہیں جو فرعون کے غرق ہونے سے پہلے ظاہر ہوئیں، جن کا ذکر سورۂ اعراف اور دوسرے مقامات پر ہے۔ ان میں سمندر کا پھٹنا، من و سلویٰ اترنا، بارہ چشمے جاری ہونا اور بادل کا سایہ وغیرہ شامل نہیں، کیونکہ ان کا فرعون کو دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔ ” سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ“ بھی اگرچہ آیات میں شامل ہے، مگر اس کی عظمت کی وجہ سے اسے الگ ذکر فرمایا۔ اکثر مفسرین نے اگرچہ اس سے عصائے موسیٰ مراد لیا ہے، مگر مجھے ان مفسرین کی بات راجح معلوم ہوتی ہے جنھوں نے فرمایا: ”اس سے مراد وہ غلبہ اور سطوت و ہیبت ہے جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو عطا ہوئی تھی۔“ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں فرعون کی طرف بھیجتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ﴾ [ القصص: ۳۵ ] ”اور ہم تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے۔“ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کے حصول کی دعا سکھائی، فرمایا: ﴿ وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴾ [ بني إسرائيل: ۸۰ ] ”اور کہہ اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور میرے لیے اپنی طرف سے ایسا غلبہ بنا جو مددگار ہو۔“

زیر تفسیر آیت میں بھی ”سُلْطٰنٍ“ سے مراد غلبہ ہے۔ غور کیجیے فرعون کس قدر متکبر اور ظالم تھا، کتنے لوگوں کو اس نے قتل کیا

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے ﴿۴۶﴾ تو انھوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں، حالانکہ ان کے لوگ ہمارے غلام ہیں ﴿۴۷﴾ تو انھوں نے دونوں کو جھٹلا دیا تو وہ ہلاک کیے گئے لوگوں میں سے ہو گئے ﴿۴۸﴾

ہوگا۔ اس کے دروازے پر کتنا سخت پہرا ہوگا۔ دو آدمی جو ہاتھ میں صرف عصا لیے ہوئے ہیں، اس کے پاس جاتے ہیں، کسی کو روکنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ بات شروع ہوتی ہے تو وہ ہر بات میں لاجواب ہوتا ہے۔ لاجواب ہو کر جیل کی دھمکی دیتا ہے، مگر دھمکی پر عمل کی ہمت نہیں ہوتی، جادوگروں سے مقابلہ کرواتا ہے، ناکام ہوتا ہے۔ (شعراء: ۱۸ تا ۲۸) پھر قتل کرنا چاہتا ہے مگر جرأت نہیں ہوتی۔ (مؤمن: ۲۶) اللہ بہتر جانتا ہے کتنے سال اسی طرح گزرے، مگر وہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکا، اسے کہتے ہیں "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" یعنی واضح غلبہ۔

**آیت 46** ❶ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا : یہاں وہ بات حذف کر دی ہے جسے فرعون اور اس کے سرداروں نے سخت تکبر سے ٹھکرا دیا، کیونکہ اس سے پہلے تمام انبیاء کے تذکرے میں اس کا بیان کئی بار ہو چکا ہے، یعنی: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۳۲] "کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں۔" اور اللہ تعالیٰ کے بیان کے متعلق ہر رسول کی دعوت یہی تھی۔ (دیکھیے انبیاء: ۲۵)

❷ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ: "فَاسْتَكْبَرُوْا" میں سین اور تاء کا اضافہ تکبر کی شدت پر دلالت کرتا ہے۔ "قَوْمًا عَالِيْنَ" کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۴)۔

**آیت 47** فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا ...... : تکبر اور سرکشی کے نتیجے میں انھوں نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی بات ماننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں کی بات پر ایمان لے آئیں، جب کہ ان کے لوگ ہمارے غلام ہیں اور ہم ان سے بلند تر ہیں۔ پہلا اعتراض موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی ذات پر ہے اور دوسرا ان کی قوم پر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے کھانے پینے اور چلنے پھرنے میں رسولوں کو اپنے جیسا بشر تو دیکھ لیا اور اسے جھٹلانے کا بہانہ بھی بنا لیا، مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ ان کے دلائل و معجزات کے سامنے لاجواب ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود انھیں قتل کرنے سے عاجز ہیں۔ کم از کم وہ یہی سوچ لیتے کہ کوئی بشر وہ ہے جو جاہل اور عقل سے خالی ہے اور کوئی بشر وہ ہے جو اتنا علم اور اتنی عقل رکھتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ جب علم و عقل میں اتنا تفاوت ہو سکتا ہے تو رسالت کا تفاوت کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور اللہ اپنے کسی بندے پر یہ احسان کیوں نہیں کر سکتا۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۰، ۱۱)۔

**آیت 48** ❶ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ : فاء سببیہ ہے، یعنی تکبر جھٹلانے کا سبب بنا اور جھٹلانا ہلاک کیے

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

ع ۱۸ ۳

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، تاکہ وہ (لوگ) ہدایت پائیں ﴿۴۹﴾ اور ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو عظیم نشانی بنایا اور دونوں کو ایک بلند زمین کی طرف جگہ دی، جو رہنے کے لائق اور بہتے پانی والی تھی ﴿۵۰﴾

جانے والوں میں شامل ہونے کا باعث بنا۔

② فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ : یعنی بجائے اس کے کہ وہ عام عادت کے مطابق یکے بعد دیگرے فوت ہوں، جھٹلانے کے باعث سمندر میں ڈبو کر ہلاک کیے جانے والوں میں شامل ہو گئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۹۰ تا ۹۲) "مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ" میں قریش کے لیے بھی دھمکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو جھٹلانے والوں کو ہلاک کر دیا کرتا ہے۔

**آیت 49** ① وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ : موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات فرعونیوں کو غرق کرنے کے بعد ملی، جیسا کہ سورۂ اعراف (۱۳۶ تا ۱۴۵) میں فرعون کے غرق ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے چالیس راتوں کے لیے طور پر اعتکاف اور دیدارِ الٰہی والے معاملے کے بعد الواح کی صورت میں کتاب عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات فرعون اور قبطیوں کو غرق کرنے کے بعد نازل فرمائی اور تورات نازل کرنے کے بعد کسی امت کو عام عذاب کے ساتھ ہلاک نہیں فرمایا، بلکہ ایمان والوں کو کفار کے ساتھ لڑنے کا حکم دیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ [ القصص : ۴۳ ] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اس کے بعد کہ ہم نے پہلی نسلوں کو ہلاک کر دیا، جو لوگوں کے لیے دلائل اور ہدایت اور رحمت تھی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔" اس لیے " لَعَلَّهُمْ " (تاکہ وہ) میں ضمیر "هُمْ" بنی اسرائیل ہی کے لیے قرار دی جائے گی، فرعونیوں کے لیے نہیں۔

② لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ : یعنی کتاب تو اس لیے تھی کہ بنی اسرائیل ہدایت حاصل کریں، مگر اپنے آپ میں نبی کو موجود پا کر، اس کے معجزوں کو آنکھوں سے دیکھ کر اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کو سن کر بھی ان کے اکثر سیدھی راہ پر نہیں آئے۔ جیسا کہ قرآن میں جابجا ان کی نافرمانی کے قصے مذکور ہیں۔ امت مسلمہ کو تنبیہ ہے کہ دیکھنا تمھارا حال بھی ان کی طرح نہ ہو جائے۔

**آیت 50** ① وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً : "اٰيَةً" میں تنوین تعظیم کی ہے "عظیم نشانی۔" یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے ابن مریم کو نشانی بنایا، نہ یہ فرمایا کہ ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا، بلکہ دونوں کو ملا کر ایک عظیم نشانی قرار دیا، کیونکہ ان دونوں کا وجود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عظیم نشان تھا کہ اس نے آدم علیہ السلام کو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا فرمایا، حوا علیہا السلام کو صرف مرد سے پیدا فرمایا اور مریم علیہا السلام کے بطن سے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ جب کہ عام پیدائش ماں باپ دونوں سے ہوتی ہے اور وہ بھی اللہ کی قدرت کا نشان ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں ﴿۵۱﴾

② یہاں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کا نام لینے کے بجائے ''ابن مریم'' فرمایا کہ انھیں خدا قرار دینے والوں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ ایک خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، سو خدا کیسے ہو گئے؟

③ وَ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ : ''رَبْوَةٍ'' ٹیلا، اونچی جگہ۔ '' ذَاتِ قَرَارٍ '' ہموار، جہاں رہنا آسان ہو۔ ''مَعِيْنٍ'' جاری پانی، یہ ''عَانَ يَعِيْنُ'' (بَاعَ يَبِيْعُ) سے ہو تو ''مَبِيْعٌ'' کے وزن پر اسم مفعول ہے، اصل اس کا ''مَعْيُوْنٌ'' ہے، میم زائد ہے۔ زجاج نے فرمایا: ''مَعِيْنٍ'' چشموں میں جاری پانی، گویا یہ ''عَيْنٌ'' (چشمہ) سے مشتق ہے۔'' ابن الاعرابی نے فرمایا: '' مَعَنَ الْمَاءُ'' ''پانی بہ پڑا۔'' اس صورت میں اس کا وزن ''فَعِيْلٌ'' ہے اور میم اصلی ہے، جاری پانی۔ (قرطبی)

④ اس ربوہ (ٹیلا) سے کیا مراد ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد سرزمین مصر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ملک شام (جہاں عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے) کا حاکم ہیروڈس تھا، وہ نجومیوں سے سن کر کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سرداری ملے گی، بچپن ہی سے ان کا دشمن ہو گیا تھا اور ان کے قتل کے درپے تھا۔ مریم علیہا السلام انھیں لے کر مصر چلی گئیں اور جب تک ہیروڈس زندہ رہا واپس نہ آئیں۔ انجیل متیٰ میں یہ واقعہ اسی طرح مذکور ہے، لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ اس سے مراد بیت المقدس کے قریب کھجور والی وہ بلند جگہ ہے جہاں عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور مریم علیہا السلام کو نیچے سے آواز دی گئی کہ غم نہ کر، تیرے نیچے تیرے رب نے ایک ندی جاری کر دی ہے اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا تو وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گی، پس کھا، پی اور ٹھنڈی آنکھ سے رہ۔ (دیکھیے مریم: ۲۳ تا ۲۶) کیونکہ قرآن کی سب سے صحیح تفسیر وہ ہے جو قرآن کی کسی آیت سے ہو، پھر صحیح احادیث سے اور پھر آثار سے۔'' (ابن کثیر) اسرائیلی روایات کو جب ہم نہ سچا کہہ سکتے نہ جھوٹا تو ان سے کوئی بات کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟

**آیت 51** ① يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ ...... : ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو حکم دے رہے ہیں کہ حلال کھاؤ اور صالح اعمال کرتے رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اکلِ حلال عمل صالح کے لیے مددگار ہے۔'' (ابن کثیر) ظاہر ہے حلال حاصل کرنے کے لیے محنت بھی کرنا پڑے گی۔ چنانچہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجرت پر بکریاں چرائی ہیں اور تجارت بھی کی ہے اور آخر میں تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ ترین رزق مال غنیمت کے ساتھ غنی فرما دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ﴾ [ الأنفال : ٦٩ ] ''سو اس میں سے کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی، اس حال میں کہ حلال، طیب ہے۔'' مقدام رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ وَ إِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ )) [ بخاري، البيوع، باب كسب الرجل و عمله بيده : ٢٠٧٢ ] ''کسی شخص نے کوئی کھانا اس کھانے سے بہتر نہیں کھایا جو وہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے اور

وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ

اور بے شک یہ تمھاری امت ہے، جو ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، سو مجھ سے ڈرو ﴿۵۲﴾ پھر وہ اپنے معاملے

اللہ کے نبی داوٗد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:(( كَانَ زَكَرِيَّا نَجَّارًا )) [ ابن ماجه، التجارات، باب الصناعات : ۲۱۵۰، عن أبي هريرة رضي الله عنه و صححه الألباني ] ''زکریا علیہ السلام نجار (ترکھان) تھے۔'' اس کی مزید تفصیل اور حرام کھانے والے کی دعا قبول نہ ہونے کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۲)۔

اس آیت میں رہبانیت کا بھی رد ہے، جو اللہ کی نعمتیں اپنے آپ پر حرام کر لیتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے بعد شاید اسی لیے اس حکم کا ذکر کیا ہے کہ رہبانیت کا حکم کسی بھی رسول کو نہ تھا۔

② اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ : اس میں حلال کھانے اور عمل صالح پر جزا کا وعدہ ہے اور اس کے خلاف پر سزا کی وعید ہے۔

**آیت 52** وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ...... : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۹۲)۔

**آیت 53** ① فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا : اصل دین تمام پیغمبروں کا ایک ہے، البتہ بعض وقتی احکام میں فرق ہو سکتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کا دین اسلام ہے اور ان کے پیروکار سب امتِ مسلمہ ہیں۔ جس کے چند بنیادی اصول یہ ہیں: ① توحید، یعنی عبادت صرف اللہ کی ہے، اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔ ② قیامت، یعنی مرنے کے بعد سب کو اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے عمل کا بدلا پانا ہے۔ ③ اکل حلال، یعنی صرف حلال اور طیب کھانا کھانا ہے، حرام سے پوری طرح اجتناب کرنا ہے۔ ④ عمل صالح، یعنی ریا سے بچ کر خالص اللہ کے لیے رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنا ہے۔ ہر پیغمبر یہی اصول دین لے کر آیا، مگر لوگوں نے اصول دین ہی میں اختلاف کر کے سیکڑوں فرقے بنا لیے، مثلاً پہلے اصل توحید کو لے لیجیے، صرف ایک اللہ کی عبادت اور اسی سے استعانت کی جگہ کسی نے پیغمبر کو رب بنا لیا، کسی نے احبار و رہبان کو، کسی نے تین رب بنا لیے، کسی نے وحدت الوجود کا عقیدہ نکال لیا کہ ہر چیز میں رب ہے۔ کسی نے کہا، فلاں اللہ کا بیٹا ہے، کسی نے کہا، فلاں اللہ کے نور میں سے جدا شدہ نور ہے۔ کسی نے کہا، اللہ تعالیٰ بزرگوں اور ولیوں میں اتر آتا ہے۔ کسی نے کہا، بزرگ ترقی کر کے رب بن جاتے ہیں۔ اللہ کے سوا کئی ہستیوں کو عالم الغیب اور مختار کل تسلیم کیا گیا۔ حتیٰ کہ انسان نے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اپنے نفع و نقصان کو پتھروں، درختوں، مویشیوں، جن بھوتوں، قبروں اور آستانوں سے وابستہ کر دیا اور ان کے آگے سر جھکانے اور انھی سے مرادیں مانگنے لگا۔ پیغمبروں کی لائی ہوئی توحید پر بہت کم لوگ قائم رہے۔

دوسرا اصل قیامت پر ایمان ہے۔ بعض لوگوں نے دوبارہ جی اٹھنے ہی کا انکار کر دیا اور جنھوں نے اسے تسلیم کیا انھوں نے بھی اس کے تقاضوں کو نہ سمجھا۔ کسی نے کہا، ہم چونکہ انبیاء کی اولاد یا سادات ہیں، لہٰذا ہمیں عذاب کیسے ہو سکتا ہے؟ بعض لوگوں نے جبری سفارش کا عقیدہ وضع کر لیا کہ اگر فلاں مرشد کی بیعت کر لی جائے تو وہ شفاعت کر کے ہمیں چھڑا لیں گے۔

زُبُرًا ۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾

میں آپس میں کئی گروہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ہر گروہ کے لوگ اسی پر بہت خوش ہیں جو ان کے پاس ہے ﴿۵۳﴾

بعض نے یہی عقیدہ اپنے بتوں یا دیوتاؤں سے وابستہ کر لیا۔ نصاریٰ نے کفارے کا عقیدہ گھڑ لیا کہ مسیح علیہ السلام ہم گناہ گاروں کے کفارے کے طور پر سولی چڑھ گئے، اب ان کے نام لیواؤں کے سب گناہ معاف ہیں۔ بعض پادری حضرات اس دنیا ہی میں لوگوں سے رقمیں بٹور کر انھیں معافی نامے جاری کرنے لگے اور بعض لوگوں نے عقیدہ گھڑا کہ اگر فلاں قبر کے بہشتی دروازے کے نیچے سے عرس کے دن گزرا جائے تو یقیناً نجات ہو جائے گی۔ سستی نجات کے ایسے سب عقیدے لغو اور باطل ہیں اور قرآن نے ایسے عقائد رکھنے والوں کو آخرت کے منکر یعنی کافر قرار دیا ہے۔

تیسرا اصل حلال و طیب کھانا تھا، اس میں بھی لوگوں نے افراط و تفریط کی راہ پیدا کر لی۔ راہبوں، جوگیوں اور بعض صوفیوں نے اپنے اوپر حلال اشیاء کو حرام قرار دے لیا اور بعض دوسروں نے حلال و حرام کی تمیز ہی ختم کر دی اور سود اور قوم لوط کے عمل جیسی حرام اشیاء کو، جنھیں ساری شریعتوں میں حرام قرار دیا جاتا رہا، حلال ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے علماء و مشائخ، بتوں کے مہنتوں اور مقبروں اور مزاروں کے مجاوروں نے حلت و حرمت کے اختیارات خود سنبھال لیے۔ ایسے لوگوں کا تذکرہ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔

چوتھا اصل عمل صالح ہے، غالباً اس اصل میں شرک سے بھی زیادہ فرقہ بازی ہوئی، دین کے بعض اصولی احکام کو مسخ کر کے بدعی عقائد و اعمال شامل کر دیے گئے اور ان باتوں کی اصل بنیاد حب جاہ و مال تھی۔ چنانچہ بے شمار سیاسی اور بدعی قسم کے فرقے وجود میں آ گئے، ہر فرقے نے اپنے پیشوا کی بات انبیاء کی بات کی طرح حرف آخر قرار دے دی۔

گویا اس سادہ اور مختصر سی اصولی تعلیم سے اختلاف کر کے لوگ جو فی الحقیقت ایک ہی امت تھے، سیکڑوں ہزاروں فرقوں میں بٹتے چلے گئے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کو دوزخ کا ایندھن سمجھتا ہے، حالانکہ یہ اصولی تعلیم آج بھی موجود ہے اور اگر کوئی شخص یا کوئی فرقہ تعصب سے بالاتر ہو کر راہِ حق کو تلاش کرنا چاہے تو راہِ حق آج بھی ایسی چھپی ہوئی چیز نہیں جس کا سراغ نہ لگایا جا سکتا ہو۔ (تیسیر القرآن از کیلانی رحمہ اللہ بتصرف)

﴿2﴾ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ : "فَرِحُوْنَ" بہت خوش۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص ہر حال میں اپنے گروہ کو قائم رکھنے پر اڑ جاتا ہے تو اس کے دل میں حقیقت کی تلاش کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور اسے اپنے دھڑے ہی کی ہر بات درست معلوم ہوتی ہے اور وہ اسی پر خوش رہتا ہے، خواہ کتنی غلط ہو اور دوسرے کی بات خواہ کتنی صحیح ہو اسے غلط معلوم ہوتی ہے۔ افسوس! مسلمان بھی خیر القرون کے بعد کتاب و سنت پر ایک جماعت رہنے کے بجائے فرقوں میں بٹ گئے۔ کچھ عقائدی فرقے، کچھ فقہی فرقے اور کچھ صوفی فرقے اور ہر ایک اپنے دھڑے پر اتنی سختی سے قائم ہے کہ اس کے

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾

سو تو انھیں ایک وقت تک ان کی غفلت میں رہنے دے ﴿۵۴﴾ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم مال اور بیٹوں میں سے جن چیزوں کے ساتھ ان کی مدد کر رہے ہیں ﴿۵۵﴾ (ان کے ذریعے) ہم انھیں بھلائیاں دینے میں جلدی کر رہے ہیں، بلکہ وہ نہیں سمجھتے ﴿۵۶﴾ بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرنے والے ہیں ﴿۵۷﴾

مسلک کے خلاف قرآن مجید کی صریح آیت، یا رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث بھی پیش کی جائے تو وہ یہ کہہ کر اسے ماننے سے انکار کر دے گا کہ کیا ہمارے بڑوں کو اس کا علم نہ تھا؟ اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ شاید مسیح علیہ السلام ہی اس امت کو کتاب و سنت پر جمع فرما سکیں گے۔

**آیت 54** فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ: یعنی ایسے متعصب اور ہٹ دھرم لوگ جو راہِ راست کی طرف آنا پسند ہی نہیں کرتے اور اپنے حال ہی پر خوش ہیں، انھیں ان کے حال ہی پر رہنے دیجیے، ایک وقت آنے والا ہے جب انھیں سب حقیقت پوری طرح معلوم ہو جائے گی۔

**آیت 55، 56** ① اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ ......: "اَنَّمَا" یہاں اکٹھا لفظ نہیں بلکہ "أَنَّ" اور "مَا" (بمعنی اَلَّذِيْ) الگ الگ لفظ ہیں، قرآن کے رسم الخط میں انھیں اکٹھا لکھ دیا گیا ہے، معنی ہے "کہ وہ چیزیں جو۔"

② ہر گروہ کے اپنے حال پر بہت خوش رہنے کا سبب چونکہ انھیں لگنے والا دھوکا تھا کہ خوش حالی اور مال و اولاد کی کثرت اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل ہے، چنانچہ کفار کہا کرتے تھے کہ ہم اموال و اولاد میں زیادہ ہیں اور ہمیں کسی صورت عذاب نہیں ہو گا۔ دیکھیے سورۂ سبا (۳۵) اور کہف (۳۴ تا ۳۶) اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ کے لیے اس کا رد فرمایا۔

③ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ: یعنی ان کا یہ گمان درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں شعور ہی نہیں کہ مال و اولاد کی یہ فراوانی انھیں مہلت دینے کے لیے اور ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ہے کہ جس قدر انھیں ڈھیل ملے اسی قدر ان کے گناہوں کا پیمانہ اور لبریز ہو اور پھر بھرپور طریقے سے ان پر گرفت کی جائے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی نافرمانی کرے اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں کمی محسوس نہ کرے وہ فکر کر لے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی رسی دراز کی جا رہی ہے۔

**آیت 57** ① اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ: "إِشْفَاقٌ" کا معنی ہے متوقع چیز کا شدید خوف اور "وَجِلٌ" بروزن "فَزِعٌ" کا معنی ہے، سخت ڈرنے والا۔ اس سے پہلے غفلت میں مبتلا ان لوگوں کا ذکر فرمایا جن کے ہاں کفر و فسق کے باوجود مال اور بیٹوں کی فراوانی ہوتی جاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر خوش ہے، تبھی یہ سب کچھ ہمیں دے رہا ہے۔ اب ان

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾

اور وہ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں ﴿۵۸﴾ اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں کرتے ﴿۵۹﴾ اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۶۰﴾

---

کے مقابلے میں مخلص و مومن بندوں کا ذکر ہے، جو کمال ایمان و عمل کے باوجود عُجب اور خود پسندی سے محفوظ ہیں اور ہر وقت اس بات سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ کیا خبر اس کی جناب میں ہمارے عمل قبول ہوتے ہیں یا نہیں۔

❷ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص مومن بندوں کی چار صفات بیان فرمائی ہیں، پہلی یہ کہ وہ اپنے رب سے بہت ڈرنے والے ہیں کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ واضح رہے کہ اہل ایمان کا اپنے رب سے یہ خوف اس قسم کا نہیں ہوتا جیسے کسی جابر و ظالم بے رحم سے ہوتا ہے، بلکہ وہ اسے اپنا رب یعنی ہر نعمت عطا کرنے والا سمجھ کر اس کے ساتھ انتہائی محبت کے ساتھ ساتھ اس کی ناراضی کے خطرے سے انتہائی خوف بھی رکھتے ہیں۔

**آیت 58** وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ : دوسری صفت یہ کہ وہ اپنے رب کی آیات پر ایسا یقین رکھتے ہیں جو شک سے پاک ہے۔ چنانچہ وہ یقین انھیں اس کی اطاعت کا پابند کرتا ہے اور اس کی نافرمانی سے باز رکھتا ہے۔

**آیت 59** وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ : تیسری صفت یہ کہ وہ اپنے رب کے ساتھ نہ بڑا شرک کرتے ہیں، نہ چھوٹا، نہ جلی، نہ خفی، نہ کسی غیر کی پرستش کرتے ہیں اور نہ کوئی عمل ریا (دکھلاوے) کے لیے کرتے ہیں اور نہ سمعہ (شہرت) کے لیے، بلکہ ان کا ہر عمل اپنے رب کے لیے خالص ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ صفت ایمان میں شامل تھی مگر اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے الگ بھی ذکر فرمایا۔

**آیت 60** وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا...... : ”آتٰی يُؤْتِيْ إِيْتَاءً“ کا معنی ہے دینا۔ عام طور پر اس سے مراد صدقہ و زکوٰۃ لیا جاتا ہے، مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اس سے نیکی کے تمام اعمال مراد ہیں۔“ (طبری) عربی میں ”إِيْتَاءٌ“ (دینا) کا لفظ صرف مال یا کوئی مادی چیز دینے ہی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ معنوی چیزیں دینے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، مثلاً کسی شخص کی اطاعت قبول کر لینے کے لیے کہتے ہیں: ”آتَيْتُهُ مِنْ نَفْسِي الْقَبُوْلَ“ اور اطاعت قبول نہ کرنے کے لیے کہتے ہیں: ”آتَيْتُهُ مِنْ نَفْسِي الْإِبَاءَ۔“ ابن عطیہ فرماتے ہیں: ”یہ معنی زیادہ خوب صورت ہے، گویا فرمایا: ”وَالَّذِيْنَ يُعْطُوْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ مَا بَلَغَهُ جُهْدُهُمْ“ ”یعنی وہ اپنی جانوں کی طرف سے اللہ کی اطاعت میں وہ سب کچھ پیش کر دیتے ہیں جو ان کے آخری بس میں ہوتا ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ وہ ہر نیک عمل کرتے ہوئے خود پسندی کا

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝۶۱ وَ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَ لَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۶۲

یہ لوگ ہیں جو بھلائیاں حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں اور یہی ان کی طرف آگے نکلنے والے ہیں ۝۶۱ اور ہم کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی وسعت کے مطابق اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے ۝۶۲

شکار ہونے کے بجائے سخت ڈر رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کے پاس جانا ہے، کیا خبر اس کی جناب میں ہمارا عمل قبول ہوتا ہے یا نہیں اور کیا خبر کہ رب تعالیٰ کے حضور جانے کے وقت ہمارے ایمان و عمل کا کیا حال ہوتا ہے، کیونکہ دار و مدار تو خاتمے پر ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے پوچھا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ [ المومنون : ۶۰ ] أَهُوَ الَّذِيْ يَزْنِيْ وَ يَسْرِقُ وَ يَشْرَبُ الْخَمْرَ؟ قَالَ لَا، يَا بِنْتَ أَبِيْ بَكْرٍ! أَوْ يَا بِنْتَ الصِّدِّيْقِ! وَلٰكِنَّهُ الرَّجُلُ يَصُوْمُ وَ يَتَصَدَّقُ وَ يُصَلِّيْ، وَ هُوَ يَخَافُ أَنْ لَا يُتَقَبَّلَ مِنْهُ )) [ ابن ماجه، الزهد، باب التوقي على العمل : ۴۱۹۸۔ ترمذي: ۳۱۷۵۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۱۶۲ ] ''یا رسول اللہ! (اللہ کا فرمان ہے): ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ کیا اس سے مراد وہ شخص ہے جو چوری کرتا ہے، زنا کرتا ہے اور شراب پیتا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں! اے ابوبکر کی بیٹی! بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں اور وہ ڈر رہے ہوتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے قبول نہ کیا جائے۔'' ترمذی کی حدیث کے آخر میں ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾ [ المومنون : ۶۱ ] ''یہی (مذکورہ بالا صفات والے) وہ لوگ ہیں جو بھلائیاں حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ ان کی طرف آگے نکلنے والے ہیں۔'' اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا'' سے مراد صرف صدقہ و زکوٰۃ ہی نہیں، بلکہ تمام اعمال ہیں۔

**آیت 61** اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ......: یعنی یہ لوگ جن میں یہ چاروں خوبیاں ہیں یہی نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ انھیں حاصل کرنے میں سبقت لے جانے والے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ واقعہ: ۱۰ تا ۲۶) طبری نے ''وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ'' کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول حسن سند کے ساتھ نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''سَبَقَتْ لَهُمُ السَّعَادَةُ'' ''یعنی ان کی ان چاروں صفات کی وجہ سے (جو پہلے ہی اللہ کے علم میں ہیں) ان کے لیے پہلے ہی (جلدی بھلائیاں حاصل ہونے کی) سعادت طے ہو چکی ہے۔'' گویا یہ اس آیت کے ہم معنی ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾ [ الأنبياء : ۱۰۱ ] ''بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی طے ہو چکی، وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں گے۔''

**آیت 62** ① وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا......: یعنی ہم نے اپنے مومن بندوں کی جو صفات بیان کی ہیں، یہ ایسی نہیں

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَ لَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾
حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾

بلکہ ان کے دل اس سے سخت غفلت میں ہیں اور ان کے لیے اس کے سوا کئی کام ہیں، وہ انھی کو کرنے والے ہیں﴿۶۳﴾
یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوش حال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے اچانک وہ بلبلا رہے ہوں گے ﴿۶۴﴾

ہیں کہ انسان کی وسعت اور گنجائش سے باہر ہوں اور وہ ان پر عمل نہ کرسکتا ہو۔ کیونکہ یہ ہمارا دستور ہی نہیں کہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف دیں۔ اسی لیے جہاں عذر آتا ہے رخصت دے دی جاتی ہے۔ پانی نہیں تو تیمم کرلو، سفر ہے تو نماز قصر کرلو اور روزہ افطار کرلو، بیمار ہو تو بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھ لو، خوف ہے تو پیدل یا سوار ہی پڑھ لو، بھوک سے بے بس ہو تو بقدر ضرورت حرام کھا لو، اگر نفس کی سرکشی سے نافرمانی ہو جائے تو توبہ کرکے پلٹ آؤ۔ پھر اتنی آسانیوں کے بعد بھی بے رخی اور سرکشی کی روش اپناؤ، تو یاد رکھو کہ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے، جس میں تمھارا چھوٹا، بڑا، ظاہر اور مخفی ہر عمل محفوظ ہے۔ دیکھیے سورۂ کہف (۴۹) اور جاثیہ (۲۹) رازی نے فرمایا: ''کتاب کو انسان کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بولتا ہے، کیونکہ کتاب تو بولتی نہیں، بلکہ جو اس میں لکھا ہوتا ہے اس کا اظہار کرتی ہے۔'' مگر اب وڈیو کیمرے کے ذریعے سے کسی بھی شخص کے عمل کی تصویر بھی محفوظ ہوتی ہے اور آواز بھی۔ اس لیے اس تاویل کی ضرورت نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تو ہمارے خیال سے بھی کہیں بلند ہے، جس کے حکم سے چمڑے اور ہاتھ پاؤں بول کر سب کچھ بتائیں گے، اس کے حکم سے کتاب کا بولنا کون سا بعید ہے۔

2 وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ : یعنی نہ کسی کو قصور کے بغیر سزا ملے گی، نہ کسی کا قصور دوسرے کے نامۂ اعمال میں درج ہوگا، نہ کسی عمل کی جزا میں کمی ہوگی اور نہ سزا میں زیادتی۔

**آیت 63** بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا ...... : ''غَمْرَةٍ'' میں تنوین تہویل کی ہے، اس لیے ترجمہ ''سخت غفلت'' کیا ہے۔ ''هٰذَا'' کا اشارہ ان چیزوں کی طرف ہے جو اس سے پہلے مذکور ہیں، یعنی بات وہ نہیں جو کفار نے سمجھ رکھی ہے کہ اموال و اولاد کی صورت میں انھیں اللہ کی طرف سے بھلائیاں مل رہی ہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے دل بھلائیوں کے حصول کا سبب بننے والی صفات سے (یعنی خشیت الٰہی، آیات پر ایمان، شرک سے اجتناب اور کوئی بھی عمل کرتے ہوئے اس کے قبول نہ ہونے کا خوف رہنا) اور قیامت کے دن کتاب اعمال کے پیش ہونے سے سخت غفلت میں ہیں۔ پھر ان کا جرم یہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی کئی اعمال ہیں جنھیں وہ ہر حال میں کرنے والے ہیں، تاکہ ان پر حجت تمام ہو اور وہ اپنے کیے کا خمیازہ بھگتیں۔

**آیت 64** حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ ...... : ''يَجْـَٔرُوْنَ'' ''جُؤَارٌ'' درحقیقت گائے یا بیل کے سخت تکلیف میں بلبلانے کو کہتے ہیں۔ عذاب سے مراد بظاہر دنیا میں آنے والا عذاب ہے، خواہ کسی آفت کی صورت میں ہو یا موت کی صورت

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ۫ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖۗ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

آج مت بلبلاؤ، بے شک تم کو ہماری طرف سے مدد نہ دی جائے گی ﴿۶۵﴾ بے شک میری آیات تم پر پڑھی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جایا کرتے تھے ﴿۶۶﴾ تکبر کرتے ہوئے، رات کو باتیں کرتے ہوئے اسی کے بارے میں بے ہودہ گوئی کرتے تھے ﴿۶۷﴾ تو کیا انھوں نے اس بات میں خوب غور نہیں کیا، یا ان کے پاس وہ چیز آئی ہے جو ان کے پہلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی ﴿۶۸﴾

میں، کیونکہ آسودگی اور خوش حالی کی موجودگی میں وہی آتا ہے۔ عذاب خواہ خوش حال کفار پر آئے یا بدحال کفار پر، چیخنے چلانے اور بلبلانے میں دونوں یکساں ہوتے ہیں، مگر "مُتْرَفِيْنَ" (خوش حال) کا ذکر خاص طور پر اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہی لوگ حق کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے ہیں اور اپنی سرداری کی وجہ سے بدحال لوگوں کے کفر پر قائم رہنے کا باعث بنتے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ سبا: ۳۱ تا ۳۳) اس لیے عذاب نازل ہونے کے وقت ان کی حالت بیان فرمائی کہ ان کی ساری شیخی اور اکڑفوں ختم ہو جائے گی اور وہ سخت تکلیف میں مبتلا بیل کی طرح بلبلائیں گے۔

**آیت 65** لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ...... : یعنی اب بلبلانے اور چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں، کیونکہ یہ جزا کا وقت ہے، توبہ اور عمل کا وقت ختم ہو گیا۔ اب ہماری طرف سے کسی مدد کی امید مت رکھو۔ دیکھیے سورۂ مومن (۸۲ تا ۸۵)۔

**آیت 66** قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ ...... : "نَكَصَ" (ض، ن) عموماً کسی خیر کے کام سے پیچھے ہٹنے کو کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "تَنْكِصُوْنَ" کا معنی "تُدْبِرُوْنَ" (پلٹتے تھے) بیان فرمایا ہے۔ (طبری) یعنی یہ عذاب تمھارے اپنے اعمالِ بد ہی کا نتیجہ ہے کہ میری آیات جب تمھارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم ایڑیوں کے بل پھر جاتے تھے، تمھیں سننا تک گوارا نہ تھا۔

**آیت 67** ① "مُسْتَكْبِرِيْنَ" یہ "تَنْكِصُوْنَ" کی ضمیر سے حال ہے، یعنی ہماری آیات کی تلاوت کے وقت تمھارا الٹے پاؤں پھر جانا کسی خوف یا مصروفیت یا کسی اور وجہ سے نہیں تھا، بلکہ تم محض تکبر کرتے ہوئے سننے سے اجتناب کے لیے ایڑیوں پر پھر جاتے تھے۔

② بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ : "سَمَرَ يَسْمُرُ سَمَرًا وَ سُمُوْرًا فَهُوَ سَامِرٌ" (ن) رات کو دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا اور قصے کہانیاں سنانا۔ "هَجَرَ يَهْجُرُ هَجْرًا وَ هِجْرَةً" چھوڑنا اور "هُجْرًا" بے ہودہ، لغو اور فضول باتیں کرنا، بکواس کرنا۔ "بِهٖ" کی ضمیر قرآن کی طرف جاتی ہے، جو آیات کے ضمن میں مذکور ہے، یعنی رات کو باتیں کرتے ہوئے تم اس قرآن کے متعلق بے ہودہ گوئی اور بکواس کیا کرتے تھے۔

**آیت 68** ① اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ ......: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزیں بیان فرمائی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾

یا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا تو وہ اسے اوپرا سمجھنے والے ہیں ﴿۶۹﴾ یا کہتے ہیں کہ اسے کوئی جنون ہے، بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے اور ان میں سے اکثر حق کو برا جاننے والے ہیں ﴿۷۰﴾

بھی سبب ہوتا تو کفار کا رسول اللہ ﷺ اور قرآن پر ایمان نہ لانا معقول تھا، مگر جب ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو ان کے پاس انکار، تکبر اور مذاق اڑانے کا کوئی عذر نہیں۔

❷ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ : یعنی کیا ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کو انھوں نے سمجھا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وجہ نہیں، قرآن کوئی پہیلی نہیں، کسی ایسی زبان میں نہیں جو ان کی سمجھ سے باہر ہو۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو آدمی کی سمجھ سے بالا ہو، وہ اس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں۔ مخالفت اس لیے نہیں کر رہے کہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی اور انھیں سمجھ نہیں آیا، بلکہ اس لیے مخالفت کر رہے ہیں کہ وہ ماننا نہیں چاہتے۔

❸ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ : یعنی یا ان کے انکار کی یہ وجہ ہے کہ اس نے کوئی نرالی بات پیش کی ہے جو کبھی کسی کے سننے ہی میں نہیں آئی؟ ظاہر ہے یہ بات بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء ہمیشہ آتے رہے ہیں، یہ کوئی پہلا رسول نہیں۔ فرمایا: ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ [ الأحقاف : ۹ ] ”کہہ دیجیے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں ہوں۔“ ان کے گرد و پیش عراق، شام اور مصر میں کئی انبیاء آئے ہیں، ان کی اپنی سرزمین میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام آئے، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام آئے۔ یہ خود ان کو سچے رسول مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ مشرک نہ تھے، بلکہ توحید کی دعوت لے کر آئے تھے۔ غرض ان کے انکار کی وجہ یہ بھی نہیں کہ ان کے پاس نبی ﷺ کی آمد کوئی انوکھی بات ہے۔

تنبیہ: قرآن میں جہاں یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ کو ان لوگوں کی طرف بھیجا گیا جن کے آباء کی طرف کوئی رسول نہیں آیا، وہاں مراد قریب زمانے میں رسول کا نہ آنا ہے اور یہاں مراد بعید زمانے میں رسول کا آنا ہے، جو ان کے بھی علم میں ہے، کیونکہ ابراہیم، اسماعیل، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کو وہ لوگ بھی رسول مانتے تھے۔

**آیت 69** اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ : تیسری وجہ ان کے ایمان نہ لانے کی یہ ہو سکتی ہے کہ ایک بالکل اجنبی آدمی ان میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہو کہ مجھے رسول مانو، جس کے حسب نسب، صدق و امانت اور حسن اخلاق کو وہ نہ جانتے ہوں، سو یہ وجہ بھی نہیں، کیونکہ وہ ان میں سے سب سے عالی خاندان کا فرد اور عالی اخلاق کا مالک ہے۔ اس دعویٰ سے پہلے چالیس سال تک وہ ان میں رہا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۱۶)۔

**آیت 70** ❶ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ......: ”جِنَّةٌ“ پر تنوین تنکیر کی ہے، یعنی یہ کہتے ہیں کہ اس کو کسی قسم کا جنون ہے۔ چوتھی وجہ ان کے انکار کی یہ ہو سکتی ہے کہ وہ کہتے ہوں کہ اسے کسی قسم کا جنون ہے اور واقعی وہ آپ کو کسی قسم کا دیوانہ یا پاگل

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور اگر حق ان کی خواہشوں کے پیچھے چلے تو یقیناً سب آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، بگڑ جائیں، بلکہ ہم ان کے پاس ان کی نصیحت لے کر آئے ہیں تو وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں ﴿۷۱﴾

سمجھتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اصل وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ہٹ دھرمی سے اپنی زبان سے جو چاہیں کہتے رہیں، مگر دل سے آپ ﷺ کی کمال دانائی کے قائل ہیں، کیونکہ خود انھوں نے صادق اور امین کا لقب دیا ہے۔ بھلا پاگلوں کو یہ لقب دیا جاتا ہے، پھر وہ کیسا دیوانہ ہے (یا مستشرقین کی ہرزہ سرائی کے مطابق مرگی کے دورے کا مریض ہے) کہ دیوانگی یا مرگی کے دورے کے وقت اس کی زبان سے قرآن جیسا کلام نکلتا ہے، جس کی سب سے چھوٹی سورت کا جواب پیش کرنے سے پوری کائنات قاصر ہے اور جس نے تیئیس (۲۳) برس کے مختصر عرصے میں ساری دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

② بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ : جب یہ بات بھی نہیں تو نتیجہ یہی ہے کہ جو دعوت اس رسول نے پیش کی ہے وہ حق ہے، جب کہ ان کے اکثر حق بات کو ناپسند کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی شتر بے مہار خواہشات اور حیوانی خصلتوں کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ سچی بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فرمایا: ''ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔'' کیونکہ جو حق پسند تھے وہ ایمان لے آئے۔

**آیت 71** ① وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ ...... : یعنی اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلے تو زمین و آسمان کا یہ سلسلہ تباہ ہو جائے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی خواہش دوسرے کی خواہش سے ٹکراتی ہے اور ان کا علم محدود ہے، نہ پوری موجود کائنات کا علم رکھتے ہیں، نہ آئندہ کی کچھ خبر رکھتے ہیں۔ ان کی خواہشات پر عمل کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ دور کیوں جائیے، ملکوں کے منتخب نمائندے ایک قانون بناتے ہیں، جب اس کی خرابیاں سامنے آتی ہیں تو اسے ختم کر کے اور بنا دیتے ہیں، کچھ دیر کے بعد اسے بھی بدلنا پڑتا ہے۔ کتنے قانون انھوں نے خود بنائے، جن کے نتیجے میں وہ خود پھانسی کے پھندے میں جھول گئے۔ پھر یہ لوگ تو اللہ کے سوا کئی معبودوں کی پرستش کرتے ہیں، اگر ان کی خواہش کے مطابق ایک سے زیادہ معبودوں کے ہاتھ میں کائنات کا نظام دے دیا جائے تو سوچ لو کہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ سلسلہ چل سکتا ہے؟ یہ کائنات تو صرف ایک مالک کے حکم پر چل رہی ہے، جو خود حق ہے، اس کا کلام حق ہے اور اس کا سب کچھ برحق ہے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۲۲): ﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ کی تفسیر۔

② بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ ...... : ذکر کے دو معنی ہیں، ایک نصیحت اور ایک عز و شرف اور ناموری، یہاں دونوں درست ہیں۔ نصیحت اس لیے کہ کفار مکہ کہہ سکتے تھے: ﴿ لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ﴾ [ الأنعام : ۱۵۷ ] ''اگر ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم پہلی امتوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔'' اللہ تعالیٰ نے ان کو شکوے کا موقع ہی نہیں دیا اور خود

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖۗ وَّ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

یا تو ان سے کسی آمدنی کا مطالبہ کرتا ہے تو تیرے رب کی آمدنی بہتر ہے اور وہ سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے ﴿۷۲﴾ اور بے شک تو یقیناً انھیں سیدھے راستے کی طرف بلاتا ہے ﴿۷۳﴾ اور بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، یقیناً اصل راستے سے ہٹے ہوئے ہیں ﴿۷۴﴾

ہی وہ کتاب نازل فرما دی جو ان کے لیے نصیحت ہے، مگر چونکہ اس میں ان کے عیوب اور خامیوں کی اصلاح کی بات تھی، اس لیے تکبر اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ اسے تسلیم کرنے کے بجائے اپنی ہی نصیحت اور خیر خواہی کی بات سے منہ موڑنے والے بن گئے۔ فعل ماضی "أَعْرَضُوْا" کے بجائے اسم فاعل "مُعْرِضُوْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے صرف ایک دو بار ہی منہ نہیں موڑا، بلکہ پکے منہ موڑنے والے بن گئے۔ ذکر کا دوسرا معنی عز و شرف اور شہرت و ناموری ہے، یعنی یہ قرآن ایمان لانے والوں، خصوصاً عرب کے لیے تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے عز و شرف اور ناموری کا باعث ہے، مگر یہ ایسے بدنصیب ہیں کہ انھیں اپنی ناموری اور اپنا عز و شرف بھی راس نہیں آتا۔ یہ دوسرا مطلب یہاں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

**آیت 72** اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا ...... : "خَرْجٌ" اور "خَرَاجٌ" کسی شخص کو ادا کیا جانے والا روزانہ، ماہانہ یا سالانہ عطیہ۔ یہ ان کے انکار کی پانچویں وجہ ہے، جو ممکن ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یا پھر یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ آپ ان سے روزانہ، ماہانہ یا سالانہ کسی تنخواہ کا سوال کرتے ہوں، جسے وہ بوجھ محسوس کرتے ہوں، تو ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے تم سے کسی اجرت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کا دیا ہوا تو ختم ہو جائے گا مگر دنیا اور آخرت میں آپ کے رب کی طرف سے عطا کیا جانے والا رزق کبھی ختم ہونے والا نہیں اور اس سے بہتر روزی دینے والا کوئی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ دعوت حق کا یہ کام بالکل بے لوث ہو کر کر رہے ہیں اور ان سے کوئی حق الخدمت طلب نہیں کرتے تو ان کا آپ کی دعوت کو ٹھکرانا سراسر حماقت اور عاقبت نااندیشی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو کئی جگہ صاف اعلان کرنے کا حکم دیا ہے کہ میں تم سے کسی اجرت یا بدلے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ مثلاً سورۂ ص (۸۶) وغیرہ۔

**آیت 73** وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : یعنی ان پانچوں باتوں میں سے ایک کا وجود بھی نہیں، جس کی وجہ سے یہ آپ کو جھٹلا سکیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ انھیں بالکل سیدھے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں، جسے کوئی الٹی سمجھ والا ہی ٹھکرا سکتا ہے۔ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے۔

**آیت 74** وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ : یعنی سیدھے راستے سے ہٹنے کا اصل باعث آخرت پر ایمان کا نہ ہونا ہے۔ اگر پختہ یقین ہو کہ آخرت کو اللہ کے حضور پیش ہونا ہے تو ممکن نہیں کہ آدمی صحیح راستہ جاننے کے بعد غلط راستوں پر چلتا رہے۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور انھیں جو بھی تکلیف لاحق ہے دور کر دیں تو بھی وہ یقیناً اپنی سرکشی میں اصرار کریں گے، اس حال میں کہ بھٹک رہے ہوں گے ﴿۷۵﴾

آیت 75 ﴿ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ ...... : اس آیت کی ایک تفسیر وہ ہے جو ابن عاشور نے ''التحریر والتنویر'' میں اور بقاعی نے ''نظم الدرر'' میں فرمائی ہے۔ روح المعانی میں بھی اسے ایک امکان کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ تفسیر یہ ہے کہ اس آیت کا عطف آیت (۶۴): ﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ﴾ (یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوش حال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے، اچانک وہ بلبلا رہے ہوں گے) پر ہے اور اس آیت اور اُس آیت کے درمیان کی آیات جملہ ہائے معترضہ ہیں، جن سے مقصود ان کے خلاف دلائل کا ذکر اور ان کے عذر بہانے ختم کرنا ہے۔ یعنی اگر ہم ان کے چیخنے، پکارنے اور بلبلانے پر رحم کر کے ان پر آنے والا عذاب دور کر دیں، تب بھی وہ اپنی سرکشی سے باز نہیں آئیں گے، بلکہ اسی پر اڑے رہیں گے اور اسی میں سر مارتے پھریں گے، کیونکہ کفر اور سرکشی ان کی طبعی خصلت بن چکی ہے، جو کسی طرح ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [ الأنعام : ۲۸ ] ''اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔'' آیات کے سیاق سے یہ تفسیر نہایت مناسب ہے۔

دوسری تفسیر شیخ عبد الرحمان سعدی نے کی ہے کہ اس میں کفار کی شدید سرکشی اور ہٹ دھرمی کا بیان ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں، مثلاً قحط پڑ جاتا ہے، بھوک سے لاچار ہو جاتے ہیں، سمندری طوفان میں گھر جاتے ہیں، یا کوئی وبا آگھیرتی ہے تو خلوصِ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اسے دور کرنے کی دعا کرتے ہیں، پھر اگر اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرما کر وہ مصیبت دور کر دے تو بھی وہ اپنے کفر اور سرکشی پر اڑے رہتے ہیں اور اسی میں سر مارتے پھرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ [ یونس : ۲۱ تا ۲۳ ] ''اور جب ہم لوگوں کو کوئی رحمت چکھاتے ہیں، کسی تکلیف کے بعد، جو انھیں پہنچی ہو، تو اچانک ان کے لیے ہماری آیات کے بارے میں کوئی نہ کوئی چال ہوتی ہے۔ کہہ دے اللہ چال میں زیادہ تیز ہے۔ بے شک ہمارے بھیجے ہوئے لکھ رہے ہیں جو تم چال چلتے ہو۔ وہی ہے جو تمھیں خشکی اور سمندر میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں لے کر عمدہ ہوا کے ساتھ چل پڑتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں تو ان

وَ لَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَ مَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝۷۶ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝۷۷ ع

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، پھر بھی وہ نہ اپنے رب کے آگے جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے تھے ۝۷۶ یہاں تک کہ جب ہم نے ان پر کسی سخت عذاب والا کوئی دروازہ کھولا، اچانک وہ اس میں نا امید تھے ۝۷۷

(کشتیوں) پر سخت تیز ہوا آ جاتی ہے اور ان پر ہر جگہ سے موج آ جاتی ہے اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کو گھیر لیا گیا ہے، تو اللہ کو اس طرح پکارتے ہیں کہ ہر عبادت کو اس کے لیے خالص کرنے والے ہوتے ہیں، یقیناً اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو ہم ضرور ہی شکر کرنے والوں سے ہوں گے۔ پھر جب اس نے انھیں نجات دے دی اچانک وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔''

**آیت 77،76** ﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ...... : ''اَخَذْنٰهُمْ'' (ہم نے انھیں پکڑا) میں ''هُمْ'' (اُن) سے مراد موجودہ کفار و منکرین نہیں بلکہ اس سے مراد ان جیسے وہ منکرین ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جو اپنے اپنے دور میں اسی طرح کے کفر و انکار پر اڑے ہوئے تھے۔ موجودہ دور کے منکرین کو تاریخ کے اس سبق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے لیے آنے والے عذابوں سے سبق نہیں لیتے، یہاں تک کہ وہ اپنے آخری ہولناک انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ پہلے کمتر درجے کا عذاب بھیجتا ہے، تاکہ لوگ سنبھل جائیں، فرمایا: ﴿ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ ﴾ [ السجدۃ : ۲۱ ] ''اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے۔'' پھر جب لوگ اس عذاب سے عبرت نہیں پکڑتے تو ان کی رسی دراز کر دی جاتی ہے اور انھیں نافرمانی کے باوجود خوش حالی عطا کر دی جاتی ہے، تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون کثرت سے بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۴۲ تا ۴۴)، اعراف (۹۴ تا ۹۸)، یونس (۱۲ تا ۲۱) اور دخان (۱۰ تا ۱۶)۔

بعض مفسرین نے اس عذاب سے مراد وہ قحط لیا ہے جو ہجرت سے پہلے مکہ والوں پر رسول اللہ ﷺ کی بد دعا سے مسلط ہوا اور سخت عذاب والے دروازے سے مراد یوم بدر لیا ہے، جبکہ بعض نے اس عذاب سے مراد بدر اور سخت عذاب والے دروازے سے مراد ہجرت کے بعد ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے گندم روک لینے سے واقع ہونے والا قحط لیا ہے۔ ابن جزی ''التسہیل'' میں فرماتے ہیں: ''زیادہ راجح یہ ہے کہ پہلے عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے اور شدید عذاب سے مراد موت اور آخرت کا عذاب ہے۔ کیونکہ شدید عذاب وہی ہے، دنیا کا عذاب اس کے مقابلے میں ادنیٰ ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴾ یعنی ہر خیر سے نا امید ہوں گے۔ کفار کو یہ نا امیدی آخرت کے دن ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ [ الروم : ۱۲ ] ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم نا امید ہو جائیں گے۔'' بدر اور قحط کے بعد تو وہ بار بار حملہ آور ہوتے رہے تھے۔

وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ١ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۠۷۸ وَ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۷۹

اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، بہت کم تم شکر کرتے ہو ۷۸ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا اور اسی کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ۷۹

آیت 78 ① وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ …… : اس سے پہلے کفار کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ تھا، اب انھیں مخاطب کر کے احسانات یاد دلائے۔ یہ غائب سے مخاطب کی طرف التفات ہے، کیونکہ بعض اوقات وعید کا اثر نہیں ہوتا، ہاں! کسی احسان کی خوشگوار یاد دل کو مائل کر دیتی ہے۔

② وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ …… : یعنی وہ لوگ نہ اپنے رب کے لیے جھکے اور نہ عاجزی اختیار کی، حالانکہ رب صرف وہ ہے، کوئی اور نہیں۔ جس نے کسی پہلے نمونے کے بغیر تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل پیدا فرمائے، جو سننے، دیکھنے اور سمجھنے کے مرکز ہیں۔ ان تینوں چیزوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جسم کی تمام نعمتیں ان کے تابع ہیں، یہ نہ ہوں تو کچھ بھی نہیں۔

③ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ : یہ بات کہ تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو، کئی طرح سمجھی جا سکتی ہے۔ مثلاً سوچو، کوئی آدمی اگر تمھیں یہ تینوں نعمتیں دے اور تم اس کا بدلا دینا چاہو تو کیا دے سکتے ہو؟ یا اس طرح سوچو کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ تینوں نعمتیں تم سے چھین لے تو تمھارا کیا حال ہوگا؟ اب جو اس نے یہ سب کچھ تمھیں دے رکھا ہے تو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے تم اس کی کس قدر فرماں برداری کر رہے ہو؟ اس سے بڑی ناشکری کیا ہوگی کہ اپنا خالق و مالک مانتے ہوئے اس اکیلے کی عبادت کے بجائے تم نے اس کے شریک بنا رکھے ہیں، جنھوں نے کچھ پیدا ہی نہیں کیا اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بجائے تم اسے جھٹلا رہے ہو؟ ان حواس کی شکر گزاری تو یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے صحیح راستے کی طرف رہنمائی حاصل کرو، ورنہ ان کے ذریعے سے جسمانی اور مادی خواہش تو دوسرے حیوانات بھی پوری کر رہے ہیں۔ تمھارا حق یہ ہے کہ کائنات میں توحید کے جو دلائل پائے جاتے ہیں ان حواس کے ذریعے سے ان دلائل کو آنکھوں سے دیکھو، کانوں سے سنو اور دل سے سمجھو اور توحیدِ الٰہی پر دل و جان سے ایمان رکھو۔

④ "قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ" کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم شکر کرتے ہی نہیں، کیونکہ عرب "قَلِيْلٌ" کو نہ ہونے کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ ابو کبیر ہذلی نے "تَأَبَّطَ شَرًّا" کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

قَلِيْلُ التَّشَكِّيْ لِلْمُهِمِّ يُصِيْبُهُ    كَثِيْرُ الْهَوٰى شَتَّى النَّوٰى وَ الْمَسَالِكِ

"وہ پیش آنے والی مہمات کی شکایت بہت کم کرنے والا ہے، بہت سے مقاصد والا، مختلف نیتوں اور راستوں والا ہے۔" "شکایت بہت کم کرنے والا" سے مراد یہ ہے کہ وہ شکایت کرتا ہی نہیں۔

آیت 79 وَ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ …… : یہ اللہ تعالیٰ کے "وحدہ لا شریک لہ" ہونے کی دوسری دلیل ہے اور قیامت کی بھی

وَهُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ لَهُ اخْتِلَافُ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْۤا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے قبضہ میں رات اور دن کا بدلنا ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۸۰﴾ بلکہ انھوں نے کہا جیسے پہلوں نے کہا تھا ﴿۸۱﴾ انھوں نے کہا کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے، کیا واقعی ہم ضرور اٹھائے جانے والے ہیں؟ ﴿۸۲﴾

کہ جس اکیلے نے تمھیں وجود کی نعمت عطا کر کے ساری دنیا میں پھیلا دیا، وہ تمھیں سمیٹنے پر بھی قادر ہے اور یاد رکھو کہ اس اکیلے ہی کی طرف تمھیں دوبارہ اکٹھا کیا جائے گا۔

**آیت 80** ① وَهُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ...... : اکٹھا کرنے کے ذکر کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے ساری کائنات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا ذکر فرمایا۔ خصوصاً ان کاموں کا ذکر فرمایا جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، تاکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کی دلیل بن سکیں۔ چنانچہ فرمایا، اور وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور رات اور دن کا بدلنا بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ یہ توحید کی بھی دلیل ہے اور قیامت کی بھی کہ موت و حیات اور اندھیرے و اجالے کو یکے بعد دیگرے لانے والے کے لیے تمھیں موت کے بعد زندگی عطا کرنا اور تمھیں قیامت کو زندہ کر کے حساب کے لیے سامنے لا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے؟ فرمایا:
﴿ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ۲۹ ] ''جس طرح اس نے تمھاری ابتدا کی، اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے۔''

② اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ : ہمزہ استفہام اصل میں فاء کے بعد ہے، مگر چونکہ اس کا مقام کلام کی ابتدا ہے، اس لیے اسے فاء سے پہلے لایا گیا ہے، یعنی تو کیا تم اتنی واضح بات بھی نہیں سمجھتے؟ یا یوں کہہ لیجیے، تو کیا تم کوئی بات بھی نہیں سمجھتے؟

**آیت 82،81** ① بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ: یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ناراضی کے اظہار کے لیے انھیں مخاطب کرنا چھوڑ کر ان کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ کرنا شروع کر دیا، گویا اتنی واضح دلیلوں کے بعد بھی انکار پر اڑے رہنے کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں کہ انھیں مخاطب کیا جائے۔

② مرنے کے بعد زندگی کا انکار صرف قیامت کا انکار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا بھی انکار ہے اور شرک ہی کا شاخسانہ ہے۔ جو شخص رب تعالیٰ کو ایک مانتا ہو اور اس کی قدرت و حکمت پر ایمان رکھتا ہو وہ کبھی قیامت کا انکار نہیں کر سکتا۔

③ یعنی ان لوگوں کے پاس اپنے آباء کی تقلید کے سوا قیامت کے انکار اور دوسرے غلط عقائد و اعمال کے لیے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے۔

④ قَالُوْۤا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ...... : ''جب ہم مر جائیں گے'' ہی کافی تھا، مگر اس کے بعد ''اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے'' کے الفاظ کے ساتھ وہ اپنے خیال میں مرنے کے بعد زندگی کے عقل سے بعید ہونے کی بات بہت مدلل کر رہے ہیں اور ''ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ'' میں ''اِنَّ'' اور ''لام'' کے ساتھ وہ رسول اللہ ﷺ کا قیامت کے عقیدے کو نہایت تاکید سے بیان کرنے

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾

بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے ہمیں اور ہمارے باپ دادا کو یہی وعدہ دیا گیا۔ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ﴿۸۳﴾ کہہ یہ زمین اور اس میں جو کوئی بھی ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو؟ ﴿۸۴﴾ ضرور کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ﴿۸۵﴾

کا ذکر کرتے ہوئے ہمزہ استفہام کے ساتھ اس کا شدت سے انکار کر رہے ہیں کہ بھلا ایسا بھی کبھی ہو سکتا ہے؟

**آیت 83** ① لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا ......: "اَسَاطِيْرُ" "أُسْطُوْرَةٌ" کی جمع ہے، دل لگی کے لیے لکھے جانے والے قصے کہانیاں اور افسانے۔ "أُفْعُوْلَةٌ" کا وزن عموماً دل لگی کا مفہوم ادا کرنے والے الفاظ کے لیے آتا ہے، جیسے: "أُضْحُوْكَةٌ، أُرْجُوْحَةٌ، أُعْجُوْبَةٌ، أُحْدُوْثَةٌ، أُغْلُوْطَةٌ" وغیرہ۔

② پچھلی آیت میں ان کے قیامت کے انکار کی ایک وجہ بیان ہوئی ہے، یہ دوسری وجہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہو کر پیش ہونے کا دعویٰ اس پیغمبر کی طرح پہلے انبیاء کی طرف سے بھی ہوتا چلا آ رہا ہے، مگر سیکڑوں ہزاروں برس گزرنے کے باوجود پورا نہیں ہوا، کوئی مرنے کے بعد واپس نہیں آیا، معلوم ہوا یہ سب قصے کہانیاں ہیں۔ گویا ان کے خیال میں دوبارہ زندہ ہونے کا وعدہ اسی دنیا کے اندر پورا ہونا ہے۔ انتہائی ذہانت اور عقل کے دعوے داروں کی سمجھ دیکھیے کہ رسول کیا فرما رہے ہیں اور وہ اس کا مطلب کیا سمجھ رہے ہیں؟

**آیت 85،84** ① قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ ......: جب کفار نے اتنی شدت کے ساتھ قیامت کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے ان باتوں کا اقرار کروائیں اور ان کی زبان سے کہلوائیں جنھیں وہ جانتے پہچانتے اور مانتے ہیں، جنھیں تسلیم کرنے کی صورت میں انھیں لازماً قیامت کے دن زندہ ہونے کا اقرار کرنا پڑے گا۔ چنانچہ فرمایا، ان سے کہہ اگر واقعی تم کچھ جانتے ہو تو بتاؤ یہ زمین اور اس میں جو کچھ ہے، اس کا مالک کون ہے؟

② قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ : "تَذَكُّرٌ" (تفعّل) کا اصل معنی یاد کرنا ہے۔ "تَذَكَّرُوْنَ" اصل میں "تَتَذَكَّرُوْنَ" ہے، یعنی تو پھر تم اپنی فطرت میں رکھی ہوئی اس بات کو یاد کیوں نہیں کرتے جو غفلت میں پڑ کر بھلا چکے ہو اور اس سے نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے کہ جب زمین کا اور اس میں موجود ہر چیز کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر مالک کو چھوڑ کر مملوک کی پوجا کیوں؟ اور جب تم میں سے معمولی شخص بھی اس بات پر تیار نہیں کہ وہ اپنے غلاموں سے پوچھ گچھ نہ کرے، یا انھیں ان کی کارکردگی کا صلہ نہ دے، یا ان کے درمیان عدل نہ کرے، تو تم نے اس قادرِ مطلق اور حکیمِ کامل کے متعلق کیسے سوچ لیا کہ وہ تمھیں دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا، یا نہیں کرے گا اور اس کے بندے جو بھی کرتے رہیں نہ ان سے باز پرس کرے گا، نہ انھیں ان کے کیے کی جزا سزا دے گا اور نہ ان کے درمیان عدل فرمائے گا۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾

کہہ ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ ﴿۸۶﴾ ضرور کہیں گے اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۸۷﴾

آیت 87،86 ❶ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ ...... : زمین کے بعد ان سے عالم بالا کے متعلق سوال کرنے کا حکم دیا، کیونکہ آسمان زمین سے کہیں بڑا ہے، پھر ہر آسمان نیچے والے سے بڑا ہے اور ان سے اوپر عرش ان سب کو محیط ہے، جسے رب تعالیٰ نے عظیم (بہت بڑی عظمت والا) فرمایا ہے اور جو زمین و آسمان اور ان میں موجود ہر چیز سے پہلے موجود تھا۔ فرمایا: ''پوچھو، ان کا رب کون ہے؟'' فرمایا: ''وہ جواب میں کہیں گے، یہ سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے۔'' فرمایا: ''تو پھر تم ڈرتے نہیں؟'' پہلے فرمایا تھا: ﴿ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ؟) اب اس سے سخت الفاظ میں فرمایا: ﴿ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ (تو پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟) کیونکہ کوئی شخص جس قدر اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کا علم رکھے گا اتنا ہی زیادہ وہ اس سے ڈرے گا۔ مثلاً ایک بچے کو کچھ علم نہیں کہ بادشاہ کتنی قوت کا مالک ہے، وہ اس سے نہیں ڈرے گا۔ ہاں، جسے جس قدر معلوم ہوگا کہ بادشاہ کتنی قوت رکھتا ہے، وہ اس سے اتنا ہی ڈرے گا۔ اس لیے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [ فاطر : ۲۸ ] ''اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں۔'' یہاں فرمایا کہ یہ جان کر بھی کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب اللہ ہے، تم اس کے ساتھ شریک بناتے ہو اور کے بعد اس کی دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کا انکار کرتے ہو، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟

❷ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ : یہاں ایک سوال ہے کہ یہ کہنے کے بعد کہ ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ جواب بظاہر یہ ہے: ''اَللّٰهُ'' کہ وہ اللہ ہے، اس کے بجائے فرمایا: ''لِلّٰهِ'' کہ یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب طبری اور دوسرے مفسرین نے یہ دیا ہے کہ ''مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ'' (ساتوں آسمانوں کا رب کون ہے؟) کا معنی یہی ہے کہ ''لِمَنِ السَّمٰوَاتُ السَّبْعُ'' یعنی ساتوں آسمان اور عرش عظیم کس کی ملکیت ہیں؟ اس لیے جواب آیا: ''لِلّٰهِ'' کہ یہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔

❸ حجاز، عراق اور شام کے تمام قراء اس لفظ کو ''لِلّٰهِ'' پڑھنے پر متفق ہیں، کیونکہ ان کی طرف امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے جو مصحف بھیجے گئے، ان میں یہ لفظ اسی طرح ہے۔ البتہ بصرہ کے قاری ابوعمرو رحمہ اللہ اسے ''اَللّٰهُ'' پڑھتے ہیں، کیونکہ ان کے مصحف میں اسی طرح لکھا ہے۔ اس صورت میں معنی واضح ہے کہ ''وہ اللہ ہے۔'' طبری نے ''لِلّٰهِ'' کی قراءت کو راجح قرار دیا ہے، کیونکہ بصرہ کے سوا تمام بلادِ اسلام کے مصاحف میں یہ لفظ اسی طرح لکھا ہے۔

❹ ابن عاشور رحمہ اللہ نے ''لِلّٰهِ'' میں ایک نکتہ بیان فرمایا ہے کہ سوال تو یہ تھا کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ ان کی طرف سے اس کا جواب یہ ذکر فرمایا کہ وہ (یہ کہنے کے بجائے کہ ان کا رب اللہ ہے) یہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کی

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی، اگر تم جانتے ہو؟ ﴿۸۸﴾ ضرور کہیں گے اللہ کے لیے ہے۔ کہہ پھر تم کہاں سے جادو کیے جاتے ہو؟ ﴿۸۹﴾

ملکیت ہے، کیونکہ وہ زمین و آسمان اور عرش عظیم غرض ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھتے تھے، مگر انھوں نے شریک اور رب کئی بنا رکھے تھے۔ چنانچہ وہ حج و عمرہ کے لیے لبیک کہتے ہوئے کہتے تھے: « لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ ...... إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ » [ مسلم، الحج، باب التلبية وصفتها و وقتها : ۱۱۸۵ ] ''(اے اللہ!) میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں ...... مگر تیرا ایک شریک ہے، اس کا مالک بھی تو ہے، وہ کسی شے کا مالک نہیں۔'' مشرکین عرب فرشتوں کو اور مشرکین یہود و نصاریٰ عزیر اور عیسیٰ علیہ السلام کو رب سمجھتے تھے۔ یوسف علیہ السلام نے قید خانے کے ساتھیوں کو فرمایا: ﴿ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [ یوسف : ۳۹ ] ''کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، نہایت زبردست ہے۔'' غرض مشرکین مالک صرف اللہ کو سمجھتے، مگر رب دوسروں کو بھی مانتے تھے، اس لیے فرمایا: ﴿ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ کہ پھر کہہ دے کہ ہر چیز کا مالک اللہ کو مان کر پھر دوسرے ارباب کی پرستش کرتے ہو، تو تم اس کے غصے سے ڈرتے نہیں کہ وہ ساری کائنات کا مالک تمھارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟

آیت 88 ① قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ : "مُلْكٌ" اور "مِلْكٌ" دونوں کے مفہوم میں مبالغہ پیدا کرنے کے لیے لفظ "مَلَكُوْتٌ" استعمال کیا گیا ہے، یعنی ایسی کامل ملکیت اور کامل بادشاہی جس میں کوئی نقص نہ ہو۔ "بِيَدِهٖ" کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے۔''

② وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ: " أَجَارَ يُجِيْرُ " (افعال) پناہ دینا، کسی کو ہر ایک سے بچا کر اپنی حفاظت میں لے لینا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''عرب کا دستور تھا کہ ان کا سردار کسی کو پناہ دے دیتا تو اس کی پناہ کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی تھی اور کسی کو اس کے مقابلے میں پناہ دینے کا اختیار نہیں ہوتا تھا۔''

③ جب ان سے نیچے اور اوپر کے دونوں جہانوں کے مالک ہونے کا اقرار کروا لیا تو حکم دیا گیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ہر چیز کے رب ہونے کا اعتراف کرواؤ، تاکہ اس میں وہ چیزیں آ جائیں جن کا ذکر ہوا ہے اور وہ بھی جن کا ذکر نہیں ہوا۔ چنانچہ فرمایا، کہہ دے وہ کون ہے کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل ملکیت اور کامل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے (یعنی جسے وہ پناہ دے دے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا) اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی (یعنی جسے وہ پکڑ لے اسے کوئی اپنی پناہ میں نہیں لے سکتا، نہ اس سے چھڑا سکتا ہے)۔

آیت 89 ① سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ : یعنی وہ کہیں گے اس کا مالک بھی اللہ ہی ہے۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ

بلکہ ہم ان کے پاس کامل سچ لائے ہیں اور بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں ﴿۹۰﴾ اللہ نے نہ کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی اس کے ساتھ کوئی معبود تھا، اس وقت ضرور ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا تھا، اسے لے کر چل دیتا اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔ پاک ہے اللہ اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۹۱﴾ غائب اور حاضر کو جاننے والا ہے،

② قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ : "تُسْحَرُوْنَ" کا لفظی معنی ہے "جادو کیے جاتے ہو۔" جادو کا اثر دماغ پر ہوتا ہے، آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ پھر تمھاری مت کہاں سے ماری جا رہی ہے اور تمھارے ہوش و حواس کیسے گم ہو گئے کہ ایسی موٹی بات نہیں سمجھ سکتے۔ جب زمین و آسمان اور عرش عظیم کا مالک وہی ہوا اور ہر چیز اسی کے قبضہ و اختیار میں ہوئی تو عبادت میں اس کا شریک کہاں سے نکل آیا اور تمھارے بدن کی ہڈیاں اور ریزے اس کی قدرت و اختیار سے نکل کر کہاں چلے جائیں گے کہ وہ انھیں زندہ نہیں کر سکے گا۔

③ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرکین عرب کا عقیدہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ جسے پکڑ لے اسے کوئی پناہ دے کر چھڑا نہیں سکتا اور جسے اپنی پناہ میں لے لے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مگر افسوس کہ بعض مسلمان کہلانے والے شرک میں اس حد تک بڑھ گئے کہ مخلوق کو خالق سے بھی زیادہ اختیار رکھنے والا بنا دیا، چنانچہ ایسے ہی ایک تک باندھنے والے نے کہا ہے ؂

خدا جس کو پکڑے چھڑا لے محمد     محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

عجیب بات یہ ہے کہ اس صریح شرک اور اللہ تعالیٰ کی شدید گستاخی کے باوجود انھیں اصرار ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے مسلمان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهُ » [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالٰی : ﴿ واذكر في الكتاب مريم...... ﴾: ۳۴۴۵ ] "مجھے حد سے مت بڑھاؤ، جیسے نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، چنانچہ یہی کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔"

**آیت 90** ① بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ : "اَلْحَقُّ" سے مراد یہاں "سچ" ہے، کیونکہ مقابلے میں "لَكٰذِبُوْنَ" آ رہا ہے۔ "کامل" کا مفہوم الف لام سے حاصل ہو رہا ہے، یعنی ہم ان کے پاس جھوٹے قصے کہانیاں (اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ) نہیں لائے، بلکہ ایسا سچ لائے ہیں جس میں کوئی نقص نہیں۔

② وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ : یعنی یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں، اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے، یا کوئی اس کا بیٹا ہے جسے خدائی اختیارات حاصل ہیں، یا وہ جو چاہے اللہ تعالیٰ سے منوا سکتا ہے اور اس بات میں جھوٹے ہیں کہ موت کے بعد زندگی ممکن نہیں ہے اور ان کا جھوٹ ان کے اعترافات سے ثابت ہے جو اوپر گزرے۔

**آیت 92,91** ① مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ ...... : "وَلَدٍ" نکرہ پر "مَا" کے ساتھ نفی آئی تو عموم پیدا ہو گیا کہ "اللہ نے

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾
رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

**پس وہ بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۹۲﴾ تو کہہ اے میرے رب! اگر تو کبھی مجھے ضرور ہی وہ (عذاب) دکھائے جس کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۹۳﴾ تو اے میرے رب! مجھے ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کرنا ﴿۹۴﴾**

کوئی اولاد نہیں بنائی۔'' ''مِنْ'' کے ساتھ اس عموم کی تاکید ہوگئی، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی اولاد نہیں بنائی۔'' یعنی نہ کوئی فرشتہ، نہ نبی، نہ ولی، نہ کوئی اور۔

② تفسیر ابن کثیر میں ہے: ''اللہ تعالیٰ اس سے اپنی برتری بیان فرما رہا ہے کہ اس کی اولاد ہو یا اس کا کوئی شریک ہو، ملک میں، تصرف میں، عبادت کا مستحق ہونے میں۔ وہ یکتا ہے، نہ اس کی اولاد ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ کئی ایک الٰہ (معبود) ہیں تو ہر ایک اپنی مخلوق کا مستقل مالک ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں موجودات میں نظام قائم نہیں رہ سکتا، حالانکہ کائنات کا انتظام مکمل ہے۔ عالم علوی، عالم سفلی اور آسمان و زمین وغیرہ کمال ربط کے ساتھ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ دستور سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا کہ ان سب کا خالق و مالک ایک ہی ہے، نہ کہ متفرق کئی ایک۔ پھر بہت سے الٰہ (معبود) مان لینے کی صورت میں یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر ایک دوسرے کو پست و مغلوب کرنا اور خود غالب اور طاقت ور ہونا چاہے گا، اگر غالب آ گیا تو مغلوب الٰہ (معبود) نہ رہا، اگر غالب نہ آیا تو وہ خود الٰہ (معبود) نہیں۔'' (ابن کثیر)

پس ثابت ہوا کہ معبود ایک اللہ ہے۔ وہ ظالم، سرکش، حد سے گزر جانے والے مشرک جو اللہ کی اولاد ٹھہراتے ہیں اور اس کے شریک بتاتے ہیں، ان کے بیان کردہ اوصاف سے ذات الٰہی بہت بلند و بالا اور برتر و منزہ ہے، وہ ہر چیز کو جانتا ہے جو مخلوق سے پوشیدہ ہے اور اسے بھی جو مخلوق پر عیاں ہے، پس وہ ان تمام شرکاء سے پاک ہے جو مشرک اور منکر اللہ کا شریک بتاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اولاد یا شریک کے رد کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۲۲)، بنی اسرائیل (۴۲، ۱۱۱)، نحل (۵۷، ۵۸)، اور کہف (۴) کی تفسیر۔

**آیت 94,93** ① قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ: ''اِمَّا'' ''اِنْ'' کی تاکید ''مَا'' کے ساتھ کی گئی ہے، اس لیے ترجمہ ''اگر کبھی'' کیا گیا ہے اور ''تُرِيَنَّ'' میں نون ثقیلہ تاکید کے لیے ہے۔ مفسر بقاعی نے لکھا ہے: ''أَيْ إِنْ كَانَ وَلَا بُدَّ مِنْ أَنْ تُرِيَنِّيْ قَبْلَ مَوْتِيْ'' اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: ''اگر تو کبھی مجھے ضرور ہی وہ (عذاب) دکھائے۔''

② یعنی جب اللہ تعالیٰ کی جناب میں اولاد یا شریک بنانے کی سخت گستاخی کی جاتی ہے تو یقیناً کوئی سخت آفت آ کر رہے گی، اس لیے ہر مومن کو حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کے عذاب سے ڈر کر یہ دعا مانگے۔

③ آیت کے اولین مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کے ساتھ امت کا ہر فرد بھی مخاطب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں عذاب نہ لانے کا وعدہ فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [ الأنفال : ۳۳ ] ''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ تو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی

# وَ اِنَّا عَلٰۤى اَنۡ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمۡ لَقٰدِرُوۡنَ ﴿۹۵﴾

**اور بے شک ہم اس بات پر کہ تجھے وہ (عذاب) دکھائیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، ضرور قادر ہیں ﴿۹۵﴾**

عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔'' اس کے باوجود اس آیت میں آپ ﷺ کو عذاب سے بچنے کی دعا کا حکم دیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے عذاب سے سخت خوف زدہ رہتے تھے اور اس سے بچنے کی دعا کرتے رہتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پہلے اور پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیے، اس کے باوجود آپ کو استغفار کا حکم دیا، فرمایا: ﴿ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ﴾ [ النصر : ۳ ] ''تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ۔'' اور آپ ﷺ کثرت سے استغفار کیا کرتے تھے۔ اس سے آپ ﷺ کی اللہ تعالیٰ سے خشیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس میں امت کے لیے تعلیم بھی ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''رسول اللہ ﷺ جب بادل یا آندھی دیکھتے تو آپ کے چہرے پر اس کے اثرات پہچانے جاتے۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''یا رسول اللہ! لوگ جب بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، اس امید پر کہ اس میں بارش ہوگی اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ جب آپ اسے دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار نظر آتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( يَا عَائِشَةُ ! مَا يُؤْمِنِيْ أَنْ يَكُوْنَ فِيْهِ عَذَابٌ؟ عُذِّبَ قَوْمٌ بِالرِّيْحِ وَقَدْ رَأَى قَوْمٌ الْعَذَابَ فَقَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا )) [ بخاري، التفسير، باب قوله: ﴿ فلما رأوه عارضا...... ﴾ : ٤٨٢٩ ] ''اے عائشہ! کیا ضمانت ہے کہ اس میں کوئی عذاب نہ ہو؟ ایک قوم (عاد) پر آندھی کا عذاب آیا اور ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہنے لگے، یہ بادل ہم پر بارش برسانے والا ہے۔''

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدمی کو ہمیشہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ پروردگارا! تو مجھے عفو اور عافیت عطا فرما اور اگر تو نے کچھ لوگوں کو عذاب دینے کا ارادہ کر ہی لیا ہو تو مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کرنا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ دعا نقل فرمائی ہے: (( اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَ أَنْ تَغْفِرَ لِيْ وَ تَرْحَمَنِيْ وَ إِذَا أَرَدْتَ فِتْنَةً فِيْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ، وَ أَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَ حُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُ إِلٰى حُبِّكَ )) ''اے اللہ! میں تجھ سے نیکیاں کرنے، برائیاں چھوڑنے اور مساکین کی محبت کا سوال کرتا ہوں اور اس بات کا بھی کہ تو مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کرے اور جب تو کسی قوم کے فتنے کا ارادہ کرے تو مجھے فتنے میں ڈالے بغیر قبض کر لے۔ میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور ان لوگوں کی محبت کا جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں اور ایسے عمل کی محبت کا جو تیری محبت کے قریب کر دے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّهَا حَقٌّ فَادْرُسُوْهَا ثُمَّ تَعَلَّمُوْهَا )) [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة ص : ٣٢٣٥، قال الترمذي حسن صحيح و قال الألباني صحيح ] ''یہ کلمات حق ہیں انھیں پڑھو، پھر انھیں اچھی طرح سیکھ لو۔''

⑤ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ دعا سکھائی تاکہ مشرکین پر عذاب آئے تو آپ اس وقت ان کے ساتھ نہ ہوں، بلکہ ان سے الگ ہوں، پھر آپ ﷺ کو ہجرت کی توفیق عطا فرما کر آپ کو کافروں سے الگ کر دیا اور قحط اور جنگوں کی صورت میں ان پر جو عذاب آئے آپ کو ان سے محفوظ رکھا۔

**آیت 95** ① وَ اِنَّا عَلٰۤى اَنۡ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمۡ لَقٰدِرُوۡنَ : ''إِنَّ'' اور ''لام'' کے ساتھ تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾

اس طریقے سے برائی کو ہٹا جو سب سے اچھا ہو، ہم زیادہ جاننے والے ہیں جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں ﴿۹۶﴾

نے آپ ﷺ کو مشرکین مکہ پر عذاب کا وہ وعدہ پورا ہوتا ہوا آنکھوں سے دکھا دیا، جب کہ آپ اس وقت ان سے الگ ہو چکے تھے اور مدینہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ چنانچہ اس عذاب کی ابتدا بدر سے ہوئی، جب رسول اللہ ﷺ نے کفار قریش کے سرداروں کی لاشیں کنویں میں پھینکنے کا حکم دیا اور پھر اس کنویں کے کنارے پر کھڑے ہو کر ایک ایک کا نام لے کر فرمایا: (( فَإِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؟ )) [ بخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل : ۳۹۷۶ ] ”یقیناً ہم نے تو وہ وعدہ سچا پا لیا جو ہمارے رب نے ہم سے کیا تھا، تو کیا تم نے بھی وہ وعدہ سچا پایا جو تمھارے رب نے تم سے کیا تھا؟“ پھر ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہو گیا اور دسویں سال حجۃ الوداع کے موقع پر مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دی گئی کہ اسلام قبول کر لیں یا جزیرۃ العرب خالی کر دیں اور یہاں سے نکل جائیں، ورنہ جہاد کے ذریعے سے ان کا کلی خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یہ عذاب تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں ان پر نازل ہوا، پھر خلفائے راشدین کے زمانے میں آس پاس کے ممالک سے شرک اور مشرکین کا خاتمہ ہوا اور اسلام کا بول بالا ہوا۔ (والحمد للہ)

② اگر عذاب سے مراد آسمان سے نازل ہونے والا عذاب ہو، جیسا کہ عاد و ثمود پر نازل ہوا، تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان سے عذاب کا جو وعدہ کر رہے ہیں یقیناً آپ کو دکھانے پر قادر ہیں، مگر ایک تو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہم نے طے کیا ہے کہ جہاد کے ذریعے سے مسلمانوں کے ہاتھوں کفار کو عذاب ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [ التوبة : ۱۴ ] ”ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔“ اور بے شک ہم آسمان سے ایسا عذاب بھیجنے پر قادر ہیں جو ان کا صفایا کر دے، مگر ہماری حکمت کا تقاضا انھیں مہلت دینے کا ہے، تاکہ ان میں سے جنھوں نے اسلام قبول کرنا ہے کر لیں اور جن کی آئندہ نسل نے اسلام قبول کرنا ہے وہ نسل وجود میں آ جائے۔

**آیت 96** ① اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ...... : یعنی ہم عذاب میں جو تاخیر کر رہے ہیں اس میں ہماری حکمت ہے، آپ اس دوران ان کی ہر برائی اور زیادتی کا جواب ایسے طریقے سے دیں جو اچھا ہی نہیں، سب سے اچھا ہو۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا کچھ کہتے ہیں، کس طرح اللہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور کس طرح آپ کو کاہن، شاعر، جادوگر اور دیوانہ وغیرہ کہتے ہیں۔

② برائی کا جواب بہترین طریقے سے یہ ہے کہ بدی کا جواب نیکی سے، ظلم کا جواب انصاف سے، خیانت کا جواب دیانت داری سے، جھوٹ کا جواب سچ سے، قطع رحمی کا جواب صلہ رحمی سے اور گالی گلوچ کا جواب دعا و سلام سے دیا جائے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ۳۴ ] ”(برائی کو) اس (طریقے) کے ساتھ ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ

وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ

**اور تو کہہ اے میرے رب! میں شیطانوں کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں﴿۹۷﴾ اور اے میرے رب! میں اس**

شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہو گا جیسے وہ دلی دوست ہو۔'' اس میں عفو و درگزر کی تعلیم دی گئی ہے، کیونکہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے لیے یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: (( وَاللّٰهِ! مَا انْتَقَمَ لِنَفْسِهِ فِيْ شَيْءٍ يُؤْتَى إِلَيْهِ قَطُّ حَتّٰى تُنْتَهَكَ حُرُمَاتُ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ )) [ بخاري، الحدود، باب إقامة الحدود والانتقام لحرمات الله : ٦٧٨٦ ] ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ کی گئی کسی زیادتی میں اپنی ذات کا انتقام کبھی نہیں لیا، مگر اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال کیا جائے تو اللہ کی خاطر انتقام لیتے تھے۔''

**آیت 98، 97** ① وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ...... : ''اَلْهَمْزُ'' کا معنی ہاتھ یا کسی بھی چیز کے ساتھ چوکا مارنا ہے۔ گلا گھونٹنے، طعنہ دینے اور غیبت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مراد شیطان کے چوکے، وسوسے اور اکساہٹیں ہیں، جن کے ساتھ وہ غصے پر ابھارتا ہے، حتیٰ کہ جنون تک پہنچا دیتا ہے۔ شیاطین انس و جن کے وساوس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ناس کی تفسیر۔ ''اَنْ يَّحْضُرُوْنِ'' اصل میں ''أَنْ يَّحْضُرُوْنِيْ'' ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ''اَنْ'' کے ساتھ ''يَحْضُرُوْنِ'' کا نون گر جاتا، یاء کو حذف کر کے نون کا کسرہ باقی رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب! میں صرف شیاطین کے چوکوں ہی سے تیری پناہ نہیں مانگتا، اس بات سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں، کیونکہ انھوں نے خیر کے ساتھ تو آنا ہی نہیں۔ برے لوگوں کی صحبت سے بھی بچنے کی دعا سکھائی۔

② برائی کا جواب نیکی سے دینا اگرچہ دشمنوں کو دوست بنانے کے لیے اکسیر ہے، مگر اس کے لیے بہت بڑے حوصلے کی ضرورت ہے، ہر شخص میں یہ برداشت نہیں پائی جاتی، آدمی کا نفس اسے انتقام پر ابھارتا ہے، پھر انسانوں اور جنوں میں سے شیطان اسے اکسا کر غصہ دلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے برائی کا جواب بہترین طریقے کے ساتھ دینے کی تلقین کے بعد ایسے شیطان انسانوں اور جنوں کی اکساہٹوں سے اپنی پناہ مانگنے کی تاکید فرمائی، کیونکہ ان ظالموں کا مقابلہ کرنے میں انسان بے بس ہے۔ یہاں اس کی کوئی تدبیر کام نہیں آتی، نہ ہی وہ شیطان کسی نیکی یا احسان سے دوست بنتے یا نرم ہوتے ہیں، کیونکہ انھوں نے دشمنی کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس لیے اسے اس ذات گرامی کی پناہ میں آ جانا چاہیے جس کے قبضے میں کائنات کی ہر چیز ہے، نیک ہو یا بد ہر ایک کی پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے۔ دوسری جگہ یہی بات تفصیل سے بیان فرمائی: ﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ [ حمٓ السجدة : ٣٤ تا ٣٦ ] ''اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) کے ساتھ ہٹا جو سب سے اچھا

# يَّحۡضُرُوۡنِ ﴿۹۸﴾

سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آموجود ہوں﴿۹۸﴾

ہے، تو اچانک وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہوگا جیسے وہ دلی دوست ہے۔ اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انھی کو جو صبر کریں اور یہ نہیں دی جاتی مگر اسی کو جو بہت بڑے نصیب والا ہے۔ اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ تجھے ابھار ہی دے تو اللہ کی پناہ طلب کر، بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید پڑھتے وقت شیطان سے پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ (نحل: ۹۸) رسول اللہ ﷺ نے موت کے وقت شیطان کے گمراہ کرنے سے دعا کی تعلیم دی، ابو الیسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَدْمِ وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ التَّرَدِّيْ، وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْهَرَمِ وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ يَتَخَبَّطَنِيَ الشَّيْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَمُوْتَ فِيْ سَبِيْلِكَ مُدْبِرًا وَ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَمُوْتَ لَدِيْغًا » [ أبوداوٗد، الوتر، باب في الإستعاذة : ۱۵۵۲، و صححه الألباني ] ''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں (اپنے اوپر) دیوار وغیرہ گرنے سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں نیچے گر جانے سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں غرق ہونے سے، جلنے سے اور شدید بڑھاپے سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان مجھے موت کے وقت خبطی بنا دے اور اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تیرے راستے میں پیٹھ دیتا ہوا مروں اور تیری پناہ مانگتا ہوں کہ زہریلے ڈنگ سے مروں۔'' کسی خاص وقت ہی میں نہیں، بلکہ '' أَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحۡضُرُوۡنِ '' کا مطلب یہ ہے کہ ''اے میرے رب! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ شیاطین میرے پاس کسی بھی وقت آئیں یا موجود ہوں۔'' اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے تمام کاموں کے شروع میں اللہ کا نام لینے کا حکم دیا، کیونکہ اللہ کا نام لینے سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے کھانے پینے، جماع اور ذبح وغیرہ کے شروع میں اللہ کا نام لینے کا حکم دیا، رات کو اللہ کا نام لے کر سونے کا حکم دیا اور فرمایا: « وَ أَغْلِقُوا الْأَبْوَابَ، وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَفْتَحُ بَابًا مُغْلَقًا، وَ أَوْكُوْا قِرَبَكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ، وَ خَمِّرُوْا آنِيَتَكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ، وَلَوْ أَنْ تَعْرُضُوْا عَلَيْهَا شَيْئًا وَ أَطْفِئُوْا مَصَابِيْحَكُمْ » [ بخاري، الأشربة، باب تغطية الإناء : ۵۶۲۳۔ مسلم : ۲۰۱۲/۹۷ ] ''(جب رات کی ایک گھڑی گزر جائے تو) دروازے بند کرلو اور اس وقت اللہ کا نام لو، کیونکہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھولتا اور اللہ کا نام لے کر اپنے مشکیزوں کا منہ باندھ دو۔ اللہ کا نام لے کر اپنے برتنوں کو ڈھانپ دو، خواہ کسی چیز کو چوڑائی میں رکھ کر ہی ڈھانپ سکو اور اپنے چراغ (سونے سے پہلے) بجھا دیا کرو۔'' ہمارے استاذ حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ ان کے پاس ایک شخص نے شکایت کی کہ رات کو اچانک گھر کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں، تو انھوں نے رات بسم اللہ پڑھ کر دروازے بند کرنے کی نصیحت کی تو دروازوں کا کھلنا ختم ہوگیا۔

رسول اللہ ﷺ نے غصے کے وقت بھی شیطان سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی۔ سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو آدمی

# حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾

## یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے تو کہتا ہے اے میرے رب! مجھے واپس بھیجو ﴿۹۹﴾

نبی ﷺ کے پاس ایک دوسرے کو گالی دینے لگے، ہم آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے کو سخت غصے میں گالی دے رہا تھا، اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا، نبی ﷺ نے فرمایا: (( إِنِّيْ لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ، لَوْ قَالَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، فَقَالُوْا لِلرَّجُلِ أَلَا تَسْمَعُ مَا يَقُوْلُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ؟ قَالَ إِنِّيْ لَسْتُ بِمَجْنُوْنٍ )) [ بخاري، الأدب، باب الحذر من الغضب : ۶۱۱۵ ] ''میں ایک کلمہ جانتا ہوں، اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ دے تو جو غصہ اسے آیا ہوا ہے چلا جائے۔ وہ کلمہ ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' ہے۔'' لوگوں نے اسے کہا: ''سنتے نہیں! نبی ﷺ کیا فرما رہے ہیں؟'' وہ کہنے لگا: ''میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔''

**آیت 99** ❶ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ : یہاں ایک سوال ہے کہ لفظ ''حَتّٰۤی'' (یہاں تک) کا تعلق کس سے ہے؟ مفسرین نے اس کی کئی توجیہیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کفار کی برائیوں کا جواب بہترین طریقے سے دیتے رہیں اور جو باتیں یہ بناتے ہیں انھیں ہمارے حوالے کرتے رہیں، یہاں تک کہ...... دوسری توجیہ اس سے زیادہ واضح ہے کہ اس کا تعلق محذوف جملے سے ہے جو ''حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ'' سے خود بخود معلوم ہو رہا ہے: ''أَيْ لَا يَزَالُوْنَ كَذٰلِكَ حَتّٰى إِذَا جَاءَ ......'' یعنی وہ اسی طرح اپنے کفر و شرک پر قائم رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے...... اس طرح جملے کے حذف کی مثال فرزدق کا شعر ہے ؎

فَيَا عَجَبًا حَتّٰى كُلَيْبٌ تَسُبُّنِيْ　　كَأَنَّ أَبَاهَا نَهْشَلٌ أَوْ مُجَاشِعُ

(أَيْ يَسُبُّنِيَ النَّاسُ حَتّٰى كُلَيْبٌ ) ''یعنی تعجب ہے کہ مجھے سبھی لوگ گالی دیتے ہیں، حتیٰ کہ بنو کلیب بھی گالی دیتے ہیں، جیسے ان کا باپ نہشل یا مجاشع ہے، یعنی کسی نامور باپ کی اولاد نہ ہونے کے باوجود کلیب جیسے قبیلے کے بے وقعت لوگ بھی میرے جیسے اونچے نسب والے شخص کو گالی دیتے ہیں۔''

❷ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ : ''رَجَعَ يَرْجِعُ'' لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی، اس کا معنی لوٹنا بھی ہے اور لوٹانا بھی، یہاں مراد لوٹانا ہے۔ یعنی کافر و مشرک اپنے کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے اور رسولوں کی بتائی ہوئی وہ تمام حقیقتیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں، جنھیں وہ اب تک جھٹلاتے رہے تھے، تو وہ مہلت دینے اور دنیا کی طرف واپس لوٹانے کی درخواست کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ منافقون (۱۰، ۱۱) اور ابراہیم (۴۴) یہ درخواست وہ موت کے وقت بھی کریں گے، قیامت کے دن بھی اور آگ کو دیکھ کر بھی، جیسا کہ دوسری آیات میں آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۳)، سجدہ (۱۲)، انعام (۲۷)، شوریٰ (۴۴)، مؤمن (۱۱)، فاطر (۳۷) اور سبا (۵۱ تا ۵۳)۔

❸ ''رَبِّ'' (اے میرے رب!) میں مخاطب واحد ہے، جبکہ ''ارْجِعُوْنِ'' (مجھے واپس بھیجو) میں مخاطب جمع ہے۔ مفسرین

لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کرلوں۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک بات ہے جسے وہ کہنے والا ہے اور ان کے پیچھے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے، ایک پردہ ہے ﴿۱۰۰﴾

نے اس کی تین توجیہیں کی ہیں، ایک یہ کہ کافر نہایت عجز کے ساتھ درخواست کرتے ہوئے تعظیم کے لیے اللہ تعالیٰ کو جمع کے صیغے سے مخاطب کرے گا، جیسا کہ تمام زبانوں میں یہ انداز معروف ہے، عربی میں بھی ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ فرشتوں نے سارہ علیہا السلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿ اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ [ هود : ۷۳ ] ”کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے گھر والو!“ ابن عاشور لکھتے ہیں کہ مخاطب مذکر ہو یا مؤنث، تعظیم کے وقت اس کے لیے جمع مذکر کی ضمیر ”كُم“ ہی استعمال ہوتی ہے۔ کلام عرب میں واحد مخاطب کے لیے جمع کی ضمیر کی مثال حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول ہے ؎

أَلَا فَارْحَمُوْنِيْ يَا إِلٰهَ مُحَمَّدٍ ... فَإِنْ لَمْ أَكُنْ أَهْلًا فَأَنْتَ لَهُ أَهْلٌ

اس شعر میں شاعر نے ”فَارْحَمْنِيْ“ کے بجائے ”فَارْحَمُوْنِيْ“ کہا ہے اور حماسہ کے شاعر جعفر بن علبہ حارثی کا شعر ہے، جس میں وہ اپنی محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

فَلَا تَحْسَبِيْ أَنِّيْ تَخَشَّعْتُ بَعْدَكُمْ ... لِشَيْءٍ وَ لَا أَنِّيْ مِنَ الْمَوْتِ أَفْرَقُ

”پس تو یہ گمان نہ کر کہ میں تمھارے بعد کسی چیز کی وجہ سے عاجز ہو گیا ہوں اور نہ یہ کہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔“

اس شعر میں شاعر نے ”بَعْدَكِ“ کے بجائے ”بَعْدَكُمْ“ کہا ہے۔ یہ توجیہ سب سے اچھی ہے۔ دوسری توجیہ طبری رحمہ اللہ نے فرمائی ہے کہ کافر کلام کی ابتدا ”رَبِّ“ سے کرے گا، جو استغاثہ کے لیے ہے، مگر وہ واپس بھیجنے کی درخواست ان فرشتوں سے کرے گا جو اس کی روح نکالنے کے لیے آئے ہوں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کچھ لوگ کسی کو پکڑ لیں اور وہ کہے ”ہائے اللہ! مجھے چھوڑ دو۔“ یہ توجیہ بھی بہت اچھی ہے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ کافر اللہ تعالیٰ سے بار بار درخواست کرے گا: ”اِرْجِعْنِيْ، اِرْجِعْنِيْ، اِرْجِعْنِيْ“ تو اس تکرار کے بیان کے لیے جمع کا صیغہ ”ارْجِعُوْنِ“ استعمال کیا گیا ہے۔ اس توجیہ کی معتبر نظیر مجھے نہیں ملی۔

**آیت 100** ① لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ : تاکہ میں جو کچھ مال و متاع چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کرلوں، یا اس دنیا میں جا کر کوئی نیک عمل کرلوں جسے میں چھوڑ آیا ہوں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے: ”قتادہ نے آیت: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ ﴾ کے متعلق کہا کہ علاء بن زیاد فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اس مرنے والے کی جگہ رکھ کر سوچے کہ گویا اس کی موت آ پہنچی تھی اور اس نے رب تعالیٰ سے مہلت مانگی تو اسے مل گئی، سو وہ اس مہلت میں جس قدر ہو سکے اللہ تعالیٰ کی بندگی کر لے۔ اور قتادہ نے فرمایا، اللہ کی قسم! نہ وہ گھر والوں کی طرف جانے کی تمنا کرے گا، نہ اولاد کی

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن ان کے درمیان نہ کوئی رشتے ہوں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے ﴿۱۰۱﴾

طرف، بلکہ یہی تمنا کرے گا کہ واپس جا کر اللہ کی اطاعت کر لے۔ سو کوتاہی کرنے والے کافر کی آرزو دیکھو اور ملی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس پر عمل کر لو۔‘‘

② كَلَّا : اس کے دو معنی ہیں اور دونوں مراد ہیں، ایک یہ کہ ہرگز ایسا نہ ہوگا کہ تم دنیا میں واپس جاؤ اور دوسرا یہ کہ تمھارا کہنا کہ میں واپس جا کر نیک عمل کروں گا، ہرگز درست نہیں۔

③ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا : یعنی یہ صرف ایک بات ہوگی جو وہ کہے گا، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، بلکہ وہ صاف جھوٹ کہہ رہا ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۲۸ ] ’’اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا اور بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔‘‘ دوسرا مطلب یہ کہ یہ صرف اس کے منہ کی بات ہوگی جو وہ بار بار کہے گا، مگر اسے اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی بات ہے جو ہر کافر مرتے وقت ضرور ہی کہنے والا ہے۔

④ وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ : ’’وَرَاءٌ‘‘ کا معنی آگے بھی ہے اور پیچھے بھی، یہاں دونوں معنی مراد ہیں کہ آگے ایک اور عالم برزخ آرہا ہے، جسے قبر کی زندگی بھی کہا جاتا ہے، جہاں پہنچ کر دنیا والوں سے پردہ ہو جاتا ہے اور آخرت بھی سامنے نہیں آتی۔ ہاں کافر کے لیے آخرت کے عذاب کا تھوڑا سا نمونہ سامنے آتا ہے، جس کا مزہ قیامت تک چکھتا رہے گا۔ اسی طرح اہل ایمان کے لیے راحت و نعمت میسر ہوتی ہے۔ دونوں کا احادیث میں ذکر ہے اور آیات میں بھی۔ دیکھیے سورۂ مومن (۴۵، ۴۶)۔

**آیت 101** ① فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ : نسب سے مراد وہ قرابت ہے جو ولادت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ’’بَيْنَهُمْ‘‘ سے مراد کفار ہیں، کیونکہ پیچھے انھی کا ذکر آرہا ہے۔ عالم برزخ کے بعد جب قبروں سے زندہ ہو کر نکلنے کے لیے صور میں پھونکا جائے گا تو کفار کی باہمی تمام نسبی قرابتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کسی کا باپ یا بیٹا یا بھائی نہیں رہے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس نسبی تعلق کی وجہ سے جو ایک دوسرے کی مدد ہوتی ہے، وہ نہیں ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ۝ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴾ [ عبس : ۳۴ تا ۳۷ ] ’’جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔ اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی۔‘‘ یہ حال مجرموں کا ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ ۝ وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴾ [ المعارج : ۱۱ تا ۱۴ ] ’’مجرم چاہے گا کاش کہ اس دن کے عذاب سے (بچنے کے

فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فِيۡ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

پھر وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے تو وہی لوگ کامیاب ہیں ﴿۱۰۲﴾ اور وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے تو وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانوں کا نقصان کیا، جہنم ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۰۳﴾

لیے) فدیے میں دے دے اپنے بیٹوں کو۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو۔ اور اپنے خاندان کو، جو اسے جگہ دیا کرتا تھا۔ اور ان تمام لوگوں کو جو زمین میں ہیں، پھر اپنے آپ کو بچا لے۔'' یہ معاملہ صور پھونکنے کے وقت ہوگا۔ بعد میں بھی کفار کا حال یہی رہے گا۔ البتہ ایمان والوں کو ان کی نسبی قرابت کا فائدہ ہوگا اور دوستی کا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّيَّتُهُمۡ بِاِيۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَ مَاۤ اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَيۡءٍ﴾ [ الطور : ۲۱ ] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان سے ان کے عمل میں کچھ کمی نہ کریں گے۔'' اور دوستی کے متعلق فرمایا: ﴿اَلۡاَخِلَّآءُ يَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِيۡنَ﴾ [ الزخرف : ٦٧ ] ''سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، مگر متقی لوگ۔''

② وَ لَا يَتَسَآءَلُوۡنَ : یہاں ایک سوال ہے کہ یہاں فرمایا کہ وہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے، جب کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ اَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ﴾ [ الصافات : ۲۷ ] ''اور ان کے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔'' ایسا کیوں ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا دن ہے۔ اس میں مختلف مواقع اور مختلف حالتیں ہوں گی، کسی حالت میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے اور کسی میں نہیں کریں گے۔ لہٰذا ان آیات میں تعارض نہیں۔

**آیت 103,102** ان دونوں آیات میں قیامت کا ایک اور منظر بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے اعمال کا وزن۔ ''مَوَازِيۡنُ'' کو جمع لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ میزان کئی قسم کے ہوں گے، ہر عمل کے لیے مخصوص ترازو ہوگا۔ ان دونوں آیات میں اہل ایمان کے لیے خوش خبری ہے اور مشرکین کے لیے وعید، کیونکہ اصل وزن ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ہوگا، مشرکین کے عمل ویسے ہی باطل ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ قَدِمۡنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا﴾ [ الفرقان : ۲۳ ] ''اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔'' اور فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا﴾ [ الکھف : ۱۰۵ ] ''یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے، سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔''

تَلۡفَحُ وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ وَ هُمۡ فِيۡهَا كٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمۡ تَكُنۡ اٰيٰتِيۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَكُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوۡا رَبَّنَا غَلَبَتۡ عَلَيۡنَا شِقۡوَتُنَا وَ كُنَّا قَوۡمًا ضَآلِّيۡنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡهَا فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخۡسَـُٔوۡا فِيۡهَا وَ لَا تُكَلِّمُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾

ان کے چہروں کو آگ جھلسائے گی اور وہ اس میں تیوری چڑھانے والے ہوں گے ﴿۱۰۴﴾ کیا میری آیتیں تم پر پڑھی نہ جاتی تھیں، تو تم انھیں جھٹلایا کرتے تھے؟ ﴿۱۰۵﴾ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم پر ہماری بدبختی غالب آگئی اور ہم گمراہ لوگ تھے ﴿۱۰۶﴾ اے ہمارے رب! ہمیں اس سے نکال لے، پھر اگر ہم دوبارہ ایسا کریں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے ﴿۱۰۷﴾ فرمائے گا اس میں دور دفع رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو ﴿۱۰۸﴾

**آیت 104** ① تَلۡفَحُ وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ : چہرے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ انسان کا سب سے اہم اور باشرف حصہ ہے اور انسان سب سے زیادہ اسی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، جب آگ اسے بھی جلا رہی ہوگی تو جسم کے دوسرے حصوں کا کیا حال ہوگا۔

② وَ هُمۡ فِيۡهَا كٰلِحُوۡنَ : " كَلَحَ " کا معنی ہے کہ اوپر کا ہونٹ اوپر اٹھ جائے اور نیچے کا مزید نیچے ہو جائے اور دانت باہر نکل آئیں، جس سے چہرہ شدید تیوری والا، نہایت بدشکل اور ڈراؤنا ہو جائے، جیسے بکرے کی جلی ہوئی سری ہوتی ہے۔

**آیت 106** ① قَالُوۡا رَبَّنَا غَلَبَتۡ عَلَيۡنَا شِقۡوَتُنَا : "شِقْوَةٌ" بدبختی۔ "الصحيح المسبور" میں ہے کہ آدم بن ابی ایاس نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد کا قول نقل فرمایا ہے کہ آیت : ﴿ غَلَبَتۡ عَلَيۡنَا شِقۡوَتُنَا ﴾ کا معنی ہے: "اَلَّتِي كَتَبْتَ عَلَيْنَا" یعنی ہم پر ہماری وہ بدبختی غالب آ گئی جو تو نے ہم پر لکھی تھی۔ طبری نے بھی یہ قول نقل فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ ظالم اپنا عذر پیش کرتے ہوئے بھی سارا الزام اللہ تعالیٰ پر رکھیں گے، جیسا کہ شیطان نے بھی اپنی گمراہی کا الزام اللہ تعالیٰ کو دیا تھا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۶)۔

② وَ كُنَّا قَوۡمًا ضَآلِّيۡنَ : ابن کثیر نے فرمایا: "یعنی ہم پر حجت قائم ہوئی (اور ہم تک ہدایت کی بات پہنچی) لیکن ہم اس سے کہیں زیادہ بدبخت تھے کہ اس کے تابع ہوتے اور اس کی پیروی کرتے، سو ہم اس سے بھٹک گئے اور ہمیں ہدایت حاصل نہ ہو سکی۔"

**آیت 107** رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡهَا ...... : یہ مطالبہ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار کر چکے ہوں گے۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۹۹)۔

**آیت 108** قَالَ اخۡسَـُٔوۡا فِيۡهَا ......: " خَسَأَ يَخْسَأُ (منع) أَيْ ذَلَّ۔ " "اِخْسَـُٔوْا" ذلیل رہو، دفع دور رہو۔ یہ لفظ کتے وغیرہ کو دھتکارنے کے لیے بولا جاتا ہے، پھر اس کا استعمال ہر اس شخص کے لیے بھی ہونے لگا جسے حقیر اور ذلیل قرار دے کر دور دفع ہونے کے لیے کہا جائے، یعنی اللہ تعالیٰ انھیں دھتکارتے ہوئے فرمائیں گے کہ اسی جہنم میں ذلیل اور دور دفع رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد ان کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور یہ ان کا آخری کلام ہوگا، مگر انھی آیات میں آگے ان کی اللہ تعالیٰ سے گفتگو آ رہی ہے: ﴿ قٰلَ كَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِى الۡاَرۡضِ عَدَدَ سِنِيۡنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوۡا لَبِثۡنَا يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ فَسۡـَٔـلِ الۡعَآدِّيۡنَ ﴾ [ المؤمنون : ۱۱۲، ۱۱۳ ] "فرمائے گا تم زمین میں سالوں کی گنتی میں کتنی مدت رہے؟ وہ

اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿١١٠﴾

بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے بندوں میں سے کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، سو تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿١٠٩﴾ تو تم نے انھیں مذاق بنا لیا، یہاں تک کہ انھوں نے تم کو میری یاد بھلا دی اور تم ان سے ہنسا کرتے تھے ﴿١١٠﴾

کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے، سو شمار کرنے والوں سے پوچھ لے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ ایسی کوئی روایت صحیح نہیں۔ البتہ آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی درخواست حقارت کے ساتھ رد کر دی جائے گی۔

**آیت 109** ① اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ ...... : ''فَرِيْقٌ'' کے لفظ سے معلوم ہوا کہ اللہ کے وہ بندے کفار اور ان کے عقیدہ و عمل سے یکسر الگ گروہ تھے۔ مقصود اس کلام سے کفار کو دنیا میں اہل ایمان کے ساتھ ان کے سلوک کی اور اہل ایمان کی موجودہ حالت کی خبر دے کر حسرت و افسوس دلانا ہے۔

② رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا : ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: (( أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ )) [ بخاري، الإيمان، باب من قال إن الإيمان هو العمل : ٢٦ ] ''کون سا عمل افضل ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔'' یعنی میرے بندوں میں سے ایک گروہ کے لوگ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لانے کے عمل کا وسیلہ پیش کر کے مجھ سے دعا کیا کرتے تھے۔ اس سے دعا کے وقت اپنے کسی خالص عمل کا وسیلہ پیش کرنا ثابت ہوا۔ دیکھیے ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ کی تفسیر اور آل عمران کی آیت (۱۹۳) کی تفسیر۔

③ فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا : ''غَفَرَ'' کا معنی پردہ ڈالنا ہے۔ ''اَلْمِغْفَرُ'' خود کو کہتے ہیں، جو لوہے کا ہوتا ہے اور دشمن کی ضرب سے پردے کا کام دیتا ہے، یعنی اے ہمارے رب! ہم تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان لائے ہیں، اس لیے تو ہمارے گناہوں اور لغزشوں پر پردہ ڈال، ایسا پردہ کہ کراماً کاتبین کے دفتر میں بھی نظر نہ آئے اور ہم پر رحم کر۔

④ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ : یہاں بقاعی رحمہ اللہ نے واؤ عطف کا نکتہ بیان فرمایا ہے (اور انھوں نے تقریباً ہر ایسی جگہ مقام کے مطابق کوئی نکتہ بیان فرمایا ہے، جو صاحب ذوق حضرات کے لیے نہایت پر لطف ہے) وہ کہتے ہیں کہ واؤ کا مطلب یہ ہے کہ ''اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ'' سے پہلے ایک جملہ ہے جس پر ''اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ'' کا عطف ہے۔ ''فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا'' کی مناسبت سے پورا کلام اس طرح ہے: ''فَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ وَ أَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ۔'' واؤ عطف سے چونکہ بات واضح ہو رہی ہے، اس لیے ''أَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ'' کو حذف کر دیا، کیونکہ مسلمہ قاعدہ ہے: ''خَيْرُ الْكَلَامِ مَا قَلَّ وَ دَلَّ'' کہ بہترین کلام وہ ہے جس میں الفاظ کم ہوں اور وہ مدلل ہو۔

**آیت 110** ① فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا ...... : ''حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ'' کا لفظی معنی یہ ہے کہ انھوں نے تمھیں میری یاد

اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

**بے شک میں نے انھیں آج اس کے بدلے جو انھوں نے صبر کیا، یہ جزا دی ہے کہ وہی کامیاب ہیں ﴿۱۱۱﴾ فرمائے گا تم زمین میں سالوں کی گنتی میں کتنی مدت رہے؟ ﴿۱۱۲﴾ وہ کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے، سو شمار کرنے والوں سے پوچھ لے ﴿۱۱۳﴾**

بھلا دی۔ یعنی تم ان کے پیچھے ایسے ہاتھ دھو کر پڑے اور ان کا اس قدر مذاق اڑاتے رہے کہ گویا وہ تمھیں میری یاد بھلانے کا سبب بن گئے۔ (شوکانی)

② وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ: دیکھیے سورۂ مطففین (۲۹ تا ۳۶)۔

**آیت 111** اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ ...... : دنیا میں اہل ایمان کے لیے ایک صبر آزما مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ دین پر عمل کرتے ہیں تو دین سے جاہل اور ایمان سے بے خبر لوگ انھیں ہنسی مذاق اور ملامت کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ کتنے ہی کمزور ایمان والے ہیں جو ان ملامتوں سے ڈر کر بہت سے احکام الٰہی پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں، جیسے مشرکانہ رسوم سے کنارہ کشی اور ان کا رد ہے، ڈاڑھی ہے، پردے کا مسئلہ ہے، شادی بیاہ اور موت وغیرہ کی ہندوانہ رسوم سے اجتناب ہے وغیرہ وغیرہ۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کسی بھی ملامت کی پروا نہیں کرتے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے کسی بھی موقع پر انحراف نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انھیں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے گا اور انھی کو کامیابی سے سرفراز فرمائے گا۔ یا اللہ! تو ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرما۔ (آمین) سورۂ مطففین کی آیات (۲۹ تا ۳۶) بھی ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 112** قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ : کفار قیامت کا انکار کرتے تھے اور دنیا کی زندگی کے علاوہ کسی زندگی کو نہیں مانتے تھے۔ ان کے خیال میں مٹی اور ہڈیاں ہو جانے کے بعد زندہ ہونا ممکن نہ تھا، اس لیے انھوں نے دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھا، اسے آخرت پر ترجیح دی اور اسے اس طرح گزارا جیسے انھیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے، حالانکہ یہ تھوڑا سا وقت غنیمت جان کر اگر آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے اور اسے اللہ کی فرماں برداری میں گزارتے تو اس کے صلے میں ہمیشہ ہمیشہ جنت کی نہ ختم ہونے والی نعمتوں کے مالک بنتے۔ لیکن انھوں نے یہ تھوڑا سا وقت بہت لمبا زمانہ سمجھ کر اللہ کی نافرمانی میں گزارا تو اس کے بدلے میں ہمیشہ ہمیشہ جہنم کے مستحق ٹھہرے۔ قیامت کے دن جب وہ اس عذاب میں مبتلا ہوں گے جو ختم ہونے والا ہی نہیں، تو اللہ تعالیٰ انھیں اس زندگی کی حقیقت یاد دلانے کے لیے، جسے وہ سبھی کچھ سمجھتے تھے، ان سے سوال کریں گے کہ تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟

**آیت 113** ① قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ...... : وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم وہاں ایک دن یا اس کا کچھ حصہ رہے

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

فرمائے گا تم نہیں رہے مگر تھوڑا ہی، کاش کہ تم جانتے ہوتے ﴿۱۱۴﴾ تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ ﴿۱۱۵﴾

ہیں۔ گویا وہ عذاب کی مصیبت میں ایسے پھنسے ہوں گے کہ انھیں اچھی طرح وہ عرصہ بھی یاد نہیں رہے گا جو انھوں نے دنیا میں گزارا، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے سوال کے جواب میں یہ کہہ کر کہ ہم نے وہاں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ گزارا ہے، یہ کہیں گے کہ ہمیں تو وہ مدت اچھی طرح یاد نہیں، اس لیے آپ شمار کرنے والوں سے پوچھ لیں، جنھوں نے ہماری زندگی کے ایک ایک سانس کے عمل کو شمار کر رکھا ہے۔ مراد فرشتے ہیں۔

2 انھیں دنیا کی زندگی اتنی مختصر کیوں دکھائی دے گی، اس لیے کہ گزرا ہوا وقت ایسے ہی دکھائی دیتا ہے اور اس لیے کہ جو ختم ہو جائے وہ باقی رہنے والے کے مقابلے میں کالعدم ہوتا ہے اور اس لیے کہ جہنم کے ایک غوطے کے بعد ہی انھیں یہ محسوس ہو گا کہ انھوں نے کبھی راحت و آرام دیکھا ہی نہیں۔ [ دیکھیے مسلم : ۲۸۰۷ ]

**آیت 114** ﴿ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا...... : اللہ تعالیٰ ان کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ واقعی تم دنیا میں بہت تھوڑا ٹھہرے ہو، کیونکہ دنیا اور اس کا ساز و سامان فانی ہونے کی وجہ سے ہے ہی بہت تھوڑا، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى﴾ [ النساء : ۷۷ ] "کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو متقی ہے۔" مگر اب اس اعتراف کا کچھ فائدہ نہیں، کاش! تم اس وقت یہ جانتے ہوتے تو اس مختصر سے وقت میں اپنے مالک کی فرماں برداری کر کے ہمیشہ کی جنتوں کے وارث بن جاتے۔

**آیت 115** ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا...... : یعنی پھر کیا تم نے سمجھ رکھا تھا کہ ہم اس دنیا میں عیش کرنے اور مزے لوٹنے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ (دیکھیے قیامہ: ۳۶) تم نے دیکھا کہ اس دنیا میں نہ ظالموں کو ان کے ظلم کا پورا بدلا ملتا ہے، نہ اپنے خیال میں نیک اعمال کرنے والوں کو ان کی نیکی کا بدلا ملتا ہے اور نہ کوئی انسان دوبارہ زندہ ہو کر آیا جو تمھیں بتاتا کہ اچھے اعمال والوں کو ان کی جزا اور ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ملی ہے۔ لہٰذا تم نے یقین کر لیا کہ یہی دنیا ہی دنیا ہے، جس قدر ہو سکے یہاں عیش و عشرت کا سامان جمع کر لو۔ اس کے سوا زندگی کا کوئی مقصد نہیں، نہ ہمیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے، نہ کسی کے سامنے پیش ہونا ہے، حالانکہ اگر تم اس کائنات کے نظامِ عدل میں ذرا بھی غور کرتے، یا رسول کی بات پر یقین کرتے تو تمھیں معلوم ہو جاتا کہ اس کائنات اور اس میں انسان کو محض کھیل تماشے کے طور پر اور بے مقصد نہیں بنایا گیا، بلکہ ہر کام کا ایک نتیجہ ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمھارے اچھے اور برے اعمال کا کوئی نتیجہ نہ نکلے اور چونکہ دنیا کی زندگی اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لیے بہت تھوڑی ہے، اس لیے مرنے کے بعد ہم نے ہمیشہ کی زندگی رکھی ہے، تاکہ

# فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

## پس بہت بلند ہے اللہ، جو سچا بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عزت والے عرش کا رب ہے ﴿۱۱۶﴾

عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکیں۔

**آیت 116** ① فَتَعٰلَى اللّٰهُ......: "تَعَالٰى" "عَلَا يَعْلُوْ" (ن) سے باب تفاعل ہے، جس میں مبالغہ ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "پس بہت بلند ہے اللہ" یعنی اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ تمھیں بے کار اور بے مقصد پیدا کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی تین صفات بیان فرمائیں، جن میں سے ہر صفت کا تقاضا ہے کہ وہ کوئی کام عبث اور بے مقصد نہ کرے۔

② الْمَلِكُ الْحَقُّ: پہلی صفت یہ ہے کہ وہ سچا بادشاہ ہے، اس کی بادشاہی حق اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ دوسرے بادشاہ نہ اپنی بادشاہی کے حقیقی مالک ہیں اور نہ ان کی بادشاہی حق اور باقی رہنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ [ آل عمران : ٢٦ ] "کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے۔" جب کوئی عقل مند آدمی بے مقصد کام نہیں کرتا تو سچا بادشاہ جو ساری کائنات کا اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کے متعلق تم نے کیسے گمان کر لیا کہ اس نے تمھیں عبث اور بے مقصد پیدا کر دیا ہے؟

③ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: یہ دوسری صفت ہے، جس میں پیدا کرنے کی حکمت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ بادشاہی میں یکتا ہے، بلکہ اس کے سوا کوئی معبود ہے ہی نہیں، عبادت صرف اسی کا حق ہے، کس قدر نادان ہو کہ اس وحدہ لا شریک لہ معبود نے تمھیں اپنی توحید اور عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور تم نے گمان کر لیا کہ ہمیں پیدا کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں۔

④ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ: عرش کا معنی تخت ہے۔ کسی چیز کے کریم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اس کی جنس کی اشیاء کی تمام خوبیاں اور کمالات موجود ہوں اور وہ ان سب سے بلند اور باشرف ہو، جیسے فرمایا: ﴿اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ﴾ [ النمل : ٢٩ ] "بے شک میری طرف ایک عزت والا خط پھینکا گیا ہے۔" اور فرمایا: ﴿وَ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ﴾ [ الدخان : ٢٦ ] "اور کھیتیاں اور عمدہ مقام۔" اور فرمایا: ﴿كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾ [ الشعراء : ٧ ] "ہم نے اس میں کتنی چیزیں ہر عمدہ قسم میں سے اگائی ہیں۔" اور فرمایا: ﴿وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ [ بني إسرائيل : ٢٣ ] "اور ان سے بہت کرم والی بات کہہ۔" (ابن عاشور و راغب) اس آیت میں یہ اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت ہے کہ وہ کائنات کی سب سے بڑی مخلوق عرشِ الٰہی کا مالک ہے، جو زمین و آسمان اور اس میں موجود ساری مخلوق کو محیط ہے اور سب سے بلند ہے، تو وہ باقی مخلوقات کا مالک کیوں نہ ہو گا۔

⑤ عرشِ الٰہی کو کریم (عزت و شرف والا) اس لیے فرمایا کہ کسی جگہ کی عزت اس کے رہنے والے کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسے کہتے ہیں "فُلَانٌ مِنْ بَيْتٍ كَرِيْمٍ" کہ فلاں شخص باعزت گھر کا فرد ہے۔ کیونکہ اس گھر کے رہنے والے معزز ہوتے ہیں۔

وَ مَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡہَانَ لَہٗ بِہٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ ؕ اِنَّہٗ

اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے، جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں تو اس کا حساب صرف اس کے

عرش کی سب سے بڑی عزت اور اس کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اس پر رب کریم مستوی ہے اور اس عرش ہی سے تمام احکامات اور ساری رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

⑥ پورے قرآن مجید میں "رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ" اسی مقام پر آیا ہے۔ "رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ" دو جگہ آیا ہے، سورۂ توبہ (۱۲۹) اور نمل (۲۶) میں۔ یہاں عرش کی صفت کریم اس لیے آئی ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے عیب سے منزہ ہونے اور دنیا اور آخرت میں اس کی صفت عدل کا بیان مقصود ہے، جب کہ سورۂ توبہ اور نمل میں اس کی صفت قہر و جبروت کا بیان مقصود ہے۔ (بقاعی)

آیت 117 ① وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ...... : ''جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے'' کے بعد ''جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں'' کا یہ مطلب نہیں کہ کسی دوسرے ایسے معبود کو پکارنا جائز ہے جس کی کوئی دلیل کسی کے پاس موجود ہو۔ بلکہ یہ جملہ معترضہ ہے، جس کا مقصد اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو پکارنے کی کوئی دلیل ہے ہی نہیں، نہ عقلی، نہ نقلی۔ (دیکھیے احقاف: ۴) یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ جو شخص کسی پر ظلم کرے، جس کا اسے کوئی حق نہیں تو وہ اس کا بدلا پائے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی ایسا ظلم بھی ہوتا ہے جس کا کسی کو حق حاصل ہے، بلکہ مقصد ظلم کی برائی بیان کرنا ہے کہ ظلم کا حق کسی کو بھی نہیں۔

② رازی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ غور و فکر کے بعد دلیل پر عمل کرنا حق ہے اور تقلید (بلا دلیل کسی بات کو لے لینا) باطل ہے۔

③ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ : یعنی اس کا یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کی سزا کا کوئی شخص حساب نہیں کر سکتا، نہ اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کا حساب صرف اس کے رب کے پاس ہے اور وہی اس کی سزا جانتا ہے۔ لوگوں کو اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ میں یہ جرم کسی صورت بھی معاف نہیں کروں گا، اس کے سوا جو بھی گناہ ہے، جسے چاہوں گا بخش دوں گا۔ (دیکھیے نساء: ۴۸، ۱۱۶) اور اس میں رسول اللہ ﷺ کو بھی تسلی ہے کہ آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے، حساب لینا ہمارا کام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [ الرعد : ٤٠ ] ''تو تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔''

④ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ : ''اِنَّ'' کے بعد ضمیر ''ہٗ'' پیچھے کسی لفظ کی طرف نہیں لوٹتی، اسے ضمیر شان کہتے ہیں۔ یہ کسی بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''بے شک حقیقت یہ ہے کہ۔'' ''کافر فلاح نہیں پائیں گے'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو پکارنے والے کافر ہیں اور کافر فلاح نہیں پائیں گے۔

لَا یُفۡلِحُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ قُلۡ رَّبِّ اغۡفِرۡ وَ ارۡحَمۡ وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

رب کے پاس ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ کافر فلاح نہیں پائیں گے ﴿۱۱۷﴾ اور تو کہہ اے میرے رب! بخش دے اور رحم کر اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہے ﴿۱۱۸﴾

5 سورت کی ابتدا ان لوگوں کے ذکر سے ہوئی تھی جو فلاح پانے والے ہیں اور اختتام ان لوگوں کے ذکر سے ہو رہا ہے جو فلاح نہیں پائیں گے۔

**آیت 118** 1 وَ قُلۡ رَّبِّ اغۡفِرۡ وَ ارۡحَمۡ......: اس سے پہلے آیت (۱۰۹) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کامیاب ہونے والے بندوں کی ایک صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ یہ دعا ”رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَ ارۡحَمۡنَا وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ“ کرتے ہیں اور سورت کے آخر میں انھی بندوں کی طرح کفار و مشرکین سے کٹ کر اپنے رب کی مغفرت اور رحمت کے دامن میں پناہ لینے کا حکم دیا۔ وہ تمام دعائیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں لفظ ”قُلۡ“ کے ساتھ حکم دیا ہے، نہایت جامع دعائیں ہیں اور عجیب و غریب اسرار رکھتی ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا کرنے کا حکم ہے، جن کے پہلے پچھلے تمام گناہ اللہ نے معاف فرما دیے (دیکھیے فتح: ۲) تو امت کو تو بدرجۂ اولیٰ یہ دعا کرنے کا حکم ہے۔

2 ابن کثیر نے فرمایا: ”اَلۡغَفۡرُ“ کا لفظ جب مطلق آئے تو اس کا معنی گناہ کو مٹانا اور لوگوں کے سامنے اس پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے اور ”رحمت“ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اقوال و افعال میں سیدھا رکھے اور اپنی توفیق خاص سے نوازے۔

3 وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ: یہ مختصر جملہ ہے، مکمل جملہ یوں ہے: ”رَبِّ اغۡفِرۡ وَ ارۡحَمۡ فَأَنۡتَ خَیۡرُ الۡغَافِرِیۡنَ وَ أَنۡتَ خَیۡرُ الرَّاحِمِیۡنَ“ اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے آیت (۱۰۹) کی تفسیر۔ اللہ تعالیٰ سب رحم کرنے والوں سے بہتر اس لیے ہے کہ دوسرے سب رحم کرنے والے اسی کا عطا کردہ رحم کرتے ہیں اور وہ بھی اس کی رحمت کے سویں حصے میں سے اپنے حصے میں آنے والے رحم سے۔

4 ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ”مجھے ایسی دعا سکھائیں جو میں اپنی نماز میں کروں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا، یوں کہو: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ » [ بخاري، الأذان، باب الدعاء قبل السلام : ۸۳٤ ] ”اے اللہ! یقیناً میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، بہت زیادہ ظلم اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخشتا، سو مجھے بخش دے، عظیم بخشش اپنے پاس سے اور مجھ پر رحم کر، کیونکہ تو ہی غفور و رحیم ہے۔“

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

(یہ) ایک عظیم سورت ہے، ہم نے اسے نازل کیا اور ہم نے اسے فرض کیا اور ہم نے اس میں واضح آیات اتاری ہیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ①

آیت 1 ① سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا : "سُوْرَةٌ" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے اور یہ مبتدا محذوف "هٰذِهٖ" کی خبر ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "(یہ) ایک عظیم سورت ہے۔"

② "اَنْزَلْنٰهَا" (ہم نے اسے نازل کیا) یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کے اظہار کے لیے اپنا ذکر جمع متکلم کے صیغے (ہم نے) کے ساتھ فرمایا ہے، بلکہ "اَنْزَلْنٰهَا" "فَرَضْنٰهَا" اور "اَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ" تینوں میں زور جمع متکلم کے صیغہ "ہم نے" پر ہے، یعنی اس کا نازل کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ "ہم" ہیں۔ اس لیے اسے کسی بے اختیار واعظ کی بات سمجھ کر ہلکا نہ سمجھ بیٹھنا، بلکہ خوب جان لو کہ اس کا نازل کرنے والا وہ ہے جس کی مٹھی میں ساری کائنات ہے، جو ہر جان دار کی پیشانی پکڑے ہوئے ہے اور تم مر کر بھی اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔

③ "اَنْزَلْنٰهَا" (نازل کرنے) سے ظاہر ہے کہ اسے اتارنے والا بلندی پر ہے اور اس نے اسے بلند مقام عرش سے اتارا ہے، جیسا کہ خود اس نے فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [ طٰهٰ : ۵ ] "وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔" ان مفسروں پر افسوس ہوتا ہے جو یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ بلندی پر ہے، اس لیے وہ "ہم نے نازل کیا" کی بھی تاویل بلکہ تحریف پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جہت میں نہیں، نہ کسی جگہ میں ہے، وہ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ دائیں ہے نہ بائیں، نہ آگے ہے اور نہ پیچھے۔ پھر وہ کہاں ہے؟ کہتے ہیں کسی جگہ بھی نہیں۔ مگر وہ اس فطری تقاضے کا کیا کریں گے جو ہر انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے اپنے ہاتھ اور اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائے۔ ان حضرات میں سے کئی ایسے دیدہ دلیر بزرگ بھی گزرے ہیں اور کئی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سوال ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ بلکہ جو شخص یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے وہ کافر ہے۔ ان لوگوں کو یہ خوف بھی نہیں آتا کہ ان کے فتوے کی زد میں کون کون آ رہا ہے۔ خود رسول کریم ﷺ نے ایک لونڈی کے ایمان کا امتحان لیتے ہوئے دو سوال کیے تھے، ایک یہ کہ اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: "آسمان میں۔" دوسرا سوال یہ کیا کہ میں کون ہوں؟ اس نے کہا: "آپ اللہ کے رسول ہیں۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ مومنہ ہے۔" [ مسلم، المساجد، باب تحريم الكلام في الصلاة...... : ۵۳۷ ]

④ وَ فَرَضْنٰهَا : یعنی اس سورت میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ محض سفارشات نہیں ہیں کہ جی چاہے تو مانو، ورنہ جو جی میں

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ

جو زنا کرنے والی عورت ہے اور جو زنا کرنے والا مرد ہے، سو دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور تمھیں ان

آئے کرتے رہو، بلکہ یہ قطعی احکام ہیں جن پر عمل کرنا ہم نے تم پر اور تمھارے بعد آنے والوں پر فرض کر دیا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا" سے اس سورت کی عظمت اور اہمیت بیان کرنا مقصود ہے، یہ مقصد نہیں کہ دوسری سورتوں کی یہ شان نہیں ہے۔

⑤ وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ: یعنی اس سورت میں ہم نے جو احکام و مسائل بیان کیے ہیں ان میں کوئی پیچیدگی یا ابہام نہیں ہے، صاف اور واضح ہدایات ہیں، جن کے متعلق تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ فلاں بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، تو ہم اس پر عمل کیسے کرتے؟ اس پُر زور تمہید سے اس سورت میں مذکور احکام کی اہمیت واضح ہو رہی ہے۔ اس کے بعد احکام شروع ہوتے ہیں۔

**آیت 2** ① اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا...... : سورۂ نساء کی آیات (۱۵، ۱۶) میں اللہ تعالیٰ نے زنا کرنے والی عورتوں کے متعلق چار مردوں کی گواہی کے بعد انھیں گھروں میں بند رکھنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے، یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی سبیل پیدا فرما دے۔ اسی طرح زنا کا ارتکاب کرنے والے مرد اور عورت کو توبہ کرنے تک ایذا و تکلیف دینے کا حکم دیا اور یہاں سورۂ نور کی زیر تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے کنوارے مرد اور کنواری عورت کی سزا بیان فرمائی۔ جیسا کہ عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( خُذُوْا عَنِّيْ ، خُذُوْا عَنِّيْ ، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ، اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَ نَفْيُ سَنَةٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ )) [ مسلم، الحدود، باب حد الزنى : ۱٦۹۰ ] ''مجھ سے (دین کے احکام) لے لو، مجھ سے (دین کے احکام) لے لو، اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لیے سبیل پیدا فرما دی ہے۔ کنوارا، کنواری کے ساتھ (زنا کرے) تو ان کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ، شادی شدہ کے ساتھ (زنا کرے) تو ان کے لیے سو کوڑے اور سنگسار ہے۔'' اس آیت سے بالاتفاق سورۂ نساء کی آیت کا حکم منسوخ ہو گیا۔

② اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ: یہ مبتدا ہے، اس کی خبر "فَاجْلِدُوْا" ہے۔ اس پر ''فاء'' اس لیے آئی ہے کہ مبتدا میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے، کیونکہ الف لام، "اَلَّذِيْ" کے معنی میں ہے، یعنی جو زنا کرنے والی عورت اور جو زنا کرنے والا مرد ہے۔ اس آیت میں مسلم حکام کو حکم ہے کہ جو عورت یا جو مرد بھی زنا کا ارتکاب کرے، خواہ وہ کسی دین یا ملت سے تعلق رکھتا ہو، اگر ان کا مقدمہ تمھارے پاس لایا جائے، جب وہ شادی شدہ نہ ہوں تو دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ شادی شدہ زانیہ اور زانی کے لیے رجم کا حکم ہے، جیسا کہ گزشتہ فائدہ میں مذکور حدیث میں آیا ہے، مزید تفصیل آگے آئے گی۔

③ غیر مسلم ذمی اگر زنا کا ارتکاب کریں اور مسلم حکام کے پاس مقدمہ لایا جائے تو ان کا فیصلہ بھی کتاب و سنت کے مطابق کیا جائے گا، جیسا کہ سورۂ مائدہ (۴۸، ۴۹) میں مذکور ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲

کے متعلق اللہ کے دین میں کوئی نرمی نہ پکڑے، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور لازم ہے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو ۝۲

آئے اور انھوں نے آپ سے ذکر کیا کہ ان کے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا تَجِدُوْنَ فِي التَّوْرَاةِ فِيْ شَأْنِ الرَّجْمِ ؟ )) ''تم تورات میں رجم کے متعلق کیا پاتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہم انھیں ذلیل کرتے ہیں اور انھیں کوڑے مارے جاتے ہیں۔'' عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم نے جھوٹ کہا، تورات میں رجم یقیناً موجود ہے۔'' چنانچہ وہ تورات لائے اور اسے کھولا، تو ان میں سے ایک شخص نے رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ دیا اور جو اس سے پہلے اور اس کے بعد تھا اسے پڑھ دیا۔ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''ہاتھ اٹھا۔'' اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس میں رجم کی آیت موجود تھی، تو کہنے لگے: ''اے محمد! اس نے سچ کہا ہے، اس میں رجم کی آیت موجود ہے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کے متعلق حکم دیا اور دونوں کو سنگسار کر دیا گیا۔ [ بخاري، الحدود، باب أحكام أهل الذمة و إحصانهم إذا زنوا و رفعوا إلى الإمام : ٦٨٤١ ]

امام بخاری رحمہ اللہ کے باب کے عنوان قائم کرنے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل ذمہ اگر مقدمہ مسلمانوں کے پاس لائیں تو ان کے لیے بھی زنا کی سزا وہی ہے جو مسلمانوں کے لیے ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں پر بھی رجم کا حکم نافذ فرمایا۔ تفصیل کے لیے فتح الباری ملاحظہ فرمائیں۔ جن روایات میں اس حد کے نفاذ کے لیے اسلام کی شرط آئی ہے، ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند سے ثابت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں ذمی غیر مسلموں کو بے شک اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی ہے، مگر انھیں بے حیائی اور بدکاری پھیلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

4 "اَلزَّانِيَةُ" کو "الزَّانِيْ" سے پہلے لانے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عموماً زنا کی ترغیب عورتوں کی طرف سے ہوتی ہے، اگر ان کی طرف سے کوئی اشارہ یا مسکراہٹ یا بے حجابی یا کلام میں دلکشی نہ ہو تو مرد کو اقدام کی جرأت کم ہی ہوتی ہے۔ اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ )) [ بخاري، النكاح، باب ما يتقي من شوم المرأة : ٥٠٩٦ ] ''میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ نقصان پہنچانے والا کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔'' اس کے علاوہ زنا کی قباحت اور اس کی عار عورتوں کے لیے زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ بکارت اور حمل کے مسائل کا سامنا انھی کو ہوتا ہے۔ "فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا" اس لیے فرمایا کہ زنا کی ترغیب عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے، سزا دونوں کو ایک جیسی ملے گی۔

5 فَاجْلِدُوْا : " جِلْدٌ " کا معنی چمڑا ہے۔ اس لفظ سے فقہاء نے دو مسائل اخذ کیے ہیں، ایک یہ کہ مارنے کے لیے کوڑا چمڑے کا ہونا چاہیے، جو درمیانہ ہو، نہ بہت سخت نہ بالکل نرم۔ دوسرا یہ کہ ضرب یعنی مار کا اثر جلد تک رہنا چاہیے، ایسی ضرب نہ ہو جس سے گوشت پھٹ جائے، اور یہ کوڑے چہرے اور نازک حصوں کو چھوڑ کر جسم کے الگ الگ حصوں پر مارے جائیں نہ

کہ ایک ہی جگہ، اور پوری طاقت سے ہاتھ بلند کر کے نہیں بلکہ ہاتھ کندھے سے بلند کیے بغیر درمیانی ضرب لگائی جائے۔ زمخشری نے فرمایا: " اَلْجَلْدُ " کا معنی جلد پر ضرب ہے، چنانچہ "جَلَدَهُ "(اس نے اس کی جلد پر مارا) ایسے ہی ہے جیسے "ظَهَرَهُ" (اس نے اس کی پشت پر مارا)، " بَطَنَهُ " (اس نے اس کے پیٹ پر مارا) اور "رَأَسَهُ" (اس نے اس کے سر پر مارا)۔ آج کل حکومتیں جلادوں کے ہاتھوں جس قسم کے کوڑے مرواتی ہیں، جن کے لیے جلادوں کو باقاعدہ مشق کروائی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی جگہ پڑیں، پھر ملزم کو ٹکٹکی پر باندھ کر اس کے چوتڑوں پر اس طرح کوڑے برسائے جاتے ہیں کہ جلاد دور سے دوڑتا ہوا آ کر پوری قوت سے کوڑا مارتا ہے، ایک ہی جگہ چند کوڑے لگنے کے بعد گوشت کے ٹکڑے اڑنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات ہڈیاں ننگی ہو جاتی ہیں اور وہ ساری عمر کے لیے روگی بن جاتا ہے۔ اسلام میں ایسے کوڑے مارنے کی وحشیانہ سزا کسی بھی جرم میں مقرر نہیں کی گئی، بلکہ اگر زنا کا ارتکاب ایسے کنوارے شخص سے ہو جو سو کوڑے برداشت نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے رعایت بھی موجود ہے۔ سعید بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہمارے محلے میں ایک ناقص اعضا والا کمزور آدمی تھا، اسے دیکھا گیا کہ محلے کی ایک لونڈی سے بدکاری کر رہا تھا۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا: "اسے سو کوڑے مارو۔" لوگوں نے کہا: "یا رسول اللہ! وہ اس سے کمزور ہے، اگر ہم نے اسے سو کوڑے مارے تو وہ مر جائے گا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَخُذُوْا لَهُ عِثْكَالًا ، فِيْهِ مِائَةُ شِمْرَاخٍ ، فَاضْرِبُوْهُ ضَرْبَةً وَاحِدَةً )) [ ابن ماجه، الحدود، باب الكبير والمريض يجب عليه الحد : ٢٥٧٤ ] "پھر کھجور کا ایک خوشہ لو، جس میں سو ٹہنیاں ہوں اور وہ اسے ایک ہی بار مار دو۔"

6 وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ ...... : کیونکہ بدکاروں پر رحم کرنا سارے اسلامی معاشرے پر ظلم ہے۔ پہلی امتوں پر حدود الٰہی میں نرمی ہی سے تباہی آئی۔ حدود اللہ کا احترام اور نفاذ باقی نہ رہے تو قوم اندرونی خلفشار اور جرائم میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ان پر وبائیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِيْنَ! خَمْسٌ إِذَا ابْتُلِيْتُمْ بِهِنَّ، وَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ تُدْرِكُوْهُنَّ : لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ، حَتّٰى يُعْلِنُوْا بِهَا، إِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ وَالْأَوْجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِيْ أَسْلَافِهِمُ الَّذِيْنَ مَضَوْا، وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ، إِلَّا أُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ وَ شِدَّةِ الْمَؤُوْنَةِ وَ جَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ، وَلَمْ يَمْنَعُوْا زَكَاةَ أَمْوَالِهِمْ، إِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَاءِ، وَ لَوْ لَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوْا وَلَمْ يَنْقُضُوْا عَهْدَ اللّٰهِ وَ عَهْدَ رَسُوْلِهٖ، إِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ غَيْرِهِمْ، فَأَخَذُوْا بَعْضَ مَا فِيْ أَيْدِيْهِمْ وَمَا لَمْ تَحْكُمْ أَئِمَّتُهُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، وَ يَتَخَيَّرُوْا مِمَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ، إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ )) [ ابن ماجه، الفتن، باب العقوبات : ٤٠١٩۔ مستدرك حاكم : ٥٤٠/٤، ح : ٨٦٢٣، و قال صحيح على شرط مسلم۔ صحيح الترغيب و الترهيب : ٢١٨٧ ] "اے مہاجرین کی جماعت! پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو گئے (تو ان کی سزا ضرور ملے گی) اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم انھیں پاؤ، کسی قوم میں جب بھی فحاشی (بے حیائی و بدکاری) عام ہوتی ہے، جو ان میں علانیہ کی جائے تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں

پھیل جاتی ہیں جو ان کے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں نہیں ہوتی تھیں اور جو بھی قوم ماپ اور تول میں کمی کرتی ہے انھیں قحط سالیوں، مشقت کی سختی اور بادشاہ کے ظلم کے ساتھ پکڑ لیا جاتا ہے اور کوئی بھی قوم اپنے مالوں کی زکوٰۃ دینا چھوڑ دیتی ہے تو ان کے لیے آسمان سے بارش روک لی جاتی ہے اور اگر چوپائے نہ ہوں تو بارش سرے ہی سے نہ ہو اور جب کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول کا عہد توڑتی ہے تو ان پر دوسری قوموں میں سے دشمن مسلط کر دیے جاتے ہیں جو ان کے قبضے سے کئی چیزیں چھین لیتے ہیں اور جن کے امراء اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے اور جو اللہ نے اتارا ہے اسے اختیار نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی لڑائی آپس میں ڈال دیتا ہے۔‘‘

یہ نتیجہ حدود اللہ کو معطل کرنے کا ہے، جب کہ حدود اللہ قائم کرنے سے بے حساب برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (٦٦) اور سورۂ اعراف (٩٦)۔

7 وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ : اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں مارتے وقت تمھارے دل میں ان پر رحم اور شفقت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہو، بلکہ ’’فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ‘‘ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حد نافذ کرنے میں تمھاری طرف سے کوئی نرمی یا ترس رکاوٹ نہ بنے۔ رہا مارتے ہوئے، یا یہ منظر دیکھ کر دل میں رحم و شفقت کا کوئی جذبہ پیدا ہونا تو یہ طبعی بات ہے، اس پر آدمی کا کوئی اختیار نہیں اور نہ اس پر کوئی گناہ ہے۔ گناہ یہ ہے کہ ترس کھا کر حد نافذ نہ کی جائے، یا ترس کھا کر حد نہ لگانے کی سفارش کی جائے، یا اس قدر آہستہ کوڑے مارے جائیں کہ حد کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔

قرہ مزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: ’’یا رسول اللہ! میں بکری ذبح کرتا ہوں تو میں اس پر رحم کرتا ہوں۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَالشَّاةُ إِنْ رَحِمْتَهَا رَحِمَكَ اللّٰهُ، مَرَّتَيْنِ » [ الأدب المفرد للبخاري : ٣٧٣۔ مسند أحمد : ٤٣٦/٣، ح : ١٥٥٩٨ ] ’’اور بکری پر اگر تو رحم کرے گا تو اللہ تجھ پر رحم کرے گا۔‘‘ یہ الفاظ آپ نے دو مرتبہ فرمائے۔‘‘

8 وہ جرم، جس کی حد اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے، وہ حاکم کے پاس لے جانے سے پہلے آپس میں معاف کیا جا سکتا ہے، حاکم کے پاس مقدمہ پیش ہونے کے بعد نہ سفارش کی اجازت ہے، نہ حاکم کو حد معاف کرنے کا اختیار ہے۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « تَعَافَوُا الْحُدُوْدَ فِيْمَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَغَنِيْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ » [ أبوداوٗد، الحدود، باب یعفی عن الحدود...... : ٤٣٧٦۔ نسائي : ٤٨٩٠، قال الألباني صحیح ] ’’حدود کو آپس میں ایک دوسرے کو معاف کر دیا کرو، کیونکہ میرے پاس جو بھی حد آئے گی واجب ہو جائے گی۔‘‘

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کو مخزومی عورت کے معاملے نے فکر میں ڈال دیا، جس نے چوری کی تھی، کہنے لگے: ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کون بات کرے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے اسامہ بن زید کے سوا کون یہ جرأت کرے گا۔‘‘ تو اسامہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ؟ ثُمَّ قَامَ فَخَطَبَ، فَقَالَ : يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا ضَلَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ، وَ إِذَا سَرَقَ الضَّعِيْفُ فِيْهِمْ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَايْمُ اللّٰهِ! لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعَ مُحَمَّدٌ يَدَهَا »

[ بخاري، الحدود، باب كراهية الشفاعة في الحد إذا رفع إلى السلطان : ۶۷۸۸۔ مسلم : ۱۶۸۸ ] ''کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے متعلق سفارش کر رہے ہو؟'' پھر آپ ﷺ اٹھے اور خطبہ دیا، فرمایا: ''لوگو! تم سے پہلے لوگ اسی لیے گمراہ ہو گئے کہ جب اونچا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) بھی چوری کرتی تو یقیناً محمد اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''

⑨ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: اللہ تعالیٰ کی حدود کے دو مقصد ہیں، ایک یہ کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا ملے، دوسرا یہ کہ وہ اس کے لیے اور لوگوں کے لیے عبرت بنے اور وہ اس جرم سے باز رہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ١ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [ المائدة : ۳۸ ] ''اور جو چوری کرنے والا ہے اور جو چوری کرنے والی ہے سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ اس کی جزا کے لیے جو ان دونوں نے کمایا، اللہ کی طرف سے عبرت کے لیے اور اللہ سب پر غالب کمال حکمت والا ہے۔'' چور کا کٹا ہوا ہاتھ عبرت کے لیے کافی ہے، یہاں زانی کے لیے حد لگاتے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہونے کا حکم دیا، تاکہ باعث عبرت ہو۔ کوڑے مارتے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کی موجودگی بجائے خود ایک سزا ہے، کیونکہ کوڑوں کی تکلیف تو ختم ہو جاتی ہے مگر رسوائی کا احساس جلدی ختم ہونے والا نہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کے سامنے حد لگانے کی صورت میں اس بات کی گنجائش بھی نہیں رہے گی کہ حد معطل کر دی جائے، یا اس میں کمی یا نرمی کی جائے۔

⑩ شادی شدہ مرد یا شادی شدہ عورت زنا کرے تو اس کی حد رجم ہے جو قرآن، سنت متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ یہ حکم قرآن مجید میں موجود آیات کے ساتھ بھی ثابت ہے اور قرآن کی اس آیت سے بھی ثابت ہے جس کی تلاوت منسوخ ہے، لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ قرآن مجید میں موجود آیت کے ذکر سے پہلے یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ پہلے انبیاء اور ان کی امتوں پر نازل شدہ احکام جو قرآن نے ذکر فرمائے ہیں اور قرآن و سنت میں ان کے منسوخ ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا، ان پر عمل ہمارے نبی کریم ﷺ اور آپ کی پوری امت پر فرض ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام میں اٹھارہ (۱۸) پیغمبروں کا نام لیا اور ان کے آباء اور اولاد و اخوان کا ذکر فرمایا، پھر فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ [ الأنعام : ۹۰ ] ''یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔'' رجم کی سزا کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں تورات کے حوالے سے فرمایا ہے: ﴿وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ﴾ [ المائدة : ۴۳ ] ''اور وہ تجھے کیسے منصف بنائیں گے جب کہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے۔'' یہ حکم رجم تھا جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کے فوائد میں گزر چکا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اسی کے موافق فیصلہ فرمایا اور فرمایا: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَوَّلُ مَنْ أَحْيَا أَمْرَكَ إِذْ أَمَاتُوْهُ » ''اے اللہ! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرا حکم زندہ کیا، جب انھوں نے اسے مردہ کر دیا تھا۔'' مفصل حدیث اس طرح ہے کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک یہودی کے پاس سے گزرے جس کا منہ کالا کیا ہوا تھا اور اسے کوڑے مارے گئے تھے تو نبی اکرم ﷺ نے انھیں بلایا اور فرمایا: « هٰكَذَا تَجِدُوْنَ حَدَّ الزَّانِيْ فِيْ

كِتَابِكُمْ؟ قَالُوا نَعَمْ، فَدَعَا رَجُلًا مِنْ عُلَمَائِهِمْ، فَقَالَ أَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ الَّذِيْ أَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلٰى مُوْسٰى! أَهٰكَذَا تَجِدُوْنَ حَدَّ الزَّانِيْ فِيْ كِتَابِكُمْ؟ قَالَ لَا، وَلَوْ لَا أَنَّكَ نَشَدْتَنِيْ بِهٰذَا لَمْ أُخْبِرْكَ، نَجِدُهُ الرَّجْمَ، وَلٰكِنَّهُ كَثُرَ فِيْ أَشْرَافِنَا، فَكُنَّا إِذَا أَخَذْنَا الشَّرِيْفَ تَرَكْنَاهُ، وَإِذَا أَخَذْنَا الضَّعِيْفَ، أَقَمْنَا عَلَيْهِ الْحَدَّ، قُلْنَا تَعَالَوْا فَلْنَجْتَمِعْ عَلٰى شَيْءٍ نُقِيْمُهُ عَلَى الشَّرِيْفِ وَالْوَضِيْعِ، فَجَعَلْنَا التَّحْمِيْمَ وَالْجَلْدَ مَكَانَ الرَّجْمِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَوَّلُ مَنْ أَحْيَا أَمْرَكَ إِذْ أَمَاتُوْهُ فَأَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ ﴾ [ مسلم، الحدود، باب رجم اليهود أهل الذمة في الزنى : ١٧٠٠ ] ”کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی حد ایسے ہی پاتے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں!“ تو آپ ﷺ نے ان کے علماء میں سے ایک آدمی کو بلایا اور فرمایا: ”میں تمھیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر تورات نازل فرمائی، کیا تم اپنی کتاب میں زنا کی حد ایسے ہی پاتے ہو؟“ اس نے کہا: ”نہیں! اور اگر آپ مجھے یہ قسم نہ دیتے تو میں آپ کو نہ بتاتا۔ ہم وہ (حد) رجم ہی پاتے ہیں، لیکن یہ کام (زنا) ہمارے بڑے لوگوں میں عام ہو گیا تو ہم جب بڑے کو پکڑتے تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کمزور کو پکڑتے تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ تو ہم نے کہا، آؤ ہم کسی ایسی سزا پر متفق ہو جائیں جو ہم اونچے لوگوں اور کمزور لوگوں سب پر قائم کریں، تو ہم نے رجم کی جگہ منہ کالا کرنا اور کوڑے مارنا مقرر کر دیا۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرا حکم زندہ کیا جب انھوں نے اسے مردہ کر دیا تھا۔“ تو آپ ﷺ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اسے رجم کر دیا گیا۔“ اس حدیث کے بعد سورۂ مائدہ کی آیات (۴۱ تا ۵۰) ملاحظہ فرمائیں، رجم اللہ کا حکم ہونا بالکل واضح ہو جائے گا۔

تورات کے اس حکم رجم کو اللہ کا حکم قرار دے کر اس پر عمل ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اعضا کے قصاص کا ذکر تورات کے حوالے سے فرمایا۔ قرآن میں اعضا کے قصاص کا اس کے سوا کہیں ذکر نہیں، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اعضا کے قصاص کا حکم دیا اور امت اعضا کے قصاص پر متفق ہے، فرمایا: ﴿ وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ [ المائدة : ٤٥ ] ”اور اس میں ہم نے ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں میں برابر بدلا ہے، پھر جو اس (قصاص) کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔“ مائدہ کی آیت (۴۸) میں قرآن کو پہلی کتابوں پر ”مُهَيْمِنًا“ فرمانے سے ایک مقصد یہ بھی ظاہر ہے کہ شادی شدہ زانی کے رجم اور نفس اور اعضا کے قصاص کا مسئلہ اب قرآن کے زیر حفاظت ہے۔

⑪ قرآن کی وہ آیت جس میں رجم کا صریح حکم تھا اور جس کی تلاوت منسوخ اور حکم باقی ہے، اس کا ذکر امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے منبر پر نہایت شد و مد سے فرمایا، جب آپ کو فکر ہوئی کہ کچھ لوگ قرآن میں رجم کا صریح لفظ نہیں دیکھیں گے تو

اس کا انکار کر دیں گے (جیسا کہ خارجیوں نے اور ہمارے زمانے کے کچھ آزاد خیال لوگوں نے کیا ہے) تو اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اپنے عمل کا حوالہ بھی دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا خطبہ مروی ہے، جو انھوں نے اپنے آخری حج سے واپس آ کر مدینہ میں دیا۔ اس میں مذکور ہے کہ انھوں نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِالْحَقِّ، وَ أَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ، فَكَانَ مِمَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ آيَةُ الرَّجْمِ فَقَرَأْنَاهَا وَ عَقَلْنَاهَا وَ وَعَيْنَاهَا، رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ رَجَمْنَا بَعْدَهُ، فَأَخْشَى إِنْ طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ أَنْ يَّقُوْلَ قَائِلٌ، وَاللّٰهِ! مَا نَجِدُ آيَةَ الرَّجْمِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ، فَيَضِلُّوْا بِتَرْكِ فَرِيْضَةٍ أَنْزَلَهَا اللّٰهُ، وَالرَّجْمُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى إِذَا أُحْصِنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ، إِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ، أَوْ كَانَ الْحَبَلُ، أَوِ الْاِعْتِرَافُ » [ بخاري، الحدود، باب رجم الحبلٰی من الزنا إذا أحصنت : ٦٨٣٠ ] ''اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق دے کر بھیجا اور آپ پر کتاب نازل فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر جو کچھ نازل فرمایا اس میں رجم کی آیت بھی تھی، ہم نے اسے پڑھا، سمجھا اور یاد کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر لوگوں پر لمبا زمانہ گزر گیا تو کوئی کہنے والا کہے کہ اللہ کی قسم! ہم اللہ کی کتاب میں رجم کو نہیں پاتے، تو وہ اس فریضہ کو ترک کرنے کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ رجم اللہ کی کتاب میں حق ہے اس شخص پر جو شادی شدہ ہو، مرد ہو یا عورت، جب دلیل قائم ہو جائے، یا حمل ہو یا اعتراف ہو۔''

⑫ رسول اللہ ﷺ سے کئی احادیث میں رجم کا حکم منقول ہے، جیسا کہ زیر تفسیر آیت کے فائدہ (۱) میں گزرا اور آپ ﷺ کا ماعز اسلمی اور غامدیہ کو رجم کرنا تقریباً حدیث کی ہر کتاب میں مذکور ہے، اسی طرح یہود کو رجم کرنا فائدہ (۳) اور فائدہ (۱۰) میں گزرا ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا رجم کو اللہ کی کتاب کا فیصلہ قرار دے کر اس پر عمل کرنا صحیح بخاری میں مروی ہے، ابوہریرہ اور زید بن خالد رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ہم نبی ﷺ کے پاس موجود تھے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا: « أَنْشُدُكَ اللّٰهَ إِلَّا مَا قَضَيْتَ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللّٰهِ » ''میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ ہر حال میں ہمارے درمیان کتاب اللہ کے ساتھ فیصلہ فرمائیں۔'' تو وہ شخص کھڑا ہو گیا جس سے اس کا جھگڑا تھا اور وہ اس سے زیادہ سمجھ دار تھا۔ اس نے کہا: ''آپ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب کے ساتھ فیصلہ فرمائیں اور مجھے (بات کرنے کی) اجازت دیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہو!'' اس نے کہا: ''میرا بیٹا اس کے ہاں مزدور تھا تو اس نے اس کی بیوی سے زنا کر لیا، میں نے اس کے بدلے سو بکریاں اور ایک خادم دے کر اس کی جان چھڑائی۔ پھر میں نے کچھ اہل علم آدمیوں سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے، اور اس کی بیوی پر رجم ہے۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: « وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ جَلَّ ذِكْرُهُ، الْمِائَةُ شَاةٍ وَالْخَادِمُ رَدٌّ عَلَيْكَ، وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَ تَغْرِيْبُ عَامٍ، وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ! عَلَى امْرَأَةِ هٰذَا، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا، فَغَدَا عَلَيْهَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَهَا » [ بخاري، الحدود، باب الاعتراف بالزنا :

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ

**زانی مرد نکاح نہیں کرے گا مگر کسی زانیہ عورت سے، یا کسی مشرکہ عورت سے، اور زانیہ عورت، اس سے نکاح نہیں کرے گا**

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں ضرور تمھارے درمیان اللہ جل ذکرہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ وہ سو بکریاں اور خادم تمھیں واپس ہوں گے اور تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے، اور اے انیس! صبح اس کی بیوی کے پاس جاؤ، اگر وہ اعتراف کر لے، تو اسے رجم کر دو۔'' وہ صبح اس کے پاس گئے، اس نے اعتراف کر لیا تو انھوں نے اسے رجم کر دیا۔'' [ ۶۸۲۷، ۶۸۲۸ ]

⑬ امت مسلمہ میں کچھ لوگوں نے رجم کا انکار کیا۔ بعض نے کوڑوں اور رجم بلکہ تمام حدود ہی کو وحشیانہ سزائیں قرار دے کر ان کا انکار کر دیا۔ ایسے لوگوں کو امت مسلمہ بدترین منافق ہی کے طور پر پہچانتی ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اسلام کا لبادہ انھوں نے مسلمانوں میں شامل رہ کر کفر کی نمائندگی کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اس لیے ان کے نفاق کا علم عام ہونے کی وجہ سے یہ لوگ اسلام کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے، بلکہ مسلمان ہمیشہ اس انتظار میں ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ کب وہ مبارک وقت آئے گا جب عہد نبوی اور خلافت راشدہ کی طرح اللہ کی حدود قائم ہوں گی اور معاشرے میں امن وامان اور عفت و پاک دامنی کا دور دورہ ہوگا۔

⑭ اللہ کی حدود کو اصل نقصان ان لوگوں نے پہنچایا اور انھی کے ہم نواؤں کے برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے اللہ کی حدود معطل ہوئیں، جنھوں نے اگرچہ حدود اللہ کا انکار نہیں کیا، نہ کنوارے زانی کے لیے کوڑوں کی حد کا اور نہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی حد کا، مگر انھوں نے ایسے حیلے ایجاد کر لیے جن سے کسی زانی پر (کنوارا ہو یا شادی شدہ) حد نافذ کرنا تقریباً ناممکن ہے اور لطف یہ کہ ان لوگوں کے موجودہ ہم نوا ان فقہی قوانین کو اللہ کا حکم قرار دینے پر اور انھیں بطور اسلام ملک میں نافذ کرنے پر مُصِر ہیں۔ ہم ان میں سے چند شقیں یہاں نقل کرتے ہیں: ① اجرت پر لائی ہوئی عورت سے زنا کرے تو اس پر حد نہیں۔ ② دار الحرب اور دار البغی میں زنا کرے تو اس پر حد نہیں۔ ③ جن عورتوں سے نکاح حرام ہے (ماں، بہن، بیٹی، خالہ، پھوپھی، بھانجی اور بھتیجی وغیرہ) ان سے نکاح کر کے زنا کرے تو اس پر حد نہیں، خواہ اسے معلوم ہو کہ یہ حرام ہے۔ ④ جس حکمران کے اوپر کوئی حکمران نہ ہو وہ زنا کرے تو اس پر حد نہیں۔ ⑤ اگر زانی دعویٰ کر دے کہ وہ اس کی بیوی ہے تو حد ساقط ہو جائے گی، خواہ وہ کسی اور کی بیوی ہو اور وہ کوئی دلیل بھی پیش نہ کرے۔ یہ ہیں ان کے چند حیلے، تو فرمایئے! وہ کون سا زانی ہوگا جو جھوٹا دعویٰ کر کے حد سے جان نہیں بچائے گا؟

**آیت 3** ① اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً : یہاں ایک سوال ہے کہ کئی زانی مرد عفیف اور پاک دامن عورتوں سے نکاح کرتے ہیں اور کئی زانیہ عورتوں سے عفیف اور پاک دامن مرد نکاح کر لیتے ہیں، تو اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہاں نکاح سے مراد معروف نکاح نہیں ہے، بلکہ یہ جماع کے معنی میں

## وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ③

## مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے ③

ہے اور مقصد زنا کی قباحت اور شناعت بیان کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زانی مرد اپنی ناجائز ہوس کسی زانیہ ہی سے پوری کرے گا جو اس جیسی بدکار ہے، یا کسی مشرکہ سے جو زنا کو حرام نہیں سمجھتی، اسی طرح زانیہ عورت کی ناجائز ہوس وہی مرد پوری کرے گا جو اس جیسا بدکار ہے، یا کوئی مشرک جو زنا کو حرام نہیں سمجھتا اور ایسا کرنا یعنی زنا کرنا مومنوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔ طبری نے حسن سند کے ساتھ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور اسے راجح قرار دیا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت سے مراد زنا کی حرمت ہے، نکاح کی حرمت نہیں۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ فاسق و فاجر آدمی، جس کی عادت زنا اور فسق ہے، اسے صالح عورتوں سے نکاح کی رغبت نہیں ہوتی، اسے اپنے جیسی کسی خبیث، فاسق اور بدکار عورت یا اس جیسی مشرکہ عورت ہی سے نکاح کی رغبت ہوتی ہے، اسی طرح علانیہ بدکار اور فاسق عورت سے نکاح کی رغبت صالح مردوں کو نہیں ہوتی بلکہ اس جیسے بدکار مردوں ہی کو ہوتی ہے۔ ان مفسرین کے مطابق یہ حکم اکثر لوگوں کا بیان ہوا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے نیکی کوئی پرہیز گار آدمی ہی کرتا ہے، حالانکہ بعض اوقات وہ آدمی بھی نیکی کر لیتا ہے جو پرہیز گار نہیں ہوتا۔ اسی طرح زانی بعض اوقات عفیفہ و مومنہ عورت سے نکاح کر لیتا ہے اور زانیہ عورت سے بعض اوقات عفیف و مومن مرد نکاح کر لیتا ہے۔ مشرک مرد اور مشرکہ عورت کی زانی مرد اور زانیہ عورت کے ساتھ ایک مناسبت یہ ہے کہ جس طرح مشرک مرد اور مشرکہ عورت اپنے مالک کو چھوڑ کر دوسروں کے در پر جھکتے ہیں اسی طرح زانی مرد اپنی بیوی کو چھوڑ کر اور زانیہ عورت اپنے شوہر کو چھوڑ کر غیروں سے منہ کالا کرتے ہیں۔

② وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: "ذٰلِكَ" کا اشارہ بعض نے زنا کی طرف قرار دیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، مگر زیادہ درست یہی ہے کہ یہ اشارہ عقد نکاح کی طرف ہے۔ یعنی یہ جانتے ہوئے کہ فلاں عورت بدکار اور غیر تائب ہے، اس سے نکاح کرنا مومن مردوں کے لیے حرام ہے، اسی طرح اپنی پاک دامن بیٹی کو کسی بدکار شخص کے نکاح میں دینا جو تائب نہ ہو، مومنوں کے لیے حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ﴾ [ النور : ٢٦ ] "گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بھی مردوں اور عورتوں کے نکاح کے لیے دونوں کے پاک دامن ہونے کی اور بدکار نہ ہونے کی شرط لگائی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ﴾ [ المائدۃ : ٥ ] "آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جنھیں کتاب

دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو، اس حال میں کہ تم قید نکاح میں لانے والے ہو، بدکاری کرنے والے نہیں اور نہ چھپی آشنائیں بنانے والے۔'' ''وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' کی شان نزول میں مروی حدیث رسول ﷺ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بدکار عورتوں یا بدکار مردوں سے، جو تائب نہ ہوں، نکاح حرام ہے۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی جسے مرثد بن ابی مرثد (رضی اللہ عنہ) کہا جاتا تھا، وہ مکہ سے قیدی اٹھا کر مدینہ لایا کرتا تھا اور مکہ میں ایک بدکار عورت تھی، جسے عناق کہا جاتا تھا، وہ اس کی دوست تھی۔ مرثد بن ابی مرثد نے مکہ میں قید ایک آدمی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اٹھا لے جائے گا۔ اس کا بیان ہے کہ میں مکہ میں آیا اور میں چاندنی رات میں مکہ کی ایک دیوار کے سائے میں تھا کہ عناق آئی، اس نے دیوار کے ساتھ میرے سائے کا ہیولا دیکھا۔ جب وہ میرے پاس پہنچی تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ کہنے لگی: ''مرثد ہو؟'' میں نے کہا: ''مرثد ہوں۔'' کہنے لگی: ''مرحباً و اهلاً، آؤ ہمارے پاس رات گزارو۔'' میں نے کہا: ''عناق! اللہ نے زنا حرام کر دیا ہے۔'' اس نے آواز دی، خیموں والو! یہ وہ آدمی ہے جو تمھارے آدمی اٹھا لے جاتا ہے۔ چنانچہ آٹھ آدمی میرے پیچھے لگ گئے اور میں (مکہ کے ایک پہاڑ) خندمہ پر چلنے لگا، حتیٰ کہ اس کی ایک غار تک پہنچ کر اس میں داخل ہو گیا۔ وہ لوگ آئے، حتیٰ کہ میرے سر پر آ کھڑے ہوئے اور انھوں نے پیشاب کیا، تو ان کا پیشاب میرے سر پر گرا، مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں مجھ سے اندھا کر دیا۔ پھر وہ واپس چلے گئے، میں بھی دوبارہ اپنے ساتھی کے پاس آیا اور اسے اٹھایا، وہ آدمی بھاری تھا، یہاں تک کہ میں اسے ''اذخر'' تک لے آیا (یعنی مکہ سے باہر جہاں اذخر گھاس تھی)، اس کی بھاری بیڑی کھولی اور اسے اس طرح لے کر چلا کہ میں اسے اٹھاتا تھا اور وہ مجھے تھکا دیتا تھا، حتیٰ کہ میں مدینہ پہنچ گیا۔ تو میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: ''یا رسول اللہ! میں عناق سے نکاح کر لوں؟'' میں نے دو مرتبہ یہ بات کہی، رسول اللہ ﷺ خاموش رہے، مجھے کوئی جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ١ وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ١ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ النور : ۳ ] تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مرثد! زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور جو زانیہ یا مشرکہ ہے اس سے نکاح نہیں کرتا مگر جو زانی ہے یا مشرک ہے، اس لیے تو اس (عناق) سے نکاح مت کر۔'' [ ترمذي، تفسیر القرآن، باب و من سورة النور : ۳۱۷۷۔ نسائي : ۳۲۳۰۔ أبوداؤد : ۲۰۵۱۔ مستدرك حاكم : ۱۶۶/۲، ح : ۲۷۰۱، و قال الألباني حسن الأسناد ]

ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا: ''زانیہ عورت سے نکاح کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں تصریح فرمائی ہے کہ وہ حرام ہے اور فرمایا کہ جو اس سے نکاح کرے وہ زانی ہے یا مشرک، کیونکہ یا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی قبول کرے گا اور اس کے وجوب کا عقیدہ رکھے گا یا نہیں۔ اگر وہ اس کے وجوب کا عقیدہ ہی نہ رکھتا ہو تو وہ مشرک ہے اور اگر اس کی پابندی قبول کرتا ہو اور اس کے وجوب کا عقیدہ رکھتا ہو، پھر اس کی خلاف ورزی کرے تو وہ زانی ہے۔ پھر اس کے حرام ہونے کی تصریح فرمائی کہ زانی یا مشرک سے نکاح مومنوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔'' اس آیت کے مطابق امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ پاک دامن مرد کا نکاح

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴﴾

اور وہ لوگ جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ لائیں تو انھیں اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان لوگ ہیں ﴿۴﴾

زانی غیر تائب عورت سے اور پاک دامن عورت کا نکاح زانی غیر تائب مرد سے حرام قرار دیتے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تفسیر سورۂ نور میں اس مسلک کی تائید کرتے ہوئے ان لوگوں کی پُر زور تردید کی جو اس نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں۔

③ اگر کسی مرد سے زنا سرزد ہو جائے، پھر وہ توبہ کر لے تو اس کا نکاح پاک دامن عورت سے جائز ہے، اسی طرح زانیہ عورت توبہ کر لے تو اس سے عفیف مومن کا نکاح جائز ہے، جیسا کہ کوئی مشرک مرد یا عورت شرک سے توبہ کر کے مسلمان ہو جائیں تو ان کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ اس کی دلیل سورۂ فرقان کی آیت (۷۰) اور دوسری بہت سی آیات ہیں۔ ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ میں ایک عورت کے پاس جاتا تھا اور اس کے ساتھ اس کام کا ارتکاب کرتا تھا جو اللہ نے مجھ پر حرام کیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس سے نکاح کروں تو کچھ لوگوں نے کہا ہے: ''اِنَّ الزَّانِيَ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً'' ''زانی نہیں نکاح کرے گا مگر زانیہ سے یا مشرکہ سے۔'' تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''یہ آیت اس کے متعلق نہیں، تم اس سے نکاح کر لو، جو گناہ ہو گا وہ میرے ذمے رہنے دو۔'' (ابن کثیر، دکتور حکمت بن بشیر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے)

**آیت 4** ① وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ : ''الْمُحْصَنٰتِ'' سے مراد پاک دامن عورتیں ہیں، کنواری ہوں یا شادی شدہ۔ ان پر تہمت لگانے سے مراد زنا کی تہمت ہے، کیونکہ ''پاک دامن عورتوں'' کا لفظ قرینہ ہے کہ ان پر تہمت پاک دامن نہ ہونے ہی کی ہے۔ اس کے علاوہ چار گواہوں کی شہادت بھی دلیل ہے کہ مراد زنا کی تہمت ہے، اگر کوئی شخص کسی پر چوری یا شراب نوشی یا کفر وغیرہ کی تہمت لگائے تو اس پر حد قذف نافذ نہیں کی جائے گی، بلکہ حاکم کی صواب دید کے مطابق تعزیر ہو گی۔ اگرچہ یہاں ذکر پاک دامن عورتوں کا ہے مگر اس میں پاک دامن مرد بھی شامل ہیں، ان پر بہتان لگانے والوں پر بھی یہی حد لاگو ہو گی، کیونکہ جس علت کی بنا پر پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی حد مقرر کی گئی ہے وہی علت پاک دامن مردوں پر تہمت لگانے میں بھی موجود ہے۔ اس لیے پوری امت کا اجماع ہے کہ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی حد پاک دامن مرد پر تہمت لگانے والے پر بھی نافذ کی جائے گی۔ یہاں عورتوں کا ذکر اس لیے ہے کہ ان پر تہمت زیادہ تکلیف دہ اور باعث عار ہوتی ہے اور اس لیے بھی کہ آگے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا ذکر آ رہا ہے۔

② جو شخص کسی پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے چار مسلمان عادل مرد گواہ پیش کرے۔ (دیکھیے نساء: ۱۵) دوسرے کسی جرم کے ثبوت کے لیے چار گواہ مقرر نہیں کیے گئے۔ اگر کسی

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝۵

شخص نے کسی کو زنا کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے تو اگر اس کے پاس مزید تین گواہ نہیں تو اسے اجازت نہیں کہ اس کا ذکر کرے، بلکہ اسے خاموش رہنے کا حکم ہے، تاکہ وہ گندگی جہاں ہے وہیں تک محدود رہے، معاشرے میں لوگوں کے ناجائز تعلقات کے چرچے نہ ہوں، کیونکہ اس سے بے شمار برائیاں پھیلتی ہیں، ماحول میں زنا کا تذکرہ اسے پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ کوئی شخص اگر چھپ کر زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا اتنا نقصان نہیں جتنا زنا کی اشاعت (بے حیائی کی بات پھیلانے) سے معاشرے کا نقصان ہوتا ہے۔ ہاں، اگر کوئی شخص اتنی دیدہ دلیری سے زنا کرتا ہے کہ چار مرد اسے عین حالت زنا میں دیکھتے ہیں تو انھیں اجازت ہے کہ اسے حاکم کے پاس لے جائیں، تاکہ وہ اس پر حد نافذ کر کے اس خبیث فعل کی روک تھام کرے۔ ایک طرف زنا کی سخت ترین حد مقرر فرمائی، دوسری طرف لوگوں کی عزتوں کی حفاظت اور ان کی کمزوریوں پر پردے کے لیے حکم دیا کہ جو شخص کسی پاک دامن پر زنا کا الزام لگائے، پھر چار گواہ پیش نہ کرے تو اسے بہتان کی حد لگاؤ۔ بہتان لگانے والا مرد ہو یا عورت، جیسا کہ حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ (رضی اللہ عنہما) کے ساتھ حمنہ بنت جحش (رضی اللہ عنہا) پر بھی حد قذف لگائی گئی تھی۔

③ جو شخص کسی پاک دامن مسلم مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگائے، پھر چار گواہ نہ لا سکے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق تین حکم دیے ہیں، پہلا یہ کہ اسے اسی (۸۰) کوڑے مارو، دوسرا یہ کہ اس کی کوئی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور تیسرا یہ کہ یہی لوگ فاسق (نافرمان) ہیں (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ میں قصر قلب ہے)، نہ کہ وہ لوگ جنھیں یہ فاسق ثابت کرنا چاہتے تھے۔

**آیت 5** ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ...... : اس بات پر اتفاق ہے کہ توبہ سے بہتان کی حد معاف نہیں ہوگی، اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ توبہ اور اصلاح کے بعد اس سے فسق کا حکم اٹھ جائے گا، البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ توبہ اور اصلاح کے بعد اس کی شہادت قبول ہوگی یا نہیں۔ طبری رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے کہ انھوں نے "وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا" پڑھا اور فرمایا: ''پھر جو شخص توبہ اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔'' اگرچہ بعض لوگوں کے مطابق توبہ اور اصلاح کے بعد بھی اس کی شہادت قبول نہیں ہوگی، مگر صحیح بات یہی ہے کہ اگر بہتان لگانے والا توبہ کرے کہ آئندہ میں ایسی بات نہیں کروں گا اور واقعی اپنی اصلاح کر لے اور ایسی کوئی غلطی نہ کرے تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔ کیونکہ مردود الشہادہ تو وہ فسق کی وجہ سے تھا، جب فسق نہ رہا تو شہادت کیوں قبول نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ کہ توبہ سے تو کفر و شرک بھی معاف ہو جاتا ہے، قذف تو اس سے کہیں کم گناہ ہے۔ رہا لفظ "اَبَدًا" (ہمیشہ) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ تہمت لگانے سے باز نہ آئے، خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے، اس کی شہادت مت قبول کرو۔ رہی وہ مدت جس سے اس کی توبہ اور اصلاح ثابت ہو جاتی ہے تو

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۶ وَ الْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۷ وَ يَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۸ وَ الْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۹

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس کوئی گواہ نہ ہوں مگر وہ خود ہی تو ان میں سے ہر ایک کی شہادت اللہ کی قسم کے ساتھ چار شہادتیں ہیں کہ بلاشبہ یقیناً وہ سچوں سے ہے ۝۶ اور پانچویں یہ کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹوں سے ہو ۝۷ اور اس (عورت) سے سزا کو یہ بات ہٹائے گی کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار شہادتیں دے کہ بلاشبہ یقیناً وہ (مرد) جھوٹوں سے ہے ۝۸ اور پانچویں یہ کہ اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہو، اگر وہ (مرد) سچوں سے ہو ۝۹

بعض لوگوں نے اس کے لیے ایک سال مدت مقرر کی ہے، مگر یہ بات کتاب و سنت سے ثابت نہیں، اس لیے یہ بات قاضی پر چھوڑ دی جائے گی، اگر اسے کسی بھی مدت میں اس کی توبہ اور اصلاح کا یقین ہو جائے تو وہ اس کی شہادت قبول کر سکتا ہے، کیونکہ یقیناً اللہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی، وہ توبہ کے بعد بے حد پردہ پوشی بھی کرتا ہے اور رحم بھی۔

**آیت 6 تا 9** ① وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ ...... : حد قذف کی آیات نازل ہونے کے بعد یہ مسئلہ پیش آیا کہ اگر خاوند اپنی بیوی کو زنا کرتے ہوئے دیکھے اور اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو وہ کیا کرے۔ سب سے پہلے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرضی طور پر اس کے متعلق پوچھا، کہنے لگے: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! إِنْ وَجَدْتُ مَعَ امْرَأَتِيْ رَجُلًا، أَأُمْهِلُهُ حَتّٰى آتِيَ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ؟ قَالَ نَعَمْ )) [ مسلم، كتاب اللعان : ۱۴۹۸/۱۵ ] ''یا رسول اللہ! اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو پاؤں تو کیا اسے چار گواہ لانے تک مہلت دوں؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں!'' عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے پوچھا: ''اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پائے تو وہ یا تو بات کرے گا تو تم اسے کوڑے مارو گے، یا وہ (اسے) قتل کر دے گا، تو تم اسے قتل کر دو گے، یا خاموش رہے گا تو دلی غیظ پر خاموش رہے گا۔'' آپ نے کہا: (( اَللّٰهُمَّ ! افْتَحْ )) ''یا اللہ! تو فیصلہ فرما!'' اور دعا کرنے لگے، تو لعان کی آیات اتریں: ﴿ وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ ...... اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [ النور : ۶ تا ۹ ] تو وہی آدمی اس آزمائش میں مبتلا ہو گیا۔ چنانچہ وہ اور اس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انھوں نے لعان کیا۔ مرد نے اللہ کی چار قسمیں کھائیں کہ وہ یقیناً سچوں میں سے ہے، پھر پانچویں دفعہ اس نے لعنت کی کہ اس پر لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔ پھر وہ عورت لعنت کرنے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ٹھہرو!'' مگر وہ نہیں مانی اور اس نے لعان کر دیا۔ جب

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، کمال حکمت والا ہے (تو جھوٹوں کو دنیا ہی میں سزا مل جاتی) ﴿۱۰﴾

وہ واپس گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''شاید کہ وہ سیاہ گھونگھریالے بالوں والے بچے کو جنم دے۔'' تو اس نے سیاہ گھونگھریالے بالوں والے بچے ہی کو جنم دیا۔ [ مسلم، کتاب اللعان : ۱٤۹٥ ]

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: ''یا رسول اللہ! یہ بتائیں کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو دیکھے تو کیا اسے قتل کر دے، تو تم اسے قتل کر دو گے، یا وہ کیا کرے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے بارے میں قرآن کی وہ آیات نازل فرمائیں جن میں لعان کا ذکر ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے اور تمھاری بیوی کے متعلق فیصلہ فرما دیا ہے۔'' سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ان دونوں نے لعان کیا اور میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا اور اس نے بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی تو یہ سنت ٹھہری کہ لعان کرنے والے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کر دی جائے گی اور وہ حاملہ تھی تو خاوند نے اس کے حمل کو اپنا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے وہ ماں کے نام پر پکارا جاتا تھا، پھر میراث میں یہ سنت جاری ہوئی کہ وہ لڑکا اپنی ماں کا وارث بنے گا اور وہ اس کی وارث ہوگی۔'' [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ والخامسة أن لعنت الله عليه ...... ﴾ : ٤٧٤٦ ]

② ان دونوں احادیث میں لعان کے تقریباً سبھی احکام آ گئے ہیں۔ میاں بیوی دونوں میں سے ایک کے یقیناً جھوٹا ہونے کے باوجود ان کا معاملہ لعان کے بعد اللہ کے سپرد کیا جائے گا، تاکہ مہلت اور پردہ پوشی سے فائدہ اٹھا کر غلطی والا فریق اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کر لے۔

③ یاد رہے کہ کسی خاوند کا محض شک کی بنا پر یا بچے کے حلیہ کو اپنے مطابق نہ دیکھ کر بیوی پر زنا کا الزام لگا دینا سخت گناہ ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''یا رسول اللہ! میرے ہاں کالے رنگ کا بچہ پیدا ہوا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے رنگ کیا ہیں؟'' کہا: ''سرخ ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا ان میں کوئی خاکستری بھی ہے؟'' کہا: ''جی ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ کیسے ہو گیا؟'' کہا: ''شاید اسے کوئی رگ کھینچ کر لے گئی ہو۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو شاید تمھارے اس بیٹے کو بھی کوئی رگ کھینچ کر لے گئی ہو۔'' [ بخاری، الطلاق، باب إذا عرض بنفي الولد : ٥٣٠٥ ]

**آیت 10** ﴿ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ ...... ﴾ : ''اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی......'' اس ''اگر'' کا جواب محذوف ہے، یعنی ''تو پھر تمھارا وہ حال ہوتا جو بیان میں آنا مشکل ہے'' اس لیے یہ جواب محذوف کر دیا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لعان کا حکم نازل نہ کرتا تو خاوند اگر بیوی کو زنا کی حالت میں دیکھتا تو اس کا معاملہ دوسرے لوگوں کی طرح نہیں تھا، جن کے متعلق حکم ہے کہ اگر وہ کسی کو زنا کرتے ہوئے دیکھیں اور وہ چار گواہ نہ لا سکتے ہوں تو خاموش

إِنَّ الَّذِينَ جَآءُو بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

بے شک وہ لوگ جو یہ بہتان لائے ہیں وہ تمھی سے ایک گروہ ہیں، اسے اپنے لیے برا مت سمجھو، بلکہ یہ تمھارے

رہیں، کیونکہ اس میں ان کا ذاتی دخل نہیں اور وہ اللہ سے زیادہ غیرت مند نہیں، بخلاف خاوند کے کہ وہ اگر خاموش رہے تو ساری عمر دل کی جلن کے ساتھ خاموش رہے اور دوسروں کی اولاد کو اپنی اولاد تسلیم کرے، طلاق دے تو اس کا نقصان ہے اور اگر الزام لگائے تو چار گواہ لائے، اگر نہ لا سکے، جو بظاہر لانے ممکن نہیں تو بہتان کی حد جھیلے۔ دوسری طرف اگر محض خاوند کے الزام یا قسمیں کھانے سے بیوی کے زنا کا ثبوت ہو جاتا تو عورت کے لیے سخت مصیبت تھی، کیونکہ ممکن ہے وہ سچی ہو۔ اسی طرح اگر عورت کو قسمیں کھانے کی وجہ سے بری سمجھ لیا جاتا تو مرد پر حد قذف واجب ہو جاتی، حالانکہ ممکن ہے وہی سچا ہو۔ اس لیے لعان کا حکم اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور اس کی رحمت ہے اور اس نے یہ حکم اپنے "تَوَّابٌ" اور "حَكِيمٌ" ہونے کی وجہ سے دیا ہے، تاکہ میاں بیوی میں سے جو فریق سچا ہو بلا سبب سزا سے بچ جائے اور جو جھوٹا ہو دنیا میں اس پر پردہ رہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ مہلت سے فائدہ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی توابیت کی صفت کی بدولت توبہ کر لے اور اسے توبہ قبول ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے۔

**آیت 11** ① إِنَّ الَّذِينَ جَآءُو بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ : "اَلْإِفْكُ" کا لفظی معنی الٹا کرنا ہوتا ہے، مراد ایسا بہتان ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہو۔ اس سے مراد وہ بہتان ہے جو منافقین نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگایا تھا، دو تین مخلص مسلمان بھی سادہ دلی کی وجہ سے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کی تفصیل خود عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنیے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ جب سفر پر جاتے تو اپنی بیویوں کے نام قرعہ ڈالتے، جس بیوی کے نام قرعہ نکلتا اسے آپ اپنے ساتھ لے جاتے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ (بنو المصطلق) میں قرعہ ڈالا جو میرے نام نکلا، تو میں آپ کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ یہ واقعہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد کا ہے۔ میں ایک ہودے میں سوار رہتی اور جب اترتی تو ہودے سمیت اتاری جاتی۔ ہم اسی طرح سفر کرتے رہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس غزوہ سے فارغ ہوئے اور سفر سے لوٹے تو ہم لوگ مدینہ کے نزدیک آ پہنچے، آپ نے ایک رات کوچ کا اعلان کیا۔ یہ اعلان سن کر میں اٹھی اور پیدل چل کر لشکر سے پار نکل گئی، جب حاجت سے فارغ ہوئی اور لشکر کی طرف آنے لگی تو مجھے معلوم ہوا کہ ''اظفار'' کے نگینوں کا ہار (جو میرے گلے میں تھا) ٹوٹ کر گر گیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈنے لگی اور اسے ڈھونڈنے میں دیر لگ گئی۔ اتنے میں وہ لوگ جو میرا ہودہ اٹھا کر اونٹ پر لادا کرتے تھے، انھوں نے ہودہ اٹھایا اور میرے اونٹ پر لاد دیا۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ میں ہودہ میں موجود ہوں، کیونکہ اس زمانہ میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں، پُر گوشت اور بھاری بھر کم نہ ہوتی تھیں اور تھوڑا سا کھانا کھایا کرتی تھیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے جب ہودہ اٹھایا تو انھیں اس کے ہلکے پن کا کوئی خیال نہ آیا، علاوہ ازیں میں ان دنوں ایک کم سن لڑکی تھی۔ خیر وہ ہودہ اونٹ پر لاد کر چل دیے۔ لشکر کے روانہ ہونے کے بعد میرا ہار مجھے مل گیا اور میں اسی ٹھکانے کی طرف چلی گئی جہاں رات کو اترے تھے، دیکھا تو وہاں نہ کوئی پکارنے والا ہے اور نہ جواب دینے والا (مطلب سب جا چکے تھے)، میں نے ارادہ کیا کہ اپنے ٹھکانے پر

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَ الَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱﴾

لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کے لیے گناہ میں سے وہ ہے جو اس نے گناہ کمایا اور ان میں سے جو اس کے بڑے حصے کا ذمہ دار بنا اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۱﴾

چلی جاؤں، کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب وہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو اسی جگہ تلاش کرنے آئیں گے۔ میں وہاں بیٹھی رہی، نیند نے غلبہ کیا اور میں سو گئی۔ لشکر کے پیچھے پیچھے (گرے پڑے سامان کی خبر رکھنے کے لیے) صفوان بن معطل السلمی الذکوانی مقرر تھے۔ وہ رات چلے اور صبح میرے ٹھکانے کے قریب پہنچے اور دور سے کسی انسان کو سوتے ہوئے دیکھا، پھر میرے قریب آئے تو مجھے پہچان لیا، کیونکہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے انھوں نے مجھے دیکھا تھا، جب انھوں نے مجھے پہچان کر "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھا تو میں بیدار ہو گئی اور اپنی چادر سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اللہ کی قسم! انھوں نے نہ مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے "إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کے سوا کوئی بات سنی۔ انھوں نے اپنی سواری بٹھائی اور اس کے اگلے پاؤں کو پاؤں سے دبائے رکھا تو میں اس پر سوار ہو گئی۔ وہ آگے سے اونٹنی کی مہار پکڑ کر پیدل چلتے رہے، یہاں تک کہ ہم لشکر سے اس وقت جا ملے جب وہ عین دوپہر کو گرمی کی شدت کی وجہ سے پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ تو جن کی قسمت میں تباہی لکھی تھی وہ تباہ ہوئے۔ اس تہمت کا ذمہ دار عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا۔ خیر ہم لوگ مدینہ پہنچے، وہاں پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور مہینا بھر بیمار رہی۔ لوگ تہمت لگانے والوں کی باتوں کا چرچا کرتے رہے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی، البتہ ایک بات سے مجھے شک سا پڑتا تھا، وہ یہ کہ آپ ﷺ کی وہ مہربانی جو بیماری کی حالت میں مجھ پر ہوا کرتی تھی وہ اس بیماری میں مجھے نظر نہیں آئی۔ بس یہ تھا کہ آپ میرے پاس آتے تو سلام کہتے، پھر فرماتے: "کیا حال ہے؟" اور چلے جاتے، اس سے مجھے شک پڑتا، مگر مجھے کسی بات کی خبر نہ تھی۔ بیماری سے کچھ افاقہ ہوا تو میں کمزور ہو گئی، ابھی کمزور ہی تھی کہ "مناصع" کی طرف گئی۔ مسطح کی ماں (عاتکہ) میرے ساتھ تھی۔ ہم لوگ ہر رات کو وہاں رفع حاجت کے لیے جایا کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہم اپنے گھروں کے نزدیک بیت الخلا نہیں بناتے تھے، بلکہ اگلے زمانہ کے عربوں کی طرح رفع حاجت کے لیے باہر جایا کرتے تھے۔ کیونکہ گھروں کے قریب بیت الخلا بنانے سے اس کی بدبو ہمیں تکلیف دیتی۔ خیر میں اور مسطح کی ماں جو ابورہم بن عبد مناف کی بیٹی تھی اور اس کی ماں صخر بن عامر کی بیٹی اور ابوبکر صدیق کی خالہ تھی، اس کا بیٹا مسطح تھا، رفع حاجت سے فراغت کے بعد ہم دونوں گھر کو آ رہی تھیں کہ مسطح کی ماں کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسلا تو وہ کہنے لگی: "مسطح ہلاک ہو۔" میں نے اسے کہا: "تم نے بہت بری بات کہی، کیا تم اس شخص کو کوستی ہو جو بدر میں شریک تھا؟" وہ کہنے لگی: "اے بھولی لڑکی! کیا تم نے وہ نہیں سنا جو اس نے کہا ہے؟" میں نے کہا: "اس نے کیا کہا ہے؟" تب اس نے تہمت لگانے والوں کی باتیں مجھ سے بیان کیں تو میری بیماری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب میں گھر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لائے اور سلام کر کے پوچھا: "اب کیسی ہو؟" میں نے کہا: "کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں والدین کے پاس جاؤں؟" میرا ارادہ اس وقت یہ تھا کہ ان سے خبر کی

تحقیق کروں۔ آپ ﷺ نے مجھے اجازت دے دی۔ میں اپنے والدین کے پاس آ گئی تو میں نے اپنی ماں سے کہا: ''امی! لوگ (میرے بارے میں) کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' اس نے کہا: ''بیٹی! اتنا رنج نہ کرو، اللہ کی قسم! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی مرد کے پاس کوئی خوبصورت عورت ہوتی ہے اور وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کی سوکنیں بھی ہوں تو وہ بہت کچھ کرتی رہتی ہیں۔'' میں نے کہا: ''سبحان اللہ! لوگوں نے اس کا چرچا بھی کر دیا۔'' چنانچہ میں وہ ساری رات روتی رہی، صبح ہو گئی مگر میرے آنسو تھمتے ہی نہ تھے، نہ آنکھوں میں نیند کا سرمہ تک آتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہما) کو بلایا، کیونکہ وحی اترنے میں دیر ہو رہی تھی اور آپ ﷺ ان سے اپنی اہلیہ سے علیحدگی کے متعلق مشورہ چاہتے تھے۔ چنانچہ اسامہ بن زید نے تو آپ کو اس کے مطابق مشورہ دیا جو وہ جانتے تھے کہ عائشہ ایسی ناپاک باتوں سے پاک ہے اور اس کے مطابق کہا جو ان کے دل میں آپ کے گھر والوں کی محبت تھی۔ انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! وہ آپ کی اہلیہ ہے اور ہم خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے۔'' علی (رضی اللہ عنہ) نے کہا: ''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی اور عورتیں اس کے علاوہ بھی بہت ہیں اور اگر آپ بریرہ سے پوچھیں تو وہ آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا دے گی۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے بریرہ (رضی اللہ عنہا) کو بلایا اور اس سے پوچھا: ''کیا تم نے کوئی ایسی بات دیکھی ہے کہ عائشہ کے متعلق تمھیں کچھ شک ہو؟'' بریرہ (رضی اللہ عنہا) کہنے لگیں: ''اللہ کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! میں نے اس میں کوئی بات نہیں دیکھی جسے میں اس کا عیب سمجھوں، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ نوعمر لڑکی ہے، گھر والوں کا گندھا ہوا آٹا رکھ کر سو جاتی ہے اور بکری آ کر اسے کھا جاتی ہے۔'' (اس کے بعد) رسول اللہ ﷺ (خطبہ دینے کے لیے) کھڑے ہوئے اور اس دن عبد اللہ بن ابی کے خلاف مدد مانگی، فرمایا: « يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ! مَنْ يَعْذِرُنِيْ مِنْ رَجُلٍ قَدْ بَلَغَنِي أَذَاهُ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ ؟ فَوَ اللّٰهِ! مَا عَلِمْتُ عَلٰى أَهْلِيْ إِلَّا خَيْرًا، وَ لَقَدْ ذَكَرُوْا رَجُلًا مَا عَلِمْتُ عَلَيْهِ إِلَّا خَيْرًا، وَمَا كَانَ يَدْخُلُ عَلٰى أَهْلِيْ إِلَّا مَعِيَ » ''مسلمانو! اس آدمی کے خلاف کون میری حمایت کرتا ہے جس کی تکلیف مجھے میرے گھر والوں کے متعلق پہنچی ہے، اللہ کی قسم! میں نے اپنے اہل خانہ میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور ان لوگوں نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا ہے جس میں خیر کے سوا میں نے کچھ نہیں دیکھا اور وہ میرے گھر کبھی اکیلا نہیں بلکہ میرے ساتھ ہی آتا ہے۔'' یہ سن کر سعد بن معاذ انصاری (اوس قبیلے کے سردار) کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''میں اس کے مقابل آپ کی مدد کرتا ہوں، اگر وہ اوس قبیلے سے ہے تو میں اس کی گردن اڑاتا ہوں اور اگر ہمارے بھائیوں خزرج قبیلے سے ہے تو آپ جو حکم دیں گے ہم بجا لائیں گے۔'' یہ بات سن کر سعد بن عبادہ، جو خزرج قبیلے کے سردار تھے، کھڑے ہوئے، وہ اس سے پہلے نیک آدمی تھے، مگر قومی حمیت نے انھیں بھڑکا دیا، انھوں نے سعد بن معاذ سے کہا: ''اللہ کی قسم! تم نے جھوٹ کہا، اللہ کی قسم! نہ تم اسے قتل کرو گے اور نہ ہی قتل کر سکتے ہو۔'' اتنے میں اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچا کے بیٹے تھے، کھڑے ہوئے اور انھوں نے سعد بن عبادہ سے کہا: ''تم جھوٹ کہہ رہے ہو، اللہ کی قسم! ہم اسے ضرور قتل کریں گے، کیونکہ تم منافق ہو، منافقوں کی طرف داری کرتے ہوئے، ان کی طرف سے جھگڑتے ہو۔'' اس پر

اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ آپس میں لڑ پڑیں، رسول اللہ ﷺ ابھی منبر ہی پر تھے، آپ ﷺ انھیں سمجھاتے اور ٹھنڈا کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے اور آپ ﷺ بھی خاموش ہو گئے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں وہ سارا دن روتی رہی، نہ میرے آنسو تھمتے تھے نہ آنکھوں میں نیند کا سرمہ تک پڑتا تھا۔ (والد نے مجھے گھر واپس جانے کا حکم دیا اور میں گھر چلی گئی) میرے والدین صبح میرے پاس آ گئے، میں دو راتیں اور ایک دن سے مسلسل رو رہی تھی، اس عرصہ میں مجھے نہ نیند آئی تھی اور نہ آنسو تھمتے تھے، والدین کو گمان ہوتا تھا کہ رو رو کر میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ پھر ایسا ہوا کہ میرے والدین میرے پاس بیٹھے تھے اور میں رو رہی تھی کہ ایک انصاری عورت نے اندر آنے کی اجازت مانگی، میں نے اجازت دے دی تو وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر رونے لگی۔ ہم اس حال میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، آپ نے سلام کہا اور بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے جب سے مجھ پر تہمت لگی تھی آپ میرے پاس نہیں بیٹھے تھے۔ آپ ایک مہینا انتظار کرتے رہے، مگر وحی نہیں آئی۔ آپ ﷺ نے بیٹھ کر خطبہ پڑھا، پھر فرمایا: (( أَمَّا بَعْدُ، يَا عَائِشَةُ! فَإِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِيْ عَنْكِ كَذَا وَ كَذَا، فَإِنْ كُنْتِ بَرِيْئَةً فَسَيُبَرِّئُكِ اللّٰهُ، وَإِنْ كُنْتِ أَلْمَمْتِ بِذَنْبٍ فَاسْتَغْفِرِي اللّٰهَ وَتُوْبِيْ إِلَيْهِ، فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ ثُمَّ تَابَ إِلَى اللّٰهِ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ )) ''اما بعد! عائشہ! مجھے تمھارے بارے میں یہ بات پہنچی ہے، اگر تو بے گناہ ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے ضرور بری کر دے گا اور اگر تو کسی گناہ سے آلودہ ہوئی ہے تو اللہ سے معافی مانگ اور توبہ کر، کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔'' جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم کی تو میرے آنسو سوکھ گئے، حتیٰ کہ مجھے ان کا ایک قطرہ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا، میں نے اپنے والد سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ کہا ہے اس کا جواب دیں۔'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں میں کیا کہوں۔'' پھر میں نے اپنی ماں سے کہا: ''آپ رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں۔'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں میں کیا کہوں۔'' آخر میں خود ہی جواب دینے لگی، میں نوعمر لڑکی تھی، قرآن میں نے زیادہ نہیں پڑھا تھا، میں نے کہا: (( إِنِّيْ وَاللّٰهِ! لَقَدْ عَلِمْتُ لَقَدْ سَمِعْتُمْ هٰذَا الْحَدِيْثَ حَتّٰى اسْتَقَرَّ فِيْ أَنْفُسِكُمْ وَ صَدَّقْتُمْ بِهِ، فَلَئِنْ قُلْتُ لَكُمْ : إِنِّيْ بَرِيْئَةٌ، وَاللّٰهُ! يَعْلَمُ أَنِّيْ بَرِيْئَةٌ، لَا تُصَدِّقُوْنَنِيْ بِذٰلِكَ، وَلَئِنِ اعْتَرَفْتُ لَكُمْ بِأَمْرٍ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَنِّيْ مِنْهُ بَرِيْئَةٌ لَتُصَدِّقُنِّيْ، وَاللّٰهِ! مَا أَجِدُ لَكُمْ مَثَلًا إِلَّا قَوْلَ أَبِيْ يُوْسُفَ قَالَ: ﴿ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾ [ يوسف : ۱۸ ] )) ''اللہ کی قسم! میں جانتی ہوں کہ آپ لوگوں نے یہ بات سنی ہے، حتیٰ کہ آپ کے دل میں جم گئی ہے اور آپ نے اسے سچا سمجھ لیا ہے، اب اگر میں آپ سے کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں، تو تم مجھے اس میں سچا نہیں سمجھو گے اور اگر میں کسی بات کا اعتراف کر لوں، جب کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ مجھے سچا سمجھیں گے۔ اللہ کی قسم! میں اپنی اور تمھاری مثال ایسی ہی سمجھتی ہوں جیسے یوسف کے باپ نے کہا تھا: ''سو (میرا کام) اچھا صبر ہے اور اللہ ہی ہے جس سے اس پر مدد مانگی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو۔'' پھر میں نے کروٹ بدل لی اور بستر پر لیٹ گئی۔ میں اس وقت جانتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ تعالیٰ ضرور میری بے گناہی کی وجہ سے مجھے بری کر دے گا، لیکن

اللہ کی قسم! مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں ایسی وحی نازل کرنے والا ہے جس کی تلاوت کی جائے گی اور میرے دل میں میری شان اس سے کہیں کم تر تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں ایسی بات فرمائے گا جس کی تلاوت کی جایا کرے گی۔ مجھے تو یہ امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ نیند میں خواب دیکھیں گے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مجھے پاک قرار دے گا۔ تو اللہ کی قسم! ابھی رسول اللہ ﷺ وہاں سے چلے نہ تھے، نہ ہی گھر والوں میں سے کوئی باہر گیا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی اور آپ پر وہ سختی ہونے لگی جو اس موقع پر ہوا کرتی تھی، یہاں تک کہ آپ سے موتیوں کی طرح پسینا ٹپکنے لگا، حالانکہ وہ سردی کا دن تھا۔ ایسا اس کلام کے بوجھ کی وجہ سے ہوتا تھا جو آپ پر نازل ہوتا تھا۔ جب وہ حالت ختم ہوئی تو آپ خوش تھے اور ہنس رہے تھے۔ پھر پہلی بات جو آپ نے کہی یہ تھی: (( يَا عَائِشَةُ ! أَمَّا اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ فَقَدْ بَرَّأَكِ )) ''عائشہ! اللہ عزوجل نے تمھیں بری کر دیا۔'' میری والدہ نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ کی طرف اٹھو (اور شکریہ ادا کرو)۔'' میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں آپ کی طرف نہیں اٹھوں گی اور اللہ کے سوا کسی کا شکریہ ادا نہیں کروں گی۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ...... وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ النور : ۱۱ تا ۲۰ ]

جب اللہ تعالیٰ نے میری براءت میں یہ آیات نازل فرمائیں تو ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے، جو محتاجی اور قرابت کی وجہ سے مسطح پر خرچ کیا کرتے تھے، کہا: ''اللہ کی قسم! میں مسطح پر کبھی کچھ خرچ نہیں کروں گا، کیونکہ اس نے عائشہ کے متعلق ایسی باتیں کی ہیں۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ١۪ۖ وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا١ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ١ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ النور : ۲۲ ] ''اور تم میں سے فضیلت اور وسعت والے اس بات سے قسم نہ کھا لیں کہ قرابت والوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دیں اور لازم ہے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں بخشے اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' یہ آیت سن کر ابوبکر نے کہا: ''کیوں نہیں؟ اللہ کی قسم! مجھے پسند ہے کہ اللہ مجھے بخش دے۔'' اور وہ مسطح پر جو خرچ کیا کرتے تھے دوبارہ کرنے لگے اور کہا: ''اللہ کی قسم! میں کبھی یہ معمول بند نہیں کروں گا۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ (اس تہمت کے زمانہ میں) زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے میرے بارے میں پوچھا کرتے تھے کہ زینب تمھیں کیا معلوم ہے، یا تم نے کیا دیکھا ہے؟ تو وہ یہی کہتی کہ میں اپنے کان اور آنکھ کی خوب احتیاط رکھتی ہوں، مجھے تو اس کے اچھا ہونے کے سوا کچھ معلوم نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بیویوں میں سے زینب ہی میرا مقابلہ کرتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی پرہیز گاری کی وجہ سے اسے بچا لیا اور اس کی بہن حمنہ اس کی خاطر لڑنے لگی۔ تو جس طرح دوسرے تہمت لگانے والے تباہ ہوئے وہ بھی تباہ ہوئی۔'' [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ لو لا إذ سمعتموه ظن المؤمنون...... ﴾ : ۴۷۵۰ ]

② اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ...... : ایک ذہن کے لوگوں کے گروہ اور جماعت کو ''عُصْبَةٌ'' اور ''عِصَابَةٌ'' کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں اور '' عَصَبَ يَعْصِبُ '' (ض) کا معنی باندھنا اور مضبوط کرنا ہے، یعنی جو لوگ یہ عظیم بہتان اپنے پاس سے بنا کر لائے ہیں ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے، اس لیے ان سے معاملہ

کرتے وقت ان کے ساتھ غیر مسلموں والا سلوک نہ کرو، کیونکہ یہ تمھی میں سے ہیں، ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں اور بات باہمی فساد تک جا پہنچے۔ جیسا کہ تجربے سے یہ بات ثابت بھی ہوگئی ہے کہ جب آپ نے عبد اللہ بن ابی کے مقابلے میں مدد کے لیے کہا تو قریب تھا کہ لوگ لڑ پڑتے، اگر نبی کریم ﷺ انھیں ٹھنڈا نہ کرتے۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے یہ کہہ کر کہ ''جو لوگ یہ بہتان لائے ہیں تمھی میں سے ایک گروہ ہیں'' ان کا بہتان اور جھوٹ بھی واضح فرمایا اور زیادہ تعاقب سے بھی منع فرما دیا۔

③ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ : یہ بات مخلص مسلمانوں کے اطمینان کے لیے فرمائی، جنھیں اس بہتان سے صدمہ پہنچا تھا، خصوصاً جن کا اس واقعہ سے براہ راست تعلق تھا، مثلاً نبی کریم ﷺ، ابوبکر صدیق، عائشہ، ان کی والدہ اور صفوان بن معطل رضی اللہ عنہم۔ فرمایا، تم اس واقعہ کو اپنے لیے برا مت سمجھو، بلکہ یہ تمھارے لیے کئی لحاظ سے بہتر ہے:

① اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ، عائشہ، ان کے والدین اور صفوان بن معطل رضی اللہ عنہم کو جو رنج و غم پہنچا اور مسلسل ایک ماہ تک وہ شدید کرب میں مبتلا رہے، اس کرب پر صبر اور بہتان لگانے والوں سے درگزر کا یقیناً اللہ کے ہاں بہت اجر ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ الزمر : ۱۰ ] ''صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔'' حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارے سے تمام بہتان لگانے والوں کی گردنیں تن سے جدا ہو سکتی تھیں۔ اس اجر کے علاوہ براءت کی آیات نازل ہونے پر ان تمام حضرات کو اتنی ہی خوشی ہوئی جتنا صدمہ پہنچا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ آیات اترنے پر ہنس رہے تھے، اسی طرح عائشہ، ان کے والدین، صفوان بن معطل رضی اللہ عنہم اور تمام مسلمانوں کو درجہ بدرجہ خوشی ہوئی۔

② ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس واقعہ سے جو عزت ملی امت مسلمہ میں سے کسی کو حاصل نہ ہو سکی کہ ان کی بریت کے لیے قرآن مجید اترا، جو قیامت تک تمام دنیا میں پڑھا جاتا رہے گا اور قرآن نے ان کی جو براءت بیان فرمائی رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاکیزہ زندگی اس کی سچی شہادت ہے کہ وہ ہر بہتان سے پاک ہیں۔ اس سے قرآن کا اعجاز بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کی کوئی پیش گوئی غلط ثابت نہ ہوئی ہے، نہ ہوگی۔

③ اس واقعہ میں یہ بھی خیر ہے کہ بہتان لگانے والے مخلص مسلمانوں پر حد لگنے سے وہ گناہ سے پاک ہو گئے اور منافقین کا نفاق ظاہر ہو گیا، جس سے آئندہ ان کے نقصانات سے بچنا آسان ہو گیا۔

④ اس واقعہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نیک نفسی اور پاک طینتی بھی ثابت ہوتی ہے کہ مسلسل ایک ماہ کے پروپیگنڈے کے باوجود مخلص مسلمانوں میں سے صرف تین آدمی حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہم اس پروپیگنڈے کا شکار ہوئے، باقی تمام صحابہ اس بدگمانی سے پوری طرح محفوظ رہے۔ ازواج مطہرات میں سے کسی نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی بدنامی میں حصہ نہیں لیا، حتیٰ کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے، جو عائشہ رضی اللہ عنہا کی برابر کی چوٹ تھیں، سوکن ہونے کے باوجود قسم کھا کر عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاک ہونے کی شہادت دی۔ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی کا واقعہ بھی، جو آگے آ رہا ہے، صحابہ کے کریم النفس اور پاک طینت ہونے کا زبردست ثبوت ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بہتان لگانے کے باوجود مسطح سے حسن سلوک ان کی خشیت الٰہی اور صبر کا بہترین نمونہ ہے۔

لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَاۤ

کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور کہا کہ

عائشہ رضی اللہ عنہا کا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بہتان کے باوجود حسن سلوک اور ان کی عزت افزائی کرنا ان کے عالی نفس ہونے کی دلیل ہے۔

⑤ اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے، ورنہ آپ ایک ماہ تک مسلسل کرب میں مبتلا نہ رہتے۔ اس سے اس غلو کی جڑ کٹ گئی جس میں اس سے پہلے یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے اور جس میں بعض نادان مسلمان بھی مبتلا ہیں۔

⑥ اس واقعہ کے نتیجہ میں زنا اور قذف کی حد نازل ہوئی اور قیامت تک کے لیے مسلمان مردوں اور عورتوں کی عصمت وعفت بہتان طرازوں سے محفوظ کر دی گئی اور مسلم معاشرے میں بے حیائی کی اشاعت کا پوری طرح سد باب کر دیا گیا۔

④ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ : یعنی جس شخص نے اس فتنے میں جتنا حصہ لیا اسی قدر گناہ گار ہوا اور سزا کا مستحق ہوا۔ کسی نے اپنے پاس سے بہتان باندھ کر طوفان اٹھایا، کسی نے بہتان باندھنے والے کی زبانی موافقت کی، کوئی سن کر ہنس دیا، کسی نے خاموشی سے سن لیا، حالانکہ اسے انکار کرنا چاہیے تھا اور کسی نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ صاف جھوٹ ہے، یہ بات کہنے والوں کو اللہ نے پسند فرمایا، باقی سب کو تھوڑا بہت الزام دیا۔

⑤ وَ الَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ : اس سے مراد رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی ہے، جیسا کہ خود عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر اسی کے متعلق فرمایا کہ اس کی تکلیف مجھے میرے گھر والوں کے متعلق پہنچی ہے، دیکھیے زیر تفسیر آیت کا پہلا فائدہ۔ بعض روایات میں حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، مگر صحیح بات یہی ہے کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے سن کر یہ بات آگے کر دی، ورنہ یہ بہتان گھڑنے والا عبد اللہ بن ابی ہی تھا۔ یہی ظالم لوگوں کو جمع کرتا اور نہایت چالاکی سے خود دامن بچا کر دوسروں کے منہ سے کہلوایا کرتا تھا۔ اس کے لیے عذاب عظیم اس لیے کہ دوسرے تمام لوگوں کا گناہ اس کے سر پر بھی تھا، کیونکہ اس نے اس کی ابتدا کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ )) [ مسلم، الزکاۃ، باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق تمرۃ...... : ۱۰۱۷ ] ”جو شخص اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کرے اس پر اس کا اپنا گناہ بھی ہوگا اور ان کا گناہ بھی جو اس پر عمل کریں گے، بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی ہو۔“ عذاب عظیم کا مطلب یہ ہے کہ اسے توبہ کی توفیق نہیں ہوگی، وہ کفر پر فوت ہوگا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوگا، جو ”اَلدَّرْكُ الْاَسْفَلُ مِنَ النَّارِ“ ہے۔ [ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ ] اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس جماعت کے دوسرے لوگوں کو توبہ کی توفیق عطا ہوگی۔

**آیت 12** ① لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا : بظاہر یوں کہنا چاہیے تھا کہ ”کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو تم نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا“ اس کے بجائے فرمایا: ”کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو مومن

# اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۲﴾

یہ صریح بہتان ہے ﴿۱۲﴾

مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا‘‘ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تہمت کو سچا سمجھنے والے مرد اور عورتیں دونوں تھے، اس لیے دونوں کو متنبہ کرنے کے لیے خاص طور پر ان کے مومن ہونے کا ذکر فرمایا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ کسی تہمت کی وجہ سے کسی مومن کے متعلق اپنے دل میں برا گمان نہ آنے دیا جائے۔

② اس آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس بہتان کو سن کر اپنے دلوں میں (عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق) اچھا گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ صریح بہتان ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس بہتان کو سن کر مومن مرد اور مومن عورتیں اپنے بارے میں اچھا گمان کرتے۔ یعنی تم اپنے متعلق سوچتے کہ اگر تم اپنی ماں، بہن یا بیٹی کے ساتھ اکیلے ہوتے تو کبھی یہ حرکت کرتے۔ تو تم نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ صفوان (رضی اللہ عنہ) اپنی اور تمام مومنوں کی ماں کے ساتھ ایسا خیال بھی کرے گا، بلکہ کیا تمھارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ کسی قافلے سے بچھڑی ہوئی کوئی خاتون مل جائے تو اس کے ساتھ ایسی خسیس حرکت کرو۔ یہ وہی شخص سوچ سکتا ہے جس میں ایمان نہ ہو اور انتہائی گندے ذہن کا مالک ہو، وہ دوسرے کو بھی ایسا ہی گندا سمجھے گا جیسا خود گندا ہے۔ پاک باز شخص دوسرے کے متعلق بھی پاک بازی ہی کا گمان کرے گا۔

تیسرا معنی یہ ہے کہ ”بِاَنۡفُسِهِمۡ“ سے مراد دوسرے مومن ہیں، کیونکہ تمام مومن ایک جان کی مانند ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ [ النساء: ۲۹ ] ”اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔“ اور فرمایا: ﴿فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤى اَنۡفُسِكُمۡ﴾ [ النور: ۶۱ ] ”اپنے آپ کو سلام کہو۔“ اور فرمایا: ﴿وَ لَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ [ الحجرات: ۱۱ ] ”اور اپنے آپ پر عیب نہ لگاؤ۔“ مراد کسی دوسرے کو قتل کرنا اور ایک دوسرے کو سلام کہنا اور کسی دوسرے پر عیب لگانا ہے۔ یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ مومن مرد اور مومن عورتیں اپنے بارے میں یعنی دوسرے مومنوں کے بارے میں اچھا گمان کرتے، کیونکہ وہ اور دوسرے مومن ایک ہی ہیں۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَوَادِّهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى )) [ بخاري، الأدب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۰۱۱ ] ”تم مومنوں کو ایک دوسرے پر رحم، ایک دوسرے کے ساتھ دوستی اور ایک دوسرے پر شفقت کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح دیکھو گے کہ جب اس کا ایک عضو بیمار ہو تو اس کی خاطر سارا جسم بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

③ وَ قَالُوۡا هٰذَاۤ اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ : صاف جھوٹ اور صریح بہتان اس لیے کہ جو کچھ ہوا اس میں شک کی گنجائش ہی نہ تھی، ام المومنین رضی اللہ عنہا دن کے وقت عین دوپہر کی روشنی میں صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کی سواری پر آ رہی ہیں۔ صفوان مہار پکڑے ہوئے ہیں، پورا لشکر آپ کو دیکھ رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود ہیں۔ اگر (بالفرض) شک والی کوئی بات ہوتی تو وہ

لَوۡ لَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذۡ لَمۡ يَاۡتُوۡا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنۡدَ اللّٰهِ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَ رَحۡمَتُهٗ فِى الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمۡ فِىۡ مَاۤ اَفَضۡتُمۡ فِيۡهِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۴﴾

وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے، تو جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں ﴿۱۳﴾ اور اگر دنیا اور آخرت میں تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً اس بات کی وجہ سے جس میں تم مشغول ہوئے، تم پر بہت بڑا عذاب پہنچتا ﴿۱۴﴾

چھپ چھپا کر آتے، اکٹھے آنے کی جرأت نہ کرتے اور دن کے بجائے رات کو آتے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی رات کو آئے تھے، فرمایا: ﴿وَ جَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ عِشَآءً يَّبۡكُوۡنَ﴾ [ يوسف : ١٦ ] ”اور وہ اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے آئے۔“ اس لیے یہ بات واضح تھی کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا پر جو الزام لگایا گیا صاف جھوٹ اور صریح بہتان ہے اور ایمان والے ہر مرد اور عورت کو یہی کہنا لازم ہے۔

**آیت 13** لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ...... : ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگانے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اس دعویٰ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے، تو جب وہ اس کے گواہ نہیں لائے تو وہی اللہ کے ہاں کامل جھوٹے ہیں۔ ابن عاشور نے اس کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے: ”مطلب یہ ہے کہ جو شخص دیکھے بغیر کوئی خبر دے اسے لازم ہے کہ وہ مشاہدہ کرنے والے کا حوالہ دے اور وہ مشاہدہ کرنے والے اتنی تعداد میں ہونے ضروری ہیں کہ اس قسم کے واقعہ میں اتنی تعداد سے سچ کا یقین حاصل ہو جائے۔ (یہ تعداد زنا کے لیے کم از کم چار ہے) اب ان لوگوں نے جو اُم المومنین پر تہمت باندھی تو ان میں سے کسی نے بھی نہ دیکھا اور نہ اتنی تعداد میں دیکھنے والے پیش کیے جس سے کسی پر زنا کا جرم ثابت ہوتا ہے، بلکہ محض خیال اور گمان سے تہمت لگا دی، اس لیے اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِيَّاكُمۡ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكۡذَبُ الۡحَدِيۡثِ )) [ بخاري، الأدب، باب : ﴿ يأيها الذين آمنوا اجتنبوا...... ﴾ : ٦٠٦٦ ] ”(برے) گمان سے بچو، کیونکہ (برا) گمان سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔“ ”فَاُولٰٓئِكَ“ کی تاکید ”هُمۡ“ کے ساتھ کرنے اور خبر ”الۡكٰذِبُوۡنَ“ پر الف لام لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، جس سے مراد ان کے جھوٹا ہونے میں مبالغہ ہے۔ گویا وہ اتنے کامل جھوٹے ہیں کہ ان کے مقابلے میں کوئی اور جھوٹا ہے ہی نہیں۔ ”اللہ کے ہاں جھوٹے“ سے مقصود ان کے حقیقی جھوٹا ہونے کا بیان ہے، کیونکہ اللہ کا علم کبھی خلاف واقعہ نہیں ہو سکتا۔ رہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص اگر چار گواہ زنا کے ثبوت کے لیے پیش نہ کر سکے تو ممکن ہے وہ سچ ہی کہہ رہا ہو، مگر شرعی فیصلہ ظاہر کے مطابق ہو گا اور اسے جھوٹا قرار دے کر اس پر قذف کی حد نافذ کی جائے گی، تو اس آیت کا یہ مطلب نہیں (اگرچہ دوسرے دلائل سے یہ بات درست ہے)۔“ [ التحرير والتنوير ]

**آیت 14** وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ...... : یعنی اگر دنیا میں تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا کہ اس نے تمھیں دنیا میں

اِذۡ تَلَقَّوۡنَهٗ بِاَلۡسِنَتِكُمۡ وَ تَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِكُمۡ مَّا لَيۡسَ لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ وَّ تَحۡسَبُوۡنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّ هُوَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمٌ ﴿۱۵﴾

جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لے رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمھیں کچھ علم نہیں اور تم اسے معمولی سمجھتے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی تھی ﴿۱۵﴾

بے شمار نعمتیں دی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ گناہ پر فوراً مؤاخذہ کے بجائے وہ مہلت دیتا ہے اور اگر آخرت میں اس کا فضل نہ ہوتا کہ وہ توبہ قبول کرتا ہے اور گناہ بخش دیتا ہے، تو تم جس کام (بہتان) میں مشغول ہوئے تھے اس کی وجہ سے تمھیں بہت بڑا عذاب آلیتا۔

آیت 15 ❶ اِذۡ تَلَقَّوۡنَهٗ بِاَلۡسِنَتِكُمۡ : "تَلَقّٰى يَتَلَقّٰى" (تفعّل) کسی سے کوئی چیز لینا، جیسے فرمایا: ﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ﴾ [ البقرة : ۳۷ ] "پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے۔" یعنی جب تم اس بہتان کو ایک دوسرے سے لے کر آگے بیان کرتے تھے کہ میں نے فلاں سے یوں سنا، فلاں نے یہ کہا وغیرہ۔

❷ وَ تَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِكُمۡ : یعنی یہ صرف تمھارے مونہوں کی بات تھی، نہ تمھارے دل میں اس کا یقین تھا نہ سننے والے کو یقین ہو سکتا تھا، جیسا کہ منافقین کے متعلق فرمایا: ﴿ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ﴾ [ آل عمران : ۱٦۷ ] "اپنے مونہوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔"

❸ مَا لَيۡسَ لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ : "عِلۡمٌ" پر تنوین تنکیر کے لیے ہے، یعنی تم اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمھیں کچھ علم نہ تھا۔

❹ وَ تَحۡسَبُوۡنَهٗ هَيِّنًا : تم اسے معمولی سمجھتے تھے، جس کی دلیل یہ ہے کہ تم اسے ایک دوسرے سے لے کر آگے بیان کرتے تھے، یا کم از کم اس پر خاموش رہتے تھے، کیونکہ اگر تم اسے معمولی نہ سمجھتے تو سختی سے اس کا انکار کرتے اور ایسی بات کرنے والے کو ٹوکتے۔

❺ وَهُوَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمٌ : حالانکہ بہتان کسی پر بھی ہو، اللہ کے ہاں بہت بڑا گناہ ہے، تو جب وہ ام المومنین پر ہو، جو خاتم الانبیاء، سید المرسلین اور سید ولد آدم ﷺ کی بیوی ہے تو کتنا بڑا گناہ ہوگا۔ رازی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں تین گناہوں کا مرتکب قرار دیا اور اس پر عذاب عظیم کے خطرے سے آگاہ فرمایا۔ پہلا گناہ یہ کہ ایک دوسرے سے سن کر اسے پھیلانا برائی کی اشاعت ہے، جو بہت بڑا گناہ ہے۔ دوسرا گناہ وہ بات کرنا ہے جس کا علم نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہی بات کرنی چاہیے جس کا علم ہو، ایسی بات کرنا جس کے سچا ہونے کا علم نہ ہو اسی طرح حرام ہے جیسے وہ بات کرنا حرام ہے جس کے جھوٹا ہونے کا علم ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ﴾ [ بني إسرائيل : ۳٦ ] "اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔" اور نبی ﷺ نے فرمایا: « كَفٰى بِالۡمَرۡءِ كَذِبًا اَنۡ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ » [ مسلم، المقدمة : ۵ ] "آدمی کو

وَ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧﴾

اور کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو کہا ہمارا حق نہیں ہے کہ ہم اس کے ساتھ کلام کریں، تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے ﴿١٦﴾ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے اس سے کہ دوبارہ کبھی ایسا کام کرو، اگر تم مومن ہو ﴿١٧﴾

جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر بات جو سنے آگے بیان کر دے۔'' تیسرا گناہ یہ کہ وہ اسے معمولی سمجھتے تھے، حالانکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

6 اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے کسی گناہ کو معمولی سمجھنے سے وہ معمولی نہیں ہوتا، بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ اس کی دنیا و آخرت کی بربادی کا باعث بن جائے، جب وہ اسے معمولی سمجھ کر بار بار اس کا ارتکاب کرتا رہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَاتٍ وَ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَهْوِيْ بِهَا فِيْ جَهَنَّمَ )) [ بخاري، الرقاق، باب حفظ اللسان : ٦٤٧٨ ] ''بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی بات کرتا ہے، جس کی طرف وہ خیال بھی نہیں کرتا، لیکن اللہ تعالیٰ اس بات کے ساتھ اسے بہت سے درجے بلند کر دیتا ہے اور بندہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی بات کرتا ہے، جس کی طرف وہ خیال بھی نہیں کرتا، لیکن اس کے ساتھ وہ جہنم میں گر جاتا ہے۔''

**آیت 16** وَ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ ...... : اس سے پہلے آیت (١٣) میں یہ ادب سکھایا تھا کہ جب اچھے لوگوں کے بارے میں کوئی نامناسب بات سنی جائے تو ان کے متعلق اچھا گمان رکھنا لازم ہے۔ اب اس کے متعلق دوسرا ادب بیان فرمایا کہ اگر کوشش کے باوجود کوئی وسوسہ یا خیال دل میں آ جائے تو اسے زبان پر ہرگز نہ لائے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: (( إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِيْ عَمَّا وَسْوَسَتْ أَوْ حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسَهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهِ أَوْ تَكَلَّمْ )) [ بخاري، الأيمان والنذور، باب إذا حنث ناسيا ...... : ٦٦٦٤، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ان باتوں سے درگزر فرمایا ہے جو وہ اپنے دل میں کریں، جب تک وہ اسے قول یا عمل میں نہ لائیں۔'' یعنی جب تم نے یہ بات سنی تو بجائے اس کے کہ اس پر خاموش رہتے، یا اس پر یقین کرتے، یا اسے آگے پھیلاتے، تم نے سنتے ہی یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارا حق نہیں کہ ہم یہ بات زبان پر لائیں، بلکہ ایسی بات سے اپنی شدید نفرت کے اظہار کے لیے ساتھ ہی یہ بھی کہنا تھا: ﴿ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴾ تو پاک ہے کہ تیرے نبی کی بیوی بدکاری کے ارتکاب سے آلودہ ہو، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ نبی کی بیوی بدکار ہو، وہ کافر تو ہو سکتی ہے، بدکار نہیں، کیونکہ انبیاء کفار کی طرف مبعوث ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ جو چیز کفار کے نزدیک قابل نفرت ہو وہ اس سے پاک ہوں اور ظاہر ہے کہ عورت کی بدکاری ان کے نزدیک بھی قابل نفرت ہے۔

**آیت 17** يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ ...... : ''يَعِظُكُمْ'' کے ضمن میں ''يَنْهَاكُمْ'' کا معنی موجود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ

وَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور اللہ تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے ﴿۱۸﴾ بے شک جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ ان لوگوں میں بے حیائی پھیلے جو ایمان لائے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۱۹﴾

تمھیں اس سے منع کرتا ہے کہ دوبارہ کبھی ایسا کام کرو، اگر تم مومن ہو، یعنی یہ کام ایمان کے منافی ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو۔

آیت 18 وَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ...... : آیات کو کھول کر بیان کرنے کے ساتھ علیم و حکیم کی مناسبت ظاہر ہے۔

آیت 18 ① اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ ...... : "اَلْفَاحِشَةُ" انتہائی برے کام کو کہتے ہیں، یہ لفظ زنا پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کی تہمت اور چرچے پر بھی۔ یعنی جو لوگ ایمان والوں میں بے حیائی اور بدکاری کا تذکرہ پھیلانا چاہتے ہیں اور پاک دامن مسلمانوں پر تہمتیں تراش کر مجلسوں میں ان کا چرچا کرتے ہیں، جس کے سننے سے زنا سے نفرت ختم ہوتی ہے، بلکہ ایسی باتوں میں دلچسپی کے نتیجے میں یہ برائی مزید پھیلتی ہے اور اس کا ذکر کرنے والے اور اسے خاموشی سے سن کر تہمت تراشنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے، عفیف مسلمانوں کے گوشت سے لذت اٹھاتے ہیں۔ ان کے لیے دنیا میں عذابِ الیم ہے کہ تہمت لگانے والوں کو دُرّے پڑتے ہیں اور وہ مردود الشہادہ اور فاسق ٹھہرتے اور ان کا اور ان کے مجلس نشینوں کا نفاق اور فسق مسلمانوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے، جس سے وہ مسلم معاشرے میں بے اعتبار ٹھہرتے ہیں اور آخرت کے عذاب کے المناک ہونے کی کوئی حد ہی نہیں۔

② آج کل تمام دنیا کے کفار اور ان کے مددگار مسلم حکمرانوں کی پوری کوشش ہے کہ ریڈیو، اخبارات، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، سکول و کالج کی تعلیم، غرض ہر طریقے سے مسلم معاشروں میں زنا اور اس کا تذکرہ عام ہو۔ ایک آدھ ملک کے سوا کسی ملک میں نہ زنا کی حد نافذ ہے نہ بہتان کی۔ نتیجہ اس کا دشمنوں کے خوف، قتل و غارت، بدامنی، وباؤں اور نئی سے نئی بیماریوں کے عذابِ الیم کی صورت میں سب کے سامنے ہے اور قیامت کا عذابِ الیم ابھی باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

③ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: یعنی زنا کی حد اور بہتان کی حد جو اللہ نے مقرر فرمائی ہے اور ایمان والوں میں بے حیائی پھیلانے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں جو عذابِ الیم رکھا ہے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر بات جانتا ہے"، اسے ان گناہوں کے خوفناک نتائج کا بھی علم ہے اور یہ بھی کہ انھیں کیسے روکا جا سکتا ہے۔ "اور تم نہیں جانتے" لہٰذا تم اپنی عقل سے جو بھی قاعدہ و قانون مقرر کرو گے وہ تمھاری لاعلمی کی وجہ سے کبھی بھی مسلمانوں کی پاک دامنی اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کا ضامن نہیں بن سکتا۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ اللہ بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے (تو تہمت لگانے والوں پر فوراً عذاب آ جاتا) ﴿۲۰﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو اور جو شیطان کے قدموں کے پیچھے چلے تو وہ تو بے حیائی اور برائی کا حکم دیتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا اور لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۱﴾

**آیت 20** وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ ...... : اس کا جواب محذوف ہے ”تو تمھیں توبہ کا موقع ہی نہ ملتا اور فوراً اللہ کا عذاب تمھیں اپنی گرفت میں لے لیتا، یہ محض اس کا فضل و رحمت اور اس کا رؤف و رحیم ہونا ہے کہ اس نے تمھیں توبہ کا موقع دیا اور حد کے ذریعے سے تمھیں پاک کرنے کا اہتمام فرمایا۔“

**آیت 21** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ...... : ”خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ“ کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۶۸) اور ”بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ“ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نحل کی آیت (۹۰) پہلے فرمایا: ﴿لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ پھر ”الشَّيْطٰنِ“ کے لیے ضمیر لا کر ”وَ مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوَاتِهِ“ کہنے کے بجائے دوبارہ نام لے کر فرمایا: ﴿وَ مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ مراد توجہ دلانا ہے کہ آدمی سوچے کہ میں کس کی پیروی کر رہا ہوں۔

② وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ ...... : اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی شخص کسی طرح بھی اپنے آپ کو پاک نہیں رکھ سکتا، نہ پاک کر سکتا ہے۔ اگر انسان کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو کوئی انسان بھی پاک نہ رہ سکے، کیونکہ شیطان اور اس کے لشکر اسے گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور ”فحشاء“ اور ”منکر“ کو خوش نما بنا کر اس کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں، نفس امارہ ان کی طرف مائل ہے اور ان کا حکم دیتا ہے۔ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے، یہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہی ہے جس کی بدولت کوئی شخص گناہوں سے پاک رہتا ہے، یا گناہ کے بعد توبہ کے ساتھ پاک ہوتا ہے۔ اس مفہوم کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۶، ۱۷) اور سورۂ نجم (۳۲)۔

③ اس مقام پر ان الفاظ سے مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مذکورہ واقعۂ افک میں ملوث ہونے سے بچ گئے، یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے جو ان پر ہوا، ورنہ وہ بھی اسی رو میں بہ جاتے جس میں بعض مسلمان بہ گئے تھے۔ اس لیے شیطان کے مکر وفریب

وَ لَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۪ۖ وَلْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

**اور تم میں سے فضیلت اور وسعت والے اس بات سے قسم نہ کھا لیں کہ قرابت والوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دیں اور لازم ہے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں بخشے اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۲۲﴾**

سے بچنے کے لیے ایک تو ہر وقت اللہ سے مدد طلب کرتے رہو اور اس کی طرف رجوع کرتے رہو اور دوسرے جو لوگ اپنے نفس کی کمزوری سے شیطان کے فریب کا شکار ہو گئے ان کو زیادہ ہدف ملامت نہ بناؤ، بلکہ خیر خواہانہ طریقے سے ان کی اصلاح کرو۔

④ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے، مگر اس کی مشیت اندھی نہیں، بلکہ وہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اپنے اس علم ہی کی وجہ سے جسے پاک کرنے کے لائق جانتا ہے پاک کر دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [ القصص : ٥٦ ] ''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

**آیت 22** ① وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ ...... : ''لَا يَاْتَلِ'' ''أَلِيَّةٌ'' (بروزن فَعِيْلَةٌ، بمعنی قسم) میں سے باب افتعال ''اِئْتَلٰى يَأْتَلِيْ'' میں سے نہی غائب ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۲۲۶): ﴿ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ﴾ میں ''يُؤْلُوْنَ'' باب افعال میں سے ہے۔ سورۂ نور کی آیت (۱۱) میں صحیح بخاری کی حدیث (۴۷۵۰) گزر چکی ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگانے والوں میں مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے (بعض نے انھیں خالہ زاد بھی کہا ہے)، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے قرابت اور ان کے فقر کی وجہ سے ان کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، جب مسطح نے یہ بات کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ وظیفہ بند کر دیا، لیکن جب یہ آیت اتری اور اس میں یہ الفاظ آئے: ﴿ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ ''کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں بخشے؟'' تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا، کیوں نہیں، میں تو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے۔ چنانچہ انھوں نے وہ وظیفہ دوبارہ جاری کر دیا اور کہا، میں اس میں کبھی کمی نہیں کروں گا۔

② پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے تو اگر اہلِ افک اس گناہ میں مبتلا ہوئے ہیں اور تم اس سے محفوظ رہے ہو تو اس میں تمھارا کچھ کمال نہیں، یہ محض اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے، اس لیے جب بہتان لگانے والے تائب ہو چکے، انھیں اس کی سزا بھی مل چکی تو ان کی غلطی ہی پر نظر نہ رکھو، بلکہ ان سے حُسن سلوک کے اسباب پر بھی نگاہ رکھو، جن میں سے ہر سبب کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمھیں برتری اور وسعت دی ہے اس میں سے انھیں بھی دیتے رہو۔ ان حسن سلوک کے اسباب میں سے ایک سبب قرابت دار ہونا ہے، دوسرا مسکین اور تیسرا مہاجر فی سبیل اللہ ہونا ہے۔ تینوں سبب

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۟ۙ﴿۲۳﴾

بے شک وہ لوگ جو پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں لعنت کیے گئے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ﴿۲۳﴾

جمع ہیں تو ان کا حق انھیں بالاولیٰ دینا چاہیے۔

③ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مرتد ہونے کے سوا دوسرے گناہوں سے کسی شخص کے اعمال صالحہ بالکل ختم نہیں ہو جاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہتان لگانے کے باوجود اہل افک میں سے مہاجرین کی ہجرت کی قدر افزائی فرمائی ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔

④ وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا: "وَ لْيَعْفُوْا" "عَفَا يَعْفُوْ" کا معنی مٹانا ہے، کہا جاتا ہے: "عَفَتِ الرِّيْحُ الْأَثَرَ" "ہوا نے قدموں کا نشان مٹا دیا۔" یعنی ان کی لغزش کا خیال دل سے مٹا دیں اور اس پر پردہ ڈال دیں۔ "وَ لْيَصْفَحُوْا" بعض اہل علم نے فرمایا کہ یہ "صَفْحَةُ الْعُنُقِ" (گردن کا کنارہ) سے مشتق ہے، یعنی ان کے برے سلوک سے اس طرح درگزر کرو جیسے تم نے ان سے گردن کا کنارا پھیر لیا ہے۔ عفو و درگزر کا یہ حکم سورۂ آل عمران (۱۳۴)، نساء (۱۴۹)، حجر (۸۵)، شوریٰ (۴۳) اور دیگر کئی آیات میں آیا ہے۔ (اضواء البیان)

⑤ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ: اس کی شان نزول اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گار مسلم کو معاف کرنا اور اس سے درگزر کرنا گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے۔ تم بخشو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں بخشے گا، تم درگزر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے درگزر فرمائے گا، جیسا عمل کرو گے ویسی جزا پاؤ گے۔

⑥ یہ آیت دلیل ہے کہ نیکی نہ کرنے کی قسم کھانا جائز نہیں، ایسی قسم کا کفارہ دے کر وہ نیکی کر لینی چاہیے۔ اسی طرح اگر قسم کا پورا نہ کرنا بہتر ہو تو اس کا بھی کفارہ دے کر بہتر کام کرنا چاہیے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنٍ فَرَأٰى غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا فَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَلْيَفْعَلْ )) [ ترمذي، النذور والأيمان، باب ما جاء في الكفارة قبل الحنث : ۱۵۳۰، و قال الألباني صحيح ] "جو شخص کسی کام پر قسم کھائے، پھر اس کے علاوہ کو بہتر سمجھے تو اسے چاہیے کہ اپنی قسم کا کفارہ دے دے اور (بہتر کام) کر لے۔"

**آیت 23** ① اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ ...... "الْغٰفِلٰتِ" (بے خبر) سے مراد وہ سیدھی سادی شریف عورتیں ہیں جن کے دل پاک ہیں اور ان کے دل میں بدچلنی کا بھولے سے بھی خیال نہیں آتا، ان میں سے کسی پر تہمت لگانا کبیرہ گناہ اور لعنت کا باعث ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ، قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَا هُنَّ؟ قَالَ الشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَ قَتْلُ النَّفْسِ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَ أَكْلُ الرِّبَا وَ أَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ وَالتَّوَلِّيْ يَوْمَ الزَّحْفِ وَ قَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ )) [ بخاري، الحدود، باب

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

جس دن ان کی زبانیں اوران کے ہاتھ اوران کے پاؤں ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۲۴﴾

رمي المحصنات : ٦٨٥٧ ] ''سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو۔'' صحابہ نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! وہ ہلاک کرنے والی چیزیں کیا ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شرک، جادو، اس جان کو قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن بھاگ جانا اور پاک دامن مومن و غافل عورتوں پر تہمت لگانا۔'' یہاں جب عام پاک دامن غافل و مومن عورتوں پر تہمت لگانا لعنت کا باعث ہے تو امہات المومنین خصوصاً عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بدزبانی کرنے والے کا کیا حال ہوگا، جن کی براءت خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔ اب ان پر تہمت لگانے والا صرف تہمت کا مجرم نہیں بلکہ قرآن کو جھٹلانے کا بھی مجرم ہے اور قرآن کو جھٹلانے والا کافر ہے۔

❷ یہاں پاک دامن غافل و مومن عورتوں پر بہتان کی جتنی شدید وعید آئی ہے وہ عموماً کفار ہی کے لیے ہے کہ دنیا و آخرت میں ان پر لعنت ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے، جو جہنم ہی ہو سکتا ہے اور قیامت کے دن ان کے اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے، جو کفار کے ساتھ کیا جانے والا معاملہ ہے، جیسا کہ سورۂ حم سجدہ (۱۹ تا ۲۳) میں ہے، اس لیے اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ...... '' سے مراد عبد اللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھی ہیں اور ''الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ'' سے مراد امہات المومنین خصوصاً عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہن ہیں۔ ''اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ'' سے لے کر تمام آیات کے تسلسل سے یہ معنی درست معلوم ہوتا ہے، مگر آیت کے الفاظ عام ہونے کی وجہ سے (کہ جو لوگ بھی پاک دامن غافل و مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، وہ عورتیں جو بھی ہوں، ان کے لیے یہ وعید ہے) اگر مراد عام ہو کہ ہر تہمت لگانے والے کے لیے یہ وعید ہے تو اس سے مراد وہ تہمت لگانے والے ہوں گے جو تہمت لگانے کو حلال سمجھتے ہیں، یا جنھوں نے توبہ نہیں کی، کیونکہ اس سے پہلی آیات میں توبہ کرنے والوں کے ساتھ حُسن سلوک کا اور ان کی سابقہ نیکیاں پیشِ نظر رکھنے کا حکم ہے۔ اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قذف سے توبہ نہ کرنے والوں کی موت کفر پر ہونے کا خطرہ ہے۔ اللہ سب مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

❸ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ یہ ساری وعید پاک دامن غافل و مومن عورتوں پر بہتان کی آئی ہے، مردوں پر بہتان کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ''الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ'' پر بہتان عموماً کسی مومن مرد کے ساتھ ہی لگایا جائے گا، اس لیے اسے الگ سے ذکر نہیں کیا گیا۔

**آیت 24** ❶ **يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ ......** : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یٰس (۶۵) اور سورۂ حم السجدہ (۱۹ تا ۲۱) یعنی ان کے یہ اعضا ان کے خلاف تہمت لگانے اور دوسرے برے اعمال کی گواہی دیں گے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَضَحِكَ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مِمَّا أَضْحَكُ؟ قَالَ قُلْنَا

يَوْمَىِٕذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

**اس دن اللہ انھیں ان کا صحیح بدلا پورا پورا دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق ہے، جو ظاہر کرنے والا ہے﴿۲۵﴾**

اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ مِنْ مُخَاطَبَةِ الْعَبْدِ رَبَّهُ، يَقُوْلُ يَا رَبِّ! أَلَمْ تُجِرْنِيْ مِنَ الظُّلْمِ؟ قَالَ يَقُوْلُ بَلٰى، قَالَ فَيَقُوْلُ فَإِنِّيْ لَا أُجِيْزُ عَلٰى نَفْسِيْ إِلَّا شَاهِدًا مِنِّيْ، قَالَ فَيَقُوْلُ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ شَهِيْدًا، وَ بِالْكِرَامِ الْكَاتِبِيْنَ شُهُوْدًا، قَالَ: فَيُخْتَمُ عَلٰى فِيْهِ، فَيُقَالُ لِأَرْكَانِهِ انْطِقِيْ، قَالَ فَتَنْطِقُ بِأَعْمَالِهِ، قَالَ ثُمَّ يُخَلّٰى بَيْنَهُ وَ بَيْنَ الْكَلَامِ، قَالَ فَيَقُوْلُ بُعْدًا لَكُنَّ وَ سُحْقًا، فَعَنْكُنَّ كُنْتُ أُنَاضِلُ ›› [ مسلم، الزهد، باب الدنيا سجن للمؤمن ...... : ۲۹۶۹ ] ”ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے، آپ ﷺ ہنسے اور فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو میں کس بات پر ہنسا ہوں؟“ ہم نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔“ فرمایا: ”بندے کی اپنے رب کے ساتھ گفتگو پر، وہ کہے گا: ”اے میرے رب! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟“ اللہ فرمائے گا: ”کیوں نہیں!“ تو وہ کہے گا: ”پھر میں اپنی ذات پر اپنے سوا کسی گواہ کو نہیں مانتا۔“ اللہ فرمائے گا: ”آج تجھ پر تو خود ہی کافی گواہ ہے اور کراماً کاتبین گواہ کافی ہیں۔“ چنانچہ اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور اس کے اعضا سے کہا جائے گا، بولو! چنانچہ وہ بول کر اس کے اعمال بتائیں گے۔ پھر اسے بات کرنے کی اجازت دی جائے گی تو وہ اپنے اعضا سے کہے گا: ”تمھارے لیے دوری اور ہلاکت ہو، میں تمھاری طرف ہی سے تو دفاع کر رہا تھا۔“

2 زبان اگرچہ دنیا میں بھی بولتی ہے مگر یہاں بندے کی مرضی کے مطابق بولتی ہے، کیونکہ اسے اللہ کا حکم یہی ہے، وہاں اللہ کی مرضی کے مطابق اصل حقیقت کے مطابق بولے گی، کیونکہ اسے یہی حکم ہو گا۔

3 اگرچہ جسم کے اور اعضا بھی بولیں گے، جیسا کہ سورۂ حٰم السجدہ (۲۰، ۲۱) میں چمڑوں کے بولنے کا ذکر ہے، تاہم یہاں زبان، ہاتھ اور پاؤں کا خاص طور پر ذکر اس لیے فرمایا کہ ان اعضا کا تہمت تراشی میں زیادہ دخل ہے، زبان کی بات، ہاتھوں کے اشارے اور پاؤں کی دوڑ دھوپ تہمت کی تکمیل کرتی ہے۔

4 زبان گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جس رب کے حکم سے اس میں کلام کی قوت پیدا ہوئی ہے اسی کے حکم سے جسم کے ہر حصے میں یہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے ہاتھ، پاؤں اور چمڑوں کے کلام پر تعجب نہیں ہونا چاہیے، فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴾ [ یٰسٓ : ۸۲ ] ”اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“ آج کل پلاسٹک کی سی ڈی اور کیسٹ سے آواز نکلتی ہے اور کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔

**آیت 25** 1 يَوْمَىِٕذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ: ”دِيْنَهُمْ“ سے مراد جزا ہے، کیونکہ وہی پوری دی جائے گی۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴾ [ النجم : ٤١ ] ”پھر اسے اس کا بدلا دیا جائے گا، پورا بدلا۔“

2 وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ: اللہ تعالیٰ کی صفت ”اَلْحَقُّ“ کے دو معنی ہیں، ایک معنی ”ثابت“ ہے، کیونکہ اس کی ذات ہمیشہ سے ہے، نہ اس پر پہلے عدم ہے اور نہ اس پر کبھی فنا ہے، دوسری کسی چیز میں یہ صفت نہیں پائی جاتی ہے۔ لفظ ”اَللّٰهُ“

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ لوگ اس سے بری کیے ہوئے ہیں جو وہ کہتے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور باعزت روزی ہے ﴿۲۶﴾

اور اس کی خبر "اَلْحَقُّ" پر الف لام آنے سے اور ان دونوں کے درمیان "هُوَ" لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی حق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، باقی سب باطل ہیں، کیونکہ حق کے مقابلے میں باطل ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ كَلِمَةُ لَبِيْدٍ : أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ » [ بخاري، مناقب الأنصار، باب أيام الجاهلية : ۳۸۴۱ ] "سب سے سچی بات جو شاعر نے کہی ہے، وہ لبید کی بات ہے کہ سن لو! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔" "حق" کا دوسرا معنی عدل و انصاف ہے، مراد "ذُو الْحَقِّ أَيْ ذُو الْعَدْلِ" ہے، یعنی عدل و انصاف والا ہے، جیسے "زَيْدٌ عَدْلٌ" بول کر مراد "ذُو الْعَدْلِ" لیتے ہیں۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بہتان لگانے والوں کو ان کا صحیح بدلا دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو حق فیصلہ کرنے والا ہے، سچ کو سچ ظاہر کرنے والا ہے۔ کیونکہ دوسرے حاکم حق فیصلہ کریں بھی تو اس میں خطا اور کوتاہی کا امکان رہتا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ایک ایسی ذات ہے جس کا ہر فیصلہ حق ہے۔

③ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ ......" سے مراد کفار و منافقین ہی ہیں، کیونکہ مومن کو تو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کے "الْحَقُّ الْمُبِيْنُ" ہونے کا علم ہے، اس لیے اگر اس سے بہتان کی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ اللہ کے خوف سے توبہ کر لیتا ہے، جبکہ کافر اور منافق اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے بہتان باندھنے پر جمے رہتے ہیں، انھیں قیامت کو اللہ تعالیٰ کے "الْحَقُّ الْمُبِيْنُ" ہونے کا علم ہوگا۔

**آیت 26** ① **اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ......** : اس آیت میں یہ نفسیاتی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ خبیث (گندے) مردوں کا نبھاؤ خبیث عورتوں سے اور پاکیزہ مردوں کا نبھاؤ پاکیزہ عورتوں ہی سے ہو سکتا ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک مرد خود تو بڑا پاکیزہ ہے مگر وہ ایک خبیث عورت سے برسوں نبھاؤ کرتا چلا جائے۔ مقصود عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاکیزگی کا بیان ہے کہ ان میں خباثت کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو ازل سے ابد تک پاکیزہ ہستیوں کے سردار تھے، ان کے ساتھ نہایت محبت و اطمینان سے برسوں نبھاؤ کرتے چلے جاتے؟ بعض مفسرین نے "اَلْخَبِيْثٰتُ" سے مراد گندے اقوال و افعال اور "الطَّيِّبٰتُ" سے مراد پاکیزہ اقوال و افعال لیے ہیں، یعنی کوئی آدمی جیسا خود ہوتا ہے ویسے ہی وہ اعمال کرتا ہے اور ویسے ہی اقوال زبان پر لاتا ہے۔ اب چونکہ عائشہ رضی اللہ عنہا پاک تھیں، ان کی سیرت اور ان کے اقوال و افعال بھی پاک تھے اور یہ منافق خود گندے تھے، اس لیے ان سے ایسے ہی گندے اقوال و افعال کی توقع تھی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو، یہاں تک کہ انس حاصل کر لو اور ان کے

② اُولٰٓىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ : یعنی طیب مرد اور طیب عورتیں ان باتوں سے صاف بری کیے ہوئے ہیں جو خبیث مرد اور خبیث عورتیں کہتے ہیں۔ ''مُبَرَّءُوْنَ'' اسم مفعول کا صیغہ ہے ''بری کیے ہوئے۔'' اس میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی واشگاف الفاظ میں براءت کا ذکر ہے۔ یعنی اہل ایمان میں سے جو یہ سنتا ہے وہ ''سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ '' کہہ کر انھیں پاک قرار دیتا ہے اور رب تعالیٰ بھی '' اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ '' کے ساتھ ان کی براءت کا اعلان فرماتے ہیں۔ ''مِمَّا يَقُوْلُوْنَ '' یعنی بہتان تراشوں کی صرف منہ کی باتیں ہیں، ان کی حقیقت کچھ نہیں۔

③ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ : ''مَغْفِرَةٌ'' پر تنوینِ تعظیم کی وجہ سے ''بڑی بخشش'' ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی خبیث لوگوں کے برا کہنے سے وہ برے نہیں ہو جاتے، بلکہ ان کی تہمتوں کی وجہ سے انھیں جو رنج پہنچتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں تو یہ چیز ان کی خطاؤں اور لغزشوں کی بخشش کا ذریعہ بنتی ہے اور مفسد لوگ جس قدر انھیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں اسی قدر انھیں عزت کی روزی ملتی ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عائشہ، ان کے والدین اور صفوان رضی اللہ عنہم سب کے لیے جنت کی بشارت ہے، جو حقیقی رزق کریم ہے، کیونکہ اس بہتان سے ان سب کی عزت و آبرو پر حملہ ہوا اور سب کو نہایت رنج پہنچا۔

آیت 27 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا ...... : سورت کے شروع سے زنا اور بہتان کی حد اور ان کی مذمت کا بیان آ رہا ہے، اب ان احکام کا ذکر شروع ہوتا ہے جن سے مردوں اور عورتوں کے ایسے میل جول کی روک تھام ہوتی ہے جو زنا اور بہتان کا سبب بنتا ہے۔ ان احکام میں گھروں میں داخلے کی اجازت، نظر کی حفاظت، پردے اور نکاح کی تاکید اور قحبہ گری سے ممانعت جیسے آداب شامل ہیں۔

② غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ : یعنی صرف اپنے گھروں میں داخلے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں، جہاں آدمی اکیلا رہتا ہو، یا بیوی کے ساتھ رہتا ہو۔ اگرچہ افضل یہی ہے کہ وہاں داخلے سے پہلے بھی کسی طرح گھر والوں کو اپنی آمد سے آگاہ کر دیا جائے، ممکن ہے وہ ایسی حالت میں ہوں جس میں خاوند کا دیکھنا انھیں پسند نہ ہو۔ چنانچہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب بیان کرتی ہیں: (( كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ إِذَا جَاءَ مِنْ حَاجَةٍ فَانْتَهٰى إِلَى الْبَابِ تَنَحْنَحَ وَ بَزَقَ كَرَاهَةَ أَنْ يَّهْجُمَ مِنَّا عَلٰى أَمْرٍ يَكْرَهُهُ )) [ ابن جرير : ٢٦١٣١ ] ''عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) جب کسی کام سے فارغ ہو کر گھر آتے تو دروازے پر آ کر کھانستے اور تھوکتے کہ کہیں ان کی نظر ہماری کسی ایسی چیز پر نہ پڑ جائے جو انھیں ناپسند ہو۔'' ابن کثیر نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا أَطَالَ أَحَدُكُمُ الْغَيْبَةَ فَلَا يَطْرُقْ أَهْلَهُ لَيْلًا )) [ بخاري، النكاح، باب لا يطرق أهله...... : ٥٢٤٤ ] ''جب تم میں سے کوئی شخص زیادہ عرصہ گھر سے غائب رہے تو گھر والوں کے پاس رات کے وقت نہ آئے۔'' مسلم میں یہ الفاظ زائد ہیں: (( نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَنْ يَّطْرُقَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ لَيْلًا

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

رہنے والوں کو سلام کہو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔﴿۲۷﴾

يَتَخَوَّنُهُمْ أَوْ يَلْتَمِسُ عَثَرَاتِهِمْ ﴾ [ مسلم، الإمارة، باب كراهية الطروق...... : ۱۸۴ / ۷۱۵، قبل ح : ۱۹۲۹ ] ”رسول اللہ ﷺ نے (زیادہ عرصہ گھر سے غائب رہنے والے شخص کو) منع فرمایا کہ وہ گھر والوں کی خیانت یا ان کی غلطی کی تلاش کے لیے رات کو (اچانک) ان کے پاس آئے۔“

③ ”حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا“ کا لفظی ترجمہ ہے ”یہاں تک کہ تم انس حاصل کر لو۔“ اس لیے اس میں نہ صرف اجازت حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے، بلکہ یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ تم معلوم کر لو کہ گھر میں کوئی ہے بھی یا نہیں اور ہے تو اسے تمھارا آنا ناگوار تو نہیں ہے؟

④ اجازت مانگنے کا طریقہ، بنو عامر کا ایک آدمی آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے کی اجازت طلب کی، کہنے لگا: ”کیا میں اندر آ جاؤں؟“ نبی ﷺ نے اپنے خادم سے کہا: ”اس کے پاس جاؤ اور اسے اجازت مانگنے کا طریقہ سکھاؤ کہ وہ اس طرح کہے: ﴿ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ؟ ﴾ ”السلام علیکم، کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اس آدمی نے یہ بات سن لی اور کہا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ؟“ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اجازت دے دی اور وہ داخل ہو گیا۔“ [ أبوداوٗد، الأدب، باب كيف الاستئذان؟ : ۵۱۷۷ ]

کلدہ بن حنبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”میں نبی ﷺ کے پاس گیا اور آپ کے پاس سیدھا چلا آیا، میں نے نہ سلام کہا (اور نہ اجازت مانگی)، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اِرْجِعْ فَقُلِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ﴾ [ أبوداوٗد، الأدب، باب كيف الاستئذان؟ : ۵۱۷۶، صححه الألباني ] ”واپس جاؤ اور کہو السلام علیکم۔“

⑤ اجازت زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ مانگے، اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلا جائے۔ [ دیکھیے بخاري، الاستئذان، باب التسليم والاستئذان ثلاثا : ۶۲۴۵، عن أبي موسى رضی اللہ عنہ ]

⑥ دروازہ کھٹکھٹانے یا سلام کہنے پر اگر گھر والے پوچھیں، کون ہے تو اپنا نام بتائے۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے پاس ایک قرض کے سلسلے میں حاضر ہوا، جو میرے والد کے ذمے تھا، میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، آپ ﷺ نے پوچھا: ﴿ مَنْ ذَا؟ فَقُلْتُ أَنَا، فَقَالَ أَنَا أَنَا ﴾ ”کون ہے؟“ میں نے کہا: ”میں ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں، میں۔“ گویا آپ نے اسے ناپسند فرمایا۔ [ بخاري، الاستئذان، باب إذا قال من ذا؟ فقال أنا : ۶۲۵۰ ]

⑦ ہزیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک آدمی آیا اور نبی ﷺ کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر اجازت مانگنے لگا، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿ هٰكَذَا عَنْكَ أَوْ هٰكَذَا، فَإِنَّمَا الْإِسْتِئْذَانُ مِنَ النَّظَرِ ﴾ [ أبوداوٗد، الأدب، باب كيف الاستئذان؟ : ۵۱۷۴، صححه الألباني ] ”اس طرف ہو جاؤ یا اس طرف، کیونکہ دیکھنے ہی کی وجہ سے اجازت مانگی جاتی ہے۔“

⑧ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ لَوِ اطَّلَعَ فِيْ بَيْتِكَ أَحَدٌ وَ لَمْ تَأْذَنْ لَهُ خَذَفْتَهُ بِحَصَاةٍ

فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا حَتّٰى يُؤۡذَنَ لَـكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا‌ هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸﴾

پھر اگر تم ان میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہو، یہاں تک کہ تمھیں اجازت دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ، یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۲۸﴾

فَفَقَأْتَ عَيْنَهُ مَا كَانَ عَلَيْكَ مِنْ جُنَاحٍ ﴾ [ بخاري، الديات، باب من أخذ حقه...... : ٦٨٨٨ ] ''اگر کوئی آدمی تیرے گھر میں جھانکے، جبکہ تو نے اجازت نہ دی ہو اور تو کنکری پھینک کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پر کچھ گناہ نہ ہوگا۔'' ایسی صورت میں آنکھ پھوڑنے پر نہ قصاص ہے، نہ دیت۔

⑨ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ ...... : یعنی ان آداب میں دونوں طرف کا فائدہ ہے، اجازت مانگنے والے کا بھی اور گھر والوں کا بھی۔ (ابن کثیر) ''لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ'' تاکہ تم نصیحت حاصل کرو کہ جس طرح تمھیں دوسروں کا بلا اجازت آ گھسنا برا محسوس ہوتا ہے، اسی طرح دوسروں کو تمھارا بلا اجازت در آنا بھی برا محسوس ہوتا ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے اجازت مانگنے کے حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ (الا ما شاء اللہ) رشتہ داروں، ہمسایوں بلکہ اجنبیوں تک کے گھروں میں آنے جانے کے لیے اجازت کی ضرورت ہی نہیں رہی، اس پر مزید عام بے پردگی اور بے لباسی سے بدتر لباس ہے، جس سے مسلم معاشرے میں بے حیائی کا سیلاب آ رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں بدکاری، بدگمانی، تہمت تراشی، رقابت، قتل و غارت اور دوسری برائیاں پھیل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی حدود اور اپنے احکام پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**آیت 28** ① فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا : یعنی اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو اس سے تمھارے لیے بغیر اجازت وہاں داخلہ جائز نہیں ہو جاتا۔ ہر آدمی جس طرح اپنی ذاتی حالتوں میں سے بعض حالتوں پر کسی کا مطلع ہونا پسند نہیں کرتا اسی طرح وہ اپنی بعض چیزوں پر بھی کسی کے مطلع ہونے کو پسند نہیں کرتا اور عین ممکن ہے کہ بلا اجازت گھس جانے سے تم پر چوری یا خیانت کا الزام لگ جائے اور جھگڑا پیدا ہو جائے۔ ہاں، اگر اس نے اجازت دے رکھی ہو کہ میں گھر میں نہ ہوں تو تم آ جاؤ تو وہاں جانے میں کوئی حرج نہیں۔

② وَاِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا: یعنی اگر تمھیں واپس جانے کے لیے کہا جائے تو واپس ہو جاؤ، نہ غصہ کرو، نہ کبر کی وجہ سے تنگی یا بے عزتی محسوس کرو، کیونکہ گھر والے نے تمھارا کوئی ایسا حق نہیں روکا جو اس پر واجب ہو، وہ اجازت کا اختیار رکھتا ہے، چاہے دے یا نہ دے، لوگوں کے اپنے اپنے حالات ہوتے ہیں، کسی کو کیا خبر کہ کوئی کس حال میں ہے۔

③ هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ : یعنی تمھارا واپس آ جانا تمھارے لیے زیادہ عزت اور پاکیزگی کا باعث ہے، کیونکہ اس طرح تم کسی کے دروازے پر کھڑے رہنے کی بے قدری سے بچ جاؤ گے، واپس چلے آنے سے صاحب خانہ کے دل میں تمھاری حیا ہوگی اور سب سے بڑھ کر اللہ کی طرف سے اجر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ ان گھروں میں داخل ہو جن میں رہائش نہیں کی گئی، جن میں تمھارے فائدے کی کوئی چیز ہو اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو ﴿۲۹﴾ مومن مردوں سے کہہ دے اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی

④ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ : اس میں جاسوسی یا کسی بری نیت سے کسی گھر میں داخل ہونے پر وعید ہے۔

⑤ طبری نے بعض مہاجرین سے نقل کیا ہے کہ میری ساری عمر یہ آرزو رہی ہے کہ میں کسی کے گھر جاؤں اور اندر سے مجھے یہ جواب ملے کہ واپس چلے جاؤ اور میں واپس چلا آؤں، تاکہ مجھے اس آیت پر کم از کم ایک مرتبہ تو عمل کرنے کی سعادت نصیب ہو جائے۔

**آیت 29** ① لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ ...... : یعنی ایسے مکان جو کسی کے رہنے کی جگہیں نہ ہوں اور ان سے تمھارا کوئی فائدہ یا کوئی ضرورت وابستہ ہو اور وہ ہر خاص و عام کے لیے کھلے ہوں تو ان کے اندر بلا اجازت داخل ہونے میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جیسے اسٹیشن، بسوں کے اڈے، مساجد، کھانے پینے اور رہائش کے ہوٹل، مسافر خانے، دکانیں اور وہ مہمان خانے جن میں جانے کی ایک دفعہ اجازت مل چکی ہو۔ اسی طرح وہ مکانات جو بے آباد، ویران اور اجڑے پڑے ہوں ان کے اندر آرام کر لینا، سایہ حاصل کرنا اور رات گزارنا وغیرہ جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن مکانوں میں آدمی کا کوئی فائدہ، مقصد یا ضرورت نہ ہو وہاں نہیں جانا چاہیے۔

② وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ : یعنی اللہ تعالیٰ تمھارے ظاہر اور پوشیدہ اعمال جانتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ کسی جگہ جانے میں تمھاری نیت کیا ہے۔

**آیت 30** ① قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ : "غَضَّ طَرْفَهُ، خَفَضَهُ" "اس نے اپنی آنکھ نیچی کر لی۔" دوسرا معنی ہے "نَقَصَ وَ وَضَعَ مِنْ قَدْرِهِ" "اس نے فلاں کی قدر کم کی۔" (قاموس) زنا اور بہتان سے محفوظ رکھنے کے لیے گھروں میں داخلے کے آداب بیان فرمانے کے بعد نظر کی حفاظت کا حکم دیا، کیونکہ آدمی کے دل کا دروازہ یہی ہے اور تمام شہوانی فتنوں کا آغاز عموماً یہیں سے ہوتا ہے۔ احمد شوقی نے کہا ہے: "نَظْرَةٌ فَابْتِسَامَةٌ فَسَلَامٌ فَكَلَامٌ فَمَوْعِدٌ فَلِقَاءٌ" "نظر ملتی ہے، پھر مسکراہٹ، پھر سلام، پھر گفتگو، پھر وعدہ اور پھر ملاقات تک بات جا پہنچتی ہے۔"

② اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کے ساتھ براہ راست مخاطب فرمایا ہے، جیسا کہ "لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ" اور "لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ" سے پہلے ہے، یہاں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: "مومن مردوں سے کہہ دے" اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نظر کا معاملہ نہایت خطرناک ہے اور اسے روکنا نہایت مشکل کام ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شہنشاہانہ جلال کے ساتھ نبی ﷺ کو حکم دیا کہ مومن مردوں سے کہہ دے اور مومن عورتوں سے کہہ دے۔ (البقاعی) (واللہ اعلم)

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰

شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ بے شک اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں ۝۳۰

③ ”قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ“ میں ”مِنْ“ تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”مومن مردوں سے کہہ دے اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھیں۔“ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ نہیں کہ کسی چیز کو بھی نظر بھر کر نہ دیکھو، راستہ چلتے ہوئے بھی نگاہ مت اٹھاؤ، بلکہ حکم کچھ نگاہیں نیچی رکھنے کا ہے اور مراد ان چیزوں سے نگاہ نیچی رکھنا ہے جن کی طرف نگاہ بھر کر دیکھنا اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے، مثلاً اپنی بیوی اور محرم رشتوں کے سوا عورتوں کو دیکھنا، کسی ڈاڑھی کے بغیر لڑکے کو شہوت کی نظر سے دیکھنا، یا کسی کا خط یا وہ چیز دیکھنا جسے وہ چھپانا چاہتا ہے وغیرہ۔

④ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ : بلا ارادہ پڑنے والی پہلی نظر معاف ہے، گناہ اس نظر پر ہے جو جان بوجھ کر ڈالی جائے۔ نظر کا ذکر خصوصاً فرمایا، کیونکہ عموماً زنا کی ابتدا اس سے ہوتی ہے، ورنہ زنا سارے حواس ہی سے ہوتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ وَ زِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَتَمَنّٰى وَ تَشْتَهِي وَ الْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ كُلَّهُ وَ يُكَذِّبُهُ» [ بخاري، الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج : ۶۲۴۳ ] ”اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زنا میں سے اس کا حصہ لکھ دیا ہے، جسے وہ لامحالہ حاصل کرے گا، چنانچہ آنکھ کا زنا دیکھنا ہے، زبان کا زنا بولنا ہے اور نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب کر دیتی ہے۔“

جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک نظر کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی نظر ہٹا لوں۔“ [ مسلم، الآداب، باب نظر الفجاءة : ۲۱۵۹ ] البتہ ضرورت کے لیے غیر محرم عورت کو دیکھ سکتا ہے، مثلاً اس سے نکاح کا ارادہ ہو، یا طبی ضرورت ہو، یا کسی حادثہ کی وجہ سے ضرورت پڑ جائے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ﴾ [ الأنعام : ۱۱۹ ] ”حالانکہ بلاشبہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ۔“

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا يَنْظُرُ الرَّجُلُ إِلٰى عَوْرَةِ الرَّجُلِ وَلَا الْمَرْأَةُ إِلٰى عَوْرَةِ الْمَرْأَةِ وَ لَا يُفْضِي الرَّجُلُ إِلَى الرَّجُلِ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ وَلَا تُفْضِي الْمَرْأَةُ إِلَى الْمَرْأَةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ» [ مسلم، باب الحيض، تحريم النظر إلى العورات : ۳۳۸ ] ”کوئی مرد دوسرے مرد کی شرم گاہ نہ دیکھے، نہ ہی کوئی عورت کسی عورت کی شرم گاہ دیکھے۔ نہ کوئی مرد کسی مرد کے ساتھ ایک کپڑے میں لیٹے اور نہ کوئی عورت کسی عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں لیٹے۔“

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ

اور مومن عورتوں سے کہہ دے اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت ظاہر

5 مرد کے لیے اپنی بیوی یا لونڈی کے جسم کا ہر حصہ دیکھنا جائز ہے، اسی طرح بیوی کے لیے اپنے خاوند کے جسم کا اور لونڈی کے لیے اپنے مالک کے جسم کا ہر حصہ دیکھنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ [ البقرة : ۱۸۷ ] ”وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔“ ظاہر ہے کہ لباس سے جسم کا کوئی حصہ پوشیدہ نہیں رہتا۔ ابن ماجہ (۶۶۲) میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کہ میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم گاہ نہیں دیکھی، سند کے لحاظ سے ثابت نہیں، کیونکہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والا راوی مجہول ہے۔ اس کے برعکس عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے، ہمارے ہاتھ اس میں باری باری آتے جاتے تھے۔“ ایک روایت میں ہے: ”ہم جنبی ہوتے تھے۔“ [ بخاري، الغسل، باب هل يدخل الجنب يده...... : ۲۶۱، ۲۶۳ ]

6 وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ : یہاں ”مِنْ“ استعمال نہیں فرمایا کہ اپنی کچھ شرم گاہوں کی حفاظت کریں، بلکہ فرمایا، اپنی شرم گاہوں کی مکمل حفاظت کریں، کیونکہ نظر سے مکمل بچاؤ ممکن نہ تھا۔

7 اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ : وہ اس حکم پر عمل کرنے والوں کو جزا دے گا اور عمل نہ کرنے والوں کو سزا دے گا، خواہ ان کی نیکی یا بدی سے کوئی آگاہ ہو یا آگاہ نہ ہو، جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح واقف ہے۔ فرمایا: ﴿يَعْلَمُ خَآىِٕنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾ [ المؤمن : ۱۹ ] ”وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور اسے بھی جو سینے چھپاتے ہیں۔“

**آیت 31** 1 وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ...... : عورتوں کو بھی اسی طرح اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھنے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم فرمایا جیسے مردوں کو یہ حکم دیا، مگر عورتوں پر مردوں کو نہ دیکھنے کی اتنی سختی نہیں جتنی مردوں پر عورتوں کے دیکھنے کے بارے میں ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ اپنی چادر کے ساتھ مجھے پردے میں لیے ہوئے تھے اور میں حبشیوں کو دیکھ رہی تھی، وہ (برچھوں کے ساتھ) کھیل رہے تھے، یہاں تک کہ میں ہی اکتا جاتی، تو ایک نوعمر لڑکی کا اندازہ کر لو جو کھیل دیکھنے کی شوقین ہو۔“ [ بخاري، النكاح، باب نظر المرأة إلى الحبش...... : ۵۲۳۶ ] یعنی اندازہ لگا لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے کتنی دیر کھڑے رہے ہوں گے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ان کے خاوند نے تیسری طلاق دے دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: ”ام شریک کے گھر رہ کر عدت گزارو۔“ پھر فرمایا: ”اس عورت کے پاس میرے صحابہ کثرت سے آتے ہیں (کیونکہ وہ مال دار اور بہت مہمان نواز خاتون تھی)، اس لیے تم ابن ام مکتوم کے گھر عدت گزارو، کیونکہ وہ نابینا آدمی ہے، تم اپنے کپڑے بھی نیچے رکھ سکو گی۔“ [ مسلم، الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها : ۱۴۸۰/۳۸ ] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر شہوانی خیال نہ ہو تو عورتیں مردوں کو دیکھ سکتی ہیں۔ پردے کا حکم عورتوں کو ہے، تاکہ مرد انھیں نہ دیکھیں، مردوں کو نہیں کہ عورتیں انھیں نہ دیکھیں۔ البتہ اگر شہوت کے ساتھ ہو تو عورتوں کو بھی مردوں

اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا

نہ کریں مگر جو اس میں سے ظاہر ہو جائے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنی زینت ظاہر

کی طرف دیکھنا حرام ہے، جیسا کہ آیت سے ظاہر ہے۔

② سنن ابی داؤد اور بعض دوسری کتب احادیث میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس میمونہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں تو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے اور یہ واقعہ ہمیں حجاب کا حکم ہونے کے بعد کا ہے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس سے حجاب کرو۔'' ہم نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا یہ نابینا نہیں کہ نہ ہمیں دیکھتا ہے، نہ ہمیں پہچانتا ہے؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَ فَعَمْيَاوَانِ أَنْتُمَا؟ أَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِهِ ! » [ أبوداؤد، اللباس، باب في قوله عزوجل : ﴿ و قل للمؤمنات ...... ﴾ : ٤١١٢ ] ''تو کیا تم بھی اندھی ہو؟ کیا تم اسے نہیں دیکھتیں!'' اس حدیث سے عورتوں کا آنکھوں والے مردوں ہی کو نہیں نابینا مردوں کو دیکھنا بھی منع ثابت ہوتا ہے، مگر امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ یہ فرمائی ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کی خصوصیت ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے گھر عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ ہمارے ایک شیخ اس کی یہ توجیہ فرماتے تھے کہ نابینا آدمی اپنے ستر کا خیال نہیں رکھ سکتا، نہ اسے اپنا ستر کھلنے کا پتا چل سکتا ہے، اس لیے اس سے حجاب کا حکم دیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ثابت ہی نہیں، چنانچہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں ایک راوی نبہان مولیٰ ام سلمہ ہے، اسے تقریب میں ''مقبول'' کہا گیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب کے مقدمہ میں خود فرمایا ہے کہ جس راوی کے متعلق وہ مقبول کہیں، اگر کسی حدیث میں اس کی متابعت ہو تو وہ مقبول ہے، ورنہ ''لین الحدیث'' ہے۔ اس لیے یہ روایت ضعیف ہے۔ [ هداية المستنير بتخريج ابن كثير ]

③ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا : چونکہ مردوں کے لیے عورتوں سے بڑا فتنہ کوئی نہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ » [ بخاري، النكاح، باب ما يتقي من شؤم المرأة...... : ٥٠٩٦، عن أسامة بن زيد رضي الله عنهما ] ''میں نے اپنے بعد مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ نقصان پہنچانے والا نہیں چھوڑا۔'' اس لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کے علاوہ اپنی زینت چھپانے کا بھی حکم دیا، چنانچہ فرمایا کہ مومن عورتوں سے کہہ دے کہ (ان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ) اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو اس میں سے ظاہر ہو جائے۔ زینت کا معنی جمال اور حسن ہے۔ یہ دو قسم کی ہے، ایک فطری حسن و جمال اور دوسری جو بناؤ سنگار، زیبائش و آرائش اور زیور وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ لباس بھی زینت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [ الأعراف : ۳۱ ] ''ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لو۔'' اس میں زینت کا معنی لباس ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ عورتیں اپنی کوئی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو خود ظاہر ہو جائے، یعنی انھیں اپنے بدن اور اس کے بناؤ سنگار میں سے کوئی چیز ظاہر کرنا جائز نہیں مگر وہ کپڑے جنھیں چھپایا جا ہی نہیں سکتا، یا وہ زینت جو کسی کام یا حرکت کی وجہ سے بے اختیار ظاہر ہو جائے۔ ''الصحيح المسبور من التفسير بالمأثور'' میں ہے: ''طبری نے صحیح اسانید کے ساتھ

لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ

نہ کریں مگر اپنے خاوندوں کے لیے، یا اپنے باپوں، یا اپنے خاوندوں کے باپوں، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے خاوندوں کے

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''﴿ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ قَالَ هِيَ الثِّيَابُ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ ''وہ اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو اس میں سے ظاہر ہو جائے'' اس سے مراد کپڑے ہیں۔'' حاکم نے اسے روایت کیا اور اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ (مستدرک حاکم: ۲/ ۳۹۷، ح: ۳۴۹۹) اور طبرانی (۹۱۱۶) نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد (۷/ ۸۲) میں فرمایا: ''طبرانی نے اسے کئی اسانید کے ساتھ مطول اور مختصر روایت کیا ہے، جن میں سے ایک سند کے راوی صحیحین (بخاری و مسلم) کے راوی ہیں۔''

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، بلکہ انھوں نے اس کے ساتھ بالیاں، کنگن، انگوٹھی، سرمہ اور مہندی بھی شامل کر دی ہے اور یہ کہا ہے کہ عورتوں کا چہرہ اور ہتھیلیاں مع زیور و آرائش وہ زینت ہے جو عورتوں کے لیے اپنوں اور بیگانوں سب کے سامنے ظاہر کرنا جائز ہے۔ یہ لوگ دلیل کے طور پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پیش کرتے ہیں کہ ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ لوگ نہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پورا پیش کرتے ہیں اور نہ پردے کے متعلق ان کے دوسرے اقوال پیش نظر رکھتے ہیں۔ چہرے کے پردے کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف طبری نے مشہور حسن سند (علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس) کے ساتھ بیان کیا ہے، لطف یہ ہے کہ ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' کی تفسیر جو چہرے کے پردے کے منکر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نامکمل بیان کرتے ہیں، وہ بھی اسی سند کے ساتھ مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [ الأحزاب: ٥٩ ] (اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ اپنے آپ پر لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں تو انھیں تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: (( أَمَرَ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا خَرَجْنَ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ فِيْ حَاجَةٍ أَنْ يُّغَطِّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِنَّ بِالْجَلَابِيْبِ وَ يُبْدِيْنَ عَيْنًا وَاحِدَةً )) [ طبري: ٢٨٨٨٠ ] ''اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے گھروں سے باہر نکلیں تو اپنے چہروں کو اپنے سروں کے اوپر سے بڑی چادروں کے ساتھ ڈھانپ لیں اور ایک آنکھ کھلی رکھیں۔'' ایسا شخص جو گھر سے باہر نکلتے ہوئے مومن عورتوں کے لیے صرف ایک آنکھ کھلی رکھنے کو اللہ کا حکم قرار دیتا ہے وہ عورتوں کے لیے چہرے اور ہاتھوں کو اپنوں اور بیگانوں کے سامنے کھلا رکھنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے موقف میں کوئی اختلاف نہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' کی تفسیر اجنبیوں کے اعتبار سے فرمائی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' کی تفسیر اپنے لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ اجنبیوں کے سامنے ظاہری کپڑوں کے سوا کوئی زینت ظاہر نہ کریں اور

بَنِيۡۤ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِيۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوۡ نِسَآئِهِنَّ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيۡنَ

بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں، یا اپنی عورتوں (کے لیے)، یا (ان کے لیے) جن کے

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ ہے کہ ''زینت ظاہرہ'' (چہرہ اور ہاتھ) خاوند کے علاوہ اپنے محرموں کے سامنے بھی ظاہر کر سکتی ہیں، جس میں سرمہ، مہندی، بالیاں، کنگن، ہار سب کچھ شامل ہے۔ ان محرموں کا بیان آگے فرمایا: ﴿ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اٰبَآئِهِنَّ اَوۡ اٰبَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآئِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِيۡۤ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِيۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوۡ نِسَآئِهِنَّ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ ﴾ [ النور : ۳۱ ] البتہ زینت باطنہ (پیٹ، سینہ، ران اور مخفی حصے) صرف خاوند کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں۔ اب آپ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی '' اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا '' کی مکمل تفسیر پڑھیں، جس کا صرف شروع کا حصہ بیان کیا جاتا ہے۔ طبری نے (علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس سے) حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ آیت: ﴿ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا ﴾ کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( وَالزِّيْنَةُ الظَّاهِرَةُ : الْوَجْهُ وَ كُحْلُ الْعَيْنِ وَ خِضَابُ الْكَفِّ وَ الْخَاتَمُ، فَهٰذِهِ تَظْهَرُ فِيْ بَيْتِهَا لِمَنْ دَخَلَ مِنَ النَّاسِ عَلَيْهَا )) [ طبري : ۲٦۱۷۰ ] ''زینت ظاہرہ سے مراد چہرہ، آنکھ کا سرمہ، ہتھیلی کی مہندی اور انگوٹھی ہے، چنانچہ وہ یہ چیزیں اپنے گھر میں ان لوگوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہے جو اس کے پاس اندر آتے ہیں۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما پر اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ وہ یہ زینت گھر کے اندر اپنے لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے کی بات کر رہے ہیں اور یہ حضرات سرمہ و مہندی، گلے کے ہار اور کنگن اور انگوٹھی سمیت چہرے اور ہتھیلیوں کو اپنوں اور بیگانوں سب کے سامنے کھلا رکھنے کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول قرار دے رہے ہیں۔ [ فَيَا لِلْعَجَبِ وَلِضَيْعَةِ الْأَدَبِ ]

④ اب قرآن مجید اور احادیث و آثار سے چہرے کے پردے کے چند دلائل بیان کیے جاتے ہیں:

① سب سے پہلے زیر تفسیر آیت ہی کو دیکھیں، اس میں '' وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا '' کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ﴾ ''اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں'' گریبان پر پہلے ہی قمیص کا کپڑا موجود ہوتا ہے، اس کے باوجود اس پر اوڑھنی کا حکم دیا ہے، اب چہرے کے پردے کے منکر خود ہی غور فرمائیں کہ عورت کے حسن و جمال کے اصل مرکز چہرے کو مع سرمہ و زیور تو کھلا رکھنے کی اجازت دے دی گئی جو مرد کے لیے سراسر فتنہ ہے اور سینہ جس پر قمیص بھی تھی اسے مزید اوڑھنی کے ساتھ ڈھانکنے کا حکم دیا گیا۔

② طبری نے اپنی حسن سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول نقل کیا ہے جو اللہ کے فرمان '' اَوِ التّٰبِعِيۡنَ غَيۡرِ اُولِي الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ '' کے متعلق ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: (( فَهٰذَا الرَّجُلُ يَتْبَعُ الْقَوْمَ وَهُوَ مُغَفَّلٌ فِيْ عَقْلِهِ لَا يَكْتَرِثُ لِلنِّسَاءِ وَلَا يَشْتَهِيْهِنَّ فَالزِّيْنَةُ الَّتِيْ تُبْدِيْهَا لِهٰؤُلَاءِ قُرْطَاهَا وَ قِلَادَتُهَا وَ سِوَارُهَا وَ أَمَّا خَلْخَالُهَا وَ مِعْضَدَاهَا وَ نَحْرُهَا وَ شَعْرُهَا فَإِنَّهَا لَا تُبْدِيْهِ إِلَّا لِزَوْجِهَا )) [ طبري : ۲٦۱۹٤ ] ''تو یہ وہ آدمی ہے جو کچھ لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور وہ عقل کا بدھو ہے، نہ اسے عورتوں کی پروا ہے نہ ان سے کوئی جنسی حاجت، تو وہ زینت جو ان لوگوں کے سامنے کھول سکتی ہے وہ اس کی بالیاں، ہار اور کنگن ہیں، رہی اس کی پازیب، بازو، سینہ اور بال تو وہ صرف خاوند

غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا

مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں، یا تابع رہنے والے مردوں کے لیے جو شہوت والے نہیں، یا ان لڑکوں کے لیے

کے سامنے کھول سکتی ہے۔‘‘

③ ”وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ“ میں پاؤں کو زور سے زمین پر مارنے سے منع کیا کہ مردوں کو ان کے زیور کی آواز سے شہوانی خیال پیدا نہ ہو۔ اب ایک عورت جو معلوم نہیں جوان ہے یا بوڑھی، خوبصورت ہے یا بدصورت، اس کی پازیب کی آواز دلوں میں خرابی پیدا کرتی ہے اور اسے چھپائے رکھنے کا حکم ہے، تو چہرہ جس پر کسی عورت کے خوبصورت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے، وہ کھلا رکھنا کیسے جائز ہو گیا؟

④ ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ [ الأحزاب : ٥٩ ] ”اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ اپنے آپ پر لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں تو انھیں تکلیف نہ پہنچائی جائے۔“ اس آیت کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اوپر گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب کسی کام کے لیے گھروں سے باہر نکلیں تو اپنے چہروں کو اپنے سروں کے اوپر سے بڑی چادروں کے ساتھ ڈھانپ لیں اور ایک آنکھ کھلی رکھیں (اگر راستہ وغیرہ دیکھنے کی ضرورت ہو، ورنہ وہ بھی نہیں)۔ اس آیت سے استدلال کی مزید تفصیل کے لیے سورۂ احزاب ملاحظہ فرمائیں۔

⑤ ﴿ وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَ اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [ النور : ٦٠ ] ”اور عورتوں میں سے بیٹھ رہنے والیاں، جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں، سو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے کپڑے اتار دیں، جب کہ وہ کسی قسم کی زینت ظاہر کرنے والی نہ ہوں اور یہ بات کہ (اس سے بھی) بچیں ان کے لیے زیادہ اچھی ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ استدلال کی تفصیل کے لیے اس آیت کی تفسیر دیکھیے۔

⑥ ﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْۤ اٰبَآىِٕهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآىِٕهِنَّ وَ لَاۤ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَ لَا نِسَآىِٕهِنَّ وَ لَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَ اتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴾ [ الأحزاب : ٥٥ ] ”ان (عورتوں) پر کوئی گناہ نہیں اپنے باپوں (کے سامنے آنے) میں اور نہ اپنے بیٹوں کے اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی عورتوں کے اور نہ ان (کے سامنے آنے) میں جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں اور (اے عورتو!) اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح شاہد ہے۔“ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اجنبیوں سے حجاب کا حکم دیا تو وضاحت فرما دی کہ ان اقارب سے حجاب نہیں، جیسا کہ سورۂ نور کی آیت (۳۱): ﴿ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ

يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ

جو عورتوں کی پردے کی باتوں سے واقف نہیں ہوئے اور اپنے پاؤں (زمین پر) نہ ماریں، تاکہ ان کی وہ زینت

اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ﴾ میں وضاحت فرمائی ہے، جب ان اقارب سے پردہ نہ کرنے میں گناہ نہیں تو معلوم ہوا کہ اجنبیوں سے پردہ نہ کرنے میں گناہ ہے۔“

⑦ احادیث سے بھی عورتوں کے لیے پردے کا حکم ثابت ہے، یہاں چند احادیث درج کی جاتی ہیں، اس سے پہلے صحیح بخاری میں سے عائشہ رضی اللہ عنہا کی لمبی حدیث بیان ہو چکی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں کہ صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ لشکر کے پیچھے تھے، وہ صبح کے وقت جب اس جگہ پہنچے جہاں میں لیٹی ہوئی تھی، تو اس نے ایک سویا ہوا انسان دیکھا، پھر جب وہ میرے پاس آئے، تو اس نے مجھے پہچان لیا، کیونکہ وہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے مجھے دیکھ چکے تھے، تو میں نے اپنی بڑی چادر کے ساتھ اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ [ بخاري : ٢٦٦١ ] یہ حدیث صاف دلیل ہے کہ اگر حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے انھوں نے ام المومنین کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ کبھی نہ پہچان سکتے، کیونکہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد انھیں دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

⑧ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عورتوں کو عید کے لیے نکلنے کا حکم دیا تو انھوں نے کہا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! إِحْدَانَا لَيْسَ لَهَا جِلْبَابٌ، قَالَ لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا )) [ بخاري، الصلاة، باب وجوب الصلاة في الثياب : ٣٥١ ] ”یا رسول اللہ! ہم میں سے کسی کے پاس بڑی چادر نہیں ہوتی؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس کی بہن اسے پہننے کے لیے کوئی اپنی بڑی چادر دے دے۔“ اگر پردہ فرض نہ ہوتا تو ان کے سوال کا جواب تھا کہ دوپٹا ہی کافی ہے، بڑی چادر کی ضرورت نہیں۔

⑨ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”اونٹوں کے سوار ہمارے پاس سے گزرتے، جب کہ ہم احرام کی حالت میں ہوتیں، تو جب وہ ہمارے برابر آتے تو ہم میں سے ہر ایک اپنی بڑی چادر سر سے چہرے پر لٹکا لیتی، جب گزر جاتے تو ہم اسے ہٹا دیتیں۔“ [ أبوداؤد، المناسك، باب في المحرمة تغطي وجهها : ١٨٣٣ ] عبد المحسن العباد نے ابوداؤد کی شرح میں فرمایا: ”اس حدیث میں ایک راوی پر کلام کیا گیا ہے، اسی لیے البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف ابی داؤد میں ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے ”مشکوٰۃ“ میں اسے ”حسن“ کہا ہے اور ”حجاب المرأة المسلمة“ میں بھی حسن کہا ہے اور اسماء رضی اللہ عنہا سے ایک صحیح سند کے ساتھ اس کا شاہد بھی ہے، چنانچہ یہ حدیث اپنے شواہد کی وجہ سے صحیح ہے۔“ تو احرام کی حالت میں، جب نقاب پہننا منع ہے، اگر پردہ واجب نہ ہوتا تو وہ چہرے پر چادریں کیوں لٹکاتیں؟

⑤ اب ان لوگوں کے دلائل ملاحظہ فرمائیں جو چہرے اور ہتھیلیوں کے پردے کو واجب نہیں مانتے، ان کی سب سے بڑی دلیل قرآن مجید کے الفاظ ”اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا“ کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تفسیر ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں اور صحابی کی تفسیر حجت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا پورا قول اور اس کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے محرم رشتہ داروں

# لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

**معلوم ہو جو وہ چھپاتی ہیں اور تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو اے مومنو! تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۳۱﴾**

کے سامنے چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی بات فرمائی ہے نہ کہ اجنبیوں کے سامنے اور اگر کسی کو اصرار ہو کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سب لوگوں کے سامنے عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی رکھنے کے قائل ہیں، تو یاد رہے کہ کسی صحابی کی تفسیر اسی وقت حجت ہوگی جب دوسرے کسی صحابی نے اس کے خلاف تفسیر نہ کی ہو۔ یہاں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اجنبیوں کے سامنے صرف کپڑوں کا ظاہر ہو جانا جائز رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [ النساء : ٥٩ ] ''پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔'' یعنی تنازع کے وقت کسی کی بات بھی حجت نہیں رہتی، اس وقت صرف اللہ اور اس کے رسول کی بات حجت ہوتی ہے اور قرآن وسنت کی رو سے غیر محرم مردوں سے چہرے اور ہاتھوں کا پردہ واجب ہے، جیسا کہ آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں۔

ان حضرات کی دوسری دلیل عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور انھوں نے باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے رخ پھیر لیا اور فرمایا: « يَا أَسْمَاءُ ! إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيْضَ لَمْ يَصْلُحْ لَهَا أَنْ يُّرٰى مِنْهَا إِلَّا هٰذَا وَ هٰذَا » [ أبوداؤد، اللباس، باب فيما تبدي المرأة من زينتها : ٤١٠٤ ] ''اسماء! عورت جب بلوغت کو پہنچ جائے تو (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ) اس کے سوا اور اس کے سوا اس کی کوئی چیز نظر آنا درست نہیں۔'' اس حدیث سے عورت کا غیر محرم کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں ظاہر کرنا جائز ثابت ہوا۔ اس دلیل کے متعلق عبدالمحسن العباد نے ابوداؤد کی شرح میں فرمایا ہے: ''یہ حدیث صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں انقطاع ہے (خود امام ابوداؤد نے فرمایا ہے کہ خالد بن دریک نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نہیں سنا) اور اس میں سعید بن بشیر ضعیف ہے، پھر اس میں ولید کی تدلیس ہے اور اس کے متن میں بھی نکارت ہے، کیونکہ یہ بات بہت بعید ہے کہ اسماء بڑی عمر میں باریک کپڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئیں، کیونکہ ہجرت کے وقت ان کی عمر ستائیس برس تھی۔'' محمد بن صالح بن عثیمین نے بھی ''رسالة الحجاب'' میں انھی وجوہ سے حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اگر اس حدیث کو صحیح بھی مانا جائے تو اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ یہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے اور یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال ممکن نہیں ہوتا۔ اردو تفسیر کے ایک مصنف نے اس حدیث سے یہ دلیل اخذ کی ہے کہ اجنبیوں کے سامنے تو نہیں البتہ عورت محرم رشتہ داروں کے علاوہ ان رشتہ داروں کے سامنے بھی چہرہ اور ہتھیلیاں کھول سکتی ہے جو محرم نہ ہوں، مگر جب روایت ہی ثابت نہیں تو اس سے استدلال کیسے ہو سکتا ہے۔ انھی بزرگوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن ام ہانی رضی اللہ عنہا آخر وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتی رہیں اور کم از کم منہ اور چہرے کا پردہ انھوں نے آپ سے کبھی نہیں کیا۔ اس کی دلیل کے طور پر انھوں نے ابوداؤد سے ایک روایت کا حوالہ دیا ہے، جس میں ہے کہ

ام ہانی رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا بچا ہوا پانی پیا، اس میں چہرہ کھلا ہونے کا ذکر ہی نہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ کئی بزرگ کس طرح اپنے پاس سے بات بنا کر اسے کتب احادیث کے ذمے لگا دیتے ہیں اور کسی دلیل کے بغیر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ فلاں عورت نے رسول اللہ ﷺ سے چہرے کا پردہ کبھی نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات بالکل بے دلیل ہے کہ غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھ کھولنے جائز ہیں اور یہ بات فتنے کا بہت بڑا دروازہ کھولنے کا باعث ہے۔

تیسری دلیل ان حضرات کی صحیح بخاری میں مروی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سواری پر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے، تو خثعم قبیلے کی ایک عورت آئی تو فضل اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ فضل کی طرف دیکھنے لگی، تو رسول اللہ ﷺ فضل کا منہ دوسری طرف پھیرنے لگے۔ [ بخاري، الحج، باب وجوب الحج...... : ١٥١٣ ] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس عورت نے رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں پردہ نہیں کیا، اگر پردہ ضروری ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے پردے کا حکم دیتے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اس میں یہ ذکر نہیں کہ وہ عورت بے پردہ تھی، اگر فرض کیا جائے کہ وہ بے پردہ تھی تو اس میں یہ ذکر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے پردے کا حکم نہیں دیا۔ پردے کا حکم جب اس سے پہلے آیات و احادیث کے ذریعے امت تک پہنچ چکا تھا تو اگر کسی موقع پر رسول اللہ ﷺ سے اس کی تاکید نقل نہ بھی ہوئی ہو تو کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

⑥ **وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ** : " خُمُرٌ " " خِمَارٌ " کی جمع ہے "اوڑھنی۔" "جُيُوْبٌ" "جَيْبٌ" کی جمع ہے "گریبان۔" یعنی عورتوں کو چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں سر سے لا کر گریبان پر ڈالیں، تاکہ سینہ اور گلے کا زیور چھپا رہے۔ اسلام سے پہلے کی جاہلیت میں عورتیں اپنے سینوں پر کچھ نہیں ڈالتی تھیں، بلکہ وہ دوپٹے کے دونوں کنارے پیچھے کی طرف لٹکا لیتیں، جس سے بسا اوقات ان کی گردن، بال، چوٹی، زیور اور چھاتی صاف نظر آتی تھیں، موجودہ زمانے کی جاہلیت کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔ سورۂ احزاب کی آیت (۵۹) میں بھی عورتوں کو بڑی چادریں نیچے لٹکا کر رکھنے کا حکم دیا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (( يَرْحَمُ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُهَاجِرَاتِ الْأُوَلَ لَمَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ : ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ شَقَقْنَ أَكْنَفَ مُرُوْطِهِنَّ فَاخْتَمَرْنَ بِهَا )) [ أبو داوٗد، اللباس، باب في قول الله تعالٰى : ﴿ و ليضربن بخمرهن على جيوبهن ﴾ : ٤١٠٢ ] "اللہ تعالیٰ پہلی مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے، جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ تو انھوں نے اپنی سب سے موٹی چادریں پھاڑیں اور انھیں اوڑھ لیا۔"

⑦ **وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ** ...... : یعنی بے اختیار ظاہر ہونے والی زینت یعنی لباس تو خود ہی ظاہر ہو جاتا ہے، گھر کے اندر یا گھر سے باہر کسی جگہ لباس کے ظاہر ہونے میں کوئی گناہ نہیں، البتہ اس کے علاوہ زینت ظاہرہ یعنی چہرہ اور ہاتھ صرف ان لوگوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے، یہ کل بارہ (۱۲) ہیں۔ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا ذکر حدیث میں ہے۔ ان میں سب سے پہلے خاوند ہے، اس کے سامنے تو عورت اپنی ظاہر و باطن ہر زینت ظاہر کر سکتی ہے، کیونکہ اس کی ساری زینت خاوند ہی کی امانت ہے۔ البتہ اس کے بعد جن لوگوں کا ذکر ہے ان کے سامنے

صرف چہرہ اور ہاتھ کھول سکتی ہیں۔

”اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ“ آباء میں دادا و پڑدادا اور نانا و پڑنانا بھی شامل ہیں۔ رضاعی باپ دادا کا بھی یہی حکم ہے۔ آیت میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ اگر وہ اپنی بھتیجی یا بھانجی کو دیکھیں گے تو ممکن ہے کہ اپنے بیٹوں کے سامنے ان کے حسن و جمال کا ذکر کریں، اس لیے ان کے بقول چچا اور ماموں سے بھی پردہ ہے، مگر یہ بات غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چچا اور ماموں بھی باپ کے حکم میں ہیں، انھیں بھی مجازاً باپ کہہ دیا جاتا ہے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کہا تھا: ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ [ البقرة : ۱۳۳ ] ”ہم تیرے معبود اور تیرے باپ داد ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی پیروی کریں گے جو ایک ہی معبود ہے۔“ اس میں اسماعیل علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا باپ کہا ہے، حالانکہ وہ ان کے چچا تھے۔ رضاعی چچا اور رضاعی ماموں سے بھی پردہ نہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرا رضاعی چچا آیا اور اس نے اندر آنے کی اجازت مانگی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور میں نے اس کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّهُ عَمُّكِ فَأْذَنِي لَهُ، قَالَتْ، فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّمَا أَرْضَعَتْنِي الْمَرْأَةُ وَلَمْ يُرْضِعْنِي الرَّجُلُ، قَالَتْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَمُّكِ فَلْيَلِجْ عَلَيْكِ قَالَتْ عَائِشَةُ وَ ذٰلِكَ بَعْدَ أَنْ ضُرِبَ عَلَيْنَا الْحِجَابُ، قَالَتْ عَائِشَةُ يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ )) [ بخاري، النكاح، ما يحل من الدخول...... : ۵۲۳۹ ] ”وہ تمھارا چچا ہے، اسے اندر آنے دو۔“ وہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! مجھے دودھ عورت نے پلایا ہے، مرد نے نہیں۔“ کہتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ تمھارا چچا ہے، اسے اندر آنے دو۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ”اور یہ حجاب فرض ہونے کے بعد کا واقعہ ہے۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”رضاعت سے وہ سب رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت سے حرام ہوتے ہیں۔“

”اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ“ بیٹوں میں ساری اولاد شامل ہے، بیٹے، پوتے، نواسے اور ان سے بھی نیچے تک سب بیٹے ہیں۔ ”اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ“ بھائیوں اور بہنوں میں عینی بھی شامل ہیں، جو ماں باپ دونوں کی طرف سے ہوں، علاتی بھی، جو صرف باپ کی طرف سے ہوں اور اخیافی بھی، جو صرف ماں کی طرف سے بھائی بہن ہوں۔ ایسے بھائی، بھتیجے، بھانجے اور ان کے بیٹے، پوتے اور نواسے نیچے تک کسی سے بھی پردہ نہیں، بلکہ وہ تمام مرد جن سے نکاح حرام ہے کسی سے بھی پردہ نہیں، مثلاً داماد اور ساس وغیرہ، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُسَافِرَ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ لَيْسَ مَعَهَا حُرْمَةٌ )) [ بخاري، التقصير، باب في كم يقصر الصلاة؟: ۱۰۸۸ ] ”کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو حلال نہیں کہ وہ ایک دن رات کا سفر محرم کے بغیر کرے۔“ ”اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ“ اپنی عورتوں سے پردہ نہ ہونے سے ظاہر ہے کہ جو اپنی نہ ہوں ان سے پردہ ہے۔ عبد الرحمان کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”اپنی عورتوں سے مراد آپس میں میل ملاقات رکھنے والی مسلمان عورتیں ہیں، جو ایک دوسرے کو اچھی

طرح جانتی پہچانتی اور ایک دوسرے پر اعتبار رکھتی ہوں۔ رہی دوسری غیر مسلم، مشتبہ اور اَن جانی عورتیں تو ایسی عورتوں سے اپنی زیب و زینت چھپانے اور حجاب کا ایسا ہی حکم ہے جیسے غیر مردوں سے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ عورتیں ہی ہوتی ہیں جو قحبہ گری کی دلالی بھی کرتی ہیں، نوخیز اور نوجوان لڑکیوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر غلط راہوں پر ڈال دیتی ہیں اور شیطان کی پوری نمائندگی کرتی ہیں۔ ایک گھر کے بھید کی باتیں دوسرے گھر میں بیان کرکے فحاشی پھیلاتی اور اس کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ ایسی بدمعاش قسم کی عورتوں سے پرہیز کی سخت ضرورت ہے۔ لہٰذا تمام اَن جانی اور غیر مسلم عورتوں یا غیر عورتوں سے بھی حجاب کا حکم دیا گیا، بلکہ ایسی عورتوں کو گھروں میں داخلہ پر بھی ایسے ہی پابندی لگانا ضروری ہے جیسے غیر مردوں کے لیے ضروری ہے۔'' (تیسیر القرآن)

''اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ'' عورت اپنے غلام کے سامنے بھی اپنی وہ زینت ظاہر کر سکتی ہے جو دوسرے محرموں کے سامنے ظاہر کرتی ہے۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام لے کر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ہبہ کیا تھا، فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ایک کپڑا تھا، وہ اس کے ساتھ سر ڈھانپتیں تو پاؤں تک نہ پہنچتا اور جب اس کے ساتھ پاؤں ڈھانپتیں تو سر پر نہ پہنچتا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشکل دیکھی تو فرمایا: (( إِنَّهُ لَيْسَ عَلَيْكِ بَأْسٌ إِنَّمَا هُوَ أَبُوكِ وَ غُلَامُكِ )) [ أبوداوٗد، اللباس، باب في العبد ينظر إلى شعر مولاته : ۴۱۰۶، قال الألباني صحيح ] ''تم پر کوئی حرج نہیں، یہاں صرف تمھارا باپ ہے اور تمھارا غلام ہے۔'' اس حدیث سے اجنبیوں کے سامنے سر اور پاؤں چھپانے کا حکم بھی ثابت ہوا۔ ''اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ'' اس کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے زیر تفسیر آیت کے فائدہ نمبر (۴) کے تحت دیکھیے۔

''اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ'' سے مراد وہ بچے ہیں جو نابالغ ہوں اور انھیں میاں بیوی کے معاملے کی خبر نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان نابالغ بچوں سے پردہ کرنا چاہیے جنھیں ایسے معاملات کی خبر ہو اور وہ عورت کی خوبصورتی اور بدصورتی کا ادراک رکھتے ہوں، اس اندازے کے لیے اس حدیث میں اشارہ ملتا ہے جو عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَ هُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِيْنَ وَ فَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ )) [ أبوداوٗد، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة : ۴۹۵، قال الألباني حسن صحيح ] ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہوں اور انھیں اس کی وجہ سے مارو جب وہ دس برس کے ہوں اور انھیں بستروں میں ایک دوسرے سے الگ کر دو۔''

''وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ ......'' طبری نے حسن سند کے ساتھ (عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما) بیان کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عورت مردوں کی موجودگی میں ایک پازیب کو دوسری کے ساتھ کھڑکائے۔ اس کے پاؤں میں پازیبیں ہوں، جنھیں وہ مردوں کے پاس حرکت دے تو اللہ سبحانہ نے اس سے منع کر دیا، کیونکہ یہ شیطان کا عمل ہے۔ [ طبري : ۲۶۲۱۷ ] یہاں چہرے کے پردے کو واجب نہ ماننے والے حضرات کو غور کرنا چاہیے کہ جب عورتوں کو زور سے پاؤں مار کر پازیبوں کی آواز نکالنا منع ہے کہ کہیں مردوں کو ان کی مخفی زینت معلوم نہ ہو جائے، جس سے ان کے دلوں میں کوئی غلط خیال پیدا ہو، تو یہ آواز مردوں کے دلوں میں زیادہ کشش اور فتنے کا باعث ہے، یا چہرہ جو عورت کے حسن و جمال کا آئینہ ہے؟ فیصلہ کرتے وقت انصاف شرط ہے۔

8 اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس دروازے کو بند کرنا چاہتے ہیں جس سے فحاشی کے در آنے کا امکان ہو۔ اس لیے جس طرح پاؤں مار کر زینت کا اظہار منع ہے اسی طرح کوئی بھی ایسی حرکت جس سے پوشیدہ زینت کا اظہار ہو، منع ہے۔ چنانچہ عورت کو خوشبو لگا کر گھر سے نکلنا منع ہے، اسے راستے کے درمیان چلنے سے منع کیا گیا ہے اور راستے کے کنارے پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تفصیل ابن کثیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ زینت کے اظہار کے علاوہ اسے غیر مردوں کے ساتھ نرم اور لوچدار لہجے میں بات کرنا منع ہے، جس سے ان کے دل میں طمع پیدا ہو۔ [ دیکھیے الأحزاب : ۳۲ ] حتیٰ کہ اسے نماز میں ''سبحان اللہ'' کہنے کے بجائے ہاتھ پر ہاتھ مار کر امام کو اس کی خطا پر متنبہ کرنے کا حکم ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۱۲۰۳) البتہ جب کسی قسم کا غلط خیال پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو تو عورت پردے میں رہ کر مردوں کو نصیحت کر سکتی ہے، انھیں علم پڑھا سکتی ہے، جیسا کہ امہات المومنین اور قرون خیر کی عورتیں مردوں کو احادیث بیان کیا کرتی تھیں۔

عورت کو محرم یا خاوند کے بغیر سفر کرنا منع ہے، کسی غیر محرم کے ساتھ خلوت منع ہے، حتیٰ کہ خاوند کے بھائی کے ساتھ بھی تنہائی میں بیٹھنا منع ہے، بلکہ دیور اور جیٹھ کو رسول اللہ ﷺ نے موت قرار دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۵۲۳۲) اگرچہ اسے مسجد میں نماز اور جمعہ کے لیے جانے کی اجازت ہے، مگر گھر میں اس کی نماز کو افضل قرار دیا گیا ہے مگر چونکہ مسجد میں قرآن کی تلاوت اور خطبہ وغیرہ سن کر علم حاصل ہوتا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِذَا اسْتَأْذَنَتْ أَحَدَكُمُ امْرَأَتُهُ إِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يَمْنَعْهَا )) [ مسلم، الصلاۃ، باب خروج النساء إلی المساجد...... : ۴۴۲۔ بخاري : ۸۷۳ ] ''جب تم میں سے کسی کی بیوی اس سے مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو وہ اسے منع نہ کرے۔''

عورتوں کو خاوندوں کے لیے زیبائش و آرائش کی اجازت ہے، بلکہ اس کا حکم ہے، مگر اس میں جعل سازی کی اجازت نہیں، جس سے اس کی فطری شکل وصورت تبدیل ہو جائے۔ عورتیں عموماً ایسے کام غیر مردوں کو مائل کرنے کے لیے اختیار کرتی ہیں، مثلاً ابروؤں کو باریک کرنا، چہرے کے بال اکھاڑنا، سر کے بالوں میں بال ملانا، اللہ کی پیدائش کو بدلنا، ان سب پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۴۸۸۶)

اسی طرح اونچی ایڑی کے ساتھ قد لمبا کر کے دکھانا بنی اسرائیل کے فساد کے زمانے میں ان کی عورتوں کا شیوہ تھا۔ افسوس! اب مسلم عورتوں نے کفار کی تقلید میں ہر وہ طریقہ اختیار کر لیا ہے جس سے وہ غیروں کی نظر میں خوش نما معلوم ہوں اور ان کے مردوں کی غیرت وحمیت بھی ایسی ختم ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے برداشت کرتے ہیں، بلکہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

9 **وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا** : سورت کی ابتدا سے لے کر یہاں تک جو احکام بیان ہوئے ہیں، چونکہ ان کی پابندی میں کچھ نہ کچھ کوتاہی ہو ہی جاتی ہے، بلکہ ہر کام ہی میں خطا ہو جاتی ہے، اس لیے ''اے مومنو!'' کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنے اور گناہوں سے توبہ کرنے کا حکم دیا، یعنی تمھارے مومن ہونے کا تقاضا ہے کہ جو گناہ تم کر چکے یا آئندہ تم سے سرزد ہوں گے ان سے اللہ کی طرف توبہ کرو اور آئندہ بھی کرتے رہو۔ ''**جَمِيْعًا**'' کہہ کر مردوں اور عورتوں سب کو توبہ کا حکم دیا اور توبہ کے نتیجے میں فلاح وکامیابی کی بشارت دی۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ

**اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں، عورتوں کا نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور اپنی لونڈیوں سے جو نیک ہیں ان کا**

توبہ کے تین فرائض ہیں: ① اس بات پر ندامت کہ میں نے اس گناہ کے ساتھ اللہ ذوالجلال والاکرام کی نافرمانی کی، اس پر نہیں کہ اس سے مجھے جسمانی یا مالی نقصان ہوا۔ ② کسی تاخیر کے بغیر جتنی جلدی ممکن ہو اس گناہ سے باز آ جانا۔ ③ اس بات کا عزم کہ آئندہ کبھی یہ گناہ نہیں کروں گا۔ اگر نفس کی شامت سے پھر گناہ ہو جائے تو پھر توبہ کرے۔

توبہ کے تین آداب ہیں: ① گناہ کا نہایت عاجزی کے ساتھ اعتراف۔ ② زیادہ سے زیادہ گڑگڑا کر بخشش کی دعا کرنا۔ ③ گزشتہ گناہوں کو مٹانے کے لیے زیادہ سے زیادہ نیکی کرنا۔ (التسہیل)

**آیت 32** ❶ **وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ** : "الْاَيَامٰى" "آمَ يَئِيْمُ أَيْمًا" (بَاعَ يَبِيْعُ) سے "أَيِّمٌ" (بروزن فَيْعِلٌ، كَسَيِّدٍ) کی جمع ہے، یعنی وہ عورت جس کا خاوند نہ ہو، کنواری ہو یا بیوہ یا مطلقہ اور وہ مرد جس کی بیوی نہ ہو، کنوارا ہو یا ثیب۔ زمخشری کے مطابق "أَيَامٰى" کا وزن "أَفَاعِلُ" ہے، کیونکہ یہ "أَيِّمٌ" کی جمع ہے، جو "فَيْعِلٌ" کے وزن پر ہے اور "فَيْعِلٌ" کی جمع "فَعَالٰى" نہیں آتی۔ اس لیے "أَيَامٰى" کا اصل "أَيَايِمُ" ہے، جس میں قلب کرکے میم کو یاء کی جگہ پہلے کر دیا گیا، کیونکہ الف کے بعد یاء پڑھنے میں ثقل ہے، پھر میم کو تخفیف کے لیے فتحہ دے دیا گیا اور یاء کو الف سے بدل کر "أَيَامٰى" کر دیا۔ ابن مالک اور کئی علماء کے مطابق یہ خلاف قیاس "فَعَالٰى" کے وزن پر ہے، سیبویہ کے کلام کا ظاہر بھی یہی ہے۔ (التحریر والتنویر)

❷ نگاہیں نیچی رکھنے اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنے کے حکم کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جنسی جبلت کو معطل کر دو اور ترک دنیا کرکے راہب اور جوگی بن جاؤ، کیونکہ یہ فطرت کا مقابلہ ہے اور جو شخص فطرت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے گا پادریوں اور ننوں (راہبات) کی طرح بری طرح شکست کھائے گا، بلکہ حکم دیا کہ اپنے مجرد مردوں اور عورتوں کا نکاح کرو اور حلال طریقے سے اپنی خواہش اور لذت کی تکمیل کرو، یہ تمھاری پاک دامنی اور نگاہ نیچی رکھنے کا ذریعہ ہے اور امت مسلمہ کی تعداد بڑھانے کا بھی۔

❸ "**الْاَيَامٰى مِنْكُمْ**" سے مراد مسلم آزاد مجرد مرد اور عورتیں ہیں، کیونکہ غلاموں کا ذکر بعد میں آ رہا ہے اور غیر مسلم "**مِنْكُمْ**" نہیں بلکہ "مِنْ غَيْرِكُمْ" ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ حکم کس کو ہے؟ تو عورت کا نکاح اس کے اولیاء کی ذمہ داری ہے، ان کی اجازت کے بغیر عورت کو نکاح کی اجازت نہیں۔ اگر کسی عورت کا ولی نہ ہو یا وہ ولایت کا اہل نہ رہے کہ اس کا نکاح کرنے کے بجائے نکاح کی راہ میں کسی معقول وجہ کے بغیر رکاوٹ بنا رہے تو حاکم وقت اس کا ولی ہے اور اسے حکم ہے کہ اس کا نکاح کرے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيْهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَإِنْ دَخَلَ بِهَا فَالْمَهْرُ لَهَا بِمَا أَصَابَ مِنْهَا فَإِنْ تَشَاجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهُ)) [أبوداؤد، النكاح، باب في الولي: ۲۰۸۳] ''جو عورت اپنے اولیاء کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔'' تین دفعہ فرمایا، پھر فرمایا: ''اگر شوہر اس عورت سے صحبت کر لے تو اسے مہر دینا پڑے گا، اس سے فائدہ حاصل کرنے کی

اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۳۲﴾

بھی، اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾

وجہ سے اور اگر وہ اولیاء آپس میں جھگڑ پڑیں تو جس کا کوئی ولی نہ ہو سلطان اس کا ولی ہے۔‘‘

رہے مرد تو ان کا نکاح کسی ولی کی اجازت پر موقوف نہیں، مگر ظاہر ہے کہ بچے کے جوان ہونے پر اس کے والدین یا رشتہ دار جو اس کی کفالت کر رہے ہیں، اگر اس کے نکاح کی کوشش اور اس میں تعاون نہ کریں تو اس کے لیے نکاح بہت مشکل ہے، اس لیے انھیں حکم ہے کہ اپنے بچوں کا جوان ہونے پر جتنی جلدی ممکن ہو نکاح کر دیں۔ ’’اَنۡکِحُوا‘‘ (نکاح کر دو) کا لفظ عام ہونے کی وجہ سے اس کے مخاطب حکومت و عوام تمام مسلمان بھی ہیں کہ مردوں اور عورتوں کے نکاح میں وہ جس قدر بھی تعاون کر سکتے ہوں ان کا نکاح کروا دیں۔ جب دوسروں کا نکاح کروانے کا حکم ہے تو خود اپنا نکاح کروانا تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے، جوان تھے اور کوئی چیز نہ پاتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: (( يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ )) [ بخاري، النكاح، باب من لم يستطع الباءة فليصم : ۵۰۶۶، ۵۰۶۵ ] ’’اے جوانو کی جماعت! تم میں سے جو نکاح کر سکتا ہو وہ نکاح کر لے، کیونکہ وہ نظر کو بہت نیچا کرنے والا اور شرم گاہ کو بہت محفوظ رکھنے والا ہے اور جو نکاح کا سامان نہ پائے وہ روزے کو لازم پکڑے، کیونکہ وہ اس کے لیے (شہوت) کچلنے کا باعث ہے۔‘‘

④ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ : ’’الصّٰلِحِیۡنَ‘‘ سے مراد دین کی صلاحیت (نیکی) بھی ہو سکتی ہے، اس صورت میں غلام یا لونڈی میں سے صالح وہ ہوگا جو فاجر اور زانی نہ ہو۔ اس کے مالک کو اس کی نیکی کے انعام اور مزید نیکی کی ترغیب دلانے کے لیے اس کا نکاح کر دینا چاہیے۔ رہا زانی تو وہ کیونکہ صالح نہیں فاسد ہے، اس لیے اس کا نکاح جائز نہیں، جب تک توبہ کر کے صالح نہ بن جائے۔ گویا یہ سورت کے آغاز میں مذکور حکم ’’اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ‘‘ کی تائید ہے۔ غلاموں میں خاص طور پر یہ شرط لگانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکثر یہ بیماری اس طبقے میں ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس شرف سے محروم ہوتے ہیں جو معاشرے میں کسی آزاد مرد یا عورت کو اپنی عزت کی حفاظت پر مجبور کرتا ہے۔ (سعدی) اس لیے اہل علم نے یوسف علیہ السلام کے زنا سے بچنے کو عفت کا کمال قرار دیا ہے، کیونکہ دنیاوی لحاظ سے انھیں زنا سے روکنے والی کوئی چیز موجود نہیں تھی، حتیٰ کہ ان کے پاس حرّیت بھی نہیں تھی۔ (تفصیل سورۂ یوسف میں ملاحظہ فرمائیں) ’’الصّٰلِحِیۡنَ‘‘ سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لونڈی یا غلام جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں اور انھیں اس کی ضرورت ہو۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگر غلام یا لونڈی کو نکاح کی حاجت نہ ہو تو مالک کو اس کے نکاح کا حکم نہیں اور ’’الصّٰلِحِیۡنَ‘‘ کے دونوں معنی مراد لیے جائیں تو کچھ بعید نہیں۔ (سعدی)

⑤ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ : عام طور پر غربت کو مرد کے نکاح کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے کہ

جب اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو بیوی کو کہاں سے کھلائے گا، اس لیے غریب کو کوئی رشتہ نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ تم مجرد لوگوں کا نکاح کر دو، اگر وہ فقیر ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں غنی کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پاس غیب سے غنی کر دینے کا اختیار ہے اور اسباب کے لحاظ سے بھی بیوی آنے کے بعد وہ کمائی کے لیے زیادہ جدوجہد کرے گا۔ کھانا تو پہلے وہ خود بھی کھاتا ہے، اگر مزید کمائی نہ بھی کرے تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہوتا ہے۔ [ دیکھیے، بخاري : ٥٣٩٢ ] پہلے یہ اکیلا کمائی کرتا تھا، بیوی آنے کے بعد اس کی کمائی کی استعداد دو گنا ہی نہیں بلکہ مشہور عام قول کے مطابق گیارہ گنا ہو جائے گی۔ بیوی اس کا ہاتھ بٹائے گی، ہو سکتا ہے کہ بیوی کو اللہ تعالیٰ نے کوئی ہنر عطا کر رکھا ہو، یا وہ بہتر مشورے دے کر خاوند کی بہترین مشیر ثابت ہو، یا بیوی کے رشتہ داروں کے تعاون سے حالت بدل جائے۔ علاوہ ازیں اولاد ہونے کے بعد عین ممکن ہے کہ وہ اتنی کمائی کریں کہ پورا کنبہ ہی اغنیاء میں شامل ہو جائے۔ اس کے برعکس کسی غنی کو لڑکی دے تو ہو سکتا ہے کسی آزمائش میں وہ فقیر ہو جائے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ؗ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؗ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ؗ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ آل عمران : ٢٦، ٢٧ ] ''کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور تو مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور تو جسے چاہے کسی حساب کے بغیر رزق دیتا ہے۔'' یہ سب کچھ عام مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔ دولت دھوپ چھاؤں کی طرح آج یہاں ہے تو کل وہاں، بلکہ دولت کا معنی ہی گھومنا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس صحابی کا نکاح بھی کر دیا تھا جس کے پاس ایک چادر کے سوا کچھ نہیں تھا، حتیٰ کہ لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں تھی۔ (دیکھیے بخاری: ۵۰۲۹) یہ خیال ہی نہیں فرمایا کہ یہ بیوی کو کہاں سے کھلائے گا۔ اس لیے اہل علم نے دولت مند بننے کے اسباب میں سے نکاح کو بھی ایک سبب قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''بعض لوگ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فقیری میں بھی نکاح کیا کرو، اللہ تمھیں غنی کر دے گا۔'' میری نگاہ سے تو یہ روایت نہیں گزری، نہ کسی قوی سند سے، نہ ضعیف سند سے اور نہ ہمیں اس مضمون کے لیے ایسی بے اصل روایت کی کوئی ضرورت ہے، کیونکہ قرآن کی یہ آیت اور (لوہے کی انگوٹھی تک نہ رکھنے والے سے نکاح والی) حدیث اس کے لیے کافی ہے۔ (وللہ الحمد)''۔ (ابن کثیر)

ایسی ہی ایک روایت عام مشہور ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس فقر کی شکایت لے کر آیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''نکاح کر لو۔'' اس نے نکاح کر لیا مگر غربت بدستور مسلط رہی، وہ پھر شکایت لے کر آیا تو آپ ﷺ نے پھر نکاح کا حکم دیا۔ اس نے دوسرا نکاح کر لیا، پھر بھی وہی حال رہا تو وہ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ نے پھر نکاح کا حکم دیا۔ تیسرے نکاح پر بھی غربت دور نہ ہوئی تو اس نے پھر آ کر شکایت کی، تو آپ ﷺ نے چوتھے نکاح کا حکم دیا، اس نے اس پر

وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَ الَّذِيۡنَ

اور حرام سے بہت بچیں وہ لوگ جو نکاح کا کوئی سامان نہیں پاتے، یہاں تک کہ اللہ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے

عمل کیا تو اس کی غربت دور ہوگئی۔ میں نے یہ روایت بہت تلاش کی مگر کسی معتبر کتاب میں نہیں ملی اور نہ یہ روایت نقل کرنے والے کسی صاحب نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ ایسی باتوں کا بے سروپا ہونا خود اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے فقیر کو یکے بعد دیگرے چار بیویاں ملتے چلے جانے کی کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

6 وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ : واؤ عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عطف پہلے جملے پر ہے جو "يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ" سے خود بخود سمجھ میں آنے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ اختصار قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے۔ گویا محذوف جملے کو ظاہر کیا جائے تو عبارت یوں ہوگی: "أَنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ فَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِيۡمٍ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ۔" یہاں "وَاسِعٌ" اور "عَلِيۡمٌ" صفات لانے کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ وسعت والا ہے، اس کے ہاں کوئی کمی نہیں، وہ جسے چاہے، خواہ وہ کتنا کنگال کیوں نہ ہو، اسے غنی کر دیتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا ہے، اسے معلوم ہے کہ کسے غنی کرنا ہے اور کس طرح اور کن اسباب کے ذریعے سے غنی کرنا ہے۔ (بقاعی)

آیت 33 1 وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا : "عَفَّ يَعِفُّ عَفَافًا وَ عِفَّةً" اس چیز سے باز رہنا جو حلال نہ ہو یا جمیل نہ ہو۔ "اِسۡتَعَفَّ" اور "تَعَفَّفَ" کا بھی یہی معنی ہے۔ (القاموس) "وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ" میں حروف کے اضافے کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "اور حرام سے بہت بچیں۔" یعنی جو لوگ کسی وجہ سے نکاح نہ کر سکیں، مثلاً رشتہ نہ ملے، یا مہر میسر نہ ہو، یا غلام کو اس کا مالک نکاح کی اجازت نہ دے، یا کسی اور وجہ سے حالات سازگار نہ ہوں تو وہ حرام سے بچنے کی بہت زیادہ کوشش کریں، یعنی زنا، قوم لوط کے عمل اور استمنا بالید وغیرہ سے باز رہیں۔ اس کوشش میں نگاہ نیچی رکھنا، بلا اجازت دوسروں کے گھروں میں نہ جانا اور خیالات کو پاکیزہ رکھنا وغیرہ آداب شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انسان کی اس منہ زور قوت یعنی شہوت کی آفات سے محفوظ رہنے کے لیے نکاح کا حکم دیا اور جسے نکاح میسر نہ ہو اسے زیادہ سے زیادہ نفلی روزے رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا: "یہ اس کے لیے (شہوت) کچلنے کا باعث ہوگا۔" [ دیکھیے بخاری : ۱۹۰۵ ] آپ ﷺ نے شہوت کو روزے کے ساتھ کچلنے کا حکم دیا، کیونکہ اس سے شہوت کمزور ہونے کے علاوہ ضبط نفس کی عادت بھی پڑتی ہے۔ بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ روزے سے تو شہوت قوی ہوئی ہے، یہ خیال فرض روزوں یا کبھی کبھار روزے کی حد تک تو صحیح ہے، کیونکہ جب صحت بہتر ہوتی ہے تو ہر قوت مضبوط ہوتی ہے، مگر مسلسل روزے رکھنے کا نتیجہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا اور آپ کے تجویز کردہ نسخے میں ضبط نفس کی عادت بھی ہے اور کوئی نقصان بھی نہیں، کیونکہ روزے چھوڑنے سے وہ قوت پھر بحال ہو جائے گی جو افزائش نسل اور زمین کی رونق کا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مسلسل دھنیا، یا کافور، یا پوٹاشیم برومائیڈ، یا ایسی دوائیں استعمال کرے جن سے شہوت ختم ہو جائے تو اس کا نتیجہ نہایت نقصان دہ نکلتا ہے، کیونکہ دوائیں چھوڑنے کے باوجود بعض اوقات وہ قوت دوبارہ بحال ہی نہیں ہوتی، یہ ایک قسم کا خصی ہونا ہے، جو حرام ہے۔

يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا ۖ وَّ اٰتُوۡهُمۡ

**اور وہ لوگ جو مکاتبت (آزادی کی تحریر) طلب کرتے ہیں، ان میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہیں تو ان سے مکاتبت کرلو، اگر ان میں کچھ بھلائی معلوم کرو اور انھیں اللہ کے مال میں سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے،**

2 حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ : اس میں پاک دامن رہنے والوں کے لیے وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں غنی کرے گا اور ان کے لیے آسانی پیدا فرمائے گا۔ مومن کا اللہ کے وعدے پر یقین اس کے لیے انتظار کی مشقت کو آسان بنا دیتا ہے۔ (سعدی)

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال     صد سال می تو اں بتمنا گریستن

''عرفی! اگر رونے سے وصل کی دولت میسر ہو سکتی تو تمنا میں سو سال بھی رویا جا سکتا ہے۔''

3 وَ الَّذِيۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ...... : ''اَلْكِتٰبَ'' باب مفاعلہ کا مصدر ہے، جیسے ''قَاتَلَ يُقَاتِلُ مُقَاتَلَةً وَ قِتَالًا'' ہے، یعنی غلام اور اس کے مالک کے درمیان آزادی کی تحریر کہ غلام اتنی رقم قسطوں میں فلاں مدت تک ادا کرے گا تو اسے آزادی مل جائے گی، اسے ''اَلْكِتَابُ''، ''اَلْكِتَابَةُ'' یا ''اَلْمُكَاتَبَةُ'' کہتے ہیں۔ پچھلی آیت میں مالکوں کو اپنے صالح غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کرنے کا حکم دیا۔ ان کے نکاح میں دو بڑی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ مالک انھیں نکاح کی اجازت نہ دے، دوسری یہ کہ وہ خود نکاح سے اجتناب کریں، کیونکہ غلام ہوتے ہوئے ان کے جتنے بچے پیدا ہوں گے، وہ ان کی طرح ان کے مالک کے غلام ہوں گے۔ ان دونوں رکاوٹوں کا حل یہ تھا کہ وہ آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کے لیے مالک کے ساتھ مکاتبت کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے مالکوں کو مکاتبت کا تقاضا کرنے والے لونڈی اور غلاموں کے ساتھ مکاتبت کرنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مکاتبت کا تقاضا کرنے والے غلاموں کے ساتھ مکاتبت سے انکار جائز نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، اگر اس کے خلاف کوئی قرینہ نہ ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں یہی آیت : ﴿وَ الَّذِيۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ ......﴾ درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطاء (تابعی کبیر) سے کہا: ''کیا مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنے غلام سے مکاتبت کروں، جب مجھے معلوم ہو کہ اس کے پاس مال ہے؟'' تو انھوں نے فرمایا: ''میں تو اسے واجب ہی سمجھتا ہوں۔'' عمرو بن دینار نے بیان کیا کہ میں نے عطاء سے پوچھا: ''کیا آپ یہ بات کسی سے نقل کرتے ہیں؟'' انھوں نے فرمایا: ''نہیں۔'' پھر انھوں نے مجھے بتایا کہ انھیں موسیٰ بن انس نے بیان کیا کہ (مشہور امام محمد بن سیرین کے والد) سیرین نے انس رضی اللہ عنہ سے مکاتبت کا تقاضا کیا اور وہ بہت مال والا تھا، انس رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا تو سیرین، عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا، انھوں نے فرمایا: ''اس سے مکاتبت کرو۔'' انس رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھتے ہوئے انھیں درّے کے ساتھ مارا : ﴿فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا﴾ تو انس رضی اللہ عنہ نے اس سے مکاتبت کر لی۔ [ بخاري، المكاتب، باب المكاتب و نجومه ......، قبل ح : ۲۵۶۰ ] اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی مالک غلام کے ساتھ مکاتبت کرنے سے انکار کر دے تو غلام عدالت میں جا سکتا ہے اور حاکم مالک کو مکاتبت پر مجبور کرے گا، جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے درّے کے ساتھ مارنے سے

مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيۡۤ اٰتٰىكُمۡ ‌ؕ وَلَا تُكۡرِهُوۡا فَتَيٰتِكُمۡ عَلَى الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّتَبۡتَغُوۡا

اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو، اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں، تاکہ تم دُنیا کی زندگی کا سامان طلب کرو اور جو

ثابت ہوتا ہے۔

4 اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا : بعض اہل علم نے خیر سے مراد مال لیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں ''اِنْ عَلِمْتُمْ لَهُمْ خَيْرًا'' ہونا چاہیے تھا، یعنی اگر تم ان کے پاس خیر کا علم رکھتے ہو، جبکہ یہاں الفاظ یہ ہیں کہ اگر تم ان میں خیر کا علم رکھتے ہو۔ اس لیے خیر کا مطلب یہ ہے کہ ان میں اتنی استعداد اور قوت و امانت ہو کہ وہ کمائی کر کے اپنی قیمت ادا کر سکتے ہوں، مکاتبت کو کچھ عرصہ کام سے جان چھڑانے کا بہانہ نہ بنا رہے ہوں اور آزاد ہونے کے بعد چوری یا خیانت کے بغیر اپنی روزی کما سکتے ہوں، تاکہ آزاد ہو کر گدائی نہ کرتے پھریں اور مسلم معاشرے پر بوجھ نہ بنیں۔ خیر میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ نیک اور پاک باز ہوں، تاکہ آزاد ہو کر بدکاری اور چوری ڈاکے کا ارتکاب نہ کرتے پھریں۔

بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ مالک کے لیے مکاتبت کا تقاضا قبول کرنا مستحب ہے، واجب نہیں، کیونکہ یہ فیصلہ اس نے کرنا ہے کہ اس میں خیر ہے یا نہیں، پھر غلام اس کا مال ہے جو زبردستی اس سے لینا جائز نہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے مکاتبت قبول کرنے کا حکم دیا ہے تو اس غلام کا حکم عام مال والا نہیں ہو سکتا اور غلام کو حق حاصل ہے کہ اگر مالک خواہ مخواہ اس میں خیر نہ ہونے کا بہانہ بنا کر مکاتبت سے انکار کرتا ہے تو وہ اسلامی عدالت میں چلا جائے، جو سارے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے گی کہ مالک کی بات درست ہے یا محض بہانہ ہے، جیسا کہ سیرین رحمہ اللہ کے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جانے سے ظاہر ہے۔

5 وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيۡۤ اٰتٰىكُمۡ : یہ حکم مکاتب کے مالک کو بھی ہے کہ وہ طے شدہ رقم کا ایک حصہ اسے چھوڑ دے، یا جو کچھ اس سے لیا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ واپس کر دے اور عام مسلمانوں کو بھی کہ ایسے غلاموں کو مال دے کر انھیں آزادی حاصل کرنے میں تعاون کریں۔ تعاون کی ترغیب کے لیے ارشاد ہے کہ تم جو مال انھیں دو گے وہ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے اور اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دے رہا ہے کہ اس کے دیے ہوئے مال میں سے انھیں دو، کیونکہ ایسے غلاموں کی مدد اس نے اپنے آپ پر حق قرار دی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ عَوْنُهُمُ الْمُكَاتَبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْأَدَاءَ وَالنَّاكِحُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْعَفَافَ وَالْمُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ )) [ نسائي، النكاح، باب معونة الله الناكح الذي يريد العفاف : ۳۲۲۰۔ ترمذي : ۱۶۵۵، قال الترمذي والألباني حسن ] ''تین آدمیوں کی مدد اللہ پر حق ہے، وہ مکاتب جو ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ نکاح کرنے والا جو حرام سے بچنے کا ارادہ رکھتا ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ'' اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف میں غلاموں کی آزادی کو باقاعدہ ایک مصرف مقرر فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ وَ فِي الرِّقَابِ ﴾ [ التوبة : ۶۰ ] یعنی گردنوں کو غلامی سے آزاد کرانے میں زکوٰۃ خرچ کی جائے۔ اس لیے اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیت المال میں سے مکاتب غلاموں کی رہائی کے لیے رقم خرچ کرے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''فَكُّ رَقَبَةٍ'' (گردن

عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

انھیں مجبور کرے گا تو یقیناً اللہ ان کے مجبور کیے جانے کے بعد بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۳۳﴾

چھڑانا) عمل صالح کی دشوار گھاٹی کو عبور کرنے کا حصہ ہے۔ دیکھیے سورۂ بلد (۱۳)۔
مکاتب اپنی رہائی کے لیے لوگوں اور حکومت سے مالی امداد کی درخواست کرسکتا ہے، جیسا کہ بریرہ رضی اللہ عنہا نے اپنی مکاتبت میں امداد کے لیے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی اور انھوں نے پوری رقم یک مشت ادا کر کے انھیں خرید لیا اور آزاد کردیا۔ [ دیکھیے بخاري : ۲۱٦۸ ]

6 یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عہد نبوی میں غلام تین قسم کے تھے، ایک وہ جو اصل میں آزاد تھے، لیکن کسی نے اغوا کر کے یا زبردستی غلام بنا لیا، دوسرے وہ جو نسل در نسل غلام چلے آتے تھے اور تیسرے وہ جو جنگ میں گرفتار کر کے لونڈی یا غلام بنائے جاتے تھے۔ ان غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور مالک ان کی محنت کو اپنی آمدنی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جس کے پاس جتنے زیادہ غلام ہوتے وہ اتنا ہی صاحب حیثیت سمجھا جاتا۔ اسلام نے جو غلام موجود تھے ان کی آزادی کے لیے ہر ممکن صورت اختیار فرمائی، مگر غلامی کو اس طرح ممنوع قرار نہیں دیا جس طرح شراب یا سود کو ممنوع قرار دیا اور نہ تمام غلام آزاد کرنے کا جبری حکم صادر فرمایا، بلکہ غلام آزاد کرنے کی ترغیب دی، اس کا ثواب بیان فرمایا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: (( مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُؤْمِنَةً أَعْتَقَ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنَ النَّارِ حَتّٰى يُعْتِقَ فَرْجَهُ بِفَرْجِهِ )) [ ترمذي، النذور و الأيمان، باب ما جاء في ثواب من أعتق رقبة : ۱۵۴۱، قال الترمذي حسن صحيح وقال الألباني صحيح ] ''جو شخص کوئی مومن گردن آزاد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کا ایک عضو آزاد کرے گا، یہاں تک کہ اس کی شرم گاہ کے بدلے اس کی شرم گاہ کو آزاد کرے گا۔'' کئی کاموں کا کفارہ گردن آزاد کرنا مقرر فرمایا، مثلاً قسم، ظہار، قتلِ خطا اور فرض روزے کی حالت میں جماع کے کفارے میں ترجیح غلام آزاد کرنے کو دی۔ اس کے باوجود غلامی کو ممنوع اس لیے قرار نہیں دیا کہ قیامت تک جنگیں ہوتی رہیں گی اور قیدی بنتے رہیں گے۔ ایسے مواقع پر ایک غیر مسلم حکومت کے فوجی مفتوح قوم کی عورتوں پر جس طرح کی دست درازیاں کرتے اور ظلم و ستم ڈھاتے ہیں وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ گزشتہ دونوں عالمگیر جنگوں میں بے بس قیدی عورتوں میں سے ایک ایک عورت سے جس طرح کئی کئی فوجیوں نے اپنی ہوس پوری کی اور جس درندگی کا ثبوت دیا وہ ان نام نہاد مہذب بھیڑیوں کے ماتھے پر لعنت کا بدترین داغ ہے۔ ان بیچاریوں کی صحت یا عزت یا اولاد کا ذمہ دار بننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا، جب کہ ہر ایک اپنی ہوس پوری کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا ہے۔ اسلام نے ایسی فحاشی اور درندگی کو حرام قرار دیا اور لونڈیاں بنانے کی پاکیزہ راہ کھولی، جس میں اسیر عورت ایک شخص کی لونڈی ہوتی ہے، صرف اس کے لیے اس سے بیوی کی طرح فائدہ اٹھانا جائز ہوتا ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی اولاد بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد کی طرح باپ کی وارث ہوتی ہے اور بچوں کی ماں بن جانے کی صورت میں وہ مالک کی وفات کے بعد خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔ اس کے وارث اسے آزاد کروانا چاہیں تو کسی حکومت سے معاملہ کرنے کے بجائے

اس کے مالک سے لین دین کر کے آسانی کے ساتھ آزاد کروا سکتے ہیں۔ غرض اسلام کا غلامی کی اجازت دینا مردوں اور عورتوں کی پاکیزگی اور عفت کا ضامن ہے۔ کفار نے غلامی کو سرے سے ممنوع قرار دے کر قیدی بننے والے مردوں اور عورتوں پر کوئی احسان نہیں کیا، بلکہ ظلم وستم اور بدکاری و درندگی کا دروازہ کھولا ہے اور یہی کفر کا نتیجہ ہے، جب کہ اسلام عدل، رحم، پاکیزگی اور پاک دامنی کا ضامن ہے اور غلاموں اور لونڈیوں کی سہولت اور آسائش کا اہتمام کرتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے انھیں آزادی دلانے کے راستے کھولتا ہے۔

⑦ **وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ** ...... : "**اَلْبِغَآءِ**" کا معنی زنا ہے، مگر یہ لفظ صرف عورت کے زنا پر بولا جاتا ہے، کہا جاتا ہے: "بَغَتْ، تَبْغِيْ بِغَاءً، فَهِيَ بَغِيٌّ وَ لِلْجَمَاعَةِ بَغَايَا" "فَتَيَاتٌ" "فَتَاةٌ" کی جمع ہے، معنی اس کا جوان لڑکی ہے، جیسا کہ "فَتًى" کا معنی جوان لڑکا ہے۔ عام طور پر غلام اور لونڈی پر "عَبْدٌ" اور "أَمَةٌ" کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسا کہ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ ﴾ اس لیے غلام اور لونڈی پر "عَبْدٌ" اور "أَمَةٌ" کا لفظ بولنا جائز ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ غلام کے لیے "فَتًى" اور لونڈی کے لیے "فَتَاةٌ" کا لفظ بولا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا يَقُلْ أَحَدُكُمْ عَبْدِيْ وَلَا أَمَتِيْ، وَلْيَقُلْ فَتَايَ وَفَتَاتِيْ وَغُلَامِيْ )) [ بخاري، العتق، باب كراهية التطاول على الرقيق : ۲۵۵۲، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] "تم میں سے کوئی شخص "عَبْدِيْ" اور "أَمَتِيْ" نہ کہے، بلکہ "فَتَايَ"، "فَتَاتِيْ" اور "غُلَامِيْ" کہے۔" یہاں لونڈیوں کے لیے "إِمَاءَكُمْ" کے بجائے "**فَتَيٰتِكُمْ**" کا لفظ استعمال کرنے میں ان لونڈیوں کی فتوت (جواں مردی) کا بیان مقصود ہے کہ وہ لونڈیاں ہو کر بھی پاک دامن رہنا چاہتی ہیں۔ (بقاعی)

یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو، اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں۔" تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ پاک دامن نہ رہنا چاہیں تو انھیں بدکاری پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اہل علم نے اس کا دو طرح سے جواب دیا ہے، ایک یہ کہ بدکاری پر مجبور اسی کو کیا جاتا ہے جو پاک دامن رہنا چاہے، جو پاک دامن رہنا ہی نہ چاہے اسے بدکاری پر مجبور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کہا جائے اسے بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ لفظ "اِنْ" (اگر) یہاں شرط کے لیے نہیں بلکہ اس واقعہ کے بیان کے لیے ہے جس پر یہ آیت اتری۔ واقعہ یہ تھا کہ عبد اللہ بن ابی اور اس قسم کے بدقماش اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرتے تھے، جب کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی ایک لونڈی کا نام مُسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا، وہ انھیں بدکاری پر مجبور کرتا تھا، ان دونوں نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ کے پاس کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ **وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** ﴾ [ مسلم، التفسير، باب في قوله تعالى : ﴿ ولا تكرهوا فتياتكم على البغاء ﴾ : ۳۰۲۹/۲۷ ] اس کی ایک مثال یہ آیت ہے : ﴿ **وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** ﴾ [ النساء : ۱۰۱ ] "اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کچھ کم کر لو، اگر ڈرو کہ تمھیں وہ لوگ فتنے میں ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا۔" یہاں خوف کا ذکر شرط کے لیے نہیں بلکہ اس واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ۠﴿۳۴﴾ ع ۱۰/۸

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھاری طرف کھول کر بیان کرنے والی آیات اور ان لوگوں کا کچھ حال جو تم سے پہلے گزرے اور متقی لوگوں کے لیے عظیم نصیحت نازل کی ہے۝۳۴

جس موقع پر یہ آیت اتری تھی۔ یہ دوسرا جواب پہلے کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہے، کیونکہ لونڈیاں پاک دامن نہ بھی رہنا چاہیں تو ضروری نہیں کہ وہ اس شخص سے زنا پر بھی راضی ہوں جس پر ان کا مالک انھیں مجبور کر رہا ہے۔

⑧ لِتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر دنیا کا مال طلب کرنا مقصود نہ ہو تو لونڈیوں سے زنا کروایا جا سکتا ہے، بلکہ یہ بھی بیان واقعہ کے لیے ہے کہ یہ کام کرنے والوں کا مقصد دنیا کے ساز و سامان کی طلب تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن ابی اپنی ایک لونڈی سے کہا کرتا تھا کہ جاؤ اور ہمارے لیے کچھ تلاش کر کے لاؤ، تو اس پر یہ آیت اتری۔ [ دیکھیے مسلم : ۳۰۲۹ ] رسول اللہ ﷺ نے عورت کی بدکاری کی کمائی سے منع فرمایا، ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت، زانیہ کی آمدنی اور کاہن کی شیرینی سے منع فرمایا۔'' [ بخاري، البیوع، باب ثمن الکلب : ۲۲۳۷ ] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( لَا یَحِلُّ ثَمَنُ الْكَلْبِ وَلَا حُلْوَانُ الْكَاهِنِ وَلَا مَهْرُ الْبَغِيِّ )) [ نسائي، الصید والذبائح، باب النهي عن ثمن الکلب : ۴۲۹۸ ] ''نہ کتے کی قیمت حلال ہے، نہ کاہن کی شیرینی اور نہ زانیہ کی آمدنی۔''

⑨ وَمَنْ یُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ : زنا ایک ایسا فعل ہے کہ مجبور ہو کر کرنے سے بھی نفس کی لذت کا دخل اس میں ہو ہی جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لونڈیوں کو مجبور کیے جانے کے بعد ان کی گناہ میں شرکت پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے غفور و رحیم ہے، ان کا گناہ مجبور کرنے والوں پر ہے۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر یہی ہے اور یہی ظاہر بھی ہے اور راجح بھی۔ تفسیر سعدی میں ہے: ''اس آیت میں لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنے والوں کو توبہ کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ بھی اگر توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے مجبور کرنے کے گناہ کے بعد بھی غفور و رحیم ہے، اس لیے انھیں چاہیے کہ اللہ کی جناب میں توبہ کریں اور آئندہ اس جرم سے باز آ جائیں۔'' اس آیت کے علاوہ اللہ کی رحمت کی ایک جھلک اس آیت میں بھی دکھائی دیتی ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ ﴾ [ البروج : ۱۰ ] ''یقیناً وہ لوگ جنھوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو آزمائش میں ڈالا، پھر انھوں نے توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔'' کوئی حد ہے اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت و رحمت کی کہ اس کے دوستوں کو آگ میں جلا کر تماشا دیکھنے والوں کے لیے بھی جہنم کے عذاب کی وعید تب ہے جب انھوں نے توبہ نہ کی ہو۔

**آیت 34** ① وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ : ''مُبَیِّنٰتٍ'' باب تفعیل سے اسم فاعل ''مُبَيِّنَةٌ'' کی جمع ہے، یہ باب لازم و

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایک طاق کی سی ہے، جس میں ایک چراغ ہے، وہ چراغ

متعدی دونوں میں آتا ہے، یہاں دونوں معنی اکٹھے بھی مراد ہو سکتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات واضح اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین کو خوب واضح کرنے والی بھی ہیں۔ ان آیات سے مراد نبی ﷺ پر نازل ہونے والی تمام آیات ہیں، اگرچہ سب سے پہلے اس سورت میں مذکور آیات و احکام مراد ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ [ النور : ۱ ] ”(یہ) ایک عظیم سورت ہے، ہم نے اسے نازل کیا اور ہم نے اسے فرض کیا اور ہم نے اس میں واضح آیات اتاری ہیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔“

❷ وَ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ : ”أَيْ وَ أَنْزَلْنَا مَثَلًا مِنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ۔“ ”مَثَلًا“ کا معنی ہے ضرب المثل، وہ چیز جو دوسری چیز کے مشابہ ہو، کسی کا حال جو دوسرے کے حال سے ملتا جلتا ہو، کسی چیز کی صفت اور قصہ عجیبہ، یعنی ہم نے تمھاری طرف کھول کر بیان کرنے والی آیات نازل کی ہیں اور پہلے لوگوں کے کچھ احوال نازل کیے ہیں جو تمھارے احوال سے ملتے جلتے ہیں۔ اس میں وہ احکام و حدود بھی شامل ہیں جو امت مسلمہ کی طرح پہلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے، مثلاً زنا کی حد، قصاص، فحاشی کی اشاعت کی روک تھام وغیرہ اور پہلی امتوں کے وہ حالات و واقعات جو اس امت کے احوال سے ملتے جلتے ہیں، مثلاً عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کا واقعہ اور مریم علیہا السلام پر یہودیوں کے بہتان اور یوسف علیہ السلام پر عزیز مصر کی بیوی کے بہتان کا واقعہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ تینوں واقعات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی پاک دامنی قیامت تک کے لیے قرآن میں ثبت فرما دی اور بہتان لگانے والوں کا جھوٹ ہمیشہ کے لیے واضح کر دیا۔

❸ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ : ” أَيْ وَ أَنْزَلْنَا مَوْعِظَةً “ یعنی ہم نے ڈرنے والوں اور نافرمانی سے بچنے والوں کے لیے عظیم نصیحت نازل فرمائی، کیونکہ جسے اللہ کا خوف نہیں اسے ان آیات سے کچھ حاصل نہیں۔

**آیت 35** ❶ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: ”اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے“ یعنی آسمان و زمین جو روشن ہیں تو اللہ کے نور ہی سے روشن ہیں۔ وہ نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یعنی اللہ سے رونق اور بستی ہے زمین اور آسمان کی۔ اس کی مدد نہ ہو تو سب ویران ہو جائیں۔“ یاد رہے، یہاں اللہ کے آسمان و زمین کا نور ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور آسمان و زمین کا نور ہے اور اسے روشن کرنے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں مذکور نور کی مثال بیان کی گئی ہے، جب کہ اللہ کی کوئی مثال ہے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [ الشوریٰ : ۱۱ ] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔“ دوسری دلیل یہ کہ اس آیت میں اس نور کا ذکر ہے جس سے آسمان و زمین روشن ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور حجاب کے پیچھے ہے۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم میں کھڑے ہو کر پانچ باتیں بیان فرمائیں، آپ نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِيْ لَهُ أَنْ يَّنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَ يَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا

ایک فانوس میں ہے، وہ فانوس گویا چمکتا ہوا تارا ہے، وہ (چراغ) ایک مبارک درخت زیتون سے روشن کیا جاتا

اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ ، حِجَابُهُ النُّوْرُ، لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ ›› [ مسلم، الإيمان، باب في قوله عليه السلام "إن الله لا ينام" ...... : ۱۷۹ ] ''اللہ عزوجل سوتا نہیں اور اس کے لائق ہی نہیں کہ وہ سوئے، وہ ترازو کو نیچا کرتا ہے اور اسے اونچا کرتا ہے، رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے اس کی طرف اوپر لے جایا جاتا ہے اور اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرے کی شعاعیں اس کی مخلوق میں سے ہر اس چیز کو جلا دیں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے۔''

❷ اس آیت میں ''نُوْرُ'' کا معنی ''ذُوْ نُوْرٍ'' ہے، یعنی روشن کرنے والا، جیسا کہ ''زَيْدٌ عَدْلٌ'' کا معنی یہ نہیں کہ زید عدل و انصاف ہے، بلکہ اس کا معنی ہے کہ زید عدل و انصاف والا ہے۔ بعض مفسرین نے یہی مفہوم ان الفاظ میں ادا فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ یعنی اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو روشن فرمایا۔ (نقلہ ابن کثیر عن ضحاک) آسمانوں اور زمین سے سارا جہان مراد ہے، یعنی کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ نور سے روشن ہے۔ یہ نور حسی بھی ہے اور معنوی بھی۔

حسی کی کئی قسمیں ہیں، ایک وہ نور جو خود روشن ہے اور دوسروں کو روشن کرتا ہے، جیسے سورج، چاند، ستارے، بجلی، آگ، ہر قسم کے چراغ، جگنو اور ہر وہ حیوان یا درخت جس سے روشنی نکلتی ہے، یہ سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ ایک وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے حُسن یا توانائی کی کسی نہ کسی شکل میں کائنات کے ہر ذرّے میں ودیعت کر رکھا ہے، مثلاً چہرے کا حُسن چہرے کا نور کہلاتا ہے، گھر کے افراد گھر کا نور ہوتے ہیں، گلے کا نور آواز کی صورت میں روشنی بکھیرتا ہے، زبان کا نور بولنے سے ظاہر ہوتا ہے، ہر عضو کی توانائی اس کا نور ہے۔ سمندر، پہاڑ، درخت، صحرا غرض ہر چیز کا حسن و جمال اور ان کے منافع اللہ کا نور ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان میں ودیعت کر رکھا ہے، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ نور کی ایک قسم ہر عضو کی وہ استعداد ہے جس سے حیوان یا انسان کائنات میں پھیلے ہوئے نور کا ادراک کرتا ہے، مثلاً آنکھ میں بینائی کا نور ہے، یہ نہ ہو تو نہ سورج چاند یا کوئی روشنی نظر آئے، نہ اس سے روشن کائنات کے ذرّے ذرّے میں پھیلا ہوا حُسن نظر آئے، اس لیے نابینے آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں نور نہیں۔ کان کا نور اس کے سننے کی قوت ہے۔ اسی طرح چھونے، چکھنے، سونگھنے کی قوتیں ان اعضا کا نور ہیں جن میں یہ رکھی گئی ہیں۔ اسی طرح بھوک پیاس، جنسی اشتہا، غرض بے شمار استعدادات ہیں جو اپنے اپنے متعلقہ عضو کا نور ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے کیا خوب خلاصہ نکالا ہے جو اوپر گزرا کہ اللہ سے رونق اور بستی ہے زمین و آسمان کی، اس کی مدد نہ ہو تو سب ویران ہو جائیں۔

معنوی نور کی بھی کئی قسمیں ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جس سے ضلالت کے اندھیرے ختم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا یہ نور پیغمبروں کے ذریعے سے نازل فرمایا، اللہ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

غَرۡبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيۡتُهَا يُضِيۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡهُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰى نُوۡرٍ ؕ يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ

ہے، جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہو جائے، خواہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو۔ نور پر نور ہے،

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا ﴾ [ النساء : ۱۷۴ ] ''اے لوگو! بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیل آئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک واضح نور نازل کیا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِىۡ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبۡدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخۡرِجَكُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴾ [ الحدید : ۹ ] ''وہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات اتارتا ہے، تاکہ تمھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر یقیناً بے حد نرمی کرنے والا نہایت مہربان ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ﴾ [ البقرة : ۲۵۷ ] ''اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ﴾ [ المائدة : ۱۵ ] ''بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آئی ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ انعام (۱۲۲) اور سورۂ شوریٰ (۵۲)۔

اس معنوی نور کی دوسری قسم حق کو پہچاننے اور قبول کرنے کی وہ استعداد ہے جو مومن کے دل میں ہوتی ہے، جو شروع ہی سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں رکھ دی ہے، مگر بعض اوقات وہ ماحول کے اثر یا اپنی بدعملی کی وجہ سے اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا مِنۡ مَوۡلُوۡدٍ إِلَّا يُوۡلَدُ عَلَى الۡفِطۡرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوۡ يُنَصِّرَانِهِ أَوۡ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا تُنۡتَجُ الۡبَهِيۡمَةُ بَهِيۡمَةً جَمۡعَاءَ هَلۡ تُحِسُّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ جَدۡعَاءَ ؟ )) [ بخاري، تفسیر سورة الروم، باب لا تبديل لخلق الله : ۴۷۷۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''پیدا ہونے والا ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں، یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسے چوپایہ پیدا ہوتا ہے تو پورے اعضا والا ہوتا ہے، کیا تم ان میں سے کوئی کان کٹا یا ناک کٹا دیکھتے ہو (یعنی اس کا کان یا ناک بعد میں لوگ کاٹتے ہیں)۔'' ہدایت کا یہ نور اگر کسی دل میں نہ ہو تو جتنے بھی انبیاء آ جائیں یا جتنی بھی آیات الٰہی نازل ہوں دل کے اندھے کو ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور اگر یہ نور آنکھوں یا کانوں میں نہ ہو تو تمام معجزے اور ہر وعظ و نصیحت بے کار ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ﴾ [ الأعراف : ۱۷۹ ] ''ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں۔''

مطلب ساری آیت کا یہ ہے کہ کائنات کی ساری رونق اور آبادی اللہ تعالیٰ کے فیض سے ہے، وہ نہ ہو تو کچھ بھی نہ رہ جائے، نور کے تمام ذرائع مثلاً سورج چاند وغیرہ، ان سے روشن ہونے والی کائنات اور ان کا ادراک کرنے والا نور اسی کا پیدا کردہ ہے، اسی طرح ایمان کا نور بھی اسی کا عطا کردہ ہے، اسی نے وحی بھیجی، پیغمبر بھیجے، کتابیں نازل کیں اور دلوں میں انھیں قبول کرنے کا نور رکھا۔

3 ''اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ'' میں اگرچہ حسی و معنوی تمام نور داخل ہیں اور سب ہی اللہ کے عطا کردہ ہیں، مگر زیر تفسیر آیت میں مراد ہدایت کا نور ہے کہ وہ صرف اللہ کی عطا ہے، اس کا ایک قرینہ اس سے پہلی آیت ہے، جس میں ''اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ''،

مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳۵﴾

اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۳۵﴾

اور گزشتہ اقوام کے کچھ حالات اور متقین کے لیے نصیحت نازل کرنے کا ذکر ہے اور ایک قرینہ خود اس آیت میں موجود ہے کہ ''یَهۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ'' اور تیسرا قرینہ اس سلسلہ کلام کی آخری آیت کا اختتام ہے، فرمایا: ﴿وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ﴾ [ النور : ۴۰ ] ''اور وہ شخص جس کے لیے اللہ کوئی نور نہ بنائے تو اس کے لیے کوئی بھی نور نہیں۔'' اس لیے ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ یہ تفسیر آئی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''﴿اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ﴾ يَقُوْلُ : اَللّٰهُ سُبْحَانَهُ هَادِيْ أَهْلِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ'' [ طبري : ۲۶۲۹۲ ] ''اللہ تعالیٰ کے فرمان ''اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ آسمانوں اور زمین والوں کو ہدایت دینے والا ہے۔''

شیخ المفسرین طبری نے یہی تفسیر اختیار کی ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے یہ تفسیر ذکر کر کے اسے قائم رکھا ہے، مگر ساتھ ہی فرمایا ہے کہ یہ تفسیر نور کی دوسری انواع کو اس کی تفسیر میں داخل کرنے سے مانع نہیں ہے۔ (تفسیر سورۃ النور از ابن تیمیہ) ابن کثیر نے بھی یہی تفسیر فرمائی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ﴾ [ الزمر : ۲۲ ] ''تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے سو وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر ہے۔''

④ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ...... : '' مِشْكَاةٌ '' دیوار میں طاق جو دیوار کے آر پار نہ ہو، ''زُجَاجَۃٍ'' شیشے کا فانوس۔ ''دُرِّیٌّ'' ''دُرٌّ'' کے ساتھ یاء نسبت لگانے سے ''دُرِّیٌّ'' بن گیا، موتی کی طرح چمکتا ہوا۔ ''لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرۡبِیَّۃٍ'' کے الفاظ سے زیتون کے اس تیل کی عمدگی اور شفافیت بیان کرنا مقصود ہے۔ اہل علم سے اس کی دو تفسیریں آئی ہیں، ایک یہ کہ وہ تیل زیتون کے ایسے درخت سے حاصل ہوا ہے جو نہ مشرقی ہے کہ اس کے مغرب میں کوئی پہاڑ یا اوٹ ہو، جس کی وجہ سے اس پر صرف دن کے پہلے پہر کی دھوپ پڑتی ہو اور نہ مغربی ہے کہ اس کے مشرق میں کوئی پہاڑ یا اوٹ ہو جس کی وجہ سے اس پر صرف دن کے پچھلے پہر کی دھوپ پڑتی ہو، بلکہ وہ درخت کھلی جگہ میں ہے جس پر سارا دن سورج کی دھوپ پڑتی ہے، ایسے درخت کا تیل زیادہ صاف اور عمدہ ہوتا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ زیتون کا وہ درخت نہ مشرق کی جانب ہے نہ مغرب کی طرف، بلکہ دوسرے درختوں کے عین درمیان واقع ہے، جس پر صرف جنوب کی طرف سے سورج کی دھوپ پڑتی ہے۔ درختوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے وہ سورج کی مسلسل تپش سے محفوظ رہتا ہے، جس سے اس کے پھل کی رطوبت پوری طرح محفوظ رہتی ہے۔ دونوں تفسیریں سلف سے مروی ہیں، دوسری تفسیر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے معتبر سند کے ساتھ طبری نے

نقل فرمائی ہے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''اور زیتون نہ شرق کا نہ غرب کا، یعنی باغ کے بیچ کا، نہ صبح کی دھوپ کھاوے نہ شام کی، خوب ہرا اور چکنا رہے۔''

5 ''مَثَلُ نُوْرِهٖ'' یعنی ''اس کے نور کی مثال'' سے مراد کس کے نور کی مثال ہے اور مثال کس طرح ہے؟ میں نے جتنی تفسیریں دیکھی ہیں سب سے واضح تفسیر ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے، جو طبری نے علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی معتبر سند کے ساتھ نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں: (( ﴿ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ ﴾ قَالَ مَثَلُ هُدَاهُ فِيْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ كَمَا يَكَادُ الزَّيْتُ الصَّافِيْ يُضِيْءُ قَبْلَ أَنْ تَمَسَّهُ النَّارُ فَإِذَا مَسَّتْهُ النَّارُ ازْدَادَ ضَوْءًا عَلٰى ضَوْءٍ كَذٰلِكَ يَكُوْنُ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ يَعْمَلُ بِالْهُدٰى قَبْلَ أَنْ يَّأْتِيَهُ الْعِلْمُ فَإِذَا جَاءَهُ الْعِلْمُ ازْدَادَ هُدًى عَلٰى هُدًى وَ نُوْرًا عَلٰى نُوْرٍ ))[ طبري : ۲۶۳۱۳ ] ''اس کے نور کی مثال ایک طاق کی سی ہے'' فرمایا: ''مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی مثال اس طرح ہے جیسے صاف زیتون کا تیل، قریب ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ہی روشن ہو جائے کہ اسے آگ چھوئے، پھر جب اسے آگ چھوتی ہے تو وہ روشنی پر روشنی میں بڑھ جاتا ہے، ایسے ہی مومن کا دل ہے کہ اس سے پہلے ہی ہدایت پر عمل کرنے والا ہوتا ہے کہ اس کے پاس علم آئے، پھر جب اس کے پاس علم آتا ہے تو وہ ہدایت پر ہدایت میں بڑھ جاتا ہے اور نور پر نور میں بڑھ جاتا ہے۔''

6 آیت میں مومن کے دل میں اللہ کی ہدایت کے نور کو مثال دے کر زیادہ سے زیادہ روشن بیان کرنا مقصود ہے، اس کے لیے اسے ایسے چراغ کی روشنی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو آیت کے نزول کے وقت رات کے اندھیرے میں روشنی کے لیے انسانی استعمال میں آنے والی سب سے روشن چیز تھی اور اس کی روشنی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے جو اسباب و ذرائع ہو سکتے تھے وہ بھی ساتھ ذکر فرمائے۔ سب سے پہلے یہ کہ وہ چراغ ایک طاق میں ہے، طاق میں ہونے کی وجہ سے اس کی شعاعیں مجتمع ہو کر زیادہ روشنی کا باعث بنتی ہیں، اگر وہ کسی کھلی جگہ میں ہوتا تو اس کی شعاعیں بکھر جاتیں۔ دوسری چیز اس کی روشنی کو بڑھانے والی یہ ہے کہ وہ چراغ شیشے کے ایک فانوس میں ہے، جس سے وہ ہوا کے تھپیڑوں سے محفوظ ہے اور فانوس کی وجہ سے اس کی روشنی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ تیسری چیز یہ کہ وہ فانوس عام شیشے کا بنا ہوا نہیں کہ روشنی میں معمولی اضافے کا باعث ہو، بلکہ اتنا شفاف اور چمک دار ہے جیسے کوئی چمکتا ہوا تارا ہو۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ وہ چراغ کسی عام تیل سے روشن نہیں کیا جا رہا، بلکہ تیل کی تمام قسموں میں سے جو تیل سب سے شفاف، سب سے زیادہ روشنی دینے والا اور سب سے کم دھواں دینے والا ہے وہ اس کے ساتھ روشن کیا جا رہا ہے، جو روغن زیتون ہے۔ پانچویں چیز یہ ہے کہ زیتون کا وہ تیل ردی یا خراب قسم کا نہیں کہ ایسے پھلوں سے نکالا گیا ہو جو نکمے اور خشک ہوں، بلکہ ایسے درخت کے پھلوں سے نکالا گیا ہے جو نہایت سرسبز و شاداب ہے اور جس کے پھل صاف روغن سے بھرپور ہیں۔ چھٹی چیز یہ کہ وہ تیل اتنا شفاف ہے کہ آگ لگائے بغیر بھی ایسے دکھائی دیتا ہے کہ ابھی اس سے روشنی پھوٹنے لگے گی۔ نور پر نور یعنی نور کو جس طرح بھی بڑھایا جا سکتا ہے اسی طرح اسے زیادہ سے زیادہ روشن کیا گیا ہے۔ اس میں جس کو تشبیہ دی گئی ہے وہ مومن کے دل میں اللہ کی ہدایت کا نور ہے اور جس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وہ ایسے چراغ کی روشنی ہے جس میں ہر اس طریقے سے اضافہ کیا گیا ہے جس سے اضافہ ہو سکتا ہے، یعنی تشبیہ ایک چیز سے

فِىۡ بُيُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ يُذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ ۙ﴿۳۶﴾

**ان عظیم گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں اوران میں اس کا نام یاد کیا جائے، اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان میں صبح و شام ﴿۳۶﴾**

نہیں بلکہ اس چراغ کی مجموعی صورت سے ہے، اسے تشبیہ تمثیل کہتے ہیں۔ اس میں مشبّہ کی ایک ایک چیز کی تشبیہ مشبّہ بہ کی ایک ایک چیز کے ساتھ نہیں دی جاتی، بلکہ مشبّہ کی مجموعی صورت کی تشبیہ مشبّہ بہ کی مجموعی صورت کے ساتھ دی جاتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کا انداز یہی ہے، البتہ بعض اہلِ علم نے مشبّہ کے اجزا کو مشبّہ بہ کے ایک ایک جز سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ طبری (۲۶۳۱۰) نے معتبر سند کے ساتھ ابو العالیہ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی تفسیر نقل فرمائی ہے، ان کے مطابق طاق سے مراد مومن کا سینہ ہے، فانوس سے مراد مومن کا دل ہے، چراغ وہ ایمان اور قرآن ہے جو مومن کے دل میں ہے۔ ستارے کی طرح چراغ کے روشن ہونے سے مراد مومن کے دل کا نور ایمان سے منور ہونا ہے۔ شجرہ مبارکہ سے اس چراغ کے روشن ہونے سے مراد اس کا اللہ وحدہ کے لیے اخلاص اور اس کی عبادت سے روشن ہونا ہے۔ ''لَا شَرۡقِيَّةٍ وَّلَا غَرۡبِيَّةٍ'' سے مراد ایسے درخت سے تشبیہ ہے جو گھنے درختوں کے درمیان گھرا ہوا ہے، چنانچہ وہ نہایت سبز اور چکنا ہے، اسے شدید دھوپ نہیں پہنچتی، نہ سورج کے طلوع ہوتے وقت نہ غروب ہوتے وقت، اسی طرح مومن کا دل اس سے محفوظ ہے کہ اسے مختلف حالات نقصان پہنچائیں، اگر وہ ایسے انقلابات کی زد میں آتا بھی ہے تو اللہ اسے ثابت رکھتا ہے۔ یہ بھی ایک جلیل القدر صحابی کی تفسیر ہے، جو سید القراء تھے۔ ''نُوۡرٌ عَلٰى نُوۡرٍ'' یعنی وہ نور تہ بہ تہ ہے اور اسے قوت دینے والی اور زیادہ روشن کرنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہی جس نے اسے مزید روشن نہ کیا ہو۔

⑦ يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ جب اللہ کے نورِ ہدایت سے آسمان و زمین روشن ہیں، تو کافر اس سے کیوں محروم ہیں اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اظہر من الشمس براءت کے باوجود ان پر بہتان لگانے والے اس سے اندھے کیوں رہے؟ فرمایا، اللہ اس نور کا مالک ہے، وہ اپنی چیز جسے چاہے دے، جسے چاہے نہ دے، اگر وہ کسی کو بھی نہ دے تو ظالم نہیں، مگر یہ اس کا کرم ہے کہ جو ہدایت کے قابل ہوا سے ضرور ہدایت دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴾ [ القصص : ٥٦ ] ''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

⑧ وَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ : یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے حسب حال مثالیں بیان کرتا ہے۔ قرآن مجید میں تقریباً ہر اہم مسئلے کے ساتھ کوئی نہ کوئی مثال بیان ہوئی ہے، کیوں کہ اس سے بات خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

⑨ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ : اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، جس میں سے یہ بھی ہے کہ کس بات کے لیے کون سی مثال موزوں ہے اور ہدایت کے لائق کون ہے اور کون نہیں۔

آیت 36 ① فِىۡ بُيُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنۡ تُرۡفَعَ : ''بُيُوۡتٍ'' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''ان عظیم گھروں

میں‘‘ کیا گیا ہے۔ ’’اَذِنَ‘‘ کا لفظ اجازت اور حکم دونوں معنوں میں آتا ہے، یہاں مراد حکم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [ النساء : ٦٤ ] ’’اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔‘‘

② ’’فِيْ بُيُوْتٍ‘‘ جار مجرور کس کے متعلق ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ پچھلی آیت میں کئی الفاظ ہیں جن میں سے کسی کے بھی متعلق کر دیں تو معنی درست ہوتا ہے، مثلاً ’’ نُوْرٌ ، كَمِشْكٰوةٍ ، مِصْبَاحٌ ، اَلزُّجَاجَةُ ‘‘ اور ’’ يُوْقَدُ‘‘ یعنی وہ نور ہدایت ایسے عظیم گھروں میں ملتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں: ’’جب اللہ تعالیٰ نے مومن کے دل کی اور اس میں موجود علم اور ہدایت کی مثال ایسے چراغ کے ساتھ دی جو شفاف فانوس میں ہے اور نہایت عمدہ تیل کے ساتھ روشن کیا جا رہا ہے، تو اس کی جگہ بیان فرمائی کہ وہ جگہ زمین کے تمام قطعوں میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب قطعہ اللہ کی مسجدیں ہیں، جن میں اس کی عبادت ہوتی ہے اور اس کی توحید کا اعلان ہوتا ہے۔‘‘

③ ’’اَنْ تُرْفَعَ‘‘ کا لفظی معنی ہے ’’کہ وہ (گھر) بلند کیے جائیں‘‘ مگر یہاں بلند کرنے سے مراد یہ نہیں کہ ان کی عمارت زیادہ سے زیادہ اونچی بنائی جائے، کیونکہ اگر یہ مطلب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما انھیں کھجور کے تنوں اور ٹہنیوں سے نہ بناتے اور آپ ﷺ یہ نہ فرماتے: (( مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ )) [ أبوداوٗد، الصلاۃ، باب في بناء المساجد : ٤٤٨، قال الألباني صحیح، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] ’’مجھے مساجد کو اونچا بنانے یا چونا گچ بنانے کا حکم نہیں دیا گیا۔‘‘ اس سے مراد ان کی تعظیم و تکریم ہے۔ طبری نے معتبر سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل فرمائی ہے: ’’﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ ﴾ وَهِيَ الْمَسَاجِدُ تُكْرَمُ وَ نُهِيَ عَنِ اللَّغْوِ فِيْهَا ‘‘ [ طبري : ٢٦٣٣٦ ] ’’اس آیت میں ’’بُيُوْتٍ‘‘ سے مراد مساجد ہیں، ان کی تکریم و تعظیم کی جائے اور ان میں لغو کاموں سے منع کیا گیا۔‘‘ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول سے معلوم ہوا کہ ’’بُيُوْتٍ‘‘ سے مراد مساجد ہیں اور انھیں بلند کرنے سے مراد ان کی تکریم اور ان میں لغو کاموں سے بچنا ہے۔ ’’رفع مساجد‘‘ یعنی مسجدوں کی تعظیم و تکریم میں انھیں ہر محلے میں بنانا، ان میں جھاڑو پھیرنا، انھیں نجاست اور گندگی سے پاک رکھنا، انھیں خوشبو دار رکھنا، تحیۃ المسجد پڑھے بغیر ان میں نہ بیٹھنا، ان میں تھوکنے سے، غلط اور شرکیہ اشعار پڑھنے سے، بے ہودہ باتوں اور شوروغل سے بچنا، گم شدہ چیز کا ان میں اعلان نہ کرنا اور ان میں خرید و فروخت نہ کرنا، سب کچھ شامل ہے۔ علاوہ ازیں حائضہ اور جنبی کو مسجد میں داخلے سے ممانعت، بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت، مسجد کو راستے کے طور پر استعمال کرنے کی ممانعت اور مساجد میں حدود اللہ قائم کرنے سے ممانعت بھی ان کی نظافت اور تکریم ہی کی وجہ سے ہے۔ ان میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں اور نکلتے وقت بایاں پاؤں پہلے رکھنا ان کی تکریم کا حصہ ہے۔ اسی طرح ان میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ سے رحمت کی درخواست اور شیطان مردود سے پناہ کی طلب اور نکلتے وقت اللہ کے فضل کی درخواست واضح علامت ہے کہ بندہ کسی عام جگہ میں داخل یا اس سے خارج نہیں ہو رہا، بلکہ ایک نہایت عظمت والے مقام میں داخل ہو رہا ہے، یا اس سے نکل

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ

وہ بڑی شان والے مرد جنھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ کوئی تجارت غافل کرتی ہے

رہا ہے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل آیات و احادیث میں موجود ہے اور تھوڑی سی توجہ سے بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں اس کا خاصا حصہ مذکور ہے۔

④ **وَ يُذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ** : مساجد میں اللہ کا نام یاد کرنے میں فرض اور نفل سب نمازیں شامل ہیں، اسی طرح اس میں قرآن مجید کی تلاوت، اللہ کی تسبیح، اس کی حمد، لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے تمام اذکار شامل ہیں۔ علم کا سیکھنا سکھانا، اس کا باہم مذاکرہ، اعتکاف اور دوسری تمام عبادات شامل ہیں جو مساجد میں ادا کی جاتی ہیں۔

⑤ **يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ** : "**بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ**" کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف کی آیت (۲۰۵) یعنی ان مساجد میں بڑی شان والے مرد خلوص کے ساتھ اللہ کے لیے صبح و شام تسبیح بیان کرتے ہیں۔ تسبیح میں اگرچہ سب اذکار آ جاتے ہیں اور عموماً اذکار روزانہ صبح و شام ہی کیے جاتے ہیں، مگر ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر فرض نماز کے ساتھ فرمائی ہے۔ چنانچہ طبری نے معتبر سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر بیان فرمائی ہے، انھوں نے فرمایا: "**يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ**" کا مطلب یہ ہے کہ بڑی شان والے وہ مرد پہلے اور پچھلے پہر ان میں اللہ کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ "غُدُوٌّ" سے مراد صبح کی نماز ہے اور "آصَالٌ" سے مراد عصر کی نماز ہے۔ یہ دونوں نمازیں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے فرض فرمائیں، اس لیے اس نے پسند فرمایا کہ ان نمازوں کا ذکر کرے اور ان کے ساتھ اپنی عبادت کا ذکر کرے۔"
[ طبري : ٢٦٣٥١ ]

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی تسبیح بول کر نماز مراد لی گئی ہے، دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۰)، سورۂ ق (۳۹، ۴۰) اور سورۂ طور (۴۹) بعض مفسرین نے "**الۡاٰصَالِ**" سے چاروں نمازیں مراد لی ہیں۔ بغوی نے فرمایا: "کیونکہ "**الۡاٰصَالِ**" میں وہ چاروں آ جاتی ہیں۔" "صَيۡلٌ" کا لفظ سورج ڈھلنے سے لے کر فجر سے پہلے تک بھی بولا جاتا ہے، اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے یہ تفسیر درست ہے، تاہم شان نزول کو مدنظر رکھیں تو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر راجح ہے۔

**آیت 37** ① **رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيۡعٌ......** : "**رِجَالٌ**" پر تنوین تفخیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "بڑی شان والے مرد" کیا گیا ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ "تجارت" کے بعد "بیع" کو ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ بیع بھی تجارت ہی ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ تجارت ایک وسیع عمل ہے، جس میں مختلف اشیاء خریدنے کے لیے سفر کرنا، انھیں مناسب مقام سے مناسب وقت پر مناسب قیمت کے ساتھ خریدنا، انھیں محفوظ کر کے رکھنا، پھر بیچنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں رہنا، اس کے لیے دکان پر بیٹھنا، گاہک کا انتظار کرنا اور مناسب وقت پر فروخت کر دینا سب کچھ شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمانے کے بعد کہ ان عظیم مردوں کو اللہ کے ذکر اور اقامت صلاۃ اور ادائے زکوٰۃ سے تجارت میں درکار کوئی عمل غافل نہیں کرتا، تجارت کے تمام کاموں میں سے خاص اس کام کا ذکر فرمایا جو تجارت کی ساری محنت کا نتیجہ ہے اور وہ ہے بیع، یہ لفظ

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾

اور نہ کوئی خرید و فروخت، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی ﴿۳۷﴾

بیچنے اور خریدنے دونوں پر بولا جاتا ہے، یعنی اللہ کے ان بندوں کو تجارت میں درکار کوئی کام اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتا، حتیٰ کہ خرید و فروخت کا عمل، جو تجارت کی ساری محنت کا نتیجہ ہے اور جس سے نفع حاصل ہوتا ہے، وہ بھی انھیں اللہ کے ذکر سے نہیں روکتا۔ اذان ہونے پر خواہ کوئی چیز بک رہی ہو یا خریدی جا رہی ہو اور خواہ کتنا نفع حاصل ہو رہا ہو وہ دنیا کے اس نفع کو لات مار کر اللہ کے گھر میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

② عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ : اللہ کے ذکر سے مراد دل میں اسے یاد رکھنا اور زبان سے اس کا ذکر دونوں مراد ہیں، یعنی وہ تجارت کے کسی موقع پر حتیٰ کہ خرید و فروخت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کو نہیں بھولتے، نہ کسی سودے میں ایسا کام کرتے ہیں جس سے اس نے منع فرما دیا ہے اور ان کی زبان پر ہر وقت اللہ کا ذکر ہی رہتا ہے۔ وہ بات بات پر الحمد للہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ وغیرہ کہتے ہیں اور خاموشی کی حالت میں بھی ان کی زبان اللہ کے ذکر سے تر رہتی ہے، وہ اس حکم پر کاربند رہتے ہیں: (( لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ )) [ ترمذي، الدعوات، باب ما جاء في فضل الذكر : ٣٣٧٥ ] ''تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾ [ الأحزاب : ٤١ ] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کو یاد کرو، بہت یاد کرنا۔''

③ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ : نماز کی اقامت میں اسے وقت پر ادا کرنا اور اس کے تمام ارکان کو صحیح طریقے سے ادا کرنا سب کچھ شامل ہے، یعنی کوئی تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر اور اقامت صلاۃ اور ادائے زکوٰۃ میں ان کے لیے غفلت کا باعث نہیں بنتی۔

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ دنیا کا کاروبار چھوڑ کر اللہ اللہ کرتے رہو، یہ تو رہبانیت ہے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے نہیں دی۔ اللہ کے تمام جلیل القدر پیغمبر محنت کے ساتھ کمائی کرتے تھے، آدم علیہ السلام مویشی پالنے، کھیتی باڑی، صنعت و حرفت اور ضرورت کے سارے کام خود کرتے تھے۔ زکریا علیہ السلام نجار تھے، داؤد علیہ السلام زرہیں بناتے تھے۔ تمام پیغمبروں نے بکریاں چرائی ہیں، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے اجرت پر بکریاں چرائی ہیں، تجارت بھی کی ہے، آخر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کا رزق آپ کے نیزے کے سائے تلے رکھ دیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی حال تھا، کوئی مویشی پالتا تھا، کوئی کاشت کار تھا، کوئی صنعت کار، کوئی تجارت کرتا تھا، کوئی مزدوری، البتہ جہاد میں سبھی شامل تھے، جو رزق کا سب سے باعزت ذریعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (زکوٰۃ دینے) کے حکم میں بھی کسب حلال کی ترغیب ہے کہ مال نہیں کمائے گا تو زکوٰۃ کس سے دے گا۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقے کی اپیل کرتے تو بعض صحابہ بوجھ اٹھا کر اور بعض رات بھر ڈول کھینچ کر جو کچھ کماتے پیش کر دیتے۔ دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۷۹) کی تفسیر۔

امتِ مسلمہ کی بدنصیبی کا آغاز اس دن سے ہوا جب ان لوگوں کو اولیاء اللہ قرار دے دیا گیا جنھوں نے جہاد کرنا تو دور، حلال کمانا بھی چھوڑ دیا اور اللہ پر توکّل کے نام پر لوگوں کے لقموں پر پلنا شروع کر دیا۔ ان کے ترک دنیا اور خود ساختہ زہد سے متاثر ہو کر لوگ ان پر اپنا مال نچھاور کرنے لگے کہ ان بزرگوں کے طفیل ہم بھی کچھ کیے کرائے بغیر بخشے جائیں گے۔ جب یہ حضرات لوگوں کی نظروں میں نیکی کا معیار بن گئے تو کفار کو مسلمانوں پر چڑھ دوڑنے کا موقع مل گیا۔ مسلمانوں کی نگاہوں میں ان اعلیٰ ترین لوگوں نے تجارت، صنعت، زراعت، حرب وضرب سب کچھ چھوڑا تو عوام اور حکمرانوں کی نظر میں بھی یہ کام دنیا پرستی ٹھہرے۔ نتیجہ وہ غلامی ہے جس کا عذاب امتِ مسلمہ جھیل رہی ہے۔ جب تک یہ امت روزانہ ہزار ہزار رکعت پڑھنے والے، دنیا ترک کر کے مساجد کو چھوڑ کر خانقاہوں کو آباد کرنے والے، کسی معشوق یا شیخ کے تصور میں عمر گزارنے والے، دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے عزت مآب راہبوں کی حقیقت کو نہیں سمجھے گی اور خیر القرون کے صحابہ وتابعین کے عمل کی طرف نہیں پلٹے گی، تو کوئی طاقت انھیں ذلت ورسوائی سے نہیں نکال سکتی۔

5 اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ اس کے بندے دنیا کے سب جائز کام کریں، مگر وہ کام ان کے لیے اس کی یاد اور اس کے احکام کی بجا آوری میں رکاوٹ نہ بنیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ”کِتَابُ الْبُيُوْعِ، بَابُ التِّجَارَةِ فِي الْبَزِّ وَ غَيْرِهِ“ (کپڑے وغیرہ کی تجارت کے باب) میں آیت: ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ نقل فرمانے کے بعد جلیل القدر تابعی قتادہ کا قول نقل فرمایا ہے، جس میں انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں: (( كَانَ الْقَوْمُ يَتَبَايَعُوْنَ وَ يَتَّجِرُوْنَ وَلٰكِنَّهُمْ إِذَا نَابَهُمْ حَقٌّ مِنْ حُقُوْقِ اللّٰهِ لَمْ تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ حَتّٰى يُؤَدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ )) [ بخاري، بعد ح : ۲۰۵۹ ] ”وہ لوگ خرید وفروخت کرتے اور تجارت کرتے تھے، لیکن جب ان کے سامنے اللہ کے حقوق میں سے کوئی حق آ جاتا تو کوئی تجارت یا کوئی خرید وفروخت انھیں اللہ کے اس حق کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی تھی۔“

6 یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ کے گھروں میں تسبیح کرنے والوں میں سے یہاں صرف مردوں کا ذکر فرمایا، تو کیا عورتیں مسجد میں نہیں جا سکتیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی مردانگی کا ذکر ہے جو تجارت اور خرید وفروخت چھوڑ کر مسجدوں میں جماعت کے ساتھ آ ملتے ہیں اور ظاہر ہے یہ کام مردوں کا ہے، عورتوں کا نہیں۔ (رازی) رہا عورتوں کا مسجد میں آنا تو یہ بات معروف ہے کہ وہ مسجد نبوی میں جماعت کے ساتھ شریک ہوتی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مسجدوں میں آنے کی اجازت دی اور روکنے سے منع فرمایا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی صبح اور عشاء کی نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھتی تھی (عمر رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کرتے اور غیرت کھاتے تھے) اسے کسی نے کہا: ”تم کیوں نکلتی ہو، جب کہ تمھیں معلوم ہے کہ عمر اسے ناپسند کرتے ہیں اور غیرت کھاتے ہیں؟“ اس نے کہا: ”انھیں کیا مانع ہے کہ مجھے (جانے سے) روک دیں؟“ تو اس نے کہا، انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مانع ہے: (( لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ )) [ بخاري، الجمعة، باب : ۹۰۰ ] ”اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے منع مت کرو۔“ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے گھر میں نماز پڑھنے کو افضل

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ

تا کہ اللہ انھیں اس کا بہترین بدلا دے جو انھوں نے کیا اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے ﴿۳۸﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے اعمال کسی چٹیل میدان میں ایک سراب کی طرح ہیں،

قرار دیا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءَ كُمُ الْمَسَاجِدَ وَ بُيُوْتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ )) [ أبوداوٗد، الصلاۃ، باب ما جاء في خروج النساء إلی المسجد : ۵۶۷ ] ”اپنی عورتوں کو مسجدوں سے مت روکو اور ان کے گھر ان کے لیے زیادہ اچھے ہیں۔“

❼ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ : یعنی ان مردوں کا اللہ کے گھروں میں ذکر و تسبیح کرنا اس دن کے خوف کی وجہ سے ہے جب دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی، یعنی دل اور آنکھیں خوف اور گھبراہٹ کی شدت سے اپنی معمول کی جگہ چھوڑ دیں گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ﴾ [ المؤمن : ۱۸ ] ”اور انھیں قریب آنے والی گھڑی سے ڈرا جب دل گلوں کے پاس غم سے بھرے ہوں گے۔“ اور فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴾ [ إبراهيم : ۴۲ ] ”وہ تو انھیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔“

**آیت 38** لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا : اس کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے: ”أَيْ ثَوَابَ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا “ کہ اللہ تعالیٰ انھیں ان بہترین اعمال کا ثواب دے جو انھوں نے کیے، اور یہ بھی: ”أَيْ أَحْسَنَ جَزَاءِ مَا عَمِلُوْا“ کہ اللہ تعالیٰ انھیں ان اعمال کا بہترین بدلا دے جو انھوں نے کیے۔ دوسرا معنی یہاں زیادہ مناسب ہے، کیونکہ آگے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ ”اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔“

**آیت 39** وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ...... : ”سَرَابٌ“ چٹیل میدان یا ریگستانی صحرا میں دوپہر کے وقت سورج کی روشنی کی وجہ سے دور سے ایسا نظر آتا ہے جیسے پانی لہریں مار رہا ہو، اسے ”سراب“ کہتے ہیں، جو محض نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔ ”قِيْعَةٌ“ اور ” قَاعٌ“ دونوں کا معنی چٹیل میدان ہے۔ ” الظَّمْاٰنُ “ ” فَعْلَانُ “ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے، معنی ہے سخت پیاسا۔ اس سے پہلے اہل ایمان کے دل میں ہدایت کے نور کی مثال بیان فرمائی، اب کفار کے اعمال کے لیے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں منافقین کے لیے آگ اور پانی کی مثال بیان فرمائی اور سورۂ رعد میں اس ہدایت اور علم کی جو دلوں میں جاگزین ہو جاتے ہیں، دو مثالیں بیان فرمائیں، ایک پانی کی اور دوسری آگ کی۔ یہاں کفار کے اعمال کی دو مثالیں لفظ ” اَوْ “ کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

جسے سخت پیاسا آدمی پانی خیال کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا اور اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے تو وہ اسے اس کا حساب پورا چکا دیتا ہے اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے ﴿۳۹﴾

بعض اہلِ علم نے سراب والی مثال کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ کافر دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو اپنے گمان کے مطابق کچھ اچھے کام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کام آئیں گے، جیسا کہ بیت اللہ کی خدمت، حاجیوں کو پانی پلانا، صدقہ وخیرات وغیرہ کرنا، حالانکہ ان کا کوئی بھی کام، اگرچہ وہ بظاہر اچھا ہی ہو، پھر بھی کفر کی شامت سے اللہ کے ہاں قبول و معتبر نہیں۔ ان لوگوں کو ان کے اچھے اعمال کی جزا دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ [ الأحقاف : ۲۰ ] ''تم اپنی نیکیاں اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور تم ان سے فائدہ اٹھا چکے۔'' آخرت میں ان کے اعمال ''هَبَآءً مَّنْثُوْرًا'' (بکھرا ہوا غبار) کر دیے جائیں گے۔ (دیکھیے فرقان : ۲۳) دوسری جگہ ان کے اعمال کی مثال اس راکھ سے بیان فرمائی جس پر آندھی والے دن میں سخت ہوا چلی ہو۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۸)۔

زیرِ تفسیر آیت میں فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال کی مثال اس طرح ہے جیسے دوپہر کے وقت ایک سخت پیاسے شخص کو دور سے پانی دکھائی دے، جو دراصل سراب ہو، وہ سخت پیاس کی وجہ سے اسے پانی سمجھ کر وہاں پہنچے، تو وہاں پانی وغیرہ کچھ نہ ہو، بلکہ وہاں اس سے حساب کا تقاضا کرنے والے ہوں جو اسے پکڑ کر اپنے حساب میں باندھ لیں۔ اسی طرح کافر اپنے گمان میں اپنے اچھے کاموں کو قیامت کے دن فائدہ پہنچانے والے گمان کرتا ہے، مگر قیامت کے دن وہ سراب کی طرح بے حقیقت ہو جائیں گے اور جزا ملنے کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ سے سابقہ پیش آئے گا، جو اس سے اپنا حساب پورا لے گا۔ ''وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ'' یعنی اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے، کیونکہ دوسرے لوگوں کو ہر چیز کا علم نہیں، نہ ان میں سے کوئی ایک وقت میں ایک سے زیادہ کا حساب لے سکتا ہے، اس لیے ان کے حساب میں تاخیر ہو جاتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کو پہلی پچھلی ہر چیز کا مکمل علم ہے، وہ کسی لکھنے پڑھنے کا محتاج نہیں اور وہ ایک لمحے میں ساری کائنات کا حساب بھی لے سکتا ہے، اس لیے وہ ''سَرِيْعُ الْحِسَابِ'' ہے۔ اسے حساب میں کچھ دیر نہیں لگتی۔

دوسری قسم کے کافر وہ ہیں جنھیں آخرت کی فکر ہی نہیں کہ اس کی وجہ سے وہ کوئی اچھا کام کریں، وہ سر سے پاؤں تک دنیا کی لذتوں میں غرق ہیں اور کفر و ضلالت، ظلم و جہل، خواہش پرستی اور اللہ کی نافرمانی میں غوطے کھا رہے ہیں۔ ان کی مثال آگے بیان فرمائی کہ ان کے پاس روشنی کی اتنی چمک بھی نہیں جتنی سراب پر دھوکا کھانے والے کو نظر آتی تھی۔ یہ لوگ خالص اندھیروں اور تہ بہ تہ ظلمات میں بند ہیں، روشنی کی کوئی شعاع کسی طرف سے ان تک نہیں پہنچتی۔

اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ يَّغۡشٰهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ‌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ‌ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا‌ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾

یا ان اندھیروں کی طرح جو نہایت گہرے سمندر میں ہوں، جسے ایک موج ڈھانپ رہی ہو، جس کے اوپر ایک اور موج ہو، جس کے اوپر ایک بادل ہو، کئی اندھیرے ہوں، جن میں سے بعض بعض کے اوپر ہوں، جب اپنا ہاتھ نکالے تو قریب نہیں کہ اسے دیکھے اور وہ شخص جس کے لیے اللہ کوئی نور نہ بنائے تو اس کے لیے کوئی بھی نور نہیں ﴿۴۰﴾

**آیت 40** ① اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ ...... : "لُّـجِّىٍّ" میں یاء نسبت کی ہے اور یہ "لُجٌّ" کی طرف منسوب ہے، جو "لُجَّةٌ" کی جمع ہے، جس کا معنی ہے بہت بڑا اور گہرا پانی۔ "بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ" کا معنی ہوگا "نہایت گہرے پانیوں والا سمندر۔" اس مثال کی وضاحت یہ ہے کہ گہرے پانیوں والے سمندر کی گہرائی پانی کی موٹائی کی وجہ سے نہایت تاریک ہوتی ہے۔ جدید تحقیقات بھی یہی ہیں کہ سمندر کی گہرائی میں ایک حد کے بعد روشنی کا گزر بالکل نہیں ہوتا، پھر جب اس پر تہ بہ تہ موجیں ہوں تو تاریکی اور بڑھ جاتی ہے اور جب ان موجوں کے اوپر بادل بھی ہوں تو تاریکی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، تو جو شخص ایسے سمندر کی گہرائی میں ہو وہ اتنی تہ بہ تہ تاریکیوں میں ہوگا کہ اپنے ہاتھ کو دیکھنا چاہے تو قریب نہیں کہ دیکھ پائے، حالانکہ آدمی اپنے جسم کا جو حصہ آنکھوں کے سب سے زیادہ قریب لے جا کر دیکھ سکتا ہے وہ اس کا ہاتھ ہے۔

② آیت میں کافر کے عمل کی ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ کی کیفیت اہلِ علم نے کئی طرح بیان فرمائی ہے، طبری نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے معتبر سند کے ساتھ نقل فرمایا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "کافر پانچ ظلمتوں میں پھرتا رہتا ہے، چنانچہ اس کا کلام ظلمت ہے، اس کا عمل ظلمت ہے، وہ ظلمت میں داخل ہوتا ہے اور ظلمت ہی میں سے نکلتا ہے اور قیامت کے دن آگ کی طرف جاتے ہوئے اس کا لوٹنا بھی ظلمتوں میں ہوگا۔" (طبری: ۲۶۳۷۱) یہ سید القراء کی تفسیر ہے، بعض اہلِ علم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تین طرح کی ظلمتیں بیان فرمائی ہیں، سمندر کی ظلمت، امواج کی ظلمت اور بادلوں کی ظلمت۔ اسی طرح کافر بھی تین ظلمتوں میں گرفتار ہے، عقیدے کی ظلمت، قول کی ظلمت اور عمل کی ظلمت۔"

رازی نے اسے حسن کی طرف منسوب کیا ہے۔ بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ ان ظلمتوں سے مراد دل پر، آنکھوں پر اور کانوں پر پڑے ہوئے پردے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ‌ؕ وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ﴾ [ البقرۃ : ۷ ] "اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی نگاہوں پر بھاری پردہ ہے۔" بعض نے فرمایا، تاریک دل تاریک سینے میں ہے جو تاریک جسم میں ہے۔ ایک وجہ تشبیہ یہ ہے کہ کافر حق بات نہیں جانتا اور اسے یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ نہیں جانتا اور وہ سمجھتا یہ ہے کہ وہ جانتا ہے۔ یہ تینوں مراتب ان تین ظلمتوں کے مشابہ ہیں۔ (رازی)

ایک وجہ تشبیہ یہ ہے کہ کافر کے اعمال کو اس شخص کی مجموعی حالت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو سمندر، اس کی امواج اور

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے اور اللہ اسے خوب جاننے والا ہے جو وہ کرتے ہیں ﴿۴۱﴾

بادلوں کی تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اسے تشبیہ تمثیل کہتے ہیں اور اس میں مشبّہ کی ایک ایک چیز کی مشبّہ بہ کی ایک ایک چیز کے ساتھ مشابہت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ توجیہ تکلف سے خالی ہونے کی وجہ سے بہت اچھی ہے۔

③ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ: اس سے پہلے آیت (۳۵) میں مومن کے متعلق فرمایا تھا: ﴿ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ”اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔“ اب کافر کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ جسے اللہ تعالیٰ (اس کی استعداد کی خرابی کی وجہ سے) نورِ ہدایت نہ دے اسے کہیں سے بھی کوئی نور نہیں مل سکتا۔ یا اللہ! تو اپنے خاص فضل و کرم سے ہمیں اپنا نور ہدایت عطا فرما اور ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جن کے متعلق تو نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ ﴾ [ الحدید : ۱۲ ] ”جس دن تو ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو دیکھے گا ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کی دائیں طرفوں میں دوڑ رہی ہوگی۔“

آیت 41 ① اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: اس سے پہلی آیات میں یہ بتایا کہ آسمانوں اور زمین کو حسی اور معنوی نور سے روشن کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، ساتھ ہی مومنوں کے دلوں کے نور ایمان سے منور ہونے اور کفار کے دلوں کے تاریکیوں میں غوطے کھانے کی مثالیں بیان فرمائیں، اب آسمانوں اور زمین میں پھیلے ہوئے اس نور (توحید) کی طرف رہنمائی کرنے والے چند دلائل بیان فرمائے۔

② اَلَمْ تَرَ: یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ زمین و آسمان میں موجود ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نے بھی نہیں دیکھا، اس لیے یہاں ”اَلَمْ تَرَ“ سے مراد یہ نہیں کہ ”کیا تو نے نہیں دیکھا“ بلکہ مراد ہے ”أَلَمْ تَعْلَمْ“ یعنی کیا تجھے معلوم نہیں؟ جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ﴾ [ الفیل : ۱ ] اس میں مخاطب اگر رسول اللہ ﷺ ہوں تو آپ پیدا ہی اس واقعہ کے بعد ہوئے ہیں، آپ کے اسے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہر شخص اس کا مخاطب ہے تو ہر شخص کا اس واقعہ کو دیکھنا ممکن ہی نہیں، اس لیے وہاں بھی معنی ”أَلَمْ تَعْلَمْ“ ہے۔ دراصل اس لفظ سے پوچھنا نہیں بلکہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ کیا تمھیں یہ بات معلوم نہیں، اگر معلوم نہیں ہے تو اب جان لو، اور ”اَلَمْ تَرَ“ کا لفظ اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حاصل ہونے والا علم خود دیکھنے سے حاصل ہونے والے علم کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ یقینی ہے۔ (شعراوی)

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَ يُنَزِّلُ مِنَ

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۴۲﴾ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے، پھر اسے آپس میں ملاتا ہے، پھر اسے تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اس کے درمیان سے نکل رہی ہے اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں میں سے جو اس میں ہیں، کچھ اولے اتارتا ہے، پھر انھیں

③ یعنی کیا تمھیں معلوم نہیں کہ زمین و آسمان میں جو بھی موجود ہیں، یعنی جن، انسان، فرشتے، جانور، اڑتے ہوئے پرندے، حتیٰ کہ نباتات اور جمادات سب شہادت دیتے ہیں کہ ہمیں پیدا کرنے والا اور ساری کائنات کو کسی خرابی کے بغیر نہایت حُسن و خوبی سے چلانے والا ہر نقص اور ہر شریک سے پاک ہے۔ تو جب ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے تو انسان پر تو سب سے بڑھ کر اس کی تسبیح کرنا اور اس کی توحید کی شہادت دینا لازم ہے۔ کائنات کی ہر چیز کی یہ تسبیح زبان حال ہی سے نہیں زبان قال سے یعنی بول کر بھی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴۴) اور سورۂ رعد (۱۳)۔

④ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ: زمین و آسمان میں موجود ہر چیز کی تسبیح کے بعد پرندوں کی تسبیح کا الگ ذکر فرمایا، کیونکہ وہ اڑتے وقت نہ زمین پر ہوتے ہیں نہ آسمان میں، بلکہ ان کے درمیان معلق ہوتے ہیں، یہ پرندے بھی اللہ کے ہر نقص سے پاک ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ ملک (۱۹)۔

⑤ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ: اس سے معلوم ہوا کہ ان کی یہ تسبیح اتفاقی طور پر بے سوچے سمجھے نہیں، بلکہ سمجھ کر اور علم کی بنا پر ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انھیں سکھایا اور ان کی طرف الہام کیا ہے۔

⑥ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کی تسبیح اور بندگی کو اور ان کے ہر عمل کو خوب جاننے والا ہے۔

**آیت 42** وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ...... : آسمان و زمین یعنی پوری کائنات میں حقیقی بادشاہی صرف اللہ کی ہے، اسی نے سب کو پیدا فرمایا، زندگی کا سارا سلسلہ وہی چلا رہا ہے اور سب کی واپسی بھی آخر کار اسی کی طرف ہے۔ نہ دنیا میں اس کی سلطنت میں کسی کا دخل ہے نہ آخرت میں اس کے سوا کسی کا کوئی دخل ہوگا۔ جب زمین و آسمان اور دنیا و آخرت میں سارا اختیار اسی کا ہے تو پھر دوسرے کی عبادت کیوں ہو!

**آیت 43** ① اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا...... : "أَزْجٰى يُزْجِيْ" نرمی کے ساتھ چلانا، ہانکنا، دھکیلنا۔ "أَلَّفَ يُؤَلِّفُ" دو یا زیادہ چیزوں کو جوڑنا۔ بادل کو جوڑنے سے مراد اس کے ٹکڑوں کو جوڑنا ہے۔ "رَكْمٌ" کہتے ہیں ایک چیز کو دوسری کے اوپر رکھنا۔ "رُكَامًا" تہ بہ تہ۔ "خِلَالٌ" "خَلَلٌ" کی جمع ہے، جیسے: "جِبَالٌ" "جَبَلٌ" کی جمع ہے۔ "خَلَلٌ" کا معنی شگاف، دراڑ اور سوراخ ہے۔

السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾

جس کے پاس چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے اور انھیں جس سے چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو لے جائے ﴿۴۳﴾

② ہوائیں کئی کام سرانجام دیتی ہیں، اللہ تعالیٰ پہلے ہوائیں بھیجتا ہے، وہ زمین پر جھاڑو پھیر کر خوب صفائی کر دیتی ہیں، پھر مزید ہوائیں بھیجتا ہے، وہ بادلوں کو اٹھا لاتی ہیں، تیسری ہوائیں بادلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر تہ بہ تہ کر دیتی ہیں، پھر چوتھی ہوائیں انھیں برسانا شروع کر دیتی ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۷)، روم (۴۸) اور فاطر (۹)۔

یہ توحید کی دوسری دلیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر انھیں جوڑ کر تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر یہ بھی اس کا احسان ہے کہ تہ بہ تہ بادلوں میں موجود پانی کے ذخیرے کو قطروں کی صورت میں زمین پر گراتا ہے، جس سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اور انسانوں، حیوانوں اور پودوں کو زندگی ملتی ہے۔ اگر وہ سیکڑوں ہزاروں مربع میل میں پھیلے ہوئے بادلوں کا کروڑوں اربوں ٹن پانی ایک ہی وقت میں زمین پر گرا دے تو نہ کوئی جان دار اس بوجھ کو برداشت کر سکے، نہ کوئی پودا اور نہ کوئی مکان باقی رہ جائے جس میں کوئی شخص سکونت اختیار کر سکے۔

③ وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ : "بَرَدٍ" "اولے۔" زمین سے جیسے جیسے بلندی کی طرف جائیں ٹھنڈک بڑھتی چلی جاتی ہے اور بعض اوقات اللہ کے حکم سے بادل برف کے پہاڑوں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اب یہ اللہ کا فضل ہے کہ برف کے ان پہاڑوں میں سے تودوں کی شکل میں برف گرانے کے بجائے وہ اسے اولوں کی شکل میں گراتا ہے، جس سے کم از کم نقصان ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی قدرت کا ثبوت ہے کہ وہی سمندر ہے، وہی سورج ہے جس کی تپش سے پانی بخارات بن کر اٹھتا ہے، وہی زمین ہے جس پر برستا ہے، زمین کے ہر قطعے کا سمندر سے اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا پہلے تھا، پہاڑ جن سے ٹکرا کر سائنسدان بارش برسنے کا ذکر کرتے ہیں، وہ بھی اسی جگہ ہیں، سارے اسباب یکساں ہونے کے باوجود ہمیشہ ہر جگہ ایک جیسی نہ بارش ہوتی ہے، نہ اولے پڑتے ہیں۔ کسی جگہ اگر کبھی خوش حالی لانے والی بارش ہے تو کبھی وہاں قحط مسلط کرنے والی خشکی ہے، کبھی غرق کر دینے والا سیلاب ہے اور کبھی اولوں کی صورت میں تباہی و بربادی ہے، یہ سب کچھ اللہ مالک الملک کی توحید، اس کی قدرت اور اس کے اختیار کی دلیل ہے۔

④ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ : اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ ان اولوں کو جس پر برسانا چاہتا ہے برسا دیتا ہے اور جس سے ہٹانا چاہتا ہے ہٹا دیتا ہے، محکمہ موسمیات کے اندازے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

⑤ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ : "سَنَا" بروزن "عَصَا" چمک، روشنی اور "سَنَاءٌ" بروزن "جَلَاءٌ" بلندی اور

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

اللہ رات اور دن کو ادل بدل کرتا ہے، بے شک اس میں آنکھوں والوں کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے ﴿۴۴﴾ اور اللہ نے ہر چلنے والا (جان دار) ایک قسم کے پانی سے پیدا کیا، پھر ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو چار پر چلتا ہے، اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿۴۵﴾

رفعت شان۔ آیت کا یہ جملہ اس جملے کی طرح ہے جس میں فرمایا: ﴿ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ﴾ [ البقرة : ٢٠ ] مزید دیکھیے سورۂ رعد (۱۲، ۱۳)۔

**آیت 44** يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ...... : یہ اس بات کی تیسری دلیل ہے کہ اس کائنات کا مالک ومختار اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے اور اس کی ہدایت کی روشنی زمین و آسمان میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے، چنانچہ فرمایا، اللہ تعالیٰ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے، نہ ہمیشہ دن رہتا ہے نہ رات۔ دیکھیے قصص (۷۱ تا ۷۳) پھر کبھی رات چھوٹی ہوتی ہے کبھی دن۔ دیکھیے لقمان (۲۹) واضح رہے کہ زمین پر زندہ رہنے کے جتنے اسباب موجود ہیں رات دن کے اسی الٹ پھیر کی بدولت ہیں، اگر ہمیشہ رات رہتی یا ہمیشہ دن رہتا تو کوئی چیز پیدا نہ ہو سکتی، یہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے۔ رات دن کو یا اس نظام کو برا بھلا کہنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ، يَقُوْلُ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ! فَلَا يَقُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ! فَإِنِّي أَنَا الدَّهْرُ، أُقَلِّبُ لَيْلَهُ وَ نَهَارَهُ، فَإِذَا شِئْتُ قَبَضْتُهُمَا )) [ مسلم، الألفاظ من الأدب وغيرها، باب النهي عن سب الدهر : ٢٢٤٦/٣ ] ''اللہ عزوجل فرماتا ہے، ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے، کہتا ہے، ہائے زمانے کی کم بختی! سو تم میں سے کوئی ہرگز یوں نہ کہے، ہائے زمانے کی کم بختی! اس لیے کہ میں ہی زمانہ ہوں، میں رات دن کو بدل بدل کر لاتا ہوں اور میں جب چاہوں گا دونوں کو سمیٹ لوں گا۔''

**آیت 45** ① وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۳۰) یہ اس مقام پر توحید کی چوتھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چلنے والا (جان دار) پانی سے پیدا فرمایا، پھر ایک ہی چیز سے پیدا ہونے والے تمام جان دار زندگی کی پہلی حالت ہی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، کوئی اپنے پیٹ پر چلتا ہے جیسے سانپ، مچھلی اور بعض قسم کے کیڑے مکوڑے، کوئی دو پاؤں پر چلتا ہے جیسے انسان اور پرندے اور کوئی چار پاؤں پر چلتا ہے جیسے گائے، بھینس، گھوڑے اور دوسرے چوپائے اور درندے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾ وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾

بلاشبہ یقیناً ہم نے کھول کر بیان کرنے والی آیات نازل کر دی ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے ﴿۴۶﴾ اور وہ کہتے ہیں ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے حکم مان لیا، پھر ان میں سے ایک گروہ اس کے بعد پھر جاتا ہے اور یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں ﴿۴۷﴾ اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو اچانک ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑنے والے ہوتے ہیں ﴿۴۸﴾

② **يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ** : یعنی کسی جانور کو چاہے تو اس سے زیادہ پاؤں دے دیتا ہے، جیسے کنکھجورا، کیکڑا، مکڑی اور کئی قسم کے کیڑے اور سمندری مخلوق۔ یہ کائنات میں پھیلے ہوئے نور ہدایت ہی کا اظہار ہے، جسے دیکھ کر سعادت مند لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لے آتے ہیں اور اس پر بھی کہ جب اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا فرما سکتا ہے، تو وہ قیامت کے روز دوبارہ زندہ بھی کرے گا۔ چلنے میں جانوروں کی ترتیب بھی قابل توجہ ہے، سب سے پہلے وہ جس کے پاؤں ہی نہیں، ان کے چلنے میں قدرت کا اظہار سب سے زیادہ ہے، پھر دو پاؤں پر چلنا چار پاؤں پر چلنے سے عجیب ہے۔

③ **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** : یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ جو چاہے پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

**آیت 46** ① **لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ** : دیکھیے اسی سورت کی آیت (۳۴) کی تفسیر۔

② **وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ** : دیکھیے اسی سورت کی آیت (۳۵) کی تفسیر۔

③ یہ آیت آئندہ آیات کی تمہید ہے، جن میں منافقین کا ذکر فرمایا ہے کہ یقیناً ہم نے تو کھول کر بیان کرنے والی عظیم الشان آیات نازل کی ہیں، مگر ان کے ذریعے سے صراطِ مستقیم کی ہدایت دینا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ آگے کچھ ایسے لوگوں کا ذکر فرمایا جنھیں ہدایت دینا اللہ کی مشیت نہیں ہے۔

**آیت 47** **وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا** : اس جملے کا "**وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ**" پر عطف ہے، گویا اللہ تعالیٰ اب ان لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں جنھیں ہدایت دینا اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا، یہ وہ لوگ ہیں جو ظاہر تو اسلام کرتے ہیں لیکن دل میں کفر چھپائے ہوئے ہیں، یہ منافق لوگ ہیں۔ اس آیت کا مضمون سورۂ نساء کی آیات (۶۰ تا ۶۵) سے ملتا جلتا ہے، ان کی تفسیر پر نظر ڈال لیں۔

**آیت 48** **وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ** ...... : واضح رہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جانے کا معاملہ صرف نبی ﷺ کی زندگی تک ہی نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ کے بعد آپ کی سنت کی طرف جو دعوت دی جاتی ہے وہ اصل میں آپ ہی کی طرف دعوت ہوتی ہے، اس سے منہ موڑنے والے کا حکم بھی وہی ہے جو اس آیت میں منافقین کے گروہ کا بیان ہوا ہے۔

وَ اِنْ یَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْۤا اِلَیْهِ مُذْعِنِیْنَ ﴿۴۹﴾ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور اگر ان کے لیے حق ہو تو مطیع ہو کر اس کی طرف چلے آتے ہیں ﴿۴۹﴾ کیا ان کے دلوں میں کوئی مرض ہے، یا وہ شک میں پڑ گئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول ظلم کریں گے؟ بلکہ وہ خود ہی ظالم ہیں ﴿۵۰﴾ ایمان والوں کی بات، جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے سوا نہیں ہوتی کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۵۱﴾

**آیت 49** وَ اِنْ یَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ ...... : "مُذْعِنِیْنَ" "اَیْ مُنْقَادِیْنَ" مطیع ہونے والے، یعنی جب دیکھتے ہیں کہ شریعت کے مطابق فیصلے میں ان کا فائدہ ہے، تب تو بڑے فرماں بردار بن کر آتے ہیں اور ایمان کے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں ورنہ دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور شریعت کے احکامات میں کیڑے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شریعت کی اس طرح کی پیروی اللہ تعالیٰ کی نظر میں کوئی وزن نہیں رکھتی، کیونکہ یہ شریعت کی پیروی نہیں بلکہ نفس کی پیروی ہے۔ (ابن کثیر)

**آیت 50** اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا ...... : "حَافَ یَحِیْفُ حَیْفًا" ظلم کرنا، یعنی آخر یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عدالت میں فیصلہ لے جانے سے کیوں کتراتے ہیں؟ آیا اس لیے کہ ان کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری ہے، یا اس لیے کہ انھیں پیغمبر کے سچا ہونے میں شک ہے، یا اس لیے کہ انھیں فکر ہے کہ آپ ﷺ کے پاس مقدمہ لے جائیں گے تو ہم پر ظلم کیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ نہ تو انھیں آپ ﷺ کی نبوت میں شک ہے اور نہ انھیں یہ خوف ہے کہ آپ ﷺ غلط فیصلہ کر کے ان پر ظلم کریں گے (کیونکہ ایسا نہ پہلے کبھی ہوا نہ ہوگا) تو پھر بات یہی رہ جاتی ہے کہ ان کے دلوں ہی میں بیماری ہے، ظالم اور قصور وار یہ خود ہیں، یعنی جس شخص کا ان کے ذمے حق ہے اس کو دبانا چاہتے ہیں۔ (جامع البیان، فتح القدیر)

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''دل میں روگ یہ کہ اللہ اور رسول کو سچ جانا لیکن حرص نہیں چھوڑتی کہ کہے پر چلیں، جیسے بیمار چاہتا ہے کہ چلے مگر پاؤں نہیں اٹھتے۔'' (موضح) اس سے معلوم ہوا کہ جو قاضی کتاب و سنت کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اس کے سمن کو قبول کرنا واجب ہے اور اس سے کترانا اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے سے منہ موڑنا ہے، مگر جو قاضی کتاب و سنت سے بے خبر ہو اور اس نے کسی عالم و مجتہد کے آراء و اجتہادات کو جمع کر رکھا ہو اور اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہو تو اس کے پاس مقدمہ لے جانا اور اس کے سمن کو قبول کرنا ضروری نہیں، اس لیے کہ اس رائے پر عمل کرنا اس مجتہد کے لیے جائز تھا جس کی طرف وہ رائے منسوب ہے اور وہ بھی اس وقت تک جب تک اسے کتاب و سنت کا فیصلہ نہ پہنچا تھا، مگر کسی دوسرے کے لیے اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا اور اس کے مطابق لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرنا صحیح نہیں۔ (شوکانی)

**آیت 51** اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ...... : پچھلی آیات میں منافقین کی حالت بیان ہوئی، اب اس آیت میں خالص مومنوں

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ یَخۡشَ اللّٰهَ وَ یَتَّقۡهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۵۲﴾ وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ اَمَرۡتَهُمۡ لَیَخۡرُجُنَّ ؕ قُلۡ لَّا تُقۡسِمُوۡا ۚ طَاعَةٌ مَّعۡرُوۡفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۳﴾

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے بچے تو یہی لوگ مراد پانے والے ہیں ﴿۵۲﴾ اور انھوں نے اللہ کی قسمیں کھائیں، اپنی پختہ قسمیں کہ اگر واقعی تو انھیں حکم دے تو وہ ہر صورت ضرور نکلیں گے، تو کہہ قسمیں نہ کھاؤ، جانی پہچانی ہوئی اطاعت (ہی کافی ہے)۔ بے شک اللہ اس سے خوب واقف ہے جو تم کرتے ہو ﴿۵۳﴾

کا بیان اور ان کی تعریف ہے، یعنی سچے مومنوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب کسی تنازع کے فیصلے کے لیے انھیں اللہ اور اس کے رسول (کتاب و سنت) کی طرف بلایا جائے، خواہ اس میں بظاہر ان کا نفع ہو یا نقصان تو وہ ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے، بلکہ فوراً کہتے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں کامیاب ہیں۔

**آیت 52** **وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ**...... : "**یَتَّقۡهِ**" اصل میں "یَتَّقِیْهِ" تھا، آیت کے شروع میں اسم جازم "**مَنۡ**" کی وجہ سے اس کی یاء گر گئی اور لفظ "یَتَّقِهِ" ہو گیا، جس میں قاف اور ہاء دونوں پر کسرہ ہے، پھر تخفیف کے لیے قاف کو ساکن کر دیا، جیسے "کَتِفٌ" کی تاء کو ساکن کیا گیا۔ (ابوالسعود) یعنی صرف باہمی جھگڑے ہی کے لیے نہیں بلکہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہر کام میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور کوئی کوتاہی ہو جائے تو اللہ سے ڈرے، اس گناہ سے توبہ کرے اور معافی مانگے اور آئندہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور جو ایسا کریں سو وہی مراد پانے والے ہیں۔

**آیت 53** ① **وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ**...... : "**جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ**" کی دو ترکیبیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ فعل محذوف کا مصدر ہے، جو اس فعل کی تاکید کر رہا ہے: "أَيْ أَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ يَجْهَدُوْنَ أَيْمَانَهُمْ جَهْدًا" اور "**جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ**" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی قسم کھانے کی زیادہ سے زیادہ جو طاقت رکھتے تھے اس کے ساتھ انھوں نے قسم کھائی۔ یہ "جَهَدَ نَفْسَهُ" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے اس نے اپنی جان کی آخری طاقت لگا دی۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے: "أَيْ أَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ مُجْتَهِدِيْنَ فِيْ أَيْمَانِهِمْ" یعنی انھوں نے قسموں میں اپنی پوری کوشش لگاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی۔ (شوکانی) یعنی منافقین کو اپنے طرز عمل کی وجہ سے احساس تھا کہ مسلمان ہماری بات کا اعتبار نہیں کرتے تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سے زیادہ پکی قسمیں کھا کر کہا کہ اگر آپ ہمیں ہمارے گھروں اور اہل و عیال سے نکلنے کا حکم دیں تو ہم ان سے نکل جائیں گے اور اگر جہاد کا حکم دیں تو ہم ہر صورت آپ کے ساتھ جہاد کے لیے نکلیں گے، غرض جو کہیں گے اس پر عمل کریں گے۔ درحقیقت ان کا قسم کھانا ہی اس بات کی چغلی کر رہا تھا کہ ان کی بات کا اعتبار نہیں،

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

کہہ دے اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر تم پھر جاؤ تو اس کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمھارے ذمے وہ جو تم پر بوجھ ڈالا گیا اور اگر اس کا حکم مانو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور رسول کے ذمے تو صاف پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں ﴿۵۴﴾

جیسا کہ متنبی نے کہا ہے ؂

وَ فِيْ يَمِيْنِكَ فِيْمَا أَنْتَ وَاعِدُهُ مَا دَلَّ أَنَّكَ فِي الْمِيْعَادِ مُتَّهَمُ

”اور تو جس بات کا وعدہ کر رہا ہے اس پر تیرے قسم کھانے میں اس بات کی دلیل ہے کہ تو اپنے وعدے میں قابل اعتبار نہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہہ دے کہ قسمیں مت کھاؤ۔

② طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ: ”أَيِ الْمَطْلُوْبُ مِنْكُمْ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ“ یعنی مطلوب تم سے قسمیں لینا نہیں بلکہ مطلوب جانے پہچانے طریقے کے مطابق فرماں برداری ہے اور یہی کافی ہے، قسموں کی ضرورت نہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے: ”طَاعَتُكُمْ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ“ کہ قسمیں مت کھاؤ، تمھاری اطاعت جانی پہچانی اور تمھارا جھوٹ مشہور و معروف ہے، سب جانتے ہیں کہ تم کیسی اطاعت کرتے ہو۔ قسمیں کھانے سے تم مطیع نہیں بن جاؤ گے، تم جو کچھ کر رہے ہو یا کرو گے، جتنا چاہو چھپانے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس دوسری تفسیر کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [ التوبة : ٩٦ ] ”تمھارے لیے قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، پس اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو بے شک اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔“

**آیت 54** ① قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ: یعنی صرف اللہ کا نہیں بلکہ اللہ کا بھی اور اس کے ساتھ رسول کا بھی حکم مانو۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان کا کہنا ماننا یہی ہے کہ ان کی سنت کی پیروی کی جائے۔

② فَاِنْ تَوَلَّوْا: ”تَوَلَّوْا“ اصل میں ”تَتَوَلَّوْا“ ہے، جو مضارع میں سے مخاطب کا صیغہ ہے، معنی ہے اگر تم پھر جاؤ۔ یہ فعل ماضی سے غائب کا صیغہ نہیں، جس کا معنی ہے اگر وہ پھر جائیں، کیونکہ آگے انھیں مخاطب کیا جا رہا ہے: ﴿فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ﴾ یعنی اگر تم کسی طرح کی بھی حکم عدولی کرو گے تو رسول اللہ ﷺ کا کچھ نقصان نہیں۔ اس کی ذمہ داری تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دینا تھی، سو اس نے یہ پیغام پہنچا دیا، اب اس پر عمل کرنا تمھاری ذمہ داری ہے، اگر تم اس سے پیٹھ پھیرتے ہو تو اپنا انجام خود سوچ لو۔

③ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا: یعنی اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے، اس کے سوا جس کی بھی اطاعت کرو

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ

اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین

گے ہدایت نہیں پاؤ گے۔ ابن عطیہ نے یہاں سلف میں سے بعض کا قول نقل فرمایا ہے جو اس آیت کی بہترین تفسیر ہے، لکھتے ہیں: ''جو شخص اپنے قول و فعل میں سنت کو اپنا امیر بنا لے وہ حکمت اور دانائی کی بات کرے گا اور جو اپنے قول و فعل میں خواہش کو امیر بنا لے وہ بدعت کی بات کرے گا۔'' [ المحرر الوجيز ]

④ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ : یعنی اگر تمھیں ہدایت نہ ہو تو گرفت رسول کی نہیں تمھاری ہوگی۔

آیت 55 ① وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ...... : منافقین کی تمام تر زیادتیوں کے باوجود رسول اللہ ﷺ ان سے صرفِ نظر فرماتے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد ﷺ اپنے ہی ساتھیوں کو اور پناہ دینے والوں کو قتل کرتے ہیں۔ اب ایک طرف پورے عرب کے کفار کی دشمنی تھی، دوسری طرف اسلام کے دعوے دار منافقین کی سازشیں تھیں، نتیجتاً مسلمان سخت پریشان اور خوف زدہ رہتے تھے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کا طرزِ عمل بیان کرنے اور انھیں نصیحت کرنے کے بعد مخلص مومنوں کو کئی بشارتیں دیں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی مدینہ میں آئے اور انصار نے انھیں جگہ دی تو سارا عرب ایک کمان کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو گیا، اس لیے مسلمان رات اسلحہ کے ساتھ گزارتے اور دن بھی اسی حال میں گزارتے، حتیٰ کہ وہ یہ کہنے لگ گئے: ''کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم اس وقت تک زندہ رہیں گے جب ہماری راتیں امن و اطمینان سے گزریں گی، ہمیں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا۔'' تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [ النور : ٥٥ ] [ مستدرك حاكم : ٢/ ٤٠١، ح : ٣٥١٢، قال الحاكم صحيح الإسناد وقال الذهبي صحيح ] اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ'' کا معنی ہے، جو اس کے بعد نعمت کی ناشکری کرے گا۔ مسلمانوں کی اس خوف کی حالت کا نقشہ سورۂ انفال (۲۶) میں بہترین صورت میں کھینچا گیا ہے۔

② وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ...... : یعنی تم کھلے اور چھپے دشمن کفار و منافقین کی دشمنی سے پریشان نہ ہو، تم میں سے مخلص مومن جو اعمالِ صالحہ سے آراستہ ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ انھیں عرب و عجم کے کفار و مشرکین کی زمین کا وارث بنائے گا، وہ اس کے جانشین اور حکمران ہوں گے، جیسا کہ اس نے اس سے پہلے کفار و مشرکین کے بعد بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کو جزیرۂ عرب، مصر اور شام کی حکومت بخشی۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے کیا ہوا یہ وعدہ بہت تھوڑے عرصے میں پورا فرما دیا، ہجرت کے بعد دس سال کے اندر، جب کہ ابھی رسول اللہ ﷺ زندہ تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ، خیبر، بحرین، یمن

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

کو ضرور ہی اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ہر صورت انھیں ان کے خوف کے بعد بدل

اور پورے جزیرۂ عرب پر فتح عطا فرما دی۔ آپ ﷺ ہجر کے مجوسیوں اور شام کے کئی علاقوں سے جزیہ وصول کرنے لگے، روم کے بادشاہ ہرقل، مصر کے بادشاہ مقوقس اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے آپ کی خدمت میں ہدیے ارسال کیے۔ جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے تو خلفائے اسلام نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور آپ ﷺ کے طریقے پر چل کر انھوں نے مشرق و مغرب کا بہت سا حصہ فتح کر لیا۔ اس وقت کے سب سے مضبوط حکمران کسریٰ کے تخت پر قبضہ کر لیا اور قیصر کو اس کے مملوکہ علاقوں شام وغیرہ سے ایسا نکالا کہ اسے قسطنطنیہ میں پناہ لینا پڑی۔ مشرق میں چین اور مغرب میں افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ مسلمان ان کی گردنوں اور ان کے خزانوں کے مالک بن گئے اور رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی: (( إِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْأَرْضَ، فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَ مَغَارِبَهَا، وَ إِنَّ أُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا، وَ أُعْطِيْتُ الْكَنْزَيْنِ الْأَحْمَرَ وَالْأَبْيَضَ )) [ مسلم، الفتن، باب هلاك هذه الأمة بعضهم ببعض: ۲۸۸۹ ] ”اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین لپیٹ دی تو میں نے اس کے تمام مشرق اور مغرب دیکھ لیے اور میری امت کی سلطنت اس کے ان مقامات تک پہنچے گی جو مجھے لپیٹ کر دکھائے گئے اور مجھے سرخ اور سفید دو خزانے عطا کیے گئے۔“

③ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ : یہ دوسرا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے ان کے اس دین کو اقتدار بخشے گا جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، یعنی مسلمانوں کو ایسا اقتدار ملے گا جس میں کسی اور آئین و قانون کا نہیں بلکہ اللہ کے دین اسلام کا مکمل غلبہ ہوگا، اس میں اللہ کی بات سب سے اونچی اور اس کا بول سب سے بالا ہوگا۔ دین کا یہ اقتدار پوری دنیا پر ہوگا۔ تمیم داری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: (( لَيَبْلُغَنَّ هٰذَا الْأَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَلَا يَتْرُكُ اللّٰهُ بَيْتَ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ هٰذَا الدِّيْنَ بِعِزِّ عَزِيْزٍ أَوْ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ، عِزًّا يُعِزُّ اللّٰهُ بِهِ الْإِسْلَامَ، وَ ذُلًّا يُذِلُّ اللّٰهُ بِهِ الْكُفْرَ )) [ مسند أحمد: ۱۰۳/۴، ح: ۱۶۹۵۹، قال محقق المسند إسناده صحيح على شرط مسلم ] ”یہ کام یعنی دین اسلام وہاں تک پہنچے گا جہاں رات اور دن پہنچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کوئی اینٹوں کا بنا ہوا مکان چھوڑے گا اور نہ ریشم کا بنا ہوا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں اس دین کو داخل کر دے گا، عزت والے کو عزت دے کر اور ذلیل کو ذلت دے کر۔ عزت ایسی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اسلام کو عزت بخشے گا اور ذلت ایسی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کفر کو ذلیل کرے گا۔“ اس پیش گوئی کا اکثر حصہ خلفائے راشدین، خلفائے بنی امیہ اور عثمانی خلفاء کے ہاتھوں پورا ہوا اور جو رہ گیا ہے وہ بھی پورا ہو کر رہے گا، مسلمانوں میں دین کی طرف رجوع اور جذبہ جہاد کی بیداری آنے والی صبح روشن کی نوید ہیں۔

④ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا : یہ تیسرا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خوف کی حالت بدل کر امن عطا فرمائے گا۔ جہاد کی بدولت کفار یا تو اسلام قبول کر کے اس کے محافظ بن جائیں گے، یا محکوم ہو کر جزیہ دیں گے۔ اللہ کے احکام پر عمل کی

خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

کر امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ نافرمان ہیں ﴿۵۵﴾

بدولت خوش حالی کا دور دورہ ہوگا اور حدود اللہ کے نفاذ کی برکت سے اسلام کے زیر نگیں تمام علاقے امن کی نعمت سے فیض یاب ہوں گے۔ عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا جب آپ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے آپ سے فاقے کی شکایت کی، پھر ایک اور آیا اور اس نے ڈاکے اور راہ زنی کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا: ''عدی! تم نے حیرہ (شہر) دیکھا ہے؟'' میں نے کہا: ''میں نے اسے نہیں دیکھا، لیکن میں نے اس کے متعلق سنا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تمھاری زندگی لمبی ہوئی تو تم اونٹنی پر سوار ایک عورت کو دیکھو گے، وہ حیرہ سے سفر کرے گی، حتیٰ کہ کعبہ کا طواف کرے گی، اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہیں ہوگا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا، تو بنو طے کے وہ بدمعاش کہاں جائیں گے جنھوں نے شہروں میں آگ لگا رکھی ہے؟ (آپ نے مزید فرمایا): ''اور اگر تمھاری زندگی لمبی ہوئی تو تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔'' میں نے کہا: ''کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں، کسریٰ بن ہرمز کے خزانے، اور اگر تمھاری زندگی لمبی ہوئی تو تم آدمی کو دیکھو گے، وہ سونے یا چاندی سے اپنی لپ بھر کر اس شخص کی تلاش میں نکلے گا جو اس سے اسے قبول کرے، مگر اسے کوئی شخص نہیں ملے گا جو اس سے قبول کرے......'' عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''پھر میں نے اونٹنی پر سوار ایک عورت کو دیکھا جو حیرہ سے سفر شروع کرتی تھی، حتیٰ کہ کعبہ کا طواف کرتی تھی اور میں ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کیے اور اگر تمھاری زندگی لمبی ہوئی تو تم وہ بھی دیکھ لو گے جو نبی ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی سونے چاندی سے لپ بھر کر صدقہ نکالے گا۔'' [ بخاري، المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام : ۳۵۹۵ ]

⑤ **یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا** : یعنی وہ لوگ جن کے ساتھ خلافتِ ارضی، دین کے غلبے اور خوف کے بعد امن عطا کرنے کا وعدہ ہے، وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں گے، صرف اللہ کی عبادت کریں گے، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں میں ان اوصاف میں سے کسی وصف کی کمی ہوگی یا سرے سے ان سے عاری ہوں گے انھیں حکومت مل بھی جائے تو دین کے غلبے اور امن کی نعمت میسر نہ ہوگی۔

⑥ یہ آیت خلفائے راشدین کی خلافت کے برحق ہونے کی بہت بڑی اور واضح دلیل ہے، کیونکہ اس آیت میں اگرچہ خلافت، تمکینِ دین اور خوف کے بعد امن کا وعدہ ان تمام لوگوں سے ہے جو ایمان اور عمل صالح پر کاربند ہوں، خواہ کسی زمانے میں ہوں، مگر اس کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا جو ''تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔'' اس لیے اس آیت کے سب سے پہلے مصداق بھی وہی ہیں اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر

سکتا کہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں خلافت بخشی، ان کے زمانے میں دین غالب ہوا، اللہ کی حدود قائم ہوئیں، مسلمانوں کو امن میسر رہا اور تمام دنیا کے کافر مرعوب و مقہور رہے۔ ان کے بعد بھی جن خلفاء نے جہاد جاری رکھا، اللہ کی حدود پر عمل کیا اور کسی بھی قسم کے شرک سے آلودہ نہیں ہوئے، وہ بھی اس کے مصداق ہیں اور ان کے زمانے میں بھی دین غالب رہا اور مسلمانوں کو امن کی نعمت میسر رہی۔

آئندہ جو لوگ ان اوصاف سے آراستہ ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھی یہ وعدہ پورا فرمائے گا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ خلافت صرف تیس (۳۰) برس قائم رہی ان کی بات اس حد تک تو درست ہے کہ اعلیٰ درجے کے اوصاف والے لوگ یہی خلفاء تھے، کیونکہ وہ براہِ راست نبی کریم ﷺ کے تربیت یافتہ تھے اور انھیں ایمان میں سبقت اور ہجرت کا شرف بھی حاصل تھا، ان کے بعد والوں کو یہ سارے فضائل حاصل نہ تھے، اس لیے ان کی خلافت اس بلند ترین درجے کی نہ تھی، مگر یہ بات غلط ہے کہ اس کے بعد امتِ مسلمہ اللہ کے اس وعدے سے محروم ہو گئی۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ان تیس (۳۰) سالوں کے بعد بھی ایسے خلفاء کی پیش گوئی فرمائی ہے جن کے زمانے میں دین غالب ہوگا۔ چنانچہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا، میرے ساتھ میرے والد بھی تھے، میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: (( لَا يَزَالُ هٰذَا الدِّيْنُ عَزِيْزًا مَنِيْعًا إِلَى اثْنَيْ عَشَرَ خَلِيْفَةً )) ''یہ دین بارہ خلیفوں تک خوب غالب اور محفوظ رہے گا۔'' پھر آپ ﷺ نے ایک بات کی جو لوگوں نے مجھے سننے نہیں دی، میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ ﷺ نے کیا فرمایا ہے؟ تو انھوں نے بتایا: (( كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ )) ''وہ سب قریش سے ہوں گے۔'' [ مسلم، الإمارة، باب الناس تبع لقريش : ۱۸۲۱/۹ ] ابوداؤد کی روایت (۴۲۷۹) میں یہ الفاظ بھی ہیں: (( كُلُّهُمْ تَجْتَمِعُ عَلَيْهِ الْأُمَّةُ )) ''ان سب پر امت مجتمع ہوگی۔'' علامہ البانی رحمہ اللہ نے ان الفاظ کو ضعیف کہا ہے۔

ان بارہ خلفاء سے مسلسل خلفاء مراد ہیں، یا درمیان میں کچھ وقفے سے آنے والے خلفاء مراد ہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے امتِ مسلمہ میں نااہل لوگوں کے بعد پھر نبوی طریقے پر خلافت قائم ہونے کی پیش گوئی فرمائی ہے، حتیٰ کہ آخر زمانے میں مہدی خلیفہ راشد ہوں گے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا فَيَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَّكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، ثُمَّ سَكَتَ )) [ مسند أحمد : ۲۷۳/۴، ح : ۱۸٤۳٦، مسند احمد کے محقق اور شیخ البانی نے صحیحہ (۵) میں اسے حسن کہا ہے ] ''تم میں نبوت رہے گی جب تک اللہ نے چاہا کہ رہے، پھر جب وہ اسے اٹھانا چاہے گا اٹھا لے گا، پھر نبوت کے طریقے پر خلافت ہوگی اور اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے، پھر اللہ اسے اٹھا لے گا جب چاہے گا کہ اسے اٹھا لے پھر ''ملک عاض'' (دانتوں سے کاٹنے والی بادشاہی) ہوگی

اور جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے، وہ رہے گی، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے اٹھانا چاہے گا، تو اٹھا لے گا، پھر جبر والی بادشاہی ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے، وہ رہے گی، پھر جب وہ چاہے گا کہ اسے اٹھائے تو اٹھا لے گا، پھر نبوت کے طریقے پر خلافت ہوگی۔'' پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔''

اس آیت اور ان احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کو ہمیشہ پُر امید رہنا چاہیے کہ جب بھی مسلمان ایمان اور عمل صالح پر کاربند ہو گئے، اللہ کے ساتھ شرک سے تائب ہو گئے، اپنی روزمرہ کی زندگی، اپنی معیشت، اپنی سیاست، غرض ہر چیز میں غیر اللہ کے حکم سے مکمل منہ موڑ کر ایک اللہ کے حکم پر چلنے لگے اور اس کے مطابق فیصلے کرنے لگے، اللہ کے سوا ہر حاجت روا اور مشکل کُشا کو چھوڑ کر ایک اللہ سے استغاثہ و استعانت کرنے لگے، بزدلی اور دنیا سے محبت کے بجائے شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر جہاد کرنے لگے، تو اللہ تعالیٰ انھیں ضرور خلافت علی منہاج النبوۃ کی نعمت عطا فرمائے گا، کیونکہ اسے ایمان اور عمل صالح سے مزین ایسے بندے مطلوب ہیں جو "يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا" کی عملی تصویر ہوں، یعنی صرف اس کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ البتہ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جب تک مسلمانوں کی موجودہ حالت نہیں بدلتی کہ ان کی عدالتوں میں کفار کا قانون رائج ہے، ان کی تجارت سود پر مبنی ہے، ان کی حکومت کا طریقہ کفار سے لیا ہوا ہے، ان کے معاشرے میں ہندوؤں اور یہود و نصاریٰ کی رسوم جاری ہیں، ان کی مساجد کے اندر پختہ قبروں کی پرستش ہو رہی ہے، ایک اللہ کو حاجت روا اور مشکل کُشا ماننے کے بجائے ہر ایک نے اپنا الگ داتا و دستگیر بنا رکھا ہے، وہ ایک امت بننے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ موجودہ حالت کے بدلنے تک اس خلافت کی نعمت کا حصول ایک خوبصورت خواب کے سوا کچھ نہیں جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔

7 کچھ لوگوں نے چار صحابہ کے سوا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر کہنا اپنے دین کا جز بنا لیا ہے کوئی ان سے پوچھے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح والوں سے خلافت عطا کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ کس طرح اور کن لوگوں کے ذریعے سے پورا ہوا؟ اگر وہ اپنے بارہ (۱۲) خود ساختہ اماموں کو حقیقی خلفاء بتائیں تو بتائیں علی اور حسن رضی اللہ عنہما کو چھوڑ کر دوسرے دس (۱۰) خلفاء و ائمہ کی حکومت زمین کے کس خطے پر تھی، ان میں سے کس نے امن کے ساتھ حکومت کی؟ ان ائمہ کی حالت تو یہ تھی کہ یہ حضرات خود بتاتے ہیں کہ ان کا بارھواں امام دشمنوں کے خوف سے ایک غار میں چھپ گیا اور آج تک نمودار نہیں ہوا۔ پھر اللہ کا وعدہ کن لوگوں کے ذریعے سے پورا ہوا؟ ان لوگوں کے باطل پر ہونے کے لیے یہ بات بھی ایک واضح اور فیصلہ کن دلیل ہے کہ اسلام کے مرکز مکہ اور مدینہ میں ان ساڑھے چودہ سو سال میں حکومت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، یا پھر ان سے محبت کرنے والے۔ آج تک اللہ تعالیٰ نے اس پاک سرزمین میں صحابہ کے دشمنوں کے ناپاک قدم جمنے نہیں دیے۔

8 وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: فاسق کے کئی درجے ہیں، کامل فاسق وہی ہے جو ایمان ہی سے نکل جائے۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اس خلافت کے بعد جو لوگ کفر کریں اور کفر ہی پر مریں تو یہی لوگ پورے نافرمان ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو کوئی خلفائے اربعہ کی خلافت (اور ان کے فضل و شرف) سے منکر ہوا ان الفاظ سے اس کا حال سمجھا گیا۔''

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾

ع ۷/۱۳

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کا حکم مانو، تاکہ تم رحم کیے جاؤ ﴿۵۶﴾ تو ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، ہرگز گمان نہ کر کہ وہ زمین میں عاجز کرنے والے ہیں اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور بلاشبہ وہ بری لوٹ کر جانے کی جگہ ہے ﴿۵۷﴾

**آیت 56** وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ...... : اس کا عطف "يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا" پر ہے، کیونکہ وہ اگرچہ لفظوں میں خبر ہے مگر معنی کے لحاظ سے امر ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے: " اُعْبُدُوْنِيْ وَلَا تُشْرِكُوْا بِيْ شَيْئًا وَأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ...... " خبر کے امر کے معنی میں ہونے کی ایک مثال یہ آیت ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ آگے فرمایا: ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ﴾ [ الصف : ۱۰ تا ۱۲ ] اس میں "يَغْفِرْ" پر جزم اس لیے ہے کہ یہ امر کا جواب ہے، جو "تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ" خبر کی صورت میں ہے۔ (ابن عاشور) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خلافتِ ارضی کے حصول اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حق دار بننے کا طریقہ بیان فرمایا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ (یہ بات " يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا "واؤ پر عطف سے ظاہر ہے) اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کی فرماں برداری کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یہ نہایت جامع آیت ہے، دین کی کوئی بات باقی نہیں رہی جو اس آیت میں نہ آتی ہو۔ اللہ کی توحید کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا خاص ذکر کر کے رسول کا ہر حکم ماننے کا حکم دیا۔

**آیت 57** لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ...... : مشرکین عام طور پر ہمیشہ تعداد اور قوت میں زیادہ رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی یہی حال تھا کہ مسلمان کمزور تھے، ان سے خوف زدہ رہتے تھے، تو ایسے حالات میں ان کے لیے خلافت کا وعدہ عجیب اور ناممکن سی بات نظر آتا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ کافروں کے متعلق یہ گمان ہرگز نہ کریں کہ وہ اللہ کو مقابلے میں عاجز کر دیں گے، یہ لوگ جتنی تعداد اور قوت میں ہوں، جتنی چال بازیاں اور فوجیں اکٹھی کر لیں، مقابلہ ان کا اللہ تعالیٰ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ لوگ کسی صورت مقابلے میں عاجز نہیں کر سکتے۔ کعب رضی اللہ عنہ کا شعر ہے ؎

هَمَّتْ سَخِيْنَةُ أَنْ تُغَالِبَ رَبَّهَا فَلَيُغْلَبَنَّ مُغَالِبُ الْغَلَّابِ

"سخینہ (قریش) نے ارادہ کیا کہ اپنے رب سے مقابلے میں غالب آئیں، مگر اس زبردست غالب کا مقابلہ کرنے والا تو ہر صورت مغلوب ہی ہوگا۔" [ مستدرك حاكم : ۳/۴۸۸، ح : ۶۰۶۵، حاکم، ذہبی اور البانی نے اسے صحیح کہا ہے ]

یہ حال تو دنیا میں ہوگا اور آخری مقام ان کا جہنم ہے اور وہ لوٹ کر جانے کے لیے بہت بری جگہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۛ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! لازم ہے کہ تم سے اجازت طلب کریں وہ لوگ جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوئے اور وہ بھی جو تم میں سے بلوغت کو نہیں پہنچے، تین بار، فجر کی نماز سے پہلے اور جس وقت تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین تمھارے لیے پردے (کے وقت) ہیں، ان کے بعد نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر۔ تم پر کثرت سے چکر لگانے والے ہیں، تمھارے بعض بعض پر۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۸﴾

**آیت 58** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ …… : یہاں سے پھر انھی احکام کی تکمیل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو آیت (۳۴) تک بیان ہو رہے تھے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جنھیں گھر میں داخلے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں اور یہ بھی کہ تین اوقات میں انھیں بھی اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ دو قسم کے لوگ ہیں، آدمی کے لونڈی و غلام اور نابالغ بچے۔ انھیں داخلے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں، کیونکہ گھروں میں ان کا آنا جانا کثرت سے ہوتا ہے اور ان پر اجازت کی پابندی لگانے سے دشواری اور تنگی پیدا ہوتی ہے۔ "طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ" میں یہی حکمت بیان ہوئی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام میں انسانوں کی آسانی کو مدنظر رکھا ہے اور اس کے ہر حکم میں حکمت ہے، خواہ ہمیں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے۔

② "ثَلٰثَ مَرّٰتٍ" سے مراد تین اوقات ہیں، یعنی ان تین اوقات میں اجازت مانگیں، جن کا ذکر آگے فرمایا ہے، یعنی نمازِ فجر سے پہلے، دوپہر کو آرام کے وقت جب عموماً آرام کے لیے کپڑے اتار دیے جاتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تینوں وقت پردے کے اوقات ہیں، ان اوقات میں آدمی ایسی حالت میں بھی ہوتا ہے کہ جس پر کسی کا بھی مطلع ہونا درست نہیں۔ "ثَلٰثَ مَرّٰتٍ" کی ایک تفسیر یہ ہے کہ غلام اور بچے بھی ان تین اوقات میں تین دفعہ اجازت مانگیں، اجازت مل جائے تو اندر آ جائیں ورنہ واپس چلے جائیں۔ (بقاعی) اس تفسیر میں "ثَلٰثَ مَرّٰتٍ" کے لفظ سے محض گنتی بتانے کے بجائے ایک مستقل حکم معلوم ہوتا ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے سب لوگوں کے لیے تمام اوقات میں اپنے گھر کے سوا دوسرے گھروں میں جانے کے متعلق بیان فرمایا کہ اجازت مانگنا تین دفعہ ہے، اگر مل جائے تو بہتر ورنہ واپس ہو جانا چاہیے۔ [ دیکھیے بخاري : ٦٢٤٥۔ أبو داوٗد : ٥١٨٠ ] اس آیت میں ان تین اوقات میں غلاموں اور بچوں کو بھی تین دفعہ اجازت مانگنے کا پابند فرمایا۔

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَ اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

اور جب تم میں سے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں تو اسی طرح اجازت طلب کریں جس طرح وہ لوگ اجازت طلب کرتے رہے جوان سے پہلے تھے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۹﴾ اور عورتوں میں سے بیٹھ رہنے والیاں، جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں سو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے کپڑے اتار دیں، جب کہ وہ کسی قسم کی زینت ظاہر کرنے والی نہ ہوں اور یہ بات کہ (اس سے بھی) بچیں ان کے لیے زیادہ اچھی ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۶۰﴾

③ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ : یعنی ان تین اوقات کے سوا غلام اور بچے بلا اجازت آ جا سکتے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی ایسی حالت میں ہے جو مناسب نہیں تو غلاموں اور بچوں کا قصور نہیں، خود اس کی نالائقی ہے۔

④ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ : آیات کو کھول کر وہی بیان کر سکتا ہے جس کا علم کامل ہو اور حکمت بھی کامل ہو، کوئی دوسرا جتنی وضاحت بھی کر لے اپنے علم و حکمت کی نارسائی کی وجہ سے اس کی بات پوری ہی نہیں ہوگی، پوری طرح واضح ہونا تو دور کی بات ہے۔

**آیت 59** وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا ...... : بالغ ہونے کے بعد بچوں کو بھی اجازت لینا ضروری ہے، جس طرح ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جن کا ذکر اس سے پہلے آیت (۲۷) "لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا" میں آیا ہے اور جس طرح بالغ ہونے والے ان بچوں سے پہلے دوسرے بالغ لوگ اجازت لیتے چلے آئے ہیں، بالغ ہونے کے بعد انھیں بھی ہر حال میں اجازت لے کر آنا ہوگا۔ عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ''کیا میں اپنی بہن کے پاس جانے کے لیے بھی اجازت مانگوں؟'' فرمایا: ''ہاں!'' میں نے پھر سوال دہرایا: ''میری پرورش میں میری دو بہنیں ہیں، ان کا خرچہ میرے ذمے ہے، ان کے پاس بھی اجازت لے کر جاؤں؟'' فرمایا: ''ہاں! کیا تم پسند کرتے ہو کہ انھیں برہنہ حالت میں دیکھو۔'' پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ [ النور : ۵۸ ] "ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ" تک، تو ان لوگوں کو صرف ان تین اوقات میں اجازت مانگنے کا حکم دیا گیا، پھر فرمایا: ﴿ وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا ﴾ [ النور : ۵۹ ] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اب اجازت لینا واجب ہے۔'' [ الأدب المفرد للبخاري : ۱۰۶۳ ]

**آیت 60** ① وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا ...... : بچوں کو بالغ ہونے کے بعد اجازت طلب کرنے کی

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰٓى

نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے اور نہ خود تم پر کہ تم اپنے گھروں

پابندی کے ذکر کے بعد عورتوں کے سن یاس کو پہنچنے کے بعد ان کے لیے پردے کی پابندی میں تخفیف کا حکم بیان فرمایا۔
”اَلْقَوَاعِدُ“ ”قَاعِدٌ“ کی جمع ہے، جو مذکر کا صیغہ ہونے کے باوجود عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ”حَائِضٌ“ اور ”حَامِلٌ“ ہے، یعنی وہ عورتیں جو بڑی عمر کو پہنچ جائیں، انھیں نکاح کی رغبت نہ رہے، نہ دوسروں کو ان سے نکاح کی دلچسپی رہے، ان کے لیے رعایت ہے کہ وہ غیر محرم مردوں سے پردہ نہ کریں تو ان پر گناہ نہیں، بشرطیکہ وہ اپنی زینت کا اظہار کرنے والی نہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عورتیں جن کے حسن و جمال میں مردوں کے لیے کشش باقی ہو، انھیں پردہ اتارنا جائز نہیں۔
طبری نے معتبر سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ کا قول نقل فرمایا ہے: ”آیت ”وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا“ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی عورت پر گناہ نہیں کہ گھر میں قمیص اور دوپٹے کے ساتھ رہے اور بڑی چادر اتار دے، جب تک وہ زینت ظاہر نہ کرے، جسے ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔“ (طبری: ۲۶۴۰۹) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یعنی بوڑھی عورتیں گھر میں تھوڑے کپڑوں میں رہیں تو درست ہے اور پورا پردہ رکھیں تو اور بہتر ہے۔“ گھر سے باہر بھی اگر وہ برقع یا بڑی چادر نہ لیں تو حرج نہیں، بشرطیکہ وہ کسی قسم کی زینت کا اظہار نہ کر رہی ہوں۔ ”بِزِيْنَةٍ“ میں تنوین سے ظاہر ہے کہ بوڑھی عورت کے لیے غیر محرموں کے سامنے کسی بھی طرح کی زینت کا اظہار جائز نہیں۔
② مرد جس عمر کو بھی پہنچ جائے اور جتنا بوڑھا بھی ہو جائے اگر غیر محرم ہے تو عورت کو اس سے پردہ کرنا لازم ہے، بعض عورتوں کا بوڑھوں سے پردہ اتار دینا درست نہیں۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی اس سے پردہ نہ کرنے کی اجازت نہیں آئی۔
③ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ : یعنی اجازت طلب کرنے اور پردہ کرنے کے یہ احکام فتنے کی روک تھام کے ظاہری اسباب ہیں، باقی پردے کے اندر جو کچھ ہوتا ہے اور جو فتنے اٹھائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو سنتا اور جانتا ہے اور وہ اسی کے موافق ہر ایک سے معاملہ فرمائے گا۔

**آیت 61** ① لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ ...... : بعض مفسرین نے فرمایا، اس آیت کے دو حصے ہیں، ایک شروع سے ”وَ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ“ تک اور دوسرا ”وَ لَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ“ سے آخر تک۔ پہلے حصے کا تعلق جہاد سے ہے کہ اندھے، لنگڑے اور بیمار اگر جہاد میں نہ جا سکیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ وہ معذور ہیں۔ سورۂ فتح کی آیت (۱۷) میں بعینہٖ یہی الفاظ: ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ اسی مفہوم کے لیے آئے ہیں اور سورۂ توبہ کی آیت (۹۱): ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى﴾ میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ عرب لوگ اندھے، لنگڑے اور مریض کے ساتھ کھانے سے کراہت محسوس کرتے تھے، اس پر فرمایا کہ ان کے ساتھ کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ تم پر کوئی حرج نہیں کہ اندھے،

اَنۡفُسِكُمۡ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا مِنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اٰبَآئِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اُمَّهٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اِخۡوَانِكُمۡ

سے کھاؤ، یا اپنے باپوں کے گھروں سے، یا اپنی ماؤں کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں

لنگڑے یا مریض کے ساتھ مل کر کھاؤ، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اندھے پر کوئی حرج نہیں، نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ مریض پر کوئی حرج ہے۔

تیسری تفسیر جو اس مقام سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، یہ ہے کہ یہاں "لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ" سے آیت کے آخر تک ایک ہی مسئلہ بیان ہوا ہے۔ طبری نے اپنی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ ﴾ [ النساء : ۲۹ ] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔" تو مسلمانوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپس میں اپنے اموال باطل طریقے سے کھانے سے منع فرمایا ہے اور کھانا ہمارے ان اموال میں سے ہے جو سب سے بہتر ہیں، اس لیے ہم میں سے کسی کو حلال نہیں کہ کسی کے ہاں کھانا کھائے، تو لوگوں نے ایک دوسرے کے ہاں کھانا چھوڑ دیا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ ...... اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ ﴾ (طبری: ۲۶۴۲۶) اس تفسیر کے مطابق اندھے، لنگڑے اور بیمار کو اجازت دی گئی ہے کہ معذور ہونے کی وجہ سے ان کا لوگوں پر حق ہے کہ وہ بھوک مٹانے کے لیے ہر جگہ اور ہر گھر سے کھا سکتے ہیں، انھیں خواہ مخواہ کی عزت نفس کے یا حرام سے اجتناب کے خیال میں مبتلا ہو کر کسی دوسرے کے کھانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ مجاہد نے آیت زیر تفسیر کے متعلق فرمایا: "آدمی کسی اندھے یا لنگڑے یا بیمار کو لے کر اپنے باپ یا بھائی یا بہن یا پھوپھی یا خالہ کے گھر (کچھ کھلانے کے لیے) لے جاتا تو وہ معذور لوگ اس میں گناہ محسوس کرتے کہ یہ لوگ ہمیں دوسروں کے گھروں میں لے جاتے ہیں۔ اس پر یہ آیت ان کے لیے رخصت بیان کرنے کے لیے اتری۔" [ مسند عبد الرزاق و سنده صحیح ]

اس کے بعد عام لوگوں کا ذکر فرمایا کہ وہ اپنے گھروں سے اور ان لوگوں کے گھروں سے کھا سکتے ہیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحب خانہ باقاعدہ اجازت دے تو کھائیں، ورنہ خیانت ہوگی۔ آدمی اگر ان میں سے کسی کے گھر جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اس کے بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بلا تکلف کھایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کھانا سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو مزید اجازت کی درخواست محض تکلف ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اپنے گھروں سے تو ہر شخص ہی کھاتا ہے، یہ کہنے میں کیا حکمت ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے گھروں سے کھاؤ؟ جواب یہ ہے کہ اس میں دو حکمتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اپنے گھروں سے کھانے اور مذکورہ رشتہ داروں کے گھروں سے کھانے میں کوئی فرق نہیں، جس طرح اپنے گھروں سے کھا سکتے ہو ایسے ہی ان لوگوں کے گھروں سے بھی کھا سکتے ہو۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ "اپنے گھروں" کے لفظ میں اپنے گھر کے علاوہ اپنی اولاد کا گھر بھی شامل ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ آیت میں کھانے کی اجازت کے سلسلے میں اولاد کا الگ ذکر نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے

اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ

کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا (اس گھر سے) جس کی چابیوں کے تم مالک بنے ہو، یا اپنے دوست (کے گھر) سے، تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اکٹھے کھاؤ یا الگ الگ۔ پھر جب تم کسی طرح کے گھروں میں داخل ہو تو اپنے

فرمایا ہے: ((أَنْتَ وَ مَالُكَ لِأَبِيْكَ)) [ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٦٣/٦، ح : ٢٥٦٤۔ أبو داؤد : ٣٥٣٠ ] ”تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لیے ہے۔“

② آباء میں باپ دادا اور نانا اوپر تک شامل ہیں، اسی طرح امہات میں دادی اور نانی اوپر تک اور اخوان، اخوات، اعمام، عمات، اخوال اور خالات میں حقیقی، عینی اور علاتی بھائی بہنیں، چچا، ماموں اوپر تک اور ان کی اولادیں بھی شامل ہیں، سب کے گھروں سے کھانے کی اجازت ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت سے بعض اہلِ علم نے استدلال فرمایا ہے کہ اقارب میں سے ہر ایک کا نفقہ دوسرے پر واجب ہے، اگر وہ ضرورت مند ہوں۔

③ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ : طبری نے معتبر سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل فرمائی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی شخص کو اپنی جائداد (گھر یا باغ وغیرہ) کا نگران مقرر کر دے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے رخصت عطا فرمائی کہ اپنی زیر حفاظت ونگرانی گھر یا باغ سے کھانا یا پھل وغیرہ کھا لے یا دودھ پی لے۔

④ اَوْ صَدِيْقِكُمْ : یہ ”صَدِيْقٌ“ (دوست) دال کی تشدید کے بغیر ہے اور ”صَدَاقَةٌ“ (دوستی) سے مشتق ہے۔ یہ وزن (فَعِيْلٌ) واحد، جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لیے ایک ہی ہوتا ہے۔ ”صِدِّيْقٌ“ دال کی تشدید کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے بہت سچا یا بہت تصدیق کرنے والا۔ ”صَدِيْقِكُمْ“ سے مراد وہ بے تکلف دوست ہیں جن کی عدم موجودگی میں اگر ان کے گھر سے کوئی چیز کھائی جائے تو وہ ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوتے ہیں۔

⑤ بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ اس آیت میں جن لوگوں کے گھروں سے کھانے کی اجازت دی گئی ہے ان کی طرف سے بھی اجازت ہونی چاہیے، وہ اجازت خواہ عام ہو یا خاص، اگر وہ ناگواری محسوس کریں تو ان کے گھروں سے کھانا درست نہیں، حتیٰ کہ کسی بھائی کی لاٹھی اٹھانا بھی اس کی دلی خوشی کے بغیر جائز نہیں۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ((لَا يَأْخُذَنَّ أَحَدُكُمْ مَتَاعَ أَخِيْهِ لَاعِبًا وَلَا جَادًّا وَ مَنْ أَخَذَ عَصَا أَخِيْهِ فَلْيَرُدَّهَا)) [ أبوداؤد، الأدب، باب من يأخذ الشيء من مزاح : ٥٠٠٣، قال الألباني حسن ] ”تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کا سامان نہ لے، نہ ہنسی مذاق کرتے ہوئے اور نہ سنجیدگی سے اور جس نے اپنے بھائی کی لاٹھی لی ہو وہ اسے واپس کرے۔“ اور بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان گھروں سے کھانے کی اجازت دے دی تو کھانے کے لیے گھر والوں سے اجازت

فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٦١﴾

ع ۸ ۱۴

لوگوں پر سلام کہو، زندہ سلامت رہنے کی دعا جو اللہ کی طرف سے مقرر کی ہوئی بابرکت، پاکیزہ ہے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ جاؤ ﴿٦١﴾

لینا ضروری نہیں، اس میں نہ کھانے والوں کو حجاب کرنا چاہیے، نہ اہلِ خانہ کو دریغ کرنا چاہیے۔

⑥ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا : کھانے کے متعلق جاہلیت میں دو طرح کا غلو پایا جاتا تھا، کچھ لوگ تو وہ تھے جو اکیلے اکیلے کھانا کھاتے تھے اور کسی دوسرے کے ساتھ مل کر کھانے سے نفرت کرتے تھے، جیسا کہ ہندوؤں کا طریقہ ہے، یا جس طرح اب بھی کفار سے متاثر بعض لوگ جراثیم کے ذریعے سے بیماری لگ جانے کے خوف سے کسی دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے اور کچھ لوگ وہ تھے جو اکیلا کھانے کو بخل اور کمینگی سمجھتے تھے اور جب تک کوئی دوسرا ساتھی نہ ملتا کھانا نہیں کھاتے تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات فاقہ کر جاتے، تو اللہ تعالیٰ نے دونوں پابندیاں ختم کر کے عام اجازت دے دی کہ الگ الگ کھاؤ یا اکٹھے مل کر کھاؤ، دونوں صورتوں میں تم پر گناہ نہیں۔

اگرچہ الگ الگ کھانے کی اجازت ہے مگر مل کر کھانا افضل ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( طَعَامُ الْاِثْنَيْنِ كَافِي الثَّلَاثَةِ وَ طَعَامُ الثَّلَاثَةِ كَافِي الْأَرْبَعَةِ )) [ بخاري، الأطعمة، باب طعام الواحد يكفي الاثنين : ۵۳۹۲ ] ”دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہوتا ہے اور تین آدمیوں کا کھانا چار کو کافی ہوتا ہے۔“ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( طَعَامُ الْوَاحِدِ يَكْفِي الْاِثْنَيْنِ وَطَعَامُ الْاِثْنَيْنِ يَكْفِي الْأَرْبَعَةَ وَطَعَامُ الْأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ )) [ مسلم، الأشربة، باب فضيلة المواساة في الطعام القليل...... : ۲۰۵۹ ] ”ایک آدمی کا کھانا دو کو کافی ہو جاتا ہے اور دو کا کھانا چار کو اور چار کا آٹھ کو کافی ہو جاتا ہے۔“

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ الْأَشْعَرِيِّينَ، إِذَا أَرْمَلُوا فِي الْغَزْوِ، أَوْ قَلَّ طَعَامُ عِيَالِهِمْ بِالْمَدِينَةِ، جَمَعُوا مَا كَانَ عِنْدَهُمْ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ اقْتَسَمُوهُ بَيْنَهُمْ فِي إِنَاءٍ وَاحِدٍ، بِالسَّوِيَّةِ، فَهُمْ مِنِّي وَ أَنَا مِنْهُمْ )) [ مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل الأشعريين رضي الله عنهم : ۲۵۰۰ ] ”اشعری لوگ جب لڑائی میں (کھانے کے حوالے سے) محتاج ہو جاتے ہیں، یا مدینہ میں ان کے بال بچوں کا کھانا کم ہو جاتا ہے، تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے وہ اسے ایک کپڑے میں اکٹھا کرتے ہیں، پھر آپس میں برابر بانٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔“

⑦ فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ ...... : اس میں گھروں میں داخلے کا ادب بیان فرمایا کہ داخل ہوتے وقت گھر والوں کو سلام کہے۔ ”عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ“ سے مراد اپنے لوگوں کو سلام کہنا ہے، کیونکہ وہ سب ایک جان کی مانند ہیں۔ اگر گھر میں

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾

مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب وہ اس کے ساتھ کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جو جمع کرنے والا ہے تو اس وقت تک نہیں جاتے کہ اس سے اجازت مانگیں۔ بے شک جو لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ تو جب وہ تجھ سے اپنے کسی کام کے لیے اجازت مانگیں تو ان میں سے جسے تو چاہے اجازت دے دے اور ان کے لیے اللہ سے بخشش مانگ، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۶۲﴾

کوئی بھی نہ ہو تو پھر بھی سلام کہے۔ تشہد کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو اس وقت سلام اس طرح کہنا چاہیے "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ" امام بخاری رحمہ اللہ نے "الأدب المفرد" (۱۰۵۵) میں حسن سند کے ساتھ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: "جب تو کسی گھر میں جائے، جس میں کوئی نہ ہو تو یوں کہہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔" شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اس آیت کا نہایت عمدہ خلاصہ بیان فرمایا ہے، لکھتے ہیں: "یعنی اپنایت کے علاقوں میں کھانے کی چیز کو ہر وقت پوچھنا ضروری نہیں، نہ کھانے والا اجاب کرے، نہ گھر والا دریغ کرے، مگر عورت کا گھر اس کے خاوند کا ہو تو اس کی مرضی چاہیے، اور مل کر کھاؤ یا جدا، یعنی اس کا تکرار دل میں نہ رکھیے کہ کس نے کم کھایا کس نے زیادہ، سب نے مل کر پکایا، سب نے مل کر کھایا، اور اگر ایک شخص کی مرضی نہ ہو پھر کسی کی چیز کھانی ہرگز درست نہیں۔ اور سلام کی تاکید فرمائی آپس کی ملاقات میں، اس سے بہتر دعا نہیں، جو لوگ اس کو چھوڑ کر اور لفظ ٹھہراتے ہیں اللہ کی تجویز سے ان کی تجویز بہتر نہیں۔"

8 كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ : یہاں آیات کو کھول کر بیان کرنے کی بات تیسری دفعہ آ رہی ہے، یعنی آیات کو اس طرح کھول کر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم غور و فکر کرو اور ان آیات میں ذکر کردہ احکام کو سمجھو۔

**آیت 62** 1 اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ...... : اس سے پہلے گھروں میں داخل ہوتے وقت اجازت طلب کرنے کا حکم دیا تھا، اب نکلتے وقت اجازت طلب کرنے کا حکم دیا، خصوصاً جب کسی اہم کام کے لیے اکٹھا کیا گیا ہو، مثلاً کسی کام کے بارے میں مشورہ ہو، یا جہاد کے لیے جمع کیا گیا ہو، یا نصیحت کے لیے جمع کیا گیا ہو، یا جیسا کہ خندق کھودنے کے لیے مسلمان اکٹھے ہوئے تھے، ایسے موقعوں پر منافقین جان بچانے کے لیے بلا اجازت نکل جاتے تھے، جیسا کہ اس کے بعد والی آیت میں فرمایا: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ [ النور: ٦٣ ] "بے شک اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔" اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ [ التوبة: ١٢٧ ]

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ

رسول کے بلانے کو اپنے درمیان اس طرح نہ بنالو جیسے تمھارے بعض کا بعض کو بلانا ہے۔ بے شک اللہ ان لوگوں کو

''اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان کا بعض بعض کی طرف دیکھتا ہے کہ کیا تمھیں کوئی دیکھ رہا ہے؟ پھر واپس پلٹ جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں، اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں سمجھتے۔'' بعض اہل علم نے فرمایا کہ یہاں منافقین کی صریح الفاظ میں مذمت کے بجائے اجازت لے کر جانے والے مسلمانوں کی تعریف کر کے فرمایا کہ مومن صرف یہ ہیں اور یہ بات اسی آیت میں دو دفعہ بیان فرمائی، ایک ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا......'' اور دوسری ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ'' اس سے ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر اجازت کے بغیر کھسک جانے والوں میں کامل ایمان نہیں، یا وہ ایمان سے بالکل ہی فارغ ہیں۔ مگر یہ بات صراحت کے بجائے کنائے سے بیان فرمائی، گویا منافقین اس قابل نہیں کہ ان کا نام مذمت کے لیے بھی لیا جائے۔

② فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ : اس سے معلوم ہوا کہ اجازت بلاوجہ نہیں بلکہ اپنے کسی اہم کام کے لیے مانگنی چاہیے اور یہ بھی کہ امیر کو اختیار ہے کہ جسے چاہے اجازت دے اور جسے چاہے نہ دے، کیونکہ وہ بہتر جانتا ہے کہ مجلس کی اہمیت کے پیش نظر کسے اجازت دینے کی گنجائش ہے۔

③ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ : اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عذر کی بنا پر اگرچہ اجازت لے کر جانا جائز ہے مگر پھر بھی اچھا نہیں ہے، کیونکہ یہ دنیا کے کام کو دین پر مقدم رکھنا ہے، اس لیے آپ ﷺ کو ایسے لوگوں کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ (وحیدی)

④ یہ آیت امت کی مصلحت کے لیے جماعتی نظم کی بنیاد ہے، کیونکہ سنت یہ ہے کہ ہر اجتماع کے لیے (چھوٹا ہو یا بڑا) ایک امیر ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِذَا كَانَ ثَلَاثَةٌ فِيْ سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوْا أَحَدَهُمْ )) [ أبوداوٗد، الجهاد، باب في القوم يسافرون...... : ۲۶۰۹، قال الألباني حسن صحيح ] ''جب سفر میں تین (۳) آدمی ہوں تو وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں۔'' یہ امیر ان مسلمانوں کے لیے ولی الامر کا قائم مقام ہوگا اور اس کی حیثیت رسول اللہ ﷺ کے جانشین کی ہوگی، اس لیے اس کے اجتماع سے اس کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں، کیونکہ اگر ہر شخص کو اپنی مرضی سے کھسک جانے کی اجازت ہے تو کوئی اجتماع بکھرنے سے نہیں بچے گا۔ اسی طرح جب امیر کسی دینی، سیاسی یا جہادی ضرورت کے لیے مجلس بلائے تو طے شدہ مقام اور وقت سے اجازت یا صحیح عذر کے بغیر پیچھے رہنا جائز نہیں۔ (ابن عاشور)

**آیت 63** ① لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ ...... : مفسرین نے اس آیت کے تین مطلب بیان فرمائے ہیں، پہلا یہ کہ ''دُعَآءَ الرَّسُوْلِ'' کا معنی ہے رسول کا بلانا۔ اس صورت میں لفظ ''دُعَآءَ'' اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ تمھیں بلائیں تو آپ ﷺ کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کی طرح معمولی نہ سمجھو، کیونکہ آپ ﷺ جب بلائیں تو

لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔ سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ آ پہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے ﴿۶۳﴾

حاضر ہونا واجب ہوتا ہے، جب کہ آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کا یہ حکم نہیں ہے۔ یہ مفہوم یہاں زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس سے پہلے اجازت طلب کرنے اور امر جامع میں موجود رہنے کا بیان ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے، تمھارا رسول کو بلانا۔ اس صورت میں "دُعَآءَ" اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کو اس طرح نام لے کر مت بلاؤ جس طرح تم ایک دوسرے کو نام لے کر بلاتے ہو، بلکہ یا نبی اللہ، یا رسول اللہ، یا ایسے القاب سے بلاؤ جن میں آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم ہو اور ایسے لہجے میں مت بلاؤ جس میں تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو، بلکہ آواز نیچی رکھ کر ادب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو بلاؤ۔ اس معنی کی تائید سورۂ حجرات کی ابتدائی آیات سے ہوتی ہے، فرمایا: ﴿لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ [ الحجرات : ۲ ] ''اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو اور نہ بات کرنے میں اس کے لیے آواز اونچی کرو، تمھارے بعض کے بعض کے لیے آواز اونچی کرنے کی طرح، ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم شعور نہ رکھتے ہو۔'' یہ معنی بھی بہت عمدہ ہے۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ تم رسول کی دعا کو عام لوگوں کی دعا کی طرح مت سمجھو۔ کیونکہ آپ کی دعا قبول شدہ ہے، اگر تمھارے حق میں ہوگئی تو اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں اور اگر تمھارے خلاف ہوگئی تو کوئی جائے پناہ نہیں۔ یہ معنی اگرچہ اپنی جگہ درست ہے، مگر آیت کے الفاظ سے بعید ہے۔

② قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا : "يَتَسَلَّلُوْنَ" آہستہ آہستہ خفیہ طریقے سے نکلتے ہیں، کھسکتے ہیں، جیسے "تَدَخَّلَ" اور "تَدَرَّجَ" میں آہستہ آہستہ کا مفہوم شامل ہے۔ "لِوَاذًا" "لَاذَ يَلُوْذُ" سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، ایک دوسرے کی پناہ لینا۔ یہ منافقین کا شیوہ تھا کہ کوئی مسلمان اجازت لے کر نکلتا تو اس کی آڑ لے کر وہ بھی نکل جاتے۔ کھسکنے والوں کو اللہ کی گرفت سے ڈرانا مقصود ہے۔

③ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ : "خَالَفَ يُخَالِفُ خِلَافًا وَ مُخَالَفَةً" کا معنی پیچھے رہنا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ [ التوبة : ۸۱ ] ''وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اللہ کے رسول کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہو گئے۔'' "يُخَالِفُوْنَ" کے بعد "عَنْ" کی وجہ سے ترجمہ کیا گیا ہے ''سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں۔'' اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۲۴، ۲۵) شوکانی نے فرمایا: "يُخَالِفُوْنَ" کے بعد "عَنْ" لانے کا مطلب یہ ہے کہ "يُخَالِفُوْنَ" کے ضمن میں اعراض کا مفہوم شامل ہے، یعنی جو لوگ اس کے حکم سے اعراض کرتے ہیں۔'' زمخشری نے فرمایا: "يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ" کا معنی "يَصُدُّوْنَ عَنْ أَمْرِهٖ" ہے، یعنی جو لوگ

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

ع ۱۵

سن لو! بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، یقیناً وہ جانتا ہے جس حال پر تم ہو اور اس دن کو بھی جب وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے، پھر وہ انھیں بتائے گا جو کچھ انھوں نے کیا اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۶۴﴾

اس کے حکم سے دوسروں کو روکتے ہیں۔'' مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے پیچھے رہنے کا نتیجہ فتنے میں مبتلا ہونا ہے۔ طبری نے اپنی معتبر سند کے ساتھ علی بن ابی طالب سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ آیت ''وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ'' میں فتنہ سے مراد شرک ہے، یعنی جو شخص جان بوجھ کر رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل نہیں کرتا یا عمل کرنے میں تاخیر کرتا ہے، خطرہ ہے کہ وہ خالص ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور کفر و شرک یا بدعت میں مبتلا ہو جائے گا۔

④ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : دنیا میں اس عذاب کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، دیکھیے سورۂ انعام کی آیت (۶۵) کی تفسیر۔

⑤ اس آیت میں لفظ ''اَوْ'' مانعۃ الخلو ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ فتنے اور عذابِ الیم میں سے کوئی چیز بھی ان پر نہ آئے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں چیزیں ان پر اتریں۔

⑥ جب صرف ایک معاملہ میں رسول کی اطاعت نہ کرنے پر یہ وعید سنائی گئی ہے تو ان لوگوں کو اپنے معاملے پر ضرور غور کرنا چاہیے جنھوں نے رسول کو سرے سے اطاعت کا مستحق ہی نہیں سمجھا، بلکہ دوسروں کو بھی اس سے بے نیاز ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

**آیت 64** ① اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : طبری نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، یاد رکھو، سارے آسمان اور زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور مملوک کو لائق نہیں کہ اپنے مالک کے حکم کی نافرمانی کرے اور اس کی سزا کا حق دار بنے۔ فرماتے ہیں، لوگو! اسی طرح تمھارے لیے بھی اپنے رب کے حکم کی جو تمھارا مالک ہے، خلاف ورزی کرنا درست نہیں، سو اس کی اطاعت کرو، اس کے حکم پر عمل کرو اور جب تم اس کے رسول کے ساتھ کسی جامع کام میں حاضر ہو تو اس کی اجازت کے بغیر مت نکلو۔'' (طبری: ۲۶۴۷۶)

② قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ : یعنی تم جس روش پر قائم ہو، وہ اچھی ہے یا بری، اللہ تعالیٰ یقیناً اسے جانتا ہے۔

③ وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ…… : خبر دینے سے مراد ان کے اعمال کی جزا دینا ہے۔ منافقین کا خطاب کے بعد غائب کے صیغے سے ذکر التفات ہے، جس سے ناراضی کا اظہار ہو رہا ہے۔

④ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ : یہ ''قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ'' کے مضمون کی تکمیل ہے، پہلے صرف منافقین کے احوال جاننے کا ذکر فرمایا، اب فرمایا، وہ صرف تمھارے احوال ہی نہیں بلکہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

سورۃ الفرقان ۲۵ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، آیاتھا ۷۷ رکوعاتھا ۶

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بہت برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فیصلہ کرنے والی (کتاب) اتاری، تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو ①

آیت 1 ① تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ ......: اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں سب سے پہلے توحید پر کلام فرمایا، کیونکہ وہ سب سے پہلے اور سب سے اہم ہے، پھر نبوت پر، کیونکہ وہ رب اور بندے کے درمیان واسطہ ہے، پھر قیامت پر، کیونکہ وہ خاتمہ ہے۔ (شوکانی)

② "تَبٰرَكَ" "بَرَكَةٌ" سے باب تفاعل ہے، "بَرَكَةٌ" کا اشتقاق "بِرْكَةٌ" (حوض) سے ہے کہ اس میں بہت زیادہ پانی ہوتا ہے، یا "بَرَكَ الْإِبِلُ" سے ہے، جس کا معنی اونٹ کا بیٹھنا ہے۔ باب تفاعل میں مبالغہ پایا جاتا ہے، اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ "بہت برکت والا ہے" کیا گیا ہے۔ برکت سے مراد خیر میں زیادہ ہونا، بڑھا ہوا ہونا، دائمی خیر والا ہونا ہے۔ یعنی وہ خیر اور بھلائی میں ساری کائنات سے بے انتہا بڑھا ہوا ہے۔ بلندی، بڑائی، احسان، غرض ہر لحاظ سے اس کی ذات بے حد و حساب خوبیوں اور بھلائیوں کی جامع ہے۔ یاد رہے "تَبٰرَكَ" کا لفظ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے آتا ہے، کسی اور میں یہ خوبی نہیں۔

③ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ : "نَزَّلَ" میں تکرار کا معنی پایا جاتا ہے، یعنی تھوڑا تھوڑا کرکے نازل فرمایا۔ اس کی حکمت آگے آیت (۳۲) میں آ رہی ہے۔ قرآن کو "الْفُرْقَانَ" کہا ہے، یعنی یہ اپنے احکام کے ذریعے سے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے اور اسی لفظ کی بنا پر اس سورت کا نام "الفرقان" رکھا گیا ہے۔

④ عَلٰى عَبْدِهٖ : دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کی تفسیر۔

⑤ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا: اس میں آپ پر قرآن نازل کرنے کی حکمت بیان فرمائی ہے۔ سارے جہانوں سے مراد قیامت تک تمام جن و انس ہیں، اس لیے کہ آپ ﷺ کی بعثت ان سب کے لیے ہے، کوئی دوسرا رسول دنیا میں ایسا نہیں آیا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۸)، انعام (۱۹)، سبا (۲۸) اور احزاب (۴۰) عرب اور اہل کتاب کی صراحت کے لیے دیکھیے آل عمران (۲۰) جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِيْ ...... وَ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَ بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً » [ بخاري، الصلاة، باب قول النبي ﷺ : جعلت لي الأرض ...... : ۴۳۸ ] "مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے انبیاء میں سے کسی کو نہیں دی گئیں...... (ان میں سے ایک یہ ہے کہ) پہلے نبی خاص اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا جبکہ مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا۔"

⑥ یہاں رسول اللہ ﷺ کے صرف "نذیر" ہونے کا ذکر فرمایا، کیونکہ آگے کفار کے اقوال و احوال اور ان کے انجام کا ذکر ہے،

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۲ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ وَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا ۳

وہ ذات کہ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس نے نہ کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک رہا ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا، پورا اندازہ۔ ۲ اور انھوں نے اس کے سوا کئی اور معبود بنا لیے، جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں اور اپنے لیے نہ کسی نقصان کے مالک ہیں اور نہ نفع کے اور نہ کسی موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ اٹھائے جانے کے۔ ۳

اس کے مناسب ڈرانا ہی ہے۔ نذارت و بشارت دونوں کا اکٹھا ذکر آگے آ رہا ہے، فرمایا: ﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ [ الفرقان : ٥٦ ] ”اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔“

آیت 2 ① الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چار صفات بیان فرمائی ہیں جو اس کی توحید کی دلیل ہیں۔ پہلی یہ کہ آسمان و زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، کسی اور کی نہیں۔ ان دونوں کو چلانے والا وہی ہے، دوسرے سب اپنے وجود اور اپنی بقا میں اسی کے محتاج ہیں۔

② وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا : یہ دوسری صفت ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت کی تفسیر۔ اس میں یہود و نصاریٰ کا ردّ ہے اور ان جھوٹے مسلمانوں کا بھی جو نبی ﷺ کو یا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو، یا کسی اور کو اللہ کے نور کا ٹکڑا مانتے ہیں۔

③ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ : یہ تیسری صفت ہے۔ ”لَمْ يَكُنْ“ میں نفی کا استمرار ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”اور نہ کبھی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک رہا ہے۔“ اس میں ہر قسم کے مشرکین کا ردّ ہے، جیسے بت پرست، قبر پرست، دو خدا ماننے والے اور شرک خفی کا ارتکاب کرنے والے وغیرہ۔

④ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا : یہ چوتھی صفت ہے کہ ہر چیز اسی نے پیدا کی، پھر اس کے لیے ایک خاص اندازہ مقرر فرما دیا، جس کی بدولت اس سے وہی افعال و اثرات صادر ہوتے ہیں جن کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے اور اسے وہی صورت، جسامت اور صلاحیتیں عطا کیں جو اس کی ضرورت کے مطابق ہیں، مثلاً انسان کو فہم و ادراک، غور و فکر، صنعت و حرفت اور مفید کام بجا لانے کی صلاحیت بخشی، اسی طرح ہر حیوان اور پودے اور جماد کو اس مصلحت کے مطابق بنایا جو اس سے مطلوب تھی۔ جب اللہ کے سوا کسی نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا تو کسی اور کی عبادت کیوں؟ دیکھیے سورۂ انعام (۱۰۲)، رعد (۱۶)، فاطر (۳)، زمر (۶۲)، مؤمن (۶۲)، حج (۷۳)، نحل (۲۰) اور اعراف (۱۹۱)۔

آیت 3 وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معبود برحق ہونے کے چند معیار

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ اِفْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۝۴

اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ نہیں ہے مگر ایک جھوٹ، جو اس نے گھڑ لیا اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر اس کی مدد کی، سو بلاشبہ وہ بھاری ظلم اور سخت جھوٹ پر اتر آئے ہیں ④

بیان فرمائے اور تمام مشرکوں کو دعوت دی کہ وہ اپنے خداؤں کو ان معیاروں پر پرکھیں اور بتائیں کہ وہ کسی طرح بھی معبود ہو سکتے ہیں۔ وہ معیار یہ ہیں: ① جو ہستی کوئی چیز پیدا نہ کر سکے، یا کسی چیز کی بھی خالق نہ ہو وہ معبود نہیں ہو سکتی۔ ② جو چیز خود مخلوق ہو، اسے کسی نے پیدا کیا ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے اللہ کے سوا جن کو بھی معبود بنایا گیا ہے سب مخلوق ہیں، وہ چاہے فرشتے ہوں یا جن، انسان، درخت، پتھر، بت، قبر، سورج، چاند، تارے یا کوئی اور، اس لیے انھیں معبود بنانا بہت بڑی جہالت ہے۔ ③ جو ہستی کسی دوسرے کو فائدہ یا نقصان نہ پہنچا سکتی ہو، دوسرے لفظوں میں جو ہستی حاجت روا اور مشکل کشا نہ ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ صفت ہے جسے مشرکین اللہ کے سوا بعض دوسری ہستیوں میں تسلیم کرتے ہیں، خواہ وہ جان دار ہوں یا بے جان، زندہ ہوں یا مر چکی ہوں، اور شرک کی یہی قسم سب سے زیادہ عام ہے۔ اس کا ردّ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا کہ جو چیز اپنے نفع و نقصان ہی کی مالک نہ ہو وہ کسی دوسرے کی حاجت روا یا مشکل کُشا کیسے ہو سکتی ہے! یہ معیار ایسا واضح اور زبردست ہے کہ اس کے مطابق اللہ کے سوا تمام معبود باطل قرار پاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا اور وہ ان کا بال بیکا نہ کر سکے۔ رہے بزرگان دین، خواہ وہ پیغمبر ہوں یا ولی، زندہ ہوں یا فوت ہو چکے ہوں، سب کو ان کی زندگی میں بے شمار تکلیفیں پہنچتی رہیں، لیکن وہ اپنی تکلیفیں اور بیماریاں خود رفع نہ کر سکے، تو دوسروں کی کیا کرتے، یا کیا کریں گے، وہ تو خود صرف اللہ سے دعا کرتے رہے۔ رہے شمس و قمر، تارے اور فرشتے، تو یہ سب ایسی مخلوق ہیں جن کے پاس اپنا اختیار کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ نے انھیں جس کام پر لگا دیا ہے اس کے سوا دوسرا کام کر ہی نہیں سکتے، لہٰذا وہ بھی الوہیت کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔

④ معبود برحق ہونے کا ایک معیار یہ ہے کہ وہ ہستی کسی زندہ کو مار سکتی ہو اور مردہ کو زندہ کر سکتی ہو اور زندہ کر کے قبروں سے اٹھا سکتی ہو، اللہ کی یہ شان ہے کہ وہ ہر وقت زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ چیزیں پیدا کر رہا ہے، قیامت کو وہ سب کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرے گا، دوسری کسی ہستی کے اختیار میں کسی کو زندہ کرنا ہے نہ مارنا اور نہ قیامت برپا کرنا۔ اس مقام پر معبود برحق ہونے کے یہ معیار بیان ہوئے ہیں، جب کہ دوسرے مقامات پر اور بھی کئی معیار مذکور ہیں، مثلاً جو خود محتاج ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا، جو بے جان ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا، جو کھانا کھاتا ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا، جسے نیند یا موت آتی ہے وہ الٰہ نہیں ہو سکتا، جو ہر چیز کا علم نہ رکھتا ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا، جو نہ سن سکتا ہو، نہ دیکھ سکتا ہو، نہ بول سکتا ہو، نہ جواب دے سکتا ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا وغیرہ۔ (تیسیر القرآن کیلانی بتصرف)

آیت 4 ① وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ......: توحید کے بیان اور شرک اور مشرکین کے ردّ کے بعد منکرینِ نبوت کے شبہات و

وَ قَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا فَهِيَ تُمۡلٰى عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّ اَصِيۡلًا ﴿۵﴾ قُلۡ اَنۡزَلَهُ الَّذِيۡ يَعۡلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۶﴾

اور انھوں نے کہا یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، جو اس نے لکھوا لی ہیں، تو وہ پہلے اور پچھلے پہر اس پر پڑھی جاتی ہیں ⑤ تو کہہ اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین میں سب پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ بے شک وہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ⑥

اعتراضات ذکر فرمائے، چنانچہ پہلا اعتراض ان کا یہ بیان فرمایا کہ یہ قرآن آپ نے اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے اور کچھ لوگوں نے اس معاملہ میں آپ کی مدد کی ہے۔ اس کی کچھ تفصیل سورۂ نحل (۱۰۳) میں گزر چکی ہے۔

② فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّ زُوۡرًا : ظلم کا معنی کسی چیز کو اس کی جگہ کے سوا رکھ دینا ہے، کیونکہ ظلم کا اصل معنی اندھیرا ہے اور اندھیرے میں آدمی چیز کو اس کی جگہ نہیں رکھ سکتا۔ "زُوۡرًا" ایسے سخت جھوٹ کو کہتے ہیں جو بنا سنوار کر خوش نما بنا دیا گیا ہو، اس لیے اس کا معنی فریب بھی ہو سکتا ہے۔ تنوین تہویل کے لیے ہے، یعنی انھوں نے یہ جو بات کہی ہے وہ بھاری ظلم (بے انصافی) اور سخت جھوٹ ہے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن جیسی کتاب، جس کی فصاحت و بلاغت اور مضامین کے مقابلے سے کل کائنات عاجز ہے، اسے اپنے پاس سے تصنیف کر کے پیش کر دینا کسی انسان کے بس میں نہیں، چاہے اس کی پشت پر چند نہیں ہزاروں بلکہ اللہ کے سوا سب جمع ہو جائیں۔ افسوس اور تعجب اس پر ہے کہ یہ لوگ محمد ﷺ کے بارے میں یہ بات کہہ رہے ہیں جن کی پوری زندگی ان کے سامنے گزری (دیکھیے یونس : ۱۶) اور جن کے بارے میں انھیں خوب معلوم ہے کہ آپ نے نہ کبھی پڑھنا لکھنا سیکھا اور نہ کسی عالم کی شاگردی کی (دیکھیے عنکبوت : ۴۸) پھر یہ قرآن آپ کی تصنیف کیسے ہو سکتا ہے؟

**آیت 5** وَ قَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا ...... : یعنی خود تو اَن پڑھ ہے، اس لیے دوسرے لوگوں کے ذمے اس نے یہ کام لگا رکھا ہے کہ صبح و شام یہ لکھوائی ہوئی کہانیاں اسے پڑھ پڑھ کر سنائیں، تاکہ اسے زبانی یاد ہو جائیں۔ یہ بات ایسی تھی جس کے جھوٹ اور بہتان ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ چالیس سال آپ ﷺ ان میں رہ چکے تھے، اگر کوئی شخص چھوٹے سے شہر میں چند دن صبح و شام کسی کے پاس رہے تو اس کا پتا ہر ایک کو چل جاتا ہے اور ان لوگوں کا اصرار ہے کہ اب بھی دوسروں کی لکھوائی ہوئی باتیں صبح و شام آپ کے سامنے پڑھی جاتی ہیں۔ پھر اگر ایسا ہی تھا تو وہ بھی کسی سے لکھوا کر ایسی ایک سورت ہی پیش کر دیتے۔

**آیت 6** ① قُلۡ اَنۡزَلَهُ الَّذِيۡ يَعۡلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ : یہ ان کے جھوٹ اور افترا کے جواب میں فرمایا کہ قرآن کو تو دیکھو اس میں کیا ہے؟ کیا اس کی کوئی بات غلط اور خلاف واقعہ ہے؟ یقیناً نہیں ہے، بلکہ ہر بات بالکل سچی اور صحیح ہے، اس لیے کہ اس کو اتارنے والی وہ ذات ہے جس کے پاس زمین و آسمان کی ظاہر باتوں ہی کا نہیں تمام پوشیدہ باتوں کا بھی پورا علم ہے۔ وہ ماضی کو جانتا ہے، حال اور مستقبل کو بھی۔ اس لیے اس کی نازل کردہ کتاب میں گزشتہ زمانوں کی باتیں

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾

اور انھوں نے کہا اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا کہ اس کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا ﴿۷﴾ یا اس کی طرف کوئی خزانہ اتارا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس سے وہ کھایا کرتا اور ظالموں نے کہا تم تو بس ایسے آدمی کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کیا ہوا ہے ﴿۸﴾

ہیں، حال کی بھی اور آئندہ زمانے کی بھی اور ان میں سے کوئی بات غلط ثابت ہوئی ہے نہ ہوگی۔ جو شخص آسمانوں اور زمین کے تمام راز نہ جانتا ہو وہ اس جیسی کتاب تو کجا اس جیسی ایک سورت بھی نہیں بنا سکتا، اگر تمھیں اصرار ہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ بندے کی تصنیف ہے، تو تم بھی مقابلے میں کوئی سورت لے آؤ۔

② اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ جو سب چیزوں کا علم رکھتا ہو وہ ہر چیز پر قادر بھی ہوتا ہے، پھر وہ ان لوگوں کے انکار، تکبر اور استہزا پر فوری گرفت کیوں نہیں کرتا۔ فرمایا وجہ یہ ہے کہ "اِنَّهٗ كَانَ" یعنی وہ ہمیشہ سے بندوں کے گناہوں پر بہت پردہ ڈالنے والا ہے، دائمی رحم والا ہے، وہ چاہتا تو اس گستاخی پر انھیں سخت سزا دیتا، مگر وہ غفور و رحیم ہے، اس لیے تم سے درگزر کر رہا ہے۔ اس میں انھیں توبہ و انابت اور اسلام و ہدایت کی طرف پلٹ آنے کی ترغیب ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یعنی (آسمان و زمین کی چھپی ہوئی باتیں جاننے والے نے) اپنی بخشش اور مہربانی سے ہی اسے اتارا ہے۔" (موضح) یعنی اس کی مغفرت و رحمت یہ قرآن اتارنے کا باعث ہے۔

آیت 7 ① وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ ...... : یہ قرآن پر طعن کے بعد رسول پر طعن ہے اور بہت گھٹیا طعن ہے، کفار کا یہ جاہلانہ طعن قرآن میں متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے، ان کے خیال میں کوئی بشر رسول نہیں ہو سکتا۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۴، ۹۵) اس لیے انھوں نے کہا، یہ رسول (جو ہماری طرف بھیجے جانے کا دعویٰ کرتا ہے) اسے کیا ہے کہ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ہم میں اور اس میں فرق کیا ہے؟ اسے تو فرشتہ ہونا چاہیے تھا، جو بشری ضرورتوں سے پاک ہوتا اور اگر انسان ہوتے ہوئے اسے یہ مقام مل گیا تھا، تو اس کی شان کم از کم اتنی تو ہوتی جتنی دنیا کے کسی بادشاہ کی ہوتی ہے۔ (دیکھیے زخرف: ۵۳) اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب آگے آیت (۲۰) میں دیا ہے۔

② لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ...... : یعنی اگر انسان ہی کو رسول ہونا تھا تو اس کی طرف آسمان سے کوئی فرشتہ اتارا جاتا، جو سب کو نظر آتا، ہر وقت اس کے ساتھ رہتا اور لوگوں کو بتاتا کہ یہ اللہ کا رسول ہے، پھر جو لوگ اس پر ایمان نہ لاتے انھیں اللہ کے عذاب کی دھمکی دیتا۔

آیت 8 ① اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ : یا اس کی طرف کوئی خزانہ اتارا جاتا جس سے اس کی شان کم از کم قیصر و کسریٰ کی سی تو ہوتی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۹ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۱۰ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۱۱

دیکھ انھوں نے تیرے لیے کیسی مثالیں بیان کیں، سو گمراہ ہو گئے، پس وہ کوئی راستہ نہیں پا سکتے ⑨ بہت برکت والا ہے وہ کہ اگر چاہے تو تیرے لیے اس سے بھی بہتر بنا دے ایسے باغات جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہیں اور تیرے لیے کئی محل بنا دے ⑩ بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلا دیا اور ہم نے اس کے لیے جو قیامت کو جھٹلائے، ایک بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے ⑪

② اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا : یا خزانہ نہ سہی، کم از کم اس کا کوئی باغ ہوتا، تاکہ اس باغ سے اطمینان کی روزی حاصل کرتا اور روزی کمانے کے لیے بازاروں کے چکر لگانے سے بچ جاتا۔ کفار کے اس طرح کے مطالبات کی اس سے بھی لمبی فہرست سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں بیان ہوئی ہے۔

③ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا : یہی بات فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۱۰۱)۔

آیت 9 ① اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ : دیکھو انھوں نے تمھارے لیے کیسے مثالیں بیان کیں، صرف اس لیے کہ کسی طرح آپ کو جھوٹا ثابت کر سکیں۔

② فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا : سو بھٹک گئے اور ایسے بھٹکے کہ کسی راستے پر آ ہی نہیں سکتے، کیونکہ راہ پر وہ آتا ہے جس کے دل میں اخلاص ہو اور وہ محض غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہو، ان کے دلوں میں تو اخلاص کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ مزید دیکھیے بنی اسرائیل (۴۷، ۴۸)۔

آیت 10 تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ...... : بہت برکت اور لامحدود قوتوں اور اسباب کا مالک ہے وہ اللہ کہ اگر چاہے تو جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں آپ کو اس سے کہیں بہتر چیزیں دنیا ہی میں دے دے، ایک باغ نہیں بے شمار باغات دے دے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور ایک محل نہیں بہت سے محل عطا کر دے۔

آیت 11 بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ...... : پچھلی آیت کے ساتھ اس کا تعلق یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے کہیں بہتر چیزیں عطا کر بھی دے تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ لوگ ایمان لے آئیں گے؟ یقینی جواب اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ پھر اور قسم کی باتیں بنانا شروع کر دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ سرے سے قیامت کے دن کو، دوبارہ جی اٹھنے کو، اللہ کے سامنے حاضر ہونے کو اور اپنے برے اعمال کی سزا بھگتنے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ انھوں نے اسے صاف جھٹلا دیا ہے، کیونکہ اس سے انھیں دنیا میں اپنی خواہش پرستی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، پھر اگر یہ لوگ ایسی کٹ حجتیاں نہ کریں تو اور کریں بھی کیا؟ دیکھیے سورۂ قیامہ کی آیات (۱ تا ۶)۔

اِذَا رَاَتۡهُمۡ مِّنۡ مَّكَانٍۭ بَعِيۡدٍ سَمِعُوۡا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيۡرًا ﴿۱۲﴾

جب وہ انھیں دور جگہ سے دیکھے گی تو وہ اس کے لیے سخت غصے کی اور گدھے کی سی آواز سنیں گے ﴿۱۲﴾

**آیت 12** ﴿ اِذَا رَاَتۡهُمۡ مِّنۡ مَّكَانٍۭ بَعِيۡدٍ ...... : جہنم جب ان کافروں کو بہت دور سے دیکھے گی تو وہ جہنم کی ایسی آواز سنیں گے جو شدید غصے والی اور گدھے کی آواز جیسی ہوگی۔ اس وقت جہنم کے غصے کا حال سورۂ ملک (۶ تا ۸) میں بیان ہوا ہے۔ اس سے جہنم کا صاحب شعور ہونا ثابت ہوتا ہے، اس کے علاوہ بھی کئی آیات و احادیث سے جہنم کا صاحب شعور ہونا، غصے ہونا، گدھے جیسی آواز نکالنا، کلام کرنا سب کچھ ثابت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امۡتَلَاۡتِ وَ تَقُوۡلُ هَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ ﴾ [ ق : ۳۰ ] ”جس دن ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ مزید ہے؟“ اور صحیح بخاری میں جنت اور جہنم کے آپس میں جھگڑنے کا ذکر آیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے جہنم کے اندر قدم (پاؤں) رکھنے پر اس کے قط قط (بس بس) کہنے کا ذکر ہے۔ [ دیکھیے بخاري، التفسیر، باب قوله : ﴿ و تقول هل من مزيد ﴾ : ۴۸۴۸، ۴۸۴۹ ] اور بخاری ہی میں جہنم کے اللہ تعالیٰ سے اپنی شدید گرمی کی شکایت کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے سال میں دو سانس نکالنے کی اجازت ملنے کی حدیث موجود ہے۔ [ دیکھیے بخاري، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة : ۳۲۶۰ ] جہنم کے شعور، اس کی تندی اور سرکشی کے لیے دیکھیے سورۂ فجر (۲۳) کی تفسیر۔ بعض عقل پرست حضرات ان تمام آیات و احادیث کو مجاز پر محمول کرتے ہیں، مگر اہل السنہ اسے حقیقت مانتے ہیں، کیونکہ مجاز اس وقت مانا جاتا ہے جب حقیقت ناممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ کا جہنم کو شعور، رؤیت اور کلام عطا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اگر بے جان حنانہ (ستون) کے رونے کی آواز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سن سکتے ہیں تو جہنمی جہنم کے غصے کی آواز کیوں نہیں سن سکتے اور جہنم انھیں دور سے کیوں نہیں دیکھ سکتی؟ اور اگر اللہ تعالیٰ گوشت کے ایک ٹکڑے (زبان) کو بولنے کی قوت عطا کر سکتا ہے تو وہ کسی بھی چیز میں یہ قوت کیوں پیدا نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے قریب مسلمانوں اور یہودیوں کی جنگ میں غرقد کے سوا ہر درخت اور پتھر مومن کو بول کر بتائے گا کہ یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے اسے قتل کر دے۔ [ دیکھیے مسلم، الفتن و أشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتی...... : ۲۹۲۲ ] اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَالَّذِيۡ نَفۡسِيۡ بِيَدِهِ، لَا تَقُوۡمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تُكَلِّمَ السِّبَاعُ الۡإِنۡسَ، وَ حَتّٰی تُكَلِّمَ الرَّجُلَ عَذَبَةُ سَوۡطِهِ وَ شِرَاكُ نَعۡلِهِ وَ تُخۡبِرُهُ فَخِذُهُ بِمَا أَحۡدَثَ أَهۡلُهُ بَعۡدَهُ )) [ ترمذي، الفتن، باب ما جاء في كلام السباع : ۲۱۸۱، وقال الألباني صحيح ] ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قیامت قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ درندے انسانوں سے کلام کریں گے اور آدمی سے اس کے کوڑے کا سرا اور جوتے کا تسمہ کلام کرے گا اور اس کی ران اسے بتائے گی کہ اس کے اہل نے اس کے بعد کیا گناہ کیا ہے۔“ عقل پرست حضرات ان تمام مقامات پر تاویل کرتے جائیں تو اکثر آیات و احادیث کھلونا بن کر رہ جائیں گی، جن سے یہ لوگ جس طرح چاہیں گے کھیلیں گے اور جو مطلب چاہیں گے نکالتے رہیں گے۔

وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ

اور جب وہ اس کی کسی تنگ جگہ میں آپس میں جکڑے ہوئے ڈالے جائیں گے تو وہاں کسی نہ کسی ہلاکت کو پکاریں گے ﴿۱۳﴾ آج ایک ہلاکت کو مت پکارو، بلکہ بہت زیادہ ہلاکتوں کو پکارو ﴿۱۴﴾ کہہ دے کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشگی کی جنت، جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ ان کے لیے بدلا اور ٹھکانا ہوگی ﴿۱۵﴾ ان کے لیے اس میں جو چاہیں گے

**آیت 13** وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا ......: "مُقَرَّنِيْنَ" "قَرَنَ الثَّوْرَيْنِ" (ض) اس نے دو بیل ایک لکڑی میں اکٹھے جوڑ دیے۔ "قَرَنَ الْبَعِيْرَيْنِ" اس نے دو اونٹ ایک رسی میں اکٹھے باندھ دیے۔ "مُقَرَّنِيْنَ" باب تفعیل سے اسم مفعول ہے، اس میں باندھنے کی شدت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس سے دو چیزوں کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے، ایک ان کے ہاتھوں، پاؤں اور گردنوں کا زنجیروں سے بندھا ہوا ہونا اور دوسرا ایک قسم کے کئی مجرموں کا ایک ہی جگہ ہونا۔ (دیکھیے نمل: ۸۳۔ حم السجدہ: ۱۹) یعنی جہنم میں ہر مجرم کے لیے اتنی تنگ جگہ ہوگی جہاں سے وہ ہل بھی نہیں سکے گا، اس کے علاوہ ایک ہی قسم کے کئی مجرم ایک ساتھ ہوں گے۔ (دیکھیے ابراہیم: ۴۹۔ ہمزہ: ۸، ۹) جہنم کی آگ کی لپیٹیں انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گی، اس وقت وہ سخت مصیبت سے گھبرا کر موت کو پکاریں گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یعنی ایک بار مریں تو چھوٹ جائیں، دن میں ہزار بار مرنے سے بدتر حال ہوتا ہے۔" (موضح)

**آیت 14** لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا ......: یعنی انھیں یہ جواب دیا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۷۷) اور مومن (۴۹، ۵۰)۔

**آیت 15** ① قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ ......: یعنی آپ ان مشرکوں سے کہیں کہ اس طرح جکڑے ہوئے جہنم کی تنگ جگہ میں ہر وقت موت کی آرزو کرتے رہنا بہتر ہے، یا جنتِ خلد (ہمیشگی کی جنت)؟ یہ سوال پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ ڈانٹنے کے لیے ہے، کیونکہ جنت اور جہنم کے درمیان بہتر ہونے کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

② الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ: متقی سے مراد وہ شخص ہے جو کم از کم شرک سے بچے، اس کے بعد گناہ سے بچنے کے لحاظ سے متقین کے بے شمار درجے ہیں اور حسب مراتب سب کے ساتھ جنت کا وعدہ ہے۔ البتہ مشرک کبھی جنت میں نہیں جائے گا، فرمایا:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ [ المائدۃ: ۷۲ ] "بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے، سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔"

**آیت 16** ① لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ: "لَهُمْ" اور "فِيْهَا" کو پہلے لانے میں حصر کا مفہوم ہے، یعنی یہ نعمت کہ جو چاہیں مل جائے، صرف متقی لوگوں کو حاصل ہوگی اور انھیں بھی صرف جنت میں ملے گی۔ دنیا میں یہ نعمت نہ متقی لوگوں کو حاصل

وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۶﴾

ہوگا، ہمیشہ رہنے والے، یہ تیرے رب کے ذمے ہو چکا، ایسا وعدہ جو قابل طلب ہے ﴿۱۶﴾

ہے نہ غیر متقی لوگوں کو۔ دنیا میں ہر ایک کا حال وہ ہے جو شاعر نے بیان کیا ہے ؂

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ ‏ تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

''ایسا نہیں کہ آدمی جو بھی تمنا کرے اسے حاصل ہی کر لے، کیونکہ ہوائیں کشتیوں کی خواہش کے خلاف چلا کرتی ہیں۔''

سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیت (۳۱): ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴾ میں بھی اسی آیت کا مضمون بیان ہوا ہے۔

2 یہاں ایک سوال کیا جاتا ہے کہ جنتیوں کو جب ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے تو اگر وہ نبیوں کے مرتبے کی خواہش کریں تو کیا انھیں وہ بھی حاصل ہو جائے گا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے دلوں میں ایسی تمنا پیدا ہی نہیں ہوگی، وہ سب اپنے اپنے شغل ہی میں خوش ہوں گے اور سب حسد اور تنافس سے پاک اپنی حالت پر خوش ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ إِنَّ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ ٱلْيَوْمَ فِى شُغُلٍ فَٰكِهُونَ ﴾ [ یٰس : ۵۵ ] ''بے شک جنت کے رہنے والے آج ایک شغل میں خوش ہیں۔'' اور جنت میں درجوں کا تفاوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ كَمَا يَتَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الْغَابِرَ فِي الْأُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة ...... : ۳۲۵۶ ] ''اہل جنت اپنے اوپر کے بالا خانوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے وہ نہایت چمک دار تارے کو دیکھتے ہیں، جو مشرق یا مغرب کے دور افق میں ہوتا ہے، ان کی ایک دوسرے کے درمیان درجوں کی برتری کی وجہ سے۔''

3 كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔولًا : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ یہ وعدہ اس قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے پورا کرنے کی دعا کی جائے، یا یہ ایسا وعدہ ہے جو مانگنے پر یقیناً پورا کیا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ''أُولُوا الْأَلْبَابِ'' (مومنوں) کی دعا ذکر فرمائی ہے، جو وہ کیا کرتے ہیں: ﴿ رَبَّنَا وَءَاتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ ٱلْمِيعَادَ ﴾ [ آل عمران : ۱۹۴ ] ''اے ہمارے رب! اور ہمیں عطا فرما جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبانی کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر، بے شک تو وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔'' طبری نے بعض اہل عربیت سے ''وَعْدًا مَّسْـُٔولًا'' کا معنی ''وَعْدًا وَاجِبًا'' نقل فرمایا ہے، کیونکہ جس چیز کا سوال یا مطالبہ ہو سکتا ہو وہ واجب ہوتی ہے، خواہ مطالبہ نہ ہی کیا جائے، مثلاً قرض، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: '' لَأُعْطِيَنَّكَ أَلْفًا وَعْدًا مَسْؤُولًا'' ''میں تمھیں ایک ہزار دوں گا، یہ مسئول وعدہ ہے۔'' یعنی تمھارے لیے واجب ہے، تم اس کا سوال اور مطالبہ کر سکتے ہو۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿١٨﴾

اور جس دن وہ انھیں اور جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے، اکٹھا کرے گا، پھر کہے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا، یا وہ خود راستے سے بھٹک گئے تھے؟ ﴿١٧﴾ وہ کہیں گے تو پاک ہے، ہمارے لائق نہ تھا کہ ہم تیرے سوا کسی بھی طرح کے دوست بناتے اور لیکن تو نے انھیں اور ان کے باپ دادا کو سامان دیا، یہاں تک کہ وہ (تیری) یاد کو بھول گئے اور وہ ہلاک ہونے والے لوگ تھے ﴿١٨﴾

**آیت 17** ① **وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ......** : قیامت کے دن اللہ تعالیٰ غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں کو اور ان سب کو اکٹھا کرے گا جن کی وہ پرستش کرتے رہے تھے۔ ان میں فرشتے بھی ہوں گے، انبیاء بھی، جیسے عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام اور اللہ کے کئی دوسرے نیک بندے بھی، حیوانات بھی ہوں گے، جیسے گائے، سانپ اور بندر وغیرہ، نباتات بھی ہوں گے، جیسے بیل وغیرہ اور جمادات بھی ہوں گے، جیسے بت وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ بے شعور اور بے جان چیزوں کو بھی شعور اور بولنے کی قوت عطا فرمائے گا اور ان سب سے پوچھے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا، یا یہ خود ہی سیدھے راستے سے بھٹک گئے تھے؟

② اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا پہلے ہی علم ہے، اس سوال سے مقصود ایک تو غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں کو لاجواب اور ذلیل و رسوا کرنا ہوگا، دوسرا ان کی پاک باز ہستیوں کی زبانی شرک سے بے زاری کا اعلان ہوگا۔

③ "**وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ**" میں لفظ "**مَا**" استعمال ہوا ہے، جو عموماً غیر عاقل چیزوں کے لیے آتا ہے، حالانکہ وہ انبیاء و اولیاء کی بھی پرستش کرتے تھے۔ شاید ایسا اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ان کی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا ہے، یا اس لیے کہ "**مَا**" عاقل اور غیر عاقل دونوں کے لیے آتا ہے، اگرچہ اکثر غیر عاقل چیزوں کے لیے آتا ہے۔

④ یہ مضمون قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے، فرشتوں سے سوال کے لیے دیکھیے سورۂ سبا (۴۰، ۴۱) اور مسیح علیہ السلام سے سوال کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۱۶)۔

**آیت 18** ① **قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ ......** : یعنی جب ہم خود تیرے سوا کسی کو یار و مددگار نہیں سمجھتے تھے اور تیری توحید پر قائم تھے، تو لوگوں کو اپنے بارے میں کس طرح کہہ سکتے تھے کہ تم اللہ کے بجائے ہمیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا بنالو۔ یہ بات تو ہمیں زیب ہی نہیں دیتی۔ دیکھیے آل عمران (۷۹، ۸۰)۔

② **وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ ......** : "**بُوْرًا**" "بَارَ يَبُوْرُ" سے مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے، یا "بَائِرٌ" کی جمع ہے، ہلاک ہونے والے، یعنی ہم نے انھیں گمراہ نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی کم ظرف اور کمینے لوگ تھے، تو نے انھیں اور ان کے آبا و اجداد

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّ لَا نَصْرًا ۚ وَ مَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ

سو انھوں نے تو تمھیں اس بات میں جھٹلا دیا جو تم کہتے ہو، پس تم نہ کسی طرح ہٹانے کی طاقت رکھتے ہو اور نہ کسی مدد کی اور تم میں سے جو ظلم کرے گا ہم اسے بہت بڑا عذاب چکھائیں گے ﴿۱۹﴾ اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجے مگر بلاشبہ وہ یقیناً کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تمھارے بعض کو بعض

کو ہر قسم کا رزق دیا، یہ کھا پی کر نمک حرام ہو گئے، حتیٰ کہ تیری یاد بھی بھول گئے، جو انھیں سب نعمتیں دینے والا تھا۔ ”الذِّكْرَ“ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ وہ نصیحتیں بھول گئے جو انبیاء نے انھیں کی تھیں۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۴۴)۔

آیت 19 ① فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ : یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو وہ مشرکین سے مخاطب ہو کر فرمائے گا کہ تم نے جنھیں معبود بنا رکھا تھا انھوں نے تو تمھیں تمھاری بات میں جھٹلا دیا اور تم سے بری ہو گئے۔ قیامت کے دن تمام خود ساختہ معبودوں کا اپنے پوجنے والوں سے بری ہونا اور ان کا دشمن بن جانا قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے، دیکھیے سورۂ یونس (۲۸)، نحل (۸۶)، مریم (۸۲)، فاطر (۱۳، ۱۴) اور احقاف (۶)۔

② فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا: یعنی جن سے تم مدد کی توقع رکھتے تھے وہ تمھارے دشمن بن گئے، تو اب تم عذاب سے کسی طرح نہیں بچ سکتے، نہ اسے اپنے آپ سے کسی سفارش یا فدیے سے ہٹا سکتے ہو اور نہ ہی خود یا کوئی اور تمھاری مدد کو آ سکتا ہے۔

③ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا : ظلم سے مراد شرک ہے، دیکھیے سورۂ انعام کی آیت (۸۲): ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ کی تفسیر اور عذاب کبیر سے مراد جہنم ہے۔ مطلب یہ کہ تم سب نے ظلم کا ارتکاب کیا، اس لیے ہم تمھیں جہنم کا عذاب چکھائیں گے، یعنی جہنم میں پھینکنے کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

آیت 20 ① وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ...... : یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ فرمایا، پہلے تمام رسول بھی کھاتے پیتے تھے اور روزی کمانے کے لیے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے بازاروں میں جاتے تھے، بشر تھے فرشتے نہ تھے۔ (دیکھیے یوسف: ۱۰۹۔ انبیاء: ۷، ۸) اگر کھانے پینے اور بازاروں میں چلنے پھرنے کے باوجود تم انھیں رسول مانتے ہو، جیسا کہ تم ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہونے اور ان کی ملت ہونے پر فخر کرتے ہو، نوح، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو پیغمبر مانتے ہو، تو اس رسول پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

② وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ پیغمبر کو سونے چاندی کے خزانے اور باغات و محلات عطا نہیں کیے گئے؟ فرمایا: ”ہم نے تمھارے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنایا ہے“ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عموماً انبیاء کو دنیاوی لحاظ سے معمولی حالت میں رکھتا ہے، ورنہ اگر وہ انھیں دنیا کثرت کے ساتھ دیتا تو بہت سے لوگ مال کے لالچ میں ان کے ساتھ ہو جاتے، سچے جھوٹے مل جل جاتے اور امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا۔ عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان

فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝۲۰

ع ۱۱/۲ ۱۷

کے لیے ایک آزمائش بنایا ہے۔کیا تم صبر کرو گے؟ اور تیرا رب ہمیشہ سے سب کچھ دیکھنے والا ہے ۝۲۰

کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: « إِنَّمَا بَعَثْتُكَ لِأَبْتَلِيَكَ وَ أَبْتَلِيَ بِكَ وَ أَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ تَقْرَأُهُ نَائِمًا وَ يَقْظَانَ » [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها و أهلها ، باب الصفات التي يعرف بها ...... : ۲۸٦٥ ] ”میں نے تجھے صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تیری آزمائش کروں اور تیرے ساتھ (لوگوں کی) آزمائش کروں اور میں نے تجھ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جسے پانی نہیں دھو سکتا، تو اسے سوتے جاگتے پڑھے گا۔“

الغرض! اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ان کے مختلف حالات کی وجہ سے ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے، چنانچہ رسول اور اہل ایمان منکرین کے لیے آزمائش ہیں اور منکرین کے لیے رسول اور اہل ایمان آزمائش ہیں۔غنی فقیر کے لیے آزمائش ہیں، تندرست بیمار کے لیے آزمائش ہیں کہ وہ اپنے سے برتر کو دیکھ کر اپنی حالت پر صبر کرتے ہیں یا نہیں۔فقیر اور بیمار غنی اور تندرست کے لیے آزمائش ہیں کہ وہ اپنے سے کم تر کو دیکھ کر شکر کرتے ہیں یا نہیں۔حقیقت ہے کہ شکر کی بنیاد بھی صبر ہے، جو اپنی حالت پر صابر نہیں وہ کبھی شاکر نہیں ہو سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ اَتَصْبِرُوْنَ ﴾ ”کیا تم صبر کرتے ہو۔“ مطلب یہ ہے کہ صبر کرو۔

③ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا : اس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی یہاں مناسبت رکھتے ہیں، ایک یہ کہ تمھارا رب جو کچھ کر رہا ہے دیکھ کر ہی کر رہا ہے، اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ دوسرا یہ کہ تم جس صدق اور خلوص کے ساتھ کفار کی مخالفت برداشت کرو گے وہ اسے دیکھ رہا ہے اور وہ کبھی تمھاری محنت کی بے قدری نہیں کرے گا۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

اور ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے، یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟ بلاشبہ یقیناً وہ اپنے دلوں میں بہت بڑے بن گئے اور انھوں نے سرکشی اختیار کی، بہت بڑی سرکشی ﴿۲۱﴾

آیت 21 ① وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ......: یہ نبی ﷺ کی نبوت کے منکروں کا چوتھا اعتراض ہے، اللہ تعالیٰ نے ”وَ قَالُوْا“ (اور انھوں نے کہا) یا ”وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا“ (اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا) کہنے کے بجائے فرمایا: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا﴾ (اور ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے) یعنی انھیں اتنی گستاخی کی جرأت اس لیے ہوئی کہ وہ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے۔ یقین تو دور، اگر انھیں قیامت کی اور ہمارے سامنے پیش ہونے کی امید بھی ہوتی تو اتنی بڑی بات ان کے منہ سے نہ نکلتی۔

② منکرین نے کہا کہ (اس نبی پر فرشتہ وحی لے کر اترتا ہے تو) ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں کیے گئے، یا ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہم اپنے رب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے؟ یہ ایسی بات ہے کہ کسی انسان کا حق نہیں کہ زبان پر لانے کی جرأت کرے، کیونکہ یہ اس ذات پاک پر اعتراض ہے جس کی عظمت کی کوئی حد ہے نہ کوئی اس کی حکمتیں معلوم کر سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قسم کا مفہوم رکھنے والے الفاظ ”لَقَدْ“ کے ساتھ فرمایا کہ مجھے قسم ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں بہت بڑے بن گئے اور انھوں نے ایسی سرکشی اختیار کی جو بہت بڑی سرکشی ہے۔ حالانکہ نہ حقیقت میں انھیں کوئی بڑائی حاصل ہے نہ لوگوں کی نگاہ میں۔ آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس نبی کے ساتھ فرشتے اترتے، یا خود رب تعالیٰ سامنے آ کر اس کی تصدیق کرتا۔ گویا ان کے لیے نبی کے واضح معجزات خصوصاً قرآن کی کوئی حیثیت نہیں، جس کی ایک سورت کی مثل وہ نہیں لا سکے۔

③ کفار کا یہ اعتراض اللہ تعالیٰ نے دوسرے کئی مقامات پر بھی ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ﴾ [ الأنعام : ۱۲٤ ] ”اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہمیں اس جیسا دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا، اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔ عنقریب ان لوگوں کو جنھوں نے جرم کیے، اللہ کے ہاں بڑی ذلت پہنچے گی اور بہت سخت عذاب، اس وجہ سے کہ وہ فریب کیا کرتے تھے۔“ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیات (۹۰ تا ۹۳) میں ان مطالبات کا ذکر ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی شرط کے طور پر پیش کیے تھے، ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا: ﴿اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا﴾ [ بني إسرائيل : ۹۲ ] ”یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔“

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾

جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے خوشی کی کوئی خبر نہ ہوگی اور کہیں گے (کاش! ہمارے اوران کے درمیان) ایک مضبوط آڑ ہو ﴿۲۲﴾ اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے ﴿۲۳﴾

④ اللہ تعالیٰ نے اسے بہت بڑا تکبر اور بہت بڑی سرکشی اس لیے قرار دیا کہ انھوں نے اپنے ہر شخص کے لیے نبی کا مرتبہ ملنے کا مطالبہ کیا جو فرشتے کے نزول کی وجہ سے اسے حاصل ہوتا ہے۔ (دیکھیے مدثر: ۵۲، ۵۳) پھر یہیں تک نہیں رہے، بلکہ کئی فرشتوں کے نزول کا مطالبہ کیا جو ان کے پاس اللہ کا پیغام لے کر آئیں۔ اس سے بھی بڑھے تو رب تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کر دیا۔ گویا ان چیزوں کا مطالبہ کر دیا جو نبیوں کو بھی عطا نہیں ہوئیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا تھا، اسے تکبر کیوں نہیں کہا گیا؟ جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کا مطالبہ ایمان کی شرط کے طور پر نہیں کیا تھا بلکہ شوق کے تقاضے سے کیا تھا۔

**آیت 22** ① يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ: یعنی رب تعالیٰ کو دیکھنا تو بہت دور، فرشتوں کو دیکھنا بھی معمولی بات نہیں، جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان مجرموں کے لیے کوئی خوشی کی خبر نہیں ہوگی، کیونکہ وہ ان کے لیے عذاب ہی لے کر آتے ہیں (حجر: ۸) خواہ وہ دنیا میں کوئی عذاب لے کر آئیں یا موت کے وقت ان کے پاس آئیں (انعام: ۹۳۔ انفال: ۵۰۔ محمد: ۲۷، ۲۸) یا قیامت کے دن انھیں دکھائی دیں۔

② وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا: "حِجْرًا" کا معنی آڑ، رکاوٹ ہے، "مَّحْجُوْرًا" تاکید کے لیے ہے، یعنی بہت مضبوط رکاوٹ۔ یعنی جب مجرم فرشتوں کو دیکھیں گے تو چاہیں گے کہ ان کے اور فرشتوں کے درمیان کوئی مضبوط آڑ ہو، کوئی سخت رکاوٹ ہو جس کے ذریعے سے وہ ان سے بچ جائیں۔

**آیت 23** وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ ......: "هَبَآءً" غبار کے ان ذرّات کو کہتے ہیں جو روشن دان کے ذریعے سے کمرے میں آنے والی دھوپ میں چمک رہے ہوتے ہیں، پکڑنا چاہیں تو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کوئی شخص جسے کسی چیز سے شدید کراہت ونفرت ہو وہ اسے کسی دوسرے کے ہاتھوں تباہ و برباد کرنے پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ وہ خود اسے تباہ و برباد کرتا ہے، اس لیے فرمایا کہ جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے، دنیا میں دیکھیں یا آخرت میں، تو انھوں نے اپنے خیال میں جو بھی اچھا عمل کیا ہوگا، خواہ سخاوت ہو یا صلہ رحمی یا مظلوم کی مدد یا بیت اللہ کی آباد کاری اور حاجیوں کی خدمت وغیرہ، ہم خود اس کی طرف آئیں گے اور اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے، کیونکہ عمل کی قبولیت کے لیے ایمان، اخلاص اور اس کا شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے، جب کہ ان کے اعمال اس سے خالی تھے۔ روشن دان سے آنے والی روشنی میں سکون کی حالت میں غبار کے

اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ يَوۡمَئِذٍ خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّ اَحۡسَنُ مَقِيۡلًا ﴿۲۴﴾ وَ يَوۡمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ

اس دن جنت والے ٹھکانے کے اعتبار سے نہایت بہتر اور دوپہر کی آرام گاہ کے اعتبار سے کہیں اچھے ہوں گے ﴿۲۴﴾ اور جس

ذرات پھر بھی کچھ مرتب اور موجود نظر آتے ہیں، لیکن جب انھیں ہوا یا کوئی اور چیز حرکت دیتی ہے تو کچھ ہاتھ نہیں آتا اور وہ سب بکھر کر کالعدم ہو جاتے ہیں، اس لیے انھیں بکھرا ہوا غبار فرمایا۔ (بقاعی) کفار کے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے کہیں "رَمَادٌ" (راکھ) کے ساتھ تشبیہ دی ہے (دیکھیے ابراہیم : ۱۸)، کہیں سراب کے ساتھ (دیکھیے نور : ۳۹) اور کہیں فرمایا کہ ہم ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔ (دیکھیے کہف : ۱۰۵)۔

**آیت 24** ① **اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ يَوۡمَئِذٍ خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا** ...... : جہنمیوں کے ذکر کے ساتھ اہلِ جنت کا ذکر فرمایا کہ وہ اس دن کفار سے ٹھکانے کے اعتبار سے نہایت بہتر اور آرام گاہ کے اعتبار سے کہیں اچھے ہوں گے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار کے لیے تو خیر کا وجود ہی نہیں ہو گا، پھر اہلِ جنت کا ٹھکانے اور آرام گاہ میں ان سے بہتر ہونے کا کیا مطلب؟ جواب یہ ہے کہ دنیا میں کفار کو جو عیش و آرام میسر تھا اہلِ جنت اس دن اس سے کہیں اچھے ٹھکانے اور آرام گاہ میں ہوں گے، یا یہ بات جہنمیوں پر طنز کے طور پر کہی گئی ہے۔

② **اَحۡسَنُ مَقِيۡلًا** : اصل میں "مَقِيۡلًا" کے لفظی معنی ہیں "قیلولہ کرنے کی جگہ" اور قیلولہ گرمی میں دوپہر کے آرام کو کہتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( لَا يَنۡتَصِفُ النَّهَارُ مِنۡ يَوۡمِ الۡقِيَامَةِ حَتّٰى يَقِيۡلَ هٰؤُلَاءِ وَ هٰؤُلَاءِ ثُمَّ قَرَأَ : ﴿ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَاِلَى الۡجَحِيۡمِ ﴾ )) [ مستدرك حاكم : ۲/ ۴۰۲، ح : ۳۵۱۶، صححه الحاكم و وافقه الذهبي ] "قیامت کے دن ابھی دوپہر نہ ہوئی ہو گی کہ یہ لوگ اور وہ لوگ دوپہر کا آرام کر رہے ہوں گے، پھر (کفار کے متعلق) یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَاِلَى الۡجَحِيۡمِ ﴾ [ الصافات : ٦٨ ] "بلاشبہ ان کی واپسی یقیناً اسی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف ہو گی۔"

**آیت 25** **وَيَوۡمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ** ...... : "يَوۡمَ" پر نصب محذوف "اُذۡكُرۡ" کی وجہ سے ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو۔ "تَشَقَّقُ" اصل میں "تَتَشَقَّقُ" ہے، تخفیف کے لیے ایک تاء حذف کر دی ہے۔ "آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ آسمان پھٹ کر اس سے بادل نکلے گا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "تَشَقَّقَتِ الۡاَرۡضُ بِالنَّبَاتِ" "زمین نبات کے ساتھ پھٹی" یعنی زمین پھٹ کر اس میں سے نبات نکلی۔ یعنی اس دن کو یاد کرو جب آسمان پھٹ کر اس میں سے سائبانوں کی صورت ایک بادل نکلے گا، جس میں فرشتے جماعتوں کی صورت میں لگا تار میدانِ محشر میں اتارے جائیں گے، جو زمین پر ہو گا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی ہولناکی اور اس میں واقع ہونے والے عظیم معاملات کا ذکر فرما رہے ہیں، جن میں سے آسمان کا پھٹنا اور بادلوں کے ساتھ اس کا کھل جانا بھی ہے، جو نور کے عظیم سائبانوں کی صورت میں ہوں گے۔ پھر فرشتے اتریں گے اور میدانِ محشر میں تمام انسانوں کو گھیر لیں گے، پھر اللہ اپنے بندوں میں فیصلے کے لیے

# وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾

دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے، لگا تار اتارا جانا ﴿۲۵﴾

تشریف لائے گا۔ مجاہد نے فرمایا، یہ اسی طرح ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ [ البقرۃ : ۲۱۰ ] ”وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی اور کام تمام کر دیا جائے اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔“

اس دن کی کچھ کیفیت ان آیات میں بیان ہوئی ہے، فرمایا: ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ۝ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ۝ فَيَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ۝ وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ۝ وَّ الْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ۝ يَوْمَىِٕذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴾ [ الحاقۃ : ۱۳ تا ۱۸ ] ”پس جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک بار پھونکنا۔ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا۔ تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی۔ اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن کمزور ہوگا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس دن تم پیش کیے جاؤ گے، تمھاری کوئی چھپی ہوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ [ الزمر : ۶۸ تا ۷۰ ] ”اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہوں گے، مر کر گر جائیں گے مگر جسے اللہ نے چاہا، پھر اس میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔ اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ روشن ہو جائے گی اور لکھا ہوا (سامنے) رکھا جائے گا اور نبی اور گواہ لائے جائیں گے اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور ہر شخص کو پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کیا اور وہ زیادہ جاننے والا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ۝ وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ۝ وَ جِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴾ [ الفجر : ۲۱ تا ۲۳ ] ”ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔ اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔ اور اس دن جہنم کو لایا جائے گا، اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں۔“ اتنی صریح آیات کے باوجود کئی بدنصیب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے زمین پر نزول فرمانے کے منکر ہیں اور ایسی تاویلیں کرتے ہیں جو انکار سے بھی بدتر ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۰)، فجر (۲۱ تا ۲۳) اور حاقہ (۱۶، ۱۷) کی تفسیر۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾

اس دن حقیقی بادشاہی رحمان کی ہوگی اور کافروں پر وہ بہت مشکل دن ہوگا ﴿۲۶﴾ اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا، کہے گا اے کاش! میں رسول کے ساتھ کچھ راستہ اختیار کرتا ﴿۲۷﴾ ہائے میری بربادی! کاش کہ میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا ﴿۲۸﴾

**آیت 26** اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ......: یعنی دنیا کی وہ تمام عارضی اور مجازی حکومتیں ختم ہو جائیں گی، جن سے انسان دھوکے میں پڑا رہتا ہے اور ظاہراً، باطناً، صورتاً، یعنی ہر لحاظ سے اکیلے رحمان کی بادشاہت ہوگی اور صرف اسی کا حکم چلے گا اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔ یہ بھی مومنوں پر اس کی رحمت کا تقاضا ہوگا، کیونکہ ان کے دشمنوں کو سزا دینے سے جو خوشی انھیں حاصل ہونی ہے وہ اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی؟ (بقاعی) عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَطْوِي اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ السَّمَاوَاتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَأْخُذُهُنَّ بِيَدِهِ الْيُمْنٰى ثُمَّ يَقُوْلُ أَنَا الْمَلِكُ، أَيْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟ أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟ » [ مسلم، صفات المنافقين، باب صفة القيامة والجنة والنار : ۲۷۸۸ ] ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آسمان کو لپیٹ دے گا، پھر انھیں اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر فرمائے گا، میں ہوں بادشاہ، کہاں ہیں جبار لوگ؟ کہاں ہیں متکبر لوگ؟'' اور دیکھیے سورۂ زمر (۶۷) اور مومن (۱۶) کفار پر اس دن کے سخت ہونے اور مومنوں پر آسان ہونے کا مضمون دیکھیے سورۂ مدثر (۸ تا ۱۰) میں۔

**آیت 27** ① وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ: ظالم سے مراد یہاں وہ مشرک ہے جس نے ایمان قبول نہیں کیا۔ اس کا قرینہ "يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا" ہے، یعنی وہ حسرت و افسوس اور ندامت سے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹے گا۔
② يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا : "سَبِيْلًا" پر تنوین تنکیر کے لیے ہے، کوئی راستہ، کچھ راستہ، یعنی قیامت کے دن جب ایمان والوں کو، وہ خواہ کسی بھی درجے کا ایمان رکھتے ہوں، آخر کار جنت میں داخلہ ملے گا، تو اس وقت کافر کہے گا، کاش! میں نے رسول کے ساتھ کچھ ہی راستہ اختیار کیا ہوتا، کسی بھی درجے میں رسول کی رفاقت اختیار کی ہوتی۔ دیکھیے اس کی ہم معنی آیت: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [ الحجر : ۲ ] کی تفسیر۔

**آیت 28** يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ ...... : "يٰوَيْلَتٰى" اصل میں "يَا وَيْلَتِيْ" ہے، جس میں لفظ "وَيْلَةٌ" یائے متکلم کی طرف مضاف ہے، جسے الف سے بدل دیا گیا ہے، معنی ہے میری ہلاکت، میری بربادی۔ یعنی کافر اپنی ہلاکت کو پکارے گا اور ان لوگوں کا نام لے کر کہے گا جنھوں نے اسے گمراہ کیا تھا کہ کاش! میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک کا نام لینے کے بجائے ہر شخص کے دلی دوست کے لیے "فُلَانًا" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ کفار کی اس ندامت کا ذکر سورۂ بقرہ

لَقَدۡ اَضَلَّنِیۡ عَنِ الذِّکۡرِ بَعۡدَ اِذۡ جَآءَنِیۡ ؕ وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا ﴿۲۹﴾ وَ قَالَ

بے شک اس نے تو مجھے نصیحت سے گمراہ کر دیا، اس کے بعد کہ میرے پاس آئی اور شیطان ہمیشہ انسان کو چھوڑ جانے

(۱۶۷) اور سورۂ احزاب (۶۶ تا ۶۸) میں بھی دیکھیے۔ اس سے معلوم ہوا آدمی کو خوب سوچ سمجھ کر دوست کا انتخاب کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلرَّجُلُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ » [ أبو داوٗد، الأدب، باب من يؤمر أن يجالس : ۴۸۳۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ وحسنه الألباني ] ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کسے دلی دوست بنا رہا ہے۔'' اور آپ ﷺ نے فرمایا: « مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَالسَّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَ نَافِخِ الْكِيْرِ، فَحَامِلُ الْمِسْكِ إِمَّا أَنْ يُّحْذِيَكَ وَ إِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَ إِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا طَيِّبَةً، وَ نَافِخُ الْكِيْرِ إِمَّا أَنْ يُّحْرِقَ ثِيَابَكَ وَ إِمَّا أَنْ تَجِدَ رِيْحًا خَبِيْثَةً » [ بخاري، الذبائح و الصيد، باب المسك : ۵۵۳۴، عن أبي موسٰی رضی اللہ عنہ ] ''نیک اور برے ہم نشین کی مثال کستوری رکھنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی ہے، کستوری رکھنے والا یا تو تجھے عطیہ دے دے گا، یا تو اس سے خرید لے گا، یا اس سے عمدہ خوشبو پاتا رہے گا اور بھٹی دھونکنے والا یا تو تیرے کپڑے جلا دے گا، یا تو اس سے گندی بو پاتا رہے گا۔''

**آیت 29** ① لَقَدۡ اَضَلَّنِیۡ عَنِ الذِّکۡرِ بَعۡدَ اِذۡ جَآءَنِیۡ: اس میں اس تمنا کی وجہ بیان کی ہے کہ کاش! میں فلاں کو دوست نہ بناتا۔ وہ یہ کہ میرے پاس ( الذِّکۡرِ ) کامل نصیحت آئی، مگر اس دوست نے مجھے اس کو قبول کرنے سے بے راہ کر دیا۔ ''الذِّکۡرِ'' سے مراد کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۶، ۹)۔

② وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ...... : ''الشَّیۡطٰنُ'' ''شَطَنَ'' سے مشتق ہے، جس کا معنی دوری بھی ہے اور خباثت بھی۔ شیطان ہر وہ خبیث شخص ہے جو حق سے دور ہو، خواہ انسان ہو یا جن، کیونکہ شیطان دونوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۲) ''خَذُوۡلًا'' چھوڑ جانے والا، ''کَانَ'' کی وجہ سے ''ہمیشہ چھوڑ جانے والا'' ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی شیطان آدمی کو پہلے برے کام کی ترغیب دیتا ہے، جب آدمی وہ کام کر لیتا ہے اور مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کو چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۲۱، ۲۲) رہے دوست، تو قیامت کے دن متقی دوستوں کے سوا سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۶۷)۔

**آیت 30** وَ قَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا...... : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ شکایت دنیا میں کی، کیونکہ کفار نے کہا تھا: ﴿ لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَ الۡغَوۡا فِیۡهِ لَعَلَّکُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۲۶ ] ''اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔'' اور دوسرا یہ کہ قیامت کے دن آپ ﷺ یہ شکایت کریں گے، کیونکہ قرآن مجید میں یقینی مستقبل کے لیے ماضی کا لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ بات قابل توجہ

الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰

والا ہے ۞۲۹ اور رسول کہے گا اے میرے رب! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑا ہوا بنا رکھا تھا ۞۳۰

ہے کہ ''میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑا ہوا بنا رکھا تھا'' کے الفاظ سے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرنے کا مفہوم واضح ہو رہا ہے، جو صرف ''چھوڑ رکھا تھا'' کے الفاظ سے واضح نہیں ہوتا۔ "هٰذَا الْقُرْاٰنَ" میں "هٰذَا" کے لفظ سے قرآن کی عظمت بیان کرنا مقصود ہے، یعنی انھوں نے اتنی عظمت والے قرآن کو اس طرح بنا رکھا تھا جیسے کوئی ایسی چیز ہو جسے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ رہا یہ سوال کہ آیت میں مذکور ''میری قوم'' سے مراد کیا ہے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ ''میری قوم'' کے لفظ سے سب سے پہلے آپ ﷺ کی زندگی میں قرآن پر ایمان نہ لانے والے مراد ہیں، اس کے بعد آپ ﷺ کی بعثت سے لے کر قیامت تک آنے والے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائے، کیونکہ وہ بھی آپ ﷺ کی امتِ دعوت اور آپ کی قوم ہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی امت تھی، جو ایمان نہ لانے کے باوجود ان کی امت اور ان کی قوم تھی۔ ان کے قرآن کو چھوڑنے سے مراد اسے سننے، پڑھنے، اس پر غور و فکر کرنے سے اجتناب اور اس پر ایمان نہ لانا ہے۔ اس کے بعد "قَوْمِي" میں وہ تمام ایمان لانے والے بھی شامل ہیں جنھوں نے کسی طرح بھی قرآن کو چھوڑا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قرآن کو سننے سے گریز، اس میں شور ڈالنا اور اس پر ایمان نہ لانا، اسے چھوڑنا ہے۔ اسی طرح بقدر ضرورت اس کا علم حاصل نہ کرنا اور اسے حفظ نہ کرنا بھی اسے چھوڑنا ہے۔ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہ کرنا، اس کے اوامر پر عمل نہ کرنا اور اس کی منع کردہ چیزوں سے باز نہ آنا بھی اسے چھوڑنا ہے۔ اسے چھوڑ کر دوسری چیزوں کو اختیار کرنا بھی اسے چھوڑنا ہے، مثلاً گانے بجانے کو، عشقیہ اشعار کو، لوگوں کے اقوال و آراء کو اور ان کے بنائے ہوئے طریقوں کو قرآن پر ترجیح دینا اسے چھوڑنا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امتِ مسلمہ نے جس طرح جان بوجھ کر قرآن کو پسِ پشت پھینک رکھا ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ پھینکا ہو۔ ان کے اکثر لوگ دنیا کمانے کے لیے اپنے بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان، تاجر اور صنعت کار بنائیں گے اور اس کام کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کریں گے، مگر انھیں قرآن کی تعلیم نہیں دلوائیں گے اور دلوائیں گے بھی تو صرف ناظرہ قرآن کی یا حفظ کی، جس سے انھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ کتنا ستم ہے کہ دنیا کی کوئی زبان سیکھی جائے تو اس کا ایک لفظ بھی مطلب سمجھے بغیر نہیں پڑھا جاتا، جب کہ قرآن پورا ناظرہ پڑھ لیا جاتا ہے، بعض اوقات حفظ کر لیا جاتا ہے، اس سے آگے اس کی تجوید اور حسن قراءت بھی حاصل کر لی جاتی ہے، مگر اس کا مطلب سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی جاتی۔ جب اس کا مطلب ہی نہیں سمجھا گیا، تو اس پر غور و فکر کا اور اس پر عمل کا مرحلہ کب آئے گا؟ پورا قرآن تو دور کی بات ہے روزانہ پانچ وقت جو نماز وہ پڑھتے ہیں انھیں اس کا مطلب معلوم نہیں، نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم اپنے مالک سے کلام کرتے ہوئے کیا عرض کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام ممالک میں (اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ) قرآن کو مسلمانوں کی زندگی سے عملاً نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ ان کی سیاست کفار سے لی ہوئی جمہوریت ہے، جس میں اللہ اور اس کے رسول کا کوئی دخل

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے کوئی نہ کوئی دشمن بنایا اور تیرا رب ہدایت دینے والا اور مدد کرنے والا کافی ہے ﴿۳۱﴾

نہیں، یا قرآن وسنت کے احکام کی پابندی سے آزاد استبدادی ملوکیت ہے، ان کی تجارت وصنعت کا دار و مدار سود پر ہے، ان کی عدالتوں میں کفار کے قوانین رائج ہیں اور ان کی وضع قطع اور تمدن وتہذیب یہود ونصاریٰ اور ہندوؤں کی سی ہے۔ ان کے ہاں قرآن صرف برکت کے لیے ہے، یا مجلس کے افتتاح کے لیے، یا دم درود اور پیری مریدی میں خود ساختہ وظائف کے لیے، یا محبت وعداوت اور تسخیر قلوب کے عملیات کے لیے، یا اچھے سے اچھے کاغذ اور اچھی جلد والا خرید کر جہیز میں دینے کے لیے ہے، یا خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر اونچی سے اونچی جگہ رکھنے کے لیے۔ وہ اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے، مگر بات اس کی ایک نہیں مانتے۔ ان کے دینی مدارس میں سالہا سال تک انسانوں کے مرتب کیے ہوئے مسائل پڑھائے جاتے ہیں، جب وہ دل و دماغ میں خوب راسخ ہو جاتے ہیں تو انھیں قرآن وحدیث سے دورے کی شکل میں سال دو سال میں فارغ کر دیا جاتا ہے۔ (الا ما رحم ربی)

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم قرآن کو چھوڑنے کی یہ روش ترک کر کے صحابہ وتابعین کی طرح قرآن کی طرف واپس نہیں آئیں گے، اسے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا نہیں بنائیں گے، نصرتِ الٰہی اور باعزت زندگی سے محروم ہی رہیں گے۔ سچ فرمایا امام مالک رحمہ اللہ نے: ''لَنْ يَّصْلُحَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهِ أَوَّلُهَا'' [ شرح سنن أبي داوٗد لعبد المحسن العباد : ۳۳۴/۲ ] ''اس امت کا آخر بھی اسی کے ساتھ درست ہوگا جس کے ساتھ اس کا اول درست ہوا تھا۔''

**آیت 31** ① وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ : چونکہ اس شکایت میں دل کی جلن اور شدید غم کا اظہار تھا، اس لیے اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو تسلی دی کہ قرآن کو چھوڑنے والوں کا یہ طرز عمل صرف تمھارے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ پہلے انبیاء کے ساتھ بھی ایسے ہی رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۲، ۱۲۳)۔

② وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا : اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو بشارتیں دی ہیں، ایک یہ کہ جو لوگ اب اعراض کر رہے ہیں ان میں سے کئی ہدایت قبول کریں گے، یا ان کی پشتوں سے آنے والے ہدایت قبول کریں گے، جیسا کہ پہاڑوں کے فرشتے نے اللہ کے حکم سے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کش کی کہ اگر آپ چاہیں تو میں ان پر مکہ کے دو پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( بَلْ أَرْجُوْ أَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا )) [ بخاري، بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمين ...... : ۳۲۳۱ ] ''بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ نکالے گا جو اکیلے اللہ کی عبادت کریں گے، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے۔'' اور دوسری بشارت نصرتِ الٰہی کی ہے۔ ''وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا'' میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اپنے سارے کام اس کے سپرد کر دو، کیونکہ ہدایت و نصرت کے لیے کفایت کرنے والا وہی ہے۔ (ابن عاشور)

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۛ كَذٰلِكَ ۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ قرآن اس پر ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے اتارا) تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا، خوب ٹھہر کر پڑھنا ﴿۳۲﴾

آیت 32 ① وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ ...... : یہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے منکروں کا پانچواں اعتراض ہے جو بالکل ہی بے کار ہے۔ اعتراض یہ تھا کہ آپ ﷺ پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ سوچ سوچ کر اسے تصنیف کر لیتے ہیں اور یہ انسانی کلام ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ہاں، اسے ایسے ہی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ اعتراض بے کار اس لیے ہے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ چونکہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس لیے ساری کائنات مل کر بھی اس کی ایک سورت کی مثل نہیں بنا سکتی۔ اس سے پہلے قرآن کا جو حصہ نازل ہوا ہے اس کی مثل تو یہ لوگ لا نہیں سکے، اگر پورا قرآن اکٹھا نازل ہو جائے تو اس کی مثل کیسے پیش کریں گے۔ پھر ایسا مطالبہ کیوں؟

② یہاں بھی اگر "وَقَالُوْا" (اور انھوں نے کہا) کہہ دیا جاتا تو کافی تھا، مگر "وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" اس لیے فرمایا کہ ان لوگوں نے جو یہ بات کی ہے اس کی وجہ اس مطالبے کا معقول ہونا نہیں بلکہ اس کا باعث صرف اور صرف کفر ہے، جب کوئی شخص انکار پر تل ہی جائے تو وہ ایسی ہی بے تکی ہانکا کرتا ہے۔

③ كَذٰلِكَ ۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ : یعنی اس طرح تھوڑا تھوڑا نازل کرنے میں بہت سے عظیم فائدے ہیں: ① ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس طرح ہم آپ کے دل کو مضبوط اور قائم رکھتے ہیں، اس طرح کہ جب مشکلات کا ہجوم ہوتا ہے، کفار کوئی اعتراض کرتے ہیں، یا کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو ہم وحی کے ذریعے سے اس کا حل بتا دیتے ہیں، اس طرح بار بار وحی کا نزول ہوتا ہے، جبریل علیہ السلام بار بار آپ کے پاس آتے ہیں، تو اس احساس سے آپ کی ڈھارس بندھ جاتی ہے، حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور دل مضبوط ہو جاتا ہے کہ مالک ہمارے حال سے غافل نہیں، مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے اور ساتھ ساتھ رہنمائی فرما رہا ہے اور اپنے سب سے مقرب فرشتے کو ہمارے پاس بھیج رہا ہے۔ اگر جبریل علیہ السلام ایک ہی دفعہ پورا قرآن لا کر فارغ ہو جاتے تو بار بار پیش آنے والی مشکلات میں دل کو حوصلہ کیسے ملتا اور اسے وہ لذت و قوت کیسے حاصل ہوتی جو اس احساس سے حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قاصد اس کی طرف سے اس کا پیغام لے کر آیا ہے۔

وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد　　ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

"وداع و وصل الگ الگ لذت رکھتے ہیں، تو ہزار بار جا اور سو ہزار بار آ۔"

② ایک وقت میں چند آیات اترنے سے ان کا سمجھنا آسان ہوتا تھا، موقع کی مناسبت سے ان کا مفہوم زیادہ متعین اور واضح

# وَ لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ﴿۳۳﴾

## اور وہ تیرے پاس کوئی مثال نہیں لاتے مگر ہم تیرے پاس حق اور بہترین تفسیر بھیج دیتے ہیں ﴿۳۳﴾

ہو جاتا تھا، یہ امکان ختم ہو جاتا تھا کہ ہر شخص محض لفظوں کو لے کر ان کا جو مفہوم چاہے نکالتا پھرے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے عمل میں آ کر ان آیات کی عملی تصویر بھی سامنے آ جاتی تھی۔ ساری کتاب اکٹھی اترنے میں یہ بات نہ تھی۔ ③ اس طرح قرآنِ مجید اترنے میں احکام تدریج کے ساتھ اترے، جس سے امت کے لیے تخفیف ہوئی، اگر ایک ہی وقت میں چوری، ڈاکے، قتل، شراب، بہتان، زنا، غرض ہر گناہ کی حد بیان کر دی جاتی تو اس پر عمل نہایت مشکل ہوتا۔ ④ مصلحتِ وقت کے لحاظ سے کئی احکام کچھ مدت تک کے لیے تھے، اس کے بعد انھیں منسوخ ہونا تھا، لہٰذا پوری کتاب نازل ہونے کی صورت میں یہ ممکن نہ تھا۔ ⑤ لوگوں کے سوالات کے حل اور کفار کے اعتراضات کے جواب کے لیے بار بار آیات کے نزول سے جو تسلی و تشفی ہوتی تھی وہ بیک وقت قرآن نازل ہونے سے کبھی نہ ہو سکتی تھی۔ ⑥ اہلِ عرب اُمّی لوگ تھے، جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، ان کے لیے چند آیات کو حفظ کرنا آسان تھا، جو ہر موقع پر اترتیں۔ پورا قرآن اترنے میں یہ بات نہ تھی۔ اس طرح قرآن سینوں میں محفوظ ہو گیا، کاغذ کا محتاج نہ رہا۔ لکھی ہوئی پوری کتاب مسلسل یاد کرنے میں سستی ہو سکتی تھی، جس سے صرف لکھی ہوئی کتاب پر انحصار ہو جاتا، نتیجتاً قرآن بھی پہلی کتابوں کی طرح غیر محفوظ ہو جاتا۔ ⑦ چند آیات اترنے سے قرآن کا معجز اور بے مثال کتاب ثابت ہونا زیادہ واضح ہوتا تھا، جب بھی چند آیات اترتیں تو کفار کا ان کے جواب سے قاصر رہنا نمایاں ہوتا۔ اگر پورا قرآن ایک وقت میں اترتا تو اس کا اعجاز اتنا نمایاں نہ ہوتا۔ ⑧ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ [ بني إسرائيل : ۱۰۶ ] ''اور عظیم قرآن، ہم نے اس کو جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ تو اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور ہم نے اسے نازل کیا، (تھوڑا تھوڑا) نازل کرنا۔'' اس قرآن کی مثال بارش کی طرح ہے، بارش جب بھی نازل ہوتی ہے مردہ زمین میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور یہ فائدہ تبھی ہوتا ہے جب بارش وقتاً فوقتاً نازل ہو، نہ کہ ایک ہی مرتبہ ساری بارش ہو جائے۔ ایک مثال اس کی یہ ہے کہ کوئی استاد اپنے شاگرد کو ایک ہی دن میں ساری کتاب پڑھ کر سنا دے۔

④ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا : ''تَرْتِيْلًا'' کا اصل ''تَرْتِيْلُ الْأَسْنَانِ'' سے ہے، ''دانتوں کے درمیان کچھ فاصلہ ہونا'' جیسے بابونہ کے پھول کی پتیاں ہوں، ایسے دانتوں کو ''ثَغْرٌ مُرَتَّلٌ'' کہتے ہیں۔ یعنی اسی طرح قرآن ٹھہر ٹھہر کر تیئیس (۲۳) برس میں نازل ہوا۔

**آیت 33** ﴿ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ ...... : ''مَثَلٌ'' کا معنی کسی چیز کے مشابہ چیز بھی ہے، ضرب المثل یا کہاوت بھی اور کسی چیز کی صفت بھی، جیسے فرمایا: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ [ الرعد : ۳۵ ] ''اس جنت کی صفت جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔'' (راغب) سورت کے شروع سے اللہ تعالیٰ نے کفار کے پانچ اعتراض ذکر فرمائے ہیں اور سب کا دندان شکن جواب دیا ہے، آخر میں خلاصے کے طور پر فرمایا کہ ان لوگوں نے جو شکوک و شبہات اور طعن و اعتراض پیش کیے ہیں، یا

﴿ اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴾ ﴿۳۴﴾ ع ۳

وہ لوگ جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے وہی ٹھکانے میں نہایت برے اور راستے کے اعتبار سے بہت زیادہ گمراہ ہیں ﴿۳۴﴾

قیامت تک پیش کریں گے ہم نے سب کا ایسا جواب دیا ہے اور دیتے رہیں گے جو سراسر حق ہے اور نہایت واضح ہے، ان کے اقوال کی طرح باطل یا غیر واضح نہیں ہے۔ " مَثَلٌ " سے مراد ان کے وہ سوالات، مطالبات اور اعتراضات ہیں جو انھوں نے آپ پر پیش کیے تھے اور " اَلْحَقُّ " سے مراد شبہے کا ازالہ اور سوال کا جواب ہے۔ (شوکانی) دیکھیے ان کا پہلا اعتراض تھا: ﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ﴾ [ الفرقان : ٤ ] اسی کے ضمن میں تھا: ﴿وَ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا﴾ [ الفرقان : ٥ ] دوسرا اعتراض تھا: ﴿وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا ۙ اَوْ یُلْقٰۤی اِلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْكُلُ مِنْهَا﴾ [ الفرقان : ۷، ۸ ] تیسرا اعتراض تھا: ﴿وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا﴾ [ الفرقان: ۸ ] چوتھا اعتراض تھا: ﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰی رَبَّنَا﴾ [ الفرقان : ۲۱ ] اور پانچواں اعتراض تھا: ﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ [ الفرقان : ۳۲ ] ان اعتراضات کو امثال کہنے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا تیسرا اعتراض " وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا " بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا﴾ [ الفرقان : ۹ ] " دیکھ انھوں نے تیرے لیے کیسی مثالیں بیان کیں، سو گمراہ ہو گئے، پس وہ کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔" (ابن عاشور)

**آیت 34** ❶ اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ ...... : اس آیت کو پچھلی آیات کے ساتھ ملائیں تو ان الفاظ کا تقاضا ہے کہ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے، جو یہ ہے کہ "نبی اور قرآن پر اعتراض کرنے والے یہ لوگ اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے" اور وہ لوگ جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے وہی ٹھکانے میں نہایت برے اور راستے کے اعتبار سے بہت زیادہ گمراہ ہیں۔

❷ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیْلًا : " شَرٌّ " اصل میں " أَشَرُّ " ہے، جیسے " خَیْرٌ " اصل میں " أَخْیَرُ " ہے، دونوں اسم تفضیل کے صیغے ہیں، " اَضَلُّ " بھی اسم تفضیل ہے، مگر یہاں تفضیل مراد نہیں، نہ یہ معنی ہے کہ یہ لوگ اہل جنت سے زیادہ برے ہیں۔ یہاں " شَرٌّ " اور " اَضَلُّ " کا لفظ کسی کے مقابلے میں زیادہ برے یا زیادہ گمراہ کے معنی میں نہیں بلکہ صرف مبالغے کے لیے ہے، یعنی نہایت برے اور بہت زیادہ گمراہ ہیں، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "وہی ٹھکانے میں نہایت برے اور راستے کے اعتبار سے بہت زیادہ گمراہ ہیں۔" ٹھکانے سے مراد جہنم ہے اور راستے سے مراد کفر و شرک کا راستہ ہے، جو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ چند آیات پہلے اہل جنت کا وصف بیان ہوا ہے: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا﴾

# وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو بوجھ بٹانے والا بنا دیا (۳۵)

[ الفرقان : ٢٤ ] اس کے مقابلے میں یہاں اہلِ جہنم کا وصف "شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِيْلًا" بیان ہوا ہے۔

③ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ......: دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۷) اور طٰہٰ (۱۲۵) چہروں کے بل اکٹھے کیے جانے کی ایک تفسیر یہ ہے کہ انھیں چہروں کے بل گھسیٹتے ہوئے میدانِ محشر کی طرف لے جایا جائے گا، جیسا کہ جہنم میں بھی ان کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا، فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴾ [ القمر : ٤٨ ] "جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں پر گھسیٹے جائیں گے، چکھو آگ کا چھونا۔" اور فرمایا: ﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ﴾ [ النمل : ٩٠ ] "اور جو برائی لے کر آئے گا تو ان کے چہرے آگ میں اوندھے ڈالے جائیں گے۔" دوسری تفسیر وہ ہے جو انس رضی اللہ عنہ نے روایت فرمائی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: "یا رسول اللہ! کافر کو قیامت کے دن چہرے کے بل اکٹھا کیا جائے گا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَلَيْسَ الَّذِيْ أَمْشَاهُ عَلَى الرِّجْلَيْنِ فِي الدُّنْيَا قَادِرًا عَلٰى أَنْ يُّمْشِيَهُ عَلٰى وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ الذين يحشرون على...... ﴾ : ٤٧٦٠ ] "کیا جس نے اسے ٹانگوں پر چلایا ہے وہ اس پر قادر نہیں کہ اسے قیامت کے دن اس کے چہرے پر چلائے؟" اکثر مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے۔

آیت 35 ① وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پانچ رسولوں اور ان کی اقوام کے قصے اور قومِ لوط کی بستیوں کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ فرمایا ہے، مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے والوں کو گزشتہ اقوام جیسے برے انجام سے ڈرانا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنے سے پہلے جو کتاب عطا فرمائی گئی اس کے متعلق دو قول ہیں، ایک یہ کہ وہ تورات ہی تھی اور فرعون کے غرق ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب الواح کی شکل میں "طور" پر عطا کی گئی وہ پوری تورات نہ تھی، بلکہ اس کا ایک حصہ تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تورات تو فرعون کے غرق ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو "طور" پر ملی، اس سے پہلے فرعون کی طرف روانہ ہوتے وقت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب عطا ہوئی اس سے مراد وحی الٰہی پر مشتمل وہ احکام ہیں جو تورات کے علاوہ تھے، انھیں بھی "کتاب اللہ" کہا جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مزدور کے فیصلے کے متعلق فرمایا تھا جس نے اس شخص کی بیوی سے زنا کیا تھا جس کی وہ مزدوری کر رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ )) "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تم دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنوارے مزدور کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کا اور عورت کو اعتراف کی صورت میں رجم کا حکم دیا۔ [ بخاري، الشروط، باب الشروط التي لا تحل في الحدود : ٢٧٢٤، ٢٧٢٥ ] اس قول کے مطابق فرعون اس کتاب اللہ کی تکذیب کی وجہ سے غرق ہوا جو تورات کے علاوہ تھی اور جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف حدیث کی صورت میں بھیجی گئی تھی۔

فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا ﴿۳۶﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰیَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۳۷﴾ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَیْنَ ذٰلِكَ كَثِیْرًا ﴿۳۸﴾

پھر ہم نے کہا کہ دونوں ان لوگوں کی طرف جاؤ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، برا طرح ہلاک کرنا ﴿۳۶﴾ اور نوح کی قوم کو بھی جب انھوں نے رسولوں کو جھٹلا دیا تو ہم نے انھیں غرق کر دیا اور انھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا اور ہم نے ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۳۷﴾ اور عاد اور ثمود اور کنویں والوں کو اور اس کے درمیان بہت سے زمانے کے لوگوں کو بھی (ہلاک کر دیا) ﴿۳۸﴾

② وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا : دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۲۹ تا ۳۵) اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کسی رسول کو اگر واقعی ضرورت ہو تو اس کا بوجھ بٹانے کے لیے فرشتہ نہیں بھیجا جاتا، جیسا کہ کفار کا مطالبہ ہے، بلکہ آدمی ہی بھیجا جاتا ہے۔

**آیت 36** ① فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ ...... : اس سے پہلی آیت اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے کی ابتدا کا ذکر فرمایا، پھر سارا طویل قصہ حذف کر کے ان دونوں کے قصے کی انتہا کا ذکر فرما دیا، کیونکہ یہاں مقصود اتنی بات ہی تھی، یہ اختصار کا کمال ہے۔

② اِلَى الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا : ان آیات سے مراد یا تو وہ معجزے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے، یا ایک اللہ کی عبادت، موسیٰ علیہ السلام کی نبوت تسلیم کرنے اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کے احکام ہیں، جو اللہ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام لے کر فرعون کے پاس گئے تھے۔ رسول بھیجنے سے پہلے ہی انھیں آیات جھٹلانے والے اس لیے قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ انھوں نے آیات کو جھٹلا دینا ہے، یا اس لیے کہ قرآن کے مخاطب لوگوں کو معلوم تھا کہ فرعون نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا تھا۔ ان کے علم کے اعتبار سے "كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا" فرما دیا۔

③ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا: "تَدْمِیْرًا" کسی چیز کو اس طرح توڑنا کہ پھر درست نہ ہو سکے۔ (الراغب) مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۶)۔

**آیت 37** وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ ...... : اس قوم کی طرف صرف نوح علیہ السلام آئے تھے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلا دیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک پیغمبر کو جھٹلانا سب کو جھٹلانا ہے، کیونکہ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہے۔ ان کی تکذیب اور غرق کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۲۵ تا ۴۹)۔

**آیت 38** ① وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ : نوح علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں جن کی امت انھیں جھٹلانے کی وجہ سے غرق ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام آخری نبی ہیں جن پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے فرعون اور اس کی آل غرق ہوئی۔ اس آیت میں ان کے درمیان کے لوگوں کا ذکر ہے جو پانی کے سوا ہلاک کیے گئے۔ "الرَّسِّ" کا معنی کنواں اور جمع "رِسَاسٌ" ہے۔

وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾

اور ہر ایک، ہم نے اس کے لیے مثالیں بیان کیں اور ہر ایک کو ہم نے تباہ کر دیا، بری طرح تباہ کرنا ﴿۳۹﴾ اور بلاشبہ یقیناً یہ لوگ اس بستی پر آ چکے، جس پر بارش برسائی گئی، بری بارش، تو کیا وہ اسے دیکھا نہ کرتے تھے؟ بلکہ وہ کسی طرح اٹھائے جانے کی امید نہ رکھتے تھے ﴿۴۰﴾

ابن جریر نے فرمایا: ''کلامِ عرب میں "الرَّسِّ" ہر کھودی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں، مثلاً کنواں اور قبر وغیرہ۔'' اس لیے بعض نے اس سے مراد ''اصحاب الاخدود'' بھی لیے ہیں۔ شنقیطی نے فرمایا: ''عاد و ثمود کا قصہ قرآن کی متعدد آیات میں آیا ہے، رہے "اَصْحٰبَ الرَّسِّ" تو قرآن میں نہ ان کے قصے کی تفصیل آئی ہے نہ ان کے نبی کا نام آیا ہے۔'' ان کے متعلق مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں جو سب بے دلیل ہیں، اس لیے ہم نے انھیں ذکر نہیں کیا۔ "الرَّسِّ" ایک وادی کا نام بھی ہے، جس کا زہیر نے اپنے مُعَلَّقه میں ذکر کیا ہے ؎

بَكَرْنَ بُكُوْرًا وَاسْتَحَرْنَ بِسُحْرَةٍ فَهُنَّ لِوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْفَمِ

② وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا: "قَرْنٌ" ایک زمانے کے لوگ جو ایک دوسرے سے ملتے رہے ہوں، "فَهُوَ مِنَ الْاِقْتِرَانِ۔" "بَيْنَ ذٰلِكَ" (اس کے درمیان) سے مراد نوح اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کا یا عاد و ثمود اور اصحاب الرس کے درمیان کا زمانہ ہے۔ دوسری جگہ ان کی کثرت کے متعلق فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [ إبراهيم : ۹ ] ''کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، نوح کی قوم کی (خبر) اور عاد اور ثمود کی اور ان کی جو ان کے بعد تھے، جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ﴾ [ بني إسرائيل : ۱۷ ] ''اور ہم نے نوح کے بعد کتنے ہی زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ بائبل وغیرہ کے حوالے سے نوح اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان آباء کی گنتی اور سالوں کی گنتی کا کچھ اعتبار نہیں، نہ دنیا کی مدت کا کوئی یقینی علم ہے۔ سائنسدانوں کی باتیں بھی محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں۔

آیت 39 ① وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ: یعنی ہم نے ہر ایک کو مثالیں اور دلائل دے دے کر سمجھایا۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے ہر ایک کو پہلی تباہ شدہ قوموں کی مثالیں بیان کر کے سمجھایا۔

② وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا: "تَبَّرَ يُتَبِّرُ تَتْبِيْرًا" کسی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دینا۔

آیت 40 ① وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ ......: "وَلَقَدْ" کا لفظ قسم کا مفہوم رکھتا ہے، یعنی قسم ہے کہ یہ لوگ شام کی طرف جاتے ہوئے قومِ لوط کی بستیوں کے پاس سے گزرتے ہیں، کیونکہ وہ مکہ سے شام کو جانے والے راستے پر تھیں۔ دیکھیے سورۂ حجر (۷۹) اور صافات (۱۳۷)۔

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

اور جب وہ تجھے دیکھتے ہیں تو تجھے نہیں بناتے مگر مذاق، کیا یہی ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ ﴿۴۱﴾ بے شک یہ تو قریب تھا کہ ہمیں ہمارے معبودوں سے گمراہ ہی کر دیتا، اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم ان پر جمے رہے۔ اور عنقریب وہ جان لیں گے جب عذاب دیکھیں گے، کون راستے کے اعتبار سے زیادہ گمراہ ہے ﴿۴۲﴾

② الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ : مراد کھنگر پتھروں کی بارش ہے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۸۲)، حجر (۷۴)، اعراف (۸۴)، شعراء (۱۷۳) اور نمل (۵۸)۔

③ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا...... : ”تو کیا وہ اسے دیکھا نہ کرتے تھے؟“ یعنی یقیناً دیکھا کرتے تھے۔ تو ان کے ایمان نہ لانے کی یہ وجہ نہ تھی کہ انھوں نے ان تباہ شدہ بستیوں کے آثار نہیں دیکھے تھے، بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح دوبارہ زندہ ہونے کی امید نہ رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے انھیں صرف تماشائی کی حیثیت سے دیکھا، ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کے قائل اور اس کے منکر کے دیکھنے میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ ”نُشُوْرًا“ کی تنوین کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے ”بلکہ وہ کسی طرح اٹھائے جانے کی امید نہ رکھتے تھے۔“

**آیت 41** ① وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا : مشرکین رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا جس طرح شدت کے ساتھ انکار کرتے اور آپ کی نبوت اور قرآن پر متعدد اعتراضات کرتے رہتے تھے، اس کے ذکر کے بعد ان کی ایک خاص ایذا کا ذکر فرمایا کہ وہ جب تجھے دیکھتے ہیں تو اپنے مذاق کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔

② اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا : ”هٰذَا“ کا اشارہ آپ ﷺ کی تحقیر کے لیے ہے، یعنی کیا یہی وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رسول ہو کیسے گیا، جب کہ یہ ہمارے جیسا بشر ہے، جیسا کہ ایک جگہ ان کا قول ہے: ﴿ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۹٤ ] ”کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے۔“ پھر دیکھو اگر رسالت کسی بشر کو ملنا ہی تھی تو مکہ اور طائف کے کسی سردار کو ملتی۔ یہ نہ بادشاہ نہ سرمایہ دار، اسے کیسے مل گئی! ان کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [ الزخرف : ۳۱ ] ”اور انھوں نے کہا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟“ شیخ عبد الرحمن السعدی نے فرمایا: ”ان کی یہ بات ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو سب سے بڑھ کر جاہل اور گمراہ ہو اور سخت عناد اور دشمنی رکھتا ہو۔ اس کا مقصد اپنے باطل کی ترویج ہو۔“ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۳٦ ] ”اور جب تجھے وہ لوگ دیکھتے ہیں جنھوں نے کفر کیا تو تجھے مذاق ہی بناتے ہیں، کیا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے، اور وہ خود رحمان کے ذکر ہی سے منکر ہیں۔“

**آیت 42** ① اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا...... : ”اِنْ كَادَ“ اصل میں ”اِنَّهٗ كَادَ“ تھا، یعنی بے شک وہ قریب تھا۔ یعنی

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوٰىهُ ؕ أَفَأَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾

کیا تو نے وہ شخص دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش ہی کو بنا لیا، تو کیا تو اس کا ذمہ دار ہوگا ﴿۴۳﴾

یہ تو یقیناً قریب تھا کہ ہمیں ہمارے معبودوں کی عبادت ہی سے نہیں خود ان معبودوں ہی سے گمراہ کر دیتا، یہ ہماری بہادری ہے کہ ہم ان کی عبادت پر ڈٹے رہے ہیں۔

② اس سے کفار کا اپنے شرک پر شدت کے ساتھ ڈٹے رہنا ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اسے چھوڑنے کو گمراہ ہونا قرار دے رہے ہیں اور یہ بھی کہ ان کا یہ کام کسی دلیل کی بنا پر نہ تھا، بلکہ محض آبا و اجداد کی تقلید اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا۔

③ اس آیت سے ان کا اعتراف ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حق کی دعوت پیش کرنے، اس کے لیے دلائل و معجزات پیش کرنے اور ہر اعتراض کا جواب دینے میں اتنی محنت سے کام لیا کہ کفار کو حق تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، پھر انھوں نے حق قبول نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف اور صرف ان کی ہٹ دھرمی تھی۔

④ پچھلی آیت کے ساتھ ملا کر اس آیت کو دیکھیں تو کفار کی عجیب تضاد بیانی سامنے آتی ہے کہ ابھی جس شخص کے متعلق انھوں نے نہایت حقارت سے کہا کہ کیا یہی ہے وہ جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ تو ابھی اس کی شخصیت کی تاثیر اور اس کے دلائل کی قوت کے بے پناہ ہونے کا اپنے منہ سے اعتراف کر رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اسلام کی دعوت سے کس قدر مرعوب اور بوکھلائے ہوئے تھے کہ مذاق بھی اڑاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور برتری کا احساس ان پر اس قدر حاوی بھی تھا کہ بلا ارادہ ان کے منہ سے وہ باتیں نکلوا دیتا تھا جو وہ ہرگز کہنا نہیں چاہتے تھے۔

⑤ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ...... : یہ ان کے لیے حق کو گمراہی کہنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت وعید ہے۔

**آیت 43** ① أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوٰىهُ : یہ فطری بات ہے کہ کفار کا رسول اللہ ﷺ کو مذاق کا نشانہ بنانا اور اپنے باطل معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہنا آپ ﷺ کے لیے سخت تکلیف دہ تھا، کیونکہ آپ کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایمان لے آئیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے حال پر تعجب دلاتے ہوئے فرمایا: ''کیا تو نے وہ شخص دیکھا جس نے اپنی خواہش ہی اپنا معبود بنا لیا؟'' ابوحیان نے فرمایا: ''وَالْمَعْنٰى أَنَّهُ لَمْ يَتَّخِذْ إِلٰهًا إِلَّا هَوَاهُ'' ''معنی یہ ہے کہ اس نے اپنی خواہش کے سوا کسی کو معبود بنایا ہی نہیں۔'' زمخشری نے فرمایا: ''جو شخص اپنے دین میں خواہش ہی کا حکم مانے، کوئی بھی کام کرنے یا نہ کرنے میں اسی کے پیچھے چلے تو یہ شخص اپنی خواہش کی عبادت کرنے والا اور اسے اپنا معبود بنانے والا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ شخص جو اپنی خواہش کے سوا کسی اور کو اپنا معبود ہی نہیں سمجھتا آپ اسے ہدایت کی طرف کیسے لا سکتے ہیں؟ کیا آپ اس کے ذمہ دار ہیں، یا اسے اسلام لانے پر مجبور کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ تمھیں ہر حال میں اسلام قبول کرنا ہوگا، چاہو یا نہ چاہو، جب کہ دین میں (قبولِ اسلام کے معاملہ میں) زبردستی ہے ہی نہیں، فرمایا: ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [ البقرة : ٢٥٦ ] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔'' اور فرمایا: ﴿وَمَآ أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ﴾ [ق : ٤٥ ] ''اور تو ان پر کوئی زبردستی کرنے والا نہیں۔'' اور فرمایا: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ [ الغاشية : ٢٢ ] ''تو ہرگز ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے۔'' (الکشاف)

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا ﴿۴۴﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَيۡهِ دَلِيۡلًا ﴿۴۵﴾

یا تو گمان کرتا ہے کہ ان کے اکثر سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، وہ نہیں ہیں مگر چوپاؤں کی طرح، بلکہ وہ راستے کے اعتبار سے زیادہ گمراہ ہیں۔﴿۴۴﴾ کیا تو نے اپنے رب کو نہیں دیکھا، اس نے کس طرح سائے کو پھیلا دیا اور اگر وہ چاہتا تو اسے ضرور ساکن کر دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلالت کرنے والا بنایا۔﴿۴۵﴾

اور دیکھیے سورۂ جاثیہ (۲۳) اور فاطر (۸)۔

② کوئی شخص اگر نفس کی خواہش پر کوئی گناہ کر لے اور اپنے آپ کو اللہ کا گناہ گار سمجھے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ ورنہ ہر گناہ شرک ہوگا اور ہر گناہ گار مشرک، جبکہ ایسا نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ ﴾ [ النساء : ٤٨ ] ''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے۔'' طبری نے اپنی معتبر سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا: ''مراد اس سے کافر ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور کسی دلیل کے بجائے اپنی خواہش ہی کو اپنا معبود بنا لے۔''

③ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا : یعنی آپ اس کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہیں، آپ کا کام صرف دعوت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ ﴾ [ الرعد : ٤٠ ] ''تو تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔'' اور دیکھیے سورۂ شوریٰ (۴۸)۔

**آیت 44** اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ...... : راستے کے اعتبار سے زیادہ گمراہ اس لیے کہ جانور تو معذور ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سوچنے سمجھنے کا مادہ ہی نہیں رکھا، مگر افسوس ان پر ہے جو عقل و شعور رکھتے ہیں مگر اس سے کوئی کام نہیں لیتے، یا لیتے ہیں تو الٹا لیتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ چوپائے تو پھر بھی اپنے مالک کے تابع رہتے ہیں، چراگاہ میں چلے جاتے ہیں، پھر واپس ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں، مگر یہ نہ اپنے خالق و مالک کو پہچانتے ہیں نہ اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹)۔

**آیت 45** ① اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ...... : سورت کی ابتدا توحید کے اثبات اور شرک کے رد کے دلائل سے ہوئی ہے، کفار کی گمراہی کے بیان کے بعد ایک بار پھر توحید کے دلائل کا بیان ہے۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ سائے کے پھیلنے اور سکڑنے کو کائنات میں تدریج کے اصول کی مثال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، توجہ اس بات کی طرف دلائی جا رہی ہے کہ یہی اصول قرآن کے آہستہ آہستہ نازل ہونے میں کار فرما ہے۔

② آیت کے شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اپنا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ اَلَمۡ تَرَ اِلٰى

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝۴۶

پھر ہم نے اسے اپنی طرف سمیٹ لیا، تھوڑا تھوڑا سمیٹنا۔ ۴۶

رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ﴾ ''کیا تو نے اپنے رب کو نہیں دیکھا، اس نے کس طرح سائے کو پھیلا دیا۔'' کیونکہ اصل مقصود سائے کی کیفیت کی طرف توجہ دلانا ہے اور آخر میں اپنا ذکر اپنی عظمت کے اظہار کے لیے جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴾ ''پھر ہم نے سورج کو اس پر دلالت کرنے والا بنایا۔''

3 سائے سے مراد روشنی اور تاریکی کے بین بین وہ درمیانی حالت ہے جو سورج نکلنے سے پہلے ہوتی ہے اور دن بھر مکانوں میں، دیواروں کی اوٹ میں اور درختوں کے نیچے رہتی ہے۔ بعض مفسرین نے سائے سے مراد رات کی ظلمت لی ہے، جسے اللہ تعالیٰ سورج غروب ہونے کے ساتھ بتدریج پھیلاتا ہے اور طلوع آفتاب تک بتدریج ختم کرتا ہے۔

4 یعنی تم نے اپنے رب کی عجیب کاری گری نہیں دیکھی کہ اس نے سائے کو اس طرح بنایا کہ طلوع آفتاب تک ہر جگہ پھیلا ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ سورج کو طلوع نہ ہونے دیتا تو وہی سایہ قائم رہتا، مگر اس نے اپنی قدرت سے سورج نکالا، جس سے دھوپ پھیلنا شروع ہوئی اور سایہ بتدریج ایک طرف کو سمٹنے لگا۔ اگر دھوپ نہ آتی تو سائے کو ہم سمجھ بھی نہ سکتے۔ پھر سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہر چیز کا سایہ مغرب کی طرف بہت لمبا اور پھیلا ہوا ہوتا ہے، پھر جیسے جیسے سورج بلند ہوتا ہے سایہ آہستہ آہستہ سکڑتا جاتا ہے، حتیٰ کہ دھوپ پھیلنے سے بالکل ختم ہو جاتا ہے یا تھوڑا سا رہ جاتا ہے، پھر سایہ مشرق کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے جو آخر کار رات کی تاریکی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ سائے کے اس پھیلنے اور سکڑنے میں انسان، حیوان حتیٰ کہ زمین پر پائی جانے والی ہر چیز کے لیے بے شمار فائدے ہیں، بلکہ ان کی زندگی ہی سائے کے اس گھٹنے بڑھنے پر موقوف ہے۔ ہمیشہ سایہ رہے تو زمین پر کوئی جان دار مخلوق بلکہ نباتات تک باقی نہ رہ سکے، کیونکہ ان سب کی زندگی سورج کی حرارت پر موقوف ہے۔ سایہ بالکل نہ رہے تب بھی زندگی محال ہے، کیونکہ ہر وقت سورج کے سامنے رہنے اور اس کی شعاعوں سے کوئی پناہ نہ ملنے کی صورت میں نہ جان دار زندہ رہ سکتے ہیں نہ نباتات، بلکہ پانی تک کا وجود باقی رہنا مشکل ہے، پھر اللہ کا فضل یہ ہے کہ دھوپ چھاؤں کا یہ سلسلہ آہستہ آہستہ بدلتا ہے، اگر یہ تبدیلی یک لخت ہو تب بھی زمین کی مخلوقات کی خیر نہیں۔ دن رات، دھوپ چھاؤں اور موسموں کے تغیر و تبدل کا سارا سلسلہ تدریج کے اصول پر قائم ہے، جس سے مقصود انسان کی ضروریات بہم پہنچانا ہے۔ دن بھر کے اوقات، نمازوں کے ہوں یا کسی اور کام کے، سائے کے بڑھنے گھٹنے سے وجود میں آتے ہیں۔

5 وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۷۱، ۷۲)۔

6 ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا : یعنی اگر دھوپ نہ ہوتی تو کچھ پتا نہ چلتا کہ سایہ کیا ہوتا ہے، کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ (قرطبی) اس کے علاوہ سورج کا سائے پر دلالت کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ سایہ دھوپ کے تابع رہتا ہے، دھوپ ہی کے اعتبار سے وہ بڑھتا گھٹتا اور پھیلتا سمٹتا ہے، گویا دھوپ اس کے لیے بمنزلہ دلیل و راہنما ہے۔ (شوکانی)

آیت 46 1 ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا...... : یعنی آہستہ آہستہ گھٹاتے ہوئے ہم اسے بالکل مٹا دیتے ہیں، جیسے جیسے سورج بلند

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ۝۴۷ ﴾

اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے رات کو لباس بنایا اور نیند کو آرام اور دن کو اٹھ کھڑا ہونا بنایا۔ ۝۴۷

ہوتا ہے سایہ بھی بتدریج کم ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ نصف النہار کے وقت بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سورج کے مغرب کی طرف ڈھلنے کے ساتھ سائے کو بڑھاتے بڑھاتے رات کے آنے پر اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔

② اپنی طرف سمیٹنے سے مراد غائب کرنا اور فنا کر دینا ہے، کیونکہ ہر چیز کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے، ہر چیز اسی کی طرف سے آتی ہے اور اسی کی طرف جاتی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ ﴾ [ هود: ۱۲۳ ] ”اور اللہ ہی کے پاس آسمانوں اور زمین کا غیب ہے اور سب کے سب کام اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔“

③ قَبْضًا یَّسِیْرًا : یعنی اتنا آہستہ کہ پوری طرح اس کے سمٹنے کا ادراک نہایت مشکل ہے۔

**آیت 47** ① وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا ...... : ”سُبَاتًا“ اور ” سَبْتٌ “ (ن، ض) مصدر ہیں، راحت، سکون، قطع کرنا۔ کلام کا اسلوب بطور التفات متکلم سے غائب کی طرف واپس آ گیا ہے۔ سائے اور دھوپ کے بعد رات اور دن کا ذکر فرمایا۔ جملے کے دونوں جز ”هُوَ“ اور ”الَّذِیْ“ معرفہ ہونے سے اس میں قصر افراد پیدا ہو رہا ہے، یعنی رات دن بنانے والا وہ اکیلا ہی ہے، کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں۔ جب تم بھی مانتے ہو کہ رات دن کا ایک لمحہ بنانے میں کسی کا کوئی حصہ نہیں، تو ان کے اندر موجود کسی چیز کا داتا اور دستگیر کوئی دوسرا کیسے بن گیا؟ ” جَعَلَ لَكُمْ “ میں توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دھوپ چھاؤں اور رات دن کا یہ سلسلہ تمھارے لیے بنایا ہے، وہ ہر چیز سے غنی ہے۔ رات کو لباس بنانے کا مطلب یہ ہے کہ روشنی راحت میں خلل انداز ہو سکتی تھی، لہٰذا اس نے رات کو تاریک بنا دیا جو لباس کی طرح ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ رات کی تاریکی میں کتنے ہی دینی و دنیوی فائدے ہیں، کسی غازی، کسی عابد شب بیدار، کسی علم کی لذت یا کسی اونچے مقصد کی لذت سے آشنا ہی کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ البتہ ایک فائدہ ایسا ہے جس سے کوئی بھی محروم نہیں رہتا، نہ اس سے کوئی مستغنی ہو سکتا ہے اور وہ ہے نیند، جو موت کی طرح تمھاری تمام حرکت قطع کر کے تمھیں مکمل سکون کی وادی میں لے جاتی ہے اور تمھاری تھکن دور کرتی اور پورے جسم کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کر دیتی ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۶۰) اور زمر (۴۲)۔

② وَ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا : ”نُشُوْرًا“ میں دو مفہوم پائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ نیند ایک طرح کی موت ہے اور دن کو بیدار ہونا قیامت کو اٹھنے کی ایک مثال ہے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر جاتے تو کہتے: (( بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَ أَحْیَا )) ”تیرے ہی نام کے ساتھ میں مرتا ہوں اور زندہ ہوں گا۔“ اور جب بیدار ہوتے تو کہتے: (( اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْیَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَ إِلَیْهِ النُّشُوْرُ )) [ بخاري، الدعوات، باب ما یقول إذا نام: ۶۳۱۲ ] ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں موت دینے کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔“ دوسرا یہ کہ رات آرام کے لیے اور دن کام کاج اور اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لیے ہے۔ آیت میں اللہ کی توحید کی دلیل بھی ہے اور قیامت پر اس کی قدرت کا اظہار بھی اور نعمت کی یاد دہانی بھی۔ اور دیکھیے سورۂ قصص (۷۳)۔

وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَاۤ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾

اور وہی ہے جس نے ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری کے لیے بھیجا اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا ﴿۴۸﴾ تاکہ ہم اس کے ذریعے ایک مردہ شہر کو زندہ کریں اور اسے اس (مخلوق) میں سے جو ہم نے پیدا کی ہے، بہت سے جانوروں اور انسانوں کو پینے کے لیے مہیا کریں ﴿۴۹﴾

**آیت 48** ① **وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا** ...... : دیکھیے سورۂ اعراف (۵۷) ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہے کہ وہ ہواؤں کو خوش خبری دینے والی بنا کر بھیجتا ہے کہ وہ اپنے بعد بادل آنے کی خوش خبری دیتی ہیں، اور ہواؤں کی کئی قسمیں ہیں جو کئی کاموں پر مقرر ہیں، بعض وہ جو بادلوں کو ابھارتی ہیں، بعض انھیں اٹھاتی ہیں، کچھ انھیں ہانکتی ہیں، کچھ ان سے پہلے بشارت دیتی ہیں، کچھ زمین پر جھاڑو پھیر دیتی ہیں اور کچھ بادلوں میں بار آوری کا کام کرتی ہیں، تاکہ ان سے بارش برسے۔'' یعنی ہواؤں، بادلوں اور بارش کے اس سلسلے کا خالق اور مالک و مختار بھی وہی ہے۔ اس حقیقت کو مشرکینِ مکہ بھی تسلیم کرتے تھے۔

② **وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا** : یہاں پھر غائب سے متکلم کی طرف التفات ہے۔ ''السَّمَآءِ'' سے مراد بادل ہے۔ ''طَهُوْرًا'' ''جس کے ساتھ طہارت حاصل کی جائے'' جیسا کہ ''وَقُوْدٌ'' جس کے ساتھ آگ جلائی جائے، ''وَضُوْءٌ'' جس کے ساتھ وضو کیا جائے، ''سَحُوْرٌ'' جس کے ساتھ سحری کی جائے اور ''سَنُوْنٌ'' جس کے ساتھ دانت صاف کیے جائیں۔ یعنی ہم نے بادل سے پانی اتارا جو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک ہوتا ہے اور ہر طرح کے جراثیم اور زہریلے مادوں سے بھی۔ زمین سے جو پانی بخارات کی صورت میں بادل کی صورت اختیار کرتا ہے وہ بخارات بن کر اڑنے سے پہلے نجس ہو یا زہر آلود، نمکین ہو یا کسی عنصر کے ساتھ ملا ہوا، جب بادل سے برسے گا تو ہر آمیزش اور نجاست سے پاک ہوگا اور صرف خود ہی پاک نہیں ہوگا بلکہ دوسری چیزوں کو بھی نجاست سے پاک کرنے والا ہوگا۔ یہ آیت دلیل ہے کہ کسی بھی چیز کو پاک کرنے کا اصل ذریعہ پانی ہے۔

**آیت 49** ① **لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ** ...... : ''اَنَاسِيَّ'' ''أَنْسِيٌّ'' کی جمع ہے، جیسے: ''کُرْسِيٌّ'' کی جمع ''کَرَاسِيُّ'' ہے یا ''إِنْسَانٌ'' کی جمع ہے جو اصل میں ''أَنَاسِيْنُ'' تھا، جیسے: ''ظَرِبَانٌ'' (بلی جیسا ایک جانور) کی جمع ''ظَرَابِيُّ'' ہے، پھر آخری نون کو یاء سے بدل دیا اور یاء کا یاء میں ادغام کر دیا۔ ''سَقٰی یَسْقِيْ'' پلانا، ''أَسْقٰی یُسْقِيْ'' پلوانا، پینے کے لیے مہیا کرنا۔

② اگر سمندر کا پانی اپنی اصل حالت میں کھیتی کو پلایا جائے تو کھیتی مرجھا کر تباہ ہو جائے اور اگر کوئی جان دار پی لے تو اس کی آنتوں کو کاٹ کے رکھ دے، یا کم از کم زخمی کر دے، لیکن اسی سمندر کے پانی کے بخارات جب بارش میں منتقل ہوتے ہیں تو کیا نباتات، کیا حیوان اور کیا انسان، سب کے لیے یہ پانی حیات بخش ثابت ہوتا ہے، کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور جان دار

وَ لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے ان کے درمیان پھیر پھیر کر بھیجا، تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں، مگر اکثر لوگوں نے سخت ناشکری کرنے کے سوا کچھ نہیں مانا ﴿۵۰﴾

مخلوق بارش ہونے سے پہلے ہواؤں کی آمد ہی پر مسرور ہو کر جھومنے لگتی ہے۔ نباتات ہی سے جان دار مخلوق کو غذا حاصل ہوتی ہے اور اس کے پینے کے لیے اللہ تعالیٰ صاف ستھرا پانی دیتا ہے۔ جمادات کے علاوہ اس کائنات ارضی پر کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کی زندگی کی بقا پانی کے بغیر ممکن ہو۔ (کیلانی)

③ ان دو آیات میں بھی اللہ کی توحید، موت کے بعد زندگی کے دلائل اور اللہ کی نعمت کی یاددہانی تینوں چیزیں موجود ہیں۔

آیت 50 ① وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ ...... : اس آیت کی دو تفسیریں ہیں اور دونوں درست ہیں۔ اگر ”صَرَّفْنٰهُ“ میں ”ہٗ“ کی ضمیر اوپر بیان کردہ دلائل کی طرف ہو، جیسا کہ اکثر مفسرین کا رجحان ہے، تو معنی یہ ہوگا کہ ہم نے توحید کے دلائل کو قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے پھیر پھیر کر بیان کیا ہے، تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں، مگر اکثر لوگوں نے توحید قبول نہیں کی اور انھوں نے ناشکری اور کفر کے سوا کچھ مانا ہی نہیں۔ اور اگر ”صَرَّفْنٰهُ“ کی ضمیر ”مَآءً“ کی طرف ہو تو معنی یہ ہوگا کہ ہم نے اس پانی کو ان کے درمیان طرح طرح سے پھیرا ہے، چنانچہ وہ کہیں زیادہ برستا ہے کہیں کم۔ سب جگہ ایک جیسا اور ایک وقت میں نہیں برستا، کسی جگہ بارش سے سیلاب آجاتا ہے تو دوسری جگہ بارش کا ایک قطرہ نہیں گرتا اور قحط پڑ جاتا ہے، کہیں وہ مائع صورت میں ہے، کہیں پتھر کی طرح برف کی صورت میں اور کہیں بخارات کی صورت میں۔ غرض یہ سب اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے فرمایا: « مَا مِنْ عَامٍ أَمْطَرَ مِنْ عَامٍ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَصْرِفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ﴾ » [ مستدرك حاكم : ٤٠٣/٢، ح : ٣٥٢٠۔ طبري : ٢١٢١٦۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٤٦٠/٥، ح : ٢٤٦١ ] ”یعنی کوئی سال ایسا نہیں جس میں دوسرے کسی سال سے زیادہ بارش ہوتی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ جیسے چاہتا ہے اسے پھیرتا ہے۔“ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ﴾ [ الفرقان : ٥٠ ] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے ان کے درمیان پھیر پھیر کر بھیجا، تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔“ دکتور حکمت بن بشیر نے اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ سعید بن جبیر کے واسطے سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسی سند کے ساتھ روایت کر کے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول طبری اور بیہقی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے اسے صحیح کہا ہے۔ [ السنن الكبرى للبيهقي : ٣٦٣/٣ ]

ان دو جلیل القدر صحابہ کے قول کی رو سے یہ تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ بات وہ اپنے پاس سے نہیں کہہ سکتے، اس لیے یہ حکماً مرفوع ہے۔ ابن عاشور لکھتے ہیں: ”جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بارش زمین پر ہر سال مجموعی طور پر ایک جیسی ہوتی ہے اور یہی بات سیکڑوں برس پہلے وحی کے ذریعے سے بتا دی گئی تھی۔“

# وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾

اور اگر ہم چاہتے تو ضرور ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے ﴿۵۱﴾

② لِيَذَّكَّرُوْا: یعنی بارش کو اس طرح پھیر پھیر کر مختلف جگہوں پر کم یا زیادہ نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں، بارش کو محض اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل کا نتیجہ مانیں، اس کے برسنے پر اللہ کا شکر ادا کریں اور نہ برسنے پر توبہ و استغفار کریں۔

③ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا: "كُفُوْرًا" اور "كُفْرٌ" دونوں مصدر ہیں، "كُفُوْرًا" میں حرف زیادہ ہونے کی وجہ سے مبالغہ ہے، یعنی سخت ناشکری۔ ناشکری یہ کہ اس بارش کو ستاروں کا کرشمہ قرار دیا جائے۔ زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیبیہ میں ایک بارش کے بعد، جو رات کے وقت ہوئی تھی، صبح کی نماز پڑھائی، جب فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: (( هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ : قَالَ أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَ كَافِرٌ، فَأَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ رَحْمَتِهِ، فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ، وَ أَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَ كَذَا، فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ وَ مُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ )) [ مسلم، الإيمان، باب بيان كفر من قال مطرنا بالنوء : ۷۱۔ بخاري : ۸۴۶ ] "جانتے ہو آج رات تمھارے رب نے کیا فرمایا ہے؟" انھوں نے کہا: "اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔" کہا، اس نے فرمایا ہے: "آج میرے بندوں نے صبح کی ہے کہ کچھ مجھ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور کچھ کفر کرنے والے ہیں۔ جس نے کہا، ہم پر اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی ہے، تو یہ مجھ پر ایمان رکھنے والا اور ستارے کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اور جس نے کہا، ہم پر فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی تو یہ ستارے پر ایمان رکھنے والا اور میرے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔"

**آیت 51** ① وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا : یعنی جس طرح ہم نے بارش کو مختلف شہروں اور ملکوں میں بانٹ دیا، اگر ہم چاہتے تو اسی طرح ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے، مگر ہم نے ایسا نہیں چاہا، کیونکہ اس سے الگ الگ امتیں وجود میں آتیں، جن کا آپس میں اختلاف ہوتا، اس لیے ہم نے ساری زمین کے لیے ایک آفتاب کی طرح سب کے لیے ایک ہی ڈرانے والا مقرر فرمایا کہ سب اس کی اطاعت کریں اور ان کے انکار کی صورت میں وہ سب کے ساتھ قتال کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت تک کے تمام لوگوں کے لیے نذیر ہونے کا ذکر اسی سورت کے شروع میں بھی ہے: ﴿ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ مزید حوالہ جات کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۸)۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی کمال قوت اور بے نیازی کا اظہار بھی ہے اور اس کی حکمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کمال نعمت کا بھی۔ فرمایا اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے اور جس شان کا چاہتے بھیج دیتے، کسی کی جرأت نہ تھی کہ ہمیں روک سکتا، مگر ہم نے یہ نہیں چاہا، بلکہ یہ چاہا ہے کہ یہ عزت و رفعت "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کو ملے، فرمایا: ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ [ الم نشرح : ۴ ] "اور ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر دیا۔" اور فرمایا: ﴿ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ [ بني إسرائيل :

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

پس تو کافروں کا کہنا مت مان اور اس کے ساتھ ان سے جہاد کر، بہت بڑا جہاد ﴿۵۲﴾

۷۹ ] ’’قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے۔‘‘

آیت 52 ① فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ: چونکہ ہم نے ہر بستی کی طرف الگ الگ نذیر بھیجنے کے بجائے تمام جہانوں کے لیے آپ ہی کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اس لیے آپ کافروں کا کہنا مت مانیے، خواہ وہ معجزوں کا مطالبہ کریں یا طعن و تشنیع اور ٹھٹھے مذاق کے ساتھ دعوت سے روکنے کی کوشش کریں، یا مداہنت کی پیش کش کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ [ القلم : ۹ ] ’’وہ چاہتے ہیں کاش! تو نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کریں۔‘‘

② وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا: ”جَاهَدَ يُجَاهِدُ جِهَادًا وَ مُجَاهَدَةً“ (مفاعلہ) کسی کے مقابلے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دینا۔ ”بِهٖ“ سے مراد قرآن مجید ہے، جس کا تذکرہ ”وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ“ میں گزرا ہے اور جس کے ذکر کے ساتھ سورت کی ابتدا ہوئی ہے، فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ یعنی اگر ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیجا جاتا تو آپ کے بوجھ میں کمی ہو جاتی، اب تمام لوگوں تک پیغام پہنچانے کی ذمہ داری کی وجہ سے آپ کا بوجھ بہت زیادہ ہو گیا ہے، اس لیے آپ اس قرآن کو لے کر جہاد کبیر کریں۔ ’’جہاد کبیر‘‘ سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے اس سے مراد اپنی آخری کوشش تک لگا دینا ہے، یعنی دعوت کے ذریعے سے بھی اور جب ممکن ہو قتال کے ذریعے سے بھی۔ رازی لکھتے ہیں: ’’بعض مفسرین نے فرمایا، یہاں جہاد سے مراد اللہ کا پیغام پہنچانے اور دعوت میں پوری کوشش کرنا ہے اور بعض نے فرمایا، قتال (لڑائی) کے ساتھ جہاد مراد ہے اور بعض نے فرمایا، دونوں کے ساتھ جہاد مراد ہے۔‘‘ رازی نے فرمایا: ’’پہلی تفسیر زیادہ قریب ہے، کیونکہ سورت مکی ہے اور قتال کا حکم ہجرت کے بھی کچھ دیر بعد نازل ہوا۔‘‘ مگر حقیقت یہ ہے کہ زیادہ قریب بات یہ ہے کہ دعوت و قتال دونوں کے ساتھ جہاد مراد ہے، کیونکہ لفظ جہاد (پوری کوشش صرف کرنے) کا تقاضا بھی یہی ہے اور لفظ ’’کبیر‘‘ کا بھی۔ رہی یہ بات کہ یہ سورت مکی ہے، تو مکی سورتوں میں بھی قتال کا ذکر موجود ہے، اگرچہ حکمت الٰہی کے پیش نظر ہجرت سے پہلے قتال کی اجازت نہیں دی گئی، جیسا کہ سورۂ مزمل میں (جو بالاتفاق مکی ہے) فرمایا: ﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ [ المزمل : ۲۰ ] ’’اس نے جان لیا کہ یقیناً تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں لڑیں گے، پس اس میں سے جو میسر ہو پڑھو۔‘‘ اور عروہ بن زبیر نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ’’قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ سے زیادہ جو ایذا دی وہ کیا تھی؟‘‘ تو انھوں نے دو دنوں کا ذکر فرمایا، جن میں سے ایک وہ دن تھا جب عقبہ بن ابی معیط نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں چادر ڈال کر گلا گھونٹا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے دھکا دے کر آپ کو چھڑایا اور ایک اس سے پہلا دن کہ جب آپ طواف کر رہے تھے اور جب آپ کفار قریش کے پاس سے گزرتے تو وہ کوئی نہ کوئی تکلیف دہ بات کرتے، تین چکروں میں ایسا ہی ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( تَسْمَعُوْنَ

وَ هُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا دیا، یہ میٹھا ہے، پیاس بجھانے والا اور یہ نمکین ہے کڑوا اور اس نے ان دونوں

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! أَمَا وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِالذَّبْحِ ‏» [مسند أحمد :۲/۲۱۸، ح:۷۰۵٤۔ مسند أبي يعلى: ٦/٤٢٥، ح: ۷۳۳۹ ] ’’قریشیو! سنتے ہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! میں تمھارے پاس (تمھارے) ذبح (کا پیغام) لے کر آیا ہوں۔‘‘ مسند احمد اور مسند ابی یعلیٰ دونوں کی تحقیق میں اسے حسن کہا گیا ہے۔

ذبح کا یہ حکم جسے لے کر رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے، جب اس پر عمل کا وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر عمل کر کے دکھایا اور فرمایا: « أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ » [ بخاري، الإيمان، باب:﴿ فإن تابوا و أقاموا الصلاة...... ﴾ : ۲۵، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] ’’مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام لوگوں سے لڑوں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کا رسول ہے۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، جب وہ یہ کام کرلیں تو انھوں نے مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔‘‘

③ جہادِ کبیر کی تفسیر دعوت و قتال دونوں کے ساتھ کرنا اس لیے بھی راجح ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: « أَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ؟ » ’’کون سا جہاد افضل ہے؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ أُهْرِيْقَ دَمُهُ وَ عُقِرَ جَوَادُهُ » [ ابن ماجه، الجهاد، باب القتال في سبيل الله : ۲۷۹٤، قال الشيخ الألباني صحيح ] ’’جس کا خون بہا دیا گیا اور اس کا گھوڑا کاٹ دیا گیا۔‘‘ اور طارق ابن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے اس وقت رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا جب آپ رکاب میں پاؤں رکھ چکے تھے: « أَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ؟ » ’’کون سا جہاد افضل ہے؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: « كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ » [ نسائي، البيعة، باب فضل من تكلم بالحق عند إمام جائر : ٤٢١٤ ] ’’کسی ظالم بادشاہ کے پاس حق بات کہہ دینا۔‘‘ ظاہر ہے ظالم بادشاہ کے سامنے وہی شخص کلمۂ حق کہہ سکتا ہے جو اس کے سامنے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جائے گا، یہ ہر ایرے غیرے کا کام نہیں۔ اس لیے پچھلی حدیث میں اور اس میں کوئی تضاد نہیں۔

④ اس مقام پر ایک روایت بیان کی جاتی ہے، جس میں مال و جان کی قربانی والے جہاد کو جہاد اصغر قرار دیا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ قَالُوْا وَمَا الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ؟ قَالَ جِهَادُ الْقَلْبِ » ’’ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف واپس پلٹ آئے ہیں۔‘‘ لوگوں نے کہا: ’’تو وہ جہادِ اکبر کیا ہے؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جہاد القلب (دل کا جہاد)۔‘‘ ’’اَلْمَقُوْلُ مِنْ مَا لَيْسَ بِمَنْقُوْلٍ‘‘ کے مصنف ولید بن راشد السعیدان لکھتے ہیں: ’’حافظ ابن حجر نے (تسدید القوس میں) فرمایا، یہ ابراہیم بن ابی عبلہ کا کلام ہے۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ اس کا اصل کچھ نہیں اور یہ جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت 53 ① وَ هُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ ...... : ’’فُرَاتٌ‘‘ ’’فَرُتَ يَفْرُتُ‘‘ کا معنی توڑ دینا ہے، میٹھا پانی پیاس کو ختم

وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝۵۳

کے درمیان ایک پردہ اور مضبوط آڑ بنا دی ۝۵۳

کرتا ہے، اس لیے اسے " فُرَاتٌ " کہتے ہیں۔ توحید کے دلائل جو "اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ" سے شروع ہوئے تھے یہ ان کا چوتھا سلسلہ ہے۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی قدرت کے کمال اور انسان پر اس کے انعامات تینوں چیزوں کا بیان ہے۔ اس کی ہم معنی آیت سورۂ رحمٰن میں ہے: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ﴾ [ الرحمٰن: ۱۹، ۲۰ ] "اس نے دو سمندروں کو ملا دیا، جو اس حال میں مل رہے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے (جس سے) وہ آگے نہیں بڑھتے۔" "هُوَ الَّذِيْٓ" میں مبتدا اور خبر دونوں کے معرفہ ہونے سے قصر کا مفہوم ادا ہو رہا ہے کہ دو سمندروں کو اس طرح ملانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ زمین کے تقریباً ستر (۷۰) فیصد حصے پر سمندر ہے جس کا پانی سخت نمکین ہے، بظاہر اس کے ساتھ ملا ہوا میٹھے پانی کا کوئی سمندر نہیں اور یہ بات یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بات کسی صورت غلط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مفسرین نے آیت کے کئی مصداق بیان فرمائے ہیں اور سبھی درست ہیں۔ ایک مصداق اس کا یہ ہے کہ عربی میں بحر کا لفظ پانی کے بڑے ذخیرے پر بولا جاتا ہے، اس لیے یہ لفظ سمندر اور دریا دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو اس سے مراد زمین پر موجود پانی کے دو بڑے ذخیرے ہیں، ایک میٹھا جو دریاؤں، جھیلوں اور ندی نالوں کی صورت میں ہے اور دوسرا کڑوا جو سمندر کی صورت میں ہے۔ ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے زمین کی اوٹ بنا دی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی اپنی جگہ رہتے ہیں، نہ نمکین میٹھے پر غالب آتا ہے اور نہ میٹھا نمکین پر۔ اس کا واضح مشاہدہ جزیروں پر ہوتا ہے، جہاں سمندر کے سخت نمکین پانی کے ساتھ ہی میٹھے پانی کا دریا چل رہا ہوتا ہے۔

دوسرا مصداق اس کا یہ ہے کہ اس سے مراد زمین کے نیچے موجود پانی کے دو سمندر ہیں، جن میں سے ہر ایک کی رو دوسرے کی رو کے بالکل ساتھ چل رہی ہے، ایک جگہ نلکا لگائیں تو میٹھا پانی نکلتا ہے اور بعض اوقات اس کے قریب ہی دوسرا نلکا لگانے سے نمکین پانی نکلتا ہے، حتیٰ کہ دیوار کی ایک طرف کا پانی میٹھا ہوتا ہے اور دوسری طرف کا نمکین، نہ یہ اس کی نمکینی میں دخل دیتا ہے اور نہ وہ اس کی شیرینی میں۔ میری دانست میں یہ صورت سب سے واضح ہے، ہر شخص اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور اس پر کسی ملحد کے لیے اعتراض کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ تیسرا مصداق اس کا وہ مقام ہے جہاں کسی بڑے دریا کا پانی سمندر میں گرتا ہے اور اس کے اندر دور تک چلا جاتا ہے، اس کا رنگ اور ذائقہ سمندر کے پانی کے رنگ اور ذائقے سے الگ رہتا ہے، دونوں کے درمیان نظر نہ آنے والی رکاوٹ حائل رہتی ہے۔ مفسر ابوحیان لکھتے ہیں: " وَ نِيْلُ مِصْرَ فِيْ فَيْضِهِ يَشُقُّ الْبَحْرَ الْمَالِحَ شَقًّا بِحَيْثُ يَبْقٰى نَهْرًا جَارِيًا أَحْمَرَ فِيْ وَسْطِ الْمَالِحِ لِيَسْتَقِيَ النَّاسُ مِنْهُ " [ البحر المحیط ] "یعنی مصر کا دریائے نیل اپنی طغیانی کے زمانے میں نمکین سمندر کو چیرتا ہوا شور سمندر کے وسط میں سرخ رنگ کے دریا کی صورت میں دور تک بہتا چلا جاتا ہے، جس سے لوگ پینے کے لیے پانی حاصل کرتے ہیں۔" چوتھا مصداق اس کا یہ ہے کہ کھارے اور کڑوے سمندر کے درمیان ایسے ذخیرے موجود ہیں جن کا پانی بالکل میٹھا ہے۔ ابوحیان ہی نے لکھا ہے: " وَ تَرَى الْمِيَاهَ قِطَعًا فِيْ وَسْطِ الْبَحْرِ الْمَالِحِ فَيَقُوْلُوْنَ هٰذَا مَاءٌ ثَلْجٌ فَيَسْقُوْنَ مِنْهُ مِنْ وَسْطِ الْبَحْرِ " [ البحر المحیط ] "یعنی نمکین سمندر کے وسط

وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِہۡرًا ؕ وَ کَانَ رَبُّکَ قَدِیۡرًا ﴿۵۴﴾

اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر کو پیدا کیا، پھر اسے خاندان اور سسرال بنا دیا اور تیرا رب ہمیشہ سے بے حد قدرت والا ہے۔ ﴿۵۴﴾

میں (میٹھے) پانی ٹکڑوں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں، جن کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ یہ برف کا پانی ہے اور وہ سمندر کے درمیان اس سے پینے کا پانی حاصل کرتے ہیں۔"

تفہیم القرآن میں ہے: "خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں، جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتب رومی) اپنی کتاب "مرآۃ الممالک" میں (جو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے) خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشان دہی کرتا ہے، اس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں، جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداءً وہ بھی خلیج فارس کے انھی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی، بعد میں "ظہران" کے پاس کنویں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔ بحرین کے قریب بھی سمندر کی تہ میں آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے لوگ کچھ مدت پہلے تک پینے کا پانی حاصل کرتے رہے ہیں۔"

(2) اس آیت میں نعمت کی یاد دہانی کس طرح ہے، اس کے لیے میٹھے اور نمکین سمندروں میں سے میٹھے پانی کے فوائد بیان کرنے کی تو خاص ضرورت ہی نہیں، کیونکہ خشکی کے ہر جان دار کی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے، البتہ نمکین سمندر میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کا مشاہدہ کئی طرح سے ہوتا ہے۔ "تفسیر احسن البیان" میں ہے: "سمندری پانی کھارا رکھنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے۔ میٹھا پانی زیادہ دیر کہیں ٹھہرا رہے تو وہ خراب ہو جاتا ہے، اس کے ذائقے، رنگ یا بو میں تبدیلی آ جاتی ہے، کھارا پانی خراب نہیں ہوتا، نہ اس کا ذائقہ بدلتا ہے، نہ رنگ اور بو۔ اگر ان ساکن سمندروں کا پانی بھی میٹھا ہوتا تو اس میں بدبو پیدا ہو جاتی، جس سے انسانوں اور حیوانوں کا زمین میں رہنا مشکل ہو جاتا۔ اس میں مرنے والے جانوروں کی سڑاند اس پر مستزاد۔ اللہ کی حکمت تو یہ ہے کہ ہزاروں (لاکھوں) برس سے یہ سمندر موجود ہیں، ان میں ہزاروں (لاکھوں بلکہ کروڑوں) جانور مرتے ہیں اور انھی میں گل سڑ جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں ملاحت (نمکیات) کی اتنی مقدار رکھ دی ہے کہ وہ اس کے پانی میں ذرا بھی بدبو پیدا نہیں ہونے دیتی، ان سے اٹھنے والی ہوائیں بھی صحیح ہیں اور ان کا پانی بھی پاک ہے، حتیٰ کہ ان کا مردار بھی حلال ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: (( هُوَ الطَّهُورُ مَاءُهُ الْحِلُّ مَيْتَتُهُ )) [ أبوداوٗد، الطھارۃ، باب الوضوء بماء البحر : ۸۳ ] "اس (سمندر) کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے۔" (احسن البیان) پانی کا یہ عظیم ذخیرہ ہزاروں لاکھوں ٹن وزنی سامان مختلف مقامات پر پہنچانے کا آسان ترین ذریعہ بھی ہے، خوراک اور ضروریات زندگی کا لامحدود خزانہ بھی اور تمام جان داروں اور پودوں کو میٹھا پانی مہیا کرنے کے لیے بادلوں اور بارشوں کی پیدائش کا منبع بھی۔ اس کے علاوہ موسموں کے رد و بدل میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ فاطر (۱۲)، نحل (۱۴)، حج (۶۵)، زخرف (۱۱، ۱۲) اور جاثیہ (۱۲)۔

آیت 54 (1) وَهُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا...... : یہ توحید کے دلائل کی پانچویں قسم ہے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾

اور وہ اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نفع دیتی ہے اور نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہے اور کافر ہمیشہ رب کے خلاف مدد کرنے والا ہے ﴿۵۵﴾

توحید، اس کی قدرت کاملہ اور آدمی پر انعام تینوں کا ذکر ہے۔ ''بَشَرًا'' کا لفظ ''اَلْبَشَرَۃُ'' (کھال، ظاہری جلد) سے ہے، دوسرے تمام جانوروں کا جسم بالوں سے یا پروں وغیرہ سے چھپا ہوتا ہے، جبکہ انسان کی جلد اس سے صاف ہوتی ہے، اس لیے اسے ''بشر'' کہا جاتا ہے۔ پچھلی آیت میں خالق و مالک اور تنہا معبود ہونے کی دلیل کے طور پر دو پانیوں کو ملنے سے روکنے کی قدرت کا ذکر تھا اور اس آیت میں انھیں ملانے کا ذکر ہے، فرمایا: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ [ الدھر : ۲ ] ''بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا۔'' تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ کائنات میں سب کچھ خود بخود ہر چیز کی طبیعت کے تقاضے سے ہو رہا ہے۔ نہیں! یہ اس زبردست مالک و مختار کا کام ہے، چاہتا ہے تو سمندروں کو ملنے سے روک دیتا ہے، چاہتا ہے تو قطرے کو باہم ملا دیتا ہے اور پانی پر صورت گری اور نقش آفرینی فرما دیتا ہے۔

② فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا : یعنی یہی کرشمہ بجائے خود کیا کم تھا کہ وہ ایک حقیر قطرے سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق بنا دیتا ہے، اس پر مزید یہ کہ اس نے انسان کا ایک نمونہ ہی نہیں، دو الگ الگ نمونے (عورت اور مرد) بنا دیے، فرمایا: ﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى﴾ [ القیامۃ : ۳۹ ] ''پھر اس نے اس سے دو قسمیں نر اور مادہ بنائیں۔'' پھر وہ مذکر ہو یا مؤنث، ان سب کی نسبت باپ دادا کی طرف ہوتی ہے، فلاں بن فلاں اور فلانہ بنت فلاں۔ جب مرد اور عورت کی آپس میں شادی ہوتی ہے تو ان کے بہت سے سسرالی رشتے دار بن جاتے ہیں، خاندانی قبیلوں اور قوموں کا یہ سارا پھیلاؤ ایک قطرۂ منی سے وجود میں آتا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء کی پہلی آیت اور سورۂ حجرات (۱۳)۔

③ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا : یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ہیں، کیونکہ تیرا رب ہمیشہ سے بے حد قدرت والا ہے۔ ہمیشگی کا مفہوم ''كَانَ'' سے ظاہر ہو رہا ہے۔

**آیت 55** ① وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ ...... : انسان کو کسی کی عبادت اور خود سپردگی پر آمادہ کرنے والی چیز اس سے فائدے کی امید ہوتی ہے یا نقصان کا خوف۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے انعامات اور عاد و ثمود اور دوسری قوموں کو دی جانے والی سزائیں شمار کرنے کے بعد کفار کی بے عقلی بیان فرمائی کہ وہ اس محسن کو چھوڑ کر جس نے انھیں پانی کی ایک بوند سے پیدا فرما کر ضرورت کی ہر چیز اور ہر نعمت عطا فرمائی ہے، ان بے حقیقت چیزوں کی پوجا کر رہے ہیں جو نہ انھیں کوئی فائدہ پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان۔ ''يَعْبُدُوْنَ'' مضارع کا صیغہ (جو استمرار کے لیے ہے) ان کے حال پر تعجب کے لیے ذکر فرمایا کہ یہ نہیں کہ انھوں نے ایک آدھ دفعہ یہ کمینگی کی ہو، بلکہ کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے سوا تمام ہستیوں کے نفع و نقصان کے مالک ہونے کی اور عبادت کا حق دار ہونے کی نفی بار بار فرمائی ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر ﴿۵۶﴾ کہہ دے میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا مگر جو چاہے کہ اپنے رب کی طرف کوئی راستہ اختیار کرے ﴿۵۷﴾

دیکھیے سورۂ مائدہ (۷۶)، اعراف (۱۸۸)، یونس (۱۸، ۴۹)، رعد (۱۶)، فرقان (۳)، یٰس (۷۵)، فتح (۱۱) اور سورۂ جن (۲۱)۔

② وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا : "اَلْكَافِرُ" میں الف لام جنس کا ہے یا استغراق کا، اور "كَانَ" استمرار اور ہمیشگی کے لیے ہے، یعنی ہر کافر کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اس کے دشمنوں کی مدد کرتا ہے، خواہ وہ شیاطین الجن ہوں یا شیاطین الانس۔ اس کی دلی، زبانی، مالی اور جانی ساری توانائیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور کفر اور کافروں کی حمایت کے لیے وقف ہوتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ [ النساء : ۷۶ ] "وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا وہ باطل معبود کے راستے میں لڑتے ہیں۔ پس تم شیطان کے دوستوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے۔" "عَلٰى رَبِّهٖ" میں کافر کی نمک حرامی نمایاں فرمائی ہے کہ اسے سوچنا چاہیے کہ وہ کس کے خلاف مورچہ باندھے ہوئے ہے، کیا اپنے پرورش کرنے والے ہی کے خلاف؟

آیت 56 وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا : اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور کفار کے لیے تنبیہ، یعنی اگر کافر ایمان نہیں لاتے اور اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کی دشمنی اور مخالفت سے باز نہیں آتے تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں، آپ کا کام حق قبول کرنے والوں کو بشارت دینا اور اسے ٹھکرانے والے کو ڈرانا ہے اور بس۔ کفار کو سمجھایا جا رہا ہے کہ جس رسول کی دشمنی پر تم کمر باندھے ہوئے ہو وہ تو سر سے پاؤں تک تمھارا خیر خواہ ہے، وہ تمھیں ایمان قبول کرنے پر جنت کی خوش خبری دینے والا اور ایمان سے انکار کرنے پر اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہے، ایسے خیر خواہ سے دشمنی رکھنا تمھیں زیب دیتا بھی ہے؟

آیت 57 ① قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ : قرآن مجید میں یہ جملہ کئی جگہ آیا ہے، یہاں مطلب یہ ہے کہ کفار جو آپ کی عداوت پر تلے ہوئے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ میں اپنے رب کی طرف سے تمھارے پاس جو پیغام لے کر آیا ہوں، اسے پہنچانے میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ تم اپنے اموال بچانے کی خاطر مجھ پر ایمان لانے سے گریز کرو۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ﴾ [ هود : ۵۱ ] "میری مزدوری اللہ کے سوا کسی پر نہیں۔" اس سے بڑی نادانی کیا ہوگی کہ جو شخص تمھاری دین و دنیا کی بہتری کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہا ہے اور اس پر تم سے کسی مزدوری کا مطالبہ بھی نہیں کرتا، تم اسی کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۚ﴿۵۸﴾

اور اس زندہ پر بھروسا کر جو نہیں مرے گا اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی پوری خبر رکھنے والا کافی ہے ﴿۵۸﴾

② اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا : مفسرین نے اس جملے کی دو تفسیریں فرمائی ہیں اور دونوں درست ہیں۔ ایک یہ کہ میں اس دعوت پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، لیکن تم میں سے جو شخص چاہے کہ جہاد اور دوسرے خیر کے کاموں میں خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے اور اسے اس کی رحمت اور ثواب کے حصول کا ذریعہ بنائے تو وہ ایسا کرے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ التوبة : ٩٩ ] ”اور بدویوں میں سے کچھ وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قربتوں اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سن لو! بے شک وہ ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے، عنقریب اللہ انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ اس صورت میں ” اِلَّا “ بمعنی ”لٰكِنْ “ ہے اور استثنا منقطع ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ میں تم سے اس دعوت پر اس شخص کے سوا کوئی مزدوری نہیں مانگتا جو اپنے رب کے قرب کا راستہ اختیار کرنا چاہے۔ میری مزدوری بس ایسے لوگوں کا حصول ہے، اس کے سوا اللہ تم سے کسی مال یا جاہ یا کسی بھی مزدوری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ ہاں، ایسے لوگوں کا حصول میرے لیے بہت بڑی مزدوری اور اجرت ہے، کیونکہ ایک شخص بھی ایمان لے آئے تو وہ میرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے، پھر میری دعوت پر ایمان لانے والے جو بھی صالح عمل کریں گے سب کا اجر ان کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ملے گا، میرے لیے یہی اجرت بہت ہے۔ اس صورت میں استثنا متصل ہے۔

**آیت 58** ① وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ : یہ بتانے کے بعد کہ تمام کفار آپ کی دشمنی میں یک جان اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں، ان کی دشمنی اور ایذا سے بچنے کا طریقہ بتایا کہ آپ ان کی دشمنی پر صبر کریں، نہ کسی کا خوف رکھیں نہ کسی سے امید، اپنے ہر کام میں اس پر بھروسا رکھیں جو ہمیشہ زندہ ہے، کبھی نہیں مرے گا، وہی آپ کی ہر طرح سے حفاظت فرمائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [ المائدة : ٦٧ ] ”اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو تُو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔“ بعض اہلِ علم نے فرمایا، اس کے بعد کسی عاقل کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی بھی مخلوق پر بھروسا کرے، کیونکہ مخلوق کو مرنا ہے۔ یاد رہے، توکل کا معنی یہ نہیں کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے، بلکہ توکل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حسب استطاعت تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد بھروسا صرف اللہ پر رکھا جائے۔

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾

وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا، بے حد رحم والا ہے، سو اس کے متعلق کسی پورے باخبر سے پوچھ ﴿۵۹﴾

② اس جملے میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات "الْحَيِّ" اور "الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ" کے ساتھ مشرکین پر چوٹ بھی ہے کہ وہ ان ہستیوں کی عبادت کرتے اور انھیں اپنا داتا و دستگیر مانتے ہیں جو نہ زندہ ہیں اور نہ موت سے محفوظ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [ النحل : ۲۰، ۲۱ ] "اور وہ لوگ جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں اور وہ نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے۔"

③ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ : تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہر ایسی چیز کی نفی ہے جو اس کی شان کے لائق نہ ہو، جس میں سب سے پہلی چیز اس کا کوئی شریک ہونا ہے اور حمد سے مراد اس کے لیے ہر خوبی ثابت کرنا ہے جو اس کی شان کے لائق ہے۔ یعنی اللہ پر توکل کے ساتھ اس کی تسبیح و تحمید آپ کو ہر دشمن سے محفوظ رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جو بھی حکم دیا ہے وہ آپ کے ساتھ پوری امت کے لیے بھی ہے، جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ وہ آپ کے ساتھ خاص ہے۔

④ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا : اس میں دو عموم ہیں، تمام بندے اور ان کے تمام گناہ اور "خَبِيْرًا" میں مبالغے کی وجہ سے "علم" کا بھی عموم ہے اور "كَفٰى" کے فاعل کی تاکید "باء" کے ساتھ کرنے میں کفایت میں بھی عموم ہے، یعنی وہ اپنے تمام بندوں کے تمام گناہوں کی پوری پوری خبر رکھنے والا ہونے کے لحاظ سے ہر طرح کافی ہے، کیونکہ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۵۹) اور سورۂ سبا (۳)۔

⑤ اس جملے میں کفار کے لیے وعید اور دھمکی بھی ہے، جیسے کوئی بڑا اپنے ماتحت کو کہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو میں دیکھ رہا ہوں۔

آیت 59 ① الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا...... : اس کی تفسیر سورۂ یونس، ہود اور طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔ یہاں ان صفات کا ذکر اللہ تعالیٰ پر توکل کی تلقین کے لیے بھی ہے اور اس میں نزول قرآن میں تدریج پر اعتراض کے جواب کی طرف اشارہ بھی ہے۔

② فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا : "پورے باخبر" سے مراد خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہے اور "بِهٖ" سے مراد "عَنْهُ" (اس کے متعلق) ہے۔ اس آیت میں مزید وہ افعال و اوصاف ذکر فرمائے ہیں جن کی وجہ سے اللہ پر توکل کرنا چاہیے، یعنی اس پر توکل کر جو ہمیشہ زندہ ہے، جس پر کبھی موت نہیں آئے گی، جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہو گیا، جو بے حد رحم والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی پیدائش، استواء علی العرش اور اس کی لامحدود رحمت کے بارے میں اہلِ کتاب یا مشرکین

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَ مَا الرَّحۡمٰنُ ٭ اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا وَ زَادَهُمۡ نُفُوۡرًا ﴿۶۰﴾ تَبٰرَكَ الَّذِيۡ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ جَعَلَ فِيۡهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيۡرًا ﴿۶۱﴾ وَ هُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ الَّيۡلَ وَ النَّهَارَ خِلۡفَةً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يَّذَّكَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُكُوۡرًا ﴿۶۲﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں اور رحمان کیا چیز ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو ہمیں حکم دیتا ہے اور یہ بات انھیں بدکنے میں بڑھا دیتی ہے ﴿۶۰﴾ بہت برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک روشنی کرنے والا چاند بنایا ﴿۶۱﴾ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا، اس کے لیے جو چاہے کہ نصیحت حاصل کرے، یا کچھ شکر کرنا چاہے ﴿۶۲﴾

کیا جانیں، ان کی تفصیلات کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، لہٰذا اسی سے دریافت کیجیے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثۡلُ خَبِيۡرٍ ﴾ [ فاطر : ١٤ ] ''اور تجھے ایک پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔'' یعنی اللہ تعالیٰ جیسا پورا باخبر۔

**آیت 60** ﴿ وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ ...... : اس آیت کی دو تفسیریں ہیں، ایک یہ کہ مشرکین مکہ زمین و آسمان کے خالق کے لیے ''اللہ'' کا لفظ تو مانتے تھے، لیکن وہ اس کے نام ''رحمان'' سے مانوس نہ تھے، اس لیے اسے سنتے ہی چڑ جاتے تھے۔ دیکھیے سورۂ رعد (۳۰) اور بنی اسرائیل (۱۱۰) دوسری تفسیر اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ یہ بات کہ ''رحمان چیز کیا ہے'' محض کافرانہ شوخی اور سراسر ہٹ دھرمی کی بنا پر کہتے تھے، جس طرح فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ [ الشعراء : ٢٣ ] ''اور رب العالمین کیا چیز ہے؟'' حالانکہ نہ کفار مکہ اس بے حد رحم والی ہستی سے بے خبر تھے اور نہ فرعون رب العالمین سے ناواقف تھا، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے برملا کہا تھا: ﴿ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَاۤ اَنۡزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ بَصَآئِرَ ﴾ [ بنی إسرائیل : ١٠٢ ] ''بلاشبہ یقیناً تو جان چکا ہے کہ انھیں آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا کسی نے نہیں اتارا، اس حال میں کہ واضح دلائل ہیں۔''

**آیت 61** ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيۡ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوۡجًا ...... : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۱۶) اور بروج (۱)۔

**آیت 62** ﴿ ❶ وَهُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ الَّيۡلَ وَ النَّهَارَ خِلۡفَةً : اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی قدرت کا کمال اور نعمتوں کی یاد دہانی تینوں چیزیں موجود ہیں۔ یعنی رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں، رات جاتی ہے تو دن آجاتا ہے اور دن جاتا ہے تو رات آجاتی ہے۔ اگر ہمیشہ دن رہتا یا ہمیشہ رات رہتی تو زندگی اور اس کی مصروفیات کا سلسلہ باقی نہ رہ سکتا۔ (دیکھیے قصص : ۷۱ تا ۷۳) دن رات کے اس بدلنے میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (دیکھیے بقرہ : ۱۶۴۔ آل عمران : ۱۹۰) ایک مطلب اس کا یہ ہے کہ دن اور رات گھٹتے بڑھتے اور ایک دوسرے کی جگہ آتے جاتے رہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوۡلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيۡلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ ﴾ [ الحج : ٦١ ] ''یہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' طبری

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا

اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے

نے معتبر سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل فرمائی ہے: ''جس کا کوئی کام رات کو رہ جائے تو وہ دن کو پورا کر لیتا ہے اور دن کو رہ جائے تو رات کو پورا کر لیتا ہے۔'' (طبری: ۲۶۶۶۰) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ، لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ النَّهَارِ، وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ، لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ اللَّيْلِ، حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا » [ مسلم، التوبة، باب قبول التوبة من الذنوب ...... : ۲۷۵۹ ] ''اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے، تاکہ دن کو برائی کرنے والا شخص توبہ کر لے اور دن کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے، تاکہ رات کو برائی کرنے والا توبہ کر لے، یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: « مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا، فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا » [ مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة ...... : ۶۸۴/۳۱۵ ] ''جو شخص کسی نماز سے سویا رہ جائے یا بھول جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے وہ یاد آئے پڑھ لے۔'' امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهِ أَوْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ فَقَرَأَهُ فِيْمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَ صَلَاةِ الظُّهْرِ، كُتِبَ لَهُ كَأَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ » [ مسلم، صلاة المسافرين، باب جامع صلاة الليل: ۷۴۷ ] ''جو شخص اپنے مقرر کردہ وظیفے سے یا اس کے کچھ حصے سے سویا رہ جائے، پھر اسے فجر کی نماز اور ظہر کی نماز کے درمیان پڑھ لے تو گویا اس نے اسے رات ہی میں پڑھا ہے۔''

''خِلْفَةً'' کا ایک معنی ''مختلف'' بھی ہے، قاموس میں ہے: ''اَلْخِلْفُ وَالْخِلْفَةُ بِالْكَسْرِ اَلْمُخْتَلِفُ'' اس کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کو روشنی اور اندھیرے میں، گرمی اور سردی میں، کام اور آرام میں ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔

❷ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا : یعنی کہ اگر کوئی کفر یا فسق کی وجہ سے غفلت میں مبتلا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے کسی طرح نصیحت ہو تو دن رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں اس کے لیے بہت بڑی نصیحت ہے کہ اتنی بڑی تبدیلی وہی کر سکتا ہے جو لامحدود قدرت والا اور ہر طرح صاحب اختیار ہے، اور اگر کوئی مومن اور صالح ہے اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہے تو دن رات کی یہ تبدیلی بہت بڑی نعمت ہے، جس پر اسے شکر ادا کرنا لازم ہے۔ رات دن کے سلسلے میں ایک نصیحت ابن العربی نے ذکر فرمائی ہے کہ ایک آدمی جس کی عمر ساٹھ (۶۰) برس ہے، وہ رات سو کر گزار دیتا ہے، تو اس کی آدھی عمر بے کار گئی، پھر دن کا تقریباً چھٹا حصہ آرام میں گزر جاتا ہے، یوں کل دو تہائی چلا گیا۔ اس کے پاس ساٹھ (۶۰) سال کی عمر میں سے بیس (۲۰) برس رہ گئے۔ کتنی بڑی جہالت اور بے وقوفی ہے کہ آدمی اپنی عمر کا دو تہائی حصہ فانی لذت میں گزار دے اور عمر عزیز کو اس دائمی لذت کے حصول کے لیے خرچ نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس اس کے لیے تیار کر رکھی ہے۔

آیت 63 ❶ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ ...... : اللہ تعالیٰ کا عبد (بندہ) ہونے کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ رب ہے اور یہ اس کا بندہ ہے، اس بندگی میں ساری مخلوق شریک ہے، مسلم ہوں یا کافر، نیک ہوں یا بد، سب اللہ کے عبد (بندے) ہیں، وہ سب کا رب ہے، فرمایا: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [ مریم: ۹۳ ]

سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

ہیں سلام ہے ﴿۶۳﴾

’’آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔‘‘ دوسری حیثیت عبد ہونے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معبود ہے اور یہ اس کی عبادت اور بندگی کرنے والا ہے۔ اس معنی میں عباد الرحمٰن (رحمان کے بندے) صرف انبیاء، اولیاء اور اس کے نیک بندے ہیں۔ اس لحاظ سے جب کسی کو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) کہا جاتا ہے، تو اسے مخلوق کے مرتبوں میں سے سب سے اونچے مرتبے پر فائز کیا جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱) اور سورۂ جن (۱۹)۔

② رحمان کی عبادت کے لحاظ سے بندوں کی ایک قسم کا ذکر پچھلی آیات میں گزرا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو وہ جانتے بوجھتے ہوئے شوخی و شرارت اور سرکشی و تکبر کے ساتھ رحمان کو جاننے ہی سے انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں رحمان ہے کیا چیز؟ اور مزید بدک جاتے ہیں، حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ رحمان کون ہے۔ اب رحمان کے ان بندوں کا ذکر ہے جو واقعی رحمان کی بندگی کرتے ہیں اور رات دن کے یکے بعد دیگرے آنے جانے سے اور کائنات کی ہر چیز سے نصیحت حاصل کرتے اور مالک کا شکر ادا کرتے ہیں، فرمایا: ﴿لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾ [ الفرقان : ٦٢ ] ’’اس کے لیے جو چاہے کہ نصیحت حاصل کرے، یا کچھ شکر کرنا چاہے۔‘‘ اور ان کی ان صفات کا ذکر ہے جو رحمان کی بندگی سے پیدا ہوتی ہیں، جن سے وہ لوگ سراسر محروم رہتے ہیں جو رحمان کو سجدہ کرنے کے حکم پر سرکشی اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں، نہ شکر ادا کرتے ہیں۔

③ ”عِبَادُ الرَّحْمٰنِ“ کے لفظ میں اشارہ ہے کہ ان کی یہ صفات ان پر رحمان کی رحمت کا نتیجہ ہیں۔

④ ’’عباد الرحمان‘‘ کے سب سے پہلے مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو ان آیات میں ذکر کردہ تمام صفات کے ساتھ متصف تھے۔ (دیکھیے فتح : ۲۹) اس کے بعد قیامت تک آنے والے تمام متقی مومن اس کے مصداق ہیں۔ اسی طرح ’’عباد الشیطان‘‘ کے سب سے پہلے مصداق ابولہب، ابوجہل اور ان کے ساتھی ہیں، ان کے بعد قیامت تک آنے والے تمام کفار و فجار۔

⑤ عباد الرحمان کی صفات جو اس مقام پر بیان ہوئی ہیں، چار قسم کی ہیں، پہلی قسم ان کا دینی کمالات کے ساتھ آراستہ ہونا ہے، ان کی ابتدا ”الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا“ سے ہوتی ہے۔ دوسری قسم ان کا ہر طرح کے رذائل اور کمینگیوں سے پاک ہونا ہے، یہ ”وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ“ سے شروع ہوتی ہے۔ تیسری قسم ان کا اسلام کے احکام پر کار بند ہونا ہے، ان صفات کا ذکر آیت (۶۴): ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ اور آیت (۶۷): ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا ...... ﴾ اور آیت (۶۸): ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ﴾ سے لے کر آیت (۷۲): ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾ تک میں ہے اور چوتھی قسم ان کی طرف سے اس بات کی مسلسل کوشش اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کی دینی حالت بہتر سے بہتر ہوتی چلی جائے، اس کا ذکر آیت (۷۴): ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ میں ہے۔ (ابن عاشور)

❻ **يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا** : "هَوْنًا" نرمی، مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے: "أَيْ مَشْيًا ذَا هَوْنٍ" یعنی بہت نرمی والی چال چلتے ہیں۔ یعنی رحمان کے محبوب بندے وہ ہیں جو تواضع اور عاجزی اختیار کرتے ہیں اور جب زمین پر چلتے ہیں تو نرمی کے ساتھ چلتے ہیں نہ کہ فساد برپا کرنے والوں اور ظلم و جبر کرنے والوں کی طرح اینٹھتے اور اکڑتے ہوئے۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ [ لقمان : ۱۸ ] ''اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ کسی اکڑنے والے، فخر کرنے والے سے محبت نہیں کرتا۔'' نرمی کی چال سے مراد سکون اور وقار کی چال ہے نہ کہ دکھاوے کے لیے بناوٹ کے ساتھ مریضوں کی طرح چلنا۔ خود رسول اللہ ﷺ مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح چلتے تھے: "كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ عَنْ صَبَبٍ" (گویا ڈھلوان کی طرف اتر رہے ہوں)۔ [ مسند أحمد : ۹۶/۱، ح : ۷۴۹، قال المحقق سندہ قوي ] ابو طفیل رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بارے میں بیان کرتے ہیں: (( كَانَ أَبْيَضَ مَلِيحًا، إِذَا مَشٰى كَأَنَّمَا يَهْوِيْ فِيْ صَبُوْبٍ )) [ أبوداوٗد، الأدب، باب في هدی الرجل : ۴۸۶۴، وقال الألباني صحیح ] ''آپ سفید رنگ اور انتہائی خوبصورت تھے، جب چلتے تو گویا ڈھلوان میں اتر رہے ہوں۔'' زمین پر نرمی کے ساتھ چلنے میں عام زندگی کا چال چلن بھی شامل ہے، کیونکہ آدمی کی چال اس کے چلن ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ رحمان کے بندوں کی چال اور ان کا چلن دونوں سے تواضع اور نرمی کا اظہار ہوتا ہے، ان میں نہ تکبّر ہوتا ہے نہ شدت، ہاں، کفار کے مقابلے میں وہ اکڑ کر بھی چلتے ہیں اور ان میں شدت بھی ہوتی ہے، جیسا کہ طواف کے اندر رمل کے حکم سے ظاہر ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [ الفتح : ۲۹ ] ''محمد اللہ کا رسول ہے اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [ المائدۃ : ۵۴ ] ''مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت۔''

❼ **وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا** : "جَهْل" کا لفظ یہاں ''علم'' کے مقابلے میں نہیں بلکہ ''حلم'' کے مقابلے میں ہے۔ "الْجٰهِلُوْنَ" کے لفظ سے یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ عباد الرحمٰن لوگوں سے ہمیشہ علیحدگی اور ترکِ کلام اختیار نہیں کرتے، بلکہ صرف ان کی جہالت اور اکھڑ پن کے رویے پر انھیں ترکی بہ ترکی جواب دینے اور جھگڑنے کے بجائے سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [ القصص : ۵۵ ] ''اور جب وہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ سلام ہے تم پر، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔'' ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَنَا زَعِيْمٌ بِبَيْتٍ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا، وَ بِبَيْتٍ فِيْ وَسَطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَ إِنْ كَانَ مَازِحًا، وَ بِبَيْتٍ فِيْ أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهٗ )) [ أبوداوٗد،

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾

اور وہ جو اپنے رب کے لیے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے رات گزارتے ہیں ﴿۶۴﴾ اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب پھیر دے۔ بے شک اس کا عذاب ہمیشہ چمٹ جانے والا ہے ﴿۶۵﴾

الأدب، باب في حسن الخلق : ۴۸۰۰، و حسنه الألباني ] ''میں جنت کے اطراف میں مکان کا ضامن ہوں، اس شخص کے لیے جو جھگڑا چھوڑ دے خواہ حق دار ہو اور جنت کے وسط میں مکان کا ضامن ہوں اس شخص کے لیے جو جھوٹ چھوڑ دے خواہ مذاق سے ہو اور جنت کے سب سے بلند مقام پر مکان کا ضامن ہوں اس شخص کے لیے جو اپنا خلق (اخلاق) اچھا بنا لے۔''

**آیت 64** ﴿ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ ...... : پچھلی آیت میں لوگوں کے ساتھ ان کے معاملے کا ذکر تھا، اس آیت میں اپنے رب کے ساتھ ان کے معاملے کا ذکر ہے۔ حسن بصری نے فرمایا: ''پچھلی آیت میں ان کے دن کا ذکر ہے اور اس آیت میں ان کی رات کا۔'' اس آیت سے قیام اللیل کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ مزید دیکھیے آیت: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ [ السجدة : ۱۶ ] اور آیت: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴾ [ الذاريات : ۱۷ ] امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: (( مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ وَ مَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ )) [ مسلم، المساجد و مواضع الصلاة، باب فضل صلاة العشاء والصبح في جماعة : ۶۵۶ ] ''جو شخص عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جو صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے ساری رات نماز پڑھی۔'' اس حدیث سے عشاء اور فجر جماعت کے ساتھ پڑھنے پر قیام اللیل کا اجر حاصل ہونا ثابت ہوتا ہے، اس کے باوجود کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اس کے علاوہ بھی قیام اللیل کی پابندی کرتے ہیں ان کے درجے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو صرف فرائض پر اکتفا کرتے ہیں۔

**آیت 65** ① وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا ...... : مخلوق اور خالق کے ساتھ اپنا معاملہ درست کرنے کے باوجود ان میں غرور یا خود پسندی کا شائبہ تک نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق سمجھتے ہوئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت اور عفو کے طلب گار اور عذاب جہنم سے بچنے کے خواست گار رہتے ہیں۔ سورۂ مومنون کی آیت (۶۰): ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ (اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں) میں ان کی یہی کیفیت بیان ہوئی ہے اور سورۂ ذاریات کی آیت (۱۷، ۱۸): ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ (وہ رات کے بہت تھوڑے حصے میں سوتے تھے اور رات کی آخری گھڑیوں میں وہ بخشش مانگتے تھے) میں مذکور ساری رات قیام کے بعد سحریوں کے وقت استغفار کا باعث بھی ان کا یہی احساس ہوتا ہے۔

اِنَّهَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَ الَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ يُسۡرِفُوۡا وَ لَمۡ يَقۡتُرُوۡا وَ كَانَ بَيۡنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

بے شک وہ بری ٹھہرنے کی جگہ اور اقامت کی جگہ ہے ﴿۶۶﴾ اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور (ان کا خرچ) اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے ﴿۶۷﴾

② اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا: "غَرَامًا" "چمٹ جانے والا" جس طرح مقروض جب تک قرض ادا نہ کرے غریم (قرض خواہ) اس کی جان نہیں چھوڑتا۔ جیسے شاعر نے کہا ہے ؎

سَتَعْلَمُ لَيْلٰى أَيَّ دَيْنٍ تَدَانَيَتْ وَ أَيَّ غَرِيْمٍ فِي التَّقَاضِيْ غَرِيْمُهَا

"لیلیٰ جان لے گی کہ اس نے کون سا قرض اٹھالیا ہے اور تقاضا کرنے میں اس کا قرض خواہ کیسا قرض خواہ ہے؟"

یہ جملہ عباد الرحمان کا قول بھی ہوسکتا ہے اور رب رحمان کا فرمان بھی۔

آیت 66 اِنَّهَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا: "مُسۡتَقَرًّا" کچھ مدت ٹھہرنے کی جگہ گناہ گار مسلمانوں کے لیے اور "مُقَامًا" ہمیشہ اقامت کی جگہ کفار کے لیے۔ یہ جملہ بھی رب رحمان اور عباد الرحمان دونوں کا ہوسکتا ہے۔

آیت 67 وَالَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ يُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ يَقۡتُرُوۡا...... : لوگوں کے ساتھ اور اپنے رب کے ساتھ رویے کے بعد ان کے مالی معاملے کا ذکر ہے۔ اسراف کا اطلاق کسی کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے پر ہوتا ہے، مثلاً کھانے پینے یا لباس یا مکان یا شادی بیاہ وغیرہ پر بے دریغ خرچ کر دینا (ایک بلب کی ضرورت ہو تو زیادہ بلب لگا دینا، تھوڑے پانی سے کام چلتا ہو تو بے دریغ پانی بہا دینا) یا اپنی ہمت اور مقدور سے زیادہ خرچ کر دینا (پھر قرض اتارتے رہنا یا مانگنا شروع کر دینا) ایسی فضول خرچیوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ پھر اسراف کی ایک قسم تبذیر ہے، جس کا معنی ہے بلاضرورت خرچ کرنا، مثلاً دن کو بھی گلی میں بلب جلائے رکھنا، یا پانی کی ٹونٹی کھلی چھوڑ دینا۔ اسی طرح ناجائز کاموں میں خرچ کرنا بھی تبذیر ہے، جیسے شراب، زنا، جوئے، گانے بجانے یا آتش بازی وغیرہ ایسے کاموں میں ایک پیسہ بھی خرچ کرنا حرام ہے۔ اسراف کی ضد "قتور" ہے، جو "قَتَرَ يَقۡتُرُ (ن، ض) قَتۡرًا وَ قُتُوۡرًا" سے ہے۔ باب "افعال" اور "تفعیل" سے "إِقۡتَار" اور "تَقۡتِيۡر" بھی اسی معنی میں آتا ہے، یعنی خرچ میں تنگی کرنا، شدید بخل کہ مقدور ہوتے ہوئے بھی ضرورت سے کم خرچ کرنا اور مال کو جوڑ جوڑ کر رکھنا، اپنی ذات اور اہل و عیال کی جائز ضروریات میں بھی بخل کرنا۔ اسراف اور تقتیر کے درمیان کی صفت کا نام اقتصاد (میانہ روی) ہے، یعنی اتنا خرچ کرنا جتنی ضرورت ہے اور جتنی ہمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے "بَيۡنَ ذٰلِكَ قَوَامًا" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ "قَوَامٌ" دو چیزوں کے عین درمیان کو کہتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۲)، اعراف (۳۱) اور بنی اسرائیل (۲۹،۲۶)۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾

اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو یہ کرے گا وہ سخت گناہ کو ملے گا ﴿۶۸﴾ اس کے لیے قیامت کے دن عذاب دگنا کیا جائے گا اور وہ ہمیشہ اس میں ذلیل کیا ہوا رہے گا ﴿۶۹﴾

**آیت 68** ① وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ : یہ عباد الرحمٰن کی صفات کی ایک اور قسم ہے، یعنی ان برائیوں اور کمینگیوں سے پاک ہونا جو مشرکین میں پائی جاتی ہیں اور عباد الرحمان ایمان کی وجہ سے ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہاں ان کے تین بڑی برائیوں سے بچے رہنے کا ذکر فرمایا، یعنی شرک، قتل ناحق اور زنا۔ اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں، مگر عرب کے معاشرے میں اس وقت زیادہ تسلط انھی تین گناہوں کا تھا، اس لیے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا گیا، اس سے مشرکین پر چوٹ بھی مقصود ہے کہ وہ اتنی نمایاں برائیوں میں مبتلا ہیں جن کی برائی ہر عقل سلیم پر واضح ہے۔

② وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ : مراد ہر انسانی جان ہے، کیونکہ کسی بھی انسانی جان کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے۔

③ اِلَّا بِالْحَقِّ: جیسے جان کے بدلے جان، شادی شدہ زانی کا رجم، مرتد کو قتل کرنا، جنگ میں کافر کو قتل کرنا اور مسلم یا غیر مسلم محارب کو قتل کرنا، یہ سب صورتیں " اِلَّا بِالْحَقِّ" کے تحت آتی ہیں۔ یہ تینوں گناہ اسی ترتیب کے ساتھ ایک حدیث میں بھی مذکور ہیں، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''کون سا گناہ سب بڑا ہے؟'' فرمایا: ''یہ کہ تم کسی کو اللہ کا شریک قرار دو، حالانکہ اسی نے تمھیں پیدا فرمایا۔'' سائل نے کہا: ''پھر کون سا؟'' فرمایا: ''یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کر دو کہ وہ تمھارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگی۔'' اس نے کہا: ''پھر کون سا؟'' فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے ہمسائے کی بیوی کی رضا سے اس کے ساتھ زنا کرو۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت اتار دی: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ [ الفرقان : ٦٨ ] [ بخاری، الأدب، باب قتل الولد ...... : ٦٠٠١ ]

④ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا : " اَثَامًا " "اِثْمٌ" میں الف کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، ''سخت گناہ۔'' اس کا معنی گناہ کی جزا بھی آتا ہے، یعنی سخت گناہ کی سزا پائے گا۔ ابن کثیر میں ہے کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اثام جہنم میں ایک وادی ہے۔'' دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا: ''اسے طبری نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔''

**آیت 69** يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...... : " فِيْهٖ" میں ہائے ضمیر کے کسرہ کے ساتھ یاء ملا دی گئی ہے، اسے اشباع کہتے ہیں۔ ان تینوں برائیوں کو ایک ہی " الَّذِيْنَ " کے صلے کے طور پر ذکر کیا ہے، گویا ان کے مجموعے کو ایک برائی قرار دیا ہے۔ " ذٰلِكَ " کا اشارہ بھی اس مجموعے کی طرف ہے۔ مراد اس سے کفار ہیں، کیونکہ مومن نہ غیر اللہ کو پکارتا ہے، نہ وہ

إِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا، کچھ نیک عمل تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا

ابدی جہنمی ہے، جبکہ ان تینوں کے مرتکب کے لیے دگنے عذاب کی اور اس میں ذلیل ہو کر ہمیشہ رہنے کی وعید ہے۔

آیت 70 ❶ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا ...... : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اہل شرک میں سے کچھ لوگوں نے قتل کیے اور بہت کیے اور زنا کیے اور بہت کیے، پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''آپ جو بات کہتے ہیں اور جس کی دعوت دیتے ہیں وہ بہت اچھی ہے، اگر آپ ہمیں یہ بتا دیں کہ ہم نے جو کچھ کیا اس کا کوئی کفارہ ہے؟'' تو یہ آیت اتری: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ...... ﴾ [ الفرقان : ٦٨ ] اور یہ آیت اتری: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ [ الزمر : ٥٣ ] ''اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو جاؤ۔'' [ مسلم، الإیمان، باب کون الإسلام یهدم ما قبله ...... : ۱۲۲ ] یہ آیت ان لوگوں کے لیے بشارت ہے جن کی زندگی پہلے طرح طرح کے جرائم سے آلودہ رہی ہو اور اب وہ اپنی اصلاح پر آمادہ ہوں، یہی عام معافی کا دن تھا جس نے اس بگڑے ہوئے معاشرے کے لاکھوں انسانوں کو سہارا دے کر مستقبل کے بگاڑ سے بچا لیا اور انھیں امید کی روشنی دکھا کر اصلاح پر آمادہ کیا۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ جو گناہ تم کر چکے ہو ان کی سزا سے اب تم کسی طرح بچ نہیں سکتے تو وہ ہمیشہ کے لیے بدی کے بھنور میں پھنس جاتے۔ توبہ کی اس نعمت نے بگڑے ہوئے لوگوں کو کس طرح سنبھالا، اس کا اندازہ ان بہت سے واقعات سے ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آئے، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی محبت میرے دل میں ڈال دی تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے عرض کی: ''اپنا دایاں ہاتھ آگے کیجیے، تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عمرو! تجھے کیا ہوا؟'' میں نے کہا: ''میری ایک شرط ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیری کیا شرط ہے؟'' میں نے کہا: (( أَنْ تُغْفَرَ لِيْ، قَالَ أَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو! أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ وَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا؟ وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ )) [ مسلم، الإیمان، باب کون الإسلام یهدم ما قبله و کذا الهجرة والحج : ۱۲۱ ] ''(میری شرط یہ ہے) کہ میرے گناہ معاف ہوں (جواب تک کیے ہیں)۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عمرو! کیا تو جانتا نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے؟ اور یہ کہ ہجرت اپنے سے پہلے گناہوں کو مٹا دیتی ہے؟ اور یہ کہ حج اپنے سے پہلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے؟''

❷ اللہ تعالیٰ نے برائیوں کو نیکیوں میں بدلنے کے لیے تین شرطیں رکھی ہیں، پہلی توبہ، یعنی گناہ سے باز آ جانا، گزشتہ گناہوں پر ندامت اور آئندہ کے لیے گناہ نہ کرنے کا عزم۔ دوسری شرط ایمان ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول ہی نہیں اور تیسری شرط عمل صالح ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق عمل کرنا۔ ''عَمَلًا صَالِحًا'' نکرہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا

اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾

اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۷۰﴾

ہے ''اور عمل کیا، کچھ نیک عمل۔'' شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''اور کیا کچھ نیک کام۔'' اس میں بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں توبہ اور ایمان کے ساتھ تھوڑے عمل صالح کی بھی بہت قدر ہے۔

③ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ : اس کی دو تفسیریں ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انھیں گناہوں کی جگہ نیکیوں کی توفیق دے گا، کفر اور شرک کی جگہ وہ ایمان اور توحید پر قائم ہوں گے، مومنوں کو قتل کرنے کے بجائے میدان جنگ میں کفار کو قتل کریں گے۔ زنا کی جگہ پاک دامنی پر، جھوٹ کی جگہ صدق پر اور نافرمانی کی جگہ فرماں برداری پر قائم ہوں گے۔ (وعلی ہذا القیاس) یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے معتبر سند کے ساتھ طبری نے نقل فرمائی ہے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے گا، یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنِّي لَأَعْلَمُ آخِرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُوْلًا الْجَنَّةَ، وَآخِرَ أَهْلِ النَّارِ خُرُوْجًا مِنْهَا، رَجُلٌ يُؤْتٰى بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُقَالُ اعْرِضُوْا عَلَيْهِ صِغَارَ ذُنُوْبِهِ وَارْفَعُوْا عَنْهُ كِبَارَهَا، فَتُعْرَضُ عَلَيْهِ صِغَارُ ذُنُوْبِهِ، فَيُقَالُ عَمِلْتَ يَوْمَ كَذَا وَ كَذَا، كَذَا وَ كَذَا، وَ عَمِلْتَ يَوْمَ كَذَا وَ كَذَا، كَذَا وَ كَذَا، فَيَقُوْلُ نَعَمْ، لَا يَسْتَطِيْعُ أَنْ يُّنْكِرَ، وَهُوَ مُشْفِقٌ مِنْ كِبَارِ ذُنُوْبِهِ أَنْ تُعْرَضَ عَلَيْهِ، فَيُقَالُ لَهُ فَإِنَّ لَكَ مَكَانَ كُلِّ سَيِّئَةٍ حَسَنَةً، فَيَقُوْلُ رَبِّ! قَدْ عَمِلْتُ أَشْيَاءَ لَا أَرَاهَا هٰهُنَا، فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ضَحِكَ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ )) [ مسلم، الإيمان، باب أدنٰی أهل الجنة منزلة فيها : ۱۹۰ ] ''میں اس شخص کو جانتا ہوں جو جنت میں داخل ہونے والوں میں سب سے آخری اور جہنم سے نکلنے والوں میں سب سے آخری ہوگا، وہ ایسا آدمی ہوگا جسے قیامت کے دن لایا جائے گا اور کہا جائے گا: ''اس کے سامنے اس کے چھوٹے گناہ پیش کرو اور اس کے بڑے گناہ بچائے رکھو۔'' تو اس کے سامنے اس کے چھوٹے گناہ پیش کیے جائیں گے اور کہا جائے گا: ''تو نے فلاں فلاں دن یہ یہ عمل کیے تھے اور فلاں فلاں دن یہ یہ عمل کیے تھے؟'' وہ کہے گا: ''ہاں!'' انکار نہیں کر سکے گا اور وہ اپنے بڑے گناہوں کے پیش کیے جانے سے ڈر رہا ہوگا، تو اس سے کہا جائے گا: ''تمھارے لیے ہر برائی کی جگہ ایک نیکی ہے۔'' تو وہ کہے گا: ''اے میرے رب! میں نے کئی کام کیے ہیں جو مجھے یہاں دکھائی نہیں دے رہے۔'' (ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں): ''تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ ہنسے یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھیں ظاہر ہو گئیں۔''

④ اہل علم نے گناہوں کو نیکیوں میں بدلنے کی توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ گناہ جتنی بار یاد آتے ہیں ان پر ندامت اور استغفار مسلسل نیکی ہے، اسی طرح توبہ کے بعد یہ عزم کہ آئندہ اگر موقع ملا تو میں ہمیشہ برائی کے بجائے نیکی کروں گا، یہ عزم ایسی نیکی ہے جو انسان کو جنت کا ابدی وارث بنا دیتی ہے۔ گزشتہ پر ندامت یا آئندہ کا عزم اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم

وَ مَنْ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَ الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ

اور جو توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو یقیناً وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، سچا رجوع کرنا۔ ﴿۷۱﴾ اور وہ جو جھوٹ میں

گناہوں کو نیکیوں میں بدلنے کا باعث بن جائے گا۔ (بقاعی) ایک اور توجیہ یہ ہے کہ وہ شخص جس نے گناہ کیا ہی نہیں، مثلاً زنا یا چوری کی ہی نہیں، اسے گناہ سے بچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی، بخلاف اس شخص کے جو زنا کا مرتکب رہا ہے، اسے زنا چھوڑنے میں جس قدر دشواری پیش آتی ہے اسے برداشت کرنا اور گناہ نہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔

⑤ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا : بظاہر گناہوں کو نیکیوں میں بدلنا بعید معلوم ہوتا ہے، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے گناہوں پر پردہ ڈالنے والا اور بے حد رحم کرنے والا ہے، اس سے یہ کرم کچھ بھی بعید نہیں۔

**آیت 71** وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ...... : یہاں ایک سوال یہ ہے کہ پچھلی آیت میں توبہ کے ذکر کے بعد دوبارہ توبہ کے ذکر میں کیا حکمت ہے؟ اور ایک یہ کہ یہ کہنا کہ "جو شخص توبہ کرے تو وہ توبہ کرتا ہے......" ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے "مَنْ قَامَ فَاِنَّهٗ يَقُوْمُ" یعنی جو کھڑا ہو تو وہ کھڑا ہوتا ہے، تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ اس کا جواب کئی طرح سے دیا گیا ہے، ایک یہ کہ اس میں توبہ کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ جو شخص توبہ کرے اور عمل صالح کرے، تو اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اس توبہ کے ساتھ کسی معمولی ہستی کی طرف پلٹ کر نہیں جا رہا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ کر جا رہا ہے، جو بندے کی توبہ سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کی توبہ معمولی نہیں بلکہ بڑی شان والی اور سچی توبہ ہے۔

دوسرا یہ کہ اگرچہ پچھلی آیت میں بھی عمل صالح کا ذکر تھا مگر اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اسے پھر دہرایا اور فرمایا کہ صرف زبانی توبہ اللہ کے ہاں معتبر نہیں، اس کے مطابق عمل بھی ضروری ہے، چنانچہ جو شخص توبہ کرے اور نیک اعمال کرے وہ اللہ کی طرف سچی اور حقیقی توبہ کرتا ہے اور جو قدرت کے باوجود عمل نہ کرے اس کا توبہ کا دعویٰ قبول نہیں اور اس کی توبہ سچی اور حقیقی نہیں، بلکہ جھوٹی اور بے کار ہے۔ تیسرا یہ کہ پچھلی آیت میں کفر کے زمانے میں کیے ہوئے گناہوں سے توبہ کا ذکر تھا، اس آیت میں مسلمان ہونے کے بعد کیے ہوئے گناہوں سے توبہ کا ذکر ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی کوئی شخص کسی بھی گناہ سے توبہ کرے تو اس کی توبہ بھی سچی اور مقبول توبہ ہو گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما مسلمان قاتل کی توبہ قبول ہونے کے قائل نہیں، اس آیت سے اس کی توبہ کا قبول ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۹۳): ﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا ﴾ کی تفسیر۔



**آیت 72** ① وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ : اہل ایمان کی تین بنیادی صفات کے بعد اب چند مزید صفات کا ذکر ہوتا ہے، جن کے ساتھ ایمان میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ "شَهِدَ يَشْهَدُ" حاضر ہونے کے معنی میں آتا ہے اور اس کا اصل مفہوم یہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ [ البقرة : ۱۸۵ ] "تو تم میں سے جو اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس کا روزہ رکھے۔" اور کسی چیز کے متعلق گواہی دینے کے لیے بھی آتا ہے، جس میں وہ حاضر رہا ہو یا جانتا ہو، جیسا کہ فرمایا:

وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

شریک نہیں ہوتے اور جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو باعزت گزر جاتے ہیں ﴿۷۲﴾

﴿وَ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ [ الطلاق : ۲ ] ''اور اپنوں میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنا لو۔'' اور فرمایا: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ١ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ﴾ [ آل عمران : ۱۸ ] ''اللہ نے گواہی دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔''

اس آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ وہ باطل کی مجلسوں میں حاضر نہیں ہوتے، جن میں مشرکین حاضر ہوتے ہیں۔ وہ لہو و لعب، گانے بجانے، غیبت یا بدکاری کی مجلسیں ہوں یا ظلم و زیادتی یا کسی بھی گناہ کی منصوبہ بندی کی مجلسیں، یا کفار کے جشنوں، ان کے کھیل تماشوں کی مجلسیں، غرض ایسی ہر مجلس میں شرکت سے وہ اجتناب کرتے ہیں۔ اس صورت میں لفظ ''الزُّوْرَ'' ''لَا يَشْهَدُوْنَ'' کا مفعول بہ ہو گا۔ یہی مفہوم سورۂ انعام میں بیان ہوا ہے، فرمایا: ﴿وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ١ؕ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [ الأنعام : ٦٨ ] ''اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔'' اور ''يَشْهَدُوْنَ'' کا معنی گواہی بھی ہو سکتا ہے، اس صورت میں ''لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ'' سے مراد ''لَا يَشْهَدُوْنَ بِالزُّوْرِ'' یا ''لَا يَشْهَدُوْنَ شَهَادَةَ الزُّوْرِ'' ہو گا کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کبیرہ گناہوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَ عُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَ قَتْلُ النَّفْسِ وَ شَهَادَةُ الزُّوْرِ )) [ بخاري، الشهادات، باب ما قيل في شهادة الزور : ٢٦٥٣ ] ''اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کو ستانا، کسی جان کو قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔'' ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''آیات کے سیاق سے زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ وہ جھوٹ اور باطل کی مجلس میں شریک نہیں ہوتے۔''

② وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا : ''كِرَامًا'' کریم کا اصل معنی وہ چیز ہے جو اپنی قسم میں سب سے عمدہ ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾ [ لقمان : ۱۰ ] ''پھر ہم نے اس میں ہر طرح کی عمدہ قسم اگائی۔'' ''لغو'' کا معنی بے فائدہ اور بے کار چیز، یعنی ''كُلَّ مَا يَنْبَغِيْ أَنْ يُّلْغٰى وَ يُطْرَحُ'' کہ ہر وہ چیز جو بے کار کیے جانے اور پھینکے جانے کے لائق ہو۔ (کشاف) اس میں ہر گناہ آ جاتا ہے، یعنی رحمان کے بندے بے ہودہ مجالس میں شریک نہیں ہوتے اور اگر ایسی کسی مجلس پر ان کا گزر ہو تو الجھنے اور لڑنے کے بجائے بہت باعزت اور عمدہ ترین طریقے سے گزر جاتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا﴾ [ الأنعام : ۷۰ ] ''اور ان لوگوں کو چھوڑ دے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور دل لگی بنا لیا۔'' اور فرمایا: ﴿وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ١ٞ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ١ٞ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ﴾

وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

اور وہ کہ جب انھیں ان کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی جائے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے ﴿۷۳﴾ اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا ﴿۷۴﴾

[ القصص : ۵۵ ] ''اور جب وہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ سلام ہے تم پر، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔''

آیت 73 ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ ...... : ''بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے'' بلکہ وہ انھیں نہایت غور وفکر سے سنتے اور ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ اس میں کفار پر چوٹ ہے کہ وہ اپنے رب کی آیات سن کر ذرہ بھر متاثر نہیں ہوتے، بلکہ اپنے کفر پر سختی سے جمے رہتے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے کفار کا یہی نقشہ کھینچا ہے، فرمایا: ﴿ وَ اِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴾ [ نوح : ۷ ] ''اور بے شک میں نے جب بھی انھیں دعوت دی، تاکہ تو انھیں معاف کر دے، انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے اور اَڑ گئے اور تکبر کیا، بڑا تکبر کرنا۔'' کفار کی اس حالت کے بیان کے لیے دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۵، ۲۶)۔ زمخشری نے فرمایا کہ اس کا معنی یہ نہیں کہ رحمان کے بندے آیات کے ساتھ نصیحت سن کر گرتے نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے بلکہ سنتے اور دیکھتے ہوئے گر جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [ السجدة : ۱۵ ] ''ہماری آیات پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب انھیں ان کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ﴾ [ مریم : ۵۸ ] ''جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی تھیں وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے۔''

آیت 74 ﴿ ① وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا ...... : مکی دور میں مسلمانوں کی زندگی کچھ اس طرح سے گزر رہی تھی کہ باپ مسلمان ہے تو اولاد کافر ہے اور اولاد مسلمان ہے تو والدین کافر ہیں، شوہر مسلمان ہے تو بیوی کافر ہے اور بیوی مسلمان ہے تو شوہر کافر ہے۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے سخت غم اور اضطراب کا باعث بنی ہوئی تھی، وہ اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کو جہنم کا ایندھن بنتے ہوئے دیکھتے تو سخت بے چین ہوتے۔ لہٰذا عباد الرحمان کی صفات میں سے ایک صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے ازواج و اولاد کو بھی ایمان کی دولت نصیب فرما، تاکہ انھیں دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ واضح رہے کہ مرد یہ دعا کریں تو ان کی ازواج بیویاں ہوں گی اور عورتیں یہ دعا کریں تو ان کے ازواج ان کے

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ﴿۷۵﴾

**یہ لوگ ہیں جنھیں جزا میں بلند و بالا محل عطا کیے جائیں گے، اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا اور اس میں ان کا استقبال زندگی کی دعا اور سلام کے ساتھ کیا جائے گا ﴿۷۵﴾**

خاوند ہوں گے۔ اس دعا کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ پروردگارا! ہمیں ایسے ازواج و اولاد عطا فرما جو تیرے فرماں بردار ہوں اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی خوشی کا باعث ہوں۔

② وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا : اس کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ ہر شخص امام ہے اور کوئی نہ کوئی پیروکار رکھتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (۵۲۰۰) میں ہے: (( كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ )) ”تم سب حکمران ہو اور تم سب اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہو۔“ مطلب یہ ہے کہ پروردگارا! جن لوگوں کے ہم امام ہیں، مثلاً ہمارے اہل و عیال اور ہمارے زیر نگرانی لوگ، تو انھیں متقی بنا دے، تاکہ ہم متقین کے امام ہوں، فاجروں کے امام نہ ہوں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تو ہمیں اتنا متقی بنا کہ ہم متقین کے امام اور پیشوا بن جائیں۔ طبری نے معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ ہمیں ہدایت کے امام بنا کہ ہم سے لوگوں کو ہدایت حاصل ہو، گمراہی کے امام نہ بنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ سعادت کے متعلق فرمایا:

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۷۳ ] ”اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیاں کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی بھیجی اور وہ صرف ہماری عبادت کرنے والے تھے۔“ اور اہل شقاوت کے متعلق فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ [ القصص : ٤١ ] ”اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے۔“

خلاصہ یہ کہ انھوں نے دو دعائیں کیں، ایک اپنی اولاد و ازواج کے لیے کہ وہ توحید و اطاعتِ الٰہی پر کاربند ہوں اور ان کے لیے دنیا و آخرت میں آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں، دوسری اپنے لیے کہ انھیں تقویٰ کی ایسی توفیق عطا ہو کہ وہ متقین کے امام بنیں اور لوگوں کو ہدایت اور تقویٰ کی دعوت دیں۔

**آیت 75** ① اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ......: ” غُرْفَةٌ “ ہر بلند عمارت اور اونچا محل، بالا خانہ۔ ”الْغُرْفَةَ“ سے مراد کوئی ایک بالا خانہ نہیں بلکہ مراد جنس ہے، یعنی عباد الرحمان کو صبر کے بدلے جنت کے بالا خانے یعنی اونچے محل عطا کیے جائیں گے، جن کی بلندی ان کے مراتب کے اعتبار سے ہوگی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ، كَمَا يَتَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الْغَابِرَ فِي الْأُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة ...... : ۳۲۵٦ ] ”اہل جنت اپنے اوپر کی طرف بالا خانوں والوں کو دیکھیں گے جیسے تم مشرق یا مغرب کے افق پر دور چمک دار تارے کو دیکھتے ہو، ان کی ایک دوسرے

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾

ع ۶

ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں۔ وہ ٹھہرنے اور رہنے کی اچھی جگہ ہے ﴿۷۶﴾ کہہ میرا رب تمھاری پروا نہیں کرتا اگر تمھارا پکارنا نہ ہو، سو بے شک تم نے جھٹلا دیا، تو عنقریب (اس کا انجام) چمٹ جانے والا ہوگا ﴿۷۷﴾

کے درمیان درجوں کی برتری کی وجہ سے۔'' اور دیکھیے سورۂ زمر (۲۰) اور عنکبوت (۵۸)۔

② بِمَا صَبَرُوْا: یعنی عباد الرحمان کو یہ نعمت ان کے صبر کی وجہ سے حاصل ہوگی کہ انھوں نے نیکی پر صبر کیا، برائی سے اجتناب پر صبر کیا اور راہِ حق میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ الزمر : ۱۰ ] ''صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔''

③ وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا : "تَحِيَّةٌ" "حَيّٰى يُحَيِّيْ" کا مصدر ہے، زندگی کی دعا دینا۔ رب تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے جنتیوں کے استقبال اور سلام کے لیے دیکھیے سورۂ رعد (۲۳، ۲۴)، انبیاء (۱۰۱ تا ۱۰۳)، زمر (۷۳) اور سورۂ یٰس (۵۵ تا ۵۸)۔

آیت 77،76 ① قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ: "مَا" یہاں نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور استفہامیہ بھی، یعنی میرا رب تمھاری پروا نہیں کرتا، یا میرا رب تمھاری کیا پروا کرے گا؟ ''میرا رب'' اس لیے فرمایا کہ خطاب کفار سے ہے، جو کما حقہ اسے رب نہیں مانتے۔

② لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ: یہ خطاب کفار سے ہے، کیونکہ آگے فرمایا ہے: ﴿ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ﴾ ''سو بے شک تم نے جھٹلا دیا۔'' "دُعَآؤُكُمْ" کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "إِيْمَانُكُمْ" کیا ہے۔ [ طبري بطريق علي بن أبي طلحة و ذكره البخاري ] یعنی میرا رب تمھیں مہلت اس لیے دے رہا ہے کہ تم اس پر ایمان لے آؤ، اس کی عبادت کرو اور اس سے دعا کرو، کیونکہ اس نے جن و انس کو پیدا ہی اپنی عبادت کے لیے کیا ہے، سو اگر تم ایمان لا کر اس کی عبادت نہ کرو اور اس کے حضور دعائیں نہ کرو تو اسے تمھاری کچھ پروا نہیں ہے۔

ایک تفسیر اس کی یہ بھی ہے کہ کفار بھی شدید مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے ان کی التجا سن کر مصیبت دور بھی کر دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۴۰، ۴۱)، یونس (۲۲)، عنکبوت (۶۵)، روم (۳۳) اور لقمان (۳۲) فرمایا، اللہ تعالیٰ جو تمھیں مہلت دے رہا ہے اور تمھاری پکار پر مشکلات بھی دور کر دیتا ہے، یہ صرف تمھارے اس کو پکارنے کی وجہ سے ہے، اس کے باوجود تم نے جھٹلا دیا ہے تو سن لو کہ اس کا عذاب تمھیں پہنچ کر رہے گا۔ چنانچہ دنیا ہی میں جنگِ بدر اور دوسرے موقعوں پر انھوں نے وہ عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور قیامت بھی کچھ دور نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰسٓمّٓ ① تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا یَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ③ اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ لَهَا خٰضِعِیۡنَ ④

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

طٰسٓمّٓ ① یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ② شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ مومن نہیں ہوتے ③ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی اتار دیں، پھر اس کے سامنے ان کی گردنیں نیچی ہو جائیں ④

**آیت 1** طٰسٓمّٓ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱)۔

**آیت 2** تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ : یہ تمہیدی فقرہ اس مضمون کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے جو اس سورت میں آگے بیان ہوا ہے۔ کفار مکہ نبی ﷺ سے کوئی نشانی (معجزہ) مانگتے تھے، تاکہ اسے دیکھ کر انھیں اطمینان ہو جائے کہ آپ واقعی یہ پیغام اللہ کی طرف سے لائے ہیں۔ فرمایا، اگر کسی کو ایمان لانے کے لیے نشانی کی طلب ہے تو کتابِ مبین کی یہ آیات موجود ہیں، مزید کسی معجزے کی ضرورت نہیں۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ہر واقعہ کے آخر پر دہرایا ہے: ﴿ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ﴾ [ الشعراء : ٨ ] ”بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے۔“ یعنی قرآن میں آنے والی ہر آیت اور ہر واقعہ ہی معجزہ ہے، جو قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل ہے اور جس کا جواب لانے سے پوری مخلوق عاجز ہے۔

**آیت 3** لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ...... : اس سے مقصود نبی ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ ان بدبختوں کے ایمان نہ لانے پر آپ اس قدر رنجیدہ نہ ہوں، قرآن سے بڑا معجزہ کوئی نہیں، وہ آپ نے انھیں دکھلا دیا، اب بھی ایمان نہیں لاتے تو ان پر اتنا غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھیے سورۂ کہف کی آیت (٦) اور سورۂ فاطر کی آیت (٨) کی تفسیر۔

**آیت 4** اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ...... : آسمان سے نشانی اتارنے سے مراد وہ معجزے دکھانا ہے جن کا وہ مطالبہ کرتے تھے۔ (سعدی) یعنی اگر ہم چاہیں تو آسمان سے کوئی نشانی اتار دیں، جس کے آنے کے بعد ان کے لیے ماننے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہے، لیکن ہم ایسا نہیں کرتے، کیونکہ دنیا امتحان کا گھر ہے اور ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص بھی ایمان لائے سوچ سمجھ کر اپنے اختیار سے لائے، نہ کہ کسی دباؤ اور مجبوری کے تحت۔ اس لیے ہم نے انبیاء و رسل بھیجے، صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں۔ یہ حقیقت قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۹۹)، ہود (۱۱۸، ۱۱۹) اور غاشیہ (۲۱، ۲۲) اور ہم اس لیے بھی نشانی نہیں اتارتے کہ ایمان وہ معتبر ہے جو بن دیکھے ہو، جب غیب ہی سے پردہ اٹھ گیا، پھر کوئی ایمان لائے بھی تو اسے کوئی فائدہ نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَلَمۡ یَكُ یَنۡفَعُهُمۡ اِیۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴾ [ المؤمن : ٨٥ ] ”پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ﴿٥﴾ فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿٧﴾

اور ان کے پاس رحمان کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی جو نئی ہو، مگر وہ اس سے منہ موڑنے والے ہوتے ہیں ﴿٥﴾ پس بے شک وہ جھٹلا چکے، سو ان کے پاس جلد ہی اس چیز کی خبریں آجائیں گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ﴿٦﴾ اور کیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں کتنی چیزیں ہر عمدہ قسم میں سے اگائی ہیں ﴿٧﴾

عذاب دیکھ لیا۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور اس موقع پر کافر خسارے میں رہے۔'' اور دیکھیے سورۂ حجر (٦ تا ٨) اور فرقان (٢١، ٢٢)۔

**آیت 5** ① وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمَٰنِ ...... : سورۂ انبیاء کی آیت (٤٢) میں ہے: ﴿عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ﴾ اور یہاں فرمایا: ﴿مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمَٰنِ﴾ اس کی مناسبت یہ ہے کہ آپ جن کے غم میں پڑے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ رحمان اپنی رحمت سے جب ان کی بھلائی کے لیے کوئی نصیحت بھیجتا ہے، تو وہ اس سے منہ موڑنے والے ہوتے ہیں۔ "مُحْدَثٍ" کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ معاملہ اس نصیحت کے ساتھ ہے جو بار بار نئی سے نئی آتی رہتی ہے، اگر ایک آدھ دفعہ ہی آتی تو ان کا کیا حال ہوتا، اس لیے ان کے غم میں اپنے آپ کو ہلاک مت کریں۔

② "إِلَّا أَعْرَضُوا عَنْهُ" (مگر اس سے منہ موڑ لیتے ہیں) کے بجائے فرمایا: ﴿إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ﴾ "مگر وہ اس سے منہ موڑنے والے ہوتے ہیں'' اس میں ان کے مسلسل اعراض کا بیان ہے۔

③ قرآن مجید کے محدث ہونے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (٢) کی تفسیر۔

**آیت 6** ① فَقَدْ كَذَّبُوا ...... : یعنی یہ لوگ صرف اعراض تک ہی نہیں رہے بلکہ انھوں نے صاف جھٹلا دیا اور اس سے بڑھ کر ان چیزوں کا مذاق بھی اڑانے لگے جن کے آنے کی رسول ﷺ نے خبر دی تھی، جیسا کہ "كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ" سے معلوم ہو رہا ہے۔

② فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ: یعنی پیغمبر نے انھیں جن چیزوں کے واقع ہونے کی خبریں دیں، جن کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے، وہ بہت جلد ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ حق تھیں۔ اس میں کفار کے لیے سخت وعید ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (٤، ٥)۔

③ "أَنْبَاءُ" "نَبَأٌ" کی جمع ہے، کسی بڑے واقعہ کی خبر کو "نَبَأٌ" کہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ﴾ [ الأنعام : ٣٤ ] "اور بلاشبہ یقیناً تیرے پاس ان رسولوں کی کچھ خبریں آئی ہیں۔'' "أَنْبَاءُ" جمع کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی بہت سی باتوں کا مذاق اڑاتے رہے تھے، مثلاً قیامت، دنیا میں ان کو ملنے والی سزا، مسلمانوں کا غالب آنا، فتح مکہ، جہنم کا عذاب اور زقوم کا درخت وغیرہ۔

**آیت 7** أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ ...... : اصل میں واؤ عطف پہلے ہے اور ہمزہ بعد میں ہے، چونکہ ہمزہ استفہام کلام کے

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۸ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۹ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۱۰ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۱۱

**بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے ۸ اور بے شک تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ۹ اور جب تیرے رب نے موسیٰ کو آواز دی کہ ان ظالم لوگوں کے پاس جا ۱۰ فرعون کی قوم کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں ۱۱**

شروع میں ہوتا ہے، اس لیے واؤ عطف کو بعد میں کر دیا۔ واؤ عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جملہ محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے، یعنی ”أَلَمْ يَرَوْا إِلَى السَّمَاءِ وَ أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ“ ”کیا انھوں نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا اور کیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا۔“ یہ اختصار کلام اللہ کا اعجاز ہے۔ (بقاعی) یعنی اگر وہ رسول پر اترنے والی آیات کو جھٹلائیں اور ان کا مذاق اڑائیں تو اس میں کون سا تعجب ہے، کیا انھوں نے اس سے پہلے آسمان، زمین اور اس میں پائی جانے والی ہر قسم کی بے شمار عمدہ ترین چیزیں نہیں دیکھیں؟ اگر انھوں نے اپنے خالق و مالک پر اور اس کی توحید پر ایمان لانا ہوتا تو یہ سب کچھ بطور دلیل کیا کم تھا، جب انھیں اس سے عبرت نہیں ہوئی تو آپ پر نازل ہونے والی آیات سے انھیں کیا عبرت ہوگی۔

**آیت 8** اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ : یعنی آسمان و زمین اور اس میں پائی جانے والی بے شمار نفیس ترین چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کی بہت بڑی نشانی ہے، مگر ان کے اکثر شروع ہی سے ایمان لانے والے نہ تھے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [ الذاریات : ۲۰، ۲۱ ] ”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں اور تمھارے نفسوں میں بھی، تو کیا تم نہیں دیکھتے؟“ مزید دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۵)، حم السجدہ (۹، ۱۰) اور لقمان (۱۰، ۱۱)۔

**آیت 9** وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ : ”اِنَّ“ کے اسم ”رَبَّكَ“ اور خبر ”الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ“ دونوں کے معرفہ ہونے سے قصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے اور درمیان میں ”لَهُوَ“ ضمیر لانے سے قصر میں مزید زور پیدا ہو رہا ہے۔ یعنی تیرا رب ہی ہے جو سب پر غالب ہے، اس کے سوا کوئی غالب نہیں، وہ زبردست قوت والا ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، ان کی نافرمانیوں پر انھیں آنکھ جھپکنے میں پکڑ سکتا ہے، مگر وہ ساتھ ہی رحیم بھی ہے، توبہ کرنے پر عمر بھر کی نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اس لیے انھیں سنبھلنے کے لیے موقع پر موقع دیے جا رہا ہے اور ان کی سرکشی پر گرفت نہیں کر رہا۔

**آیت 11،10** ① وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى : یہاں سے عبرت کے لیے پہلی قوموں کے چند واقعات بیان فرمائے ہیں، جن سے مقصود یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے اور ان کا مذاق اڑانے کا انجام ہلاکت ہے۔ گویا ان واقعات سے پچھلی آیت: ﴿ فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ کی تائید اور وضاحت مقصود ہے۔ (شوکانی) اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾

**اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے ﴿۱۲﴾ اور میرا سینہ تنگ پڑتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی، سو تو ہارون کی طرف پیغام بھیج ﴿۱۳﴾ اور ان کا میرے ذمے ایک گناہ ہے، پس میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے ﴿۱۴﴾**

اور اہلِ ایمان کو تسلی دلانا بھی مقصود ہے۔ اس کے لیے ابتدا موسیٰ علیہ السلام اور پھر ابراہیم علیہ السلام کے واقعات سے فرمائی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی بہت سی چیزوں میں مشارکت ہے، مثلاً ہجرت، جہاد اور ارضِ مقدس کو حاصل کرنے کی آرزو وغیرہ۔ موسیٰ علیہ السلام کو وہ کتاب ملی جو قرآن کے بعد انتہائی جامع کتاب ہے اور انھیں بہت سے معجزے ملے۔ قرآن میں ان کا اور ان کی قوم کا ذکر سب سے زیادہ کیا گیا ہے۔

② یہ واقعہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ، اعراف اور طٰہٰ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے اور آگے سورۂ قصص میں بھی آ رہا ہے۔

③ اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ : اس قوم کا نام قبط تھا، انھیں ظالم اس لیے فرمایا کہ وہ کفر و شرک کر کے اپنی جان پر ظلم کر رہے تھے، فرعون کو ربِ اعلیٰ مان رہے تھے اور بنی اسرائیل کو غلام بنا کر، ان کے بیٹوں کو قتل کر کے اور عورتوں کو باقی رکھ کر ان پر بھی ظلم کر رہے تھے۔

④ اَلَا یَتَّقُوْنَ : فرمایا، یہ لوگ بے تحاشا ظلم و ستم کرتے ہی چلے جا رہے ہیں، کیا انھیں خوف نہیں کہ کوئی ان سے باز پرس کرنے والا بھی ہے!!

**آیت 13،12** ① وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ : یعنی اتنے بڑے کام کے لیے جاتے ہوئے مجھے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔

② وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ : یعنی میں پوری روانی سے تقریر نہیں کر سکتا۔

③ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ : تاکہ ان سے مجھے تقویت اور پشت پناہی حاصل ہو اور یوں بھی وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۳۱۔ قصص : ۳۴) موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کا تعاون حاصل کرنے کے لیے درخواست کی نہ کہ رسالت سے سبکدوشی کے لیے۔ (شوکانی)

**آیت 14** وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ ......: یعنی مجھ سے ان کا ایک آدمی قتل ہو گیا ہے، جو ان کے کہنے کے مطابق میرا جرم ہے، اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اس واقعہ کی تفصیل سورۂ قصص (۱۵) میں آ رہی ہے، مختصر یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی کو ایک اسرائیلی سے لڑتے دیکھ کر گھونسا مار دیا، جس سے اس قبطی کی موت واقع ہو گئی، پھر جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کی اطلاع فرعون اور اس کے لوگوں کو ہو گئی ہے اور وہ بدلا لینے کے لیے مشورے کر رہے ہیں تو وہ مصر سے مدین چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ خوف طبعی طور پر انبیاء علیہم السلام کو بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾

فرمایا ہرگز ایسے نہ ہوگا، سو تم دونوں ہماری نشانیوں کے ساتھ جاؤ، بے شک ہم تمھارے ساتھ خوب سننے والے ہیں ﴿۱۵﴾ تو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ بلاشبہ ہم رب العالمین کا پیغام پہنچانے والے ہیں ﴿۱۶﴾ یہ کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے ﴿۱۷﴾

**آیت 15** ① قَالَ كَلَّا ...... : فرمایا، ہرگز ایسا نہیں ہوگا، نہ وہ تمھیں قتل کر سکیں گے، نہ کوئی ایذا پہنچا سکیں گے۔ تمھاری ہارون کو معاون نبی بنانے کی درخواست بھی قبول ہے، اس لیے تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔

② فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ : ہمت بندھانے کے لیے دو چیزیں عطا فرمائیں، پہلی عصا اور ید بیضا کے معجزے، دوسری اپنی معیت کا وعدہ۔ عام معیت تو کائنات کی ہر چیز کو حاصل ہے، یہاں معیت سے مراد معیت خاصہ ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی فوج کے آ پہنچنے پر فرمایا تھا: ﴿ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ [ الشعراء : ٦٢ ] ”ہرگز نہیں! بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے ضرور راستہ بتائے گا۔“ اور جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھی کے لیے کہا تھا: ﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ [ التوبۃ : ٤٠ ] ”غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ ”سَمِعَ“ ”اس نے سنا“ اور ”اِسْتَمَعَ“ ”اس نے کان لگا کر سنا۔“ ”اِنَّا مَعَكُمْ“ میں ضمیر ”كُمْ“ تثنیہ کے لیے استعمال ہوئی ہے، کیونکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِيْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴾ [ طٰہٰ : ٤٦ ] ”ڈرو نہیں، بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔“

**آیت 16** ① فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ : موسیٰ علیہ السلام کو دو ہدف دے کر بھیجا گیا تھا، ایک فرعون کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرنا (دیکھیے نازعات : ۱۷ تا ۱۹) اور دوسرا بنی اسرائیل کو آزادی دلانا۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۴۷)۔

② فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : اللہ تعالیٰ نے فرعون کے سامنے جا کر گفتگو کی ابتدا اس بات سے کرنے کا حکم دیا کہ ہم ”رب العالمین کے رسول“ (پیغام پہنچانے والے) ہیں، یعنی ہم جو کچھ تمھیں کہہ رہے ہیں وہ ہماری بات نہیں، بلکہ رب العالمین کا پیغام اور اس کا فرمان ہے جو ہم تمھیں پہنچا رہے ہیں۔ ”رب العالمین“ کے لفظ کے ساتھ واشگاف الفاظ میں اسے بتایا کہ وہ (فرعون) رب نہیں ہے۔ رب وہ ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے، جن میں فرعون بھی شامل ہے۔ اس میں توحید کا اعلان بھی ہے، کیونکہ ”عالمین“ کا لفظ پوری کائنات کو شامل ہے، جن میں فرعون اور قبطیوں کے تمام معبود بھی شامل ہیں، مثلاً سورج، چاند، ستارے اور گائے وغیرہ۔ گویا اس چھوٹے سے جملے میں توحید و رسالت دونوں کا پیغام موجود ہے۔

**آیت 17** اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ : موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف توحید و رسالت کے ساتھ یہ پیغام بھی

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

اس (فرعون) نے کہا کیا ہم نے تجھے اپنے اندر اس حال میں نہیں پالا کہ تو بچہ تھا اور تو ہم میں اپنی عمر کے کئی سال رہا ﴿۱۸﴾ اور تو نے اپنا وہ کام کیا، جو تو نے کیا اور تو ناشکروں میں سے ہے ﴿۱۹﴾ کہا میں نے اس وقت وہ کام اس حال میں کیا کہ میں خطا کاروں سے تھا ﴿۲۰﴾

دے کر بھیجا گیا کہ وہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر دے اور انھیں ان کے ساتھ ان کے آبا واجداد کی سرزمین میں جانے دے۔

آیت 19،18 ﴿ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا ...... : یہاں لمبی بات سننے والے کی سمجھ پر چھوڑ کر حذف کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی ہیبت عطا فرمائی کہ وہ دونوں کسی فوج یا اسلحے کے بغیر فرعون کے دربار میں پہنچے، اس کی فوج اور پہرے داروں میں سے کسی کو انھیں روکنے کی جرأت نہ ہو سکی اور دربار میں پہنچ کر انھوں نے اس کے تمام سرداروں کی موجودگی میں اسے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا کہ اصل رسول وہی ہیں، ہارون صرف معاون ہیں، اس لیے اس نے موسیٰ علیہ السلام ہی کو مخاطب کیا، ہارون علیہ السلام سے بات نہیں کی۔ موسیٰ علیہ السلام سے بات کرتے ہوئے اس نے ان کی دعوت پر بات کرنے سے گریز کرتے ہوئے حکمرانوں کے عام ہتھکنڈے استعمال کیے، جن میں سے پہلا ہتھکنڈا ان کی پرورش کا احسان جتا کر شرمندہ کرنا تھا۔ چنانچہ کہنے لگا کہ کیا ہم نے تجھے اپنے پاس رکھ کر تیری اس وقت پرورش نہیں کی جب تو بچہ تھا اور تو اپنی عمر کے کئی برس ہم میں رہا۔ دوسرا ہتھکنڈا انھیں مجرم ثابت کر کے سزا سے خوف زدہ کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پرورش کے احسان سے شرمندہ ہو کر یا جان کے خوف سے وہ زبان بند رکھیں گے۔ چنانچہ کہنے لگا: ''اور تو نے اپنا وہ کام کیا جو تو نے کیا اور تو ناشکروں میں سے ہے'' یعنی ہمارے اتنے احسانات کے باوجود تم نے ہمارے ایک آدمی کو قتل کر دیا جو یقیناً تمھاری احسان فراموشی تھی۔ ''اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا'' (کیا ہم نے تیری اپنے ہاں پرورش نہیں کی) کے الفاظ سے ان مفسرین اور مؤرخین کی بات کی کسی قدر تائید ہوتی ہے جن کا خیال ہے کہ یہ فرعون وہ نہیں تھا جس کے گھر موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی تھی، بلکہ اس کا بیٹا تھا، کیونکہ اگر یہ وہی ہوتا تو کہتا، کیا میں نے تیری پرورش نہیں کی اور تو کئی سال میرے پاس رہا؟ (واللہ اعلم)

آیت 20 ﴿ قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ : ''اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ'' ''میں اس وقت ضلالت والوں سے تھا۔'' لفظ ''ضلالت'' ہر جگہ گمراہی کے معنی میں نہیں ہوتا، بلکہ عربی زبان میں اسے ناواقفیت، نادانی، خطا اور بھول وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ قبطی کے قتل کے واقعہ کو دیکھیں تو یہاں اس کا معنی نادانی، خطا یا بھول ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ نہ ان کا ارادہ اسے قتل کرنے کا تھا اور نہ ان کے وہم و گمان میں یہ بات تھی کہ ایک گھونسے سے اس کا کام تمام ہو جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے اس کے اس طعن کا جواب دیا جس سے وہ انھیں مجرم ثابت کرنا چاہتا تھا، کیونکہ جرم ثابت ہونے سے وہ قصاص کے مستحق ٹھہرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دھمکی کا جواب کسی خوف کے بغیر نہایت دلیری سے دیا کہ ہاں، وہ کام میں نے کیا ہے، مگر میں

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾
وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾

پھر میں تم سے بھاگ گیا جب میں تم سے ڈرا تو میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں سے بنا دیا ﴿۲۱﴾ اور یہ کوئی احسان ہے جو تو مجھ پر جتلا رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے ﴿۲۲﴾ فرعون نے کہا اور رب العالمین کیا چیز ہے؟ ﴿۲۳﴾

نے اس وقت یہ کام جان بوجھ کر نہیں کیا، نہ میرا یہ ارادہ تھا کہ اسے قتل کروں، مجھے کیا خبر تھی کہ ایک گھونسے میں اس کا دم نکل جائے گا، کبھی ایک گھونسے سے بھی موت واقع ہوا کرتی ہے؟ مجھ سے یہ کام دانستہ نہیں خطا اور بھول سے ہوا ہے اور کیا کسی قانون میں خطا سے ہونے والے کام کو جرم قرار دیا جاتا ہے؟

آیت 21 ﴿ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ ...... : یعنی اس وقت کی بات چھوڑو جب میں خطا کاروں سے تھا، حاضر وقت کی بات کرو، جو یہ ہے کہ جب میں تمھارے خوف سے تمھارے ہاں سے بھاگ گیا تو میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا، یعنی نبوت وعلم بخشا اور مجھے رسولوں میں شامل فرما لیا۔ اب میں وہ موسیٰ نہیں جو خطا کاروں سے تھا، اب میں اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہوں اور تمھارے پاس اس کا پیغام لانے والا ہوں۔

آیت 22 ﴿ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ ...... : یہ اس کے پہلے طعن کا جواب ہے، یعنی آج تو مجھ پر یہ احسان کیسے جتلا سکتا ہے کہ تو نے اپنے گھر میں رکھ کر میری پرورش کی، حالانکہ اس کا سبب تیرا ظلم وستم تھا۔ اگر تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کے بیٹوں کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع نہ کر رکھا ہوتا تو میں اپنے گھر میں پرورش پاتا، میری والدہ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہاتی اور اس طرح میں تیرے گھر پہنچ جاتا۔

آیت 23 ﴿ ① قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ : فرعون نے جب دیکھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو خوف زدہ نہیں کر سکا اور وہ کسی صورت توحید کی دعوت سے اور بنی اسرائیل کی آزادی کے مطالبے سے باز آنے والے نہیں تو وہ مجادلے پر اتر آیا۔ عموماً مناظرے کا کامیاب اسلوب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مدّ مقابل کو سوالات میں الجھا دیا جائے۔ تو اس کے مطابق اس نے کہا: ﴿ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''اور رب العالمین کیا ہے؟'' واؤ عطف اس لیے ہے کہ اس سے پہلے وہ ایک سوال کر چکا تھا: ﴿ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا ﴾ یہ اس پر عطف ہے۔ یہاں مفسرین عام طور پر لکھتے ہیں کہ ''مَا'' کے ساتھ کسی چیز کی حقیقت کے متعلق سوال ہوتا ہے، چونکہ مخلوق خالق کی حقیقت کا ادراک کر ہی نہیں سکتی، اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے آثار کو اس کے تعارف کے لیے پیش فرمایا۔ ابن عاشور نے فرمایا، لفظ ''مَا'' کے ساتھ سوال ہو تو ''مَا'' کے بعد والی چیز کی وہ حقیقت معلوم کرنا مقصود ہوتی ہے جس سے وہ دوسری چیزوں سے الگ ہو جائے۔ اس لیے کسی کی قوم یا قبیلہ معلوم کرنا ہو تو ''مَا'' کے ساتھ سوال ہوتا ہے، جیسا کہ فارس کے ساتھ ایک جنگ میں کسریٰ کے جرنیل کی مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے گفتگو ہوئی تو اس نے پوچھا:

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

کہا جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور اس کا بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو ﴿۲۴﴾ اس نے ان لوگوں سے کہا جو اس کے اردگرد تھے، کیا تم غور سے نہیں سنتے؟ ﴿۲۵﴾

(( مَا أَنْتُمْ؟ )) ''تم کیا ہو؟'' تو انھوں نے فرمایا: (( نَحْنُ أُنَاسٌ مِنَ الْعَرَبِ )) [ بخاري، الجزية، باب الجزية والموادعة ...... : ۳۱۵۹ ] ''ہم عرب کے کچھ لوگ ہیں۔''

② قبطیوں کے ہاں کئی معبودوں کی پرستش ہوتی تھی، مشرکین کا علم الاصنام سراسر باطل ہونے کی وجہ سے نہایت پُر پیچ اور ناقابل فہم ہوتا ہے۔ فرعون کی سلطنت میں کئی معبودوں کی پرستش ہوتی تھی، فرعون بھی ان کی خدائی کو مانتا تھا۔ (دیکھیے اعراف : ۱۲۷) اس کے باوجود وہ ان تمام معبودوں کا نمائندہ بن کر اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا اور کہلواتا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۖ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [ النازعات : ۲۳، ۲۴ ] ''پھر اس نے اکٹھا کیا، پس پکارا۔ پس اس نے کہا میں تمھارا سب سے اونچا رب ہوں۔'' کبھی یہ کہتا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [ القصص : ۳۸ ] ''اے سردارو! میں نے اپنے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں جانا۔'' بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''رب العالمین'' کو نہیں جانتا تھا، اس لیے اس نے پوچھا: ﴿ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ''رب العالمین'' کو اچھی طرح جانتا تھا، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا تھا: ﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ﴾ [ بني إسرائيل : ۱۰۲ ] ''بلاشبہ یقیناً تو جان چکا ہے کہ انھیں آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا کسی نے نہیں اتارا، اس حال میں کہ واضح دلائل ہیں۔'' اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اور اس کی قوم کے متعلق شہادت دی ہے، فرمایا: ﴿ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ﴾ [ النمل : ۱۴ ] ''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل ان کا اچھی طرح یقین کر چکے تھے۔'' معلوم ہوا اس کا سوال ''وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' تجاہلِ عارفانہ تھا، وہ جاننے کے باوجود ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سورۂ طٰہٰ میں اس کا سوال یہ نقل ہوا ہے: ﴿ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴾ [ طٰهٰ : ۴۹ ] ''تو تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ!؟''

**آیت 24** ﴿ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا، رب العالمین وہ ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا رب ہے، اگر تم میں کسی چیز پر یقین کرنے کی صلاحیت ہے تو اس بات پر یقین کے سوا تمھارے لیے کوئی چارہ نہیں، تم تو زمین کے ایک نہایت چھوٹے سے قطعہ مصر پر حکومت کی وجہ سے رب اعلیٰ بن رہے ہو، حالانکہ تم نے مصر کو نہ پیدا کیا نہ اہل مصر کو روزی دے رہے ہو۔ تو وہ جس نے زمین و آسمان اور وہ سب کچھ پیدا فرمایا جو ان دونوں کے درمیان ہے اور ان کی پرورش بھی کر رہا ہے۔ غور کرو تمھیں کس بات پر یقین آتا ہے، اپنے رب ہونے پر یا اس کے رب ہونے پر جو آسمانوں کا، زمین کا اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کا خالق و مالک اور رازق ہے؟

**آیت 25** ﴿ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ : ظاہر ہے فرعون رب اعلیٰ ہونے کا لاکھ دعویٰ کرے، آسمان و زمین کے ایک

قَالَ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ۲۶ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۲۷

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۲۸

**کہا جو تمھارا رب اور تمھارے پہلے باپ دادا کا رب ہے ۲۶ کہا یقیناً تمھارا یہ پیغمبر، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، ضرور پاگل ہے ۲۷ اس نے کہا جو مشرق و مغرب کا رب ہے اور اس کا بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے، اگر سمجھتے ہو ۲۸**

ذرّے کا خالق و پروردگار نہیں تھا اور اپنی اوقات کو خوب جانتا تھا، جب وہ موسیٰ علیہ السلام کی بات کا جواب نہ دے سکا تو بات کو خلط ملط کرنے، اپنے درباریوں کو ابھارنے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دلیل کو بے وزن بنانے کے لیے کہنے لگا، کیا تم غور سے سنتے نہیں، یہ شخص کیسی عجیب بات کر رہا ہے؟ کیا ایسی بات کبھی تمھارے سننے میں آئی بھی ہے؟

**آیت 26** قَالَ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ: فرعون نے درباریوں کو بھڑکایا تو موسیٰ علیہ السلام نے انھیں بھی خطاب میں شامل کر لیا اور فرمایا ''رب العالمین'' وہ ہے جو تمھارا اور تمھارے پہلے آبا و اجداد کا رب ہے، جو پہلے بھی موجود تھا، اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ یہ بات اگرچہ ''رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ'' کے ضمن میں آ چکی تھی کہ آسمان و زمین تو فرعون کی پیدائش سے پہلے پیدا ہو چکے تھے، یہ ان کا رب کیسے بن گیا، مگر موسیٰ علیہ السلام بات کو مزید قریب کر کے ان کے اور ان کے باپ دادا تک لے آئے کہ سوچو، جب تمھارے باپ یا دادا موجود تھے تو رب ہونے کے یہ مدعی صاحب کیا اس وقت موجود تھے؟ اور آئندہ جب تمھاری اولاد کی اولاد ہوگی تو اس وقت یہ رب صاحب کہاں ہوں گے؟

**آیت 27** قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ: موسیٰ علیہ السلام کی دلیل اتنی واضح اور زبردست تھی کہ فرعون اس کا جواب دینا چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کی ذات پر حملہ آور ہو گیا اور کہنے لگا، یقیناً تمھارا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، ضرور پاگل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے چہرے پر حکمت و دانائی اور نور فراست کے آثار ان کے دیوانہ یا پاگل ہونے کی نفی کر رہے تھے، اس لیے فرعون نے ''اِنَّ'' اور ''لام تاکید'' کے ساتھ انھیں مجنون قرار دیا کہ یقیناً یہ ضرور پاگل ہے۔

**آیت 28** ① قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ ......: شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''موسیٰ علیہ السلام ایک بات کہے جاتے تھے اللہ کی قدرتیں بتانے کو اور فرعون بیچ میں اپنے سرداروں کو ابھارتا تھا کہ ان کو یقین نہ آ جائے۔'' پاگل ہونے کے الزام کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے اب وہ دلیل پیش کی جو ان کے جدّ امجد ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے پیش کی تھی کہ ''رب العالمین'' وہ ہے جو مشرق و مغرب اور ان کے مابین کا رب ہے، جو ہمیشہ سے سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے، تمھیں رب ہونے کا زعم ہے تو ذرا سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا دو۔

② اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ: مجھے دیوانہ بتاتے ہو اور خود عقل مند ہونے کا دعویٰ کرتے ہو، اگر تم میں واقعی عقل ہے تو بتاؤ کہ رب وہ ہے جس کے حکم سے سورج ہمیشہ مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا ہے، یا تم جو ایک دفعہ بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ پہلی

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

کہا یقیناً اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور ہی قید کیے ہوئے لوگوں میں شامل کر دوں گا ﴿۲۹﴾ کہا کیا اگرچہ میں تیرے پاس کوئی واضح چیز لے آؤں؟ ﴿۳۰﴾ اس نے کہا تو اسے لے آ، اگر تو سچوں سے ہے ﴿۳۱﴾ پس موسیٰ نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اچانک وہ واضح اژدہا تھی ﴿۳۲﴾ اور اپنا ہاتھ نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید (چمکدار) تھا ﴿۳۳﴾

دفعہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق نرم لفظ استعمال فرمائے، یعنی "اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ" لیکن جب اس نے مجنون ہونے کا الزام لگایا تو موسیٰ علیہ السلام نے سخت الفاظ استعمال فرمائے "اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ" کہ اگر تم سمجھتے ہو۔ (ابن جزی)

**آیت 29** ① قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـهًا غَيْرِيْ ...... : ہر ظالم و جابر اور باطل کے علم بردار حکمران کا وتیرہ ہے کہ جب وہ دلیل کے میدان میں شکست کھاتا ہے تو آخری حربے کے طور پر طاقت کے استعمال کی دھمکی دیتا ہے کہ یا تو ہمارے غلط کو بھی صحیح مانو، ورنہ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔ فرعون نے بھی آخر میں صاف کہہ دیا کہ مصر میں میرے سوا کوئی خدا نہیں اور نہ کسی کا حکم چلے گا، اگر میرے سوا کسی اور معبود کی حکومت مانی تو تمھارے لیے قید خانہ تیار ہے۔

② لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ : فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہنے کے بجائے کہ "لَأَسْجُنَنَّكَ" (میں تجھے قید کر دوں گا) یہ کہا کہ "میں تجھے قید کیے ہوئے لوگوں میں شامل کر دوں گا۔" اس میں وہ موسیٰ علیہ السلام کو نہایت خوفناک نتیجے سے ڈرا رہا تھا کہ ان لوگوں کا حال دیکھ لو جنھیں میں نے قید کر رکھا ہے، تمھیں بھی ان کے ساتھ شامل کر دوں گا۔ واضح رہے کہ آخرت کا منکر اور جواب دہی کے احساس سے عاری ہونے کی وجہ سے فرعون نہایت سنگدل تھا اور انسانیت اور رحم سے یکسر نا آشنا تھا، وہ اپنے مخالفوں سے قید خانے میں جو سلوک کرتا ہو گا بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے کو پیش نظر رکھ کر اس کا تصور کچھ مشکل نہیں۔

**آیت 30** قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ : جب فرعون لاجواب ہو گیا اور قید خانے کی دھمکی دینے لگا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے معجزے پیش کرنے کی پیش کش کی اور اس کے لیے نہایت نرم الفاظ اور نرم لہجہ اختیار فرمایا کہ ہو سکتا ہے وہ ان کے صدق کی واضح دلیل دیکھ کر ہی ایمان لے آئے۔ "اَوَلَوْ جِئْتُكَ" میں واؤ سے پہلے ایک لفظ محذوف ہے: "أَتَفْعَلُ بِيْ ذٰلِكَ وَلَوْ جِئْتُكَ......" یعنی کیا اگر میں تمھارے سامنے بالکل واضح چیز پیش کر دوں، پھر بھی تم نہیں مانو گے اور میرے ساتھ یہی سلوک کرو گے۔

**آیت 31** قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ: فرعون کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اس نے کہا، اگر سچے ہو تو پیش کرو۔

**آیت 33،32** فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۰۷، ۱۰۸)۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّ قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

اس نے ان سرداروں سے کہا جو اس کے اردگرد تھے، یقیناً یہ تو ایک بہت ماہر فن جادوگر ہے ﴿۳۴﴾ جو چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے ساتھ تمھیں تمھاری سرزمین سے نکال دے، تو تم کیا حکم دیتے ہو؟ ﴿۳۵﴾ انھوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو مؤخر رکھ اور شہروں میں جمع کرنے والے بھیج دے ﴿۳۶﴾ کہ وہ تیرے پاس ہر بڑا جادوگر لے آئیں، جو بہت ماہر فن ہو ﴿۳۷﴾ تو جادوگر ایک مقرر دن کے طے شدہ وقت کے لیے جمع کر لیے گئے ﴿۳۸﴾ اور لوگوں سے کہا گیا کیا تم جمع ہونے والے ہو؟ ﴿۳۹﴾ شاید ہم ان جادوگروں کے پیروکار بن جائیں، اگر وہی غالب رہیں ﴿۴۰﴾ پھر جب جادوگر آگئے تو انھوں نے فرعون سے کہا کیا واقعی ہمارے لیے ضرور کچھ صلہ ہوگا، اگر ہم ہی غالب ہوئے؟ ﴿۴۱﴾ کہا ہاں اور یقیناً تم اس وقت ضرور مقرب لوگوں سے ہو گے ﴿۴۲﴾ موسیٰ نے ان سے کہا پھینکو جو کچھ تم پھینکنے والے ہو ﴿۴۳﴾ تو انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں اور انھوں نے کہا فرعون کی عزت کی قسم! بے شک ہم، یقیناً ہم ہی غالب آنے والے ہیں ﴿۴۴﴾

**آیت 35،34** قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ ...... : ابھی خدائی کے دعوے تھے اور ابھی اپنے وزیروں اور درباریوں سے پوچھنے پر اتر آیا کہ بتاؤ کیا کیا جائے، اس آئی بلا کو کیونکر ٹالا جائے؟ اس نے اپنے اقتدار کا سورج غروب ہوتے دیکھ کر یہ رویہ اختیار کیا۔ یہاں یہ ذکر ہے کہ یہ بات فرعون نے کہی، جب کہ سورۂ اعراف (۱۰۹، ۱۱۰) میں ہے کہ یہ بات فرعون کے سرداروں نے کہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات فرعون نے کہی تو اس کے سرداروں نے بھی وہی بات دہرا دی۔

**آیت 37،36** قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ ...... : ان آیات کی تفسیر سورۂ اعراف (۱۱۱، ۱۱۲) میں گزر چکی ہے، فرق یہ ہے کہ وہاں "اَرْسِلْ" ہے اور یہاں "ابْعَثْ" ہے، دونوں ہم معنی ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں "سٰحِرٍ عَلِيْمٍ" ہے اور یہاں "سَحَّارٍ عَلِيْمٍ" ہے، یہاں مبالغہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے: "کہ وہ تیرے پاس ہر بڑا جادوگر لے آئیں، جو بہت ماہر فن ہو۔" جبکہ وہاں ترجمہ ہے "کہ وہ تیرے پاس ہر ماہر فن جادوگر لے آئیں۔"

**آیت 39،38** فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ ...... : سورۂ طٰہٰ (۵۹) میں اس مقرر کردہ وقت اور مقام کا ذکر گزر چکا ہے۔

**آیت 44** وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ ...... : فرعون کی تعظیم کے لیے اس کی عزت کی قسم کھائی کہ ہم ضرور ہی جیتیں گے۔

فَاَلْقٰی مُوْسٰی عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَیْرَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾

پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اچانک وہ ان چیزوں کو نگل رہی تھی جو وہ جھوٹ بنا رہے تھے ﴿۴۵﴾ تو جادوگر نیچے گرا دیے گئے، اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے تھے ﴿۴۶﴾ انھوں نے کہا ہم تمام جہانوں کے رب پر ایمان لے آئے ﴿۴۷﴾ موسیٰ اور ہارون کے رب پر ﴿۴۸﴾ کہا تم اس پر ایمان لے آئے، اس سے پہلے کہ میں تمھیں اجازت دوں، بلاشبہ یہ ضرور تمھارا بڑا ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے، سو یقیناً تم جلدی جان لو گے، میں ضرور ہر صورت تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف سمت سے بری طرح کاٹوں گا اور یقیناً تم سب کو ضرور بری طرح سولی دوں گا ﴿۴۹﴾ انھوں نے کہا کوئی نقصان نہیں، بے شک ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں ﴿۵۰﴾

اس سے جادوگروں کا مقصد فرعون کو خوش اور موسیٰ علیہ السلام کو مرعوب کرنا تھا۔ جاہلیت میں لوگ اس قسم کی قسمیں کھایا کرتے تھے، اسلام میں اس سے منع کر دیا گیا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَلَا إِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْ لِيَصْمُتْ )) [ بخاري، الأيمان والنذور، باب لا تحلفوا بآبائكم : ٦٦٤٦ ] ''خبردار! اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے باپوں کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، جسے قسم کھانی ہو وہ اللہ کی قسم کھائے، یا خاموش رہے۔'' اس کے باوجود آج کل بعض مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات کی قسم کھانے پر مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ اپنے پیر و مرشد یا کسی بزرگ کی قبر کی قسم کھاتے ہیں، یا عام رواج کے مطابق کہہ دیتے ہیں مجھے تیری قسم یا تیرے سر کی قسم وغیرہ، اس طرح وہ دوسروں کی عظمت کا اظہار کرتے ہیں، تو جس طرح اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے مخلوق کی سچی قسم کھانا اس سے بھی بڑھ کر گناہ ہے۔

**آیت 48، 47** قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ...... : ''ہم تمام جہانوں کے رب پر ایمان لے آئے'' کے بعد ''موسیٰ اور ہارون کے رب پر'' اس لیے کہا کہ کہیں فرعون کو شبہ نہ ہو کہ انھوں نے اسے تمام جہانوں کا رب قرار دے دیا ہے، کیونکہ وہ بھی اپنے آپ کو رب کہتا تھا۔ (کبیر)

**آیت 50** قَالُوْا لَا ضَیْرَ ...... : ''لَا ضَیْرَ'' کوئی نقصان نہیں۔ ''ضَارَ يَضِيْرُ ضَيْرًا'' اور ''ضَرَّ يَضُرُّ ضَرًّا'' ہم معنی ہیں، یعنی بہر حال اللہ کی طرف تو لوٹنا ہی ہے، اس طرح مریں گے تو شہادت کا درجہ پائیں گے اور صبر کا اجر ملے گا۔ (وحیدی)

اِنَّا نَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنۡ کُنَّاۤ اَوَّلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۱﴾ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡۤ اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۵۲﴾

بے شک ہم لالچ رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے لیے ہماری خطائیں معاف کرے گا، اس لیے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے بنے ہیں ﴿۵۱﴾ اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو رات کو لے چل، یقیناً تمھارا پیچھا کیا جائے گا ﴿۵۲﴾

آیت 51 اَنۡ کُنَّاۤ اَوَّلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: یعنی دلیل واضح ہو جانے کے بعد قومِ فرعون میں سے سب سے پہلے ہم ایمان لائے۔

نوٹ : آیت (۴۱) سے (۵۱) تک کی تفسیر کے لیے سورۂ اعراف (۱۱۳ تا ۱۲۶) اور سورۂ طٰہٰ (۶۵ تا ۷۵) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 52 ① وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡۤ ...... : اوپر کے واقعات کے بعد بنی اسرائیل کی ہجرت کا ذکر شروع ہوتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے بعد فوراً ہی موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل سمیت مصر سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا، بلکہ یہاں کئی سال کی تاریخ چھوڑ دی گئی ہے، جس کا ذکر سورۂ اعراف (۱۲۷ تا ۱۳۵) اور سورۂ یونس (۸۳ تا ۸۹) میں گزر چکا ہے اور جس کا ایک حصہ آگے سورۂ مؤمن (۲۳ تا ۴۶) اور سورۂ زخرف (۴۶ تا ۵۶) میں آ رہا ہے۔ یہاں چونکہ سلسلہ کلام کی مناسبت سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جس فرعون نے صریح نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود یہ ہٹ دھرمی دکھائی تھی اس کا انجام آخر کار کیا ہوا۔

② ان آیات میں ایک بہت بڑی عبرت یہ ہے کہ حق واضح ہونے کے بعد اسے تسلیم کرنے میں ایک طرف جادوگر ہیں، جنھوں نے ایمان لانے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی پر چڑھانے کی دھمکیاں بھی انھیں حق سے برگشتہ نہیں کر سکیں، دوسری طرف فرعون اور اس کی قوم ہے، جو سالہا سال تک ان معجزوں کے علاوہ مزید نشانیاں دیکھتے رہے اور بار بار ایمان لانے اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کا وعدہ کرتے رہے، اس کے باوجود غرق ہونے تک ایمان سے محروم رہے۔ سچ فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے: ﴿اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَ تَهۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ﴾ [ الأعراف : ۱۵۵ ] ”یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش، جس کے ساتھ تو گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے۔“ سورت کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے ایمان نہ لانے پر تسلی دیتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دیکھیے اسی سورت کی آیات (۳ تا ۹)۔

③ جب فرعون کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کے خلاف اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ (دیکھیے یونس : ۸۸) اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا کہ میرے (مسلم) بندوں کو (بنی اسرائیلی ہوں یا کوئی اور) لے کر راتوں رات نکل جاؤ اور یاد رکھو! تمھارا تعاقب کیا جائے گا، اس لیے اتنا فاصلہ طے کر لو کہ تعاقب کرنے والے جلدی تم تک نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ ایسے موقع پر معروف طریقے کے مطابق پورے مصر کے بنی اسرائیل کے لیے ایک وقت اور ایک جگہ مقرر کر دی

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾

تو فرعون نے شہروں میں اکٹھا کرنے والے بھیج دیے ﴿۵۳﴾ کہ بے شک یہ لوگ تو ایک تھوڑی سی جماعت ہیں ﴿۵۴﴾ اور بلاشبہ یہ ہمیں یقیناً غصہ دلانے والے ہیں ﴿۵۵﴾

گئی، جس پر وہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جلد از جلد فرعون کی سلطنت (مصر) سے نکل جانے کے لیے رات کو روانہ ہو گئے۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے قبطیوں سے عاریتاً زیور مانگ لیے تھے جنھیں وہ ساتھ لے کر ہی روانہ ہو گئے، مگر یہ بات درست نہیں۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۸۷) کی تفسیر۔

**آیت 53** فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ: صبح ہوئی اور فرعون اور اس کے لوگوں نے دیکھا کہ بنی اسرائیل جا چکے ہیں تو وہ سخت برافروختہ ہوئے، وہ کسی صورت انھیں جانے نہیں دینا چاہتے تھے، کیونکہ وہ ان سے گھروں اور کھیتوں کی محنت مشقت کی بیگار لیتے تھے۔ اس لیے انھیں واپس لانے کے لیے فرعون نے فوجیں اکٹھی کرنے کے لیے تمام شہروں میں آدمی بھیج دیے۔

**آیت 54** اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ: ''شِرْذِمَةٌ'' چھوٹا سا گروہ، اس نے انھیں مزید حقیر اور بے وقعت بتانے کے لیے ''قَلِيْلُوْنَ'' کے ساتھ تاکید کی، جو جمع قلت کا صیغہ ہے۔ ''هٰٓؤُلَآءِ'' کے ساتھ اشارہ بھی حقارت کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ لوگ ایک چھوٹی سی جماعت اور تھوڑے سے لوگ ہیں، ہمیں ان کی کیا پروا ہے، ہم آسانی سے انھیں نیست و نابود کر سکتے ہیں اور چاہیں تو معمولی وسائل کے ساتھ انھیں واپس لا سکتے ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو دلیری دے رہا تھا، جب کہ اس سے اس کا سخت خوف زدہ ہونا ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر واقعی وہ اتنے ہی قلیل اور بے وقعت ہیں تو تمھیں اتنی فوجیں اکٹھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں مفسرین نے بائبل سے متاثر ہو کر لکھا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد بچوں اور بوڑھوں کے علاوہ چھ لاکھ تھی، مگر یہ بات عقلاً ممکن ہی نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے انھیں مبالغہ قرار دیا ہے۔ جوانوں کی اتنی بڑی تعداد اگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتی تو وہ کبھی ہجرت کا راستہ اختیار نہ کرتے اور چھ لاکھ کو ''لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ'' بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مفسر مراغی لکھتے ہیں: ''جو بات یقین سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل فرعون کے لشکر سے بہت کم تھے، لیکن ہم کسی معین عدد کا یقین نہیں کر سکتے، تورات اور تاریخ کی کتابوں میں جو مبالغہ آمیز باتیں ہیں ان کی تصدیق بہت مشکل ہے، ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے، ہمارے لیے بہتر ہے کہ ان کی تفاصیل میں نہ پڑیں۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں ان روایات کو باطل قرار دیا ہے اور ان میں موجود غلو کی وضاحت کی ہے، جسے نہ عقل قبول کرتی ہے اور نہ صحیح علمی بحث کے سامنے وہ قائم رہ سکتی ہیں۔''

**آیت 55** وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ: وہ ہمیں غصہ دلانے والے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہم سے آزادی کا مطالبہ کر کے بد امنی اور شور و شر پھیلاتے رہتے ہیں اور اب ہمارے پوچھے بغیر ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔ بعض مفسرین نے غصہ دلانے کے اسباب

وَ اِنَّا لَجَمِيۡعٌ حٰذِرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوۡنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوۡزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيۡمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۵۹﴾

اور بے شک ہم یقیناً سب چوکنے رہنے والے ہیں ﴿۵۶﴾ تو ہم نے انھیں باغوں اور چشموں سے نکال دیا ﴿۵۷﴾ اور خزانوں سے اور عمدہ جگہ سے ﴿۵۸﴾ ایسے ہی ہوا اور ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا ﴿۵۹﴾

میں سے ان کا زیورات لے جانا بھی لکھا ہے، مگر یہ بات ثابت نہیں۔

**آیت 56** وَ اِنَّا لَجَمِيۡعٌ حٰذِرُوۡنَ : یعنی اگرچہ وہ چھوٹا سا گروہ اور تھوڑے سے لوگ ہیں، مگر ہمیں ہر وقت ہوشیار اور چوکنا رہنا ہے اور ہر ایسے فتنے کا پہلے ہی سدباب کرنا ہے جو کسی وقت بھی پھیل سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس نے اپنی قوم کو ان کا پیچھا کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ کہا کہ وہ قلیل تعداد والے چھوٹا سا گروہ ہیں، ان کے تعاقب میں کوئی مشکل درپیش نہیں، پھر یہ ذکر کیا کہ وہ ہمارے شدید دشمن ہیں اور انھوں نے ہمیں غصہ دلا دیا ہے، اس لیے ان کا ہر حال میں پیچھا کرنا ہوگا اور آخر میں اس نے لازمی احتیاطی تدبیر کے طور پر ان کے تعاقب کو ضروری قرار دیا۔ یہ سب باتیں اس نے اپنے خوف کو چھپانے کے لیے کیں کہ اتنا بڑا بادشاہ ہو کر ان بے سروسامان لوگوں سے ڈر رہا ہے۔

**آیت 58،57** فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ...... : چند ہی دنوں میں فرعون نے بنی اسرائیل کے تعاقب کے لیے ایک لشکر جرار تیار کر لیا۔ اس کے نزدیک تو یہ کام نہایت عقل مندی کا تھا کہ اس نے پورے ملک سے اپنی ساری قوت اکٹھی کر لی، تاکہ بنی اسرائیل کو زبردستی دوبارہ اپنی غلامی میں واپس لے آئے، یا انھیں دنیا سے مٹا دے، مگر اللہ تعالیٰ کی تدبیر غالب ہے۔ اس نے فرعون کی چال اسی پر پلٹ دی، اس کی سلطنت کے بڑے بڑے ستون پورے ملک سے اکٹھے ہو گئے، تمام فوجیں بھی یکجا ہو گئیں اور ایک ہی وقت میں سمندر میں غرق کر دی گئیں۔ اگر وہ بنی اسرائیل کے لیے فوجیں جمع نہ کرتا تو زیادہ سے زیادہ ایک قوم اس کے ہاتھ سے نکل جاتی، مگر اس کی سلطنت اور عیش و عشرت کے اسباب باقی رہتے۔ اب اس کی تدبیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود، اس کی افواج اور اس کے امراء و وزراء، جو اس کی سلطنت کا خلاصہ تھے، سب سمندر میں غرق ہو گئے۔ یہ اس قادر و مختار کا کام تھا کہ ایک طرف اس نے فرعون کو، اس کی پوری قوت کو اور اس کی قوم کے سرداروں کو ان کے باغوں، چشموں، خزانوں اور عالی شان مقامات سے نکالا اور سمندر میں لا کر غرق کر دیا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو خیریت کے ساتھ مصر سے نکال کر آزادی سے ہمکنار کر دیا۔

**آیت 59** كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ : "كَذٰلِكَ" کو مبتدا محذوف کی خبر بنا لیں "أَيِ الْأَمْرُ كَذٰلِكَ" یا فعل محذوف کا فاعل "أَيْ وَقَعَ كَذٰلِكَ" یعنی اگرچہ یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے، مگر ایسے ہی ہوا اور ہم نے ان باغوں، چشموں، خزانوں اور عالی شان جگہوں کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر کی سرزمین کے مالک بن گئے، جب کہ بنی اسرائیل جہاد سے انکار کی پاداش

فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الۡجَمۡعٰنِ قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ﴿۶۱﴾

تو انھوں نے سورج نکلتے ان کا پیچھا کیا ﴿۶۰﴾ پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا بے شک ہم یقیناً پکڑے جانے والے ہیں ﴿۶۱﴾

میں چالیس برس تو صحرا ہی میں دھکے کھاتے رہے، اس کے بعد بھی معروف یہی ہے کہ ان کی پیش قدمی شام کی طرف ہوئی اور شام ہی یوشع بن نون اور بعد میں داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی سلطنت کا مرکز تھا۔ تاریخ میں ان کی مصر واپسی کا کہیں ذکر نہیں۔

اس سوال کا حل دو طرح سے ہے، ایک وہ جو بہت سے مفسرین نے اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بہت سے باغوں، چشموں، خزانوں اور عمدہ جگہوں کا وارث بنایا، مگر مصر میں نہیں بلکہ شام میں۔ مصر کے باغوں، چشموں وغیرہ کی وارث اور قومیں بنیں۔ ان مفسرین کے نزدیک سورۂ دخان (۲۸) میں مذکور: ﴿ كَذٰلِكَ ۖ وَ اَوۡرَثۡنٰهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ ﴾ (اسی طرح ہوا اور ہم نے ان کا وارث اور لوگوں کو بنا دیا) کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے سرزمین مصر کا وارث بنی اسرائیل کے سوا اور لوگوں کو بنا دیا۔ ابن عاشور، بقاعی اور بہت سے مفسرین کی یہی رائے ہے۔

دوسرا حل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مصر کے باغوں، چشموں اور خزانوں وغیرہ کا مالک بالآخر بنی اسرائیل کو بنا دیا، مگر ان کو نہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ ہجرت کرکے وہاں سے نکلے تھے، بلکہ بنی اسرائیل ہی کی ایک اور نسل کو یہ نعمت عطا ہوئی اور یہی مطلب ہے اس آیت کا: ﴿ كَذٰلِكَ ۖ وَ اَوۡرَثۡنٰهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ ﴾ [ الدخان : ۲۸ ] مجھے اس رائے پر اطمینان ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ تاریخ میں بنی اسرائیل کے مصر واپس آنے کا ذکر نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ قبل مسیح کی تاریخ کا پوری طرح اعتبار مشکل ہے اور اس میں کسی بات کے ذکر نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ سلیمان علیہ السلام جنھوں نے یمن کی ملکہ کی حکومت کا علم ہونے پر اسے اپنے زیر نگیں کرنے تک دم نہیں لیا اور قرآن کے بیان کے مطابق جنھیں ایسی سلطنت ملی جو بعد میں کسی کے شایان شان ہی نہیں، ان کے لیے مصر کو اپنی قلمرو میں شامل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس لیے فرعون کی قوم کو ان کے باغوں اور چشموں وغیرہ سے نکال لانے کے بعد ''اور ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا'' کے الفاظ کو ان کے ظاہر پر ہی رہنے دینا چاہیے۔ ہاں، یہ درست ہے کہ وہ بنی اسرائیل اور تھے جو وارث بنے، ''تیہ'' میں چالیس سال تک سر مارتے رہنے والے بنی اسرائیل نہیں تھے۔ (واللہ اعلم) مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۶)۔

**آیت 60** ﴿ فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ ﴾: ''مُشۡرِقِيۡنَ'' کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ لوگ سورج طلوع ہوتے ہی بنی اسرائیل کے تعاقب میں روانہ ہو گئے اور دوسرا معنی یہ کہ وہ مشرق کی طرف رخ کیے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑے۔ (ابن جزی) اگر نقشے کو غور سے دیکھیں تو مصر کے مشرق میں بحر قلزم ہے، جو شمال کی طرف پھیلتا گیا ہے، اس کے آخر میں مصر خشکی کے ذریعے سے صحرائے سینا کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلنے کے لیے مشرق کی طرف سمندر کا رخ کیا، جس کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چلتے ہوئے وہ صحرائے سینا میں داخل ہونا چاہتے تھے، مگر فرعون نے انھیں سمندر پر ہی جا لیا۔ اب ان کے آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون اور اس کا لشکر۔

**آیت 61** ﴿ فَلَمَّا تَرَآءَ الۡجَمۡعٰنِ ﴾......: ''تَرَاءٰى يَتَرَاءٰى تَرَائِيًا'' (تفاعل) ایک دوسرے کو دیکھنا۔ جب دونوں جماعتیں

قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾ فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾

کہا ہرگز نہیں! بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے ضرور راستہ بتائے گا ﴿٦٢﴾ تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی سمندر پر مار، پس وہ پھٹ گیا تو ہر ٹکڑا بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا ﴿٦٣﴾

ایک دوسرے کو نظر آنے لگیں تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے کہ ہم تو یقیناً پکڑے جانے والے ہیں۔ ''إِنَّ'' اور ''لام تاکید'' سے ان کے شدید خوف کا اظہار ہو رہا ہے کہ اب ہر صورت یہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے، یا پھر غلام بنا کر ساتھ لے جائیں گے۔ اس سے پہلے مصر میں بھی انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ﴾ [ الأعراف : ١٢٩ ] ''ہمیں اس سے پہلے ایذا دی گئی کہ تو ہمارے پاس آئے اور اس کے بعد بھی کہ تو ہمارے پاس آیا۔'' اب انھیں فرعون کی صورت میں موت نظر آئی تو انھوں نے یہ بات کہی۔ یہاں ''قَالَ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ'' کے بجائے '' قَالَ أَصْحٰبُ مُوْسٰى '' اس لیے فرمایا کہ ہجرت کر کے آنے والوں میں بنی اسرائیل کے علاوہ مسلمان بھی تھے۔

**آیت 62** ﴿ قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ : فرمایا، ایسا ہرگز نہیں ہو گا، بلکہ میرا رب میرے ساتھ ہے، اس نے فرعون کی طرف روانہ کرتے ہوئے خود مجھ سے وعدہ کیا ہے: ﴿ إِنَّا مَعَكُم مُّسْتَمِعُونَ ﴾ [ الشعراء : ١٥ ] ''بے شک ہم تمھارے ساتھ خوب سننے والے ہیں۔'' اسی کے حکم سے میں یہاں آیا ہوں، یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اب وہ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ دے، وہ مجھے ضرور ان سے نجات کا راستہ بتائے گا۔

**آیت 63** ﴿ فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ...... : بعض لوگ جو معجزات کے منکر ہیں فرعون اور اس کی قوم کے سمندر میں غرق ہونے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل سمندر کے کنارے پہنچے تو اس وقت سمندر میں جزر کی کیفیت تھی، پانی پیچھے ہٹ گیا تھا، چنانچہ وہ بخیریت اس سے گزر گئے، ان کے پیچھے فرعون اور اس کی قوم بھی سمندر میں داخل ہو گئی۔ جب وہ پوری طرح اس کے اندر داخل ہو گئے تو سمندر میں ''مد'' کی کیفیت پیدا ہو گئی، پانی یک لخت چڑھ آیا اور وہ سب غرق ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاویل نہیں بلکہ قرآن کا صاف انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ اپنا عصا سمندر پر مار، چنانچہ سمندر پھٹ گیا اور پانی کا ہر ٹکڑا ایک بہت بڑے، لمبے چوڑے اور اونچے پہاڑ کی صورت میں تھم گیا۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ ان کے درمیان (سمندر کی تہ کی گیلی اور دلدلی زمین میں) خشک راستہ بن گیا، فرمایا: ﴿ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ﴾ [ طٰہٰ : ٧٧ ] ''پس ان کے لیے سمندر میں ایک خشک راستہ بنا۔'' غور کریں کہاں مد و جزر سے سمندر کا بڑھنا گھٹنا اور کہاں پانی کا اپنی سطح ہموار رکھنے کے بجائے بہت بڑے بڑے پہاڑوں کی صورت میں تھم جانا۔ دراصل ان لوگوں کا ایمان ہی نہیں کہ جس مالک نے آگ میں جلانے کی اور پانی میں بہنے اور ڈبونے کی خاصیت رکھی ہے، وہ جب چاہے ان سے یہ خاصیت واپس بھی لے سکتا ہے۔ یہ لوگ اندھے بہرے مادے ہی کو اپنا معبود بنائے بیٹھے ہیں،

وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور وہیں ہم دوسروں کو قریب لے آئے ﴿۶۴﴾ اور ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو بچا لیا ﴿۶۵﴾ پھر دوسروں کو ڈبو دیا ﴿۶۶﴾ بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے ﴿۶۷﴾

جو اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہاں "فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ" کے بجائے "**فَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى**" میں موسیٰ علیہ السلام کا نام اپنے رب پر اعتماد کے صلے میں ان کی عظمت شان کے اظہار کے لیے ہے۔

**آیت 64** **وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ** : "أَزْلَفَ يُزْلِفُ" قریب کرنا۔ "**ثَمَّ**" وہاں، اس جگہ۔ "**الْاٰخَرِيْنَ**" دوسرے لوگ یعنی فرعون کی قوم۔ "**ثَمَّ**" کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم الشان موقع پر ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو مسلمانوں کے قریب پہنچا دیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص تصرّف تھا کہ فرعون اور اس کی قوم سمندر میں داخل ہوگئی، ورنہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ فرعون جیسا مادہ پرست ایسے خوفناک منظر کو دیکھتے ہوئے کیسے سمندر میں داخل ہوگیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کرکے جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ فرمایا کہ اس موقع پر ہم انھیں قریب لے آئے، ورنہ وہ کہاں قریب آنے والے تھے۔

**آیت 66،65** **وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ** ......: یعنی اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے کہ ہم نے اس پانی سے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے تمام ساتھیوں کو بچا کر نکال لیا، پھر ہم نے اسی پانی کے ساتھ دوسروں کو غرق کر دیا۔

**آیت 67** ❶ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً** : ایک ہی پانی کے ذریعے سے کسی کو بچا لینے اور کسی کو غرق کر دینے میں یقیناً بہت بڑی نشانی ہے کہ اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قوموں اور سلطنتوں میں انقلاب آتے رہتے ہیں، مگر ایسے حیرت انگیز اور عظیم الشان واقعہ کے ساتھ انقلاب ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔

❷ **وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ**: اس جگہ "**اَكْثَرُهُمْ**" سے مراد ان لوگوں میں سے اکثر مراد نہیں جو فرعون کے ساتھ آئے تھے، کیونکہ وہ تو سب غرق ہوگئے اور غرق ہوتے وقت ایمان لائے بھی تو بے سود۔ (دیکھیے یونس: ۹۰، ۹۱) مراد مصر میں فرعون سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ ہیں کہ ان کے اکثر ایمان نہیں لائے، بہت کم ایمان لائے۔ جن میں فرعون کے جادوگر، اس کی بیوی آسیہ اور اس کی قوم کے چند لڑکے شامل تھے۔ (دیکھیے یونس: ۸۳) اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ اتنے عظیم الشان معجزے دیکھ کر بھی ان کے اکثر ایمان نہیں لائے تو آپ اپنی قوم کے اکثر لوگوں کے ایمان نہ لانے پر اتنے غمگین کیوں ہیں؟ یہاں مفسرین نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں ایک خاتون کا ذکر کیا ہے، جس کے بتانے پر بنی اسرائیل یوسف علیہ السلام کی میت کو ان کی قبر سے نکال کر ساتھ لے گئے تھے اور جس نے اس شرط پر موسیٰ علیہ السلام کو اس قبر کی نشان دہی کی تھی کہ وہ اس بات کی ضمانت دیں کہ اسے جنت میں ان کا ساتھ ملے گا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، میں نے مفسرین کی دیکھا دیکھی اسے نقل کر دیا ہے، ورنہ اس میں نکارت ہے، یعنی یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٨﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿٧١﴾

اور بے شک تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، بے حد رحم والا ہے ﴿٦٨﴾ اور ان پر ابراہیم کی خبر پڑھ ﴿٦٩﴾ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ ﴿٧٠﴾ انھوں نے کہا ہم عظیم بتوں کی عبادت کرتے ہیں، پس انھی کے مجاور بنے رہتے ہیں ﴿٧١﴾

**آیت 68** وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ : یعنی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والا اور اپنے ماننے والوں پر رحم کرنے والا ہے۔ چنانچہ دیکھو دم بھر میں فرعون کو غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو نجات دلا کر بادشاہ بنا دیا۔ اس میں ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے بھی بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا، اگر ہجرت کے بعد مکہ کے فرعونوں نے آپ کا تعاقب کیا تو ان کا حال بھی مصر کے فرعون جیسا ہوگا اور پھر واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مدد فرمائی اور بدر کے میدان میں مکہ کے فرعونوں کو تباہ و برباد کیا۔

**آیت 69** وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ : سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی شدت غم کا ذکر فرمایا، جو آپ کو اپنی قوم کے ایمان نہ لانے پر لاحق ہوئی تھی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کا بیان فرمایا، تاکہ آپ کو تسلی ہو اور آپ کو یاد رہے کہ نہ آپ پہلے رسول ہیں اور نہ ہی آپ کی قوم جھٹلانے میں پہلی ہے، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے عظیم الشان معجزے لے کر آنے کے باوجود قبطیوں کے بہت ہی کم لوگ ان پر ایمان لائے۔ اس کے بعد ابو الانبیاء ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو خلیل اللہ کے بلند منصب پر فائز تھے، تاکہ آپ کے سامنے وہ شخصیت بھی رہے جس کا غم بھی بے انتہا تھا، کیونکہ وہ اپنے باپ اور اپنی قوم کو آگ میں جاتے ہوئے دیکھتا تھا، مگر انھیں اس سے بچا نہ سکتا تھا۔ اس نے انھیں ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ دلیل کے ساتھ انھیں بالکل لاجواب کر دیا، مگر انھوں نے نہیں مانا، بلکہ آباء کی تقلید ہی پر جمے رہے۔ فرمایا: ''اور ان (مشرکین مکہ) کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کی عظیم خبر بھی پڑھ۔''

**آیت 70** اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ : یہ سوال کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو، پوچھنے کے لیے نہیں تھا، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ بت پوجتے ہیں، بلکہ بت پرستی پر غور و فکر کی دعوت دینے کے لیے تھا، کیونکہ اپنا موقف خود بیان کرتے وقت اس کی کمزوریاں انسان کے سامنے اس سے کہیں زیادہ آتی ہیں کہ کوئی دوسرا اسے بیان کرے۔

**آیت 71** قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ : ''اَصْنَامًا'' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ دن بھر کام کرنے کو ''ظَلَّ يَظَلُّ'' اور رات بھر کام کرنے کو ''بَاتَ يَبِيْتُ'' کہتے ہیں۔ ''ظَلَّ يَظَلُّ'' کسی وقت کسی کام میں مصروف ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ''عٰكِفِيْنَ'' اعتکاف کہتے ہیں کسی جگہ جم کر بیٹھے رہنا یعنی مجاوری۔ ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے جواب میں اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ ''اَصْنَامًا'' (بتوں کی) مگر انھوں نے فخر کے لیے کہا کہ ہم عظیم بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ''لَهَا'' کو ''عٰكِفِيْنَ'' سے پہلے لانے سے تخصیص پیدا ہو رہی ہے، یعنی ہم انھی کے مجاور بنے رہتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کسی قبر پرست

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾

کہا کیا وہ تمھیں سنتے ہیں، جب تم پکارتے ہو؟ ﴿۷۲﴾ یا تمھیں فائدہ دیتے، یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ ﴿۷۳﴾ انھوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا کہ وہ ایسے ہی کرتے تھے ﴿۷۴﴾ کہا تو کیا تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے ﴿۷۵﴾ تم اور تمھارے پہلے باپ دادا ﴿۷۶﴾ سو بلاشبہ وہ میرے دشمن ہیں، سوائے رب العالمین کے ﴿۷۷﴾

کو سمجھانے کے لیے کہا جائے کہ تم کس چیز کی پوجا کر رہے ہو؟ (یعنی جس کا کوئی فائدہ نہیں) تو وہ آگے سے فخر کے ساتھ کہے کہ ہم تو فلاں دربار ہی کے مجاور ہیں۔

**آیت 73،72** قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ...... : ابراہیم علیہ السلام نے کسی بھی ذات کی عبادت کے لیے اس میں پائی جانے والی تین صفات ذکر کر کے فرمایا کہ کیا ان میں یہ تینوں یا کوئی ایک صفت پائی جاتی ہے؟ کیا جب تم انھیں پکارتے ہو تو یہ تمھاری بات سنتے ہیں؟ یا تمھیں کوئی فائدہ پہنچاتے ہیں؟ یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو ان کی عبادت کیوں کرتے ہو؟

**آیت 74** قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ : یعنی لکڑی، پتھر اور دھات کے یہ بت سنتے تو نہیں، نہ ہی کوئی نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں، مگر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو قدیم زمانے سے ایسے ہی کرتے ہوئے پایا ہے، تو کیا وہ سب بے وقوف تھے جو ان کی پوجا کرتے رہے، آخر ان کے پاس ان کی عبادت کی کوئی دلیل تو ہو گی۔ گویا جب کوئی معقول جواب نہ بن پڑا تو باپ دادا کی تقلید کا سہارا لیا، جو ہر اندھے کی لاٹھی اور ڈوبنے والے کے لیے آخری تنکا ہے۔ یہی حال ان مقلد حضرات کا ہے جو اس لیے اپنے امام کی تقلید کرتے جا رہے ہیں کہ فلاں فلاں بزرگ بھی تو ان کی تقلید کرتے رہے ہیں۔

**آیت 76،75** قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ...... : "اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ" کے الفاظ سے ابراہیم علیہ السلام یہ باور کروا رہے ہیں کہ کسی دین کے حق ہونے کے لیے بس یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ قدیم آبا و اجداد کے وقت سے چلا آ رہا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کام میں پہلے لوگوں کی غلطی ثابت ہو جائے تو اسے فوراً چھوڑ دیتے ہو، تو کیا دین ہی اتنا بے حیثیت ہے کہ غلط جان کر بھی نسلوں کی نسلیں آنکھیں بند کر کے اس پر چلتی جائیں اور مکھی پر مکھی مارتی جائیں؟

**آیت 77** ① فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ : "عَدُوٌّ" "فَعُوْلٌ" کے وزن پر ہے، واحد، جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے، اس لیے "فَاِنَّهُمْ" میں جمع کی خبر ہونے کے باوجود واحد آیا ہے۔ یعنی تم اور تمھارے قدیم ترین آبا و اجداد جن چیزوں کی عبادت کرتے رہے ہیں وہ سب چیزیں میری دشمن ہیں۔ ہاں، اگر ان میں سے کوئی ''رب العالمین'' کی بھی عبادت کرتا رہا ہے، تو صرف ''رب العالمین'' میرا دوست ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾

وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے ﴿۷۸﴾

2 یہاں ایک سوال ہے کہ بتوں کے دشمن تو ابراہیم علیہ السلام تھے، بتوں نے ان سے کیا دشمنی کرنا تھی؟ تو یہاں یہ کہنے کے بجائے کہ میں ان کا دشمن ہوں، یہ کیوں فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ ابراہیم علیہ السلام انھیں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو، جتنی مرضی ان سے محبت کر لو یا ان کی عبادت کر لو، قیامت کے دن وہ تمھارے دشمن بن جائیں گے، ایک اللہ عزوجل کی ذات پاک ہے کہ وہ اپنی عبادت کرنے والوں کی دوست رہے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ۝ وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ ﴾ [ الأحقاف : ۵، ۶ ] ''اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انھیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔ اور جب سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہوں گے۔'' سورۂ بقرہ (۱۶۵، ۱۶۶) اور سورۂ مریم (۸۱، ۸۲) میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ مگر ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہنے کے بجائے کہ ''تمھارے معبود تمھارے دشمن ہوں گے'' یہ فرمایا کہ تمھارے یہ معبود (اگر میں ان کی عبادت کروں گا تو) میرے دشمن ہوں گے۔ اس میں انھوں نے دعوت میں حکمت اور دانائی کو محفوظ رکھا ہے کہ مخاطب سوچے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو اپنی فکر ہے کہ بتوں کی عبادت کی صورت میں انھیں ان کی دشمنی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی طرح مجھے بھی اپنی فکر کرنی چاہیے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ''عَدُوٌّ'' (دشمن) اسی کو نہیں کہتے جسے آپ سے دشمنی ہو، اسے بھی دشمن کہا جاتا ہے جس سے آپ کو دشمنی ہو۔ جس سے اپنی شدید دشمنی کا اظہار کرنا ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ میرا دشمن ہے اور جس سے شدید محبت کا اظہار کرنا ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ میرا دوست ہے۔ مرزا غالب نے کہا ہے ؎

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں ۔۔۔ عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

گویا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی شدید عداوت کے اظہار کے لیے انھیں اپنا دشمن اور ''رب العالمین'' کو اپنا دوست قرار دیا ہے۔

3 ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ میں بتوں سے اپنی دشمنی کا جو اظہار کیا ہے دوسری جگہ اس کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿ وَ تَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۵۷ ] ''اور اللہ کی قسم! میں ضرور ہی تمھارے بتوں کی خفیہ تدبیر کروں گا، اس کے بعد کہ تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔'' پھر ابراہیم علیہ السلام نے اس دشمنی کا عملی مظاہرہ بھی بتوں کو توڑ کر فرمایا۔ ان الفاظ میں اس بات کا بھی اظہار ہے کہ میں تمھارے بتوں سے ہرگز نہیں ڈرتا، وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، میرا ان کے ساتھ اور تمھارے ساتھ تعلق دشمنی کا ہے۔ (دیکھیے ممتحنہ: ۴۔ انعام: ۸۰، ۸۱) اللہ تعالیٰ کے دوسرے جلیل القدر پیغمبروں نے بھی کفار اور ان کے معبودوں کے متعلق صاف اعلان کیا کہ وہ ان کے خلاف جو کر سکتے ہیں انھیں ان کی کوئی پروا ہے نہ ان سے کوئی خوف۔ نوح علیہ السلام کے متعلق دیکھیے سورۂ یونس (۷۱) اور ہود علیہ السلام کے متعلق دیکھیے سورۂ ہود (۵۵، ۵۶)۔

آیت 78 ﴿ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ : ''یَهْدِیْنِ'' اصل میں ''یَهْدِیْنِیْ'' ہے، آیات کے آخری حروف کی موافقت

# وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾

**اور وہی جو مجھے کھلاتا ہے اور مجھے پلاتا ہے ﴿۷۹﴾ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے ﴿۸۰﴾**

کے لیے یاء حذف کر دی گئی ہے، نون کا کسرہ اس کی دلیل ہے۔ آئندہ آیات کے اندر "**یَسْقِیْنِ**"، "**یَشْفِیْنِ**" اور "**یُحْیِیْنِ**" میں بھی یاء محذوف ہے۔ یہاں سے ابراہیم علیہ السلام نے رب العالمین کی وہ صفات بیان کی ہیں جن کی وجہ سے وہ عبادت کا حق دار ہے، یعنی ''رب العالمین'' وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے۔ یہاں "**الَّذِیْ خَلَقَنِیْ**" (وہ جس نے مجھے پیدا کیا) کے بعد "**فَهُوَ یَهْدِیْنِ**" (پھر وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے) حصر کے ساتھ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پیدا کرنے کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے متعلق موجود ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق کہا جائے کہ اسی نے مجھے پیدا کیا ہے، جبکہ ہدایت کا دعویٰ بہت سی ہستیوں کے متعلق ہے، اس لیے فرمایا کہ پھر وہی مجھے ہدایت دیتا ہے، اور کوئی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم مانتے ہو کہ اس نے پیدا کیا تو مانو کہ ہدایت بھی وہی دیتا ہے۔ "**الَّذِیْ خَلَقَنِیْ**" (جس نے مجھے پیدا کیا) ماضی کے ساتھ ہے، کیونکہ پیدا تو وہ کر چکا، جبکہ "**فَهُوَ یَهْدِیْنِ**" (پھر وہ مجھے راستہ دکھاتا ہے) مضارع ہے، کیونکہ ہدایت کی ضرورت ہر ہر لمحے میں ہے اور وہ ہر لمحے مجھے ہدایت دیتا ہے۔ پیدائش کے بعد سب سے زیادہ اہم ہدایت ہے، اس لیے ان دونوں کا ذکر سب سے پہلے فرمایا۔

**آیت 79** ﴿ **وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ** : یہ دونوں صفات بھی حصر کے ساتھ ہیں کہ وہی مجھے کھلاتا ہے اور مجھے پلاتا ہے، اور کوئی نہیں۔ یہاں بھی حصر کی ضرورت اس لیے ہے کہ لوگوں نے اور بھی داتا اور رزاق بنا رکھے ہیں۔ یہ ''رب العالمین'' ہونے کی تیسری وجہ ہے کہ اس نے پیدا کر کے مجھے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ میری ضرورت کی ہر چیز مجھے مہیا کرتا ہے۔

**آیت 80** ﴿ ❶ **وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ** : یعنی وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے، مگر میں جب اس کھانے پینے میں حد اعتدال سے گزر کر بیمار ہوتا ہوں، یا اپنی کسی اور غلطی کی وجہ سے بیمار ہوتا ہوں تو وہی ہے جو پھر مجھے شفا دے دیتا ہے۔ یہ پچھلی آیت کے ساتھ ایک لطیف مطابقت ہے۔ بعض طبیبوں کا کہنا ہے کہ اگر مُردوں سے پوچھا جائے، تمھاری موت کا سبب کیا ہوا تو اکثر یہی کہیں گے کہ زیادہ کھانے سے، بدہضمی سے۔

❷ اگرچہ بیماری اور شفا دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، مگر ابراہیم علیہ السلام نے یہاں بیمار ہونے کی نسبت اپنی طرف کی ہے کہ ''جب میں بیمار ہوتا ہوں'' اور شفا دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے کہ "**فَهُوَ یَشْفِیْنِ**" (تو وہی مجھے شفا دیتا ہے)، اس میں ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا ادب ملحوظ رکھا ہے کہ خیر و شر دونوں کا خالق ہونے کے باوجود شر کی نسبت اس کی طرف نہ کی جائے، جیسا کہ صحیح مسلم (۷۷۱) کی ایک حدیث میں ہے: (( وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْكَ )) اور جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں "**اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ**" میں انعام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، مگر "**الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ**" میں ''غضب'' اور ''ضلالت'' کی نسبت اس کی طرف نہیں ہے اور سورۂ کہف (۷۹ تا ۸۲) میں خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی تاویل بیان کرتے وقت اس ادب کو خوب ملحوظ رکھا ہے اور سورۂ جن (۱۰) میں جنوں نے بھی اس ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ "**فَهُوَ یَشْفِیْنِ**" میں بھی حصر ہے کہ

وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۸۲﴾ رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُکۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾

**اور وہ جو مجھے موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا ﴿۸۱﴾ اور وہ جس سے میں طمع رکھتا ہوں کہ وہ جزا کے دن مجھے میری خطا بخش دے گا ﴿۸۲﴾ اے میرے رب! مجھے حکم عطا کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا ﴿۸۳﴾**

وہی مجھے شفا دیتا ہے، کوئی اور نہیں، کیونکہ اور بھی بے شمار ہستیاں ہیں جن کو لوگوں نے شفا دینے والے سمجھ رکھا ہے۔

**آیت 81** وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ : یہ دونوں حصر کے بغیر ہیں، کیونکہ ان میں حصر کی ضرورت نہیں تھی کہ کہا جائے وہی مجھے موت دے گا اور وہی مجھے زندہ کرے گا، کیونکہ سب مانتے ہیں کہ مارنا یا زندہ کرنا صرف ''رب العالمین'' کا کام ہے، اور کسی کا یہ دعویٰ ہی نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کے دور کے جبار نے جو کہا تھا: ﴿اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۸ ] (میں زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں) وہ محض اس کی ڈھٹائی اور بے شرمی تھی، اس کے دعوے کو کسی نے وقعت ہی نہیں دی۔

**آیت 82** وَ الَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ : یعنی قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت قائم فرمائے گا تو وہاں کسی کی عدالت، حاکمیت یا سلطنت نہیں ہوگی، نہ اس کے فیصلوں میں کسی کا کوئی دخل ہوگا، نہ اس کے سوا کوئی کسی کے گناہ معاف کر سکے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [ آل عمران : ۱۳۵ ] ''اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟'' چونکہ میں اس کا موحد بندہ ہوں، میں نے اس کے ساتھ شرک نہیں کیا، اس لیے میں اس سے امید رکھتا ہوں کہ اس دن وہ میری خطائیں معاف فرمائے گا۔ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی تواضع اور ان کا انکسار بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی بے پروائی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی امید کا اظہار کیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ صفات اس لیے بیان فرمائیں کہ مشرکین کو مطمئن کر سکیں کہ عبادت صرف اس ''رب العالمین'' کا حق ہے جو ان صفات کا مالک ہے۔ دوسرے معبود جو نہ پیدا کر سکیں، نہ رہنمائی کر سکیں، نہ کھانے کو دے سکیں، نہ پینے کو، نہ شفا کے مالک ہوں، نہ موت و حیات کے، نہ قیامت برپا کر سکتے ہوں، نہ عدالت قائم کر سکتے ہوں، وہ عبادت کے حق دار کیسے ہو سکتے ہیں؟

**آیت 83** ① رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُکۡمًا : اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کی صفات بیان کرنے کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں چند دعائیں کی ہیں۔ اس میں دعا کا ادب ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کا سلیقہ سکھایا گیا ہے کہ دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف جس قدر ہو سکے کرو، پھر اپنی عرض داشت پیش کرو۔ سورۂ فاتحہ میں بھی یہی سبق سکھایا گیا ہے۔

② حُکۡم کا معنی فیصلہ ہے، یعنی پروردگارا! فیصلے کے لیے جو چیزیں درکار ہیں وہ سب مجھے عطا کر، یعنی اپنے دین کا پورا علم جس سے صحیح فیصلہ ہوتا ہے، پھر ہر معاملے کا صحیح فہم، پھر وہ اقتدار جس کے ساتھ فیصلہ نافذ ہوتا ہے۔

③ وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ : یعنی دنیا میں بھی صالح دوستوں اور ساتھیوں کی رفاقت عطا فرما اور آخرت میں بھی انھی کے ساتھ ملا دے۔ یوسف علیہ السلام نے بھی یہ دعا کی: ﴿تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ﴾ [ یوسف : ۱۰۱ ] ''مجھے مسلم ہونے کی

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾

اور پیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ ﴿۸۴﴾ اور مجھے نعمت کی جنت کے وارثوں میں سے بنا ﴿۸۵﴾ اور میرے باپ کو بخش دے، یقیناً وہ گمراہوں میں سے تھا ﴿۸۶﴾

حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔'' اور ہمارے نبی کریم ﷺ نے بھی آخری وقت دعا کی تھی: (( اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى )) ''(اے اللہ!) مجھے سب سے بلند رفیقوں میں شامل فرما دے۔'' آپ ﷺ نے یہ دعا تین دفعہ کی۔ [ بخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب : ٣٦٦٩، ٤٤٣٧ ]

**آیت 84** ﴿ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ ...... : ''لِسَانَ'' سے مراد تعریف ہے، کیونکہ وہ زبان سے ہوتی ہے۔ ''لِسَانَ صِدْقٍ'' سے مراد اچھی تعریف اور نیک شہرت ہے، یعنی قیامت تک آنے والی نسلوں میں مجھے سچی ناموری عطا فرما کہ وہ اچھے الفاظ میں میرا ذکر کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، یہودی، عیسائی اور مسلمان سب انھیں اپنا پیشوا مانتے ہیں اور ان کا ذکرِ خیر کرتے ہیں۔ مسلمان تو نماز میں ''كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ'' اور ''كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ'' بھی کہتے ہیں۔ [ دیکھیے بخاري : ٣٣٧٠ ] امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال فرمایا کہ آدمی کی اس خواہش میں کوئی حرج نہیں کہ اس کی نیک شہرت ہو۔ بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ اس کا فائدہ آخرت میں یہ ہے کہ ممکن ہے کہ نیک اعمال میں اس کی شہرت سن کر کوئی شخص وہ اعمال کرنے لگے جس کا اجر اسے بھی ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ )) [ مسلم، العلم، باب من سن سنة حسنة ...... : ١٥/١٠١٧، قبل ح : ٢٦٧٤، عن جرير بن عبد الله رضی اللہ عنہ ] ''جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کرے، پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا جائے، تو اس کے لیے ان لوگوں جیسا اجر لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے اجروں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔'' بعض مفسرین نے اس سے یہ بھی مراد لیا ہے کہ آخر زمانے میں میری نسل سے نبی ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [ البقرة : ١٢٩ ] ''اے ہمارے رب! اور ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیج۔'' مگر اس دعا کے الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔

**آیت 85** ﴿ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ : ''وَرَثَةِ'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون کی آیت (۱۱) پچھلی آیت میں دنیا کی سعادت مانگی اور اس آیت میں آخرت کی سعادت طلب کی۔

**آیت 86** ﴿ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ : ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے رخصت ہوتے وقت استغفار کی دعا کا وعدہ کیا تھا (مریم : ۴۷) چنانچہ انھوں نے یہ دعا فرمائی۔ زندگی میں دعا کا حاصل یہ ہے کہ اسے توبہ کی توفیق بخش، تاکہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں اور وفات کے بعد ہو تو اس کے شرک اور دوسرے گناہ معاف کرنے کی دعا ہے، لیکن بعد میں جب انھیں معلوم ہوا کہ ایک مشرک اور دشمنِ حق کے لیے دعائے مغفرت کرنا صحیح نہیں ہے تو انھوں نے اس دعا سے رجوع کر لیا،

وَ لَا تُخۡزِنِیۡ یَوۡمَ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۸۷﴾ یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۹﴾

اور مجھے رسوا نہ کر، جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے ﴿۸۷﴾ جس دن نہ کوئی مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے ﴿۸۸﴾ مگر جو اللہ کے پاس سلامتی والا دل لے کر آیا ﴿۸۹﴾

جیسا کہ سورۂ توبہ میں ہے: ﴿ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنۡهُ ﴾ [ التوبة : ١١٤ ] ''پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔''

آیت 87 وَ لَا تُخۡزِنِیۡ یَوۡمَ یُبۡعَثُوۡنَ : یعنی قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے میرا مؤاخذہ کر کے، یا میرے والد کو عذاب دے کر مجھے رسوا نہ کر کہ لوگ اسے جہنم میں جلتا ہوا دیکھ کر کہیں یہ ابراہیم کا باپ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول فرمائی، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَلْقٰى إِبْرَاهِيْمُ أَبَاهُ آزَرَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ عَلٰى وَجْهِ آزَرَ قَتَرَةٌ وَغَبَرَةٌ فَيَقُوْلُ لَهٗ إِبْرَاهِيْمُ أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ لَا تَعْصِنِيْ؟ فَيَقُوْلُ أَبُوْهُ فَالْيَوْمَ لَا أَعْصِيْكَ، فَيَقُوْلُ إِبْرَاهِيْمُ يَا رَبِّ! إِنَّكَ وَعَدْتَنِيْ أَنْ لَّا تُخْزِيَنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ، فَأَيُّ خِزْيٍ أَخْزٰى مِنْ أَبِي الْأَبْعَدِ؟ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى إِنِّيْ حَرَّمْتُ الْجَنَّةَ عَلَى الْكَافِرِيْنَ، ثُمَّ يُقَالُ يَا إِبْرَاهِيْمُ! مَا تَحْتَ رِجْلَيْكَ؟ فَيَنْظُرُ فَإِذَا هُوَ بِذِيْخٍ مُلْتَطِخٍ فَيُؤْخَذُ بِقَوَائِمِهٖ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ واتخذ الله إبراهيم خليلا ﴾ : ٣٣٥٠ ] ''قیامت کے دن ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو اس حال میں ملیں گے کہ اس کے چہرے پر سیاہی اور غبار ہو گا۔ ابراہیم علیہ السلام اس سے کہیں گے: ''میں نے تجھے کہا نہ تھا کہ میری نافرمانی مت کر۔'' ان کا باپ کہے گا: ''تو آج میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔'' ابراہیم علیہ السلام کہیں گے: ''اے رب! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے اس دن رسوا نہیں کرے گا جب لوگ اٹھائے جائیں گے، تو میرے بدنصیب باپ سے بڑھ کر ذلت کیا ہو گی۔'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''یقیناً میں نے جنت کافروں پر حرام کر دی ہے۔'' پھر کہا جائے گا: ''ابراہیم! تیرے پاؤں کے نیچے کیا ہے؟'' وہ دیکھیں گے تو اچانک گندگی میں لت پت ایک بجو ہو گا، پھر اس بجو کو اس کی ٹانگوں سے پکڑ کر آگ میں پھینک دیا جائے گا۔'' گویا اللہ تعالیٰ مشرک پر جنت حرام کرنے کا قانون بھی قائم رکھیں گے اور ابراہیم علیہ السلام کو رسوا ہونے سے بھی بچا لیں گے کہ رسوائی تو تب ہو کہ لوگ دیکھیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ آگ میں جل رہا ہے۔ ایک بجو آگ میں جل رہا ہو تو کسی کو کیا خبر کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے۔

آیت 88 یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ: جس دن آدمی کو اللہ کے عذاب سے کوئی مال نہیں بچا سکے گا، خواہ زمین بھرنے کے برابر سونا ہو (آل عمران: ۹۱) اور صرف بیٹے ہی نہیں، زمین کے تمام لوگ بطور فدیہ پیش کیے جائیں تو وہ بھی کام نہ آئیں گے۔ (معارج: ۱۱ تا ۱۴)۔

آیت 89 اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ : سلامتی والے دل سے مراد ایسا دل ہے جو کفر و شرک سے پاک ہو۔ بعض

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۝ وَ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ۝ وَ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ۝

اور متقی لوگوں کے لیے جنت قریب لائی جائے گی ﴿۹۰﴾ اور گمراہ لوگوں کے لیے بھڑکتی آگ ظاہر کر دی جائے گی ﴿۹۱﴾ اور ان سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ جنھیں تم پوجتے تھے؟ ﴿۹۲﴾ اللہ کے سوا۔ کیا وہ تمھاری مدد کرتے ہیں، یا اپنا بچاؤ کرتے ہیں؟ ﴿۹۳﴾ پھر وہ اور تمام گمراہ لوگ اس میں اوندھے منہ پھینک دیے جائیں گے ﴿۹۴﴾ اور ابلیس کے تمام لشکر بھی ﴿۹۵﴾

نے بدعت و جہالت اور اخلاق رذیلہ سے پاک ہونا بھی مراد لیا ہے۔ مال اور اولاد بھی کام آئیں گے تو اس کے جس کا دل کفر و شرک سے خالی ہو گا۔

**آیت 91،90** وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ...... : ابراہیم علیہ السلام نے "يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ" کا مزید نقشہ بیان کیا ہے کہ جنت متقین کے قریب لائی جائے گی اور وہ اس کے نظارے سے لطف اندوز ہوں گے، اسی طرح جہنم گمراہوں کو میدان حشر ہی میں دکھائی دینے لگے گی جو ان کا ٹھکانا بننے والی ہے، تا کہ جلد از جلد ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا مل جائے۔ "غَاوِيْنَ" (گمراہوں) سے مراد یہاں مشرکین ہیں، جیسا کہ اگلی آیت میں صراحت آ رہی ہے۔

**آیت 93،92** وَ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ...... : "يَنْتَصِرُوْنَ" "اِنْتَصَرَ يَنْتَصِرُ" (افتعال) کا معنی اپنا بچاؤ کرنا بھی ہے اور بدلا لینا بھی، یعنی ان گمراہوں سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے، کیا وہ تمھاری مدد کرتے ہیں، یا تمھارا بدلا لیتے ہیں، یا کم از کم اپنا بچاؤ ہی کرتے ہیں؟

**آیت 95،94** فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ...... : "كَبَّ يَكُبُّ" منہ کے بل گرانا۔ "كَبْكَبَ" میں لفظ کے تکرار سے معنی میں تکرار پیدا ہو رہا ہے، بار بار گرانا۔ یعنی ان کے باطل معبود اوندھے منہ جہنم میں ایک دوسرے کے اوپر بار بار گرائے جائیں گے، یعنی جب انھیں اوندھے منہ ڈالا جائے گا تو بار بار ٹھوکریں کھاتے ہوئے، الٹ پلٹ ہوتے ہوئے نیچے گرتے جائیں گے حتیٰ کہ اس کی گہرائی تک پہنچ جائیں گے۔ ان کے ساتھ ان کی عبادت کرنے والے گمراہ لوگ اور ابلیس کے تمام لشکر بھی اسی طرح گرائے جائیں گے۔ بتوں کا ذکر پہلے فرمایا، تا کہ پوجنے والوں کو انھیں پہلے گرتے ہوئے دیکھ کر مزید عبرت ہو۔ ابلیس کے لشکروں سے مراد اس کے تمام پیروکار ہیں جو دوسروں کو بھی گمراہ کرتے رہے۔ طبری نے معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ "فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا" کا معنی ہے اس میں جمع کیے جائیں گے، گویا الٹے منہ گراتے ہوئے سب کو وہاں جمع کر دیا جائے گا۔ [ طبری : ۲۶۸۸۸ ]

قَالُوْا وَ هُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

وہ کہیں گے جب کہ وہ اس میں جھگڑ رہے ہوں گے ﴿۹۶﴾ اللہ کی قسم! بے شک ہم یقیناً کھلی گمراہی میں تھے ﴿۹۷﴾ جب ہم تمھیں جہانوں کے رب کے برابر ٹھہراتے تھے ﴿۹۸﴾ اور ہمیں گمراہ نہیں کیا مگر ان مجرموں نے ﴿۹۹﴾ اب نہ ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والے ہیں ﴿۱۰۰﴾

آیت 96 تا 98 ① قَالُوْا وَ هُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ...... : " اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ " اصل میں "اِنَّا كُنَّا لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ " ہے۔ دلیل اس کی " فِيْ " پر آنے والا لام ہے۔ یعنی وہ جہنم میں اپنے معبودوں سے جھگڑتے ہوئے ان سے کہیں گے کہ اللہ کی قسم! ہم یقیناً کھلی گمراہی میں تھے، جب ہم تمھیں رب العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے، اس کے بعض اختیارات اور صفات تمھارے لیے بھی مانتے تھے، تمھارے لیے حلال وحرام کرنے کے اختیار کا عقیدہ رکھتے تھے، تمھیں بھی عالم الغیب اور مختار کل سمجھتے تھے، تمھیں بگڑی بنانے والے، فریاد کو پہنچنے والے، اولاد عطا کرنے والے اور شفا دینے والے سمجھتے تھے۔

② یاد رہے رسول اللہ ﷺ نے ایسے الفاظ بولنے سے بھی منع فرمایا جن سے مخلوق کی خالق کے ساتھ کسی طرح بھی برابری ظاہر ہوتی ہو۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَا تَقُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شَاءَ فُلَانٌ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَاءَ فُلَانٌ )) [ أبو داوٗد، الأدب، باب لا يقال خبثت نفسي : ۴۹۸۰، قال الألباني صحيح ] "یہ مت کہو کہ جو اللہ نے چاہا اور فلاں نے چاہا، بلکہ یوں کہو کہ جو اللہ نے چاہا، پھر فلاں نے چاہا۔" ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: (( مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ )) "جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( جَعَلْتَ لِلّٰهِ نِدًّا )) "تم نے اللہ کا شریک بنا دیا۔" یوں کہو: (( مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ )) "جو اللہ اکیلا چاہے۔" [ الأدب المفرد : ۱/ ۲۷۴، ح : ۷۸۳، وقال الألباني صحيح ]

آیت 99 وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ : ان مجرموں سے مراد وہ سردار اور وڈیرے ہیں جنھوں نے انھیں گمراہ کیا تھا۔ پیروکاروں اور معتقدوں کی طرف سے انھی لوگوں کو نشانۂ ملامت بنایا جا رہا ہو گا جنھیں وہ دنیا میں اپنا پیشوا اور بزرگ مانتے تھے، ان کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے، ان کی نذریں نیازیں چڑھاتے تھے، قیامت کو جب حقیقت کھلے گی اور پیچھے چلنے والوں کو معلوم ہو گا کہ آگے چلنے والے ہمیں کہاں لے آئے اور خود کہاں ہیں تو یہی پیروکار انھیں مجرم ٹھہرائیں گے اور ان پر لعنت کریں گے۔ قرآن نے کئی مقامات پر یہ نقشہ کھینچا ہے، تاکہ لوگ آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے نہ چلیں اور تقلید کے بجائے تحقیق سے کام لیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)، اعراف (۳۷، ۳۸)، احزاب (۶۷، ۶۸)، حٰم السجدہ (۲۹) اور سورۂ ص (۵۹ تا ۶۱)۔

آیت 100 فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ : یعنی جن جن کو ہم دنیا میں اپنا سفارشی سمجھتے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ ان کا دامن تھام لیں گے تو ہمارا بیڑا پار ہے، ان میں سے آج کوئی نظر نہیں آتا۔ مشرکوں کے لیے کوئی سفارشی نہیں ہو گا، جب کہ مومنوں کے لیے

وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ ع كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۣ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ ۚ

اور نہ کوئی دلی دوست ﴿۱۰۱﴾ تو کاش کہ ہمارے لیے واپس جانے کا ایک موقع ہو، تو ہم مومنوں میں سے ہو جائیں ﴿۱۰۲﴾ بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان والے نہیں تھے ﴿۱۰۳﴾ اور بے شک تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰۴﴾ نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿۱۰۵﴾

انبیاء، فرشتے اور مومن سفارشی ہوں گے۔

**آیت 101** وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ : "صَدِيْقٍ" جو دوستی میں سچا ہو اور "حَمِيْمٍ" جسے دوست کی وجہ سے گرمی آتی ہو، یعنی دلی دوست۔ "حَمِيْمٍ" کا معنی رشتہ دار بھی ہے۔ یعنی کفار کا قیامت کے دن کوئی دلی دوست ہوگا نہ رشتے دار، سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، جب کہ مومنوں کے دوست انبیاء، فرشتے اور تمام مومن ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ الزخرف : ٦٧ ] "سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔"

**آیت 102** فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً ...... : کفار کی اس تمنا کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ہے اور یہ بھی کہ ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۷)، انعام (۲۷، ۲۸) اور مؤمنون (۱۰۶ تا ۱۰۸)۔

**آیت 103** اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ...... : یعنی ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم کو دعوت کے ان واقعات میں بہت بڑی نشانی ہے، اس کے باوجود ان کے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہ ہوئے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ جب خلیل اللہ کی بے حد کوشش و محنت کے باوجود اکثر لوگ ایمان نہ لائے، تو آپ ان کے ایمان نہ لانے پر غمگین کیوں ہوتے ہیں۔ ایک معنی اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان قریش میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں، سو آپ ان کے ایمان نہ لانے پر غمگین نہ ہوں۔

**آیت 104** وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۹)۔

**آیت 105** ❶ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۣ الْمُرْسَلِيْنَ : سورت کا آغاز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دلانے اور رسولوں کو جھٹلانے کے انجام بد کے ساتھ ہوا تھا، موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام اور ان کی قوم کے ذکر کے بعد اب قومِ نوح کا ذکر ہوتا ہے۔ اس میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والوں کے انجامِ بد کا ذکر ہے، اس کے بعد عاد، ثمود، قوم لوط اور اصحاب الایکہ کے ذکر میں بھی یہ دونوں چیزیں نمایاں ہیں۔

❷ اگرچہ انھوں نے صرف ایک پیغمبر نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، لیکن چونکہ تمام پیغمبروں کی دعوت ایک تھی اور ایک پیغمبر کو جھٹلانا اس

اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ نُوۡحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾

**جب ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۱۰۶﴾ بے شک میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ﴿۱۰۷﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۰۸﴾**

دعوت کو جھٹلانا ہے جو تمام پیغمبر لے کر آئے، اس لیے فرمایا کہ انھوں نے تمام پیغمبروں کو جھٹلا دیا۔ تقابل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۹ تا ۶۴)، یونس (۷۱ تا ۷۳)، ہود (۲۵ تا ۴۸)، بنی اسرائیل (۳)، انبیاء (۷۶، ۷۷)، مومنون (۲۳ تا ۳۰) اور فرقان (۳۷) اس کے علاوہ نوح علیہ السلام کے واقعہ کی تفصیل کے لیے یہ مقامات بھی زیر نظر رکھیں، سورۂ عنکبوت (۱۴، ۱۵)، صافات (۷۵ تا ۸۲)، قمر (۹ تا ۱۵) اور سورۂ نوح مکمل۔

**آیت 106** اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ نُوۡحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ : "اَخُوۡهُمۡ" کے لفظ سے ان کے ساتھ نوح علیہ السلام کا نسبی تعلق واضح کیا ہے اور اس خیر خواہی کی طرف اشارہ ہے جو نوح علیہ السلام کو اس قوم کا فرد ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول بشر ہی ہوتے ہیں اور حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے، کیونکہ انسانوں کے لیے نمونہ انسان ہی بن سکتا ہے، فرشتہ یا کوئی اور نہیں، مگر اس وقت کفار نے بشر ہونے کی وجہ سے انھیں نبی نہیں مانا اور اب کئی جاہل ایسے ہیں جو نبی مانتے ہیں مگر نبی ہونے کی وجہ سے بشر نہیں مانتے۔ عقیدہ دونوں کا ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے جا بجا اس عقیدے کی تردید کی ہے۔

دوسرے مقامات پر مذکور نوح علیہ السلام کے خطاب کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ﴿ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴾ [ المؤمنون : ۲۳ ] "اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی بھی معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟" اور فرمایا: ﴿ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوۡهُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴾ [ نوح : ۳ ] "کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔" دعوت کے آغاز میں خوف دلانے میں حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا قوم کو اس کے غلط رویے کے برے انجام کا خطرہ محسوس نہ کرایا جائے وہ صحیح بات پر توجہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے قریبی رشتہ داروں کو جمع کر کے صفا پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا: (( فَإِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ )) [ بخاري، التفسیر، باب : ﴿ و أنذر عشیرتك الأقربین ...... ﴾ : ۴۷۷۰ ] "میں تمھیں ایک بہت سخت عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہوں۔"

**آیت 108،107** اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ...... : نوح علیہ السلام نے دعوائے رسالت کے ثبوت کے طور پر دو چیزیں پیش فرمائیں، پہلی یہ کہ میں امانت دار ہوں، میری ساری عمر تمھارے سامنے گزری، تم میری امانت اور میرے صدق سے خوب واقف ہو، پھر تمھیں میری رسالت تسلیم کرنے میں رکاوٹ کیا ہے؟ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ بات واشگاف الفاظ میں کہہ دینے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴾ [ یونس : ۱۶ ] "پس بے شک میں تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہ چکا ہوں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟" حدیث ہرقل میں ابوسفیان نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صادق و امین

وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۟﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوۡنِ ﴿۱۱۰﴾
قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے ﴿۱۰۹﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۱۰﴾ انھوں نے کہا کیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں، حالانکہ تیرے پیچھے وہ لوگ لگے ہیں جو سب سے ذلیل ہیں ﴿۱۱۱﴾

ہونا تسلیم کیا تو ہرقل نے کہا: ''یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں پر جھوٹ سے تو اجتناب کرے اور اللہ پر جھوٹ باندھ دے کہ اس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔'' (دیکھیے بخاری : ۷) غرض نوح علیہ السلام نے قوم کو اپنے امین ہونے کا حوالہ دے کر اپنی رسالت کی اطلاع دی اور فرمایا (چونکہ میں رسول امین ہوں) اس لیے تم اللہ سے ڈرو کہ مجھے جھٹلا کر کہیں تم اس کے غضب کا نشانہ نہ بن جاؤ اور میرا کہا مانو۔ معلوم ہوا کہ رسول کا ہر حکم ماننا امت کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کتاب اللہ کی چند آیات پہنچا دے اور بس، اس کے علاوہ اس کی بات ماننا لازم نہ ہو۔

**آیت 109** ① **وَمَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ**: اپنی رسالت کے ثبوت کے لیے دوسری چیز یہ پیش فرمائی کہ دین داری اور روحانیت کے دعوے داروں کا مقصود عموماً اپنی گدی جمانا، مال و زر جمع کرنا اور سرداری حاصل کرنا ہوتا ہے۔ خانقاہوں اور راہبوں کی کٹیاؤں کے تقدس کے پیچھے عموماً بدترین ہوس زر ہی چھپی ہوتی ہے، مگر مجھے اللہ کا پیغام پہنچانے میں نہ تم سے کسی مزدوری یا دنیاوی منفعت کی خواہش ہے نہ تم سے اس کا کوئی مطالبہ۔ ایسے بے غرض خیر خواہ کی بھی بات نہ مانو تو تم سے بڑا بدنصیب کون ہوگا۔ اس بات کا نوح علیہ السلام نے خاص طور پر اس لیے بھی ذکر کیا کہ ان کی قوم نے ان پر بہتان باندھا تھا کہ وہ رسالت کے ذریعے سے اپنی قوم پر بڑائی حاصل کرنا چاہتے ہیں، سورۂ مومنون میں ہے: ﴿ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۙ يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتَفَضَّلَ عَلَيۡكُمۡ ﴾ [ المؤمنون : ۲٤ ] ''یہ نہیں ہے مگر تمھارے جیسا ایک بشر، جو چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کر لے۔'' نوح علیہ السلام کی طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی بھی اس کی شاہد عدل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے پیچھے نہ کوئی دینار چھوڑا، نہ درہم اور نہ کوئی اور چیز، جو کچھ تھا صدقہ کر دیا۔ اللہ کے پیغمبر ایسے ہی بے لوث ہوتے ہیں اور وہ اس کا اعلان بھی کرتے رہتے ہیں۔

② **اِنۡ اَجۡرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ**: اس میں قیامت کے عقیدے کی دعوت بھی ہے کہ میری تگ و دو اور محنت کی اجرت صرف اور صرف رب العالمین کے ذمے ہے اور ظاہر ہے کہ وہ قیامت کے دن ہی پوری پوری ملے گی۔

**آیت 110** **فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوۡنِ**: یہ آیت دوبارہ آئی ہے، اس کے تکرار میں حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں رسول امین کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کو جھٹلانے پر اللہ سے ڈرایا ہے اور اس آیت میں اس رسول کو جھٹلانے پر اللہ تعالیٰ سے ڈرایا ہے جو پیغامِ الٰہی پہنچانے میں کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ فرمایا، ایسے بے لوث خیر خواہ کو جھٹلاتے ہوئے اللہ سے ڈرو اور اس کی اطاعت کرو۔

**آیت 111** **قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَكَ** ......: ''**الۡاَرۡذَلُوۡنَ**'' ''أَرۡذَلُ'' (اسم تفضیل) کی جمع سالم ہے، سب سے کمتر، نیچ، ذلیل، جن

قَالَ وَ مَا عِلۡمِیۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنۡ حِسَابُهُمۡ اِلَّا عَلٰى رَبِّیۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

اس نے کہا اور مجھے کیا علم کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں ﴿۱۱۲﴾ ان کا حساب تو میرے رب ہی کے ذمے ہے، اگر تم سمجھو ﴿۱۱۳﴾

کے پاس جاہ و مال نہ ہو، غریب، محتاج۔ ان میں وہ لوگ بھی آ جاتے ہیں جو حقیر سمجھے جانے والے پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات کہنے والے نوح علیہ السلام کی قوم کے سردار تھے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۲۷) اس سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے بھی ایسے ہی لوگ تھے۔ حدیثِ ہرقل میں ہے کہ اس نے ابوسفیان سے سوال کیا: (( فَأَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُوْنَهُ أَمْ ضُعَفَائُهُمْ ؟ )) ''اونچے لوگ اس کی پیروی اختیار کر رہے ہیں یا کمزور لوگ؟'' ابوسفیان نے جواب دیا: ''کمزور لوگ۔'' تو ہرقل نے کہا: ''رسولوں کی پیروی کرنے والے یہی لوگ ہوتے ہیں۔'' [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي...... : ۷ ] کیونکہ مال و جاہ والے لوگوں کو ایمان قبول کرنے میں ان کا مال و جاہ، اپنی عزت اور رتبے کا احساس اور دنیوی مفاد رکاوٹ بن جاتے ہیں، کیونکہ ایمان لانے کی صورت میں انھیں حکم منوانے کے بجائے حکم ماننا پڑتا ہے، جب کہ کمزور لوگ ان رکاوٹوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس مکالمے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی تسلی ہے، کیونکہ آپ کی قوم کے لوگ بھی اللہ کے فضل کا مستحق مال داروں ہی کو سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے مکہ یا طائف کے کسی مال دار سردار کو نبوت ملنی چاہیے تھی، سورۂ زخرف میں ہے: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [ الزخرف : ۳۱ ] ''اور انھوں نے کہا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟'' واضح رہے کہ مومن کو رذیل یا ذلیل سمجھنا یا کہنا جائز نہیں، بلکہ ہر مومن کے متعلق یہی خیال رکھنا چاہیے کہ ہو سکتا ہے یہ مجھ سے بہتر ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ ﴾ [ الحجرات : ۱۱ ] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کوئی قوم کسی قوم سے مذاق نہ کرے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔''

**آیت 113,112** قَالَ وَمَا عِلۡمِیۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ......: یعنی مجھے تو اللہ کا راستہ بتانے سے غرض ہے نہ کہ ان کے پیشوں سے۔ وہ کمائی کے لیے جو بھی کام کریں یا جو بھی پیشہ اختیار کریں، اگر وہ جائز ہے تو وہ اپنے ایمان دار ہونے کی وجہ سے ان مغرور مال داروں سے افضل ہیں جو اللہ کی نافرمانی پر تلے ہوئے ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں، مجھے تو ظاہری ایمان کو دیکھنا ہے، ان کی نیتوں کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، وہی ان کا حساب کرے گا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَ يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ، وَ يُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ )) [ بخاري، الإيمان، باب فإن تابوا و أقاموا الصلاة : ۲۵ ] ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اگر وہ یہ کام کریں تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے محفوظ کر لیے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔''

وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾

اور میں ایمان والوں کو کسی صورت نکال دینے والا نہیں ہوں ﴿۱۱۴﴾ میں نہیں ہوں مگر ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ﴿۱۱۵﴾ انھوں نے کہا اے نوح! یقیناً اگر تو باز نہ آیا تو ہر صورت سنگسار کیے گئے لوگوں سے ہو جائے گا ﴿۱۱۶﴾ اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ﴿۱۱۷﴾

**آیت 114** ﴿ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ : یہ سرداروں کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ ان رذیلوں کو اپنے ہاں سے نکال دیں تو ہم آپ کی مجلس میں بیٹھیں، فرمایا میں کسی صورت ایمان والوں کو نکال دینے والا نہیں کہ انھیں دھکے دے کر نکال دوں۔ (نفی کی تاکید باء کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ میں ''کسی صورت'' کا اضافہ کیا گیا ہے) یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے میں ان کے پیچھے پھرتا رہوں اور جو میری بات مانتے ہیں انھیں دھکے دے کر نکال دوں۔ (دیکھیے عبس : ۵ تا ۹) میرا کام تو صاف اور واضح الفاظ میں کفر کے برے انجام سے ڈرانا ہے، پھر جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے نہ مانے۔ ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ بھی بعینہٖ یہی صورت پیش آئی، نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی گفتگو آپ ﷺ کو اسی لیے سنائی جا رہی ہے، فرق صرف نوح علیہ السلام اور محمد ﷺ کا ہے، ورنہ دونوں کی دعوت اور دونوں کے لیے مغرور اور متکبر سرداروں کا جواب ایک ہی ہے۔ یقیناً اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے بہت بڑی تسلی ہے کہ یہ سب کچھ آپ ہی پر نہیں گزر رہا، اہلِ زمین کی طرف سب سے پہلے رسول کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اہلِ ایمان کو اپنے پاس سے نکالنے کی ممانعت کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۵۲، ۵۳) اور کہف (۲۸)۔

**آیت 116** ﴿ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ ﴾ ...... : نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی یہ گفتگو دو چار مواقع کی بات نہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کی قوم کی یہ کش مکش ساڑھے نو سو (۹۵۰) برس جاری رہی۔ جیسے جیسے آپ دعوت کے کام میں آگے بڑھتے گئے وہ بدی میں آگے بڑھتے گئے۔ آخر کار تمام ظالم و جابر لوگوں کی طرح، جو دلیل میں لاجواب ہو کر دھمکیوں اور تشدد پر اتر آتے ہیں، نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ آئندہ اگر تم اپنی دعوت سے باز نہ آئے تو ہم پتھر مار مار کر تمھیں ختم کر دیں گے۔

**آیت 117** ﴿ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴾ : ''كَذَّبُوْنِ'' اصل میں ''كَذَّبُوْنِيْ'' ہے۔ جب قوم اس حد تک پہنچ گئی کہ اپنے رسول کو سنگسار کر دے اور اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو اطلاع بھی دے دی کہ اب ان میں سے مزید کوئی ایمان نہیں لائے گا (دیکھیے ہود : ۳۶) تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اس دعا کے الفاظ قرآن میں مختلف مقامات پر موجود ہیں، فرمایا: ﴿ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [ القمر : ۱۰ ] ''کہ بے شک میں مغلوب ہوں، سو تو بدلا لے۔'' اور فرمایا: ﴿ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [ نوح : ۲۶ ] ''اے میرے رب! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ۔'' یہاں انھوں نے جو کہا ہے کہ ''اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا'' یہ اللہ کے حضور شکایت کے لیے ہے، یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ

فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ كَذَّبَتْ عَادُ ࣙالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

پس تو میرے درمیان اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے، کھلا فیصلہ اور مجھے اور میرے ساتھ جو ایمان والے ہیں، انھیں بچالے ﴿۱۱۸﴾ تو ہم نے اسے اور ان کو جو اس کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں تھے، بچا لیا ﴿۱۱۹﴾ پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا ﴿۱۲۰﴾ بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے ﴿۱۲۱﴾ اور بلاشبہ تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۲۲﴾ عاد نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿۱۲۳﴾ جب ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۲۴﴾ بے شک میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ﴿۱۲۵﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۲۶﴾ اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے ﴿۱۲۷﴾

---

کو یہ بات معلوم نہیں اور نوح علیہ السلام اسے بتا رہے ہیں۔

**آیت 118** **فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا** ...... : اس فیصلے سے مراد انھیں نیست و نابود کر دینے والا عذاب ہے، جو "**وَ نَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ**" سے سمجھ میں آ رہا ہے۔

**آیت 120،119** **فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ** ...... : اس کی تفصیل سورۂ ہود (۳۶ تا ۴۹) میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 122،121** **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً** ...... : ان آیات کی تفسیر سورت کے شروع میں آیت (۸، ۹) کے تحت گزر چکی ہے۔

**آیت 123 تا 127** ① **كَذَّبَتْ عَادُ ࣙالْمُرْسَلِيْنَ** ...... : نوح علیہ السلام اور ان کے بعد چاروں انبیاء علیہم السلام کے قصوں میں خاص طور پر تقویٰ اور اطاعت کے حکم اور تبلیغ رسالت پر کسی قسم کے بدلے کی نفی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء کی بعثت کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی توحید اور اس کے رسولوں کی اطاعت کا حکم دینا ہے اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام دنیاوی طمع سے پاک ہوتے ہیں۔

② اس قصے کی اور نوح علیہ السلام کے قصے کی ابتدائی آیات ایک جیسی ہیں، اس لیے ان کی تفسیر دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تقابل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۶۵ تا ۷۲) اور ہود (۵۰ تا ۶۰) مزید تفصیلات ان مقامات پر بھی ہیں، سورۂ حم السجدہ (۱۳ تا ۱۶)، احقاف (۲۱ تا ۲۶)، ذاریات (۴۱ تا ۴۵)، قمر (۱۸ تا ۲۲) اور سورۂ فجر (۶ تا ۸) قومِ عاد کا مسکن حضر موت کے قریب

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک یادگار بناتے ہو؟ اس حال میں کہ لاحاصل کام کرتے ہو ﴿۱۲۸﴾ اور بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہو، شاید کہ تم ہمیشہ رہو گے ﴿۱۲۹﴾

اس جگہ تھا جسے اب ''الربع الخالی'' کہا جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۶۵)۔

3 **اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ** ...... ہود علیہ السلام کی تقریر سمجھنے کے لیے اس قوم کے متعلق وہ بنیادی معلومات نگاہ میں رہنا ضروری ہیں جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مذکور ہیں۔ ان کے مطابق قوم نوح کی تباہی کے بعد اس قوم کو عروج عطا ہوا۔ (اعراف : ۶۹) جسمانی لحاظ سے یہ لوگ بڑے تنومند اور زور آور تھے۔ (اعراف : ۶۹۔ حاقہ : ۷) اس قوم جیسی کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔ (فجر : ۸) وہ نہایت ترقی یافتہ تھے، اونچے اونچے ستونوں والی بلند و بالا عمارتیں بنانے کی وجہ سے ان کی شہرت ہی ''ستونوں والے'' کے نام سے تھی۔ (فجر : ۶، ۷) مادی ترقی اور جسمانی قوت کی وجہ سے وہ سخت متکبر تھے اور کسی کو اپنے سے طاقتور نہیں مانتے تھے۔ (حٰم السجدہ: ۱۵) ان کا سیاسی نظام بڑے بڑے سرکش جباروں کے ہاتھ میں تھا۔ (ہود : ۵۹) مذہبی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے منکر نہیں تھے بلکہ مشرک تھے، ایک اللہ کو معبود ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ (اعراف : ۷۰)۔

**آیت 128** **اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ** : ''**رِيْعٍ**'' اونچی جگہ۔ قاموس میں ہے ''رِیْعٌ'' (کسرہ اور فتحہ کے ساتھ) اونچی زمین یا ہر کشادہ راستہ یا ہر راستہ یا پہاڑ میں کھلا راستہ یا بلند پہاڑ۔ واحد کے لیے تاء کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ''**اٰيَةً**'' نشانی، یادگار۔ ''**تَعْبَثُوْنَ**'' ''عَبَثٌ'' (ع) بے فائدہ اور لاحاصل کام کرنا، یعنی تم بے فائدہ اور لاحاصل کام کرتے ہو۔ ''کُلُّ رِیْعٍ'' سے مراد بہت سی اونچی جگہیں ہیں، کیونکہ ہر اونچی جگہ تو یادگار نہ بن سکتی ہے اور نہ انھوں نے بنائی تھی۔ ہود علیہ السلام نے پہلے اپنی قوم کو تمام انبیاء کی لائی ہوئی بنیادی تعلیم اللہ پر ایمان، اس کے تقویٰ اور اطاعت کی دعوت دی، اس کے بعد ان کے چند کاموں پر انکار کا اظہار فرمایا۔ پہلا یہ کہ تم ہر اونچی اور نمایاں جگہ، جہاں تمھارے فخر و غرور، تمھاری شان و شوکت اور دولت و قوت کا اظہار ہو سکتا ہے کوئی نہ کوئی یادگار بنا دیتے ہو، جس کا دنیا یا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں۔ ہود علیہ السلام کا مقصد نمود و نمائش کے اس رجحان سے ہٹانا ہے، جس کی وجہ سے ایسے عبث کام کیے جاتے ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ ہم کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔ بے دریغ مال خرچ کرتے ہوئے کوئی اپنی یادگار کے طور پر شاندار مقبرہ تعمیر کرا دیتا ہے، کوئی بلند و بالا مینار کھڑا کر دیتا ہے، کوئی بارہ دری بنوا دیتا ہے۔ عجائب عالم میں شمار ہونے والے اہرامِ مصر اور تاج محل بھی اپنے بانیوں کی ایسی ہی لاحاصل اور عبث یادگاریں ہیں، جن کی جواب دہی انھیں کرنا ہو گی۔ ان یادگاروں کی مذمت اس لیے فرمائی کہ یہ فخر و غرور، فضول خرچی اور عمر عزیز کو ضائع کرنے پر دلالت کرتی ہیں، جن کا باعث یہ ہے کہ ان کے بنانے والوں کو جواب دہی کا احساس نہیں۔

**آیت 129** **وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ** ...... : ''**مَصَانِعَ**'' ''مَصْنَعٌ'' یا ''مَصْنَعَةٌ'' کی جمع ہے۔ مختار الصحاح اور قاموس میں اس کا معنی بڑے بڑے قلعے، مضبوط محلات اور زمین دوز نہریں لکھا ہے۔ راغب لکھتے ہیں کہ ''صَنْعٌ'' کا معنی کوئی کام عمدہ طریقے

وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾

اور جب تم پکڑتے ہو تو بہت بے رحم ہو کر پکڑتے ہو ﴿۱۳۰﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۳۱﴾

سے کرنا ہے۔ عالی شان جگہوں کو "مَصَانِعَ" کہا گیا ہے۔ "لَعَلَّكُمْ" "لَعَلَّ" کا معنی ہے "امید ہے، شاید" یہاں یہ "كَاَنَّ" کا مفہوم ادا کر رہا ہے "گویا، جیسے۔" یہ ان کا دوسرا کام ہے جس پر ہود علیہ السلام نے انکار کا اظہار فرمایا، اس سے ان کی ہمیشہ زندہ رہنے کی حرص اور لمبی امید کا اظہار ہوتا تھا۔ یعنی تمھاری دوسری قسم کی تعمیرات ایسی ہیں جو اگرچہ استعمال کے لیے ہیں مگر انھیں شاندار، مزین اور مستحکم بنانے کے لیے تم اپنی دولت، محنت اور قابلیت اس طرح صرف کرتے ہو جیسے تمھیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے، اس کے سوا تمھیں کسی اور زندگی کی فکر ہی نہیں۔

ابن کثیر نے ابن ابی حاتم سے نقل فرمایا ہے کہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے "غوطہ" میں مسلمانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں اور شجر کاری دیکھی تو ان کی مسجد میں جا کر آواز دی: "اے دمشق والو!" وہ ان کے پاس جمع ہو گئے، تو انھوں نے اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر فرمایا: "کیا تم حیا نہیں کرتے؟ کیا تم حیا نہیں کرتے؟ تم وہ کچھ جمع کر رہے ہو جو کھاتے نہیں اور وہ عمارتیں بنا رہے ہو جن میں رہتے نہیں اور اس کی امید کرتے ہو جو کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے کئی صدیاں گزریں، وہ لوگ جمع کرتے تھے، پھر اس کی حفاظت کرتے تھے، عمارتیں بناتے تھے اور بہت مضبوط بناتے تھے، امیدیں باندھتے تھے اور بہت لمبی باندھتے تھے، پھر ان کی امید دھوکا نکلی اور ان کی جماعت ہلاک ہو گئی اور ان کی رہائش گاہیں قبریں بن گئیں۔ یاد رکھو! قومِ عاد عدن سے عمان تک گھوڑوں اور اونٹوں کے مالک تھے، اب کون ہے جو مجھ سے ان کی میراث دو درہم میں خرید لے؟" دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا، اس کی سند حسن ہے۔

**آیت 130** وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ : یہ ان کا تیسرا کام ہے جس پر ہود علیہ السلام نے انکار فرمایا کہ تم ایسے سنگدل اور انسانیت سے عاری ہو کہ کمزوروں کے لیے تمھارے دل میں کوئی رحم نہیں، وہ گرد و پیش کی کمزور قومیں ہوں یا تمھارے پست طبقہ کے لوگ، جب انھیں پکڑتے ہو تو بہت بے رحم ہو کر پکڑتے ہو، دنیا کے لالچ اور تکبر نے انسانی اخلاق کا لباس تمھارے جسموں سے اتار دیا ہے۔ اس کا باعث بھی یہی تھا کہ ان کا اللہ کی توحید اور یوم آخرت پر ایمان نہ تھا۔ ایمان سنگدلی کی اجازت نہیں دیتا۔ مومن قتل کرتے وقت بھی سنگدلی سے کام نہیں لیتا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ أَعَفَّ النَّاسِ قِتْلَةً أَهْلُ الْإِيْمَانِ » [ مسند أحمد : ۳۹۳/۱، ح : ۳۷۲۸، قال المحقق حديث حسن ] "یقیناً قتل کرنے میں سب لوگوں سے زیادہ اچھا طریقہ اختیار کرنے والے اہلِ ایمان ہوتے ہیں۔"

**آیت 131** فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ : یہ دعوت کا خلاصہ ہے جو تقریر کے شروع میں بیان فرمایا، تاکید کے لیے اسے پھر بیان فرمایا ہے کہ اللہ سے ڈر کر اس اکیلے کی عبادت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور اس سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمھاری مدد کی جنھیں تم جانتے ہو ﴿۱۳۲﴾ اس نے چوپاؤں اور بیٹوں کے ساتھ تمھاری مدد کی ﴿۱۳۳﴾ اور باغوں اور چشموں کے ساتھ ﴿۱۳۴﴾ یقیناً میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۱۳۵﴾ انھوں نے کہا ہم پر برابر ہے کہ تو نصیحت کرے، یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ ہو ﴿۱۳۶﴾ نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کی عادت ﴿۱۳۷﴾ اور ہم قطعاً عذاب دیے جانے والے نہیں ﴿۱۳۸﴾

**آیت 132 تا 134** وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ...... : نصیحت کرتے ہوئے ہود علیہ السلام نے انھیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلا کر تیسری بار پھر اس سے ڈرایا۔ پہلی آیت میں مجمل طور پر نعمتیں ذکر فرمائیں، پھر مفصل طریقے سے بیان کیں، یعنی سوچو جس مالک نے تمھیں اتنی نعمتیں عطا فرمائیں وہ انھیں چھین بھی سکتا ہے۔

**آیت 135** اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ : نصیحت کی ابتدا ڈرانے سے کی تھی، اب اسے ختم بھی اسی پر کیا، کیونکہ خوف ہی انسان کو غلط راستے سے پلٹنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ یعنی اگر تم ایمان نہ لائے تو میں تم پر ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ''بہت بڑے عذاب سے'' کہنے کے بجائے فرمایا ''بہت بڑے دن کے عذاب سے'' مطلب یہ ہے کہ جب وہ دن ہی بہت بڑا ہے تو اس کا عذاب کتنا بڑا ہوگا۔

**آیت 136** قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ ...... : مفردات راغب میں ہے ''وعظ'' ایسا ڈانٹنا ہے جس کے ساتھ خوف دلانا بھی ہو۔ خلیل نے فرمایا: ''اس کا معنی ہے ایسے اچھے طریقے سے نصیحت کرنا جس سے دل نرم ہو جائیں۔'' یہ ہود علیہ السلام کی قوم کا جواب ہے کہ تم نصیحت کرو یا نہ کرو، ہم تمھاری بات کسی طرح ماننے والے نہیں۔ ان الفاظ سے ان کا ہود علیہ السلام کے ساتھ بے پروائی اور تحقیر کا سلوک نمایاں ہو رہا ہے۔ سورۂ ہود (۵۳) میں ان کے جواب کے مزید الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 137، 138** اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ...... : یعنی یہ بت پرستی، یادگاریں اور عالی شان عمارتیں بنانا اور اپنے مخالفین کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کوئی ہمارا شیوہ ہی نہیں، یہی کچھ ہمارے پہلے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ ان کا دین بھی یہی تھا اور تمدن بھی یہی، نہ ان پر کوئی عذاب آیا نہ ہم پر آئے گا۔ آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نصیحت کی یہ باتیں جو تم ہم سے کر رہے ہو کوئی نئی نہیں ہیں، پہلے بھی ایسے خبطی گزرے ہیں جو اس طرح کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ ہم پر ان کا کچھ اثر نہیں، نہ ہمیں کوئی عذاب ہوگا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

پس انھوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے ﴿۱۳۹﴾ اور بلاشبہ تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴۰﴾ ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿۱۴۱﴾ جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۴۲﴾ بے شک میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ﴿۱۴۳﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۴۴﴾ اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے ﴿۱۴۵﴾

**آیت 139** ① **فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ** : اللہ تعالیٰ نے بہت سی قوموں کو پانی کے ذریعے سے عذاب دیا اور جن لوگوں کو اپنی قوت و طاقت کا بہت زعم تھا، اللہ تعالیٰ نے انھیں ہوا کے ذریعے سے عذاب دیا جو پانی سے کہیں بڑھ کر قوت و طاقت رکھتی ہے، یہ عذاب آندھی کی صورت میں تھا جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل ان پر چلی اور اس نے ان کی ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۱۶)، احقاف (۲۴، ۲۵) اور حاقہ (۶، ۷)۔

② **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً** ...... : بے شک ان لوگوں کے قصے میں مشرکین مکہ کے لیے ایک عظیم درس عبرت ہے، مگر نہ ان کے اکثر لوگ ایمان لائے، نہ ان کے اکثر ایمان لانے والے ہیں۔

**آیت 140** **وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ** : ظالموں پر عذاب اس کی عزت اور غلبے کا اظہار ہے اور ایمان والوں کی نجات اس کی رحمت کا اظہار ہے۔

**آیت 141 تا 145** ① **كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ** ...... : ثمود اور صالح علیہ السلام کا قصہ اس سے پہلے سورۂ اعراف (۷۳ تا ۷۹)، ہود (۶۱ تا ۶۸)، حجر (۸۰ تا ۸۴) اور بنی اسرائیل (۵۹) میں گزر چکا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نمل (۴۵ تا ۵۳)، ذاریات (۴۳ تا ۴۵)، قمر (۲۳ تا ۳۱)، فجر (۹) اور شمس (۱۱)۔

② **اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ**: صالح علیہ السلام کی قوم بھی ان کی امانت و دیانت اور غیر معمولی قابلیت کو مانتی تھی۔ (دیکھیے ہود: ۶۲) قوم کا انھیں "اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ" کہنے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبوت کے اعلان سے پہلے وہ ان کے نزدیک نہایت سمجھ دار اور عقل مند تھے اور ان کی حالت کی تبدیلی ان کے خیال سے جادو کا نتیجہ تھی۔

اَتُتۡرَكُوۡنَ فِیۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوۡعٍ وَّ نَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِیۡمٌ ﴿۱۴۸﴾

وَ تَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا فٰرِهِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۵۰﴾

کیا تم ان چیزوں میں جو یہاں ہیں، بے خوف چھوڑ دیے جاؤ گے ﴿۱۴۶﴾ باغوں اور چشموں میں ﴿۱۴۷﴾ اور کھیتوں اور کھجوروں میں، جن کے خوشے نرم و نازک ہیں ﴿۱۴۸﴾ اور تم پہاڑوں سے تراش کر گھر بناتے ہو، اس حال میں کہ خوب ماہر ہو ﴿۱۴۹﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۵۰﴾

آیت 146 تا 150 ① اَتُتۡرَكُوۡنَ فِیۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیۡنَ ...... : قومِ عاد کی طرح یہ لوگ بھی اللہ کی عبادت سے کنارہ کش ہو چکے تھے، بتوں کے پجاری اور قیامت کے منکر تھے، جس کے نتیجے میں ان کی ساری تگ و دو دنیا کی آسائشوں کے حصول اور عیش پرستی تک محدود تھی، آخرت کی فکر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے احساس سے یکسر عاری تھے، ان کے بدترین اور مفسد لوگ ان کے سردار اور راہ نما بنے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صالح علیہ السلام کو بھیجا، جنھوں نے اوپر والی آیات کے مطابق انھیں اللہ سے ڈرنے اور اپنے رسول کی اطاعت کرنے کی تلقین فرمائی اور بتایا کہ وہ ان سے کسی بھی قسم کی مالی منفعت کے طلب گار نہیں ہیں۔ اس کے بعد انھیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلا کر اور اس کے عذاب سے ڈرا کر نصیحت فرمائی۔ قومِ ثمود کی آبادی حجر کے علاقہ میں تھی، جو مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان واقع ہے اور آج کل اسے ''مدائن صالح'' کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو جاتے ہوئے یہاں سے گزرے تھے، اس کی تفصیل سورۂ اعراف (۷۳) میں دیکھیے۔ یعنی یہاں دنیا کے اندر اپنے علاقے میں جو تم امن سے رہ رہے ہو، کسی دشمن کا خوف نہیں، ضرورت کی ہر چیز تمھیں میسر ہے اور راحت و آرام کے تمام اسباب بھی، تو کیا تمھیں ان باغوں چشموں، کھیتوں کے نرم و نازک خوشوں والے درختوں اور پہاڑوں کو تراش کر نہایت مہارت کے ساتھ بنائی پائیدار اور خوبصورت عمارتوں میں ہمیشہ رہنے دیا جائے گا؟ جب یہ طے شدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ ہر حال میں تمھیں مالک کے سامنے پیش ہو کر جواب دہ ہونا ہے، تو اللہ سے ڈرو اور اس سوال کا جواب سوچ لو کہ اس کا دیا کھاتے ہو اور دوسرے کے گن گاتے ہو اور میری اطاعت کرو، کیونکہ اس نے مجھے تمھاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔

② وَ تَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ ...... : عاد کے تمدن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، جب کہ ثمود کے تمدن کی سب سے نمایاں خصوصیت، جس کی بنا پر وہ مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فجر (۷) میں عاد کو ''ذَاتِ الۡعِمَادِ'' (ستونوں والے) کہا گیا ہے اور ثمود کے متعلق فرمایا: ﴿الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ﴾ [ الفجر : ۹ ] ''جنھوں نے وادی میں چٹانوں کو تراشا۔'' اس کے علاوہ وہ اپنے میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے محل تعمیر کرتے تھے، فرمایا: ﴿تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُهُوۡلِهَا قُصُوۡرًا﴾ [ الأعراف : ۷۴ ] ''تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو۔'' ان تعمیرات سے ان کی غرض و غایت اپنی شان و شوکت، مہارت اور کمال فن کی نمائش تھی، نہ کہ کوئی حقیقی ضرورت۔ بگڑے ہوئے معاشروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ ایک طرف لوگوں کو سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں ملتی تو دوسری طرف

وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

اور حد سے بڑھنے والوں کا حکم مت مانو ﴿۱۵۱﴾ وہ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے ﴿۱۵۲﴾ انھوں نے کہا تو تُو انھی لوگوں سے ہے جن پر زبردست جادو کیا گیا ہے ﴿۱۵۳﴾

امراء اور اہلِ ثروت کمزوروں کی مدد کے بجائے اپنی ضرورت سے زیادہ عمارتیں بنانے کے بعد بلاضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

تفہیم القرآن میں ہے: ''ثمود کی ان عمارات میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں، جنھیں ۱۹۵۹ء کے دسمبر میں میں نے خود دیکھا ہے۔ یہ جگہ مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام ''العلاء'' (جسے عہد نبوی میں وادی القریٰ کہا جاتا تھا) سے چند میل کے فاصلے پر بجانب شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے الحجر اور مدائن صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں ''العلاء'' تو اب بھی نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے، جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں، مگر ''الحجر'' کے گرد و پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے، آبادی برائے نام ہے، روئیدگی بہت کم ہے، چند کنویں ہیں، انھی میں سے ایک کنویں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ صالح علیہ السلام کی اونٹنی اسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے۔ اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو ''العلاء'' کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کھیل کھیل ہو گئے ہیں، صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انھیں سطح زمین سے چوٹی تک جھنجھوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے۔ اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف ''العلاء'' سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً پچاس (۵۰) میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کے حدود میں ۳۰، ۴۰ میل کے اندر ملتے چلے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور سو میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلہ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔''

**آیت 152،151** ﴿ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ...... : یعنی ان لوگوں کا کہنا مت مانو جو اخلاق و تہذیب کی ساری حدیں پھلانگ کر شتر بے مہار بن گئے ہیں۔ مراد ان کے وہ سردار اور امراء ہیں جو شرک و کفر کے داعی اور حق کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور جن کی زیرِ قیادت ان کا بگڑا ہوا نظامِ زندگی چل رہا تھا، ایسے لوگ ہمیشہ زمین میں فساد ہی پھیلاتے ہیں، ان کے ہاتھوں اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید کے دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ''الْمُسْرِفِيْنَ'' میں سب سے پیش پیش وہ نو (۹) بدمعاش تھے جنھوں نے ملک میں فساد مچا رکھا تھا اور آخر کار قوم کی تباہی کا سبب بنے، فرمایا: ﴿ وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴾ [ النمل : ۴۸ ] ''اور اس شہر میں نو (۹) شخص تھے، جو اس سرزمین میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔''

**آیت 153** ﴿ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ : '' مَسْحُوْرِيْنَ'' جن پر جادو کیا گیا ہو۔ '' الْمُسَحَّرِيْنَ'' باب تفعیل سے

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۚۖ فَاۡتِ بِاٰیَةٍ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرۡبٌ وَّ لَكُمۡ شِرۡبُ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَ لَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَكُمۡ عَذَابُ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵۶﴾

تو نہیں ہے مگر ہمارے جیسا ایک آدمی، پس کوئی نشانی لے آ، اگر تو سچوں سے ہے ﴿۱۵۴﴾ اس نے کہا یہ ایک اونٹنی ہے، اس کے لیے پانی پینے کی ایک باری ہے اور تمھارے لیے ایک مقرر دن کی باری ہے ﴿۱۵۵﴾ اور اسے کسی برائی سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ تمھیں ایک بڑے دن کا عذاب پکڑ لے گا ﴿۱۵۶﴾

ہے، اس میں مبالغہ ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”تو تُو انھی لوگوں سے ہے جن پر زبردست جادو کیا گیا ہے۔“ جب وہ لوگ صالح علیہ السلام کی دعوت پر کوئی اعتراض نہ کر سکے تو عامۃ الناس کو بے وقوف بنانے کے لیے کہنے لگے، زبردست جادو کی وجہ سے تیری عقل ماری گئی ہے۔

**آیت 154** مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ..... اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ تو ہمارے جیسا بشر ہے اور بشر رسول نہیں ہو سکتا، جیسا کہ تمام پیغمبروں کے امتیوں نے بشر ہونے کی وجہ سے ان کی رسالت کا انکار کیا۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۴) دوسرا یہ کہ تو ہمارے جیسا ایک بشر ہے، پھر تجھ میں کیا خصوصیت ہے کہ ہمیں چھوڑ کر تجھے رسالت عطا ہوئی ہے۔ (دیکھیے قمر: ۲۵) ”فَاۡتِ بِاٰیَةٍ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ“ اس لیے اپنی اس خصوصیت کی دلیل کے طور پر تجھے کوئی معجزہ پیش کرنا ہوگا، جس سے ثابت ہو جائے کہ واقعی تجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔

**آیت 155، 156** ① قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ ......: اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو ”آیَةٌ بَیِّنَةٌ“ اور ”آیَةٌ مُبْصِرَةٌ“ (واضح نشانی و معجزہ) قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۷۳)، ہود (۶۴) اور بنی اسرائیل (۵۹) اس سے معلوم ہوا کہ وہ عام قسم کی اونٹنی نہ تھی بلکہ اس کی پیدائش اور ظاہر ہونے میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جس کی بنا پر اسے معجزہ قرار دیا گیا۔ ”الصحیح المسبور“ میں ہے کہ ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے: ”صالح علیہ السلام نے انھیں فرمایا، نکلو! تو وہ ایک چٹان کی طرف نکلے، وہ چٹان اس طرح لرزی جس طرح حاملہ اونٹنی کو درد زہ ہوتا ہے، پھر وہ پھٹی اور اس کے درمیان سے اونٹنی نکلی تو صالح علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰیَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِیۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَكُمۡ عَذَابٌ قَرِیۡبٌ ﴾ [ هود: ٦٤ ] ”یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمھارے لیے عظیم نشانی، پس اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ، ورنہ تمھیں ایک قریب عذاب پکڑ لے گا۔“ اگرچہ اس روایت کی سند صحیح ہے مگر یہ صحابی کا قول ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”قوم کے بڑے بڑے سردار جمع ہوئے اور انھوں نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اس چٹان سے ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک پوری جسامت کی اونٹنی نکالو، جس کی یہ یہ صفات ہوں۔ صالح علیہ السلام نے ان سے پختہ عہد لیا کہ اگر ان کی فرمائش پوری کر دی جائے تو وہ ایمان لا کر ان کی پیروی اختیار کریں گے۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾ ع ۸/۱۹/۱۲

تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، پھر پشیمان ہوگئے ﴿۱۵۷﴾ تو انھیں عذاب نے پکڑ لیا۔ بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اوران کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے ﴿۱۵۸﴾ اور بلاشبہ تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۵۹﴾

جب انھوں نے قول دے دیا تو صالح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لیے کھڑے ہوئے کہ ان کی فرمائش پوری کر دی جائے، چنانچہ وہ چٹان جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا تھا، یکا یک پھٹی اور اس میں سے ان کی مطلوبہ صفات کی اونٹنی ظاہر ہوئی، اسے دیکھ کر کچھ لوگ ایمان لے آئے، لیکن اکثر اپنے کفر پر جمے رہے، اس پر صالح علیہ السلام نے ان سے فرمایا: ﴿هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ﴾ [ ھود : ٦٤ ] ”یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمھارے لیے عظیم نشانی، پس اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ، ورنہ تمھیں ایک قریب عذاب پکڑ لے گا۔“ مفسر مراغی لکھتے ہیں: ”اس قسم کی روایات کو سچا ماننا ہم پر اسی وقت لازم ہے جب وہ صحیح خبروں سے ثابت ہوں۔“ مطلب یہ ہے کہ یہ روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں، تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ عام اونٹنی نہ تھی بلکہ معجزانہ شان رکھنے والی اونٹنی تھی۔ اس اونٹنی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک صحیح حدیث مسند احمد کے حوالے سے سورۂ اعراف (۷۳) میں گزر چکی ہے۔

② لَهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ : قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو صرف اتنا حکم نہ تھا کہ ہر دوسرے روز یہ اونٹنی تمھارے سارے علاقے کا پانی پیے گی، بلکہ یہ حکم بھی تھا کہ یہ تمھارے کھیتوں اور باغوں میں جہاں چاہے گی جائے گی اور جو چاہے گی کھائے گی، اسے کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۷۳) اور ہود (۶۴)۔

**آیت 157** ① فَعَقَرُوْهَا : اللہ تعالیٰ نے یہاں ان سب کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، حالانکہ کونچیں کاٹنے والا صرف ایک شخص ”قدار“ تھا، جیسا کہ سورۂ شمس میں ہے: ﴿اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا﴾ [ الشمس : ۱۲ ] ”جب اس (قوم) کا سب سے بڑا بدبخت اٹھا۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے یہ کام پوری قوم کے مشورے اور ان کی فرمائش پر کیا تھا، جیسا کہ سورۂ قمر میں ہے: ﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ﴾ [ القمر : ۲۹ ] ”تو انھوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، سو اس نے (اسے) پکڑا، پس کونچیں کاٹ دیں۔“ اس لیے سبھی مجرم قرار دیے گئے۔

② فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ : سورۂ ہود میں ہے کہ اونٹنی کو قتل کرنے پر صالح علیہ السلام نے انھیں تین دن کی مہلت دی، چنانچہ جب حسبِ وعدہ عذاب کے آثار نمودار ہونے لگے تو وہ ندامت کا اظہار کرنے لگے، مگر وہ وقت ندامت اور توبہ کا نہ تھا۔ (دیکھیے مومن : ۸۵) اور ان کی ندامت رسول کو جھٹلانے پر نہ تھی، بلکہ عذاب میں مبتلا ہونے پر تھی۔

**آیت 159،158** ① فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۸) اور ہود (۶۷)۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٦٠﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٦١﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٦٣﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٤﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿١٦٦﴾

لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿١٦٠﴾ جب ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿١٦١﴾ بے شک میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ﴿١٦٢﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿١٦٣﴾ اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے ﴿١٦٤﴾ کیا سارے جہانوں میں سے تم مردوں کے پاس آتے ہو ﴿١٦٥﴾ اور انھیں چھوڑ دیتے ہو جو تمھارے رب نے تمھارے لیے تمھاری بیویاں پیدا کی ہیں، بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو ﴿١٦٦﴾

② اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ …… : ان آیات کی تفسیر سورت کے شروع میں آیت (۸، ۹) کے تحت گزر چکی ہے۔

**آیت 161،160** كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِالْمُرْسَلِيْنَ …… : لوط علیہ السلام کے حالات کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۸۰ تا ۸۴)، ہود (۷۷ تا ۸۳)، حجر (۶۱ تا ۷۷)، انبیاء (۷۱ تا ۷۵)، نمل (۵۴ تا ۵۸)، صافات (۱۳۳ تا ۱۳۸) اور قمر (۳۳ تا ۳۹) لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اصلاً یہ عراق کے رہنے والے تھے، انھیں جن بستیوں کی طرف مبعوث کیا گیا ان کا صدر مقام سدوم تھا، اس کے رہنے والوں کو لوط کی قوم اس لیے کہا گیا کہ وہ ان میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ممکن ہے ان کی بیوی بھی انھی میں سے ہو۔ اگلی آیت میں لوط علیہ السلام کو ان کا بھائی اسی مناسبت سے کہا گیا ہے، ورنہ ان کا ان سے نسبی رشتہ نہیں تھا۔ اسی لیے جب ان کی قوم کے بدمعاش ان کے مہمانوں کی بے عزتی پر تل گئے تو انھوں نے کہا: ﴿ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴾ [ ھود : ۸۰ ] ''کاش! واقعی میرے پاس تمھارے مقابلہ کی کچھ طاقت ہوتی، یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لیتا۔'' تفصیل سورۂ اعراف (۸۰ تا ۸۴)، ہود (۷۷ تا ۸۳) اور حجر (۶۱ تا ۷۷) میں دیکھیے۔

**آیت 162 تا 164** ان آیات کی تفسیر آیت (۱۰۷ تا ۱۰۹) کے تحت گزر چکی ہے۔

**آیت 165** اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ سارے جہانوں میں سے تم نے مردوں کو اس کام کے لیے چن لیا ہے کہ ان سے خواہش نفس پوری کرو، حالانکہ دنیا میں عورتیں بہت ہیں۔ دوسرا یہ کہ دنیا بھر میں تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت پوری کرنے کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو، تم سے پہلے کسی نے یہ خسیس حرکت نہیں کی۔ اس مفہوم کی صراحت سورۂ عنکبوت میں اس طرح آئی ہیں: ﴿ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ؗ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ العنکبوت : ۲۸ ] ''بے شک تم یقیناً اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے نہیں کی۔''

**آیت 166** ① وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ …… : اس آیت کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس خواہش کو پورا

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

انھوں نے کہا اے لوط! بے شک اگر تو باز نہ آیا تو یقیناً تو ضرور نکالے ہوئے لوگوں سے ہو جائے گا ﴿۱۶۷﴾ اس نے کہا بے شک میں تمھارے کام سے سخت دشمنی رکھنے والوں سے ہوں ﴿۱۶۸﴾ اے میرے رب! مجھے اور میرے گھر والوں کو اس سے نجات دے جو یہ کرتے ہیں ﴿۱۶۹﴾

کرنے کے لیے جو بیویاں اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے پیدا کی ہیں انھیں چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو۔ اس صورت میں "مَا" بیانیہ ہے، ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمھاری بیویوں میں سے جو کچھ تمھارے رب نے تمھارے لیے پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ یعنی قُبل کے بجائے غیر فطری وضع سے شہوت پوری کرتے ہو۔ اس صورت میں "مَا" تبعیض کے لیے ہے۔ بعید نہیں کہ وہ لوگ یہ حرکت اولاد سے بچنے کے لیے کرتے ہوں۔

② بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ : یعنی صرف اسی کام میں نہیں بلکہ ہر کام میں حد سے گزرنا تمھاری عادت بن چکی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ﴾ [ العنکبوت : ۲۹ ] "کیا بے شک تم واقعی مردوں کے پاس آتے ہو اور راستہ کاٹتے ہو اور اپنی مجلس میں برا کام کرتے ہو؟" ہمارے عہد میں یورپی لوگ فطرت کی مخالفت میں اس قدر حد سے گزر گئے ہیں کہ انھوں نے قانوناً قوم لوط کے عمل کو جائز قرار دے دیا ہے اور مردوں کا مردوں کے ساتھ نکاح کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ نئی سے نئی بیماریوں کی صورت میں اللہ کے عذاب کا کوڑا ان پر برس رہا ہے، تاہم بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر ایسا عذاب بھیجے جو دنیا کے لیے باعث عبرت ہو۔

**آیت 167** ① قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ ...... : اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا شیوہ تھا کہ جو ان کی مرضی کے خلاف بات کرے اسے عبرت ناک طریقے سے ذلیل و خوار کر کے نکال دیتے تھے۔ اس لیے انھوں نے پہلے نکالے جانے والوں کے انجام کا حوالہ دے کر کہا کہ ہم تمھیں بھی ان میں شامل کر دیں گے۔

② بقاعی نے فرمایا، وہ لوگ لوط علیہ السلام کو اپنی بستی سے ذلیل کر کے نکالنا چاہتے تھے، جبکہ اللہ تعالیٰ انھیں اس بستی سے باعزت طریقے سے نکالنے والا تھا، پھر وہی ہوا جو اللہ چاہتا تھا کیونکہ: ﴿ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ ﴾ [ یوسف : ۲۱ ] "اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔"

**آیت 168** قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ: "اَلْقَالِیْنَ" "اَلْقَالِيْ" کی جمع ہے جو "قَلٰی يَقْلِيْ" سے اسم فاعل ہے، جس کا معنی شدید نفرت اور دشمنی بھی ہے اور گوشت بھوننا بھی۔ لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمھیں منع کرنے سے کیسے باز آ سکتا ہوں، جب کہ میں تمھارے اس کام سے شدید دشمنی رکھنے والوں میں سے ہوں، اتنی شدید کہ اس سے میرا دل جلتا ہے۔

**آیت 169** رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ : یعنی کفار پر ان اعمال کا وبال اور عذاب نازل فرما اور ہمیں ان کے اعمال بد کی نحوست اور وبال سے محفوظ رکھ۔

فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

تو ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات دی ﴿۱۷۰﴾ سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں سے تھی ﴿۱۷۱﴾ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا ﴿۱۷۲﴾ اور ہم نے ان پر بارش برسائی، زبردست بارش۔ پس ان لوگوں کی بارش بری تھی جنھیں ڈرایا گیا تھا ﴿۱۷۳﴾ بے شک اس میں یقیناً ایک نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان والے نہیں تھے ﴿۱۷۴﴾ اور بلاشبہ تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۷۵﴾ ایکہ والوں نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿۱۷۶﴾ جب ان سے شعیب نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۷۷﴾ بے شک میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ﴿۱۷۸﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۷۹﴾ اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے ﴿۱۸۰﴾

**آیت 170 تا 173** ان آیات کی تفسیر اس مقام پر لوط علیہ السلام کے قصے کے شروع میں دیے ہوئے حوالہ جات میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 174، 175** ان آیات کی تفسیر آیت (۸، ۹) کے تحت گزر چکی ہے۔

**آیت 176، 177** ﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ...... ﴾ : ''اَلْئَیْکَةُ'' درختوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں، یہ جھنڈ مدین کے اردگرد واقع تھے۔ شعیب علیہ السلام مدین والوں اور اصحاب الایکہ دونوں کی طرف مبعوث تھے، مگر چونکہ ان کی رہائش مدین میں تھی اور ان کا نسبی تعلق بھی اہلِ مدین سے تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کا انتخاب بستیوں میں رہنے والے سے کیا ہے (دیکھیے یوسف : ۱۰۹) اس لیے مدین کے ذکر میں شعیب علیہ السلام کو ان کا بھائی قرار دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا﴾ [ الأعراف : ۸۵ ] ''اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔'' جب کہ اصحاب الایکہ کے ذکر میں فرمایا: ﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ﴾ [ الشعراء : ۱۷۷ ] ''جب شعیب نے ان سے کہا'' اس سے معلوم ہوا کہ شعیب علیہ السلام ان کی طرف مبعوث تو تھے مگر نسب یا سسرال یا ان میں رہائش کا کوئی ایسا تعلق نہ تھا کہ انھیں ان کا بھائی کہا جاتا۔ (التحریر والتنویر)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''صحیح بات یہ ہے کہ اصحاب الایکہ اہلِ مدین ہی ہیں، دونوں کو ماپ تول پورا کرنے کی نصیحت کی گئی۔ انھیں اصحاب الایکہ اس لیے فرمایا کہ ''الایکہ'' ایک درخت تھا یا درختوں کا جھنڈ تھا، جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ جب مدین (شہر یا قوم) کا ذکر فرمایا تو شعیب علیہ السلام کو ان کا بھائی فرمایا، لیکن جب ان کی نسبت شجر پرستی کی طرف کی تو فرمایا: ﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ﴾ ''جب شعیب نے ان سے کہا'' یعنی اخوت کا تعلق ختم کر دیا۔''

**آیت 178 تا 180** ان آیات کی تفسیر اسی سورت کی آیات (۱۰۷ تا ۱۰۹) کے تحت گزر چکی ہے۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾

ماپ پورا دو اور کم دینے والوں میں سے نہ بنو ﴿۱۸۱﴾ اور سیدھی ترازو کے ساتھ وزن کرو ﴿۱۸۲﴾ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ ﴿۱۸۳﴾ اور اس سے ڈرو جس نے تمھیں اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا ﴿۱۸۴﴾ انھوں نے کہا تُو تو انھی لوگوں سے ہے جن پر زبردست جادو کیا گیا ہے ﴿۱۸۵﴾ اور تو نہیں ہے مگر ہمارے جیسا ایک بشر اور بے شک ہم تو تجھے جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں ﴿۱۸۶﴾ سو ہم پر آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا دے، اگر تو سچوں میں سے ہے ﴿۱۸۷﴾

**آیت 181 تا 183** ﴿ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ لَا تَكُوْنُوْا ...... ﴾ : ان کی ماپ تول میں کمی بیشی، زمین میں فساد اور رہزنی کا ذکر سورۂ اعراف (۸۵، ۸۶) میں گزر چکا ہے۔ شعیب علیہ السلام کے قصے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۸۵ تا ۹۳)، ہود (۸۴ تا ۹۵) اور عنکبوت (۳۶، ۳۷) بعض لوگوں نے مدین کے اس بزرگ کو شعیب علیہ السلام قرار دیا ہے جس کے پاس موسیٰ علیہ السلام نے دس سال گزارے تھے، مگر یہ بات بالکل بے اصل ہے، ''مدین'' کے ہر بزرگ کا شعیب علیہ السلام ہونا ضروری نہیں۔

**آیت 184** ﴿ وَ اتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾: شعیب علیہ السلام نے گفتگو کا آغاز ''اَلَا تَتَّقُوْنَ'' سے کیا تھا، اب اسی تقویٰ کی تاکید کے لیے فرمایا کہ اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلی نسلوں کو پیدا فرمایا۔ اس نے اگر تمھیں پیدا کیا ہے تو ملیا میٹ بھی کر سکتا ہے۔ اس میں توحید کی بھی تلقین ہے کہ جب پیدا کرنے میں اس کا کوئی شریک نہیں تو عبادت میں اس کے لیے شریک کیوں بناتے ہو۔ امتِ مسلمہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی دلیل کے ساتھ اپنی عبادت کا حکم دیا، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۲۱ ] ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ۔''

**آیت 185، 186** ① ﴿ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ...... ﴾ : یہ وہی جواب ہے جو قوم ثمود نے صالح علیہ السلام کو دیا تھا۔

② ﴿ وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ : یہ ''اِنْ'' اصل میں ''اِنَّ'' ہے جس کا اسم ''نَا'' محذوف ہے: ''أَيْ وَ إِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ'' یعنی ہمارا گمان تمھارے جھوٹے ہونے کے سوا کہیں جاتا ہی نہیں۔

**آیت 187** ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ : ''كِسَفًا'' ''كِسْفَةٌ'' کی جمع ہے، جیسے ''قِطْعَةٌ'' کی جمع ''قِطَعٌ'' ہے۔ ''كِسَفًا'' کا معنی ہے ٹکڑے۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

اس نے کہا میرا رب زیادہ جاننے والا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو ﴿۱۸۸﴾ چنانچہ انھوں نے اسے جھٹلا دیا تو انھیں سائبان کے دن والے عذاب نے آ پکڑا۔ یقیناً وہ بہت بڑے دن کا عذاب تھا ﴿۱۸۹﴾

**آیت 188** ﴿ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ : شعیب علیہ السلام نے جواب دیا کہ عذاب لانا یا آسمان سے ٹکڑے گرانا میرا کام نہیں، میرے رب کا کام ہے، کیونکہ وہی خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو، تم پر عذاب آنا ہے یا نہیں اور آنا ہے تو تمھارے اعمال کے مطابق کب آنا ہے اور کس قدر آنا ہے؟ میرا کام متنبہ کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔ شعیب علیہ السلام کے اس واقعہ میں قریش کے لیے بھی تنبیہ ہے، کیونکہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبے کرتے تھے: ﴿ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۹۲ ] ''یا آسمان کو ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے، جیسا کہ تو نے دعویٰ کیا ہے، یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔''

**آیت 189** ① ﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ﴾ ...... : اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید یا کسی صحیح حدیث میں نہیں آئی۔ ظاہر الفاظ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کچھ ٹکڑے گرانے کے مطالبے کے جواب میں ان پر بادل کا ایک سائبان بھیج دیا، جس سے ایسا عذاب برسا کہ وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اس عذاب کی حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، مگر خود اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب دیا کہ وہ کس قسم کا عذاب تھا، فرمایا یقیناً وہ ایک عظیم دن کا عذاب تھا۔ جب وہ دن عظیم تھا تو اس میں اترنے والے عذاب کی عظمت کا خود اندازہ کر لو۔

② یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ''اصحابِ مدین'' اور ''اصحاب الایکہ'' الگ الگ قومیں تھیں، کیونکہ اصحاب الایکہ پر ''يَوْمِ الظُّلَّةِ'' کا عذاب آیا، جب کہ اصحابِ مدین پر زلزلے اور صیحہ (چیخ) کا عذاب آیا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ۷۸ ] ''تو انھیں زلزلے نے پکڑ لیا تو انھوں نے اپنے گھر میں اس حال میں صبح کی کہ گرے پڑے تھے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [ هود : ۶۷ ] ''اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں چیخ نے پکڑ لیا، تو انھوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں صبح کی کہ گرے پڑے تھے۔''

بعض مفسرین نے سائبان کے عذاب کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ ''اصحاب الایکہ'' پر پہلے سات دن تک سخت لو چلتی رہی، جس سے ان کے بدن پک گئے، چشموں اور کنووں کا پانی سوکھ گیا۔ وہ گھبرا کر جنگل کی طرف نکلے، وہاں دھوپ کی شدت اور نیچے سے گرم زمین نے ان کے پاؤں کی کھال اتار دی، پھر ایک سیاہ بادل سائبان کی شکل میں نمودار ہوا، وہ سارے کے سارے خوشی کے مارے اس کے سائے میں جمع ہو گئے، اس وقت اچانک بادل سے آگ برسنا شروع ہوئی جس سے سب ہلاک ہو گئے۔ مگر ہم مفسرین کی اس تفصیل کو نہ سچا کہتے ہیں نہ جھوٹا، کیونکہ یہ نہ قرآن مجید سے ثابت ہے نہ صحیح حدیث سے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

**بے شک اس میں یقیناً ایک نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان والے نہیں تھے ﴿۱۹۰﴾ اور بلاشبہ تیرا رب، یقیناً وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۹۱﴾ اور بے شک یہ یقیناً رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے ﴿۱۹۲﴾ جسے امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے ﴿۱۹۳﴾ تیرے دل پر، تاکہ تو ڈرانے والوں سے ہو جائے ﴿۱۹۴﴾**

**آیت 191،190** ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً﴾ …… : اس سورت میں سات انبیاء کے واقعات میں سے ہر ایک کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں، ان سے مقصود نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا اور جھٹلانے والوں کو متنبہ کرنا ہے کہ ان میں سے ہر واقعہ میں ایک عظیم نشانی ہے کہ اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ بار بار دہرانے سے بات زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔

**آیت 192** ❶ وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: شروع سورت میں تمہیداً قرآن کے ذکر سے مقصود رسول اللہ ﷺ کی رسالت و نبوت کو ثابت کرنا تھا، پھر جھٹلانے والوں کو دھمکی دی اور اس سلسلہ میں انبیاء کے سات قصے بیان فرمائے، تاکہ آپ ﷺ کو تسلی ہو اور آپ کو جھٹلانے والے عبرت حاصل کریں۔ اب یہاں سے پھر رسالت کا اثبات شروع کیا اور آپ کی نبوت کے حق ہونے کے دلائل اور کفار کے شبہات کے جواب آخر سورت تک چلے گئے ہیں۔ (کبیر، قرطبی)

❷ "تَنْزِيْلٌ" مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے، نازل کیا ہوا۔ کفار قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا انکار کرتے تھے، اس لیے وہ نبی ﷺ کی رسالت کے بھی منکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کا آغاز یہ کہہ کر فرمایا کہ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینے کے لیے اور کفار کو کفر کے انجام بد سے ڈرانے کے لیے انبیائے کرام ﷩ کے سات قصے بیان فرمائے، جو اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ یہ قرآن یقیناً وحی الٰہی ہے اور آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ رسول، جو نہ پڑھ سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے، گزشتہ انبیاء اور قوموں کے واقعات کیسے بیان کر سکتا تھا۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ انکار جتنا شدید ہو بات اتنی ہی تاکید سے کی جاتی ہے۔ اس لیے نہایت تاکید کے ساتھ فرمایا کہ بے شک یہ یقیناً رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے، نہ محمد (ﷺ) نے اسے خود تصنیف کیا ہے، نہ کسی اور انسان یا جنّ کا گھڑا ہوا ہے۔

**آیت 193** نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ : "الرُّوْحُ" سے مراد فرشتہ ہے، اسے "روح" اس لیے کہا گیا ہے کہ فرشتے عالم اجسام کے بجائے عالم ارواح سے تعلق رکھتے ہیں۔ (ابن عاشور) "الْاَمِيْنُ" نہایت امانت دار، اس سے مراد جبریل ؑ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انبیاء تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے امین قرار دیا ہے۔ ان کی یہ صفت اور دوسری صفات سورۂ تکویر (۱۹ تا ۲۱) میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 194** ❶ عَلٰى قَلْبِكَ : دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿۱۹۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

واضح عربی زبان میں ﴿۱۹۵﴾ اور بے شک یہ یقیناً پہلے لوگوں کی کتابوں میں موجود ہے ﴿۱۹۶﴾

[ البقرۃ : ۹۷ ] ''کہہ دے جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو بے شک اس نے یہ کتاب تیرے دل پر اللہ کے حکم سے اتاری ہے۔'' یعنی اس قرآن مجید کو جبریل علیہ السلام نے کانوں کے ذریعے سے آپ کو سنانے کے بجائے آپ کے دل پر نازل کیا ہے۔ اگرچہ کانوں نے بھی دل ہی کو بات پہنچائی ہے، مگر بلاواسطہ دل پر نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اسے سمجھنے میں اور یاد رکھنے میں کوئی کمی نہ رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ [ الأعلی : ۶، ۷ ] ''ہم ضرور تجھے پڑھائیں گے تو تُو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے۔'' اور دیکھیے سورۂ قیامہ (۱۶ تا ۱۹)۔

② لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ : یہ کہنے کے بجائے کہ ''تاکہ تو ڈرانے والا بن جائے'' فرمایا ''تاکہ تو انبیاء و رسل کی عظیم الشان جماعت میں شامل ہو جائے'' کیونکہ اس میں آپ کی زیادہ عظمت کا اظہار ہے۔ اگرچہ رسول ''نذیر'' بھی ہوتے ہیں اور ''بشیر'' بھی، مگر یہاں ''منذر'' ہونے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس سورت کا سارا بیان ہی انبیاء کے اپنی اقوام کو ڈرانے پر مشتمل ہے اور جیسا کہ پہلے گزرا کہ جب تک کسی شخص یا قوم کو اپنے غلط راستے پر چلنے کے خوفناک نتائج سے آگاہ نہ کیا جائے اس کا راہِ راست پر آنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے ہر پیغمبر نے اپنی بات کا آغاز '' اَلَا تَتَّقُوْنَ '' سے فرمایا۔

**آیت 195** ① بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ: معلوم ہوا کہ نبی ﷺ پر صرف قرآن مجید کے مفہوم و معانی نازل نہیں ہوئے کہ آپ نے انھیں الفاظ کا جامہ پہنایا ہو، بلکہ یہ عربی زبان کے الفاظ کی صورت میں آپ پر نازل ہوا ہے۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے ساتھ کلام کرنے کے منکر ہیں، یہ آیت اور دوسری بہت سی آیات ان کا رد کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عربی زبان میں اللہ تعالیٰ کا معجز کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کا امتیاز ہے، ساری مخلوق جمع ہو کر بھی صرف معانی ہی نہیں اس کے الفاظ کی مثال لانے سے بھی عاجز ہے۔

② مُّبِيْنٍ : یعنی منکرین کا اس پر ایمان نہ لانا اس کے بیان میں کسی خامی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود ان کی نااہلی یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے، کیونکہ یہ تمام زبانوں سے فصیح زبان عربی میں ہے اور اس عربی میں جو معمّے یا پہیلی کی زبان نہیں بلکہ ''عربی مبین'' ہے، اس میں کوئی ایسا لفظ یا ایسی ترکیب نہیں جو عرب میں کثرت سے مستعمل نہ ہو، یا معنی کی ادائیگی میں اس کے اندر کوئی کمی ہو۔ جو لوگ اس پر ایمان نہیں لا رہے ان کے پاس یہ عذر ہرگز نہیں کہ ہم اسے سمجھ نہیں سکے۔

**آیت 196** وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ : ''زُبُر'' ''زَبُوْر'' کی جمع ہے، جس کا معنی کتاب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ كُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ﴾ [ القمر : ۵۲ ] ''اور ہر چیز جسے انھوں نے کیا، وہ دفتروں میں درج ہے۔'' اس آیت میں دو مفہوم شامل ہیں، ایک یہ کہ اس قرآن میں جو احکام و تعلیمات ہیں وہ پہلے انبیاء و رسل کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ سب کتابیں اللہ کی توحید، آخرت، اس کے رسولوں پر ایمان اور ان کی اطاعت کے حکم پر مشتمل ہیں اور سب میں شرک اور اللہ اور اس کے رسولوں

اَوَلَمۡ یَكُنۡ لَّهُمۡ اٰیَةً اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۹۷﴾ وَ لَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰی بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِیۡنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۹۹﴾

اور کیا ان کے لیے یہ ایک نشانی نہ تھی کہ اسے بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں ﴿۱۹۷﴾ اور اگر ہم اسے غیر عرب لوگوں میں سے کسی پر نازل کرتے ﴿۱۹۸﴾ پس وہ اسے ان پر پڑھتا تو بھی وہ اس پر ایمان لانے والے نہ ہوتے ﴿۱۹۹﴾

کی نافرمانی سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا یہ کتاب کوئی انوکھی یا پہلی کتابوں سے الگ تعلیمات پر مشتمل نہیں ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس قرآن کا تذکرہ پہلی کتابوں میں بھی موجود ہے، کیونکہ ان میں واضح الفاظ میں اس قرآن کو لانے والے پیغمبر کی آمد کی بشارت دی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ﴾ [ الأعراف : ١٥٧ ] ”وہ جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔“ اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: ﴿ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ﴾ [ الصف : ٦ ] ”اور میں ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے۔“ تورات و انجیل کے حوالوں کے لیے مذکورہ بالا آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 197** ﴿ اَوَلَمۡ یَكُنۡ لَّهُمۡ اٰیَةً ...... ﴾: یعنی کیا مشرکین مکہ کے یہ جاننے کے لیے کہ قرآن واقعی اللہ کی طرف سے نازل شدہ اور پہلی کتابوں میں مذکور ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں ہیں، یہ بات کافی نہیں کہ بنی اسرائیل کے علماء اس سے واقف ہیں، جیسا کہ ان حضرات کی شہادت سے معلوم ہوا جو ان میں سے ایمان لائے، مثلاً عبد اللہ بن سلام اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہما اور جیسا کہ ان میں سے بعض علانیہ اور بعض اپنی خصوصی مجلسوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں، گو اپنی بعض مصلحتوں کی وجہ سے ایمان نہیں لائے۔ اہلِ کتاب کی شہادت مشرکین مکہ کے ہاں اس لیے حجت قرار پاتی ہے کہ وہ پچھلی کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے انھی کی طرف رجوع کرتے تھے اور جو بات وہ کہتے تھے اسے صحیح تسلیم کرتے تھے۔ نجاشی اور اس کے درباریوں نے جعفر رضی اللہ عنہ سے سورۂ مریم کی آیات سن کر ان کے حق ہونے کا برملا اقرار کیا تھا۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۸۳)، مزید دیکھیے قصص (۵۲، ۵۳) آیت میں لفظ ”اٰیَةً“ ”لَمۡ یَكُنۡ“ کی خبر ہے اور ”اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ ......“ بتاویل مصدر اس کا اسم مؤخر ہے۔ (قرطبی، شوکانی)

**آیت 199،198** ﴿ وَ لَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰی بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِیۡنَ ...... ﴾: ”الۡاَعۡجَمِیۡنَ“ ”أَعۡجَمُ“ کی جمع ہے، گونگا یا جو سرے سے عربی نہ جانتا ہو، انسان ہو یا جانور۔ ”أَعۡجَمِيٌّ“ کا بھی یہی معنی ہے، اس میں یائے نسبت تاکید کے لیے زیادہ کی گئی ہے۔ ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں گے ہی نہیں، اس لیے آپ ان کے ایمان نہ لانے پر غم زدہ نہ ہوں۔ اگر اب یہ لوگ ایک عربی رسول پر نازل ہونے کی وجہ سے اس قرآن پر ایمان نہیں لا رہے، حالانکہ یہ عظیم ترین معجزہ ہے، جس کی ایک سورت کی مثال بھی وہ نہیں لا سکے، یہ کہہ کر کہ اس نے خود اسے تصنیف کر لیا ہے، تو اگر ہم اس فصیح و بلیغ ترین عربی کلام کو کسی عجمی پر نازل

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اسی طرح ہم نے یہ بات مجرموں کے دلوں میں داخل کر دی ﴿۲۰۰﴾ وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں ﴿۲۰۱﴾ پس وہ ان پر اچانک آپڑے اور وہ سوچتے بھی نہ ہوں ﴿۲۰۲﴾ تو وہ کہیں کیا ہم مہلت دیے جانے والے ہیں ﴿۲۰۳﴾

کرتے، جو عربی زبان کا ایک لفظ بھی نہ جانتا ہوتا اور وہ اسے ان کے سامنے پڑھتا، جس سے وہ اس کے من جانب اللہ ہونے کا انکار کر ہی نہ سکتے، پھر بھی یہ لوگ اپنے شدید عناد کی وجہ سے ایمان نہ لاتے، بلکہ اسے جادو کہہ کر یا کوئی اور بہانہ بنا کر جھٹلا دیتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [ یونس : ۹۶، ۹۷ ] ”بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی، وہ ایمان نہیں لائیں گے، خواہ ان کے پاس ہر نشانی آ جائے، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“ مزید دیکھیے سورۂ حجر (۱۴، ۱۵) اور انعام (۱۱۱)۔

**آیت 201.200** ﴿ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ...... ﴾ : ”سَلَكَ يَسْلُكُ“ پرونا، سوئی میں دھاگا داخل کرنا، کسی چیز کو دوسری کے اندر گھسا دینا۔ ”سَلَكْنٰهُ“ میں ”هٗ“ کی ضمیر اس انکار اور تکذیب کی طرف جا رہی ہے جس کا ذکر پچھلی آیت ”مَا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ“ میں ہے، یعنی ہم نے اس ایمان نہ لانے کو ان مجرموں کے جرائم کی پاداش میں ان کے دلوں کے اندر اس طرح داخل کر دیا ہے جس طرح سوئی میں دھاگا داخل کر دیا جاتا ہے۔ اب یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے، حتیٰ کہ ”عذاب الیم“ دیکھ لیں۔ اس میں بھی رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لانا ہی نہیں تو ان پر آپ غم زدہ کیوں ہوتے ہیں۔ آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہی معنی راجح ہے۔

بعض مفسرین نے ”سَلَكْنٰهُ“ میں ”هٗ“ کی ضمیر کا مرجع قرآن کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ قرآن کا حق ہونا تو ان کے دلوں میں اتار دیا گیا ہے مگر ان کی ہٹ دھرمی کا یہ حال ہے کہ...... ۔ (اشرف الحواشی) بعض نے اس کا مرجع قرآن کو قرار دے کر اس کی تفسیر اس طرح کی ہے: ”یعنی یہ اہلِ حق کے دلوں کی طرح تسکینِ روح اور شفائے قلب بن کر ان کے اندر نہیں اترتا، بلکہ ایک گرم لوہے کی سلاخ بن کر اس طرح گزرتا ہے کہ وہ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اس کے مضامین پر غور کرنے کے بجائے اس کی تردید کے لیے حربے ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں۔“ (تفہیم القرآن)

**آیت 203.202** ﴿ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ...... ﴾ : یعنی وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک وہ ”عذاب الیم“ کو دیکھ لیں، جو ان پر اچانک آئے اور وہ سوچتے بھی نہ ہوں، پھر وہ یہ کہیں کہ کیا ہم مہلت دیے جانے والے ہیں کہ ہم ایمان لائیں اور تصدیق کریں، مگر اس وقت مہلت نہیں ملے گی۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَ مَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَ مَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

تو کیا وہ ہمارا عذاب ہی جلدی مانگتے ہیں ﴿۲۰۴﴾ پس کیا تو نے دیکھا اگر ہم انھیں کئی سال فائدہ دیں ﴿۲۰۵﴾ پھر ان کے پاس وہ چیز آجائے جس کا وہ وعدہ دیے جاتے تھے ﴿۲۰۶﴾ تو وہ فائدہ جو وہ دیے جاتے تھے، ان کے کس کام آئے گا؟ ﴿۲۰۷﴾ اور ہم نے کوئی بستی تباہ نہیں کی مگر اس کے لیے کئی ڈرانے والے تھے ﴿۲۰۸﴾ یاد دہانی کے لیے اور ہم ظالم نہ تھے ﴿۲۰۹﴾

**آیت 204** ﴿ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ : یعنی عذاب آئے گا تو مہلت کا مطالبہ کریں گے اور آج مہلت ملی ہوئی ہے تو عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں: ﴿ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [ الأنفال : ٣٢ ] ”تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔“ کبھی کہتے ہیں: ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [ الشعراء : ١٨٧ ] ”سو ہم پر آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا دے۔“ کبھی کہتے ہیں: ﴿ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ٩٢ ] ”یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔“ کبھی کہتے ہیں: ﴿ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ يونس : ٤٨ ] ”یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔“

**آیت 205تا207** ﴿ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ...... (1) ان کا عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرنے سے ظاہر ہے کہ وہ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے اور بہت دیر تک زندہ رہنے کی امید رکھتے ہیں، اسی لیے وہ اسے جلدی طلب کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ فرمایا، یہ بتاؤ کہ اگر ہم ان کی توقع کے مطابق کچھ سال انھیں زندہ رہنے اور فائدہ اٹھانے کا موقع دے دیں، پھر ان پر عذاب آئے یا موت ہی آجائے جس کے بعد عذاب ہی عذاب ہے، تو جتنے سال انھیں زندہ رہنے کا اور زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جاتا رہا وہ عذاب سے بچانے میں ان کے کس کام آئے گا؟ (دیکھیے بقرہ: ۹۶) وہ گزرا ہوا سارا عرصہ تو ایک ساعت سے زیادہ معلوم نہیں ہوگا۔ (دیکھیے روم: ۵۵) اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق دنیا کے سب سے خوش حال کافر کو جہنم کا ایک غوطہ دلانے کے بعد پوچھا جائے گا کہ تو نے کبھی خیر دیکھی ہے تو وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ نہیں۔ [ دیکھیے مسلم، صفات المنافقين، باب صبغ أنعم أهل الدنيا في النار : ٢٨٠٧، عن أنس رضی اللہ عنہ ] تفسیر کبیر میں ہے کہ میمون بن مہران طواف میں حسن بصری سے ملے اور نصیحت کی درخواست کی تو انھوں نے صرف اس آیت کی تلاوت کر دی، تو میمون نے کہا، آپ نے نصیحت کی اور کمال کی نصیحت کی۔

(2) ”سِنِيْنَ“ جمع مذکر سالم نکرہ قلت کے لیے استعمال ہوا ہے، یعنی جتنی لمبی زندگی بھی مل جائے وہ چند سال ہی ہیں، کیونکہ گزر جانے والی چیز قلیل ہی ہوتی ہے۔

**آیت 208، 209** ﴿ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ...... : یعنی ہم نے جو بستی بھی ہلاک کی اس کی طرف خبردار

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

اور اسے لے کر شیاطین نہیں اترے ﴿۲۱۰﴾ اور نہ یہ ان کے لائق ہے اور نہ وہ یہ کر سکتے ہیں ﴿۲۱۱﴾ بلاشبہ وہ تو سننے ہی سے الگ کیے ہوئے ہیں ﴿۲۱۲﴾

کرنے اور ڈرانے والے بھیجے، تا کہ وہ انھیں نصیحت کریں اور یاد دہانی کروائیں، پھر جب انھوں نے ان کی نصیحت قبول نہیں کی، نہ یاد دہانی کی پروا کی تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہماری طرف سے ان پر کوئی ظلم نہ تھا، ظلم اس وقت ہوتا جب ہم پہلے نصیحت نہ کرتے اور خبردار نہ کرتے۔ پہلی آیت کے مضمون کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۵) اور قصص (۵۹) اور دوسری آیت کے مضمون کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۴۴) اور نساء (۴۰)۔

**آیت 210** ﴿ **وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ** : یہ ذکر کرنے کے بعد کہ یہ قرآن رب العالمین کا نازل کردہ ہے، جسے جبریل امین لے کر آپ کے دل پر اترا ہے، اب ان لوگوں کی تردید فرمائی جو کہتے تھے کہ محمد ﷺ کے پاس یہ وحی شیطان لاتے ہیں، جیسا کہ جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جبریل علیہ السلام کی آمد رک گئی تو قریش کی ایک عورت کہنے لگی: "أَبْطَأَ عَلَيْهِ شَيْطَانُهُ" "اس کے شیطان نے اس کے پاس آنے میں دیر کر دی ہے۔" تو اس پر یہ آیات اتریں: ﴿ **وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى** ﴾ [ الضحى : ۱ تا ۳ ] "قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی! اور رات کی جب وہ چھا جائے! نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔" [ بخاري، التهجد، باب ترك القيام للمريض : ۱۱۲۵ ] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس قرآن کو لے کر شیاطین نہیں اترے کہ یہ جادو ہو یا کہانت ہو، یا شعر ہو یا اوٹ پٹانگ خواب ہوں، کیونکہ شیاطین کا سرمایہ یہی کچھ ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے شیاطین کے لیے اس کے ناممکن ہونے کی تین وجہیں بیان فرمائیں۔

**آیت 211** ﴿ ① **وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ** : پہلی یہ کہ اتنا پاکیزہ کلام لے کر اترنا شیاطین کے لائق ہی نہیں، کیونکہ قرآن سراسر خیر و برکت اور نور ہے، جبکہ شیاطین سراسر شر و فساد اور ظلمت سے بھرے ہوئے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

② **وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ** : دوسری یہ کہ اگر ان کے لائق ہو بھی تو وہ اس جیسا کلام لانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، خواہ کتنی کوشش کر لیں، فرمایا: ﴿ **قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا** ﴾ [ بني إسرائيل : ۸۸ ] "کہہ دے اگر سب انسان اور جنّ جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کا بعض بعض کا مددگار ہو۔"

**آیت 212** ﴿ **اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ** : تیسری وجہ یہ کہ اگر بالفرض وہ سن سنا کر لانے کی طاقت بھی رکھتے ہوں تو بارگاہ الٰہی میں ان کا دخل ہی نہیں کہ سن لیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ فرشتوں سے سن کر آگے پہنچا دیں، مگر قرآن کے نزول کے وقت ان پر فرشتوں کی باہمی گفتگو سننے پر بھی پابندی لگا دی گئی، اب وہ سننے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر شہابوں کی

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

سو تو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکار، ورنہ تو عذاب دیے جانے والوں سے ہو جائے گا ﴿۲۱۳﴾ اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرا ﴿۲۱۴﴾

بارش ہوتی ہے۔ کوئی ایک آدھ بات چوری سے سن بھی لیں تو سیکڑوں جھوٹوں کی آمیزش کی وجہ سے اس کا اعتبار نہیں رہتا۔ دیکھیے سورۂ جن (۸ تا ۱۰) اور صافات (۶ تا ۱۰)۔

**آیت 213** ﴿ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ...... : قرآن کے حق اور منزل من اللہ ہونے کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ایک اللہ کو پکارنے اور اس کے سوا کسی کو بھی نہ پکارنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر کسی اور کو پکارو گے تو عذاب دیے جانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ یہ خطاب اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو ہے، مگر اصل مقصود کفار و مشرکین کو متنبہ کرنا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تو نہ شرک کیا نہ کرنا تھا، آپ ﷺ کو اس لیے مخاطب کیا کہ سب لوگ آگاہ ہو جائیں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ بالفرض رسول سے سرزد ہو جائے تو اسے بھی عذاب ہوگا، پھر دوسرے لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [ الزمر : ٦٥ ] ”اور بلاشبہ یقیناً تیری طرف وحی کی گئی اور ان لوگوں کی طرف بھی جو تجھ سے پہلے تھے کہ بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا۔“

**آیت 214** ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ : اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرا کہ میری قرابت پر بھروسا نہ رکھنا۔ سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرانے کے حکم سے ظاہر ہے کہ جو ان کے علاوہ ہیں انھیں بالاولیٰ ڈرانا ہوگا اور جب قریب ترین رشتہ داروں کو ڈرانے میں ان کی ناپسندیدگی یا ناراضی کی پروا نہیں کی جائے گی تو دوسروں کی ناراضی یا ناپسندیدگی تو اس کے مقابلے میں معمولی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس فریضہ کو اس طرح ادا کیا جیسے اس کا حق تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب آیت: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ اتری تو رسول اللہ ﷺ صفا پہاڑ پر چڑھے اور آواز دینے لگے: « يَا بَنِي فِهْرٍ! يَا بَنِي عَدِيٍّ! لِبُطُوْنِ قُرَيْشٍ، حَتَّى اجْتَمَعُوْا، فَجَعَلَ الرَّجُلُ إِذَا لَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَخْرُجَ أَرْسَلَ رَسُوْلًا لِيَنْظُرَ مَا هُوَ، فَجَاءَ أَبُوْ لَهَبٍ وَ قُرَيْشٌ فَقَالَ أَرَأَيْتَكُمْ لَوْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ خَيْلًا بِالْوَادِيْ تُرِيْدُ أَنْ تُغِيْرَ عَلَيْكُمْ أَ كُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ؟ قَالُوْا نَعَمْ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا، قَالَ فَإِنِّيْ نَذِيْرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ، فَقَالَ أَبُوْ لَهَبٍ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ، أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ فَنَزَلَتْ : ﴿ تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴾ » [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ وأنذر عشيرتك الأقربين ...... ﴾ : ٤٧٧٠ ] ”یا بنی فہر! یا بنی عدی!“ قریش کے مختلف قبائل کو آواز دی، یہاں تک کہ وہ جمع ہو گئے، کوئی آدمی خود نہ آ سکتا تو کسی دوسرے کو بھیج دیتا، تاکہ وہ

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾

اور اپنا بازو اس کے لیے جھکا دے جو ایمان والوں میں سے تیرے پیچھے چلے ﴿۲۱۵﴾ پھر اگر وہ تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے کہ بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو ﴿۲۱۶﴾

دیکھیے کیا معاملہ ہے۔ غرض ابولہب اور قریش سب آ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بتاؤ کہ اگر میں تمھیں اطلاع دوں کہ اس وادی میں ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا جانو گے؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں! ہم نے آپ پر سچ ہی کا تجربہ کیا ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''پھر میں تمھیں ایک شدید عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہوں۔'' تو ابولہب نے کہا: ''تیرے لیے سارا دن ہلاکت ہو، کیا تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا ہے؟'' اس پر یہ سورت اتری: ﴿ تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴾ [ اللھب : ۱، ۲ ]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( يَا بَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ! اشْتَرُوْا أَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ، يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! اشْتَرُوْا أَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ، يَا أُمَّ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ! يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ! اشْتَرِيَا أَنْفُسَكُمَا مِنَ اللّٰهِ، لَا أَمْلِكُ لَكُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، سَلَانِيْ مِنْ مَالِيْ مَا شِئْتُمَا )) [ بخاري، المناقب، باب من انتسب إلى آبائه ...... : ۳۵۲۷ ] ''اے بنی عبد مناف! اپنی جانیں اللہ سے خرید لو، اے بنی عبد المطلب! اپنی جانیں اللہ سے خرید لو، اے زبیر بن عوام کی ماں اور رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی (صفیہ)! اے فاطمہ بنت محمد! تم دونوں اپنی جانیں اللہ سے خرید لو، میں اللہ کے ہاں تمھارے لیے کچھ اختیار نہیں رکھتا، مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہو مانگ لو۔'' ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے قریش کو اور اپنے چچا عباس کو بھی مخاطب فرمایا۔ [ دیکھیے بخاري، التفسیر، باب : ﴿ و أنذر عشیرتك ...... ﴾ : ۴۷۷۱ ]

**آیت 215** وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ ...... : ڈرانے کی ضرورت اس کے لیے ہے جو اعراض کرے، جو پیروی اختیار کرے اس کے لیے اس کے برعکس حکم دیا، فرمایا مومنوں میں سے جو آپ کے پیچھے چلیں، اپنے ہوں یا پرائے، ان کے لیے اپنا (شفقت کا) بازو جھکا دیں، جس طرح مرغی کسی خطرے کو محسوس کر کے اپنے بچوں کو اپنے پروں میں لے لیتی ہے اسی طرح آپ بھی اے پیغمبر! ان کو اپنی رحمت و عنایت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھیں۔ نرمی کا یہ حکم ان پیچھے چلنے والوں کے لیے ہے جو مومن ہیں۔ معلوم ہوا جو لوگ قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیتے تھے، جیسے ابوطالب، بنو ہاشم اور بنو مطلب، یا حق کو پہچاننے کی وجہ سے ساتھ دیتے تھے مگر ایمان نہیں لاتے تھے، ان کے ساتھ مومنوں والی نرمی اور شفقت کا حکم نہیں۔

**آیت 216** فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ ...... : یعنی پھر اگر وہ تیری نافرمانی کریں، تیرے قریب ترین رشتہ دار ہوں یا کوئی اور، تو ان کے ساتھ مومنوں کے لیے نرمی والے معاملے کے بجائے ان سے الگ ہو جا اور کہہ دے کہ تم جس نافرمانی کا ارتکاب کر رہے

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾

اور اس سب پر غالب، نہایت رحم والے پر بھروسا کر ﴿۲۱۷﴾ جو تجھے دیکھتا ہے، جب تو کھڑا ہوتا ہے ﴿۲۱۸﴾ اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے پھرنے کو بھی ﴿۲۱۹﴾ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۲۰﴾ کیا میں تمھیں بتاؤں شیاطین کس پر اترتے ہیں ﴿۲۲۱﴾ وہ ہر زبردست جھوٹے، سخت گناہ گار پر اترتے ہیں ﴿۲۲۲﴾

ہو میں اس سے بری ہوں۔ ممکن ہے تیرا لاتعلقی کا اعلان ہی انھیں واپس لے آئے، یا کم از کم تو اللہ کے ہاں بری ہو جائے۔

**آیت 217** وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ : جب ہر نافرمانی کرنے والے سے براءت کا اعلان کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ نافرمانی کرنے والے کوئی ہوں یا کتنے ہوں، تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اس لیے سب سے بیزار ہو کر اس مالک پر بھروسا رکھ، جو عزیز (سب پر غالب) بھی ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی کی پیش نہیں جاتی اور رحیم (بے حد رحم والا) بھی کہ اس کی بے حساب رحمت ہمیشہ اپنوں پر متوجہ رہتی ہے۔ توکل کا معنی اپنا کام اس کے سپرد کر دینا جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ اس کے لیے کافی ہو جائے گا۔

**آیت 218 تا 220** ① الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ...... : یعنی اس عزیز و رحیم پر بھروسا رکھ جو ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہے، اس وقت بھی جب تو کھڑا ہوتا ہے، رات قیام میں کھڑا ہو یا دعوت و جہاد کے فریضے کی ادائیگی کے لیے، یا کسی بھی کام کے لیے اور تیرے صحابہ میں تیرے گھومنے پھرنے کو بھی دیکھ رہا ہے جن کا خاص وصف ساجدین ہے، فرمایا: ﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾ [ الفتح : ۲۹ ] ”تو انھیں اس حال میں دیکھے گا کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اپنے رب کا فضل اور (اس کی) رضا ڈھونڈتے ہیں، ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے۔“ جب تو ان کے ساتھ باجماعت نماز کی حالت میں اپنی ہیئت بدل رہا ہوتا ہے، کبھی ان کے ساتھ سجدے میں ہوتا ہے، کبھی رکوع میں، کبھی قیام میں اور جب تو ان سجدہ گزاروں کے ساتھ دعوت یا جہاد کے کام میں پھر رہا ہوتا ہے تو تیرا رب ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہے اور اپنے اس قیام اور پھرنے میں تو جو کچھ کہتا ہے وہ اسے سنتا ہے اور جو کچھ تو کرتا ہے اسے جانتا ہے، کیونکہ وہی سننے والا، جاننے والا ہے۔ اس لیے اس پر بھروسا رکھ جس کی نگاہ سے تو ایک لمحہ اوجھل نہیں، وہ تجھے کبھی بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔

② ان آیات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کی شب و روز کی مصروفیات کو جو شخص بھی غور سے دیکھے گا وہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں کا شیطان سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

**آیت 221، 222** هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ...... : ”اَفَّاكٍ“ ”اِفْكٌ“ میں سے مبالغہ ہے، زبردست جھوٹا۔

يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾

وہ سنی ہوئی بات لا ڈالتے ہیں اور ان کے اکثر جھوٹے ہیں ﴿۲۲۳﴾

” اَثِيْمٍ “ ”اِثْمٌ“ میں سے مبالغہ ہے، سخت گناہ گار۔ پہلے فرمایا تھا کہ شیاطین نہ یہ قرآن لے کر اترے ہیں نہ ان کے لیے یہ ممکن ہے، اب یہ بیان ہے کہ شیاطین کا قرآن لے کر آنے کی طرح رسول اللہ ﷺ پر اترنا بھی محال ہے، کیونکہ آپ ﷺ صادق و امین ہیں اور خیر کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہیں، شیاطین تو ایسے لوگوں پر اترتے ہیں جو نہایت جھوٹے اور سخت گناہ گار ہوں، کیونکہ انھوں نے انھی لوگوں پر اترنا ہوتا ہے جن کے دلوں میں ان کی بات قبول کرنے کی استعداد ہو اور جو جھوٹ، خیانت، خبث اور دوسری کمینگیوں میں ان کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ مراد اس سے وہ کاہن، نجومی، جوتشی، چوریاں بتانے والے اور عامل قسم کے لوگ ہیں جو غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے اور لوگوں کو ان کی قسمتیں بتاتے پھرتے ہیں۔ کچھ جنوں اور موکلوں کی تسخیر کے دعوے سے اپنا کاروبار چلاتے پھرتے ہیں۔

**آیت 223** **يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ:** ”**السَّمْعَ**“ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، یعنی سنی ہوئی بات۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ شیاطین فرشتوں سے سنی ہوئی بات کاہنوں کے کانوں میں لا ڈالتے ہیں، جن میں وہ اپنی طرف سے سو (۱۰۰) جھوٹی باتیں ملا دیتے ہیں۔ فرشتوں سے سنی ہوئی وہ بات سچی نکلتی ہے تو سو (۱۰۰) جھوٹی باتوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کرتے۔ دوسرا یہ کہ وہ ”افاک و اثیم“ کاہن شیاطین سے سنی ہوئی بات لوگوں کو بتاتے ہیں جس میں وہ مزید جھوٹ ملا دیتے ہیں اور ان کے اکثر جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں، سوائے اس ایک بات کے جو شیاطین نے چرا کر ان تک پہنچائی ہوتی ہے۔ ”**يُلْقُوْنَ السَّمْعَ**“ میں ”**السَّمْعَ**“ مصدر مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے، یعنی وہ شیاطین فرشتوں کی گفتگو سننے کے لیے کان لگاتے ہیں، یا وہ کاہن شیاطین کی باتیں سننے کے لیے کان لگاتے ہیں۔ یہ معنی بھی درست ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِذَا قَضَى اللّٰهُ الْأَمْرَ فِي السَّمَاءِ، ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ، كَأَنَّهُ سِلْسِلَةٌ عَلٰى صَفْوَانٍ، فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَا ذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا لِلَّذِيْ قَالَ الْحَقَّ، وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ، فَيَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُ السَّمْعِ وَمُسْتَرِقُوا السَّمْعِ هٰكَذَا بَعْضُهُ فَوْقَ بَعْضٍ، وَصَفَهُ سُفْيَانُ بِكَفِّهِ فَحَرَفَهَا وَ بَدَّدَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، فَيَسْمَعُ الْكَلِمَةَ فَيُلْقِيْهَا إِلٰى مَنْ تَحْتَهُ، ثُمَّ يُلْقِيْهَا الْآخَرُ إِلٰى مَنْ تَحْتَهُ، حَتّٰى يُلْقِيَهَا عَلٰى لِسَانِ السَّاحِرِ أَوِ الْكَاهِنِ، فَرُبَّمَا أَدْرَكَ الشِّهَابُ قَبْلَ أَنْ يُلْقِيَهَا، وَرُبَّمَا أَلْقَاهَا قَبْلَ أَنْ يُدْرِكَهُ، فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ فَيُقَالُ أَلَيْسَ قَدْ قَالَ لَنَا يَوْمَ كَذَا وَ كَذَا، كَذَا وَ كَذَا؟ فَيُصَدَّقُ بِتِلْكَ الْكَلِمَةِ الَّتِيْ سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ )) [ بخاري، التفسير، باب ﴿ حتى إذا فزع عن قلوبهم...... ﴾ : ٤٨٠٠ ]

**”جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا فیصلہ آسمان پر کرتا ہے تو فرشتے عاجزی سے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان انھیں اس طرح سنائی دیتا ہے جیسے صاف چکنے پتھر پر زنجیر کی آواز ہوتی ہے، پھر جب وہ گھبراہٹ ان کے دلوں سے دور ہو جاتی ہے تو وہ آپس میں دریافت کرتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اس نے حق فرمایا ہے اور وہ بہت بلندی والا،**

# وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾

## اور شاعر لوگ، ان کے پیچھے گمراہ لوگ لگتے ہیں ﴿۲۲۴﴾

بہت بڑائی والا ہے، تو (کبھی کبھی) چوری سننے والا اسے سن لیتا ہے اور چوری سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔'' اور (حدیث کے راوی) سفیان نے چوری سننے والوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو الگ الگ کرکے ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر دکھایا۔ ''تو وہ (شیطان جن) بات سن لیتا ہے اور اپنے سے نیچے والے کو پہنچا دیتا ہے، پھر وہ دوسرا اسے اپنے سے نیچے والے کو پہنچا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے جادوگر کاہن کی زبان پر ڈال دیتا ہے، پھر بعض اوقات شعلہ اسے نیچے پہنچانے سے پہلے آ پکڑتا ہے اور بعض اوقات وہ شعلہ پہنچنے سے پہلے دوسرے کو وہ بات پہنچا دیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتا ہے۔ تو کہا جاتا ہے، کیا اس نے ہمیں فلاں فلاں دن ایسے ایسے نہیں کہا تھا؟ تو اس بات کی وجہ سے جو آسمان سے سنی تھی اس کو سچا سمجھ لیا جاتا ہے۔'' عائشہ زوج النبی ﷺ بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: (( إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَنْزِلُ فِي الْعَنَانِ، وَهُوَ السَّحَابُ، فَتَذْكُرُ الْأَمْرَ قُضِيَ فِي السَّمَاءِ، فَتَسْتَرِقُ الشَّيَاطِيْنُ السَّمْعَ فَتَسْمَعُهُ، فَتُوْحِيْهِ إِلَى الْكُهَّانِ، فَيَكْذِبُوْنَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة...... : ۳۲۱۰ ] ''فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور اس کام کا ذکر کرتے ہیں جس کا آسمان میں فیصلہ کیا گیا ہوتا ہے۔ تو شیطان چوری سے اس کی طرف کان لگاتے ہیں اور اسے سن لیتے ہیں اور کاہنوں کے دلوں میں پہنچا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنی طرف سے سو (۱۰۰) جھوٹ ملا دیتے ہیں۔''

صفیہ نے نبی ﷺ کی بیویوں میں سے ایک بیوی سے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ أَتٰى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً )) [ مسلم، السلام، باب تحريم الكهانة...... : ۲۲۳۰ ] ''جو شخص کسی عرّاف (چوریاں یا گم شدہ چیزیں بتانے والے) کے پاس گیا اور اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تو اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں ہوگی۔'' ابوہریرہ اور حسن رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ أَتٰى كَاهِنًا أَوْ عَرَّافًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ )) [ مسند أحمد : ۴۲۹/۲، ح : ۹۵۴۸ ] ''جو شخص کسی کاہن یا عرّاف کے پاس جائے اور اسے اس بات میں سچا سمجھے جو وہ کہے تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا جو محمد ﷺ پر نازل ہوا۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کاہنوں (غیب کی باتیں بتانے والوں) کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَيْسُوْا بِشَيْءٍ، قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَإِنَّهُمْ يُحَدِّثُوْنَ أَحْيَانًا بِالشَّيْءِ يَكُوْنُ حَقًّا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ الْكَلِمَةُ مِنَ الْحَقِّ يَخْطَفُهَا الْجِنِّيُّ فَيَقُرُّهَا فِيْ أُذُنِ وَلِيِّهِ قَرَّ الدَّجَاجَةِ فَيَخْلِطُوْنَ فِيْهَا أَكْثَرَ مِنْ مِائَةِ كَذْبَةٍ )) [ بخاري، الأدب، باب قول الرجل للشيء ...... : ۶۲۱۳ ] ''وہ کچھ بھی نہیں۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! بعض اوقات وہ ہمیں کوئی بات بتاتے ہیں جو سچی نکلتی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ بات حق ہوتی ہے جسے جنّی (جنّ) اچک لیتا ہے اور اپنے دوست کے کان میں مرغی کے کڑکڑ کرنے کی طرح ڈال دیتا ہے، پھر وہ اس کے ساتھ سو (۱۰۰) جھوٹ ملا لیتے ہیں۔''

**آیت 224** وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ : ''الْغَاوٗنَ'' ''غَوٰى يَغْوِيْ'' (ض) سے اسم فاعل کی جمع ہے، گمراہ لوگ۔ کفارِ مکہ

اَلَمۡ تَرَ اَنَّهُمۡ فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّهِیۡمُوۡنَ ﴿۲۲۵﴾ وَ اَنَّهُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲۲۶﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں ﴿۲۲۵﴾ اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں ﴿۲۲۶﴾

رسول اللہ ﷺ پر کاہن کے علاوہ شاعر ہونے کا الزام بھی لگاتے تھے، اس لیے آپ سے کہانت کی نفی کے بعد شاعر ہونے کی نفی بھی فرمائی۔ مزید دیکھیے سورۂ یٰس (۶۹) اور حاقہ (۴۰ تا ۴۳) ان آیات میں شعراء کی تین خصوصیات بیان فرمائیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ شعراء اور نبی کریم ﷺ میں اور شعر اور قرآن مجید میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ پہلی خصوصیت یہ کہ شعراء کے پیچھے گمراہ، بھٹکے ہوئے اور اوباش قسم کے لوگ لگتے ہیں، پھر جن کے پیچھے لگنے والے گمراہ ہوں خود ان کے گمراہ ہونے میں کیا کمی ہو گی؟ عرب کے سب سے بڑے شاعر ''امرء القیس'' نے جس بے حیائی اور فحاشی کی اشاعت اپنے شعروں میں کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی، یہاں تک کہ اہلِ عرب بھی اسے اپنا سب سے بڑا شاعر ماننے کے باوجود ''اَلْمَلِكُ الضِّلِّيْلُ'' (رند بادشاہ) کہتے تھے۔ شاعروں کا محبوب موضوع عشق بازی، شراب نوشی اور بازاری عورتوں یا کسی کی معصوم بہو بیٹی کے حُسن و جمال کا تذکرہ ہے، یا شہوت بھڑکانے والی فحش باتیں۔ وہ کسی کی بے جا مدح کرتے ہیں اور کسی کی ناجائز مذمت، اس لیے ان کے ساتھی بھی اسی قبیل کے لوگ ہوتے ہیں۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی انتہائی سچے، پاکباز، شریف اور مہذب تھے۔ ایسے شخص کو شاعر وہی شخص کہہ سکتا ہے جو جھوٹ بولنے میں حیا کی ساری حدیں پار کر گیا ہو۔

**آیت 225** اَلَمۡ تَرَ اَنَّهُمۡ فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّهِیۡمُوۡنَ : یہ شاعروں کی دوسری خصوصیت ہے جو یہاں بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب انھیں کوئی خیال آتا ہے اسے اچھوتے انداز میں شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، انھیں اس سے غرض نہیں کہ وہ رحمانی ہے یا شیطانی، روحانی ہے یا نفسانی، اس سے خیر کے جذبات پیدا ہوں گے یا شر کے۔ کبھی کسی کی تعریف کر کے اسے آسمان پر چڑھا دیتے ہیں اور کبھی کسی کی ہجو اور مذمت کر کے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیتے ہیں۔ ایک شعر سے معلوم ہو گا کہ شاعر ولی ہے جب کہ دوسرے شعر سے پتا چلے گا کہ وہ شیطان ہے۔ ایک ہی سانس میں وہ نیکی اور بدی دونوں کی باتیں بے تکلف کہہ دے گا، لیکن کہے گا ایسے مؤثر اور دلکش انداز میں کہ سننے والے ان دونوں سے متاثر ہو جائیں گے، لیکن نفس انسانی کو چونکہ نیکی کے بجائے بدی کی باتیں ہی عموماً مرغوب ہوتی ہیں، اس لیے شاعر کے چھوڑے ہوئے بدی والے اثرات و نقوش تو قائم رہتے ہیں، مگر نیکی کے اثرات غائب ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کا کلام ''وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا'' کا مصداق بن جاتا ہے۔ (تفسیر مدنی)

**آیت 226** وَ اَنَّهُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ : یہ شاعروں کی تیسری خصوصیت ہے جو نبی ﷺ کے طرزِ عمل کی عین ضد تھی، آپ ﷺ کو جاننے والا ہر شخص جانتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، دوست دشمن سب کا اتفاق تھا کہ آپ کے قول و فعل میں تضاد نہیں، جب کہ شاعروں کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے کہنے کی باتیں اور ہوتی ہیں، کرنے کی اور۔ شعر پڑھو تو معلوم ہو گا کہ شیر سے زیادہ بہادر ہیں مگر پرلے درجے کے بزدل ہوں گے، سخاوت کا مضمون ایسا باندھیں گے کہ آدمی

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ

**مگر وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور انتقام لیا، اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا**

سمجھے ان سے بڑا سخی کوئی نہیں جب کہ واقع میں سخت کنجوس ہوں گے، زہد و قناعت اور خود داری کا بلند بانگ دعویٰ کریں گے جب کہ حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر رہے ہوں گے۔ مرزا غالب نے اپنا حال خود ہی بیان کر دیا ہے ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب  تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حالی نے مسدس میں اپنے زمانے کے شاعروں کا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے  عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے  مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے  جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

ان اشعار میں حالی نے شاعروں کی مذمت کرتے ہوئے دوسرے تمام گناہ گاروں کو جہنم سے آزادی کا پروانہ دے دیا، یہ اس شاعری ہی کا نتیجہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَأَنْ يَمْتَلِئَ جَوْفُ الرَّجُلِ قَيْحًا يَرِيْهِ خَيْرٌ مِنْ أَنْ يَمْتَلِئَ شِعْرًا )) [ مسلم، الشعر، باب في إنشاد الأشعار……: ۲۲۵۷، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”(تم میں سے) کسی آدمی کا اندرون (سینہ، پیٹ) پیپ سے بھر جائے جو اسے گلا دے، تو وہ اس سے بہتر ہے کہ شعر سے بھرے۔“ اندرون (سینہ، پیٹ) شعر سے بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے بجائے اشعار آدمی پر غالب ہوں۔ ورنہ اچھے اشعار یاد کرنے اور سننے سنانے میں کوئی حرج نہیں۔ عمرو بن شرید اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سواری پر سوار تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( هَلْ مَعَكَ مِنْ شِعْرِ أُمَيَّةَ بْنِ أَبِي الصَّلْتِ شَيْءٌ ؟ قُلْتُ نَعَمْ، قَالَ هِيهِ فَأَنْشَدْتُهُ بَيْتًا، فَقَالَ هِيهِ ثُمَّ أَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيهِ حَتّٰى أَنْشَدْتُهُ مِائَةَ بَيْتٍ )) [ مسلم، الشعر، باب في إنشاد الأشعار……: ۲۲۵۵ ] ”تمھیں امیہ بن صلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟“ میں نے کہا: ”جی ہاں!“ آپ نے فرمایا: ”سناؤ۔“ میں نے ایک شعر سنایا، آپ نے فرمایا: ”اور سناؤ۔“ میں نے ایک شعر اور سنایا، آپ نے فرمایا: ”اور سناؤ۔“ حتیٰ کہ میں نے آپ کو سو شعر سنائے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: (( إِذَا خَفِيَ عَلَيْكُمْ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ فَابْتَغُوْهُ فِي الشِّعْرِ فَإِنَّهُ دِيْوَانُ الْعَرَبِ )) [ مستدرك حاكم : ۴۹۹/۲، ح : ۳۸۴۵، قال الحاكم صحيح و وافقه الذهبي ] ”جب تم سے قرآن کی کوئی چیز مخفی رہے (کسی لفظ کا مطلب سمجھ میں نہ آئے) تو اسے شعر میں تلاش کرو، کیونکہ وہ عرب کا دیوان ہے (یعنی ان کے گزشتہ علوم کا مجموعہ ہے)۔“ ابن حبان (۵۷۷۲) کے حاشیہ میں اس کے محقق نے یہ روایت بیہقی کی ”الاسماء والصفات“ کے حوالے سے نقل کر کے اس کی دو سندوں کو حسن کہا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تفسیر قرآن میں اشعار عرب سے استشہاد معروف ہے۔

**آیت 227** ① **اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** ……: شعراء کی مذمت کے بعد ان میں سے ایسے لوگوں کو مستثنیٰ فرمایا جن میں چار اوصاف پائے جائیں، پہلا وصف یہ کہ وہ مومن ہوں۔ دوسرا یہ کہ وہ صالح اعمال کے حامل ہوں، فاسق و فاجر اور

وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ ع

اور عنقریب وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، جان لیں گے کہ وہ لوٹنے کی کون سی جگہ لوٹ کر جائیں گے ﴿۲۲۷﴾

بدکار نہ ہوں۔ تیسرا یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہوں، اپنی عام زندگی میں بھی اور اپنے اشعار میں بھی۔ ایسا نہ ہو کہ زبانی تسبیح وتہلیل اور اذکار پر تو بہت زور ہو مگر اشعار میں اللہ کی یاد کے بجائے عشق و ہوس اور فضول باتوں کا تذکرہ ہو۔ چوتھا وصف یہ کہ وہ اپنے کلام سے ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کا کام لیتے ہوں اور کفار و مشرکین اسلام، مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو بد زبانی کریں ان کا دندان شکن جواب دیں۔ ایسے موقع پر وہ زبان سے وہ کام لیتے ہیں جو میدان جنگ میں مجاہد تیر وتلوار سے لیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے رسول اللہ ﷺ خود شعرائے اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اُهْجُوْا قُرَيْشًا فَإِنَّهُ أَشَدُّ عَلَيْهَا مِنْ رَشْقٍ بِالنَّبْلِ )) [ مسلم، فضائل الصحابة، باب فضائل حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ : ۲۴۹۰ ] ''قریش کی ہجو کرو، کیونکہ وہ ان پر تیروں کے چھیدنے سے بھی سخت ہے۔'' اور اس حدیث کے آخر میں ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ حسان رضی اللہ عنہ سے کہہ رہے تھے: (( إِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ لَا يَزَالُ يُؤَيِّدُكَ مَا نَافَحْتَ عَنِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ )) ''روح القدس تیری مدد کرتا رہتا ہے جب تک تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دفاع کرتا رہے۔'' اور فرماتی ہیں کہ میں نے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: (( هَجَاهُمْ حَسَّانُ فَشَفٰى وَ اشْتَفٰى )) [ مسلم، فضائل الصحابة، باب فضائل حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ : ۲۴۹۰ ] ''حسان نے ان کی ہجو کی اور شفا دی اور شفا پائی۔'' کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ کی شعر کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهِ وَلِسَانِهِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَكَأَنَّمَا تَنْضَحُوْنَهُمْ بِالنَّبْلِ )) [ صحيح ابن حبان : ۴۷۰۷، قال المحقق إسناده على شرط الشيخين ] ''مومن اپنی تلوار اور اپنی زبان کے ساتھ جہاد کرتا ہے، قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! گویا تم انھیں تیروں کے ساتھ چھیدتے ہو۔''

آیت سے ظاہر ہے کہ شعر کی دو حالتیں ہیں، ایک وہ جس کی مذمت آئی ہے، دوسری وہ جس کی اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً )) [ ابن ماجه، الأدب، باب الشعر : ۳۷۵۵، و قال الألباني صحيح ] ''بعض شعر حکمت سے بھرے ہوتے ہیں۔'' عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلشِّعْرُ بِمَنْزِلَةِ الْكَلَامِ حَسَنُهُ كَحَسَنِ الْكَلَامِ وَ قَبِيْحُهُ كَقَبِيْحِ الْكَلَامِ )) [ السنن الدار قطني : ۲۷۴/۵، ح : ۴۳۰۸ ] ''شعر کلام کی طرح ہے، سو اس میں سے جو اچھا ہے وہ اچھے کلام کی طرح ہے اور جو اس میں سے برا ہے وہ برے کلام کی طرح ہے۔''

② **وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا......:** ظلم کرنے والوں سے مراد وہ کفار و مشرکین ہیں جنھوں نے ایمان قبول نہ کرکے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور ضد اور ہٹ دھرمی سے اسلام کو نیچا دکھانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو ساحر، کاہن اور شاعر کہہ کر جھٹلاتے رہے۔ فرمایا، یہ لوگ جلد ہی جان لیں گے کہ ان کا کیا انجام ہونے والا ہے آخرت میں اور دنیا میں بھی۔ ان الفاظ میں کفار کے لیے بہت سخت وعید ہے۔ [ اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَ عَذَابِ الْآخِرَةِ ]

سُوْرَةُ النَّمْلِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اٰیاتھا ۹۳ رکوعاتھا ۷

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ① هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ③ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ④

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

طٰسٓ، یہ کامل قرآن اور واضح کتاب کی آیات ہیں ① مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہیں ② وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین بھی وہی رکھتے ہیں ③ بے شک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیے ہیں، پس وہ حیران پھرتے ہیں ④

**آیت 1** طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ: یہاں قرآن کا ذکر پہلے ہے جب کہ سورۂ حجر میں اس کے برعکس کتاب کا ذکر پہلے ہے، وہاں فرمایا: ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ [ الحجر : ۱ ] ”الٓرٰ۔ یہ کامل کتاب اور واضح قرآن کی آیات ہیں۔“ یہ فرق کیوں ہے؟ ابو حیان اور زمخشری کے مطابق یہ فرق ظاہر نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بعض معطوف علیہ اور معطوف ایسے ہوتے ہیں جن میں سے کسی کو پہلے ذکر کرنے کی کوئی وجہ ترجیح نہیں ہوتی، جسے چاہو پہلے ذکر کر دو اور جسے چاہو بعد میں، جیسا کہ ”وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ“ اور ”وَ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا“ میں ہے۔ قرآن اور کتاب کے عطف کا معاملہ بھی یہی ہے، جبکہ بعض ایسے ہوتے ہیں جن میں معطوف علیہ کو پہلے لانے کی وجہ ظاہر ہوتی ہے، جیسے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ﴾ [ آل عمران : ۱۸ ] ”اللہ نے گواہی دی کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔“ ابن عاشور نے ایک وجہ ترجیح بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ سورۂ حجر میں اس آیت کے بعد کفار کے قیامت کے دن حسرت و افسوس کا ذکر ہے، جب کہ یہاں اس کے بعد ایمان والوں کے لیے اس کے ہدایت اور بشارت ہونے کا ذکر ہے۔ کفار کو چونکہ قرآن پڑھنے سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے وہاں کتاب کا ذکر پہلے فرمایا، کیونکہ کتاب تو ہر حال میں ان پر حجت ہے۔ مومنین کا تعلق قرآن لکھنے سے زیادہ پڑھنے کے ساتھ ہے، اس لیے یہاں قرآن کا ذکر پہلے فرمایا۔ (التحریر والتنویر)

**آیت 3،2** هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (۲ تا ۴) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 4** اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ...... : اہلِ ایمان کے لیے قرآن کے ہدایت اور بشارت ہونے کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، کہ ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال مزیّن کر دیے ہیں، یعنی انھیں ان کے کفر کی یہ سزا

# اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَ هُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۵ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۶

**یہی لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور وہ آخرت میں، وہی سب سے زیادہ خسارے والے ہیں ⑤ اور بلاشبہ یقیناً تجھے قرآن ایک کمال حکمت والے، سب کچھ جاننے والے کے پاس سے عطا کیا جاتا ہے ⑥**

دی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [ الأنعام : ١١٠ ] ”اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے اور انھیں چھوڑ دیں گے، اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں گے۔“ یا ان کے کفر کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ دنیا ہی میں مگن ہو گئے اور اسی کو اپنی تمام کوششوں کا مرکز سمجھنے لگے، گویا آخرت پر ایمان نہ لانے کی یہ سزا ملتی ہے کہ انسان اپنے برے کاموں کو بھی اچھا سمجھنے لگتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَ اتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا﴾ [ الكهف : ١٠٣ تا ١٠٦ ] ”کہہ دے کیا ہم تمھیں وہ لوگ بتائیں جو اعمال میں سب سے زیادہ خسارے والے ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہوگئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، تو ان کے اعمال ضائع ہوگئے، سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔ یہ ان کی جزا جہنم ہے، اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کو مذاق بنایا۔“

**آیت 5** ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ...... : یہ برا عذاب دنیا میں بھی ہے کہ اموال و اولاد کے باوجود انھیں قناعت اور سکون قلب میسر نہیں، فرمایا: ﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ [ طٰہٰ : ١٢٤ ] ”اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔“ بلکہ وہ اموال و اولاد ان کے لیے عذاب کا باعث ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ [ التوبة : ٥٥ ] ”سو تجھے نہ ان کے اموال بھلے معلوم ہوں اور نہ ان کی اولاد، اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔“ اس کے علاوہ بھی یہ عذاب مختلف افراد اور اقوام پر مختلف صورتوں میں آتا ہے۔ بیماریاں، فقر، بدامنی، قتل و غارت اور دشمن کا غلبہ، غرض عذاب کی بے شمار صورتیں ہیں، پھر موت کے وقت فرشتوں کے ہاتھوں عذاب اور برزخ کے عذاب کا مرحلہ ہے اور آخرت کے عذاب کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو آخرت میں سب سے زیادہ خسارے والے قرار دیا۔

**آیت 6** ﴿ ① وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ ...... : ”مِنْ لَّدُنْ“ (کے پاس سے) کے لفظ سے قرآن مجید کی اللہ تعالیٰ کے

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ

جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا بلاشبہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے، میں عنقریب تمھارے پاس اس سے کوئی خبر لاؤں گا، یا تمھارے پاس اس سے سلگایا ہوا انگارا لے کر آؤں گا، تاکہ تم تاپ لو ⑦ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے آواز دی گئی کہ بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہے اور اللہ پاک ہے جو

ساتھ شدتِ اتصال بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ تجھے اپنے پاس سے عطا کر رہا ہے۔ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں کہ جس کا علم ناقص ہو، یا جو معاملات کی حکمت سے نا آشنا ہو، بلکہ یہ ایک کمال حکمت والے ہر چیز کا علم رکھنے والے نے اپنے پاس سے تجھے عطا کیا ہے، جس کا ہر کام اور ہر حکم حکمت سے بھرا ہوا ہے اور جسے ماضی، حال اور مستقبل کا پورا علم ہے، اس لیے نہ اس کی کوئی خبر غلط ہوتی ہے اور نہ اس کی تدبیر میں کوئی غلطی ہوتی ہے۔

② **حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ** : دونوں صفات کا گزشتہ آیات سے بھی تعلق ہے اور آئندہ انبیاء کے قصوں کے ساتھ بھی کہ ان انبیاء کی بعثت، ان پر گزرنے والے واقعات اور آپ کی طرف ان کی صحیح ترین صورت میں وحی اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کا اظہار ہے۔ یہ دونوں الفاظ مبالغہ کے لیے آتے ہیں۔ ان کو نکرہ لانے سے مزید مبالغہ پیدا ہو گیا ہے، یعنی ایک انوکھے کمال حکمت و علم رکھنے والے کے پاس سے۔

**آیت 7** **اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا** : "تَصْطَلُوْنَ" "صَلِیَ یَصْلٰی" (ع) سے باب افتعال ہے۔ اصل میں "تَصْتَلِیُوْنَ" تھا، تاء کو طاء سے بدل دیا اور یاء حذف ہو گئی۔ "شِهَابٌ" شعلہ یا انگارا۔ "قَبَسٍ" (کسی آگ سے) سلگایا ہوا۔ ان آیات کی تفسیر سورۂ اعراف میں اور سورۂ طٰہٰ کی ابتدا میں گزر چکی ہے، یہاں صرف اس مقام سے متعلق چند باتیں ذکر ہوں گی۔ "اِذْ" سے پہلے "اُذْكُرْ" محذوف ہے، یعنی اس وقت کو یاد کر جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ اس کی طرح تجھے بھی کسی پیشگی علم یا توقع کے بغیر وحی عطا کی گئی ہے۔ (دیکھیے قصص: ۸۶) اور اس کے بعد ذکر کردہ انبیاء اور ان کی اقوام کے قصوں میں تیرے اور تیری قوم کے لیے بہت سا علم و حکمت کا سامان موجود ہے۔

**آیت 8** ① **فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ** ...... : موسیٰ علیہ السلام جب اس آگ کے پاس آئے تو انھیں آواز دی گئی کہ بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہے۔ یہاں سوال ہے کہ "مَنْ فِی النَّارِ" (وہ جو آگ میں ہے) سے مراد کون ہے؟ اور "مَنْ حَوْلَهَا" (جو اس آگ کے اردگرد ہے) سے مراد کون ہے؟ بعض مفسرین نے "مَنْ فِی النَّارِ" سے مراد موسیٰ علیہ السلام لیے ہیں اور کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام آگ کے قریب تھے، اس لیے ان کو "مَنْ فِی النَّارِ" کہہ دیا گیا اور "مَنْ حَوْلَهَا" سے مراد فرشتے ہیں۔ بعض نے ان الفاظ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام اور فرشتوں کے لیے سلام کے قائم مقام قرار دیا ہے، جس طرح فرشتوں نے سارہ علیہا السلام کو "رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ" کہا تھا۔

اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑧

سارے جہانوں کا رب ہے۔⑧

صاحب ''مواہب الرحمان'' فرماتے ہیں، یہ تکلف سے خالی نہیں۔ زمخشری اور ان کے ہم خیال حضرات نے ''بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ'' کا معنی ''بُوْرِكَ فِيْ مَكَانِ النَّارِ'' کیا ہے، یعنی آگ کی جگہ بابرکت ہے اور اس کے اردگرد کی جگہ، یعنی سارا ملک شام بابرکت ہے۔ مگر ''مَنْ'' ذوی العقول کے لیے آتا ہے، اس سے مکان مراد لینا بعید بات ہے۔ سب سے ظاہر بات وہ ہے جو عبدالرزاق نے اپنی صحیح سند کے ساتھ قتادہ سے نقل کی ہے، انھوں نے فرمایا: '' نُوْرُ اللّٰهِ بُوْرِكَ '' یعنی اللہ کا نور بابرکت ہے۔ عبدالرزاق ہی نے حسن کا قول نقل کیا ہے کہ ''مَنْ فِي النَّارِ'' سے مراد نور ہے اور ''مَنْ حَوْلَهَا'' سے مراد فرشتے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ بابرکت ہے وہ ذات پاک جو اس آگ میں ہے اور وہ فرشتے بھی جو اس کے اردگرد ہیں۔ اس معنی کی تائید اگلی آیت میں مذکور الفاظ ''يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ '' سے بھی ہوتی ہے۔ یہ آگ جو موسیٰ علیہ السلام کو نظر آئی اللہ تعالیٰ کی ذات کا نور نہیں تھی بلکہ نور یا نار کا وہ پردہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے چہرے کا حجاب ہے۔ یہ تفسیر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بیٹے ابوعبیدہ نے اللہ تعالیٰ کے نور کے پردوں والی حدیث بیان کرتے ہوئے زیرِ تفسیر آیت کی تلاوت کرکے فرمائی ہے۔

صحیح مسلم میں ابوعبیدہ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں کھڑے ہوکر پانچ باتیں بیان فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِيْ لَهُ أَنْ يَّنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ، وَ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجَابُهُ النُّوْرُ وَفِيْ رِوَايَةِ أَبِيْ بَكْرٍ النَّارُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهٰى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ » [ مسلم، الإيمان، باب في قوله عليه السلام إن الله لا ينام ...... : ١٧٩ ] ''اللہ عزوجل سوتا نہیں، نہ ہی سونا اس کے لائق ہے۔ وہ ترازو کو نیچا کرتا ہے اور اسے اونچا کرتا ہے، رات کا عمل اس کی طرف دن کے عمل سے پہلے اوپر لے جایا جاتا ہے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے اس کی طرف اوپر لے جایا جاتا ہے، اس کا حجاب نور ہے۔'' ابوبکر کی روایت میں (نور کی جگہ) نار ہے۔ ''اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرے کی شعائیں اس کی مخلوق میں سے ان سب چیزوں کو جلا دیں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے۔'' مسند احمد میں ہے کہ ابوعبیدہ نے یہ حدیث بیان کر کے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ مسند أحمد : ٤٠٠/٤، ٤٠١، ح : ١٩٦٠٦ ] اور ابن ابی حاتم نے بھی اپنی تفسیر میں سورۂ نمل کی اس آیت کے تحت یہ حدیث بیان فرمائی ہے، جس کے آخر میں ابوعبیدہ نے اس آیت کی تلاوت کی ہے۔ ابن ابی حاتم کے محقق نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ [ الصحيح المسبور ]

یونانی فلسفے سے متاثر بہت سے مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآن و حدیث میں بیان کی گئی بہت سی باتوں کا انکار کر دیا، یا ان کی تاویل کی، مثلاً قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ وہ جب چاہے جہاں چاہے نور یا نار کے پردے میں محجوب رہ کر نزول فرماتا ہے، وہ رات کے پچھلے پہر آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ قیامت کے دن زمین پر

يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُۙ۝۹ وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰

اے موسیٰ! بے شک حقیقت یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں، جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۹ اور اپنی لاٹھی پھینک۔ تو جب اس نے اسے دیکھا کہ حرکت کر رہی ہے، جیسے وہ ایک سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر لوٹا اور واپس نہ مڑا۔ اے موسیٰ! مت ڈر، بے شک میں، میرے پاس رسول نہیں ڈرتے ۱۰

نزول فرمائے گا، اس دن اس کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ وہ جب چاہے، جو چاہے، جس سے چاہے کلام کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ ہمارے ان مفسرین نے ان سب باتوں کو اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی قرار دے کر ان کا انکار کر دیا، یا ان کی ایسی تاویل کی جو انکار سے بھی بدتر ہے۔ ان حضرات نے یہ نہ سوچا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے بڑھ کر اللہ کی شان نہ سمجھ سکتے ہیں، نہ بیان کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر ”مَنْ فِي النَّارِ“ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے موسیٰ علیہ السلام یا کوئی اور مراد لینے کے پیچھے بھی یہی مشکل کارفرما ہے۔

2 وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: یہ اس بات کی تردید ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے آگ کے حجاب میں نزول کو یا بذات خود کلام کرنے کو اپنے نزول یا کلام کرنے کی طرح سمجھے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿ليس كمثله شيء و هو السميع البصير﴾ [ الشوریٰ : ۱۱ ] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ یعنی یہ بھی مانو کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مانو کہ وہ سمیع بھی ہے بصیر بھی، مگر اس کا سمع و بصر تمھاری مثل نہیں۔

3 بعض حضرات نے اس جگہ کی تعیین کا تکلف کیا ہے، جہاں موسیٰ علیہ السلام کو یہ معاملہ پیش آیا تھا اور انھوں نے عیسائی بادشاہ قسطنطین کے ۳۶۵ء میں اس مقام پر ایک کنیسہ تعمیر کرنے کو بطور دلیل پیش کیا ہے، بلکہ لوگوں کی روایات کو بنیاد بنا کر ایک درخت کو بھی وہ درخت قرار دے دیا ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کو آگ نظر آئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی معتبر دلیل نہیں کہ ہم اس جگہ کی تعیین کر سکیں۔ ہدایت کے لیے وہی کافی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے بیان فرما دیا ہے، اگر اس کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی تعیین فرما دیتے۔

آیت 9 يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۴) یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اپنی دو صفات بیان فرمائیں، ایک ”عزیز“ اور دوسری ”حکیم“۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو جو عظیم ذمہ داری دی جانے والی تھی اس کے لیے انھیں یہ اطمینان دلانا ضروری تھا کہ فرعون کو دعوت دیتے وقت اس کی شان و شوکت یا قوت و عظمت سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ انھیں بھیجنے والا اللہ ہے جو سب پر غالب ہے اور جو کمال حکمت والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے گھر پرورش دلانے، پھر دس سال بکریاں چروانے اور اندھیری رات میں صحرا میں راستہ بھلا کر اچانک نبوت اور معجزے عطا کر کے فرعون کی طرف بھیجنے میں اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔

آیت 10 1 وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ ...... : ”جَآنٌّ“ اصل میں چھوٹے سفید سانپ کو کہتے ہیں۔ سورۂ اعراف

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑪ وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ⑫

مگر جس نے ظلم کیا، پھر برائی کے بعد بدل کر نیکی کی تو بے شک میں بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہوں ⑪ اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، کسی عیب کے بغیر (چمکتا ہوا) سفید نکلے گا، نو نشانیوں میں، فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔ بلاشبہ وہ نافرمان لوگ تھے ⑫

(۱۰۷) اور شعراء (۳۲) میں اس کے لیے "ثُعْبَانٌ" کا لفظ آیا ہے، جس کا معنی بڑا سانپ (اژدہا) ہے۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ شروع میں "جَآنٌّ" تھا، پھر "ثُعْبَانٌ" بن گیا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اول سٹک سی بن گئی تھی پتلی، جب فرعون کے آگے ڈالی تو ناگ ہوگئی بڑھ کر۔'' (موضح) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سانپ جسم میں اژدہا تھا، مگر تیزی میں چھوٹے سانپ جیسا تھا۔

② يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ...... : موسیٰ علیہ السلام کے خوف زدہ ہو کر پیٹھ پھیر کر لوٹنے سے ظاہر ہے کہ انھیں اس سے پہلے نہ اپنے نبی بنائے جانے کا علم تھا، نہ یہ معجزات عطا کیے جانے کا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پہلی وحی پر سخت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''اے موسیٰ! ڈرو نہیں، رسول میرے پاس ڈرا نہیں کرتے۔'' بعض حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدائش سے بھی پہلے عالم الغیب باور کروانے پر اصرار کرتے ہیں۔

**آیت 11** اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا...... : یعنی میرے حضور ڈرنے کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ کسی شخص نے فی الواقع ظلم کیا ہو، اور ظالموں کو ڈرنا ہی چاہیے، لیکن جو شخص ظلم کے بعد توبہ کر لے، برے کاموں کے بعد نیکی کی راہ اختیار کر لے اور اپنا طرز عمل بدل لے تو میں اسے معاف کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ غالباً اس میں موسیٰ علیہ السلام کے غلطی سے قبطی کو قتل کرنے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جسے انھوں نے خود ظلم کہا تھا: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ﴾ [ القصص : ١٦ ] ''اے میرے رب! یقیناً میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، سو مجھے بخش دے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا تھا، فرمایا: ﴿ فَغَفَرَ لَهٗ ﴾ [ القصص : ١٦ ] ''تو اس نے اسے بخش دیا۔'' اب پھر اس مغفرت کا حوالہ دیا جا رہا ہے کہ جب میں تمھیں معاف کر چکا تو تمھیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔

**آیت 12** ① وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ : موجودہ تورات کی دوسری کتاب خروج، باب (۴) کی آیت (۶) میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کو مبروص لکھا ہے۔ قرآن مجید چونکہ کتب سابقہ پر مہیمن (نگہبان) بن کر آیا ہے، جہاں ان میں کوئی غلطی ہو اس کی اصلاح کرتا ہے، اس لیے اس جگہ فرمایا: ﴿ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ یعنی مبروص نہ تھا۔ (ثنائی)

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰيٰتُنَا مُبۡصِرَةً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۳﴾ وَ جَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۱۴﴾

تو جب ان کے پاس ہماری نشانیاں آنکھیں کھول دینے والی پہنچیں تو انھوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے ﴿۱۳﴾ اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل ان کا اچھی طرح یقین کر چکے تھے، پس دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا ﴿۱۴﴾

② فِيۡ تِسۡعِ اٰيٰتٍ ......: یعنی یہ دو معجزے ان نو (۹) نشانیوں میں سے ہیں، جن کے ذریعے سے میں نے تیری مدد کی ہے۔ ان نو نشانیوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۰۱) بعض نے کہا ہے کہ یہ دو نشانیاں (عصا اور ید بیضا) ان نو (۹) نشانیوں کے علاوہ تھیں، اس صورت میں "فِيۡ" بمعنی "مَعَ" ہوگا اور ترجمہ ہوگا "نو نشانیوں سمیت۔" (قرطبی)

**آیت 13** فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰيٰتُنَا مُبۡصِرَةً ......: "مُبۡصِرَةً" دکھانے والی، آنکھیں کھول دینے والی، واضح، روشن۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر آیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق ان پر کوئی عام عذاب آتا تو فرعون اور اس کے درباری موسیٰ علیہ السلام سے کہتے تھے کہ اپنے رب سے دعا کر کے یہ عذاب ٹلوا دو، تو تم جو کہتے ہو ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ عذاب ٹل جاتا تو وہ اپنے وعدے سے مکر جاتے۔ ظاہر ہے سارے ملک پر قحط، طوفان، ٹڈی دل اور دوسرے الٰہی لشکروں کا امڈ آنا جادو کا کرشمہ کسی طرح نہیں ہوسکتا تھا۔ آنکھیں کھول دینے والی اتنی نشانیاں آنے پر بھی انھوں نے انھیں کھلا جادو کہہ دیا۔

**آیت 14** ① وَ جَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ......: "أَيۡقَنَ يُوۡقِنُ" کا معنی بھی یقین کرنا ہے، "اِسۡتَيۡقَنَ" میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی کیا گیا ہے "اچھی طرح یقین کر لیا۔" جحود یہ ہے کہ دل سے ایک بات کو درست سمجھتے ہوئے زبان سے اس کا انکار کر دے، یعنی فرعون اور اس کی قوم نے ان معجزوں کے سچا ہونے کے یقین کے باوجود ان کا انکار کر دیا۔ یہی بات موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہی تھی: ﴿ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَاۤ اَنۡزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ﴾ [ بني إسرائيل : ۱۰۲ ] "بلاشبہ یقیناً تو جان چکا ہے کہ انھیں آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا کسی نے نہیں اتارا۔"

② ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا: یعنی پوری طرح یقین کے باوجود ان کے انکار کی دو وجہیں تھیں، ایک ظلم، دوسرا علو۔ ظلم یہ کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو رسول ماننے کے بجائے جھوٹا کہہ دیا، بلکہ جادوگر قرار دے دیا اور علو کا بیان ان آیات میں ہے: ﴿ ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِهٖ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَ كَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴾ [ المؤمنون : ۴۵ تا ۴۷ ] "پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی آیات اور واضح دلیل دے کر بھیجا۔ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔ تو انھوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں، حالانکہ ان کے لوگ ہمارے غلام ہیں۔"

③ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ: اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کو جھٹلانے والوں کے لیے وعید

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۵

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے داؤد اور سلیمان کو ایک علم دیا اور ان دونوں نے کہا تمام تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ۝۱۵

ہے۔ "فَانْظُرْ" (پس دیکھ) کا مخاطب ہر شخص بھی ہوسکتا ہے۔

آیت 15 ① وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا : موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے میں ان لوگوں کا نمونہ ملتا ہے جنھوں نے جانتے بوجھتے ہوئے محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کیا، جیسے ابولہب اور ابوجہل وغیرہ اور سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے قصے میں ان لوگوں کا نمونہ ہے جو حق واضح ہونے پر ایمان لے آئے اور فرعون کے طرز عمل کے برعکس ان کی سلطنت ان کے لیے حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہیں بنی۔ یہی حال رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کا تھا۔ یمن کا بادشاہ نجاشی ہو یا سردارانِ قریش میں سے ایمان لانے والے ہوں، یا مدینہ کے اوس و خزرج کے سردار۔

② "عِلْمًا" کی تنوین تنکیر کے لیے بھی ہوسکتی ہے، جس سے ایک قسم کا علم مراد ہو، یعنی ہم نے ان دونوں کو ایک علم عطا کیا جو دوسروں کو عطا نہیں کیا گیا۔ مراد پرندوں کی بولی کا علم ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں: "ہمیں ان دو پیغمبروں کے سوا کسی کے متعلق معلوم نہیں کہ ان کو یہ علم دیا گیا ہو۔" اور یہ تنوین تعظیم کے لیے بھی ہوسکتی ہے، یعنی ہم نے ان دونوں کو عظیم الشان علم عطا کیا، جس میں نبوت و حکمت، قضا و سلطنت، پرندوں کی بولی اور سائنس کے علوم شامل تھے۔ جن کی بدولت ان کے زمانے میں ان کی سلطنت برّی، بحری اور فضائی اعتبار سے اپنے دور کی سب سے طاقت ور حکومت تھی، بلکہ سلیمان علیہ السلام کو تو وہ حکومت عطا کی کہ قیامت تک آنے والی کوئی سلطنت بھی ان کی سلطنت جیسی نہیں ہوسکتی، کیونکہ انھوں نے دعا کی تھی: ﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ﴾ [ صٓ : ۳۵ ] "اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔"

③ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ...... : یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کا حصہ تھا کہ ان تمام نعمتوں پر مغرور ہونے کے بجائے انھوں نے انھیں اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھا اور اس کا شکر ادا کیا۔

④ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ ...... : "جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی" سب پر فضیلت کا دعویٰ اس لیے نہیں کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس دعویٰ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا تھا اور داؤد اور سلیمان علیہما السلام جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر چلتے تھے، یہ جانتے ہوئے تمام بندوں پر فضیلت کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے اور اس لیے کہ تمام اولاد آدم پر فضیلت تو صرف خاتم الانبیاء ﷺ ہی کو حاصل ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ أَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَ أَوَّلُ شَافِعٍ وَ أَوَّلُ مُشَفَّعٍ )) [ مسلم، الفضائل، باب تفضیل نبینا صلی اللہ علیہ وسلم علی جمیع الخلائق...... : ۲۲۷۸ ] "میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں اور پہلا شخص ہوں جس سے قبر پھٹے گی اور پہلا سفارش کرنے والا ہوں اور پہلا

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾

اور سلیمان داؤد کا وارث بنا اور اس نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ہمیں ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔ بے شک یہ یقیناً یہی واضح فضل ہے ﴿١٦﴾

شخص ہوں جس کی سفارش قبول کی جائے گی۔''

**آیت 16** ① وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ...... : اس سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت و سلطنت اور علم و عمل کی وراثت ہے۔ اگر مال و جائداد کی وراثت ہوتی تو وارث کے طور پر صرف سلیمان علیہ السلام کا ذکر نہ ہوتا بلکہ اس میں داؤد علیہ السلام کے دوسرے بیٹے بھی شریک ہوتے۔ علاوہ ازیں اگر ان کے ذاتی اموال کی وراثت ہی مراد ہو تو سلیمان علیہ السلام کا ''يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ'' کہہ کر سب لوگوں کو بتانا بے معنی ہو جاتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے اموال و جائداد کا کوئی وارث نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ )) [ بخاري، الفرائض، باب قول النبي ﷺ لا نورث...... : ٦٧٢٧، عن عائشة رضی اللہ عنہا ] ''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو چھوڑ جائیں صدقہ ہے۔'' اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَ إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا، وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ )) [ أبوداوٗد، العلم، باب في فضل العلم : ٣٦٤١، قال الألباني صحيح ] ''یقیناً علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے ورثے میں دینار و درہم نہیں چھوڑے، انھوں نے صرف علم کا ورثہ چھوڑا ہے، تو جو اسے حاصل کر لے اس نے بہت بڑا حصہ حاصل کر لیا۔'' مزید دیکھیے سورۂ مریم (٥، ٦)۔

② وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ : یعنی ہمیں پرندوں کی بولی سمجھنا سکھایا گیا ہے، بلکہ بولنا بھی، جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کا ہُد ہُد سے مکالمہ آگے آ رہا ہے، پھر انھیں صرف پرندوں ہی نہیں بلکہ تمام حیوانات کی بولی سکھائی گئی تھی، جیسا کہ چیونٹی کی بات سننے کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ پرندوں کا ذکر اختصار کے لیے ہے، کیونکہ پرندے تمام جانداروں سے زیادہ انسان سے دور رہنے اور بدکنے والے ہیں۔ جب داؤد اور سلیمان علیہما السلام ان کی بولی جانتے تھے تو دوسرے جانوروں کی بولی کا علم تو انھیں بالا ولیٰ تھا، جو انسان کے قریب رہتے ہیں۔ تمام جانوروں میں سے پرندوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے بھی ہے کہ وہ ان کی فوج کا باقاعدہ حصہ تھے۔ پرندوں کی بولی کے علم سے مراد اندازوں پر مبنی علم نہیں، جو علم الحیوانات کے ماہرین ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ مراد واضح طور پر ان کی باتوں کو سمجھنا ہے، جو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ خاص معجزہ تھا۔

③ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ : ''كُلِّ شَيْءٍ'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اس میں علم و نبوت، مال و حکمت حتیٰ کہ جنوں، انسانوں، پرندوں، حیوانات اور ہوا وغیرہ کی تسخیر سبھی چیزیں شامل ہیں۔ (شوکانی) یہاں ''كُلِّ'' کا لفظ کثیر کے معنی میں ہے، جیسا کہ ہُد ہُد نے ملکہ سبا کے متعلق کہا تھا: ﴿ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [ النمل : ٢٣ ] ''اور اسے

وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ

اور سلیمان کے لیے اس کے لشکر جمع کیے گئے، جو جنوں اور انسانوں اور پرندوں سے تھے، پھر وہ الگ الگ تقسیم کیے جاتے تھے ﴿۱۷﴾ یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی پر آئے تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں داخل

ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔" حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ اسے ہر چیز میں سے حصہ تو نہیں ملا تھا، اور جیسا کہ قوم عاد پر آنے والی آندھی کے متعلق فرمایا: ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا ﴾ [ الأحقاف: ٢٥ ] "وہ (آندھی) ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی۔"

❹ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ: فضل کا معنی برتری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں عطا کرنے کے لیے بے شمار انسانوں میں سے ہمیں منتخب فرمایا، یقیناً یہ واضح برتری ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ یہ بتانے سے سلیمان علیہ السلام کا مقصد فخر کا نہیں بلکہ شکر کا اظہار تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں کو یہ بات بتانا ان کی ذمہ داری تھی، تاکہ لوگ ان کی قدر پہچانیں اور ان کی اطاعت کریں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ )) [ ترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة بني إسرائيل : ٣١٤٨، قال الألباني صحيح ] "میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں اور کوئی فخر نہیں۔"

آیت 17 ❶ وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ ......: "يُوْزَعُوْنَ" اگر " وَزَعَ يَزَعُ " بروزن " وَضَعَ يَضَعُ " سے ہو تو اس کا معنی روکنا ہے اور اگر " أَوْزَعَ يُوْزِعُ " (افعال) سے ہو تو اس کا معنی تقسیم کرنا ہے۔ (قاموس) اس میں سلیمان علیہ السلام کی اس خصوصیت و فضیلت کا ذکر ہے جس میں وہ پوری انسانی تاریخ میں منفرد ہیں کہ ان کی حکمرانی صرف انسانوں ہی پر نہ تھی، بلکہ جنّات، حیوانات اور پرندے حتیٰ کہ ہوا تک ان کے تابع فرمان تھی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کے تمام لشکروں یعنی انسانوں، جنّوں اور پرندوں سب کو جمع کیا گیا۔ ظاہر ہے یہ اہتمام جہاد فی سبیل اللہ ہی کے لیے کیا جاتا تھا، تاکہ ساری دنیا میں اللہ کا دین غالب اور اس کا بول بالا ہو جائے۔ اس کی دلیل آگے آ رہی ہے کہ کس طرح ملکہ سبا اور اس کی قوم کے شرک کا علم ہونے پر سلیمان علیہ السلام نے اسے تابع فرمان ہو کر حاضر ہونے کا حکم دیا اور حکم عدولی کی صورت میں اسے اپنے لشکروں کی دھمکی دی، فرمایا: ﴿ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا ﴾ [ النمل : ٣٧ ] "اب ہر صورت ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کے مقابلے کی ان میں کوئی طاقت نہیں۔"

❷ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ: یعنی سب کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، مثلاً جنّوں کا گروہ الگ، انسانوں کا گروہ الگ اور پرندوں کا گروہ الگ، پھر فوجی ترتیب کے مطابق ان کی تقسیم کی جاتی، مثلاً دس دس آدمیوں پر ایک امیر، پھر سو آدمیوں پر امیر، پھر ہزار پر۔ غرض تمام لشکر بہترین تقسیم کے ساتھ مرتب تھے، جس سے نہایت مختصر وقت میں ان کا جائزہ بھی لیا جا سکتا تھا اور جنگی احکام پر عمل درآمد بھی ہو جاتا تھا۔

آیت 18 حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ......: اس آیت سے بہت سے مسائل معلوم ہوتے ہیں: ① چیونٹیوں کو اللہ تعالیٰ

وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

ہو جاؤ، کہیں سلیمان اور اس کے لشکر تمھیں کچل نہ دیں اور وہ شعور نہ رکھتے ہوں ﴿۱۸﴾

نے اجتماعیت کا شعور بخشا ہے، چنانچہ وہ بستیوں کی صورت میں رہتی ہیں۔ ان کی باقاعدہ ایک ملکہ ہوتی ہے، جس کے احکام کے تحت وہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کی بستیوں کے اندر حیرت انگیز ترتیب کے ساتھ مکانات، ان کی دہلیزیں، چھتیں، راستے، غرض سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ آنے والے وقت کے لیے غذا جمع کرتی ہیں اور اسے ایسے طریقے سے محفوظ کرتی ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، چنانچہ وہ غلے کے ہر دانے کو کاٹ کر دو حصوں میں کر دیتی ہیں، تاکہ وہ نمی سے اُگ نہ جائے۔ ان میں پہرے دار، لڑاکا دستے، خوراک جمع کرنے والے اور صفائی کرنے والے، غرض ہر طرح کے مجموعے ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہ وادی جس پر سے سلیمان علیہ السلام گزرنے والے تھے ایسی ہی وادی تھی جس میں چیونٹیوں کی بستیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا محل وقوع بیان نہیں فرمایا، نہ ہدایت کے مقصد کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ مفسرین میں سے کوئی وہ وادی شام میں بیان کرتا ہے، کوئی طائف میں۔ اصل مقام کوئی بھی نہیں جانتا۔ ② سلیمان علیہ السلام کے اس وادی کے قریب آنے پر ایک چیونٹی نے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اس بظاہر حقیر سی مخلوق کا ایک فرد اپنی ساری قوم کے لیے فکر مند ہے اور انھیں بچنے کی تدبیر سے آگاہ کر رہا ہے۔ یہ زندہ قوموں کی علامت ہے۔ جب کسی قوم کے افراد صرف اپنی فکر میں پڑ جائیں تو اس قوم کو ذلت اور بربادی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی، جیسا کہ اس وقت امتِ مسلمہ کے اکثر افراد کا حال ہو چکا ہے۔

③ سلیمان علیہ السلام کا عالم الغیب نہ ہونا چیونٹیوں کو بھی معلوم تھا، چنانچہ اس چیونٹی نے کہا، کہیں سلیمان اور اس کے لشکر تمھیں کچل نہ دیں، جب کہ وہ شعور نہ رکھتے ہوں۔ ④ اس میں سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکروں کی تعریف بھی ہے کہ وہ جانتے بوجھتے ہوئے کبھی زیادتی نہیں کرتے، لاعلمی میں کوئی ان کی یلغار میں کچلا جائے تو الگ بات ہے۔ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی شان تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [ الفتح : ۲۵ ] ''اور اگر کچھ مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں، جنھیں تم نہیں جانتے تھے (اگر یہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے تو تم پر لاعلمی میں ان کی وجہ سے عیب لگ جائے گا (تو ان پر حملہ کر دیا جاتا)۔'' ⑤ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عام راستے پر چلنے والوں کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ چیونٹیوں وغیرہ کو بچائیں، یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اپنا بچاؤ خود کریں۔

⑥ یہ بھی معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام پرندوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کی بولی بھی سمجھتے تھے، یہ ان کا معجزہ تھا۔ ⑦ چیونٹی کی آواز آدمی کو سنائی نہیں دیتی، سلیمان علیہ السلام نے سن لی، یہ چیونٹی کی بولی سمجھنے کے علاوہ مزید معجزہ ہے۔ ⑧ معجزات کے بعض منکروں نے لکھا ہے کہ ''وادی النمل'' بنو نمل قبیلے کا مسکن تھی اور یہ نملہ چیونٹی نہیں تھی بلکہ اس قبیلے کا ایک آدمی تھا۔ مگر یہ قرآن کی بدترین تحریف ہے، کیونکہ چیونٹی کے قول '' وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ '' سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عام چیونٹیاں تھیں جو

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

**تو وہ اس کی بات سے ہنستا ہوا مسکرایا اور اس نے کہا اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر کروں، جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہے اور یہ کہ میں نیک عمل کروں، جسے تو پسند کرے اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما ﴿۱۹﴾**

زمین پر رینگتی پھرتی ہیں، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی لشکر انسانوں سے بھری ہوئی وادی کو کچلتا ہوا گزر جائے اور اسے پتا ہی نہ چلے۔ علاوہ ازیں اس صورت میں آیت کا اس علم سے کوئی تعلق نہیں رہتا جس کے عطا ہونے پر سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے شکر نعمت کی توفیق مانگ رہے ہیں۔ نہ تاریخ میں بنونمل نامی قبیلے کا کوئی وجود پایا جاتا ہے، نہ عربی زبان میں۔ بنوکلب قبیلے کے آدمی کو کلب یا بنو اسد قبیلے کے آدمی کو اسد کہا جاتا ہے کہ بنونمل قبیلے کے آدمی کو نملہ کہا جائے!! معجزات کے منکروں کی مشکل یہ ہے کہ وہ قرآن کا صاف انکار کرنے کی جرأت نہیں رکھتے، اس لیے اس کے معانی میں تحریف کرتے رہتے ہیں۔

**آیت 19** ① فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا: تبسم بعض اوقات غصے اور ناراضی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے، جیسا کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیثِ توبہ میں ہے: (( تَبَسَّمَ تَبَسُّمَ الْمُغْضَبِ )) [ بخاري : ٤٤١٨ ] کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھ کر مسکرائے، غصے والے کی طرح مسکرانا۔ تبسم کے بعد "ضَاحِكًا" اس لیے فرمایا کہ یہ مسکراہٹ ہنسنے کا پیش خیمہ تھی، جو خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ مسکرانے اور ہنسنے کی وجہ ایک تو چیونٹی کی دانش مندی اور اپنی قوم کی خیر خواہی پر تعجب تھا، دوسری وجہ اپنی نیک شہرت پر خوشی تھی کہ چیونٹیاں تک جانتی ہیں کہ سلیمان دانستہ کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔

② وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ ......: چیونٹی کی آواز سن لینا، پھر اس کی بات سمجھ لینا، پھر اپنی نیک شہرت، یہ سب ایسی چیزیں تھیں کہ سلیمان علیہ السلام کا دل فخر و غرور کے بجائے شکر کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ مگر یہ سوچ کر کہ میں اس نعمت کا اور ان تمام نعمتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہیں، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے شکر کی توفیق عطا کرنے کی دعا کی۔ والدین پر نعمت بھی آدمی کے حق میں نعمت ہوتی ہے۔

③ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ: عمل صالح وہ ہے جو خالص اللہ کے لیے ہو اور اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو۔ سلیمان علیہ السلام کو علم عطا ہونے پر عمل کی فکر دامن گیر ہوئی، کیونکہ عمل کے بغیر علم انسان کے خلاف حجت ہوتا ہے۔

④ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے صالح بندوں میں شمولیت اور جنت کا حصول

وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝۲۰

اور اس نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا مجھے کیا ہے کہ میں فلاں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا، یا وہ غائب ہونے والوں سے ہے ۝۲۰

اللہ کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا: «لَنْ يُّدْخِلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، قَالُوْا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ لَا، وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَ رَحْمَةٍ» [ بخاري، المرضى، باب تمني المريض الموت : ٥٦٧٣ ] ”کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔“ لوگوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی نہیں؟“ فرمایا: ”نہیں! میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل اور رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے۔“

5 سلیمان علیہ السلام نے نبی ہو کر صالحین میں داخل ہونے کی دعا کیوں کی؟ دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۱)۔

آیت 20 1 وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى ...... : اس سے سلیمان علیہ السلام کے کمال احتیاط، نظم و ترتیب اور بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے کی ذاتی طور پر نگرانی کا پتا چلتا ہے، حتیٰ کہ پرندوں میں سے ایک پرندے ہُد ہُد اور ہُد ہُد میں سے ایک خاص ہُد ہُد کی عدم موجودگی بھی ان سے مخفی نہ رہ سکی۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم بھی چھوٹے سے چھوٹے معاملے کی بہ نفس نفیس خبر رکھتے تھے۔ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حالات، خصوصاً ان کا شام کا سفر اس کی بہترین مثال ہے۔

2 فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ: یعنی معاملہ کیا ہے، آیا ہُد ہُد یہاں موجود ہے اور مجھے نظر نہیں آ رہا، یا وہ ان میں سے ہے جو غائب ہیں؟ معلوم ہوا جائزے میں اور بھی کئی لوگ غائب تھے، مگر ان کے متعلق باز پرس کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے وہ اجازت سے غائب ہوں، یا ان کے تذکرے کی ضرورت نہ ہو۔ اس واقعہ سے انبیاء علیہم السلام کے عالم الغیب ہونے کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ اگر سلیمان علیہ السلام کو ہُد ہُد کے متعلق علم ہوتا تو یہ بات نہ کہتے۔

3 اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے ہُد ہُد کو اس لیے طلب کیا تھا کہ وہ زمین کے نیچے پانی دیکھ لیتا تھا، مگر یہ بات بے دلیل ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ بتا دیتا، یا رسول اللہ ﷺ اس کا ذکر فرما دیتے۔ آیت کے الفاظ بھی اس مفہوم کے خلاف ہیں، کیونکہ اس میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے تمام پرندوں کا جائزہ لیا تو ایک خاص ہُد ہُد (الْهُدْهُدَ) کو غائب پایا۔ اس میں پانی کی ضرورت کے لیے ہُد ہُد کو طلب کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ ہُد ہُد کے متعلق سوال کی وجہ لشکر کا جائزہ تھا اور لشکر کا جائزہ مجاہدین کی معمول کی بات ہے۔ علاوہ ازیں پانی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے سلیمان علیہ السلام کو ہُد ہُد کی کوئی محتاجی نہ تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جنّوں اور عفریتوں کی وہ فوج عطا کر رکھی تھی جسے کسی بھی جگہ سے پانی لانا کچھ

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۲۱ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ

یقیناً میں اسے ضرور سزا دوں گا، بہت سخت سزا، یا میں ضرور ہی اسے ذبح کر دوں گا، یا ضرور ہی میرے پاس کوئی واضح دلیل لے کر آئے گا ﴿۲۱﴾ پس وہ کچھ دیر ٹھہرا، جو زیادہ نہ تھی، پھر اس نے کہا میں نے اس بات کا احاطہ کیا ہے

مشکل نہ تھا (جیسا کہ آنکھ جھپکنے میں ملکہ سبا کا تخت آ جانا، اس کی واضح مثال ہے)۔ کوئی قدیم مفسر اس قسم کی کوئی بے سروپا اسرائیلی روایت نقل کر دیتا ہے تو بعد والے مفسرین اسے اندھا دھند نقل کرتے جاتے ہیں، یہ سوچتے ہی نہیں کہ اس کا کوئی ثبوت بھی ہے یا نہیں، حتیٰ کہ ایسی بہت سی بے سروپا باتوں کو متفق علیہ حقیقت سمجھ لیا جاتا ہے۔ (تفسیر السعدی)

**آیت 21** لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا...... : ہُد ہُد کا بلا اجازت غائب ہونا صریح نافرمانی تھا، اس لیے سلیمان علیہ السلام نے واضح عُذر پیش نہ کرنے کی صورت میں اس کے لیے دو سزائیں سنائیں، ایک ذبح کر دینا اور دوسری ذبح سے کمتر کوئی سخت سزا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سلطان کی بلا عذر نافرمانی پر تعزیر ہونی چاہیے، اگر کوئی مجاہد بلا اجازت غائب ہوتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ آیا یہ اس کا معمول ہے یا اتفاق سے ایسا ہوا ہے، پھر معمول ہونے کی صورت میں اس کی غیر حاضری اگر لشکر پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے طرزِ عمل سے امیر کے احکام کی قدر و قیمت باقی نہ رہنے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا جرم بہت بڑا بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس موقع کو بھی دیکھا جاتا ہے جس سے وہ غائب ہوا ہے، اگر اس کی ذمہ داری ایسی ہے کہ اس کے غائب ہونے یا سو جانے سے پورے لشکر کی تباہی کا خطرہ ہے تو ایسی کوتاہی معاف کرنے کا مطلب اپنے لشکر کو آپ ہی برباد کر دینا ہے۔ اس کے باوجود سلیمان علیہ السلام کا کمال انصاف اور تحمل دیکھیے کہ واضح دلیل پیش کرنے کی صورت میں اس سزا سے مستثنیٰ قرار دیا۔

**آیت 22** ① فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ...... : احاطہ کا معنی کسی چیز کا پورا علم اور مکمل معلومات ہوتا ہے۔ ہُد ہُد کو بھی فکر تھی کہ غیر حاضری کی کیا سزا ہو سکتی ہے، اس لیے وہ تھوڑی ہی دیر میں حاضر ہو گیا اور اپنی غیر حاضری کا عُذر بیان کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے سلیمان علیہ السلام کے دل میں اس خبر کا تجسس اور شوق پیدا کیا جو وہ سنانے چلا تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ میں نے اس بات کی مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں جس کی مکمل معلومات آپ کے پاس نہیں اور میں سبا سے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔

② اس سے معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کو سبا کے پورے حالات معلوم نہ تھے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''سلیمان علیہ السلام کو اس ملک کا حال مفصل نہ پہنچا تھا، اب پہنچا۔'' (موضح) یہاں ایک سوال ہے کہ اتنی عظیم الشان سلطنت کے باوجود سلیمان علیہ السلام کو سبا اور یمن کا علم کیوں نہ ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یہ بات درست نہیں کہ سلیمان علیہ السلام کو یمن کا علم نہ تھا، بات صرف یہ ہے کہ وہ دوسرے علاقوں کے معاملات میں مصروفیت کی وجہ سے اس کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے ہُد ہُد نے جو چشم دید حالات بیان کیے، وہ اس سے پہلے انھیں معلوم نہیں ہو سکے تھے۔ ہُد ہُد نے بھی احاطہ علم کی نفی کی ہے، علم کی نفی نہیں کی۔ اس

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾

جس کا احاطہ تو نے نہیں کیا اور میں تیرے پاس سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں ﴿۲۲﴾

کے علاوہ ہُد ہُد نے عورت کے حکمران ہونے اور اس کی اور اس کی قوم کی آفتاب پرستی کو زیادہ نمایاں کیا، کیونکہ اس کے نزدیک ان میں سے کوئی بات بھی قابل برداشت نہیں تھی۔

③ سلیمان علیہ السلام وہ عظیم پیغمبر تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا﴾ [ النمل : ١٥ ] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے داؤد اور سلیمان کو ایک علم دیا۔'' ان کے مقابلے میں علمی لحاظ سے ہُد ہُد کی کوئی حیثیت نہ تھی، اس کے باوجود ہُد ہُد نے دعوے سے کہا کہ میں نے اس بات کا احاطہ کیا ہے جس کا آپ نے احاطہ نہیں کیا۔ سلیمان علیہ السلام اس پر نہ ناراض ہوئے، نہ اسے گستاخ قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا ایک کم مرتبہ شخص کو کوئی ایسی بات معلوم ہو سکتی ہے جو اس سے عالی مرتبے والے کو معلوم نہ ہو، مثلاً یہ مسئلہ کہ اجازت تین دفعہ مانگی جاتی ہے، اس کے بعد واپس چلے جانا چاہیے، عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا۔ [ دیکھیے أبوداؤد : ٥١٨٠ ] جنابت کے لیے تیمم کا مسئلہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو یاد رہا، عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے ذہن میں نہ رہا۔ چنانچہ وہ جنبی کے لیے تیمم کے قائل نہیں تھے۔ [دیکھیے بخاري : ٣٤٦، ٣٤٧] وہ درخت جو مسلم کی مانند ہے، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے دوسرے حاضرین کے ذہن میں نہ آیا، ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ذہن میں آ گیا۔ [ دیکھیے بخاري : ٦١ ] صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے: (( أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكَاةَ )) یہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کو معلوم تھی، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو معلوم نہ تھی۔ اس پر حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ''اس قصے میں دلیل ہے کہ سنت بعض اوقات اکابر صحابہ سے مخفی رہ جاتی ہے اور دوسرے صحابہ اس پر مطلع ہو جاتے ہیں، اس لیے آراء کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی، خواہ وہ کتنی قوی ہوں، جب ان کے خلاف سنت موجود ہو اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ سنت فلاں سے کیسے مخفی رہ گئی؟'' (واللہ الموفق)

[ فتح الباري، الإيمان، باب : ﴿ فإن تابوا و أقاموا الصلاة...... ﴾، تحت ح : ٢٥ ]

④ فروہ بن مُسَیک مرادی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب سبا کے بارے میں آیات نازل ہوئیں، (جیسے سبا: ۱۵) تو ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! یہ سبا کیا ہے، کوئی زمین ہے یا کوئی عورت ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَيْسَ بِأَرْضٍ وَلَا امْرَأَةٍ وَلٰكِنَّهُ رَجُلٌ وَلَدَ عَشَرَةً مِنَ الْعَرَبِ، فَتَيَامَنَ مِنْهُمْ سِتَّةٌ وَ تَشَاءَمَ مِنْهُمْ أَرْبَعَةٌ، فَأَمَّا الَّذِيْنَ تَشَاءَمُوْا : فَلَخْمٌ وَ جُذَامٌ وَ غَسَّانُ وَ عَامِلَةُ، وَ أَمَّا الَّذِيْنَ تَيَامَنُوْا فَالْأَزْدُ وَالْأَشْعَرِيُّوْنَ وَحِمْيَرٌ وَكِنْدَةُ وَمَذْحِجٌ وَأَنْمَارٌ، فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَا أَنْمَارٌ؟ قَالَ: الَّذِيْنَ مِنْهُمْ خَثْعَمٌ وَبَجِيْلَةُ )) [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة سبا : ٣٢٢٢، قال الألباني صحيح حسن ] ''وہ نہ زمین ہے نہ عورت، بلکہ عرب کا ایک آدمی تھا جس کے ہاں دس بچے پیدا ہوئے، ان میں سے چھ یمن میں چلے گئے اور چار شام کو چلے گئے۔ جو لوگ شام میں گئے تھے وہ یہ ہیں: لخم، جذام، غسان اور عاملہ اور

إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾

**بے شک میں نے ایک عورت کو پایا کہ ان پر حکومت کر رہی ہے اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے اور اس کا ایک بڑا تخت ہے ﴿۲۳﴾**

جو یمن میں گئے تھے وہ یہ ہیں : ازد، اشعرون، حمیر، مذحج اور انمار۔'' اس نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! انمار سے مراد کون ہیں؟'' فرمایا: ''وہی جن میں سے خثعم اور بجیلہ ہیں۔'' بعد میں اس قوم کا اور یمن کے اس شہر کا نام بھی سبا پڑ گیا، جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ یہ شہر یمن کے موجودہ دار الحکومت صنعاء سے تقریباً پچپس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

⑤ یہاں ایک لطیف نکتہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نبی تھے، مگر یہ ''نَبَأٌ'' (خبر) ان کے پاس نہ تھی۔ ہدہد نبی نہ تھا، مگر یہ ''نَبَأٌ'' (خبر) اس کے پاس تھی۔ معلوم ہوا نبی کے پاس ہر ''نَبَأٌ'' نہیں ہوتی، نہ وہ عالم الغیب ہوتا ہے، بلکہ اس کے پاس صرف اتنی ''نَبَأٌ'' ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ اسے بتا دے اور صرف کسی ''نَبَأٌ'' سے کوئی شخص نبی نہیں بن جاتا، جب تک اسے وحی الٰہی سے خبر نہ دی جاتی ہو۔ (الشیخ محمد حسین شیخوپوری رحمہ اللہ)

⑥ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حکمران کو حالات سے باخبر رہنے کے لیے تمام اطراف میں جاسوس مقرر کرنے ضروری ہیں۔

**آیت 23** ① إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ : ہدہد کے لیے یہ بات بڑے تعجب کی تھی کہ کسی قوم کی بادشاہ ایک عورت ہو۔ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً )) [ بخاري، المغازي، باب كتاب النبي ﷺ إلى كسرىٰ و قيصر : ٤٤٢٥، ٧٠٩٩ ] ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جنھوں نے اپنے معاملے کا والی ایک عورت کو بنا دیا۔''

② وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ : یعنی اسے سلطنت کے لیے درکار ہر چیز دی گئی ہے۔ ''كُلِّ'' کا مفہوم ہر مقام کی مناسبت سے متعین ہوتا ہے، ورنہ اسے ہر چیز تو نہیں دی گئی تھی۔

③ اس عورت کا نام مفسرین نے بلقیس بیان کیا ہے، بعض نے لکھا ہے کہ اس کی ماں جنّوں سے تھی، مگر یہ بات قرآن یا حدیث سے ثابت نہیں، اگر ضرورت ہوتی تو قرآن میں اس کا نام ضرور بیان ہوتا اور انسانوں اور جنّوں کی اس رشتہ داری کا ذکر بھی ہوتا۔ یقیناً اس کا نام و نسب ذکر نہ کرنے ہی میں حکمت ہے۔ اس لیے آپ اسے بلقیس کے بجائے ملکہ سبا کہہ سکتے ہیں۔

④ اسرائیلیات میں کس قدر مبالغہ ہوتا ہے، خواہ بیان کرنے والے کتنے ثقہ اور کس پائے کے ہوں، اس کا اندازہ مفسرین کے ان بیانات سے ہوتا ہے جن میں انھوں نے ملکہ سبا کی افواج کی تعداد بیان کی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں سے اس کے متعلق تین اقوال ملاحظہ فرمائیں: ① ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے معاملے والی خاتون کے ساتھ ایک ہزار سردار تھے اور ہر سردار کے تحت ایک لاکھ جنگجو تھے (کل تعداد دس کروڑ ہوئی)۔ ② مجاہد نے کہا، ملکہ سبا کے تحت بارہ ہزار سردار تھے اور ہر سردار کے تحت ایک لاکھ جنگجو تھے (کل تعداد ایک ارب بیس کروڑ)۔ ③ قتادہ نے کہا، اس کے مشیر تین سو بارہ

وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾

میں نے اسے اور اس کی قوم کو پایا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال مزیّن کر دیے ہیں، پس انھیں اصل راستے سے روک دیا ہے، پس وہ ہدایت نہیں پاتے ﴿۲۴﴾

آدمی تھے، ہر آدمی دس ہزار پر امیر تھا (کل تعداد اکتیس لاکھ بیس ہزار)۔ ابن کثیر نے فرمایا: ''یہ قول زیادہ قریب ہے، اگرچہ ملک یمن کے لحاظ سے یہ بھی بہت زیادہ ہے۔''

یہ روایات اگرچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ سے آئی ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں۔ ان کا اسرائیلی ہونا ظاہر ہے اور ابن کثیر نے دو لفظوں میں ان کا ساقط الاعتبار ہونا بیان فرما دیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اتنی فوج تو بہت دور کی بات ہے، آیا اس وقت ملک یمن یا شاید پوری دنیا کی آبادی بھی ایک ارب بیس کروڑ تھی؟ اس سے پہلے سلیمان علیہ السلام کے لشکروں کی تعداد بھی مفسرین نے اسی انداز سے بیان کی ہے اور کئی مفسرین نے ناقابل اعتبار کہہ کر اسے نقل نہیں کیا۔ بہرحال ''**وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ**'' سے یہ ظاہر ہے کہ ملکہ عظیم الشّان سلطنت کی مالک تھی اور اسے مال و دولت، افواج اور اسلحہ وغیرہ کی تمام چیزیں میسر تھیں، جو حکومت کے لیے درکار ہوتی ہیں۔

⑤ **وَ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ** : ہُد ہُد نے اس کے تخت کا خاص طور پر ذکر کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تخت میں کوئی ایسی خوبی تھی کہ سلیمان علیہ السلام جیسے شان و شوکت والے بادشاہ کے ساتھ رہنے والے ہُد ہُد نے بھی اسے عظیم قرار دیا۔ یہاں بھی بعض مفسرین نے ایسی اسرائیلی روایات ذکر کی ہیں جو پہلی ہی نظر میں فضول دکھائی دیتی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ اسی (۸۰) ہاتھ (۱۲۰ فٹ) لمبا اور چالیس (۴۰) ہاتھ (۶۰ فٹ) چوڑا تھا۔ بھلا ایک عورت کو بیٹھنے کے لیے اتنے لمبے چوڑے تخت کی کیا ضرورت تھی۔ طبری نے یہاں بہت خوب صورت بات فرمائی ہے کہ عظیم سے مراد یہاں قدر و قیمت میں عظیم ہونا ہے، نہ کہ لمبا چوڑا ہونے میں عظیم ہونا۔

**آیت 24** **وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ** ...... : یعنی ہر قسم کی نعمت میسر ہونے پر لازم تھا کہ وہ ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کی عبادت کرتے اور اسی کو سجدہ کرتے، مگر میں نے دیکھا کہ اس کے بجائے وہ اور اس کی قوم سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے ہیں اور انھیں اصل راستے سے روک دیا ہے، لہٰذا وہ ہدایت نہیں پاتے۔ یعنی ان کے ہدایت نہ پانے کی وجہ یہ ہے کہ شیطان نے ان کی نگاہ میں سورج کی پرستش مزیّن کر دی ہے، اس لیے وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ رہے ہیں۔ اب غلط راستے پر چلنے والا کوئی شخص یقین کر لے کہ میں صحیح جا رہا ہوں اور غلطی بتانے والے کی دشمنی پر اتر آئے تو وہ کبھی سیدھے راستے پر نہیں آ سکتا۔ یہ کہہ کر ہُد ہُد نے گویا سلیمان علیہ السلام کو اس قوم سے جہاد

اَلَّا یَسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِیۡ یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ یَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۶﴾ السجدۃ

**تاکہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین میں چھپی چیزوں کو نکالتا ہے اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو ﴿۲۵﴾ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو عرش عظیم کا رب ہے ﴿۲۶﴾**

کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ یہاں اعمال مزین کرنے کی نسبت شیطان کی طرف فرمائی ہے، کیونکہ وہ لوگوں کی نگاہ میں گناہ کو مزین کرتا ہے۔ دوسری جگہ کفار کے لیے اعمال مزین کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے، جیسا کہ اسی سورت کی آیت (۴) میں ہے، کیونکہ مخلوق کے ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ﴿ وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَ مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [ الصافات : ۹۶ ] ”حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔“

**آیت 25** ① اَلَّا یَسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِیۡ یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ ...... : ”الۡخَبۡءَ“ مصدر بمعنی اسم مفعول ”اَلۡمَخۡبُوۡءُ“ ہے، چھپی ہوئی چیز، یعنی یہ لوگ اس اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین میں چھپی ہوئی چیز نکالتا ہے۔ اس آیت کا دوسرا ترجمہ وہی ہے جو اوپر کیا گیا ہے کہ تاکہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین میں چھپی چیزوں کو نکالتا ہے۔ ہُدہُد نے اس بنیادی حقیقت کے ثبوت کے لیے تین عظیم الشان دلیلیں پیش کیں کہ معبود برحق صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے، اس کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔ پہلی یہ کہ وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کی مخفی اور پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے۔ آسمانوں کی پوشیدہ چیزوں کے عموم میں سورج، چاند، ستارے، سیارے، بارش، ہوا اور بجلی وغیرہ سب ہی داخل ہیں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں میں تمام نباتات، پودے، درخت، دریا، چشمے، زیر زمین پانی، تیل، گیس اور بے شمار معدنیات سب آ جاتے ہیں۔ **بعض اہلِ علم** نے فرمایا کہ ہُدہُد کی خوراک عام طور پر وہ کیڑے ہوتے ہیں جو درختوں کی چھال یا زمین کے نیچے چھپے ہوتے ہیں۔ اس بظاہر معمولی سے پرندے نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی دلیل اپنی سمجھ اور تجربے کے مطابق دی کہ عبادت اور سجدے کے لائق وہ اللہ ہے جو ہر مخلوق کو اس کی چھپی ہوئی روزی تک رسائی دیتا ہے۔ سورج جسے اپنی گردش ہی سے فرصت نہیں، نہ اس نے کوئی چیز پیدا کی کہ وہ اسے چھپانے یا ظاہر کرنے کا علم یا اختیار رکھتا ہو، وہ عبادت یا سجدے کے لائق کیسے ہو گیا؟ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ہُدہُد کی روزی ہے ریت سے کیڑے نکال نکال کر کھانا، نہ دانہ کھائے نہ میوہ، اس کو اللہ کی اسی قدرت سے کام ہے۔“

② وَ یَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ : یہ اکیلے اللہ کو سجدہ کرنے کی دوسری دلیل ہے، یعنی سجدے کے لائق وہ ذات ہے جس کا علم اتنا وسیع ہے کہ نہ صرف آسمان و زمین ہی کی پوشیدہ قوتوں اور چیزوں کو جانتا ہے بلکہ وہ سب کچھ بھی جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو یا پوشیدہ رکھتے ہو۔ سورج یا کسی اور مخلوق کو کسی کے ظاہر یا پوشیدہ حالات کی کیا خبر کہ وہ سجدے کے لائق ہو۔

**آیت 26** اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ...... : یہ توحید کی تیسری دلیل ہے کہ وہ عرش عظیم کا رب ہے۔ مالک تو وہ کائنات کی ہر چیز کا ہے، لیکن یہاں صرف عرش عظیم کا ذکر کیا۔ ایک تو اس لیے کہ عرشِ الٰہی کائنات کی سب سے بڑی چیز اور سب سے برتر

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

کہا عنقریب ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا، یا تو جھوٹوں سے تھا ﴿۲۷﴾ میرا یہ خط لے جا، پس اسے ان کی طرف پھینک دے، پھر ان سے لوٹ آ، پس دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں ﴿۲۸﴾ اس (ملکہ) نے کہا اے سردارو! بے شک میری طرف ایک بہت عزت والا خط پھینکا گیا ہے ﴿۲۹﴾ بے شک وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور بے شک وہ اللہ کے نام سے ہے، جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۰﴾ یہ کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور فرماں بردار بن کر میرے پاس آجاؤ ﴿۳۱﴾

ہے۔ دوسرا یہ واضح کرنے کے لیے کہ ملکہ سبا کا تختِ شاہی بھی گو بہت بڑا ہے، مگر اسے عرش عظیم سے کوئی نسبت نہیں، جس پر اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق مستوی ہے۔ یہاں ہُد ہُد کا کلام ختم ہوا۔ بعض مفسرین نے ان دو آیات کو اللہ تعالیٰ کا کلام قرار دیا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہُد ہُد کے کلام کے بعد توحید کی تعلیم کے لیے فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى عَنْ قَتْلِ أَرْبَعٍ مِنَ الدَّوَابِّ : النَّمْلَةُ وَالنَّحْلَةُ وَالْهُدْهُدُ وَالصُّرَدُ )) [ أبو داوٗد، الأدب، باب في قتل الذر : ۵۲۶۷ ] ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چار جانوروں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، چیونٹی، شہد کی مکھی، ہُد ہُد اور صُرَد (لٹورا) کو۔“

**آیت 27** قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ : چونکہ ہُد ہُد نے سزا سے بچنے کے لیے بطور عُذر یہ بات بیان کی تھی، اس لیے اس میں غلط بیانی کا بھی امکان تھا، لہٰذا سلیمان علیہ السلام نے اگرچہ سزا سے درگزر فرمایا، تاہم فرمایا کہ ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا یا تو جھوٹوں سے تھا۔ یہاں یہ الفاظ قابل غور ہیں کہ یہ کہنے کے بجائے کہ ”أَ صَدَقْتَ أَمْ كَذَبْتَ“ یعنی تو نے سچ کہا یا جھوٹ کہا، یہ فرمایا کہ ”یا تو جھوٹوں سے تھا۔“ بقاعی نے اس کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ سلیمان علیہ السلام جیسے صاحب جلال بادشاہ کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت وہی کر سکتا تھا جو عادی جھوٹا ہو، اس لیے فرمایا: ”یا تو جھوٹوں میں سے تھا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی متہم شخص خبر لائے تو لازم ہے کہ اس کے سچا یا جھوٹا ہونے کی تحقیق کی جائے۔

**آیت 28** ① اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا …… : سلیمان علیہ السلام نے فوراً ہی خبر کی تحقیق کا آغاز کر دیا، چنانچہ خط لکھا اور ہُد ہُد کو حکم دیا کہ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان کی طرف پھینک، پھر ان سے لوٹ کر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں، یعنی ایک طرف رہ کر ان کی باتیں سنتا اور ان پر سوچ بچار کرتا رہ، پھر آ کر مجھ سے بیان کر۔ یہاں بات کا کچھ حصہ محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے کہ ہُد ہُد وہ خط لے کر گیا اور اسے ملکہ سبا کے پاس لے جا کر پھینک دیا۔ ملکہ اس خط کی آمد کا طریقہ اور اس کا مضمون پڑھ کر حیران رہ گئی۔

② اس سے معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام ہُد ہُد سے عام معلومات کی بہم رسانی کے علاوہ خط رسانی کا کام بھی لیتے تھے۔

**آیت 29 تا 31** ① قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ……: چنانچہ اس نے اپنی سلطنت کے سرداروں اور مشیروں

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

کہا اے سردارو! تم میرے معاملے میں مجھے حل بتاؤ، میں کبھی کسی معاملے کا فیصلہ کرنے والی نہیں، یہاں تک کہ تم میرے پاس موجود ہو ﴿۳۲﴾

کو جمع کیا اور انھیں مخاطب کر کے کہا: ''اے سردارو! میری طرف ایک بہت عزت والا خط پھینکا گیا ہے۔'' ملکہ نے اس خط کو بہت عزت والا اس لیے کہا کہ ایک تو وہ عجیب و غریب اور غیر معمولی طریقے سے آیا تھا، کسی سفارتی وفد کے بجائے ایک پرندے نے اسے لا پھینکا تھا۔ دوسرے وہ سلیمان جیسے باشکوہ بادشاہ کی طرف سے تھا جو شام و فلسطین اور اردگرد کے علاقوں کے فرماں روا تھے۔ تیسرے اس کی ابتدا بتوں یا دیوتاؤں کے نام کے بجائے اللہ رحمان و رحیم کے نام سے تھی، پھر اتنا مختصر اور جامع کہ لکھنے والے کی پوری مراد چند لفظوں میں مکمل ادا ہو رہی تھی اور اس نے نہایت بارعب اور پُر ہیبت لہجے میں صاف صاف حکم دیا تھا کہ سرکشی چھوڑ کر اطاعت کرو اور تابع فرمان یا مسلمان بن کر اس کے سامنے حاضر ہو جاؤ۔

❷ اس خط سے خط لکھنے کے کئی آداب معلوم ہو رہے ہیں، ایک یہ کہ خط لکھنے والے کو خط کے شروع میں اپنا تعارف کرانا ضروری ہے کہ یہ خط کس کی طرف سے ہے۔ دوسرا یہ کہ خط کی ابتدا ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' سے ہونی چاہیے۔ تیسرا یہ کہ خط مختصر، جامع اور واضح ہونا چاہیے۔ قرآن میں مذکور الفاظ کے مطابق خط لکھنے والے کا نام ''بِسْمِ اللّٰهِ'' سے پہلے ہے، مگر مفسرین فرماتے ہیں کہ ملکہ چونکہ اپنے الفاظ میں خط کا تذکرہ کر رہی تھی، اس لیے اس نے ''مِنْ سُلَيْمٰنَ'' کا ذکر پہلے کر دیا، ورنہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' اس سے پہلے ہے، جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے خطوط سے واضح ہے کہ ان میں ابتدا اس طرح ہوتی ہے: (( بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ ...... )) [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي : ۷ ]

❸ ''وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ'' کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ''میرے پاس تابع فرمان بن کر آ جاؤ۔'' یہ شاہی جلال کا آئینہ دار ہے، دوسرا یہ کہ مسلمان ہو کر میرے پاس آ جاؤ، یہ پیغمبرانہ شان کا اظہار ہے۔ سلیمان علیہ السلام میں دونوں صفات موجود تھیں، اس لیے مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان بن کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ، اگر اسلام قبول نہیں تو تابع فرمان تمھیں ہر حال میں ہونا پڑے گا۔ فرمایا: ﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [ التوبة : ۲۹ ] ''یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔''

**آیت 32** ❶ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ......: اس سے پہلے ملکہ سبا کی بات چل رہی ہے، ''يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ ......'' بھی اسی کا کلام ہے۔ بظاہر درمیان میں ''قَالَتْ'' لانے کی ضرورت نہ تھی۔ بقاعی فرماتے ہیں: ''کلام کے درمیان وقفہ ہے کہ ملکہ سبا سلیمان علیہ السلام کا خط سنا کر منتظر تھی کہ قوم کے سردار اس پر اپنا ردعمل ظاہر کریں گے، مگر جب وہ خط سن کر خاموش اور مبہوت رہ گئے، تو اس نے کہا: ''اے سردارو! میرے اس معاملے میں مجھے حل بتاؤ۔''

❷ اس سے ملکہ کی دانش مندی اور سمجھ داری ظاہر ہے کہ وہ ہر کام اپنے سرداروں کے مشورے سے کرتی تھی اور یہ بھی کہ سبا کا

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾

**انھوں نے کہا ہم بڑی قوت والے اور بہت سخت جنگ والے ہیں اور معاملہ تیرے سپرد ہے، سو دیکھ تو کیا حکم دیتی ہے ﴿۳۳﴾ اس نے کہا بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں اسے خراب کر دیتے ہیں اور اس کے رہنے والوں میں سے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور اسی طرح یہ کریں گے ﴿۳۴﴾**

نظام بادشاہی ہونے کے باوجود استبدادی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ طرز حکومت کوئی بھی ہو، بادشاہت ہو یا خلافت، یا جمہوریت، مشورے کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بعض لوگ بادشاہت کو مطلق العنانی اور جمہوریت کو مشورہ قرار دیتے ہیں، مگر یہ سراسر غلط ہے۔ ایک بادشاہ ہر کام مشورے سے کرنے والا ہوسکتا ہے، عادل بادشاہ ایسے ہی ہوتے ہیں اور ایک جمہوری سربراہ بدترین مطلق العنان آمر ہوسکتا ہے، جو پارلیمنٹ کے ارکان کو ان کی خواہشوں اور کمزوریوں کی وجہ سے داغ دار بنا کر اپنی مرضی کے تابع رکھنے پر مجبور رکھنے والا ہو۔ اس وقت تقریباً دنیا کے تمام جمہوری سربراہوں کا یہی حال ہے، بلکہ جمہوریت جس میں عوام کے لفظ کی گردان ذکر الٰہی کی طرح کی جاتی ہے، صرف عوام کو ایک دفعہ رائے کا حق دیتی ہے، پھر وہ چار پانچ سال تک بے بسی سے اپنے چنے ہوئے نمائندوں کی مطلق العنانی کے زخم کھاتے رہتے ہیں۔ اسلام میں مطلق العنان بادشاہت یا جمہوریت دونوں کا وجود نہیں۔ یہاں خلیفہ ہو یا بادشاہ، اللہ تعالیٰ کے احکام کو، جو قرآن و حدیث میں ہیں، کوئی چاہے یا نہ چاہے، ہر حال میں نافذ کرنے کا پابند ہے۔ اس کے بعد دوسرے معاملات میں وہ مشورہ کرنے کا پابند ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ [ الشورى : ۳۸ ] ”اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ [ آل عمران : ۱۵۹ ] ”اور کام میں ان سے مشورہ کر۔“ مگر اس کے لیے نہ ہر ایک سے مشورہ ضروری ہے نہ وہ اکثریت کی رائے کا پابند ہے، بلکہ وہ ہر کام میں ان لوگوں سے مشورہ لے گا جو اس کے اہل ہیں اور چونکہ فیصلے کے نفع نقصان کا ذمہ دار وہ ہے، اس لیے آخری فیصلہ اسی کا ہوگا، جو بعض اوقات اقلیت کی رائے کے مطابق بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: (( لَوْ أَنَّكُمَا تَتَّفِقَانِ عَلٰى أَمْرٍ وَاحِدٍ مَا عَصَيْتُكُمَا فِيْ مَشُوْرَةٍ أَبَدًا )) [ فتح الباري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول الله تعالى: ﴿ و أمرهم شورى ...... ﴾ : ۳۴۱/۱۳ ] ”اگر تم کسی بات پر متفق ہو جاؤ تو میں اس معاملے میں کبھی تمھاری مخالفت نہیں کروں گا۔“ مشورے کی ایک مثال ملکہ سبا کے سرداروں کی مجلس ہے کہ انھوں نے مشورہ دے کر کہا: ﴿ وَ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴾ [ النمل : ۳۳ ] ”اور معاملہ تیرے سپرد ہے، سو دیکھ تو کیا حکم دیتی ہے۔“

**آیت 33** ﴿ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ ...... ﴾: سرداروں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ ہم بڑی قوت والے اور سخت جنگجو ہیں، یعنی اسلحہ، فوج اور تیاری ہر لحاظ سے پورے ہیں، مگر ہم آپ کے حکم کے بغیر کچھ بھی کرنے والے نہیں، آپ غور و فکر کر لیں کہ کیا حکم دیتی ہیں، ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔

**آیت 34** ﴿ ① قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً ...... ﴾: ملکہ ان سے زیادہ سمجھ دار تھی اور سلیمان علیہ السلام کے متعلق ان سے زیادہ

وَ اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور بے شک میں ان کی طرف کوئی تحفہ بھیجنے والی ہوں، پھر انتظار کرنے والی ہوں کہ ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں ﴿۳۵﴾

علم رکھتی تھی، انھوں نے اگرچہ جنگ کے حق میں رائے دی تھی، مگر اسے معلوم تھا کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکروں میں انسانوں کے علاوہ جنّ اور پرندے بھی شامل ہیں اور وہ ان کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ہُدہُد کے ذریعے سے آنے والے خط کا عجیب و غریب مشاہدہ بھی کر چکی تھی۔ اس لیے اس نے کہا، مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم نے ان سے مقابلے اور لڑائی کا ارادہ کیا تو وہ اپنے لشکروں کے ساتھ حملہ آور ہو کر مجھے اور تم سب سرداروں کو خاص طور پر ذلیل و خوار یا ہلاک کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں بزورِ شمشیر داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کر دیتے ہیں اور اس کے باشندوں میں سے جو عزت والے ہوں انھیں ذلیل کر دیتے ہیں، قتل کر کے یا قیدی بنا کر، کیونکہ وہ ان کی موجودگی کو اپنی حکومت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

② وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ: یہ ملکہ سبا کا قول بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ہم نے اطاعت قبول نہ کی تو یہ لوگ بھی ایسے ہی کریں گے اور اللہ تعالیٰ کا کلام بھی ہو سکتا ہے کہ ملوک ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اللہ کا ڈر نہ رکھنے والے بادشاہوں کا یہی حال ہوتا ہے، کیونکہ ان کی مہم جوئی اور دوسری قوموں پر چڑھائی اعلائے کلمۃ اللہ اور کسی نیک مقصد کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ محض اپنی برتری کے اظہار اور دوسری قوموں کو اپنا غلام بنانے کے لیے اور ان کے تمام وسائل پر قبضے کے لیے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ ظلم کی کسی صورت سے بھی دریغ نہیں کرتے، حتیٰ کہ بعض اوقات شہروں کے شہر آگ لگا کر جلا دیتے ہیں۔

آیت 35 ﴿ وَ اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ ...... : اس کے بعد اس نے طے کیا کہ حالات کا جائزہ لیتی رہے اور سلیمان علیہ السلام سے موافقت کر کے صلح کر لے۔ چنانچہ اس نے اپنے سرداروں سے کہا کہ میں اس کی طرف ان کے شایان شان تحفہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ وہ میرے قاصدوں کو کیا جواب دیتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تحفہ قبول کر لیں اور ہم ہر سال کچھ رقم بطور جزیہ بھیجتے رہیں اور وہ ہم پر چڑھائی کا خیال ترک کر دیں۔ یہ خاتون اپنے شرک کی حالت اور اسلام کی حالت دونوں میں بہت عقل مند تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کسی کے شوق کے مطابق تحفہ وہ چیز ہے جو لوہے کو بھی نرم کر دیتا ہے، اور اسے یہ بھی آزمانا تھا کہ دیکھیں وہ ہمارے اس مال کو قبول کرتے ہیں یا نہیں، اگر قبول کر لیا تو سمجھ لو کہ وہ ایک بادشاہ ہیں، پھر ان سے مقابلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر واپس کر دیا تو ان کی نبوت میں کوئی شک نہیں، پھر مقابلہ سراسر بے سود بلکہ مُضِر ہے۔ مفسرین نے ان تحائف کی عجیب و غریب تفصیلات بیان کی ہیں جو سب اسرائیلیات ہیں، ان میں سے ایک بھی ثابت نہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ٘ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ١ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَ لَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

تو جب وہ سلیمان کے پاس آیا تو اس نے کہا کیا تم مال کے ساتھ میری مدد کرتے ہو؟ تو جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے، بلکہ تم ہی اپنے تحفے پر خوش ہوتے ہو﴿۳۶﴾ ان کے پاس واپس جا، اب ہر صورت ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کے مقابلے کی ان میں کوئی طاقت نہیں اور ہر صورت انھیں اس سے اس حال میں ذلیل کر کے نکالیں گے کہ وہ حقیر ہوں گے ﴿۳۷﴾

**آیت 36** ① **فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ** ...... : جب سفیر تحائف لے کر سلیمان علیہ السلام کے پاس آیا تو انھوں نے وہ تحفے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ مجھے تمھارے مال و دولت سے کوئی غرض نہیں اور نہ میں مال و دولت کی رشوت لے کر اپنے ارادے سے باز رہ سکتا ہوں۔ میں یہ دولت لے کر کیا کروں گا، وہ تو میرے پاس پہلے ہی تم سے بہت زیادہ موجود ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ میں تم سے مال و دولت لے کر خوش ہو جاؤں اور تمھیں کفر و شرک پر قائم رہنے دوں؟ "**اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ**" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہدیہ مال و زر کی صورت میں تھا۔

② **بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ** : "فَرِحَ" کا معنی خوش ہونا بھی ہے اور پھول جانا بھی، یعنی یہ تمھارا ہی کام ہے کہ اس قسم کے تحفوں سے خوش ہو جاتے ہو اور پھول جاتے ہو، مجھے تو اگر تحفہ چاہیے تو تمھارے ایمان کا چاہیے، اگر تم اس پر آمادہ نہیں تو لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

**آیت 37** ① **اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ** ...... : یہاں کچھ عبارت محذوف ہے، یعنی یہ تحفے تحائف لے کر واپس چلے جاؤ اور انھیں بتاؤ کہ اگر وہ تابع فرمان ہو کر حاضر نہ ہوئے تو ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کے مقابلے کی ان میں کوئی طاقت نہ ہو گی۔

② **وَ لَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ** : ذلت یہ کہ سلطنت اور حکومت چھن جائے گی اور "صغار" (حقارت اور پستی) یہ کہ غلام اور قیدی بنیں گے، یا جلاوطن کیے جائیں گے۔ یہ معاملہ صرف ملکہ سبا کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مسلمانوں کو تمام دنیا کے کفار سے لڑتے رہنے کا حکم ہے، حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائیں یا اپنے ہاتھ سے جزیہ دینے کی ذلت قبول کریں اور مسلمانوں کے سامنے پست اور حقیر ہوں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [ التوبة : ۲۹ ] "لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے،

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾

**کہا اے سردارو! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لے کر آئے گا، اس سے پہلے کہ وہ فرماں بردار ہو کر میرے پاس آئیں؟ ﴿۳۸﴾ جنوں میں سے ایک طاقت ور شرارتی کہنے لگا میں اسے تیرے پاس اس سے پہلے لے آؤں گا کہ تو اپنی جگہ سے اٹھے اور بلاشبہ میں اس پر یقیناً پوری قوت رکھنے والا، امانت دار ہوں ﴿۳۹﴾**

یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔‘‘

افسوس! اس کتابِ ہدایت نے تو سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ بھی اور صریح الفاظ میں بھی مسلمان کو حکم دیا تھا کہ تمام دنیا کے کفار سے لڑتے رہو، حتیٰ کہ وہ اسلام قبول کر لیں یا اپنے ہاتھ سے جزیہ دے کر مسلمانوں کے ماتحت ہو کر زندگی بسر کریں، مگر مسلمانوں نے یہ سبق بھلا دیا اور شہادت اور جنت کی لذتوں کی طلب کے بجائے دنیائے فانی کے عیش و عشرت میں کھو گئے اور جہاد سے ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ نتیجہ کفار کی ذلت و پستی کے بجائے مسلمانوں کی ذلت و پستی کی صورت میں سب کے سامنے ہے اور بقول امام مالک رحمہ اللہ: ’’لَنْ يَّصْلُحَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهِ أَوَّلُهَا ‘‘[ شرح سنن أبي داوٗد لعبد المحسن العباد : ۳۳۴/۲ ] ’’اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی نسخے کے ساتھ ہوگی جس کے ساتھ اس امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی۔‘‘

**آیت 38** قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا ...... : آیات کے سیاق سے یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ جب قاصد ملکہ سبا کے پاس پہنچا اور اس نے سلیمان علیہ السلام کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا اور ان کا پیغام پہنچایا تو وہ سمجھ گئی کہ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود آپ کے ہاں حاضر ہو کر آپ کے ساتھ گفت و شنید کرے۔ چنانچہ وہ اپنے لشکر اور سرداروں کے ساتھ روانہ ہوئی، ابھی وہ راستے میں تھی اور پہنچا ہی چاہتی تھی کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنے سرداروں کو مخاطب کر کے فرمایا: ’’تم میں سے کون ہے جو اس کا تخت میرے پاس اس سے پہلے لے آئے کہ وہ تابع فرمان ہو کر میرے پاس آئیں۔‘‘ سلیمان علیہ السلام کا مقصد اس سے یہ تھا کہ جب وہ یہاں پہنچ کر اپنے تخت کو موجود پائے تو اسے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو کیسی غیر معمولی قوتیں عطا فرماتا ہے، تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ میں واقعی اللہ کا نبی ہوں اور اس کی عقل کا بھی امتحان ہو جائے کہ کچھ تبدیلی کے بعد وہ اپنا تخت پہچانتی ہے یا نہیں۔ بعض مفسرین نے سلیمان علیہ السلام کے ملکہ کا تخت منگوانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ اس کے پہنچنے سے پہلے اس کے تخت پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے، کیونکہ جب وہ پہنچ کر اسلام قبول کر لے گی تو اس کے مال پر قبضہ جائز نہ ہوگا۔ مگر یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ سلیمان علیہ السلام کے پاس تو ہر چیز ملکہ سے کہیں بہتر اور بڑھ کر موجود تھی اور کسی شخص کے مسلمان ہونے کی امید پر اس کی مدد کے بجائے پہلے ہی اس کے اموال پر قبضہ جمانے کی فکر کرنا ایک نبی تو دُور خلفائے اسلام کی شان کے لائق بھی نہیں۔ ویسے بھی پہلی امتوں کے لیے مال غنیمت حلال نہیں تھا۔

**آیت 39** قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ ...... : ’’عِفْرِيْتٌ‘‘ کا مادہ ’’ اَلْعَفَرُ ‘‘ ہے، جس کا معنی مٹی ہے۔ تفسیر مراغی میں ہے: ’’ اَلْعِفْرِيْتُ مِنَ الْبَشَرِ : اَلْخَبِيْثُ الْمَاكِرُ الَّذِيْ يُعَفِّرُ أَقْرَانَهُ ‘‘ ’’وہ خبیث مکار جو اپنے مقابل لوگوں کو

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا

اس نے کہا جس کے پاس کتاب کا ایک علم تھا، میں اسے تیرے پاس اس سے پہلے لے آتا ہوں کہ تیری آنکھ تیری طرف جھپکے۔ پس جب اس نے اسے اپنے پاس پڑا ہوا دیکھا تو اس نے کہا یہ میرے رب کے فضل سے ہے، تاکہ وہ

مٹی پر گرا دے۔'' مراد جو طاقت ور ہو اور شریر ہو۔ ایک بہت طاقت ور شریر جنّ کہنے لگا، آپ اپنی جس مجلس میں بیٹھے ہیں آپ کے اس سے اٹھ کر جانے سے پہلے وہ تخت میں آپ کے پاس لے آؤں گا اور میں اسے لانے کی پوری قوت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں، یعنی کسی ہیرے، جوہر یا قیمتی چیز کی خیانت نہیں کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے اس کی شہرت اچھی نہ تھی، اس لیے اسے اپنی صفائی پیش کرنا پڑی۔ (واللہ اعلم) سلیمان علیہ السلام کے پاس ایسے شیاطین بڑی تعداد میں موجود تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ﴾ [ الأنبياء : ۸۲ ] ''اور کئی شیطان جو اس کے لیے غوطہ لگاتے تھے اور اس کے علاوہ کام بھی کرتے تھے۔''

**آیت 40** ❶ **قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ** ......: ابن ابی حاتم نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ''میں اس سے جلدی چاہتا ہوں۔'' اس پر وہ شخص جس کے پاس کتاب کا ایک علم تھا، کہنے لگا: ''میں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے لاتا ہوں کہ آپ کی آنکھ جھپکے۔'' سلیمان علیہ السلام نے دیکھا تو وہ تخت ان کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس پر تکبّر اور غرور کے بجائے انھوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

❷ آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت لانے والا یہ شخص کون تھا، اس کے پاس کس کتاب کا علم تھا اور وہ علم کیا تھا؟ اس کی تصریح قرآن یا کسی صحیح حدیث میں نہیں ہے۔ لہٰذا ہم صرف اتنی بات ماننے کے مکلّف ہیں جتنی قرآن میں بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک شخص تھا جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ اکثر مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کا ایک وزیر آصف بن برخیا تھا، جو بنی اسرائیل سے تھا اور اسے اللہ تعالیٰ کے اس اسم اعظم کا علم تھا جس کے ذریعے سے اگر دعا کی جائے تو وہ اسے ضرور قبول فرماتا ہے اور وہ تخت لانا آصف بن برخیا کی کرامت تھی، لیکن ظاہر ہے کہ ان مفسرین کی یہ بات اسرائیلیات سے ہے، کیونکہ یہ حضرات نہ اس وقت موجود تھے، نہ یہ بتاتے ہیں کہ انھیں یہ بات کس نے بتائی اور نہ ان سے لے کر سلیمان علیہ السلام تک کوئی سند ہے کہ اس پر یقین کیا جا سکے۔ بعض مفسرین نے اسے جبریل علیہ السلام اور بعض نے خضر علیہ السلام قرار دیا ہے، مگر یہ بالکل ہی بے اصل ہے۔ بعض مفسرین نے سلیمان علیہ السلام کو وہ شخص قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جب عفریت نے سلیمان علیہ السلام کے مجلس سے اٹھنے سے پہلے تخت لانے کی بات کی تو سلیمان علیہ السلام نے، جن کے پاس کتاب اللہ کا علم تھا، اسے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے تیرے پاس لاتا ہوں۔ چنانچہ وہ اسے لے آئے اور یہ ان کا معجزہ تھا، جس پر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ رازی اور کچھ اور مفسرین نے صرف اس بات کو صحیح کہا ہے، مگر اس میں جو تکلف ہے وہ مخفی نہیں۔ زمانہ حال کے ایک مفسر محمد اسحاق خاں نے ایک احتمال کا ذکر کیا ہے جو ان سے پہلے بھی ایک جدید مفسر ذکر کر چکے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''علم کتاب سے بظاہر یہاں مراد

عِنۡدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ ۖ لِیَبۡلُوَنِیۡۤ ءَاَشۡکُرُ اَمۡ اَکۡفُرُ ؕ وَ مَنۡ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ

مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں، یا ناشکری کرتا ہوں اور جس نے شکر کیا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جس نے

خداوند قدوس کی کتاب وشریعت یعنی تورات کا علم ہے کہ اپنے دور میں علم اور ہدایت ونور کا سرچشمہ وہی کتاب الٰہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم کتاب کو اسمائے الٰہی اور خواص کلمات کے اس علم کا بھی کوئی حصہ حاصل تھا جو سحر اور شعبدہ وغیرہ جیسے سفلی علوم کے مقابلے کے لیے بنی اسرائیل کو بابل کی اسیری کے دور میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں کے ذریعے سے قدرت کی طرف سے عطا فرمایا گیا تھا۔ یہ علم تورات وغیرہ آسمانی صحیفوں میں سے کسی کا حصہ نہیں تھا، بلکہ یہ ان سے الگ ایک خاص علم تھا جو ایک خاص دور میں اور خاص ضرورت ومصلحت کے لیے بنی اسرائیل کو سکھایا گیا تھا۔ جس طرح کہ اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہاروت و ماروت کے قصے کے ضمن میں فرمایا گیا ہے۔ سو علم کتاب وشریعت رکھنے والے اس شخص نے اپنے اسی علم کی تاثیر وتسخیر کے ذریعے سے ملکہ بلقیس کے اس تخت کو اس قدر جلد سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر کر دیا۔''

لیکن یہ بھی تکلّف سے خالی نہیں ہے۔ قرآن مجید اور تفاسیر کے مطالعہ کے بعد دو باتیں زیادہ قریب معلوم ہوتی ہیں، ان میں سے کوئی بھی مراد ہوسکتی ہے۔ (واللہ اعلم) پہلی یہ کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنے جن سرداروں سے تخت لانے کی فرمائش کی وہ تین قسم کے لشکروں کے سردار تھے۔ جنّ، انس اور طیر یعنی پرندے، ان میں جبریل علیہ السلام بطور سردار شامل نہیں تھے اور خضر علیہ السلام کا اس وقت تک زندہ ہونا اور سلیمان علیہ السلام کے سرداروں میں شامل ہونا، پھر اتنی طاقت کا مالک ہونا بالکل ہی بے سروپا بات ہے۔ غالب احتمال یہ ہے کہ یہ تخت لانے والا کوئی صالح جنّ تھا جو ان جنّوں میں سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے تابع کر رکھے تھے۔ جنّوں کی سرعت انتقال مسلّم ہے، یعنی وہ نہایت تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں، جیسا کہ وہ آسمان دنیا کے نیچے فرشتوں کی باتیں سننے کے لیے پہنچ جاتے ہیں، اتنی تیزی سے نہ انسان منتقل ہوسکتا ہے نہ پرندے۔ آج کل تیز رفتار سے تیز رفتار طیارے بھی اتنی تیزی سے کارروائی نہیں کر سکتے جتنی تیزی کا دعویٰ عفریت نے کیا تھا۔ الفاظ قرآن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عفریت (خبیث سرکش) جن نے گھنٹے دو گھنٹے یا اس سے کم وبیش وقت میں وہ تخت محافظوں اور کمروں سے نکال کر لانے کا اور اتنی طاقت رکھنے کا دعویٰ کیا تو وہ شخص جو کتاب کا ایک علم رکھتا تھا، اسے چشم زدن میں لے آیا۔ ''الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ'' میں ''الَّذِیۡ'' سے مراد انسان بھی ہوسکتا ہے اور جنّ بھی۔ یہ لفظ صرف انسان کے ساتھ خاص نہیں کہ کہا جائے کہ وہ انسان ہی تھا۔ اس لیے یا تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ عفریت کی سرعت مجلس سے اٹھنے تک کی تھی، مگر کتاب کا ایک علم رکھنے والے صالح جن کی سرعت آنکھ جھپکنے سے بھی تیز تھی۔

ایک دوسرا احتمال ہمارے استاذ حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ بیان فرماتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس علم کی کیفیت بیان نہیں فرمائی، کیونکہ نزول قرآن کے وقت بیان کی جاتی تو وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ مثلاً آج سے دو سو سال پہلے اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا کہ ہزاروں میل کے فاصلے سے تصویر ایک جگہ سے دوسری جگہ آنکھ جھپکنے میں پہنچ سکتی ہے تو کوئی شخص

لِنَفۡسِهٖ ۚ وَ مَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيۡ غَنِيٌّ كَرِيۡمٌ ﴿۴۰﴾

ناشکری کی تو یقیناً میرا رب بہت بے پروا، بہت کرم والا ہے ﴿۴۰﴾

اسے تسلیم نہ کرتا، مگر آج یہ بات حقیقت بن کر سب کے سامنے آ چکی ہے۔ اس طرح سلیمان علیہ السلام کے اس سردار کے پاس وہ علم بھی تھا جس سے کوئی مادی وجود بھی آنکھ جھپکنے میں ہزاروں میل کے فاصلے سے منتقل ہو سکتا ہے۔ آج کل سائنس دان اس کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعمت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ہی خاص تھی، کیونکہ انھوں نے دعا کی تھی: ﴿ رَبِّ اغۡفِرۡ لِيۡ وَ هَبۡ لِيۡ مُلۡكًا لَّا يَنۡۢبَغِيۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِيۡ ﴾ [ ص : ۳۵ ] ''اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔'' رہی یہ بات کہ یہ علم رکھنے والا جن تھا یا انسان، تو یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر وہ انسان تھا تو کچھ بعید نہیں کہ وہی ہو جس کا نام ہمارے مفسرین نے اہل کتاب سے آصف نقل کیا ہے۔ بہر حال نام معلوم ہونا نہ ضروری ہے نہ اس کا کوئی خاص فائدہ ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نام ضرور بتا دیتا۔ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کی عظمت ہر حال میں مسلّم ہے، جو ان کے بعد نہ کسی کو عطا ہوئی ہے نہ ہوگی۔ اگر یہ قوت طبعی علم کے تحت ہو پھر بھی سلیمان علیہ السلام کا معجزہ ہی ہے کہ ان کے زیر فرمان اس قسم کے اصحاب کمال تھے جو بعد میں کسی کو میسر نہیں ہوئے۔ رہی یہ بات کہ یہ طبعی علم، '' عِلۡمٌ مِّنَ الۡكِتٰبِ '' کیسے ہو گیا، تو جواب اس کا یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں طبعی علوم کی طرف بہت توجہ دلائی گئی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ وَ الۡفُلۡكِ الَّتِيۡ تَجۡرِيۡ فِي الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۶۴ ] ''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ چیزیں لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں۔'' اور دیکھیے سورۂ آل عمران اور دوسری بہت سی آیات۔

③ ہمارے زمانے کے کچھ اولیاء پرست حضرات کہتے ہیں کہ جب سلیمان علیہ السلام کے ایک امتی ولی میں اتنی طاقت تھی تو امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیاء کی طاقت تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے آنکھ جھپکنے میں کسی کو کہیں سے کہیں پہنچا دینا اولیائے کرام کی قوت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مگر ان حضرات کے پاس اس بات کا کیا جواب ہے کہ اگر ایسے اولیاء موجود ہیں تو وہ سلیمان علیہ السلام کے امتی ولی کی طرح امریکہ، برطانیہ، اسرائیل یا بھارت کے کفار کو چیلنج کیوں نہیں دیتے اور ان کے ایٹم بم اٹھا کر کیوں نہیں لے آتے، کفار کی غلامی پر قناعت کیوں کیے بیٹھے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل اور ہماری امت تمام امتوں سے افضل ہے، مگر دنیا کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت، مثلاً جنوں اور پرندوں کی فوج یا دنیا کے علوم میں سے کوئی علم کسی اور پیغمبر یا اس کی امت کو عطا ہو جائے جو امتِ مسلمہ کے پاس نہ ہو تو اس سے امتِ مسلمہ کی افضلیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ دوسرے پیغمبروں اور ان کی امتوں کی فضیلت جزوی ہے، ہمارے نبی اور آپ کی امت کی فضیلت کلی ہے۔ ہمارے نبی اور آپ کے صحابہ نے بھی جہاد کے ذریعے سے دنیا فتح کی اور اسلام کا بول بالا کیا، حالانکہ ان کے پاس وہ وسائل نہ تھے جو سلیمان علیہ السلام کے پاس تھے۔ اتنے کم وسائل رکھتے ہوئے حیرت انگیز شجاعت اور بے مثال قربانی کے ساتھ سلیمان علیہ السلام

سے زیادہ علاقوں کو اسلام کے زیر نگیں لانا سید الانبیاء اور آپ کی امت کے افضل ہونے کی دلیل ہے۔

④ **فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ**: بقاعی نے فرمایا: ''بظاہر اتنے الفاظ ہی کافی تھے کہ '' فَلَمَّا رَآهُ عِندَهُ '' کیونکہ '' عِندَهُ '' کا لفظ '' مُسْتَقِرٌّ '' محذوف ہی کے متعلق ہوتا ہے۔ یہاں اس لفظ کو ظاہر کرنے اور صرف '' عِنْدَهٗ '' کے بجائے '' مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ '' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے حقیقت میں اپنے پاس پڑا ہوا پایا، جو نہ جادو کا اثر تھا، نہ خواب اور نہ ہی کوئی مثالی صورت۔''

⑤ **قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ**...... : جب سلیمان علیہ السلام نے وہ تخت فی الواقع آنکھوں کے سامنے پڑا ہوا دیکھا تو بجائے پھولنے یا فخر وغرور کے اپنے رب کے فضل کا اعتراف کیا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں کہ مجھے ایسے علم والے ساتھی میسر ہیں، بلکہ یہ صرف اور صرف میرے رب کا فضل ہے جس کا مقصد میری آزمائش ہے کہ میں اس کا شکر کرتا ہوں یا کفر کرتا ہوں۔ کفر کا لفظ شکر کے مقابلے میں بھی آتا ہے اور ایمان کے مقابلے میں بھی۔ کیونکہ جو شخص اللہ کی نعمت کی قدر کرتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے، وہ اس پر ایمان بھی لے آتا ہے اور جو اس کی نعمت کی بے قدری اور ناشکری کرتا ہے وہ اس پر ایمان لانے سے بھی محروم رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نعمت چھین کر بھی آزمائش ہوتی ہے اور نعمت دے کر بھی۔ مومن مصیبت پر صبر کرتا ہے اور آزمائش میں کامیاب ہو جاتا ہے، پھر نعمت پر شکر کرتا ہے تب بھی کامیاب ہوتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ صبر وہی کرتا ہے جو شاکر ہو اور شکر وہی کرتا ہے جو صابر ہو۔ اس واقعہ میں سلیمان علیہ السلام کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ اتنی عظیم سلطنت اور حیرت انگیز قوتوں والے لشکر رکھنے کے باوجود نہ ان کے دل میں فخر کا کوئی خیال آیا، نہ ہی زبان پر کوئی ایسا لفظ آیا، بلکہ انھوں نے ہر نعمت کو اللہ کا فضل ہی قرار دیا۔

⑥ **وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ**...... : یعنی جو شکر کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں کرتا، اس کا فائدہ خود اسی کو ہے، کیونکہ اس سے اسے مزید نعمتیں حاصل ہوں گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ [ إبراهيم : ۷ ] ''کہ بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمھیں زیادہ دوں گا۔'' اور جو اللہ کی نعمتوں کی بے قدری اور ان کا انکار کرتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ اسے نہ بندوں کی کوئی ضرورت یا پروا ہے، نہ ان کی عبادت کی، کیونکہ وہ غنی ہے اور اتنے بے حد کرم والا ہے کہ بندوں کے کفر اور ناشکری کے باوجود نعمتیں دیتا ہی چلا جاتا ہے اور فوری گرفت کے بجائے اس نے مہلت دے رکھی ہے، تاکہ بندے اس کی طرف پلٹ آئیں۔ اس مفہوم کی اور بھی آیات ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ﴾ [ حٰم السجدة : ٤٦ ] ''جس نے نیک عمل کیا سو اپنے لیے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہوگی۔'' اور فرمایا: ﴿ وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ [إبراهيم : ۸ ] ''اور موسیٰ نے کہا اگر تم اور وہ لوگ جو زمین میں ہیں، سب کے سب کفر کرو تو بے شک اللہ یقیناً بڑا بے پروا، بے حد تعریف والا ہے۔'' ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے روایت کی کہ اس نے فرمایا: (( يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَ آخِرَكُمْ، وَ إِنْسَكُمْ وَ جِنَّكُمْ، كَانُوْا عَلٰی أَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَ آخِرَكُمْ، وَ إِنْسَكُمْ وَ جِنَّكُمْ، كَانُوْا عَلٰی أَفْجَرِ قَلْبِ

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾

کہا اس کا تخت اس کے لیے بے پہچان کر دو، تا کہ ہم دیکھیں کیا وہ راہ پر آتی ہے، یا ان لوگوں سے ہوتی ہے جو راہ نہیں پاتے ﴿۴۱﴾ پھر جب وہ آئی تو اس سے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا یہ تو گویا وہی ہے اور ہم اس سے پہلے علم دیے گئے تھے اور ہم فرماں بردار تھے ﴿۴۲﴾

رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنكُم، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَ آخِرَكُمْ، وَ إِنْسَكُمْ وَ جِنَّكُمْ، قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُوْنِيْ، فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ، يَا عِبَادِيْ! إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيْهَا لَكُمْ، ثُمَّ أُوَفِّيْكُمْ إِيَّاهَا، فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ، وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ ﴾ [ مسلم، البر و الصلة، باب تحریم الظلم : ۲۵۷۷ ] ''اے میرے بندو! اگر تمھارے اول اور تمھارے آخر اور تمھارے انس اور تمھارے جن تم میں سے کسی سب سے زیادہ متقی شخص کے دل پر ہو جائیں (یعنی اس جیسے ہو جائیں)، تو یہ چیز میرے ملک میں کچھ اضافہ نہیں کرے گی۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اول اور تمھارے آخر اور تمھارے انس اور تمھارے جن تمھارے کسی سب سے فاجر شخص کے دل پر ہو جائیں (یعنی اس جیسے ہو جائیں)، تو یہ چیز میرے مُلک میں کچھ کمی نہیں کرے گی۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اول اور تمھارے آخر اور تمھارے انس اور تمھارے جن ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں، پھر مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کو دے دوں جو اس نے مانگا، تو یہ میرے مُلک میں سے اتنا ہی کم کرے گا جتنا ایک سوئی جب سمندر میں داخل کی جائے۔ اے میرے بندو! یہ تو تمھارے ہی اعمال ہیں جو میں تمھارے لیے محفوظ رکھتا ہوں، تو جو خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جو اس کے سوا پائے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔''

**آیت 41** ❶ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا: سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کے تخت میں ایسی تبدیلی کر دو کہ اس کی پہچان نہ ہو سکے۔
❷ نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ...... : تا کہ اس کی عقل و دانش اور فہم و فراست کا امتحان کریں کہ وہ یہ بات جان لیتی ہے کہ یہ تخت اسی کا ہے، یا اسے سمجھ نہیں پاتی، اور اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر (ایمان باللہ کی) راہ پر آتی ہے، یا پھر بھی انھی لوگوں میں شامل رہتی ہے جو یہ راہ نہیں پاتے۔ '' اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ '' میں دونوں مفہوم شامل ہیں۔

**آیت 42** ❶ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ...... : جب ملکہ سبا آئی تو سلیمان علیہ السلام نے اس سے پوچھا: ''کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟'' سلیمان علیہ السلام کے سوال میں ان کی کمال ذہانت ظاہر ہو رہی ہے، انھوں نے یہ نہیں فرمایا کہ کیا یہ تمھارا تخت ہے؟ کیونکہ اس میں جواب کا بھی اشارہ ہو جاتا اور وہ کہہ دیتی کہ ہاں! یہ میرا ہی تخت ہے۔ اس کے بجائے سلیمان علیہ السلام نے موجودہ تخت کو الگ تخت ظاہر کیا اور پوچھا: ''کیا تمھارا تخت ایسا ہی ہے؟'' ملکہ کے جواب سے اس کی عقل مندی معلوم ہوتی

وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ

**اور اسے اس چیز نے روکے رکھا جس کی عبادت وہ اللہ کے سوا کرتی تھی، بلاشبہ وہ کافر لوگوں میں سے تھی ﴿۴۳﴾ اس سے کہا گیا اس محل میں داخل ہو جا۔ تو جب اس نے اسے دیکھا تو اسے گہرا پانی سمجھا اور اپنی دونوں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا لیا۔ اس نے کہا یہ تو شیشوں کا ملائم بنایا ہوا فرش ہے۔ اس (ملکہ) نے کہا اے میرے رب! بے شک**

ہے، اگر وہ کہتی کہ ہاں میرا تخت ایسا ہی ہے تو ثابت ہو جاتا کہ اس نے اپنا تخت نہیں پہچانا اور اگر کہتی کہ یہ وہی ہے تو شناخت بدلنے کی وجہ سے اسے ایسا کہنا مشکل تھا، اس لیے اس نے تھوڑے سے شک کے الفاظ کے ساتھ کہا: ”یہ تو گویا وہی ہے۔“ اس طرح وہ امتحان میں کامیاب ہوگئی۔

② **وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ:** یعنی ہمیں تو اس سے پہلے ہی آپ کی قوت و شوکت اور عظیم سلطنت کا علم ہو گیا تھا اور ہم تابع فرمان ہو چکے تھے، اسی لیے خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں۔

**آیت 43** **وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ ......:** یعنی اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے باوجود اسے ایمان لانے سے روکا تو آفتاب نے جسے وہ اللہ کے سوا معبود بنا بیٹھی تھی اور اسے چھوڑنے پر تیار نہ تھی اور اس کے سورج پرستی پر جمے رہنے کی وجہ بھی اس کی ہٹ دھرمی نہ تھی، بلکہ وجہ یہ تھی کہ وہ کافر قوم سے تھی اور اپنی قوم کے رسم و رواج کو ترک کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ یہ ترجمہ ”مَا“ موصولہ کی صورت میں ہے۔ ”مَا“ مصدریہ کی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا: ”اور اسے (ایمان لانے سے) روکا تو اس عبادت نے جو وہ اللہ کے سوا معبودوں کی کرتی تھی۔“ بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: ”سلیمان علیہ السلام نے اسے ان چیزوں سے روک دیا جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتی تھی۔“ حافظ ابن کثیر اور دوسرے ائمہ نے اس معنی کے بجائے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ ملکہ سبا نے شیشے کے ملائم فرش کو پانی سمجھنے کی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد ایمان قبول کیا، اس سے پہلے وہ اپنی قوم کے رسم و رواج پر قائم تھی۔

**آیت 44** ① **قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ......:** ”**قَوَارِيْرَ**“ ”قَارُوْرَةٌ“ کی جمع ہے، شیشے۔ ”**لُجَّةً**“ بہت زیادہ اور گہرا پانی۔ ”**مُمَرَّدٌ**“ ”ملائم، چکنا بنایا ہوا۔“ ”**الصَّرْحَ**“ کا معنی محل بھی ہے اور صحن بھی۔ یہ آخری چیز تھی جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز سلیمان علیہ السلام کا خط اور اس کا عجیب و غریب طریقے سے پہنچنا تھا، جس میں اسے تابع فرمان ہو کر حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ دوسری چیز سلیمان علیہ السلام کا اس کے بیش قیمت ہدیوں کو واپس کر دینا اور لشکر کشی کی دھمکی تھی۔ تیسری چیز تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے سے اس کے تخت کا اس کے آنے سے پہلے پہنچ جانا تھا۔ ابتدائی ملاقات اور گفتگو کے بعد اسے سلیمان علیہ السلام کے محل میں چلنے کے لیے کہا گیا، جب اس نے صحن کو دیکھا تو سمجھی کہ یہ گہرا پانی ہے اور اس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا

ظَلَمۡتُ نَفۡسِيۡ وَ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَيۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۴﴾ ع

میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کے لیے فرماں بردار ہوگئی ﴿۴۴﴾

اٹھالیا، جیسے گہرے پانی سے گزرنے والا اپنے پائینچے چڑھا لیتا ہے۔ کیونکہ وہ بلور کا فرش تھا جس کی بناوٹ ایسی تھی کہ شیشے کے بجائے گہرا پانی دکھائی دیتا تھا۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ پانی نہیں بلکہ نہایت صفائی کے ساتھ شیشوں کو جوڑ کر بنایا ہوا چکنا ملائم فرش ہے۔

② محل میں داخلے کے اس واقعہ سے سلیمان علیہ السلام کی کمال حکمت معلوم ہوتی ہے جو انھوں نے ملکہ سبا کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے اختیار فرمائی۔ شیشے کے اس محل اور صحن کا اہتمام سلیمان علیہ السلام نے اس لیے فرمایا کہ ملکہ کو پتا چلے کہ جس ساز و سامان پر اسے اور اس کی قوم کو ناز تھا، یہاں اس سے بہت بڑھ کر سامان موجود ہے اور ساتھ ہی یہ معلوم ہو جائے کہ سورج اور ستاروں کی چمک سے مرعوب ہو کر انھیں رب سمجھ لینا ایسا ہی دھوکا ہے جیسے آدمی چمکتے شیشے کو پانی سمجھ بیٹھے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کو اپنی عقل کا قصور اور ان (یعنی سلیمان علیہ السلام) کی عقل کا کمال معلوم ہوا، سمجھی کہ دین میں بھی جو یہ سمجھتے ہیں وہی صحیح ہے۔'' (موضح) اس چیز نے اسے اس اعتراف پر مجبور کیا جو آگے آ رہا ہے۔ اس میں سلیمان علیہ السلام کی کمال حکمت کے ساتھ ملکہ کی کمال دانائی اور ذہانت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ سلیمان علیہ السلام جو بات اسے اس طریقے سے سمجھانا چاہتے تھے، وہ سمجھ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو ہی اس پر صحیح اثر انداز ہوتی ہے۔

③ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّيۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِيۡ ...... : فرش کی حقیقت سے آگاہی ملکہ کے لیے توحید سے آگاہی کا ذریعہ بن گئی۔ چنانچہ اس نے کہا، اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اب تک شرک میں مبتلا رہی اور تجھے بھلائے رکھا اور اب میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ رب العالمین کے لیے اسلام لے آئی اور اس کی مکمل فرماں بردار بن گئی۔

**تنبیہ:** سلیمان علیہ السلام کے اس قصے میں بہت سی باتیں اسرائیلیات سے داخل کر دی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ ملکہ سبا کی ماں جنات سے تھی اور یہ کہ سلیمان علیہ السلام نے اس سے نکاح کا ارادہ کیا تو انھیں بتایا گیا کہ اس کے پاؤں تو گدھے کے جسم جیسے ہیں اور اس کی پنڈلیوں پر بہت سے بال ہیں۔ اس پر انھوں نے بلور کا یہ محل بنوایا، تاکہ اس کے کپڑا اٹھانے سے اس کے پاؤں اور پنڈلیوں کو دیکھ سکیں۔ جب اس نے کپڑا اٹھایا اور سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ تو نہایت خوب صورت تھی، ہاں! اس کی پنڈلیوں پر بال تھے، انھوں نے جنوں سے پوچھا کہ ان بالوں کا کیا کریں تو انھوں نے بال صفا پاؤڈر ایجاد کیا، چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے اس سے نکاح کر لیا وغیرہ۔ یہ تمام باتیں بالکل بے اصل ہیں، بلکہ سلیمان علیہ السلام جیسے شخص کی ذات پر لگائی گئی کمینی تہمتیں ہیں، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی شہادت یہ ہے: ﴿نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾ [ صٓ : ٤٤ ] ''(سلیمان) اچھا بندہ تھا، یقیناً وہ بہت رجوع کرنے والا تھا۔'' اصل حقیقت یہی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جو کچھ بھی کیا اسلام کی دعوت پھیلانے اور اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کیا اور ان کے یہ تمام واقعات ہمارے لیے سبق ہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو تو اچانک وہ دو گروہ ہو کر جھگڑ رہے تھے ﴿۴۵﴾ کہا اے میری قوم! تم بھلائی سے پہلے برائی کیوں جلدی مانگتے ہو، تم اللہ سے بخشش کیوں نہیں مانگتے، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۴۶﴾

**آیت 45** وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ...... : اس کا عطف "وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا" پر ہے اور یہ موسیٰ اور داؤد و سلیمان علیہم السلام کے قصوں کے بعد تیسرا قصہ ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۳ تا ۷۹)، ہود (۶۱ تا ۶۸)، شعراء (۱۴۱ تا ۱۵۹)، قمر (۲۳ تا ۳۲) اور شمس (۱۱ تا ۱۵) ملکہ سبا اور اس کی قوم عزت و سلطنت کے باوجود سلیمان علیہ السلام کی دعوت پر اسلام لے آئی۔ اب صالح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہوتا ہے جو صالح علیہ السلام کی بعثت پر دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک مومن و مسلم جو عموماً "مستضعفین" (کمزور) تھے، دوسرا کافر و منکر جو "مستکبرین" (متکبر لوگ) تھے۔ دو گروہ بنتے ہی ان کے درمیان سخت جھگڑا شروع ہو گیا، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ [ الأعراف : ۷۵، ۷۶ ] "اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، ان لوگوں سے کہا جو کمزور گنے جاتے تھے، ان میں سے انھیں (کہا) جو ایمان لے آئے تھے، کیا تم جانتے ہو کہ واقعی صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا بے شک ہم جو کچھ دے کر اسے بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہیں۔ وہ لوگ جو بڑے بنے ہوئے تھے، انھوں نے کہا بے شک ہم جس پر تم ایمان لائے ہو، اس کے منکر ہیں۔" یہی صورت حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ مکہ میں بھی پیدا ہوئی کہ قوم دو گروہوں میں بٹ گئی اور یہ جھگڑا اس وقت تک جاری رہا جب تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے جزیرۂ عرب پورے کا پورا اسلام کے زیر نگیں نہیں آ گیا اور کفار یا تو ذلیل و خوار ہو کر مردار ہوئے یا اسلام کے سایۂ رحمت میں آ گئے۔ یہ قصہ ان حالات کے عین مطابق تھا جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

**آیت 46** ① قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ ...... : " اَلسَّيِّئَةُ " سے مراد عذاب ہے اور "اَلْحَسَنَةِ" سے مراد رحمت ہے۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو ڈرنے کے بجائے انھوں نے اسے مذاق بنا لیا اور اسے جلد از جلد لانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ صالح علیہ السلام نے نہایت نرمی اور محبت سے "اے میری قوم!" کہہ کر انھیں نصیحت کی کہ بجائے اس کے کہ تم اللہ سے خیر و رحمت کے طلب گار بنو، الٹا اس سے عذاب مانگنے میں کیوں جلدی مچاتے ہو؟ اہل مکہ کے لیے اس واقعہ

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

انھوں نے کہا ہم نے تیرے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو تیرے ہمراہ ہیں، بدشگونی پکڑی ہے۔ کہا تمھاری بدشگونی اللہ کے پاس ہے، بلکہ تم ایسے لوگ ہو جو آزمائے جا رہے ہو ﴿۴۷﴾

میں سبق تھا، کیونکہ وہ بھی اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [ العنكبوت : ۵۳ ] ”اور وہ تجھ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو ان پر عذاب ضرور آ جاتا اور یقیناً وہ ان پر ضرور اچانک آئے گا اور وہ شعور نہ رکھتے ہوں گے۔“ حتیٰ کہ وہ یہاں تک کہہ گزرے: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [ الأنفال : ۳۲ ] ”اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔“

❷ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ ...... : یعنی عذاب میں تاخیر سے حاصل ہونے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر تم اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش کیوں نہیں مانگتے، تا کہ تم پر رحم کیا جائے، کیونکہ عذاب آ جانے پر توبہ واستغفار کا کوئی فائدہ نہیں۔

آیت 47 ❶ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ ......: ”اِطَّيَّرْنَا“ اصل میں ”تَطَيَّرْنَا“ ہے، (ہم نے بدشگونی لی) تاء کو ساکن کر کے طاء میں ادغام کیا اور پہلا حرف ساکن ہو جانے کی وجہ سے شروع میں ہمزہ وصلی کا اضافہ کر دیا۔ ادغام کی وجہ سے بدشگونی کے معنی میں شدّت کا اظہار ہو رہا ہے۔ صالح علیہ السلام کو جھٹلانے والوں نے کہا کہ ہم نے تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے ساتھ بدشگونی پکڑی ہے اور تمھیں منحوس ہی پایا ہے کہ آئے دن ہم پر آفات ومصائب کا ہجوم رہتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کا باعث تم اور تمھارے ساتھی ہیں۔ آلِ فرعون پر جب مختلف عذاب آئے تو انھوں نے بھی یہی بات کہی تھی: ﴿ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ﴾ [ الأعراف : ۱۳۱ ] ”تو جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے یہ تو ہمارے ہی لیے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔“ سورۂ یٰس میں مذکور بستی کے لوگوں نے بھی اپنے رسولوں سے یہی کہا تھا: ﴿ اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [ یٰس : ۱۸ ] ”بے شک ہم نے تمھیں منحوس پایا ہے، یقیناً اگر تم باز نہ آئے تو ہم ضرور ہی تمھیں سنگسار کر دیں گے اور تمھیں ہماری طرف سے ضرور ہی دردناک عذاب پہنچے گا۔“ ہمارے نبی ﷺ کو بھی کفار ایسے ہی کہتے تھے: ﴿ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴾ [ النساء : ۷۸ ] ”اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔“

❷ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۱) کی تفسیر۔

وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور اس شہر میں نو (۹) شخص تھے، جو اس سرزمین میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے ﴿۴۸﴾ انھوں نے کہا آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور ہی اس پر اور اس کے گھر والوں پر رات حملہ کریں گے، پھر ضرور ہی اس کے وارث سے کہہ دیں گے ہم اُس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے اور بلاشبہ ہم ضرور سچے ہیں ﴿۴۹﴾

③ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ: یعنی تمھارے مصائب کا سبب ہمارا منحوس ہونا نہیں، بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ اب تمھارا امتحان شروع ہے کہ تم آفات و مصائب سے سبق حاصل کر کے ایمان قبول کرتے ہو یا کفر پر جمے رہتے ہو۔

**آیت 48** وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ ...... قومِ ثمود کے شہر کا معروف نام ''حجر'' ہے۔ سورۂ حجر کا نام اسی شہر کے نام پر ہے۔ یہ مکہ سے شام جاتے ہوئے راستے پر پڑتا ہے۔ اس شہر میں نو (۹) بدمعاش تھے، جو ملک میں فساد کرتے تھے اور یہ نہیں کہ تھوڑی بہت خرابی کرتے ہوں اور کچھ اچھے کام بھی کرتے ہوں، بلکہ فرمایا کہ وہ کوئی اچھا کام کرتے ہی نہیں تھے۔ جن میں سب سے نمایاں وہ ملعون تھا جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں، دوسرے آٹھ اس کے ساتھی تھے۔ اس ملعون کا تذکرہ سورۂ شمس میں ہے۔ ان کے نام بعض روایات میں آتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی روایت بھی ثابت نہیں۔ بعض لوگ اس قصے کی وجہ سے نو (۹) کے عدد کو منحوس سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسی بدشگونی سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

**آیت 49** ① قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ......: ''لَنُبَيِّتَنَّهٗ'' ''بَيَّتَ يُبَيِّتُ تَبْيِيْتًا'' شب خون مارنا، رات کو اچانک حملہ کرنا۔ جب ان لوگوں نے باہمی مشورے سے اونٹنی کو ہلاک کر دیا اور صالح علیہ السلام نے انھیں تین دن بعد عذاب آنے سے خبردار کر دیا تو اس کے بعد بھی ان لوگوں نے یہی سمجھا کہ یہ عذاب تو آتا ہے یا نہیں، اس سے پہلے کیوں نہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں کا قصہ تمام کر دیں۔ چنانچہ ان نو بدمعاشوں نے صالح علیہ السلام کے قتل کا ویسا ہی منصوبہ بنایا جیسا قریشِ مکہ نے ہجرت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے قتل کا بنایا تھا۔ البتہ یہ فرق ضرور تھا کہ قریش نے سوچا تھا کہ بدلے کی صورت میں قتل کرنے پر ہم سے دیت کا مطالبہ کیا جائے گا تو وہ ہم سب مل کر اکٹھی کر کے دے دیں گے۔ لیکن یہ بدمعاش ان سے بھی چار ہاتھ آگے کی بات سوچ رہے تھے، انھوں نے طے کیا کہ جب صالح (علیہ السلام) کے ولی (جیسے رسول اللہ ﷺ کے ولی بنو ہاشم تھے) ہم سے کوئی بات پوچھیں گے تو ہم کہہ دیں گے کہ ہم تو موقع پر موجود ہی نہ تھے، ہمیں کیا خبر انھیں کون قتل کر گیا ہے؟ دوسرا فرق یہ تھا کہ قریشِ مکہ نے صرف رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا، جب کہ ان بدمعاشوں نے صالح علیہ السلام اور ان کے پورے خاندان کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے اس منصوبے کے معاہدے پر سب نے ایک دوسرے کے سامنے قسمیں کھائیں کہ ایک تو اس کو اور اس کے خاندان کو قتل کر کے دم لیں گے، دوسرے اپنے جرم کا کبھی اعتراف نہیں کریں گے۔ (کیلانی)

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۰ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۵۱ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵۲ وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۵۳

اور انھوں نے ایک چال چلی اور ہم نے بھی ایک چال چلی اور وہ سوچتے تک نہ تھے ۝۵۰ پس دیکھ ان کی چال کا انجام کیسا ہوا کہ ہم نے انھیں اور ان کی قوم، سب کو ہلاک کر ڈالا ۝۵۱ تو یہ ہیں ان کے گھر گرے ہوئے، اس کے باعث جو انھوں نے ظلم کیا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو جانتے ہیں ۝۵۲ اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور بچتے رہے تھے ۝۵۳

② مفسر شنقیطی نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کو ان کے اولیاء کے ذریعے سے بہت نفع پہنچایا، کیونکہ ظاہر ہے کہ ان نو (۹) بدمعاشوں نے شب خون مار کر صالح علیہ السلام اور ان کے خاندان کو قتل کرنے اور اس کا اعتراف نہ کرنے کا منصوبہ اسی لیے بنایا کہ وہ ان کے اولیاء کے خوف سے علانیہ قتل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور قتل کرنے کی صورت میں بھی انھیں ان کے اولیاء کا خوف تھا۔'' جیسا کہ قریش ابوطالب اور بنو ہاشم کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر علانیہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

**آیت 51، 50** وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا ...... : ان کی چال تو وہ منصوبہ تھا جس پر انھوں نے آپس میں قسمیں کھائیں اور اللہ تعالیٰ کی چال یہ تھی کہ اس نے دوسرے انبیاء کی طرح صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بحفاظت وہاں سے نکال لیا۔ ان کے نکلنے کی دیر تھی کہ اس شہر بلکہ قومِ ثمود کے پورے علاقے میں شدید زلزلے کا عذاب آیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ [ الأعراف : ۷۸ ] ''تو انھیں زلزلے نے پکڑ لیا۔'' جس کے ساتھ خوف ناک چیخ کی آواز بھی تھی، فرمایا: ﴿وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ﴾ [ هود : ٦٧۔ القمر : ٣١ ] ''اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں چیخ نے پکڑ لیا۔'' جس سے ان کی بستیاں برباد ہو گئیں اور وہ نو (۹) بدمعاش اور ان کی قوم کے لوگ سب ہلاک ہو گئے۔

**آیت 53، 52** ① فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً : "خَاوِيَةً" کا معنی گرنے والے بھی ہیں، جیسا کہ سورۂ بقرہ (۲۵۹) میں ہے: ﴿وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ اور خالی بھی ہے، جیسے: "أَرْضٌ خَاوِيَةٌ أَيْ خَالِيَةٌ۔" (قاموس) مکہ والے شام کو جاتے تو راستے میں وادی القریٰ میں ثمود کی بستیوں کے کھنڈر دیکھتے تھے، عالی شان عمارتیں پیوندِ زمین تھیں، آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔

② اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ...... : یعنی جاہلوں کے لیے ان اجڑے ہوئے مکانوں اور کھنڈروں میں کوئی عبرت نہیں، ان کے خیال میں اس زلزلے کا صالح علیہ السلام اور ان کی اونٹنی سے، یا اس قوم کے کفر و شرک یا سرکشی سے کوئی تعلق نہیں، دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ (دیکھیے اعراف : ۹۴، ۹۵) یہ علم والے ہی ہیں جو جانتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے ایک کمال حکمت و قدرت والے پروردگار کے حکم کے تحت ہو رہا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے بے راہ روی اور ظلم و ستم کی سزا دنیا میں بھی دے دیتا ہے، اس لیے وہ جب ایسی بستیوں پر گزرتے ہیں جو عذابِ الٰہی سے برباد ہوئیں تو ان سے عبرت حاصل کرتے اور اللہ کی گرفت سے ڈر کر توبہ و استغفار کرتے ہیں۔

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا

اور لوط کو جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم بے حیائی کو آتے ہو، جب کہ تم دیکھتے ہو﴿۵۴﴾ کیا بے شک تم واقعی عورتوں کو چھوڑ کر شہوت سے مردوں کے پاس آتے ہو، بلکہ تم ایسے لوگ ہو کہ جہالت برتتے ہو﴿۵۵﴾ تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو، بلاشبہ یہ ایسے لوگ ہیں جو

**آیت 54** وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ …… : لوط علیہ السلام کے قصے کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۸۰ تا ۸۴)، ہود (۷۷ تا ۸۳)، حجر (۶۱ تا ۷۷)، انبیاء (۷۱ تا ۷۵)، شعراء (۱۶۰ تا ۱۷۵)، عنکبوت (۲۸ تا ۳۵)، صافات (۱۳۳ تا ۱۳۸) اور قمر (۳۳ تا ۳۹)۔ صالح علیہ السلام کے واقعہ کے بعد، جو قرابت رکھنے والوں کی طرف مبعوث تھے اور جن کی قوم مومن و کافر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اس پیغمبر کا ذکر کیا جو اپنی قوم میں اجنبی تھا اور جس پر اہل سدوم میں سے ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا، یہ پیغمبر لوط علیہ السلام تھے۔ ”الۡفَاحِشَةَ“ وہ کام جو برائی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ ”تُبۡصِرُوۡنَ“ یہ بصیرت سے بھی ہو سکتا ہے اور بصارت سے بھی۔ بصیرت سے ہو تو مطلب یہ کہ تم یہ انتہائی بے حیائی کا کام کرتے ہو جب کہ خود بھی سمجھتے ہو کہ یہ گندا اور خلاف فطرت فعل ہے، جو تم سے پہلے کسی قوم نے نہیں کیا اور حقیر سے حقیر جانور بھی ایسا کام نہیں کرتے اور بصارت سے ہو تو مطلب یہ ہے کہ تم اس قدر بے حیا ہو چکے ہو کہ ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے یہ کام کرتے ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَتَاۡتُوۡنَ فِىۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ﴾ [ العنکبوت : ۲۹ ] ”اور تم اپنی مجلس میں برا کام کرتے ہو۔“

**آیت 55** ❶ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً …… : ہمزہ استفہام کے بعد ”اِنَّ“ اور لام کے ساتھ تاکید کا مطلب تعجب کا اظہار ہے کہ کیا واقعی ایسا ہی ہے کہ تم وہ کام کرتے ہو جو کسی صحیح الفطرت آدمی کے خیال میں بھی نہیں آتا۔

❷ پچھلی آیت میں صرف فاحشہ کا ذکر کیا تھا، اب مذمت کی مزید تاکید کے لیے ان کے فعل بد کی تصریح فرمائی کہ تم پاک دامنی اور اولاد کے حصول کے لیے بیویوں کے پاس جانے کے بجائے محض شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ شہوت پوری کرنے کے لیے عورتیں کافی نہیں بلکہ تم ایسے لوگ ہو جو علم کے بجائے جہل کے اسیر ہو اور اس فعل بد کے انجام سے جاہل ہو کہ دنیا اور آخرت میں اس کا وبال کتنا خوف ناک ہے۔ دنیا میں چند ہی سالوں میں تمھاری نسل ختم ہو جائے گی اور تمھاری عورتوں میں بدکاری پھیل جائے گی۔ جہالت کا ایک معنی سفاہت اور حماقت بھی ہے، کوئی گالی گلوچ اور بے ہودہ حرکتیں کرنے لگے تو کہتے ہیں، وہ جہالت پر اتر آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا﴾ [ الفرقان : ٦٣ ] ”اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔“ مطلب یہ کہ مردوں کے پاس جانا تمھاری کوئی حقیقی ضرورت نہیں، محض سفاہت و حماقت ہے جس کی وجہ سے تم یہ کام کر رہے ہو۔

**آیت 56** فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ …… : لوط علیہ السلام کی بہترین نصیحت کا جواب ان کے پاس جہالت کے سوا کچھ نہ تھا اور

اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

بہت پاک باز بنتے ہیں ﴿۵۶﴾ تو ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی بیوی۔ ہم نے اسے پیچھے رہنے والوں میں طے کر دیا تھا ﴿۵۷﴾ اور ہم نے ان پر بارش برسائی، زبردست بارش، سو بری بارش تھی ان لوگوں کی جو ڈرائے گئے تھے ﴿۵۸﴾ کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جنھیں

انھوں نے ثابت کر دیا کہ لوط علیہ السلام جو انھیں **"قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ"** کہہ رہے تھے، درست ہی کہہ رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اتنی سنجیدہ بات کا جواب استہزا اور تمسخر کے ساتھ دیا، جو جاہلوں کا کام ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿ **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** ﴾ [ البقرۃ : ٦٧ ] ”میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں۔“ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۸۲)۔

**آیت 58.57** ❶ **فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ**...... : اس کی تفصیل سورۂ ہود (۸۱ تا ۸۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس سورت میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد تین انبیاء سلیمان، صالح اور لوط علیہم السلام کے حالات کا ذکر ہوا ہے اور ان کے حالات میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں مشابہت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا ہے۔ مثلاً سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر تم مطیع فرمان بن کر حاضر ہو جاؤ تو بہتر، ورنہ ہم ایسے لشکر سے تم پر حملہ کریں گے جس کے مقابلے کی تم تاب نہ لا سکو گے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین مکہ پر ایسا ہی لشکر لائے تھے۔ صالح علیہ السلام کو ان کی قوم نے بلوے کی صورت میں شب خون مار کر قتل کرنا چاہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں نجات دے دی۔ قریشِ مکہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سلوک کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی سازش سے بال بال بچا لیا۔ لوط علیہ السلام کی قوم کو ان کی قوم نے شہر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیں، جب کہ قریش مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عملاً شہر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ (کیلانی)

❷ ابو حیان اندلسی نے فرمایا کہ لوط علیہ السلام کے قصے سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ پورے قرآن میں لوط علیہ السلام کے انھیں اس بے حیائی سے روکنے ہی کا ذکر ہے، توحید کی دعوت کا ذکر نہیں، اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرتے ہوں، لیکن اس برے کام کی ایجاد اور اپنے رسول کو جھٹلانے کی وجہ سے ان پر عذاب آیا ہو، جیسا کہ سورۂ شعراء میں ہے: ﴿ **كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ اِۨلْمُرْسَلِيْنَ** ﴾ [ الشعراء : ١٦٠ ] ”لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔“ یا یہ وجہ ہے کہ وہ تھے تو مشرک لیکن جب لوط علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ بہیمیت میں بلکہ اس سے بھی نیچے درجے میں گر چکے ہیں، تو ضروری سمجھا کہ پہلے انھیں انسانیت کے رتبے کی دعوت دی جائے، پھر توحید کی دعوت دی جائے۔ (البحر المحیط)

**آیت 59** ❶ **قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ**: اس آیت کی پچھلی آیات کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والی قوموں کے انجام بد کے اور انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو نجات دینے کے ذکر کے بعد فرمایا کہ اللہ کے اس احسان پر ”الحمد للہ“ کہو کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے منکروں کی جڑ کاٹ دی اور اپنے بندوں کو بچا لیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** ﴾ [ الأنعام : ٤٥ ] ”تو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا

وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

اس نے چن لیا۔ کیا اللہ بہتر ہے، یا وہ جنھیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟ ﴿۵۹﴾

تھا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا رب ہے۔''

2 وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى : اس کا عطف ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' پر بھی ہو سکتا ہے کہ کہو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور کہو ''سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى'' اور ''قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ'' پر بھی۔ اس صورت میں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے چنیدہ بندوں پر سلام ہے اور یہی راجح ہے۔ یعنی اللہ کے ان بندوں پر سلام ہے جنھیں اس نے نبوت کے لیے یا انبیاء پر ایمان لانے اور ان کی مدد کے لیے چن لیا اور جو اپنی اقوام کی شدید مخالفت اور بے شمار مصائب کے باوجود حق پر ڈٹے رہے اور حق کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اللہ کے ان بندوں میں انبیاء، ان کے صحابہ اور تمام مومن شامل ہیں، جیسا کہ تشہد میں ہے: «اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ» ''سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔''

3 آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ : یعنی اللہ تو وہ ہے جو مجرموں کو سزا دیتا ہے اور اپنے چنیدہ بندوں کو نجات دیتا ہے اور ان پر سلام بھیجتا ہے۔ اب بتاؤ وہ اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنھیں لوگوں نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، جو دوسروں کو نفع یا نقصان تو کجا اپنی حفاظت تک نہیں کر سکتے۔

4 بعض مفسرین نے اس آیت کی پہلی آیات سے یہ مناسبت ذکر فرمائی کہ انبیاء کے قصص سے فارغ ہو کر ''آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ'' سے توحید کا بیان شروع فرمایا اور یہ الفاظ بطور خطبہ ارشاد فرمائے جو بیان شروع ہونے سے قبل کہنے چاہییں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اللہ کی تعریف اور پیغمبر پر سلام بھیج کر اگلی بات شروع کرنی لوگوں کو سکھلا دی۔'' (موضح) چنانچہ کلام کا یہی ادب علماء، خطباء اور واعظین کی تحریروں، تقریروں میں اور فتح کی خوش خبری اور کسی نعمت پر مبارکباد کے مکتوبات میں تورات سے چلا آتا ہے کہ ابتدا حمد و سلام سے کرتے ہیں۔ مگر اب اسے ملائیت سمجھا جانے لگا ہے اور موجودہ زمانے کے مسلمان مقررین اور مصنفین اپنی گفتگو یا تحریر کا آغاز اس کلام سے کرنے کا تصور تک اپنے ذہن میں نہیں رکھتے، یا پھر اس میں شرم محسوس کرتے ہیں۔

5 ''خَيْرٌ'' اسم تفضیل کا صیغہ ہے، جو اصل میں ''أَخْيَرُ'' تھا، زیادہ اچھا، یعنی کیا اللہ بہتر (زیادہ اچھا) ہے یا وہ جنھیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے معبودوں میں بھی کوئی خیر یا اچھائی ہے، کیونکہ ان میں تو کسی خیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دراصل ان پر طنز ہے کہ تم جو ان باطل معبودوں کو پوجتے ہو تو یقیناً ان میں کوئی خیر سمجھ کر ہی پوجتے ہو، مگر یہ بتاؤ کہ تمھارے مطابق بھی بہتر اور زیادہ اچھا کون ہے؟ یہ ایسا سوال ہے کہ ضدی سے ضدی مشرک بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے معبود بہتر ہیں، اور یہ مان لینے کے بعد کہ بہتر اللہ تعالیٰ ہے، ان کے شرک کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے، اس لیے کہ یہ بات تو سراسر عقل کے خلاف ہے کہ بہتر کو چھوڑ کر کمتر کو اختیار کیا جائے۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

(کیا وہ شریک بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ رونق والے باغات اگائے، تمھارے بس میں نہ تھا کہ ان کے درخت اگاتے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو راستے سے ہٹ رہے ہیں ﴿۶۰﴾

آیت 60 ❶ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ...... : ''حَدَآئِقَ'' ''حَدِيْقَةٌ'' کی جمع ہے، جو اصل میں وہ باغ ہے جس کے گرد دیوار ہو، پھر ہر باغ کو '' حَدِيْقَةٌ '' کہا جانے لگا۔ ''اَمَّنْ'' کے ''أَمْ'' سے پہلے ہمزہ استفہام والا ایک جملہ مقدر ہے، جو عبارت کے تسلسل سے سمجھ میں آرہا ہے: ''أَيِ أَشُرَكَاءُ هُمْ خَيْرٌ أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ''یعنی کیا ان کے شریک بہتر ہیں یا وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا؟'' یہاں اللہ تعالیٰ نے پانچ آیات میں اپنی وہ صفات ذکر فرمائیں جو مشرکین مکہ بھی مانتے تھے کہ وہ اللہ کے سوا کسی میں نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ ہر آیت میں چند صفات بیان کر کے فرماتے ہیں کہ جب یہ صفات صرف اللہ کی ہیں تو پھر کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہو سکتا ہے؟ اس پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ صفات بیان فرمائیں کہ آسمانوں کا خالق وہ ہے اور زمین کا بھی، پھر آسمان سے بارش برسانے والا اور اس کے ساتھ زمین سے خوش ذائقہ اور خوش منظر باغات اگانے والا بھی وہی ہے۔ مشرکین یہ تینوں باتیں مانتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴾ [ الزخرف : ۹ ] ''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً ضرور کہیں گے کہ انھیں سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے نے پیدا کیا ہے۔'' آسمان و زمین ہی نہیں، خود ان کو پیدا کرنے والا بھی وہ اللہ ہی کو مانتے ہیں، فرمایا: ﴿ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ [ الزخرف : ۸۷ ] ''اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر کہاں بہکائے جاتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [ العنکبوت : ۶۳ ] ''اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔'' مطلب یہ ہے کہ تم مانتے ہو کہ یہ سب کچھ کرنے والا وہ اکیلا ہے، کائنات کے اس سارے نظام میں نہ کوئی فرشتہ شریک ہے، نہ کوئی نبی و ولی اور نہ کوئی اور معبود، پھر اس کے ساتھ ان کی عبادت کرتے ہو جن کے متعلق مانتے ہو کہ نہ پیدا کرتے ہیں، نہ رزق دیتے ہیں، تو بتاؤ کیا اللہ کے ساتھ کوئی معبود ہو سکتا ہے جو نہ پیدا کرے نہ روزی دے؟ اور فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [ النحل : ۱۷ ] ''تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔'' عرب کے مشرکین ہی نہیں، دنیا بھر کے مشرکین مانتے تھے اور آج بھی مانتے ہیں کہ کائنات کا خالق اور کائنات کے نظام کو چلانے والا

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ

(کیا وہ شریک بہتر ہیں) یا وہ جس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں بنائیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان رکاوٹ بنا دی؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور)

اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے قرآن مجید کے اس سوال کا کوئی ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم شخص برائے بحث بھی یہ جواب نہیں دے سکتا تھا کہ ان کاموں میں ہمارے معبود شریک ہیں، اگر کوئی ایسا کہتا تو اس کی قوم کے ہزاروں آدمی اسے جھٹلا دیتے اور کہہ دیتے کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔

2 مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا: یہ اس خیال کی تردید ہے جو انسان کے ذہن میں آجاتا ہے کہ زمین کو ہم بناتے ہیں، بیج ہم ڈالتے ہیں، پانی ہم دیتے ہیں، غرض یہ باغ اور کھیتیاں اگانے والے ہم ہیں۔ فرمایا، تمھارے بس ہی میں نہ تھا کہ تم ان باغات کے درخت اگاتے، یہ ہم ہیں جنھوں نے رونق اور خوبی والے یہ باغ اگائے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴾ [ الواقعة : ٦٣ تا ٦٧ ] ”پھر کیا تم نے دیکھا جو کچھ تم بوتے ہو؟ کیا تم اسے اگاتے ہو، یا ہم ہی اگانے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو ضرور اسے ریزہ ریزہ کر دیں، پھر تم تعجب سے باتیں بناتے رہ جاؤ۔ کہ بے شک ہم تو تاوان ڈال دیے گئے ہیں۔ بلکہ ہم بے نصیب ہیں۔“

3 ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ: نہیں، اللہ کی قسم! نہیں۔

4 بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ: ”يَعْدِلُوْنَ“ ”عُدُوْلٌ“ سے ہے، جس کا معنی ہٹنا ہے، بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو راستے سے ہٹ رہے ہیں۔ یا ”عَدْلٌ“ سے ہے، جس کا معنی برابر کرنا ہے، بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو (دوسروں کو) اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ پہلے جنھیں مخاطب کیا گیا تھا، یعنی: ﴿ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ...... ﴾ (اور تمھارے لیے آسمان سے پانی اتارا......) اب انھیں غائب کے صیغے کے ساتھ ذکر فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴾ (بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو راستے سے ہٹ رہے ہیں) اس سے ناراضی کا اظہار ہو رہا ہے کہ یہ لوگ خطاب کے قابل نہیں۔

آیت 61 1 اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا: یا کون ہے جس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔ مفسر عبدالرحمان کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”اس ایک جملے میں اللہ تعالیٰ کی کئی قدرتیں سمٹ کر آ گئی ہیں۔ یہ بات تو ہزاروں سال پہلے انسان کے علم میں آ چکی تھی کہ ہمارا یہ عظیم الجثہ کرۂ زمین گول ہے اور فضا میں معلق ہے۔ زمین کا اکثر حصہ سمندر ہے اور زمین کے گول ہونے کے باوجود پانی اس سے گر نہیں جاتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر آسمانی کرہ کی طرح ہماری زمین میں بھی کشش ثقل موجود ہے، جس کی وجہ سے اشیاء زمین پر از خود گر تو سکتی ہیں مگر خود بخود کسی طاقت کے استعمال کے بغیر اوپر نہیں اٹھ سکتیں، ماسوائے گیسوں اور آبی بخارات کے کہ ان کا کرہ ہی زمین سے اوپر ہے۔ اگر کوئی گیس جو عام ہوا سے ہلکی ہو، زمین سے بھی نکلے گی تو از خود اوپر اٹھ جائے گی۔ یہ عجائبات ہی کیا کم تھے کہ اب مزید علم ہیئت کی تحقیقات نے ان عجائبات میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے، مثلاً

الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾

معبود ہے؟ بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿٦١﴾

یہ کہ ہماری زمین سورج کے سامنے رہتے ہوئے اپنے محور کے گرد تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور اس کا چکر ایک دن رات یا ۲۴ گھنٹوں میں پورا ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ ہماری زمین سورج سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے اور اس کے گرد بھی ایک سال میں ایک گردش پوری کرتی ہے، تو گویا سورج کے گرد اس کی گردش کی رفتار چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ ہے۔ ان دونوں قسم کی گردشوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ ہم محسوس تک نہیں کر سکتے، بلکہ آرام سے اس پر چلتے پھرتے اور زندگی بسر کرتے ہیں۔ زمین کے جائے قرار ہونے کا ایک مفہوم یہ ہوا اور صحیح احادیث میں وارد ہے کہ ہماری زمین پہلے ان گردشوں کی وجہ سے ہچکولے کھاتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مختلف اطراف میں پہاڑ ایسی مناسبت سے رکھ دیے کہ ہچکولے کھانا بند ہوگئی اور دوسری تمام اشیاء کے لیے قرار بن گئی۔ اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اگر زمین ہمیشہ سورج کے سامنے رہتی تو زمین کے نصف حصہ پر تو ہمیشہ دن چڑھا رہتا اور باقی نصف پر ہمیشہ رات ہی رہتی، اس طرح پوری کی پوری زمین نباتات اور سب جانداروں کے لیے بالکل ناکارہ ثابت ہوتی۔ اس لیے کہ نباتات اور جانداروں کی زندگی اور نشوونما کے لیے جیسے دن کی ضرورت ہے ویسے ہی رات کی بھی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر رات اور دن کا نظام قائم فرما کر اسے تمام مخلوق کے لیے جائے قرار بنا دیا۔ اس کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ زمین سے سورج کا فاصلہ اگر موجودہ فاصلے سے کم ہوتا تو تمام مخلوق گرمی کی شدت اور تپش سے مرجھا جاتی اور بالآخر ختم یا تباہ ہو جاتی اور اگر یہ فاصلہ زیادہ ہوتا تو اتنی زیادہ سردی ہوتی کہ تمام تر مخلوق سردی سے ٹھٹھر جاتی اور بالآخر تباہ یا ہلاک ہو جاتی۔ اس طرح بھی یہ زمین مخلوق کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی تھی۔ اس کا پانچواں پہلو یہ ہے کہ ہماری زمین سورج کے گرد ۷۷ ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے گھوم رہی ہے، جس سے ایک تو دن اور رات کے اوقات میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہتی ہے، کبھی دن بڑے ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور راتیں بتدریج چھوٹی ہوتی جاتی ہیں اور کبھی اس کے برعکس معاملہ شروع ہو جاتا ہے، پھر اس بنا پر موسموں میں تبدیلی آتی ہے، کبھی موسم گرما ہوتا ہے کبھی سرما، کبھی بہار، کبھی خزاں اور کبھی برسات اور ان موسموں کا مختلف قسم کی اجناس، غلے اور پھل دار درختوں کے پیدا ہونے، ان کی نشوونما اور فصلوں اور پھلوں کے پکنے سے گہرا تعلق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ نظام قائم نہ فرماتے تو پھر اس زمین پر بسنے والوں کے لیے خوراک کا مسئلہ نہایت پریشان کن صورت اختیار کر سکتا تھا۔ اس صورت میں یہ زمین ہمارے لیے جائے قرار نہ بن سکتی تھی اور اس کا چھٹا پہلو یہ ہے کہ ہماری زمین سے اوپر پانچ چھ سو میل کی بلندی تک کثیف ہوا کا کرہ بنا کر زمین کو آفات سماوی یا فضائی سے محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق تقریباً دو کروڑ شہاب ثاقب روزانہ ۳۰ میل فی سیکنڈ کی برق رفتاری سے ہماری زمین کا رخ کرتے ہوئے گرتے ہیں۔ جب وہ اس کرۂ ہوائی میں پہنچتے ہیں تو انھیں آگ لگ جاتی ہے اور وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض اوقات زیادہ بڑی جسامت والا شہاب زمین پر گر بھی پڑتا ہے اور زمین میں گہرا گڑھا ڈال دیتا ہے، لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے، جیسا اللہ کو منظور ہوتا ہے، عام حالات میں ہم ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ

اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَ یَجۡعَلُكُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۶۲﴾

یا وہ جو لاچار کی دعا قبول کرتا ہے، جب وہ اسے پکارتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے اور تمھیں زمین کے جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ بہت ہی کم تم نصیحت قبول کرتے ہو ﴿۶۲﴾

زمین کے گرد کرۂ ہوائی کا یہ انتظام نہ فرماتے تو زمین کبھی محفوظ جائے قرار نہیں بن سکتی تھی۔ غرض اس مسئلہ کے اتنے زیادہ پہلو ہیں کہ جتنا بھی ان میں غور کیا جائے مزید پہلو سامنے آتے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس نظامِ کائنات میں اللہ کے علاوہ کسی اور معبود کا بھی کچھ دخل ہے، خواہ یہ دخل کتنا ہی معمولی ہو؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر دوسروں کو اللہ کی عبادت میں کیسے شریک بنایا جا سکتا ہے؟'' (تیسیر القرآن)

❷ وَ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنۡهٰرًا: نہروں سے مراد تمام ندی نالے اور دریا وغیرہ ہیں، انھیں ایک تو بارش سے پانی مہیا ہوتا ہے، بارش کا کچھ پانی زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، باقی زائد پانی ندی نالوں کی طرف رخ کر لیتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا منبع پہاڑ اور پہاڑوں کے درمیان چشمے ہیں۔ سردیوں میں پہاڑوں پر برف جم جاتی ہے جو گرمیوں میں پگھل کر پہلے ندی نالوں کی اور پھر دریاؤں کی صورت اختیار کر لیتی ہے، یا یہ پانی پہلے سے بنے ہوئے ندی نالوں کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ انھی کے ذریعے سے ان علاقوں میں سیرابی ہوتی ہے جہاں بارش کم ہوتی ہے، یا وقت پر نہیں ہوتی اور نہروں کا بالخصوص ذکر اس لیے فرمایا کہ تمام نباتات اور جانداروں کی زندگی اور نشوونما کا دارومدار پانی پر ہے۔ ہوا کے بعد پانی ایسی اہم چیز ہے جس کے بغیر کوئی چیز اپنی زندگی باقی نہیں رکھ سکتی۔ (کیلانی)

❸ وَ جَعَلَ بَیۡنَ الۡبَحۡرَیۡنِ حَاجِزًا: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان (۵۳)۔

❹ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ: یعنی اکثر مشرکین حق کا علم نہیں رکھتے، اس لیے اللہ کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔ اکثر اس لیے فرمایا کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو حق کا علم رکھتے ہیں، مگر عناد کی وجہ سے اسے قبول نہیں کرتے۔

آیت 62 ❶ اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ ......: اس سے پہلے آفاق میں پائی جانے والی چیزوں کا ذکر تھا، جنھیں مشرکین بھی مانتے تھے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، اب خود انسان کی ذات میں پائی جانے والی چند چیزوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ کیا تمھارے معبود بہتر ہیں یا وہ ذات پاک کہ جب تمام سہارے جواب دے جاتے ہیں اور تمھاری مجبوری اور بے چارگی آخری حد کو پہنچتی ہے تو تم بے اختیار اسے پکارتے ہو اور وہ تمھاری فریاد سنتا اور اسے قبول کرتا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ یقیناً وہی بہتر ہے۔ مشرکین عرب خود اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ مصیبت کو ٹالنے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے اور یہ بات صرف مشرکین عرب تک ہی محدود نہیں، بلکہ دنیا بھر کے مشرکین کا عام طور پر یہی حال ہے، کیونکہ یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے، حتیٰ کہ روس کے دہریے، جو اللہ تعالیٰ کے منکر ہیں

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾

**یا وہ جو تمھیں خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں راہ دکھاتا ہے اور وہ جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری دینے کے لیے بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ بہت بلند ہے اللہ اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۶۳﴾**

اور جنھوں نے باقاعدہ اللہ کے وجود اور اس کی عبادت کے خلاف مہم چلا رکھی ہے، ان پر بھی جب گزشتہ جنگ عظیم میں جرمن فوجوں کا نرغہ سخت ہو گیا، تو انھیں اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی ضرورت محسوس ہو گئی تھی۔ اس لیے قرآن مجید یاد دلاتا ہے کہ جب تم پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو تم اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتے ہو، مگر جب وہ وقت ٹل جاتا ہے تو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہو۔ دیکھیے سورۂ انعام (۴۰، ۴۱)، یونس (۲۱، ۲۲)، نحل (۵۳ تا ۵۵) اور بنی اسرائیل (۶۷) یہ حال مشرکین اور منکرین کا تھا، مگر تعجب ہمارے زمانے کے ان مسلمانوں پر ہے جو توحید کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن مصیبت تک میں اللہ کو نہیں پکارتے، بلکہ یا رسول اللہ! یا غوث اعظم! یا معین الدین اجمیری! کشتی پار کر دے، جیسے نعرے لگاتے ہیں۔

❷ **وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ:** زمین کا جانشین بنانا دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ وہ تمھیں ایک نسل کے بعد دوسری نسل کی صورت میں زمین میں لاتا ہے۔ اگر ایک ہی وقت میں سب کو پیدا کر دیتا تو زمین تنگ ہو جاتی، رشتہ داریوں اور تعلقات کا سلسلہ قائم نہ ہو سکتا، سب لوگ باقی رہنے کی کوشش میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہتے، پھر یا تو ہر ایک کو صدیوں زمین پر جینا پڑتا، جہاں کوئی خوشی خالص نہیں ہے، یا چند ہی سالوں میں زمین کی آبادی کا یہ سلسلہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا۔ زمین کے جانشین بنانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ تمھیں ایک دوسرے کے بعد زمین میں سلطنت عطا کرتا ہے۔

❸ **قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ:** " قَلِيْلًا " کا معنی ہے "بہت کم۔" "مَا" کے ساتھ اس کی تاکید سے معنی ہو گیا "بہت ہی کم۔" یعنی پوری طرح نصیحت حاصل کرتے تو اللہ کے ساتھ شریک نہ بناتے۔

**آیت 63** ❶ **اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ :** یعنی یا وہ بہتر ہے جس نے ستاروں کے ذریعے سے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ تم رات کے اندھیرے میں بھی اپنا راستہ تلاش کر سکتے ہو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ تدبیروں میں سے ایک ہے کہ اس نے بحری اور برّی سفروں میں انسان کی رہنمائی کے لیے وہ ذرائع پیدا کر دیے ہیں جن سے وہ اپنی سمت، سفر اور منزل مقصود کی طرف راہ متعین کرتا ہے۔ دن کے وقت زمین کی مختلف علامتیں اور آفتاب کے طلوع و غروب کی سمتیں اس کی مدد کرتی ہیں اور تاریک راتوں میں تارے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سورۂ نحل میں ان سب کو اللہ تعالیٰ کے احسانات میں شمار کیا گیا ہے، فرمایا: ﴿وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ [ النحل : ۱٦ ] "اور علامتیں (بنائیں) اور ستاروں کے ساتھ وہ راستہ معلوم کرتے ہیں۔" (تفہیم القرآن) پھر مقناطیس میں قطب نمائی کی خاصیت رکھ کر بندوں کو اس سے آگاہ کر دینا بحر و بر اور دن رات میں رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔

اَمَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ وَ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ

یا وہ جو پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دہراتا ہے اور جو تمھیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ

② وَمَنۡ یُّرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ: رحمت سے مراد یہاں بارش ہے، جس کے آنے سے پہلے ہوائیں اس کی آمد کی خبر کر دیتی ہیں۔

آیت 64 ① اَمَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ: یہ سادہ سی بات، جسے ایک جملے میں بیان کر دیا گیا ہے، اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہے کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دور تک اترتا جاتا ہے اتنے ہی وجود الٰہ اور وحدت الٰہ کے شواہد اسے ملتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو بجائے خود تخلیق ہی کو دیکھیے، انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے؟! اس وقت تک مسلّم سائنٹفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں ان سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آجانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانون بخت و اتفاق کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔ اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں میں بے جان مادے سے جاندار مادہ پیدا کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز معلوم کی جا سکی ہے وہ صرف وہ مادہ ہے جسے اصطلاح میں ''ڈی۔این۔اے'' کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جو زندہ خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہر حیات تو ضرور ہے مگر خود جاندار نہیں۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے، جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد آگے دیکھیے، زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں، بلکہ بے شمار متنوّع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰ لاکھ اور نباتات کی تقریباً ۲ لاکھ انواع کا پتا چلا ہے، یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورت نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آرہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تک کہیں بھی دو نوعوں کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیات کا ڈھانچہ توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیات تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ متحجرات کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ خنثیٰ مشکل کہیں نہیں ملا ہے۔ آج تک کسی نوع کا جو فرد بھی ملا ہے، اپنی پوری صورت نوعیہ کے ساتھ ہی ملا ہے اور ہر وہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے بہم پہنچ جانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع، حکیم، ایک الخالق، الباری، المصور ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں متنوع صورتیں عطا کی ہیں۔

اللّٰہِ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۶۴﴾

**کوئی (اور) معبود ہے؟ کہہ لاؤ اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو ﴿۶۴﴾**

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ، اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوع حیوانی اور نباتی کی ساخت وترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد وحساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی جھوٹوں بھی ان کروڑ ہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علم تناسل کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کے لیے ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہو اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورت نوعیہ میں ممیّز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیے کے ایک حصہ میں ہوتا ہے، جسے بمشکل انتہائی طاقت ور خوردبین کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشوونما کو حتماً اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی اپنی صورت نوعیہ کا راستہ ہے۔ اسی کی بدولت گیہوں کے ایک دانے سے آج تک جتنے پودے بھی دنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں، انھوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے۔ کسی آب و ہوا یا کسی ماحول میں یہ حادثہ رونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانۂ جو پیدا ہوتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی، بلکہ ناقابل تصور وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص توالد و تناسل کے اس خوردبینی تخم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصے میں لیے ہوئے ہوتا ہے اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پُر پیچ عملیات کو دیکھے کہ جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخمِ تناسل اُسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی تصوّر نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے، بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبّر اور ایک حیّ و قیّوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی ان کارخانوں کی نگرانی و راہ نمائی سے غافل نہ ہو۔ یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق یہ گمان کر سکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ یا جن یا نبی یا ولی ذرّہ برابر بھی کوئی حصہ رکھتا ہے، اور کون صاحبِ عقل آدمی تعصب سے پاک ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق و اعادۂ خلق اس کمال حکمت و نظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا اور آپ سے آپ چلے جا رہا ہے۔ (تفہیم القرآن)

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾

کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا اور وہ شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے ﴿۶۵﴾

② وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: رزق دینے کا معاملہ بھی اتنا سادہ نہیں ہے جتنا سرسری طور پر کوئی شخص ان مختصر الفاظ کو پڑھ کر محسوس کرتا ہے۔ اس زمین پر لاکھوں انواع حیوانات کی اور لاکھوں ہی نباتات کی پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے اربوں افراد موجود ہیں اور ہر ایک کی غذائی ضروریات الگ ہیں۔ خالق نے ان میں سے ہر نوع کی غذا کا سامان اس کثرت سے اور ہر ایک کی دسترس کے اس قدر قریب فراہم کیا ہے کہ کسی نوع کے افراد بھی یہاں غذا پانے سے محروم نہیں رہ جاتے، اور پھر اس انتظام میں زمین اور آسمان کی اتنی مختلف قوتیں مل جل کر کام کرتی ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ گرمی، روشنی، ہوا، پانی اور زمین کے مختلف اقسام کے مادوں کے درمیان اگر ٹھیک تناسب کے ساتھ تعاون نہ ہو تو غذا کا ایک ذرّہ بھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ کون شخص تصور کر سکتا ہے کہ یہ حکیمانہ انتظام ایک مدبّر کی تدبیر اور سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر یوں ہی اتفاقاً ہو سکتا تھا؟ اور کون اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے کہ اس انتظام میں کسی جنّ، فرشتے یا کسی بزرگ کی روح کا کوئی عمل دخل ہے؟ (تفہیم القرآن)

③ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: یعنی اس چیز کی کوئی دلیل لاؤ کہ اللہ کے سوا یا اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ ظاہر ہے اس پر ان کے پاس کوئی دلیل ہے ہی نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۱۱۷ ] ’’اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے، جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں تو اس کا حساب صرف اس کے رب کے پاس ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ کافر فلاح نہیں پائیں گے۔‘‘ تو جب تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل ہی نہیں تو یہ بات تمھاری سمجھ میں کیسے آتی ہے کہ پیدا کرنا، رزق دینا اور دوسرے یہ تمام کام تو اللہ کے ہوں، مگر عبادت اس کے سوا یا اس کے ساتھ کسی اور کی کی جائے؟ "بُرْهَانَكُمْ" (اپنی دلیل) اس لیے فرمایا کہ فی الواقع تو کوئی دلیل نہیں، تم نے اگر کوئی دلیل بنا رکھی ہے تو پیش کرو۔

**آیت 65** ① قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...... : "الْغَيْبُ" "غَابَ يَغِيْبُ" کا مصدر ہے، اکثر غائب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مراد وہ چیزیں ہیں جو نہ حواس خمسہ سے معلوم ہو سکیں اور نہ عقل ان کا ادراک کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی معبود کی عبادت، اس سے فریاد کرنے اور اسے مشکل کشا یا حاجت روا سمجھنے کی ابتدا اس بات سے ہوتی ہے کہ اسے عالم الغیب سمجھ لیا جاتا ہے۔ ورنہ اگر عقیدہ یہ ہو کہ میرے تمام احوال سے میرے مالک کے سوا کوئی واقف ہی نہیں، تو وہ کسی غیر کو کیوں پکارے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ کوئی آسمان میں ہے یا زمین میں، اللہ کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا۔

2 اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو غیب کی بعض باتوں کی اطلاع دیتا ہے، مگر اس سے وہ عالم الغیب نہیں بن جاتے، کیونکہ انھیں اتنی ہی بات معلوم ہوتی ہے جتنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴾ [ الجن : ۲۶ تا ۲۸ ] ''(وہ) غیب کو جاننے والا ہے، پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر کوئی رسول، جسے وہ پسند کر لے تو بے شک وہ اس کے آگے اور اس کے پیچھے پہرا لگا دیتا ہے۔ تاکہ جان لے کہ انھوں نے واقعی اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں اور اس نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہیں اور ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو مصر سے قمیص کی روانگی کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام کی خوشبو آ گئی، مگر چند میل کے فاصلے پر کنویں میں پڑے ہوئے یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہو سکی اور سال ہا سال تک رونے کی وجہ سے آنکھیں سفید ہو گئیں، مگر علم اس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے معراج کروا دیا، مگر جوتوں پر لگی گندگی کا علم اسی وقت ہوا جب جبریل علیہ السلام نے آ کر نماز میں بتایا۔ اگر بعض باتیں معلوم ہونے سے کوئی عالم الغیب بن جاتا ہو تو ہم میں سے ہر شخص عالم الغیب ہو گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے ہمیں بھی غیب کی کئی باتوں کا علم ہے۔

3 اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ سوال کے انداز میں بیان ہوئی ہیں، کیونکہ مشرکین بھی مانتے تھے کہ پیدا کرنا، بارش اتارنا، رزق دینا اور دوسری صفات صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ علم کے متعلق چونکہ مشرکین یہ نہیں مانتے تھے، بلکہ غیر اللہ کو پکارتے ہی اس لیے تھے کہ سمجھتے تھے کہ وہ ہمارے حال سے واقف ہیں اور ہماری فریاد سن رہے ہیں، حالانکہ اکیلے اللہ تعالیٰ کو خالق ماننے کا مطلب یہی ہے کہ اپنی مخلوق کا پورا علم بھی وہی رکھتا ہے، فرمایا: ﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ [ الملك : ۱۴ ] ''کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے۔'' جس نے پیدا ہی نہیں کیا اسے اللہ کی مخلوق کے جملہ احوال کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر آج کل بھی بعض کلمہ گو حضرات انبیاء، اولیاء اور پیروں فقیروں کو اس عقیدے کے ساتھ پکارتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں، بلکہ صاف کہتے ہیں کہ وہ کون سی بات ہے جو ان سے مخفی ہے اور اس کے لیے انھوں نے بے شمار کہانیاں گھڑ رکھی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سوالیہ انداز کے بجائے صاف لفظوں میں کہہ دینے کا حکم فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔

4 جب انبیاء و اولیاء غیب نہیں جانتے تو کاہن، رمال، جفار، جوتشی، جعلی استخارے کر کے آئندہ کی خبریں بتانے والے اور چوریاں بتانے والے عالم الغیب کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ سب لوگ جھوٹے و دغا باز ہیں۔ آسمان سے سنی ہوئی کوئی بات سچی نکل آتی ہے تو وہ اس کے ساتھ اپنے جھوٹ کا بازار چمکاتے رہتے ہیں۔

5 اگر اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب ہوتا تو اس کے سب سے زیادہ لائق ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب عطائی تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''مَا كَانَ وَ مَا يَكُوْنُ'' کا علم عطا فرما دیا تھا، فرق صرف ذاتی اور عطائی کا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی کسی صفت میں برابر کا شریک بنا لے۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۸)

اور سورۂ نحل (۷۱) کی تفسیر۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دعویٰ کے لیے کہ اللہ تعالیٰ نے "مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ" (جو ہو چکا اور جو ہوگا) کا سارا علم نبی کریم ﷺ کو دے دیا تھا، یہ واضح کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وہ علم کب عطا فرمایا۔ اگر کہا جائے کہ نبوت ملنے سے پہلے یا وفات سے پہلے کسی وقت آپ کو یہ علم عطا ہو گیا تھا تو جبریل علیہ السلام کی آمد اور وحی کے نزول کا سلسلہ عبث ٹھہرتا ہے اور اگر کہا جائے کہ وفات سے پہلے تو آپ عالم الغیب نہیں تھے، البتہ وفات کے وقت عالم الغیب ہو گئے تھے، تو وہ احادیث اس کا رد کرتی ہیں جن میں فرشتوں کے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہنے کا ذکر ہے کہ (( إِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ )) [ بخاري : ٤٦٢٥ ] "تم نہیں جانتے انھوں نے تمھارے بعد کیا نئے کام کیے تھے۔" اور جن میں شفاعت کے لیے عرش کے نیچے سجدے کی حالت میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ محامد سکھانے کا ذکر ہے جو آپ ﷺ کو اس سے پہلے معلوم نہیں ہوں گے۔ (دیکھیے بخاری: ۷۵۱۰)

6 الغرض، یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب اللہ کے سوا کوئی نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے غیب کی کسی بات کی اطلاع دے دے، لیکن جمیع "مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ" کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ﴾ [ الأنعام : ٥٩ ] "اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" اور فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ [ لقمان : ٣٤ ] "بے شک اللہ، اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ بارش برساتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔" اور فرمایا: ﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ﴾ [ البقرة : ٢٥٥ ] "وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرتے مگر جتنا وہ چاہے۔"

قرآن مجید نے اللہ کے سوا کسی سے علم غیب کی صرف مطلق اور عام نفی ہی نہیں فرمائی بلکہ انبیاء علیہم السلام اور خود نبی کریم ﷺ کے بارے میں صاف تصریح فرمائی ہے کہ وہ عالم الغیب نہیں ہیں، انھیں غیب کا علم اتنا ہی دیا گیا ہے جس کی رسالت کے لیے ضرورت تھی۔ پہلے انبیاء کے متعلق دیکھیے، آدم علیہ السلام کا قصہ۔ [ طٰہٰ : ١٢٠ تا ١٢٢ ] نوح علیہ السلام کا قصہ۔ [ ھود : ٣١ تا ٣٦ اور ٤٥ تا ٤٧ ] ابراہیم علیہ السلام کا قصہ۔ [ الشعراء : ٦٩ تا ٨٦ ] لوط علیہ السلام کا قصہ۔ [ ھود : ٧٧ تا ٨٣ ] یعقوب علیہ السلام کا قصہ۔ [ یوسف : ٨٣، ٨٤ ] سلیمان علیہ السلام کا قصہ۔ [ النمل : ٢٠ تا ٢٨ ] موسیٰ علیہ السلام کا قصہ۔ [ الأعراف : ١٤٣۔ طٰہٰ : ٢١ اور ٦٤ تا ٦٨ اور ٨٣ تا ٨٦۔ النمل : ١٠۔ القصص : ٢٠ ] زکریا علیہ السلام کا قصہ۔ [ مریم : ٢ تا ١٠۔ آل عمران : ٣٧ تا ٤٧ ] داؤد علیہ السلام کا قصہ۔ [ صٓ : ٢٢ تا ٢٥ ] فرشتے بھی غیب نہیں جانتے۔ [ البقرة : ٣١ تا ٣٣ ] اور جن بھی غیب نہیں جانتے ہیں۔ [ سبا : ١٢ تا ١٤ ] ہمارے نبی کریم ﷺ کی زندگی کے تین زمانے ہیں، نبوت سے پہلے کا زمانہ۔ نبوت کا زمانہ اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد کا زمانہ۔ نبوت سے پہلے زمانے کے متعلق قرآن مجید نے تصریح فرمائی کہ آپ کو ان باتوں کا علم نہ تھا۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۵۲)، قصص

(۴۴ تا ۴۶، ۴۸) اور ہود (۴۹)۔

نبی بننے سے فوت ہونے تک کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو گزشتہ و آئندہ کے بے شمار واقعات اور علوم عطا فرمائے، مگر اللہ کے علم سے آپ کے علم کی کوئی نسبت نہیں، جیسا کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اور موسیٰ علیہ السلام کے علم کی اللہ تعالیٰ کے علم سے نسبت کی مثال سمندر اور چڑیا کی چونچ کے قطرے کی مثال دے کر سمجھائی۔ [ دیکھیے بخاري : ٤٧٢٥ ] ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (( مَنْ حَدَّثَكَ أَنَّهُ يَعْلَمُ الْغَيْبَ فَقَدْ كَذَبَ )) [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿ عالم الغيب فلا يظهر على غيبه أحدا ﴾...... : ٧٣٨٠، ٤٨٥٥ ] ''جو شخص تجھے یہ کہے کہ رسول ﷺ غیب جانتے تھے اس نے جھوٹ کہا۔''

اب نبی ﷺ کی زندگی کے چند واقعات اختصار کے ساتھ ملاحظہ ہوں جن سے آپ کے عالم الغیب ہونے کی نفی ہوتی ہے:
① عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق واقعۂ افک۔ دیکھیے سورۂ نور (۱۱ تا ۲۶) اور صحیح بخاری میں حدیث افک (۴۱۴۱)۔ ② شہد حرام کرنے کا واقعہ۔ دیکھیے سورۂ تحریم (۱ تا ۴) اور صحیح بخاری (۴۹۱۲)۔ ③ اللہ نے آپ سے کچھ پیغمبروں کا حال بیان فرمایا، کچھ کا نہیں۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۶۴)۔ ④ آپ کو قیامت کے وقت کا علم نہیں۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۶۳)، شوریٰ (۱۷)، اعراف (۱۸۷)، طٰہٰ (۱۵)، نمل (۶۵)، لقمان (۳۴)، حٰم السجدہ (۴۷)، زخرف (۸۵) اور ملک (۲۵، ۲۶)۔ ⑤ اللہ کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دیکھیے مدثر (۳۱)۔ ⑥ عبد اللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی کا واقعہ۔ دیکھیے سورۂ عبس (۱ تا ۱۲)۔ ⑦ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ مدینہ اور اس کے ارد گرد کچھ منافق ہیں، نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، تو انھیں نہیں جانتا، ہم انھیں جانتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۰۱)۔ ⑧ رسول اللہ ﷺ کا آسمانوں پر تشریف لے جانا اور جبریل علیہ السلام سے بار بار پوچھنا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ پھر آپ ﷺ کا فرمانا کہ سدرۃ المنتہیٰ کو ایسے رنگوں نے ڈھانپ لیا کہ میں نہیں جانتا وہ کیا تھے؟ [ دیکھیے بخاري، الصلاة، باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء : ٣٤٩ ] ⑨ فتح مکہ کے موقع پر آپ پردے کے پیچھے غسل کر رہے تھے کہ ام ہانی رضی اللہ عنہا حاضر ہوئیں، اس نے سلام کہا تو آپ نے فرمایا: ''کون ہے؟'' بتایا کہ ام ہانی ہوں۔ [ دیکھیے بخاري، الغسل، باب التستر في الغسل عند الناس : ٢٨٠ ] ⑩ ایک سفر میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا، رسول اللہ ﷺ اور لوگ آپ کے ساتھ اس کی تلاش کے لیے ٹھہر گئے۔ بعد میں اس اونٹ کو کھڑا کیا جس پر عائشہ رضی اللہ عنہا سو رہی تھیں تو ہار اس کے نیچے سے مل گیا۔ [ دیکھیے بخاري، التيمم، باب : ٣٣٤ ]

⑪ مرض الموت میں جب آپ کا مرض بڑھ گیا تو آپ بار بار بے ہوش ہو کر ہوش میں آتے تو فرماتے: ''لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟'' عرض کیا جاتا، نہیں تین بار ایسا ہوا۔ [ دیکھیے بخاري، الأذان، باب أن جعل الإمام ليؤتم به : ٦٨٧ ] ⑫ ستر صحابہ کو مشرکین کی ایک جماعت کی طرف بھیجا، انھوں نے ان کو شہید کر دیا، آپ سخت غمگین ہوئے۔ [ دیکھیے بخاري، الوتر، باب القنوت قبل الركوع و بعده : ١٠٠٢ ] ⑬ رسول اللہ ﷺ سوئے رہے، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ بھی سوئے رہے، سورج پوری طرح نکل آیا تو صبح کی نماز بعد میں پڑھی۔ [ دیکھیے مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة...... : ٦٨٠ ]

⑭ مسجد میں جھاڑو دینے والی عورت فوت ہو گئی اور جنازے کے بعد دفن کر دی گئی، تو آپ نے فرمایا: ''تم نے مجھے کیوں نہیں

بتایا۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر بتاؤ۔'' [دیکھیے بخاري، الصلاة، باب کنس المسجد : ٤٥٨ ] ⑮ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اپنے گھر جاتا ہوں، وہاں مجھے میرے بستر پر کھجور پڑی ہوئی ملتی ہے، میں اسے کھانے کے لیے اٹھا لیتا ہوں، لیکن پھر یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں یہ صدقہ کی کھجور نہ ہو تو میں اسے پھینک دیتا ہوں۔'' [ دیکھیے بخاري، اللقطة، باب إذا وجد تمرة ...... : ٢٤٣١ ]

⑯ آپ نے فرمایا: ''مجھے لیلۃ القدر دکھائی گئی، پھر بھلا دی گئی۔'' [ دیکھیے بخاري، فضل ليلة القدر، باب التماس ليلة القدر...... : ٢٠١٦ ] ⑰ بنو عکل اور عرینہ کے لوگوں کا واقعہ جنھیں آپ ﷺ نے اونٹوں کے ساتھ رہ کر دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا اور وہ تندرست ہونے پر آپ کے چرواہے کو قتل کر کے اونٹنیاں ہانک کر لے گئے۔ [ دیکھیے بخاري، الجهاد والسير، باب إذا حرق المشرك...... : ٣٠١٨، ٢٣٣ ] ⑱ یہودی عورت کا بکری کے گوشت میں زہر ملانے کا واقعہ۔ [ دیکھیے بخاري، الهبة و فضلها، باب قبول الهدية من المشركين : ٢٦١٧ ] ⑲ رسول اللہ ﷺ نے دس آدمیوں کو جاسوسی کے لیے روانہ کیا، ان کا سردار عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ سات شہید ہو گئے، تین بچ گئے، انھوں نے دعا کی: ''یا اللہ! ہماری خبر ہمارے پیغمبر ﷺ کو پہنچا دے۔'' بعد میں باقی دو بھی شہید ہو گئے اور خبیب رضی اللہ عنہ قیدی بن گئے، پھر ان کو بھی شہید کر دیا گیا۔ [ دیکھیے بخاري، الجهاد والسير، باب هل يستأسر الرجل؟...... : ٣٠٤٥ ] مزید واقعات محترم ارشاد اللہ مان کی کتاب ''تلاشِ حق'' میں دیکھیں، انھوں نے یہاں اٹھتر (۷۸) واقعات نقل کیے ہیں۔

رہا نبی ﷺ کی وفات کے بعد کا زمانہ، تو کئی احادیث سے ثابت ہے کہ آپ قیامت کے دن بھی عالم الغیب نہیں ہوں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( يَأَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ إِلَى اللّٰهِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا، ثُمَّ قَالَ : ﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ إِلٰى آخِرِ الْآيَةِ ثُمَّ قَالَ : أَلَا وَإِنَّ أَوَّلَ الْخَلَائِقِ يُكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِبْرَاهِيْمُ، أَلَا وَإِنَّهُ يُجَاءُ بِرِجَالٍ مِنْ أُمَّتِيْ فَيُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ! أُصَيْحَابِيْ، فَيُقَالُ، إِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ، فَأَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ : ﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ﴾ فَيُقَالُ : إِنَّ هٰؤُلَاءِ لَمْ يَزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى أَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ )) [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ و كنت عليهم شهيدا ما دمت فيهم...... ﴾ : ٤٦٢٥ ] ''اے لوگو! تم اللہ کے سامنے ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ جمع کیے جاؤ گے۔'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ [ الأنبياء : ١٠٤ ] ''جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کی ابتدا کی (اسی طرح) ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں۔'' پھر فرمایا: ''سنو! سب سے پہلے قیامت کے دن ابراہیم علیہ السلام کو کپڑے پہنائے جائیں گے۔ سن لو! میری امت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے، فرشتے ان کو پکڑ کر بائیں طرف والوں (یعنی دوزخیوں) میں لے جائیں گے۔ میں عرض کروں گا: ''اے رب! یہ تو میرے امتی ہیں۔'' ارشاد ہوگا: ''تم نہیں جانتے، انھوں نے تمھارے بعد کیا کام کیے۔'' تو اس وقت میں وہی کہوں گا جو اللہ کے نیک بندے

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

بلکہ ان کا علم آخرت کے بارے میں گم ہو گیا ہے، بلکہ وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں، بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں ﴿۶۶﴾

عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: ﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ﴾ [ المائدة: ۱۱۷ ] ''اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا، پھر جب تُو نے مجھے اٹھا لیا تو تُو ہی ان پر نگران تھا۔'' ارشاد ہوگا: ''یہ لوگ اپنی ایڑیوں کے بل اسلام سے پھرتے رہے جب تو ان سے جدا ہوا۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَأَسْتَأْذِنُ عَلٰى رَبِّي فَيُؤْذَنُ لِي فَأَقُوْمُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَأَحْمَدُهُ بِمَحَامِدَ لَا أَقْدِرُ عَلَيْهِ الْآنَ، يُلْهِمُنِيْهِ اللّٰهُ تَعَالٰى )) [ مسلم، الإيمان، باب أدنى أهل الجنة منزلة فيها : ۱۹۳/۳۲۶ ] ''(قیامت کے روز جب سب لوگ میرے پاس آئیں گے تو) میں اپنے رب سے اجازت مانگوں گا، مجھے اجازت دے دی جائے گی تو میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا اور اللہ کی ایسی حمد وثنا کروں گا کہ آج میں اس پر قادر نہیں، اس وقت وہ حمد اللہ تعالیٰ مجھے القا کرے گا۔''

⑦ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ علمِ غیب کی نفی ان سے نہیں کی جا رہی جو قیامت کے دن اٹھائے نہیں جائیں گے، مثلاً بت یا حجر وشجر، یا شمس وقمر، یا فرشتے، بلکہ ان لوگوں سے کی جا رہی ہے جو قیامت کو اٹھائے جائیں گے، خواہ وہ پیغمبر ہوں یا صدیق، یا شہداء، یا صالحین۔ فرمایا، علم غیب تو کجا انھیں یہ بھی شعور نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔

**آیت 66** ① بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ : ''ادّٰرَكَ'' اصل میں ''تَدَارَكَ'' ہے، جو باب تفاعل سے ماضی کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ ''درك'' ہے، اسی سے ''ادّٰرَكَ'' بنا ہے، کسی چیز کو پا لینا۔ ''تَدَارَكَ'' کا معنی ہے کسی چیز کو پکڑنے کے لیے لگا تار دوڑنا، بھاگ کر پیچھے سے پکڑنے کی کوشش کرنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ آخرت کو جاننے کے لیے ان کا علم لگا تار دوڑتا ہی رہا، مگر اسے حاصل نہ کر سکا، آخر تھک ہار کر رہ گیا۔ ''غَابَ'' گم ہو گیا، ''اِنْتَهٰى'' ختم ہو گیا۔ ''ادّٰرَكَ'' کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں، ان میں سے سب سے صحیح یہی قول ہے، کیونکہ طبری نے معتبر سند کے ساتھ علی بن ابوطلحہ کے واسطے سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: ''﴿ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ يَقُوْلُ غَابَ عِلْمُهُمْ'' [ طبري : ۲۷۲۹۲ ] یعنی ''ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ'' کا معنی ہے آخرت کے بارے میں ان کا علم گم ہو گیا۔

② ''عَمُوْنَ'' ''عَمِيٌّ'' (بروزن فَرِحٌ) کی جمع ہے، مراد دل کے اندھے ہیں۔

③ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا آسمان وزمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا اور وہ شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ظاہر ہے اس میں مشرکین کے بنائے ہوئے معبودوں کے ساتھ انبیاء وصحابہ سب شامل ہیں کہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام عام کفار ومشرکین کی طرف پھر گیا ہے، جو قیامت کے منکر تھے، ان کے متعلق تین دفعہ لفظ ''بَلْ'' کے ساتھ تین باتیں فرمائیں، بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم گم ہو گیا ہے، انھیں

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

**اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی تو کیا واقعی ہم ضرور نکالے جانے والے ہیں؟ ﴿۶۷﴾ بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے ہم سے یہ وعدہ کیا گیا اور ہمارے باپ دادا سے بھی، یہ نہیں ہیں مگر پہلے لوگوں کی فرضی کہانیاں ﴿۶۸﴾**

اس کے وقوع کے وقت کے متعلق کچھ علم نہیں، بلکہ انھیں قیامت کے واقع ہونے ہی میں شک ہے۔ قیامت کی فکر تو وہ کرے گا جسے اس کے حق ہونے کا یقین ہو، بلکہ یہ جان بوجھ کر اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں، پیغمبر کی بات پر اور قیامت کے حق ہونے کے دلائل پر غور تک کرنے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ اس سے انھیں اللہ کے سامنے پیش ہونے اور حساب دینے پر یقین کرنا پڑتا ہے، جس کے بعد وہ اپنی خواہش پرستی اور من مانی نہیں کر سکتے، اس لیے قیامت کے انکار کا بہانہ یہ بنائے رکھتے ہیں کہ بتاؤ وہ قیامت کب قائم ہو گی؟ جیسا کہ فرمایا: ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ﴾ [ القیامۃ : ۱ تا ٦ ] ”نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں! اور نہیں، میں بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں! کیا انسان گمان کرتا ہے کہ بے شک ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ کیوں نہیں؟ (ہم انھیں اکٹھا کریں گے) اس حال میں کہ ہم قادر ہیں کہ اس (کی انگلیوں) کے پورے درست کر (کے بنا) دیں۔ بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے (آنے والے دنوں میں بھی) نافرمانی کرتا رہے۔ وہ پوچھتا ہے اٹھ کھڑے ہونے کا دن کب ہو گا؟“

**آیت 67** وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ...... : پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ کفار آخرت سے اندھے بنے ہوئے ہیں، اس آیت میں بتایا کہ وہ اپنے اندھے پن میں کیسے بے کار اعتراض کرتے ہیں۔ یہاں بظاہر ” قَالُوْا “ کہنا ہی کافی تھا کہ ”انھوں نے کہا“ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ ”اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا“ یعنی ان کی اس بات کا سبب ان کا کفر، یعنی حق کو چھپانا اور اس کا انکار کرنا ہے۔ دوبارہ زندہ کرنے پر تعجب کے اظہار کے لیے کفار نے دو مرتبہ ہمزہ استفہامیہ استعمال کیا ہے اور دوسرے ہمزہ کے بعد مزید تعجب کے اظہار کے لیے ”اِنَّ“ اور لام تاکید کا لفظ استعمال کیا ہے کہ ”کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی تو کیا واقعی ہم ضرور نکالے جانے والے ہیں۔“ ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک قبروں میں جانے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے نکالا جانا ممکن ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کا جواب دیا ہے کہ جس نے پہلی دفعہ بنایا وہ دوبارہ کیوں نہیں بنا سکتا۔

**آیت 68** ① لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ : اس بات کا یعنی قبروں سے نکالے جانے کا وعدہ ہم سے اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادا سے بھی کیا گیا۔ یہاں ”هٰذَا“ کا لفظ ”نَحْنُ“ سے پہلے ہے، جب کہ سورۂ مومنون میں ”نَحْنُ“

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

کہہ زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوا ﴿۶۹﴾ اور ان پر غم نہ کر اور نہ اس سے کسی تنگی میں ہو جو وہ چال چلتے ہیں ﴿۷۰﴾

---

کا لفظ پہلے ہے، فرمایا: ﴿ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا ﴾ [ المؤمنون : ۸۳ ] اس کی حکمت مفسرین نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ہر مقام کے لحاظ سے جو لفظ زیادہ اہم ہوتا ہے وہ پہلے لایا جاتا ہے۔ دونوں مقامات کا مقابلہ کرنے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

② اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: یعنی پہلے ہمارے بڑوں سے بھی یہی وعدے کیے گئے تھے، وہی باتیں یہ پیغمبر نقل کر رہے ہیں، درحقیقت یہ محض فرضی قصے کہانیاں ہیں جو پہلے لوگوں نے دنیا کا نظام چلانے اور سرکشوں کو قابو میں رکھنے کے لیے گھڑیں اور نسل در نسل بیان ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ ہم نے آج تک نہ دیکھا، نہ سنا کہ کوئی شخص مرنے کے بعد زندہ ہوا ہو، اسے نیکی پر جزا یا بدی پر سزا ملی ہو۔ ہمارے زمانے میں بھی جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس بھی اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہے، حالانکہ اس کا تعلق دیکھنے یا سننے سے نہیں، بلکہ اس کا تمام تر انحصار ایسے سچے (پیغمبر) کی خبر پر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔

**آیت 69** ① قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... : یہ کفار کے اعتراض کا جواب ہے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو مجرموں کا انجام کیا ہوا، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبروں نے ان نافرمانوں سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو کر رہا اور پیغمبروں کی کوئی بات جھوٹی نہیں ہوئی۔ اب جو ان پیغمبروں نے کہا ہے کہ ایک دن قیامت ضرور آئے گی اور اس میں لوگوں کو ان کے نیک اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا ملے گی تو ان کی یہ بات بھی جھوٹی نہیں ہو سکتی۔

② فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ: قیامت کے منکروں کو مجرم قرار دیا گیا ہے، کیونکہ انسان کو جرم اور ظلم و زیادتی سے روکنے والی چیز صرف اور صرف آخرت کا یقین ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی کو مجرم بننے سے کوئی چیز باز رکھ سکتی ہی نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ جب قیامت کے منکروں کے جرائم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو اس کا زبردست ہاتھ انھیں تباہ و برباد کر کے دنیا کو ان کے وجود اور ان کے جرائم سے نجات دیتا ہے، مگر ان کے جرائم کا پورا بدلا تو انھیں آخرت ہی میں دیا جائے گا۔ دنیا میں اگر کوئی بچ بھی گیا تو آخرت میں بچ کر کہاں جائے گا۔

**آیت 70** ① وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ: اس میں آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، تو آپ ان پر غمگین نہ ہوں۔ آپ کا کام سمجھانا اور بدی کے انجام سے آگاہ کرنا ہے، کسی کو مومن بنا دینا نہ آپ کا کام ہے، نہ آپ کی ذمہ داری۔

② وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ: یعنی یہ لوگ آپ کے خلاف جو سازشیں کرتے اور چالیں چلتے ہیں، ان سے آپ

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور وہ کہتے ہیں کب (پورا) ہوگا یہ وعدہ، اگر تم سچے ہو؟ ﴿۷۱﴾ کہہ دے قریب ہے کہ تمھارے پیچھے آ پہنچا ہو اس کا کچھ حصہ جو تم جلدی مانگ رہے ہو ﴿۷۲﴾ اور بے شک تیرا رب یقیناً لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن ان کے اکثر شکر نہیں کرتے ﴿۷۳﴾

---

تنگ دل نہ ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کا محافظ و نگہبان ہے: ﴿وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المائدۃ: ٦٧] وہی آپ کو ان لوگوں سے بچائے گا اور وہ اپنے مکر و فریب میں خود ہی گرفتار ہوں گے، آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

**آیت 71** ① **وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ** ......: کافروں کا یہ کہنا اس لیے نہیں تھا کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ قیامت اور اس میں ہونے والا عذاب کب واقع ہوگا، بلکہ وہ یہ بات قیامت کا مذاق اڑانے کے لیے کہتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم اسے جلد از جلد لانے کا مطالبہ کریں گے، جب وہ ہمارے تقاضے کے مطابق واقع نہیں ہوگی تو ہمیں اس کا مذاق اڑانے کا اور اسے جھوٹ قرار دینے کا موقع مل جائے گا۔

② لفظ "**الْوَعْدُ**" کے ساتھ بھی وہ قیامت کا تمسخر اڑا رہے تھے، کیونکہ وعدہ اچھی چیز کا ہوتا ہے، بری چیز کی وعید ہوتی ہے۔ وہ مذاق اڑاتے ہوئے قیامت کو "**هٰذَا الْوَعْدُ**" کہہ رہے ہیں، پھر "**اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ**" کہہ کر جلد از جلد عذاب لانے پر ابھار رہے ہیں، انھیں یہ معلوم نہیں کہ پیغمبروں کے سچے ہونے میں کوئی شک نہیں، مگر عذاب لانا یا نہ لانا اور جلدی لانا یا دیر سے لانا پیغمبر کا کام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ پیغمبر کا کام صرف خبردار کرنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ [الملك: ٢٥، ٢٦] "اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ کہہ دے یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تو بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔"

**آیت 72** **قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ** ......: "ردیف" اس شخص کو کہتے ہیں جو سواری پر کسی شخص کے پیچھے بیٹھا ہو۔ یعنی جلدی نہ مچاؤ، جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو، وہ ہر حال میں آ کر رہے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ تمھارے قریب آ پہنچا ہو۔ اس کچھ حصے کا آغاز تو جنگ بدر ہی سے ہو گیا تھا، پھر آپ ﷺ کی زندگی ہی میں اس کچھ حصے کی کئی قسطوں سے کفار کو سابقہ پیش آتا رہا، پھر قبر کا عذاب بھی قریب ہے اور قیامت بھی کچھ دور نہیں، فرمایا: ﴿اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ [النحل: ١] "اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔"

**آیت 73** **وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ** ......: "**لَذُوْ فَضْلٍ**" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "بڑے فضل والا" کیا گیا ہے، یعنی ان لوگوں کے جلدی عذاب لانے کے مطالبے کے باوجود اللہ تعالیٰ عذاب میں تاخیر کر رہا ہے اور انھیں مہلت دے رہا ہے، تو یہ اس کا ان پر بہت بڑا فضل ہے، جس پر انھیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے، مگر اکثر لوگ شکر نہیں

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾

**اور بے شک تیرا رب یقیناً جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں ﴿۷۴﴾ اور آسمان و زمین میں کوئی غائب چیز نہیں مگر وہ ایک واضح کتاب میں موجود ہے ﴿۷۵﴾ بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں ﴿۷۶﴾**

کرتے۔ اکثر اس لیے فرمایا کہ ایک قلیل تعداد اہلِ ایمان کی ایسی ہے جو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

**آیت 74** **وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ ......** : یعنی عذاب میں تاخیر کی یہ وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال کا علم نہیں، یقیناً تیرا رب وہ بھی جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور وہ بھی جو وہ ظاہر کر رہے ہیں۔ لفظ ''رب'' میں تاخیر اور مہلت کا سبب بیان ہوا ہے اور اس بات میں کہ وہ ان کی سینوں میں چھپی ہوئی اور ان کی ظاہر ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے، شدید وعید بھی ہے، جیسے کسی کو ڈانٹنا ہو تو کہا جاتا ہے کہ میں تمھاری حرکتیں دیکھ رہا ہوں۔ پوشیدہ باتوں کو جاننا تو صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے ہی، لوگوں کے ظاہر اعمال کو جاننا بھی صرف رب تعالیٰ ہی کی شان ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا ایک وقت میں اتنے لوگوں کی بات سن ہی نہیں سکتا، ان کے ہر عمل سے کیسے باخبر ہو سکے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ رعد (۱۰)، ہود (۵) اور طٰہٰ (۷)۔

**آیت 75** **وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ......** : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۵۹) ''غَآئِبَةٍ'' میں تاء مبالغہ کے لیے ہے، جیسے '' كَافِيَةٌ '' اور ''عَلَّامَةٌ '' میں ہے، یعنی انتہائی مخفی چیز بھی لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے، لہٰذا جس عذاب کی یہ جلدی مچا رہے ہیں اس کا وقت بھی اس میں لکھا ہے، وہ اپنے وقت پر آ کر رہے گا۔ اس کا دیر سے آنے کا یہ مطلب لینا کہ نہیں آئے گا، سراسر حماقت ہے۔

**آیت 76** ① **اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ......** : مفسر رازی نے پچھلی آیات کے ساتھ اس آیت کی مناسبت یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کی ابتدا اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کے اثبات پر گفتگو کرنے کے بعد اب نبوت پر بحث شروع فرمائی اور آپ ﷺ کی نبوت کے اثبات میں چونکہ قرآن ہی سب سے بڑی دلیل ہے، اس لیے سب سے پہلے اس کا ذکر فرمایا، یعنی یہ قرآن آپ ﷺ کے معجزات میں سے ہے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہیں۔ بنی اسرائیل کے لیے جو تورات و انجیل کے عالم ہیں، اس کی یہ بات دلیل ہے کہ یہ ان کی اکثر وہ اشیاء بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے اور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان میں حق اور درست بات کیا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾

**اور بے شک وہ یقیناً ایمان والوں کے لیے سراسر ہدایت اور رحمت ہے ﴿۷۷﴾ یقیناً تیرا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا اور وہی سب پر غالب، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۷۸﴾**

② اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ: یہود و نصاریٰ بہت سے فرقوں میں بٹ گئے تھے، اس بنا پر ان کے درمیان سخت اختلافات پائے جاتے تھے، مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی جھوٹا اور ولد الزنا کہتے تھے۔ نصاریٰ نے یہاں تک غلو کیا کہ انھیں عین ذاتِ الٰہی یا اس کا بیٹا بنا بیٹھے۔ (نعوذ باللہ) اسی طرح اور بھی بہت سے امور تھے جن میں ان کے درمیان سخت اختلافات پائے جاتے تھے۔ ان میں حق اور اعتدال کی راہ قرآن نے واضح کی جو قرآن کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۴۸) اگر وہ اس راہ کو اختیار کرتے تو ان میں ہرگز کوئی اختلاف نہ رہتا اور ان سب کی فرقہ بندی ختم ہو جاتی۔

③ یہ جو فرمایا کہ قرآن بنی اسرائیل کے لیے اکثر وہ چیزیں بیان کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، تو اس میں اشارہ ہے کہ اس نے بہت سی باتیں جن میں ان کا اختلاف ہے، بیان نہیں کیں، کیونکہ ان کے ذکر کرنے سے کوئی اہم مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا اور اس لیے کہ اس میں ان کی بعض خطاؤں اور لغزشوں کی پردہ پوشی ہے جو ان سے سرزد ہوئیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے ذکر نہ کرنے کو اپنی طرف سے عفو قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ [ المائدۃ: ۱۵ ] ''اے اہل کتاب! بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو تمھارے لیے ان میں سے بہت سی باتیں کھول کر بیان کرتا ہے، جو تم کتاب میں سے چھپایا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔ بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آئی ہے۔''

آیت 77 وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: اگرچہ یہ قرآن تمام جہانوں کو خبردار کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔ (دیکھیے فرقان: ۱) مگر اس سے ہدایت اور رحمت انھی کو حاصل ہوتی ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۲ تا ۵) اور ایمان والے لوگ ہی ان گمراہیوں سے بچتے ہیں جن میں بنی اسرائیل اور مشرکین عرب مبتلا ہوئے۔ اس قرآن کی بدولت انھیں زندگی کا سیدھا راستہ ملے گا اور اس کی بدولت ان پر اللہ کی وہ رحمتیں ہوں گی جن کا تصور بھی بنی اسرائیل یا کفارِ قریش نہیں کر سکتے، چنانچہ چند ہی سالوں میں وہ لوگ جو سراسر گمراہی میں مبتلا تھے، ہدایت میں دنیا کے امام بن گئے اور ان پر اللہ کی اتنی رحمتیں ہوئیں کہ وہ روئے زمین کے بہت بڑے حصے کے فرماں روا بن گئے۔

آیت 78 ① اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ: یعنی جس طرح تیرے رب نے دنیا میں ان کے اختلافات اور تحریفات کا بھانڈا پھوڑا ہے، اسی طرح وہ قیامت کے دن بھی اپنے حکم کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا کہ کون حق پر تھا

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ

پس اللہ پر بھروسا کر، یقیناً تو واضح حق پر ہے ۝ بے شک تو نہ مُردوں کو سناتا ہے اور نہ بہروں کو اپنی پکار

اور کون باطل پر۔ دیکھیے سورۂ زمر (۴۶)۔

② وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ : کیونکہ وہ سب پر غالب ہے، اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ وہ سب کچھ جانتا ہے، اس سے کوئی بات مخفی نہیں، اس لیے اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔

آیت 79 فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ...... : اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرتے ہوئے اس پر بھروسا رکھیں، دشمنوں کی تکذیب، استہزا، ایذا رسانیاں اور سازشیں اگرچہ پریشان کرنے والی ہیں، مگر آپ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیں، کیونکہ آپ واضح حق پر ہیں جس کے سچا ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور جو حق پر ہو اسے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ غلبہ آخر کار حق ہی کا ہوگا۔

آیت 80 ① اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ...... : یہ بھی آپ ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ آپ ان لوگوں کے قرآن پر ایمان نہ لانے سے دل گرفتہ نہ ہوں، ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ انھوں نے ایمان لانا ہی نہیں۔ یہ کافر لوگ مُردوں کی طرح ہیں، جنھیں دعوت دینا اور نصیحت کی کوئی بات سنانا قطعی سودمند نہیں اور یہ ان بہروں کی طرح ہیں جو پیٹھ دے کر بھاگ رہے ہوں۔ اگر وہ سامنے دیکھ رہے ہوتے تو شاید توجہ کے ساتھ کچھ سمجھ جاتے، مگر پیٹھ دے کر بھاگنے کی صورت میں تو ممکن ہی نہیں کہ وہ کوئی بات سن سکیں۔ روحانی موت اور روحانی بہرے پن کو جسمانی موت اور جسمانی بہرے پن کے ساتھ تشبیہ سے ظاہر ہے کہ مُردوں کو کوئی بات سنائی نہیں جاسکتی۔ یہ نفی عام ہے، اس سے صرف وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جو دلیل (کتاب و سنت) سے ثابت ہوں اور وہ صرف دو ہیں، ان کے علاوہ کسی آیت یا صحیح حدیث سے مُردوں کا سننا ثابت نہیں۔ ایک موقع وہ ہے جو انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلْعَبْدُ إِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهِ وَتُوُلِّيَ وَ ذَهَبَ أَصْحَابُهُ حَتّٰى إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ، أَتَاهُ مَلَكَانِ فَأَقْعَدَاهُ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؟ فَيَقُوْلُ أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهُ، فَيُقَالُ انْظُرْ إِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ أَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا، وَ أَمَّا الْكَافِرُ أَوِ الْمُنَافِقُ فَيَقُوْلُ لَا أَدْرِيْ، كُنْتُ أَقُوْلُ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ، فَيُقَالُ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ، ثُمَّ يُضْرَبُ بِمِطْرَقَةٍ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً بَيْنَ أُذُنَيْهِ فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ إِلَّا الثَّقَلَيْنِ » [ بخاري، الجنائز، باب الميت يسمع ...... : ۱۳۳۸ ] ''بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس سے رخ پھیر لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس چل دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان کے جوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے، تو اس کے پاس دو فرشتے آ جاتے ہیں، اسے بٹھا دیتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں: ''اس شخص یعنی محمد ﷺ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟'' وہ جواب دیتا ہے: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے

الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ ﴿۸۰﴾

سنا سکتا ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر پلٹ جائیں ﴿۸۰﴾

بندے اوراس کے رسول ہیں۔'' تو اس سے کہا جاتا ہے: ''جہنم میں اپنے ٹھکانے کی طرف دیکھ، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں تیرے لیے ایک ٹھکانا جنت میں بنا دیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اس بندۂ مومن کو جنت و جہنم دونوں دکھائی جاتی ہیں۔ اور رہا کافر یا منافق تو وہ (اس سوال کے جواب میں) کہتا ہے: ''مجھے نہیں معلوم، میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تھا، وہی میں بھی کہتا رہا۔'' تو اسے کہا جاتا ہے: ''نہ تو نے کچھ سمجھا اور نہ (اچھے لوگوں کی) پیروی کی۔'' اس کے بعد ہتھوڑے کے ساتھ اس کے دونوں کانوں کے درمیان (یعنی سر پر) بڑی زور سے مارا جاتا ہے اور وہ اتنے بھیانک طریقے سے چیختا ہے کہ انسان اور جنّ کے سوا اردگرد کی تمام مخلوق اس چیخ پکار کو سنتی ہے۔''

دوسرا موقع ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن قریش کے سرداروں میں سے چوبیس آدمیوں کے متعلق حکم دیا تو وہ بدر کے کنوؤں میں سے ایک خبیث گندگی والے کنویں میں پھینک دیے گئے اور آپ ﷺ جب کسی قوم پر فتح پاتے تو میدان میں تین دن ٹھہرتے تھے۔ جب بدر میں تیسرا دن ہوا تو آپ نے اپنی اونٹنی کے متعلق حکم دیا تو اس پر اس کا پالان کسا گیا، پھر آپ چل پڑے اور آپ کے پیچھے آپ کے اصحاب بھی چل پڑے اور کہنے لگے، ہمارا خیال یہی ہے کہ آپ اپنے کسی کام کے لیے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ آپ اس کنویں کے کنارے پر کھڑے ہو گئے اور انھیں ان کے اور ان کے باپوں کے نام لے لے کر پکارنے لگے: (( يَا فُلَانُ بْنَ فُلَانٍ، وَ يَا فُلَانُ بْنَ فُلَانٍ! أَيَسُرُّكُمْ أَنَّكُمْ أَطَعْتُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ؟ فَإِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا، فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ قَالَ فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا تُكَلِّمُ مِنْ أَجْسَادٍ لَا أَرْوَاحَ لَهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُوْلُ مِنْهُمْ )) [ بخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل : ۳۹۷٦ ] ''اے فلاں بن فلاں! اور اے فلاں بن فلاں! کیا تمھیں پسند ہے کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی، کیونکہ ہم نے تو جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا اسے حق پایا، تو کیا تم نے بھی جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تھا، حق پایا؟'' تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ ان جسموں سے کیا بات کرتے ہیں جن میں روحیں نہیں ہیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! تم ان سے زیادہ وہ باتیں سننے والے نہیں جو میں انھیں کہہ رہا ہوں۔''

2 ہمارا ایمان ہے کہ ان دونوں موقعوں پر مُردے وہ بات سنتے ہیں جس کا حدیث میں ذکر ہے، ان کے سوا مُردے زندوں کی کوئی بات نہیں سنتے، مگر ان دو احادیث کو بنیاد بنا کر بعض لوگوں نے عقیدہ بنا لیا کہ تمام مُردے سنتے ہیں اور ہر بات ہر وقت سنتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مُردہ پرستی اور غیر اللہ کو پکارنے اور ان سے فریاد کرنے کی بنیاد یہی عقیدہ ہے کہ مُردے سنتے ہیں، ورنہ اگر یقین ہو کہ وہ سنتے ہی نہیں تو پاگل ہی ہو گا جو انھیں پکارے گا۔ قرآن مجید میں مُردوں کے نہ سننے کا مضمون متعدد جگہ

وَمَاۤ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا

**اور نہ تو کبھی اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ پر لانے والا ہے، تو نہیں سنائے گا مگر انھی کو جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، پھر وہ فرماں بردار ہیں ﴿۸۱﴾ اور جب ان پر بات واقع ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے،**

بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۵۲) اور فاطر (۱۹ تا ۲۲) بلکہ مُردوں کو خبر ہی نہیں کہ کوئی انھیں پکار رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ نحل (۲۰، ۲۱)، فاطر (۱۳، ۱۴) اور احقاف (۴ تا ۶) اور قیامت سے پہلے فوت شدہ لوگ واپس بھی نہیں آتے۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۳۱) اور انبیاء (۹۵) عزیر علیہ السلام اور جن حضرات کا دنیا میں زندہ ہونا قرآن یا صحیح حدیث سے ثابت ہے، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

③ قبر پرستوں کے برعکس کچھ لوگوں نے ان دو مواقع پر بھی مُردوں کے سننے سے انکار کر دیا، پھر ان میں سے بعض نے تو صاف ان حدیثوں کا انکار کر دیا، حالانکہ یہ صحیح بخاری کی احادیث ہیں جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے اور بعض نے ان کی ایسی لغو تاویلیں کیں جو انکار سے بھی بدتر ہیں، حالانکہ حق افراط و تفریط کے درمیان ہے۔

**آیت 81** وَمَاۤ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ ...... : یعنی آپ دل کے اندھوں کو راہ راست پر نہیں لا سکتے، آپ تو اسی کو سنائیں گے اور اسی کو راہ راست پر لائیں گے جو ہماری آیتوں کو سن کر ان کا اثر قبول کرتے ہیں اور اثر قبول کرنا یہی ہے کہ آپ کی دعوت پر ایمان لے آئیں۔

**آیت 82** ① وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ ...... : یعنی جس وعید کو یہ لوگ جھٹلا رہے ہیں اور اسے لانے کی جلدی مچا رہے ہیں، جب اس کا وقت آ جائے گا تو ہم زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو انوکھی قسم کا ہوگا (تنوین تنکیر سے انوکھے کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے)۔ وہ جانور قیامت کی علامات میں سے ہوگا، اس کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ آخرت کی حقیقتوں سے حجاب اٹھنے کے بعد آزمائش کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ وہ جانور ستر ہاتھ لمبا ہوگا، اس کی چار ٹانگیں اور دو پر ہوں گے، اس کے پاس موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی وغیرہ۔ مگر کسی صحیح حدیث میں اس جانور کی کیفیت بیان نہیں ہوئی، اس لیے ہمیں اتنا ہی کافی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ بعض لوگوں نے اسے حدیثِ دجّال میں مذکور جانور "جساسہ" قرار دیا ہے اور بعض نے یاجوج ماجوج، مگر یہ سب اندھیرے میں تیر ہیں۔

② تُكَلِّمُهُمْ : وہ جانور لوگوں سے بات کرے گا۔ قیامت کے قریب اس قسم کے عجیب و غریب واقعات کثرت سے ہوں گے کہ وہ چیزیں جو عام طور پر کلام نہیں کرتیں، کلام کریں گی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُكَلِّمَ السِّبَاعُ الْإِنْسَ، وَ حَتّٰى يُكَلِّمَ الرَّجُلَ عَذَبَةُ سَوْطِهِ وَشِرَاكُ نَعْلِهِ وَتُخْبِرُهُ فَخِذُهُ بِمَا أَحْدَثَ أَهْلُهُ بَعْدَهُ» [ ترمذي، الفتن، باب ما جاء في كلام السباع : ۲۱۸۱، و قال الألباني صحيح و رواه أحمد : ۸۴/۳، ح : ۱۱۷۹۸ ] "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قیامت قائم نہیں ہوگی

بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

جو ان سے کلام کرے گا کہ فلاں فلاں لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے ﴿۸۲﴾

حتیٰ کہ درندے انسانوں سے کلام کریں گے اور آدمی سے اس کے کوڑے کا کنارا اور جوتے کا تسمہ بات کرے گا اور اس کی ران اسے بتائے گی کہ اس کے گھر والوں نے اس کے بعد کیا کیا۔'' حتیٰ کہ جب قیامت بالکل قریب ہوگی اور اس کی علاماتِ خاصہ کا ظہور شروع ہوگا، جن کے ظاہر ہونے کے بعد کسی کا ایمان لانا قبول نہیں ہوگا (دیکھیے انعام : ۱۵۸) اس وقت وہ جانور زمین سے نکلے گا۔ حذیفہ بن اُسید غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانے سے ہمیں جھانک کر دیکھا، ہم قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ، فَذَكَرَ الدُّخَانَ، وَالدَّجَّالَ، وَالدَّابَّةَ، وَ طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَنُزُوْلَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، وَيَأْجُوْجَ وَ مَأْجُوْجَ، وَثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ، خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ، وَ خَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ، وَ خَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ، وَ آخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ، تَطْرُدُ النَّاسَ إِلٰى مَحْشَرِهِمْ )) [ مسلم، الفتن، باب في الآيات التي تكون قبل الساعة : ۲۹۰۱ ] ''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم دس نشانیاں دیکھو۔'' اور آپ نے وہ نشانیاں شمار کیں کہ سورج کا اس کے مغرب سے طلوع ہونا، دخان (دھواں)، دابہ (زمین سے نکلنے والا جانور)، یاجوج ماجوج کا نکلنا، عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اور دجال کا نکلنا اور تین خسف (زمین کا دھنس جانا) ایک خسف مغرب میں، ایک خسف مشرق میں اور ایک خسف جزیرۂ عرب میں اور آخر میں یمن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی ان کے محشر کی طرف لے جائے گی۔''

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی، جو میں ابھی تک نہیں بھولا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: (( إِنَّ أَوَّلَ الْآيَاتِ خُرُوْجًا، طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَخُرُوْجُ الدَّابَّةِ عَلَى النَّاسِ ضُحًى، وَأَيُّهُمَا مَا كَانَتْ قَبْلَ صَاحِبَتِهَا، فَالْأُخْرٰى عَلٰى إِثْرِهَا قَرِيْبٌ )) [ مسلم، الفتن، باب في خروج الدجال...... : ۲۹٤۱ ] ''آیات (نشانیوں) میں سب سے پہلی سورج کا اس کے مغرب سے طلوع ہونا اور دابہ (ایک جانور) کا دوپہر کے وقت لوگوں کے سامنے نکلنا، ان میں سے جو بھی دونوں سے پہلے ہوگی، دوسری اس کے بعد قریب ہی ظاہر ہو جائے گی۔''

ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( تَخْرُجُ الدَّابَّةُ فَتَسِمُ النَّاسَ عَلٰى خَرَاطِيْمِهِمْ، ثُمَّ يُعْمَرُوْنَ فِيْكُمْ حَتّٰى يَشْتَرِيَ الرَّجُلُ الْبَعِيْرَ فَيَقُوْلَ مِمَّنِ اشْتَرَيْتَهُ؟ فَيَقُوْلُ اشْتَرَيْتُهُ مِنْ أَحَدِ الْمُخَطَّمِيْنَ )) [ مسند أحمد : ۲٦۸/۵، ح : ۲۲۳۷۱۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۳۲۲ ] ''(زمین سے) ایک جانور نکلے گا، جو لوگوں کی پیشانیوں پر نشان لگائے گا اور وہ (نشان زدہ) لوگ بہت زیادہ ہو جائیں گے، حتیٰ کہ آدمی کسی سے اونٹ خریدے گا تو کوئی پوچھے گا کہ یہ تو نے کس سے خریدا ہے؟ وہ جواب دے گا کہ میں نے یہ کسی نشان زدہ سے خریدا ہے۔'' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سِتًّا طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، أَوِ الدُّخَانَ، أَوِ الدَّجَّالَ، أَوِ الدَّابَّةَ،

وَ يَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَ لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک جماعت اکٹھی کریں گے، ان لوگوں سے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، ان کی قسمیں بنائی جائیں گی ﴿۸۳﴾ یہاں تک کہ جب وہ آ جائیں گے تو فرمائے گا کیا تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا، حالانکہ تم نے ان کا پورا علم حاصل نہ کیا تھا، یا کیا تھا جو تم کیا کرتے تھے؟ ﴿۸۴﴾

أَوْ خَاصَّةَ أَحَدِكُمْ، أَوْ أَمْرَ الْعَامَّةِ ›› [ مسلم، الفتن، باب في بقية من أحاديث الدجال : ۲۹۴۷ ] ''چھ چیزوں سے پہلے نیک اعمال کرنے میں جلدی کر لو، ایک سورج کا مغرب سے نکلنا، دوسری دخان (دھواں)، تیسری دجّال، چوتھی زمین کا جانور، پانچویں موت اور چھٹی قیامت۔''

③ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا ...... : اس کی ایک تفسیر وہ ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے کہ ''النَّاسَ'' سے مراد مخصوص لوگ ہیں، یعنی وہ جانور لوگوں سے یہ کلام کرے گا کہ فلاں فلاں لوگ (النَّاسَ) ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے، یعنی وہ ایمان نہ لانے والوں کی نشان دہی کرے گا، جیسا کہ اوپر عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزرا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ''اَنَّ النَّاسَ'' سے پہلے لام محذوف ہے، گویا عبارت یوں ہے: '' تُكَلِّمُهُمْ لِأَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيَاتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ'' یعنی وہ دابہ ان سے کلام کرے گا، کیونکہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔ اس صورت میں اس دابہ کا کلام کرنا ہی قیامت کی نشانی ہوگا۔ دونوں معنوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں یہ ''اَنَّ النَّاسَ'' جانور کا کلام ہے اور بعد والے معنی کے لحاظ سے یہ ''اَنَّ النَّاسَ'' جانور یا کلامِ دابہ کی وجہ بیان ہوئی ہے۔

**آیت 83** وَ يَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ ...... : ''يُوْزَعُوْنَ'' '' وَزَعَ يَزَعُ ''(ف) سے مضارع مجہول ہو تو معنی ہے ''روکے جائیں گے'' اور ''أَوْزَعَ يُوْزِعُ'' (افعال) سے ہو تو معنی ہے ''الگ الگ تقسیم کیے جائیں گے۔'' یعنی ہر امت میں سے اللہ کی آیات جھٹلانے والے لوگوں کے گروہ کو جمع کیا جائے گا، پھر جو لوگ آگے ہوں گے انھیں روک لیا جائے، تاکہ پیچھے والے ان سے آ کر مل جائیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کی الگ الگ قسموں کی جماعت بندی کی جائے گی، مثلاً چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور زانیوں وغیرہ میں سے ہر ایک کا الگ جتھا بنایا جائے گا۔ اس معنی کی تائید سورۂ صافات کی آیت (۲۲) اور سورۂ تکویر کی آیت (۷) سے ہوتی ہے۔

**آیت 84** حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ ...... : یعنی ان کے حاضر ہونے پر ان سے عقائد و اعمال دونوں کے متعلق سوال ہوگا اور یہ سوال انھیں شرمندہ اور لاجواب کرنے کے لیے ہوگا کہ کیا دنیا میں تمھارا یہی مشغلہ رہا کہ تم ہماری آیات کو پوری طرح جاننے اور سمجھنے کے بغیر ہی جھٹلاتے رہے۔ تمھارے جھٹلانے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ تم نے پوری طرح جاننے اور سمجھنے کے بعد انھیں غلط سمجھ کر جھٹلایا ہو، یا پھر بتاؤ تم کیا کرتے رہے تھے، جیسا کہ سورۂ ملک میں کفار کا قول نقل کیا ہے، فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ

وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ

اور ان پر بات واقع ہو جائے گی، اس کے بدلے جو انھوں نے ظلم کیا، پس وہ نہیں بولیں گے ﴿۸۵﴾ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو بنایا، تاکہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۸۶﴾ اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں میں ہے اور

مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴾ [ الملك : ۱۰، ۱۱ ] ''اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے، یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔ پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، سو دوری ہے بھڑکتی ہوئی آگ والوں کے لیے۔'' ہمارے زمانے کے بدعتی، فرقہ پرست، منکرین حدیث اور کفار سے مرعوب جدّت کے دعوے دار لوگوں کا بھی یہی حال ہے کہ جہاں کوئی آیت یا حدیث سمجھ میں نہ آئی اس پر پوری طرح غور کرنے یا کسی سے سمجھنے کے بغیر ہی اسے ردّ کر دیا، یا کوئی آیت یا حدیث اپنے فرقے کے مسلک کے خلاف نظر آئی تو اسے رد کر دیا، یا اس کی ایسی تاویل کی جو ردّ کر دینے سے بھی بدتر ہے۔

**آیت 85** وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا...... : یعنی ان پر اللہ کی حجت قائم ہو گئی، اس لیے وہ بول ہی نہیں سکیں گے کہ کوئی عُذر پیش کر سکیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اس وقت ہو گا جب ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی۔

**آیت 86** اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ...... : حشر کا ذکر فرمایا تو اس کی دلیل کے طور پر رات کی نیند اور ظلمت کا ذکر فرمایا، جو ایک طرح کی موت ہے اور دن کی بیداری اور اجالے کا ذکر فرمایا، جو زندگی ہے۔ (دیکھیے زمر: ۴۲) یعنی کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ موت و حیات کا یہ سلسلہ ہر روز ان کے مشاہدے میں آتا ہے، بلکہ خود ان کی ذات پر گزرتا ہے، جس میں ان کے لیے سکون اور تلاش رزق کی نعمتیں بھی موجود ہیں۔ صرف یہ دو نشانیاں ہی ان لوگوں کے لیے کافی ہیں جو قیامت پر ایمان لانا چاہتے ہیں۔



**آیت 87** ① وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ : ''الصُّوْرِ'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۷۳) گزشتہ آیت (۸۳) میں خاص کفار کے حشر کا ذکر تھا، اب تمام مخلوق کے حشر کا ذکر ہے، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ صرف کفار کا حشر ہو گا۔

② فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ : بعض مفسرین نے تین نفخے ذکر فرمائے ہیں، نفخۂ فزع، نفخۂ صعق اور نفخۂ قیام، مگر صحیح بات یہی ہے کہ نفخۂ فزع اور نفخۂ صعق ایک ہی ہے، کیونکہ دونوں کے بعد ''اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ'' ہے۔ صعق کا لفظ بے ہوشی اور موت دونوں معنوں میں آتا ہے۔ پہلی دفعہ صور میں پھونکے جانے سے پیدا ہونے والی ابتدائی کیفیت فزع اور گھبراہٹ ہے، جو آخر میں ہر چیز کی ہلاکت اور فنا تک پہنچ جائے گی، پھر ایک طویل وقفے کے بعد، جس کی مدت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، دوبارہ صور میں پھونکا جائے گا تو سب لوگ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جائیں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان

فَفَزِعَ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ كُلٌّ اَتَوۡهُ دٰخِرِيۡنَ ﴿۸۷﴾

جو زمین میں ہے، گھبرا جائے گا مگر جسے اللہ نے چاہا اور وہ سب اس کے پاس ذلیل ہو کر آئیں گے ﴿۸۷﴾

کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ أَرْبَعُونَ، قَالَ أَرْبَعُونَ يَوْمًا؟ قَالَ أَبَيْتُ، قَالَ أَرْبَعُونَ شَهْرًا؟ قَالَ أَبَيْتُ، قَالَ أَرْبَعُونَ سَنَةً؟ قَالَ أَبَيْتُ، قَالَ ثُمَّ يُنْزِلُ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْبَقْلُ، لَيْسَ مِنَ الْإِنْسَانِ شَيْءٌ إِلَّا يَبْلٰى، إِلَّا عَظْمًا وَاحِدًا وَهُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ، وَمِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ يوم ينفخ في الصور فتأتون أفواجا ﴾ : ٤٩٣٥ ] ''دو نفخوں کے درمیان چالیس کا وقفہ ہے۔'' لوگوں نے کہا: ''(ابو ہریرہ!) چالیس دن ؟'' انھوں نے کہا: ''میں یہ نہیں کہتا۔'' لوگوں نے کہا: ''چالیس مہینے؟'' کہا: ''میں یہ نہیں کہتا۔'' لوگوں نے کہا: ''چالیس سال؟'' کہا: ''میں یہ نہیں کہتا۔'' اور حدیث بیان کی: ''پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا تو لوگ اُگ آئیں گے جیسے سبزی اُگتی ہے اور انسان کی کوئی چیز نہیں جو بوسیدہ نہ ہو، سوائے ایک ہڈی کے جو دم کی ہڈی ہے۔ اسی سے مخلوق کو قیامت کے دن دوبارہ جوڑا جائے گا۔''

③ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ: یعنی صور میں پھونکے جانے پر زمین و آسمان میں جو بھی ہے گھبرا جائے گا۔ سورۂ زمر میں فرمایا: ﴿ فَصَعِقَ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [ الزمر : ٦٨ ] ''جو لوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہوں گے، مر کر گر جائیں گے مگر جسے اللہ نے چاہا۔'' یعنی آسمانوں میں اور زمین میں موجود جو بھی ہے بے ہوش ہو جائے گا، ہلاک ہو جائے گا مگر جسے اللہ چاہے۔ اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ مفسرین میں سے بعض نے کہا کہ اس سے مراد انبیاء ہیں، بعض نے کہا شہداء، بعض نے ملائکہ اور بعض نے حور عین مراد لی ہیں، مگر '' اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ '' کی تعیین کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی جائے کہ وہی بہتر جانتا ہے کہ وہ خوش نصیب کون ہیں جو اس نفخہ کے وقت نہ گھبرائیں گے، نہ بے ہوش یا ہلاک ہوں گے۔ کیونکہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلنَّاسُ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَكُوْنُ أَوَّلَ مَنْ يُفِيْقُ، فَإِذَا أَنَا بِمُوْسٰى آخِذٌ بِقَائِمَةٍ مِنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ فَلَا أَدْرِيْ أَفَاقَ قَبْلِيْ أَمْ جُوْزِيَ بِصَعْقَةِ الطُّوْرِ؟ » [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالٰى : ﴿ و واعدنا موسٰى ...... ﴾ : ٣٣٩٨ ] ''لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے، تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو ہوش میں آئے گا۔ اچانک میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ عرش کے پایوں میں سے ایک پائے کو پکڑے ہوئے ہوں گے، سو میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا انھیں طور کی بے ہوشی کی جزا دی گئی۔'' تو جب سید الخلق ﷺ (جنھیں زہر خورانی کی وجہ سے شہادت کی سعادت بھی نصیب ہوئی) اس صعقہ سے مستثنیٰ نہیں تو باقی شہداء یا انبیاء و صلحاء کے متعلق یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے؟ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کہا جائے اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا اس فزع اور صعقہ سے محفوظ رکھے گا۔

④ اس '' اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ '' میں بھی اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا اظہار ہو گا کہ صور کی اس خوف ناک آواز کے وقت، جس

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾

**اور تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے، انھیں جمے ہوئے گمان کرتا ہے، حالانکہ وہ (اس وقت) بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے، اس اللہ کی کاری گری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ یقیناً وہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم کرتے ہو ﴿۸۸﴾ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر بدلا ہے اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے ﴿۸۹﴾**

---

سے جنّ، انسان، فرشتے، آسمان و زمین، سورج، چاند، ستارے اور پہاڑ، غرض ہر چیز فنا ہو جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا اس پر اس وقت بھی گھبراہٹ یا فنا کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

5 **وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ:** " دَخَرَ " کے معنی میں عاجزی، ذلّت اور حقارت تینوں باتیں پائی جاتی ہیں، یعنی ساری مخلوق عاجز اور حقیر بن کر اللہ کے حضور پیش ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [ مریم : ۹۳ ] ''آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔''

**آیت 88** 1 **وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً**...... : یعنی اس وقت صرف انسان ہی نہیں بلکہ وہ پہاڑ جنھیں دیکھ کر تم خیال کرتے ہو کہ اپنی جگہ نہایت مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں، انھیں کوئی چیز ہلا نہیں سکتی، وہ قیامت کے دن بادل کی طرح فضا میں اڑتے پھریں گے۔ قیامت کے دن پہاڑوں کے مختلف احوال مذکور ہیں، سب کا حاصل یہ ہے کہ ان کو اڑا کر زمین صاف کر دی جائے گی۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۰۵)، معارج (۹)، حاقہ (۱۴)، مزمل (۱۴)، قارعہ (۵)، فرقان (۲۳) اور واقعہ (۶) اور ان پر گزرنے والی کیفیات کی ترتیب کے لیے سورۂ نبا کی آیت (۲۰) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

2 **صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ** ...... : اتقان کا معنی کسی چیز کو پوری مہارت کے ساتھ مضبوط بنانا ہے، یعنی پہاڑوں کو بادل کی طرح اڑا دینا اس اللہ کی کاری گری ہے جس نے صرف پہاڑ ہی نہیں، بلکہ ہر چیز کو مضبوط اور محکم بنایا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے اور اس بات کی بھی کہ وہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے، حتیٰ کہ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں، اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ کیونکہ اتقان قدرت کے بغیر ممکن نہیں اور قدرت علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے اس علم و قدرت ہی سے قیامت قائم ہوگی اور اسی سے لوگوں کو ان کے افعال کی جزا یا سزا ملے گی، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

**آیت 89** 1 **مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا:** نیکی سے مراد ہر نیک کام ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد " لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "، بعض نے اخلاص اور بعض نے فرائض کا ادا کرنا لیا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے عام رکھا جائے، کیونکہ تخصیص

وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ ؕ ہَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ رَبَّ ہٰذِہِ الۡبَلۡدَۃِ الَّذِیۡ حَرَّمَہَا وَ لَہٗ کُلُّ شَیۡءٍ ۫ وَّ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿ۙ۹۱﴾

اور جو برائی لے کر آئے گا تو ان کے چہرے آگ میں اوندھے ڈالے جائیں گے۔ تم بدلا نہیں دیے جاؤ گے مگر اسی کا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۹۰﴾ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں جس نے اسے حرمت دی اور اسی کے لیے ہر چیز ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہو جاؤں ﴿۹۱﴾

---

کی کوئی وجہ نہیں۔ (شوکانی) "خَیۡرٌ مِّنۡہَا" سے مراد دس گنا سے سات سو گنا تک ہے، بلکہ نیکی میں زیادہ اخلاص اور حسنِ ادا کی برکت سے بغیر حساب بھی ہوسکتا ہے۔

② وَ ہُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ یَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ : "فَزَعٍ" پر تنوین تعظیم کی ہے، یعنی وہ اس دن بڑی گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا یَحۡزُنُہُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ﴾ [ الأنبیاء : ۱۰۳ ] "انھیں سب سے بڑی گھبراہٹ غمگین نہ کرے گی۔" اگر کم درجہ کی گھبراہٹ ہو تو اس آیت کے منافی نہیں، جیسا کہ آیت (۸۷) میں گزر چکا ہے۔

**آیت 90** وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ ...... : یہاں برائی سے مراد شرک ہے، اس پر صحابہ اور بعد کے علماء کی اکثریت کا اتفاق ہے۔ اس تخصیص کی وجہ وہ ہولناک سزا ہے جو آگے بیان کی جا رہی ہے۔ دلیل اس کی وہ صحیح حدیث ہے جس میں ہے کہ آگ سجدے کے مقامات کو نہیں کھائے گی (دیکھیے بخاری: ۶۵۷۳) اور سجدے کے مقامات میں سب سے زیادہ معزز مقام چہرہ ہے، لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ چہرے کے بل آگ میں گرائے جانے والوں سے مراد موحد مسلمان ہوں۔

**آیت 91** ① اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ رَبَّ ہٰذِہِ الۡبَلۡدَۃِ ...... : اس آیت میں قریشِ مکہ پر چوٹ ہے کہ تم لوگ جو اس شہر میں رہتے ہو، جسے اللہ تعالیٰ نے حرمت والا اور جائے امن قرار دیا ہے، جہاں نہ کسی کو قتل کیا جاتا ہے، نہ کسی پر ظلم ہوتا ہے، نہ اس میں شکار کی اجازت ہے، نہ اس کے درخت کاٹنے کی، جس کی وجہ سے تم بے شمار فوائد اٹھا رہے ہو۔ اللہ کے گھر کے متولی ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں تمھاری عزت اور تمھارا وقار قائم ہے۔ سارے عرب میں کسی کی جان اور مال محفوظ نہیں، لوگوں کو ان کے گھروں سے اٹھا لیا جاتا ہے، ان کے اموال لوٹ لیے جاتے ہیں، مگر بیت اللہ کی وجہ سے مکہ میں بھی تمھیں اس کی نعمت میسر ہے اور ہر جانب سے وافر رزق تمھیں پہنچتا ہے۔ سردی میں یمن کی طرف اور گرمی میں شام کی طرف تمھارے تجارتی قافلے جاتے ہیں۔ کعبہ کے احترام کی وجہ سے کوئی انھیں لوٹنے کی جرأت نہیں کرتا۔ تم بھی مانتے ہو کہ یہ سب کچھ اس گھر کے رب کی وجہ سے ہے، ان بتوں کی وجہ سے نہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ تمھارا حق تو یہ تھا کہ تم اس شہر کے رب کی عبادت کرتے جس نے تمھیں بھوک میں کھانا اور خوف میں امن عطا کیا، فرمایا: ﴿فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ

وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور یہ کہ میں قرآن پڑھوں، پھر جو سیدھے راستے پر آجائے تو وہ اپنے ہی لیے راستے پر آتا ہے اور جو گمراہ ہو تو کہہ دے کہ میں تو بس ڈرانے والوں میں سے ہوں ﴿۹۲﴾ اور کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے، عنقریب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم انھیں پہچان لو گے اور تیرا رب ہرگز اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۹۳﴾

---

مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴾ [ القریش : ۳، ۴ ] ''تو ان پر لازم ہے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ وہ جس نے انھیں بھوک سے (بچا کر) کھانا دیا اور خوف سے (بچا کر) امن دیا۔'' فرمایا، ان سے کہہ دو تم ان نعمتوں کی ناشکری کرتے ہوئے غیر اللہ کی عبادت کرتے ہو تو تمھاری مرضی، مجھے تو یہی حکم ہے کہ میں اس گھر کے رب کی عبادت کروں جس نے اسے حرمت والا بنایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: (( إِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ، لَا يُعْضَدُ شَوْكُهُ، وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهُ وَلَا يَلْتَقِطُ لُقَطَتَهُ إِلَّا مَنْ عَرَّفَهَا )) [ بخاري، الحج، باب فضل الحرم ...... : ۱۵۸۷ ] ''اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے حرم قرار دیا، نہ اس کے کانٹے والے درخت کاٹے جائیں اور نہ اس کے شکار کو ڈرایا جائے اور نہ اس میں کوئی گری ہوئی چیز اٹھائے، مگر جو اس کا اعلان کرتا رہے۔''

② وَ لَهٗ كُلُّ شَيْءٍ : یہ لفظ اس لیے فرمایا کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف اس لیے ہے کہ وہ شہر مکہ کا رب ہے، اس لیے ساتھ ہی فرمایا کہ ہر چیز کا مالک بھی وہی ہے، اس لیے مجھے اس کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔

③ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۱ تا ۱۶۳)۔

آیت 92 وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى ...... : یعنی مجھے یہ حکم ہے کہ میں خود بھی مطیع اور فرماں بردار رہوں اور تمھیں بھی قرآن پڑھ کر سناتا رہوں۔ پھر جو شخص میری دعوت سے راہِ راست پر آجائے تو اس کا فائدہ اسی کو ہے اور جو بھٹکا رہے تو کہہ دے کہ میرا کام اللہ کے عذاب سے ڈرانا ہے، کسی کو راہِ حق پر لے آنا میرا کام نہیں، نہ ہی مجھ پر اس کی ذمہ داری ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [ الرعد : ٤٠ ] ''تو تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ [ هود : ١٢ ] ''تُو تو صرف ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔''

آیت 93 ① وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ : اور کہہ دے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ کسی کے ہدایت قبول کرنے یا نہ کرنے سے اس کی حمد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اگر تمام جنّ و انس اور پہلے اور پچھلے سب سے متقی شخص کے دل والے ہو جائیں تو اس سے اس کی بادشاہت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور اگر تمام جنّ و انس اور اول و آخر سب سے فاجر شخص کے دل والے ہو جائیں تو اس سے اس کی بادشاہت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

سُوْرَةُ الْقَصَصِ ۲۸ مکیۃ ۴۹ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰیاتھا ۸۸ رکوعاتھا ۹

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

طٰسٓمّٓ ① یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ② ہم تجھ پر موسیٰ اور فرعون کی کچھ خبر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ③

② سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا: عنقریب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا، تو تم انھیں پہچان لو گے کہ ہاں یہ وہی نشانیاں ہیں جن کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا، مگر اس وقت کا پہچاننا تمھیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گا۔ یہ خطاب کفار مکہ سے ہے، اسلامی فتوحات اور تباہ شدہ قوموں کے آثار بھی ان میں شامل ہیں اور قرب قیامت کی نشانیاں بھی اس کے تحت آجاتی ہیں۔ دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۵۳)۔

③ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: آیت کے اس جملے کے تحت ابن کثیر نے ابن ابی حاتم سے جید سند کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز کا قول ذکر کیا ہے، انھوں نے فرمایا: « فَلَوْ كَانَ اللّٰهُ مُغْفِلاً شَيْئًا لَأَغْفَلَ مَا تَعْفِي الرِّيَاحُ مِنْ أَثَرِ قَدَمَيِ ابْنِ آدَمَ » [ ابن كثير : ٦/ ٢١٩ ] ''اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز سے غفلت کرنے والا ہوتا، تو ابن آدم کے قدموں کے نشانوں سے ضرور غفلت برتتا، جنھیں ہوائیں مٹا دیتی ہیں (مگر اللہ تعالیٰ ان سے بھی غافل نہیں)۔'' مراد یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ [ يٰس : ١٢ ] ''بے شک ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں جو عمل انھوں نے آگے بھیجے اور ان کے چھوڑے ہوئے نشان بھی۔'' اور ابن کثیر نے امام احمد رحمہ اللہ کے متعلق نقل فرمایا کہ وہ یہ دو اشعار پڑھا کرتے تھے، جو یا تو ان کے ہیں یا کسی اور کے ؎

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلَا تَقُلْ     خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيْبُ

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً     وَ لَا أَنَّ مَا يَخْفٰى عَلَيْهِ يَغِيْبُ

''یعنی جب تو کسی بھی وقت اکیلا ہو تو یہ نہ کہنا کہ میں اکیلا ہوں، بلکہ کہنا کہ مجھ پر ایک زبردست نگران ہے اور نہ کبھی گمان کرنا کہ اللہ تعالیٰ ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہے اور نہ یہ کہ کوئی پوشیدہ چیز اس کے علم سے باہر ہے۔''

## سورۃ القصص

**آیت 2،1** طٰسٓمّٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: حروف مقطعات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱) اور دوسری آیت کی تفسیر سورۂ یوسف کی آیت (۲) میں دیکھیں۔

**آیت 3** ① نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ : ''نَبَاٌ'' اس خبر کو کہتے ہیں جو اہم اور شان والی ہو۔ ''مِنْ''

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ④

بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے رہنے والوں کو کئی گروہ بنا دیا، جن میں سے ایک گروہ کو وہ نہایت کمزور کر رہا تھا، ان کے بیٹوں کو بری طرح ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ فساد کرنے والوں سے تھا ④

بعض کے معنی میں ہے، اس لیے ترجمہ ''کچھ خبر'' کیا گیا ہے۔ شوق دلانے کے لیے قصّے کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا، ہم تجھ پر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے اہم واقعے کا کچھ حصہ حق کے ساتھ، یعنی ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔

② لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: ''یعنی مسلمان اپنا حال قیاس کر لیں ظالموں کے مقابلہ میں۔'' (موضح) مطلب یہ ہے کہ اس قصّے میں مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ فرعون سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہوسکتا اور بنی اسرائیل سے زیادہ کوئی مظلوم نہیں۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو کمزور ہونے کے باوجود فرعون کے مقابلے میں کامیاب کیا، اسی طرح جو مسلمان مکہ میں کمزور اور مغلوب ہیں، یا دنیا کے کسی بھی خطے میں یا کسی بھی وقت مظلوم و مجبور ہوں گے، انھیں ہرگز مایوس نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ ان کی بھی اسی طرح مدد فرمائے گا، انھیں دشمنوں سے نجات دلائے گا اور ان کے دشمنوں کو نیست و نابود کرے گا۔

③ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں اس کتاب لا ریب کو صرف متقین کے لیے ہدایت قرار دیا، اسی طرح یہاں فرمایا کہ ہم آپ کو موسیٰ اور فرعون کے قصّے کا کچھ حصہ ان لوگوں کے لیے سنا رہے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ سننے اگرچہ کافر بھی ہیں مگر فائدہ صرف اہلِ ایمان ہی اٹھاتے ہیں۔ جن لوگوں نے طے کر رکھا ہے کہ ہم نے ماننا ہی نہیں، انھیں اس واقعے سے بلکہ پورے قرآن سے کچھ حاصل نہیں۔ کچھ حصہ اس لیے فرمایا کہ اس قصے کے بہت سے حصّے اس سورت کے بجائے دوسری سورتوں میں ہیں اور قرآن کوئی بھی واقعہ بطور تاریخ پورا بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کے صرف وہ حصّے بیان کرتا ہے جن کی ضرورت ہوتی ہے۔

④ اس واقعہ کے لیے مزید ملاحظہ کریں سورۂ بقرہ (رکوع ۶)، اعراف (رکوع ۱۳ تا ۱۶)، یونس (رکوع ۸، ۹)، ہود (رکوع ۹)، بنی اسرائیل (رکوع ۱۲)، مریم (رکوع ۴)، طٰہٰ (رکوع ۱ تا ۵)، مؤمنون (رکوع ۳)، شعراء (رکوع ۲ تا ۴)، نمل (رکوع ۱)، عنکبوت (رکوع ۴)، مؤمن (رکوع ۳ تا ۵)، زخرف (رکوع ۵)، دخان (رکوع ۱)، ذاریات (رکوع ۲) اور نازعات (رکوع ۱)۔

آیت 4 ① اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ: ''الْاَرْضِ'' سے مراد سرزمین مصر ہے، جس کا قرینہ فرعون کا ذکر ہے، کیونکہ اس کی حکومت صرف مصر میں تھی۔ جو لوگ اسے پوری زمین کا بادشاہ سمجھتے ہیں ان کی بات درست نہیں، کیونکہ ہجرت کے بعد مصر کے قریب ہی مدین پہنچنے پر موسیٰ علیہ السلام اس کی گرفت سے آزاد تھے۔ ''عَلَا'' کا لفظی معنی ہے ''اس نے سر اٹھایا، اونچا بن گیا'' یعنی اپنے اصل مقام بندگی سے اونچا ہو کر خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا اور اپنی حقیقت کو بھول گیا۔ ''فِي الْاَرْضِ''

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۵

اور ہم چاہتے تھے کہ ہم ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں نہایت کمزور کر دیا گیا اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھی کو وارث بنائیں۔ ۵

کے لفظ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ بلندی اور کبریائی تو اس ذات کا لباس ہے جو عرش پر بلند ہے، زمین پر رہنے والے کا حق تو عرش والے کے سامنے پستی اور عاجزی ہے، نہ کہ سرکشی کرتے ہوئے اللہ کے بندوں کو ذلیل وخوار کرنا اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنا۔

② وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا: یعنی اس نے سرزمین مصر کے باشندوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ فرعون کے زمانے کی تہذیب اور ان کے عقائد بہت حد تک ہندوؤں کی تہذیب اور عقائد سے ملتے جلتے ہیں۔ ہندو بھی چار طبقوں میں تقسیم ہیں، برہمن، کھتری، ویش اور شودر۔ جن میں برہمنوں کو سب پر بالا دست رکھا گیا ہے اور شودر کو انسانیت کی حد سے بھی نیچے گرا دیا گیا ہے۔ مصری تہذیب بھی بادشاہ کی خدائی کے ساتھ گائے کی پجاری تھی، ہندوؤں کا بھی یہی حال ہے۔ فرعونِ مصر نے بھی مصر کے رہنے والوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا تھا اور ان سب کو آپس میں دست وگریبان کر رکھا تھا اور مختلف قسم کی مراعات دے کر یا ان پر ظلم وستم کر کے انھیں اتنا بے وقعت اور بے بس بنا رکھا تھا کہ وہ کسی بات میں اس سے اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے اس کے رب اعلیٰ ہونے کے دعوے کو بھی مان لیا۔ (دیکھیے زخرف: ۵۱ تا ۵۴) آج کل بھی ملکوں اور قوموں کو محکوم رکھنے کے لیے بڑی طاقتوں کا یہی طریقہ ہے کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔

③ يَسْتَضْعِفُ طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ: " أَضْعَفَ يُضْعِفُ" (افعال) کا معنی کمزور کرنا ہے اور استفعال میں حروف کے اضافے کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی وہ ان میں سے ایک گروہ کو بہت زیادہ ہی کمزور کر رہا تھا۔ مراد اس سے بنی اسرائیل ہیں، جو یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر آئے تھے اور مدت تک نہایت شان وشوکت اور عزت واحترام کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے، پھر اللہ کی نافرمانی اور اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مصر کے اصل باشندوں کو، جو قبطی تھے، ان پر مسلط کر دیا اور اس فرعون نے تو انھیں کمزور اور بے بس کرنے کی انتہا کر دی۔ اس نے ایسا بندوبست کیا کہ قبطی آقا بن کر رہیں اور بنی اسرائیل غلام اور خدمت گار بن کر۔ چنانچہ مشقت کا ہر کام زبردستی ان سے لیا جاتا، مثلاً کھیتی باڑی، عمارتیں بنانے اور نہریں وغیرہ کھودنے کا کام اور گھروں میں خدمت کا کام ان کی عورتوں سے لیا جاتا۔ اس کے علاوہ لڑکوں کو ذبح کر کے عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے زندہ رکھا جاتا۔

④ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ: اس حکم کی وجہ اور ذبح کی کیفیت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۹)۔

⑤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ: " إِنَّ " عموماً اپنے سے پہلے والے کلام کی علت بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یعنی اس کے اس ظلم اور سرکشی کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کا کام ہی فساد اور جن کی پہچان ہی مفسدین کے نام سے ہے۔

آیت 5 ① وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ......: فرعون کے اس ظلم کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کس

وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۞ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ

**اور انھیں زمین میں اقتدار دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو ان سے وہ چیز دکھلائیں جس سے وہ ڈرتے تھے ⑥ اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اسے دودھ پلا، پھر جب تو اس پر ڈرے تو اسے دریا میں ڈال**

---

طرح برداشت کر سکتی تھی، خصوصاً جب مظلوم قوم مسلمان بھی ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا: (( اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ )) [ بخاري، الزكاة، باب أخذ الصدقة من الأغنياء ...... : ۱۴۹۶ ] ''مظلوم کی بددعا سے بچ، کیونکہ اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔'' یعنی فرعون تو اس مظلوم قوم کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا، مگر ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں نہایت کمزور کیا گیا۔ احسان وہ عطیہ ہے جو کسی عوض کے بغیر دیا جائے، یعنی بنی اسرائیل پر فرعون سے نجات کی نعمت اور دوسری نعمتیں محض ہمارا احسان اور فضل و کرم تھا۔

② **وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً :** مستضعفین کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ کی غیرت جب جوش میں آتی ہے تو وہ ان سے صرف ظلم ہی دور نہیں کرتا، بلکہ انھیں مزید انعامات سے بھی نوازتا ہے۔ چنانچہ فرمایا، ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں اور انھیں دین کی پیشوائی کے ساتھ حکومت و اقتدار کے پیشوا بھی بنائیں، تاکہ کسی کو ان پر ظلم کی جرأت ہی نہ ہو۔

③ **وَ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ :** اور انھیں فرعون اور آل فرعون کے غلبے و اقتدار کا اور ان تمام چیزوں کا وارث بنائیں جو وہ چھوڑ کر غرق ہونے والے تھے، اور ایسا ہی ہوا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۷)، شعراء (۵۷ تا ۵۹) اور دخان (۲۵ تا ۲۷)۔

**آیت 6** **وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ ......:** ہامان فرعون کا وزیر تھا، جو ظلم و ستم میں اس کا شریک اور آلہ کار تھا۔ یعنی ہم چاہتے تھے کہ انھیں زمین میں اقتدار بخشیں اور ان کا سکّہ جما دیں اور فرعون، ہامان اور ان کے لشکروں نے جس خطرے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کیا تھا کہ کہیں ان کی تعداد اور قوت اتنی نہ بڑھ جائے کہ وہ ہماری حکومت پر قابض ہو جائیں، بنی اسرائیل ہی کے ذریعے سے وہ خطرہ انھیں حقیقت بنا کر دکھا دیں اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اللہ کی تقدیر کبھی ٹل نہیں سکتی، نہ اس کے ارادے کو پورا ہونے سے کوئی طاقت روک سکتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ یوسف : ۲۱ ] ''اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

**آیت 7** ① **وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى :** ''وحی'' کا لفظی معنی خفیہ اور تیز اشارہ ہے۔ وحی کرنے کا مطلب کوئی بات خفیہ طریقے سے دل میں ڈالنا ہے۔ یہاں کلام کا ایک حصہ محذوف ہے کہ مظلوم بنی اسرائیل پر احسان کی ابتدا یہاں سے ہوئی کہ ان کی نجات کا ذریعہ بننے والے لڑکے کی ماں اس کے ساتھ اس سال حاملہ ہوئی جس میں ان کے لڑکوں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ ان کے والد کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمران بیان فرمایا ہے۔ [ دیکھیے مسلم، الإیمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ ...... : ۱۶۵/۲۶۷ ]

فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۚ إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

دے اور نہ ڈر اور نہ غم کر، بے شک ہم اسے تیرے پاس واپس لانے والے ہیں اور اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں ⑦

اس سے پہلے ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کی ولادت اس سال ہو چکی تھی جس میں لڑکے قتل نہیں کیے جاتے تھے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۴۹) کی تفسیر۔ ان کی والدہ کا نام اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایا، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے ان کا نام "ایارفت" اور بعض نے "لوحا" بتایا ہے، مگر یہ کسی صحیح حوالے سے ثابت نہیں۔ قرآن ان کا ذکر "اُمّ موسیٰ" کے نام سے کرتا ہے۔

② یہاں اللہ تعالیٰ نے "اَوْحَيْنَآ" میں اور آگے آنے والے الفاظ میں اپنی عظمت کے اظہار کے لیے اپنا ذکر جمع کے صیغے کے ساتھ فرمایا ہے، کیونکہ شاہی حکم عموماً جمع کے صیغے سے جاری ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو ملک الملوک اور شہنشاہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری قدرت وحکمت کے نتیجے میں ہوا، ورنہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔

③ وحی کا لفظی معنی خفیہ اور تیز اشارہ ہے۔ اُمّ موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہ وحی کس طرح کی، اس کی صراحت نہیں فرمائی۔ انھیں الہام کیا (ان کے دل میں ڈالا) یا انھیں خواب دکھایا، بہر حال یہ وحی انھیں چند باتیں بتانے کے لیے تھی، نبوت کی وحی نہیں تھی۔ کیونکہ اس بات پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبیہ نہیں تھیں، کیونکہ تمام انبیاء مرد تھے۔ (دیکھیے انبیاء: ۷) بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ان کے پاس فرشتہ آیا، اس صورت میں بھی یہی کہا جائے گا کہ فرشتے تو بعض اوقات غیر انبیاء کے پاس بھی آ جاتے ہیں، جیسا کہ مریم بنت عمران علیہا السلام کے پاس بھی فرشتہ آیا اور انھیں مسیح علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی۔ (دیکھیے مریم: ۱۶ تا ۲۱) صحیح بخاری (۳۴۶۴) اور صحیح مسلم (۲۹۶۴) میں گنجے، کوڑھی اور نابینے شخص کا قصہ مذکور ہے کہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور ان سے ہم کلام ہوا۔ سنن کبریٰ بیہقی کی صحیح حدیث (۹۱۱۰) میں ہے کہ فرشتوں نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو سلام کیا، لیکن اس سے وہ نبی نہیں بن گئے۔

④ اَنْ اَرْضِعِيْهِ: اللہ تعالیٰ نے اُمّ موسیٰ کو وحی کی کہ اپنے بچے کو کچھ مدت تک دودھ پلا، تاکہ اس کی ابتدائی غذائی ضرورت پوری ہو جائے، کیونکہ ماں کے دودھ سے بڑھ کر کوئی چیز وہ ضرورت پوری نہیں کر سکتی، اور جسم کچھ مضبوط ہو جائے، جو آخری مرتبہ دودھ پلا کر دریا میں ڈالنے سے لے کر دایہ کا دودھ ملنے تک کا وقفہ برداشت کر سکے۔ "اسے دودھ پلا" کے ضمن میں یہ حکم بھی موجود ہے کہ اتنی مدت تک اسے ہر حال میں چھپا کر رکھ، کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ حمل کی پوری مدت، پھر ولادت کے وقت، حتیٰ کہ کچھ عرصہ دودھ پلانے تک فرعون کی مقرر کردہ دایوں اور اس کے جاسوسوں کو اس معاملے کی خبر نہ ہو سکنا اللہ تعالیٰ کا معجزانہ انتظام تھا، جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ (۳۹) میں "وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَيْنِيْ" کے الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے۔ دودھ پلانے کا یہ عرصہ کتنا تھا؟ تین ماہ یا چھ ماہ یا سال، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، کیونکہ صحیح ذریعے سے اس کی تعیین ثابت نہیں۔

⑤ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ: اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ (۳۸ تا ۴۰) میں ہے۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۸

**تو فرعون کے گھر والوں نے اسے اٹھالیا، تاکہ آخر ان کے لیے دشمن ہو اور غم کا باعث ہو، بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطا کار تھے ۸**

6 **وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ:** خوف آنے والے خطرے کا ہوتا ہے اور غم گزشتہ نقصان کا۔ فرمایا جب تمھیں فرعون کے جاسوسوں کا خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا میں پھینک دو اور نہ ڈرو کہ ضائع ہو جائے گا، یا اسے کوئی نقصان پہنچے گا اور نہ غم کرو کہ میں نے اپنے بچے کو دریا میں کیوں پھینک دیا۔

7 **اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ:** مفسرین نے اس آیت میں اللہ کے کلام کا اعجاز بیان کیا ہے کہ اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُمّ موسیٰ کو دو چیزوں کا حکم دیا ہے، یعنی "**اَنْ اَرْضِعِيْهِ**" اور "**فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ**" اور دو چیزوں سے منع فرمایا ہے، یعنی "**وَلَا تَخَافِيْ**" اور "**وَلَا تَحْزَنِيْ**" اور دو چیزوں کا وعدہ فرمایا اور خوش خبری دی ہے، یعنی "**اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ**" اور "**وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ**"۔

**آیت 8** 1 **فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ:** " اِلْتَقَطَ " کا معنی ہے کسی کی گری ہوئی چیز اٹھا لینا۔ اُمّ موسیٰ کا گھر دریائے نیل کے کنارے پر فرعون کے محل کے بالائی جانب تھا۔ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایک صندوق میں بند کر کے اسے پانی سے محفوظ بنا کر دریا میں ڈال دیا، جو بہتا ہوا فرعون کے محل کے پاس سے گزرا، اس کے لوگوں نے اسے دیکھا تو دریا سے نکال کر فرعون کے پاس لے آئے۔

2 **لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا:** اس ''لام'' کو اکثر مفسرین ''لام عاقبت'' کہتے ہیں، یعنی آل فرعون کے اسے اٹھانے کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے غم کا باعث بنے۔ مگر اسے لام تعلیل بھی بنا سکتے ہیں، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر تھی کہ آل فرعون نے اسے اٹھا لیا، تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعث غم بنے۔

3 **اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ ......:** "**خٰطِـِٕيْنَ**" "أَخْطَأَ يُخْطِئُ" (افعال) کا معنی ہے بھول کر خطا کرنا اور "خَطِئَ يَخْطَأُ" (ع) کا معنی ہے جان بوجھ کر گناہ کرنا، جیسا کہ فرمایا: ﴿**نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ**﴾ [ العلق : ۱٦ ] ''پیشانی کے ان بالوں کے ساتھ جو جھوٹے ہیں، خطا کار ہیں۔'' اس کا مصدر "خِطْأٌ" (خاء کے کسرے کے ساتھ) ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿**اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا**﴾ [ بني إسرائيل : ۳۱ ] ''بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے۔'' اور سورۂ یوسف میں ہے: ﴿**اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ**﴾ [ یوسف : ۲۹ ] ''یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی۔'' "**اِنَّ**" کے ساتھ عموماً پہلی بات کی علت بیان کی جاتی ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام ان کے لیے دشمن اور باعث غم کیوں بننے والے تھے؟ اس لیے کہ وہ سب اللہ کے نافرمان اور خطا کار تھے، جنھوں نے ہزاروں بچوں کو ذبح کر دیا اور بنی اسرائیل پر بے پناہ ظلم کیے۔ اللہ تعالیٰ نے انھی کے

وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

**اور فرعون کی بیوی نے کہا یہ میرے لیے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، امید ہے کہ وہ ہمیں فائدہ پہنچائے، یا ہم اسے بیٹا بنا لیں اور وہ سمجھتے نہ تھے ۝۹**

پرورده کو ان کی ہلاکت کا ذریعہ بنا دیا۔ بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ ”چوکنے والے“ کیا ہے، مگر ”خَاطِئٌ“ کا لغوی معنی اس ترجمے کا ساتھ نہیں دیتا۔

**آیت 9** ① **وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ** ……: فرعون اور اس کی بیوی نے صندوق کھلوایا تو اس میں سے نہایت خوب صورت اور پیارا بچہ نکلا، جس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی کشش رکھ دی تھی کہ جو دیکھے اس سے محبت کرنے لگے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ﴾ [ طٰه : ۳۹ ] ”اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے ایک محبت ڈال دی۔“ مگر جس طریقے سے یہ بچہ آیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ بنی اسرائیل کے کسی آدمی کا بچہ ہے، جس نے ذبح ہونے سے بچانے کے لیے اسے دریا کے حوالے کر دیا ہے، اس لیے فرعون اور اس کے خونخوار ساتھیوں نے اصرار کیا کہ اسے ہر حال میں ذبح کیا جائے، مگر فرعون کی بیوی کہنے لگی کہ یہ میری اور تیری آنکھ کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل مت کرو۔ فرعون کی بیوی کا یہ کہنا کہ ”اسے قتل مت کرو“ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ لوگ اسے قتل کرنے کے درپے ہو چکے تھے۔

② رسول اللہ ﷺ نے فرعون کی بیوی کا نام آسیہ بتایا ہے۔ یہ خاتون دنیا کی سب سے بلند مرتبہ خواتین میں سے ایک تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا آسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَ إِنَّ فَضْلَ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ و ضرب الله مثلا …… ﴾ : ۳٤۱۱، عن أبي موسى رضي الله عنه ] ”مردوں میں سے بہت سے کامل ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ کی عورتوں پر برتری ایسے ہی ہے جیسے ثرید کی برتری تمام کھانوں پر۔“ آسیہ علیہا السلام کے متعلق مزید دیکھیے سورۂ تحریم (۱۱)۔

③ **عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا**: اس سے معلوم ہوا کہ فرعون اولاد سے محروم تھا۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ ”**اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى**“ کا دعویٰ کرنے والا اولاد کی خواہش رکھنے کے باوجود اولاد حاصل نہیں کر سکا۔ لوگوں کے بنائے ہوئے بہت سے مشکل کُشا اور حاجت روا، جن سے لوگ اولاد مانگتے ہیں، دنیا سے بے اولاد ہی رخصت ہو گئے۔ لاہور میں مدفون مشہور بزرگ علی ہجویری کی خود اولاد نہیں تھی، مگر لوگ ہیں کہ انھیں د (رازق) اور گنج بخش (خزانے عطا کرنے والا) کہہ کر ان سے مال و اولاد مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔

④ آسیہ علیہا السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ کہا اللہ تعالیٰ نے اسے سچ کر دکھایا، آپ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بھی بنے اور

وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰ وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ؗ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۱

اور موسیٰ کی ماں کا دل خالی ہوگیا۔ یقیناً وہ قریب تھی کہ اسے ظاہر کر ہی دیتی، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے اس کے دل پر بند باندھ دیا تھا، تاکہ وہ ایمان والوں میں سے ہو ۝۱۰ اور اس نے اس کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جا۔ پس وہ اسے ایک طرف سے دیکھتی رہی اور وہ شعور نہیں رکھتے تھے ۝۱۱

اسے وہ نفع پہنچایا جو کم ہی کسی بچے نے اپنی پالنے والی کو پہنچایا ہوگا۔ اگر فرعون بھی یہ الفاظ کہتا تو شاید اسے بھی یہ سعادت مل جاتی، مگر ظالموں کو ایسی ہدایت نہیں ملتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [ البقرة : ۲۵۸ ] ''اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

5 وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: یعنی انھیں یہ خیال تک نہ تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ہمارے زوال اور ہماری ہلاکت کا باعث بنے گا۔

آیت 10 1 وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا: اوپر ان کا حال بیان ہوا جنھیں وہ بچہ ملا، اب اس کا حال بیان ہوتا ہے جس سے وہ جدا ہوا۔ ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ انھوں نے اس کی تفسیر میں فرمایا: (( فَارِغًا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ غَيْرِ ذِكْرِ مُوْسٰى )) ''موسیٰ علیہ السلام کی ماں اتنی بے قرار ہوگئی کہ اس کا دل موسیٰ کی یاد کے سوا ہر چیز سے خالی ہوگیا۔''

2 اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ: یہ ''اِنْ'' اصل میں ''إِنَّ'' ہے، جس کا اسم محذوف ہے۔ دلیل اس کی ''لَتُبْدِيْ بِهٖ'' پر آنے والا لام ہے۔ محذوف کو ظاہر کریں تو عبارت ہوگی: ''إِنَّهَا كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ'' یعنی وہ بے قراری کی وجہ سے قریب تھی کہ اس کا معاملہ ظاہر کر دیتی کہ ہائے میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا بچہ دریا میں پھینک دیا۔

3 لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی ہم نے اس سے جو وعدہ کیا تھا کہ ''اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ'' (ہم اسے تیرے پاس واپس لانے والے ہیں) اس پر اس کا ایمان پختہ رکھنے کے لیے ہم نے اس کے دل پر صبر کا بند باندھ دیا اور اس کی ڈھارس بندھا دی، اگر یہ نہ ہوتا تو وہ قریب تھی کہ بچے کا راز خود ہی فاش کر دیتی، مگر ہمارے بند باندھنے کی وجہ سے وہ قائم رہی۔

آیت 11 1 وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ: ''قَصَّ يَقُصُّ'' کا معنی بیان کرنا بھی ہے اور پیچھے پیچھے جانا بھی۔ موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے ان کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کے ایک بھائی ہارون تھے اور ایک بہن تھی۔

2 فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: ''عَنْ جُنُبٍ'' کا معنی ''دور سے'' یا ''جانب سے'' یعنی وہ کنارے پر رہ کر ساتھ چلتی ہوئی دور سے اسے دیکھتی رہی، اس طرح کہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اس سے اس لڑکی کی دانائی اور ذہانت کا پتا چلتا ہے۔ ماں نے صرف پیچھے پیچھے جانے کو کہا تھا، یہ اس کی دانش مندی تھی کہ پیچھے کس طرح

وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ

**اور ہم نے اس پر پہلے سے تمام دودھ حرام کر دیے تو اس نے کہا کیا میں تمھیں ایک گھر والے بتلاؤں جو تمھارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ ہوں ﴿۱۲﴾ تو ہم نے اسے اس کی ماں کے پاس واپس**

---

جانا ہے۔ ایک عرب شاعر نے خوب کہا ہے ؎

إِذَا كُنْتَ فِيْ حَاجَةٍ مُرْسِلًا فَأَرْسِلْ حَكِيْمًا وَ لَا تُوْصِهٖ

''جب تم کسی کام کے لیے بھیجو تو دانا آدمی کو بھیجو، پھر اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔''

**آیت 12** ① **وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ:** ''الْمَرَاضِعَ'' ''مُرْضِعٌ'' کی جمع بھی ہو سکتی ہے، یعنی دودھ پلانے والیاں اور ''مَرْضَعٌ'' کی بھی جو ظرف مکان ہو تو مراد دودھ پلانے کی جگہ ہوگی، یعنی دودھ کی چھاتیاں اور اگر مصدر میمی ہو تو مراد تمام دودھ ہوں گے، یعنی ہم نے اپنی تقدیر میں طے شدہ حکم کے ذریعے سے موسیٰ علیہ السلام پر تمام دودھ پہلے ہی حرام کر دیے تھے، یعنی پینے سے منع کر دیا تھا۔ فرعون کی بیوی کو موسیٰ علیہ السلام سے بے پناہ محبت ہوگئی تھی اور وہ ہر قیمت پر ان کے لیے دودھ کا انتظام کرنا چاہتی تھی، مگر جو دایہ بھی لائی گئی، موسیٰ نے اس کا دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ فرعون کی بیوی سخت فکر مند تھی کہ دودھ نہ پینے کی وجہ سے اتنا پیارا بچہ کہیں فوت نہ ہو جائے۔

② **فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ ......:** موسیٰ علیہ السلام کی بہن اجنبی بن کر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو اس نے موقع پا کر کہا، کیا میں تمھیں ایک ایسے گھر والے بتاؤں جو تمھارے لیے اس کی کفالت کریں گے اور وہ اس کے خیر خواہ ہوں گے۔ یہاں درمیان کی بات چھوڑ دی گئی ہے، کیونکہ وہ خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ فرعون کے گھر والوں نے اس سے پوچھا کہ وہ گھر والے کون ہیں؟ اس نے کہا، میری ماں۔ انھوں نے کہا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بچہ تمھارا ہے اور تم اس کے متعلق جانتی ہو۔ اس نے کہا، بلکہ ہم بادشاہ کے خیر خواہ اور مخلص محبت کرنے والے ہیں، اس لیے اس بچے کی خیر خواہی اور خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ انھوں نے کہا، تمھاری اماں کے ہاں دودھ کہاں سے آیا؟ اس نے کہا، میرا بھائی ہارون پچھلے سال پیدا ہوا ہے اور دودھ پی رہا ہے۔ غرض انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلوایا، کیونکہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سلطنت کی ملکہ ہر حال میں اس کے لیے دودھ کا انتظام کرنا چاہتی تھی، جوں ہی ماں نے بچے کے منہ سے اپنی چھاتی لگائی، بچہ خوش ہو کر دودھ پینے لگا۔

**آیت 13** ① **فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ:** یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں سے جو وعدہ کیا تھا کہ اسے تمھارے پاس واپس لائیں گے، اتنی دیر ہی میں پورا کر دیا جتنی دیر کوئی بچہ ماں کے دودھ کے بغیر گزار سکتا ہے۔

② **كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا:** ''قَرَّ يَقَرُّ (ض، ع) قُرَّةً وَ قُرُوْرًا'' ''آنکھ کا ٹھنڈا ہونا۔'' تاکہ اس کی آنکھ جو بیٹے کی جدائی میں سکون

اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾

**پہنچا دیا، تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور وہ غم نہ کرے اور تاکہ وہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۱۳﴾**

سے نا آشنا تھی، آنسو بہا بہا کر اور بیدار رہ کر سرخ اور گرم ہو چکی تھی، بیٹے کے واپس ملنے، اسے دودھ پلانے اور اپنے پاس رکھنے سے ٹھنڈی اور پرسکون ہو جائے اور آرام کی نیند سو جائے اور غم زدہ نہ رہے۔

**نکتہ:** اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کے اعضا کا درجہ حرارت مختلف رکھا ہے، اس کی جلد کا درجہ حرارت عموماً $37^0$ ہوتا ہے۔ جگر کو کام کرنے کے لیے $40^0$ کے قریب درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ آنکھ کا درجہ حرارت زیادہ سے زیادہ $9^0$ ہوتا ہے، اس سے زیادہ ہو جائے تو آنکھ پگھل کر بہ جائے، اس لیے دل کی خوشی کے لیے آنکھ کی ٹھنڈک کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (شعراوی)

③ قدیم زمانے میں ان ممالک کے بڑے اور خاندانی لوگ بچوں کو اپنے ہاں پالنے کے بجائے دودھ پلانے والی عورتوں کے سپرد کر دیتے تھے۔ خود ہمارے نبی کریم ﷺ نے بھی حلیمہ سعدیہ کے ہاں صحرا میں پرورش پائی۔ اس کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ اپنے گھر لے گئیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹے کو واپس لانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ بھی پورا ہوا اور شاہی خزانے سے ماں کو جو وظیفہ ملتا رہا وہ اس کے علاوہ تھا۔

④ اس مقام پر بعض مفسرین نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَثَلُ الَّذِيْ يَعْمَلُ وَ يَحْتَسِبُ فِيْ صِنْعَةِ الْخَيْرِ كَمَثَلِ أُمِّ مُوْسٰى تُرْضِعُ وَلَدَهَا وَ تَأْخُذُ أَجْرَهَا)) ''وہ شخص جو کام کرے اور اپنے کام میں نیکی کی نیت رکھے، اس کی مثال موسیٰ کی والدہ کی سی ہے، جو اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اپنی مزدوری وصول کرتی ہے۔'' مگر ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ہے، البتہ ایک مرسل روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: ((مَثَلُ الَّذِيْنَ يَغْزُوْنَ مِنْ أُمَّتِيْ وَ يَأْخُذُوْنَ الْجُعْلَ يَتَقَوَّوْنَ بِهِ عَلٰى عَدُوِّهِمْ كَمَثَلِ أُمِّ مُوْسٰى تُرْضِعُ وَلَدَهَا وَ تَأْخُذُ أَجْرَهَا)) ''میری امت کے جو لوگ جنگ کرتے ہیں اور وظیفہ لیتے ہیں، جس کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں قوت حاصل کرتے ہیں، ان کی مثال ام موسیٰ کی سی ہے جو اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اپنی مزدوری وصول کرتی ہے۔'' یہ روایت مرسل (جو ضعیف کی ایک قسم ہے) ہونے کے علاوہ سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے '' سلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني (ح: ٤٥٠٠)'' اس حدیث میں جو بات بیان ہوئی ہے اگرچہ فی نفسہ درست ہے، جو اپنی طرف سے بطور مثال بیان کی جا سکتی ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے ذمے وہی بات لگانے کی اجازت ہے جو آپ سے ثابت ہو، ورنہ ''مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ'' کی وعید کا مصداق بننے کا خطرہ ہے۔

⑤ **وَلِتَعۡلَمَ اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ:** یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی ماں کے پاس واپس پہنچا دیا، تاکہ اسے پہلے وحی کے ذریعے

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور پورا طاقت ور ہو گیا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا اور اسی طرح نیکی کرنے والوں کو ہم بدلا دیتے ہیں ﴿۱۴﴾

سے سن کر اللہ کا وعدہ حق ہونے کا علم تھا، تو اب آنکھوں سے دیکھ کر اس کے حق ہونے کا علم ہو جائے۔ پہلے اگر علم الیقین تھا تو اب عین الیقین ہو جائے۔ (بقاعی)

⑥ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ کا وعدہ حق ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جوں ہی کسی کام میں کوئی مشکل پیش آتی ہے، اللہ تعالیٰ سے بدظن ہو جاتے ہیں اور انھیں اللہ کے وعدے پر یقین نہیں رہتا، حالانکہ اس کا وعدہ خلاف نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اسباب کو کچھ اس طرح پھیر کر لاتا ہے جو انسانی سمجھ سے باہر ہوتا ہے اور جس چیز کا گمان بھی نہیں ہوتا وہ آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے۔ پھر بعض اوقات آدمی ایک چیز کو برا سمجھتا ہے جب کہ وہ اس کے حق میں بہتر ہوتی ہے اور ایک چیز کو اچھا سمجھتا ہے جب کہ وہ اس کے حق میں بری ہوتی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۶) اور نساء (۱۹)۔

ہاں مشو نومید چوں واقف نہ ای ز اسرارِ غیب باشد اندر پردہ بازی ہائے پنہاں غم مخور

''خبردار! ناامید نہ ہو، کیونکہ تو غیب کے اسرار سے واقف نہیں۔ پردے کے اندر کئی پوشیدہ کھیل ہو رہے ہوتے ہیں، غم مت کر۔''

**آیت 14** ① وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى: یہاں ایک لمبی بات حذف کر دی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے رضاعت کے ایام اپنی والدہ کے پاس گزرے، جس سے انھیں اپنے والدین، بھائی بہن اور خاندان سے شناسائی ہوگئی اور آئندہ بھی اس تعلق کی وجہ سے میل جول جاری رہا، جس سے وہ اپنے آبائے کرام ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کے دین سے واقف ہو گئے اور بنی اسرائیل کی زبوں حالت پر براہ راست مطلع رہنے لگے۔ رضاعت کے بعد شاہی محل میں منتقل ہونے کے ساتھ ان کی پرورش اور تربیت ایک شہزادے کی حیثیت سے ہوئی، انھیں اس وقت کے تمام علوم و فنون، لکھنے پڑھنے اور جہانبانی کے طریقے سکھائے گئے، جنگ میں درکار عام تربیت اور سپہ سالاری کے لیے خاص تربیت دی گئی۔ ان تمام چیزوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی اور تربیت تھی، جس کے ذریعے سے انھیں آنے والی ذمہ داری کے لیے تیار کیا گیا، حتیٰ کہ وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گئے۔ ''بَلَغَ اَشُدَّهٗ'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۲۲) وہاں یوسف علیہ السلام کے لیے صرف ''بَلَغَ اَشُدَّهٗ'' کا لفظ آیا ہے، جب کہ یہاں موسیٰ علیہ السلام کے لیے ''وَ اسْتَوٰۤى'' کا لفظ بھی آیا ہے، یعنی وہ پورے طاقت ور ہو گئے، کیونکہ جسمانی قوت یوسف علیہ السلام میں موسیٰ علیہ السلام جیسی نظر نہیں آتی۔

② اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا: ''حُكْمًا'' کا معنی فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے اور ''عِلْمًا'' سے مراد دنیا اور دین کا علم ہے، یعنی جوان ہونے پر ہم نے انھیں حق و باطل میں فیصلہ کرنے کی اہلیت عطا فرمائی اور دنیا و دین دونوں کا علم عطا فرمایا۔ جس میں سے

وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ٝ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ٝ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

اور وہ شہر میں اس کے رہنے والوں کی کسی قدر غفلت کے وقت داخل ہوا تو اس میں دو آدمیوں کو پایا کہ لڑ رہے ہیں، یہ اس کی قوم سے ہے اور یہ اس کے دشمنوں میں سے ہے۔ تو جو اس کی قوم سے تھا اس نے اس سے اس کے خلاف مدد مانگی جو اس کے دشمنوں سے تھا، تو موسیٰ نے اسے گھونسا مارا تو اس کا کام تمام کر دیا۔ کہا یہ شیطان کے کام سے ہے، یقیناً وہ کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے ﴿۱۵﴾

---

دنیا کے علوم شاہی محل کے ذریعے سے حاصل ہوئے اور دین کا علم اور اس کا فہم والدہ کے گھر اور خاندان کے ذریعے سے حاصل ہوا۔ بعض مفسرین نے ''حُكْمًا وَّ عِلْمًا'' سے مراد نبوت لی ہے، مگر یہاں یہ معنی درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ نبوت تو اس کے دس سال بعد طور پر عطا ہوئی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

③ **وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ:** احسان کا معنی نیک کام کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے احسان کی تفسیر ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ'' کے ساتھ فرمائی ہے کہ ''اللہ کی عبادت ایسے کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، پھر اگر اُسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔'' [ دیکھیے بخاري، الإیمان، باب سؤال جبریل ...... : ۵۰ ] احسان کا ایک معنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی معاوضہ کی طلب یا خواہش کے بغیر کسی کے ساتھ نیکی کرنا، جیسا کہ بنی اسرائیل کے نیک لوگوں نے قارون کو نصیحت کی تھی: ﴿ وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ [ القصص : ۷۷ ] ''اور احسان کر جیسے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے۔'' فرمایا: ''ہم محسنین کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں'' اس سے معلوم ہوا موسیٰ علیہ السلام احسان کی صفت سے پوری طرح آراستہ تھے، جس کی جزا میں اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم و علم عطا فرمایا۔

**آیت 15** ① **وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا:** ''شہر میں داخل ہوا'' سے معلوم ہوا کہ شاہی محلات عام آبادی سے باہر واقع تھے، جہاں سے وہ شہر میں داخل ہوئے۔ ''غَفْلَةٍ'' میں تنوین کی وجہ سے ''کسی قدر غفلت'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ وہ شہر میں ایسے وقت میں آئے جو کسی قدر غفلت کا وقت تھا۔ یہ صبح سویرے یا عشاء کے بعد یا دوپہر کے وقت میں سے کوئی وقت بھی ہو سکتا ہے، مگر غالب یہی ہے کہ وہ دوپہر کا وقت تھا جب سڑکیں سنسان ہوتی ہیں، لوگ گرمی کی وجہ سے گھروں میں آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ابن ابی حاتم نے اپنی صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر فرمایا ہے: ''نِصْفُ النَّهَارِ'' ''(یعنی یہ) دوپہر کا وقت تھا۔'' [ ابن أبي حاتم : ۱۶۷۵۵ ]

② **فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ......:** موسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے ہیں، وہ قبطیوں کے بنی اسرائیل پر

قَالَ رَبِّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾

**کہا اے میرے رب! یقیناً میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، سو مجھے بخش دے۔ تو اس نے اسے بخش دیا، بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۶﴾**

مظالم سے بھی آگاہ تھے اور ہر روز اپنی آنکھوں سے ان مظالم کا مشاہدہ کرتے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ان کی ہمدردیاں اپنی قوم کے ساتھ تھیں۔ قوم بھی جانتی تھی کہ وہ ان کے ایک فرد ہیں۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ جھگڑ رہے ہیں، ان میں سے ایک ان کی قوم سے ہے اور دوسرا قبطی ہے، جو ان کے دشمن تھے۔ قبطی حسبِ عادت غلام سمجھ کر اسرائیلی پر زیادتی کر رہا تھا۔ اسرائیلی اگر مقابلہ کر سکتا ہوتا تو اسے مدد مانگنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ بے بس ہو گیا تو اس نے مدد کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی۔ موسیٰ علیہ السلام طبعی طور پر کمزوروں اور مظلوموں کے ہمدرد تھے۔ اب ظلم ہوتے دیکھا تو مظلوم کو بچانے کے لیے آگے بڑھے اور قبطی کو ایک گھونسا مارا، جس سے اس کا کام تمام ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کا اسے قتل کرنے کا نہ ارادہ تھا نہ ان کے وہم و گمان میں یہ بات تھی کہ وہ ایک گھونسے سے مر جائے گا۔ جب اچانک یہ واقعہ ہوا اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کے انجام پر غور کیا کہ ان کے اور ان کی قوم کے حق میں اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے، تو وہ سخت پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ شیطان کا کام ہے جس نے بڑے فساد کے لیے مجھے غصہ دلا کر یہ کام کروایا ہے۔ وہ تو ایسا دشمن ہے جو کھلم کھلا گمراہ کر دینے والا ہے۔

**آیت 16** ① **قَالَ رَبِّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ......:** گو موسیٰ علیہ السلام نے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا تھا، مگر پیغمبروں کی شان بڑی ہے، ان کی شان کے لحاظ سے یہ بے احتیاطی بھی مناسب نہ تھی، اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے اسے گناہ سمجھا اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے طلب گار ہوئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرما دی، مگر موسیٰ علیہ السلام اس کے بعد بھی نادم رہے اور قیامت کے دن جب لوگ ان کے پاس جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری شفاعت کیجیے تو اپنی ندامت کا اظہار ان الفاظ میں کریں گے: (( إِنِّيْ قَتَلْتُ نَفْسًا لَمْ أُوْمَرْ بِقَتْلِهَا )) [ مسلم، الإيمان، باب أدنى أهل الجنة منزلة فيها : ۱۹٤ ] ”میں نے ایک شخص قتل کر دیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔“

② قرآن کے بیان سے ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ قتل نادانستہ ہوا تھا، مگر بائبل موسیٰ علیہ السلام کو قتلِ عمد کا مجرم ٹھہراتی ہے۔ چنانچہ اس کی روایت ہے کہ ”مصری اور اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام نے اِدھر اُدھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے، تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔“ (خروج : ۲ : ۱۲) یہ یہود کی ان تحریفات میں سے ہے جن کی اصلاح قرآن نے فرمائی، جو پہلی تمام کتابوں پر مہیمن ہے۔

③ موسیٰ علیہ السلام کی دعا ”فَاغْفِرْ لِيْ“ میں بخشش کی درخواست کے ساتھ پردہ ڈالنے کی درخواست کا مفہوم بھی شامل ہے۔ ”مِغْفَرٌ“ اس خود کو کہتے ہیں جس کے ساتھ جنگ میں سر ڈھانپتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو معاف فرما دیا اور اس واقعہ پر پردہ بھی ڈال دیا اور اگلے دن پیش آنے والے واقعہ تک کسی کو خبر نہیں ہوئی کہ قتل کس نے کیا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآىِٕفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖۗ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

کہا اے میرے رب! اس وجہ سے کہ تو نے مجھ پر انعام کیا، تو میں کبھی بھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا ﴿۱۷﴾ غرض اس نے شہر میں ڈرتے ہوئے صبح کی، انتظار کرتا تھا، تو اچانک وہی شخص جس نے کل اس سے مدد مانگی تھی، اس سے فریاد کر رہا تھا۔ موسیٰ نے اس سے کہا یقیناً تو ضرور کھلا گمراہ ہے ﴿۱۸﴾ پھر جوں ہی اس نے ارادہ کیا کہ اس کو پکڑے جو ان دونوں کا دشمن تھا، اس نے کہا اے موسیٰ! کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے قتل کر دے، جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا ہے، تو نہیں چاہتا مگر یہ کہ زمین میں زبردست بن جائے اور تو نہیں چاہتا کہ اصلاح کرنے والوں میں سے ہو ﴿۱۹﴾

**آیت 17** قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ ...... : "بِمَآ" میں باء سببیت کے لیے ہے، یعنی اے میرے رب! تو نے جو مجھ پر انعام کیا کہ مجھے ہر قسم کی نعمت سے نوازا اور میرے فعل پر پردہ ڈال دیا، اس وجہ سے میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔ ممکن ہے موسیٰ علیہ السلام کی مراد مجرم سے وہ اسرائیلی ہو جس کی انھوں نے مدد کی تھی، کیونکہ وہ جرم کا سبب بنا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے "مجرمین" سے فرعون اور اس کی قوم کے لوگ مراد لیے ہوں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور مجرم تھے اور ان کے اللہ تعالیٰ کے حضور عہد کرنے کا مطلب یہ ہو کہ تو نے جو مجھے نعمت و عزت اور راحت و قوت عطا فرمائی ہے اس کا شکر یہ ہے کہ اسے ان مجرموں کی حمایت و اعانت میں صرف نہ کروں، بلکہ ان سے اپنا تعلق منقطع کرلوں اور اس ظالم حکومت کا کل پُرزہ نہ بنوں۔ ابن جریر اور بہت سے دوسرے مفسرین نے موسیٰ علیہ السلام کے اس عہد کا یہی مطلب لیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے بھی اس کے مطابق تفسیر فرمائی ہے۔ اس آیت سے ظالم حکمرانوں کا ساتھ دینے اور ان کا تعاون کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

**آیت 19،18** فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآىِٕفًا یَّتَرَقَّبُ ...... : موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قبطی قتل ہو گیا تھا، اس لیے انھوں نے شہر میں اس حال میں صبح کی کہ کل کے واقعہ سے خوف زدہ تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور کب کوئی انھیں گرفتار کرنے کے لیے آتا ہے۔ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ وہی اسرائیلی جس نے کل ان سے ایک قبطی سے بچانے کے لیے مدد مانگی تھی، وہ ایک اور قبطی سے لڑ رہا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں سے گزرے تو اس نے چیخ چیخ کر انھیں مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کل کے واقعہ سے آزردہ تھے، اسے کہنے لگے، یقیناً تو کھلا گمراہ شخص ہے، یعنی ہر روز کسی نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا

وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآىِٕفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۲ ۸ ۵

اور ایک آدمی شہر کے سب سے دور کنارے سے دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا اے موسیٰ! بے شک سردار تیرے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں، پس نکل جا، یقیناً میں تیرے لیے خیر خواہوں سے ہوں ﴿۲۰﴾ تو وہ ڈرتا ہوا اس سے نکل پڑا، انتظار کرتا تھا، کہا اے میرے رب! مجھے ان ظالم لوگوں سے بچا لے ﴿۲۱﴾

---

رہتا ہے، کل ایک شخص سے لڑ رہا تھا، آج ایک اور سے جھگڑا مول لیے کھڑا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ کل تیرے سبب سے میں ایک جان کو قتل کر چکا ہوں، اب تو نے پھر وہی ماحول بنا دیا ہے۔ پھر جوں ہی موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو پکڑنے کا ارادہ کیا، چونکہ انھوں نے ابھی اسرائیلی کو ڈانٹا تھا، اس لیے وہ موسیٰ علیہ السلام کے تیور دیکھ کر ڈر گیا اور سمجھا کہ وہ اسے پکڑنا چاہتے ہیں۔ اس نے جان بچانے کے لیے کہا، موسیٰ! تم مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہو! جیسے تم نے کل ایک بندہ قتل کر دیا تھا۔ اس سے پہلے یہ راز موسیٰ اور اسرائیلی کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ قبطی نے یہ بات سنی تو فوراً جا کر فرعون کو اطلاع دی، فرعون شدید غضب ناک ہوا اور اس نے خود اپنے سرداروں کی مجلس بلا کر فیصلہ کیا کہ اب اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ موسیٰ کو قتل کر دیا جائے۔ ”**فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ**“ میں ”اَنْ“ کے فائدے کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۹۶)۔

**آیت 20** ❶ **وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى**...... : ادھر فرعون کے آدمی موسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہوئے، ادھر مجلس میں موجود ایک شخص فوراً شہر کے سب سے دور کنارے سے گلیوں بازاروں کے قریب ترین راستے سے دوڑتا ہوا آیا اور موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگا، موسیٰ! سردار تمھیں قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں، اس لیے فوراً یہاں سے نکل جاؤ، میں تمھارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

❷ سورۂ یٰس میں ہے: ﴿**وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى**﴾ [ یٰس : ۲۰ ] جب کہ یہاں ہے: ﴿**وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى**﴾ مفسرین نے فرمایا، ہر مقام پر وہ لفظ پہلے لایا جاتا ہے جو وہاں اہم ہوتا ہے۔ اس مقام پر اس آدمی کی مردانگی بیان کرنا اہم ہے، اس لیے ”**رَجُلٌ**“ کا لفظ پہلے ذکر فرمایا، کیونکہ فرعون کا راز فاش کرنے کے نتیجے سے آگاہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع دی اور یہ کسی مرد ہی کا کام ہو سکتا تھا، پھر یہ بھی اس کی مردانگی تھی کہ بہت دور جگہ سے سرکاری دستے سے پہلے پہنچ گیا۔

❸ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہ سنایا ہمارے پیغمبر کو کہ لوگ ان کی جان لینے کی فکر کریں گے اور وہ بھی وطن سے نکلیں گے، چنانچہ کافر سب اکٹھے ہوئے تھے کہ ان پر مل کر چوٹ کریں، اسی رات میں آپ وطن سے ہجرت کر گئے۔“ (موضح)

**آیت 21** **فَخَرَجَ مِنْهَا خَآىِٕفًا يَّتَرَقَّبُ**...... : ”**يَتَرَقَّبُ**“ ”رَقَبَةٌ“ سے ہے، گردن پھیر کر ادھر ادھر دیکھنا، انتظار کرنا۔

وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾

اور جب اس نے مدین کی طرف رُخ کیا تو کہا میرا رب قریب ہے کہ مجھے سیدھے راستے پر لے جائے ﴿۲۲﴾ اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچا تو اس پر لوگوں کے ایک گروہ کو پایا جو پانی پلا رہے تھے اور ان کے ایک طرف دو عورتوں کو پایا کہ (اپنے جانور) ہٹا رہی تھیں۔ کہا تمھارا کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے کہا ہم پانی نہیں پلاتیں یہاں تک کہ چرواہے پلا کر واپس لے جائیں اور ہمارا والد بڑا بوڑھا ہے ﴿۲۳﴾

موسیٰ علیہ السلام کے علم میں یہ بات آئی تو فوراً اکیلے ہی اس شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے انھیں ایسا کوئی سابقہ پیش نہیں آیا تھا، بلکہ وہ شہزادے کی حیثیت سے نہایت خوش حالی کے ساتھ راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب شہر سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دشمن کی گرفت سے بچتے ہوئے نکلے، اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے میرے رب! جس طرح تو نے میری معجزانہ طریقے سے پرورش فرمائی مجھے ان ظالم لوگوں سے نجات عطا فرما۔ ظالم اس لیے فرمایا کہ پہلے بے شمار مظالم کے علاوہ ان کا تازہ ترین ظلم یہ تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہو گئے تھے، جو صریح ظلم تھا، کیونکہ قتل خطا کی سزا کسی قانون میں بھی قتل نہیں ہے۔

**آیت 22** ① **وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ ......:** اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور انھیں اس راستے پر ڈال دیا جو مدین کی طرف جاتا تھا۔ مدین خلیج عقبہ کے مغربی ساحل پر ''مقنا'' سے چند میل بجانب شمال واقع تھا، آج کل اسے ''اَلْبِدَءُ'' کہتے ہیں۔ اس زمانے میں مدین فرعون کی سلطنت سے باہر تھا۔ مصر کی حکومت پورے جزیرہ نمائے سینا پر نہیں تھی، بلکہ صرف اس کے مغربی اور جنوبی علاقے تک محدود تھی۔ خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی ساحل، جن پر بنی مدیان آباد تھے، وہ مصری اقتدار سے آزاد تھے، اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلتے ہی مدین کا رخ کیا، کیونکہ قریب ترین آزاد اور آباد علاقہ وہی تھا، لیکن وہاں جانے کے لیے انھیں گزرنا بہر حال مصر کے مقبوضہ علاقوں ہی سے تھا اور مصری فوج سے بچ کر نکلنا تھا، اس لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے سیدھے راستے پر ڈال دے، جس سے میں صحیح سلامت مدین پہنچ جاؤں۔ (تفہیم القرآن)

② ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ سعید بن جبیر کے واسطے سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے کہ ''موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین کی طرف چلے تو ان کے پاس راستے میں سبزی اور درختوں کے پتوں کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، حتیٰ کہ پاؤں سے ننگے ہو گئے۔ مدین پہنچنے سے پہلے ہی ان کے پاؤں کے جوتے ٹوٹ کر گر گئے۔ جب سائے میں جا کر بیٹھے تو اس وقت وہ ساری مخلوق میں اللہ کے چنے ہوئے بندے تھے اور حال یہ تھا کہ بھوک سے پیٹ پیٹھ سے لگا ہوا تھا۔''

**آیت 23** ① **وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ ......:** یعنی جب مدین پہنچے تو اس کے کنویں پر دیکھا کہ لوگوں کا ایک ہجوم ہے، جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہا ہے۔ مدین ایک قبیلے کا نام بھی ہے، جو مدین بن ابراہیم کی اولاد سے تھا۔ اس لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

تو اس نے ان کے لیے پانی پلا دیا، پھر پلٹ کر سائے کی طرف آ گیا اور اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میں، جو بھلائی بھی تو میری طرف نازل فرمائے، اس کا محتاج ہوں ﴿۲۴﴾

کا ان سے نسبی تعلق بھی تھا، کیونکہ وہ بھی ابراہیم علیہ السلام کے پوتے یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ (ابن عاشور)

② وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ: ”ذَادَ يَذُوْدُ ذَوْدًا“ ہٹانا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ دو عورتیں مردوں سے الگ ایک کنارے پر کھڑی ہیں اور اپنی بھیڑ بکریوں کو پانی کی طرف جانے سے ہٹا رہی ہیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ پانی پینے کے لیے لوگوں کی بکریوں میں گھس جائیں اور پھر گم ہو جائیں۔ اتنی قوت نہ تھی کہ مجمع کو ہٹا دیں یا خود بھاری ڈول نکال لیں۔

③ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا: موسیٰ علیہ السلام کو ان کا حال دیکھ کر رحم آیا اور ان سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں کھڑی ہو، پانی کیوں نہیں پلاتی؟

④ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ: ”الرِّعَآءُ“ ”رَاعِيٌّ“ کی جمع ہے، چرواہے۔ ”أَصْدَرَ يُصْدِرُ“ پانی پلا کر واپس لے جانا۔ انھوں نے کہا، جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں، ہم پانی نہیں پلاتیں، کیونکہ ہمارا باپ بہت بوڑھا اور کمزور ہے، یہاں آنے کے قابل نہیں، نہ وہ پانی نکال سکتا ہے نہ ہم بھاری ڈول نکال سکتی ہیں، چرواہے چلے جائیں تو ان کا بچا کھچا پانی ہم پلا لیں گی، یا بعد میں ڈول میں تھوڑا تھوڑا پانی نکال کر انھیں پانی پلا لیں گی۔ ان عورتوں کا نام مفسرین نے ”صفورا“ اور ”لیّا“ بیان کیا ہے، مگر یہ بات کسی معتبر ذریعے سے ثابت نہیں۔

⑤ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ: ان خواتین کے والد کے متعلق مشہور یہ ہے کہ وہ شعیب علیہ السلام تھے۔ اس کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ مدین کی طرف شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ مدین کے وہ بزرگ جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی میزبانی کی وہ بھی شعیب علیہ السلام ہی تھے۔ علماء فرماتے ہیں کہ شعیب علیہ السلام کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کا ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ﴾ [ هود : ۸۹ ] ”اور لوط کی قوم (بھی) ہرگز تم سے کچھ دور نہیں ہے۔“ اور سب جانتے ہیں کہ لوط اور ابراہیم علیہما السلام ایک زمانے میں ہوئے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے صدیوں پہلے گزرے ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں: ”اس کی تائید کہ وہ بزرگ شعیب علیہ السلام نہیں تھے، اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ شعیب علیہ السلام ہوتے تو غالب گمان یہی ہے کہ قرآن میں ان کا نام مذکور ہوتا۔ بعض احادیث میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ان کے نام کی تصریح ملتی ہے، مگر ان میں سے کسی کی سند صحیح نہیں، جیسا کہ ہم آگے ذکر کریں گے۔“ (ابن کثیر) بنی اسرائیل کی کتابوں میں ان کا نام ”ثیرون“ آیا ہے، ایک جگہ ان کا نام ”رعوائیل“ آیا، دوسری جگہ ”یترو“ آیا ہے اور ایک جگہ ”حوباب“ آیا ہے۔ علمائے اسلام میں سے بعض نے ان کا نام ”یثریٰ“ بیان کیا ہے، مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ بات ثابت شدہ خبر کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی، جو یہاں موجود نہیں۔

**آیت 24** ① فَسَقٰى لَهُمَا: پیغمبروں میں فطری طور پر ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ہوتا ہے، جیسا کہ اُمّ المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: (( كَلَّا، وَاللّٰهِ! مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَ تَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِي الضَّيْفَ وَ تُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ )) [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...... : ۳ ]

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ٘ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ

تو ان دونوں میں سے ایک بہت حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی، اس نے کہا بے شک میرا والد تجھے بلا رہا ہے، تاکہ تجھے اس کا بدلا دے جو تو نے ہمارے لیے پانی پلایا ہے۔ تو جب وہ اس کے پاس

”ہرگز (ایسا) نہیں (ہوگا)، اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، کیونکہ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں اور بے کسوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور بے روزگار کے لیے کام ڈھونڈتے ہیں اور مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی طرف سے آنے والی مصیبتوں پر مدد کرتے ہیں۔“ موسیٰ علیہ السلام تھکے ماندے اور بھوکے پیاسے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان کی بکریوں کو پلانی پلا دیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں ابن ابی شیبہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”موسیٰ علیہ السلام جب مدین کے پانی پر پہنچے تو وہاں لوگوں کی ایک جماعت کو پایا جو پانی پلا رہے تھے۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو انھوں نے کنویں پر دوبارہ پتھر رکھ دیا، جسے دس آدمی ہی اٹھا سکتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ دو عورتیں ہیں جو اپنے جانوروں کو ہٹا رہی ہیں، ان سے پوچھا: ”تمھارا معاملہ کیا ہے؟“ انھوں نے اپنا ماجرا بیان کیا، تو آپ نے جا کر وہ پتھر اٹھایا اور ایک ہی ڈول نکالا تھا کہ بکریاں سیراب ہو گئیں۔“ ابن کثیر نے فرمایا: ”اس کی سند صحیح ہے، حاکم نے بھی اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔“ [ ابن کثیر : ۲۲۷/۶ ]

2 **ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ:** بقاعی لکھتے ہیں: ”پھر جس طرف ان کا رخ تھا اس طرف پیٹھ کر کے سائے کی طرف چلے گئے، تاکہ وہاں آرام کر سکیں اور مخلوق کی خیر خواہی اور مدد کے بعد خالق کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”**الظِّلِّ**“ کو معرفہ اس لیے ذکر فرمایا کہ جہاں لوگ کثرت سے آتے جاتے ہوں وہاں سائے کی موجودگی انوکھی نہیں، بلکہ جانی پہچانی بات ہے، خصوصاً جہاں پانی بھی ہو۔“

3 **فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ:** اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے اس کی صفات میں سے صفت ”رب“ کے واسطے سے دعا کی، کیونکہ اس وقت ان کا حال صفت ربوبیت سے فریاد کا تقاضا کرتا تھا۔ بھوک اتنی کہ پیٹ پیٹھ سے لگا ہوا تھا۔ بے وطنی ایسی کہ کوئی واقفیت نہ کوئی مونس و غم خوار، کوئی گھر نہ ٹھکانا، دشمن کے تعاقب کا مسلسل خوف، غرض ہر لحاظ سے فقر ہی فقر۔ ایسی حالت میں انھوں نے کسی مخلوق کے ساتھ شکوہ نہیں کیا، بلکہ اپنے رب ہی کی جناب میں درخواست پیش کی کہ اے میرے پالنے والے! میں تو جو خیر بھی تو میری طرف نازل فرمائے اس کا محتاج ہوں۔ ”نازل فرمائے“ کا لفظ اس لیے بولا کہ آدمی کو جو کچھ ملتا ہے آسمان سے آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ [ الذاریات : ۲۲ ] ”اور آسمان ہی میں تمھارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔“ حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا نہایت جامع دعا ہے، دنیا اور آخرت کی کوئی بھلائی ایسی نہیں جو اس میں نہ آ گئی ہو۔ طویل سفر کے بعد غربت اور فقر و فاقہ کی حالت میں عجز و انکسار سے بھری ہوئی یہ جامع دعا موسیٰ علیہ السلام کے لبوں سے نکلی تو ساتھ ہی قبولیت کے آثار بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔

آیت 25 1 **فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ:** ”عَلٰی حَیَاءٍ“ کا معنی ہے حیا کے ساتھ، ”**عَلَى اسْتِحْیَآءٍ**“ میں حروف زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی بہت حیا کے ساتھ۔

2 شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”عورتوں نے پہچانا کہ چھاؤں پکڑتا ہے مسافر ہے، دور سے آیا ہوا تھکا، بھوکا، جا کر اپنے باپ

لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

آیا اور اس کے سامنے حال بیان کیا تو اس نے کہا خوف نہ کر، تو ان ظالم لوگوں سے بچ نکلا ہے ﴿۲۵﴾

سے کہا۔'' ابن کثیر لکھتے ہیں: ''جب وہ دونوں باپ کے پاس جلدی واپس پہنچ گئیں تو اسے تعجب ہوا اور اس نے ان سے اس کے متعلق پوچھا، انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے احسان کا ذکر کیا، تو اس نے ان میں سے ایک کو انھیں بُلانے کے لیے بھیجا۔''

③ ''تو ان دونوں میں سے ایک بہت حیا کے ساتھ چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی۔'' سبحان اللہ! وہ خاتون کس قدر باحیا ہوگی جس کے بہت حیا کی شہادت رب العالمین نے دی ہے۔ ''تَمْشِيْ بِاسْتِحْيَاءٍ'' کے بجائے '' **تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ**'' اس لیے فرمایا گویا وہ حیا کی سواری پر سوار ہو کر چلی آ رہی تھی، حیا کی ہر صورت اس کی دسترس میں تھی۔ ابن ابی حاتم نے عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: (( ﴿ **فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ** ﴾ قَائِلَةٌ بِثَوْبِهَا عَلٰى وَجْهِهَا لَيْسَتْ بِسَلْفَعٍ مِنَ النِّسَاءِ وَلَاجَةً، خَرَّاجَةً )) [ طبري : ۲۷۵۸۵۔ ابن أبي حاتم : ۱۶۸۳۲ ] ''وہ نہایت حیا کے ساتھ اپنا کپڑا چہرے پر ڈالے ہوئے آئی، بے باک عورتوں کی طرح نہیں جو بے دھڑک اور بے خوف چلی آتی ہوں، ہر جگہ جا گھستی ہر طرف نکل جاتی ہوں۔'' ابن کثیر نے فرمایا: '' هٰذَا إِسْنَادٌ صَحِيْحٌ '' اور تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا: ''وَ سَنَدُهُ صَحِيْحٌ۔'' ظاہر یہی ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے، مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں حیا کا مطلب کیا تھا۔ جو لوگ چہرے کے پردے کے قائل نہیں انھیں غور کرنا چاہیے کہ امیر المومنین چہرے کے پردے کو حیا قرار دے رہے ہیں۔

④ **قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ**: اس خاتون کے بلانے کے انداز سے بھی اس کی کمال دانائی اور حیا ظاہر ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی طرف سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا، بلکہ باپ کی طرف سے پیغام دیا، کیونکہ ایک باحیا خاتون کو زیب ہی نہیں دیتا کہ کسی اجنبی مرد کو ساتھ چلنے کے لیے کہے۔

⑤ **لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا**: یہ بات بھی اس نے حیا ہی کی وجہ سے کہی، کیونکہ ایک غیر مرد کو ساتھ لے جانے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے، اس کے بغیر شبہات پیدا ہو سکتے تھے، جن کا اس نے پہلے ہی سد باب کر دیا۔

⑥ یہاں مفسرین نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ انبیاء تو احسان کا بدلا نہیں لیتے، پھر موسیٰ علیہ السلام پانی پلانے کی اجرت لینے کے لیے کیوں چل پڑے؟ جواب اس کا ایک تو یہ ہے کہ یہ معروف معنوں میں اجرت نہیں، بلکہ احسان کا بدلا ہے، احسان کے بدلے میں کوئی احسان کرے تو اسے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ** ﴾ [ الرحمٰن : ۶۰ ] ''نیکی کا بدلا نیکی کے سوا کیا ہے۔'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول کرتے تھے اور اس کا بدلا بھی دیتے تھے، حدیث کے الفاظ ہیں: (( كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَ يُثِيْبُ عَلَيْهَا )) [ بخاري، الهبة، باب المكافأة في الهبة : ۲۵۸۵ ] پھر موسیٰ علیہ السلام اس وقت سخت اضطرار کی حالت میں تھے، انھوں نے اس دعوت کو اپنی دعا کی قبولیت کا نتیجہ سمجھا اور خواہ مخواہ کی خودداری سے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اس موقع کو ضائع نہیں کیا۔ دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ اگر کسی کو اصرار ہو کر یہ

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ١ٞ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۲۶

**دونوں میں سے ایک نے کہا اے میرے باپ! اسے اجرت پر رکھ لے، کیونکہ سب سے بہتر شخص جسے تو اجرت پر رکھے طاقت ور، امانت دار ہی ہے ۲۶**

اجرت ہی تھی تو محنت کے بدلے میں مزدوری لینا موسیٰ علیہ السلام منع نہیں سمجھتے تھے، نہ ہی یہ منع ہے، خصوصاً جب کوئی بلا طلب مزدوری دے دے، جیسا کہ خضر علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ جب انھوں نے گرتی ہوئی دیوار سیدھی کر دی تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ [ الکھف : ۷۷ ] ''اگر تو چاہتا تو ضرور اس پر کچھ اجرت لے لیتا۔''

⑦ **فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ**: جب موسیٰ علیہ السلام اس بزرگ کے پاس آئے تو ظاہر ہے سب سے پہلی بات تعارف تھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا نام ونسب، اپنی قوم پر فرعون کا ظلم وستم، اپنی پیدائش اور پرورش کا قصہ اور ایک نادانستہ قتل پر فرعون کے ان کی جان کے درپے ہونے کا حال بیان کیا۔

⑧ **قَالَ لَا تَخَفْ**......: اس بزرگ نے کھانا وغیرہ پیش کرنے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کا خوف دور کیا، کیونکہ خوف میں مبتلا شخص بھوک کے مارے کھانا کھائے بھی تو اس میں اسے لذت نہیں ملتی، اس لیے سب سے پہلے اس نے کہا ڈرو مت، اس جگہ فرعون کی حکومت نہیں، تم ان ظالموں سے نجات پا چکے ہو۔ اس کے بعد نہایت عزت واحترام سے ان کی مہمان نوازی کی۔

**آیت 26** ① **قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ**: ان دونوں میں سے ایک نے کہا، ابا جان! آپ اسے مزدور رکھ لیں، تاکہ ہم عورتوں کو بکریاں چرانے کی مشقت سے رہائی مل جائے۔ ضروری نہیں کہ اس نے یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی اس کے باپ سے پہلی ملاقات کے وقت ہی کہہ دی ہو۔ تین دن مہمان نوازی تو حق ہے، اس لیے غالب یہی ہے کہ اس دوران ان لڑکیوں اور ان کے والد نے موسیٰ علیہ السلام کے اوصاف حمیدہ کا اچھی طرح سے مشاہدہ کر لیا تو لڑکی نے اپنے باپ سے یہ بات کہی۔

② **اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ**: تفسیر ابن کثیر میں ہے: ''عمر، ابن عباس، شریح قاضی، ابو مالک، قتادہ، محمد بن اسحاق اور کئی ایک نے فرمایا کہ اس کے والد نے پوچھا، تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ اس نے کہا، اس نے وہ پتھر اٹھا لیا جو دس آدمیوں سے کم اٹھا نہیں سکتے اور جب میں اس کے ساتھ آئی تو اس کے آگے چل رہی تھی، اس نے مجھ سے کہا، میرے پیچھے چلی آؤ اور جہاں راستہ بدلنا ہو مجھے کنکری کے ساتھ اشارہ کر دو، میں سمجھ جاؤں گا کس طرف جانا ہے۔'' تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا، عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔[ ابن أبي حاتم : ۱٦۸٤۳ ] دوسرے ائمہ کے اقوال بھی طبری (۲۷٦۰۹) یا ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیے ہیں، مگر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں، اس لیے اس کا ماخذ اسرائیلی روایات ہی ہے۔

③ سب سے بہتر شخص جسے تم اجرت پر رکھو وہ ہے جو قوت والا اور امانت دار ہو۔ یہ ہے وہ قاعدہ جو کسی شخص کو ذمہ داری دیتے وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک وقت میں یہ دونوں صفات بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ کوئی شخص اگر

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

اس نے کہا بے شک میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کردوں، اس (شرط) پر کہ تو آٹھ سال میری مزدوری کرے گا، پھر اگر تو دس پورے کردے تو وہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر

---

کام کی اہلیت اور قوت رکھتا ہے تو امانت میں کمزور ہے اور اگر امین ہے تو قوت و اہلیت نہیں رکھتا۔ آج کل حکومتیں کسی عہدے پر مقرر کرنے سے پہلے امتحانات اور انٹرویو کے ذریعے سے اہلیت کا اندازہ تو کرتی ہیں مگر امانت کا نہیں، نتیجہ بے حساب بد دیانتی اور خیانت ہے، جس نے مسلمان ملکوں کی معیشت اور معاشرت دونوں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔

④ اس بات سے اس لڑکی کی کمال فراست اور آدمیوں کی پہچان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لوگوں میں سب سے زیادہ فراست والے تین ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فراست عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں، عزیز مصر کی یوسف علیہ السلام کے متعلق فراست، جب اس نے بیوی سے کہا: ﴿ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ ﴾ [ یوسف : ۲۱ ] ''اس کی رہائش باعزت رکھ۔'' اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ والی خاتون کی فراست کہ جس نے کہا: ﴿ یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ٘ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴾ [ القصص : ۲٦ ] ''اے میرے باپ! اسے اجرت پر رکھ لے، کیونکہ سب سے بہتر شخص جسے تو اجرت پر رکھے طاقت ور، امانت دار ہی ہے۔'' [ ابن أبي حاتم : ۱٦۸۳۸ ]

**آیت 27** ① قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ ...... : باپ نے بیٹی کی رائے سے اتفاق کر لیا، مگر جوان بیٹیوں کی موجودگی میں ایک غیر محرم مرد کو گھر میں رکھنا مناسب نہیں تھا، اس لیے اس مرد دانا نے فیصلہ کیا کہ ایک بیٹی کا اس صالح جوان کے ساتھ نکاح کر کے اسے مزدور کے طور پر گھر میں رکھ لے۔ چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ﴿ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ ﴾ ''یقیناً میں ارادہ رکھتا ہوں۔'' اہل علم فرماتے ہیں، اس بزرگ نے ''اِنَّ'' کے ساتھ تاکید اس لیے کی کہ عام طور پر لوگ کسی اجنبی جوان کو جو مالی لحاظ سے بھی فقیر ہو، رشتہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس لیے اس نے کہا، یقیناً میں ارادہ رکھتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں، اس شرط پر کہ تو آٹھ سال میری مزدوری کرے گا......

② اس سے معلوم ہوا کہ کسی صالح آدمی کو اپنی بیٹی کے رشتے کی پیش کش خود کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ ایسا ہونا چاہیے۔ بے شمار لڑکیاں اس لیے نکاح سے محروم بیٹھی ہیں کہ ان کے والد انتظار میں ہیں کہ کوئی ہم سے رشتہ پوچھے، جبکہ لڑکوں کے والدین انکار کے خوف سے رشتہ مانگنے کی جرأت نہیں کرتے۔ نتیجہ اس کا لڑکے لڑکیوں دونوں کا نکاح سے محروم رہنا ہے۔ صحابہ کرام میں سے عمر رضی اللہ عنہ کا عمل اس کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے فوت ہونے سے بیوہ ہوگئی، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بدری صحابہ میں سے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور انھیں حفصہ کا رشتہ پیش کیا، انھوں نے کہا، میں اس بارے میں سوچوں گا، کچھ راتیں گزریں تو مجھے ملے اور کہنے لگے: ''میری رائے یہی

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾

مشقت ڈالوں، اگر اللہ نے چاہا تو یقینا تو مجھے نیک لوگوں سے پائے گا ﴿۲۷﴾

ٹھہری ہے کہ میں ان دنوں نکاح نہ کروں۔'' عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: ''اگر آپ چاہیں تو میں حفصہ بنت عمر کا نکاح آپ سے کر دوں۔'' ابوبکر خاموش رہے، مجھے کچھ جواب نہیں دیا، میں دل میں ان پر عثمان سے بھی زیادہ ناراض ہوا۔ چند راتیں گزریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نکاح کا پیغام بھیج دیا، تو میں نے حفصہ کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔'' [ بخاري، النكاح، باب عرض الإنسان ابنته أو أخته على أهل الخير : ۵۱۲۲ ] دیکھیے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر غیرت مند کون ہوگا، مگر اپنی بیٹی کے رشتے کی پیش کش خود کر رہے ہیں۔

3 بعض لوگ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ نکاح میں لڑکی کا مہر یہ ہو سکتا ہے کہ خاوند اس کے والد کی مزدوری کرے، مگر یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ مہر عورت کا حق ہے نہ کہ اس کے باپ کا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے بیان میں صرف نکاح کے ارادے اور اس کی شرط کا ذکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کم از کم آٹھ سال اپنے سسر کے ساتھ رہیں گے، اس سے پہلے اپنی بیوی کو لے کر نہیں جائیں گے۔ اگر یہ عقد نکاح ہوتا تو اس میں دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کی تعیین ہوتی اور ارادے کے الفاظ کے بجائے یہ الفاظ ہوتے کہ میں نے اپنی فلاں لڑکی کا نکاح اتنے مہر میں تمھارے ساتھ کیا۔ قرآن نے نکاح کے لیے ابتدائی گفتگو اور والد کی شرط کا ذکر کیا ہے، عقد نکاح اور مہر وغیرہ کی تفصیل کا ذکر چھوڑ دیا ہے، کیونکہ اس کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں تھی۔

4 اس واقعہ سے مزدوری کرنے کا جواز بلکہ اس کا استحباب ثابت ہوتا ہے اور اس کے ضمن میں بکریاں رکھنے اور انھیں چرانے کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اجرت پر بکریاں چرائی ہیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلاَّ رَعَى الْغَنَمَ » ''اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجا اس نے بکریاں چرائی ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے پوچھا: ''تو کیا آپ نے بھی (چرائی ہیں)؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « نَعَمْ كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلٰى قَرَارِيْطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ » [ بخاري، الإجارة، باب رعي الغنم على قراريط : ۲۲۶۲ ] ''ہاں، میں اہل مکہ کے لیے چند قیراطوں پر بکریاں چرایا کرتا تھا۔''

5 یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی لمبی مدت تک بکریاں چرانے کی اجرت کیا تھی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مزدوری صرف کھانا اور کپڑا ہی تھی، جیسا کہ عتبہ بن نُدّر السلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''طٰسٓمّٓ'' کی تلاوت کی، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر پہنچے، تو فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شرم گاہ کی عفت اور پیٹ کے کھانے پر آٹھ سال یا دس سال اپنے آپ کو مزدور بنائے رکھا۔'' [ ابن ماجه، الرهون، باب إجارة الأجير على طعام بطنه : ۲۴۴۴ ] ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس پر فرمایا: ''اس طریق سے یہ حدیث ضعیف ہے، کیونکہ مسلمہ بن علی (خُشنی، دمشقی اور ہلالی) ائمہ کے

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ ع

کہا یہ بات میرے درمیان اور تیرے درمیان (طے) ہے، ان دونوں میں سے جو مدت میں پوری کردوں تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے ﴿۲۸﴾

نزدیک روایت میں ضعیف ہے۔ ایک اور سند سے بھی یہ حدیث آئی ہے مگر اس میں بھی نظر ہے۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ نے بعض روایات نقل کی ہیں کہ جس سال موسیٰ علیہ السلام نے رخصت ہونا تھا اس سال ان کے سسر نے ان سے کہا کہ اس سال جو بکری اپنے رنگ سے مختلف بچہ دے وہ تمھارا ہوگا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایسی کسی روایت کی سند صحیح نہیں۔ بعض صحابہ کے اقوال موجود ہیں، مگر ظاہر ہے کہ وہ اسرائیلیات سے ہیں، کیونکہ وہ صحابہ اس واقعہ کے وقت موجود نہیں تھے، نہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات روایت کرتے ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ یہ بات اسی طرح چھوڑ دی جائے جس طرح قرآن نے تفصیل کے بغیر چھوڑ دی ہے، اگر یہ بات ہدایت کے لیے ضروری ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور بیان فرما دیتے۔

**آیت 28** ① **قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ** ......: موسیٰ علیہ السلام نے اپنے سسر سے کہا، آپ نے جو کہا کہ میں آٹھ سال آپ کی مزدوری کروں گا، یہ میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگیا، اب یہ میری مرضی کی بات ہے کہ آٹھ برس کے بعد دو برس اور خدمت کروں یا آٹھ ہی برس بعد اپنی بیوی کو لے کر چلا جاؤں۔ دونوں صورتوں میں آپ مجھے مجبور نہیں کریں گے کہ ابھی اور خدمت کرو۔

② **وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ**: یہ کلمہ عہد کو پختہ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد اس بزرگ نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح موسیٰ علیہ السلام سے کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ''خیر'' کی تمام چیزیں ان کے لیے مہیا کر دیں، جن کی انھیں ضرورت تھی۔

③ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے اہلِ حیرہ کے ایک یہودی نے پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے دو مدتوں میں سے کون سی مدت پوری کی تھی؟ میں نے کہا، مجھے معلوم نہیں جب تک میں عرب کے عالم کے پاس جا کر پوچھ نہ لوں۔ چنانچہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور ان سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''انھوں نے وہ مدت پوری کی جو دونوں میں زیادہ اور بہتر تھی (یعنی دس سال)۔ اللہ کا رسول جب بات کرتا ہے تو اسے پورا کرتا ہے (یعنی ایسا شخص جو آئندہ رسول بننے والا ہے، وہی مدت پوری کرے گا جو زیادہ کامل ہے)۔'' [ بخاري، الشهادات، باب : ۲۶۸٤ ] یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور بظاہر یہ ان کا اجتہاد ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مفہوم کی متعدد روایات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل کی ہیں، مگر سند کے لحاظ سے سب میں کلام ہے، اگرچہ ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے فرمایا: **''فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ''** سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے وہ مدت پوری کی تھی جو زیادہ کامل تھی اور جس میں ان کے سسر کے ساتھ زیادہ حسن سلوک پایا جاتا تھا، کیونکہ ''**الْاَجَلَ**'' میں الف لام کا معنی کامل مدت ہے اور وہ مدت دس سال ہی ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى** ﴾ [ البقرة : ۲۰۳ ] ''پھر جو دو دنوں

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾

پھر جب موسیٰ نے وہ مدت پوری کردی اور اپنے گھر والوں کو لے کر چلا تو اس نے پہاڑ کی طرف سے ایک آگ دیکھی، اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو، بے شک میں نے ایک آگ دیکھی ہے، ہوسکتا ہے کہ میں تمھارے لیے اس سے کوئی خبر لے آؤں، یا آگ کا کوئی انگارا، تاکہ تم تاپ لو ﴿۲۹﴾ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے اس بابرکت قطعہ میں وادی کے دائیں کنارے سے ایک درخت سے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں، جو سارے جہانوں کا رب ہے ﴿۳۰﴾

میں جلد چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اس شخص کے لیے جو ڈرے۔'' ظاہر ہے جو شخص ایام تشریق کا تیسرا دن بھی پورا کرے وہ زیادہ کامل ہے۔

④ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں: ''ہمارے حضرت ﷺ بھی وطن سے نکلے، سو آٹھ برس پیچھے آکر مکہ فتح کیا، اگر چاہتے اسی وقت شہر خالی کرواتے کافروں سے۔ دس برس پیچھے پاک کیا۔'' (موضح)

**آیت 29** ① **فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ:** اہل کتاب اور اکثر مسلمان مفسرین کا کہنا ہے کہ ان دس سالوں کے دوران وہ فرعون فوت ہوگیا جس نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی تھی اور اب اس کی جگہ اور فرعون حکمران تھا۔ (واللہ اعلم) موسیٰ علیہ السلام نے جب وہ مدت پوری کر لی تو بیوی کو لے کر اپنے وطن جانے کے ارادے سے مدین سے روانہ ہو گئے۔ اس ارادے کی دلیل یہ ہے کہ طُور اس راستے پر واقع ہے جو مدین سے مصر کی طرف جاتا ہے۔ ایک تو اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے کا شوق تھا، دوسرے ہوسکتا ہے یہ خیال بھی ہو کہ لوگ اب تک اس واقعہ کو بھول چکے ہوں گے اور وہاں رہنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

② **اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا......** : ''**جَذْوَةٍ**'' لکڑی کا ٹکڑا جس کے سرے پر آگ ہو۔ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نمل میں گزر چکا ہے۔

**آیت 30** ① **فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ......:** ''**شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ**'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مریم (۵۲) اور طٰہٰ (۸۰) ''**مِنَ الشَّجَرَةِ**'' جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے تو دیکھا کہ سرسبز درخت میں آگ لگی ہوئی ہے، جس سے جلنے کے بجائے درخت مزید سرسبز اور خوب صورت دکھائی دے رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام حیرت سے یہ منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ درخت میں

وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿٣١﴾

**اور یہ کہ اپنی لاٹھی پھینک۔ تو جب اس نے اسے دیکھا کہ حرکت کر رہی ہے، جیسے وہ ایک سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر چل دیا اور پیچھے نہیں مڑا۔ اے موسیٰ! آگے آ اور خوف نہ کر، یقیناً تو امن والوں سے ہے ﴿٣١﴾**

سے آواز آئی: ''اے موسیٰ! بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں جو رب العالمین ہے۔''

② **اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ:** دیکھیے سورۂ طٰہٰ (١٤) اللہ تعالیٰ نے یہاں موسیٰ علیہ السلام کو دو ناموں کے ساتھ اپنا تعارف کروانے کا ذکر فرمایا ہے، ایک ''اللّٰهُ'' جو ذاتی نام ہے، جس میں اس کی ساری صفات آ جاتی ہیں اور دوسرا ''رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' جو اللہ کے اسماء میں سے ایسا اسم ہے جس میں اس کی وہ تمام صفات آ جاتی ہیں جن کے آثار آدمی کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں بھی انھی دو اسماء کا ذکر ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اِنِّيْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ﴾ [ طٰہٰ: ١٢ ] اور ﴿ اِنَّنِيْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا ﴾ [ طٰہٰ: ١٤ ] یہاں بات مختصر کی ہے، سورۂ طٰہٰ میں ان اسماء کے تقاضے پر عمل کا بھی حکم دیا ہے، فرمایا: ﴿ فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۝ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴾ [ طٰہٰ: ١٤ تا ١٦ ] ''سو میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔ یقیناً قیامت آنے والی ہے، میں قریب ہوں کہ اسے چھپا کر رکھوں، تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلا دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے۔ سو تجھے اس سے وہ شخص کہیں روک نہ دے جو اس پر یقین نہیں رکھتا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگا ہوا ہے، پس تو ہلاک ہو جائے گا۔'' سورۂ نمل میں دو مزید صفات کا بھی ذکر ہے، فرمایا: ﴿ يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [ النمل: ٩ ] ''اے موسیٰ! بے شک حقیقت یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں، جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ان تمام صفات کا ذکر فرمایا تھا، پھر ہر سورت میں اس کے مضمون کے مطابق ان میں سے چند صفات کا ذکر فرما دیا۔

**آیت 31** ① **وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ:** یہاں کچھ عبارت محذوف ہے کہ جب انھوں نے اپنی لاٹھی پھینکی تو وہ یکلخت سانپ بن گئی۔

② **فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ ......** : تو جب اس نے اسے دیکھا کہ حرکت کر رہی ہے...... ''جَآنٌّ'' اور ''ثُعْبَانٌ'' کی تطبیق کے لیے دیکھیے سورۂ نمل (١٠)۔

③ **وَلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ:** یعنی اتنے خوف زدہ ہوئے کہ ایک جانب کو نہیں بلکہ پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے اور مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کہیں وہ سانپ پیچھے نہ پہنچ جائے۔

④ **يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ:** اللہ تعالیٰ نے آواز دی، اے موسیٰ! مڑ کر بھاگنے کے بجائے آگے آ، کیونکہ تو امن والوں سے ہے۔ ''اِنَّ'' علت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ (٢١) میں بتایا: ''اسے پکڑ اور ڈر نہیں، ہم اسے پھر اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔'' مزید فوائد کے لیے سورۂ طٰہٰ (٢١) دیکھیے۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾

اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کر، وہ کسی عیب کے بغیر سفید (چمکدار) نکلے گا اور خوف سے (بچنے کے لیے) اپنا بازو اپنی جانب ملا لے، سو یہ دونوں تیرے رب کی جانب سے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف دو دلیلیں ہیں۔ بلاشبہ وہ ہمیشہ سے نافرمان لوگ ہیں ﴿۳۲﴾ کہا اے میرے رب! بے شک میں نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کیا ہے، اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے ﴿۳۳﴾

**آیت 32** ① اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ ...... : دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ ﴾ "سِلْكٌ" اس دھاگے کو کہتے ہیں جس میں موتی پروئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں دھاگا مہارت اور احتیاط سے داخل کیا جاتا ہے، یعنی کسی گھبراہٹ کے بغیر اطمینان کے ساتھ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۲۲)۔

② وَ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ: موسیٰ علیہ السلام کو جس مقصد کے لیے بھیجا جا رہا تھا، اس میں کئی مقامات ایسے آنے والے تھے جن میں آدمی شدید خوف کا شکار ہو جاتا ہے، بلکہ اسے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ دو عظیم الشان معجزوں کے ساتھ اس خوف کا علاج بھی بتا دیا کہ جب بھی تمھیں کوئی خوف محسوس ہو اپنا بازو پہلو کے ساتھ اچھی طرح ملا لو، اس سے تمھارا دل مضبوط ہو جائے گا اور خوف دور ہو جائے گا۔ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ خوف کے وقت کوئی شخص موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں یہ عمل کرے تو اس کا خوف ختم ہو جائے گا یا کم ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

③ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ ...... : یعنی لاٹھی کا سانپ بننا اور ہاتھ کا سفید چمک دار ہو کر نکلنا صرف آج اسی موقع کے لیے نہیں بلکہ یہ دونوں معجزے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجتے ہوئے تمھیں نبوت کی دلیل اور سند کے طور پر عطا کیے گئے ہیں، کیونکہ وہ ہمیشہ سے نافرمان لوگ ہیں۔ انھیں دعوت دینے اور ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ایسے ہی زبردست معجزوں کی ضرورت ہے۔ ''اِنَّ'' تعلیل کے لیے ہوتا ہے اور ''كَانَ'' میں ہمیشگی کا معنی پایا جاتا ہے۔

**آیت 33** قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا ......: موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کے لیے نہیں کہی، بلکہ اس سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات میں مدد کی درخواست کے لیے کہی۔ چنانچہ ان خطرات کا ذکر کیا جو انھیں اس سلسلے میں نظر آ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ سے ان خطرات میں مدد کی ضمانت حاصل کر لی۔ (تفسیر بقاعی میں ہے کہ یہ پیش بینی اس جلیل القدر پیغمبر کی عادت مبارکہ تھی، دیکھیے انھوں نے کس طرح ہماری بھلائی کے لیے بار بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تخفیف کی درخواست کے لیے اللہ تعالیٰ کی جناب میں واپس جانے کو کہا) ان میں سے پہلا خطرہ یہ بیان کیا کہ میں نے ان کا ایک آدمی

وَ اَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۤ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور میرا بھائی ہارون، وہ زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہے، تو اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج کہ میری تصدیق کرے، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے ﴿۳۴﴾ کہا ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو ضرور مضبوط کریں گے اور تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے، ہماری نشانیوں کے ساتھ تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب آنے والے ہو ﴿۳۵﴾

---

قتل کیا ہے، اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے دعوت پیش کرنے سے پہلے ہی قتل کر دیں گے۔

**آیت 34** وَ اَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا...... : ''رِدْاً'' مددگار، دیوار کا پشتہ جو اسے مضبوط کرنے کے لیے لگایا جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک دفعہ بچپن میں موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی ڈاڑھی پکڑ لی تو اس نے کہا، یہ وہی ہے جس کے ہاتھوں میری سلطنت کے زوال کی پیش گوئی کی گئی ہے، اس وجہ سے اس نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ آسیہ علیہا السلام نے کہا، یہ بچہ ہے، اسے ان باتوں کی کیا خبر؟ اس کے سامنے انگارا اور ہیرا رکھ کر دیکھ لو، جب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انگارا اور ہیرا رکھ کر ان کی آزمائش کی جانے لگی اور موسیٰ علیہ السلام ہیرے کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے، تو جبریل علیہ السلام نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انگارے کی طرف کر دیا اور انھوں نے اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لیا، جس سے ان کی زبان جل گئی اور لکنت پیدا ہو گئی۔ مگر یہ حکایت کسی معتبر ذریعے سے ثابت نہیں۔ البتہ سورۂ طٰہٰ (۲۵ تا ۲۸) میں مذکور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں کچھ گرہ تھی جس کی وجہ سے انھیں بات سمجھانے میں دقت پیش آتی تھی اور انھوں نے اسے دور کرنے کی دعا کی تھی۔ فرعون نے بھی انھیں اس بات کا طعن دیا تھا: ﴿ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّ لَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴾ [ الزخرف : ۵۲ ] ''بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں، وہ جو حقیر ہے اور قریب نہیں کہ وہ بات واضح کرے۔''

یہاں دوسرا خطرہ انھوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ بات پوری طرح واضح نہ کر سکنے کی وجہ سے میں ڈرتا ہوں کہ فرعون اور اس کے سردار مجھے جھٹلا دیں گے، ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے، اگر بحث کی نوبت آ گئی تو وہ میرے مددگار ثابت ہوں گے، اس لیے انھیں میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج کہ میری تصدیق کریں، یعنی حق کو خوب کھول کر بیان کریں، کفار کے اعتراضات کا ایسا جواب دیں کہ انھیں جھٹلانے کی جرأت نہ ہو۔ سورۂ طٰہٰ (۲۹ تا ۳۶) میں یہ بات زیادہ تفصیل سے مذکور ہے۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام رسالت کی ذمہ داری بہترین طریقے سے ادا کرنے میں کس قدر مخلص اور اس کے لیے کتنے فکر مند تھے۔

**آیت 35** ① قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ...... : اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور تین باتوں کا وعدہ فرمایا، پہلا یہ کہ ہم ہارون کو نبی بنا کر تمھارا بازو ضرور مضبوط کریں گے (سین تاکید کے لیے ہے)، وہ تمھارے ساتھ فرعون

فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مُّوۡسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًى وَّ مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۶﴾

**تو جب موسیٰ ان کے پاس ہماری کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہا یہ تو ایک گھڑے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں اور ہم نے یہ اپنے پہلے باپ دادا میں نہیں سنا ﴿۳۶﴾**

کے دربار میں جائیں گے۔ بعض سلف نے فرمایا، کسی بھائی پر اس کے بھائی کا اتنا بڑا احسان نہیں جتنا بڑا احسان موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام پر ہے کہ ان کی شفاعت سے انھیں نبوت مل گئی، اس سے اللہ تعالیٰ کے ہاں موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ كَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ وَجِیۡهًا ﴾ [ الأحزاب : ٦٩ ] ''اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اللہ کے ہاں بہت مرتبے والا تھا۔''

② فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ : دوسرا وعدہ یہ کہ فرعونیوں کے مقابلے میں تم دونوں کو ہم ایسا غلبہ اور دبدبہ عطا کریں گے کہ ہمارے معجزے تمھارے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ تم تک پہنچ نہیں پائیں گے اور نہ کسی قسم کی دست درازی کر سکیں گے۔ چنانچہ بعد میں ایسے ہی ہوا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کو تمام تر اسباب و وسائل اور اسلحہ و افواج کے باوجود کبھی اس بات کی جرأت و ہمت نہ ہو سکی کہ ان پر کسی طرح ہاتھ اٹھا سکیں۔ یہ تفسیر ''بِاٰیٰتِنَاۤ'' کو ''فَلَا یَصِلُوۡنَ'' کے متعلق کرنے کی صورت میں ہے۔

③ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚ اَنۡتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ : یہ تیسرا وعدہ ہے کہ تم دونوں اور تمھارے پیروکار ہی آخر کار غالب ہوں گے۔ ''بِاٰیٰتِنَاۤ'' کو ''الۡغٰلِبُوۡنَ'' کے متعلق کرنے سے معنی یہ ہوگا کہ تم دونوں اور تمھارے پیروکار ہی ہمارے معجزات کی بدولت غالب رہو گے۔ یہ مضمون کہ رسول اور ان کے پیروکار ہی آخر غالب ہوں گے، قرآن میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ مومن (۵۱) اور مجادلہ (۲۱)۔

**آیت 36** فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مُّوۡسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ...... : موسیٰ علیہ السلام یہ ذمہ داری لے کر وادی طویٰ سے واپس لوٹے۔ درمیان کی بات قرآن نے یہاں چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنے گھر آئے۔ والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کی، ہارون علیہ السلام کو نبوت عطا ہونے کا ماجرا سنایا، پھر دونوں بھائی فرعون اور اس کے سرداروں کو دعوت دینے کے لیے ان کے دربار میں پہنچے اور انھیں توحید الٰہی کی دعوت دی اور انھیں اللہ کی طرف سے اپنی رسالت کا اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کا حکم سنایا۔ موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعوت سورۂ طٰہٰ (۴۷ تا ۵۴) اور شعراء (۱۶ تا ۳۳) میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ جب فرعون نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تو انھوں نے اپنی رسالت کی دلیل کے طور پر عصا اور یدِ بیضا کا معجزہ پیش کیا۔ فرعون کے پاس ان معجزوں کا کوئی جواب نہیں تھا، وہ دل سے موسیٰ علیہ السلام کے سچا نبی ہونے کو مان چکا تھا۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۱۰۲) اور نمل (۱۴) مگر اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنانے کے لیے دو باتیں کہیں، ایک یہ کہ تمھارا عصا اور یدِ بیضا سحر مفتری ہے، یعنی تمھارا گھڑا ہوا اور بنایا ہوا جادو ہے، حقیقت اس کی کچھ نہیں۔ سورۂ اعراف (۱۰۹ تا ۱۲۶)، طٰہٰ (۵۵ تا ۷۶) اور شعراء (۳۴ تا ۵۱) میں اس کے جادوگر جمع کر کے ان معجزات کے مقابلے کا اور جادوگروں کے ناکام ہو کر مسلمان ہو جانے کا ذکر گزر چکا ہے۔

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور موسیٰ نے کہا میرا رب اسے زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا اور اس کو بھی جس کے لیے اس گھر کا اچھا انجام ہوگا، بے شک حقیقت یہ ہے کہ ظالم کامیاب نہیں ہوتے ﴿۳۷﴾

دوسری بات اس نے یہ کہی کہ ہم نے توحید کی یہ دعوت اپنے پہلے آبا و اجداد میں نہیں سنی۔ فرعون کی اس بات کی بنیاد محض آبا و اجداد کی تقلید تھی، جو ان لوگوں کی دلیل ہوتی ہے جن کے پاس کوئی دلیل نہ ہو اور وہ محض ہٹ دھرمی سے کسی غلط بات پر ڈٹ جائیں۔ بھلا یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ میں نے خسارے کا سودا کرنا ہی کرنا ہے، کیونکہ میرے باپ نے خسارے کا سودا کیا تھا۔ فرعون ہی نہیں تمام باطل پرستوں کے پاس حق کے انکار کا یہی بہانہ ہوتا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (١٧٠)۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون کا یہ کہنا جھوٹ تھا کہ ہم نے اپنے پہلے آباء میں یہ بات نہیں سنی، کیونکہ اس سے پہلے مصر میں یوسف علیہ السلام گزر چکے تھے جو قید خانے میں بھی توحید کی دعوت کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، جیسا کہ قریش مکہ کا یہ کہنا جھوٹ تھا کہ ہم نے اپنے آباء میں یہ بات نہیں سنی، حالانکہ ان کے آبا و اجداد میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام تھے جو بتوں کو توڑنے والے تھے اور توحید الٰہی کے زبردست علمبردار تھے، مگر فرعون اور قریش مکہ نے صرف ان آباء کو دلیل بنایا جو عقل و ہدایت دونوں سے خالی تھے، فرمایا: ﴿ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ [ البقرة : ١٧٠ ] ''کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پاتے ہوں۔''

**آیت 37** ① وَ قَالَ مُوْسٰى رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى...... : مفسرین کہتے ہیں کہ بظاہر فرعون کی بات نقل کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی بات نقل کرنے کے لیے ''قَالَ'' ہی کافی تھا، ''واؤ'' کی ضرورت نہ تھی، مگر دونوں کی بات کا موازنہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ''واؤ'' کا ذکر کیا کہ فرعون نے یہ کہا اور موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا۔

② موسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام اللہ تعالیٰ کی اس تلقین پر عمل کا ایک خوب صورت نمونہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انھیں فرعون کی طرف بھیجتے ہوئے کی تھی، فرمایا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ [ طٰہٰ : ٤٤ ] ''پس اس سے بات کرو، نرم بات، اس امید پر کہ وہ نصیحت حاصل کر لے، یا ڈر جائے۔'' فرعون کی ہٹ دھرمی کے جواب میں انھوں نے اسے جھوٹا کہنے یا کوئی سخت بات کرنے کے بجائے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا رب زیادہ جاننے والا ہے کہ اس کے پاس سے ہدایت لے کر کون آیا ہے اور اس گھر کا اچھا انجام کس کا ہوتا ہے؟ ہاں! اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے۔ یہ اس طرح کی بات ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَ لَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾ [ سبا : ٢٤ تا ٢٦ ] ''کہہ تمھیں آسمانوں اور زمین سے رزق

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ

**اور فرعون نے کہا اے سردارو! میں نے اپنے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں جانا، تو اے ہامان! میرے لیے مٹی پر**

کون دیتا ہے؟ کہہ دے اللہ۔ اور بے شک ہم یا تم ضرور ہدایت پر ہیں، یا کھلی گمراہی میں ہیں۔ کہہ دے نہ تم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا جو ہم نے جرم کیا اور نہ ہم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا جو تم کرتے ہو۔ کہہ ہم سب کو ہمارا رب جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہی خوب فیصلہ کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

③ عَاقِبَةُ الدَّارِ : آلوسی نے فرمایا: ’’الدَّارِ‘‘ (اس گھر) سے مراد دنیا ہے، اس کا اچھا انجام ایسا خاتمہ ہے جو انسان کو اللہ کے فضل و کرم کے ساتھ جنت میں لے جائے۔‘‘

**آیت 38** ① وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ : سرکش اور مغرور فرعون پر موسیٰ علیہ السلام کی اتنی نرم اور حلم والی بات کا کچھ اثر نہیں ہوا، بلکہ اس نے اپنے سرداروں کو مخاطب کر کے لاف زنی شروع کر دی کہ ’’اے سردارو! میں نے اپنے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں جانا۔‘‘ اس سے فرعون کے تکبر کا اور اس کی حماقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ گویا وہ انھیں کہہ رہا تھا کہ مجھے معلوم نہیں کہ میرے سوا تمھارا کوئی معبود ہو اور جو مجھے معلوم نہیں وہ ہے ہی نہیں۔ بتائیے اس سے بڑی بے وقوفی کیا ہوگی۔ تمھیں تو یہ تک معلوم نہ ہو سکا کہ تمھارے گھر میں کس کی پرورش ہو رہی ہے؟ اس کی قوم کے سرداروں نے بھی اس کی اس یاوہ گوئی پر خاموش رہ کر اس کی تائید کی، جو ان کی جہالت اور بزدلی کی انتہا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ [ الزخرف : ٥٤ ] ’’غرض اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔‘‘

② استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ’’شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہاں ’’اِلٰہ‘‘ (خدا) کا ترجمہ حاکم کیا ہے اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ فرعون اپنے آپ کو ارض و سماء کا خالق اور معبود نہیں سمجھتا تھا، بلکہ وہ خود بہت سے دیوتاؤں کی پرستش کرتا تھا۔ پس فرعون کا مطلب یہ تھا کہ میں ہی تمھارا مطاع اور حاکم مطلق ہوں، میرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، جس کی فرماں برداری کی جائے۔‘‘ (اشرف الحواشی) فرعون کے رب اعلیٰ ہونے کے دعوے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۲۷) کی تفسیر۔

③ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ...... : اپنے اس دعوے کے ساتھ کہ مجھے اپنے سوا تمھارا کوئی الٰہ معلوم نہیں، فرعون نے یہ دکھانے کے لیے کہ واقعی اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ وہ پکی اینٹیں تیار کرے۔ یہاں قرآن مجید کے الفاظ کے انتخاب پر توجہ فرمائیں، عربی زبان میں پکی اینٹ کے لیے ’’آجُرٌّ، طُوْبٌ‘‘ اور ’’قَرْمَدٌ‘‘ وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، مگر ان سب کی ادائیگی میں ایک قسم کا ثقل پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بجائے فرمایا: ﴿ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ ﴾ ’’تو اے ہامان! میرے لیے مٹی پر آگ جلا۔‘‘ اس جملے میں پختہ اینٹ بنانے کا طریقہ بھی بیان ہو گیا، ہامان کو اس کی تیاری کا حکم بھی اور اس جملے کے کسی لفظ میں کسی قسم کا کوئی ثقل بھی نہیں آیا، سب حروف متناسب اور سلیس ہیں۔ عام طور

فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾

آگ جلا، پھر میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا، تاکہ میں موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں اور بے شک میں یقیناً اسے جھوٹوں میں سے گمان کرتا ہوں ﴿۳۸﴾

پر کہا جاتا ہے کہ پختہ اینٹ بنانے کی ابتدا ہامان نے فرعون کے حکم سے کی، مگر اس کی کوئی پختہ دلیل نہیں کہ اس سے پہلے پختہ اینٹیں نہیں بنتی تھیں۔

④ **فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا** ...... : لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اس نے یہ حکم دیا کہ پختہ اینٹیں تیار کر کے میرے لیے ایک بلند و بالا محل بنا، تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے رب کو دیکھوں، کیونکہ میں تو اسے جھوٹا ہی گمان کرتا ہوں۔ فرعون کی یہ بات سورۂ مومن (۳۶، ۳۷) میں بھی بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید یا حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ اس نے وہ محل بنایا یا نہیں۔ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ہامان نے کاریگر اور مزدور جمع کیے، حتیٰ کہ پچاس ہزار مستری جمع ہو گئے۔ مزدور اور کارکن اس کے علاوہ تھے۔ اسی طرح اینٹیں پکانے والے، چونا بنانے والے، لکڑی اور لوہے کا کام کرنے والے بھی ان کے علاوہ تھے۔ ان سب نے وہ عمارت بنائی جو اتنی بلند تھی کہ مخلوق میں سے کسی نے اتنی بلند عمارت نہیں بنائی۔ جب وہ فارغ ہوئے تو فرعون اس کے اوپر چڑھا اور اس نے آسمان کی طرف تیر پھینکنے کا حکم دیا، وہ واپس آیا تو خون سے لت پت تھا۔ کہنے لگا، میں نے موسیٰ کے معبود کو قتل کر دیا۔ فرعون گھوڑے کے ساتھ اس پر چڑھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورج غروب ہونے کے قریب جبریل علیہ السلام کو بھیجا، انھوں نے اس عمارت پر اپنا پر مارا اور اسے تین ٹکڑوں میں کاٹ دیا۔ ایک ٹکڑا فرعون کے لشکر پر گرا، جس نے ان میں سے دس لاکھ آدمیوں کو ہلاک کر دیا، ایک ٹکڑا سمندر میں گرا اور ایک ٹکڑا مغرب میں جا گرا اور اس عمارت کے بنانے میں جس نے کچھ بھی کام کیا تھا، کوئی باقی نہ رہا۔ طبری نے اسے اختصار کے ساتھ سُدی سے بیان کیا ہے۔ قرطبی نے اسے ذکر کر کے اس کے کمزور ہونے کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے: ''وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِصِحَّةِ ذٰلِكَ'' کہ اس روایت کی صحت کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اسرائیلی روایات کی یہی مصیبت ہے کہ ان کی کوئی سند ہوتی ہے نہ ان کا سرا کہیں جا کر ملتا ہے۔ اس زمانے میں صرف مصر کے اندر دس لاکھ کے لشکر کی بات بھی قابل توجہ ہے۔ حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے اور اکثر مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ یہ فرعون کی محض گیدڑ بھبکی تھی، جس کے ساتھ وہ اپنی قوم کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ اینٹیں بنانے کا حکم بھی اس نے معاملے کو لٹکانے کے لیے دیا، ورنہ مصری لوگوں کو اینٹوں کی ضرورت ہی نہ تھی، جو لوگ اہرام مصر اتنے بڑے بڑے پتھروں سے بنا سکتے ہیں، جن میں سے ہر پتھر کا حجم عام کمرے کے مکمل حجم کے برابر ہے، انھیں اینٹیں پکانے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ صرف وقت گزاری کی کارروائی تھی، ویسے بلند و بالا پہاڑوں کے ہوتے ہوئے اینٹوں سے عمارت بنانے کا حکم دینا، جو کسی طرح بھی پہاڑوں جتنی بلند نہیں ہو سکتی، محض دھوکا تھا۔ جیسا کہ اس نے اپنے سرداروں سے کہا تھا: ﴿ **ذَرُوْنِيْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَ لْيَدْعُ رَبَّهٗ** ﴾ [ المؤمن : ۲٦ ] ''(اور فرعون نے کہا) مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ اپنے رب کو پکارے۔'' بندہ

پوچھے تمھیں کس نے پکڑا ہوا ہے، جسے چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہو! ہمت ہے تو ہاتھ بڑھا کر تو دیکھو۔

5 مفسر عبدالرحمان کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ بات دراصل اس نے اپنی رعایا کو اُلّو بنانے اور ان سے دعوتِ حق کے اثر کو زائل کرنے کے لیے کہی تھی اور یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسی چند برس پیشتر روس نے، جو ایک کمیونسٹ اور دہریت پسند ملک ہے، کہی تھی۔ اس نے اپنا ایک سپوتنک طیارہ چھوڑا جو چند لاکھ میل بلندی تک پہنچا تو واپسی پر ان لوگوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ہم اتنے لاکھ میل کی بلندی تک ہو آئے ہیں، مگر ہمیں مسلمانوں کا خدا کہیں نہیں ملا۔ یعنی ان احمقوں کا یہ خیال تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی موجود ہے تو یہی چند لاکھ میلوں کی بلندی پر ہی ہو سکتی ہے اور اس واقعہ کو بھی انھوں نے لوگوں کو اُلّو بنانے کے لیے ہی سائنٹفک دلیل کے طور پر پیش کیا، حالانکہ یہی لوگ جب کائنات کی وسعت کا حال بتاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سورج ہماری زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے اور زمین اس کے گرد گردش کر رہی ہے۔ یہ اس سورج کا تیسرا سیارہ ہے اور سورج کے گرد نواں سیارہ پلوٹو گردش کرتا ہے، جو سورج سے ۳ ارب ۶۸ کروڑ میل کے فاصلے پر ہے۔ نیز یہ کہ اس کائنات میں نظام شمسی میں سورج ایک ستارہ یا ثابت ہے اور کائنات میں ایسے ہزاروں ستارے یا ثوابت مشاہدہ کیے جا چکے ہیں اور یہ ستارے یا سورج ہمارے سورج سے جسامت کے لحاظ سے بہت بڑے ہیں۔ ہمارے سورج سے بہت دور تقریباً ۴۰۰ کھرب کلومیٹر کے فاصلے پر ایک سورج موجود ہے، جو ہمیں محض روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام قلب عقرب ہے۔ اگر اسے اٹھا کر ہمارے نظام شمسی میں رکھا جائے تو سورج سے مریخ تک کا تمام علاقہ اس میں پوری طرح سما جائے گا، جبکہ مریخ کا سورج سے فاصلہ ۱۴ کروڑ ۱۵ لاکھ میل ہے، گویا قلب عقرب کا قطر ۲۸ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے لگ بھگ ہے۔ پھر جب کائنات میں ہر سو بکھرے سیاروں کے فاصلے کھربوں میل کے عدد سے بھی تجاوز کر گئے تو ہیئت دانوں نے نوری سال کی اصطلاح ایجاد کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ روشنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اس لحاظ سے ہماری زمین سے سورج کا فاصلہ جو حقیقتاً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے، روشنی کا یہ سفر آٹھ منٹ کا سفر ہے، گویا سورج ہم سے آٹھ نوری منٹ کے فاصلے پر ہے۔ اب کائنات میں ایسے سیارے بھی موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ہزارہا بلکہ لاکھوں نوری سالوں کے فاصلے پر ہیں۔

یہ تو ہے کائنات کی وسعت کا وہ مطالعہ جو انسان کر چکا ہے اور جو ابھی انسان کے علم میں نہیں آسکا، وہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ اب کیا وہ ہستی جو ان ساری چیزوں کی خالق اور ان سب سے اوپر ہے، کیا یہ احمق اسے چند لاکھ میلوں کی بلندی پر پا لیں گے؟ نیز وہ سمجھ رہے ہیں جیسے وہ کوئی مادی جسم ہے، جو ان کی گرفت میں آسکتا ہے۔ [ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ] اس سے بڑی حماقت ان روسی داناؤں نے یہ کی کہ اپنی سائنٹفک تحقیق کو اپنے سکولوں میں پڑھانا شروع کر دیا، تو ایک لڑکی کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا کہ جہاں تک سپوتنک میزائل پہنچا تھا اللہ تعالیٰ اس سے بہت اوپر تھا۔ فرعون نے بھی ہامان سے ایسی ہی بات کہی تھی، جس سے لوگوں کو اللہ کی ہستی کے بارے میں شک میں مبتلا کر دے، ورنہ عملاً نہ ہامان نے کوئی ایسا اونچا محل یا مینار بنایا تھا اور نہ ہی فرعون کا یہ مقصد تھا۔''

6 وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ: یعنی موسیٰ جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آسمانوں پر رب ہے جو ساری کائنات کو پالنے والا ہے،

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور وہ اور اس کے لشکر کسی حق کے بغیر زمین میں بڑے بن بیٹھے اور انھوں نے گمان کیا کہ بے شک وہ ہماری طرف واپس نہیں لائے جائیں گے ﴿۳۹﴾ تو ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑ لیا، پھر انھیں سمندر میں پھینک دیا۔ سو دیکھ ظالموں کا انجام کیسا تھا ﴿۴۰﴾ اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت کے دن ان کی مدد نہیں کی جائے گی ﴿۴۱﴾

---

میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔

**آیت 39** ① **وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ :** ''الْاَرْضِ'' سے مراد زمین مصر ہے۔ یعنی بڑائی کا حق تو صرف اللہ رب العالمین کو ہے، مگر یہ لوگ ایک ذرا سے ملک میں اقتدار پا کر یہ سمجھ بیٹھے کہ بس ہم ہی بڑے ہیں۔

② **وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ :** یعنی چند روزہ اقتدار پا کر وہ سمجھ بیٹھے کہ ان کے اوپر کوئی ہستی نہیں، جس کے سامنے مر کر انھیں پیش ہونا ہے، لہٰذا کھلی چھٹی ہے جو چاہیں کریں اور ملک میں جو فساد پھیلانا چاہیں پھیلاتے رہیں۔

**آیت 40** ① **فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ :** '' نَبَذَ يَنْبِذُ '' پھینک مارنا۔ اس مقام پر درمیان کے بہت سے واقعات چھوڑ دیے گئے ہیں، جو دوسرے مقامات پر مذکور ہیں، یہاں صرف ان کے انجام کی خبر دی گئی ہے۔ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے تکبر کے مقابلے میں ان کے بے حقیقت ہونے کی تصویر کھینچ دی ہے کہ وہ جو اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ بیٹھے تھے، جب وہ مہلت ختم ہو گئی جو اللہ تعالیٰ نے انھیں راہ راست پر آنے کے لیے دی تھی تو انھیں کوڑے کرکٹ کی طرح سمندر میں پھینک دیا گیا۔

② **فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ :** اس میں ہر عبرت حاصل کرنے والے شخص کو ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام ان لوگوں کا ہو گا جو رسول اللہ ﷺ کو جھٹلائیں گے۔

**آیت 41** ① **وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ :** ''اَىِٕمَّةً'' ''إِمَامٌ'' کی جمع ہے، جس کی پیروی کی جائے، جیسا کہ نماز میں مقتدی امام کی پیروی کرتا ہے۔ امامت نیکی میں بھی ہوتی ہے اور برائی میں بھی، جیسا کہ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ [ الأنبياء : ۷۳ ] ''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے۔'' برائی میں امامت کی مثال فرعون اور اس کے لشکر تھے۔ فرمایا، ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے، یعنی جب تک زندہ رہے کفر میں لوگوں کے پیشوا رہے اور اپنے قول و فعل سے انھیں کفر کی دعوت دیتے

وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن وہ دور دفع کیے گئے لوگوں سے ہوں گے ﴿۴۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اس کے بعد کہ ہم نے پہلی نسلوں کو ہلاک کر دیا، جو لوگوں کے لیے دلائل اور ہدایت اور رحمت تھی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۴۳﴾

---

رہے، جس کا نتیجہ آگ ہے۔ اسی طرح یہ قیامت کے دن بھی امام اور پیشوا ہوں گے، مگر آگ کی طرف، فرمایا: ﴿ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴾ [ هود : ۹۸ ] ”وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا، پس انھیں پینے کے لیے آگ پر لے آئے گا اور وہ پینے کی بری جگہ ہے، جس پر پینے کے لیے آیا جائے۔“

② وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ: یعنی یہاں کے لشکر وہاں کام نہ دیں گے، نہ کسی طرف سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔

**آیت 42** ① وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً: یعنی دنیا میں جو بھی ان کا ذکر کرتا ہے ان پر لعنت بھیجتا ہے۔

② وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ: ”الْمَقْبُوْحِيْنَ“ ”أَيْ مَطْرُوْدِيْنَ“ یعنی دور دفع کیے ہوئے، قبیح بنائے گئے۔ یعنی صرف دنیا ہی میں ان پر لعنت نہیں پڑے گی بلکہ قیامت کے دن بھی وہ اللہ کی رحمت سے دور کیے ہوئے ہوں گے، ان کی شکلیں قبیح ہوں گی اور چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے۔

**آیت 43** وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا ...... : یہاں سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے دلائل اور اس پر اعتراضات کا جواب شروع ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ ہم نے یہ بات پہلے آبا و اجداد میں نہیں سنی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ﴾ [ ص : ۷ ] ”ہم نے یہ بات آخری ملت میں نہیں سنی، یہ تو محض بنائی ہوئی بات ہے۔“ زیر تفسیر آیت سے پہلے آیت (۳۶) میں گزرا ہے کہ یہی اعتراض فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام پر کیا تھا: ﴿ وَ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴾ ”اور ہم نے یہ بات اپنے پہلے باپ دادا میں نہیں سنی۔“ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر فرعون کی ہلاکت تک کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ہم نے پہلی نسلوں قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط وغیرہ کو ہلاک کرنے کے بعد جب ہر طرف گمراہی اور ظلمت کا دور دورہ تھا، موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جو اس وقت کے لوگوں کے لیے ایسے دلائل لیے ہوئے تھی جن سے دل کی آنکھ روشن ہوتی ہے اور جو گمراہی سے نکال کر ہدایت میں لانے والی اور عذاب سے بچا کر رحمت کا مستحق بنانے والی تھی۔ اور یہ اعتراض بے کار تھا کہ ہم نے اپنے پہلے باپ دادا میں یہ بات نہیں سنی، کیونکہ اسی لیے تو موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا کہ مدت دراز تک رسول نہ آنے کی وجہ سے لوگوں

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور اس وقت تو مغربی جانب میں نہیں تھا جب ہم نے موسیٰ کی طرف حکم کی وحی کی اور نہ تو حاضر ہونے والوں سے تھا ﴿۴۴﴾

کو ہدایت اور روشنی کی ضرورت تھی۔ اسی طرح بنی اسماعیل میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے بعد ہزاروں سال کا وقفہ واقع ہو جانے کی وجہ سے ان کی طرف رسول بھیجنے کی ضرورت تھی۔ بنی اسرائیل کی طرف آنے والے آخری رسول عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا، تاکہ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل میں سے کسی کے پاس یہ عذر نہ رہے کہ ہمارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔ یہی بات آگے آیت (۴۷) میں آ رہی ہے اور اس سے پہلے سورۂ مائدہ میں بھی گزر چکی ہے، فرمایا: ﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [ المائدة : ١٩ ] ”اے اہلِ کتاب! بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی خوش خبری دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا، تو یقیناً تمھارے پاس ایک خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آ چکا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

**آیت 44** ① **وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ** ...... : ”**بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ**“ میں ”جَانِبٌ“ موصوف ہے جو اپنی صفت کی طرف مضاف ہے اور یہ کلام عرب میں عام ہے، جیسے ”مَسْجِدُ الْجَامِعِ، دِيْنُ الْقَيِّمِ، حَقُّ الْيَقِيْنِ“ اور ”دَارُ الْآخِرَةِ۔“ بعض نحوی حضرات جو موصوف کو صفت کی طرف مضاف کرنا جائز نہیں سمجھتے، وہ ان سب مقامات میں کوئی نہ کوئی لفظ محذوف مانتے ہیں، مثلاً ”**بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ**“ کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں ”بِجَانِبِ الْمَكَانِ الْغَرْبِيِّ“ ہے۔ مگر اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغربی جانب سے کس مقام کی مغربی جانب مراد ہے؟ کیونکہ ہر جگہ ہی کسی نہ کسی لحاظ سے مغربی ہوتی ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ عرب کے ہاں سمتوں کے تعین کے لیے بیت اللہ کو اصل قرار دیا گیا ہے۔ بیت اللہ کو سامنے رکھ کر مشرق کی طرف منہ کریں تو دائیں طرف کے علاقے کو یمن (دایاں) کہتے ہیں، بائیں طرف کو شام (بایاں) اور سامنے کے علاقے کو جانب شرقی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرق کی طرف منہ کر کے فرمایا: (( أَلَا إِنَّ الْفِتْنَةَ هٰهُنَا مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ )) [ مسلم، الفتن و أشراط الساعة، باب الفتنة من المشرق...... : ٢٩٠٥۔ بخاري : ٣٥١١ ] ”آگاہ ہو جاؤ! اس (یعنی مشرق کی) طرف سے فساد پھوٹے گا، جدھر سے شیطان کا سینگ طلوع ہوتا ہے۔“ اور بیت اللہ سے مغرب کی جانب والے علاقوں کو ”جانب غربی“ کہا جاتا ہے۔ امرء القیس نے ایک بادل کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے کہا ہے ؎

عَلٰى قَطَنٍ بِالشَّيْمِ أَيْمَنُ صَوْبِهِ    وَ أَيْسَرُهُ عَلَى السِّتَارِ فَيَذْبُلِ

وَ لٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَ مَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾

**اور لیکن ہم نے کئی نسلیں پیدا کیں، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی اور نہ تو اہل مدین میں رہنے والا تھا کہ ان کے سامنے ہماری آیات پڑھتا ہو اور لیکن ہم ہمیشہ رسول بھیجنے والے رہے ہیں ﴿۴۵﴾**

''غور سے دیکھنے پر اس کی بارش کا دایاں حصہ قطن مقام پر تھا اور اس کا بایاں حصہ ستار پھر یذبل نامی مقام پر تھا۔'' یہاں دائیں اور بائیں جانب سے مراد مشرق کی طرف منہ کرنے کے بعد دائیں اور بائیں جانب مراد ہے۔

واضح رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جب طُور سے ندا آئی تو اس وقت وہ طُور سے اس جانب میں تھے جو کعبہ کی طرف رخ کرنے سے اس کی غربی جانب بنتی ہے اور اس وقت وہ جس وادی میں تھے وہ موسیٰ علیہ السلام کے کعبہ کی طرف رخ کرنے کی صورت میں پہاڑ کی دائیں طرف تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے ''الْوَادِ الْاَيْمَنِ'' اور ''بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى'' فرمایا ہے۔

❷ ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے حق ہونے کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی اور انھیں نبوت عطا فرمائی، اس وقت اے محمد! نہ تو طُور کی غربی جانب میں موجود تھا، نہ یہ منظر دیکھنے والوں میں سے تھا اور نہ تو اس سے پہلے پڑھنا لکھنا جانتا تھا (دیکھیے عنکبوت : ۴۸) بلکہ یہ غیب کی وہ باتیں ہیں جو ہم نے تجھے وحی کے ذریعے سے بتلائی ہیں، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ تو اللہ کا سچا رسول ہے، کیونکہ تو نے نہ خود ان باتوں کا مشاہدہ کیا، نہ یہ کسی سے سیکھیں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے، سورۂ آل عمران میں ہے: ﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ ﴾ [ آل عمران : ٤٤ ] ''یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، ہم اسے تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنے قلم پھینک رہے تھے۔'' اور دیکھیے سورۂ ہود (۴۹ اور ۱۰۰)، یوسف (۱۰۲) اور طٰہٰ (۹۹)۔

**آیت 45** ❶ **وَ لٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ** : یعنی آپ اس وقت موجود نہیں تھے، لیکن ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے لے کر آپ تک بہت سی نسلیں اور قومیں پیدا کیں، جن پر سیکڑوں ہزاروں سال کی لمبی مدت گزر گئی۔ جس سے اصل واقعات اور دین کے صحیح احکام اپنی اصل صورت پر باقی نہ رہے، لہٰذا ضرورت تھی کہ نئے پیغمبر کے ذریعے سے دین اور شریعت کو صحیح، مکمل اور آخری صورت میں پیش کیا جائے، اس لیے ہم نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور یہ تمام واقعات وحی کے ذریعے سے آپ کو بتائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ لمبی مدتیں گزرنے کی وجہ سے اہلِ عرب نبوت و رسالت کو بالکل ہی بھلا بیٹھے تھے، اس لیے انھیں آپ کی نبوت پر تعجب ہو رہا ہے اور وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

❷ **وَ مَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ......** : یعنی موسیٰ علیہ السلام کو ''مدین'' جا کر جو واقعات پیش آئے، ان کے اتنی صحت اور خوبی کے ساتھ بیان کرنے سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت آپ وہاں رہائش رکھتے تھے، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور نہ تو پہاڑ کے کنارے پر تھا جب ہم نے آواز دی اور لیکن تیرے رب کی طرف سے رحمت ہے، تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۴۶﴾

تھے، یا ان سے سیکھ رہے تھے اور انھیں اس طرح ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے تھے جیسے اب اہل مکہ کو سناتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ اس وقت اہل مدین میں مقیم نہیں تھے کہ انھیں ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ بعض مفسرین نے "تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا" کو حال بنایا ہے اور "عَلَيْهِمْ" سے مراد اہل مکہ لیے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اہل مکہ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام اور اس بزرگ کے متعلق ہماری آیات کی تلاوت کرتے وقت تو اہل مدین میں مقیم نہیں تھا کہ سب کچھ دیکھ کر انھیں سنا رہا ہو، بلکہ یہ سب کچھ ہماری وحی کے ذریعے سے ہوا۔

③ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ: لیکن بات یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے پیغمبر بھیجتے رہے ہیں، جو لوگوں کو غفلت سے بیدار کرتے اور ہمارے احکام سے آگاہ کرتے رہے۔ اب اسی عادت کے مطابق ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپ پر یہ آخری کتاب نازل فرمائی، تاکہ لمبی مدتیں گزرنے کے بعد لوگ پھر صحیح دین اور اصل واقعات سے آگاہ ہو جائیں۔

آیت 46 ① وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا: ان تینوں آیات میں "وَمَا كُنْتَ" (اور تو وہاں موجود نہ تھا) کی تکرار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق اور صدق پر ہونے کو واضح فرمایا گیا ہے کہ جب آپ ان مقامات میں سے کہیں بھی موجود نہیں تھے، پھر بھی ان کے بارے میں اصل حقائق کو صحیح طور پر اور بالکل واقعہ کے مطابق بیان کرتے ہیں تو یہ اس بات کی کھلی دلیل اور واضح ثبوت ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اس کی وحی آپ کے پاس آتی ہے جس کے ذریعے سے آپ یہ سب کچھ اتنی صحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

② "وَمَا كُنْتَ" (اور تو وہاں موجود نہ تھا) کی تکرار کے ساتھ یہ اہم حقیقت بھی واضح فرما دی گئی ہے کہ پیغمبر حاضر و ناظر اور ہر جگہ موجود نہیں ہوتے، نہ وہ عالم الغیب ہوتے ہیں۔ انھیں جو علم ہوتا ہے وحی کے ذریعے سے ہوتا ہے اور وہ بھی اتنا جتنی وحی کی جائے۔

③ وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ: یعنی آپ کو یہ واقعات اس لیے معلوم نہیں ہوئے کہ آپ ان مواقع پر موجود تھے، یا انھیں دیکھ رہے تھے، بلکہ یہ آپ کے رب کی رحمت ہے کہ اس نے آپ کو نبوت عطا فرمائی اور وحی سے نوازا۔

④ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ ...... : اس قوم سے مراد اہل مکہ اور عرب ہیں۔ ان میں ابراہیم، اسماعیل اور شعیب علیہم السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ ہزاروں برس کی اس طویل مدت میں باہر کے انبیاء کی دعوتیں تو ضرور وہاں پہنچتی رہیں، مثلاً موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی دعوت، کیونکہ اس کے بغیر ان کا کفر و شرک پر جمے رہنے کا عذر موجود رہتا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عذر کسی کے لیے باقی نہیں چھوڑا، مگر خاص اس سرزمین میں کسی نبی کی بعثت نہیں ہوئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے وہاں آخری پیغمبر کو مبعوث

وَلَوْ لَآ اَنْ تُصِیْبَهُمْ مُّصِیْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ انھیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچے گی جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو کہیں گے اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور ایمان والوں میں سے ہو جاتے ﴿۴۷﴾ پھر جب ان کے پاس ہمارے ہاں سے حق آ گیا تو انھوں نے کہا اسے اس جیسی چیزیں کیوں نہ دی

---

فرمایا۔ اس مضمون کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ سجدہ (۳) اور یٰسٓ (۱ تا ۶)۔

**آیت 47** ① **وَلَوْلَآ اَنْ تُصِیْبَهُمْ مُّصِیْبَةٌ** ...... : یعنی عرب کے لوگوں کا کفر و شرک اور ان کی سرکشی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی پیغمبر بھیجے بغیر بھی ان پر عذاب بھیجتا تو ظلم نہ ہوتا، کیونکہ ان پر جو مصیبت آتی ان کے ہاتھوں کی کمائی ہوتی، مگر اس نے احسان فرمایا اور ان کے لیے عُذر کا کوئی موقع نہیں چھوڑا کہ وہ کہہ سکیں کہ پروردگارا! تو نے ہماری طرف کوئی پیغام پہنچانے والا کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور ایمان لانے والوں میں شامل ہو جاتے۔ یہ مضمون کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اس لیے بھیجے کہ لوگوں کے پاس کفر و شرک کا کوئی عُذر باقی نہ رہے، قرآن میں کئی جگہ بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۶۵)، انعام (۱۵۶، ۱۵۷)، مائدہ (۱۹) اور سورۂ فاطر (۲۴) وغیرہ۔

② "**وَلَوْلَآ اَنْ تُصِیْبَهُمْ**" کا جواب محذوف ہے، جو سلسلہ کلام سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے، یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے عذاب آنے پر یہ لوگ کہیں گے کہ پروردگارا! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا، "لَعَجَّلْنَا لَهُمُ الْعَذَابَ" (تو ہم ان پر جلدی عذاب بھیج دیتے)، یا "لَمَا أَرْسَلْنَا رَسُولًا" (تو ہم کوئی رسول نہ بھیجتے)۔

**آیت 48** ① **فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا**...... : یعنی رسول نہ بھیجتے تو بہانہ ہوتا کہ رسول کیوں نہ بھیجا، اب ہماری طرف سے رسول آیا تو ضد اور عناد سے کہنے لگے کہ اسے اس قسم کے معجزات کیوں نہیں دیے جو موسیٰ کو دیے گئے تھے، مثلاً عصا، یدِ بیضا، سمندر کا پھٹنا، بادلوں کا سایہ کرنا، پتھر سے بارہ چشمے پھوٹنا، من و سلویٰ کا اترنا، اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا اور تورات کا الواح کی شکل میں نازل ہونا وغیرہ۔ معلوم ہوا نہ ماننا ہو تو بہانے ختم نہیں ہوتے۔

② مفسر رازی فرماتے ہیں: ''ان لوگوں نے جو مطالبہ کیا ضروری نہیں تھا کہ اسی طرح ہوتا، کیونکہ نہ تمام انبیاء کے معجزات کا ایک ہونا لازم ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ان پر اترنے والی کتاب ایک ہی طرح نازل ہو، کیونکہ کبھی کتاب کا اکٹھا نازل ہونا بہتر ہوتا ہے جیسے تورات اور کبھی جدا جدا کر کے نازل کرنا بہتر ہوتا ہے، جیسے قرآن۔''

③ **اَوَلَمْ یَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ** : یعنی ان کے طلب کردہ معجزات اگر دکھا بھی دیے جائیں تو کیا فائدہ؟ جنھوں نے طے کر لیا ہے کہ ایمان نہیں لانا، وہ ہر طرح کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔ کیا ان کے ہم جنس لوگوں نے جو ان جیسا مذہب اور ان جیسا عناد رکھنے والے تھے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے کافر، انھوں نے ان معجزات کا

لَوْ لَاۤ اُوْتِيَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَ قَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

**گئیں جو موسیٰ کو دی گئیں؟ تو کیا انھوں نے اس سے پہلے ان چیزوں کا انکار نہیں کیا جو موسیٰ کو دی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا یہ دونوں (مجسّم) جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں اور کہنے لگے ہم تو ان سب سے منکر ہیں ﴿۴۸﴾**

انکار نہیں کیا تھا جو موسیٰ کو دیے گئے تھے؟ انھوں نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق کہا تھا کہ یہ (اتنے بڑے جادوگر ہیں کہ) مجسّم جادو ہیں، جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں اور انھوں نے کہا تھا کہ ہم تو ان سب سے منکر ہیں۔

یہ معنی درست ہے، مگر اس سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا......" (کیا انھوں نے ان چیزوں کا انکار نہیں کیا جو موسیٰ کو دی گئیں) میں انکار کرنے والوں سے مراد قریش ہی ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ معجزے لانے کا مطالبہ کیا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔ اس معنی کے زیادہ صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ "فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ" سے لے کر "وَ قَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ" تک سب باتیں کہنے والے وہی لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ﴾ "کہہ پھر اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو۔" ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات کہنے کا حکم ان لوگوں کے لیے تھا جو آپ کے مخاطب تھے اور وہ قریش تھے، یا آپ کے زمانے کے دوسرے کفار، کیونکہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہی کے منکر نہ تھے بلکہ اس سے پہلی نبوتوں کے بھی منکر تھے، وہ نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر ان کے تابع دار بنے، نہ عیسیٰ علیہ السلام پر۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے زمانے کے کفار کا قول نقل فرمایا: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ [ سبا : ۳۱ ] "اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، ہم ہرگز نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس پر جو اس سے پہلے ہے۔" مطلب یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے جن معجزوں کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں ان معجزوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام پر بھی یہ کب ایمان لائے تھے جو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ خود کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزے دیے گئے تھے، مگر پھر بھی انھوں نے ان کو نبی مان کر ان کی پیروی کبھی قبول نہیں کی۔

④ **قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا:** یعنی قرآن اور تورات دونوں جادو ہیں، جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی نقل فرمایا ہے۔ آسمانی کتابوں میں قرآن کے بعد سب سے عظیم الشان کتاب تورات ہے، موسیٰ علیہ السلام کے بعد تمام انبیاء بشمول عیسیٰ علیہ السلام اسی پر عمل پیرا رہے، اس لیے قرآن میں عموماً تورات اور قرآن کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ [ الأنعام : ۹۱ ] "کہہ وہ کتاب کس نے اتاری جو موسیٰ لے کر آیا؟ جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی۔" یہاں تورات کے نور اور ہدایت ہونے کا ذکر فرمایا، پھر قرآن کے متعلق فرمایا: ﴿وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

قُلۡ فَاۡتُوۡا بِكِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ هُوَ اَهۡدٰى مِنۡهُمَاۤ اَتَّبِعۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنۡ لَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَكَ فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يَتَّبِعُوۡنَ اَهۡوَآءَهُمۡ ؕ وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰٮهُ بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۰﴾ ع

۵/۸

کہہ پھر اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو کہ میں اس کی پیروی کروں، اگر تم سچے ہو ﴿۴۹﴾ پھر اگر وہ تیری بات قبول نہ کریں تو جان لے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۵۰﴾

[ الأنعام : ۹۲ ] ”اور یہ ایک کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا، بڑی برکت والی ہے، اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے ہے۔“ اسی سورۂ انعام کے آخر میں فرمایا: ﴿ ثُمَّ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ ﴾ [ الأنعام : ۱۵۴ ] ”پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس شخص پر (نعمت) پوری کرنے کے لیے جس نے نیکی کی۔“ اور اس سے اگلی آیت میں قرآن کا ذکر فرمایا: ﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوۡهُ وَاتَّقُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴾ [ الأنعام : ۱۵۵ ] ”اور یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی برکت والی، پس اس کی پیروی کرو اور بچ جاؤ، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“

**آیت 49** قُلۡ فَاۡتُوۡا بِكِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ...... : یعنی ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ میں اور موسیٰ جادوگر ہیں اور تورات اور قرآن جادو ہیں، تو تم کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو من گھڑت نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت والی ہو، تو میں بلا تامّل اس کی پیروی کروں گا، کیونکہ مجھے تو ہدایت سے سروکار ہے۔

**آیت 50** ① فَاِنۡ لَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَكَ فَاعۡلَمۡ ...... : پھر اگر وہ تمھارا یہ مطالبہ قبول نہ کریں تو جان لو کہ ان کے پاس کوئی دلیل یا حجت نہیں، بلکہ وہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ یہ مطالبہ قبول کر سکتے ہیں، بلکہ یہ بات ان کے عجز کے اظہار کے لیے کہی جا رہی ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ایسی کتاب کہاں سے آ سکتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوۡا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ﴾ [ البقرة : ۲۴ ] ”پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا اور نہ کبھی کرو گے تو اس آگ سے بچ جاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔“

② وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰٮهُ بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ : ”اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔“ اس آیت میں تقلید کا زبردست رد ہے، کیونکہ تقلید کی تعریف ہے: ”أَخْذُ قَوْلِ الْغَيْرِ بِلَا دَلِيْلٍ“ کہ اللہ اور اس کے رسول کے غیر کی بات کو بلا دلیل لے لینا۔ اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت دلیل ہے، جو قرآن اور سنت ہے۔ اس کو چھوڑ کر جس کی بھی بات مانی جائے وہ خواہش کی پیروی ہے، جس سے بڑی

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں پے در پے بات پہنچائی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۱﴾ وہ لوگ جنھیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں ﴿۵۲﴾

گمراہی کوئی نہیں۔ رازی نے بھی اس آیت کو تقلید کے رد کی دلیل قرار دیا ہے۔

③ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: یہ کہنے کے بجائے کہ اللہ ایسے لوگوں کو جو خواہش کی پیروی کریں، ہدایت نہیں دیتا، فرمایا، اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، یعنی اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنی خواہش کی پیروی کرنے والے ظالم ہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا، کیونکہ وہ ظلمت میں رہنا پسند کرتے ہیں اور جو چیز جہاں رکھنی چاہیے وہاں رکھنے کے بجائے دوسری جگہ رکھتے ہیں (ظلم کا یہی معنی ہے) اور جو اندھیرے میں رہنے پر اصرار کرے اسے ہدایت کی روشنی کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔

**آیت 51** وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ ......: ''وَصَّلَ الْقَوْلَ تَوْصِيْلاً'' بات کے ساتھ بات ملانا، پے در پے بات پہنچانا۔ قرآن اور تورات کو جادو قرار دے کر دونوں کے انکار کے اعلان کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے مطابق اللہ کی طرف سے ان کے پاس کوئی ہدایت آئی ہی نہیں اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ انکار جتنا شدید ہو اتنی ہی تاکید کے ساتھ بات کی جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ''لام'' اور ''قَدْ'' کی دوہری تاکید کے ساتھ، جو قسم کا مفہوم رکھتی ہے، فرمایا: ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں پے در پے بات پہنچائی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔'' اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں، ایک یہ کہ ہم ایک رسول کے بعد دوسرا رسول اور ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب بھیجتے رہے اور اس طرح مسلسل اپنی بات لوگوں تک پہنچاتے رہے، ان سب کی تعلیمات ان تک بھی پہنچتی رہیں، تاکہ یہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ہی دفعہ نازل کر دینے کے بجائے ہم انھیں اس کی آیات یکے بعد دیگرے پے در پے پہنچا رہے ہیں، کبھی وعدہ و وعید کی صورت میں، کبھی وعظ و نصیحت کی صورت میں، کبھی قصوں اور عبرتوں کے بیان کی صورت میں اور کبھی امر و نہی کی صورت میں کہ کسی طور پر نصیحت حاصل کریں۔

**آیت 52** اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ ......: یعنی درحقیقت یہ لوگ ضد اور عناد میں گرفتار ہیں، ہدایت کے طالب ہی نہیں، کیونکہ اگر یہ فی الواقع ہدایت کے طلب گار ہوتے تو ہمارے پے در پے نصیحت کرنے سے ہدایت پا جاتے، جیسا کہ کئی لوگ جنھیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی، وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ عبد اللہ بن سلام، سلمان فارسی، تمیم داری، جارود عبدی اور رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہم وغیرہ اور وہ عیسائی جو نجاشی کے پاس تھے اور قرآن سن کر رونے لگے تھے، جن کا ذکر سورۂ اعراف (۱۵۹) میں گزر چکا ہے۔

وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ۝۵۳ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝۵۴

اور جب ان کے سامنے اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یقیناً یہی ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بے شک ہم اس سے پہلے فرماں بردار تھے (۵۳) یہ لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر دوہرا دیا جائے گا، اس کے بدلے کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو ہٹاتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں (۵۴)

**آیت 53** ① **وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ** : یعنی جب ان کے سامنے قرآن کی تلاوت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں، ہم اس پر ایمان لے آئے۔

② **اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ** : "اِنَّ" علت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، مطلب یہ کہ ہم اس پر ایمان لے آئے، کیونکہ یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے۔

③ **اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ** : یہ بھی ایمان لانے کی ایک علت ہے، یعنی ہم سنتے ہی اس پر اس لیے ایمان لے آئے کہ ہم اس سے پہلے ہی مسلم تھے۔ تورات و انجیل کی بنیادی تعلیم وہی تھی جو قرآن کی ہے، جب ہم نے دیکھا کہ یہ تو وہی ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی امتوں کا دین اسلام تھا اور وہ بھی مسلم تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا ﴾ [ الحج : ۷۸ ] "اپنے باپ ابراہیم کی ملت کے مطابق، اسی نے تمھارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے اور اس (کتاب) میں بھی۔" یہ کہنا کہ "مسلمین" صرف امت محمد ﷺ کا نام ہے، درست نہیں۔ "**اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ**" کا معنی یہ بھی ہے کہ تورات و انجیل میں اس نبی اور اس کتاب کی پیش گوئیاں پڑھ کر ہم تو اس سے پہلے ہی اس پر ایمان رکھتے تھے اور دل و جان سے مسلم یعنی اس کے تابع فرمان تھے۔

**آیت 54** ① **اُولٰٓىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ** : یعنی اہلِ کتاب میں سے جو لوگ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے انھیں دوہرا اجر ملے گا، کیونکہ یہ لوگ پہلے رسول پر ایمان لائے، پھر آپ ﷺ پر بھی ایمان لائے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ : رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَ آمَنَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ إِذَا أَدَّى حَقَّ اللّٰهِ وَ حَقَّ مَوَالِيهِ وَ رَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ [ يَطَؤُهَا ] فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَ عَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ )) [ بخاري، العلم، باب تعليم الرجل أمته و أهله : ۹۷ ] "تین آدمیوں کے لیے دو اجر ہیں، ایک اہلِ کتاب میں سے کوئی آدمی جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور محمد ﷺ پر ایمان لایا اور ایک وہ غلام جو کسی کی ملکیت میں ہے، جب اللہ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا حق ادا کرے اور ایک وہ آدمی جس کے

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؗ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ؗ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

**اور جب وہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ سلام ہے تم پر، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے ﴿۵۵﴾**

پاس کوئی لونڈی تھی، جس سے وہ جماع کرتا تھا، اسے اس نے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا اور تعلیم دی اور اچھی تعلیم دی، پھر آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا، تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔“

② **بِمَا صَبَرُوْا**: صبر تین طرح کا ہے، طاعت پر صبر، معصیت سے صبر اور مصیبت پر صبر۔ یعنی پہلے ایک رسول علیہ السلام پر ایمان لا کر صابر اور ثابت قدم رہے، پھر دوسرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اس پر ثابت قدم رہے۔ اسی طرح خواہشاتِ نفس کے مقابلے میں ثابت قدم رہے اور ان آزمائشوں اور مصیبتوں پر صبر کرتے رہے جو قبولِ اسلام کے بعد ان پر آئیں۔

③ **وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ**: ”دَرَأَ يَدْرَأُ“ کا معنی دفع کرنا، دور کرنا، یا پرے ہٹانا ہے۔ اس آیت کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ اگر کوئی شخص ان سے برا سلوک کرے تو اس کا جواب برائی سے نہیں بلکہ اچھے سے اچھے طریقے سے دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ [ حمٓ السجدة : ۳٤ ] ”اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) کے ساتھ ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہوگا جیسے وہ دلی دوست ہے۔“ اور دیکھیے سورۂ رعد (۲۲) اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی برائی ہو جائے تو بعد میں نیک اعمال کر کے اس کا اثر ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [ هود : ١١٤ ] ”اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“

④ **وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ**: برائی کا جواب اچھائی سے دینا، یا نیکی کے ساتھ برائی کو مٹانا بعض اوقات ممکن ہی نہیں ہوتا جب تک خرچ نہ کیا جائے، اس لیے ان کی یہ صفت بیان فرمائی کہ ہم نے انھیں جو کچھ دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس میں حقوقِ واجبہ و مستحبہ، فرض زکاۃ اور نفلی صدقات سبھی آ گئے۔ ”رَزَقْنٰهُمْ“ میں اپنے احسان کا احساس بھی دلایا ہے اور یہ بھی کہ اگر وہ خرچ کرتے ہیں تو اپنا کچھ خرچ نہیں کرتے، بلکہ اللہ کا دیا ہوا ہی خرچ کرتے ہیں، لہٰذا انھیں خرچ کرنے میں دریغ نہیں ہونا چاہیے۔

**آیت 55** ① **وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ**: یعنی جب کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ [ الفرقان : ۷۲ ] ”جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو باعزت گزر جاتے ہیں۔“

② **وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ**: یعنی جب کوئی جاہل بے وقوفی کی کوئی حرکت کرے یا نامناسب بات کرے تو

**اِنَّكَ لَا تَهۡدِيۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعۡلَمُ**

بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو

جواب میں ایسی بات یا حرکت نہیں کرتے، بلکہ کہتے ہیں، ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمھارے لیے تمھارے عمل، تم جہالت کرو گے ہم صبر ہی کریں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ شوریٰ (۱۵) اور سبا (۲۵، ۲۶)۔

③ **سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ** : دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا ﴾ [ الفرقان : ٦٣ ] ''اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔'' جاہلوں کو سلام محبت اور دعا کا سلام نہیں، بلکہ جدائی اور قطع تعلق کا سلام ہے۔ بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ سلام ایمان والوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے دعا ہے اور جاہلوں کا جہل برداشت کرنے کی علامت ہے۔

④ اس سے معلوم ہوا کہ جس جاہل سے توقع نہ ہو کہ سمجھانے سے سمجھے گا تو اس سے کنارا ہی بہتر ہے۔

⑤ **لَا نَبۡتَغِي الۡجٰهِلِيۡنَ** : یعنی ہم نہ دوستی اور مجلس کے لیے جاہلوں کو چاہتے ہیں، نہ جہالت میں مقابلے یا گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے کے لیے انھیں چاہتے ہیں، بلکہ دور ہی سے سلام کہہ کر ان سے کنارا کرتے ہیں۔ یہ بات دل میں کہتے ہیں، کیونکہ اونچی کہنے سے تو خواہ مخواہ جھگڑا ہو سکتا ہے۔

**آیت 56** ① **اِنَّكَ لَا تَهۡدِيۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ** ...... : رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے بے حد خیر خواہ تھے اور ان کے ایمان لانے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ خصوصاً آپ کے دل میں اپنے قرابت داروں کے متعلق صلہ رحمی کے جذبے کی وجہ سے یہ خواہش اور بھی زیادہ تھی۔ اس مقام پر اہلِ کتاب کے ان لوگوں کا ذکر آیا جو کتاب اللہ کی تلاوت سنتے ہی ایمان لے آئے، تو قدرتی طور پر آپ ﷺ کی طبیعت کا اس بات سے متاثر ہونا لازمی تھا کہ نسبتاً دور والے ایمان لانے میں بازی لے گئے اور میرے قرابت دار حتیٰ کہ عزیز چچا ابو طالب اس نعمت سے محروم رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دی کہ اس معاملے میں آپ کی دعوت یا خیر خواہی میں کوئی کمی نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ہدایت آپ کے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور وہی زیادہ جانتا ہے کہ ہدایت پانے والے کون ہیں، اہلِ کتاب ہیں یا عرب، اقارب ہیں یا دور کے رشتہ دار۔ (بقاعی) کسی اور کو علم ہی نہیں کہ ہدایت کسے دینی ہے، تو وہ ہدایت کیا دے گا؟ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب کے بارے میں اتری۔

② سعید بن مسیب کے والد بیان کرتے ہیں: (( لَمَّا حَضَرَتْ أَبَا طَالِبٍ الْوَفَاةُ جَاءَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَوَجَدَ عِنْدَهُ أَبَا جَهْلٍ وَعَبْدَ اللّٰهِ بْنَ أَبِيْ أُمَيَّةَ بْنِ الْمُغِيْرَةِ، فَقَالَ أَيْ عَمِّ! قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ، فَقَالَ أَبُوْ جَهْلٍ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَبِيْ أُمَيَّةَ أَتَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ؟ فَلَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْرِضُهَا عَلَيْهِ، وَيُعِيْدَانِهِ بِتِلْكَ الْمَقَالَةِ حَتّٰى قَالَ أَبُوْ طَالِبٍ آخِرَ مَا

بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

زیادہ جاننے والا ہے ﴿۵۶﴾

كَلَّمَهُمْ عَلٰى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَأَبٰى أَنْ يَّقُوْلَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ! لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَا لَمْ أُنْهَ عَنْكَ ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ : ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ ﴾ وَ أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْ أَبِيْ طَالِبٍ، فَقَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ﴾ [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ إنك لا تهدى من أحببت...... ﴾ ٤٧٧٢ ] ''جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آئے اور اس کے پاس ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ کو پایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے چچا! تو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہہ دے، یہ ایسا کلمہ ہے جس کے ذریعے سے میں تیرے لیے اللہ کے پاس جھگڑا کروں گا۔'' تو ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ نے کہا: ''کیا تو عبدالمطلب کی ملت سے بے رغبتی کرتا ہے۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ اس کے سامنے یہی بات پیش کرتے رہے اور وہ دونوں اپنی وہی بات دہراتے رہے، حتیٰ کہ ابوطالب نے ان سے آخری بات جو کی وہ یہ تھی: ''عبدالمطلب کی ملت پر (مر رہا ہوں)۔'' اور اس نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے سے انکار کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں ہر صورت تیرے لیے استغفار کروں گا، جب تک مجھے منع نہ کر دیا گیا۔'' تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى ﴾ [ التوبة : ۱۱۳ ] ''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں۔'' اور اللہ عزوجل نے ابوطالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔''

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے کہا: ''تو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہہ دے، میں قیامت کے دن تیرے لیے اس کی شہادت دوں گا۔'' اس نے کہا: ''اگر یہ نہ ہوتا کہ قریش کے لوگ مجھے عار دلائیں گے کہ اسے اس پر (موت کی) گھبراہٹ نے آمادہ کیا تو میں اس کے ساتھ تیری آنکھ ٹھنڈی کر دیتا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [ مسلم، الإيمان، باب الدليل على صحة إسلام...... : ۲۵/۴۲ ]

③ بعض لوگوں کو اصرار ہے کہ ابوطالب اسلام پر فوت ہوا، ان کا کہنا یہ ہے کہ عبدالمطلب ملتِ ابراہیم پر تھے اور ''عَلٰى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ''میں ملتِ ابراہیم پر فوت ہو رہا ہوں'' لہٰذا وہ مسلمان تھا۔ مگر حدیث کے الفاظ ''اور اس نے لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا'' کے بعد اس تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

④ ابوطالب کو رسول اللہ ﷺ سے بے حد محبت تھی، اس نے ہر طرح سے آپ کی حفاظت اور آپ کا دفاع کیا، مگر اس کی

وَ قَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور انھوں نے کہا اگر ہم تیرے ہمراہ اس ہدایت کی پیروی کریں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔ اور کیا ہم نے انھیں ایک باامن حرم میں جگہ نہیں دی؟ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں، ہماری طرف سے روزی کے لیے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۵۷﴾

---

محبت طبعی یعنی قرابت اور نسب کی وجہ سے تھی، ایمانی محبت نہ تھی، اس لیے ہدایت نصیب نہ ہو سکی۔

5 اگرچہ یہ آیت ابوطالب کے بارے میں اتری مگر اصولی طور پر اس کا حکم عام ہے اور اس میں ہر وہ شخص شامل ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ وہ ایمان لے آئے، مگر اس نے کفر پر مرنے کو ترجیح دی۔ مزید دیکھیے سورۂ توبہ (۱۱۳)۔

6 یہاں فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [ الشوری : ۵۲ ] ''اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' پہلی آیت میں ہدایت سے مراد منزلِ مقصود پر پہنچا دینا ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے، یہ کسی اور کا کام نہیں۔ دوسری آیت میں ہدایت سے مراد راستہ دکھانا ہے، یہ کام رسول اللہ ﷺ بھی سرانجام دیتے تھے۔

**آیت 57** 1 وَقَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ...... : رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ اور اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُوْتِيَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَ لَمْ يَكْفُرُوْا بِمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ﴾ [ القصص : ۴۸ ] ''پھر جب ان کے پاس ہمارے ہاں سے حق آ گیا تو انھوں نے کہا اسے اس جیسی چیزیں کیوں نہ دی گئیں جو موسیٰ کو دی گئیں؟ تو کیا انھوں نے اس سے پہلے ان چیزوں کا انکار نہیں کیا جو موسیٰ کو دی گئی تھیں۔'' اب اس آیت میں ان کے ایمان نہ لانے کا ایک اور بہانہ ذکر فرمایا۔ ''وَقَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ...... '' کا عطف گزشتہ آیت (۴۸) ''قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُوْتِيَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى'' پر ہے، یعنی بعض مشرکین نے یہ کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ حق پر ہیں، لیکن ہم ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے آپ کے ہمراہ ہدایت کی پیروی اختیار کر لی اور سارے عرب کی مخالفت مول لے لی تو وہ ہمیں ہماری سرزمین سے اُچک لیں گے اور ایسی خاموشی سے یکلخت اٹھا لے جائیں گے کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو گی۔

2 اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا...... : یہ ان کے عذر کا جواب ہے کہ جب پورے عرب میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ ہے، کسی کی جان محفوظ ہے نہ مال، دن دہاڑے لوگوں کو اٹھا کر لونڈی و غلام بنا لیا جاتا ہے، قبائل غربت و فقر کی وجہ سے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں، تو کیا اس وقت ہم نے انھیں اس حرم میں جگہ نہیں دی جس کے امن و امان کی یہ حالت ہے کہ اس کے جانوروں تک کو کوئی نہیں ستاتا اور جسے وادی غیر ذی زرع ہونے کے باوجود اس قدر مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ دنیا بھر کے پھل اور اموال تجارت اس کی طرف کھچے چلے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ حیثیت ہم نے بخشی ہے، تو جب ہم

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

**اور کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں جو اپنی معیشت پر اِترا گئی تھیں، تو یہ ہیں ان کے گھر جو ان کے بعد آباد نہیں کیے گئے مگر بہت کم اور ہم ہی ہمیشہ وارث بننے والے ہیں ﴿۵۸﴾ اور تیرا رب کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں، یہاں تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول بھیجے جو ان کے سامنے ہماری آیات پڑھے اور ہم کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر جب کہ اس کے رہنے والے ظالم ہوں ﴿۵۹﴾**

---

نے کفر و شرک کے باوجود انھیں اس قدر امن و امان دیا اور اپنی نعمتوں سے نوازا تو کیا جب وہ ہمارا دین اختیار کریں گے تو ہم انھیں پناہ نہیں دیں گے؟ اور لوگوں کی دست درازی سے ان کی حفاظت نہیں کریں گے۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو گا، لیکن اکثر لوگ نادان ہیں، جانتے نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۷)۔

**آیت 58** ① **وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ**...... : ''بَطَرٌ'' کا معنی ہے نعمت پر سرکشی اختیار کرنا، پھول جانا۔ اس کا معنی ناشکری اور انکار بھی آتا ہے۔ پہلا معنی ہو تو یہاں ''فِيْ'' محذوف ہو گا: ''أَيْ بَطِرَتْ فِيْ مَعِيْشَتِهَا۔'' حرف جار حذف ہونے سے ''**مَعِيْشَتَهَا**'' پر نصب آ گئی۔ جیسا کہ سورۂ اعراف (۱۵۵) میں ہے: ﴿**وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا**﴾ ''أَيْ مِنْ قَوْمِهٖ''۔ یہ ان کے عُذر کا دوسرا جواب ہے، یعنی تم نے گمان کر رکھا ہے کہ ایمان لانے کی صورت میں تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے اور ایمان نہ لائے تو تمھاری شان و شوکت، سیادت و عزت، مال و دولت اور اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ معیشت محفوظ رہے گی۔ سو تمھارا یہ گمان غلط ہے، تم سے پہلے کتنی ہی اقوام، جو اپنی معیشت پر اِترا گئی تھیں اور ان کے رہنے والے اپنی خوش حالی اور فارغ البالی کی بدولت بدمست ہو گئے تھے، مثلاً عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ، ہم نے انھیں ایسا ہلاک اور برباد کیا کہ ان کی بستیاں یہ تمھارے سامنے ہیں، ان میں ایسی نحوست ہے کہ ان کے بعد کوئی ان میں آباد ہی نہیں ہوا، مگر بہت کم کہ راہ چلتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے کوئی مسافر اترا اور پھر چل دیا۔ تمھیں ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

② **وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ** : یعنی ان میں سے کوئی باقی ہی نہیں رہا جو ان کے گھروں اور مال و دولت کا وارث بنے، فرمایا: ﴿**فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ**﴾ [ الحاقۃ : ۸ ] ''تو کیا تو ان کا کوئی بھی باقی رہنے والا دیکھتا ہے؟'' ان کے وارث ہم بنے اور ہر چیز کے وارث ہمیشہ ہم ہی ہوا کرتے ہیں۔ ''**كُنَّا**'' میں ''كَانَ'' استمرار اور ہمیشگی کے لیے ہے۔

**آیت 59** ① **وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى**...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نافرمان بستیوں کو ہلاک کرنے کا اصول بیان فرمایا اور اس سوال کا جواب دیا کہ ان اقوام کی ہلاکت کے بعد کتنی مدت گزری، کفار کا کفر و شرک اور ان کی سرکشی

وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

ع ۶

**اور تمھیں جو کچھ بھی دیا گیا ہے سو دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ اس سے کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے ﴿۶۰﴾**

اور ظلم و زیادتی انتہا کو پہنچ چکی، انھیں کیوں ہلاک نہیں کیا گیا؟ فرمایا، یہ تیرے رب کی ربوبیت اور اس کی رحمت ہے کہ وہ کبھی بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا، جب تک ان کی مرکزی بستی میں کوئی پیغام پہنچانے والا (رسول) نہ بھیجے، جو ان کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کر کے ان کا یہ عذر ختم نہ کر دے کہ ہمیں عذاب سے پہلے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا۔ **"مَا كَانَ"** میں نفی کا استمرار ہے، یعنی ایسا کبھی ہوا ہی نہیں، نہ ہونے والا ہے۔ جیسے دیکھیے سورۂ آل عمران (۷۹) اور یونس (۳۶)۔

② **وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى**...... : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد ایمان نہ لانے والوں پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ فرمایا، ہماری یہ بھی عادت ہے کہ ہم بستیوں کو کبھی ہلاک نہیں کرتے، جب تک ان کے رہنے والے ظلم پر اس طرح نہ ڈٹ جائیں کہ ظالم کے لقب کے حق دار بن جائیں۔ اب اس نبی کی آمد پر تمھیں مہلت دی جا رہی ہے کہ تم کفر و شرک اور ظلم پر اصرار کر کے ظالم ٹھہرتے اور عذاب کے مستحق بنتے ہو یا ایمان لا کر رحمت کے حق دار بنتے ہو۔

③ ابن کثیر نے فرمایا: ''یہ آیت دلیل ہے کہ نبی ﷺ جو اُمّ القریٰ (مکہ) میں مبعوث ہوئے، وہ عرب و عجم کی تمام بستیوں کی طرف مبعوث تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ [ الشورٰی : ۷ ] ''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن وحی کیا، تاکہ تو بستیوں کے مرکز (مکہ) کو ڈرائے اور ان لوگوں کو بھی جو اس کے اردگرد ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [ الأعراف : ۱۵۸ ] ''کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' (ابن کثیر) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔'' ان میں سے ایک یہ بیان فرمائی: (( وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَ بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً )) [ بخاري، التيمم، باب : ۳۳۵ ] ''اور ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔''

**آیت 60** ① **وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا**...... : یہ کفار مکہ کے شبہے کا تیسرا جواب ہے، کیونکہ ان کے شبہے کا اصل یہ تھا کہ ہم یہ دین اس لیے قبول نہیں کر رہے کہ ہمیں اپنی دنیا کے نقصان کا خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ یہ تمھاری بہت بڑی غلطی ہے، کیونکہ دنیا میں تمھیں جو کچھ بھی دے دیا جائے سب دنیا کی زندگی کا تھوڑے سے وقت کے لیے فائدہ اٹھانے کا سامان ہے، جس نے آخر ختم ہونا ہے اور آخرت میں جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اس سے کہیں بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی ہے اور کوئی بھی عقل مند بہتر اور باقی کو چھوڑ کر کمتر اور فانی کو ترجیح نہیں دیتا، تو کیا تمھیں عقل نہیں کہ

اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰهُ وَعۡدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيۡهِ كَمَنۡ مَّتَّعۡنٰهُ مَتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ثُمَّ هُوَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ﴿۶۱﴾

**تو کیا وہ شخص جسے ہم نے وعدہ دیا اچھا وعدہ، پس وہ اسے ملنے والا ہے، اس شخص کی طرح ہے جسے ہم نے سامان دیا، دنیا کی زندگی کا سامان، پھر قیامت کے دن وہ حاضر کیے جانے والوں سے ہے ﴿۶۱﴾**

فانی کو ترجیح دے کر ہمیشہ کی زندگی برباد کر رہے ہو۔

② جو کچھ اللہ کے ہاں ہے اسے بہت بہتر اس لیے فرمایا کہ دنیا کا ساز و سامان اس کے مقابلے میں نہ مقدار میں کچھ حیثیت رکھتا ہے نہ خوبی میں۔ مقدار میں اتنا ہو گا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ آخِرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُوْلًا الْجَنَّةَ ، وَآخِرَ أَهْلِ النَّارِ خُرُوْجًا مِنَ النَّارِ رَجُلٌ يَخْرُجُ حَبْوًا فَيَقُوْلُ لَهُ رَبُّهُ ادْخُلِ الْجَنَّةَ فَيَقُوْلُ رَبِّ! الْجَنَّةُ مَلْأَى فَيَقُوْلُ لَهُ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَكُلُّ ذٰلِكَ يُعِيْدُ عَلَيْهِ الْجَنَّةُ مَلْأَى فَيَقُوْلُ إِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا عَشْرَ مِرَارٍ )) [ بخاري، التوحيد، باب كلام الرب عزوجل يوم القيامة...... : ۷۵۱۱ ] ''جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والا، جو جہنم سے نکلنے والوں میں سب سے آخری ہو گا، گھسٹتا ہوا آگ سے نکلے گا تو اسے اس کا رب فرمائے گا: ''جنت میں داخل ہو جا۔'' وہ کہے گا: ''اے میرے رب! جنت بھری ہوئی ہے۔'' اللہ تعالیٰ اسے تین دفعہ فرمائے گا، ہر بار وہ یہی جواب دے گا کہ جنت بھری ہوئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تمھیں دنیا سے دس گنا زیادہ (جنت) عطا کی جاتی ہے۔'' مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَاللّٰهِ! مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ ( وَ أَشَارَ يَحْيٰى بِالسَّبَّابَةِ ) هٰذِهِ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ تَرْجِعُ ؟ )) [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب فناء الدنيا و بيان الحشر يوم القيامة : ۲۸۵۸ ] ''اللہ کی قسم! آخرت کے مقابلے میں دنیا اس کے سوا کچھ نہیں، جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی یہ (شہادت کی) انگلی سمندر میں ڈالے، پھر دیکھے وہ کتنا پانی لے کر لوٹتی ہے؟'' اور خوبی میں آخرت اس لیے کہیں بہتر ہے کہ اس کی ہر نعمت کسی بھی قسم کے غم یا فکر سے پاک ہے، جب کہ دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہیں اور وہ اتنی بہتر ہے کہ کوئی شخص نہ اس کی خوبی بیان کر سکتا ہے، نہ وہ کسی کے تصور میں آ سکتی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (( أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ فَاقْرَؤُوْا إِنْ شِئْتُمْ : ﴿ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِيَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡيُنٍ ﴾ )) [ السجدة : ۱۷ ] [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة و أنها مخلوقة : ۳۲۴۴ ] ''میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال تک آیا ہے۔'' اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ''کوئی جان نہیں جانتی کہ اس کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کچھ سامان چھپا کر رکھا گیا ہے۔''

**آیت 61** اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰهُ وَعۡدًا حَسَنًا...... : اس آیت میں مومن و کافر کی زندگیوں کا موازنہ کیا گیا ہے اور سوال کی

وَ يَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۶۲﴾

اور جس دن وہ انھیں آواز دے گا، پس کہے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جو تم گمان کرتے تھے؟ ﴿۶۲﴾

صورت میں سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آیا یہ دونوں زندگیاں کسی صورت برابر ہوسکتی ہیں؟ جب یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتیں تو تم دنیا کے فائدے کے لیے رسول کی پیروی کیوں چھوڑتے ہو؟ دنیا کی نعمتیں مومن و کافر دونوں کو ملتی ہیں، مگر مومن اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند رہ کر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، جس کی وجہ سے آخرت کی نعمتیں صرف اس کے لیے خاص ہو جاتی ہیں۔ (دیکھیے اعراف: ۳۲) اور ایمان اور عمل صالح والوں سے اللہ تعالیٰ کا یہی وعدۂ حسنہ ہے، جو ہر حال میں مومن کو مل کر رہے گا، کیونکہ اللہ کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [ النحل : ۹۷ ] ”جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انھیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے۔“ اس کے مقابلے میں کافر ہے، مومن کے متعلق جو فرمایا کہ وہ ہمارے اچھے وعدے کو ملنے والا ہے، تو یہ اشارہ ہے کہ کافر کو بھی شیطان اور اس کے بنائے ہوئے شریک وعدے دلاتے رہتے ہیں، مگر ان کے دلائے ہوئے وعدے اسے کبھی حاصل نہیں ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ابراہیم میں ذکر فرمایا ہے کہ قیامت کے دن شیطان کہے گا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ الۡحَقِّ وَ وَعَدۡتُّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُكُمۡ ﴾ [ إبراهيم : ۲۲ ] ”بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا، سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے تم سے خلاف ورزی کی۔“ کافر کو دنیا کی زندگی کا کچھ سامان دیا گیا، ملنا اسے بھی اتنا ہی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے، مگر اس نے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے بجائے اپنی خواہش نفس کے مطابق اس سے فائدہ اٹھایا، جس کے نتیجے میں وہ ان لوگوں میں شامل ہونے والا ہے جو قیامت کے دن حاضر کیے جانے والے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں ”اَلۡمُحۡضَرِيۡنَ“ (حاضر کیے جانے والے) کا لفظ عذاب میں حاضر کیے جانے والوں کے متعلق ہی استعمال ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ صافات (۵۷ اور ۱۲۷) اس لفظ میں بھی یہ مفہوم موجود ہے، کیونکہ حاضر اسی کو کیا جاتا ہے جو حاضر نہ ہونا چاہے، جنت میں تو ہر شخص شوق سے جائے گا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”تو کیا وہ شخص جو مومن ہے، اس وعدے کو سچا جاننے والا ہے جو اللہ نے اس کے صالح اعمال پر اس سے ثواب کی صورت میں کیا ہے، جو لامحالہ اسے ملنے والا ہے، اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو کافر ہے، اللہ کی ملاقات اور اس کے وعدہ و وعید کو جھٹلانے والا ہے۔ سو اسے دنیا کی زندگی میں تھوڑے سے دن کچھ سامان ملنے والا ہے، پھر قیامت کے دن وہ حاضر کیے جانے والوں میں سے ہے۔ مجاہد نے فرمایا، یعنی عذاب دیے جانے والوں میں سے ہے۔“ (ابن کثیر)

**آیت 62** ① **وَ يَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ** ...... : یہ آیات بھی مشرکین مکہ ہی سے متعلق ہیں جو دنیوی مفادات کی خاطر شرک اور شرک کے علم برداروں سے چمٹے ہوئے تھے، انھیں ان کے اس عملِ بد کے انجام سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ الفاظ عام ہونے کی وجہ سے ان کا تعلق تمام کفار سے بھی ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انھیں آواز دے کر دو سوال کریں گے، دونوں سوالوں سے

قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْۤا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾

وہ لوگ کہیں گے جن پر بات ثابت ہو چکی، اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ لوگ جنھیں ہم نے گمراہ کیا، ہم نے انھیں اسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم گمراہ ہوئے، ہم تیرے سامنے بری ہونے کا اعلان کرتے ہیں، یہ ہماری تو عبادت نہیں کرتے تھے ﴿۶۳﴾

مقصود پوچھنا نہیں بلکہ انھیں ذلیل کرنا اور ان کے شرکاء کے بے بس اور بے اختیار ہونے کا اظہار ہے۔

② فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ: یہ پہلا سوال ہے جو اللہ تعالیٰ مشرکین کو آواز دے کر ان سے کریں گے کہ بتاؤ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے متعلق تم سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ تمھارے نفع یا نقصان کے مالک ہیں اور دنیوی مفادات ان کی بدولت حاصل ہو رہے ہیں، یا وہ تمھیں سفارش کر کے چھڑوا لیں گے؟ دیکھیے سورۂ انعام (۹۴)۔

**آیت 63** ① قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ: ''بات ثابت ہو چکی'' سے مراد ہے ''عذاب کی بات ثابت ہو چکی'' جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ السجدة : ۱۳ ] ''اور لیکن میری طرف سے بات پکی ہو چکی کہ یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا۔'' اور ''جن پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی'' سے مراد شیاطین یا وہ بڑے بڑے پیشوا، سردار، لیڈر اور پیر فقیر قسم کے لوگ ہیں جن کو لوگوں نے دنیا میں '' اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ '' بنا لیا تھا اور جن کی بات کے مقابلے میں وہ اللہ اور اس کے رسولوں کی بات کو رد کر دیا کرتے تھے۔ وہ کسی چیز کو حلال کہہ دیتے تو حلال سمجھتے، حرام کہہ دیتے تو حرام سمجھتے، یہ ان کو اللہ کے سوا رب اور اللہ کے شریک بنانا تھا۔ جن پیشواؤں نے لوگوں کو اپنی بندگی پر لگایا تھا اور جن پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہوگا وہ کہیں گے، اے ہمارے رب!......۔

② رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا......: یعنی جنھیں اللہ کے شریک بنایا گیا تھا، وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ لوگ جنھیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انھیں ویسے ہی گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے، یعنی گمراہی کی دعوت دینے والوں کی دعوت پر جس طرح ہم اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے اسی طرح ہم نے ان کے سامنے گمراہی پیش کی تو یہ اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے، نہ ہم پر کسی نے جبر کیا تھا اور نہ ہم نے ان پر کوئی زبردستی کی۔

③ تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ: ہم ان کی گمراہی کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ اللہ کے سوا جن کی بھی عبادت کی گئی، وہ نیک تھے یا بد، قیامت کے دن اپنی عبادت کرنے والوں سے بری ہو جائیں گے، بلکہ ان کے دشمن ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۸۱، ۸۲)، احقاف (۵، ۶)، عنکبوت (۲۵) اور سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)۔

④ مَا كَانُوْۤا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ: کیونکہ اللہ کے سوا کسی بھی شریک کی پیروی کرنے والے یا اسے پکارنے والے درحقیقت نہ کسی موجود چیز کو پکار رہے ہیں، نہ اس کی پیروی کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ کے کسی شریک کا وجود ہے ہی نہیں، وہ محض اپنے خیال اور

وَ قِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾

اور کہا جائے گا اپنے شریکوں کو پکارو۔ سو وہ انھیں پکاریں گے تو وہ انھیں جواب نہ دیں گے اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے۔ کاش کہ واقعی وہ ہدایت قبول کرتے ہوتے ﴿۶۴﴾ اور جس دن وہ انھیں آواز دے گا، پس کہے گا تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟ ﴿۶۵﴾

---

گمان کی پیروی کر رہے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴾ [ یونس : ٦٦ ] ''سن لو! بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور جو لوگ اللہ کے غیر کو پکارتے ہیں وہ کسی بھی قسم کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔'' اس لیے جنھیں شریک بنایا گیا تھا وہ صاف کہہ دیں گے کہ یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ محض اپنے گمان کی پرستش کیا کرتے تھے اور ہمارے بندے نہیں بلکہ اپنے نفس کے بندے بنے ہوئے تھے۔

5 اس آیت میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سوال تو ان لوگوں سے ہوگا جنھوں نے شریک بنائے تھے، مگر بول وہ اٹھیں گے جنھیں شریک بنایا گیا تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب عام مشرکین سے سوال ہوگا تو پیشوا اور سردار سمجھ لیں گے کہ اب ہماری شامت آنے والی ہے، ہمارے یہ مرید اور پیروکار ضرور اپنی گمراہی کا ذمہ دار ہمیں ٹھہرائیں گے، اس لیے وہ پہلے ہی اپنی صفائی پیش کرنے لگیں گے۔

**آیت 64** **وَ قِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ** ...... : یعنی پہلے ان سے کہا جائے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جو تم گمان کرتے تھے؟ ابھی وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے پائے ہوں گے کہ ان سے کہا جائے گا کہ اپنے شریکوں کو مدد کے لیے بلاؤ۔ وہ انھیں پکاریں گے تو وہ انھیں جواب نہیں دیں گے۔ اس وقت مایوس ہو کر تمنا کریں گے، کاش! وہ دنیا میں ہدایت قبول کرتے ہوتے۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ شیاطین اور مشرکین جب اپنے شریکوں کے طور پر اللہ کے نیک بندوں کا نام لیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اپنے شریکوں کو پکارو، وہ کچھ جواب نہ دیں گے، کیونکہ وہ ان کی مشرکانہ حرکتوں سے واقف تھے نہ ہی ان پر خوش تھے۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہنم سامنے لا کر کھڑی کر دی جائے گی، تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ ہم اس میں گرائے جانے والے ہیں۔ دیکھیے سورۂ کہف (۵۲، ۵۳)۔

**آیت 65** **وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ** : یہ دوسرا سوال ہے جو نبوت کے متعلق ہے کہ جب میرے رسولوں نے تمھیں میرا پیغام پہنچایا اور اس پر چلنے کی ہدایت کی تو تم نے انھیں کیا جواب دیا۔ پہلا سوال توحید کے متعلق تھا، یہی دو سوال قبر میں ہوں گے، یعنی ''مَنْ رَّبُّكَ؟'' ''تیرا رب کون ہے؟'' اور ''مَنْ نَبِيُّكَ؟'' ''تیرا نبی کون ہے؟'' اور تیسرا سوال یہ کہ ''مَا دِيْنُكَ؟'' ''تیرا دین کیا ہے؟'' مومن کا جواب ہوگا: ''رَبِّيَ اللّٰهُ وَ نَبِيِّي مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾

**تو اس دن ان پر تمام خبریں تاریک ہو جائیں گی، سو وہ ایک دوسرے سے (بھی) نہیں پوچھیں گے ﴿۶۶﴾ پس رہا جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیا، سو امید ہے کہ وہ فلاح پانے والوں میں سے ہوگا ﴿۶۷﴾**

وَ سَلَّمَ وَ دِيْنِيَ الْإِسْلَامُ" "میرا رب اللہ ہے، میرا نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور میرا دین اسلام ہے۔" [ دیکھیے مسند البزار : ۱۵۴/۱۷، ح : ۹۷٦۰۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۱۲۷/٦، ح : ۲٦۲۸ ]

**آیت 66** ① **فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ** ......: "عَمِيَ يَعْمٰى عَمًى" (ع) کا معنی اندھا ہونا ہے۔ کہنا یہ تھا کہ "فَعَمُوْا عَنِ الْأَنْبَاءِ يَوْمَئِذٍ" کہ "وہ اس دن خبروں سے اندھے ہو جائیں گے۔" مبالغے کے لیے الٹ فرمایا کہ اس دن ان پر تمام خبریں تاریک ہو جائیں گی، یعنی یہ بات ان کی سمجھ ہی میں نہیں آئے گی کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دیں، نہ ہی یہ ہو سکے گا کہ ایک دوسرے سے پوچھ کر اس سوال کا جواب دے دیں۔ اس وقت کی دہشت ہی اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات پوچھ ہی نہیں سکیں گے۔

② اس سوال سے پہلے قبر میں منکر نکیر کے سوالات کے جواب میں بھی کافر اور منافق یہی کہیں گے: « هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِيْ » "ہائے ہائے، میں نہیں جانتا۔" [ دیکھیے أبو داوٗد، السنة، باب المسألة في القبر ...... : ٤٧٥٣، عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ، و صححه الألباني ] یہ بھی خبروں کے تاریک ہو جانے ہی کا نتیجہ ہوگا۔

③ یہاں فرمایا: ﴿ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ "وہ ایک دوسرے سے (بھی) نہیں پوچھیں گے۔" دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۲۷ ] "اور ان کے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔" اسی طرح یہاں فرمایا: "وہ کچھ جواب نہ دے سکیں گے۔" دوسری جگہ فرمایا، وہ کہیں گے: ﴿ وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [ الأنعام : ۲۳ ] "اللہ کی قسم! جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے۔" اس ظاہری اختلاف کی حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا دن بہت لمبا ہے۔ اس میں کفار پر کئی مرحلے آئیں گے، جن میں کبھی وہ خاموش رہیں گے، کبھی جرم سے انکار کریں گے، کبھی اقرار کریں گے اور کہیں گے ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی۔ کبھی ایک دوسرے سے سوال کریں گے اور کبھی ایک دوسرے سے سوال نہیں کر سکیں گے، اس لیے مقامات مختلف ہونے کی وجہ سے ان آیات میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۲۲، ۲۳)۔

**آیت 67** ① **فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ** ......: قرآن مجید میں کافر و مومن اور عذاب و ثواب دونوں کے بیان کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہاں کفر پر مرنے والوں کے ذکر کے بعد توبہ کر کے ایمان اور عمل صالح والوں کا ذکر فرمایا کہ امید ہے کہ یہ لوگ فلاح پانے والوں سے ہوں گے۔

② یہاں مشہور سوال ہے کہ توبہ، ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے فلاح کا وعدہ موجود ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع

وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور چن لیتا ہے، ان کے لیے کبھی بھی اختیار نہیں، اللہ پاک ہے اور بہت بلند ہے، اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۶۸﴾

میں مومنوں کی چند صفات ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۵ ] ''یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے بڑی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں۔'' پھر یقین کے بجائے ''فَعَسٰۤى'' (سو امید ہے) کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ عام بادشاہ کسی چیز کی امید دلا دیں تو اسے پورا کرتے ہیں، تو شاہوں کا شاہ ملک الملوک امید دلائے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ پوری نہ کرے، یہ اس کی شان ہی کے خلاف ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ''فَعَسٰۤى'' (سو امید ہے) اس توبہ، ایمان اور عمل صالح والے شخص کے اعتبار سے ہے کہ اسے یہ امید رکھنی چاہیے، کیونکہ یقین تو تب ہو جب اسے قبولیت کی سند مل جائے۔

**آیت 68** ① **وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ** : قیامت کے دن مشرکین کی رسوائی اور ان کے شرکاء کی بے بسی کے اظہار کے بعد اللہ تعالیٰ کی توحید کا اور اس کے چند دلائل کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا: ''تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس چیز کو یا جس شخص کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔'' ظاہر ہے جس نے پیدا کیا وہی چنے گا۔ جس کا پیدا کرنے میں کوئی حصہ ہی نہیں، کسی چیز یا شخص کے انتخاب میں اس کا کیا دخل ہوسکتا ہے۔ پھر کسی چیز یا شخص کو چننا صرف اسی کی مشیّت پر موقوف ہے، نہ اس میں کسی کا مشورہ چلتا ہے، نہ کسی چیز یا شخص کی خوبی کی وجہ سے اسے چننا اس پر لازم ہے، کیونکہ: ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۲۳ ] ''اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔'' اس نے چاہا تو عرش کو برتری بخشی، کعبہ کو قبلہ بنایا، انبیاء کو نبوت بخشی، محمد ﷺ کو سید ولد آدم بنایا، مہاجرین و انصار کو محمد ﷺ کی صحبت کے لیے چنا، خلفائے اربعہ کو تمام صحابہ پر برتری بخشی، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نبوت فلاں کو کیوں نہیں ملی، جیسے کفار نے کہا تھا: ﴿ لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [ الزخرف : ۳۱ ] ''یہ قرآن ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟'' جواب میں فرمایا: ﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ [ الزخرف : ۳۲ ] ''کیا تیرے رب کی رحمت وہ تقسیم کرتے ہیں۔''

② **مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ** : بندوں کے پاس یہ اختیار کبھی بھی نہ تھا، نہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جسے چاہیں چن لیں، (**كَانَ** میں نفی کا استمرار ہے) پھر ان مشرکین کو یہ اختیار کہاں سے مل گیا کہ رب تعالیٰ کے بندوں کو رب تعالیٰ کے اختیارات کا مالک بنا دیں، جو اس نے کسی کو دیے ہی نہیں، نہ ان اختیارات کا مالک اس کے سوا کوئی ہوسکتا ہے۔ آخر انھیں کس نے یہ اختیار دیا کہ اس کے بندوں میں سے جسے چاہیں مشکل کشا بنا لیں، جسے چاہیں داتا (رزاق)، گنج بخش، فریاد رس یا دستگیر قرار دے دیں۔

# وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۶۹﴾

## اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں ﴿۶۹﴾

اولاد، رزق، فتح وشکست، عزت و ذلت، شفا ومرض، زندگی اور موت کے محکمے، جو اس نے کسی کو دیے ہی نہیں، اپنے بنائے ہوئے شریکوں میں تقسیم کرتے پھریں۔

❸ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ انبیاء یا اولیاء کو یہاں تک اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ کمان سے نکلا ہوا تیر بھی واپس لے آتے ہیں اور تقدیر کا لکھا تک مٹا دیتے ہیں، یا بدل دیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں نواز دیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں راندۂ درگاہ بنا دیتے ہیں، یہ سب کفریہ باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی کے پاس یہ اختیار ذاتی طور پر ہے، نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار دیا ہے، فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴾ ''ان کے لیے کبھی بھی اختیار نہیں۔''

❹ **سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** : یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کے پاس اختیار ہونا اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے عیب ہے کہ وہ اکیلا سب کچھ کرنے پر قادر نہیں اور اس کی شان کو گرا دینے والی بات ہے، اس لیے فرمایا: ''اللہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔'' ''عَلَا يَعْلُوْ عُلُوًّا'' (بلند ہونا) اور ''تَعَالٰى يَتَعَالٰى تَعَالِيًا'' (بہت بلند ہونا)۔ معلوم ہوا کہ اس کارخانۂ قدرت میں کسی بندے کو، چاہے وہ ولی یا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، کوئی اختیار نہیں ہے۔ تمام اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ ''**سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ**'' کے الفاظ اکٹھے قرآن میں صرف اسی ایک مقام پر آئے ہیں۔

❺ دنیا میں بندے کو عمل کرنے یا نہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، جس پر اسے ثواب یا عذاب ہوگا، اس کے اوپر بھی اللہ تعالیٰ ہی کا اختیار ہے۔ اس لیے یہ کہنا حق ہے کہ مخلوق کو کوئی اختیار نہیں۔ قرآن و حدیث کے مطابق یہ دو باتیں ماننا ضروری ہیں، ایک یہ کہ بندے کو اسباب کے تحت بعض اشیاء میں اختیار دیا گیا ہے، چاہے تو کفر کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو شکر کا۔ وہ مجبور محض نہیں کہ کسی عمل میں اسے کسی طرح کا اختیار بھی نہ ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴾ [ الدھر : ۳ ] ''بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھایا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔'' دوسری بات یہ کہ بندے کو یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کے اختیار کے تحت ہے، وہ نہ چاہے تو بندہ نہ کوئی ارادہ کر سکتا ہے نہ عمل۔ جیسا کہ سورۂ دہر میں فرمایا: ﴿ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ [ الدھر : ۳۰ ] ''اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔'' یہ اللہ کی تقدیر ہے، جس پر ایمان رکھنا لازم ہے، جو اس پر ایمان نہ رکھے مومن نہیں۔ رہی یہ بات کہ ایسا کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مالک ہے جو چاہے کرے، نہ کسی کو اس سے پوچھنے کا حق ہے نہ اختیار، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۲۳ ] ''اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔'' مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے۔ مخلوق کو اس کے علم اور حکمت تک رسائی نہ ہے نہ ہو سکتی ہے، اس لیے اسے اپنی اوقات میں رہنا لازم ہے۔

**آیت 69** **وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ** ...... : ''اَكَنَّ يُكِنُّ اِكْنَانًا'' چھپانا۔ پچھلی آیت میں مذکور اختیار اور

وَهُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ ؗ وَلَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

**اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے لیے دنیا اور آخرت میں سب تعریف ہے اور اسی کے لیے حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۝**

قدرت علم کے بغیر ممکن ہی نہیں، اس لیے فرمایا: ''تیرا رب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔'' یعنی قدرت و اختیار کا مالک بھی وہی ہے اور پوشیدہ اور ظاہر کا علم بھی اسی کے پاس ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ سینوں کی چھپی ہوئی بات جاننا تو واقعی اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، مخلوق کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی، مگر جو کچھ لوگ علانیہ کرتے یا کہتے ہیں اسے جاننا تو آدمی کے لیے بھی کچھ مشکل نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ سینوں کی چھپی ہوئی بات تو پھر بھی بعض اوقات کسی اشارے کنائے سے کچھ نہ کچھ معلوم ہو جاتی ہے، مگر ایک ہی وقت میں سب لوگ جو کر رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں، اسے رب العالمین کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اگر کوئی سنے گا تو اسے ایک شور کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ﴾ [ الرعد : ۱۰ ] ''برابر ہے تم میں سے جو بات چھپا کر کرے اور جو اسے بلند آواز سے کرے اور وہ جو رات کو بالکل چھپا ہوا ہے اور (جو) دن کو ظاہر پھرنے والا ہے۔''

**آیت 70** ① **وَهُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ** : اور وہ جس نے جو چاہا پیدا کیا اور پیدا کرتا ہے اور جو چاہے اختیار کرتا ہے اور جو سینوں کی چھپائی ہوئی باتوں کو اور علانیہ کیے جانے والے کاموں کو جانتا ہے وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ کیونکہ یہ صفات کسی اور میں ہیں ہی نہیں، پھر کوئی اس کا شریک کیسے بن گیا!؟

② **لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ** : دنیا اور آخرت میں تعریف جو بھی ہے اور جس کی بھی ہے سب اس اکیلے کی ہے، کیونکہ جو تعریف ہو گی کسی نہ کسی خوبی پر ہو گی اور خوبی جو بھی ہے اور جس میں ہے سب اس کی عطا کردہ ہے۔ سو تعریف جس کی بھی کی جائے اصل میں اسی کی ہو گی۔ اس کے علاوہ دنیا اور آخرت میں اس نے جو کچھ کیا یا کر رہا ہے یا کرے گا سب محمود ہی محمود ہے۔ اس کی بات یا اس کا کام ایک بھی ایسا نہیں جس کی مذمت کی جا سکے۔ اس لیے مومن دنیا میں بھی اسی کی حمد کرتے ہیں اور آخرت میں بھی اسی کی حمد کریں گے۔ دیکھیے سورۂ زمر (۷۴، ۷۵)۔

③ **وَلَهُ الْحُكْمُ** : حکم کی دو قسمیں ہیں، ایک تکوینی حکم اور ایک تشریعی۔ تکوینی حکم کا مطلب ''کُنْ'' کہنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ [ یٰس : ۸۲ ] ''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔'' یہ حکم صرف اس کا ہے، کسی اور میں یہ قدرت ہے نہ اختیار، فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ [ الرعد : ۴۱ ] ''اور اللہ فیصلہ فرماتا ہے، اس کے فیصلے پر کوئی نظر ثانی کرنے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔'' دوسرا حکم تشریعی ہے، یعنی اس نے اپنے بندوں کو جو کچھ کرنے یا نہ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾

کہہ کیا تم نے دیکھا اگر اللہ تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک رات کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے پاس کوئی روشنی لے آئے؟ تو کیا تم نہیں سنتے ﴿۷۱﴾ کہہ کیا تم نے دیکھا اگر اللہ تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک دن کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے پاس کوئی رات لے آئے، جس میں تم آرام کرو؟ تو کیا تم نہیں دیکھتے ﴿۷۲﴾

کرنے کا حکم دیا ہے یہ بھی صرف اس کا حق ہے، کسی دوسرے کو یہ حق دینا اسے اللہ کا شریک بنانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [ الشوریٰ : ۲۱ ] ''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

④ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ : یعنی مرنے کے بعد تم اپنے بنائے ہوئے کسی مشکل کشا، حاجت روا، داتا، دستگیر، گنج بخش یا غریب نواز کی طرف نہیں بلکہ اس اکیلے کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور وہی تمھارا حساب کر کے نیک کو نیکی کا اور بد کو بدی کا بدلا دے گا، اس لیے اس کے ساتھ کسی کو شریک بنا کر اپنی جان پر ظلم مت کرو۔

**آیت 72،71** ① قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ ...... : ''اَرَءَيْتُمْ'' کا لفظی معنی ہے ''کیا تم نے دیکھا۔'' عرب اسے ''أَخْبِرُوْنِيْ'' (مجھے بتاؤ) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، یعنی تم نے دیکھا ہے تو بتاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کی ایک اور دلیل اور اس کی نعمتوں میں سے ایک اور نعمت، جس پر وہ حمد کا مستحق ہے، رات دن کا بدلنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ [ آل عمران : ۱۹۰ ] ''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔'' فرمایا: ''یہ بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر قیامت کے دن تک ہمیشہ رات کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھارے پاس کوئی روشنی لے آئے، خواہ کسی قسم کی ہو یا کتنی معمولی ہو۔'' ( بِضِيَآءٍ کی تنوین تنکیر و تقلیل کے لیے ہے ) یہاں اللہ تعالیٰ نے ''اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ'' (تو کیا تم سنتے نہیں) ذکر فرمایا، جب کہ اگلی آیت میں ''اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'' (تو کیا تم نہیں دیکھتے) فرمایا۔ ابن ہبیرہ نے فرمایا: ''اس کی حکمت یہ ہے کہ سمع کی سلطنت رات کو ہوتی ہے اور بصر کی دن کو (رات کی تاریکی میں کان سنتے ہیں، آنکھ نہیں دیکھتی اور دن کی روشنی کے ذریعے سے آنکھ دیکھتی ہے، کان نہیں سنتے )۔'' (بقاعی) یعنی رات کی اس تاریکی میں، جو ہمیشہ کے لیے قیامت تک مسلط ہو، یہ بات تمھارے کان سن سکتے ہیں کہ اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھارے پاس کسی بھی طرح کی تھوڑی سے تھوڑی روشنی ہی لے آئے؟ تو کیا تم سنتے نہیں کہ سن کر سمجھو اور سمجھ کر اللہ کی توحید پر ایمان لے آؤ۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ تم پر قیامت کے دن تک ہمیشہ کے لیے دن کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھارے پاس کوئی رات لے

وَ مِنۡ رَّحۡمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾ وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُ اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۷۴﴾ وَ نَزَعۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا فَقُلۡنَا ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ فَعَلِمُوۡۤا اَنَّ الۡحَقَّ لِلّٰہِ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۷۵﴾ ع

اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن کو بنایا ہے، تاکہ اس میں آرام کرو اور تاکہ اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۷۳﴾ اور جس دن وہ انھیں آواز دے گا، پس کہے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جو تم گمان کرتے تھے؟ ﴿۷۴﴾ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکالیں گے، پھر ہم کہیں گے لاؤ اپنی دلیل، تو وہ جان لیں گے کہ بے شک سچ بات اللہ کی ہے اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ گھڑا کرتے تھے ﴿۷۵﴾

---

آئے جس میں تم راحت اور سکون پا سکو۔

② ان آیات میں رات کا ذکر دن سے پہلے فرمایا، کیونکہ رات کے بعد دن آنے کی نعمت بہت بڑی نعمت ہے۔ انسان کی معیشت کا سارا سلسلہ اسی پر موقوف ہے۔ علاوہ ازیں رات ایک طرح کا عدم ہے اور ضیاء وجود اور ظاہر ہے کہ عدم وجود سے پہلے ہے۔

**آیت 73** **وَ مِنۡ رَّحۡمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ ......** : یعنی اسی نے اپنی رحمت سے تمھارے لیے رات دن کی صورت میں راحت وسکون اور معیشت کے اسباب و وسائل مہیا کیے، تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر بجا لاؤ، مگر تم نے شکر ادا کرنے کے بجائے اس کے لیے شریک بنانے شروع کر دیے۔ معلوم ہوا کہ فطری طریق یہی ہے کہ انسان دن کو کام کرے اور رات کو آرام اور عموماً ہوتا بھی ایسا ہی ہے، پھر دونوں وقت دونوں کام ہوتے ہیں۔

**آیت 74** **وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُ ......** : توحید کے مزید دلائل ذکر کرنے کے بعد وہی مضمون دہرایا جو اوپر گزرا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کو آواز دے کر کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جنھیں تم گمان کرتے تھے!؟ بار بار یہ کہنے کا مقصد انھیں ڈانٹنا، ذلیل و رسوا کرنا اور ان کی اور ان کے شرکاء کی بے بسی کا اور شرک کے باطل ہونے کا اظہار ہو گا۔ پھر کبھی وہ اس بات سے انکار کریں گے کہ وہ کسی شریک کی عبادت کرتے تھے (دیکھیے انعام : ۲۲ تا ۲۴)، کبھی اپنے جھوٹے معبودوں کو پکاریں گے اور کوئی جواب نہ پائیں گے اور کبھی مایوس ہو کر خاموش ہو رہیں گے۔

**آیت 75** ① **وَ نَزَعۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا** : اس گواہ سے مراد وہ نبی ہے جس نے کسی امت کو حق کا پیغام پہنچایا اور اس کی امت کے وہ لوگ بھی جنھوں نے پیغمبر کے بعد لوگوں کو دین کی تبلیغ کی۔ اسی طرح ہر وہ ذریعہ بھی جس سے کسی قوم یا شخص تک حق کا پیغام پہنچا۔ وہ گواہ گواہی دے گا کہ میں نے ان لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا تھا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ جِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴾ [ الزمر : ٦٩ ] ”اور نبیوں اور گواہوں کو لایا جائے گا اور ان کے

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾

بے شک قارون موسیٰ کی قوم سے تھا، پس اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اسے اتنے خزانے دیے کہ ان کی چابیاں ایک طاقت ور جماعت پر بھاری ہوتی تھیں۔ جب اس کی قوم نے اس سے کہا مت پھول، بے شک اللہ پھولنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۷۶﴾

درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

② **فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ** ...... : اس گواہی کے بعد مجرموں کو موقع دیا جائے گا کہ وہ اس کے خلاف کوئی عذر پیش کر سکتے ہیں تو کریں اور جب وہ کوئی عذر پیش نہیں کر سکیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اللہ کا پیغام پہنچنے کے بعد جو شرک ہی پر قائم رہے، اس کی تمھارے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کرو۔ تو اس وقت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ سچی بات اللہ کی ہے، عبادت اسی کا حق ہے، کوئی اس کا شریک نہیں اور انھوں نے جو شریک بنائے تھے اور دنیا میں جو حجت بازی کرتے تھے، سب کچھ ان سے گم ہو جائے گا، نہ کوئی شریک ہاتھ آئے گا نہ اسے شریک بنانے کی کوئی دلیل پیش کر سکیں گے۔

**آیت 76** ① **اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى** ...... : کفار مکہ کے ایمان قبول نہ کرنے کا بہت بڑا باعث ان کے مالی اور دنیوی مفادات تھے، جس کا اظہار انھوں نے یہ کہہ کر کیا: ﴿ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ﴾ [ القصص : ۵۷ ] ”اگر ہم تیرے ہمراہ اس ہدایت کی پیروی کریں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔“ یہ لوگ بہت بڑے سیٹھ، ساہوکار اور سرمایہ دار تھے، جنھیں بین الاقوامی تجارت نے قارونِ وقت بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس بہانے کو کئی طرح سے دور فرمایا، جس میں انھیں حرم کی بدولت حاصل نعمتوں کا تذکرہ بھی ہے، اپنی معیشت پر متکبر قوموں کی ہلاکت کا بھی اور اس بات کا بھی کہ دنیا میں تمھیں جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے۔ اس کی وجہ سے آخرت کا نقصان نہ کرو، جو اس سے کہیں بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ درمیان میں قیامت کے دن مشرکوں کا حال اور توحید کے کچھ دلائل ذکر فرمائے۔ آخر میں قارون، اس کے مال و دولت، اس کے کفر و تکبر اور اس کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا کہ دنیا کی دولت ایسی چیز نہیں کہ اس کی خاطر آدمی ایمان کی دولت اور ہمیشہ کی سعادت سے محروم رہے۔

② **اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى** : قرآن مجید نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا اور اپنی قوم کے خلاف فرعون کا ساتھی بنا ہوا تھا، جیسے تمام ظالم بادشاہ کسی قوم پر ظلم و ستم کے لیے اسی قوم کے کسی آدمی کو مال و دولت اور عہدہ و مرتبہ دے کر اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔ بعض تفسیروں میں لکھا ہے کہ یہ تورات کا حافظ تھا اور بہت خوب صورت آواز سے تورات پڑھتا تھا، مگر اندر سے منافق تھا۔ لیکن قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کفر میں اتنا پکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانے والوں میں فرعون کے ساتھ جن دو آدمیوں کا نام لیا ہے ان میں سے ایک قارون تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ

وَ ابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ

اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس میں آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول اور احسان کر جیسے اللہ

اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴾ [ المؤمن : ۲۳، ۲۴ ] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا۔ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف تو انھوں نے کہا، جادوگر ہے، بہت جھوٹا ہے۔'' (مزید دیکھیے عنکبوت:۳۹) اس کے مطابق اس کے تورات کا عالم یا منافق ہونے کی بات درست نہیں۔

③ فَبَغٰى عَلَيْهِمْ : اس سے بڑی سرکشی کیا ہوگی کہ وہ اپنی ہی قوم کے خلاف ایسے شخص کا دست و بازو بن گیا جوان کے لڑکے ذبح کرتا تھا، ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا اور انھیں بدترین سزائیں دیتا تھا۔

④ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ ظالموں کو جو مال ملتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے، جس میں ان کی آزمائش اور ان پر حجت پوری کرنے کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ''اَلْعُصْبَةُ'' غیر معین آدمیوں کی جماعت۔ اسے ''عُصْبَةٌ'' اس لیے کہتے ہیں کہ ان کا ہر فرد دوسرے کے لیے قوت کا باعث ہوتا ہے۔ عرف میں دس سے لے کر چالیس آدمیوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ ''مَفَاتِحُ'' ''مِفْتَحٌ'' کی جمع ہے، چابیاں۔ یعنی ہم نے قارون کو اتنے خزانے دیے تھے جن سے بھرے ہوئے کمروں کے تالوں کی چابیاں ایک قوت والی جماعت پر اٹھانے میں بھاری تھیں۔ تفاسیر میں ان خزانوں کی عجیب و غریب تفصیل مذکور ہے، جس کی تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ صاحبِ کشّاف نے فرمایا: ''اس کے اموال کی کثرت کے بیان میں مبالغے کے کئی الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی ''اَلْكُنُوْزُ ، اَلْمَفَاتِحُ، اَلنَّوْءُ (بھاری ہونا) اَلْعُصْبَةُ، أُولِي الْقُوَّةِ'' اس سے ان اموال کا بہت زیادہ ہونا ثابت ہو رہا ہے۔''

⑤ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ ...... : انسان کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے نوازے تو وہ ان پر پھول جاتا ہے، اس کی گفتگو، اس کا لباس، اس کی چال ڈھال، اس کے رنگ ڈھنگ، غرض اس کی ایک ایک ادا سے کبر و غرور ٹپکنے لگتا ہے۔ یہی حال قارون کا ہوا، بنی اسرائیل کے نیک بزرگ اور عالم لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے دولت دی ہے تو اپنے آپ میں رہ، اسے اللہ کی نافرمانی میں خرچ مت کر اور پھول مت جا، اللہ تعالیٰ پھول جانے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

آیت 77 ① وَ ابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ : اور اللہ تعالیٰ نے تجھے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے ذریعے سے آخری گھر یعنی جنت حاصل کرنے کی کوشش کر۔

② وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا : یعنی مت بھول کہ دنیا جو تجھے عطا کی گئی ہے، اس میں تیرا حصہ کیا ہے۔ اس کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِيْ مَالِيْ إِنَّمَا لَهُ مِنْ مَالِهِ ثَلَاثٌ، مَا أَكَلَ فَأَفْنٰى أَوْ لَبِسَ فَأَبْلٰى أَوْ أَعْطٰى فَاقْتَنٰى وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَ تَارِكُهُ لِلنَّاسِ )) [ مسلم،

اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ وَ لَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِي الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۷۷﴾

نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد مت ڈھونڈ، بے شک اللہ فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۷۷﴾

الزهد، باب ”الدنيا سجن للمؤمن و جنة للكافر“ : ۲۹۵۹ ] ”بندہ کہتا ہے میرا مال، میرا مال، حالانکہ اس کے مال میں اس کی تو صرف تین چیزیں ہیں، جو اس نے کھایا اور فنا کر دیا، یا پہنا اور پرانا کر دیا، یا (اللہ کی راہ میں) دیا اور ذخیرہ بنا لیا اور جو اس کے سوا ہے تو یہ اسے لوگوں کے لیے چھوڑ کر (دنیا سے) جانے والا ہے۔“ بعض مفسرین نے فرمایا، کسی چیز میں آدمی کا حصہ وہ نہیں ہوتا جو اس سے جدا ہو جائے، بلکہ وہ ہوتا ہے جو اس کے ساتھ رہے۔ اس کے مطابق دنیا میں سے آدمی کا حصہ وہ نیکی ہے جو آخرت میں اس کے ساتھ جائے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا، دنیا میں سے آدمی کے حصے سے مراد اس کا کفن ہے، کیونکہ اس کے سوا وہ کوئی چیز ساتھ لے کر نہیں جاتا ؎

نَصِيْبُكَ مِمَّا تَجْمَعُ الدَّهْرَ كُلَّهُ ٭ رِدَاءَانِ تُلْوٰى فِيْهِمَا وَ حَنُوْطُ

”ساری عمر تو جو کچھ جمع کرے گا اس میں سے تیرا حصہ دو چادریں ہیں، جن میں تجھے لپیٹا جائے گا اور مُردے کو لگائی جانے والی خوشبو ہے۔“

ایک تفسیر جو اکثر مفسرین نے بیان فرمائی ہے، یہ ہے کہ مال کا حریص بعض اوقات بخل کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنی جان پر بھی خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے، اپنے کھانے، پہننے اور دوسری ضروریات میں بھی بخل سے کام لیتا ہے۔ قارون کو بزرگوں نے نصیحت کی کہ دنیا میں اپنے حصے کو مت بھول، اپنی جان پر بھی ضرورت کے مطابق خرچ کر۔ یہ چاروں تفسیریں درست ہیں اور ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔

③ **وَاَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ** : یعنی جیسے اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان (بہترین سلوک) کیا ہے، یہ مال و دولت اور شان و شوکت تجھے کسی بدلے کے بغیر عطا کی ہے، اسی طرح تو بھی اللہ کی مخلوق کے ساتھ احسان کر، یعنی ان سے کسی صلے کی خواہش کے بغیر بہترین سلوک کر۔ احسان کی یہ تفسیر اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جو کچھ دیا ہے کسی بدلے کے بغیر دیا ہے۔ والدین کے ساتھ بھی اسی احسان کا حکم ہے، فرمایا: ﴿وَ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا﴾ [ بني إسرائيل : ۲۳ ] ”اور ماں باپ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کر۔“ کیونکہ بڑھاپے میں ان سے کسی صلے کی توقع نہیں ہوتی۔ احسان کی تفسیر حدیث میں یہ بھی آئی ہے: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ )) [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ ...... : ۵۰ ] ”اللہ کی عبادت اس طرح کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھتا ہے۔“ اس تفسیر کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ جیسے اللہ نے تیرے ساتھ بہترین سلوک کیا ہے تو بھی اس کے ساتھ بہترین معاملہ رکھ کہ ہر وقت اور ہر کام میں اسے پیشِ نظر رکھ اور اپنے ہر حال پر اس کی نگرانی کو اس طرح مدنظر رکھ کہ تیرا ہر کام اور تیری ہر حرکت اس کی رضا کے مطابق ہو، یہ احسان ہے۔

④ **وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِي الۡاَرۡضِ ......** : زمین میں ہر خرابی اور ہر فساد اللہ کے ساتھ شرک اور اس کی اور اس کے رسول کی

قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

اس نے کہا مجھے تو یہ ایک علم کی بنا پر دیا گیا ہے، جو میرے پاس ہے۔ اور کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ اس سے پہلے کئی نسلیں ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ طاقت ور اور زیادہ جماعت والی تھیں اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھا نہیں جاتا ﴿۷۸﴾

---

نافرمانی سے پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ [ الروم : ٤١ ] ''خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔'' قوم کے دانش مند لوگوں نے قارون کو زمین میں فساد کی کوشش سے منع کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ مفسدوں سے محبت نہیں رکھتا۔

آیت 78 ① قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ : اس نے کہا اللہ کا مجھ پر کوئی احسان نہیں، یہ سب کچھ تو مجھے صرف اس علم کی وجہ سے دیا گیا ہے جو میرے پاس ہے۔ یہ اس طرح کی بات ہے جیسے آج کل کے دہریہ سائنس دان کہتے ہیں کہ ہماری تمام تر ترقی ہمارے علوم کی وجہ سے ہے، اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ عقل، ذہانت اور مہارت عطا کرنے والا کون ہے؟ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ''عِنْدِيْ'' کو ''عِلْمٍ'' کے متعلق ماننے کے بجائے ''اُوْتِيْتُهٗ'' کے متعلق مانا جائے، اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ ''میرے نزدیک یہ سب کچھ مجھے اللہ تعالیٰ کے میرے اعمال و اوصاف کو جاننے کی بنا پر ملا ہے۔'' یعنی اسے معلوم تھا کہ میں اس قابل ہوں، اگر میں اس کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہوتا تو وہ مجھے یہ مال کیوں دیتا۔

② وہ علم جو قارون کو دیا گیا تھا، کیا تھا؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ علمِ کیمیا تھا، جس کے ساتھ وہ سونا بنا لیتا تھا، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں۔ اللہ تعالیٰ بندے کو تجارت، صنعت، زراعت، غرض جس ذریعے سے بھی رزق دے وہ اس ذریعے کو رزق کا باعث قرار دے لیتا ہے اور اس مالک کو بھول جاتا ہے جس نے اس کے لیے اس علم و ہنر کو ذریعہ بنایا۔

③ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ ...... : یعنی یہ شخص جو اپنے علم و ہنر پر اس قدر مغرور تھا، کیا اسے معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اس سے زیادہ قوت اور زیادہ جمع شدہ مال اور زیادہ جماعتوں والے لوگوں کو ہلاک کر دیا؟ ان کا علم و ہنر انھیں ہلاک ہونے سے نہ روک سکا، تو اس کا وہ علم جس پر اسے ناز ہے اسے ہلاک ہونے سے کیسے بچا سکے گا؟ اور اگر دنیا میں زیادہ مال و دولت اور زیادہ طرف داروں کا ہونا اللہ تعالیٰ کے خوش ہونے کی دلیل ہے تو پھر ان لوگوں پر عذاب کیوں آیا جو اس سے زیادہ قوت والے اور زیادہ تعداد والے تھے؟

④ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ : یعنی مجرم تو یہی دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ ہم بہت اچھے لوگ ہیں، مگر جب ان پر جرم ثابت ہو جاتا ہے اور اللہ کا عذاب آتا ہے تو ان سے پوچھ کر انھیں نہیں پکڑا جاتا کہ تمھارے گناہ کیا ہیں۔

⑤ دوسرے مقام پر جو فرمایا ہے: ﴿فَوَ رَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [ الحجر : ۹۲، ۹۳ ] ( سو تیرے

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾

**پس وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی زینت میں نکلا۔ ان لوگوں نے کہا جو دنیا کی زندگی چاہتے تھے، اے کاش! ہمارے لیے اس جیسا ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بلاشبہ وہ یقیناً بہت بڑے نصیب والا ہے ﴿۷۹﴾**

---

رب کی قسم ہے! یقیناً ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے، اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے) تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ قیامت کا دن بہت لمبا ہے۔ مجرموں کو ہلاک کرنے کے وقت ان سے ان کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا، ہاں دوسرے مقامات اور مواقع پر ان سے سوال کیا جاتا ہے۔

**آیت 79** ① **فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ** : قارون نے مال و دولت پر اپنے کبر و غرور کے زبانی اظہار کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس نے لوگوں کے سامنے اس کی نمائش کا بھی اہتمام کیا۔ "**فِيْ زِيْنَتِهٖ**" (اپنی زینت میں) کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس نے اس موقع پر اپنی دولت و حشمت کا کیا کچھ اہتمام کیا ہوگا۔ اس طرح وہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو مرعوب کرنا چاہتا تھا، تاکہ ان میں سے کچھ لوگ ٹوٹ کر اس سے آملیں، کیونکہ عوام کی اکثریت ایسے مظاہروں سے متاثر ہوتی ہے۔ تفاسیر میں اس کی زینت کی کچھ تفصیل بیان ہوئی ہے، مگر اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا تانا بانا اسرائیلی روایات ہیں، مثلاً تفسیر طبری میں ہے کہ قتادہ نے فرمایا: ''ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ چار ہزار سواریوں پر نکلے، ان پر اور ان کی سواریوں پر ارغوانی (شوخ گلابی) رنگ تھا۔'' ابن زید نے کہا: ''میرے والد ذکر کیا کرتے تھے کہ وہ ستر ہزار کے جلوس کے ساتھ نکلا۔'' مراغی نے مقاتل کا قول نقل کیا ہے کہ وہ چتکبرے خچر پر سوار تھا، جس کی زین سونے کی تھی، ساتھ چار ہزار گھڑ سوار تھے، جنھوں نے ارغوانی لباس پہنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ تین سو گورے رنگ کی لڑکیاں تھیں، جو زیور اور سرخ لباس پہن کر چتکبرے خچروں پر سوار تھیں وغیرہ وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ قتادہ وہاں موجود تھے، نہ زید، نہ مقاتل اور نہ ان کے پاس وحی کے ذریعے سے یہ تفصیل آئی۔ ہاں، اتنی بات ضرور ہے کہ جس شخص کے خزانوں کی چابیاں ایک قوت والی جماعت پر بھاری ہوتی تھیں اس نے اپنی دولت اور شان و شوکت کے اظہار میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہوگی۔ چنانچہ اس نے ایسا متکبرانہ انداز اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند تھا۔

② **قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا**...... : وہ لوگ جن کی زندگی کا مقصد ہی دنیا اور اس کی زیب و زینت کا حصول ہے، قارون کی شان و شوکت دیکھ کر کہنے لگے، کاش! ہمیں بھی یہ سب کچھ ملا ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یقیناً وہ بہت بڑے نصیب والا ہے۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کے عوام بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ دنیوی خوش حالی کی خواہش ہر دل میں موجود ہے اور فرعون کی قوم کے لوگ بھی۔ ان لوگوں کی اس تمنا کی مثالیں اب بھی ہمیں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ مردوں کو دیکھو یا عورتوں کو، جوانوں کو دیکھو یا بوڑھوں کو، ہر ایک دنیوی ترقی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ہر ایک

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

**اور ان لوگوں نے کہا جنھیں علم دیا گیا تھا، افسوس تم پر! اللہ کا ثواب اس شخص کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان لایا اور اس نے اچھا عمل کیا اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انھی کو جو صبر کرنے والے ہیں ﴿۸۰﴾**

---

نے کوئی نہ کوئی تمنا پال رکھی ہے کہ کاش! میرا مکان فلاں جیسا ہو، میری سواری فلاں جیسی ہو، میرا کاروبار فلاں جیسا ہو، پھر اس تمنا کے حصول کے لیے نہ اسے حلال کی پروا ہے نہ حرام کی۔ قرآن نے یہ مثالیں صرف داستان طرازی کے لیے بیان نہیں فرمائیں، بلکہ یہ سب کچھ ہمیں ایسے روّیے کے بدانجام سے آگاہ کرنے کے لیے بیان فرمایا ہے۔

**آیت 80** ① وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ...... : وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا تھا، کہنے لگے، افسوس تم پر! اللہ کی نافرمانی کے ساتھ حاصل ہونے والی اس زیب و زینت اور شان و شوکت کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ بدلا کہیں بہتر ہے جو وہ ایمان اور عمل صالح والوں کو عطا کرتا ہے۔ اس آیت میں اللہ کے ثواب سے مراد وہ رزق کریم ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر قائم رہ کر محنت و کوشش کے نتیجے میں دنیا اور آخرت میں حاصل ہوتا ہے۔

② وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ: صبر کی تین قسمیں ہیں، اللہ کے احکام پر صبر یعنی ان کا پابند رہنا، اس کی نافرمانی سے صبر یعنی اس سے بچتے رہنا اور مصیبتوں پر صبر۔ یعنی اللہ کا یہ ثواب صرف انھی لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے جن میں اتنا صبر اور ثابت قدمی ہو کہ حلال طریقے اختیار کرنے پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں، خواہ تھوڑا رزق ملے یا زیادہ، حرام سے قطعاً اجتناب کریں، خواہ اس سے کتنے فائدے مل رہے ہوں اور اس صدق و دیانت کی وجہ سے پیش آنے والی ہر مشکل اور مصیبت پر صبر کریں۔ دنیا کی تکالیف کو عارضی اور چند روزہ سمجھ کر کسی نہ کسی طرح گزار دیں اور اللہ تعالیٰ سے شکوہ شکایت کا کوئی لفظ زبان پر نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ثواب، جو مومن کو دنیا میں ملتا ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ، کافر کے مال و منال سے خواہ وہ کتنا زیادہ ہو، اس لیے بہتر ہے کہ مومن کو اللہ کی فرماں برداری کی خوشی کا احساس، اس کے عطا کردہ رزق پر صبر و قناعت اور اس کی وجہ سے ملنے والی سکون و اطمینان کی دولت کے مقابلے میں کافر کے اموال و اولاد اور زیب و زینت کی کوئی حقیقت ہی نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ان کے لیے بے شمار رنج و غم اور عذاب کا باعث ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ [ التوبة : ٥٥ ] ”سو تجھے نہ ان کے اموال بھلے معلوم ہوں اور نہ ان کی اولاد، اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔“ اور آخرت میں اللہ کا ثواب کفار کی دنیوی زینت و مال سے اس لیے کہیں بہتر ہے کہ یہ عارضی ہے اور وہ باقی، اس میں بے شمار پریشانیوں اور رنج و غم کی آمیزش ہے اور وہ ہر قسم کے رنج و غم کی آمیزش سے پاک ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

تو ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر نہ اس کے لیے کوئی جماعت تھی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی

آیت 81 ① **فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ** : اللہ تعالیٰ کو اس کے تکبر کے اس مظاہرے پر ایسی غیرت آئی کہ اس نے اسے اور اس کے گھر کو جس میں اس کے اہل و عیال، نوکر چاکر اور خزانے تھے، سب کو زمین میں دھنسا دیا۔ قارون کی اس حالت پر وہ حدیث منطبق ہوتی ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( بَيْنَمَا رَجُلٌ يَجُرُّ إِزَارَهُ مِنَ الْخُيَلَاءِ خُسِفَ بِهِ ، فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِي الْأَرْضِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب : ۳٤۸٥ ] ''ایک آدمی اپنی چادر تکبّر سے گھسیٹتا جا رہا تھا، تو اسی حالت میں اسے زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ قیامت کے دن تک زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔'' علمائے تفسیر کا رجحان یہ ہے کہ اس سے مراد قارون ہے۔

② اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ تکبّر سے چادر لٹکانا بھی اللہ تعالیٰ کو اس قدر ناپسند ہے کہ اگر اس کی رحمت نہ ہو تو ایسے آدمی کو زمین میں دھنسا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کپڑا خود بخود ڈھلک جائے تو وہ تکبر نہیں، جیسا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کپڑا ڈھلک جاتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے، مگر بعض لوگ جان بوجھ کر کپڑا لٹکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تکبر سے ایسا نہیں کرتے۔ ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنیے، جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ نے ایک لمبی حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: (( وَارْفَعْ إِزَارَكَ إِلٰى نِصْفِ السَّاقِ فَإِنْ أَبَيْتَ فَإِلَى الْكَعْبَيْنِ وَ إِيَّاكَ وَ إِسْبَالَ الْإِزَارِ فَإِنَّهَا مِنَ الْمَخِيْلَةِ وَ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيْلَةَ )) [ أبو داوٗد، اللباس، باب ما جاء في إسبال الإزار : ٤٠٨٤، و صححه الألباني ] ''اپنی چادر نصف پنڈلی تک اٹھاؤ، اگر نہیں مانتے تو ٹخنوں تک اٹھاؤ، اور چادر لٹکانے سے بچو، کیونکہ یہ تکبر سے ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔'' اس سے ثابت ہوا کہ جان بوجھ کر کپڑا لٹکانا ہی تکبر ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سننے کے بعد اسے نہ ماننا اور جان بوجھ کر کپڑا لٹکانا صاف تکبر ہے۔ جان بوجھ کر چادر لٹکانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ، قَالَ فَقَرَأَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَ مِرَارٍ، قَالَ أَبُوْ ذَرٍّ خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ الْمُسْبِلُ إِزَارَهُ وَالْمَنَّانُ وَ الْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ )) [ مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم إسبال الإزار...... : ۱۰٦ ] ''تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ان سے کلام کرے گا، نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' تین دفعہ فرمایا تو ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وہ تو ناکام اور نامراد ہو گئے، یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی چادر (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانے والا اور احسان جتلانے والا اور اپنا سامان جھوٹی قسم کے ساتھ بیچنے والا۔''

③ قرآن مجید کے بیان سے ظاہر ہے کہ اسے زمین میں دھنسانے کا باعث اس کا تکبر اور اس کے اظہار کے لیے اس کا اپنی

وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾

مدد کرتی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کرنے والوں سے تھا ﴿۸۱﴾

زینت اور شان وشوکت کے ساتھ نکلتا تھا۔ مگر بعض مفسرین نے اس کی بغاوت اور سرکشی کے اور واقعات بھی بیان کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ قارون نے ایک فاحشہ عورت کو اس شرط پر کچھ مال دیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر بدکاری کی تہمت لگائے، جب وہ بنی اسرائیل میں کھڑے ہو کر کتاب اللہ کی تلاوت کر رہے ہوں تو یہ عورت کہے کہ موسیٰ! تم نے میرے ساتھ ایسے ایسے کیا ہے۔ لہٰذا جب اس نے مجلس میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات کہی تو وہ ڈر کر کانپ اٹھے اور دو رکعتیں پڑھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''میں تمھیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے سمندر کو پھاڑا اور تمھیں فرعون سے نجات دی اور فلاں فلاں احسانات کیے کہ تم ہر صورت وہ شخص بتاؤ جس نے تمھیں اس بات پر آمادہ کیا ہے جو تم نے کہی۔'' اس نے کہا، جب آپ نے مجھ سے قسم دے کر پوچھا ہے تو قارون نے مجھے اتنا مال دیا ہے، اس شرط پر کہ میں آپ کو اس اس طرح کہوں اور میں اللہ سے معافی مانگتی ہوں اور توبہ کرتی ہوں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر گئے اور قارون کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں وحی کی کہ میں نے زمین کو حکم دے دیا ہے کہ اس کے متعلق تمھارا حکم مانے تو موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا کہ اسے نگل جائے، تو ایسا ہی ہوا۔ ابن کثیر نے یہ واقعہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ سند اس کی اچھی بھی ہو تو یہ ان کا قول ہے، انھوں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل نہیں فرمایا اور ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے وقت ابن عباس رضی اللہ عنہما موجود نہیں تھے، بلکہ درمیان میں سیکڑوں ہزاروں سال کا فاصلہ ہے۔ اس لیے اس کے اسرائیلی روایت ہونے میں کوئی شک نہیں، جس پر یقین ممکن نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ اس میں قارون کا سمندر سے پار ہونا بھی مذکور ہے، جب کہ سورۂ مومن میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجنے اور ان تینوں کے آپ کو جھٹلانے کا ذکر فرمایا ہے، پھر فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا: ﴿وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا﴾ [ المؤمن : ٤٥، ٤٦ ] ''اور آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ جو آگ ہے، وہ اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔'' اسی طرح سورۂ عنکبوت (۳۹، ۴۰) میں ان تینوں کے تکبر کی وجہ سے ایمان نہ لانے اور اپنے گناہوں میں پکڑے جانے کا ذکر ہے۔ غرض قرآن مجید سے قارون کے ایمان لانے یا سمندر سے پار جانے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، بلکہ اس کے مسلسل جھٹلانے، تکبر کرنے اور اس کی پاداش میں زمین کے اندر دھنس جانے کا ذکر ہی ملتا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا: ''یہاں بہت سی اسرائیلیات ذکر کی گئی ہیں جن سے ہم نے پہلوتہی کی ہے۔'' کاش! ابن کثیر یہ اسرائیلیات بھی ذکر نہ کرتے جو انھوں نے ذکر کی ہیں۔

**۹ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ ......** : یعنی اس وقت نہ کوئی جماعت تھی جو اس کی مدد کو پہنچتی، نہ وہ خود اپنے آپ کو بچا سکا۔ اس کے نوکر چاکر، ساتھی اور دوست اس کے کسی کام نہ آ سکے۔

وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ ۚ لَوْ لَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور جن لوگوں نے کل اس کے مرتبے کی تمنا کی تھی انھوں نے اس حال میں صبح کی کہ کہہ رہے تھے افسوس! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہم پر احسان کیا تو وہ ضرور ہمیں دھنسا دیتا، افسوس! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ کافر فلاح نہیں پاتے ﴿۸۲﴾

---

**آیت 82** ❶ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ...... : "وَيْكَاَنَّ" کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں، بعض نے فرمایا، اس کا معنی "أَلَمْ تَرَ أَنَّ" (کیا تو نے نہیں دیکھا کہ) ہے۔ بعض نے فرمایا، یہ "وَيْ"، "كَ" اور "أَنَّ" کا مجموعہ ہے۔ "وَيْ" تعجب کا کلمہ ہے، کاف تعلیل کے لیے ہے (اس لیے) اور "أَنَّ" حرف تحقیق ہے۔ یعنی تعجب ہے، اس لیے کہ بے شک اللہ تعالیٰ...... ۔ اور بعض نے فرمایا "وَيْ" کلمہ تندّم ہے، یعنی ندامت اور افسوس کے اظہار کے لیے آتا ہے اور کاف حرف تشبیہ ہے (بمعنی گویا کہ)۔ میں نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے: "افسوس! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ۔"

❷ یعنی کل جو لوگ مال و دولت اور جاہ و حشمت میں قارون کو حاصل مرتبے کی تمنا کر رہے تھے، صبح ہوئی تو وہی کہہ رہے تھے کہ افسوس! معلوم یہی ہوتا ہے کہ رزق کا زیادہ ہونا یا کم ہونا کسی کے علم یا محنت پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی پر موقوف ہے۔ وہ جس کا رزق چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ کسی کو رزق زیادہ دینے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے پاس مال کمانے کا ہنر زیادہ ہے اور کسی کا رزق تنگ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے پاس مال کمانے کا ہنر نہیں، نہ ہی مال کا زیادہ ہونا اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی یا کم ہونا اس کے ناراض ہونے کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی علامت صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ کسی کو ایمان کی دولت عطا فرما دے، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَخْلَاقَكُمْ ، كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ ، وَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُعْطِي الْمَالَ مَنْ أَحَبَّ وَمَنْ لَّا يُحِبُّ ، وَلَا يُعْطِي الْإِيْمَانَ إِلَّا مَنْ يُّحِبُّ » [ الأدب المفرد : ۲۷۵. قال الألباني صحيح، موقوف في حكم المرفوع، وانظر سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۲۷۱٤ ] "اللہ تعالیٰ نے تمھارے درمیان تمھارے اخلاق اسی طرح تقسیم کیے ہیں جس طرح اس نے تمھارے رزق تقسیم کیے ہیں اور اللہ مال اسے بھی دیتا ہے جس سے محبت کرتا ہے اور اسے بھی جس سے محبت نہیں کرتا، مگر ایمان اس کے سوا کسی کو نہیں دیتا جس سے وہ محبت کرتا ہو۔"

❸ لَوْ لَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا......: یعنی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں قارون کی طرح نہیں بنایا، ورنہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی۔ ہم تو حرص کی وجہ سے "يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ" (کاش! ہمارے لیے اس جیسا ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے) کہہ کر اس جیسے عذاب کے حق دار بن چکے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری آرزو پوری نہ

تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۸۳﴾

یہ آخری گھر، ہم اسے ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو نہ زمین میں کسی طرح اونچا ہونے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کسی فساد کا اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے ﴿۸۳﴾

---

کی، بلکہ قارون کا انجام آنکھوں سے دکھا کر رجوع کی توفیق فرمائی۔ اب معلوم ہوا کہ مال و دولت جتنا بھی جمع کر لیں کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

④ ابو کبشہ الانماری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ لمبی حدیث ہے، اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّمَا الدُّنْيَا لِأَرْبَعَةِ نَفَرٍ : عَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالاً وَعِلْمًا فَهُوَ يَتَّقِيْ رَبَّهُ فِيْهِ وَيَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهُ وَيَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيْهِ حَقًّا فَهٰذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالاً فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ يَقُوْلُ لَوْ أَنَّ لِيْ مَالاً لَعَمِلْتُ فِيْهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَهُوَ بِنِيَّتِهِ فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ، وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالاً وَلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا فَهُوَ يَخْبِطُ فِيْ مَالِهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ لَا يَتَّقِيْ فِيْهِ رَبَّهُ وَلَا يَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهُ وَلَا يَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيْهِ حَقًّا فَهٰذَا بِأَخْبَثِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ لَمْ يَرْزُقْهُ اللّٰهُ مَالاً وَلَا عِلْمًا فَهُوَ يَقُوْلُ لَوْ أَنَّ لِيْ مَالاً لَعَمِلْتُ فِيْهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَهُوَ بِنِيَّتِهِ فَوِزْرُهُمَا سَوَاءٌ )) [ ترمذي، الزهد، باب ما جاء مثل الدنيا مثل أربعة نفر : ۲۳۲۵ ] ''دنیا صرف چار آدمیوں کے لیے ہے، ایک وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا، چنانچہ وہ اس کے بارے میں اپنے رب سے ڈرتا ہے اور صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں اللہ کا حق جانتا ہے، یہ سب سے افضل مرتبے میں ہے اور ایک وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم دیا، مگر مال نہیں دیا، چنانچہ وہ سچی نیت والا ہے۔ کہتا ہے، اگر میرے پاس مال ہوتو میں فلاں شخص جیسا عمل کروں۔ سو یہ اس کی نیت ہے اور دونوں کا اجر برابر ہے۔ اور ایک وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا، مگر علم نہیں دیا۔ چنانچہ وہ اس میں علم کے بغیر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔ نہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا ہے، نہ اس میں صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ اس میں اللہ کا کوئی حق جانتا ہے۔ سو وہ بدترین مرتبے میں ہے اور ایک وہ بندہ جسے اللہ نے نہ مال دیا ہے نہ علم۔ چنانچہ وہ کہتا ہے، اگر میرے پاس مال ہوتو میں فلاں شخص جیسا عمل کروں تو یہ اس کی نیت ہے اور ان دونوں کا گناہ برابر ہے۔'' جو لوگ کل قارون کے مرتبے کی تمنا کر رہے تھے اس حدیث کی رو سے قارون اور وہ دونوں گناہ میں برابر تھے، اس لیے انھوں نے اللہ کا احسان مانا کہ اس نے ہمیں قارون کی طرح زمین میں دھنسا نہیں دیا۔

**آیت 83** ① تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ ...... : ''عُلُوًّا'' کا لفظی معنی اونچا ہونا ہے، مراد اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر جاننا ہے۔ ''فَسَادًا'' کا لفظی معنی خرابی ہے، عام طور پر یہ لفظ چوری، ڈاکے، غصب، لوٹ مار، قتل و غارت اور لوگوں کا حق مارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مراد اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہے، خواہ کوئی بھی ہو، کیونکہ اسی سے زمین میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور سب سے بڑا فساد اللہ کے ساتھ شرک ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾

جو شخص نیکی لے کر آیا تو اس کے لیے اس سے بہتر (صلہ) ہے اور جو برائی لے کر آیا تو جن لوگوں نے برے کام کیے وہ بدلا نہیں دیے جائیں گے مگر اسی کا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۸۴﴾ بے شک جس نے تجھ پر یہ قرآن فرض کیا ہے وہ ضرور تجھے ایک عظیم الشان لوٹنے کی جگہ کی طرف واپس لانے والا ہے۔ کہہ میرا رب اسے زیادہ جاننے والا ہے جو ہدایت لے کر آیا اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے ﴿۸۵﴾

② آخرت کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ آخری گھر جس کا ذکر تم سنتے رہتے ہو، ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو صرف یہ نہیں کہ تکبر اور سرکشی اختیار نہیں کرتے اور فساد فی الارض کا ارتکاب نہیں کرتے، بلکہ ان دونوں کاموں کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔ مطلب یہ کہ دارِ آخرت میں فرعون، قارون اور ان جیسے لوگوں کا کوئی حصہ نہیں، جن کی زندگی سراسر علو اور فساد ہو۔

③ عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن خطبہ دینے کے لیے ہم میں کھڑے ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی باتیں بیان فرمائیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ وَلَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ )) [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب الصفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة و أهل النار : ٢٨٦٥/٦٤ ] ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ عاجزی اختیار کرو، حتیٰ کہ کوئی شخص کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی شخص کسی پر سرکشی نہ کرے۔'' عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَّ نَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه : ٩١ ] ''وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا۔'' ایک آدمی نے کہا: ''آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے)؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت رکھتا ہے، تکبر تو حق کا انکار اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔''

④ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ: اور اچھا انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور ہر قسم کے کبر اور فساد سے بچ کر رہتے ہیں۔

**آیت 84** مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ...... : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۰) اور سورۂ نمل (۸۹) کی تفسیر۔

**آیت 85** ① اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ ...... : ''مَعَادٍ'' میں تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ عظیم الشان

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ

اور تو امید نہ رکھتا تھا کہ تیری طرف کتاب نازل کی جائے گی مگر تیرے رب کی طرف سے رحمت کی وجہ سے (یہ نازل

لوٹنے کی جگہ کیا گیا ہے۔ قرآن فرض کرنے سے مراد اس پر عمل اور اسے تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانے اور اس کے لیے جہاد کرنے کا فریضہ عائد کرنا ہے۔

② **لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ** : پہلے فرمایا تھا: ”**وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ**“ اب رسول اللہ ﷺ کے لیے اس اچھے انجام کا ذکر فرمایا اور سورت کا اختتام عظیم الشان خوش خبری کے ساتھ فرمایا، یعنی جس اللہ نے آپ پر قرآن پر عمل کا اور اس کی دعوت کا فریضہ عائد کیا ہے وہ آپ کی محنت و مشقت اور ادائیگی فرض کے نتیجہ میں آپ کو ایک عظیم الشّان انجام تک پہنچانے والا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں اس طرح کہ آپ اس شہر مکہ سے ہجرت کریں گے اور دوبارہ پھر اس میں واپس آئیں گے اور اس شاندار طریقے سے آئیں گے کہ پورا جزیرۂ عرب آپ کے زیرِ نگین ہوگا۔ جیسا کہ صحیح بخاری (۴۷۷۳) میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس ”**مَعَادٍ**“ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ چنانچہ ہجرت کے آٹھویں سال اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو گیا اور آپ فاتحانہ شان سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اور آخرت میں عظیم الشّان مقام محمود پر پہنچانے والا ہے، جس کی وجہ سے پہلے اور پچھلے سب آپ پر رشک کریں گے۔ اسے ”**مَعَادٍ**“ اس لیے فرمایا کہ قرآن مجید میں آخرت کو سب کے لیے لوٹنے کی جگہ قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿**وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ**﴾ [ البقرة : ۲۸۱ ] ”اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“ اور فرمایا: ﴿**ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ**﴾ [ البقرة : ۲۸ ] ”پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“ اور فرمایا: ﴿**اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ**﴾ [ المائدة : ۴۸ ] ”اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے۔“ مفسرین میں سے بعض نے ”**مَعَادٍ**“ سے مراد مکہ اور بعض نے جنت لی ہے، دونوں اقوال اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

③ **قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى**...... : یہ پیش گوئی کہ آپ کا رب آپ کو اسی مکہ میں فاتحانہ شان سے واپس لائے گا، کفار کے نزدیک ایسی بات تھی جو کوئی گمراہ شخص ہی کر سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے آنے والی بات کا جواب پہلے ہی بتا دیا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کون ہے جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہے اور بہت جلد یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی۔

**آیت 86** ① **وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ**...... : رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں جن حالات سے گزر رہے تھے اور جس طرح کفار نے آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا، ان حالات میں یہ پیش گوئی کہ آپ کا رب آپ کو یہاں سے ہجرت کے بعد اسی عظیم الشّان مقام میں لانے والا ہے، بظاہر ایک ناممکن کام کی پیش گوئی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلانے کے لیے اس احسان کا ذکر فرمایا جو اس سے کہیں بڑا احسان تھا۔ فرمایا، آپ کو تعجب ہوتا ہے اور یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ آپ نہایت باعزت طریقے سے اپنے شہر میں واپس آئیں گے تو ذرا اپنی رسالت پر تو غور کریں،

ظَهِيۡرًا لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۸۶﴾

ہوئی) سو تو ہرگز کافروں کا مددگار نہ بن ﴿۸۶﴾

کبھی آپ نے سوچا بھی تھا یا دل میں یہ خیال یا آرزو بھی پیدا ہوئی تھی کہ آپ اللہ کے رسول بن جائیں گے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نعمت عطا فرمائی اور رسالت کے لیے چن لیا جو آپ کے خیال تک میں نہ تھی، تو وہ ایسی خبر سے آپ کو کیسے محروم رکھے گا جو آپ کی خواہش ہے اور جس کا آپ شوق رکھتے ہیں۔

② یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے اللہ کا سچا رسول ہونے کی بھی زبردست دلیل ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ رسالت اور نبوت محض اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے، وہ جنھیں چنتا ہے انھیں بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہمیں اتنی بڑی نعمت ملے گی۔ یہ نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کا طریقہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی اپنی نبوت کا اشتہار شروع کر دیتے ہیں۔ اس سورت میں اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملنے کا ذکر ہے، وہ معاملہ بھی اچانک ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھی جبریل علیہ السلام غار حرا میں اچانک آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو رسول اللہ ﷺ کے سچا رسول ہونے کی دلیل کے طور پر کئی جگہ بیان فرمایا ہے کہ ایک اُمّی شخص، جس کی عمر کے چالیس سال سب کے سامنے گزرے، جو نہ لکھنا جانتا تھا نہ پڑھنا، اگرچہ صدق و امانت اور اخلاق حمیدہ سے پہلے بھی متصف تھا، مگر نہ کسی کے خیال میں یہ بات تھی نہ خود اس کے دل میں یہ امید تک پیدا ہوئی تھی کہ اسے ایسی کتاب عطا کی جائے گی جس کی ایک سورت کی مثل اللہ کے سوا پوری کائنات جمع ہو کر بھی نہیں لا سکے گی۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِيۡ مَا الۡكِتٰبُ وَ لَا الۡاِيۡمَانُ وَ لٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِيۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهۡدِيۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴾ [ الشوریٰ : ۵۲ ] ”اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔“ ایک جگہ یہ صراحت فرمائی کہ یہ غیب کی خبریں، جو ہم آپ کو وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم، فرمایا: ﴿ تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَ لَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا ﴾ [ ھود : ۴۹ ] ”یہ غیب کی خبروں سے ہے جنھیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انھیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔“

③ فَلَا تَكُوۡنَنَّ ظَهِيۡرًا لِّلۡكٰفِرِيۡنَ : اللہ تعالیٰ نے کتاب و نبوت عطا کرنے کی نعمت یاد دلانے کے بعد پانچ حکم دیے، پہلا یہ کہ آپ کی قوم قریش اور آپ کے بھائی بندوں اور رشتہ داروں میں سے جو لوگ دین کے معاملہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے رہے، بلکہ مخالفت پر اتر آئے ہیں، آپ کسی صورت نہ ان کا ساتھ دیں نہ ان کی حمایت کریں۔

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ

اور یہ لوگ تجھے اللہ کی آیات سے کسی صورت روکنے نہ پائیں، اس کے بعد کہ وہ تیری طرف اتاری گئیں اور اپنے رب کی طرف بلا اور ہرگز مشرکوں سے نہ ہو ﴿٨٧﴾ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو مت پکار، اس کے سوا کوئی معبود

**آیت 87** ① وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ : "لَا يَصُدُّنَّكَ" صاد اور دال کے ضمہ کے ساتھ یہ لفظ پورے قرآن میں اسی مقام پر ہے، دوسری تمام جگہوں میں دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ نہی غائب جمع مذکر با نون تاکید ثقیلہ کا صیغہ ہے کہ تجھے ہرگز نہ روکیں۔ یہ دوسرا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات نازل ہونے کے بعد کفار خواہ کتنی کوشش کریں، کتنی ایذا پہنچائیں، یا کتنا لالچ دیں، ان آیات پر عمل سے اور ان کی تبلیغ سے کسی صورت آپ کو روکنے نہ پائیں۔ یہی بات دوسری جگہ فرمائی: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ [ المائدۃ: ٦٧ ] "اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو تُو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔"

② وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ : یہ تیسرا حکم ہے کہ اپنے رب کی طرف دعوت دیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے دین کی دعوت پورے زور و شور سے دیتے رہیں، جس میں کوئی کمی یا کوتاہی نہ ہو، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [ یوسف : ١٠٨ ] "کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں۔"

③ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ : یہ چوتھا حکم ہے کہ مشرکین سے ہرگز نہ ہوں۔

**آیت 88** ① وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ : یہ پانچواں حکم ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکار۔ یہ پانچوں حکم ہر انسان کے لیے ہیں، مگر آپ کو مخاطب کرنے سے ایک تو آپ کے لیے ان احکام کی تاکید مراد ہے اور ایک یہ کہ سنایا آپ کو جا رہا ہے مگر خبردار دوسرے تمام لوگوں کو کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ تو ان احکام پر عمل کر ہی رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کے آپ کو رسالت کے لیے چن لینے کے بعد آپ سے شرک کا امکان ہی نہیں تھا، جیسا کہ دوسری جگہ یہی بات بہت سخت لہجے میں کہی گئی ہے: ﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْۤ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [ الزمر : ٦٤، ٦٥ ] "کہہ دے پھر کیا تم مجھے غیر اللہ کے بارے میں حکم دیتے ہو کہ میں (ان کی) عبادت کروں اے جاہلو! اور بلاشبہ یقیناً تیری طرف وحی کی گئی اور ان لوگوں کی طرف بھی جو تجھ سے پہلے تھے کہ بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے

اِلَّا وَجۡهَهٗ ؕ لَهُ الۡحُكۡمُ وَ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۸﴾

نہیں، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، مگر اس کا چہرہ، اسی کے لیے حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۸۸﴾

ہو جائے گا۔'' مقصد یہ ہے کہ جب اس مسئلے میں کسی پیغمبر کے لیے کوئی رعایت نہیں تو کسی اور کے لیے کیا ہوگی۔

2 **لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ** : یہ وہ جملہ ہے جو اسلام کی دعوت کا خلاصہ ہے۔ قرآن مجید کی اکثر سورتوں کا آغاز بھی شرک کی تردید اور توحید کی دعوت سے ہوتا ہے اور اختتام بھی۔ یہاں اس دعوے کی تین دلیلیں بیان فرمائی ہیں۔

3 **كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ** : یہ اس بات کی پہلی دلیل ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، کیونکہ وہی ہے جو دائم، باقی، حیّ اور قیّوم ہے۔ اس کے سوا سب کو مرنا ہے، سب فانی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے: (( أَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ، وَالْجِنُّ وَالْإِنْسُ يَمُوْتُوْنَ )) [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿ و هو العزيز الحكيم ﴾ ...... : ۷۳۸۳ ] ''میں تیری عزت کی پناہ چاہتا ہوں، تُو وہ ہے کہ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور تُو کبھی نہیں مرتا، جبکہ جن اور انسان مر جاتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ **كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ ۚ وَّ يَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَ الۡاِكۡرَامِ** ﴾ [ الرحمٰن : ۲۶، ۲۷ ] ''ہر ایک جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والا ہے اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی شان اور عزت والا ہے۔'' اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ كَلِمَةُ لَبِيْدٍ : أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ )) [ بخاري، مناقب الأنصار، باب أيام الجاهلية : ۳۸۴۱ ] ''سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی لبید کی بات ہے کہ سن لو! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔''

4 **لَهُ الۡحُكۡمُ** : یہ اللہ تعالیٰ کے معبودِ واحد ہونے کی دوسری دلیل ہے کہ کائنات میں اسی کا حکم جاری و ساری ہے، اس کے سوا ''کُنْ'' کا اختیار کسی کے پاس نہیں۔

5 **وَ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ** : یہ توحید کی تیسری دلیل ہے کہ تمام لوگوں کو اسی کے پاس واپس جانا اور اسی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ دوسرے سب تو خود پیش ہونے والے ہیں، پھر وہ معبود کیسے بن گئے۔

سورۃ العنکبوت ۲۹ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — آیاتہا ۶۹ رکوعاتہا ۷

الٓمّٓ ۝١ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ ۝٢ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِيۡنَ ۝٣

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

**الٓمّٓ ① کیا لوگوں نے گمان کیا ہے کہ وہ اسی پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ کہہ دیں ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی ② حالانکہ بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کی آزمائش کی جو ان سے پہلے تھے، سو اللہ ہر صورت ان لوگوں کو جان لے گا جنھوں نے سچ کہا اور ان لوگوں کو بھی ہر صورت جان لے گا جو جھوٹے ہیں③**

**آیت 1** الٓمّٓ: حروف مقطعات کی بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

**آیت 2** اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا...... ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں مسلمان بہت سخت حالات سے گزر رہے تھے، کفار نے ان کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ انسانی فطرت کے مطابق مسلمان کبھی کبھار مصیبتوں کی تاب نہ لا کر گھبرا جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں حوصلہ دینے کے لیے فرمایا: ''کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ وہ اسی پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ کہہ دیں ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔'' یہ استفہام انکار کے لیے ہے، یعنی ایسا نہیں ہوسکتا، بلکہ آزمائش ضرور ہوگی، تاکہ سچے کو جھوٹے سے اور مخلص کو منافق سے جدا کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق آزمائش ایمان کے حساب سے ہوتی ہے، جتنا ایمان مضبوط ہو اتنی ہی آزمائش سخت ہوتی ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! لوگوں میں سب سے سخت آزمائش کن کی ہوتی ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الصَّالِحُوْنَ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ، فَالْأَمْثَلُ مِنَ النَّاسِ ، يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلٰى حَسَبِ دِيْنِهِ ، فَإِنْ كَانَ فِيْ دِيْنِهِ صَلَابَةٌ زِيْدَ فِيْ بَلَائِهِ، وَ إِنْ كَانَ فِيْ دِيْنِهِ رِقَّةٌ خُفِّفَ عَنْهُ، وَمَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتّٰى يَمْشِيَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ لَيْسَ عَلَيْهِ خَطِيْئَةٌ )) [ مسند أحمد : ۱/ ۱۷۲، ح : ۱٤۸۵۔ ترمذي : ۲۳۹۸، و صححه الألباني ] ''(آزمائش میں سب سے سخت) انبیاء ہوتے ہیں، پھر صالحین، پھر لوگوں میں سے جو افضل ہو، پھر جو اس کے بعد افضل ہو، آدمی کی آزمائش اس کے دین کے حساب سے ہوتی ہے، اگر اس کے دین میں مضبوطی ہو تو اس کی آزمائش میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور اگر اس کے دین میں نرمی ہو تو اس سے تخفیف کی جاتی ہے اور آدمی کی آزمائش جاری رہتی ہے، حتیٰ کہ وہ زمین پر اس حال میں چلتا پھرتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہیں ہوتا۔''

اس مضمون کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۴۲ اور ۱۷۹)، بقرہ (۲۱۴)، توبہ (۱۶) اور سورۂ محمد (۳۱)۔

**آیت 3** ① وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ: یعنی یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے جو تمھارے ساتھ پیش آیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ مستقل سنت رہی ہے اور پہلے لوگوں کی بھی آزمائشیں ہوتی رہی ہیں، خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ④

یا ان لوگوں نے جو برے کام کرتے ہیں، یہ گمان کرلیا ہے کہ وہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے، برا ہے جو وہ فیصلہ کر رہے ہیں ④

رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت کی، اس وقت آپ کعبہ کے سائے میں ایک چادر کا تکیہ بنائے ہوئے تھے، ہم نے آپ سے کہا: (( أَلَا تَسْتَنصِرُ لَنَا؟ أَلَا تَدْعُو لَنَا؟ فَقَالَ قَدْ كَانَ مَنْ قَبْلَكُمْ يُؤْخَذُ الرَّجُلُ فَيُحْفَرُ لَهُ فِي الْأَرْضِ فَيُجْعَلُ فِيهَا فَيُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَيُوضَعُ عَلٰى رَأْسِهِ فَيُجْعَلُ نِصْفَيْنِ وَ يُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِيدِ مَا دُونَ لَحْمِهِ وَعَظْمِهِ فَمَا يَصُدُّهُ ذٰلِكَ عَنْ دِينِهِ، وَاللّٰهِ! لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرُ حَتّٰى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلٰى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ إِلَّا اللّٰهَ وَالذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهِ وَ لٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُونَ )) [ بخاري، الإكراه، باب من اختار الضرب و القتل و الهوان على الكفر : ۶۹۴۳ ] ”کیا آپ ہمارے لیے مدد نہیں مانگتے؟ کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم سے پہلے لوگوں میں آدمی کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا اور اسے زمین میں گاڑ دیا جاتا، پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھا جاتا اور اسے دو حصوں میں چیر دیا جاتا اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈیوں سے نوچ دیا جاتا اور یہ چیز اسے اس کے دین سے نہیں روکتی تھی۔ اللہ کی قسم! یہ کام ضرور مکمل ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا، یا اسے اپنی بکریوں کے متعلق بھیڑیے کا (خوف ہوگا)، لیکن تم بہت جلدی کا مطالبہ کرتے ہو۔“

② **فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا** ...... : ”سو اللہ تعالیٰ ہر صورت ان لوگوں کو جان لے گا جنھوں نے سچ کہا“ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ ماضی، حال اور مستقبل کی ہر بات کو جانتا ہے، پھر اس کا کیا مطلب کہ وہ سچوں اور جھوٹوں کو جان لے گا۔ مفسر ابن کثیر نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے، عام علم تو ان چیزوں کا بھی ہوتا ہے جو وجود میں نہ آئی ہوں، مگر دیکھنے سے حاصل ہونے والا علم (یا یہ علم کہ کوئی چیز وجود میں آ چکی ہے) کسی چیز کے وجود میں آنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۴۲) کی تفسیر۔

**آیت 4** **اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا** ...... : اگرچہ ”الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ“ (جو لوگ برے کام کرتے ہیں) کے الفاظ عام ہیں، جن میں مومن و کافر دونوں آ جاتے ہیں، مگر یہاں مراد کافر ہیں۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”پہلی دو آیتیں مسلمانوں کے متعلق تھیں جو کافروں کی ایذاؤں میں گرفتار تھے اور یہ آیت کافروں سے متعلق ہے جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے۔“ (موضح) یعنی ایمان والوں کی آزمائشوں اور امتحانات کو دیکھ کر کیا کافروں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے اور ہماری گرفت میں نہیں آئیں گے؟ اگر انھوں نے عارضی مہلت سے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ ہم ہمیشہ مزے میں رہیں گے، کبھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہیں آئیں گے، تو انھوں نے بہت بری رائے قائم کر لی ہے، کیونکہ مومنوں کی آزمائش تو ایک وقت تک ہے اور ان کے درجات کی بلندی کا باعث ہے، جب کہ کفار کے لیے شدید عذاب تیار ہے جو مومنوں کی آزمائش کی طرح چند روزہ نہیں بلکہ دائمی ہے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۵﴾

جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو بے شک اللہ کا مقرر وقت ضرور آنے والا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۵﴾

**آیت 5** مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ...... : اس آیت میں ایمان والوں کے لیے خوش خبری ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے وہ اس چند روزہ آزمائش پر صبر کرنے اور زیادہ سے زیادہ نیک عمل کرنے کی کوشش کرے، تو اس کی امید ضرور پوری ہوگی، کیونکہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آنے والا ہے اور وہ بندے کی دعا کو اور اس کے عمل کو بلکہ کائنات کی ہر آواز اور ہر کام کو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ قرآن مجید میں دو قسم کے لوگ بیان ہوئے ہیں، ایک وہ جو قیامت پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتے ہیں، ان کا اس آیت میں ذکر ہے اور سورۂ کہف کی آخری آیت میں بھی، فرمایا: ﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴾ [ الكهف : ۱۱۰ ] ”پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔“ دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید اور اس کا شوق رکھنے والے کو خوش خبری ہو کہ اس کی امید ضرور پوری ہوگی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو وقت مقرر کر رکھا ہے وہ ضرور آنے والا ہے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ اس وقت سے پہلے ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اخلاص کے ساتھ اپنے رب کو راضی کرنے والے صالح اعمال کر لے۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهُ، قَالَتْ عَائِشَةُ أَوْ بَعْضُ أَزْوَاجِهِ إِنَّا لَنَكْرَهُ الْمَوْتَ، قَالَ لَيْسَ ذَاكَ وَلٰكِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللّٰهِ وَ كَرَامَتِهِ فَلَيْسَ شَيْءٌ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ فَأَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ وَأَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ وَ إِنَّ الْكَافِرَ إِذَا حُضِرَ بُشِّرَ بِعَذَابِ اللّٰهِ وَ عُقُوْبَتِهِ فَلَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَهَ إِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ وَ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهُ )) [ بخاري، الرقاق، باب من أحب لقاء الله أحب الله لقاءه : ٦٥٠٧ ] ”جو شخص اللہ کی ملاقات محبوب رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ کی ملاقات ناپسند کرتا ہے اللہ اس کی ملاقات ناپسند کرتا ہے۔“ اس پر عائشہ رضی اللہ عنہا یا آپ کی کسی اور بیوی نے کہا: ”ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ بات نہیں، بلکہ جب مومن کی موت کا وقت آتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی اور اس کے باعزت ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اسے اس سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی جو اس کے آگے آنے والی ہے اور جب کافر کی موت کا وقت آتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اسے اس سے زیادہ ناپسندیدہ چیز کوئی نہیں ہوتی جو اس کے آگے ہے، تو وہ اللہ کی ملاقات ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات ناپسند کرتا ہے۔“ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی دعا نماز میں پڑھی، جس میں اللہ تعالیٰ سے کئی چیزیں مانگی گئی ہیں، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۞

اور جو جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے جہاد کرتا ہے، یقیناً اللہ تو سارے جہانوں سے بہت بے پروا ہے ۞

« وَ أَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ إِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ إِلٰى لِقَائِكَ فِيْ غَيْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ » [ نسائي، السهو، نوع آخر : ١٣٠٦ ] ”(اے اللہ!) اور میں تجھ سے تیرے چہرے کو دیکھنے کی لذت کا اور تیری ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں، کسی تکلیف کے بغیر جو نقصان پہنچانے والی ہے اور کسی فتنے کے بغیر جو گمراہ کرنے والا ہے۔“

لوگوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی نہ امید رکھتا ہے نہ شوق، ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [ یونس : ۷، ۸ ] ”بے شک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے اور اس پر مطمئن ہو گئے اور وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اس کے بدلے جو وہ کمایا کرتے تھے۔“

**آیت 6** ❶ **وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ:** ”جَهَدَ يَجْهَدُ“ کا معنی کوشش کرنا ہے اور ”جَاهَدَ“ (مفاعلہ) میں مقابلے کا مفہوم بھی ہے اور مبالغے کا بھی، یعنی کسی کے مقابلے میں پوری کوشش لگا دینا۔ مومن کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر کاربند رہنے کے لیے بہت سی چیزوں کے مقابلے میں جدوجہد کرنا پڑتی ہے، اسے اپنے نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو ہر وقت اسے اپنی خواہش کا غلام بنانے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے، شیطان کا بھی جس نے اس کی دشمنی کی قسم کھا رکھی ہے اور اپنے گھر سے لے کر تمام دنیا کے ان انسانوں کا بھی جو اسے راہ حق سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، حتیٰ کہ اسے اس کوشش میں لڑائی بھی کرنا پڑتی ہے، جس میں وہ دشمن کو قتل کرتا ہے اور خود بھی قتل ہو جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں جہاد کا لفظ اکثر اسی معنی میں آیا ہے۔ سب سے اونچا درجہ اس کا وہ ہے کہ جب وہ سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا کر قربان ہو جاتا ہے۔ عبد اللہ بن حُبشی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں (لمبی حدیث ہے): « قِيْلَ فَأَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ ؟ قَالَ مَنْ جَاهَدَ الْمُشْرِكِيْنَ بِمَالِهِ ، وَنَفْسِهِ، قِيْلَ فَأَيُّ الْقَتْلِ أَشْرَفُ ؟ قَالَ مَنْ أُهْرِيْقَ دَمُهُ ، وَعُقِرَ جَوَادُهُ » [ مسند أحمد : ٣/ ٤١١، ٤١٢، ح : ١٥٤٠٧. قال محقق المسند إسناده قوي۔ أبو داؤد : ١٤٤٩، قال الألباني صحيح ] ”(نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے) سوال کیا گیا کہ کون سا جہاد افضل ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مشرکین کے ساتھ اپنی جان اور مال کے ساتھ جہاد کرے۔“ پوچھا گیا: ”پھر کون سا قتل سب سے اونچی شان والا ہے؟“ فرمایا: ”جس کا خون بہا دیا جائے اور اس کا عمدہ گھوڑا کاٹ دیا جائے۔“

❷ فرمایا، جو شخص اپنے نفس یا شیطان یا کسی بھی دشمن کے مقابلے میں اپنی آخری کوشش لگا دیتا ہے اس کا فائدہ خود اس کو ہے، اللہ تعالیٰ کو نہ کسی کی عبادت سے کوئی فائدہ ہے نہ کسی کے گناہ سے کوئی نقصان، بلکہ اگر کسی کو توفیق ملی ہے تو اسے مزید اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس مضمون کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیت (۴۶): ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے یقیناً ہم ان سے ان کی برائیاں ضرور دور کر دیں گے اور یقیناً

وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ﴾ ''جس نے نیک عمل کیا سو اپنے لیے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہو گی۔'' اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۷) : ﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ﴾ ''اگر تم نے بھلائی کی تو اپنی جانوں کے لیے بھلائی کی اور اگر برائی کی تو انھی کے لیے۔''

❸ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ : ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ سے بیان کیا، لمبی حدیث ہے، اس میں ہے: (( يَا عِبَادِيْ ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى أَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا، يَا عِبَادِيْ ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا )) [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم : ۲۵۷۷ ] ''اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور تمھارے پچھلے، تمھارے انسان اور تمھارے جن سب تم میں سے ایک ایسے آدمی جیسے ہو جائیں جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیز گار ہے تو اس سے میری بادشاہت میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہو گا اور اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور تمھارے پچھلے، تمھارے انسان اور تمھارے جن سب تم میں سے ایک ایسے آدمی جیسے ہو جائیں جو تم میں سے سب سے زیادہ فاجر ہے تو اس سے میری بادشاہت میں سے کچھ بھی کم نہیں ہو گا۔''

❹ مفسر رازی نے فرمایا، اس آیت میں خوش خبری بھی ہے اور ڈرانا بھی۔ ڈرانا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جب سارے جہانوں سے غنی ہے تو اگر وہ تمام بندوں کو اپنے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دے تو کوئی اسے پوچھنے والا نہیں اور خوش خبری اس لیے کہ اس نے جو کچھ پیدا کیا ہے اپنے بندوں میں سے کسی ایک بندے کو دے دے تو اس کا کچھ کم نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں سے کسی چیز کی اسے تو ضرورت نہیں، وہ سارے جہانوں سے بے پروا ہے، پھر ''کُنْ'' کہہ کر وہ جتنا چاہے اور پیدا کر سکتا ہے، یہ بات بہت امید دلانے والی اور بہت بڑی خوش خبری ہے۔

**آیت 7** ❶ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ : یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، آزمائش پر ثابت قدم رہے، مشرکین کی ایذا سے متزلزل نہیں ہوئے، پھر صالح اعمال کرتے رہے، اپنے اور اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے جہاد کرتے رہے تو ہم ان کی برائیاں ضرور دور کر دیں گے، ایمان لانے کی برکت سے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیں گے، پھر اعمال میں سے ہجرت سے پہلے کے تمام گناہ معاف کر دیں گے اور حج سے پہلے کے تمام گناہ معاف کر دیں گے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام داخل کیا تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: ''اپنا دایاں ہاتھ پھیلائیں، تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔'' آپ نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا، کہتے ہیں، میں

# الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

## انھیں اس عمل کی بہترین جزا ضرور دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ۝

نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو آپ نے فرمایا: ”عمرو! تمھیں کیا ہوا؟“ میں نے کہا: ”میں چاہتا ہوں کہ شرط کرلوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کس چیز کی شرط کرو گے؟“ میں نے کہا: ”اس بات کی کہ مجھے بخش دیا جائے۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا؟ وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ )) [ مسلم، الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله ...... : ١٢١ ] ”کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے جو کچھ ہوا اسے گرا دیتا ہے؟ اور ہجرت اپنے سے پہلے جو کچھ ہوا اسے گرا دیتی ہے؟ اور حج اپنے سے پہلے جو کچھ ہوا اسے گرا دیتا ہے؟“ پھر توبہ سے گزشتہ گناہ معاف ہی نہیں ہوتے بلکہ نیکیوں میں بدل دیے جاتے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان کی آیت (٧٠) کی تفسیر۔ اس کے علاوہ وضو، نماز، روزہ، صدقہ اور جہاد غرض ہر نیکی گناہوں کے مٹانے کا باعث بنتی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود کی آیت (١١٤)۔

❷ **وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** : اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ آدمی کے نیک اعمال میں سے جو اعمال سب سے زیادہ اچھے ہوں گے ان کو ملحوظ رکھ کر اسے اچھی جزا دی جائے گی۔ دوسرا یہ کہ آدمی اپنے عمل کے لحاظ سے جتنی جزا کا مستحق ہوگا اس سے زیادہ اچھی جزا اسے دی جائے گی۔ کفر کی حالت میں جو نیک اعمال کیے تھے مسلمان ہونے کے بعد ان کی جزا بھی ملے گی۔ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! یہ بتائیں کہ وہ کام جو میں جاہلیت میں ثواب سمجھ کر کرتا تھا، یعنی صلہ رحمی، غلام آزاد کرنا اور صدقہ، تو کیا میرے لیے ان میں اجر ہے؟“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَسْلَمْتَ عَلٰى مَا سَلَفَ لَكَ مِنْ خَيْرٍ )) [ بخاري، البيوع، باب شراء المملوك من الحربي و هبته و عتقه : ٢٢٢٠ ] ”تم اس تمام نیکی سمیت مسلمان ہوئے ہو جو اس سے پہلے تم نے کی۔“ پھر ایمان لانے کے بعد ہر نیکی کا بدلا دس گنا سے لے کر سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ تک بلکہ بلا حساب دیا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ نساء (٤٠)، انعام (١٦٠)، قصص (٨٤)، بقرہ (٢٦١)، زمر (١٠) اور مومن (٤٠)۔

❸ رازی نے بہتر بدلے کے متعلق ایک نفیس نکتہ بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آدمی کے اعمال یا تو دل سے تعلق رکھتے ہیں، یا آنکھ سے نظر آتے ہیں، یا کان کے ساتھ سنائی دیتے ہیں، یہ اللہ کا فضل ہے کہ ان اعمال کے بدلے میں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں وہ نعمتیں دے گا ”مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ“ (جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں) اور کان سے سنائی دینے والے اعمال کے بدلے میں وہ نعمتیں دے گا ”وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ“ (جو کسی کان نے نہیں سنیں) اور دل کے ایمان اور حسن اعتقاد کے بدلے میں وہ نعمتیں دے گا ”وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ“ (جن کا خیال تک کسی بشر کے دل میں نہیں آیا)۔ ایمان اور عمل صالح کی اس سے بہتر جزا کیا ہوسکتی ہے۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۸

**اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید کی ہے اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کا کہنا مت مان، تمھیں میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا جو تم کیا کرتے تھے ⑧**

آیت 8 ① وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا : اللہ پر ایمان اور عمل صالح کی تلقین اور اس کی فضیلت بیان کرنے کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا، کیونکہ انھی سے انسان کا وجود ہوتا ہے، باپ خرچ کرتا اور پرورش کرتا ہے، جبکہ ماں دودھ پلاتی اور پالتی ہے۔ قرآن مجید میں عموماً اللہ کے حق کے بعد والدین کا حق بیان ہوا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴾ [ بني إسرائيل : ٢٣ ] ''اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر کبھی تیرے پاس دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ ہی جائیں تو ان دونوں کو ''اُف'' مت کہہ اور نہ انھیں جھڑک اور ان سے بہت کرم والی بات کہہ۔''

② بقاعی نے پچھلی آیات کے ساتھ اس آیت کا یہ ربط نکالا ہے کہ آزمائش کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کو اس کے والدین کفر و شرک پر مجبور کریں تو ایسے موقع پر اسے ثابت قدم رہنا چاہیے اور کفر و شرک کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔

③ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا : یعنی اگر والدین تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک بنائے جس کا تجھے کوئی علم نہیں تو ان کا کہنا مت مان، یعنی جس کے شریک ہونے کی تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، کیونکہ علم وہ ہے جس کی دلیل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ بھلا شرک کی بھی کوئی دلیل ہو سکتی ہے، وہ تو محض توہم پرستی اور تقلید کے اندھے پن سے وجود میں آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ والدین کے کہنے پر اللہ کے ساتھ شرک کرنا کسی صورت جائز نہیں، صرف شرک ہی نہیں اللہ اور اس کے رسول کی کوئی بھی نافرمانی ماں باپ یا کسی مخلوق کے کہنے پر جائز نہیں۔ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ )) [ مسند أحمد : ١٣١/١، ح : ١٠٩٩، صحیح علی شرط مسلم ] ''اللہ عزوجل کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں۔'' اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ عَلَی الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا أَحَبَّ وَ كَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ ، فَإِنْ أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ عَلَيْهِ وَ لَا طَاعَةَ )) [ ترمذي، الجهاد، باب ما جاء لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق : ١٧٠٧، و صححه الترمذي و الألباني ] ''سننا اور ماننا مسلمان آدمی پر فرض ہے ان حکموں میں جو اسے پسند ہوں یا ناپسند ہوں، جب تک

# وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾

**اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے ہم انھیں ضرور ہی نیک لوگوں میں داخل کریں گے ﴿۹﴾**

اسے (اللہ کی) نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، تو جب اسے (اللہ کی کسی) نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا جائز ہے نہ ماننا۔"

④ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے بارے میں قرآن کی کئی آیات اتریں، (ان میں سے یہ ہے کہ) سعد کی ماں نے (ان کے مسلمان ہونے پر) قسم کھالی کہ اس سے کبھی کلام نہیں کرے گی جب تک وہ اپنے دین سے کافر نہ ہو جائے اور نہ کھائے گی نہ پیے گی۔ اس نے کہا، تم کہتے ہو کہ اللہ نے تمھیں والدین کے بارے میں وصیت کی ہے اور میں تمھاری ماں ہوں اور تمھیں یہ حکم دیتی ہوں۔ سعد نے کہا، وہ تین دن ایسے ہی رہی، حتیٰ کہ بھوک سے اس پر غشی طاری ہو گئی، تو اس کا ایک بیٹا اٹھا جس کا نام عمارہ تھا، اس نے اسے (پانی وغیرہ) پلایا تو وہ (ہوش میں آ کر) سعد پر بددعائیں کرنے لگی، اس پر اللہ عز و جل نے قرآن میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾ [ العنکبوت : ۸ ] اور یہ آیت: ﴿وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾ [ لقمان : ۱۵ ] [ مسلم، فضائل الصحابة، باب في فضل سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ : ۱۷۴۸، بعد الحدیث : ۲۴۱۲ ]

⑤ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ ......: یعنی دنیا کی یہ رشتہ داریاں اور والدین کے حقوق اس دنیا کی حد تک ہیں، آخر کار ماں باپ اور اولاد سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور پلٹ کر جانا ہے، پھر اگر ماں باپ نے اولاد کو گمراہی پر مجبور کیا یا ناحق زیادتی کی تو وہ پکڑے جائیں گے اور اگر اولاد نے والدین کے جائز حقوق میں کوتاہی کی تو ان سے باز پرس ہوگی۔

**آیت 9** وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......: یعنی اگر کسی کے والدین مشرک ہوں گے تو مومن بیٹا نیکوں کے ساتھ ہوگا، مشرک والدین کے ساتھ نہیں، اس لیے کہ گو والدین دنیا میں اس کے بہت قریب رہے اور محبت بھی کرتے رہے مگر ان کی اس سے اور اس کی ان سے محبت طبعی تھی، دینی نہ تھی، جب کہ حقیقی محبت دینی محبت ہے جو والدین کی کفار کے ساتھ تھی اور اس کی اہل ایمان کے ساتھ تھی اور قیامت کے دن آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے حقیقی (دینی) محبت ہوگی۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "یا رسول اللہ! آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے مگر ابھی ان سے نہیں ملا؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ» [ بخاري، الأدب، باب علامة الحب في الله...... : ۶۱۶۹ ] "آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھے گا۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِيْقًا﴾ [ النساء : ۶۹ ] "اور جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔" اس لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے صالحین میں داخل فرمائے گا جن کے ساتھ ملانے کی دعا اللہ کے جلیل القدر پیغمبر کرتے رہے، جیسا کہ سلیمان علیہ السلام نے دعا کی: ﴿وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [ النمل : ۱۹ ] "اور اپنی رحمت سے

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَ لَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ⑩

**اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے ہم اللہ پر ایمان لائے، پھر جب اسے اللہ (کے معاملہ) میں تکلیف دی جائے تو لوگوں کے ستانے کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتا ہے اور یقیناً اگر تیرے رب کی طرف سے کوئی مدد آجائے تو یقیناً ضرور کہیں گے ہم تو تمھارے ساتھ تھے، اور کیا اللہ اسے زیادہ جاننے والا نہیں جو سارے جہانوں کے سینوں میں ہے ⑩**

مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔'' اور یوسف علیہ السلام نے دعا کی: ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ [ یوسف : ۱۰۱ ] ''مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔'' ان لوگوں کو صالحین میں داخل کرنے کی اس مقام پر ایک لطیف مناسبت ہے کہ جب والدین کے شرک کا حکم دینے کی صورت میں ان کی بات نہ ماننے کا حکم دیا گیا تو ظاہر ہے اس سے والدین اور اس کے درمیان دوری اور قطع تعلق قدرتی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے اس جدائی کے بدلے اسے صالحین میں داخل فرمایا، تاکہ اسے ان سے اُنس حاصل ہو اور اس کا دل لگا رہے۔ (ابن عاشور) اپنے عزیزوں سے جدائی کے عوض اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُنس عطا ہونے کی ایک مثال آسیہ علیہا السلام کی دعا ہے، جس نے ایمان لانے کی وجہ سے خاوند اور گھر چھن جانے پر دعا کی: ﴿رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ [ التحریم : ۱۱ ] ''اے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے۔'' اس دعا میں ''عِنْدَكَ'' اور ''بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں، فرعون کے بدلے رب تعالیٰ کی ہمسائیگی اور گھر کے بدلے جنت کا گھر، کیا خوب جزا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں باپ اور دوسرے خُویش واقارب کی مزاحمت کے باوجود ایمان و عمل صالح پر ثابت قدم رہنے والوں کے لیے یہ بہت بڑا انعام ہے۔

**آیت 10** ① وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ...... : یہ وہ لوگ ہیں جو مکہ میں مسلمان ہو گئے، مگر مشرکین کے ساتھ ان کا حال یہ تھا کہ ان کی دی ہوئی ایذا پر صبر نہیں کر سکتے تھے، جب انھیں ایذا دی جاتی تو دل سے شرک کی طرف پلٹ جاتے، مگر مسلمانوں سے یہ بات چھپاتے اور ان کے ساتھ رہتے۔ یہ لوگ منافق تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ہجرت سے پہلے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ ضحاک اور جابر بن زید کا قول ہے۔ (ابن عاشور) فرمایا، لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو کہتا ہے کہ میں ایمان لایا، پھر جب اسے اللہ کے بارے میں ایذا اور سزا دی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی سزا اور ایذا کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتا ہے، حالانکہ لوگوں کی طرف سے ملنے والی ایذا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کی آپس میں کوئی مشابہت نہیں۔ لوگوں سے ملنے والی سزا محدود ہے جو ختم ہونے والی ہے، زیادہ سے زیادہ موت تک رہ سکتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہمیشہ کے لیے ہے، لوگوں سے ملنے والی سزا اس کے لیے ثواب کا باعث ہے، جب کہ اللہ کا عذاب اس کے غضب کا

وَ لَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَيَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ ⑪ وَ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِيۡلَنَا وَ لۡنَحۡمِلۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ وَ مَا هُمۡ بِحٰمِلِيۡنَ مِنۡ خَطٰيٰهُمۡ مِّنۡ شَيۡءٍ ؕ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ⑫

**اور یقیناً اللہ ان لوگوں کو ضرور جان لے گا جو ایمان لائے اور یقیناً انھیں بھی ضرور جان لے گا جو منافق ہیں ⑪ اور جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے ان لوگوں سے کہا جو ایمان لائے کہ تم ہمارے راستے پر چلو اور لازم ہے کہ ہم تمھارے گناہ اٹھا لیں، حالانکہ وہ ہرگز ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں، بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں ⑫**

نتیجہ ہے، اس لیے اسے چاہیے تھا کہ اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے لوگوں کی ایذا اور سزا پر صبر کرتا اور ہمیشہ کی جنت کا حق دار بنتا، مگر اس نے لوگوں کی ایذا و سزا کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا اور دین سے پھر گیا، مگر دنیوی مفادات کی خاطر ظاہری تعلق مسلمانوں سے بھی قائم رکھا۔

② **وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكَ......** : چنانچہ اگر کبھی رب تعالیٰ کی طرف سے مدد آ گئی، مسلمانوں کو فتح ہوئی تو کہہ دیں گے ہم تو تمھارے ساتھ تھے، کیا اللہ تعالیٰ اس چیز کو سب سے زیادہ جاننے والا نہیں جو تمام جہانوں کے سینوں میں ہے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں: ''معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں ان لوگوں کا دل سے کفر اور ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ رہنا مشرکین کے ساتھ ایک قسم کا طے شدہ معاملہ تھا، کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔'' اس مضمون کی آیت یہ ہے: ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ ۚ فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَيۡرُ ۨ اطۡمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨ انۡقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ ﴾ [ الحج : ۱۱ ] ''اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے، پھر اگر اسے کوئی بھلائی پہنچ جائے تو اس کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش آ پہنچے تو اپنے منہ پر اُلٹا پھر جاتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا، یہی تو صریح خسارہ ہے۔''

③ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ایذا اور مجبور کرنے کی وجہ سے کفر کا ارتکاب کرنے والوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک وہ جنھوں نے مجبوری کی وجہ سے کلمۂ کفر کہہ دیا، مگر دل سے اسلام پر مطمئن رہے، دوسرے وہ جنھوں نے شرح صدر کے ساتھ دل سے کفر اختیار کر لیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَ قَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَ لٰكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا ﴾ [ النحل : ۱۰۶ ] ''جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان کے بعد، سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے۔'' زیر تفسیر آیت میں مذکورہ لوگ وہ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ''مَنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا'' (جو کفر کے لیے سینہ کھول دے) کے الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے۔

**آیت 11** **وَ لَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَيَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ** : یعنی ایسی آزمائشیں بھیج کر اور ایسے حالات پیدا کر کے جن میں یہ منافق اپنے دلوں کا حال چھپائے نہیں رہ سکیں گے۔

**آیت 12** ① **وَ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا......** : اس آیت میں ایمان لانے والوں کی ایک اور آزمائش کا ذکر

وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ٝ وَ لَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾

**اور یقیناً وہ ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ بھی۔ اور یقیناً وہ قیامت کے دن اس کے متعلق ضرور پوچھے جائیں گے جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے ﴿۱۳﴾**

فرمایا ہے کہ کفار ہر طریقے سے انھیں بہکانے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے کفار نے ایمان لانے والوں سے کہا، تم ہمارے راستے پر چلو، ہماری طرح بت پرستی کرو اور مَن مانی زندگی بسر کرو، نہ کچھ کرنے کی پابندی نہ کسی کام سے رکنے کی پابندی اور ہم پر لازم ہے کہ تمھارے گناہ اٹھائیں۔ (''**وَلْنَحْمِلْ**'' امر کا صیغہ تاکید کے لیے استعمال کیا ہے) یعنی ہم ہر صورت تمھارے گناہ اٹھائیں گے، جیسے کہا جاتا ہے، تم یہ کام کرو، تمھارا گناہ میری گردن پر۔

② **وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ** ...... : اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کفار ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں، یقیناً یہ جھوٹ بول رہے ہیں، اس وقت گناہ اٹھانا تو دور کی بات انھوں نے اپنے پیچھے چلنے والوں سے بالکل ہی لاتعلق ہو جانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ** ﴾ [ البقرة : ١٦٦ ] ''جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے آپس کے تعلقات بالکل منقطع ہو جائیں گے۔'' ان کے گناہ نہ اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کسی صورت نہیں ہو سکتا کہ قیامت کے دن ان کے گناہ خود اٹھا کر انھیں گناہ سے بری کر دیں اور کہیں کہ تم جنت میں جاؤ، تمھارے گناہوں کی سزا ہم بھگتیں گے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ **وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى** ﴾ [ فاطر : ١٨ ] ''اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور اگر کوئی بوجھ سے لدی ہوئی (جان) اپنے بوجھ کی طرف بلائے گی تو اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا جائے گا، خواہ وہ قرابت دار ہو۔''

**آیت 13** ① **وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ** : یعنی یہ جھوٹے ہیں، ان کا بوجھ رتی برابر ہلکا نہیں کر سکتے، ہاں اپنا بوجھ بھاری کر رہے ہیں، ایک تو یہ اپنے ذاتی گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے اور دوسرا اس کے ساتھ ان لوگوں کے گناہوں کا بھی جنھیں انھوں نے گمراہ کیا تھا، اگرچہ ان کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (دیکھیے نحل : ۲۵) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( **مَنْ دَعَا إِلٰى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ دَعَا إِلٰى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا** )) [ مسلم، العلم، باب من سن سنة حسنة أو سيئة...... : ٢٦٧٤ ] **''جو شخص ہدایت کے کسی کام کی طرف دعوت دے اسے ان لوگوں کے اجروں جیسا اجر ملے گا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے اجروں میں کچھ کمی نہیں کرے گا اور جو شخص گمراہی کے کسی کام کی طرف دعوت دے اس پر ان لوگوں کے گناہوں جیسا گناہ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے گناہوں**

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ وَ ہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ ان میں پچاس کم ہزار برس رہا، پھر انھیں طوفان نے پکڑ لیا، اس حال میں کہ وہ ظالم تھے ﴿۱۴﴾**

میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔'' عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا، لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم و ذريته : ۳۳۳۵ ] ''کوئی جان ظلم سے قتل نہیں کی جاتی مگر آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے پر اس کے خون کا ایک حصہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے قتل کا طریقہ شروع کیا۔''

② وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...... : یعنی جو جھوٹی باتیں یہ بناتے ہیں کہ ہم تمھارا بوجھ اٹھا لیں گے یہ خود مستقل گناہ ہے، اس افترا کی بھی انھیں سزا ملے گی، جس میں ان سے کی جانے والی باز پرس بھی ہو گی، جو بجائے خود نہایت خوفناک مرحلہ ہے۔

**آیت 14** ① وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ : سورت کے آغاز میں جو فرمایا تھا کہ ہم نے پہلے لوگوں کی بھی آزمائش کی، اس کی کچھ تفصیل کے لیے ان پیغمبروں کا ذکر فرمایا جنھوں نے لمبے عرصے تک آزمائش پر صبر کیا اور قوم کی طرف سے بے شمار اذیتوں کے باوجود ان کی خیر خواہی میں اور انھیں دعوت دینے میں کمی نہیں کی۔ مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کو تسلی دینا ہے۔ ان واقعات کا آغاز نوح علیہ السلام سے فرمایا، کیونکہ وہ پہلے رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف بھیجے گئے۔ نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں تینتالیس (۴۳) جگہ آیا، ان واقعات میں انبیاء اور اہل ایمان کی آزمائش کا ذکر بھی ہے اور اس بات کا بھی کہ کافر اس گمان میں نہ رہیں کہ وہ ہماری گرفت سے بچ نکلیں گے۔ نوح علیہ السلام کے متعلق مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۳۳)، نساء (۱۶۳)، انعام (۸۴)، اعراف (۵۹ تا ۶۴)، یونس (۷۱ تا ۷۳)، انبیاء (۷۶، ۷۷)، مومنون (۲۳ تا ۳۰)، فرقان (۳۷)، شعراء (۱۰۵ تا ۱۲۲)، صافات (۷۵ تا ۸۲)، قمر (۹ تا ۱۵)، حاقہ (۱۱، ۱۲) اور سورۂ نوح مکمل۔

② فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا : نوح علیہ السلام کی اپنی قوم کو سمجھانے کی مدت ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال تھی۔ ظاہر ہے کہ منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی انھوں نے عمر کا ایک حصہ گزارا ہو گا اور طوفان کے بعد بھی زندہ رہے ہوں گے۔ مفسرین کے ان کی کل عمر کے متعلق مختلف اقوال ہیں، مگر صحتِ سند کے ساتھ کوئی بات ثابت نہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ نوح علیہ السلام کے اپنی قوم میں رہنے کی مدت بیان کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں، ایک یہ کہ کفار کے اسلام قبول نہ کرنے اور کفر پر اڑے رہنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل تنگ ہوتا تھا، آپ کی تسلی کے لیے فرمایا کہ نوح علیہ السلام تقریباً ہزار برس دعوت دیتے رہے، جس کے نتیجے میں ان کی قوم میں بہت تھوڑے لوگ ہی ایمان لائے، اس کے باوجود وہ نہ اکتائے، نہ انھوں نے دعوت دینا ترک کیا، تو آپ کا زیادہ حق بنتا ہے کہ صبر کریں، کیونکہ آپ ان کے مقابلے

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَ جَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

پھر ہم نے اسے بچالیا اور کشتی والوں کو بھی اور اسے جہانوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا ﴿۱۵﴾

میں بہت تھوڑا عرصہ ان میں رہے ہیں اور آپ پر ایمان لانے والے کہیں زیادہ ہیں۔ دوسرا فائدہ کفار کو تنبیہ ہے کہ انھیں عذاب میں تاخیر سے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہزار برس کی مہلت بھی دے دیا کرتا ہے، مگر کفر پر اصرار کرنے والی قوم پر آخر کار اس کا عذاب آ جاتا ہے، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم جب ظلم و تعدّی سے باز نہ آئی تو طوفان نے انھیں آ لیا۔ "فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ" سے ظاہر ہے کہ طوفان کا باعث ان کا ظلم پر اصرار تھا، اگر وہ توبہ کر لیتے تو ان پر عذاب نہ آتا۔

③ بعض لوگوں کو نوح علیہ السلام کی اتنی عمر پر تعجب ہوتا ہے، مگر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کی طویل عمر کا ذکر ہے، صحیح حدیث کے مطابق انسان کی پیدائش کی ابتدا میں اس کا قد بھی آج کے قد سے کہیں لمبا تھا۔ مدت ہائے دراز گزرنے کے ساتھ دونوں میں کمی آتی گئی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهِ ، طُوْلُهُ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا...... فَكُلُّ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰى صُوْرَةِ آدَمَ ، فَلَمْ يَزَلِ الْخَلْقُ يَنْقُصُ بَعْدُ حَتَّى الْآنَ )) [ بخاري، الاستئذان، باب بدء السلام : ٦٢٢٧ ] "اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس کی صورت پر پیدا کیا، اس کا طول (قد) ساٹھ ہاتھ تھا...... تو جو شخص بھی جنت میں جائے گا آدم کی صورت پر ہوگا۔ پھر بعد میں اب تک خلقت (کا قد) کم ہوتا چلا گیا۔"

**آیت 15** ① فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ : یہ واقعہ سورۂ ہود (۳۷ تا ۴۸) میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

② وَ جَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ : اس جملے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ہم نے اس واقعہ کو تمام جہانوں کے لیے نشانی بنا دیا کہ جو بھی اسے سنے اس سے عبرت حاصل کرے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے اس کشتی کو تمام جہانوں کے لیے نشانی بنا دیا کہ پانی میں غرق ہونے سے بچاؤ کا یہ طریقہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد تمام زمانوں میں انسان نے اس کی مانند کشتیاں بنا کر غرق ہونے سے بچنے کا اور سمندر میں سفر کا بندوبست کیا۔ یہ مضمون ان آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے: ﴿ وَ اٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ۝ وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ۝ وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ۙ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [ یٰس : ٤١ تا ٤٤ ] "اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ بے شک ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی کئی اور چیزیں بنائیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کر دیں، پھر نہ کوئی ان کی فریاد سننے والا ہو اور نہ وہ بچائے جائیں۔ مگر ہماری طرف سے رحمت اور ایک وقت تک فائدہ پہنچانے کی وجہ سے۔" شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: "جس وقت یہ سورت اتری ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اصحاب کافروں کی ایذاؤں سے تنگ آ کر جہاز پر سوار ہو کر ملک حبشہ کی طرف گئے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہجرت کر آئے تب وہ جہاز

وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور ابراہیم کو جب اس نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۱۶﴾

والے صحابہ بھی سلامتی سے آ ملے۔" (موضح) گویا نوح علیہ السلام اور سفینۂ نوح کی تاریخ اس رنگ میں دہرائی گئی۔

تیسرا مطلب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کشتی صدیوں تک جودی پہاڑ کی چوٹی پر موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو خبر دیتی رہی کہ اس سرزمین میں کبھی ایسا طوفان آیا تھا جس کی بدولت یہ اتنی بڑی کشتی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچی۔ اب بھی اخباروں میں اس کشتی کی تلاش کے لیے مہمات روانہ ہونے کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ اس مطلب کی تائید اللہ کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

﴿وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾

[ القمر : ۱۳ تا ۱۵ ] "اور ہم نے اسے تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کر دیا۔ جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، اس شخص کے بدلے کی خاطر جس کا انکار کیا گیا تھا۔ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے ایک نشانی بنا کر چھوڑا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟" چوتھا مطلب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور کشتی میں سوار لوگوں کو نجات دی اور اس نجات کو تمام جہانوں کے لیے نشانی بنا دیا، جو کئی لحاظ سے نشانی تھی، ایک یہ کہ طوفان آنے سے پہلے کشتی تیار ہوگئی، دوسرا یہ کہ نوح علیہ السلام نے اپنا اور کشتی میں موجود تمام انسانوں اور جانوروں کی خوراک کا ذخیرہ کر لیا، تیسرا یہ کہ خوراک ختم ہونے سے پہلے پہلے پانی زمین میں جذب ہو کر خشک ہو گیا، جب کہ اتنا بڑا سمندر جو پہاڑوں کی بلندی کے برابر گہرا ہو، اتنی مدت میں کبھی خشک نہیں ہوتا، اگر اتنی جلدی پانی جذب نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی زندہ باقی نہ رہتا، چوتھا یہ کہ وہ کشتی اتنی مدت تک ہوا کے تھپیڑوں اور خطرناک بحری جانوروں کے حملوں سے بھی محفوظ رہی۔ ان تمام باتوں میں کشتی کا یا کشتی والوں کا کچھ کمال نہ تھا، یہ ہم تھے جنھوں نے ان تمام چیزوں کا اہتمام کر کے نوح علیہ السلام اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس نجات کو تمام جہانوں کے لیے نشانی بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چاروں مطالب میں کوئی تضاد نہیں، چاروں بیک وقت مراد ہو سکتے ہیں۔

**آیت 16** ① وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ...... : "اِبْرٰهِيْمَ" کا عطف "نُوْحًا" پر ہے اور یہ "اَرْسَلْنَا" کا مفعول ہے، یعنی "اور ہم نے ابراہیم کو بھیجا۔" بعض مفسرین نے اسے "اُذْكُرْ" کا مفعول بنایا ہے کہ ابراہیم کو یاد کر۔ اگرچہ یہ بھی ہوسکتا ہے، مگر آگے آیت (۳۶) میں "وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا" سے ظاہر ہے کہ راجح یہی ہے کہ یہ "اَرْسَلْنَا" کا مفعول ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (رکوع ۱۵، ۱۶ اور ۳۵)، آل عمران (رکوع ۷)، انعام (رکوع ۹)، ہود (رکوع ۷)، ابراہیم (رکوع ۶)، حجر (رکوع ۴)، مریم (رکوع ۳)، انبیاء (رکوع ۵)، شعراء (۵)، صافات (رکوع ۳)، زخرف (رکوع ۳) اور ذاریات (رکوع ۲)۔

② نوح علیہ السلام کے بعد ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا، کیونکہ ان کی آزمائش بھی بہت بڑی تھی، انھیں آگ میں پھینک دیا گیا، ہجرت

اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡكًا ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَمۡلِكُوۡنَ لَـكُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ وَاعۡبُدُوۡهُ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ ؕ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾

تم اللہ کے سوا چند بتوں ہی کی تو عبادت کرتے ہو اور تم سراسر جھوٹ گھڑتے ہو۔ بلاشبہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو تمھارے لیے کسی رزق کے مالک نہیں ہیں، سو تم اللہ کے ہاں ہی رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر کرو، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۱۷﴾

کرنا پڑی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں کئی باتوں کے ساتھ آزمایا اور وہ سب میں پورے اترے۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۲۴) ان آزمائشوں میں بہت بڑی آزمائش اس قوم کو توحید کی دعوت دینا تھی جو بت پرست تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے انھیں حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو، یعنی اس بات سے ڈرو کہ اگر تم نے اس کی عبادت نہ کی، اس کا حکم نہ مانا یا کسی غیر کو اس کا شریک بنایا تو وہ تمھیں عذاب دے گا۔

③ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ : ”خَيْرٌ“ اصل میں ”أَخْيَرُ“ ہے جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے، زیادہ اچھا، مگر یہاں تفضیل کا معنی مراد نہیں، کیونکہ توحید شرک سے زیادہ اچھی نہیں بلکہ توحید ہی اچھی ہے، شرک میں کسی طرح کی کوئی اچھائی نہیں۔ (سعدی) یا یہ مطلب ہے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اور تمھارے خیال میں اس میں کسی قسم کی خیر ہے، لیکن اللہ کی عبادت اور اسی سے ڈرنا ہر حال میں اس سے کہیں اچھا ہے (اگرچہ فی الواقع بتوں کی عبادت میں کوئی خیر نہیں)۔ (آلوسی)

④ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ : یعنی اگر تمھیں کچھ بھی علم ہو۔ معلوم ہوا شرک میں وہی گرفتار ہوتا ہے جو علم سے بالکل محروم ہوتا ہے۔

**آیت 17** ① اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا : قرآن مجید میں بتوں کے لیے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ① ”صَنَمٌ“ اس کی جمع ”أَصْنَامٌ“ ہے، معنی ہے وہ بت جو قابلِ انتقال اور قابلِ فروخت ہوں، خواہ وہ پیتل یا لوہے یا چاندی کے ہوں، یا لکڑی کے یا پتھر کے اور ”صِنَاعَةُ الْأَصْنَامِ“ کا معنی ہے بت تراشی کا فن، جیسے ابراہیم علیہ السلام کا باپ بت تراش بھی تھا اور بت فروش بھی۔ ② ”نُصُبٌ“ اس کی جمع ”أَنْصَابٌ“ ہے، معنی ہے ایسے بت یا مجسمے جنھیں پوجا پاٹ کے لیے نصب کر دیا گیا ہو، جیسے مشرکین مکہ کے بت لات، منات، عزیٰ اور ہبل وغیرہ تھے۔ ③ ”أَوْثَانٌ“ یہ ”وَثَنٌ“ کی جمع ہے، وثن کا تعلق زیادہ تر مقامات سے ہوتا ہے، یعنی آستانے وغیرہ، خواہ وہاں بت نصب ہوں یا نہ ہوں۔ بعض دفعہ بعض مخصوص مقامات پر پتھروں، درختوں (مثلاً پیپل وغیرہ)، ستاروں (مثلاً قطب وغیرہ) یا دریاؤں (مثلاً گنگا وغیرہ) سے الٰہی صفات کا عقیدہ رکھ کر ان کی پرستش شروع کر دی جاتی ہے اور ایسے مقامات بسا اوقات کسی بزرگ یا کسی ولی یا کسی بت سے منسوب ہوتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے جو ”اَوۡثَانًا“ کا ذکر کیا تو اس سے مراد ان کی قوم کے بت خانے ہیں جن میں بت از خود شامل ہیں۔ (کیلانی)

وہ قبریں بھی ''اوثان'' میں شامل ہیں جن کی عبادت کی جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ، لَعَنَ اللّٰهُ قَوْمًا اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ )) [ مسند أحمد: ۲/ ۲۴۶، ح: ۷۳۷۶، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ، قال

وَ اِنۡ تُكَذِّبُوۡا فَقَدۡ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۸﴾

**اور اگر تم جھٹلاؤ تو تم سے پہلے کئی امتیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول کے ذمے تو کھلم کھلا پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۸﴾**

المحقق و إسناده قوي۔ الموطأ : ۱/۱۷۲، ح : ٤١٤ ] ”اے اللہ! میری قبر کو وثن (بت) نہ بنانا، جس کی عبادت کی جائے۔ اللہ ان لوگوں پر لعنت فرمائے جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا۔“

2 **وَ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡكًا** : یعنی تم لوگ بت نہیں گھڑتے بلکہ جھوٹ کا پلندہ گھڑتے ہو، ان بتوں اور بت خانوں سے تم کئی قصے اور کہانیاں خود گھڑ کر ان سے منسوب کر دیتے ہو۔ مثلاً اگر فلاں آستانے پر مہینے میں ایک دفعہ دودھ کا چڑھاوا نہ چڑھایا جائے تو جانور بیمار پڑ جاتے ہیں یا مر جاتے ہیں، یا فلاں آستانے کی گستاخی یا توہین کا انجام اتنا خطرناک ہوتا ہے، یا فلاں بت خانے یا مزار پر حاضری دینے سے رزق میں فراوانی ہو جاتی ہے، لہٰذا تم جو ان بتوں کو گھڑتے ہو تو ساتھ ہی جھوٹ کے پلندے بھی گھڑتے ہو، ورنہ صرف بت گھڑنے کا تمھیں کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ (کیلانی)

3 **اِنَّ الَّذِيۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ**...... : اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام نے شرک کے ابطال پر تین دلائل قوم کے سامنے رکھے، ایک یہ کہ یہ بت تمھارے اپنے گھڑے ہوئے ہیں، گویا تم اللہ کی مخلوق ہو اور یہ تمھاری مخلوق ہیں اور الٰہ کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ وہ خالق ہے باقی سب اس کی مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہ الٰہ نہیں ہو سکتا اور یہ الٰہ تو مخلوق در مخلوق ہیں، یہ الٰہ کیسے بن گئے؟ دوسری دلیل یہ ہے کہ ان بتوں کے نفع یا نقصان سے متعلق تمھیں خود ہی داستانیں اور قصے کہانیاں تراشنا پڑتی ہیں۔ اگر تمھارے ان قصے کہانیوں کو ان سے علیحدہ کر دیا جائے تو باقی یہ پتھر کے پتھر یا بے جان مادے ہی رہ جاتے ہیں اور ایسے مادے الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ تیسری دلیل یہ ہے کہ یہ تمھیں رزق کیا دیں گے، رزق تو تم خود ان کے آگے چڑھاووں اور نذروں نیازوں کی صورت میں رکھتے ہو، چاہو تو تم ان کے آگے رزق رکھ دو، چاہو تو اٹھا لو اور چاہو تو ان کے اوپر مل دو۔ لہٰذا ایسے غلط عقائد ان سے منسوب نہ کرو اور رزق مانگنا ہے تو اللہ سے مانگو اور جس کا کھاؤ اسی کا گن گاؤ، اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر بجا لاؤ۔ (کیلانی) شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”اکثر خلق روزی کے پیچھے ایمان دیتی ہے، سو جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی روزی نہیں دیتا اپنی خوشی کے موافق۔“ (موضح)

4 **اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ** : یعنی بالآخر تمھیں اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور تمھارا انجام اسی کے ہاتھ میں ہے، ان بتوں کی طرف نہ تم نے پلٹنا ہے، نہ تمھارا انجام ان کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا تمھیں عبادت تو اس کی کرنی چاہیے جو تمھاری عاقبت کو سنوار سکتا ہے اور رزق بھی اسی سے مانگنا چاہیے۔

**آیت 18** 1 **وَ اِنۡ تُكَذِّبُوۡا فَقَدۡ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ** : واؤ عطف سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے والا جملہ، جس پر اس جملے کا عطف ہے، وہ محذوف ہے، یعنی ”فَإِنْ تُصَدِّقُوْنِيْ فَقَدْ فُزْتُمْ بِسَعَادَةِ الدَّارَيْنِ“ ”سو اگر تم میری تصدیق کرو تو تم دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“ ”وَ اِنۡ تُكَذِّبُوۡا ......“ اور اگر تم مجھے جھٹلا دو تو نصیحت کے لیے تمھارا یہ بات جاننا ہی کافی ہے کہ تم سے پہلے بہت سی امتوں نے اپنے انبیاء کو جھٹلایا، مثلاً قوم نوح، عاد، ثمود وغیرہ، تو ان کا

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دہرائے گا، بے شک یہ اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۱۹﴾ کہہ زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی، پھر اللہ ہی دوسری پیدائش پیدا کرے گا، یقیناً اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۰﴾

انجام کیا ہوا۔ انھوں نے پیغمبروں کا کچھ بگاڑا یا اپنا انجام ہی خراب کیا؟

2 وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ : اور رسول کے ذمے اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کا پیغام اس طرح پہنچا دے کہ اس میں کوئی شک باقی نہ رہے، کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

آیت 19 1 اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ...... : ابن جریر اور بعض دوسرے مفسرین کے مطابق یہاں تک ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب ہے اور یہاں سے آگے اللہ تعالیٰ کا کفار قریش سے خطاب ہے جو "لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد "فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ" سے پھر ابراہیم علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ جبکہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ "فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ" تک یہ سارا کلام ہی ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ مجھے بھی یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں نہ سلسلہ کلام توڑنا پڑتا ہے، نہ مطلب میں کوئی خلل آتا ہے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو توحید کے بعد آخرت کے دلائل سنا رہے ہیں جن کے جواب کا ذکر اس آیت میں ہے : ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ ......﴾ ویسے ابراہیم علیہ السلام کا یہ خطاب کفار قریش کے بھی عین حسب حال ہے، کیونکہ مشرک اقوام کے عقائد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

2 ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور کفار مکہ دو بنیادی گمراہیوں میں مبتلا تھے، ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک، دوسری آخرت کا انکار۔ پہلی گمراہی کا رد اوپر کی آیات میں آ چکا ہے، یہ دوسری گمراہی کا رد ہے۔

3 ابراہیم علیہ السلام نے دوبارہ زندہ ہونے کے ثبوت کے لیے خود ان کے وجود کو پیش فرمایا، جس کا مشاہدہ وہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس وقت پیدا فرمایا جب کہیں ان کا ذکر تک نہ تھا۔ وجود میں آنے کے بعد وہ سننے دیکھنے والے انسان بن گئے، تو جس نے انھیں شروع میں پیدا فرمایا وہ انھیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، ("اِنَّ" تعلیل کے لیے آتا ہے) کیونکہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [ الروم : ۲۷ ] "اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے۔" شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "شروع تو دیکھتے ہو، دہرانا اسی سے سمجھ لو۔"

آیت 20 قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... : یعنی اپنی ذات کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پیدائش میں بھی غور کرو اور چل پھر

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۫ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

ع ۲ ۱۴

وہ عذاب دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور رحم کرتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۱﴾ اور نہ تم کسی طرح زمین میں عاجز کرنے والے ہو اور نہ آسمان میں اور نہ اللہ کے سوا تمھارا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ﴿۲۲﴾ اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا وہ میری رحمت سے ناامید ہو چکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۲۳﴾

---

کر دیکھو۔ زمین اور آسمان کی نشانیوں پر غور کرو، آسمانوں کو، ستاروں کو، زمینوں کو، پہاڑوں کو، درختوں کو، جنگلوں کو، نہروں کو، دریاؤں کو، سمندروں کو، پھلوں کو، کھیتوں کو دیکھو تو سہی، یہ سب کچھ نہیں تھا، پھر اللہ نے سب کچھ پیدا کر دیا۔ یہ تمام نشانیاں اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ظاہر کرتی ہیں، اسی پر دوسری زندگی کو قیاس کر لو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، پہلی دفعہ پیدا کرنے پر بھی اور دوبارہ پیدا کرنے پر بھی۔ پچھلی آیت میں اپنے نفس اور اپنی ذات پر غور کرنے کا حکم دیا تھا، اس آیت میں آفاق پر غور کا حکم دیا۔

**آیت 21** يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ...... : قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے دلائل کے بعد فرمایا کہ پھر وہ جسے چاہے گا اپنے عدل کے ساتھ عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا اپنے فضل کے ساتھ رحم فرمائے گا، البتہ ہر حال میں تمھیں واپس اس کے پاس جانا ہے۔

**آیت 22** ① وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ : یہاں یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے قابو ہی نہ آیا تو وہ اسے اپنے پاس کیسے حاضر کرے گا؟ لہٰذا فرمایا، تم زمین کے کسی کونے میں چلے جاؤ یا آسمان کے کسی کنارے پر، تم اللہ تعالیٰ کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے کہ وہ تمھیں پکڑ نہ سکے۔ سورۂ رحمٰن میں یہی بات فرمائی: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴾ [ الرحمٰن : ۳۳ ] ”اے جن و انس کی جماعت! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ، کسی غلبے کے سوا نہیں نکلو گے۔“

② وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ : مطلب یہ ہے کہ نہ تم خود اتنے زور آور ہو کہ کہیں بھاگ کر اللہ کی گرفت سے نکل سکو اور نہ تمھارے کوئی حمایتی یا مددگار ہیں جو تمھیں اس کی گرفت سے بچا سکیں۔

**آیت 23** وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖ...... : اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں عام ہے، جس سے کافر اور مومن، منافق اور مخلص، نیک اور بد یکساں طور پر مستفید ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو دنیا کے وسائل، آسائش اور مال و دولت عطا کر رہا

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ

**پھر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا اسے قتل کر دو، یا اسے جلا دو، تو اللہ نے اسے آگ سے بچالیا۔**

ہے۔ یہ رحمت الٰہی کی وہ وسعت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [ الأعراف : ١٥٦ ] ''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔'' لیکن آخرت چونکہ دار الجزاء ہے۔ انسان نے دنیا کی کھیتی میں جو کچھ بویا ہو گا اسی کی فصل اسے وہاں کاٹنا ہو گی، جیسے عمل کیے ہوں گے ویسی ہی جزا اسے وہاں ملے گی۔ اللہ کی بارگاہ میں بے لاگ فیصلے ہوں گے۔ دنیا کی طرح اگر آخرت میں بھی نیک و بد کے ساتھ یکساں سلوک ہو اور مومن و کافر دونوں ہی رحمت الٰہی کے مستحق قرار پائیں تو اس سے ایک تو اللہ تعالیٰ کی صفت عدل پر حرف آتا ہے اور دوسرے قیامت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ قیامت کا دن تو اللہ نے رکھا ہی اس لیے ہے کہ وہاں نیکوں کو ان کی نیکیوں کے صلے میں جنت اور بدوں کو ان کی بدیوں کی جزا میں جہنم دی جائے۔ اس لیے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت صرف اہل ایمان کے لیے خاص ہو گی۔ جیسے یہاں بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ آخرت اور معاد کے منکر ہوں گے وہ میری رحمت سے ناامید ہوں گے، یعنی ان کے حصے میں رحمتِ الٰہی نہیں آئے گی۔ سورۂ اعراف میں اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ [ الأعراف : ١٥٦ ] ''سو میں یہ (رحمت آخرت میں) ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو متقی، زکاۃ ادا کرنے والے اور ہماری آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہوں گے۔'' (احسن البیان) اس سورت کی آیت (۵): ﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ﴾ میں اللہ کی رحمت کی امید رکھنے والوں کا بیان ہے اور زیر تفسیر آیت میں اللہ کی رحمت سے ناامید لوگوں کا بیان ہے۔ نیز دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۸)۔

**آیت 24** ① **فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ** : ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ توحید اور آخرت کے متعلق ان کے دلائل کا جواب نہ دے سکے تو تشدد پر اتر آئے اور باطل پرستوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے، ان کے پاس دلیل کا جواب دلیل نہیں ہوتا، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ مار دو، جلا دو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا ان کے بتوں کو توڑنے کا واقعہ حذف کر دیا ہے۔ وہ واقعہ بھی بتوں کے باطل ہونے کی عملی دلیل تھا، جب وہ علمی اور عملی دلائل کے مقابلے میں لاجواب ہو گئے تو سب نے اتفاق کے ساتھ انھیں ختم کرنے کا فیصلہ کیا، تاہم اس میں اختلاف تھا کہ انھیں ختم کرنے کا طریقہ کیا ہو، تو وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اسے قتل کر دو یا جلا دو۔ آخری فیصلہ یہی ہوا کہ اسے عبرت ناک طریقے سے جلا دو، کیوں کہ وہ انھیں زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے باقاعدہ ایک عمارت بنا کر اسے ایندھن سے بھر کر آگ سے جلا دینے کا اہتمام کیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ﴾ [ الصافات : ٩٧ ] ''انھوں نے کہا اس کے لیے ایک عمارت بناؤ، پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دو۔''

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴿۲۴﴾

بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۲۴﴾

② فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ : اس جملے سے یہ بات خود بخود واضح ہو رہی ہے کہ ان لوگوں نے آخر کار ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینک دیا۔ یہاں صرف اتنا بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں آگ سے بچا لیا، مگر دوسری جگہ صراحت کے ساتھ فرمایا: ﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ﴾ [ الأنبیاء : ٦٩ ] ''ہم نے کہا اے آگ! ابراہیم پر سراسر ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔'' ظاہر ہے اگر انھیں آگ میں پھینکا ہی نہ گیا ہوتا تو آگ کو یہ حکم دینے کا کوئی مطلب نہیں تھا، نہ یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں آگ سے بچا لیا۔

③ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ : ان نشانیوں میں سے سب سے پہلی نشانی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش ضرور کرتا ہے اور جو جتنا مقرب ہو آزمائش اتنی ہی سخت ہوتی ہے۔ اس واقعہ ہی کو دیکھ لیجیے، اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو ان پر ہاتھ ڈالنے ہی نہ دیتا، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ﴿فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا﴾ [ القصص : ٣٥ ] ''کہ یہ لوگ تم دونوں تک نہیں پہنچیں گے۔'' اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی قوم میں سے ان کا کوئی ہمدرد کھڑا کر دیتا، جیسا کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ابوطالب کو کھڑا کر دیا، جس نے مشرک ہونے کے باوجود کہا ؎

وَاللّٰهِ لَنْ يَّصِلُوْا إِلَيْكَ بِجَمْعِهِمْ حَتّٰى أُوَسَّدَ فِي التُّرَابِ دَفِيْنَا

''اللہ کی قسم! یہ لوگ اپنی جماعت کے ساتھ بھی تم تک نہیں پہنچیں گے، حتیٰ کہ مجھے مٹی میں دفن کر دیا جائے۔''

مگر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے دنیا کا کوئی سبب یا ذریعہ نہیں رہنے دیا جس کے ساتھ وہ آگ میں جلنے سے بچ جائیں۔ یہاں آزمائش اور امتحان میں ابراہیم علیہ السلام کی کمال کامیابی ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا کا ہر سہارا ختم ہونے اور شعلے مارتی ہوئی آگ سامنے دیکھنے کے باوجود انھوں نے نہ اللہ کی توحید کا دامن چھوڑا، نہ قوم کے سامنے جھکے، نہ کسی غیر کو پکارا، زبان سے نکلا تو یہی نکلا: (( حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ الذين قال لهم الناس...... ﴾ : ٤٥٦٤ ] ''مجھے اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔'' دوسری نشانی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا صدق آزما لیا تو آگ کو ان کے لیے برد و سلام بنا دیا، حالانکہ اس کا کام ہی جلانا ہے اور دنیا کے تمام ظاہری اسباب ختم ہونے کے باوجود کلمہ کن ( كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا ) کے ساتھ انھیں بچا لیا۔ تیسری نشانی یہ کہ جس اللہ نے دنیا کی تمام چیزوں میں مختلف خاصیتیں رکھی ہیں، وہ اپنے خاص بندوں کے لیے ان میں ان کے الٹ خاصیتیں پیدا کر دیتا ہے۔ پانی کا کام بہنا ہے، وہ اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات کے لیے الگ الگ پہاڑوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا۔ آگ کا کام جلانا ہے لیکن اللہ کے حکم سے وہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے گلزار بن گئی۔

چوتھی نشانی یہ کہ وہی مشرکین جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو پکڑا، باندھا اور آگ میں پھینک دیا، آگ سے نکلنے کے بعد انھیں

وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور اس نے کہا بات یہی ہے کہ تم نے اللہ کے سوا بت بنائے ہیں، دنیا کی زندگی میں آپس کی دوستی کی وجہ سے، پھر قیامت کے دن تم میں سے بعض بعض کا انکار کرے گا اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت کرے گا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہی ہے اور تمھارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۲۵﴾

ذرہ برابر نقصان نہ پہنچا سکے، حالانکہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ انھیں قید کر دیتے یا قتل کر دیتے، مگر یہ اللہ تعالیٰ کا زبردست ہاتھ تھا جس کے زیر حفاظت وہ ان کا بال بیکا نہ کر سکے۔ پانچویں نشانی یہ کہ اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے باوجود ان کی قوم کے لوگ کفر پر اڑے رہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب کوئی قوم انکار پر اڑ جاتی ہے تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی انھیں نفع نہیں دیتا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا سچ ہونا ثابت ہوا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ٦ ] ”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انھیں ڈرایا ہو یا انھیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔“ اور دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۱) اسی لیے فرمایا کہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے بہت سے نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں۔ ”لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ“ میں لام انتفاع کا ہے، یعنی ان نشانیوں سے فائدہ ایمان والے ہی اٹھاتے ہیں، ایمان سے محروم لوگوں کو ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

**آیت 25** ① وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ...... : ابراہیم علیہ السلام نے آگ سے نکلنے کے بعد بھی قوم کو نصیحت ترک نہیں کی، بلکہ سمجھایا کہ تمھارے ان بتوں کو شریک بنانے کی بنیاد کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں، محض ایک دوسرے کی دوستی کی وجہ سے تم نے انھیں شریک بنا رکھا ہے۔ یہ صرف اندھی تقلید، قومی مروّت و لحاظ اور باہمی تعلقات کا دباؤ ہے جس کی وجہ سے تم ان کی پرستش پر اڑے ہوئے ہو، مگر تمھاری یہ دوستی اور شرک و کفر پر اجماع و اتحاد صرف دنیا کی زندگی تک ہے۔

② ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ...... : یعنی پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے، تمھاری یہ دوستی شدید دشمنی میں بدل جائے گی اور تم سب ایک دوسرے کو لعنت کرو گے اور تمھارا ٹھکانا آگ ہی ہے۔ (”النَّارُ“ خبر پر الف لام کی وجہ سے حصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے) اور کوئی تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ الزخرف : ٦٧ ] ”سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔“ اور فرمایا: ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۥ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ٣٨ ] ”جب بھی کوئی جماعت (آگ میں) داخل ہوگی اپنے ساتھ والی کو لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جس وقت سب ایک دوسرے سے آملیں گے تو ان کی

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَ قَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞﴾

**تو لوط اس پر ایمان لے آیا اور اس نے کہا بے شک میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، یقیناً وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۞**

پچھلی جماعت اپنے سے پہلی جماعت کے متعلق کہے گی اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا، تو انھیں آگ کا دگنا عذاب دے۔ فرمائے گا سبھی کے لیے دگنا ہے اور لیکن تم نہیں جانتے۔'' اور فرمایا: ﴿وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا﴾ [ الأحزاب : ٦٧ ] ''اور کہیں گے اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انھوں نے ہمیں اصل راہ سے گمراہ کر دیا۔'' اور دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)۔

**آیت 26** ① **فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ** : ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے صحیح سلامت باہر آئے اور انھوں نے یہ نصیحت کی تو لوط علیہ السلام فوراً ہی ان پر ایمان لے آئے اور ان کے تابع فرمان ہو گئے، ان کے سوا کوئی اور ان پر ایمان نہیں لایا۔ فوراً کا مفہوم ''فاء'' سے نکل رہا ہے۔

② یہاں ایک سوال ہے کہ عام طور پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے کے لیے ''آمَنَ بِهٖ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، ''آمَنَ لَهٗ'' کا لفظ کسی کی بات کا اعتبار اور یقین کرنے کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا تھا: ﴿وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ﴾ [ يوسف : ١٧ ] ''اور تو ہرگز ہمارا اعتبار کرنے والا نہیں، خواہ ہم سچے ہوں۔'' تو یہاں ''آمَنَ لَهٗ'' لانے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب اکثر مفسرین نے تو یہ دیا ہے کہ ایمان لانے اور تصدیق کرنے کے لیے ''آمَنَ بِهٖ'' اور ''آمَنَ لَهٗ'' دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ جادوگروں کے ایمان لانے پر فرعون کا قول اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ ''اٰمَنْتُمْ لَهٗ'' نقل فرمایا ہے۔ (دیکھیے طٰہٰ: ۷۱) اور بعض جگہ ''اٰمَنْتُمْ بِهٖ'' (دیکھیے اعراف: ۱۲۳)۔ اس لیے ''آمَنَ بِهٖ'' اور ''آمَنَ لَهٗ'' کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابنِ جزیّ صاحبُ التسہیل نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں ''آمَنَ'' کے ضمن میں ''اِنْقَادَ'' (مطیع ہو گیا) کا مفہوم داخل ہے، اس لیے اس کا صلہ ''لَهٗ'' آیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ''تو اسی وقت لوط اس کے لیے تابع فرمان ہو گیا۔'' مفسرین میں سے بعض نے لوط علیہ السلام کو ابراہیم کا بھانجا اور اکثر نے بھتیجا بیان کیا ہے، قابل یقین دلیل کسی نے بھی ذکر نہیں فرمائی، البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ لوط علیہ السلام ان کی قوم اور ان کے شہر کے آدمی تھے۔

③ **وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ** ...... : ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی پوری قوم میں سے صرف ایک شخص ایمان لایا ہے تو ان سے ناامید ہو کر وہاں سے نکل پڑے، ان کے ساتھ ان کی بیوی سارہ اور لوط علیہ السلام بھی تھے، کچھ خبر نہ تھی کہاں جانا ہے، اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگے، میں تو وطن چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں۔ وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے، وہی میری حفاظت کرے گا، مجھے غلبہ عطا کرے گا اور جہاں اس کی حکمت کا تقاضا ہو گا مجھے لے جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی قوم سے نجات دلا کر اپنی حفاظت میں خیریت اور سلامتی کے ساتھ سرزمین شام میں پہنچا دیا، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ [ الأنبياء : ٧١ ]

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ

اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی اور ہم نے اسے اس کا اجر

''اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے جہانوں کے لیے برکت رکھی ہے۔'' قرآن مجید میں ارض مبارک سے مراد شام کی زمین ہوتی ہے۔ (دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل : ۱) ان کے ہجرت کر جانے کے بعد قوم پر جو گزری اس کے لیے سورۂ انبیاء کی آیات (۷۴، ۷۵) کے حواشی دیکھیے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو نمرود اور اس کی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجا، اس پر بھی جب یہ لوگ سرکشی سے باز نہ آئے تو ان پر مچھروں کا عذاب نازل ہوا۔ یہ مچھر ان لوگوں کا تو سب خون پی گئے، گوشت اور چربی سب کھا گئے، خالی ہڈیاں زمین پر گر پڑیں، مگر نمرود کے دماغ میں ایک مچھر چڑھ گیا جس کے سبب سے اس کے سر پر ایک مدت تک مار پڑتی رہی، اس ذلت کے بعد پھر وہ بھی ہلاک ہو گیا۔ طبری نے یہ بات تابعی زید بن اسلم کے قول سے نقل کی ہے، جس کا اسرائیلی روایت ہونا ظاہر ہے، اس لیے اس پر کسی صورت یقین نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی اسے قرآن کی تفسیر میں بیان کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ''لا ریب کتاب'' کی تفسیر بھی ''لا ریب'' ذریعے سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ اس حکایت میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہمارے کئی واعظ کئی سال تک اس مچھر کی وجہ سے نمرود کے سر پر جوتے مرواتے رہتے ہیں، حالانکہ مچھر بے چارے کی کل عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مسلمان واعظین کی عجائب پسندی نے اس بات کو ایک مسلّمہ حقیقت بنا دیا ہے۔

**آیت 27** ① **وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ** : اس آیت میں ایک لطیف فائدہ ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ابراہیم علیہ السلام پر آنے والے تمام مشکل حالات کو ایسے بہترین حالات کے ساتھ بدل دیا جو پہلے حالات کے بالکل الٹ تھے، یعنی قوم نے انھیں توحید کی دعوت کی وجہ سے آگ میں پھینکا، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سے خیریت و سلامتی کے ساتھ بچا لیا۔ وہ پوری قوم میں تنہا تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں انھیں اتنی اولاد عطا فرمائی جس سے دنیا بھر گئی۔ ان کے رشتے دار خود گمراہ اور مشرک تھے اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے اور شرک کی دعوت دینے والے تھے، جن میں ان کا باپ آزر بھی تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان رشتہ داروں کے بدلے میں ایسے رشتہ دار دیے جو خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کو ہدایت دینے والے تھے، یہ ان کی وہ اولاد تھی جن میں اللہ تعالیٰ نے نبوت اور کتاب رکھ دی۔ وہ اپنے وطن میں بے وطن تھے، تو اللہ تعالیٰ نے بابرکت زمین شام میں انھیں ٹھکانا عطا فرمایا۔ ان کے پاس مال و جاہ نہیں تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اتنا مال عطا فرمایا کہ وہ اچانک آنے والے چند مہمانوں کے لیے تھوڑی دیر میں بھنا ہوا بچھڑا لے آتے ہیں اور جاہ و مرتبہ اتنا عطا فرمایا کہ قیامت تک آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے ساتھ ان پر بھی درود بھیجا جاتا رہے گا۔ ایک وقت تھا کہ وہ اپنی قوم میں اس قدر بے حیثیت تھے کہ انھیں ایک بے نام شخص سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ سورۂ انبیاء میں ہے: ﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ [ الأنبياء : ٦٠ ] ''انھوں نے کہا ہم نے ایک جوان سنا ہے جسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔'' اور دعوتِ توحید کی وجہ سے ان کی قوم ان

فِي الدُّنْيَا ۚ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾

دنیا میں دیا اور بے شک وہ آخرت میں یقیناً صالح لوگوں سے ہے ﴿۲۷﴾

کی دشمن تھی، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں قیامت تک آنے والوں میں ایسی لسانِ صدق (سچی شہرت اور ناموری) عطا فرمائی کہ اب کم ہی کوئی شخص ہوگا جو انھیں نہ جانتا ہو۔ یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان سب ان سے محبت کرتے ہیں، ان کا ذکر اچھے سے اچھے طریقے سے کرتے ہیں اور ان کی طرف نسبت پر فخر کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اس بات کی بلا ریب شہادت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خاطر کوئی چیز ترک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے کہیں بہتر چیز عطا کرتا ہے۔

❷ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ : یعنی ابراہیم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد کے سوا کسی کو نبوت اور آسمانی کتاب نہیں دی گئی، جتنے انبیاء ہوئے ان کی اولاد سے ہوئے، اس لیے انھیں ابو الانبیاء کہا جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا ایک سلسلہ اسحاق و یعقوب علیہما السلام کا ہے، جس میں عیسیٰ علیہ السلام تک بہت سے حضرات کو نبوت ملی۔ دوسرا سلسلہ اسماعیل علیہ السلام کا ہے جس میں آخری نبی سید ولد آدم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔ زمخشری نے یہاں ایک سوال ذکر کیا ہے کہ یہاں ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق و یعقوب علیہما السلام عطا فرمانے کا ذکر ہے، اسماعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں، پھر خود ہی جواب دیا کہ یہاں ان کا اور سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی "وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ" کے ضمن میں موجود ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں اسماعیل علیہ السلام کا ذکر صراحت کے ساتھ نہ کرنے میں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اس سورت میں شروع سے اہل ایمان کی آزمائش اور امتحان کا ذکر آ رہا ہے، جس میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کا ذکر بھی ہے، ان کی آزمائش کے ذکر کے بعد ان پر انعامات کا ذکر ہے، جن میں صراحت کے ساتھ اسحاق و یعقوب علیہما السلام کا ذکر فرمایا، کیونکہ آزمائش کے خاتمے پر بڑھاپے میں ان کا ملنا انعام ہی انعام تھا۔ اسماعیل علیہ السلام بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کا انعام تھے، مگر ان کے ساتھ شدید قسم کے امتحانات بھی وابستہ تھے، مثلاً وادی غیر ذی زرع میں چھوڑنا، انھیں ذبح کرنے کا حکم دینا وغیرہ۔ اس لیے انعام کے تذکرے میں اس کا نام صراحت کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا، اگرچہ نبوت و کتاب عطا کی جانے والی اولاد میں ان کا ذکر بھی فرما دیا۔ (واللہ اعلم)

❸ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا : اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر اس آیت کے فائدہ (۱) میں گزرا ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''یعنی دنیا میں حق تعالیٰ نے مال، اولاد، عزت اور ہمیشہ کا نام دیا اور ملک شام ہمیشہ کے لیے ان کی اولاد کو بخشا۔'' (موضح)

❹ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ : یعنی دنیا میں دیے جانے والے اجر سے ان کے آخرت کے درجات میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ انھیں صالحین میں شمولیت کا شرف عطا کیا گیا جس کے حصول کی دعا اللہ کے جلیل القدر پیغمبر بھی کرتے رہے، جیسے سلیمان علیہ السلام نے دعا کی: ﴿وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [النمل : ۱۹] ''اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔'' اور یوسف علیہ السلام نے دعا کی: ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ [یوسف : ۱۰۱] ''مجھے

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۲۸ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ وَ تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِيۡلَ ۙ۬ وَ تَاۡتُوۡنَ فِيۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۝۲۹

اور لوط کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا بے شک تم یقیناً اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے نہیں کی ۲۸ کیا بے شک تم واقعی مردوں کے پاس آتے ہو اور راستہ کاٹتے ہو اور اپنی مجلس میں برا کام کرتے ہو؟ تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا ہم پر اللہ کا عذاب لے آ، اگر تو سچوں سے ہے ۲۹

---

مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔'' اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: (( مَا مِنْ نَبِيٍّ يَمْرَضُ إِلَّا خُيِّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَكَانَ فِيْ شَكْوَاهُ الَّذِيْ قُبِضَ فِيْهِ أَخَذَتْهُ بُحَّةٌ شَدِيْدَةٌ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ : ﴿ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيۡقِيۡنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴾ [ النساء : ٦٩ ] فَعَلِمْتُ أَنَّهُ خُيِّرَ )) [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ فاولٓئك مع الذين أنعم الله عليهم ...... ﴾ : ٤٥٨٦ ] ''جو بھی نبی بیمار ہوتا ہے اسے دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے۔'' اور آپ جس بیماری میں فوت ہوئے آپ کو بہت سخت کھانسی ہوئی، تو میں نے سنا آپ کہہ رہے تھے: ''ان لوگوں کے ساتھ (ملا دنے) جن پر تو نے انعام کیا نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صالحین میں سے۔'' تو میں نے جان لیا کہ آپ کو اختیار دے دیا گیا ہے۔''

5 اس آیت میں دینِ حق کی خاطر صبر کرنے میں ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کی ترغیب ہے۔

**آیت 28** وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ ...... : ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی لوط علیہ السلام کا ذکر فرمایا، کیونکہ وہ ان پر ایمان لائے اور دونوں نے اکٹھے ہجرت کی۔ لوط علیہ السلام کے واقعہ کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (رکوع ۱۰)، حجر (رکوع ۴، ۵)، انبیاء (رکوع ۵)، شعراء (رکوع ۹)، نمل (رکوع ۴)، صافات (رکوع ۴) اور قمر (رکوع ۲) اور آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۸۰) اور نمل (۵۴، ۵۵)۔

**آیت 29** 1 اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ وَ تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِيۡلَ: قطع سبیل (راستہ کاٹنے) سے مراد عام طور پر راہ زنی و ڈاکا مارنا لیا جاتا ہے، یعنی تم لوگ مسافروں سے ان کے مال چھین کر انھیں قتل کر دیتے ہو، یا زبردستی ان کے ساتھ برائی کا ارتکاب کرتے ہو، یا زیادتی کی کوئی بھی صورت اختیار کرتے ہو جس سے لوگوں کے لیے راہ چلنا خطرناک ہو جاتا ہے۔

2 وَ تَاۡتُوۡنَ فِيۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ : یعنی بدکاری اور بے حیائی کے کام چھپ کر نہیں بلکہ اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا ایک دوسرے کے سامنے کرتے ہو۔ اسی بات کو سورۂ نمل میں یوں فرمایا: ﴿ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴾ [ النمل : ٥٤ ]

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۳۰ وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝۳۱ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ٚ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ٞ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۲ وَ لَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالُوْا لَا تَخَفْ وَ لَا تَحْزَنْ ٙ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۳ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۳۴

اس نے کہا اے میرے رب! ان مفسد لوگوں کے خلاف میری مدد فرما ۝۳۰ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے تو انھوں نے کہا یقیناً ہم اس بستی والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، بے شک اس کے رہنے والے ظالم چلے آئے ہیں ۝۳۱ اس نے کہا اس میں تو لوط ہے۔ انھوں نے کہا ہم اسے زیادہ جاننے والے ہیں جو اس میں ہے، یقیناً ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو ضرور بچالیں گے، مگر اس کی بیوی، وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے ۝۳۲ اور جیسے ہی ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے وہ ان کی وجہ سے مغموم ہوا اور ان کے سبب دل میں تنگ ہوا اور انھوں نے کہا نہ ڈر اور نہ غم کر، بے شک ہم تجھے اور تیرے گھر والوں کو بچانے والے ہیں مگر تیری بیوی، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے ۝۳۳ بے شک ہم اس بستی والوں پر آسمان سے ایک عذاب اتارنے والے ہیں، اس وجہ سے جو وہ نافرمانی کیا کرتے تھے ۝۳۴

’’کیا تم اس طرح بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو کہ آنکھوں سے (اسے ہوتا) دیکھ رہے ہوتے ہو۔‘‘

③ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ ...... : یہاں ان کی قوم کا جواب یہ ذکر فرمایا ہے کہ انھوں نے کہا ہم پر اللہ کا عذاب لے آ، اگر تو سچوں سے ہے اور سورۂ اعراف اور سورۂ نمل میں ان کا جواب یہ ذکر فرمایا ہے کہ انھوں نے کہا انھیں اپنی بستی سے نکال دو، کیونکہ یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔ اب ہوسکتا ہے کہ پہلے تو لوط علیہ السلام کے سمجھانے پر انھوں نے بستی سے نکال دینے کی دھمکی دی ہو اور پھر ان کی نصیحت سے تنگ آ کر عذاب کا مطالبہ کر دیا ہو، یا ممکن ہے ترتیب اس کے برعکس ہو۔ (واللہ اعلم) یہ بات تو ظاہر ہے کہ انھوں نے لوط علیہ السلام کو یہ دونوں باتیں کیں۔

**آیت 30** قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ ...... : لوط علیہ السلام نے ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو کر یہ دعا کی کہ اے میرے رب! ان مفسد لوگوں کے خلاف میری مدد فرما۔ ’’الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ‘‘ میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ’’ان مفسد لوگوں‘‘ کیا گیا ہے۔ اللہ کے پیغمبر اپنی قوم پر بددعا اس وقت کرتے ہیں جب انھیں یقین ہو جائے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

**آیت 31 تا 34** وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ...... : ان آیات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۶۹ تا

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس سے ان لوگوں کے لیے ایک کھلی نشانی چھوڑ دی جو عقل رکھتے ہیں ﴿۳۵﴾ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا) تو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اور یوم آخر کی امید رکھو اور زمین میں فساد کرنے والے بن کر دنگا نہ مچاؤ ﴿۳۶﴾ تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، پس انھیں زلزلے نے پکڑ لیا تو وہ صبح کو اپنے گھر میں پڑے کے پڑے رہ گئے ﴿۳۷﴾ اور عاد اور ثمود کو (ہم نے ہلاک کیا) اور یقیناً ان کے رہنے کی کچھ جگہیں تمھارے

۸۲) اور سورۂ حجر (۵۱ تا ۷۹)۔

**آیت 35** وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً ...... : کھلی نشانی سے مراد اس بستی کے وہ آثار ہیں جو اب تک باقی ہیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام نے ان کی بستیوں کو زمین کی تہ سے اکھاڑا اور آسمان کے بادلوں تک اٹھا کر ان پر الٹا کر دے مارا (جس سے وہ سارا خطہ زمین کی سطح سے کافی نیچے دھنس گیا) اور ان پر تہ بہ تہ کھنگر والے پتھروں کی بارش برسائی، جو رب تعالیٰ کی طرف سے نشان والے تھے۔ یہ واقعہ نشانی اس لحاظ سے ہے کہ یہ علاقہ اس تجارتی شاہراہ پر واقع ہے جو مکہ سے شام کو جاتی ہے اور کفار مکہ اسے تجارتی سفروں میں آتے وقت اور جاتے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے کہ اس حد سے گزرنے والی قوم کا انجام کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا تذکرہ سورۂ حجر (۷۶) اور سورۂ صافات (۱۳۷) میں فرمایا ہے۔

**آیت 37,36** وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ...... : ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (رکوع ۱۱) اور سورۂ ہود (رکوع ۸) "وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ" "رَجَاءٌ" کا معنی امید ہے، یہ خوف کے معنی میں بھی آتا ہے، کیونکہ امید اور خوف لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی آخرت کے آنے کی امید رکھو، یہ نہ سمجھو کہ زندگی بس دنیا ہی کی ہے، اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ آخرت کے دن کی امید رکھو کہ اس میں تمھارے نیک اعمال کا پورا بدلا ملے گا۔

**آیت 38** ① وَعَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ...... : "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ "ان کے رہنے کی کچھ جگہیں تمھارے سامنے آ چکی ہیں" ظاہر ہے کہ ان کے شہر اور آبادیاں تو اللہ کے عذاب سے تباہ و برباد ہو چکی تھیں، مگر ان کے آثار اور بچے کھچے کچھ گھر عبرت کے سامان کے طور پر باقی تھے۔ عاد اور ثمود دونوں قومیں جن علاقوں میں آباد تھیں وہ معروف شاہراہوں پر واقع تھے اور عرب کے تمام لوگ ان سے واقف تھے۔ جنوبی عرب کا پورا علاقہ جو اب احقاف، یمن اور حضر موت کے نام سے معروف ہے، قوم عاد کا مسکن تھا اور حجاز کے شمالی حصہ میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ و خیبر سے تیماء اور تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے۔ جس زمانے میں قرآن اترا ہے یقیناً اس

مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۟ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۟ۙ﴿۳۸﴾ وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ ۟ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۚ﴿۳۹﴾

سامنے آچکی ہیں اور شیطان نے ان کے لیے ان کے کام مزین کر دیے، پس انھیں اصل راستے سے روک دیا، حالانکہ وہ بہت سمجھ دار تھے ﴿۳۸﴾ اور قارون اور فرعون اور ہامان کو، اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آیا، تو وہ زمین میں بڑے بن بیٹھے اور وہ بچ نکلنے والے نہ تھے ﴿۳۹﴾

وقت وہ آثار اور زیادہ نمایاں ہوں گے۔

② وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ : "أَبْصَرَ يُبْصِرُ" دیکھنا، صاحب بصیرت ہونا۔ "اِسْتَبْصَرَ يَسْتَبْصِرُ" میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا، یعنی وہ بہت بصیرت والے، نہایت سمجھ دار تھے، مگر ان کی ساری بصیرت اور ساری سمجھ داری دنیا تک محدود تھی۔ دنیا کے کاموں میں بڑے ہوشیار اور فنکار تھے، اپنے دور کے نہایت ترقی یافتہ اور طاقت ور لوگ تھے۔ لیکن شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے ایسے خوش نما بنائے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کی مت ماردی اور آخرت سے مکمل طور پر بیگانہ کر دیا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اکثر لوگوں کا یہی حال بیان فرمایا ہے: ﴿ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖۚ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ [ الروم : ٦، ٧ ] "اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہ دنیا کی زندگی میں سے ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے، وہی غافل ہیں۔" ان آیات کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ بہت سمجھ دار تھے، بڑے صاحب بصیرت تھے، انھیں خوب علم تھا کہ پیغمبر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے، مگر وہ اپنی لذتوں میں ایسے غرق تھے اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال ایسے مزین کر دیے تھے کہ وہ جاننے بوجھنے کے باوجود اپنی لذتیں چھوڑ کر راہ حق پر آنے کے لیے تیار نہیں تھے، عناد اور سرکشی کی بنا پر انبیاء کی مخالفت کرتے تھے۔ یہی حال اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کا بیان فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب معجزات لے کر ان کے پاس آئے تو: ﴿ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [ النمل : ١٤ ] "اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل ان کا اچھی طرح یقین کر چکے تھے، پس دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔" دونوں تفسیریں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

③ پہلے پیغمبروں اور ان کی امتوں کے ان واقعات میں کفار قریش کے لیے تنبیہ اور عبرت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کی صورت میں ان کا انجام بھی پہلے جھٹلانے والوں جیسا ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے تسلی اور حوصلہ ہے کہ آزمائشوں اور مشکلات کے بعد آخر انھی کو کامیابی حاصل ہوگی۔

**آیت 39** وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ...... : پچھلی آیات میں کافر اور متکبر اقوام کا ذکر تھا، اس آیت میں ابوجہل، امیہ

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۰

تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے ۝۴۰

ابن خلف، عتبہ، شیبہ، ابولہب اور قریش کے دوسرے بڑے بڑے کافر اور متکبر سرداروں کے لیے بطور مثال گزشتہ چند کافر اور متکبر افراد کا ذکر فرمایا جو اپنے کفر و تکبر کی وجہ سے اپنی اور اپنی قوم کی بربادی کا باعث بنے۔ ان میں قارون دولت کی کثرت کی وجہ سے کفر و تکبر کی مثال ہے، فرعون حکومت کی وجہ سے اور ہامان وزارت کی وجہ سے۔ ان تینوں کے پاس موسیٰ علیہ السلام واضح معجزات لے کر آئے، مگر وہ سرزمین مصر میں بڑے بن بیٹھے اور ایمان لانے سے انکار کر دیا، پھر جب اللہ کا عذاب آیا تو ایک بھی ایسا نہ تھا کہ اس کی گرفت سے بچ نکلتا۔

**آیت 40** ① فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ...... : تو ہم نے ان میں ہر ایک کو اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑ لیا۔ ”فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا“ ”حَاصِبًا“ سخت آندھی جو سنگریزے اور پتھر اڑا کر لائے، یعنی پھر ان میں کچھ وہ تھے جن پر ہم نے پتھراؤ والی آندھی بھیجی۔ اس سے مراد قومِ عاد ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت ٹھنڈی، سخت تیز اور کنکر و پتھر اڑانے والی آندھی بھیجی جو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی، جس کے ساتھ تمام کافر اس طرح گرے پڑے تھے جیسے گرے ہوئے کھجور کے درختوں کے تنے ہوں۔ دیکھیے سورۂ حاقہ (۵ تا ۸) اور سورۂ قمر (۱۹، ۲۰) بعض مفسرین نے ان لوگوں سے مراد قومِ لوط لی ہے، کیونکہ ان کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ﴾ [القمر : ۳۴] ”بے شک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ایک ہوا بھیجی سوائے لوط کے گھر والوں کے۔“ اور غرق ہونے والوں سے مراد نوح علیہ السلام کی قوم اور چیخ والوں سے مراد شعیب علیہ السلام کی قوم لی ہے، مگر ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے کی آیات میں نوح، لوط اور شعیب علیہم السلام کی قوم پر آنے والے عذابوں کا ذکر گزر چکا ہے، یہاں سے عاد اور اس کے بعد کے لوگوں پر آنے والے عذابوں کا ذکر ہے، اس لیے یہاں پتھراؤ والی آندھی سے ہلاک ہونے والوں سے مراد قومِ عاد ہی ہے۔

② وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ : اس سے مراد قومِ ثمود ہے، اگرچہ شعیب علیہ السلام کی قوم بھی ”الصَّيْحَةُ“ (چیخ) سے ہلاک ہوئی، مگر اس کی گرفت کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

③ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ : اس سے مراد قارون ہے، جیسا کہ سورۂ قصص کی آیت (۸۱) میں گزرا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾

ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اللہ کے سوا اور مددگار بنا رکھے ہیں مکڑی کی مثال جیسی ہے، جس نے ایک گھر بنایا، حالانکہ بے شک سب گھروں سے کمزور تو مکڑی کا گھر ہے، اگر وہ جانتے ہوتے ﴿۴۱﴾ یقیناً اللہ جانتا ہے جسے وہ اس کے سوا پکارتے ہیں کوئی بھی چیز ہو اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۴۲﴾

④ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا : اس سے مراد فرعون، ہامان اور ان کی قوم ہے۔ ویسے الفاظ کے عموم کی وجہ سے اگر ”حَاصِبًا“ والوں سے مراد قومِ عاد اور قومِ لوط دونوں اور ”الصَّيْحَةُ“ والوں سے مراد قومِ ثمود اور قومِ شعیب دونوں اور غرق ہونے والوں سے مراد آل فرعون اور قوم نوح دونوں لیے جائیں تو کوئی مانع نہیں۔

⑤ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ ...... : ”كَانَ“ استمرار کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کبھی بھی ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرے، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے اور ایسے افعال کا ارتکاب کرتے تھے جن کا نتیجہ ان پر عذاب اور ان کی ہلاکت اور بربادی تھا۔

**آیت 41** مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ...... : اللہ کے عذاب کے ساتھ ہلاک ہونے والی تمام اقوام اور تمام افراد کا اصل جرم اور اپنی جان پر ظلم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور مددگار اور مشکل کُشا بنا رکھے تھے، اب مکہ کے مشرکوں نے بھی انھی کی روش اپنا رکھی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مثال دے کر واضح فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی کو مددگار سمجھنے والوں کی مثال مکڑی کی ہے جو گھر بناتی ہے، گھر کا فائدہ یہ ہے کہ وہ سردی، گرمی، بارش، آندھی اور حملہ آور سے بچاتا ہے، مگر مکڑی کا گھر نہ اسے سردی سے بچاتا ہے نہ گرمی سے، نہ بارش یا طوفان سے نہ ہی کسی حملہ آور سے، بلکہ اتنا بودا اور ناپائیدار ہوتا ہے کہ ہاتھ کے معمولی سے اشارے سے نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود، حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھنا بالکل ایسے ہی بے فائدہ ہے، کیونکہ وہ کسی کے کام نہیں آ سکتے۔ اللہ کے سوا تمام سہارے بیکار ہیں، اگر وہ کوئی مدد کر سکتے تو گزشتہ اقوام کو تباہی سے بچا لیتے، مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ انھیں نہیں بچا سکے۔

**آیت 42** ① اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ ...... : ممکن تھا عنکبوت کی مثال سن کر کوئی شخص تعجب کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو مکڑی جیسا بے بس اور بے اختیار بنا دیا، کسی کو مستثنیٰ نہ کیا، بعض لوگ بتوں کو پوجتے ہیں، بعض آگ کو، بعض پانی کو جب کہ وہ لوگ بھی ہیں جو فرشتوں اور انبیاء و اولیاء کو پوجتے اور پکارتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ لوگ اللہ کے سوا جس کسی کو بھی پکارتے ہیں اسے سب معلوم ہیں، اگر ان میں سے کسی کے پاس بھی کچھ قدرت یا اختیار ہوتا تو اللہ تعالیٰ سب کی سرے سے نفی نہ کرتا۔

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾

ع ۱۶

اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں ﴿۴۳﴾ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، بلاشبہ اس میں ایمان والوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے ﴿۴۴﴾

② وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : یعنی اللہ خود سب پر غالب ہے، اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں اور وہ کمال حکمت والا ہے، اسے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔

③ اس آیت کا ایک اور ترجمہ بھی ہو سکتا ہے ''یقیناً اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ اس کے سوا کسی بھی چیز کو نہیں پکارتے۔'' یعنی اسے چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں اور عزیز و حکیم بس وہی ہے۔

آیت 43 ① وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ : یہ کفار کے اس سوال کا جواب ہے کہ مکڑی، مچھر اور مکھی وغیرہ جیسی حقیر چیزوں کی مثال کی کیا ضرورت تھی؟ جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ﴾ [ البقرۃ : ۲۶ ] ''اور رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں اللہ نے اس کے ساتھ مثال دینے سے کیا ارادہ کیا؟'' جواب دیا کہ مثال کا مقصد بات کو سمجھانا ہوتا ہے، کیونکہ مثال سے بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے، مگر ان مثالوں کو صرف علم والے سمجھتے ہیں۔

② وَ مَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ : ''الْعٰلِمُوْنَ'' (جاننے والوں) سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں پر سوچ بچار کرتے ہیں، ایسے لوگ ہی راسخ فی العلم کہلانے کے حق دار ہیں۔

آیت 44 ① خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ : یعنی کائنات کا یہ نظام حق پر قائم ہے۔ اس نے اسے نہایت حکمت سے بنایا ہے، بے فائدہ اور بے مقصد نہیں بنایا۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۱۶) اور دخان (۳۸)۔

② اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ : زمین و آسمان کی پیدائش میں صرف ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں، کیونکہ وہی ان پر غور کرتے ہیں، دوسرے لوگ زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار قدرتوں اور نشانیوں کے پاس سے گزر جاتے ہیں مگر دھیان ہی نہیں کرتے۔ (دیکھیے سورۂ یوسف : ۱۰۶) جو لوگ دل میں جذبۂ ایمان رکھتے ہوئے اس نظام کائنات پر غور کریں گے ان پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ یہ نظام نہ کسی خالق کے بغیر بنا ہے اور نہ اس کے ایک سے زیادہ خالق ہو سکتے ہیں، بس ایک ہی ذات پاک ہے جس نے اسے پیدا کیا اور وہی اس کی حق دار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ انھی غور و فکر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ''لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ'' قرار دیا ہے۔ (دیکھیے بقرہ : ۱۶۴) اور انھی کو ''لِاُولِي الْاَلْبَابِ'' قرار دیا ہے۔ (دیکھیے آل عمران : ۱۹۰)

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ

اس کی تلاوت کر جو کتاب میں سے تیری طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کر، بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے

**آیت 45** ① اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ...... : مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر جو ظلم وستم ہو رہا تھا اور انھیں ایمان پر ثابت قدم رہنے میں جو مشکلات پیش آرہی تھیں سورت کے شروع سے یہاں تک انھیں ان مشکلات کو برداشت کرنے اور ان پر استقامت اختیار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی آزمائش کی سنت بیان کی گئی۔ اس کے نمونے کے لیے پہلے اولوالعزم پیغمبروں کی آزمائش اور ان کی قوموں کے شدید معاندانہ رویے پر ان کے صبر کو بیان کیا گیا، ساتھ ہی نافرمان اقوام کا عبرت ناک انجام ذکر کیا گیا۔ مقصد مسلمانوں کو تسلی دینا اور مشکل سے مشکل حالات میں استقامت کی تلقین ہے۔ اب وہ عملی تدبیر بتائی جس سے مومن میں وہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ باطل کے مقابلے میں کھڑا رہ سکتا ہے اور اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے احکام پر کاربند رہ سکتا ہے جب ہر طرف بے حیائی اور برائی کا دور دورہ اور اس کی زبردست اشاعت اور ترغیب موجود ہو۔

② اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ : اس مقصد کے لیے پہلا حکم کتاب اللہ کی تلاوت ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ دوسرے مقامات پر دوسرے لوگوں کو پڑھ کر سنانے کا حکم ہے، مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے: ﴿ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ﴾ [ المائدۃ : ۲۷ ] ’’اور ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر کی تلاوت حق کے ساتھ کر۔‘‘ سورۂ اعراف میں ہے: ﴿ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا ﴾ [ الأعراف : ۱۷۵ ] ’’اور انھیں اس شخص کی خبر پڑھ کر سنا جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں تو وہ ان سے صاف نکل گیا۔‘‘ سورۂ یونس میں ہے: ﴿ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ﴾ [ یونس : ۷۱ ] ’’اور ان پر نوح کی خبر پڑھ۔‘‘ اور سورۂ شعراء میں ہے: ﴿ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ [ الشعراء : ۶۹ ] ’’اور ان پر ابراہیم کی خبر پڑھ۔‘‘ مگر اس مقام پر مطلق تلاوت کا حکم ہے، جس میں سب سے پہلے خود تلاوت کا حکم ہے، پھر تمام لوگوں کے لیے تلاوت کا حکم ہے، ایک اور مقام پر بھی اسی طرح مطلق تلاوت کا حکم ہے، فرمایا: ﴿ وَ اتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴾ [ الکھف : ۲۷ ] ’’اور اس کی تلاوت کر جو تیری طرف تیرے رب کی کتاب میں سے وحی کی گئی ہے، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور نہ اس کے سوا تو کبھی کوئی پناہ کی جگہ پائے گا۔‘‘ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو سننے اور اس کی تلاوت سے دل کو سکون و ثبات حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴾ [ الفرقان : ۳۲ ] ’’اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ قرآن اس پر ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے اتارا) تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا، خوب ٹھہر کر پڑھنا۔‘‘

قرآن کی تلاوت ہی سے دل میں ایمان، کردار کی پختگی اور مصائب و مشکلات برداشت کرنے کی طاقت پیدا ہوتی ہے اور یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ جس شاعر یا مصنف کا کلام بار بار پڑھا جائے آدمی کو اس سے محبت ہو جاتی ہے، اس لیے

وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

روکتی ہے اور یقیناً اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ﴿۴۵﴾

قرآن کی تلاوت اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، پھر اس میں مذکور اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی صفات، اس کے احکام و مواعظ اور پہلی امتوں اور پیغمبروں کے واقعات بار بار پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کا دین ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے، جس سے اس پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔ رات کے قیام میں اس کی تلاوت کی برکات کا تو شمار ہی نہیں۔ (دیکھیے سورۂ مزمل) اس طرح کثرتِ تلاوت کے ساتھ قرآن سینے میں محفوظ ہو جاتا اور محفوظ رہتا ہے، جس پر آدمی خود بھی عمل کر سکتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت و تبلیغ کر سکتا ہے اور اس کی تعلیم دے سکتا ہے، اگر اس کی تلاوت میں سستی کی جائے تو یہ بہت جلد سینے سے نکل جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( تَعَاهَدُوا الْقُرْآنَ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَهُوَ أَشَدُّ تَفَصِّيًا مِنَ الْإِبِلِ فِيْ عُقُلِهَا )) [ بخاري، فضائل القرآن، باب استذكار القرآن و تعاهده : ۵۰۳۳ ] ''قرآن کا دھیان رکھو، کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ اس سے بھی جلدی چھوٹ کر نکل جاتا ہے جتنی جلدی اونٹ اپنی رسیوں میں سے نکل جاتے ہیں۔'' بڑے ہی بدنصیب ہیں وہ لوگ جو قرآن کو محض ایک خط قرار دے کر اس کی تلاوت کو بے کار مشغلہ قرار دیتے ہیں۔

③ اگرچہ قرآن کی تلاوت جس طرح بھی ہو فائدے اور ثواب سے خالی نہیں، مگر اس کا حقیقی فائدہ تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب اسے سمجھ کر پڑھا جائے، کیونکہ اس کے بغیر اس پر تدبر ممکن نہیں، جو اس کا اصل مقصد ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ [ محمد : ۲۴ ] ''تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا کچھ دلوں پر ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں؟'' سمجھ کر پڑھنے ہی سے آدمی اس پر عمل کر سکتا ہے اور اسی سے اس میں باطل سے مقابلے کا جذبہ اور اس کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اکثر اہلِ کتاب کی بربادی کا باعث یہی ہوا کہ وہ تعلیم اور عمل کے بغیر تورات کے لفظوں کی تلاوت پر قانع ہو گئے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۷۸) کی تفسیر۔ آج کل مسلمانوں کی اکثریت کا بھی یہی حال ہے۔ کتاب اللہ کی تلاوت میں اس کا لوگوں کو سنانا اور دعوت دینا بھی شامل ہے۔

④ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ : دوسرا حکم نماز کی اقامت کا ہے، کیونکہ اس سے آدمی میں اپنے رب کے ساتھ وہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے لیے ہر مصیبت اور مشکل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۴۵، ۴۶) ''اقامتِ صلاۃ'' میں صلاۃ سے مراد تمام فرض نمازیں ہیں اور قائم کرنے سے مراد انھیں درست طریقے سے ادا کرنا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۳) کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

⑤ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ : ''اِنَّ'' عموماً تعلیل کے لیے ہوتا ہے، یعنی نماز قائم کرنے کا حکم اس لیے ہے کہ نماز ''الْفَحْشَآءِ'' اور ''الْمُنْكَرِ'' سے روکتی ہے۔ ''الْفَحْشَآءِ'' کوئی بھی قول یا فعل جس میں بہت بڑی قباحت ہو۔ (راغب) مثلاً زنا وغیرہ اور ''الْمُنْكَرِ'' وہ قول و عمل جس کا انسانی فطرت اور عقل انکار کرتی ہو۔ نماز کے بے حیائی اور برائی سے روکنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ نماز میں یہ تاثیر ہے کہ اس سے انسان بے حیائی اور برائی سے باز آ جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ نماز کا نمازی سے تقاضا یہ ہے کہ وہ بے حیائی اور برائی سے باز آ جائے۔ یہ دونوں مطلب درست ہیں اور ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ آدمی جو نماز کو اس کے اوقات پر جماعت کے ساتھ ادا کرے، اس کے ارکان و شروط اور خشوع کا خیال رکھتے ہوئے صحیح طریقے سے ادا کرے، اس میں پڑھی جانے والی فاتحہ اور دوسری دعاؤں کے ذریعے سے دل کی حاضری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مناجات کرے اور بار بار ”رَبِّ اغْفِرْلِيْ“ اور استغفار کی دوسری دعاؤں کے ساتھ بخشش کی درخواست کرے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرے، تو یقیناً نماز اسے بے حیائی اور برائی سے روک دے گی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: (( إِنَّ فُلَانًا يُصَلِّيْ بِاللَّيْلِ ، فَإِذَا أَصْبَحَ سَرَقَ قَالَ إِنَّهُ سَيَنْهَاهُ مَا تَقُوْلُ )) [ مسند أحمد : ۴۴۷/۲، ح : ۹۷۹۲، قال المحقق صحیح ] ”فلاں شخص رات نماز پڑھتا ہے، جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عنقریب اس کا یہ عمل اسے اس کام سے روک دے گا جو تو کہہ رہا ہے۔“ یہاں ایک سوال ہے کہ کیا وجہ ہے کہ کئی لوگ نماز ادا کرتے ہیں مگر بے حیائی اور برائی سے باز نہیں آتے؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ اگر وہ نماز کو اخلاص اور اس کے ارکان و آداب اور خشوع کا خیال رکھتے ہوئے دل کی حاضری کے ساتھ روزانہ پانچ مرتبہ مسجد میں باجماعت ادا کرتے تو یقیناً ان کی نماز انھیں فحشاء اور منکر سے باز رکھتی۔ اگر اس کا یہ اثر ظاہر نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں خلل ہے، دوا کے اجزا پورے نہیں، تبھی شفا نہیں ہوئی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نماز تو کہتی ہے کہ جب تو ہر کام چھوڑ کر مسجد میں آ گیا، تیرے باوضو ہونے سے اور تیرے ادا کیے جانے والے الفاظ سے تیرے رب کے سوا کوئی واقف نہیں، پھر بھی تو بے وضو نماز نہیں پڑھتا، نماز میں فضول بات نہیں کرتا، تو جس رب کے ڈر سے نماز میں اس کی نافرمانی سے پرہیز کرتا ہے نماز کے بعد بھی تجھے اس کے خوف سے ہر بے حیائی اور برائی سے اجتناب لازم ہے۔ نماز بہرحال بے حیائی اور برائی سے منع کرتی ہے، کوئی اس کا کہا نہ مانے تو اس کی مرضی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ بھی بے حیائی اور برائی سے منع کرتا ہے، فرمایا: ﴿ وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [ النحل : ۹۰ ] ”اور اللہ بے حیائی اور برائی اور سرکشی سے منع کرتا ہے، وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔“ پھر کوئی اس کا حکم مانتا ہے، کوئی نہیں مانتا۔

6 اس مقام پر کتبِ تفسیر میں چند احادیث مروی ہیں جو سنداً ثابت نہیں ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں سے وہ روایات اس کے محقق دکتور حکمت بن بشیر کی تحقیق کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں: ① ابن ابی حاتم نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان ” اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ “ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ لَّمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ )) ”جس شخص کی نماز اسے فحشاء اور منکر سے نہ روکے اس کی کوئی نماز نہیں۔“ اس کی سند میں ایک راوی عمر بن ابی عثمان مجہول ہے۔ ② ابن ابی حاتم اور طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ لَّمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ لَمْ يَزْدَدْ بِهَا مِنَ اللّٰهِ إِلَّا بُعْدًا )) ”جس شخص کی نماز اسے بے حیائی اور برائی سے نہ روکے اس نماز کے ساتھ اس کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوری ہی میں

اضافہ ہوگا۔'' یہ روایت لیث بن ابی سلیم راوی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ③ ابن جریر طبری نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يُطِعِ الصَّلَاةَ وَطَاعَةُ الصَّلَاةِ تَنْهَاهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ» ''جو شخص نماز کی اطاعت نہ کرے اس کی نماز نہیں اور نماز کی اطاعت اسے فحشاء اور منکر سے روکے گی۔'' اس کی سند میں دو راوی جویبر اور حسین (بن داؤد) ضعیف ہیں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی ضحاک کی ان سے ملاقات ثابت نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان تمام روایات کے متعلق فرمایا: ''زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف (صحابہ کے اقوال) ہیں (مگر صحابہ سے بھی اکثر اقوال کی سند کمزور ہے)۔'' یہ روایات جن میں برائی سے نہ روکنے والی نماز کو کالعدم اور اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث بیان کیا گیا ہے، ان کی حقیقت میں نے اس لیے بیان کر دی ہے کہ ایسا فتویٰ لگانے والا شخص فتویٰ کی سنگینی پر غور کرے اور اس بات پر بھی کہ وہ نبی ﷺ کے ذمے ایسی بات لگا رہا ہے جو آپ ﷺ سے ثابت نہیں۔

⑦ **وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ** : اس کے تین مطلب بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور وہ کیوں نہ روکے گی جب کہ وہ اللہ کا ذکر ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ [ طٰہٰ : ۱۴ ] ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔'' اور یقیناً اللہ کا ذکر اور اس کی یاد برائی اور بے حیائی سے روکنے میں سب سے بڑی چیز ہے۔ دوسرا یہ کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور یقیناً اللہ کا ذکر اور اس کی یاد نماز میں ہو یا اس کے بعد، فحشاء اور منکر سے روکنے میں سب سے بڑی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کا دھیان اور ہر وقت اسے پیش نظر رکھنا ہی آدمی کو گناہ سے باز رکھتا ہے اور گناہ اسی وقت سرزد ہوتا ہے جب آدمی اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے۔ اوپر کے دونوں مطلب اس وقت ہیں جب لفظ ''ذِكْرُ'' اپنے مفعول کی طرف مضاف مانا جائے اور ترجمہ یہ کیا جائے کہ (بندے کا) اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا سب سے بڑی بات ہے۔ تیسرے مطلب کے مطابق لفظ ''ذِكْرُ'' اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے، ترجمہ یہ ہوگا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا (اپنے بندے کو) یاد کرنا سب سے بڑی بات ہے۔ یعنی نماز میں بندہ اپنے رب کا ذکر کرتا اور اسے یاد کرتا ہے تو یہ بڑی بات ہے، لیکن اس کے جواب میں ادھر سے اللہ تعالیٰ جو بندے کا ذکر کرتا اور اسے یاد کرتا ہے یہ سب سے بڑی بات ہے۔ یہ تفسیر امام طبری نے معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمائی ہے۔ اس تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ﴾ [ البقرۃ : ۱۵۲ ] ''سو تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو۔''

⑧ بعض مفسرین نے نماز کے برائی اور بے حیائی سے روکنے کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ جتنی دیر آدمی نماز میں رہے گا کم از کم اتنی دیر تو بے حیائی اور برائی سے باز رہے گا۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''جتنی دیر نماز میں لگے اتنا تو ہر گناہ سے بچے، امید ہے آگے بھی بچتا رہے اور اللہ کی یاد کو اس سے زیادہ اثر ہے، یعنی گناہ سے بچے اور اعلیٰ درجوں پر چڑھے۔'' (موضح) بعض لوگوں نے اس تفسیر پر اعتراض کیا ہے کہ نماز کے علاوہ بھی کئی کام ہیں جن میں مصروف رہنے تک آدمی گناہ سے بچا رہتا ہے، مگر یہ اعتراض بے سود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ صرف نماز ہی بے حیائی سے روکتی ہے۔

وَ لَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور اہلِ کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، مگر وہ لوگ جنھوں نے ان میں سے ظلم کیا اور کہو ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور تمھاری طرف نازل کیا گیا اور ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۴۶﴾

---

⑨ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ : یعنی نیک یا بد جو بھی عمل تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور تمھیں اس کی جزا یا سزا دے گا۔ اس میں بشارت بھی ہے اور نذارت بھی۔ یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ آیت کے شروع میں "اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ" کے مخاطب اگرچہ نبی کریم ﷺ ہیں، مگر مراد آپ کے ساتھ پوری امت بھی ہے، اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

**آیت 46** ① وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ...... : یعنی مشرکوں کا دین جڑ سے غلط ہے اور کتاب والوں کا دین اصل میں سچ تھا تو ان سے ان کی طرح نہ جھگڑو کہ جڑ سے ان کی بات کاٹو، بلکہ نرمی سے واجبی بات سمجھاؤ، مگر ان میں جو (صریح) بے انصافی پر (اتر) آئے اس کی سزا وہی ہے (یعنی اس کے ساتھ اس کے جرم کے مطابق سلوک کرو)۔ (موضح)

② کتاب اللہ کی تلاوت کے حکم کے بعد فرمایا کہ اہل کتاب میں سے جو اسے سن کر سمجھنے کے لیے بحث کرے اس کے ساتھ ایسے طریقے ہی سے بحث کرو جو بہتر سے بہتر ہو سکتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ وہ راہِ راست اختیار کرے۔ دوسری آیت میں یہ حکم عام ہے اور دعوتِ دین میں ہر ایک کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کرنے کا حکم ہے، فرمایا: ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [ النحل : ۱۲۵ ] "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔ بے شک تیرا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا اور وہی ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ۳۴ ] "اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) کے ساتھ ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہو گا جیسے وہ دلی دوست ہے۔" اور جیسا کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجتے ہوئے حکم دیا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۴۴ ] "پس اس سے بات کرو، نرم بات، اس امید پر کہ وہ نصیحت حاصل کر لے، یا ڈر جائے۔"

③ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ : یعنی ان میں سے جو ظلم پر اڑ جائیں، ضد اور تعصب برتیں اور حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، پھر مناظرے و مباحثے بے سود ہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ بات میں سختی جائز ہے اور آگے چل کر ان کے ساتھ جدال کے

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی، پھر وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی، اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان (مشرکین) میں سے بھی کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر جو کافر ہیں ﴿۴۷﴾

---

بجائے قتال ہوگا، اس وقت تک کہ ایمان لے آئیں یا جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۲۹ ] ”لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔“ مکی سورتوں میں آنے والے وقت میں کفار کے ساتھ قتال کے اشارے کئی جگہ موجود ہیں۔

④ **وَ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا** : اس میں ہمیں حکم ہے کہ بحث مباحثہ میں اہل کتاب جب کوئی ایسی بات بیان کریں جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ صحیح ہے یا غلط، سچ ہے یا جھوٹ، تو ہم نہ اسے جھوٹا کہیں، کیوں کہ ہوسکتا ہے وہ سچ ہو اور نہ سچا کہیں، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ جھوٹ ہو، بلکہ اس پر مجمل ایمان رکھیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہو، نہ اس میں کوئی تبدیلی ہوئی ہو اور نہ کوئی تاویل اور یہ کہیں ”ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو تمھاری طرف نازل کیا گیا۔“ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « كَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَءُوْنَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ ، وَ يُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُصَدِّقُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ، وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَ﴿ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا ﴾ » [ بخاري، التفسير، باب: ﴿ قولوا آمنا باللہ ...... ﴾ : ۴۴۸۵ ] ”اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور اہل اسلام کے لیے اس کی تفسیر عربی زبان میں کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اہل کتاب کو نہ سچا کہو اور نہ انھیں جھوٹا کہو اور یہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا۔“ واضح رہے کہ پہلی کتابوں کے متعلق اجمالی طور پر یہ تسلیم کرنا تو ضروری ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی ہیں، مگر عمل صرف قرآن وحدیث پر کیا جائے گا۔ اس مضمون کی مزید تفصیل کے لیے اس تفسیر کے مقدمہ میں اسرائیلیات کا عنوان ملاحظہ فرمائیں۔

⑤ **وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ** ...... : یعنی اہل کتاب کو اپنے اور ان کے درمیان مشترک مسائل پیش کر کے قائل کرنے کی کوشش کرو، جن میں سب سے اہم چیز اللہ تعالیٰ کی توحید ہے، جو اب بھی تحریف کے باوجود تورات اور انجیل میں جابجا موجود ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران کی آیت (۶۴) کی تفسیر۔

**آیت 47** ① **وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ** : یعنی جس طرح ہم نے آپ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں پر

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ

**اور تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا، اس وقت باطل والے**

کتاب نازل کی ایسے ہی آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی۔

② فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی'' سے مراد تمام اہل کتاب نہیں، کیونکہ جس نے کتاب پڑھی ہی نہیں یا اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی یا اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور اس میں تحریف و تبدل سے کام لیا تو وہ درحقیقت ان لوگوں میں شامل ہی نہیں جنھیں کتاب دی گئی، کیونکہ انھوں نے اسے اس طرح لیا ہی نہیں جیسے لینا چاہیے تھا۔ یعنی وہ لوگ جنھیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی اور وہ فی الواقع اس کا اتباع کرتے ہیں وہ اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں، کیونکہ دونوں کا مضمون اصولی طور پر ایک ہے اور پہلی کتابوں کی کوئی خوبی ایسی نہیں جو اس میں موجود نہ ہو، بلکہ یہ کتاب تو پہلی کتابوں پر مہیمن (نگران) ہے اور یہ زندۂ جاوید معجزہ ہے، تو حقیقی اہلِ کتاب اس پر کیوں ایمان نہیں لائیں گے۔

③ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ: یعنی ان اہلِ عرب مشرکین میں سے بھی کئی لوگ اس پر ایمان لا رہے ہیں اور لائیں گے، جو حق واضح ہونے کے بعد اسے قبول کرنے والے ہیں۔

④ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ: ''جُحُوْدٌ'' کا معنی کسی بات کا علم ہونے کے باوجود اس کا انکار کر دینا ہے۔ (دیکھیے نمل: ۱۴) جبکہ ''کُفْر'' کا لفظ ایمان کے مقابلے میں آتا ہے، اس کا معنی ناشکری بھی ہے، انکار بھی اور چھپانا بھی۔ (قاموس) ''آیَاتِنَا'' کا لفظی معنی نشانیاں ہیں، مراد قرآن مجید ہے، کیونکہ اس کی تمام آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانیاں اور معجزہ ہیں، جن کے مقابلے کی آیات پوری کائنات پیش نہیں کر سکتی اور اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان کا انکار ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں کرے گا جو حق کا علم رکھتے ہوئے اسے چھپاتے اور اس کا انکار کرتے ہیں۔

**آیت 48** ① وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ......: یعنی اے نبی! وحی کے ذریعے سے آنے والی جس کتاب کی تلاوت کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اس کے نزول سے پہلے آپ اپنی قوم میں چالیس سال کا عرصہ رہے ہیں، نہ آپ کسی بھی طرح کی لکھی ہوئی کوئی چیز پڑھتے تھے نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے، بلکہ محض اُمّی تھے۔ وہ سب لوگ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں جن میں آپ کی زندگی گزری، بلکہ بہت تھوڑے آدمی چھوڑ کر ان کا اپنا حال بھی یہی ہے کہ وہ اُمّی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [ الجمعة : ٢ ] ''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا۔'' اور پہلی کتابوں میں بھی آپ کی یہی صفت مذکور ہے، فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ﴾ [ الأعراف : ١٥٧ ] ''وہ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں، جو اُمّی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔'' اس آیت میں نبی ﷺ کے اُمّی ہونے کو آپ کے

## الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

## لوگ ضرور شک کرتے ﴿۴۸﴾

دعویٰ نبوت میں سچا ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے۔ دیکھیے سورۂ قصص (۸۶) اور یونس (۱۶) ابن کثیر فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ (وفات تک) یہی حال رہا، آپ نہ پڑھ سکتے تھے نہ ہی ایک سطر یا ایک حرف اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے، بلکہ آپ کے کئی کاتب تھے جو وحی اور مختلف علاقوں کی طرف خطوط وغیرہ لکھتے تھے۔

بعض لوگوں نے ”مِنْ قَبْلِهٖ“ کے لفظ سے دلیل لی ہے کہ نبوت سے پہلے تو آپ فی الواقع لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، مگر نبوت کے بعد آپ ﷺ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ ان حضرات نے عقیدت میں غلو کی وجہ سے یہ بات کہی ہے، یہ نہیں سوچا کہ ایک شخص ان پڑھ ہوکر سارے جہاں کا استاذ بن جائے، یہ زیادہ حیران کن بات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے یا یہ کہ کوئی عالم فاضل اور پڑھا لکھا شخص کوئی کتاب تصنیف کر کے لے آئے۔ آپ ﷺ کے آخری وقت تک اُمّی ہونے کی دلیل صلح حدیبیہ کے معاہدے کا واقعہ ہے، جس کا صلح نامہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا تھا۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( فَكَتَبَ هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالُوْا لَوْ عَلِمْنَا أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَمْ نَمْنَعْكَ وَلَبَايَعْنَاكَ، وَلٰكِنِ اكْتُبْ هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، فَقَالَ أَنَا وَاللّٰهِ ! مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَأَنَا وَاللّٰهِ ! رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ وَكَانَ لَا يَكْتُبُ قَالَ فَقَالَ لِعَلِيٍّ امْحُ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ عَلِيٌّ وَاللّٰهِ ! لَا أَمْحَاهُ أَبَدًا قَالَ فَأَرِنِيْهِ قَالَ فَأَرَاهُ إِيَّاهُ، فَمَحَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ )) [ بخاري، الجزية، باب المصالحة على ثلاثة أيام ...... : ۳۱۸۴ ] ”علی رضی اللہ عنہ نے لکھا: ”یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد رسول اللہ نے معاہدہ کیا ہے۔“ انھوں نے کہا: ”اگر ہم جانتے ہوتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو (خانہ کعبہ سے) نہ روکتے، بلکہ ہم آپ کی بیعت کر لیتے، لیکن لکھو کہ یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد بن عبد اللہ نے معاہدہ کیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں محمد بن عبد اللہ ہوں اور اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ہوں۔“ براء نے فرمایا: ”اور آپ لکھتے نہیں تھے۔“ تو آپ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”رسول اللہ (کا لفظ) مٹا دو۔“ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ کی قسم! میں اسے کبھی نہیں مٹاؤں گا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر وہ مجھے دکھاؤ۔“ انھوں نے وہ لفظ آپ کو دکھایا تو نبی ﷺ نے اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔“

یہ واقعہ ذوالقعدہ چھ ہجری کا ہے جس کے بعد رسول اللہ ﷺ چار سال اور چند ماہ زندہ رہے، اس میں صراحت ہے ”وَكَانَ لَا يَكْتُبُ“ (آپ ﷺ لکھتے نہیں تھے) اب وہ کون سی روایت ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ نے لکھنا سیکھ لیا تھا؟ حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ بخاری کی بعض روایات میں جو آیا ہے: (( ثُمَّ أَخَذَ فَكَتَبَ )) (پھر آپ ﷺ نے پکڑا اور لکھا) یہ دوسری روایت پر محمول ہے جس میں ہے: (( ثُمَّ أَمَرَ فَكَتَبَ )) ”پھر آپ ﷺ نے حکم دیا تو انھوں نے لکھا۔“ ابن کثیر فرماتے ہیں، بعض لوگوں نے جو حدیث بیان کی ہے: (( إِنَّهٗ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى تَعَلَّمَ الْكِتَابَةَ )) ”کہ آپ فوت نہیں ہوئے حتیٰ کہ آپ نے لکھنا سیکھ لیا“ تو یہ روایت ضعیف ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے اُمّی ہونے کا اعتراف فرمایا ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ، لَا نَكْتُبُ وَ لَا نَحْسُبُ،

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۹

بلکہ یہ تو واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر جو ظالم ہیں ۝۴۹

الشَّهْرُ هٰكَذَا وَ هٰكَذَا يَعْنِيْ مَرَّةً تِسْعَةً وَعِشْرِيْنَ، وَمَرَّةً ثَلَاثِيْنَ ›› [ بخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ لا نكتب و لا نحسب : ۱۹۱۳ ] ”ہم اُمّی لوگ ہیں، لکھنا اور حساب کرنا نہیں جانتے، قمری مہینا اتنا ہوتا ہے اور اتنا بھی۔“ یعنی کبھی انتیس (۲۹) دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس (۳۰) دن کا۔“

❷ یہ اللہ کی شان ہے کہ ایک طرف آپ ﷺ کو وہ کتاب عطا فرمائی جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثل کل عالم بنانے سے عاجز ہے، تو دوسری طرف آپ ﷺ کو نہ پڑھنا سکھایا نہ لکھنا۔ پھر بھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ عالم الغیب تھے اور ” مَا كَانَ وَ مَا يَكُوْنُ “ (جو ہو چکا اور جو ہو گا) سب جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔

❸ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ : یعنی اگر آپ پڑھتے ہوتے یا ہاتھ سے لکھتے ہوتے تو باطل پرستوں کے لیے شک کا کوئی موقع ہو سکتا تھا کہ آپ نے اگلی کتابیں پڑھ کر یہ باتیں لکھ لی ہیں، انھی کو آہستہ آہستہ اپنے الفاظ میں سنا رہے ہیں۔ گو اس وقت بھی یہ کہنا غلط ہوتا، کیونکہ کتنا بھی پڑھا لکھا انسان ہو بلکہ دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسان مل کر اور کل مخلوق کو ساتھ ملا کر بھی اس بے مثال کتاب کی ایک سورت جیسی سورت پیش نہیں کر سکتے، پھر بھی اگر آپ پڑھے لکھے ہوتے تو جھوٹے لوگوں کو بات بنانے کا موقع مل سکتا تھا۔ جب آپ کا اَن پڑھ ہونا سب کے ہاں مسلّم ہے تو اس شبہ کا موقع بھی نہ رہا۔

❹ آپ کے اُمّی ہونے کے باوجود کفار نے یہ بہتان جڑ دیا: ﴿ وَ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴾ [ الفرقان : ۵ ] ”اور انھوں نے کہا یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھوا لی ہیں، سو وہ پہلے پہر اور پچھلے پہر اس پر پڑھی جاتی ہیں۔“ اگر آپ پڑھے لکھے ہوتے تو باطل پرستوں کے شکوک و شبہات کا اور بہتان باندھنے کا کیا حال ہوتا۔

❺ یہاں ایک سوال ہے کہ ” وَ لَا تَخُطُّهٗ “ (اور نہ تو اسے لکھتا تھا) کے الفاظ ہی کافی تھے، پھر ” بِيَمِيْنِكَ “ (اپنے دائیں ہاتھ سے) فرمانے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بعض اوقات لکھوانے کو بھی لکھنا کہہ دیا جاتا ہے، مثلاً بعض اوقات خط لکھوا کر بھیجنے والا کہہ دیتا ہے، میں نے فلاں کو خط لکھا ہے۔ اس امکان کو ختم کرنے کے لیے فرمایا: ﴿ وَ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ﴾ ”اور نہ تو اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔“

**آیت 49** ❶ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ : یعنی یہ قرآن پہلی کتابوں کو پڑھ کر تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ جس میں دو نمایاں اوصاف ہیں، ایک یہ کہ یہ آیات بینات ہیں، یعنی ایسا واضح معجزہ ہیں جن کا جواب نہ کوئی لا سکا ہے نہ لا سکے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ البقرة : ۲۳ ] ”اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کی مثل ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتی بلا لو، اگر تم سچے ہو۔“ دوسرا وصف یہ کہ پہلی تمام کتابیں کسی نہ کسی چیز میں لکھی ہوئی تھیں اور انھیں صرف لکھ کر محفوظ کیا گیا

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور انھوں نے کہا اس پر اس کے رب کی طرف سے کسی قسم کی نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں، کہہ دے نشانیاں تو سب اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو صرف ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۵۰﴾ اور کیا انھیں یہ کافی نہیں ہوا کہ ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے۔ بے شک اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے بڑی رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۵۱﴾

---

تھا، جب کہ یہ قرآن اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہے۔ اگرچہ اسے لکھا بھی گیا ہے مگر یہ لکھے ہوئے کا محتاج نہیں اور یہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ اسے لانے والا اُمّی ہے، جو لکھے ہوئے سے پڑھتا ہی نہیں، بلکہ یہ کتاب اس کے سینے میں ہے اور یہ ہر دور میں امت مسلمہ کے لاکھوں حفاظ کے سینوں میں محفوظ ہوتی ہے، کوئی شخص اس کے کسی لفظ یا نقطے یا زیر زبر میں تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اگر دنیا سے اس کے تمام نسخے بھی غائب کر دیے جائیں، تو بھی اس کی حفاظت میں کوئی خلل نہیں آتا۔ جب کہ پہلی تمام کتابوں کا دارومدار لکھے ہوئے نسخوں پر تھا اور پیغمبر یا ایک آدھ شخص کے سوا ان کا کوئی حافظ ہونا ثابت نہیں۔ اس لیے ان میں کمی بیشی اور تحریف و تصحیف ممکن تھی اور واقع بھی ہوئی، جیسا کہ بائبل میں جمع شدہ نوشتے اس کی واضح دلیل ہیں ؎

نہ ہو ممتاز کیوں اسلام دنیا بھر کے دینوں میں　　وہاں مذہب کتابوں میں یہاں قرآن سینوں میں

② **وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ:** یعنی اتنی واضح نشانیاں دیکھ کر اور ان کے حق ہونے کا علم رکھنے کے بعد ان کا انکار وہی کریں گے جو ظالم ہیں اور قرآن کو ماننے اور حق والے کو اس کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔

**آیت 50** ① **وَ قَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ:** قرآن اور پیغمبر کے حق ہونے کے دلائل کے سامنے جب مشرکین لاجواب ہوجاتے تو عجیب و غریب قسم کے اعتراض اور مطالبے پیش کرتے، جو عناد، تکبر اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایسے چند اعتراض اور ان کے جواب ذکر فرمائے۔ ان میں سے پہلا اعتراض یہ تھا کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانیاں کیوں نازل نہیں کی گئیں؟ اس سے ان کی مراد صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور موسیٰ علیہ السلام کے عصا جیسے معجزات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہہ دیں نشانیاں اور معجزات تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس اور اسی کے اختیار میں ہیں، نہ یہ میرے قبضے میں ہے کہ جو معجزہ تم طلب کرو وہی دکھلا دیا کروں اور نہ یہ میری ذمہ داری ہے۔ میری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے انجام سے آگاہ کرتا رہوں اور ڈراتا رہوں۔

② حفاظ کرام یاد رکھیں کہ پورے قرآن میں "لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" صرف اسی مقام پر ہے۔ دوسرے تمام مقامات پر "نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ" یا "اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ" واحد کے لفظ کے ساتھ ہی ہے۔

**آیت 51** ① **اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ......:** فرمایا، یہ لوگ نشانی طلب کرتے ہیں، کیا نشانی کے لیے

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

کہہ دے اللہ میرے درمیان اور تمھارے درمیان گواہ کافی ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ لوگ جو باطل پر ایمان لائے اور انھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۵۲﴾

انھیں یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر یہ عظیم کتاب نازل کی ہے، جب کہ آپ اُمّی (اَن پڑھ) تھے؟ ایک اَن پڑھ شخص پر اتنی عظیم کتاب کا نازل ہونا کیا کم معجزہ ہے، جس کی ایک سورت کی مثال لانے سے کل عالم عاجز ہے؟ مطلب یہ کہ اگر تم ہدایت قبول کرنا چاہو تو قرآن کریم ہی اس مقصد کے لیے کافی معجزہ ہے، اس کے ہوتے ہوئے مزید نشانیاں طلب کرنا محض ہٹ دھرمی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ إِلَّا أُعْطِيَ مِنَ الْآيَاتِ مَا مِثْلُهُ أُومِنَ ، أَوْ آمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُهُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللّٰهُ إِلَيَّ فَأَرْجُو أَنِّي أَكْثَرُهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ )) [ بخاري، الاعتصام بالكتاب و السنة، باب قول النبي ﷺ بعثت بحوامع الكلم : ۷۲۷۴ ] ”انبیاء میں سے جو بھی نبی تھا، اسے نشانیوں میں سے ایسی نشانیاں دی گئیں جن نشانیوں (کو دیکھ کر ان) پر آدمی ایمان لائے اور مجھے جو نشانی دی گئی وہ صرف وحی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میری پیروی کرنے والے ان سب سے زیادہ ہوں گے۔“

❷ **يُتْلٰى عَلَيْهِمْ** : یہ کتاب ہر جگہ اور ہر وقت ان کے سامنے پڑھی جا رہی ہے، یعنی ایسا نہیں کہ یہ معجزہ ان سے مخفی یا ان کی نگاہوں سے کسی وقت اوجھل ہو۔ جب کہ اس سے پہلے انبیاء کے معجزے ہر وقت سامنے نہیں ہوتے تھے۔ عصائے موسیٰ سانپ بنا مگر چند بار، ہر وقت نہیں۔

❸ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** : اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردہ معجزہ (قرآن کریم) کی دو خصوصیات بیان فرمائیں، جو پہلے کسی پیغمبر کے معجزے میں نہیں تھیں۔ پہلی یہ کہ پہلے پیغمبروں کے معجزے ان کی اقوام کے لیے عذاب کا باعث ہوتے، کیونکہ ان میں حقیقت سے اس طرح پردہ اٹھا دیا گیا تھا کہ جب آنکھوں سے دیکھ کر وہ ایمان نہ لائے تو اللہ کے عذاب نے ان کا نام ونشان مٹا دیا۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردہ معجزہ (قرآن کریم) بنی نوع انسان کے لیے سراسر رحمت ہے، کیونکہ اسے نہ ماننے والوں کے لیے بھی مہلت ہے کہ ان پر فوراً عذاب نہیں آتا۔ یہ ”**اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً**“ کا مطلب ہے۔ دوسری خصوصیت یہ کہ پہلے پیغمبروں کے معجزے ان کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہوگئے، جب کہ قرآن کریم قیامت تک اہلِ ایمان کی نصیحت اور یاد دہانی کے لیے باقی رہے گا۔ یہ ”**ذِكْرٰى**“ کا مفہوم ہے۔

**آیت 52** ❶ **قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ شَهِيْدًا** : کفار کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کا یہ ایک اور جواب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴾ [ الرعد :

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

**اور وہ تجھ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو ان پر عذاب ضرور آ جاتا اور یقیناً وہ ان پر ضرور اچانک آئے گا اور وہ شعور نہ رکھتے ہوں گے ﴿۵۳﴾**

۴۳ ] ''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں تو کسی طرح رسول نہیں ہے۔ کہہ دے میرے درمیان اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ شخص بھی جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔'' یعنی اگر تم مجھے جھٹلاتے ہو تو میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہ ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔ وہ تمھاری تکذیب اور سرکشی کو اور میری سچائی اور خیر خواہی کو بخوبی جانتا ہے۔ اگر میں اس پر جھوٹ باندھتا تو وہ ضرور مجھ سے انتقام لیتا، کیونکہ وہ ایسے لوگوں کو بغیر انتقام لیے نہیں چھوڑتا، جیسے خود اس کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۫ۖ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴾ [ الحاقة : ۴۴ تا ۴۷ ] ''اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔'' چونکہ اس پر میری سچائی روشن ہے کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں اور اس کا نام لے کر اس کی کہی ہوئی بات تم سے کہتا ہوں، اس لیے وہ میری تائید کر رہا ہے اور مجھے روز بروز غلبہ دیتا جا رہا ہے اور واضح معجزات اور قطعی دلائل کے ساتھ میری تائید فرماتا جا رہا ہے۔ (ابن کثیر)

② **يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ:** یعنی اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، نہ میرا پیغام رسالت پہنچانا اور نہ تمھارا جھٹلانا۔ وہ اپنے علم کے مطابق قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا۔

③ **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ ......** : جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اصل خسارے والے یہی لوگ ہیں، کیونکہ انھوں نے حق کو چھوڑا اور باطل کو اختیار کیا، پھر اس سے بڑھ کر خسارا کیا ہوگا؟ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انھیں اس کی جزا دے گا۔

**آیت 53** ① **وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ:** یہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے اور آپ کا مذاق اڑانے کی ایک اور صورت ہے جو کفار نے اختیار کی کہ اگر ہم باطل پر ہیں تو ہم پر فوراً عذاب لے آؤ۔ جس عذاب سے تم ڈراتے ہو وہ کب آئے گا؟ اس عذاب سے ان کی مراد دنیا میں عذاب تھی۔

② **وَلَوْلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ** : فرمایا، اگر دنیا میں ان پر آنے والے عذاب کا اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر نہ کر دیا ہوتا، جو آگے پیچھے نہیں ہو سکتا، تو ان کے مطالبے کے وقت ہی عذاب آ جاتا۔

③ **وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ:** اس امت میں پہلی امتوں کی طرح آسمانی عذاب کے بجائے مسلمانوں کے ہاتھوں کفار کو عذاب دینا طے کیا گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [ التوبة : ۱۴ ] ''ان سے لڑو، اللہ انھیں

يَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ۙ﴿۵۴﴾ يَوۡمَ يَغۡشٰهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ وَ يَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾

وہ تجھ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ بے شک جہنم یقیناً کافروں کو گھیرنے والی ہے ﴿۵۴﴾ جس دن عذاب انھیں ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ڈھانپ لے گا اور (اللہ) فرمائے گا چکھو جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿۵۵﴾

---

تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔'' فرمایا، دنیا میں ان پر عذاب ضرور آئے گا مگر ان کے مطالبے پر فوراً نہیں، بلکہ مقرر وقت پر آئے گا اور اچانک آئے گا، جب ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بدر اور بعد کی جنگوں حتیٰ کہ فتح مکہ میں پورا ہو گیا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس امت کا عذاب یہی تھا، مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہونا، پکڑے جانا۔ سو فتح مکہ میں مکے کے لوگ بے خبر رہے کہ حضرت کا لشکر سر پر آ کھڑا ہوا۔'' (موضح)

④ ''اَجَلٌ مُّسَمًّى'' (مقرر مدت) سے مراد موت اور پھر آخرت بھی ہو سکتی ہے، جس کا سلسلہ مرنے کے فوراً بعد شروع ہو جائے گا اور موت کے متعلق کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کب آ جائے۔ مفسر ابن جزیّ نے فرمایا، یہ معنی زیادہ ظاہر ہے۔

**آیت 54** يَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ ...... : تعجب کے لیے دوبارہ فرمایا، یہ لوگ آپ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ جہنم تو ان کافروں کو گھیرے ہوئے ہے، کیونکہ ''كُلُّ آتٍ قَرِيبٌ'' ''آنے والی ہر چیز قریب ہے۔'' یقین جانو! یہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے اس کے گھیرے میں آ چکے ہیں۔

**آیت 55** ① يَوۡمَ يَغۡشٰهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ...... : یہ جہنم کے گھیرنے کی تفصیل ہے کہ عذاب کافروں کو ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے یعنی ہر طرف سے گھیر لے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَهُمۡ مِّنۡ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ غَوَاشٍ ﴾ [ الأعراف : ٤١ ] ''ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا اور ان کے اوپر کے لحاف ہوں گے۔'' اور فرمایا: ﴿ لَهُمۡ مِّنۡ فَوۡقِهِمۡ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنۡ تَحۡتِهِمۡ ظُلَلٌ ﴾ [ الزمر : ١٦ ] ''ان کے لیے ان کے اوپر سے آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے سے بھی سائبان ہوں گے۔'' اور فرمایا: ﴿ لَوۡ يَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا حِيۡنَ لَا يَكُفُّوۡنَ عَنۡ وُّجُوۡهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ﴾ [ الأنبياء : ٣٩ ] ''کاش! وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اس وقت کو جان لیں جب وہ نہ اپنے چہروں سے آگ کو روک سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں سے۔''

② وَ يَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ: یعنی آگ کے عذاب کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کا معنوی عذاب مزید ہو گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوۡمَ يُسۡحَبُوۡنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوۡهِهِمۡ ؕ ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ ﴾ [ القمر : ٤٨ ] ''جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں پر گھسیٹے جائیں گے، چکھو آگ کا چھونا۔'' اور فرمایا: ﴿ يَوۡمَ يُدَعُّوۡنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيۡ كُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحۡرٌ هٰذَاۤ اَمۡ اَنۡتُمۡ لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۵﴾ اِصۡلَوۡهَا فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا ۚ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [ الطور :

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بے شک میری زمین وسیع ہے، سو تم میری ہی عبادت کرو ﴿۵۶﴾

۱۳ تا ۱٦ | ''جس دن انھیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا، سخت دھکیلا جانا۔ یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے۔ تو کیا یہ جادو ہے، یا تم نہیں دیکھ رہے؟ اس میں داخل ہو جاؤ، پھر صبر کرو یا صبر نہ کرو، تم پر برابر ہے، تمھیں صرف اسی کا بدلا دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔'' ''يَقُوْلُ'' کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے یہ بات کہے گا اور عذاب کا فرشتہ بھی، یا پھر خود عذاب اس کا فاعل ہے جو ان سے کہے گا کہ اپنے اعمال کی سزا چکھو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَأْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ، يَعْنِيْ بِشِدْقَيْهِ، ثُمَّ يَقُوْلُ أَنَا مَالُكَ، أَنَا كَنْزُكَ ثُمَّ تَلَا: ﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ ﴾ » [ آل عمران : ۱۸۰ ][ بخاري، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة ...... : ۱٤۰۳، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی، تو قیامت کے دن وہ مال اس کے لیے ایک گنجے شکل کا سانپ بنا دیا جائے گا، جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ نقطے ہوں گے، وہ قیامت کے دن اس کے گلے میں طوق بنا دیا جائے گا۔ پھر وہ اس کی باچھوں کو پکڑے گا، پھر کہے گا، میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ [ آل عمران : ۱۸۰ ] ''اور وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے، ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے، عنقریب قیامت کے دن انھیں اس چیز کا طوق پہنایا جائے گا جس میں انھوں نے بخل کیا اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی میراث ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پورا باخبر ہے۔''

**آیت 56** ❶ **يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا:** یہ حقیقت ہے کہ ساری مخلوق ہی اللہ تعالیٰ کے عبد (غلام) ہیں۔ پھر یہ بندے دو قسم کے ہیں، مومن اور کافر۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا، مومن نے اپنی پسند چھوڑ کر رب کی پسند اختیار کی، اس کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دی، چنانچہ وہ ہر چیز میں اللہ کا عبد، بندہ اور غلام بن گیا۔ جو مالک نے کہا، کیا، جس سے روک دیا اس سے رک گیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ''يٰعِبَادِيَ'' (اے میرے بندو!) کے معزز اور پیار بھرے الفاظ کے ساتھ مخاطب فرمایا۔ کافر بھی اگرچہ اللہ ہی کا بندہ ہے مگر اس نے اپنے رب کے سامنے سرکشی اختیار کی، اس کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی پر چلا، سو محبت کے خطاب سے محروم رہا۔ ''يٰعِبَادِيَ'' کے بعد ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا'' اس بات کے اظہار کے لیے ہے کہ ان لوگوں کو یہ شرف ایمان کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

❷ **اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ:** اس سورت کا مضمون ہے اہلِ ایمان کی آزمائش، یہ آزمائش بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اپنے وطن میں رہنے کی صورت میں مومن کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے، کفار کا ظلم و ستم اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۞

**ہر جان موت کو چکھنے والی ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے (۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ہم انھیں ضرور ہی جنت کے اونچے گھروں میں جگہ دیں گے، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں، یہ ان عمل کرنے والوں کا اچھا بدلا ہے (۵۸)**

دین پر نہ عمل کر سکتا ہے نہ اس کی دعوت دے سکتا ہے۔ سورت کے نزول کے وقت مکہ میں مسلمانوں کا یہی حال تھا۔ ایسی صورت میں انھیں ہجرت کی ترغیب دی کہ اگر مکہ کی سرزمین میں، جہاں تم اب ہو، میری بندگی بجالانا مشکل ہو رہا ہے تو میری زمین تنگ نہیں، بہت فراخ ہے، تم اپنا وطن چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں تم آزادی سے میری بندگی کر سکو۔ ابراہیم اور لوط علیہما السلام کی مثالیں اسی سورت میں اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، پھر مدینہ منورہ کی طرف اور اللہ تعالیٰ نے انھیں امن و اطمینان اور آزادی کی نعمت بھی عطا فرمائی اور فراخ رزق کی بھی۔ اب بھی یہی حکم ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ رہتا ہو جہاں برائیوں کا دور دورہ ہو اور اس کے لیے اللہ کے احکام پر عمل ممکن نہ رہے تو لازم ہے کہ اس جگہ سے ہجرت کر کے ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ آزادی سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کر سکے۔ سورۂ نساء کی آیات (۹۷ تا ۱۰۰) میں ہجرت کی فرضیت، اس کی فضیلت اور ہجرت نہ کرنے والوں کے بارے میں وعید بیان ہوئی ہے۔

(3) **فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ:** اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت کا اصل مقصد اکیلے اللہ کی عبادت ہے، روزی کمانے یا کسی اور مقصد کے لیے کسی ملک یا شہر میں چلے جانا اصل ہجرت نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، وَمَنْ هَاجَرَ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ » [ بخاري، الحيل، باب في ترك الحيل...... : ٦٩٥٣، عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ] ”تو جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوئی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اور جس نے دنیا کی کسی چیز کی طرف ہجرت کی، جسے وہ حاصل کرے یا کسی عورت کی طرف، جس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔“

**آیت 57** **كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ......:** اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی ترغیب ہے، یعنی ہر جان خواہ اپنے وطن میں رہے یا وہاں سے ہجرت کر جائے، موت کی تلخی کو چکھنے والی ہے۔ یہ چند دن کی زندگی جہاں اور جیسے ہو سکے کاٹ لو، پھر ہمارے پاس آ اکٹھے ہو گے۔

**آیت 58** (1) **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......:** اس سے پہلے آیت (۵۴) اور (۵۵) میں کفار کے ٹھکانے کا ذکر فرمایا تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے مومن بندوں کے لیے تیار کیے جانے والے بہترین ٹھکانے کا ذکر فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے صالح اعمال کیے، ہم انھیں جنت کے بلند و بالا مکانوں میں جگہ دیں گے۔ (دیکھیے فرقان :

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ ۖ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں (۵۹) اور کتنے ہی چلنے والے (جاندار) ہیں جو اپنا رزق نہیں اٹھاتے، اللہ انھیں رزق دیتا ہے اور تمھیں بھی اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے (۶۰)

۷۵۔ زمر: ۲۰) جن کے نیچے پانی، دودھ، شراب اور شہد کی نہریں بہ رہی ہوں گی۔ (دیکھیے سورۂ محمد: ۱۵) جس طرف ان نہروں کا رخ پھیرنا چاہیں گے پھیر لیں گے۔ (دیکھیے دہر: ۶) ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ (دیکھیے کہف: ۲، ۳ اور ۱۰۷، ۱۰۸)۔

② نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ: یعنی جنت کے وہ بالا خانے ان عمل کرنے والوں کا بہت اچھا بدلا ہیں۔

**آیت 59** ① الَّذِيْنَ صَبَرُوْا: یعنی جنت کے بالا خانوں پر سرفراز ہونے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے دین اسلام اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر، گناہوں سے اجتناب پر، مشرکین کی ایذاؤں پر، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی تکالیف پر صبر کیا، خویش و اقارب اور وطن کو چھوڑا اور دشمنوں سے پنجہ آزما ہوئے۔

② وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ: اور وہ ہمیشہ اپنے ہر کام میں صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ وہ اپنے وطن، جائداد، کاروبار، دوست احباب، خویش و اقارب، غرض کسی چیز پر بھروسا نہیں کرتے، بلکہ صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہوئے اس کے راستے میں ہجرت اور جہاد کے لیے نکل جاتے ہیں۔

**آیت 60** وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا...... : ہجرت کرتے ہوئے جان کی فکر کے بعد ذہن میں آنے والی سب سے پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ وطن سے نکلے تو کھائیں گے کہاں سے؟ اللہ تعالیٰ نے روزی کی طرف سے تسلی دلائی کہ رزق کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں، اللہ تعالیٰ کا رزق ساری مخلوق کے لیے عام ہے، جو بھی ہو اور جہاں بھی ہو۔ بلکہ جن لوگوں نے ہجرت کی ان کا رزق کثرت، وسعت اور عمدگی میں پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا، چنانچہ وہ تھوڑی مدت ہی میں تمام علاقوں میں شہروں کے حاکم بن گئے۔ اس لیے فرمایا، کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی روزی ساتھ لیے نہیں پھرتے، ان کے گھروں میں کل کی خوراک نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ان کے ہر نئے دن کے لیے نئی روزی کا بندوبست کرتا ہے اور ہر مخلوق کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، اسے بہم پہنچاتا ہے، حتیٰ کہ زمین کی تہ میں چیونٹیوں کو، ہوا میں پرندوں کو اور پانی میں مچھلیوں کو ان کی ضرورت کی ہر چیز وافر عطا فرماتا ہے۔ (دیکھیے سورۂ ہود: ۶) "وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" وہ اپنی مخلوق کی ہر بات سنتا بھی ہے جانتا بھی ہے، اس لیے وہ ہر ایک کی روزی اس تک پہنچا دیتا ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَ تَرُوْحُ بِطَانًا )) [ ترمذي، الزهد، باب في التوكل على الله : ۲۳۴۴۔ ابن ماجه : ۴۱۶۴، و صححه الألباني ] "اگر تم اللہ پر اس طرح بھروسا کرو جیسے اس پر بھروسا کرنے کا حق ہے تو تمھیں اسی طرح رزق دیا جائے جیسے پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے، وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ کے ساتھ واپس آتے ہیں۔"

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾

**اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے، پھر کہاں بہکائے جا رہے ہیں ﴿٦١﴾ اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے اور اس کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿٦٢﴾**

**آیت 61** ① وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ...... : یہاں سے کلام کا رخ پھر اہلِ مکہ کی طرف ہو گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے معبودِ واحد ہونے کی دلیل کے طور پر مشرکینِ مکہ کے اس اعتراف کا ذکر ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ فرمایا، اے رسول! یا اے مخاطب! اگر تو ان مشرکین سے پوچھے کہ وہ کون ہے جس نے یہ سب آسمان پیدا کیے اور یہ زمین پیدا کی؟ اور وہ کون ہے جس نے تمھارے فائدے کے لیے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا؟ تو یقیناً وہ کسی تردُّد کے بغیر کہیں گے کہ وہ ''اللہ'' ہے۔ یہ ایک حیران کن حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا آج تک کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ میں نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور میں نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے۔ اس لیے کتنا بڑے سے بڑا مشرک ہو، اسے یہ حقیقت ماننے کے بغیر چارہ نہیں۔

② فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ : یہ ان کی الٹی سوچ پر اور اپنے ہی قول کے خلاف عمل پر تعجب کا اظہار ہے۔ یعنی جب تم مانتے ہو کہ اکیلا اللہ تعالیٰ ہی آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا اور سورج و چاند کو مسخر کرنے والا ہے، تو عبادت میں کسی اور کو کیوں شریک کرتے ہو اور کسی اور پر بھروسا کیوں کرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر اپنے اکیلے رب اور مالک ہونے کو اپنے اکیلا معبود ہونے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے، کیوں کہ مشرکین اس کا اعتراف کرتے تھے۔

③ بعض مفسرین نے پچھلی آیت کے ساتھ اس آیت کی مناسبت یہ بیان کی ہے کہ اس آیت کے مخاطب فکر معاش کی وجہ سے ہجرت میں تردُّد کرنے والے حضرات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زمین و آسمان، سورج اور چاند سب کو پیدا کرنے والا اور انھیں اپنے اپنے کام پر لگانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور انسان کی تمام ضروریاتِ زندگی اسی نظام سے وابستہ ہیں۔ انھی ضروریات میں سے ایک ضرورت کھانے پینے کی اور ذریعہ معاش کی ہے۔ تو مسلمان جہاں بھی ہجرت کر کے جائیں گے یہ سارا نظام وہاں بھی موجود ہو گا اور اللہ عزوجل انھیں وہاں بھی ایسے ہی روزی مہیا کرے گا جیسے یہاں کر رہا ہے، تو یہ لوگ کہاں بہکائے جا رہے ہیں۔

**آیت 62** ① اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ......: یعنی ہجرت کی وجہ سے کسی کا رزق کم نہیں ہوتا۔ رزق کا فراخ ہونا یا تنگ ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، وہی جانتا ہے کہ کس کو

وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾

ع ۲ ۱۲ ۲

اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے، کہہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ ان کے اکثر نہیں سمجھتے ﴿۶۳﴾

---

کتنا رزق دینا چاہیے۔ اور اگر خطاب مشرکین سے ہو تو مطلب یہ ہے کہ رزق کھول دینا یا بند کر دینا تمھارے بنائے ہوئے داتاؤں اور دستگیروں کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا پوری طرح علم رکھنے والا ہے۔

② ''اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے اور اس کے لیے تنگ کر دیتا ہے'' کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، لیکن ''يَقْدِرُ'' کے بعد ''لَهٗ'' کی وجہ سے ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور اسی کے لیے کبھی تنگ بھی کر دیتا ہے۔ یہ اس کی مشیت پر موقوف ہے، جب چاہے کسی کا رزق کھول دے اور جب چاہے اس کا رزق تنگ کر دے، اس کا ہجرت کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

③ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور اس کے لیے تنگ کر دیتا ہے، مگر بند نہیں کرتا۔

④ **اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** : یعنی اللہ کی مشیت اندھے کی لاٹھی کی طرح نہیں کہ بلا وجہ کسی کا رزق فراخ کر دے یا تنگ کر دے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے خوب واقف ہے کہ کس کے حق میں فراخی سے روزی دینا بہتر ہے اور کس کے حق میں تنگی سے روزی دینا، یا ایک ہی بندے کو کب فراخی سے روزی دینا بہتر ہے اور کب تنگی سے۔

**آیت 63** ① **وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً** ...... پچھلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت ''خلق'' اور ''رزق'' کا ذکر تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت ''إِحْيَاءٌ بَعْدَ الْمَوْتِ'' (موت کے بعد زندہ کرنے) کا ذکر ہے۔ فرمایا، اگر تو ان سے پوچھے کہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا؟ تو یقیناً وہ کہیں گے کہ وہ ''اللہ'' ہے۔

② **قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ** : کفار کے اعتراف کو توحید کی دلیل کے طور پر بیان کرنے کے بعد فرمایا ''الحمد للہ'' کہو، کیوں کہ جب مخاطب پر کوئی ایسی دلیل پیش کی جائے جو اس کے ہاں مسلّم ہو اور وہ اس کا جواب نہ دے سکے تو حجت تمام ہونے پر ''الحمد للہ'' کہا جاتا ہے۔ ''الحمد للہ'' کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس اعتراف نعمت کے بعد تم جس شرک میں گرفتار ہو، ہم اس سے محفوظ ہیں اور یہ بھی کہ جب یہ سب نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں اور تم اس کا اعتراف بھی کرتے ہو تو لازم ہے کہ شکر بھی اسی کا ادا کرو۔

③ **بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ**: کیوں کہ اگر وہ سمجھتے ہوتے تو اتنے اعتراف کے بعد شرک کی لعنت میں گرفتار نہ ہوتے۔

④ ان کے اکثر کو ''لَا يَعْقِلُوْنَ'' فرمایا، سب کو نہیں، کیونکہ ان میں سے کچھ بات سمجھتے بھی تھے، جن میں سے کچھ تو ایمان

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور دنیا کی یہ زندگی نہیں ہے مگر ایک دل لگی اور کھیل، اور بے شک آخری گھر، یقیناً وہی اصل زندگی ہے، اگر وہ جانتے ہوتے ﴿۶۴﴾

---

لے آئے اور کچھ سمجھنے کے باوجود عناد کی وجہ سے کفر پر اڑے رہے۔

**آیت 64** ❶ **وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ** ...... : "**الدُّنْيَآ**" "اَلْأَدْنٰی" کی مؤنث ہے، قریب، گھٹیا۔ اس کے مقابلے میں "**الْاٰخِرَةَ**" ہے۔ "**لَهْوٌ**" وہ چیز جو ضروری کاموں سے دل کو غافل کر دے، یعنی دل لگی، جیسے گانا بجانا وغیرہ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [ لقمان : ٦ ] "اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو غافل کرنے والی بات خریدتا ہے، تاکہ جانے بغیر اللہ کے راستے سے گمراہ کرے۔" "**لَعِبٌ**" "کھیل۔" اس جملے میں آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا بے وقعت ہونا چار طرح سے بیان ہوا ہے، سب سے پہلے "**هٰذِهِ**" کا لفظ حقارت کے اظہار کے لیے ہے، یعنی "یہ" دنیا کی زندگی۔ جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر کے لیے کہا تھا: ﴿ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ﴾ [ الزخرف : ٥٢ ] "بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں، وہ جو حقیر ہے۔" دوسرا "**الدُّنْيَآ**" کا لفظ دنایت اور گھٹیا پن پر دلالت کر رہا ہے، تیسرا "**لَهْوٌ**" (دل لگی) اور چوتھا "**لَعِبٌ**" (کھیل)، یعنی اس حقیر دنیا کی زندگی کی حقیقت دل لگی اور کھیل کے سوا اور کچھ نہیں، جس طرح کوئی شخص کچھ وقت کے لیے گا بجا کر اور کھیل کود کر گھر چلا جائے۔ یہاں کوئی بادشاہ ہے یا وزیر، تاجر ہے یا صنعت کار، مالک ہے یا مزدور، اگر کسی بھی ایسے کام میں مصروف ہے جو قیامت کے دن کے لیے کار آمد نہیں تو سمجھ لیجیے وہ محض دل لگی اور کھیل تماشے میں مصروف ہے اور اس کے تمام ساتھی اس کھیل تماشے کا حصہ ہیں۔ اس تماشے میں کوئی بادشاہ ہے، کوئی وزیر ہے اور کوئی کچھ اور۔ انھیں عیش و عشرت کے جتنے سامان میسر ہیں، عورتیں ہوں یا بیٹے، سونے چاندی کے خزانے ہوں یا اعلیٰ نسل کے گھوڑے، ہر قسم کے چوپائے ہوں یا کھیتیاں اور باغات، سب اس کھیل کے کھلونے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے اور کھیل کا ہر کردار اسی بے سروسامانی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ان کھلونوں کے ساتھ ساٹھ یا ستر یا سو برس دل بہلا لے، آخر کار اسے یہ سب کچھ چھوڑ کر موت کے دروازے سے گزر کر اس جہاں میں پہنچنا ہے جہاں کی زندگی دائمی اور ابدی ہے۔ بڑا ہی بدنصیب ہے وہ شخص جو اس کھیل میں مصروف رہے اور اس دائمی زندگی کی فکر نہ کرے۔

❷ **وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ** : "**الدَّارَ**" موصوف ہے اور "**الْاٰخِرَةَ**" اس کی صفت، آخری گھر۔ یہاں ایک لفظ محذوف ہے، یعنی "إِنَّ حَيَاةَ الدَّارِ الْآخِرَةِ لَهِيَ الْحَيَوَانُ" "**الْحَيَوَانُ**" مصدر ہے، جس طرح "اَلْحَيَاةُ" مصدر ہے۔ "**الْحَيَوَانُ**" میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے "زندگی" کے مفہوم میں مبالغہ پایا جاتا ہے، پھر "**الْحَيَوَانُ**" پر "الف لام" کمال کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اس لیے "**الْحَيَوَانُ**" کا ترجمہ "اصل زندگی" کیا گیا ہے۔ یعنی یقیناً آخری گھر کی زندگی ہی اصل زندگی ہے، جسے کبھی زوال نہیں، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ یہاں کی چند روزہ زندگی سے زیادہ آخری زندگی کی فکر کرے، کیونکہ

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝٦٥ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝٦٦

پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں، اس حال میں کہ اسی کے لیے عبادت کو خالص کرنے والے ہوتے ہیں، پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو اچانک وہ شریک بنا رہے ہوتے ہیں ۝٦٥ تاکہ جو کچھ ہم نے انھیں دیا اس کی ناشکری کریں اور تاکہ فائدہ اٹھالیں۔ سو عنقریب وہ جان لیں گے ۝٦٦

---

وہ اصل اور دائمی ہے۔ دنیا کے کھیل تماشے میں غرق ہو کر عاقبت کو بھول نہ بیٹھے، بلکہ یہاں رہ کر وہاں کی تیاری کرے۔

③ **لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ** : اگر وہ جانتے ہوتے تو فانی کو باقی پر ترجیح نہ دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے فرمایا: (( لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ )) [ ترمذي، الزهد، باب ما جاء في هوان الدنيا على الله عزوجل : ۲۳۲۰، عن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ، وقال الترمذي و الألباني صحيح ] ''اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر ہوتی، تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس میں سے پانی کا ایک گھونٹ نہ پلاتا۔''

**آیت 65** **فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ ......** : اس سے پہلی آیات میں مشرکین مکہ پر ان کے اعتراف کے ساتھ حجت قائم کی تھی کہ آسمان و زمین کا خالق، سورج و چاند کو مسخر کرنے والا اور آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین کو زندہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، یعنی یہ مان کر پھر اس کے ساتھ شریک بنانے کا کیا جواز ہے؟ اس آیت میں ان پر اس بات کے ساتھ حجت قائم کی ہے کہ سمندری سفر میں جب ان کے بحری جہاز طوفان کی لپیٹ میں آتے ہیں تو وہ اپنی فطرت میں چھپی ہوئی توحید کے ہاتھوں مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی بندگی خالص کرتے ہوئے اس اکیلے ہی کو پکارتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ انھیں طوفان سے بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو اپنی ہی بات کے خلاف شرک کرنے لگتے ہیں۔ بتائیے اس سے زیادہ ناشکری کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی ضروریاتِ زندگی تو سب اللہ مہیا کرے اور جب جان پر بن جائے تو اس مصیبت سے نجات بھی اللہ دے، لیکن جب آسودہ حالی کا وقت آئے تو انسان نہ صرف اللہ کو بھول جائے بلکہ اس کے اختیارات میں دوسروں کو شریک بنانے لگے؟ یہ نبوی دور کے مشرکوں کا حال تھا، آج کل کے مسلمان مشرک ان سے بھی بدتر ہیں کہ یہ مصیبت کے وقت بھی غیر اللہ کو پکارتے اور ان کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ صرف مذہبی مشرکوں کا حال نہیں بلکہ بڑے بڑے دہریے جب کسی مشکل میں ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اس ذات واحد کو پکارتے ہیں اور جب بچ نکلتے ہیں تو پھر مالک کا انکار کرنے لگتے ہیں، آخر اتنا بڑا تضاد کیوں ہے؟ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۶۳، ۶۴)، یونس (۲۲، ۲۳)، بنی اسرائیل (۶۷) اور لقمان (۳۲)۔

**آیت 65** **لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ......** : یعنی نجات پانے کے بعد شرک کرنے سے انھیں اس کے سوا کچھ حاصل نہیں کہ ہماری عطا کردہ نعمتوں کی ناشکری کرتے رہیں اور صرف دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں، جبکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ سو بہت جلد وہ اپنے اس کام کا انجام جان لیں گے۔ (بغوی)

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِهِمۡ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَةِ اللّٰهِ یَكۡفُرُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَیۡسَ فِیۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۶۸﴾

اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک حرم امن والا بنا دیا ہے، جب کہ لوگ ان کے گرد سے اچک لیے جاتے ہیں، تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟ ﴿۶۷﴾ اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، یا حق کو جھٹلا دے جب وہ اس کے پاس آئے۔ کیا ان کافروں کے لیے جہنم میں کوئی رہنے کی جگہ نہیں ہے؟ ﴿۶۸﴾

---

**آیت 67** **اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا**...... : اہلِ مکہ کو اس سے پہلے سمندری سفر میں خوف میں مبتلا کرنے کے بعد امن عطا کرنے کی نعمت کا ذکر فرمایا تھا، اب خشکی کے اندر کسی خوف میں مبتلا کیے بغیر اس وقت امن عطا کرنے کی نعمت کا ذکر فرمایا جب پورا عرب اس نعمت سے محروم تھا۔ "**اَوَلَمۡ یَرَوۡا**" میں واوٴ عطف اصل میں ہمزہ استفہام سے پہلے ہے، مگر چونکہ ہمزہ استفہام شروع میں آتا ہے، اس لیے واوٴ کو بعد میں کر دیا۔ اس لیے واوٴ کا ترجمہ ہمزہ سے پہلے کیا گیا ہے ''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا......'' یعنی جس وقت ان کے اردگرد پورے جزیرۂ عرب کی یہ حالت ہے کہ کسی کی جان محفوظ ہے نہ مال، کسی کو کچھ خبر نہیں کہ اسے کب اٹھا لیا جائے گا، ان حالات میں اہلِ مکہ کو حرم کی وجہ سے مکہ میں بھی امن ہے، حتیٰ کہ کوئی حرم میں اپنے باپ کے قاتل کو دیکھ لے تو اسے کچھ نہیں کہتا اور پھر سردی اور گرمی میں دور دراز کے سفروں میں بھی حرم کے باشندے ہونے کی وجہ سے انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ (دیکھیے سورۂ قریش کی تفسیر) کیا اس کے باوجود وہ باطل معبودوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں؟ مزید دیکھیے سورۂ قصص (۵۷)۔

**آیت 68** ① **وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا**...... : ''ظلم'' کا معنی اندھیرا ہے کہ کسی کا حق دوسرے کو دے دینا، کیونکہ اندھیرے میں آدمی کسی چیز کو اس کی اصل جگہ نہیں رکھ سکتا۔ آدمی پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اس نے اسے پیدا فرمایا۔ اس لیے سب سے بڑا انصاف اللہ کی توحید اور اس اکیلے کی عبادت ہے اور سب سے بڑا ظلم اور بے انصافی اس کے ساتھ کسی کو شریک بنانا اور اس شریک کی عبادت کرنا ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق تھا۔ اس لیے فرمایا، اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور اس کے لیے شریک بنائے؟ اسی طرح جب تک کسی شخص کے پاس حق نہ پہنچے اس کے لیے عذرِ معذرت کی گنجائش نکل سکتی ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے اور حق پہنچ جانے کے بعد جو شخص حق کو جھٹلا دے اس سے بڑا ظالم کون ہے؟ مقصد یہ ہے کہ ان دونوں سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔

② **اَلَیۡسَ فِیۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡكٰفِرِیۡنَ**: "**لِلۡكٰفِرِیۡنَ**" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ''ان کافروں کے لیے'' کیا گیا ہے، یعنی کیا ان کافروں کے لیے جو اللہ پر جھوٹ باندھتے اور حق آ جانے کے بعد اسے جھٹلا دیتے ہیں جہنم میں کوئی جگہ نہیں ہے؟ یعنی یقیناً ان کے رہنے کی جگہ جہنم ہی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ ع

اور وہ لوگ جنھوں نے ہمارے بارے میں پوری کوشش کی ہم ضرور ہی انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے اور بلاشبہ اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۶۹﴾

**آیت 69** ❶ **وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا:** کفار کا انجام بیان کرنے کے بعد اپنے مومن بندوں کے لیے بشارت بیان فرمائی۔ سورت کا آغاز اہل ایمان کی آزمائش اور جہاد کے ذکر سے ہوا تھا، فرمایا: ﴿ وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ﴾ [ العنکبوت : ٦ ] اب اختتام بھی اسی جہاد پر بشارت کے ساتھ ہوتا ہے۔ "**وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا**" میں جہاد سے وہی جہاد مراد ہے جو سورت کے شروع میں "**وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ**" سے مراد ہے۔ اس لیے اس پہلی آیت کا فائدہ دوبارہ نقل کیا جاتا ہے۔ "جَهَدَ يَجْهَدُ" کا معنی کوشش کرنا ہے اور "جَاهَدَ" (مفاعلہ) میں مقابلے کا مفہوم بھی ہے اور مبالغے کا بھی، یعنی کسی کے مقابلے میں پوری کوشش لگا دینا۔ مومن کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر کاربند رہنے کے لیے بہت سی چیزوں کے مقابلے میں جدوجہد کرنا پڑتی ہے، اسے اپنے نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو ہر وقت اسے اپنی خواہش کا غلام بنانے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے، شیطان کا بھی جس نے اس کی دشمنی کی قسم کھا رکھی ہے اور اپنے گھر سے لے کر تمام دنیا کے ان انسانوں کا بھی جو اسے راہ حق سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، حتیٰ کہ اسے اس کوشش میں لڑائی بھی کرنا پڑتی ہے، جس میں وہ دشمن کو قتل کرتا ہے اور خود بھی قتل ہو جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں جہاد کا لفظ اکثر اسی معنی میں آیا ہے۔ سب سے اونچا درجہ اس کا وہ ہے جب وہ سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا کر قربان ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بن حُبشی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں (لمبی حدیث ہے): (( قِيلَ فَأَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ ؟ قَالَ مَنْ جَاهَدَ الْمُشْرِكِيْنَ بِمَالِهِ ، وَنَفْسِهِ، قِيْلَ فَأَيُّ الْقَتْلِ أَشْرَفُ ؟ قَالَ مَنْ أُهْرِيقَ دَمُهُ، وَعُقِرَ جَوَادُهُ )) [ مسند أحمد : ٤١١/٣، ٤١٢، ح : ١٥٤٠٧، قال المحقق إسناده قوي۔ أبو داوٗد : ١٤٤٩، قال الألباني صحيح ] "(نبی ﷺ سے) سوال کیا گیا کہ کون سا جہاد افضل ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جو مشرکین کے ساتھ اپنی جان اور مال کے ساتھ جہاد کرے۔" پوچھا گیا: "پھر کون سا قتل سب سے اونچی شان والا ہے؟" فرمایا: "جس کا خون بہا دیا جائے اور اس کا عمدہ گھوڑا کاٹ دیا جائے۔"

❷ یعنی اللہ پر جھوٹ گھڑنے اور حق کو جھٹلانے والوں کا انجام تو جہنم ہے، مگر ہماری خاطر جو لوگ ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد کریں گے اور ہماری راہ میں اپنے مال اور اپنی جانیں قربان کریں گے ہم ضرور ہی انھیں وہ راستہ دکھا دیں گے جن پر چل کر وہ ہم تک پہنچیں اور انھیں ان پر چلنے کی توفیق دیں گے اور ان پر ثابت قدم رکھیں گے، کیونکہ ہدایت کی تکمیل ان تینوں چیزوں کے ساتھ ہوتی ہے۔

❸ **وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ:** "اِنَّ" علت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، یہاں ایک جملہ محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص ہماری راہ میں جہاد کرے وہ محسن ہے، یعنی اپنی جان پر اور دوسرے لوگوں پر احسان کرنے والا ہے اور ایسے لوگ جو احسان کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے۔

❹ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، اس کے باوجود وہ اپنی مخلوق کے ساتھ بھی ہے۔ پھر اس کی یہ معیت (ساتھ) ایک تو عام

سُوْرَةُ الرُّوْمِ ۳۰ مکیۃ ۸۴ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا ۶۰ رُكُوْعَاتُهَا ۶

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ بِنَصْرِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ① رومی مغلوب ہوگئے ② سب سے قریب زمین میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے ③ چند سالوں میں، سب کام اللہ ہی کے اختیار میں ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس دن مومن خوش ہوں گے ④ اللہ کی

---

ہے کہ وہ اپنے علم وقدرت کے ساتھ یا جس طرح وہ خود بہتر جانتا ہے ہر بندے کے ساتھ ہے (دیکھیے حدید: ۴۔ مجادلہ: ۷) اور ایک خاص معیت ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے لشکروں کے آنے پر کہا تھا: ﴿اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾ [الشعراء: ۶۲] ''بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے ضرور راستہ بتائے گا۔'' اور جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے آ پہنچنے پر اپنے غار کے ساتھی سے فرمایا تھا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰] ''غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' ''الْمُحْسِنِيْنَ'' کے ساتھ ہونے سے مراد یہی خاص معیت ہے، یعنی اللہ اپنی ہدایت، حفاظت، حمایت اور نصرت کے ذریعے سے ان کے ساتھ ہے۔

⑤ بعض مفسرین نے اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ )) ''ہم چھوٹے جہاد (یعنی کفار سے لڑائی) سے بڑے جہاد (یعنی نفس سے جہاد) کی طرف واپس آئے ہیں۔'' حالانکہ یہ کسی شخص کا قول ہے، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے لگانا بہت بڑا جھوٹ اور زبردست دیدہ دلیری ہے۔ جہاد اکبر وہی ہے جس کا ذکر اوپر حدیث رسول میں آیا ہے: (( مَنْ أُهْرِيقَ دَمُهُ وَ عُقِرَ جَوَادُهُ )) ''جس کا خون بہا دیا گیا اور اس کا عمدہ گھوڑا کاٹ دیا گیا۔'' حقیقت یہ ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد بھی سب سے بڑھ کر اسی کا ہے جو اللہ کی راہ میں جان دے دیتا ہے۔ کچھ لوگوں نے قتال فی سبیل اللہ کو چھوٹا قرار دیا اور نفس سے جہاد کو بڑا قرار دے کر حجروں میں چلہ کشی کے لیے بیٹھ گئے۔ ایسے آرام دہ جہاد ہی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان دنیا میں مغلوب ہیں اور کافر غالب۔ کاش! یہ حضرات راہبوں کے طریقے کے بجائے وہ جہاد کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا، جس کے ساتھ وہ صرف دس سال کے عرصے میں پورے جزیرۂ عرب کے مالک بن گئے اور پھر نصف صدی کے اندر اندر مشرق سے مغرب تک کے فرماں روا بن گئے۔

## سورة الروم

آیت 1-5 ① الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ ...... ''الٓمّٓ'' کے متعلق سورۂ بقرہ کی ابتدا ملاحظہ فرمائیں۔

اللّٰهِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ﴿۵﴾

مدد سے، وہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۵﴾

سورۂ روم کی ان ابتدائی آیات میں دو ایسی پیش گوئیاں کی گئی ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی رسالت کے حق ہونے پر زبردست دلیل ہیں۔ ان میں سے پہلی پیش گوئی یہ تھی کہ اگر آج روم شکست کھا گیا ہے تو چند ہی سالوں میں روم پھر ایران پر غالب آ جائے گا اور دوسری پیش گوئی یہ تھی کہ اگر آج مسلمان مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں مظلوم و مقہور ہیں تو ان کو بھی اسی دن مشرکینِ مکہ پر غلبہ حاصل ہوگا جس دن روم ایران پر غالب آئے گا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو نبوت عطا ہوئی تو اس وقت عرب کے اطراف میں دو بڑی طاقتیں موجود تھیں۔ ایک روم کی عیسائی حکومت، جو دو باتوں میں مسلمانوں سے قریب تھے۔ ایک یہ کہ دونوں اہلِ کتاب تھے، دوسرے دونوں آخرت پر یقین رکھتے تھے، لہٰذا مسلمانوں کی ہمدردیاں انھی کے ساتھ تھیں۔ مسلمانوں کی عیسائی حکومت سے ہمدردی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور قریشیوں کی مسلمانوں کو واپس لانے کی کوشش کے باوجود حبشہ کے عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دی اور قریش کی سفارت بری طرح ناکام ہوئی اور انھیں خالی ہاتھ وہاں سے آنا پڑا تھا۔ دوسری بڑی طاقت ایران کی تھی، جو دو وجہوں سے مشرکینِ مکہ سے قریب تھے۔ ایک یہ کہ ایرانی دو خداؤں کے قائل اور آتش پرست تھے اور مشرکین بت پرست تھے اور دوسرے یہ کہ دونوں آخرت کے منکر تھے۔ انھی وجوہ کی بنا پر مشرکینِ مکہ کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔

رسول اللہ ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان چھ سو برس کا وقفہ تھا۔ [ دیکھیے بخاري، مناقب الأنصار، باب إسلام سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ : ۳۹۴۸ ] جب آپ ﷺ کو نبوت ملی تو اس وقت روم و ایران میں جنگ شروع تھی اور اس کی خبریں مکہ میں بھی پہنچتی رہتی تھیں۔ جب ایران کی فتح کی کوئی خبر آتی تو مشرکینِ مکہ بغلیں بجاتے اور اس خبر کو اپنے حق میں نیک فال قرار دیتے اور کہتے کہ جس طرح ایران نے روم کا سر کچلا ہے، ایسے ہی ہم بھی کسی وقت مسلمانوں کا سر کچل دیں گے۔ اس جنگ میں ایرانیوں نے رومیوں کو فیصلہ کن شکست دی، جس کے نتیجے میں عرب کے ساتھ ملنے والے علاقوں میں روم کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا۔ یہ خبر مشرکین کے لیے بڑی خوش کن اور مسلمانوں کے لیے بہت صدمے کا باعث تھی۔ مشرکین نے انھیں یہ کہہ کر چھیڑنا شروع کر دیا کہ جس طرح ایران نے روم کو ختم کر دیا ہے، ایسے ہی ہم بھی تمھیں مٹا ڈالیں گے۔ ایسے حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ اگرچہ بظاہر اہلِ روم کی فتح کے کوئی آثار نہیں تھے مگر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پر پورا یقین تھا۔ اسی یقین کی بنیاد پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشرکین کے ساتھ شرط بھی باندھ لی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس واقعہ کی تفصیل کے لیے بہت سی روایات نقل فرمائی ہیں، جن میں سے اکثر کی سند کمزور ہے۔ صرف دو روایتوں کی سند اچھی ہے، وہ یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

پہلی روایت یہ کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے فرمان ”الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ﴿۲﴾ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ“ کے

متعلق فرمایا: (( غُلِبَتْ وَ غَلَبَتْ )) ''رومی مغلوب ہو گئے اور (پھر) غالب آ گئے۔'' اور فرمایا، مشرکین پسند کرتے تھے کہ اہلِ فارس رومیوں پر غالب آئیں، کیونکہ مشرکین اور اہلِ فارس دونوں بت پرست تھے اور مسلمان پسند کرتے تھے کہ رومی فارس والوں پر غالب آئیں، کیونکہ وہ (رومی) اہلِ کتاب تھے۔ لوگوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اس بات کا ذکر کیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَمَا إِنَّهُمْ سَيَغْلِبُوْنَ )) ''سن لو! یقیناً وہ (رومی) غالب آئیں گے۔'' ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات مشرکین کو بتائی تو وہ کہنے لگے: ''ہمارے اور اپنے درمیان ایک مدت مقرر کر لو، اگر ہم غالب آ گئے تو ہمیں یہ کچھ ملے گا اور اگر تم غالب آ گئے تو تمھیں یہ کچھ ملے گا۔'' تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پانچ سال مدت مقرر کر لی۔ مگر رومی غالب نہ آئے، تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے یہ مدت دس سے کم تک کیوں مقرر نہ کی۔'' ابو سعید نے کہا ''اَلْبِضْعُ'' کا لفظ دس سے کم تک ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، پھر بعد میں رومی غالب آ گئے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: ﴿الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ سفیان نے فرمایا: ''میں نے سنا ہے کہ وہ ان پر بدر کے دن غالب آئے۔'' [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة الروم : ۳۱۹۳، و قال حسن صحيح غريب ] احمد شاکر نے مسند احمد (۲۴۹۵) کی تحقیق میں اسے صحیح کہا ہے اور شیخ البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

دوسری روایت یہ کہ نیار بن مکرم الاسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیات اتریں: ﴿الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾ تو ان دنوں فارس کے لوگ رومیوں پر پوری طرح غالب تھے، لیکن مسلمان ان پر رومیوں کے غلبے کو پسند کرتے تھے، کیونکہ رومی اور مسلمان اہلِ کتاب تھے اور اللہ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: ﴿يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ﴾ جبکہ قریش فارس کے غلبے کو پسند کرتے تھے، کیونکہ مشرکین اور فارس والے اہلِ کتاب نہیں تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نکلے اور مکہ کے کناروں میں چیخ چیخ کر یہ آیات سنانے لگے: ﴿الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾ قریش کے کچھ لوگوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا، ہمارے تمھارے درمیان یہ بات طے ہوگئی، تمھارے ساتھی کا گمان ہے کہ روم فارس پر ''بِضْعِ سِنِيْنَ'' (چند سالوں) میں غالب آ جائیں گے، تو کیا ہم اس پر تمھارے ساتھ شرط نہ رکھ لیں؟ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا، کیوں نہیں! اور یہ جوئے کی شرط حرام ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مشرکین نے شرط باندھ لی اور شرط کی مقدار طے کر لی۔ انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا، بتاؤ کتنی مدت مقرر کرتے ہو۔ ''بِضْعٌ'' تین سال سے نو سال تک ہوتا ہے، تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک اوسط وقت مقرر کر لو جہاں مدت پوری ہو جائے، تو انھوں نے چھ سال کی مدت مقرر کر لی۔ پھر یہ ہوا کہ رومیوں کے غالب آنے سے پہلے چھ سال گزر گئے، تو مشرکین نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے طے شدہ شرط وصول کر لی۔ لیکن جب ساتواں سال شروع ہوا تو رومی اہلِ فارس پر غالب آ گئے، تو اس پر مسلمانوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا چھ سال مقرر کرنا ان کا قصور قرار دیا کہ انھوں نے چھ سال کی مدت کیوں مقرر کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے تو " فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ " کا لفظ فرمایا ہے، جو نو (۹) سال تک پر بولا جاتا ہے اور اس وقت بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة الروم : ۳۱۹۴، و قال حديث حسن صحيح غريب وقال الألباني حسن ]

ان دونوں صحیح حدیثوں سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی یہ کہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں رومی اس وقت بری طرح سے مغلوب تھے کہ تمام لوگوں کی نگاہوں میں چند سالوں کے اندر ان کا غالب آنا ممکن نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اللہ تعالیٰ کی آیات پر اتنا مضبوط ایمان تھا کہ ظاہری اسباب کے بالکل مخالف ہونے کے باوجود انھوں نے ان کے سچا ہونے پر مشرکین کے ساتھ شرط طے کر لی۔ تیسری یہ کہ امت کے بڑے سے بڑے شخص سے بھی اجتہاد میں خطا ہو سکتی ہے۔ امتِ مسلمہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عظیم شخصیت کوئی نہیں، لیکن یہاں ان سے مدت کی تعیین میں خطا ہو گئی، مگر اپنے اجتہاد کے خطا ثابت ہونے پر بھی ان کے اللہ کی آیات پر ایمان میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی درست رائے سے نوازا تھا کہ ان کی خطا پکڑنا بہت ہی مشکل ہے، مگر ان سے بھی خطا ہو جاتی تھی، پھر انھوں نے ان کی خطا کی مثال کے لیے صحیح بخاری سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: ''آج رات میں نے خواب میں ایک سائبان دیکھا، جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے، میں لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ اسے اپنی ہتھیلیوں میں لے رہے ہیں، کوئی زیادہ لینے والا ہے اور کوئی کم لینے والا۔ پھر اچانک ایک رسی آسمان سے زمین تک آ ملی، تو میں آپ کو دیکھتا ہوں کہ آپ نے اسے پکڑا اور اوپر چڑھ گئے۔ پھر اسے ایک اور آدمی نے پکڑا، وہ اس کے ساتھ چڑھ گیا، پھر اسے ایک اور آدمی نے پکڑا وہ بھی اوپر چڑھ گیا۔ پھر وہ کٹ گئی، پھر دوبارہ مل گئی۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! میرا باپ آپ پر قربان، آپ کو اللہ کی قسم! مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی تعبیر کروں۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی تعبیر کرو۔'' انھوں نے کہا: ''وہ سائبان تو اسلام ہے اور جو شہد اور گھی ٹپک رہا ہے وہ قرآن کی حلاوت ہے، جو ٹپک رہی ہے۔ پھر کوئی قرآن سے زیادہ حاصل کرنے والا ہے اور کوئی کم حاصل کرنے والا ہے۔ رہی وہ رسی جو آسمان سے زمین تک ملی ہوئی ہے، تو اس سے مراد وہ حق ہے جس پر آپ قائم ہیں، آپ اسے پکڑے رکھیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو بلند کرے گا، پھر آپ کے بعد اسے ایک اور آدمی پکڑے گا اور اس کے ساتھ بلند ہو جائے گا، پھر ایک اور آدمی اسے پکڑے گا اور اس کے ساتھ بلند ہو جائے گا، پھر ایک اور آدمی اسے پکڑے گا تو اس کے ساتھ وہ کٹ جائے گی، پھر اس کے لیے ملا دی جائے گی اور وہ اس کے ساتھ بلند ہو جائے گا۔ یا رسول اللہ! میرا باپ آپ پر قربان، مجھے بتایئے! میں نے درست کہا یا خطا کی؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے کچھ درست کہا، کچھ خطا کی۔'' انھوں نے کہا: ''آپ کو اللہ کی قسم ہے! آپ مجھے وہ ضرور بتائیں جو میں نے خطا کی ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم مت ڈالو۔'' [ بخاري، التعبير، باب من لم ير الرؤيا الأول عابر إذا لم يصب : ۷۰۴٦ ]

زیرِ تفسیر آیت میں '' بِضْعِ '' کی تعیین میں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خطا ہو گئی۔ جب امت کے سب سے بڑے شخص سے خطا ہو سکتی ہے تو ان ائمہ سے خطا کیوں نہیں ہو سکتی جن کی تقلید میں لوگوں نے اسلام میں چار فرقے بنا رکھے ہیں، جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے برابر تو کجا صحابی یا تابعی بھی نہیں ہیں اور جن کی بہت سی اجتہادی خطائیں ان کے شاگردوں نے بھی بیان کی ہیں اور جو وحی کے شرف

کے حامل بھی نہ تھے کہ وحی کے ذریعے سے ان کی خطا کی اصلاح ہو جاتی ہو۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ امتیوں کے اجتہادات و آراء کو دین سمجھنے کے بجائے صرف کتاب وسنت کو لازم پکڑیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور جو خطا سے پاک ہیں، فرمایا: ﴿ اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ﴾ [ الأعراف : ۳ ] ''اس کے پیچھے چلو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے سوا اور دوستوں کے پیچھے مت چلو۔'' چوتھی بات یہ کہ ان دونوں روایتوں میں سے ایک میں پانچ سال کی مدت مقرر کرنے کا ذکر ہے اور دوسری میں چھ سال کا۔ اس کے باوجود ائمہ حدیث نے دونوں کو صحیح کہا ہے اور اس اختلاف کو روایتوں کے ضعف کا باعث نہیں سمجھا، کیونکہ اصل مقصود دونوں کا ایک ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو مدت طے کی تھی وہ ''بِضْعِ'' کی اصل مراد سے کم تھی۔

❷ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن ابی حاتم اور ابن جریر سے دو روایتیں نقل کی ہیں، جن میں ذکر ہے کہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طے کردہ مدت میں رومی غالب نہ آئے اور مشرکین نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شرط کی رقم لے لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر کہ ''بِضْعٌ'' سے مراد نو (۹) سال تک ہوتے ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ مشرکین سے شرط لگائی، جس میں مدت زیادہ کی اور شرط کی رقم بھی زیادہ کی۔ چنانچہ نو سال پورے ہونے سے پہلے رومی فارسیوں پر غالب آ گئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے شرط کی رقم وصول کر لی۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو، کیونکہ صحیح روایات میں اور ان میں کوئی تعارض نہیں۔ مگر سند کی رو سے یہ روایات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ اس مقام پر ابن کثیر رحمہ اللہ نے رومیوں کے فارسیوں پر غالب آنے کے واقعات کی مزید کچھ تفصیل بیان کی ہے، مگر اسے غریب ترین قرار دیا ہے۔ ہمارے بعض اردو مفسرین نے بعض انگریز مؤرخین سے لمبی تفصیل ذکر کی ہے، مگر ان تمام تفصیلات کی کوئی پکی سند ہے نہ کوئی معتبر ذریعہ۔ قرآن کی تفسیر کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے جو قرآن مجید اور صحیح روایات سے ثابت ہے۔ اور یہ کوئی کم عجیب نہیں کہ وہ بات جس کا ہونا لوگوں کی نگاہ میں ممکن ہی نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اس کی پیش گوئی فرما دی اور ظاہری اسباب میں سے کوئی سبب موجود نہ ہونے کے باوجود چند ہی سالوں میں وہ رومی دوبارہ غالب آ گئے جو بری طرح مغلوب تھے۔

❸ **فِيْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ** : ''سب سے قریب زمین'' سے مراد جزیرۂ عرب کی قریب ترین زمین ہے۔ یہ ''اذرعات'' اور ''بصریٰ'' کے درمیان کا خطہ ہے، جو شام کی سرحد پر حجاز سے ملتا ہوا مکہ کے قریب واقع ہے۔

❹ **فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ** : یہاں ایک سوال ہے کہ متعین وقت بتانے کے بجائے ''بِضْعِ'' کا لفظ بولنے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کو وہ سال، وہ مہینا اور وہ وقت معلوم تھا جس میں روم نے فارس پر غالب آنا تھا مگر اس وقت خبروں کا دوسرے مقامات پر پہنچنا اس طرح تیز رفتار نہ تھا جس طرح آج کل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ متعین وقت بتا دیتا، پھر کسی مقام پر اطلاع پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو وہاں کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی کتاب پر طعن کا موقع مل سکتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مدت کی تعیین کے لیے ایسا لفظ استعمال فرمایا جس سے اس بات کا امکان ہی نہ رہا اور ہر شخص کو قرآن کی پیش گوئی کا حق ہونا ثابت ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہ وقت تھوڑا مخفی رکھنے میں یہ حکمت بھی تھی کہ اس غلبے کے انتظار میں مسلمانوں کے حوصلے بلند رہیں کہ اب غلبہ ہوا اور اب ہوا۔ اگر متعین وقت بتا دیا جاتا تو اتنی مدت تک حوصلے ٹوٹے رہتے۔

5 لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ : ’’ الْاَمْرُ ‘‘ سے مراد اللہ کا تکوینی امر ہے، یعنی اس کا ’’کُنْ‘‘ کہنا، جس سے ہر کام ہو جاتا ہے۔ یعنی روم کے مغلوب ہونے سے پہلے بھی ہر کام صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تھا اور رومیوں کے چند سالوں میں غالب آنے کے بعد بھی ہر کام اسی کے اختیار میں ہے۔ اس میں یہ بھی سبق ہے کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ فلاں کی تدبیر کی وجہ سے اسے فتح ہوئی اور فلاں کی کوتاہی کی وجہ سے اسے شکست ہوئی۔ نہیں! وہ تدبیر یا کوتاہی بھی اسی کی تقدیر میں طے شدہ ہے۔ اسی طرح کوئی یہ نہ سمجھے کہ آسمان کی گردش یا سورج، چاند یا کسی ستارے کی تاثیر سے ایسا ہوا، نہیں! جو ہوا پہلے بھی اللہ کے حکم سے ہوا اور بعد میں بھی اسی کے حکم سے ہوگا۔ سورج، چاند، ستاروں یا آسمان کی گردش کا کسی واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا تو بعض لوگوں نے کہا کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کی وجہ سے سورج گرہن ہوا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ ، وَلٰكِنَّهُمَا آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوْهُمَا فَصَلُّوْا )) [ بخاري، الكسوف، باب لا تنكسف الشمس لموت أحد ولا لحياته : ۱۰۵۷ ] ’’سورج اور چاند نہ کسی کی موت کی وجہ سے گرہن ہوتے ہیں اور نہ کسی کی زندگی کی وجہ سے، بلکہ وہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، تو جب ان دونوں کو دیکھو تو نماز پڑھو۔‘‘

6 وَ يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ : ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’جب بدر کا دن ہوا تو رومی فارس پر غالب ہوئے اور مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوئی اور یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿ الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ﴾ (ابوسعید رضی اللہ عنہ نے) فرمایا: ’’تو مسلمان روم کے فارس پر غالب آنے سے خوش ہوئے۔‘‘ [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة الروم : ۳۱۹۲، و قال حسن غريب و قال الألباني صحيح لغيره ] ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس روایت اور سفیان ثوری اور بہت سے اہلِ علم کے قول کے مطابق روم کو فارس پر یہ غلبہ اس روز حاصل ہوا جس روز مسلمان بدر میں مشرکین پر فتح یاب ہوئے۔ مفسر رازی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ’’ وَ يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ‘‘ (اور اس دن مومن اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے) سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس دن مومن روم کی فارس پر فتح کی خبر سے خوش ہوں گے اور یہ بھی کہ اس دن مومن مشرکین کے خلاف اللہ کی نصرت اور بدر کی فتح پر خوش ہوں گے۔ مگر راجح یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس دن اہلِ روم فارس پر غالب آئیں گے اس دن مسلمان مشرکین پر فتح یابی اور اللہ کی نصرت سے خوش ہوں گے، کیونکہ بدر کے دن مسلمانوں کو اپنی فتح پر خوشی ہوئی تھی اور کسی روایت میں ذکر نہیں کہ روم کی فتح یابی کی خبر عین بدر کے دن پہنچی تھی۔ گویا اس آیت میں دو خوش خبریاں ہیں، ایک روم کا چند سالوں میں فارس پر غالب آنا اور ایک اس دن مسلمانوں کا مشرکین پر غلبے سے خوش ہونا اور سب جانتے ہیں کہ دونوں بشارتیں پوری ہوئیں۔

بعض تابعین کا خیال ہے کہ رومیوں کو ایرانیوں پر فتح صلح حدیبیہ کے بعد ہوئی۔ ان کا استدلال اس واقعہ سے ہے کہ قیصر روم نے منت مانی تھی کہ جب وہ فتح یاب ہوگا تو حمص سے پیدل چل کر ایلیا (بیت المقدس) جائے گا۔ چنانچہ جب وہ ایلیا آیا

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۝۶

تو ابھی واپس نہیں ہوا تھا کہ اسے دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط ملا جو آپ نے اس کے نام صلح حدیبیہ کے بعد لکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے ابوسفیان کو بلایا (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور شام میں تجارت کی غرض سے آئے ہوئے تھے) اور ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مختلف سوالات کیے، جیسا کہ صحیح بخاری میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کو ایرانیوں پر فتح بھی اسی سال ہوئی، لیکن اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ رومیوں کو پہلی فتح تو بدر کے دن ہوئی، مگر دشمن کی فوجوں کی مکمل صفائی اور تمام علاقوں کے مکمل بندوبست کے بعد منت پوری کرنے کی نوبت چار سال بعد صلح حدیبیہ کے سال آئی۔ (واللہ اعلم)

⑦ **يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ** : آپس میں لڑنے والے کفار میں سے جس کی چاہتا ہے مدد کر دیتا ہے اور مسلمانوں اور کافروں کی لڑائی میں بھی جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے۔ نہ فتح یاب کرنا اس کے راضی ہونے کی دلیل ہے اور نہ شکست دینا اس کی ناراضی کی دلیل ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ آدمی کو آزماتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ** ﴾ [ آل عمران : ۱۴۰ ] ''اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں، اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے بعض کو شہید بنائے۔'' اور فرمایا: ﴿ **قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** ﴾ [ آل عمران : ۲۶ ] ''کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

⑧ **وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ** : اور وہی عزیز (سب پر غالب) ہے، جسے وہ نصرت سے نواز دے پھر کوئی اس پر فتح نہیں پا سکتا، مگر اس کا غلبہ بے رحم نہیں، بلکہ وہ رحیم (بے حد رحم والا) ہے، جب چاہتا ہے مغلوب اور شکست خوردہ لوگوں کو پھر فتح سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

**آیت 6** ① **وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ** : یعنی روم کا چند سالوں میں فارس پر غالب آنا اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، جس کی سنت یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

② **وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ** : لیکن اکثر لوگ، جن میں کفارِ قریش بھی شامل ہیں، یہ بات نہیں جانتے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ کوئی ایسی بات کرتا ہے جو ظاہری اسباب کے لحاظ سے ممکن نہیں ہوتی تو وہ اللہ کے وعدے کو جھوٹا کہنے لگتے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ ظاہری اسباب کے علاوہ بے شمار باطنی اسباب بھی ہوتے ہیں جو اندر ہی اندر اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں اور

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚۖ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

وہ دنیا کی زندگی کے کچھ ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے، وہی غافل ہیں ۝

نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ تمام ظاہری اور باطنی اسباب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کام کا ارادہ کر لے، چاہے تو اس کے اسباب پیدا کر دے اور چاہے تو اسباب کے بغیر ہی اسے پورا کر دے۔

**آیت 7** ① **يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا**...... : ”**ظَاهِرًا**“ پر تنوین تقلیل و تحقیر کے لیے ہے، یعنی وہ دنیا کی زندگی کے بس ظاہر کو جانتے ہیں، وہ بھی تھوڑا سا۔ ان کا علم یہیں تک محدود ہے۔ ان کی ساری تگ و دو دنیا میں کھانے پینے، پہننے اور ہر قسم کی لذتوں اور آسائش و آرائش کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے ہے۔ وہ دنیا کی زندگی کے باطن، یعنی اس کی اصل حقیقت کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ یہ چند روزہ ہے اور امتحان گاہ ہے۔ رہی آخرت، تو وہ اس سے بالکل ہی غافل ہیں، یعنی انھیں اس کی فکر ہی نہیں کہ وہاں اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے پیش ہونا ہے۔

② یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اکثر لوگ دنیا کی زندگی کے ظاہر کے کچھ حصے کو جانتے ہیں، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار حیران کن ایجادات کر چکے ہیں، مثلاً بری، بحری اور فضائی سواریاں، تیل، گیس، ہوا اور پانی سے چلنے والی بے شمار قسم کی مشینیں، بجلی اور ایٹم وغیرہ، تو یہ سب کچھ تھوڑا سا کیسے ہوا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی دنیوی ترقی جس طرح آج کے مقابلے میں بالکل معمولی ہے، اسی طرح ہر آنے والے دن کے مقابلے میں موجودہ ترقی بالکل معمولی ہے، مگر کافر صرف اسی ترقی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، آخرت کے امور کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

③ کفار کے دنیا کے ظاہر کا کچھ علم رکھنے اور آخرت سے یکسر غافل ہونے کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ انھوں نے حساب اور علم ہندسہ میں اتنا کمال حاصل کیا کہ انھوں نے کیلکولیٹر اور کمپیوٹر ایجاد کر لیے، جن کے ذریعے سے وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی رقموں کا بالکل صحیح حساب لگا لیتے ہیں، مگر آخرت کے معاملات سے اس قدر بے خبر ہیں کہ ان میں سے بعض پیدا کرنے والے ہی کے منکر ہیں۔ جب کہ جاہل سے جاہل شخص بھی جانتا ہے کہ کوئی چیز بنانے والے کے بغیر نہیں بنتی۔ پھر بعض اعلیٰ درجے کی مخلوق ہو کر پتھروں کو پوج رہے ہیں اور بعض ایک رب ماننے کے بجائے تین رب مانتے ہیں، مسیح خدا، مریم خدا اور روح القدس خدا، جو ایک جمع ایک، جمع ایک کے نتیجے میں تین خدا بنتے ہیں، مگر ان کا اصرار ہے کہ یہاں ایک جمع ایک، جمع ایک تین نہیں بنتے بلکہ ایک خدا بنتا ہے۔ بتائیے اس سے بڑھ کر جہالت کیا ہو سکتی ہے، کبھی ایک، ایک اور ایک بھی ایک ہو سکتے ہیں؟ پھر ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ ہم توحید فی التثلیث کو اس لیے مانتے ہیں کہ یہ عقل سے اونچی بات ہے، حالانکہ یہ بھی ان کی جہالت ہے۔ کوئی شخص دو جمع دو کا نتیجہ پانچ نکالے تو یہ عقل سے اونچی بات نہیں ہوگی، بلکہ صریح عقل کے خلاف ہوگی۔ یہی حال تین خداؤں کے ایک خدا ہونے کا ہے۔

اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾

اور کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اسے پیدا نہیں کیا مگر حق اور ایک مقرر وقت کے ساتھ اور بے شک بہت سے لوگ یقیناً اپنے رب سے ملنے ہی کے منکر ہیں ﴿۸﴾

**آیت 8** ① **اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ......** : اس میں دو احتمال ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "**اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ**" ایک مستقل جملہ ہے اور "**مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى**" دوسرا جملہ ہے۔ یعنی کیا ان لوگوں نے جو اللہ کے رسولوں اور اس کی ملاقات کو جھٹلاتے ہیں اپنی جانوں میں غور نہیں کیا، کیونکہ ان کی جانوں میں کئی نشانیاں ہیں، جن کے ساتھ وہ جان سکتے ہیں کہ جس ذات نے انھیں عدم سے وجود بخشا ہے وہ اس کے بعد انھیں دوبارہ بھی زندہ کرے گا اور یہ کہ وہ ذات جس نے انھیں ایک سے دوسری کئی حالتوں میں منتقل کیا، چنانچہ نطفے سے علقہ میں، پھر مضغہ میں، پھر ذی روح انسان میں، پھر بچے کی صورت میں، پھر جوان، پھر بوڑھے، پھر کھوسٹ بوڑھے کی شکل میں منتقل کیا۔ آیا اس ذات کے لائق ہے کہ انھیں شتر بے مہار چھوڑ دے، نہ انھیں کوئی حکم دے، نہ کسی چیز سے منع کرے، نہ انھیں کوئی ثواب ہو نہ عقاب ہو۔ نہیں، بلکہ ہر حال میں وہ مختلف حالتوں سے منتقل ہوتے ہوئے اپنے اعمال کے محاسبے کے لیے اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ انشقاق: ۶ اور ۱۶ تا ۱۹) (عبد الرحمٰن سعدی)

دوسرا احتمال یہ ہے کہ "**فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ**" "**اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا**" کا ظرف ہے اور جملہ "**بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى**" پر مکمل ہو رہا ہے۔ یعنی کیا ان لوگوں نے اپنی جانوں یعنی اپنے دلوں میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان کی تمام اشیاء کو نہ عبث اور بے مقصد پیدا فرمایا ہے اور نہ ہی ہمیشہ رہنے کے لیے بنایا ہے، بلکہ انھیں اپنی کمال حکمت کے مطابق حق کے ساتھ یعنی حقیقی مقصد (آزمائش) کے لیے پیدا فرمایا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿**لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا**﴾ [ هود : ۷ ] "تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے عمل میں کون بہتر ہے۔" اور ایک مقررہ مدت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، جہاں پہنچ کر ہر حال میں اس سلسلے کو ختم ہونا ہے اور وہ مقررہ مدت قیام قیامت، حساب اور ثواب و عتاب کا وقت ہے۔ یہی بات اس آیت میں فرمائی ہے: ﴿**اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ**﴾ [ المؤمنون : ۱۱۵ ] "تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟" دیکھیے یہاں اللہ تعالیٰ نے کیسے واضح فرمایا کہ اگر وہ مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد ایسے ہی چھوڑ دے اور انھیں دوبارہ زندہ کر کے اپنے پاس لے جا کر حساب نہ کرے تو اس کا انسانوں کو پیدا کرنا عبث ہوگا۔ (شنقیطی) آیت کی تفسیر کا پہلا احتمال بھی صحیح ہے مگر یہ دوسرا زیادہ واضح ہے، اس لیے ترجمہ اسی احتمال کے مطابق کیا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں کہ زمین و آسمان کی پیدائش بے مقصد نہیں بلکہ حق ہی کے ساتھ ہے اور یہ کہ قیامت ہر حال میں قائم ہوگی، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اکٹھی بیان ہوئی ہیں۔

اَوَ لَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ؕ﴿۹﴾

اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ سخت تھے اور انھوں نے زمین کو پھاڑا اور اسے آباد کیا اس سے زیادہ جو انھوں نے اسے آباد کیا ہے اور ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے ﴿۹﴾

دیکھیے سورۂ دخان (۳۸ تا ۴۰) اور سورۂ حجر (۸۵)۔

② وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ : اور بہت سے لوگ آخرت کے اور دوبارہ زندہ ہو کر اپنے رب کی ملاقات کے اور حساب کتاب کے منکر ہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنے دلوں میں غور ہی نہیں کیا۔ اگر وہ اپنے دلوں میں زمین و آسمان پر اور ان کے درمیان کی بے شمار عجیب و غریب اشیاء (دیکھیے بقرہ: ۱۶۴) پر غور کرتے تو انھیں اپنے رب کی ملاقات کا یقین ہو جاتا۔

**آیت 9** ① اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا ...... : آخرت کے حق ہونے کے دلائل ذکر کرنے کے بعد اس کی تکذیب کرنے والی پہلی اقوام کے برے انجام سے ڈرایا ہے۔ کیونکہ ان اقوام کے آثار مکہ مکرمہ کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ عاد و ثمود ہوں یا اصحابِ مدین اور قومِ لوط ہو یا قومِ سبا یا قومِ فرعون، مکہ مکرمہ کے لوگ تجارت کے لیے ان تمام علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ "الْاَرْضِ" سے مراد مکہ مکرمہ اور اس کے ارد گرد کے علاقے ہیں، جن کا قرآن میں جا بجا ذکر ہے۔ یعنی یہ لوگ جو اللہ کی وحدانیت، اس کے رسولوں کی رسالت اور آخرت کو جھٹلانے والے ہیں، کیا اس زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان جھٹلانے والے لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ یقیناً یہ لوگ زمین میں چلے پھرے ہیں اور انھوں نے سب کچھ دیکھا ہے، مگر عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ انھیں کچھ نصیحت ہوتی کہ وہ لوگ قوت کے لحاظ سے ان سے بہت زیادہ تھے۔ ان کے قد کاٹھ اور ان کی جسمانی، مالی اور فوجی قوت ان سے کہیں زیادہ تھی اور انھوں نے زمین کو ان سے زیادہ پھاڑا تھا۔ زمین کو پھاڑنے میں زراعت، معدنیات نکالنا اور آب پاشی کا نظام قائم کرنا سبھی کچھ آ جاتا ہے اور انھوں نے زمین کو اس سے کہیں زیادہ آباد کیا جو ان اہلِ مکہ نے آباد کیا ہے۔ انھوں نے بڑی بڑی عمارتیں، کارخانے اور پانی کے بند بنائے۔ ان کے پاس ان کے رسول واضح معجزے اور دلائل لے کر آئے، مگر انھوں نے انھیں جھٹلا دیا، تو اللہ کے عذاب کا نشانہ بنے اور اب تک ان کی بستیوں کے نشانات ان کی بربادی کی داستان سنا رہے ہیں۔

② كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ ...... : اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ پہلے لوگ ان سے قوت میں زیادہ تھے اور انھوں

عٓ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

**پھر ان لوگوں کا انجام جنھوں نے برائی کی بہت برا ہی ہوا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور وہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے ⑩ اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ بنائے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ⑪**

نے زمین کو پھاڑا اور اسے آباد کیا، اس سے زیادہ جو انھوں نے اسے آباد کیا ہے، اس میں کفار (اہل مکہ) پر چوٹ بھی ہے، کیونکہ اہلِ مکہ کا اہلِ مصر، اہلِ شام اور اہلِ یمن کے ساتھ زمین کی زراعت اور آباد کاری میں کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ مکہ میں نہ قابل زراعت زمین تھی، نہ انھوں نے زمین کو پھاڑا اور نہ ہی ان کے پاس آب پاشی کا کوئی نظام تھا۔ جبکہ مصر، شام اور یمن زراعت اور دوسرے شعبوں میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ سو اہلِ مکہ کو بھی زراعت اور زمین کی آباد کاری کرنے والے قرار دینے میں اور پہلی قوموں کو ان سے زیادہ ترقی یافتہ قرار دینے میں ان کے ساتھ ایک طرح کا مذاق بھی ہے کہ ترقی کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو پیش نظر رکھیں اور دیکھیں کہ جب اتنی زبردست ترقی یافتہ قومیں اپنے رسولوں کو جھٹلانے کی پاداش میں ہلاک کر دی گئیں تو ان بے چاروں کی کیا اوقات ہے۔

③ **فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ** ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی اقوام کو تباہ کیا ان سب میں قدر مشترک ظلم تھا اور ظلم کی بنیاد آخرت سے انکار ہے، کیونکہ جو قوم آخرت پر یقین رکھتی ہو اور اسے اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس ہو تو وہ ظلم کر ہی نہیں سکتی۔ سو اگر آخرت سے انکار کی وجہ سے ان پر عذاب آیا تو اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ یہ ان کے اپنے ظلم کا نتیجہ تھا اور اگر اہلِ مکہ پر اپنے رسول کو اور آخرت کو جھٹلانے کے نتیجے میں عذاب آیا تو ان کے اپنے ظلم کی وجہ ہی سے آئے گا۔

**آیت 10** **ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى** ...... : "**السُّوْٓاٰى**" "أَسْوَأُ" کا مؤنث ہے جو اسم تفضیل ہے، مگر یہاں تفضیل مراد نہیں بلکہ مراد مبالغہ ہے، یعنی بہت ہی برا۔ "**اَنْ كَذَّبُوْا**" سے پہلے لام محذوف ہے، یعنی اس لیے کہ انھوں نے جھٹلایا۔ "**ثُمَّ**" کا لفظ لانے میں اشارہ ہے کہ ان قوموں کو بہت مہلت دی گئی، پھر آخر کار ان کا انجام بہت ہی برا ہوا۔

**آیت 11** **اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ** ...... : پچھلی آیات کا حاصل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ دوبارہ زندہ کرنے اور آخرت برپا کرنے پر قادر ہے۔ اب یہی بات صراحت کے ساتھ بطور دعویٰ ذکر فرمائی اور اس طرح فرمائی کہ اس کی دلیل بھی ساتھ ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ **اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ** ﴾ اب تک جو خلق بھی پیدا ہوئی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہے اور وہ اب بھی ہر لمحے جو چاہتا ہے نئی سے نئی مخلوق پیدا کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہ بات تم بھی مانتے ہو کہ دوسرے کسی نے نہ خلق کی ابتدا کی، نہ کر رہا ہے، نہ کرے گا اور نہ کسی میں جرأت ہے کہ یہ دعویٰ ہی کرے۔ جب یہ حق ہے تو یہ بھی حق ہے کہ وہ اس خلق کو دوبارہ بھی پیدا کرے گا، کیونکہ اس کے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنا اور دوبارہ پیدا کرنا یکساں ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، تاکہ ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا ملے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى** ﴾ [ طٰہٰ : ۱۵ ] "تاکہ ہر شخص کو اس کا

وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ⑫ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَ كَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ⑬ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ⑭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ⑮

اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم ناامید ہو جائیں گے ⑫ اور ان کے لیے ان کے شریکوں میں سے کوئی سفارش کرنے والے نہیں ہوں گے اور وہ اپنے شریکوں سے منکر ہو جائیں گے ⑬ اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے ⑭ پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو وہ عالی شان باغ میں خوش وخرم رکھے جائیں گے ⑮

بدلا دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے۔“

**آیت 12** **وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ** : ”أَبْلَسَ الرَّجُلُ“ جب کوئی آدمی لاجواب ہو کر خاموش ہو جائے اور اسے مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملے، مراد ناامید ہونا ہے۔ یعنی جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم لوگ نجات سے ناامید ہو جائیں گے، کیونکہ ان کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے گا اور انھیں اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کوئی بات نہیں ملے گی۔ مجرموں سے مراد یہاں مشرکین ہیں، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے، گناہ گار مسلمان مراد نہیں ہیں۔

**آیت 13** ① **وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا** : یعنی مشرکین نے جن ہستیوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا تھا ان میں سے کوئی بھی ان کی شفاعت نہیں کرے گی، کیونکہ اس دن نہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے گا اور نہ کسی ایسے شخص کے حق میں سفارش ہو سکے گی جس کے لیے شفاعت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن نہ ہو۔ دیکھیے آیت الکرسی اور سورۂ طٰہٰ (۱۰۹)۔

② **وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۷) اور سورۂ انعام (۲۲، ۲۳)۔

**آیت 14** **وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ**: دنیا میں مومن و کافر اور مُوحّد و مشرک اکٹھے رہ رہے ہیں، ان کے درمیان وطن، نسب، کاروبار، پیشے اور دوستی وغیرہ کے تعلقات بھی ہوتے ہیں، مگر قیامت کے دن ان کے درمیان ایسی جدائی واقع ہو جائے گی کہ پھر کبھی اکٹھے نہیں ہوں گے، چنانچہ کہا جائے گا: ﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ [ یٰس : ۵۹ ] ”اور الگ ہو جاؤ آج اے مجرمو!“ اور تمام اہل محشر دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، فرمایا: ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾ [ الشوریٰ : ۷ ] ”ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ بھڑکتی آگ میں۔“

**آیت 15** **فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ**...... : ”رَوْضَةٍ“ میں تنوین تعظیم اور تفخیم کے لیے ہے، عظیم اور عالی شان باغ، مراد جنت ہے۔ ”يُحْبَرُوْنَ“ ”حَبَرَهُ يَحْبُرُهُ“ جب کسی کو ایسا خوش کیا جائے کہ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھے اور

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآیِٔ الۡاٰخِرَۃِ فَاُولٰٓئِکَ فِی الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۱۶﴾

فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾

اور رہ گئے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تو وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے ﴿۱۶﴾ پس اللہ کی تسبیح کرو، جب تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو ﴿۱۷﴾

"تَحۡبِیۡرٌ" مزین کرنا، چمکا دینا۔ یعنی ایمان اور عمل صالح والے لوگ عظیم اور عالی شان باغ یعنی جنت میں خوش کیے جائیں گے، انھیں کھانے پینے، رہنے اور دوستوں، بیویوں اور دل میں آنے والی ہر خواہش پوری ہونے کی خوشی عطا کی جائے گی اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی زیارت کی خوشی نصیب ہوگی، جس سے بڑی کوئی خوشی نہیں ہوگی۔

**آیت 16** وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ...... : عذاب میں حاضر کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے بھاگنے کی کوشش کریں گے، مگر فرشتے انھیں مارتے پیٹتے، باندھتے گھسیٹتے ہوئے جہنم میں لا حاضر کریں گے اور پھر وہ ہمیشہ اس میں حاضر رکھے جائیں گے، کبھی نکل نہیں سکیں گے۔

**آیت 17** ① فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ: "سُبۡحَانَ اللّٰہِ" فعل محذوف "سَبِّحُوۡا" کا مفعول مطلق ہے۔ ''پس تم اللہ کی تسبیح کرو'' میں ''پس'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تم جان چکے کہ ایمان اور عمل صالح والوں کا حال کیا ہوگا اور اللہ کی آیات کا انکار اور ان تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوگا، تو تم پر لازم ہے کہ جنت کے عالی شان باغوں میں جانے کے لیے اور عذابِ الٰہی سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو۔ اسے ہر شریک، ہر عیب اور ہر کمزوری سے پاک مانو۔ مشرکین و کفار اللہ کے شریک بنا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو قیامت قائم کرنے سے عاجز قرار دے رہے ہیں، تم ان سب باتوں سے اللہ تعالیٰ کے پاک ہونے کا اعلان کرو اور اس کی تسبیح کرو۔

② حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ...... : زبان اور عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے اظہار اور اعلان کی بہترین اور جامع صورت نماز ہے۔ اس لیے مفسرین نے یہاں تسبیح سے مراد نماز لی ہے اور یہاں اس کا واضح قرینہ بھی موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح تو دن رات کے ہر لمحے میں ہوسکتی ہے اور ہونی چاہیے، اس کے لیے اوقات مقرر کرنے کا مطلب یہی ہے کہ یہاں تسبیح کی خاص صورت کا حکم دیا جا رہا ہے، جو نماز پنج گانہ ہے۔ چنانچہ "حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ" (جب تم شام کرتے ہو) سے مغرب اور عشاء مراد ہیں، "حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ" (جب تم صبح کرتے ہو) سے صبح کی نماز مراد ہے، "عَشِیًّا" (پچھلے پہر) سے عصر کی نماز اور "حِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ" (جب تم ظہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو) سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ یاد رہے نمازوں کے یہ اوقات اجمالاً بیان ہوئے ہیں، ان کے اول و آخر کی تعیین اور نمازوں کی ادائیگی کا طریقہ حدیث رسول ﷺ میں بیان ہوا ہے، جس کے بغیر قرآن مجید کے حکم پر عمل ممکن ہی نہیں۔ قرآن مجید میں نمازوں کے اوقات کے بیان کے لیے سورۂ بنی اسرائیل (۷۸)، ہود (۱۱۴) اور طٰہٰ (۱۳۰) کی تفسیر پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔

وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

ع ۲ ۹ ۵

اور اسی کے لیے سب تعریف ہے آسمانوں اور زمین میں اور پچھلے پہر اور جب تم ظہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو ﴿۱۸﴾ وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے ﴿۱۹﴾

**آیت 18** ① وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ......: اس آیت میں "وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ" کا تعلق "فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ" کے ساتھ ہے۔ مسلسل عبارت یوں ہے: "فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۔" "وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کا جملہ درمیان میں معترضہ ہے، یعنی صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ہر خوبی کا مالک بھی وہی ہے، آسمانوں میں اور زمین میں جہاں بھی خوبی کی کوئی بات ہے اس خوبی کا مالک اور اس پر حمد کا حق دار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ سو تسبیح کے ساتھ تحمید کا فریضہ بھی ادا کرو۔

② نمازوں کے یہ پانچوں اوقات نظام عالم میں روزانہ برپا ہونے والی پانچ تبدیلیوں کے مطابق رکھے گئے ہیں۔ شام کو آفتاب عالم تاب غروب ہوتا ہے، دن کی حکومت ختم ہوتی ہے، اس وقت نماز مغرب کا حکم ہے، پھر عشاء تک شفق کا راج ہوتا ہے۔ شفق غروب ہونے کے ساتھ سورج کا بقیہ اثر بھی ختم ہو کر رات کا اندھیرا مکمل ہو جاتا ہے، جس پر عشاء کی نماز کا حکم ہے۔ طلوع فجر کے ساتھ رات اپنا دامن سمیٹتی ہے، اس وقت فجر کی نماز کا حکم ہے۔ پھر سورج کی روشنی اور گرمی جب اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو ظہر کا حکم ہے اور آفتاب کی حرارت اور روشنی کمال کے بعد زردی میں بدلنا شروع ہوتی ہے تو عصر کی نماز کا حکم ہے۔ گویا ہر انقلاب عالم پر انقلاب لانے والے کے حضور سجدہ ریز ہونے کا حکم ہے۔

**آیت 19** يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ......: کائنات میں دن کو رات سے اور رات کو دن سے بدلنے اور صبح و شام اور عشاء اور ظہر و عصر کا تغیر برپا کرنے کے ذکر کے ساتھ ہی اپنی قدرت کے کمال، یعنی زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو نکالنے اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دینے کا بیان فرمایا۔ (مزید دیکھیے آل عمران: ۲۷) اور ان تبدیلیوں کو بطور دلیل ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی طرح تم بھی قیامت کے دن دوبارہ زمین سے زندہ کر کے نکال کھڑے کیے جاؤ گے۔ یعنی تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ کائنات کا یہ کارخانہ اسی طرح جاری ہے کہ مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکلتا ہے۔ زمین مردہ پڑی ہوتی ہے، اس میں سبزی اور تروتازگی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا، لیکن پانی برستے ہی طرح طرح کی سبزیاں اُگ آتی ہیں اور ہزاروں قسم کے جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے قادر مطلق کے لیے، جس کی قدرت سے یہ سب کچھ ہوا، تمھیں تمھارے مر جانے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ اور دیکھیے سورۂ یٰس (۳۳) اور حج (۵)۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر اچانک تم بشر ہو، جو پھیل رہے ہو ﴿۲۰﴾

آیت 20 ① وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ......: یہاں سے چھ آیات تک ایسی نشانیوں یعنی عجیب و غریب چیزوں کا بیان ہے جو ایک تو اوپر کے سلسلہ کلام کے مطابق اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کا محاسبہ کرے اور انھیں جزا و سزا دے۔ دوسرے وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ کائنات نہ خود بنی ہے، نہ خود بخود چل رہی ہے اور نہ ہی ایک سے زیادہ ہستیوں نے اسے بنایا ہے، بلکہ اسے اکیلے اللہ نے پیدا فرمایا ہے، وہی اسے چلا رہا ہے، اس کارخانۂ ہستی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ یہ چھ کی چھ آیات "وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ" کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ چند آیات ہیں، تمام آیات کا شمار ہی نہیں، مگر سمجھنے اور ایمان لانے کے لیے یہی نشانیاں کافی ہیں۔

② اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ......: "تُرَابٍ" پر تنوین تقلیل و تحقیر کی ہے، اس لیے ترجمہ "حقیر مٹی" کیا گیا ہے۔ اپنی نشانیوں میں سب سے پہلے انسان کی پیدائش کا ذکر فرمایا، کیونکہ انسان دوسری تمام چیزوں سے زیادہ اپنے آپ کو جانتا ہے اور اسے اپنے وجود پر غور کسی بھی دوسری چیز پر غور سے زیادہ آسان ہے۔ "اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کرنے سے مراد یہ ہو کہ تمھارے باپ آدم کو حقیر مٹی سے پیدا کیا۔ "ثُمَّ" (پھر) کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اسے اکیلے ہی کو بنا کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ نطفے اور بیضے کے ملاپ کے ساتھ اس کے توالد و تناسل کا ایسا عظیم الشان سلسلہ جاری کیا کہ تم بشر کی صورت میں ساری زمین پر پھیل رہے ہو اور سیکڑوں ہزاروں سالوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ لفظ "اِذَاۤ" (اچانک) عموماً "فاء" کے بعد آتا ہے، یہاں "ثُمَّ" کے بعد آیا ہے، جس میں تاخیر کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس میں اس تاخیر اور ان مراحل کی طرف بھی اشارہ ہے جو آدم علیہ السلام کی مٹی سے تخلیق اور اس کے بعد کے انسانوں کے وجود میں آنے کے دوران پیش آتے ہیں، مثلاً نطفہ، علقہ اور مضغہ وغیرہ۔

دوسرا مطلب یہ کہ "تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا" سے مراد یہ ہو کہ اس نے تم سب کو حقیر مٹی سے پیدا کیا، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو مٹی سے پیدا کیا، جو مردہ ہے، جس میں زندگی کا نام و نشان نہیں۔ "مٹی" کا مزاج سرد خشک ہے، وہ حرارت سے خالی ہے اور رطوبت سے بھی، جن سے حیات وجود میں آتی ہے۔ تمھارا وجود اور ان تمام اشیاء کا وجود جن سے تمھاری زندگی قائم ہے، اسی بے جان مٹی سے قائم ہے۔ کیونکہ انسان کی پیدائش نطفہ سے ہے، جو ظاہر ہے غذا سے بنتا ہے اور غذا نباتات سے بنتی ہے یا حیوانات کے گوشت، دودھ اور گھی سے، ان حیوانات کی زندگی بھی نباتات یا ایسی چیزوں پر موقوف ہے جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ غرض تمھارا وجود اس مردہ مٹی سے ہے جس سے پیدا ہونے کے مرحلے گزارنے کے بعد تم اچانک بشر کی صورت میں زمین میں پھیل رہے ہو۔ "اچانک" اس لیے فرمایا کہ تخلیق کے تمام

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھی سے بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان کی طرف (جاکر) آرام پاؤ اور اس نے تمھارے درمیان دوستی اور مہربانی رکھ دی، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً

---

مراحل لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہوتے ہیں، تمام مراحل مکمل ہونے کے بعد ماں کے پیٹ سے بچے اور انڈے سے چوزے کا ظہور اچانک ہوتا ہے۔ ان مراحل کے لیے دیکھیے سورۂ حج (۵) اور سورۂ مومنون (۱۲، ۱۳)۔

③ **تَنْتَشِرُوْنَ** : یعنی بے جان مٹی سے پیدا کر کے تمھیں ایسی بھرپور زندگی عطا فرمائی کہ تم پوری زمین میں پھیل گئے۔ تم نے محل، قلعے، آبادیاں اور شہر تعمیر کیے، خشکی، سمندر اور فضا میں سفر کے ذریعے سے زمین کا کونا کونا چھان مارا۔ شہروں میں دیکھو یا صحراؤں میں، جنگلوں میں دیکھو یا پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا سمندروں کی وسعتوں میں، ہر جگہ انسان کا وجود نظر آ جائے گا۔ یہ سب اس وحدہ لاشریک لہ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

**آیت 21** ① **وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا......** : یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی کمال قدرت پر دلالت کرنے والی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھاری خاطر (نہ کہ اپنے کسی فائدے کے لیے) خود تمھی میں سے بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان کی طرف جا کر سکون حاصل کرو۔ "سَكَنَ عِنْدَهُ" کا معنی ہے جسمانی طور پر کسی کے پاس جا کر رہنا اور "سَكَنَ إِلَيْهِ" قلبی اور روحانی طور پر کسی کے پاس راحت و سکون پانا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے کہ ہمارے والد ماجد آدم علیہ السلام کو جنت میں رہ کر بھی، جہاں ہر نعمت موجود تھی، سکون اسی وقت حاصل ہوا جب اللہ تعالیٰ نے خود ان کی ذات سے ان کی بیوی اور ہماری ماں حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا** ﴾ [ الأعراف : ۱۸۹ ] "وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، تا کہ وہ اس کی طرف (جا کر) سکون حاصل کرے۔" آدم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد کے سکون کے لیے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے جوڑے بنا دیا۔ یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ مردوں اور عورتوں کی پیدائش ہمیشہ اس اعتدال اور توازن سے رہی ہے کہ ان کی باہمی زوجیت کی ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مرد اتنے زیادہ ہو جائیں کہ انھیں بیوی نہ مل سکے یا عورتیں اتنی بڑھ جائیں کہ انھیں خاوند نہ مل سکیں، اور یہ بھی اس کی حکمت ہے کہ مرد کو عورت اور عورت کو مرد کے پاس ہی سکون حاصل ہو سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود انسانوں میں سے ان کے جوڑے پیدا فرمائے۔ معلوم ہوا وہ تمام کہانیاں یکسر افسانے ہیں جن میں انسانوں اور جنوں کے درمیان زوجیت اور توالد و تناسل کا ذکر ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ راہب اور جوگی جو انسانی فطرت سے جنگ کر کے عورتوں سے قطع تعلق کے ساتھ سکون تلاش کرتے رہے یا کر رہے ہیں، سخت دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، کیونکہ فطرت سے جنگ کا انجام ہمیشہ شکست ہوتا ہے۔ جس طرح بھوک کے وقت کھانا اللہ تعالیٰ سے تعلق کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح شادی

وَ رَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

بہت سی نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں ﴿۲۱﴾

اللہ تعالیٰ سے تعلق کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ انسان کے لیے سکون کا باعث اور اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ اولادِ آدم میں سب سے زیادہ متقی شخص رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( حُبِّبَ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا النِّسَاءُ وَالطِّيبُ وَ جُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ )) [ نسائي، عشرة النساء، باب حب النساء : ۳۳۹۱، عن أنس رضی اللہ عنہ ] ''دنیا میں سے میرے لیے عورتیں اور خوشبو محبوب بنا دی گئیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں بنا دی گئی۔''

یاد رہے! یہ سکون مرد اور عورت کے نکاح کے تعلق ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ زوجیت کا جائز طریقہ یہی ہے۔ بدکاروں کو یہ نعمت میسر نہیں آ سکتی۔ کافر اقوام نے اللہ کے احکام سے بغاوت کر کے نکاح کے بغیر مرد عورت کے زندگی گزارنے کی جو روش اختیار کر رکھی ہے اس سے انھیں وہ سکون کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جو خاوند اور بیوی کو حاصل ہوتا ہے، اور ان ملعونوں کا تو ذکر ہی کیا جو مردوں کی مردوں سے یا عورتوں کی عورتوں سے ہوس پوری کر کے، یا کتوں بلیوں اور دوسرے جانوروں سے سکون حاصل کرنے کی ناکام و نامراد کوشش کر رہے ہیں، کیونکہ یہ انسانوں ہی نہیں جانوروں کی فطرت کے بھی خلاف ہے۔

❷ **وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً** ...... : یعنی مرد عورت کی زوجیت میں سکون کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوستی اور رحمت رکھ دی ہے۔ دنیا میں عشق کی بے شمار داستانیں مشہور ہیں اور ہر طرف اسی کا شور اور ہنگامہ ہے، مگر حقیقی دوستی اور محبت جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاوند اور بیوی کے درمیان پیدا ہوتی ہے، ناجائز عشق اور حرام محبت میں گرفتار لوگ اس کی بُو بھی نہیں پا سکتے۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانی نہیں کہ وہ مرد اور عورت جو ایک دوسرے سے پوری طرح واقف بھی نہیں ہوتے، نکاح کے بعد صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے مودّت اور محبت کے ایسے رشتے میں بندھ جاتے ہیں جو زندگی بھر قائم رہتا اور دن بدن مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَمْ نَرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلَ النِّكَاحِ )) [ ابن ماجه، النكاح، باب ما جاء في فضل النكاح : ۱۸۴۷، عن ابن عباس و صححه البوصيري و الألباني ] ''ہم نے دو محبت کرنے والوں کے لیے نکاح جیسی چیز نہیں دیکھی۔'' اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری لکھتے ہیں: ''یعنی جب عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے محبت ہو جائے تو ہم نے ان کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی، کیونکہ اس سے محبت میں مزید اضافہ ہوتا ہے، جب کہ زنا کے نتیجے میں محبت کے بجائے عداوت اور بغض پیدا ہوتا ہے۔''

❸ **وَ رَحْمَةً** : اللہ کی قدرت کی عظیم نشانیوں میں سے ایک نشانی دوستی اور محبت کے ساتھ ساتھ وہ رحم اور مہربانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان رکھ دی ہے کہ وہ تندرستی اور صحت و جوانی میں بھی اور بڑھاپے اور بیماری میں بھی ایک دوسرے پر نہایت مہربان اور رحم کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب کہ عاشقوں اور بدکاروں کا عشق کتنا ہی شور انگیز ہو، حُسن کے ڈھلنے کے ساتھ ہوا میں بکھر جاتا ہے اور اس میں محبوب پر رحم کے بجائے اصل جذبہ اپنی ہوس پوری کرنا اور خالص خود غرضی ہوتا ہے۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا الگ الگ ہونا ہے۔

---

④ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ : ”فِيْ ذٰلِكَ“ (اس میں) سے مراد پچھلی آیت اور اس آیت میں مذکور چیزیں ہیں، یعنی تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کرنے میں، تمھارے زمین کے اندر بشر کی صورت میں پھیل جانے میں، تمھارے سکون کے لیے خود تمھی میں سے تمھارے جوڑے پیدا کرنے میں اور تمھارے درمیان دوستی اور رحمت کا جذبہ پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کی قدرت اور اس کے آخرت قائم کرنے پر دلالت کرنے والی بہت سی نشانیاں ہیں، مگر صرف ان لوگوں کے لیے جو ان چیزوں میں غور و فکر کریں۔

آیت 22 ① وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرت کاملہ اور تمھیں دوبارہ زندہ کرنے پر دلالت کرنے والی بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی جو بہت سی نشانیوں پر مشتمل ہے، آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے، جس کے مقابلے میں تمھیں پہلی یا دوسری دفعہ پیدا کرنا بالکل ہی معمولی بات ہے۔ لاکھوں کروڑوں سال سے چلا آنے والا زمین اور آسمانوں کا نظام اور ان میں موجود سورج چاند اور بے شمار وسیع و عریض سیاروں پر مشتمل کہکشاؤں کا سلسلہ جو دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے (دیکھیے ذاریات : ۴۷) رب تعالیٰ کی بے پایاں قدرتوں کی واضح نشانی ہے، جیسا کہ فرمایا : ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [ المؤمن : ۵۷ ] ”یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ اگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور نے پیدا کیا ہے، یا کسی اور کا اس میں کوئی حصہ ہے، یا کم از کم اسے پیدا کرنے کا کوئی دعوے دار ہی ہے تو سامنے لاؤ۔

② وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ : اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی کائنات میں پایا جانے والا تنوع ہے کہ اس نے جو چیز پیدا کی وہ دوسری چیز سے الگ پیدا کی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس تنوع میں سے صرف دو چیزیں ذکر فرمائی ہیں، ایک انسانوں کی زبانوں کا مختلف ہونا، دوسرا ان کے رنگوں کا مختلف ہونا۔ ایک مٹی اور ایک پانی سے پیدا ہونے والے انسانوں کی زبانیں مختلف ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، جاپانی، ترکی، حبشی، چینی، روسی، فرانسیسی، جرمنی، سپینی، غرض ہر قوم کی الگ زبان ہے، پھر ہر زبان کی بے شمار ذیلی زبانیں ہیں۔ ان ذیلی زبانوں کے لہجے اور بعض الفاظ ہر چند میل کے فاصلے پر مختلف ہو جاتے ہیں۔ پھر بولتے وقت ایک ہی زبان مثلاً عربی یا انگلش میں بات کرتے ہوئے کسی ایک شخص کا لہجہ، آواز، ادائیگی، تیزی یا آہستگی، نرمی یا سختی، شیرینی یا تلخی دوسرے شخص سے نہیں ملتی، حتیٰ کہ آدم علیہ السلام سے لے کر آخری انسان تک ہر شخص جب بولتا ہے تو اس کا تکلم صرف اسی کو عطا ہوا ہے، جس سے وہ پوری بنی نوع انسان میں دوسروں سے ممتاز ہے۔ اسے جاننے والا شخص پردے کے پیچھے اس کی بات سن کر پہچان لے گا کہ فلاں شخص بول رہا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب نشانی مزید نمایاں ہوگئی ہے کہ اسے کسی شخص کا تکلم دے دیا جائے، تو وہ کروڑوں اربوں انسانوں میں سے جدا کر دے گا۔

لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾

بے شک اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۲۲﴾

اسی طرح انسانوں کے رنگوں کا مختلف ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی ہے کہ ایک ہی اصل سے پیدا ہونے والے انسانوں میں کوئی سفید ہے، کوئی گندمی، کوئی سیاہ، کوئی سرخ، کوئی زرد اور کوئی ان کے درمیان۔ پھر کمال یہ ہے کہ بظاہر ایک ہی رنگ، مثلاً سیاہ رنگ والے ایک انسان کا رنگ دوسرے سیاہ فام انسان کے رنگ سے نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے رنگ میں اتنی قسمیں رکھ دی ہیں کہ ہر سیاہ کا رنگ دوسرے سیاہ کے رنگ سے اور ہر سفید کا رنگ دوسرے سفید کے رنگ سے مختلف ہے۔ کسی شخص کی آنکھوں کی پتلی کی رنگت اور ساخت دوسرے شخص کی آنکھ کی رنگت اور ساخت سے نہیں ملتی۔ کسی ایک شخص کے بالوں کا سیاہ یا سرخ یا سنہری یا سفید رنگ دوسرے کے سیاہ یا سرخ یا سنہری یا سفید رنگ سے نہیں ملتا۔ کسی شخص کی جسمانی ساخت اور اس کے ہاتھ پاؤں کی لکیریں دوسرے شخص سے نہیں ملتیں، جب کہ دیکھنے میں سب انسان ہیں۔ تخلیق کا یہ باریک ترین اور عظیم ترین سلسلہ کیا اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ یہ سب کچھ ایک رب قدیر کی قدرت کا شاہکار ہے؟ جس نے جو چاہا پیدا کر دیا، جو پیدا کیا خوب صورت پیدا کیا اور بے مثال اور لاجواب پیدا کیا۔ عقل سے کتنے خالی ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا، یا کہتے ہیں کہ دو خالقوں یا مالکوں کی موجودگی میں یہ نظام چل رہا ہے، یا کہتے ہیں کہ اتنی عظیم قدرتوں کا مالک مٹی ہو جانے کے بعد انسانوں کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا!؟

پھر تنوع کے اس سلسلے کو ذرا پھیلا کر دیکھیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ [ الرعد : ٤ ] ''اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے مختلف ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت کئی تنوں والے اور ایک تنے والے، جنھیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو پھل میں بعض پر فوقیت دیتے ہیں، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔'' زمین سے پیدا ہونے والی ہر جنس، حیوانات ہوں یا نباتات یا جمادات، ان کی ہر قسم دوسری قسم سے جدا ہے، مثلاً گائے بکری سے جدا ہے، آم کا درخت جامن سے جدا ہے، گندم جَو سے الگ ہے، لوہا تانبے سے الگ ہے۔ پھر لامحدود تنوع دیکھیے کہ ہر درخت کا ہر پتا اسی درخت کے دوسرے پتے سے الگ ہے۔ ذرا اس کی لکیروں پر غور کرو، ہر ایک کی لکیریں دوسرے کی لکیروں سے الگ ہیں۔ دیکھنے میں تمام درخت اور تمام پودے سبز ہیں، مگر ہر ایک کو دوسرے سے الگ سبز رنگ عطا ہوا ہے۔ صرف درخت ہی نہیں چرندوں، پرندوں، درندوں اور آبی جانوروں میں سے ہر ایک کا یہی حال ہے۔ رنگوں کا یہ اختلاف ہی اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور اس کی قدرت کی کافی دلیل ہے۔

③ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ : یعنی آسمان و زمین کی پیدائش اور زبانوں اور رنگوں کے اختلاف سے اللہ تعالیٰ کی اور اس

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

اور اس کی نشانیوں میں سے تمھارا دن اور رات میں سونا اور تمھارا اس کے فضل سے (حصہ) تلاش کرنا ہے۔ بے شک

کی قدرتوں کی پہچان ہر ایرے غیرے کا کام نہیں، ان نشانیوں کی پہچان علم والوں کا کام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ [ العنکبوت : ٤٣ ] ''اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں۔'' رنگوں کے اختلاف سے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی معرفت اور اس کی خشیت صرف علماء کا حصہ ہونا دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴾ [ فاطر : ٢٧، ٢٨ ] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ کئی پھل نکالے، جن کے رنگ مختلف ہیں اور پہاڑوں میں سے کچھ سفید اور سرخ قطعے ہیں، جن کے رنگ مختلف ہیں اور کچھ سخت کالے سیاہ ہیں۔ اور کچھ لوگوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں سے بھی ہیں جن کے رنگ اسی طرح مختلف ہیں، اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں، بے شک اللہ سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے۔''

**آیت 23** ① وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ : یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کے کمالِ قدرت اور اس کے تمھیں دوبارہ زندہ کرنے پر دلالت کرنے والی نشانیوں میں سے ایک نشانی تمھارا رات اور دن میں سونا ہے۔ جس کے ساتھ بے اختیار تمھاری ہر سرگرمی ختم اور تمھارے حواس ظاہری کے تمام اعمال بند ہو جاتے ہیں اور تمھیں اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہیں رہتی۔ اس سے پہلے کام کاج اور حرکت و محنت کی وجہ سے تمھارے جسم میں جو ٹوٹ پھوٹ اور تھکاوٹ ہوئی تھی، نیند عطا کرنے والا مالک نیند کے دوران جسم کی مرمت کر کے اور تھکاوٹ دور کر کے دوبارہ کام کاج کے قابل بنا کر تمھیں پھر بیدار کر دیتا ہے۔ جس طرح نیند اس کی نشانی ہے، بیداری اور رات دن میں اس کے فضل کی تلاش بھی اس کی نشانی ہے۔ دونوں اسی کی تخلیق ہیں، کسی کا ان میں ذرہ بھر دخل نہیں، بلکہ مخلوق تو ان کی حقیقت ہی سے نا آشنا ہے کہ نیند کیا چیز ہے، کیسے آتی ہے اور کیسے ختم ہو جاتی ہے!؟ پھر دن رات کئی دفعہ سونے اور جاگنے کا یہ عمل بار بار موت و حیات کا عملی نمونہ ہے۔ پھر بھی تمھیں اصرار ہے کہ ہر روز کئی بار موت و حیات کے مراحل سے گزارنے والا مالک تمھارے اعمال کے محاسبے اور جزا و سزا کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ نہیں کر سکے گا۔

② نیند کی حقیقت اس سے زیادہ کسی کو معلوم نہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [ الزمر : ٤٢ ] ''اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں

﴿ لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ ۝۲۳ ﴾

اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں ۝۲۳

مریں ان کی نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک بھیج دیتا ہے۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں۔'' آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نیند موت ہے اور بیداری حیات اور دونوں کی حقیقت روح کے آنے جانے کو سمجھنے پر موقوف ہے۔ اور روح کیا ہے؟ اس کے متعلق فرمایا: ﴿ وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الرُّوۡحِ‌ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّىۡ وَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ٨٥ ] ''اور وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں علم میں سے بہت تھوڑے کے سوا نہیں دیا گیا۔''

3 روس میں کمیونزم کے عروج کے زمانے میں جب اللہ تعالیٰ کی منکر، مادہ پرست اور دنیا کی ظالم ترین جماعت کمیونسٹ پارٹی مزدوروں سے کھیتوں اور کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ کام لینے کی نئی سے نئی صورت سوچتی رہتی تھی، اس وقت پارٹی کے راہ نماؤں نے سوچا کہ مزدور بہت سا وقت سو کر ضائع کر دیتے ہیں، چنانچہ انھوں نے سائنس دانوں کے ذمے لگایا کہ وہ تحقیق کریں کہ ان کا نیند میں صرف ہونے والا وقت زیادہ سے زیادہ کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ کئی سالوں کی تحقیق کے بعد اس کا نتیجہ جو انھوں نے بیان کیا وہ یہ تھا کہ انسان کے لیے نیند بہت ضروری ہے، کیونکہ اس کے دوران اس کے ٹوٹے پھوٹے خلیات دوبارہ بنتے ہیں اور وہ دوبارہ کام کاج کے قابل ہو جاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تعمیر و مرمت اور تازگی کا یہ عمل نیند کے دوران صرف ایک لمحے میں پورا ہو جاتا ہے، مگر وہ لمحہ بعض اوقات نیند کی ابتدا میں آتا ہے، کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لمبی سے لمبی نیند میں بھی وہ لمحہ نہیں آتا اور انسان بیدار ہوتا ہے تو اسی طرح تھکا ماندہ اور ٹوٹا پھوٹا ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ لمحہ آ جانے کی وجہ سے نیند کی ایک جھپکی کے ساتھ ہی اس کی ساری تھکن کافور ہو جاتی ہے۔ ان سائنس دانوں نے اعتراف کیا ہے کہ انسان اس لمحے کو اپنی گرفت میں لانے سے عاجز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نشانی کے صرف ایک معمولی سے حصے کا اعتراف ہے، جسے اس نے ''وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ'' کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

4 عام طور پر قرآن مجید میں رات کو نیند اور آرام کے لیے اور دن کو تلاش معاش کے لیے قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِيَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ وَالنَّهَارَ مُبۡصِرًا ﴾ [ النمل : ٨٦ ] ''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو بنایا، تاکہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن۔'' اور فرمایا: ﴿ وَجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ۝۱۰ وَجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴾ [ النبا : ١٠، ١١ ] ''اور ہم نے رات کو لباس بنایا۔ اور ہم نے دن کو روزی کمانے کے لیے بنایا۔'' (مزید دیکھیے بنی اسرائیل : ۱۲) یہ عام معمول کا بیان ہے، مگر انسان رات کے علاوہ دن کو بھی سو جاتا ہے اور تلاش معاش دن کے علاوہ رات کو بھی کر لیتا ہے، اس لیے اس آیت میں رات اور دن دونوں میں نیند کو اور اللہ کے فضل کی تلاش کو اپنی نشانیوں میں سے نشانی قرار دیا۔

5 ﴿ وَابۡتِغَآؤُكُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ﴾: اس میں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ رزق، جو تم تلاش کرتے ہو، وہ تمھاری محنت کا نتیجہ نہیں،

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۴ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝۲۵

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمھیں خوف اور طمع کے لیے بجلی دکھاتا ہے اور آسمان سے پانی اتارتا ہے، پھر زمین کو اس کے ساتھ اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ۝۲۴ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب وہ تمھیں زمین سے ایک ہی دفعہ پکارے گا تو اچانک تم نکل آؤ گے ۝۲۵

---

بلکہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، ورنہ کوئی محنت مشقت کرنے والا فقیر نہ رہے اور محنت مشقت نہ کرنے والا کوئی شخص غنی نہ ہو۔

⑥ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ : یعنی نیند اور بیداری کی نشانی سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر اور مرنے کے بعد زندگی پر کافی استدلال صرف تجربے سے یا عقل سے یا غور وفکر سے ممکن نہیں، بلکہ یہ ان چیزوں سے ہے جن کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا رسول انھیں بیان کرے اور سننے والے انھیں سن کر دل میں جگہ دیں۔ اس لیے فرمایا کہ اس ایک نشانی میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کی بات سنتے ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اپنے سونے کا احوال نظر نہیں آتا، سو لوگوں کی زبانی سنتے ہیں۔'' (موضح) یہ ''يَسْمَعُوْنَ'' کا لفظ اختیار کرنے کا ایک اور نکتہ ہے۔

**آیت 24** ① وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا : یعنی بجلی کی گرج اور چمک سے امید بندھتی ہے کہ بارش ہو گی اور فصلیں تیار ہوں گی اور دوسری طرف ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں بجلی نہ گر پڑے، یا اتنی زیادہ بارش نہ ہو جائے کہ مکانوں اور فصلوں کو تباہ کر دے اور سب کچھ بہا لے جائے۔

② وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا : اس میں مرنے کے بعد زندگی پر بھی استدلال ہے اور اس بات پر بھی کہ بارش صرف اللہ کی قدرت اور اس کے حکم سے ہوتی ہے نہ کہ محض مادہ کی ترکیب سے۔

③ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ : بارش سے مردہ زمین کے زندہ ہونے کو مرنے کے بعد زندگی کی دلیل کے طور پر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور اسے عقل والوں کے لیے نشانی قرار دیا گیا جو بات سمجھتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ [ الحدید : ۱۷ ] ''جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے، بلاشبہ ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو۔''

**آیت 25** ① وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے زمین و

وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

**اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اسی کا ہے، سب اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۲۶﴾ اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے اور آسمانوں اور زمین میں سب سے اونچی شان اسی کی ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۷﴾**

آسمان کی پیدائش کا ذکر فرمایا، اب فرماتے ہیں کہ اس کی نشانیوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ اتنے عظیم آسمان و زمین اور ان میں موجود سورج، چاند اور ستارے کسی ستون یا تھامنے والی چیز کے بغیر محض اس کے امر کے ساتھ اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اور اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۳۳ ] ''سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔'' اس نے ہر ایک میں اپنی کمال حکمت کے ساتھ نہایت باریک اور درست حساب کے ساتھ جذب و دفع کی ایسی قوت رکھ دی ہے کہ کوئی دو جسم آپس میں نہیں ٹکراتے۔ اللہ تعالیٰ کے اس نظام میں کبھی باہمی تصادم نہیں ہوتا۔ اگر اس کا حکم نہ ہو تو نہ آسمان اپنی جگہ قائم رہ سکے اور نہ زمین۔ دیکھیے سورۂ حج (۶۵) اور سورۂ فاطر (۴۱)۔

② **ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ......** : پھر یہ نہ سمجھو کہ یہ نظام دائمی یا ابدی ہے اور جو مر گیا ہمیشہ مردہ ہی رہے گا۔ نہیں، پھر (ثُمَّ) ایک وقت آ رہا ہے جب وہ تمھارے زمین میں دفن ہونے کی حالت میں تمھیں ایک ہی آواز دے گا تو تم یک لخت زمین سے باہر نکل آؤ گے۔ مراد اس سے دوسرا نفخہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ [ الزمر : ۶۸ ] ''پھر اس (صور) میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔'' اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے بنی اسرائیل (۵۲)، یٰس (۵۳) اور نازعات (۱۳، ۱۴)۔

**آیت 26** **وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ......** : یعنی یہ اور اس سے اگلی آیت پچھلی آیات کا نتیجہ اور خلاصہ ہیں۔ یعنی یہ خیال مت کرو کہ وہ اس کے بلانے پر کیسے نکل آئیں گے، کیونکہ آسمان و زمین میں جو بھی ہے اسی کی ملکیت ہے اور سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ''کُنْ'' کہے اور کوئی شخص اس کے حکم سے انحراف کر سکے۔

**آیت 27** ① **وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ** : اللہ تعالیٰ نے یہ بات بندوں کے کہنے اور کرنے کے لحاظ سے فرمائی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ پیدا کرنا برابر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم یہ تو مانتے ہو کہ تمام مخلوقات کو پہلی بار اسی نے پیدا کیا ہے اور یہ بھی سمجھتے ہو کہ جس نے ایک دفعہ کسی چیز کو بنایا ہو اس کے لیے اس چیز کو دوبارہ بنانا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس لیے تمھارے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے لیے، جس نے پہلی بار تمام مخلوقات بنائی ہے، دوسری مرتبہ اسے پیدا کرنا زیادہ آسان ہونا چاہیے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قَالَ اللّٰهُ كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ ، وَشَتَمَنِيْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ ، أَمَّا تَكْذِيْبُهُ إِيَّايَ أَنْ يَقُوْلَ إِنِّيْ لَنْ أُعِيْدَهُ

ضَرَبَ لَكُمۡ مَّثَلًا مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ هَلۡ لَّكُمۡ مِّنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ شُرَكَآءَ فِىۡ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ فَاَنۡتُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ تَخَافُوۡنَهُمۡ كَخِيۡفَتِكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۸﴾

اس نے تمھارے لیے خود تمھی میں سے ایک مثال بیان کی ہے، کیا تمھارے لیے ان (غلاموں) میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہیں، کوئی بھی اس رزق میں شریک ہیں جو ہم نے تمھیں دیا ہے کہ تم اس میں برابر ہو، ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح تم اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے کھول کر آیات بیان کرتے ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿۲۸﴾

كَمَا بَدَأْتُهُ ، وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ أَنْ يَقُوْلَ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا، وَأَنَا الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لِّيْ كُفُوًا أَحَدٌ ›› [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ الله الصمد ﴾ ۴۹۷۵، ۴۹۷۴ ] ’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ابن آدم نے مجھے جھٹلا دیا، حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی، حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ (اللہ) مجھے دوبارہ نہیں بنائے گا جس طرح اس نے مجھے پہلی دفعہ پیدا کیا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے، اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، حالانکہ میں اکیلا ہی ہوں، بے نیاز ہوں، جس نے نہ کسی کو جنا نہ کسی نے اسے جنا اور کوئی بھی اس کا کبھی شریک نہیں۔‘‘

﴿2﴾ وَلَهُ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ : ’’الۡمَثَلُ‘‘ سے مراد یہاں صفت اور شان ہے، یعنی زمین ہو یا آسمان، پوری کائنات میں سب سے اعلیٰ صفت اور سب سے اونچی شان صرف اس کی ہے۔ ’’لَهٗ‘‘ کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ’’اور آسمانوں اور زمین میں سب سے اونچی شان اسی کی ہے۔‘‘ طبری نے معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے : « قَوْلُهُ : ﴿وَلَهُ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰى فِى السَّمٰوٰتِ﴾ يَقُوْلُ : ﴿ لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ ﴾ » یعنی یہ زیر تفسیر آیت اللہ کے اس فرمان کی طرح ہے : ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ﴾ [ الشورٰی : ۱۱ ] ’’اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔‘‘ یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ صفات اور اونچی سے اونچی شان اسی کی ہے، اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ زمین و آسمان کی کوئی بھی چیز حسن و خوبی میں اللہ تعالیٰ کی شان اور صفات کے برابر تو کیا اس سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتی، کیونکہ کسی چیز میں کوئی خوبی موجود بھی ہے تو اس کی عطا کردہ ہے۔

﴿3﴾ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ : خبر کے معرف باللام آنے کے ساتھ حصر پیدا ہو رہا ہے، یعنی وہی ہے جو سب پر غالب ہے۔ وہ جو چاہے کرے، نہ اس کے لیے کچھ مشکل ہے نہ کوئی اس کے ارادے میں رکاوٹ بن سکتا ہے، مگر غالب ہونے کے ساتھ وہ کمال حکمت والا بھی ہے۔ اس کا غلبہ اندھے کی لاٹھی نہیں، بلکہ کمال حکمت پر مشتمل ہے۔

آیت 28 ﴿1﴾ ضَرَبَ لَكُمۡ مَّثَلًا مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ ...... : یہاں تک توحید اور آخرت کا بیان ملا جلا آ رہا تھا، اب خالص توحید پر کلام شروع ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے شرک کے باطل ہونے کی مثال خود تمھاری ذات سے بیان فرمائی، تاکہ تمھیں

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾

بلکہ وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا وہ جانے بغیر اپنی خواہشوں کے پیچھے چل پڑے، پھر اسے کون راہ پر لائے جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ہیں ﴿۲۹﴾

کہیں دور نہ جانا پڑے۔ اپنے بارے میں یہی غور کر لو کہ تمھارے غلام جو تمھاری ملکیت میں ہیں، کیا ان میں سے کوئی بھی اس رزق میں تمھارا شریک ہے جو ہم نے تمھیں عطا کیا ہے کہ وہ اور تم اس کے مالک ہونے میں برابر ہو جاؤ اور اپنے اس غلام سے اسی طرح ڈرو جیسے تم آزاد لوگ ایک دوسرے سے ڈرتے ہو؟ جواب ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں، غلام آقا کے اور مملوک مالک کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر جب تم مانتے ہو کہ آسمان و زمین اور ان میں موجود ہر مخلوق، فرشتے، انسان، جن، انبیاء، اولیاء اور صلحاء، حجر، شجر اور بت وغیرہ سب کا مالک اللہ ہے اور وہ سب اللہ کی ملکیت ہیں اور تم خود اپنے غلاموں کو (جو انسان ہونے میں تمھارے برابر ہیں) اپنے اختیارات دے کر اپنے شریک اور اپنے برابر بنانے کے لیے تیار نہیں تو تم نے مخلوق کو خالق کا اور مملوک کو مالک کا شریک کیسے بنا لیا جو اللہ تعالیٰ کے کسی بھی طرح برابر نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لیے یہ مثال اس لیے بیان فرمائی کہ وہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں کو بھی اللہ ہی کی ملکیت مانتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے: « لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ » ''حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: « وَيْلَكُمْ، قَدْ قَدْ » ''تم پر افسوس! بس کرو، بس کرو۔'' مگر وہ کہتے: « إِلاَّ شَرِيْكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَ مَا مَلَكَ » [ مسلم، الحج، باب التلبية و صفتها ...... : ۱۱۸۵ ] ''مگر تیرا ایک شریک ہے جس کا مالک تو ہے اور ان چیزوں کا بھی جن کا وہ مالک ہے۔''

② كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ : یعنی ہم ایسے ہی مثالوں کے ساتھ اور خوب کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں۔

**آیت 29** ① بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ : یعنی آیات کو کھول کر بیان کرنے کا فائدہ ان لوگوں کو ہے جو عقل کے پیچھے چلیں، مگر یہ لوگ جنھوں نے شرک کے ارتکاب کا ظلم کیا، جس سے بڑا کوئی ظلم نہیں، یہ عقل کے پیچھے چلنے کے بجائے اپنی خواہشوں کے پیچھے چل رہے ہیں اور شرک کا اصل وہ خواہشیں اور آرزوئیں ہی ہیں جو شیطان اپنے پیچھے چلنے والوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔ جن کا نہ انھیں علم ہوتا ہے اور نہ حقیقت میں کہیں ان کا وجود ہوتا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۲ تا ۱۲۰) اور سورۂ نجم (۲۳ تا ۲۵)۔

② فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ : اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہی کی نسبت اس اعتبار سے ہے کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے، ورنہ انسان کی گمراہی کا سبب خود اس کی ہٹ دھرمی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [ البقرة : ۲۶ ] ''اور وہ اس کے ساتھ فاسقوں کے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔''

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ

پس تو ایک طرف کا ہو کر اپنا چہرہ اس دین کے لیے سیدھا رکھ، اللہ کی اس فطرت کے مطابق، جس پر اس نے سب

③ **وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ** : یہاں ایک سوال ہے کہ جب ”وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرٍ“ کہنے سے ہر قسم کے مددگار کی زیادہ تاکید کے ساتھ نفی ہو جاتی ہے، تو ”نّٰصِرِيْنَ“ کا لفظ لانے میں کیا حکمت ہے؟ مفسر ابو السعود نے اس کا جواب یہ دیا ہے: ”عَلٰى مَعْنَى لَيْسَ لِوَاحِدٍ مِنْهُمْ نَاصِرٌ وَاحِدٌ عَلٰى مَا هُوَ قَاعِدَةُ مُقَابَلَةِ الْجَمْعِ بِالْجَمْعِ“ ”یعنی ان میں سے کسی ایک کا کوئی ایک مدد کرنے والا نہیں ہو گا، جیسا کہ جمع کے مقابلے میں جمع کا قاعدہ ہے۔“ قرآن مجید میں ایک ہی بات مختلف اسالیب کے ساتھ بیان ہوتی ہے، کیونکہ تنوع میں حُسن ہوتا ہے۔ ایک اسلوب یہ ہے جو اس آیت میں اختیار کیا گیا ہے، دوسرا اسلوب واحد کے لفظ کے ساتھ نفی کا ہے، وہ بھی متعدد مقامات پر استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا ﴾ [ البقرۃ : ۱۲۳ ] ”جب نہ کوئی جان کسی جان کے کچھ کام آئے گی۔“ اور فرمایا: ﴿ وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴾ [ محمد : ۱۱ ] ”اور اس لیے کہ جو کافر ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴾ [ الطارق : ۱۰ ] ”تو اس کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار۔“

**آیت 30** ① **فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا** : ”لِلدِّيْنِ“ میں ”الف لام“ عہد کا ہے، یعنی یہ دین جس میں خالق و مالک اور معبود برحق صرف اللہ تعالیٰ کو مانا گیا ہے، جس میں اس کی ذات یا صفات یا افعال میں کسی کو شریک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ”حَنِيْفًا“ ”حَنَفَ“ (حاء کے ساتھ) کا لفظی معنی مائل ہونا ہے، اکثر استعمال تمام راستوں سے ہٹ کر ایک سیدھے راستے کی طرف آنے کے معنی میں ہوتا ہے، جب کہ ”جَنَفَ“ (جیم کے ساتھ) کا مطلب سیدھے راستے سے ہٹ کر اِدھر یا اُدھر ہو جانا ہوتا ہے۔ ”فَاَقِمْ“ میں ”فاء“ (پس) کا مطلب یہ ہے کہ جب اتنے سارے دلائل سے ثابت ہو گیا کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور عبادت و اطاعت کا مستحق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، تو لازم ہے کہ تم اپنا چہرہ اس دین کی طرف سیدھا رکھو، نہ ذرہ برابر اِدھر اُدھر دیکھو اور نہ اس ایک سیدھی راہ سے اِدھر اُدھر ہٹو۔

② **فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا** : ”فِطْرَتَ“ کا معنی پیدائش ہے، ”اللہ تعالیٰ کی فطرت“ سے مراد وہ حالت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور وہ اللہ کی توحید اور دین اسلام ہے، جو ہر آدمی کے دل میں پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی گئی ہے کہ تیرا خالق و مالک اللہ ہے اور تو اس کا بندہ اور غلام ہے، لہٰذا تیرے لیے اس پر قائم رہنا لازم ہے۔ اگر انسان کو اس کی طبعی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور بیرونی اثرات سے اس کے دل و دماغ کو محفوظ رکھا جائے تو وہ توحید اور دین فطرت ہی اختیار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ“ کے ساتھ آدم علیہ السلام کی اولاد کے ہر فرد سے اپنے رب ہونے کا عہد لیا ہے اور اسی عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۲، ۱۷۳) کی تفسیر۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ ، كَمَا

اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدائش کو کسی طرح بدلنا (جائز) نہیں، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۳۰﴾

تُنْتَجُ الْبَهِيمَةُ بَهِيمَةً جَمْعَاءَ، هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟ ثُمَّ يَقُوْلُ : ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ﴾ ﴾ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ لا تبديل لخلق الله ﴾ : ۴۷۷۵ ] ''کوئی بچہ نہیں جو پیدا ہو مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسے جانور پیدا ہوتا ہے تو صحیح سالم جانور پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم نے ان میں سے کوئی کان یا ناک کٹا ہوا دیکھا ہے؟'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ﴾ [ الروم : ۳۰ ] ''اسود بن سریع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ سَرِيَّةً يَوْمَ خَيْبَرَ فَقَاتَلُوا الْمُشْرِكِيْنَ، فَأَمْضٰى بِهِمُ الْقَتْلُ إِلَى الذُّرِّيَّةِ، فَلَمَّا جَاؤُوْا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا حَمَلَكُمْ عَلٰى قَتْلِ الذُّرِّيَّةِ؟ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّمَا كَانُوْا أَوْلَادَ الْمُشْرِكِيْنَ، قَالَ وَهَلْ خِيَارُكُمْ إِلَّا أَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ، وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! مَا مِنْ نَسَمَةٍ تُوْلَدُ إِلَّا عَلَى الْفِطْرَةِ، حَتّٰى يُعْرِبَ عَنْهَا لِسَانُهَا )) [ مستدرك حاكم : ۱۲۳/۲، ح ۲۵۶۶، وصححه الحاكم و وافقه الذهبي و صححه الألباني في سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۴۰۲ ] ''رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن ایک دستہ بھیجا، انھوں نے مشرکین سے جنگ کی، یہاں تک کہ قتل کرتے کرتے وہ بچوں تک جا پہنچے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں بچے قتل کرنے پر کس چیز نے آمادہ کر دیا؟'' انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! وہ مشرکین کی اولاد ہی تو تھے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے بہترین لوگ مشرکین کی اولاد ہی تو ہیں، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! کوئی جان پیدا نہیں ہوتی مگر فطرت پر، یہاں تک کہ اس کی زبان اس کے مطالب کا اظہار کرنے لگتی ہے۔'' مشرکین کے فوت شدہ بچوں کے حکم کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۵) اور اعراف (۱۷۲، ۱۷۳) کی تفسیر۔ عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: (( أَلَا إِنَّ رَبِّيْ أَمَرَنِيْ أَنْ أُعَلِّمَكُمْ مَا جَهِلْتُمْ مِمَّا عَلَّمَنِيْ يَوْمِيْ هٰذَا كُلُّ مَالٍ نَحَلْتُهُ عَبْدًا حَلَالٌ وَ إِنِّيْ خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَ إِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ وَ أَمَرَتْهُمْ أَنْ يُشْرِكُوْا بِيْ مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا )) [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب الصفات التي يعرف بها...... : ۲۸۶۵ ] ''سنو! میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس نے مجھے میرے آج کے دن میں جو کچھ سکھایا ہے تمھیں اس میں سے چند وہ باتیں سکھاؤں جن سے تم واقف نہیں ہو۔ (وہ فرماتا ہے کہ) ہر وہ مال جو میں نے کسی بندے کو عطا کیا ہے وہ حلال ہے اور میں نے اپنے تمام بندوں کو ''حنفاء'' (ایک اللہ کے ہو جانے والے) پیدا کیا ہے اور ہوا یہ کہ ان کے پاس شیاطین آئے اور انھوں نے ان کو ان کے دین سے پھیر دیا اور ان کے لیے وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں اور انھوں

مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ وَاتَّقُوۡهُ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۳۱﴾

اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں سے نہ ہو جاؤ ﴿۳۱﴾

نے ان کو حکم دیا کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک بنائیں جن کی میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔''

③ **لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ** : یعنی اللہ کا دین (اسلام) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اسے بدلنا، توحید کے بجائے شرک کرنا یا اس کے حلال و حرام کے احکام کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔ الفاظ کے عموم میں یہ بھی آتا ہے کہ جس شکل پر اللہ تعالیٰ نے کسی کو پیدا کیا ہے اسے بدلنا اور اس کے کان یا ناک وغیرہ کو کاٹنا جائز نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۱۱۹) کی تفسیر۔

④ **ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ** : یعنی شریعتِ اسلام اور فطرتِ سلیمہ پر مضبوطی سے قائم رہنا ہی بالکل سیدھا اور مضبوط دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، بلکہ باپ دادا کے رسم و رواج اور شیطان کے پیچھے چل کر فطرت کے خلاف کفر و شرک کو اختیار کیے جاتے ہیں۔

**آیت 31** ① **مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ ......** : یعنی آپ اور آپ کی امت اپنا چہرہ اس دین کے لیے سیدھا رکھیں، اس طرح کہ تم میں سے جس جس نے بھی اپنے مالک حقیقی سے کسی طرح کا انحراف کیا ہو، پھر اسی کی طرف پلٹ آنے والا ہو۔ ''**وَاتَّقُوۡهُ**'' اور دل میں اس سے ڈرتے رہو۔

② **وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ** : اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کا تقویٰ اور خوف دل کے اعمال ہیں۔ سب کے سامنے اس کے اظہار کے لیے لازم ہے کہ نماز قائم کرو، کیونکہ وہ دین کا عمود ہے اور اسلام کا ایسا شعار ہے جس سے کسی شخص کے مومن یا مشرک ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( بَيۡنَ الرَّجُلِ وَ بَيۡنَ الشِّرۡكِ وَالۡكُفۡرِ تَرۡكُ الصَّلَاةِ )) [ مسلم، الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر...... : ۸۲ ] ''آدمی کے درمیان اور شرک و کفر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ (کا فرق) ہے۔''

③ **وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ** : اور کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے تمھارا شمار مشرکین میں ہو جائے۔ نہ شرک جلی کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک بناؤ اور اس کی عبادت کرنے لگو، خواہ کسی زندہ کی عبادت ہو یا مردہ کی، بت کی عبادت ہو یا قبر کی یا آگ وغیرہ کی۔ نہ شرک خفی کرو جو ریا ہے اور نہ مشرکین کو دلی دوست بناؤ، کیونکہ اس سے تمھارا شمار انھی میں ہوگا، فرمایا: ﴿ **وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ** ﴾ [ المائدة : ۵۱ ] ''اور جو ان (یہود و نصاریٰ) کو دوست بنائے تو بلاشبہ وہ انھی میں سے ہے۔'' اور نہ مشرکین کی مشابہت اختیار کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنۡ تَشَبَّهَ بِقَوۡمٍ فَهُوَ مِنۡهُمۡ )) [ أبو داوٗد، اللباس، باب في لبس الشهرة : ۴۰۳۱، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما و قال الألباني حسن صحيح ] ''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے تو وہ انھی میں سے ہے۔'' نہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مقابلے میں کسی بھی شخص کے قول کو اپنا دین بناؤ، خواہ وہ امام ہوں یا پیر یا درویش، کیونکہ اسی وجہ سے یہود و نصاریٰ کا شمار مشرکین میں ہوا، فرمایا: ﴿ **اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ**

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی گروہ ہو گئے، ہر گروہ اسی پر جو ان کے پاس ہے، خوش ہیں ﴿۳۲﴾ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے رب کو اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے پکارتے ہیں، پھر جب وہ انھیں اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھاتا ہے تو اچانک ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہیں ﴿۳۳﴾

---

اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ﴾ [ التوبۃ : ۳۱ ] ”انھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔“

**آیت 32** ① مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا : یعنی ان لوگوں سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اصل اور فطری دین (توحید) کو چھوڑ کر اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور کئی گروہ بن گئے۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کوئی کسی کی عبادت کرنے لگا اور کوئی کسی دوسرے کی۔ ان کا مختلف گروہوں میں بٹ جانا ہی ان کے باطل ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ حق ایک ہے اور باطل گروہوں کا شمار نہیں۔ ”مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۵۹) معلوم ہوا دنیا میں کفر و شرک کے جتنے دین پائے جاتے ہیں وہ سب اصل دین فطرت (توحید) میں بگاڑ سے پیدا ہوئے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۳) اور سورۂ یونس (۱۹)۔

② كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ : یعنی ہر فرقہ اور گروہ سمجھتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور دوسرے باطل پر، اور جو سہارے انھوں نے تلاش کر رکھے ہیں انھیں دلائل سے تعبیر کرتے ہیں اور ان پر خوش ہیں۔

**آیت 32** ① وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ : اس آیت میں اس بات کی دلیل بیان فرمائی کہ انسان کی فطرت توحید ہے کہ جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ توحید کی شہادت ہر انسان کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ وہ زبان سے اس کا اقرار نہ کرے مگر واقعات سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”جیسے بھلے برے کام ہر انسان کی جِبِلّت پہچانتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا بھی ہر انسان کی جِبِلّت پہچانتی ہے، جو ڈر کے وقت کھل جاتی ہے (یعنی مصیبت پیش آنے پر ظاہر ہو جاتی ہے)۔“

② ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً ...... : ”پھر جب وہ انھیں اپنے پاس سے کوئی نعمت عطا کرتا ہے“ مثلاً بیماری سے شفا یا طوفان سے نجات یا بدحالی کے بعد خوش حالی اور دولت مندی وغیرہ، جو خالص اس کی طرف سے ہوتی ہے، کسی دوسرے کا اس میں کوئی دخل یا اختیار نہیں ہوتا، تو اچانک وہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک بنا رہے ہوتے ہیں، چنانچہ وہ دوسرے

لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۥ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ اِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾

**تاکہ جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس کی ناشکری کریں، سو فائدہ اٹھا لو کہ جلد ہی جان لو گے ﴿۳۴﴾ یا ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے کہ وہ بول کر وہ چیزیں بتاتی ہے جنھیں وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا کرتے تھے ﴿۳۵﴾ اور جب ہم لوگوں کو کوئی رحمت چکھاتے ہیں وہ اس سے خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے، اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو اچانک وہ ناامید ہو جاتے ہیں ﴿۳۶﴾**

معبودوں کی نذریں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے لگتے ہیں اور کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم سے یہ مصیبت فلاں بزرگ یا فلاں آستانے کے صدقے سے ٹلی ہے۔ ’’اچانک‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ تکلیف دور ہوتے ہی فوراً ناشکری اور شرک کرنے لگتے ہیں۔

**آیت 34** **لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوْا**...... : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۶)۔

**آیت 35** **اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا**...... : ’’اَمْ‘‘ کلام کے درمیان آتا ہے، اس سے پہلے ہمزہ استفہام والا جملہ ہوتا ہے، یہاں وہ جملہ کیا ہے؟ رازی نے فرمایا: ’’تو کیا وہ بلا دلیل محض خواہش نفس کی پیروی میں شریک کر رہے ہیں، یا ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے......؟‘‘ ہمارے استاذ محمد عبدہ لکھتے ہیں: ’’یعنی آخر شرک کی دلیل کیا ہے؟ کیا ان کی عقل یہ کہتی ہے یا (ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے اور) ہماری کسی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ تمھارے فلاں بزرگ کو ہم نے اپنے اختیارات میں شریک کر لیا ہے، لہٰذا تم انھیں بھی اپنی حاجت روائی کے لیے پکار سکتے ہو؟‘‘ مزید دیکھیے سورۂ احقاف (۴)۔

**آیت 36** ① **وَ اِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا**...... : اس آیت میں لوگوں کو رحمت چکھانے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، یعنی ’’جب ہم لوگوں کو کوئی رحمت چکھاتے ہیں‘‘ اور برائی پہنچنے کا سبب ان کے ہاتھوں کی کمائی یعنی ان کے اعمال کو قرار دیا ہے۔ اس کی تفسیر کے لیے سورۂ نساء کی آیت (۷۹): ﴿ **مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ** ﴾ کی تفسیر پر نظر ڈال لیں۔ اسی طرح رحمت چکھانے کے لیے ’’ **اِذَاۤ** ‘‘ (جب) کا لفظ فرمایا اور برائی پہنچنے کے لیے ’’ **اِنْ** ‘‘ (اگر) کا لفظ فرمایا جو شک کے لیے آتا ہے۔ اس میں رحمت کے مقابلے میں تکلیف کے بہت ہی کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ (رازی)

② آیت میں انسان کی ناشکری، تنگ ظرفی اور تھڑ دلی کا بیان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تھوڑی سی نعمت بھی (’’ **رَحْمَةً** ‘‘ کی تنوین تنکیر و تقلیل کے لیے ہے) عطا ہوتی ہے تو وہ اس پر پھول جاتا ہے۔ اس کی چال ڈھال اور ہر حرکت سے اس کی نخوت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس وقت نہ وہ خالق کو خاطر میں لاتا ہے نہ اس کی مخلوق کو اور نہ اسے یہ یاد رہتا ہے کہ یہ

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۳۷﴾

نعمت دائمی نہیں بلکہ ہر حال میں چھننے والی ہے اور اگر اپنے ہی اعمال کی وجہ سے کوئی برائی آ پہنچے تو اچانک (فوراً ہی) ناامید ہو جاتا ہے اور ہمت ہار بیٹھتا ہے کہ اب کوئی نہیں جو میری مصیبت ٹال سکے۔ یہ کافر کی حالت ہے کہ سختی کے وقت مایوس ہو جاتا ہے اور عیش و آرام کے وقت تکبر و غرور کرنے لگتا ہے۔ بہت سے کمزور ایمان والوں کا بھی یہی حال ہے۔ مگر صحیح مومن کا حال اس کے برعکس ہے، اسے عیش و آرام میسر ہوتا ہے تو اللہ کا شکر بجا لاتا ہے اور جب مصیبت یا تنگی پہنچتی ہے تو صبر و تحمل سے کام لیتا ہے۔ (دیکھیے سورۂ ہود: ۹ تا ۱۱) صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ )) [ مسلم، الزهد والرقائق، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹ ] ''مومن کے ہر حال پر تعجب ہے، کیونکہ اس کا ہر معاملہ ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے خیر ہوتا ہے۔''

**آیت 37** ① **اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ** : یعنی خوش حالی پر پھول جانے یا مصیبت پر ناامید ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان خوش حالی یا مصیبت کے معاملے کو دائمی سمجھ لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ہر روز پیش آنے والے مشاہدے کی طرف توجہ دلائی کہ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے۔ ایک ہی شخص کا رزق کبھی فراخ ہے کبھی تنگ اور ایک ہی وقت میں کسی کا رزق فراخ ہے اور کسی کا تنگ۔ رزق کا معاملہ اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ بعض اوقات بڑے بڑے عقل مند اور عالم غربت کا شکار ہوتے ہیں اور ان پڑھوں اور بے وقوفوں کو ایسی روزی دیتا ہے کہ پڑھے لکھے اور دانا حیران ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کی قدرت اور اس کی حکمت ہے جسے وہی جانتا ہے، کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ مومن نہ خوش حالی کو دائمی یا اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتا ہے کہ پھول جائے اور نہ ہی مصیبت کو دائمی سمجھتا ہے کہ ناامید ہو جائے، بلکہ وہ ہر وقت خوف و رجا اور امید و بیم کے درمیان کی حالت میں رہتا ہے۔ جو اسے فخر و غرور سے بھی باز رکھتی ہے اور یاس و ناامیدی سے بھی۔

② **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** : یعنی ایک ہی شخص کو کسی وقت غنی اور کسی وقت فقیر کر دینے میں بہت سی نشانیاں ہیں اور ایک ہی وقت میں کسی کو غنی اور کسی کو فقیر کر دینے میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح اس بات میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں کہ کافر ہر لمحے دنیا کے قانون تغیر کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کوئی شخص ہمیشہ ایک حال

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾

پس قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کا چہرہ چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں ﴿۳۸﴾

---

پر نہیں رہتا، نہ سب لوگ ایک حال پر ہیں، رزق اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق پھیلتا اور سکڑتا رہتا ہے، اس کے باوجود وہ اس طرح خوشی پر مغرور اور مصیبت میں ناامید ہوتے ہیں جیسے یہ حالت ہمیشہ ہی رہے گی۔ ان تمام چیزوں میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، کیونکہ ان سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں۔ کفار نہ ان پر غور کرتے ہیں، نہ انھیں ان سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

**آیت 38** ① **فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ** : فاء (پس) کا مطلب یہ ہے کہ جب ثابت ہو گیا کہ رزق کا فراخ ہونا یا تنگ ہونا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اگر اس کا رزق فراخ ہے تو خرچ کرنے سے کم نہیں ہوگا اور اگر تنگ ہے تو روک کر رکھنے سے زیادہ نہیں ہوگا، بلکہ صدقے کی برکت سے اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ "**حَقَّهٗ**" (اس کا حق) کا مطلب یہ ہے کہ تم قرابت دار، مسکین اور مسافر کو کچھ دے رہے ہو تو یہ اس کا حق ہے، جو تم ادا کر رہے ہو، جس کے ادا نہ کرنے پر اسی طرح باز پرس ہوگی جس طرح کسی قرض خواہ کا قرض ادا نہ کرنے پر باز پرس ہوگی۔ سورۂ توبہ (۶۰) میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان فرمائے ہیں، یہاں ان میں سے صرف تین ذکر فرمائے۔ رازی نے اس میں یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ ان تینوں پر زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کرنا بھی حق ہے، مثلاً والدین اور اولاد کا نفقہ ہے، اسی طرح درجہ بدرجہ قرابت داروں کی ضروریات پر خرچ ہے، یہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی واجب رہتا ہے۔ اسی طرح مسکین اور مسافر پر بھی خرچ واجب ہے۔ آدمی زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ ان کے حقوق سے سبک دوش نہیں ہو جاتا۔ مثلاً ایک شخص زکوٰۃ ادا کر چکا ہے، اس کے پاس کوئی مہمان آجاتا ہے یا ایسا مسافر جس کا زاد راہ ختم ہو چکا ہے، یا مسکین آجاتا ہے جس نے کھانا نہیں کھایا یا وہ اپنی مسکینی کی وجہ سے پاؤں سے ننگا ہے تو ان کا حق ہے کہ ان پر خرچ کیا جائے۔ فقیر کی حالت مسکین سے بھی پتلی ہوتی ہے، اس لیے اس کا الگ ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ اس پر خرچ کرنا بالاولیٰ واجب ہے۔ رہے زکوٰۃ کے باقی چار مصارف، یعنی عاملین، مؤلفۃ القلوب، غارمین اور فی سبیل اللہ، تو وہ ایسے مصارف ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ان پر خرچ اس طرح واجب نہیں جس طرح آیت میں مذکور دیگر لوگوں پر واجب ہے۔ (واللہ اعلم)

② **ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ** : عام طور پر اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں۔ اگرچہ "**وَجْهَ**" کا مطلب رضا ہو سکتا ہے، مگر "**وَجْهَ**" کا اصل معنی تو چہرہ ہے۔ دوسرا معنی اس وقت کیا جاتا ہے جب حقیقی معنی مراد نہ لیا جا سکتا ہو، جب کہ یہاں حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی مشکل نہیں، بلکہ جو

زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

کچھ تم زکوٰۃ سے دیتے ہو، اللہ کے چہرے کا ارادہ کرتے ہو، تو وہی لوگ کئی گنا بڑھانے والے ہیں ﴿۳۹﴾

رحمان اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس کے مالک کے لیے اس کو پالتا بڑھاتا ہے، جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑی کے بچے کو یا اونٹنی کے بچے کو پالتا بڑھاتا ہے، حتیٰ کہ وہ کھجور پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے یا اس سے بھی بڑی۔'' اور دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۷۶)۔

④ اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی کی گئی ہے، ابن کثیر فرماتے ہیں: ''یعنی جو شخص کوئی ہدیہ دے جس سے اس کا ارادہ یہ ہو کہ لوگ اسے اس کے ہدیے سے زیادہ دیں گے تو اللہ کے ہاں اس میں کوئی ثواب نہیں۔'' ابن عباس، مجاہد، ضحاک، قتادہ، عکرمہ، محمد بن کعب اور شعبی نے یہی تفسیر کی ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہ کام مباح (جائز) ہے، اگرچہ اس میں ثواب نہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے خاص طور پر منع کیا گیا ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے اور انھوں نے اللہ کے اس فرمان سے دلیل پکڑی ہے: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ [ المدثر: ۶ ] ''اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ لے۔'' یعنی کوئی عطیہ نہ دے جس سے تو زیادہ حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہو۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے متعلق ابن کثیر کے محقق نے فرمایا: ''اسے طبری نے بیان کیا ہے، سند اس کی ضعیف ہے۔'' حافظ ابن کثیر نے اسی مفہوم کا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک اور قول نقل فرمایا ہے کہ ''ربا'' دو طرح کا ہے، ایک ربا جو صحیح نہیں، یعنی بیع میں ربا اور ایک ربا جس میں کوئی حرج نہیں۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کوئی ہدیہ دے، جس سے زیادہ حاصل کرنے کا ارادہ ہو، پھر یہ آیت پڑھی۔ ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا: ''سیوطی نے ''درمنثور'' میں اسے ابن ابی حاتم کی طرف منسوب کیا ہے، جس میں آیت پڑھنے کا ذکر نہیں۔'' لیکن میں نے ابن ابی حاتم میں اسے تلاش کیا تو اس میں ہے کہ مخطوطہ سے سورۂ روم کا حصہ ساقط ہے۔ [ وَ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِصِحَّتِهِ ]

جمال الدین قاسمی فرماتے ہیں: ''اس تفسیر میں کئی لحاظ سے نظر ہے، پہلی یہ کہ یہ آیت سورۂ بقرہ کی آیت (۲۷۶): ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ کے مشابہ ہے، جو بیع میں سود کے بارے میں ہے، جو اہل مکہ میں اس بری طرح پھیلا ہوا تھا کہ ان کا مزاج بن چکا تھا، جس کے ساتھ وہ تنگ دستوں کا مال اس برے طریقے سے چوس رہے تھے جس کا رحم، نرم دلی اور انسانی ہمدردی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس حال کی مذمت فرمائی، تاکہ وہ توبہ کر کے پاک ہو جائیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ربا کا حقیقی معنی سود ہی ہے، جسے سب لوگ جانتے ہیں۔ اس حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی مراد لینے کے لیے شرع یا عقل کی کوئی دلیل ہونی چاہیے جو یہاں موجود نہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ آیت سے ہبہ والا معنی مراد لے کر پھر ایسے ہبہ کو مباح قرار دینا محل نظر ہے، کیونکہ آیت کا اسلوب تو اس سے ڈرانے کا اور اس سے بچنے کی ترغیب کا ہے، جو اسے ناجائز چیزوں میں شامل کر رہا ہے اور انداز بیان کی دلالت بہت قوی دلالت ہوتی ہے۔ چوتھی وجہ یہ کہ آیت سورۂ مدثر کی آیت (۶): ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ (اور اس نیت سے احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے) کی رو سے یہ دعویٰ کہ ایسا ہبہ صرف

وَ مَآ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّيَرۡبُوَاۡ فِيۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَآ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ

اور جو کوئی سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ لوگوں کے اموال میں بڑھ جائے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور جو

لطف حقیقی معنی مراد لینے میں ہے وہ مجازی معنی مراد لینے میں نہیں، یعنی یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے چہرے کے دیدار کے طلب گار ہیں، کیونکہ اللہ کے دیدار سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ اس آیت سے خرچ کرتے وقت نیت اللہ کے لیے خالص ہونے کی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے۔

③ **وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** : معلوم ہوا جو لوگ قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا نہیں کرتے وہ کامل فلاح پانے والے نہیں ہو سکتے۔

**آیت 39** ① **وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ**...... : یعنی سود سے بظاہر مال بڑھتا دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی نحوست دنیا اور آخرت میں تباہی کا باعث ہے، جب کہ زکوٰۃ دینے کے ساتھ دنیا اور آخرت میں مال میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [ البقرة : ۲۷٦ ] ''اللہ سود کو مٹا دیتا ہے اور صدقات کو بڑھا دیتا ہے۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلرِّبَا وَ إِنْ كَثُرَ، فَإِنَّ عَاقِبَتَهُ تَصِيْرُ إِلٰى قُلٍّ )) [ مسند أحمد : ۳۹۵/۱، ح : ۳۷۵۳، قال المحقق صحیح ] ''سود خواہ بہت ہو انجام اس کا یقیناً قلت ہی ہوگا۔'' یہ سورت مکی ہے، مکہ میں ابھی سود حرام نہیں ہوا تھا، مگر کفارِ مکہ بری طرح سودی کاروبار میں مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کی طرح سود کو بھی تدریجاً حرام کیا۔ اس آیت میں صرف اس کی مذمت بیان فرمائی، اس کے بعد مدینہ میں سورۂ آل عمران (۱۳۰) میں سود در سود کو اور سورۂ بقرہ (۲۷۵ تا ۲۸۱) میں ہر طرح کے سود کو مکمل طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔

② بعض اہلِ علم نے اس آیت میں مذکور حقیقت کی مثال بیان فرمائی: ''یعنی سود (بیاج) سے گو بظاہر مال بڑھتا دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں گھٹ رہا ہے۔ جیسے کسی آدمی کا بدن ورم سے پھول جائے، وہ بیماری یا پیام موت ہے اور زکوٰۃ نکالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کم ہوگا، فی الحقیقت وہ بڑھتا ہے۔ جیسے کسی مریض کا بدن مُسہل و تنقیہ سے گھٹتا دکھائی دے مگر انجام اس کا صحت ہو، سود اور زکوٰۃ کا حال بھی انجام کے اعتبار سے ایسا ہی سمجھ لو۔''

③ **وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ**...... جیسا کہ فرمایا : ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ﴾ [ البقرة : ۲٤٥ ] ''کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، پس وہ اسے اس کے لیے بہت زیادہ گنا بڑھا دے۔'' (مزید دیکھیے بقرہ: ۲۶۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَتَصَدَّقُ أَحَدٌ بِتَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ إِلَّا أَخَذَهَا اللّٰهُ بِيَمِيْنِهِ فَيُرَبِّيْهَا كَمَا يُرَبِّيْ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ أَوْ قَلُوْصَهُ حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ أَوْ أَعْظَمَ )) [ مسلم، الزکاۃ، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب و تربیتها : ۱۰۱٤/٦٤ ] ''کوئی شخص پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ بھی کرتا ہے تو

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھیں رزق دیا، پھر تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا، کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کرے؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۴۰﴾ خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا، تاکہ وہ انھیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا ہے، تاکہ وہ باز آجائیں ﴿۴۱﴾

رسول اللہ ﷺ پر حرام تھا، محلِ نظر ہے۔ کیونکہ اگرچہ لفظوں میں خطاب صرف نبی ﷺ سے ہے مگر حکم عام ہے۔ سورۂ مدثر کے شروع سے دیکھ لیجیے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ یہ تمام احکام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پوری امت کے لیے بھی ہیں۔'' خلاصہ یہ کہ اس آیت کی پہلی تفسیر ہی قابل اعتماد ہے۔

**آیت 40** ① **اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ** ...... : یہاں سے کفار و مشرکین کو سمجھانے کے لیے پھر سلسلۂ کلام توحید اور آخرت کی طرف پھر گیا ہے۔

② **هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ** : کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو اس میں سے کچھ بھی کر سکے؟ ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے تو پھر انھیں پوجنے اور ان کے آستانوں پر نذریں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے کا کیا فائدہ؟

**آیت 41** ① **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ** ...... : خشکی سے مراد زمین کے میدان، پہاڑ اور صحرا وغیرہ ہیں اور سمندر سے مراد سمندری جزیرے، ساحلوں پر آباد شہر اور بستیاں اور سمندروں میں سفر کرنے والے جہاز اور کشتیاں ہیں۔ فساد (خرابی) سے مراد ہر آفت اور مصیبت ہے، چاہے وہ جنگ و جدال اور قتل و غارت کی صورت میں نازل ہو یا قحط، بیماری، فصلوں کی تباہی، بدحالی، سیلاب اور زلزلے وغیرہ کی صورت میں ہو۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے بحر و بر میں جو فتنہ و فساد بپا ہے اور آسمان کے نیچے جو ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں، یہ سب شرک کی وجہ سے ہیں۔ جب سے لوگوں نے توحید اور دین فطرت کو چھوڑ کر شرک کی راہیں اختیار کی ہیں اس وقت سے یہ ظلم و فساد بھی بڑھ گیا ہے۔ شرک جیسے قولی اور اعتقادی ہوتا ہے اسی طرح شرک عملی بھی ہے، جو فسق و فجور اور معاصی کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس بات کی تعیین کہ آیت میں "**بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ**" (جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا) سے مراد شرک ہے، اگلی آیت کے ساتھ ہوتی ہے، فرمایا: ﴿**قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ**﴾ [الروم: ۴۲] ''کہہ دے زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، ان کے اکثر مشرک تھے۔'' ان اقوام کی دوسری خرابیاں، جن کا قرآن نے ذکر

قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ‌ؕ كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّشۡرِكِيۡنَ ۞ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ الۡقَيِّمِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ‌ يَوۡمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوۡنَ ۞

**کہہ دے زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، ان کے اکثر مشرک تھے ۞ پس تو اپنا چہرہ سیدھے دین کی طرف سیدھا کر لے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی اللہ کی طرف سے کوئی صورت نہیں، اس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے ۞**

فرمایا ہے اور جن کی وجہ سے ان پر عذاب آیا، ان کا اصل بھی شرک تھا، اگر وہ ایک اللہ پر ایمان لاتے تو ہرگز ایسے گناہوں کے اجتماعی طور پر مرتکب نہ ہوتے۔

② اس کے برعکس جس معاشرے کی بنیاد اللہ کی توحید اور اس کے احکام و حدود کی اقامت پر ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۶۵، ۶۶) اور اعراف (۹۶)۔

③ **لِيُذِيۡقَهُمۡ بَعۡضَ الَّذِىۡ عَمِلُوۡا ......** : پوری سزا تو آخرت میں ملے گی، مگر یہ تھوڑے سے عذاب کا نمونہ ہے، تاکہ لوگ شرک اور نافرمانی چھوڑ کر توحید اور فرماں برداری کی راہ اختیار کر لیں۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۲۱) اور توبہ (۱۲۶)۔

**آیت 42** **قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ......** : یعنی قومِ نوح، عاد و ثمود، قومِ شعیب و قومِ لوط، فرعون، ہامان اور قارون وغیرہ۔ پچھلی جن قوموں پر تباہی آئی اسی شرک کی بدولت آئی، جس سے بچنے کی تمھیں تلقین کی جا رہی ہے۔

**آیت 43** ① **فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ الۡقَيِّمِ** : یعنی جب بر و بحر میں شرک کی وجہ سے فساد پھیل گیا ہے تو اے مخاطب! تو اپنا چہرہ اس دین کی طرف سیدھا کر لے جو بالکل سیدھا اور فطرتِ توحید پر قائم ہے۔

② **مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ** : "مَرَدَّ" "رَدَّ يَرُدُّ" سے مصدر میمی ہے، ہٹانا، پھیر دینا۔ یعنی اس دن سے پہلے پہلے دین قیم کی طرف اپنا رخ سیدھا کر لے جس کا واقع ہونا اللہ تعالیٰ نے طے کر دیا ہے اور اللہ کی طرف سے اس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں، پھر کوئی اور اسے کس طرح ٹال سکتا ہے؟

③ **يَوۡمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوۡنَ** : "يَصَّدَّعُوۡنَ" اصل میں "يَتَصَدَّعُوۡنَ" ہے "پھٹ جائیں گے"، یعنی قیامت کے دن مسلم و کافر اس طرح یک لخت جدا جدا ہو جائیں گے جیسے کوئی چیز پھٹ کر الگ الگ ہو جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہو گا کہ کوئی کافر مسلمانوں میں یا کوئی مسلمان کافروں میں شامل رہ جائے، فرمایا: ﴿ فَرِيۡقٌ فِى الۡجَـنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ ﴾ [ الشوریٰ : ۷ ] "ایک گروہ جنت میں ہو گا اور ایک گروہ بھڑکتی آگ میں۔"

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

**جو کفر کرے سو اس کا کفر اسی پر ہے اور جو کوئی نیک عمل کرے سو وہ اپنے ہی لیے سامان تیار کر رہے ہیں ﴿۴۴﴾ تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، اپنے فضل سے جزا دے۔ بے شک وہ کافروں سے محبت نہیں کرتا ﴿۴۵﴾**

---

**آیت 44** **مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ......** : اس میں جدا جدا ہونے والے دونوں فریقوں کا حال بیان فرمایا کہ جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال اسی پر ہوگا اور جو نیک عمل کریں گے وہ اپنے ہی لیے آرام کی جگہ تیار کر رہے ہیں، یا سامان تیار کر رہے ہیں قبر میں، جنت میں بلکہ دنیا میں بھی۔ ''كَفَرَ'' کے ساتھ دوسرے برے اعمال کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ کفر کے بعد کسی عمل کا اعتبار ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ قَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [ الفرقان : ۲۳ ] ''اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔'' اور کفر کے مقابلے میں ایمان کے بجائے عمل صالح فرمایا، کیونکہ ایمان بھی عمل صالح میں شامل ہے اور اس لیے کہ عمل صالح کی اہمیت واضح ہو جائے۔

**آیت 45** ① **لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......** : اس میں قیامت کے دن لوگوں کے جدا جدا ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ بقاعی نے فرمایا: ''یہاں دو جملوں میں سے ہر ایک کا ایک حصہ حذف کر دیا اور ایک بیان کر دیا ہے، جس سے حذف شدہ حصہ خود بخود معلوم ہو رہا ہے۔'' گویا مفصل کلام یوں ہوگا: ''لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ يُحِبُّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ بِعَدْلِهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ'' ''تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اپنے فضل سے جزا دے، کیونکہ وہ ایمان والوں سے محبت کرتا ہے اور تاکہ وہ ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا اور برے اعمال کیے اپنے عدل کے ساتھ بدلا دے، کیونکہ وہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔'' پہلے جملے میں سے ''إِنَّهُ يُحِبُّ الْمُؤْمِنِيْنَ'' حذف کر دیا اور دوسرے میں سے ''لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ بِعَدْلِهِ'' حذف کر دیا۔ اسے احتباک کہتے ہیں اور لمبی بات کو اس طرح مختصر کرنا قرآن کے بیان کا ایک حسن ہے۔

② **مِنْ فَضْلِهٖ**: یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کو جنت میں داخلہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں ملے گا بلکہ محض فضل یعنی اصل بدلے سے زائد اجر کے طور پر ملے گا۔ کیونکہ دنیا میں اگر انسان نے اللہ کا شکر ادا کیا یا اس کا فرماں بردار بن کر رہا تو اس سے تو اس کے پہلے احسانات کا بدلا ہی پورا نہیں ہوتا، اس توفیق کا بدلا کس طرح ہوگا جس کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا!؟ اس لیے بندوں کو جو اجر بھی ملے گا وہ ان کے اعمال سے زائد انعام ہی ہوگا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: (( لَنْ يُّدْخِلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ )) ''کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔'' لوگوں نے کہا: (( وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ )) ''اور کیا آپ کو بھی نہیں اے اللہ کے رسول!؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا، وَلَا

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

**اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہواؤں کو خوش خبری دینے والیاں بنا کر بھیجتا ہے اور تاکہ تمھیں اپنی کچھ رحمت چکھائے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۴۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسول ان کی قوم کی طرف بھیجے تو وہ ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے، پھر ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنھوں نے جرم کیا اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہی تھا ﴿۴۷﴾**

أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَ رَحْمَةٍ ))[ بخاري، المرضى، باب تمنى المريض الموت : ۵۶۷۳ ] ''نہیں، مجھے بھی نہیں، اِلاّ یہ کہ اللہ مجھے فضل و رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے۔''

**آیت 46** وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ ...... : بروبحر میں فساد کا باعث شرک بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل کے طور پر چند چیزیں ذکر فرمائیں جن کا سب لوگ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں بھی "اِرْسَالُ الرِّيَاحِ" کے الفاظ مذکور ہوں (رِیْحٌ کی جمع کے صیغے کے ساتھ) ان سے مراد خوش گوار ہوائیں ہوتی ہیں۔ اس آیت میں دو قسم کی خوش گوار ہواؤں کا اور ان کے فوائد کا ذکر فرمایا، ایک رحمت کی بارش کی خوش خبری دینے والی، جس سے گرد و غبار اور فضا میں پھیلی ہوئی زہرناکی ختم ہوتی ہے، مردہ زمین سیراب ہوتی ہے، طرح طرح کی فصلیں، پودے اور درخت پیدا ہوتے ہیں اور تمام جان داروں کی بنیادی ضرورت پانی مہیا ہوتا ہے۔ غرض بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ دوسری وہ موافق ہوائیں جو کشتیوں اور جہازوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ پہلے زمانے میں تو رواج ہی بادبانی کشتیوں کا تھا، جن کے چلنے کا زیادہ تر انحصار موافق ہواؤں پر ہوتا تھا۔ آج کل انجن سے چلنے والی کشتیوں اور جہازوں کا دور ہے، پھر بھی موافق اور مخالف ہواؤں کا ان کشتیوں اور جہازوں پر خاصا اثر پڑتا ہے۔ فرمایا، یہ کشتیاں جو موافق ہواؤں کے سہارے چلتی ہیں ان کے ذریعے سے تم اللہ کا فضل تلاش کرتے ہو کہ وہ طلبِ علم، تجارت اور دوسری ضروریات کے لیے سفر کا آسان اور سستا ذریعہ بنتی ہیں۔ پھر تم انھی کشتیوں پر اپنا ہزاروں لاکھوں من تجارتی سامان لے جا کر خوب نفع کماتے ہو اور انھی جہازوں پر ملکوں کو فتح کرتے ہو۔ ایک علاقے میں پیدا ہونے والی چیزیں صرف وہاں تک محدود نہیں رہتیں بلکہ تمام دنیا کے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہواؤں کے بھیجنے میں یہ تمام فوائد بھی ہیں اور یہ بھی کہ تم ان نعمتوں پر اللہ کا شکر کرو اور اس کی وحدانیت مان کر اس اکیلے کی عبادت کرو۔

**آیت 47** وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا ...... : اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت برپا ہونے کے دلائل سن کر بھی

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۚ﴿۴۸﴾

**اللہ وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادل کو ابھارتی ہیں، پھر وہ اسے آسمان میں پھیلا دیتا ہے جیسے چاہتا ہے اور وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ پس تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اس کے درمیان سے نکل رہی ہے، پھر جب وہ اسے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برسا دیتا ہے تو اچانک وہ بہت خوش ہوتے ہیں ﴿۴۸﴾**

---

کفار ایمان نہ لائے اور اپنی ضد ہی پر اڑے رہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی تسلی کے لیے فرمایا کہ آپ پہلے شخص نہیں جسے جھٹلایا گیا ہو، بلکہ آپ سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے جو اپنی اقوام کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے، جو وحی الٰہی کی آیات بھی تھیں اور پیغمبر کو ملنے والے معجزے بھی، مگر کفار اپنے جرائم پر اڑے رہے تو ہم نے ان مجرموں سے انتقام لیا اور مومنوں کی نصرت فرمائی اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر ہمیشہ سے لازم رہا ہے۔ (**كَانَ** استمرار کے لیے ہے) "**الْمُؤْمِنِیْنَ**" میں پیغمبر، ان کے صحابہ اور تمام مومنین شامل ہیں۔

**آیت 48** **اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا** ...... : عبدالرحمان کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی نشانیاں ذکر فرما دیں، مثلاً ہوا جو ایک کنکر کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتی اور کنکر زمین پر آ پڑتا ہے، مگر یہ ہوا آبی بخارات کو ایک کاغذ کے پرزے کی طرح اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتی ہے۔ وہ آبی بخارات جن میں کروڑوں ٹن پانی موجود ہوتا ہے اور اس وزن کا اندازہ زمین کے اس رقبے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں یہ بارش ہوئی اور جتنے انچ بارش ہوئی۔ دوسری یہ کہ ان بار بردار ہواؤں کا رخ طبعی طور پر متعین نہیں ہوتا (کہ لازماً فلاں جانب ہی چلیں گی) بلکہ اللہ تعالیٰ جس طرف خود چاہے اسی طرف ہی موڑ دیتا ہے۔ اس لیے جہاں چاہتا ہے وہیں بارش ہوتی ہے، دوسرے علاقے میں نہیں ہوتی (اور جتنی چاہتا ہے ہوتی ہے، زیادہ نہیں ہوتی)۔ تیسری یہ کہ جب یہ بادل کسی ایسے ٹھنڈے فضائی علاقے میں پہنچتے ہیں جو آبی بخارات کو پھر سے پانی میں منتقل کر سکیں تو وہاں بھی بادلوں کا سارا پانی یک لخت پانی بن کر زمین پر نہیں گر پڑتا بلکہ قطرہ قطرہ بن کر گرتا ہے، حتیٰ کہ اگر ٹھنڈک زیادہ ہو تو بھی وہ قطرے ہی اولے بن کر گرتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ زیادہ سردی کی وجہ سے سارا پانی برف بن کر یک لخت گر پڑے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں۔

بارش سے پہلے زمین کا یہ حال تھا کہ دھول اڑتی پھرتی تھی، درختوں کے پتوں پر گرد و غبار پڑا تھا۔ بارش ہوتی ہے تو درخت دھل جاتے ہیں اور زمین لہلہانے لگتی ہے، گویا اسے نئی زندگی مل گئی، پھر کئی قسم کے جان دار بھی بارش میں پیدا ہو کر بولنے اور چلنے پھرنے لگتے ہیں۔ ایک بہار آ جاتی ہے جس سے دل مسرور ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی تمام مخلوق کی روزی کا سامان بھی میسر

وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَ لَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾

حالانکہ بے شک وہ اس سے پہلے کہ ان پر برسائی جائے، اس سے پہلے یقیناً ناامید تھے ﴿۴۹﴾ سو اللہ کی رحمت کے نشانات کی طرف دیکھ کہ وہ کس طرح زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے، بے شک وہی یقیناً مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۵۰﴾ اور یقیناً اگر ہم کوئی ہوا بھیجیں، پھر وہ اس (کھیتی) کو زرد پڑی ہوئی دیکھیں تو یقیناً اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں ﴿۵۱﴾

---

آنے لگتا ہے اور انسان جو برسات سے بیشتر مایوسی کا شکار ہو رہا تھا پھر سے خوش ہو کر پھولنے اور اِترانے لگتا ہے۔''

**آیت 49** وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ ...... : واؤ حالیہ ہے اور ''اِنْ كَانُوْا'' اصل میں ''إِنَّهُمْ كَانُوْا'' ہے۔ ''لَمُبْلِسِيْنَ'' پر آنے والے لام کی وجہ سے ''إِنَّ'' کو ''اِنْ'' سے بدل دیا اور ''هُمْ'' کو حذف کر دیا۔ ''مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ'' کے بعد ''مِنْ قَبْلِهٖ'' دوبارہ لانے کا مطلب تاکید ہے، یعنی وہ بارش اترنے سے پہلے، اس کے عین پہلے تک بالکل ناامید تھے۔ اس میں لمبی ناامیدی کا نہایت تیزی کے ساتھ فوری خوشی میں بدلنے کا بیان ہے، یعنی وہ بالکل ناامید تھے، بارش اترتے ہی خوشیاں منانے لگے۔ اس سے اللہ کی قدرت معلوم ہوتی ہے کہ لمحہ بھر میں دنیا کی حالت بدل جاتی ہے، کچھ دیر پہلے سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور اب بارش کے بعد ہر طرف خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔

**آیت 50** ① فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ ...... : اس آیت میں بارش کے ساتھ مردہ زمین کے زندہ کر دینے کو قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کرنے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

② وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ : یعنی وہ صرف مُردوں ہی کو زندہ کرنے والا نہیں بلکہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ مُردوں کو زندہ کرنا تو اس کی قدرت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے، جس کا نمونہ تم بارش کے بعد زمین کے زندہ ہونے کی صورت میں دیکھتے ہو۔

**آیت 51** وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا ...... : یعنی اگر ہم کوئی سخت سرد یا گرم ہوا بھیج دیں، جس سے ان کے کھیت زرد پڑ جائیں تو وہ ناشکری کرنے لگ جائیں گے اور پہلی نعمت سے بھی مکر جائیں گے۔ اس میں کافر اور دنیا دار مسلمان کا حال بیان ہوا ہے کہ جب اس پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے تو اس وقت وہ خوش تو بہت ہوتا ہے مگر اللہ کا شکر پھر بھی ادا نہیں کرتا اور جب کوئی نعمت چھنتی ہے تو اس وقت اسے اللہ یاد تو آتا ہے مگر صبر و شکر کے لیے نہیں، بلکہ کفر اور ناشکری کے کلمات کا ہدف بنانے کے لیے۔ نعمت ملنے پر اللہ کا احسان ماننے کے لیے تو قطعاً تیار نہ تھا، زوالِ نعمت پر اور بھی برگشتہ ہو گیا اور اللہ کو کوسنے لگ گیا کہ اس نے ہم پر یہ کیسی مصیبت ڈال دی ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع

**پس بے شک تو نہ مُردوں کو سناتا ہے اور نہ بہروں کو پکار سناتا ہے، جب وہ پیٹھ پھیر کر لوٹ جائیں ﴿۵۲﴾ اور نہ تو کبھی اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ پر لانے والا ہے۔ تو نہیں سناتا مگر انھی کو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، پھر وہ فرماں بردار ہیں ﴿۵۳﴾**

آیت 52 ① فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی کہ خوش گوار ہواؤں، بارش، بحری جہازوں اور توحید الٰہی پر دلالت کرنے والی دوسری بے شمار نشانیوں کے باوجود اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ غم زدہ نہ ہوں، کیونکہ آپ زندوں کو سنا سکتے ہیں مُردوں کو نہیں اور کان والوں کو سنا سکتے ہیں بہروں کو نہیں، جب کہ کفر و عناد پر اَڑے ہوئے یہ لوگ زندہ نہیں حقیقت میں مردہ ہیں اور کان رکھنے والے نہیں بلکہ ایسے بہرے ہیں جو پیٹھ دے کر جا رہے ہوں، جنھیں کسی صورت بات پہنچائی جا ہی نہ سکتی ہو، کیونکہ اگر وہ دیکھ رہے ہوتے تو شاید دیکھ کر ہی سمجھ جاتے، مگر جب وہ سماعت سے مرحوم بھی ہیں اور پیٹھ دے کر بھی جا رہے ہیں تو آپ ان کو کیسے سنائیں گے!؟

② اللہ تعالیٰ کے کلام کی بلندی اور بلاغت کو تو کسی کا کلام چھو بھی نہیں سکتا، مگر انسانی حد تک ایک شاعر نے یہ مفہوم اچھا ادا کیا ہے ؎

لَقَدْ أَسْمَعْتَ لَوْ أَسْمَعْتَ حَيًّا وَ لٰكِنْ لَا حَيَاةَ لِمَنْ تُنَادِيْ
وَ لَوْ نَارًا نَفَخْتَ بِهَا أَضَاءَتْ وَ لٰكِنْ أَنْتَ تَنْفُخُ فِي الرَّمَادِ

’’تم نے اپنی بات یقیناً سنا دی اگر تو کسی زندہ کو آواز دیتا، مگر جسے تو آواز دے رہا ہے اس میں زندگی ہی نہیں۔ اور اگر کوئی معمولی سی آگ بھی ہوتی جس میں تو پھونک مارتا تو وہ روشن ہو جاتی، مگر تُو تو راکھ میں پھونکیں مار رہا ہے۔‘‘

③ اس میں شک نہیں کہ اس آیت میں مُردوں اور بہروں سے مراد ایمان نہ لانے والے کافر ہیں، مگر یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ فوت شدہ مردے زندہ لوگوں کی بات نہیں سنتے، کیونکہ اگر مردے سنتے ہوں تو ایمان نہ لانے والوں کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ کس چیز میں دی جا رہی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مُردے نہیں سنتے اور یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے۔ ہاں وہ دو مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں، ایک بدر میں کفار کے مقتولین سے رسول اللہ ﷺ کا خطاب جو انھیں کنویں میں پھینکنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا (دیکھیے بخاری: ۳۹۷۶) اور دوسرا میت کا قبر میں دفن کیے جانے کے بعد واپس جانے والوں کے جوتوں کی آواز سننا۔ (دیکھیے بخاری: ۱۳۳۸)

آیت 53 وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ...... : یہاں اندھوں سے بھی دل کے اندھے ہی مراد ہیں، جنھیں گمراہی سے نکال کر نجات کی راہ پر لے آنا آپ کے بس میں نہیں اور نہ ایسا کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ دیکھیے سورۂ نمل (۸۰، ۸۱)۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنا دیا، وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا ہے، ہر چیز پر قادر ہے ﴿۵۴﴾

**آیت 54** ① **اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ**...... : مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں: ''انسان کا اصل تو مٹی سے ہے، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون کے ٹکڑے سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے، پھر اسے ہڈیاں پہنائی جاتی ہیں، پھر ہڈیوں پر گوشت پوست پہنایا جاتا ہے، پھر روح پھونکی جاتی ہے، پھر ماں کے پیٹ سے ضعیف و نحیف ہو کر نکلتا ہے، پھر تھوڑا تھوڑا بڑھتا ہے اور مضبوط ہوتا جاتا ہے، پھر بچپن کے زمانے کی بہاریں دیکھتا ہے، پھر جوانی کے قریب پہنچتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، آخر نشوونما موقوف ہو جاتی ہے۔ اب قُویٰ پھر مضمحل ہونا شروع ہوتے ہیں، طاقتیں گھٹنے لگتی ہیں، ادھیڑ عمر کو پہنچتا ہے، پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ طاقت کے بعد یہ کمزوری بھی قابل عبرت ہوتی ہے کہ ہمت پست ہے۔ دیکھنا، سننا، چلنا، پھرنا، اٹھنا، اچکنا، پکڑنا غرض ہر طاقت گھٹ جاتی ہے، رفتہ رفتہ بالکل جواب دے جاتی ہے اور ساری صفتیں متغیر ہو جاتی ہیں، بدن پر جھریاں پڑ جاتی ہیں، رخسار پچک جاتے ہیں، دانت ٹوٹ جاتے ہیں اور بال سفید ہو جاتے ہیں، یہ ہے قوت کے بعد کی ضعیفی اور بڑھاپا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، بنانا بگاڑنا اس کی قدرت کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ ساری مخلوق اس کی غلام، وہ سب کا مالک۔ وہ عالم و قادر، نہ اس کا سا کسی کا علم، نہ اس جیسی کسی کی قدرت۔'' (ابن کثیر)

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے توحید کا اثبات اور منکرین قیامت کا رد فرمایا ہے کہ جو اللہ انسان کو عدم سے نکال کر وجود میں لا سکتا ہے، پھر ضُعف کی حالت سے بڑھا کر قوت اور جوانی تک پہنچاتا ہے، پھر قوت و جوانی سے ضُعف اور بڑھاپے کی طرف لا کر موت تک پہنچا دیتا ہے، اس کے لیے اسے دوبارہ پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں، خصوصاً جب وہ علیم بھی ہے، اسے کائنات کے ہر شخص اور ہر چیز کے ہر ذرّے کا علم ہے کہ کہاں ہے اور قدیر بھی ہے کہ اس کا وجود و عدم دونوں اس کی قدرت کا نتیجہ ہیں۔ وہ جب چاہے مردہ اجزا کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

③ **یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ** : یعنی ضُعف سے قوت کی طرف اور قوت سے ضُعف اور بڑھاپے کی طرف انسان کا یہ سفر اندھے اور بے شعور مادّے کے خود بخود ہونے والے تغیرات نہیں، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، کسی کو جنین ہی کی حالت میں ختم کر دیتا ہے، کسی کو پیدا ہوتے ہی، کسی کو بچپن میں بلا لیتا ہے، کسی کو جوانی تک پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے بڑھاپے تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کی مشیّت، کمال علم اور کمال قدرت کے مطابق ہوتا ہے۔

④ ابن عاشور فرماتے ہیں: ''لفظ ''**ضُعْفٍ**'' آیت میں ضاد کے ضمّہ کے ساتھ ہے اور یہ زیادہ فصیح اور لغتِ قریش ہے اور اس کے ضاد پر فتحہ بھی جائز ہے اور یہ لغتِ تمیم ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں :

وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ٞ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

**اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسمیں کھائیں گے کہ وہ ایک گھڑی کے سوا نہیں ٹھہرے۔ اسی طرح وہ بہکائے جاتے تھے ﴿۵۵﴾ اور وہ لوگ جنھیں علم اور ایمان دیا گیا کہیں گے کہ بلاشبہ یقیناً تم اللہ کی کتاب میں اٹھائے جانے کے دن تک ٹھہرے رہے، سو یہ اٹھائے جانے کا دن ہے اور لیکن تم نہیں جانتے تھے ﴿۵۶﴾**

"میں نے اسے رسول اللہ ﷺ کے سامنے "اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ" (یعنی ضاد کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا تو آپ ﷺ نے مجھے " مِنْ ضُعْفٍ "(یعنی ضاد کے ضمہ کے ساتھ) پڑھایا۔" [ ترمذي، القراءات، باب ومن سورة الروم : ۲۹۳۶، وقال الألباني حسن۔ أبو داؤد، الحروف و القراءات، باب : ۳۹۷۸ ] جمہور نے تینوں جگہ **"ضُعْفٍ"** کا لفظ ضاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم اور حمزہ نے اسے ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یقیناً ان کے پاس اس کا ثبوت ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے خلاف ہے۔ اس قراءت اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اسے ضاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا، کیونکہ یہ آپ ﷺ کی قوم کی لغت ہے اور جو دوسرے قبیلے کی لغت میں پڑھے اس کے لیے فتحہ کے ساتھ پڑھنے کی رخصت ہے اور جس کی کوئی خاص لغت نہ ہو اسے دونوں طرح پڑھنے کا اختیار ہے۔" (التحریر و التنویر) یاد رہے کہ اگرچہ عاصم کی قراءت ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہے مگر ان کے ایک راوی حفص نے (جن کی روایت ہمارے ہاں رائج ہے) ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی وجہ سے اس کے ضاد کے ضمہ کو ترجیح دی ہے۔

**آیت 55** **وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ** ...... : قیامت کے دن مجرم لوگ قسمیں کھائیں گے کہ وہ ایک گھڑی کے سوا نہیں ٹھہرے، یعنی دنیا میں ان کی زندگی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں تھی۔ انھیں اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے رب کو پہچانتے یا اپنے پیغمبروں کی باتوں پر عمل کرتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوگا کہ اتنے تھوڑے وقت میں ہم پر حجت قائم نہیں ہوئی، اس لیے ہم معذور ہیں۔ (ابن کثیر) یعنی جس طرح یہ لوگ دنیا میں حق کو پہچانتے تھے اور جانتے بوجھتے ہوئے اسے چھوڑ کر باطل کی طرف جاتے اور باطل کے سچا ہونے پر قسمیں اٹھاتے تھے، اسی طرح آخرت میں بھی یہ جانتے ہوئے کہ وہ دنیا میں اتنی مدت رہے ہیں کہ اگر جاننا یا ماننا چاہتے تو یہ کام کر سکتے تھے۔ (فاطر : ۳۷) جھوٹی قسمیں کھائیں گے کہ وہ دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ رہے ہی نہیں اور سمجھ رہے ہوں گے کہ دنیا کی طرح یہاں بھی قسموں کی وجہ سے ہمارا جھوٹ چل جائے گا۔ دیکھیے سورۂ مجادلہ (۱۸)۔

**آیت 56** **وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ** ...... : یعنی جس طرح دنیا میں علم و ایمان والے ان کے جھوٹ کی تردید کیا کرتے تھے اور ان پر حجت قائم کیا کرتے تھے، اب بھی ان کی بات سنتے ہی ان کی تردید کرتے ہوئے کہیں گے کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو کہ تم دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لکھے ہوئے کے مطابق

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۶

تو اس دن ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا تھا ان کا عذر کرنا فائدہ نہ دے گا اور نہ انھیں معافی مانگنے کا موقع دیا جائے گا ﴿۵۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثال بیان کی ہے اور یقیناً اگر تو ان کے پاس کوئی نشانی لائے تو یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ضرور ہی کہیں گے کہ تم نہیں ہو مگر جھوٹے ﴿۵۸﴾ اسی طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو نہیں جانتے ﴿۵۹﴾ پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ لوگ تجھے ہرگز ہلکا نہ کر دیں جو یقین نہیں رکھتے ﴿۶۰﴾

---

قیامت کے دن تک ٹھہرے ہو۔ تو یہ ہے قیامت کا دن جو ٹھیک وعدے کے مطابق آ پہنچا ہے، لیکن تم یہ بات نہیں جانتے تھے بلکہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور رسولوں سے کہا کرتے تھے کہ لے آؤ وہ قیامت جس کی تم دھمکی دیتے ہو۔

**آیت 57** فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ ...... : یعنی اس دن ان کا یہ عُذر کہ ہمیں وقت ہی نہیں ملا، انھیں کچھ فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی انھیں معافی مانگنے یا اپنے رب کو راضی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

**آیت 58** ① وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ : سورت کے آخر میں فرمایا کہ ہم نے اپنے وجود، اپنی وحدانیت، اپنی قدرت، کائنات کی تخلیق اور اسے دوبارہ پیدا کرنے کی دلیل کے لیے ہر قسم کی مثالیں بیان کر دی ہیں اور رسول نے اپنا فریضہ ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص مزید کسی معجزے کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ ضد اور عناد کی وجہ سے ایسا کرتا ہے، کیونکہ جب کوئی شخص ایک واضح دلیل کو جھٹلا دے تو اس کے لیے دوسری دلیلوں کو جھٹلانا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

② وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا...... : اس لیے فرمایا کہ اگر آپ ان کے پاس کوئی بھی معجزہ لے آئیں یہ یہی کہیں گے کہ تم تو محض جھوٹے ہو۔ اس آیت کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۱) اور یونس (۹۶، ۹۷)۔

**آیت 59** كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ...... : یعنی جن کے دل صحیح علم سے کورے ہوتے ہیں اور وہ ہٹ دھرمی سے ہر بات کا انکار ہی کرتے چلے جاتے ہیں، بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں قبولِ حق کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔

**آیت 60** فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ...... : اللہ کا یہ وعدہ اس سورت کی آیت (۴۷) میں گزر چکا ہے، فرمایا: ﴿ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ''اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہی تھا۔'' یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدد کرنا اپنے ذمے لے رکھا ہے، اس لیے آپ صبر کریں اور یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر یقین نہیں رکھتے آپ کو کسی موقع پر ہلکا نہ کر دیں کہ آپ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں، بلکہ خوب مستحکم اور مضبوط ہو کر اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔

سُوْرَةُ لُقْمٰن ٣١ مکیۃ ٥٧ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰیاتها ٣٤ رکوعاتها ٤

الٓمّٓ ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٦﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ① یہ کمال حکمت والی کتاب کی آیات ہیں ② نیکی کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہیں ③ وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین بھی وہی رکھتے ہیں ④ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے سراسر ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ⑤ اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو غافل کرنے والی بات خریدتا ہے، تاکہ جانے بغیر اللہ کے راستے سے گمراہ کرے اور اسے مذاق بنائے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ⑥ اور جب اس پر ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس نے

---

**آیت 1، 2** الٓمّٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس کی پہلی آیت کی تفسیر۔

**آیت 3 تا 5** هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ......: ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیات (۲ تا ۵) کی تفسیر۔

**آیت 6، 7** ① وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ......: محسنین کے اوصاف اور ان کے حسنِ انجام کے ذکر کے بعد ان بدنصیبوں کا ذکر فرمایا جن کے لیے "عَذَابٌ مُّهِيْنٌ" یعنی ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے۔ "لَهْوَ" کا لفظی معنی "غافل کر دینا" ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [ المنافقون : ۹ ] "تمھارے اموال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔" "لَهْوَ" ہر اس بات یا کام کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد کی چیز سے غافل کر دے۔ شیخ عبدالرحمان السعدی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "وَمِنَ النَّاسِ" لوگوں میں سے کوئی ایسا بدنصیب اور بے توفیق بھی ہے، "مَنْ يَّشْتَرِيْ" جو اس طرح رغبت رکھتا اور پسند کرتا ہے جیسے قیمت خرچ کر کے حاصل کرنے والا پسند کرتا ہے، "لَهْوَ الْحَدِيْثِ" ان باتوں کو جو دلوں کو غافل کر دینے والی اور عظیم مقصد سے روک دینے والی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس میں ہر حرام کلام، ہر باطل اور ایسے اقوال پر مشتمل ہر ہذیان داخل ہے جو کفر، فسق اور معصیت کی رغبت پیدا کرے، وہ اقوال حق کو رد کرنے والے لوگوں کے ہوں، جو باطل کے ساتھ بحث کر کے حق کو زیر کرنے کی کوشش کرتے

كَأَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

وہ سنی ہی نہیں، گویا اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے، سو اسے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے ۝

ہیں، غیبت، چغلی، جھوٹ اور گالی گلوچ کی صورت میں ہوں یا گانے بجانے، شیطان کے باجوں اور غافل کر دینے والی داستانوں اور افسانوں کی صورت میں ہوں، جن کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہو نہ آخرت میں۔ تو لوگوں کی یہ قسم وہ ہے جو ہدایت والی بات چھوڑ کر "لَهْوَ" والی بات خریدتی ہے۔"

② میں نے شیخ عبد الرحمن السعدی کا کلام اس لیے نقل کیا ہے کہ عام طور پر اس آیت میں "لَهْوَ الْحَدِيْثِ" سے مراد صرف گانا بجانا لیا جاتا ہے، جب کہ آیت کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے، اگرچہ حرام غنا (ناجائز گانا) بھی اس میں شامل ہے۔ طبری میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو حسن سند کے ساتھ ثابت ہے کہ انھوں نے قسم کھا کر فرمایا کہ اس سے مراد غنا (گانا) ہے، تو یہ "لَهْوَ الْحَدِيْثِ" کی ایک جزئی کا بیان ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس کا مصداق ایسے گانے بجانے والے ہوں گے جو دین سے روکنے والے، اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنانے والے اور انھیں سن کر تکبر سے منہ پھیرنے والے ہوں، کیونکہ ان اوصاف کی ان آیات میں صراحت ہے، اور یہ اوصاف کفار کے ہیں مسلمانوں کے نہیں اور انھی کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ مسلمان کو ہونے والا عذاب تو اسے گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوگا۔ البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمان کہلانے والے لوگ جو حرام عشقیہ گانے بجانے کو اپنا پیشہ یا شغل بنا لیتے ہیں، اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں بدترین نفاق پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ کی آیات کو سن کر ان کے ساتھ ان کا رویہ بھی بعینہٖ وہی ہوتا ہے جو ان آیات میں مذکور ہے۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کا مذاق اڑانے کے لیے مولوی کا مذاق اڑاتے اور اسے گالی دیتے ہیں، جب کہ ظاہر ہے کہ مولوی بے چارے کا قصور یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات سناتا ہے۔ ایسی صورت میں صرف نام کے مسلمان ہونے کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ کی آیات کے انکار، ان سے استکبار اور ان کو مذاق بنانے کے ساتھ مسلمانی کے دعوے پر اصرار قیامت کے دن ان کے کسی کام نہ آئے گا۔ افسوس! اس وقت یہ بیماری بری طرح امتِ مسلمہ میں پھیل چکی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، موبائل فون، انٹرنیٹ، غرض ہر ذریعے سے کفار اور ان کے نام نہاد مسلم گماشتوں نے اسے اس قدر پھیلا دیا ہے کہ کم ہی کوئی خوش نصیب اس سے بچا ہوگا۔ حالانکہ دین کے کمال و زوال کے علاوہ دنیوی عروج و زوال میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اقبال نے چند لفظوں میں اس کا نقشہ کھینچا ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے ‌ ‌ ‌ ‌ شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

کوئی شخص اگر حرام گانے بجانے کا عمل گناہ سمجھ کر کرے، اس پر نادم ہو تو پھر بھی معافی کی امید ہے، مگر جب کوئی قوم فنون لطیفہ یا روح کی غذا کا نام دے کر اسے حلال ہی کر لے، تو اس کے لیے اللہ کے عذاب کے کوڑے سے بچنا بہت ہی مشکل ہے۔ ابو عامر یا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَيَكُوْنَنَّ مِنْ أُمَّتِيْ أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۹﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کے لیے نعمت کے باغات ہیں ﴿۸﴾ ہمیشہ ان میں رہنے والے۔ اللہ کا وعدہ ہے سچا اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۹﴾

الْحِرَ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ ، وَلَيَنْزِلَنَّ أَقْوَامٌ إِلٰى جَنْبِ عَلَمٍ يَرُوْحُ عَلَيْهِمْ بِسَارِحَةٍ لَّهُمْ، يَأْتِيْهِمْ، يَعْنِي الْفَقِيْرَ، لِحَاجَةٍ فَيَقُوْلُوا ارْجِعْ إِلَيْنَا غَدًا فَيُبَيِّتُهُمُ اللّٰهُ وَيَضَعُ الْعَلَمَ ، وَيَمْسَخُ آخَرِيْنَ قِرَدَةً وَ خَنَازِيْرَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ›› [ بخاري، الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر...... : ۵۵۹۰ ] ”میری امت میں کئی لوگ ہوں گے جو شرم گاہ (زنا) اور ریشم اور شراب اور باجوں کو حلال کر لیں گے اور کئی لوگ ایک پہاڑ کے پہلو میں اتریں گے، ان کے چرواہے شام کو ان کے چرنے والے مویشی لایا کریں گے، ان کے پاس فقیر اپنی حاجت کے لیے آئے گا، وہ کہیں گے کل آنا۔ تو رات ہی کو اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب بھیجے گا اور وہ پہاڑ ان پر گرا دے گا اور کئی دوسروں کی شکلیں قیامت تک کے لیے بندروں اور خنزیروں کی شکل میں بدل دے گا۔“ ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ‹‹ لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِّنْ أُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا، يُعْزَفُ عَلٰى رُؤُوْسِهِمْ بِالْمَعَازِفِ وَالْمُغَنِّيَاتِ يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْأَرْضَ وَيَجْعَلُ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ ›› [ ابن ماجه، الفتن، باب العقوبات : ۴۰۲۰، و قال الألباني صحيح ] ”میری امت کے کچھ لوگ شراب پییں گے، اس کا نام اصل نام کے بجائے اور رکھ لیں گے، ان کے سامنے باجے بجائے جائیں گے اور گانے والیاں گائیں گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنا دے گا۔“

**آیت 8** **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......** : لہو الحدیث کے خریدار بدنصیبوں اور ان کی جزا کے ذکر کے بعد ایمان اور عمل صالح والے خوش نصیبوں کا ذکر فرمایا کہ ان کے لیے نعمت کے باغات ہیں، جن میں نعمت ہی نعمت ہو گی، کسی قسم کی زحمت یا تکلیف یا رنج و غم نہیں ہو گا، جب کہ دنیا کا کوئی باغ یا کوئی نعمت ایسی نہیں جس کے ساتھ کوئی زحمت یا رنج و غم نہ ہو۔

**آیت 8** ① **خٰلِدِيْنَ فِيْهَا** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ کہف (۱۰۷، ۱۰۸)۔

② **وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا** : جنت کے وعدے کی ضمانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا نام ذکر فرمایا کہ یہ کسی ایرے غیرے کا وعدہ نہیں، بلکہ ساری کائنات کے مالک اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو سب سے بڑا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ”**حَقًّا**“ کے ساتھ مزید یقین دلایا ہو کہ وعدہ بھی ایسا ہے جو بالکل سچا ہے، جس سے زیادہ سچا کوئی وعدہ ہو ہی نہیں سکتا۔

③ **وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ** : اس میں مزید یقین دہانی ہے کہ یہ وعدہ کرنے والا وہ ہے جو سب پر غالب ہے، کوئی قوت اسے وعدہ پورا کرنے سے روک نہیں سکتی اور وہ کمال حکمت والا ہے۔ اس نے یہ وعدہ اندھا دھند اور بے موقع نہیں فرمایا، بلکہ حکمت

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑩ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ⑪ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ

اس نے آسمانوں کو ستونوں کے بغیر پیدا کیا، جنھیں تم دیکھتے ہو اور زمین میں پہاڑ رکھ دیے، تاکہ وہ تمھیں ہلا نہ دے اور اس میں ہر طرح کے جانور پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس میں ہر طرح کی عمدہ قسم اگائی ⑩ یہ ہے اللہ کی مخلوق، تو تم مجھے دکھاؤ کہ ان لوگوں نے جو اس کے سوا ہیں کیا پیدا کیا ہے؟ بلکہ ظالم لوگ کھلی گمراہی میں ہیں ⑪ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی کہ اللہ کا شکر کر اور جو شکر کرے تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے

---

کے مطابق فرمایا ہے۔

**آیت 10** **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا**...... : اس میں اللہ تعالیٰ کی عزت و حکمت کی چند نشانیوں کا ذکر فرما کر اس کی توحید کو اجاگر فرمایا، جو قرآن مجید کا سب سے بڑا اور اصل موضوع ہے۔ "**بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا**" کی تفسیر سورۂ رعد (۲) میں اور "**اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ**" کی تفسیر سورۂ حجر (۱۹) اور سورۂ انبیاء (۳۱) میں دیکھیے۔

**آیت 11** **هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ**...... : یعنی یہ ستونوں کے بغیر بلند آسمان، زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ اور اس میں پھیلے ہوئے جانور، آسمان سے اترنے والا پانی اور اس کے ساتھ زمین سے پیدا ہونے والی ہر عمدہ اور نفیس قسم کی چیز، یہ سب کچھ تو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ اب مجھے دکھاؤ کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے سوا کسی اور نے پیدا فرمائی ہے؟ ظاہر ہے ایک بھی نہیں۔ تو پھر مشرکین اس کے سوا کسی اور کی عبادت کیوں کرتے ہیں، کیا ان کے پاس کوئی دلیل ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ مشرک ظالم ہیں اور ظالم بھی ایسے جو واضح گمراہی میں مبتلا ہیں، شرک کی ظلمت اور اندھیرے میں انھیں سیدھا راستہ سوجھتا ہی نہیں، اس لیے وہ اس راستے پر چل رہے ہیں جو واضح طور پر غلط اور گمراہی کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار اس بات کو اپنی توحید کی دلیل کے طور پر بیان فرمایا ہے کہ پیدا کرنے والا صرف وہ ہے، تو پھر عبادت کسی اور کی کیوں ہو؟ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱، ۲۲)، رعد (۱۶)، نحل (۱۷ تا ۲۱)، حج (۷۳، ۷۴)، فاطر (۴۰) اور احقاف (۴، ۵)۔

**آیت 12** ① **وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ** : تفاسیر میں لقمان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ملاحظہ فرمائیں، روح المعانی میں ہے: "وہب نے کہا، وہ ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ مقاتل نے کہا، ان کے خالہ زاد تھے۔ عبدالرحمٰن سہیلی نے کہا، وہ عنقا بن سرون کے بیٹے تھے۔ بعض نے کہا، وہ آزر کی اولاد سے تھے، ہزار برس زندہ رہے اور داؤد علیہ السلام کو پایا اور ان سے علم حاصل کیا۔

اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيۡدٌ ﴿۱۲﴾

اور جو ناشکری کرے تو یقیناً اللہ بہت بے پروا، بہت تعریفوں والا ہے ﴿۱۲﴾

ان کے مبعوث ہونے سے پہلے فتویٰ دیتے تھے، جب وہ مبعوث ہوئے تو فتویٰ دینا چھوڑ دیا۔ ان سے پوچھا گیا تو فرمانے لگے، جب مجھ سے کفایت کی گئی تو کیا میں اکتفا نہ کروں۔ بعض نے کہا، وہ بنی اسرائیل کے ایک قاضی تھے۔ یہ بات واقدی سے نقل کی گئی ہے، مگر انھوں نے کہا، ان کا زمانہ محمد ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تھا۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا، وہ نبی تھے۔ اکثر کا کہنا ہے کہ وہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں تھے، نبی نہیں تھے اور ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ آزاد تھے یا غلام۔ اکثر کا کہنا ہے کہ وہ غلام تھے۔ ایک اختلاف اور ہے، بعض نے کہا، حبشی تھے، یہ ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے اور ابن مردویہ نے یہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ مجاہد نے ان کے بارے میں بیان کیا کہ وہ موٹے ہونٹوں اور پاؤں کے سیدھے تلووں والے تھے۔ بعض نے کہا، وہ نُوبی تھے، پھٹے ہوئے پاؤں اور موٹے ہونٹوں والے تھے۔ یہ ابن عباس، ابن مسیّب اور مجاہد سے منقول ہے۔ ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا، میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے کہا، آپ کو لقمان کے بارے میں کیا خبر پہنچی ہے؟ انھوں نے فرمایا، وہ چھوٹے قد، چپٹی ناک والے نُوبی (حبشی) تھے۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن المنذر نے ابن المسیّب سے بیان کیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ لقمان مصر کے سیاہ فام لوگوں میں سے کالے رنگ والے اور بڑے ہونٹوں والے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں حکمت عطا کی، مگر نبوت نہیں دی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان کا پیشہ کیا تھا۔ چنانچہ خالد بن ربیع نے کہا، وہ نجار (راء کے ساتھ) یعنی ترکھان تھے اور معانی الزجاج میں ہے، وہ نجاد تھے (دال کے ساتھ، بروزن کتاب، جو بچھونے اور گدے وغیرہ بناتے اور سیتے ہیں)۔ ابن ابی شیبہ نے اور احمد نے ''الزہد'' میں اور ابن المنذر نے ابن المسیّب سے روایت کی ہے کہ وہ خیاط (کپڑے سینے والے) تھے، جو نجاد سے عام ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ چرواہے تھے۔ بعض نے کہا، وہ ہر روز اپنے مالک کے لیے ایندھن کا گٹھا لاتے تھے۔'' مفسر آلوسی صاحب روح المعانی یہ سب کچھ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: '' وَلَا وُثُوقَ لِيۡ بِشَيۡءٍ مِنۡ هٰذِهِ الۡأَخۡبَارِ وَ إِنَّمَا نَقَلۡتُهَا تَأَسِّيًا بِمَنۡ نَقَلَهَا مِنَ الۡمُفَسِّرِيۡنَ الۡأَخۡيَارِ غَيۡرَ أَنِّيۡ أَخۡتَارُ أَنَّهٗ كَانَ رَجُلًا صَالِحًا حَكِيۡمًا وَلَمۡ يَكُنۡ نَبِيًّا'' ''یعنی مجھے ان خبروں میں سے کسی پر کوئی اعتبار نہیں ہے، میں نے تو انھیں صرف اس لیے نقل کیا ہے کہ جید مفسرین نے انھیں نقل کیا ہے۔ میں تو صرف اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ وہ صالح اور حکیم (ودانا) آدمی تھے، نبی نہیں تھے۔''

میں نے بھی یہ سارا کلام یہ دکھانے کے لیے نقل کیا ہے کہ بعض مفسرین کس طرح بلاثبوت باتیں نقل کرتے جاتے ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کرتے کہ مجاہد، قتادہ، ابن المسیّب وغیرہ حضرات کا ہزاروں برس پہلے گزرے ہوئے لقمان کے ساتھ کوئی میل جول رہا ہے، یا انھوں نے ان تک کوئی سند بیان کی ہے۔ نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب روایت نقل کرتے ہوئے یہ اہتمام کرتے ہیں کہ ثابت شدہ روایت ہی نقل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلوم

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا، جب کہ وہ اسے نصیحت کر رہا تھا اے میرے چھوٹے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے ﴿۱۳﴾

---

نہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا اور جسے صاحب روح المعانی نے ترجیح دی ہے۔ ان کے غلام یا حبشی وغیرہ ہونے کی کوئی روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ البتہ نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی ان کی حکمت اور دانائی کے واقعات عرب میں مشہور تھے اور جاہلی شعراء اور خطباء اپنے کلام میں ان کا ذکر کرتے تھے، جیسا کہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔

❷ شرک کی تردید میں ایک پر زور عقلی دلیل پیش کرنے کے بعد اب عرب کے لوگوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ توحید کی بات صرف پیغمبروں ہی کے ذریعے سے نہیں آئی، بلکہ عقل و حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے اور پہلے عاقل اور دانا لوگ بھی یہی بات کہتے چلے آئے ہیں، چنانچہ تمھارا اپنا مشہور حکیم لقمان بھی اب سے بہت پہلے یہی کچھ کہہ گیا ہے۔

❸ **اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ** : تفسیر قاسمی میں ہے: ''قَالَ فِي الْبَصَائِرِ الشُّكْرُ مَبْنِيٌّ عَلٰى خَمْسَةِ قَوَاعِدَ، خُضُوْعُ الشَّاكِرِ لِلْمَشْكُوْرِ وَ حُبُّهُ لَهُ وَاعْتِرَافُهُ بِنِعْمَتِهِ وَالثَّنَاءُ عَلَيْهِ بِهَا وَ أَنْ لَا يَسْتَعْمِلَهَا فِيْمَا يَكْرَهُ، هٰذَا الْخَمْسَةُ هِيَ أَسَاسُ الشُّكْرِ وَبِنَاءُهُ عَلَيْهَا فَإِنْ عُدِمَ مِنْهَا وَاحِدَةٌ اخْتَلَّتْ قَاعِدَةٌ مِنْ قَوَاعِدِ الشُّكْرِ وَكُلُّ مَنْ تَكَلَّمَ فِي الشُّكْرِ فَإِنَّ كَلَامَهُ إِلَيْهَا يَرْجِعُ وَ عَلَيْهَا يَدُوْرُ'' ''البصائر میں فرمایا کہ شکر کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، شکر کرنے والے کا اس کے سامنے عاجز ہونا جس کا وہ شکر ادا کر رہا ہے، اس کے ساتھ محبت کرنا، اس کی نعمت کا اعتراف کرنا، اس پر اُس کی تعریف کرنا اور یہ کہ اس نعمت کو اس جگہ استعمال نہ کرے جہاں نعمت دینے والا پسند نہ کرتا ہو۔ یہ پانچوں چیزیں ہی شکر کی اساس ہیں اور انھی پر اس کی بنیاد ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک کم ہو تو شکر کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد کم ہو جائے گی۔ جس نے بھی شکر کے بارے میں گفتگو کی ہے اس کی گفتگو کا نتیجہ یہی ہے اور وہ اسی پر گھومتی ہے۔''

❹ **وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ابراہیم (۷) اور سورۂ نمل (۴۰)۔

❺ **وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ** : یعنی کسی کے کفر کا اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں، کیونکہ وہ بے نیاز ہے اور وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں، کوئی شکر کرے یا نہ کرے، کائنات کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ اس کی ذات محمود ہے اور تمام خوبیوں کا مالک وہی ہے، کسی میں کوئی خوبی ہے تو اس کی اپنی نہیں بلکہ اسی کی عطا کردہ ہے۔

**آیت 13** ❶ **وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ**...... : ''وَعَظَ'' کا معنی کسی چیز سے روکنا ہے، جس میں ترغیب کے ساتھ ڈرانا بھی ہو، جیسا کہ اللہ نے نوح علیہ السلام کو بیٹے کے لیے سفارش پر فرمایا: ﴿ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [ ھود : ٤٦ ] ''پس مجھ سے اس بات کا سوال نہ کر جس کا تجھے کچھ علم نہیں۔ بے شک میں تجھے اس سے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے ہو جائے۔'' اور جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْۤ

﴿ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًۢا بَلِيۡغًا ﴾ [ النساء : ٦٣ ] ”سوتو ان سے دھیان ہٹا لے اور انھیں نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں بہت اثر کرنے والی ہو۔“

❷ يٰبُنَيَّ: ”اِبۡنٌ“ اصل میں ”بَنَوٌ“ ہے، اس کی تصغیر ”بُنَيۡوٌ“ ہے۔ یائے متکلم کی طرف مضاف کرنے سے ”بُنَيۡوِيَ“ ہو گیا۔ واؤ کو یاء کرنے سے ”بُنَيۡيِيَ“ ہو گیا۔ پھر ایک یاء حذف کرنے اور ادغام سے ”بُنَيَّ“ ہو گیا۔ معنی اس کا ہے ”اے میرے چھوٹے بیٹے۔“ چھوٹے سے مراد پیارا ہے۔ بیٹے پر شفقت اور محبت کے اظہار کے لیے تصغیر اور یائے متکلم کی طرف مضاف کر کے مخاطب فرمایا۔

❸ اس سے معلوم ہوا کہ وعظ کرتے وقت مخاطب کو نہایت محبت اور شفقت بھرے الفاظ کے ساتھ خطاب کرنا چاہیے، جیسا کہ لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ”يٰبُنَيَّ“ کہہ کر اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو ”يٰۤاَبَتِ“ کہہ کر مخاطب فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کو ”يَا عَمِّ! قُلْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ“ کہہ کر وعظ فرمایا۔ بلکہ عام گفتگو میں بھی اس ادب کو ملحوظ رکھنا چاہیے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے والد کو ”يٰۤاَبَتِ اِنِّيۡ رَاَيۡتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوۡكَبًا“ اور والد نے انھیں ”يٰبُنَيَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡيَاكَ عَلٰۤى اِخۡوَتِكَ“ کے ساتھ مخاطب کیا۔

❹ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ: حکمت عطا ہونے کے بعد یہ پہلی نصیحت ہے جو لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کی اور یہی وہ اصل الاصول ہے جس کی وحی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر رسول کو فرمائی، فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِيۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴾ [ الأنبياء : ٢٥ ] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“ اس سے معلوم ہوا کہ ہر والد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی اولاد کو شرک سے بچانے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں وعظ کے ساتھ ان کے لیے اللہ سے دعا بھی شامل ہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا، تو ان کے نگاہوں سے اوجھل ہونے پر اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ﴿ وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِيۡ وَبَنِيَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ﴾ [ إبراهيم : ٣٥ ] ”اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔“

❺ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ: ”اِنَّ“ کا لفظ تعلیل کے لیے آتا ہے، یعنی اس کے ساتھ پہلی بات کی علت بیان کی جاتی ہے، فرمایا: ”اللہ کے ساتھ شرک مت کر، کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔“ ظلم کا معنی ہے ”وَضۡعُ الشَّيۡءِ فِيۡ غَيۡرِ مَحَلِّهٖ“ کسی چیز کو اس کی جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا، کسی کا حق دوسرے کو دے دینا۔ کیونکہ ظلم کا اصل معنی اندھیرا ہے اور اندھیرے میں آدمی کسی چیز کو اس کی اصل جگہ نہیں رکھ سکتا۔ موحد آدمی اپنی پوری زندگی توحید کی روشنی میں بصیرت کے ساتھ گزارتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِيۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيۡ ﴾ [ يوسف : ١٠٨ ] ”کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔“

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی ہے، اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری کی حالت میں اسے اٹھائے رکھا اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا ۔

جب کہ مشرک ساری عمر شرک کی ظلمتوں میں بھٹکتا رہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [ البقرۃ : ۱۷۱ ] ''بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ نہیں سمجھتے۔'' شرک بہت بڑا ظلم اس لیے ہے کہ اس سے بڑھ کر بے انصافی ہو نہیں سکتی کہ بے بس اور عاجز مخلوق کو خالق و مالک اور مختار رب تعالیٰ کے اختیارات کا مالک بنا دیا جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حق تلفی ہے اور آدمی کا اپنی جان پر بھی بہت بڑا ظلم کہ وہ اپنے آپ کو توحید کے بلند آسمان سے گرا کر شرک کی پستی میں گرا دے اور ہمیشہ کی نعمتوں والی جنت کے بجائے ابد الآباد جہنم کے عذاب کا سزاوار ٹھہرے۔ دیکھیے سورۂ حج (۳۱) اور مائدہ (۷۲) مزید دیکھیے سورۂ انعام کی آیت (۸۲): ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 14** ① **وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ** : اللہ عزوجل نے لقمان علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو وصیت ذکر فرمائی، جس میں انھوں نے اسے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کی تاکید فرمائی، تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے انسان کو ماں باپ کا حق ادا کرنے کی وصیت فرما دی، کیونکہ وہ دنیا میں اس کے آنے اور اس کی پرورش کا ذریعہ بنے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۲۳، ۲۴)، عنکبوت (۸) اور انعام (۱۵۱) یہاں ''وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ'' کے بعد اس وصیت کی تفسیر ''اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ'' کے ساتھ فرمائی ہے، یعنی ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق وصیت کی کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کر۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر ماں کا حق زیادہ ہونے کی طرف توجہ دلائی کہ اس نے باپ سے کہیں زیادہ بچے کی مشقت اٹھائی ہے۔ معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ (دادا بہز بن حکیم) بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَنْ أَبَرُّ )) ''یا رسول اللہ! میں کس کے ساتھ نیکی اور احسان وسلوک کروں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أُمَّكَ ثُمَّ أُمَّكَ ثُمَّ أُمَّكَ ثُمَّ أَبَاكَ ثُمَّ الْأَقْرَبَ فَالْأَقْرَبَ )) [ أبو داوٗد، الأدب، باب في بر الوالدين : ۵۱۳۹، و قال الألباني حسن صحیح ] ''اپنی ماں کے ساتھ، پھر اپنی ماں کے ساتھ، پھر اپنی ماں کے ساتھ، پھر اپنے باپ کے ساتھ، پھر اپنے سب سے قریب کے ساتھ، پھر اس کے بعد زیادہ قریب کے ساتھ۔'' بعض اہلِ علم نے اس تاکید کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ والدہ کی کمزوری اور طبعی نرمی اور شفقت کی وجہ سے اولاد اس کی پروا نہیں کرتی اور اس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرتی ہے، جب کہ باپ کی طبیعت کی وجہ سے اس کا خیال کرنا پڑتا ہے، لہٰذا تاکید کے لیے ماں کا ذکر تین دفعہ فرمایا۔ یہ مطلب نہیں کہ ماں کو تین روپے دو اور باپ کو ایک روپیہ، بلکہ اولاد کو دونوں ہی کا خیال رکھنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

② **حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ** : ''وَهْنًا'' کی ترکیب کئی طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ یہ ''اُمُّهٗ'' سے حال بمعنی اسم فاعل

اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾

میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ﴿۱۴﴾

ہے: ''أَيْ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ ذَاتَ وَهْنٍ عَلٰى وَهْنٍ'' یعنی اس کی ماں نے اسے اس حالت میں اٹھائے رکھا کہ وہ کمزوری پر کمزوری والی تھی۔ زمخشری نے فرمایا: ''**وَهْنًا**'' فعل محذوف ''تَهِنُ'' کا مفعول مطلق ہے، یعنی اس کی ماں نے اسے اس حال میں اٹھایا کہ وہ کمزور پر کمزور ہوتی جاتی تھی، دن بدن اس کا ضعف بڑھتا جاتا تھا، کیونکہ جیسے جیسے اس کا حمل بڑھتا، اس کا بوجھ اور ضعف بڑھتا جاتا تھا۔'' ایک صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے حرف جار ''باء'' محذوف ہے، جس کے حذف کرنے سے اس پر نصب آئی ہے۔ ''أَيْ حَمَلَتْهُ بِضُعْفٍ عَلٰى ضُعْفٍ'' یعنی اس نے اسے کمزوری پر کمزوری کے ساتھ اٹھائے رکھا۔

③ ''**وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ**'' (کمزوری پر کمزوری) میں دورانِ حمل دن بدن بڑھنے والی کمزوری کے بعد ''**وَ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ**'' (اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے) کے درمیان کمزوری اور مشقت کے کئی مرحلے ذکر نہیں فرمائے، کیونکہ وہ خود بخود سمجھ میں آ رہے ہیں۔ جن میں ولادت کا جاں گسل مرحلہ، پھر نفاس کی کمزوری، پھر دن رات بچے کی پرورش، نگہداشت، اسے دودھ پلانا اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا وغیرہ شامل ہیں۔

④ **وَ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ** : حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ''**وَ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ**'' (اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ہم معنی ہے: ﴿**وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ**﴾ [ البقرة : ۲۳۳ ] ''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے۔'' اسی سے ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ ائمہ نے استنباط فرمایا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿**وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا**﴾ [ الأحقاف : ۱۵ ] ''اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے ماں کی پرورش کا، اس کمزوری، تکان اور دن رات بیداری اور مشقت کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بچے کو اس کا احسان یاد دلائے جو اس نے اس پر کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا**﴾ [ بني إسرائيل : ۲۴ ] ''اور کہہ اے میرے رب! ان دونوں پر رحم کر جیسے انھوں نے چھوٹا ہونے کی حالت میں مجھے پالا۔''

⑤ زمخشری نے فرمایا: ''اگر تم کہو کہ دودھ چھڑانے کی مدت دو سال مقرر کرنے کا کیا مطلب ہے، تو میں کہوں گا کہ یہ مدت مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حد ہے جس سے تجاوز درست نہیں۔ دو سال سے کم میں دودھ چھڑانے کا معاملہ ماں کے اجتہاد پر موقوف ہے۔ اگر وہ سمجھے کہ وہ اس سے پہلے دودھ چھڑانا برداشت کر سکتا ہے تو وہ چھڑا سکتی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿**وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ**﴾ [ البقرة : ۲۳۳ ] ''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے۔''

وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا ۖ وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾

اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کوئی علم نہیں تو ان کا کہنا مت مان اور دنیا میں اچھے طریقے سے ان کے ساتھ رہ اور اس شخص کے راستے پر چل جو میری طرف رجوع کرتا ہے، پھر میری ہی طرف تمھیں لوٹ کر آنا ہے، تو میں تمھیں بتاؤں گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿۱۵﴾

6 اس آیت سے معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کی کامل مدت دو سال ہے۔ اس عرصے میں دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ثابت ہوگی، اس کے بعد نہیں۔ بعض لوگوں نے مدت رضاعت اڑھائی سال قرار دی ہے اور اسے احتیاط کا تقاضا قرار دیا ہے۔ مگر صریح آیت کے بعد کسی کو احتیاط یا کسی اور وجہ سے اس کی مخالفت کا کوئی اختیار نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ احقاف (۱۵)۔

7 **اِلَیَّ الۡمَصِيۡرُ** : ''اِلَیَّ'' کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے کسی اور کی طرف نہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ یہ نہیں بتایا کہ کس کا لوٹ کر آنا مراد ہے؟ جواب یہ ہے کہ اسے عام رکھا ہے، تاکہ اس میں سب لوگ شامل ہو جائیں۔ یعنی ہر ایک کو، جن میں تم بھی شامل ہو، میری ہی طرف واپس آنا ہے۔ اس میں از سر نو اللہ عزوجل اور والدین کے شکر کی وصیت ہے اور وعدہ بھی اور وعید بھی کہ اگر میرے متعلق اور اپنے والدین کے متعلق میری وصیت پر عمل کرو گے تو جزائے خیر پاؤ گے، ورنہ سزا کے لیے تیار رہو۔

**آیت 15** 1 **وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ** ...... : والدین کے ساتھ حُسن سلوک کی تاکید کے بعد اس میں سے ایک چیز کا استثنا فرمایا کہ اگر وہ تجھ پر اس بات کا زور دیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے، تو خواہ جتنا زور لگا لیں ان کی بات مت ماننا۔ سورۂ عنکبوت کی آٹھویں آیت میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں ''وَاِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِىۡ'' ہے اور یہاں ''عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ'' ہے۔ ''عَلٰۤى'' کے لفظ میں ''لام'' کی بہ نسبت زیادہ قوت پائی جاتی ہے، اس لیے تفسیر میں اس بات کی طرف ''خواہ جتنا زور لگا لیں'' کے الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں فتنے کا ذکر ہے، جو والدین کی طرف سے منت وسماجت اور نرمی سے بھی ہو سکتا ہے اور سختی سے بھی، بہلانے پھسلانے یا بے رخی کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور طاقت، قوت اور زبردستی کے ساتھ بھی۔ والدین کی طرف سے شرک پر آمادہ کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کے باوجود ان کی اطاعت نہ کرنے کا حکم دیا، خواہ معاملہ تلوار یا بندوق تک پہنچ جائے۔ معمولی کوششیں خود بخود اس کے ضمن میں آ گئیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کے بعد آدمی کے سب سے بڑے محسنوں کی بات ماننا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں جائز نہیں، تو پھر کسی اور کی کیا حیثیت ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے؟ خواہ کوئی رشتہ دار ہو یا دوست، پیر ہو یا فقیر، امام ہو یا حاکم، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا طَاعَةَ لِمَخۡلُوۡقٍ فِيۡ مَعۡصِيَةِ الۡخَالِقِ )) [ المعجم الكبير للطبراني : ۱۳/ ۶۰، ح : ۱۴۷۹۵ ] ''خالق کی نافرمانی کے معاملہ میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔'' مزید دیکھیے سورۂ عنکبوت (۸) کی تفسیر۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾

اے میرے چھوٹے بیٹے! بے شک کوئی چیز اگر رائی کے دانے کے وزن کی ہو، پس کسی چٹان میں ہو، یا آسمانوں میں، یا زمین میں تو اسے اللہ لے آئے گا، بلاشبہ اللہ بڑا باریک بین، پوری خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۶﴾

② وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا : ممکن تھا کہ کوئی شخص اس سے یہ سمجھ لیتا کہ والدین کے مشرک ہونے یا شرک پر آمادہ کرنے کی کوشش کی صورت میں ان سے سرے ہی سے قطع تعلق کر لینا چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ جب تک وہ زندہ ہیں، ان معاملات میں جو دین کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے، ان کے ساتھ اچھے طریقے کے ساتھ رہو۔ مثلاً ان کے کھانے پینے، پہننے، رہنے اور علاج وغیرہ کی ضروریات کا خیال رکھو، ان کے ساتھ نرمی اور محبت کے ساتھ بات کرو، ان کے غصے اور تلخی کو برداشت کرتے رہو۔ جب مشرک والدین کے متعلق یہ حکم ہے، تو مومن والدین کا حق کس قدر ہو گا!

③ وَ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ : اس جملے میں دوبارہ تاکید فرمائی کہ دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ معروف طریقے سے رہنے کی صورت میں اس بات کا خیال رکھو کہ تم میں مداہنت نہ پیدا ہو جائے کہ دینی معاملات میں بھی تم ان کے پیچھے چل پڑو۔ نہیں، چلنا انھی لوگوں کے راستے پر ہے جن کا رجوع میری طرف ہے اور جو صرف میری ہدایت اور رہنمائی پر چلتے ہیں۔ یہ راستہ صرف ان لوگوں کا ہے جو قرآن و حدیث پر چلتے ہیں، کیونکہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ یہی دو چیزیں ہیں۔ کسی ایسے شخص کی رائے یا قیاس پر چلنا، جس پر اللہ کی طرف سے وحی نہیں ہوتی "سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" پر چلنا نہیں، کیونکہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے اس کی طرف رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ غیر اللہ کی طرف ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ﴾ [ الأعراف : ۳ ] ''اس کے پیچھے چلو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے سوا اور دوستوں کے پیچھے مت چلو۔''

④ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ : ''میں تمھیں بتاؤں گا'' میں ڈانٹنے کا جو زور ہے وہ ''میں تمھیں جزا دوں گا'' میں نہیں۔

**آیت 16** ① یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ...... : لقمان علیہ السلام کی پہلی وصیت کے بعد دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے بارے میں وصیت فرمائی۔ اب دوبارہ لقمان علیہ السلام کی وصیتوں کا بیان شروع ہوتا ہے۔ پہلی وصیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا رد اور اس کی توحید کا بیان تھا، اس وصیت میں اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کے کمال کا بیان ہے۔

② اکثر مفسرین کے مطابق "اِنَّهَاۤ" میں ضمیر "ھا" نیکی اور بدی کے اس عمل کی طرف جا رہی ہے جس کا ذکر پچھلی آیت "بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" میں ہے : " أَيْ إِنَّ الْفِعْلَةَ الْحَسَنَةَ أَوِ السَّيِّئَةَ إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ "یعنی ''اچھا یا برا عمل اگر رائی کے ایک دانے کے برابر ہو گا......'' ابن عاشور نے فرمایا کہ "تَكُ" کا اسم مؤنث مقام کی دلالت کے مطابق مقدر مانا

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ

اے میرے چھوٹے بیٹے! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور اس (مصیبت) پر صبر کر جو تجھے

جائے گا: " أَيْ إِنْ تَكُ الْكَائِنَةُ " یعنی اگر ہونے والی کوئی بھی چیز رائی کے دانے کے برابر ہوگی۔ یہ عام ہے، جس میں نیکی اور بدی بھی شامل ہے۔

③ **مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ**: مراد چھوٹی سے چھوٹی چیز ہے، کیونکہ عرب اس کے لیے "مِثْقَالَ ذَرَّةٍ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یا "**مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ**" کا۔ "**مِثْقَالَ**" "ثَقُلَ" میں سے آلہ کا وزن ہے، بروزن "مِفْعَالٌ"۔

④ **فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ** : یہ بیان کسی بھی ایسی چیز کی مثال کے طور پر ہے جو زیادہ سے زیادہ مخفی ہو اور جس کا حصول زیادہ سے زیادہ مشکل ہو۔

⑤ **يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ** : اس میں اللہ تعالیٰ کے کمال علم اور قدرت کا بیان ہے کہ کوئی چیز کہیں بھی ہو، کتنی پوشیدہ سے پوشیدہ اور کتنی بعید سے بعید ہو، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے اور وہ اسے حاضر کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ جب چاہے گا اسے اپنے پاس لے آئے گا۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ کوئی عمل نیک ہو یا بد، جتنا بھی چھپ کر کیا جائے اور اس کا کرنے والا کہیں بھی چلا جائے، اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے کرنے والے کو اپنے پاس لے آئے گا اور اس کی جزا دے گا۔ (دیکھیے سورۂ انبیاء: ۴۷) جب اتنی مخفی اور عام رسائی سے باہر چیزوں کے متعلق اس کے علم و قدرت کا یہ عالم ہے، تو ان چیزوں کے بارے میں اس کے علم اور قدرت کا خود ہی اندازہ لگا لو جو اتنی مشکل اور دشوار نہیں ہیں۔ اس وصیت میں حدیثِ جبریل میں مذکور "احسان" کی تاکید ہے کہ آدمی ہر وقت یہ خیال رکھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ مجھ پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ اس سے انسان اللہ تعالیٰ کی معصیت سے بچ جاتا ہے۔

⑥ **اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ** : "لُطْفٌ" میں باریک بینی اور نرمی دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ ابن عاشور نے فرمایا: "اَللَّطِيْفُ مَنْ يَّعْلَمُ دَقَائِقَ الْأَشْيَاءِ وَيَسْلُكُ فِيْ إِيْصَالِهَا إِلٰى مَنْ تَصْلُحُ لَهُ مَسْلَكَ الرِّفْقِ" "لطیف وہ ہے جو نہایت باریک اشیاء کو جانتا ہو اور جن کے لائق وہ چیزیں ہیں ان تک انھیں پہنچانے میں نرمی کا طریقہ اختیار کرے۔" مثلاً اس کے لطیف ہونے کا اظہار اس کیڑے کے وجود سے ہوتا ہے جو کسی بہت بڑی چٹان کے اندر ہے، جس تک پہنچنے کا یا خوراک پہنچانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اب یہ اس لطیف و خبیر کا کام ہے کہ اس نے اسے وہاں کس طرح پیدا فرمایا، پھر ہر لمحے اس کی ہر ضرورت اسے پہنچائی، پھر جب چاہے چٹان کو توڑ کر یا توڑے بغیر اور اسے ذرہ بھر خراش پہنچائے بغیر جہاں چاہے لے آئے۔ جو رائی کے دانے کے برابر اشیاء کا اتنا علم اور ان پر اتنی دسترس رکھتا ہے، بڑی اشیاء کے متعلق اس کے علم و قدرت کا کیا حال ہوگا!؟ یہاں تک بنیادی صحیح عقیدے کا بیان مکمل ہو گیا۔

**آیت 17** ① **يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ**...... : لقمان علیہ السلام نے بنیادی عقائد کی وصیت کے بعد بیٹے کو بنیادی

مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾

پہنچے، یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے ﴿۱۷﴾

احکام کی وصیت فرمائی۔ جن میں سب سے اول اور سب سے اہم نماز کی اقامت ہے، جس میں اس کو وقت پر صحیح طریقے اور خشوع واطمینان کے ساتھ باجماعت ادا کرنا سب کچھ شامل ہے۔ دوسری چیز لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور تیسری چیز برائی سے منع کرنا ہے، کیونکہ سب لوگ دنیا میں آخرت کے سفر پر ہیں۔ اگر کوئی شخص ساتھیوں کا خیال نہیں رکھے گا اور انھیں ساتھ لے کر چلنے کی کوشش نہیں کرے گا تو وہ اسے بھی لے بیٹھیں گے اور وہ منزل پر پہنچنے سے محروم رہے گا۔ اسی طرح اس سفر میں سب لوگ ایک جہاز پر سوار ہیں، اگر اس میں سوراخ کرنے والوں کو روکا نہیں جائے گا تو جہاز کے ڈوبنے کے ساتھ سب ڈوب جائیں گے۔ واضح رہے کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا دو الگ الگ حکم ہیں اور دونوں پر عمل ضروری ہے۔ جس کا بلند ترین درجہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، جسے رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے کوہان کی چوٹی قرار دیا ہے۔

❷ اقامتِ صلاۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم میں ان تینوں کا علم حاصل کرنا خود بخود شامل ہے، کیونکہ یہ مسلّم قاعدہ ہے: ''مَا لَا یَتِمُّ الْوَاجِبُ إِلَّا بِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ'' ''جن چیزوں کے بغیر واجب پوری طرح ادا نہیں ہوتا وہ بھی واجب ہیں۔'' معروف ومنکر کے صحیح علم کے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوئے عین ممکن ہے کہ کوئی شخص کتاب وسنت اور معروف کی دعوت کے بجائے شرک و بدعت اور خرافات ومنکرات کی اشاعت کرتا پھرے، جیسا کہ آج کل بہت سے لوگوں کا یہی حال ہے۔ اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے دعوت کا اسلوب، اس کے لیے ضروری حکمت، موعظہ حسنہ، نرمی اور برداشت سیکھنا اور اختیار کرنا بھی لازم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ برائی کو روکنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری اور اس کے لیے مطلوب قوت، گھوڑے اور سواریاں تیار رکھنا بھی لازم ہے۔ غرض لقمان علیہ السلام کی اس نصیحت میں اگرچہ نمایاں طور پر نماز کا ذکر آیا ہے، کیونکہ ایمان کے بعد وہ سب سے اہم فریضہ ہے، مگر معروف اور منکر کے ضمن میں پورا اسلام، اس کا علم حاصل کرنا اور اسے آگے پہنچانا سب کچھ آ گیا ہے۔

❸ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ : اگرچہ معروف کے ضمن میں اس کا ذکر آ چکا ہے، تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے الگ بھی ذکر فرمایا۔ اس میں دو چیزیں شامل ہیں، پہلی یہ کہ اقامت صلاۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کی ادائیگی میں پیش آنے والی ہر مصیبت پر صبر کرنا۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص بھی یہ کام کرے گا اس پر مصیبتوں نے آنا ہی آنا ہے۔ جنّ وانس کے شیاطین ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے اور اسے ہر قسم کی اذیتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ سو اس پر لازم ہے کہ صبر سے کام لے۔ دوسری چیز یہ کہ دنیا کی زندگی آزمائشوں اور مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے، راحت اور آرام صرف جنت میں حاصل ہوگا۔ اس لیے مومن پر لازم ہے کہ اس قید خانے کی ہر تکلیف اور آزمائش پر صبر کرے اور اپنے رب کا شکوہ کرنے کے بجائے اس پر راضی رہے۔

وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۚ﴿۱۸﴾

اور لوگوں کے لیے اپنا رخسار ٹیڑھا نہ رکھ اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ کسی اکڑنے والے، فخر کرنے والے سے محبت نہیں کرتا ﴿۱۸﴾

④ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ : "عَزْمِ" مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہے: "أَيِ الْأُمُوْرُ الْمَعْزُوْمَةُ" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "عَزْمِ" کا معنی "واجب کرنا" ہے، یعنی یہ چاروں ایسے کاموں میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب اور فرض کیے گئے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے: (( إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخَصُهُ ، كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى عَزَائِمُهُ )) [ صحيح ابن حبان : ۳۵٤، عن ابن عباس رضي الله عنهما و صححه شعيب الأرنؤوط ] "اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے، جس طرح وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے فرائض پر عمل کیا جائے۔" اشرف الحواشی میں ہے: "دوسرا مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا یہ کام بڑے عزم و ہمت کا کام ہے، کم ہمت لوگوں کے بس میں نہیں کہ اس کی سختیاں جھیل سکیں۔ اس لیے اپنے اندر عزم و ہمت پیدا کر۔"

آیت 18 ① وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ : "صَعَرٌ" اونٹ کو لگنے والی ایک بیماری، جس سے وہ اپنی گردن ایک طرف پھیرے رکھتا ہے۔ اس سے باب "تفعیل" تکلف کے لیے ہے۔ یعنی تکلف سے ایک طرف منہ پھیرے رکھنا۔ یہ انداز حقارت کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عمرو بن حی تغلبی نے اپنے بعض بادشاہوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

وَ كُنَّا إِذَا الْجَبَّارُ صَعَّرَ خَدَّهُ أَقَمْنَا لَهُ مِنْ مَيْلِهِ فَتَقَوَّمَا

"اور ہم ایسے تھے کہ جب کسی جبار نے اپنا رخسار ٹیڑھا کیا، تو ہم نے اس کی ٹیڑھ سیدھی کر دی، سو تو بھی سیدھا ہو جا۔" [ فتقوّما امر کا صیغہ ہے (ابوعبید) اور آخر میں الف اشباع کے لیے ہے ]

② احکام کی وصیت کے بعد لقمان علیہ السلام نے چند آداب و اخلاق کی وصیت فرمائی، فرمایا لوگوں کے لیے اپنا رخسار ٹیڑھا نہ رکھ، یعنی انھیں حقیر سمجھ کر ایسا نہ کر جیسے متکبّر اور مغرور لوگ کرتے ہیں، بلکہ تواضع اور نرمی اختیار کر، جیسا کہ عقل مند لوگوں کا شیوہ ہے۔ تحقیر کے اس انداز سے منع کرنے میں زبان یا ہاتھ کے ساتھ کسی کی تحقیر سے منع کرنا بالاولیٰ شامل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ ﴾ [ بني إسرائيل : ۲۳ ] "ماں باپ کو "اُف" نہ کہو۔" مراد کسی بھی طرح تکلیف پہنچانے سے منع کرنا ہے۔

③ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا : یہاں ایک سوال ہے کہ چلا زمین ہی پر جاتا ہے، پھر خاص طور پر اس کا ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ تمام لوگوں کی طرح اس زمین سے تمھاری پیدائش ہے، اسی میں تم نے دفن ہونا ہے اور دوسرے تمام لوگ بھی اسی زمین پر چل رہے ہیں، پھر تمھارا دوسروں کو حقیر اور اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھنا اور اکڑ کر چلنا

وَ اقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴿۱۹﴾ ع۸/۱۱

اور اپنی چال میں میانہ روی رکھ اور اپنی آواز کچھ نیچی رکھ، بے شک سب آوازوں سے بری یقیناً گدھے کی آواز ہے ﴿۱۹﴾

تمھیں کس طرح زیب دیتا ہے؟ (واللہ اعلم) سورۂ بنی اسرائیل (۳۷) میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

④ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۳۶)۔

**آیت 19** ① وَ اقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ : اکڑ کر چلنے سے منع کیا تو ممکن تھا کہ اس پر عمل کرتے ہوئے کوئی انتہائی کمزور اور مریل چال اختیار کرتا، اس لیے چال میں میانہ روی کا حکم دیا، جس سے نہ تکبر کا اظہار ہوتا ہو نہ کمزوری کا۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان (۶۳)۔

② وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ : "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "اور اپنی آواز کچھ نیچی رکھ۔" اس سے معلوم ہوا کہ بلاضرورت اونچی آواز سے نہیں بولنا چاہیے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور چلا کر بولنے سے سننے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔ بولتے وقت اپنی آواز کسی قدر پست رکھنی چاہیے، نہ اتنی کہ سننے والے سن یا سمجھ ہی نہ سکیں۔

③ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ : یعنی بلاضرورت اونچی آواز سے بولنے اور چیخنے کی مثال گدھے کی آواز جیسی ہے اور تمام آوازوں سے بری آواز گدھے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے چیخنے چلانے کی آوازوں کو "**زَفِیْرٌ**" اور "**شَهِیْقٌ**" (گدھے کی آواز) کہا ہے۔ (دیکھیے ہود: ۱۰۶) کفار جب جہنم میں پھینکے جائیں گے تو اس کی خوف ناک آواز جو انھیں سنائی دے گی، اللہ تعالیٰ نے اسے بھی "**شَهِیْقًا**" فرمایا ہے۔ (دیکھیے ملک: ۷) اس سے گدھے کی آواز کا شدید مکروہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ رازی نے یہاں ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ ہر جانور جب بولتا ہے تو اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ تکان کی وجہ سے بول رہا ہے یا بوجھ سے یا خوف یا مار کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، صرف گدھا ایسا جانور ہے جو کسی ضرورت کی وجہ سے نہیں بولتا، وہ نہ بوجھ کی وجہ سے بولتا ہے نہ مارنے سے، حتیٰ کہ اگر اسے جان سے مار دیا جائے تو بھی نہیں بولتا اور بولتا ہے تو بلاضرورت ہی بولتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی آواز سب سے زیادہ بری لگنے کی ایک وجہ اس کی کرختگی اور شدت کے علاوہ یہ بھی ہے۔" (الکبیر) رسول اللہ ﷺ نے گدھے کے رینکنے کی وجہ اس کا شیطان کو دیکھنا بیان فرمایا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِذَا سَمِعْتُمْ صِيَاحَ الدِّيَكَةِ فَاسْأَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنَّهَا رَأَتْ مَلَكًا، وَ إِذَا سَمِعْتُمْ نَهِيْقَ الْحِمَارِ فَتَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ رَأَى شَيْطَانًا )) [ بخاري، بدء الخلق، باب خير مال المسلم غنم ...... : ۳۳۰۳ ] "جب تم مرغوں کے چیخنے کی آواز سنو تو اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو، کیونکہ انھوں نے کوئی فرشتہ دیکھا ہے اور جب تم گدھے کے رینکنے کی آواز سنو تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگو، کیونکہ اس نے کوئی شیطان دیکھا ہے۔" یہ مثال دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم گدھے کی مشابہت اختیار مت کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ، الَّذِيْ يَعُوْدُ فِيْ

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے تمھاری خاطر مسخر کر دیا اور تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کر دیں، اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم اور بغیر کسی ہدایت اور بغیر

---

هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِيْ قَيْئِهِ ﴾ [ بخاري، الهبة، باب لا يحل لأحد أن يرجع في هبته و صدقته : ۲۶۲۲، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] ''بری مثال ہمارے لیے نہیں ہے (ہمیں اس کا مصداق نہیں بننا چاہیے) وہ شخص جو اپنے ہبہ کو واپس لیتا ہے، وہ کتے کی طرح ہے، جو اپنی قے چاٹ لیتا ہے۔''

④ ''الْحَمِيْرِ'' ''حِمَارٌ'' کی جمع ہے۔ ابن عاشور لکھتے ہیں: ''قرآن مجید میں گدھے کے لیے جمع کا لفظ ''الْحَمِيْرِ'' آیا ہے، حالانکہ لفظ ''صَوْتُ'' مفرد ہے۔ ''حِمَارٌ'' کا لفظ نہیں فرمایا، کیونکہ جس جمع پر جنس کا الف لام آجائے وہ مفرد و جمع کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جمع پر جنس کا الف لام آجائے تو وہ اس سے جمع ہونے کا مفہوم ختم کر دیتا ہے۔ یہاں ''حِمَارٌ'' کے بجائے ''الْحَمِيْرِ'' کے لفظ کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے، کیونکہ ''الْحَمِيْرِ'' کا لفظ آیات کے فواصل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ اس سے پہلی اور بعد والی آیات کے فواصل کو دیکھنے سے ظاہر ہے، جو ''خَبِيْرٌ'' ، ''الْاُمُوْرِ'' ، ''فَخُوْرٍ'' ، ''مُّنِيْرٍ'' اور ''السَّعِيْرِ'' وغیرہ ہیں۔'' (التحریر والتنویر) ہمارے بھائی حافظ عبد اللہ رفیق صاحب (دار العلوم المحمدیہ لاہور) نے اس کی ایک اور دلچسپ توجیہ فرمائی ہے کہ گدھے اکٹھے مل کر رینکنا شروع کر دیں تو ماحول بہت زیادہ خراب ہو جاتا ہے۔ یہاں لقمان علیہ السلام کی وصیتیں ختم ہو گئیں، آگے پھر توحید کے دلائل اور مشرکین کو ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جس کے ساتھ سورت کی ابتدا ہوئی تھی۔

**آیت 20** ① **اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ** : ''**اَلَمْ تَرَوْا**'' کا معنی ''اَلَمْ تَعْلَمُوْا'' (کیا تم نے جانا) ہے، کیونکہ انسان نے آسمان و زمین کی ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے اپنی خاطر مسخر شدہ نہیں دیکھا، مگر اس کے لیے دیکھنے کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ یہ بات اتنی واضح ہے جیسے آنکھوں سے دیکھی ہوئی بات ہوتی ہے۔ (بقاعی) ''**سَخَّرَ لَكُمْ**'' میں لام انتفاع کا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''تمھاری خاطر مسخر کر دیا'' کیونکہ چند چیزیں اگر انسان کے کسی حد تک تابع فرمان ہیں، جیسے چوپائے وغیرہ کہ انسان ان سے جس طرح چاہے فائدہ اٹھا سکتا ہے، تو بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ انھیں انسان کی خاطر مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں پابند کر دیا ہے کہ وہ سب اس کے فائدے اور خدمت کے لیے کام کریں، جیسے سورج، چاند، ستارے بلکہ فرشتے بھی جو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ موذی جانور بھی آخر کار کسی نہ کسی طرح انسان کے فائدے کے لیے ہیں، حتیٰ کہ ابلیس بھی کہ وہ نہ ہوتا تو نہ آزمائش کا سلسلہ ہوتا، نہ اس میں کامیاب ہو کر انسان ہمیشہ کی جنت کا وارث بن سکتا۔ وہ لوگ اپنی حیثیت سے بہت بڑھ کر بولتے ہیں جو کہتے

مُّنِيۡرٍ ۝۲۰

کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتا ہے ۝۲۰

ہیں کہ آدمی سائنس کے ساتھ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ کائنات تو بہت دور کی بات ہے، یہ حضرات اپنے دل کی دھڑکن ہی کو مسخر کر کے دکھائیں، یا بچپن سے جوانی، پھر بڑھاپے کی منزلوں کو تابع فرمان بنا کر دکھائیں، چلیں موت ہی کو مسخر کر لیں۔ فرمایا: ﴿ كَبُرَتۡ كَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ؕ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا كَذِبًا ﴾ [ الکھف : ٥ ] ''(یہ بات) بولنے میں بڑی ہے، جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے، وہ سراسر جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔'' اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی دلیل ''خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا...... '' بیان فرمائی تھی، اب زمین و آسمان کی ہر چیز کو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کرنے کو اپنی توحید کی دلیل کے طور پر بیان فرمایا کہ سوچو! اس خلق یا تسخیر میں تمھارے کسی معبود کا ذرہ برابر بھی دخل ہے؟

② وَ اَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً : کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جن کا انسان اپنے حواس سے مشاہدہ کرتا ہے، یا وہ عقل سے معلوم ہوتی ہیں، یا اسے کسی کے بتانے سے معلوم ہوتی ہیں اور چھپی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو انسان کے جسم کے اندر یا باہر اس کے مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں، جن کا اسے شعور تک نہیں کہ اس کے پروردگار نے اس کے رزق، اس کی نشوونما اور حفاظت کے لیے کیا کچھ سامان فراہم کر رکھا ہے۔ مثلاً انسان کھانا کھا کر فارغ ہو جاتا ہے، اسے کچھ خبر نہیں کہ اس کے اندر کتنی مشینیں اسے ہضم کرنے، جزو بدن بنانے اور اس کے فضلے کو خارج کرنے کے لیے پوری مستعدی کے ساتھ مصروف عمل ہو جاتی ہیں۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں جیسے جیسے تحقیق آگے بڑھتی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں انسان کے سامنے بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ تو ہوئیں دنیوی اور مادی نعمتیں، دینی اور روحانی نعمتیں جو ظاہر اور پوشیدہ ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں اور ان سے کہیں زیادہ ہیں، جیسا کہ اسلام، قرآن، نبی کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت وغیرہ۔ رازی نے ''ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً'' کی ایک سادہ سی پُر لطف توجیہ کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''ظاہری نعمتوں سے مراد اعضائے انسانی کا سلامت ہونا ہے اور باطنی نعمتوں سے مراد وہ قوتیں ہیں جو ان اعضا میں ودیعت کی گئی ہیں۔ دیکھیے آنکھ، کان، ناک اور زبان سب چربی، گوشت، ہڈی اور پٹھوں سے بنے ہیں، جو صاف نظر آتے ہیں، مگر ان میں دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور بولنے کی قوتیں باطنی نعمتیں ہیں۔ بعض اوقات باطنی نعمت مثلاً بینائی، شنوائی ختم ہو جاتی ہے، جب کہ ظاہری عضو، مثلاً آنکھ یا کان سلامت رہتا ہے۔ یہی حال ہر عضو کا ہے۔''

③ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ...... : یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو خلق، تسخیر اور دوسری بے شمار ظاہری و باطنی نعمتوں کے دلائل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ثابت ہو چکنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات میں جھگڑتے اور بحثیں کرتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ موجود بھی ہے یا نہیں؟ اور ہے تو ایک ہے یا اس کے ساتھ دوسرے بھی خدائی میں شریک ہیں؟ اور اس کی صفات کیا ہیں؟

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۲۱ وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۲۲

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، اور کیا اگرچہ شیطان انھیں بھڑکتی آگ کے عذاب کی طرف بلاتا رہا ہو؟ ۲۱ اور جو شخص اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کر دے اور وہ نیکی کرنے والا ہو تو یقیناً اس نے مضبوط کڑے کو اچھی طرح پکڑ لیا اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کی طرف ہے ۲۲

④ **بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ**: علم حاصل کرنے کے تین مراتب ہیں، پہلا اپنی جدوجہد اور غور وفکر سے معلوم کرنا، دوسرا کسی علم والے سے رہنمائی حاصل کر لینا اور تیسرا کسی درست کتاب کے مطالعہ سے علم حاصل کر لینا۔ مشرکین کا حال یہ ہے کہ نہ ان کے پاس خود کوئی علم یا سمجھ بوجھ ہے جس کی بنا پر وہ حقیقت کو سمجھ سکیں، نہ انھیں کسی سچے راہ نما کی راہ نمائی حاصل ہے اور نہ ان کے پاس خود اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کوئی کتاب موجود ہے جس سے انھوں نے یہ عقیدہ اخذ کیا ہو۔ بلکہ علم کے تینوں ذرائع سے محرومی کے بعد ان کی کل کائنات تقلید آباء ہے اور وہ اندھا دھند ان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔

⑤ حافظ صاحبان یاد رکھیں کہ "**اَلَمْ تَرَوْا**" قرآن مجید میں صرف دو جگہ آیا ہے، ایک اس آیت میں اور دوسرا سورۂ نوح میں: ﴿**اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا**﴾ [ نوح : ۱۵ ] ان کے علاوہ ہر جگہ واحد کے صیغے کے ساتھ "**اَلَمْ تَرَ**" ہی آیا ہے۔

**آیت 21** ① **وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ**......: یعنی کتاب اللہ اور پیغمبر ﷺ کی ہدایت کے مقابلے میں اپنے جاہل اسلاف کو پیش کرتے ہیں، پھر اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے؟ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۰)۔

② **اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ**: یعنی کیا اگر شیطان انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف دعوت دے رہا ہو تب بھی یہ ان کے ساتھ دوزخ کی آگ میں جا کودیں گے اور یہ سوچنے کی زحمت ہی نہ کریں گے کہ وہ انھیں کدھر لے جا رہا ہے؟

**آیت 22** ① **وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ**......: اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی علم، ہدایت یا کتاب منیر کے بغیر جھگڑتے ہیں۔ اب ان کے مقابلے میں اس شخص کا ذکر ہے جو اپنے چہرے یعنی اپنے آپ کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کے سپرد اور اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اپنا ہر عمل صرف اس کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ جو وہ کہے کرتا ہے، جس سے روک دے رک جاتا ہے۔ نہ اپنی خواہش پر چلتا ہے نہ کسی دوست یا رشتہ دار کے پیچھے چلتا ہے اور نہ آبا و اجداد میں سے

وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۲۳

اور جس نے کفر کیا تو اس کا کفر تجھے غم میں نہ ڈالے، ہماری ہی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے، پھر ہم انھیں بتائیں گے جو کچھ انھوں نے کیا۔ بے شک اللہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے ۝۲۳

---

کسی کی راہ و رسم اختیار کرتا ہے۔ اس کی نماز، قربانی، زندگی اور موت سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ الأنعام : ١٦٢ ] ''کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔'' آیت میں چہرے کو اللہ کے حوالے کرنے کا ذکر ہے، مراد پورے وجود کو اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ کیونکہ چہرہ جسم کا سب سے باشرف حصہ ہے، اس کے تابع ہونے سے پورا وجود تابع ہو جاتا ہے۔

2 وَ هُوَ مُحْسِنٌ : اور وہ اپنا ہر عمل اس طرح کرتا ہے گویا وہ اپنے رب کو دیکھ رہا ہے۔ سو اگر وہ اسے نہیں دیکھتا تو اس کا رب اسے دیکھ رہا ہے اور وہ ہر عمل میں اللہ کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتا ہے۔

3 فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى : "أَمْسَكَ يُمْسِكُ إِمْسَاكًا" تھامنا، پکڑنا۔ "اسْتَمْسَكَ" میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے مبالغہ ہے، یعنی ''اچھی طرح پکڑ لیا۔'' "اَلْعُرْوَةُ" کڑا یا حلقہ یا رسی کا کنارا جسے لٹکتے ہوئے گرنے سے بچنے کے لیے پکڑ لیا جائے اور "الْوُثْقٰى" "أَوْثَقُ" کا مؤنث ہے ''سب سے مضبوط۔'' یعنی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینے والا یہ وہ شخص ہے جس نے اسلام کی رسی کے مضبوط حلقے کو اچھی طرح تھام لیا ہے۔ اسے بلندی سے پستی میں یا جہنم میں گرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اسی حلقے کو تھامے ہوئے آخر کار وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے گا اور اس کی جنت کا وارث بن جائے گا۔ بخلاف ان لوگوں کے جو کسی علم، ہدایت یا کتاب منیر کے بغیر جھگڑتے ہیں کہ انھوں نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک گرنے والے کھوکھلے تودے کے کنارے پر رکھی ہے، جو انھیں لے کر جہنم کی آگ میں گرنے والا ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۰۹)۔

4 وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ : "اِلَى اللّٰهِ" کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا کہ تمام کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے، کسی اور کی طرف نہیں، وہی ہر کام کی جزا دے گا۔

آیت 23 1 وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ...... : اس میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد اسلام کے ہر داعی کو تسلی دی ہے کہ جو شخص ہماری دعوت اور پیغام پہنچنے کے باوجود کفر پر اصرار کرتا ہے، آپ اس کے کفر کی وجہ سے غم زدہ نہ ہوں، آپ کا کام پیغام پہنچانا تھا، وہ آپ نے پہنچا دیا، اب انھوں نے ہمارے پاس واپس آنا ہے تو ہم انھیں وہ سب کچھ بتائیں گے جو انھوں نے کیا۔ اس میں کفار کے لیے زبردست وعید ہے۔

2 اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ : کفار کا کفر کچھ علانیہ تھا کچھ دلوں میں پوشیدہ تھا، فرمایا، اللہ تعالیٰ کو سینوں کی بات کا

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿۲۴﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۵﴾

ہم انھیں تھوڑا سا سامان دیں گے، پھر انھیں ایک بہت سخت عذاب کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے ﴿۲۴﴾ اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۲۵﴾

---

پوری طرح علم ہے، وہ ان کی بھی جزا دے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اسلام کا اظہار کرتا ہے مگر دل میں کفر رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا بھی خوب علم ہے، وہ خود ہی اس سے نمٹ لے گا۔

**آیت 24** **نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ** : یہ سامعین کے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال کا جواب ہے کہ اس قدر کفر کے باوجود ان پر عذاب جلدی کیوں نہیں آ جاتا؟ فرمایا، ہم انھیں دنیا میں تھوڑا سا برتنے کا سامان دیں گے، پھر انھیں مجبور اور بے بس کر کے ایک بہت سخت عذاب کی طرف لے جائیں گے، تو وہ کسی طرح ہماری گرفت سے نکل کر بھاگ نہیں سکیں گے۔ "**غَلِيظٍ**" اصل میں بھاری اور ضخامت والے جسم کو کہتے ہیں، گویا وہ عذاب ان پر ایک ضخیم (لمبے چوڑے اور بھاری) جسم کی طرح آ گرے گا، جس کے بوجھ کے نیچے وہ ایسے دبے ہوں گے کہ کسی طرف نکل نہیں سکیں گے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۹، ۷۰)۔

**آیت 25** ① **وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ**...... : اس سے پہلے مشرکین کے اللہ تعالیٰ کے متعلق مجادلہ کا ذکر فرمایا، اب ان کے مسکت جواب کا ذکر ہے کہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اب اس اقرار کے بعد ان کے پاس جھگڑنے کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ "اَلْمَرْءُ يُؤْخَذُ بِإِقْرَارِهِ" "آدمی اپنے اقرار کے ساتھ پکڑا جاتا ہے۔"

② **قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ** : آپ فرمائیں کہ جب تم نے مان لیا کہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، جس میں تمھارے بنائے معبود بھی شامل ہیں، تو تمام حمد اور ہر خوبی کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ٹھہرا، پھر تم ہر خوبی کے مالک کو چھوڑ کر اس کی عبادت کیوں کرتے ہو جس میں اپنی کوئی خوبی ہے ہی نہیں؟

③ **بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ** : بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، یا جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کا مطلب اور نتیجہ کیا ہے، مثلاً جب انھوں نے اعتراف کر لیا کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، تو پھر انھیں لازماً ماننا ہوگا کہ مالک بھی وہی ہے، رب بھی وہی ہے، حاکم اور شارع بھی وہی ہے، عبادت اور بندگی کا حق دار بھی وہی ہے، دعا اور فریاد بھی اسی سے کرنی چاہیے۔ یہ علم و عقل سے کتنی بعید بات اور کتنا بڑا تناقض ہے کہ خالق تو کوئی اور ہو اور معبود اس کی مخلوق میں سے کسی کو بنا لیا جائے۔

④ یہ جو فرمایا کہ "ان کے اکثر نہیں جانتے" تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین میں سے کچھ ایسے بھی تھے اور ہوتے ہیں کہ بات

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾ وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾

اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، بے شک اللہ ہی سب سے بے پروا، بے حد خوبیوں والا ہے ﴿۲۶﴾ اور اگر ایسا ہو کہ زمین میں جو بھی درخت ہیں قلمیں ہوں اور سمندر اس کی سیاہی ہو، جس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی، یقیناً اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۷﴾

واضح ہونے پر سمجھ لیتے اور مان جاتے ہیں۔ ان کا ذکر آگے " **فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ** " میں آ رہا ہے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو جانتے ہیں مگر ضد اور عناد کی وجہ سے مانتے نہیں۔

**آیت 26** **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ**...... : یہ پہلی آیت ہی کا نتیجہ ہے کہ جب آسمانوں کا اور زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو ظاہر ہے کہ ان کا مالک بھی وہی ہے، اور جب مالک وہ ہے تو ثابت ہوا کہ چیز اپنے وجود اور بقا میں اس کی محتاج ہے اور وہ سب سے غنی ہے، کسی کا محتاج نہیں اور ہر حمد کا مالک ہے۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۲)۔

**آیت 27** ① **وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ**...... : " **كَلِمٰتُ** " "كَلِمَةٌ" کی جمع ہے، جس کا معنی کلام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا** ﴾ [ المؤمنون : ۱۰۰ ] "یہ تو ایک بات ہے جسے وہ کہنے والا ہے۔" مراد اللہ تعالیٰ کے دوسرے کلام کے ساتھ ساتھ کلمہ "کُنْ" بھی ہے۔ یہ اس خیال کا رد ہے جو ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا مالک ہے اور وہ غنی ہے، مگر یہ سب کچھ ختم بھی تو ہو سکتا ہے اور جو غنی ہے وہ محتاج بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس خیال کے رد میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں کبھی کمی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ کبھی محتاج ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کلمہ "کُنْ" کہنے سے ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ جو بات چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ جس طرح اس کی ذات کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اسی طرح اس کے کلمات کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا اور نہ ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ پھر جو مالک ایک کلمہ "کُنْ" کہنے سے سارے عالم کو فنا کر سکتا ہے اور ایک "کُنْ" کہہ کر اس جیسے بلکہ اس سے کہیں بڑے اور اعلیٰ کروڑوں جہان پیدا کر سکتا ہے اور جس کے کلمات کی کوئی انتہا نہیں اور نہ وہ کبھی ختم ہو سکتے ہیں، ایسے مالک کے ملک کو کبھی زوال ہو سکتا ہے؟ یا وہ کبھی محتاج ہو سکتا ہے؟ نہیں، وہ ہمیشہ سے غنی و حمید ہے اور عزیز و حکیم ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

② مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ اپنی عظمت، کبریائی، جلال، اپنے اسماء و صفاتِ حسنیٰ اور اپنے کامل کلمات کے متعلق بتاتے ہوئے فرماتے ہیں، جن کا نہ کوئی احاطہ کر سکتا ہے اور نہ کسی بشر کو ان کی حقیقت اور شمار کا علم ہے، جیسا کہ سید البشر اور خاتم الرسل ﷺ نے فرمایا: (( لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ )) [ مسلم، الصلاة، باب ما يقال

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

نہیں ہے تمھارا پیدا کرنا اور نہ تمھارا اٹھانا مگر ایک جان کی طرح۔ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۲۸﴾

في الركوع و السجود؟ : ٤٨٦ ] ''میں تیری ثنا کا شمار نہیں کر سکتا، تو اسی طرح ہے جیسے تو نے خود اپنی ثنا کی ہے۔'' چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ ...... ﴾ یعنی اگر زمین کے تمام درخت قلم بنا دیے جائیں اور سمندر کو سیاہی بنا دیا جائے اور اس کے ساتھ سات سمندر مزید بڑھا دیے جائیں اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھے جائیں، جو اس کی عظمت، جلال اور اس کی صفات پر دلالت کرتے ہیں، تو قلم ٹوٹ جائیں گے، سمندروں کا پانی ختم ہو جائے گا، خواہ ان جیسے جتنے بھی اور لے آئیں۔ ''سات سمندروں'' کا ذکر صرف مبالغہ کے لیے ہے، اس سے حصر مراد نہیں، نہ ہی یہ بات ہے کہ کوئی سات سمندر موجود ہیں جو عالم کو گھیرے ہوئے ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے جو اسرائیلیات بیان کرتے ہیں، جن کی تصدیق یا تکذیب نہیں ہو سکتی، بلکہ حقیقت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں بیان فرمایا: ﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴾ [ الكهف : ۱۰۹ ] ''کہہ دے اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے برابر اور سیاہی لے آئیں۔'' چنانچہ اس کی مثل سے مراد اس جیسا ایک اور سمندر نہیں بلکہ اس جیسا، پھر اس جیسا، پھر اس جیسا، اس طرح آگے بڑھاتے جاؤ۔ جتنے بھی سمندر لے آئیں اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے کلمات کا شمار نہیں ہو سکتا۔ حسن بصری نے فرمایا: ''اگر زمین کے تمام درخت قلم بنا دیے جائیں اور سمندر سیاہی ہو جائے اور اللہ تعالیٰ فرمائے کہ ''میرا یہ حکم ہے اور میرا یہ حکم ہے'' تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا اور قلم ٹوٹ جائیں گے۔'' (ابن کثیر)

③ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب اور زبردست ہے، وہ جو ارادہ کرے کوئی نہ اسے روک سکتا ہے، نہ اس سے باز پرس کر سکتا ہے، اور وہ کمال حکمت والا ہے، اس کا غلبہ اندھے کی لاٹھی نہیں، بلکہ اس کا ہر کام سراسر حکمت پر مبنی ہے۔

**آیت 28** ① مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ : اللہ تعالیٰ کے کمال علم و قدرت کے بیان کے بعد کفار کی اس بات کی تردید فرمائی کہ ہم دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے؟ چنانچہ فرمایا، تم سب کو پیدا کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ایک شخص کے پیدا کرنے اور زندہ کرنے کی طرح ہی ہے، کیونکہ وہ تمام چیزوں کو کلمہ ''کُنْ'' سے موجود کر دیتا ہے، پھر تمھیں دوبارہ زندہ کر دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟ دیکھیے سورۂ یٰس (۲۲ اور ۷۹)۔

② اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ : ان دو صفات کی مناسبت یہاں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اربوں انسانوں کی پکار بیک وقت سن لیتا ہے۔ ایک انسان کی دعا سننا اسے دوسرے کی دعا سننے سے غافل یا قاصر نہیں بنا سکتا۔ اس کے لیے ایک انسان کی ایک وقت میں دعا سننا اور اربوں انسانوں کی اسی وقت دعا سننا برابر ہے۔ پھر اس کی مخلوق صرف انسان ہی نہیں بلکہ لاکھوں انواع میں اور اربوں

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؗ كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے، ہر ایک ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے اور یہ کہ اللہ اس سے جو تم کرتے ہو پورا باخبر ہے ﴿۲۹﴾

کھربوں کی تعداد میں ہے، وہ ان سب کی دعا اور فریاد سنتا ہے اور ایک چیونٹی کی بھی فریاد اسی طرح سنتا ہے جیسے ایک انسان کی۔ پھر معاملہ سننے تک محدود نہیں بلکہ سننے کے ساتھ وہ اپنی ساری مخلوق کو دیکھ بھی رہا ہے۔ ان کے ظاہری اور باطنی حالات سے واقف بھی ہے، انھیں رزق بھی پہنچا رہا ہے اور ان کی جملہ ضروریات بھی پوری کر رہا ہے۔ یہی حال اس کی تخلیق کا ہے، اس کا ایک انسان کو پیدا کرنا بھی ایسے ہی ہے جیسے سب انسانوں کو پیدا کرنا۔ وہ ایک ہی وقت میں لاکھوں انسانوں اور اربوں دوسری مخلوق کو اس وقت بھی پیدا کر رہا ہے اور مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ تمام انسانوں کو ایسے ہی ایک وقت میں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کے لیے ایک انسان کے دوبارہ پیدا کرنے اور سب انسانوں کے دوبارہ پیدا کرنے میں کوئی فرق نہیں۔ (کیلانی)

**آیت 29** ① **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ** …… : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۷) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تمام انسانوں کو پیدا کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے ایک جان کو پیدا کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ جب دن بڑھنے لگتے ہیں تو ہر روز رات کا ایک حصہ دن میں شامل ہو جاتا ہے، پھر سردیوں کی آمد کے ساتھ دن کا وہی حصہ رات میں شامل ہوتا جاتا ہے۔ دن کو رات اور رات کو دن کا حصہ بنا دینے والے کے لیے تمھاری موت کے بعد حیات بالکل معمولی بات ہے۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رات کی تاریکی کو دن کی روشنی پر اور دن کی روشنی کو رات کی تاریکی پر لے آتا ہے۔

② **وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؗ كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى**: حافظ صاحبان توجہ فرمائیں کہ پورے قرآن مجید میں "**كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى**" اسی مقام پر ہے۔ دوسرے تمام مقامات پر "**كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى**" ہے۔ یہ دوبارہ زندگی کے ممکن ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ یعنی انسان سے کہیں بڑی مخلوق سورج اور چاند کا اس طرح مسخر ہونا کہ مدت ہائے دراز سے اسی طرح چل رہے ہیں اور اس وقت تک چلتے رہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ "**اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى**" (ایک مقرر وقت تک) کے لفظ میں کئی چیزیں شامل ہیں، پہلی یہ کہ رات دن کی روزانہ کی گردش میں یہ دونوں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک چلتے ہیں، پھر اسی سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا روزانہ کا یہ سفر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف رہٹ کی طرح جاری رہتا ہے۔ دوسری یہ کہ طلوع و غروب کے وقت کے لحاظ سے چاند ایک ماہ میں اپنا سفر پورا کر کے اسی وقت طلوع ہوتا ہے جس وقت وہ پچھلے ماہ طلوع ہوا تھا اور سورج سال کے بعد عین اسی وقت طلوع ہوتا ہے جس

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾

یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور یہ کہ اس کے سوا وہ جس کو پکارتے ہیں وہی باطل ہے اور یہ کہ اللہ ہی بے حد بلند، بے حد بڑا ہے ﴿۳۰﴾

وقت وہ پچھلے سال طلوع ہوا تھا۔ تیسری یہ کہ سورج اور چاند اس وقت تک چل رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی گردش ختم ہونے کے لیے مقرر فرمایا ہے اور وہ قیامت کا دن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۞ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ﴾ [ التکویر : ۱، ۲ ] ''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔'' آیات کے سیاق کے لحاظ سے یہ معنی یہاں زیادہ مناسب ہے، اس لیے اکثر مفسرین نے یہاں ''اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى'' سے قیامت کا دن ہی مراد لیا ہے۔

③ یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس مقام پر ''اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جب کہ دوسرے مقامات پر ''لِاَجَلٍ مُّسَمًّى'' استعمال فرمایا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ سلیمان الجمل نے فرمایا: ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ''اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى'' فرمایا ہے، جب کہ سورۂ فاطر اور سورۂ زمر (اور رعد) میں ''لِاَجَلٍ مُّسَمًّى'' فرمایا ہے۔ کیونکہ یہاں یہ لفظ دو ایسی آیات کے درمیان آیا ہے جن میں اس انتہا کا ذکر ہے جب مخلوق ختم ہو گی، چنانچہ اس سے پہلے ''مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ'' ہے اور بعد میں ''اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَ اخْشَوْا يَوْمًا'' ہے، دونوں آیات کائنات کے اس نظام کے خاتمے پر دلالت کر رہی ہیں اور سورۂ فاطر اور زمر میں یہ بات نہیں، کیونکہ سورۂ فاطر میں نہ خلق کی ابتدا کا ذکر ہے نہ انتہا کا اور سورۂ زمر میں ابتدا کا ذکر ہے انتہا کا نہیں، اس لیے وہاں ''لام'' کا لفظ استعمال فرمایا کہ سورج اور چاند جس طرح چلتے دکھائی دے رہے ہیں یہ ایک مقرر وقت پر پہنچنے کے لیے چل رہے ہیں۔''

④ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ : اس کا عطف ''اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ'' پر ہے۔ ''اَلَمْ تَرَ'' کا معنی تھا ''کیا تم نے نہیں جانا؟'' یعنی تم یقیناً جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور...... یہ بھی جانتے ہو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

**آیت 30** ① ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ : یعنی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اس لیے بیان فرمایا ہے کہ تم جان لو کہ وہی حق ہے جو حقیقی فاعل و مختار ہے، کیونکہ وہ ازلی و ابدی ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اپنے وجود میں وہ کسی کا محتاج نہیں۔

② وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ : اور اس کے سوا مشرک جس کی بھی عبادت کرتے ہیں سب باطل ہیں، ان کا کہیں وجود ہی نہیں۔ یہاں نہ کوئی لات ہے، نہ منات، نہ داتا، نہ دستگیر، نہ گنج بخش، نہ غریب نواز۔ سب ان مشرکوں کے خیال اور وہم کی تخلیق ہیں اور انھوں نے اپنے پاس سے فرض کر لیا ہے کہ فلاں صاحب خدائی میں کوئی دخل رکھتے ہیں اور انھیں مشکل کشائی اور حاجت روائی کے اختیارات حاصل ہیں، حالانکہ فی الواقع ان میں سے کوئی بھی نہ خدائی اختیارات کا مالک ہے،

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمۡ مِّنۡ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ﴿۳۱﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر میں اللہ کی نعمت سے چلتی ہیں، تاکہ وہ تمھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ بے شک اس میں ہر بڑے صابر، بڑے شاکر کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۳۱﴾

نہ کسی کو پکارنا اور اس سے فریاد کرنا حق ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۶) اور سورۂ نجم (۱۹ تا ۲۳)۔

③ ان آیات میں دہریوں کا بھی رد ہے جو اس کائنات کو ازلی اور ابدی سمجھتے ہیں اور مشرکوں کا بھی جو فانی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں۔

④ **وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡكَبِیۡرُ**: یعنی کائنات کی ہر چیز سے اس کی شان بلند ہے اور بڑائی میں بھی وہ کائنات کی ہر چیز سے بڑا ہے۔ ان دونوں صفات کا مجموعہ "**ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ**" میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ایک واضح اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ بلندی اور بڑائی جب اللہ ہی کی شان ہے تو اس کے مقابلے میں ساری مخلوق پست، عاجز اور حقیر ہے، جس کے مفہوم کو لفظ ''عبد'' ادا کرتا ہے، فرمایا: ﴿ اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا﴾ [ مریم : ۹۳ ] ''آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔'' اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ اس علی و کبیر کے اختیارات اس کی پیدا کردہ ہستیوں کے لیے سمجھ لیے جائیں جو اس کے عباد اور اس کے سامنے بالکل پست، عاجز اور حقیر ہیں!؟

**آیت 31** ① **اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ......** : اس سے پہلے اللہ نے "**اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ**" میں اور "**اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّهَارِ ......**" میں اپنی بعض نعمتوں کی طرف توجہ دلائی، اب "**اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ**" میں سمندر میں چلنے والے جہازوں کی نعمت کی طرف متوجہ فرمایا۔ یعنی کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کشتیاں اور بحری جہاز سمندر میں محض اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کے احسان کی بدولت چل رہے ہیں؟ کیونکہ اگر اس کا احسان نہ ہوتو پانی جو ایک سوئی نہیں اٹھاتا بلکہ غرق کر دیتا ہے، پہاڑوں جیسے لمبے چوڑے اور اونچے جہازوں کو اپنے سینے پر نہ اٹھائے رکھے۔ یہ اسی کا احسان ہے کہ اس نے پانی میں یہ خاصیت رکھ دی ہے کہ وہ ایک خاص حجم کی چیز کو نیچے نہیں جانے دیتا، کیونکہ پانی میں ہر چیز کا وزن ہوا میں وزن کی نسبت کم ہوتا ہے اور یہ کمی کسی چیز کے حجم کے برابر پانی کے حجم کے برابر ہوتی ہے۔ (تیسیر القرآن) اگر اللہ تعالیٰ پانی کو اس طرح پیدا نہ فرماتا، پھر انسان کو پانی کی اس خاصیت کا علم عطا نہ فرماتا اور اس کے جد امجد نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا طریقہ نہ سکھاتا تو وہ کبھی اس میں کشتیاں یا جہاز نہ چلا سکتا اور نہ ہی اتنی وزنی چیزیں نہایت آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتا، جو خشکی کے راستے منتقل کرنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ (دیکھیے یٰسٓ: ۴۱ تا ۴۴) پھر سمندر میں آندھیاں، طوفان اور تلاطم خیز موجیں انسان کو آنکھ جھپکنے میں ہلاکت سے دو چار کر سکتی ہیں اور سمندر میں اتنی عظیم الجثہ مخلوق موجود ہے جو ایک ہی ٹکر میں کشتیوں اور جہازوں کو ڈبو سکتی ہیں۔ پھر سمندر کے اندر پہاڑ ہیں جن سے

وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ

اور جب انھیں سائبانوں جیسی کوئی موج ڈھانپ لیتی ہے تو اللہ کو پکارتے ہیں، اس حال میں کہ دین کو اس کے لیے خالص کرنے والے ہوتے ہیں، پھر جب وہ انھیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو ان میں سے کچھ ہی سیدھی راہ

ٹکرا کر جہاز پاش پاش ہو جاتے ہیں اور مقناطیسی چٹانیں ہیں جو انسان کی ساری کوششوں کے باوجود جہازوں کو کھینچ کر غرقاب کر دیتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص مہربانی ہوتی ہے کہ انسان اکثر اوقات سمندری سفر خیر و عافیت سے طے کر لیتا ہے۔

② **لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ** : یعنی ایسی نشانیاں جن سے پتا چلتا ہے کہ سارے اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کیسے ہی مضبوط اور بحری سفر کے لیے موزوں جہاز بنا لے اور جہاز رانی کے فن میں کتنا ہی کمال حاصل کر لے، سمندر میں پیش آنے والی ہولناک طاقتوں کے مقابلے میں جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل شامل نہ ہو وہ اکیلا اپنی تدابیر کے بل بوتے پر بخیریت سفر نہیں کر سکتا۔

③ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ** : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اتنی عظیم اور واضح نشانیوں کے باوجود مشرک ان سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ فرمایا، ان نشانیوں سے توحید کا سبق ہمیشہ وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جن میں دو وصف ہوں، ایک یہ کہ وہ "**صَبَّارٍ**" (بہت بڑے صبر والے) ہوں، ان کے مزاج میں تلوّن نہ ہو، بلکہ ثابت قدمی ہو، گوارا و ناگوار، سخت اور نرم، اچھے اور برے تمام حالات میں صحیح عقیدے پر قائم رہیں۔ یہ نہیں کہ برا وقت آیا تو اللہ کے سامنے گڑگڑانے لگے اور اچھا وقت آنے پر سب کچھ بھول گئے، یا اس کے برعکس اچھے حالات میں تو اللہ تعالیٰ پر خوش رہے اور اس کی پرستش کرتے رہے اور مصیبت کی ایک چوٹ پڑتے ہی اسے گالیاں دینے لگے۔ دوسرا وصف یہ کہ وہ "**شَكُوْرٍ**" (بہت بڑے شکر کرنے والے) ہوں، نمک حرام اور احسان فراموش نہ ہوں، بلکہ ہمیشہ نعمت دینے والے کے لیے دل میں احسان مندی اور قدر دانی کا جذبہ رکھیں اور اپنے قول و عمل سے اس کا شکر ادا کرتے رہیں۔ یہ دونوں وصف صرف مومن میں پائے جاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ )) [ مسلم، الزهد والرقائق، باب المؤمن أمره كله خير : ۲۹۹۹، عن صهيب رضی اللہ عنہ ] "مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر معاملہ ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں کہ اگر اسے کوئی خوشی پہنچے، وہ شکر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے خیر ہوتی ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے، سو وہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتی ہے۔"

آیت 32 ① **وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ** ...... : پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ سمندر میں چلنے والی کشتیوں اور جہازوں کو دیکھ کر ایمان والوں کی حالت کا ذکر فرمایا، جو بہت صبر و شکر کرنے والے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے ان کشتیوں میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی اور اس کے قادر و مختار ہونے کی بہت سے نشانیاں ہیں۔ اب بتایا کہ مشرکوں کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے، چنانچہ جب سمندر میں طوفان آتا ہے اور یک لخت پانی کی موجیں سائبانوں کی طرح انھیں ڈھانپ لیتی ہیں اور وہ

مُّقۡتَصِدٌ ؕ وَ مَا يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوۡرٍ ﴿۳۲﴾

پر قائم رہنے والے ہیں، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو نہایت عہد توڑنے والا، بے حد ناشکرا ہو ﴿۳۲﴾

سمجھ لیتے ہیں کہ معاملہ ختم ہے تو تمام خداؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کو چھوڑ کر اپنے دین یعنی عبادت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس اکیلے کو پکارتے ہیں۔

② **فَلَمَّا نَجّٰهُمۡ اِلَى الۡبَرِّ فَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ**...... : "**خَتَّارٍ**" "خَتۡرٌ" میں سے ہے، جو بدترین عہد شکنی اور غداری کو کہتے ہیں۔ "**مُقۡتَصِدٌ**" کا لفظی معنی سیدھی راہ پر چلنے والا بھی ہے اور میانہ روی اختیار کرنے والا بھی۔ اس جملے کی تین تفسیریں ہو سکتی ہیں اور تینوں درست ہیں، ایک یہ کہ "**مُقۡتَصِدٌ**" کا معنی سیدھی راہ پر چلنے والا ہے، کیونکہ تمام راستوں میں سے درمیانہ راستہ ہی سیدھا اور درست ہوتا ہے۔ "**فَمِنۡهُمۡ**" میں "مِنۡ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ انھیں سائبانوں جیسی ان موجوں سے بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو ان میں سے کچھ ہی سیدھی راہ پر رہنے والے ہوتے ہیں، جو اس عہد پر قائم رہتے ہیں جو انھوں نے طوفان کی حالت میں اپنے رب سے کیا تھا، جیسا کہ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ رضی اللہ عنہ تھے، ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کا صاف انکار کر دیتے ہیں جن کا مشاہدہ انھوں نے سمندر میں کیا تھا اور اس عہد کو توڑ دیتے ہیں جو انھوں نے طوفان کے وقت اپنے رب سے کیا تھا۔ پھر جو دہریے ہیں وہ اپنے بچ جانے کے لیے مادی اسباب بیان کرتے پھرتے ہیں کہ ہم فلاں وجہ سے بچ گئے اور جو مشرک ہیں وہ اپنے بچ جانے کو کسی نہ کسی داتا یا دستگیر کی کرم نوازی قرار دینے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی آیات اور اس کی نعمتوں کا اس طرح صاف انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو بدترین عہد توڑنے والا اور نہایت ناشکرا ہو۔ "**خَتَّارٍ**" اور "**كَفُوۡرٍ**" مشرک کی صفات ہیں، جو بالترتیب مومن کی صفات "**صَبَّارٍ**" اور "**شَكُوۡرٍ**" کے مقابلہ میں آئی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "**مُقۡتَصِدٌ**" سے مراد کفر میں میانہ روی اختیار کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کفر میں اتنے شدید نہیں رہتے، بلکہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں، جبکہ اکثر اپنے رب کی اس نعمت کا صاف انکار کر کے بدترین عہد شکنی اور ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں "**مُقۡتَصِدٌ**" سے مراد "مُقۡتَصِدٌ فِي الۡكُفۡرِ" ہوگا۔ تیسری تفسیر اس کی یہ ہے کہ "اِقۡتِصَادٌ" سے مراد ایمان و اخلاص اور عمل میں میانہ روی ہے: "أَيْ فَمِنۡهُمۡ مُقۡتَصِدٌ فِي الۡإِيۡمَانِ وَالۡعَمَلِ" یعنی طوفان سے نجات کے بعد جب کچھ وقت گزرتا ہے تو اخلاص اور ایمان کی وہ کیفیت کسی کی بھی باقی نہیں رہتی جو طوفان کے وقت تھی۔ پھر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اخلاص و ایمان اور عمل کے اعلیٰ درجے سے میانہ روی پر آ جاتے ہیں، البتہ اکثر کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عہد توڑ کر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا صاف انکار کر دیتے ہیں اور پھر اپنے شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: "یعنی جو حال خوف کے وقت تھا وہ تو کسی کا نہیں، مگر بالکل بھول بھی نہ جائے، ایسے بھی کم ہیں۔ نہیں تو اکثر قدرت سے منکر ہوتے ہیں،

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٚ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿٣٣﴾

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو کہ نہ باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ایسا ہوگا جو اپنے باپ کے کسی کام آنے والا ہو۔ یقیناً اللہ کا وعدہ سچ ہے، تو کہیں دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور کہیں وہ دغا باز اللہ کے بارے میں تمھیں دھوکا نہ دے جائے ﴿٣٣﴾

اپنے بیج نکلنے کو تدبیر پر رکھتے ہیں یا کسی ارواح وغیرہ کی مدد پر۔'' اللہ تعالیٰ کے کلام کا اعجاز ہے کہ آیت کے الفاظ میں تینوں معنوں کی گنجائش ہے اور کچھ بعید نہیں کہ تینوں مراد ہوں۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (٦٧)، عنکبوت (٦٥) اور یونس (٢١ تا ٢٣)۔

**آیت 33** ① یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ...... : مختلف طریقوں سے توحید اور آخرت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب تقویٰ کا حکم دیا، جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل اور اس کی نافرمانی سے بچنے کا نام ہے اور قیامت کے دن سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا، کیونکہ اسی سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ اگر باز پرس کا خوف نہ ہو تو کوئی چیز آدمی کو تقویٰ پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

② وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ : یعنی دنیا میں سب سے قریب باہمی تعلق والدین اور اولاد کا ہے، جب وہ ایک دوسرے کے کام نہ آسکے تو کوئی اور رشتے دار، دوست، لیڈر یا پیر فقیر کیا کام آسکے گا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (٤٨)، عبس (٣٤ تا ٣٧)، اور معارج (٨ تا ١٤) والد کے کام نہ آسکنے کی مثال نوح علیہ السلام اور ان کا بیٹا ہیں۔

③ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا : ''جَازٍ'' ''جَزٰی یَجْزِیْ'' سے اسم فاعل ہے۔ اولاد کے کام نہ آسکنے کی مثال ابراہیم علیہ السلام اور ان کا باپ ہیں۔

④ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ : اللہ کے وعدے سے مراد قیامت قائم ہونا ہے، وہ ہر حال میں ہو کر رہے گی۔

⑤ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا : دنیا کی زندگی انسانوں کو کئی طرح سے دھوکے میں ڈالتی ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ زندگی بس دنیا ہی کی زندگی ہے، جینا مرنا سب کچھ یہیں ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں، لہٰذا جو کچھ کرنا ہے یہیں پر کر لو۔ دیکھیے سورۂ انعام (٢٩)، مومنون (٣٧) اور جاثیہ (٢٤) کوئی کہتا ہے کہ دنیوی خوشی یا بدحالی ہی حق و باطل کا اور اللہ تعالیٰ کے راضی یا ناراض ہونے کا معیار ہے، اگر قیامت قائم ہوئی تو وہاں بھی وہی خوش حال ہوں گے جو یہاں خوش حال ہیں۔ دیکھیے سورۂ مریم (٧٧) کوئی آخرت پر ایمان کے باوجود دنیا کی خواہشات کی محبت میں کھو کر اس دن کی یاد ہی بھلا بیٹھتا ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (١٤) غرض دنیا کی زندگی آدمی کو طرح طرح سے دھوکے میں ڈالتی ہے۔

⑥ وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ : ''اَلْغَرُوْرُ'' ''غین'' کے فتح کے ساتھ صفت مشبہ ''فَعُوْلٌ'' بمعنی فاعل ہے، دھوکا دینے والا،

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَ مَا تَدْرِي نَفْسٌ

بے شک اللہ، اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ بارش برساتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے

جیسے: ﴿ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۳ ] اور ''غین'' کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے، جیسے : ﴿ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ﴾ [ الأنعام : ۱۱۲ ] اور: ﴿ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَلَا شُكُورًا ﴾ [ الدهر : ۹ ] دھوکا دینے والے سے مراد شیطان ہے، وہ ابلیس اور اس کی اولاد سے ہو یا انسانوں میں سے۔ لفظ کو عام رکھیں تو آدمی کا نفس بھی اسے دھوکا دیتا ہے اور دنیا بھی دھوکا دیتی ہے، اس لیے کئی مفسرین نے یہاں ''الْغَرُورُ'' کی تفسیر ''دنیا'' فرمائی ہے۔

❼ اللہ تعالیٰ کے بارے میں شیطان کا یہ دھوکا کئی طرح سے ہوتا ہے۔ یہ کسی کو دھوکا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے ہی نہیں، کسی کو دھوکا دیتا ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے، گناہ کرلو، بعد میں توبہ کر لینا۔ کسی سے کہتا ہے کہ فلاں بزرگ یا پیر کا اس پر بڑا زور ہے، وہ سفارش کر کے تمھیں اس کی پکڑ سے بچالیں گے۔ غرض وہ مختلف طریقوں سے انسان کو دنیا کی طرف مائل کر کے اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیتا ہے۔

**آیت 34** ❶ **إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ** : قیامت کے ذکر پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب آئے گی؟ اور یہی سوال کفار بار بار کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اسے مخفی رکھنا اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت ہے، تاکہ ہر شخص اس کے لیے ہر وقت تیار رہے اور ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا ملے۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۱۵) ''عِنْدَهُ'' کو پہلے لانے سے تخصیص کا معنی پیدا ہوا کہ قیامت کا علم صرف اس کے پاس ہے، کسی اور کے پاس نہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۷)، احزاب (۶۳) اور نازعات (۴۲ تا ۴۴) حدیث جبریل میں جبریل علیہ السلام کے سوال ''مَتَى السَّاعَةُ؟'' (قیامت کب ہے؟) کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ )) ''جس سے پوچھا گیا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا''...... پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ : ﴿ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ إن الله عنده علم الساعة ﴾ : ٤٧٧٧ ] ''قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ﴾ [ لقمان : ٣٤ ] ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَفَاتِيْحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ، ثُمَّ قَرَأَ : ﴿ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ إن الله عنده علم الساعة ﴾ : ٤٧٧٨ ] ''غیب کی چابیاں پانچ ہیں۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ [ لقمان : ٣٤ ]

❷ **وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ** : اس کا عطف ''عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ'' پر ہے، گویا عبارت یوں ہے ''وَ إِنَّ اللّٰهَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ'' یعنی اللہ تعالیٰ ہی بارش اتارتا ہے، اور جو اتارتا ہے وہی جانتا ہے کہ کہاں اتارنی ہے، کب اتارنی ہے اور کتنی اتارنی ہے، اس کے

مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾ ع ۱۴

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۴﴾

سوا کسی کو یہ بات معلوم نہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ "وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ" دونوں جملوں میں حصر پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ نہیں، جس کا ترجمہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی یہ کام کرتا ہے۔ اس کا سب سے قوی جواب تو وہ ہے جو شنقیطی نے دیا ہے کہ یہ بات کہ یہاں حصر مراد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث سے ثابت ہے، جیسا کہ اوپر گزرا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن مجید اور لغت عرب کو جاننے والا کوئی نہیں۔ ویسے علمائے عربیت نے کئی طرح سے یہاں حصر ثابت فرمایا ہے جن میں سے ایک جواب یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ اگر کہا جاتا کہ "إِنَّ عِلْمَ السَّاعَةِ عِنْدَ اللّٰهِ" تو جملہ مختصر بھی ہوتا اور بات بھی ادا ہو جاتی، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ" اور اس کی خبر "عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" بیان فرمائی۔ اس میں دو طرح سے حصر ہے، لفظ "اللّٰهَ" کو زیادہ صراحت کے ساتھ پہلے لانا، پھر خبر کے جملہ میں "عِنْدَهٗ" کو مقدم کرنا، جس سے تخصیص پیدا ہوئی۔ گویا جملے کی ابتدا جو حصر کے ساتھ ہوئی، وہی حصر "وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ" میں بھی ملحوظ ہے، کیونکہ ان دونوں کا عطف جملہ "عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" پر ہے۔ بعض اوقات عامۃ الناس کی طرف سے ایک سوال آتا ہے کہ آج کل سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ محکمہ موسمیات والے پہلے ہی پیش گوئی کر دیتے ہیں کہ فلاں دن بارش ہو گی، اگر یہ مفاتیح الغیب سے ہے، جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، تو وہ کیسے بتا دیتے ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ علم یقین کا نام ہے، ظن و تخمین اور گمان کو علم نہیں کہتے۔ محکمہ موسمیات والے اپنے تجربے کے مطابق ہوا کے دباؤ اور فضا میں موجود نمی وغیرہ کو دیکھ کر بارش ہونے یا نہ ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں، مگر کبھی ان کی بات درست ثابت ہوتی ہے کبھی نادرست۔ بعض اوقات تجربے کے مطابق بارش ہونے کے تمام اسباب ہوتے ہیں مگر بادل ایک بوند برسائے بغیر گزر جاتے ہیں اور بعض اوقات بارش کے اسباب میں سے کچھ بھی موجود نہیں ہوتا کہ یکایک تمام اسباب پیدا ہو کر بارش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب، کہاں اور کتنی ہو گی محکمہ موسمیات والوں کا یہ اعلان بھی ہے کہ آج بارش کا امکان ہے۔ سو فیصد علم نہ ان کے پاس ہے نہ ان کا دعویٰ ہے۔ آیت پر اعتراض کرنے والوں کا حال "مُدعی سست گواہ چست" والا ہے۔

③ **وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ** : اس کا عطف بھی "عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" پر ہے: "أَيْ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ" یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے۔ یہاں بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ آج کل الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پیدا ہونے والا لڑکا ہے یا لڑکی۔ اس کے جواب میں عموماً علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ آیت کے الفاظ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں لڑکا ہے یا لڑکی، بلکہ فرمایا "مَا فِي الْاَرْحَامِ" کہ جو کچھ پیٹوں میں ہے، ضروری نہیں کہ اس

سے مراد لڑکا یا لڑکی ہی لیا جائے، بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ جنین زندہ رہنے والا ہے یا ضائع ہو جانے والا، طویل عمر والا ہے یا تھوڑی عمر والا، خوش بخت ہے یا بدنصیب، تندرست رہے گا یا بیمار ہو گا۔ سو اگر اس کی جنس معلوم ہو بھی جائے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، تب بھی قرآن کے بیان پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یقیناً یہ جواب بہت عمدہ ہے، مگر ابھی تک یہ دعویٰ کہ الٹرا ساؤنڈ سے لڑکے یا لڑکی کی جنس معلوم ہو جاتی ہے، سو فیصد درست ثابت نہیں ہوا۔ خود ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ جنین کی وضع پیٹ میں ایسی ہوتی ہے کہ اس کے اعضائے تناسل اس کے سر کے نیچے چھپے ہوتے ہیں اور الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے سے اندازے ہی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے جو اکثر صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط بھی نکلتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ الٹرا ساؤنڈ سے جنس معلوم ہو جاتی ہے، سو فیصد درست نہیں۔ الٹرا ساؤنڈ کی شہرت کے باوجود میں نے اپنی زندگی میں دو دفعہ الٹرا ساؤنڈ کی پیش گوئی تمام دنیا کے سامنے غلط ثابت ہوتی ہوئی دیکھی ہے، ایک دفعہ برطانیہ کے ولی عہد کی بیوی لیڈی ڈیانا کے ہاں ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ لڑکی پیدا ہوگی، مگر ان کے اعلان کے برعکس لڑکا پیدا ہوا۔ دوسرا پاکستان کی سابقہ وزیراعظم بے نظیر کے ڈاکٹر نے اعلان کیا کہ لڑکا پیدا ہو گا، مگر لڑکی پیدا ہوئی۔ اب آپ سوچیں کہ برطانیہ اور پاکستان کے ان اونچے مناصب پر فائز لوگوں کے پاس الٹرا ساؤنڈ کے ماہرین کی کیا کمی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے سے ایک ہزار بچوں کے متعلق پیش گوئی کی جائے، جن میں سے نوسو ننانوے درست اور ایک غلط نکلے تو بھی اسے علم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ علم وہ ہے جو یقینی ہو، کبھی غلط نہ نکلے۔ البتہ اگر کوئی آپریشن کر کے آنکھوں سے بچے کی جنس دیکھ لے تو قرآن کی بات پھر بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ یہ بات کہ بچہ دانیوں میں کیا ہے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، کیونکہ ''کیا ہے'' میں لڑکے لڑکی کی جنس کے علاوہ بے شمار باتیں داخل ہیں۔

(4) **وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا** : مسروق فرماتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: ''اماں جان! کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''تم نے جو بات کہی اس سے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کیا تم ان تین باتوں سے بھی ناواقف ہو؟ جنھیں جو بھی تمھیں بیان کرے وہ جھوٹ کہے گا۔'' پھر فرمایا: (( مَنْ حَدَّثَكَ أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ رَأَى رَبَّهُ فَقَدْ كَذَبَ، ثُمَّ قَرَأَتْ : ﴿ **لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ** ﴾ [ الأنعام : ۱۰۳ ]، ﴿ **وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ** ﴾ [ الشورٰی : ۵۱ ] وَ مَنْ حَدَّثَكَ أَنَّهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ فَقَدْ كَذَبَ ثُمَّ قَرَأَتْ : ﴿ **وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا** ﴾ [ لقمان : ۳۴ ] وَمَنْ حَدَّثَكَ أَنَّهُ كَتَمَ فَقَدْ كَذَبَ، ثُمَّ قَرَأَتْ : ﴿ **يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ** ﴾ [ المائدۃ : ۶۷ ]، وَ لٰكِنَّهُ رَأَى جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ صُوْرَتِهِ مَرَّتَيْنِ )) [ بخاري، التفسیر، باب : ۴۸۵۵۔ مسلم : ۱۷۷ ] ''جو شخص تمھیں بیان کرے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے یقیناً جھوٹ کہا، پھر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے یہ آیت پڑھی: ﴿ **لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ** ﴾ [ الأنعام : ۱۰۳ ] ''اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے اور وہی نہایت باریک بین، سب خبر رکھنے والا ہے۔'' اور یہ آیت: ﴿ **وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ** ﴾ [ الشورٰی : ۵۱ ] ''اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے

کے پیچھے سے۔‘‘ ’’اور جو شخص تمھیں بیان کرے کہ آپ ﷺ وہ جانتے ہیں جو کل ہوگا تو اس نے یقیناً جھوٹ کہا۔‘‘ پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ [ لقمان : ۳٤ ] ’’اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔‘‘ ’’اور جو شخص تمھیں بیان کرے کہ آپ ﷺ نے (وحی کی بات کو) چھپایا ہے، اس نے یقیناً جھوٹ کہا۔‘‘ پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ [ المائدة : ٦٧ ] ’’اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔‘‘ ’’لیکن آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔‘‘

رُبَیِّع بنت مُعوِّذ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ’’جس رات میری رخصتی ہوئی اس کی صبح رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئے اور میرے بستر پر بیٹھ گئے، جہاں تم بیٹھے ہو اور کچھ چھوٹی لڑکیاں دف بجا کر اپنے آباء کے متعلق شعر پڑھ رہی تھیں جو بدر میں شہید ہوئے، یہاں تک کہ ایک لڑکی نے کہا: « وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ » ’’اور ہم میں وہ نبی ہے جو کل ہونے والی بات جانتا ہے۔‘‘ تو نبی ﷺ نے فرمایا: « لَا تَقُوْلِيْ هٰكَذَا ، وَقُوْلِيْ مَا كُنْتِ تَقُوْلِيْنَ » [ بخاري، المغازي، باب : ٤٠٠١ ] ’’اس طرح مت کہو اور وہ کہتی جاؤ جو کہہ رہی تھی۔‘‘

5 وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ: یعنی کوئی انسان نہیں جانتا کہ اسے موت کہاں آئے گی، خشکی پر یا سمندر میں یا پہاڑ پر۔ جب اسے اپنی موت کی جگہ کا علم نہیں تو وقت کا علم کیسے ہو سکتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: « إِذَا كَانَ أَجَلُ أَحَدِكُمْ بِأَرْضٍ أَوْثَبَتْهُ إِلَيْهَا الْحَاجَةُ ، فَإِذَا بَلَغَ أَقْصٰى أَثَرِهِ ، قَبَضَهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ ، فَتَقُوْلُ الْأَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَبِّ! هٰذَا مَا اسْتَوْدَعْتَنِيْ » [ ابن ماجه، الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد : ٤٢٦٣، وقال البوصيري و الألباني صحيح ] ’’جب تم میں سے کسی شخص کی موت کسی زمین میں طے ہو، تو کوئی ضرورت اسے چھلانگ لگوا کر وہاں پہنچا دیتی ہے۔ پھر جب وہ اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اس کے قدم کا آخری نشان ہوتا ہے، تو اللہ سبحانہ اسے قبض کر لیتے ہیں۔ چنانچہ زمین قیامت کے دن کہے گی: ’’اے میرے رب! یہ ہے وہ امانت جو تو نے میرے پاس رکھی تھی۔‘‘

6 اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ان پانچ چیزوں کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے اور ان کے ظاہر و باطن کی پوری خبر رکھنے والا ہے۔

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ ۳۲ مَكِّيَّةٌ ۷۵ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ۳۰ رُكُوْعَاتُهَا ۳

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ① اس کتاب کا نازل کرنا جس میں کوئی شک نہیں، جہانوں کے رب کی طرف سے ہے ② یا وہ کہتے ہیں کہ اس

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْجُمُعَةِ فِيْ صَلَاةِ الْفَجْرِ : ﴿ الٓمّٓ ۚ تَنْزِيْلُ ﴾ [ السجدة ] وَ: ﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ ﴾ [ الدهر ] )) [ بخاري، الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الفجر يوم الجمعة : ۸۹۱ ] ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت کیا کرتے تھے۔‘‘

**آیت 1، 2** الٓمّٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: ’’الٓمّٓ‘‘ کے متعلق دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔ ’’الْكِتٰبِ‘‘ میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ’’اس کتاب‘‘ کیا گیا ہے۔ ’’مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ‘‘ ’’تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ‘‘ کی خبر ہے۔ جملہ ’’لَا رَيْبَ فِيْهِ‘‘ معترضہ ہے یا ’’الْكِتٰبِ‘‘ کی صفت، یا اس سے حال ہے۔ آیت میں قرآن مجید کے متعلق دو باتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل کی گئی ہے، دوسری یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کوئی شک نہ ہونے سے مراد یہ بھی ہے کہ اس میں بیان کردہ ہر بات یقینی ہے، کسی بات میں شک کی گنجائش نہیں اور یہ بھی مراد ہے کہ اس کے رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اگر کسی کو شک ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے دور کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے، فرمایا: ﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ البقرة : ۲۳ ] ’’اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کی مثل ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتی بلا لو، اگر تم سچے ہو۔‘‘ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید سب سے بڑا معجزہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، جس کے مقابلے سے پوری مخلوق عاجز ہے۔

**آیت 3** ① اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: ’’اَمْ‘‘ سے پہلے عموماً ایسا جملہ موجود یا مقدر ہوتا ہے جو ہمزہ استفہام سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں مقدر جملہ ظاہر کریں تو عبارت یہ ہو گی: ’’ أَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ بِهِ أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ ‘‘ یعنی ’’کیا یہ لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو کر ایمان لاتے ہیں، یا یہ کہہ کر جھٹلا دیتے ہیں کہ اس پیغمبر نے اسے اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے؟‘‘ کئی مفسرین نے اس ’’اَمْ‘‘ کو منقطعہ قرار دے کر ’’بَلْ‘‘ کے معنی میں قرار دیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہو گا: ’’بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے۔‘‘ اس ’’بَلْ‘‘ سے پہلے بھی ایک عبارت محذوف ہے کہ یہ لوگ اس پر ایمان لانے کے بجائے یہی کہتے ہیں کہ اس نے اسے اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۴، ۵) اور مدثر (۱۸ تا ۲۵)۔

② بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ: فرمایا، ان کا یہ کہنا درست نہیں، بلکہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ③

نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ بلکہ وہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے، تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تاکہ وہ راہ پائیں ③

کے صدق و امانت کو پوری طرح جاننے کے باوجود صریح غلط اور لغو بات کہہ رہے ہیں۔

③ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ : مراد قومِ عرب ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے ساتھ سب سے پہلے خطاب فرمایا اور ان کے ذریعے سے تمام دنیا تک یہ پیغام پہنچانے کا اہتمام فرمایا۔ اس سے پہلے اگرچہ عرب میں اسماعیل، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام مبعوث ہو چکے تھے، مگر ان کی بعثت کو مدتیں گزر چکی تھیں۔ ان کے بعد تورات و انجیل نازل ہوئیں، مگر عرب میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ اس لیے اللہ عزوجل نے آخری نبی ان میں مبعوث فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿ وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ١٥٥ تا ١٥٧ ] ''اور یہ عظیم کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی برکت والی، پس اس کی پیروی کرو اور بچ جاؤ، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب تو صرف ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور بے شک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے یقیناً بے خبر تھے۔ یا یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت والے ہوتے۔ پس بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت آچکی، پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے کنارا کرے۔ عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے کنارا کرتے ہیں، برے عذاب کی جزا دیں گے، اس کے بدلے جو وہ کنارا کرتے تھے۔'' مزید تفصیل مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

④ اس مقام پر کئی مفسرین نے اسماعیل علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دو ہزار یا اڑھائی ہزار سال کا عرصہ بیان کیا ہے، مگر اس کا کوئی قابل اعتماد حوالہ نہیں دیا، اس لیے ہمارے پاس اس لمبی مدت کی تعیین کا کوئی ذریعہ نہیں۔

⑤ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ : یہاں ''لَعَلَّ'' ''كَيْ'' کے معنی میں ہے ''تاکہ وہ ہدایت پائیں'' اور اگر ''تَرَجِّيْ'' کے معنی میں ہو، یعنی ''امید ہے، یا شاید'' تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے ہے کہ تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں، اس امید پر کہ وہ ہدایت پا جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو ہر بات کا علم ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے یا نہیں، تو اسے ''شاید'' یا ''امید ہے'' کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ

**اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ④ وہ آسمان سے**

---

**آیت 4** ① **اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ** : قرآن کریم اور رسول کریم ﷺ کی رسالت کے حق ہونے کے بیان کے بعد اس اہم ترین مسئلے کا ذکر فرمایا جس کی طرف دعوت دینے کے لیے آپ ﷺ کو اور تمام رسولوں کو بھیجا گیا اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے دلائل کا بیان۔ چنانچہ فرمایا: ''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو، زمین کو اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔'' ان دنوں سے مراد معروف دن نہیں، کیونکہ آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے ان کا وجود ہی نہیں تھا، ہوسکتا ہے وہ دن ہزاروں یا لاکھوں سال کے ہوں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴) اور حٰم السجدہ (۹ تا ۱۲)۔

② **ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴)، یونس (۳) اور طٰہٰ (۵)۔

③ **مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ** : یہ اس باطل خیال کا رد ہے کہ بے شک آسمان و زمین اور ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، مگر کچھ ہستیاں ایسی زبردست یا اللہ کی محبوب ہیں جو سفارش کر کے اس کی گرفت سے چھڑا لیں گی۔ فرمایا، یاد رکھو! اگر وہ تمھیں عذاب دینا چاہے تو اس کے مقابلے میں تمھارا کوئی دوست نہیں ہوگا جو اس کے عذاب سے تمھیں چھڑا سکے اور نہ کوئی سفارشی، جو اس کی اجازت کے بغیر سفارش کی جرأت کر سکے۔

④ **اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ** : یعنی کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے کہ عرش سے فرش تک اس کی حکومت ہے، اس کے پیغام اور پیغمبر کو جھٹلا کر کہاں جاؤ گے؟

**آیت 5** ① **يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ......** : اس آیت کی تفسیر میں اہلِ علم کا بہت اختلاف ہے، حتیٰ کہ بعض نے اس کی تفصیل اللہ کے علم کے سپرد کرتے ہوئے خاموشی اختیار فرمائی ہے، کیونکہ ہر تفسیر میں ایک طرح کی کمی اور اعتراض کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ یہاں ان میں سے دو تفسیریں نقل کی جاتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرماتا ہے اسے آسمان سے زمین کی طرف نافذ فرماتا ہے، پھر اس کے نافذ ہونے کی خبر اوپر اس کی طرف ایک ایسے دن میں جاتی ہے جس کی مقدار آسمان سے زمین پر اترنے اور پھر اس کی طرف چڑھنے میں دنیا کے ہزار سال کے برابر ہے، کیونکہ آسمان و زمین کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے، چنانچہ اترنے اور اوپر جانے کا فاصلہ ہزار سال ہے۔ ابن جریر طبری نے فرمایا: ''یہ سب اقوال سے بہتر ہے، کیونکہ یہ اس کے معانی میں سب سے ظاہر اور قرآن کے ظاہر الفاظ سے زیادہ ملتا ہے۔'' ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کے ساتھ مجاہد، قتادہ اور ضحاک کا قول نقل فرمایا ہے: ''(اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر) فرشتے کا اترنا پانچ سو سال کے فاصلے میں ہوتا ہے اور اس کا چڑھنا بھی پانچ سو سال کے فاصلے میں ہوتا ہے، لیکن وہ اسے آنکھ جھپکنے میں طے کر لیتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ

السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾

زمین تک (ہر) معاملے کی تدبیر کرتا ہے، پھر وہ (معاملہ) اس کی طرف ایسے دن میں اوپر جاتا ہے جس کی مقدار ہزار سال ہے، اس (حساب) سے جو تم شمار کرتے ہو ﴿۵﴾

---

نے فرمایا: ﴿ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ [ السجدۃ : ۵ ] ''ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ہزار سال ہے، اس (حساب) سے جو تم شمار کرتے ہو۔'' (ابن کثیر) قاسمی، ابن جزیّ صاحبُ التسہیل، بغوی، سعدی اور بہت سے مفسرین نے یہی معنی بیان فرمایا ہے، یا اس کو ترجیح دی ہے۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں ''يَوْمٌ'' کا لفظ پچاس ہزار سال کی مدت کے لیے بھی آیا ہے اور ہزار سال کے لیے بھی، دنیا کے عام دنوں کے لیے بھی اور وقت کے چھوٹے سے چھوٹے جز کے لیے بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ [ الرحمٰن : ۲۹ ] ''اس سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔'' یہاں ''ہر دن'' سے مراد ہر لمحہ ہے۔ مقصد اس آیت کا یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے لاتعلق نہیں ہو گیا کہ اس کے چلانے کا کام کوئی اور کر رہا ہو، بلکہ آسمان سے لے کر زمین تک، بڑے سے لے کر چھوٹے تک، ہر کام کی تدبیر وہ خود کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر حکم پر عمل کی بھی مکمل خبر رکھتا ہے اور زمین و آسمان کے درمیان ہزار برس کے فاصلے کے باوجود اس کے حکم سے یہ سب کچھ لمحوں میں ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں ان جاہل صوفیوں اور مشرکین کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم کا نظام اپنے پیاروں کو دے کر فارغ ہو چکا ہے اور اب سارا نظام وہی چلا رہے ہیں۔ پھر ان حضرات نے اس کے لیے باقاعدہ عہدے بنا رکھے ہیں، جن کے مطابق ان کا کوئی ولی قیوم کے مرتبے پر ہے، کوئی قطب ہے، کوئی غوث ہے، کچھ ابدال ہیں اور کچھ اوتاد، اور یہی حضرات دنیا کا نظام چلا رہے ہیں۔ اس کے مطابق انھوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی کو غوثِ اعظم (سب سے بڑا مددگار) کا عہدہ دے رکھا ہے۔ ایک اللہ کو پکارنے کے بجائے یہ لوگ کبھی کسی کو مدد کے لیے پکارتے ہیں اور کبھی کسی کو۔ دراصل ان کی گمراہی کے پیچھے وہی فاسد عقیدہ ہے جس کی تردید اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمائی ہے کہ جو مالک لمحوں میں ہزار سال کے فاصلے سے ہر معاملے کی تدبیر کرتا اور اس کی پوری خبر رکھتا ہے، اس اکیلے کی عبادت اور اسی سے مانگنے کے بجائے کسی ایسے کی عبادت اور اس سے فریاد کیوں کی جائے جس کا کسی کام کی تدبیر میں کوئی دخل ہی نہیں۔

② دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کے وقت سے لے کر آسمان سے اپنی مخلوق اور زمین کے ہر معاملے کی تدبیر کر رہا ہے اور یہ سلسلہ ان کے فنا ہونے تک جاری رہے گا۔ پھر یہ تمام معاملات اس کی طرف اوپر جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے بارے میں ایک ایسے دن کے اندر فیصلہ فرمائے جس کی مقدار ہزار برس ہے، ان دنوں سے جو تم شمار کرتے ہو۔ مفسر المراغی، ابن عاشور، ابوبکر الجزائری صاحب ایسر التفاسیر، ابراہیم القطان صاحب تیسیر التفسیر اور دوسرے کئی مفسرین نے یہی معنی بیان کرنے پر اکتفا فرمایا ہے اور کئی دوسرے مفسرین نے اسے ترجیح دی ہے۔ اس معنی کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝

وہی غائب اور حاضر کو جاننے والا، سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ⑥ جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش تھوڑی سی مٹی سے شروع کی ⑦

کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر معاملے کے اور ہر انسان کے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا ذکر فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ [ آل عمران : ۲۸ ]، ﴿ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۲۸ ]، ﴿ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ ﴾ [ هود : ۱۲۳ ] ﴿ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۶۰ ] اور فرمایا: ﴿ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ﴾ [ یونس : ۴ ]

اس تفسیر میں ایک اشکال ہے کہ سورۂ معارج (۴) میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی ہے، جب کہ یہاں ایک ہزار سال کا ذکر ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہزار سال سے مراد محض کثرت ہے، کیونکہ عربی زبان میں سب سے بڑا عدد "أَلْفٌ" (ہزار) ہی ہے۔ اس سے زیادہ عدد کی ضرورت ہو تو دوسرے عدد ساتھ ملائے جاتے ہیں، مثلاً "خَمْسُوْنَ أَلْفًا" یا "مِائَةُ أَلْفٍ" اور بعض اوقات کثرت کے اظہار کے لیے "أَلْفٌ" ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس لیے "خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ" اور "اَلْفَ سَنَةٍ" دونوں سے قیامت ہی کا دن مراد ہے اور دونوں عددوں سے کثرت کا اظہار مقصود ہے۔ ہوسکتا ہے اصل مدت اس سے کہیں زیادہ ہو جسے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ (واللہ اعلم) بعض مفسرین نے یہ حل بیان فرمایا ہے کہ مصیبت کے ایام لمبے ہوتے ہیں، چنانچہ پچاس ہزار سال کی لمبائی کفار کے لیے ہوگی، جیسے فرمایا: ﴿ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴾ [ المدثر : ۹، ۱۰ ] "تو وہ اس دن، ایک مشکل دن ہے۔ کافروں پر آسان نہیں۔"

**آیت 6** ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ...... : یعنی وہ پروردگار جو خلق و تدبیر کا یہ سارا سلسلہ چلا رہا ہے، اس کا علم اتنا وسیع ہے کہ جو کچھ تم سے غائب ہے یا حاضر، ماضی ہے یا حال یا مستقبل، سب کچھ اس کے علم میں ہے، قدرت اس کی اتنی بے پایاں ہے کہ وہ ہر ایک پر غالب ہے اور رحمت اتنی کہ ہر چیز کو اپنے دامن میں سمائے ہوئے ہے۔ اس کے سوا نہ کسی کے پاس یہ علم ہے، نہ قدرت اور نہ رحمت، خواہ وہ انسان ہو یا جنّ یا فرشتہ یا کوئی اور مخلوق، تو پھر کسی اور کی عبادت کیوں کی جائے؟

**آیت 7** ① الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ : یعنی اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان کائنات میں بے حد و حساب جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں اور جس مقصد کے لیے بنائی ہیں، انھیں اس کے لیے ایسی شکل و صورت عطا فرمائی ہے جس سے زیادہ خوب صورت اور عمدہ صورت کا تصور میں آنا محال ہے۔

② وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ : اپنی پیدا کردہ ہر چیز کے حسن کے مشاہدے کے لیے انسان کو خود اس کی ذات میں غور و

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ﴿۸﴾ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۹﴾

پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصے سے بنائی ﴿۸﴾ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی ایک روح پھونکی اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت کم شکر کرتے ہو ﴿۹﴾

فکر کرنے کی دعوت دی کہ اس کے لیے تمھیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے تمھاری پیدائش کی ابتدا حقیر مٹی سے کی، جس میں زندگی کا نام و نشان نہ تھا۔ پوری زمین سے ایک مٹھی لے کر اپنے ہاتھوں سے پتلا بنا کر پہلا انسان پیدا فرما دیا۔ ”طِيْنٍ“ میں تنوین تحقیر کی ہے۔

**آیت 8** **ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ** : اس کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون (۱۲ تا ۱۴) اور سورۂ حج (۵) یعنی پھر اس کی نسل کو نطفہ اور توالد و تناسل سے آگے چلا دیا، جس سے لاتعداد انسان آگے پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نطفہ کو خلاصہ اس لیے فرمایا کہ اطباء کے مطابق یہ غذا کے چوتھے ہضم کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے، جب کہ خون تیسرے ہضم کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اعضائے بول سے نکلنے کی وجہ سے اسے ”مَهِيْنٍ“ قرار دیا۔ پھر منی کے اس قطرے میں لاکھوں جرثومے ہوتے ہیں جو طاقت ور خورد بین کے بغیر نظر نہیں آتے، جن میں سے ہر جرثومہ رحم میں مکمل انسان بننے کی استعداد رکھتا ہے۔

**آیت 9** ① **ثُمَّ سَوّٰىهُ** : ”سَوّٰى يُسَوِّيْ تَسْوِيَةً“ برابر کرنا، درست کرنا۔ پھر اس انتہائی چھوٹے سے جرثومے کو ماں کے رحم میں پیوست کیا اور علقہ اور مضغہ کی منزلوں سے بڑھاتے ہوئے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر، اسے گوشت پوست پہنا کر، ہر عضو کو اس کی بہتر سے بہتر جگہ رکھ کر ہر طرح سے درست اور مکمل کر دیا۔

② **وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ** : ”مِنْ“ تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”اور اس میں اپنی ایک روح پھونکی۔“ مراد اس سے اپنی پیدا کردہ روح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ”لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ“ ہے، انسان کا شرف بیان کرنے کے لیے اس میں پھونکی جانے والی روح کو اپنی روح قرار دیا۔ کیونکہ ارواح جتنی بھی ہیں سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، مگر انسان کی خصوصیت کے اظہار کے لیے اس کی روح کی نسبت اپنی طرف فرمائی، جیسا کہ تمام اونٹنیوں کا مالک اللہ ہے مگر صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ”نَاقَةُ اللّٰهِ“ فرمایا، تمام مساجد اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں، مگر کعبہ کو ”بیت اللہ“ کہا جاتا ہے اور بندے سب کے سب اللہ کے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص شرف کے اظہار کے لیے فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ [ بني إسرائيل : ۱ ] اور فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ﴾ [ الجن : ۱۹ ] اور دوسرے مقامات پر انھیں اپنا بندہ قرار دیا۔ مزید دیکھیے سورۂ حجر کی آیت (۲۹) کی تفسیر۔

③ **وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ** : اس سے پہلے انسان کی پیدائش کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ کیا، روح پھونکنے سے جیتا جاگتا انسان وجود میں آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ جب تم پیدا ہوئے تو کچھ نہ جانتے

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ۬ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ⑩

اور انھوں نے کہا کیا جب ہم زمین میں گم ہو گئے، کیا واقعی ہم ضرور نئی پیدائش میں ہوں گے؟ بلکہ وہ اپنے رب کی ملاقات سے منکر ہیں ⑩

تھے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں علم حاصل کرنے کے ذرائع عطا فرمائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ [ النحل : ۷۸ ] ''اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے، تا کہ تم شکر کرو۔'' علم حاصل کرنے کے ذرائع میں سب سے پہلے سننے کی نعمت کا ذکر فرمایا، کیونکہ پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے کان ہی اپنا کام شروع کرتے ہیں، اس کے بعد آنکھیں اپنا کام شروع کرتی ہیں، اور اس لیے بھی کانوں کا ذکر پہلے فرمایا کہ کانوں پر کوئی پردہ نہیں، وہ ہر وقت اپنا کام سرانجام دیتے ہیں، حتیٰ کہ سونے کی حالت میں بھی سخت آواز جگانے کا باعث ہوتی ہے، جب کہ آنکھیں بند کر لینے سے یا سو جانے سے دیکھنے کا عمل رک جاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کا عمل ان دونوں کے بعد شروع ہوتا ہے، اس لیے ''الْاَفْـِٕدَةَ'' کا ذکر دونوں کے بعد فرمایا۔

④ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ : یہ سب باتیں ایسی واضح ہیں کہ تم میں سے ہر ایک کے مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں، مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

آیت 10 ① وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ...... : رسول کریم ﷺ اور قرآن کریم کے حق ہونے اور توحید اور اس کے چند دلائل بیان کرنے کے بعد اب اسلام کے تیسرے بنیادی عقیدے قیامت اور اس پر کفار کے اعتراض اور اس کے جواب کا ذکر ہوتا ہے۔ ''وَ قَالُوْٓا'' میں ''واؤ'' کے ساتھ ان کے اس قول پر عطف ہے جو پہلی آیات سے ظاہر ہو رہا ہے، گویا کلام یوں ہوگا: ''قَالُوْا مُحَمَّدٌ لَيْسَ بِرَسُوْلٍ وَالْإِلٰهُ لَيْسَ بِوَاحِدٍ وَقَالُوْٓا ءَ إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ...... '' یعنی انھوں نے کہا کہ محمد رسول نہیں ہے اور معبود ایک نہیں ہے اور انھوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں گم ہو گئے......'' زمخشری اور طبری نے فرمایا: ''ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ'' اس وقت کہا جاتا ہے جب پانی دودھ میں اچھی طرح مل جائے اور غائب ہو جائے۔ یعنی کیا جب ہم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم ایک نئی پیدائش میں زندہ کر دیے جائیں گے؟ ہمزہ استفہام کے بعد پھر ہمزہ استفہام دوسری زندگی پر تعجب اور اس سے انکار کے لیے ہے، یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

② بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ : اس سے پہلے انسان کی مٹی اور پھر نطفے سے پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد کفار کے اس اعتراض کے جواب کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ ہم مٹی میں مٹی ہو گئے تو دوبارہ کیسے پیدا ہوں گے، جواب ظاہر تھا کہ جس طرح پہلی مرتبہ اس مٹی سے پیدا ہوئے جب تمھارا نام و نشان نہ تھا، اب اسی مٹی میں مل گئے تو دوبارہ کیوں پیدا نہیں ہو سکتے۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۷۹ تا ۸۱ اور ۱۲) اس لیے فرمایا، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات تسلیم نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ وہ اپنی خواہش پرستی اور فسق و فجور کو چھوڑنا نہیں چاہتے، جو انھیں رب تعالیٰ کی ملاقات تسلیم کرنے کے بعد چھوڑنا پڑیں گے،

قُلۡ يَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِىۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَلَوۡ تَرٰٓى اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡؕ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾

کہہ دے تمھیں موت کا فرشتہ قبض کرے گا، جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۱۱﴾ اور کاش! تو دیکھے جب مجرم لوگ اپنے رب کے پاس اپنے سر جھکائے ہوں گے اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، پس ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں ﴿۱۲﴾

جیسا کہ فرمایا: ﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ؕ اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ بَلٰى قٰدِرِيۡنَ عَلٰٓى اَنۡ نُّسَوِّىَ بَنَانَهٗ ۙ بَلۡ يُرِيۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِيَفۡجُرَ اَمَامَهٗ ﴾ [ القيامة : ١ تا ٥ ] ''نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں! اور نہیں، میں بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں! کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ کیوں نہیں؟ (ہم انھیں اکٹھا کریں گے) اس حال میں کہ ہم قادر ہیں کہ اس (کی انگلیوں) کے پورے درست کر (کے بنا) دیں۔ بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے (آنے والے دنوں میں بھی) نافرمانی کرتا رہے۔''

**آیت 11** ① **قُلۡ يَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِىۡ وُكِّلَ بِكُمۡ** : یعنی تم اپنے آپ کو محض بدن اور دھڑ سمجھتے ہو کہ خاک میں رل مل کر برابر ہو گئے۔ ایسا نہیں، بلکہ تم اصل میں ''جان'' (روح) ہو، جسے فرشتہ لے جاتا ہے، بالکل فنا نہیں ہوتے۔ (موضح) ''**وُكِّلَ بِكُمۡ**'' کے لفظ سے معلوم ہوا کہ فرشتہ وہی جان نکالتا ہے جس کا اسے حکم ہو، خود اس کا اختیار کچھ نہیں۔

② **ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ** : ''اِلٰى رَبِّكُمۡ'' پہلے لانے کی وجہ سے ترجمہ کیا گیا ہے: ''پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

③ ملک الموت کا نام عام طور پر عزرائیل مشہور ہے، مگر کتاب و سنت میں یہ بات کہیں مذکور نہیں، محض اسرائیلی روایت ہے۔ دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ لوگوں کو ایک فرشتہ نہیں بلکہ کئی فرشتے فوت کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا وَهُمۡ لَا يُفَرِّطُوۡنَ﴾ [ الأنعام : ٦١ ] ''یہاں تک کہ جب تمھارے کسی ایک کو موت آتی ہے اسے ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔'' مزید دیکھیے سورۂ نساء (۹۷)، انعام (۹۳) اور سورۂ محمد (۲۷) اہلِ علم نے اس کی توجیہ یہ فرمائی ہے کہ روحیں قبض کرنے پر مقرر فرشتہ ایک ہی ہے جس کا یہاں ذکر ہے، لیکن اس کے ساتھ مدد کرنے والے فرشتے بھی ہیں جو مختلف طرح سے اس کی مدد کرتے ہیں، جیسا کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں مومن اور کافر کی جان نکلنے کا ذکر ہے کہ ملک الموت جب میت کی روح نکالتا ہے تو دوسرے فرشتے اس کے ہاتھ سے تیزی کے ساتھ لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں۔ [ دیکھیے مسند أحمد : ٢٨٧/٤، ح : ١٨٥٦١ ]

**آیت 12** ① **وَلَوۡ تَرٰٓى اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ** : پچھلی آیت میں جو فرمایا ''ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ''

وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

**اور اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے اور لیکن میری طرف سے بات پکی ہو چکی کہ یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا ﴿۱۳﴾ سو چکھو، اس وجہ سے کہ تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا، بے شک ہم نے تمھیں بھلا دیا اور ہیشگی کا عذاب چکھو، اس کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۱۴﴾**

(پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) اب اس حالت کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ "نَكَسَ يَنْكُسُ" (ن) کا معنی کسی چیز کو سر کے بل الٹا کرنا ہے، مراد ذلت، شرمندگی اور غم کے ساتھ سروں کو جھکانا ہے۔ "**الْمُجْرِمُوْنَ**" کے لفظ کے ساتھ ان کے اس انجام کا سبب صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

② **رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا** : یہاں "يَقُوْلُوْنَ" کا لفظ مقدر ہے، یعنی وہ سر جھکائے ہوئے یہ بات کہہ رہے ہوں گے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اگر انھیں دوبارہ واپس بھیج بھی دیا جائے تو اپنی پرانی روش ہی پر چلیں گے، فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۲۷، ۲۸ ] "اور کاش! تو دیکھے جب وہ آگ پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش! ہم واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔ بلکہ ان کے لیے ظاہر ہو گیا جو وہ اس سے پہلے چھپاتے تھے اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔" کفار کے اس اظہارِ حسرت و ندامت کا ذکر متعدد آیات میں آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۳) اور مومنون (۹۹، ۱۰۰)۔

③ **اِنَّا مُوْقِنُوْنَ** : مگر اس وقت یقین ہو جانے کا کیا فائدہ؟ جو وقت یقین کے فائدہ دینے کا تھا (یعنی دنیا میں) وہ تو انھوں نے گنوا دیا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۸۵)۔

**آیت 13** **وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا** ...... : یعنی یہ کیا بات ہوئی کہ اب تم حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لے آؤ اور ہم تمھاری سزا موقوف کر دیں، یا تمھیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیں۔ اس طرح کی جبری ہدایت تو ہم تمھیں پہلے ہی دے سکتے تھے، مگر اس سے قیامت کی جزا و سزا بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی اور امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اب تو ضروری ہے کہ میرا وہ قول پورا ہو جو میں نے ابلیس کے آدم کو سجدے سے انکار کے وقت اسے مخاطب کر کے فرمایا تھا: ﴿ قَالَ فَالْحَقُّ ۫ وَ الْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ صٓ : ۸۴، ۸۵ ] "فرمایا پھر حق یہی ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔"

**آیت 14** ① **فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا** : یعنی ان مجرموں سے کہا جائے گا کہ دنیا کے عیش میں گم ہو کر تم

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّ مِمَّا

ہماری آیات پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب انھیں ان کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے ﴿۱۵﴾ ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور طمع کرتے ہوئے پکارتے ہیں اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے

---

نے اس بات کو بالکل بھلا دیا کہ کبھی اپنے رب سے ملاقات بھی ہونی ہے، اب اس بھولنے کا مزا چکھو۔ آیت کے آخر میں اس مزے کی صراحت فرما دی کہ اپنے عمل کی وجہ سے ہمیشگی کا عذاب چکھو۔

(2) اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ : یعنی جس طرح تم نے ہمیں بھلائے رکھا، آج ہم نے بھی تمھیں بھلا دیا۔ انھیں ہمیشہ عذاب میں چھوڑے رکھنے کو نسیان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھولنا ممکن ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴾ [ طٰہٰ : ۵۲ ] ''میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' اور دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۲۴ تا ۱۲۶)۔

**آیت 15** اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا ...... : یعنی وہ لوگ جو تکبر کرتے ہوئے ہماری ملاقات ہی کو بھول گئے، وہ ہماری آیات پر کبھی ایمان نہیں لاتے۔ ہماری آیات پر تو صرف وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جن کی صفات اپنے رب کی ملاقات کو بھول جانے والوں سے بالکل جدا ہوتی ہیں۔ ان کے دلوں میں ضد، ہٹ دھرمی اور عناد نہیں ہوتا۔ ان کی طبیعت اتنی سلیم ہوتی ہے کہ جب انھیں آیاتِ الٰہی کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ فوراً حق قبول کرتے اور اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ان کے نفس کی کبریائی انھیں حق قبول کرنے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے مانع نہیں ہوتی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجود میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: (( سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ )) [ بخاري، الأذان، باب الدعاء في الركوع : ۷۹۴ ] ''پاک ہے تو اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! اور تیری حمد کے ساتھ، اے اللہ! مجھے بخش دے۔''

**آیت 16** (1) تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ...... : یعنی وہ نماز اور ذکر الٰہی کی خاطر اپنے آرام دہ بستر اور لذیذ نیند چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا اعلیٰ درجہ تہجد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِيْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶﴾ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [ الذاریات : ۱۵ تا ۱۸ ] ''بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ لینے والے ہوں گے جو ان کا رب انھیں دے گا، یقیناً وہ اس سے پہلے نیکی کرنے والے تھے۔ وہ رات کے بہت تھوڑے حصے میں سوتے تھے۔ اور رات کی آخری گھڑیوں میں وہ بخشش مانگتے تھے۔'' اس کے علاوہ بھی قیام اللیل کی فضیلت میں بہت سی آیات و احادیث آئی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے ؎

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۱۶﴾

يَبِيتُ يُجَافِي جَنبَهُ عَنْ فِرَاشِهِ إِذَا اسْتَثْقَلَتْ بِالْمُشْرِكِينَ الْمَضَاجِعُ

''وہ رات اس حال میں گزارتا ہے کہ اپنا پہلو اپنے بستر سے الگ رکھتا ہے، جب مشرکین کے بستر انھیں نہایت بوجھل کیے ہوتے ہیں۔'' [ بخاري، التهجد، باب فضل من تعار من الليل فصلّى : ۱۱۵۵ ]

مگر یہاں ایک سوال ہے کہ یہ جو فرمایا کہ ہماری آیات پر ایمان صرف وہی لوگ لاتے ہیں جن میں یہ صفات پائی جائیں، تو کیا جو شخص تہجد نہ پڑھے اس کا اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بے شک ایمان کا اعلیٰ مرتبہ انھی لوگوں کا ہے جو فرائض کے علاوہ نفل قیام اللیل کا اہتمام کرتے ہیں، مگر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ جو شخص مغرب کے بعد عشاء کے انتظار میں نہیں سوتا بلکہ عشاء جماعت کے ساتھ ادا کرتا ہے، پھر فجر کے وقت آرام دہ بستر اور میٹھی نیند چھوڑ کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے، وہ بھی اس فضیلت سے محروم نہیں رہتا۔ کیونکہ اس کا پہلو بھی نماز کی خاطر بستر سے جدا رہا ہے اور وہ سویا ہے تب بھی اس کے انتظار میں سویا ہے۔ عبد الرحمٰن بن ابی عمرہ کہتے ہیں کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مغرب کی نماز کے بعد مسجد میں داخل ہوئے اور اکیلے بیٹھ گئے، میں ان کے پاس جا بیٹھا تو انھوں نے کہا، بھتیجے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے: (( مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ )) [ مسلم، المساجد و مواضع الصلاة، باب فضل صلاة العشاء و الصبح في جماعة : ٦٥٦ ] ''جو شخص عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جو شخص صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے ساری رات قیام کیا۔'' انس بن مالک رضی اللہ عنہ زیر تفسیر آیت: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں: (( نَزَلَتْ فِي انْتِظَارِ هٰذِهِ الصَّلَاةِ الَّتِي تُدْعَى الْعَتَمَةَ )) [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة السجدة : ۳۱۹٦، و صححه الألباني ] ''یہ آیت اس نماز کے بارے میں اتری جسے عتمہ (عشاء) کہا جاتا ہے۔'' اور ابو برزہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَ الْعِشَاءِ وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا )) [ بخاري، مواقيت الصلاة، باب ما يكره من النوم قبل العشاء : ٥٦٨ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء سے پہلے سونے کو اور اس کے بعد باتیں کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔''

﴿2﴾ **يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا:** یعنی وہ اپنے رب کی گرفت کے خوف اور اس کی رحمت کی امید کے ساتھ اسے پکارتے ہیں۔ انھیں خوف ہے کہ ان کے اعمال رد نہ کر دیے جائیں اور امید بھی کہ وہ قبولیت کا شرف حاصل کر لیں گے۔ (دیکھیے مومنون: ۵۷ تا ۶۱) نہ بے جا امید، جو بے عمل یا بد عمل بنا دیتی ہے اور نہ اتنا خوف جو اللہ کی رحمت سے مایوس کر دے اور آدمی کو کفر تک پہنچا دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض صوفیوں نے جو کہا: ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں جہنم کو بجھا دوں اور جنت کو

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۷﴾

پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے، اس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۷﴾

جلا دوں، تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کسی ڈر یا لالچ سے نہ کریں بلکہ محض اس کی رضا کے لیے کریں۔'' اور بعض نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے، پھر خواہ مجھے جنت میں بھیج دے خواہ جہنم میں پھینک دے۔'' یہ فضول باتیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی صفت ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر یہ بھی ان لوگوں کی جہالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو جنت اور جہنم سے الگ کر دیا، حالانکہ جنت اسے ملے گی جس پر وہ راضی ہوگا اور جہنم میں وہ جائے گا جس پر وہ ناراض ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے کہا: (( كَيْفَ تَقُوْلُ فِي الصَّلَاةِ؟ )) ''تم نماز میں کیا کہتے ہو؟'' اس نے کہا: (( أَتَشَهَّدُ وَ أَقُوْلُ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ، أَمَا إِنِّيْ لَا أُحْسِنُ دَنْدَنَتَكَ وَلَا دَنْدَنَةَ مُعَاذٍ )) ''میں تشہد پڑھتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور آگ سے تیری پناہ مانگتا ہوں، ہاں! میں آپ جیسی اچھی گنگناہٹ نہیں کر سکتا اور نہ معاذ جیسی گنگناہٹ کر سکتا ہوں۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: (( حَوْلَهَا نُدَنْدِنُ )) [ أبوداؤد، الصلاة، باب تخفيف الصلاة: ۷۹۲، و صححه الألباني ] ''ہم بھی اسی کے گرد گنگنا رہے ہیں۔'' تو جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی ساری تگ و دو جہنم سے بچنے اور جنت کے حصول کے لیے ہے، تو پھر ان سے بڑھ کر اللہ کی رضا چاہنے والا کون ہوگا۔ ہمارے ایک شاعر نے جو کہا ہے ؎

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد    دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے    او بے خبر، جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

تو یہ اسی تصوف سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے جس کی تعلیمات بنیادی طور پر اسلام ہی کے خلاف ہیں۔ اسلام نے تو '' رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ '' کہنے کی تعلیم دی ہے۔ مسلمانوں نے جہاد چھوڑ کر دنیا کفار کے سپرد کر دی اور غلامی پر قانع ہو گئے، پھر عیش و عشرت میں پڑ کر عقبیٰ سے بھی گئے اور کچھ بے چارے راہبوں کی طرح رب کو راضی کرنے کے لیے دنیا کو چھوڑ کر خانقاہوں، جنگلوں اور کٹیاؤں میں ہُو، حق کے ورد کرتے رہے اور کفر کی یلغار اسلام اور مسلمانوں کو محکوم بناتی چلی گئی۔ [ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ]

③ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳) کی تفسیر۔

**آیت 17** فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ...... : لفظ ''نَفْسٌ'' نکرہ ہے، جو عموم کا فائدہ دیتا ہے، یعنی کوئی نفس نہیں جانتا، خواہ انسان ہو یا جن یا فرشتہ، پھر خواہ ملک مقرب ہو یا نبی مرسل، غرض اللہ کے سوا کوئی ان نعمتوں کو نہیں جانتا جو اس نے مذکور اہل ایمان کے لیے چھپا کر رکھی ہیں، جن سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، ان کے ان اعمال کی جزا

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

**تو کیا وہ شخص جو مومن ہو وہ اس کی طرح ہے جو نافرمان ہو؟ برابر نہیں ہوتے ﴿۱۸﴾ لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے رہنے کے باغات ہیں، مہمانی اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۹﴾**

کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ، قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ اقْرَؤُوْا إِنْ شِئْتُمْ : ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ فلا تعلم نفس ما أخفي ...... ﴾ : ۴۷۷۹۔ مسلم : ۲۸۲۴ ] ”اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال آیا۔“ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر چاہو تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھ لو: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ [ السجدۃ : ۱۷ ] اس مقام پر ابن کثیر رحمہ اللہ نے جنت کی نعمتوں کے بیان میں کئی احادیث ذکر کی ہیں۔

**آیت 18** اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ......: ”فِسْقٌ“ کا لفظ ”فَسَقَتِ الثَّمَرَةُ“ سے نکلا ہے، جب پھل پھٹ کر چھلکے سے نکل جائے، پھر اطاعت سے نکل جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ نافرمان مومن پر بھی بولا جاتا ہے اور کافر پر بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [ النور : ۵۵ ] ”جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ نافرمان ہیں۔“ اس آیت میں فاسق سے مراد کافر و مشرک ہے، کیونکہ مومن کے مقابلے میں آ رہا ہے۔ کفار کے لیے عذاب کی وعید اور مومنوں کے لیے نعمتوں کی نوید کا ذکر آیا تو اس پر کوئی کج بحث کہہ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کیا کمی ہے، وہ چاہے تو جس طرح دنیا میں اس نے مومن و کافر سبھی کو اپنی نعمتیں دے رکھی ہیں، آخرت میں بھی دونوں کو نواز دے۔ فرمایا، یہ تو عدل و حکمت ہی کے خلاف ہے، بھلا ایک ماننے والا اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نہ ماننے والا ہے؟ ایک مطیع و فرماں بردار شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان اور باغی ہے؟ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے، نہ دنیا میں ان کی زندگی کا انداز ایک ہے، نہ موت کے وقت اور نہ آخرت میں ایک ہو گا۔ اس مضمون کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ ص (۲۸)، حشر (۲۰) اور جاثیہ (۲۱) یہ آخرت کے ثواب و عقاب کی نہایت عمدہ دلیل ہے، کیونکہ اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو تو نیک و بد سب یکساں ہو جائیں اور نیک و بد کا یکساں ہو جانا پروردگار عالم کی حکمت کے بالکل خلاف ہے۔

**آیت 19** ① اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى: ”الْمَاْوٰى“ ”أَوٰى يَأْوِيْ“ (ض) (جگہ پکڑنا، پناہ لینا، رہنا) سے ظرف یا مصدر میمی ہے، رہنے کی جگہ یا رہائش۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے صالح عمل کیے ان کے لیے ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں، دنیا کی طرح نہیں جو دارِ زوال ہے اور نہ ہی جہنم کی طرح جو جائے فرار ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۲۰

اور رہے وہ لوگ جنھوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا آگ ہی ہے، جب کبھی چاہیں گے کہ اس سے نکلیں اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا آگ کا وہ عذاب چکھو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۝۲۰

② نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : "نُزُلًا" مہمان کی آمد پر اس کی خاطر تواضع کے لیے جو کچھ پیش کیا جائے۔ جب مہمانی کا یہ عالم ہے تو مزید عنایتوں کا کیا حال ہو گا۔ ان کا کچھ اندازہ اس سے پہلی آیت : ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ اور حدیثِ رسول: (( مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ )) [ مسلم : ۲۸۲٤ ] سے ہو سکتا ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ کسی کے نیک اعمال کو اس کے لیے جنت کی مہمانی کا سبب بنا دے، ورنہ کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَأَبْشِرُوْا، فَإِنَّهُ لَا يُدْخِلُ أَحَدًا الْجَنَّةَ عَمَلُهُ، قَالُوْا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِمَغْفِرَةٍ وَ رَحْمَةٍ )) [ بخاري، الرقاق، باب القصد و المداومة على العمل : ٦٤٦٧ ] "سیدھے رہو، قریب رہو اور خوش خبری سنو، کیونکہ کسی کو بھی اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔" لوگوں نے کہا: "یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی نہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے مغفرت اور رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے۔"

آیت 20 ① وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ : "الَّذِيْنَ فَسَقُوْا" سے مراد کفار ہیں، جیسا کہ پیچھے گزرا۔ "مَاْوٰىهُمْ" کی خبر "النَّارُ" معرف باللام آنے کی وجہ سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا کہ "ان کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔" یعنی کفار کی جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔

② كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ...... : ظاہر ہے جہنم سے کفار کے نکلنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں، تو وہ آگ سے نکلنے کا ارادہ کیسے کریں گے۔ اس کا اندازہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث سے ہوتا ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے کئی چیزوں کا ذکر فرمایا، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خواب میں دکھائیں۔ ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( فَانْطَلَقْنَا إِلٰى ثَقْبٍ مِثْلِ التَّنُّوْرِ أَعْلَاهُ ضَيِّقٌ وَ أَسْفَلُهُ وَاسِعٌ يَتَوَقَّدُ تَحْتَهُ نَارًا فَإِذَا اقْتَرَبَ ارْتَفَعُوْا حَتّٰى كَادَ أَنْ يَخْرُجُوْا، فَإِذَا خَمَدَتْ رَجَعُوْا فِيْهَا، وَ فِيْهَا رِجَالٌ وَنِسَاءٌ عُرَاةٌ، فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا؟ قَالَا انْطَلِقْ...... وَالَّذِيْ رَأَيْتَهُ فِي الثَّقْبِ فَهُمُ الزُّنَاةُ )) [ بخاري، الجنائز، باب : ۱۳۸٦ ] "پھر ہم ایک سوراخ کی طرف چلے جو تنور کی طرح تھا، اس کا اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا کھلا تھا۔ اس کے نیچے سے آگ بھڑک رہی تھی، جب وہ اوپر قریب آتی تو وہ اوپر اٹھ آتے، یہاں تک کہ نکلنے کے قریب ہو جاتے، جب وہ ماند پڑتی تو واپس اسی میں لوٹ جاتے۔ میں نے کہا: "یہ کون ہیں؟" تو دونوں فرشتوں نے کہا: "آگے چلو۔" ...... (تمام مشاہدات کے بعد ان فرشتوں نے بتایا) "تم نے اس سوراخ میں جو کچھ دیکھا وہ زانی لوگ تھے۔" واضح رہے کہ ایک ہی حال میں رہنے میں تکلیف کی وہ شدت نہیں ہوتی جو بار بار اس

وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں ﴿۲۱﴾ اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی، پھر اس نے ان سے منہ پھیر لیا۔ یقیناً ہم ان مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں ﴿۲۲﴾

کے دہرانے سے ہوتی ہے۔ جہنمیوں کے لیے آگ کے ماند ہونے پر ہر مرتبہ اس کی تیزی اور بڑھا دی جائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۹۷ ] ''ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب کبھی بجھنے لگے گی ہم ان پر بھڑکانا زیادہ کر دیں گے۔'' اور فرمایا: ﴿ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾ [ الحج : ۲۲ ] ''جب کبھی ارادہ کریں گے کہ سخت گھٹن کی وجہ سے اس سے نکلیں، اس میں لوٹا دیے جائیں گے۔''

**آیت 21** وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى ...... : یعنی ہم اس بڑے عذاب سے پہلے، جس کا ابھی ذکر ہوا انھیں ایک ادنیٰ عذاب ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ باز آ جائیں۔ مراد آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا کا عذاب ہے، جیسا کہ طبری نے معتبر سند کے ساتھ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: ''اس سے مراد دنیا کی مصیبتیں، بیماریاں اور آزمائشیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ بندوں کو مبتلا کرتا ہے، تاکہ وہ توبہ کر لیں۔'' دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴾ [ التوبة : ۱۲٦ ] ''اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ نصیحت پکڑتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [ الروم : ٤۱ ] ''خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا، تاکہ وہ انھیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا ہے، تاکہ وہ باز آ جائیں۔'' کفار مکہ کے لیے اس سے مراد وہ قتل بھی ہے جس سے وہ جنگ بدر میں دو چار ہوئے اور وہ قحط سالی بھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے ان پر مسلط ہوئی۔ بعض مفسرین نے ''الْعَذَابِ الْاَدْنٰى'' سے مراد عذابِ قبر لیا ہے، مگر آیت کے آخری الفاظ ''لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ'' (تاکہ وہ پلٹ آئیں) سے ظاہر ہے کہ یہ تفسیر درست نہیں، کیونکہ عذابِ قبر کے بعد توبہ اور واپس پلٹنے کا کوئی موقع نہیں۔

**آیت 22** ① وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ...... : یہ استفہام انکاری ہے کہ ''اس سے بڑا ظالم کون ہے؟'' یعنی کوئی نہیں، وہی بڑا ظالم ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی، پھر اس نے ان سے منہ پھیر لیا۔ ''ثُمَّ'' (پھر) کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات بہت بعید اور تعجب والی ہے کہ آیاتِ الٰہی کے ساتھ نصیحت کے بعد بھی اس نے ان سے منہ پھیر لیا۔ وہ آیات (نشانیاں) جن کے ساتھ آدمی کو نصیحت ہوتی ہے، کئی طرح کی ہیں، ایک آفاقی نشانیاں، جو کائنات میں ہر طرف

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پس تو اس سے ملنے کے بارے میں کسی شک میں نہ رہ اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا ﴿۲۳﴾

بکھری ہوئی ہیں، مثلاً سورج، چاند، ستارے، دن رات، ہوا، بارش، سمندر، کشتیاں اور زمین کی نباتات وغیرہ۔ دوسری وہ جو خود انسان کے نفس میں موجود ہیں، یعنی اس کی ساخت، اس میں رکھی گئی عجیب وغریب قوتیں اور استعدادیں اور اس کے اعضا کا حیران کن خودکار نظام۔ ان دونوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ [ حمٓ السجدۃ: ۵۳ ] ”عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں میں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان کے لیے واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے۔“ تیسری وہ تاریخی واقعات جن سے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جس قوم نے بھی اللہ کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور اس کے رسولوں اور اس کی آیات کو جھٹلایا، تو اللہ نے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ سورۂ ابراہیم کی آیت (۵): ﴿ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ﴾ اور سورۂ یوسف کی آیت (۱۱۱): ﴿ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ میں ایسے ہی واقعات کے ساتھ نصیحت اور عبرت مراد ہے۔ چوتھی جو آزمائشوں اور مصیبتوں کی شکل میں ہر شخص اور ہر قوم کے سامنے آتی ہیں، تاکہ وہ پلٹ آئیں، جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہے۔ پانچویں قسم اللہ تعالیٰ کی وہ آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے انبیاء پر نازل فرمائیں۔ ان آیات میں بھی گزشتہ چاروں قسم کی آیات پر غور و فکر کی طرف توجہ دلا کر اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں اور اس کے احکام پر عمل کی دعوت دی جاتی ہے۔

② اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ: ”الْمُجْرِمِيْنَ“ میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ”ان مجرموں سے“ کیا گیا ہے، یعنی آیاتِ الٰہی کے ساتھ نصیحت کے بعد منہ موڑ لینے والے ان مجرموں سے ہم یقیناً انتقام لینے والے ہیں، دنیا میں عذابِ ادنیٰ اور آخرت میں عذابِ اکبر کے ساتھ۔

**آیت 23** وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ: ”لِقَآىِٕهٖ“ کی ضمیر ”الْكِتٰبَ“ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور لفظ ”مُوْسٰى“ کی طرف بھی۔ پہلی صورت میں وہی بات دہرائی ہے جو سورت کے شروع میں فرمائی تھی کہ اس لاریب کتاب کا نازل کرنا رب العالمین کی طرف سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، اب آپ کو کتاب ملی ہے، تو آپ اس کتاب کے ملنے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوں۔ ہماری طرف سے کتاب کا عطا کیا جانا کوئی نئی بات نہیں، ہم پہلے بھی رسولوں کو کتابیں عطا کرتے رہے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَ لَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [ الأحقاف: ۹ ] ”کہہ دے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ کہ)

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۫ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور ہم نے ان میں سے کئی پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، جب انھوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین کیا کرتے تھے ﴿۲۴﴾

تمھارے ساتھ (کیا)، میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور میں تو بس واضح ڈرانے والا ہوں۔'' اس میں اگرچہ اوّل مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر مراد ہر سننے والا ہے کہ کوئی بھی سننے والا رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ملنے میں کسی قسم کے شک میں نہ رہے، آپ کو کتاب ملنا ایسے ہی ہے جیسے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس تفسیر کے مطابق ''الْكِتٰبَ'' سے مراد خاص تورات نہیں، جنس کتاب ہے، یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تو آپ بھی کتاب ملنے ہی کوئی شک نہ کریں۔ اور ''لِقَآءٌ'' سے مراد کتاب کا ملنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ ﴾ [ النمل : ٦ ] ''اور بلاشبہ یقیناً تجھے قرآن ایک کمال حکمت والے، سب کچھ جاننے والے کے پاس سے عطا کیا جاتا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ سے پہلے قریب ترین پیغمبر اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں، مگر ایک تو تمام بنی اسرائیل ان پر ایمان نہیں لائے اور ایک یہ کہ وہ بھی تورات ہی کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بجائے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دینے کا ذکر فرمایا۔ بعض مفسرین نے ''الْكِتٰبَ'' کی طرف ضمیر لوٹانے کی صورت میں یہ معنی کیا ہے کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ملنے کے بارے میں شک نہ کریں۔

دوسری صورت میں یعنی جب ''لِقَآىِٕهٖ'' کی ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف جا رہی ہو تو معنی یہ ہوگا کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں کسی قسم کے شک میں نہ رہیں، جو معراج کی رات بیت المقدس میں اور چھٹے آسمان پر ہوئی، جیسا کہ صحیح بخاری اور دوسری کتبِ احادیث میں مذکور ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( رَأَيْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِيْ مُوْسٰی رَجُلًا آدَمَ طُوَالًا جَعْدًا ، كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَنُوْءَةَ، وَ رَأَيْتُ عِيْسٰی رَجُلًا مَرْبُوْعًا مَرْبُوْعَ الْخَلْقِ إِلَی الْحُمْرَةِ وَ الْبَيَاضِ، سَبْطَ الرَّأْسِ، وَرَأَيْتُ مَالِكًا خَازِنَ النَّارِ وَ الدَّجَّالَ فِيْ آيَاتٍ أَرَاهُنَّ اللّٰهُ إِيَّاهُ ، فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِنْ لِّقَائِهِ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمين و الملائكة في السماء...... : ٣٢٣٩ ] ''میں نے اس رات جب مجھے رات کو لے جایا گیا، موسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھا، بہت لمبے گٹھے ہوئے جسم یا گھونگریالے بالوں والے، گویا وہ شنوءہ قبیلے کے آدمیوں سے ہیں اور میں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھا، میانہ قد، سرخی اور سفیدی کی طرف مائل سیدھے بالوں والے اور میں نے جہنم کے دربان مالک اور دجال کو دیکھا، من جملہ ان کئی اور نشانیوں کے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دکھائیں۔ (سورۂ سجدہ میں اسی کا ذکر ہے کہ) پس تو اس کی ملاقات کے بارے میں کسی شک میں نہ رہ۔''

② وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ : ''جَعَلْنٰهُ'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر کتاب کے لیے ہے، یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو دی جانے والی کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنا دیا۔ پہلے اسی مضمون کی آیت سورۂ بنی اسرائیل (۲) میں گزر چکی ہے۔

**آیت 24** ① وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا : اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ ایسے امام اور پیشوا بنائے جو

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۲۵﴾

بے شک تیرا رب ہی قیامت کے دن ان کے درمیان اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۲۵﴾

لوگوں کی رہنمائی ہمارے حکم کے ساتھ کرتے تھے۔ ظاہر ہے اللہ کے حکم کے ساتھ رہنمائی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کا علم رکھتے ہوں، اس میں بنی اسرائیل کے انبیاء بھی شامل ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ جَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَيۡرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيۡتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوۡا لَنَا عٰبِدِيۡنَ ﴾ [ الأنبياء : ۷۳ ] ''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیاں کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی بھیجی اور وہ صرف ہماری عبادت کرنے والے تھے۔'' اور بنی اسرائیل کے وہ علماء بھی جو ہدایت پر قائم تھے اور لوگوں کو اللہ کے حکم کے مطابق اس ہدایت کی طرف دعوت دیتے تھے۔ یہ ہدایت اللہ کی کتاب تھی اور اس پر ایمان لانے والے دو طرح کے لوگ تھے، ایک وہ ائمہ جو اللہ کے حکم کے مطابق رہنمائی کرتے تھے اور دوسرے ان کے وہ پیروکار جو اس رہنمائی پر عمل کرتے تھے۔ پہلی قسم کے لوگوں کا مقام نبوت کے بعد سب سے بلند ہے، فرمایا: ﴿ يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ۙ وَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ﴾ [ المجادلة : ۱۱ ] ''اللہ ان لوگوں کو درجوں میں بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا۔''

❷ لَمَّا صَبَرُوۡا ۟ؕ وَ كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يُوۡقِنُوۡنَ : یعنی ان ائمہ کو پیشوائی کا یہ مقام دو وجہ سے حاصل ہوا، ایک صبر کی وجہ سے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری پر باندھ کر اور اس کی منع کردہ چیزوں سے روک کر رکھا۔ وہ اللہ کے دین کی دعوت دیتے رہے اور اس کے لیے جہاد کرتے رہے اور انھوں نے اس راستے میں پیش آنے والی ہر مصیبت پر صبر کیا۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین کی وجہ سے کہ وہ دنیاوی فائدوں اور لذتوں میں پھسل جانے والے نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے وعدوں پر یقین رکھنے والے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امامت کا مقام وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو صبر اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین کے وصف سے آراستہ ہوں۔

**آیت 25** ❶ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ ...... : پچھلی آیت میں اس وقت کا ذکر ہے جب بنی اسرائیل نے کتاب اللہ پر عمل کیا، ان کے علماء اور ائمہ خود دین پر قائم رہے، دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور اس راستے میں اپنوں اور بیگانوں کی ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے۔ بعد میں جب وہ دنیا پرستی اور طمع میں مبتلا ہو گئے، جانتے بوجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل کے بجائے اس کی من مانی تاویل بلکہ اس میں تحریف کرنے لگے، ہر ایک نے اپنی مرضی کے مسائل ایجاد کر لیے تو وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر فرقہ اپنے آپ ہی کو سچا قرار دیتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان کے ان اختلافات کے بارے میں تیرا رب ہی قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا۔

اَوَ لَمۡ يَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ يَمۡشُوۡنَ فِىۡ مَسٰكِنِهِمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اَوَ لَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَى الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا تَاۡكُلُ مِنۡهُ اَنۡعَامُهُمۡ وَ اَنۡفُسُهُمۡ ؕ اَفَلَا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾ وَ يَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۸﴾

اور کیا اس بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں، تو کیا یہ نہیں سنتے؟ ﴿۲۶﴾ اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو چٹیل زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر اس کے ذریعے کھیتی نکالتے ہیں جس میں سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں اور وہ خود بھی، تو کیا یہ نہیں دیکھتے؟ ﴿۲۷﴾ اور وہ کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ ﴿۲۸﴾

---

❷ بنی اسرائیل کے ان حالات و واقعات میں امت مسلمہ کے لیے سبق ہے کہ امامت کا مقام کن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور کسی قوم کے عروج و زوال کا باعث کیا چیز ہوتی ہے۔

**آیت 26** **اَوَلَمۡ يَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ** ...... : یہ بات مشرکین عرب کے متعلق فرمائی کہ کیا اس بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا، جن کے تباہ شدہ کھنڈرات اب بھی باقی ہیں، جن میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں اور ان کی ویرانی ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ مراد عرب میں آنے والے پیغمبروں کی امتیں ہیں، یعنی قومِ عاد، ثمود اور اہلِ مدین وغیرہ۔ اہلِ عرب ان کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان اقوام کے حالات زندگی اپنے بزرگوں سے سنتے بھی تھے، پھر بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتے تھے، اس لیے فرمایا: ﴿ **اَفَلَا يَسۡمَعُوۡنَ** ﴾ تو کیا یہ لوگ سنتے نہیں کہ پیغمبروں کی نافرمانی کا انجام کیا ہوتا ہے؟

**آیت 27** **اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَى الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ** ...... : یہ توحید و رسالت کے ساتھ سورت کے تیسرے بنیادی مضمون کا تذکرہ ہے، یعنی کیا ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے بارش کے پانی کے ساتھ بنجر زمین سے کھیتیوں کو پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، جن میں سے وہ بھی کھاتے ہیں اور ان کے چوپائے بھی؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام مُردوں کو دوبارہ زندگی بخش کر حساب کے لیے سامنے لا کر کھڑا کرے گا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۷)، روم (۵۰) اور یٰس (۳۳ تا ۳۵)۔

**آیت 26** **وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ**...... : مشرکین جب قیامت قائم ہونے کے دلائل کے سامنے لاجواب ہوتے تو کہتے، اچھا بتاؤ، یہ فیصلہ کب ہوگا، قیامت کب آئے گی؟ اس سے ان کی جہالت واضح ہوتی ہے کہ جب ایک چیز کا آنا یقینی ہو تو صرف اس وجہ سے اس سے غفلت برتنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس کے وقت کا علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس

قُلۡ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ لَا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِیۡمَانُہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ انۡتَظِرۡ اِنَّہُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۳۰﴾

کہہ دے فیصلے کے دن ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا نہ ان کا ایمان لانا نفع دے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی ﴿۲۹﴾ پس تو ان سے منہ پھیر لے اور انتظار کر، یقیناً وہ (بھی) انتظار کرنے والے ہیں ﴿۳۰﴾

سوال کا متعدد مرتبہ ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ نازعات (۴۲ تا ۴۵) اور بنی اسرائیل (۴۹ تا ۵۱)۔

**آیت 29** **قُلۡ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ لَا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِیۡمَانُہُمۡ** ...... : یعنی تمھارے اس سوال سے تمھیں کچھ حاصل نہیں، تم اس مہلت کو غنیمت سمجھو جو اس وقت تمھیں حاصل ہے۔ کیونکہ فیصلے کا وہ دن آ گیا تو آنکھوں دیکھی حقیقت پا کر نہ تمھارا ایمان لانا تمھیں کچھ فائدہ دے گا اور نہ مزید مہلت ملے گی۔ دیکھیے سورۂ مومن (۸۴، ۸۵)۔

**آیت 30** ① **فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ انۡتَظِرۡ** : جو لوگ قیامت کا انکار محض اس لیے کر رہے ہیں کہ انھیں اس کا وقت نہیں بتایا گیا، انھیں سمجھانا بے سود ہے، آپ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور انتظار کریں کہ اللہ کا وعدہ کب پورا ہوتا ہے، جو ہر حال میں پورا ہو کر رہنے والا ہے۔

② **اِنَّہُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ** : یقیناً وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں کہ آپ اور آپ کی یہ چھوٹی سی جماعت کب زمانے کی کسی گردش کا شکار ہوتی ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۹۸) اور سورۂ طور میں فرمایا: ﴿ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ ﴿۳۰﴾ قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُتَرَبِّصِیۡنَ ﴾ [ الطور : ۳۰، ۳۱ ] ”یا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس پر ہم زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں؟ کہہ دے انتظار کرو، پس بے شک میں (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں۔“

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ ۳۳ مدنیۃ ۹۰ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰیاتھا ۷۳ رکوعاتھا ۹

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے نبی! اللہ سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہنا مت مان۔ یقیناً اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے ①

---

**آیت 1** ① يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ ...... : سورت کا آغاز رسول اللہ ﷺ کو "يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ" کے خطاب سے ہوتا ہے۔ اس میں آپ ﷺ کی تکریم و تشریف مقصود ہے، کیونکہ قرآن مجید میں دوسرے انبیاء کو ان کے ناموں کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، جیسا کہ "يٰۤاٰدَمُ ، يٰنُوْحُ ، يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ، يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ" وغیرہ، مگر آپ ﷺ کو "يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ" اور "يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ" کے ساتھ ہی مخاطب کیا گیا ہے۔

② اس سورت میں آپ ﷺ کو پانچ دفعہ "يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ" کے ساتھ مخاطب فرمایا ہے، ایک یہ آیت، دوسری آیت (۲۸) : ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴾، تیسری آیت (۴۵): ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴾، چوتھی آیت (۵۰) : ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ ﴾ اور پانچویں آیت (۵۹) : ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ ﴾ اس سے ظاہر ہے کہ اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کے ذاتی معاملات کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اگرچہ مقصود امت کی تعلیم بھی ہے۔

③ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ : یہ سورت سن پانچ ہجری کے آخر میں غزوۂ احزاب کے زمانے میں نازل ہوئی۔ یہ وقت رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر نہایت مشکل اور آزمائش کا تھا، کیونکہ قریش، غطفان، ہذیل اور پورے عرب کے مشرکین مل کر اسلام کو مٹانے کی آخری کوشش کے لیے دس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ان کی مدد مدینہ کے یہود اور منافقین بھی کر رہے تھے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ اسی زمانے میں آپ ﷺ کو زمانۂ جاہلیت کی کچھ ایسی رسوم کو توڑنے کا حکم ہوا جو اس وقت سب لوگوں کے ہاں مسلمہ تھیں، مثلاً بیوی کو ماں کہہ دیا جائے تو اسے ماں ہی کی طرح حرام سمجھنا، منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کا مقام دے کر وارث بنانا، اس کی بیوی کے ساتھ بہو کی طرح نکاح حرام سمجھنا وغیرہ۔ متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) بنانے کی یہ رسم اتنی مستحکم تھی کہ جب تک رسول اللہ ﷺ خود اپنے عمل سے اسے نہ توڑتے اس کا ختم ہونا مشکل تھا۔ آپ ﷺ نے نبوت سے پہلے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔ جاہلیت کی رسوم میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ غلام آزاد بھی ہو جائے تو وہ اسے حقیر ہی سمجھتے اور آزاد لوگوں کا درجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلے اس رسم کو توڑا اور اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح، جو نہایت عالی خاندان سے تھیں، اپنے آزاد کردہ غلام زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا، مگر دونوں میں موافقت نہ ہو سکی، تو زید رضی اللہ عنہ نے اسے طلاق دے دی۔ اب

وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾

اور اس کی پیروی کر جو تیرے رب کی جانب سے تیری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یقیناً اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ پورا باخبر ہے ﴿۲﴾

آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیں، کیونکہ اس نے زید سے نکاح کر کے بہت بڑی قربانی دی تھی اور اس کی دل جوئی بھی مقصود تھی۔ مگر ڈر یہ تھا کہ پورے عرب کے مشرکین اور منافقین اس پر طعن و تشنیع کا طوفان برپا کر دیں گے کہ محمد (ﷺ) بہو سے نکاح کو حرام کہتے ہیں اور خود بہو سے نکاح کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ چار بیویوں سے نکاح جائز تھا، اگر آپ ﷺ زینب سے نکاح کرتے تو یہ پانچویں بیوی ہوتی، کیونکہ اس سے پہلے سودہ، عائشہ، حفصہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن آپ کے نکاح میں تھیں۔ اس پر بھی کفار و منافقین کو طعن کا موقع ملتا، اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ''يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ ......'' کہہ کر زیادہ بیویاں رکھنے کی خصوصی اجازت عطا فرمائی۔ غرض اس قسم کی کئی باتوں کی اصلاح کرنا تھی، مگر آپ ﷺ کفار و منافقین کے طوفان اٹھانے کے خوف سے انقباض محسوس کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورت کا آغاز ہی اس بات سے کیا: ''اے نبی! اللہ سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہنا مت مان۔'' یہ لمبی بات کو مختصر کرنے کی ایک خوب صورت مثال ہے، جو یہ تھی کہ اللہ سے ڈر، کفار و منافقین یا کسی اور سے مت ڈر اور اللہ کا حکم مان اور کفار و منافقین کا کہنا مت مان۔

4 اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا : ''اِنَّ'' عموماً تعلیل کے لیے ہوتا ہے، یعنی یہ کسی بات کی وجہ بیان کرتا ہے۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز کا علم رکھنے والا، کمال حکمت والا ہے'' یعنی اس کے احکام، علم و حکمت پر مبنی ہیں، جب کہ کفار کے رسوم و رواج اور ضابطوں کی بنیاد وہم و گمان، جہل اور بے وقوفی پر ہے۔ آگے اس کی تفصیل بیان فرمائی کہ منہ سے کہہ دینے سے کوئی عورت ماں نہیں بن جاتی، نہ کوئی شخص منہ سے کہہ دینے سے بیٹا بن جاتا ہے۔ وہ تقدیس جو حقیقی ماں، بہن، بیٹی اور بہو کے رشتے میں ہوتی ہے، مصنوعی رشتے میں کبھی نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ رشتے عام میل ملاپ کی وجہ سے برائی پھیلنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس لیے کسی کافر یا منافق سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، ایک اللہ سے ڈریں اور اسی کا حکم مان کر جاہلیت کی ان تمام رسوم کا خاتمہ کر دیں۔

5 اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے امت کو تنبیہ کی مؤثر ترین صورت اختیار فرمائی گئی ہے کہ جب یہ حکم سب سے بڑے شخص کو ہے تو دوسروں کے لیے تو اس کی تاکید اس سے بھی زیادہ ہے۔

**آیت 2** 1 وَ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ : یعنی منہ بولے بیٹوں کے متعلق، جاہلیت کی کسی رسم کے متعلق، یا دنیا و آخرت کی کسی بھی بات کے متعلق آپ کسی کافر یا منافق کی بات ماننے کے بجائے اس حکم کی پیروی کریں جو آپ کو آپ کے پروردگار کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔

2 اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا : تم اللہ کی وحی یعنی قرآن و سنت کی پیروی کے بارے میں جو کچھ بھی کرتے ہو، وہ اس

وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۳ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝۴

اور اللہ پر بھروسا کر اور اللہ وکیل کی حیثیت سے کافی ہے ③ اللہ نے کسی آدمی کے لیے اس کے سینے میں دو دل نہیں بنائے اور نہ اس نے تمھاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، تمھاری مائیں بنایا ہے اور نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے بنایا ہے، یہ تمھارا اپنے مونہوں سے کہنا ہے اور اللہ سچ کہتا ہے اور وہی (سیدھا) راستہ دکھاتا ہے ④

---

سے پوری طرح باخبر ہے۔ تم اس کے احکام پر خوش دلی سے عمل کرو یا تنگ دلی سے، یا عمل نہ کرو، وہ تمھیں تمھارے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

③ یہاں جمع کے ساتھ خطاب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پہلے تمام خطاب بھی دراصل پوری امت کے لیے ہیں۔

**آیت 3** **وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** ...... : یعنی اللہ کے احکام پر عمل کرنے کے نتیجے میں کفار و منافقین کی طرف سے جو کچھ کہا جائے یا کیا جائے، اس کی پروا مت کریں، اپنا ہر کام اللہ کے سپرد کر دیں، کیونکہ اس کے سپرد جو کام کر دیا جائے وہ اس کے لیے کافی ہے۔

**آیت 4** ① **مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ** ...... : "أَدْعِيَاءُ" "دَعِيٌّ" (فَعِيْلٌ بمعنی مفعول) کی جمع ہے۔ اصل مقصود کو بیان کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر یہ بات بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں رکھے کہ ایک میں ایمان ہو اور ایک میں کفر۔ سینے میں دل ایک ہی ہے، وہ یا مومن ہوگا یا منافق یا کافر۔ اسی طرح ہر شخص کی ماں ایک ہی ہے، جس کے پیٹ میں سے وہ پیدا ہوا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے بعد کسی کو ماں کہہ دینے سے وہ اس کی ماں بن جائے، نہ تمھارے اپنی بیویوں کو ماں کی طرح حرام کہنے سے وہ ماں بن جاتی ہیں، اور ہر شخص کا باپ بھی ایک ہی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے تو اس کا باپ ایک تھا، پھر کسی نے اس کو بیٹا کہہ دیا تو وہ اس کا باپ بن گیا۔ یہ صرف تمھارے منہ کی باتیں اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی بات کو نہیں مانتا، وہ تو وہی بات کہتا ہے جو حقیقت اور سچ ہے اور وہ اصل سیدھے راستے ہی کی راہ نمائی کرتا ہے۔ ظہار کا لفظ "ظَهْرٌ" سے مشتق ہے، جس کا معنی پیٹھ ہے، یعنی اپنی بیوی کو یہ کہہ دینا کہ تم مجھ پر ماں کی طرح حرام ہو۔ اس کے تفصیلی احکام سورۂ مجادلہ میں آئیں گے۔ منہ بولے بیٹے کے متعلق تفصیل یہاں بیان ہو رہی ہے، اس کی مطلقہ سے نکاح کی تفصیل چند آیات کے بعد آئے گی۔

② ان آیات میں کسی کو منہ بولا بیٹا بنانے سے منع کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں اسے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھا، وہ بیٹا بنانے والے کی ولدیت کے ساتھ مشہور ہوتا اور اس کا وارث قرار پاتا تھا، البتہ محبت اور شفقت کے اظہار کے لیے کسی کو بیٹا

اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآىِٕهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِي الدِّيۡنِ وَمَوَالِيۡكُمۡ ؕ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ ۙ وَلٰكِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۝۵

**انھیں ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے ہاں زیادہ انصاف کی بات ہے، پھر اگر تم ان کے باپ نہ جانو تو وہ دین میں تمھارے بھائی اور تمھارے دوست ہیں اور تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جس میں تم نے خطا کی اور لیکن جو تمھارے دلوں نے ارادے سے کیا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝۵**

کہہ کر پکارا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے انس رضی اللہ عنہ کو ''یا بُنَيَّ'' کہہ کر پکارا۔ [دیکھیے مسلم، الآداب، باب جواز قوله لغير ابنه يا بني ...... : ۲۱۵۱ ] اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ کی رات ہم بنی عبدالمطلب کے چھوٹے لڑکوں کو گدھیوں پر سوار کر کے آگے بھیج دیا تھا، تو اس موقع پر نبی ﷺ ہماری رانوں پر تھپکیاں دے کر فرمانے لگے: (( أُبَيْنِيَّ! لَا تَرْمُوا الْجَمْرَةَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ )) [ أبو داوٗد، المناسك، باب التعجيل من جمع : ۱۹٤۰ ] ''میرے پیارے بیٹو! جب تک سورج طلوع نہ ہو جمرات کو کنکر نہ مارو۔''

آیت 5 ① **اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآىِٕهِمۡ** : یعنی جو متبنّٰی بنائے جا چکے ہیں اب انھیں ان کے باپوں ہی کی نسبت سے پکارو۔ ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اصل باپ کے سوا کسی دوسرے باپ کی طرف منسوب کرنے سے منع کر دیا اور اس کی سخت وعید بیان فرمائی، چنانچہ زید رضی اللہ عنہ کو بھی زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ مَوْلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَا كُنَّا نَدْعُوْهُ إِلَّا زَيْدَ بْنَ مُحَمَّدٍ حَتّٰى نَزَلَ الْقُرْآنُ : ﴿اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآىِٕهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ أدعوهم لآبائهم...... ﴾ : ٤٧٨٢ ] ''رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) زید بن حارثہ کو ہم زید بن محمد ہی کہا کرتے تھے، یہاں تک کہ قرآن اترا: ﴿اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآىِٕهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ﴾ ''انھیں ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے ہاں زیادہ انصاف کی بات ہے۔'' سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنِ ادَّعٰى إِلٰى غَيْرِ أَبِيْهِ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرُ أَبِيْهِ فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ )) [ بخاري، الفرائض، باب من ادعى إلى غير أبيه : ٦٧٦٦ ] ''جس شخص نے اپنے باپ کے غیر کی طرف اپنی نسبت کی اور وہ جانتا ہو کہ وہ اس کا باپ نہیں، تو اس پر جنت حرام ہے۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَا تَرْغَبُوْا عَنْ آبَاءِكُمْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ أَبِيْهِ فَهُوَ كُفْرٌ )) [ بخاري، الفرائض، باب من ادعى إلى غير أبيه : ٦٧٦٨ ] ''اپنے باپوں سے بے رغبتی مت کرو، کیونکہ جس نے اپنے باپ سے بے رغبتی کی تو یہ کام کفر ہے۔'' واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ مِنْ أَعْظَمِ الْفِرٰى أَنْ يَدَّعِيَ الرَّجُلُ إِلٰى غَيْرِ

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ

یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں اور رشتے دار اللہ کی

أَبِيهِ، أَوْ يُرِيَ عَيْنَهُ مَا لَمْ تَرَ، أَوْ يَقُولَ عَلٰى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَا لَمْ يَقُلْ ﴾ [ بخاري، المناقب، باب : ۳۵۰۹ ] ”سب سے بڑے بہتانوں میں سے یہ بات ہے کہ آدمی اپنی نسبت اپنے باپ کے غیر کی طرف کرے، یا اپنی آنکھوں کو وہ دکھائے جو انھوں نے نہیں دیکھا (خواب گھڑ کر سنائے) یا اللہ کے رسول ﷺ کے متعلق وہ بات کہے جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائی۔“

② **هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ:** ”اَقْسَطُ“ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منہ بولا بیٹا بنانے والے کی طرف باپ ہونے کی نسبت کرنا بھی قسط (انصاف) ہے، ہاں، اصل باپ کی طرف نسبت زیادہ انصاف ہے۔ اس کا جواب شعراوی نے یہ دیا ہے کہ زید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا غلام ہوتے ہوئے آپ ﷺ کو اپنے باپ پر ترجیح دے کر آپ کے پاس رہنا پسند کیا اور آپ ﷺ نے اس میں بیٹے جیسی سعادت دیکھ کر اسے بیٹا بنا لیا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے شرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ناراضی کا اظہار نہیں فرمایا۔ ہاں، اصل باپ کی طرف نسبت کو ”اَقْسَطُ“ کہہ کر دوسرے کی طرف نسبت سے منع فرما دیا، کیونکہ حق یہی ہے اور اللہ تعالیٰ حق بات ہی فرماتا ہے۔

③ **فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ مَوَالِيْكُمْ** : ”مَوَالِيْ“ ”مَوْلٰی“ کی جمع ہے، یہاں اس سے مراد دوست ہیں۔ یعنی اگر ان کے باپ معلوم نہ ہوں تو وہ دین میں تمھارے بھائی اور دوست ہیں۔ کسی کی طرف نسبت کے بجائے انھیں ”يَا أَخِيْ، يَا مَوْلَايَ“ (اے میرے بھائی، اے میرے دوست) کہہ کر پکارو۔

④ **وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ......:** یعنی ممانعت سے پہلے تم منہ بولے بیٹوں کو ان کے پرورش کرنے والوں کا بیٹا کہتے رہے، یا کسی کو علم نہ ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے کا بیٹا کہہ دیا، یا بلا ارادہ زبان سے کسی دوسرے کا بیٹا کہہ بیٹھے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ گناہ تو اس میں ہے کہ ممانعت کے بعد دیدہ و دانستہ کسی کو اس کے باپ کے سوا دوسرے کا بیٹا کہو۔ تمھاری خطا پر گناہ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ اس نے خطا اور نسیان کو معاف فرما دیا ہے۔ واضح رہے کہ بعض لوگ منہ بولے بیٹے بنانے کو ان آیات کے ساتھ منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر یہ درست نہیں، کیونکہ منسوخ تو تب ہوتا جب وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا۔ وہ تو اسلام سے پہلے کی ایک رسم تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ختم فرمایا، اسے منسوخ نہیں کہا جا سکتا۔

**آیت 6** ① **اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ** : پچھلی آیات میں منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام کے ساتھ پکارنے کا حکم دیا، جس میں زید رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہ کہنا بھی شامل تھا، تو ضروری تھا کہ نبی کریم ﷺ کا مسلمانوں سے تعلق واضح کیا جائے کہ باپ کی طرف نسبت کی تاکید کو دیکھ کر باپ کے تعلق کو نبی کے تعلق سے زیادہ اہم نہ

اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُہٰجِرِیۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِکُمۡ

کتاب میں ان کا بعض، بعض پر دوسرے ایمان والوں اور ہجرت کرنے والوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے مگر یہ کہ تم

سمجھ لینا، کیونکہ نبی ﷺ کے ساتھ تمھارا جو تعلق ہے وہ باپ ہی نہیں تمھاری جان سے بھی زیادہ قرب کا ہے۔

2 ”اَلنَّبِیُّ“ میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ ”یہ نبی“ کیا گیا ہے۔

3 ”اَوۡلٰی“ کا معنی ”أَقۡرَبُ“ (زیادہ قریب) بھی ہے اور ”أَحَقُّ“ (زیادہ حق رکھنے والا) بھی۔ یہاں اگر معنی ”أَقۡرَبُ“ کیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ کسی قرابت دار کا قُرب آدمی کے ساتھ اتنا نہیں جتنا قُرب نبی ﷺ کا ایمان والوں کے ساتھ ہے۔ اس قرب سے مراد تعلق کا قُرب ہے نہ کہ جسمانی قُرب کہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت ہر مومن کے ساتھ اس کی جان سے بھی زیادہ قریب رہتے ہوں۔ بلکہ جس طرح تمام قرابت دار جہاں بھی ہوں ان کا آپس میں نسبی قُرب اور تعلق قائم رہتا ہے، اسی طرح مومن جہاں بھی ہو اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی قرابت تمام رشتہ داروں حتیٰ کہ اس کی اپنی جان کی قرابت سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ اس کے رشتہ دار، حتیٰ کہ اس کا نفس بھی بعض اوقات اسے نقصان پہنچا سکتا ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ مومنوں کے لیے خیر ہی خیر کا باعث ہیں۔ مگر یہاں ”أَحَقُّ“ کا معنی زیادہ مناسب ہے، بلکہ ”أَقۡرَبُ“ سے مراد بھی ”أَحَقُّ“ (زیادہ حق دار) ہی ہے، یعنی اس قرب کی وجہ سے آپ ﷺ زیادہ حق رکھنے والے ہیں، کیونکہ اس کے متصل بعد رشتہ داروں کے بارے میں یہی لفظ فرمایا: ﴿وَ اُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ﴾ یعنی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی پر رسول اللہ ﷺ کا حق اس کے تمام رشتہ داروں سے، حتیٰ کہ اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان مال میں اپنا تصرف (اتنا) نہیں چلتا جتنا نبی ﷺ کا۔ اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنی روا نہیں اور نبی حکم کرے تو فرض ہے۔“ (موضح) آگے اسی سورت میں فرمایا: ﴿وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِہِمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا﴾ [ الأحزاب : ۳۶ ] ”اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا۔“

اپنی جان سے بھی زیادہ حق رکھنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنی ذات سے بھی بڑھ کر آپ کا حکم مانا جائے۔ ایک طرف دنیا جہاں کے کسی بھی شخص، حتیٰ کہ اپنی ذات کا تقاضا ہو، دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہو تو آپ کے فرمان کو ترجیح دی جائے، اور یہ بات بھی کہ آپ ﷺ کے ساتھ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَ وَلَدِهِ وَ النَّاسِ أَجْمَعِيْنَ » [ بخاري، الإيمان، باب حب الرسول ﷺ من الإيمان : ۱۴، ۱۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا یہاں تک کہ میں اس کے لیے اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ

مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

اپنے دوستوں سے کوئی نیکی کرو۔ یہ (حکم) کتاب میں ہمیشہ سے لکھا ہوا ہے ۝

محبوب نہ ہو جاؤں۔'' ایک دفعہ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ مجھے میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! حَتّٰی أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ )) ''نہیں (اے عمر!) اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب تک میں تیرے لیے تیری جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: (( فَإِنَّهُ الْآنَ، وَاللّٰهِ ! لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ )) ''اب اللہ کی قسم! آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْآنَ يَا عُمَرُ! )) ''اب، اے عمر!'' [ بخاري، الأيمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبي ﷺ ؟: ٦٦٣٢ ] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا مِنْ مُؤْمِنٍ إِلَّا وَأَنَا أَوْلٰی بِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، اقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ : ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [ الأحزاب : ٦ ] فَأَيُّمَا مُؤْمِنٍ مَاتَ وَتَرَكَ مَالًا فَلْيَرِثْهُ عَصَبَتُهُ مَنْ كَانُوْا ، وَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضَيَاعًا فَلْيَأْتِنِيْ فَأَنَا مَوْلَاهُ )) [ بخاري، الاستقراض، باب الصلاة على من ترك دينا : ٢٣٩٩، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''جو بھی مومن ہے، میں دنیا اور آخرت میں اس پر زیادہ حق رکھنے والا، یا سب سے زیادہ اس سے قرب رکھنے والا ہوں، چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ تو جو مومن کوئی مال چھوڑ جائے اس کے وارث اس کے عصبہ ہوں گے، جو بھی ہوں اور جو کوئی قرض یا بال بچے چھوڑ جائے تو (اس کا وارث) میرے پاس آئے، میں اس کا ولی ہوں۔''

④ **وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ** : نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کی بنا پر جو اوپر ذکر ہوئی، ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی منہ بولی مائیں تو کسی معنی میں بھی ان کی مائیں نہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ مائیں ہونے سے مراد ان کی تعظیم و تکریم ہے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان سے نکاح جائز نہیں۔ دوسرے احکام مثلاً خلوت، پردہ، ان کی اولاد سے شادی وغیرہ میں وہ ان کی ماں کی طرح نہیں۔

⑤ **وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ** ...... : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی آباد کاری اور معاشی ضرورتوں کے لیے ایک مہاجر اور ایک انصاری کو آپس میں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا، اسے مؤاخات کہتے ہیں۔ یہ بھائی چارہ اتنا بڑھا کہ وہ ایک دوسرے کے وارث اور ولی قرار پا گئے۔ فوت ہونے پر مہاجر کی میراث رشتہ داروں کے بجائے اس کے انصاری بھائی کو ملتی اور انصاری کی میراث مہاجر کو ملتی۔ سورۂ احزاب کی اس آیت میں اس کے منسوخ ہونے کا حوالہ دیا گیا۔ دیکھیے سورۂ انفال (۷۲ تا ۷۵) یہاں ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ منہ کے ساتھ کہنے سے نہ کوئی ماں بنتی ہے، نہ بیٹا، نہ ہی بھائی، اس لیے اب وراثت کے زیادہ حق دار رشتے کے بھائی ہیں، نہ کہ حلیف ہونے یا عقد مؤاخات کی وجہ سے بننے والے بھائی۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۟ۙ

اور جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا پختہ عہد لیا اور تجھ سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا۔

⑥ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِيٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا : یعنی اپنے مومن یا مہاجر بھائیوں کے ساتھ میراث کے سوا کوئی نیکی کرو تو درست ہے، مثلاً زندگی میں ان سے احسان والا سلوک کرو، انھیں ہدیہ وغیرہ دو، مرنے کے بعد ان کے حق میں ثلث تک وصیت کر جاؤ، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

⑦ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا : یعنی لوحِ محفوظ میں اصل حکم یہی ہے، گو لوگوں نے دوسروں کو وارث بنانے کا رواج بنا لیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ منسوخ ہوگا، اس لیے اسے منسوخ کر کے اصل حکم بحال کر دیا ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم کتاب اللہ، یعنی قرآن مجید میں پہلے لکھا جا چکا ہے، کیونکہ یہ حکم سورۂ انفال (۷۲ تا ۷۵) میں نازل ہوا جو سورۂ احزاب سے پہلے نازل ہوئی۔ (ابن عاشور)

آیت 7 ① وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ ...... : جاہلی معاشرے میں منہ بولے بیٹوں کی ان کے باپ کی طرف نسبت کرنے کے حکم، پھر آپ ﷺ کے متبنّٰی زید رضی اللہ عنہ کی طلاق کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کے حکم پر عمل نہایت مشکل تھا، کیونکہ متبنّٰی کا مسئلہ ان کے دینی عقیدے کی شکل اختیار کر چکا تھا اور ان کے رگ وپے میں رچ چکا تھا۔ پھر زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح میں طرح طرح کی باتوں کا اندیشہ بھی تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس عہد کی طرف توجہ دلائی جو اس نے تمام انبیاء سے اور خود رسول اللہ ﷺ سے لیا، جس میں ان پر یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ ہر حال میں احکام پر عمل کرنے میں اور انھیں لوگوں تک پہنچانے میں کوئی تنگی محسوس نہیں کریں گے، نہ ہی اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے ڈریں گے۔ یہی بات اس سورۂ احزاب میں دوبارہ زیادہ تفصیل کے ساتھ آیت (۳۸، ۳۹) میں آ رہی ہے۔ انبیاء سے لیے جانے والے میثاق کا ذکر سورۂ احزاب کی اس آیت اور آیت (۳۸، ۳۹) کے علاوہ سورۂ آل عمران کی آیت (۸۱) اور سورۂ شوریٰ کی آیت (۱۳) میں بھی آیا ہے کہ ہر پیغمبر دوسرے تمام پیغمبروں کی تصدیق کرے گا، اپنے آپ پر اور لوگوں پر دین قائم کرے گا۔ دین میں تفرقے سے بچے گا۔ مشرکین پر گراں گزرنے کے باوجود اللہ کے دین کی دعوت میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

② وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ ...... : تمام انبیاء سے عہد لینے کے بعد پانچ پیغمبروں کا نام لے کر عہد لینے کی صراحت فرمائی۔ اس سے ان پیغمبروں کی شان کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر پیغمبر کی دعوت مدت دراز تک جاری رہی، پھر سب سے آخر میں آنے کے باوجود ہمارے نبی کریم ﷺ کا نام پہلے ذکر فرمایا۔ آپ کے بعد باقی انبیاء کا نام ان کے تشریف لانے کی ترتیب کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اس میں آپ ﷺ کی رفعت کا اظہار مقصود ہے اور یہ بھی کہ یہاں اس عہد کا ذکر خاص آپ کے لیے کیا

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۸ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

تاکہ وہ سچوں سے ان کے سچ کے بارے میں سوال کرے اور اس نے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے ⑧ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم پر کئی لشکر چڑھ آئے تو ہم نے

گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس مقام پر لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگرچہ دنیا میں سب سے آخر میں تشریف لائے، مگر وجود میں سب سے پہلے آئے، یعنی سب سے پہلے پیدا ہوئے، مگر یہ بات بالکل بے دلیل ہے۔ جس حدیث میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ کب سے نبی ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( كُنْتُ نَبِيًّا وَ آدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَ الْجَسَدِ )) [ مستدرك حاكم : ۲/ ۶۰۸، ح : ۴۲۰۹ ] (میں اس وقت نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں آپ ﷺ کے نبی طے ہونے کا بیان ہے۔ یہ معنی نہیں کہ آپ اس وقت پیدا ہو چکے تھے، کیونکہ آپ ﷺ کا سب سے آخر میں پیدا ہونا سب کو معلوم ہے۔

③ خصوصاً نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینے کی تاکید کا ذکر سورۂ مائدہ (۶۷) میں ہے اور اہل کتاب کو اس تاکید کا ذکر سورۂ آل عمران (۱۸۷) اور اعراف (۱۶۹) میں ہے۔

④ اس مقام پر اس عہد کو یاد دلانے اور بالخصوص "مِنْكَ" کہنے سے مراد یہ ہے کہ آپ جو منہ بولے رشتوں کے معاملے میں جاہلیت کی رسم توڑنے سے جھجک رہے ہیں اور دشمنوں کے طعن و تشنیع سے ڈر رہے ہیں، تو آپ لوگوں کے طعن و تشنیع کی قطعاً پروا نہ کریں، دوسرے پیغمبروں کی طرح آپ سے بھی ہمارا پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی ہم آپ کو حکم دیں گے اسے بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا جو فریضہ ہم نے آپ پر عائد کیا ہے اسے بلا تامل سرانجام دیں اور کفار و منافقین کی باتوں کی پروا مت کریں، ان سے آپ کو محفوظ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے، فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [ المائدۃ : ۶۷ ] ''اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔''

**آیت 8** لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ......: یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ عہد محض قول و قرار کے لیے نہیں لیا، بلکہ اس لیے لیا ہے کہ وہ قیامت کے دن پیغمبروں سے سوال کرے گا کہ کیا تم نے قوم کو میرا پیغام پہنچایا؟ پھر قوم نے تمھیں کیا جواب دیا اور دعوت کا نتیجہ کیا ہوا؟ پیغمبروں سے جو عہد لیا، وہ ان کی امت کے لوگوں کے لیے بھی ہے اور ''صادقین'' کا لفظ بھی عام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مومن سے بھی اس عہد کے متعلق سوال ہوگا، پھر جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے اس عہد کو پورا کیا وہی صادق قرار پائیں گے اور اجر کے مستحق ہوں گے اور جنھوں نے اس کا انکار کیا، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

**آیت 8** ① يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ......: سورت کے شروع میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے تقویٰ کا حکم دیا اور اس کا ہر حکم علی الاعلان سنا دینے اور کفار و منافقین کی پروا نہ کرتے ہوئے اس پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اور اس

وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۹

ان پر آندھی بھیج دی اور ایسے لشکر جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے خوب دیکھنے والا تھا ۹

معاملے اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ پر توکل کا حکم دیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور اس پر توکل کی صورت میں اس کے کافی ہو جانے کی دلیل کے طور پر جنگِ احزاب میں مسلمانوں کو اپنی نصرت کی نعمت یاد دلائی، یہ جنگ مسلمانوں کو پیش آنے والی تمام جنگوں سے زیادہ خوف ناک تھی۔ اس میں بتایا ہے کہ جب اللہ کے فرماں بردار بندے صرف اللہ پر توکل کرتے ہیں تو وہ ایسے لشکروں کے ساتھ ان کی مدد کرتا ہے جو نظر بھی نہیں آتے۔ اس آیت میں ”يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا“ کے ساتھ مسلمانوں کو مخاطب فرمایا، معلوم ہوا کہ اس سے پہلے نبی ﷺ کو خطاب بھی تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ آپ ﷺ کا ذکر اس لیے ہے کہ جب نبی اس حکم کی تعمیل کا پابند ہے تو امت تو بدرجۂ اولیٰ اس کی تعمیل کی پابند ہوگی۔ (بقاعی)

2 ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہ غزوۂ خندق کا ذکر ہے، جسے غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے، جو صحیح اور مشہور روایات کے مطابق شوال سن پانچ ہجری میں واقع ہوا۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ سن چار (۴) ہجری میں نبی ﷺ نے مدینہ کے یہودی قبیلہ بنونضیر کو مدینہ کی سرزمین سے جلا وطن کر دیا تھا۔ اس کے کچھ اشراف (سرکردہ لوگ) مکہ گئے اور سرداران قریش سے ملاقات کر کے انھیں نبی ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے رہے اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر تم مدینہ پر حملہ کرو تو ہم تمھارا ساتھ دیں گے اور ہر طریقے سے تمھاری مدد کریں گے۔ جب قریش نے آمادگی کا اظہار کیا تو وہ نجد کے قبائل غطفان اور ہذیل وغیرہ کی طرف گئے اور انھیں بھی مدینہ پر حملے کے لیے اکسایا اور ہر ممکن طریقے سے امداد کرنے کا وعدہ کیا، یہاں تک کہ وہ بھی آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ سن پانچ (۵) ہجری میں ایک طرف ابوسفیان کی سرکردگی میں قریش اور ان کے حلیف قبائل کا لشکر اور دوسری طرف غطفان، ہذیل اور ان کے حلیف قبائل کا لشکر عیینہ بن حصن کی سرکردگی میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے پہنچ گئے اور جنوب اور مشرق سے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ شمال کی طرف سے بنونضیر اور بنوقینقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینہ سے جلا وطن ہونے کے بعد خیبر اور وادی القریٰ میں آباد ہو گئے تھے۔ مجموعی طور پر ان سب کی تعداد دس ہزار تھی۔ نبی ﷺ نے حالات کا اندازہ کر کے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے ان سمتوں میں خندق کھدوائی اور عام مسلمانوں کے ساتھ خود بھی زمین کھودنے اور مٹی اٹھانے کا کام کرتے رہے۔ پیچھے یعنی مغرب کی سمت میں قبیلہ بنوقریظہ کے یہودی آباد تھے، جو مسلمانوں کے حلیف تھے، اس لیے مسلمان ان کی طرف سے بے فکر تھے، بلکہ انھوں نے اپنے بال بچے ان گڑھیوں میں بھیج دیے تھے جو ان کی جانب تھیں۔ لیکن بنونضیر کا سردار حُیی بن اخطب ان کے پاس پہنچا اور انھیں حالات کی سازگاری کا واسطہ دے کر مسلمانوں سے بدعہدی پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح گویا مدینہ منورہ ہر طرف سے مشرکوں اور یہودیوں کے نرغہ میں آ گیا۔ ان آیات میں انھی نازک حالات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا احسان و انعام بیان کیا ہے۔“ (اشرف الحواشی) واضح رہے کہ قرآن مجید میں اس غزوہ کی تفصیل مؤرخین کے طریقے والی ترتیب پر نہیں، بلکہ نصیحت و عبرت

کے اعتبار سے بیان ہوئی ہے، اس لیے واقع ہونے کے لحاظ سے کئی بعد والی باتیں پہلے بیان ہوئی ہیں اور کئی پہلے والی بعد میں۔

3 غزوۂ احزاب میں کفار کی تعداد دس ہزار تھی، جب کہ مشہور قول کے مطابق مسلمان تین ہزار تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ نو سو تھے۔ ابن حزم نے ''جوامع السیرۃ'' میں فرمایا: ''یہی بات صحیح ہے بلاشک اور پہلی وہم ہے۔'' اس وقت مسلمانوں کی حالت کا نقشہ پیش کرنے کے لیے چند احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کی طرف نکلے تو مہاجرین و انصار سردی میں صبح صبح خندق کھود رہے تھے، ان کے پاس کوئی غلام نہ تھے، جو ان کے بجائے یہ کام سرانجام دیتے، تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشقت اور بھوک کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا ؎

اَللّٰهُمَّ إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْآخِرَهْ فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَ الْمُهَاجِرَهْ

''اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے، سو تو انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔''

صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں کہا ؎

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا أَبَدًا

''ہم وہ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاد پر بیعت کی ہے، ہمیشہ کے لیے، جب تک ہمارے جسم میں جان باقی ہے۔''

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جواب میں کہتے ؎

اَللّٰهُمَّ إِنَّهُ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَهْ فَبَارِكْ فِي الْأَنْصَارِ وَ الْمُهَاجِرَهْ

''اے اللہ! خیر تو بس آخرت ہی کی خیر ہے، سو تو انصار و مہاجرین میں برکت فرما۔''

انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (( يُؤْتَوْنَ بِمِلْءِ كَفَّيَّ مِنَ الشَّعِيْرِ فَيُصْنَعُ لَهُمْ بِإِهَالَةٍ سَنِخَةٍ تُوْضَعُ بَيْنَ يَدَيِ الْقَوْمِ ، وَالْقَوْمُ جِيَاعٌ ، وَهِيَ بَشِعَةٌ فِي الْحَلْقِ وَلَهَا رِيْحٌ مُنْتِنٌ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب : ۴۰۹۹، ۴۱۰۰ ] ''صحابہ کرام کو دو ہتھیلیاں بھرنے کے برابر جو دیے جاتے، ان کے لیے اس سے بدلی ہوئی بو والی چربی کے ساتھ کھانا تیار کیا جاتا، جو لوگوں کے سامنے رکھا جاتا، وہ بھوکے ہوتے، یہ کھانا ان کے گلوں میں اٹکتا جس میں ناگوار بو ہوتی۔''

جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (( إِنَّا يَوْمَ الْخَنْدَقِ نَحْفِرُ فَعَرَضَتْ كُدْيَةٌ شَدِيْدَةٌ، فَجَاءُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالُوْا هٰذِهِ كُدْيَةٌ عَرَضَتْ فِي الْخَنْدَقِ ، فَقَالَ أَنَا نَازِلٌ ثُمَّ قَامَ وَ بَطْنُهُ مَعْصُوْبٌ بِحَجَرٍ ، وَ لَبِثْنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ لَا نَذُوْقُ ذَوَاقًا، فَأَخَذَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْمِعْوَلَ فَضَرَبَ فِي الْكُدْيَةِ، فَعَادَ كَثِيْبًا أَهْيَلَ أَوْ أَهْيَمَ، فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! ائْذَنْ لِيْ إِلَى الْبَيْتِ فَقُلْتُ لِامْرَأَتِيْ رَأَيْتُ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ شَيْئًا، مَا كَانَ فِيْ ذٰلِكَ صَبْرٌ، فَعِنْدَكِ شَيْءٌ؟ قَالَتْ عِنْدِيْ شَعِيْرٌ وَعَنَاقٌ ، فَذَبَحْتُ الْعَنَاقَ وَطَحَنَتِ الشَّعِيْرَ، حَتّٰى جَعَلْنَا اللَّحْمَ فِي الْبُرْمَةِ، ثُمَّ جِئْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَالْعَجِيْنُ قَدِ انْكَسَرَ، وَالْبُرْمَةُ بَيْنَ الْأَثَافِيِّ قَدْ كَادَتْ أَنْ تَنْضَجَ فَقُلْتُ طُعَيِّمٌ لِيْ ، فَقُمْ أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ رَجُلٌ أَوْ رَجُلَانِ ، قَالَ كَمْ هُوَ؟ فَذَكَرْتُ لَهُ ،

قَالَ كَثِيرٌ طَيِّبٌ قَالَ قُلْ لَّهَا لَا تَنْزِعِ الْبُرْمَةَ وَ لَا الْخُبْزَ مِنَ التَّنُّورِ حَتّٰى آتِيَ فَقَالَ قُوْمُوْا، فَقَامَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَ الْأَنْصَارُ، فَلَمَّا دَخَلَ عَلَى امْرَأَتِهِ قَالَ وَيْحَكِ، جَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَمَنْ مَعَهُمْ، قَالَتْ هَلْ سَأَلَكَ؟ قُلْتُ نَعَمْ، فَقَالَ ادْخُلُوْا وَلَا تَضَاغَطُوْا فَجَعَلَ يَكْسِرُ الْخُبْزَ وَ يَجْعَلُ عَلَيْهِ اللَّحْمَ، وَيُخَمِّرُ الْبُرْمَةَ وَالتَّنُّوْرَ إِذَا أَخَذَ مِنْهُ، وَيُقَرِّبُ إِلٰى أَصْحَابِهِ ثُمَّ يَنْزِعُ، فَلَمْ يَزَلْ يَكْسِرُ الْخُبْزَ وَ يَغْرِفُ حَتّٰى شَبِعُوْا وَ بَقِيَ بَقِيَّةٌ قَالَ كُلِيْ هٰذَا وَ أَهْدِيْ، فَإِنَّ النَّاسَ أَصَابَتْهُمْ مَجَاعَةٌ ﴾ [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق و هي الأحزاب : ٤١٠١ ] ''خندق کے دن ہم کھدائی کر رہے تھے، تو ایک سخت چٹان پیش آ گئی۔ صحابہ نبی ﷺ کے پاس آئے اور بتایا کہ یہ ایک سخت چٹان پیش آ گئی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''میں اترتا ہوں۔'' چنانچہ آپ ﷺ اٹھے، آپ کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ ہمیں تین دن گزر چکے تھے کہ ہم نے کوئی چیز چکھی تک نہ تھی۔ نبی ﷺ نے کدال پکڑی، چٹان پر ماری تو وہ بھربھرے تودے کی طرح ہو گئی۔ میں نے کہا: ''یا رسول اللہ! مجھے گھر جانے کی اجازت دیں۔'' گھر جا کر میں نے بیوی سے کہا: ''میں نے نبی ﷺ کی ایسی حالت دیکھی ہے جس پر مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا، تو تیرے پاس کچھ (کھانے کے لیے) ہے؟'' اس نے کہا: ''میرے پاس کچھ جو اور ایک بکری کی پٹھوری ہے۔'' میں نے پٹھوری ذبح کی، اس نے جو پیسے اور ہم نے گوشت ہانڈی میں ڈال دیا۔ پھر میں نبی ﷺ کے پاس آیا، اتنے میں آٹا پکنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور ہانڈی چولھے پر پکنے کے قریب تھی۔ میں نے جا کر کہا: ''تھوڑا سا کھانا ہے یا رسول اللہ! آپ اور آپ کے ساتھ ایک یا دو آدمی چلیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کتنا ہے؟'' میں نے بتایا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بہت ہے اور عمدہ ہے، بیوی سے کہو کہ میرے آنے تک نہ ہانڈی اتارے اور نہ تنور سے روٹی نکالے۔'' آپ نے صحابہ سے فرمایا: ''چلو۔'' مہاجرین و انصار اٹھ کھڑے ہوئے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیوی کے پاس گئے اور اسے کہنے لگے: ''تجھ پر افسوس ہو! نبی ﷺ مہاجرین و انصار اور جو بھی ان کے ساتھ ہیں انھیں لے کر آ رہے ہیں۔'' اس نے کہا: ''آپ ﷺ نے تم سے پوچھا تھا؟'' میں نے کہا: ''ہاں!'' خیر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اندر آ جاؤ اور بھیڑ نہ کرو۔'' آپ روٹی توڑ توڑ کر اس پر گوشت ڈالتے رہے۔ ہانڈی اور تنور سے سالن اور روٹی نکالنے کے بعد اسے ڈھانک دیتے اور صحابہ کے سامنے رکھ دیتے، پھر دوبارہ اسی طرح کرتے، آپ روٹی اور سالن ڈالتے رہے، یہاں تک کہ سب سیر ہو گئے اور کھانا بچ بھی گیا تو جابر کی بیوی سے فرمایا: ''کھاؤ اور ہدیہ بھی دو، لوگوں کو بھوک آ پہنچی ہے۔'' اس سے اگلی روایت میں جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اُدْعُ خَابِزَةً فَلْتَخْبِزْ مَعَكِ ﴾ ''اپنے ساتھ روٹیاں پکانے والی ایک اور عورت بلا لو۔'' اور جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ ایک ہزار تھے اور اللہ کی قسم! وہ کھا کر کھانا چھوڑ گئے، ہانڈی اسی طرح اُبل رہی تھی اور آٹا پکایا جا رہا تھا۔'' [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق و هي الأحزاب : ٤١٠٢ ] اس حدیث سے ابن حزم کی بات کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا لشکر تین ہزار نہیں بلکہ ایک ہزار کے قریب تھا۔

کفار کا خندق کو عبور کرنے کے لیے اتنا زبردست دباؤ تھا کہ مسلسل دفاع کی وجہ سے بعض اوقات آپ کی نماز بھی رہ جاتی اور آپ بعد میں ادا کرتے۔ جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''عمر رضی اللہ عنہ خندق کے موقع پر سورج غروب ہونے کے بعد آئے اور قریش کو

برا بھلا کہتے ہوئے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! یا رسول اللہ! میں نماز کے قریب بھی نہیں جا سکا، حتیٰ کہ سورج ڈوبنے کے قریب پہنچ گیا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَاللّٰهِ! مَا صَلَّيْتُهَا )) ''اللہ کی قسم! میں نے بھی (عصر) نہیں پڑھی۔'' تو ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بطحان میں اترے، آپ نے اور ہم نے نماز کے لیے وضو کیا، تو آپ نے سورج غروب ہونے کے بعد عصر پڑھی، پھر مغرب پڑھی۔'' [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب : ٤١١٢ ] عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب (اتحادی لشکروں) کے خلاف بد دعا کی اور عرض کیا: (( اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ! سَرِيْعَ الْحِسَابِ! اِهْزِمِ الْأَحْزَابَ، اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَ زَلْزِلْهُمْ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب : ٤١١٥ ] ''اے اللہ! اے کتاب نازل کرنے والے! بہت جلد حساب لینے والے! ان لشکروں کو شکست دے۔ اے اللہ! انھیں شکست دے اور انھیں سخت ہلا کر رکھ دے۔'' اللہ تعالیٰ نے ''**جُنُوْدًا**'' کا لفظ ارشاد فرمایا، حالانکہ اس کا واحد ''جُنْدٌ'' (لشکر) بھی بڑی تعداد کے اظہار کے لیے کافی تھا، لیکن کیونکہ یہ مختلف گروہ تھے، قریش مکہ، بنو غطفان وغیرہ، اس لیے ''**جُنُوْدًا**'' کا لفظ استعمال فرمایا۔

④ **فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا** : الرحیق المختوم میں ہے: ''مشرکین نے مدینہ کا محاصرہ ایک ماہ یا ایک ماہ کے قریب جاری رکھا تھا۔'' آزمائش کے یہ ایام بہت سخت تھے۔ اس دوران مسلمانوں کی حالت اس کے بعد والی آیات میں بیان ہوئی ہے۔ کفار اس ارادے سے آئے تھے کہ مسلمانوں کا نام و نشان مٹا کر دم لیں گے اور جاتے ہی مردوں کو قتل کر کے عورتوں اور بچوں کو باندھ کر ساتھ لے آئیں گے۔ دس ہزار کے مقابلے میں ایک ہزار کی حیثیت ہی کیا تھی، مگر اللہ کی توفیق سے خندق کی وجہ سے وہ نہ مدینہ میں داخل ہو سکے، نہ انھیں کوئی کامیابی حاصل ہو سکی۔ وہ تو ایک ہلّے میں فتح کا منصوبہ لے کر آئے تھے، لیکن یہاں انھیں محاصرے کے لیے ایک ماہ رکنا پڑا، جس کے لیے وہ تیار ہو کر نہیں آئے تھے، نہ ہی ان کے پاس اتنے دن رہنے کے لیے درکار خور و نوش کی اور دوسری اشیاء موجود تھیں، اس لیے وہ ہر لمحے زیادہ سے زیادہ قوت سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ مسلمانوں نے اگرچہ اپنی حد تک مدافعت کی، مگر ان کی تعداد، ان کی تیاری اور تدابیر ہرگز ایسی نہ تھیں کہ ان لشکروں کا مقابلہ کر سکتیں، لیکن ان کی حالتِ زار دیکھ کر اور ان کی فریاد سن کر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور غیب سے ان کی مدد فرمائی۔ یہ مدد دو چیزوں پر مشتمل تھی، ایک سخت آندھی اور دوسرے ایسے لشکر جو مسلمانوں کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ ''**رِيْحًا**'' سے مراد وہ نہایت سرد اور سخت آندھی ہے جس سے کفار کے خیمے اکھڑ گئے، ان کے چولھوں کی آگ بجھ گئی، دیگیں الٹ گئیں، گھوڑے اور اونٹ رسیاں تڑوا کر بھاگ گئے اور ان پر ایسا شدید خوف طاری ہوا کہ وہ راتوں رات محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق و هي الأحزاب : ٤١٠٥ ] ''میری مدد صبا (مشرق سے آنے والی ہوا) کے ساتھ کی گئی اور عاد کو دبور (مغرب سے آنے والی ہوا) کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔''

⑤ **وَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا** : ان لشکروں سے مراد فرشتوں کے لشکر ہیں، جنھوں نے کفار کے دلوں میں رعب ڈال کر ان کی ہمتیں توڑ دیں اور انھیں تتر بتر کر دیا۔ بعض حضرات نے لکھ دیا کہ غزوۂ خندق میں فرشتوں کا اترنا صحیح احادیث سے صراحت کے

ساتھ ثابت نہیں، مگر یہ بات درست نہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں: « لَمَّا رَجَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنَ الْخَنْدَقِ وَ وَضَعَ السِّلَاحَ وَاغْتَسَلَ، أَتَاهُ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ قَدْ وَضَعْتَ السِّلَاحَ وَاللّٰهِ! مَا وَضَعْنَاهُ، فَاخْرُجْ إِلَيْهِمْ قَالَ فَإِلٰى أَيْنَ؟ قَالَ هَاهُنَا، وَأَشَارَ إِلٰى بَنِيْ قُرَيْظَةَ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِلَيْهِمْ » [ بخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب...... : ٤١١٧ ] ''جب رسول اللہ ﷺ خندق سے واپس آئے، ہتھیار اتار دیے اور غسل کیا تو جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''آپ نے ہتھیار اتار دیے، اللہ کی قسم! ہم نے تو نہیں اتارے، سو آپ ان کی طرف نکلیے۔'' آپ نے فرمایا: ''کس طرف؟'' انھوں نے بنو قریظہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اس طرف۔'' تو نبی ﷺ ان کی طرف نکل پڑے۔'' انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: « كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلَى الْغُبَارِ سَاطِعًا فِيْ زُقَاقِ بَنِيْ غَنْمٍ مَوْكِبِ جِبْرِيْلَ حِيْنَ سَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِلٰى بَنِيْ قُرَيْظَةَ » [ بخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب...... : ٤١١٨ ] ''گویا کہ میں وہ غبار چمکتا ہوا دیکھ رہا ہوں جو جبریل علیہ السلام کی سواری سے بنو غنم کی گلی میں اٹھ رہا تھا، جب رسول اللہ ﷺ بنی قریظہ کی طرف گئے۔''

رسول اللہ ﷺ کے غزوات میں فرشتوں کے نزول اور اس کے جنود کی آمد کا ذکر قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، جنگ حنین میں فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ [ التوبة : ٢٦ ] ''پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم نے نہیں دیکھے۔'' یہ ''جنود'' فرشتے تھے، اس کی وضاحت غزوۂ بدر کے بیان میں سورۂ انفال میں آئی ہے، فرمایا: ﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴾ [ الأنفال : ١٢ ] ''جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں، عنقریب میں ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دوں گا۔ پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ۔'' سورۂ توبہ میں غار کے اندر رسول اللہ ﷺ کی مدد نظر نہ آنے والے انھی لشکروں کے ساتھ کرنے کا ذکر فرمایا: ﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [ التوبة : ٤٠ ] ''اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے ان لوگوں نے نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی کفار کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں میں بارہا فرشتوں کے نزول کا مشاہدہ ہوا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسے کئی واقعات پیش آئے ہیں، شرط اعلائے کلمۃ اللہ

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰

جب وہ تم پر تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے آ گئے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں گمان کرتے تھے، کئی طرح کے گمان ⑩

کے لیے جہاد اور اس پر استقامت ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انفال کی آیت (۱۰) کی تفسیر۔

❻ یہ جنگ کفار کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی سب سے بڑی مہم تھی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ اس کے بعد اتنے لشکر کبھی جمع نہ کر سکے، نہ پھر انھیں مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت ہو سکی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی پیش گوئی پہلے ہی فرما دی۔ سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ لشکر آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا، نَحْنُ نَسِيْرُ إِلَيْهِمْ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب : ۴۱۱۰ ] ”اب ہم ان پر حملہ آور ہوں گے، وہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوں گے، ہم ان کی طرف پیش قدمی کریں گے۔“

❼ رسول اللہ ﷺ کسی قسم کے فخر یا غرور کے بجائے ان لشکروں کی شکست کو ہمیشہ اپنے اکیلے رب کا کام قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کہا کرتے تھے: (( لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، أَعَزَّ جُنْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَ غَلَبَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ، فَلَا شَيْءَ بَعْدَهُ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب : ۴۱۱۴ ] ”اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس نے اپنے لشکر کو غلبہ عطا فرمایا اور اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلا تمام جماعتوں پر غالب آیا، سو اس کے بعد کوئی چیز نہیں۔“

❽ **وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا** : یعنی تم دشمن کے مقابلے میں جو کچھ کر رہے تھے، خندق کھود رہے تھے، بھوک پیاس اور خوف کی سختیاں برداشت کر رہے تھے اور استقامت اختیار کیے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ سب کچھ خوب دیکھ رہا تھا، سو اس نے تمھاری حالت دیکھ کر غیب سے تمھاری مدد فرمائی۔

**آیت 10** ❶ **اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ** : اس سے مراد مدینہ کا بالائی حصہ، یعنی مشرقی جانب ہے۔ اس طرف سے عیینہ بن حصن کی قیادت میں قبیلہ غطفان، عوف بن مالک کی قیادت میں قبیلہ ہوازن اور طلیحہ بن خویلد اسدی کی قیادت میں نجد کے قبائل آئے اور ان کے ساتھ بنو نضیر کے یہودی بھی مل گئے۔

❷ **وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ** : نیچے کی جانب سے مراد مدینے کا مغربی حصہ ہے۔ اس طرف سے ابوسفیان بن حرب کی قیادت میں کفار مکہ اور کچھ دوسرے لوگ آئے۔ عین حالت جنگ میں بنو قریظہ نے بھی صلح توڑ دی اور دشمن کے ساتھ مل گئے۔

❸ **وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ** : ” زَاغَ يَزِيْغُ زَيْغًا “ (ض) کا معنی ہے ”مَالَ“ یعنی جھکنا، ٹیڑھا ہونا۔ سورۂ نجم میں ہے: ﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى ﴾ [ النجم : ۱۷ ] ”نہ نگاہ ادھر ادھر ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔“ اللہ تعالیٰ نے آنکھ کے اوپر نیچے اور

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ⑪

اس موقع پر ایمان والے آزمائے گئے اور ہلائے گئے، سخت ہلایا جانا ⑪

دائیں بائیں کی جہتوں میں حرکت کرنے کی خاص کیفیت رکھی ہے، جب زیادہ خوف یا گھبراہٹ آ پڑے تو نگاہ ان جہتوں سے پھر جاتی ہے، پھر کبھی وہ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [ الأنبياء : ٩٧ ] ''تو اچانک یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی جنھوں نے کفر کیا۔'' کبھی ایک ہی طرف پھری ہوئی رہ جاتی ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے اور کبھی بے اختیار گھومنے لگتی ہے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے : ﴿ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴾ [ الأحزاب : ١٩ ] ''ایسے دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اس شخص کی طرح گھومتی ہیں جس پر موت کی غشی طاری کی جا رہی ہو۔'' مراد خوف کی شدت ہے۔

④ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ : ''الْحَنَاجِرَ'' ''حَنْجَرَةٌ'' کی جمع ہے، حلق کا آخری حصہ۔ خوف کی شدت کی تصویر کھینچی ہے، جیسے دل شدید دھڑکن اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنی جگہ چھوڑ کر حلق تک آ پہنچا ہو۔ بقاعی نے کہا، ہوسکتا ہے یہ تشبیہ کے بجائے حقیقت ہو کہ طحال اور پھیپھڑا پھول کر دل کو گلے کی طرف دھکیل دیں، اس لیے بزدل کو کہتے ہیں : '' اِنْتَفَخَ مَنْخِرُهُ أَيْ رِئَتُهُ '' یعنی اس کا پھیپھڑا پھول گیا۔ خوف کی وجہ سے دل گلے کی طرف جانے کی وجہ سے بعض اوقات سانس بند ہو کر آدمی کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( شَرُّ مَا فِيْ رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ ، وَجُبْنٌ خَالِعٌ )) [ مسند أحمد : ٣٢٠/٢، ح : ٨٢٨٣، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ، صحيح ] ''بدترین چیز جو آدمی میں ہے، وہ شدید حرص ہے جو بے حوصلہ بنا دینے والی ہے اور بزدلی ہے جو دل نکال دینے والی ہے۔''

⑤ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا : اس سے مراد یا تو کمزور ایمان والے لوگ ہیں، کیونکہ پختہ ایمان والوں کا ذکر آگے آ رہا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴾ [ الأحزاب : ٢٢ ] ''اور جب مومنوں نے لشکروں کو دیکھا تو انھوں نے کہا یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا، اور اس چیز نے ان کو ایمان اور فرماں برداری ہی میں زیادہ کیا۔'' ایسے کمزور ایمان والے لوگ یہ گمان کر رہے تھے کہ اب کے بار نہیں بچیں گے۔ یا سبھی مومن مراد ہیں اور کئی طرح کے گمانوں سے مراد وہ گمان ہیں جو بے اختیار اس موقع پر دل میں آجاتے ہیں، جیسا کہ سورۂ بقرہ (٢١٤) اور سورۂ یوسف (١١٠) میں ہے۔

**آیت 11** ① هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ : یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ امتحان ہو جائے کہ ایسے سخت حالات میں کون ایمان پر قائم رہتا ہے اور کس کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔

② وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا : چاروں طرف سے لشکروں کے ہجوم اور شہر کے اندر سے بنو قریظہ کی عہد شکنی کی خبر سے مسلمانوں کی یہ حالت ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ اس وقت خوف کی حالت کا اور مسلمانوں کی جانفشانی کا اندازہ زبیر اور

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا

اور جب منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کچھ بیماری ہے، کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے

حذیفہ رضی اللہ عنہما کے بیانات سے ہوتا ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کے دن فرمایا: (( مَنْ يَأْتِينَا بِخَبَرِ الْقَوْمِ؟ )) ''کون ہے جو ہمارے پاس ان (بنو قریظہ کے یہودی) لوگوں کی خبر لائے؟'' زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں ہوں۔'' آپ نے پھر فرمایا: ''کون ہے جو ہمارے پاس ان لوگوں کی خبر لائے؟'' زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں ہوں۔'' پھر فرمایا: ''کون ہے جو ہمارے پاس ان لوگوں کی خبر لائے؟'' زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا، وَ إِنَّ حَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق و هي الأحزاب : ۴۱۱۳ ] ''ہر نبی کا ایک حواری (خاص مددگار) ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔'' ابراہیم تیمی کے والد بیان کرتے ہیں کہ ہم حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے، ایک آدمی کہنے لگا: ''اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پا لیتا تو آپ کے ساتھ مل کر لڑتا اور پوری کوشش لگا دیتا۔'' تو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو ایسا کرتا؟ حالانکہ میں نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احزاب کی رات دیکھا اور ہمیں سخت آندھی اور سردی نے گھیرا ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَلَا رَجُلٌ يَأْتِينِي بِخَبَرِ الْقَوْمِ جَعَلَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ مَعِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ )) ''کیا کوئی آدمی ہے جو میرے پاس ان لوگوں کی خبر لائے، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن میرے ساتھ کر دے گا؟'' ہم خاموش رہے، کسی نے آپ کو جواب نہیں دیا، پھر فرمایا: ''کیا کوئی آدمی ہے جو میرے پاس ان لوگوں کی خبر لائے، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن میرے ساتھ کر دے گا؟'' ہم خاموش رہے اور کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب نہیں دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قُمْ يَا حُذَيْفَةُ! فَأْتِنَا بِخَبَرِ الْقَوْمِ )) ''حذیفہ! اٹھو اور ہمارے پاس ان لوگوں کی خبر لے کر آؤ۔'' اب میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا، کیونکہ آپ نے میرا نام لے کر مجھے اٹھنے کا کہا تھا۔ آپ نے فرمایا: (( اِذْهَبْ فَأْتِنِي بِخَبَرِ الْقَوْمِ وَلَا تَذْعَرْهُمْ عَلَيَّ )) ''جاؤ، میرے پاس ان لوگوں کی خبر لے کر آؤ اور انھیں مجھ پر اکسا نہ دینا (یعنی ایسا کوئی کام نہ کرنا جس کی وجہ سے وہ بھڑک اٹھیں)۔'' جب میں آپ کے پاس سے نکلا تو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں حمام میں چل رہا ہوں، یہاں تک کہ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ابوسفیان آگ کے ساتھ اپنی پیٹھ سینک رہا تھا۔ میں نے تیر کمان پر چڑھایا اور ارادہ کیا کہ اسے نشانہ بناؤں، تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات یاد آ گئی کہ انھیں مجھ پر اکسا نہ دینا اور اگر میں تیر مار دیتا تو سیدھا اسے لگتا، پھر میں واپس آیا تو ایسے ہی محسوس ہوتا تھا جیسے میں حمام میں چل رہا ہوں۔ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو میں نے آپ کو ان لوگوں کی خبر بیان کی اور فارغ ہوا تو مجھے سردی نے آ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنا ایک زائد کمبل اوڑھا دیا، جسے آپ اوڑھ کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ میں صبح تک سویا رہا، جب صبح ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قُمْ يَا نَوْمَانُ! )) ''بہت زیادہ سونے والے! اٹھ جاؤ۔'' [ مسلم، الجهاد و السير، باب غزوة الأحزاب : ۱۷۸۸ ]

آیت 12 ① وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ ...... : ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا'' سے لے کر آیت (۲۷) تک کی

# غُرُوْرًا ⑫

## محض دھوکا دینے کے لیے وعدہ کیا تھا ⑫

آیات غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنو قریظہ کے بعد نازل ہوئیں۔ ان میں دونوں جنگوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ پچھلی آیت تک ایمان والوں کے خوف، آزمائش اور سخت جھنجوڑے جانے کا ذکر ہوا ہے، جس کے دوران ان کے دلوں میں طرح طرح کے گمان بھی آتے رہے، مگر ان کی زبان پر کفر یا مایوسی کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ اب اس دوران منافقین کے رویے اور ان کی منافقانہ باتوں کا ذکر ہوتا ہے، جن سے ان کا نفاق کھل کر سب کے سامنے آ گیا۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ سوال یہ ہے کہ منافقین کے دلوں میں بھی تو بیماری ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ [ البقرۃ : ۱۰ ] ''ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے۔'' تو یہاں منافقین کے بعد ''اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو پکے منافق تھے، جیسے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی۔ ان کے متعلق جو سورۂ بقرہ میں ''فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' فرمایا ہے، وہاں ''مَّرَضٌ'' کی ''تنوین'' تعظیم وتہویل کے لیے ہے، اس لیے وہاں مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ایک بھاری بیماری ہے۔ اس آیت میں ''اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو ابھی نفاق میں پختہ نہیں ہوئے تھے، بلکہ ان کے دلوں میں شک و شبہ اور نفاق کی کچھ بیماری تھی۔ گویا یہاں ''مَّرَضٌ'' میں تنوین تنکیر و تبعیض کے لیے ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ [ الحج : ۱۱ ] ''اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے۔'' غرض اس موقع پر صرف پکے ایمان والے ثابت قدم رہے۔ رہے منافقین یا ڈھلمل یقین والے، تو ان سب کا نفاق کھل کر سامنے آ گیا۔

③ **مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا** : جنگ خندق کے دوران رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو کئی بشارتیں دی تھیں۔ خندق کھودنے کے دوران ایک چٹان جو کھدائی میں رکاوٹ بن گئی تھی، اس پر رسول اللہ ﷺ نے کدال ماری تو وہ تین ضربوں میں تین ٹکڑے ہوگئی اور ہر ضرب پر اس سے ایک چمک نکلی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پہلی ضرب کے ساتھ مجھے کسریٰ کے شہر اور ان کے اردگرد کے شہر اور بہت سے شہر دکھائے گئے، جنھیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔'' وہاں موجود صحابہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! دعا کیجیے اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر فتح عطا فرمائے، ان کے گھر ہمیں بطور غنیمت عطا کرے اور ان کے شہر ہمارے ہاتھوں برباد کرے۔'' رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا کر دی اور فرمایا: ''پھر میں نے دوسری ضرب لگائی تو قیصر کے شہر اور ان کے اردگرد کی بستیاں میرے سامنے لائی گئیں، یہاں تک کہ میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! اللہ سے دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں ان پر فتح عطا فرمائے، ان کے گھر ہمیں بطور غنیمت عطا فرمائے اور ان کے شہر ہمارے ہاتھوں برباد کرے۔'' رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا کر دی اور فرمایا: ''پھر میں نے تیسری ضرب ماری تو حبشہ کے شہر اور ان کے اردگرد کی

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

**اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا اے یثرب والو! تمھارے لیے ٹھہرنے کی کوئی صورت نہیں، پس لوٹ چلو، اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگتا تھا، کہتے تھے ہمارے گھر تو غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ کسی طرح غیر محفوظ نہیں، وہ بھاگنے کے سوا کچھ چاہتے ہی نہیں ﴿۱۳﴾**

بستیاں میرے سامنے لائیں گئیں، حتیٰ کہ میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔'' اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حبشیوں کو اپنے حال پر رہنے دو جب تک وہ تمھیں تمھارے حال پر رہنے دیں اور ترکوں کو کچھ نہ کہو جب تک وہ تمھیں کچھ نہ کہیں۔''
[ نسائي، الجهاد، باب غزوة الترك والحبشة : ۳۱۷۸، و قال الألباني حسن ]

جب مدینہ کو کفار نے ہر طرف سے گھیر لیا اور یہودیوں کی عہد شکنی کی وجہ سے مدینہ کے اندر سے بھی ہر وقت حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا، تو اس وقت مسلمانوں کے لیے مزید پریشانی کا باعث یہ بات ہوئی کہ منافقین اور کچے ایمان والے لوگوں نے ایسی باتیں کہنا شروع کر دیں جن سے لوگوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور بددلی پھیل جائے، مثلاً یہ کہ محمد (ﷺ) تو ہمیں قیصر و کسریٰ کے شہر فتح ہونے کی بشارتیں سناتے تھے، جبکہ اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہم قضائے حاجت کے لیے بھی باہر نہیں جا سکتے۔ معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدے کیے تھے سب دھوکا تھے۔ دراصل منافقین کا خیال یہ تھا کہ بس ایمان کا دعویٰ کرنے کی دیر ہے، آسمان سے فرشتے اتریں گے اور انھیں فتح حاصل ہو جائے گی، انھیں انگلی تک نہیں ہلانا پڑے گی، حالانکہ ایمان کے بعد آزمائش تو اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، تاکہ کھرے کھوٹے الگ الگ ہو جائیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بعض منافق کہنے لگے، پیغمبر کہتا ہے کہ میرا دین پہنچے گا مشرق مغرب، یہاں جائے ضرور (قضائے حاجت) کو نہیں نکل سکتے۔ مسلمان کو چاہیے اب بھی ناامیدی کے وقت بے ایمانی کی باتیں نہ بولے۔''

**آیت 13** ① وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ : ''یثرب'' مدینے کا پرانا نام ہے، رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد اس کا نام ''مدینۃ النبی ﷺ'' پڑ گیا، جو اختصار کے ساتھ مدینہ مشہور ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ أَنِّيْ أُهَاجِرُ مِنْ مَكَّةَ إِلٰى أَرْضٍ بِهَا نَخْلٌ، فَذَهَبَ وَهَلِيْ إِلٰى أَنَّهَا الْيَمَامَةُ أَوْ هَجَرُ، فَإِذَا هِيَ الْمَدِيْنَةُ يَثْرِبُ )) [ بخاري، المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام : ۳۶۲۲ ] ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ایسی زمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جو کھجوروں والی ہے، تو مجھے گمان ہوا کہ وہ جگہ یمامہ یا ہجر ہے، لیکن وہ یثرب یعنی مدینہ منورہ ہے۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرٰی يَقُوْلُوْنَ يَثْرِبُ وَهِيَ الْمَدِيْنَةُ ، تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ )) [ بخاري، فضائل المدينة، باب فضل المدينة...... : ۱۸۷۱ ] ''مجھے ایک بستی کے متعلق حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی، لوگ اسے یثرب کہتے ہیں، حالانکہ وہ ''المدینہ'' ہے۔

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾

**اور اگر اس (شہر) میں ان پر اس کے کناروں سے داخل ہوا جاتا، پھر ان سے فتنہ برپا کرنے کا سوال کیا جاتا تو یقیناً وہ اسے (عمل میں) لے آتے اور اس میں دیر نہ کرتے مگر تھوڑی ﴿۱۴﴾ حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ کا عہد ہمیشہ پوچھا جانے والا ہے ﴿۱۵﴾**

---

وہ (منافق) لوگوں کو اس طرح دور کرے گی جس طرح بھٹی لوہے کی میل کو دور کر دیتی ہے۔“

② **فَارْجِعُوْا** : منافقین کے ایک گروہ نے مسلمانوں کی ہمتیں پست کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سلع پہاڑی اور خندق کے درمیان (جہاں رسول اللہ ﷺ کا معسکر تھا) اب رہنے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے واپس لوٹ جاؤ۔ اس واپس لوٹ جاؤ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مدینہ واپس چلو اور یہ بھی کہ دوبارہ پہلے دین پر واپس ہو جاؤ اور مشرکین کے ساتھ مل جاؤ، تاکہ وہ تمھیں نقصان نہ پہنچائیں۔ یعنی وہ مسلمانوں کو ارتداد کی ترغیب دیتے، مگر ایسے الفاظ میں کہ اگر کوئی باز پرس کرے تو کہیں کہ ہمارا مطلب تو مدینہ واپس چلنا تھا۔

③ **وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ** : ان میں سے کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ کہہ کر اپنے گھروں کو واپسی کی اجازت مانگی کہ ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں اور ڈر ہے کہ کہیں بنو قریظہ حملہ کر کے ہمارے بچوں اور عورتوں کو ہلاک نہ کر دیں، یا چور لوٹ مار نہ کریں۔

④ **وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ** : حالانکہ وہ کسی طرح غیر محفوظ نہیں تھے، کیونکہ مسلمانوں نے تمام عورتوں اور بچوں کو شہر کی مضبوط حویلیوں میں رکھ کر اور نا کے لگا کر محفوظ کر دیا تھا۔

⑤ **اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا** : یعنی ان کی اجازت مانگنے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے، بلکہ وہ کسی طرح میدانِ جنگ سے بھاگنا چاہتے ہیں۔

**آیت 14** **وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ......** : ”**دُخِلَتْ**“ کی ضمیر ”مدینہ“ کی طرف جا رہی ہے، یعنی ” وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمُ الْمَدِيْنَةُ مِنْ جِهَاتِهَا أَيْ وَلَوْ دَخَلَ الْأَحْزَابُ عَلَيْهِمُ الْمَدِيْنَةَ۔“ ”**الْفِتْنَةَ**“ سے مراد کفر و شرک اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے، یعنی اگر کفار شہر میں داخل ہو کر ان منافقین کو دعوت دیتے کہ آؤ دوبارہ ہمارے ساتھ کفر میں واپس آ جاؤ اور ہم سے مل کر مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے لڑو تو وہ فوراً ان کی پیش کش قبول کرتے اور ذرا دیر نہ کرتے۔

**آیت 15** **وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ ......** : یہ عہد ان منافقوں نے احد کے موقع پر جنگ سے گریز اور پسپائی کے بعد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو ہم اپنی سابقہ کوتاہی کی تلافی کریں گے اور لڑائی سے پیٹھ نہیں پھیریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ عہد یاد دلایا کہ اسے کوئی لمبی مدت نہیں گزری، بلکہ غزوۂ احزاب سے کچھ ہی پہلے انھوں

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَ الْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَ لَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۸﴾

کہہ دے تمھیں بھاگنا ہرگز نفع نہیں دے گا اگر تم مرنے یا قتل ہونے سے بھاگو اور اس وقت تمھیں فائدہ نہیں دیا جائے گا مگر بہت کم ﴿۱۶﴾ کہہ دے وہ کون ہے جو تمھیں اللہ سے بچائے گا، اگر وہ تم سے کسی برائی کا ارادہ کرے، یا تم پر کسی مہربانی کا ارادہ کرے اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۷﴾ یقیناً اللہ تم میں سے رکاوٹیں ڈالنے والوں کو جانتا ہے اور اپنے بھائیوں سے یہ کہنے والوں کو بھی کہ ہماری طرف آجاؤ اور وہ لڑائی میں نہیں آتے مگر بہت کم ﴿۱۸﴾

نے وہ عہد کیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کو صرف زبانی عہد کے ساتھ دھوکا نہیں دیا جا سکتا، بلکہ وہ آزمائش کا کوئی موقع لا کر پوچھتا ضرور ہے کہ تمھارا وعدہ سچا تھا یا جھوٹا۔ اس کے علاوہ قیامت کے دن وہ ایمان کے عہد سے لے کر لڑائی سے فرار نہ کرنے تک کے ہر عہد کے متعلق بھی پوچھے گا کہ پورا کیا یا نہیں۔

**آیت 16** ❶ **قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ ......** : یعنی فرار سے تمھاری عمر کچھ بڑھ نہیں جائے گی، نہ ہی فرار اختیار کرنے سے تم قتل سے یا موت سے بچ جاؤ گے، کیونکہ موت کا وقت تو مقرر ہو چکا ہے۔ پھر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اللہ کی راہ میں لڑ کر عزت کی موت مرو اور شہادت کا رتبہ پاؤ۔

❷ **وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا** : یعنی اگر تم نے فرار اختیار کیا اور تمھاری کچھ عمر باقی ہوئی تب بھی دنیا کی لذتوں سے تم تھوڑا ہی فائدہ اٹھا سکو گے، کیونکہ ایسے بزدلوں کا مقدر دشمن کے غلبہ کی صورت میں ذلت اور غلامی ہوتا ہے اور اگر اس سے بچ بھی گئے تو کتنی دیر زندہ رہ لو گے۔

**آیت 16** **قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ......** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۱۰۷) اور سورۂ زمر (۳۸) یعنی اپنے خیال میں تم نے عرب کے مشرکین سے بچنے کے لیے فرار اختیار کیا، لیکن اگر اللہ حکم دے اور مسلمان تمھیں اب قتل کر دیں تو تمھیں کون بچائے گا، یا وہ تم پر رحم کا ارادہ کرے تو کون اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ بہرحال اللہ کی گرفت سے انھیں کوئی حمایتی یا مددگار نہیں بچا سکے گا۔

**آیت 16** ❶ **قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ ......** : یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو دوسروں کو بھی جہاد سے روکتے ہیں اور اپنے یار دوست لوگوں اور کنبے قبیلے کے لوگوں سے کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے کے

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾

تمھارے بارے میں سخت بخیل ہیں، پس جب خوف آپہنچے تو تُو انھیں دیکھے گا کہ تیری طرف ایسے دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اس شخص کی طرح گھومتی ہیں جس پر موت کی غشی طاری کی جارہی ہو، پھر جب خوف جاتا رہے تو تمھیں تیز زبانوں کے ساتھ تکلیف دیں گے، اس حال میں کہ مال کے سخت حریص ہیں۔ یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے اور یہ ہمیشہ سے اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۱۹﴾

بجائے ہمارے پاس چلے آؤ اور ہماری طرح آرام سے گھروں میں رہو۔ مراد اس سے منافقین ہیں۔

② وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا : یعنی کبھی کبھار دکھاوے اور نام لکھوانے کے لیے چلے آتے ہیں۔

**آیت 19** اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ...... : "اَشِحَّةً" "شَحِيْحٌ" کی جمع ہے، سخت حرص اور بخل کے مجموعے کو "اَلشُّحُّ" کہتے ہیں۔ "حِدَادٍ" جمع ہے "حَدِيْدٌ" کی، تیز۔ "سَلَقُوْكُمْ" "سَلَقَ يَسْلُقُ" (ن) "سَلَقَهُ بِالسَّوْطِ" یعنی اس نے اسے کوڑے سے اتنا مارا کہ کھال اتار دی۔ "سَلَقَ اللَّحْمَ عَنِ الْعَظْمِ" ہڈی سے گوشت اتار دیا۔ جب کوئی کسی کو بہت سخت بات کہے تو کہتے ہیں: "سَلَقَهُ بِالْكَلَامِ۔" "اَلْخَيْرِ" سے مراد مال غنیمت ہے۔ مولانا محمد جونا گڑھی رحمہ اللہ نے اس مقام پر تفسیر ابن کثیر کا جو اردو ترجمہ کیا ہے وہ بہت پر لطف ہے، لکھتے ہیں: "یہ بڑے بخیل ہیں، نہ ان سے تمھیں کوئی مدد پہنچے، نہ ان کے دل میں تمھاری کوئی ہمدردی، نہ مال غنیمت میں تمھارے حصے پر یہ خوش۔ خوف کے وقت تو ان نامردوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں، آنکھیں چھاچھ پانی ہو جاتی ہیں، مایوسانہ نگاہوں سے تکنے لگتے ہیں، لیکن خوف دور ہوا کہ انھوں نے لمبی لمبی زبانیں نکال ڈالیں اور بڑھے چڑھے دعوے کرنے لگے اور شجاعت و مردمی کا دم بھرنے لگے اور مال غنیمت پر بے طرح گرنے لگے۔ ہمیں دو، ہمیں دو کا غل مچا دیتے ہیں، ہم آپ کے ساتھی ہیں، ہم نے جنگی خدمات انجام دی ہیں، ہمارا حصہ ہے اور جنگ کے وقت صورتیں بھی نہیں دکھاتے، بھاگتوں کے آگے اور لڑتوں کے پیچھے رہا کرتے ہیں۔ دونوں عیب جس میں جمع ہوں اس جیسا بے خیر انسان کون ہوگا؟ امن کے وقت عیاری، بدخلقی، بدزبانی اور لڑائی کے وقت نامردی، روباہ بازی اور زنانہ پن۔ لڑائی کے وقت حائضہ عورتوں کی طرح الگ اور یکسو اور مال لینے کے وقت گدھوں کی طرح ڈھینچو ڈھینچو۔ اللہ فرماتا ہے، بات یہ ہے کہ ان کے دل شروع ہی سے ایمان سے خالی ہیں، اس لیے ان کے اعمال بھی اکارت ہیں۔ اللہ پر یہ آسان ہے۔"

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآىِٕكُمْ ؕ وَ لَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْۤا اِلَّا قَلِيْلًا ۠ ﴿۲۰﴾ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ؕ ﴿۲۱﴾

وہ لشکروں کو سمجھتے ہیں کہ نہیں گئے اور اگر لشکر آ جائیں تو وہ پسند کریں گے کاش! واقعی وہ بدویوں میں باہر نکلے ہوئے ہوتے، تمھاری خبریں پوچھتے رہتے اور اگر وہ تم میں موجود ہوتے تو نہ لڑتے مگر بہت کم ﴿۲۰﴾ بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہو ﴿۲۱﴾

**آیت 20** يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا...... : ”بَادُوْنَ“ ”بَدَا يَبْدُوْ“ سے اسم فاعل کی جمع ہے، یہاں مراد ”خَارِجُوْنَ إِلَى الْبَدْوِ“ ہے، یعنی بدویوں کی طرف نکلنے والے۔ ابن کثیر میں ہے: ”یعنی ان کی بزدلی اور ڈرپوکی کا یہ عالم ہے کہ اب تک انھیں اس بات کا یقین نہیں ہوا کہ لشکر کفار لوٹ گیا ہے، انھیں خطرہ ہے کہ وہ پھر کہیں نہ آ پڑے۔ مشرکین کے لشکروں کو دیکھتے ہی ان کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور کہتے ہیں، کاش کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ اس شہر ہی میں نہ ہوتے، بلکہ گنواروں کے ساتھ کسی اجاڑ گاؤں یا کسی دور دراز کے جنگل میں ہوتے، کسی آتے جاتے سے پوچھ لیتے کہ کہو بھئی، لڑائی کا کیا حشر ہوا؟ اللہ فرماتا ہے کہ یہ اگر تمھارے ساتھ بھی ہوں تو بے کار ہے۔ ان کے دل مردہ ہیں، نامردی کے گھن نے انھیں کھوکھلا کر رکھا ہے۔ یہ کیا لڑیں گے اور کون سی بہادری دکھائیں گے؟“

**آیت 21** ① لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ...... : ”اُسْوَةٌ“ اور ”قُدْوَةٌ“ جس کی پیروی کی جائے، نمونہ۔ اس میں لڑائی سے پیچھے رہنے والوں پر عتاب ہے، یعنی تمھارا فرض تھا کہ جس طرح اللہ کے رسول ﷺ اس موقع پر جان لڑا رہے تھے اور تمام تکلیفوں اور مشقتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے، تم بھی جان لڑاتے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے تمھیں تو خطرے میں جھونک دیا ہو اور خود کسی پناہ میں آرام کرنے بیٹھ گئے ہوں! اگر وہ ایسا کرتے تو تمھارے لیے وجہ جواز ہو سکتی تھی، مگر وہ تو ہر کام میں پیش پیش تھے۔ خندق کھودنے میں، کدال چلانے میں، مٹی ڈھونے میں، بلکہ صحابہ کے ساتھ جنگی ترانے پڑھنے میں، بھوکے اور بیدار رہنے میں، پوری جنگ میں بہ نفس نفیس محاذ پر رہنے میں سب کے ساتھ، بلکہ آگے آگے تھے۔ ”كَانَ“ کا لفظ استمرار کے لیے ہے، یعنی اس سے بھی پہلے مکہ اور طائف میں کفار کی طرف سے آنے والی تکلیفیں برداشت کرنے میں، ہجرت کے پر خطر سفر میں، احد میں پیش آنے والے زخم اور صدمے اٹھانے میں، غرض پوری زندگی میں ہر مشکل مرحلے پر وہ سب سے آگے اور تمھارے لیے نمونہ تھے۔ پھر تمھارا بزدلی دکھانا اور کسی کام سے بچنے کی فکر کرنا کسی بھی لحاظ سے معقول قرار نہیں دیا جا سکتا۔

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

**اور جب مومنوں نے لشکروں کو دیکھا تو انھوں نے کہا یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا، اور اس چیز نے ان کو ایمان اور فرماں برداری ہی میں زیادہ کیا ﴿۲۲﴾**

② یہ آیت گو جہاد کے بارے میں نازل ہوئی، مگر اس کے لفظ عام ہیں، اس لیے یہ ہر موقع اور محل کے لیے عام ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے تمام اقوال، افعال اور احوال میں مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں، جن پر انھیں چلنا لازم ہے اور ان کے لیے جائز نہیں کہ اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی معاملہ میں آپ ﷺ کی پیروی سے گریز کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ آل عمران : ۳۱ ] ''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' اور دیکھیے سورۂ اعراف کی آیات (۱۵۶ تا ۱۵۸) اور سورۂ حشر (۷)۔

③ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ: اُسوہ (نمونہ) دو طرح کا ہے، ایک اسوۂ حسنہ (اچھا نمونہ) اور دوسرا اسوۂ سیئہ (برا نمونہ)۔ اسوۂ حسنہ تو رسول اللہ ﷺ ہیں، کیونکہ آپ کی پیروی کرنے والا صراط مستقیم پر چل کر عزت و نعمت کی جنت تک پہنچ جائے گا۔ آپ ﷺ کے خلاف جو بھی ہے وہ اسوۂ سیئہ ہے، جیسا کہ کفار کو جب رسولوں نے اپنی پیروی کا حکم دیا تو انھوں نے کہا: ﴿ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [ الزخرف : ۲۲ ] ''بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا ہے اور بے شک ہم انھی کے قدموں کے نشانوں پر راہ پانے والے ہیں۔''

④ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ...... : اس اسوۂ حسنہ پر وہی لوگ چلتے ہیں اور انھی کو اس کی توفیق ملتی ہے جن میں تین وصف ہوں، ایک اللہ پر ایمان، اس سے ملاقات اور اس کے دیدار کی امید، دوسرا آخرت پر ایمان اور اس کے ثواب کی امید اور تیسرا کثرت سے اللہ کو یاد کرنا۔ ان لوگوں کو یہ تینوں چیزیں رسول کی پیروی کے لیے ہر وقت آمادہ اور مستعد رکھتی ہیں، بخلاف کافر اور منافق کے جس کا نہ اللہ پر ایمان ہے، نہ آخرت پر اور نہ کبھی اس نے اپنے مالک کو یاد کیا، تو ان لوگوں کے سامنے دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں، اس لیے وہ رسول کو نمونہ بنانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے۔

**آیت 22** ① وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ...... : کفار کے لشکروں کی کثرتِ تعداد، محاصرے کی سختی، سردی اور بھوک کی شدت اور بنو قریظہ کی عہد شکنی کی وجہ سے جب حالات نہایت سنگین ہو گئے تو اس وقت منافقوں کا اور شکوک و شبہات کے مریض مسلمانوں کا حال اوپر بیان ہوا کہ انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے وعدے محض فریب تھے، اب مخلص مومنوں کا حال بیان ہوتا ہے کہ انھوں نے ان سختیوں کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو آزمائش، تنگی اور تکلیف کے وہی مرحلے ہیں جن کے آنے کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے پہلے ہی خبر دے رکھی ہے اور جن پر صبر کے بعد اس کی نصرت کا وعدہ ہے، جیسا کہ فرمایا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ

مومنوں میں سے کچھ مرد ایسے ہیں جنھوں نے وہ بات سچ کہی جس پر انھوں نے اللہ سے عہد کیا، پھر ان میں سے کوئی تو

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [ البقرة : ٢١٤ ] ”یا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگی اور تکلیف پہنچی اور وہ سخت ہلائے گئے، یہاں تک کہ وہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔“

❷ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ : یعنی اللہ اور اس کے رسول نے آزمائش کا جو وعدہ کیا تھا وہ سچا تھا اور اس پر صبر کے بعد مسلمانوں کی فتح و نصرت اور کفار کی شکست کا وعدہ بھی سچا تھا، جو سورۂ بقرہ (۲۱۴) میں ” اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ “ کے الفاظ کے ساتھ کیا گیا اور اس سے پہلے مکہ میں نازل ہونے والی سورۂ قمر (۴۵) میں ” سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ “ کے الفاظ کے ساتھ کیا گیا تھا۔

❸ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا : یعنی وہ پہلے سے بھی زیادہ ایمان میں پختہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام ماننے والے بن گئے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ آدمی کے ایمان میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں آٹھ آیات اور متعدد احادیث سے یہ بات مدلل فرمائی ہے۔ ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو صریح آیات و احادیث کے باوجود مصر ہیں کہ ایمان میں نہ کمی ہوتی ہے، نہ زیادتی۔

**آیت 23** ❶ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ : پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کا دعویٰ کرنے والے کچھ لوگوں کا ذکر فرمایا، جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا اور بزدلی اور نامردی سے میدان سے بھاگ گئے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴾ [ الأحزاب : ١٥ ] ”حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ کا عہد ہمیشہ پوچھا جانے والا ہے۔“ اب ان لوگوں پر چوٹ کے لیے ان ایمان والوں کا ذکر ہوتا ہے جو فی الواقع مرد تھے اور جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا معاہدہ پورا کر دیا۔ اس آیت میں ان تمام مخلص مسلمانوں کی تعریف ہے جو اپنی جان و مال کی پروا نہ کرتے ہوئے اتنے مشکل حالات اور اتنے کثیر دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہے۔ ان میں سب سے آگے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جو کسی جنگ اور کسی موقع میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے نہیں رہے اور جنھوں نے اپنا جان و مال سب کچھ رسول اللہ ﷺ پر قربان کر دیا تھا، پھر عمر، عثمان، علی اور درجہ بدرجہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اس معاہدے سے مراد وہ معاہدہ ہے جو ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خود بخود ہو جاتا ہے، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ

مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾

وہ ہے جو اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وہ ہے جو انتظار کر رہا ہے اور انھوں نے نہیں بدلا، کچھ بھی بدلنا ﴿٢٣﴾

بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [ التوبة : ١١١ ] ”بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوب خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔“

② **فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ** ...... : ”نَحْبٌ“ کا معنی عہد، نذر اور موت ہے، یہاں ”نَحْبٌ“ سے مراد ایسا عہد ہے جو نذر کی طرح موت تک کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے شہادت پا کر وہ نذر پوری کر دی کہ مرتے دم تک رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور کچھ اس انتظار میں ہیں اور انھوں نے اپنے عہد میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔ اس آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنگ خندق سے پہلے جنگ بدر اور اُحد میں شہید ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے، مثلاً حمزہ، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن جحش، سعد بن ربیع اور انس بن نضر رضی اللہ عنہم وغیرہ۔

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”میرے چچا (انس بن نضر رضی اللہ عنہ) جن کے نام پر میرا نام رکھا گیا، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر کی لڑائی میں شریک نہ ہو سکے تو یہ بات ان پر شاق گزری۔ انھوں نے کہا: ”پہلی لڑائی جس میں رسول اللہ ﷺ شریک ہوئے، میں اس سے غائب رہا، اب اگر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی جنگ میں شریک ہونے کا موقع دیا تو اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ میں کیا کرتا ہوں۔“ اس کے سوا وہ کچھ کہنے سے ڈرے، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احد کی لڑائی میں شریک ہوئے تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے سامنے آئے۔ انس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ”ابوعمرو! کہاں جا رہے ہو؟“ پھر کہنے لگے: ”واہ واہ! مجھے تو احد کی طرف سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے۔“ پھر وہ لڑے یہاں تک کہ قتل ہو گئے۔ (لڑائی کے بعد دیکھا گیا) تو ان کے بدن پر اسی (۸۰) سے زائد تلوار، نیزے اور تیر کے زخم تھے۔ ان کی بہن اور میری پھوپھی رُبَیّع بنت نضر رضی اللہ عنہا نے کہا: ”میں نے اپنے بھائی کو نہیں پہچانا مگر ان کی انگلیوں کی پوریں دیکھ کر۔“ اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ [ الأحزاب : ٢٣ ] انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھتے تھے کہ یہ آیت ان کے اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔“ [ مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد : ١٩٠٣ ] معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: (( طَلْحَةُ مِمَّنْ قَضٰى نَحْبَهُ )) [ ترمذي، التفسير، باب و من سورة الأحزاب : ٣٢٠٢ ] ”طلحہ (رضی اللہ عنہ) ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی نذر پوری کر چکے۔“ گویا نبی ﷺ نے ان کی زندگی ہی میں انھیں شہید قرار دے دیا۔ قیس بن حازم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے طلحہ رضی اللہ عنہ کا

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾

**تا کہ اللہ سچوں کو ان کے سچ کا بدلا دے اور منافقوں کو عذاب دے اگر چاہے، یا ان کی توبہ قبول فرمائے۔ بلاشبہ اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۴﴾**

ہاتھ دیکھا کہ وہ شل تھا، جس کے ساتھ انھوں نے احد کے دن نبی ﷺ کا دفاع کیا تھا۔ [ بخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب ذكر طلحة بن عبيد الله : ۳۷۲٤ ]

③ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ : اس سے مراد وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو منتظر تھے کہ کب کوئی موقع ملتا ہے جس میں وہ جان کی قربانی پیش کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنا کیا ہوا عہد پورا کریں۔ ان کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ عہد کے سچے صرف وہی ہیں جو شہید ہو چکے، بلکہ "إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ" (فتح یا شہادت) کا ہر طالب اس کا مصداق ہے۔

④ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا : منافقین نے تو اپنا عہد بدل ڈالا، لیکن یہ سچے مومن اپنے عہد پر پوری طرح قائم رہے۔

**آیت 24** ① لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ : جنگ احزاب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بیان فرمایا، مثلاً مشرکین کے لشکروں کی آمد، مدینہ کا محاصرہ، مسلمانوں پر شدید خوف کا طاری ہونا، منافقوں کے طعنے اور بزدلی کی باتیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ثابت قدمی اور قربانی، رسول اللہ ﷺ کا بے مثال کردار۔ اب ان سب باتوں کی حکمت بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو مسلمانوں کو ان پریشانیوں کے بغیر ہی نعمتوں سے نواز دیتا، مگر اس نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ وہ چاہتا تھا کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کا امتحان لے اور جو لوگ اپنے امتحان میں سچے اور پکے ثابت ہوں انھیں ان کی سچائی کا بدلا دے اور یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ ﴾ [ محمد : ۳۱ ] " اور ہم ضرور ہی تمھیں آزمائیں گے، یہاں تک کہ تم میں سے جہاد کرنے والوں کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں اور تمھارے حالات جانچ لیں۔" اور فرمایا: ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ﴾ [ آل عمران : ۱۷۹ ] "اللہ کبھی ایسا نہیں کہ ایمان والوں کو اس حال پر چھوڑ دے جس پر تم ہو، یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے۔"

② وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ : اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو منافقین کو عذاب دے، چاہے تو نہ دے، کیونکہ کفر پر مرنے والوں کے لیے عذاب تو وہ خود طے کر چکا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ چاہے تو عہد توڑنے والے منافقین کو موت سے پہلے توبہ کی توفیق نہ دے اور انھیں ان کے نفاق کی سزا دے اور چاہے تو توبہ کی توفیق دے کر ان کی توبہ قبول فرمائے۔ دلیل اس کی " اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ " کے الفاظ ہیں۔

③ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ منافق جو آگ کے درک اسفل کے حق دار بن چکے، وہ توبہ کیسے

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۟ۚ ﴿۲۵﴾ وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ

**اور اللہ نے ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، ان کے غصے سمیت لوٹا دیا، انھوں نے کوئی بھلائی حاصل نہ کی اور اللہ مومنوں کو لڑائی سے کافی ہوگیا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۲۵﴾ اور اس نے ان اہلِ کتاب کو، جنھوں نے ان کی مدد کی تھی، ان کے قلعوں سے اتار دیا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، ایک گروہ کو**

کریں گے؟ فرمایا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے بے حد مغفرت والا، یعنی گناہوں پر پردہ ڈالنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔ وہ جس پر چاہے مہربان ہو کر اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے، پھر اپنی مزید رحمت کے ساتھ نواز دے۔ اس میں عہد توڑنے والے منافقین کے لیے توبہ کی ترغیب اور ان کی توبہ کی قبولیت کی بشارت ہے۔

**آیت 25** ① **وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا** : ان آیات میں غزوۂ احزاب کا انجام بیان فرمایا کہ کفار اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دینے کے جس ارادے سے آئے تھے اس میں انھیں کوئی کامیابی نہ ہوئی، نہ مسلمانوں کو مٹا سکے، نہ مدینہ فتح ہوا اور نہ مال غنیمت یا اسیر حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دل کی جلن اور غصے سے بھرے ہونے کی حالت میں کوئی بھی فائدہ حاصل کیے بغیر واپس لوٹا دیا۔

② **وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ**: یعنی مسلمانوں کو لڑنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے لڑائی اپنے ذمے لے لی اور آندھی اور فرشتوں کے لشکروں کے ساتھ کفار کے لشکروں کو مار بھگایا۔ اس کی تفصیل اسی سورت کی آیت (۹) کی تفسیر میں ملاحظہ کریں۔

③ **وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا** : چونکہ اتنی تعداد اور تیاری کے باوجود کفار کا بھاگ جانا عقل سے بعید اور نہایت حیران کن واقعہ تھا، اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے بے حد قوت والا، سب پر غالب ہے، اس کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔

**آیت 26** ① **وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ** : "صَيَاصِيْ" "صِيْصِيَةٌ" کی جمع ہے۔ جولاہے کا تانے اور بانے کے دھاگوں کو سیدھا کرنے والا آلہ، مُرغ کا کانٹا جو اس کی ٹانگ کے ایک طرف نکلا ہوتا ہے، گائے اور ہرن وغیرہ کا سینگ، قلعہ اور ہر وہ چیز جس کے ساتھ کوئی اپنا دفاع اور حفاظت کرتا ہے۔ (قاموس) قریش، بنوغطفان اور ان کے ساتھ آنے والوں کے واپس جانے کے ساتھ ہی معرکۂ احزاب ختم ہو گیا، مگر بنو قریظہ کے ساتھ معرکہ ختم نہیں ہوا، جنھوں نے اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑ ڈالا تھا۔ جس میں یہ عہد کیا گیا تھا کہ باہر سے آنے والے حملہ آور کے مقابلے میں مسلمان اور یہودی ایک دوسرے کی مدد کریں گے، لیکن یہودیوں نے یہ عہد توڑ ڈالا اور قریش اور اتحادی لشکروں کے ساتھ اس بات پر اتفاق کر لیا کہ وہ مسلمانوں کے پیچھے سے مدینہ پر حملہ آور ہوں گے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور ایک اور انصاری صحابی رضی اللہ عنہم کو اس بات کی

## فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا ﴿٢٦﴾

تم قتل کرتے تھے اور دوسرے گروہ کو قید کرتے تھے ﴿٢٦﴾

تحقیق کے لیے بھیجا اور فرمایا: ''اگر وہ صلح پر قائم ہوں تو سب کے سامنے بیان کر دینا اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو اشارے سے سمجھا دینا۔'' وہ ان کے پاس گئے تو دیکھا کہ انھوں نے معاہدہ بری طرح توڑ ڈالا ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی نازیبا الفاظ کہے اور کہنے لگے: ''محمد کون ہے؟ ہمارے اور محمد کے درمیان کوئی عہد ہے نہ پیمان۔'' سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارے سے حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ بنو قریظہ کے ارادے نہایت خطرناک تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں ناکام و نامراد کر دیا۔ قریش اور ان کے درمیان بے اعتمادی پیدا ہو گئی اور ان کے قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ آخر وہ قلعوں میں بند ہو کر مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔

2 **وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ** : جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آئے تو ہتھیار اتار کر ابھی غسل ہی کیا تھا کہ جبریل علیہ السلام آئے اور کہنے لگے: ''آپ نے ہتھیار رکھ دیے، مگر ہم فرشتوں نے ابھی ہتھیار نہیں رکھے، بنو قریظہ کی طرف چلیں۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ )) ''کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے، مگر بنو قریظہ کے پاس جا کر۔'' [ بخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب...... : ٤١١٩، ٤١١٧ ] چنانچہ آپ نے جا کر بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ایک ماہ کے قریب جاری رہا، حتیٰ کہ وہ مقابلے سے عاجز آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا، آخر کار وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس شرط پر کہ ان کے بارے میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو فیصلہ کریں انھیں قبول ہوگا۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو خندق کے دوران بازو کی رگ میں تیر لگا تھا، جس کے نتیجے میں آخر کار وہ شہید بھی ہو گئے۔ ان کے سامنے یہ بات بھی تھی کہ اگر بنو قریظہ قریش کے ساتھ بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق کامیاب ہو جاتے تو مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیتے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ اس نے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔

3 **فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا** : ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہل قریظہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر اتر آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کی طرف پیغام بھیجا۔ وہ ایک گدھے پر سوار ہو کر آئے، جب مسجد کے قریب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا: (( قُوْمُوْا إِلٰى سَيِّدِكُمْ أَوْ خَيْرِكُمْ )) ''اپنے سردار یا (فرمایا) اپنے بہترین آدمی کی طرف اٹھو۔'' پھر آپ نے فرمایا: (( هٰؤُلَاءِ نَزَلُوْا عَلٰى حُكْمِكَ )) ''یہ لوگ تیرے فیصلے پر اترے ہیں۔'' سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: (( تُقْتَلُ مُقَاتِلَتُهُمْ وَ تُسْبٰى ذَرَارِيُّهُمْ )) ''ان کے لڑائی کے قابل مرد قتل کر دیے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی و غلام بنا لیا جائے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قَضَيْتَ بِحُكْمِ اللّٰهِ وَرُبَّمَا قَالَ بِحُكْمِ الْمَلِكِ )) ''تو نے اللہ کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔'' یا یہ فرمایا: ''بادشاہ کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کیا۔'' [ بخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب...... : ٤١٢١ ] بنو قریظہ کے عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''میں بنو قریظہ کے قیدیوں میں سے تھا، مسلمان دیکھتے تھے جس کے

وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ

اور تمھیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث بنا دیا اور اس زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا تھا اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۷﴾ اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دے اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ سامان دے دوں اور تمھیں رخصت کر دوں،

---

(زیر ناف) بال اگے ہوتے اسے قتل کر دیتے اور جس کے نہ اگے ہوتے اسے قتل نہ کرتے، چنانچہ میں ان میں سے تھا جن کے بال نہیں اگے تھے۔'' [ أبو داوٗد، الحدود، باب في الغلام يصيب الحد : ٤٤٠٤ ]

**آیت 27** ① وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ : غزوۂ بنو قریظہ میں ان کے مردوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی و غلام بنانے کے علاوہ ان کے کھیت، باغات، مکانات، قلعے، مویشی، ہتھیار اور درہم و دینار وغیرہ سب مسلمانوں کی ملکیت میں آ گئے، جو خمس نکال کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیے گئے۔

② وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا : ''وَطِئَ يَطَأُ وَطْأً'' ''اَلشَّيْءَ بِرِجْلِهِ'' ''کسی چیز کو پاؤں سے روندنا۔'' یعنی اس زمین کا بھی مالک بنا دیا جس پر تم نے قدم نہیں رکھا تھا۔ مراد اس سے بنو قریظہ کی زمین ہی ہے، یعنی ان کی وہ زمین جہاں ان کی قوت و شوکت کی وجہ سے تم قدم تک نہ رکھ سکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمھاری میراث بنا دی۔ بعض مفسرین نے اس سے بنو قریظہ کے بعد فتح ہونے والے علاقے، مثلاً خیبر، پھر مکہ، حنین، تبوک، فارس، روم، غرض قیامت تک مسلمانوں کی ملکیت میں آنے والے تمام علاقے مراد لیے ہیں۔ مگر اس صورت میں ''وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ'' کے بعد ''وَيُوَرِّثُكُمْ أَرْضًا لَمْ تَطَئُوْهَا'' ہونا چاہیے تھا، یعنی یہ کہنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں بنو قریظہ کی زمین، ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ تمھیں ایسی زمین کا وارث بھی بنائے گا جس پر تم نے قدم نہیں رکھا۔ اگرچہ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن میں آئندہ ہونے والے واقعات کو یقینی ہونے کی وجہ سے ماضی کے صیغے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مگر ایک ہی ماضی کے صیغے ''وَ اَوْرَثَكُمْ'' کے ساتھ ماضی اور مستقبل دونوں مراد لینا بہر حال قابلِ غور ہے۔

③ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرًا : یعنی یہ سب کچھ تمھاری بہادری یا مہارت کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ محض اللہ کی مدد سے ہوا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر ہمیشہ سے پوری طرح قادر ہے، اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔

**آیت 28** ① يٰۤاَيُّهَا النَّبِیُّ...... : نبی کریم ﷺ ہمیشہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے اور مال غنیمت میں سے خمس کا اختیار رکھنے کے باوجود سب کچھ ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتے۔ نتیجہ اس کا گھر میں تنگی و ترشی کے ساتھ گزارا تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (( مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مُنْذُ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ مِنْ طَعَامِ بُرٍّ ثَلَاثَ لَيَالٍ تِبَاعًا حَتّٰى قُبِضَ )) [ بخاري، الرقاق، باب كيف كان عيش النبي ﷺ و أصحابه...... : ٦٤٥٤ ] ''محمد ﷺ کے گھر والوں نے، جب سے آپ

# وَ اُسَرِّحۡكُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ﴿۲۸﴾

## اچھے طریقے سے رخصت کرنا ﴿۲۸﴾

مدینہ میں آئے، تین دن پے در پے گندم کا کھانا سیر ہو کر نہیں کھایا، یہاں تک کہ آپ فوت ہو گئے۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا ہی نے بیان فرمایا: (( مَا أَكَلَ آلُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَكْلَتَيْنِ فِيْ يَوْمٍ إِلَّا إِحْدَاهُمَا تَمْرٌ )) [ بخاري، الرقاق، كيف كان عيش النبي ﷺ ...... : ٦٤٥٥ ] ''محمد ﷺ کے گھر والوں نے کسی دن دو دفعہ کھانا نہیں کھایا، مگر ان میں سے ایک دفعہ صرف کھجور ہوتی تھی۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے عروہ سے فرمایا: (( ابْنَ أُخْتِيْ! إِنْ كُنَّا لَنَنْظُرُ إِلَى الْهِلَالِ ثَلَاثَةَ أَهِلَّةٍ فِيْ شَهْرَيْنِ، وَمَا أُوْقِدَتْ فِيْ أَبْيَاتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَارٌ فَقُلْتُ مَا كَانَ يُعِيْشُكُمْ ؟ قَالَتِ الْأَسْوَدَانِ التَّمْرُ وَ الْمَاءُ إِلَّا أَنَّهُ قَدْ كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ جِيْرَانٌ مِنَ الْأَنْصَارِ كَانَ لَهُمْ مَنَائِحُ، وَ كَانُوْا يَمْنَحُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْ أَبْيَاتِهِمْ، فَيَسْقِيْنَاهُ )) [ بخاري، الرقاق، باب كيف كان عيش النبي ﷺ...... : ٦٤٥٩ ] ''بھانجے! ہم چاند دیکھتے تھے، دو مہینوں میں تین چاند، اس حال میں کہ رسول اللہ ﷺ کے گھروں میں آگ نہیں جلی ہوتی تھی۔'' میں نے کہا: ''پھر تمھیں کیا چیز زندہ رکھتی تھی؟'' کہا: ''دو سیاہ چیزیں، کھجور اور پانی، مگر رسول اللہ ﷺ کے انصار میں سے کچھ پڑوسی تھے جن کے پاس دودھ والے جانور تھے اور وہ اپنے گھروں سے (کچھ دودھ) رسول اللہ ﷺ کو بطور تحفہ دے دیا کرتے تھے اور آپ ہمیں وہ پلا دیتے۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: (( كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَبِيْتُ اللَّيَالِيَ الْمُتَتَابِعَةَ طَاوِيًا وَ أَهْلُهُ لَا يَجِدُوْنَ عَشَاءً )) [ ترمذي، الزهد، باب ما جاء في معيشة النبي ﷺ وأهله : ٢٣٦٠، وقال الألباني حسن ] ''رسول اللہ ﷺ کئی راتیں خالی پیٹ گزار دیتے اور آپ ﷺ کے گھر والوں کو شام کا کھانا نہیں ملتا تھا۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے بستر کے متعلق بتایا: (( كَانَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْ أَدَمٍ، وَحَشْوُهُ مِنْ لِيْفٍ )) [ بخاري، الرقاق، باب كيف كان عيش النبي ﷺ...... : ٦٤٥٦ ] ''رسول اللہ ﷺ کا بستر چمڑے کا تھا، جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔'' لطف یہ کہ رسول اللہ ﷺ اس حال پر خوش تھے اور آپ نے اسے اللہ تعالیٰ سے مانگ کر لیا تھا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا )) [ مسلم، الزكاة، باب في الكفاف و القناعة : ١٠٥٥ ] ''اے اللہ! آل محمد کا رزق گزارے کے برابر کر دے۔''

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَ أَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ لِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ إِنَّهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ أَغْنِيَائِهِمْ بِأَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا )) [ ترمذي، الزهد، باب ما جاء أن فقراء المهاجرين...... : ٢٣٥٢ ] ''اے اللہ! مجھے مسکین ہونے کی حالت میں زندہ رکھنا، مسکین ہونے کی حالت میں موت دے اور مسکینوں کی جماعت سے اٹھا۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! یہ کیوں؟'' آپ نے فرمایا: ''وہ جنت میں اپنے اغنیاء سے چالیس (۴۰) سال پہلے جائیں گے۔'' ظاہر ہے زندگی کا یہ معیار

نہایت صبر آزما اور مشکل ہے، اس معیارِ زندگی میں آپ کے ساتھ ازواج مطہرات بھی شریک تھیں۔

❷ **قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ** : بنو قریظہ کے اموال اور دوسری فتوحات کے نتیجے میں جب مسلمانوں کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو انصار و مہاجرین کی عورتوں کو دیکھ کر آپ ﷺ کی بیویوں نے بھی نان و نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کسی صورت اپنی زہد و قناعت کی زندگی ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بیویوں کے اصرار پر آپ کو سخت رنج اور صدمہ ہوا اور آپ نے قسم کھا لی کہ میں ایک ماہ تک تمھارے پاس نہیں آؤں گا۔ اسے ''ایلاء'' کہتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۲۶، ۲۲۷) پھر آپ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہونے کی اجازت لینے کے لیے آئے تو دیکھا کہ لوگ آپ ﷺ کے دروازے پر بیٹھے ہیں، ان میں سے کسی کو اجازت نہیں ملی۔ خیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اجازت مل گئی، وہ اندر آ گئے، پھر عمر رضی اللہ عنہ اجازت کے لیے آئے، انھیں بھی اجازت مل گئی۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو پایا کہ آپ ﷺ بیٹھے ہیں اور آپ کے گرد آپ ﷺ کی بیویاں ہیں، آپ غمگین اور خاموش ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: ''میں ضرور کوئی ایسی بات کروں گا جس سے رسول اللہ ﷺ کو ہنساؤں گا۔'' چنانچہ وہ کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! کبھی آپ خارجہ کی بیٹی (میری بیوی) کو دیکھتے، اس نے مجھ سے خرچہ مانگا تو میں نے اٹھ کر اس کی گردن دبا دی۔'' رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور فرمانے لگے: ''یہ سب میرے اردگرد بیٹھی ہیں، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، یہ مجھ سے خرچہ مانگتی ہیں۔'' تو ابوبکر رضی اللہ عنہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گردن دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور عمر رضی اللہ عنہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن دبانے کے لیے اٹھے۔ دونوں کہہ رہے تھے کہ تم رسول اللہ ﷺ سے وہ مانگتی ہو جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ وہ دونوں کہنے لگیں: ''اللہ کی قسم! ہم کبھی رسول اللہ ﷺ سے وہ چیز نہیں مانگیں گی جو آپ ﷺ کے پاس نہ ہو۔'' پھر آپ ﷺ ان سے ایک ماہ یا انتیس دن علیحدہ رہے، پھر آپ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴾

[ الأحزاب : ۲۸ ] [ مسلم، الطلاق، باب بیان أن تخییره امرأته...... : ۱٤۷٥ ]

❸ **اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا** : صحیح بخاری میں عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث میں ہے کہ بیویوں سے ایک ماہ تک علیحدہ رہنے کی قسم کا ایک باعث حفصہ رضی اللہ عنہا کا عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کا راز بتانا بھی تھا، جس کا ذکر سورۂ تحریم میں ہے۔ اسی حدیث میں ہے کہ جب انتیس دن گزر گئے تو سب سے پہلے آپ ﷺ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے آپ سے کہا: ''آپ نے تو ہمارے ہاں ایک ماہ تک نہ آنے کی قسم کھائی تھی اور ابھی انتیس راتیں گزری ہیں، میں انھیں اچھی طرح گنتی رہی ہوں۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ مہینا انتیس دنوں کا ہے۔'' اور وہ مہینا تھا بھی انتیس دنوں کا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''پھر اللہ تعالیٰ نے اختیار دینے کی آیت نازل فرمائی تو سب بیویوں سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا، فرمایا: ''میں تم سے ایک بات کہنے لگا ہوں، کوئی حرج نہیں کہ اس کے جواب میں جلدی نہ کرو اور اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لو۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میں خوب جانتی تھی کہ میرے ماں باپ مجھے آپ ﷺ سے جدا ہونے کی رائے کبھی نہیں دیں گے۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ ...... اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [ الأحزاب : ۲۸، ۲۹ ]

وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخری گھر کا ارادہ رکھتی ہو تو بے شک اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے ﴿۲۹﴾

---

میں نے کہا: ''کیا میں اس کے متعلق اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں گی؟ میں تو اللہ اور اس کے رسول کو اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہوں۔'' پھر آپ ﷺ نے اپنی باقی بیویوں کو بھی اختیار دیا، انھوں نے بھی وہی بات کہی جو عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہی تھی۔
[ بخاري، المظالم، باب الغرفة و العلية ...... : ۲٤٦٨ ]

④ ابن کثیر نے عکرمہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ اس وقت آپ کے نکاح میں نو (۹) بیویاں تھیں، پانچ قریش سے تھیں: عائشہ، حفصہ، ام حبیبہ، سودہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن اور بنو نضیر سے صفیہ بنت حیی، بنو ہلال سے میمونہ بنت حارث، بنو اسد سے زینب بنت جحش اور بنو المصطلق سے جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہن۔

⑤ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اختیار دیا، ہم نے اللہ اور اس کے رسول کو پسند کیا تو آپ ﷺ نے اسے ہم پر کچھ شمار نہیں کیا۔'' [ بخاري، الطلاق، باب من خيّر أزواجه...... : ٥٢٦٢ ] اس سے معلوم ہوا اختیار دینے کے بعد بیوی خاوند کے پاس رہنا پسند کرے تو اس سے کسی قسم کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

⑥ فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ : "تَعَالَيْنَ" (آؤ) "عَلَا يَعْلُوْ" سے باب تفاعل میں سے جمع مؤنث امر حاضر کا صیغہ ہے۔ اصل اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص اونچی جگہ کھڑا ہو کر کسی سے کہے اوپر آؤ، پھر کسی کو بھی بلانے کے لیے "تَعَالَ" (آؤ) استعمال ہونے لگا۔

⑦ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا : آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے لیے دو چیزوں میں سے ایک چیز پسند کر لو، پہلی یہ کہ اگر تم دنیا کی زندگی، اس کی زیب و زینت اور آرائش کو پسند کرتی ہو تو میرے ساتھ تمھارے رہنے کی کوئی صورت نہیں، پھر آؤ میں تمھیں کچھ سامان دے دیتا ہوں (جس کا طلاق دیتے وقت اپنی حیثیت کے مطابق دینے کا حکم ہے، جسے ''متعہ طلاق'' کہتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ: ۲۳۶ تا ۲۴۱) اور تمھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیتا ہوں، یعنی کوئی طعن و تشنیع کیے یا کوئی تکلیف دیے بغیر طلاق دے کر آزاد کر دیتا ہوں۔ دوسری چیز کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

**آیت 29** ① وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ...... : اور دوسری یہ کہ اگر تم اللہ کی رضا اور اس کے رسول کی رضا اور آخرت کے گھر کی طلب گار ہو اور اس کے لیے تنگی ترشی کی زندگی پر صبر کر سکتی ہو تو تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

② لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ : شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''یہ جو فرمایا "لِلْمُحْسِنٰتِ" (جو نیکی پر رہیں) تو آپ ﷺ کی ازواج سب نیک ہی رہیں، مگر حق تعالیٰ صاف خوش خبری کسی کو نہیں دیتا، تاکہ نڈر نہ ہو جائے، خاتمہ کا ڈر لگا رہے۔''

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ط

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی بے حیائی (عمل میں) لائے گی اس کے لیے عذاب دگنا بڑھایا جائے گا اور

③ اَجْرًا عَظِيْمًا : مفسر آلوسی نے فرمایا: ''جب ازواج مطہرات کو اختیار دیا گیا اور انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو پسند کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی تعریف فرمائی اور فرمایا: ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ ﴾ [ الأحزاب : ٥٢ ] ''تیرے لیے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ کہ تو ان کے بدلے کوئی اور بیویاں کر لے، اگرچہ ان کا حسن تجھے اچھا لگے۔'' (روح المعانی) ان بیویوں سے مراد وہ نو بیویاں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اس سے بڑا اجر کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری اور عمل صالح کی صورت میں دوہرے اجر کی بشارت دی، پھر اس کے صلے میں انھیں زندگی بھر نبی ﷺ کی زوجیت کا شرف حاصل رہا اور جنت میں بھی وہ آپ کے ساتھ ہوں گی۔ [ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُنَّ وَ أَرْضَاهُنَّ ]

**آیت 30** ① يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ...... : قاموس میں ہے: ''اَلْفَاحِشَةُ الزِّنَا وَمَا يَشْتَدُّ قُبْحُهُ مِنَ الذُّنُوْبِ وَ كُلُّ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ'' یعنی ''فاحشہ کا معنی ہے زنا اور وہ گناہ جو سخت قبیح ہوں اور ہر وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔'' قرآن مجید میں ''اَلْفَاحِشَةُ'' (خاص بے حیائی، معرف باللام) کا لفظ زنا کے لیے آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ﴾ [ النساء : ١٥ ] ''اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں، ان پر اپنے میں سے چار مرد گواہ طلب کرو۔'' جبکہ ''فَاحِشَةٌ'' (نکرہ) سے مراد کوئی بھی گناہ ہوتا ہے اور ''فَاحِشَةٌ مُبَيِّنَةٌ'' سے مراد فحش کلامی، بدخلقی، ایذا رسانی یا کوئی بھی علانیہ گناہ لیا گیا ہے، جس میں زنا بھی شامل ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۹) یہاں سے امہات المومنین کو ادب سکھانے کے لیے چند نصیحتیں کی گئیں ہیں، کیونکہ وہ امت کے لیے نمونہ ہیں۔ فرمایا، اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی بے حیائی عمل میں لائے گی اس کا عذاب دگنا بڑھایا جائے گا، یعنی تم میں سے جو بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدخلقی یا فحش کلامی یا ایذا رسانی کا معاملہ کرے گی اسے دگنا عذاب دیا جائے گا، کیونکہ جس کا مقام جتنا بلند ہوتا ہے نافرمانی کی صورت میں اسے سزا بھی اتنی سخت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو کفار کی طرف مائل ہونے کی صورت میں فرمایا: ﴿ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ﴾ [ بني إسرائيل : ٧٥ ] ''اس وقت ہم ضرور تجھے زندگی کے دگنے اور موت کے دگنے (عذاب) کا مزہ چکھاتے۔''

الوسیط للطنطاوی میں لکھا ہے: ''کسی نے حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے علی زین العابدین سے کہا، تم اہل بیت تو بخشے بخشائے ہو۔ تو وہ غصے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ ہم پر تو وہ قانون زیادہ لاگو ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی بیویوں پر لاگو کیا کہ ہمارے برائی کرنے والے کو دگنا عذاب ہو اور ہمارے نیکی کرنے والے کو دگنا ثواب ہو۔'' نبی ﷺ کی بیویوں سے گناہ کے ارتکاب میں نبی ﷺ پر بھی حرف آتا تھا اور یہ آپ کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہوتا، جو عام مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے سے بڑا گناہ اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کا باعث ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا

## وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

## یہ بات اللہ پر ہمیشہ سے آسان ہے ۝۳۰

وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴾ [ الأحزاب : ٥٧ ] ''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا۔''

2 ''بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ '' کا لفظ نکرہ ہونے کی وجہ سے عام ہے، اس لیے اس سے بدخلقی، فحش کلامی کے علاوہ زنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں سوال اٹھتا ہے کہ معاذ اللہ، کیا ازواج مطہرات سے برائی کا اندیشہ تھا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ جملہ شرطیہ ہے، واقع میں ایسا ہونا ضروری نہیں، مقصود صرف ازواج مطہرات کے مرتبے کے پیش نظر ان کو گناہ کے ارتکاب کی صورت میں دگنے عذاب سے خبردار کرنا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس سے بھی بڑے، بلکہ تمام گناہوں سے بڑے گناہ کے انجام سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [ الزمر : ٦٥ ] ''اور بلاشبہ یقیناً تیری طرف وحی کی گئی اور ان لوگوں کی طرف بھی جو تجھ سے پہلے تھے کہ بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا۔'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یا پہلے انبیاء سے شرک کے ارتکاب کا اندیشہ تھا۔

3 وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا : یعنی تمھیں غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ تم نبی کی بیویاں ہو اور تم پر کوئی گرفت نہ ہو گی۔

وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ



**اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک عمل کرے گی اسے ہم اس کا اجر دو بار دیں گے اور ہم نے اس کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے ﴿۳۱﴾ اے نبی کی بیویو! تم عورتوں میں سے کسی ایک**

آیت 31 ① وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ...... : اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی بیویوں سے فرمایا کہ جس طرح تمھارے لیے گناہ پر عذاب دگنا ہے اسی طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری اور عمل صالح پر ثواب بھی دگنا ہے، کیونکہ جس طرح تمھارے گناہ میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کے ساتھ ان کی ایذا بھی ہے، اسی طرح ان کی فرماں برداری پر اطاعت کے ساتھ ان کی خاص خوشی بھی ہے۔ دوہرے گناہ اور دوہرے ثواب کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ازواج مطہرات امت کے لیے نمونہ ہیں۔ انھیں دیکھ کر اگر کسی نے گناہ کیا تو اس کا وبال ان پر بھی ہوگا اور اگر انھیں دیکھ کر کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اختیار کی تو اس کا ثواب انھیں بھی ملے گا۔

② وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا : ازواج مطہرات کو اختیار دینے کے حکم کا باعث ان کا خرچے میں اضافے کا مطالبہ تھا۔ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کو ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے جو آخرت کی طلب میں اللہ اور اس کے رسول کی فرماں بردار رہے اور عمل صالح کرے، ہم نے اس کے لیے بہت عزت والا رزق تیار کر رکھا ہے۔ مفسرین نے اس رزق کریم سے مراد جنت کا رزق بیان فرمایا ہے۔ یقیناً اس سے زیادہ عزت والا رزق کوئی نہیں، مگر اس میں جنت کے علاوہ آئندہ ہونے والی فتوحات کے حوالے سے رزق کی فراخی کی بشارت بھی ہے، کیونکہ مالِ غنیمت بھی رزق کریم ہے، جس کے حصول میں رزق کے ساتھ فتح کی عزت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ اس کے خمس میں سے ہر بیوی کو اسّی (۸۰) وسق (دو سو چالیس من) کھجوریں اور بیس (۲۰) وسق (ساٹھ من) جو دیا کرتے تھے (اور یہ وظیفہ آپ کی وفات کے بعد بھی جاری رہا)۔'' [ أبو داوٗد، الخراج، باب ما جاء في حكم أرض خيبر : ۳۰۰۶، و قال الألباني حسن الإسناد ] یہ الگ بات ہے کہ امہات المومنین رسول اللہ ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں آپ ﷺ ہی کی طرح اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتیں اور اسی زندگی پر قناعت کرتیں جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے اختیار کی تھی۔

آیت 32 ① يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ ...... : یعنی تمھاری حیثیت اور مرتبہ عام عورتوں جیسا نہیں، بلکہ تمھیں نبی کی بیویاں ہونے کا جو شرف عطا ہوا ہے اس کی وجہ سے تمھارا مقام دوسری عورتوں سے بلند ہے اور تم ان کے لیے نمونہ ہو۔ اس آیت سے بعض اہلِ علم نے استدلال کیا ہے کہ ازواج مطہرات دوسری عورتوں سے افضل ہیں، البتہ آسیہ زوجہ فرعون، مریم بنت عمران اور فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ان کی فضیلت صحیح نصوص سے ثابت ہے۔

فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

جیسی نہیں ہو، اگر تقویٰ اختیار کرو تو بات کرنے میں نرمی نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کر بیٹھے اور وہ بات کہو جو اچھی ہو ﴿۳۲﴾

دیکھیے سورۂ آل عمران (۴۲) زمخشری نے فرمایا: ''أَحَدٍ'' کا لفظ مذکر، مؤنث، واحد، تثنیہ اور جمع سب کے لیے آتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم عورتوں کی جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت جیسی نہیں ہو۔ یعنی جب عورتوں کی قوم کو ایک ایک جماعت کر کے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی جماعت ایسی نہیں جو فضیلت اور پیش قدمی میں تمھارے برابر ہو۔''

② اِنِ اتَّقَيْتُنَّ : اس کا تعلق پہلے جملے سے ہے، یعنی دوسری عورتوں سے افضل ہونے کے لیے شرط تقویٰ ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ وہ بے خوف نہ ہو جائیں، بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہیں اور ان کاموں سے بچتی رہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ازواج مطہرات کا آخر دم تک تقویٰ پر قائم رہنا ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، لہٰذا ان کی فضیلت بھی مسلّم ہے۔ '' اِنِ اتَّقَيْتُنَّ '' کا تعلق بعد والے جملے سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو بات کرنے میں لوچ اور نرمی اختیار نہ کرو۔

③ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ...... : اللہ تعالیٰ نے جس طرح عورت کے وجود میں مرد کے لیے جنسی کشش رکھی ہے، جس کی حفاظت کے لیے پردے کا اور آنکھ نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح عورت کی آواز میں بھی فطری طور پر دل کشی، نرمی اور نزاکت رکھی ہے، جو مرد کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اس لیے نبی ﷺ کی بیویوں کو حکم دیا گیا کہ مردوں سے بات کرتے وقت ایسا لہجہ اختیار کریں جس میں نرمی اور دل کشی کے بجائے قدرے سختی اور مضبوطی ہو، تاکہ دل کا کوئی بیمار کسی غلط خیال میں مبتلا ہو کر آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امہات المومنین کو ایسے لہجے میں غیر محرم مردوں سے بات کرنے کی اجازت تھی جو لوچ اور ملائمت سے خالی ہو۔ خصوصاً اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی گھریلو زندگی اور عورتوں کے مسائل کے متعلق امت کو وہی بہتر اور پوری طرح آگاہ کر سکتی تھیں اور فی الواقع انھوں نے یہ فریضہ بہترین طریقے سے ادا کیا۔ عام طور پر جو کہا جاتا ہے کہ عورت کی آواز غیر محرم کو سننا جائز نہیں، یہ بات درست نہیں۔ واضح رہے کہ یہ حکم امہات المومنین کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ امت کی تمام عورتوں کے لیے ہے، کیونکہ ازواج مطہرات امت کی عورتوں کے لیے نمونہ ہیں۔ اگلی آیت میں مذکور احکام بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ اگرچہ ان کی اوّلین مخاطب امہات المومنین ہیں، مگر یہ حکم سب کے لیے ہے، ورنہ دوسری عورتوں کے لیے جاہلیت کے زمانے کی عورتوں کی طرح زیب و زینت کے عام اظہار کی اجازت ہو گی، جب کہ انھیں زور سے زمین پر پاؤں مار کر مخفی زینت کے اظہار کی بھی اجازت نہیں۔ دیکھیے سورۂ نور (۳۱)۔

④ وَ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا : نرمی سے بات کرنے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں کہ ایسی بات کرو جو اخلاق کے منافی ہو اور اس میں مخاطب کی بے عزتی ہو، بلکہ صرف لہجے میں مضبوطی ہونی چاہیے، بات بہرصورت اچھی اور دستور کے مطابق ہونی لازم ہے۔

وَ قَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی وَ اَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیۡنَ

اور اپنے گھروں میں ٹکی رہو اور پہلی جاہلیت کے زینت ظاہر کرنے کی طرح زینت ظاہر نہ کرو اور نماز قائم کرو اور

**آیت 33** ① وَ قَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ : "قَرۡنَ" باب "قَرَّ یَقَرُّ قَرَارًا" (سمع) (کسی جگہ ٹھہرنا) سے جمع مؤنث امر حاضر کا صیغہ ہے، جو اصل میں "اِقۡرَرۡنَ" تھا۔ پہلی راء کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا اور اس کا فتحہ قاف کو دے دیا، ہمزہ وصلی کی ضرورت نہ رہی، اس لیے اسے حذف کر دیا گیا، جیسا کہ "ظَلِلۡتَ" کو پہلا لام حذف کر کے "ظَلۡتَ" کر دیا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے "وَقَرَ یَقِرُ وَقَارًا" (ض) سے مشتق قرار دیا ہے، مگر یہ صرف اس قراءت کی صورت میں ہو سکتا ہے جس میں "قَرۡنَ" کو قاف کے کسرہ کے ساتھ "قِرۡنَ" پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ "وَعَدَ یَعِدُ" میں سے "عِدۡنَ" کے وزن پر ہوگا۔ قاف کے فتحہ کی صورت میں اسے "وَقَارٌ" سے مشتق قرار دینا مشکل ہے۔ اس آیت میں ازواج مطہرات کو گھروں کے اندر ٹھہرے رہنے کا حکم دیا، کیونکہ اس میں ان کی زیادہ حفاظت اور سلامتی پائی جاتی ہے۔ یہی حکم دوسری عورتوں کے لیے بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلۡمَرۡأَۃُ عَوۡرَۃٌ وَ إِنَّھَا إِذَا خَرَجَتِ اسۡتَشۡرَفَھَا الشَّیۡطَانُ وَ إِنَّھَا لَا تَکُوۡنُ أَقۡرَبَ إِلَی اللّٰہِ مِنۡھَا فِیۡ قَعۡرِ بَیۡتِھَا )) [ طبراني في الأوسط : ۳/ ۱۸۹، ح : ۲۸۹۰، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ : ۶/ ۱۸۷، ح : ۲۶۸۸ ] "عورت پردے کی چیز ہے، وہ جب نکلتی ہے تو شیطان اسے گردن اٹھا کر دیکھتا ہے اور وہ اللہ کے اس سے زیادہ کبھی قریب نہیں ہوتی جس قدر وہ اپنے گھر کے اندر (رہ کر قریب) ہوتی ہے۔"

② وَ لَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی : "تَبَرُّجَ" کا معنی ہے عورت کا غیر محرم مردوں کے سامنے اپنی اس زینت کا اظہار کرنا جسے چھپانا واجب ہے، یعنی اسلام سے پہلے جاہلیت کے دور میں عورتیں جس طرح بن سنور کر اور زینت لگا کر مردوں کے سامنے آتی تھیں تم ایسا مت کرو۔ یہاں "الۡاُوۡلٰی" کا لفظ احتراز کے لیے نہیں بلکہ جاہلیت جہلا کی طرح یا تو ایک محاورہ ہے، یا اسلام سے پہلے کی حالت کے اعتبار سے "الۡاُوۡلٰی" فرما دیا ہے۔ جاہلیت میں رواج تھا کہ عورتیں بناؤ سنگار کر کے بے پردہ باہر نکلا کرتی تھیں۔ افسوس! اب یہی رواج ثقافت اور دوسرے خوش نما ناموں سے مسلمانوں میں رائج ہو گیا ہے۔ اس جملے سے معلوم ہوا کہ عورت زینت چھپا کر ضرورت کے لیے گھر سے نکل سکتی ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد سودہ رضی اللہ عنہا اپنی حاجت کے لیے نکلیں، وہ جسیم عورت تھیں، پہچاننے والے پر مخفی نہیں رہتی تھیں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا تو کہا: "اے سودہ! اللہ کی قسم! تم ہم پر مخفی نہیں رہتیں، اس لیے دیکھا کرو کیسے نکلتی ہو؟" عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ واپس پلٹ آئیں، رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تھے، آپ شام کا کھانا کھا رہے تھے، آپ کے ہاتھ میں گوشت کی بوٹی تھی کہ انھوں (سودہ رضی اللہ عنہا) نے آ کر کہا: "اے اللہ کے رسول! میں اپنی کسی ضرورت کے لیے نکلی تو عمر (رضی اللہ عنہ) نے مجھے ایسے ایسے کہا۔" فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی حال میں آپ پر وحی فرمائی کہ وہ بوٹی آپ کے ہاتھ میں تھی، آپ نے رکھی نہ تھی، آپ نے فرمایا: (( إِنَّہٗ قَدۡ أُذِنَ لَکُنَّ أَنۡ تَخۡرُجۡنَ لِحَاجَتِکُنَّ )) [ بخاري، التفسیر، باب قوله : ﴿ لا تدخلوا بیوت النبي ...... ﴾ : ۴۷۹۵ ] "تم عورتوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ اپنی حاجت کے لیے باہر نکلو۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ

الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ

**زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے گھر والو!**

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عورتوں کے باہر نکلنے پر مکمل پابندی لگانے کے خواہش مند تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے لیے انھیں نکلنے کی اجازت عطا فرمائی۔ مگر اس کے لیے پردے کی پابندی لگائی، حتیٰ کہ وہ نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں جانا چاہیں تو بھی حکم ہے کہ زینت کا اظہار کرتی ہوئی نہ نکلیں اور خوشبو لگائے ہوئے نہ ہوں۔

③ **وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ** ...... : ازواج مطہرات کے لیے عار بننے والی چیزوں سے اجتناب کے حکم کے بعد انھیں فرائض کی ادائیگی کا حکم دیا۔ چنانچہ بدنی عبادتوں میں سب سے افضل عبادت نماز کا اور مالی عبادتوں میں سب سے افضل عبادت زکوٰۃ کا حکم دیا۔ اس کے بعد جامع حکم دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات کی اطاعت کریں۔ اس میں ازواج مطہرات کے لیے بشارت بھی ہے کہ ان پر خوش حالی کا وقت آنے والا ہے، جس میں وہ زکوٰۃ ادا کریں گی، چنانچہ خیبر کی فتح کے بعد تنگی کا وقت ختم ہو گیا، جیسا کہ پیچھے گزرا ہے، پھر خلفائے راشدین کے زمانے میں روم و شام، مصر اور فارس فتح ہوئے، تو امہات المومنین میں سے ہر ایک کا سالانہ وظیفہ بارہ ہزار درہم مقرر ہو گیا، جو تقریباً ایک ہزار دینار (ساڑھے چار کلو سونے) کے برابر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ان کی ایسی تربیت ہوئی تھی کہ وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتی تھیں۔

④ **اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ** ...... : یعنی تمھیں لوچ دار آواز کے ساتھ بات کرنے اور جاہلیت کے اظہارِ زینت کی طرح زینت کے اظہار سے منع کرنے کا مقصد تمھاری تذلیل یا تم سے ناراضی کا اظہار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے ظاہری اور باطنی ہر قسم کی گندگی دور کرے اور تمھیں ہر قسم کے عیب سے خوب اچھی طرح پاک صاف رکھے۔ واضح رہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نعوذ باللہ پہلے ان میں ایسی کوئی گندگی موجود تھی، بلکہ قرآن مجید میں کسی چیز سے بچے رہنے کے لیے بھی اسے چھوڑ دینے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ [ یوسف : ۳۷ ] ”بے شک میں نے اس قوم کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور وہ آخرت کے ساتھ بھی کفر کرنے والے ہیں۔“

⑤ **اَهْلَ الْبَيْتِ** : اس سے پہلے ”یا“ کا لفظ محذوف ہے، جس کی وجہ سے یہ منصوب ہے، یعنی ”اے گھر والو!“ اس آیت سے پہلی اور اس کے بعد والی آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔ پہلی آیات میں ”**وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ**“ اور بعد والی آیات میں ”**وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ**“ صریح دلیل ہے کہ گھر والیاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔ بعض لوگوں نے سیاق و سباق کی واضح شہادت کے باوجود صرف اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو اہلِ بیت ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ ”**لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ**“ میں ضمیر ”کُمْ“ مذکر استعمال ہوئی ہے، حالانکہ اہلِ عرب خواتین سے خطاب

الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

اور تمھیں پاک کر دے، خوب پاک کرنا ﴿۳۳﴾

کے وقت ضمیر ''کُمْ'' عام استعمال کرتے ہیں، بلکہ قرآن مجید میں ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو ان کے اہلِ بیت کہا گیا ہے اور ان سے ضمیر ''کُمْ'' کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب فرشتوں نے انھیں بیٹے اور پوتے کی بشارت دی اور انھوں نے اس بڑھاپے میں اولاد ہونے پر تعجب کا اظہار کیا تو فرشتوں نے ان سے کہا: ﴿ اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ [ هود : ۷۳ ] ''کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے گھر والو!'' یہ آیت صریح نص ہے کہ بیوی اہلِ بیت ہوتی ہے اور عورت کو ضمیر ''کُمْ'' کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے۔ مشہور اسلامی شاعر عمر بن ابی ربیعہ نے کہا ہے ؎

فَإِنْ شِئْتُ حَرَّمْتُ النِّسَاءَ سِوَاكُمْ     وَ إِنْ شِئْتُ لَمْ أُطْعَمْ نُقَاخاً وَلَا بَرْدًا

صحیح احادیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت ہیں۔ چنانچہ جب ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی تو ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: (( يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ! مَنْ يَّعْذِرُنِيْ مِنْ رَجُلٍ قَدْ بَلَغَنِيْ أَذَاهُ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ؟ )) [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ لو لا إذ سمعتموه...... ﴾ : ٤٧٥٠ ] ''اے مسلمانوں کی جماعت! ایک ایسے شخص کے بارے میں کون میری مدد کرتا ہے جس کی اذیت رسانی اب میرے اہلِ بیت (یعنی میرے گھر والوں) تک پہنچ گئی ہے؟''

اگرچہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ بیت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہیں، مگر احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بھی اہلِ بیت میں شمار فرمایا ہے۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے انھیں اپنے اہلِ بیت میں شامل کروایا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: (( نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ [ الأحزاب : ۳۳ ] فِيْ بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ فَدَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ وَحَسَنًا وَحُسَيْنًا فَجَلَّلَهُمْ بِكِسَاءٍ وَ عَلِيٌّ خَلْفَ ظَهْرِهِ فَجَلَّلَهُ بِكِسَاءٍ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِيْ فَأَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَ طَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ وَ أَنَا مَعَهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ ، أَنْتِ عَلٰى مَكَانِكِ وَ أَنْتِ إِلٰى خَيْرٍ )) [ ترمذي، المناقب، باب في مناقب أهل بيت النبي صلی اللہ علیہ وسلم : ۳۷۸۷، و قال الألباني صحيح ] ''جب یہ آیت: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اتری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ، حسن اور حسین کو بلایا اور انھیں ایک چادر کے اندر کر لیا اور علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ کے پیچھے تھے، تو انھیں ایک چادر کے اندر کر لیا، پھر کہا: ''اے اللہ! یہ میرے اہل بیت

ع وَ اذۡكُرۡنَ مَا يُتۡلٰى فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الۡحِكۡمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيۡفًا خَبِيۡرًا ﴿۳۴﴾ ع

**اور تمھارے گھروں میں اللہ کی جن آیات اور دانائی کی باتوں کی تلاوت کی جاتی ہے انھیں یاد کرو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے نہایت باریک بین، پوری خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۴﴾**

---

(گھر والے) ہیں، سو ان سے گندگی دور کر دے اور انھیں پاک کر دے، خوب پاک کرنا۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا میں بھی ان کے ساتھ ہوں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اپنی جگہ پر ہے اور تو بھلائی کی طرف ہے۔'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو دعا کر کے اہلِ بیت میں شامل کروایا اور ان کے لیے گندگی دور کرنے اور انھیں پاک کرنے کی دعا فرمائی۔ یہ آیت اس سے پہلے اتر چکی تھی، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے پہلے آیت سے مراد صرف ازواج مطہرات تھیں۔ رہا ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا سوال اور آپ کا انھیں جواب، تو بعض حضرات نے اس سے یہ بات نکالنے کی کوشش کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اہلِ بیت میں شامل نہیں فرمایا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اطمینان دلایا کہ تمھیں یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ تم پہلے ہی اس مقام پر ہو اور خیر پر ہو۔ ان لوگوں پر تعجب ہے جو آیت کے اصل مصداق کو اہلِ بیت ماننے کے لیے تیار نہیں اور جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اہلِ بیت میں شامل کیا گیا، صرف ان کے اہلِ بیت ہونے پر اصرار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔

**آیت 34** ① **وَ اذۡكُرۡنَ مَا يُتۡلٰى فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ ......** : پچھلی آیات میں امہات المومنین کو عمل کا حکم دیا تھا، جس میں کچھ چیزوں سے اجتناب اور کچھ چیزوں کے ادا کرنے کا حکم تھا، اب انھیں علم حاصل کرنے اور اسے آگے پہنچانے کا حکم دیا۔ ''اذۡكُرۡنَ'' ''ذِکۡرٌ'' سے مشتق ہے، جس کا معنی دل میں یاد کرنا اور یاد رکھنا بھی ہے اور کسی کلام کو زبان پر لانا بھی۔ یعنی تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تلاوت کی جاتی ہے، اسے یاد کرو اور یاد رکھو، کبھی اس سے غفلت نہ کرو اور اسے دوسرے لوگوں کے سامنے بھی ذکر کرو اور ان تک پہنچاؤ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری یہ تھی کہ اللہ کے احکام امت تک پہنچا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مرد یا ایک عورت تک کوئی حکم پہنچا دینے سے آپ کا فریضہ ادا ہو جاتا تھا، پھر اس مرد یا عورت کا فرض ہوتا کہ اسے آگے پہنچائے، جیسا کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل : ٣٤٦١ ] ''میری طرف سے آگے پہنچا دو، خواہ ایک آیت ہو۔'' امت کے ہر فرد کو ہر حکم بہ نفسِ نفیس پہنچانا نہ آپ کے ذمے تھا، نہ آپ کے لیے ممکن تھا۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقوال و افعال اور احوال ایسے تھے جن کا تعلق گھریلو زندگی سے تھا اور جن کا علم صرف ازواج مطہرات کو ہوتا تھا، اس لیے انھیں آیات و حکمت کو یاد کرنے، انھیں یاد رکھنے اور لوگوں کے سامنے ذکر کرنے کا حکم دیا اور امہات المومنین نے یہ فریضہ نہایت خوش اسلوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا۔ چنانچہ دینی مسائل کا بہت بڑا حصہ انھی کے ذریعے سے امت تک پہنچا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی وہ ان سے پوچھتے اور انھیں ان کے پاس سے، خصوصاً

عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے اس کا تسلی بخش حل مل جاتا۔

2 یہ آیت عورتوں کو دین کی تعلیم دلانے کی واضح دلیل ہے، مردوں کی طرح ان پر بھی لازم ہے کہ قرآن و حدیث کا علم حاصل کریں اور اسے آگے پہنچائیں۔

3 "اٰيٰتِ اللّٰهِ" سے مراد قرآن کریم کی آیات ہیں۔ "الْحِكْمَةِ" کا لفظی معنی دانائی اور عقل کی بات ہے، مراد اس سے قرآن مجید کے علوم اور معانی ہیں جو رسول اللہ ﷺ بیان فرماتے تھے۔ اسی طرح اس میں رسول اللہ ﷺ کے جملہ اقوال و افعال اور احوال بھی شامل ہیں، کیونکہ وہ بھی قرآن کی عملی تفسیر تھے، جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (( كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ )) [ مسند أحمد : ۹۱/٦، ح : ۲٤٦٥٥ ] ''قرآن آپ کا خلق تھا۔'' یعنی قرآن آپ کی طبعی عادت بن چکا تھا کہ آپ کا ہر کام خود بخود قرآن مجید کے مطابق ہوتا تھا۔ اس لیے امام شافعی اور دوسرے ائمہ نے بہت سے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "الْحِكْمَةِ" سے مراد سنت ہے۔ بعض لوگ اس پر یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی طرح سنت کی بھی تلاوت ہوتی تھی، مگر یہ شبہ بے کار ہے، کیونکہ تلاوت کے لفظ کو صرف قرآن کی تلاوت کے لیے خاص کرنا بعد کی اصطلاح ہے۔ قرآن میں اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ سورۂ بقرہ میں یہی لفظ جادو کے ان الفاظ کے متعلق استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے، فرمایا: ﴿ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۰۲ ] ''اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھتے تھے۔'' ظاہر ہے وہاں تلاوت سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو سناتے تھے۔ ویسے یاد کرنے کرانے کے لیے حدیث رسول پڑھنا بھی کارِ ثواب ہے اور حدیث حفظ کرنے والے کو اسے بار بار پڑھنا پڑتا ہے۔ ہاں، پڑھنے پڑھنے میں فرق ضرور ہے۔

4 یہ آیت ازواج مطہرات کے اہلِ بیت ہونے کی بھی واضح دلیل ہے، کیونکہ "فِيْ بُيُوْتِكُنَّ" میں رسول اللہ ﷺ کے گھروں کو ان کے گھر کہا گیا ہے۔

5 اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا : "لَطِيْفًا" کے لفظ میں بے حد مہربانی کے ساتھ باریک بینی اور خفیہ طریقے سے کسی کام کے ادا کرنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ دونوں صفات ذکر کرنے میں کئی باتوں کی طرف اشارہ ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا تمام عورتوں میں سے ازواج مطہرات کو نبی ﷺ کی صحبت کے لیے چننا، ان کی طہارت کا اہتمام کرنا، انھیں علم و عمل کا کمال حاصل کرنے کا موقع عطا کرنا، اس کے مخفی سے مخفی امور سے واقف ہونے، اس کے نہایت مہربان ہونے اور ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہونے کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے اس نے انھیں اس کا اہل سمجھ کر اس مرتبے کے لیے منتخب فرمایا۔ ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ چونکہ یہ آیات ازواج مطہرات کے خرچے میں اضافے کے مطالبے پر نازل ہوئیں، لہٰذا مطلب یہ ہے کہ حالات بظاہر تمھارے لیے مشکل ہیں، لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کو ترجیح دو گی تو آخرت کی نعمتوں کے ساتھ دنیا کی خوش حالی بھی کچھ دور نہیں، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ایسے باریک طریقوں سے وجود میں لے آتا ہے جو کسی کی سوچ میں بھی نہیں آسکتے۔ وہ لطیف بھی ہے اور پوری طرح باخبر بھی، اس نے ان لوگوں کو جو دنیا کی زیب و زینت سے بے نیاز تھے، زمین کے

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ

بے شک مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد

مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا اور جو دنیا کے طلب گار تھے اور جن کی ساری تگ و دو ہی دنیا کے لیے تھی انھیں غلام بنا دیا۔

آیت 35 ❶ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ ...... : امہات المومنین کو پاکیزہ اعمال و اخلاق کی ترغیب، برے اطوار سے اجتناب کی تلقین اور کتاب و حکمت کے سیکھنے اور سکھانے کی تاکید کے بعد ان دس صفاتِ کمال کا ذکر فرمایا جن پر کار بند ہونے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ مگر ان صفات والوں کو عام الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا اور تمام مردوں اور عورتوں دونوں کو الگ الگ صراحت کے ساتھ ذکر فرمایا، تاکہ کوئی اسے امہات المومنین کے ساتھ خاص نہ سمجھ لے، نہ ان فضائل کو اور ان کے اجر و ثواب کو صرف مردوں کا حصہ سمجھ لے۔

❷ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! قرآن میں جس طرح مردوں کا ذکر ہوتا ہے ہم عورتوں کا نہیں ہوتا۔'' تو اچانک ایک دن میں نے منبر پر آپ کی آواز سنی، میں نے دروازے کے قریب ہو کر کان لگایا تو آپ فرما رہے تھے: ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآىِٕمِيْنَ وَ الصّٰٓىِٕمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

[ الأحزاب : ٣٥ ] [ مسند أحمد : ٣٠١/٦، ح : ٢٦٥٧٥، و قال المحقق صحيح ]

❸ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ : اسلام کا معنی انقیاد (تابع ہو جانا) ہے اور ایمان کا معنی تصدیق ہے۔ پھر ان کا استعمال تین طرح ہوتا ہے، کبھی دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۟ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [ الذاريات : ٣٥، ٣٦ ] ''سو ہم نے اس (بستی) میں ایمان والوں سے جو بھی تھا نکال لیا۔ تو ہم نے اس میں مسلمانوں کے ایک گھر کے سوا کوئی نہ پایا۔'' کبھی الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا ﴾ [ الحجرات : ١٤ ] ''بدویوں نے کہا ہم ایمان لے آئے، کہہ دے تم ایمان نہیں لائے اور لیکن یہ کہو کہ ہم مطیع ہو گئے۔'' اور کبھی مسلم کا لفظ عام ہوتا ہے، یعنی وہ شخص جو اسلام کے ظاہری اعمال بجا لائے، عام اس سے کہ اس کے سچا ہونے کا یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور مومن کا لفظ خاص ہوتا ہے، یعنی وہ شخص جو ظاہری اعمال بجا لانے کے ساتھ دل سے بھی اللہ اور اس کے سچا ہونے کا یقین رکھتا ہو۔ ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں ''الْمُسْلِمِيْنَ'' سے مراد تمام مسلم ہیں، خواہ صرف ظاہر میں اعمال بجا لانے والے ہوں یا دل سے بھی یقین رکھنے والے ہوں۔ (ابن جزی)

❹ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ : چونکہ ''الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ'' میں مخلص اور منافق دونوں آ سکتے تھے، اس لیے مومنین اور

وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ

اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور

مومنات کا ذکر فرمایا، یعنی جو ظاہری انقیاد کے ساتھ دل میں بھی ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ جب تک دل میں یقین نہ ہو ظاہر میں تابع ہونے کا کچھ فائدہ نہیں۔

5 وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ : ہمیشہ کے لیے اطاعت کرنے والے۔ اسلام کے بعد ایمان کا مرتبہ ہے، ان دونوں کے نتیجے میں قنوت، یعنی اطاعت اور فرماں برداری پیدا ہوتی ہے۔

6 وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ: اس کی تفصیل سورۂ توبہ کی آیت (۱۱۹): ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

7 وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۵ اور ۱۵۳)۔

8 وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ ...... : یعنی وہ تکبر اور غرور سے پاک ہیں، ہر وقت اللہ کے سامنے عاجز اور دل و زبان اور جسم و جان سے اس کے آگے جھکے رہتے ہیں، حق سامنے آنے پر اس سے نہ سر پھیرتے ہیں، نہ انکار کرتے ہیں۔ خشوع اور عاجزی کی تمام کیفیتیں نماز میں جمع ہیں، اس لیے خشوع کا اعلیٰ درجہ نماز میں خشوع ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۱، ۲ ] ''یقیناً کامیاب ہوگئے مومن۔ وہی جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔'' ممکن ہے یہاں عام حالات میں خشوع کے ساتھ خاص طور پر یہ مراد ہو، کیونکہ اس کے بعد صدقے اور روزے کا ذکر ہے اور نماز، صدقہ اور روزہ تینوں اسلام کے بنیادی ارکان ہیں۔ خشوع، صدقہ اور صیام کے الفاظ میں فرض اور نفل دونوں شامل ہیں۔

9 وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ : اس میں زنا سے اجتناب کے علاوہ ننگا ہونے سے اجتناب بھی شامل ہے اور ایسا لباس پہننے سے بھی جس سے جسم کا وہ حصہ نمایاں ہوتا ہو جسے چھپانا لازم ہے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۵ تا ۷) اور معارج (۲۹ تا ۳۱)۔

10 وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ...... : ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے راستے میں چل رہے تھے تو ایک پہاڑ پر گزرے، جسے جمدان کہا جاتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( سِيْرُوْا هٰذَا جُمْدَانُ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ )) ''چلتے رہو، یہ جمدان ہے، ''مفرد'' لوگ (اپنے کام میں اکیلے رہ جانے والے) سبقت لے گئے۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! مفرد لوگوں سے کیا مراد ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلذَّاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذَّاكِرَاتُ )) [ مسلم، الذکر و الدعاء، باب

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

ذکر کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے ﴿۳۵﴾

الحث علی ذکر الله تعالی : ۲٦٧٦ ] ''اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مرد اور بہت زیادہ یاد کرنے والی عورتیں۔'' ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ وَ أَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ وَأَرْفَعِهَا فِيْ دَرَجَاتِكُمْ وَ خَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ إِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَ الْوَرِقِ وَ خَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوْا أَعْنَاقَهُمْ وَ يَضْرِبُوْا أَعْنَاقَكُمْ؟ قَالُوْا بَلٰى قَالَ ذِكْرُ اللّٰهِ تَعَالٰى )) [ ترمذي، الدعوات، باب منه : ۳۳۷۷. و قال الألباني صحیح ] ''کیا میں تمھیں وہ عمل نہ بتاؤں جو تمھارے اعمال میں سے سب سے بہتر ہے اور تمھارے مالک کے ہاں سب سے پاکیزہ ہے اور تمھارے درجات میں سب سے بلند ہے اور تمھارے لیے سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بہتر ہے اور اس سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن سے ملو، پھر وہ تمھاری گردنیں اڑائیں اور تم ان کی گردنیں اڑاؤ؟'' صحابہ نے عرض کیا: ''کیوں نہیں (یا رسول اللہ!)'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اللہ کا ذکر ہے۔'' عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! اسلام کے احکام مجھ پر بہت زیادہ ہو گئے ہیں، اس لیے آپ مجھے کوئی ایک چیز بتا دیں جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ )) [ ترمذي، الدعوات، باب ما جاء في فضل الذكر : ۳۳۷۵، و قال الألباني صحیح ] ''تیری زبان ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے۔''

یاد رہے زبانی ذکر ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو دل میں یاد رکھنا اور ہر وقت اس بات کا احساس ضروری ہے کہ میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں آدمی اللہ کی نافرمانی سے بچتا ہے اور اگر نافرمانی کر بیٹھے تو اللہ کی یاد اسے اپنے رب کے ساتھ معاملہ درست کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کی صفت بیان فرمائی: ﴿ وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۵ ] ''اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟ اور انھوں نے جو کیا اس پر اصرار نہیں کرتے جب کہ وہ جانتے ہوں۔'' اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ حاصل کرنے والے سات خوش نصیبوں میں سے ایک وہ ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ )) [ بخاري، الأذان، باب من جلس في المسجد...... : ٦٦٠ ] ''وہ آدمی جس نے اللہ کو خلوت میں یاد کیا تو اس کی آنکھیں بہ پڑیں۔'' اللہ کی نافرمانی پر اصرار کے ساتھ محض زبان سے ذکر کو اللہ کی یاد کہنا ''یاد'' کے مفہوم سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

**وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ**

**اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ**

آیت 36 ① **وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ** ...... : "**الْخِيَرَةُ**" "تَخَيَّرَ يَتَخَيَّرُ" (تفعّل) کا مصدر ہے، جیسا کہ "تَطَيَّرَ" کا مصدر "اَلطِّيَرَةُ" ہے۔ اہلِ علم فرماتے ہیں، اس وزن پر اس باب سے یہی دو مصدر آتے ہیں۔ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ رہنے کا یا اپنے سے الگ ہونے کا اختیار دیں، تاکہ واضح ہو جائے کہ آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ اب فرمایا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرح بیویوں کو ساتھ رہنے یا جدا ہونے کا اختیار دیا گیا، اس طرح ہر آدمی کو ہر کام میں آپ ﷺ کا حکم ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہے۔ بلکہ کچھ کام ایسے ہیں جن میں کسی مومن مرد یا مومن عورت کو اپنی مرضی کا اختیار نہیں، یہ وہ کام ہیں جن کا اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول واضح حکم دے دیں اور اسے کرنے یا نہ کرنے کی گنجائش نہ دیں۔ اگر وہ خود ہی گنجائش دے دیں تو الگ بات ہے، جیسا کہ بریرہ رضی اللہ عنہا لونڈی تھیں تو مغیث رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، جب وہ آزاد ہوئیں تو خاوند کے غلام ہونے کی وجہ سے انھیں اس کی زوجیت میں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ بریرہ رضی اللہ عنہا نے اس سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (( يَا عَبَّاسُ! أَلَا تَعْجَبُ مِنْ حُبِّ مُغِيْثٍ بَرِيْرَةَ، وَ مِنْ بُغْضِ بَرِيْرَةَ مُغِيْثًا )) "اے عباس! کیا تمھیں مغیث کی بریرہ سے محبت اور بریرہ کی مغیث سے نفرت پر تعجب نہیں ہوتا؟" نبی ﷺ نے اس سے فرمایا: (( لَوْ رَاجَعْتِهِ؟ )) "کاش! تو اس سے رجوع کر لیتی؟" اس نے کہا: "یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّمَا أَنَا أَشْفَعُ )) "میں تو صرف سفارش کر رہا ہوں۔" اس نے کہا: (( فَلَا حَاجَةَ لِيْ فِيْهِ )) [ بخاري، الطلاق، باب شفاعة النبي ﷺ في زوج بريرة : ۵۲۸۳ ] "مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"**اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا**" کا یہی مطلب ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے فیصلہ کن حکم آ جائے تو کسی مسلمان کو اپنا اختیار استعمال کرنے کی کسی صورت میں گنجائش باقی نہیں رہتی۔ "**كَانَ**" کے ساتھ "**مَا**" نافیہ کی مزید تاکید ہو رہی ہے، کیونکہ "**كَانَ**" کے ساتھ نفی کا استمرار اور اس کی ہمیشگی مقصود ہے۔ یعنی کسی مومن مرد یا مومن عورت کو کبھی بھی یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول......

② اکثر مفسرین نے اس آیت کی شان نزول یہ لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبد المطلب کی بیٹی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو اپنے متبنّٰی اور آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح کے لیے کہا تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ میں حسب میں اس سے بہتر ہوں، انکار کر دیا۔ اس پر یہ آیت اتری تو وہ نکاح پر رضا مند ہو گئیں اور رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس شان نزول کی دو روایتیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی عوفی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ہے،

**مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ﴿۳۶﴾**

**ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے سو یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا ﴿۳۶﴾**

جو طبری نے روایت کی ہے، اس کی سند ضعیف ہے۔ دوسری ابن لہیعہ عن ابن ابی عمرہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ہے، اسے بھی طبری نے روایت کیا ہے اور یہ بھی ابن لہیعہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یقینی نہیں کہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح زید رضی اللہ عنہ سے ہجرت کے بعد ہوا تھا، جب کہ یہ سورت مدنی ہے۔ ابن عاشور نے اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہ نکاح ہجرت سے پہلے مکہ میں ہو چکا تھا اور ابن کثیر نے مقاتل بن حیان کا جو قول نقل کیا ہے کہ زینب رضی اللہ عنہا زید رضی اللہ عنہ کے پاس ایک سال کے قریب رہیں، ثابت نہیں، کیونکہ مقاتل تبع تابعی ہیں، انھوں نے اس بات کو نقل کرنے والے تابعی کا ذکر کیا ہے نہ صحابی کا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اصول شریعت کی رُو سے دیکھا جائے تو گو نکاح کرنا ایک شرعی حکم ہے، مگر یہ بات کہ نبی کسی خاص عورت کو کسی خاص مرد، یا کسی خاص مرد کو کسی خاص عورت سے نکاح کرنے پر شرعی طور پر مامور کرے صحیح نہیں، یعنی نبی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو فلاں مرد سے شادی کر اور اگر وہ عورت نہ مانے تو نافرمان قرار پائے۔ ہمارے اس دعویٰ پر بریرہ رضی اللہ عنہا کی حدیث قوی شہادت ہے (جو اسی آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے)۔'' (تفسیر ثنائی) اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ کہنے کے بجائے کہ زینب رضی اللہ عنہا نے اس آیت کے نزول سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا، اس آیت کو اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کی تاکید سمجھا جائے، جس طرح یہ تاکید اسی سورت کے شروع میں اس سے بھی جامع الفاظ میں گزر چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [ الأحزاب : ٦ ] ''یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہے۔''

③ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ آیت تمام احکام کے لیے عام ہے کہ اللہ اور اس کا رسول جب کسی چیز کا فیصلہ فرما دیں تو نہ کسی کے لیے اس کی مخالفت جائز ہے، نہ اسے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار کسی کو باقی رہتا ہے، نہ اس کے مقابلے میں کسی قیاس یا رائے یا قول اقوال کی کوئی حیثیت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [ النساء : ٦٥ ] ''پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کر لیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔''

④ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ...... : اس میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی شدید وعید ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [ النور : ٦٣ ] ''سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ آ پہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔''

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى

اور جب تو اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام کیا اور جس پر تو نے انعام کیا کہہ رہا تھا کہ اپنی بیوی اپنے پاس روکے رکھ اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپاتا تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے ڈرتا تھا، حالانکہ

**آیت 37** ❶ **وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ**...... : ان آیات کے نزول کا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ حکم نازل کرنے کا ارادہ فرمایا کہ منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹوں کے حکم میں کسی طرح بھی نہیں ہیں اور یہ کہ اگر وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں، تو انھیں یعنی منہ بولے بیٹے بنانے والوں کے لیے ان سے نکاح جائز ہے، کیونکہ وہ عورتیں حقیقی بیٹوں کی بیویوں کی طرح ان کی بہو نہیں ہیں۔ تو اس وقت متبنّٰی کی رسم معاشرے میں اس قدر پختہ اور مستحکم ہو چکی تھی کہ بہت بڑے اقدام کے بغیر اس کی اصلاح ممکن نہ تھی اور ضروری تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے قول کے علاوہ آپ کے عمل کے ساتھ اس پر کاری ضرب لگائی جائے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے اسباب پیدا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، جنھیں زید بن محمد کہا جاتا تھا (کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں متبنّٰی بنایا تھا، جب آیت "**اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ**" اتری تو انھیں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کہا جانے لگا) رسول اللہ ﷺ نے ان کا نکاح زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا تھا۔ مزاج کے اختلاف کی وجہ سے ان دونوں میاں بیوی میں موافقت نہ رہ سکی، اس لیے زید رضی اللہ عنہ بار بار رسول اللہ ﷺ سے ان کے رویے کی شکایت کرتے اور طلاق دینے کی اجازت مانگتے۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہو چکا تھا کہ زید اسے طلاق دیں گے اور وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ مگر اس ڈر سے کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا اور منافقین، یہودی اور مشرکین اسے آپ کی عصمت پر طعن کا ذریعہ بنائیں گے، آپ ﷺ زید رضی اللہ عنہ کو طلاق سے منع کرتے اور یہی فرماتے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور اللہ سے ڈرو۔

❷ "**لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ**" سے مراد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "یہ آیت: ﴿**وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ**﴾ زینب بنت جحش اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی۔" [ بخاري، التفسیر، باب قوله : ﴿ و تخفي في نفسك...... ﴾ : ٤٧٨٧ ] اللہ تعالیٰ کا اس پر دوسرے بے شمار انعامات کے ساتھ یہ انعام بھی تھا کہ اسے اس کے مشرک خاندان سے نکال کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچایا، پھر غلامی سے آزادی عطا فرمائی۔ اسلام قبول کرنے اور اس میں سبقت کرنے والے چار افراد میں شامل ہونے کی سعادت بخشی۔ قرآن مجید میں تمام صحابہ میں سے صرف اس کا نام صراحت کے ساتھ ذکر فرمایا اور رسول اللہ ﷺ کا اس پر دوسرے کئی انعامات کے ساتھ یہ انعام بھی تھا کہ اسے آزاد کیا، اپنا بیٹا بنایا، اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ نکاح کیا اور اسے اپنی خاص محبت سے نوازا، چنانچہ اسے اور اس کے بیٹے اسامہ کو حب رسول ﷺ (رسول اللہ ﷺ کے محبوب) کہا جاتا تھا۔

زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآىِٕهِمْ اِذَا

اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تو اس سے ڈرے، پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ ان سے

③ **وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ** : وہ بات کیا تھی جسے رسول اللہ ﷺ چھپاتے تھے اور اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے والا تھا، اس کے متعلق تفاسیر میں متعدد اقوال مذکور ہیں۔ بعض اقوال ایسے بھی ہیں جو شانِ نبوت کے سراسر منافی ہیں، عقل کے بھی صاف خلاف ہیں اور صحیح سند کے ساتھ ثابت بھی نہیں، بعد کے لوگوں کی فضول باتیں ہیں۔ اس لیے حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں: ''ان کا بیان مناسب نہیں۔'' اور حافظ ابن کثیر نے فرمایا: ''ابن جریر اور ابن ابی حاتم وغیرہ نے یہاں بعض سلف سے کچھ آثار نقل کیے ہیں، جنھیں ذکر کرنے سے ہم نے پہلو تہی اختیار کی ہے، کیونکہ وہ ثابت نہیں ہیں۔'' مگر چونکہ ان اقوال کو لے کر مستشرقین اور اسلام کے مخالفین نے رسول اللہ ﷺ پر زبانِ طعن دراز کی ہے، اس لیے انھیں بیان کرنا اور ان کی حقیقت کھولنا لازم ہے۔ چنانچہ قتادہ اور ابن زید نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ زید رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی میں ان کے گھر گئے، تو زینب رضی اللہ عنہا کو اس کی زینت میں دیکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ہوا سے اس کے گھر کا پردہ ہٹ گیا اور آپ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا تو آپ کے دل میں اس کی محبت جاگزین ہوگئی اور آپ نے فرمایا: ''سبحان ہی ہے جو دلوں کو پھیرنے والا ہے۔'' جب زید آئے تو زینب نے انھیں رسول اللہ ﷺ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بتائے، تو زید رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور کہا: ''مجھے معلوم ہوا کہ آپ میرے گھر آئے، لیکن آپ اندر کیوں تشریف نہیں لائے؟ شاید آپ کو زینب پسند آئی ہے تو کیا میں اسے چھوڑ دوں؟'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی بیوی اپنے پاس رکھو اور اللہ سے ڈرو۔'' تو یہ آیت اتری۔ تفسیر جلالین میں آیت کا سبب نزول یہی بیان کیا گیا ہے اور مفسر جلال نے اسی کے مطابق تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''تو اپنے دل میں اس کی محبت چھپانے والا تھا، جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور یہ کہ اگر زید اسے طلاق دے دے تو میں اس سے نکاح کر لوں۔'' یہی تفسیر زمخشری، نسفی، ابن جریر اور ثعلبی وغیرہ نے کی ہے۔ ہاں، ابن جریر نے اس باطل تفسیر کے ساتھ وہ تفسیر بھی لکھی ہے جس میں یہ فضول باتیں نہیں ہیں اور یہ باطل روایات بھی نقل کر دی ہیں، اگرچہ سند بیان کرنے کی وجہ سے ان کا نقصان کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آثار میں سے کسی کی سند صحیح نہیں، نہ ہی قتادہ یا ابن زید اس واقعہ کے وقت موجود تھے، وہ تابعی ہیں اور اپنی بات کا حوالہ بھی ذکر نہیں کرتے کہ انھوں نے کس سے یہ روایت سنی ہے اور پھر یہ صریح عقل کے بھی خلاف ہے۔ زینب کوئی اجنبی خاتون نہ تھی، جسے رسول اللہ ﷺ نے اچانک دیکھا ہو۔ وہ آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھی، آپ کے سامنے جوان ہوئی، آپ نے اپنے (منہ بولے) بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگا، اس کے ساتھ نکاح کیا، آپ کے ساتھ اس نے ہجرت کی، اس وقت تک پردے کا نہ رواج تھا، نہ اس کا حکم اترا تھا کہ اتنے سالوں تک آپ نے اسے نہ دیکھا ہو۔ غرض اس قسم کی روایات ہر لحاظ سے باطل اور جھوٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی پاک بازی اور عفت کو بطور

قَضَوۡا مِنۡهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۷﴾

حاجت پوری کر چکیں اور اللہ کا حکم پورا کیا جانے والا تھا ﴿۳۷﴾

چیلنج ذکر کرنے کا حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے کفار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴾ [ یونس : ١٦ ] ''پس بے شک میں تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہ چکا ہوں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟''

4 رہی یہ بات کہ پھر حقیقت میں بات کیا تھی جسے رسول اللہ ﷺ اپنے دل میں چھپا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے والا تھا، تو اس میں راجح قول وہی ہے جو اس آیت کے پہلے فائدے میں ذکر کیا گیا ہے اور جسے اکثر محقق مفسرین، مثلاً حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے اختیار کیا ہے اور ہمارے شیخ استاذ محمد عبدہ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اصل بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ زینب آپ کی بیوی ہونے والی ہے، مگر آپ اس کے اظہار سے شرماتے تھے کہ مخالفین الزام لگائیں گے کہ دیکھیے اپنی بہو سے نکاح کر لیا۔ اس لیے جب زید نے آ کر شکایت کی تو آپ نے فرمایا ﴿ اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ ﴾ اس پر اللہ تعالیٰ نے عتاب آمیز لہجے میں فرمایا کہ جب میں نے آپ کو پہلے بتا دیا ہے کہ زینب کا نکاح آپ سے ہونے والا ہے تو آپ زید سے یہ بات کیوں کہہ رہے ہیں، یعنی آپ کی شان کے لائق نہیں، بلکہ بہتر یہ تھا کہ آپ خاموش رہتے، یا زید سے کہہ دیتے کہ تم جو کرنا چاہتے ہو کرو۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں، یہ عتاب ترک اولیٰ پر ہے۔'' (اشرف الحواشی) واضح رہے کہ یہ بات صراحت کے ساتھ کسی حدیث سے ثابت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ آپ کا نکاح زینب سے ہوگا، یہ صرف سُدی کا قول ہے، یا علی بن حسین (زین العابدین) سے کمزور سند کے ساتھ مروی قول ہے۔ البتہ قرآن مجید کے الفاظ: ''وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا'' اور ''مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنۡ حَرَجٍ فِيۡمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ'' اور ''وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرًا'' سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

5 فَلَمَّا قَضٰى زَيۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰكَهَا : ''وَطَرًا'' کا معنی حاجت ہے، یعنی جب زید نے کچھ مدت تک اپنے نکاح میں رکھنے کے بعد اسے طلاق دے دی اور اس کی عدت بھی پوری ہوگئی، جس میں انھوں نے رجوع نہیں کیا اور ثابت ہو گیا کہ ان کے دل میں زینب کے متعلق جو خواہش تھی پوری ہو چکی اور اب ان کی کوئی خواہش یا حاجت نہیں رہی، تو ہم نے اے نبی! اس کا نکاح آپ سے کر دیا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''زینب کا آپ سے نکاح کرنے والا ولی خود اللہ تعالیٰ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ آپ انسانوں میں سے کسی ولی یا عقد یا مہر یا گواہوں کے بغیر (اس کے خاوند ہیں) اس کے پاس چلے جائیں۔'' (ابن کثیر) انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب زینب رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ان سے میرا ذکر کرو۔'' زید جب ان کے پاس گئے تو وہ آٹے میں خمیر ملا رہی تھیں، کہتے ہیں کہ **جب میں** نے انھیں دیکھا تو میرے سینے میں ان کی اتنی عظمت چھا گئی کہ میں ان کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھ سکا، کیونکہ **رسول اللہ** ﷺ نے

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۙ ﴿۳۸﴾

نبی پر اس کام میں کبھی کوئی تنگی نہیں جو اللہ نے اس کے لیے فرض کر دیا۔ یہی اللہ کا طریقہ ہے ان لوگوں میں جو پہلے گزرے اور اللہ کا حکم ہمیشہ سے اندازے کے مطابق ہے، جو طے کیا ہوا ہے ﴿۳۸﴾

ان کا ذکر کیا تھا۔ غرض میں نے ان کی طرف پیٹھ کر لی اور ایڑیوں پر پھر گیا اور کہا: ”اے زینب! مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے، وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں (یعنی نبی ﷺ نے آپ کی طرف پیغامِ نکاح بھیجا ہے)۔“ زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: ”میں اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتی جب تک اپنے رب سے مشورہ نہ کرلوں (یعنی استخارہ نہ کرلوں)۔“ پھر وہ اپنی جائے نماز پر کھڑی ہو گئیں اور قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ ان کے پاس اجازت کے بغیر تشریف لے آئے۔“ [ مسلم، النكاح، باب زواج زينب بنت جحش رضي الله عنها ...... : ۱٤۲۸ ]

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( جَاءَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ يَشْكُوْ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ اتَّقِ اللّٰهَ، وَ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ، قَالَ أَنَسٌ لَوْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَاتِمًا شَيْئًا لَكَتَمَ هٰذِهِ، قَالَ فَكَانَتْ زَيْنَبُ تَفْخَرُ عَلٰى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ تَقُوْلُ زَوَّجَكُنَّ أَهَالِيْكُنَّ، وَ زَوَّجَنِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوَاتٍ )) [ بخاري، التوحيد، باب : ﴿ و كان عرشه على الماء ﴾...... : ۷٤۲۰ ] ”زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آکر شکایت کرنے لگے تو نبی ﷺ انھیں یہی کہتے رہے: ”اللہ سے ڈر اور اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھ۔“ انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اگر رسول اللہ ﷺ کوئی چیز چھپانے والے ہوتے تو اس بات کو ضرور چھپا لیتے۔“ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر زینب رضی اللہ عنہا نبی ﷺ کی دوسری بیویوں پر فخر کرتے ہوئے کہتی تھیں: ”تمھارا نکاح تمھارے گھر والوں نے کیا اور میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے کیا۔“

❻ **لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ ......** : یعنی ہم نے زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ سے اس لیے کر دیا کہ جاہلی رسم کے مطابق اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کو جو حرام سمجھا جاتا تھا، آپ کے عملی اقدام سے یہ رسم ختم کی جائے اور ایمان والوں کو اپنے منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ عورتوں کے ساتھ نکاح میں کوئی تنگی نہ رہے اور وہ کسی گناہ یا عار کے احساس کے بغیر ان سے نکاح کر سکیں۔

❼ **وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا** : یعنی اللہ کا یہ فیصلہ پورا ہو کر رہنے والا تھا کہ متبنّٰی حقیقی بیٹا نہیں ہوتا، نہ اسے متبنّٰی بنانے والے کے لیے اس کی مطلقہ سے نکاح حرام ہے اور یہ فیصلہ بھی پورا ہو کر رہنا تھا کہ زینب رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں گی۔

**آیت 38** ❶ **مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ ......** : یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے جو کام طے کر دیا اور اس کا حکم دے دیا اس کے ادا کرنے میں اس پر کوئی تنگی نہ پہلے تھی، نہ اب ہے، نہ آئندہ ہونی چاہیے۔ ”**كَانَ**“ نفی کے استمرار کے لیے

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾

وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا ﴿۳۹﴾

ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''کبھی کوئی تنگی نہیں۔'' اس لیے اسے وہ بات بتانے میں یا اس پر عمل کرنے میں کسی طعن و تشنیع یا ملامت کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرمایا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں، اسی طرح یہ بھی طے فرما دیا کہ نبی ﷺ اپنے متبنّٰی کی مطلقہ سے نکاح کریں گے۔ اس لیے آپ ﷺ کو اس کے اظہار یا اس پر عمل کے سلسلے میں منافقین یا یہود کے طعن کی پروا نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ وہی بات ہے جو سدی اور زین العابدین نے فرمائی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے اپنے متبنّٰی کی مطلقہ سے نکاح محض مباح ہے، مگر بہت سی مصلحتوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے طے کرنے کی وجہ سے آپ ﷺ پر فرض تھا۔

**② سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ:** لفظ ''سُنَّةَ'' پر نصب یا تو اس لیے ہے کہ اس سے پہلے حرف جر ''کاف'' محذوف ہے، جس کے حذف ہونے کی وجہ سے یہ منصوب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے لیے جو کچھ طے فرمایا اسے ادا کرنے میں اس پر اسی طرح کوئی حرج نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا پہلے انبیاء کے بارے میں طریقہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے جو طے کر دیتا وہ اس کی ادائیگی میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے تھے۔ یا یہ فعل محذوف کا مصدر ہے، یعنی ''سَنَّ اللّٰهُ هٰذَا سُنَّةً فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ'' مطلب ایک ہی ہے کہ گزشتہ انبیاء بھی ایسے کاموں کے کرنے میں حرج محسوس نہیں کرتے تھے جو اللہ کی طرف سے ان پر فرض کر دیے جاتے تھے، چاہے ان کی اقوام اور زمانے کے رسم و رواج ان کے خلاف ہوتے تھے۔

**③ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا:** یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام خاص طور پر حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں، دنیاوی حکمرانوں کی طرح وقتی اور فوری ضرورت پر مشتمل نہیں ہوتے، اسی طرح ان کا وقت بھی مقرر ہوتا ہے جس کے مطابق وہ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

**آیت 39** **① الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ ......:** پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ اللہ کا یہی طریقہ ان لوگوں میں رہا ہے جو اس سے پہلے تھے۔ اب ان کی تعریف فرمائی کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کا پیغام پہنچانے میں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو ان کی طرح اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچانے اور اس کے سوا کسی سے نہ ڈرنے کی تلقین ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [ الأنعام : ۹۰ ] ''یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔''

**② وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا:** ''حَسِيْبًا'' کا معنی حساب لینے والا بھی ہے اور کفایت کرنے والا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حَسْبِيَ اللّٰهُ ﴾

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ

محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں اور لیکن وہ اللہ کا رسول اور تمام نبیوں کا ختم کرنے والا ہے اور اللہ ہمیشہ

”مجھے اللہ ہی کافی ہے۔“ [ التوبة : ۱۲۹ ] پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ اس اکیلے سے ڈرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے عمل پر محاسبہ کرنے والا ہے اور اس محاسبے کے لیے وہ اکیلا ہی کافی ہے، اسے کسی معاون کی ضرورت نہیں۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ اس کے بندے جب اس کا پیغام پہنچاتے ہیں تو دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلے میں کفایت اور مدد کرنے کے لیے انھیں اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے۔

③ ان آیات میں تقیہ کا رد ہے، اس لیے کہ اللہ کے پیغمبر اس کا پیغام صراحت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں، اس میں کسی کے خوف کو خاطر میں نہیں لاتے، نہ کسی سے ڈر کر اسے چھپاتے ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے نبی کریم ﷺ سب کے سردار ہیں۔ آپ ﷺ نے اللہ کا پیغام مشرق و مغرب میں تمام بنی آدم تک پہنچایا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو تمام دینوں پر غالب کر دیا۔ پھر آپ کے صحابہ یہ پیغام پہنچانے میں آپ کے بہترین وارث بنے، انھوں نے اپنی زبان، اپنے ہاتھ اور اپنی تلوار کے ساتھ آپ کا دین کل عالم تک پہنچا دیا۔ آپ کے رات دن، سفر و حضر، گھر اور باہر کے تمام اقوال و افعال اور احوال امت تک پہنچا دیے۔ اس کے بعد ہر زمانے کے لوگ یہ پیغام آگے پہنچاتے رہے، اگر ان میں سے کوئی خوف کے مارے تقیہ اختیار کرتا تو اللہ کا دین ہم تک کیسے پہنچتا اور اس کے قیامت تک باقی رہنے کی کیا صورت ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں بھی ان میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

**آیت 40** ① **مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ** : یعنی نبی ﷺ نے اگرچہ زید کو متبنّیٰ بنایا، مگر وہ آپ کے بیٹے نہیں، نہ آپ اس کے حقیقی باپ ہیں، اس لیے انھیں زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہ ہی کہو۔ نبی ﷺ کا کوئی بیٹا اتنی دیر زندہ نہیں رہا کہ بلوغت کی عمر کو پہنچے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے تین بیٹے قاسم، طیب اور طاہر پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے ابراہیم پیدا ہوئے، وہ بھی دودھ پینے ہی کی عمر میں فوت ہو گئے، بیٹیاں چار پیدا ہوئیں، جو خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں، یعنی زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن۔ تین آپ ﷺ کی زندگی میں فوت ہو گئیں اور فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی وفات کا صدمہ دیکھا، پھر آپ ﷺ کے چھ ماہ بعد فوت ہو گئیں۔ (ابن کثیر)

② **مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ** ...... : اس ایک آیت میں ان تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی کریم ﷺ پر کر رہے تھے، یا کر سکتے تھے۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا، جب کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کو خود ہی حرام کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا ”محمد (ﷺ) تمھارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں“ یعنی آپ نے جس شخص (زید) کی مطلقہ سے نکاح کیا ہے وہ آپ کا بیٹا تھا ہی نہیں، تم خود جانتے ہو کہ آپ ﷺ کا کوئی بیٹا نہیں، تو وہ بہو کیسے بن گئی؟ دوسرا اعتراض یہ ہو سکتا تھا کہ متبنّیٰ حقیقی بیٹا نہ سہی، مگر اس کی بیوی سے نکاح زیادہ سے

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۴۰﴾

زیادہ جائز تھا، آخر اس کا کرنا ضروری تو نہیں تھا۔ اس کے جواب میں فرمایا ''اور لیکن وہ اللہ کا رسول ہے'' یعنی رسول ہونے کی وجہ سے اس کی ذمہ داری ہے کہ جن رسوم کی وجہ سے حلال چیزوں کو تم نے حرام کر رکھا ہے، ان کے باطل ہونے کا پیغام اپنی زبان کے ساتھ ہی نہیں اپنے عمل کے ساتھ بھی پہنچائے۔ پھر مزید تاکید فرمائی کہ یہ اس لیے ضروری ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا جو یہ پیغام پہنچائے۔ اس لیے آپ پر لازم ہے کہ ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کا ہر پیغام پہنچا دیں۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، یعنی اسے خوب معلوم ہے کہ جاہلیت کی کس رسم کو کس طرح ختم کرنا ہے۔

③ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ...... : یہ آیت صریح دلیل ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں، جب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تو رسول بالاولیٰ نہیں ہو سکتا، کیونکہ نبی عام ہے اور رسول خاص ہے۔ ہر رسول نبی ہوتا ہے جب کہ ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کے آخری نبی ہونے کے متعلق بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متواتر احادیث آئی ہیں اور آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے کذّاب قرار دیا، ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَلْحَقَ قَبَائِلُ مِنْ أُمَّتِيْ بِالْمُشْرِكِيْنَ وَحَتّٰى يَعْبُدُوا الْأَوْثَانَ وَ إِنَّهُ سَيَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ ثَلَاثُوْنَ كَذَّابُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ وَ أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ » [ ترمذي، الفتن، باب ما جاء لا تقوم الساعة حتى يخرج كذابون : ۲۲۱۹، و قال الألباني صحيح ] ''قیامت قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ میری امت کے کچھ قبائل مشرکین سے جا ملیں گے اور میری امت میں تیس کذّاب ہوں گے، جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے، حالانکہ میں نبیوں کا سلسلہ ختم کرنے والا ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا: « أَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ » [ مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ : ۲۴۰۴ ] ''تم مجھ سے اس مرتبے پر ہو جس پر ہارون (علیہ السلام) موسیٰ (علیہ السلام) سے تھے، مگر فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ الرِّسَالَةَ وَ النُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ وَ لَا نَبِيَّ، قَالَ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَى النَّاسِ، فَقَالَ لٰكِنِ الْمُبَشِّرَاتُ، فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ مَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ رُؤْيَا الْمُسْلِمِ وَ هِيَ جُزْءٌ مِنْ أَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ » [ ترمذي، الرؤيا، باب ذهبت النبوة و بقيت المبشرات : ۲۲۷۲، وقال الألباني صحيح الإسناد ] ''رسالت اور نبوت ختم ہوگئی، اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہے، نہ کوئی نبی۔'' یہ بات لوگوں پر شاق گزری تو آپ نے فرمایا: ''لیکن مبشرات باقی ہیں۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''مسلمان کا خواب اور وہ نبوت کے اجزا میں سے ایک جز ہے۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ مَثَلِيْ وَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۴۲﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کو یاد کرو، بہت یاد کرنا ﴿۴۱﴾ اور اس کی تسبیح کرو، پہلے پہر اور پچھلے پہر ﴿۴۲﴾

مَثَلَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى بَيْتًا فَأَحْسَنَهُ وَ أَجْمَلَهُ، إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ، فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ بِهِ وَ يَعْجَبُوْنَ لَهُ، وَ يَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ؟ قَالَ فَأَنَا اللَّبِنَةُ، وَ أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ ›› [ بخاري، المناقب، باب خاتم النبيين ﷺ : ٣٥٣٥ ] ”میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے ایک مکان بنایا، اسے ہر لحاظ سے خوب صورت بنایا، مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس کو چاروں طرف سے گھوم کر دیکھتے ہیں اور اس پر تعجب کرتے ہیں اور کہتے ہیں، یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی؟ تو میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں۔“ یہ تمام احادیث اور دوسری بہت سی احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ رہا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول تو وہ ختم نبوت کے منافی نہیں، کیونکہ انھیں نبوت آپ سے پہلے مل چکی ہے۔ اب وہ آپ کے امتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے اور آپ ﷺ کی شریعت پر چلیں گے۔ آج تک پوری امت کا یہی متفق علیہ عقیدہ ہے، اس لیے ختم نبوت کا منکر قطعی کافر اور ملت اسلام سے خارج ہے۔

④ رسول اللہ ﷺ کے کسی بالغ مرد کا باپ نہ ہونے اور خاتم النّبیین رسول ہونے کے درمیان ایک اور مناسبت بھی ہے، جو صحابی رسول عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے اور وہ مناسبت اللہ تعالیٰ کے ”بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا“ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نے نبی ﷺ کے بیٹے ابراہیم کو دیکھا ہے؟ انھوں نے فرمایا: ‹‹ مَاتَ صَغِيْرًا، وَ لَوْ قُضِيَ أَنْ يَّكُوْنَ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَبِيٌّ عَاشَ ابْنُهُ، وَ لٰكِنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهُ ›› [ بخاري، الأدب، باب من سمى بأسماء الأنبياء : ٦١٩٤ ] ”وہ چھوٹی عمر ہی میں فوت ہو گئے اور اگر فیصلہ ہوتا کہ محمد ﷺ کے بعد نبی ہو تو آپ کا بیٹا زندہ رہتا، لیکن آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔“ یہ بات اگرچہ ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے، مگر یہ اپنی رائے سے کہنا مشکل ہے، کیونکہ نبی کا بیٹا نبی ہونا ضروری نہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے تھے۔

**آیت 42،41** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ...... : ان آیات کی پچھلی آیات کے ساتھ مناسبت بعض اہلِ علم نے یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب تمھیں زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح جیسے معاملات میں منافقین اور اسلام کے دوسرے دشمنوں کے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑے تو ان کے ساتھ الجھنے یا انھیں برا بھلا کہنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی تسبیح کثرت سے کرو، اس سے تمھیں اطمینان عطا ہو گا، اسلام پر استقامت ملے گی اور فتنے کا دروازہ جلدی بند ہو گا۔ خصوصاً ”وَسَبِّحُوْهُ“ کے مفہوم میں منافقین کی باتوں سے اپنے بری ہونے کا اظہار بھی شامل ہے، یعنی نبی ﷺ یا کسی مومن پر کسی طعن یا بہتان کا ذکر ہو تو اس سے اپنی براءت کا اظہار کرو، جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ النور : ١٦ ] ”اور کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو کہا ہمارا حق نہیں ہے کہ ہم اس کے ساتھ کلام کریں، تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔“

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ

وہی ہے جو تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے، تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے اور وہ

② ذِكْرًا كَثِیْرًا : طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت اور اس کے بعد کی دو آیات کی تفسیر ذکر فرمائی ہے، انھوں نے فرمایا: "لَا یَفْرِضُ اللّٰهُ عَلٰی عِبَادِهٖ فَرِیْضَةً إِلَّا جَعَلَ لَهَا حَدًّا مَعْلُوْمًا، ثُمَّ عَذَرَ أَهْلَهَا فِيْ حَالِ عُذْرٍ، غَیْرَ الذِّكْرِ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ یَجْعَلْ لَهٗ حَدًّا یَنْتَهِيْ إِلَیْهِ وَ لَمْ یَعْذُرْ أَحَدًا فِيْ تَرْكِهٖ إِلَّا مَغْلُوْبًا عَلٰی عَقْلِهٖ قَالَ : ﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِكُمْ ﴾ بِاللَّیْلِ وَ النَّهَارِ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ، وَ فِي السَّفَرِ وَ الْحَضَرِ، وَ الْغِنٰی وَ الْفَقْرِ، وَ السَّقَمِ وَ الصِّحَّةِ، وَ السِّرِّ وَ الْعَلَانِیَةِ، وَ عَلٰی كُلِّ حَالٍ، وَ قَالَ : ﴿ وَ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا ﴾ فَإِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ صَلّٰی عَلَیْكُمْ هُوَ وَ مَلَائِكَتُهٗ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ : ﴿ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ ﴾" [ طبري : ۲۸۷٦٤ ] "یعنی اللہ نے ہر فرض کی کوئی نہ کوئی حد مقرر فرمائی ہے، پھر عذر کی حالت میں وہ بھی معاف ہے، لیکن نہ اللہ کے ذکر کی کوئی حد ہے، نہ وہ کسی عذر سے معاف ہوتا ہے۔ ہاں! عقل یا ہوش نہ رہے تو الگ بات ہے، فرمایا: "اللہ کا ذکر کرو کھڑے، بیٹھے، لیٹے" رات اور دن میں، خشکی اور تری میں، سفر اور حضر میں، غنا اور فقر میں، صحت اور بیماری میں، پوشیدگی اور ظاہر میں، غرض ہر حال میں اللہ کا ذکر لازم ہے اور فرمایا: "اور اس کی تسبیح کرو پہلے پہر اور پچھلے پہر" جب تم یہ کرو گے تو اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے گا اور اس کے فرشتے تمھارے لیے دعائیں کریں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وہی ہے جو تم پر صلاۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔" اللہ کا ذکر کثرت سے کرنے کے متعلق کئی احادیث اسی سورت کی آیت (۳۵): ﴿ وَ الذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ﴾ کی تفسیر میں ذکر ہو چکی ہیں۔ اس کے متعلق اہلِ علم نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے "الوابل الصیب" میں ذکر کے ایک سو فوائد تفصیل سے ذکر فرمائے ہیں۔

③ وَ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا : زمخشری نے فرمایا: "پچھلی آیت میں ذکر کثیر کا حکم تھا، اب تسبیح کا حکم دیا۔ تسبیح بھی ذکر میں شامل ہے، اس کا خاص طور پر ذکر اسی طرح فرمایا جیسے فرشتوں کے ذکر کے بعد جبریل اور میکائیل کا ذکر فرمایا، تاکہ دوسرے اذکار پر اس کی فضیلت بیان کرے، کیونکہ اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان تمام صفات و افعال سے پاک بیان کرنا ہے جو اس کے لیے جائز نہیں۔ دوسرے اذکار پر اس کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے کسی آدمی کے تمام اوصاف مثلاً نماز، روزے وغیرہ کی کثرت وغیرہ پر اس بات کی فضیلت ہے کہ وہ شرک و بدعت کی نجاست اور ہر قسم کے گناہوں کی آلودگی سے پاک ہے۔ پھر پہلے اور پچھلے پہر تسبیح کا خصوصاً ذکر فرمایا، مراد تمام نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنا ہے، کیونکہ نماز دوسری چیزوں سے افضل ہے، یا فجر، مغرب اور عشاء کی نماز مراد ہے، کیونکہ ان کی ادائیگی میں زیادہ مشقت ہے۔" (کشاف) بعض اہلِ علم نے اس سے مراد فجر اور عصر لی ہے۔ تسبیح بول کر نماز مراد لینے کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۰)۔

آیت 43 ① هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ ...... : صلاۃ کا معنی رحمت بھی ہے، ذکر خیر بھی اور دعا بھی۔ صحیح

رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾

ایمان والوں پر ہمیشہ سے نہایت مہربان ہے ﴿۴۳﴾

بخاری میں ابو العالیہ سے نقل ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی صلاۃ کا مطلب اس کا فرشتوں کے پاس تعریف کرنا ہے اور فرشتوں کی صلاۃ کا مطلب دعا کرنا ہے۔'' قاموس میں ہے: '' اَلصَّلَاةُ الدُّعَاءُ وَالرَّحْمَةُ وَالْإِسْتِغْفَارُ وَ حَسَنُ الثَّنَاءِ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ عِبَادَةٌ فِيْهَا رُكُوْعٌ وَ سُجُوْدٌ، اسْمٌ يُوْضَعُ مَوْضِعَ الْمَصْدَرِ'' ''صلاۃ سے مراد دعا، رحمت، استغفار، اللہ عزوجل کی طرف سے اس کے رسول ﷺ کی تعریف اور رکوع و سجود والی عبادت ہے۔ یہ اسم ہے جو مصدر کے قائم مقام ہے۔''

② فرشتوں کی صلاۃ سے مراد مسلمانوں کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا ہے۔ اس کی دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تُصَلِّيْ عَلٰى أَحَدِكُمْ مَا دَامَ فِيْ مُصَلَّاهُ مَا لَمْ يُحْدِثْ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ، اللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ، لَا يَزَالُ أَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاةٍ مَا دَامَتِ الصَّلَاةُ تَحْبِسُهٗ، لَا يَمْنَعُهٗ أَنْ يَنْقَلِبَ إِلٰى أَهْلِهٖ إِلَّا الصَّلَاةُ )) [ بخاري، الأذان، باب من جلس في المسجد ينتظر الصلاة...... : ٦٥٩ ] ''یقیناً فرشتے تم میں سے ہر اس شخص کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں جو اپنی نماز کی جگہ میں رہے، جب تک وہ بے وضو نہ ہو کہ اے اللہ! اسے بخش دے، اے اللہ! اس پر رحم فرما۔ جب تک نماز نے اسے گھر جانے سے روک رکھا ہو، نماز کے سوا اسے کوئی چیز مانع نہ ہو۔'' سورۂ مومن کی آیات (۷ تا ۹) میں بھی فرشتوں کی اس دعا کا ذکر ہے جو وہ مومنوں کے لیے کرتے ہیں۔

③ اس آیت کا پچھلی آیت سے تعلق دو طرح سے ہے، ایک تو یہ کہ پچھلی آیت میں اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنے کا حکم دیا، اس آیت میں اس کا نتیجہ بیان فرمایا کہ جب تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو گے تو وہ فرشتوں کے سامنے تمھارا ذکر خیر کرے گا، لوگوں میں تمھاری اچھی شہرت فرمائے گا، تم پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے گا اور اس کے فرشتے تمھارے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کریں گے۔ اس رحمت و مغفرت کے ذریعے سے دنیا میں وہ تمھیں جہالت اور نافرمانی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان اور علم و عمل کی روشنی میں لے آئے گا۔ اور قیامت کے دن عطا ہونے والی نعمت کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (( أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ، وَ أَنَا مَعَهٗ إِذَا ذَكَرَنِيْ، فَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ، وَ إِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَأٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَأٍ خَيْرٍ مِّنْهُمْ، وَ إِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَ إِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا، وَ إِنْ أَتَانِيْ يَمْشِيْ أَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً )) [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالٰى : ﴿ و يحذركم الله نفسه ﴾...... : ٧٤٠٥ ] ''میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں جو وہ میرے متعلق رکھتا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے، سو اگر وہ مجھے اپنے نفس میں یاد کرے تو میں اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرے تو میں اسے اس سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ ایک

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۖۚ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

**ان کی دعا، جس دن وہ اس سے ملیں گے، سلام ہوگی اور اس نے ان کے لیے باعزت اجر تیار کر رکھا ہے ﴿۴۴﴾**

بالشت میرے قریب ہو تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہو تو میں دونوں ہاتھ پھیلانے کے برابر اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ چلتا ہوا میری طرف آئے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔‘‘

دوسری طرح اس کا پہلی آیات سے تعلق یہ ہے کہ اس آیت میں ذکر کثیر اور صبح و شام تسبیح کا حکم دینے کی وجہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو تمھارے کسی استحقاق کے بغیر محض اپنی بے پایاں رحمت کی وجہ سے تم پر صلاۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے تمھارے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرتے ہیں، تاکہ وہ تمھیں دنیا میں اندھیروں سے روشنی میں لائے اور آخرت میں اجر کریم عطا کرے۔ سو تم پر لازم ہے کہ ایسے مہربان رب کا ذکر کثیر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ؁ فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ [ البقرة : ۱۵۱، ۱۵۲ ] ’’جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول تمھی سے بھیجا ہے، جو تم پر ہماری آیات پڑھتا اور تمھیں پاک کرتا اور تمھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور تمھیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ سو تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو۔‘‘ یعنی ہمارے رسول بھیجنے کی نعمت کا تقاضا یہ ہے کہ تم میرا ذکر کرو اور میرا شکر کرو۔

④ **وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا** : یعنی ان تمام مہربانیوں کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ایمان والوں پر بے حد رحم کرنے والا ہے۔ ہمیشہ کا مفہوم ’’**كَانَ**‘‘ کا لفظ ادا کر رہا ہے۔ دنیا میں اس کی رحمت دوسری نعمتوں کے ساتھ انھیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانا ہے اور آخرت میں اس کی رحمت کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

**آیت 44** ① **تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ** : یعنی جس دن اللہ تعالیٰ سے ان کی ملاقات ہوگی اللہ تعالیٰ انھیں سلام کہے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَلٰمٌ ۫ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ [ یٰس : ۵۸ ] ’’سلام ہو، اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔‘‘ فرشتے انھیں سلام کہیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ؁ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ [ الرعد : ۲۳، ۲۴ ] ’’اور فرشتے ہر دروازے میں سے ان پر داخل ہوں گے۔ سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا۔ سو اچھا ہے اس گھر کا انجام۔‘‘ اور ایک دوسرے کے لیے ان کی دعا بھی سلام ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ یونس : ۱۰ ] ’’ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ’’پاک ہے تو اے اللہ!‘‘ اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔‘‘ بلکہ جنت میں ہر طرف سے سنائی دینے والی آواز بھی یہ مبارک کلمہ ہی ہوگا، فرمایا: ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا ؁ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ [ الواقعة : ۲۵، ۲۶ ]

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝۴۵

اے نبی! بے شک ہم نے تجھے گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ۝۴۵

’’وہ اس میں نہ بے ہودہ گفتگو سنیں گے اور نہ گناہ میں ڈالنے والی بات۔ مگر یہ کہنا کہ سلام ہے، سلام ہے۔‘‘

❷ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا : یعنی جنت کی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی آدمی کے دل میں ان کا خیال تک آیا۔ مزید دیکھیے سورۂ سجدہ (۱۷)۔

آیت 45 ❶ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی پانچ صفات بیان فرمائیں، جن سے وہ عظیم الشان مراتب معلوم ہوتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فائز فرمایا اور ان ذمہ داریوں پر روشنی پڑتی ہے جو رسول کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو اتنے عالی مراتب عطا فرمائے ہیں کہ آپ کے مخالفین جتنے بہتان باندھ لیں اور جتنی زبان درازی کر لیں، آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اس لیے آپ اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے رہیں اور ان کی باتوں کی پروا مت کریں۔ ان میں سب سے پہلی صفت ”شَاهِدًا“ ہے۔ یہ شہادت دو طرح سے ہے، ایک دنیا میں اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور سچا دین صرف اسلام ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ [ آل عمران : ۱۸، ۱۹ ] ’’اللہ نے گواہی دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔‘‘ رسول اللہ ﷺ نے پوری دنیا کے سامنے اپنے قول اور عمل کے ساتھ اس بات کی شہادت دی۔ دوسری آخرت کو شہادت، یعنی قیامت کے دن آپ ﷺ اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے تمام پیغام امت کو پہنچا دیے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ [ النساء : ٤١ ] ’’پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔‘‘ اور فرمایا: ﴿ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ [ البقرة : ١٤٣ ] ’’اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر شہادت دینے والا بنے۔‘‘

❷ بعض حضرات نے ”شَاهِدًا“ کے لفظ کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے تمام اعمال دیکھ رہے ہیں اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ ورنہ دیکھے بغیر شہادت کیسے دے سکتے ہیں؟ مگر یہ بات غلط ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا کام بندوں کے اعمال پر شہادت دینا نہیں کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں، بلکہ ان کا کام اس بات کی گواہی دینا ہے کہ بندوں تک حق پہنچا دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ

وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝

اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے اذن سے اور روشنی کرنے والا چراغ ۝

الْغُيُوْبِ ﴾ [ المائدۃ : ۱۰۹ ] ''جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر کہے گا تمھیں کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، بے شک تو ہی چھپی باتوں کو بہت خوب جاننے والا ہے۔'' اسی طرح جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لینا؟ تو وہ عرض کریں گے: ﴿ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ [ المائدۃ : ۱۱۷ ] ''اور میں ان پر گواہ تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔''

یہ آیات اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ انبیاء لوگوں کے اعمال پر گواہ نہیں ہوں گے، پھر وہ کس چیز کے گواہ ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ [ البقرۃ : ۱۴۳ ] ''اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر شہادت دینے والا بنے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ امت پر شہادت دیں گے اور آپ کی امت لوگوں پر شہادت دے گی۔ اگر یہ شہادت اعمال کی ہو تو شہادت دینے کے لیے پوری امت کا حاضر و ناظر ہونا لازم آتا ہے اور اگر امت کے لوگ صرف اس شہادت کے لیے بلائے جائیں گے کہ خالق کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچ گیا تو یقیناً رسول اللہ ﷺ بھی اسی بات کی شہادت دیں گے۔ مزید دلائل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۳) اور سورۂ مائدہ (۱۱۷) کی تفسیر۔

③ وَ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا : یہ دوسری اور تیسری صفت ہے، یعنی آپ ایمان والوں کو یہ بشارت دینے والے ہیں کہ عنقریب ان سے مصائب کے بادل چھٹ جانے والے ہیں اور جلد ہی اللہ تعالیٰ انھیں اپنی فتح و نصرت سے سرفراز فرمائے گا اور مرنے کے بعد انھیں جنت کی ابدی نعمتیں اور اللہ کا دیدار میسر ہونے والا ہے۔ اسی طرح آپ حق کا انکار کرنے والوں کو دنیا میں ان کے برے انجام اور ذلت و خواری سے ڈرانے والے ہیں اور آخرت میں جہنم کے دائمی عذاب سے بھی۔

آیت 46 ① وَ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ : یعنی آپ اللہ کی توحید اور اس کے احکام کی اطاعت کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے ہیں اور یہ دعوت اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے آپ کو اس کام پر مامور کیا گیا ہے۔ اب جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ آپ کی نہیں بلکہ آپ کو مامور کرنے والے کی مخالفت کرتا ہے۔

② وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا : قرآن مجید میں دو جگہ سورج کو ''سراج'' کہا گیا ہے، جیسا کہ آسمانوں کو اوپر تلے پیدا کرنے کے ذکر کے بعد فرمایا: ﴿ وَ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾ [ نوح : ۱۶ ] ''اور اس نے ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنا دیا۔'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴾ [ النبا : ۱۳ ] ''اور ہم نے ایک بہت

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾

اور ایمان والوں کو خوش خبری دے کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے ﴿۴۷﴾

روشن گرم چراغ بنایا۔'' یہاں رسول اللہ ﷺ کو ''سراج منیر'' فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو لوگوں کے کفر و شرک کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان کے نور کی طرف لانے کا ذریعہ بنایا، جس طرح سورج کو رات کی تاریکی ختم کر کے روشنی کا ذریعہ بنایا۔ سراجِ منیر قرار دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں چاند کے نور کے باوجود روشنی کے لیے آگ یا مشعلیں جلانے کی ضرورت باقی رہتی ہے، مگر جب آفتاب عالم تاب طلوع ہوتا ہے تو کسی چراغ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد نہ کسی نبی کی پیروی باقی رہی، نہ قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے کسی امام، بزرگ یا پیر کی تقلید کی گنجائش ہے۔

**آیت 47** **وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا** : **''فَضْلًا''** کا معنی زائد ہونا، یعنی برتری ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ** ﴾ [ المؤمنون : ۲۴ ] ''یہ نہیں ہے مگر تمھارے جیسا ایک بشر، جو چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔'' یعنی اے نبی! مومنوں کو بشارت دے دے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی برتری عطا ہونے والی ہے۔ کفار کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو عطا ہونے والے فضل اور برتری کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ شوریٰ میں فرمایا: ﴿ **تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ** ﴾ [ الشوریٰ : ۲۲ ] ''تو ظالموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو انھوں نے کمایا، حالانکہ وہ ان پر آکر رہنے والا ہے اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وہ جنتوں کے باغوں میں ہوں گے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔'' اور دوسری امتوں کے اہلِ ایمان کے مقابلے میں اس امت کی برتری کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت (۱۴۳) اور آل عمران کی آیت (۱۱۰) کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

علاوہ ازیں ہماری امت کی دوسری امتوں پر برتری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں وہ پیغمبر مبعوث فرمایا جو سید ولد آدم ہے اور جس طرح آپ ﷺ کو سب انبیاء سے افضل بنایا اسی طرح آپ کی امت کو دوسری امتوں پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّمَا بَقَاؤُكُمْ فِيْمَا سَلَفَ قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ كَمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلٰى غُرُوْبِ الشَّمْسِ، أُوْتِيَ أَهْلُ التَّوْرَاةِ التَّوْرَاةَ فَعَمِلُوْا حَتّٰى إِذَا انْتَصَفَ النَّهَارُ عَجَزُوْا، فَأُعْطُوْا قِيْرَاطًا قِيْرَاطًا، ثُمَّ أُوْتِيَ أَهْلُ الْإِنْجِيْلِ الْإِنْجِيْلَ فَعَمِلُوْا إِلٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ، ثُمَّ عَجَزُوْا، فَأُعْطُوْا قِيْرَاطًا قِيْرَاطًا، ثُمَّ أُوْتِيْنَا الْقُرْآنَ فَعَمِلْنَا إِلٰى غُرُوْبِ الشَّمْسِ، فَأُعْطِيْنَا قِيْرَاطَيْنِ قِيْرَاطَيْنِ، فَقَالَ أَهْلُ الْكِتَابَيْنِ أَيْ رَبَّنَا! أَعْطَيْتَ هٰؤُلَاءِ قِيْرَاطَيْنِ قِيْرَاطَيْنِ، وَأَعْطَيْتَنَا قِيْرَاطًا قِيْرَاطًا، وَ نَحْنُ كُنَّا أَكْثَرَ عَمَلًا؟ قَالَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ هَلْ ظَلَمْتُكُمْ مِنْ أَجْرِكُمْ مِنْ شَيْءٍ؟ قَالُوْا لَا، قَالَ فَهُوَ فَضْلِيْ أُوْتِيْهِ مَنْ أَشَاءُ )) [ بخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك ركعة من العصر قبل الغروب : ۵۵۷ ] ''تم سے پہلی قوموں کے مقابلے میں تمھارا عرصہ اتنا ہے جتنا عصر سے

وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ دَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

**اور کافروں اور منافقوں کا کہنا مت مان اور ان کی ایذا رسانی کی پروانہ کر اور اللہ پر بھروسا کر اور وکیل کی حیثیت سے اللہ کافی ہے ﴿۴۸﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس**

غروبِ آفتاب تک۔ اہل تورات کو تورات دی گئی، انھوں نے کام کیا، جب دوپہر ہوئی تو وہ تھک کر رہ گئے تو انھیں ایک ایک قیراط دیا گیا، پھر اہل انجیل کو انجیل دی گئی، انھوں نے عصر کی نماز تک کام کیا، پھر تھک کر رہ گئے، انھیں بھی ایک ایک قیراط دیا گیا۔ پھر ہمیں قرآن دیا گیا تو ہم نے سورج غروب ہونے تک کام کیا تو ہمیں دو دو قیراط دیے گئے، تو دونوں کتابوں والے کہنے لگے: ''اے ہمارے رب! تو نے انھیں دو دو قیراط دیے اور ہمیں ایک ایک قیراط دیا، حالانکہ ہم نے زیادہ کام کیا؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کیا میں نے تمھاری مزدوری میں کچھ کمی کی ہے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں!'' فرمایا: ''پھر یہ میرا فضل ہے، میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں۔''

**آیت 48** ① **وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ** : یعنی کفار و منافقین جو آپ کو مداہنت کے لیے کہتے ہیں، لوگوں کے کفر و شرک پر خاموش رہنے کے لیے اصرار کرتے ہیں اور جاہلیت کی رسوم توڑنے سے روکتے ہیں، ان کا کہنا مت مان، بلکہ دعوت حق پر استقامت اختیار کر۔ اس سورت کے شروع میں یہی حکم دیا تھا، یعنی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ اب تاکید کے لیے اسے دوبارہ ذکر فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ قلم (۸ تا ۱۵) اور شوریٰ (۱۵)۔

② **وَ دَعْ اَذٰىهُمْ** : یعنی دعوت دین کی وجہ سے وہ آپ کو جو تکلیف پہنچاتے ہیں اس کی پروا مت کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِيْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ [ آل عمران : ۱۸٦ ] ''یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

③ **وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ......** : یعنی آپ اپنے سب کام اللہ کے سپرد کر دیں، کیونکہ جو کام اللہ کے سپرد کر دیا جائے، وہ اس کے لیے کافی ہے۔

**آیت 49** ① **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ......** : سورت کے شروع سے متبنّٰی بنانے کی رسم توڑنے کا، رسول اللہ ﷺ کے متبنّٰی زید رضی اللہ عنہ کے اپنی بیوی زینب کو طلاق دینے کا اور رسول اللہ ﷺ کے اس کے ساتھ نکاح کا ذکر آ رہا تھا۔ اس پر منافقین کی باتوں کا تذکرہ بھی ہوا اور ان کی پروانہ کرنے کا بھی، پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا منصب، آپ کی رفعت شان اور آپ کی ذمہ داریاں نہایت جامع انداز میں بیان فرمائیں۔ اب دوبارہ نکاح و طلاق کے کچھ مسائل کا ذکر

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

سے پہلے کہ انھیں ہاتھ لگاؤ تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں چھوڑ دو، اچھے طریقے سے چھوڑنا ﴿۴۹﴾

ہوتا ہے، جن میں سے اکثر کا سابقہ رسول اللہ ﷺ کو بھی پیش آیا۔

2 ”مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ“ میں ہاتھ لگانے سے مراد جماع ہے اور یہ قرآن مجید کے بیان کی پاکیزگی ہے کہ وہ اس کے لیے صریح الفاظ کے بجائے کنائے کا لفظ استعمال کرتا ہے، مثلاً ”مساس“ یا ”ملامسہ“ وغیرہ۔ اس میں ہمارے لیے بھی سبق ہے کہ یہ مفہوم ادا کرنے کے لیے صریح الفاظ کے بجائے کنائے کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

3 کسی مسلمان عورت کو اگر خاوند عقد نکاح کے بعد صحبت سے پہلے طلاق دے دے تو عورت پر کوئی عدت نہیں، جس میں خاوند رجوع کر سکتا ہو، بلکہ اگر وہ عورت چاہے تو اسی وقت دوسرا نکاح کر سکتی ہے، کیونکہ صحبت ہوئی ہی نہیں کہ یہ دیکھنے کے لیے انتظار کی ضرورت ہو کہ حمل تو نہیں ٹھہرا۔ استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”بعض اہلِ علم نے خلوت صحیحہ کو بھی بمنزلہ صحبت کے شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دینے سے مہر اور عدت لازم ہو گی، مگر یہ مسئلہ بظاہر اس آیت کے خلاف ہے۔“ (اشرف الحواشی) آیت میں اگرچہ مومن عورتوں کا ذکر ہے، مگر اس بات پر اجماع ہے کہ یہودی یا عیسائی عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ مومن عورتوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جب مومن عورت پر عدت نہیں، جسے مومن مرد کے نکاح میں رکھنے اور اسے رجوع کا موقع دینے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے، تو کتابیہ عورت پر تو بالا ولیٰ عدت نہیں۔ (بقاعی)

4 یہ حکم ان عورتوں کا ہے جنھیں دخول سے پہلے طلاق دی جائے، اگر نکاح کے بعد دخول سے پہلے خاوند فوت ہو جائے تو عورت پر عدت بھی ہو گی اور وہ خاوند کی وارث بھی ہو گی۔ معقل بن سنان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا تھا۔ [ أبوداوٗد، النكاح، باب فيمن تزوج و لم يسم لها صداقًا حتى مات : ٢١١٤، و قال الألباني صحيح ]

5 فَمَتِّعُوْهُنَّ : جس عورت کو دخول سے پہلے طلاق دی گئی ہو وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو نکاح کے وقت اس کے لیے مہر مقرر کیا گیا ہو گا، یا نہیں۔ اگر مہر مقرر نہیں کیا گیا تو اسے مہر نہیں ملے گا اور اگر مقرر کیا گیا ہے تو نصف مہر دیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ سامان مثلاً کپڑوں کا جوڑا وغیرہ دینا ضروری ہے، اسے ”متعہ طلاق“ کہا جاتا ہے۔ مقصد اس کا طلاق سے ہونے والی دل شکنی کا کچھ نہ کچھ مداوا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیات (۲۳۶، ۲۳۷) میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے اس کی مقدار کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سہل بن سعد اور ابو اسید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے امیمہ بنت شراحیل سے نکاح کیا، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لائی گئی اور آپ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو جیسے اس نے ناپسند کیا، تو آپ ﷺ نے ابو اسید سے کہا کہ وہ اس کا سامان تیار کریں اور اسے دو رازقیہ (کتان سے بنے ہوئے سفید لمبے) کپڑے بھی دے دیں۔“ [ بخاري، الطلاق، باب من طلق و هل يواجه الرجل امرأته بالطلاق ؟ : ٥٢٥٦، ٥٢٥٧ ]

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ٞ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً

اے نبی! بے شک ہم نے تیرے لیے تیری بیویاں حلال کر دیں جن کا تو نے مہر دیا ہے اور وہ عورتیں جن کا مالک تیرا دایاں ہاتھ بنا ہے، اس (غنیمت) میں سے جو اللہ تجھ پر لوٹا کر لایا ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں، جنھوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی بھی

6 ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ ...... : لفظ ''ثُمَّ'' سے دو مسئلے ثابت ہوتے ہیں، ایک یہ کہ طلاق وہ معتبر ہے جو نکاح کے بعد دی جائے، نکاح سے پہلے دی ہوئی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں، مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میں جس عورت سے نکاح کروں اسے طلاق ہے، تو طلاق نہیں ہوگی، کیونکہ یہ نکاح کے بعد نہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے (اس آیت کے حوالے سے) فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے طلاق کو نکاح کے بعد رکھا ہے۔'' اور علی، سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبدالرحمان، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، ابان بن عثمان، علی بن حسین، شریح، سعید بن جبیر، قاسم، سالم، طاؤس، حسن، عکرمہ، عطاء، عامر بن سعد، جابر بن زید، نافع بن جبیر، محمد بن کعب، سلیمان بن یسار، مجاہد، قاسم بن عبدالرحمان، عمرو بن ہرم اور شعبی رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ ایسی عورت کو طلاق نہیں ہوگی۔ [ بخاري، الطلاق، باب لا طلاق قبل النكاح، بعد الحديث : ٥٢٦٨ ] دوسرا مسئلہ یہ کہ نکاح کے بعد اگر دخول نہیں ہوا تو خواہ کتنی مدت کے بعد طلاق ہوئی ہو، عدت نہیں ہے۔

7 وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا : اچھے طریقے سے چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر اچھے طریقے سے اسے طلاق دے کر رخصت کر دے۔ لوگوں کے سامنے اس کے عیوب یا شکایات کے دفتر نہ کھولے کہ کوئی اور بھی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے اس حکم سے ظاہر ہے کہ طلاق کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط کرنا درست نہیں، کیونکہ اس سے مرد نہ بھی چاہے تو اسے کوئی نہ کوئی شکوہ یا عیب بیان کرنا پڑے گا، جس سے عورت کی رسوائی ہوگی، جو اسے اچھے طریقے سے چھوڑنے کے خلاف ہے۔

**آیت 50** 1 يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ ...... : اس آیت میں ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے لوگوں کے لیے چار سے زیادہ بیویاں ممنوع قرار دیتے ہیں تو خود انھوں نے چار سے زیادہ شادیاں کیسے کر لیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اے نبی! ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ تمام بیویاں حلال کی ہیں جن کا آپ نے مہر دیا ہے۔ مراد وہ بیویاں ہیں جو آیت کے نزول کے وقت آپ کے نکاح میں تھیں۔ مطلب یہ کہ عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے ہم ہیں اور آپ کے لیے اس شرط کو ختم کرنے والے بھی ہم ہیں۔ جن عورتوں سے آپ نے نکاح فرمایا ان کی تعداد گیارہ تھی، جن میں سے نو بیویاں آپ کی وفات کے وقت زندہ تھیں۔ دو بیویاں خدیجہ اور زینب بنت

لَّكَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا فَرَضۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيۡۤ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ

مومن عورت اگر وہ اپنا آپ نبی کو ہبہ کر دے، اگر نبی چاہے کہ اسے نکاح میں لے لے۔ یہ خاص تیرے لیے ہے، مومنوں کے لیے نہیں۔ بے شک ہم نے جان لیا جو ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور ان عورتوں کے بارے میں فرض

خزیمہ ام المساکین رضی اللہ عنہا وفات پا چکی تھیں۔ ان کے علاوہ چند عورتوں کے متعلق اختلاف ہے کہ آپ کا ان سے عقد نکاح ہوا یا نہیں، مگر اس پر اتفاق ہے کہ وہ رخصت ہو کر آپ کے گھر نہیں آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت یہ نو امہات المومنین حیات تھیں: ① عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ② سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا ③ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا ④ ام سلمہ بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا ⑤ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ⑥ جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا ⑦ ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا ⑧ صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا ⑨ اور میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا۔

② ابن کثیر لکھتے ہیں: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ تھا، جو پانچ سو درہم ہوتے ہیں۔ ہاں ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا کا مہر نجاشی رحمہ اللہ نے اپنے پاس سے چار سو دینار دیا تھا۔ صفیہ رضی اللہ عنہا کا مہر انھیں آزاد کرنا تھا، وہ خیبر کے قیدیوں میں سے تھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آزاد کر دیا اور اسی آزادی کو ان کا مہر قرار دیا اور نکاح کر لیا۔ جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا بنو المصطلق سے گرفتار ہو کر آئی تھیں، انھوں نے ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے جتنی رقم پر مکاتبت کی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اتنی رقم ادا کر کے ان سے عقد کر لیا تھا۔'' (ابن کثیر)

③ **وَمَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ**: ''أَفَاءَ يُفِيْءُ'' کا معنی ''لوٹا کر لانا'' ہے۔ ''فے'' عموماً ان اموال کو کہا جاتا ہے جو جنگ کے بغیر دشمن سے حاصل ہوں۔ بعض اوقات جنگ کے ساتھ ملنے والی غنیمت کو بھی ''فے'' کہہ لیتے ہیں۔ ان اموال کو ''فے'' اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام اموال حقیقت میں مسلمان کی ملکیت ہیں جو عارضی طور پر کفار کے قبضے میں ہیں، جب مسلمان انھیں حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنا ہی مال واپس لیتے ہیں۔ ان عورتوں کے آپ کے لیے حلال کرنے کے ذکر کے بعد جن کے ساتھ آپ نے مہر دے کر نکاح کیا تھا، تین قسم کی عورتیں حلال کرنے کا ذکر فرمایا۔ ان میں سے پہلی قسم لونڈیاں ہیں، جو بطور فے آپ کو حاصل ہوئیں اور آپ نے لونڈی کی حیثیت سے ان سے فائدہ اٹھایا۔ یہ ماریہ قبطیہ تھیں، جنھیں مقوقس مصر نے آپ کے لیے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ اس لیے وہ فے کے حکم میں تھیں، ان سے آپ کے بیٹے ابراہیم پیدا ہوئے۔ ''**مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ**'' کا یہ معنی نہیں کہ جو لونڈیاں بطور فے آپ کے پاس نہ آئیں وہ آپ کے لیے حلال نہیں، بلکہ ''سراری'' (لونڈیوں) کی تو آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے عام اجازت ہے۔ (قرطبی)

④ **وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ**...... : پہلی بیویوں کے بعد آپ کے لیے حلال کی جانے والی عورتوں کی یہ دوسری قسم ہے، یعنی وہ عورتیں جو باپ یا ماں کی طرف سے آپ کی قریبی رشتہ دار ہیں اور انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی ہے۔ ان کے ساتھ نکاح آپ کے لیے حلال ہے۔ یہ تفسیر اس لیے کی گئی ہے کہ آپ کے ماموں یا خالہ کی کوئی بیٹی تھی ہی نہیں۔ آپ کی

لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰

**کیا جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں، تاکہ تجھ پر کوئی تنگی نہ ہو اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝۵۰**

والدہ کے خاندان بنوزہرہ کو آپ ﷺ کے ماموں کہا جاتا تھا۔

⑤ **وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ**...... : یہ تیسری قسم ہے، یعنی مندرجہ بالا عورتوں کے علاوہ کوئی مومن عورت اگر اپنا آپ نبی ﷺ کو ہبہ کر دے، یعنی مہر کے بغیر نکاح میں دینے کی پیش کش کرے اور نبی ﷺ اس سے نکاح کرنا چاہیں تو آپ کے لیے ولی اور مہر کے بغیر اس سے نکاح حلال ہے۔ ثابت بنانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے انس رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، وہ اپنے آپ کو آپ ﷺ کے لیے پیش کر رہی تھی، تو انس رضی اللہ عنہ کی بیٹی نے کہا: ''اس کی حیا کتنی کم تھی؟'' تو انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ تجھ سے بہتر تھی، اس نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے لیے پیش کیا تھا۔'' [ بخاري، الأدب، باب ما لا يستحيا من الحق للتفقه في الدين : ۶۱۲۳ ]

⑥ **خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ** : یعنی یہ اجازت صرف آپ کے ساتھ خاص ہے، دوسرے مسلمانوں کے لیے وہی حکم ہے جو سورۂ نساء (۲۴) میں فرمایا: ﴿ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ﴾ یعنی بن مہر نکاح جائز نہیں۔ (موضح) اسی طرح چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف آپ کے لیے ہے، دوسرے مسلمانوں کے لیے نہیں۔

⑦ **قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** : یعنی عام مسلمانوں کو نکاح کے لیے جن شرائط کا پابند کیا گیا ہے، ان کا پابند رہنا ان کے لیے ضروری ہے اور وہ یہ کہ مہر، ولی اور گواہوں کے بغیر نکاح کرنا جائز نہیں، اس کے علاوہ وہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتیں نکاح میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ مسائل سورۂ نساء (۳، ۴ اور ۲۴، ۲۵) میں گزر چکے ہیں۔

⑧ **لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ** : یعنی دعوت دین کی مصلحت کے لیے آپ کو ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ آپ پر زیادہ نکاح کرنے میں کوئی تنگی نہ رہے۔ کیونکہ بہت سی مصلحتوں کی وجہ سے آپ کو زیادہ نکاح کرنے ہوں گے۔ اہلِ علم نے رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کے ساتھ نکاح میں جو مصلحتیں مدنظر تھیں ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور اسلام کے مخالفین رسول اللہ ﷺ کے تعددِ ازواج پر جو جو اعتراض کرتے ہیں ان کا مدلل جواب دیا ہے۔ اس مقصد کے لیے مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی تصنیف ''مقدس رسول'' لاجواب کتاب ہے۔ الرحیق المختوم میں بھی یہ مصلحتیں اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

● **وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** : یعنی ہم نے رفع حرج کے لیے آپ کو جو اجازتیں عطا فرمائی ہیں ان کا باعث ہماری مغفرت و رحمت کی صفت ہے۔ (ابن عاشور)

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَ لَا يَحْزَنَّ وَ يَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ

ان میں سے جسے تو چاہے مؤخر کر دے اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دے دے اور تو جسے بھی طلب کر لے، ان عورتوں میں سے جنھیں تو نے الگ کر دیا ہو تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں

**آیت 51** ① تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ...... : اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے بیویوں کے بارے میں مزید رعایتوں کا بیان ہے۔ ان میں سے ایک رعایت یہ ہے کہ جو عورتیں اپنے نفس آپ کے لیے ہبہ کریں، ان میں سے آپ جسے چاہیں مؤخر رکھیں اور جسے چاہیں اپنے پاس جگہ دیں، آپ پر ان کی پیش کش قبول کرنا لازم نہیں اور ایک رعایت یہ ہے کہ جو عورتیں آپ کے نکاح میں ہیں، آپ پر ان کے پاس باری باری جانے کی پابندی نہیں، آپ جس کے پاس چاہیں رات بسر کریں، جسے چاہیں مؤخر رکھیں۔

② وَ مَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ : تیسری رعایت یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی کی باری آپ نے ختم کی ہو اور دوبارہ اسے طلب کرنا چاہیں، تو اس میں بھی آپ پر کوئی مضائقہ نہیں۔

③ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ...... : بیویوں کا حق ساقط کرنے سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی بیویوں دونوں سے تنگی دور کرنا مقصود تھا۔ نبی ﷺ کی تنگی دور کرنا تو ظاہر ہی ہے، بیویوں کی تنگی دور کرنا اس لحاظ سے ہے کہ جب ان میں سے ہر ایک کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں باری کے دن نبی ﷺ کا اس کے ہاں رات بسر کرنا اس کا حق نہیں تو آپ کے ساتھ اور آپس میں ایک دوسری کے ساتھ بھی ان کی چپقلش اور تنازعات ازخود ختم ہو جائیں گے، کیونکہ تنازعات کی بنیاد ہی حقوق کا دعویٰ ہے۔ جب حق ہی نہ رہا تو جھگڑا کیسا۔ پھر جب آپ کسی بیوی کے پاس جائیں گے تو اس احساس سے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لیے اس کے پاس جانا ضروری نہیں تھا، اسے آپ کے آنے سے خوشی ہوگی اور اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور انھیں یہ جان کر آپ کے نہ آنے سے غم بھی نہیں ہوگا کہ آپ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی اجازت سے کر رہے ہیں اور آپ اپنی بیویوں کو جتنا وقت یا جتنی توجہ دیں گے، سب اسی پر خوش رہیں گی اور شکر گزار ہوں گی۔

④ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان رعایتوں کے باوجود آپ نے ان سے فائدہ اٹھایا نہ اپنا نفس ہبہ کرنے والی کسی خاتون سے آپ نے نکاح کیا، نہ کسی بیوی کی باری ختم کی، صرف سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری عائشہ رضی اللہ عنہا کو دی تو آپ نے اس کی اجازت دی، آپ ﷺ دوسری تمام بیویوں کے پاس باری باری جاتے تھے۔ آپ اس کا کس قدر اہتمام کرتے تھے وہ ان احادیث سے ظاہر ہے:

① معاذہ عدویہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا کہ اس آیت: ﴿ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ﴾ (ان میں سے جسے تو چاہے مؤخر کر دے اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دے دے) کے نازل ہونے کے بعد بھی جب آپ ہم میں سے

كُلُّهُنَّ ۭ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴿۵۱﴾

اور وہ غم نہ کریں اور وہ سب کی سب اس پر راضی ہوں جو تو انھیں دے اور اللہ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، بڑے حلم والا ہے ﴿۵۱﴾

کسی عورت کی باری کے دن میں ہوتے تو ہم سے اجازت مانگتے۔ [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ ترجي من تشاء منهن…… ﴾ : ۴۷۸۹ ] فتح الباری میں ہے، یعنی آپ جس بیوی کی باری کے دن میں ہوتے دوسری کے پاس جانا چاہتے تو اس سے اجازت مانگتے۔

② عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر جانا چاہتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے، پھر جس کا قرعہ نکلتا اسے ساتھ لے جاتے اور ہر بیوی کے پاس باری باری ایک دن رات رہتے، سوائے سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے کہ اس نے اپنی باری عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے ہبہ کر دی تھی، اس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی حاصل کرنا چاہتی تھیں۔'' [ بخاري، الهبة، باب هبة المرأة لغير زوجها…… : ۲۵۹۳ ]

③ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بیماری کی وجہ سے) بوجھل ہو گئے اور آپ کی بیماری سخت ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بیویوں سے بیماری کے ایام میرے گھر میں گزارنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے آپ کو اجازت دے دی۔'' [ بخاري، الهبة، باب هبة الرجل لامرأته والمرأة لزوجها : ۲۵۸۸ ]

④ عروہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: ''میرے بھانجے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ٹھہرنے کی تقسیم میں کسی کو دوسری پر فضیلت نہیں دیتے تھے اور کم ہی کوئی دن ہوگا، ورنہ آپ ہر روز ہم سب کے پاس چکر لگاتے اور بغیر مساس (بغیر صحبت) ہر ایک کے پاس ٹھہرتے، یہاں تک کہ اس بیوی کے پاس پہنچتے جس کی باری ہوتی اور اس کے پاس رات گزارتے۔ سودہ رضی اللہ عنہا جب عمر رسیدہ ہو گئیں اور انھیں اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے علیحدگی اختیار کریں گے تو انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! میں نے اپنی باری عائشہ کو دی۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان سے قبول کر لیا۔'' فرماتی ہیں: ''ہم کہا کرتی تھیں کہ اس اور اس جیسی عورتوں ہی کے بارے میں یہ آیت اتری ہے: ﴿ وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ [ النساء : ۱۲۸ ] ''اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے کسی قسم کی زیادتی یا بے رخی سے ڈرے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں کسی طرح کی صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے، اور تمام طبیعتوں میں حرص (حاضر) رکھی گئی ہے اور اگر تم نیکی کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پورا باخبر ہے۔''

[ أبو داوٗد، النكاح، باب في القسم بين النساء : ۲۱۳۵، وقال الألباني حسن صحيح ]

⑤ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ : اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے بھی خطاب ہے اور تمام مومنوں سے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کی عظیم ذمہ داریوں کے پیش نظر جو رعایتیں دی ہیں، تاکہ وہ گھریلو پریشانیوں سے آزاد رہ کر اطمینان سے دعوت

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعۡدُ وَلَآ اَنۡ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكَ حُسۡنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ رَّقِيۡبًا ﴿۵۲﴾ ع

**تیرے لیے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ کہ تو ان کے بدلے کوئی اور بیویاں کر لے، اگر چہ ان کا حسن تجھے اچھا لگے مگر جس کا مالک تیرا دایاں ہاتھ بنے اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح نگران ہے ﴿۵۲﴾**

کا فریضہ سرانجام دے سکیں، اس کے متعلق اگر تمھارے دلوں میں تسلیم و رضا ہو گی یا کراہت و انکار تو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان کو جناب رسالت میں معمولی سوئے ظن سے بھی سخت اجتناب لازم ہے۔

⑥ **وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَلِيۡمًا** : یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے، مگر اس کے حلم کی بھی انتہا نہیں، اس لیے وہ تمھاری کسی خطا پر فوری گرفت نہیں کرتا، بلکہ تمھیں اپنی اصلاح کا موقع دیتا ہے۔

**آیت 52** ① **لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعۡدُ**...... : پچھلی آیات میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا کہ اگر وہ چاہیں تو آپ ﷺ کی زوجیت میں رہیں اور اگر چاہیں تو آپ سے علیحدہ ہو جائیں، لیکن جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تو انھیں اللہ کی طرف سے ایک دنیاوی بدلا یہ ملا کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ اب آپ ان کے سوا کسی اور عورت سے نکاح نہیں کر سکتے، نہ ہی ان میں سے کسی کو چھوڑ کر اس کے بدلے دوسری لا سکتے ہیں، گو اس کا حُسن آپ کو کتنا ہی پسند ہو۔ یہ صراحت اس لیے فرمائی کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ بیویوں کی تعداد نو (۹) سے زیادہ کرنا جائز نہیں، ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کے بدلے میں بیوی لا کر نو کا عدد پورا کر لیں تو اجازت ہے۔ فرمایا، انھیں طلاق دے کر ان کی جگہ بھی اور بیویاں لانے کی اجازت نہیں، خواہ نو سے زیادہ نہ بھی ہوں۔ ہاں، لونڈیوں کی بات دوسری ہے، ان پر کوئی پابندی نہیں۔

② ابن جریر طبری نے اس آیت کی دوسری تفسیر اختیار کی ہے کہ پچھلی آیت (۵۰): ﴿ **اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ** ...... ﴾ میں چار قسم کی جو عورتیں آپ کے لیے حلال کی گئی ہیں، ان کے بعد یعنی ان کے سوا کسی اور عورت سے نکاح جائز نہیں۔ نہ موجود بیویوں کو طلاق دے کر ان کی جگہ اور بیوی لانا جائز ہے۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں امہات المومنین کے بلند مرتبے کا اظہار ہو رہا ہے۔

③ "**وَلَوۡ اَعۡجَبَكَ حُسۡنُهُنَّ**" سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو آدمی اسے دیکھ سکتا ہے۔

④ **وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ رَّقِيۡبًا** : یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح نگران ہے، اس لیے کوئی بھی کام کرتے ہوئے ذہن میں حاضر رکھو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ )) [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ ...... : ۵۰ ] "اللہ کی عبادت (اس طرح) کرو گویا کہ اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔"

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡذَنَ لَكُمۡ اِلٰى طَعَامٍ غَيۡرَ نٰظِرِيۡنَ اِنٰٮهُ ۙ وَلٰـكِنۡ اِذَا دُعِيۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانْتَشِرُوۡا وَلَا مُسۡتَاۡنِسِيۡنَ لِحَدِيۡثٍ ؕ اِنَّ ذٰ لِكُمۡ كَانَ يُؤۡذِى النَّبِىَّ فَيَسۡتَحۡىٖ مِنۡكُمۡ وَاللّٰهُ لَا يَسۡتَحۡىٖ مِنَ الۡحَـقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھروں میں مت داخل ہو مگر یہ کہ تمھیں کھانے کی طرف اجازت دی جائے، اس حال میں کہ اس کے پکنے کا انتظار کرنے والے نہ ہو اور لیکن جب تمھیں بلایا جائے تو داخل ہو جاؤ، پھر جب کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور نہ (بیٹھے رہو) اس حال میں کہ بات میں دل لگانے والے ہو۔ بے شک یہ بات ہمیشہ سے نبی کو تکلیف دیتی ہے، تو وہ تم سے شرم کرتا ہے اور اللہ حق سے شرم نہیں کرتا اور جب تم ان سے کوئی سامان مانگو تو ان سے

آیت 53 ① يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتَ النَّبِيِّ ...... : گزشتہ آیات میں نبی ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کے باہمی معاملات کے متعلق راہ نمائی فرمائی گئی، اب امت کو امہات المومنین کے چند آداب بتائے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کے گھروں میں داخلے کے متعلق چند احکام بیان ہوتے ہیں، جو کچھ عرصہ بعد سورۂ نور میں تمام مسلمانوں کے گھروں میں داخلے کے لیے بھی نافذ کر دیے گئے۔ دور جاہلیت میں عرب لوگ بلا تکلف ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے تھے، کسی سے ملنے کے لیے اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت لینے یا انتظار کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ ہر شخص گھر کے اندر جا کر عورتوں سے بات کر لیتا اور صاحب خانہ کے متعلق پوچھ لیتا اور عورتیں بھی پردہ نہیں کرتی تھیں۔ بعض اوقات اس سے بہت سی اخلاقی خرابیوں کا آغاز ہوتا تھا، اس لیے پہلے نبی ﷺ کے گھروں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی دوست ہو یا رشتہ دار اجازت کے بغیر آپ کے گھروں میں داخل نہ ہو، پھر سورۂ نور (۲۷) میں تمام گھروں میں داخلے کے لیے اس قاعدے کا اعلان کر دیا گیا۔

② اِلٰى طَعَامٍ غَيۡرَ نٰظِرِيۡنَ اِنٰٮهُ ...... : "اِنٰهُ" میں "إِنًى" "أَنَى يَأْنِيْ" (ض) کا مصدر ہے، اس کا معنی ہے "کسی چیز کا وقت ہو جانا۔" جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلَمۡ يَاۡنِ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ﴾ [ الحديد : ١٦ ] "کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے جھک جائیں۔" یہ لفظ کھانا پک جانے کے معنی میں بھی آتا ہے، کیونکہ پکنے پر اس کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ اہلِ عرب میں جو غیر مہذب عادات پھیلی ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ کھانے کے وقت کا اندازہ کر کے کسی کے گھر پہنچ جاتے، یا اس کے گھر آ کر بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو جاتا۔ اس سے صاحب خانہ مشکل میں پڑ جاتا، نہ یہ کہہ سکتا کہ میرے کھانے کا وقت ہے، آپ تشریف لے جائیں، نہ اس کے بس میں ہوتا کہ اپنے کھانے کے ساتھ آنے والوں کے لیے بھی کھانا تیار کرے۔ بعض اوقات کھانے کے لیے دعوت دی جاتی، مگر مدعو حضرات وقت سے پہلے ہی آ کر بیٹھ جاتے، جس سے گھر والے سخت کوفت میں مبتلا ہو جاتے۔ اللہ

مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا

پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور تمھارا کبھی بھی حق نہیں کہ

تعالیٰ نے اس بے ہودہ عادت سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ کھانا تیار ہونے کے انتظار میں پہلے ہی جا کر نہ بیٹھ جاؤ، بلکہ جب گھر والا کھانے کے لیے بلائے اس وقت جاؤ۔ یہ حکم بھی نمونے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے گھر سے شروع ہوا، ورنہ ساری امت کے گھروں کے لیے یہی حکم ہے۔

③ وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ : یہ ایک اور بے ہودہ عادت کی اصلاح ہے۔ بعض لوگ کھانے کی دعوت میں بلائے جاتے ہیں تو کھانے سے فارغ ہو کر وہیں باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں، جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انھیں پروا نہیں ہوتی کہ اس سے گھر والوں کو کس قدر کوفت ہو رہی ہے کہ نہ وہ حیا کی وجہ سے انھیں جانے کو کہہ سکتے ہیں اور نہ آزادی سے اپنا کوئی کام کر سکتے ہیں۔

④ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ : یعنی کھانے پینے سے فارغ ہو کر تمھارا باتوں میں دل لگا کر بیٹھے رہنا نبی ﷺ کو ہمیشہ تکلیف دیتا ہے۔ ہمیشہ کا مفہوم "كَانَ" سے ظاہر ہو رہا ہے۔ پھر وہ تم سے حیا کرتے ہوئے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اب اٹھ جاؤ۔ مگر اللہ تعالیٰ حق کہنے سے نہیں شرماتا، اس لیے اس نے یہ احکام دیے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے طفیلیوں (بن بلائے مہمانوں) اور بوجھ بن جانے والوں کو اپنے نبی کے لیے برداشت نہیں فرمایا، پھر عام آدمی انھیں کیسے برداشت کر سکتا ہے۔

⑤ اس آیت میں امہات المومنین کے حجاب کا حکم نازل ہوا، اس لیے اسے آیت حجاب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی موافقات، یعنی ان باتوں میں سے ہے جن میں ان کی بات کے مطابق قرآن نازل ہوا، مگر ان کا حسن ادب یہ ہے کہ انھوں نے یہ کہنے کے بجائے کہ قرآن نے میری بات کی موافقت کی، یہ کہا کہ میں نے تین باتوں میں اپنے رب کی موافقت کی۔ چنانچہ ان میں سے ایک یہ ہے: ﴿ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لَوْ أَمَرْتَ نِسَاءَكَ أَنْ يَّحْتَجِبْنَ، فَإِنَّهُ يُكَلِّمُهُنَّ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ، فَنَزَلَتْ آيَةُ الْحِجَابِ ﴾ [ بخاري، الصلاة، باب ما جاء في القبلة...... : ۴۰۲ ] "میں نے کہا، یا رسول اللہ! آپ کی بیویوں کے پاس اچھے اور برے ہر قسم کے لوگ (دینی یا دنیوی مسائل کے لیے) آتے ہیں، کاش! آپ انھیں حجاب کا حکم دے دیں، تو اللہ تعالیٰ نے آیتِ حجاب کو نازل فرمایا۔"

⑥ اس آیت کا نزول جس موقع پر ہوا اسے انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں: "جب رسول اللہ ﷺ کی شادی زینب رضی اللہ عنہا سے ہوئی تو (ولیمے میں) گوشت اور روٹی کھلائی گئی۔ مجھے لوگوں کو دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا، لوگ آتے اور کھا کر چلے جاتے، پھر اور لوگ آتے اور کھا کر چلے جاتے۔ میں نے سب کو دعوت دی، حتیٰ کہ کوئی شخص باقی نہ رہا۔ آخر میں میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! اب کوئی شخص نہیں ملتا جسے میں دعوت دوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا اب کھانا اٹھا دو۔" (سب لوگ کھانا کھا کر چلے گئے) اور تین شخص گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے، رسول اللہ ﷺ نکلے اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے

رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾

تم اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ اس کے بعد کبھی اس کی بیویوں سے نکاح کرو۔ بے شک یہ بات ہمیشہ سے اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے ﴿۵۳﴾

کی طرف چلے گئے اور کہا: ''اے اہلِ بیت (گھر والو)! اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ'' انھوں نے کہا: (( وَ عَلَيْكَ السَّلَامُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ، كَيْفَ وَجَدْتَ أَهْلَكَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ )) ''آپ پر بھی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو، آپ نے اپنے اہل کو کیسا پایا، اللہ آپ کے لیے برکت کرے۔'' اسی طرح آپ اپنی تمام بیویوں کے گھروں میں گئے اور سب کو عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح سلام کیا، سب نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح جواب دیا۔ پھر جب لوٹ کر آئے تو دیکھا کہ وہ تین آدمی (ابھی تک) گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت حیا والے تھے، آپ پھر عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف چلے گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے آپ کو جا کر بتایا یا کسی اور نے بتایا کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ چنانچہ آپ واپس آئے اور اس حالت میں کہ دروازے کی دہلیز میں آپ کا ایک پاؤں اندر تھا اور دوسرا باہر تھا، آپ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا اور حجاب کی آیت نازل ہوگئی۔'' [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ لا تدخلوا بيوت النبي ...... ﴾ : ۴۷۹۳ ]

⑦ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا ...... : اس آیت کے نزول کے ساتھ حکم ہوا کہ محرم مردوں کے سوا کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر نہ آئے اور جسے بھی خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے، خواہ کوئی چیز مانگنے کی ضرورت ہو، یا کوئی بات یا دینی مسئلہ پوچھنے کی۔

⑧ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ : اس جملے پر تھوڑی سی توجہ سے بھی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جب امہات المومنین، جو دنیا کی پاک باز ترین خواتین تھیں اور صحابہ کرام، جو دنیا کے پاک باز ترین مرد تھے، انھیں دلوں کو پاک رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے کوئی بات کرتے وقت حجاب کا حکم ہے تو عام لوگوں کو بلا حجاب ایک دوسرے سے ملنے کی، یعنی گھروں، ہسپتالوں، سکولوں، کالجوں، پارکوں، عدالتوں اور اسمبلیوں میں مردوں اور عورتوں کے بلا تکلف میل جول اور مخلوط معاشرے کی اسلام میں کیا گنجائش ہو سکتی ہے اور ان کے دلوں کی طہارت و پاکیزگی کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ اب جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ اصل پردہ دل کا ہے، کیونکہ شرم و حیا کا اور برے خیالات کا تعلق دل سے ہے، یہ ظاہر پردہ کچھ ضروری نہیں، ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو دل سے مانا ہی نہیں۔

⑨ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ : یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا، خواہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا ہو، یا آپ کی خواہش کے بغیر آپ کے گھر میں بیٹھے رہنا ہو، یا حجاب کے بغیر ازواج مطہرات سے گفتگو کرنا ہو، یا منافقین کی طرح کسی قسم کی دل آزار باتیں کرنا ہو، غرض کسی بھی طریقے سے ہو، تمھارے لیے جائز نہیں، نہ ہی یہ تمھیں کبھی زیب دیتا ہے۔

⑩ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا : یہ گناہ عظیم اس لحاظ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

اِنۡ تُبۡدُوۡا شَيۡـًٔا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴿۵۴﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ‌ ۚ وَاتَّقِيۡنَ اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ

اگر تم کسی چیز کو ظاہر کرو، یا اسے چھپاؤ تو بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۵۴﴾ ان (عورتوں) پر کوئی گناہ نہیں اپنے باپوں (کے سامنے آنے) میں اور نہ اپنے بیٹوں کے اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی عورتوں کے اور نہ ان (کے سامنے آنے) میں جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں اور (اے عورتو!) اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح شاہد ہے ﴿۵۵﴾ بے شک اللہ اور

اگر کوئی آدمی ان سے نکاح کرے تو گویا اس نے اپنی ماں سے نکاح کیا، پھر جو احترام اللہ نے انھیں بخشا ہے وہ کبھی ملحوظ نہ رکھ سکے گا، بلکہ اپنی عاقبت برباد کرے گا۔

**آیت 54** اِنۡ تُبۡدُوۡا شَيۡـًٔا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ...... : یعنی زبان سے تو کجا، کسی مومن کے دل میں ایسا خیال بھی نہیں آنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو ظاہر و باطن اور دل کے خیالات یکساں روشن ہیں، کوئی بات اس سے چھپی نہیں رہ سکتی۔

**آیت 55** لَا جُنَاحَ عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ اٰبَآئِهِنَّ...... : یعنی ان رشتہ داروں کے سامنے آنے اور حجاب کے بغیر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے محرم رشتہ داروں کا بھی یہی حکم ہے، خواہ نسبی ہوں یا رضاعی۔ پردے کے متعلق امہات المومنین کا حکم بھی وہی ہے جو عام مسلمان عورتوں کا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نور کی آیت (۳۱) کی تفسیر۔

**آیت 56** ① اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ...... : لفظ ''صلاۃ'' کی تفسیر اس سے پہلے آیت (۴۳) میں گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اور فرشتوں اور مومنوں کی نسبت سے ''صلاۃ'' کا کیا معنی ہے۔ اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والی کئی خصوصیات کا ذکر فرمایا، مثلاً آپ کا مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھنا، آپ کے لیے چار سے زیادہ بیویوں کا حلال ہونا، آپ کا خاتم النبیین ہونا، آپ کی بیویوں کا امہات المومنین ہونا، ان کے حجاب و احترام کا خصوصی اہتمام اور آپ ﷺ کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کی حرمت وغیرہ۔ ''اِنَّ'' کا لفظ عموماً تعلیل کے لیے، یعنی پہلی باتوں کی علت بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ زیر تفسیر آیت میں مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے ان بلند مراتب کا خاص خیال رکھنے اور ان کے تحفظ و احترام کا حکم دینے کی وجہ ذکر فرمائی۔ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''مقصود اس آیت سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ''ملأ اعلیٰ'' یعنی آسمانوں کی بلند مجلس میں اپنے بندے اور نبی کے مرتبہ و منزلت کی بلندی کی خبر دے رہا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ آپ کی تعریف و ثنا کرتا اور آپ پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے بھی آپ کے لیے رحمت و مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرتے ہیں۔ آسمانوں والوں کی خبر دے کر اب زمین والوں کو حکم

وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۵۶﴾

**اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام بھیجو، خوب سلام بھیجنا ﴿۵۶﴾**

دیتا ہے کہ تم بھی آپ پر صلاۃ و سلام بھیجو، تا کہ آپ کی تعریف و ثنا پر اور آپ کے لیے مغفرت و رحمت اور برکت کی دعا پر عالم علوی (آسمانوں والے) اور عالم سفلی (زمین والے) سب متحد ہو جائیں۔‘‘

❷ آیت کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے کہ کلام میں کچھ الفاظ حذف ہیں، جو خود بخود معلوم ہو رہے ہیں، یعنی ’’**صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا**‘‘ سے ظاہر ہے کہ آیت کی ابتدا اس طرح ہے: ’’إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ وَ يُسَلِّمُوْنَ‘‘ اسے احتباک کہتے ہیں اور یہ کلامِ الٰہی کے حسن کا ایک مظہر ہے۔ (بقاعی) انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کے سلام کا ذکر قرآن میں الگ الگ بھی آیا ہے، جیسے: ﴿**سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ**﴾، ﴿**سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ**﴾ وغیرہ اور اکٹھا بھی آیا ہے، جیسے: ﴿**وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ**﴾ [ دیکھیے الصافات: ۷۹، ۱۰۹، ۱۸۱ ]

❸ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ پر صلاۃ کے لیے کئی الفاظ مروی ہیں، جو سبھی اس مقصد کے لیے پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں: (( سَأَلْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! كَيْفَ الصَّلَاةُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ؟ فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ عَلَّمَنَا كَيْفَ نُسَلِّمُ، قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب: ۳۳۷۰ ] ’’ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ’’ہم نے کہا: ’’آپ اہلِ بیت (گھر والوں) پر صلاۃ کس طرح ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تو سکھا دیا ہے کہ ہم آپ پر سلام کیسے بھیجیں۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’تم یوں کہو کہ اے اللہ! محمد اور آل محمد پر صلاۃ بھیج، جیسے تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر صلاۃ بھیجی، بے شک تو تعریف کیا ہوا بزرگی والا ہے اور اے اللہ! محمد اور آل محمد پر برکتیں نازل فرما، جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر برکتیں نازل فرمائیں، بے شک تو تعریف کیا ہوا ہے، بزرگی والا ہے۔‘‘ اس حدیث اور دوسری احادیث میں صحابہ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سکھا دیا ہے کہ ہم آپ پر سلام کیسے بھیجیں، اس سلام سے مراد نماز کے تشہد میں سلام کی تعلیم ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( عَلَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، وَ كَفِّيْ بَيْنَ كَفَّيْهِ، التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنِي السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ: اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ )) [ بخاري، الاستئذان، باب الأخذ باليدين: ۶۲۶۵ ] ’’مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد اس طرح سکھایا جس طرح مجھے قرآن کی کوئی سورت سکھاتے تھے، اس وقت میری ہتھیلی آپ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھی: ’’تمام قولی عبادتیں اللہ کے لیے ہیں اور تمام بدنی عبادتیں اور

تمام مالی عبادتیں، سلام ہو تجھ پر اے نبی! اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں، سلام ہو ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر، میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔''

جس طرح اس حدیث سے ظاہر ہے کہ آیت میں ''سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا'' پر عمل کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے نماز میں تشہد کے اندر سلام کے الفاظ کے ساتھ دی ہے، اسی طرح صحابہ نے آپ ﷺ سے صلاۃ کے بھی وہی الفاظ سیکھنے کی درخواست کی جو نماز میں پڑھے جائیں۔ چنانچہ ابو مسعود عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( أَقْبَلَ رَجُلٌ حَتّٰى جَلَسَ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ نَحْنُ عِنْدَهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَمَّا السَّلَامُ عَلَيْكَ فَقَدْ عَرَفْنَاهُ فَكَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا فِيْ صَلَاتِنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ؟ قَالَ فَصَمَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ حَتّٰى أَحْبَبْنَا أَنَّ الرَّجُلَ لَمْ يَسْأَلْهُ فَقَالَ إِذَا أَنْتُمْ صَلَّيْتُمْ عَلَيَّ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَ آلِ إِبْرَاهِيْمَ وَ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ )) [ مسند أحمد : ١١٩/٤، ح : ١٧٠٧٦، مسند احمد کے محقق نے بارہ کتب حدیث سے اس حدیث کا حوالہ نقل کر کے اس کی صحت بیان فرمائی ہے ] ''ایک آدمی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا اور ہم آپ ﷺ کے پاس موجود تھے، اس نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ پر سلام کو تو ہم جان چکے، اب ہم آپ پر صلاۃ کیسے بھیجیں، جب ہم اپنی نماز میں صلاۃ بھیجیں، اللہ تعالیٰ آپ پر صلاۃ نازل فرمائے؟'' تو رسول اللہ ﷺ کچھ دیر خاموش رہے، حتیٰ کہ ہم نے چاہا کہ یہ شخص یہ سوال نہ کرتا کہ اتنے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم مجھ پر صلاۃ بھیجو تو اس طرح کہو۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے صلاۃ کے ان الفاظ کی تعلیم دی جو اوپر حدیث میں مذکور ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے حکم ''صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا'' سے اور رسول اللہ ﷺ کی اس پر عمل کے لیے تشہد میں سلام اور صلاۃ کے الفاظ کی بہ نفس نفیس تعلیم سے ظاہر ہے کہ کم از کم نماز میں یہ صلاۃ و سلام پڑھنا ضروری ہے۔ بعض حضرات کی اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ صلاۃ و سلام زندگی میں صرف ایک دفعہ فرض ہے۔ بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ کلمۂ شہادت بھی زندگی میں صرف ایک دفعہ قبولِ اسلام کے وقت پڑھنا فرض ہے۔ حالانکہ صلاۃ کے علاوہ کلمہ شہادت پڑھنے کا حکم بھی ہر تشہد میں، اذان کا جواب دینے میں اور دوسرے کئی مقامات پر آیا ہے۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ زندگی میں صرف ایک دفعہ کلمہ اور درود پڑھنا فرض ہونے پر امت کے اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ انھیں خوب معلوم ہے کہ کتنے جلیل القدر ائمہ نے نماز میں درود و سلام کو فرض تسلیم کیا ہے، پھر بھی اپنے غلط دعویٔ اجماع پر اصرار کرتے چلے جاتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ایسے کئی مواقع مذکور ہیں جہاں درود پڑھنے کا حکم ہے۔

④ بہت سی احادیث میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر آنے پر صلاۃ بھیجنے کی تاکید آئی ہے۔ علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْبَخِيْلُ الَّذِيْ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ )) [ ترمذي، الدعوات، باب رغم أنف رجل ذكرت عنده...... : ٣٥٤٦ ] ''بخیل وہ ہے جس کے پاس میرا ذکر کیا جائے تو وہ مجھ پر صلاۃ نہ پڑھے۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ وَ رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ دَخَلَ

عَلَيْهِ رَمَضَانُ ثُمَّ انْسَلَخَ قَبْلَ أَنْ يُغْفَرَ لَهُ وَ رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ أَدْرَكَ عِنْدَهُ أَبَوَاهُ الْكِبَرَ فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ ›› [ ترمذي، الدعوات، باب رغم أنف رجل ذكرت عنده...... : ٣٥٤٥، وقال الألباني حسن صحيح ] ’’اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا جائے تو وہ مجھ پر صلاۃ نہ بھیجے اور اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس پر ماہ رمضان آئے، پھر وہ اس کی بخشش ہونے سے پہلے گزر جائے اور اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے والدین اس کے پاس بڑھاپے کو پائیں پھر وہ اسے جنت میں داخل نہ کروائیں۔‘‘ ان احادیث کی رو سے رسول اللہ ﷺ کے ذکر پر صلاۃ پڑھنا لازم ہے، اگرچہ آپ کا نام آنے پر ہر مرتبہ صلاۃ پڑھنی چاہیے اور محدثین کا یہی قول ہے تاہم کسی مجلس میں آپ کا نام آنے پر اگر ایک مرتبہ صلاۃ پڑھ لے تو امید ہے کہ صلاۃ نہ پڑھنے کی وعید سے بچ جائے گا۔ جیسا کہ امام ترمذی نے بعض اہلِ علم سے نقل فرمایا ہے، کیونکہ حدیث کے الفاظ میں اس کی گنجائش موجود ہے اور آگے فائدہ (٦) میں مذکور دوسری حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

5 نماز میں نبی ﷺ پر جن الفاظ میں صلاۃ پڑھی جاتی ہے نماز کے علاوہ بھی انھی الفاظ میں پڑھی جائے گی، مگر اس کے علاوہ مختصر الفاظ میں بھی پڑھی جا سکتی ہے، جیسا کہ تمام صحابہ کرام جب رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کرتے یا آپ کا نام لیتے تھے تو ”صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ“ کے الفاظ ادا کرتے تھے، جیسا کہ تمام کتب احادیث کی تمام احادیث سے ثابت ہے۔ اگر ہر محدث نے اپنے استاذ سے حتیٰ کہ تابعی نے صحابی سے یہ الفاظ نہ سنے ہوتے تو وہ نقل نہ فرماتے، کیونکہ وہ نقل میں نہایت امین تھے، بلکہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گزرے ہوئے کسی وقت کو یاد کرتے تو یہی مختصر صلاۃ پڑھتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کے مولیٰ عبداللہ نے بیان کیا: ‹‹ أَنَّهُ كَانَ يَسْمَعُ أَسْمَاءَ تَقُوْلُ كُلَّمَا مَرَّتْ بِالْحَجُوْنِ : صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ مُحَمَّدٍ لَقَدْ نَزَلْنَا مَعَهُ هَاهُنَا، وَ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ خِفَافٌ ›› [ بخاري، العمرة، باب متى يحل المعتمر؟ : ١٧٩٦ ] ’’اسماء رضی اللہ عنہا جب بھی حجون کے پاس سے گزرتیں تو یہ کہتیں ”صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ مُحَمَّدٍ“ ہم آپ کے ساتھ یہاں اترے تھے، ان دنوں ہم ہلکی پھلکی تھیں۔‘‘ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے ذکر خیر کے وقت ”صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ“ کے الفاظ پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ سے خطاب کے صیغے کے ساتھ ’’الصلاۃ‘‘ کا لفظ، مثلاً ”اَلصَّلَاةُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!“ رسول اللہ ﷺ سے یا کسی صحابی سے ثابت نہیں، کیونکہ مخلوق کے پاس صلاۃ (رحمت و برکت) ہے ہی نہیں، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ ہی سے اسے نازل کرنے کی دعا کر سکتے ہیں۔

6 نبی ﷺ پر صلاۃ کی فضیلت اور نہ پڑھنے کی وعید میں بہت سی احادیث مروی ہیں، یہاں دو حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

① عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ‹‹ إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا ›› [ مسلم، الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن...... : ٣٨٤ ] ’’جب تم مؤذن کو سنو تو اسی طرح کہو جیسے وہ کہتا ہے، پھر مجھ پر صلاۃ پڑھو، کیونکہ جو مجھ پر ایک بار صلاۃ پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس پر دس دفعہ صلاۃ بھیجتا ہے۔‘‘ ② ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿۵۷﴾

**بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ﴿۵۷﴾**

نے فرمایا: (( مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ يَذْكُرُوا اللّٰهَ فِيهِ وَ لَمْ يُصَلُّوا عَلٰى نَبِيِّهِمْ إِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ تِرَةً فَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُمْ وَ إِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُمْ )) [ ترمذي، الدعوات، باب ما جاء في القوم يجلسون...... : ۳۳۸۰، وقال الألباني صحيح ] ''کوئی قوم کسی مجلس میں نہیں بیٹھی جس میں انھوں نے نہ اللہ کا ذکر کیا اور نہ اپنے نبی پر صلاۃ بھیجی، مگر وہ (مجلس) قیامت کے دن ان کے لیے باعث حسرت ہوگی، پھر اگر اس نے چاہا تو انھیں سزا دے گا اور اگر چاہا تو انھیں بخش دے گا۔''

**آیت 57** ① **إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ......** : قرآن مجید میں وعدہ و وعید اور ترغیب و ترہیب دونوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی عظمت، شان اور ان کے پاس آپ کی مدح و ثنا کے حوالے کے ساتھ ایمان والوں کو آپ کی مدح و ثنا اور آپ پر صلاۃ و سلام کا حکم دینے کے ساتھ ہی ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو مدح و ثنا کے بجائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ایذا دیتے ہیں۔ فرمایا ان پر اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مراد ان لوگوں سے منافقین ہیں، جنھوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، مگر رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ کسی مومن سے اس بات کا تصور ہی نہیں ہوسکتا کہ وہ جان بوجھ کر آپ ﷺ کو ایذا دے۔

② اللہ تعالیٰ کو ایذا دینے سے مراد اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اس کی شان میں گستاخی کرنا اور ان کاموں کا ارتکاب ہے جو اس نے حرام قرار دیے ہیں، مثلاً یہود کا کہنا: ﴿ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ﴾ [ المائدة : ٦٤ ]، نصاریٰ کا کہنا: ﴿ الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ [ التوبة : ۳۰ ] اور مشرکین کا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں اور بتوں کو اور اللہ کی مخلوق کو اس کا شریک قرار دینا ہے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا أَحَدٌ أَصْبَرُ عَلٰى أَذًى سَمِعَهُ مِنَ اللّٰهِ، يَدَّعُونَ لَهُ الْوَلَدَ، ثُمَّ يُعَافِيهِمْ وَ يَرْزُقُهُمْ )) [ بخاري، التوحيد، باب قول اللّٰه تعالى : ﴿ إن اللّٰه هو الرزاق...... ﴾ : ۷۳۷۸ ] ''اللہ تعالیٰ سے زیادہ تکلیف دہ بات سن کر صبر کرنے والا کوئی نہیں، لوگ اس کے لیے اولاد قرار دیتے ہیں، پھر بھی وہ انھیں عافیت دیتا ہے اور رزق دیتا ہے۔'' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ عزوجل نے فرمایا: (( يُؤْذِينِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَ أَنَا الدَّهْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ )) [ مسلم، الألفاظ من الأدب وغيرها، باب النهي عن سب الدهر : ۲۲۴۶/۲ ] ''ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے، (اس طرح کہ) وہ زمانے کو گالی دیتا ہے، حالانکہ زمانہ تو میں ہوں، رات دن کو میں بدلتا ہوں۔''

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کو اور اہلِ ایمان کو ایذا بھی اللہ تعالیٰ کو ایذا ہے، جیسا کہ کعب بن اشرف کے رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کی ہجو کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ لِكَعْبِ بْنِ الْأَشْرَفِ؟ فَإِنَّهُ قَدْ آذَى اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ ))

وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۸

اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف دیتے ہیں، بغیر کسی گناہ کے جو انھوں نے کمایا ہو تو یقیناً انھوں نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۵۸

[ بخاري، الرهن، باب رهن السلاح : ۲۵۱۰ ] ''کعب بن اشرف (کے قتل) کے لیے کون تیار ہے؟ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دی ہے۔''

3 رسول اللہ ﷺ کو ایذا سے مراد کسی بھی طرح کی ایذا ہے، جسمانی ہو یا روحانی، آپ کو جھٹلانا ہو یا مخالفت کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کو ہر طرح کی تکلیف پہنچائی گئی، انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَقَدْ أُخِفْتُ فِي اللّٰهِ وَ مَا يُخَافُ أَحَدٌ وَ لَقَدْ أُوْذِيْتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يُؤْذٰی أَحَدٌ )) [ ترمذي، صفة القيامة والرقائق والورع، باب : ۲۴۷۲ ] ''مجھے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ڈرایا گیا اتنا کہ کسی کو اتنا نہیں ڈرایا جاتا اور مجھے اللہ کی خاطر ایذا دی گئی اتنی کہ کسی کو اتنی نہیں دی جاتی۔'' ان ایذاؤں میں مکہ مکرمہ میں شاعر، کاہن، ساحر کہنا، مذاق اڑانا، سجدے کی حالت میں اونٹنی کی اوجھڑی اور آلائش لا کر اوپر ڈال دینا، چادر کے ساتھ گلا گھونٹ دینا، شعب ابی طالب میں تین سال محصور رکھنا، اہلِ طائف کا زبانی بدسلوکی کے علاوہ سنگ باری کرنا وغیرہ شامل ہیں اور مدینہ میں منافقوں کی بدزبانی اور طعنہ زنی بھی، مثلاً ''لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ'' اور ''وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ'' جیسی باتیں آپ کے لیے شدید ایذا کا باعث تھیں۔ پچھلی آیات میں آپ ﷺ کو ایذا دینے والی بعض ایسی چیزوں سے بھی منع کیا گیا ہے جن کا ایذا ہونا عام طور پر معلوم نہیں تھا، خصوصاً آیت (۵۳) میں بیان کردہ چیزیں۔

4 رسول اللہ ﷺ کی ایذا میں آپ کی تکذیب اور مخالفت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات پر طعن و تشنیع کی جائے، یا آپ کے پیاروں کے متعلق بدزبانی کی جائے۔

آیت 58 1 وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا...... : یعنی انھیں بدنام کرنے کے لیے ان کی طرف ایسے کاموں کی نسبت کرتے ہیں جو انھوں نے کیے ہی نہیں۔ یہ بہتان ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسول! غیبت کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ )) ''تمھارا اپنے بھائی کا ذکر اس چیز کے ساتھ کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔'' کہا گیا: ''یہ بتائیں اگر میرے بھائی میں وہ چیز موجود ہو جو میں کہہ رہا ہوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( فَإِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ وَ إِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهُ )) [ أبوداوٗد، الأدب، باب في الغيبة : ۴۸۷۴، وقال الألباني صحيح ] ''اگر اس میں وہ چیز موجود ہے جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ چیز نہیں تو تم نے اس پر بہتان باندھا۔'' رسول اللہ ﷺ بیعت لیتے وقت شرک، چوری، زنا اور قتل نہ کرنے کے ساتھ بہتان نہ باندھنے کا بھی عہد لیتے تھے۔ دیکھیے سورۂ ممتحنہ (۱۲)۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ اپنے آپ پر

سعید بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ مِنْ أَرْبَى الرِّبَا الْاِسْتِطَالَةَ فِيْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَيْرِ حَقٍّ )) [ أبوداوٗد، الأدب، باب في الغيبة : ٤٨٧٦، وقال الألباني صحيح ] ''سود کی سب سے بڑی قسموں میں سے ایک کسی مسلمان کی عزت پر دست درازی یا زبان درازی ہے۔'' ابن کثیر نے فرمایا: ''آیت: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ...... ﴾ اس وعید میں سب سے پہلے تو کفار داخل ہیں، پھر رافضی شیعہ جو صحابہ کے نقص بیان کرتے اور ان کے ذمے وہ عیب لگاتے ہیں جن سے انھیں اللہ تعالیٰ نے بری قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جو تعریف فرمائی یہ صاف اس کے الٹ کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کی تعریف کی اور ان کے متعلق بتایا کہ وہ ان سے راضی ہو گیا اور یہ جاہل اور غبی انھیں برا بھلا کہتے، ان کے نقص نکالتے اور ان کے ذمے وہ چیزیں لگاتے ہیں جو حقیقت میں انھوں نے کبھی کی ہی نہیں، یہ الٹے دلوں والے ہیں کہ جو لوگ تعریف کے لائق ہیں ان کی مذمت کرتے ہیں اور جو مذمت کے لائق ہیں ان کی تعریف کرتے ہیں۔'' (ابن کثیر)

2 قاسمی نے فرمایا: ''اکلیل میں ہے کہ اس آیت سے مسلمان کو ایذا دینا حرام ثابت ہوا۔ ہاں کسی شرعی وجہ سے ہو تو الگ بات ہے، جیسے کسی گناہ کی سزا اور اس میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو مسلمان کو ایذا کی وجہ سے حرام کی گئی ہیں، مثلاً دوسرے کی بیع پر بیع یا اس کے خطبہ (منگنی) پر خطبہ اور امام شافعی نے صراحت فرمائی کہ کسی شخص کے آگے سے کھانا جب اسے اس سے تکلیف ہوتی ہو، حرام ہے۔''

**آیت 59** 1 **يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ ......** : مسلمانوں کو ایذا دینے والوں کے لیے وعید کے بیان کے بعد مسلم عورتوں کو ایذا سے بچنے کے لیے پردے کی تاکید فرمائی۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ایک سے زیادہ تھیں۔ بعض لوگ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دوسری بیٹیوں کو آپ کی بیٹیاں تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے کہنے کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں سے مراد امت کی عورتیں ہیں، مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں اور آپ کی بیٹیوں کے بعد مومنوں کی عورتوں کا الگ ذکر فرمایا ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں مذکور ہیں، زینب، ام کلثوم، رقیہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہن۔ "**نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ**" میں مومنوں کی بیویوں کے علاوہ ان سے تعلق رکھنے والی تمام عورتیں، مثلاً ان کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بھتیجیاں اور بھانجیاں وغیرہ سب شامل ہیں۔

2 "جَلَابِيْبُ"، "جِلْبَابٌ" کی جمع ہے، بڑی چادر جو جسم کو ڈھانپ لے۔ "**مِنْ**" کا لفظ تبعیض کے لیے ہے، یعنی اپنی چادروں کا کچھ حصہ۔ "**يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ**"، "أَدْنٰى يُدْنِيْ" کا معنی قریب کرنا ہے، "**عَلَيْهِنَّ**" کے لفظ سے اس میں لٹکانے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ عرب کی عورتیں تمام جاہل معاشروں کی طرح سب لوگوں کے سامنے کھلے منہ پھرتی تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾

لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں تو انھیں تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۹﴾

فرمایا: ''اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور ایمان والوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ اپنے آپ پر لٹکا لیا کریں۔'' اس لٹکانے سے مراد کیا ہے؟ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا: " أَمَرَ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا خَرَجْنَ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ فِيْ حَاجَةٍ أَنْ يُّغَطِّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ مِنْ فَوْقِ رُؤُوْسِهِنَّ بِالْجَلَابِيْبِ، وَ يُبْدِيْنَ عَيْنًا وَاحِدَةً " [ طبري : ۲۸۸۸۰ ] ''اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت کے لیے گھر سے نکلیں تو اپنے چہرے کو اپنے سروں کے اوپر سے بڑی چادروں کے ساتھ ڈھانپ لیں اور ایک آنکھ کھلی رکھیں۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (( لَمَّا نَزَلَتْ : ﴿ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ خَرَجَ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ كَأَنَّ عَلٰى رُءُوْسِهِنَّ الْغِرْبَانَ مِنَ الْأَكْسِيَةِ )) [ أبو داوٗد، اللباس، باب في قول اللّٰه تعالٰی: ﴿ يدنين عليهن من جلا بيبهن ﴾ : ۴۱۰۱، وقال الألباني صحيح ] ''جب آیت ''يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ'' نازل ہوئی تو انصار کی عورتیں اس طرح نکلیں جیسے ان کے سروں پر (سیاہ) چادروں کی وجہ سے کوے ہوں۔''

3 ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ : یہاں ایک سوال ہے کہ اگر اپنے آپ پر چادروں کا کچھ حصہ اس طرح لٹکایا جائے کہ صرف ایک آنکھ کھلی رہے، چہرہ نظر ہی نہ آئے تو اس طرح تو عورت کی پہچان ہو ہی نہیں سکتی، پھر یہ فرمانے کا کیا مطلب ہے کہ ''یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں تو انھیں تکلیف نہ پہنچائی جائے۔'' جواب اس کا یہ ہے کہ پہچانی جائیں سے یہ مراد نہیں کہ یہ فلاں عورت ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ پردہ کرنے کی وجہ سے ان کی پہچان ہو جائے کہ یہ شریف اور باحیا عورتیں ہیں، پھر کوئی انھیں چھیڑنے کی جراَت نہیں کرے گا، نہ کسی کے دل میں انھیں اپنی طرف مائل کرنے کا لالچ پیدا ہو سکے گا۔ اس کے برعکس بے پردہ عورت کی کیا پہچان ہو سکتی ہے کہ وہ شریف ہے یا بازار میں پیش ہونے والا سامان، جسے کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پردہ اتارنے کے بعد اسے ایذا سے محفوظ رہنے کے بجائے فاسق و فاجر لوگوں کی چھیڑ چھاڑ، زبردستی اور بعض اوقات اغوا کا منتظر رہنا چاہیے۔

4 بعض لوگ کہتے ہیں کہ چہرے کا پردہ نہیں، مگر یہ آیت ان کا رد کرتی ہے، اس کے علاوہ سورۂ نور کی آیت (۳۱ اور ۶۰) سے اور سورۂ احزاب کی آیت (۵۳ اور ۵۵) سے بھی واضح طور پر پردے کا حکم ثابت ہو رہا ہے۔ زیر تفسیر آیت کے ساتھ ایک مرتبہ ان آیات کا ترجمہ و تفسیر بھی دیکھ لیں۔ واقعۂ افک میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا کہنا کہ صفوان نے مجھے پردے کی آیات اترنے سے پہلے دیکھا تھا، بھی چہرے کے پردے کی واضح دلیل ہے۔

5 وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا : ''غَفُوْرًا'' پردہ ڈالنے والا، ''رَحِيْمًا'' بے حد مہربان۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کے

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٠﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿٦١﴾

یقیناً اگر یہ منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں جھوٹی خبریں اڑانے والے لوگ باز نہ آئے تو ہم تجھے ضرور ہی ان پر مسلط کر دیں گے، پھر وہ اس میں تیرے پڑوس میں نہیں رہیں گے مگر کم ﴿٦٠﴾ اس حال میں کہ لعنت کیے ہوئے ہوں گے، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے، بری طرح ٹکڑے کیا جانا ﴿٦١﴾

لیے پردے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ اس کی صفت مغفرت و رحمت ہے۔ وہ تم پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور تم پر رحم کرنا چاہتا ہے اور اس کے حکم کی تعمیل ہی سے تم اس کی پردہ پوشی اور رحمت کے حق دار بنو گے، اگر تم نے اس کی اطاعت نہ کی تو اپنی کوتاہیوں پر اس کی پردہ پوشی کی اور رحمت کی امید نہ رکھو۔

**آیت 60** **لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ**...... : "**لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ**" "أَغْرٰى يُغْرِيْ" کا معنی ہے ابھارنا، اکسانا، بھڑکا دینا، مسلط کر دینا۔ گزشتہ اور زیر تفسیر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ سے بعض منافقین اور دل میں فسق و فجور کا روگ رکھنے والے لوگ راستے میں عورتوں کو چھیڑتے تھے اور جھوٹی خبریں پھیلا کر مسلمانوں کو پریشان کرتے تھے، جیسا کہ انھوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کے معاملے میں کیا۔ ان آیات میں پہلے تو عورتوں کو پردے کا حکم دیا، تاکہ ایسے بدطینت لوگوں کو دست درازی کی جرأت نہ ہو سکے۔ پھر اس آیت میں دھمکی دی کہ اگر یہ منافق لوگ اور جن کے دلوں میں بدکاری کی بیماری ہے اس چھیڑ چھاڑ اور دست درازی سے اور افواہ بازی سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کا قلع قمع کرنے کے لیے ان پر مسلط کر دیں گے، پھر یہ لوگ مدینہ میں آپ کے ساتھ کم ہی رہ سکیں گے، پھر یا تو انھیں جلاوطن کر دیا جائے گا، یا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ پوشیدہ زنا اور دوسرے گناہ معاشرے کے لیے اتنے نقصان دہ نہیں، جس قدر دیدہ دلیری سے راہ چلتی خواتین کو چھیڑنا اور ان پر دست درازی کی کوشش کرنا، یا جرأت اور دلیری کے ساتھ علانیہ برائی کا ارتکاب نقصان دہ ہے۔ اس لیے اس کی روک تھام کے لیے نہایت سخت دھمکی دی۔

**آیت 61** **مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا** : یعنی ایسے لوگ ملعون ہیں، جہاں پائے جائیں گے انھیں گرفتار کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ان آیات میں مذکورہ احکام وقتی اور عارضی نہیں، بلکہ قرآن مجید کے دوسرے احکام کی طرح قیامت تک کے لیے ہیں۔ اب بھی حکومت پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں کا یہی علاج کرے، جو لوگ بھرے بازار سے لڑکیاں اٹھا لیں، لڑکے اٹھا کر ان سے قوم لوط کا عمل کریں، پورے معاشرے کے سامنے نکاح کے بغیر بدکار مرد عورت اکٹھے رہ کر اللہ کی حدود کو للکارتے رہیں۔ ان کا علاج یہی ہے کہ انھیں گرفتار کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے، تاکہ دوبارہ کسی کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہو۔ اغوا اور ایسے دوسرے معاملات سادہ زنا کے کیس نہیں ہیں، بلکہ زنا کے علاوہ یہ فساد فی الارض

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾

**اللہ کے طریقے کی طرح ان لوگوں میں جو پہلے گزرے اور تو اللہ کے طریقے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائے گا ﴿۶۲﴾ لوگ تجھ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں، تو کہہ اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور تجھے کیا چیز معلوم کرواتی ہے، شاید قیامت قریب ہو ﴿۶۳﴾**

---

کے تحت بھی آتے ہیں، جن کی سزا ایسے لوگوں کا صفایا ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( لَقِيْتُ عَمِّيْ وَ مَعَهُ رَايَةٌ فَقُلْتُ لَهُ أَيْنَ تُرِيْدُ؟ قَالَ بَعَثَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى رَجُلٍ نَكَحَ امْرَأَةَ أَبِيْهِ فَأَمَرَنِيْ أَنْ أَضْرِبَ عُنُقَهُ وَ آخُذَ مَالَهُ )) [ أبو داوٗد، الحدود، باب في الرجل يزني بحريمه : ۴۴۵۷، وقال الألباني صحيح ] ''میں اپنے چچا سے ملا، اس کے پاس جھنڈا تھا، میں نے اس سے کہا: ''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' اس نے کہا: ''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی طرف بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا ہے کہ میں اس کی گردن اتار دوں اور اس کا مال لے لوں۔'' مزید دیکھیے سورۂ مائدہ (۳۳)۔

**آیت 62** **سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ......** : یعنی معاشرے کو پاک رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ عورتوں کو چھیڑنے والے اور خوف و ہراس پھیلانے والوں کو گرفتار کیا جاتا تھا اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا تھا۔ یہ سزا کوئی نئی نہیں، بلکہ پہلی تمام آسمانی شریعتوں میں ہمیشہ یہی سزا دی جاتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور نہ آئندہ اس میں تبدیلی ہوگی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''تورات میں بھی یہ نقل ہے کہ مفسدوں کو اپنے بیچ سے باہر کر دو۔'' (موضح)

**آیت 63** ① **يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ** : قرطبی نے فرمایا: ''ان سوال کرنے والوں سے مراد وہی پیغمبر کو ایذا دینے والے، دل کے بیمار، منافق اور جھوٹی خبریں اڑانے والے لوگ ہیں، جن کا پیچھے ذکر ہوا، جب ان کو عذاب مہین سے ڈرایا جاتا تو وہ کہتے ''اَلسَّاعَةُ'' عذاب کی وہ گھڑی، یعنی قیامت کب ہے؟ مقصد ان کا پوچھنا نہیں تھا، بلکہ اس کا انکار اور مذاق اڑانا اور پیغمبر کو لاجواب کرنا تھا کہ انھیں اتنا بھی علم نہیں کہ قیامت کب ہوگی۔'' دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۷)، طٰہٰ (۱۵)، نمل (۶۶)، نازعات (۴۲ تا ۴۴) اور سورۂ ملک (۲۵ تا ۲۷) وغیرہ۔

② **قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ** : یعنی اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کا علم دوسرے تمام لوگوں کی طرح مجھ سے بھی مخفی رکھا ہے تو اس سے میرے صدق پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور نہ نبی ہونے کی یہ شرط ہے کہ وہ غیب دان ہو اور ان باتوں کو بھی جانتا ہو جو اللہ تعالیٰ نے اسے نہیں بتائیں۔

③ **وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا** : یعنی اگرچہ اس کے متعین وقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر بھی یہ

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾

**بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے بھڑکتی آگ تیار کی ہے ﴿۶۴﴾ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہمیشہ، نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار ﴿۶۵﴾**

جان لو کہ وہ بہت نزدیک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ [ القمر : ۱ ] ”قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔“ اور فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۱ ] ”لوگوں کے لیے ان کا حساب بہت قریب آ گیا اور وہ بڑی غفلت میں منہ موڑنے والے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [ النحل : ۱ ] ”اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔“ اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ بِإِصْبَعَيْهِ هٰكَذَا بِالْوُسْطٰى وَالَّتِيْ تَلِي الْإِبْهَامَ بُعِثْتُ وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ )) [ بخاري، التفسير، باب سورة : ﴿ والنازعات ﴾ : ۴۹۳۶ ] ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ نے اپنی دو انگلیوں درمیانی اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ”مجھے اور قیامت کو اس طرح (ساتھ ساتھ) بھیجا گیا ہے۔“

④ یہاں ایک سوال ہے کہ ”السَّاعَةَ“ مؤنث کی خبر ”قَرِيْبًا“ مذکر کیوں ہے؟ جواب کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف کی آیت (۵۶): ﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 64** **اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ ......** : مفردات راغب میں ہے ”لَعَنَ“ کا معنی ناراض ہو کر دفع دور کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کی لعنت سے مراد آخرت میں سزا دینا ہے اور دنیا میں اپنی رحمت اور توفیق سے محروم رکھنا ہے اور انسان کی لعنت کسی کے لیے بددعا کرنا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینے والے یہ کافر، خواہ علانیہ منکر ہیں یا منافق، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی رحمت اور توفیق سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

**آیت 65** ① **خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا** : پھر یہ نہیں کہ کچھ دیر رہ کر اس سے نکل آئیں گے کہ اس خیال سے بھی تکلیف کچھ کم ہو جاتی ہے، بلکہ ”خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ“ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہ نہ سمجھو کہ ”خٰلِدِيْنَ“ کا لفظ صرف لمبی مدت کے لیے ہے، بلکہ ”اَبَدًا“ یعنی یہ ہمیشگی ابدی ہے، کبھی اس سے نکلنے والے نہیں۔

② **لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا** : عذاب کی ہمیشگی کی مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ عذاب میں مبتلا آدمی کو یا تو کوئی دوست سفارش کر کے چھڑوا سکتا ہے، یا مددگار جو زبردستی چھڑوا لے، مگر کفار کو وہاں کوئی دوست ملے گا نہ مددگار۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۸)۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾

**جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے، کہیں گے اے کاش کہ ہم نے اللہ کا کہنا مانا ہوتا اور ہم نے رسول کا کہنا مانا ہوتا ﴿۶۶﴾ اور کہیں گے اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انھوں نے ہمیں اصل راہ سے گمراہ کر دیا ﴿۶۷﴾**

---

آیت 66 ① **يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ** : یہ بیان کرنے کے بعد کہ کوئی سفارش کرنے والا یا مددگار ان سے عذاب نہیں ہٹا سکے گا، اب بیان فرمایا کہ ان کے جسم کے اعضا میں سے کوئی عضو بھی دوسرے عضو کو آگ سے نہیں بچا سکے گا۔ دنیا میں چہرے پر آنے والی کسی ضرب یا آگ کی لپٹ سے ہاتھ ڈھال بن جاتا ہے، یا آدمی سر جھکا لیتا ہے، مگر وہاں چہرے اور آگ کے درمیان کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکے گی۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۳۹)، زمر (۲۴) اور سورۂ قمر (۴۸) پھر جب چہرے کا یہ حال ہوگا، جو جسم کا سب سے باشرف حصہ ہے تو دوسرے اعضا کا کیا حال ہوگا!؟

② آگ میں چہرے الٹ پلٹ کیے جانے کے ذکر سے مقصود ان کی بری حالت کی منظر کشی ہے کہ اگرچہ چہروں کو چاروں طرف سے آگ نے گھیر رکھا ہوگا، اس کے باوجود انھیں الٹ پلٹ بھی کیا جائے گا، تاکہ نئی سے نئی آگ کے سامنے آتے رہیں اور ایک جگہ سے اگر تکلیف میں کوئی کمی ممکن ہو تو وہ بھی نہ ہو سکے۔ (دیکھیے توبہ: ۳۵) نئے سے نئے عذاب کے لیے چہروں کے الٹ پلٹ کیے جانے کے ساتھ چمڑوں کی مسلسل تبدیلی کا عمل بھی جاری رہے گا۔ دیکھیے سورۂ نساء (۵۶) [ اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ ]

③ **يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا** : "لَيْتَ" (کاش) کا لفظ تمنّی کے لیے ہوتا ہے، یعنی ایسی چیز کی خواہش جو ممکن نہ ہو۔ ابن کثیر نے فرمایا، اس حال میں جب کہ ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جا رہے ہوں گے، وہ تمنا کریں گے کہ کاش! دنیا میں انھوں نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور رسول کی اطاعت کی ہوتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے میدانِ حشر میں ان کا حال بیان فرمایا: ﴿ **وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا** ﴾ [ الفرقان : ۲۷ تا ۲۹ ] "اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا، کہے گا اے کاش! میں رسول کے ساتھ کچھ راستہ اختیار کرتا۔ ہائے میری بربادی! کاش کہ میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا۔ بے شک اس نے تو مجھے نصیحت سے گمراہ کر دیا، اس کے بعد کہ میرے پاس آئی اور شیطان ہمیشہ انسان کو چھوڑ جانے والا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ **رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ** ﴾ [ الحجر : ۲ ] "بہت بار چاہیں گے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کاش! وہ کسی طرح کے مسلم ہوتے۔"

آیت 67 **وَ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا** ...... : "سَادَةٌ" "سَيِّدٌ" کی جمع ہے اور "كُبَرَاءُ" "كَبِيْرٌ" کی

ربَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا

**اے ہمارے رب! انھیں دگنا عذاب دے اور ان پر لعنت کر، بہت بڑی لعنت ﴿۶۸﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو!**

جمع ہے۔ ابن کثیر میں ہے: ''طاؤس نے فرمایا ''سَادَتَنَا'' سے مراد سردار اور چودھری ہیں اور ''كُبَرَآءَنَا'' سے مراد عالم ہیں۔'' قرآن مجید میں لوگوں کی گمراہی کا باعث بننے والے طبقے تین بتائے گئے ہیں، مستکبرین (چودھری، سردار)، احبار (علماء) اور رہبان (درویش)۔ عبداللہ بن مبارک نے فرمایا ؎

وَ هَلْ أَفْسَدَ الدِّيْنَ إِلَّا الْمُلُوْكُ وَ أَحْبَارُ سَوْءٍ وَ رُهْبَانُهَا

''دین کو بادشاہوں، برے علماء اور درویشوں ہی نے خراب کیا ہے۔''

یعنی جہنمی کہیں گے کہ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بجائے اپنے سرداروں، عالموں اور درویشوں کی اطاعت کی اور سمجھتے رہے کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ انھوں نے ہمیں سیدھے راستے پر لے جانے کے بجائے اصل راستے سے گمراہ کر دیا۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ جو شخص قرآن مجید کی آیت یا رسول اللہ ﷺ کی حدیث معلوم ہونے کے باوجود اس کے خلاف اپنے سادات و اکابر، یعنی کسی بادشاہ، عالم یا پیر کی اطاعت کرتا ہے، وہ قیامت کے دن یہی تمنا کرے گا جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۵ تا ۱۶۷)۔

**آیت 68** **رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ......** : اپنی لاحاصل تمناؤں اور حسرتوں کے اظہار کے ساتھ ہی دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اپنے سادات و اکابر کو دگنا عذاب دینے کی دعا کریں گے، مگر اس سے بھی انھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۳۸، ۳۹) اور سورۂ ص (۵۵ تا ۶۱)۔

**آیت 68** ① **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى** : اوپر بتایا کہ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دینے والوں پر لعنت اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ سورت کے شروع ہی سے منافقین کے رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے کا ذکر چلا آ رہا ہے، جو کبھی جنگ احزاب میں یہ کہنے کی صورت میں تھی کہ اللہ اور اس کے رسول نے محض دھوکا دینے کے لیے ہم سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا تھا، کبھی میدان چھوڑ کر گھروں کو جانے کی اجازت مانگنے کی صورت میں اور کبھی یہ کہہ کر کہ اب مسلمانوں کی مدینہ میں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ اس کے علاوہ ان کی یہود اور دوسرے کفار کے ساتھ دوستی اور ان کی فتح کی خواہش رسول اللہ ﷺ کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ آپ کی ذاتی زندگی کے متعلق تکلیف دہ باتیں اس پر مزید تھیں۔ مثلاً آپ کی چار سے زائد بیویوں پر اعتراض، اپنے متبنّٰی زید رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح وغیرہ۔ سورت کے آخر میں پھر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو رسول اللہ ﷺ کی ایذا سے یہ کہہ کر منع فرما رہے ہیں کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دی۔

② موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دینے والوں کی باتوں کا قرآن میں متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے تمام بنی اسرائیل ایسے نہیں

كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ؕ﴿۶۹﴾

**ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو تکلیف پہنچائی تو اللہ نے اسے اس سے پاک ثابت کر دیا جو انھوں نے کہا تھا اور وہ اللہ کے ہاں بہت مرتبے والا تھا ﴿۶۹﴾**

تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی طرح ہونے سے منع فرمایا جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دی۔ ان لوگوں کا یہ رویہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے سخت تکلیف دہ تھا کہ عموماً وہ حکم ماننے سے صاف انکار کر دیتے تھے اور اس کے لیے لفظ بھی ”لَنْ“ (ہرگز نہیں) کا استعمال کرتے جو نفی کی تاکید کے لیے آتا ہے، مثلاً: ﴿لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ [ البقرة : ۶۱ ]، ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [ البقرة : ۵۵ ] اور: ﴿لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا﴾ [ المائدة : ۲۴ ] ہارون علیہ السلام کے بچھڑے کی عبادت سے منع کرنے پر کہنے لگے: ﴿لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى﴾ [ طٰہٰ : ۹۱ ] ”ہم اسی پر مجاور بن کر بیٹھے رہیں گے، یہاں تک کہ موسیٰ ہماری طرف واپس آئے۔“ کبھی حکم کی تعمیل میں ٹال مٹول سے کام لیتے تھے، جیسا کہ گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو پہلے ”اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا“ کہا، پھر گائے کی کیفیت کے متعلق سوال پر سوال داغتے رہے۔ ان کا یہ رویہ ان کے اس محسن کے ساتھ تھا جس نے ان کی خاطر لمبی مدت تک فرعون سے تکلیفیں جھیلیں، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے انھیں فرعون کی غلامی سے نجات اور آزادی کی نعمت عطا فرمائی۔ جس کی دعا سے انھیں من و سلویٰ ملتا تھا، بادلوں کا سایہ میسر تھا اور ان کے لیے پانی کے بارہ چشمے جاری تھے۔

③ **فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا** : ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ایذا موسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی پر الزام اور دھبے لگانے تک پہنچ گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ان کے تمام الزامات سے پاک ہونا روز روشن کی طرح ظاہر فرما دیا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت مرتبے والے تھے۔ ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی داغ لگنے دیتا۔

④ بنی اسرائیل کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کی ایذا کا ایک نمونہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”موسیٰ علیہ السلام بہت حیا والے، بہت پردے والے تھے۔ شدید حیا کی وجہ سے ان کی جلد کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بنی اسرائیل کے ایذا دینے والوں میں سے بعض نے انھیں ایذا دی اور کہنے لگے: ”موسیٰ اپنا جسم اتنا سخت چھپاتے ہیں تو ضرور اس میں کوئی عیب ہے، یا برص ہے، یا خصیہ پھولا ہوا ہے، یا کوئی اور بیماری ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا ان چیزوں سے پاک ہونا ظاہر کرے، جو وہ ان کے متعلق کہتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اکیلے ہوئے تو اپنے کپڑے پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے، جب فارغ ہوئے تو کپڑے لینے کے لیے بڑھے تو پتھر ان کے کپڑے لے کر بھاگ اٹھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی لی اور پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ وہ پتھر بنی اسرائیل کی ایک مجلس کے پاس جا پہنچا اور انھوں نے انھیں ننگا دیکھ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوق میں سب سے خوب صورت اور ان عیبوں سے بالکل بری تھے جو وہ کہتے تھے۔ الغرض! پتھر رک گیا، تو موسیٰ علیہ السلام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۟ۙ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور بالکل سیدھی بات کہو۔ (۷۰)

نے اپنے کپڑے لے کر پہن لیے اور پتھر کو اپنی لاٹھی سے مارنے لگے۔ اللہ کی قسم! پتھر پر ان کے مارنے کی وجہ سے لاٹھی کے تین یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے۔ یہ مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴾ [ الأحزاب : ٦٩ ] [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب : ٣٤٠٤ ]

5 رسول اللہ ﷺ کو بعض اوقات کسی بظاہر مسلمان کی طرف سے ایذا دی گئی تو آپ ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو دی جانے والی ایذا اور اس پر ان کے صبر کا ذکر فرمایا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے کچھ مال تقسیم کیا تو ایک آدمی کہنے لگا: ''اس تقسیم میں اللہ کی رضا مقصود نہیں رکھی گئی۔'' میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو یہ بات بتائی تو آپ غصے میں آ گئے، یہاں تک کہ میں نے آپ کے چہرے میں غصے کو دیکھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: (( يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوْسٰى قَدْ أُوْذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب : ٣٤٠٥ ] ''اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم فرمائے، انھیں اس سے زیادہ ایذا دی گئی تو انھوں نے صبر کیا۔''

6 بعض تفاسیر میں اس ایذا کے ضمن میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام پر ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام لگا دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے بھیجے، جنھوں نے ہارون علیہ السلام کی میت اٹھا کر دکھا دی اور اس میں ایسا کوئی نشان نہیں تھا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی براءت فرما دی۔ مگر یہ قصہ رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں، ظاہر ہے یہ اسرائیلی روایت ہے جسے ہم نہ سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔

**آیت 70** 1 **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا** : ''سَدَّ يَسُدُّ'' (ن) بند کرنا، پُر کرنا اور ''سَدَّ يَسَدُّ'' (س، ض) سیدھا ہونا۔ ''**سَدِيْدًا**'' سیدھا، درست۔ ''سَدَّدَ يُسَدِّدُ'' (تفعیل) سیدھا کرنا۔ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( قُلِ اللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ وَسَدِّدْنِيْ وَاذْكُرْ بِالْهُدٰى هِدَايَتَكَ الطَّرِيْقَ وَالسَّدَادِ سَدَادَ السَّهْمِ )) [ مسلم، الذكر والدعاء، باب في الأدعية : ٢٧٢٥ ] ''یوں کہو کہ اے اللہ! مجھے ہدایت دے اور سیدھا کر دے اور ہدایت کی دعا کرتے ہوئے صحیح راستے پر جانے کو دل میں رکھو اور سیدھا کرنے کی دعا کرتے ہوئے تیر کے سیدھا کرنے کو دل میں رکھو۔''

2 گزشتہ آیت میں مسلمانوں کو نبی ﷺ کی ایذا دہی سے منع فرمایا۔ ایذا تبھی ہوتی ہے جب کوئی شخص غلط بات کرے اور الزام لگائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ پر مال کی تقسیم میں ناانصافی کا الزام لگایا گیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اسی وقت غلط بیانی اور الزام تراشی کر سکتا ہے جب وہ اللہ سے نہ ڈرے۔ اس لیے ایذا دہی سے منع کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا اور سیدھی بات کہنے کا حکم دیا۔

يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا

وہ تمھارے لیے تمھارے اعمال درست کر دے گا اور تمھارے لیے تمھارے گناہ بخش دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے تو یقیناً اس نے کامیابی حاصل کر لی، بہت بڑی کامیابی ﴿۷۱﴾ بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر

**آیت 71** ① **يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ** : اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور سیدھی صاف بات کہنے کے دو فائدے بیان فرمائے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال درست کر دے گا اور دوسرا یہ کہ گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ عام طور پر لوگ بگڑے ہوئے کاموں کو درست کرنے کے لیے جھوٹ بولتے اور چالاکی و ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اینچ پیچ اور غلط بیانی کی وجہ سے سننے والے مزید بھڑکتے اور بدگمان ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ کام مزید بگڑتے ہیں اور کبھی درست نہیں ہوتے، مگر جب آدمی اللہ سے ڈرے اور سیدھی صاف بات کہے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ سارے کام درست بھی ہو جائیں گے اور گزشتہ گناہوں کی مغفرت بھی ہو جائے گی۔ کیونکہ سیدھی بات دلوں سے کدورت ختم کرنے اور باہمی صلح صفائی کا باعث بن جاتی ہے اور سیدھا ہو جانے پر اللہ تعالیٰ بھی درگزر فرماتا ہے۔

② رسول اللہ ﷺ نے نکاح اور دوسری حاجات کے موقع پر پڑھے جانے والے جس خطبہ کی تعلیم دی اس میں آپ ﷺ چار آیات پڑھتے تھے، جن میں سے دو یہ ہیں۔ کیونکہ اللہ سے ڈرنا اور سیدھی بات کہنا ہر معاملے میں ضروری ہے، خصوصاً میاں بیوی کے معاملے میں تو اس کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، کیونکہ ان کے درمیان معاملات کا کوئی گواہ نہیں ہوتا، صرف اللہ کا خوف اور سیدھی بات ان کے معاملات کو درست رکھ سکتی ہے اور معمولی سی چالاکی اور غلط بیانی باہمی اعتماد کو ختم کر کے گھر برباد کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔

③ **وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ......** : کیونکہ اصل کامیابی جنت کا حصول اور جہنم سے نجات ہے، جو صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۳، ۱۴) اور آل عمران (۱۸۵)۔

**آیت 72** ① **اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ ......** : کائنات میں اللہ تعالیٰ کے دو قسم کے احکام جاری و ساری ہیں، ایک اس کا حکم "کُنْ" (ہو جا) ہے، جب وہ کسی چیز کو یہ حکم دیتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے، ممکن نہیں کہ وہ اس کے حکم کے مطابق نہ ہو۔ اسے کونی حکم کہتے ہیں۔ دوسرا حکم وہ ہے جس میں اس نے اختیار دے دیا ہے کہ جسے حکم دیا گیا ہے چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ ساتھ ہی تعمیل پر ثواب کا وعدہ اور عمل نہ کرنے پر عذاب کی وعید ہے، اسے شرعی حکم کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ان شرعی احکام و فرائض کا نام "امانت" ہے۔ جن و انس کو چھوڑ کر باقی پوری کائنات اللہ تعالیٰ کے کونی احکام کی پابند ہے۔ ان میں سے کسی کو اللہ کی نافرمانی کا اختیار ہی نہیں۔ نہ وہ نافرمانی کرتے ہیں، نہ کر سکتے ہیں۔ انسان بعض چیزوں میں دوسری

وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾

گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت ظالم، بہت جاہل ہے ﴿۷۲﴾

مخلوقات کی طرح کونی احکام کا پابند ہے، مثلاً اس کا پیدا ہونا، اس کے جسم کے تمام نظام، سانس کی آمد و رفت، دل کی دھڑکن، جوانی، بڑھاپے، صحت، بیماری، زندگی اور موت کے مراحل اس کے اختیار میں نہیں، البتہ بعض چیزوں یعنی شرعی احکام میں اسے اختیار دیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے لیے ثواب یا عذاب رکھا گیا ہے۔ اس آیت میں امانت سے مراد شرعی احکام، یعنی فرائض و محرمات ہیں جو انسان پر عائد کیے گئے ہیں۔

ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی یہی تفسیر فرمائی ہے، چنانچہ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ان کا قول نقل کیا ہے: " اَلْأَمَانَةُ الْفَرَائِضُ ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ ﴾ إِنْ أَدَّوْهَا أَثَابَهُمْ، وَ إِنْ ضَيَّعُوْهَا عَذَّبَهُمْ، فَكَرِهُوْا ذٰلِكَ، وَ أَشْفَقُوْا مِنْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ، وَ لٰكِنْ تَعْظِيمًا لِّدِيْنِ اللّٰهِ أَنْ لَّا يَقُوْمُوْا بِهَا، ثُمَّ عَرَضَهَا عَلٰى آدَمَ، فَقَبِلَهَا بِمَا فِيْهَا، وَ هُوَ قَوْلُهُ : ﴿ وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ غُرًّا بِأَمْرِ اللّٰهِ " [ طبري : ۲۸۹۱۹، ۲۸۹۱۷ ] ''امانت سے مراد فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا کہ اگر وہ انھیں ادا کریں گے تو وہ انھیں ثواب دے گا اور اگر انھوں نے وہ ضائع کیے تو انھیں عذاب دے گا۔ تو انھوں نے اسے ناپسند کیا اور اس سے ڈر گئے، کسی نافرمانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کو بہت بڑا سمجھتے ہوئے کہ وہ اس پر قائم نہیں رہ سکیں گے، پھر ان (فرائض) کو آدم (یعنی انسان) پر پیش کیا تو اس نے ان کو اس (ثواب و عذاب) سمیت قبول کر لیا جو ان میں تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مطلب ہے: ﴿ وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ ''اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بے شک وہ ہمیشہ سے بہت ظالم بہت جاہل ہے۔'' یعنی وہ اللہ کے حکم سے غافل ہے۔''

صحابہ اور تابعین سے جتنی تفسیریں آئی ہیں وہ سب اس میں آ جاتی ہیں، جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، مثلاً ابن کثیر میں ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عورت کو اس کی شرم گاہ کا امانت دار بنایا گا۔'' بعض نے کہا: ''اس سے مراد غسل جنابت ہے۔'' زید بن اسلم نے فرمایا: ''مراد نماز، روزہ اور غسل جنابت ہے۔'' خلاصہ یہ کہ تمام اوامر و نواہی، فرائض و محرمات انسان کے لیے اللہ کی طرف سے امانت ہیں اور یہ امانت اتنی عظیم اور بھاری چیز ہے کہ آسمان و زمین اور پہاڑوں نے اتنی بڑی مخلوقات ہونے کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔

(2) بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بات تمثیلی طور پر بیان کی گئی ہے، یعنی اتنی بڑی مخلوقات میں یہ ذمہ داری اٹھانے کی استعداد نہیں جو انسان میں موجود ہے، ورنہ ایسا نہیں کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمین اور پہاڑ کے سامنے امانت پیش کی ہو اور انھوں نے اسے قبول نہ کیا ہو۔ مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ تاویل کی ضرورت تب ہوتی ہے جب ظاہری معنی مراد لینا ممکن نہ ہو، جب کہ زمین و آسمان اور پہاڑوں میں ادراک اور سمجھ کا ہونا، ان کا اللہ کی تسبیح کرنا، ان کا رونا اور خوش ہونا متعدد آیات و احادیث سے ثابت ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۷۴)، بنی اسرائیل (۴۴)، نور (۴۱)، حشر (۲۱)، نحل (۴۸)، دخان (۲۹)

اور سورۂ حم السجدہ (۲۱)۔

3 شاہ عبدالقادر نے "**ظَلُوْمًا جَهُوْلًا**" کا ترجمہ "بے ترس نادان" کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں: "یعنی اپنی جان پر ترس نہ کھایا۔ امانت کیا؟ پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر، زمین و آسمان میں اپنی خواہش کچھ نہیں، یا ہے تو وہی ہے جس پر قائم ہیں۔ آسمان کی خواہش پھرنا، زمین کی خواہش ٹھہرنا۔ انسان میں خواہش اور ہے اور حکم خلاف اس کے۔ اس پرائی چیز کو برخلاف اپنے جی کے تھامنا بڑا زور چاہتا ہے۔ اس کا انجام یہ کہ منکروں کو قصور پر پکڑنا اور ماننے والوں کا قصور معاف کرنا۔ اب بھی یہی حکم ہے کہ کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کرے تو بدلا ہے اور بے اختیار ضائع ہو تو بدلا نہیں۔" (موضح) شاہ صاحب کے کلام کا آخری حصہ (اس کا انجام یہ......) اگلی آیت "**لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ**" کی تفسیر ہے۔

4 لفظ امانت جس طرح ان فرائض اور اوامر ونواہی پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر عائد ہوئے اور اس نے انھیں قبول کیا، اسی طرح اس صفت پر بھی بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھی ہے، جس کی بدولت وہ ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرتا اور ان فرائض کو ادا کرتا ہے جو حق تعالیٰ نے اس پر عائد کیے ہیں۔ چنانچہ حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حدیثیں بیان کیں، ان میں سے ایک میں نے دیکھ لی ہے اور دوسری کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیان فرمایا: « أَنَّ الْأَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ، ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ الْقُرْآنِ، ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ » "یعنی امانت لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری، پھر انھوں نے اسے قرآن سے سیکھا، پھر انھوں نے سنت سے سیکھا۔" حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کے اٹھائے جانے کے متعلق بتایا، فرمایا: « يَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْأَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهِ، فَيَظَلُّ أَثَرُهَا مِثْلَ أَثَرِ الْوَكْتِ، ثُمَّ يَنَامُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ فَيَبْقٰى أَثَرُهَا مِثْلَ الْمَجْلِ، كَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهُ عَلٰى رِجْلِكَ فَنَفِطَ، فَتَرَاهُ مُنْتَبِرًا، وَ لَيْسَ فِيْهِ شَيْءٌ، فَيُصْبِحُ النَّاسُ يَتَبَايَعُوْنَ فَلَا يَكَادُ أَحَدٌ يُؤَدِّي الْأَمَانَةَ، فَيُقَالُ إِنَّ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ رَجُلًا أَمِيْنًا وَ يُقَالُ لِلرَّجُلِ مَا أَعْقَلَهُ وَ مَا أَظْرَفَهُ وَ مَا أَجْلَدَهُ وَ مَا فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ » [ بخاري، الرقاق، باب رفع الأمانة: ٦٤٩٧ ] "آدمی سوئے گا تو اس کے دل سے امانت اٹھالی جائے گی اور اس کا نشان ہلکے سے داغ کی طرح رہ جائے گا۔ پھر ایک اور دفعہ سوئے گا تو (مزید) اٹھالی جائے گی تو اس کا نشان ایک چھالے کی طرح رہ جائے گا، جیسے تو کوئی انگارا اپنے پاؤں پر لڑھکائے تو ایک چھالا پھول آتا ہے، تم اسے ابھرا ہوا دیکھتے ہو، حالانکہ اس میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حال یہ ہو جائے گا کہ صبح اٹھ کر لوگ خرید و فروخت کریں گے اور قریب نہیں ہوگا کہ کوئی بھی امانت ادا کرے، حتیٰ کہ کہا جائے گا کہ فلاں قبیلے میں ایک امانت دار آدمی ہے اور کہا جائے گا کہ فلاں آدمی کس قدر عقل مند، کس قدر ذہین اور کتنا مضبوط ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان نہیں ہوگا۔"

5 لفظ "امانت" کا ایک اور مفہوم بھی ہے، بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَنْ حَلَفَ بِالْأَمَانَةِ فَلَيْسَ مِنَّا » [ أبو داوٗد، الإيمان و النذور، باب كراهية الحلف بالأمانة: ٣٢٥٣، وقال الألباني صحيح ] "جس نے امانت کی قسم اٹھائی وہ ہم میں سے نہیں۔" اس حدیث میں امانت سے کیا مراد ہے، اکثر شارحین حدیث نے فرمایا کہ آدمی کی طرح اس

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾ ع

**تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور (تاکہ) اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول کرے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۷۳﴾**

کی امانت بھی چونکہ مخلوق ہے اور مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں، اس لیے اس پر یہ سخت حکم لگایا گیا ہے۔ مگر میری دانست میں اس کا مصداق عیسائیوں کی شریعت کے عقائد و احکام پر مشتمل وہ کتاب ہے جو ان کے بادشاہ قسطنطین کے زمانہ میں اس کے حکم سے تین سو اٹھارہ پادریوں نے تصنیف کی تھی اور اس کا نام ''اَلْأَمَانَةُ الْكَبِيْرَةُ'' رکھا تھا۔ جس میں بہت سی حلال چیزوں کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا گیا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''انھوں نے اس کا نام ''اَلْأَمَانَةُ الْكَبِيْرَةُ'' رکھا، حالانکہ درحقیقت وہ ''اَلْخِيَانَةُ الْحَقِيْرَةُ'' ہے۔'' تفسیر ابن کثیر میں اس کی تفصیل سورۂ آل عمران کی آیات (۵۵ تا ۵۸) اور سورۂ روم کی ابتدائی آیات اور کئی اور مقامات کی تفسیر میں موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق کہ ''امت مسلمہ بھی یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چل پڑے گی'' ہماری امت کے بعض بادشاہوں نے بھی اپنے زمانے کے علماء کے ذمے یہ ذمہ داری لگائی کہ وہ شریعت کے احکام کے لیے کتاب تصنیف کریں، مگر ان علماء نے کتاب و سنت کے بجائے اقوال جمع کر کے اسے شریعت کے قوانین قرار دیا اور شاید ہی کوئی اللہ کی حد باقی رہی ہو جسے انھوں نے حیلے بہانے سے ختم نہ کیا ہو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا اس امت پر احسان عظیم ہے کہ آسمانی ہدایت قرآن و سنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس لیے لوگوں کے اقوال کو شریعت اسلام قرار دینے والے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے اور ان شاء اللہ کامیاب ہو بھی نہیں سکیں گے۔ مختصر یہ کہ امانت نامی کتاب، جسے عیسائی مقدس کتاب سمجھتے اور اس کی قسم اٹھاتے تھے، مسلمانوں کو نہایت سختی کے ساتھ اس کی قسم کھانے سے منع کر دیا گیا۔

**آیت 73** لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ ...... : اس آیت میں انسان کے امانت کی ذمہ داری کو اٹھانے کا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ سورت کی ابتدا اس حکم کے ساتھ ہوتی ہے کہ ''اے نبی! اللہ سے ڈر اور کفار و منافقین کی اطاعت مت کر'' پھر سورت کے درمیان میں منافقوں کی خیانتوں کا اور ان کے اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں سے لیے ہوئے تمام عہد توڑنے کا ذکر فرمایا۔ سورت کے آخر میں امانت کی اہمیت اور اس میں خیانت کرنے والے منافق اور مشرک لوگوں کے عذاب اور امانت کا حق ادا کرنے والے مومنوں کا ثواب ذکر فرمایا۔ کچھ تفسیر اس کی پچھلی آیت کے فائدہ (۳) میں شاہ عبدالقادر کے کلام میں گزر چکی ہے۔

سورۃ سبا ۳۴ ۔ ۵۱ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ آیاتہا ۵۴ رکوعاتہا ۶

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِى الۡاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے اور آخرت میں بھی سب تعریف اسی کے لیے ہے اور وہی کمال حکمت والا، ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے ①

آیت 1 ① اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ...... : حمد کا معنی کسی کی خوبی کی وجہ سے تعریف ہے۔ یہ سورت ان پانچ سورتوں میں سے ایک ہے جن کی ابتدا ”اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ“ سے ہوتی ہے اور وہ ہیں سورۂ فاتحہ، انعام، کہف، سبا اور فاطر۔ پانچوں میں سب تعریف اللہ کے لیے ہونے کی الگ الگ دلیل بیان کی گئی ہے، اگرچہ ان سب کا ایک دوسری کے ساتھ بھی تعلق ہے۔ ”اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ“ کہنے میں صرف یہی بات نہیں آتی کہ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ یہ بات بھی آتی ہے کہ تمام خوبیوں کا مالک بھی وہی ہے، کیونکہ خوبی نہ ہو تو تعریف کیسی؟ اور سب تعریف اور تمام خوبیاں اللہ کے لیے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آسمانوں میں جو کچھ ہے، یا زمین میں جو کچھ ہے، مراد پوری کائنات میں جو بھی چیز ہے اس کا مالک وہی ہے۔ اسی نے سب کچھ پیدا کیا، وہی انھیں قائم رکھے ہوئے ہے اور وہی ان کی تدبیر فرما رہا ہے۔ کسی بھی چیز میں اگر کوئی خوبی ہے تو اس کی عطا کردہ، پھر ہر خوبی اور ہر تعریف کا مالک اس کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

② اس آیت کی تفسیر دو طرح ہے، ایک یہ کہ پہلے جملے ”اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ“ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں سب تعریف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ دوسرے جملے ”وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِى الۡاٰخِرَةِ“ میں آخرت میں سب تعریف اس کے لیے ہونے کا ذکر ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلے جملے ”اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ“ سے مراد یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں حمد اللہ کے لیے ہے۔ پھر آخرت میں حمد کا اللہ ہی کے لیے ہونا خاص طور پر دوبارہ ذکر فرمایا، کیونکہ دنیا میں تو بظاہر کسی اور کی بھی تعریف ہو جاتی ہے، مگر آخرت میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی حمد ہوگی اور ہر ایک کی زبان پر ”اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ“ کا کلمہ جاری ہوگا۔ دیکھیے سورۂ زمر (۷۴)، اعراف (۴۳) اور فاطر (۳۴، ۳۵) یہ ایسے ہی جیسے سورۂ بقرہ کی آیت (۹۸) : ﴿مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ﴾ میں لفظ ”مَلٰٓئِكَتِهٖ“ میں سب فرشتے شامل ہونے کے باوجود جبریل و میکال کا الگ ذکر بھی فرمایا۔ ”اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ“ کے مزید فوائد کے لیے سورۂ فاتحہ کے فوائد ملاحظہ فرمائیں۔

③ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ : یعنی صرف وہ ایک ہے جس کا ہر کام محکم و مضبوط ہے اور جسے کائنات کے ذرّے ذرّے کی پوری خبر ہے، اس لیے اس کے کسی کام میں کوئی نقص ہے نہ عیب، جبکہ کوئی اور نہ پوری خبر رکھتا ہے نہ حکمت، اس لیے اس کے پاس

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ۞ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَآ أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۞

وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور وہی نہایت رحم والا، بے حد بخشنے والا ہے ② اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ کہہ دے کیوں نہیں، قسم ہے میرے رب کی! وہ تم پر ضرور ہی آئے گی، (اس رب کی قسم ہے) جو سب چھپی چیزیں جاننے والا ہے! اس سے ذرہ برابر چیز نہ آسمانوں میں چھپی رہتی ہے اور نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی کوئی چیز ہے اور نہ بڑی مگر ایک واضح کتاب میں ہے ③

---

عجز و فقر کے سوا کچھ نہیں، پھر حمد کس بات پر؟

**آیت 2** ① **يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا** ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی کچھ تفصیل بیان فرمائی۔ وہ ان تمام چیزوں کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہیں اور جو اس سے نکلتی ہیں اور جو آسمان سے اترتی ہیں اور اس میں چڑھتی ہیں، جو شمار سے باہر ہیں اور جنھیں صرف وہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کمال علم بھی اس کے اکیلے مستحق حمد ہونے کی دلیل ہے، کسی اور کو دوسری چیزیں تو ایک طرف رہیں خود اپنی ذات کا بھی پورا علم نہیں، پھر وہ ''الحمد'' کے لائق کیسے ہو گیا۔

② **وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ** : یعنی ہر چیز کا مالک ہونے، حکیم و خبیر ہونے اور ذرے ذرے کا علم رکھنے کے باوجود بندوں کی نافرمانی پر فوری گرفت نہیں کرتا، کیونکہ وہی ہے جس کی نہ رحمت کی کوئی حد ہے، نہ مغفرت کی۔ اس لیے اس نے بندوں کو مہلت دے رکھی ہے اور بڑی سے بڑی سرکشی پر بھی مقرر کردہ وقت سے پہلے گرفت نہیں فرماتا۔

**آیت 3** ① **وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ** : یہ بیان کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بے حساب نعمتیں کی ہیں، ان پر دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی حمد اور شکر اسی کے لیے ہے، یہ بیان فرمایا کہ کفار اپنے خالق و مالک کی حمد کے بجائے دوبارہ زندہ ہو کر اس کے سامنے پیش ہونے کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔

② **قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ** : قسم اٹھا کر بات کرنے سے اس بات کی اہمیت اور اس کے واقع ہونے کی تاکید مقصود ہوتی ہے، جس پر قسم اٹھائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات جتنی شدت سے کی گئی ہو اس کا رد اتنی ہی یا اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کفار قیامت کا انکار قسمیں اٹھا اٹھا کر کرتے تھے، جیسا کہ اللہ نے ذکر فرمایا: ﴿ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَنْ يَمُوتُ ﴾ [ النحل : ۳۸ ] ''اور انھوں نے اپنی پکی قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے۔'' وہ قیامت کا مذاق بھی اڑاتے تھے اور اسے جلد از جلد لانے کا مطالبہ بھی کرتے تھے،

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ④

**تاکہ وہ ان لوگوں کو بدلا دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے سراسر بخشش اور باعزت رزق ہے ④**

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے رب کی قسم کھا کر انھیں بتائیں کہ وہ تم پر ضرور بالضرور آئے گی۔ حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ آیت ان تین آیات میں سے ایک ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے رب کی قسم کھا کر بتائیں کہ قیامت ضرور قائم ہوگی۔ ان میں سے ایک سورۂ یونس کی آیت ہے: ﴿ وَ يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚۛ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴾ [ یونس : ۵۳ ] ''اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا یہ سچ ہی ہے؟ تو کہہ ہاں! مجھے اپنے رب کی قسم! یقیناً یہ ضرور سچ ہے اور تم ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہو۔'' دوسری یہ آیت اور تیسری سورۂ تغابن میں ہے: ﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ﴾ [ التغابن : ۷ ] ''وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا انھوں نے گمان کیا کہ وہ ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔ کہہ دے کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم! تم ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے۔''

③ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ...... : ''عٰلِمِ الْغَيْبِ'' ''رَبِّيْ'' کی صفت ہے۔ ''عَزَبَ يَعْزُبُ'' (ن، ض) غائب ہونا، چھپا رہنا۔ ''لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرُ ......'' میں ''اَصْغَرُ'' اور ''اَكْبَرُ'' پر رفع مبتدا ہونے کی وجہ سے ہے۔ ''اِلَّا'' حرف استثنا ہے اور ''فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ'' خبر ہے۔ ''كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ'' سے مراد لوح محفوظ ہے۔ کتاب کو واضح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کتابوں میں لکھی ہوئی بات ڈھونڈنا پڑتی ہے، مگر وہ ایسی کتاب ہے جو ہر چیز کو خود ہی واضح کر دیتی ہے۔

④ قیامت کے منکروں کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی اور ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو گئے اور ہماری خاک کے ذرات بھی کہاں سے کہاں منتشر ہو گئے تو ہم دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے کہو، مجھے اپنے اس رب کی قسم ہے جو غیب کو جاننے والا ہے! جس سے ذرہ برابر کوئی چیز بھی چھپی ہوئی نہیں، نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی، مگر اس کے علم میں ہے اور لوح محفوظ میں درج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے والوں کے ذرات جہاں بھی ہوں وہ سب سے واقف بھی ہے اور انھیں جمع کرنے اور دوبارہ جوڑنے اور زندہ کرنے پر قادر بھی ہے۔ دیکھیے سورۂ ق (۳، ۴) اور قیامہ (۳، ۴)۔

⑤ ''ذَرَّةٍ'' غبار کے اس چھوٹے سے چھوٹے حصے کو کہتے ہیں جو روشنی میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ''کہ اس سے چھوٹی ہر چیز بھی کتاب مبین میں ہے'' اس حقیقت کا بیان ہے جو ان آیات کے نزول کے سیکڑوں برس بعد تجربے سے ثابت ہوئی کہ ذرہ (ایٹم) بھی قابل تقسیم ہے اور اس سے چھوٹی بھی بہت سے چیزیں موجود ہیں۔

⑥ وَ لَاۤ اَكْبَرُ : یہاں ایک سوال ہے کہ یہ کہنے کے بعد کہ ''ذرے سے چھوٹی چیزیں بھی کتاب مبین میں ہیں'' یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ''اس سے بڑی چیزیں بھی کتاب مبین میں ہیں۔'' جواب اس کا یہ ہے کہ اس کی ضرورت یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ لوح محفوظ میں صرف باریک چیزوں کا علم ہی محفوظ کیا گیا ہے۔

آیت 4 لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... : ان آیات میں قیامت کا مقصد اور اس کی حکمت بیان کی گئی

وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝

اور وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات میں کوشش کی، اس حال میں کہ نیچا دکھانے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب کی سزا ہے ⑤ اور وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا ہے، دیکھتے ہیں کہ جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے اور وہ اس کا راستہ دکھاتا ہے جو سب پر غالب ہے، تمام خوبیوں والا ہے ⑥

ہے، یعنی قیامت اس لیے برپا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح والوں کو ان کی جزا دے، کیونکہ دنیا کی محدود مدت میں نہ نیکوں کو ان کی پوری جزا ملتی ہے، نہ بدوں کو ان کی پوری سزا۔ اب اگر جزا و سزا کا کوئی دن ہی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیک و بد یکساں ہیں، جب کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ دیکھیے سورۂ ص (۲۸)، سجدہ (۱۸ تا ۲۰) اور حشر (۲۰) اور اللہ تعالیٰ کے عدل کے بھی خلاف ہے۔ (دیکھیے انبیاء: ۴۷) بلکہ یہ ان لوگوں پر ظلم ہوگا جن پر دنیا میں ظلم ہوتا رہا، جب کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ذرہ برابر ظلم کا روا دار نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۴۶ ] ''اور تیرا رب اپنے بندوں پر ہرگز کوئی ظلم کرنے والا نہیں۔'' بھلا وہ کون سا مالک ہے جس کے غلاموں میں سے کوئی اس کا حکم مانے، کوئی نہ مانے اور وہ سب سے یکساں سلوک کرے، اور اس کے غلاموں میں سے بعض بعض پر ظلم کرتا رہے اور وہ ظالم سے باز پرس ہی نہ کرے، پھر جب انسان اپنے غلاموں میں یہ برداشت نہیں کرتا تو اس بادشاہوں کے بادشاہ، ملک الملوک کے متعلق یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے؟ "مَغْفِرَةٌ" پر تنوین تعظیم کی ہے اور "رِزْقٌ كَرِيْمٌ" سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۱۷)۔

**آیت 5** وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ ...... : "رِجْزٍ" کا معنی ہے "أَسْوَأُ الْعَذَابِ" (بدترین عذاب) یعنی جن لوگوں کی کوشش ہے کہ ہماری آیات کا مقابلہ کرتے ہوئے عاجز کر دیں اور نیچا دکھا دیں، کبھی انھیں جادو کہتے ہیں، کبھی شعر اور کبھی پہلے لوگوں کے افسانے، تاکہ لوگوں کو ان پر ایمان لانے سے روکیں، ان کے لیے بدترین قسم کے عذاب کی سزا ہے، جو نہایت المناک ہے۔ مراد جہنم ہے، جس سے زیادہ بری اور دردناک سزا کوئی نہیں۔

**آیت 6** ① وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ...... : "يَرَى" میں رُؤیت (دیکھنے) سے مراد یہاں دل کے ساتھ دیکھنا یعنی جاننا ہے۔ "يَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" کا پہلا مفعول "الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" ہے اور دوسرا مفعول "الْحَقَّ" ہے۔ "هُوَ" ضمیر فصل ہے۔ خبر "الْحَقَّ" پر الف لام کی وجہ سے اور ضمیر فصل کی وجہ سے کلام میں حصر اور تاکید پیدا ہوگئی، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ ''وہی حق ہے۔'' "الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" سے مراد سب سے پہلے صحابہ کرام ہیں، پھر تمام مسلمان جو فکر و دانش اور علم نافع سے بہرہ مند ہوئے، یا اہلِ کتاب میں سے جو لوگ ایمان لائے، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ۔ اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں رسول، وحی الٰہی اور قیامت کے متعلق اہل علم و دانش کا یقین و ایمان اور کفار کا عقیدہ و اعلان بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا، جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ تو جانتے اور یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے وہی

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ ۝ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝

اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا کیا ہم تمھیں وہ آدمی بتائیں جو تمھیں خبر دیتا ہے کہ جب تم ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاؤ گے، پوری طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا جانا، تو بلاشبہ تم یقیناً بالکل نئی پیدائش میں ہو گے ⑦ کیا اس نے اللہ پر ایک جھوٹ باندھا ہے، یا اسے کچھ جنون ہے؟ بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ عذاب اور بہت دور کی گمراہی میں ہیں ⑧

---

حق ہے اور وہ اس ذات پاک کا راستہ دکھاتا ہے جو سب پر غالب اور تمام خوبیوں کا مالک ہے۔ کفار اور شیطان لاکھ کوشش کر لیں، وہ اس کے سب پر غالب ہونے اور تمام خوبیوں کا مالک ہونے کے یقین کی وجہ سے اس کے راستے کے سوا کسی اور راستے پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے وہ اس کے بتانے کے مطابق قیامت قائم ہونے پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی تیاری کرتے ہیں۔

② بعض مفسرین نے "وَيَرَى الَّذِيْنَ" کا عطف "لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" پر بیان کیا ہے، مگر بہتر یہی ہے کہ اسے نیا کلام قرار دیا جائے۔

**آیت 7** وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ ...... : اہلِ علم کے بعد کفار کا قول ذکر فرمایا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ جیسی شخصیت کا ذکر، جن کی شہرت محتاج بیان نہیں، حقارت کے انداز سے "ایک آدمی" کہہ کر کیا، یعنی لوگوں سے کہا، کیا ہم تمھیں "ایک آدمی" بتائیں جو تمھیں یہ بتاتا ہے کہ جب تم ریزہ ریزہ کر کے منتشر کر دیے جاؤ گے تو پھر ایک نئی پیدائش کے ساتھ زندہ کر دیے جاؤ گے۔

**آیت 8** ① اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ...... : یعنی اس کا یہ کہنا کہ ریزہ ریزہ کر دیے جانے کے بعد تم نئے سرے سے پھر زندہ کیے جاؤ گے، دو حال سے خالی نہیں، یا تو ہوش و حواس کی درستی میں وہ جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہا ہے اور اس کی طرف نسبت کر کے وہ بات کہہ رہا ہے جو اس نے نہیں فرمائی، یا اسے جنون ہے، اس کا دماغ خراب ہے، بے سوچے سمجھے جو جی میں آئے کہہ دیتا ہے۔ [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ ]

② بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ...... : رسول اللہ ﷺ کی پوری عمر قریش مکہ کے سامنے گزری تھی۔ (دیکھیے یونس : ۱۶) آپ کے متعلق یہ دونوں باتیں اتنی بے کار تھیں کہ ان کی تردید کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا صادق اور امین ہونا سب کے ہاں مسلّم تھا۔ (دیکھیے انعام : ۳۳) جیسا کہ ابوسفیان کے اس اعتراف پر کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کے متعلق

اَفَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ نُسۡقِطۡ عَلَيۡهِمۡ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ ﴿۹﴾ ع

**تو کیا انھوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا جو آسمان و زمین میں سے ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، اگر ہم چاہیں انھیں زمین میں دھنسا دیں، یا ان پر آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا دیں۔ یقیناً اس میں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے ضرور ایک نشانی ہے ⑨**

جھوٹ بولنے کا کوئی واقعہ معلوم نہیں، ہرقل نے کہا تھا: ''یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں پر تو جھوٹ نہ بولے، مگر اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے لگے۔'' [ دیکھیے بخاري : ۷ ] رہی دیوانہ یا پاگل ہونے کی بات تو آپ کی عقل کا کمال دوست و دشمن سب کے سامنے تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں، اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں وہ جہالت اور نادانی سے کام لے رہے ہیں اور غور و فکر سے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، جس کی وجہ سے وہ حق بات اور سیدھی راہ سے بہت دور نکل گئے ہیں اور اس راستے پر چل رہے ہیں جو انھیں سیدھا جہنم کے عذاب میں لے جانے والا ہے۔ الٹا سیدھی راہ پر چلنے والے کو جھوٹا یا دیوانہ بتا رہے ہیں۔

**آیت 9** ① **اَفَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ مِّنَ ......** : فرمایا، آخرت کا انکار زمین و آسمان کی پیدائش میں غور و فکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر یہ اپنے آگے اور پیچھے چاروں طرف پھیلے ہوئے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے پر غور کرتے، جن کی وسعت ان کے خیال سے بھی زیادہ ہے تو زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر نہ تعجب کرتے، نہ اس کا انکار کرتے، کیونکہ آسمان و زمین کی پیدائش کے مقابلے میں ان کی تخلیق تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا﴾ [ النازعات : ۲۷ ] ''کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔'' اور فرمایا: ﴿لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَكۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ﴾ [ المؤمن : ۵۷ ] ''یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

② **اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ ......** : ''**كِسَفًا**'' ''كِسۡفَةٌ'' کی جمع ہے، ٹکڑے۔ اس میں کفار کو ڈرایا ہے کہ یہی آسمان و زمین جن کو تم اپنے لیے نفع بخش اور زندگی کا سبب سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ چاہے تو انھی چیزوں کو تمھاری ہلاکت کا موجب بنا سکتا ہے۔ پھر وہ چاہے تو تمھیں اس زمین میں دھنسا دے، جیسے اس نے قارون کو دھنسا دیا، یا آسمان سے عذاب کے کچھ ٹکڑے گرا دے، جیسے اس نے اصحاب الایکہ کے ساتھ کیا۔

③ **اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ** : یعنی جو شخص کسی قسم کا تعصب یا ہٹ دھرمی نہ رکھتا ہو، بلکہ اخلاص کے

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ﴿۱۰﴾

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے بڑا فضل عطا کیا، اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کو دہراؤ اور پرندے بھی اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا ﴿۱۰﴾**

ساتھ اپنے رب سے ہدایت کا طالب ہو اور اس کی طرف رجوع رکھتا ہو، اس کے لیے تو آسمان و زمین کے اس عظیم الشان نظام میں بہت بڑا سبق موجود ہے کہ جس نے اتنا بڑا حکمت سے بھرا ہوا نظام بنایا ہے، وہ دوبارہ زندہ بھی کر سکتا ہے اور یہ بھی سبق ہے کہ اس کی عنایت اور اس کے فضل ہی سے ہم بچے ہوئے ہیں، ورنہ وہ ایک ہی لحہ میں ہمیں ہلاک کر سکتا ہے۔ یہ زمین اس کی ہے اور آسمان بھی اسی کا ہے، پھر ہم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں؟ مگر جو اپنے رب کی طرف رجوع کے بجائے اس سے بغاوت اختیار کر چکا ہو، اس کے لیے یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود اس میں کوئی سبق نہیں۔

**آیت 10** ① **وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا** : "**فَضْلًا**" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "بڑا فضل" کیا گیا ہے۔ پچھلی آیات کے ساتھ داؤد علیہ السلام کے ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ پچھلی آیت میں فرمایا کہ زمین و آسمان میں ہر اس بندے کے لیے عظیم نشانی اور عبرت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ اب اپنے رجوع کرنے والے کچھ بندوں کا اور ان کے چند واقعات کا ذکر فرمایا، ان میں سے ایک داؤد علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت سی عنایات فرمائیں اور انھیں متعدد قسم کی نعمتیں بخشیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی چند عنایات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے جو قرآن یا حدیث میں آئی ہیں۔

وہ بکریاں چرانے والے ایک عام نوجوان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کفار کے بادشاہ جالوت جیسے گراں ڈیل دشمن کو قتل کروا کر بنی اسرائیل کا محبوب بنا دیا اور پھر ایسا عروج عطا فرمایا کہ وہ طالوت کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کے بادشاہ بن گئے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں سلطنت کے ساتھ علم و حکمت بھی عطا فرمایا۔ (بقرہ : ۲۵۱) انھیں نبوت بخشی اور زبور عطا فرمائی۔ (نساء : ۱۶۳) انھیں زبردست قوت عطا فرمائی۔ (سورۂ ص : ۱۷) انھیں اور ان کے بیٹے سلیمان علیہ السلام کو خاص علم عطا فرمایا۔ (نمل : ۱۵) انھیں پرندوں کی بولی سکھائی۔ (نمل : ۱۶) انھیں توبہ و انابت کا وصف عطا فرمایا اور ان کی مغفرت فرمائی۔ (سورۂ ص : ۲۴، ۲۵) انھیں صحیح فیصلہ کرنے کی استعداد اور عدل کرنے کی توفیق بخشی۔ (انبیاء : ۷۹۔ ص : ۲۶) ان کے لیے لوہا نرم کر دیا اور انھیں زرہیں بنانا سکھایا۔ (انبیاء : ۸۰۔ سبا : ۱۰، ۱۱) انھیں نہایت خوب صورت آواز عطا فرمائی اور پہاڑوں اور پرندوں کو ان کے ساتھ تسبیح دہرانے کا حکم دیا۔ (انبیاء : ۷۹۔ سبا : ۱۰) ان کے لیے (زبور) پڑھنا ہلکا کر دیا گیا تھا، چنانچہ وہ گھوڑوں پر زین ڈالنے کا حکم دیتے اور ان پر زین ڈالنے سے پہلے اسے پڑھ لیتے تھے۔ [ دیکھیے بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالٰی : ﴿ و آتينا داوٗد زبورا ﴾ : ۳٤۱۷ ] انھیں صوم و صلاۃ کی اور اس کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں استقامت کی وہ توفیق بخشی جس کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ "وہ رات کا نصف سو جاتے، پھر ایک ثلث قیام کرتے اور ایک سدس پھر سو جاتے تھے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔" [ أبو داوٗد، الصيام، باب في صوم يوم و

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱﴾

یہ کہ کشادہ زرہیں بنا اور کڑیاں جوڑنے میں اندازہ رکھ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہوں ﴿۱۱﴾

فطر یوم : ۲۴۴۸، وقال الألباني صحيح ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب دشمن سے مڈبھیڑ ہوتی تو (داؤد علیہ السلام) بھاگتے نہیں تھے۔'' [ بخاري، الصوم، باب صوم داوٗد عليه السلام : ۱۹۷۹، عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما ] اور وہ صرف اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ [ دیکھیے بخاري، البيوع، باب كسب الرجل و عمله بيده : ۲۰۷۲ ] تلاش کرنے سے ان پر اللہ تعالیٰ کی مزید عنایات بھی مل سکتی ہیں۔

❷ **يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ** : اس سے پہلے لفظ ''قُلْنَا'' (ہم نے کہا) محذوف ہے، جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے۔ ''اَوِّبِيْ'' ''آبَ يَؤُبُ أَوْبًا'' (ن) لوٹنا اور ''أَوَّبَ يُأَوِّبُ'' (تفعیل) لوٹانا، دہرانا۔ یعنی ہم نے پہاڑوں سے کہا کہ اے پہاڑو! ان کے ساتھ تسبیح اور تلاوت کے کلمات دہراؤ اور اے پرندو! تم بھی۔ گویا ''وَ الطَّيْرَ'' کا عطف ''جِبَالُ'' کے محل پر ہے، اس لیے منصوب ہے، یا یہ ''سَخَّرْنَا لَهٗ'' محذوف کا مفعول ہے، یعنی ہم نے ان کے لیے پرندے بھی تسبیح کرنے کے لیے مسخر کر دیے، جیسا کہ سورۂ ص میں فرمایا: ﴿وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾ [ صٓ : ۱۹ ] ''اور پرندوں کو بھی (مسخر کر دیا) جب کہ وہ اکٹھے کیے ہوئے سب اس کے لیے بہت رجوع کرنے والے تھے۔'' پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کا بیان سورۂ انبیاء (۷۹) میں گزر چکا ہے۔

❸ **وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ** : داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کرنے کی کیفیت اکثر مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے آگ میں پگھلائے بغیر ان کے ہاتھ میں موم یا گندھے ہوئے آٹے کی طرح ہوتا تھا۔ اگر ایسا ہو تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، مگر یہ صرف قتادہ کا قول ہے، رسول اللہ ﷺ سے یہ بات ثابت نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں لوہا پگھلا کر نرم کرنے کا سلیقہ سکھا دیا ہو تو یہ بھی ''اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ'' ہی ہے۔ آج کل کسی معجزے یا کرامت کے بغیر ہنر کی بدولت لوہا لوگوں کے ہاتھوں میں نرم ہو چکا ہے۔ داؤد علیہ السلام کے لیے سب سے پہلے لوہے کی بھٹی ایجاد کرنے، اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور سب سے پہلے زرہیں بنانے کا اور اس بات کا شرف بھی کچھ کم نہیں کہ بعد میں آنے والوں نے انھی سے یہ ہنر حاصل کیے۔ نیز دیکھیے سورۂ انبیاء (۸۰)۔

**آیت 11** ❶ **اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ** : ''سٰبِغٰتٍ'' کامل اور وسیع، یہ ''دُرُوْعٌ'' محذوف کی صفت ہے، یعنی ہم نے اس سے کہا کہ مکمل اور کشادہ زرہیں تیار کر، جو لڑنے والے کے پورے جسم کو صحیح طریقے سے ڈھانپ لیں اور اسے دشمن کے وار سے محفوظ رکھیں۔

❷ **وَ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ** : ''السَّرْدِ'' کسی موٹی چیز کو سینا، پرونا، جیسے زرہ بننا، چمڑے کو سینا، یہاں لوہے کی کڑیوں کو ترتیب

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾

اور سلیمان کے لیے ہوا کو (تابع کردیا)، اس کا صبح کا چلنا ایک ماہ کا اور شام کا چلنا ایک ماہ کا تھا اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہایا، اور جنوں میں سے کچھ وہ تھے جو اس کے سامنے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے کجی کرتا ہم اسے بھڑکتی آگ کا کچھ عذاب چکھاتے تھے۔ ﴿۱۲﴾

سے جوڑنا مراد ہے۔ (مفردات) کڑیاں جوڑنے میں اندازہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹی بڑی نہ ہوں، نہ ایسی کھلی ہوں کہ جوڑ زیادہ حرکت کرتے رہیں، نہ اتنی تنگ ہوں یا کیل اتنے موٹے ہوں کہ آدمی انھیں پہن کر حرکت ہی نہ کر سکے۔ بلکہ ہر کڑی اور ہر جوڑ جسم میں اس کی جگہ درست بیٹھے اور آپس میں صحیح طریقے سے مرتب ہو۔

③ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا : اس خطاب میں داؤد علیہ السلام کی آل کو بھی شامل فرما لیا ہے، اس لیے "اِعْمَلْ" کے بجائے "اعْمَلُوْا" فرمایا۔

④ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ : اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی، یعنی تم جو کچھ کر رہے ہو میں اسے خوب دیکھ رہا ہوں، صالح اعمال پر جزا دوں گا اور برے اعمال پر سزا دوں گا۔

آیت 12 ① وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ ...... : اللہ تعالیٰ کی طرف انابت کرنے والے بندوں میں سے داؤد علیہ السلام کے بعد ان کے فرزند ارجمند سلیمان علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ وہ ایک مہینے کی راہ دن کے پہلے پہر اور ایک مہینے کی راہ دن کے پچھلے پہر طے کر لیتی تھی۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس زمانے میں بحری جہاز موافق ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ آیت میں "غُدُوٌّ" سے مراد جانا ہے اور "رَوَاحٌ" سے مراد واپسی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک ماہ تک موافق ہوا سلیمان علیہ السلام کے پایۂ تخت سے مشرق کی طرف چلتی تھی، جس کے ذریعے سے ان کے بحری جہاز تجارتی اور دوسرے مقاصد کے لیے مشرق کی طرف روانہ ہوتے تھے، پھر ایک ماہ کے لیے واپسی کے سفر کے لیے مغرب کی طرف چلتی تھی جس سے وہ جہاز واپس فلسطین کی طرف آ جاتے اور یہ مطلب ہے اس آیت کا: ﴿تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۸۱] "اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے۔" یہ اور اس جیسی تفسیروں کی حقیقت کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۸۱)۔

ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ ان میں اس شخصیت کو عطا ہونے والی چیزوں کا ذکر ہے، جس نے یہ دعا کی تھی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ﴾ [صٓ: ۳۵] "اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔" اور جس کی فوجوں کے ایک صاحبِ علم نے یمن سے آنکھ جھپکنے میں ملکہ سبا کا تخت لا حاضر کیا تھا۔ موجودہ زمانے میں جتنی ترقی ہوئی ہے، یا آئندہ ہوگی سلیمان علیہ السلام کو عطا کردہ قوتوں کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، پھر اگر ہوا ان کے حکم سے انھیں ایک ماہ کا سفر پہلے پہر اور ایک ماہ

**یَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَ تَمَاثِیۡلَ وَ جِفَانٍ کَالۡجَوَابِ وَ قُدُوۡرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعۡمَلُوۡۤا**

**وہ اس کے لیے بناتے تھے جو وہ چاہتا تھا، بڑی بڑی عمارتیں اور مجسمے اور حوضوں جیسے لگن اور ایک جگہ جمی ہوئی**

کا سفر پچھلے پہر میں طے کروا دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ رہی اس کی کیفیت کہ ہوا انھیں یہ فاصلہ کیسے طے کرواتی تھی تو وہ اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمائی اور جو بات معلوم نہ ہو اس کے متعلق تکلّف نہیں کرنا چاہیے۔ سورۂ ص میں فرمایا: ﴿قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِيۡنَ﴾ [ صٓ : ۸۶ ] ''کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں سے ہوں۔'' مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۸۱)۔

② **وَ اَسَلۡنَا لَهٗ عَيۡنَ الۡقِطۡرِ** : ''سَالَ يَسِيلُ سَيْلًا'' (ض) بہنا۔ ''أَسَالَ يُسِيلُ إِسَالَةً'' (افعال) بہانا، جاری کرنا۔ ''اَسَلۡنَا'' باب افعال کے ماضی معلوم سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا، سلیمان علیہ السلام کو وہ نعمت وراثت میں ملی، مزید ان کے لیے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا، تاکہ وہ انھیں وافر مقدار میں دستیاب رہے اور ان کے زیر فرمان انسان اور جن اس سے ان کی اور ان کی افواج کی ضرورت کی ہر چیز، مثلاً ہر قسم کے چھوٹے بڑے برتن اور گھروں کے اندر اور باہر استعمال ہونے والا سامان تیار کرتے رہیں۔ ایک اخبار کے مطابق اب بھی اسرائیل میں یہودی تانبے کے اس مقام کی تلاش میں ہیں۔

③ **وَ مِنَ الۡجِنِّ مَنۡ يَّعۡمَلُ بَيۡنَ يَدَيۡهِ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ** : سورۂ انبیاء میں ان جنات کا تذکرہ ''شیاطین'' کے لفظ سے کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ انبیاء میں مذکورہ شیاطین سے مراد انسانی شیاطین نہیں، بلکہ جنی شیاطین ہیں۔ وہ جنات جو کام کرتے تھے ان کا تذکرہ اس مقام کے علاوہ سورۂ انبیاء (۸۲) اور سورۂ ص (۳۷، ۳۸) میں ملاحظہ کریں۔

④ **وَ مَنۡ يَّزِغۡ مِنۡهُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا**...... : اس کی تفسیر سورۂ انبیاء (۸۲) میں ملاحظہ کریں۔

**آیت 13** ① **يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ** : ''مَحَارِيۡبَ'' ''مِحۡرَابٌ'' کی جمع ہے، یہ ''حَرۡبٌ'' سے ''مِفۡعَالٌ'' کے وزن پر ہے، جو آلہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اصل معنی اس کا جنگ کا آلہ یا ہتھیار ہے، پھر یہ لفظ کئی معانی میں استعمال ہونے لگا، جن سب معانی میں کسی نہ کسی طرح جنگ کا مفہوم شامل ہے۔ چنانچہ قلعہ اور بڑی عالی شان عمارت کو بھی ''محراب'' کہتے ہیں، کیونکہ اس میں رہ کر دشمن سے جنگ کی جاتی ہے۔ عبادت کے لیے خاص کمرے کو بھی ''محراب'' کہتے ہیں، کیونکہ وہ شیطان سے جنگ میں مددگار رہے، جیسا کہ زکریا علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيۡ فِي الۡمِحۡرَابِ﴾ [ آل عمران : ۳۹ ] ''تو فرشتوں نے اسے آواز دی، جب کہ وہ عبادت خانے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔'' داؤد علیہ السلام کی عبادت کے لیے مخصوص جگہ کو بھی ''محراب'' کہا گیا ہے، فرمایا: ﴿وَهَلۡ اَتٰىكَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَ﴾ [ صٓ : ۲۱ ] ''اور کیا تیرے پاس جھگڑنے والوں کی خبر آئی ہے، جب وہ دیوار پھاند کر عبادت خانے میں آ گئے۔''

سلیمان علیہ السلام کی سیرت میں سب سے نمایاں وصف جہاد ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں انسانوں، جنوں اور پرندوں

اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

دکھیں۔اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے عمل کرو۔اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں ﴿۱۳﴾

کی فوجیں عطا فرما رکھی تھیں۔ جنگی ضروریات کی تیاری اور فراہمی سے انھیں خاص دلچسپی تھی، چنانچہ گھوڑوں کی دوڑ کروانے کے بعد ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے کا ذکر سورۂ ص (۳۰ تا ۳۳) میں ہے۔ یہ سن کر کہ زمین کے کسی خطے پر شرک کا غلبہ اور مشرک عورت کی حکومت ہے، فوراً جہاد کے لیے تیار ہو جانے کا ذکر ملکہ سبا کے قصے میں ہے۔ (دیکھیے سورۂ نمل) ظاہر ہے اس کے لیے ہر قسم کا جنگی ساز و سامان تیار کرنا ضروری تھا، اسے ذخیرہ کرنے کے لیے بڑی بڑی عمارتوں کی ضرورت تھی، دشمن کے علاقے میں پیش قدمی، اس پر حملے اور جنگ کے لیے ان شہروں کے نقشے اور اہم عمارتوں کے ماڈل بہم پہنچانا ضروری تھا۔ بڑی تعداد میں فوجوں کے لیے کھانا پکانے، تقسیم کرنے اور اس کے لیے برتن مہیا کرنے کا کام بہت بڑا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام کاموں کے لیے انسانوں اور پرندوں کے علاوہ جنوں کو بھی سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا۔ اگر ان میں سے کوئی ان کے حکم سے سرتابی کرتا، تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگ کے شعلوں کے ساتھ سزا دی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ ان کی جنگی ضروریات کے لیے دور دراز سے ہر قسم کا عمارتی سامان پتھر، مرمر، لکڑی اور لوہا وغیرہ مہیا کرتے اور ان کے ساتھ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے۔ ان عمارتوں میں مسجد اقصیٰ کی عمارت بھی شامل تھی۔

**② وَ تَمَاثِيْلَ** : یہ "تِمْثَالٌ" کی جمع ہے، کسی دوسری چیز کی مثل جو چیز بنائی جائے، خواہ جان دار کی ہو یا بے جان کی، ماڈل اور مجسمہ کی شکل میں ہو، یا کاغذ پر تصویر کی شکل میں ہو۔ جنات سلیمان علیہ السلام کے لیے کس قسم کی تماثیل بناتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفصیل نہیں آئی، بعض مفسرین نے اس کی تفصیل میں جو جان دار اشیاء، مثلاً شیر، چیتے وغیرہ کی تصاویر یا مجسّمے بنانے کا ذکر کیا ہے، وہ ان کی سنی سنائی بات ہے، کیونکہ نہ انھوں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے، نہ وہ سلیمان علیہ السلام کے ساتھ رہے ہیں اور نہ اپنی معلومات کا ذریعہ بتاتے ہیں، جو سلیمان علیہ السلام تک پہنچتا ہو۔

آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ جنات سلیمان علیہ السلام کے حکم سے وہ محاریب اور تماثیل بناتے تھے جو وہ چاہتے تھے۔ ظاہر ہے اللہ کا اتنا جلیل القدر پیغمبر شیروں، ہاتھیوں اور چیتوں یا انسانوں کے لاحاصل مجسّمے بنوائے، ممکن ہی نہیں، خصوصاً اس لیے کہ وہ جس تورات کے احکام پر عامل تھے اس میں جان دار اشیاء کی مورتیاں بنانا حرام تھا۔ حرمت کا یہ حکم اب بھی تورات میں متعدد مقامات پر موجود ہے: ''تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔'' (خروج، باب: ۲۰، آیت: ۴) اور ایک جگہ ہے: ''تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ کوئی تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو، اس لیے کہ میں خداوند تمھارا خدا ہوں۔'' (احبار، باب: ۲۶، آیت ۱) ایک اور جگہ ہے: ''تا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے

بنالو، جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے پرندے یا زمین کے رینگنے والے جان دار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہو، ملتی ہو۔'' (استثناء، باب:۴، آیت:۱۶ تا ۱۸)۔

تورات کی ان صریح آیات سے واضح ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی طرف جان دار اشیاء کے مجسمے بنانے کی نسبت ان پر بہتان ہے، جو اسی طرح ان پر لگایا گیا ہے جیسے ان پر جادوگر ہونے کا یا بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کا بہتان لگایا گیا ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور تورات کے احکام پر پوری طرح عامل تھے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہی ہے کہ سلیمان علیہ السلام جو عمارت بنوانا چاہتے یا جن علاقوں کے نقشے یا عمارتوں کے ماڈل بنوانا چاہتے تھے، جنات ان کے حکم سے تیار کر دیتے تھے۔ اس آیت سے جان دار اشیاء کی تصاویر یا مجسّموں کا جواز نکالنا ہرگز درست نہیں، کیونکہ ان کی حرمت متفق علیہ مسئلہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جان دار اشیاء کی تصاویر کی صریح حرمت اور ان پر وعید کے لیے صحیح بخاری اور دوسری کتب احادیث کا مطالعہ فرمائیں۔ اختصار کے پیش نظر انھیں یہاں نقل نہیں کیا گیا۔

③ **وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ** : ''**جِفَانٍ**'' ''جَفْنَةٌ'' کی جمع ہے، کھانے کا بڑا برتن، لگن، تھال۔ ''اَلْجَوَابِ'' اصل میں ''اَلْجَوَابِيُ'' ہے جو ''جَابِيَةٌ'' کی جمع ہے ''حوض''۔ ''**قُدُوْرٍ**'' ''قِدْرٌ'' کی جمع ہے، ہانڈی، دیگ۔ ''**رّٰسِيٰتٍ**'' ''رَسَا يَرْسُوْ'' سے اسم فاعل مؤنث ''رَاسِيَةٌ'' کی جمع ہے۔ قرآن میں پہاڑوں کو ''**رّٰسِيٰتٍ**'' کہا گیا ہے، زمین میں گڑے ہوئے۔ سلیمان علیہ السلام کی فوجوں کی کثرت کے پیش نظر عام دیگیں جتنی بھی ہوں کافی نہیں تھیں، نہ چھوٹے برتن کھانا کھلانے کے لیے کافی تھے، اس لیے جنات سلیمان علیہ السلام کے لیے ان کی خواہش کے مطابق پکانے کے لیے تانبے وغیرہ کی یا پہاڑوں کو تراش کر پتھر کی اتنی بڑی بڑی دیگیں تیار کرتے تھے جو ایک ہی جگہ جمی رہتیں۔ انھیں اٹھا کر دوسری جگہ لے جایا نہیں جا سکتا تھا۔ ان میں سے ہر دیگ میں ہزاروں آدمیوں کا کھانا پکتا تھا اور مجاہدین کو اجتماعی طور پر کھانا کھلانے کے لیے جنات سلیمان علیہ السلام کی حسبِ منشا اتنے بڑے بڑے لگن یا تھال بناتے تھے جو حوضوں کی طرح لمبے چوڑے ہوتے، جن پر ایک وقت میں بہت سے آدمی کھانا کھا لیتے تھے۔

ایک ہی برتن میں بہت سے آدمیوں کے کھانا کھانے کا یہ معمول ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی موجود تھا۔ عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَصْعَةٌ يَحْمِلُهَا أَرْبَعَةُ رِجَالٍ يُقَالُ لَهَا الْغَرَّاءُ فَلَمَّا أَضْحَوْا وَسَجَدُوا الضُّحٰى أُتِيَ بِتِلْكَ الْقَصْعَةِ يَعْنِيْ وَقَدْ ثُرِدَ فِيْهَا فَالْتَفُّوْا عَلَيْهَا فَلَمَّا كَثُرُوْا جَثَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَعْرَابِيٌّ مَا هٰذِهِ الْجِلْسَةُ؟ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَعَلَنِيْ عَبْدًا كَرِيْمًا وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا عَنِيْدًا ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُوْا مِنْ حَوَالَيْهَا وَ دَعُوْا ذِرْوَتَهَا يُبَارَكْ فِيْهَا )) [ أبو داوٗد، الأطعمة، باب ما جاء في الأكل من أعلى الصحفة : ۳۷۷۳، قال الألباني صحيح ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک لگن یا تھال تھا، جسے چار آدمی اٹھاتے تھے، اسے ''غراء'' کہتے تھے۔ جب ضحیٰ ہوئی اور لوگوں نے ضحیٰ کی نماز پڑھ لی تو وہ لگن لایا گیا، اس میں گوشت کے سالن میں روٹی بھگو کر ثرید بنایا گیا تھا۔ لوگ اس کے گرد بیٹھ گئے، جب لوگ زیادہ ہو گئے تو

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا

پھر جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ کیا تو انھیں اس کی موت کا پتا نہیں دیا مگر زمین کے کیڑے (دیمک) نے جو اس

رسول اللہ ﷺ گھٹنوں کے بل ہو گئے، ایک اعرابی نے کہا: ''یہ کیا بیٹھنے کا طریقہ ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے کریم بندہ بنایا ہے، بدبخت و سرکش نہیں بنایا۔'' پھر فرمایا: ''اس کے اردگرد سے کھاؤ، درمیان کو چھوڑے رکھو کہ اس میں برکت ہو۔'' ظاہر ہے جس برتن کو چار آدمی اٹھائیں، اس میں سو دو سو آدمیوں کا کھانا تو ضرور ہوگا اور جو برتن حوض جیسا کھلا ہو، اس میں سے کھانے والوں کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔ سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں کے ان کاموں کے بیان کا مقصد ان کی سلطنت کی وسعت، جہاد کے لیے ان کی افواج کی کثرت، ان کی وسعت قلب، سخاوت اور انسانوں کے علاوہ جنات پر ان کی ہیبت کا بیان ہے کہ یہ سب کچھ ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا۔

④ **اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا** : ''اِعْمَلُوْۤا'' سے پہلے ''قُلْنَا'' اور ''اٰلَ دَاوٗدَ'' سے پہلے حرف ندا ''یا'' محذوف ہے، جس کی وجہ سے ''اٰلَ'' کا لفظ منصوب ہے۔ ''شُكْرًا'' مفعول لہ ہے۔ آل داؤد میں ان کے گھر والوں کے ساتھ وہ خود بھی شامل ہیں، یعنی ہم نے کہا، اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے عمل کرو۔ معلوم ہوا آدمی پر اللہ تعالیٰ کے انعام جتنے زیادہ ہوں، اسے اتنی ہی زیادہ اعمالِ صالحہ کی کوشش کرنی چاہیے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ یقیناً نماز کے لیے اتنا قیام کرتے کہ آپ کے دونوں پاؤں، یا (یہ کہا کہ) آپ کی دونوں پنڈلیوں پر ورم آ جاتا، جب آپ ﷺ سے (اس بارے میں) کہا جاتا تو فرماتے: (( أَفَلَا أَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا؟ )) ''تو کیا میں پورا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟'' [ بخاري، التهجد، باب قيام النبي ﷺ الليل : ۱۱۳۰ ] داؤد علیہ السلام کی نماز، ان کے روزوں اور جہاد کا تذکرہ اس سورت کی آیت (۱۰) میں گزر چکا ہے۔

⑤ **وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ** : ''الشَّكُوْرُ'' مبالغے کا صیغہ ہے، اس لیے ترجمہ ''پورے شکر گزار'' کیا ہے۔ اس میں ترغیب ہے کہ تم بھی میرے ان قلیل بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کرو جو پورے شکر گزار ہیں۔

**آیت 14** ① **فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ ......** : ''دَآبَّةُ الْاَرْضِ'' دیمک۔ ''تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ'' ''تَبَيَّنَ يَتَبَيَّنُ'' (تفعل) کا معنی واضح طور پر جان لینا بھی ہے اور کسی چیز کا واضح ہو جانا اور کھل کر سامنے آ جانا بھی ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

إِذَا اشْتَبَكَتْ دُمُوْعٌ فِيْ خُدُوْدٍ  تَبَيَّنَ مَنْ بَكٰى مِمَّنْ تَبَاكٰى

''جب رخساروں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تو وہ لوگ صاف ظاہر ہو گئے جو رو رہے تھے، ان لوگوں سے جو رونے کی نمائش کر رہے تھے۔''

② اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو عطا کردہ عظیم سلطنت، علمی کمالات اور ہوا اور جنوں کی تسخیر وغیرہ کے بیان کے بعد ان کی موت کا تذکرہ فرمایا ہے، یہ بتانے کے لیے کہ موت سے کوئی نہیں بچ سکتا، اگر اس سے کوئی بچتا تو سلیمان علیہ السلام ضرور بچ جاتے، جن کے پاس اتنی عظیم قوتیں تھیں۔

خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۴﴾

کی لاٹھی کھاتا رہا، پھر جب وہ گرا تو جنّوں کی حقیقت کھل گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلیل کرنے والے عذاب میں نہ رہتے ﴿۱۴﴾

3 سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ جنّات غیب جانتے ہیں، جیسا کہ آج کل بھی اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنّوں کے علم غیب کی حقیقت واضح کرنے کے لیے ایک عجیب طریقہ اختیار فرمایا، وہ یہ کہ سلیمان علیہ السلام کی وفات اس حال میں ہوئی کہ وہ اپنی لاٹھی پر ٹیک لگا کر کھڑے تھے۔ جنّات ان کاموں میں مصروف تھے جن کا حکم انھیں سلیمان علیہ السلام نے دے رکھا تھا، انھیں معلوم نہیں ہو سکا کہ سلیمان علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور وہ بدستور کام میں جتے رہے۔ دیمک ان کی لاٹھی کو اندر سے کھاتی رہی، جب لاٹھی اندر سے کھوکھلی ہوگئی اور سلیمان علیہ السلام کا بوجھ برداشت نہ کر سکی تو وہ گر پڑے۔ تب جا کر لوگوں اور جنّوں کو ان کی وفات کا پتا چلا۔ اس واقعہ سے تمام لوگوں کے سامنے جنّوں کی حقیقت کھل گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔

4 اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے تابع جنّوں اور شیاطین سے سرکش انسانی قبائل مراد نہیں، کیونکہ ان کے متعلق کوئی بھی علم غیب کا قائل نہیں، نہ خود انھیں اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے، بلکہ یہ حقیقی جن و شیاطین تھے۔

5 اکثر تفاسیر میں لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام وفات کے بعد لاٹھی کے سہارے ایک سال تک کھڑے رہے۔ بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جنّوں کو حکم دے کر شیشے کا ایک مکان بنوایا اور اس میں لاٹھی کے سہارے کھڑے ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کی وفات ہوگئی۔ جنّات ان کو ایک سال تک لاٹھی کے سہارے کھڑے دیکھتے رہے اور انھیں زندہ سمجھ کر ان کی ہیبت کی وجہ سے ان کی بتائی ہوئی تعمیرات اور دوسرے کام کرتے رہے۔ مگر ایک سال تک اس طرح کھڑے رہنے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے پورا سال نہ کچھ کھایا، نہ پیا، نہ لباس بدلا، نہ نماز پڑھی یا جماعت کروائی، نہ کسی خدمت گار کے دل میں کوئی فکر پیدا ہوئی، جو ہر روز ان کے لیے ان کاموں کا اہتمام کرتے تھے، نہ امور سلطنت کے متعلق کسی نے ان سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ آیا یہ ممکن بھی ہے؟ میں نے بہت سی تفسیروں کا مطالعہ کیا، مگر انھوں نے اس سوال کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ بعض مفسرین نے اسے استعارہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ لاٹھی کو دیمک کے کھانے کا مطلب ان کی سلطنت کا اندرونی طور پر آہستہ آہستہ کمزور ہونا ہے وغیرہ، مگر آیت کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

علامہ مراغی نے اس کا اچھا حل بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ” وَالْكِتَابُ الْكَرِيْمُ لَمْ يُحَدِّدِ الْمُدَّةَ الَّتِيْ قَضَاهَا سُلَيْمَانُ وَهُوَ مُتَوَكِّئٌ عَلٰى عَصَاهُ حَتّٰى عَلِمَ الْجِنُّ بِمَوْتِهِ، وَقَدْ رَوَى الْقَصَّاصُوْنَ أَنَّهَا كَانَتْ سَنَةً، وَ مِثْلُ هٰذَا لَا يَنْبَغِي الرُّكُوْنُ إِلَيْهِ، فَلَيْسَ مِنَ الْجَائِزِ أَنَّ خَدَمَ سُلَيْمَانَ لَا يَتَنَبَّهُوْنَ إِلَى الْقِيَامِ بِوَاجِبَاتِهِ الْمَعِيْشِيَّةِ مِنْ مَأْكَلٍ وَ مَشْرَبٍ وَ مَلْبَسٍ وَ نَحْوِهَا يَوْمًا كَامِلًا دُوْنَ أَنْ يُّحَادِثُوْهُ فِيْ ذٰلِكَ وَ يَطْلُبُوْا إِلَيْهِ الْقِيَامَ بِخِدْمَتِهِ،

**لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ**

**بلاشبہ یقیناً سبا کے لیے ان کے رہنے کی جگہ میں ایک نشانی تھی۔ دو باغ دائیں اور بائیں (جانب) سے۔ اپنے رب**

فَالْمَعْقُوْلُ أَنَّ الْأَرَضَةَ بَدَأَتِ الْعَصَا وَ سُلَيْمَانُ لَمْ يَتَنَبَّهْ لِذٰلِكَ، وَ بَيْنَمَا هُوَ مُتَوَكِّئٌ عَلَيْهَا حَانَتْ مَنِيَّتُهُ، وَكَانَتِ الْأَرَضَةُ قَدْ فَعَلَتْ فِعْلَهَا فِي الْعَصَا فَانْكَسَرَتْ فَخَرَّ عَلَى الْأَرْضِ فَعَلِمَتِ الْجِنُّ كِذْبَهَا، إِذْ كَانَتْ تَدَّعِيْ أَنَّهَا تَعْلَمُ الْغَيْبَ، إِذْ لَوْ عَلِمَتْهُ مَا لَبِثَتْ تُرْهِقُ نَفْسَهَا فِيْ شَاقِّ الْأَعْمَالِ الَّتِيْ كُلِّفَتْ بِهَا " ''قرآن کریم نے اس مدت کی تعیین نہیں فرمائی جو سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو ان کی موت کا علم ہونے تک لاٹھی پر ٹیک لگانے کی حالت میں گزاری۔ قصہ گو حضرات نے بیان کیا ہے کہ وہ ایک سال تھی مگر ایسی بات قابل توجہ نہیں ہے، کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ سلیمان علیہ السلام کی خدمت کرنے والوں کا پورا ایک دن ان کی معاشی ضروریات یعنی کھانے پینے اور لباس وغیرہ کی طرف خیال ہی نہ جائے، نہ وہ ان سے اس کے بارے میں بات کریں، نہ ان کی خدمت سرانجام دینے کا تقاضا کریں (سال تو بہت دور کی بات ہے)۔ اس لیے معقول بات یہ ہے کہ دیمک پہلے ہی لاٹھی میں لگ چکی تھی، سلیمان علیہ السلام کو اس کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ اس پر ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ ان کی موت کا وقت آ گیا، جب کہ دیمک لاٹھی کے اندر اپنا کام کر چکی تھی۔ چنانچہ وہ ٹوٹ گئی اور سلیمان علیہ السلام زمین پر گر گئے تو جنوں کو اپنا جھوٹ معلوم ہو گیا، کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ غیب جانتے ہیں، اس لیے کہ اگر وہ اسے جانتے ہوتے تو ان مشقت والے کاموں میں اپنی جان نہ مارتے رہتے جن کی انھیں تکلیف دی گئی تھی۔''

مراغی کی رائے اس لیے بھی مضبوط ہے کہ ایک سال کی مدت کی کوئی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، محض اسرائیلی روایات ہیں، جن کا یہ درجہ بھی نہیں کہ انھیں "لَا نُصَدِّقُ وَلَا نُكَذِّبُ" کہا جا سکے، بلکہ سب صریح عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک سال مدت بیان کرنے کے باوجود ان روایات کو اسرائیلیات قرار دیا ہے اور مرفوع روایت کو غریب اور "فِيْ صِحَّتِهٖ نَظَرٌ" فرمایا ہے اور فی الواقع وہ روایت غیر ثابت ہے۔

**آیت 15** ① **لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ**: اللہ تعالیٰ نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے ذکر کے بعد، جو انابت و رجوع والے شکر گزار بندے تھے، قومِ سبا کا ذکر فرمایا، جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی نعمتیں دیں، مگر انھوں نے ان نعمتوں کی ناشکری کی، انابت کے بجائے اعراض اور سرکشی اختیار کی، اپنے رسولوں کو اور آخرت کو جھٹلا دیا، جس کے نتیجے میں ان پر عذاب آیا اور ساری خوش حالی ختم ہو گئی۔ اس میں قریش کے لیے بھی نصیحت تھی، جنھیں بیت اللہ کی وجہ سے ہر طرح کی نعمت و راحت میسر تھی، انھوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کو جھٹلایا تو قومِ سبا کی طرح ان کی وہ خوش حالی اور امن و سکون ختم ہو گیا، جیسا کہ فرمایا:

﴿ **وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ** ﴾ [ النحل : ۱۱۲، ۱۱۳ ] ''اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی، اس کے پاس

وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾

...کے دیے سے کھاؤ اور اس کا شکر کرو، پاکیزہ شہر ہے اور بے حد بخشنے والا رب ہے ﴿۱۵﴾

اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس انھی میں سے ایک رسول آیا تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، تو انھیں عذاب نے اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ ظالم تھے۔'' سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ سبا کے ذکر کا ایک اور تعلق بھی ہے جو سورۂ نمل میں مذکور سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے قصے سے ظاہر ہے۔

② سبا سے مراد قوم ہے جس کا باپ سبا نامی شخص تھا۔ (دیکھیے سورۂ نمل: ۲۲) پھر ملک کا نام بھی یہی پڑ گیا۔

③ **فِيْ مَسْكَنِهِمْ** : یہ علاقہ آج کل یمن کے نام سے معروف ہے۔

④ **اٰيَةٌ** : یعنی ان کے لیے ان کے ملک میں بہت بڑی نشانی تھی، جس سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرت اور کاری گری کا اظہار ہوتا تھا اور جسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ایسے مالک کا شکر اور اس کی اطاعت واجب ہے اور اس کی ناشکری اور نافرمانی سے پرہیز لازم ہے۔

⑤ **جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ** : یہ اس نشانی کی تفصیل ہے۔ سبا کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے ''ارض القرآن'' کے مصنف نے لکھا ہے: ''اسی سلسلۂ عمارت میں ایک چیز ''بند مآرب'' ہے، جس کو عرب حجاز ''سد'' اور عرب یمن ''عرم'' کہتے ہیں۔ عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں، پانی پہاڑوں سے بہ کر ریگستانوں میں خشک اور ضائع ہو جاتا ہے، زراعت کے مصرف میں نہیں آتا۔ ''سبا'' مختلف مناسب موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند باندھ دیتے تھے کہ پانی رک جائے اور بقدر ضرورت زراعت کے کام میں آئے۔ مملکت سبا میں اس طرح کے سیکڑوں بند تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور ''سد مآرب'' ہے، جو ان کے دار الحکومت ''مارب'' میں واقع تھا۔ شہر مارب کے جنوب میں دائیں بائیں دو پہاڑ ہیں، سبا نے ان دو پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق م میں ''سد مارب'' کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند تقریباً ایک سو پچاس فٹ لمبی اور پچاس فٹ چوڑی ایک دیوار ہے۔ اس کا اکثر حصہ تو اب افتادہ ہے، تاہم ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے۔ ''ارناڈ'' ایک یورپی سیاح نے اس کے موجودہ حالات پر ایک مضمون فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل (رسالے) میں لکھا ہے، اس کا موجودہ نقشہ نہایت عمدگی سے تیار کیا ہے، اس دیوار پر جا بجا کتبات ہیں، وہ بھی پڑھے گئے۔ اس سد میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں جو حسب ضرورت کھولی اور بند کی جا سکتی تھیں۔ ''سد'' کے دائیں بائیں، مشرق و مغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے، جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ اس نظام آب رسانی سے چپ و راست دونوں جانب اس ریگستانی اور شور ملک کے اندر سیکڑوں کوس تک بہشت زار تیار ہو گئی تھی، جس میں انواع و اقسام کے میوے اور خوشبودار درخت تھے۔ قرآن کریم ''**جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ**'' کہہ کر انھی باغوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔'' (ارض القرآن)

فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ سَیۡلَ الۡعَرِمِ وَ بَدَّلۡنٰہُمۡ بِجَنَّتَیۡہِمۡ جَنَّتَیۡنِ ذَوَاتَیۡ اُکُلٍ خَمۡطٍ وَّ اَثۡلٍ وَّ شَیۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِیۡلٍ ﴿۱۶﴾

**پھر انھوں نے منہ موڑ لیا تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیجا اور ہم نے انھیں ان کے دو باغوں کے بدلے دو اور باغ دیے جو بدمزہ پھلوں اور جھاؤ کے درختوں اور کچھ تھوڑی سی بیریوں والے تھے ﴿۱۶﴾**

دائیں اور بائیں دو باغوں کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہر گھر اور ہر گلی کے دائیں بائیں، یعنی ہر طرف باغ ہی باغ تھے۔

⑥ **كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ** : یعنی ہم نے اپنے رسولوں اور صالح بندوں کی زبانی ان سے یہ بات کہی، یا اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں اور دائیں بائیں کے ان باغات اور کھیتوں کا ان سے تقاضا یہ تھا۔

⑦ **بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ** : ''طیب'' ہر چیز میں سے اعلیٰ کو کہتے ہیں۔ ''**بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ**'' سے مراد زرخیز اور عمدہ آب و ہوا والی زمین ہے، اس کے مقابلے میں بنجر، شور اور خراب آب و ہوا والی زمین کے لیے ''خبیث'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالۡبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخۡرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيۡ خَبُثَ لَا يَخۡرُجُ اِلَّا نَكِدًا﴾ [ الأعراف : ٥٨ ] ''اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کی کھیتی اس کے رب کے حکم سے نکلتی ہے اور جو خراب ہے (اس کی کھیتی) ناقص کے سوا نہیں نکلتی۔''

⑧ **وَرَبٌّ غَفُوۡرٌ** : یعنی اگر توحید پر قائم رہو گے، انبیاء کی اطاعت کرو گے اور انابت و رجوع کو اپنا شیوہ بناؤ گے تو اس خوش حالی کے ساتھ اپنے رب کو بھی اپنے لیے مہربان پاؤ گے، جو تمھاری کوتاہیوں پر پردہ ڈالے گا، اس طرح دنیا و آخرت دونوں تمھاری ہوں گی۔

**آیت 16** ① **فَاَعۡرَضُوۡا** : یعنی انھوں نے انابت و رجوع کے بجائے اعراض اور سرکشی کو اور بندگی اور شکر گزاری کے بجائے کفر اور ناشکری کو اختیار کیا اور پیغمبروں اور نیکی کا حکم کرنے والوں کی نصیحتوں سے منہ موڑ لیا۔

② **فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ** : ''**الۡعَرِمِ**'' ''عَرِمَةٌ'' کی جمع ہے، تہ بہ تہ پتھر، مراد پتھروں کا بنا ہوا بند ہے۔ یعنی ان کی سرکشی اور اعراض کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر بند کا سیلاب بھیجا۔ زوردار مسلسل بارشوں سے اتنا پانی جمع ہوا کہ اس کے سامنے بند ٹھہر نہ سکا اور ٹوٹ پھوٹ گیا۔ پانی کی شدت اتنی تھی کہ باقی بند بھی ٹوٹتے چلے گئے اور سارا قابل کاشت علاقہ زیر آب آ گیا۔ پانی کے ریلے سے باغ اور کھیت ہی تباہ نہیں ہوئے بلکہ زمین بھی کٹاؤ کا شکار ہو گئی اور اس کی زرخیز تہ اتر گئی۔ بند اور نہریں ختم ہونے سے آئندہ کے لیے زمین کی سیرابی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ جہاں کبھی پانی کی فراوانی تھی وہاں لوگ پینے کے پانی کو بھی ترسنے لگے۔ سیلاب میں اکثر لوگ اور ان کے مال مویشی غرق ہو گئے، جو بچے وہ جان بچا کر مختلف ملکوں کی طرف نکل گئے اور ایسے بکھرے کہ ان کا بکھرنا عربی زبان کا ایک محاورہ بن گیا، چنانچہ کہا جانے لگا کہ فلاں قوم ''سبا'' کی طرح بکھر گئی۔

③ **وَبَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ**...... : ''**ذَوَاتَيۡ**'' یہ ''ذَاتٌ'' کا تثنیہ ہے، والے۔ ''**اُكُلٍ**'' پھل۔ ''**خَمۡطٍ**'' بکھٹا، گلے میں اٹکنے والا، بدمزہ۔ ''**اَثۡلٍ**'' جھاؤ۔ یعنی میلوں پھیلی ہوئی وادیوں کی دونوں جانب بہترین پھلوں والے باغوں کی جگہ ہم

**ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا وَ هَلۡ نُجٰزِيۡۤ اِلَّا الۡكَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾ وَ جَعَلۡنَا بَيۡنَهُمۡ وَ بَيۡنَ الۡقُرَى الَّتِيۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرۡنَا فِيۡهَا السَّيۡرَ ؕ سِيۡرُوۡا فِيۡهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيۡنَ ﴿۱۸﴾**

**یہ ہم نے انھیں اس کا بدلا دیا جو انھوں نے ناشکری کی اور ہم یہ بدلا نہیں دیتے مگر اسی کو جو بہت ناشکرا ہو ﴿۱۷﴾ اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھی، نظر آنے والی بستیاں بنا دیں اور ان میں چلنے کا اندازہ مقرر کر دیا، راتوں اور دنوں کو بے خوف ہو کر ان میں چلو ﴿۱۸﴾**

---

نے ان کے لیے ایسے دو رویہ باغ اگا دیے جن میں یا تو بکھٹے، کسیلے اور بدمزہ پھلوں والے درخت تھے، یا جھاؤ کے درخت یا تھوڑی سی بیریوں کا کچھ حصہ۔ بکھٹے اور بدمزہ پھلوں اور جھاؤ پر مشتمل قطعوں کو باغ نہیں کہا جا سکتا، بطور تہکم اور مذاق صرف لفظی طور پر باغ کے مقابلے میں باغ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، البتہ بیری میں لذت ہوتی ہے۔ اس کی قلت بیان کرنے کے لیے دو لفظ استعمال فرمائے، ایک "**قَلِيۡلٍ**" اور دوسرا اس میں سے بھی کچھ تھوڑا سا حصہ یعنی "**شَيۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ**" کا لفظ استعمال فرمایا۔

**آیت 17** **ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا**...... : "**الۡكَفُوۡرَ**" مبالغے کا صیغہ ہے، بہت کفر کرنے والا، بہت ناشکرا۔ یعنی ہم نے انھیں اس کا بدلا دیا جو انھوں نے ناشکری کی اور ایسی سخت سزا ہم اسی کو دیتے ہیں جو بہت ناشکرا ہو، یعنی کافر و مشرک ہو، کیونکہ بڑی ناشکری اور بڑا ظلم شرک ہی ہے۔ تھوڑی بہت ناشکری والے سے ہمارا معاملہ درگزر کا ہوتا ہے۔ "**وَهَلۡ نُجٰزِيۡۤ اِلَّا الۡكَفُوۡرَ**" کے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں کچھ الفاظ جو آگے قوسین میں ہیں، محذوف ہیں، یعنی ہم نے انھیں یہ جزا اس کے بدلے میں دی جو انھوں نے ناشکری کی (اور ناشکری میں حد سے بڑھ گئے) اور ہم ایسے بڑے ناشکرے ہی کو یہ سخت بدلا دیا کرتے ہیں۔

**آیت 18** ❶ **وَجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمۡ وَبَيۡنَ الۡقُرَى الَّتِيۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا**...... : برکت والی بستیوں سے مراد شام کا علاقہ ہے۔ قرآن مجید میں اکثر برکت والی زمین شام کی سرزمین کو کہا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۷)، بنی اسرائیل (۱) اور سورۂ انبیاء (۷۱ اور ۸۱) یعنی یمن سے شام تک سڑک کے کنارے مسلسل بستیاں تھیں، جو پہاڑیوں یا اونچی جگہوں پر بنائی گئی تھیں اور ایک دوسری سے اتنی قریب تھیں کہ ایک بستی سے دوسری بستی نظر آتی تھی اور ایسے اندازے اور تناسب سے آباد تھیں کہ مسافر کو ہر منزل پر کھانا، پانی اور آرام کا موقع ملتا تھا۔ آبادیوں کے قریب ہونے اور نظر آتے رہنے کی وجہ سے نہ مسافروں کا دل گھبراتا تھا، نہ چوروں ڈاکوؤں کا خوف تھا اور نہ زادِ راہ ساتھ لینے کی مشقت تھی۔

❷ **سِيۡرُوۡا فِيۡهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيۡنَ** : یعنی رات دن کی جس گھڑی میں سفر کرنا چاہو کرو، نہ جان و مال کا کوئی اندیشہ، نہ راستے کے لیے سامان سفر ساتھ لینے کی کوئی ضرورت۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

**تو انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمارے سفروں کے درمیان دوری پیدا کر دے، اور انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو ہم نے انھیں کہانیاں بنا دیا اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر طرح ٹکڑے ٹکڑے کرنا، بلاشبہ اس میں ہر بہت صبر کرنے والے، بہت شکر کرنے والے کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۱۹﴾**

---

آیت 19 ① فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا...... : اس کی تفسیر تین طرح سے کی گئی ہے، ایک یہ کہ انھیں یہ نعمتیں راس نہ آئیں، وہ امن و عافیت کی قدر کرنا بھول گئے اور کبر و غرور میں آ کر کہنے لگے کہ یہ بھی کوئی سفر ہے کہ ہر تھوڑی مسافت کے بعد بستی پائی جاتی ہے۔ مزا تو جب آتا کہ دور دراز علاقوں، چٹیل میدانوں، دشوار گزار جنگلوں اور پرخطر وادیوں سے گزر ہوتا۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''آرام میں مستی یہ آئی، لگے تکلیف مانگنے کہ جیسے اور ملکوں کی خبر سنتے ہیں کہ سفروں میں پانی نہیں ملتا، آبادی نہیں ملتی، ویسا ہم کو بھی ہو، یہ بڑی ناشکری ہوئی۔'' (موضح) ان کی یہ دعا اسی طرح کی ہے جیسے بنی اسرائیل نے من و سلویٰ اور دوسری سہولتوں کے مقابلے میں دالوں اور سبزیوں وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا۔

دوسری تفسیر ابن عاشور کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ بات اپنے انبیاء اور صالح لوگوں کے جواب میں کہی، جب وہ انھیں شرک سے منع کرتے تھے، کیونکہ وہ انھیں نصیحت کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر اتنی نعمتیں کی ہیں، سفر اتنا آسان بنا دیا اور اس قدر خوش حالی عطا فرمائی ہے، سو تم پر اس کا شکر کرنا اور اس اکیلے کی عبادت کرنا واجب ہے، تو انھوں نے آگے سے یہ بات کہی جو آیت میں مذکور ہے، جیسا کہ کفار قریش نے کہا تھا: ﴿اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [ الأنفال : ۳۲ ] ''اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔'' دلیل اس کی یہ ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَعْرَضُوْا﴾ ''انھوں نے منہ موڑ لیا'' ظاہر ہے منہ کسی دعوت ہی سے موڑا جاتا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کی اس بات کے بعد فرمایا: ﴿وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ﴾ ''اور انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا'' یعنی انھوں نے ناشکری اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، قرآن میں ظلم کا لفظ اکثر شرک کے لیے آیا ہے، کیونکہ اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں۔''

تیسری تفسیر وہ ہے جس کی طرف تقریباً تمام مفسرین نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہ ان کی زبانِ حال کی بات ہے۔ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے کہتا ہے کہ پروردگارا! میں ان نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔ اسی طرح جو قوم اللہ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتی ہے، وہ گویا اپنے رب سے دعا کرتی ہے کہ اے پروردگارا! یہ نعمتیں ہم سے واپس لے لے، کیونکہ ہم اس قابل نہیں ہیں۔

② وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ : یعنی انھوں نے کفر و شرک پر اصرار کیا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور بلاشبہ یقیناً ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچا کر دکھایا تو مومنوں کے ایک گروہ کے سوا وہ سب اس کے پیچھے چل پڑے ﴿۲۰﴾

3 **فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ......** : یعنی ہم نے انھیں اس طرح برباد اور منتشر کیا کہ وہ بکھرنے کے لیے کہاوت اور ضرب المثل بن گئے۔ مختلف قبائل کے سیلاب سے بچ نکلنے والے لوگ اپنا وطن چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ غسانیوں نے اردن اور شام کا رخ کیا، اوس اور خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے، خزاعہ نے جدہ کے قریب تہامہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ ازد کا قبیلہ عمان میں جا کر آباد ہوا، لخم اور کندہ بھی نکلنے پر مجبور ہوئے، حتیٰ کہ سبا نام کی کوئی قوم دنیا میں موجود نہ رہی، صرف کہاوتوں اور افسانوں میں اس کا ذکر باقی رہ گیا۔

4 **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ** : قوم سبا پر لازم تھا کہ ان بے حساب نعمتوں کی قدر کرتے اور ان کا شکر ادا کرتے جن کا ان آیات میں ذکر ہوا، پھر جب عذاب آیا تو لازم تھا کہ گناہوں سے توبہ کرتے اور مصیبت پر صبر کرتے۔ ان کے سردار ملک کے نظام کو دوبارہ درست کرنے کی کوشش کرتے، امن بحال کرتے، پہلے کی طرح زرعی ضرورتوں اور سفری سہولتوں کا بندوبست کرتے، مگر وہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر مختلف علاقوں میں بکھر گئے اور انھوں نے نہ اللہ کے انعامات کا شکر کیا، نہ مصیبت آنے پر تائب ہوئے اور نہ صبر سے وہاں رہ کر ان کے سرداروں نے ملک کی اصلاح کی کوشش کی، بلکہ جس کا جدھر منہ آیا نکل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اور شکر لازم وملزوم ہیں۔ شکر وہی کرتا ہے جو تقدیر میں سے اپنے حصے پر صابر ہو اور صبر وہی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی قدر جانتا اور ان کا شکر ادا کرتا ہو جو اسے حاصل ہیں۔ سبا کے واقعات میں نشانیاں تو ہر شخص کے لیے ہیں، مگر ہر صبار و شکور کے لیے بہت سی نشانیاں اور عبرتیں اس لیے بتائیں کہ وہی ہیں جو اپنی مصیبتوں پر بہت صبر اور نعمتوں پر بہت شکر کرتے ہیں اور دوسروں پر آنے والی مصیبتوں اور انھیں ملنے والی نعمتوں پر ان کے رویے اور اس کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ نہ صبر کرتے ہیں، نہ شکر اور نہ ہی دوسروں کے حال سے انھیں عبرت ہوتی ہے۔

**آیت 20** **وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ......** : یعنی ابلیس نے آدم علیہ السلام کو سجدے سے انکار کے بعد جس گمان کا اظہار کیا تھا کہ تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔ (دیکھیے اعراف : ۱۷) اس ظالم نے قوم سبا کو گمراہ کر کے ان کے بارے میں اپنے اس گمان کو سچا کر دکھایا، چنانچہ وہ سب اس کے پیچھے لگ گئے، صرف مومنوں کا ایک گروہ اس سے محفوظ رہا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ سبا میں بھی ہمیشہ کچھ لوگ ایسے موجود رہے جو اللہ واحد کی عبادت پر قائم رہے اور شیطان ان پر اپنا تسلّط قائم نہ کر سکا۔

وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾

اور اس کا ان پر کوئی غلبہ نہ تھا مگر تاکہ ہم جان لیں کون ہے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس سے (الگ) جو اس کے بارے میں شک میں ہے اور تیرا رب ہر چیز پر پوری طرح نگران ہے ﴿۲۱﴾ کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے ﴿۲۲﴾

**آیت 21** ① **وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ**: یعنی ابلیس کو یہ طاقت حاصل نہ تھی کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرنا چاہے اسے زبردستی ڈنڈے کے زور سے نافرمانی کی راہ پر کھینچ کر لے جائے۔ اسے صرف یہ اختیار تھا کہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈال سکے، اسے سبز باغ دکھا کر دھوکے میں مبتلا کرے اور اس کے سامنے گناہوں کو خوش نما کر کے پیش کرے۔

② **اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ** : یعنی ابلیس کو یہ اختیار دینے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ معلوم ہو جائے کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون ہے جسے اس میں شک ہے اور سب دیکھ لیں کہ رحمان کی بات ماننے والا کون ہے اور شیطان کی پیروی کرنے والا کون، جنتی کون ہے اور جہنمی کون۔

③ **مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ** : معلوم ہوا آخرت میں شک کرنا بھی کفر ہے اور سبا والوں کی ناشکری اور سرکشی کا اصل سبب یہ تھا کہ انھیں آخرت پر یقین نہیں تھا۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ صحیح عقیدہ ہی انسان کو راہِ راست پر قائم رکھ سکتا ہے اور آخرت پر یقین ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلنے کا پابند رکھتی ہے۔

④ **وَ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ** : تیرا رب ہر چیز پر پوری طرح نگران اور نگہبان ہے، کوئی چیز اس کی حفاظت اور نگرانی سے باہر نہیں، نہ ہی شیطان اس سے زبردست ہو کر کسی کو گمراہ کر سکتا ہے، اس نے خود ہی اپنی حکمت کے تحت اسے آزمائش کے لیے اور حجت تمام کرنے کے لیے انسانوں کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا اختیار دے رکھا ہے۔

**آیت 22** ① **قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ** ...... : سورت کی ابتدا اس بات سے ہوئی کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور دنیا اور آخرت میں حمد کا سزاوار بھی وہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذکر فرمایا کہ کفار آخرت کا انکار کرتے ہیں، جب کہ وہ ضرور آئے گی۔ اس کے بعد آخرت پر ایمان رکھنے والوں اور اس کے منکروں کی اور ان کے اچھے اور برے انجام کی مثال کے طور پر داؤد و سلیمان علیہما السلام کا اور قومِ سبا کا ذکر فرمایا۔ آخرت کے بیان کے بعد یہاں سے پھر اسی

وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ

اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے، یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ

توحید کا بیان شروع ہوتا ہے جس سے سورت کا آغاز ہوا تھا۔

② **لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ** ...... : یعنی اللہ تعالیٰ تو جسے چاہتا ہے داؤد و سلیمان علیہما السلام کی طرح نواز دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قوم سبا کی طرح برباد کر دیتا ہے، کیونکہ وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا مالک ہے، اب تم اپنے بناوٹی معبودوں کو پکارو، بھلا وہ تمھاری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں، کیونکہ مدد وہ تب کریں جب ان کے پاس کوئی چیز ہو، وہ تو آسمان و زمین میں موجود ایک ذرے کے مالک بھی نہیں۔ دیکھیے سورۂ فاطر (۱۳)، مومنون (۸۸، ۸۹)، نحل (۷۳)، یونس (۱۰۶) اور سورۂ جن (۲۱، ۲۲)۔

③ **وَ مَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ** : یہ اس بات کا رد ہے کہ چلیے پورے مالک نہ سہی، ملکیت و اختیار میں ان کا کچھ حصہ ضرور ہے۔ دیکھیے سورۂ فاطر (۴۰) اور سورۂ احقاف (۴)۔

④ **وَ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ** : نہ ہی ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کا مددگار ہے جس سے کبھی اللہ تعالیٰ نے مدد لی ہو، یا اب مدد لیتا ہو۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۱۱) اور سورۂ کہف (۵۱)۔

**آیت 23** ① **وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ** : مشرکین کہتے تھے کہ ہم اپنے معبودوں کو اس لیے پکارتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے سفارش کر کے ہماری حاجت روائی اور مشکل کشائی کروا دیتے ہیں۔ (دیکھیے یونس: ۱۸۔ زمر: ۳) یہ اس کا رد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی سفارش کام نہیں آتی، ہاں، جسے وہ خود اجازت دے اور جس کے حق میں اجازت دے۔ ”لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ“ (جس کے لیے وہ اجازت دے) میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ ظاہر ہے مشرک کو تو شفاعت کرنے کی جرأت ہی نہ ہوگی، اجازت تو دور کی بات ہے اور نہ ہی کسی کو مشرک کے حق میں سفارش کی اجازت ہوگی، کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۷۲) صرف ایمان والوں کے حق میں سفارش ہوگی، مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد، حتیٰ کہ فرشتے اور رسول بھی اجازت کے بغیر سفارش نہیں کر سکیں گے۔ (دیکھیے نجم: ۲۶) سفارش تو دور کی بات ہے، وہاں اجازت کے بغیر کوئی بول بھی نہیں سکے گا۔ (دیکھیے طٰہٰ: ۱۰۹) حتیٰ کہ سید الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم بھی سفارش کے لیے جائیں گے تو سجدے میں گر جائیں گے، لمبی مدت تک تسبیح و تحمید کے بعد سر اٹھانے اور سفارش کرنے کی اجازت ملے گی تو سفارش کریں گے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں معروف ہے۔

② **حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ** ...... : ”فَزِعَ يَفْزَعُ“ (س) گھبرا جانا۔ ”فَزَّعَ يُفَزِّعُ“ (تفعیل) گھبراہٹ دور کرنا، خصوصاً جب اس کے ساتھ حرف ”عَنْ“ ہو۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس سے پہلے جملے **”وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ“** کے ساتھ اس جملے کا کیا تعلق ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ تم جن ہستیوں کو اپنا سفارشی سمجھتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ اپنے زور یا دبدبے یا اللہ کا محبوب ہونے کی وجہ سے اپنی بات منوا لیتے ہیں، ان کی کیا بساط ہے کہ اجازت کے بغیر سفارش کی

قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

**دور کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں تمھارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ کہتے ہیں حق (فرمایا) اور وہی سب سے بلند، بہت بڑا ہے ﴿۲۳﴾**

جرأت کر سکیں۔ وہاں تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کے سامنے عرشِ معلیٰ کے فرشتے اور ان کے نیچے آسمان دنیا تک کے فرشتے، جو برابر احکامِ الٰہی سنتے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ جب رب العزت کوئی وحی فرماتا ہے تو وہ سب اس کی ہیبت سے تھرتھرا اٹھتے ہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ اس ہیبت کو ان کے دلوں سے ہٹا لیتا ہے تو ہر گروہ اپنے سے اوپر والے سے پوچھتا ہے کہ رب تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟ ''**قَالُوا الْحَقَّ**'' وہ کہتے ہیں، اس نے حق فرمایا ہے۔ ''**وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ**'' اور وہی سب سے بلند اور بہت بڑا ہے۔ چنانچہ وہ فرشتے اپنے نیچے والے فرشتوں کو حق تعالیٰ کی وحی کسی کمی بیشی کے بغیر پہنچاتے ہیں۔ پھر جب مقربین ملائکہ کی یہ حالت ہے، جو وحی کے عادی بنا دیے گئے ہیں، تو مشرکین کسی اور سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا قَضَى اللّٰهُ الْأَمْرَ فِي السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَالسِّلْسِلَةِ عَلٰى صَفْوَانٍ، قَالَ عَلِيٌّ وَ قَالَ غَيْرُهُ صَفْوَانٍ يَنْفُذُهُمْ ذٰلِكَ، فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا لِلَّذِيْ قَالَ الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ، فَيَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُو السَّمْعِ، وَ مُسْتَرِقُو السَّمْعِ هٰكَذَا، وَاحِدٌ فَوْقَ آخَرَ وَ وَصَفَ سُفْيَانُ بِيَدِهِ، وَ فَرَّجَ بَيْنَ أَصَابِعِ يَدِهِ الْيُمْنٰى، نَصَبَهَا بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ فَرُبَّمَا أَدْرَكَ الشِّهَابُ الْمُسْتَمِعَ، قَبْلَ أَنْ يَرْمِيَ بِهَا إِلٰى صَاحِبِهِ، فَيُحْرِقُهُ وَ رُبَّمَا لَمْ يُدْرِكْهُ حَتّٰى يَرْمِيَ بِهَا إِلَى الَّذِيْ يَلِيْهِ إِلَى الَّذِيْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْهُ حَتّٰى يُلْقُوْهَا إِلَى الْأَرْضِ، وَ رُبَّمَا قَالَ سُفْيَانُ حَتّٰى تَنْتَهِيَ إِلَى الْأَرْضِ فَتُلْقٰى عَلٰى فَمِ السَّاحِرِ، فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ فَيُصَدَّقُ، فَيَقُوْلُوْنَ أَلَمْ يُخْبِرْنَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا يَكُوْنُ كَذَا وَكَذَا؟ فَوَجَدْنَاهُ حَقًّا، لِلْكَلِمَةِ الَّتِيْ سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ إلا من استرق السمع...... ﴾ : ٤٧٠١ ] ''جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو فرشتے اس کے فرمان کے سامنے عاجزی اختیار کرتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں۔ (انھیں اللہ کا فرمان اس طرح سنائی دیتا ہے) جیسے وہ صاف چکنے پتھر پر زنجیر کی آواز ہو، تو جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کی جاتی ہے تو وہ (آپس میں) پوچھتے ہیں: ''تمھارے رب نے کیا فرمایا؟'' وہ کہتے ہیں: ''اس نے حق فرمایا اور وہی سب سے بلند، بہت بڑا ہے۔'' اس گفتگو کو چوری سننے والے شیاطین بھی سن لیتے ہیں، جو اس طرح ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔'' حدیث کے راوی سفیان نے اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کو کنارے کے رخ کیا اور انگلیوں کو کھول دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو وہ شیطان وہ بات سن لیتا ہے اور اپنے سے نیچے والے شیطان کو بتا دیتا ہے (یہ سلسلہ نیچے تک چلتا ہے)، یہاں تک کہ سب سے نیچے والا وہ بات کسی جادوگر یا کاہن کو پہنچا دیتا ہے، پھر کبھی اس سے پہلے کہ وہ نیچے والے کو بات پہنچائے اسے آگ کا انگارا آ دبوچتا ہے اور اسے جلا دیتا ہے اور کبھی اس کے لگنے سے پہلے وہ اس بات کو آگے پہنچا دیتا ہے، تو وہ (جادوگر یا کاہن) اس کے ساتھ سو

قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ وَ اِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی ہُدًی اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۴﴾

کہہ تمھیں آسمانوں اور زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ کہہ دے اللہ۔ اور بے شک ہم یا تم ضرور ہدایت پر ہیں، یا کھلی گمراہی میں ہیں ﴿۲۴﴾

جھوٹ ملا دیتا ہے، تو (جب آسمان سے سنی ہوئی بات صحیح ہو جاتی ہے تو اس کے ماننے والوں کی طرف سے) کہا جاتا ہے کہ کیا فلاں فلاں دن اس (جادوگر یا کاہن) نے ہمیں اس طرح نہیں کہا تھا؟ تو اس ایک بات کی وجہ سے جو شیطان نے آسمان سے سنی تھی کاہن یا ساحر کی بات کو سچا سمجھ لیا جاتا ہے۔‘‘

**آیت 24** ① **قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ** : پچھلی آیت میں بیان کرنے کے بعد کہ مشرکین کے بنائے ہوئے شرکاء کائنات میں ایک ذرے کے مالک نہیں، بلکہ سب کا مالک ایک اللہ تعالیٰ ہے، اب نبی ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے اس بات کا اقرار کروائیں کہ کائنات میں ہر ایک کو رزق بھی وہ اکیلا ہی دے رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا، ان سے کہو آسمان سے بارش برسا کر، سورج، چاند اور ستاروں سے گرمی، توانائی اور روشنی بہم پہنچا کر اور تمھارے فائدے کے لیے ہر چیز مسخر کر کے زمین سے تمھارے لیے اور تمھارے چوپاؤں کے لیے خوراک اور زندگی کی ہر ضرورت کون مہیا کرتا ہے؟ یہ سب دل سے مانتے ہیں کہ وہ اللہ ہی ہے، اس لیے اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے، مگر ان کے لیے اقرار بھی مشکل ہے، کیونکہ اس سے ان کے شرک کی عمارت ڈھے جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کا جواز پیش نہیں کر سکتے کہ رزق تو اللہ دے اور عبادت کسی اور کی ہو، اس لیے لامحالہ وہ خاموشی اختیار کریں گے۔ تو اس موقع پر آپ خود اعلان کریں کہ وہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

② **وَ اِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی ہُدًی ......** : یعنی ہم دو فریق بن چکے ہیں، ایک وہ جو آسمان و زمین میں ایک اللہ ہی کو رزاق مانتے ہیں اور اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس کے ساتھ ایسی ہستیوں کو شریک بناتے ہیں جو نہ کائنات کے ایک ذرے کے مالک ہیں، نہ کسی کا نفع و نقصان یا رزق ان کے اختیار میں ہے، اور ہم دونوں میں سے ایک گروہ یا ہدایت پر ہے یا واضح گمراہی میں مبتلا ہے، تم خود فیصلہ کر لو کہ ہدایت پر کون ہے اور گمراہ کون؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس بات میں کوئی شک ہے کہ ایک رب کو رزاق مان کر اسی کی عبادت کرنے والے حق پر ہیں اور ان کے مخالف باطل پر، بلکہ نہایت حکیمانہ طریقے سے دونوں چیزیں مخاطب کے سامنے رکھ کر خود اس سے انصاف طلب کیا گیا ہے، کیونکہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں کہ وہ کہے دونوں گمراہ ہیں، نہ یہ کہ دونوں حق پر ہیں۔ لامحالہ اسے ماننا پڑے گا کہ ہدایت پر وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کا خالق و رازق ماننے کے بعد عبادت بھی اسی کی کرتا ہے اور وہ شخص یقیناً کھلی گمراہی میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو خالق و رازق تو مانتا ہے، مگر عبادت دوسروں کی کرتا ہے، لہٰذا آپ اپنے منہ سے کہنے کے بجائے کہ مشرک باطل پر ہے، اسے فیصلے کا موقع دے کر اس مقام پر لے آئیں کہ وہ خود کہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرنے والا حق پر ہے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والا باطل پر ہے۔

③ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ جو جہاں لگا ہوا ہے ٹھیک ہے، یا اپنی جگہ سب لوگ ہی درست ہیں، بلکہ حق

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَ لَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ ﴿۲۶﴾

**کہہ دے نہ تم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا جو ہم نے جرم کیا اور نہ ہم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا جو تم کرتے ہو ﴿۲۵﴾ کہہ ہم سب کو ہمارا رب جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہی خوب فیصلہ کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶﴾**

---

ایک ہے اور جو حق پر نہیں وہ باطل پر ہے۔ باہم متضاد باتیں دونوں حق نہیں ہو سکتیں، مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی حق ہو کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور یہ بھی حق ہو کہ ہر نشہ آور چیز حرام نہیں۔ نہ ایک مسئلے میں چار متضاد مذہب حق ہو سکتے ہیں۔

**آیت 25** **قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا** ...... : یہ بھی بحث و مناظرہ میں حکمت و شائستگی برتنے کی تعلیم ہے، یعنی باوجود یہ کہ مسلمان حق پر ہیں اور ان کے اعمال نیک ہیں، مگر انھیں چاہیے کہ مخاطب کو یوں کہہ کر غور و فکر کی دعوت دیں کہ اپنے صغیرہ گناہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے لیے جرم کا لفظ استعمال کریں اور ان کے کفر و شرک اور کبیرہ گناہوں کے لیے لفظ ''عمل'' استعمال کریں کہ تم سے اس کے بارے میں سوال نہیں ہوگا جو ہم نے جرم کیے اور ہم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو عمل تم کر رہے ہو۔ اپنے لیے ماضی کا لفظ ''**اَجْرَمْنَا**'' استعمال کرنے کا حکم دیا اور ان کے لیے مضارع کا لفظ ''**تَعْمَلُوْنَ**'' استعمال کرنے کا حکم دیا، یعنی فرض کرو ہم مجرم ہیں تو اس کا خمیازہ ہم بھگتیں گے، تم سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی اور تمھارا کوئی عمل گرفت کے قابل ہوا تو اس کی باز پرس تم سے ہوگی، ہم سے نہیں۔ لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کو اپنا فائدہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ کہیں ہم غلط راستے پر تو نہیں جا رہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، اس کا مطلب ان سے براءت کا اظہار ہے، یعنی نہ تم ہمارے ہو نہ ہم تمھارے، بلکہ ہم تمھیں اللہ تعالیٰ کی طرف، اس کی توحید اور اس اکیلے کی عبادت کی طرف دعوت دیتے ہیں، اگر تم قبول کر لو تو تم ہمارے اور ہم تمھارے ہو گئے اور اگر نہ مانو تو ہم تم سے بری ہیں اور تم ہم سے بری ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ یونس : ٤١ ] ''اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۚ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ؕ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ ﴾ [ الکافرون : ۱ تا ٦ ] ''کہہ دے اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔''

**آیت 26** **قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ** ...... : عبد الرحمان کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اور اگر تم لوگ یہ

قُلۡ اَرُوۡنِیَ الَّذِیۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلۡ هُوَ اللّٰهُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ﴿۲۷﴾ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾

**کہہ دے مجھے وہ لوگ دکھاؤ جنھیں تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ ملایا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہی اللہ سب پر غالب، بڑی حکمت والا ہے ﴿۲۷﴾ اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۲۸﴾**

سمجھتے ہو کہ آخرت کا اور جواب دہی کا تصور ہی غلط ہے تو یقین جانو کہ جو اللہ ہم سب کو عدم سے وجود میں لایا ہے، پھر ہم سب کو دوبارہ مرنے کے بعد زندہ کر کے اکٹھا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے، آج تم اپنے آپ کو درست سمجھتے ہو اور ہم اپنے آپ کو درست سمجھتے ہیں، لیکن اس دن اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان اس طرح انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے گا جس کی تمھیں بھی ٹھیک سمجھ آ جائے گی اور اس کا فیصلہ اس لحاظ سے درست ہو گا کہ وہ ہم سب کا خالق ہے اور خالق کو اپنی بنائی ہوئی چیز کی جس قدر سمجھ ہو سکتی ہے دوسروں کو نہیں ہو سکتی۔ وہ تو تمھارے اور ہمارے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے، لہٰذا اس کے فیصلے پر کسی غلطی یا زیادتی کا امکان نہیں ہو سکتا۔‘‘

**آیت 27** ① **قُلۡ اَرُوۡنِیَ الَّذِیۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِهٖ شُرَكَآءَ** : یعنی اس سے پہلے کہ آخرت میں پہنچ کر ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ ہو، تم مجھے یہیں بتاؤ کہ تمھارے ان معبودوں میں کون سی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے تم انھیں اللہ کا شریک یا اپنا معبود سمجھ رہے ہو اور ان کی حمایت پر بھروسا کر کے اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو رہے ہو۔

② **كَلَّا ؕ بَلۡ هُوَ اللّٰهُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ** : نہیں، یہ ہرگز اس کے شریک نہیں ہو سکتے، بلکہ عبادت کا حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہے، جو سب پر غالب اور کمال حکمت والا ہے، جب کہ یہ بے چارے نہ عزیز ہیں نہ حکیم، ان کے پاس بندگی و بے چارگی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

**آیت 28** ① **وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ** : ’’**كَآفَّةً**‘‘ بمعنی ’’عَامَّةً‘‘ ہے، یہ ’’النَّاسِ‘‘ سے حال ہے، یعنی ہم نے تجھے نہیں بھیجا، مگر تمام لوگوں کی طرف۔ آخرت اور توحید کے بیان کے بعد نبی کریم ﷺ کی رسالت کا بیان فرمایا۔ داؤد و سلیمان علیہما السلام کو نبوت کے ساتھ ایسی بادشاہت عطا ہوئی جو ان کا خاصہ تھی اور نبی کریم ﷺ کو ایسی رسالت عطا ہوئی جو آپ ﷺ کے سوا کسی نبی کو عطا نہیں ہوئی۔ وہ یہ کہ پہلے تمام انبیاء صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور ان کی دعوت محدود وقت تک کے لوگوں کے لیے ہوتی تھی، جبکہ آپ ﷺ کو روئے زمین کی تمام اقوام اور سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا اور آپ ﷺ کی دعوت قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۸)، انبیاء (۱۰۷) اور سورۂ فرقان (۱) کی تفسیر۔

② ’’**كَآفَّةً**‘‘ کا ایک اور معنی بھی کیا گیا ہے کہ ’’كَفَّ يَكُفُّ كَفًّا‘‘ (ن) کا معنی روکنا ہے اور ’’**كَآفَّةً**‘‘ میں تاء تانیث کی

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّ لَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ۞ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ

**اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ ۲۹ کہہ تمھارے لیے ایک دن کا طے شدہ وعدہ ہے، جس سے تم نہ ایک گھڑی پیچھے رہو گے اور نہ آگے بڑھو گے ۳۰ اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا ہم ہرگز نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس پر جو اس سے پہلے ہے، اور کاش! تو دیکھے جب یہ ظالم اپنے رب کے پاس**

---

نہیں، بلکہ مبالغہ کی ہے، جیسا کہ "عَلَّامَةٌ" اور "رَاوِيَةٌ" میں ہے، بہت روکنے والا، یعنی ہم نے تجھے لوگوں کو (ضلالت سے) بہت روکنے والا ہی بنا کر بھیجا ہے۔ یہ معنی بھی درست ہے۔

③ **بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا** : یعنی آپ کی دعوت میں بشارت و نذارت دونوں جمع ہیں، اطاعت کرنے والوں کے لیے خوش خبری دینا اور نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانا۔

④ **وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ** : یعنی اکثر لوگ آپ کی قدر و منزلت نہیں جانتے، انھیں احساس نہیں کہ کیسی عظیم الشان ہستی کی بعثت سے انھیں نوازا گیا ہے، اس لیے جہل کی وجہ سے وہ آپ کی مخالفت اور عداوت پر کمر بستہ ہیں۔

**آیت 29** **وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ** ...... : یعنی جس وقت کے متعلق تم نے ابھی کہا ہے کہ "ہم سب کو ہمارا رب جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا" وہ وقت آخر کب آئے گا؟ ان کے پوچھنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس وقت کا علم ہونے پر وہ اس کے لیے تیاری کرنا چاہتے تھے، بلکہ یہ کہہ کر وہ قیامت کو جھٹلا رہے تھے اور اس کا مذاق اڑا رہے تھے، کیونکہ آخرت پر ایمان رکھنے والے اس کے جلدی لانے کا مطالبہ نہیں کیا کرتے، بلکہ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۱۸)۔

**آیت 30** **قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً** ...... : یعنی تمھارے لیے اس کا ایک وقت مقرر کیا گیا ہے جس سے تم نہ ایک گھڑی پیچھے رہو گے کہ تمھیں توبہ اور رجوع کی مہلت ملے، نہ ایک گھڑی آگے ہو گے کہ مقرر وقت سے پہلے عذاب آ جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے جتنی مہلت طے کر رکھی ہے وہ پوری ہونے کے بعد ہی عذاب آئے گا، خواہ تم کتنی ہی جلدی مچاتے رہو۔ خلاصہ یہ کہ یہ مت پوچھو کہ وہ وقت کب آئے گا، بلکہ اس کے لیے تیاری کرو۔ مزید دیکھیے سورۂ یونس (۴۹)۔

**آیت 31** ① **وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ** ...... : نبی ﷺ کفار مکہ سے توحید، رسالت اور آخرت پر بات کرتے ہوئے کبھی اپنی وحی کی تائید کے طور پر تورات و انجیل کا ذکر فرماتے کہ قرآن کی طرح ان میں بھی توحید اور آخرت

الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

کھڑے کیے ہوئے ہوں گے، ان میں سے ایک دوسرے کی بات رد کر رہا ہوگا، جو لوگ کمزور سمجھے گئے تھے ان لوگوں سے جو بڑے بنے تھے، کہہ رہے ہوں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لانے والے ہوتے ﴿۳۱﴾ وہ لوگ جو بڑے بنے تھے، ان لوگوں سے جو کمزور سمجھے گئے، کہیں گے کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا، اس کے بعد کہ وہ تمھارے پاس آئی؟ بلکہ تم مجرم تھے ﴿۳۲﴾

---

کا ذکر ہے، تو کفارِ مکہ کبر و عناد میں آ کر کہتے کہ نہ ہم اس قرآن کو مانیں گے، نہ اس سے پہلی کسی کتاب کو۔ قرآن مجید نے ان کی اس بات کے جواب یا اس کی تردید کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، کیونکہ انھوں نے بات ہی ایسی کی جس کا نتیجہ پہلے تمام پیغمبروں کا انکار تھا، جو واضح طور پر غلط تھا اور انھوں نے یہ بات محض ضد میں آ کر کہی تھی، ورنہ وہ پہلے پیغمبروں اور ان کی کتابوں کو جانتے تھے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ انھوں نے کبھی نبی ﷺ سے موسیٰ علیہ السلام جیسے معجزے لانے کا مطالبہ کیا، جیسا کہ سورۂ قصص میں ہے: ﴿لَوْ لَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى﴾ [ القصص : ٤٨ ] ''اسے اس جیسی چیزیں کیوں نہ دی گئیں جو موسیٰ کو دی گئیں؟'' کبھی تورات کی طرح لکھی ہوئی کتاب لانے کا مطالبہ کیا، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ﴾ [ بني إسرائيل : ٩٣ ] ''اور ہم تیرے چڑھنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، یہاں تک کہ تو ہم پر کوئی کتاب اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔'' اگر پہلے کسی نبی یا اس کی شریعت یا کتاب کو مانتے ہی نہ تھے تو ان مطالبوں کا کیا مطلب؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کی تردید کے بجائے قیامت کے دن ان کے ہونے والے برے حال کا ذکر فرمایا، جس قیامت کا وہ شدت سے انکار کرتے اور مذاق اڑاتے تھے۔

**2** ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ...... : ''رَجَعَ يَرْجِعُ'' (ض) لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی، لوٹنا اور لوٹانا۔ یہاں لوٹانا مراد ہے۔ ''الظّٰلِمُوْنَ'' ظالم سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے، الف لام کی وجہ سے ''یہ ظالم'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اپنی گمراہی کا الزام دوسروں پر دھر رہا ہوگا، جیسا کہ عموماً ناکامی کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ جہنم میں داخلے سے پہلے ہوگا، تاہم جہنم میں داخلے کے بعد بھی ان کا یہ جھگڑا جاری رہے گا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۳۸، ۳۹)، ابراہیم (۲۱)، قصص (۶۳)، احزاب (۶۶ تا ۶۸)، مومن (۴۷، ۴۸)، ص (۵۵ تا ۶۱) بقرہ (۱۶۵ تا ۱۶۷) اور حم السجدہ (۲۹)۔

**آیت 32** ﴿بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ﴾: بلکہ تم خود مجرم تھے جو عقل اور سمجھ رکھنے کے باوجود محض دنیا کے لالچ میں ہمارے پیچھے

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور وہ لوگ جو کمزور سمجھے گئے، ان لوگوں سے جو بڑے بنے تھے، کہیں گے بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چال بازی نے (ہمیں روکا) جب تم ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں۔ اور وہ ندامت کو چھپائیں گے جب عذاب دیکھیں گے اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں جنھوں نے کفر کیا، طوق ڈال دیں گے۔ انھیں بدلا نہیں دیا جائے گا مگر اسی کا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۳۳﴾ اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے خوش حال لوگوں نے کہا بے شک ہم اس چیز کے جو دے کر تم بھیجے گئے ہو، منکر ہیں ﴿۳۴﴾

---

چلتے رہے اور ہدایت قبول کرنے سے انکار کرتے رہے۔

**آیت 33** ① **بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ** ...... : "أَيْ بَلْ صَدَّنَا عَنِ الْهُدٰى مَكْرُكُمْ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" یعنی کمزور لوگ ان بڑوں سے کہیں گے کہ صرف یہی نہیں کہ ہم مجرم تھے اور تمھارا ہمیں ہدایت سے روکنے میں کوئی دخل نہ تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمھاری دن رات کی تدبیروں اور سازشوں نے ہمیں راہِ راست سے روکے رکھا۔ جب تم ہمیں اللہ کے ساتھ کفر کرنے اور اس کے ساتھ شریک بنانے کا حکم دیا کرتے تھے۔

② **وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ** : یعنی دونوں فریق ایک دوسرے پر الزام تراشی کریں گے، مگر دونوں ہی اپنے اپنے کفر پر نادم ہوں گے، لیکن اپنی پشیمانی اور ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔

③ **وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** : آپس کی بحث سے دونوں فریقوں کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں ہی مجرم ہیں اور ان کی یہ بحث لاحاصل ہے۔ لہٰذا ہم دونوں کو ایک جیسی سزا دیں گے، ان کے گلوں میں طوق اور پاؤں میں لوہے کی زنجیریں ڈال کر انھیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

④ **هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** : یعنی یہ عذاب ان کے اپنے اعمال ہی کی جزا ہو گی۔

**آیت 34** **وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ** ......: "تَرَفٌ" خوش حالی۔ "مُتْرَفُوْنَ" اسم مفعول ہے، وہ لوگ جنھیں خوش حالی عطا کی گئی۔ خوش حالی عطا فرمانے والا اللہ تعالیٰ تھا، جیسا کہ سورۂ مومنون میں فرمایا: ﴿ وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۳۳ ] "اور اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی ملاقات کو

وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع ۱۰

**اور انھوں نے کہا ہم اموال و اولاد میں زیادہ ہیں اور ہم ہرگز عذاب دیے جانے والے نہیں ہیں ﴿۳۵﴾ کہہ دے بے شک میرا رب رزق فراخ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۳۶﴾**

جھٹلایا اور ہم نے انھیں دنیا کی زندگی میں خوش حال رکھا تھا، کہا یہ نہیں ہے مگر تمھارے جیسا ایک بشر، جو اس میں سے کھاتا ہے جس میں سے تم کھاتے ہو اور اس میں سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔'' اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ ان کی مخالفت پر مغموم نہ ہوں، آپ سے پہلے ہر نبی کی مخالفت اور اس کا مقابلہ مال و ثروت اور جاہ و حشمت والے لوگوں ہی نے کیا اور شروع میں اس کا ساتھ مستضعفین، یعنی کمزور اور غریب لوگوں ہی نے دیا۔ یہی بات ہرقل نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے اس وقت کہی جب اس کے دریافت کرنے پر ابوسفیان نے بتایا کہ آپ ﷺ کی پیروی کرنے والے غریب اور معمولی قسم کے لوگ ہیں۔ [ دیکھیے بخاري : ۷ ] قرآن مجید میں یہ بات بہت سے مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ انبیاء ﷩ کی دعوت کی مخالفت سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خوش حال اور متکبر لوگوں ہی نے کی ہے۔ مثلاً دیکھیے سورۂ انعام (۱۲۳)، اعراف (۶۰، ۶۶، ۷۵، ۸۸، ۹۰)، ہود (۲۷)، بنی اسرائیل (۱۶) اور سورۂ مومنون (۲۴، ۳۳ تا ۳۸، ۴۶، ۴۷)۔

**آیت 35** وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ...... : یعنی انھوں نے ایک تو اپنے اموال و اولاد کی کثرت پر فخر کیا اور انبیاء اور ان کے متبعین کی تحقیر کی، جیسا کہ فرعون نے اپنے آپ کو مصر کا بادشاہ ہونے کی وجہ سے بہتر اور موسیٰ علیہ السلام کو مہین (حقیر) کہا تھا۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۵۱ تا ۵۴) '' وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ '' دوسرے انھوں نے اپنی خوش حالی کو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم پر ناراض ہوتا تو ہمیں تم سے زیادہ مال و اولاد کیوں دیتا، یہ دلیل ہے کہ ہم پر عذاب ہرگز نہیں آئے گا۔ ( بِمُعَذَّبِيْنَ میں باء نفی کی تاکید کے لیے ہے ) بلکہ اگر قیامت قائم ہوئی تو وہاں بھی ہم ہی کو یہ نعمتیں ملیں گی۔ دیکھیے سورۂ مریم (۷۷ تا ۸۰) اور سورۂ مدثر (۱۱)۔

**آیت 36** قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ...... : یعنی دنیا کی آسودگی اور خوش حالی اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس کی حکمت و مشیت یعنی بندوں کی آزمائش ہے۔ وہ بعض اوقات ناراض ہونے کے باوجود آزمائش کے لیے اور حجت تمام کرنے کے لیے کافر و فاسق کا رزق فراخ کر دیتا ہے اور کبھی آزمائش کے لیے اور گناہوں کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے مومن کا رزق تنگ کر دیتا ہے اور کبھی اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر کافر کا رزق تنگ اور مومن کا فراخ کر دیتا ہے، تا کہ آزمائش قائم رہے اور دنیا کی خوش حالی دیکھ کر سب لوگ کفر ہی کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ (دیکھیے زخرف : ۳۳ تا ۳۵) لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے اور مال و اولاد کی کثرت کو اللہ تعالیٰ کے خوش ہونے کی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔

وَ مَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ؗ فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور نہ تمھارے مال ایسے ہیں اور نہ تمھاری اولاد جو تمھیں ہمارے ہاں قرب میں نزدیک کر دیں، مگر جو شخص ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے دگنا بدلا ہے، اس کے عوض جو انھوں نے عمل کیا اور وہ بالا خانوں میں بے خوف ہوں گے ﴿۳۷﴾ اور جو لوگ ہماری آیات کے بارے میں کوشش کرتے ہیں، اس حال میں کہ [illegible] والے ہیں، وہی لوگ عذاب میں حاضر کیے جانے والے ہیں ﴿۳۸﴾

**آیت 37** ① **وَ مَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ** ...... : اس جملے کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ مال و اولاد ایسی چیزیں نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب کا ذریعہ بن سکیں، بلکہ یہی چیزیں اکثر انسانوں کے لیے تقرب کے بجائے الٹا اس کے غضب اور غصے کا سبب بن جاتی ہیں اور اسے لے ڈوبتی ہیں۔ اس کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب کا معیار ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں۔ ''**اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا**'' کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ بھی لائے تو یہی مال اور اولاد اس کے لیے اللہ کے ہاں تقرب کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ وہ یوں کہ اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہے اور اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کر کے اسے اللہ کا فرماں بردار بنا دے۔ (تیسیر القرآن)

② **فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا** : ''**الضِّعْفِ**'' ''نِصْفٌ'' کی ضد ہے، یعنی کسی چیز کی مثل اتنا ہی اور، پھر یہی لفظ کئی گنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جو دس گنا بھی ہو سکتا ہے، سات سو گنا بھی، بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۱)۔

③ **وَ هُمْ فِي الْغُرُفٰتِ** : ''اَلْغُرْفَةُ'' بلند و بالا عمارت، بالا خانہ۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ كَمَا يَتَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الْغَابِرَ فِي الْأُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوِ الْمَغْرِبِ، لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ، قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَاءِ لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُهُمْ، قَالَ بَلٰى، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! رِجَالٌ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ صَدَّقُوا الْمُرْسَلِيْنَ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة ...... : ۳۲۵۶ ]

''جنتی لوگ اپنے سے اوپر بالا خانوں میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے وہ اس ستارے کو دیکھتے ہیں جو آسمان کے کنارے پر مشرق یا مغرب میں گزر رہا ہوتا ہے، کیونکہ ان میں سے بعض بعض سے افضل ہو گا۔'' لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ تو انبیاء کے گھر ہوں گے، جہاں ان کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکے گا؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ لوگ (وہاں پہنچیں گے) جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور انھوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔''

④ **اٰمِنُوْنَ** : بے خوف اس لیے ہوں گے کہ جنت کی نعمتیں ابدی اور دائمی ہوں گی اور ان کا دنیا والا خوف دور ہو جائے گا۔

**آیت 38** **وَ الَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا** ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حج (۵۱) اور سورۂ سبا (۵) ''**مُحْضَرُوْنَ**''

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۳۹

کہہ دے بے شک میرا رب رزق فراخ کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اور اس کے لیے تنگ کر دیتا ہے اور تم جو بھی چیز خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دیتا ہے اور وہ سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے ۝۳۹

یعنی کبھی تھوڑی دیر کے لیے بھی اس سے غائب نہیں ہو سکیں گے، ہمیشہ اس میں حاضر رکھے جائیں گے۔

**آیت 39** ❶ **قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ** : یہ الفاظ دوبارہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ دونوں جگہ مقصد مختلف ہے۔ پہلی آیت میں کفار کی بات کا رد مقصود ہے اور یہاں اہلِ ایمان کو خرچ کرنے کی ترغیب مقصود ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ''**يَقْدِرُ**'' کے ساتھ ''**لَهٗ**'' کا اضافہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور اسی کا رزق جب چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص اگر یہ سمجھ کر بخل کرے اور اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرے کہ خرچ کرنے سے میرا رزق تنگ ہو جائے گا تو یہ اس کی بھول ہے، رزق کی تنگی یا فراخی کا تعلق اس کے بخل یا سخاوت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (( أَنْفِقْ بِلَالُ! وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا )) [ سلسلة الأحاديث الصحيحة: ٦/١٦٠، ح: ٢٦٦١۔ مسند البزار: ٤/٢٠٤، ح: ١٣٦٦ ] ''بلال! خرچ کر اور عرش والے کی طرف سے فقیری سے مت ڈر۔''

❷ ''**يَقْدِرُ لَهٗ**'' (اس کے لیے تنگ کر دیتا ہے) میں ''عَلَيْهِ'' کے بجائے ''**لَهٗ**'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کا رزق تنگ بھی اس کے فائدے ہی کے لیے کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ پر قناعت کرنا اور اس پر راضی ہو جانا بہت بڑی سعادت ہے اور اس میں حساب بھی کم ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَ رُزِقَ كَفَافًا وَ قَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ )) [ مسلم، الزکاة، باب في الکفاف و القناعة : ١٠٥٤ ] ''یقیناً وہ شخص کامیاب ہو گیا جو اسلام لایا اور اسے گزارے کے مطابق رزق دیا گیا اور اللہ نے اسے جو کچھ دیا اس پر قانع کر دیا۔''

❸ **وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ** : یعنی اللہ کی راہ میں اس کے حکم کے مطابق زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم جو چیز بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دنیا میں اور عطا فرمائے گا اور آخرت کے اجر کا تو کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا اللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَ يَقُولُ الْآخَرُ اللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا )) [ بخاري، الزکاة، باب قول اللّٰه تعالٰی : ﴿ فأما من أعطى ...... ﴾ : ١٤٤٢ ] ''جس دن بھی بندے صبح کرتے ہیں، اس میں دو فرشتے اترتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کی جگہ اور دے اور دوسرا کہتا ہے، اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے مال کو تباہ کر۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: (( يَا ابْنَ آدَمَ! أَنْفِقْ أُنْفِقْ عَلَيْكَ، وَ قَالَ يَمِينُ اللّٰهِ مَلْأَى

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کیا یہ لوگ تمھاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟ ﴿۴۰﴾

سَحَّاءُ لَا يَغِيْضُهَا شَيْءٌ، اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ ›› [ مسلم، الزكاة، باب الحث على النفقة...... : ٩٩٣۔ بخاري : ٤٦٨٤ ] ''اے آدم کے بیٹے! تو خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا۔'' اور فرمایا: ''اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے، بہت برسنے والا ہے، دن رات خرچ کرنے سے اس میں کوئی چیز کمی نہیں لاتی۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ‹‹ مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَّالٍ وَ مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ ›› [ مسلم، البر و الصلة، باب استحباب العفو والتواضع : ٢٥٨٨ ] ''کوئی صدقہ مال میں کمی نہیں لاتا اور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت ہی میں اضافہ فرماتا ہے اور اللہ کے لیے کوئی نیچا نہیں ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ اسے اونچا کر دیتا ہے۔''

4 وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: اس لیے کہ دوسرے تمام دینے والے اسی کے دیے میں سے دیتے ہیں، وہ اکیلا ہے جو ہر چیز اپنے پاس سے دیتا ہے۔

**آیت 40** 1 وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ ......: اس کا عطف ''وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ '' پر ہے۔ پہلے مستکبرین کے مستضعفین سے بری ہونے کا ذکر فرما کر اس دن ان کی بری حالت کا نقشہ کھینچا ہے، اب فرشتوں کے ان سے بری ہونے کا ذکر فرما کر اس دن ان کے ذلیل وخوار اور بے یار و مددگار رہنے کا ذکر فرمایا۔

2 مفسر عبدالرحمان کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مشرکین خواہ دور نبوی کے ہوں یا اس سے پہلے دور کے یا مابعد کے دور کے، وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کو پوجتے ہیں، یا ان قبروں کو پوجتے ہیں، بلکہ ان کے اعتقاد کے پیچھے ان کا ایک پورا گھڑا ہوا فلسفہ ہوتا ہے۔ مثلاً سورج کی پوجا کرنے والے پہلے سورج کی روح کا ایک خیالی نقشہ یا تصویر قائم کرتے ہیں، پھر اس خیالی تصویر کے مطابق اس کا مجسمہ بناتے ہیں، پھر یہ سمجھتے ہیں کہ اس مجسمے کے ساتھ سورج کی روح کا ہر وقت تعلق قائم رہتا ہے اور ہم جو سورج کے مجسمے کو پوجتے ہیں تو دراصل یہ اس بت کی نہیں بلکہ ہم سورج دیوتا کی عبادت کرتے ہیں۔ مشرکین نے اس طرح کی کئی دیویاں اور دیوتا بنا رکھے تھے، پھر یہ مجسمے مظاہر قدرت ہی کے نہیں بلکہ بعض صفات کے بھی ہوتے تھے اور ان صفات کو بھی سیاروں سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً فلاں علم کی دیوی، فلاں دولت کی دیوی ہے وغیرہ وغیرہ، پھر کچھ مشرک فرشتوں کے خیالی مجسمے بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ مشرکین عرب کی ایک کثیر تعداد ایسی ہی تھی جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور لات، منات اور عزیٰ کے مجسمے بنا کر ان کی عبادت کرتے، تو سمجھتے یہی تھے کہ ہم ان بتوں کی نہیں بلکہ ان فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں جن کی ارواح ان مجسّموں یا بتوں سے وابستہ رہتی ہیں۔ اسی طرح قبر پرست بھی یہ سمجھتے تھے کہ ہم اس قبر کے پرستار نہیں، بلکہ ہماری سب نیاز مندیاں اور نذریں نیازیں تو صاحب قبر کے لیے ہیں، جس کی روح اس کی قبر کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ ان تمام معبودوں سے چونکہ فرشتے ہی برتر مخلوق ہیں، لہٰذا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

وہ کہیں گے تو پاک ہے، تو ہمارا دوست ہے نہ کہ وہ، بلکہ وہ جنّوں کی عبادت کیا کرتے تھے، ان کے اکثر انھی پر ایمان رکھنے والے تھے ﴿۴۱﴾ سو آج تمھارا کوئی کسی کے لیے نہ نفع کا مالک ہے اور نہ نقصان کا اور ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنھوں نے ظلم کیا چکھو اس آگ کا عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ﴿۴۲﴾

---

شرمندہ کرنے اور انھیں حسرت دلانے کے لیے انھی سے سوال کرے گا کہ یہ لوگ تمھاری ہی عبادت کرتے تھے؟ کیا تم نے انھیں ایسا کہا تھا کہ تمھاری عبادت کیا کریں، یا کچھ اس قسم کی آرزو تم نے کی تھی؟ اور یہ سوال اگرچہ فرشتوں سے ہوگا مگر مقصد ان کی پوجا کرنے والوں کو رسوا اور لاجواب کرنا ہوگا۔‘‘

③ قیامت کے روز یہ سوال فرشتوں ہی سے نہیں ہوگا بلکہ ان تمام ہستیوں سے کیا جائے گا جن کی دنیا میں عبادت ہوتی تھی۔ سورۂ فرقان میں ہے: ﴿ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴾ [ الفرقان : ۱۷ ] ’’اور جس دن وہ انھیں اور جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے، اکٹھا کرے گا، پھر کہے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا، یا وہ خود راستے سے بھٹک گئے تھے؟‘‘ اور سورۂ مائدہ میں ہے: ﴿ وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [ المائدۃ : ۱۱۶ ] ’’اور جب اللہ فرمائے گا، اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو؟‘‘

**آیت 41** ① قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ : یعنی فرشتے بھی عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کر کے اپنی صفائی پیش کریں گے اور کہیں گے، تو اس سے پاک ہے کہ تیرا کوئی شریک ہو، ہم تو تیرے بندے ہیں اور تو ہی ہمارا ولی ہے، تجھ ہی سے ہماری دوستی ہے، ان سے ہماری کوئی دوستی ہے نہ کوئی تعلق۔

② بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ…… : یعنی گو یہ بظاہر ہمارے بت بنا کر ہماری عبادت کرتے تھے، لیکن حقیقت میں یہ شیاطین کی بندگی کرتے تھے، کیونکہ انھوں نے ہی ان کو یہ راستہ دکھایا تھا کہ تجھے چھوڑ کر دوسروں کو اپنا معبود سمجھیں، ان کے آگے نذر و نیاز پیش کریں اور اپنی حاجت روائی کے لیے انھیں پکاریں۔ ’’الْجِنَّ‘‘ سے مراد شیاطین ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴾ [ النساء : ۱۱۷ ] ’’وہ اس کے سوا نہیں پکارتے مگر مؤنثوں کو اور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو۔‘‘

**آیت 42** ① فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّ لَا ضَرًّا : یہ فرشتوں اور ان کی عبادت کرنے والوں دونوں

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾

اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں یہ نہیں ہے مگر ایک آدمی، جو چاہتا ہے کہ تمھیں اس سے روک دے جس کی عبادت تمھارے باپ دادا کرتے تھے اور کہتے ہیں یہ نہیں ہے مگر ایک گھڑا ہوا جھوٹ۔ اور ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا، حق کے بارے میں کہا، جب وہ ان کے پاس آیا، یہ نہیں ہے مگر کھلا جادو ﴿۴۳﴾

سے خطاب ہے۔ یعنی دنیا میں یہ لوگ یہ سمجھ کر تمھاری عبادت کرتے تھے کہ تم انھیں کوئی فائدہ پہنچاؤ گے، یا نقصان سے بچا لو گے اور اللہ کے عذاب سے محفوظ رکھو گے، جیسے آج کل پیر پرستوں اور قبر پرستوں کا حال ہے، مگر آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچانے کا اختیار رکھتا ہے نہ نقصان سے بچانے کا۔ عابد و معبود دونوں عاجز ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ﴾ [الحج : ۷۳] ''کمزور ہے مانگنے والا اور وہ بھی جس سے مانگا گیا۔''

❷ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ ...... : ظالموں سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے اور مشرک سب سے بڑے ظالم ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۸۲) اور سورۂ لقمان (۱۳)۔

**آیت 43** ❶ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا ...... : یہ ذکر کرنے کے بعد کہ قیامت کے دن مشرکین جہنم میں جائیں گے اور ان کے بنائے ہوئے معبود ان کے کچھ کام نہ آئیں گے، اب ان کے اس عذاب کا حق دار ہونے کی وجہ بیان فرمائی، جو یہ تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یا اسلام کے کسی داعی نے ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھیں تو انھوں نے وہ الفاظ کہے جو اس آیت میں ذکر ہوئے ہیں۔

❷ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ ...... : یعنی یہ شخص تمھیں ان ہستیوں کی عبادت سے روکنا چاہتا ہے جن کی عبادت تمھارے آبا و اجداد مدت سے کرتے چلے آئے ہیں۔ مقصد ان کا لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے والے کے خلاف بھڑکانا تھا، یہ کہہ کر کہ یہ شخص تمھیں تمھارے آباء کے دین سے روکنا چاہتا ہے، تو کیا تمھارے آبا و اجداد کوئی پاگل تھے جو ان کی عبادت کرتے تھے۔ پھر یہ نہیں کہ انھوں نے ایک آدھ دفعہ یہ کام کیا ہو، بلکہ ''كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ'' وہ مدت سے ان کی عبادت کرتے چلے آئے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ان کے شرک کے حق ہونے کی واحد دلیل آبا و اجداد کی تقلید تھی، جو سراسر جہل ہے، جس کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔

❸ وَ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى : یہاں ''هٰذَاۤ'' سے مراد قرآن ہے۔ لفظ ''اِفْكٌ مُّفْتَرًى'' میں قرآن کے متعلق انھوں نے دو باتیں کہیں، ایک تو یہ کہ فی نفسہٖ یہ جھوٹ ہے، دوسری یہ کہ اسے گھڑ کر اللہ کے ذمے لگا دیا گیا ہے۔

❹ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ ...... : کفار کی پریشان گوئی دیکھیے کہ کبھی اسے جھوٹ کہتے ہیں اور کبھی اسے واضح جادو کہتے ہیں، اور یہ جو فرمایا کہ جب ان کے پاس حق آ گیا تو انھوں نے اسے واضح جادو کہا، تو مراد اس سے یہ ہے کہ اگر انھیں حق کا علم

وَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَ مَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾ وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ

حالانکہ ہم نے نہ انھیں کوئی کتابیں دیں جنھیں وہ پڑھتے ہوں اور نہ ان کی طرف تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا بھیجا ﴿۴۴﴾ اور ان لوگوں نے (بھی) جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے اور یہ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے جو ہم نے انھیں دیا تھا، پس انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب کیسا تھا؟ ﴿۴۵﴾ کہہ دے میں تو تمھیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ، پھر خوب غور کرو کہ تمھارے ساتھی میں جنون کی

نہ ہوتا اور وہ اس قسم کی باتیں کرتے تو شاید معذور ہوتے، اب حق واضح ہو جانے کے بعد انکار کی صورت میں جہنم کے سوا ان کا انجام کیا ہو سکتا ہے؟

**آیت 44** وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا ...... : اس آیت کی تفسیر دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ ہم نے انھیں ان کے مشرکانہ اقوال و افعال کی اجازت پر مشتمل کوئی کتاب نہیں دی جو ان کے پاس موجود ہو اور وہ اسے پڑھتے پڑھاتے ہوں اور نہ ہی ہم نے آپ سے پہلے ان کی طرف ایسا کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا ہے جو ان کے مشرکانہ اقوال و افعال کی تائید کرتا ہو۔ دیکھیے سورۂ روم (۳۵)، فاطر (۴۰)، زخرف (۲۱) اور سورۂ احقاف (۴) اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہماری طرف سے خاص ان کے لیے کوئی کتابیں نازل نہیں ہوئیں، نہ ہی آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا، اس لیے ضروری تھا کہ ان پر کتاب نازل ہو اور ان کی طرف پیغمبر مبعوث ہو، اسی لیے ہم نے آپ کو یہ قرآن دے کر ان کی طرف مبعوث فرمایا۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۳)۔

**آیت 45** ① وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... : "مِعْشَارَ" اور "عُشْرٌ" دونوں کا معنی دسواں حصہ ہے۔ یعنی پہلی اقوام جو تباہ کی گئیں، انھیں جو قد و قامت، قوت و دولت اور شان و شوکت عطا کی گئی تھی، ان عرب کے کافروں کے پاس تو اس کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ دیکھیے سورۂ روم (۹)، مومن (۲۱) اور سورۂ احقاف (۲۶)۔

② فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ : "نَكِيْرِ" اصل میں "نَكِيْرِيْ" ہے، آیات کے فواصل (آخری حروف) کی موافقت کے لیے یاء حذف کر دی اور کسرہ یہ بتانے کے لیے باقی رکھا کہ یہاں یاء محذوف ہے، یعنی میرا انکار، میرا عذاب۔ انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو اس پر میں نے انھیں کیسی سخت سزا دی اور کس طرح برباد کیا کہ ان کا نشان تک نہیں ملتا، تو ان بے چاروں کی کیا حیثیت ہے کہ یہ ہماری گرفت سے بچ سکیں گے۔

**آیت 46** ① قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ...... : "جِنَّةٍ" کا معنی جنون، دیوانگی اور پاگل پن ہے۔ مشرکین کے باطل

جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۞ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۞

کون سی چیز ہے۔ وہ تو ایک شدید عذاب سے پہلے محض تمھیں ڈرانے والا ہی ہے ۞ کہہ میں نے تم سے جو بھی اجرت مانگی ہے تو وہ تمھاری ہوئی۔ میری اجرت تو اللہ ہی پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔۞

اقوال کے رد کے بعد رسول اللہ ﷺ کو نہایت قوی دلائل، مؤثر اسالیب اور مختلف انداز سے حق بات سمجھانے کی تلقین فرمائی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو کذّاب اور ساحر کے علاوہ مجنون، یعنی دیوانہ بھی کہتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہو کہ میں تمھیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں کہ بڑی مجلسوں میں تو شور وغل، بھیڑ بھاڑ اور اجتماعی دباؤ کی وجہ سے آدمی صحیح طرح سوچ نہیں سکتا، تم ضد اور تعصب کو نکال کر اکیلے اکیلے یا دو دو ہو کر سوچو کہ محمد (ﷺ) آخر تمھارا صاحب ہے، تمھارے ساتھ اس نے نبوت سے پہلے چالیس برس گزارے، جسے تم صادق اور امین کہتے تھے، جس کی معاملہ فہمی اور درست رائے کی شہادت تم بھی دیتے تھے، اب اس نے جب تمھیں اللہ کا پیغام پہنچایا تو تم نے اسے مجنون کہنا شروع کر دیا، لہٰذا تم اس کی لائی ہوئی ہر بات پر پوری طرح غور کرو اور سوچ کر بتاؤ کہ آخر ان میں سے کون سی بات ہے جسے تم جنون کہہ سکو؟ کیا اللہ کو ایک ماننا دیوانگی ہے؟ کیا زنا، چوری، قتل نفس اور بہتان سے منع کرنا دیوانگی ہے؟ کیا صدق، عفاف، امانت، مہمان نوازی اور ہمدردی کا حکم دینا دیوانگی ہے؟ کسی ایک بات پر انگلی رکھ کر تو بتاؤ کہ یہ بات دیوانے کی بات ہے۔ یہ تفسیر ”مَا“ کو استفہامیہ مان کر ہے، اگر ”مَا“ نافیہ ہو تو معنی ہوگا کہ تمھارے ساتھی میں کسی طرح کا جنون نہیں۔ یہ معنی بھی درست ہے۔

② اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ ...... : یعنی پیغمبر تو تمھیں ایک نہایت سخت عذاب آنے سے پہلے اس سے ڈرانے والا ہے، تو تم اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرو کہ اپنی قوم کو شدید عذاب آنے سے پہلے آگاہ کر کے اس سے بچانے کی کوشش کرنے والا دیوانہ ہوتا ہے یا اس کا ہمدرد اور خیر خواہ۔ بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک دن صفا پہاڑی پر چڑھے اور فرمایا: ”يَا صَبَاحَاهُ“ (جو کسی اہم خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے کہا جاتا تھا) تو قریش آپ کے پاس جمع ہو گئے اور کہنے لگے: ”تمھیں کیا ہوا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ الْعَدُوَّ يُصَبِّحُكُمْ أَوْ يُمَسِّيكُمْ أَمَا كُنْتُمْ تُصَدِّقُونِيْ؟» ”یہ بتاؤ کہ اگر میں تمھیں اطلاع دوں کہ دشمن تم پر صبح حملہ کرے گا یا شام حملہ کرے گا تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟“ انھوں نے کہا: «بَلٰى» ”کیوں نہیں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ» ”تو پھر میں تمھیں ایک نہایت سخت عذاب سے پہلے اس سے ڈرانے والا ہوں۔“ تو ابولہب نے کہا: «تَبًّا لَكَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟» ”تیرے لیے ہلاکت ہو، کیا تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا ہے؟“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ (سورت) اتاری: ﴿تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ﴾ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿إن هو إلا نذير لكم...... ﴾ : ٤٨٠١ ]

آیت 47 ① قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ...... : یہ دوسری تلقین ہے کہ اس بات کی صراحت کر دیں کہ اللہ تعالیٰ

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾

کہہ بے شک میرا رب (دل میں) حق ڈالتا ہے، سب غیبوں کو بہت خوب جاننے والا ہے ﴿۴۸﴾

کا پیغام پہنچانے پر میں تم سے کوئی اجرت یا معاوضہ تو نہیں مانگتا، میں نے تم سے جو بھی اجرت مانگی ہے تو وہ تمھاری ہوئی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ اگر تم نے مجھے کچھ دیا ہے تو وہ تم لے لو، جب اسے معلوم ہو کہ اس نے اسے کچھ نہیں دیا، مطلب صرف اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ تم نے مجھے کچھ دیا ہی نہیں جو میں تمھیں واپس دوں۔ ایسے ہی یہاں فرمایا کہ اگر میں نے تم سے کوئی مزدوری مانگی ہے تو وہ تمھاری ہوئی۔ مطلب یہ کہ میں نے تم سے کوئی مزدوری مانگی ہی نہیں، میری دعوت تو محض تمھاری خیر خواہی کے لیے ہے، جیسا کہ ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [ الشعراء : ۱۲۷ ] ''اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے۔'' دوسرا معنی یہ ہے کہ میں نے یہ پیغام پہنچا کر تم سے کسی چیز کا سوال کیا ہے تو وہ تمھارے ہی فائدے کی چیز ہے۔ میرا تم سے مطالبہ صرف یہ ہے کہ تم اپنے رب تعالیٰ کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرو، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ [ الفرقان : ۵۷ ] ''کہہ دے میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا مگر جو چاہے کہ اپنے رب کی طرف کوئی راستہ اختیار کرے۔''

② وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ : یعنی الزام لگانے والے جو کچھ چاہیں کہتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ میری مزدوری اللہ کے ذمے ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ میرے صدق اور خلوص نیت پر گواہ ہے کہ اس کا پیغام پہنچانے میں مجھے دنیا کی کسی چیز کا طمع نہیں، نہ میں اس کے سوا کسی سے کسی مزدوری یا بدلے کا طلب گار ہوں، نہ اس کی خواہش رکھتا ہوں۔

**آیت 48** ① قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ : ''قَذَفَ يَقْذِفُ'' کا معنی پھینکنا ہے، یہ ڈالنے کے معنی میں بھی آتا ہے: ''أَيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ فِيْ قُلُوْبِ أَصْفِيَاءِهٖ'' یعنی وہ اپنے خاص بندوں کے دلوں میں حق ڈال دیتا ہے۔ جب ثابت ہو گیا کہ یہ نبی نہ مجنون ہے، نہ دنیا کا طالب، نہ تم اس کے کسی قول یا فعل کو جھوٹ، جادو یا دیوانگی ثابت کر سکے تو ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس لیے فرمایا، اے نبی! جو لوگ توحید، انبیاء کی رسالت اور آخرت کے منکر ہیں ان سے کہہ دے کہ بے شک میرا رب وحی کے ذریعے سے اپنے چنے ہوئے بندوں کے دل میں حق بات ڈالتا ہے، اسی نے میرے دل میں بذریعہ وحی اس حق کا القا فرمایا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ﴾ [ المؤمن : ۱۵ ] ''وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی اتارتا ہے، تاکہ آپس کی ملاقات کے دن سے ڈرائے۔'' ''يَقْذِفُ بِالْحَقِّ'' کا دوسرا معنی ''يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ'' ہے، یعنی کہہ دے بے شک میرا رب حق کو باطل پر پھینک مارتا ہے تو وہ اس کا دماغ کچل دیتا ہے، پس وہ اچانک مٹنے والا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ [ الأنبياء : ۱۸ ] ''بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ اس کا دماغ کچل

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَ اِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾

**کہہ دے حق آ گیا اور باطل نہ پہلی دفعہ کچھ کرتا ہے اور نہ دوبارہ کرتا ہے ﴿۴۹﴾ کہہ دے اگر میں گمراہ ہوا تو اپنی جان ہی پر گمراہ ہوں گا اور اگر میں نے ہدایت پائی تو اسی کی وجہ سے جو میرا رب میری طرف وحی بھیجتا ہے، یقیناً وہ سب کچھ سننے والا، قریب ہے ﴿۵۰﴾**

دیتا ہے، پس اچانک وہ مٹنے والا ہوتا ہے۔'' یعنی تمھارے اس حق کو جھوٹ یا جادو یا دیوانگی کہنے سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا، میرا رب اس حق کو باطل پر اس زور سے پھینک مارے گا کہ وہ یکا یک ہی مٹ جائے گا۔ اس آیت میں تیسری بات کی تلقین ہے کہ آپ مشرکین کو صراحت سے کہہ دیجیے کہ تم لوگ نہ حق سے جھگڑے میں غالب آ سکتے ہو نہ لڑائی میں، کیونکہ میرا رب میرے دل میں حق کا القا کرتا ہے، کیونکہ وہ تمام غیبوں کو خوب جاننے والا ہے۔ اب جو شخص غیب جانتا ہی نہیں، نہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیب کی کوئی بات بتائی جاتی ہے تو وہ حق کے ساتھ کیا جھگڑا کرے گا؟ پھر میرا رب حق کو باطل پر مار کر اس کا دماغ کچل دیتا، تو اہل باطل اہل حق کے ساتھ کیا لڑائی کریں گے؟

② **عَلَّامُ الْغُيُوْبِ** : وہ تمام غیبوں کو خوب جاننے والا ہے۔ غیب کی ان باتوں میں سے جو چاہے اپنے جس پیغمبر کے دل میں چاہے ڈال دیتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ غیب کی کس بات کی اطلاع کس پیغمبر کو دینی ہے۔ دیکھیے سورۂ جن (۲۶ تا ۲۸)۔

**آیت 49** ① **قُلْ جَآءَ الْحَقُّ** : یہ چوتھی تلقین ہے کہ انھیں واضح کر دیں کہ ان کا باطل بہت جلد ختم ہو جائے گا اور اس کا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ [ بني إسرائيل : ۸۱ ] ''اور کہہ دے حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل ہمیشہ سے مٹنے والا تھا۔''

② **وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ** : ''أَبْدَأَ يُبْدِئُ إِبْدَاءً'' (افعال) کوئی کام شروع میں کرنا اور اعادہ کا معنی ہے اسے دوبارہ کرنا۔ ہر زندہ شخص ان دونوں سے خالی نہیں ہوتا، یا وہ کوئی کام ابتداءً کرتا ہے یا دوبارہ، البتہ مُردہ ان میں سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک مقولہ ہے جو عرب کسی شخص یا قوم کے نیست و نابود ہونے پر استعمال کرتے ہیں: ''إِنَّهُ مَا يُبْدِئُ وَمَا يُعِيْدُ'' یعنی وہ بالکل مٹ گیا، اس کا نشان بھی باقی نہ رہا۔

③ اس آیت کے نزول کے تھوڑا عرصہ بعد ہی یہ پیش گوئی سچی ہو گئی۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے، تو آپ ہر بت کو ایک لکڑی کے ساتھ، جو آپ کے ہاتھ میں تھی، ٹھوکر مارتے جاتے اور کہتے تھے: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ اور ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ﴾ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿و قل جاء الحق و زهق الباطل﴾ : ۴۷۲۰ ]

**آیت 50** ① **قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ** : یہ پانچویں تلقین ہے کہ آپ انھیں سمجھانے کے لیے کہیں کہ

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾

**اور کاش! تو دیکھے جب وہ گھبرا جائیں گے، پھر بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور وہ قریب جگہ سے پکڑ لیے جائیں گے ﴿۵۱﴾**

اگر تمھارے بتوں کو اور تمھارے آباء کے دین کو چھوڑنے کی وجہ سے میں گمراہ ہو گیا ہوں، جیسا کہ میرے بارے میں تم کہتے پھرتے ہو تو اس گمراہی کا وبال مجھی پر پڑے گا، تم پر اس کی ذمہ داری نہیں اور اگر میں ہدایت یافتہ ہوں، جیسا کہ حقیقت ہے، تو یہ میرا کمال یا خوبی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری راہ نمائی ہے اور میں تمھیں صاف بتا چکا ہوں کہ میں اپنے نفس کی یا کسی اور کی پیروی کرتا ہی نہیں، بلکہ صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف کی جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ﴾ [ الأعراف : ۲۰۳ ] ''کہہ دے میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی جانب سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔'' اس آیت میں یہ ادب بھی سکھایا گیا کہ خامی اور غلطی کی نسبت اپنی طرف کرنی ہے اور ہدایت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف، کیونکہ ساری خیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ہدایت اور بھلائی صرف اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی اور اس کے بیان کردہ حق میں ہے، پھر جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنے نفس کی وجہ سے گمراہ ہوتا ہے اور جسے ہدایت ملتی ہے اسے اللہ کی طرف سے ملتی ہے، جیسا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: (( أَقُوْلُ فِيْهَا بِرَأْيِيْ، فَإِنْ يَّكُ خَطَأً فَمِنِّيْ وَ مِنَ الشَّيْطَانِ، وَ إِنْ يَّكُ صَوَابًا، فَمِنَ اللّٰهِ )) [ مسند أحمد : ۲۷۹/٤، ح : ۱۸٤۸۹ ] ''میں اس کے بارے میں اپنی رائے سے کہتا ہوں، اگر وہ خطا ہوئی تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہوگی اور اگر درست ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔''

② اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ : ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، جب ہم کسی وادی کی بلندی پر پہنچتے تو ہم ''لا الٰہ الا اللہ'' اور ''اللہ اکبر'' کہتے اور ہماری آوازیں بلند ہو جاتیں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَا أَيُّهَا النَّاسُ! ارْبَعُوْا عَلٰی أَنْفُسِكُمْ، فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ أَصَمَّ وَ لَا غَائِبًا، إِنَّهُ مَعَكُمْ، إِنَّهُ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ، تَبَارَكَ اسْمُهُ وَ تَعَالٰی جَدُّهُ )) [ بخاري، الجهاد و السير، باب ما يكره من رفع الصوت في التكبير : ۲۹۹۲ ] ''لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو، کیونکہ تم نہ کسی بہرے کو پکار رہے ہو نہ غائب کو، وہ تو تمھارے ساتھ ہے، بے شک وہ سب کچھ سننے والا ہے، قریب ہے۔ اس کا نام بہت برکت والا اور اس کی شان بہت بلند ہے۔''

**آیت 51** ① وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ : ''اِذْ فَزِعُوْا'' (جب گھبرا جائیں گے) سے دنیا کے بعد آخرت کی تمام منزلیں مراد ہیں، جن میں موت کے وقت فرشتوں کی آمد، پھر قبر میں سوال و جواب، پھر قبروں سے نکلنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا، پھر جہنم میں جانا سب کچھ شامل ہے۔ یعنی اب تو کفار بہت ڈینگیں مارتے ہیں، لیکن جب دنیا کی مہلت ختم ہوگی، اللہ تعالیٰ کی گرفت آئے گی اور ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی، اس وقت ان کے لیے اس سے بچ کر نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

وَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝۵۲ وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝۵۳

اور وہ کہیں گے ہم اس پر ایمان لے آئے، اور ان کے لیے دور جگہ سے (ایمان کو) حاصل کرنا کیسے ممکن ہے ۝۵۲ حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے اس سے انکار کر چکے ہیں اور وہ بہت دور جگہ سے بن دیکھے (نشانے پر) پھینکتے رہے ہیں ۝۵۳

② وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ : یعنی ایسے مجرموں کو کہیں دور سے تلاش نہیں کرنا پڑے گا، وہ جہاں بھی ہوں گے وہیں گرفتار کر لیے جائیں گے۔ بچ نکلنے کی یا بھاگ کھڑے ہونے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

آیت 52 ① وَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ : یعنی جب آخرت کے عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے، ہم اللہ پر ایمان لے آئے جو اکیلا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ﴾ [ المؤمن : ٨٤ ] ''پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا ہم اس اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے ان کا انکار کیا جنھیں ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے تھے۔'' اور فرمایا: ﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ﴾ [ السجدة : ١٢ ] ''اور کاش! تو دیکھے جب مجرم لوگ اپنے رب کے پاس اپنے سر جھکائے ہوں گے اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، پس ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔''

② وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ : ''التَّنَاوُشُ'' آسانی سے کسی چیز کو حاصل کر لینا، لے لینا۔ یعنی ایمان لانے کی جگہ دنیا تھی جو بہت دور رہ گئی، اب اتنی دور جگہ سے ایمان کو حاصل کرنا کیسے ممکن ہے؟ عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان لانے سے تو کچھ حاصل نہیں، اس کا وقت تو سکرات موت سے پہلے تھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ )) [ ترمذي، الدعوات، باب إن الله يقبل توبة العبد...... : ٣٥٣٧، قال الألباني حسن ] ''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک موت کے وقت اس کا گلا نہ بولنے لگے۔''

آیت 53 ① وَ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ : یعنی اس سے پہلے جب ایمان لانے کا وقت تھا تو اس کے ساتھ کفر کرتے رہے۔

② وَ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ : غیب سے مراد بن دیکھے ہے۔ دور سے پتھر یا تیر پھینکا جائے، پھر ایسے نشانے پر پھینکا جائے جسے دیکھا ہی نہ ہو تو وہ پتھر یا تیر نشانے پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔ یعنی یہ لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے رسول اور آخرت کے انکار پر اڑے رہے اور ان کے متعلق کچھ بھی جانے بغیر طرح طرح کی باتیں کرتے رہے، کبھی رسول کا مذاق اڑاتے، اسے مجنون، ساحر، کذّاب کہتے، کبھی اہلِ ایمان پر پھبتیاں کستے، کبھی موت کے بعد زندگی کو ناممکن قرار دیتے رہے۔ الغرض! جو منہ میں آیا بے باکی اور بے خوفی سے بکتے رہتے اور انھیں اقرار بھی تھا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں گمان کی بنا پر کہہ رہے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ﴾ [ الجاثية : ٣٢ ] ''ہم تو محض معمولی سا

وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾ ع ۶ ۹ ۱۲

اور ان کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جن کی وہ خواہش کریں گے، رکاوٹ ڈال دی جائے گی، جیسا کہ اس سے پہلے ان جیسے لوگوں کے ساتھ کیا گیا۔ یقیناً وہ ایسے شک میں پڑے ہوئے تھے جو بے چین رکھنے والا تھا ﴿۵۴﴾

گمان کرتے ہیں اور ہم ہرگز پورا یقین کرنے والے نہیں۔'' حقیقت بھی یہی ہے کہ شرک، دہریت اور انکارِ آخرت کے عقائد کوئی شخص بھی یقین کی بنا پر اختیار نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔ کفر کی پوری عمارت محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہے، علم و یقین پر نہیں۔

**آیت 54** ① وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ ...... : ''أَشْيَاعٌ'' ''شِيْعَةٌ'' کی جمع ہے، ایک جیسے لوگوں کی جماعت۔ ''مَا يَشْتَهُوْنَ'' (جس کی وہ خواہش کریں گے) سے مراد توبہ اور ایمان لانا ہے۔ یعنی وہ آخرت میں چاہیں گے کہ ان کا ایمان قبول ہو جائے اور عذاب سے ان کی نجات ہو جائے، مگر ان کے درمیان اور ان کی خواہش کے درمیان رکاوٹ ڈال دی جائے گی۔ جیسا کہ ان سے پہلے توحید و رسالت اور آخرت کے منکرین کے ساتھ کیا گیا کہ عذاب دیکھنے کے بعد کسی کی توبہ قبول ہوئی نہ ایمان لانا معتبر ہوا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [ المؤمن : ۸۵ ] ''پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور اس موقع پر کافر خسارے میں رہے۔''

② اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ : ''مُّرِيْبٍ'' ''أَرَابَ يُرِيْبُ إِرَابَةً'' (افعال) سے اسم فاعل ہے، بے چین رکھنے والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید، اس کے پیغمبروں کی رسالت اور آخرت سے انکار کرنے والوں کے عقائد کی بنیاد علم پر نہیں ہوتی، بلکہ محض وہم و گمان پر ہوتی ہے۔ وہ کبھی دلیل کے ساتھ ثابت نہیں کر سکتے کہ اتنی عظیم کائنات کسی بنانے والے کے بغیر خود بخود بن گئی، یا ان کے بنائے ہوئے معبود فی الواقع اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں شریک ہیں، نہ ہی وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو اپنا پیغمبر نہیں بنا سکتا، نہ یہ کہ وہ دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتے یا قیامت نہیں آ سکتی، وہ خود بھی اس کے متعلق شک میں مبتلا رہتے ہیں اور شک بھی ایسا جو انھیں بے چین رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے بعض مفادات کی بنا پر اپنے شک کا اظہار نہیں کرتے۔

سُوْرَةُ فَاطِرٍ ۳۵ مَكِّيَّة ۴۳ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا ۴۵ رُكُوْعَاتُهَا ۵

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جو دو دو اور

---

**آیت 1** ① **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** : "فَطَرَ يَفْطِرُ فَطْرًا" (ض، ن) نئے سرے سے پیدا کرنا، پھاڑنا۔ سورت کی ابتدا اس دعوے کے ساتھ ہوئی ہے کہ تمام خوبیوں اور سب تعریف کا حق دار اللہ وحدہ ہے۔ "**اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ**" کی تفسیر سورۂ فاتحہ کی ابتدا میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے بعد پوری سورت میں اس بات کے دلائل بیان ہوئے ہیں کہ وہ اکیلا تمام خوبیوں کا مالک اور معبود برحق ہے۔ درمیان میں توحید کے ساتھ ساتھ نبوت، قیامت اور ان سے متعلق بعض باتوں کا ذکر بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اکیلے معبود برحق ہونے کی پہلی دلیل یہ بیان فرمائی کہ وہ آسمان و زمین کو ابتداءً کسی نمونے کے بغیر عدم سے پھاڑ نکالنے والا ہے۔ آسمان و زمین سے مراد ساری کائنات ہے۔ جب پیدا کرنے والا وہ ہے تو عبادت کا حق دار کوئی دوسرا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہی بات آگے صراحت کے ساتھ آیت (۳) میں آرہی ہے۔ پھر اس نے اپنی مخلوق کو پیدا فرما کر ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ان کے لیے دنیا کی ہر ضرورت مہیا فرمائی اور اس کی طرف ان کی راہ نمائی فرمائی، فرمایا: ﴿ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۵۰ ] "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی، پھر راستہ دکھایا۔" فطری ہدایت کے علاوہ انبیاء و رسل کو مبعوث فرمایا، اس کا ذکر آیت (۴) میں ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب اس نے پہلے پہل نمونے کے بغیر یہ سب کچھ پیدا فرما لیا تو دوبارہ بنانا اس کے لیے کیا مشکل ہے، اس کا صراحت کے ساتھ ذکر آیت (۵) میں آرہا ہے۔

② **جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا** : "رُسُلًا" "رَسُوْلٌ" ( بروزن فَعُوْلٌ "بمعنی مَفْعُوْلٌ" ) کی جمع ہے، جسے کوئی پیغام دے کر بھیجا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جن انبیاء و رسل کا انتخاب فرمایا، ان کے پاس اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اس نے فرشتوں کو اپنا رسول بنایا۔ ( دیکھیے سورۂ شوریٰ : ۵۱ ) ان میں سب سے بڑی شان والے جبریل علیہ السلام ہیں۔ ان کا لقب "اَلرُّوْحُ الْأَمِيْنُ" ہے۔ بعض اوقات وہ دوسرے فرشتوں کو بھی پیغام پہنچانے کے لیے یا اپنے احکام کی تنفیذ کے لیے بھیجتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں کفار کی بدسلوکی اور زیادتی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (( فَانْطَلَقْتُ وَ أَنَا مَهْمُوْمٌ عَلٰى وَجْهِيْ فَلَمْ أَسْتَفِقْ إِلَّا وَأَنَا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ فَرَفَعْتُ رَأْسِيْ فَإِذَا أَنَا بِسَحَابَةٍ قَدْ أَظَلَّتْنِيْ فَنَظَرْتُ فَإِذَا فِيْهَا جِبْرِيْلُ فَنَادَانِيْ فَقَالَ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ وَمَا رَدُّوْا عَلَيْكَ وَ قَدْ بَعَثَ اللّٰهُ إِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَأْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ فِيْهِمْ فَنَادَانِيْ مَلَكُ الْجِبَالِ فَسَلَّمَ عَلَيَّ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ، وَ أَنَا مَلَكُ الْجِبَالِ وَ قَدْ بَعَثَنِيْ رَبُّكَ إِلَيْكَ لِتَأْمُرَنِيْ بِأَمْرِكَ فَمَا شِئْتَ؟ إِنْ شِئْتَ أَنْ أُطْبِقَ عَلَيْهِمُ

وَ رُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

تین تین اور چار چار پروں والے ہیں، وہ (مخلوق کی) بناوٹ میں جو چاہتا ہے اضافہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ①

الْأَخْشَبَيْنِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ أَرْجُوْ أَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا ›› [ بخاري، بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمين و الملائكة ...... : ٣٢٣١۔ مسلم : ١٧٩٥ ] ''تو میں غم کی حالت میں جدھر منہ تھا چل پڑا۔ مجھے افاقہ ہوا تو میں قرن الثعالب پر تھا، میں نے سر اٹھایا تو ایک بدلی نے مجھ پر سایہ کیا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا تو اس میں جبریل علیہ السلام تھے۔ انھوں نے مجھے آواز دی اور کہا: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کی بات اور آپ کو ان کا جواب سن لیا اور اس نے آپ کی طرف پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا ہے، تاکہ آپ ان کے متعلق اسے جو چاہیں حکم دیں۔'' پھر مجھے پہاڑوں کے فرشتے نے آواز دی اور مجھے سلام کہا، پھر کہا: ''اے محمد! اللہ عزوجل نے آپ کی قوم کی بات سن لی ہے، میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں اور آپ کے رب نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے، تاکہ آپ مجھے جو حکم چاہیں کریں؟ اگر چاہیں کہ میں انھیں دو پہاڑوں کے درمیان پیس دوں تو میں ایسے کر دیتا ہوں۔'' تو میں نے کہا: ''بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے وہ لوگ نکالے گا جو اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔''

بعض اوقات فرشتوں کو انبیاء کے علاوہ بھی اپنے صالح بندوں کو بشارت دینے کے لیے یا ان کی راہ نمائی کے لیے خواب میں یا بیداری میں بھیج دیتا ہے، جیسا کہ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور مریم علیہا السلام کا معاملہ ہوا اور جیسا کہ وہ میدانِ قتال میں مجاہدین کے دل مضبوط رکھنے کے لیے فرشتوں کو بھیجتا ہے۔ بعض اوقات وہ انھیں آزمائش کے لیے بھی بھیج دیتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (٣٤٦٤) میں گنجے، برص والے اور اندھے کا قصہ مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کی دلیل کے طور پر یہاں آسمان و زمین کی پیدائش کے بعد فرشتوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ وہ اس کے ہاں بہت معزز مقام رکھتے ہیں، اس کے باوجود اس کے بندے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ٢٦ ] ''بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔'' ان کے ذمے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانا ہے اور انھیں نافذ کرنا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴾ [ النازعات : ٥ ] ''پھر جو کسی کام کی تدبیر کرنے والے ہیں!'' اس میں مشرکین کو اس بات کی طرف توجہ دلانا بھی مقصود ہے کہ جن فرشتوں کو تم نے معبود بنا رکھا ہے وہ اپنا اختیار کچھ نہیں رکھتے، ان کی حیثیت محض رسول (قاصد) کی ہے جس کی اپنی بات کچھ نہیں ہوتی، بلکہ وہ بھیجنے والے کا پیغام پہنچاتا ہے، یا اس پر عمل کرتا ہے۔

③ اُولِيْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ : فرشتوں کی پیدائش میں اپنے کمال قدرت کے بیان کے لیے ان کے ''اَجْنِحَةٍ'' کا ذکر فرمایا، جو ''جَنَاحٌ'' (بفتح جیم) کی جمع ہے۔ یہ لفظ ہاتھ، بازو اور پہلو کے معنی میں بھی آتا ہے، مگر پرندوں کے ذکر کے ساتھ اس کا معنی ''پر'' ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ ﴾ [ الأنعام : ٣٨ ] ''اور نہ کوئی اڑنے والا، جو

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾

جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے کسی بھی رحمت میں سے کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲﴾

اپنے دو پروں سے اڑتا ہے۔'' فرشتوں کی آسمانوں اور زمین میں آمدورفت کے لیے پَر ہی موزوں ہو سکتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، یا جس نے انھیں اصل صورت میں دیکھا ہے کہ ان "اَجْنِحَةٍ" کی کیا کیفیت ہے؟ آیا وہ صرف پرواز کے لیے ہیں، یا وہی بازوؤں کا کام بھی دیتے ہیں۔ آیت سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پَر کم از کم دو ضرور ہیں، زیادہ کی حد اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ تین تین، چار چار سے معلوم ہوا کہ وہ دو سے زیادہ پروں والے بھی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ضروری نہیں فرشتوں کے پَر جفت عدد میں ہوں بلکہ طاق بھی ہیں۔

④ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ: اس جملے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں اور سبھی بیک وقت مراد لیے جا سکتے ہیں اور جامع کلمات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو پیدا کرتے ہوئے جس کے پَر جتنے چاہتا ہے زیادہ بنا دیتا ہے، جس سے ان کی قوتِ پرواز میں بے حساب اضافہ ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى جِبْرِيْلَ ، لَهُ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله تعالى : ﴿ فأوحى إلى عبده ما أوحى ﴾ : ۴۸۵۷ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو (اصل صورت میں) دیکھا، ان کے چھ سو پَر تھے۔''

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ساری مخلوق میں سے جس میں چاہتا ہے اور جتنی چاہتا ہے زیادتی کر دیتا ہے، مثلاً طویل القامت یا قصیر القامت ہونے میں، حسن و جمال میں، عقل و دانش میں، جرأت و بہادری میں، سخاوت و بخل میں، بلندی و پستی میں، قوت و ضعف میں، غرض کمیت و کیفیت کی بے شمار صورتوں میں جتنی چاہتا ہے زیادتی کر دیتا ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اس نے جتنی مخلوق بنائی ہے اس میں جتنا چاہتا ہے اضافہ کرتا رہتا ہے، نئی سے نئی مخلوق، نئے سے نئے سیارے، نئی کہکشائیں، نئے حیوانات و جمادات و نباتات پیدا فرماتا رہتا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں ہے: ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ [ الرحمن : ۲۹ ] ''ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔'' اس میں یہود کا رد ہے، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ساتویں دن فارغ ہو گیا، اب وہ مزید کوئی چیز پیدا نہیں کرتا۔

⑤ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: "اِنَّ" عموماً پہلی بات کی علت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خلق میں اپنی مرضی کے مطابق اضافہ کرتا ہے اور زمین و آسمان کی اور پروں والے پیغام رساں فرشتوں کی پیدائش فرماتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ وہاں کسی بھی ارادے کے پورا کرنے میں کسی عجز کا تصور نہیں ہے۔

**آیت 2** ① مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ ...... : اس آیت سے مقصود بھی مشرکین کی اس غلط فہمی کا رد ہے کہ اللہ تعالیٰ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ٘ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴﴾

اے لوگو! اللہ کی نعمت یاد کرو جو تم پر ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے، جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟ ﴿۳﴾ اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ﴿۴﴾

کے بندوں میں سے کوئی انھیں اولاد، روزی یا کوئی نعمت دے سکتا ہے یا روک سکتا ہے۔ رحمت سے مراد وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے، چاہے وہ مادی ہو جیسے بارش، روزی، اولاد اور صحت وغیرہ، یا معنوی اور روحانی ہو، جیسے علم و حکمت، ایمان و اسلام، بعثت انبیاء، دعا کی قبولیت اور توبہ کی توفیق وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ بندوں کو جو بھی نعمت حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ وہ اپنی نعمت کسی کو دینا چاہے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں اور روکنا چاہے تو کوئی اسے دینے والا نہیں۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد کہا کرتے تھے: (( لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَ لَهُ الْحَمْدُ، وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَ لَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَ لَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ )) [ بخاري، الأذان، باب الذكر بعد الصلاة : ۸۴۴ ] ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کے لیے سب تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ اے اللہ! جو تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو روک دے وہ دینے والا کوئی نہیں اور تیرے مقابلے میں کسی شان والے کو اس کی شان کوئی کام نہیں دیتی۔'' یہ مضمون قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۷)، یونس (۱۰۷) اور سورۂ زمر (۳۸)۔

② وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : خبر پر الف لام لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا۔ یہ پہلے جملے کی علت ہے کہ وہی ایسا زبردست غالب ہے کہ اس کے حکم کو کوئی روک نہیں سکتا اور ایسا کمال حکمت والا ہے جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، کسی اور میں یہ صفات ہیں ہی نہیں، تو پھر کون ہے جو اس کے کھولے ہوئے کو بند کر سکے یا اس کے بند کیے ہوئے کو کھول سکے؟

**آیت 3** ① يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں فراموش نہ کرو اور نمک حرام نہ بنو، بھلا بتاؤ اللہ کے سوا تمھارا کوئی خالق ہے جو تمھیں رزق دے رہا ہو؟ ظاہر ہے کوئی نہیں۔ استفہام انکاری ہے۔

② فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ : یعنی پھر تمھیں یہ دھوکا کہاں سے لگ گیا کہ خالق و رازق تو اللہ تعالیٰ ہو، مگر بندگی اور فرماں برداری دوسروں کی کی جائے۔ مثل مشہور ہے ''جس کا کھائیے اسی کا گائیے۔''

**آیت 4** ① وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ : توحید کے بعد رسالت کا ذکر ہے۔ ''وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ''

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ⑤

اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو کہیں دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور کہیں وہ دھوکے باز تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا نہ دے جائے ⑤

میں واوٴ عطف دلیل ہے کہ اس سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے، جس کا مفہوم یہ ہے: ”فَإِنْ يُصَدِّقُوكَ فَقَدْ فَازُوْا لِأَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا“ یعنی اگر یہ آپ کی تصدیق کریں تو یہ کامیاب ہیں، کیونکہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

② ”وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ“: شرط ہے، اس کی جزا محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے: ”وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَتَأَسَّ بِالرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ“ یعنی اگر یہ آپ کو جھٹلا دیں تو آپ اپنے سے پہلے رسولوں کے حالات سے تسلی حاصل کریں، کیونکہ آپ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے اور انھوں نے قوم کے جھٹلانے پر صبر کیا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور جھٹلانے والوں کے لیے وعید کہ رسولوں کو پہلے جھٹلانے والے لوگوں کی طرح یہ لوگ بھی برباد ہوں گے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر پہلے رسولوں کا حوالہ دے کر آپ کو تسلی دی گئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٤] ”اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تو انھوں نے اس پر صبر کیا کہ وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی اور کوئی اللہ کی باتوں کو بدلنے والا نہیں اور بلاشبہ یقیناً تیرے پاس ان رسولوں کی کچھ خبریں آئی ہیں۔“ اور دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۴۳)۔

③ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ : یعنی یہ لوگ آپ کو جھٹلا کر آخر کہاں جائیں گے، تمام معاملات آخر پیش تو ہمارے سامنے ہی ہوں گے اور ہم نے ہی ان کا فیصلہ کرنا ہے۔ توحید و رسالت کے ساتھ آخرت کا ذکر ہے۔

**آیت 5** ① يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ : وعدے سے مراد آخرت کا وعدہ ہے، جس کا پچھلی آیت کے آخری جملے میں ذکر ہے کہ تمام معاملات اللہ کے حضور پیش ہونے والے ہیں۔

② فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا : یعنی اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے کہ تمھیں اس کے حضور پیش ہونا ہے تو کہیں دنیا کی زندگی اپنی لذتوں اور دل فریبیوں کے ساتھ تمھیں اس دھوکے میں نہ ڈال دے کہ بس یہی زندگی ہے، کیونکہ اس دنیا نے بہت سے لوگوں کو اس دھوکے میں رکھ کر برباد کر دیا۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۹)، مؤمنون (۳۷) اور سورۂ جاثیہ (۲۴) ”الدُّنْيَا“ ”اَلْأَدْنٰى“ کی مؤنث ہے، قریب کی زندگی جو آخرت کے مقابلے میں قریب ہے، یا کمینی اور حقیر زندگی، جیسا کہ ”دَنِيٌّ“ بمعنی حقیر ہے۔ مقصود دنیا کی زندگی کی حقارت کی طرف توجہ دلا کر اس سے ہوشیار ہونے کی تاکید ہے۔

③ وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ : ”اَلْغُرُوْرُ“ غین کے ضمہ کے ساتھ ”غَرَّ يَغُرُّ“ (ن) کا مصدر ہے، دھوکا دینا اور غین کے فتحہ کے ساتھ صفت مشبہ ہے، جس میں مبالغے کا معنی بھی ہے، یعنی بہت دھوکا دینے والا۔ الف لام اس میں عہد کا ہے، وہ دھوکا

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؕ۶ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۷

ع ۱ / ۱۴

بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ والوں کو صرف اس لیے بلاتا ہے کہ وہ بھڑکتی آگ والوں سے ہو جائیں ۶ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ۷

---

دینے والا جسے تم بھی جانتے ہو، یعنی شیطان، جس کی صراحت اگلی آیت میں آ رہی ہے، جیسا کہ "شُکُوْرٌ" (شین کے ضمہ کے ساتھ) شکر کرنا اور "شَکُوْرٌ" (شین کے فتحہ کے ساتھ) بہت شکر کرنے والا۔

**4** شیطان اللہ تعالیٰ کے بارے میں کئی طرح سے فریب دیتا ہے، کسی کو یہ فریب دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سرے سے وجود ہی نہیں، یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود ہیں جو نفع و نقصان کا اختیار رکھتے ہیں۔ کسی کو یہ حکم دیتا ہے کہ گناہ کر لو پھر توبہ کر لینا، کسی کو اللہ کی رحمت کے نام پر دھوکا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے، جتنے چاہو گناہ کر لو، وہ بخش دے گا اور اکثر کو "تسویف" کے ساتھ دھوکا دیتا ہے، تسویف کا معنی ہے "سَوْفَ أَفْعَلُ" کہ میں نیک عمل کر ہی لوں گا، ایسی بھی کیا جلدی ہے، ابھی بہت وقت باقی ہے، وہ آدمی کو اسی دھوکے میں رکھتا ہے، حتیٰ کہ عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔

**آیت 6** **1** اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ : شیطان تمھارا دشمن ہے، تمھارے ساتھ اس کی عداوت قدیم اور قیامت تک کے لیے دائمی ہے، جس کی بنیاد حسد پر ہے اور حاسد کی عداوت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سورۂ کہف میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ [ الكهف : ۵۰ ] "اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ جنوں میں سے تھا، سو اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، تو کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں، وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے۔"

**2** فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا : جب وہ تمھارا دشمن ہے تو تم بھی ہمیشہ اسے دشمن ہی سمجھو، وہ کبھی تمھارا خیر خواہ یا دوست نہیں ہو سکتا، اپنے عقائد و اعمال اور اپنے اقوال و افعال اور احوال، غرض ہر چیز میں اس کی مخالفت کرو اور مرتے دم تک یہ عداوت قائم رکھو۔

**3** اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ : اپنے گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کا کہا مانتے ہیں اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ یعنی شیطان بظاہر جتنی بھی خیر خواہی کرے مقصد اس کا یہی ہے کہ وہ اکیلا جہنم میں جانے کے بجائے اپنے دوستوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائے۔ اس لیے اس کی خیر خواہی پر کبھی بھی اعتماد نہ کرو۔

**آیت 7** **1** اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ : اس آیت میں اپنے فرماں بردار اور نافرمان بندوں کا انجام بیان فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ⑧

**تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اسے اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟) پس بے شک اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، سو تیری جان ان پر حسرتوں کی وجہ سے نہ جاتی رہے۔ بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ⑧**

② **لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ** : "**مَغْفِرَةٌ**" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی بخشش'' کیا گیا ہے۔ "**اَجْرٌ كَبِيْرٌ**" (بہت بڑا اجر) یعنی ان کے لیے ان کے اعمال سے کہیں بڑھ کر اور ان کی سوچ اور فکر سے بھی بڑا اجر ہے۔ یہاں "**اَجْرٌ كَبِيْرٌ**" سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔

**آیت 8** ① **اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ** : اس کا جواب محذوف ہے: "أَيْ كَمَنْ لَيْسَ كَذٰلِكَ" یعنی کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اسے اچھا سمجھا، وہ اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟ ظاہر ہے کہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ ایسا شخص اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت عطا ہوئی ہو اور وہ اس پر عمل کرتا ہو۔ دوسری جگہ یہ بات واضح الفاظ میں فرمائی: ﴿ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴾ [ محمد : ۱٤ ] ''تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال مزین کر دیے گئے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔'' مطلب یہ کہ کافر اور مومن برابر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کیا گیا تو اس نے اسے اچھا سمجھا، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اگرچہ برا کام کرتا ہے لیکن اسے برا ہی سمجھتا ہے، اچھا نہیں۔ ظاہر ہے یہ دونوں شخص بھی برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ ایک شخص جو برا کام کرتا ہے اور اسے برا ہی سمجھتا ہے، اس کے متعلق تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی راہ راست پر آ جائے گا، لیکن جو شخص برا کام کرتا ہے مگر اسے اچھا سمجھ کر کرتا ہے تو اس کے راہ راست پر آنے کی کبھی امید نہیں کی جا سکتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴾ [ الکہف : ۱۰۳، ۱۰٤ ] ''کہہ دے کیا ہم تمھیں وہ لوگ بتائیں جو اعمال میں سب سے زیادہ خسارے والے ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں۔''

اس آیت میں برے عمل سے مراد کفر و شرک ہے، جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت کے بعد فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ ﴾ [ الکہف : ۱۰۵ ] ''یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا انکار کیا۔'' البتہ آیت کے الفاظ عام ہونے کی وجہ سے بدعتی لوگ بھی اس میں شامل ہیں، کیونکہ وہ بدعت کو نیکی سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے چوری، زنا اور قتل وغیرہ کا ارتکاب کرنے والا شخص اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا ہے، اس لیے امید ہے کہ

وَ اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹

اور اللہ ہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا، پھر وہ بادل کو ابھارتی ہیں، پھر ہم اسے ایک مردہ شہر کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں، پھر ہم اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح اٹھایا جانا ہے ۝۹

---

وہ توبہ کر لے گا، مگر خود ساختہ دین پر عمل کرنے والا، مثلاً اپنے یا لوگوں کے بنائے ہوئے ورد و وظائف یا دوسرے کام کرنے والا شخص تو جو کچھ کر رہا ہے نیکی سمجھ کر کرتا ہے، اسے توبہ کی توفیق کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے جب شیطان کسی کو کافر بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اسے کسی بدعت پر لگا دے، جسے وہ نیکی سمجھ کر کرتا رہے گا اور جتنی محنت سے کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوتا جائے گا، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے۔

② فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ : یعنی ایسے لوگوں کا وجود اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کی وجہ سے ہے اور بعض کا گمراہ ہونا اور بعض کا ہدایت پانا اس کی حکمت کا نتیجہ ہے، وہ چاہتا تو سب ہدایت پا جاتے مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اگرچہ اس کا ہدایت دینا یا گمراہ کرنا بھی آدمی کے عمل یا استعداد کا نتیجہ ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ﴾ [ البقرۃ : ۲٦ ] ''اور وہ اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقوں کو۔''

③ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ : ''حَسَرٰتٍ'' واحد ''حَسْرَةٌ'' کسی چیز کے ہاتھ سے نکلنے پر شدید غم اور افسوس، یعنی آپ کا کام دعوت اور پیغام پہنچانا ہے، انھیں راہ راست پر لے آنا آپ کے بس میں نہیں۔ اس لیے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے ایمان نہ لانے پر حسرت و افسوس کی وجہ سے آپ کی جان ہی نکل جائے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ کفار کا کفر پر قائم رہنا اللہ کی مشیت سے ہے، آپ اپنا کام سرانجام دیں، لوگوں کا ایمان لانا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ اس آیت سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو لوگوں کے ایمان نہ لانے پر کس قدر افسوس اور صدمہ ہوتا تھا، حتیٰ کہ قریب تھا کہ آپ اس غم میں جان ہی سے گزر جائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾ [ الکہف : ٦ ] ''پس شاید تو اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والا ہے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔'' اور فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ [ الشعراء : ۳ ] ''شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔''

④ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ : اس جملے میں دھمکی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ انھیں ان کے برے اعمال کی سزا دے گا۔ کسی حاکم کا مجرم کو یہ کہنا کہ میں تمھاری حرکتوں سے خوب واقف ہوں، دراصل اسے آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ تمھیں اس کی سزا دے کر رہوں گا۔

**آیت 9** وَ اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا...... : قرآن کریم میں موت کے بعد زندگی پر عموماً خشک زمین کے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ

جو شخص عزت چاہتا ہو سو عزت سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ اسی کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے اور نیک عمل اسے

ہرا ہونے سے استدلال کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ حج میں فرمایا: ﴿ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ [ الحج : ۵ تا ۷ ] ''اور تو زمین کو مردہ پڑی ہوئی دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر خوبصورت قسم میں سے اگاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور (اس لیے) کہ وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور (اس لیے) کہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ اور (اس لیے) کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور (اس لیے) کہ اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔'' سب لوگ دیکھتے ہیں کہ بارش ہوتی ہے تو خشک، بنجر اور مردہ زمین یک دم زندہ ہو کر نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے، پھر اس سے صرف نباتات ہی پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہزاروں جانور یعنی مینڈک، حشرات الارض اور جھینگر وغیرہ بھی پیدا ہو کر اپنی اپنی بولیاں بولنے لگتے ہیں۔ یہ آخر کہاں سے پیدا ہو گئے؟ بالکل یہی کیفیت انسانوں کے زمین سے جی اٹھنے کی ہو گی، انسان کا حال عجیب ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدے میں آتی ہے اسے من و عن تسلیم کر لیتا ہے، مگر بالکل اس جیسی دوسری چیز کا انکار صرف اس لیے کر دیتا ہے کہ وہ اس کے مشاہدے میں نہیں آئی، حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

**آیت 10** ① مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا: عزت کا معنی غلبہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴾ [ صٓ : ۲۳ ] ''اور اس نے بات کرنے میں مجھ پر بہت سختی کی۔'' اس آیت کی تفسیر دو طرح سے ہو سکتی ہے، پہلی جو سب سے واضح ہے، یہ ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اسے عزت و غلبہ حاصل ہو تو اسے جان لینا چاہیے کہ عزت سب کی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [ آل عمران : ۲۶ ] ''کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔'' اس میں ان کفار و مشرکین اور بعض نام نہاد مسلمانوں کا رد ہے جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، تاکہ وہ ان کے لیے عزت اور غلبے کا باعث بنیں، فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۙ○ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [ مریم : ۸۱، ۸۲ ] ''اور انھوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے، تاکہ وہ ان کے لیے باعث عزت ہوں۔ ہرگز ایسا نہ ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف مد مقابل ہوں گے۔'' اور ان ضعیف الایمان اور منافق قسم کے لوگوں کا بھی رد ہے جو کفار سے دوستی کرتے ہیں، تاکہ دنیا میں باعزت اور غالب ہو کر زندگی بسر کر سکیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ

يَرْفَعُهٗ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ⑩

بلند کرتا ہے اور جو لوگ برائیوں کی خفیہ تدبیر کرتے ہیں ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور ان لوگوں کی خفیہ تدبیر ہی برباد ہوگی ⑩

---

لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ [ النساء : ۱۳۸، ۱۳۹ ] ''منافقوں کو خوش خبری دے دے کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ وہ جو کافروں کو مومنوں کے سوا دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں؟ تو بے شک عزت سب اللہ کے لیے ہے۔'' یعنی جو شخص جاننا چاہتا ہے کہ عزت و غلبے کا مالک کون ہے، وہ جان لے کہ عزت و غلبہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اب جو بھی عزت و غلبہ چاہتا ہو وہ اس سے طلب کرے، کیونکہ جس کسی کو بھی عزت ملی ہے یا ملے گی اسی سے ملی ہے اور اسی سے ملے گی۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ جو شخص اسلام کا مقابلہ کر کے اس پر غالب ہونا چاہتا ہے وہ جان لے کہ عزت و غلبہ تو سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جو اس پر غالب آنے کی کوشش کرے گا وہ بری طرح مغلوب ہوگا۔

② اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ : ''الْكَلِمُ'' ''كَلِمَةٌ'' کی جمع نہیں، ورنہ ''يَصْعَدُ'' کے بجائے ''تَصْعَدُ'' کا لفظ آتا اور اس کی صفت مؤنث آتی، بلکہ یہ اسم جنس ہے جو واحد و جمع سب پر بولا جاتا ہے۔ جب اس کا ایک فرد بیان کرنا مقصود ہو تو اس کے ساتھ ''تاء'' لگا دیتے ہیں، جیسے ''تَمْرٌ'' کھجور، ایک ہو یا بہت سی ہوں، لیکن اگر ایک کھجور کہنا ہو تو ''تَمْرَةٌ'' کہا جائے گا۔

③ اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جن کے ذریعے سے عزت حاصل ہوتی ہے اور وہ ہیں ایمان اور عمل صالح۔

④ ''الْكَلِمُ الطَّيِّبُ'' (پاکیزہ بات) سے مراد بعض نے کلمہ توحید ''لا الٰہ الا اللہ'' لیا ہے، مگر لفظ عام ہے، اس میں کلمہ اسلام کے ساتھ ذکر، دعا، تلاوتِ قرآن، تعلیم، تربیت اور دعوت سبھی شامل ہیں، یعنی ہر پاکیزہ بات اسی کی طرف چڑھتی ہے اور وہی اسے قبول کرتا اور بلندی عطا کرتا ہے۔ ناپاک اور خبیث باتیں عروج حاصل کر ہی نہیں سکتیں۔

⑤ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ : اس کی تفسیر میں بھی تین احتمال ہیں، پہلا یہ کہ ''ہٗ'' ضمیر سے مراد الکلم الطیب ہے، یعنی عمل صالح الکلم الطیب (پاکیزہ بات) کو بلند کرتا ہے۔ کوئی کلمہ اپنی جگہ کتنا پاکیزہ ہو قبول اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے ساتھ عمل بھی نیک ہو، یعنی عمل کا نیک ہونا الکلم الطیب کی قبولیت کے لیے شرط ہے۔ نیک عمل وہ ہے جو خالص اللہ کے لیے ہو اور سنت کے مطابق ہو۔ دیکھیے سورۂ کہف کی آخری آیت۔ دوسرا یہ کہ ''يَرْفَعُ'' کا فاعل ''الْكَلِمُ الطَّيِّبُ'' کی ضمیر ہو اور ''ہٗ'' کی ضمیر سے مراد عمل صالح ہو، یعنی پاکیزہ بات عمل صالح کو بلند کرتی ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ الکلم الطیب سے مراد ''لا الٰہ الا اللہ'' ہو، یعنی ایمان اور کلمہ توحید کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ﴾ [ النحل : ۹۷ ] ''جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی۔'' اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ ''يَرْفَعُ'' میں فاعل کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جو

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾

اور اللہ ہی نے تمھیں تھوڑی سی مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر اس نے تمھیں جوڑے بنا دیا اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے اور نہ کسی عمر پانے والے کی عمر بڑھائی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے مگر ایک کتاب میں (درج) ہے۔ بلاشبہ یہ اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۱۱﴾

بھی عمل صالح ہے اللہ اس کو بلند کرتا ہے، یعنی اسے قبول کرتا اور اس کی جزا عطا کرتا ہے۔ یہ تینوں معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں اور تینوں درست ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے ارادۂ عزت، صعودِ کلم طیب اور رفع عمل صالح کی باہمی مناسبت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''یعنی عزت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تمھارے ذکر اور بھلے کام چڑھتے جاتے ہیں جب اپنی حد کو پہنچیں گے تب بدی پر غلبہ (حاصل) کریں گے، کفر دفع ہوگا (اور) اسلام کو عزت (نصیب) ہوگی۔''

⑥ **وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ** : مکر کا معنی ہے خفیہ تدبیر، وہ اچھی ہو یا بری، اکثر مذموم تدبیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ''**يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ**'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو الکلم الطیب کے بجائے باطل اور خبیث باتیں لے کر اٹھتے ہیں اور مکاریوں اور چالاکیوں سے انھیں غالب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے۔ اس کے اولین مصداق وہ لوگ ہیں جنھوں نے دار الندوہ میں رسول اللہ ﷺ کو قید یا قتل یا جلا وطن کرنے کا منصوبہ بنایا۔ دیکھیے سورۂ انفال (۳۰) ان کے علاوہ وہ سب لوگ اس میں داخل ہیں جو اسلام کے خلاف سازشیں کر کے اس پر غلبے کی کوشش کرتے ہیں۔

⑦ **وَ مَكْرُ اُولٰٓىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ** : یعنی انھی کی تدبیر ناکام و نامراد ہوگی، اللہ کی تدبیر کبھی ناکام نہیں ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ** ﴾ [ آل عمران : ٥٤ ] ''اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔'' چنانچہ آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کرنے والے اس میں کامیاب نہ ہوئے، بلکہ بدر میں ہلاک ہوئے، پھر باقی فتح مکہ میں مغلوب ہوئے۔ مزید دیکھیے سورۂ فاطر (۴۳)، طور (۴۲)، رعد (۴۲) اور سورۂ انعام (۱۲۴، ۱۲۵)۔

**آیت 11** ① **وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ**...... : اس سے پہلے بارش سے زمین کے زندہ ہونے کو موت کے بعد زندگی کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا، اب اس آیت میں موت کے بعد زندگی کی تین دلیلیں پیش فرمائیں جو تینوں عقلی ہیں، پہلی انسان کا مٹی سے پیدا ہو کر مختلف مراحل سے گزر کر موت کی آغوش میں جا بسنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ**

وَ مَا یَسْتَوِی الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ فِیْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور دو سمندر برابر نہیں ہوتے، یہ میٹھا پیاس بجھانے والا ہے، جس کا پانی آسانی سے گلے سے اترنے والا ہے اور یہ نمکین ہے کڑوا اور ہر ایک میں سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور زینت کا سامان نکالتے ہو جو تم پہنتے ہو اور تو اس میں کشتیوں کو دیکھتا ہے پانی کو چیرتی ہوئی چلنے والی ہیں، تاکہ تم اس کے فضل میں سے (حصہ) تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۲﴾

---

وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا ﴾ [ الحج : ۵ ] ”اے لوگو! اگر تم اٹھائے جانے کے بارے میں کسی شک میں ہو تو بے شک ہم نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر کچھ جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی، تاکہ ہم تمھارے لیے واضح کریں اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر ہم تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو قبض کر لیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔“ یعنی جس اللہ نے پہلے مٹی سے پیدا فرمایا وہ انسان کے مٹی ہونے کے بعد دوبارہ بھی اسے پیدا فرما سکتا ہے۔

② وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ : یعنی کسی بھی مادہ کے حمل سے لے کر وضع تک کے تمام مراحل جس ہستی کے علم میں ہیں اور اسی کے کمال قدرت سے سرانجام پا رہے ہیں، اس کے لیے اس انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ بنا دینا کیا مشکل ہے؟ اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورۂ حج کی آیت (۸)۔

③ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ ...... : یہ بعث بعد الموت کی تیسری دلیل ہے، یعنی کسی زیادہ عمر والے کو زیادہ عمر دی جاتی ہے، یا کم عمر والے کو کم عمر دی جاتی ہے، تو یہ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے ہی طے فرما دیا ہے۔ تو جس ہستی نے ہر زیادہ عمر والے کی عمر اور کم عمر والے کی عمر پہلے ہی لکھ دی ہے اور جو ہر شخص کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے واقف ہے اس کے لیے انھیں دوبارہ بنانے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے؟

④ یعنی اگرچہ تمھارے لیے اور پوری مخلوق کے لیے ناممکن ہے کہ تم پہلے ہی ان باتوں کو جان لو یا ان کا فیصلہ کر لو، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بالکل آسان ہے، کیونکہ اسے پہلے ہی ان سب باتوں کا علم ہے اور وہ ہمیشہ سے یہ سب کچھ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

آیت 12 وَ مَا یَسْتَوِی الْبَحْرٰنِ ...... : موت کے بعد زندگی کے لیے بارش کے ساتھ مردہ زمین کو زندہ کرنے کی مثال

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ﴿۱۳﴾

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا، ہر ایک ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے۔ یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے، اسی کی بادشاہی ہے اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے مالک نہیں ﴿۱۳﴾

اور دوسری مثالوں کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت کے مزید دلائل کا بیان فرمایا۔ ان میں سے ایک دلیل میٹھے دریاؤں اور نمکین سمندروں کا بظاہر ایک ہونے اور کئی منافع میں ایک جیسا ہونے کے باوجود کئی چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے۔ عذب فرات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان (۵۳) اور باقی آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۱۴)۔

**آیت 13** ① **يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ ......** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۷)، حج (۶۱) اور سورۂ لقمان (۲۹)۔

② **كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى** : یعنی یہ سب قیامت کے دن تک چل رہے ہیں، جب قیامت آئے گی تو ان کا چلنا موقوف ہو جائے گا اور یہ نظام باقی نہیں رہے گا۔

③ **وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ......** : ''**قِطْمِيْرٍ**'' کھجور کی گٹھلی پر باریک سے چھلکے کو کہتے ہیں، یعنی جس کی صفات اوپر بیان ہوئی ہیں حقیقت میں یہ ہے تمھارا سچا پروردگار، جو اکیلا زمین و آسمان کا بادشاہ ہے اور جنھیں تم حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہو وہ بے چارے بادشاہ تو کیا ہوں گے، کھجور کی گٹھلی پر باریک سی جھلی کے مالک بھی نہیں۔ بعض مفسرین نے ''**مِنْ دُوْنِهٖ**'' سے مراد بت قرار دیے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی ہے سب شامل ہیں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ برملا اعلان کر دیں کہ وہ نہ اپنے لیے کسی نفع یا نقصان کے مالک ہیں، نہ کسی دوسرے کے لیے، پھر کسی اور پیر فقیر کی کیا حیثیت ہے؟ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۸) اور سورۂ جن (۲۱) اس کی ایک دلیل اگلی آیت کے یہ الفاظ ہیں: ﴿ **وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ** ﴾ [ فاطر : ١٤ ] ''اور قیامت کے دن وہ تمھارے شرک کا انکار کریں گے۔'' ظاہر ہے قیامت کے دن ان کے شرک کا انکار بت نہیں، بلکہ وہ فرشتے، انبیاء اور صالحین کریں گے جن کے وہ بت بناتے تھے اور جنھیں وہ پکارتے رہتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۱۶)۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾

اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن لیں تو تمھاری درخواست قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھے ایک پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا ﴿۱۴﴾ اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے ﴿۱۵﴾

**آیت 14** ① اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ : جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ [ الأحقاف : ٥ ] ”اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انھیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔“

② وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ : اگر وہ سن بھی لیں تو تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ ان کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ١٩٤ ] ”بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمھارے جیسے بندے ہیں، پس انھیں پکارو تو لازم ہے کہ وہ تمھاری دعا قبول کریں، اگر تم سچے ہو۔“ اور فرمایا: ﴿ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ [ الرعد : ١٤ ] ”برحق پکارنا صرف اسی کے لیے ہے اور جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کچھ بھی قبول نہیں کرتے، مگر اس شخص کی طرح جو اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلانے والا ہے، تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، حالانکہ وہ اس تک ہرگز پہنچنے والا نہیں اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سراسر بے سود۔“

③ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ : اس کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مریم (۸۲) اور سورۂ قصص (۶۲، ۶۳)۔

④ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ : عرب میں یہ کلمہ ضرب المثل ہے کہ جب کسی نادان کو کسی دانا مجرب نے انجام کار سے آگاہ کیا تو وہ تنبیہ کر دیتا ہے کہ اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لے اور کہتا ہے: ”لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ“ یعنی جو شخص خبردار ہے، جس طرح اس نے تجھے بتا دیا ویسا کوئی نہیں بتائے گا، پھر ظاہر ہے اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون علیم و خبیر ہو سکتا ہے۔ (مواہب)

”خَبِيْرٍ“ کا معنی پوری خبر رکھنے والا ہے اور پوری خبر رکھنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا سب کا علم ناقص ہے اور پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی بھی خبر نہیں دے سکتا اور اس نے تمھیں بتا دیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پکار نہیں سنتا، بالفرض سن بھی لے تو درخواست قبول نہیں کر سکتا اور قیامت کے دن وہ سب تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے۔

**آیت 15** ① يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ...... : خبر ”الْفُقَرَآءُ“ پر الف لام آنے سے حصر اور تاکید کا معنی

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا

**اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے ﴿۱۶﴾ اور یہ اللہ پر کچھ مشکل نہیں ﴿۱۷﴾ اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور اگر کوئی بوجھ سے لدی ہوئی (جان) اپنے بوجھ کی طرف بلائے گی تو**

---

پیدا ہو گیا کہ لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو۔ اسی طرح ''وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ'' میں ضمیر فصل ''هُوَ'' اور خبر ''الْغَنِيُّ'' پر الف لام سے حصر کا معنی پیدا ہوا کہ صرف اللہ ہی ہے جو سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔

2 یہ بیان کرنے کے بعد کہ آسمان و زمین کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے سوا جنھیں پکارا جاتا ہے وہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان سے بچا سکتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ایک قطمیر (کھجور کی گٹھلی پر باریک چھلکا) کے مالک بھی نہیں۔ اب پچھلے سارے بیان کے خلاصے اور نتیجے کے طور پر فرمایا، لوگو! تم ہی اللہ تعالیٰ کے ہر طرح سے محتاج ہو، اپنے وجود میں، اپنی بقا اور اپنی ہر ضرورت کے لیے، لہٰذا اسی سے مانگو اور اسی کی عبادت کرو۔

3 **وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ** : یعنی دوسرے سب محتاج ہیں، ایک اللہ تعالیٰ ہے جو غنی ہے، کسی کا محتاج نہیں۔ غنی کے ساتھ حمید اس لیے فرمایا کہ غنی ایسا بھی ہو سکتا ہے جو کسی کا محتاج تو نہ ہو مگر نہ اس میں کوئی خوبی ہو نہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچاتا ہو۔ فرمایا، اللہ ایسا غنی ہے کہ وہ تمام کمالات اور خوبیوں کا مالک ہے، تمھیں اور تمام مخلوق کو حاصل ہر نعمت اسی کی عطا کردہ ہے، اس لیے وہی تمام تعریفوں اور تمام شکر کا مستحق ہے۔

**آیت 17،16** 1 **اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ** ...... : زمخشری نے فرمایا: ''اس آیت میں شریک بنانے کی وجہ سے ان پر غضب کا اظہار ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [ محمد : ۳۸ ] ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔''

2 غضب کے اظہار کے ساتھ اپنے غنی ہونے کا بھی بیان ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمھیں ہلاک کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، کیونکہ اس نے تمھیں اپنی کوئی محتاجی دور کرنے کے لیے پیدا نہیں فرمایا۔ نہ تمھارے نہ ہونے سے اس کے ملک میں کوئی کمی واقع ہو گی، نہ یہ کہ وہ تمھارے جیسے اور پیدا نہیں کر سکتا، وہ چاہے تو تمھیں ختم کر کے نئی مخلوق پیدا کر لے، جو تم سے ہر طرح بہتر ہو اور یہ بات اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

**آیت 18** 1 **وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى** : اس آیت میں مشرکین کے اس غلط خیال کا رد فرمایا کہ قیامت کے دن کچھ لوگ ان کے گناہ اپنے ذمے لے کر انھیں چھڑا لیں گے، جیسا کہ نصرانیوں کا کہنا ہے کہ مسیح علیہ السلام ان کے گناہوں کی پاداش میں سولی پر چڑھ گئے اور بعض کلمہ گو حضرات کا کہنا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کی محبت کی وجہ سے انھیں قیامت کے دن کوئی نہیں پوچھے گا، کیونکہ انھوں نے شہید ہو کر اپنے ساتھ محبت کرنے والوں کے گناہوں کا بوجھ خود اٹھا لیا ہے۔ آیت میں '' وَازِرَةٌ ''

تُنۡذِرُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنۡ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفۡسِهٖ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۸﴾

**اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا جائے گا، خواہ وہ قرابت دار ہو، تُو تو صرف ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو پاک ہوتا ہے تو وہ صرف اپنے لیے پاک ہوتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۱۸﴾**

---

محذوف لفظ "نَفۡسٌ" کی صفت ہے، جو مؤنث ہے، اس لیے صفت بھی مؤنث آئی ہے اور یہ لفظ اس لیے اختیار فرمایا کہ اس میں مرد عورتیں سب آ جاتے ہیں۔ یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی دوسری جان کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

② **وَاِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَةٌ اِلٰى حِمۡلِهَا**...... : یعنی نہ یہ ہوگا کہ کوئی اپنے آپ کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھا لے اور نہ یہ ہوگا کہ کسی کے پکارنے اور درخواست کرنے سے کوئی کسی کا بوجھ اٹھا لے، بلکہ اگر کوئی قرابت دار اپنے قریبی رشتہ دار کو اس مقصد کے لیے بلائے گا، حتیٰ کہ باپ ہو یا بیٹا تو وہ بھی اس کے بوجھ سے ذرہ برابر اپنے ذمے نہیں لے گا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی اور ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا۔ بلانے پر بھی بوجھ نہ اٹھانے کا ذکر الگ اس لیے فرمایا کہ عرب کے ہاں معروف تھا کہ جب کوئی تمھیں مدد کے لیے بلائے تو ہر صورت اس کی مدد کرو۔ فرمایا، وہاں بلانے پر بھی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ دیکھیے سورۂ لقمان (۳۳) اور عبس (۳۳ تا ۳۷) مزید دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۴)، بنی اسرائیل (۱۵) اور عنکبوت (۱۲، ۱۳)۔

③ **اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ**...... : اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ ان لوگوں کے رویے سے دلبرداشتہ اور غم زدہ نہ ہوں جو آپ کی دعوت سن کر ایمان نہیں لاتے، کیونکہ آپ صرف ان لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو اپنے رب کو دیکھے بغیر اس سے ڈرتے ہیں اور جب کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہوتا اس وقت بھی اس سے ڈرتے ہیں ("**بِالۡغَيۡبِ**" کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں) اور نماز قائم کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ کے ڈرانے سے وہی لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس پر ایمان رکھتے، اس سے ڈرتے اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور جو ان دیکھے رب کو مانتا ہی نہیں اور ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے، اسے آپ کے ڈرانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، نہ آپ اس کے لیے فکر مند ہوں۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۱۱) اور سورۂ قٓ (۴۵)۔

④ **وَمَنۡ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفۡسِهٖ** : یعنی آپ کی نصیحت سن کر جو شخص کفر و شرک اور فسق و فجور کی نجاست سے پاک ہوتا ہے، اس کا آپ پر یا اللہ تعالیٰ پر کچھ احسان نہیں، اس کے پاک ہونے کا فائدہ خود اسی کو ہے۔

⑤ **وَ اِلَى اللّٰهِ الۡمَصِيۡرُ** : یعنی کفر و فسوق کی نجاست میں آلودہ رہنے کا یا اس سے پاک ہونے کا نتیجہ پوری طرح قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور ضرور ظاہر ہوگا، کیونکہ سب کو دوبارہ اللہ ہی کی طرف واپس پلٹنا ہے۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

**اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں ﴿۱۹﴾ اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی ﴿۲۰﴾ اور نہ سایہ اور نہ لُو ﴿۲۱﴾ اور نہ زندے برابر ہیں اور نہ مُردے۔ بے شک اللہ سنا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تو ہرگز اسے سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہے ﴿۲۲﴾**

**آیت 19** **وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ** : یہ کافر اور مومن کی مثال ہے کہ کافر اندھا ہے اور مومن آنکھوں والا۔

**آیت 20** **وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ** : یہ کفر و ایمان کی مثال ہے کہ کفر نام ہے اندھیروں کا اور ایمان نور ہے۔ باطل اور کفر کی صورتیں اور اس کی راہیں بے شمار ہیں، اس لیے اس کے لیے جمع کا لفظ ''**الظُّلُمٰتُ**'' استعمال فرمایا، جب کہ حق ایک ہے اور ایمان کا راستہ بھی ایک ہی ہے، اس لیے اس کے لیے لفظ ''**النُّوْرُ**'' واحد استعمال فرمایا۔ حرف نفی ''**لَا**'' دو بار تاکید کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

**آیت 21** **وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ** : ''**الْحَرُوْرُ**'' سخت گرم ہوا، لُو۔ یہ ثواب اور عذاب یعنی جنت و جہنم کی مثال ہے کہ جنت سایہ ہے اور جہنم لُو۔

**آیت 22** ① **وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ** : یہ ایمان لانے والوں کی اور ایمان نہ لانے والوں کی مثال ہے کہ ایمان لانے والے زندوں کی طرح ہیں اور ایمان نہ لانے والے مُردوں کی طرح۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، جس طرح یہ باہم متضاد اور مختلف چیزیں برابر نہیں ہیں کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، بلکہ دونوں کے درمیان بہت سا فرق اور بُعد ہے اور جس طرح اندھیرے اور روشنی برابر نہیں اور سایہ اور لُو برابر نہیں، اسی طرح زندہ اور مُردے برابر نہیں۔ یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے بیان فرمائی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور کافروں کے لیے کہ وہ مردہ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ﴾ [ الأنعام : ۱۲۲ ] ''اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنا دی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں ہے، ان سے کسی صورت نکلنے والا نہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ﴾ [ ھود : ۲۴ ] ''دونوں گروہوں کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے والے کی طرح ہے، کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں؟'' چنانچہ مومن سننے اور دیکھنے والا ہے، دنیا اور آخرت کے اندر روشنی میں صراطِ مستقیم پر چلتا ہے، یہاں تک کہ یہ سفر اسے سایوں اور چشموں والی جنتوں کے ٹھکانے میں پہنچا دیتا ہے اور کافر اندھا اور بہرا ہے، اندھیروں میں چلتا ہے، ان سے کسی طرح نہیں نکلتا۔ دنیا اور آخرت میں اپنی سرکشی

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾

تُو تو محض ایک ڈرانے والا ہے ﴿۲۳﴾ بے شک ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت نہیں مگر اس میں ایک ڈرانے والا گزرا ہے ﴿۲۴﴾

---

اور گمراہی میں بھٹکتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ یہ سفر اسے جہنم کی لُو اور گرم پانی تک پہنچا دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا كَرِيْمٍ ﴾ [ الواقعة : ۴۳، ۴۴ ] ”اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں ہوں گے۔ جو نہ ٹھنڈا ہے اور نہ باعزت۔“

❷ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ : سنانے کا مطلب سوچنے، سمجھنے اور قبول کرنے کی توفیق کے ساتھ سنانا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہنے کی تو بات ہی دوسری ہے، وہ جسے چاہے سنا دے، چاہے تو بے جان پتھروں کو سنا دے، کسی اور میں یہ قدرت نہیں، نہ یہ رسول کے بس کا کام ہے کہ جن لوگوں کے دل مردہ ہو چکے ہوں ان کے دلوں میں اپنی بات اُتار سکے اور جو بات سننا ہی نہ چاہتے ہوں ان کے بہرے کانوں کو حق کی آواز سنا سکے، وہ تو انھی کو سنا سکتا ہے جو معقول بات سننے اور اس پر غور کے لیے آمادہ ہوں۔

❸ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ : یہ مشرکین کی مثال ہے کہ وہ مُردوں کی طرح ہیں جو سنتے نہیں، یعنی جس طرح تیرے بس میں یہ بات نہیں کہ تو قبروں میں دفن مُردوں کو اپنی بات سنا سکے اسی طرح جن لوگوں کے دل مُردہ ہو چکے ہیں تو انھیں بھی اللہ کی آیات نہیں سنا سکتا، نہ انھیں راہ راست پر لا سکتا ہے۔

❹ یہ آیت مُردوں کے نہ سننے کی بھی واضح دلیل ہے۔ دیکھیے سورۂ نمل (۸۰، ۸۱)۔

**آیت 23** اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ : یعنی تیرا کام لوگوں کو خبردار کرنے اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے سے زیادہ کچھ نہیں، انھیں ہدایت دینا اور ان کے دل میں ایمان اتار دینا تیرا کام نہیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے تُو ان کے ایمان نہ لانے پر اس قدر دلبرداشتہ اور غم زدہ نہ ہو۔

**آیت 24** ❶ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا: حق سے مراد اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت ہے۔ یعنی اے رسول! ہم نے تجھے حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ جو تجھ پر ایمان لائیں انھیں جنت کی بشارت دے اور جو تجھے جھٹلائیں انھیں اللہ کے عذاب سے ڈرائے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت اور تسلی ہے۔

❷ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ : اس میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اپنی رحمت کا اور اپنے فضل کا بیان فرمایا ہے کہ اس نے لوگوں کو اندھیروں میں بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑا کہ ان کے لیے سیدھے اور غلط راستے کی نشان دہی نہ کرے، بلکہ اس سے پہلے جو قوم بھی گزری اس نے اس کی طرف کوئی نہ کوئی ڈرانے والا ضرور بھیجا، خواہ وہ نبی یا رسول ہو، خواہ اس کا نائب دین کا

وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۚ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۲۶﴾ ع اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

**اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بلاشبہ ان لوگوں نے (بھی) جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ اور صحیفوں کے ساتھ اور روشنی کرنے والی کتاب کے ساتھ آئے ﴿۲۵﴾ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنھوں نے کفر کیا، تو میرا عذاب کیسا تھا؟ ﴿۲۶﴾ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر ہم نے**

---

کوئی عالم اور مبلغ ہو جس کے ذریعے سے رسول کی لائی ہوئی شریعت لوگوں تک پہنچ جائے۔

**آیت 25** ① **وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ** : اس میں رسول اللہ ﷺ کو مزید تسلی دی ہے۔ یعنی اگر یہ لوگ تجھے جھٹلا دیں تو غم یا افسوس کی ضرورت نہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، نہ آپ پہلے رسول ہیں جسے جھٹلایا گیا ہو، بلکہ آپ سے پہلے لوگوں کے پاس بھی کئی رسول آئے اور آپ سے پہلے لوگوں نے بھی اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔

② **جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ** : یہاں ایک سوال ہے کہ "اَلْکِتَابُ الْمُنِیْرُ" "اَلزُّبُرُ" میں بھی داخل ہے اور "اَلْبَیِّنَاتُ" میں بھی، تو پھر عطف ڈال کر اسے الگ کیوں ذکر کیا گیا؟ بعض اہل علم نے اس کا جواب دیا کہ تینوں الفاظ اگرچہ ایک چیز پر صادق آتے ہیں مگر عطف اس لیے ڈالا گیا ہے کہ تینوں سے الگ الگ مفہوم مراد لیا گیا ہے، چنانچہ "اَلْبَیِّنَاتُ" سے مراد معجزات ہیں، "اَلزُّبُرُ" سے مراد وہ کتابیں ہیں جو وعظ و نصیحت پر مشتمل ہیں اور "اَلْکِتَابُ الْمُنِیْرُ" سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں شریعت کے احکام تھے، جیسا کہ تورات وغیرہ۔ (شوکانی)

**آیت 26** **ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا** ...... : نبی ﷺ کو تسلی دینے کے بعد آپ کی نافرمانی کرنے والوں اور ایمان نہ لانے والوں کو دھمکی اور ڈانٹ کے لیے فرمایا کہ پھر ان رسولوں پر ایمان نہ لانے والوں کو میں نے پکڑ لیا، تو میرا عذاب کیسا تھا؟ اسی طرح اگر یہ لوگ آپ پر ایمان نہ لائے تو میرا عذاب ان سے بھی کچھ دور نہیں۔

**آیت 27** ① **اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً** ...... : یعنی اس کائنات میں اشیاء کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہے، جیسا کہ میٹھے دریا اور نمکین سمندر، نابینا اور بینا لوگ، اندھیرے اور روشنی، سایہ اور لو، مردہ اور زندہ، مومن اور کافر کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اب نباتات و جمادات کی بوقلمونی اور رنگا رنگی پر غور کرو، اگر ایک صانع حکیم کی کاریگری نہ ہوتی تو کائنات میں یہ رنگا رنگی کبھی نہ ہوتی۔ یہ اندھے، بہرے اور شعور سے عاری مادے کا کام نہیں، بلکہ اس قادرِ مطلق کا کام ہے جس نے اس اختلاف کو اپنی وحدانیت اور کمال قدرت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

② "اَلَمْ تَرَ" کا لفظی معنی ہے "کیا تو نے نہیں دیکھا؟" یہ کلمہ بعض اوقات ایسے شخص سے کہا جاتا ہے جسے پہلے اس بات کا علم ہو، اس وقت یہ تعجب کے اظہار کے لیے ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسے شخص سے کہا جاتا ہے جسے پہلے علم نہیں ہوتا۔ اس وقت مقصود اسے بتانا اور اسے تعجب میں ڈالنا ہوتا ہے۔ یہ کلمہ اس دوسرے مفہوم میں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے، گویا جس

مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾

**اس کے ساتھ کئی پھل نکالے، جن کے رنگ مختلف ہیں اور پہاڑوں میں سے کچھ سفید اور سرخ قطعے ہیں، جن کے رنگ مختلف ہیں اور کچھ سخت کالے سیاہ ہیں ﴿۲۷﴾**

---

شخص نے ایک چیز نہیں دیکھی اسے دیکھنے والے شخص کی طرح قرار دے کر اس سے بات کی جاتی ہے، اس لحاظ سے کہ یہ ایسی چیز ہے جس سے تمھارا لاعلم ہونا مناسب ہی نہیں، پھر اس سے اس شخص کی طرح بات کی جاتی ہے جس نے اسے دیکھا ہو اور اسے اچھی طرح جانتا ہو۔ آیت میں "اَلَمْ تَرَ" کا معنی "أَلَمْ تَعْلَمْ" ہے، کیا تو نے نہیں جانا، یعنی یقیناً تم جانتے ہو۔ (ملخص از آلوسی)

③ یعنی اے مردِ عاقل! یقیناً تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بہت سا پانی اتارا ("مَآءً" کی تنوین تکثیر کے لیے ہے) پھر اس کے ساتھ زمین سے بہت سے پھل اگائے، جن کے رنگ، شکلیں، اقسام اور ذائقے مختلف ہیں۔ کوئی سرخ ہے، کوئی زرد، کوئی سبز، کوئی میٹھا، کوئی کھٹا اور کوئی اس کے علاوہ، حالانکہ سب ایک ہی زمین سے پیدا ہوئے اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوئے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ [ الرعد : ٤ ] "اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے مختلف ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت کئی تنوں والے اور ایک تنے والے، جنھیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو پھل میں بعض پر فوقیت دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔"

④ "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" میں اللہ تعالیٰ نے پانی اتارنے میں اپنا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ فرمایا، پھر "فَاَخْرَجْنَا بِهٖ" میں اپنا ذکر جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ کیا ہے، اسے "التفات" کہتے ہیں۔ اس سے مقصود زمین سے اتنی مختلف چیزیں اگانے میں اپنی کمال قدرت کو نمایاں کرنا ہے کہ یہ سب کچھ ہم نے سرانجام دیا ہے۔

⑤ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ...... : "جُدَدٌ" "جُدَّةٌ" کی جمع ہے، اس کا معنی راستہ اور لکیر ہے۔ مراد پہاڑوں میں مختلف رنگوں کی دھاریاں اور قطعے ہیں۔ "سُوْدٌ" "أَسْوَدُ" کی جمع ہے۔ "غَرَابِيْبُ" جمع ہے "غِرْبِيْبٌ" کی۔ جب کسی چیز کو زیادہ سیاہ کہنا ہو تو "أَسْوَدُ" کی تاکید کے طور پر یہ لفظ آتا ہے، یعنی "أَسْوَدُ غِرْبِيْبٌ" جیسا کہ اردو میں "کالا سیاہ" یا "کالا بھجنگا" کہا جاتا ہے۔ یہاں آیات کے فواصل کی مناسبت سے "غَرَابِيْبُ" کو پہلے کر دیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونوں میں سے ایک اور نمونے کا ذکر ہے، فرمایا ہماری قدرت ہی کا کرشمہ ہے کہ پہاڑوں میں مختلف رنگوں کے قطعے ہیں، کوئی سفید ہیں، کوئی سرخ اور کوئی کالے سیاہ اور کوئی کسی اور رنگ کے، کسی کی کوئی شکل ہے کسی کی کوئی اور، کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا، کوئی پتھر کا ہے کوئی مٹی کا، کوئی سنگ مرمر کا ہے کوئی نمک کا اور کوئی کسی اور چیز کا۔ "غَرَابِيْبُ سُوْدٌ" میں ایک مزید اہم

وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

**اور کچھ لوگوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں سے بھی ہیں جن کے رنگ اسی طرح مختلف ہیں، اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں، بے شک اللہ سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے ﴿۲۸﴾**

---

نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پہلے تو نباتات و جمادات کے رنگ مختلف ہیں، پھر ہر رنگ میں مزید اختلاف ہے، کوئی کالا ہے، کوئی اس سے زیادہ کالا اور کوئی کالا سیاہ۔ انسانوں کے سروں کے بالوں کی سیاہی کو ہی دیکھ لو کہ ایک شخص کے سر کے بالوں کی سیاہی دوسرے کے سر کے بالوں کی سیاہی سے مختلف ہے۔ دیکھتے جاؤ اور تعجب کرتے جاؤ کہ اس قادر مطلق کے کارخانۂ حکمت کی رنگا رنگی کی کوئی حد ہے کہ اس نے آدم علیہ السلام سے لے کر آخری انسان کے سر کے بالوں کی سیاہی کو دوسرے انسان کے سر کے بالوں کی سیاہی سے الگ بنایا ہے اور اس کے ہاتھوں کی لکیروں اور آنکھ کی پتلی بلکہ جسم کی ہر چیز کو دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ ہر درخت کے سبز رنگ کو دوسرے کے سبز رنگ سے الگ بنایا ہے، اس کے ہر پتے کی لکیریں دوسرے پتے سے الگ ہیں۔ ہر پھل مثلاً آم، جامن اور کھجور کو دوسرے سے الگ تو بنایا ہی ہے، پھر ہر پھل کے اندر اتنا تنوع رکھ دیا ہے کہ آم اور کھجور وغیرہ کی گٹھلی سے پیدا ہونے والا پھل پہلے درخت کے پھل سے الگ قسم کا ہے، جس کی گٹھلی سے وہ پیدا ہوا ہے، جیسا کہ ہر انسان اپنے ماں باپ سے الگ رنگ اور الگ شکل و صورت کا ہے۔ غرض ہر چیز کا رنگ الگ ہے اور اس رنگ مثلاً سفید یا سرخ یا زرد یا سیاہ میں سے ہر سفید، سرخ، زرد اور سیاہ کی سفیدی، سرخی، زردی اور سیاہی دوسرے سے مختلف ہے، یہی حال اس کے ذائقے کا ہے۔
﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المؤمنون : ۱٤] ''سو بہت برکت والا ہے اللہ جو بنانے والوں میں سب سے اچھا ہے۔''

**آیت 28** ① **وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ:** یعنی صرف نباتات اور جمادات ہی میں نہیں بلکہ دوسری تمام مخلوقات میں رنگا رنگی کا یہی عالم ہے۔ انسان، جانور اور چوپائے سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں ہر جنس کی مختلف قسمیں ہیں اور ہر قسم کا ہر فرد دوسرے سے مختلف ہے۔

② **اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا :** یہاں علم سے مراد دنیوی علوم نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی صفات کا علم ہے، جس کو اللہ کی عظمت و صفات کا جتنا علم ہوگا اتنا ہی وہ اس کی نافرمانی سے ڈرے گا۔ علاوہ ازیں آیت میں ''علماء'' سے مراد وہ اصطلاحی علماء بھی نہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ کا علم رکھنے کی بنا پر علمائے دین کہے جاتے ہیں۔ وہ اس آیت کے مصداق اسی صورت میں ہوں گے جب ان کے اندر اللہ کا ڈر بھی ہوگا۔ اسی طرح وہ مسلمان سائنس دان بھی اس کے مصداق ہیں جن کے دل میں کائنات کے عجائب سامنے آنے پر اللہ کی عظمت کے یقین اور اس سے ہیبت و خشیت میں اضافہ ہوتا ہے۔
طبری نے معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ علماء وہ ہیں جو جانتے ہیں: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ ''یقیناً اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾

**بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور انھوں نے نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا اس میں سے انھوں نے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا، وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو کبھی برباد نہ ہوگی ﴿۲۹﴾**

③ تفسیر قاسمی میں ہے: ''اس سے پہلے فرمایا تھا: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ [ فاطر : ۱۸ ] ''تو صرف ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔'' یہ جملہ اسی کی تکمیل ہے، لوگوں کے مختلف طبقات اور مراتب بیان کرنے کے بعد بتایا کہ رب تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس سے کون ڈرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس سے وہی ڈرتے ہیں جو اس کا اور اس کی صفاتِ جلیلہ و افعالِ جمیلہ کا علم رکھتے ہیں، کیونکہ بندہ اسی سے ڈرتا ہے جس کا اسے علم ہو اور جس کی قوت و عظمت اور صفات کمال کو وہ جانتا ہو۔ پھر جسے اس کا جتنا زیادہ علم ہوگا اتنا ہی وہ اس سے ڈرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( وَاللّٰهِ! لَأَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَ أَخْشَاكُمْ لَهُ )) [ منتخب مسند عبد بن حميد، ح : ۱۵۰۲ ] ''اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ کا علم رکھنے والا اور تم سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہوں۔'' صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: (( إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَ أَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ أَنَا )) [ بخاري، الإيمان، باب قول النبي ﷺ أنا أعلمكم بالله : ۲۰ ] ''بے شک تم سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا میں ہوں۔'' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت پر دلالت کرنے والے کاموں کے ذکر کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے صرف علم والے ڈرتے ہیں۔ کافر چونکہ اللہ تعالیٰ کی اس پہچان سے بالکل بے خبر ہیں، اس لیے انھیں ڈرانا بالکل بے سود ہے۔'' (افادہ از ابوالسعود)

قاسمی ہی نے قاشانی سے نقل فرمایا ہے: ''یعنی اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو اس کے عالم و عارف ہیں (اسے جاننے پہچاننے والے ہیں)، کیونکہ یہاں خشیت اور ڈرنے سے مراد عذاب کا ڈر نہیں ہے، بلکہ خشیت دل میں خشوع و انکسار کی اس حالت کا نام ہے جو اس کی عظمت کے تصور اور اسے دل میں حاضر کرنے سے پیدا ہوتی ہے، کیونکہ جو اس کی عظمت کا تصور نہ کرے، ممکن نہیں اس سے ڈرے اور اللہ تعالیٰ اپنی عظمت کے ساتھ جس شخص کے دل کی آنکھوں کے سامنے حاضر ہو وہ اس سے اس طرح ڈرے گا جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ کا کامل علم و معرفت رکھنے والے کے درمیان اور اس کا ناقص علم و معرفت رکھنے والے کے درمیان اس کی حاضری کے تصور میں بہت زیادہ فرق ہے اور دونوں کے درمیان علم و معرفت کی کمی بیشی کے لحاظ سے اتنے مرتبے ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔''

④ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے، چاہے تو نافرمان اور سرکش لوگوں کو فوراً پکڑے، مگر وہ بے حد بخشنے والا ہے، اس لیے انھیں مہلت دیے جاتا ہے، تاکہ وہ کسی وقت بھی پلٹ آئیں۔

**آیت 29** ① اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ ...... : یہ بات ذکر کرنے کے بعد کہ علماء ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے

لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

تاکہ وہ انھیں ان کے اجر پورے پورے دے اور اپنے فضل سے انھیں زیادہ بھی دے، بلاشبہ وہ بے حد بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے ﴿۳۰﴾

---

ڈرتے ہیں، ان کے تین اوصاف ذکر فرمائے، پھر انھیں ملنے والے اجر کا ذکر فرمایا۔ ان تین اوصاف میں سے پہلا وصف اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے علم کا سرچشمہ وہی ہے اور اسی سے اللہ کی خشیت پیدا کرنے والا علم حاصل ہوتا ہے۔ دوسری اور تیسری صفت اس علم کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے نماز قائم کرنا اور اس کے دیے ہوئے میں سے خفیہ اور علانیہ ہر طرح سے خرچ کرنا ہے۔ یہ تینوں چیزیں علم و عمل کی بنیاد ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہود کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے اللہ کی کتاب کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا: ﴿فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ [ آل عمران : ۱۸۷ ] ''تو انھوں نے اسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا۔'' اور نماز قائم کرنے کے بجائے اسے ضائع کر دیا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بجائے خواہش پرستی، سود خوری اور شدید بخل کو اپنا شیوہ بنا لیا، فرمایا: ﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴾ [ مریم : ۵۹ ] ''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔'' جس کے نتیجے میں وہ اس علم سے محروم ہو گئے جس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے۔

❷ يَرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ : علم و ایمان والوں کے عمل کو تجارت کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ آدمی دنیا میں جو بھی تجارت کرتا ہے، اس میں اپنا سرمایہ اور محنت و قابلیت اس امید پر صرف کرتا ہے کہ اسے اصل کے ساتھ ساتھ نفع بھی حاصل ہوگا، اس کے باوجود اسے نفع کی امید کے ساتھ خسارے کا بلکہ اصل سرمایہ برباد ہونے کا ڈر بھی رہتا ہے، مگر اللہ کے بندے جو اپنے اوقاتِ عزیزہ کو، جو ان کی زندگی کا سرمایہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کے سودے میں صرف کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے سودے میں نفع ہی نفع کی امید ہے، خسارے کا یا اصل سرمایہ برباد ہونے کا کوئی خوف نہیں۔

**آیت 30** ❶ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ : '' لِيُوَفِّيَهُمْ '' میں لام عاقبت کا ہے، یعنی اہل علم کی تلاوتِ کتاب، اقامتِ صلاۃ اور خرچ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور اپنے فضل سے مزید بھی دے گا۔ یہ لام علت اور وجہ بیان کرنے کے لیے بھی ہو سکتا ہے، یعنی علم والے لوگ قرآن کی تلاوت، اقامتِ صلاۃ اور اللہ کے عطا کردہ میں سے خرچ کرتے ہیں، تاکہ وہ انھیں ان کے اجر پورے دے اور اپنے فضل سے مزید بھی عطا فرمائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ [ النساء : ۱۷۳ ] ''پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو وہ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ بھی دے گا۔'' اپنے فضل سے مزید عطا کرنے میں ایک نیکی کو سات سو نیکیوں تک یا اس سے بھی زیادہ بڑھانا ہے، پھر چند روزہ

وَالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۳۱ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝۳۲

اور وہ جو ہم نے تیری طرف کتاب میں سے وحی کی ہے وہی حق ہے، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی یقیناً پوری خبر رکھنے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ۝۳۱ پھر ہم نے اس کتاب کے وارث اپنے وہ بندے بنائے جنھیں ہم نے چن لیا، پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے اور ان میں سے کوئی میانہ رو ہے اور ان میں سے کوئی نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے، اللہ کے حکم سے۔ یہی بہت بڑا فضل ہے ۝۳۲

زندگی کے عمل پر ہمیشہ کی جنت عطا کرتا ہے، پھر جنت کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت اپنا دیدار عطا فرماتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ﴾ [ یونس : ۲٦ ] ”جن لوگوں نے نیکی کی انھی کے لیے نہایت اچھا بدلا اور کچھ زیادہ ہے۔“ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔ (آمین)

2 اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ : یعنی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کے گناہوں پر بے حد پردہ ڈالنے والا اور ان کے نیک اعمال کی بے حد قدر کرنے والا ہے۔

**آیت 31** 1 وَ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ...... : اس کا عطف ” اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ “ پر ہے۔ کتاب اللہ کی تلاوت کرنے والے علماء کی فضیلت بیان کرنے کے بعد فرمایا: ”اور یہ کتاب جو ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے، کامل حق یہی ہے۔“ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے احکام پر مشتمل جتنی کتابیں ہیں ان میں سے جو لوگوں کی تصنیف کردہ ہیں ان میں حق کا کچھ حصہ ہے بھی تو اکثر حصہ باطل ہے اور جو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، مثلاً تورات و انجیل تو ان کے اندر بعد میں تحریف اور کمی بیشی کی وجہ سے کچھ باطل چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں، ان کی جو باتیں حق ہیں یہ کتاب ان کی تصدیق کرتی ہے اور جو باطل ہیں ان کی تردید کرتی ہے، اس لیے یہ ان کے اصل اور صحیح مضامین کی محافظ ہے۔ اب کامل حق چونکہ صرف اسی کتاب میں ہے، اس لیے آپ کو اور آپ کی امت کو صرف اس پر عمل کرنا چاہیے۔

2 اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ضروریات کی پوری خبر رکھنے والا اور ان کے اعمال کو پوری طرح دیکھنے والا ہے۔ اس نے آپ پر یہ کتاب ان کی اور ان کے زمانے کی تمام ضروریات کو مدنظر رکھ کر نازل فرمائی ہے۔

**آیت 31** 1 ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا : یعنی ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف وحی کی، پھر اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنھیں ہم نے اس کتاب کا وارث بننے کے لیے، یعنی امتِ مسلمہ میں شامل ہونے کے لیے

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّ لُؤۡلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمۡ فِیۡهَا حَرِیۡرٌ ﴿۳۳﴾

ہیشگی کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں انھیں کچھ کنگن سونے کے اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ان میں ریشم ہوگا ﴿۳۳﴾

---

چن لیا اور یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں چن لیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴾ [ الشوری : ۱۳ ] ''اللہ اپنی طرف چن لیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف راستہ اسے دیتا ہے جو رجوع کرے۔''

❷ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ...... : کتاب اللہ کے وارث بننے والے افراد کی، یعنی امت مسلمہ کی تین قسمیں ہیں، کچھ وہ جو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں کہ ان کی نیکیاں گناہوں کے مقابلے میں کم ہیں، کچھ میانہ رو ہیں کہ جن کے نیک و بد اعمال قریباً برابر ہیں اور کچھ وہ جو اللہ کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں۔ ان تینوں گروہوں کو حاصل ہونے والی نعمت، یعنی کتاب اللہ کی وراثت اور امتِ مسلمہ میں شمولیت بہت ہی بڑا فضل ہے۔

**آیت 33** ❶ جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا : یعنی یہ تینوں گروہ آخر کار جنات عدن میں داخل ہو جائیں گے۔ طبری اور بیہقی نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے: (( هُمْ أُمَّةُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، وَرَّثَهُمُ اللّٰهُ كُلَّ كِتَابٍ أَنْزَلَهُ، فَظَالِمُهُمْ يُغْفَرُ لَهُ، وَ مُقْتَصِدُهُمْ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا، وَ سَابِقُهُمْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ )) [ طبري : ۲۹۲۳٦ ۔ البعث والنشور للبيهقي : ۱/٦۸، ح : ٦٤ ] ''یہ (کتاب کے وارث) امت محمد ﷺ کے لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی نازل کردہ تمام کتابوں کا وارث بنایا۔ ان میں سے ظالم کو بخش دیا جائے گا، ان کے میانہ رو کا آسان حساب ہوگا اور ان کے سبقت لے جانے والے جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے۔'' یعنی امت مسلمہ میں سے اپنی جان پر ظلم کرنے والے لوگ اگر جہنم میں گئے بھی تو ہمیشہ وہاں نہیں رہیں گے، بلکہ ایمان کی برکت سے انھیں شفاعت کے ذریعے سے یا ایمان والوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے نتیجے میں جہنم سے نکال لیا جائے گا اور وہ جنات عدن میں داخل ہو جائیں گے اور یہ بہت ہی بڑا فضل ہے جو ان لوگوں کو کبھی حاصل نہیں ہوگا جو امت مسلمہ میں داخل ہو کر کتاب اللہ کے وارث نہیں بنے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جنت کی نعمتیں ہمیشہ کے لیے حرام کر دی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ﴾ [ الأعراف : ۵۰ ] ''اللہ تعالیٰ نے جنت کا پانی اور اس کا رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے۔''

❷ بعض مفسرین نے ان تینوں گروہوں میں سے ''ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ'' کفار کو قرار دیا ہے اور تینوں گروہوں کی تفصیل ان تین گروہوں کے مطابق کی ہے جن کا ذکر سورۂ واقعہ میں ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کی تین قسمیں ہو جائیں گی، اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور سابقون۔ ان میں سے سابقون اور اصحاب الیمین جنتی ہوں گے اور اصحاب الشمال جہنمی ہوں گے۔ مگر پہلی تفسیر راجح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تینوں گروہوں کا ذکر کر کے تینوں کے متعلق فرمایا کہ وہ جنات عدن میں داخل ہوں گے۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

اور وہ کہیں گے سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا، بے شک ہمارا رب یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے ﴿۳۴﴾ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے گھر میں اتارا، نہ ہمیں اس میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور نہ ہمیں اس میں کوئی تھکاوٹ پہنچتی ہے ﴿۳۵﴾

---

اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب امت مسلمہ کا ہر فرد ہی جنت میں داخل ہو گا تو ایمان لانے کے بعد جہنم سے ڈرانے اور ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ ان میں سے کوئی جہنم میں نہیں جائے گا، بلکہ اگر کوئی شخص جہنم میں مدتوں رہنے کے بعد آخر کار جنت میں داخل ہو جائے تو یہ بھی فضل کبیر ہے۔ کیونکہ جب ایسے لوگ جنت میں جائیں گے تو کافر اس وقت تمنا کریں گے کہ کاش! وہ کسی درجے کے بھی مسلمان ہوتے تو ہمیشہ جہنم میں نہ رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [ الحجر : ۲ ] ''بہت بار چاہیں گے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کاش! وہ کسی طرح کے مسلم ہوتے۔'' مزید سورۂ حجر کی آیت (۲) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

3 يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ...... : اس کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حج کی آیت (۲۳)۔

**آیت 34** 1 وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ : حزن کسی چیز کے ہاتھ سے نکلنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی دل کی کیفیت کا نام ہے، یعنی غم، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ ﴾ [ الحدید : ۲۳ ] ''تاکہ تم اس پر غم نہ کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے۔'' دنیا میں انسان کو جو بھی ملا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جانے والا ہے، اس لیے دنیا میں جب تک کوئی نعمت انسان کے پاس رہتی ہے وہ اس خوف میں رہتا ہے کہ یہ نعمت مجھ سے چھن نہ جائے اور جب چھنتی ہے تو اسے غم ہوتا ہے۔ جنت میں داخلے اور موت کے ذبح کر دیے جانے کے بعد اہل جنت کو نہ کوئی نعمت چھننے کا خوف ہو گا، یعنی '' لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ '' اور نہ کسی نعمت کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم، یعنی '' وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ '' کیونکہ نہ ان کے جمال میں کمی ہو گی، نہ کھانے پینے میں، نہ ان کی قوت اور جوانی میں، نہ ان کی لذتوں میں اور نہ ہمیشہ رہائش میں تو پھر غم کس بات کا، اس لیے وہ اللہ کا شکر ادا کریں گے، جس نے ان سے ہر قسم کا غم دور کر دیا۔ دنیا کی ہر نعمت تو ختم ہونے کی وجہ سے غم کا باعث بنتی تھی، یہ جنت ہی ہے جس کی کوئی نعمت غم کا باعث نہیں بنے گی۔ ابن الرومی نے کہا ہے ؎

وَ مَنْ سَرَّهُ أَلَّا يَرٰى مَا يَسُوْءُهُ ... فَلَا يَتَّخِذْ شَيْئًا يُبَالِيْ لَهُ فَقْدًا

''جسے پسند ہو کہ وہ غمگین کرنے والی کوئی چیز نہ دیکھے تو وہ ایسی کوئی چیز نہ پکڑے جس کے گم ہونے کی اسے فکر ہو۔''

2 اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۳۰)۔

**آیت 35** 1 الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ : ''دَارَ الْمُقَامَةِ'' ہمیشہ رہنے کا گھر، جس سے کبھی نکالا نہیں جائے گا۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۚ﴿۳۶﴾

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس کا کچھ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ایسے ہی ہر ناشکرے کو بدلا دیا کرتے ہیں ﴿۳۶﴾

---

② مِنْ فَضْلِهٖ : یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ اس میں رہنا محض اللہ کے فضل سے ہے، کیونکہ آدمی کے اعمال تو ان نعمتوں کے شکر کے لیے بھی کافی نہیں جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسے عطا کی ہیں، پھر اگر کوئی نیکی کی ہے تو محدود وقت میں کی ہے، اس پر ہمیشہ ہمیشہ کی جنت محض اللہ کا فضل ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: (( لَنْ يُّدْخِلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ )) ''کسی شخص کا عمل بھی اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا۔'' صحابہ نے کہا: ''تو کیا آپ کو بھی نہیں اے اللہ کے رسول!؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا، وَ لَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَ رَحْمَةٍ )) [ بخاري، المرضى، باب تمنى المريض الموت : ۵۶۷۳ ] ''نہیں، مجھے بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے فضل و رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے۔''

③ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ : یعنی ہماری تمام محنتوں اور تکلیفوں کا خاتمہ ہو گیا۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''رہنے کا گھر اس سے پہلے کوئی نہ تھا، ہر جگہ چل چلاؤ اور روزی کا غم، دشمنوں کا ڈر اور رنج اور مشقت، وہاں پہنچ کر سب گئے۔'' (موضح)

**آیت 36** ① وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ : جنت میں جانے والے خوش نصیبوں کے بعد جہنم میں جانے والے بدنصیبوں کا ذکر فرمایا، یعنی جن لوگوں نے اس کتاب کو ماننے سے انکار کر دیا جو ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور جس کے وارث ہمارے چنے ہوئے بندے ہیں، ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔

② لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا : جہنمی موت کو راحت خیال کریں گے اور اس کی تمنا کریں گے، مگر ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہو گی۔ قرآن مجید کی کئی آیات میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ جہنمیوں پر موت نہیں آئے گی کہ وہ عذاب سے رہائی پا جائیں، نہ ہی ان کی زندگی کوئی زندگی ہو گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴾ [ الأعلى : ۱۳ ] ''پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔'' اور دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۵ تا ۱۷) اور سورۂ زخرف (۷۷) ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يُؤْتٰى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ هٰذَا الْمَوْتُ، وَ كُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، ثُمَّ يُنَادِيْ يَا أَهْلَ النَّارِ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ، فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ هٰذَا الْمَوْتُ، وَ كُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، فَيُذْبَحُ ثُمَّ يَقُوْلُ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ : ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ

وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾ ع ۱۱ / ۱۶

اور وہ اس میں چلائیں گے، اے ہمارے رب! ہمیں نکال لے، ہم نیک عمل کریں گے، اس کے خلاف جو ہم کیا کرتے تھے۔ اور کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی کہ اس میں جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا حاصل کر لیتا اور تمھارے پاس خاص ڈرانے والا بھی آیا۔ پس چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ﴿۳۷﴾

---

وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ وَ هٰؤُلَاءِ فِي غَفْلَةٍ أَهْلُ الدُّنْيَا ﴿وَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ) [ بخاري، التفسير، سورة كهيعص، باب قوله عز وجل : ﴿ و أنذرهم يوم الحسرة ﴾ : ۴۷۳۰ ] ''موت کو ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: ''اے جنت والو!'' وہ گردنیں اٹھا کر دیکھیں گے، وہ کہے گا: ''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں، یہ موت ہے۔'' اور ان سب نے اسے دیکھا ہو گا، پھر وہ آواز دے گا: ''اے آگ والو!'' وہ گردنیں اٹھا کر دیکھیں گے، وہ کہے گا: ''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں، یہ موت ہے۔'' اور ان سب نے اسے دیکھا ہو گا، پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر وہ کہے گا: ''اے جنت والو! (اب) ہمیشگی ہے اور کوئی موت نہیں اور اے آگ والو! (اب) ہمیشگی ہے اور کوئی موت نہیں۔'' پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ [ مریم : ۳۹ ] ''اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب (ہر) کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں (یعنی دنیا دار لوگ) اور وہ ایمان نہیں لاتے۔''

3 وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا : کفار کی ایک سزا تو یہ ہو گی کہ ان کی موت کی تمنا کبھی پوری نہیں ہو گی، اس پر مزید سزا یہ ہو گی کہ کبھی عذاب میں وقفہ نہیں ہو گا، نہ عذاب کی شدت میں کمی ہو گی، بلکہ لحہ بہ لحہ ان کے عذاب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۱، ۱۶۲)، زخرف (۷۴)، بنی اسرائیل (۹۷) اور سورۂ نبا (۳۰)۔

4 كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ : ہم ہر ناشکرے کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں جو ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے ایمان لانے کے بجائے کفر پر اصرار کرتا ہے۔

**آیت 37** 1 وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ...... : ''يَصْطَرِخُوْنَ'' ''صَرَخَ يَصْرُخُ صُرَاخًا'' (ن) (سخت چیخنا) سے باب افتعال ہے، جس میں مزید مبالغہ ہے، اصل میں ''يَصْتَرِخُوْنَ'' تھا، ''صاد'' کی مناسبت سے ''تاء'' کو ''طاء'' سے بدل دیا، یعنی بہت چیخیں چلائیں گے۔ جہنمیوں کی تمنا کہ انھیں ایک دفعہ جہنم سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا جائے اور وہ پہلے کے برعکس نیک عمل کریں گے، قرآن مجید میں کئی جگہ ذکر ہوئی ہے، مگر ان کی یہ تمنا پوری نہیں کی جائے گی۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۳)، سجدہ (۱۲)، مؤمن (۱۱) اور سورۂ شوریٰ (۴۴) ایک مقام پر فرمایا کہ اگر انھیں واپس بھیج بھی دیا جائے تو دوبارہ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۸)۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزیں جاننے والا ہے، بے شک وہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۳۸﴾

② اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ ...... : اس آیت کی تفسیر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بیان فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَعْذَرَ اللّٰهُ إِلَى امْرِئٍ أَخَّرَ أَجَلَهُ حَتّٰى بَلَّغَهُ سِتِّيْنَ سَنَةً )) [ بخاري، الرقاق، باب من بلغ ستين سنة...... : ٦٤١٩ ] ''اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کا عذر ختم کر دیا جس کی موت میں اتنی دیر کی کہ وہ ساٹھ برس ہی کو پہنچ گیا۔'' مگر اس حدیث سے مراد یہ نہیں کہ اس سے کم عمر والے کو یہ بات نہیں کہی جائے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ سب سے زیادہ ڈانٹ اس عمر کے لوگوں کو پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات ہر اس شخص کو کہی جائے گی جو بلوغت کی عمر کو پہنچا، اللہ تعالیٰ نے اسے اچھے برے کی تمیز عطا فرمائی، اگر وہ چاہتا تو ایمان لا سکتا تھا، مگر وہ جان بوجھ کر کفر پر اڑا رہا۔ کیونکہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ساٹھ سال سے کم عمر والے کفار کو اس عذر کی وجہ سے جہنم سے چھٹکارا نہیں ملے گا کہ انھیں ساٹھ برس کی عمر نہیں ملی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کتنے ہی کافر جہنم واصل ہوئے، جن کی عمریں ساٹھ سال سے کم تھیں۔

③ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ : اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد ہر وہ شخص ہے جس کے ذریعے سے کسی کو حق کا پیغام پہنچے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ١٥ ] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔'' ''النَّذِيْرُ '' کا لفظ عام ہے، جس میں رسول اور اس کے نائب کے علاوہ وقتاً فوقتاً پیش آنے والے حوادث بھی شامل ہیں، جن سے بندہ عبرت حاصل کر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴾ [ التوبة : ١٢٦ ] ''اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ نصیحت پکڑتے ہیں۔'' بعض سلف نے سفید بالوں کو بھی ''النَّذِيْرُ'' میں شامل کیا ہے، کیونکہ وہ زندگی کی مہلت ختم ہونے سے خبردار کرتے ہیں۔

④ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ : یہاں ظالموں سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ جہنم میں ہمیشہ وہی رہیں گے۔

آیت 38 اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں ہر غائب چیز کو جاننے والا ہے، اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں، وہ سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی خوب جانتا ہے اور تمھارے دلوں میں چھپے ہوئے کفر پر اصرار سے بھی خوب واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اتنی مدت تک عمر دینے پر جب تم کفر پر قائم رہے تو مزید عمر دینے پر بھی تم یہی کچھ کرتے اور اسے خوب معلوم ہے کہ اگر وہ تمھاری درخواست قبول کر کے تمھیں دوبارہ دنیا میں بھیج دے تو تم پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کرتے رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ٢٨ ] ''اور اگر انھیں دوبارہ بھیج دیا جائے تو دوبارہ وہی کام کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔''

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا، پھر جس نے کفر کیا تو اس کا کفر اسی پر ہے اور کافروں کو ان کا کفران کے رب کے ہاں ناراضی کے سوا کچھ زیادہ نہیں کرتا اور کافروں کو ان کا کفر خسارے کے سوا کچھ زیادہ نہیں کرتا ﴿۳۹﴾ کہہ دے کیا تم نے اپنے شریکوں کو دیکھا، جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ زمین میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے، یا ہم نے انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اس کی کسی دلیل پر قائم ہیں؟ بلکہ ظالم لوگ، ان کے بعض بعض کو دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتے ﴿۴۰﴾

---

**آیت 39** ① هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ : اس کے انعام اور اپنے کفر اور ناشکری پر غور کرو، اس کا احسان دیکھو کہ اس نے پہلی نسل کو فوت کر کے تمھیں اس کی جگہ زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کا مالک بنا دیا۔ ( خلیفہ کا مطلب سمجھنے کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳۰) " اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً " کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں ) اگر ہر آنے والی نسل کے ساتھ پہلی تمام نسلیں بھی موجود رہتیں تو زمین میں نہ رہنے کی گنجائش رہتی، نہ ان کی ضروریات پوری ہوتیں۔ اس احسان کا بدلا تم نے یہ دیا کہ اس کی ناشکری کی، اس کا احسان ماننے سے انکار کیا اور اس کے ساتھ شریک بنا لیے، جنھوں نے نہ کچھ پیدا کیا، نہ ان کا زمین کی پیدائش یا ملکیت میں کوئی حصہ ہے اور تم نے انھیں پکارنا شروع کر دیا۔

② فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ : تو جو اس نعمت کی ناشکری کرے اور اس کا احسان ماننے اور اس کے احکام تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو اس کی ناشکری اور انکار کا وبال اسی پر پڑے گا، کسی دوسرے کو اس کا کچھ نقصان نہیں۔

③ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ...... : یعنی اگر کفار کو ان کے کفر کے باوجود زمین کی خلافت ملی ہوئی ہے اور مال و اولاد اور دوسری نعمتوں کے ساتھ لمبی عمر ملی ہوئی ہے اور ان کی رسی دراز ہے، تو یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر خوش ہے، اس لیے انھیں نعمتیں دیے جا رہا ہے اور نہ یہ سمجھیں کہ وہ اس طرح نفع کا سودا کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کافروں کے کفر سے ان پر اللہ تعالیٰ کے شدید غضب میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے کفر سے ان کا خسارا ہی بڑھ رہا ہے، کیونکہ اس سے ان پر حجت تمام ہو رہی ہے اور ان کے عذر ختم ہو رہے ہیں۔

**آیت 40** ① قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھیں زمین کی خلافت

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ۬ وَ لَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

**بے شک اللہ ہی آسمانوں کو اور زمین کو تھامے رکھتا ہے، اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور یقیناً اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی ان دونوں کو نہیں تھامے گا، بے شک وہ ہمیشہ سے نہایت بردبار، بے حد بخشنے والا ہے ﴿۴۱﴾**

بخشی، تو تم نے اس کی عبادت میں کچھ اوروں کو شریک بنا لیا اور انھیں پکارنا اور ان سے مانگنا شروع کر دیا، تو یہ بتاؤ کہ تمھارے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ کیا تمھارے بنائے ہوئے ان شریکوں نے، جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، زمین یا زمین کی کوئی چیز پیدا کی ہے؟ اگر کی ہے تو مجھے بھی دکھاؤ وہ کون سی چیز ہے؟ (دیکھیے حج : ۷۳۔ رعد : ۱۶) یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے تو اس کی نشان دہی کرو، یا ہم نے انھیں کوئی تحریر دی ہے، جو اس بات کی دلیل ہو کہ فلاں فلاں کو ہم نے بیماروں کو تندرست کرنے یا بے روزگاروں کو روزگار عطا کرنے یا حاجت مندوں کو ان کی حاجتیں پوری کرنے کے اختیارات دیے ہیں، اس لیے تمھیں یہ سب کچھ ان سے مانگنا چاہیے اور ان کا احسان مند ہونا چاہیے، اگر ایسی کوئی تحریر ہے تو لاؤ پیش کرو اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو خود ہی سوچو کہ آخر تم اپنی جانوں پر اتنا بڑا ظلم کیوں کر رہے ہو۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ احقاف (۴) میں بھی بیان فرمائی ہے۔

❷ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا : یعنی بات یہ نہیں کہ ان شریکوں میں سے کسی کے پاس کوئی اختیار ہے، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ شرک کا کاروبار کرنے والے یہ تمام ظالم، یہ جھوٹے پیشوا اور پیر، یہ پنڈت، پروہت، یہ کاہن اور عراف، یہ مجاور اور ان کے ایجنٹ ایک دوسرے کو محض جھوٹے وعدے دلا رہے ہیں کہ فلاں آستانے پر جاؤ گے تو اولاد ملے گی، فلاں بزرگوں سے مدد مانگو گے تو سنگ دل محبوب موم ہو جائے گا، فلاں درگاہ سے ہر مراد پوری ہوتی ہے۔ غرض یہ سارا کاروبار دھوکے پر اور جھوٹے وعدوں پر چل رہا ہے، جیسا کہ فرمایا : ﴿ يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [ النساء : ۱۲۰ ] ’’وہ انھیں وعدے دیتا ہے اور انھیں آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انھیں دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتا۔‘‘ اور قیامت کے دن شیطان صاف کہہ دے گا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ﴾ [ إبراھیم : ۲۲ ] ’’بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا، سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے تم سے خلاف ورزی کی۔‘‘

**آیت 41** ❶ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ...... : یعنی تمھارے بنائے ہوئے شریکوں کا تو یہ حال ہے کہ نہ انھوں نے زمین یا اس کی کوئی چیز پیدا کی، نہ آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے، وہ بے چارے تو اپنا آپ بھی نہیں سنبھال سکتے، جب کہ اللہ جل شانہ وہ ہے جس نے ساری کائنات پیدا فرمائی اور وہی اس کا نظام چلا رہا ہے۔ اسی نے اتنے عظیم آسمانوں کو اور زمین کو ان کی اپنی اپنی جگہ تھام رکھا ہے کہ کسی زلزلے یا حادثے سے اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہوتے اور اگر یہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو اس کے سوا کوئی نہیں جو انھیں تھام سکے۔ اگر تم کہتے ہو کہ تمھارے شریک پیدا تو نہیں کر سکتے، نہ

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ﴿۴۲﴾

اور انھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ واقعی اگر کوئی ڈرانے والا ان کے پاس آیا تو ضرور بالضرور وہ امتوں میں سے کسی بھی امت سے زیادہ ہدایت پانے والے ہوں گے، پھر جب ان کے پاس ایک ڈرانے والا آیا تو اس نے ان کو دور بھاگنے کے سوا کچھ زیادہ نہیں کیا ﴿۴۲﴾

آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے مگر وہ گرتے ہوؤں کو تھام لیتے ہیں تو تمھارا یہ خیال بھی غلط ہے۔ گرتے ہوؤں کو تھامنا بھی اسی کا کام ہے جس نے ہر چیز کو اس کی جگہ تھام رکھا ہے۔

② اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا : یعنی تمھارے مشرکانہ اقوال و افعال تو اتنے خوفناک عذاب کے طالب ہیں کہ ان کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ تم پر ڈھے کر گر پڑیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۙ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴾ [ مریم : ۹۰، ۹۱ ] ”آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں کہ انھوں نے رحمان کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا۔“ مگر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو گرنے سے روک رکھا ہے، کیونکہ وہ بے حد بردبار ہے، اس لیے مہلت پر مہلت دیے جا رہا ہے، بے حد بخشنے والا ہے، جو اس کے حلم سے فائدہ اٹھا کر توبہ کرے اس کے تمام گناہ بخش دیتا ہے۔ آیت کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مشرک اپنے شرک اور نافرمانی کی وجہ سے اس کے مستحق ہو چکے ہیں کہ ان پر آسمان گرا کر اور زمین شق کر کے انھیں تباہ و برباد کر دیا جائے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے حلم و مغفرت کی وجہ سے آسمانوں کو اور زمین کو تھامے ہوئے ہے اور اگر یہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو اس کے سوا کوئی طاقت نہیں جو انھیں تھام سکے۔

**آیت 42** ① وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ...... : مشرکین کے کفر اور ناشکری کا اظہار شرک کی صورت میں بھی ہوتا تھا اور پیغمبر کو جھٹلانے کی صورت میں بھی، چنانچہ شرک کی تردید کے بعد پیغمبر کو جھٹلانے کی صورت میں ان کی ناشکری کا ذکر فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مشرکین مکہ کی سفر کے دوران میں عرب کے دوسرے شہروں مثلاً یثرب اور خیبر وغیرہ میں یا دوسرے ملکوں مثلاً شام وغیرہ میں اہل کتاب سے ملاقات ہوتی تو وہ ان کی بت پرستی اور دوسری جہالتوں پر طعن کرتے، تو یہ اس کے جواب میں کہتے کہ تم لوگوں کے پاس تو اللہ کے رسول اور اس کی کتابیں آئیں، اگر ہمارے پاس کوئی پیغمبر آیا تو ہم کسی بھی امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے، اور اپنی اس بات پر پکی سے پکی جو قسم وہ کھا سکتے تھے کھاتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ

اسۡتِكۡبَارًا فِي الۡاَرۡضِ وَ مَكۡرَ السَّيِّئِ ؕ وَ لَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ ؕ فَهَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۚ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا ﴿۴۳﴾

زمین میں تکبر کی وجہ سے اور بری تدبیر کی وجہ سے اور بری تدبیر اپنے کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں گھیرتی۔ اب یہ پہلے لوگوں سے ہونے والے طریقے کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ پس تو نہ کبھی اللہ کے طریقے کو بدل دینے کی کوئی صورت پائے گا اور نہ کبھی اللہ کے طریقے کو پھیر دینے کی کوئی صورت پائے گا ﴿۴۳﴾

---

مِمَّنۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنۡهَا ﴾ [ الأنعام : ١٥٦، ١٥٧ ] ”ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب تو صرف ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور بے شک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے یقیناً بے خبر تھے۔ یا یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت والے ہوتے۔ پس بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت آ چکی، پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے کنارا کرے۔“ اور جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنۡ كَانُوۡا لَيَقُوۡلُوۡنَ ۙ﴿۱۶۷﴾ لَوۡ اَنَّ عِنۡدَنَا ذِكۡرًا مِّنَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۙ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوۡا بِهٖ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [ الصافات : ١٦٧ تا ١٧٠ ] ”اور بے شک وہ (کافر) تو کہا کرتے تھے۔ اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی کوئی نصیحت ہوتی۔ تو ہم ضرور اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے۔ تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، سو جلد ہی جان لیں گے۔“

② فَلَمَّا جَآءَهُمۡ نَذِيۡرٌ مَّا زَادَهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرَا : تو جب ان کے پاس ڈرانے والا آیا تو بجائے اس کے کہ وہ کسی بھی امت سے زیادہ ہدایت قبول کرتے، وہ اپنے کفر و شرک پر اڑے رہے، بلکہ رسول کی آمد نے ان کے بدکنے اور دور بھاگنے میں اضافہ ہی کیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ہدایت سے دور ہو گئے۔

**آیت 43** ① اسۡتِكۡبَارًا فِي الۡاَرۡضِ : یعنی ان کی رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے اور ہدایت سے بدکنے اور دور بھاگنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو جھوٹا سمجھتے تھے، بلکہ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ زمین پر رہ کر، جو اللہ تعالیٰ کی کائنات میں پستی کی انتہا ہے، اونچے اور بڑے بن کر رہنا چاہتے تھے، جو پیغمبر کی اطاعت قبول کرنے کی صورت میں ممکن نہ تھا، کیونکہ اس وقت انھیں اپنی مرضی چھوڑ کر اللہ کے حکم کے تابع ہونا پڑتا تھا، جو انھیں منظور نہ تھا۔

② وَمَكۡرَ السَّيِّئِ : اور حق سے زیادہ دور ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے صدق و امانت کو جاننے کے باوجود آپ پر ایمان لانے کے بجائے حق کا راستہ روکنے اور آپ ﷺ کو نقصان پہنچانے کے لیے بہت بری تدبیریں اور خوف ناک سازشیں اختیار کیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق قبول کرنے کے بجائے ضد میں آ کر وہ اس سے بہت دور ہو گئے، جیسا کہ سورۂ انفال (۳۰) میں کفار مکہ کی رسول اللہ ﷺ کے خلاف قید، جلاوطنی یا قتل کی تدبیروں کا ذکر ہے۔

③ وَلَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ : "حَاقَ يَحِيقُ" اور "أَحَاطَ يُحِيطُ" دونوں کا معنی گھیرنا ہے، یعنی بری تدبیر جس

اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَلِیۡمًا قَدِیۡرًا ﴿۴۴﴾

اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، حالانکہ وہ قوت میں ان سے زیادہ سخت تھے اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کوئی چیز اسے بے بس کر دے، بے شک وہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۴۴﴾

کے متعلق کی جائے ہو سکتا ہے اسے تھوڑا بہت نقصان پہنچ جائے، مگر وہ پوری طرح گھیرا اور احاطہ بری تدبیر کرنے والے ہی کا کرتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازشوں سے آپ ﷺ کا کچھ نہیں بگڑا، بلکہ ان سازشوں نے غزوۂ بدر، احد، خندق اور فتح مکہ میں کفار ہی کو گھیرے میں لے کر انھیں ناکام و نامراد کر دیا۔

④ فَہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ: یعنی اگر یہ اپنی روش نہ بدلیں گے اور اپنی سرکشی میں بڑھتے جائیں گے تو پہلے کافروں کی طرح ان پر عذاب نازل ہو کر رہے گا۔

⑤ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا : یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور جو پہلے سے چلا آ رہا ہے کہ وہ مجرموں کو مہلت دیتا ہے، پھر پکڑ لیتا ہے، تم اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پاؤ گے کہ ان مجرموں کی رسی ہمیشہ دراز رہے، یا انھیں عذاب کے بجائے انعام سے نوازا جائے۔ اس میں کفار کے لیے وعید ہے اور رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے لیے تسلی اور بشارت ہے۔

⑥ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا : نہ ہی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کوئی کام ہونے کا حکم دے یا کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ کرے اور عذاب نازل نہ ہو، یا کسی قوم پر عذاب کا ارادہ کرے اور وہ اس سے پھیر کر کسی اور قوم پر نازل کر دیا جائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ ﴾ [ الرعد : ۱۱ ] ''اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لے تو اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں۔''

**آیت 44** ① اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ روم کی آیت (۹) کی تفسیر۔

② وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ شَیۡءٍ......: یعنی آسمان و زمین یعنی ساری کائنات میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتی کہ وہ اسے پکڑ نہ سکے، یا پکڑنے کے بعد وہ اس کی گرفت سے نکل کر بھاگ جائے۔

③ اِنَّہٗ کَانَ عَلِیۡمًا قَدِیۡرًا : کیونکہ وہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا ہے اور ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی چیز اسے عاجز کر دے، وہ اسے اس لیے نہ پکڑ سکے کہ اسے پتا ہی نہ چلے کہ وہ کہاں ہے، یا اسے معلوم تو ہو مگر وہ اسے پکڑنے کی طاقت نہ رکھے۔ ہمیشہ کا معنی ''کَانَ'' کا لفظ ادا کر رہا ہے۔

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

ع ۵ ۸ ۱۷

اور اگر اللہ لوگوں کو اس کی وجہ سے پکڑے جو انھوں نے کمایا تو اس کی پشت پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑے اور لیکن وہ انھیں ایک مقرر مدت تک مہلت دیتا ہے، پھر جب ان کا مقرر وقت آ جائے تو بے شک اللہ اپنے بندوں کو ہمیشہ سے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۴۵﴾

آیت 45 ❶ وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل کی آیت (۶۱) کی تفسیر۔

❷ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا : یعنی جب ان کا مقرر وقت آ گیا تو اللہ ہمیشہ سے اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ کون کہاں ہے۔ لہٰذا اس وقت نہ کوئی اس سے چھپا رہ سکے گا، نہ اس کی گرفت سے بچ سکے گا، پھر کسی کا حال اس سے پوشیدہ نہیں، وہ ہر ایک کو اس کے اچھے یا برے عمل کا ٹھیک ٹھیک بدلا دے گا۔

سُوْرَةُ یٰسٓ ۳۶ مَکِّیَّۃ ۴۱ ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ اٰیَاتُهَا ۸۳ رُکُوْعَاتُهَا ۵

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قرآن مجید کی ہر سورت کے فضائل میں یہ بات ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا پوری کائنات جمع ہو کر بھی کسی ایک سورت جیسی سورت پیش نہیں کر سکتی۔ بعض سورتوں کی کوئی خاص فضیلت بھی رسول اللہ ﷺ سے آئی ہے، جیسا کہ سورۂ فاتحہ کے فضائل پیچھے گزر چکے ہیں۔ سورۂ یٰس کے فضائل میں کئی روایات مشہور ہیں، قریب الموت شخص کے پاس اسے پڑھنے کی روایت تو اتنی مشہور ہے کہ اقبال نے موجودہ مسلمانوں کے قرآن کے ساتھ تعلق کے بارے میں کہا ہے ؎

بآیاتش ترا کارے جزایں نیست  که از یاسین او آساں بمیری

''یعنی اس کی آیات کے ساتھ تجھے اس کے سوا کوئی غرض نہیں کہ اس کی سورۂ یٰس کے ساتھ تیری موت آسانی سے واقع ہو جائے۔''

مگر خاص طور پر اس سورت کی فضیلت میں آنے والی کوئی روایت صحیح نہیں، کچھ روایات موضوع ہیں اور کچھ ضعیف ہیں۔ یہاں تفسیر ابن کثیر میں مذکور چند روایات اور ان کا ضعف بیان کیا جاتا ہے:

① انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ قَلْبًا وَ قَلْبُ الْقُرْآنِ يٰسٓ مَنْ قَرَأَ يٰسٓ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِقِرَاءَتِهَا قِرَاءَةَ الْقُرْآنِ عَشْرَ مَرَّاتٍ )) [ ترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء في فضل يس : ۲۸۸۷ ] ''ہر چیز کا ایک دل ہے اور قرآن کا دل سورۂ یٰس ہے اور جو سورۂ یٰس پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے کے ساتھ اس کے لیے دس مرتبہ قرآن کی تلاوت لکھ دیتا ہے۔''

امام ترمذی نے یہ روایت بیان کر کے فرمایا: ''یہ حدیث حسن غریب ہے، ہم اسے حمید بن عبد الرحمان کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے اور (اس کا ایک راوی) ہارون ابو محمد شیخ مجہول ہے۔'' ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے نقل کیا ہے، انھوں نے فرمایا: (( حَدِيْثٌ بَاطِلٌ لَا أَصْلَ لَهُ )) [ العلل : ۵۶/۲ ] ''یہ باطل حدیث ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔'' محدث علامہ البانی نے اسے موضوع کہا ہے۔ (دیکھیے ضعیف سنن ترمذی)

② ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ قَرَأَ يٰسٓ فِيْ لَيْلَةٍ أَصْبَحَ مَغْفُوْرًا لَّهُ )) [ مسند أبي يعلى : ۶۲۲۴ ] ''جو شخص کسی رات سورۂ یٰس پڑھے، وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اسے بخش دیا گیا ہوتا ہے۔'' ابن کثیر نے اس کی سند کو جید کہا ہے، مگر مسند ابو یعلیٰ کے محقق نے اس کے ایک راوی ہشام بن زیاد کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر نے تقریب میں اس راوی کے متعلق فرمایا: '' مَتْرُوْكٌ '' یعنی اسے محدثین نے ترک کر دیا ہے۔

③ جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ قَرَأَ يٰسٓ فِيْ لَيْلَةٍ ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ غُفِرَ لَهُ )) [ ابن حبان : ۲۵۷۴ ] ''جو شخص کسی رات اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے سورۂ یٰس پڑھے، اسے بخش دیا جاتا ہے۔'' تفسیر ابن کثیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا، اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ حسن نے جندب رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔

## یٰسٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ۙ﴿۲﴾

## یٰسٓ ﴿۱﴾ اس حکمت سے بھرے ہوئے قرآن کی قسم! ﴿۲﴾

④ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يٰسٓ قَلْبُ الْقُرْآنِ لَا يَقْرَأُ هَا رَجُلٌ يُرِيْدُ اللّٰهَ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ إِلَّا غُفِرَ لَهُ وَاقْرَؤُوْهَا عَلٰى مَوْتَاكُمْ )) [ مسند أحمد : ٢٦/٥، ح : ٢٠٣٠٠ ] ''سورۂ یٰس قرآن کا دل ہے، جو آدمی بھی اسے اللہ اور دار آخرت کے ارادے سے پڑھے، اسے بخش دیا جاتا ہے اور تم اسے اپنے مرنے والوں پر پڑھو۔'' تفسیر ابن کثیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا کہ اس کی سند ''عَنْ رَجُلٍ عَنْ أَبِيْهِ'' دو آدمیوں کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

⑤ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَوَدِدْتُّ أَنَّهَا فِيْ قَلْبِ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْ أُمَّتِيْ يَعْنِيْ يٰسٓ )) [ مسند بزار : ٢٣٠٥ ] ''میری خواہش ہے کہ یہ یعنی سورۂ یٰس میری امت کے ہر انسان کے دل میں موجود ہو۔'' محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا: ''اس کی سند ضعیف ہے، کیونکہ اس کا ایک راوی ابراہیم بن حکم بن ابان ضعیف ہے۔'' تفسیر ابن کثیر میں مذکور روایات کے علاوہ ایک مشہور روایت یہ ہے کہ عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں، مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ قَرَأَ يٰسٓ فِيْ صَدْرِ النَّهَارِ قُضِيَتْ حَوَائِجُهُ )) [ سنن الدارمي : ٥٤٩/٢، ح : ٣٤١٨ ] ''جو شخص دن کے شروع حصے میں سورۂ یٰس پڑھے، اس کی ضرورتیں پوری کر دی جاتی ہیں۔'' دارمی کے محقق حسین سلیم اسد نے فرمایا: ''اس کی سند ضعیف و مرسل ہے۔'' یعنی عطاء بن ابی رباح تابعی ہیں، انھوں نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور نہ اپنی خبر کا ذریعہ بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں ابراہیم بن حکم راوی ضعیف ہے۔ ان روایات کے علاوہ روایات کا حال ان سے بھی ابتر ہے۔

**آیت 1** یٰسٓ : یہ حروف مقطعات ہیں، ان کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔

**آیت 2** وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ : قسم سے مقصود اس بات کا یقین دلانا ہوتا ہے جس کے لیے قسم اٹھائی جائے اور قسم اس بات کی دلیل ہوتی ہے جو اس قسم کے بعد اس کے جواب کے طور پر آ رہی ہوتی ہے، پھر بعض اوقات جس کی قسم اٹھائی جائے اس کی عظمت ہی کو جواب قسم کی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مثلاً اللہ کی قسم، اور بعض اوقات قسم کا مفہوم جواب قسم کی دلیل ہوتا ہے اور اس کے سچے ہونے کی شہادت دے رہا ہوتا ہے۔ ''الْحَكِیْمِ'' کا ایک معنی یہ ہے کہ یہ قرآن دانائی اور حکمت سے بھرپور ہے، اس کی کوئی بات نہ خطا ہے نہ عقل کے خلاف اور نہ کم تر درجہ کی، بلکہ ہر بات ہی کمال عقل و دانش پر مبنی ہے اور ایک معنی یہ ہے کہ یہ قرآن انتہائی محکم اور مضبوط ہے، اس کی آیات میں کوئی باہمی اختلاف نہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن حکیم کی قسم کھا کر تین باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ یقیناً تو رسولوں میں سے ہے، جنھیں ہماری طرف سے بھیجا گیا ہے، دوسری یہ کہ یقیناً تو سیدھے راستے پر ہے اور تیسری یہ کہ یہ عزیز و رحیم کا نازل کردہ ہے۔ قسم اور جواب قسم میں مناسبت بالکل واضح ہے کہ آپ کی رسالت اور دوسری دونوں باتوں کے لیے اور

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۟ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۟ؕ

بلاشبہ تو یقیناً بھیجے ہوئے لوگوں میں سے ہے ③ سیدھی راہ پر ہے ④

کوئی دلیل نہ بھی ہو تو یہ قرآن ہی ان کی دلیل کے لیے کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حکمت سے بھرپور اور ہر لحاظ سے محکم یہ قرآن اس بات کا شاہد ہے کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں، بالکل سیدھے راستے پر ہیں اور یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے، جو عزیز بھی ہے اور رحیم بھی۔ کیونکہ آپ ﷺ اُمی تھے، نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا، نہ آپ نے کسی کی شاگردی اختیار کی تھی، نہ آپ نے نبوت سے پہلے کبھی کوئی ایسا یا اس سے ملتا جلتا کلام پیش کیا، جس سے شبہ ہو کہ کلام کا یہ ملکہ ترقی کرتا کرتا اس درجے تک پہنچ گیا۔ یہ سب باتیں کفارِ مکہ اچھی طرح جانتے تھے، کیونکہ وہ ذاتی طور پر آپ کو چالیس برس سے جانتے تھے، پھر چالیس برس کے بعد آپ ﷺ کی زبان پر یک لخت ایسے کلام کا جاری ہو جانا، جس نے عرب کے تمام فصیح و بلیغ لوگوں کو مقابلے سے عاجز کر دیا اور گونگا بنا دیا اور بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز آ گئے۔ اس سے یہ تین باتیں ثابت ہو رہی ہیں، ایک یہ کہ یہ عظیم الشّان حکیمانہ کلام آپ کا کلام نہیں بلکہ کسی اور کا کلام ہے جس نے آپ کو بھیجا ہے، دوسری یہ کہ وہ بھیجنے والا کوئی مخلوق نہیں بلکہ خود خالق کائنات ہے، جو عزیز و رحیم ہے، کیونکہ اگر یہ کسی اور کا کلام ہوتا تو وہ اس جیسا مزید بھی بنا کر پیش کر دیتا، جب کہ پوری کائنات مل کر بھی اس جیسی ایک سورت پیش کرنے سے عاجز ہے اور تیسری یہ کہ جب آپ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں تو یقیناً آپ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ بالکل سیدھا راستہ ہے۔ اس میں قرآن کی عظمت و رفعت کا اظہار بھی ہے کہ اس کی قسم اٹھائی جا رہی ہے۔

**آیت 3** اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ : اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ نبی کریم ﷺ کو اپنے رسول ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ دراصل یہ ان کفار کی تردید ہے جو آپ ﷺ سے صاف کہتے تھے کہ آپ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ اپنی طرف سے گھڑ کر یہ کلام پیش کر رہے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴾ [ الرعد : ۴۳ ] ”اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں تو کسی طرح رسول نہیں ہے۔ کہہ دے میرے درمیان اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ شخص بھی جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔“

**آیت 4** عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : یعنی آپ دین توحید پر ہیں، جو سیدھا اللہ تک پہنچا دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآىِٕرٌ ﴾ [ النحل : ۹ ] ”اور سیدھا راستہ اللہ ہی پر (جا پہنچتا) ہے اور ان میں سے کچھ (راستے) ٹیڑھے ہیں۔“ یہی بات ان آیات میں فرمائی: ﴿ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴾ [ الشوریٰ : ۵۲، ۵۳ ] ”اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس اللہ کے راستے کی طرف کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے، سن لو! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔“

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝۵ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۶

**یہ سب پر غالب، نہایت مہربان کا نازل کیا ہوا ہے ۝۵ تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے جن کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے، تو وہ بے خبر ہیں ۝۶**

---

**آیت 5** **تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ** : یعنی یہ کسی بے اختیار اور بے بس شخص کا کلام نہیں جس کے جھٹلانے کی کوئی پروا نہ ہو، بلکہ اس اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے جو سب پر غالب ہے، اس کے مقابلے میں نہ کوئی اپنا کلام لا سکتا ہے نہ اس کے کلام کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک سکتی ہے اور نہ اسے جھٹلا کر کوئی اس کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ ساتھ ہی وہ بے حد رحم والا بھی ہے کہ اس نے تمھاری ہدایت کے لیے رسول بھیجا، کتاب نازل فرمائی، پھر تمھیں مہلت دی اور جھٹلانے پر فوراً نہیں پکڑا۔

**آیت 6** ❶ **لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ** ...... : یعنی آپ ﷺ کو اس لیے رسول بنایا اور یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس میں اس سے پہلے کوئی نبی نہیں آیا، اس لیے وہ دین حق سے بے خبر ہیں۔ یہی مضمون سورۂ سجدہ (۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔

❷ ابن کثیر نے فرمایا کہ ”**لِتُنْذِرَ قَوْمًا**“ میں قوم سے مراد عرب ہیں، جن کے آباء کو ڈرایا نہیں گیا، مگر اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ صرف عرب ہی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس کا جواب ابن کثیر نے یہ دیا ہے کہ اکیلے عرب کے ذکر سے دوسری اقوام کی طرف مبعوث ہونے کی نفی نہیں ہوتی، جس طرح بعض افراد کے ذکر سے عموم کی نفی نہیں ہوتی۔ یہاں بہت سی آیات اور متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ آپ تمام اقوام کی طرف مبعوث ہیں اور آپ کی بعثت قیامت تک کے لیے ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷) اور سورۂ سبا (۲۸) مفسر سلیمان الجمل نے فرمایا: ”**لِتُنْذِرَ قَوْمًا**“ سے مراد عرب اور غیر عرب تمام اقوام ہیں اور ”**اٰبَآؤُهُمْ**“ سے مراد قریب کے آباء ہیں، یعنی قریب زمانے میں نہ عرب کی طرف کوئی نبی آیا نہ غیر عرب کی طرف۔ ہاں بعید زمانے میں عرب کی طرف اسماعیل، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام مبعوث ہوئے اور غیر عرب کی طرف سب سے آخر میں عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے، جن کی بعثت کو تقریباً چھ سو برس گزر چکے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے زمانے کے تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہیں، خواہ عرب ہو یا عجم، کیونکہ ان کے قریب آباء کی طرف کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ انبیاء کی آمد پر مدت دراز گزرنے کی وجہ سے یہ سب لوگ اصل دین سے بے خبر ہیں۔“ یہ تفسیر بھی بہت عمدہ ہے۔ اس پر وہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا جو ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر پر وارد ہوتا ہے۔

❸ ایک اور سوال یہ ہے کہ زمانۂ فترت (جس میں کوئی رسول نہیں آیا) کے لوگوں کو شرک اور گمراہی کی وجہ سے عذاب کیوں ہوگا، جب کہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے: ﴿**وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا**﴾ [ بني إسرائيل : ١٥ ] ”اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔“ جواب اس کا سورۂ بنی اسرائیل میں اسی آیت (۱۵) کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

بے شک ان کے اکثر پر بات ثابت ہو چکی، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑦ بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں کئی طوق ڈال دیے ہیں، پس وہ ٹھوڑیوں تک ہیں، سو ان کے سر اوپر کو اٹھا دیے ہوئے ہیں ⑧ اور ہم نے ان کے آگے سے ایک دیوار کر دی اور ان کے پیچھے سے ایک دیوار، پھر ہم نے انھیں ڈھانک دیا تو وہ نہیں دیکھتے ⑨

**آیت 7** **لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ** ......: "**حَقَّ الْقَوْلُ**" (بات ثابت ہو چکی) سے مراد ان پر عذاب کا فیصلہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ السجدة : ١٣ ] "اور اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے اور لیکن میری طرف سے بات پکی ہو چکی کہ یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا۔" یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو پیغمبر کی آمد اور حق واضح ہونے کے بعد بھی اپنے کفر پر اڑے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ازل ہی میں ان کے بارے میں علم تھا کہ وہ اپنے عناد اور سرکشی کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے اور اس نے اپنے اس علم کی بنا پر لکھ دیا تھا کہ وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ اللہ نے جبراً انھیں ایمان سے محروم رکھا، کیونکہ جبر کی صورت میں تو وہ عذاب کے مستحق قرار نہ پاتے۔ یہ بات کہ ان کی گمراہی کا باعث خود ان کی ضد اور ان کا عناد ہے، کئی آیات میں بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶، ۲۷)، زخرف (۳۶، ۳۷)، صف (۵)، انعام (۱۱۰)، حم السجدہ (۲۵) اور احقاف (۱۷، ۱۸) اس آیت کی ہم معنی یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [ یونس : ۹۶، ۹۷ ] "بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ہر نشانی آ جائے، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔"

**آیت 8** **اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا** ......: "**اَغْلٰلًا**" "غُلٌّ" (غین کے ضمہ کے ساتھ) کی جمع ہے، لوہے کا کڑا یا زنجیر جو مجرم کے گلے میں ڈال کر اسے باندھا جاتا ہے، بعض اوقات اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ بھی گردن کے ساتھ باندھ دیے جاتے ہیں۔ یہ قید کی سخت ترین صورت ہے۔ "**الْاَذْقَانِ**" "ذَقَنٌ" کی جمع ہے، ٹھوڑیاں۔ "**مُّقْمَحُوْنَ**" "قَمَحَ الْبَعِيْرُ" جب اونٹ حوض سے سر اٹھائے اور پانی نہ پیے۔ "فُلَانٌ أَقْمَحَ الْبَعِيْرَ" "فلاں نے اونٹ کا سر اٹھا دیا۔" "مُقْمَحٌ" اسم مفعول، جس کا سر اوپر اٹھا دیا گیا ہو اور وہ اسے نیچے نہ جھکا سکتا ہو۔ اس آیت میں ان کے کفر پر اصرار اور اڑے رہنے کی نہایت مؤثر تصویر کشی فرمائی ہے، یعنی ہم نے ان انکار کرنے والوں کی گردنوں میں بھاری طوق ڈال دیے ہیں، جو ایک دوسرے کے اوپر اس طرح تہ بہ تہ ہیں کہ ٹھوڑیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے سر اوپر اٹھا دیے گئے ہیں۔

**آیت 9** **وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا** ......: یعنی ہم نے ان کی گردنوں میں بھاری طوق ڈالنے کے علاوہ ان کے

وَسَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾ اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکۡرَ وَخَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ ۚ فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ وَّاَجۡرٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۱﴾ اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ

اور ان پر برابر ہے، خواہ تو انھیں ڈرائے، یا انھیں نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۱۰﴾ تُو تو صرف اسی کو ڈراتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمان سے بن دیکھے ڈرے۔ سو اسے بڑی بخشش اور باعزت اجر کی خوش خبری دے ﴿۱۱﴾ بے شک ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں جو عمل انھوں نے آگے بھیجے اور ان کے چھوڑے

---

آگے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار کر دی ہے، پھر انھیں اوپر سے پردے کے ساتھ ڈھانک دیا ہے، جس کے نتیجے میں انھیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو اپنی جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کے غلط ہونے کی کھلی سے کھلی دلیل بھی نہ انھیں دکھائی دیتی ہے نہ اسے سنتے ہیں۔ اب یہ لوگ حق پر ایمان لائیں تو کیسے لائیں؟

**آیت 10** **وَسَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ** : اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں سمجھانا اور تبلیغ کرنا چھوڑ دیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب آپ لوگوں کو سمجھائیں گے اور عام تبلیغ کریں گے تو آپ کو دو قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آئے گا، ایک وہ لوگ جن پر آپ کی تبلیغ کوئی اثر نہیں کرے گی اور وہ اپنے کفر و شرک پر بضد رہیں گے۔ اس آیت میں انھی لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۶)۔

**آیت 11** **اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکۡرَ** ...... : یعنی آپ کے ڈرانے کا فائدہ صرف ان لوگوں کو ہو گا جو نصیحت سنیں اور اسے مان کر اس پر عمل کریں۔ "**وَخَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ**" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ فاطر (۱۸) "**بِمَغۡفِرَةٍ**" کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔

**آیت 12** ① **اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی** : یعنی ہم ان سب کو مرنے کے بعد زندہ کریں گے، ان کو بھی جو آپ کے ڈرانے کے باوجود کفر پر اڑے رہے اور انھیں بھی جنھوں نے آپ کی نصیحت سن کر اس کی پیروی کی، تاکہ انھیں ان کے اعمال کی جزا دیں۔ بعض مفسرین نے مُردوں کو زندہ کرنے سے مشرکین کو شرک سے نکال کر ایمان میں لانا مراد لیا ہے، مگر سیاق کے لحاظ سے پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔

② **وَنَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا** : اور اچھے یا برے جو عمل بھی انھوں نے کیے ہیں، ہم سب لکھ رہے ہیں۔ مراد اس سے وہ اعمال ہیں جو انھوں نے اپنی زندگی میں خود کیے۔

③ **وَاٰثَارَهُمۡ** : "اٰثَارَ" "اَثَرٌ" کی جمع ہے۔ اس کی تفسیر میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد ان کی زندگی میں یا ان کی موت کے بعد دوسرے لوگوں کے وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جن کا سبب یہ بنے اور ان کے کسی قول یا فعل یا ان کی کسی حالت کی وجہ سے دوسرے لوگوں نے وہ اعمال اختیار کیے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کی دعوت، نصیحت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر یا جہاد فی سبیل اللہ کی وجہ سے یا ان کے پڑھانے یا تصنیف کی وجہ سے ان کی زندگی میں یا موت کے بعد جو نیک عمل

الْمَوْتٰى وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۲﴾

ہوئے نشان بھی اور جو بھی چیز ہے ہم نے اسے ایک واضح کتاب میں ضبط کر رکھا ہے ﴿۱۲﴾

کیے، یا انھوں نے کوئی مسجد، مدرسہ یا لوگوں کے فائدے کی کوئی چیز بنا دی، جس سے ان کی موت کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے رہے، سب ان کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔ یہی حال ان برے اعمال کا ہے جو ان کی وجہ سے ان کی زندگی میں یا موت کے بعد لوگوں نے کیے، وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں درج ہوں گے۔ جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَ أَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ )) [ مسلم، الزكاة، باب الحث على الصدقة...... : ۱۰۱۷ ] ''جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ (یعنی کتاب وسنت کی کوئی بات) جاری کرے اس کے لیے اس کے اپنے عمل کا اجر ہے اور ان لوگوں کے عمل کا بھی جو اس کے بعد کریں، بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں سے کچھ کم ہو اور جو شخص اسلام میں کوئی برا طریقہ (یعنی کتاب و سنت کے خلاف یا کوئی بدعت) جاری کرے اس پر اپنے گناہ کا بوجھ ہو گا اور ان کے گناہ کا بھی جو اس کے بعد کریں گے، بغیر اس کے کہ ان کے بوجھ میں سے کچھ کم ہو۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ )) [ مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان ...... : ۱۶۳۱ ] ''جب انسان فوت ہو جاتا ہے، تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے، صدقہ جاریہ سے، یا اس علم سے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، یا نیک اولاد سے جو اس کے لیے دعا کرے۔''
اس آیت اور ان احادیث سے دعوت و تعلیم اور جہاد فی سبیل اللہ کے عمل کی عظمت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

'' اٰثَارَهُمْ '' کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نیکی یا بدی کی طرف چل کر جانے والے قدموں کے نشانوں کو بھی اللہ تعالیٰ لکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مسجد نبوی کے ارد گرد زمین کے کچھ قطعے خالی ہو گئے تو بنو سلمہ نے ارادہ کیا کہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں، یا رسول اللہ! ہم نے یہ ارادہ کیا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَا بَنِي سَلِمَةَ ! دِيَارَكُمْ ! تُكْتَبْ آثَارُكُمْ دِيَارَكُمْ! تُكْتَبْ آثَارُكُمْ )) [ مسلم، المساجد، باب فضل كثرة الخطا إلى المساجد : ۶۶۵ ] ''اے بنو سلمہ! اپنے گھروں ہی میں رہو، تمھارے قدموں کے نشانات لکھے جائیں گے، (اے بنو سلمہ!) اپنے گھروں ہی میں رہو، تمھارے قدموں کے نشانات لکھے جائیں گے۔''
ابن کثیر نے فرمایا، اس قول اور پہلے قول میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ اس قول کی رو سے '' اٰثَارَهُمْ '' سے کسی کی پیروی کی وجہ سے کیے جانے والے اعمال مراد لینا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتا ہے، کیونکہ جب قدموں کے نشان تک لکھے جاتے ہیں تو اچھے یا برے

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ان کے لیے بستی والوں کو بطور مثال بیان کر، جب اس میں بھیجے ہوئے آئے ﴿۱۳﴾ جب ہم نے ان کی طرف دو (پیغمبر) بھیجے تو انھوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے تیسرے کے ساتھ تقویت دی تو انھوں نے کہا بے شک ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے ہیں ﴿۱۴﴾

---

جن اعمال میں کوئی شخص نمونہ بنا، وہ تو بدرجہ اولیٰ لکھے جاتے ہیں۔

④ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ : "اِمَامٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد لوحِ محفوظ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ہونے والا ہر کام پہلے ہی درج فرما دیا ہے، یا ہر شخص کا اعمال نامہ ہے جس میں اس کا چھوٹا یا بڑا ہر عمل پورے ضبط کے ساتھ درج ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ﴾ [ بني إسرائيل : ۷۱ ] "جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔" یہاں امام سے مراد ان کے اعمال کی کتاب ہے۔ اس واضح کتاب کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر ہے۔ دیکھیے سورۂ زمر (۶۹) اور کہف (۴۹) یہاں "اِمَامٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد اعمال نامہ لینا زیادہ مناسب ہے، اگرچہ اس میں وجود میں آنے کے بعد وہی کچھ درج ہوگا جو اس سے پہلے لوح محفوظ میں درج ہو چکا ہے۔

**آیت 13** وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ...... : یعنی جن لوگوں کو ڈرانے کے لیے آپ کو یہ قرآن حکیم دے کر مبعوث کیا گیا ہے اور جن کے اکثر لوگ کفر پر اصرار کی وجہ سے عذاب کے مستحق بن چکے ہیں، انھیں اس بستی کے لوگوں کا حال بطور مثال سنائیں، جن کی طرف ہمارے بھیجے ہوئے رسول آئے۔ انھوں نے بھی اپنے رسولوں کو انھی کی طرح جھٹلایا تھا، سو ان کا انجام یہ لوگ بھی پیش نظر رکھیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی بھی ہے کہ آپ پہلے رسول نہیں جسے اس کی قوم نے جھٹلایا ہو۔

**آیت 14** ① اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا ...... : یعنی ہم نے ان لوگوں کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے دونوں کو جھٹلا دیا، تو ہم نے انھیں تیسرے پیغمبر کے ساتھ قوت دی، تو ان سب نے حرف تاکید "اِنَّ" کے ساتھ انھیں کہا کہ یقیناً ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے ہیں۔

② مفسر عبد الرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یہ بستی کون سی تھی؟ اس کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی صراحت نہیں۔ (بعض) مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد روم میں واقع شہر انطاکیہ ہے۔ پھر اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ یہ رسول بلا واسطہ رسول تھے یا بالواسطہ رسول یا مبلغ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مبلغ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہی نے بھیجے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ قرآن کے بیان سے سرسری طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلا واسطہ اللہ کے رسول تھے اور اگر یہی بات ہو تو ان کا زمانہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہونا چاہیے، کیونکہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک کوئی

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ⑮ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ⑯ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑰ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑱

انھوں نے کہا تم ہمارے جیسے بشر ہی تو ہو اور رحمان نے کوئی چیز نازل نہیں کی، تم تو محض جھوٹ ہی کہہ رہے ہو ⑮ انھوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمھاری طرف ضرور بھیجے ہوئے ہیں ⑯ اور ہم پر صاف پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ⑰ انھوں نے کہا بے شک ہم نے تمھیں منحوس پایا ہے، یقیناً اگر تم باز نہ آئے تو ہم ضرور ہی تمھیں سنگسار کر دیں گے اور تمھیں ہماری طرف سے ضرور ہی دردناک عذاب پہنچے گا ⑱

---

نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا، اور بستی کے نام کی تعیین یا رسول کے بلاواسطہ یا بالواسطہ ہونے کی تعیین کوئی مقصود بالذات چیز بھی نہیں کہ اس کی تحقیق ضروری ہو، مقصود بالذات چیز تو کفارِ مکہ کو سمجھانا ہے۔ کیونکہ کفارِ مکہ اور ان بستی والوں کے حالات میں بہت سی باتوں میں مماثلت پائی جاتی تھی۔" یہ رسول عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے بھیجے ہوئے تھے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان پر وہی اعتراض کیا گیا جو اللہ کے دوسرے رسولوں پر کیا گیا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر اس اعتراض کے بجائے وہ کوئی اور اعتراض کرتے۔

**آیت 15** **قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا** ...... : کفارِ مکہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی بات کہی۔ دیکھیے سورۂ انعام (۹۱) بلکہ ہر قوم نے اپنے رسول کو یہی کہا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو، آخر تم میں ہم سے بڑھ کر وہ کون سی خوبی ہے جو اللہ نے تمھیں ہی نبوت کے لیے منتخب کیا؟ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۰)، بنی اسرائیل (۹۴)، مومنون (۳۴) اور تغابن (۶) گویا نبوت کے متعلق ہمیشہ سے جاہلی تصور یہ ہے کہ جو بشر ہو وہ رسول نہیں ہو سکتا۔ دوسرے الفاظ میں یہی تصور بعض جاہلوں میں اس طرح پایا جاتا ہے کہ جو رسول ہو وہ بشر نہیں ہو سکتا، حالانکہ قرآن تمام انبیاء کو بشر بھی ثابت کرتا ہے اور رسول بھی۔

**آیت 16** **قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ** : "ہمارا رب جانتا ہے" یہ الفاظ قسم کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بلاغت کا اصول ہے کہ سننے والا جتنی شدت کے ساتھ کسی بات کا منکر ہو اتنی ہی تاکید کے ساتھ بات کی جائے۔ پیغمبروں کا حوصلہ دیکھیے، بستی والوں کے انھیں صاف جھوٹا کہنے پر بھی وہ برافروختہ نہیں ہوئے، بلکہ قسم کھا کر انھیں اپنی رسالت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

**آیت 17** **وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ** : یعنی ہمارا فریضہ اتنا ہی ہے کہ ہم تمھیں اللہ کا پیغام صاف پہنچا دیں۔ رہا تمھیں مومن بنا لینا، یا تمھارے مطالبات کے مطابق معجزے دکھانا، یا تم پر عذاب لے آنا، تو یہ ہمارا کام نہیں۔

**آیت 16** **قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ** ...... : جب بستی والے دلیل کے ساتھ جواب نہ دے سکے تو دھمکی پر اتر آئے، جیسا کہ

قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ١ؕ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ١ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰى قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾

**انھوں نے کہا تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے۔ کیا اگر تمھیں نصیحت کی جائے، بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو ﴿۱۹﴾ اور شہر کے سب سے دور کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو ﴿۲۰﴾**

فرعون اور دوسرے متکبروں کا شیوہ رہا ہے۔ کہنے لگے، اگر تم اپنی دعوت سے باز نہ آئے تو ہم تمھیں سنگسار کر دیں گے اور تمھیں ہمارے ہاتھوں دردناک سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔ "**تَطَیَّرْنَا**" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نمل (۴۷) اور سورۂ اعراف (۱۳۱)۔

**آیت 19** ① **قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ** : پیغمبروں نے کہا، تم پر آنے والی نحوست کا باعث ہم نہیں بلکہ خود تمھارے افعال ہیں کہ تم نے اللہ کے ساتھ شرک اور اس کی صریح نافرمانی اور سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ اگر تم پر قحط پڑا ہے، یا وبا آئی ہے، یا کوئی اور آفت تو اس کا باعث تم خود ہو، ہم نہیں، کیونکہ ہم تو اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت ہی کی دعوت دیتے ہیں۔

② **اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ** : اس شرط کا جواب محذوف ہے، یعنی کیا اگر تمھیں نصیحت کی جائے اور تمھاری خیر خواہی کی جائے تو شکر گزار ہونے کے بجائے ہمیں منحوس قرار دیتے ہو اور دھمکیاں دیتے ہو؟

③ **بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ** : بلکہ اصل یہ ہے کہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔ اپنی خواہشوں کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی، یا عقل و دانش کی رو سے عائد ہونے والی کوئی پابندی تمھیں قبول نہیں۔

**آیت 20** ① **وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰى** : آیات سے ظاہر ہے کہ پیغمبروں کی دعوت اور قوم کا مباحثہ مدت تک جاری رہا، حتیٰ کہ ان کی دعوت ساری بستی میں پھیل گئی اور جب انھوں نے قتل کی دھمکی دی تو یہ خبر بھی ہر طرف پھیل گئی کہ بستی کے لوگ پیغمبروں کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ بستی خاصی بڑی تھی، جسے پہلے اللہ تعالیٰ نے "**الْقَرْیَةِ**" فرمایا ہے، اس کے بعد اسے "**الْمَدِیْنَةِ**" یعنی شہر کہا ہے۔ اس شہر کے سب سے دور کنارے میں ایک صالح آدمی رہتا تھا، اسے جب پیغمبروں کی دعوت اور قوم کے انکار کی اور پیغمبروں کو قتل کرنے کی دھمکیوں کی خبر پہنچی تو وہ شہر کے سب سے دور کنارے سے دوڑتا ہوا آیا کہ کہیں وہ جلدی میں پیغمبروں کو قتل ہی نہ کر دیں، اور وہ اپنی قوم کو سمجھانے لگا۔ اس مرد صالح کا یہ عمل ہمارے لیے نمونہ ہے کہ جب اسے معلوم ہو گیا کہ پیغمبر حق پر ہیں تو اس نے اس بات پر اکتفا نہیں کیا کہ اپنی جگہ بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہتا، بلکہ حق کی شہادت دینے کے لیے جتنی جلدی ہو سکتا تھا دوڑتا ہوا پہنچا اور اس نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے قوم کو سمجھانے کی پوری کوشش کی اور کہا، اے میری قوم! اللہ کے ان رسولوں کی پیروی اختیار کرو۔ اس مرد صالح کا نام تفاسیر میں حبیب نجار لکھا ہے جو اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ (واللہ اعلم)

② یہاں ایک سوال ہے کہ سورۂ قصص میں موسیٰ علیہ السلام کو ان کے قتل کے مشورے کی خبر دینے والے صاحب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ ﴾ [ القصص : ۲۰ ] جب کہ یہاں فرمایا: ﴿ وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ ﴾

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

ان کی پیروی کرو جو تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے اور وہ سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں ﴿۲۱﴾

اس میں کیا حکمت ہے؟ اہلِ علم نے فرمایا کہ ہمیشہ پہلے اس بات کا ذکر کیا جاتا ہے جو موقع کے لحاظ سے زیادہ اہم ہو۔ سورۂ قصص میں موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دینے والے شخص کی مردانگی کا اظہار زیادہ اہم تھا، اس لیے ”رَجُلٌ“ کا ذکر پہلے فرمایا، جب کہ یہاں اس مردِ ناصح کا دور سے آ کر سمجھانے کا ذکر زیادہ اہم تھا، اس لیے ”مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ“ کو پہلے ذکر فرمایا۔ (واللہ اعلم)

**آیت 21** **اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ** : یعنی پیغمبروں کی بات مان لو، ان کے کہنے پر چلو اور دیکھو کہ وہ اپنے کسی دنیوی مفاد کی خاطر تمھیں دعوت نہیں دے رہے، نہ ہی تم سے اپنی اس خیر خواہی کی کوئی اجرت طلب کر رہے ہیں، خود سیدھے راستے پر ہیں اور تمھیں سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں۔

وَمَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ یُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّیۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَیۡـًٔا وَّ لَا یُنۡقِذُوۡنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّیۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّکُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ﴿۲۵﴾ قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ ؕ قَالَ یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

اور مجھے کیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۲﴾ کیا میں اس کے سوا ایسے معبود بنالوں کہ اگر رحمان میرے بارے میں کسی نقصان کا ارادہ کرے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے بچائیں گے ﴿۲۳﴾ یقیناً میں تو اس وقت ضرور کھلی گمراہی میں ہوں گا ﴿۲۴﴾ بے شک میں تمھارے رب پر ایمان لایا ہوں، سو مجھ سے سنو ﴿۲۵﴾ اسے کہا گیا جنت میں داخل ہو جا۔ اس نے کہا اے کاش! میری قوم جان لے ﴿۲۶﴾

**آیت 22** ① **وَمَالِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ** : توحید کی دعوت دیتے ہوئے اس مرد صالح نے نہایت حکیمانہ اسلوب اختیار کیا کہ انھیں مخاطب کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مخاطب کر لیا، تاکہ وہ چڑ نہ جائیں۔ یعنی آخر مجھے کیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور ان کی عبادت کروں جنھوں نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا، بلکہ خود لوگوں نے انھیں بنایا ہے۔

② **وَ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ** : اور یہ بھی نہ سمجھنا کہ اس نے ہمیں پیدا کر کے آزاد چھوڑ دیا ہے، اب اس کا کوئی تعلق واسطہ ہم سے نہیں رہا، بلکہ تم سب کو مرنے کے بعد اسی کے پاس واپس لے جایا جائے گا، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔

**آیت 23** **ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ ......** : کیا میں اپنے پیدا کرنے والے کے بجائے ان زندہ یا مردہ ہستیوں کی عبادت کروں کہ رحمٰن اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے تو ان کی سفارش میرے کسی کام آسکے گی نہ وہ زبردستی مجھے بچا سکیں گے۔

**آیت 24** **اِنِّیۡۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ** : یعنی اگر میں ایسا کروں گا تو اس وقت میں یقیناً کھلی گمراہی میں ہوں گا۔ اس بستی والوں میں عقیدے اور عمل کی جو خرابیاں تھیں وہ سب اہلِ مکہ میں بھی پائی جاتی تھیں۔ اس بستی والوں کی مثال کے ساتھ مقصود اہلِ مکہ کو سمجھانا ہے۔

**آیت 25** **اِنِّیۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّکُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ** : پھر اس مرد ناصح نے لوگوں کو اور اس بستی کی طرف بھیجے گئے پیغمبروں کو، سب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ایمان لانے کا اور اس پر اپنی استقامت کا اعلان کیا، یعنی میں اس رب پر ایمان لایا ہوں جو میرا ہی نہیں تمھارا بھی رب ہے، سو تم پر لازم ہے کہ میری بات غور سے سنو۔

**آیت 26** ① **قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ** : یہاں درمیان کی بات محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ اس کی اس بات پر

بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

اس بات کو کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے معزز لوگوں میں سے بنا دیا ﴿۲۷﴾ اور ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ہم اتارنے والے تھے ﴿۲۸﴾ وہ نہیں تھی مگر ایک ہی چیخ، پس اچانک وہ بجھے ہوئے تھے ﴿۲۹﴾

---

قوم کے لوگ اس پر پل پڑے اور اسے شہید کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی شہادت کو قبول فرمایا اور شہادت کی دیر تھی کہ اسے جنت میں داخلے کی بشارت مل گئی۔ شہداء کے جنت میں داخلے کی کیفیت کے متعلق دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۵۴) اور آل عمران (۱۶۹ تا ۱۷۱)۔

2 قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ : اس سے ظاہر ہے کہ وہ بندہ اپنی قوم کا کس قدر خیر خواہ تھا کہ زندگی میں بھی اس نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے قوم کو نصیحت کی اور مرنے کے بعد بھی ان کے لیے اس کی خیر خواہی جاری رہی، پھر اپنے قاتلوں کے متعلق اس کی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو اعزاز و اکرام بخشا کسی طرح ان کو بھی معلوم ہو جائے اور اسے جان کر وہ بھی ایمان لے آئیں اور اس اکرام کے حق دار بن جائیں۔ فی الحقیقت مومن ایسا ہی خیر خواہ ہوتا ہے، احد کے شہداء نے شہادت کے بعد اسی تمنا کا اظہار کیا تھا۔ ہمارے لیے اس میں سبق ہے کہ دعوت دیتے ہوئے کبھی غیظ و غضب اور انتقامی جذبے سے مغلوب نہ ہوں، بلکہ نہایت صبر و ہمت کے ساتھ دعوت جاری رکھیں۔

**آیت 27** بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ : اس قصے میں اہلِ مکہ کے لیے بھی پیغام ہے کہ جس طرح وہ مرد صالح اپنی قوم کا خیر خواہ تھا محمد ﷺ بھی تمھارے ایسے ہی سچے خیر خواہ ہیں۔ اس قصے میں قریش کے لیے ایک اور سبق بھی ہے کہ اگر تم نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اور لوگوں کو لے آئے گا جو آپ پر ایمان لائیں گے اور آپ کی مدد کریں گے اور شہادت کی پروا نہیں کریں گے، جیسا کہ اس بستی کے دور ترین حصے سے وہ آدمی آیا تھا۔

**آیت 28** وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ...... : اس قوم کے بالکل حقیر اور بے وقعت ہونے کے اظہار کے لیے فرمایا کہ ہم نے اس کے بعد اس کی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے آسمان سے فرشتوں کا کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ہی جب ہم کسی قوم کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں تو فرشتوں کی فوج بھیجتے ہیں، کیونکہ اس کام کے لیے اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے ایک فرشتے کی ایک چیخ ہی کافی ہوتی ہے۔ ہاں، اپنے مومن بندوں کی مدد کے لیے ہم ہزاروں فرشتے نازل کر دیتے ہیں جو ان کے دل کو مضبوط رکھتے ہیں، اور اس وقت کفار کو عذاب آسمان کے فرشتوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ ایمان والوں کے ہاتھوں سے دیا جاتا ہے۔

**آیت 29** اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ: یعنی فرشتے نے ایک چیخ ماری جس سے ان سب کی زندگی

یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

ع ۲ — ۱

**ہائے افسوس ان بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا رہا مگر وہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کیا کرتے تھے ﴿۳۰﴾ کیا انھوں نے نہیں دیکھا، ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے کہ وہ ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتے ﴿۳۱﴾ اور نہیں ہیں وہ سب مگر اکٹھے ہمارے پاس حاضر کیے جانے والے ہیں ﴿۳۲﴾**

---

کا شعلہ بجھ گیا۔ ان کے یک لخت ہلاک ہونے کو آگ کے بجھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ ابو العلاء المعری نے کہا ہے ؎

وَ كَالنَّارِ الْحَيَاةُ فَمِنْ رَمَادٍ أَوَاخِرُهَا وَ أَوَّلُهَا دُخَانٌ

''زندگی آگ کی طرح ہے، جس کا آخر راکھ اور ابتدا دھواں ہے۔''

**آیت 30** **یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ** ...... : فوت شدہ چیز پر شدید افسوس کو حسرت کہتے ہیں۔ "**الْعِبَادِ**" میں الف لام عہد کا ہے، مراد وہ بندے ہیں جو رسولوں کو جھٹلاتے رہے، اس بستی والے بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ ان کی حالت کا نقشہ ہے کہ ان کا حال ایسا ہے جس پر حسرت و افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ان کے پاس جو رسول بھی آیا وہ اسے جھٹلاتے ہی رہے۔

**آیت 31** **اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ** ...... : "**اَلَمْ یَرَوْا**" سے مراد "أَلَمْ يَعْلَمُوْا" ہے، یعنی سابقہ اقوام کے انجام کی طرف نہ دیکھتے ہیں نہ اس میں غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ قومیں بھی اپنے رسولوں کا مذاق اڑاتی رہیں اور اس کی پاداش میں انھیں ہلاک کر دیا جاتا تھا اور ان کا نام و نشان تک ایسا مٹا کہ ان میں سے کوئی بھی بچ کر ان کے پاس واپس نہیں لوٹا، پھر بھی ان کافروں کا یہی دستور رہا کہ جب کوئی نیا رسول آتا تو اس سے اسی طرح تمسخر اور استہزا شروع کر دیتے جو پہلے کفار کی عادت تھی اور کچھ سبق حاصل نہیں کرتے تھے اور آج کفار مکہ کا بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ (کیلانی) "**لَا یَرْجِعُوْنَ**" (وہ پلٹ کر نہیں آتے) کے لفظ میں ان لوگوں کا رد ہے جو بعض شخصیتوں کے موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں آنے کے قائل ہیں اور ان ہندوؤں کا بھی جو کہتے ہیں کہ تمام مرنے والے دوبارہ دنیا میں کسی دوسری شکل میں آتے ہیں۔ اگر پہلی زندگی میں انھوں نے اچھے کام کیے ہوں تو پہلے سے اچھی صورت میں اور اگر برے کام کیے ہوں تو پہلے سے بری صورت میں اور اس عقیدے کو تناسخ یا آواگون کہتے ہیں۔

**آیت 32** **وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِیْعٌ** ...... : یہ "اِنْ" نافیہ ہے اور "لَمَّا" بمعنی "إِلَّا" ہے۔ یعنی جو لوگ پہلے گزر چکے یا موجود ہیں یا آئندہ ہوں گے، وہ سب ہمارے پاس اکٹھے حاضر کیے جانے والے ہیں۔ "**مُحْضَرُوْنَ**" اسم مفعول ہے، یعنی وہ چاہیں یا نہ چاہیں، اپنے خیال میں جتنے بڑے ہوں، ہر حال میں سب ہمارے پاس اکٹھے حاضر کیے جانے والے ہیں۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝۳۳ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝۳۴ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝۳۵ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۶

اوران کے لیے ایک عظیم نشانی مردہ زمین ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے غلہ نکالا تو وہ اسی میں سے کھاتے ہیں ۝۳۳ اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے کئی باغ بنائے اور ان میں کئی چشمے پھاڑ نکالے ۝۳۴ تاکہ وہ اس کے پھل سے کھائیں، حالانکہ اسے ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے ۝۳۵ پاک ہے وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے ان چیزوں سے جنھیں زمین اگاتی ہے اور خود ان سے اور ان چیزوں سے جنھیں وہ نہیں جانتے ۝۳۶

**آیت 33** ① **وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ** : پچھلی آیت میں تمام لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر کیے جانے کا ذکر ہے، جو قیامت کے دن ہوگا، چونکہ کفار اسے نہیں مانتے تھے، اس لیے اب اس کی کئی دلیلیں بیان فرمائیں۔ یہاں "اٰيَةٌ" (نشانی) سے مراد دلیل و برہان ہے۔ مردہ زمین سے مراد بنجر اور بے آباد زمین ہے۔

② **اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا** ...... : "اٰيَةٌ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی ہماری مُردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کی ایک عظیم دلیل یہ ہے کہ ہم بنجر اور قحط زدہ زمین پر بارش برساتے ہیں تو وہ بڑھتی پھولتی اور لہلہاتی ہے، پھر ہم اس سے غلہ پیدا کرتے ہیں جو ان کے کھانے کی چیزوں کا اکثر حصہ ہیں۔

**آیت 34** **وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ** ...... : "نَخِيْلٍ" "نَخْلٌ" کی جمع ہے، جیسے "عَبْدٌ" کی جمع "عَبِيْدٌ" ہے۔ "اَعْنَابٍ" "عِنَبٌ" کی جمع ہے اور "الْعُيُوْنِ" "عَيْنٌ" کی جمع ہے، مراد کنویں اور چشمے ہیں جن سے زمین سیراب کی جاتی ہے۔ یعنی مُردہ زمین کو زندہ کر کے ہم اس سے ان کی خوراک کے لیے صرف غلہ ہی نہیں اگاتے بلکہ ان کے کام و دہن کی لذت کے لیے مختلف اقسام کے پھل بھی کثرت سے پیدا کرتے ہیں۔ یہاں صرف دو پھلوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ کثیر المنافع بھی ہیں اور عربوں کو مرغوب بھی، نیز ان کی پیداوار بھی عرب میں زیادہ ہے، پھر غلے کا ذکر پہلے کیا، کیوں کہ اس کی پیداوار بھی زیادہ ہے اور خوراک کی حیثیت سے اس کی اہمیت بھی مسلّمہ ہے۔ جب تک انسان روٹی یا چاول وغیرہ خوراک سے اپنا پیٹ نہیں بھرتا، محض پھل فروٹ سے اس کی غذائی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ (احسن البیان)

**آیت 33** **لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ** ......: یعنی یہ غلے، باغات، چشمے اور پھل ان کی کسی کوشش اور محنت سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ یہ سب کچھ ہم نے پیدا کیا ہے، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے کہ ہماری ہی عبادت کریں، کسی اور کو اس میں شریک نہ کریں۔

**آیت 36** **سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا** ...... : یعنی ان لوگوں نے اللہ کے جو شریک بنا رکھے ہیں وہ ان سے پاک

# وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

**اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے، ہم اس پر سے دن کو کھینچ اتارتے ہیں تو اچانک وہ اندھیرے میں رہ جانے والے ہوتے ہیں ﴿۳۷﴾**

---

ہے۔ پھر اپنی کچھ صفات بیان فرمائیں جو صرف اس کے ساتھ خاص ہیں اور جن کا تقاضا ہے کہ اسے ہر عیب، ہر نقص اور ہر شرک سے پاک سمجھا جائے۔ ''الْاَزْوَاجَ'' کے کئی معنی ہیں، مثلاً اس کا اطلاق نر و مادہ پر بھی ہوتا ہے۔ مرد عورت کے لیے زوج ہے اور عورت مرد کے لیے اور ان دونوں میں اللہ تعالیٰ نے فطرتی طور پر ایک دوسرے کے لیے کشش رکھ دی ہے، پھر اس زوج کے ایک دوسرے سے ملنے سے آگے مزید تخلیق کا سلسلہ چلتا ہے اور یہ سلسلہ صرف حیوانات ہی میں نہیں، نباتات میں بھی پایا جاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [ الذاريات : ٤٩ ] ''اور ہر چیز سے ہم نے دو قسمیں بنائیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' نباتات میں سے کچھ درخت تو ایسے ہیں جن کا عام انسانوں کو بھی علم ہوتا ہے، مثلاً کھجور اور انار کے درخت نر بھی ہوتے ہیں اور مادہ بھی، جب پھل لگنے کا موسم ہوتا ہے تو ہوائیں نر درختوں کا بیج اٹھا کر مادہ درختوں پر پھینک دیتی ہیں تو مزید پیدائش عمل میں آتی ہے اور نباتات کی ہر قسم میں نر و مادہ کا سلسلہ موجود ہے، خواہ ابھی تک انسان کو اس کا علم ہوا ہو یا نہ ہو۔ پھر یہ سلسلہ جمادات حتیٰ کہ مادہ کے ایک ذرہ کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی مثبت اور منفی قوتیں موجود ہیں، جو آپس میں ایک دوسرے کے لیے کشش رکھتی ہیں۔ دوسرے زوج کا لفظ آپس میں مماثلت رکھنے والی چیزوں کے لیے بھی آتا ہے، مثلاً ایک جوتا دوسرے جوتے کے لیے زوج ہوتا ہے اور اس معنی میں بھی یہ لفظ قرآن میں موجود ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴾ [ ص : ٥٨ ] ''اور دوسری اس کی ہم شکل کئی (ازواج) قسمیں۔'' اور ازواج کا ایک معنی ایک دوسرے کے مخالف اشیاء، جیسے دن رات کا زوج ہے اور رات دن کا، یا سایہ دھوپ کا اور دھوپ سائے کا، یا روشنی تاریکی کی زوج اور تاریکی روشنی کی، گویا یہ زوج کا سلسلہ اتنا وسیع ہے جو نباتات اور حیوانات کے علاوہ بھی تمام اشیاء میں پایا جاتا ہے، خواہ تمھیں اس کا علم ہو یا نہ ہو سکے۔ فرمایا: ﴿ وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [ الذاريات : ٤٩ ] ''اور ہم نے ہر چیز سے دو قسمیں بنائیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

اس آیت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے ''سُبْحٰنَ الَّذِيْ'' کا لفظ استعمال فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہر قسم کے زوج سے پاک ہے، نہ اس کا کوئی مقابل ہے اور نہ مماثل، کیونکہ مقابلہ یا مماثلت ان چیزوں میں ہو سکتی ہے جو کسی درجہ میں فی الجملہ اشتراک رکھتی ہوں، مگر خالق اور مخلوق کا کسی حقیقت میں اشتراک نہیں ہوتا، اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا میں شرک کی جتنی بھی اقسام پائی جاتی ہیں ان میں سے ہر قسم میں اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی نہ کسی کمی، کمزوری، عیب یا نقص کا الزام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ''سُبْحٰنَ'' کا لفظ کہہ کر مشرکوں کے ہر قسم کے شرکیہ عقیدے کی تردید فرما دی۔ (کیلانی)

**آیت 37** ﴿ وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ﴾...... : ''نَسْلَخُ'' ''سَلَخَ يَسْلَخُ'' (ف، ن) بکری کی کھال اتارنا۔ قیامت اور اللہ تعالیٰ کی

وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿ؕ۳۸﴾

**اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے، یہ اس سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے کا اندازہ ہے ﴿۳۸﴾**

قدرت کے دلائل میں سے مکانی دلیل مُردہ زمین بیان فرمائی ہے۔ اب زمانی دلیلوں کا ذکر ہوتا ہے کہ ان کے لیے ایک اور دلیل قیامت کی اور اس بات کی بھی کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے، رات ہے، جس پر دن کے نور کا پردہ چڑھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کے اظہار کے لیے اپنا ذکر جمع کے صیغے کے ساتھ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ نَسۡلَخُ مِنۡہُ النَّہَارَ ﴾ ہم اس رات سے دن کو کھینچ اتارتے ہیں تو اچانک وہ اندھیرے میں رہ جانے والے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ جو اندھیرے کے بعد روشنی اور روشنی کے بعد اندھیرا لانے والا ہے، اس کے لیے تمھیں موت کے بعد زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟

**آیت 38** ① **وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا** ...... : ''مُسۡتَقَرٌّ'' باب استفعال سے اسم ظرف ہے، قرار کی جگہ یا وقت۔ یہ دوسری دلیل ہے، یعنی سورج کا روزانہ غروب ہونے کے بعد طلوع ہونا موت کے بعد زندگی کی دلیل ہے۔ اس آیت کے دو معنی ہیں اور دونوں معنی ایک وقت میں مراد ہو سکتے ہیں اور یہ قرآن کا اعجاز ہے۔ ایک معنی یہ کہ سورج اپنی اس جگہ چل رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرما دی ہے اور وہ عرش کے نیچے ہے۔ اس صورت میں ''**لِمُسۡتَقَرٍّ**'' میں ''لام'' ''علی'' یا ''فِيْ'' کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے: ''اور سورج چلا جاتا ہے اپنے ٹھہرے ہوئے راستے پر۔'' اس معنی کی دلیل ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس قول ''**وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا**'' کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مُسْتَقَرُّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ )) [ بخاري، التفسير، سورة يٰس، باب قوله : ﴿ و الشمس تجري ...... ﴾ : ٤٨٠٣ ] ''اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔''

دوسرا معنی یہ کہ سورج اپنی اس جگہ یا وقت کی طرف چلا جا رہا ہے جو اس کے ٹھہرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے، جہاں پہنچنے کے بعد اسے آگے چلنے کے بجائے واپس چلنے کا حکم دیا جائے گا اور وہ مشرق سے طلوع ہونے کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔ اس کے چلنے کا یہ راستہ اور ٹھہر جانے کی وہ جگہ اور وہ وقت اس ہستی کا مقرر کردہ ہے جو سب پر غالب، سب کچھ جاننے والی ہے۔ یہ معنی بھی حدیث سے ثابت ہے، جیسا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ سورج غروب ہوتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: (( أَ تَدْرِيْ أَيْنَ تَذْهَبُ؟ )) ''کیا تم جانتے ہو یہ کہاں جاتا ہے؟'' میں نے کہا: (( اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ )) ''اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَإِنَّهَا تَذْهَبُ حَتّٰی تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ، فَتَسْتَأْذِنَ فَيُؤْذَنَ لَهَا، وَيُوْشِكُ أَنْ تَسْجُدَ فَلَا يُقْبَلَ مِنْهَا، وَتَسْتَأْذِنَ فَلَا يُؤْذَنَ لَهَا، فَيُقَالُ لَهَا ارْجِعِيْ مِنْ حَيْثُ جِئْتِ فَتَطْلُعُ مِنْ مَّغْرِبِهَا، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰی : ﴿ وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴾ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر : ٣١٩٩ ] ''یہ سورج چلتا جاتا ہے، حتیٰ کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، پھر اجازت مانگتا ہے تو اسے اجازت دی جاتی ہے اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے تو اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت مانگے

وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾

اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی ( کھجور کی ) ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے ﴿۳۹﴾

تو اسے اجازت نہ دی جائے، پھر وہ اپنے مغرب سے طلوع ہوگا، یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ ''

② اس آیت سے معلوم ہوا کہ سورج چل رہا ہے۔ سائنس دان اس کی دو حرکتیں بیان کرتے ہیں، ایک اس کی اپنے مدار کے گرد حرکت اور دوسری اس حرکت کے ساتھ ساتھ کسی عظیم کہکشاں کے گرد حرکت۔ ( واللہ اعلم )

③ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حقیقت تو سب کو معلوم ہے کہ سورج ہر وقت چلتا رہتا ہے، اگر کہیں غروب ہوتا ہے تو اس سے اگلی جگہ طلوع ہو رہا ہوتا ہے، تو غروب ہوتے وقت اس کے عرش کے نیچے سجدہ کرنے اور چلنے کی اجازت طلب کرنے کا مطلب کیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ سورج عرش کے نیچے چل رہا ہے اور ہر وقت اور ہر لمحے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہے اور ہر لمحے اس کا آگے چلنا اللہ تعالیٰ کی اجازت پر موقوف ہے، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت نہیں ملے گی، وہ ٹھہر جائے گا اور اللہ کے حکم کے مطابق مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ [ الحج: ۱۸ ] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ۔ اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا اور جسے اللہ ذلیل کر دے پھر اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

④ سورج کا روزانہ غروب کے بعد دوبارہ طلوع ہونا موت کے بعد زندگی کی واضح دلیل ہے۔

⑤ سورج اور چاند کی عظیم مخلوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی دو جلال و کمال والی صفات ''عزیز'' اور ''علیم'' کا یہاں بھی ذکر فرمایا ہے اور سورۂ انعام ( ۹۶ ) اور سورۂ حٰم السجدہ ( ۱۲ ) میں بھی۔

**آیت 39** ① وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ : ''اَلْعُرْجُوْنَ'' بروزن ''فُعْلُوْنَ'' جمع ''عَرَاجِيْنُ'' یہ ''اَلْعِرَاجُ'' سے مشتق ہے، جس کا معنی ٹیڑھا ہونا ہے۔ کھجور کے گچھے کی وہ ٹیڑھی میڑھی ڈنڈیاں جن کے ساتھ کھجوریں لگی ہوتی ہیں۔

② یہ تیسری دلیل ہے، سورج کی طرح چاند ہمیشہ ایک شکل کا نہیں رہتا، بلکہ روزانہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اٹھائیس منزلیں مقرر فرمائیں جن میں وہ نظر آتا ہے۔ پھر ایک دن یا دو دن غائب رہ کر دوبارہ طلوع ہو جاتا ہے۔ پہلی رات وہ

لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ وَ لَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ ؕ وَ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾

**نہ سورج، اس کے لیے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں ﴿۴۰﴾**

پتلی ٹیڑھی سی لکیر کی طرح ہوتا ہے جس کی روشنی بھی مدھم ہوتی ہے، پھر وہ بڑھتا ہوا چودھویں رات کو پورا روشن ہو جاتا ہے، پھر گھٹتا ہوا اٹھائیسویں رات کو دوبارہ اس حالت میں پلٹ جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کھجور کی پرانی ٹیڑھی بے رونق ڈنڈی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ لاکھوں برس سے چاند کا گھٹنا بڑھنا اور طلوع و غروب اسی طرح جاری ہے۔ اتنے زبردست غلبے اور کامل علم والے کے لیے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔

**آیت 40** ① لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ : یہ چوتھی دلیل ہے، یعنی چاند کی روشنی کے ظہور کا وقت رات ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ رات کو جب چاند چمک رہا ہو تو اچانک سورج طلوع ہو جائے۔

② وَ لَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ : اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ ابھی دن کا وقت باقی ہو اور یکا یک رات چھا جائے۔

③ وَ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ : "سَبَحَ یَسْبَحُ" (ف) کا معنی تیرنا ہے۔ یعنی کیا سورج، کیا چاند اور کیا ستارے (جن میں زمین بھی شامل ہے) ہر ایک کا اپنا اپنا فلک (مدار) ہے، جس میں وہ تیر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اربوں ستاروں میں سے ہر ایک کا مدار دوسرے سے الگ بنایا ہے اور ایسا نظام قائم کیا ہے کہ کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں آ کر اس سے ٹکراتا نہیں، بلکہ باقاعدگی سے اپنے مدار میں گھوم رہا ہے اور یہ نظام قیامت تک چلتا رہے گا۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نشانی ہے۔

④ ان آیات کا اصل مقصد علم ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں، بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لے کر آسمان تک جدھر بھی وہ نگاہ ڈالے گا اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حد و حساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دہریت اور شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس میں نظام شمسی بھی شامل ہے، اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز سورج زمین سے تین لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کے بعید ترین سیارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲ ارب ۹۷ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ بلکہ اگر پلوٹو کو بعید ترین سیارہ مانا جائے تو وہ سورج سے ۴ ارب ۶۰ کروڑ میل دور تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظام شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سے حصہ ہے۔ جس کہکشاں میں ہمارا یہ نظام شمسی شامل ہے اس میں تقریباً تین ہزار ملین (۳ ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴ سال صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً بیس لاکھ

وَ اٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ﴿۴۱﴾ وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا ﴿۴۱﴾ اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی کئی اور چیزیں بنائیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں ﴿۴۲﴾

---

لولبی سحابیوں میں سے ایک ہے اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی دس لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرام فلکی، جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں، ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں دس کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ (تفہیم القرآن) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہیئت دانوں کے ان اندازوں بلکہ انسان کے خیال سے بے حد وحساب وسیع ہے۔ یہ ایک معمولی جھلک ہے جو انھیں دکھائی دی ہے۔

**آیت 41** ① **وَ اٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ** ...... : "ذُرِّيَّةٌ" کا لفظی معنی اولاد ہے۔ "**ذُرِّيَّتَهُمْ**" میں ضمیر "هُمْ" سے مراد انسان ہیں۔ "**الْمَشْحُوْنِ**" بھری ہوئی، مراد اس سے نوح علیہ السلام کی کشتی ہے۔ یعنی ایک اور نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ ہم نے نسل انسان کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور وہ پانی جو لوہے کی سوئی اور لکڑی کے ایک ڈنڈے تک کو نہیں اٹھاتا، بلکہ غرق کر دیتا ہے، اسی پانی نے ہمارے سکھانے کے مطابق لوہے یا لکڑی سے بنی ہوئی کشتی کو اٹھا لیا، جو آدمیوں سے اور ہر جانور کے ایک ایک جوڑے اور ان کی ضرورت کی اشیاء سے خوب بھری ہوئی تھی۔

② یہاں ایک سوال ہے کہ کشتی میں اولاد ہی نہیں ان کے باپ بھی سوار ہوتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ "ہم نے ان کی نسل (یا اولاد) کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا" یہ کیوں نہ فرمایا کہ "ہم نے ان کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا؟" جواب اس کا یہ ہے کہ نوح علیہ السلام سے پہلے آبا، کو کشتی بنانے کا طریقہ معلوم نہ تھا، نہ وہ سمندر میں سفر کر سکتے تھے۔ آدم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد، جسے باقی رکھنا منظور تھا، ساری کی ساری اس کشتی میں سوار تھی اور طوفان کے بعد وہی زمین پر باقی رہی، باقی سب غرق ہوگئی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ **وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ** ﴾ [ الصافات : ۷۷ ] "اور ہم نے اس کی اولاد ہی کو باقی رہنے والے بنا دیا۔" اس لیے یہاں "**اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ**" فرمایا۔ (نظم الدرر) دوسری جگہ اسی کشتی کا ذکر ان الفاظ میں ہے: ﴿ **اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۙ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ** ﴾ [ الحاقۃ : ۱۱، ۱۲ ] "بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمھیں کشتی میں سوار کیا، تاکہ ہم اسے تمھارے لیے ایک یاد دہانی بنا دیں اور یاد رکھنے والا کان اسے یاد رکھے۔"

**آیت 42** **وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ** : اس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے انسان کو کشتی بنانے کا علم نہ تھا۔ نوح علیہ السلام کی بنائی ہوئی کشتی کے ذریعے سے طوفان سے بچ نکلنے والوں نے بحری سفر کے لیے کشتیاں بنانے کا سلسلہ شروع کر

وَ اِنۡ نَّشَاۡ نُغۡرِقۡہُمۡ فَلَا صَرِیۡخَ لَہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡقَذُوۡنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۴۴﴾
وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّقُوۡا مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ مَا خَلۡفَکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۴۵﴾

اور اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کر دیں، پھر نہ کوئی ان کی فریاد کو پہنچنے والا ہو اور نہ وہ بچائے جائیں ﴿۴۳﴾ مگر ہماری طرف سے رحمت اور ایک وقت تک فائدہ پہنچانے کی وجہ سے (ہم انھیں مہلت دیتے ہیں) ﴿۴۴﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے بچو اس (عذاب) سے جو تمھارے سامنے ہے اور جو تمھارے پیچھے ہے، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۴۵﴾

---

دیا جو عام کشتیوں سے بادبانی جہازوں تک پہنچا، پھر انجن والے جہاز ایجاد ہوئے، جن کا سلسلہ ایٹمی ایندھن سے چلنے والے طیارہ بردار جہازوں اور آبدوزوں تک جا پہنچا ہے۔ آگے دیکھیے کیا کچھ ایجاد ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت سے مراد یہ لیا ہے کہ ہم نے ان کے لیے کشتی کی طرح اور سواریاں بھی پیدا کی ہیں، مثلاً اونٹ جو صحرا کا جہاز کہلاتا ہے، اسی طرح موٹر، ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ۔ اگرچہ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے، مگر اگلی آیت میں غرق کے ذکر کی وجہ سے "مِنۡ مِّثۡلِہٖ" سے مراد ایسی سواریاں لینا بہتر ہے جو سمندری سفر میں کام آتی ہیں، جن میں ہوائی جہاز بھی شامل ہیں۔ نو ایجاد سواریوں کا پیشگی ذکر سورۂ نحل (۸) میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 43** وَ اِنۡ نَّشَاۡ نُغۡرِقۡہُمۡ فَلَا صَرِیۡخَ لَہُمۡ ...... : یعنی یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم نے پانی میں بحری جہاز اٹھانے کی خوبی رکھی اور انسان کو کشتیاں اور جہاز بنانے کا سلیقہ سکھایا، پھر ہمارا ہی احسان ہے کہ ہم انھیں سلامتی کے ساتھ منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کر دیں، پھر نہ کوئی ان کی مدد کو پہنچ سکتا ہے اور نہ وہ خود اپنے آپ کو غرق ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

**آیت 44** اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ : یہ بس ہماری رحمت اور زندگی کی مقررہ مدت تک مہلت دینے ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم سمندر اور ہواؤں کی سرکش اور بے پناہ قوتوں کو اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں، جس سے مسافر اور تاجر صحیح سلامت دوسرے کنارے پر جا اترتے ہیں۔

**آیت 45** وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّقُوۡا مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ ...... : کائنات میں پھیلی ہوئی توحید اور آخرت کی نشانیوں اور دلیلوں کے ذکر کے بعد، جن سے مشرکین نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں، اب نصیحت کرنے والوں کے ساتھ ان کے سلوک کا ذکر فرمایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے خیر خواہی کی ہر بات سے بھی کان بند کر رکھے ہیں۔ "مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ" سے مراد پہلے گناہ اور "وَ مَا خَلۡفَکُمۡ" سے مراد بعد کے گناہ ہیں، یا "مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ" سے مراد دنیا کا عذاب اور "وَ مَا خَلۡفَکُمۡ" سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ یعنی جب ان سے ان گناہوں سے بچنے کے لیے کہا جاتا ہے جو وہ کر چکے ہیں کہ ان پر نادم ہو جاؤ، ان سے توبہ کر لو اور آئندہ کے لیے ان سے بچ جاؤ، یا جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس عذاب سے بچ جاؤ جو تمھارے گناہوں کی پاداش میں تم پر دنیا میں آ سکتا ہے اور اس سے بھی جو آخرت میں آ رہا ہے، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اس جملے کا جواب یہ ہے "أَعۡرَضُوۡا عَنۡهُ" یعنی وہ اس نصیحت سے منہ پھیر لیتے ہیں، مگر یہاں یہ جواب حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ یہ اگلی آیت سے

وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۷﴾

اور ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں ﴿۴۶﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس میں سے خرچ کرو جو تمھیں اللہ نے دیا ہے تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان سے کہتے ہیں جو ایمان لائے، کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو کھلا دیتا۔ نہیں ہو تم مگر واضح گمراہی میں ﴿۴۷﴾

---

خود بخود معلوم ہو رہا ہے۔

**آیت 46** **وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ** ...... : یعنی صرف اس نصیحت ہی سے نہیں، ان کے پاس ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں، خواہ وہ ان کی ذات یا پوری کائنات میں پھیلی ہوئی آیات اور نشانیاں ہوں اور خواہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات ہوں۔ چنانچہ وہ نہ اس کی توحید کو مانتے ہیں اور نہ اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

**آیت 47** ① **وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ** ...... : یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں جو کچھ دیا ہے، اس میں فقراء اور مساکین کے جو حقوق ہیں وہ بھی ادا کرو، تو جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا تو وہ ان فقراء و مساکین کو خود ہی دے دیتا۔ جب اللہ تعالیٰ ہی کا ارادہ انھیں دینے کا نہیں تو ہم انھیں کیوں دیں؟ تم مسلمان تو صاف گمراہی میں پڑے ہوئے ہو کہ ایسے لوگوں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہو جن کا پیٹ اللہ نہیں بھرنا چاہتا۔

② مشرکین کی یہ بات محض کٹ حجتی ہے، کیونکہ وہ خود بھی خوب جانتے تھے کہ غریبوں کی مدد کرنا بہت اچھا کام ہے۔ رہا اللہ کے چاہنے کا بہانہ، تو یہ محض اپنی بخیلی چھپانے کے لیے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا امتحان ہی کے لیے بنائی ہے، فقیری اور امیری دونوں آزمائشیں ہیں، فقیر کی آزمائش صبر سے ہے اور غنی کی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت یعنی اس کے چاہنے کا سہارا صرف اس وقت تک لیتے ہیں جب تک خود مجرم ہوں۔ جب کوئی دوسرا مجرم ہو اور ان کی حق تلفی ہو رہی ہو تو کبھی اللہ کی مشیت کا سہارا نہیں لیں گے۔ مثلاً اگر کوئی ڈاکو ان کا مال چھین لے، یا ان کا آدمی قتل کر دے تو کبھی یہ کہہ کر خاموش نہیں ہوں گے کہ اللہ نے ایسے ہی چاہا، اس لیے ٹھیک ہو گیا۔

③ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کفار و مشرکین کو صرف توحید و رسالت ہی کی دعوت نہیں دیتے تھے، بلکہ نماز، زکوٰۃ اور دوسری نیکیوں کا حکم بھی دیتے تھے، جیسا کہ حدیثِ ہرقل میں ہے کہ ہرقل نے ابوسفیان سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا: ''وہ تمھیں کس بات کا حکم دیتے ہیں؟'' تو ابوسفیان نے بتایا: (( یَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصِّلَةِ وَالْعَفَافِ )) ''وہ ہمیں نماز، زکوٰۃ، صلہ رحمی اور پاک دامنی کا حکم دیتے ہیں۔'' [ بخاري، التفسیر، باب : ﴿ قل یا أهل الکتاب تعالوا...... ﴾ : ۴۵۵۳ ]

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴۸ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝۴۹

اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ ۝۴۸ وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ایک ہی چیخ کا، جو انھیں پکڑ لے گی جب کہ وہ جھگڑ رہے ہوں گے ۝۴۹

**آیت 48** ① **وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ** ...... : کفار چونکہ قیامت کو نہیں مانتے تھے، اس لیے وہ نبی ﷺ اور مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ پھر تم قیامت لاتے کیوں نہیں؟ اچھا، یہ بتاؤ کہ وہ کب آئے گی؟ اس سے ان کا مقصود تاریخ معلوم ہونے پر اس کی تیاری نہ تھا، بلکہ محض جھٹلانا اور مذاق اڑانا تھا کہ جب وہ فوراً قیامت نہ لا سکیں گے تو ہم کہیں گے قیامت وغیرہ کچھ نہیں۔

② **اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** : یہ الفاظ ابھارنے کے لیے اور جھوٹا ثابت کرنے میں زور پیدا کرنے کے لیے ہیں۔

**آیت 49** ① **مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً** ...... : ان کے جواب میں یہ نہیں کہا گیا کہ قیامت فلاں وقت آئے گی، بلکہ ان کے سامنے قیامت کے چند ہولناک مناظر کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے۔

② **اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً** : ایک ہی چیخ سے مراد اسرافیل علیہ السلام کا پہلی دفعہ صور میں پھونکنا ہے، جس سے تمام مخلوق مر جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یہ لوگ جس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں اس کے لیے ہمیں کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں، صرف ایک مرتبہ صور میں پھونک دیا جائے گا، جس کی چیخ کی آواز سے سب لوگ بے ہوش ہو کر مر جائیں گے۔

③ **تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ** : "يَخِصِّمُوْنَ" اصل میں "يَخْتَصِمُوْنَ" (افتعال) ہے۔ تاء کو صاد کے ساتھ بدل کر صاد میں ادغام کر دیا اور صاد کی موافقت کے لیے خاء کو بھی کسرہ دے دیا۔ ادغام سے ان کے جھگڑنے کی شدت بیان کرنا مقصود ہے۔ یعنی وہ قیامت آہستہ آہستہ نہیں آئے گی، جسے دیکھ کر وہ کچھ سنبھل جائیں، بلکہ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے اور پورے زور و شور سے ایک دوسرے سے جھگڑا اور بحث کر رہے ہوں گے کہ اچانک ایک چیخ سے قیامت برپا ہو جائے گی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: (( تَقُوْمُ السَّاعَةُ وَالرَّجُلُ يَحْلُبُ اللِّقْحَةَ فَمَا يَصِلُ الْإِنَاءُ إِلٰى فِيْهِ حَتّٰى تَقُوْمَ وَ الرَّجُلَانِ يَتَبَايَعَانِ الثَّوْبَ فَمَا يَتَبَايَعَانِهِ حَتّٰى تَقُوْمَ وَالرَّجُلُ يَلِطُ فِيْ حَوْضِهِ فَمَا يَصْدُرُ حَتّٰى تَقُوْمَ )) [ مسلم، الفتن، باب قرب الساعۃ : ۲۹۵۴ ] "قیامت (اتنی اچانک) قائم ہوگی کہ آدمی اونٹنی کا دودھ دوہ رہا ہوگا، پھر برتن اس کے منہ تک نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ وہ قائم ہو جائے گی اور دو آدمی کپڑے کی خرید و فروخت کر رہے ہوں گے، تو ابھی سودا کر نہیں پائیں گے کہ وہ قائم ہو جائے گی اور آدمی اپنے حوض کی لپائی کر رہا ہوگا، ابھی واپس نہیں ہوگا کہ وہ قائم ہو جائے گی۔"

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّ لَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر وہ نہ کسی وصیت کی طاقت رکھیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس آئیں گے ﴿۵۰﴾ اور صور میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے ﴿۵۱﴾ کہیں گے ہائے ہماری بربادی! کس نے ہمیں ہماری سونے کی جگہ سے اٹھا دیا؟ یہ وہ ہے جو رحمان نے وعدہ کیا اور رسولوں نے سچ کہا تھا ﴿۵۲﴾

**آیت 50** فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً ...... : ”تَوْصِيَةً“ ”وَصّٰى يُوَصِّيْ“ (تفعیل) کا مصدر ہے، وصیت کرنا۔ یعنی اس چیخ کے بعد انھیں اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ وہ کچھ وصیت کر سکیں، یا جو باہر ہیں وہ اپنے گھر واپس جا سکیں، بلکہ جو کوئی جہاں موجود ہوگا وہیں دھر لیا جائے گا۔

**آیت 51** وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ : ”اَلْاَجْدَاثِ“ ”جَدَثٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”فَرَسٌ“ کی جمع ”أَفْرَاسٌ“ ہے۔ ”يَنْسِلُوْنَ“ ”نَسَلَ“ (ن، ض) نَسْلاً، نَسَلًا وَ نَسَلَانًا فِيْ مَشْيِهٖ“ دوڑنا۔
یعنی صور میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو اچانک سب لوگ اپنی قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔ (دیکھیے قمر: ۶ تا ۸۔ معارج: ۴۳) صور میں کتنی دفعہ پھونکا جائے گا اور دو دفعہ پھونکنے کے درمیان کتنا عرصہ ہوگا، اس تفصیل کے لیے سورۂ نمل کی آیت (۸۷) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 52** ❶ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا : یعنی اس وقت انھیں یہ احساس نہیں ہوگا کہ وہ مر چکے تھے اور اب زندہ کیے گئے ہیں، بلکہ سمجھیں گے کہ ہم سوئے ہوئے تھے اور کسی نے ہمیں جگا دیا ہے۔ گزری ہوئی لمبی مدت انھیں ایک لمحہ معلوم ہوگی۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۵۲) اور روم (۵۵)۔

❷ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ : یہاں یہ ذکر نہیں کہ یہ بات کون کہے گا، عین ممکن ہے کہ خود ہی ان کی سمجھ میں آ جائے کہ یہ تو وہی قیامت ہے جو رسول ہمیں بتایا کرتے تھے اور ہم اسے جھٹلاتے تھے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مومن یا فرشتے انھیں یہ بات کہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مستقبل کو حاضر قرار دے کر اب یہ جواب دے رہے ہوں۔

❸ یہاں لفظ ”الرَّحْمٰنُ“ صرف اس کا وعدہ یاد دلانے کے لیے نہیں، بلکہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس خوف ناک دن میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ننانوے حصوں کے وہ جلوے نظر آئیں گے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ﴾ [ الفرقان : ۲۶ ] ”اس دن حقیقی بادشاہی رحمان کی ہوگی۔“ اور فرمایا: ﴿وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ﴾ [ طٰہٰ : ۱۰۸ ] ”اور سب آوازیں رحمان کے لیے پست ہو جائیں گی۔“

اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۵۳﴾ فَالۡيَوۡمَ لَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَيۡـًٔا وَّلَا تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِىۡ شُغُلٍ فٰكِهُوۡنَ ﴿۵۵﴾ هُمۡ وَاَزۡوَاجُهُمۡ فِىۡ ظِلٰلٍ عَلَى الۡاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوۡنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ ﴿۵۷﴾

نہیں ہوگی مگر ایک ہی چیخ، تو اچانک وہ سب ہمارے پاس حاضر کیے ہوئے ہوں گے ﴿۵۳﴾ پس آج کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور نہ تمھیں اس کے سوا کوئی بدلا دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۵۴﴾ بے شک جنت کے رہنے والے آج ایک شغل میں خوش ہیں ﴿۵۵﴾ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں ﴿۵۶﴾ ان کے لیے اس میں بہت پھل ہے اور ان کے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو وہ طلب کریں گے ﴿۵۷﴾

**آیت 53** **اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً** ...... : مراد صور میں دوسری دفعہ کی پھونک ہے، جس سے لمحہ بھر میں قیامت برپا ہو جائے گی۔ دیکھیے سورۂ نحل (۷۷) اور نازعات (۱۳، ۱۴)۔

**آیت 54** **فَالۡيَوۡمَ لَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَيۡـًٔا** ...... : یعنی اس وقت اعلان ہوگا کہ آج کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، نہ یہ کہ ان کی نیکیوں میں کوئی کمی کی جائے اور نہ یہ کہ وہ گناہ اس کے ذمے ڈال دیے جائیں جو اس نے نہیں کیے، بلکہ صرف انھی اعمال کی جزا ملے گی جو وہ کرتے رہے تھے۔

**آیت 53** **اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ** ...... : یہ ذکر کرنے کے بعد کہ ہر ایک کو اس کے عمل ہی کی جزا ملے گی، پہلے اہلِ جنت کی جزا ذکر فرمائی کہ آج کے دن وہ ایک عظیم مشغولیت میں خوش ہوں گے۔ "**شُغُلٍ**" کا معنی ایسا کام ہے جو انسان کو دوسرے کاموں سے روک دے۔ اس میں تنوین تعظیم کی ہے، مراد یہ ہے کہ وہ اپنی بیویوں سے اور جنت کی دوسری نعمتوں سے لذت اٹھانے میں ایسے مگن ہوں گے کہ انھیں کسی اور چیز کا خیال تک نہیں آئے گا، کیونکہ جنت کی وہ نعمتیں ایسی ہوں گی جو انسان کے وہم و گمان سے بھی بالا ہیں۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۱۷) "**الۡيَوۡمَ**" (آج) کے لفظ سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنت جلد ہی جنت میں چلے جائیں گے۔

**آیت 54** **هُمۡ وَاَزۡوَاجُهُمۡ فِىۡ ظِلٰلٍ** ...... : جنت کے سایوں کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۵۷)۔

**آیت 57** **لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ** : "**فَاكِهَةٌ**" میں تنوین تکثیر کے لیے ہے، یعنی ان کے لیے جنت میں بہت سے پھل ہوں گے اور انھیں ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ تمنا کریں گے اور مانگیں گے۔ یہ تو جسمانی لذتوں کا حال ہوگا، روحانی لذتوں میں سب سے اونچی لذت کا ذکر اگلی آیت میں فرمایا۔

سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ ﴿۵۸﴾ وَ امۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿ۙ۶۰﴾ وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾

سلام ہو۔ اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے ﴿۵۸﴾ اور الگ ہو جاؤ آج اے مجرمو! ﴿۵۹﴾ کیا میں نے تمھیں تاکید نہ کی تھی اے اولاد آدم! کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿۶۰﴾ اور یہ کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۶۱﴾

**آیت 58** سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ : یعنی اس بے حد مہربان رب کی طرف سے جنتیوں کو سلام کہا جائے گا۔ دوسری آیات میں ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی ہوگا۔ رب رحیم کے دیدار اور اس کی طرف سے سلام کے بعد انھیں ہر لحاظ سے سلامتی حاصل ہوگی اور ایسا تحفہ اور ایسی نعمت ملے گی جس سے بڑا تحفہ اور بڑی نعمت کوئی نہیں، کیونکہ اس سے انھیں اس کی ابدی رضا حاصل ہو جائے گی، جس کے بعد وہ کبھی ان پر ناراض نہیں ہوگا۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۷۲) اور سورۂ یونس (۲۶)۔

**آیت 58** وَ امۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ : جنتیوں کی ہر لحاظ سے تکریم اور رب رحیم کی طرف سے سلام کے ذکر کے بعد بتایا کہ جہنمیوں سے کیا کہا جائے گا، یعنی ان سے کہا جائے گا کہ اے مجرمو! تم جنتیوں سے الگ ہو جاؤ۔ دنیا میں بے شک تم اکٹھے رہے، مگر آج تمھارا ان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ، مجوس اور مشرکین سب الگ ہو جائیں گے (دیکھیے یونس: ۲۸۔ روم: ۱۴ تا ۱۶) اور جو جس کی پرستش کرتا تھا اس کے پیچھے چلا جائے گا، صرف موحد باقی رہ جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ قلم کی آیت (۴۲) ﴿یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 60** اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ ...... : ''عَهِدَ إِلَیۡهِ'' کا معنی ہے اس کو وصیت کی۔ آلوسی نے فرمایا، اس تاکیدی نصیحت سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ اوامر ونواہی ہیں جو اس نے اپنے رسولوں کی معرفت بنی آدم کے لیے بھیجے، جن میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا سَوۡاٰتِہِمَا ؕ اِنَّہٗ یَرٰىکُمۡ ہُوَ وَ قَبِیۡلُہٗ مِنۡ حَیۡثُ لَا تَرَوۡنَہُمۡ ؕ اِنَّا جَعَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ﴾ [ الأعراف : ۲۷ ] ''اے آدم کی اولاد! کہیں شیطان تمھیں فتنے میں نہ ڈال دے، جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، وہ دونوں سے ان کے لباس اتارتا تھا، تاکہ دونوں کو ان کی شرم گاہیں دکھائے، بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کے دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔'' بعض نے کہا، مراد وہ عہد ہے جو ''اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ'' میں مذکور ہے، (دیکھیے سورۂ اعراف: ۱۷۲ کی تفسیر) یا وہ عقلی دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے کائنات میں رکھے ہیں۔

**آیت 61** وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ : ''اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ'' میں اور ''اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ'' میں ''اَنۡ''

وَ لَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾ اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا۔ تو کیا تم نہیں سمجھتے تھے ﴿۶۲﴾ یہ ہے وہ جہنم جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے ﴿۶۳﴾ آج اس میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کفر کیا کرتے تھے ﴿۶۴﴾ آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۶۵﴾

---

تفسیر یہ ہے اور یہ سب اسی تاکیدی نصیحت کی تفسیر ہے۔

**آیت 62** اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ : یعنی کیا تم اتنی عقل نہ رکھتے تھے کہ جب شیطان تمھارا دشمن تھا تو تم اس کے بتائے ہوئے راستے پر نہ چلتے؟

**آیت 64،63** هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ...... : "اِصْلَوْهَا" "صَلِيَ يَصْلٰى (ع) النَّارَ" کا اصل معنی آگ سینکنا ہے۔ انھیں یہ بات بطور طنز و استہزا کہی جائے گی۔ (التحریر) اور اس حکم کے ساتھ ہی انھیں دھکیل کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ سورۂ طور میں فرمایا: ﴿ یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴾ [ الطور : ۱۳، ۱۴ ] "جس دن انھیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا، سخت دھکیلا جانا۔ یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے۔"

**آیت 65** ① اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ ...... : مونہوں پر مہر لگانے کی وجہ یہ ہوگی کہ بعض مجرم قیامت کے دن اپنے جرم کا اقرار کرنے سے انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے کوئی جرم کیا ہی نہیں، وہ گواہوں کو جھٹلا دیں گے اور نامہ اعمال کو بھی درست نہیں مانیں گے، بلکہ اپنے بے گناہ ہونے کی قسمیں کھائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ﴾ [ الأنعام : ۲۳ ] "پھر ان کا فریب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کہیں گے، اللہ کی قسم! جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے۔" اور قسمیں کھا کر دل میں سمجھیں گے کہ جس طرح دنیا میں جھوٹ چل جاتا تھا، اب بھی چل جائے گا، فرمایا: ﴿ یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَیْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ [ المجادلة : ۱۸ ] "جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ وہ کسی چیز پر (قائم) ہیں، سن لو! یقیناً وہی اصل جھوٹے ہیں۔"

اس وقت ان سے یہ معاملہ ہوگا جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ آپ اچانک ہنس دیے اور فرمایا: "جانتے ہو میں کس بات پر ہنسا ہوں؟" ہم نے کہا: "اللہ اور

وَ لَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِہِمۡ فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۶۶﴾

اور اگر ہم چاہیں تو یقیناً ان کی آنکھیں مٹا دیں، پھر وہ راستے کی طرف بڑھیں تو کیسے دیکھیں گے؟ ﴿۶۶﴾

اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا : (( مِنْ مُخَاطَبَةِ الْعَبْدِ رَبَّهُ يَقُوْلُ يَا رَبِّ! أَلَمْ تُجِرْنِيْ مِنَ الظُّلْمِ؟ قَالَ يَقُوْلُ بَلٰى، قَالَ فَيَقُوْلُ فَإِنِّيْ لَا أُجِيْزُ عَلٰى نَفْسِيْ إِلَّا شَاهِدًا مِنِّيْ، قَالَ فَيَقُوْلُ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ شَهِيْدًا وَ بِالْكِرَامِ الْكَاتِبِيْنَ شُهُوْدًا قَالَ فَيُخْتَمُ عَلٰى فِيْهِ فَيُقَالُ لِأَرْكَانِهِ انْطِقِيْ قَالَ فَتَنْطِقُ بِأَعْمَالِهِ قَالَ ثُمَّ يُخَلّٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْكَلَامِ قَالَ فَيَقُوْلُ بُعْدًا لَكُنَّ وَ سُحْقًا فَعَنْكُنَّ كُنْتُ أُنَاضِلُ )) [ مسلم، الزهد و الرقائق، باب الدنيا سجن للمؤمن و جنة للكافر : ۲۹۶۹ ] ''میں بندے کی اپنے رب سے گفتگو پر ہنسا ہوں (جو وہ قیامت کے دن کرے گا)، وہ کہے گا: ''اے میرے رب! کیا تو مجھے ظلم سے پناہ نہیں دے چکا؟'' وہ فرمائے گا: ''کیوں نہیں؟'' کہے گا: ''میں اپنے سوا کسی گواہ کی گواہی اپنے خلاف منظور نہیں کروں گا (میرا بدن میرا اپنا ہے باقی سب میرے دشمن ہیں)۔'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''آج تیری ذات ہی تیرے خلاف بطور گواہ کافی ہے اور کراماً کاتبین گواہ کافی ہیں۔'' چنانچہ اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے جسم کے اعضا سے کہا جائے گا: ''بولو!'' تو وہ اس کے سارے اعمال بول کر بتائیں گے، پھر اسے بولنے کی اجازت دی جائے گی تو وہ اپنے اعضا سے کہے گا: ''تمھارا ستیاناس ہو اور تم (مجھ سے) دور ہو جاؤ، میں تو تمھارا ہی دفاع کر رہا تھا۔''

② اس آیت میں ہاتھوں اور پاؤں کے بولنے اور شہادت دینے کا ذکر ہے، جبکہ دوسرے مقامات پر جسم کے دوسرے اعضا کے بولنے کا بھی ذکر ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوۡهَا شَهِدَ عَلَیۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَ اَبۡصَارُهُمۡ وَ جُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ۲۰ ] ''یہاں تک کہ جوں ہی اس (آگ) کے پاس پہنچیں گے ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔'' اور فرمایا: ﴿ یَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَیۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [ النور : ۲۴ ] ''جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔'' اس آیت پر ایک سوال ہے کہ مونہوں پر مہر کے باوجود زبانیں کیسے شہادت دیں گی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ مہر سے مراد یہ ہے کہ اس کی زبان پر سے اس کا اختیار ختم کر دیا جائے گا اور زبان کو اپنی مرضی سے صحیح بات کہنے کا اختیار ہوگا۔

**آیت 66** ① وَ لَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِهِمۡ ...... : پچھلی دو آیتوں کے ساتھ ان دو آیات کا تعلق یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ وہ قیامت کے دن شرک سے انکار کے بعد اس کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں گے، تو اس سے دل میں خیال گزرتا ہے کہ کاش! دنیا میں بھی انھیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسولوں کی تصدیق پر مجبور کر دیا جاتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اگر ہمارا ارادہ یہ ہوتا تو ہم ایسا کر دیتے اور کفر و شرک کرنے والوں کو فوراً پکڑ لیتے، تاکہ وہ اپنے کفر و شرک سے باز آ جائیں، مگر ہم نے دنیا کو دارالامتحان بنایا ہے اور ہر ایک کو عمل کی مہلت دی ہے۔ (ابن عاشور)

وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور اگر ہم چاہیں تو یقیناً ان کی جگہ ہی پر ان کی صورتیں بدل دیں، پھر نہ وہ (آگے) چل سکیں اور نہ واپس آئیں ﴿۶۷﴾ اور جسے ہم زیادہ عمر دیتے ہیں اسے بناوٹ میں الٹا کر دیتے ہیں، تو کیا یہ نہیں سمجھتے ﴿۶۸﴾

② "طَمَسَ يَطْمِسُ" (ض) کا معنی "مٹانا" ہے، لفظ "عَلٰى" کے بغیر بھی اس کا معنی یہی ہے، "عَلٰى" کے لفظ سے مراد مٹانے میں مبالغہ ہے۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں سرے ہی سے مٹا دیں، پھر وہ راستے کی طرف بڑھیں تو اسے کس طرح دیکھیں گے۔ "لَوْ" کا لفظ شرط کے نہ ہونے کی وجہ سے جزا کے نہ ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "لیکن ہم نے یہ نہیں چاہا تو ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہم نے انھیں ان کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود ایک وقت تک مہلت دی ہے۔"

**آیت 67** وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ...... : مسخ کا معنی ہے انسان کی شکل اس کے علاوہ کسی اور شکل میں بدل دینا، مثلاً اسے بندر یا خنزیر یا پتھر بنا دینا۔ "مَكَانَةٌ" "مَكَانٌ" (جگہ) کی مؤنث ہے (بُقْعَةٌ کی تاویل کے ساتھ)، یعنی اور اگر ہم چاہیں تو (جب وہ کفر و شرک کا ارتکاب کریں) انھیں زمین کے عین اسی ٹکڑے پر مسخ کر دیں، پھر نہ وہ آگے جا سکیں اور نہ گھر واپس جا سکیں (مگر ہم نے یہ نہیں چاہا......)۔

**آیت 68** ① وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ: انسان کی جوانی جوں جوں ڈھلتی ہے، بڑھاپا، کمزوری اور ناتوانی آتی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ دوبارہ بچوں کی طرح کمزور اور ہر کام میں دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ بڑے عالی دماغ کے باوجود سب کچھ بھول جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ﴾ [ الروم : ٥٤ ] "اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنا دیا، وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا ہے، ہر چیز پر قادر ہے۔" اور فرمایا: ﴿ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا﴾ [ الحج : ٥ ] "پھر ہم تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو قبض کر لیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمّی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔"

② اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ: مفسرین نے پچھلی آیات کی مناسبت سے اس کی تفسیر دو طرح سے کی ہے، ایک یہ کہ زندگی کے ان انقلابات کو دیکھ کر بھی یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ یہ انقلابات لانے والی ہستی کے لیے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا اور قیامت برپا کرنا کچھ مشکل نہیں، بلکہ آخرت اور جزائے اعمال حق ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: "یعنی جیسے لڑکا سست تھا، بوڑھا بھی ویسا ہی ہوا، یہ بھی نشان ہے پھر پیدا ہونے کا۔" (موضح) دوسری تفسیر یہ کہ پھر بھی کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ جو پروردگار عمر دے کر بناوٹ میں الٹا

وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾

اور ہم نے نہ اسے شعر سکھایا ہے اور نہ وہ اس کے لائق ہے۔ وہ تو سراسر نصیحت اور واضح قرآن کے سوا کچھ نہیں ﴿۶۹﴾ تا کہ اسے ڈرائے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر بات ثابت ہو جائے ﴿۷۰﴾

---

کر دیتا ہے، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ آنکھیں دینے کے بعد انھیں مٹا دے اور اچھی صورتیں عطا کرنے کے بعد انھیں مسخ کر دے۔

**آیت 69** ① **وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ** : پچھلی آیات سے اس کی مناسبت یہ ہے کہ کفار توحید و آخرت اور زندگی کے بعد موت اور جنت و دوزخ کے متعلق نبی ﷺ کی باتوں کو محض شاعری قرار دے کر اپنے خیال میں بے وزن ٹھہرانے کی کوشش کرتے تھے، یہ ان کے اس الزام کا رد ہے۔ یعنی آپ ﷺ نبوت و رسالت کے جس مقام پر فائز ہیں شاعری کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔ شاعری کا حُسن اور کمال تو جھوٹ، مبالغہ آرائی، خیالی بلند پروازی اور فرضی نکتہ آفرینی ہے، جب کہ نبی ﷺ کی شان ان چیزوں سے بلند و بالا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طبیعت ایسی رکھی کہ باوجود خاندان عبدالمطلب سے ہونے کے، جس کا ہر فرد فطرتاً شاعر ہوتا تھا، پوری عمر میں کوئی شعر نہیں کہا۔ یوں جنگ وغیرہ کے موقع پر زبان مبارک سے کبھی کوئی مقفّٰی عبارت ایسی نکل گئی جو شعر کا سا وزن رکھتی تھی تو وہ الگ بات ہے، اسے شعر و شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ شعر اور شعراء پر مفصل کلام کے لیے دیکھیے سورۂ شعراء کی آیات (۲۲۴ تا ۲۲۷) کی تفسیر۔

② "**وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ**" کے الفاظ پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ کو "عَالِمُ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ" قرار دیتے ہیں۔

③ **اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ** : یعنی یہ تو نصیحت اور یاد دہانی ہے اور واضح پڑھی جانے والی آسمانی کتاب ہے۔

**آیت 70** ① **لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا** : تا کہ یہ اس آدمی کو ڈرائے جس کا دل اور جس کی بصیرت زندہ ہے، جس نے اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو معطل نہیں کر رکھا اور نہ ہی اس کا دل پتھر کی طرح مُردہ ہو چکا ہے کہ اسے کتنی ہی نصیحت کی جائے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، کیونکہ زندہ دل والا آدمی ہی اس کے ڈرانے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ [ فاطر : ۱۸ تا ۲٤ ] "تُو تو صرف ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو پاک ہوتا ہے تو وہ صرف اپنے لیے پاک ہوتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔ اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی۔ اور نہ سایہ اور نہ لُو۔ اور نہ زندے برابر ہیں اور نہ مردے۔ بے شک اللہ سنا دیتا ہے

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان چیزوں میں سے جنھیں ہمارے ہاتھوں نے بنایا، ان کے لیے مویشی پیدا کیے، پھر وہ ان کے مالک ہیں ﴿۷۱﴾ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ ان کی سواری ہیں اور ان میں سے بعض کو وہ کھاتے ہیں ﴿۷۲﴾

---

جسے چاہتا ہے اور تو ہرگز اسے سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہے۔ تُو تو محض ایک ڈرانے والا ہے۔ بے شک ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت نہیں مگر اس میں ایک ڈرانے والا گزرا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴾ [ یٰسٓ : ۱۱ ] ''تُو تو صرف اسی کو ڈراتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمان سے بن دیکھے ڈرے۔ سو اسے بڑی بخشش اور باعزت اجر کی خوش خبری دے۔'' اور فرمایا: ﴿ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ مَاۤ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [ الروم : ۵۲، ۵۳ ] ''پس بے شک تو نہ مُردوں کو سناتا ہے اور نہ بہروں کو پکار سناتا ہے، جب وہ پیٹھ پھیر کر لوٹ جائیں۔ اور نہ تو کبھی اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ پر لانے والا ہے۔ تو نہیں سناتا مگر انھی کو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، پھر وہ فرماں بردار ہیں۔''

**2** **وَ يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ:** اور تاکہ جو کفر پر ڈٹے رہیں ان پر اللہ کی طرف سے حجت پوری ہو جائے اور ان کے پاس کوئی ایسا عذر نہ رہے جس کی بنا پر وہ قیامت کے دن اپنے آپ کو بے قصور اور مظلوم تصور کر سکیں۔

**آیت 71** **اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ ......:** یہاں سے پھر توحید اور اس کے بعد آخرت کے دلائل کا بیان ہے۔ ''اَنْعَامًا'' ''نَعَمٌ'' کی جمع ہے، یعنی کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ یہ جانور جن کے یہ مالک بنے ہوئے ہیں، یہ سب ہم نے پیدا کیے ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی ہے اور ان پر ایمان رکھنا اور ان کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا واجب ہے، تاہم یہاں اہلِ علم نے ''اپنے ہاتھوں سے'' بنانے کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ ہم نے انھیں کسی کی شرکت یا واسطے کے بغیر خود بنایا ہے۔ ان کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا ذرہ برابر دخل نہیں ہے۔ (فتح البیان)

**آیت 72** **وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ ......:** یعنی ان چوپاؤں کو ہم نے ان کے تابع کر رکھا ہے، اگر ہم دوسرے جنگلی جانوروں کی طرح ان کی طبیعت میں بھی وحشت رکھ دیتے تو وہ کبھی ان کے قابو میں نہ آتے، کجا یہ کہ ان کے مالک بنتے۔ ہمارے تابع کرنے کا نتیجہ ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اونٹ کی نکیل تھام لے تو اونٹ جیسا قوی اور بڑا جانور اس کے ساتھ چل پڑتا ہے اور اگر اس کے ساتھ سو اونٹوں کی قطار ہو تو وہ بھی ایک بچے کے ہانکنے سے سیدھی چلتی رہتی ہے۔ اس ماتحتی کے علاوہ ان پر سوار ہو کر لمبے لمبے سفر آسانی سے طے کرتے ہیں۔ خود سوار ہوتے ہیں، سامان لادتے ہیں اور بوجھ ڈھونے کا

وَ لَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور ان کے لیے ان میں کئی فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے ﴿۷۳﴾ اور انھوں نے اللہ کے سوا کئی معبود بنا لیے، تاکہ ان کی مدد کی جائے ﴿۷۴﴾ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے اور یہ ان کے لشکر ہیں، جو حاضر کیے ہوئے ہیں ﴿۷۵﴾

---

کام لیتے ہیں، حتیٰ کہ بعض کو ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔

**آیت 73** ① **وَ لَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ:** سواری اور گوشت کے علاوہ انسان کے لیے ان جانوروں میں بہت سے فوائد ہیں، مثلاً ان کی کھال، چربی، سینگوں، بالوں اور آنتوں وغیرہ سے سیکڑوں چیزیں بناتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھیتی باڑی کرتے ہیں، ان کے گوبر کی کھاد بناتے ہیں اور ان کی خرید و فروخت کے ساتھ زندگی کی ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔ جانوروں کے ذریعے سے آدمی کو پینے کی بھی بہت سی چیزیں مہیا ہوتی ہیں، مثلاً ان کا دودھ اور بے شمار وہ چیزیں جو دودھ سے بنتی ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ نحل (۵ تا ۸) اور سورۂ زخرف (۱۲ تا ۱۴)۔

② **اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ** : یعنی یہ سب قسم کے احسانات تو انسان پر اللہ تعالیٰ نے کیے، اب بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا، اس نے انھی جانوروں کی قربانیاں غیر اللہ کے آستانوں پر اور ان کے نام پر کیں۔ ان کے نام پر جانور آزاد چھوڑے جن کا ان جانوروں کے پیدا کرنے اور انھیں انسان کا مطیع بنانے میں کچھ بھی عمل دخل نہ تھا، اس سے بڑھ کر ناشکری اور نمک حرامی کیا ہو سکتی ہے!؟

**آیت 74** **وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ......** : انسان نے اللہ کے سوا جن کی بھی عبادت کی ہے صرف اس لیے کی ہے کہ وہ اس کی مدد کریں، اس کی کوئی حاجت پوری کریں، یا اس کی کوئی مشکل دور کریں۔ اگر وہ آخرت پر بھی ایمان رکھتا ہے تو اس لیے کہ اسے سفارش کے بل بوتے پر عذاب سے بچا لیں، یہ سب مدد کی صورتیں ہیں۔

**آیت 75** ① **لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ** : فرمایا، وہ ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دنیا میں ان کی مدد کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے عابدوں کی مدد تو کیا کریں گے وہ اپنی بقا، حفاظت اور دوسری ضروریات کے لیے اپنی عبادت کرنے والوں کے محتاج ہیں اور آخرت میں وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۶)۔

② **وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ:** اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، پہلا یہ کہ "هُمْ" سے مراد مشرکین اور "لَهُمْ" سے مراد ان کے معبود ہوں، یعنی بجائے اس کے کہ ان کے معبود ان کی مدد کریں یہ عبادت کرنے والے ہر وقت ان کے مددگار اور خدمت گار فوج بنے ہوئے ہیں، ان کے آستانے تعمیر کرتے ہیں، ان کے آستانوں اور قبروں پر جھاڑو دیتے ہیں، انھیں چمکا کر رکھتے

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾

پس ان کی بات تجھے غم زدہ نہ کرے، بے شک ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں ﴿۷۶﴾ اور کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑنے والا ہے ﴿۷۷﴾

ہیں، وہاں لنگر کا انتظام کرتے ہیں، ان کی حمایت میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور ان کی مشکل کُشائی اور حاجت روائی کے جھوٹے قصے بیان کر کے لوگوں کو ان کا گرویدہ بناتے ہیں۔ اگر عبادت کرنے والوں کے یہ لشکر نہ ہوں تو ان کی خدائی ایک لمحہ نہیں چل سکتی۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ "هُمْ" سے مراد باطل معبود اور "لَهُمْ" سے مراد مشرکین ہوں، یعنی وہ جھوٹے معبود قیامت کے دن ان کفار کی عبادت کا انکار کر کے انھیں عذاب دینے دلوانے والے لشکر بن جائیں گے۔

**آیت 76** ① **فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ** : اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ جب ہمارے متعلق ان مشرکین کے جہل اور عناد کا یہ حال ہے تو آپ بھی ان کی باتوں سے غم زدہ نہ ہوں۔

② **اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ** : (إِنَّ تعلیل کے لیے ہوتا ہے) کیونکہ آپ غم زدہ تو تب ہوں جب انھیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، ہم تو ان کی وہ باتیں بھی جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور وہ بھی جو ظاہر کرتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپس میں وہ آپ کے سچا ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور لوگوں کے سامنے آپ کو شاعر، ساحر اور کاہن وغیرہ کہتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں ان کی خفیہ سازشوں کا بھی علم ہے اور علانیہ دشمنی کا بھی، آپ فکر نہ کریں، ہم سارا حساب برابر کر دیں گے۔

**آیت 77** ① **اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ** : یہاں سے سورت کے آخر تک کفار کے اس انکار کا دلیل کے ساتھ جواب ہے جو وہ قیامت کا مذاق اڑانے کے لیے سوال کی صورت میں کرتے تھے کہ "مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ" قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ یعنی قیامت وغیرہ کچھ نہیں، نہ ہی کوئی مر کر زندہ ہو سکتا ہے۔ "اَوَلَمْ يَرَ" (اور کیا انسان نے نہیں دیکھا) سے مراد ہے "أَوَلَمْ يَعْلَمْ" (اور کیا انسان کو معلوم نہیں)۔ کیونکہ کسی بھی شخص نے اپنا نطفے سے پیدا ہونا آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

② **اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ** : "نُّطْفَةٍ" "نَطَفَ يَنْطُفُ" (ن، ض) ٹپکنا، اس میں تنوین تحقیر کے لیے ہے، معمولی اور حقیر قطرہ، یعنی کیا انسان کو معلوم نہیں کہ ہم نے انسان کو ایک حقیر قطرے سے پیدا کیا ہے؟ بسر بن جحاش القرشی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « بَزَقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ كَفِّهِ، ثُمَّ وَضَعَ إِصْبَعَهُ السَّبَّابَةَ وَقَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنّٰى تُعْجِزُنِيْ ابْنَ آدَمَ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ مِثْلِ هٰذِهِ، فَإِذَا بَلَغَتْ نَفْسُكَ هٰذِهِ، وَأَشَارَ إِلٰى حَلْقِهِ، قُلْتَ أَتَصَدَّقُ، وَأَنّٰى أَوَانُ الصَّدَقَةِ؟ » [ ابن ماجه، الوصايا، باب النهي عن الإمساك...... : ۲۷۰۷، قال البوصيري صحيح وقال الألباني حسن ]

''رسول اللہ ﷺ نے اپنی ہتھیلی پر تھوکا، پھر اپنی شہادت کی انگلی اس پر رکھی اور فرمایا: ''اللہ عز وجل فرماتا ہے، اے ابن آدم! تو مجھے کیسے عاجز کر سکتا ہے، حالانکہ میں نے تجھے اس جیسی چیز سے پیدا کیا ہے اور جب تیری جان یہاں پہنچ جاتی ہے (اور آپ

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۷۹﴾

اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جب کہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟ ﴿۷۸﴾ کہہ دے انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا خوب جاننے والا ہے ﴿۷۹﴾

---

نے حلق کی طرف اشارہ فرمایا) تو تُو کہتا ہے، میں صدقہ کرتا ہوں، بھلا اب صدقے کا وقت کہاں؟''

③ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ : ''خَصِيْمٌ'' مبالغے کا صیغہ ہے، بہت جھگڑنے والا۔ ''اِذَا'' فجائیہ اچانک کے معنی میں آتا ہے، یعنی ایسی عجیب چیز کا وجود میں آنا جس کا وہم و گمان نہ ہو، یعنی ایسے حقیر قطرے سے پیدا کیے جانے والے انسان کا حق تو یہ تھا کہ ہمیشہ اس کا سر ہمارے احسان کے بوجھ سے جھکا رہتا۔ یہ تو امید ہی نہ تھی کہ وہ صاف جھگڑے پر اتر آئے گا اور اتنا زیادہ جھگڑے گا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۴)۔

**آیت 78** ① وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ...... : یعنی ہمیں مخلوق کی طرح عاجز سمجھتا ہے کہ جس طرح انسان مُردہ کو زندہ نہیں کر سکتا ہم بھی نہیں کر سکتے اور یہ بھول جاتا ہے کہ خود اسے ہم نے کس چیز سے پیدا کیا۔ کہتا ہے، آخر جب بدن گل سڑ کر ہڈیاں رہ گیا اور وہ بھی پرانی اور بوسیدہ وکھوکھلی تو انھیں دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ اگر یہ اپنی پیدائش کو یاد رکھتا تو یہ سوال ہرگز نہ کرتا، کیونکہ جو انسان کو ایک حقیر مردہ قطرے سے پیدا کر سکتا ہے، جب اس کا نام ونشان نہیں تھا، اس کے لیے اسے اس کی بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطفے سے پیدا کرنے کی بات کئی مقامات پر یاد دلائی ہے، سورۂ دہر میں فرمایا: ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ﴾ [ الدهر : ۲ ] ''بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا۔'' اور سورۂ مرسلات میں فرمایا: ﴿ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [ المرسلات : ۲۰ ] ''کیا ہم نے تمھیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟''

**آیت 79** ① قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ ...... : یعنی جس نے ان ہڈیوں کو اس وقت پیدا کر لیا جب ان کا وجود ہی نہ تھا، پھر ان میں جان ڈال دی، وہی انھیں دوبارہ زندہ کر دے گا، کیونکہ دوبارہ بنانا تو زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اگرچہ اس قادر مطلق کے لیے پہلی مرتبہ بنانا اور دوبارہ بنانا یکساں آسان ہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۷)۔

② وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ : ''خَلْقٍ'' مصدر بھی ہو سکتا ہے، یعنی ''ہر طرح کا پیدا کرنا'' اور اسم مفعول بمعنی مخلوق بھی، یعنی ''ہر ہر مخلوق'' پہلا معنی ہو تو مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز کے متعلق خوب جانتا ہے کہ اسے کس طرح پیدا کرنا ہے، پھر یہ بھی کہ اسے پہلی دفعہ کیسے پیدا کرنا ہے اور دوبارہ کیسے بنانا ہے، لہٰذا اس کے لیے بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ دوسرا معنی ہو تو مطلب یہ ہے کہ وہ ہر ہر مخلوق کو جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور اس کے فنا ہونے کے بعد اس کے ذرات کہاں کہاں ہیں، سو

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ۝۸۰ اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؔ بَلٰى ۗ وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ۝۸۱

وہ جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی، پھر یکا یک تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۝۸۰ اور کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے اور پیدا کر دے؟ کیوں نہیں اور وہی سب کچھ پیدا کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۝۸۱

---

وہ ہر ذرے کو اس کی جگہ سے جمع کر کے دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَانَ رَجُلٌ يُسْرِفُ عَلٰى نَفْسِهِ، فَلَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ قَالَ لِبَنِيْهِ إِذَا أَنَا مُتُّ فَأَحْرِقُوْنِيْ ثُمَّ اطْحَنُوْنِيْ ثُمَّ ذَرُّوْنِيْ فِي الرِّيْحِ، فَوَ اللّٰهِ ! لَئِنْ قَدَرَ اللّٰهُ عَلَيَّ لَيُعَذِّبَنِّيْ عَذَابًا مَا عَذَّبَهُ أَحَدًا فَلَمَّا مَاتَ فُعِلَ بِهِ ذٰلِكَ، فَأَمَرَ اللّٰهُ الْأَرْضَ، فَقَالَ اجْمَعِيْ مَا فِيْكِ مِنْهُ فَفَعَلَتْ فَإِذَا هُوَ قَائِمٌ، فَقَالَ مَا حَمَلَكَ عَلٰى مَا صَنَعْتَ؟ قَالَ يَا رَبِّ! خَشْيَتُكَ فَغَفَرَ لَهُ » [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب : ۳۴۸۱ ] ”ایک آدمی اپنی جان پر زیادتی کرتا تھا۔ جب اس کی موت کا وقت آیا، اس نے اپنے بیٹوں سے کہا، جب میں فوت ہو جاؤں، مجھے جلا دینا، پھر مجھے پیسنا، پھر مجھے ہوا میں اڑا دینا، کیونکہ قسم ہے اللہ کی! اگر اللہ نے مجھ پر قابو پا لیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو اس نے کسی کو نہیں دیا۔ تو جب وہ فوت ہو گیا، اس کے ساتھ ایسے ہی کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا، فرمایا، تجھ میں اس کا جو کچھ ہے جمع کر دے، اس نے ایسے ہی کیا تو وہ اسی وقت کھڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تجھے اس طرح کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟“ اس نے کہا: ”اے میرے رب! تیرے خوف نے۔“ تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔“

**آیت 80** الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا ...... : ”الْاَخْضَرِ“ سے مراد تر و تازہ درخت ہے، جو پانی سے لبریز ہوتا ہے۔ یہ دوبارہ زندگی کی دوسری دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء سے ان کی ضد نکالنے پر قادر ہے، وہ بوسیدہ ہڈیوں سے دوبارہ زندہ انسان بنا دے گا، کیونکہ دیکھو، پانی اور آگ ایک دوسرے کی ضد ہیں، مگر اس نے پانی سے لبریز تازہ درخت میں آگ پکڑنے والا وہ مادہ رکھ دیا ہے جس سے تازہ لکڑی بھی جلنے لگتی ہے۔ اسی طرح وہ زندہ سے مُردہ کو اور مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور نکالے گا۔

**آیت 81** اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ ...... : یہ دوبارہ زندگی کی تیسری دلیل ہے کہ آسمان اور زمین کو دیکھو، ان میں اللہ تعالیٰ نے جو عجیب و غریب اور عظیم الشان چیزیں رکھی ہیں، انھیں دیکھو اور ان کے مقابلے میں انسان کو دیکھو، کیا اس عظیم آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا اس ضعیف البنیان انسان کو پہلے یا دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا؟ پھر اللہ تعالیٰ نے خود ہی جواب دیا، کیوں نہیں! وہ خلاق بھی ہے اور علیم بھی۔ جب اس میں صفت خلق اور صفت علم پورے کمال کے ساتھ جمع ہیں تو پھر کون سا مُردہ ہے جو وہ زندہ نہ کر سکے؟ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی پیدائش کو انسان کے دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل

اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے ﴿۸۲﴾ سو پاک ہے وہ کہ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی کامل بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۸۳﴾

کے طور پر کئی مقامات پر نہایت زوردار انداز میں بیان فرمایا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَكۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ ﴾ [ المؤمن : ۵۷ ] ''یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ لَمۡ یَعۡیَ بِخَلۡقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی بَلٰۤی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴾ [ الأحقاف : ۳۳ ] ''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے نہیں تھکا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ کیوں نہیں! یقیناً وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ﴾ [النازعات : ۲۷ ] ''کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔''

**آیت 82** اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا ...... : یہ ایک طرح سے پہلی آیات کا نتیجہ اور خلاصہ ہے کہ اسے پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز بنانے میں دقت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس ''کُنۡ'' کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔

**آیت 83** ① فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَیۡءٍ : ''مَلَكُوۡتُ'' ''مُلۡكٌ'' (مصدر) میں مبالغہ ہے، اس لیے اس کا ترجمہ ''کامل بادشاہی'' کیا گیا ہے۔

② وَ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ : یعنی یہ نہیں کہ مٹی میں رَل مِل کر تمھارا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ نہیں، بلکہ اسے دوبارہ وجود عطا کیا جائے گا۔ یہ بھی نہیں ہو گا کہ تم بھاگ کر کسی اور کے پاس پناہ طلب کر لو، بلکہ تمھیں ہر حال میں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہو گا، جہاں وہ تمھارے اعمال کے مطابق اچھی یا بری جزا دے گا۔

سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ مکیۃ ۵۶ ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ اٰیاتہا ۱۸۲ رکوعاتہا ۵

وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا ۙ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے ان (جماعتوں) کی جو صف باندھنے والی ہیں! خوب صف باندھنا ① پھر ان کی جو ڈانٹنے والی ہیں! زبردست ڈانٹنا ②

**آیت 1** **وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا** : قسم عموماً تاکید کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جب مخاطب کسی بات کا منکر ہو۔ بعض اوقات کسی بات کی عظمت اور اہمیت واضح کرنے کے لیے بھی قسم اٹھائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی اکثر قسموں پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قسم عموماً اس بات کی دلیل ہوتی ہے جو قسم کے بعد بیان ہوتی ہے۔ "**الصّٰٓفّٰتِ**" "صَافَّةٌ" کی جمع ہے، صف بنانے والی جماعت۔ ان جماعتوں سے اکثر مفسرین نے فرشتے مراد لیے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ صفت خود ان کی زبانی بیان فرمائی ہے، فرمایا: ﴿وَ اِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ ﴿۱۶۵﴾ۚ وَ اِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ﴾ [ الصافات : ۱۶۵، ۱۶۶ ] "اور بلاشبہ ہم، یقیناً ہم صف باندھنے والے ہیں۔ اور بلاشبہ ہم، یقیناً ہم تسبیح کرنے والے ہیں۔" حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ، جُعِلَتْ صُفُوْفُنَا كَصُفُوْفِ الْمَلَائِكَةِ وَ جُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَ جُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْرًا إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ )) [ مسلم، المساجد و مواضع الصلاۃ : ۵۲۲ ] "ہمیں دوسرے لوگوں پر تین باتوں میں فضیلت دی گئی ہے، ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح بنائی گئی ہیں اور ہمارے لیے ساری زمین مسجد بنا دی گئی ہے اور ہمارے لیے اس کی مٹی پاک کرنے والی بنا دی گئی ہے جب ہمیں پانی نہ ملے۔" اور جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَلَا تَصُفُّوْنَ كَمَا تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا؟ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ كَيْفَ تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا؟ قَالَ يُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْأُوَلَ وَ يَتَرَاصُّوْنَ فِي الصَّفِّ )) [ مسلم، الصلاۃ، باب الأمر بالسکون في الصلاۃ...... : ۴۳۰ ] "کیا تم اس طرح صفیں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس صفیں بناتے ہیں؟" ہم نے کہا: "اے اللہ کے رسول! فرشتے اپنے رب کے پاس کس طرح صفیں بناتے ہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ (پہلے) پہلی صفیں مکمل کرتے ہیں اور صف میں چونا گچ ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔"

**آیت 2** **فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا** : "فاء" اس بات کی دلیل ہے کہ ان سے مراد بھی فرشتے ہیں، جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہے۔ "**زَجۡرًا**" تاکید کے لیے ہے، یعنی پھر ان فرشتوں کی قسم! جن کی ڈانٹ معمولی نہیں بلکہ ایسی زبردست ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات، خواہ کتنی بے پناہ قوت کی مالک ہوں، ان کے سامنے دم نہیں مار سکتیں، مثلاً موت کے فرشتے۔ (دیکھیے انعام : ۹۳) ہواؤں اور بادلوں پر مامور فرشتے جو انھیں ہانکتے اور چلاتے ہیں۔ (دیکھیے رعد : ۱۳) پہاڑوں پر مامور فرشتہ، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف سے واپسی پر اللہ کے حکم سے آپ کو پیش کش کی کہ اگر آپ فرمائیں تو میں آپ کی قوم کے کفار کو دو

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۵

**پھر ان کی جو ذکر کی تلاوت کرنے والی ہیں! ③ کہ بے شک تمھارا معبود یقیناً ایک ہے ④ جو آسمانوں اور زمین کا اوران دونوں کے درمیان کی چیزوں کا رب اور تمام مشرقوں کا رب ہے ⑤**

پہاڑوں کے درمیان پیس کر ملیامیٹ کر دوں۔ صور میں پھونکنے والا فرشتہ، جس کی ایک ہی ڈانٹ سے تمام لوگ قبروں سے نکل کر زمین کے اوپر ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [ النازعات : ۱۳، ۱۴ ] ''پس وہ تو صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔ پس یک لخت وہ زمین کے اوپر موجود ہوں گے۔''

**آیت 3** فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا : اس سے مراد بھی فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے انبیاء پر ذکر نازل کرتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں نیکی کا خیال ڈالتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴾ [ المرسلات : ۵، ۶ ] ''پھر جو (دلوں میں) یاد (الٰہی) ڈالنے والے ہیں۔ عذر کے لیے یا ڈرانے کے لیے۔''

**آیت 4** اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ : یعنی اللہ کے حکم سے کائنات کا نظام چلانے والے فرشتے، جو اس کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور جن کی ڈانٹ سے زمین و آسمان کے معاملات کی تدبیر ہوتی ہے اور جو پیغمبروں پر وحی نازل کرتے ہیں اور ذکر الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں، یہ سب فرشتے شاہد اور دلیل ہیں کہ کائنات کا معبودِ حقیقی ایک ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایک نہ ہوتو یہ کائنات ایک لمحے کے لیے قائم نہیں رہ سکتی، بلکہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر فنا ہو جائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [ الأنبياء : ۲۲ ] ''اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔'' شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ان تینوں آیات کی ایک اور بہت عمدہ تفسیر فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''فرشتے کھڑے ہوتے ہیں قطار ہو کر سننے کو حکم اللہ کا، پھر جھڑکتے ہیں شیطانوں کو جو سننے کو جا لگتے ہیں، پھر جب اتر چکا، تو اس کو پڑھتے ہیں ایک دوسرے کو سنانے کو۔'' (موضح) اگلی آیات میں اس دعوے کی مزید دلیلیں بیان فرمائی ہیں۔

**آیت 5** ① رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا : مراد اس سے پوری کائنات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار اپنے اکیلے رب ہونے کو اکیلا معبود ہونے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے کہ جب ہر چیز کا مالک اور رب میں ہوں اور تم بھی مانتے ہو کہ ہر چیز پیدا میں نے کی اور اس کی پرورش بھی میں ہی کرتا ہوں، تو عبادت کسی اور کی کیوں ہو؟ داتا اور دستگیر کوئی اور کس طرح بن گیا؟ مصیبت کے وقت کسی اور کو پکارا کیوں جائے؟

② وَرَبُّ الْمَشَارِقِ : "الْمَشَارِقِ" "مَشْرِقٌ" کی جمع ہے، طلوع ہونے کی جگہ۔ سورج ہمیشہ مشرقی سمت کے درمیان سے طلوع نہیں ہوتا، بلکہ گرمیوں میں اس کا مشرق شمال کی طرف سرکتا جاتا ہے اور سردیوں میں جنوب کی طرف اور ہر روز سورج کے طلوع ہونے کی جگہ الگ ہوتی ہے، اس لحاظ سے سال بھر میں سورج کے ۳۶۵ مشرق ہوتے ہیں۔ پھر اس کائنات میں

**اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِ الْكَوَاكِبِ ۙ﴿۶﴾ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ﴿۸﴾**

**بے شک ہم نے ہی آسمان دنیا کو ایک انوکھی زینت کے ساتھ آراستہ کیا، جو ستارے ہیں ﴿۶﴾ اور ہر سرکش شیطان سے خوب محفوظ کرنے کے لیے ﴿۷﴾ وہ اوپر کی مجلس کی طرف کان نہیں لگا سکتے اور ہر طرف سے ان پر (شہاب) پھینکے جاتے ہیں ﴿۸﴾**

---

صرف سورج ہی گردش نہیں کرتا، چاند اور بے شمار سیارے طلوع وغروب ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے طلوع ہونے کے اپنے اپنے مقامات ہیں، جن میں سورج کے مشرقوں کی طرح تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے مشرقوں کی تعداد ہمارے حساب سے باہر ہے۔ یہاں صرف مشارق کے ذکر پر اکتفا فرمایا، کیونکہ ظاہر ہے کہ جو مشرقوں کا رب ہے مغربوں کا رب بھی وہی ہے۔ سورۂ معارج (۴۰) میں مشارق و مغارب دونوں کے رب کی قسم کھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رب المشارق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سورج اور ان تمام سیاروں کی نقل وحرکت کا مالک وہی ہے، کسی اور کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ "**رَبُّ الْمَشَارِقِ**" میں ایک اور نکتہ بھی ہے کہ سورج اپنی روزانہ کی گردش میں اس زمین کے مختلف حصوں پر ایک دوسرے کے بعد پے در پے طلوع ہوتا ہے۔ جہاں زمین کا کوئی حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہی اس کا مشرق ہے۔ اس لحاظ سے بھی نہ مشرقوں کا شمار ہے نہ مغربوں کا۔ (الوسیط)

**آیت 6** **اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِ الْكَوَاكِبِ**: "**الدُّنْيَا**" "اَلْأَدْنٰی" کی مؤنث ہے، سب سے قریب، یعنی جو آسمان ہماری زمین سے دکھائی دیتا ہے۔ "زِیْنَةٍ" پر تنوین تنکیر کی ہے، اس لیے ترجمہ "ایک انوکھی زینت" کیا ہے۔ "**الْكَوَاكِبِ**" "زِیْنَةٍ" سے بدل ہے، ترجمے میں اسے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ستاروں کی پیدائش کی بے شمار حکمتوں میں سے ایک آسمان دنیا کی آرائش و زیبائش ہے۔ اگر ستارے نہ ہوں تو نہ آسمان کا یہ حسن ہو نہ زمین پر روشنی ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں چراغ بھی فرمایا ہے: ﴿**وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ**﴾ [ الملك : ۵ ] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی اور ہم نے انھیں شیطانوں کو مارنے کے آلے بنایا اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

**آیت 7** **وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ** : "**مَارِدٍ**" "شَدِيْدُ الشَّرِّ" یعنی زینت کے علاوہ آسمان دنیا کو ہر سرکش شیطان سے محفوظ کرنے کے لیے بنایا ہے۔

**آیت 8** **لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى**...... : "**لَا يَسَّمَّعُوْنَ**" اصل میں "لَا يَتَسَمَّعُوْنَ" (تفعّل) ہے۔ "اوپر کی مجلس" سے مراد فرشتوں کی مجلس ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لیے آپس میں گفتگو کرتے ہیں کہ آئندہ فلاں کام کب اور کیسے کرنا ہے۔ یعنی ان ستاروں کے ذریعے سے سرکش شیاطین سے فرشتوں کی باتیں محفوظ رکھنے کا اتنا زبردست انتظام ہے کہ وہ ان کی مجلس کی طرف کان بھی نہیں لگا سکتے، بلکہ ان پر ہر جانب سے شہاب پھینکے جاتے ہیں۔ اگر "**اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ**"

دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾

**بھگانے کے لیے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے ⑨ مگر جو کوئی اچانک اچک کر لے جائے تو ایک چمکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ⑩ سو ان سے پوچھ کیا یہ پیدا کرنے کے اعتبار سے زیادہ مشکل ہیں، یا جنھیں ہم پیدا کر چکے؟ بے شک ہم نے انھیں ایک چپکتے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے ⑪**

کا استثنا نہ ہوتا تو یہ آیت دلیل تھی کہ وہ کچھ بھی نہیں سن سکتے، مگر اللہ تعالیٰ نے خود ہی ” اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ “ (مگر جو کوئی اچانک اچک کر لے جائے) کے ساتھ استثنا فرما دیا، جو آگے آ رہا ہے۔

**آیت 9** **دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ**: ”دَحَرَ يَدْحَرُ دَحْرًا وَ دُحُوْرًا“ (ف) بھگانا، دفع کرنا۔ ”وَاصِبٌ“ ”وَصَبَ يَصِبُ وُصُوْبًا“ (ض) دائمی ہونا۔ یعنی ان کے لیے دائمی عذاب ہے، کیونکہ دنیا میں بھگانے کے لیے ان پر شہاب پھینکے جاتے ہیں اور آخرت میں جہنم کا عذاب اس کے علاوہ ہے۔

**آیت 10** **اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ** ......: یعنی شیاطین ملأ اعلیٰ کی کسی بات پر کان نہیں لگا سکتے، سوائے اس بات کے جسے کوئی شیطان دفعتاً اچک کر لے جائے، تو ایسی صورت میں ایک چمکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو وہ شعلہ نیچے کے شیطان کو وہ بات پہنچانے سے پہلے ہی لگ کر اسے ہلاک کر ڈالتا ہے اور کبھی پہنچانے کے بعد، پھر وہ بات کئی شیاطین سے منتقل ہوتی ہوئی کسی کاہن تک پہنچ جاتی ہے، جو اس میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں کے درمیان پھیلا دیتا ہے۔ استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہ بحث حکماء اور علماء کے مابین مختلف فیہ چلی آئی ہے کہ آیا یہی تارے شہابِ ثاقب کا بھی کام دیتے ہیں یا وہ شہاب ان کے علاوہ ہیں، یا ان تاروں کی گرمی سے آگ پیدا ہو کر ہی انگارا بن جاتا ہے۔“ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”انھی تاروں کی روشنی سے آگ نکلتی ہے جس سے شیطانوں کو مار پڑتی ہے، جیسے سورج سے اور آتشی شیشے سے۔“ (موضح) ان آیات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۱۶ تا ۱۸)، شعراء (۲۱۰ تا ۲۱۲ اور ۲۲۲، ۲۲۳) اور سورۂ جن (۸، ۹)۔

**آیت 11** **فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا** ......: کفار آخرت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، ان کا کہنا تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کے جواب میں دو دلیلیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی یہ کہ اس سے پہلے ہم جو کچھ پیدا کر چکے ہیں، جن کا اس سورت میں ذکر ہے، یعنی آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی مخلوق، صافات، زاجرات، تالیات، فرشتے، شیاطین اور ستارے وغیرہ، انھیں پیدا کرنا مشکل ہے یا ان لوگوں کو دوبارہ پیدا کرنا؟ ظاہر ہے اتنی عظیم مخلوقات کے مقابلے میں انسان بے چارے کی حیثیت ہی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہ کر سکے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ المؤمن : ۵۷ ] ”یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ مزید تفصیل

بَلْ عَجِبْتَ وَ يَسْخَرُوْنَ ۝ وَ اِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝ وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝

بلکہ تو نے تعجب کیا اور وہ مذاق اڑاتے ہیں ⑫ اور جب انھیں نصیحت کی جائے وہ قبول نہیں کرتے ⑬ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو خوب مذاق اڑاتے ہیں ⑭

کے لیے دیکھیے سورۂ یٰس (۸۱)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ہم نے انھیں ایک چپکتے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے (جو مٹی اور پانی کے ملنے سے بنتا ہے) اور یہ مر کر پھر مٹی ہو جائیں گے۔ تو جب پہلی دفعہ ہم نے انھیں مٹی سے پیدا کر لیا تو اسی مٹی سے ہم انھیں دوبارہ کیوں پیدا نہیں کر سکتے، جب کہ اس سے پہلے ہم ایک مرتبہ انھیں پیدا کر بھی چکے ہیں!؟ (دیکھیے حج : ۵) اور ہر عقل مند جانتا ہے کہ دوسری مرتبہ بنانا پہلی مرتبہ سے آسان ہوتا ہے، یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ روم میں بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [ الروم : ۲۷ ] ''اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے۔''

**آیت 13،12** ① **بَلْ عَجِبْتَ** : یہاں ایک سوال ہے کہ یہاں ''بَلْ'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ''فَاسْتَفْتِهِمْ'' (ان سے پوچھ) کہ تمھیں دوبارہ پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا جو کچھ ہم پیدا کر چکے؟ جواب اس کا اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا کہ یقیناً وہ سب کچھ انسان کے دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس سوال کا مقصد انھیں لاجواب کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اتنے واضح دلائل کے باوجود یہ لوگ قیامت سے انکار کیوں کرتے ہیں، یہ بات انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی، بلکہ اے نبی یا اے مخاطب! اس پر تجھے تعجب ہوتا ہے اور تعجب ہونا بھی چاہیے، کیونکہ بات ہی تعجب کی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ١ؕ۬ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ١ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ١ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ١ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [ الرعد : ۵ ] ''اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم یقیناً ایک نئی پیدائش میں ہوں گے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

② **وَيَسْخَرُوْنَ** : یعنی تجھے ان پر تعجب ہوتا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جب دلائل سے لاجواب ہوتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں۔

**آیت 14** **وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ** : ''سَخِرَ يَسْخَرُ'' (س) مذاق اڑانا اور ''اِسْتَسْخَرَ'' (استفعال) میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ میں لفظ ''خوب'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں، مثلاً چاند کا پھٹنا یا آپ کا راتوں رات مسجد اقصیٰ تک سیر کر کے آ جانا اور اس کے متعلق ان کے ہر سوال کا درست جواب

وَ قَالُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۞ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۞ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۞ قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۞ فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ یَنْظُرُوْنَ ۞ وَ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۞

اور کہتے ہیں یہ صاف جادو کے سوا کچھ نہیں ⑮ کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو چکے تو کیا واقعی ہم ضرور اٹھائے جانے والے ہیں؟ ⑯ اور کیا ہمارے پہلے باپ دادا بھی؟ ⑰ کہہ دے ہاں! اور تم ذلیل ہو گے ⑱ سو وہ بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی، تو یکایک وہ دیکھ رہے ہوں گے ⑲ اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! یہ تو جزا کا دن ہے ⑳

دینا وغیرہ، تو ایمان لانے کے بجائے خوب مذاق اڑاتے ہیں۔

**آیت 15** وَقَالُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ : یعنی ہر معجزے کو جادو قرار دے کر ایمان لانے سے انکار کر دیتے ہیں۔

**آیت 16، 17** ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ...... : ان آیات کی تفسیر اور ”ءَاِذَا مِتْنَا“ اور ”ءَاِنَّا“ میں دو دفعہ ہمزہ استفہام لانے کی حکمت کے لیے دیکھیے سورۂ نمل (۶۷، ۶۸)۔

**آیت 18** ① قُلْ نَعَمْ : یعنی آپ ان سے کہیں ہاں، تم اور تمھارے باپ دادا مٹی اور ہڈیاں ہونے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔

② وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ : ”دَخَرَ یَدْخَرُ دُخُوْرًا“ (ف) ذلیل اور حقیر ہونا۔ یعنی تم اس حال میں اٹھائے جاؤ گے کہ اللہ عزوجل کی قدرت کے سامنے بے بس اور حقیر ہو گے۔ تمھارا اٹھنا اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہوگا، یعنی جس طرح تمھاری پیدائش اور موت میں تمھاری اپنی مرضی کا کوئی عمل دخل نہ تھا، اسی طرح تم دوبارہ جی اٹھنے پر بھی مجبور اور بے بس ہو گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ ﴾ [ النمل : ۸۷ ] ”اور وہ سب اس کے پاس ذلیل ہو کر آئیں گے۔“

**آیت 19** ① فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ : اس سے مراد دوسرا نفخہ ہے۔ یعنی انھیں دوبارہ اٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ صور کی ایک پھونک ایسی زبردست ڈانٹ اور اٹھ جانے کا اعلان ہوگی کہ سب قبروں سے نکل کر زمین کے اوپر ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [ النازعات : ۱۳، ۱۴ ] ”پس وہ تو صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔ پس یک لخت وہ زمین کے اوپر ہوں گے۔“

② فَاِذَا هُمْ یَنْظُرُوْنَ : یعنی اس ایک ہی ڈانٹ سے سب مردے خواہ مٹی ہو چکے ہوں، یکایک زندہ ہو کر قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔

**آیت 20** وَقَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ : قیامت کے دن کفار کے پچھتانے اور اپنے آپ کو ملامت کرنے کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ اس وقت اپنی ہلاکت کو آواز دیں گے اور کہیں گے، ہائے ہماری بربادی! یہی جزا کا دن ہے، حالانکہ اس وقت

هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾ اُحۡشُرُوا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ وَمَا كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۲﴾ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـئُوۡلُوۡنَ ﴿۲۴﴾

یہی فیصلے کا دن ہے، جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ﴿۲۱﴾ اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے جوڑوں کو اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے ﴿۲۲﴾ اللہ کے سوا، پھر انھیں جہنم کی راہ کی طرف لے چلو ﴿۲۳﴾ اور انھیں ٹھہراؤ، بے شک یہ سوال کیے جانے والے ہیں ﴿۲۴﴾

ندامت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

**آیت 21** **هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ** : اس وقت فرشتے اور مومن انھیں کہیں گے، یا وہ خود ایک دوسرے کو ملامت کے لیے کہیں گے، ہاں! یہی وہ فیصلے کا دن ہے جسے تم نہیں مانتے تھے۔

**آیت 22، 23** ① **اُحۡشُرُوا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ** …… : یہاں ''الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا'' سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انھیں اور ان کے ''من دون اللہ'' معبودوں کو جہنم کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا اور ظاہر ہے موحد مسلمان اللہ کے سوا کسی معبود کی پرستش نہیں کرتے۔ نیز دیکھیے سورۂ انعام (۸۲) اور لقمان (۱۳) ''وَاَزۡوَاجَهُمۡ'' طبری میں علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''اَزۡوَاجٌ'' (جوڑوں) سے مراد ان جیسے دوسرے لوگ ہیں۔'' بیویاں بھی مراد ہوسکتی ہیں، جو کفر و شرک میں ان کی ہم نوا تھیں۔ یعنی قیامت قائم ہونے کے ساتھ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ کفار و مشرکین کو مومنوں سے الگ کرو اور ان میں سے ہر ہر قسم کو الگ الگ اکٹھا کرو، مثلاً زانیوں کو زانیوں کے ساتھ، سود خوروں کو سود خوروں کے ساتھ، چوروں کو چوروں کے ساتھ، اسی طرح مشرک خاوندوں کو ان کی مشرک بیویوں کے ساتھ اکٹھا کرنے کا حکم ہوگا، جیسا کہ ایمان والے اپنی بیویوں کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ ﴾ [ الرعد : ۲۳ ] ''ہمیشگی کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولادوں میں سے جو نیک ہوئے۔'' ان کے ساتھ ان کے بتوں اور دوسرے باطل معبودوں کو بھی اکٹھا کر کے جہنم کے راستے کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا، جن کی وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے رہے تھے۔ جن میں شیاطین اور وہ جنّ اور انسان بھی شامل ہوں گے جو اپنی عبادت کروانے پر خوش تھے۔ مقصد انھیں ذلیل کرنا ہوگا کہ اب اپنے خداؤں سے کہو کہ تمھاری مدد کریں۔ البتہ فرشتے، انبیاء اور صلحاء، جنھیں وہ پوجتے رہے تھے، وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۹۸ تا ۱۰۳)۔

② **فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡجَحِيۡمِ** : ہدایت کا لفظ یہاں ان کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

**آیت 24** **وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـئُوۡلُوۡنَ** : جہنم کے صراط کی طرف لے جاتے ہوئے حکم ہوگا کہ انھیں ٹھہراؤ، کیونکہ ان

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْۤا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾

کیا ہے تمھیں، تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ ﴿۲۵﴾ بلکہ آج وہ بالکل فرماں بردار ہیں ﴿۲۶﴾ اور ان کے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کریں گے ﴿۲۷﴾ کہیں گے بے شک تم ہمارے پاس قسم کی راہ سے آتے تھے ﴿۲۸﴾

---

سے ان کے اعمال کے متعلق سوال ہوگا، اس وقت دنیا میں ان کے کفر وشرک اور دوسرے برے اعمال میں شریک دوست اور ان کے جھوٹے معبود بھی ان کے ساتھ ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ۱۹ ] ''اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، پھر ان کی الگ الگ قسمیں بنائی جائیں گی۔'' ''يُوْزَعُوْنَ'' کا ایک معنی یہ ہے کہ ان کی الگ الگ قسمیں بنائی جائیں گی اور ایک معنی یہ ہے کہ انھیں روکا جائے گا۔

**آیت 25** مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ: ''تَنَاصَرُوْنَ'' (تفاعل) اصل میں ''تَتَنَاصَرُوْنَ'' ہے، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی ہے۔ باب تفاعل میں تشارک ہوتا ہے، ''تَنَاصَرَ'' ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ اعمال کے محاسبے کے ساتھ ساتھ انھیں ذلیل کرنے کے لیے اور ان کے خداؤں کی بے بسی ظاہر کرنے کے لیے ایک سوال یہ ہوگا کہ تم تو کہا کرتے تھے : ﴿نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ﴾ [ القمر : ٤٤ ] ''ہم ایک جماعت ہیں جو بدلا لے کر رہنے والے ہیں۔'' یا جیسا کہ تمھارا دعویٰ تھا کہ قیامت کے دن ہمارے معبود ہمیں بچا لیں گے، اب تمھیں کیا ہوا کہ تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے؟

**آیت 26** بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ : ''أَسْلَمَ يُسْلِمُ'' (افعال) تابع فرمان ہو جانا، ''اِسْتَسْلَمَ'' میں مبالغہ ہے، اس لیے ترجمہ ''بالکل فرماں بردار'' کیا گیا ہے۔ یعنی آج وہ کوئی جواب نہیں دے رہے، بلکہ ان کی تمام اکڑفوں جاتی رہی اور وہ پوری طرح عاجز اور فرماں بردار ہو کر کھڑے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىِٕذِ السَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾ [ النحل : ۸۷ ] ''اور اس دن وہ اللہ کے سامنے فرماں بردار ہونا پیش کریں گے اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے۔''

**آیت 27** وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ : یعنی گمراہ لوگ اور انھیں گمراہ کرنے والے، کمزور اور قوت والے ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر یہ گفتگو کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جہنم کی باہمی گفتگو، ان کا ایک دوسرے کو ملامت کرنا اور گمراہ کرنے والوں کا اپنی پیروی کرنے والوں سے بری ہونے کے اعلان کا ذکر کئی مقامات پر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)، ابراہیم (۲۱، ۲۲)، اعراف (۳۸، ۳۹)، سبا (۳۱ تا ۳۳) اور مومن (۴۷، ۴۸)۔

**آیت 28** ① قَالُوْۤا : یعنی کمزور اور پیروی کرنے والے اپنے سرداروں اور گمراہ کرنے والوں سے کہیں گے۔

② اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ : ''الْيَمِيْنِ'' کا معنی قسم بھی ہے، دایاں ہاتھ بھی اور دائیں جانب بھی۔ اگر اس کا معنی

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآىِٕقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

وہ کہیں گے بلکہ تم ایمان والے نہ تھے ﴿۲۹﴾ اور ہمارا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا، بلکہ تم (خود) حد سے بڑھنے والے لوگ تھے ﴿۳۰﴾ سو ہم پر ہمارے رب کی بات ثابت ہوگئی۔ بے شک ہم یقیناً چکھنے والے ہیں ﴿۳۱﴾ سو ہم نے تمھیں گمراہ کیا، بے شک ہم خود گمراہ تھے ﴿۳۲﴾

---

قسم لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم ہی قسم کی راہ سے ہمارے پاس آتے تھے، یعنی قسمیں کھا کھا کر اپنے آپ کو ہمارا خیر خواہ ظاہر کرتے تھے اور اگر اس کا معنی دایاں ہاتھ لیا جائے تو اس سے مراد قوت ہوگی، کیونکہ اہلِ عرب یمین بول کر قوت مراد لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ تم زور اور قوت دکھلا کر ہمیں مرعوب کرتے تھے اور بہکانے کے لیے ہم پر چڑھ دوڑا کرتے تھے اور اگر دائیں جانب معنی ہو تو مراد خیر اور نیکی کی جانب ہوگی اور مطلب یہ ہوگا کہ تم آ کر ہمیں خیر خواہی، نیکی اور دینِ حق کی راہ سے بہکاتے تھے اور کہتے تھے کہ جس چیز کا ہم تمھیں حکم دے رہے ہیں نیکی اور حق وہی ہے۔ آیت کے الفاظ میں بیک وقت تینوں معنوں کی گنجائش ہے اور یہ کلام اللہ کا اعجاز ہے، کیونکہ ان کے سردار گمراہ کرنے کے یہ تینوں طریقے استعمال کرتے تھے۔ کمزور لوگوں کا مقصد اپنی گمراہی کی پوری ذمہ داری سرداروں پر ڈالنا ہوگا، تاکہ عذاب سے کسی طرح بچ سکیں۔

**آیت 29** قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ : ان کے سردار انھیں پانچ جواب دیں گے، پہلا یہ کہ دنیا میں ہم تمھارے کفر کا سبب نہیں تھے، بلکہ تم نے خود اپنی مرضی سے ایمان قبول کرنے سے انکار کیا اور اس پر کفر کو ترجیح دی۔ کفر کا منبع تمھاری ذات تھی، ایمان کسی وقت بھی تمھارے دلوں میں نہیں تھا کہ ہم نے تمھیں اس سے مرتد کیا ہو۔

**آیت 30** ① وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ : یہ دوسرا جواب ہے کہ ہمارا تم پر کوئی ایسا غلبہ نہ تھا جو تمھیں کفر پر قائم رہنے پر مجبور کرتا۔ تم اپنی رضا سے کفر پر مطمئن اور خوش تھے۔

② بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ : یہ تیسرا جواب ہے کہ بلکہ خود تمھارے خمیر میں حد سے تجاوز اور سرکشی بھری ہوئی تھی، اس لیے تم حق کو چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگ گئے اور انبیاء کی مخالفت کرتے رہے۔

**آیت 31** فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآىِٕقُوْنَ : یہ پہلے تینوں جوابوں کے نتیجے میں چوتھا جواب ہے، یعنی ہم نے کفر پر قائم رکھنے کے لیے تم پر کوئی زبردستی نہیں کی، بلکہ اصل میں نہ تم ایمان والے تھے نہ ہم، جیسے ہم مجرم تھے ویسے ہی تم مجرم تھے، لہٰذا یہی انجام ہوا کہ دونوں عذاب کے مستحق ٹھہرے اور کفر و شرک کی جزا کے طور پر ہمارے رب نے جس عذاب کا وعدہ کیا تھا کہ : ﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ السجدة : ۱۳ ] (یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا) وہ وعدہ ہم پر پورا ہوگیا۔

**آیت 32** فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ : یہ پانچواں جواب ہے کہ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، مگر ہم خود گمراہ تھے اور ظاہر

فَاِنَّهُمْ يَوْمَىِٕذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ يَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾

پس بے شک وہ اس دن عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہوں گے ﴿۳۳﴾ بے شک ہم مجرموں کے ساتھ ایسے ہی کیا کرتے ہیں ﴿۳۴﴾ بے شک وہ ایسے لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو تکبر کرتے تھے ﴿۳۵﴾ اور کہتے تھے کیا واقعی ہم یقیناً اپنے معبودوں کو ایک دیوانے شاعر کی خاطر چھوڑ دینے والے ہیں؟ ﴿۳۶﴾

ہے ایک گمراہ سے گمراہی کی طرف بلانے ہی کی توقع ہو سکتی ہے، کیونکہ جو گمراہ ہوتا ہے وہ لازماً یہ چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس جیسے ہو جائیں، تاکہ کوئی کسی کو ملامت کرنے والا نہ رہے۔ لہٰذا ہم نے تمھیں گمراہی کی دعوت ہی دینا تھی اور دی، یہ تمھارا کام تھا کہ عقل سے کام لیتے اور ہماری بات نہ مانتے۔ اب مرضی سے کفر اختیار کرنے کے بعد ہمیں اس کا ذمہ دار نہ ٹھہراؤ۔

**آیت 33** **فَاِنَّهُمْ يَوْمَىِٕذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ** : یعنی پیروی کرنے والے بھی اور پیشوا بھی، گمراہ ہونے والے بھی اور گمراہ کرنے والے بھی، سب اپنی اپنی گمراہی کے مطابق عذاب میں شریک ہوں گے، جیسے گمراہی میں شریک تھے۔ کسی کا کوئی عذر قبول کر کے اسے معافی نہیں دی جائے گی۔

**آیت 34** **اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ** : مجرمین سے مراد کفار و مشرکین ہیں، کیونکہ آگے آ رہا ہے کہ وہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے سے تکبر کرتے تھے۔ یعنی ان کے ساتھ ہم یہی سلوک کرتے ہیں کہ جس طرح وہ جرم میں باہم شریک تھے، عذاب میں بھی باہم شریک ہیں۔

**آیت 35** **اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ** ...... : یہاں ''لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' سے پہلے ''قُوْلُوْا'' (کہو) محذوف ہے۔ ''اِنَّ'' تعلیل یعنی عذاب کی وجہ بیان کرنے کے لیے ہے۔ یعنی ان کے عذاب کی وجہ یہ ہے کہ جب انھیں کہا جاتا ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہو اور توحید کا اقرار کرو تو اس سے تکبر کرتے تھے، یعنی اس سب سے بڑی حقیقت کو بھی ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور اصل تکبر یہی ہے کہ حق بات کا انکار کر دیا جائے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه : ۹۱ ] ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا۔'' ایک آدمی نے پوچھا: ''آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو۔ (کیا یہ بھی تکبر ہے)؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر تو حق سے اکڑ جانے اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔''

**آیت 36** **وَ يَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا** ...... : یعنی وہ کلمہ توحید کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّكُمْ لَذَآىِٕقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَ مَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾

**بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے اور اس نے تمام رسولوں کی تصدیق کی ہے ﴿۳۷﴾ بلاشبہ تم یقیناً دردناک عذاب چکھنے والے ہو ﴿۳۸﴾ اور تمھیں صرف اسی کا بدلا دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۳۹﴾ مگر اللہ کے خالص کیے ہوئے بندے ﴿۴۰﴾ یہی لوگ ہیں جن کے لیے مقرر رزق ہے ﴿۴۱﴾**

معبودوں کو، جن کی عبادت ہم اور ہمارے آباء کرتے چلے آئے ہیں، ایک دیوانے شاعر کے کہنے پر چھوڑ دیں؟ اس سے ان کی مراد نبی کریم ﷺ تھے۔ ان ظالموں نے حق سے انکار ہی کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ سارے جہان سے زیادہ علم و عقل والے شخص کو دیوانہ اور شاعر قرار دیا۔ حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ آپ کا شعر اور شعراء سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی آپ دیوانے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں ان کا جواب دیا۔

**آیت 37** ① **بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ** : یعنی آپ ﷺ کا آنا حق ہے اور آپ جو کتاب اور شریعت لے کر آئے ہیں وہ بھی حق ہے۔

② **وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ** : اور آپ نے تمام رسولوں کی تصدیق کی ہے۔ تصدیق کا معنی سچا قرار دینا ہے، یہاں اس سے کئی معانی مراد ہیں، ایک یہ کہ آپ ﷺ کے آنے کے ساتھ پہلے رسولوں کا سچا ہونا ثابت ہو گیا، کیونکہ انھوں نے آپ کی آمد کی پیش گوئی کی تھی، اگر آپ تشریف نہ لاتے تو ان کا سچا ہونا ثابت نہ ہوتا۔ دوسرا یہ کہ آپ ﷺ نے پہلے رسولوں کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے اور انھیں اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو سچا قرار دیا۔

**آیت 38** **اِنَّكُمْ لَذَآىِٕقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ** : اس سے پہلے انھوں نے آپس میں جو کہا تھا "**اِنَّا لَذَآىِٕقُوْنَ**" (ہم عذاب چکھنے والے ہیں) صحیح بھی ہو سکتا تھا، غلط بھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یقینی بات کا اعلان فرمایا کہ تم یقیناً دردناک عذاب چکھنے والے ہو۔

**آیت 38** **وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** : یعنی ہم نے تم پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ تمھیں اسی کفر و شرک اور رسولوں کو جھٹلانے کی جزا مل رہی ہے جس کا ارتکاب تم کرتے رہے۔

**آیت 40** **اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ** : مگر اللہ کے وہ بندے جنھیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا، جن کے متعلق ابلیس نے بھی اقرار کیا کہ وہ انھیں گمراہ نہیں کر سکے گا (دیکھیے سورۂ ص: ۸۳) وہ عذابِ الیم نہیں چکھیں گے، نہ ان کے حساب میں شدت ہو گی، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو دس گنا سے سات سو گنا، بلکہ بے حساب گنا تک بڑھائے گا اور برائیوں سے، اگر کوئی ہوئیں، درگزر فرمائے گا۔

**آیت 41** **اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ** : یعنی ایسی روزی جو ان کے لیے مقرر ہو چکی ہے، جس کے ملنے کا انھیں یقین

فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۴۳﴾ عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۴﴾ یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ ﴿۴۵﴾

کئی قسم کے پھل اور وہ عزت بخشے گئے ہیں ﴿۴۲﴾ نعمت کے باغوں میں ﴿۴۳﴾ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ﴿۴۴﴾ ان پر صاف بہتی ہوئی شراب کا جام پھرایا جائے گا ﴿۴۵﴾

ہے کہ ہمیشہ ملتی رہے گی، کبھی روکی نہیں جائے گی۔ اگلی آیت میں اس کی کچھ تفصیل بیان فرمائی۔

**آیت 42** ① ”فَوَاكِهُ“ ”فَاكِهَةٌ“ کی جمع ہے، پھل جس سے لذت حاصل ہو۔ یعنی ان کے کھانے کی تمام چیزیں، حتیٰ کہ گوشت وغیرہ بھی، لذت کے لیے ہوں گی، نہ کہ پیٹ بھرنے کے لیے، کیونکہ جنت میں بھوک پیاس کے ستانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۱۸، ۱۱۹)۔

② وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ : ”فَوَاكِهُ“ جسمانی لذتیں ہیں جو روحانی لذتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتیں، اس لیے فرمایا کہ وہ اس میں عزت بخشے گئے ہیں۔ ”مُكْرَمُوْنَ“ اسم مفعول اس لیے استعمال فرمایا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے، فرشتوں کی طرف سے اور جنت کے دوسرے تمام ساتھیوں اور خدمت گاروں غرض ہر طرف سے عزت ملے گی۔

**آیت 43** فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ : کھانے پینے اور اکرام کے ساتھ رہنے کی عمدہ جگہ بھی ضروری ہے، اس لیے فرمایا، وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے، جہاں نعمت کے سوا کسی چیز کا تصور ہی نہیں۔ وہاں نہ فقر ہے نہ بیماری، نہ بغض ہے نہ عداوت، نہ غم ہے نہ خوف اور نہ ہی وہاں موت ہے۔ غرض نعمت ہی نعمت ہے، نہ کوئی زحمت ہے نہ کسی نعمت کا زوال۔

**آیت 44** عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ : لذت کی تکمیل کے لیے احباب اور مجلس کے لوازم کا ہونا ضروری ہے۔ فرمایا، وہ اور ان کے احباب سب بادشاہ ہوں گے، جو تختوں پر بیٹھے ہوں گے اور وہ جتنے بھی زیادہ ہوں گے ہر ایک کا چہرہ دوسرے کے چہرے کے سامنے ہوگا، کسی کی پیٹھ دوسرے کی طرف نہیں ہوگی۔ اس سے ان کے دلوں کی صفائی اور باہمی محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے، کیونکہ دلوں میں محبت نہ ہو تو چہرے ایک دوسرے کی طرف نہیں رہتے۔

**آیت 45** ① یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَاْسٍ : ”كَاْسٌ“ شیشے کا پیالہ جو شراب سے بھرا ہوا ہو، خالی پیالے کو ”كَاْسٌ“ نہیں کہتے۔ مجلس احباب میں سرور کے لیے شراب معروف تھی، سو فرمایا، جنت میں شراب کے جام پھرانے والے غِلمان ہوں گے، انھی جنتیوں کے لڑکے جو (چھوٹی عمر میں فوت ہو گئے اور) ہمیشہ اسی طرح رہیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَیَطُوْفُ عَلَیْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ [ الطور : ۲۴ ] ”اور ان پر چکر لگاتے رہیں گے انھی کے لڑکے، جیسے وہ چھپائے ہوئے موتی ہوں۔“ اور فرمایا: ﴿ یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِیْقَ ۙ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ ﴾ [ الواقعة : ۱۷، ۱۸ ] ”ان پر چکر لگا رہے ہوں گے وہ لڑکے جو ہمیشہ (لڑکے ہی) رکھے جائیں گے۔ ایسے کوزے اور ٹونٹی والی صراحیاں اور لبالب بھرے ہوئے پیالے لے کر جو بہتی ہوئی شراب کے ہوں گے۔“

بَيۡضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۚۖ﴿۴۶﴾ لَا فِيۡهَا غَوۡلٌ وَّلَا هُمۡ عَنۡهَا يُنۡزَفُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَ عِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِيۡنٌ ۙ﴿۴۸﴾

جو سفید ہوگی، پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی ﴿۴۶﴾ نہ اس میں کوئی دردِ سر ہوگا اور نہ وہ اس سے مدہوش کیے جائیں گے ﴿۴۷﴾ اور ان کے پاس نگاہ نیچے رکھنے والی، موٹی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی ﴿۴۸﴾

② مِنۡ مَّعِيۡنٍ: "مَعِيۡنٍ" "مَعَنَ يَمۡعَنُ مُعُوۡنًا" (ف، ک) "اَلۡمَاءُ" "جَرٰی" پانی کا بہنا۔ "مَعِيۡنٍ" (فَعِيۡلٌ) بہنے والا، جیسے "شَرُفَ" سے "شَرِيۡفٌ" ہے۔ یعنی وہ شراب اس قسم کی نہیں ہوگی جو دنیا میں پھلوں اور غلوں کو گلا سڑا کر کشید کی جاتی ہے، بلکہ قدرتی چشموں سے نکلے گی اور نہروں کی صورت میں بہتی ہوگی، جن میں سے جام بھر بھر کر انھیں پلائے جائیں گے۔ جنت کی چار قسم کی نہروں میں سے ایک قسم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ﴾ [ محمد : ۱۵ ] "اور کئی نہریں شراب کی ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہے۔"

**آیت 46** بَيۡضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ : "بَيۡضَآءَ" "أَبۡيَضُ" کی مؤنث ہے، سفید۔ کھانے پینے کی چیزوں میں سب سے پہلی مرغوب یا نامرغوب چیز ان کا رنگ ہے، اس کے بعد ان کی لذت ہے۔ دنیا کی شرابیں عموماً بدرنگ ہوتی ہیں اور اتنی بدذائقہ اور بدبودار ہوتی ہیں کہ پینے والے کا منہ بگڑ بگڑ جاتا ہے، جبکہ جنت کی شراب کا رنگ نہایت سفید ہوگا اور پینے والوں کے لیے بہت لذیذ ہوگی، جس میں سے کستوری کی خوشبو آئے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿خِتٰمُهٗ مِسۡكٌ﴾ [ المطففين : ۲٦ ] "اس کی مہر کستوری ہوگی۔" "لِلشّٰرِبِيۡنَ" (جمع) لانے میں اشارہ ہے کہ شراب کا دور مجلس احباب میں چلے گا۔

**آیت 47** لَا فِيۡهَا غَوۡلٌ وَّلَا هُمۡ عَنۡهَا يُنۡزَفُوۡنَ : "غَوۡلٌ" کا معنی خرابی، سر درد، پیٹ کا درد اور ہلاکت ہے۔ "يُنۡزَفُوۡنَ" "نَزَفَ" (مجرد) اور "أَنۡزَفَ" (مزید فیہ) معروف و مجہول کا معنی عقل زائل ہونا ہے۔ دنیا کی شراب میں پائی جانے والی خرابیوں میں سے اس کے بدرنگ، بدذائقہ اور بدبودار ہونے کی نفی تو "بَيۡضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ" سے ہوگئی تھی، اب اس میں پائی جانے والی مزید خرابیوں کی بھی نفی فرما دی۔ دنیا کی شراب پینے کے بعد الٹیاں آتی ہیں، خمار کی صورت میں سر، پیٹ اور سارے جسم میں درد ہوتا ہے جو بعض اوقات ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے اور عقل جو انسان کا شرف ہے، جاتی رہتی ہے۔ جنت کی شراب ایسی ہر خرابی سے پاک ہوگی، نہ اس میں سر درد یا کوئی اور خرابی ہوگی اور نہ ہی اس کی وجہ سے ان کی عقل ماری جائے گی۔ البتہ شراب کی وہ خوبیاں جن کی وجہ سے لوگ اتنی خرابیوں کے باوجود اسے پیتے ہیں، وہ سب بدرجہ اتم موجود ہوں گی، مثلاً کھانے کی رغبت پیدا کرنا، سرور لانا اور قوت و شہوت کو ابھارنا وغیرہ۔

**آیت 46** وَ عِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِيۡنٌ : "عِيۡنٌ" "عَيۡنَاءُ" کی جمع ہے، خوب صورت موٹی آنکھوں والی۔ کھانے پینے اور شراب کے ساتھ لذت کی تکمیل بیویوں کی صحبت سے ہوتی ہے، اس کے لیے ان کی بیویوں کا ذکر فرمایا، جو ہر قسم کے ظاہری و باطنی اور صوری و معنوی کمال سے آراستہ ہوں گی۔ معنوی کمال یہ کہ ایسی عفیف ہوں گی کہ ان کی نگاہیں اپنے

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ۝۴۹ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝۵۰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝۵۱ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝۵۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ۝۵۳

جیسے وہ چھپا کر رکھے ہوئے انڈے ہوں ۝۴۹ پھر ان کے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کریں گے ۝۵۰ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا بے شک میں، میرا ایک ساتھی تھا ۝۵۱ وہ کہا کرتا تھا کہ کیا واقعی تو بھی ماننے والوں میں سے ہے ۝۵۲ کیا جب ہم مر گئے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا واقعی ہم ضرور جزا دیے جانے والے ہیں؟ ۝۵۳

خاوندوں کے سوا کسی کی طرف نہیں اٹھیں گی اور ظاہری حسن کا یہ حال ہوگا کہ وہ گورے رنگ والی اور نہایت خوب صورت موٹی آنکھوں والی ہوں گی، جن کی آنکھوں کی سیاہی بہت سیاہ اور سفیدی بہت سفید ہوگی۔ سورۂ واقعہ میں ہے : ﴿ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴾ [ الواقعۃ : ۲۲ ] ''اور (ان کے لیے وہاں ) سفید جسم، سیاہ آنکھوں والی عورتیں ہیں، جو فراخ آنکھوں والی ہیں۔''

**آیت 49** **كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ** : ''بَيْضٌ'' ''بَيْضَةٌ'' کی جمع ہے، انڈے۔ انڈے کا رنگ عموماً سفید سرخی مائل ہوتا ہے، جس میں کچھ زردی کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ رنگ چھپا کر رکھنے سے قائم رہتا ہے، ورنہ اڑ جاتا ہے۔ خصوصاً شتر مرغ کے انڈے اس رنگ کے ہوتے ہیں اور شتر مرغ انھیں اپنے ملائم اور نرم پروں کے ریشوں کے فرش پر رکھ کر انھی کے ساتھ ڈھانپ دیتا ہے۔ عرب لوگ عورتوں کے ایسے رنگ کو بہت پسند کرتے ہیں اور انھیں چھپائے ہوئے انڈوں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اشرف الحواشی میں ہے : ''بعض مفسرین نے ''بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ'' کی تفسیر ''انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی'' سے کی ہے اور اس کی یہی تفسیر ام سلمہ رضی اللہ عنھا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے، اس لیے اس کی یہی تفسیر صحیح ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ''بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ'' کا مطلب دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ''ان کی (یعنی جنت کی حوروں کی ) نرمی اور نزاکت اس جھلی جیسی ہوگی جو انڈے کے چھلکے سے چپکی ہوتی ہے اور اسے ''غِرْقِيٌّ'' کہا جاتا ہے۔'' (ابن کثیر، ابن جریر ) قاموس میں ہے: ''غَرْقَأَتِ الدَّجَاجَةُ بَيْضَتَهَا'' ''مرغی نے سخت چھلکے کے بغیر انڈا دیا۔'' مگر تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے : ''اسے طبری اور طبرانی نے ایک ہی سند اور متن کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کی سند سلیمان بن ابی کریمہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اسے عقیلی اور ابن عدی نے ضعیف کہا ہے۔'' علاوہ ازیں قرآن میں ان عورتوں کو ''اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ'' بھی کہا گیا ہے، اس لیے ''بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ'' اور ''اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ'' کی مناسبت مدنظر رہنی چاہیے۔ (واللہ اعلم )

**آیت 50** **فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ** : جنتی جنت میں ایسی آراستہ مجلسوں میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے دنیا میں گزرے ہوئے حالات و واقعات پوچھیں گے اور سنائیں گے۔

**آیت 51 تا 53** **قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ......** : ''قَرِيْنٌ'' ایسے ساتھی یا دوست کو کہتے ہیں جو ہم عمر ہو، یا

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ﴿۵۶﴾

کہے گا کیا تم جھانک کر دیکھنے والے ہو؟﴿۵۴﴾ پس وہ جھانکے گا تو اسے بھڑکتی آگ کے وسط میں دیکھے گا﴿۵۵﴾ کہے گا اللہ کی قسم! یقیناً تو قریب تھا کہ مجھے ہلاک ہی کر دے﴿۵۶﴾

بہادری، قوت اور اس طرح کے دوسرے اوصاف میں ہم سر ہو، اور اس لفظ کا استعمال عموماً برے معنوں میں ہوتا ہے۔ (کیلانی) ان میں سے ایک جنتی کہے گا، دنیا میں میرا ایک ساتھی تھا، جو مرنے کے بعد اٹھنے کا منکر تھا، وہ مذاق کرتے ہوئے انکار کے طور پر کہا کرتا تھا کہ کیا واقعی تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے جیسی بعید از عقل بات کو مانتے ہیں، کیا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا واقعی ہمیں ہمارے اعمال کی جزا دی جائے گی؟ ”مَدِیْنُوْنَ“ ”مَدِیْنٌ“ کی جمع ہے، جو اصل میں ”دَانَ یَدِیْنُ دِیْنًا“ (ض) سے اسم مفعول ”مَدْیُوْنٌ“ ہے۔

**آیت 54** قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ: وہ مومن اپنے جنتی ساتھیوں اور ہم نشینوں سے کہے گا، کیا تم جہنم میں جھانکو گے، شاید وہ کہیں نظر آ جائے تو دیکھیں کس حال میں ہے؟ کیونکہ اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرنے والے کو جہنم میں دیکھ کر اور دوستوں کو دکھا کر خوشی ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ یَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴾ [ المطففين : ٣٤ تا ٣٦ ] ”سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں۔ تختوں پر (بیٹھے) نظارہ کر رہے ہیں۔ کیا کافروں کو اس کا بدلا دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟“

**آیت 55** ① فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ: ”سَوَآءِ“ کا اصل معنی برابر ہے، یہاں مراد درمیان ہے، کیونکہ درمیان کی جگہ چاروں طرف سے برابر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ مومن اپنے دوستوں کے ساتھ جھانکے گا تو قیامت کے اس منکر کو بھڑکتی ہوئی آگ کے وسط میں دیکھے گا۔

② اس سے معلوم ہوا کہ آخرت میں جنتیوں کو دیکھنے اور سننے کی جو قوتیں عطا کی جائیں گی وہ دنیا کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوں گی۔ اس وقت ہم دنیا میں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آدمیوں کی آوازیں سنتے اور انھیں دیکھتے ہیں، مگر صرف ٹیلی ویژن کی وساطت سے۔ آخرت میں ہر شخص دوسرے سے کسی آلے کے بغیر بات کر سکے گا اور اسے دیکھ سکے گا، خواہ وہ کتنا دور ہو۔

**آیت 55** ① قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ: ”اِنْ كِدْتَّ“ اصل میں ”إِنَّكَ كِدْتَّ“ تھا، دلیل اس کی ”لَتُرْدِیْنِ“ کا لام ہے۔ ”كِدْتَّ“ ”كَادَ يَكَادُ“ سے ماضی معلوم ہے۔ ”لَتُرْدِیْنِ“ اصل میں ”لَتُرْدِيْنِيْ“ تھا۔ ”أَرْدٰى يُرْدِيْ إِرْدَاءً“ (افعال) ہلاک کرنا۔ اسے مخاطب کر کے کہے گا، اللہ کی قسم! یقیناً تو قریب تھا کہ مجھے راہ راست سے بہکا کر ہلاک کر دیتا۔

وَ لَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر میرے رب کی نعمت نہ ہوتی تو یقیناً میں بھی ان میں ہوتا جو حاضر کیے گئے ہیں ﴿۵۷﴾ تو کیا ہم کبھی مرنے والے نہیں ہیں ﴿۵۸﴾ مگر ہماری پہلی موت اور نہ ہم کبھی عذاب دیے جانے والے ہیں ﴿۵۹﴾ یقیناً یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۶۰﴾ اس جیسی (کامیابی) ہی کے لیے پس لازم ہے کہ عمل کرنے والے عمل کریں ﴿۶۱﴾

---

② ان آیات میں برے ساتھیوں سے اجتناب کا سبق ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل نہ ہوتو اس کا نتیجہ کتنا مہلک ہے۔

**آیت 57** ① **وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ** : اس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کا احسان یاد کر کے اس کا تذکرہ کرے گا کہ اگر میرے رب کا مجھ پر احسان نہ ہوتا تو میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوتا جنھیں گرفتار کر کے جہنم میں حاضر کیا گیا ہے۔ یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے ایمان پر قائم رکھا، ورنہ میرے قدم بھی ڈگمگا جاتے۔

② ان دونوں دوستوں کا قصہ سورۂ کہف میں مذکور دو باغوں کے مالک (جو آخرت کا منکر تھا) اور اس کے مومن دوست کے قصے سے مناسبت رکھتا ہے۔

**آیت 59،58** **اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ**...... : ان آیات کی دو تفسیریں ہیں، ایک یہ ہے کہ وہ مومن یہ بات اپنے اس کافر دوست کو کہے گا جو قیامت کا منکر تھا اور وہ دنیا میں کہا کرتا تھا : ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴾ [ الدخان : ۳۵ ] ''کہ ہماری اس پہلی موت کے سوا کوئی (موت) نہیں اور نہ ہم کبھی دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں۔'' مومن اسے مخاطب کر کے کہے گا، اب دیکھ لو! کیا تمھاری وہ بات درست نکلی یا غلط کہ : ﴿ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ ''تو کیا ہم کبھی مرنے والے نہیں ہیں، مگر ہماری پہلی موت اور نہ ہم کبھی عذاب دیے جانے والے ہیں۔'' یعنی اب آگ کے وسط میں گرنے پر تمھیں ثابت ہو گیا کہ تمھاری بات غلط تھی؟

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس مومن کا یہ خطاب اپنے دنیا کے کافر ساتھی کے ساتھ اس سے پہلی آیت ''لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ'' پر ختم ہو گیا، اس کے بعد وہ مومن جنت میں عطا کردہ نعمتوں کو دیکھ کر اور یہ جان کر کہ اب ہمیشہ جنت میں رہنا ہے، اب نہ موت آئے گی اور نہ یہاں سے نکالے جائیں گے، خوشی اور تعجب کے ساتھ اپنے جنتی ساتھیوں سے کہے گا کہ کیا واقعی ایسا ہے کہ پہلی موت کے بعد جو آ چکی، اب ہم کبھی مرنے والے نہیں، نہ ہی ہمیں کبھی عذاب ہو گا، بلکہ ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے اور جنت ہی میں رہیں گے؟ اگرچہ اکثر مفسرین نے دوسری تفسیر کی ہے، مگر پہلی تفسیر زیادہ ظاہر ہے۔

**آیت 61،60** **اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ**...... : یہ دونوں آیات اس مومن کا بقیہ کلام بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾

کیا مہمانی کے طور پر یہ بہتر ہے، یا زقوم کا درخت؟ ﴿۶۲﴾ بے شک ہم نے اسے ظالموں کے لیے ایک آزمائش بنایا ہے ﴿۶۳﴾ بے شک وہ ایسا درخت ہے جو بھڑکتی ہوئی آگ کی تہ میں اگتا ہے ﴿۶۴﴾

---

کلام بھی کہ "عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ" (اللہ کے خالص کیے ہوئے بندوں) کو حاصل ہونے والا یہ "رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ" (مقرر رزق) ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ایسے ہی خوش کن انجام کو حاصل کرنے کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

**آیت 62** اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ : "نُزُلًا" کھانے پینے کی چیزیں اور آرام کی جگہ جو مہمان کے آنے کے وقت کے لیے تیار کی جائیں۔ "الزَّقُّوْمِ" اسی سے "تَزَقُّمٌ" ہے، جس کا معنی کسی ناگوار چیز کو نہایت مشکل سے نگلنا ہے۔ اس درخت کا دنیا میں وجود نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے آگ میں پیدا فرمائے گا۔ صرف لفظی مشابہت کی حد تک ایک زہریلا پودا ہے جو "زقوم" کہلاتا ہے، جس کا دودھ جسم کو لگ جائے تو جسم سوج جاتا ہے اور آدمی مر جاتا ہے۔ صحرا کے قریب کی خشک زمینوں میں پایا جاتا ہے۔ (الوسیط) اہل جنت کے لیے "رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿﴾ فَوَاكِهُ ۚ وَ هُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ" کی مہمانی کے ذکر کے بعد اہل جہنم کی مہمانی کا ذکر فرمایا۔ اگرچہ بہتری میں دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں، مگر کفار اپنے اعمال کو مسلمانوں کے اعمال سے بہتر سمجھتے تھے، اس لیے ان کا نتیجہ ذکر کر کے فرمایا کہ بتاؤ، دونوں میں سے بہتر کیا ہے؟ علاوہ ازیں اس میں کفار پر طنز بھی ہے۔

**آیت 63** اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ: یہاں "اَلظَّالِمِيْنَ" سے مراد کفار و مشرکین ہیں اور "زقوم" انھی کے لیے آزمائش ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنایا: ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿﴾ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ﴾ [الدخان: ۴۳ تا ۴۶] "بے شک زقوم کا درخت گناہ گار کا کھانا ہے۔ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح، پیٹوں میں کھولتا ہے۔ گرم پانی کے کھولنے کی طرح۔" اور یہ فرمان: ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ﴾ [الواقعۃ: ۵۱، ۵۲] "پھر بے شک تم اے گمراہو! جھٹلانے والو! یقیناً تھوہر کے پودے میں سے کھانے والے ہو۔" تو ایمان والوں کو اسے ماننے میں کوئی الجھن نہیں ہوئی، کیونکہ انھیں یقین تھا کہ اللہ اور اس کا رسول جو فرماتے ہیں وہ حق ہے۔ وہ کفار ہی تھے جنھوں نے کہا، آگ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۶۰)۔

**آیت 64** اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ : یعنی زقوم ایسا درخت ہے جو جہنم کی تہ میں اگتا ہے اور آگ کی حرارت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا، جیسے پانی جن پودوں پر چڑھ جائے وہ مر جاتے ہیں، مگر سمندر کی تہ میں بے شمار درخت اور پودے اگتے ہیں۔

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٦٦﴾
ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿٦٨﴾

اس کے خوشے ایسے ہیں جیسے وہ شیطانوں کے سر ہوں ﴿٦٥﴾ پس بے شک وہ یقیناً اس میں سے کھانے والے ہیں، پھر اس سے پیٹ بھرنے والے ہیں ﴿٦٦﴾ پھر بلاشبہ ان کے لیے اس پر یقیناً سخت گرم پانی کی آمیزش ہے ﴿٦٧﴾ پھر بلاشبہ ان کی واپسی یقیناً اسی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف ہوگی ﴿٦٨﴾

**آیت 65** **طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ** : قاموس میں ہے "طَلْعٌ" دو ملے ہوئے جوتوں جیسی چیز ہے (جو کھجور کے درخت کے سرے پر نکلتی ہے) جس کے درمیان تہ بہ تہ پھل ہوتا ہے۔ "**رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ**" میں شیاطین سے مراد اگر ابلیس کی اولاد ہو تو وہ کسی نے نہیں دیکھی، نہ ان کے سر دیکھے ہیں، مگر یہ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ تمام دماغوں میں شیطان کا تصور سب سے بری اور مکروہ شخصیت کا ہے، جو ہر قسم کی خیر سے خالی ہے، جیسا کہ کسی بدصورت عورت یا مرد کو بدصورتی میں تشبیہ دینی ہو تو اسے بھوتنی یا بھوت کہا جاتا ہے، حالانکہ بھوت کسی نے نہیں دیکھا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ سانپوں کی ایک قسم کو بھی شیاطین کہتے ہیں، ان کے سروں سے مراد ان کے "پھن" ہیں۔

**آیت 66** **فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا......** : یعنی جہنمیوں پر ایسی خوف ناک بھوک مسلط ہوگی کہ زقوم کے نہایت تلخ ہونے اور گلے میں اٹکنے کے باوجود اسے چاروناچار کھائیں گے۔ دیکھیے سورۂ مزمل (۱۲، ۱۳) اور غاشیہ (۶، ۷) اور پیٹ بھر کر کھائیں گے۔

**آیت 67** **ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ** : "شَابَ يَشُوْبُ شَوْبًا" (ن) ملانا۔ "**حَمِيْمٍ**" انتہائی گرم پانی، یعنی زقوم کھانے کے بعد انھیں ایسی ہولناک پیاس لگے گی جس کی وجہ سے وہ مجبوراً انتہائی گرم پانی پییں گے، جو ایسا سخت گرم ہوگا کہ ان کی انتڑیاں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، فرمایا: ﴿ **وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ** ﴾ [ محمد : ۱۵ ] "اور انھیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ ان کی انتڑیاں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔" یہی مضمون سورۂ واقعہ (۵۱ تا ۵۵) میں بھی بیان ہوا ہے۔

**آیت 68** **ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ** : اس سے معلوم ہوا کہ زقوم کا درخت اور کھولتے پانی کے چشمے جہنم کے کسی خاص حصے میں ہوں گے، جب انھیں بھوک یا پیاس لگے گی تو انھیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا، یا وہ خود ہی چلے جائیں گے، پھر دوبارہ انھیں بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لایا جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ** ﴾ [ الرحمٰن : ٤٤ ] "وہ اس (جہنم) کے درمیان اور کھولتے ہوئے سخت گرم پانی کے درمیان چکر کاٹتے رہیں گے۔"

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ۙ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَ لَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۷۱﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۙ﴿۷۳﴾

بے شک انھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا ﴿۶۹﴾ تو وہ انھی کے قدموں کے نشانوں پر دوڑائے چلے جاتے ہیں ﴿۷۰﴾ اور بلاشبہ یقیناً ان سے پہلے اگلے لوگوں میں سے زیادہ تر گمراہ ہو گئے ﴿۷۱﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان میں کئی ڈرانے والے بھیجے ﴿۷۲﴾ سو دیکھ ان ڈرائے جانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۷۳﴾

**آیت 70،69** اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ…… : "اَلْفَوْا" "أَلْفَى يُلْفِي إِلْفَاءً" (افعال) پانا۔ "يُهْرَعُوْنَ" کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ ہود کی آیت (۷۸) کی تفسیر۔ یعنی ان کفار کے عذاب الیم کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آباء کو ضلالت پر جمے ہوئے دیکھا اور اندھوں کی طرح بغیر سوچے سمجھے ان کے پیچھے دوڑ پڑے، جیسے کوئی انھیں پیچھے سے ہانک رہا ہو۔

**آیت 71** ① وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ : اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور داعیانِ حق کو تسلی دی ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے پر زیادہ پریشان نہ ہوں، ان سے پہلے بھی اکثر لوگ گمراہ ہوئے۔ اگر یہ گمراہ ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔
② اس سے معلوم ہوا کہ حق کی پیروی کرنے والی ایک جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے، اگرچہ اکثریت گمراہوں کی رہی ہے۔

**آیت 72** وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ : یعنی پہلے اکثر لوگوں کے گمراہ ہونے کا باعث یہ نہیں تھا کہ ان کے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان میں بہت سے ڈرانے والے بھیجے، جو انھیں کفر و شرک اور اللہ کی حدود سے تجاوز کے برے انجام سے ڈراتے تھے۔ مگر انھوں نے حق قبول نہیں کیا، بلکہ باپ دادا کی تقلید پر جمے رہے اور اندھا دھند پہلوں کے نقشِ قدم پر دوڑتے گئے۔

**آیت 72** فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ…… : تو اے رسول یا اے مخاطب! دیکھ، ان لوگوں کا انجام کیا ہوا کہ اپنے اعمال کی وجہ سے پکڑے گئے۔ اس پکڑ کی کچھ وضاحت سورۂ عنکبوت میں ہے، فرمایا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ [ العنكبوت : ۴۰ ] "تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔"

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۷۴﴾ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۹﴾

مگر اللہ کے خالص کیے ہوئے بندے ﴿۷۴﴾ اور بلاشبہ یقیناً نوح نے ہمیں پکارا تو یقیناً ہم اچھے قبول کرنے والے ہیں ﴿۷۵﴾ اور ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو بہت بڑی مصیبت سے نجات دی ﴿۷۶﴾ اور ہم نے اس کی اولاد ہی کو باقی رہنے والے بنا دیا ﴿۷۷﴾ اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں اس کے لیے باقی رکھا ﴿۷۸﴾ (یہ کہنا) کہ نوح پر تمام جہانوں میں سلام ہو ﴿۷۹﴾

---

**آیت 74** اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ : یعنی ہم نے تمام جھٹلانے والوں کو تباہ و برباد کر دیا، مگر اللہ کے وہ بندے جو اس کی توحید و عبادت کے لیے چنے ہوئے تھے، وہی محفوظ رہے۔ آگے چند "مُنْذِرِیْنَ" (ڈرانے والوں) اور چند "مُنْذَرِیْنَ" (ڈرائے جانے والوں) کے قصے بیان فرمائے، تاکہ رسول اللہ ﷺ اور حق کے تمام داعی حضرات کے دلوں کو اطمینان حاصل ہو اور حق جھٹلانے والوں کو عبرت ہو۔

**آیت 75** ① وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ : پکارنے سے مراد وہ دعا ہے جو نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک صبر و استقامت کے ساتھ دعوت دینے کے بعد اس وقت کی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں آگاہ کیا کہ اب تمھاری قوم میں سے ان کے سوا کوئی ایمان نہیں لائے گا جو ایمان لا چکے۔ اس دعا کا ذکر سورۂ قمر (۱۰) اور سورۂ نوح (۲۶) میں ہے۔

② فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ : یہاں اس کے بعد مخصوص بالمدح "نَحْنُ" محذوف ہے، یعنی یقیناً ہم اچھے دعا قبول کرنے والے ہیں۔ نوح علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۳۶ تا ۴۸)۔

**آیت 76** وَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ ...... : "الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ" (بہت بڑی مصیبت) سے نجات سے مراد اس طوفانِ عظیم سے نجات ہے اور اس ہر وقت کی پریشانی سے بھی جو قوم کے جھٹلانے اور ستانے کی صورت میں سیکڑوں برس انھیں لاحق رہی۔

**آیت 77** وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ : اس سے صاف ظاہر ہے کہ طوفان کے بعد صرف نوح علیہ السلام کی نسل آگے چلی، باقی ایمان والوں کی نسل ختم ہوگئی۔ اس آیت کے مطابق سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۳) : ﴿ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ﴾ (اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا!) کا مطلب بھی یہی ہے کہ بعد میں نوح علیہ السلام کے بیٹوں اور پوتوں کی نسل ہی چلی جو کشتی میں سوار تھے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔

**آیت 79،78** وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ...... : یعنی بعد میں آنے والی تمام اقوام نوح علیہ السلام پر سلام بھیجتی رہیں گی۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۸۲﴾
وَ اِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ ﴿۸۳﴾

بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ﴿۸۰﴾ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں سے تھا ﴿۸۱﴾ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا ﴿۸۲﴾ اور بے شک اس کے گروہ میں سے یقیناً ابراہیم (بھی) ہے ﴿۸۳﴾

**آیت 80** **اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ** : ''احسان'' اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی ہوتا ہے اور بندوں کے ساتھ بھی۔ اللہ کی عبادت میں احسان کا ذکر حدیثِ جبریل میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: « أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ » [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ ......: ٥٠ ] ''(احسان یہ ہے) کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، تو اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو یقیناً وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔'' بندوں کے ساتھ احسان کا ذکر قارون کو اس کی قوم کی نصیحت میں ہے، فرمایا: ﴿ وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ﴾ [ القصص : ٧٧ ] ''جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا تو بھی احسان کر۔'' یعنی کسی معاوضے کی خواہش کے بغیر ان سے نیکی کر۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے نوح علیہ السلام کو جزا دی، ان کی دعا قبول کی، انھیں اور ان کے اہل کو بہت بڑی مصیبت سے نجات دی اور ان پر سلام کو تاقیامت جاری رکھا، ایسے ہی ہم سب احسان کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔

**آیت 81** **اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ** : کیونکہ وہ ہمارے مومن بندوں سے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بندوں کے مراتب میں سب سے بلند مرتبہ ہے، کیونکہ اس میں دین کے تمام عقائد و اعمال آ جاتے ہیں، پھر جیسے جیسے ایمان کامل ہوگا ویسے ہی جزا کامل ہوگی۔ اور ظاہر ہے نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے ایمان کے کمال تک عام لوگوں کا ایمان نہیں پہنچ سکتا اور ہمارے نبی ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے سید ولد آدم بنایا، ان کے ایمان کا درجہ تو سب سے عالی ہے۔

**آیت 81** **ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ** : پھر نوح علیہ السلام کو ملنے والی جزا میں سے ایک بہت بڑی جزا یہ ہے کہ ہم نے انھیں اور ان کے اہل کو نجات دی اور دوسرے تمام لوگوں کو غرق کر دیا جو ان پر ایمان نہیں لائے اور انھیں عمر بھر ستاتے رہے، کیونکہ دشمنوں سے انتقام کے ساتھ دل اور آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

**آیت 81** **وَ اِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ** : ''شِيْعَةٌ'' ''شَاعَ يَشِيْعُ شِيَاعًا'' (ض) سے مشتق ہے، جس کا معنی ساتھ دینا ہے، ایسی جماعت جو کسی کا ساتھ دے۔ یعنی نوح علیہ السلام کا ساتھ دینے والے گروہ میں سے ابراہیم علیہ السلام بھی ہیں، کیونکہ وہ بھی توحید، آخرت اور دین کی تمام بنیادی چیزوں کے متعلق وہی عقائد و اعمال رکھتے تھے جو نوح علیہ السلام کے تھے، بلکہ تمام انبیاء کا اصل دین ایک ہی ہے جس کا نام اسلام ہے اور سب کی امتیں ایک امت ہیں جس کا نام امتِ مسلمہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴾ [ المؤمنون : ٥٢ ] ''اور بے شک یہ تمھاری امت ہے، جو ایک ہی

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾

جب وہ اپنے رب کے پاس بے روگ دل لے کر آیا ﴿۸۴﴾ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ ﴿۸۵﴾ کیا اللہ کو چھوڑ کر گھڑے ہوئے معبودوں کو چاہتے ہو؟ ﴿۸۶﴾ تو جہانوں کے رب کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے؟ ﴿۸۷﴾ پس اس نے ستاروں میں ایک نگاہ ڈالی ﴿۸۸﴾

---

امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، سو مجھ سے ڈرو۔"

**آیت 84** **اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ** : جب اس نے نوح علیہ السلام کی طرح شرک، شک، منافقت، حسد، بغض، سرکشی اور ہر روگ سے پاک دل لے کر نہایت اخلاص اور عاجزی کے ساتھ اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔

**آیت 85** **اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ**...... : ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ ان کی عبادت کے انکار کے لیے تھا۔

**آیت 86** **اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ** : "**اِفْكًا**" مصدر بمعنی اسم مفعول برائے مبالغہ ہے اور "**اٰلِهَةً**" اس سے بدل ہے۔ "**اِفْكًا**" کو اصل معنی میں لیں تو یہ مفعول لہٗ بن جائے گا۔

**آیت 87** **فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** : یعنی رب العالمین جو پوری کائنات کا مالک ہے اور تمام جہانوں کے ایک ایک ذرے کی پرورش کر رہا ہے، اس کے متعلق تمھارا کیا گمان ہے؟ کیا تم نے اس میں کوئی نقص یا عیب پایا کہ اپنے گھڑے ہوئے معبودوں کی عبادت کرنے لگے اور اس کی گرفت سے بالکل بے خوف ہو گئے؟

**آیت 88** **فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ** : ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ محض زبانی نصیحت سے وہ بتوں کے بے بس اور بے اختیار ہونے کو ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے عملاً انھیں توڑنا پڑے گا تو انھوں نے پہلے تو اعلان کیا کہ اللہ کی قسم! جب تم کہیں گئے تو میں تمھارے بتوں کی کوئی تدبیر ضرور کروں گا۔ (دیکھیے انبیاء : ۵۷) پھر مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے، کیونکہ ان کی موجودگی میں یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی دوران ان کی قوم کے ایک جشن یا میلے کا دن آ گیا، انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ ابراہیم علیہ السلام چاہتے تھے کہ جب وہ لوگ اپنے میلے میں چلے جائیں اور ان کے بتوں کے پاس کوئی نہ رہے تو اطمینان کے ساتھ انھیں توڑ دیں، اس لیے انھوں نے پہلے تو ستاروں میں ایک نگاہ ڈالی۔ ستاروں میں نگاہ ڈالنے کا مقصد کیا تھا؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ محاورہ ہے جو غور و فکر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ جب کوئی غور طلب معاملہ سامنے آتا ہے تو آدمی آسمان کی طرف دیکھتا ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں میں ایک نگاہ ڈالی، کچھ سوچا اور کہا کہ میں تو بیمار ہوں، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم بتوں کے علاوہ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش بھی کرتی تھی اور ستاروں کو حوادث زمانہ میں مؤثر سمجھتی تھی، اس لیے ابراہیم علیہ السلام نے انھیں مغالطہ دینے کے لیے کہا کہ میں تو بیمار ہوں، یا بیمار ہونے والا ہوں، تاکہ وہ سمجھیں کہ انھوں نے یہ بات ستاروں کو دیکھ کر معلوم کی ہے۔

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْیَمِیْنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقْبَلُوْۤا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾

پھر کہا میں تو بیمار ہوں ﴿۸۹﴾ تو وہ اس سے پیٹھ پھیر کر واپس چلے گئے ﴿۹۰﴾ تو وہ چپکے سے ان کے معبودوں کی طرف گیا اور اس نے کہا کیا تم کھاتے نہیں؟ ﴿۹۱﴾ تمھیں کیا ہے کہ تم بولتے نہیں؟ ﴿۹۲﴾ پھر وہ دائیں ہاتھ سے مارتے ہوئے ان پر پل پڑا ﴿۹۳﴾ تو وہ دوڑتے ہوئے اس کی طرف آئے ﴿۹۴﴾

**آیت 89** فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ : یہ ایسی بات تھی جو درحقیقت سچی تھی، کیونکہ عموماً آدمی کی طبیعت کچھ نہ کچھ خراب ہوتی ہے، مگر قوم نے اس کا مطلب کچھ اور سمجھا (کہ وہ جانے کے قابل نہیں ہیں) جس سے ابراہیم علیہ السلام اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایسی باتوں کو جن میں کہنے والے کی نیت کچھ ہو اور سننے والا کچھ اور سمجھے ''معاریض'' کہتے ہیں، جن کے ساتھ آدمی صریح جھوٹ سے بچ جاتا ہے۔ صحیح بخاری (۳۳۵۸) میں ابراہیم علیہ السلام کی ''ثَلَاثَ کَذِبَاتٍ'' والی حدیث پر مفصل بحث کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۶۲، ۶۳) کی تفسیر۔

**آیت 90** فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ : تو وہ لوگ انھیں وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

**آیت 91** فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمْ ...... : ''رَاغَ یَرُوْغُ'' (ن) کا معنی خفیہ طور پر جانا، حیلہ کرتے ہوئے تیزی سے جانا، مائل ہونا۔ ابراہیم علیہ السلام چپکے سے ان کے بتوں کی طرف گئے اور ان کا مذاق اڑاتے ہوئے ان سے کہنے لگے: ''کیا تم کھاتے نہیں؟'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ مندر میں بتوں کے سامنے طرح طرح کے کھانے، مٹھائیاں اور پھل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ مقصد یہ کہ معمولی جانور بھی کم از کم کھاتے تو ہیں، یہ بے جان پتھر جو کھاتے بھی نہیں، انسان ان کی پوجا کیسے کرنے لگا؟

**آیت 92** مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ : جب بتوں کی طرف سے جواب نہ ملا تو کہنے لگے، تمھیں کیا ہے کہ تم بولتے نہیں! ناک نقشہ اور تمام اعضا تو تمھارے انسانوں جیسے ہیں، مگر تم نہ کھا سکتے ہو، نہ بول سکتے ہو، پھر تعجب ہے کہ وہ انسان تمھیں پوجنے لگے جو کھاتے پیتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں؟

**آیت 92** فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْیَمِیْنِ : ''یَمِیْنٌ'' کا معنی دایاں ہاتھ بھی ہے اور قوت بھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۵۸) کی تفسیر۔

**آیت 94** فَاَقْبَلُوْۤا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ : '' زَفَّ یَزِفُّ زَفًّا وَ زُفُوْفًا وَ زَفِیْفًا '' (ض) تیزی سے جانا، دوڑنا۔ یعنی بتوں کا یہ حال دیکھ کر قوم کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ ان کا یہ حال کس نے کیا ہے، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام انھیں پہلے ہی اپنے ارادے سے آگاہ کر چکے تھے، اس لیے وہ سب دوڑتے ہوئے ان کے پاس آئے اور انھیں پکڑ کر مجمع میں لے آئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۵۹ تا ۶۱)۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَ قَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾

اس نے کہا کیا تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے خود تراشتے ہو؟ ﴿۹۵﴾ حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو ﴿۹۶﴾ انھوں نے کہا اس کے لیے ایک عمارت بناؤ، پھر اسے بھڑکتی آگ میں پھینک دو ﴿۹۷﴾ غرض انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنے کا ارادہ کیا تو ہم نے انھی کو سب سے نیچا کر دیا ﴿۹۸﴾ اور اس نے کہا بے شک میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، وہ مجھے ضرور راستہ دکھائے گا ﴿۹۹﴾

**آیت 95** قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ : کیا تم اپنے تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کرتے ہو؟

**آیت 96** وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ : "مَا تَعْمَلُوْنَ" کے دو معنی ہو سکتے ہیں، "مَا" موصولہ ہو تو مطلب یہ ہے کہ کیا تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے خود تراشتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں پیدا کیا اور ان چیزوں کو بھی جو تم بناتے ہو، یعنی تم اور تمھارے بت دونوں اللہ کی مخلوق ہیں، پھر خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ اور "مَا" مصدریہ ہو تو معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں پیدا کیا اور جو عمل تم کرتے ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندے کے تمام افعال کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے، بندہ صرف کاسِب اور عامِل ہے، اس کے عمل کا خالق وہ خود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے اور یہی اہلِ سنت کا عقیدہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر کتاب " خَلْقُ أَفْعَالِ الْعِبَادِ "لکھی ہے۔

**آیت 97** قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا ...... : "بُنْيَانًا" کی تنوین تعظیم کی ہے۔ "الْجَحِيْمِ" خوب بھڑکائی ہوئی آگ، یہ "جَحَمَ فُلَانٌ النَّارَ" (ف) (فلاں نے آگ خوب بھڑکائی) سے مشتق ہے۔ دلیل میں لا جواب ہونے پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے ایک بڑی عمارت بناؤ، اسے ایندھن سے بھر کر آگ لگاؤ اور جب وہ خوب بھڑک اٹھے تو ابراہیم (علیہ السلام) کو اس میں پھینک دو۔ اس چار دیواری یا عمارت کا بلند اور بڑا ہونا تو "بُنْيَانًا" کے لفظ اور اس کی تنوین سے ظاہر ہو رہا ہے، مگر اس کی پیمائش کسی معتبر ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچی۔

**آیت 96** فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۷۰)۔

**آیت 99** ① وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ ...... : قرطبی نے فرمایا: "یہ آیت ہجرت اور کفار سے علیحدگی اختیار کرنے میں اصل ہے۔" آگ سے سلامتی کے ساتھ نکلنے کے عظیم معجزے کے بعد بھی جب لوط علیہ السلام کے سوا کوئی شخص ایمان نہ لایا تو ابراہیم علیہ السلام نے وہاں سے ہجرت کا فیصلہ فرمایا اور کہنے لگے، میں اپنی قوم اور اپنے وطن سے، جہاں کفر کا تسلط ہے، اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، جہاں آزادی سے اپنے رب کی عبادت کر سکوں اور اس کے دین کی دعوت دے سکوں۔ ان کے ساتھ ان کی

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

اے میرے رب! مجھے (لڑکا) عطا کر جو نیکوں سے ہو ﴿۱۰۰﴾ تو ہم نے اسے ایک بہت بردبار لڑکے کی بشارت دی ﴿۱۰۱﴾

---

بیوی سارہ اور بھتیجے لوط علیہ السلام تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدمی جب کسی جگہ اپنے دین پر پوری طرح عمل نہ کر سکے تو اسے وہاں سے ہجرت کرنی چاہیے۔

② **سَيَهْدِيْنِ** : یہ اصل میں "سَيَهْدِيْنِيْ" ہے، یہاں "سین" تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "وہ مجھے ضرور راستہ دکھائے گا" کیا گیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جب اپنے وطن سے نکلے تو انھیں معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے، مگر انھیں اپنے رب پر بھروسے کی وجہ سے یقین تھا کہ وہ ضرور ان کی راہ نمائی فرمائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ )) [ ترمذي، صفة القيامة والرقائق، باب : ۲۵۱٦ ] "تو اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھ وہ تیرا دھیان رکھے گا۔" اور یہ بات یقینی ہے کہ جو شخص اللہ کی خاطر کوئی چیز چھوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بہتر چیز عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہ نمائی مبارک سرزمین شام کی طرف فرمائی۔

**آیت 100** **رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ** : اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ جب وہ اپنی قوم سے مایوس ہوئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ پروردگارا! مجھے اپنی قوم اور خاندان کے عوض صالح اولاد عطا فرما، جو غریب الوطنی میں میری مونس وغم خوار اور مددگار ہو۔ واضح رہے، صالح ہونا بندے کے مقامات میں سے بہت اونچا مقام ہے، جس کی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے دعا کی: ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۸۳ ] "اے میرے رب! مجھے حکم عطا کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا۔" اور اس جگہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لیے دعا کی: ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یوسف علیہ السلام نے اپنے لیے دعا کی: ﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ یوسف : ۱۰۱ ] "مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔" اور سلیمان علیہ السلام نے دعا کی: ﴿ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ النمل : ۱۹ ] "اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔" کیونکہ مکمل صالح وہ ہے جس کا ہر کام درست ہو۔

**آیت 101** ① **فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ** : یعنی ہم نے ان کی دعا قبول کی اور انھیں ایک بہت حلم والے لڑکے کی بشارت دی۔ حلم میں صبر، حسنِ خلق، حوصلے کی وسعت اور زیادتی کرنے والوں سے درگزر شامل ہے۔ عموماً اس کا ترجمہ بردباری کیا جاتا ہے۔ یہ بیٹا اسماعیل علیہ السلام تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے یا تو یہ دعا کافی عمر ہونے کے بعد کی، یا ان کی دعا اور اس کی قبولیت میں کئی سال کا وقفہ ہوا، کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ ﴾ [ إبراهيم : ۳۹ ] "سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔" ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو وادی غیر ذی زرع ( مکہ ) میں چھوڑا، جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آب زم زم مہیا فرمایا

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ٞ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

پھر جب وہ اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچ گیا تو اس نے کہا اے میرے چھوٹے بیٹے! بلاشبہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، تو دیکھ تو کیا خیال کرتا ہے؟ اس نے کہا اے میرے باپ! تجھے جو حکم دیا جا رہا ہے کر گزر، اگر اللہ نے چاہا تو تُو ضرور مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا ﴿۱۰۲﴾

اور قبیلہ بنو جرہم کو لا بسایا۔

**آیت 102** ① **فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ** ...... : ”**يٰبُنَيَّ**“ ”اِبْنٌ“ کی تصغیر ہے، اے میرے چھوٹے بیٹے! مراد ہے اے میرے پیارے بیٹے! ابراہیم علیہ السلام وقتاً فوقتاً شام سے اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی خبر گیری کے لیے آتے رہتے تھے۔ جب بیٹا اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچ گیا، یعنی اس قابل ہو گیا کہ باپ کا ہاتھ بٹا سکے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کو ایک نیا امتحان پیش آیا۔ وہ یہ کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بڑی دعاؤں اور آرزوؤں کے بعد بڑھاپے میں ملنے والے نہایت عزیز بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، اس لیے انھوں نے اسے اللہ کا حکم سمجھ کر کسی بھی تردد کے بغیر اس پر عمل کا پکا ارادہ کر لیا اور بیٹے سے کہا، اے میرے پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، سو دیکھ، تو کیا خیال کرتا ہے۔

② **فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى** : بیٹے کی رائے پوچھنے کا مطلب یہ نہ تھا کہ اگر وہ نہ مانتا تو وہ اللہ کے حکم پر عمل نہ کرتے، بلکہ وہ اپنے ساتھ بیٹے کو اللہ کے حکم کی اطاعت میں شریک کرنا چاہتے تھے اور انھیں امید تھی کہ بیٹا اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے ضرور آمادگی کا اظہار کرے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حلیم لڑکے کی بشارت دی تھی اور واقعی بیٹے نے یہ کہہ کر حلیم ہونے کا ثبوت دیا جو اگلے جملے میں مذکور ہے۔

③ **قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ** : ”**يٰۤاَبَتِ**“ کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۴) اس سے معلوم ہوا کہ اسماعیل علیہ السلام نے اسے محض خواب نہیں بلکہ اللہ کا حکم سمجھا اور کہا اے میرے باپ! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے وہ کیجیے۔ یہ صاف دلیل ہے کہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں نے یہی سمجھا اور دونوں اسے اللہ کا حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے۔

④ **سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ** : اس میں اسماعیل علیہ السلام کی کمال اطاعت کے ساتھ ان کا کمال صبر ظاہر ہو رہا ہے، جوان کے ”غُلٰمٌ حَلِيْمٌ“ ہونے کا نتیجہ تھا۔ اطاعت اور صبر کے ساتھ ان کا اللہ تعالیٰ کے لیے حسنِ ادب بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ انھوں نے اپنی اطاعت اور قربانی کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع قرار دیا کہ اگر اس نے چاہا تو میں اس آزمائش پر صبر کروں گا۔

# فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝۱۰۳

## تو جب دونوں نے حکم مان لیا اور اس نے اسے پیشانی کی ایک جانب پر گرا دیا۝۱۰۳

**آیت 103** ❶ **فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ** : عام طور پر مفسرین نے ''اَلْجَبِیْنُ'' کا ترجمہ پیشانی یا ماتھا کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو اوندھا اس لیے لٹایا کہ ذبح کرتے وقت اس کا چہرہ دیکھ کر کہیں دل میں رقت اور ہاتھ میں لرزش پیدا نہ ہو جائے۔ بعض نے کچھ آثار بھی نقل کیے ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام نے خود ابراہیم علیہ السلام کو ایسا کرنے کی وصیت کی۔ بعض نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کے کہنے پر اس کے دونوں ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیے اور اسے الٹا لٹا لیا اور چاہتے تھے کہ نیچے سے گردن پر چھری پھیریں۔ مگر یہ سب اسرائیلیات ہیں اور ان میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں۔ اس مقام پر جبین سے مراد ماتھا لینا بہت بعید ہے، کیونکہ جبین کا معنی ''جَبْهَةٌ'' (ماتھے) کی ایک جانب ہے۔ ہر آدمی کی دو جبینیں ہوتی ہیں۔ طبری نے اس قسم کی روایتیں نقل کرنے کے باوجود خود **''وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ''** کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''وَ صَرَعَهُ لِلْجَبِیْنِ وَ الْجَبِیْنَانِ مَا عَنْ یَمِیْنِ الْجَبْهَةِ وَ عَنْ شِمَالِهَا وَلِلْوَجْهِ جَبِیْنَانِ وَ الْجَبْهَةُ بَیْنَهُمَا'' یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اسے جبین پر گرا لیا اور دو جبینیں وہ ہیں جو ''جَبْهَةٌ'' (پیشانی) کے دائیں اور بائیں طرف ہوتی ہیں اور چہرے کی دو جبینیں ہوتی ہیں اور ''جَبْهَةٌ'' (پیشانی) ان دونوں کے درمیان ہوتی ہے۔'' قاموس میں ہے: ''اَلْجَبِیْنَانِ حَرْفَانِ مُکْتَنِفَا الْجَبْهَةِ مِنْ جَانِبَیْهَا'' ''یعنی ماتھے کے دونوں جانبوں والے کناروں کو دو جبینیں کہتے ہیں۔'' اس لیے میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ''اس نے اسے پیشانی کی ایک جانب پر گرا دیا۔'' ذبح کرتے وقت کسی بھی جانور کو اسی طرح گرایا جاتا ہے، تاکہ حلق پر چھری پھر سکے۔

❷ ''**فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ**'' (تو جب دونوں نے حکم مان لیا اور اس نے اسے پیشانی کی ایک جانب پر گرا دیا) تو پھر کیا ہوا؟ صاحب کشف نے فرمایا: ''جواب یہ ہے کہ (کَانَ مَا کَانَ) یعنی پھر ہوا جو ہوا۔'' اس سوال کا جواب یہاں ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ بات بیان میں آنا مشکل ہے کہ اس وقت باپ کے دل پر کیا گزری تھی، فرشتوں کی حیرانی کا کیا عالم تھا اور اللہ تعالیٰ، جس کے حکم پر وہ عزیز بیٹے کو ذبح کر رہے تھے، کس قدر خوش اور مہربان ہو رہا تھا۔

❸ اس مقام پر مفسرین نے بعض صحابہ اور تابعین سے مختلف آثار نقل کیے ہیں، جن میں سے اکثر کی تو سند ہی صحیح نہیں۔ اگر صحیح ہو بھی تو ظاہر ہے وہ حضرات واقعہ کے وقت موجود نہیں تھے، نہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ باتیں روایت کی ہیں اور نہ ہی اپنی معلومات کا کوئی اور معتبر ذریعہ بتایا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''البدایة والنهایة'' میں اسماعیل علیہ السلام کے قصے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''غَالِبُ مَا هٰهُنَا مِنَ الْآثَارِ مَأْخُوْذٌ مِنَ الْإِسْرَائِیْلِیَاتِ وَفِي الْقُرْآنِ کِفَایَةٌ عَمَّا جَرٰی مِنَ الْأَمْرِ الْعَظِیْمِ وَالْاِخْتِبَارِ الْبَاهِرِ وَأَنَّهٗ فُدِيَ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ وَ قَدْ وَرَدَ فِي الْحَدِیْثِ أَنَّهٗ کَانَ کَبْشًا'' ''یعنی یہاں ذکر کیے جانے والے اکثر آثار اسرائیلیات سے لیے گئے ہیں اور قرآن مجید میں جو کچھ مذکور ہے وہ اس عظیم الشان معاملے اور طاقت سے اونچے امتحان کے بیان کے لیے کافی ہے اور یہ کہ ان کا فدیہ عظیم ذبیحے کے ساتھ دیا گیا اور حدیث میں آیا ہے کہ وہ ایک مینڈھا تھا۔''

وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾

**اور ہم نے اسے آواز دی کہ اے ابراہیم! ﴿۱۰۴﴾ یقیناً تو نے خواب سچا کر دکھایا، بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ﴿۱۰۵﴾ بے شک یہی تو یقیناً کھلی آزمائش ہے ﴿۱۰۶﴾ اور ہم نے اس کے فدیے میں ایک بہت بڑا ذبیحہ دیا ﴿۱۰۷﴾**

---

**آیت 105،104** ① **وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ** ……: جب ان دونوں نے حکم مان لیا اور اس نے اسے پیشانی کی ایک جانب پر گرا دیا (تو ہوا جو ہوا) اور ہم نے اسے آواز دی کہ اے ابراہیم! یقیناً تو نے خواب سچا کر دکھایا۔ مفسر سلیمان الجمل نے فرمایا: ''اگر تم کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو کیسے فرمایا کہ تو نے خواب سچا کر دکھایا، حالانکہ انھوں نے خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں، خواب سچا تو اسی صورت میں ہونا تھا کہ اسے ذبح کر دیتے؟ تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے خواب سچا کر دکھانے والا اس لیے فرمایا کہ انھوں نے اپنی پوری کوشش اور طاقت صرف کر دی، جو کچھ کر سکتے تھے کیا، ذبح کرنے والا جو کچھ کرتا ہے وہ سب کیا، تو اللہ تعالیٰ کو جو مطلوب تھا وہ انھوں نے ادا کر دیا اور وہ تھا اللہ تعالیٰ کے حکم کے لیے پوری طرح مطیع اور فرماں بردار ہو جانا۔'' بقاعی نے اس سوال کے جواب میں فرمایا: ''قَالَ اللّٰهُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا فِيْ أَنَّكَ تَذْبَحُهُ فَإِنَّكَ قَدْ عَالَجْتَ وَ بَذَلْتَ الْوُسْعَ فِيْهِ وَ فَعَلْتَ مَا رَأَيْتَ فِي الْمَنَامِ فَمَا انْذَبَحَ لِأَنَّكَ مَا رَأَيْتَ أَنَّكَ ذَبَحْتَهُ فَاكْفُفْ عَنْ مُعَالَجَةِ الذَّبْحِ بِأَزْيَدَ مِنْ هٰذَا'' ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تو نے اپنا خواب سچا کر دیا کہ تو اسے ذبح کر رہا ہے، کیونکہ تو نے کوشش کی اور اپنی پوری طاقت اس میں صرف کی اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا وہ کیا، مگر وہ ذبح نہیں ہوا، کیونکہ تو نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ تو نے اسے ذبح کر دیا ہے (بلکہ یہ دیکھا تھا کہ ذبح کر رہے ہو) اس لیے اس سے زیادہ ذبح کی کوشش سے رک جا۔'' بقاعی کے علاوہ اور کئی مفسرین نے یہی توجیہ فرمائی ہے کہ خواب ''**اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ**'' تھا، ''أَنِّيْ ذَبَحْتُكَ'' نہیں تھا اور ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ کیا اس کے ساتھ وہ خواب سچا ہو گیا۔

② **اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ** : یعنی ہمارا دستور ہے کہ ہم نیکو کاروں کو ایسے مشکل حکم کر کے آزماتے ہیں، پھر انھیں ثابت قدم رکھتے ہیں۔ جب وہ اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں تو ان کے درجات بلند کرتے ہیں اور جس آزمائش میں ہم انھیں ڈالتے ہیں اس سے نکلوا بھی دیتے ہیں، جیسے ابراہیم علیہ السلام کو آگ کی آزمائش میں ڈالا اور وہاں سے سلامت نکال بھی لائے اور ان کا درجہ بلند کر دیا۔ اسی طرح بیٹے کی قربانی کی آزمائش میں بیٹے کو بچا لیا اور درجات بھی بلند کر دیے۔

**آیت 106** **اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ** : یعنی بوڑھے باپ کو اکلوتا بیٹا ذبح کرنے کا حکم، جو کام کاج میں اس کا مددگار بننے کی عمر کو پہنچ چکا ہے، یقیناً یہ باپ بیٹے دونوں کے لیے کھلی آزمائش اور بہت سخت امتحان ہے۔

**آیت 107** **وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ** : ''ذِبْحٌ'' (ذال کے کسرہ کے ساتھ) بمعنی ''مَذْبُوْحٌ''، یعنی ہم نے اسماعیل علیہ السلام

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝١٠٨ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝١٠٩ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝١١٠ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١١١ وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝١١٢

اور پیچھے آنے والوں میں اس کے لیے یہ بات چھوڑ دی ⓾ کہ ابراہیم پر سلام ہو ۝١٠٩ ہم اسی طرح نیکی کرنے والوں کو بدلا دیتے ہیں ۝١١٠ بلاشبہ وہ ہمارے مومن بندوں سے تھا ۝١١١ اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، جو نبی ہوگا، صالح لوگوں سے (ہوگا) ۝١١٢

---

کے فدیے اور بدلے میں ایک عظیم ذبیحہ دیا۔ یہ ایک مینڈھا تھا جو ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے قربان کر دیا۔ اسے عظیم اس لیے فرمایا کہ وہ اسماعیل علیہ السلام جیسے عظیم شخص کا فدیہ تھا اور اس لیے کہ اس کی قربانی عظیم عبادت تھی، جو قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے سنت قرار پائی۔ تفسیری روایات میں اس مینڈھے کا جنت سے آنے کا ذکر ہے اور یہ بھی کہ یہ وہی مینڈھا تھا جو آدم علیہ السلام کے بیٹے نے بطور قربانی دیا تھا۔ وہ جنت میں پلتا رہا اور اس موقع پر ابراہیم علیہ السلام کے لیے اتارا گیا۔ بعض نے کہا کہ یہ ایک پہاڑی بکرا تھا جو پہاڑ سے اتارا گیا تھا۔ مگر یہ تمام روایات اسرائیلی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بھی ثابت نہیں۔ ہاں! یہ ثابت ہے کہ وہ سینگوں والا مینڈھا تھا، جیسا کہ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (کعبہ کے چابی بردار) عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: (( إِنِّي كُنْتُ رَأَيْتُ قَرْنَيِ الْكَبْشِ حِيْنَ دَخَلْتُ الْبَيْتَ، فَنَسِيْتُ أَنْ آمُرَكَ أَنْ تُخَمِّرَهُمَا، فَخَمِّرْهُمَا فَإِنَّهُ لَا يَنْبَغِي أَنْ يَكُوْنَ فِي الْبَيْتِ شَيْءٌ يَشْغَلُ الْمُصَلِّيَ، قَالَ سُفْيَانُ لَمْ تَزَلْ قَرْنَا الْكَبْشِ فِي الْبَيْتِ حَتَّى احْتَرَقَ الْبَيْتُ فَاحْتَرَقَا )) [ مسند أحمد : ٦٨/٤، ح : ١٦٦٣٧۔ مسند احمد کے محققین نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے ] ”میں جب بیت اللہ میں داخل ہوا تو میں نے اس مینڈھے کے سینگ دیکھے تھے، تو میں تمھیں ان کو ڈھانپنے کا حکم دینا بھول گیا۔ سو انھیں ڈھانپ دو، کیونکہ یہ مناسب نہیں کہ بیت اللہ میں کوئی ایسی چیز ہو جو نمازی کو مشغول کرے۔“ سفیان نے فرمایا: ”وہ سینگ بیت اللہ میں رہے، حتیٰ کہ بیت اللہ کو آگ لگ گئی تو وہ بھی جل گئے۔“

**آیت 108 تا 111** وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیات (۷۸ تا ۸۱)۔

**آیت 112** وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ : اہلِ کتاب کا کہنا ہے کہ ذبح کا یہ واقعہ اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ نہیں بلکہ اسحاق علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ بعض مسلم مفسرین نے بھی یہی بات کہی ہے، مگر یہ درست نہیں، کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے ملنے والے بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم کے ساتھ آزمائش کے بعد اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری کا ذکر فرمایا اور اس بات پر مسلمانوں کا اور اہلِ کتاب کا اتفاق ہے کہ اسماعیل علیہ السلام پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ایک اور نہایت مضبوط دلیل اس کی یہ ہے کہ جب فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری دی تو اس کے ساتھ ہی فرمایا: ﴿ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ

وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾ وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور ہم نے اس پر اور اسحاق پر برکت نازل کی اور ان دونوں کی اولاد میں سے کوئی نیکی کرنے والا ہے اور کوئی اپنے آپ پر صریح ظلم کرنے والا ہے ﴿۱۱۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا ﴿۱۱۴﴾

يَعْقُوْبَ ﴾ [ هود : ۷۱ ] کہ اسحاق (علیہ السلام) کے بعد ان کے بیٹے یعقوب (علیہ السلام) ہوں گے، ظاہر ہے یہ وہ بیٹا ہو ہی نہیں سکتا جسے دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچتے ہی ذبح کا حکم دیا جانے والا تھا، کیونکہ ان کے متعلق تو اتنی عمر تک زندہ رہنے کی بشارت تھی کہ پورے جوان ہو کر ان کی شادی ہو گی، پھر اولاد ہو گی۔ اس کے علاوہ تورات میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا ذکر ہے (دیکھیے پیدائش :۲۲۔۲) اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اکلوتے بیٹے اسماعیل علیہ السلام تھے۔ اس کے باوجود اہلِ کتاب نے تحریف کر کے اسحاق علیہ السلام کو ذبیح لکھ دیا۔ پھر اس مینڈھے کے سینگوں کا کعبہ میں مدت تک رہنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ مکہ میں ہوا۔ اگر یہ واقعہ اسحاق علیہ السلام سے متعلق ہوتا تو شام میں ہوتا، مکہ سے اس کا تعلق نہ ہوتا۔

**آیت 113** ① **وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ** : "عَلَيْهِ" سے مراد ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ برکت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ انھیں بہت اولاد عطا فرمائی اور ان کی اولاد میں نبوت کا سلسلہ رکھا۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: "دونوں" کہا دونوں بیٹوں کو، دونوں سے بہت اولاد پھیلی، اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں نبی گزرے بنی اسرائیل کے اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں عرب، جن میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔" (موضح)

② **وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ** ...... : یعنی ان کی اولاد میں سے نیک بھی ہوں گے، بد بھی، عدل کرنے والے بھی ہوں گے اور اپنی جان پر صاف ظلم کرنے والے بھی۔ شیخ عبد الرحمان السعدی نے فرمایا: "شاید یہ کہنے کا مقصد یہ وہم دور کرنا ہو جو بعض لوگوں کو "**وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ**" سے پیدا ہو سکتا تھا کہ اس کا تقاضا ہے کہ ان کی اولاد میں بھی وہ برکت جاری رہے اور برکت مکمل تب ہوتی جب ساری اولاد نیک ہو، تو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اولاد میں سے نیک و بد ہر قسم کے لوگ ہوں گے۔" یعنی محض خاندان اور باپ دادا کے ساتھ نسبت اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کی مثال امتِ مسلمہ میں بعض لوگوں کا اہلِ بیت کے متعلق یہ خیال ہے کہ سید بادشاہ جو کچھ بھی کرتے رہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی اولاد ہونے کی وجہ سے بخشے بخشائے ہیں، جب کہ یہ خیال باطل ہے۔ کیونکہ اگر نبی کی اولاد ہونا ہی بخشش کے لیے کافی ہو تو سارے انسان ہی آدم و نوح علیہما السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی اولاد ہیں، اس لیے سب ہی بخشے ہوئے ہونے چاہییں۔

**آیت 114** **وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ** : یعنی انھیں نبوت عطا کی اور دوسرے بے شمار احسانات فرمائے، جن میں سے بعض احسانات کا ذکر آگے فرمایا۔

وَ نَجَّيْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ هَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

اور ہم نے ان دونوں کو اور دونوں کی قوم کو بہت بڑی مصیبت سے نجات دی ﴿۱۱۵﴾ اور ہم نے ان کی مدد کی تو وہی غالب ہوئے ﴿۱۱۶﴾ اور ہم نے ان دونوں کو نہایت واضح کتاب دی ﴿۱۱۷﴾ اور ہم نے ان دونوں کو سیدھے راستے پر چلایا ﴿۱۱۸﴾ اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں ان کے لیے یہ بات چھوڑی ﴿۱۱۹﴾ کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو ﴿۱۲۰﴾ بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ﴿۱۲۱﴾ بے شک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے ﴿۱۲۲﴾ اور بلاشبہ الیاس یقیناً رسولوں میں سے تھا ﴿۱۲۳﴾ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۱۲۴﴾ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور بنانے والوں میں سے سب سے بہتر کو چھوڑ دیتے ہو؟ ﴿۱۲۵﴾

**آیت 115** وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ : بہت بڑی مصیبت سے مراد فرعون کی غلامی، لڑکوں کا قتل اور عورتوں کا باقی رکھنا ہے۔ علاوہ ازیں سمندر میں غرق ہونے سے نجات بھی کرب عظیم سے نجات ہے۔

**آیت 116** وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ : "هُمْ" ضمیر جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ فرعون سے نجات اور اس پر اور اس کی آل یعنی قبطیوں پر فتح ونصرت صرف موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو نہیں بلکہ تمام بنی اسرائیل کو حاصل ہوئی۔

**آیت 117** وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ: "اَلْمُبِيْنُ" باب افعال سے اسم فاعل ہے، معنی ہے "واضح" اور "اَلْمُسْتَبِيْنَ" باب استفعال سے اسم فاعل ہے، اس میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ ہے، اس لیے ترجمہ "نہایت واضح" کیا گیا ہے، مراد تورات ہے۔

**آیت 115** وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ : صراط مستقیم کی ہدایت بہت بڑا احسان ہے، کیونکہ اسی پر نجاتِ اُخروی کا دارو مدار ہے۔

**آیت 119 تا 122** وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیات (۷۸ تا ۸۱)۔

**آیت 124.123** وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ...... "اَلَا تَتَّقُوْنَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ شعراء کی آیت (۱۰۶)۔

**آیت 125** ① اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا : قرآن کے متعدد مقامات پر لفظ "بَعْلًا" شوہر کے معنی میں آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ

اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

اللہ کو، جو تمھارا رب ہے اور تمھارے پہلے باپ دادا کا رب ہے ﴿۱۲۶﴾ تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، سو یقیناً وہ ضرور حاضر کیے جانے والے ہیں ﴿۱۲۷﴾ مگر اللہ کے وہ بندے جو چنے ہوئے ہیں ﴿۱۲۸﴾

(۲۲۸) اور نساء (۱۲۷) اس کا معنی مالک اور آقا بھی ہے۔ مشرک اقوام اس لفظ کو رب یا معبود کے معنی میں استعمال کرتی ہیں، اس لیے الیاس علیہ السلام کی قوم نے اپنے سب سے بڑے بت کا نام ''بعل'' رکھا ہوا تھا۔ الیاس علیہ السلام نے انھیں سمجھایا کہ کیا تم ''بعل'' نامی بت کو پوجتے ہو؟

② **وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ** : اور بنانے والوں میں سب سے بہتر یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہو۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اور بھی کوئی پیدا کرنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب پیدا کرنے والوں سے بہتر فرمایا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیاء کو جوڑ کر کوئی چیز بنانے پر بھی ''خلق'' کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً انسان لوہے وغیرہ سے مشینیں اور موٹریں وغیرہ بنا لیتا ہے، مگر ان سب میں وہ اللہ کے بنائے ہوئے مادے کا محتاج ہے۔ اس لیے اس کی بنائی ہوئی ہر چیز بھی اللہ ہی کی (خلق) پیدا کردہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [ الصافات : ۹٦ ] ''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔'' البتہ ابتدا میں کسی چیز کو پیدا کرنا یا چیزیں جوڑ کر ان میں روح ڈال دینا صرف اس پاک پروردگار کا کام ہے۔ (دیکھیے حج : ۷۳) اس لیے اسے ''اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ'' فرمایا۔

**آیت 126** **اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ** ...... : الیاس علیہ السلام نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کروائی کہ یہ بعل دیوتا کا بت تو تم نے خود گھڑا ہے، یہ بے جان بت ہے، جس کے خالق تم خود ہو۔ اس کی حفاظت بھی تم ہی کرتے ہو، پھر اس کی عبادت بھی کرنے لگتے ہو۔ تمھیں تو لازم تھا کہ اس کی عبادت کرتے جس نے تمھیں بنایا ہے، پھر تمھیں صرف بنایا ہی نہیں بلکہ تمھاری پرورش بھی کرتا ہے، تمھارے آبا و اجداد کا بھی وہی خالق و رازق ہے۔ ایسے بہترین خالق کو چھوڑ کر اپنے گھڑے ہوئے بے جان بت کے سامنے سربسجود ہوتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی!؟ (کیلانی)

**آیت 127** **فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ** : یعنی وہ جھٹلانے کی پاداش میں جہنم میں حاضر کیے جانے والے ہیں، جہاں انھیں جھٹلانے کی سزا مل کر رہے گی۔

**آیت 128** **اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ** : یعنی الیاس علیہ السلام کی ساری قوم نے انھیں جھٹلایا، مگر اللہ کے چنے ہوئے بندوں نے نہیں جھٹلایا، بلکہ وہ ان پر ایمان لے آئے، اس لیے وہ عذاب سے محفوظ رہے اور رہیں گے۔

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۖ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۖ ﴿۱۳۷﴾ وَ بِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۖ ﴿۱۴۰﴾

اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں اس کے لیے یہ بات چھوڑ دی ﴿۱۲۹﴾ کہ سلام ہو الیاسین پر ﴿۱۳۰﴾ بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ﴿۱۳۱﴾ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا ﴿۱۳۲﴾ اور بلاشبہ لوط یقیناً رسولوں میں سے تھا ﴿۱۳۳﴾ جب ہم نے اسے اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی ﴿۱۳۴﴾ سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی ﴿۱۳۵﴾ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا ﴿۱۳۶﴾ اور بلاشبہ تم یقیناً صبح جاتے ہوئے ان پر سے گزرتے ہو ﴿۱۳۷﴾ اور رات کو بھی۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ ﴿۱۳۸﴾ اور بلاشبہ یونس یقیناً رسولوں میں سے تھا ﴿۱۳۹﴾ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر گیا ﴿۱۴۰﴾

---

**آیت 129 تا 132** وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ...... : ان آیات کی تفسیر پیچھے آیات (۷۸ تا ۸۱) کے تحت گزر چکی ہے۔ ”اِلْ يَاسِيْنَ“ الیاس علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، جیسے ایک ہی پہاڑ کو قرآن میں ”طور سینا“ بھی کہا گیا ہے اور ”طور سینین“ بھی۔

**آیت 133 تا 136** وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۷۷ تا ۸۳) اور سورۂ حجر (۵۷ تا ۷۷)۔

**آیت 137، 138** وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ...... : یعنی تم تجارت کے لیے شام و فلسطین کی طرف جاتے اور آتے ہوئے دن رات اور صبح و شام قوم لوط کی تباہ شدہ بستیوں کے پاس سے گزرتے ہو، تو کیا تم عقل نہیں کرتے اور تمھیں ان کے انجام سے عبرت نہیں ہوتی؟

**آیت 139** وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ : ان کا نام حدیث میں یونس بن مَتّٰی آیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَنْبَغِيْ لِعَبْدٍ أَنْ يَقُوْلَ أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالٰى : ﴿ و إن يونس لمن المرسلين ﴾ : ۳۴۱۶ ] ”کسی بندے کے لائق نہیں کہ وہ کہے کہ میں یونس بن متّٰی سے بہتر ہوں۔“

**آیت 140** ① اِذْ اَبَقَ : ”أَبَقَ (ض، ن، س) إِبَاقًا وَ أَبْقًا وَ أَبَقًا، الْعَبْدُ“ غلام کے اپنے مالک کے پاس سے بھاگ جانے کو کہتے ہیں۔ یونس علیہ السلام چونکہ اپنے مالک (اللہ تعالیٰ) کے حکم کا انتظار کیے بغیر اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، اس لیے

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾

پھر وہ قرعہ میں شریک ہوا تو ہارنے والوں میں سے ہو گیا ﴿۱۴۱﴾ پھر مچھلی نے اسے نگل لیا، اس حال میں کہ وہ مستحق ملامت تھا ﴿۱۴۲﴾

ان کے جانے کے لیے " اَبَقَ " کا لفظ استعمال کیا گیا۔ یونس علیہ السلام اپنی قوم کو کب اور کیوں چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ اس کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۹۸) اور سورۂ انبیاء (۸۷)۔

2 اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ : بھری ہوئی کشتی سے مراد سامان اور مسافروں سے بھری ہوئی کشتی ہے۔

**آیت 141** 1 فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ: "سَاهَمَ" (مفاعلہ) قرعہ میں حصہ لینا۔ "الْمُدْحَضِيْنَ" "أَدْحَضَ يُدْحِضُ" (افعال) میں سے اسم مفعول ہے، پھسلانا، باطل کرنا۔ ان آیات سے واقعہ کی یہ صورت سمجھ میں آتی ہے کہ یونس علیہ السلام جس کشتی میں سوار ہوئے وہ اپنی گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ دوران سفر طوفان یا کسی خطرے کی صورت میں زائد بوجھ کم کرنے کے لیے پہلے سامان سمندر میں پھینکا جاتا ہے، اس کے بعد بھی اگر خطرہ باقی رہے تو کچھ آدمیوں کو پھینک دیا جاتا ہے، تاکہ سب لوگ غرق نہ ہوں۔ یونس علیہ السلام جس کشتی میں سوار ہوئے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ قرعہ ڈالا جائے اور جن لوگوں کا نام پھینکنے کے لیے نکلے، انھیں سمندر میں پھینک دیا جائے۔ قرعہ ڈالا گیا تو یونس علیہ السلام کا نام بھی ان لوگوں میں نکلا جو سمندر میں پھینکے جانے والے تھے۔ "فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ" (تو وہ قرعہ ہارنے والوں یا پھسلائے گئے آدمیوں میں سے ہو گیا) کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ قرعہ میں یونس علیہ السلام کے ساتھ اور لوگوں کا نام بھی نکلا، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ مختصر یہ کہ سب کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا۔

2 اس مقام پر بعض تفاسیر میں لکھا ہے: ''جب یونس علیہ السلام کشتی میں سوار ہو گئے اور کشتی گہرے پانی میں پہنچی تو آگے بڑھنے کے بجائے چکر کھانے لگی۔ کشتی والوں نے کشتی میں سوار لوگوں سے کہا کہ ایسا معاملہ ہمیں اس وقت پیش آتا ہے جب کوئی بھاگا ہوا غلام کشتی میں سوار ہو۔ انھوں نے قرعہ ڈالا کہ جس کا نام قرعہ میں نکلے اسے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ تین بار قرعہ ڈالا گیا، لیکن وہ ہر بار یونس علیہ السلام ہی کے نام پر نکلا۔ بار بار قرعہ اس لیے ڈالا گیا کہ وہ لوگ یونس علیہ السلام کی نیکی دیکھ کر انھیں سمندر میں پھینکنا نہیں چاہتے تھے۔ جب تین بار قرعہ انھی کے نام پر نکلا تو وہ خود ہی یہ کہہ کر سمندر میں کودنے کے لیے تیار ہو گئے کہ وہ بھاگا ہوا غلام میں ہوں۔'' اس حکایت میں وہ باتیں ہیں جو قرآن و حدیث میں نہیں ہیں اور نہ ہی کسی معتبر ذریعے سے ثابت ہیں، اس لیے ان کا اعتبار مشکل ہے۔

**آیت 142** فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ : "الْحُوْتُ" مچھلی۔ اکثر بڑی مچھلی کو "حُوت" کہا جاتا ہے۔ "مُلِيْمٌ" "أَلَامَ يُلِيْمُ" (افعال) ملامت والا کام کرنا، ملامت کا مستحق ہونا۔ "مُلِيْمٌ" ملامت کا مستحق، خواہ اسے ملامت کی جائے یا نہ کی جائے۔ جب یونس علیہ السلام کو سمندر میں پھینکا گیا تو اللہ کے حکم سے ایک بڑی مچھلی نے انھیں سالم نگل لیا۔ مستحق ملامت اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ

فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

پھر اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ تسبیح کرنے والوں سے تھا ﴿۱۴۳﴾ تو یقیناً اس کے پیٹ میں اس دن تک رہتا جس میں لوگ اٹھائے جائیں گے ﴿۱۴۴﴾ پھر ہم نے اسے چٹیل میدان میں پھینک دیا، اس حال میں کہ وہ بیمار تھا ﴿۱۴۵﴾

---

کی اجازت کے بغیر قوم سے نکل آئے تھے۔

**آیت 144،143** ① فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ...... : ''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ تسبیح کرنے والوں میں سے تھا'' میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک تو یہ کہ وہ اس سے پہلے بھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور اس کا ذکر کرنے والے تھے اور دوسری یہ کہ اس وقت بھی انھوں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہوئے کہا: ﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [ الأنبياء : ۸۷ ] ''تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں۔'' اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو وہیں فوت ہو جاتے اور مچھلی کا پیٹ ہی ان کی قبر بن جاتا۔

② اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مصیبت کے وقت پکارنے پر مدد فرماتا ہے، خوش حالی میں اپنی تسبیح اور ذکر کرنے والوں کا مصیبت میں زیادہ خیال رکھتا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لڑکے! میں تمھیں چند باتیں نہ سکھاؤں جن کے ساتھ تمھیں اللہ تعالیٰ نفع دے گا؟'' میں نے کہا: ''کیوں نہیں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ أَمَامَكَ، تَعَرَّفْ إِلَيْهِ فِي الرَّخَاءِ، يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ )) [ مسند أحمد : ۱/۳۰۷، ح : ۲۸۰۷، قال المحقق حديث صحيح ] ''اللہ کا دھیان رکھ، وہ تیرا دھیان رکھے گا۔ اللہ کا دھیان رکھ تو اسے اپنے سامنے پائے گا۔ خوش حالی میں اس سے جان پہچان رکھ، وہ سختی میں تیری پہچان رکھے گا۔'' جو خوش حالی میں ایمان نہ لائے اور اللہ تعالیٰ کو یاد نہ رکھے سختی میں اس کا ایمان اور اس کی فریاد کام نہیں دیتی، جیسا کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت کہا: ﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ﴾ [ يونس : ۹۰ ] ''میں ایمان لایا کہ حق یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔'' تو اسے کہا گیا: ﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ [ يونس : ۹۱ ] ''کیا اب؟ حالانکہ بے شک تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں سے تھا۔''

**آیت 145** فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ : ''اَلْعَرَآءُ'' چٹیل میدان، جس میں کوئی درخت اور سائے کی چیز نہ ہو۔ مچھلی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انھیں سمندر سے باہر ایک چٹیل میدان میں اسی طرح صحیح سالم اگل دیا جس طرح نگلا تھا، مگر مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کی جلد نہایت نرم و نازک ہو گئی تھی اور وہ اس وقت سخت کمزور اور بیمار تھے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے خاص احسان سے توبہ کی قبولیت کی وجہ سے ان کا مرتبہ پہلے سے بلند ہو چکا تھا۔ دیکھیے سورۂ قلم (۵۰،۴۹) یونس علیہ السلام مچھلی کے

وَ اَنۡۢبَتۡنَا عَلَیۡہِ شَجَرَۃً مِّنۡ یَّقۡطِیۡنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَ اَرۡسَلۡنٰہُ اِلٰی مِائَۃِ اَلۡفٍ اَوۡ یَزِیۡدُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوۡا فَمَتَّعۡنٰہُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۱۴۸﴾ فَاسۡتَفۡتِہِمۡ اَلِرَبِّکَ الۡبَنَاتُ وَ لَہُمُ الۡبَنُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾

اور ہم نے اس پر ایک بیل دار پودا اگا دیا ﴿۱۴۶﴾ اور اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا، بلکہ وہ زیادہ ہوں گے ﴿۱۴۷﴾ پس وہ ایمان لے آئے تو ہم نے انھیں ایک وقت تک فائدہ دیا ﴿۱۴۸﴾ پس ان سے پوچھ کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے؟ ﴿۱۴۹﴾

---

پیٹ میں کتنے دن رہے، تھوڑی دیر رہے یا تین دن یا سات دن یا چالیس دن، جیسا کہ مفسرین کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان نہیں فرمائی، کیونکہ جتنی مدت بھی رہے ہوں، تھوڑی ہو یا زیادہ، مچھلی کے پیٹ میں ان کا زندہ رہ جانا اور صحیح سلامت نکل آنا ہی بہت بڑا معجزہ ہے۔

**آیت 146** وَ اَنۡۢبَتۡنَا عَلَیۡہِ شَجَرَۃً مِّنۡ یَّقۡطِیۡنٍ : ”قَطَنَ بِالْمَکَانِ“ (ن) کسی جگہ اقامت اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ ”یَقْطِیْنٍ“ اس میں سے ”یَفْعِیْلٌ“ کے وزن پر ہے۔ یہ لفظ ہر ایسے پودے پر بولا جاتا ہے جس کا تنا نہ ہو، مثلاً کدو، ککڑی، تربوز اور خربوزہ وغیرہ۔ زیادہ تر میٹھے کدو کو ”یَقْطِیْنٍ“ کہتے ہیں، کیونکہ وہ زمین پر پڑا رہتا ہے۔ ”عَلَیْہِ“ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بیل کا تنا معجزانہ طور پر اونچا کر دیا، جس سے یونس علیہ السلام پر سایہ ہو گیا، یا وہ بیل کسی اور بلند چیز پر چڑھ کر انھیں سایہ اور غذا مہیا کرتی رہی۔

**آیت 147** وَ اَرۡسَلۡنٰہُ اِلٰی مِائَۃِ اَلۡفٍ اَوۡ یَزِیۡدُوۡنَ : تندرست ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں پھر ایک لاکھ یا اس سے زیادہ افراد پر مشتمل آبادی کی طرف پیغامِ حق پہنچانے کے لیے بھیج دیا۔ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ وہی آبادی تھی جہاں سے وہ ناراض ہو کر گئے تھے اور جن کی توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے محفوظ رکھا تھا۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں جو لفظ ”اَوْ“ استعمال فرمایا ہے کہ ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا ”یا“ وہ زیادہ ہوں گے، یہ لفظ تو شک کے لیے استعمال ہوتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کے لیے شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ دیکھنے والوں کے لحاظ سے ہے کہ اگر کوئی انھیں دیکھے تو کہے گا کہ ایک لاکھ ہیں یا اس سے زیادہ ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ”اَوْ“ بمعنی ”بَلْ“ ہے، اور اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے ”بلکہ وہ زیادہ ہوں گے۔“

**آیت 148** ① فَاٰمَنُوۡا : شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”وہی قوم جس سے بھاگے تھے، ان پر ایمان لا رہی تھی۔ (وہ انھیں) ڈھونڈتی تھی کہ یہ جا پہنچے، (اس سے) ان کو بڑی خوشی ہوئی۔“ (موضح)

② فَمَتَّعۡنٰہُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ : یعنی انھیں عذاب سے بیک وقت ہلاک کرنے کے بجائے ہر ایک کو اس کی مقررہ عمر تک فائدہ اٹھانے کا موقع عطا فرمایا۔

**آیت 149** فَاسۡتَفۡتِہِمۡ اَلِرَبِّکَ الۡبَنَاتُ...... : پچھلی آیات کے ساتھ ان آیات کی مناسبت یہ ہے کہ مشرکین کے بدترین

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

یا ہم نے فرشتوں کو مؤنث پیدا کیا، جب کہ وہ حاضر تھے ﴿۱۵۰﴾ سن لو! بے شک وہ یقیناً اپنے جھوٹ ہی سے کہتے ہیں ﴿۱۵۱﴾ کہ اللہ نے اولاد جنی اور بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں ﴿۱۵۲﴾

عقائد میں سے ایک قیامت کا انکار تھا اور ایک شرک تھا، جس کی ایک صورت فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دے کر ان کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنا تھی۔ قرآن میں متعدد مقامات پر ان کے اس عقیدے کا ذکر کر کے اس کی تردید کی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۷)، نحل (۵۷، ۵۸)، بنی اسرائیل (۴۰)، زخرف (۱۶ تا ۱۹) اور نجم (۲۱ تا ۲۷) یہاں سورت کے شروع میں ان کے انکارِ قیامت پر فرمایا: ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ [ الصافات : ۱۱ ] ”سو ان سے پوچھ کیا یہ پیدا کرنے کے اعتبار سے زیادہ مشکل ہیں، یا وہ جنھیں ہم نے پیدا کیا؟ بے شک ہم نے انھیں ایک چپکتے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے۔“

اب دوسرے عقیدے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ﴾ ”پس ان سے پوچھ کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے؟“ زمخشری نے فرمایا: ”اس کا عطف سورت کے شروع میں ”فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا“ پر ہے، اگرچہ ان کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔“ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہوئے وہ تین ظلم کر رہے تھے، ایک یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رہے تھے، حالانکہ وہ اس سے پاک ہے، کیونکہ یہ عجز اور محتاجی کی دلیل ہے۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں قرار دیں، جب کہ اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ انھوں نے اللہ کے مقرب فرشتوں کو مؤنث قرار دیا، حالانکہ وہ مذکر و مؤنث کی تفریق سے پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب باتوں پر ان کا رد فرمایا اور سخت غصے کا اظہار فرمایا، چنانچہ فرمایا: ”ان سے پوچھو کہ کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں اور ان کے لیے بیٹے ہیں؟“ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ بیٹی کی خبر پر ان کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور اسے زندہ درگور کرنے کی فکر کرنے لگتے ہیں اور اپنے لیے اتنی ناگوار بات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔

**آیت 150** اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ : اس میں فرشتوں کے مؤنث ہونے کی تردید فرمائی کہ انھیں کیسے معلوم ہوا کہ فرشتے مؤنث ہیں، کیا جب ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تو یہ موجود تھے کہ انھوں نے دیکھا ہو کہ ہم نے انھیں مؤنث بنایا ہے؟

**آیت 152،151** اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ …… : فرمایا، سن لو! ان کا یہ کہنا کہ اللہ نے اولاد جنی ہے صاف بہتان ہے اور یہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

اَصۡطَفَى الۡبَنَاتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمۡ لَكُمۡ سُلۡطٰنٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاۡتُوۡا بِكِتٰبِكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۵۷﴾ وَجَعَلُوۡا بَيۡنَهٗ وَبَيۡنَ الۡجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدۡ عَلِمَتِ الۡجِنَّةُ اِنَّهُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

کیا اس نے بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دی؟ ﴿۱۵۳﴾ کیا ہے تمھیں، تم کیسا فیصلہ کر رہے ہو؟ ﴿۱۵۴﴾ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ﴿۱۵۵﴾ یا تمھارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ ﴿۱۵۶﴾ تو لاؤ اپنی کتاب، اگر تم سچے ہو ﴿۱۵۷﴾ اور انھوں نے اس کے درمیان اور جنّوں کے درمیان رشتہ داری بنا دی، حالانکہ بلاشبہ یقیناً جنّ جان چکے ہیں کہ بے شک وہ ضرور حاضر کیے جانے والے ہیں ﴿۱۵۸﴾

**آیت 153 تا 155** اَصۡطَفَى الۡبَنَاتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ ...... : ”اَصۡطَفَى“ اصل میں ”أَ اِصۡطَفٰى“ تھا، ہمزہ استفہام آنے کے بعد ہمزہ وصلی حذف کر دیا۔ ”تَذَكَّرُوۡنَ“ اصل میں ”تَتَذَكَّرُوۡنَ“ ہے۔

**آیت 156، 157** اَمۡ لَكُمۡ سُلۡطٰنٌ مُّبِيۡنٌ ...... : دعوے کو ثابت کرنے کے لیے یا عینی شہادت ہوتی ہے یا کوئی نقلی دلیل۔ عینی شہادت کا رد یہ کہہ کر فرمایا کہ جب ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تو کیا تم موجود تھے؟ ظاہر ہے موجود نہیں تھے۔ اب کسی معتبر نقلی دلیل کا مطالبہ فرمایا کہ کیا تمھارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی کتاب ہے جس میں لکھا ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں؟ جب یہ بھی نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ تمھارے عقائد من گھڑت اور جھوٹ ہیں۔

**آیت 158** ① وَجَعَلُوۡا بَيۡنَهٗ وَبَيۡنَ الۡجِنَّةِ نَسَبًا ...... : اللہ تعالیٰ اور جنّوں کے درمیان نسب بنانے سے کیا مراد ہے؟ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں دو قول ذکر کیے ہیں، پہلا مجاہد کا قول کہ مشرکین نے کہا، فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا، تو ان کی مائیں کون ہیں؟ انھوں نے کہا ”بَنَاتُ سَرَوَاتِ الْجِنِّ“ ”سردار جنیوں کی بیٹیاں۔“ مگر اس تفسیر میں اللہ تعالیٰ اور جنّوں کے درمیان نسبی رشتہ قائم نہیں ہوتا، بلکہ صہری یعنی سسرالی رشتہ قائم ہوتا ہے، کیونکہ جنیوں کی بیٹیاں (نعوذ باللہ) اللہ کی بیویاں ہوں تو جنّ سسر ہوں گے۔ علاوہ ازیں مجاہد کی ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات بھی نہیں، اس لیے یہ منقطع ہے۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نقل کیا ہے کہ اللہ کے ان دشمنوں نے اللہ تعالیٰ اور ابلیس کو دو بھائی قرار دیا۔ مفسرین نے اس تشریح میں فرمایا کہ یہ ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ خالق دو ہیں، ایک خالق خیر، جسے ”یزداں“ کہتے ہیں اور ایک خالقِ شر، جسے ”اہرمن“ کہتے ہیں۔ مگر اس تفسیر میں بھی دو خرابیاں ہیں، ایک تو اس کی سند ثابت نہیں، کیونکہ یہ طبری نے عوفی عن ابن عباس کے طریق سے بیان کی ہے، جو ضعیف ہے، دوسرے اس میں اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے درمیان بھائی ہونے کے رشتے کا بیان ہے، جب کہ آیت میں عام جنّوں کا ذکر ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں ”الۡجِنَّةِ“ سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ جنّات کو ان کے چھپے ہوئے ہونے کی وجہ سے

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾

اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۱۵۹﴾ مگر اللہ کے وہ بندے جو چنے ہوئے ہیں ﴿۱۶۰﴾ پس بلاشبہ تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو ﴿۱۶۱﴾ تم اس کے خلاف بہکانے والے نہیں ﴿۱۶۲﴾ مگر اس کو جو بھڑکتی آگ میں داخل ہونے والا ہے ﴿۱۶۳﴾

---

''جنّ'' کہتے ہیں، جیسا کہ جنین، جنون وغیرہ الفاظ میں یہی مفہوم پایا جاتا ہے اور فرشتے بھی چھپے ہوتے ہیں، اس لیے یہاں مراد یہ ہے کہ انھوں نے فرشتوں اور اللہ کے درمیان نسبی رشتہ قرار دیا ہے، اس طرح کہ انھیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ مگر اس میں بھی دو خرابیاں ہیں، ایک تو فرشتوں کو ''جنّ'' کہنا بہت بڑا تکلف ہے، کیونکہ جنّ آگ سے پیدا ہوئے ہیں اور فرشتے نور سے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ بات تو اوپر آیت (۱۵۳) میں گزر چکی ہے: ﴿ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴾ اسے بلاضرورت دوبارہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ میں نے اس مسئلے میں بہت سی تفاسیر کا مطالعہ کیا، سب کا خلاصہ یہ ہے جو میں نے اوپر بیان کر دیا۔ آخر میں مجھے مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر سے اطمینان ہوا، وہ یہ کہ مشرکین جس طرح فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے جنّوں کو اللہ کے بیٹے (یا اولاد) کہتے تھے۔ دلیل اس کی اللہ تعالیٰ کا یہی فرمان ہے کہ انھوں نے اللہ کے درمیان اور جنّوں کے درمیان نسب قرار دیا۔ ظاہر ہے نسب کا اطلاق سب سے پہلے بیٹوں اور بیٹیوں پر ہوتا ہے۔ مشرکوں سے یہ بات کچھ بعید نہیں اور اللہ سے زیادہ سچا راوی کون ہو سکتا ہے؟ (واللہ اعلم)

**②** **وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ :** ''مُحْضَرُوْنَ'' (حاضر کیے گئے) انھی کے متعلق کہا جاتا ہے جو خود آنا نہ چاہتے ہوں۔ یعنی یقیناً جنّوں کو معلوم ہے کہ وہ حساب کے لیے حاضر کیے جانے والے ہیں۔ کیا باپ کا اولاد کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے؟

**آیت 159** **سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ :** یعنی اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے پاک ہے جو یہ مشرکین بیان کرتے ہیں۔

**آیت 160** **اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ :** اس کی دو توجیہیں ہیں اور دونوں بیک وقت بھی مراد ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ کے مخلص بندے ایسی باتیں نہیں کہتے، یہ مشرکین ہی کا شیوہ ہے۔ دوسری یہ کہ جنّ جانتے ہیں کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی حاضر کیے جانے والے ہیں، مگر اللہ کے وہ بندے جو چنے ہوئے ہیں، جنّ ہوں یا انسان، وہ اس گرفتاری سے آزاد رہیں گے، کیونکہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت تیار کر رکھی ہے۔ وہ نہایت اعزاز کے ساتھ بلائے جائیں گے۔

**آیت 161 تا 163** **فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ...... :** ''عَلَيْهِ'' میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے۔ ''فَاتِنِيْنَ'' فتنے میں ڈالنے والے، بہکانے والے۔ ''صَالِ'' صَلِيَ يَصْلٰى صِلِيًّا'' (س) (داخل ہونا) سے اسم فاعل ہے۔ یعنی اے گروہ کفار و مشرکین! تم اور تمھارے باطل معبود کسی کو اللہ تعالیٰ کے خلاف بہکا کر گمراہ نہیں کر سکتے، سوائے اس کے جس نے خود ہی جہنم

وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۱۶۴ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝۱۶۵ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۝۱۶۶

اور ہم میں سے جو بھی ہے اس کی ایک مقرر جگہ ہے ۝۱۶۴ اور بلاشبہ ہم، یقیناً ہم صف باندھنے والے ہیں ۝۱۶۵ اور بلاشبہ ہم، یقیناً ہم تسبیح کرنے والے ہیں ۝۱۶۶

میں جانے کا تہیہ کر رکھا ہو۔ اس کے مخلص بندوں کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''یعنی تم انسان اور تمھارے شیطان اللہ کی مرضی کے بغیر گمراہ نہیں کر سکتے، گمراہ وہی ہوگا جس کو اس نے دوزخی لکھ دیا۔'' (موضح)

**آیت 164** وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زبانی ان کا اعتراف ذکر فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد نہیں بلکہ اس کے کامل اطاعت گزار بندے اور ہر وقت اس کی عبادت اور تسبیح کرنے والے ہیں۔ یعنی تمھارے اس شرکیہ عقیدے کے مقابلے میں فرشتوں کا اپنا بیان یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک فرشتے کا ایک مقرر درجہ اور مقام ہے، جس سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنِّي أَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ وَأَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ، أَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ مَا فِيْهَا مَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلَّا وَمَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهُ سَاجِدًا لِلّٰهِ، وَاللّٰهِ! لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا )) [ ترمذي، الزهد، باب قول النبي ﷺ لو تعلمون ما أعلم...... : ۲۳۱۲، و صححه الألباني، أنظر تراجعات الألباني، ح : ۳۳ ] ''میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چر چرا رہا ہے اور اس کا حق ہے کہ چر چرائے۔ اس میں چار انگلیوں کے برابر جگہ نہیں مگر کوئی نہ کوئی فرشتہ اس میں اپنی پیشانی اللہ کے لیے سجدے میں رکھے ہوئے ہے۔ قسم ہے اللہ کی! اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔''

**آیت 165** وَ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ : اور ہم سب اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے صفیں بنانے والے ہیں۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَلَا تَصُفُّوْنَ كَمَا تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا؟ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا؟ قَالَ يُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْأُوَلَ، وَيَتَرَاصُّوْنَ فِي الصَّفِّ )) [ مسلم، الصلاة، باب الأمر بالسكون في الصلاة...... : ۴۳۰۔ أبوداؤد : ۶۶۱ ] ''تم لوگ اس طرح صفیں کیوں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس صفیں بناتے ہیں؟'' ہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! فرشتے اپنے رب کے پاس کس طرح صفیں بناتے ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ (پہلے) پہلی صفیں مکمل کرتے ہیں اور صفوں میں چونا گچ ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔''

**آیت 166** وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ : اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۱۹، ۲۰ ] ''اور اسی کا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اس کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔ وہ رات اور دن

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

اور بے شک وہ (کافر) تو کہا کرتے تھے ﴿۱۶۷﴾ اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی کوئی نصیحت ہوتی ﴿۱۶۸﴾ تو ہم ضرور اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے ﴿۱۶۹﴾ تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، سو جلد ہی جان لیں گے ﴿۱۷۰﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے بندوں کے لیے ہماری بات پہلے طے ہو چکی ﴿۱۷۱﴾ کہ بے شک وہ، یقیناً وہی ہیں جن کی مدد کی جائے گی ﴿۱۷۲﴾ اور بے شک ہمارا لشکر، یقیناً وہی غالب آنے والا ہے ﴿۱۷۳﴾

---

تسبیح کرتے ہیں، وقفہ نہیں کرتے۔“

**آیت 167 تا 170** ”وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ“ اصل میں ”وَ اِنَّهُمْ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ“ تھا۔ دلیل اس کی ”لَيَقُوْلُوْنَ“ پر آنے والا لام ہے، جس کی وجہ سے ”اِنَّ“ کو ”اِنْ“ کر دیا اور ”هُمْ“ کو حذف کر دیا۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ فاطر (۴۲) اور سورۂ انعام (۱۵۶، ۱۵۷) یعنی یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ گزشتہ لوگوں کی طرح ہمارے پاس کوئی پیغمبر آتا، یا ہم پر اللہ کی طرف سے کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے۔ مگر جب یہ کتاب ان کے پاس آ گئی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اس انکار کا نتیجہ وہ بہت جلدی جان لیں گے۔

**آیت 171 تا 173** ① **وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا**...... : پچھلی آیت میں کفار کو ان کے انکار کا نتیجہ بہت جلدی دیکھ لینے کی دھمکی دی تھی، اب رسول اللہ ﷺ کو حوصلہ اور تسلی دینے کے لیے فرمایا کہ ہمارے ان بندوں کے لیے، جنھیں ہم اپنا رسول بنا کر بھیجتے ہیں، ہماری یہ بات پہلے طے ہو چکی ہے کہ انھی کی مدد کی جائے گی اور صرف انھی کی نہیں بلکہ ان کے اور ان کے پیروکاروں کی صورت میں ہمارا جو بھی لشکر ہو گا وہی غالب رہیں گے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [ المجادلة : ۲۱ ] ”اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول، یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [ المؤمن : ۵۱ ] ”بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔“

② **اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ** : اس آیت میں صرف اللہ کے رسولوں کے منصور ہونے کی تاکید کئی طرح سے فرمائی ہے، پہلے ضمیر ”هُمْ“ کی تاکید دوبارہ ”هُمْ“ لا کر فرمائی، پھر اس پر ”لام“ کے ساتھ مزید تاکید فرمائی، پھر خبر پر الف لام لا کر ”الْمَنْصُوْرُوْنَ“ فرمایا، اس سے بھی کلام میں حصر پیدا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر حال میں انھی کی نصرت ہو گی، ان کے مقابلے میں دوسروں کی نہیں اور ہر حال میں رسول اور ان کے پیروکار ہی غالب رہیں گے۔

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ حَتّٰى حِيۡنٍۙ ﴿۱۷۴﴾ وَّ اَبۡصِرۡهُمۡ فَسَوۡفَ يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷۵﴾

سو ایک وقت تک ان سے منہ موڑ لے ﴿۱۷۴﴾ اور انھیں دیکھ، پس وہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے ﴿۱۷۵﴾

❸ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات انبیاء اور اہل ایمان پر کفار بھی غالب آ جاتے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں ابوسفیان سے ہرقل کا سوال مذکور ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس آدمی سے کبھی تمھاری جنگ بھی ہوئی ہے، اگر ہوئی ہے تو اس کا نتیجہ کیا رہا؟ تو اس نے جواب دیا: (( كَانَتْ دُوَلًا وَ سِجَالًا ، يُدَالُ عَلَيْنَا الْمَرَّةَ وَنُدَالُ عَلَيْهِ الْأُخْرٰى )) ''جنگ باریوں کی صورت میں رہی، کبھی وہ ہم پر غالب رہا اور کبھی ہم اس پر غالب رہے۔'' اس سوال کا بہترین جواب تو وہ ہے جو ہرقل نے تمام سوالوں کا جواب سننے کے بعد اپنے تبصرے میں دیا، اس نے کہا: (( وَ سَأَلْتُكَ هَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ وَ قَاتَلَكُمْ فَزَعَمْتَ أَنْ قَدْ فَعَلَ ، وَ أَنَّ حَرْبَكُمْ وَ حَرْبَهُ تَكُوْنُ دُوَلًا ، وَ يُدَالُ عَلَيْكُمُ الْمَرَّةَ وَ تُدَالُوْنَ عَلَيْهِ الْأُخْرٰى ، وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْتَلٰى ، وَ تَكُوْنُ لَهَا الْعَاقِبَةُ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب دعاء النبي ﷺ إلى الإسلام والنبوة ...... : ۲۹٤۱، ٤٥٥٣، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ] ''اور میں نے تم سے پوچھا کہ کیا تم نے اس سے اور اس نے تم سے جنگ کی ہے، تو تم نے بتایا کہ ہاں کی ہے اور تمھاری اور اس کی لڑائی باریوں کی صورت میں رہی، کسی بار وہ تم پر غالب آتا رہا اور کسی دوسری بار تم غالب آتے رہے اور رسولوں کی اسی طرح آزمائش کی جاتی ہے اور آخری نتیجہ انھی کے حق میں ہوتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ نصرت و غلبہ دنیا میں بعض اوقات دلیل اور حجت کے لحاظ سے ہوتا ہے، بعض اوقات فتح اور حکومت ملنے کے ساتھ اور کبھی اپنے موقف پر ثابت اور قائم رہنے کے ساتھ۔ چنانچہ اگر مومن بعض اوقات اپنے دنیوی حالات کی کمزوری کی وجہ سے مغلوب ہو جائے تب بھی دلیل میں اور اپنے ایمان پر ثابت رہنے کی وجہ سے غالب وہی ہے اور آخری نتیجہ اسی کے حق میں ہوگا، جیسا کہ ہرقل نے کہا۔ وہ شہید بھی ہو جائے تو ہمیشہ نعمت کی زندگی کے حصول میں کامیاب ہو گیا اور یقیناً ایک وقت آنے والا ہے جب اہل ایمان کی کفار پر برتری سامنے آ جائے گی، فرمایا: ﴿ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۙ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ؕ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ [ المطففين : ۳٤ تا ۳٦ ] ''سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں۔ تختوں پر (بیٹھے) نظارہ کر رہے ہیں۔ کیا کافروں کو اس کا بدلا دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟'' اور اللہ تعالیٰ نے بھی دنیا اور آخرت دونوں کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [ المؤمن : ٥١ ] ''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔'' رہا دنیا میں مسلمانوں کا بعض اوقات شکست سے دوچار ہونا، تو جیسا کہ ہرقل نے کہا، یہ اللہ تعالیٰ کی ابتلا اور آزمائش کی حکمت کی وجہ سے ہے۔ اگر دنیا میں ہمیشہ مسلمان ہی فتح یاب ہوں تو امتحان کا معاملہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۴)، آل عمران (۱۴۲) اور سورۂ توبہ (۱۶)۔

**آیت 175،174** فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ حَتّٰى حِيۡنٍ ...... : ''ایک وقت'' سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک ہم آپ کو جنگ کی

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾

تو کیا وہ ہمارا عذاب جلدی مانگتے ہیں؟ ﴿۱۷۶﴾ پھر جب وہ ان کے صحن میں اترے گا تو ڈرائے گئے لوگوں کی صبح بری ہوگی ﴿۱۷۷﴾

---

اجازت نہیں دیتے آپ انھیں ان کے حال پر چھوڑے رکھیں، بس زبانی طور پر دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہیں اور انھیں دیکھتے جائیں، بہت جلد یہ اپنا انجام دیکھ لیں گے۔ یاد رہے، یہ آیات مکی دور کی ہیں۔ اور ''ایک وقت'' سے ''یوم بدر'' بھی مراد ہو سکتا ہے اور فتح مکہ بھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہجرت کے بعد جب جہاد شروع ہوا تو کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ کفار نے اپنی شکست اور مسلمانوں کی فتح کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور ان آیات کے اترنے کے بعد چودہ، پندرہ سال ہی گزرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ جس مکہ سے چھپ کر نکلے تھے، اسی مکہ میں دن کی روشنی میں دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ فاتحانہ شان سے داخل ہوئے اور کوئی مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ پھر چند سال بعد ہی ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمان صرف عرب ہی نہیں بلکہ روم، مصر اور ایران وغیرہ پر بھی غالب آ گئے۔

**آیت 176** **اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ:** قرآن مجید میں کفار کو جب بھی عذاب کی دھمکی دی جاتی وہ جھٹلانے کے لیے اسے فوراً لانے کا مطالبہ کرتے، جیسا کہ سورۂ یونس میں ہے: ﴿ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ یونس : ۴۸ ] ''یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو؟'' بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے کہ اگر اسلام واقعی اس کی طرف سے حق ہے تو وہ ان پر پتھر برسائے یا عذاب الیم لے آئے۔ (دیکھیے سورۂ انفال: ۳۲) اس لیے فرمایا کہ پھر کیا یہ لوگ سرکشی اور جہالت میں اس حد تک پہنچ گئے اور اس قدر بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہمارا عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

**آیت 177** **فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ ......** : یعنی یہ عذاب ہر حال میں ان پر آ کر رہے گا۔ پھر جب وہ ان کے صحن میں اتر آیا تو جن لوگوں کو عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اور وہ جھٹلا رہے ہیں ان کی صبح بری ہوگی۔ صبح کا لفظ خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا کہ عرب عموماً صبح کے وقت حملہ کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا معمول بھی یہی تھا۔ چنانچہ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ خَرَجَ إِلٰى خَيْبَرَ فَجَاءَ هَا لَيْلًا، وَ كَانَ إِذَا جَاءَ قَوْمًا بِلَيْلٍ لَا يُغِيْرُ عَلَيْهِمْ حَتّٰى يُصْبِحَ، فَلَمَّا أَصْبَحَ، خَرَجَتْ يَهُوْدُ بِمَسَاحِيْهِمْ وَ مَكَاتِلِهِمْ، فَلَمَّا رَأَوْهُ قَالُوْا مُحَمَّدٌ وَاللّٰهِ! مُحَمَّدٌ وَ الْخَمِيْسُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، خَرِبَتْ خَيْبَرُ، إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب دعاء النبي ﷺ إلى الإسلام...... : ۲۹۴۵ ] ''نبی ﷺ خیبر کی طرف نکلے اور رات وہاں پہنچے اور آپ جب کسی قوم کے پاس رات کو پہنچتے تو صبح ہونے تک حملہ نہیں کرتے تھے۔ جب صبح ہوئی تو یہودی اپنی بیلچے اور ٹوکریاں لے کر نکلے۔ جب انھوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو کہنے لگے: ''محمد، اللہ کی قسم! محمد اپنے لشکر کے ساتھ (آ گئے)۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اکبر! خیبر برباد ہو گیا، ہم لوگ جب کسی قوم کے صحن میں اترتے ہیں تو ان لوگوں کی

وَ تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

اور ایک وقت تک ان سے منہ موڑ لے ﴿۱۷۸﴾ اور دیکھ، پس وہ بھی جلدی دیکھ لیں گے ﴿۱۷۹﴾ پاک ہے تیرا رب، عزت کا رب، ان باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۱۸۰﴾ اور سلام ان پر جو بھیجے گئے ﴿۱۸۱﴾ اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۱۸۲﴾

---

صبح بری ہوتی ہے جنھیں پہلے ڈرایا جا چکا ہوتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی عذاب عموماً صبح کے وقت آتا تھا، جیسے قومِ لوط کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴾ [ ھود : ۸۱ ] ''بے شک ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، کیا صبح واقعی قریب نہیں؟''

**آیت 179،178** وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ...... : تاکید کے لیے بات دوبارہ دہرائی، تاکہ آپ ﷺ کو تسلی ہو اور شاید کفار عبرت حاصل کرلیں۔ یہاں صرف ''اَبْصِرْ'' فرمایا، ''أَبْصِرْهُمْ'' نہیں فرمایا، اس لیے کہ پہلے ان کا ذکر ہو چکا ہے، یا اس لیے کہ پہلے صرف کفار مکہ کو دیکھنے کا حکم ہے، اب عموم کے لیے ''هُمْ'' کو حذف کر دیا کہ صرف کفار قریش ہی کو نہیں بلکہ سب جھٹلانے والوں کو اور ان کے ہر حال کو دیکھتے جاؤ، بہت جلد وہ بھی انجام دیکھ لیں گے۔

**آیت 180 تا 182** سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ...... : چونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے متعلق کفار کے برے اقوال، مثلاً اس کی اولاد یا اس کے شرکاء بنانے کا ذکر ہے، اس لیے آخر میں ان کی ایسی تمام باتوں سے اللہ تعالیٰ کے پاک ہونے کا ذکر فرمایا۔ گویا یہ ان کے شرکیہ عقائد و اقوال کی تردید اور انبیاء اور ان کی اقوام کے احوال کے ذکر کے بعد پوری سورت کا خلاصہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق ان لوگوں نے جو باتیں گھڑ رکھی ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کوئی عیب یا نقص لازم آتا ہے، اللہ کی ذات ایسے تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے، کیونکہ وہ ساری عزت کا مالک ہے اور رسولوں پر سلام ہے کہ وہ اپنی اپنی قوموں سے تکالیف برداشت کر کے بھی مسلسل اللہ کی توحید پیش کرتے رہے۔ اور ہر بات اس پر ختم ہوتی ہے کہ جو خوبی اور جو تعریف بھی ہے وہ اللہ کی ہے، کیونکہ وہی تمام جہانوں کی پرورش کرنے والا ہے۔ کسی اور میں کوئی خوبی ہے تو بھی اسی کی ہے، کیونکہ وہ اسی کی عطا کردہ ہے۔

سُوْرَةُ صٓ ۳۸ مکیۃ ۳۸ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — اٰیاتھا ۸۸ رکوعاتھا ۵

صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ؕ﴿۱﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ﴿۲﴾ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّ لَاتَ حِیۡنَ مَنَاصٍ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

صٓ ۔ اس نصیحت والے قرآن کی قسم!① بلکہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تکبر اور مخالفت میں (پڑے ہوئے) ہیں② ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا تو انھوں نے پکارا اور وہ بچ نکلنے کا وقت نہیں تھا③

**آیت 1** ① **صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ** : "صٓ" حروف مقطعات میں سے ہے، اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔

② **وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ** : "الۡقُرۡاٰنِ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ "اس قرآن" کیا ہے۔ "الذِّکۡرِ" کا معنی عزّو شرف بھی ہوسکتا ہے، نصیحت بھی اور اللہ تعالیٰ کا اور ان تمام چیزوں کا ذکر بھی جن کی انسان کو نجات کے لیے ضرورت ہے۔ یہاں تینوں معانی بیک وقت مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ یہ قرآن کمال عزّو شرف والا بھی ہے، نصیحت والا بھی ہے اور اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر بھی ہے جن کی ضرورت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۱۰): ﴿ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ کِتٰبًا فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ ﴾ کی تفسیر۔

③ "اس نصیحت والے قرآن کی قسم" اس کا جوابِ قسم یہاں ذکر نہیں ہوا۔ اگلے جملے "بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا" سے نئی بات شروع ہوگئی ہے، جس سے قسم کا جواب سمجھ میں آ رہا ہے۔

**آیت 2** **بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ** : "عِزَّۃٍ" سے مراد خود ساختہ عزت، یعنی تکبّر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتۡہُ الۡعِزَّۃُ بِالۡاِثۡمِ ﴾ [ البقرۃ : ۲۰۶ ] "اور جب اس سے کہا جاتا ہے اللہ سے ڈر تو اس کی عزت اسے گناہ میں پکڑے رکھتی ہے۔" "شِقَاقٍ" "شَقٌّ" سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، کسی کا دوسرے کے مقابلے میں اس طرح آنا کہ یہ ایک شق (طرف) میں ہو اور وہ دوسری شق میں، یعنی شدید مخالفت اور عداوت۔ اس جملے سے "وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ" کا جواب قسم ظاہر ہو رہا ہے: "أَيْ إِنَّ كُفْرَهُمْ لَيْسَ بِبُرْهَانٍ بَلْ هُوَ بِسَبَبِ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ" کہ اس عزّو شرف والے، نصیحت سے بھرپور اور نجات کے لیے ضروری ہر بات پر مشتمل قرآن کی قسم ہے کہ کفار کا کفر کسی دلیل یا معقول وجہ سے نہیں، بلکہ محض تکبّر اور شدید مخالفت کی وجہ سے ہے۔ قسم عموماً جواب قسم کی دلیل ہوتی ہے، مطلب یہ کہ ان اوصاف والا (ذِی الذِّکۡرِ) قرآن شاہد اور دلیل ہے کہ اسے نہ ماننے والوں کے کفر کا باعث کوئی دلیل یا معقول وجہ نہیں بلکہ اس کی وجہ محض عزت و شقاق ہے۔ "عِزَّۃٍ" اور "شِقَاقٍ" پر تنوین تکبّر اور مخالفت کی شدت کے اظہار کے لیے ہے۔

**آیت 2** ① **کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ** : اس آیت میں قریش اور اس امت کے تمام کفار کو پہلی امتوں کے

وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ٘ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۚۖ ④ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ⑤

**اور انھوں نے اس پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا اور کافروں نے کہا یہ ایک سخت جھوٹا جادوگر ہے ④ کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے ⑤**

---

تکبّر اور انکار کے انجام بد سے ڈرایا ہے۔ ''اَهْلَكْنَا'' جمع متکلم کا لفظ اپنی عظمت کے اظہار کے لیے لائے ہیں۔ ''قَرْنٍ'' زمانے کی اتنی مدت جس میں ایک دوسرے سے ملنے والی ایک نسل ختم ہو جائے۔ راجح قول کے مطابق یہ مدت سو سال ہے، مراد ایک زمانے کے لوگ ہیں۔ '' كَمْ '' خبریہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی نسلوں اور قوموں کو ہلاک کر دیا۔

② **فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ** : ''لَاتَ'' ''لَا'' نافیہ ہی ہے، جس پر مبالغہ کے لیے ''تاء'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ ہمیشہ لفظ ''حِيْنَ'' یا وقت کا معنی دینے والے الفاظ پر آتا ہے۔ اس کا اسم محذوف ہے اور ''حِيْنَ مَنَاصٍ'' اس کی خبر ہے۔ گویا عبارت یہ ہے: ''وَلَاتَ الْحِيْنُ حِيْنَ مَنَاصٍ۔'' ''مَنَاصٍ'' ''نَاصَ يَنُوْصُ نَوْصًا'' سے مصدر میمی ہے۔ اس کا معنی (فَرَّ مِنْ فُلَانٍ) کسی سے بھاگ جانا بھی ہے اور ''نَجَا وَ فَاتَ'' (بچ کر نکل جانا بھی) مطلب یہ ہے کہ جب ان قوموں نے ہماری طرف سے آنے والی ہلاکت اور عذاب کی نشانیوں کو دیکھا تو انھوں نے پکارا، یعنی مدد کے لیے اور ہلاکت سے بچانے کے لیے پکارا اور ایمان لانے کا اقرار کیا مگر وہ وقت ہمارے عذاب سے بھاگنے یا بچ نکلنے کا نہیں تھا، کیونکہ ہمارا قاعدہ ہے کہ جب ہمارا عذاب آ جائے تو پھر ایمان لانے یا توبہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس آیت کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ مؤمنون (۶۴، ۶۵)، مؤمن (۸۴، ۸۵) اور انبیاء (۱۱ تا ۱۳)۔

**آیت 4** ① **وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ** : یعنی انھیں اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ ان کے پاس ڈرانے اور خبردار کرنے کے لیے اسے بھیجا گیا جو ان کی جنس انسان سے ہے، ان کی قوم عرب سے ہے اور ان کے قبیلے قریش سے ہے، حالانکہ عجیب بات تو اس وقت ہوتی جب کوئی فرشتہ یا عجمی ان کی طرف بھیجا جاتا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۶۴)، توبہ (۱۲۸) اور سورۂ یونس (۲) کی تفسیر۔

② **وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ** : '' كَفَرَ يَكْفُرُ '' کا معنی انکار بھی ہے اور چھپانا بھی۔ یہاں ''وَقَالُوْا'' (اور انھوں نے کہا) کے بجائے '' وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ '' (اور کافروں نے کہا) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا رسول اللہ ﷺ کو ساحر اور کذاب کہنا محض ان کے حق کو چھپانے اور جانتے بوجھتے ہوئے اس کے انکار کی وجہ سے ہے، ورنہ یہ تو آپ کو صادق اور امین کہتے تھے۔ دیکھیے سورۂ یونس کی آیت (۱۶): ﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ﴾ اور سورۂ انعام (۳۳) کی تفسیر۔

**آیت 5** ① **اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا** : یعنی کیا ایک ''اللہ'' ہی ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے اور وہ ایک ہی عبادت کا مستحق ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو وہ سارے دیوتا اور داتا و دستگیر ہی ختم کر دیے جنھیں دنیا مانتی چلی آئی ہے۔

وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡهُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمۡ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ ۚ﴿ۖ۶﴾ مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِی الۡمِلَّةِ الۡاٰخِرَةِ ۚۖ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ۚ﴿ۖ۷﴾

اور ان کے سرکردہ لوگ چل کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو، یقیناً یہ تو ایسی بات ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے ⑥ ہم نے یہ بات آخری ملت میں نہیں سنی، یہ تو محض بنائی ہوئی بات ہے ⑦

② اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ: "عُجَابٌ" عجیب کے معنی میں ہے، مگر اس میں مبالغہ زیادہ ہے، جیسا کہ لمبے آدمی کو "طویل" کہتے ہیں اور زیادہ ہی لمبا ہو تو اسے "طُوال" کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دینا ان کی نظر میں حد سے زیادہ عجیب بات تھی، کیونکہ ان کے نزدیک اپنے آباء سے سنی ہوئی بات کے خلاف کوئی بات انتہائی عجیب بات تھی، جیسا کہ ان کی زبانی آگے آ رہا ہے۔ ان لوگوں کو عقیدۂ توحید عجیب معلوم ہو رہا تھا، حالانکہ تعجب کی چیز عقیدۂ شرک ہے، جس پر نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے نہ نقلی۔

**آیت 6** ① وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡهُمۡ ......: "الۡمَلَاُ" کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۴۶) یعنی کفار کے سرکردہ اور بڑے لوگ توحید کی دعوت سن کر آپ کی مجلس سے یہ کہہ کر چل کھڑے ہوئے کہ اپنے دین اور طریقے پر چلتے رہو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو، جیسا کہ قوم نوح نے کہا تھا: ﴿ لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمۡ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا یَغُوۡثَ وَ یَعُوۡقَ وَ نَسۡرًا ﴾ [ نوح : ۲۳ ] "تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وَدّ کو چھوڑنا اور نہ سُواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔"

② بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو باطل اور شرک پر ڈٹے رہنے کی اتنی تاکید کر رہے ہیں، اہلِ حق کو تو اس سے زیادہ حق پر قائم رہنا چاہیے اور ایک دوسرے کو قائم رہنے کی تاکید کرنی چاہیے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴾ [ العصر : ۱ تا ۳ ] "زمانے کی قسم! کہ بے شک ہر انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔"

③ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ: یعنی اس نے ہمارے سامنے جو کلمہ توحید پیش کیا ہے یہ ایسی چیز ہے جس کے اعلان کا اور اسے ہر حال میں نافذ کرنے کا ارادہ کیا جا چکا ہے، اب اسے اس سے باز رکھنے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو۔

**آیت 7** ① مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِی الۡمِلَّةِ الۡاٰخِرَةِ: آخری ملت سے مراد ان کے قریب کے آبا و اجداد ہیں، کیونکہ اصل دینِ ابراہیم (علیہ السلام) تو توحید پر قائم تھا۔ یہ عمرو بن لُحی خزاعی تھا جس نے عرب میں بت پرستی کو رواج دیا، حتیٰ کہ عین کعبہ میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی مورتیوں کے ہاتھ میں فال کے تیر رکھ دیے گئے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: "پچھلا دین (آخری ملت) کہتے تھے اپنے باپ دادوں کو، یعنی آگے تو سنتے ہیں کہ اگلے لوگ ایسی باتیں کہتے، پر ہمارے بزرگ تو یوں نہیں کہہ گئے۔" (موضح) بعض مفسرین نے فرمایا کہ آخری ملت سے مراد عیسائی ہیں، کیونکہ آپ ﷺ سے پہلے سب سے آخر میں آنے

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۸

کیا ہمارے درمیان میں سے اسی پر نصیحت نازل کی گئی ہے؟ بلکہ وہ میری نصیحت سے شک میں ہیں، بلکہ انھوں نے ابھی تک میرا عذاب نہیں چکھا ۸

---

والے نبی عیسیٰ علیہ السلام ہی تھے، یعنی ہم نے نصاریٰ میں بھی توحید کی بات نہیں سنی، بلکہ وہ بھی تین خداؤں کے قائل ہیں۔

② اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ : "اخْتِلَاقٌ" مصدر بمعنی اسم مفعول برائے مبالغہ ہے، یعنی یہ محض گھڑی ہوئی بات ہے۔

**آیت 8** ① ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا : یہ ہے وہ اصل بات جس سے ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم نہ کرنے کی وجہ ظاہر ہو رہی ہے اور وہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد اور حسد کی وجہ سے عداوت کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سرداروں اور چودھریوں کو چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بلند منصب کے لیے کیوں چُنا؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس حسد اور عداوت کا کئی جگہ ذکر فرمایا اور اس کا رد فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [ الأنعام : ١٢٤ ] "اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہمیں اس جیسا دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا، اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝۳۱ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ [ الزخرف : ٣١، ٣٢ ] "اور انھوں نے کہا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟ کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟" اسی حسد کا اظہار قوم ثمود نے صالح علیہ السلام پر کیا تھا: ﴿ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝۲۵ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴾ [ القمر : ٢٥، ٢٦ ] "کیا یہ نصیحت ہمارے درمیان میں سے اسی پر نازل کی گئی ہے؟ بلکہ وہ بہت جھوٹا ہے، متکبر ہے۔ عنقریب وہ کل جان لیں گے کہ بہت جھوٹا، متکبر کون ہے؟"

② بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ : "شَكٍّ" سے مراد ذہن کی وہ کیفیت ہے جس میں آدمی دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو ترجیح نہ دے سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جملے میں ان کے دل کی حالت بیان فرمائی ہے کہ ان کے پاس میرے ذکر کو جھٹلانے کی کوئی معقول وجہ نہیں مگر وہ حسد کی وجہ سے اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے وہ اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ اگر حسد چھوڑ کر تھوڑا سا غور کریں تو انھیں یقین کی نعمت حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کی قوم کا حال خود ان کی زبانی یہی بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۶۲)۔

③ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ : "لَمْ يَذُوْقُوْا" انھوں نے نہیں چکھا اور "لَمَّا يَذُوْقُوْا" انھوں نے ابھی تک نہیں چکھا۔ "عَذَابِ" اصل میں "عَذَابِيْ" (میرا عذاب) ہے۔ آیات کے فواصل کی موافقت کے لیے یاء حذف کر کے کسرہ باقی رہنے دیا ہے۔ یعنی ان کے ایسی باتیں کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں کوئی حقیقت ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابھی تک میری مار نہیں چکھی۔ جب میری مار پڑی تو ان کے سب کَس بَل نکل جائیں گے اور انھیں ایسی باتیں کرنے کا ہوش نہیں رہے گا۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝۹ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۣ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝۱۰ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱

کیا انھی کے پاس تیرے رب کی رحمت کے خزانے ہیں، جو سب پر غالب ہے، بہت عطا کرنے والا ہے ۝۹ یا آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے درمیان کی چیزوں کی بادشاہی انھی کے پاس ہے تو وہ سیڑھیوں میں اوپر چڑھ جائیں ۝۱۰ (یہ) ایک حقیر سا لشکر ہے، لشکروں میں سے، جو اس جگہ شکست کھانے والا ہے ۝۱۱

**آیت 9** **اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ** ...... : یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ ہم میں سے اسی پر یہ ذکر کیوں نازل کیا گیا۔ فرمایا، کیا تیرے عزیز و وہاب رب کی رحمت کے خزانے ان کے پاس ہیں کہ جس کو جو نعمت چاہیں دیں، جسے چاہیں نہ دیں اور جسے یہ چاہیں اسے نبوت کا بلند منصب عطا کریں؟ نہیں، ہرگز نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے خزانوں کا اکیلا خود مالک ہے، اپنی رسالت کے لیے جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم رکھتا ہے۔ اب اگر اس نے اپنی نعمت رسالت کے لیے آپ کو چُنا ہے تو یہ حسد کیوں کرتے ہیں؟ اس اعتراض کا یہی جواب سورۂ انعام (۱۲۴) اور زخرف (۳۱، ۳۲) میں دیا گیا ہے، جیسا کہ اس سے پہلی آیت کے پہلے فائدے میں گزر چکا ہے۔

**آیت 10** **اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ...... : "**لَهُمْ**" پہلے آنے سے حصر پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی یا پھر اللہ تعالیٰ کے بجائے زمین و آسمان کی سلطنت کے مالک یہی ہیں کہ جسے جو چاہیں دیں، جو چاہیں نہ دیں؟ تو پھر زمین پر کیوں پھرتے ہیں، آسمان کی سیڑھیوں پر چڑھیں، زمین و آسمان کی ساری سلطنت سنبھالیں اور اللہ تعالیٰ کے بجائے خود جسے چاہیں نبوت دیں جسے چاہیں نہ دیں؟ ظاہر ہے ایسا نہیں، تو پھر ایسی بے ہودہ باتیں کیوں کرتے ہیں؟

**آیت 11** **جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ** : "**جُنْدٌ**" پر تنوین تقلیل و تحقیر کے لیے ہے اور "**مَا**" اس کی مزید تاکید کے لیے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "أَكَلْتُ شَيْئًا مَا، أَيْ شَيْئًا قَلِيْلًا" "میں نے تھوڑی سی چیز کھائی۔" "**جُنْدٌ مَّا**" ایک حقیر سا لشکر۔ "**هُنَالِكَ**" وہاں، اس جگہ، یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول کے مقابلے میں۔ "**الْاَحْزَابِ**" "حِزْبٌ" کی جمع ہے، یعنی مختلف لشکر، جماعتیں۔ یعنی خدائی اختیارات کی ڈینگیں مارنے والے اور مختلف جماعتوں اور لشکروں سے جمع ہونے والے اس حقیر سے لشکر کی بساط ہی کیا ہے۔ یہ تو جب بھی میدان میں آیا شکست کھانے والا ہے، جیسا کہ سورۂ قمر میں فرمایا: ﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ [ القمر : ٤٥ ] "عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھیں پھیر کر بھاگیں گے۔" بدر کے دن آپ ﷺ "**سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ**" کہتے ہوئے میدان کی طرف بڑھے، پھر احد، خندق، فتح مکہ ہر موقع پر ایسا ہی ہوا کہ لشکر کفار نے منہ کی کھائی۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾ وَ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾

ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور عاد نے اور میخوں والے فرعون نے ﴿۱۲﴾ اور ثمود اور قوم لوط اور ایکہ والوں نے، یہی لوگ وہ لشکر ہیں ﴿۱۳﴾ نہیں ہے (ان میں سے) کوئی مگر اس نے رسولوں کو جھٹلایا، تو میرا عذاب واقع ہو گیا ﴿۱۴﴾ اور یہ لوگ کسی چیز کا انتظار نہیں کر رہے سوائے ایک سخت چیخ کے، جس میں کوئی وقفہ نہ ہو گا ﴿۱۵﴾

---

**آیت 13،12** ① **كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ** ...... : یعنی ان بے چارے قریش اور ان کی ہمنوا جماعتوں کی کیا حیثیت ہے، ان سے پہلے تعداد اور قوت و شوکت میں ان سے کہیں زیادہ اقوام، یعنی قومِ نوح، میخوں والا فرعون، عاد، ثمود، قومِ لوط اور اصحاب الایکہ وہ بڑے بڑے لشکر تھے جن میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا تو ان پر میرا عذاب واقع ہو گیا۔

② **وَ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ** : "الْاَوْتَادِ" "وَتَدٌ" کی جمع ہے، میخ۔ فرعون کو میخوں والا کہنے کا مطلب یا تو یہ ہے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا تھا اس کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھکوا کر سزا دیا کرتا تھا، یا یہ کہ اس کی سلطنت ایسی مضبوط تھی گویا زمین میں میخیں ٹھکی ہوئی ہیں، یا اس کا لشکر اتنا زیادہ تھا کہ جہاں ٹھہرتا ہر طرف خیموں کی میخیں ہی میخیں نظر آتیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی عمارتیں زمین میں میخوں کی طرح ٹھکی ہوئی ہوں، جیسا کہ اہرامِ مصر ہزاروں سال سے زمین کے اندر گڑے ہوئے ہیں۔

**آیت 14** **اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ** : "عِقَابِ" اصل میں "عِقَابِيْ" ہے، میرا عذاب، میری سزا۔ سورۂ عنکبوت میں ان تمام اقوام کے جھٹلانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ [ العنکبوت : ۴۰ ] "تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔"

**آیت 15** **وَ مَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً** ...... : "**يَنْظُرُ**" یہاں "يَنْتَظِرُ" کے معنی میں ہے۔ "**صَيْحَةً وَّاحِدَةً**" (ایک سخت چیخ) سے مراد دوسری دفعہ صور کے نفخہ سے پیدا ہونے والی آواز ہے، کیونکہ پہلے نفخہ کے وقت تک زندہ و موجود رہنے کا انتظار تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ "**فَوَاقٍ**" مَا بَيْنَ الْحَلْبَتَيْنِ مِنَ الْوَقْتِ أَوْ مَا بَيْنَ فَتْحِ يَدِكَ وَ قَبْضِهَا عَلَى الضَّرْعِ" (قاموس) "دو دفعہ دودھ دوہنے کے درمیان کا وقفہ یا دودھ دوہتے وقت تھن کو پکڑنے اور چھوڑنے کا درمیانی وقفہ۔" مراد تھوڑا

وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾

اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا حصہ یوم حساب سے پہلے جلدی دے دے ﴿۱۶﴾ اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر، جو قوت والا تھا، یقیناً وہ بہت رجوع کرنے والا تھا ﴿۱۷﴾

سا وقفہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والے یہ لوگ ایک سخت چیخ کے انتظار میں ہیں، جو شروع ہو گی تو اس میں اس وقت تک کوئی وقفہ نہیں ہو گا جب تک تمام لوگ زندہ ہو کر اللہ کے حضور پیش نہیں ہو جائیں گے، فرمایا: ﴿ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ [ یٰس : ۵۳ ] ”نہیں ہو گی وہ مگر ایک ہی چیخ، تو اچانک وہ سب ہمارے پاس حاضر کیے ہوئے ہوں گے۔“ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے۔

آیت 16 وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا ......: ” قَطَّ يَقُطُّ قَطًّا “ (ن) قلم وغیرہ کا سرا کاٹنا۔ ”قِطٌّ“ حصے کو کہتے ہیں، کیونکہ ہر ایک کو اس کا حصہ کاٹ کر دیا جاتا ہے۔ انعام کے لیے کاغذ کا جو ٹکڑا لکھ کر دیا جاتا ہے اسے بھی ”قِطٌّ“ کہتے ہیں۔ مراد عذاب میں سے ان کا حصہ ہے، بعض نے اعمال نامہ مراد لیا ہے۔ یعنی کفار قیامت کو ناممکن سمجھ کر اس کا انکار کرتے ہوئے اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے جرأت کی اس حد تک پہنچ گئے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ربوبیت کے واسطے سے دعا کرتے ہوئے کہنے لگے، اے ہمارے رب! عذاب میں سے ہمارا جو حصہ ہے وہ ہمیں یوم حساب سے پہلے ابھی جلدی دے دے، جیسا کہ ابوجہل وغیرہ نے نہایت دیدہ دلیری سے کہا تھا: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [ الأنفال : ۳۲ ] ”اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔“

آیت 17 ① اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ: اس سورت میں یہاں تک کفار کی جو باتیں ذکر ہوئی ہیں، مثلاً آپ کو ساحر و کذاب کہنا اور ان کا یہ اعتراض کہ کیا ہم سب میں سے رسول بنانے کے لیے یہی ایک شخص رہ گیا تھا؟ اور یہ کہ اس دعوت کے پیچھے کوئی سوچی سمجھی سازش ہے اور قیامت کا مذاق اڑاتے ہوئے انھوں نے جو کچھ کہا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان سب باتوں پر صبر کا حکم دیا اور تسلی کے لیے داؤد علیہ السلام اور چند دوسرے پیغمبروں کو یاد کرنے کا حکم دیا۔

② وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ : ”الْاَيْدِ“ کا معنی قوت ہے۔ ” آدَ الرَّجُلُ يَئِيْدُ أَيْدًا “ (ض) جب کوئی آدمی قوی ہو جائے تو کہتے ہیں: ”فَهُوَ أَيِّدٌ“ جیسے فرمایا: ﴿ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ [ البقرۃ : ۸۷ ] ”اور ہم نے اسے روح القدس کے ساتھ قوت بخشی۔“ داؤد علیہ السلام بڑی قوت والے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں کئی قوتوں سے نوازا تھا، مثلاً جسمانی قوت جس کے ساتھ انھوں نے جالوت کو قتل کیا، قلبی شجاعت و قوت جس کی وجہ سے وہ کبھی دشمن کے مقابلے میں پیٹھ نہیں دکھاتے تھے، عبادت کی قوت جس کا اظہار روزانہ تہائی رات کی نماز اور ہمیشہ ایک دن کے ناغے کے ساتھ روزے سے ہوتا ہے، فرماں روائی کی قوت

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾ وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا

بے شک ہم نے پہاڑوں کو اس کے ہمراہ مسخر کر دیا، وہ دن کے پچھلے پہر اور سورج چڑھنے کے وقت تسبیح کرتے تھے ﴿۱۸﴾ اور پرندوں کو بھی، جب کہ وہ اکٹھے کیے ہوتے، سب اس کے لیے رجوع کرنے والے تھے ﴿۱۹﴾ اور ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی اور اسے حکمت اور فیصلہ کن گفتگو عطا فرمائی ﴿۲۰﴾ اور کیا تیرے پاس جھگڑنے والوں کی خبر آئی ہے، جب وہ دیوار پھاند کر عبادت خانے میں آ گئے ﴿۲۱﴾ جب وہ داؤد کے پاس اندر آئے تو وہ ان سے گھبرا گیا،

---

جس کے ساتھ انھوں نے گرد و پیش کی تمام مشرک قوتوں کو زیر کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کی۔ صحیح فیصلے کی قوت (حکم)، فیصلہ کن خطاب کی قوت، حُسن صوت کی نعمت جس کی وجہ سے پہاڑ اور پرندے بھی ان کے ساتھ تسبیح و تلاوت میں شریک ہو جاتے تھے، لوہے کو موم کرنے اور زرہیں بنانے کی قوت جس کے ذریعے سے وہ صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ مزید تفصیل سورۂ بقرہ (۲۵۱)، انبیاء (۷۸، ۷۹)، نمل (۱۵، ۱۶) اور سورۂ سبا (۱۰ تا ۱۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔

③ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ : یعنی وہ اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے، کوئی قدم اپنی مرضی سے نہیں اٹھاتے تھے۔ ہر وقت نماز، دعا، امید و خوف، ذکر و تلاوت اور جہاد کے ساتھ اسی کی طرف توجہ رکھتے، کبھی کوئی کمی ہو جاتی تو فوراً توبہ و استغفار کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔

**آیت 19، 18** اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ...... : اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو نہایت خوب صورت آواز عطا کر رکھی تھی اور پہاڑوں اور پرندوں کو ان کے ساتھ پابند کر دیا تھا کہ جب وہ ترنم کے ساتھ تسبیح کرتے تو پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے اور اڑتے ہوئے پرندے سن کر آگے جانے کے بجائے ان کے گرد جمع ہو کر ان کے ساتھ تسبیح میں مشغول ہو جاتے۔ مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۷۹) اور سورۂ سبا (۱۰)۔

**آیت 20** وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ ...... : "الْحِكْمَةَ" کے مفہوم میں نبوت، کتاب اللہ کا علم اور معاملات کی فہم و فراست، سب چیزیں شامل ہیں اور "فَصْلَ الْخِطَابِ" سے مراد ہے مقدمہ سن کر صحیح، واضح اور دوٹوک فیصلہ کرنا۔ "فَصْلَ الْخِطَابِ" میں یہ بھی شامل ہے کہ لمبی بات کو مختصر الفاظ میں ایسے طریقے سے بیان کیا جائے کہ ہر شخص کو پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔ ان دونوں چیزوں کے لیے اعلیٰ درجے کی عقل اور فہم و فراست کے ساتھ قادر الکلام ہونا بھی ضروری ہے۔

**آیت 21 تا 23** ① وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ...... : "نَبَؤُا" کسی اہم خبر کو کہتے ہیں۔ "الْخَصْمِ" واحد، تثنیہ اور جمع سب پر بولا جاتا ہے۔ "تَسَوَّرُوْا" "سُوْرٌ" دیوار کو کہتے ہیں اور "تَسَوَّرُوْا" کے ضمن میں "دَخَلُوْا" کا معنی شامل ہونے کی وجہ سے

لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾

انھوں نے کہا مت ڈر، دو جھگڑنے والے ہیں، ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے، سوتو ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور بے انصافی نہ کر اور ہماری سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر ﴿۲۲﴾ بے شک یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے، تو اس نے کہا کہ یہ میرے سپرد کر دے اور اس نے بات کرنے میں مجھ پر بہت سختی کی ﴿۲۳﴾

---

"**الْمِحْرَابَ**" کو اس کا مفعول بنایا گیا ہے، یعنی دیوار پھاند کر ''محراب'' میں داخل ہوئے۔ "**الْمِحْرَابَ**" عبادت کے لیے مخصوص کمرہ۔ "**لَا تُشْطِطْ**" بے انصافی نہ کر۔ "شَطَطٌ" زیادتی، ظلم۔ "أَشَطَّ الْحَاكِمُ إِذَا جَارَ" (افعال) حاکم نے بے انصافی کی۔ "**نَعْجَةً**" "أُنْثَى مِنَ الضَّانِ" بھیڑ یا دنبی۔ "عَزَّ يَعِزُّ" (ض) غالب آنا۔ "**الْخُلَطَآءِ**" "خَلِيْطٌ" کی جمع ہے، شریک۔ مگر "خَلِيْطٌ" عام ہے، اس میں وہ لوگ بھی آ جاتے ہیں جنھوں نے اپنا مال ملایا ہوا ہو، مگر ہر ایک اپنے اپنے مال کا الگ الگ مالک ہو۔ "**قَلِيْلٌ**" بہت کم۔ "**مَا**" کے ساتھ تاکید کی وجہ سے ''بہت ہی کم۔''

② اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے داؤد علیہ السلام کو یاد کرنے کا حکم دیا اور یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے بات کا آغاز اس طرح کیا کہ کیا تیرے پاس ان جھگڑنے والوں کی خبر آئی ہے؟ مقصد اسے سننے کا شوق دلانا ہے۔

③ **اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ** : جب وہ جھگڑنے والے دیوار پھاند کر داؤد علیہ السلام کے پاس ان کے عبادت کے لیے مخصوص کمرے میں آ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ پہرے وغیرہ کی وجہ سے دروازے کی طرف سے داخل نہیں ہو سکے، ورنہ انھیں دیوار پھاندنے کی ضرورت نہیں تھی۔

④ **اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ** : داؤد علیہ السلام ان کے اس طرح دیوار پھاند کر اچانک آ دھمکنے سے گھبرا گئے کہ یہ دشمن نہ ہوں، جو قتل کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے آئے ہیں، خصوصاً اس لیے کہ بنی اسرائیل کا اپنے انبیاء کو قتل کرنا معروف تھا۔

⑤ **قَالُوْا لَا تَخَفْ** ...... : انھوں نے آتے ہی سب سے پہلے تسلی دی کہ ڈرو نہیں، ہم کسی بری نیت سے نہیں آئے، بلکہ دونوں آپس کا ایک جھگڑا لے کر آپ کے پاس آئے ہیں، اس لیے آپ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور بے انصافی نہ کریں اور ہماری راہ نمائی سیدھے راستے کی طرف کریں۔

⑥ **اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً** ...... : یہ میرا حقیقی یا دینی بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے۔ تو اس نے مجھے کہا ہے کہ وہ ایک بھی میں اس کے سپرد کر دوں اور بات کرنے میں اس نے مجھ پر

قَالَ لَقَدۡ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعۡجَتِكَ اِلٰی نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡخُلَطَآءِ لَيَبۡغِيۡ بَعۡضُهُمۡ

اس نے کہا بلاشبہ یقیناً اس نے تیری دنبی کو اپنی دنبیوں کے ساتھ ملانے کے مطالبے کے ساتھ تجھ پر ظلم کیا ہے اور بے شک

بہت سختی کی اور مجھے دبا لیا ہے۔

آیت 25،24 ① قَالَ لَقَدۡ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعۡجَتِكَ اِلٰی نِعَاجِهٖ : داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ اس نے تمھاری دنبی اپنی دنبیوں کے ساتھ ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تم پر ظلم کیا ہے۔ یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ دیوار پھاند کر آئے، پھر انھوں نے مقدمہ پیش کرتے ہوئے اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ وہ اس شخص سے ہم کلام ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ حکومت کا شرف بھی عطا فرمایا ہے اور جس سے حق کے خلاف یا بے انصافی پر مبنی فیصلہ کرنے کی توقع نہیں۔ اس کے باوجود وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور بے انصافی نہ کریں۔ یہ دونوں جملے ہی کسی شخص کا غصہ بھڑکانے کے لیے کافی ہیں، کجا یہ کہ ایسا کہنے والے پہلے دیوار پھاند کر آنے کی گستاخی بھی کر چکے ہوں۔ اگر کوئی دنیا دار بادشاہ ہوتا تو یہ لوگ قتل کر دیے جاتے، یا کوئی اور عبرت ناک سزا پاتے، تاکہ آئندہ کسی کو ایسی جرأت نہ ہو، مگر داؤد علیہ السلام کا صبر اور حلم دیکھیے کہ پہلے کچھ خوف زدہ ہونے کے باوجود نہ غصے میں آئے اور نہ انھیں ملامت کا ایک لفظ بھی کہا، بلکہ ان کے اس طرح آنے اور نامناسب الفاظ کہنے کو صبر سے برداشت کیا اور وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے اسے پورا کرتے ہوئے ان کے مقدمے کا فیصلہ فرما دیا۔ یہ نبیوں ہی کا حوصلہ ہو سکتا ہے، جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی کہ کفار کی باتوں پر صبر کریں اور ہمارے بندے داؤد علیہ السلام کو یاد کریں۔

② وَ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡخُلَطَآءِ ...... : مظلوم کو تسلی دیتے ہوئے داؤد علیہ السلام نے بہت سے لوگوں کے اس کی طرح مظلوم ہونے کا ذکر فرمایا کہ تم اکیلے مظلوم اور یہ اکیلا ظالم نہیں ہے، بلکہ بہت سے شریک ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں، کیونکہ جب آدمی دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی مظلوم ہیں تو اسے کچھ حوصلہ ہو جاتا ہے، "لِأَنَّ الْمُصِيبَةَ إِذَا عَمَّتْ طَابَتْ" "کیونکہ جب مصیبت عام ہوتی ہے تو برداشت ہو جاتی ہے۔" ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ایمان اور عمل صالح والے لوگ ایسا نہیں کرتے، بلکہ وہ اپنے شریک پر ظلم سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس میں ننانوے دنبیوں والے کے لیے نصیحت بھی ہے کہ وہ ظلم سے باز آ جائے اور انبیاء علیہم السلام کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔

③ وَ قَلِيۡلٌ مَّا هُمۡ : یعنی ایمان اور عمل صالح والے لوگ، جو اپنے شریک پر ظلم نہ کریں، وہ بہت ہی کم ہیں، اکثریت کا حال اس کے خلاف ہے۔ جمہوریت کے علم برداروں کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ اس مفہوم کی مزید آیات کے لیے دیکھیے سورۂ سبا (۱۳)، بقرہ (۲۴۳)، انعام (۱۱۷)، ہود (۱۷)، یوسف (۱۰۳، ۱۰۶)، زخرف (۷۸)، اور سورۂ مائدہ (۱۰۰)۔

④ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ : "ظَنَّ" راجح گمان کو کہتے ہیں، قرائن سے حاصل ہونے والے یقین پر بھی "ظن" کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ ظَنُّوۡۤا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيۡهِ ﴾ [ التوبة : ۱۱۸ ] "اور انھوں نے یقین کر لیا کہ اللہ سے پناہ کی کوئی جگہ

عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا

بہت سے شریک یقیناً ان کا بعض بعض پر زیادتی کرتا ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور یہ لوگ بہت ہی کم ہیں۔ اور داؤد نے یقین کر لیا کہ بے شک ہم نے اس کی آزمائش ہی کی ہے تو اس نے اپنے رب

اس کی جناب کے سوا نہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [ البقرة : ٤٦ ] ''جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔'' یہاں ''ظَنَّ'' کا معنی ''شَعُرَ'' (سمجھ گیا) ہے، یا ''أَيْقَنَ'' (یقین کر لیا) ہے، کیونکہ اس کے بعد ''أَنَّ'' حرف تاکید آ رہا ہے۔

⑤ **اَنَّمَا فَتَنّٰهُ** : یعنی داؤد علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ ان لوگوں کا اس طرح دیوار پھلانگ کر آنا میری آزمائش ہے کہ میں اپنی کوتاہی پر متنبہ ہو کر اسے ترک کرتا اور اس کی معافی مانگتا ہوں یا نہیں۔

⑥ **فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ** : تو انھوں نے اپنے رب سے معافی مانگی اور بخشش کی دعا کی۔

⑦ **وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ** : رکوع کا معنی جھکنا یا سر جھکانا ہے۔ ''خَرَّ'' زمین پر گر پڑا۔ یعنی وہ رکوع کرتے ہوئے نیچے گر گئے، مراد یہ ہے کہ وہ جھکتے ہوئے سجدے میں گر گئے۔ اس لیے بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں رکوع سے مراد سجدہ ہے۔ ''وَ اَنَابَ'' (اور انھوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ''داؤد علیہ السلام چالیس دن سجدے میں پڑے روتے رہے، حتیٰ کہ ان کے آنسوؤں سے زمین پر سبزہ اُگ آیا۔'' ایسی باتیں تردید کے بغیر لکھنے والوں پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی باتیں لکھ رہے ہیں جو نہ صرف یہ کہ قرآن یا حدیث میں نہیں آئیں بلکہ صاف عقل کے خلاف ہیں۔ چالیس دن ان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات زندگی، نماز اور امور مملکت کی نگرانی وغیرہ کا کیا بنا؟ یہ نتیجہ ہے سنی سنائی بات اندھا دھند نقل کرنے کا، خواہ وہ اسرائیلی روایت ہو یا کسی اور کی بنائی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ )) [ مسلم، المقدمة : ٥، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات آگے بیان کر دے۔''

⑧ ان آیات کو سمجھنے میں اکثر لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے، جس کی وجہ مسلمانوں کا قرآن کی تفسیر میں اسرائیلی روایات پر اعتماد ہے، حالانکہ یہود کی اللہ کے پیغمبروں خصوصاً داؤد و سلیمان علیہما السلام سے دشمنی سب کو معلوم ہے۔ اگر کوئی شخص ان روایات سے ذہن کو صاف کر لے تو آیات کا مطلب سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ اس لیے پہلے آیات کا مطلب بیان کیا جاتا ہے، اس کے بعد ان روایات کے متعلق مختصر سی بات ہوگی۔ ان آیات کو سمجھنے کے لیے ان سے پہلی آیات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے: (ا) یہ بات بالکل واضح ہے کہ آیات کے اس سلسلہ میں قرآن مجید داؤد علیہ السلام کی تعریف بیان فرما رہا ہے۔ (ب) قرآن کے الفاظ یا مفہوم میں کوئی اشارہ بھی نہیں کہ یہ کوئی رمز یا کنایہ کی بات ہے، جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے کسی ایسے فعل پر ناراضی کے اظہار کے لیے فرمائی ہے جو شریعت کے خلاف یا فضیلت کے خلاف تھا۔ (ج) اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی باتوں پر

فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ۝۲۴ السجدة فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى

سے بخشش مانگی اور رکوع کرتا ہوا نیچے گر گیا اور اس نے رجوع کیا۲۴ تو ہم نے اسے یہ بخش دیا اور بلاشبہ اس کے لیے

صبر کا حکم دیتے ہوئے داؤد علیہ السلام کو نمونے کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو فرما رہے ہیں کہ اگر آپ کا سینہ اپنی قوم کے کفر سے تنگ ہوتا ہے تو صبر کریں اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کریں۔ ساتھ ہی داؤد علیہ السلام کا ذکر نہایت عزت و تکریم کے ساتھ کیا ہے اور ان کی تعریف بہت بلند اوصاف کے ساتھ فرمائی ہے: ① انھیں "عَبْدَنَا" (ہمارا بندہ) کہا ہے، یہ اکیلا لفظ ہی سب اوصاف پر بھاری ہے، جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ﴾ [ بني إسرائيل : ۱ ] "پاک ہے وہ جو رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا جس کے ارد گرد کو ہم نے برکت دی۔" ② پھر بتایا کہ وہ "ذَا الْاَيْدِ" (حق کی قوت والے تھے) ③ "اَوَّابٌ" (اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے) تھے۔ ④ "اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ" (ہماری طرف سے پہاڑ ان کے ہمراہ مسخر تھے، صبح و شام تسبیح کرتے تھے) ⑤ "وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً" (جمع کیے پرندے بھی ان کے ہمراہ تسبیح کے لیے مسخر تھے) ⑥ "وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ" (اور ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی) ⑦ "وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ" (اور انھیں حکمت عطا فرمائی) ⑧ "وَ فَصْلَ الْخِطَابِ" (اور فیصلہ کن گفتگو عطا فرمائی) ⑨ اس کے بعد یہ واقعہ ذکر فرمایا، جس کے بعد پہلے دنیا میں انھیں عطا ہونے والا مقام ذکر فرمایا: "يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ" (اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا) ⑩ پھر اپنے ہاں ان کا مرتبہ اور آخرت میں ان کا مقام بیان فرمایا: "وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى" (اور بلاشبہ اس کے لیے ہمارے پاس یقیناً بڑا قرب ہے) ⑪ "وَ حُسْنَ مَاٰبٍ" (اور اچھا ٹھکانا ہے)۔ ان اوصاف سے ظاہر ہے کہ داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نہایت مقرّب اور محبوب پیغمبر تھے اور ایسی تمام روایات ان پر صریح بہتان اور ظلم ہیں جن سے وہ ایک عام شریف آدمی سے بھی فروتر نظر آتے ہیں، تو پھر ان آیات کا مطلب کیا ہے اور ان دو جھگڑنے والوں کا مقصد کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نبی تھے اور بادشاہ بھی اور یہ دونوں بہت بھاری ذمہ داریاں ہیں۔ ان کے علاوہ انھیں اللہ تعالیٰ کی عبادت یعنی تسبیح، ذکر الٰہی، تلاوت، قیام اللیل اور روزوں کا بہت شوق تھا، اس لیے اس کے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ تسبیح و ذکر، نبوت کے فرائض اور بادشاہت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے اپنے اوقات تقسیم کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی شامل کر لیں کہ وہ صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے، جس کے لیے انھیں لوہے کی زرہیں بنانے کا مشکل اور باریک کام کرنا پڑتا تھا، سورۂ سبا کی آیت (۱۱): ﴿اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾ (کہ کشادہ زرہیں بنا اور کڑیاں جوڑنے میں اندازہ رکھ) سے ان کے کام کی مشقت اور باریکی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب نبوت، سلطنت، عبادت اور کمائی کے لیے وقت کیسے تقسیم کریں؟ اس کے لیے انھوں نے کچھ اوقات نبوت و سلطنت اور کمائی کے امور کے لیے رکھے اور کچھ وقت عبادت کے لیے خاص کر لیا،

## وَ حُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

**ہمارے پاس یقیناً بڑا قرب اور اچھا ٹھکانا ہے ﴿۲۵﴾**

جس میں وہ اپنے محراب (عبادت خانے) سے نہیں نکلتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ داؤد علیہ السلام کو اس بات کا پتا چل جائے کہ جب وہ عبادت کے لیے خلوت اختیار کرتے ہیں اس وقت بھی لوگوں کے ایک دوسرے پر ایسے ظلم واقع ہوتے ہیں جن کے لیے داؤد علیہ السلام کے عدل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دو جھگڑنے والوں کے لیے یہ آسانی پیدا فرمائی کہ دروازے بند ہونے اور پہرے داروں کی موجودگی کے باوجود وہ دیوار پھاند کر ان کے عبادت خانے میں داخل ہو گئے اور ان میں سے ایک نے اپنا قصہ سنایا اور وہ ظلم بیان کیا جو اس کے بھائی نے اس پر کیا تھا کہ کس طرح وہ بہت دولت مند اور ننانوے دنبیوں کا مالک ہونے کے باوجود اپنے فقیر بھائی سے، جو صرف ایک دنبی کا مالک ہے، اس کی واحد ملکیت بھی بہت سختی کے ساتھ اپنے سپرد کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ داؤد علیہ السلام ان کے اس طرح آنے پر پہلے گھبرائے، مگر جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو نہ ان سے ناراض ہوئے اور نہ انھیں پھر آنے کی تاریخ دی، بلکہ ان کا مقدمہ سن کر فوراً فیصلہ فرما دیا۔ ساتھ ہی سمجھ گئے کہ عبادت والے دن بھی لوگوں کے درمیان جھگڑے اور ایک دوسرے پر ظلم ہوتے ہیں، مگر ان کے عبادت میں مصروف ہونے کی وجہ سے مظلوم ان کے پاس فریاد لے کر نہیں پہنچ سکتے، حالانکہ لوگوں کے درمیان صلح اور مظلوم کی مدد عبادت خانے کی خلوت سے افضل ہے اور انھیں یقین ہو گیا کہ ان لوگوں کے اس طرح آنے سے اللہ تعالیٰ نے میری آزمائش کی ہے کہ میں یہ بات سمجھتا ہوں یا نہیں کہ عبادت میں ایسی مصروفیت نہیں ہونی چاہیے کہ مظلوم کو عدالت تک رسائی نہ ہو سکے۔ اس لیے انھوں نے اپنی اس کوتاہی پر اپنے رب سے معافی مانگی اور اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے سجدے میں گر گئے، تو ہم نے انھیں معاف کر دیا۔

(9) اکثر مفسرین نے داؤد علیہ السلام کی کوئی ایسی غلطی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو ننانوے دنبیوں اور ایک دنبی کے واقعہ سے ملتی جلتی ہو۔ حالانکہ یہ واقعہ انتہائی ظلم اور مظلومیت کی ایک تصویر ہے کہ ایک بہت دولت مند شخص اپنے فقیر بھائی سے اس کی ایک دنبی بھی چھین لینا چاہتا ہے اور حاکم وقت دروازے بند کر کے عبادت میں مصروف ہے، اب مظلوم کیا کرے؟ بعض لوگوں نے کہا، وہ دوسرے دن پیش ہو سکتے تھے، مگر سب جانتے ہیں کہ انصاف میں تاخیر بھی ظلم کے مترادف ہوتی ہے۔ دیوار پھاند کر جانے سے اور قصہ سنانے سے داؤد علیہ السلام پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ بنایا ہے، جس کا کام لوگوں کے فیصلے کرنا ہے۔ عبادت کریں، مگر اس طرح نہیں کہ فریادی آپ کی عدالت میں بار نہ پا سکیں، فرمایا: ﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾ [ صٓ : ٢٦ ] ”اے داؤد! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، سو تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یقیناً وہ لوگ

جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔‘‘ ’’خلیفہ‘‘ سے مراد حاکم ہے، جو پہلے لوگوں کی جگہ حکمران بنتا ہے، ’’اللہ کا خلیفہ‘‘ کہنا درست نہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۰)۔

⑩ بعض لوگوں نے ان دو جھگڑنے والوں کو فرشتے بتایا ہے اور لکھا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کیا تو وہ ہنس پڑے اور غائب ہو گئے۔ یہ ساری بات ہی بے اصل ہے، جس کا قرآن و حدیث میں کوئی وجود نہیں۔

⑪ داؤد علیہ السلام کی غلطی نکالتے ہوئے اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ ایک عورت کو نہاتے ہوئے دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے اور اس کے خاوند ’’اوریاہ‘‘ کو جہاد میں ایسی جگہ مقرر کرنے کا حکم دیا جہاں وہ قتل ہو گیا تو اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، حالانکہ ان کی ننانوے بیویاں موجود تھیں۔ بعض نے کہا، اس سے طلاق دینے کا تقاضا کیا، جسے وہ ٹھکرا نہ سکا، تو اس سے نکاح کر لیا۔ یہودی ملعون یہاں تک پہنچ گئے کہ انھوں نے داؤد علیہ السلام پر بہتان باندھتے ہوئے تورات میں بھی تحریف کر دی اور کہا کہ انھوں نے اوریاہ کی بیوی کو نہاتے ہوئے دیکھ کر اٹھوا لیا اور (نعوذ باللہ) اس سے ہم بستر ہوئے، جس سے وہ حاملہ ہو گئی، پھر اس کے خاوند کو جنگ میں بھیج کر مروا دیا اور اس کی عدت ختم ہونے کے بعد اسے اپنی بیوی بنا لیا، جس سے لڑکا پیدا ہوا، جس سے اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوا۔ (خلاصہ سموئیل دوم، باب ۱۱، فقرہ ۲ سے ۲۷ تک)

بعض حضرات نے داؤد علیہ السلام کی یہ غلطی نکالی ہے کہ انھوں نے صرف مدعی کی بات سن کر فیصلہ کر دیا، جب کہ انھیں دوسرے فریق کی بات سننا بھی ضروری تھا۔ حالانکہ وہاں اختصار کے لیے دوسرے فریق کی بات کا ذکر نہیں ہوا۔ کسی بات کے ذکر نہ ہونے سے اس کی نفی نہیں ہوتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے خاموش رہ کر مظلوم کے دعویٰ کو قبول کر لیا ہو۔ یہ اور اس جیسی کئی فضول باتیں بعض مفسرین نے داؤد علیہ السلام پر بہتان باندھتے ہوئے لکھی ہیں، جب کہ اسرائیلی روایات پر اعتماد جائز ہی نہیں، خصوصاً جب ان سے کسی پیغمبر کی عزت و عصمت پر حرف آتا ہو۔ اس معاملے میں مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ کا کلام بہت عمدہ ہے، وہ لکھتے ہیں: ’’ قَدْ ذَكَرَ الْمُفَسِّرُوْنَ هَاهُنَا قِصَّةً أَكْثَرُهَا مَأْخُوْذٌ مِنَ الْإِسْرَائِيْلِيَّاتِ وَلَمْ يَثْبُتْ فِيْهَا عَنِ الْمَعْصُوْمِ حَدِيْثٌ يَجِبُ اتِّبَاعُهُ وَلٰكِنْ رَوَى ابْنُ أَبِيْ حَاتِمٍ هُنَا حَدِيْثًا لَا يَصِحُّ سَنَدُهُ، لِأَنَّهُ مِنْ رِوَايَةِ يَزِيْدَ الرَّقَاشِيِّ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، وَ يَزِيْدُ وَ إِنْ كَانَ مِنَ الصَّالِحِيْنَ، لٰكِنَّهُ ضَعِيْفُ الْحَدِيْثِ عِنْدَ الْأَئِمَّةِ، فَالْأَوْلٰى أَنْ يُقْتَصَرَ عَلٰى مُجَرَّدِ تِلَاوَةِ هٰذِهِ الْقِصَّةِ وَ أَنْ يُرَدَّ عِلْمُهَا إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَإِنَّ الْقُرْآنَ حَقٌّ وَمَا تَضَمَّنَ فَهُوَ حَقٌّ أَيْضًا ‘‘ ’’مفسرین نے یہاں ایک قصہ ذکر کیا ہے، جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور اس کے متعلق معصوم (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) سے کوئی حدیث ثابت نہیں، جس کی پیروی واجب ہو۔ لیکن ابن ابی حاتم نے یہاں ایک حدیث بیان کی ہے جس کی سند صحیح نہیں، کیونکہ وہ یزید رقاشی کی روایت سے ہے، جو وہ انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔ یزید اگرچہ نیک لوگوں سے ہے، لیکن وہ ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف الحدیث ہے۔ سو بہتر یہ ہے کہ اس قصے کی صرف تلاوت پر اکتفا کیا جائے اور اس کا علم اللہ عزوجل کی طرف لوٹا دیا جائے، کیونکہ قرآن حق ہے اور جو کچھ اس میں ہے، وہ بھی حق ہے۔‘‘

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

اے داؤد! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، سو تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے ﴿۲۶﴾

**آیت 26** ① **يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ**...... : یہاں لفظ "قُلْنَا" (ہم نے کہا) محذوف ہے، یعنی ہم نے کہا اے داؤد! تمھارا مقام دوسرے لوگوں سے بہت بلند ہے، تم خلیفہ ہو اور وہ رعایا ہیں، تم حاکم ہو اور وہ محکوم ہیں۔ اس لیے لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور اس میں اپنی یا کسی دوسرے کی خواہش کا دخل نہ آنے دو، کیونکہ یہی چیز اللہ کی راہ سے بہکانے والی ہوتی ہے۔

② **اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ**...... : یعنی انسان بہکتا اسی وقت ہے جب اپنی یا کسی کی خواہش نفس کے پیچھے لگتا ہے اور یہ کام وہ تبھی کرتا ہے جب اسے حساب کا دن یاد نہ رہے۔ اگر اللہ کے سامنے جواب دہی کا تصور آنکھوں کے سامنے رہے تو انسان اپنی یا کسی کی خواہش کی پروا نہیں کرتا اور جو شخص یوم حساب کو بھول جائے وہ اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش کے پیچھے چلے گا اور شتر بے مہار کی طرح زندگی گزارے گا۔ جس کا نتیجہ اسے شدید عذاب کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

③ بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے داؤد علیہ السلام سے خطاب "**لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى**" (خواہش کی پیروی نہ کر) سے نکالا ہے کہ داؤد علیہ السلام کسی خواہش کی پیروی کر بیٹھے تھے، اس پر یہ حکم ہوا۔ حالانکہ خواہش کی پیروی سے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی منع کیا گیا ہے، تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کسی خواہش کی پیروی کر بیٹھے تھے۔ کسی کام سے منع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب وہ کام کر چکا ہے یا کر رہا ہے، بلکہ آئندہ محتاط رہنے کی تاکید کے لیے بھی حکم ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ **وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ** ﴾ [ المائدۃ : ٤٩ ] "اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کر جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔" اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ **اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ** ﴾ [ البقرۃ : ١٤٧ ] "یہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے، پس تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔" اور فرمایا: ﴿ **فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** ﴾ [ الأنعام : ٣٥ ] "پس تو جاہلوں میں سے ہرگز نہ ہو۔" سورۂ قصص میں ہے: ﴿ **فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ** ﴾ [ القصص : ٨٦ ] "سو تو ہرگز کافروں کا

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ﴿۲۷﴾

اور ہم نے آسمان و زمین کو اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا، سو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا آگ کی صورت میں بڑی ہلاکت ہے ﴿۲۷﴾

مددگار نہ بن۔'' اور اس سے اگلی آیت میں ہے: ﴿ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [ القصص : ۸۷ ] ''اور ہرگز مشرکوں سے نہ ہو۔'' تو کیا ان آیات سے یہ سمجھا جائے کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کو ان کاموں سے اس لیے روکا گیا کہ آپ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

آیت 27 ① وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا : پچھلی آیت میں خواہش پرستی کا اصل سبب یوم حساب کو بھولنا بتایا ہے، اب یوم حساب کے حق ہونے کی چند دلیلیں ذکر فرمائیں۔ سب سے پہلی دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا معمولی سا کھیت بھی کسی نوکر کے حوالے کرے تو ممکن نہیں کہ اس سے باز پرس نہ کرے، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنے عظیم الشان آسمان و زمین اور ان کے مابین کی چیزیں پیدا کیں، پھر زمین پر انسان کو بسایا اور اس کی ہر چیز اس کے لیے پیدا فرمائی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ [ البقرة : ۲۹ ] ''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔'' آسمان کو اس کے لیے چھت بنایا، اس کی ہر ضرورت کا بندوبست فرمایا، پھر وہ اس سے اس کی کارکردگی کے متعلق سوال نہ کرے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ سب کچھ اس نے باطل اور بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ سب کچھ محض کھیل ہے جو اللہ تعالیٰ کھیل رہا ہے۔ نہیں! تم سب کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی طریقوں سے بیان فرمائی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۱۱۵ ] ''تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ الدخان : ۳۸ تا ۴۰ ] ''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔ ہم نے ان دونوں کو حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔ یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا مقرر وقت ہے۔''

② ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا : یعنی اس آسمان و زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اس کے باطل اور بے مقصد ہونے کا خیال ان لوگوں کا ہے جو توحید و آخرت کے منکر ہیں۔

③ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ : یہاں ''فَوَيْلٌ لَّهُمْ'' (تو ان کے لیے بڑی ہلاکت ہے) کہنے کے بجائے ''فَوَيْلٌ

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۞ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۞

کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ یا کیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟ ۲۸ یہ ایک کتاب ہے، ہم نے اسے تیری طرف نازل کیا ہے، بہت بابرکت ہے، تاکہ وہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور تاکہ عقلوں والے نصیحت حاصل کریں ۲۹

لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا " (سو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا آگ کی صورت میں بڑی ہلاکت ہے) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس ویل (بڑی ہلاکت) کا باعث ان لوگوں کا کفر ہے۔

**آیت 28** اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ ...... : یہ یومِ حساب حق ہونے کی دوسری دلیل ہے کہ اگر یومِ حساب نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان اور عمل صالح والے اور زمین میں فساد کرنے والے ہمارے ہاں ایک جیسے ہیں، اس طرح ہم سے ڈرنے والے اور ڈھیٹ بن کر نافرمانی کرنے والے دونوں یکساں ہیں۔ خود ہی سوچو، کیا عدل و حکمت کا تقاضا یہ ہے اور کیا ہم ایسا ہونے دیں گے؟ دنیا میں تو امتحان کی وجہ سے اور مختصر مدت ہونے کی وجہ سے نیک و بد کی جزا و سزا پوری طرح ممکن نہیں، یہ سب کچھ یومِ حساب میں ہوگا۔ اس کی ہم معنی سورۂ جاثیہ کی آیت (۲۱) بھی ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 29** ❶ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ : یعنی جب نیک و بد ایک جیسے نہیں ہو سکتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی کی راہ نمائی ضروری ہے۔ اس کے لیے یہ کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے، یہ بہت برکت والی ہے، یعنی اس میں بہت زیادہ خیر کی باتیں جمع ہیں۔

❷ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ ...... : "لِيَدَّبَّرُوْا" اصل میں "لِيَتَدَبَّرُوْا" (تفعّل) ہے۔ یعنی یہ کتاب نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور عقلوں والے لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں، کیونکہ نصیحت وہی حاصل کیا کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ [ الرعد : ۱۹ ] "نصیحت تو صرف عقلوں والے ہی قبول کرتے ہیں۔" آیات میں تدبّر کا فائدہ تب ہے جب آدمی ان پر عمل کرے۔ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے حسن بصری کا قول نقل فرمایا ہے: "اللہ کی قسم! قرآن کا تدبر صرف یہ نہیں کہ اس کے الفاظ حفظ کر لیے جائیں اور اس کی حدود و احکام کو ضائع کر دیا جائے، یہاں تک کہ کچھ لوگ کہتے ہیں، میں نے پورا قرآن پڑھ لیا ہے، حالانکہ قرآن کا کوئی اثر نہ ان کے اخلاق و عادات میں نظر آتا ہے نہ ان کے اعمال اور کاموں میں۔" اسے ابنِ ابی حاتم نے روایت کیا۔ (ابن کثیر)

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾

اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، اچھا بندہ تھا، بے شک وہ بہت رجوع کرنے والا تھا ﴿۳۰﴾ جب اس کے سامنے دن کے پچھلے پہر اصیل تیز رفتار گھوڑے پیش کیے گئے ﴿۳۱﴾ تو اس نے کہا بے شک میں نے اس مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد کی وجہ سے دوست رکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پردے میں چھپ گئے ﴿۳۲﴾

---

**آیت 30** ① **وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ** : داؤد علیہ السلام پر انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے انھیں سلیمان جیسا بلند مرتبے والا بیٹا عطا کیا۔ جو ان کی طرح نبی تھا اور ایسا بادشاہ تھا کہ اس کے بعد ایسا بادشاہ نہیں ہوا۔ سلیمان علیہ السلام کے واقعات کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۷۸ تا ۸۱)، نمل (۱۵ تا ۴۴) اور سبا (۱۲)۔

② **نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ** : "اَوَّابٌ" آبَ يَؤُوْبُ أَوْبًا (ن) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت رجوع کرنے والا۔ یعنی وہ اللہ کے بہت اچھے بندے تھے اور اپنے ہر معاملے میں اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے اور کوئی قدم اپنی خواہش کی بنا پر نہیں اٹھاتے تھے۔ آگے ان کے اللہ تعالیٰ کا اچھا بندہ اور اس کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہونے کی مثال کے طور پر ان کے دو واقعات بیان فرمائے ہیں۔

**آیت 31** **اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ** : "اَلْعَشِيُّ" ظہر سے لے کر شام تک کا وقت، بعض ساری رات بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔ "**الصّٰفِنٰتُ**" "صَافِنٌ" کی جمع ہے، وہ گھوڑا جو کھڑا ہو تو تین پاؤں کو پوری طرح زمین پر رکھے اور چوتھے سُم کا سرا زمین کے ساتھ لگا رہے۔ یہ صفت عموماً اعلیٰ نسل کے گھوڑوں میں پائی جاتی ہے۔ "**الْجِيَادُ**" "جَوَادٌ" کی جمع ہے، تیز رفتار۔ یہ دونوں الفاظ مذکر و مؤنث دونوں گھوڑوں پر بولے جاتے ہیں۔ دو صفتیں اس لیے بیان فرمائیں کہ کھڑے ہونے کی حالت میں وہ گھوڑے ''صافنات'' تھے اور چلنے میں ''جواد'' (تیز رفتار) تھے۔ یعنی پچھلے پہر اعلیٰ نسل کے تیز رفتار گھوڑے ان کے سامنے معائنے کے لیے پیش کیے گئے۔

**آیت 32** ① **فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ** : "**الْخَيْرِ**" کا معنی تو بھلائی ہے، مگر عموماً اس سے مراد مال ہوتا ہے، جیسا کہ انسان کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴾ [ العادیات : ۸ ] ''اور بے شک وہ مال کی محبت میں یقیناً بہت سخت ہے۔'' یہ لفظ عموماً زیادہ مال پر بولا جاتا ہے۔ یہاں "**الْخَيْرِ**" سے مراد وہ اصیل اور تیز رفتار گھوڑے ہیں جو پچھلے پہر ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ "**الْخَيْرِ**" پر الف لام عہد کا ہے، اس لیے "**حُبَّ الْخَيْرِ**" کا ترجمہ ''اس مال کی محبت'' کیا گیا ہے۔ "**عَنْ**" یہاں سببیہ ہے، جس کا معنیٰ ''کی وجہ سے'' ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ﴾ [ التوبۃ : ۱۱۴ ] ''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر

رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

انھیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا ﴿۳۳﴾

اس وعدے کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا۔‘‘

② اس آیت میں سلیمان علیہ السلام کی جہاد سے محبت اور اس کے لیے گھوڑے پالنے اور ان کی تربیت کا ذکر فرمایا ہے، اس مقصد کے لیے انھوں نے بڑی تعداد میں اعلیٰ نسل کے تیز رفتار گھوڑے پال رکھے تھے۔ ایک دن پچھلے پہر ان کے سامنے اعلیٰ نسل کے وہ اصیل گھوڑے پیش کیے گئے جو کھڑے ہونے کی حالت میں اپنی طبیعت کی نفاست اور نزاکت کی وجہ سے تین ٹانگوں پر کھڑے ہوتے تھے، جبکہ چوتھی ٹانگ کے صرف کُھر کا کنارہ زمین پر لگتا تھا، مگر دوڑنے میں بہت تیز رفتار تھے، تو سلیمان علیہ السلام نے اتنے قیمتی گھوڑے رکھنے اور اپنے اوقاتِ عزیزہ ان کے معائنے اور دوڑانے میں صرف کرنے کی وجہ بیان کرنا ضروری سمجھا، تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ محض شاہانہ شان وشوکت کے اظہار کے لیے ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ میں نے اس مال یعنی گھوڑوں کی محبت کو دوست رکھا ہے اور اختیار کیا ہے تو اپنے رب کے ذکر کی وجہ سے کہ ان کے ساتھ جہاد کر کے اپنے رب کا ذکر دنیا بھر میں پھیلاؤں اور اس کا بول سب پر بالا کروں۔

③ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ : ’’تَوَارَتْ‘‘ اصل میں ’’تَوَارَيَتْ‘‘ ہے، ’’تَوَارٰی يَتَوَارٰی تَوَارِيًا‘‘ (تفاعل) (چھپ جانا) سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم کا صیغہ ہے، جو گھوڑوں کی جماعت پر بولا گیا ہے۔ یعنی گھوڑوں کی وہ جماعت نگاہ سے پردے میں چھپ گئی۔ ’’حَتّٰى‘‘ (یہاں تک کہ) کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس سے پہلے کچھ عبارت محذوف ہے، جو یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے حکم پر ان کی دوڑ لگوائی گئی، یہاں تک کہ وہ نگاہ سے پردے میں چھپ گئے۔

**آیت 33** ① رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا ...... : تو انھوں نے حکم دیا کہ انھیں میرے پاس واپس لاؤ۔ جب وہ واپس لائے گئے تو سلیمان علیہ السلام محبت کے ساتھ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

② گھوڑوں کی دوڑ لگوانا اور ان کے جسم پر محبت سے ہاتھ پھیرنا دونوں کام جہاد کا حصہ اور باعث اجر وثواب ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے دونوں عمل ان کے ’’نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ‘‘ ہونے کی مثال کے طور پر ذکر فرمائے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھوڑوں کی دوڑ کا مقابلہ کروایا کرتے تھے، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ((سَابَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِيْ قَدْ أُضْمِرَتْ فَأَرْسَلَهَا مِنَ الْحَفْيَاءِ، وَكَانَ أَمَدُهَا ثَنِيَّةَ الْوَدَاعِ فَقُلْتُ لِمُوْسٰى فَكَمْ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ؟ قَالَ سِتَّةُ أَمْيَالٍ أَوْ سَبْعَةٌ وَ سَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِيْ لَمْ تُضَمَّرْ، فَأَرْسَلَهَا مِنْ ثَنِيَّةِ الْوَدَاعِ، وَكَانَ أَمَدُهَا مَسْجِدَ بَنِيْ زُرَيْقٍ، قُلْتُ فَكَمْ بَيْنَ ذٰلِكَ؟ قَالَ مِيْلٌ أَوْ نَحْوُهُ وَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ مِمَّنْ سَابَقَ فِيْهَا)) [ بخاري، الجهاد، باب غاية السبق للخيل المضمرة : ۲۸۷۰ ] ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تضمیر شدہ گھوڑوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ کروایا۔ چنانچہ انھیں ’’حفیاء‘‘ سے دوڑایا اور ان کی آخری جگہ ’’ثنیۃ الوداع‘‘ تھی۔ (ابو اسحاق کہتے ہیں کہ) میں نے موسیٰ بن

عقبہ سے پوچھا: ''ان کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟'' تو انھوں نے فرمایا: ''ان دونوں کے درمیان چھ یا سات میل کا فاصلہ تھا۔'' اور ان گھوڑوں کو جو تضمیر شدہ نہیں تھے ثنیۃ الوداع سے دوڑایا اور ان کی آخری جگہ مسجد بنی زریق تھی۔ میں نے پوچھا: ''ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟'' تو موسیٰ بن عقبہ نے فرمایا: ''ان دونوں کے درمیان ایک میل یا اس کے قریب فاصلہ ہے۔'' اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اس مقابلے میں شامل تھے۔'' (تضمیر کا لفظی معنی لاغر کرنا ہے۔ یہ گھوڑوں کی خاص طریقے سے تیاری کو کہتے ہیں، جس میں پہلے انھیں خوب کھلا پلا کر موٹا کیا جاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ ان کی خوراک کم کر کے کچھ وقت کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔ اس کے دوران ان کے جسم کی مالش اور تیاری کی جاتی ہے، جس سے وہ بھوک پیاس برداشت کرنے اور زیادہ دیر تک دوڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑوں کی پیشانیوں کے بالوں پر محبت سے ہاتھ بھی پھیرا کرتے تھے، چنانچہ جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَلْوِيْ نَاصِيَةَ فَرَسٍ بِإِصْبَعِهٖ وَ هُوَ يَقُوْلُ الْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ بِنَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ : اَلْأَجْرُ وَالْغَنِيْمَةُ )) [ مسلم، الإمارة، باب فضيلة الخيل و أن الخير معقود بنواصيها : ۱۸۷۲ ] ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ ایک گھوڑے کی پیشانی کے بالوں کو اپنی انگلی کے ساتھ مروڑ رہے تھے اور فرما رہے تھے: ''گھوڑوں کی پیشانیوں کے ساتھ قیامت کے دن تک خیر باندھ دی گئی ہے، یعنی اجر اور غنیمت۔'' یہ ہے وہ تفسیر جس پر دل کو اطمینان ہوتا ہے، کیونکہ اس میں کوئی تکلّف نہیں۔ امام طبری، رازی، ابن حزم اور بہت سے ائمہ نے اسے ہی صحیح قرار دیا ہے، ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی تفسیر فرمائی ہے۔ چنانچہ طبری نے علی ابن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ آیت: ﴿ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ﴾ کے متعلق ان کا قول نقل فرمایا ہے: "يَقُوْلُ جَعَلَ يَمْسَحُ أَعْرَافَ الْخَيْلِ وَ عَرَاقِيْبَهَا حُبًّا لَهَا" یعنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام ان کی گردنوں کے بالوں پر اور ان کی ٹانگوں کے پچھلے حصوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

تنبیہ: بہت سے مفسرین نے ان آیات کی تفسیر ایک اور طریقے سے کی ہے۔ ان کے مطابق ترجمہ وتفسیر یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے سامنے پچھلے پہر اصیل تیز رفتار گھوڑے پیش کیے گئے۔ (یہاں عبارت محذوف ہے کہ انھوں نے ان کی دوڑ کا مقابلہ کروایا، جس کی وجہ سے ان کی عصر کی نماز فوت ہوگئی تو) انھوں نے کہا، میں نے مال کی محبت کو اپنے رب کے ذکر پر ترجیح دی، یہاں تک سورج پردے میں چھپ گیا۔ (تو انھوں نے حکم دیا) انھیں میرے پاس واپس لاؤ، تو وہ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں تلوار سے کاٹنے لگے۔ مگر اس تفسیر کی صورت میں کئی ایسی چیزیں محذوف ماننا پڑتی ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں، مثلاً یہ کہ ان کی عصر کی نماز فوت ہوگئی، یا سورج پردے میں چھپ گیا، پھر تلوار کا اور اس کے ساتھ پنڈلیاں اور گردنیں کاٹنے کا یہاں نہ کوئی ذکر ہے نہ قرینہ ہے اور نہ ہی ایک پیغمبر سے جہادی گھوڑوں کو اس طرح کاٹنے کی توقع ہو سکتی ہے جن کا کوئی جرم نہ تھا۔ نہ ہی سلیمان علیہ السلام کی ان سے محبت کا باعث مال کی محبت تھا، بلکہ اس محبت کا اصل باعث جہاد سے محبت تھا اور نہ ہی یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی سے منقول ہے، جب کہ پہلی تفسیر صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جیسا کہ اوپر گزرا ہے۔ مفسر رازی نے اور خصوصاً ابن حزم نے گھوڑوں کو کاٹنے والی تفسیر کی سخت تردید کی ہے۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے سلیمان کی آزمائش کی اور اس کی کرسی پر ایک جسم ڈال دیا، پھر اس نے رجوع کیا ﴿۳۴﴾

آیت 34 ① وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ ...... : روح المعانی کے مصنف آلوسی کے کہنے کے مطابق اس آزمائش سے سب سے زیادہ ظاہر مراد وہ واقعہ ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( قَالَ سُلَيْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ لَأَطُوْفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلٰى سَبْعِيْنَ امْرَأَةً تَحْمِلُ كُلُّ امْرَأَةٍ فَارِسًا يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَقَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ فَلَمْ يَقُلْ، وَلَمْ تَحْمِلْ شَيْئًا إِلَّا وَاحِدًا سَاقِطًا أَحَدُ شِقَّيْهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَوْ قَالَهَا لَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، قَالَ شُعَيْبٌ وَ ابْنُ أَبِي الزِّنَادِ تِسْعِيْنَ وَ هُوَ أَصَحُّ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿ و وهبنا لداؤد سليمان نعم العبد...... ﴾ : ٣٤٢٤ ] ”سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے کہا: ”میں آج رات (اپنی) ستر (۷۰) عورتوں کے پاس چکر لگاؤں گا اور ہر عورت ایک شہ سوار کے ساتھ حاملہ ہو گی، جو اللہ کے راستے میں جہاد کرے گا۔“ تو ان کے ساتھی (فرشتے) نے کہا: ”ان شاء اللہ (کہہ لیجیے)۔“ مگر انھوں نے نہیں کہا، چنانچہ کسی کو حمل نہ ہوا سوائے ایک کے اور اس کے بھی دو پہلوؤں میں سے ایک ساقط تھا۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اگر وہ ”ان شاء اللہ“ کہہ لیتے تو وہ سب اللہ کے راستے میں جہاد کرتے۔“ شعیب اور ابن ابی الزناد نے ”نوے (۹۰) عورتیں“ کہا اور یہی زیادہ صحیح ہے۔“

گویا سلیمان علیہ السلام کی آزمائش یہ تھی کہ ان کی خواہش کے مطابق نوے شہسوار مجاہد بیٹوں کے بجائے ان کی کرسی کا وارث بھی ایک جسد کے سوا کوئی نہ ہوا۔ جسد سے مراد وہ بچہ ہے جس کا ایک پہلو ساقط تھا۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کی تمنا مجاہد شہسوار بیٹوں کی تھی اور یہ تمنا بہت اچھی تمنا ہے، مگر ان شاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے ان کی آزمائش ہوئی اور ساقط پہلو والا صرف ایک بیٹا پیدا ہوا۔ یہ کوتاہی اگرچہ بھول کی وجہ سے ہوئی تھی مگر پیغمبروں کے بلند مرتبہ کی وجہ سے بھول پر بھی ان کی آزمائش ہو جاتی ہے، جس پر وہ معافی مانگتے ہیں۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے صریح الفاظ میں فرمایا کہ انھوں نے بھول کر وہ پودا چکھا: ﴿ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴾ [ طه : ١١٥ ] ”پھر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادے کی کچھ پختگی نہ پائی۔“ مگر ان کا لباس اتر گیا اور انھوں نے معافی مانگی: ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ٢٣ ] ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔“ اسی طرح جب سلیمان علیہ السلام کی بھول کی وجہ سے ان کی تمنا پوری نہ ہوئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اس سے مغفرت کی دعا کی، فرمایا: ﴿ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴾ [ صٓ : ٣٥ ] ”اس نے کہا اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو، یقیناً تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے۔“ میری دانست میں اس آیت کی یہ تفسیر درست ہے، کیونکہ بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور واقعہ اس کے مطابق ہے اور اس میں انبیاء علیہم السلام کی شان کے خلاف بھی کوئی بات نہیں۔

قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ هَبۡ لِیۡ مُلۡكًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

**اس نے کہا اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو، یقیناً تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے ﴿۳۵﴾**

---

(2) بعض علماء نے فرمایا، ہوسکتا ہے کہ آیات میں جس فتنے کا ذکر ہے اس سے مراد اس حدیث میں مذکور واقعہ ہو اور جسد سے مراد ساقط پہلو والا بچہ ہو، مگر یہ صرف احتمال ہے، جو بات ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش تھی، جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی اور نہ ہی اس نے ان کی کرسی پر ڈالے جانے والے جسد کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس لیے اسی پر اکتفا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش فرمائی، جس پر متنبّہ ہو کر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کی۔ کسی حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے، مگر پہلی تفسیر صحیح حدیث سے مطابقت کی وجہ سے راجح ہے۔

(3) ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے کئی ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں اور جو انبیاء کے مقام کے سراسر خلاف ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے صخر نامی ایک جنّ کو سلیمان علیہ السلام کے تخت پر قابض کر دیا تھا۔ اس کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ سلیمان علیہ السلام کی ایک بیوی بت پرست تھی، اس کی یہ سزا ملی کہ جتنی مدت اس بیوی نے بت پرستی کی تھی اتنی مدت کے لیے سلیمان علیہ السلام تخت سلطنت سے محروم کر دیے گئے اور ان کی انگوٹھی، جس میں اسم اعظم تھا، ایک لونڈی کے واسطے سے صخر کے ہاتھ پڑ گئی، پھر اس کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی دریا میں گر گئی اور ایک مچھلی نے اسے نگل لیا، پھر وہ مچھلی شکار ہو کر سلیمان علیہ السلام کے پاس آئی اور اس طرح انھوں نے اس کے پیٹ سے انگوٹھی کو نکال کر اپنا تخت واپس لے لیا۔ مگر یہ سارا قصہ اہلِ کتاب سے لیا گیا ہے اور اہلِ کتاب میں سے اکثر وہ ہیں جو سلیمان علیہ السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے اور ان کا مقصد انھیں زیادہ سے زیادہ بدنام کرنا ہے۔ (ابن کثیر) اس طرح کی کئی اور فضول کہانیاں جو نہ نقل سے ثابت ہیں اور نہ عقل انھیں تسلیم کرتی ہے، بے احتیاط لوگوں نے کتابوں میں بلا ثبوت لکھ دی ہیں اور واعظ اور قصہ گو حضرات انھیں بیان کرتے رہتے ہیں۔

مفسر ابوحیان نے فرمایا: ”مفسرین نے اس فتنے اور اس جسد کے ڈالے جانے کے متعلق کئی ایسی باتیں نقل کی ہیں جن سے انبیاء کو پاک سمجھنا واجب ہے، وہ باتیں ان کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں اور وہ ایسی ہیں جنھیں نقل کرنا جائز نہیں۔ وہ یا تو یہودیوں نے گھڑی ہیں یا زندیقوں نے۔ اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایا کہ وہ فتنہ کیا تھا اور نہ ہی یہ کہ سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر جو جسد ڈالا گیا وہ کیا تھا۔ سب سے قریب بات جو اس کے متعلق کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ فتنے سے مراد حدیث میں مذکور ستر (۷۰) عورتوں والے واقعہ میں سلیمان علیہ السلام کا ان شاء اللہ نہ کہنا ہے اور جسد سے مراد پیدا ہونے والا ادھورا بچہ ہے۔“

**آیت 35** **قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ هَبۡ لِیۡ مُلۡكًا** ...... : یعنی شہسواروں کی فوج پیدا ہونے کی آرزو میری کوتاہی کی وجہ سے

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝۳۶ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ ۝۳۷ وَّ اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝۳۸ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۹ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝۴۰ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ

تو ہم نے اس کے لیے ہوا کو تابع کر دیا جو اس کے حکم سے نرم چلتی تھی، جہاں کا وہ ارادہ کرتا تھا ۝۳۶ اور شیطانوں کو، جو ہر طرح کے ماہر معمار اور ماہر غوطہ خور تھے ۝۳۷ اور کچھ اوروں کو بھی (تابع کر دیا) جو بیڑیوں میں اکٹھے جکڑے ہوئے تھے ۝۳۸ یہ ہماری عطا ہے، سو احسان کر، یا روک رکھ، کسی حساب کے بغیر ۝۳۹ اور بلاشبہ اس کے لیے ہمارے ہاں یقیناً بڑا قرب اور اچھا ٹھکانا ہے ۝۴۰ اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کر، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک

---

اور تیری حکمت و مشیت کے تحت پوری نہیں ہوئی، تو تُو مجھے ایسی بااختیار بادشاہی عطا فرما دے کہ ویسی بادشاہی میرے سوا یا میرے بعد کسی کے پاس نہ ہو، تاکہ پھر اولاد کی ضرورت ہی نہ رہے۔ یہ دعا بھی اللہ کے دین کے غلبے کے لیے تھی۔

**آیت 36** فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ ...... : یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کی دعا قبول کر لی اور ایسی بادشاہی عطا کی جس میں ہوا ان کے تابع کر دی، وہ جہاں کا ارادہ کرتے ادھر نرم ہو کر چل پڑتی۔ سورۂ انبیاء (۸۱) میں اسے "عَاصِفَةً" (تند) بیان کیا ہے۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں کہ ہوا نہایت تند و تیز ہو، مگر ایسی ہموار کہ جسے اٹھایا ہے اسے کوئی جھٹکا تک محسوس نہ ہو، جیسا کہ آج کل ہوائی جہازوں کا حال ہے۔

**آیت 37** وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ : "بَنَّآءٍ" اور "غَوَّاصٍ" مبالغہ کے صیغے ہیں، اس لیے ان کا ترجمہ ماہر معمار اور ماہر غوطہ خور کیا ہے۔

**آیت 38** وَّ اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ : "اَلْاَصْفَادِ" "صَفَدٌ" (صاد اور فاء کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے، وہ زنجیر یا طوق جس سے کسی کو باندھا جائے۔ یعنی ان میں سے جو سرکشی یا شرارت کرتے انھیں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ کر قید کر دیا جاتا۔ ان چاروں آیات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۸۱، ۸۲)، سبا (۱۲، ۱۳) اور سورۂ نمل (۱۵ تا ۴۴) کی تفسیر۔

**آیت 39** هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ ...... : یعنی ہم نے تمھاری دعا کے مطابق تمھیں عظیم بادشاہی عطا کر دی، اب تم جسے چاہو دو جسے چاہو نہ دو اور جتنا چاہو دو، تم سے کوئی حساب بھی نہیں لیا جائے گا۔

**آیت 40** وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ : یعنی دنیوی بادشاہی کے علاوہ اسے ہمارے ہاں خاص قرب حاصل ہے اور ان کے لیے آخرت کا بہترین ٹھکانا یعنی سب سے بلند مقام جنت الفردوس تیار ہے۔

**آیت 41 تا 44** ① وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ...... : اس کا عطف اس سے پہلے "وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ" پر ہے۔ لفظ "عَبْدَنَا" میں اللہ تعالیٰ کے ان سے تعلق کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس سورت میں مذکور قصوں میں سے یہ تیسرا قصہ ہے کہ داؤد

اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿۴۱﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

شیطان نے مجھے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے ﴿۴۱﴾ اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے ﴿۴۲﴾ اور ہم نے اسے اس کے گھر والے عطا کر دیے اور ان کے ساتھ اتنے اور بھی، ہماری طرف سے رحمت کے لیے اور عقلوں والوں کی نصیحت کے لیے ﴿۴۳﴾ اور اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا (جھاڑو) لے اور اسے مار دے اور قسم نہ توڑ، بے شک ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا، اچھا بندہ تھا۔ یقیناً وہ بہت رجوع کرنے والا تھا ﴿۴۴﴾

---

اور سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اور دونوں کی آزمائش کا ذکر فرمایا اور ایوب علیہ السلام پر آنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کا اور انھیں دور کرنے کی نعمت کا ذکر فرمایا، مقصد سب سے عبرت دلانا ہے۔

**❷ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ:** ''نُصْبٌ'' تھکاوٹ اور مشقت کو کہتے ہیں اور ''عَذَابٌ'' شدید بدنی تکلیف کو۔ یعنی مجھے دو قسم کی تکلیف پہنچی ہے، ایک شدید دکھ جو مال و اولاد اور عافیت نہ رہنے کی وجہ سے تھا اور دوسری جسمانی تکلیف جو بیماری کی وجہ سے تھی۔

❸ اس دعا میں ایوب علیہ السلام کا حُسن ادب دیکھیے کہ انھوں نے دکھ اور تکلیف کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی بلکہ شیطان کی طرف کی ہے۔ حالانکہ رنج ہو یا راحت، برائی ہو یا بھلائی، سب اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہے اور وہی سب کا خالق ہے، مگر چونکہ اکثر ان کا تعلق کسی قریب یا بعید وجہ سے شیطان کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے اللہ کے مقرّب بندے شر کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں یا شیطان کی طرف، اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کرتے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مرض کی نسبت اپنی طرف اور شفا کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی، فرمایا: ﴿وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ [ الشعراء : ۸۰ ] ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔'' اور موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصے میں یوشع بن نون علیہ السلام نے بھلانے کی نسبت شیطان کی طرف کی، فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾ [ الکھف : ۶۳ ] ''اور مجھے وہ نہیں بھلائی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔'' صحیح مسلم میں نماز کے شروع میں پڑھی جانے والی ایک لمبی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، جو '' وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَ الْأَرْضَ '' سے شروع ہوتی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: (( لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَ الْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ )) [ مسلم، صلاۃ المسافرین، باب الدعاء في صلاۃ اللیل و قیامه : ۷۷۱، عن علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ ] ''حاضر ہوں اور حاضر ہوں اور خیر ساری تیرے ہاتھ میں ہے اور شر تیری طرف نہیں ہے۔''

❹ ایوب علیہ السلام کی اس دعا میں اور سورۂ انبیاء (۸۳) میں مذکور دعا: ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (بے شک

وَ اذۡكُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ اُولِي الۡاَيۡدِيۡ وَ الۡاَبۡصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَ اِنَّهُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَيۡنَ الۡاَخۡيَارِ ﴿۴۷﴾ وَ اذۡكُرۡ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ الۡيَسَعَ وَ ذَا الۡكِفۡلِ ؕ وَ كُلٌّ مِّنَ الۡاَخۡيَارِ ﴿۴۸﴾

اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کر، جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے ﴿۴۵﴾ بے شک ہم نے انھیں ایک خاص صفت کے ساتھ چُن لیا، جو اصل گھر کی یاد ہے ﴿۴۶﴾ اور بلاشبہ وہ ہمارے نزدیک یقیناً چنے ہوئے بہترین لوگوں سے تھے ﴿۴۷﴾ اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یاد کر اور یہ سب بہترین لوگوں سے ہیں ﴿۴۸﴾

---

میں، مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہے) میں ایوب علیہ السلام کے دعا کے سلیقے کا اظہار ہو رہا ہے کہ انھوں نے صریح لفظوں میں اپنے مقصد کے اظہار کے بجائے اپنی حالتِ زار اور رب تعالیٰ کی مہربانی کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان پر رحم فرما کر شفا دے دی۔

5 ان چاروں آیات کی مفصّل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۸۳، ۸۴) کی تفسیر۔

**آیت 45** وَ اذۡكُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اِسۡحٰقَ ...... : پہلے تین انبیاء کے تفصیلی ذکر کے بعد چند انبیاء کا اجمالی ذکر فرمایا۔ ”الۡاَيۡدِيۡ“ ”يَدٌ“ کی جمع ہے، جو عربی زبان میں نعمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور قوت کے معنی میں بھی۔ اس لحاظ سے ان انبیاء کے ”اُولِي الۡاَيۡدِيۡ“ (ہاتھوں والے) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عبادت کی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بڑی قوت رکھتے تھے اور یہ بھی کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات تھے۔ ”الۡاَبۡصَارِ“ (آنکھوں) کی تفسیر میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد دینی بصیرت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔

**آیت 46** اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ : ان انبیاء میں پائی جانے والی خاص صفت کو پہلے مبہم رکھا کہ ”ہم نے انھیں ایک خاص صفت کے ساتھ چُن لیا“ تاکہ شوق اور تجسس پیدا ہو کہ وہ خاص صفت کیا ہے، پھر بتایا کہ وہ صفت اصل گھر کی یاد ہے۔ اصل گھر سے مراد آخرت ہے، کیونکہ دنیا گھر نہیں بلکہ گزرگاہ ہے۔ ان انبیاء کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ ہر وقت آخرت کو یاد رکھتے تھے اور ہر معاملہ میں اسی کو پیش نظر رکھتے تھے، دنیا کی ہوس کا ان میں کوئی شائبہ نہ تھا اور لوگوں کو بھی وہ ہمیشہ آخرت یاد دلاتے رہتے تھے۔

**آیت 47، 48** وَ اِنَّهُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَيۡنَ الۡاَخۡيَارِ ...... : ”الۡمُصۡطَفَيۡنَ“ ”مُصۡطَفٰی“ کی جمع ہے، جو باب افتعال سے اسم مفعول ہے اور اصل میں ”مُصۡتَفٰی“ ہے، صاد کی وجہ سے تاء کو طاء میں بدل دیا ”چُنے ہوئے۔“ ”الۡاَخۡيَارِ“ ”خَيۡرٌ“ کی جمع ہے جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اصل میں ”أَخۡيَرُ“ ہے، اس لیے اس کی جمع ”الۡاَخۡيَارِ“ آئی ہے ”سب سے بہتر لوگ۔“

هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّ شَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾

یہ ایک نصیحت ہے اور بلاشبہ متقی لوگوں کے لیے یقیناً اچھا ٹھکانا ہے ﴿۴۹﴾ ہمیشہ رہنے کے باغات، اس حال میں کہ ان کے لیے دروازے پورے کھولے ہوئے ہوں گے ﴿۵۰﴾ ان میں تکیے لگائے ہوئے ہوں گے، وہ ان میں بہت سے پھل اور مشروب منگوا رہے ہوں گے ﴿۵۱﴾ اور ان کے پاس نگاہ نیچے رکھنے والی ہم عمر عورتیں ہوں گی ﴿۵۲﴾ یہ ہے جس کا حساب کے دن کے لیے تم سے وعدہ کیا جاتا ہے ﴿۵۳﴾ بلاشبہ یقیناً یہ ہمارا رزق ہے، جس کے لیے کسی صورت ختم ہونا نہیں ہے ﴿۵۴﴾

**آیت 49** **هٰذَا ذِكْرٌ وَ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ** : یعنی یہ تو ایک نصیحت انبیاء کے بیان میں ہوئی، اب عام متقین کا انجام سنو! یقیناً ان کے لیے بہت اچھا ٹھکانا ہے۔

**آیت 51،50** **جَنّٰتِ عَدْنٍ** ...... : "مَفْتُوحَةٌ" کھولے ہوئے، "**مُفَتَّحَةً**" (تفعیل) میں مبالغہ کی وجہ سے ترجمہ "پورے کھولے ہوئے" کیا گیا ہے۔ متعدد صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ سورۂ زمر (۷۱) میں ہے کہ جہنم کے دروازے کفار کے آنے پر کھولے جائیں گے اور آیت (۷۳) میں ہے کہ جنت کے دروازے متقین کی آمد پر پہلے سے کھولے ہوئے ہوں گے۔ "**مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ**" میں وہ بشارت بھی داخل ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: (( يَخْلُصُ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ، فَيُحْبَسُوْنَ عَلٰى قَنْطَرَةٍ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَ النَّارِ، فَيُقَصُّ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ مَظَالِمُ كَانَتْ بَيْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا، حَتّٰى إِذَا هُذِّبُوْا وَ نُقُّوْا أُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ، فَوَ الَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ! لَأَحَدُهُمْ أَهْدٰى بِمَنْزِلِهٖ فِي الْجَنَّةِ مِنْهُ بِمَنْزِلِهٖ كَانَ فِي الدُّنْيَا )) [ بخاري، الرقاق، باب القصاص يوم القيامة : ٦٥٣٥ ] "مومن آگ سے گزر جائیں گے تو انھیں جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا تو وہ ایک دوسرے سے ان زیادتیوں کا بدلا لیں گے جو ان کے درمیان دنیا میں ہوئیں، حتیٰ کہ جب وہ خوب پاک صاف کر دیے جائیں گے، تو انھیں جنت میں داخلے کی اجازت دی جائے گی۔ تو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! ان میں سے ہر ایک کو اپنے گھر کا راستہ اس سے زیادہ معلوم ہوگا جتنا اسے دنیا میں اپنے گھر کا راستہ معلوم تھا۔"

**آیت 52 تا 54** **وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ** ...... : یعنی جن کی نظریں اپنے خاوندوں سے آگے بڑھنے والی نہیں ہوں گی۔ "**اَتْرَابٌ**" "تِرْبٌ" کی جمع ہے جو "تُرَابٌ" (مٹی) سے مشتق ہے، ہم عمر جو بچپن میں مل کر مٹی کے ساتھ کھیلتے رہے ہوں۔ یعنی وہ بیویاں خاوندوں کی ہم عمر اور ہم مزاج ہوں گی۔

هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّ غَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾

یہ ہے (جزا) اور بلاشبہ سرکشوں کے لیے یقیناً بدترین ٹھکانا ہے ﴿۵۵﴾ جہنم، وہ اس میں داخل ہوں گے، سو وہ برا بچھونا ہے ﴿۵۶﴾ یہ ہے (سزا) سو وہ اسے چکھیں، کھولتا ہوا پانی اور پیپ ﴿۵۷﴾ اور دوسری اس کی ہم شکل کئی قسمیں ﴿۵۸﴾ یہ ایک گروہ ہے جو تمھارے ساتھ گھستا چلا آنے والا ہے، انھیں کوئی خوش آمدید نہیں، یقیناً یہ آگ میں داخل ہونے والے ہیں ﴿۵۹﴾

**آیت 56،55** **هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ** ...... : ”هٰذَا“ یعنی یہ تو متقین کی جزا ہوئی، اب کفار کا انجام سنو جو اللہ کی حدود سے آگے بڑھنے والے اور اس کے احکام سے سرکشی کرنے والے ہیں کہ ان کے لیے ایک بدترین ٹھکانا ہے، جو جہنم ہے۔

**آیت 57** **هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّ غَسَّاقٌ** : ”هٰذَا“ یعنی یہ ہے عذاب، سو وہ اسے چکھیں۔ ”حَمِيْمٌ“ انتہائی گرم پانی۔ ”غَسَّاقٌ“ جہنمیوں کے چمڑوں سے بہنے والی پیپ۔ (مفردات) ”غَسَقَ الْجُرْحُ (ض، س) غَسْقَانًا“ جب اس سے پیپ وغیرہ نکلے۔ قاموس اور لغت کی دوسری کتابوں میں ”غَسَّاقٌ“ کا معنی ”اَلْبَارِدُ وَ الْمُنْتِنُ“ لکھا ہے، نہایت ٹھنڈا اور بدبودار۔ قرآن مجید میں دو مقامات پر یہ لفظ ”حَمِيْمٌ“ کے مقابلہ میں آیا ہے، ایک یہاں اور ایک سورۂ نبا (۲۵) میں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا معنی شدید ٹھنڈا اور بدبودار کرنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ جہنم میں گرمی (آگ) کا عذاب بھی ہے اور سردی (زمہریر) کا بھی۔ ابن کثیر نے فرمایا ”اَلْحَمِيْمُ“ انتہا کو پہنچا ہوا گرم اور ”غَسَّاقٌ“ ایسا ٹھنڈا جس کی ٹھنڈک برداشت نہ ہو سکے۔

**آیت 58** **وَّ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ** : ”اٰخَرُ“ مبتدا ہے، ”مِنْ شَكْلِهٖۤ“ ”كَائِنٌ“ کے متعلق ہو کر اس کی صفت ہے اور ”اَزْوَاجٌ“ خبر ہے۔ یعنی ان کا عذاب صرف حمیم و غساق ہی نہیں ہوگا، بلکہ حمیم و غساق سے ملتی جلتی کئی شکلوں کا اور عذاب بھی ہوگا، مثلاً زمہریر، سموم، زقّوم اور صعود وغیرہ۔

**آیت 59** **هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ** ...... : ابن کثیر نے فرمایا، یہاں اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کی ایک دوسرے سے کی جانے والی باتوں کا ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ [ الأعراف : ۳۸ ] ”جب بھی کوئی جماعت داخل ہوگی اپنے ساتھ والی کو لعنت کرے گی۔“ یعنی وہ سلام کے بجائے ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور ایک دوسرے کو جھوٹا اور کافر کہیں گے۔ چنانچہ وہ جماعت جو دوسری جماعت سے پہلے داخل ہوگی جب اس کے بعد والی جماعت جہنم کے دربان فرشتوں کے ساتھ داخل ہوگی تو پہلے والی جماعت فرشتوں سے کہے گی، یہ ایک گروہ ہے جو تمھارے ساتھ گھستا چلا آ رہا ہے، انھیں کوئی خوش آمدید نہیں، یقیناً وہ آگ میں داخل ہونے والے ہیں۔

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿۶۱﴾ وَ قَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾

ع ۴ ۲۴ ۱۴

وہ کہیں گے بلکہ تم ہو،تمھارے لیے کوئی خوش آمدید نہیں،تم ہی اسے ہمارے آگے لائے ہو۔سو یہ برا ٹھکانا ہے ﴿۶۰﴾ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! جو اس کو ہمارے آگے لایا ہے پس تو اسے آگ میں دگنا عذاب زیادہ کر ﴿۶۱﴾ اور وہ کہیں گے ہمیں کیا ہے کہ ہم ان آدمیوں کو نہیں دیکھ رہے جنھیں ہم بدترین لوگوں میں شمار کرتے تھے ﴿۶۲﴾ کیا ہم نے انھیں مذاق بنائے رکھا، یا ہماری آنکھیں ان سے پھر گئی ہیں ﴿۶۳﴾ بلاشبہ یہ آگ والوں کا آپس میں جھگڑنا یقیناً حق ہے ﴿۶۴﴾

**آیت 60** **قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ** ...... : بعد میں داخل ہونے والے ان سے کہیں گے، بلکہ تمھارے لیے کوئی خوش آمدید نہیں، تمھی نے ہمیں اس کام کی دعوت دی جس نے ہمیں اس انجام تک پہنچایا، سو یہ ہمارا اور تمھارا بہت برا ٹھکانا ہے۔ یہ بات وہ محض دل ٹھنڈا کرنے کے لیے کہیں گے۔

**آیت 61** **قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا** ...... : جب اس سے دل ٹھنڈا نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے، اے ہمارے پروردگار! جو بھی اس عذاب کو ہمارے آگے لایا ہے تُو اسے آگ میں دگنا عذاب کر، ایک خود گمراہ ہونے کا اور دوسرا ہمیں گمراہ کرنے کا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ﴾ [ الأعراف : ۳۸ ] ”تو ان کی پچھلی جماعت اپنے سے پہلی جماعت کے متعلق کہے گی اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا، تو انھیں آگ کا دگنا عذاب دے۔ فرمائے گا سبھی کے لیے دگنا ہے اور لیکن تم نہیں جانتے۔“ اس آیت سے ملتی جلتی آیت کے لیے دیکھیے سورۂ احزاب (۶۷، ۶۸)۔

**آیت 62** **وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا** ...... : ”الْاَشْرَارِ“ ”شَرٌّ“ کی جمع ہے، جو اصل میں ”أَشَرُّ“ اسم تفضیل ہے، بدترین لوگ۔ یعنی جہنمی آگ میں چاروں طرف نگاہ ڈالیں گے تو انھیں اپنے چودھری، سردار اور پیشوا تو نظر آئیں گے مگر وہ مومن نظر نہیں آئیں گے جنھیں وہ دنیا میں مذاق کیا کرتے تھے۔ اس پر وہ حسرت و افسوس اور تعجب سے کہیں گے، ہمیں کیا ہے کہ ہم جہنم میں اپنے ساتھ ان ایمان والوں کو نہیں دیکھ رہے جنھیں ہم دنیا میں بدترین لوگوں میں شمار کرتے تھے؟

**آیت 63** **اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا** ...... : یعنی اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو ہم غلطی پر تھے کہ انھیں ناحق مذاق کا نشانہ بناتے رہے، یا وہ بھی یہیں کہیں جہنم میں ہیں، مگر ہماری نگاہیں ان سے پھر گئی ہیں، جو وہ ہمیں نظر نہیں آ رہے۔

**آیت 64** **اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ** ...... : یعنی اگرچہ یہ بات تمھاری سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ اتنے شدید عذاب اور نفسا نفسی میں

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنْذِرٌ ۖۗ وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۙ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾

کہہ دے میں تو صرف ایک ڈرانے والا ہوں اور کوئی معبود نہیں مگر اللہ، جو ایک ہے، بڑے دبدبے والا ہے ﴿۶۵﴾ جو آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے اور ان چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان ہیں، سب پر غالب، بہت بخشنے والا ہے ﴿۶۶﴾ کہہ دے وہ ایک بہت بڑی خبر ہے ﴿۶۷﴾ جس سے تم منہ پھیرنے والے ہو ﴿۶۸﴾

---

ایک دوسرے سے جھگڑیں گے، مگر سن لو! یہ بات بالکل حق ہے کہ آگ میں جلنے والے ایک دوسرے سے سخت جھگڑیں گے اور یہ بھی ان کے عذاب کا ایک حصہ ہوگا۔

**آیت 65** ① **قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنْذِرٌ** ...... : سورت کی ابتدا میں رسول اللہ ﷺ کے رسول ہونے اور اللہ تعالیٰ کے ایک معبود برحق ہونے پر کفار کے تعجب اور انکار کا ذکر تھا اور ان کے یہ کہنے کا کہ کیا یہ ہمیں ہمارے اتنے معبودوں کے بجائے ایک ہی معبود کی عبادت کی دعوت دیتا ہے اور یہ کہ ہم تمام سرداروں کے ہوتے ہوئے اس پر وحی کیسے نازل ہوگئی؟ بلکہ یہ ساحر اور کذّاب ہے۔ کفار کی ان باتوں اور ان کے قیامت کے جھٹلانے اور اس کا مذاق اڑانے پر رسول اللہ ﷺ کو صبر کا حکم دیا۔ اب سورت کے آخر میں پھر اسی مضمون کو دہرایا جا رہا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ میں تو بس ایک ڈرانے والا ہوں، نہ ساحر ہوں، نہ کذّاب، نہ کچھ اور۔ صرف ڈرانے والا اس لیے کہ بشارت ماننے والوں کے لیے ہوتی ہے، منکروں کو ڈرایا ہی جاتا ہے۔

② **وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ** : عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لفظ "**اللّٰهُ**" میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات آجاتی ہیں، کیونکہ یہ معبود برحق کا عَلَم (نام) ہے، مگر یہاں اس کے واحد معبود ہونے کی دلیل کے طور پر اس کی پانچ صفات کا خاص طور پر ذکر فرمایا، پہلی صفت "**الْوَاحِدُ**" ہے، یعنی اس کے علاوہ ہر چیز جوڑا ہے، اکیلا وہی ہے۔ "**الْقَهَّارُ**" بڑے دبدبے والا، کوئی اس کے قہر کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔

**آیت 66** **رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا** ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات بیان ہوئی ہیں جو اللہ کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں، پھر کسی اور کی عبادت کیوں، جو نہ واحد ہے نہ قہر اور دبدبے کا مالک، نہ آسمان و زمین اور ان کے مابین کا رب ہے، نہ ہی اس کے ہاتھ میں قوت و اقتدار ہے اور نہ ہی گناہوں کو بخشنے کا اختیار؟

**آیت 68،67** **قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ** ...... : پچھلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کو یہ کہنے کا حکم دیا کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں اور معبود صرف اللہ ہے جو مذکورہ صفات کا مالک ہے۔ رسول اللہ ﷺ انھیں اللہ کے عذاب سے اور قیامت سے ڈراتے تھے، جس پر وہ فوراً مطالبہ کرتے کہ وہ عذاب لاؤ، قیامت لے آؤ، یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ یہاں ان کا سوال ذکر کیے بغیر اس کا جواب دینے کا حکم دیا کہ ان سے کہہ دیجیے کہ وہ قیامت بہت بڑی خبر اور بہت بڑا واقعہ ہے جس سے تم منہ موڑنے والے ہو۔ رہا مجھ سے یہ سوال کہ وہ کب آئے گی؟ تو یہ بتانا میرا کام نہیں، قیامت تو بہت دور کی بات ہے، مجھے تو آسمانوں پر

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۢ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾

مجھے سب سے اونچی مجلس کے متعلق کبھی کچھ علم نہیں، جب وہ آپس میں جھگڑتے ہیں ﴿۶۹﴾ میری طرف اس کے سوا وحی نہیں کی جاتی کہ میں تو صرف کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۷۰﴾

---

فرشتوں کی مجلس میں ہونے والی بات چیت اور بحث کا بھی کبھی علم نہیں ہوتا، سوائے اس کے جو میری طرف وحی کی جائے۔

**آیت 70، 69** مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۢ ...... : سب سے اونچی مجلس سے مراد آسمانوں پر فرشتوں کی مجلس ہے۔ "كَانَ" ہمیشگی کا معنی دیتا ہے، اس پر نفی آنے سے نفی کی ہمیشگی مراد ہوتی ہے، یعنی فرشتوں کی مجلس میں جو بحث ہوتی ہے مجھے اس کا کبھی کچھ علم نہیں ہوتا، میں عالم الغیب نہیں، اس کے متعلق میں جو کچھ تمھیں بتاتا ہوں وہ وحی الٰہی کے ذریعے سے مجھے معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی صرف ان بحثوں کے متعلق کہ جن کا تعلق لوگوں کی ہدایت اور انھیں خبردار کرنے اور ڈرانے سے ہوتا ہے۔ یہ وحی الٰہی میری نبوت کی بھی دلیل ہے، کیونکہ اگر وحی نہ ہوتی تو میں ملأ اعلیٰ میں ہونے والی کوئی بات تمھیں نہ بتا سکتا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ملأ اعلیٰ کی ایک مجلس کی گفتگو کا ذکر فرمایا، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک صبح رسول اللہ ﷺ ہم سے صبح کی نماز سے رکے رہے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ہم سورج کی ٹکیہ دیکھ لیں، پھر آپ جلدی سے نکلے، نماز کی اقامت کہی گئی اور رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی اور اس میں اختصار سے کام لیا، جب سلام پھیرا تو آواز کے ساتھ ہمیں فرمایا، اپنی اپنی جگہ اسی طرح بیٹھے رہو، پھر فرمایا: (( أَمَا إِنِّي سَأُحَدِّثُكُمْ مَا حَبَسَنِيْ عَنْكُمُ الْغَدَاةَ إِنِّي قُمْتُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَوَضَّأْتُ فَصَلَّيْتُ مَا قُدِّرَ لِي فَنَعَسْتُ فِيْ صَلَاتِي حَتَّى اسْتَثْقَلْتُ فَإِذَا أَنَا بِرَبِّي تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى فِيْ أَحْسَنِ صُوْرَةٍ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ! قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰى؟ قُلْتُ لَا أَدْرِيْ قَالَهَا ثَلَاثًا قَالَ فَرَأَيْتُهُ وَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ أَنَامِلِهِ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَتَجَلّٰى لِيْ كُلُّ شَيْءٍ وَ عَرَفْتُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ! قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰى؟ قُلْتُ فِي الْكَفَّارَاتِ قَالَ مَا هُنَّ؟ قُلْتُ مَشْيُ الْأَقْدَامِ إِلَى الْجَمَاعَاتِ وَ الْجُلُوْسُ فِي الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَوَاتِ وَ إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ فِي الْمَكْرُوْهَاتِ قَالَ ثُمَّ فِيْمَ؟ قُلْتُ إِطْعَامُ الطَّعَامِ وَ لِيْنُ الْكَلَامِ وَ الصَّلَاةُ بِاللَّيْلِ وَ النَّاسُ نِيَامٌ، قَالَ سَلْ قُلْتُ اللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَ أَنْ تَغْفِرَ لِيْ وَ تَرْحَمَنِيْ وَ إِذَا أَرَدْتَّ فِتْنَةً فِيْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ وَأَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُ إِلٰى حُبِّكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِنَّهَا حَقٌّ فَادْرُسُوْهَا ثُمَّ تَعَلَّمُوْهَا )) [ ترمذي، التفسیر، باب سورة ص : ۳۲۳۵ ] "سنو! میں تمھیں بتاؤں گا کہ آج صبح مجھے تم سے کس چیز نے روکے رکھا، میں رات کو اٹھا، وضو کیا اور جتنی نماز قسمت میں تھی وہ پڑھی، نماز میں مجھے نیند

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

**جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ بے شک میں تھوڑی سی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں ﴿۷۱﴾ تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ ﴿۷۲﴾ پس تمام فرشتوں نے، سب کے سب نے سجدہ کیا ﴿۷۳﴾ سوائے ابلیس کے، اس نے تکبر کیا اور کافروں سے ہو گیا ﴿۷۴﴾**

آ گئی، حتیٰ کہ میں بوجھل ہو گیا تو اچانک میں اپنے رب کو بہترین صورت میں دیکھتا ہوں۔ اس نے فرمایا: ''اے محمد!'' میں نے کہا: ''حاضر ہوں، اے میرے رب!'' فرمایا: ''ملأ اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا: ''میں نہیں جانتا۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ بات تین دفعہ کہی، تو میں نے اسے دیکھا کہ اس نے اپنی ہتھیلی میرے کندھوں کے درمیان رکھی، یہاں تک کہ میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک اپنے سینے کے درمیان محسوس کی، تو میرے لیے ہر چیز روشن ہو گئی اور میں نے پہچان لی۔ پھر فرمایا: ''اے محمد!'' میں نے کہا: ''حاضر ہوں اے میرے رب!'' فرمایا: ''ملأ اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا: ''کفارات کے بارے میں۔'' فرمایا: ''وہ کیا ہیں؟'' میں نے کہا: ''پیدل چل کر جماعت (کے ساتھ نماز) کے لیے جانا اور نمازوں کے بعد مسجدوں میں بیٹھنا اور ناپسندیدہ وقتوں میں وضو کرنا۔'' فرمایا: ''پھر کس چیز میں؟'' میں نے کہا: ''کھانا کھلانے میں اور نرم کلام میں اور رات کو نماز کے بارے میں جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔'' فرمایا: ''مانگ۔'' تو میں نے یہ دعا کی: " (اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ " سے لے کر " يُقَرِّبُ إِلٰى حُبِّكَ " تک) اے اللہ! میں تجھ سے نیکیاں کرنے کا سوال کرتا ہوں اور برائیاں ترک کرنے کا اور مسکینوں کی محبت کا اور یہ کہ تو مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کرے اور جب تو کسی قوم میں فتنے کا ارادہ کرے تو مجھے فتنے میں مبتلا ہوئے بغیر فوت کر لے، اور میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور اس شخص کی محبت کا جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور اس عمل کی محبت کا جو تیری محبت کے قریب کر دے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دعا حق ہے، اسے پڑھو، پھر اسے اچھی طرح سیکھو۔'' ترمذی نے فرمایا: ''یہ حدیث حسن صحیح ہے، میں نے محمد بن اسماعیل (بخاری) سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔'' شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

**آیت 71 تا 74** ① **اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ** ...... : یہ ملأ اعلیٰ میں ہونے والی ایک بحث کا ذکر ہے جو آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق ہوئی۔ اس مجلس میں فرشتوں کے ساتھ ابلیس بھی تھا اور اسے بھی آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ تفصیل سورۂ اعراف (۱۱) میں دیکھیے۔ مفسر رازی نے فرمایا: ''اس قصے کے یہاں خاص طور پر ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ کفار کو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے روکنے والی چیز ان کا حسد اور کبر تھا، ابلیس پر لعنت کا سبب بھی اس کا آدم علیہ السلام پر حسد اور کبر تھا، اس لیے کفار کو یہ قصہ سنایا۔''

قَالَ يٰۤاِبۡلِيۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ؕ خَلَقۡتَنِيۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ ۚۖ﴿۷۷﴾ وَّاِنَّ عَلَيۡكَ لَعۡنَتِيۡۤ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِيۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ ۙ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالۡحَقُّ ۫ وَ الۡحَقَّ اَقُوۡلُ ۚ﴿۸۴﴾ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ وَ مِمَّنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۸۵﴾

فرمایا اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟ کیا تو بڑا بن گیا، یا تھا ہی اونچے لوگوں میں سے؟ ﴿۷۵﴾ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور تو نے اسے مٹی سے پیدا کیا ﴿۷۶﴾ فرمایا پھر اس سے نکل جا، کیونکہ بلاشبہ تو مردود ہے ﴿۷۷﴾ اور بے شک تجھ پر جزا کے دن تک میری لعنت ہے ﴿۷۸﴾ اس نے کہا اے میرے رب! پھر مجھے اس دن تک کے لیے مہلت دے جس میں یہ اٹھائے جائیں گے ﴿۷۹﴾ فرمایا پس بے شک تو ان لوگوں سے ہے جنھیں مہلت دی گئی ﴿۸۰﴾ مقرر وقت کے دن تک ﴿۸۱﴾ کہا تو قسم ہے تیری عزت کی! کہ میں ضرور بالضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا ﴿۸۲﴾ مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو چنے ہوئے ہیں ﴿۸۳﴾ فرمایا پھر حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں ﴿۸۴﴾ کہ میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے ﴿۸۵﴾

---

❷ اللہ تعالیٰ کے آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنانے، اس میں اپنی روح پھونکنے، فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدے کا حکم دینے اور شیطان کے سجدے سے انکار اور اس کے نتیجے کے متعلق تفصیل پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے۔ مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۰ تا ۳۸)، حجر (۲۵ تا ۴۳)، اعراف (۱۱ تا ۲۵)، بنی اسرائیل (۶۱ تا ۶۵)، کہف (۵۰) اور سورۂ طٰہٰ (۱۱۶ تا ۱۲۳)۔

**آیت 75 تا 85** ❶ قَالَ يٰۤاِبۡلِيۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّ : اس آیت سے آدم علیہ السلام کا شرف اور ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ میں نے اسے اپنے دو ہاتھوں سے بنایا۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کی تاویل کرتے ہیں، مگر جب خود اس نے اپنے ہاتھوں کا ذکر فرمایا ہے تو اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ تفصیل سورۂ مائدہ کی آیت (۶۴) میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿بَلۡ يَدٰهُ مَبۡسُوۡطَتٰنِ﴾ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

❷ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ : "اَسۡتَكۡبَرۡتَ" اصل میں "أَاِسۡتَكۡبَرۡتَ" تھا، ہمزہ استفہام آنے کے بعد ہمزہ وصلی کی ضرورت نہ رہی، اس لیے اسے حذف کر دیا۔ تفصیل سورۂ حجر (۳۲ تا ۴۰) میں دیکھیے

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾

کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں سے ہوں ﴿۸۶﴾ نہیں ہے یہ مگر ایک نصیحت تمام جہانوں کے لیے ﴿۸۷﴾ اور یقیناً تم اس کی خبر کچھ وقت کے بعد ضرور جان لو گے ﴿۸۸﴾

**آیت 86** ① **قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ......** : یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ میں دین کی تبلیغ پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، نہ میرا مقصود اس سے کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنا ہے اور نہ ہی میں تکلّف کرنے والوں سے ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے نازل نہ کیا ہو اور میں اپنے پاس سے بنا لوں، یا کسی دوسرے کی بات کو اپنی طرف منسوب کر لوں۔ انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہم عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے تو انھوں نے فرمایا: (( نُهِيْنَا عَنِ التَّكَلُّفِ )) [ بخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب ما يكره من كثرة السؤال و من تكلف...... : ۷۲۹۳ ] ”ہمیں تکلّف سے منع کر دیا گیا ہے۔“

② ”**الْمُتَكَلِّفِيْنَ**“ کا مطلب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی معلوم ہوتا ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سورت کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے، مسروق کہتے ہیں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے اور انھوں نے فرمایا: (( يَا أَيُّهَا النَّاسُ! مَنْ عَلِمَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ بِهِ، وَ مَنْ لَّمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ، فَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ يَّقُوْلَ لِمَا لَا يَعْلَمُ اللّٰهُ أَعْلَمُ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِنَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب، قوله : ﴿ وما أنا من المتكلفين ﴾ : ۴۸۰۹ ] ”لوگو! جو شخص کوئی چیز جانتا ہے وہ اسے بیان کرے اور جو نہیں جانتا وہ کہہ دے ”اللہ اعلم“ کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، کیونکہ یہ بھی علم میں داخل ہے کہ جو بات نہ جانتا ہو اس کے متعلق کہہ دے ”اللہ اعلم“ کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اللہ عز وجل نے اپنے نبی سے فرمایا: ﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴾ ”کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ ہی میں بناوٹ کرنے والوں سے ہوں۔“

**آیت 87** **اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ** : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۴)۔

**آیت 88** **وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ** : یعنی قرآن مجید میں جو وعدے یا وعید آئے ہیں، یا اس نے آئندہ کے متعلق جو کچھ بتایا ہے ان کا حق ہونا کچھ وقت کے بعد دنیا میں دیکھ لو گے، جیسا کہ بدر اور دوسرے مواقع پر کفار نے دیکھ لیا، یا پھر موت کے بعد قیامت کے دن ہر حال میں دیکھ لو گے۔

سُوْرَۃُ الزُّمَر ۳۹ مکیۃ ۵۹ — بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ — اٰیَاتُھَا ۷۵ رُکُوْعَاتُھَا ۸

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ②

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ① بلاشبہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، پس اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ تو دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہو ②

**آیت 1** تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ : "الْکِتٰبِ" میں الف لام عہد کا ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''اس کتاب'' کیا گیا ہے۔ کفار کہتے تھے کہ یہ قرآن محمد (ﷺ) نے خود بنا لیا ہے، جیسا کہ سورۂ طور میں ہے: ﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَہٗ ﴾ [ الطور : ۳۳ ] ''یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ خود گھڑ لیا ہے؟'' اللہ تعالیٰ نے سورت کی ابتدا اس بات سے فرمائی کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے، ساتھ ہی اپنی دو صفات ذکر فرمائیں، تاکہ وہ اس کلام کو معمولی خیال نہ کریں، بلکہ اس کی اہمیت سمجھیں۔ ایک یہ کہ یہ کلام نازل کرنے والا عزیز یعنی سب پر غالب ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ اس کا ذرہ بھر مقابلہ بھی کر سکے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ حکیم یعنی حکمت والا ہے، اس لیے یہ کتاب سراسر دانائی اور حکمت پر مشتمل ہے، عقل سے عاری کوئی شخص ہی اس سے بے رخی اختیار کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی سورتوں کی ابتدا اس بات سے فرمائی ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور ہر جگہ اس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اپنی چند صفات کا تذکرہ فرمایا ہے، مثلاً سورۂ مومن کے شروع میں فرمایا: ﴿ حٰمٓ ۚ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴾ ''حٰمٓ۔ اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے، جو سب پر غالب، ہر چیز کو جاننے والا ہے۔'' سورۂ جاثیہ اور احقاف کے شروع میں فرمایا: ﴿ حٰمٓ ۚ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ﴾ ''حٰمٓ۔ اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' سورۂ یٰس کے شروع میں فرمایا: ﴿ تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ﴾ ''یہ سب پر غالب، نہایت مہربان کا نازل کیا ہوا ہے۔'' سورۂ حٰم السجدہ کے شروع میں فرمایا: ﴿ حٰمٓ ۚ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾ ''حٰمٓ۔ اس بے حد رحم والے، نہایت مہربان کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔'' ظاہر ہے اس میں قرآن مجید کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی تاکید ہے اور اس کی خوبی اور فضیلت کا بیان بھی، کیونکہ کلام کرنے والا جتنی اعلیٰ صفات والا ہو گا اس کا کلام بھی اتنا ہی اعلیٰ اور کامل ہو گا۔

**آیت 2** ① اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ : ''حق'' وہ ہے جو واقعہ کے عین مطابق ہو۔ اس آیت میں قرآن مجید کی مزید خوبیاں بیان فرمائیں، ایک یہ کہ پچھلی آیت میں اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ بیان فرمایا، اب یہی بات اپنا ذکر جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ کر کے فرمائی، جس سے مقصود اپنی اور اپنے کلام کی عظمت کا اظہار ہے۔ دوسری یہ کہ ہم نے اس کتاب

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾

خبردار! خالص دین صرف اللہ ہی کا حق ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔ یقیناً اللہ ان کے درمیان اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ بے شک اللہ اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا ہو، بہت ناشکرا ہو ﴿۳﴾

---

کو تیری طرف حق کے ساتھ نازل کیا ہے، اس کی ہر بات درست ہے، کوئی بات واقعہ کے خلاف نہیں، اس لیے اس پر عمل لازم ہے۔

② فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ : دین کا معنی عبادت اور اطاعت بھی ہے اور ایمان، اسلام اور احسان بھی، جیسا کہ حدیثِ جبریل میں ہے۔ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر قول و فعل میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا ارادہ اور نیت رکھے۔ شوکانی نے فرمایا، یہ آیت نیت کے ضروری ہونے کی دلیل ہے اور اس بات کی بھی کہ وہ ہر قسم کے شرک اور ریا کی ملاوٹ سے خالص ہونی چاہیے، کیونکہ اخلاص کا تعلق دل سے ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ تمام اقوال و افعال کا دارومدار نیت پر ہے، جیسا کہ فرمایا: (( إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ )) [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...... : ۱ ] ''تمام اعمال نیتوں ہی کے ساتھ معتبر ہیں۔'' دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کی عبادت (بندگی) کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ صرف اسی کی پرستش کرے، اسی کی ہدایت کی پیروی کرے اور اسی کے احکام پر عمل کرے۔

**آیت 3** ① اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ...... : یعنی اصل حقیقت تو یہی ہے کہ خالص عبادت اور اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، مگر اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو اپنا حمایتی اور مددگار سمجھنے والے مشرک لوگ عموماً یہی کہا کرتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت انھیں خالق و مالک سمجھ کر نہیں کرتے، خالق و مالک اور اصل معبود تو ہم اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں، لیکن اس کی ذات بہت بلند ہے، ہماری وہاں رسائی نہیں ہو سکتی، اس لیے ہم ان ہستیوں کو ذریعہ بناتے ہیں اور انھیں پکارتے اور ان سے فریاد کرتے ہیں، تاکہ یہ ہماری حاجتیں اور دعائیں اللہ تعالیٰ سے پوری کروا دیں۔ کئی لوگ اس کے لیے چھت پر پہنچنے کے لیے سیڑھی کے ضروری ہونے کی مثال بیان کیا کرتے ہیں۔

② اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ...... : ایک اللہ کو پکارنے اور اس کی عبادت کرنے والے تو ایک ہی معبود پر متفق ہیں مگر اس کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارنے والوں کا کسی ایک ہستی پر اتفاق نہیں، کوئی کسی کو پکارتا ہے اور کوئی کسی کو، کیونکہ کسی کے پاس اس بات کی دلیل نہیں، نہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ فلاں ہستی کو فلاں کام کا اختیار ہے، یا وہ اللہ تعالیٰ سے فلاں فلاں کام کروا سکتا ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ④

**اگر اللہ چاہتا کہ (کسی کو) اولاد بنائے تو ان میں سے جنھیں وہ پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ضرور چن لیتا، وہ پاک ہے۔ وہ تو اللہ ہے، جو اکیلا ہے، بہت غلبے والا ہے ④**

مشرکین محض گمان کی بنا پر انھیں پوجتے جا رہے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے گمان کے مطابق کسی نہ کسی داتا، دستگیر، مشکل کُشا یا حاجت روا کو پکارتا چلا جا رہا ہے۔ مشرکین کی یہ بات چونکہ بالکل ہی بودی اور بے کار ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرنے کے بجائے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومن موحدوں اور ان مشرکین کے درمیان اور مشرکوں کے مختلف گروہوں کے باہمی اختلاف میں حق بات کا فیصلہ فرمائے گا۔

③ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ** : اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے لیے دو لفظ استعمال فرمائے ہیں، ایک "**كٰذِبٌ**" اور دوسرا "**كَفَّارٌ**"۔ "**كٰذِبٌ**" اس لیے کہ اس سے بڑا جھوٹ کوئی نہیں کہ ایسی کوئی ہستی موجود ہے جس کی پرستش سے، یا اسے پکارنے سے اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل ہو جاتا ہے اور "**كَفَّارٌ**" (بہت ناشکرا) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی دعا خود سنتا اور قبول کرتا ہے، لیکن کس قدر ناشکرے ہیں وہ لوگ جو اس کی اس نعمت کی ناشکری کرتے ہوئے اس کے بجائے بے اختیار ہستیوں کو پکارتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے لیے سیڑھی وغیرہ کی مثالیں بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتا ہے، میں قریب ہوں اور یہ کہتے ہیں کہ اس تک رسائی کے لیے واسطے ضروری ہیں۔

**آیت 4** ① **لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ......** : اس آیت میں مشرکین کے ایک اور شرک یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کی نفی فرمائی ہے، کیونکہ ان میں سے بعض عزیر علیہ السلام کو اور بعض عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے اور بعض فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ظاہر ہے اولاد دو طرح کی ہو سکتی ہے، ایک حقیقی اولاد۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عقلاً محال ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ **اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** ﴾ [ الأنعام : ۱۰۱ ] "اس کی اولاد کیسے ہوگی، جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔" یعنی اللہ کی کوئی بیوی نہیں اور بیوی کے بغیر اولاد محال ہے، پھر ہر چیز اس کی مخلوق ہے اور اولاد والد کی مخلوق نہیں بلکہ اس کی ہم جنس ہوتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنی منہ بولی اولاد بنا لینا ہے۔ فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی اولاد بنانا چاہتا تو وہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا اس کے لیے چن لیتا، نہ کہ یہ معاملہ ان مشرکوں اور گمراہ یہود و نصاریٰ پر چھوڑ دیتا، مگر نہ اس نے یہ چاہا اور نہ کسی کو اولاد بنایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے یہ ارادہ کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہاں "**لَوْ**" کا لفظ تعلیق بالمحال کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖۗ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ** ﴾ [ الأنبیاء : ۱۷ ] "اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھیل بنائیں تو یقیناً اسے اپنے پاس سے بنا لیتے، اگر ہم کرنے والے ہوتے۔"

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۵﴾

اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے، ہر ایک ایک مقرر وقت کے لیے چل رہا ہے۔ سن لو! وہی سب پر غالب، نہایت بخشنے والا ہے ﴿۵﴾

② سُبْحٰنَهٗ : یہ اللہ تعالیٰ کے کسی کو اولاد نہ بنانے کی دلیل ہے۔ دوسری جگہ یہ دلیل تفصیل سے بیان فرمائی ہے: ﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ [ البقرۃ : ۱۱۶ ] ''اور انھوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کے فرماں بردار ہیں۔'' اس آیت میں تین طرح سے اللہ تعالیٰ کے کسی کو اولاد بنانے کا رد ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۱۶)۔

③ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ : اللہ تعالیٰ نے کسی کو اولاد بنانے کی نفی کرتے ہوئے پہلے اپنا ذاتی نام ''اللّٰهُ'' ذکر فرمایا، پھر اپنی صفت ''الْوَاحِدُ'' بیان فرمائی کہ جس کی تم اولاد بتا رہے ہو وہ انسان یا کوئی مخلوق نہیں بلکہ اللہ ہے، جو اصل میں ''اَلْإِلٰهُ'' ہے، یعنی وہ معبود ہے، باقی سب عبد ہیں۔ تو جو عبد ہے وہ اس کی اولاد کیسے ہو سکتا ہے؟ ''الْوَاحِدُ'' اور ''الْقَهَّارُ'' پر الف لام کی وجہ سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی وہی واحد ہے، اس کے سوا کوئی واحد نہیں، اس کا ایک ہونا کسی کو اولاد بنانے کے منافی ہے، کیونکہ اولاد اولاد بنانے والے کی جنس ہوتی ہے، جیسا کہ انسان کسی انسان ہی کو اولاد بنا سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی کوئی جنس نہیں، کیونکہ وہ ہے ہی اکیلا، تو کوئی اس کی اولاد کیسے بن گیا؟

④ الْقَهَّارُ : اور وہی قہار ہے، اس سے اولاد کی اور ہر قسم کے شریک کی نفی ہو گئی، کیونکہ ہر چیز اس کی مقہور ہے۔ وہ سب پر قاہر اور غالب ہی نہیں بلکہ قہار اور زبردست غالب ہے، جب کہ باپ اور بیٹے کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا۔ اگلی آیات میں اپنی وحدانیت اور قدرت و عظمت پر دلالت کرنے والی کئی اور چیزیں بیان فرمائیں۔

**آیت 5** ① خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ : یعنی اس نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل درست اور صحیح طریقے پر بنایا ہے۔ کوئی شخص اس کی کسی چیز کو غلط نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی اس سے بہتر پیش کر سکتا ہے، اور اس نے انھیں خاص مقصد اور مصلحت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۷۳)، یونس (۵)، حجر (۸۵) اور نحل (۳)۔

② يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ ...... : ''كَوْرُ الْعِمَامَةِ وَ تَكْوِيْرُهَا'' پگڑی لپیٹنا۔ اس آیت میں زمین کے گول ہونے کا بھی اشارہ ہے، یعنی جس طرح سر پر پگڑی لپیٹی جاتی ہے کہ اس کے ایک پیچ کے اوپر دوسرا پیچ آ جاتا ہے، جو پہلے پیچ کو چھپا لیتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ زمین کے اوپر رات کو کسی وقفے کے بغیر دن پر لپیٹتا ہے، جیسے جیسے رات کا پیچ آگے بڑھتا ہے روشنی چھپتی جاتی ہے اور تاریکی پھیلتی جاتی ہے، اس کے پیچھے دن کا پیچ سورج کی صورت میں پھیلتا چلا آتا ہے، جس سے رات کی

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶

اس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا اور تمھارے لیے چوپاؤں میں سے آٹھ قسمیں (نر و مادہ) اتاریں۔ وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں، تین اندھیروں میں، ایک پیدائش کے بعد دوسری پیدائش میں پیدا کرتا ہے۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کس طرح پھیرے جاتے ہو ۝۶

تاریکی چھپ کر روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴)۔

③ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ …… : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ رعد (۲)۔

④ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ : لفظ ''اَلَا'' اس مقصد کے لیے ہے کہ اس آیت کے مضمون پر خوب غور کرو اور اس پر خاص توجہ دو۔ ''الْعَزِيْزُ'' یعنی وہ جس نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، جو رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے، وہی سب پر غالب ہے، کسی میں طاقت نہیں کہ وہ جو کرنا چاہے اسے روک دے اور جسے روکنا چاہے وہ کر گزرے۔ ''الْغَفَّارُ'' یعنی اتنے غلبے اور قوت کے باوجود اس نے اپنے نافرمانوں کو جو مہلت دے رکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے پناہ غلبے کے ساتھ ساتھ بندوں کے گناہوں پر نہایت پردہ ڈالنے والا اور بے حد بخشنے والا بھی ہے۔

**آیت 6** ① خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ …… : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی پہلی آیت۔

② وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ : یہ بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کی دلیل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۳، ۱۴۴) جانوروں کی آٹھ قسمیں پیدا کرنے کے لیے ''اَنْزَلَ'' (اتارا) کا لفظ یہ توجہ دلانے کے لیے ہے کہ تمھیں ملنے والی نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ [ الذاریات : ۲۲ ] ''اور آسمان ہی میں تمھارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔'' بے شمار جانوروں میں سے خاص طور پر ان جانوروں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ زیادہ تر یہی جانور لوگوں کے کھانے پینے، پہننے اور دوسری ضروریات میں استعمال ہوتے ہیں۔ لوہا بھی چونکہ انسانی ضروریات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس کے لیے بھی یہی الفاظ استعمال فرمائے: ﴿ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ [ الحدید : ۲۵ ] ''اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں۔''

③ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ : ایک پیدائش کے بعد دوسری پیدائش سے مراد نطفے سے لے کر مکمل

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ وَ لَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۷﴾

**اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، پھر تمھارا لوٹنا تمھارے رب ہی کی طرف ہے تو وہ تمھیں بتلائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ یقیناً وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۷﴾**

---

انسان تک کے سارے مراحل ہیں۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۱۲ تا ۱۴)۔

④ **فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ** : اس سے مراد پیٹ کی تاریکی، رحم کی تاریکی اور اس جھلی کی تاریکی ہے جو بچے کے اوپر لپٹی ہوتی ہے۔ ماؤں کے پیٹوں میں اتنی تاریکیوں کے اندر تمھاری مختلف مرحلوں میں پیدائش، وہیں تمھارے لیے ہر ضرورت مہیا کرنا اور ہر صدمے اور چوٹ سے محفوظ رکھنا، پھر خیریت سے اس دنیا میں لے آنا اس ذات واحد ہی کی کاری گری ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ مرسلات (۲۰ تا ۲۳) اور سورۂ عبس (۱۷ تا ۲۰)۔

⑤ **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ......** : یعنی جب تمھارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور سب بادشاہی اسی کی ہے تو لازماً تمھارا الٰہ (معبود) بھی وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور کس طرح الٰہ ہو سکتا ہے، جو نہ تمھارا خالق، نہ مالک، نہ پروردگار، نہ بادشاہ اور نہ ہی اس کا ان کاموں میں کوئی حصہ، پھر تم ایسے معبود بنا کر کس طرح اور کدھر پھیرے جاتے ہو؟ معلوم ہوا انسان کی اصل فطرت توحید کا عقیدہ ہے۔ اس سے ہٹانے والا شیطان ہوتا ہے یا دوسرے لوگ جو اسے غلط راستے کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ اس میں آدمی کی غیرت کو ابھارا ہے کہ اپنی عقل اور اپنی مرضی استعمال کرنے کے بجائے اندھا دھند دوسروں کے کہنے پر غلط راستے پر جا رہے ہو، کچھ تو سوچو کہ تمھیں سیدھے راستے سے کس طرح ہٹایا اور کدھر کو لے جایا جا رہا ہے؟

**آیت 7** ① **اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ** : کفر کا معنی ناشکری بھی ہے اور انکار بھی، یعنی اگر تم اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرو، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، یا ایمان کے بجائے کفر اختیار کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے، وہ تمھارا کسی طرح بھی محتاج نہیں، نہ اسے تمھارے شکر یا ایمان کا کوئی فائدہ ہے اور نہ تمھاری ناشکری یا کفر کا کوئی نقصان، تم ہی ہر طرح سے اس کے محتاج ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ ابراہیم (۸)۔

② **وَ لَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ** : ہاں، وہ اپنے بندوں کے لیے کفر اور ناشکری کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ کہنے کے بجائے کہ ”وَلَا یَرْضٰى لَكُمُ الْكُفْرَ“ (وہ تمھارے لیے ناشکری کو پسند نہیں کرتا) یہ فرمایا کہ وہ اپنے عباد (بندوں) کے لیے ناشکری کو پسند نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی مالک اپنے غلاموں کی ناشکری کو پسند نہیں کرتا، تم اپنے

وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيۡبًا اِلَيۡهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعۡمَةً مِّنۡهُ نَسِيَ مَا كَانَ

**اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے، اس حال میں کہ اس کی طرف رجوع کرنے والا ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ اس (مصیبت) کو بھول جاتا ہے، جس کی**

متعلق سوچ لو، کیا تم اپنے کسی غلام کی ناشکری اور بغاوت کو پسند کرو گے، حالانکہ غلام تمھارے جیسے انسان ہیں، تو اللہ اپنے غلاموں کی ناشکری اور کفر کو کیسے پسند فرمائے گا، جب کہ وہ اس کے پیدا کیے ہوئے اور ہر طرح سے اس کے محتاج ہیں؟

③ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور ارادہ اور چیز ہے اور اس کی رضا اور پسند دوسری چیز ہے۔ دنیا میں کوئی بھی کام اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا، مگر اس نے انسانوں کو اور جنّوں کو ایک حد تک اختیار دیا ہے، وہ چاہیں تو اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اس پر ایمان لائیں اور اس کے احکام پر عمل کریں، یا چاہیں تو ناشکری کرتے ہوئے اس کے ساتھ کفر کریں اور اس کے احکام کی نافرمانی کریں۔ یہ اختیار دینے میں اس کی بے شمار حکمتیں ہیں، جن میں سے ایک بندوں کی آزمائش ہے، مگر وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے بندے ہو کر وہ اس کی ناشکری اور نافرمانی کریں۔ مثلاً ابلیس اور تمام کفار کا کفر اس کی مشیت اور ارادے کے ساتھ ہی ہے، وہ اللہ سے زبردست ہو کر نہیں بلکہ اس کے دیے ہوئے اختیار ہی کی وجہ سے کفر کر رہے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کو ان کا کفر کرنا پسند نہیں ہے۔

④ وَ اِنۡ تَشۡكُرُوۡا يَرۡضَهُ لَكُمۡ : ”يَرۡضَهُ“ اصل میں ”يَرۡضَاهُ“ ہے، ”اِنۡ تَشۡكُرُوۡا“ شرط کی جزا ہونے کی وجہ سے اس پر جزم آئی، جس سے ”الف“ گر گیا۔ ”ہٗ“ ضمیر ”تَشۡكُرُوۡا“ کے ضمن میں پائے جانے والے شکر کی طرف جا رہی ہے، یعنی اگر تم شکر کرو تو اللہ تعالیٰ اس شکر کو تمھارے لیے پسند فرمائے گا۔

⑤ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى : یعنی تم میں سے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، کسی دوسرے شخص کے کہنے پر یا اسے راضی رکھنے کے لیے اگر کفر اختیار کرے گا تو کوئی اس کے کفر کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ”وَازِرَةٌ“ کے مؤنث ہونے کی وجہ جاننے اور مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فاطر کی آیت (۱۸) کی تفسیر۔

⑥ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ ...... : یعنی دنیا میں تمھیں شکر یا کفر کا اختیار ہے، مگر آخر کار تم سب کو واپس اللہ کے پاس جانا ہے، جس نے تمھیں شروع میں پیدا فرمایا۔ وہ تمھیں تمھارے انھی اعمال کی خبر اور جزا دے گا جو تم کرتے رہے، یہ نہیں ہوگا کہ کسی اور کے عمل تمھارے ذمے ڈال دیے جائیں، یا تمھارے نیک یا بد اعمال غائب کر دیے جائیں۔

⑦ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ : یہ اس سے پہلے جملے کی علت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو تم میں سے ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے پیش کرنا کچھ مشکل نہیں، کیونکہ وہ تو سینوں کی باتوں تک کو پوری طرح جاننے والا ہے، پھر کوئی قول یا عمل اس سے کس طرح مخفی رہ سکتا ہے؟

**آیت 8** ① وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ : اپنی وحدانیت اور کمال قدرت کے بہت سے دلائل اور انھیں دیکھنے کے بعد شکر یا

يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝۸

جانب وہ اس سے پہلے پکارا کرتا تھا اور اللہ کے لیے کئی شریک بنا لیتا ہے، تاکہ اس کے راستے سے گمراہ کر دے۔ کہہ دے اپنی ناشکری سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا لے، یقیناً تو آگ والوں میں سے ہے ۝۸

---

کفر کرنے والوں کا انجام بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے خوش حالی اور بدحالی میں انسان کی طبیعت کا ذکر فرمایا، ساتھ ہی بتا دیا کہ دونوں حالتوں میں مومن و کافر اور عالم و جاہل برابر نہیں ہیں۔ آیت میں "اَلْاِنْسَانَ" سے مراد کافر و مشرک ہے، کیونکہ اس کے متعلق آگے آ رہا ہے: ﴿وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ کہ نعمت ملنے پر وہ اللہ کے لیے کئی شریک بنا لیتا ہے۔ جن مشرک انسانوں کا یہاں ذکر ہے وہ کم از کم مصیبت میں تو ایک اللہ کو پکارتے تھے، مگر ہمارے زمانے کے کئی اسلام کے دعوے دار مصیبت میں اور سمندر میں طوفان کے وقت بھی غیر اللہ کو پکارتے رہتے ہیں۔ [ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ]

2 دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ : یعنی تکلیف اور مصیبت کے وقت وہ پورے خلوص کے ساتھ اپنے رب کو پکارتا ہے، اس وقت اسے کوئی دوسرا معبود یاد نہیں رہتا، وہ سب سے مایوس ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات موجود ہے کہ وہ تکلیف اس کا کوئی حاجت روا یا مشکل کُشا یا داتا یا دستگیر دور نہیں کر سکتا، اسے دور کرنے والا صرف ایک اللہ ہے۔ "مُنِيْبًا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے غیروں کو پکارتا تھا، مصیبت کے وقت سب کو چھوڑ کر واپس اللہ کی طرف آ جاتا ہے۔

3 ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ : نعمت عطا فرمانے سے مراد اس تکلیف کا دور کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی نعمت مراد ہو سکتی ہے۔

4 نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ : "اِلَيْهِ" میں ضمیر "ہٗ" سے مراد "ضُرٌّ" ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ﴾ [ یونس : ۱۲ ] "اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پہلو پر یا بیٹھا ہوا یا کھڑا ہوا ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں کسی تکلیف کی طرف، جو اسے پہنچی ہو، پکارا ہی نہیں۔"

5 وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ : یعنی اللہ کی راہ (اسلام و توحید) سے وہ نہ صرف خود گمراہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ ہمیں تو فلاں آستانے سے شفا نصیب ہوئی تھی، فلاں بزرگ کی نظر کرم سے ہم مصیبت سے نکل آئے اور فلاں حضرت جی کی توجہ سے ہماری کشتی کنارے آ لگی۔ اس طرح یہ جاہل جھوٹی کہانیاں گھڑ کر بے بس اور بے اختیار مخلوق کو اللہ کا شریک بنا کر لوگوں کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔

6 قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ...... : فرمایا، اس مشرک انسان کو کہہ دے کہ اپنے کفر و شرک کے ذریعے سے لوگوں کو گمراہ

اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ ؕ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۹﴾ ع ۱ / ۹ / ۱۵

(کیا یہ بہتر ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے عبادت کرنے والا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے؟ کہہ دے کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے؟ نصیحت تو بس عقلوں والے ہی قبول کرتے ہیں ﴿۹﴾

کر کے حاصل ہونے والی لذتوں سے معمولی فائدہ اٹھالے، مگر یہ بالکل تھوڑی مدت کے لیے ہے، بہت جلد یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور تو آگ والوں میں شامل ہو کر ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنے والا ہے۔ آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۱۲)۔

**آیت 9** ① **اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ** ...... : "**قَانِتٌ**" کا معنی عبادت کرنے والا بھی ہے، فرماں بردار بھی اور خشوع و عاجزی کرنے والا بھی۔ "**اَمَّنۡ**" (یا وہ شخص) کے لفظ سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کچھ الفاظ محذوف ہیں، یعنی "أَ هٰذَا خَيْرٌ" (کیا یہ مصیبت میں اپنے رب کو پکارنے والا اور نعمت عطا ہونے پر اسے بھول جانے والا بہتر ہے) "**اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ**" یا وہ شخص جو صرف دن کے وقت ہی نہیں بلکہ رات کی گھڑیوں میں بھی سجدے اور قیام کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے والا اور ہر حال میں اسی کا فرماں بردار ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ یہ مومن (قانت) ہر لحاظ سے اس سے بہتر ہے۔

② **یَحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ** : ایمان اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس سے امید کے درمیان ہے۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان کے پاس گئے جو موت (کے چل چلاؤ) میں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَيْفَ تَجِدُكَ؟ قَالَ وَاللّٰهِ! يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ أَرْجُو اللّٰهَ وَ إِنِّيْ أَخَافُ ذُنُوْبِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَا يَجْتَمِعَانِ فِيْ قَلْبِ عَبْدٍ فِيْ مِثْلِ هٰذَا الْمَوْطِنِ إِلَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ مَا يَرْجُوْ وَ آمَنَهُ مِمَّا يَخَافُ )) [ ترمذي، الجنائز، باب الرجاء باللّٰه والخوف بالذنب عند الموت : ۹۸۳ ] "تو اپنے آپ کو کس حال میں پاتا ہے؟" اس نے کہا: "اللہ کی قسم! یا رسول اللہ! میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا بھی ہوں۔" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس جیسے مقام پر کسی بندے کے دل میں یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوتیں مگر اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز عطا کر دیتا ہے جس کی وہ امید رکھتا ہے اور اس چیز سے اسے امن عطا کر دیتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے۔"

③ **قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ** ...... : یہاں "**الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ**" (جاننے والے) ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو دن رات، خوش حالی و بدحالی میں ہر وقت ایک اللہ ہی کی عبادت کرنے والے اور اسی کے فرماں بردار ہیں اور "**وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ**" (نہ جاننے والے) ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو تکلیف اور مصیبت میں تمام معبودوں سے واپس پلٹ کر ایک اللہ ہی کو پکارتے ہیں، مگر خوش حالی میں اسے بھول کر اللہ تعالیٰ کے لیے کئی شریک بنا لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰

کہہ دے اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس دنیا میں نیکی کی، بڑی بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، صرف کامل صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا ۝۱۰

---

تمام اختیارات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، نعمت عطا ہونے پر اسے بھلا دیتے ہیں اور اس کے شریک بنا لیتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں نہ جاننے والے قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے علم پر عمل نہیں کرتا وہ جاہل (لَا يَعْلَمُ) ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [ فاطر : ۲۸ ] ''اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف علماء (جاننے والے) ہی ڈرتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنے والے اللہ کے نزدیک علماء نہیں، خواہ ان کے پاس کتنی ڈگریاں اور کتنے عہدے ہوں اور خواہ انھوں نے کتنی کتابیں یا کتب خانے چاٹ رکھے ہوں۔

4 اس آیت سے علم اور اس پر عمل کرنے والے اہلِ علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَتْلُوْهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَ آنَاءَ النَّهَارِ، وَ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ )) [ بخاري، التوحيد، باب قول النبي صلی اللہ علیہ وسلم رجل آتاه الله القرآن...... : ۷۵۲۹ ] ''دو چیزوں کے سوا رشک کرنا درست نہیں، ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا تو وہ رات کی گھڑیوں میں اور دن کی گھڑیوں میں اس کی تلاوت کرتا ہے، اور ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے کھلا مال عطا کیا ہے تو وہ رات کی گھڑیوں اور دن کی گھڑیوں میں اسے خرچ کرتا ہے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ نے ''بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ'' میں علم کی فضیلت میں دو آیات نقل فرمائی ہیں، ایک سورۂ مجادلہ کی: ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ [ المجادلة : ۱۱ ] ''اللہ ان لوگوں کو درجوں میں بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا۔'' اور دوسری سورۂ طٰہٰ کی: ﴿وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ [ طٰه : ۱۱۴ ] ''اور کہہ اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔'' موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ بھی علم کی فضیلت کی دلیل ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۷۴)

5 اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ : ''الْاَلْبَابِ'' ''لُبٌّ'' کی جمع ہے، مغز، عقل۔ جمع ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''عقلوں والے'' کیا گیا ہے۔ ان عقلوں والوں سے مراد اہلِ ایمان ہیں نہ کہ کفار، گو وہ اپنے آپ کو کس قدر عقل و دانش والے سمجھتے ہوں، کیونکہ جب وہ اپنی عقلوں کو استعمال کر کے نصیحت حاصل ہی نہیں کرتے تو عقلوں والے کیسے ہوئے!؟ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کی طرح بلکہ ان سے بھی ''اضل'' قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹) اور انبیاء (۴۶) کی تفسیر۔

**آیت 10** 1 قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ : سورت کے شروع سے توحید کا بیان آ رہا ہے، اب بڑی محبت کے

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۟ۙ (۱۱)

کہہ دے بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں، اس حال میں کہ دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہوں (۱۱)

ساتھ ایمان والوں کو ''میرے بندو'' کہہ کر انھیں یہ پیغام دینے کا حکم دیا کہ صرف زبان سے توحید کا اقرار کافی نہیں، بلکہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ ''تَقْوٰی'' ''وَقٰی یَقِيْ وِقَايَةً'' کا مصدر ہے، اس کا لفظی معنی ''بچنا'' ہے، مراد ایسے تمام کام چھوڑ دینا ہے جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ڈر ہے اور ایسے تمام کام کرنا جن کے چھوڑنے سے اس کے عذاب کا ڈر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرو اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کرو۔

❷ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ : ''حَسَنَةٌ'' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ ''فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا'' کا تعلق ''اَحْسَنُوْا'' کے ساتھ ہے، یعنی جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک اعمال کیے ان کے لیے عظیم بھلائی ہے۔ اس بھلائی سے مراد دنیا کی بھلائی بھی ہے اور آخرت کی بھلائی بھی، کیونکہ رسول ﷺ کی اکثر دعا یہ تھی: «اَللّٰهُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ» [ بخاري، الدعوات، باب قول النبي ﷺ ربنا ...... : ٦٣٨٩ ] ''اے اللہ! ہمیں اس دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھلائی عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچانا۔'' مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۰۱) کی تفسیر۔ دنیا اور آخرت دونوں میں اس بھلائی کی تفصیل کے لیے سورۂ نحل (۹۷) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

❸ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ : یہ ہجرت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اگر کسی جگہ تم اللہ کے تقویٰ پر کار بند نہیں رہ سکتے اور اللہ کے دین پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ ہے تو اللہ کی زمین وسیع ہے، کسی دوسری جگہ چلے جاؤ، جہاں آزادی سے اللہ کے احکام پر عمل کر سکو۔ اس جملے کی مفصل تفسیر کے لیے سورۂ نساء کی آیات (۹۷ تا ۱۰۰) اور ان کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

❹ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ : صبر کا لفظی معنی باندھنا ہے۔ اہل علم نے صبر کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر صبر، اس کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب پر صبر اور پیش آنے والی تکلیفوں اور مصیبتوں پر صبر۔ صابر وہ ہے جس کی خصلت ہی صبر ہو۔ فرمایا، جن لوگوں کی خصلت صبر ہے، صرف یہی لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر کسی حساب کے بغیر دیا جائے گا۔ اس میں ہجرت کے دوران پیش آنے والی تکالیف پر صبر کی تلقین ہے اور اس پر بے حساب اجر کی بشارت ہے۔ بغیر حساب اجر سے مراد جنت ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ رہنے والی ہے۔ دنیا کی ہر نعمت خواہ کتنی ہو ختم ہونے والی ہے اور ختم ہونے والی ہر چیز کا حساب ہو سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾ [ المؤمن : ٤٠ ] ''اور جس نے کوئی نیک عمل کیا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہوا تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اس میں بے حساب رزق دیے جائیں گے۔''

آیت 11 قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ ...... : سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴾

وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳﴾ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴿۱۴﴾

**اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ماننے والوں میں سے پہلا میں بنوں ﴿۱۲﴾ کہہ دے بے شک میں ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں ﴿۱۳﴾ کہہ دے میں اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اس حال میں کہ اسی کے لیے اپنے دین کو خالص کرنے والا ہوں ﴿۱۴﴾**

[ الزمر : ۲ ] اب نبی ﷺ کو حکم دیا کہ کہہ دے مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں، اس حال میں کہ اپنی بندگی، اطاعت اور نیت کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہوں۔ تفصیل اسی سورت کی آیت (۲) میں دیکھیے۔

**آیت 12** ① وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ : "لِاَنْ اَكُوْنَ" میں لام "باء" کے معنی میں ہے: "أَيْ أُمِرْتُ بِأَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ" یعنی اللہ کا پیغام پہنچانے والے کی حیثیت سے میرا کام صرف یہ نہیں کہ اس کا پیغام پہنچا دوں، بلکہ مجھے حکم ہے کہ اس کی فرماں برداری کرنے والوں میں سب سے پہلا فرماں بردار میں بنوں۔ میں ان جابر بادشاہوں کی طرح نہ بنوں جو لوگوں کو کئی کاموں کا حکم دیتے ہیں، مگر خود وہ کام نہیں کرتے، بلکہ میں تمھیں اللہ کے جو احکام پہنچاؤں، سب سے پہلے خود ان پر عمل کروں۔

② "لِاَنْ اَكُوْنَ" میں "لام" علت بیان کرنے کے لیے بھی ہو سکتا ہے، اس صورت میں دونوں آیات کا ترجمہ اس طرح ہوگا، کہہ دے مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں، اس حال میں کہ دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہوں اور مجھے یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ میں تمام مسلمانوں میں سب سے پہلا بنوں (کیونکہ دین میں پیش قدمی اخلاص ہی سے حاصل ہوتی ہے)۔ مفسر ابو السعود نے کہا: "وَ أُمِرْتُ بِذٰلِكَ لِأَجَلِ أَنْ أَكُوْنَ مُقَدِّمَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لِأَنَّ إِحْرَازَ قَصَبِ السَّبْقِ فِي الدِّيْنِ بِالْإِخْلَاصِ فِيْهِ"

**آیت 13** قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ...... : یعنی اے پیغمبر! کہہ دے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں اور اپنی عبادت اور اطاعت اس کے لیے خالص کرنے کے بجائے تمھاری طرح اس کا کوئی شریک بناؤں تو میں ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ میرے جیسا شخص بھی (جسے اللہ تعالیٰ نے سید ولد آدم بنایا، جس کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف فرما دیے) اگر اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے شرک کا ارتکاب کر بیٹھے، تو اس عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہے، تو اپنے متعلق تم خود سوچ لو۔ تفصیل سورۂ زمر (۶۴، ۶۵) اور سورۂ انعام (۱۴، ۱۵ اور ۸۱ تا ۸۸) کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 14** قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ...... : لفظ "اللّٰهَ" کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی کہہ دے میں تو صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں، کسی اور کی عبادت نہ اسے اصل سمجھ کر کرتا ہوں نہ سفارشی یا واسطہ سمجھ کر۔ پچھلی آیت: ﴿ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ

فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۵﴾ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾

**تو تم اس کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو۔ کہہ دے بے شک اصل خسارہ اٹھانے والے تو وہ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا۔ سن لو! یہی صریح خسارہ ہے ﴿۱۵﴾ ان کے لیے ان کے اوپر سے آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے سے بھی سائبان ہوں گے۔ یہ ہے وہ جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، اے میرے بندو! پس تم مجھ سے ڈرو ﴿۱۶﴾**

اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ ...... ﴾ میں ایک اللہ کی عبادت کے امر کا اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اس آیت میں اس پر اپنے عمل کے اعلان کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے تکرار نہیں ہے۔

**آیت 15** ① **فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ** : اس میں ایک تو شرک اور مشرکین سے علیحدگی اور براءت کا اعلان ہے کہ تم اللہ کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو، مجھ سے یہ توقع ہرگز نہ رکھو۔ سورۂ کافرون میں یہی مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ دوسرے اس میں مشرکین کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر میرے سمجھانے کے باوجود تم ان جھوٹے معبودوں کی بندگی پر ڈٹے ہوئے ہو تو ڈٹے رہو، مگر سزا بھگتنے پر بھی تیار رہو۔ تمھارے انجام کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔

② **قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ** ...... : "الْخٰسِرِيْنَ" میں الف لام کمال کے معنی کے لیے ہے، یعنی کامل اور اصل خسارے والے وہ ہیں۔ آدمی کو اپنی جان اور گھر والے سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ فرمایا، کہہ دے اصل خسارے والے لوگ وہ ہیں جنھوں نے شرک کر کے اور شرک کی تعلیم دے کر قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کا ایندھن بنایا، کیونکہ دنیا کے خسارے کا تو مداوا ہو سکتا ہے مگر قیامت کے دن کے خسارے کا کوئی مداوا نہیں۔

③ **اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ** : مشرکین کی غباوت اور کند ذہنی کو مد نظر رکھ کر ایک دفعہ پھر صاف لفظوں میں ان کے واضح خسارے کا اظہار فرمایا، تاکہ کسی جملے ہی سے وہ توحید کی طرف پلٹ آئیں۔

**آیت 16** ① **لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ** ......: "ظُلَلٌ" "ظُلَّةٌ" کی جمع ہے، سائبان، چھتر، ڈھانپنے یا سایہ کرنے والی کوئی چیز، جس کی دیواریں نہ ہوں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ﴾ [ لقمان : ۳۲ ] "اور جب انھیں سائبانوں جیسی کوئی موج ڈھانپ لیتی ہے۔" یعنی ان کے اوپر اور نیچے ہر طرف آگ کے سائبان ہوں گے۔ نیچے والی آگ کی لپٹوں کو سائبان اس لیے کہا گیا کہ وہ کچھ اور لوگوں کے اوپر ہوں گی، کیونکہ جہنم میں کئی طبقے ہیں، جنھیں درکات کہا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [ النساء : ۱۴۵ ] "بے شک منافق لوگ

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ

**اور وہ لوگ جنھوں نے طاغوت سے اجتناب کیا کہ اس کی عبادت کریں اور اللہ کی طرف رجوع کیا انھی کے لیے خوش خبری ہے، سو میرے بندوں کو بشارت دے دے ﴿۱۷﴾ وہ جو کان لگا کر بات سنتے ہیں، پھر اس میں سب سے اچھی بات کی پیروی**

آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔'' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آگ کی لپٹوں کو نیچے سے اوپر اٹھنے کی وجہ سے سائبان کہا گیا ہو۔ دوسری آیت میں نیچے والی آگ کو ان کے بچھونے اور اوپر والی آگ کو ان کے لحاف بتایا ہے، فرمایا: ﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ﴾ [ الأعراف : ٤١ ] ''ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا اور ان کے اوپر کے لحاف ہوں گے۔'' اور ایک آیت میں فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ [ العنکبوت : ٥٥ ] ''جس دن عذاب انھیں ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ڈھانپ لے گا۔'' اللہ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے۔

② **ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ......** : یعنی یہ قیامت کا خسارہ اور آگ کے سائبان ہیں جن کے ساتھ اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، تو اے میرے بندو! مجھ سے ڈر جاؤ اور ہمیشہ ڈرتے رہو۔

**آیت 17** ① **وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ......** : ''الطَّاغُوْتَ'' کی لغوی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵۶)۔ استاذ محمد عبدہ لکھتے ہیں، اصل میں لفظ ''الطَّاغُوْتَ'' (بروزن فَعَلُوْتٌ لَا فَاعُوْلٌ أَصْلُهُ طَغَيُوْتٌ أَوْ طَغَوُوْتٌ) ''طُغْيَانٌ'' سے مشتق ہے، لہٰذا اس سے مراد شیطان بھی ہے اور بت بھی اور ہر وہ انسان بھی جو بندگی کی حد سے نکل کر اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر رکھتا ہو۔ اس کی عبادت سے مراد محض اسے سجدہ کرنا نہیں بلکہ اسے مستقل بالذات آمر و مطاع سمجھتے ہوئے اس کے احکام کی بجا آوری بھی ہے۔ جوہری لکھتے ہیں: ''اَلطَّاغُوْتُ الْكَاهِنُ وَالشَّيْطَانُ وَ كُلُّ رَأْسٍ فِي الضَّلَالِ'' کہ اس سے مراد شیطان، کاہن اور ہر وہ چیز ہے جو گمراہی کا منبع بنے۔ امام راغب کہتے ہیں: ''هُوَ عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مَعْبُوْدٍ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' کہ وہ ہر اس چیز سے عبارت ہے جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے۔ (روح) (اشرف الحواشی)

② معلوم ہوا توحید کے لیے صرف اللہ کی عبادت کافی نہیں، بلکہ طاغوت سے کنارا کشی بھی لازم ہے، اس لیے کلمہ توحید ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' میں پہلے تمام الٰہوں کی نفی ہے، پھر ایک اللہ کی عبادت کا اثبات ہے۔

③ **لَهُمُ الْبُشْرٰى** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس کی آیت (۶۴)۔

④ **لَهُمُ الْبُشْرٰى** : ''عِبَادِ'' اصل میں ''عِبَادِيْ'' ہے، آیات کے فواصل کی مناسبت کے لیے یاء کو حذف کر کے دال پر کسرہ باقی رکھا گیا ہے اور ترجمہ ''میرے بندوں کو'' کیا گیا ہے۔

**آیت 18** ① **الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ** : اس جملے کی تین تفسیریں ہیں، ایک یہ کہ میرے ان بندوں

# اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

**کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور یہی عقلوں والے ہیں ﴿۱۸﴾**

کو بشارت دے جو ہر بات سنتے ہیں، مگر پیروی صرف قرآن و سنت کی کرتے ہیں، کیونکہ سب باتوں سے اچھی بات اللہ کی نازل کردہ بات ہے، جیسا کہ آگے آیت (۲۳) میں آ رہا ہے: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ﴾ ''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَحْسَنُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ وَ أَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ )) [ نسائي، السهو، باب نوع من الذكر بعد التشهد : ۱۳۱۲، عن جابر رضی اللہ عنہ ] ''ہر کلام سے اچھا اللہ کا کلام ہے اور ہر طریقے سے اچھا محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔'' دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ قرآن سنتے ہیں جس میں کچھ احکام حسن (اچھے) ہیں اور کچھ اَحسن (زیادہ اچھے) ہیں، پھر وہ احسن کی پیروی کرتے ہیں۔ مثلاً قصاص لینا یا معاف کر دینا، زیادتی پر انتقام لینا یا صبر کرنا، قرض وصول کرنے میں مہلت دینا یا چھوڑ دینا، اگرچہ تینوں معاملات میں مذکور دونوں کام اچھے ہیں، مگر دوسرا کام پہلے سے زیادہ اچھا ہے۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ وہ اچھی بری سبھی باتیں سنتے ہیں، مگر کرتے وہی بات یا وہی کام ہیں جو سب سے اچھا ہو۔ ابن عطیہ نے ''المحرر الوجیز'' میں فرمایا: ''هُوَ عَامٌّ فِي جَمِيعِ الْأَقْوَالِ وَالْقَصْدُ الثَّنَاءُ عَلَى هٰؤُلَاءِ بِبَصَائِرَ وَ نَظَرٍ سَدِيْدٍ يُفَرِّقُوْنَ بِهِ بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ وَ بَيْنَ الصَّوَابِ وَالْخَطَإِ فَيَتَّبِعُوْنَ الْأَحْسَنَ مِنْ ذٰلِكَ'' ''یہ تمام اقوال کے لیے عام ہے، مقصد ان لوگوں کی بصیرتوں اور درست غور و فکر کی تعریف ہے جس کے ساتھ وہ حق و باطل اور درست اور خطا کے درمیان فیصلہ کرتے ہیں، پھر اس میں سے احسن کی پیروی کرتے ہیں۔'' الفاظ عام ہونے کی وجہ سے تیسری تفسیر زیادہ ظاہر ہے۔

② **اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ** ...... : ہر قسم کے اقوال سن کر سب سے اچھی بات کی جستجو کر کے اس پر عمل کرنے والوں ہی کو اللہ تعالیٰ نے وہ لوگ قرار دیا جنھیں اس نے ہدایت دی اور صرف انھی کو عقلوں والے قرار دیا۔

③ اس آیت سے تقلید کی واضح تردید ہو رہی ہے، کیونکہ تقلید کا معنی ہے: ''أَخْذُ قَوْلِ الْغَيْرِ بِلَا دَلِيْلٍ'' یعنی اللہ اور اس کے رسول کے غیر کی بات بلا دلیل لے لینا۔ مقلد اپنے بنائے ہوئے پیشوا کے علاوہ اوّل تو کسی کی بات سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، اگر سن بھی لے تو اپنے پیشوا کی بات پر جما رہتا ہے۔ دوسری بات خواہ قرآن مجید کی آیت ہو یا رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہو اور خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہو، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے نہ مانتا ہے۔ جب کہ مومن ہر بات غور سے سن کر اس کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور احسن پر عمل کرتا ہے۔ جہنم میں جانے والے تمنا کریں گے کہ کاش! وہ دنیا میں سنتے یا سمجھتے ہوتے، مگر اس وقت جب ان کی تمنا پوری ہونے کی کوئی صورت نہ ہوگی، فرمایا: ﴿وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [ الملك : ۱۰ ] ''اور وہ کہیں گے، اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔'' ایسے لوگ نہ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور نہ ان کا شمار ''اولوا الالباب'' میں ہو سکتا ہے۔

اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَيۡهِ كَلِمَةُ الۡعَذَابِ ؕ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِى النَّارِ ۚ﴿۱۹﴾ لٰـكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ غُرَفٌ مِّنۡ فَوۡقِهَا غُرَفٌ مَّبۡنِيَّةٌ ۙ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۖ وَعۡدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ الۡمِيۡعَادَ ﴿۲۰﴾

تو کیا وہ شخص جس پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی، پھر کیا تو اسے بچا لے گا جو آگ میں ہے ﴿۱۹﴾ لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، ان کے لیے بالا خانے ہیں، جن کے اوپر خوب بنائے ہوئے بالا خانے ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہ رہی ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ﴿۲۰﴾

**آیت 19** **اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَيۡهِ كَلِمَةُ الۡعَذَابِ**...... : تو کیا وہ شخص جس (کے شیطان کی پیروی اور کفر پر اصرار اور ضد اور عناد کی وجہ سے اس) پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی اور جسے اللہ تعالیٰ آگ میں ڈالنے کا فیصلہ فرما چکا (دیکھیے سورۂ ص : ۸۵) تو اے نبی! کیا تو اسے بچا لے گا جو آگ میں ہے؟ نہیں! تو ہرگز نہیں بچا سکے گا۔ پھر جسے تو نہ بچا سکا تو اور کون ہے جو اسے آگ سے بچا سکے گا؟ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ بے شک آپ کی شدید خواہش ہے کہ سب لوگ ایمان لے آئیں مگر ایمان لانے کی توفیق دینا یا نہ دینا آپ کے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ ﴾ [ القصص : ٥٦ ] ”بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے۔“

**آیت 20** ❶ **لٰـكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ غُرَفٌ** ...... : جہنمیوں کے ذکر کے ساتھ ہی متقیوں کا حسن انجام بیان فرمایا، تاکہ ترہیب کے ساتھ ترغیب بھی جاری رہے۔ علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَغُرَفًا يُرٰی ظُهُوْرُهَا مِنْ بُطُوْنِهَا وَ بُطُوْنُهَا مِنْ ظُهُوْرِهَا فَقَامَ إِلَيْهِ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ لِمَنْ هِيَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ!؟ قَالَ هِيَ لِمَنْ أَطَابَ الْكَلَامَ وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ وَ أَدَامَ الصِّيَامَ وَ صَلّٰی لِلّٰهِ بِاللَّيْلِ وَ النَّاسُ نِيَامٌ )) [ ترمذي، صفة الجنة، باب ما جاء في صفة غرف الجنة : ٢٥٢٧، و قال الألباني حسن ] ”جنت میں ایسے اونچے محل ہیں جن کے باہر کے حصے ان کے اندر کے حصوں سے اور اندر کے حصے باہر کے حصوں سے دکھائی دیتے ہیں۔“ ایک اعرابی نے اٹھ کر پوچھا: ”اے اللہ کے نبی! وہ کن کے لیے ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ان کے لیے جو پاکیزہ گفتگو کریں اور کھانا کھلائیں اور روزوں پر ہمیشگی کریں اور اللہ کے لیے نماز پڑھیں جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔“

❷ **مِّنۡ فَوۡقِهَا غُرَفٌ**...... : یعنی متقی لوگوں کے لیے اونچے محل ہیں، جن سے مزید بلندی پر اور اونچے محل ہیں، ان کی بلندی کا ذکر سورۂ فرقان کی آیت (۷۵) کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

❸ ”**مَّبۡنِيَّةٌ**“ ”بَنٰی يَبْنِيْ بِنَاءً“ سے اسم مفعول ہے۔ ”بنائے ہوئے“ سے مراد نہایت خوبی سے بنائے ہوئے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! حَدِّثْنَا عَنِ الْجَنَّةِ، مَا بِنَاؤُهَا؟ قَالَ لَبِنَةٌ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

**کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر اسے چشموں کی صورت زمین میں چلایا، پھر وہ اس کے ساتھ کھیتی نکالتا ہے، جس کے رنگ مختلف ہیں، پھر وہ پک کر تیار ہو جاتی ہے، پھر تو اسے دیکھتا ہے پیلی ہونے والی، پھر وہ اسے چورا بنا دیتا ہے، بے شک اس میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بڑی نصیحت ہے ﴿۲۱﴾**

ذَهَبٍ وَ لَبِنَةُ فِضَّةٍ، وَمِلَاطُهَا الْمِسْكُ الْأَذْفَرُ، وَ حَصْبَاؤُهَا اللُّؤْلُؤُ وَالْيَاقُوتُ، وَ تُرَابُهَا الزَّعْفَرَانُ، مَنْ يَدْخُلُهَا يَنْعَمُ وَ لَا يَبْأَسُ، وَ يَخْلُدُ وَ لَا يَمُوتُ، لَا تَبْلَى ثِيَابُهُ وَ لَا يَفْنَى شَبَابُهُ ‹‹ [ مسند أحمد : ۳۰۵/۲، ح : ۸۰۶۳، قال المحقق صحیح بطرقه و شواهده ] ’’یا رسول اللہ! ہمیں جنت کے متعلق بتائیں کہ وہ کس چیز کی بنی ہوئی ہے؟‘‘ فرمایا: ’’ایک اینٹ سونے کی، ایک اینٹ چاندی کی، اس کا گارا مہکنے والی کستوری ہے، اس کی کنکریاں لؤلؤ اور یاقوت ہیں اور اس کی مٹی زعفران ہے۔ جو اس میں داخل ہوگا خوش حال رہے گا، کبھی بدحال نہیں ہوگا، ہمیشہ زندہ رہے گا، کبھی فوت نہیں ہوگا، نہ اس کے کپڑے کبھی بوسیدہ ہوں گے اور نہ ہی اس کی جوانی ختم ہوگی۔‘‘

❹ ’’**مَبْنِيَّةٌ**‘‘ (بنائے ہوئے) کے لفظ سے ظاہر ہے کہ جنت کے وہ محل بنائے جا چکے ہیں اور جنت متقی بندوں کے لیے تیار کی جا چکی ہے، فرمایا: ﴿ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۳ ] ’’(جنت) ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔‘‘

**آیت 21** ❶ **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ......** : ’’**يَنَابِيْعَ**‘‘ ’’يَنْبُوْعٌ‘‘ کی جمع ہے، جس کا معنی چشمہ بھی ہے اور بہت پانی والا نالہ بھی۔ (قاموس) ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں کہ زمین میں موجود پانی کا اصل آسمان ہی سے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴾ [ الفرقان : ۴۸ ] ’’اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا۔‘‘ آسمان سے اترنے کے بعد یہ پانی زمین کی تہوں میں چلا جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے ضرورت کے مطابق جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے اور چھوٹے یا بڑے چشموں کی صورت میں باہر نکالتا ہے، جس سے ندی نالے اور دریا بنتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ﴾ ’’پھر اسے چشموں کی صورت میں زمین میں چلایا۔‘‘

❷ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ آگ کے عذاب اور ہمیشہ ہمیشہ کی جنت کے ذکر کے ساتھ ہی دنیا کی زندگی کی زیب و زینت اور خوش حالی کے عارضی اور ناپائیدار ہونے کا ذکر فرمایا۔ آسمان سے اترنے والے پانی کے ساتھ پیدا ہونے والی کھیتی کا جو حال اس آیت میں بیان ہوا ہے یہی حال انسان کا ہے، وہ پہلے بچہ ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، پھر پختہ ہو کر بوڑھا ہو جاتا ہے، آخر کار دنیا سے سدھار جاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز کا یہی حال ہے، اس کی سب زینتیں عارضی اور چند روزہ ہیں، اس کے ہر کمال

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾

تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، سو وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر ہے (کسی سخت دل کافر جیسا ہو سکتا ہے؟) پس ان کے لیے ہلاکت ہے جن کے دل اللہ کی یاد کی طرف سے سخت ہیں، یہ لوگ صریح گمراہی میں ہیں ﴿۲۲﴾

---

کو زوال ہے اور اس کی ہر چیز کو آخر کار فنا ہونا ہے۔ اس آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۲۴)، کہف (۴۵) اور حدید (۲۰)۔

③ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ : مختلف رنگوں سے مراد مختلف رنگ بھی ہیں، مثلاً سبز، سرخ، زرد وغیرہ اور مختلف قسمیں بھی، مثلاً گندم، جو اور چنے وغیرہ۔ یہ دلیل ہے کہ ایک ہی پانی اور ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور ذائقوں کی کھیتیاں پیدا کرنا اندھے بہرے مادے کا کام نہیں، بلکہ ایک قادر و مختار ہستی کا کام ہے۔ دیکھیے سورۂ رعد (۴)۔

④ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا : "هَاجَ يَهِيْجُ هَيْجًا وَ هِيَاجًا وَ هَيَجَانًا الشَّيْءُ" کسی چیز کا ابھرنا، حرکت کرنا۔ "هَاجَ النَّبْتُ" کھیتی کا خشک ہونا۔

⑤ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا : "حَطِمَ (س) الشَّيْءُ حَطَمًا" کسی چیز کا ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانا۔ "حُطَامًا" "فُتَاتًا" کا ہم وزن اور ہم معنی ہے، ریزہ ریزہ شدہ، چورا۔ اس آیت میں "ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا" (پھر وہ اسے چورا بنا دیتا ہے) فرمایا، جب کہ سورۂ حدید میں فرمایا: ﴿ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا﴾ [ الحديد : ۲۰ ] "پھر وہ چورا بن جاتی ہے۔" یہ فرق اس لیے ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت و صنعت کی بات ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اسے چشموں کی صورت میں زمین میں چلایا، پھر یہاں مختلف رنگوں کی کھیتی اُگانے اور اس کے پکنے کا ذکر ہے، اس لیے فرمایا، پھر وہ اسے چورا بنا دیتا ہے اور سورۂ حدید میں "اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا" (دنیا کی زندگی) سے بات کا آغاز ہوا ہے، اس لیے آخر میں فرمایا، پھر وہ چورا بن جاتی ہے۔

⑥ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى...... : "لَذِكْرٰى" میں تنکیر تعظیم کے لیے ہے، یعنی اس میں عقلوں والوں کے لیے بہت بڑی نصیحت ہے کہ ان کی زندگی بھی اس کھیتی کی طرح ناپائیدار اور فنا ہونے والی ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا انھیں دوبارہ اسی طرح زندہ کرے گا جس طرح وہ مردہ زمین کو پانی کے ذریعے سے زندہ کر دیتا ہے۔

**آیت 22** ① اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ...... : شرح صدر کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام کی آیت (۱۲۵) اس آیت میں بیان فرمایا کہ مومن و کافر اور فرماں بردار و نافرمان کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ "مَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ" مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے، جو بعد کے جملے سے خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے: "أَيْ كَمَنْ هُوَ قَاسِي الْقَلْبِ عَنْ ذِكْرِ

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ

اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے، (ایسی آیات) جو بار بار دہرائی جانے والی ہیں، اس سے ان لوگوں کی کھالوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کے ساتھ وہ جسے

اللّٰہِ“ یعنی وہ شخص جس کا دل اللہ تعالیٰ نے قبول اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت کی روشنی پر گامزن ہے اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کا دل اللہ کی یاد کی طرف سے پتھر کی طرح سخت ہو چکا ہے اور اسے اپنا پروردگار یاد ہی نہیں؟ قرآن مجید میں کئی مقامات پر ایسے مبتدا کی خبر مذکور بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ﴾ [ الرعد : ١٩ ] ”پھر کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی جانب سے تیری طرف اتارا گیا وہی حق ہے، اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے؟“ اور فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴾ [ محمد : ١٤ ] ”تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہے اس شخص کی طرح ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال مزیّن کر دیے گئے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی؟“

② فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ...... : ”اَلْقَاسِيَةُ“ ”قَسَا يَقْسُوْ قَسْوَةً“ سے اسم فاعل مؤنث ہے۔ ”قَسْوَةٌ“ کے مفہوم کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۷۴): ﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ ﴾ کی تفسیر۔

③ اُولٰٓىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ : اس سے بڑی گمراہی کیا ہو گی کہ کوئی شخص اپنے مالک ہی سے منہ موڑ لے۔

**آیت 23** ① اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ ......: ”نَزَّلَ“ کے مفہوم میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا پایا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ١٠٦ ] ”اور عظیم قرآن، ہم نے اس کو جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ تو اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور ہم نے اسے نازل کیا، (تھوڑا تھوڑا) نازل کرنا۔“ ”اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ“ سے مراد اللہ کا کلام ہے، کیونکہ مخلوق کا کلام کبھی بھی خالق کے کلام جیسے حسن والا نہیں ہو سکتا اور نہ مخلوق اس کی مثال پیش کر سکتی ہے۔ (دیکھیے سورۂ بقرہ: ۲۳، ۲۴) ”اَلْحَدِيْثِ“ کا معنی ”نئی“ ہے، چونکہ بات بھی نئی ہوتی ہے، اس لیے اسے ”حدیث“ کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے اور اس کا کلام حدیث اور محدث (نیا) ہوتا ہے۔ (دیکھیے سورۂ انبیاء: ۲۔ شعراء: ۵) بعض لوگوں نے یونانی فلسفیوں کا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا کہ ہر محل حوادث حادث ہوتا ہے، یعنی جس سے کوئی نئی چیز صادر ہو وہ ہمیشہ سے موجود ہستی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سننے، دیکھنے، اترنے چڑھنے، کلام کرنے، ہنسنے، غرض بے شمار صفات کا انکار کر دیا، یا ان کی تاویل کی، حالانکہ یہ قاعدہ قرآن کریم کے صریح

يَّشَآءُ ؕ وَ مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۲۳﴾

چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں ﴿۲۳﴾

خلاف ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کے باوجود وہ سمیع بھی ہے بصیر بھی، خالق بھی ہے رزاق بھی، خوش بھی ہوتا ہے ناراض بھی اور کلام بھی کرتا ہے اور ظاہر ہے کلام الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے، جن میں ترتیب اور حدوث پایا جاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر آن نئی سے نئی حالت اور نئی سے نئی شان میں ہے، فرمایا: ﴿يَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ﴾ [ الرحمٰن : ۲۹ ] ''اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔''

یونانی فلسفی چونکہ آسمانی ہدایت کی روشنی سے محروم تھے، اس لیے ان کا فلسفہ قرآن و حدیث سے متصادم ہے اور ان کے ماننے والے قرآن و حدیث پر ایمان کے دعوے کے باوجود ان میں مذکور صفات الٰہی کو ماننے سے دل میں شدید تنگی محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جو صریح تحریف ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۴۳)، توبہ (۶)، کہف (۱۰۹)، انبیاء (۲) اور سورۂ شعراء (۵)۔

② كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا : اس مقام پر پورے قرآن کو ''كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا'' کہا گیا ہے، یعنی قرآن مجید کی تمام آیات مضامین و معانی میں، تمام خبروں کے سچا ہونے اور تمام احکام کے حق ہونے میں ایک دوسری سے ملتی جلتی اور ایک دوسری کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔ اگر ایک جگہ بات مختصر ہے تو دوسری جگہ مفصل ہے، کہیں بھی کوئی اختلاف یا تناقض نہیں ہے، فرمایا: ﴿وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا﴾ [ النساء : ۸۲ ] ''اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔'' اسی طرح فصاحت و بلاغت اور حسن و خوبی میں بھی سب ایک جیسی ہیں۔ تیئیس (۲۳) سالوں کے طویل عرصہ میں تھوڑی تھوڑی آیات نازل ہونے کے باوجود کسی بھی مقام پر نہ ان کی حسن و خوبی اور فصاحت و بلاغت میں کوئی تفاوت ہے اور نہ کہیں اس کے جلال اور دبدبے میں کوئی کمی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۸۲) دوسرے مقام پر قرآن کی بعض آیات کو محکم اور بعض کو متشابہ کہا گیا ہے، اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۷)۔

③ ''مَثَانِيَ'' ''ثَنٰى يَثۡنِيۡ'' (رَمٰى يَرۡمِيۡ) کے اسم مفعول ''مَثۡنِيَّةٌ'' بروزن ''مَرۡمِيَّةٌ'' کی جمع ہے، معنی دوہرا کرنا یا دہرانا ہے۔ یعنی اس کتاب کی آیات بار بار دہرائی جانے والی ہیں، جنھیں عقائد، احکام، قصص اور ترغیب و ترہیب کو ذہن نشین کرانے کے لیے بار بار، کہیں ایک ہی طرح اور کہیں مختلف انداز میں دہرایا گیا ہے، تاکہ خوب ذہن نشین ہو جائیں اور اگر ایک جگہ بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے تو دوسری جگہ خوب واضح ہو جائے۔ لطف یہ کہ نہ اس کے مختلف مضامین بار بار دہرانے سے طبیعت اکتاتی ہے اور نہ ہی کوئی ایک سورت یا آیت بار بار پڑھنے سے دل سیر ہوتا ہے۔ ''مَثَانِيَ'' کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ عموماً کسی بات کے ذکر کے ساتھ اس کے مقابل کا بھی ذکر ہے، مثلاً ایمان و کفر، جنت و جہنم، ابرار و فجار، ترغیب و

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾

**تو کیا وہ شخص جو قیامت کے دن اپنے چہرے کے ساتھ بدترین عذاب سے بچے گا (وہ جنتی جیسا ہو سکتا ہے؟) اور ظالموں سے کہا جائے گا چکھو جو تم کمایا کرتے تھے ﴿۲۴﴾ ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے تو ان پر وہاں سے عذاب آیا کہ وہ سوچتے نہ تھے ﴿۲۵﴾**

ترہیب اور رحمت و عذاب وغیرہ۔

❹ **تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ** ...... : یعنی جب ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے جلال و قہر کا، یا اس کے عذاب کا ذکر ہوتا ہے تو خوف کی وجہ سے اپنے رب سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر جب اس کی رحمت و مغفرت کا ذکر آتا ہے تو ان کے چمڑے اور دل امید کی بدولت نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتے ہیں۔ "**تَلِيْنُ**" کے ضمن میں "تَمِيْلُ" کا معنی ہونے کی وجہ سے اسے "**اِلٰى**" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کیفیت کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۲ تا ۴)، مومنون (۵۷ تا ۶۱) اور سورۂ مائدہ (۸۳، ۸۴)۔

**آیت 24** ❶ "**اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ**" کی خبر محذوف ہے (جیسا کہ اس سے پہلے آیت : ۱۹ میں گزر چکا ہے) : "أَيْ كَمَنْ هُوَ آمِنٌ مِنَ الْعَذَابِ، أَوْ كَمَنْ هُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ" یعنی تو کیا وہ شخص جو قیامت کے دن اپنے چہرے کے ساتھ بدترین عذاب سے بچے گا، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو عذاب سے بے خوف ہو گا، یا جو اہلِ جنت سے ہو گا؟ جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ٤٠ ] "تو کیا وہ شخص جو آگ میں پھینکا جائے بہتر ہے، یا جو امن کی حالت میں قیامت کے دن آئے؟" مزید دیکھیے سورۂ قمر (۴۸) اور سورۂ ملک (۲۲)۔

❷ دنیا میں آدمی کو آگ یا کسی بھی تکلیف دہ چیز کا سامنا ہو تو وہ اپنے چہرے کو اس سے بچانے کے لیے ہاتھوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ قیامت کے دن چونکہ جہنمیوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے، اس لیے وہ عذاب سے بچنے کے لیے چار و ناچار چہروں ہی کو ڈھال بنائیں گے، یعنی بدترین عذاب کے تھپیڑے سیدھے ان کے منہ پر پڑیں گے۔

❸ **وَ قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا** ...... : یعنی وہ اپنے چہرے کے ساتھ عذاب سے بچیں گے، مگر اس سے انھیں کچھ بچاؤ حاصل نہ ہو گا، بلکہ آگ انھیں ہر جانب سے ڈھانپ لے گی۔ آگے یہ کہنے کے بجائے کہ "ان سے کہا جائے گا" فرمایا "ان ظالموں سے کہا جائے گا" مقصد یہ بات واضح کرنا ہے کہ ان کے عذاب کا باعث ان کا ظلم ہو گا اور ان سے کہا جائے گا کہ اپنی کمائی کا وبال چکھو۔

**آیت 25** **كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** ...... : رسول کریم ﷺ کو جھٹلانے والوں کو متنبہ کرنے کے لیے فرمایا کہ ان سے

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡیَ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۚ وَ لَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَکۡبَرُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ وَ لَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿ۚ۲۷﴾ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۲۸﴾

پس اللہ نے انھیں دنیا کی زندگی میں رسوائی چکھائی اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ بڑا ہے۔ کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿۲۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال بیان کی ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۷﴾ واضح قرآن، جس میں کوئی کجی نہیں، تاکہ وہ بچ جائیں ﴿۲۸﴾

پہلے لوگوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا تو ان پر وہاں سے عذاب آیا کہ وہ سوچتے بھی نہ تھے۔ مثلاً زلزلے سے ان کے مکانوں کی چھتیں ان پر گر پڑیں۔ (دیکھیے نحل : ۲۶) بعض پر پتھراؤ والی ہوا بھیجی گئی، بعض کو چیخ نے پکڑ لیا، بعض کو زمین میں دھنسا دیا گیا اور بعض کو غرق کر دیا گیا۔ (دیکھیے عنکبوت : ۴۰)

**آیت 26** ① فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡیَ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا...... : دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان عذابوں کے ذریعے سے انھیں رسوائی چکھائی اور آخرت کا عذاب ان سے کہیں زیادہ بڑا ہے، کیونکہ آخرت کی آگ دنیا کی آگ سے ستر (۷۰) گنا زیادہ حرارت والی ہے، پھر دنیا کا عذاب تو ختم ہونے والا ہے، مگر آخرت کا عذاب ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ آخرت کا عذاب رسوائی میں بھی کہیں زیادہ ہے۔ دیکھیے سورۂ حٰم السجدہ (۱۶)۔

② لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ: یعنی وہ یہ بات جانتے ہی نہ تھے کہ آخرت کا عذاب کہیں زیادہ بڑا ہے، ورنہ وہ اس سے بے خوف نہ ہوتے۔ معلوم ہوا کہ اگر انھوں نے علم کے باوجود نافرمانی کی تو حقیقت میں وہ علم نہ تھا بلکہ جہل تھا، کیونکہ علم وہ ہے جو عمل پر آمادہ کرے۔

**آیت 27** وَ لَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ...... : مثال کے ساتھ بات کرنے سے وہ بات جلد سمجھ میں آجاتی ہے اور خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے، خصوصاً ایسی مثالیں جن کا آدمی کی اپنی زندگی اور گردوپیش کی اشیاء سے تعلق ہو اور اسے روز مرہ ان سے واسطہ پڑتا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر قسم کی مثالیں بیان فرمائی ہیں، جیسا کہ اپنی توحید سمجھانے کے لیے آدمیوں کو خود ان کی مثالیں دے کر سمجھایا۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۸) اور نحل (۷۵، ۷۶)۔

**آیت 26** قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ...... : "قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۲) "غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ" میں تنوین کی وجہ سے نفی عام ہو گئی ہے، یعنی اس میں کسی قسم کی کوئی کجی نہیں۔ یہ مفہوم "غَیۡرَ مُعَوَّجٍ" (جو کجی والا نہیں) سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ کہف کی آیت (۱) یہ دونوں آیات اگلی آیت میں آنے والی مثال کے لیے تمہید کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۲۹ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۳۰

اللہ نے ایک آدمی کی مثال بیان کی جس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے والے کئی شریک ہیں اور ایک اور آدمی کی جو سالم ایک ہی آدمی کا ہے، کیا دونوں مثال میں برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے ۲۹ بے شک تو مرنے والا ہے اور بے شک وہ بھی مرنے والے ہیں ۳۰

آیت 29 ① ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا ...... : "رَجُلٌ شَكِسٌ" ضدی، بدخلق، جھگڑنے والا آدمی۔ "مُتَشٰكِسُوْنَ" باب تفاعل سے جمع مذکر اسم فاعل ہے، اس باب میں تشارک پایا جاتا ہے، ایک دوسرے سے ضد کرنے والے، جھگڑنے والے۔ یہ مشرک اور موحد کی مثال ہے، مشرک جو کئی معبودوں کی عبادت کرتا ہے اس کی مثال اس آدمی کی ہے جو کئی آقاؤں کا غلام ہے، جو اس کے مالک ہونے میں شریک ہیں اور سب بدخو، ضدی اور ایک دوسرے سے جھگڑنے والے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ غلام اسی کے کام میں لگا رہے اور ہر ایک اسے اپنے مطلب کا حکم دیتا ہے، اسے دوسروں کے کام سے کوئی سروکار نہیں، وہ حیران ہے کہ کس کا حکم بجا لائے۔ پھر ان میں سے کوئی بھی اس غلام کی ضروریات کا ذمہ دار بننے کے لیے تیار نہیں، بلکہ ہر ایک اسے دوسرے کے حوالے کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نہ وہ ان میں سے کسی کو خوش کر سکتا ہے نہ اس کی کوئی حاجت یا ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس کی زندگی جس قدر تنگ ہو گی، بخوبی ظاہر ہے۔ اس کے مقابلے میں موحد کی مثال اس آدمی کی ہے جو صرف ایک آقا کا غلام ہے، اسی کی خدمت کرتا ہے اور اسی کے سامنے اپنی ہر حاجت اور ضرورت پیش کرتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ آدمی نہایت اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کرے گا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ایک غلام جو کئی کا ہو، کوئی اس کو اپنا نہ سمجھے تو اس کی پوری خبر نہ لے اور ایک غلام جو سارا ایک کا ہو، وہ اس کو اپنا سمجھے اور پوری خبر لے، یہ مثال ہے ان کی جو ایک رب کے بندے ہیں اور جو کئی رب کے بندے ہیں۔" (موضح)

② اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: یہاں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کا مطلب یہ ہے کہ ان مشرکوں میں سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں، بلکہ یا تو وہ تسلیم کریں گے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے، یا پھر خاموشی اختیار کریں گے، دونوں صورتوں میں توحید کی خوبی اور شرک کی برائی ثابت ہو جائے گی۔ اس پر فرمایا، سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ایسی بہترین اور آسان مثال کے ساتھ توحید کا مسئلہ واضح فرمایا۔

③ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ : یعنی ایک آقا کی غلامی اور بہت سے آقاؤں کی غلامی کا فرق ماننے کے باوجود اکثر لوگ ایک اللہ کی عبادت اور بہت سے معبودوں کی عبادت کا فرق نہیں جانتے، اس لیے شرک میں گرفتار رہتے ہیں۔

آیت 30 ① اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ: یعنی اگر یہ نہیں مانتے تو نہ مانیں، ہمیشہ نہ تجھے رہنا ہے نہ ان کو، یقیناً تو مرنے والا ہے اور یقیناً وہ بھی مرنے والے ہیں۔ اس میں نبی ﷺ کے لیے وعدہ اور بشارت ہے کہ آپ کی دنیا کی محنت و مشقت

ع ۳ / ۱۰ / ۱۷

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾

پھر بے شک تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس جھگڑو گے ﴿۳۱﴾

اور تمام رنج ختم ہونے والے ہیں اور آپ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے اور ہمیشہ کی راحت و آرام والی جنت میں جانے والے ہیں، اور کافروں کے لیے وعید ہے کہ ان کی مہلت ختم ہونے والی ہے اور وہ اپنے رب کے سامنے پیش ہو کر اپنے کفر و شرک کا حساب دینے والے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں نبی ﷺ اور تمام مسلمانوں کو ان کی موت یاد دلا کر اس کی تیاری کی یاد دہانی بھی ہے۔

❷ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہو جائیں گے، تاکہ آپ کی موت کے متعلق لوگوں میں اختلاف واقع نہ ہو اور وہ آپ کی پرستش نہ کرنے لگیں، جیسا کہ پہلی امتوں میں اپنے انبیاء کی وفات کے متعلق اختلاف واقع ہوا۔ چنانچہ نبی ﷺ کی وفات پر اکثر لوگوں نے تسلیم نہ کیا کہ آپ ﷺ فوت ہو چکے ہیں، جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اس موقع پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت اور سورۂ آل عمران کی آیت (۱۴۴): ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ﴾ پڑھ کر اعلان کیا کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے۔ [ دیکھیے بخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب : ۳۶۶۷، ۳۶۶۸ ] سورۂ آل عمران کی آیت (۱۴۴) کی تفسیر بھی دیکھ لیں۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور تمام صحابہ کا اتفاق ہو گیا کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے آپ ﷺ کو غسل اور کفن دے کر دفن کر دیا، ورنہ وہ آپ ﷺ کو زندہ کبھی دفن نہ کرتے۔ افسوس! قرآن کی واضح آیات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کے باوجود کچھ لوگوں کو اصرار ہے کہ نبی ﷺ اب بھی دنیوی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب لکھتے ہیں: ''انبیاء کی موت ایک آن کے لیے ہوتی ہے، پھر انھیں حیات عطا فرمائی جاتی ہے۔'' سوال یہ ہے کہ اگر اس حیات سے مراد برزخ کی زندگی ہے تو وہ تو نیک و بد سب کو عطا ہوتی ہے اور برزخ میں جزا و سزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے انبیاء کی شان سب سے اونچی ہے اور ان کو عطا ہونے والے انعامات بھی بے حساب ہیں، اس زندگی سے کسی کو بھی انکار نہیں، مگر اس کے لیے موت ضروری ہے، کیونکہ یہ موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک آن کے بعد انھیں دنیوی زندگی عطا کر دی جاتی ہے، تو پھر انبیاء کے جاں نثار صحابہ انھیں دفن کیوں کر دیتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ سوموار کے دن فوت ہوئے اور بدھ کے دن آپ کو دفن کیا گیا، تو کیا اس وقت تک وہ آن پوری نہ ہوئی تھی اور صحابہ کو معلوم نہ ہوا تھا کہ آپ کو پھر حیات عطا ہو چکی ہے۔ کیا انھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی آپ ﷺ کے دفن کرنے پر اتفاق کر لیا اور آپ ﷺ کو زندہ دفن کر دیا اور رسول ﷺ بھی زندہ ہونے کے باوجود خاموشی کے ساتھ دفن ہو گئے؟ ﴿فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ [ النساء : ۷۸ ] ''تو ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔''

**آیت 31** ❶ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...... : اس سے پہلی اور بعد میں آنے والی آیات کے مطابق اس جھگڑے سے

مراد مشرکین اور رسول اللہ ﷺ کا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جھگڑا ہے، جب رسول اللہ ﷺ اپنا مقدمہ پیش کریں گے کہ یا اللہ! میں نے ان لوگوں کو تیرا پیغام پہنچایا مگر انھوں نے مجھے جھٹلا دیا۔ (دیکھیے فرقان : ۳۰) اور مشرکین قسمیں کھا کر دنیا میں اپنے مشرک ہونے کا انکار کر دیں گے، وہ کہیں گے : ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [ الأنعام : ٢٣ ] ''اللہ کی قسم! جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے۔'' پھر فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوگا جو ان پر نبی کی شہادت کے علاوہ ایمان والوں کی، فرشتوں کی، زمین و آسمان کی اور خود ان مشرکوں کے ہاتھ پاؤں، زبانوں اور دوسرے اعضا کی شہادتوں کے ساتھ ان کا جرم ثابت کر کے ان کے انجام کا فیصلہ فرمائے گا۔

2 آیت کے الفاظ عام ہونے کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے ہونے والے تمام جھگڑے بھی اس میں شامل ہیں، جو کفار اور مسلمانوں کے درمیان ہوں گے، یا مشرکین اور ان کے معبودوں یا بڑے لوگوں اور ان کے فرماں برداروں کے درمیان ہوں گے، یا بادشاہوں اور ان کی رعایا کے درمیان ہوں گے، یا مظلوموں اور ظالموں کے درمیان ہوں گے، خواہ وہ دونوں مسلمان ہوں، حتیٰ کہ آدمی کا اپنے اعضا سے بھی جھگڑا ہوگا۔ (دیکھیے حٰم السجدہ : ۲۱) اس لیے اکثر مفسرین نے اس آیت کو عام رکھا ہے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے:

" يُخَاصِمُ الصَّادِقُ الْكَاذِبَ، وَالْمَظْلُوْمُ الظَّالِمَ، وَالْمُهْتَدِي الضَّالَّ وَالضَّعِيْفُ الْمُسْتَكْبِرَ " [ طبري : ٣٠٣٨٣ ] ''یعنی سچا جھوٹے سے، مظلوم ظالم سے، ہدایت والا گمراہ سے اور کمزور متکبر سے جھگڑے گا۔'' زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( لَمَّا نَزَلَتْ : ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ قَالَ الزُّبَيْرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَتُكَرَّرُ عَلَيْنَا الْخُصُوْمَةُ بَعْدَ الَّذِيْ كَانَ بَيْنَنَا فِي الدُّنْيَا؟ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ إِنَّ الْأَمْرَ إِذًا لَشَدِيْدٌ )) [ ترمذي، التفسير، باب و من سورة الزمر : ٣٢٣٦، قال الترمذي حسن صحيح وقال الألباني حسن الإسناد ] ''جب یہ آیت : ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ اتری، تو زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا دنیا میں جھگڑے ہونے کے بعد وہ جھگڑے دوبارہ ہمارے درمیان ہوں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' تو زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس وقت تو معاملہ بہت سخت ہوگا۔''

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

پھر اس سے زیادہ کون ظالم ہے جس نے اللہ پر جھوٹ بولا اور سچ کو جھٹلایا جب وہ اس کے پاس آیا، کیا ان کافروں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں؟ ﴿۳۲﴾



---

آیت 32 ① فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ : ظلم کا معنی اندھیرا ہے، کسی چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ کہیں اور رکھنا بھی اور کسی کا حق دوسرے کو دے دینا بھی ظلم ہے، کیونکہ آدمی اندھیرے میں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ نہیں رکھ سکتا۔

② اللہ تعالیٰ پر جھوٹ سے مراد شرک یعنی اس کے ساتھ کسی اور کی عبادت کرنا ہے، جس کی کئی صورتیں اس سورت کے شروع سے یہاں تک بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کچھ اولیاء کی عبادت کرنا، فرشتوں کو یا مسیح و عزیر علیہما السلام کو یا کسی اور کو اللہ کی اولاد قرار دینا، مصیبت اور تکلیف کے وقت صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنا اور اس کی طرف سے کوئی نعمت عطا ہونے پر اسے بھول کر اس کے شریک بنا کر لوگوں کو گمراہ کرنا اور طاغوت کی عبادت کرنا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے سب کا رد فرما کر اس آیت میں خلاصہ بیان فرمایا، اس لیے آیت کی ابتدا ''فاء'' کے ساتھ فرمائی کہ پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ بولا اور اس کا حق دوسروں کو دے دیا؟ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کی کچھ تفصیل ان آیات کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں، سورۂ انعام (۲۱)، اعراف (۳۷)، ہود (۱۸) اور عنکبوت (۶۸)۔

③ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ : صدق کا معنی وہ بات ہے جو واقعہ کے مطابق ہو، سچی ہو، یہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید، آخرت اور رسالت ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کے پاس سچی بات نہ پہنچے تو اس کا عذر ہو سکتا ہے، مگر جس شخص کے پاس حق اور صدق آ جائے اور وہ اس پر غور و فکر کی زحمت کیے بغیر اسے سنتے ہی جھٹلا دے، یا اسے سمجھنے کے باوجود عناد کی وجہ سے اس کے آنے کے ساتھ ہی اسے جھٹلا دے، یعنی جو شخص اللہ پر جھوٹ بولے اور سچی بات سنتے ہی اسے جھٹلا دے اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔

④ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر ایک اور طریقے سے کی ہے: ''یعنی اگر نبی نے جھوٹ خدا کا نام لیا تو اس سے برا کون؟ اور اگر وہ سچا تھا اور تم نے جھٹلایا تو تم سے برا کون؟'' (موضح) اس تفسیر کے مطابق ''مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ'' کا مصداق اور ہے اور ''كَذَّبَ بِالصِّدْقِ'' کا مصداق اور، جب کہ پہلی تفسیر کے مطابق دونوں صفات ایک ہی شخص کی ہیں۔

⑤ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ : ''مَثْوًى'' ''ثَوَى يَثْوِيْ ثَوَاءً وَثُوِيًّا'' بروزن ''مَضَى يَمْضِيْ مَضَاءً وَ مُضِيًّا'' سے اسم ظرف ہے، رہنا، ٹھہرنا۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۸) یہ کہنے کے بجائے کہ ''کیا ان کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں؟'' یہ فرمایا کہ ''کیا ان کافروں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں؟'' مقصود اس بات کا اظہار ہے کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہونے کی وجہ ان کا کفر یعنی حق بات کو چھپانا اور اس کا انکار کرنا ہے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۳۳ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۴ۚۖ

اور وہ شخص جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ بچنے والے ہیں ۝۳۳ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ کچھ ہے جو وہ چاہیں گے، یہی نیکی کرنے والوں کی جزا ہے ۝۳۴

6 "اَلْكَافِرِيْنَ" جمع لانے سے ظاہر ہے کہ "مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ" (جس نے اللہ پر جھوٹ بولا) میں "مَنْ" عموم کے لیے ہے، یعنی اس سے مراد ایک شخص نہیں بلکہ ایسے تمام لوگ ہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے اور سچی بات کو جھٹلاتے ہیں۔

آیت 33 1 وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖٓ : "اَلَّذِيْ" سے مراد پہلے گروہ کے بالمقابل گروہ ہے اور پہلی آیت کے "مَنْ" کی طرح اس آیت میں "اَلَّذِيْ" عموم کے لیے ہے، اس سے مراد نبی ﷺ اور ہر وہ شخص ہے جو آپ ﷺ کی دعوت لے کر اٹھ کھڑا ہو، کیونکہ یہ لوگ سچی بات لانے والے بھی ہیں اور اسے سچ ماننے والے بھی۔ سچ لے کر آنے کے ساتھ اس کی تصدیق کی شرط اس لیے لگائی کہ بعض اوقات آدمی سچ بیان کر دیتا ہے، مگر اپنے تکبّر کی وجہ سے اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس لیے تعریف کے قابل وہی ہے جس میں صدق اور تصدیق دونوں پائی جائیں، کیونکہ اس کا صدق اس کے علم کی دلیل ہے اور تصدیق اس کی تواضع اور تکبّر سے پاک ہونے کی دلیل ہے۔ (سعدی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن ہے۔'' (موضح) اس تفسیر کے مطابق دونوں کا مصداق الگ الگ ہے، اس لیے بعض مفسرین نے سچی بات لانے والے سے مراد نبی کریم ﷺ لیے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ اس امت میں سب سے پہلے سچی بات لے کر آئے اور اس کی تصدیق کرنے والے سے مراد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لیے ہیں، کیونکہ وہ سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ اگرچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ تمام مومن بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کی تصدیق کی اور وہ تمام داعی بھی سچی بات لانے والوں میں شامل ہیں جنھوں نے اسلام کی دعوت دی۔

2 اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ : یعنی یہی لوگ شرک سے بچنے والے اور جہنم سے بچے رہنے والے ہیں۔

آیت 34 1 لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ : چونکہ وہ دنیا میں وہ کام کرتے رہے جو ان کا رب چاہتا تھا، اس لیے اس کے بدلے میں رب تعالیٰ کے ہاں انھیں وہ کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے، فرمایا: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ [ الرحمٰن : ٦٠ ] ''نیکی کا بدلا نیکی کے سوا کیا ہے۔''

2 ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ : یہاں کچھ عبارت محذوف ہے: "لِأَنَّهُمْ كَانُوْا مُحْسِنِيْنَ" کیونکہ وہ نیکی کرنے والے تھے اور نیکی کرنے والوں کی یہی جزا ہے۔ ''احسان'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۵۸)، یوسف (۳۶) اور قصص (۱۴ اور ۷۷)۔

لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾

تاکہ اللہ ان سے وہ بدترین عمل دور کر دے جو انھوں نے کیے اور انھیں ان کا اجر ان بہترین اعمال کے مطابق دے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۳۵﴾ کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے اور وہ تجھے ان سے ڈراتے ہیں جو اس کے سوا ہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں ﴿۳۶﴾

آیت 35 ① لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا : ”لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ“ محذوف فعل ”أَعْطَاهُمْ ذٰلِكَ“ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انھیں یہ جزا دے گا، تاکہ وہ ان سے وہ بدترین عمل دور کر دے جو انھوں نے کیے...... اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کے ساتھ عدل سے بڑھ کر فضل کا معاملہ فرمائے گا۔ عدل یہ ہے کہ نیکیوں اور برائیوں کو برابر شمار کر کے جزا دی جائے، جب کہ فضل یہ ہے کہ برائی صرف ایک لکھی جائے اور نیکی دس گنا سے سات سو گنا یا بے حساب لکھی جائے، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ الزمر : ۱۰ ] ”صرف کامل صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔“ اسی فضل کی بدولت اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کے سب سے برے اعمال دور کر دے گا۔ جب سب سے برے اعمال دور ہو گئے تو کم برے اعمال بھی دور کر دے گا۔ چنانچہ اگر وہ پہلے کافر ہیں تو اسلام لانے کی بدولت پہلے گناہ معاف کر دے گا، اگر مسلمان تھے تو توبہ، ہجرت، حج اور ان کے تقویٰ کی وجہ سے ان کے تمام گناہ دور کر دے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ [ الأنفال : ۲۹ ] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے (حق و باطل میں) فرق کرنے کی بڑی قوت بنا دے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔“ مزید دیکھیے سورۂ مائدہ (۶۵)، سورۂ محمد (۲)، تغابن (۹)، عنکبوت (۷) اور احقاف (۱۶)۔

② وَ يَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: یعنی انھیں ان کے اعمال کا بدلا ان کے ان اعمال کے لحاظ سے دیا جائے گا جو ان کے نامہ اعمال میں بہترین ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے کم تر درجے کے اعمال بھی بہترین بنا دیے جائیں گے اور ایک نیکی کا بدلا دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ بغیر حساب کے دیا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۹۶، ۹۷) اور طور (۲۱)۔

آیت 36 ① اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ: اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ وہ مومنوں کو جنت میں جو چاہیں گے عطا کرے گا اور ان کے بدترین اعمال دور کرے گا، ساتھ ہی بیان فرمایا کہ دنیا میں بھی وہ انھیں تمام کاموں کے لیے کافی

وَ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّضِلٍّ ؕ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِعَزِيۡزٍ ذِى انۡتِقَامٍ ﴿۳۷﴾

**اور جسے اللہ راہ پر لے آئے، پھر اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا اللہ سب پر غالب، انتقام لینے والا نہیں ہے؟ ﴿۳۷﴾**

ہو جائے گا اور تمام دشمنوں سے بھی کافی ہو جائے گا۔ اس بات کو نہایت قوت اور زور سے بیان کرنے کے لیے اسے سوالیہ انداز میں بیان فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟ یعنی یقیناً وہ اپنے بندے محمد ﷺ کے لیے اور اپنے ہر بندے کے لیے کافی ہے۔

② **وَ يُخَوِّفُوۡنَكَ بِالَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ** ...... : کافر رسول اللہ ﷺ کو اپنے معبودوں سے ڈراتے اور کہتے کہ ہمارے معبودوں کی برائی سے باز رہ، ورنہ وہ تجھے نقصان پہنچائیں گے اور تجھے دیوانہ بنا دیں گے، جیسا کہ اس زمانے کے مشرک اور قبروں کے مجاور و گدی نشین، جو نام کے مسلمان ہیں اور بزرگوں اور ولیوں کو پکارتے ہیں، ان کی نذریں نیازیں دیتے ہیں، دور دور سے جا کر ان کی قبروں پر میلے لگاتے ہیں، ہاتھ باندھ کر بڑی عاجزی سے ان کے آگے کھڑے ہوتے ہیں، بعض قبروں کے گرد طواف کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں، غرض ہر طرح کی عبادت کرتے ہیں، تو جب کوئی انھیں منع کرے اور ان سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو تو اپنے معبودوں سے ڈراتے ہیں کہ فلاں شخص نے ان کو نہ مانا تو وہ تباہ و برباد ہو گیا، اس کا یہ نقصان ہو گیا۔ ایسی باتوں سے احمق و نادان ڈر جاتے ہیں اور ان کی پوجا کرنے لگ جاتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ﴾ یعنی یہ لوگ گمراہ ہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔

**آیت 37** ① **وَمَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّضِلٍّ** : اور جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے، پھر کوئی اسے گمراہ کرنے والا نہیں۔ شیطان یا اس کے پیروکار اپنے حاجت رواؤں یا مشکل کُشاؤں سے اسے جس قدر بھی ڈرائیں وہ کبھی نہ ان سے ڈرتا ہے اور نہ وہ اللہ کے سوا کسی سے امید رکھتا ہے۔ کفار کا اپنے خداؤں سے ڈرانے کے ذکر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۵۴)، انعام (۸۰ تا ۸۲) اور سورۂ قمر (۹)۔

② **اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِعَزِيۡزٍ ذِى انۡتِقَامٍ** : کیا اللہ تعالیٰ سب پر غالب نہیں کہ جو اس کی پناہ میں ہو کوئی اس کی ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھ سکتا؟ اور کیا وہ اپنی اور اپنے دوستوں کی خاطر بہت بڑے انتقام والا نہیں (**انۡتِقَامٍ** کی تنوین تعظیم کے لیے ہے) کہ اس کے اور اس کے دوستوں کے دشمنوں کو اس کے زبردست انتقام سے کوئی نہیں بچا سکتا؟ یقیناً وہ سب پر غالب بھی ہے اور بہت بڑے انتقام والا بھی ؎

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی  ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۞۳۸

اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہہ تو کیا تم نے دیکھا کہ وہ ہستیاں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس کے نقصان کو ہٹانے والی ہیں؟ یا وہ مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روکنے والی ہیں؟ کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اسی پر بھروسا کرنے والے بھروسا کرتے ہیں ۞۳۸

آیت 38 ❶ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ...... : اس آیت میں مشرکین کی جہالت اور ان کے قول و عمل کے تضاد کو اجاگر کیا ہے۔ فرمایا، اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے، اللہ تعالیٰ نے۔ اس اقرار کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب خالق وہ ہے تو مالک بھی وہی ہے، پھر کسی اور کے پاس کسی طرح کے نفع یا نقصان کا کیا اختیار ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس اقرار کے بعد انھیں اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کے نفع یا نقصان کا اختیار نہ رکھنے کا اقرار کروانے کے لیے فرمایا، ان سے کہیے کہ پھر یہ بتاؤ کہ وہ ہستیاں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف یا نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس کی تکلیف یا نقصان کو ہٹا سکتی ہیں، یا اگر وہ مجھ پر کوئی مہربانی فرمانا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتی ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے کفار کا جواب یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ یا تو اس لیے کہ اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ جب خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے تو کوئی دوسرا اس کے ارادے کے خلاف کیا کر سکتا ہے، یا اس لیے کہ مشرک یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے معبود کچھ اختیار نہیں رکھتے، یہ نہیں کہیں گے کہ وہ نہ تکلیف دور کریں گے اور نہ اس کی رحمت کو روک سکیں گے، بلکہ لاجواب ہو کر خاموشی اختیار کریں گے۔

❷ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ...... : یعنی کافر اس سوال کے جواب میں خاموش رہیں تو آپ خود فرما دیں کہ مجھے تو اللہ کافی ہے، تمام بھروسا کرنے والے اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام بھروسا کرنے والوں کو اسی پر بھروسا کرنا لازم ہے، کیونکہ جب کسی بات کا زیادہ زور سے حکم دینا ہو تو اسے خبر کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے، مثلاً کہنا ہو کہ آج سب لوگ فلاں جگہ عصر کی نماز پڑھیں، تو کہا جائے گا، آج سب لوگ عصر کی نماز فلاں جگہ پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے۔

❸ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ...... : اللہ کے سوا ہستیوں کو مؤنث کے صیغے کے ساتھ ذکر کرنے سے ان کے بے اختیار ہونے کا اظہار اور ان کی تحقیر مراد ہے۔

❹ ''اللہ کے سوا نفع یا نقصان کا کوئی بھی مالک نہیں'' یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں جا بجا بیان

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ

کہہ دے اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک میں بھی عمل کرنے والا ہوں، پھر تم جلد ہی جان لو گے ﴿۳۹﴾ کہ کون ہے جس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب اترتا ہے ﴿۴۰﴾ بلاشبہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب لوگوں کے لیے حق کے ساتھ نازل کی ہے، پھر جو سیدھے راستے پر چلا سو اپنی جان کے لیے اور جو گمراہ ہوا تو اسی پر گمراہ ہوگا اور تو ہرگز ان پر کوئی ذمہ دار نہیں ﴿۴۱﴾ اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا اور دوسری کو ایک

فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ رعد (۱۴ تا ۱۶)، فرقان (۳)، انعام (۱۷) اور سورۂ یونس (۱۰۶، ۱۰۷)۔

**آیت 40،39** قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۳۵) "عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ" (وہ عذاب جو اسے رسوا کر دے گا) سے مراد دنیا کا عذاب اور "عَذَابٌ مُّقِيْمٌ" (ہمیشہ رہنے والا عذاب) سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

**آیت 41** اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ...... : کفار کے کفر پر اصرار سے رسول اللہ ﷺ کو سخت غم ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ اب جو شخص صحیح راستے پر چلے گا اس کا فائدہ خود اسی کو ہے اور جو گمراہ ہوگا اس کا وبال اسی پر ہے، آپ پر اس کی ذمہ داری نہیں، آپ کا فرض صرف پیغام حق پہنچانا ہے، وہ آپ نے ادا کر دیا، آگے معاملہ اللہ کے سپرد کریں، جس کے ہاتھ میں مارنا، زندہ کرنا، سلانا اور جگانا سب کچھ ہے۔

**آیت 42** ① اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ...... : اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ آدمی کی جان موت کے وقت بھی قبض کرتا ہے اور نیند کے وقت بھی۔ گویا نیند بھی ایک طرح کی موت ہے، مگر اس میں روح قبض ہونے کے باوجود جسم کے ساتھ اس کا ایسا تعلق باقی رہتا ہے جس سے نبض چلتی، کھانا ہضم ہوتا اور سانس جاری رہتا ہے۔ اس تعلق کی پوری حقیقت ہم نہیں جانتے، کیونکہ روح کے معاملات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، فرمایا: ﴿ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۸۵ ] "اور وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں علم میں سے بہت تھوڑے کے سوا نہیں دیا گیا۔" مگر اس کی ایک

الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۴۲

مقرر وقت تک بھیج دیتا ہے۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں ۴۲

ادنیٰ سی مثال، جو پوری مثال نہیں ہے، بجلی کا کرنٹ ہے کہ اس کا مرکز کسی جگہ ہوتا ہے مگر ہزاروں میل دور اس کا تعلق کسی اور چیز سے بھی ہوتا ہے، جیسے ریڈیو، ٹیلی وژن، ریموٹ وغیرہ۔ اس سے عذاب قبر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ موت کے بعد روح قبض ہونے کے باوجود اس کا جسم کے ساتھ اللہ کے حکم سے کوئی ایسا تعلق رہتا ہے کہ اس پر قبر میں عذاب و ثواب کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، انسان اپنے ناقص علم کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں سکتا۔ اس لیے بعض لوگوں نے عذاب قبر کا انکار ہی کر دیا، حالانکہ قرآن و حدیث میں اس کے صاف دلائل موجود ہیں اور مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات ہر حال میں مانے، خواہ اس کی کیفیت اسے بتائی جائے یا نہ بتائی جائے۔

② نیند کی حالت میں جان قبض ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس پر موت کا لفظ استعمال فرمایا، اگرچہ یہ بڑی اور آخری موت سے پہلے موت کی ایک قسم ہے، جو زندگی میں آدمی پر بار بار آتی اور جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ﴾ [ الأنعام : ٦٠ ] ''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کمایا۔'' حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا أَوٰى إِلٰى فِرَاشِهِ قَالَ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَ أَحْيَا وَ إِذَا قَامَ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَ إِلَيْهِ النُّشُوْرُ )) [ بخاري، الدعوات، باب ما يقول إذا نام : ٦٣١٢ ] ''نبی ﷺ جب بستر پر جاتے تو کہتے: ''تیرے ہی نام کے ساتھ مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں۔'' اور جب بیدار ہوتے تو کہتے: ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں زندگی بخشی، اس کے بعد کہ اس نے ہمیں موت دی اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔''

③ بعض اہل علم نے یہاں روح کی دو قسمیں بنائی ہیں، ایک روح حیوانی اور ایک روح نفسانی اور بعض نے نفس کو الگ اور روح کو الگ قرار دیا ہے، مگر یہ بات قرآن یا حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ جس طرح قرآن مجید میں نیند کے وقت نفسوں کو قبض کرنے کا ذکر ہے اسی طرح بخاری، ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں نیند کے وقت ارواح کو قبض کرنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے رات کے سفر کے دوران سو جانے کا اور سورج نکلنے کے بعد بیدار ہونے کا ذکر کیا ہے، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَاءَ، وَ رَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَاءَ )) [ بخاري، مواقيت الصلاة، باب الأذان بعد ذهاب الوقت : ٥٩٥ ] ''اللہ تعالیٰ نے تمھاری ارواح کو قبض کر لیا جب چاہا اور انھیں تمھیں واپس کر دیا جب چاہا۔'' اس بحث سے معلوم ہوا نیند کے وقت قبض ہونے والی چیز نفس بھی کہلاتی ہے اور روح بھی۔

④ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى : مقرر وقت سے مراد بڑی اور آخری موت ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾

**یاانھوں نے اللہ کے سوا کچھ سفارشی بنا لیے ہیں۔ کہہ دے کیا اگرچہ وہ کبھی نہ کسی چیز کے مالک ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں ﴿۴۳﴾ کہہ دے شفاعت ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۴۴﴾**

---

⑤ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ** : غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں، جن میں سب سے پہلی تو اللہ کا وحدہ لاشریک لہ ہونا ہے کہ موت و حیات اور سلانے اور جگانے کا سلسلہ صرف اس کے ہاتھ میں ہے، اگر اس کا کوئی شریک ہوتا تو یہ اختیار یا اس کا کچھ حصہ اس کے پاس بھی ہوتا، اس لیے ہر طرح کی عبادت کا حق دار اللہ تعالیٰ ہے، یہی دلیل اللہ کے خلیل علیہ السلام نے پیش فرمائی تھی: ﴿ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۸ ] ''میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔'' دوسری نشانی یہ ہے کہ جو پروردگار ہر روز موت دیتا ہے اور مرنے کے بعد زندگی عطا کرتا ہے وہ قیامت کے دن بھی تمام مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے اور یقیناً انھیں زندہ کرے گا اور وہی اکیلا سب کا فیصلہ کرے گا، کوئی اس کی مرضی کے بغیر سفارش بھی نہیں کر سکے گا، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

**آیت 43** ① **اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ** : یعنی بجائے اس کے کہ یہ لوگ موت اور نیند کی کیفیت سے کوئی سبق حاصل کریں اور ہر معاملے کا مختار صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھیں، انھوں نے کچھ دوسرے معبود بنا لیے ہیں، جنھیں وہ اللہ کے حضور سفارشی سمجھتے ہیں۔

② **قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ** : ''**كَانُوْا**'' کی وجہ سے ''**لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا**'' کی نفی میں استمرار پیدا ہو گیا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''کیا اگرچہ وہ کبھی نہ کسی چیز کے مالک ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔'' یعنی کیا پھر بھی یہ لوگ انھیں اپنا سفارشی سمجھ کر ان کی پوجا کرتے رہیں گے، ان کے نام کی نذر و نیاز مانتے رہیں گے اور اپنی دعاؤں میں ان کا وسیلہ ڈالتے رہیں گے؟ ظاہر ہے جن ہستیوں کو بھی یہ پکارتے ہیں وہ نہ ان کی بات سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں، کیونکہ سمجھی تو وہی بات جاتی ہے جو سننے میں آئے، بلکہ وہ فوت شدہ ہیں زندہ نہیں ہیں، خود انھیں اپنے متعلق علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ نحل (۲۰، ۲۱)، فاطر (۱۳، ۱۴) اور احقاف (۵، ۶)۔

**آیت 44** **قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ......** : لفظ ''**لِلّٰهِ**'' پہلے آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا۔ یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ سفارش کی تمام صورتوں کا مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کر ہی نہیں سکتا، اس لیے اسی کو پکارنا چاہیے، کیونکہ وہ اجازت دے گا تو کوئی سفارش کرے گا۔ سفارش ہی نہیں آسمان و زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، کسی

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

**اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں ﴿۴۵﴾**

اور کا دخل نہ سفارش میں ہے نہ بادشاہی میں، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی اللہ کے روبرو سفارش ہے، پر اللہ کے حکم سے، نہ کہ تمھارے کہے سے، جب موت آئے کسی کے کہے سے عزرائیل نہیں چھوڑتا۔'' (موضح) (یاد رہے! ملک الموت کا نام عزرائیل کتاب و سنت سے ثابت نہیں) شفاعت کے متعلق دیکھیے آیت الکرسی (بقرہ: ۲۵۵) کی تفسیر۔

**آیت 45** ① **وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ**...... : ''اِشْمَأَزَّ'' نفرت سے بھر گیا، تنگ پڑ گیا۔ یہ بات دنیا بھر کے مشرکوں میں مشترک ہے، خواہ وہ نام کے مسلمان کیوں نہ ہوں کہ کوئی شخص اکیلے اللہ کا اور اس کی کبریائی اور توحید کا ذکر کرے تو ان کے دل نفرت سے بھر جاتے ہیں اور تنگ پڑ جاتے ہیں اور ان کے چہروں پر ناگواری اور نفرت کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ شخص اولیاء اور بزرگوں کو نہیں مانتا، اسی لیے صرف اللہ ہی کی بات کرتا چلا جاتا ہے، نہ کسی ولی کی قوت و تصرف کا ذکر کرتا ہے جو (ان کے خیال میں) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا تیر راستے سے واپس ہٹا لاتے ہیں اور نہ کسی دستگیر یا گنج بخش یا مشکل کُشا کی دستگیری یا مشکل کُشائی کا بیان کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ **وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا** ﴾ [ بني إسرائيل : ٤٦ ] ''اور جب تو قرآن میں اپنے رب کا، اکیلے اسی کا ذکر کرتا ہے تو وہ بدکتے ہوئے اپنی پیٹھوں پر پھر جاتے ہیں۔''

② **الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ** : یعنی اکیلے اللہ کے ذکر پر ان کے دلوں کے تنگ پڑنے کی وجہ آخرت پر یقین نہ ہونا ہے، اگر آخرت پر یقین ہوتا اور وہ ایمان رکھتے کہ ہمیں اس دن اس اکیلے کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے تو وہ ایسا کبھی نہ کرتے۔

③ **وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ**...... : ''**يَسْتَبْشِرُوْنَ**'' باب استفعال میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں بھی زیادتی ہوتی ہے، یعنی بہت خوش ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ''**اشْمَاَزَّتْ**'' میں حروف کی زیادتی ان کی نفرت اور دل کی تنگی کے زیادہ ہونے کا اظہار کرتی ہے۔ ''اِشْمِئْزَازٌ'' اور ''اِسْتِبْشَارٌ'' کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اکیلے اللہ کے ذکر پر دل کی تنگی میں اور من دون اللہ کے ذکر پر اس کی خوشی میں وہ انتہا کو پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ ''**اِذَا**'' مفاجات کے لیے ہے ''اچانک'' یعنی جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ یا اس کے بغیر اس کے سوا اور ہستیوں کا ذکر کیا جائے اور ان کی جھوٹی سچی کرامات بیان ہونا شروع

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

**تو کہہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! ہر چھپی اور کھلی کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۴۶﴾**

ہوں تو اچانک ان کے چہروں پر خوشی پھیل جاتی ہے۔ مفسر آلوسی نے روح المعانی میں اپنا تجربہ لکھا ہے کہ ایک دن میں نے ایک آدمی سے کہا جو اپنی کسی مشکل میں کسی فوت شدہ سے استغاثہ کر رہا تھا اور اسے پکار کر کہہ رہا تھا کہ اے فلاں! میری مدد کر۔ میں نے اس سے کہا، تم ''یا اللہ'' کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ [ البقرة : ۱۸۶ ] ''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔'' تو وہ شخص سخت غصے میں آ گیا۔ بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتا تھا، یہ شخص اولیاء کا منکر ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے کہا، اللہ تعالیٰ کی بہ نسبت ولی جلدی سن لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں گمراہی سے محفوظ رکھے۔

**آیت 46** ① قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... : کفار کو توحید کی دعوت دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے جو مشقتیں اٹھائیں اور ان کی ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے آپ کو جو تکلیفیں پہنچیں اور توحید کے واضح دلائل کے سامنے لاجواب ہو کر بھی وہ جس طرح شرک پر ڈٹے رہے، اس پر آپ ﷺ کو تسلی دینے کے لیے حکم دیا گیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور سارا معاملہ اس کے سپرد کریں، کیونکہ وہی آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے، ہر چیز پر قادر ہے اور مخلوق کے تمام حاضر و غائب احوال کو جاننے والا ہے۔ اس لیے ان اسماء و صفات کے وسیلے سے اس سے دعا کریں کہ جب تیری توحید جیسی روشن اور واضح بات میں بھی جھگڑے ہونے لگے اور زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے اور حاضر و غائب کو جاننے والے کا وقار بھی دلوں میں نہ رہا تو اب تجھی سے فریاد ہے، تو ہی ان جھگڑوں کا فیصلہ فرمائے گا۔

② ابو سلمہ بن عبد الرحمن بیان کرتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ رات قیام کرتے تو اپنی نماز کا افتتاح کس چیز سے کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رات اٹھتے تو اپنی نماز کا افتتاح اس دعا سے کرتے: « اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَ إِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ » [ مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة النبي ﷺ و دعائه بالليل : ۷۷۰ ] ''اے اللہ! اے جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب! اے آسمان و زمین کو پیدا کرنے والے! اے حاضر و غائب کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، مجھے حق کی ان تمام باتوں میں اپنے اذن سے سیدھی

وَ لَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾

**اور اگر ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا، وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہو تو قیامت کے دن برے عذاب سے (بچنے کے لیے) وہ ضرور اسے فدیے میں دے دیں، اور ان کے لیے اللہ کی طرف سے وہ کچھ سامنے آجائے گا جس کا وہ گمان نہیں کیا کرتے تھے ﴿۴۷﴾**

راہ پر لگا جن میں اختلاف کیا گیا ہے، کیونکہ تو ہی سیدھے راستے پر لگاتا ہے جسے چاہتا ہے۔‘‘

ابو راشد حُبرانی کہتے ہیں، میں نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے کہا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے اس میں سے کچھ ہمیں بیان کریں تو انھوں نے میرے سامنے ایک کتاب نکال کر کہا، یہ ہے وہ کتاب جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوائی ہے۔ میں نے دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’یا رسول اللہ! آپ مجھے سکھائیں کہ میں صبح اور شام کو کیا پڑھوں؟‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اے ابوبکر! یہ پڑھو: (( اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَ الْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَ مَلِيْكَهُ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَ مِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَ شِرْكِهِ وَ أَنْ أَقْتَرِفَ عَلٰى نَفْسِيْ سُوْءًا أَوْ أَجُرَّهُ إِلٰى مُسْلِمٍ )) [ ترمذي، الدعوات، باب دعاء علمه ﷺ أبا بكر ...... : ۳۵۲۹، و قال الألباني صحيح ]

’’اے اللہ! اے آسمان و زمین کو پیدا کرنے والے، غائب و حاضر کو جاننے والے! تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اے ہر چیز کے رب اور اس کے بادشاہ! میں تجھ سے اپنے نفس کے شر سے اور شیطان کے شر اور اس کے شرک سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے نفس پر کسی برائی کا ارتکاب کروں یا کسی مسلم کا برا کروں۔‘‘

**آیت 47** ① **وَ لَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ......** : ظلم کرنے والوں سے مراد مشرک ہیں، انھی کا ذکر مسلسل آ رہا ہے۔ مشرکین کے اقوال و احوال کا ذکر اور ان کا رد کرنے کے بعد ان کا انجام بیان فرمایا کہ آخرت کے دن اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہو تو قیامت کے دن کے برے عذاب سے بچنے کے لیے اسے ضرور ہی فدیے میں دے دیں گے اور ان کی خواہش ہو گی کہ یہ سب کچھ دے کر ان کی جان عذاب سے بچ جائے۔ (دیکھیے یونس: ۵۴) مگر ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۸ اور ۱۲۳)، آل عمران (۹۱)، مائدہ (۳۶، ۳۷)، انعام (۷۰)، رعد (۱۸) اور سورۂ حدید (۱۵)۔

② **وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ ......** : یعنی جس طرح جنت والوں کو وہ نعمتیں ملیں گی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی آدمی کے دل میں ان کا خیال آیا (دیکھیے سجدہ: ۱۷) ایسے ہی کفار کے سامنے اللہ کی طرف سے ایسے ایسے عذاب آئیں گے جن کا وہ گمان بھی نہ کرتے تھے۔ ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے متعلق جو جھوٹی امیدیں رکھے ہوئے تھے اور اپنے حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کی دستگیری کے متعلق ان کے جو گمان تھے اس دن ان کے سامنے اللہ کی

وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾

**اور ان کے لیے ان (اعمال) کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی جو انھوں نے کمائے اور انھیں وہ چیز گھیر لے گی جسے وہ مذاق کیا کرتے تھے ﴿۴۸﴾ پھر جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے یہ مجھے ایک علم کی بنیاد ہی پر دی گئی ہے۔ بلکہ وہ ایک آزمائش ہے اور لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ﴿۴۹﴾**

طرف سے اس کے برعکس وہ کچھ پیش آئے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے تھے اور جن اعمال کو وہ نیکیاں سمجھتے تھے وہ برائیوں کی صورت میں ان کے سامنے ظاہر ہوں گے۔ سفیان ثوری سے مروی ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: ”وَيْلٌ لِأَهْلِ الرِّيَاءِ، وَيْلٌ لِأَهْلِ الرِّيَاءِ“ ”دکھاوے والوں کے لیے ہلاکت ہے، دکھاوے والوں کے لیے ہلاکت ہے۔“ (الوسیط) کیونکہ قیامت کے دن انھیں امید کے برعکس معاملہ پیش آئے گا، جیسا کہ ریا کار عالم، شہید اور سخی والی حدیث میں مذکور ہے۔

**آیت 48** **وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا** ...... : اور ان کے سامنے ان کے اعمال کی برائیاں یعنی ان کے برے نتائج ظاہر ہو جائیں گے اور وہی عذاب جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے انھیں چاروں طرف سے گھیر لے گا۔ [ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ ]

**آیت 48** ① **فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ** ...... : ”خَوَّلَ يُخَوِّلُ“ کسی معاوضے کے بغیر کوئی عطیہ دینا۔ اس آیت میں مشرک انسان کی ایک اور قبیح صفت بیان کی گئی ہے کہ جب اسے کوئی بڑی تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً فقر یا بیماری یا سیلاب یا طوفان وغیرہ، تو اپنے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ کر ایک اللہ کو پکارتا ہے، (”ثُمَّ“ تراخی کے لیے ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ نعمت کچھ مدت کے بعد ملتی ہے) پھر ایک مدت تک اس تکلیف میں رہنے اور بار بار لیٹے، بیٹھے اور کھڑے ہر حال میں اس سے فریاد کرنے اور اسے پکارنے کے بعد جب وہ اسے اس تکلیف سے نجات کی نعمت، یا کوئی بھی نعمت محض اپنے خاص فضل سے عطا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو سرے سے بھول جاتا ہے اور کہتا ہے، یہ تو مجھے صرف ایک علم کی بنا پر دی گئی ہے، مثلاً فقر کے بعد مال ملتا ہے تو کہتا ہے، یہ میرے دولت کمانے کے ہنر کی وجہ سے ملا ہے، اگر بیماری کے بعد شفا مل جائے تو کہتا ہے، یہ میری یا فلاں صاحب کی طب میں مہارت کی وجہ سے ملی ہے۔

② **اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ** : ”مجھے یہ (نعمت) ایک علم کی بنیاد پر دی گئی ہے“ یعنی اپنے رب کے سارے احسان بھلا کر اس قدر بیگانہ ہو جاتا ہے کہ نعمت دینے والے کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے ”مجھے یہ نعمت دی گئی ہے“ یہ احسان فراموشی اور نمک حرامی کی انتہا ہے، کوئی اس سے پوچھے، کیا تیرے باپ نے تجھے یہ نعمت دی ہے؟

قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾

بلاشبہ یہی بات ان لوگوں نے کہی جو ان سے پہلے تھے تو ان کے کام نہ آیا جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۵۰﴾

③ یہاں ایک سوال ہے کہ اس سے پہلے اسی سورت کی آیت (۸) میں یہی الفاظ ''واؤ'' کے ساتھ آئے ہیں: ﴿ وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ ﴾ یہاں ''فاء'' کے ساتھ '' فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ '' لانے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے (واللہ اعلم) کہ ''فاء'' کے ذریعے سے اس جملے کا تعلق ''وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ'' کے ساتھ ہے، درمیان کے جملے معترضہ ہیں، یعنی ان جاہلوں کا تضاد دیکھو کہ کبھی ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ اکیلے کے ذکر پر ان کے دل نفرت سے بھر جاتے اور سخت تنگ پڑ جاتے ہیں اور اس کے غیر کے ذکر پر ان کے دل کی کلی کھل اٹھتی ہے اور وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں (اور دوسرے وقت ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ) پھر جب انھیں کوئی بڑی تکلیف پہنچتی ہے ''فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا'' تو اسی اللہ کو پکارتے ہیں جس کے ذکر پر ان کے دل تنگ پڑ جاتے تھے اور ان غیروں کا نام بھی نہیں لیتے جن کے ذکر پر وہ بہت خوش ہو جاتے تھے۔

④ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ : یعنی وہ نعمت اسے اس کے علم کی بنا پر نہیں بلکہ آزمائش کے لیے دی گئی ہے کہ وہ عطا کرنے والے کا شکر ادا کرتا ہے یا اس کی نعمت کی ناشکری اور کفر و شرک پر اصرار کرتا ہے۔

⑤ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ : یعنی اکثر لوگ نہیں جانتے کہ مال و جاہ، صحت و قوت بلکہ ہر ایک نعمت محض اللہ کے فضل سے عطا ہوتی ہے، اس میں کسی کی عقل یا علم کا کوئی دخل نہیں، کیونکہ بہت سے علم و عقل والے کنگال، بیمار اور کمزور ہوتے ہیں، انھیں کہیں پناہ نہیں ملتی اور بہت سے علم و عقل سے عاری مال و دولت، صحت و قوت اور بے شمار نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ''اکثر لوگ'' اس لیے فرمایا کہ تھوڑے لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں، پھر ان میں سے بعض تو ایمان لے آتے ہیں اور ہر حال میں اپنے رب پر صابر و شاکر رہتے ہیں اور بعض جاننے کے باوجود ضد اور عناد سے ناشکری اور کفر اختیار کرتے ہیں۔ یہ بھی ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' ہی میں داخل ہیں، کیونکہ جو علم عمل سے آراستہ نہ ہو وہ لاعلمی ہی ہے۔ ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' میں یہ بھی داخل ہے کہ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ نعمتوں کی یہ فراوانی اگر شکر اور ایمان کا باعث نہ بنے تو اللہ کے راضی ہونے یا ان کے نعمتوں کے حق دار ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ استدراج ہے اور ان کے ذریعے سے ان پر حجت تمام ہو رہی ہے۔

آیت 50 ① قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی ان کفار قریش اور ان کے زمانے اور بعد میں آنے والے کفار سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کا یہی عقیدہ اور یہی کہنا تھا، جیسا کہ قارون کو اس کی قوم نے نصیحت کی تو اس نے کہا: ﴿ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ﴾ [ القصص : ۷۸ ] ''(یہ سب کچھ) مجھے تو ایک علم کی بنا پر دیا گیا ہے۔'' قارون کے واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۷۶ تا ۸۲)۔

② فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ : یعنی یہ کہنے والوں پر کہ ''ہمیں سب کچھ ہمارے علم کی بنا پر دیا گیا ہے'' جب اللہ تعالیٰ

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

ع ۵ / ۱۱ / ۲

**تو ان پر ان (اعمال) کے وبال آ پڑے جو انھوں نے کمائے اور وہ لوگ جنھوں نے ان میں سے ظلم کیا ان پر بھی جلد ہی ان (اعمال) کے وبال آ پڑیں گے جو انھوں نے کمائے اور وہ ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہیں ﴿۵۱﴾ اور کیا انھوں نے نہیں جانا کہ اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۵۲﴾**

کا عذاب آیا، جیسا کہ قارون کو اس کے مال و محلات سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا، تو انھوں نے جو مال، اولاد کمائے تھے اور جو دنیوی مہارت حاصل کی تھی وہ ان کے کسی کام نہ آئی۔

**آیت 51** ① **فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا** : "**سَيِّاٰتُ**" سے مراد ان کے اعمال کے برے نتائج اور وبال ہیں، یعنی ان کے اعمالِ بد کے نتائج ان پر مختلف عذابوں کی صورت میں آ پڑے۔

② **وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ ......** : یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اور بعد کے تمام کفار کو تنبیہ ہے کہ اگر پہلے لوگوں کی طرح وہ بھی ناشکری اور ظلم (کفر و شرک) سے باز نہ آئے تو ان کے اعمال کے برے نتائج بہت جلد ان پر آ پڑیں گے۔

③ **وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ** : "**بِمُعْجِزِيْنَ**" کی باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ "وہ ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہیں۔" یعنی جب ان کے اعمال کے برے نتائج اور وبال مختلف عذابوں کی صورت میں ان پر آئے تو یہ نہ انھیں روک سکیں گے اور نہ کسی صورت یہ ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز اور بے بس کر کے اس کی گرفت سے نکل کر بھاگ جائیں، یا چھپ جائیں۔ چنانچہ ان میں سے جو زندہ رہے ان پر دنیا ہی میں قحط، خوف، جنگ، قید اور قتل کی صورت میں اللہ کے عذاب آئے اور فوت ہونے والوں کے لیے عذاب شدید انتظار میں ہے۔

**آیت 52** ① **اَوَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ ......** : پچھلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ موجودہ اور پہلے کفار کا دھوکے میں مبتلا ہونے کا باعث انھیں عطا ہونے والا مال اور دوسری نعمتیں ہیں۔ انھوں نے اپنی جہالت سے یہ سمجھا کہ مال و دولت کی کثرت ان کی اپنی مہارت و قابلیت اور علم و عقل کا نتیجہ ہے اور یہ ان کے حق پر ہونے کی اور اللہ تعالیٰ کے ان پر خوش ہونے کی دلیل ہے۔ فرمایا، نہ رزق کی کشادگی کسی شخص کے علم و عقل یا مہارت پر موقوف ہے نہ اس کا تنگ ہونا کسی کے علم و عقل یا مہارت کی کمی کی وجہ سے ہے اور نہ اس کی زیادتی یا کمی اللہ تعالیٰ کے خوش یا ناخوش ہونے کی دلیل ہے، بلکہ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ جس کا رزق جب چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد اور جب

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ

چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، نیک ہو یا بد اور اس کی حکمت اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اگر رزق علم و عقل اور مہارت و قابلیت پر موقوف ہوتا تو کوئی عالم و عاقل رزق کی تنگی میں مبتلا نہ ہوتا اور نہ ہی کسی جاہل یا کم عقل کو رزق یا دوسری نعمتوں کی فراوانی حاصل ہوتی۔

② اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ : یعنی رزق کی فراخی اور تنگی میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، کیونکہ اس سے وہی فائدہ اٹھاتے اور عبرت حاصل کرتے ہیں، کیونکہ وہی ایمان رکھتے ہیں کہ رزق فراخ کرنے والا اور اسے تنگ کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ یہ فیصلہ کسی کے نیک یا بد ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی حکمت و رحمت کے تحت کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنے بندوں کا حال بہتر جانتا ہے۔ کبھی وہ اپنے بندے کا رزق تنگ کر دیتا ہے کہ اگر اس کا رزق فراخ کر دیا تو یہ سرکشی اور بغاوت پر اتر آئے گا، کبھی اس کا امتحان مقصود ہوتا ہے کہ آیا وہ اس فقر و فاقہ میں صبر کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرتا اور اسے کوسنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی وہ دل جوئی اور انعام کے طور پر یا حجت تمام کرنے کے لیے رزق فراخ کر دیتا ہے۔

**آیت 53** ① قُلْ ...... : سورت کی ابتدا سے یہاں تک مختلف طریقوں سے شرک کی تردید اور مشرکین کو وعید کا ایک لمبا سلسلہ چلا آ رہا ہے، جس کی پروا بظاہر کافر و مشرک لوگ نہیں کرتے، مگر اللہ تعالیٰ کے اس قدر پرزور کلام سے ان کے دلوں میں خوف کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، جو حد سے بڑھ جائے تو نتیجہ یاس اور ناامیدی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ہر جگہ ڈرانے کے ساتھ بشارت کا بیان بھی ضرور فرماتا ہے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کے بندے ناامید ہو کر اس کی جناب میں آنے کی جرأت ہی نہ کریں، اور بشارت اور ترغیب کے ساتھ ترہیب اور ڈرانے کا بیان بھی فرماتا ہے، تاکہ وہ بے خوف نہ ہو جائیں، جیسا کہ جراح نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے، پھر پرہیز کی تاکید کرتا ہے اور بد پرہیزی کے انجام سے ڈراتا ہے، فرمایا: ﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴾ [ الحجر : ۴۹، ۵۰ ] ''میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہوں۔ اور یہ بھی کہ بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [ الرعد : ٦ ] ''اور بے شک تیرا رب یقیناً لوگوں کے لیے ان کے ظلم کے باوجود بڑی بخشش والا ہے اور بلاشبہ تیرا رب یقیناً بہت سخت سزا والا ہے۔'' یہاں بھی وعید کے لمبے سلسلے کے بعد اپنے بندوں کو ''لَا تَقْنَطُوْا'' کے ساتھ اپنی رحمت کی امید دلائی اور بعد کی آیات میں انھیں جلد از جلد توبہ کی تلقین فرما کر وقت ہاتھ سے نکلنے سے ڈرایا ہے۔

② يٰعِبَادِيْ : بندے مومن ہوں یا کافر، سب اللہ کے بندے ہیں، اس لیے قرآن مجید میں ''عِبَادِيْ'' کا لفظ دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسا کہ مومن و کافر دونوں فریقوں کو اپنے بندے قرار دیا: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ

يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۳﴾

اٰمَنَّا ﴾ [ المؤمنون : ۱۰۹ ] ''بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے بندوں میں سے کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے۔'' اور کفار کو اپنے بندے کہا: ﴿ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴾ [ الفرقان : ۱۷ ] ''اور جس دن وہ انھیں اور جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے، اکٹھا کرے گا، پھر کہے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا، یا وہ خود راستے سے بھٹک گئے تھے؟'' اور دیکھیے سورۂ زمر (۱۶) مگر اس کا اکثر استعمال اللہ کے مخلص اور مومن بندوں کے لیے ہوا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ [ الحجر : ۴۲ ] ''بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں۔''

③ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ : اس آیت میں ''يٰعِبَادِيَ'' سے مراد قرآن مجید کے اکثر استعمال کے خلاف کفار و مشرکین ہیں، اس کی دلیل اس کے بعد کی آیات ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴾ [ الزمر : ۵۴ ] ''اور اس کے مطیع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے، پھر تمھاری مدد نہیں کی جائے گی۔'' اور ان کا یہ کہنا: ﴿ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴾ [ الزمر : ۵۶ ] ''اور بے شک میں تو مذاق کرنے والوں سے تھا۔'' اور یہ آیت: ﴿ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَ اسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [ الزمر : ۵۹ ] ''کیوں نہیں، بے شک تیرے پاس میری آیات آئیں تو تو نے انھیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو انکار کرنے والوں میں سے تھا۔''

صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیات کچھ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئیں، چنانچہ انھوں نے فرمایا: (( أَنَّ نَاسًا مِنْ أَهْلِ الشِّرْكِ كَانُوْا قَدْ قَتَلُوْا وَ أَكْثَرُوْا، وَ زَنَوْا وَ أَكْثَرُوْا، فَأَتَوْا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالُوْا إِنَّ الَّذِيْ تَقُوْلُ وَ تَدْعُوْ إِلَيْهِ لَحَسَنٌ لَوْ تُخْبِرُنَا أَنَّ لِمَا عَمِلْنَا كَفَّارَةً، فَنَزَلَ : ﴿ وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ﴾ [ الفرقان : ۶۸ ] وَ نَزَلَ : ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ [ الزمر : ۵۳ ] )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ يا عبادي الذين أسرفوا...... ﴾ : ۴۸۱۰ ] ''مشرکین میں سے کچھ لوگ جنھوں نے قتل کیے تھے اور بہت کیے تھے اور زنا کیا تھا اور بہت کیا تھا، پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''آپ جو بات کہتے ہیں اور جس کی دعوت دیتے ہیں یقیناً وہ بہت اچھی ہے، اگر آپ ہمیں بتائیں کہ ہم نے جو کچھ کیا اس کا کوئی کفارہ ہے؟'' تو یہ آیت اتری: ﴿ وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ﴾ [ الفرقان : ۶۸ ] ''اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور اس جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے قتل نہیں کرتے مگر حق کے ساتھ اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔'' یعنی اس کے بعد کی آیات میں ہے : ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ

سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [ الفرقان : ۷۰ ] ''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا نیک عمل، تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔'' ] اور یہ آیت اتری: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ ''کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ۔''

❹ ''اسراف'' کا معنی کسی بھی چیز میں حد سے گزرنا ہے، عموماً اس کا استعمال خرچ کرنے میں ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا ﴾ [ الفرقان : ٦٧ ] ''اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں۔'' یہاں اس سے مراد کفر و شرک کر کے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی ہے۔ ''عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ'' کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری زیادتی کا نقصان تم ہی کو ہے، اللہ تعالیٰ کو یا کسی اور کو نہیں، اس لیے اس زیادتی کے مداوے کی فکر بھی تمھی کو ہونی چاہیے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ﴾ [ یونس : ۲۳ ] ''اے لوگو! تمھاری سرکشی تمھاری جانوں ہی پر ہے۔''

❺ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ : ''قَنِطَ يَقْنَطُ قُنُوطًا'' (ع، ض) ناامید ہونا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کئی طرح سے گناہوں کی بخشش کی امید دلائی ہے۔ تفسیر رازی نے وہ دس وجہیں بیان کی ہیں:

① ''يٰعِبَادِيْ'' (اے میرے بندو!) بندہ غلام کو کہتے ہیں۔ غلام بے چارہ مسکین، عاجز اور محتاج ہوتا ہے، اس کی مسکنت اور بے چارگی اسے مالک کے رحم و کرم کا حق دار بناتی ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے ''يٰعِبَادِيْ'' (اے میرے بندو!) کہہ کر ان کی نسبت اپنی طرف فرمائی اور جسے اللہ تعالیٰ اپنا کہہ دے اس کے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

③ ''اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ'' کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو گناہ کیے ان کا نقصان انھی کو ہے، اللہ تعالیٰ کا اس سے کچھ نہیں بگڑا، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان کی توبہ قبول نہ کرے۔

④ ''لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ'' میں صریح الفاظ کے ساتھ ناامید ہونے سے منع فرمایا۔

⑤ ''يٰعِبَادِيْ'' (اے میرے بندو!) کے ساتھ خطاب کے بعد کلام کا تقاضا یہ تھا کہ کہا جاتا: ''لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ'' (کہ میری رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ) مگر ''مِنْ رَّحْمَتِيْ'' کے بجائے فرمایا: ''مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ'' (اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ) کیونکہ لفظ ''اللّٰهِ'' اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سب سے بڑا اور اس کی تمام صفات کا جامع نام ہے۔ تمام صفات کمال کی جامع ہستی سے ناامید ہونا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

⑥ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ : کہنا تو یہ تھا کہ ''إِنَّهُ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ'' (بے شک وہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے) مگر دوبارہ اپنا نام لے کر فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ'' (کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے) دوبارہ اپنا

گرامی قدر نام ذکر کرنے اور ”اِنَّ“ کے ساتھ اس کی تاکید سے مغفرت کے وعدے میں مبالغے کا اظہار ہو رہا ہے۔

⑦ جَمِيْعًا : ”الذُّنُوْبَ“ میں الف لام استغراق کے لیے ہے، اس لیے تمام گناہوں کی مغفرت کے وعدے کے لیے ” يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ “ ہی کافی تھا، مگر ”جَمِيْعًا“ کے ساتھ مزید تاکید فرما دی کہ اللہ تعالیٰ توبہ کے ساتھ تمام گناہ، حتیٰ کہ شرک جیسے اکبر الکبائر کو بھی بخش دیتا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں ”اَنِيْبُوْۤا“ اور ”اَسْلِمُوْا“ وغیرہ الفاظ کے ساتھ وضاحت آ رہی ہے۔

⑧ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ : ”الْغَفُوْرُ“ ”غَفَرَ يَغْفِرُ“ کا اصل معنی پردہ ڈالنا ہے اور ”الْغَفُوْرُ“ اس سے مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے گناہوں پر بہت زیادہ پردہ ڈالنے والا ہے۔ یہ عذاب کا باعث بننے والی چیزوں کو دور کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

⑨ ”الرَّحِيْمُ“ ”رُحْمٌ“ سے مبالغے کا صیغہ ہے کہ وہ بے حد رحم کرنے والا ہے۔ یہ مغفرت کے بعد مزید رحمت کے نتیجے میں عطا ہونے والی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ان دونوں کا فرق شعراوی نے ایک مقام پر ایک مثال کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ یہ مکمل نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی چور کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیتا ہے، اب وہ اسے سزا دے یا دلوا سکتا ہے، مگر وہ اس کی منتوں اور آئندہ ایسا نہ کرنے کے وعدے کی وجہ سے اس کی چوری پر پردہ ڈال دیتا ہے اور کسی کو اس کی اطلاع نہیں دیتا، یہ مغفرت ہے۔ پھر وہ اس کی حالت زار پر رحم کرتے ہوئے اسے کچھ رقم دے کر کاروبار میں کھڑا کر دیتا ہے، یہ اس پر رحم ہے۔

⑩ ” اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ “ میں ”هُوَ“ ضمیر فصل اور خبر ”الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ“ پر الف لام کی وجہ سے کلام میں تاکید اور حصر پیدا ہو گیا۔ یعنی اس کے سوا کوئی نہ غفور ہے نہ رحیم، اس سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کے کمال کا اظہار ہوتا ہے۔
یہ تمام وجوہ اللہ تعالیٰ کی کمال مغفرت و رحمت پر اور بندوں کے اس سے کسی حال میں بھی ناامید نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔
اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے ان میں سے وافر حصہ عطا فرمائے۔ (آمین)

⑥ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ...... : ”وَ اَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ“ اور بعد کی آیات سے ظاہر ہے کہ یہ وعدہ صرف ان لوگوں سے ہے جو توبہ کریں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے، کیونکہ اگر وہ کافر و مشرک ہے تو کفر و شرک سے توبہ کرنے اور اسلام قبول کرنے کے بغیر اس کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس کے تمام گناہوں کی معافی کا وعدہ توبہ یا اس کے قائم مقام اعمال کے ساتھ ہے، ورنہ اس کی بخشش اللہ تعالیٰ کی مشیّت پر موقوف ہے، وہ جسے چاہے گا بخش دے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [ النساء : ۱۱٦ ]
”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔“ اگر یہ کہا جائے کہ ہر مسلمان کے تمام گناہ توبہ کے بغیر معاف ہو جائیں گے تو شریعت کے احکام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ البتہ اس بات میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مسلمان کے گناہ چاہے گا سزا دیے بغیر معاف کر دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا، مگر آخر کار ہر موحّد مسلمان کو جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ اس وقت کفار خواہش کریں گے کہ کاش! وہ بھی مسلمان ہوتے، خواہ

کسی درجے کے ہوتے، کیونکہ کفار پر اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتیں حرام کر دی ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجر کی آیت (۲) کی تفسیر۔ اگر بخشش کا یہ معنی کیا جائے کہ آخر کار تمام مسلمان جنت میں جائیں گے تو " اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا " (بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے) سے صرف کافر مستثنیٰ ہوں گے کہ ان کے گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوں گے۔

❼ اس آیت اور بعد کی آیات سے اللہ تعالیٰ کی بے انتہا رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کو کس قدر معاف فرمانے والا ہے۔ سورۂ فرقان (۶۹، ۷۰) میں شرک، قتل ناحق اور زنا کرنے والوں کے ساتھ توبہ، ایمان اور عمل صالح کے بعد ان کی گزشتہ برائیوں کو نیکیوں میں بدل دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے کسی بندے کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، خواہ اس کے گناہوں سے زمین و آسمان بھرے ہوئے ہوں۔ صرف اللہ کی طرف پلٹنے اور اس کے سامنے اعتراف کے بعد توبہ کی ضرورت ہے، وہ سب گناہ معاف فرما دے گا، کیونکہ اسے اپنے بندوں کی توبہ بہت ہی محبوب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾ [ التوبۃ : ۱۰۴ ] "کیا انھوں نے نہیں جانا کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [ النساء : ۱۱۰ ] "اور جو بھی کوئی برا کام کرے، یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش مانگے وہ اللہ کو بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان پائے گا۔" منافقین کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ﴾ [ النساء : ۱۴۵، ۱۴۶ ] "بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔ مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی۔" اور فرمایا: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [ المائدۃ : ۷۳ ] "بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا بے شک اللہ تین میں سے تیسرا ہے، حالانکہ کوئی بھی معبود نہیں مگر ایک معبود، اور اگر وہ اس سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو یقیناً ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا انھیں ضرور دردناک عذاب پہنچے گا۔" پھر انھی کے متعلق فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ المائدۃ : ۷۴ ] "تو کیا وہ اللہ کی طرف توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے، اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے " قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ " کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنی مغفرت کی دعوت دی جنھوں نے کہا مسیح خود اللہ ہے اور جنھوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے اور جنھوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور جنھوں نے کہا اللہ فقیر ہے اور جنھوں نے کہا اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے اور جنھوں نے کہا اللہ تین میں تیسرا ہے، ان سب سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ المائدۃ : ۷۴ ] "تو کیا وہ اللہ کی طرف توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے، اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔" پھر اسے بھی توبہ کی دعوت دی جس نے ان سے بھی

بڑی بات کہی: ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [ النازعات : ٢٤ ] ''میں تمھارا سب سے اونچا رب ہوں۔'' اور جس نے کہا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [ القصص : ٣٨ ] ''میں نے اپنے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں جانا۔'' چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ [ طٰه : ٨٢ ] ''اور بے شک میں یقیناً اس کو بہت بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھے راستے پر چلے۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جو شخص اس کے بعد بھی اللہ کے بندوں کو توبہ سے مایوس کرے اس نے اللہ کی کتاب کا انکار کیا، لیکن بندہ توبہ نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس پر مہربانی فرمائے۔'' مسلمانوں کو آگ سے بھری ہوئی خندقوں میں ڈالنے والوں (اصحاب الاخدود) کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ﴾ [ البروج : ١٠ ] ''یقیناً وہ لوگ جنھوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو آزمائش میں ڈالا، پھر انھوں نے توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔'' حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس جود و کرم کو دیکھو! ان لوگوں نے اس کے دوستوں کو قتل کیا اور وہ انھیں توبہ اور مغفرت کی دعوت دے رہا ہے۔'' (ابن کثیر)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کی بہت سی آیات ہیں۔ احادیثِ صحیحہ میں ننانوے آدمیوں کے بعد سوویں آدمی کے قاتل کی توبہ کا ذکر معروف ہے، جسے نیک لوگوں کی بستی کی طرف جاتے ہوئے راستے میں موت آ گئی۔ [ دیکھیے مسلم، التوبة، باب قبول توبة القاتل و إن كثر قتله : ٢٧٦٦ ] اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بندے کی توبہ پر اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہونے کا ذکر ہے جو اپنی گم شدہ اونٹنی ملنے پر خوشی کی شدت میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: ''یا اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب'' اور خوشی کی شدت میں خطا کر جاتا ہے۔ [ دیکھیے مسلم، التوبة، باب في الحض على التوبة والفرح بها : ٢٧٤٧ ] اسی طرح اس بندے کا ذکر ہے جس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ وہ اس کے فوت ہونے کے بعد اس کی لاش کو جلا کر اس کی راکھ کچھ پانی میں بہا دیں اور کچھ ہوا میں اڑا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر کے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے کہا: ''یا اللہ! تیرے ڈر سے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔ [ دیکھیے مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى...... : ٢٧٥٦ ] پھر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی کرم ہے کہ بندہ جتنی بار بھی گناہ کرے، پھر اس کے بعد جتنی بار توبہ کرے وہ معاف فرما دیتا ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَذْنَبَ عَبْدٌ ذَنْبًا فَقَالَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى أَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًا فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَ يَأْخُذُ بِالذَّنْبِ ثُمَّ عَادَ فَأَذْنَبَ فَقَالَ أَيْ رَبِّ! اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى عَبْدِيْ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَ يَأْخُذُ بِالذَّنْبِ ثُمَّ عَادَ فَأَذْنَبَ فَقَالَ أَيْ رَبِّ! اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى أَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًا فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَ يَأْخُذُ بِالذَّنْبِ اعْمَلْ مَا شِئْتَ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ )) [ مسلم، التوبة، باب قبول التوبة من الذنوب...... : ٢٧٥٨ ] ''ایک بندے نے گناہ کیا، پھر اس نے کہا: ''اے میرے رب! مجھے میرا گناہ بخش دے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے ایک گناہ کیا، پھر جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر پکڑتا ہے۔'' پھر اس

وَ اَنِيۡبُوۡۤا اِلٰى رَبِّكُمۡ وَ اَسۡلِمُوۡا لَهٗ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ الۡعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ ﴿۵۴﴾ وَ اتَّبِعُوۡۤا اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ الۡعَذَابُ بَغۡتَةً وَّ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

**اور اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ اور اس کے مطیع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمھاری مدد نہیں کی جائے گی ﴿۵۴﴾ اور اس سب سے اچھی بات کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی جانب سے تمھاری طرف نازل کی گئی ہے، اس سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تم سوچتے بھی نہ ہو ﴿۵۵﴾**

نے دوبارہ گناہ کیا اور کہا: ''اے میرے رب! مجھے میرا گناہ بخش دے۔'' تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے ایک گناہ کیا پھر جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر پکڑتا ہے۔'' پھر ایک بار اور اس نے گناہ کیا اور کہا: ''اے میرے رب! مجھے میرا گناہ بخش دے۔'' تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے گناہ کیا پھر جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر پکڑتا ہے۔ (میرے بندے!) تو جو چاہے کر، میں نے تجھے بخش دیا۔''

**آیت 54** **وَاَنِيۡبُوۡۤا اِلٰى رَبِّكُمۡ** ...... : ''أَنَابَ يُنِيبُ إِنَابَةً'' رجوع کرنا، پلٹ آنا۔ ''تَابَ يَتُوبُ'' کا معنی بھی یہی ہے۔ چونکہ یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جو حالت کفر میں اپنے کیے ہوئے گناہوں کی وجہ سے اسلام لانے سے ہچکچا رہے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی تاکید فرمائی کہ اس کے لیے تمھیں موت سے پہلے پہلے کفر سے توبہ کرنا ہوگی، کیونکہ اس کے بعد توبہ کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی پھر کوئی تمھاری مدد کرے گا۔ ہاں! تم کفر سے توبہ کر لو تو تمھارے پہلے سب گناہ بخش دیے جائیں گے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (( فَلَمَّا جَعَلَ اللّٰهُ الْإِسْلَامَ فِيْ قَلْبِيْ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقُلْتُ ابْسُطْ يَمِيْنَكَ فَلِأُبَايِعْكَ فَبَسَطَ يَمِيْنَهُ قَالَ فَقَبَضْتُ يَدِيْ قَالَ مَا لَكَ يَا عَمْرُو!؟ قَالَ قُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ، قَالَ تَشْتَرِطُ بِمَاذَا؟ قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِيْ، قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَ أَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ )) [ مسلم، الإیمان، باب کون الإسلام یھدم ما قبله...... : ۱۲۱ ] ''جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام ڈالا، تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: ''اپنا دایاں ہاتھ پھیلائیے، تاکہ میں آپ سے بیعت کروں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمرو! تمھیں کیا ہوا؟'' میں نے کہا: ''میں نے ارادہ کیا ہے کہ شرط کر لوں۔'' آپ نے فرمایا: ''تم کیا شرط کرو گے؟'' میں نے کہا: ''یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں ہوا کہ اسلام ان چیزوں کو گرا دیتا ہے جو اس سے پہلے ہوئی ہوں اور ہجرت ان چیزوں کو گرا دیتی ہے جو اس سے پہلے ہوئی ہوں اور حج ان چیزوں کو گرا دیتا ہے جو اس سے پہلے ہوئی ہوں؟''

**آیت 54** ① **وَاتَّبِعُوۡۤا اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ** ...... : یہاں ''اَحۡسَنَ'' کی اضافت ''مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ'' کی

اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ يّٰحَسۡرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطۡتُّ فِىۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ وَ اِنۡ كُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِيۡنَ ۙ﴿۵۶﴾ اَوۡ تَقُوۡلَ لَوۡ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰٮنِىۡ لَـكُنۡتُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ ۙ﴿۵۷﴾

﴿(ایسا نہ ہو) کہ کوئی شخص کہے ہائے میرا افسوس! اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کی جناب میں کی اور بے شک میں تو مذاق کرنے والوں سے تھا۔﴿۵۶﴾ یا کہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں ضرور پرہیز گاروں میں سے ہوتا۔﴿۵۷﴾

طرف اضافت بیانیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی قرآن و حدیث کی پیروی کرو، جو ساری کی ساری ہی احسن اور دوسرے ہر کلام سے اچھی ہے، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ ﴾ [ الزمر : ۲۳ ] ''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے۔'' مزید تفصیل سورۂ زمر کی آیات (۱۷، ۱۸) کی تفسیر میں دیکھیے۔

2 مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ الۡعَذَابُ بَغۡتَةً : اچانک عذاب سے اس لیے ڈرایا کہ اس میں نہ سنبھلنے کی مہلت ملے گی نہ توبہ کی، اس لیے جلد از جلد اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی اختیار کرلو، اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت تم پر اچانک آ جائے، جب کہ تم سوچتے بھی نہ ہو، کیونکہ عذاب آنے کے بعد کی جانے والی توبہ قبول نہ ہوگی۔ مزید دیکھیے سورۂ نساء (۱۸)، یونس (۵۱ اور ۹۰، ۹۱) اور سورۂ مومن (۸۴، ۸۵)۔

**آیت 56** 1 اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ يّٰحَسۡرَتٰى ...... : ''اَنۡ'' سے مراد ''لِئَلَّا'' ہے، جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت (۱۵) میں ہے: ﴿ وَ اَلۡقٰى فِى الۡاَرۡضِ رَوَاسِىَ اَنۡ تَمِيۡدَ بِكُمۡ ﴾ ''أَيْ لِئَلَّا تَمِيْدَ بِكُمْ'' ''اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے، تاکہ وہ تمھیں ہلا نہ دے۔'' ''يّٰحَسۡرَتٰى'' اصل میں ''حَسْرَةٌ'' یائے متکلم کی طرف مضاف ہے، جسے ''الف'' میں بدل دیا ہے۔ حسرت شدید پشیمانی اور افسوس کو کہتے ہیں، ہائے میرا افسوس! ''فَرَّطۡتُّ'' ''فَرَّطَ يُفَرِّطُ تَفْرِيْطًا'' کوتاہی کرنا اور ''أَفْرَطَ يُفْرِطُ إِفْرَاطًا'' زیادتی کرنا۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ اس وقت کوئی شخص یہ کہے کہ ہائے میرا افسوس! میری اس کوتاہی اور نافرمانی پر جو میں ساری کائنات کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کے سامنے کرتا رہا، جو کسی چیز سے بے خبر نہیں۔

2 وَ اِنۡ كُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِيۡنَ : ''اِنۡ'' اصل میں ''إِنِّيْ'' ہے۔ ''إِنَّ'' کے نون کو ساکن اور اس کے اسم ''یائے متکلم'' کو حذف کر دیا۔ دلیل اس کی ''لَمِنَ السّٰخِرِيۡنَ'' پر آنے والا لام ہے، اور بے شک میں تو مذاق کرنے والوں سے تھا۔ یعنی افسوس! میں نے صرف نافرمانی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کے ساتھ مل کر مذاق اڑانے میں بھی شریک رہا۔ ظاہر ہے اجتماعی طور پر مذاق اڑانے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اور زیادہ مخالفت ہے۔ اس آیت سے بھی واضح ہے کہ ''قُلۡ يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا'' سے لے کر سلسلہ کلام کفار کے متعلق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور قیامت کا مذاق وہی اُڑاتے ہیں۔ مومن کیسا بھی بدعمل ہو اس کا ایمان اسے مذاق اُڑانے کی اجازت نہیں دیتا۔

**آیت 57** اَوۡ تَقُوۡلَ لَوۡ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰٮنِىۡ ...... : یعنی ایسا نہ ہو کہ جب کوئی اور عذر نہ ملے تو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ

اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَ اسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾

**یا کہے، جب وہ عذاب دیکھے، کاش! میرے لیے ایک بار لوٹنا ہو تو میں نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں ﴿۵۸﴾ کیوں نہیں، بے شک تیرے پاس میری آیات آئیں تو تو نے انھیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو انکار کرنے والوں میں سے تھا ﴿۵۹﴾**

دے کہ اس نے مجھے ہدایت نہیں دی، اگر وہ مجھے ہدایت دیتا تو میں ضرور پرہیز گاروں میں سے ہوتا۔ یہ وہی بات ہے جو زندگی میں کفار کہتے رہے: ﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ﴾ [ الأنعام : ١٤٨ ] ''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے۔'' دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۸) اور سورۂ نحل (۳۵) کی تفسیر۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اور قرآن بھیج کر اپنی حجت تمام کر دی۔

**آیت 58** اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ ...... : پچھلی آیت کے ضمن میں کفار کے اللہ تعالیٰ پر اس جھوٹ کا ذکر تھا کہ اس نے انھیں ہدایت نہیں دی، اس آیت کے ضمن میں ان کے ایک اور جھوٹ کا ذکر ہے کہ اس نے انھیں نیک بننے کے لیے وقت نہیں دیا، اگر انھیں دوبارہ بھیجا جائے تو وہ نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ عذاب دیکھ کر دنیا میں ایک دفعہ واپس جانے کی ناکام تمنا کریں گے۔ (دیکھیے انعام : ۲۷، ۲۸) طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے وہ بات جو بندے کہنے والے ہیں، ان کے کہنے سے پہلے بتا دی ہے اور (دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی صورت میں) وہ جو کچھ کرنے والے ہیں ان کے کرنے سے پہلے بتا دیا ہے اور فرمایا: ﴿وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ﴾ [ فاطر : ١٤ ] ''اور تجھے ایک پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔'' یعنی وہ کہیں گے ''يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ'' یا یہ کہیں گے '' لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ'' یا کہیں گے ''لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ'' ''الْمُحْسِنِيْنَ'' سے مراد ''اَلْمُهْتَدِيْنَ'' یعنی ہدایت یافتہ لوگ ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بتا دیا کہ اگر انھیں دوبارہ بھیجا گیا تو پھر بھی ہدایت نہیں پا سکیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [ الأنعام : ٢٨ ] ''اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ [ الأنعام : ١١٠ ] ''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے۔'' یعنی جس طرح وہ پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے، اگر انھیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تب بھی ان کے اور ہدایت کے درمیان رکاوٹ حائل رہے گی، جیسا کہ پہلی مرتبہ حائل رہی جب وہ دنیا میں تھے۔''

**آیت 59** بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ ...... : لفظ ''بَلٰى'' (کیوں نہیں) اس شخص کی تردید کے لیے کہا جاتا ہے جو کسی ثابت شدہ چیز کی تردید کر رہا ہو۔ کفار کے قول ''لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ'' (اگر اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں

وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾

**اور قیامت کے دن تو دیکھے گا کہ وہ لوگ جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ کیا جہنم میں ان متکبروں کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں؟ ﴿۶۰﴾**

ضرور پرہیز گاروں میں سے ہوتا) کے ضمن میں یہ بات موجود ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت نہیں دی اور "لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً" کے ضمن میں یہ بات موجود ہے کہ اس نے انھیں وقت نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کیوں نہیں، میری آیات تیرے پاس آئیں (یعنی میں نے اپنی آیات کے ذریعے سے تجھے ہدایت دی اور وقت بھی دیا) مگر تو نے انھیں جھٹلا دیا اور تکبر کیا اور تو انکار کرنے والوں میں شامل رہا، جیسا کہ قوم ثمود کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾ [ حمٓ السجدة : ۱۷ ] "اور جو ثمود تھے ہم نے انھیں سیدھا راستہ دکھایا، مگر انھوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھا رہنے کو پسند کیا۔"

**آیت 60** ① **وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا ......** : اللہ پر جھوٹ باندھنے میں اگرچہ اس کے ساتھ شرک کرنا، اس کے لیے بیوی یا اولاد قرار دینا، اپنے آپ کو اس کا محبوب قرار دینا اور ان کے علاوہ دوسرے سب جھوٹ شامل ہیں، مگر آیات کے سیاق کے لحاظ سے اس کے اولین مصداق وہ دو جھوٹ ہیں جو اس سے پہلی آیات کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں، یعنی ایک ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت نہیں دی اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مہلت نہیں دی۔

② **وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ** : قیامت کے دن کفار کے چہروں کے سیاہ ہونے کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۰۶، ۱۰۷)، یونس (۲۷) اور عبس (۴۰ تا ۴۲)۔

③ **اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ** : "مَثْوًى" ثَوٰى يَثْوِيْ بِالْمَكَانِ وَ أَثْوٰى فِيْهِ" کسی جگہ میں رہنا، جیسا کہ سورۂ قصص میں ہے: ﴿ وَ مَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ﴾ [ القصص : ٤٥ ] "اور تو اہل مدین میں رہنے والا نہیں تھا۔" اس سے معلوم ہوا جہنم میں جانے کا باعث ان کا تکبر ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں تھے اور حق معلوم ہونے کے باوجود انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور ان کے چہرے سیاہ ہونے کا باعث بھی یہی تکبر ہو گا، کیونکہ متکبر کا چہرہ بگاڑنے ہی سے اس کا تکبر ٹوٹتا ہے۔ (ابن عاشور)

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَ نَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه : ۹۱ ] "وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر تکبر ہو گا۔" ایک آدمی نے کہا: "آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے

وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اللہ ان لوگوں کو جو ڈر گئے، ان کے کامیاب ہونے کی وجہ سے نجات دے گا، نہ انھیں برائی پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۶۱﴾

کپڑے اچھے ہوں اور اس کا جوتا اچھا ہو (کیا یہ بھی تکبر ہے)؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بہت جمال والا ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے، تکبر تو حق کا انکار اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔'' عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْثَالَ الذَّرِّ فِيْ صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَيُسَاقُوْنَ إِلٰى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُسَمّٰى بُوْلَسَ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْأَنْيَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ أَهْلِ النَّارِ طِيْنَةِ الْخَبَالِ )) [ ترمذي، صفة القيامة، باب ما جاء في شدة الوعيد المتكبرين : ۲٤۹۲، قال الترمذي حسن صحيح وقال الألباني حسن ] ''متکبر لوگ قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح آدمیوں کی شکلوں میں اٹھائے جائیں گے، ہر جگہ سے ذلت انھیں ڈھانک رہی ہوگی، پھر وہ جہنم میں ایک قید خانے کی طرف ہانک کر لے جائے جائیں گے، جس کا نام ''بولس'' ہے۔ آگوں کی آگ (سب سے بڑی آگ) ان پر چڑھی ہوگی، انھیں آگ والوں کا نچوڑ ''طینۃ الخبال'' پلایا جائے گا۔'' [ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ ]

**آیت 61** ① وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا...... : متکبرین کا انجام بیان فرمانے کے بعد متقین کا انجام بیان فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ تکبر کے منافی ہے، کیونکہ تقویٰ اللہ کی نافرمانی سے بچنے اور اس کے سامنے عاجز ہو جانے کا نام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ۭ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ القصص : ۸۳ ] ''یہ آخری گھر، ہم اسے ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو نہ زمین میں کسی طرح اونچا ہونے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کسی فساد کا اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے۔''

② بِمَفَازَتِهِمْ : ''مَفَازَةٌ'' ''فَازَ يَفُوْزُ فَوْزًا'' سے مصدر میمی ہے ''کامیابی'' یا ظرف مکان ہے ''کامیابی کی جگہ'' یعنی اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو (دنیا کی امتحان گاہ میں) کامیاب ہونے کی وجہ سے جہنم سے نجات عطا فرمائے گا، یا اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو ان کے کامیاب ہونے کی جگہ (جنت میں داخلے) کے ساتھ نجات عطا فرمائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾ [ آل عمران : ۱۸۵ ] ''پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا۔''

③ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ : یعنی نہ آئندہ انھیں کوئی تکلیف یا برائی پہنچے گی۔ چنانچہ نہ ان پر کوئی خوف آئے گا اور نہ ہی انھیں دنیا میں گزرے ہوئے صدموں یا پریشانیوں کا کوئی غم رہے گا، کیوں کہ جنت کا ایک ہی پھیرا انھیں دنیا کے تمام رنج و غم بھلا دے گا۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾

اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے ﴿۶۲﴾ اسی کے پاس آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۶۳﴾

**آیت 62** ① **اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ**......: اہلِ توحید کے لیے وعدے اور مشرکین کے لیے وعید کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور ردِ شرک کے دلائل کا ذکر شروع فرمایا۔ ابن عاشور نے فرمایا: "**اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ**" اور اس کے بعد والے دو جملے "**قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ**" کی تمہید ہیں اور اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دلیل ہیں۔ پہلا جملہ "**اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ**" ہے، ظاہر ہے کہ جب ہر چیز پیدا اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے تو عبادت بھی اسی کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے معبود برحق ہونے کی دلیل کے طور پر اپنے ہر چیز کے خالق ہونے کو جا بجا بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۰۲)، رعد (۱۶)، فاطر (۳)، مومن (۶۲) اور سورۂ حج (۷۳)۔

② **وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ**: "وَكَلَ يَكِلُ" (ض) سپرد کرنا۔ ''وکیل'' جس کے سپرد کوئی چیز کی جائے کہ وہ اس کی حفاظت اور نگرانی کرے اور اس میں جو چاہے کرے۔ یہ اکیلے اللہ کی عبادت کی دوسری دلیل ہے، یعنی جس طرح ہر چیز کو پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح ہر چیز کی تدبیر و حفاظت کرنے والا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے، نہ کسی چیز کے پیدا کرنے میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ اس کی حفاظت و تدبیر میں۔ اس لیے اپنی ہر چیز اور ہر کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا حکم قرآن میں بار بار آیا ہے، فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [ آل عمران : ۱۲۲ ] ''اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔'' اور فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ [ إبراهيم : ۱۲ ] ''اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں۔''

**آیت 63** ① **لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ**: "**مَقَالِيْدُ**" "مِقْلَادٌ" کی جمع ہے، جس طرح قلادہ (ہار یا پٹا) گردن کے ساتھ ہوتا ہے اسی طرح چابی تالے کے ساتھ ہوتی ہے۔ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ "إِقْلِيْدٌ" کی جمع ہے اور عام قاعدے کے خلاف ہے۔ "إِقْلِيْدٌ" دراصل فارسی لفظ ''کلید'' سے عربی بنایا گیا ہے۔ یعنی زمین و آسمان کے خزانوں کی کنجیاں بھی اسی کے پاس ہیں، کسی اور کے پاس کچھ ہے ہی نہیں، تو اسے پکارنے اور اس سے فریاد کرنے کا کیا فائدہ؟ یہ اکیلے اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی تیسری دلیل ہے۔

② **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ**...... : یہاں ایک سوال ہے کہ ''واؤ'' کے ساتھ عطف کس جملے پر ڈالا گیا ہے؟ زمخشری نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس کا عطف "**وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا**" پر ہے اور درمیان کے جملے معترضہ ہیں۔ مگر اتنی دور عطف محل نظر ہے۔ بقاعی نے فرمایا، اس کا عطف ایک مقدر جملے پر ہے جو سیاق سے ظاہر ہو رہا ہے: "أَيْ فَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ

# قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾

## کہہ دے پھر کیا تم مجھے غیر اللہ کے بارے میں حکم دیتے ہو کہ میں (ان کی) عبادت کروں اے جاہلو! ﴿۶۴﴾

تَقَبَّلُوا آيَاتِهِ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ" "تو جو لوگ ایمان لے آئے اور اس کی آیات کو قبول کر لیا یہی لوگ کامیاب ہیں اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔" "**هُمْ**" ضمیر فصل کی وجہ سے اور "**الْخٰسِرُوْنَ**" خبر پر الف لام کی وجہ سے کلام میں تاکید اور حصر پیدا ہو گیا، یعنی خسارہ اٹھانے والے صرف وہ ہیں جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کر دیا۔ گویا اس کے علاوہ اگر کوئی خسارہ ہے بھی تو فی الحقیقت خسارہ نہیں ہے، کیونکہ وہ عارضی خسارہ ہے۔ اسی طرح حقیقی کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے، کیونکہ وہی دائمی اور پائیدار کامیابی ہے، فرمایا: ﴿**فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ**﴾ [ آل عمران : ۱۸۵ ] "پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا۔" "اللہ کی آیات" سے مراد اس کے وجود اور وحدانیت کے دلائل ہیں جو گزشتہ آیات، خصوصاً اس سے پہلے تین جملوں میں بیان ہوئے ہیں۔

**آیت 64** ① **قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ** : "**قُلْ**" کے بعد جملہ "فاء" سے شروع ہوتا ہے، مگر ہمزہ استفہام چونکہ کلام کی ابتدا میں ہوتا ہے، اس لیے "فاء" کو اس کے بعد کر دیا ہے، اسی طرح جملہ فعلیہ کا آغاز فعل "**تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ**" سے ہونا تھا اور "غَيْرَ اللّٰهِ" کو "**اَعْبُدُ**" کے بعد ہونا تھا، مگر "غَيْرَ اللّٰهِ" کی تحقیر کو نمایاں کرنے کے لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔ یعنی جب ہر چیز کا خالق اللہ ہے اور وہی ہر چیز پر نگران ہے اور اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں تو پھر کیا اس کے ہوتے ہوئے تم مجھے اس کے غیر کی عبادت کا حکم دیتے ہو، جس کے اختیار میں خود اپنا وجود بھی نہیں؟

② **اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ** : جہل کا لفظ حلم کے مقابلے میں آتا ہے اور علم کے مقابلے میں بھی، یہاں علم کے مقابلے میں آیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے "وحدہ لا شریک لہ معبود" ہونے کے اتنے واضح دلائل اپنے کانوں سے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود پتھروں، قبروں، جانوروں یا اپنے جیسی بے بس اور بے اختیار مخلوق کی عبادت کی پستی میں گرے ہوئے جاہلو! جو نہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا کچھ علم رکھتے ہو کہ صرف اسی کی عبادت کرو، نہ رسول اللہ ﷺ کی شان سے واقف ہو کہ انھیں غیر اللہ کی عبادت کی دعوت کی جرأت کر رہے ہو اور نہ ہی اس شرف کا کچھ علم رکھتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمھیں انسان بنا کر عطا کیا ہے کہ اتنی اونچی مخلوق ہو کر اپنے جیسی یا اپنے سے بھی ادنیٰ مخلوق کی عبادت کر رہے ہو۔ اقبال نے کہا ہے ؎

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد     من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

"آدمی بے سمجھی کی وجہ سے آدمی کی بندگی کرنے لگا۔ میں نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ کسی کتے نے کسی کتے کے آگے سر جھکایا ہو۔"

وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ

اور بلاشبہ یقیناً تیری طرف وحی کی گئی اور ان لوگوں کی طرف بھی جو تجھ سے پہلے تھے کہ بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا ﴿۶۵﴾ بلکہ اللہ ہی کی پھر عبادت کر اور شکر کرنے والوں سے ہو جا ﴿۶۶﴾ اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے، حالانکہ زمین ساری قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ پاک ہے

**آیت 65** ① وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ…… : سلیمان الجمل نے فرمایا: ”وَ لَقَدْ“ اور ”لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ“ دونوں میں لام کے بعد قسم مقدر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بات قسم کھا کر نہایت تاکید کے ساتھ فرمائی ہے۔ ”لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ“ (اگر تو نے شرک کیا) کے مخاطب نبی ﷺ بھی ہیں اور پہلے پیغمبروں میں سے ہر ایک پیغمبر بھی۔ یعنی آپ کو اور آپ سے پہلے ایک ایک پیغمبر کو مخاطب کر کے وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو تُو نے جو بھی اچھا کام کیا ہو گا یقیناً سب ضائع ہو جائے گا اور یقیناً تو خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۸۸)۔

② یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ کوئی نبی شرک نہیں کرے گا، پھر انھیں یہ وحی کرنے کا مطلب کیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس سے شرک کی شامت اور برائی بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے اتنے مقرب بندے شرک کا ارتکاب کر بیٹھیں تو ان کا عمل ضائع ہو جائے گا، تو پھر دوسرے لوگوں کی کیا حیثیت ہے۔ گویا پیغمبروں کو سنا کر ان کی قوموں کو ڈرایا گیا ہے۔

③ شرک کے ساتھ تمام اعمال ضائع ہونے کی یہ وعید ان لوگوں کے لیے ہے جن کی موت کفر و شرک کی حالت میں واقع ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ [البقرۃ: ۲۱۷] ”اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے، پھر اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہو تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔“ توبہ کر لینے والے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۶۸ تا ۷۰)۔

**آیت 66** ① بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ : لفظ ”اللّٰهَ“ کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی (اللہ کے ساتھ شرک نہ کر) بلکہ (اگر تجھ میں عقل ہے، یا اگر تجھے عبادت کرنی ہے تو) صرف اللہ کی عبادت کر، اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کر۔

② وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ : یعنی عقیدۂ توحید کی سمجھ عطا ہونے پر اور اکیلے اللہ کی عبادت کی توفیق ملنے پر اس کے شکر گزار بندوں میں شامل ہو جا، کیونکہ اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں۔

**آیت 67** ① وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ : یعنی جن لوگوں نے غیر اللہ کی عبادت کی، یا آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ

وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۶۷

اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بنا رہے ہیں ۝۶۷

غیر اللہ کی عبادت کریں، انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا اندازہ ہی نہیں کیا کہ اس کا مقام کس قدر بلند ہے اور اس کے سامنے وہ تمام ہستیاں جن کی وہ عبادت کر رہے ہیں، کس قدر حقیر اور بے بس ہیں، ورنہ وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔

② **وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ** ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت کا حال تو یہ ہے کہ قیامت کے دن پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں کاغذ کی طرح لپیٹے ہوئے ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ** ﴾ [ الأنبياء : ١٠٤ ] ''جس دن ہم آسمان کو کاتب کے کتابوں کو لپیٹنے کی طرح لپیٹ دیں گے۔''

③ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے قیامت کے دن زمین کو مٹھی میں لینے کو اور آسمانوں کو دائیں ہاتھ میں لپیٹنے کو اور قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق آنے والے اس طرح کے الفاظ کو نہیں مانتے اور ان سب کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو درحقیقت انکار ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا مطلب اس کی حکومت ہے (انھیں اس سے غرض نہیں کہ قیامت کو آٹھ فرشتوں کے اسے اٹھانے کی کیا تاویل کریں گے) مٹھی میں لینے اور دائیں ہاتھ میں لپیٹنے کا مطلب ان سب کا اس کے قبضۂ قدرت میں ہونا ہے (انھیں اس سے غرض نہیں کہ یہ سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں تو ہر وقت ہی ہے) یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے چہرے، پنڈلی، ہاتھ، انگلیوں، کان اور آنکھوں کا اور اس کے اترنے اور چڑھنے کا صاف انکار کرتے ہیں، بلکہ وہ اس کے سننے اور دیکھنے کے بھی منکر ہیں اور ان کا مطلب یہ کرتے ہیں کہ وہ جاننے والا ہے۔ اسی طرح وہ اس کے کلام کے بھی منکر ہیں۔ ان کے انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات کو اپنی صفات کی طرح سمجھا، ورنہ اگر وہ ان تمام صفات اور الفاظ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے کہ وہ ہماری طرح یا کسی بھی مخلوق کی طرح نہیں، بلکہ اس طرح ہیں جس طرح اس کی شان کے لائق ہے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ دیکھیے انسان سمیع و بصیر ہے، فرمایا: ﴿ **فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا** ﴾ [ الدھر : ٢ ] ''سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔'' تو کیا ہم اللہ تعالیٰ کے سمیع و بصیر ہونے کا اس لیے انکار کر دیں گے کہ اس سے وہ انسان کی طرح ہو جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ** ﴾ [ الشورٰی : ١١ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' یعنی اس کا سمع و بصر کسی اور کی مثل نہیں، بلکہ اس طرح ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ اسی طرح یقیناً اس کے ہاتھ ہیں، جو دونوں ہی یمین (دائیں) ہیں، مٹھی بھی ہے، انگلیاں بھی، مگر انسان یا مخلوق کی طرح نہیں بلکہ جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ استعارہ کہہ کر ان کا انکار کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید کی ان آیات کی تشریح جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی وہ اس قسم کی تاویلات کی تردید کرتی ہے۔

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۞

**اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہوں گے، مر کر گر جائیں گے مگر جسے اللہ نے چاہا، پھر اس میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے ۞**

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: (( يَقْبِضُ اللّٰهُ الْأَرْضَ، وَ يَطْوِي السَّمٰوَاتِ بِيَمِيْنِهِ، ثُمَّ يَقُوْلُ أَنَا الْمَلِكُ، أَيْنَ مُلُوْكُ الْأَرْضِ؟ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ والأرض جميعا قبضته...... ﴾ : ۴۸۱۲ ] ''اللہ تعالیٰ زمین کو مٹھی میں لے گا اور آسمانوں کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا، پھر فرمائے گا: ''میں ہی بادشاہ ہوں، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟'' عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ ذَاتَ يَوْمٍ عَلَى الْمِنْبَرِ : ﴿ **وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** ﴾ [ الزمر : ۶۷ ] وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ هٰكَذَا بِيَدِهِ، وَ يُحَرِّكُهَا، يُقْبِلُ بِهَا وَ يُدْبِرُ، يُمَجِّدُ الرَّبُّ نَفْسَهُ أَنَا الْجَبَّارُ، أَنَا الْمُتَكَبِّرُ، أَنَا الْمَلِكُ، أَنَا الْعَزِيْزُ، أَنَا الْكَرِيْمُ فَرَجَفَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْمِنْبَرُ، قُلْنَا لَيَخِرَّنَّ بِهِ )) [ مسند أحمد: ۷۲/۲، ح: ۵۴۱۳ ] ''ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر یہ آیت پڑھی: ﴿ **وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** ﴾ ''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے، حالانکہ زمین ساری قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بنا رہے ہیں۔'' اور آپ اپنے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے اسے آگے اور پیچھے لے جاتے رہے۔ رب تعالیٰ نے خود اپنی تعریف بیان کی کہ میں جبار ہوں، میں متکبر ہوں، میں بادشاہ ہوں، میں عزیز ہوں، میں کریم ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ منبر لرزنے لگا اور ہمیں خطرہ پیدا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سمیت گر پڑیں گے۔'' مسند احمد کے محقق نے فرمایا کہ اس کی سند مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور اس کے تمام راوی بخاری و مسلم کے راوی ہیں، ایک حماد بن سلمہ صرف مسلم کا راوی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے سلف صالحین نے صفات کی آیات و احادیث کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا ہے، ان کی تاویل نہیں کی اور کہا ہے کہ یہ صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔

④ **سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** : یعنی اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور بہت بلند ہے۔

**آیت 68** **وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ......** : اس کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نمل کی آیت (۸۷) کی تفسیر۔

وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾

**اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ روشن ہو جائے گی اور لکھا ہوا (سامنے) رکھا جائے گا اور نبی اور گواہ لائے جائیں گے اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۶۹﴾**

آیت 69 ① **وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ** ...... : قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور فرشتے زمین پر تشریف لائیں گے (دیکھیے سورۂ فجر: ۲۲) اور زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ بعض لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے زمین پر آنے کے منکر ہیں اور اس کے آسمان دنیا پر اترنے کا بھی صاف انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، نہ وہ آسمان دنیا پر اترتا ہے اور نہ قیامت کے دن زمین پر آئے گا، بلکہ یہ سب مجاز ہیں، عرش سے مراد سلطنت ہے، آسمان دنیا پر اترنے کا مطلب اس کی رحمت کا نزول ہے اور قیامت کے دن آنے کا مطلب اس کا حکم آنا ہے وغیرہ۔ حالانکہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ مجازی معنی اس وقت مراد لیا جاتا ہے جب حقیقی معنی مراد لینا محال ہو، جب کہ یہاں حقیقی معنی لینے میں کوئی مشکل نہیں۔ ان لوگوں نے یونان کے مشرک فلسفیوں کی یہ بات مان لی کہ ہر محل حوادث حادث ہوتا ہے، اس لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ پر آنے والی ہر نئی حالت اور نئی شان کا انکار کر دیا۔ چنانچہ ان کے مطابق اللہ تعالیٰ نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ بات کرتا ہے، نہ عرش پر ہے، نہ اترتا ہے، نہ چڑھتا ہے، نہ ناراض ہوتا ہے اور نہ راضی ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب حوادث (نئے احوال) ہیں جو ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ پر نہیں آ سکتے۔

یہ لوگ قرآن و حدیث میں آنے والے ایسے تمام الفاظ کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جو درحقیقت تحریف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب استعارے ہیں جو عرب کے بدوؤں کے ذہن کے مطابق اللہ تعالیٰ کو ایک بادشاہ کی صورت میں پیش کرتے ہوئے استعمال کیے گئے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ اور اس کی ذات و صفات کو نہ رسول اللہ ﷺ نے جانا نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے۔ اصل حقیقت یونانی فلسفیوں پر منکشف ہوئی اور ان کی بدولت ان حضرات تک پہنچی۔ قرآن مجید جا بجا ان کے اس قاعدے کی نفی کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ [ الرحمن : ۲۹ ] ''اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا ﴾ [ المجادلۃ : ۱ ] ''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔'' اور فرمایا: ﴿ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ [ البقرۃ : ۱۸۶ ] ''میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ [ النساء : ۱۶۴ ] ''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۵ ] ''اور ان کے پاس رحمان کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی جو نئی ہو، مگر وہ اس سے منہ موڑنے والے ہوتے ہیں۔'' مزید دیکھیے سورۂ فجر

وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

اور ہر شخص کو پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کیا اور وہ زیادہ جاننے والا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ﴿۷۰﴾

(۲۲) اور سورۂ حاقہ (۱۷) کی تفسیر۔

② **وَوُضِعَ الْكِتٰبُ** : یعنی تمام لوگوں کے اعمال نامے ان کے سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۳) اور سورۂ کہف (۴۹)۔

③ **وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ** : شہداء (گواہوں) سے مراد نبیوں کے علاوہ ہماری امت اور پہلی تمام امتوں کے وہ نیک لوگ ہیں جنھوں نے اپنی اپنی امت کے لوگوں تک حق کا پیغام پہنچایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ **وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا** ﴾ [ بني إسرائيل : ١٥ ] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔'' ان شہداء میں امت محمد ﷺ کے وہ افراد بھی شامل ہیں جو نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے حق میں شہادت دیں گے کہ انھوں نے اپنی اپنی امت کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۳) اور سورۂ نساء (۴۱) کی تفسیر۔ ان گواہوں میں کراماً کاتبین بھی شامل ہیں اور انسان کے اعضا بھی جو اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ اسی طرح زمین بھی، جس پر کسی شخص نے کوئی نیک یا برا عمل کیا ہوگا، فرمایا: ﴿ **يَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا** ﴾ [ الزلزال : ٤، ٥ ] ''اس دن وہ اپنی خبریں بیان کرے گی۔ اس لیے کہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہوگی۔''

④ **وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ** ...... : یعنی تمام نیکیاں اور بدیاں سامنے لا کر گواہوں کے ذریعے سے حجت پوری کرنے کے بعد سب لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور لوگوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۴۷) اور سورۂ نساء (۴۰)۔

**آیت 70** ① **وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ** : ہر جان کو اس کے نیک یا بد عمل کا پورا بدلا دیا جائے گا، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب عز و جل سے جو کچھ روایت کیا اس میں یہ بھی فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَ السَّيِّئَاتِ، ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ إِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ، وَ مَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً )) [ بخاري، الرقاق، باب من هم بحسنة أو بسيئة : ٦٤٩١ ] ''اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دیں، پھر ان کی وضاحت فرما دی، تو جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور عمل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر وہ اس کا ارادہ کرے اور اسے کر بھی لے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس دس سے سات سو گنا بلکہ بہت گنا تک نیکیاں لکھ لیتا ہے اور جس نے کسی برائی کا ارادہ کیا، پھر (اللہ کے خوف سے) اس پر عمل نہ کیا، تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اپنے پاس ایک پوری نیکی لکھ لیتا

وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے نگران ان سے کہیں گے کیا تمھارے پاس تم میں سے کچھ رسول نہیں آئے جو تم پر تمھارے رب کی آیات پڑھتے ہوں اور تمھیں تمھارے اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ کہیں گے کیوں نہیں، اور لیکن عذاب کی بات کافروں پر ثابت ہوگئی ﴿۷۱﴾

ہے اور اگر اس نے اس کا ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے لیے ایک برائی لکھ لیتا ہے۔''

② وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ : یعنی دنیا میں لوگ جو عمل کر رہے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، اسے کسی لکھنے والے یا حساب رکھنے والے یا گواہی پیش کرنے والے کی ضرورت نہیں، لیکن اعمال نامہ اس لیے رکھا جائے گا اور پیغمبروں اور گواہوں کو اس لیے لایا جائے گا کہ لوگوں پر حجت تمام ہو۔

**آیت 71** ① وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا : ''سَاقَ يَسُوْقُ سَوْقًا'' (ن) کسی کو اپنے آگے رکھ کر پیچھے سے ہانکنا، اس میں ہانکے جانے والے کی ذلت کا اظہار ہوتا ہے۔ آگے رہ کر کسی کو اپنے پیچھے چلانے کے لیے ''قَادَ يَقُوْدُ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ''زُمَرًا'' ''زُمْرَةٌ'' کی جمع ہے، وہ گروہ جس کے پیچھے اور گروہ ہو۔ ''زُمْرَةٌ مِنَ النَّاسِ'' اس جماعت کو کہا جاتا ہے جس کے پیچھے اور جماعت آ رہی ہو۔

② پچھلی آیات میں قیامت کے دن حق کے ساتھ فیصلے کا ذکر ہے، ان آیات میں اس فیصلے پر عمل کا ذکر ہے۔ چنانچہ پہلے عذاب کے مستحق لوگوں کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ مقام ان لوگوں کو نصیحت اور ڈرانے کا ہے جو اتنی نصیحت اور اس قدر دلائل سن کر بھی کفر پر جمے رہے۔

③ یعنی جب کافروں کا جرم ثابت ہونے کے بعد فیصلہ کر دیا جائے گا تو ٹولیاں بنا کر انھیں زبردستی ہانکتے ہوئے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴾ [ الطور : ۱۳ ] ''جس دن انھیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا، بری طرح دھکیلا جانا۔'' مختلف گروہوں میں تقسیم یا تو کفر کی درجہ بندی کے لحاظ سے ہوگی کہ منافق درک اسفل میں ہوں گے اور کچھ وہ بھی ہوں گے جنھیں صرف آگ کا جوتا پہنایا جائے گا، یا زمانے کے لحاظ سے کہ پہلے لوگ پہلے اور بعد کے لوگ بعد میں داخل ہوں گے۔ (دیکھیے اعراف : ۳۸) ایک تقسیم مجرموں کی مختلف اقسام کے لحاظ سے بھی ہوگی، مثلاً چوروں کا گروہ، بدکاروں کا گروہ وغیرہ۔ دیکھیے سورۂ صافات (۲۲) اور سورۂ حٰم السجدہ (۱۹)۔

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا

**کہا جائے گا جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے والے، پس وہ تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے ﴿۷۲﴾ اور وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے، اس حال میں کہ اس کے دروازے کھول دیے گئے ہوں گے اور اس کے نگران ان سے**

④ **حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا :** یعنی ان کے آنے پر جہنم کے دروازے، جو پہلے بند تھے، کھولے جائیں گے، جس طرح قید خانے کے دروازے صرف مجرموں کی آمد پر کھولے جاتے ہیں اور پھر ان پر بند کر دیے جاتے ہیں، تاکہ وہ وہیں قید رہیں۔

⑤ **وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ :** "خَزَنَةٌ" "خَازِنٌ" کی جمع ہے، جیسا کہ "طَلَبَةٌ" "طَالِبٌ" کی جمع ہے۔ دربان کو خازن کہا جاتا ہے، کیونکہ عموماً دربان وہیں ہوتے ہیں جہاں قیمتی چیزوں کا خزانہ ہو۔ جہنم کے دربانوں کی صفت کے لیے دیکھیے سورۂ تحریم (۶)۔

⑥ **اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ......** : جہنم کے سخت دل، سخت لہجے اور قوت والے فرشتے ان سے یہ بات پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ انھیں ملامت کرنے اور ڈانٹنے کے لیے کہیں گے، جسمانی عذاب کے ساتھ یہ عذاب مزید ہوگا۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۳۰) اور سورۂ ملک (۸ تا ۱۱)۔

⑦ **قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنْ ......** : یعنی ہاں آئے تھے اور انھوں نے ڈرایا بھی تھا، مگر ہم ہی ایسے اعمال کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ بات جو اس نے جہنم کو کافر جنوں اور انسانوں سے بھرنے کے متعلق فرمائی تھی (دیکھیے السجدہ: ۱۳) وہ ہمارے حق میں سچی ثابت ہوئی۔

**آیت 72** **فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ :** اس جملے سے معلوم ہوا کہ جہنم میں جانے کی سب سے بڑی وجہ تکبر (یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر حق کا انکار) ہے۔ ابلیس کا بھی اصل جرم تکبر ہی تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے الگ الگ جرم گنانے کے بجائے تمام جرائم کا اصل ذکر فرما دیا، جو تمام مجرموں میں مشترک ہے۔

**آیت 73** ① **وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ ......:** کفار کے انجام سے ڈرانے کے بعد متقین کے حسن انجام کی بشارت دی، کیونکہ قرآن مجید میں یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ [ مریم: ۹۷ ] "تاکہ تو اس کے ساتھ متقی لوگوں کو خوش خبری دے اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرائے جو سخت جھگڑالو ہیں۔"

② یہاں ایک سوال ہے کہ "سَاقَ يَسُوْقُ" میں سختی کے ساتھ ہانکنے کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں کفار کو سختی سے ہانک کر جہنم کی طرف لے جانے کا ذکر ہے، تو یہاں متقین کو جنت کی طرف لے جانے کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال

سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِيۡنَ ﴿۷۳﴾

کہیں گے تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، پس اس میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ رہنے والے ﴿۷۳﴾

کیا گیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ پہلے "سِيۡقَ" کے ساتھ مُشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے، ورنہ یہاں اس لفظ سے مراد سختی سے لے جانا یا ہانکنا نہیں۔ اسے تجرید کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد صرف لے جانا ہے۔ مقصد دونوں کو لے جانے کا باہمی فرق واضح کرنا ہے کہ اگرچہ دونوں کو لے جایا جائے گا، مگر کفار کو لے جانے میں سختی، دھکے اور اہانت و تذلیل ہوگی، جب کہ مومنوں کو اکرام کے ساتھ لے جایا جائے گا، جس کی دلیل بعد میں آنے والے الفاظ "وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا" اور "وَقَالَ لَهُمۡ خَزَنَتُهَا" ہیں۔

❸ **زُمَرًا:** یہ جماعتیں درجات کے لحاظ سے ہوں گی، چنانچہ سب سے بلند درجات والے پہلے داخل ہوں گے۔ (دیکھیے سورۂ واقعہ: ۱۰) مثلاً انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اسی طرح درجہ بدرجہ جماعتیں جنت میں داخل ہوں گی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَلِجُ الْجَنَّةَ صُوْرَتُهُمْ عَلٰى صُوْرَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، لَا يَبْصُقُوْنَ فِيْهَا وَ لَا يَمْتَخِطُوْنَ وَ لَا يَتَغَوَّطُوْنَ، آنِيَتُهُمْ فِيْهَا الذَّهَبُ، أَمْشَاطُهُمْ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَ مَجَامِرُهُمُ الْأَلُوَّةُ، وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ، وَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ زَوْجَتَانِ، يُرٰى مُخُّ سُوْقِهِمَا مِنْ وَّرَاءِ اللَّحْمِ، مِنَ الْحُسْنِ، لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَ لَا تَبَاغُضَ، قُلُوْبُهُمْ قَلْبٌ وَاحِدٌ، يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة و أنها مخلوقة : ۳۲۴۵ ] "پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے، وہ نہ اس میں تھوکیں گے، نہ رینٹ پھینکیں گے اور نہ پاخانہ کریں گے۔ اس میں ان کے برتن سونے کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی اور ان کی انگیٹھیاں "اُلُوَّہ" (جل کر خوشبو دینے والی ایک لکڑی) کی ہوں گی، ان کا پسینہ کستوری ہوگا، ان میں سے ہر ایک کی دو بیویاں وہ ہوں گی جن کی پنڈلیوں کا مغز حسن کی وجہ سے گوشت کے پیچھے سے دکھائی دے گا، ان میں نہ کوئی اختلاف ہوگا، نہ ایک دوسرے سے کوئی بغض ہوگا، ان کے دل ایک دل ہوں گے، صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں گے۔" صحیح مسلم میں اسی حدیث میں ہے: (( أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِيْ عَلٰى صُوْرَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ عَلٰى أَشَدِّ نَجْمٍ فِي السَّمَاءِ إِضَاءَةً ثُمَّ هُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ مَنَازِلُ )) [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها و أهلها، باب أول زمرة تدخل الجنة...... : ۲۸۳۴/۱۶ ] "میری امت کی پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے، پھر جو ان کے بعد جائیں گے وہ آسمان کے سب سے زیادہ روشن ستارے کی طرح ہوں گے، پھر اس کے بعد ان کے مختلف مراتب ہوں گے۔"

❹ جنتیوں کے گروہوں کی ایک تقسیم مختلف صالح اعمال میں خصوصیت کی بنا پر ہوگی، جن کی بنا پر انھیں مختلف دروازوں سے بلایا جائے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: (( مَنْ أَنْفَقَ زَوْجَيْنِ مِنْ شَيْءٍ مِنَ الْأَشْيَاءِ

فِي سَبِيلِ اللّٰهِ دُعِيَ مِنْ أَبْوَابِ يَعْنِي الْجَنَّةَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ! هٰذَا خَيْرٌ، فَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصَّلَاةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّلَاةِ، وَ مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْجِهَادِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الْجِهَادِ، وَ مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصَّدَقَةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّدَقَةِ، وَ مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصِّيَامِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصِّيَامِ، وَ بَابِ الرَّيَّانِ، فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ مَا عَلٰى هٰذَا الَّذِيْ يُدْعٰى مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ مِنْ ضَرُوْرَةٍ، وَ قَالَ هَلْ يُدْعٰى مِنْهَا كُلِّهَا أَحَدٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ نَعَمْ، وَ أَرْجُوْ أَنْ تَكُوْنَ مِنْهُمْ يَا أَبَا بَكْرٍ! » [ بخاري، باب فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب : ۳۶۶۶ ] ''جو شخص کسی چیز کا ایک جوڑا اللہ کے راستے میں خرچ کرے گا اسے جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا، اے اللہ کے بندے! یہ خیر ہے۔ تو جو شخص نماز والوں سے ہوگا اسے نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو جہاد والوں سے ہوگا اسے جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو صدقہ والوں سے ہوگا اسے صدقہ کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو روزے والوں سے ہوگا اسے روزے کے دروازے اور باب الریان (سیرابی کے دروازے) سے بلایا جائے گا۔'' تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جس شخص کو ان دروازوں سے بلایا جائے اسے کوئی ضرورت تو نہیں، مگر یا رسول اللہ! کیا کسی کو ان تمام دروازوں سے بھی بلایا جائے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! اور میں امید کرتا ہوں کہ اے ابوبکر! تم بھی ان میں سے ہو گے۔''

5 **حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا** : یہاں ''فُتِحَتْ'' سے پہلے ''واؤ'' لانے کا مطلب یہ ہے کہ متقین کی آمد پر جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیے گئے ہوں گے، جیسے کسی معظم و مکرم مہمان کے انتظار میں پہلے ہی دروازے کھلے رکھے جاتے ہیں۔ اسی کو دوسری آیت میں صراحت کے ساتھ فرمایا: ﴿ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴾ [ ص : ۵۰ ] ''ہمیشہ رہنے کے باغات، اس حال میں کہ ان کے لیے دروازے پورے کھولے ہوئے ہوں گے۔'' جنت کے آٹھ دروازے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « فِي الْجَنَّةِ ثَمَانِيَةُ أَبْوَابٍ، فِيْهَا بَابٌ يُسَمَّى الرَّيَّانَ لَا يَدْخُلُهُ إِلَّا الصَّائِمُوْنَ » [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة أبواب الجنة : ۳۲۵۷ ] ''جنت کے آٹھ دروازے ہیں، ایک دروازے کا نام ریّان ہے، اس میں سے صرف خاص روزے دار داخل ہوں گے۔''

6 **وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ** ...... : کفار کے برعکس متقین کی جنت کے پاس آمد پر اس کے دربان فرشتے نہایت محبت کے ساتھ ان کا اکرام اور عزت افزائی کرتے ہوئے انھیں تین باتیں کہیں گے، پہلی یہ کہ تم پر سلام ہے، یعنی اب تم ہر تکلیف، غم اور خوف سے سلامت رہو گے۔ دوسری بات ''طِبْتُمْ'' ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ تم اس سے پہلے دنیا میں کفر و شرک سے پاک رہے، سو اس میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے، دوسرا یہ کہ اب تم ہر گناہ اور بری بات سے پاک ہو گئے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَخْلُصُ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ، فَيُحْبَسُوْنَ عَلٰى قَنْطَرَةٍ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَ النَّارِ، فَيُقْتَصُّ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ، مَظَالِمُ كَانَتْ بَيْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا، حَتّٰى إِذَا هُذِّبُوْا وَ نُقُّوْا أُذِنَ لَهُمْ فِي دُخُوْلِ الْجَنَّةِ » [ بخاري، الرقاق، باب القصاص يوم القيامة : ۶۵۳۵ ] ''مومن آگ سے بچ کر نکلیں گے تو انھیں جنت اور

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۷۴﴾

**اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں سے جہاں چاہیں جگہ بنا لیں۔ سو عمل کرنے والوں کا یہ اچھا اجر ہے ﴿۷۴﴾**

آگ کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا، پھر انھیں ایک دوسرے سے ان زیادتیوں کا بدلا دلایا جائے گا جو دنیا میں آپس میں ہوئیں، پھر جب خوب پاک صاف ہو جائیں گے تو انھیں جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی۔'' تیسری بات یہ کہیں گے کہ چونکہ تم پاک ہو چکے، سو اب تم جنت میں ہمیشہ رہنے والے بن کر داخل ہو جاؤ۔ جنت میں داخلہ ہی بہت بڑی بشارت ہے، اس کے ساتھ ہمیشگی کی بشارت کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔
[ آمِيْن يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ ]

⑦ کفار کے متعلق جو فرمایا: ''**اِذَا جَآءُوْهَا**'' (جب وہ اس کے پاس آئیں گے) اس شرط کی جزا ''**فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا**'' (تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے) ہے، مگر متقین کے متعلق تینوں جملے شرط کا حصہ ہیں ''**اِذَا جَآءُوْهَا**''، ''**وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا**'' اور ''**وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا**'' ان کی جزا حذف کر دی گئی ہے، کیونکہ اس دنیا میں انسانی فکر اس کی بلندی تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ گویا عبارت یوں ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے، اس حال میں کہ اس کے دروازے کھول دیے گئے ہوں گے اور اس کے نگران ان سے کہیں گے تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، پس اس میں داخل ہو جاؤ، پاکیزہ رہنے والے، تو مت پوچھو کہ وہ کس قدر خوش ہوں گے، کیونکہ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنی بڑی نعمت حاصل کریں گے۔

**آیت 74** ① **وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ:** اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو اپنے رب کی حمد اور اس کا شکر ادا کریں گے اور اس بات کا اقرار و اعلان کریں گے کہ اس نے جو وعدہ کیا تھا: ﴿ **اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ** ﴾ [ الذاريات : ۱۵ ] کہ بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے (اور دوسری آیات مثلاً مریم: ۶۳) وہ وعدہ اس نے پورا فرما دیا۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۴۳، ۴۴) اور سورۂ فاطر (۳۳ تا ۳۵)۔

② **وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ:** آدمی جس چیز کا وارث بنتا ہے اس کا پوری طرح مالک بن جاتا ہے، کوئی دوسرا اس پر دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ انھیں ان جگہوں کا بھی مالک بنایا جائے گا جو جہنم میں جانے والوں کی تھیں، اگر وہ نیک عمل کرتے اور یہ مالکانہ حقوق ہمیشہ کے لیے ہوں گے۔

③ **نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ:** یہاں ایک سوال ہے کہ جنتی اگر چاہے تو کیا دوسرے اہل جنت کے گھروں میں اپنی جگہ بنا سکے گا؟ اس کے جواب میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ان کو حکم ہے کہ جہاں چاہیں رہیں، لیکن ہر کوئی وہی جگہ چاہے گا جو اس کے واسطے پہلے سے رکھی ہے۔'' (موضح) اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر جنتی کے پاس اتنی جگہ ہو گی کہ اسے کسی اور کی جگہ

وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ

اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور ان

لینے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ جہنم سے نکل کر جنت میں جانے والے شخص کو اللہ تعالیٰ زمین کے برابر اور اس کے ساتھ اس سے دس گنا زیادہ جگہ عطا فرمائے گا۔ [ دیکھیے بخاري، الأذان، باب فضل السجود : ۸۰۶ ] ظاہر ہے اتنی جگہ ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی جگہ کی خواہش کوئی کمینہ شخص ہی کرے گا، جب کہ جنت میں کسی کمینگی یا کمینے شخص کی گنجائش ہی نہیں۔

④ **فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ** : یہ بات متقی کہیں گے یا فرشتے، یا یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

**آیت 75** ① **وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ**...... : یعنی جس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے نزول فرمائے گا اس وقت فرشتے عرش کو اردگرد سے گھیرے ہوئے ہوں گے۔ اس منظر کو دوسرے مقام پر کچھ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے : ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ فَيَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ ۝ وَّ الْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ يَوْمَىِٕذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴾ [ الحآقة : ۱۳ تا ۱۸ ] ”پس جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک بار پھونکنا۔ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا۔ تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی۔ اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن کمزور ہوگا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس دن تم پیش کیے جاؤ گے، تمھاری کوئی چھپی ہوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔“ سورۂ حاقہ میں ان آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

② **مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ** : یہاں ایک سوال ہے کہ یہ کہنا ہی کافی تھا ”حَافِّيْنَ حَوْلَ الْعَرْشِ“ کہ وہ عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہوں گے، پھر لفظ ”مِنْ“ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب بعض مفسرین نے دیا ہے کہ یہ ”مِنْ“ زائد ہے۔ بقاعی نے فرمایا کہ یہ ”مِنْ“ تبعیض کے لیے ہے، یعنی فرشتے کتنی بھی تعداد میں ہوں عرش اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی مخلوق ہے کہ سب فرشتے مل کر بھی اس کے اردگرد کے کچھ حصے ہی پر گھیرا ڈال سکیں گے۔

③ **وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ** : یعنی ایسے پر جلال اور پر ہیبت ماحول میں اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔

④ **وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** : یعنی لوگوں کے فیصلے کا اختتام اللہ رب العالمین کی حمد پر ہوگا۔ حمد کرنے والوں کے عام ہونے کی وجہ سے ”قِيْلَ“ (کہا جائے گا) میں کہنے والے کا ذکر نہیں فرمایا۔ مطلب یہ کہ جب فیصلہ ہو چکے گا تو کائنات کا ذرہ ذرہ ان سراسر عدل اور رحم والے فیصلوں پر اللہ رب العالمین کی حمد کرے گا اور ہر طرف سے آواز آئے گی : ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔“ طبری نے صحیح سند کے ساتھ قتادہ کا قول ذکر

بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾

ع ۵

کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۷۵﴾

کیا ہے، انھوں نے فرمایا: ''مخلوق کی پیدائش کی ابتدا بھی حمد کے ساتھ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ [ الأنعام : ۱ ] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا۔'' اور مخلوق کی انتہا بھی حمد ہے، فرمایا: ﴿ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ الزمر : ۷۵ ] ''اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔'' (طبری) ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ہر کام کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہونی چاہیے، جیسا کہ اہلِ جنت کے متعلق فرمایا: ﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ یونس : ۱۰ ] ''ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ''پاک ہے تو اے اللہ!'' اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔''
حمد کے متعلق مزید دیکھیے سورۂ فاتحہ کی تفسیر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم

حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

## جلد چہارم

سورۃ المؤمن تا سورۃ الناس

دار الاندلس
Dar-ul-Andlus

بسم الله الرحمن الرحيم

نام کتاب

# تفسیر القرآن الکریم

## جلد چہارم

سورۃ المؤمن تا سورۃ الناس

ترجمہ و تفسیر

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ

Dar ul Andlus

ناشر

دار الاندلس

Ph: +92-42-37150891 ہیڈ آفس
Fax: +92-42-37150889

4-لیک روڈ چوبرجی لاہور
+92-42-37230549

6-غزنی سٹریٹ نزد رحمٰن مارکیٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾

اور ہم نے آپ کی طرف یہ نصیحت اتاری تاکہ آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

# تفسیر القرآن الکریم


فضیلۃ الاستاذ حافظ عبدالسلام بن محمد حفظہ اللہ


## جلد چہارم

سورۃ المؤمن تا سورۃ الناس


دار الاندلس

042-37230549

تفسیر القرآن الکریم

# فہرست

حٰمٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ② غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حٰمٓ ① اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے، جو سب پر غالب، ہر چیز کو جاننے والا ہے ② گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، بہت سخت سزا والا، بڑے فضل والا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ③

''سورۂ مومن'' کا ایک نام ''سورۂ غافر'' بھی ہے۔

**آیت 1** حٰمٓ : یہ حروف مقطعات ہیں، تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔

**آیت 3،2** ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ...... : اس سورت میں توحید، قیامت اور اسلام کے بنیادی عقائد اور کفار کے مسلمانوں کے ساتھ ناحق جھگڑے اور کج بحثی کا ذکر ہے۔ ان دو آیات میں اس کتاب کے نازل کرنے والے کی چھ صفات اس انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ اس کتاب پر کفار کے تمام اعتراضات کا جامع جواب آ گیا ہے۔

مفسر عبد الرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''کفار کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ کلام اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں، بلکہ تمھاری اختراع ہے۔ آغاز ہی میں فرما دیا کہ یہ کتاب کسی کمزور ہستی کی طرف سے نہیں بلکہ اس اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے جو (الْعَزِيْزِ ہے، یعنی) کائنات کی ہر چیز پر غالب ہے اور تمھاری معاندانہ کوششوں اور سازشوں کے علی الرغم اپنے کلمہ کو سربلند اور نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ (الْعَلِيْمِ ہے، یعنی) ہر چیز کا براہِ راست اور پورا پورا علم رکھتا ہے، لہٰذا اس کتاب میں اے کفار مکہ! جو (احکام اور جو) خبریں بھی دی گئی ہیں سب درست اور یقینی ہیں۔ تیسری صفت (غَافِرِ الذَّنْۢبِ) یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنے فرماں بردار بندوں کے بہت سے گناہ از خود ہی بخشتا رہتا ہے۔ چوتھی صفت (قَابِلِ التَّوْبِ) یہ ہے کہ کافر توبہ کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائیں تو ان کی توبہ قبول کر کے ان کے سابقہ گناہوں کو معاف کر دینے والا ہے اور اس صفت کا تعلق صرف نومسلموں سے نہیں بلکہ جو بندہ بھی اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اس کی طرف رجوع کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اس کے گناہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ پانچویں صفت (شَدِيْدِ الْعِقَابِ) یہ ہے کہ وہ اپنے باغیوں کو سخت سزا دے کر ان کی اکڑی ہوئی گردنیں توڑ سکتا ہے، خواہ وہ یہ عذاب دنیا میں دے یا آخرت میں اور اس کی چھٹی صفت (ذِي الطَّوْلِ) یہ ہے کہ وہ کشادہ دست (کھلے ہاتھ اور بڑے فضل والا) ہے، ہر وقت انعامات کی بارش کرتا رہتا ہے اور اس سے اپنے نافرمانوں کو بھی محروم نہیں فرماتا۔ اتنی صفات بیان کرنے کے بعد ان دو بنیادی جھگڑوں کی حقیقت بیان فرما دی جو رسول اللہ ﷺ اور کفار مکہ کے درمیان چل رہے تھے، ان میں سے پہلا یہ (لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، باقی تمام معبود جھوٹے، باطل اور بے کار ہیں اور دوسرا (اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ) یہ کہ روزِ آخرت کا قیام یقینی ہے اور تم سب کو یقیناً اللہ کے حضور پیش ہونا ہوگا۔'' (تیسیر القرآن)

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ﴿۴﴾

اللہ کی آیات میں جھگڑا نہیں کرتے مگر وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تو ان کا شہروں میں چلنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈال دے ﴿۴﴾

② اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بیان فرماتے ہوئے رحمت و عذاب دونوں پر مشتمل صفات بیان فرمائی ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے، تاکہ امید و خوف دونوں موجود رہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴾ [ الحجر : ۴۹، ۵۰ ] ''میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہوں۔ اور یہ بھی کہ بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔'' یاد رہے کہ یہاں رحمت کی صفات عذاب کی صفات سے زیادہ بیان ہوئی ہیں، چنانچہ ''شَدِيْدِ الْعِقَابِ'' سے پہلے بھی رحمت پر مشتمل دو صفات ''غَافِرِ الذَّنْۢبِ'' اور ''قَابِلِ التَّوْبِ'' ہیں اور بعد میں بھی ''ذِي الطَّوْلِ'' ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِيْ كِتَابِهِ، فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِيْ غَلَبَتْ غَضَبِيْ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في قول اللّٰه تعالٰى : ﴿ وهو الذي يبدء الخلق..... ﴾ : ۳۱۹۴ ] ''اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق پیدا فرمائی تو اپنی کتاب میں لکھ دیا، چنانچہ وہ کتاب عرش کے اوپر اس کے پاس ہے کہ بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''

**آیت 4** ① مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: ''کفر'' کا معنی چھپانا بھی ہے اور انکار بھی اور جھگڑے سے مراد کج بحثی کر کے آیاتِ الٰہی کو جھٹلانا اور انھیں رد کرنا ہے، ورنہ جس جدال اور بحث و مناظرے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی آیات کی تصدیق اور حق بات کو ثابت کرنا ہو وہ قابلِ تعریف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا: ﴿ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [ النحل : ۱۲۵ ] ''اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔'' اور نوح علیہ السلام کو ان کی قوم نے کہا: ﴿ يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [ هود : ۳۲ ] ''اے نوح! بے شک تو نے ہم سے جھگڑا کیا، پھر ہم سے بہت جھگڑا کیا، پس لے آ ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو سچوں سے ہے۔'' ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وقت کے بادشاہ کے ساتھ مناظرہ کر کے اسے لاجواب کیا، فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۸ ] ''کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔'' ابراہیم علیہ السلام نے سورج، چاند اور ستاروں کی عبادت کرنے والوں کو لاجواب کیا (دیکھیے انعام : ۷۵ تا ۸۳) اور بت پرستوں کو لاجواب کیا۔ (دیکھیے انبیاء : ۵۱ تا ۷۰) یعنی اتنی عظیم کتاب، جس کے اتارنے والے کی صفات کا ذکر اوپر گزرا، کوئی حق بات تسلیم کرنے والا شخص اس کی آیات کو جھٹلانے کے لیے جھگڑا نہیں کرتا، صرف وہی لوگ یہ جرأت کرتے ہیں جو حق کو چھپاتے اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْمِرَاءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ )) [ أبو داوٗد، السنة، باب النهي

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۪ وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ۝۵

ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور ان کے بعد بھی کئی جماعتوں نے اور ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق ارادہ کیا کہ اسے گرفتار کر لیں اور انھوں نے باطل کے ساتھ جھگڑا کیا، تاکہ اس کے ذریعے حق کو پھسلا دیں، تو میں نے انھیں پکڑ لیا، پھر میری سزا کیسی تھی؟۝۵

عن الجدال في القرآن : ۴۶۰۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ''قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔''

❷ فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ: یعنی ان لوگوں کی خوش حالی اور ان کا عیش و عشرت کے لیے یا تجارت اور دوسرے کاموں کے لیے مختلف شہروں میں پھرنا دیکھ کر کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ یہ اللہ کے پسندیدہ لوگ ہیں، دراصل یہ ان کے لیے مہلت ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۹۶، ۱۹۷)۔

آیت 5 ❶ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ ......: "الْاَحْزَابُ" "حِزْبٌ" کی جمع ہے، وہ جماعت جو اپنے عقیدے، عمل اور عادت میں ایک جیسی ہو۔ پچھلی آیت کے ساتھ اس کا تعلق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو ردّ کرنے کے لیے جو لوگ بھی جھگڑ رہے ہیں انھیں پہلی قوموں کا انجام یاد رکھنا چاہیے۔ ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے اور ان کے بعد عقیدہ، عمل اور عادات میں ان کے ساتھ شامل بہت سی قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ مثلاً عاد، ثمود، اصحاب الایکہ، قومِ لوط اور آلِ فرعون وغیرہ۔ یہ تمام اقوام اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے، آخرت کا انکار کرنے اور اپنے نبی کو جھٹلانے میں ایک جیسی تھیں۔

❷ وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ: یعنی ہر امت نے صرف جھٹلانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے رسول کو گرفتار کر کے اسے جلا وطن کر دیں، یا قتل کر دیں، یا قید رکھیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا: ﴿ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۱۱۶ ] ''اے نوح! یقیناً اگر تو باز نہ آیا تو ہر صورت سنگسار کیے گئے لوگوں سے ہو جائے گا۔'' اور صالح علیہ السلام کی قوم ثمود نے کہا: ﴿ تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ [ النمل : ۴۹ ] ''آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور ہی اس پر اور اس کے گھر والوں پر رات حملہ کریں گے، پھر ضرور ہی اس کے وارث سے کہہ دیں گے ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے اور بلاشبہ یقیناً ہم سچے ہیں۔'' اور لوط علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا: ﴿ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۱۶۷ ] ''اے لوط! بے شک اگر تو باز نہ آیا تو یقیناً تو ضرور نکالے ہوئے لوگوں سے ہو جائے گا۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کفار نے ایسی ہی سازش کی، فرمایا: ﴿ وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ

وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۞ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور اس طرح ان لوگوں پر تیرے رب کی بات ثابت ہوگئی جنھوں نے کفر کیا کہ وہی آگ والے ہیں (۶) وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور

يَمْكُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [ الأنفال: ۳۰ ] ''اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے، تاکہ تجھے قید کر دیں، یا تجھے قتل کر دیں، یا تجھے نکال دیں اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔''

❸ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ : ''اَدْحَضَ يُدْحِضُ'' (افعال) کا معنی پھسلانا ہے، یہاں مراد حق کو باطل ثابت کرنا ہے۔ یعنی ان لوگوں نے باطل کے ڈھکوسلوں کے ذریعے سے اپنے رسولوں کے ساتھ ناحق جھگڑا اور کج بحثی کی، تاکہ وہ حق کو غلط ثابت کر سکیں۔ چنانچہ کبھی انھوں نے یہ کہا کہ تم کھاتے پیتے ہو اور بشر ہو، پھر کس طرح رسول بن گئے؟ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۴) کبھی نبوت کے ثبوت کے لیے بہت سے نامناسب مطالبات پیش کر دیتے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳) کبھی مسلمانوں کے فقر اور اپنی دولت کو اپنے حق پر ہونے کی دلیل قرار دیتے۔ دیکھیے سورۂ سبا (۳۵) اور سورۂ انعام: (۵۳)۔

❹ فَاَخَذْتُهُمْ : یعنی جب ان اقوام نے اپنے اپنے پیغمبر کو گرفتار کرنے اور اسے قید یا قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو میں نے انھیں پکڑ لیا۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ایسے ارادے کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے ناکام و نامراد کیا اور آپ ﷺ کو بحفاظت مدینہ پہنچا دیا، پھر بدر اور بعد کی جنگوں میں کفر پر ڈٹے رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا۔

❺ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ : ''عِقَابِ'' اصل میں ''عِقَابِيْ'' ہے، ''یا'' کو آیات کے فواصل کی موافقت کے لیے حذف کر دیا اور ''با'' پر کسرہ باقی رکھا، تاکہ وہ ''یا'' کے حذف ہونے پر دلالت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو پہلی اقوام کے انجام سے ڈرایا کہ ان کی تباہ شدہ بستیوں کے آثار کو دیکھو کہ میں نے انھیں پکڑا تو میرا عذاب کیسا رہا؟

آیت 6 وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ... : اس کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ جس طرح پہلی قوموں پر تیرے رب کے عذاب آنے کی بات ثابت ہو چکی اور وہ تباہ و برباد کر دی گئیں، اسی طرح اب جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان پر بھی تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ آگ میں جانے والے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ان قوموں پر دنیا میں جو عذاب آیا اسی پر بس نہیں، بلکہ ان کے متعلق دنیا کے عذاب کی طرح تیرے رب کی یہ بات بھی طے ہو چکی ہے کہ آخرت میں بھی وہ آگ میں رہنے والے ہیں۔

آیت 7 ❶ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ ... : پچھلی آیات میں کفار کا انجام بیان فرمایا، جو اللہ کی آیات ٹھکرانے

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۞

اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم سے گھیر رکھا ہے، تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا ۞

کے لیے فضول جھگڑا اور کج بحثی کرتے ہیں، اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کا حال بیان فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس پر ایمان لاتے اور کج بحثی سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کے حق میں وہ بلند مرتبہ فرشتے استغفار اور دعائیں کرتے ہیں جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے ارد گرد ہیں، وہ سب "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهِ" اور اس سے ملتے جلتے کلمات کے ساتھ اپنے رب کی حمد اور اس کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں، یعنی اس پاک ذات کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ تمام صفاتِ کمال کا مالک ہے اور ہر عیب اور کمی سے پاک ہے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کے لیے تسلی بھی ہے کہ ہٹ دھرمی اور کج بحثی کرنے والے کفار کے رویے سے بددل نہ ہوں، اگر یہ لوگ تم سے دشمنی رکھتے ہیں تو تم سے دوستی رکھنے والے بھی بہت ہیں اور بڑی اونچی شان والے ہیں۔ پھر ایسے پاک باز اور خیر خواہ دوستوں کی موجودگی میں، جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمھارے لیے دعائیں اور بخشش کی درخواست کرتے ہیں، تمھیں کسی دشمن کی کیا پروا ہے؟

❷ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ : یہاں ایک سوال ہے کہ یہ بات تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ عرش اٹھانے والے اور دوسرے تمام فرشتے اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، پھر ان کے اللہ پر ایمان لانے کا ذکر خاص طور پر کیوں فرمایا؟ زمخشری نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ایمان کی فضیلت و شرف کو نمایاں کرنے کے لیے اور اس کی ترغیب دینے کے لیے کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ بلد میں مشکل گھاٹی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے گردن چھڑانے اور نیکی کے دوسرے اعمال کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے کا ذکر فرمایا، تاکہ ایمان کی فضیلت ثابت ہو اور واضح ہو جائے کہ کوئی بھی نیکی اسی وقت معتبر ہے جب اس کے ساتھ ایمان ہو۔

❸ عرش اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سے سب سے بڑی مخلوق ہے، کیونکہ وہ تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر ہے اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، پھر عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کی عظمت کا کیا حال ہوگا!؟ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( أُذِنَ لِيْ أَنْ أُحَدِّثَ عَنْ مَّلَكٍ مِنْ مَّلَائِكَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ حَمَلَةِ الْعَرْشِ، إِنَّ مَا بَيْنَ شَحْمَةِ أُذُنِهٖ إِلٰى عَاتِقِهٖ مَسِيْرَةُ سَبْعِمِائَةِ عَامٍ )) [ أبوداؤد، السنة، باب في الجهمية : ٤٧٢٧، و قال الألباني صحيح ] ''مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ان فرشتوں میں سے ایک فرشتے کے متعلق بیان کروں جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں کہ اس کے کان کی کونپل سے اس کے کندھے تک سات سو سال کا فاصلہ ہے۔'' اب یہ معلوم نہیں کہ یہ سال دنیا والے ہیں یا وہ سال ہیں جن کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہے، یا اس سے بھی طویل مدت والے سال مراد ہیں، کیونکہ ہمارے سورج کے دائرے کے باہر وقت کا حساب ہمارے حساب سے نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ افلاک کی وسعت

رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ

اے ہمارے رب! اور انھیں ہمیشہ رہائش والی ان جنتوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کو بھی

کا کچھ اندازہ نہیں، جہاں سورج بھی ایک ذرّے کی حیثیت رکھتا ہے۔ غرض یہ ان فرشتوں کی عظمت کا محض ایک اندازہ ہے۔ عرش کو اٹھانے والے اتنے عظیم فرشتے اور عرش کے ارد گرد موجود اور اس کا طواف کرنے والے فرشتے جب مومنوں کے حق میں استغفار اور دعائیں کر رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں، جیسا کہ تمام فرشتوں کے متعلق فرمایا: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۲۶، ۲۷ ] ”بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔ وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں۔“ تو اس سے ایمان والوں پر اللہ تعالیٰ کی بے حد و حساب مہربانی اور رحمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ حاقہ (۱۷)۔

④ اس آیت میں توبہ کرنے والوں کے لیے صرف عرش اٹھانے والے اور اس کے ارد گرد موجود فرشتوں کے استغفار اور دعا کا ذکر ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمام فرشتے ان کے لیے استغفار کرتے ہیں، فرمایا: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [ الشوریٰ : ۵ ] ”آسمان قریب ہیں کہ اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو زمین میں ہیں، سن لو! بے شک اللہ ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“

⑤ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا : یہاں ” يَقُوْلُوْنَ “ (وہ فرشتے کہتے ہیں) محذوف ہے۔ یعنی تسبیح و تحمید کی طرح ایمان والوں کے لیے دعا کرنا بھی ان کے معمولات میں شامل ہے۔ اس سے ایمان کی فضیلت اور ایمان والوں کے باہمی تعلق اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے کہ عرش کے پاس رہنے والے فرشتے زمین پر رہنے والے مومنوں کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ اسی طرح اس سے دعا کا سلیقہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ” رَبَّنَآ “ (اے ہمارے رب! اے ہمارے پالنے والے!) کہہ کر پکارتے ہیں، پھر اس سے اس کی رحمت اور اس کے علم کا واسطہ دے کر سوال کرتے ہیں، یعنی تیری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے (دیکھیے اعراف : ۱۵۶) اور تیرا علم بھی ہر چیز پر وسیع ہے۔ (دیکھیے انعام : ۸۰۔ طلاق : ۱۲)

⑥ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا ...... : اس لیے تو اپنی رحمت اور علم کے تقاضے کے مطابق ان گناہ گاروں کو بخش دے جو اپنے گناہوں سے توبہ کریں، ان سے باز آ جائیں اور تیرے راستے کی پیروی کریں، تو نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کریں اور جس سے منع کیا ہے اسے چھوڑ دیں اور اے اللہ! انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا لے۔ مزید دیکھیے سورۂ شوریٰ کی آیت (۵) کی تفسیر۔

آیت 8 ① رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ : یعنی گناہوں کی مغفرت اور جہنم سے نجات ہی کافی نہیں،

وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ﴿۸﴾ وَ قِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَ مَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۠﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع

جوان کے باپ دادوں اوران کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے لائق ہیں۔ بلاشبہ تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۸﴾ اور انھیں برائیوں سے بچا اور تو جسے اس دن برائیوں سے بچالے تو یقیناً تو نے اس پر مہربانی فرمائی اور یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۹﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا انھیں پکار کر کہا جائے گا کہ یقیناً اللہ کا ناراض ہونا بہت زیادہ تھا تمھارے اپنے آپ پر ناراض ہونے سے، جب تمھیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے ﴿۱۰﴾

---

بلکہ انھیں دائمی اقامت والی جنتوں میں داخل فرما، جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۹۴)۔

② وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ : اس آیت میں مذکور وعدے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ رعد (۲۳) اور سورۂ طور (۲۱)۔

③ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : یقیناً تو ہی سب پر غالب ہے، جسے تو بخشنا چاہے بخش سکتا ہے، کوئی بھی تیرا ہاتھ پکڑ نہیں سکتا اور تو کمال حکمت والا ہے، اپنی حکمت کے تحت ہی تو نے ایمان والوں کو معاف کرنے اور ان کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے ان کے والدین اور بیوی بچوں کو جنت میں داخل کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

**آیت 9** وَ قِهِمُ السَّيِّاٰتِ : " قِ " " وَقٰى يَقِيْ وِقَايَةً " (ض) سے امر کا صیغہ ہے۔ " السَّيِّاٰتِ " (برائیوں) سے مراد برے اعمال و اقوال بھی ہیں اور ان کے برے نتائج بھی۔ یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ سے ایمان والوں کو تمام برائیوں سے بچانے کی بھی دعا کرتے ہیں اور دنیا و آخرت میں ان کے برے نتائج سے محفوظ رکھنے کی بھی۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۸۵)۔

**آیت 10** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ ...... : " مَقْتٌ " شدید غصے اور ناراضی کو کہتے ہیں۔ " يُنَادَوْنَ " "انھیں پکار کر کہا جائے گا" انھیں کون پکارے گا؟ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا۔ ظاہر ہے انھیں یہ کہنے والا اللہ تعالیٰ خود ہو سکتا ہے یا جہنم پر مقرر فرشتے ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں ایمان والوں کے ساتھ فرشتوں کے سلوک کا ذکر گزرا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کے ساتھ ایمان والوں کے لیے استغفار اور وہ دعائیں کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ اب ایمان والوں کے بعد کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے سلوک کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے اعمال دیکھیں گے تو اپنے آپ پر شدید غصے ہوں گے، اس وقت فرشتے انھیں پکار کر کہیں گے: ﴿ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ کہ اب تمھیں جہنم میں جلتے ہوئے اپنے آپ پر جتنا شدید غصہ آ رہا ہے، یقین جانو! دنیا میں جب تمھیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے بھی شدید غصہ آتا تھا۔

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ۚ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

وہ کہیں گے اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور تو نے ہمیں دو دفعہ زندہ کیا، سو ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، تو کیا نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ ﴿۱۱﴾ یہ اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ جب اس اکیلے اللہ کو پکارا جاتا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم مان لیتے تھے، اب فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے جو بہت بلند، بہت بڑا ہے ﴿۱۲﴾ وہی ہے جو تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے اور اس کے سوا کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا جو رجوع کرے ﴿۱۳﴾

**آیت 11** قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ ...... : جہنمی لوگ نہایت عاجزی اور ادب کے ساتھ "رَبَّنَآ" کہہ کر اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندگی عطا کی، اب ہم اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے تیرے ساتھ شرک کر کے اور قیامت کا انکار کر کے سخت غلطی کی، تو کیا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ اب جب کہ ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ہے، ہمارا عذر قبول کر لیا جائے اور ہمیں دوبارہ عمل کرنے کے لیے پہلی زندگی کی طرف لوٹا دیا جائے؟ یہ بات وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کہیں گے۔ کفار کی اس درخواست اور اس کے جواب کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۲۷)، سجدہ (۱۲)، فاطر (۳۷) اور سورۂ نساء (۱۸) دو موتوں اور دو زندگیوں کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۸): ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 12** ① ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ ...... : یعنی انھیں جواب ملے گا کہ آج تم جس حال میں مبتلا ہو وہ اس لیے ہے کہ دنیا میں جب اکیلے اللہ کو پکارا جاتا تو تم نہیں مانتے تھے، لیکن جب اس کے ساتھ دوسرے معبود بھی شریک کیے جاتے تو تم مان لیتے تھے۔ اکیلے اللہ کی عبادت تو درکنار، اکیلے اللہ کے ذکر پر ہی تمھارے دل تنگ پڑ جاتے تھے اور غیروں کے ذکر پر تمھارے چہرے خوشی سے چمک اٹھتے تھے۔ (دیکھیے زمر: ۴۵) اب اگر تمھیں دوبارہ دنیا میں بھیج بھی دیا جائے تو تم وہی کچھ کرو گے جو تم پہلے کرتے رہے، اس لیے تمھارے جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۸)۔

② فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ : تو اب فیصلے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔ آج تمھارے بنائے ہوئے دیوتاؤں، داتاؤں، مشکل کشاؤں اور حاجت رواؤں کا فیصلے میں کوئی دخل نہیں۔ ان ہستیوں کا "الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ" کے فیصلے میں کیا دخل ہو سکتا ہے جن کا خمیر ہی پستی اور بے بضاعتی سے اٹھایا گیا ہے۔

**آیت 13** ① هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ : یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہے جو تمھیں اپنے وجود اور اپنی وحدانیت کی بے شمار نشانیاں

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

پس اللہ کو پکارو، اس حال میں کہ دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والے ہو، اگرچہ کافر برا مانیں ﴿۱۴﴾

دکھاتا ہے، جو اس وقت بھی موجود تھیں جب تمھارے بنائے ہوئے معبودوں کا وجود تک نہ تھا۔ اب بھی کوئی داتا یا دستگیر یہ دعویٰ نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اس نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی حصہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بہت سی نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے، وہ نشانیاں آفاق (کائنات) میں بھی ہیں اور خود انسان کی ذات میں بھی۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶)، حم السجدہ (۵۳)، روم (۲۰ تا ۲۷)، بقرہ (۱۶۴)، جاثیہ (۳۵) اور سورۂ مومن (۷۹، ۸۰)۔ اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد انبیاء علیہم السلام کو عطا کردہ معجزے بھی ہیں اور اس کی قدرت پر دلالت کرنے والے عجیب و غریب واقعات و حوادث بھی، جو وقتاً فوقتاً انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى﴾ [ طٰہٰ : ۵٦ ] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس (فرعون) کو اپنی تمام آیات (نشانیاں) دکھائیں، پس اس نے جھٹلایا اور انکار کر دیا۔“

❷ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا: یہ کہنے کے بعد کہ وہی ہے جو تمھیں اپنی آیات (نشانیاں) دکھاتا ہے، اپنی ایک عظیم نشانی کا ذکر فرمایا۔ ”رِزْقًا“ سے مراد یہاں بارش ہے، کیونکہ وہ انسان کے رزق کا سبب ہے۔ تمام نباتات اسی سے اُگتی ہیں، جنھیں کھا کر وہ تمام جانور پلتے ہیں جو انسان کی خوراک ہیں یا اس کے کام آتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۲)، جاثیہ (۵)، ابراہیم (۳۲)، ق (۹ تا ۱۱) اور سورۂ نحل (۱۰، ۱۱)۔

❸ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ: یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کی نشانیاں تو بے شمار ہیں، مگر ان سے نصیحت رجوع کرنے والے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی روزی ہی کو دیکھ لے کہ اسے مہیا کرنے میں قدرت کی کون کون سی چیزیں مصروف عمل ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کی موافقت کے ساتھ کام کر رہی ہیں تو کبھی شرک کی جرأت نہ کرے، کیونکہ ان تمام چیزوں کو بنانے اور چلانے والا ایک ہے۔ اگر وہ ایک نہ ہو تو کائنات ایک لحہ کے لیے بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ مگر جو شخص اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ لے اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہ کرے، وہ بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی کوئی نصیحت حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کی آنکھوں پر تقلید آباء، تعصب اور عناد کے پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

آیت 14 ❶ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: ”الدِّيْنَ“ کا معنی عبادت بھی ہے اور اطاعت بھی۔ یعنی جب تمھاری روزی کا مالک وہی ہے تو اپنی عبادت اور اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے صرف اسی کو پکارو، اس کی بندگی میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرو۔

❷ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ: یعنی تمھارے اللہ واحد کو پکارنے سے کافر و مشرک ناک بھوں چڑھائیں گے، سو تم ایک اللہ کی عبادت و اطاعت پر قائم رہو، خواہ کافر اسے کتنا ہی ناپسند کریں۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾

وہ بہت بلند درجوں والا، عرش کا مالک ہے، وہ اپنے حکم سے وحی اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، تاکہ آپس کی ملاقات کے دن سے ڈرائے ﴿۱۵﴾ جس دن وہ صاف ظاہر ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ پر چھپی نہ ہوگی۔ آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، بہت دبدبے والا ہے ﴿۱۶﴾

**آیت 15** ① رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ : "اَلدَّرَجٰتِ" "دَرَجَةٌ" کی جمع ہے، جس کا معنی مرتبہ بھی ہے اور سیڑھی بھی۔ "رَفِيْعُ" "رَفَعَ يَرْفَعُ" (ف) سے ہے، لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔ لازم سے ہو تو معنی "مُرْتَفِعُ الدَّرَجَاتِ" ہے، اس کا اصل "رَفِيْعٌ دَرَجَاتُهٗ" ہے۔ یعنی وہ بہت بلند مراتب اور سیڑھیوں والا اور عرش والا ہے، اس کی ذات مخلوق سے جدا عرش کے اوپر ہے۔ فرشتوں کو عرش تک پہنچنے کے لیے بہت سی سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ؕ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ [ المعارج : ۱ تا ۴ ] "ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کے متعلق سوال کیا جو واقع ہونے والا ہے۔ کافروں پر، اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ اللہ کی طرف سے، جو سیڑھیوں والا ہے۔ فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، (وہ عذاب) ایک ایسے دن میں (ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے۔" مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ معارج کی انھی آیات کی تفسیر۔

"رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ" میں "رَفِيْعُ" کو اگر متعدی مانا جائے تو معنی ہوگا، وہ درجوں کو بہت بلند کرنے والا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ﴾ [ یوسف : ۷۶ ] "ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلند کر دیتے ہیں۔"

② يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ : "اَلرُّوْحَ" سے مراد یہاں "وحی" ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ﴾ [ النحل : ۲ ] "وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے کہ خبردار کر دو کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو مجھ سے ڈرو۔" مزید تشریح سورۂ نحل کی اس آیت کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

③ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ : "اَلتَّلَاقِ" "لَقِيَ يَلْقٰى" (ع) سے باب تفاعل کا مصدر ہے، اصل میں "تَلَاقِيْ" ہے، ایک دوسرے سے ملنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ وحی اس لیے نازل فرماتا ہے تاکہ ملاقات کے دن سے ڈرائے۔ مراد قیامت کا دن ہے، جس میں جانیں جسموں کے ساتھ ملیں گی اور سب لوگ ایک دوسرے سے ملیں گے۔ ہر عمل کرنے والا اپنے عمل کی جزا سے ملے گا، ظالم و مظلوم ملیں گے، آسمان والے فرشتے زمین کے انسانوں سے ملیں گے اور مخلوق خالق سے ملے گی، جو ان کا حساب لے گا۔

**آیت 16** ① يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ...... : یعنی ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہر وقت ظاہر ہے، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾

**آج ہر شخص کو اس کا بدلا دیا جائے گا جو اس نے کمایا، آج کوئی ظلم نہیں۔ بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۷﴾**

اگرچہ دنیا میں کچھ لوگ اپنے خیال کے مطابق اپنے آپ کو کسی مکان یا غار وغیرہ میں یا کپڑوں میں چھپا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے چھپ گئے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [ ھود : ۵ ] ''سن لو! بلاشبہ وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں، تاکہ اس سے اچھی طرح چھپے رہیں، سن لو! جب وہ اپنے کپڑے اچھی طرح لپیٹ لیتے ہیں وہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے۔'' مگر قیامت کے دن زمین پر کوئی اوٹ نہیں رہے گی، جس میں وہ چھپ سکیں، بلکہ سب کے سب صاف ظاہر ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۙ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۙ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا﴾ [ طٰہٰ : ۱۰۵ تا ۱۰۷ ] ''اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو تُو کہہ دے میرا رب انھیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر انھیں ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا۔ جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری جگہ۔'' اس دن تو کسی کے جسم پر کوئی کپڑا بھی نہیں ہوگا، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّكُمْ مُلَاقُو اللّٰهِ حُفَاةً عُرَاةً مُشَاةً غُرْلًا )) [ بخاری، الرقاق، باب کیف الحشر : ۶۵۲۴ ] ''تم اللہ تعالیٰ سے ننگے پاؤں، ننگے بدن، پیدل چلنے والے، بغیر ختنہ کیے ہوئے ملو گے۔'' مزید دیکھیے سورۂ ابراہیم (۲۱، ۴۸) اور سورۂ حاقہ (۱۳ تا ۱۸)۔

❷ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ : یعنی دنیا میں بہت سے لوگ اپنی بادشاہی اور بڑائی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے اور بہت سے لوگ ان کی بادشاہی اور کبریائی مانتے رہے، مگر اب بتاؤ کہ آج ساری بادشاہی کا مالک کون ہے؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: (( يَقْبِضُ اللّٰهُ الْأَرْضَ، وَيَطْوِي السَّمٰوَاتِ بِيَمِيْنِهِ، ثُمَّ يَقُوْلُ أَنَا الْمَلِكُ، أَيْنَ مُلُوْكُ الْأَرْضِ؟ )) [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ والأرض جميعا قبضته...... ﴾ : ۴۸۱۲ ] ''اللہ تعالیٰ زمین کو مٹھی میں لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا، پھر فرمائے گا، میں ہی بادشاہ ہوں، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟''

❸ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ : جب کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ خود ہی یہ بات فرمائے گا، جیسا کہ پچھلے فائدے میں حدیث گزری۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اس وقت کا ذکر ہے جب سب لوگ میدان حشر میں صاف ظاہر ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ پر چھپی نہ ہوگی، اس وقت اللہ تعالیٰ پوچھے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ ''آج کس کی بادشاہی ہے؟'' ظاہر ہے اس وقت وہ سب لوگ جو وہاں جمع ہوں گے وہی یہ جواب دیں گے۔ نیک لوگ خوشی سے اور برے لوگ یہ بات بادل ناخواستہ کہیں گے، کیوں کہ کسی کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔ رہی حدیث، تو وہ اس موقع کی بات ہے جب اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو لپیٹے گا اور یہ بات فرمائے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ اکیلے کی بادشاہت کا اظہار و اقرار متعدد بار ہوگا۔

آیت 17 ❶ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ : آج کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا کہ کسی کا ثواب کم کر دیا جائے، یا کسی کو اس سے زیادہ

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ۬ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؕ﴿۱۸﴾

اور انھیں قریب آنے والی گھڑی کے دن سے ڈرا جب دل گلوں کے پاس غم سے بھرے ہوں گے، ظالموں کے لیے نہ کوئی دلی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، جس کی بات مانی جائے ﴿۱۸﴾

عذاب دیا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔

❷ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ : اللہ تعالیٰ کو تمام جن وانس کا حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگتی، اس کے لیے تمام انسانوں کا حساب ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی کا حساب لینا، کیونکہ اسے ہر چیز کا علم ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مخلوق کی طرح عاجز نہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی مقدمہ سن سکے، یا اصل حقیقت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے جلدی فیصلہ نہ کر سکے۔ انسان اپنے عجز کی وجہ سے فیصلے میں دیر کرتا ہے، جب کہ فیصلے میں دیر بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ہر طرح کے عجز سے پاک ہے، اس لیے وہ ایک ہی وقت میں سب کا حساب کر کے جنت والوں کو جنت میں اور جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دے گا، فرمایا: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [ لقمان : ۲۸ ] "نہیں ہے تمھارا پیدا کرنا اور نہ تمھارا اٹھانا مگر ایک جان کی طرح۔" اور فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴾ [ القمر : ۵۰ ] "اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے آنکھ کی ایک جھپک۔"

**آیت 18** ❶ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ : "اَلْاٰزِفَةُ" "أَزِفَ يَأْزَفُ" (س) سے اسم فاعل ہے۔ مؤنث اس لیے ہے کہ یہ "اَلسَّاعَةُ" کی صفت ہے۔ چنانچہ قیامت کے متعلق اکثر الفاظ مؤنث استعمال ہوئے ہیں، مثلاً "اَلْحَآقَّةُ"، "اَلْقَارِعَةُ"، "اَلصَّآخَّةُ" اور "اَلطَّآمَّةُ" وغیرہ۔ قیامت کو "اَلْاٰزِفَةُ" اس لیے فرمایا کہ اس کا آنا بہت قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر قیامت کے قریب آنے سے لوگوں کو خبردار فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴾ [ النجم : ۵۷، ۵۸ ] "قریب آگئی وہ قریب آنے والی۔ جسے اللہ کے سوا کوئی ہٹانے والا نہیں۔"

قیامت کے قریب آنے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء کی آیت (۱): ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ ﴾ کی تفسیر۔

❷ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ : "اَلْحَنَاجِرِ" "حَنْجَرَةٌ" کی جمع ہے، حلق۔ "كٰظِمِيْنَ" "كَظَمَ السِّقَاءَ" کا معنی مشکیزے کو پانی سے بھر کر اس کا منہ بند کر دینا ہے۔ یعنی شدید خوف اور غم کی وجہ سے مجرموں کے دل حلق کو پہنچے ہوئے ہوں گے، پھر وہ نہ تو اپنی جگہ واپس جائیں گے کہ انھیں کچھ آرام ملے اور نہ ہی ان کے بدن سے باہر نکلیں گے کہ موت آنے کے بعد ان کی جان چھوٹے۔

❸ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ : "حَمَّ يَحُمُّ" (ن) گرم کرنا۔ دلی دوست یا رشتہ دار کو "حَمِيْمٍ" اس لیے کہتے ہیں کہ اسے اپنے دوست یا رشتہ دار کی وجہ سے دل میں گرمی آتی ہے۔ قیامت کے دن ظالموں کا کوئی دلی دوست نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا:

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾

وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور اسے بھی جو سینے چھپاتے ہیں ﴿۱۹﴾

﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ الزخرف : ۶۷ ] ”سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔“

❹ وَ لَا شَفِيْعٍ: ”ظالمین“ سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔ (دیکھیے انعام : ۸۲۔ لقمان : ۱۳) ان کے حق میں کوئی بھی سفارش نہیں کرے گا، کیونکہ اس دن جو سفارش کی اجازت دی جائے گی وہ انبیاء، فرشتوں اور نیک بندوں کو دی جائے گی اور وہ بھی صرف ایمان والوں کے لیے، کفار و مشرکین کا سفارشی اس دن کوئی نہیں ہوگا۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۸)۔

❺ يُطَاعُ: ”جس کی بات مانی جائے“ یعنی اول تو کفار کے حق میں کوئی شفاعت کی جرأت ہی نہیں کرے گا۔ (دیکھیے انبیاء : ۲۸) اگر لاعلمی یا کسی شبہ کی وجہ سے سفارش کی اجازت سمجھ کر کوئی نبی یا ولی کسی کافر کے حق میں سفارش کر بھی دے گا تو اس کی سفارش نہیں مانی جائے گی۔ ہاں، سفارش قبول نہ ہونے کی وجہ بتا دی جائے گی، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے والد کے حق میں سفارش کریں گے، مگر وہ قبول نہیں ہوگی۔ اسی طرح حوضِ کوثر پر آنے والے بعض لوگوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفارش کریں گے مگر آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا نیا کام کیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفارش سے دست بردار ہو جائیں گے۔

**آیت 19** يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ......: ”خَآئِنَةَ“ ”خَانَ يَخُوْنُ“ (ن) سے ”فَاعِلَةٌ“ کے وزن پر مصدر ہے، جیسا کہ ”عَافِيَةٌ“ ہے اور یہ اسم فاعل بھی ہو سکتا ہے۔ اسم فاعل ہونے کی صورت میں دراصل ”اَلْأَعْيُنُ الْخَائِنَةُ“ تھا، پھر صفت کو موصوف کی طرف مضاف کر دیا۔ معنی ”خیانت کرنے والی آنکھیں“ ہوگا۔ مصدر ہونے کی صورت میں معنی واضح ہے اور وہ ہے ”آنکھوں کی خیانت“، یعنی اللہ تعالیٰ کفار کے حق میں سفارش قبول نہیں کرے گا۔ اگر کسی نے کسی شبہ کی بنا پر غلطی سے کر بھی دی تو مانی نہیں جائے گی، کیونکہ سفارش کرنے والے کو اس کے کفر کا پورا اندازہ نہیں ہوگا، جب کہ اللہ تعالیٰ نہ ایسے لوگوں کے حق میں سفارش کی اجازت دے گا نہ سفارش قبول کرے گا، کیونکہ وہ تو آدمی کے ظاہر اعمال ہی نہیں پوشیدہ معاملات کو بھی جانتا ہے، جن میں سے آنکھوں کی خیانت اور دلوں کی چھپائی ہوئی باتیں سب سے زیادہ مخفی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں بھی جانتا ہے، تو وہ کسی کے دل کے کفر و شرک کا علم رکھتے ہوئے اس کے حق میں سفارش کیسے قبول کر سکتا ہے؟ انسان کے ظاہری اعضا کے اعمال میں سب سے پوشیدہ عمل آنکھ کے مختلف اعمال ہیں۔ مثلاً لوگوں سے چوری کسی کو دیکھنا جسے دیکھنا حرام ہے اور آنکھ کے اشارے سے ناجائز تعلق قائم کر لینا وغیرہ اور باطنی اعضا میں سے دل کے وہ اعمال ہیں جن کا آدمی کبھی اظہار نہیں کرتا، بلکہ انھیں چھپا کر رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسے آنکھوں کی خیانت اور دل کے چھپائے ہوئے سب اعمال معلوم ہیں۔ قیامت کے دن ایسی تمام خیانتیں اور دلوں میں چھپائے ہوئے اعمال سب ظاہر کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا:
﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴾ [ الطارق : ۹ ] ”جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔“

وَ اللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝۲۰ ع اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝۲۱ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۲

اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور وہ لوگ جنھیں وہ اس کے سوا پکارتے ہیں کسی بھی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بے شک اللہ ہی تو سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ۲۰ اور کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، وہ تو قوت میں ان سے بہت زیادہ سخت تھے اور زمین میں یادگاروں کے اعتبار سے بھی، پھر اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور انھیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا ۲۱ یہ اس لیے کہ وہ لوگ، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آتے رہے تو انھوں نے انکار کیا تو اللہ نے انھیں پکڑ لیا۔ بے شک وہ بہت قوت والا، بہت سخت سزا دینے والا ہے ۲۲

---

**آیت 20** وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے راز تک سے واقف ہے، اس لیے وہی حق کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہے اور کرے گا۔ اس کے سوا جنھیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ انھیں کسی کے حال کی کچھ خبر ہے، کیونکہ وہ نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ دل کے معاملات تو بہت ہی پوشیدہ ہوتے ہیں، اس لیے حق کے ساتھ فیصلہ تو دور کی بات ہے وہ کسی قسم کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ سمیع بھی ہے بصیر بھی، مخفی سے مخفی معاملات کا علیم و خبیر بھی ہے اور تمام اختیارات کا مالک بھی، اس لیے اس اکیلے کو پکارو اور اسی کی بندگی کرو۔

**آیت 21** ❶ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ...... : گزشتہ آیات میں کفار کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اب دنیا میں آنے والے عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے کہ کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر ان قوموں کا انجام نہیں دیکھا جو ان سے پہلے انبیاء کو جھٹلانے کے جرم میں ہلاک کی گئیں؟

❷ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ ...... : اس کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ روم کی آیت (۹) کی تفسیر۔

❸ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ : "وَاقٍ" اصل میں "وَاقِيٌ" ہے، جو "وَقٰى يَقِيْ وِقَايَةً" (ض) سے اسم فاعل ہے، بچانے والا۔ یعنی ان سے زیادہ قوت و آثار والی اقوام پر ان کے گناہوں کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی تو انھیں اللہ تعالیٰ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ اسی طرح جب ان لوگوں پر اللہ کا عذاب آیا تو انھیں بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔

**آیت 22** ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ ...... : "اَلْبَيِّنَاتُ" کا لفظ عام ہے، اس سے مراد معجزے بھی ہیں، روشن دلیلیں

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا ﴿۲۳﴾ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف تو انھوں نے کہا جادوگر ہے، بہت جھوٹا ہے ﴿۲۴﴾**

بھی اور واضح احکام و ہدایات بھی۔

**آیت 23** ① وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى...... : پچھلی آیات میں پہلے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والی اقوام کے انجام کے ذکر میں جہاں موجودہ جھٹلانے والوں کے لیے عبرت اور ڈرانے کا سامان ہے وہیں رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کے لیے تسلی اور بشارت بھی ہے۔ اب رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان کی مزید تسلی کے لیے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ ذکر فرمایا، جس میں فرعون کا موسیٰ علیہ السلام اور ایمان والوں کو ڈرانا دھمکانا خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام اور اہلِ ایمان کی شجاعت، ثابت قدمی اور پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کی تفصیل بیان فرمائی ہے، ساتھ ہی فرعون اور اس کے ساتھیوں کے عبرتناک انجام کا ذکر فرمایا ہے۔ مقصد رسول اللہ ﷺ کو حوصلہ دلانا ہے کہ آپ ان کفار کے جھٹلانے سے فکر مند نہ ہوں، آخر کار موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ ہی کامیاب ہوں گے، میری مدد آپ کے ساتھ ہے۔

② بِاٰيٰتِنَا: "آیات" سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے نو (۹) معجزے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۰۱)۔

③ وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ: "سُلْطٰنٍ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ وہ ہیبت و رعب ہے جس کی وجہ سے فرعون اپنی فوجوں اور تمام تر قوت کے باوجود موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ نہ اٹھا سکا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ﴾ [ القصص : ۳۵ ] ''اور ہم تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے۔''

**آیت 24** ① اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ: ''فرعون'' اس زمانے میں مصر کے بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا، ہامان اس کا وزیر تھا اور قارون سرمایہ دار منافق تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے ہونے کے باوجود فرعون کا ساتھی بن گیا تھا۔ (دیکھیے قصص: ۷۶ تا ۸۲) موسیٰ علیہ السلام مصر کے تمام قبطیوں کی طرف بھیجے گئے تھے، مگر ان تینوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ اپنی قوم کے سردار اور موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں کرنے میں پیش پیش تھے، باقی لوگ ان کے پیروکار تھے۔

② فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ: موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات عصا اور ید بیضا کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے معجزات کے حق ہونے کے یقین کے باوجود ضد اور عناد کی وجہ سے انھوں نے ان کا صاف انکار کر دیا (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۲۔ نمل: ۱۳، ۱۴) اور اپنی قوم کو دھوکا دینے کے لیے معجزوں کو جادو اور موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر اور کذاب کہہ دیا۔ ورنہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر ہیں نہ جھوٹے، کیونکہ فرعون کے ملک میں جادوگر تو بے شمار تھے مگر کسی جادوگر سے یہ تو نہ ہو سکا کہ وہ اپنے جادو کے زور سے ملک بھر میں قحط مسلط کر دے اور جب اس قحط کو دور کرنے کی درخواست کی جائے تو وہ اپنے جادو

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾

پس جب وہ ہمارے ہاں سے حق لے کر ان کے پاس آیا تو انھوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو، جو اس کے ہمراہ ایمان لائے ہیں، قتل کرو اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو اور نہیں کافروں کی چال مگر سراسر ناکام ﴿۲۵﴾ اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ اپنے رب کو پکار لے، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمھارا دین بدل دے گا، یا یہ کہ اس سرزمین میں فساد پھیلا دے گا ﴿۲۶﴾

کے زور سے بارشیں برسا کر قحط ختم کر دے، بلکہ جادوگروں نے تو بھرے میدان میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر فرعون کی مکارانہ سازشوں کی قلعی کھول دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ذاریات میں جھٹلانے والی تمام اقوام کا یہی رویہ بیان فرمایا ہے: ﴿ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۞ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ [ الذاریات : ۵۲، ۵۳ ] ''اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے، کوئی رسول نہیں آیا مگر انھوں نے کہا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔ کیا انھوں نے ایک دوسرے کو اس (بات) کی وصیت کی ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ (خود ہی) سرکش لوگ ہیں۔''

**آیت 25** ① فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا...... : فرعون موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے پہلے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ (دیکھیے قصص: ۴) موسیٰ علیہ السلام کی آمد پر ان کے واضح معجزات دیکھ کر اور جادوگروں کے ساتھ مقابلے میں ناکام ہو کر وہ ایسا مرعوب ہوا کہ اس نے لڑکوں کو قتل کرنے کا سلسلہ روک دیا، مگر دن بدن ایمان لانے والوں میں اضافے کو دیکھ کر اس کے سرداروں نے اسے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف کارروائی پر بھڑکایا۔ اس سے پہلے وہ تمام بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتے تھے، اب انھوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے بیٹوں کو قتل کرو اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو۔ یہ بات فرعون نے نہیں بلکہ اس کے درباریوں نے کہی، فرعون نے ان سے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا، جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے: ﴿ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ﴾ [ الأعراف : ۱۲۷ ] ''ہم ضرور ان کے بیٹوں کو بری طرح قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔'' مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

② وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ : اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکا اور اپنے منصوبے میں بھی ناکام رہا۔ قحط سالیوں، پیداوار کی کمی اور طوفان، ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کے پے در پے عذابوں نے اسے دم ہی نہیں لینے دیا کہ وہ دوبارہ یہ کام کر سکتا، حتیٰ کہ اسے اس کی قوم سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۰ تا ۱۳۶)۔

**آیت 26** ① وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى : یہ کہہ کر فرعون ظاہر یہ کرنا چاہتا تھا کہ ابھی تک اس نے جو

وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾ ع ۸

اور موسیٰ نے کہا بے شک میں نے اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ لی ہے ہر اس متکبر سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا ﴿۲۷﴾

موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل نہیں کیا تو اپنے درباریوں اور سرداروں کے روکنے کی وجہ سے نہیں کیا۔ یہ بات اس نے محض رعب گانٹھنے کے لیے یا اپنے آپ کو ہمت دلانے کے لیے کہی، کیونکہ اندر سے وہ شدید خوف زدہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے "نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا" (ہم تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے۔ قصص: ۳۵) کے فرمان کے ساتھ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جو غلبہ اور رُعب عطا فرما رکھا تھا، اس کے ہوتے ہوئے اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ انھیں قتل کرے، یا کوئی اور نقصان پہنچائے۔ رہے درباری، تو وہ نہ تو فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے روکتے تھے اور نہ ہی فرعون ان کی رائے کو پرکاہ کی وقعت دیتا تھا۔ (دیکھیے مومن: ۲۹) اس نے اپنی پوری قوم کو اتنا بے وقعت بنا دیا تھا کہ وہ ہر بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، خواہ وہ عقل سے کتنی ہی دور ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ [ الزخرف: ۵٤ ] ''غرض اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔''

② وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ : یہ بھی اس کی گیدڑ بھبکی تھی، ورنہ اسے اور اس کی قوم کو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر یقین ہو چکا تھا کہ وہ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور اللہ تعالیٰ انھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہو چکا ہوتا تو اتنی افواجِ قاہرہ کا مالک ہونے کے باوجود کس نے اس کا ہاتھ موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے روک رکھا تھا۔

③ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ : دین سے مراد ان کا عقیدہ اور اس پر مبنی نظام سلطنت ہے، جس میں فرعون کو رب الاعلیٰ اور اس کے حکم کو واجب الاطاعت مانا جاتا تھا۔ یعنی مجھے خطرہ ہے کہ یہ تمھیں تمھارے اس دین اور اعتقاد کا منکر کر دے جس کے تحت تم مجھے اپنا رب سمجھ کر میری محکومی اور فرماں برداری پر مطمئن ہو اور اس طرح ملک میں انقلاب برپا کر دے، گویا میں اسے تمھاری خاطر ہی قتل کرنا چاہتا ہوں۔

④ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ : یعنی اگر وہ تمام اہلِ مصر کو آبائی دین کا منکر نہ کر سکے تو کم از کم یہ خطرہ تو ضرور ہے کہ ان میں سے بعض لوگوں کو توحید کا قائل کر لے اور بعض میری ربوبیت اور حاکمیت کے قائل رہیں، اس سے آئے دن ملک میں فساد برپا رہے۔ یہ وہی انداز ہے جسے ہر مطلق العنان حاکم اندرونی یا بیرونی خطرے کا ہَوّا کھڑا کر کے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ اس ظالم کو تو دیکھیے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو، جس سے لوگ راہِ راست پر آ رہے ہیں، فساد قرار دے رہا ہے، حالانکہ اصل فسادی وہ خود ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے: ﴿ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [ البقرۃ: ۱۲ ] ''سن لو! یقیناً وہی تو فساد ڈالنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے۔''

آیت 27 ① وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ...... : موسیٰ علیہ السلام کو جب اس بات کا علم ہوا کہ فرعون مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے اس کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ وہ

**وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ٭ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ**

**اور فرعون کی آل میں سے ایک مومن آدمی نے کہا جو اپنا ایمان چھپاتا تھا، کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ**

دشمنوں سے بچنے کے لیے اپنے رب کی پناہ طلب کرتے اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی قوم (کے حملے) کا ڈر ہوتا تو (اللہ تعالیٰ سے) یہ دعا کرتے: «اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ» [أبو داؤد، الوتر، باب ما يقول الرجل إذا خاف قومًا: ۱۵۳۷، و صححه الألباني] ”اے اللہ! ہم تجھے ان کے مقابلے میں کرتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔“ ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں ڈالے جانے کے وقت ”حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ“ کہنا اور اصحاب الاخدود والے لڑکے کا ”اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ بِمَا شِئْتَ“ کہنا بھی دشمنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ [ دیکھیے بخاري: ٤٥٦٤۔ مسلم: ٣٠٠٥ ]

② **عُذْتُ بِرَبِّيْ**: مطلب یہ ہے کہ میں اس ذات عالی کی پناہ لے رہا ہوں جس نے میری پرورش کی، مجھے نبوت کے مقام پر فائز کیا، تمام آفات و مصائب سے بچایا اور اتنی نعمتیں عطا کیں جن کا شمار نہیں۔ اس لیے فرعون اور ہر متکبر و جبار ظالم سے بھی مجھے وہی بچائے گا، سو میں اسی کی پناہ لیتا ہوں۔

③ **وَ رَبِّكُمْ**: اس میں موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو سبق دے رہے ہیں کہ ان کی طرح وہ بھی اپنے رب ہی کی پناہ مانگیں۔

④ **مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ**: صرف فرعون کے شر سے پناہ مانگنے کے بجائے ہر متکبر کے شر سے پناہ مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں وسعت اور جامعیت ہونی چاہیے، جیسا کہ اس دعا میں ہر دشمن سے پناہ کی درخواست آ گئی ہے، خواہ اس کی عداوت ظاہر ہو یا مخفی اور وہ دشمن اکیلا ہو یا جماعت۔

⑤ **لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ**: اس سے معلوم ہوا کہ ظلم اور قتلِ ناحق وہی کرتا ہے جو متکبر ہو (یعنی حق کا انکار کرتا ہو اور لوگوں کو حقیر جانتا ہو) اور حساب کے دن کا یقین نہ رکھتا ہو۔ ورنہ جو حق قبول کرنے والا ہو اور اسے باز پرس کا یقین ہو وہ کیسے ظلم کر سکتا ہے۔

**آیت 28** ① **وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ٭ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ......**: موسیٰ علیہ السلام نے ہر متکبر سے اللہ کی پناہ مانگی جو یوم حساب پر ایمان نہ رکھتا ہو، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے ان کی حمایت میں ایک ایسے آدمی کو کھڑا کر دیا جو فرعون کی آل میں سے تھا، جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا مگر اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے بہت اچھے طریقے سے موسیٰ علیہ السلام کا دفاع کیا اور فرعون کو ان کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ فرعون کے اپنے لوگوں میں سے ہونے کی وجہ سے اس نے بات کی جرأت کی اور اسی وجہ سے فرعون نے اس کی بات کے بعد اپنی قوم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، ورنہ اس کے دربار میں کسی اسرائیلی کی نہ یہ جرأت تھی اور نہ ہی اس کی برداشت تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عجیب تصرف ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا معاملہ اس کے سپرد کیا تو اس نے وہاں سے حمایت کروا دی جہاں سے وہم و گمان تک نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ”**رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ**“ فرمایا ہے، یعنی وہ مردانگی اور ایمان دونوں سے متصف تھا۔ اس کے مرد کامل اور مومن کامل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس نے افضل جہاد

اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ يَّكُ

وہ کہتا ہے ”میرا رب اللہ ہے“ حالانکہ یقیناً وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر ہے اور اگر وہ سچا ہے تو تمھیں اس کا کچھ حصہ پہنچ جائے گا جس کا وہ تم سے

کیا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ أَوْ أَمِيْرٍ جَائِرٍ )) [ أبو داوٗد، الملاحم، باب الأمر والنهي : ۴۳۴۴ ] ”افضل جہاد ظالم بادشاہ یا ظالم امیر کے سامنے عدل کی بات کہنا ہے۔“ بعض کہتے ہیں کہ یہ وہی شخص تھا جس نے اس سے پہلے فرعون کی مجلس میں موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مشورہ کی خبر انھیں پہنچائی تھی، جس پر وہ ہجرت کر کے مدین چلے گئے تھے، مگر اس بات کی تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، البتہ اس میں شک نہیں کہ وہ بھی مرد کامل تھا۔ دیکھیے سورۂ قصص (۲۰)۔

مفسر رازی نے اپنا تجربہ لکھا ہے کہ میں نے اپنی ذات پر گزرنے والے حالات میں تجربہ کیا ہے کہ جب بھی کسی شریر نے میرے متعلق شر کا ارادہ کیا اور میں نے اس سے تعرض نہیں کیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے پر اکتفا کیا، تو اللہ سبحانہ نے ایسے لوگوں کو میرے دفاع کے لیے مقرر فرما دیا جنھیں میں بالکل نہیں جانتا تھا اور جنھوں نے حد سے بڑھ کر اس شر کو دور کرنے کی کوشش کی۔

❷ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ : اس جملے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرعون کی سختیوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہر جگہ پہنچ گئی تھی، حتیٰ کہ فرعون کے خاندان کے کچھ لوگ بھی اس سے متاثر ہو چکے تھے، اگرچہ اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ مردِ مومن بھی اس سے پہلے ایمان چھپاتا تھا، مگر جب بات موسیٰ علیہ السلام کے قتل تک پہنچ گئی تو اس کے ایمان نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔ اس نے بات کا آغاز تو ایک غیر جانبدار آدمی کی طرح کیا، مگر آخر میں اس نے اپنے ایمان کا صاف اظہار کر دیا اور اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اسے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھا ہے۔ اب تک ایمان چھپائے رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اسے مومن فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ مجبوری میں ایمان چھپانے کے باوجود آدمی مومن رہتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نحل (۱۰۶)۔

❸ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ...... : اس جملے میں اس مردِ مومن نے تین حقیقتیں بیان کر دیں، پہلی یہ کہ رب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ کیا تم ایک آدمی کو اس بات پر قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب (میرا پالنے والا مالک) صرف وہ پاک ذات ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی وہ فرعون کو اپنا رب نہیں مانتا، بلکہ اس کو مانتا ہے جس نے فرعون اور اس کے باپ دادا کو اور زمین و آسمان سمیت ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، تو اس پر اسے داد دینی اور اس کی تعظیم و تکریم کرنی چاہیے یا اسے قتل کر دینا چاہیے؟ دوسری حقیقت (وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ) یہ بیان فرمائی کہ وہ تمھارے پاس اپنے اللہ کی طرف سے بھیجے جانے کی واضح دلیلیں لے کر آیا ہے، جنھیں جھٹلانے کا تمھارے پاس کوئی جواز ہی نہیں، پورے ملک کے جادوگر اس کے مقابلے میں ناکام ہو کر اس کے حق پر ہونے کا اعتراف کر چکے ہیں اور اس پر ایمان لا چکے

صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾

وعدہ کر رہا ہے۔ بے شک اللہ اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا، سخت جھوٹا ہو ﴿۲۸﴾

ہیں۔ تیسری حقیقت ( مِنْ رَّبِّكُمْ ) یہ کہ اسے جس مالک کی طرف سے پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہے وہ تمھارا بھی رب ہے، یہ تمھاری جہالت ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کو اپنا رب بنائے بیٹھے ہو۔

④ موسیٰ علیہ السلام کو جس قسم کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور جو جو حالات پیش آئے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی قسم کے حالات پیش آئے۔ ان واقعات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا سامان ہے کہ آپ ہی کو نہیں، پہلے پیغمبروں کو بھی ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

⑤ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”فرعون کے سامنے یہ کہنا ”اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ“ ( کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے ) بہت بڑی بات ہے ( اس سے بڑی دلیری ہو ہی نہیں سکتی )۔“ ہاں، بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے کہا کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ جو ایذا پہنچائی وہ مجھے بتائیں، تو انھوں نے فرمایا: (( بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُصَلِّيْ بِفِنَاءِ الْكَعْبَةِ إِذْ أَقْبَلَ عُقْبَةُ بْنُ أَبِيْ مُعَيْطٍ فَأَخَذَ بِمَنْكِبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَلَوٰى ثَوْبَهُ فِيْ عُنُقِهِ فَخَنَقَهُ خَنْقًا شَدِيْدًا فَأَقْبَلَ أَبُوْ بَكْرٍ فَأَخَذَ بِمَنْكِبِهِ وَ دَفَعَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ قَالَ : ﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، سورة المؤمن : ۴۸۱۵ ] ”ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کندھا پکڑ لیا اور اپنا کپڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے میں ڈال کر اسے بہت سختی کے ساتھ گھونٹ دیا، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور اسے کندھے سے پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور کہا: ﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ ”کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے، حالانکہ یقیناً وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے۔“

اہل علم فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس مرد مومن سے بھی زیادہ شجاع تھے، کیونکہ وہ اپنا ایمان چھپاتا تھا، جبکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کھلم کھلا مومن تھے، جو سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور دفاع میں ان کے لیے اس مرد مومن سے زیادہ خطرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ بات صرف زبان سے نہیں کہی بلکہ عملاً عقبہ کو دھکا دے کر پیچھے بھی ہٹا دیا۔

⑥ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ: وہ مرد مومن موسیٰ علیہ السلام کو کاذب نہیں سمجھتا تھا، یہ بات اس نے ایک غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے ایک مفروضہ کے طور پر کہی کہ اگر یہ جھوٹا ہے تب بھی اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر ہے، تمھارے لیے مناسب یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان سے کہا تھا: ﴿ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴾ [ الدخان : ۲۱ ]

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؗ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝۲۹

اے میری قوم! آج تمھی کو بادشاہی حاصل ہے، اس حال میں کہ (تم) اس سرزمین میں غالب ہو، پھر اللہ کے عذاب سے کون ہماری مدد کرے گا، اگر وہ ہم پر آ گیا؟ فرعون نے کہا میں تو تمھیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود رائے رکھتا ہوں اور میں تمھیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں ۝۲۹

''اور اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ سے الگ رہو۔''

7 وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ ...... : ''اور اگر یہ سچا ہے تو تمھیں اُن میں سے کوئی نہ کوئی چیز پہنچ جائے گی جن کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے۔'' اس مرد مومن نے یہاں ''يَعِدُكُمْ'' کا لفظ استعمال کیا جو وعدے کے لیے استعمال ہوتا ہے، ''يُوْعِدُكُمْ'' استعمال نہیں کیا جو وعید کے لیے ہے۔ کیونکہ وعدے میں دونوں چیزیں آ جاتی ہیں، یعنی اگر وہ سچا ہوا اور تم نے اس کی اطاعت کی تو اس کا وعدہ ہے کہ تمھیں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائیاں حاصل ہوں گی، اس کے مطابق تمھیں ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہو جائے گا، اگر وہ دنیا میں حاصل نہ ہوئیں تو آخرت میں یقیناً حاصل ہو جائیں گی اور اگر تم سچا ہونے کے باوجود اس پر ایمان نہ لائے، یا تم نے اسے قتل کر دیا تو اس نے تمھارے کفر کی صورت میں دنیا کے اندر جن جن عذابوں کا وعدہ کیا ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور تم پر آ جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمد ﷺ کو پہلی امتوں کے مختلف قسم کے عذابوں سے ڈرایا، فرمایا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ﴾ [العنكبوت : ٤٠ ] ''تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا۔'' اور اگر دنیا میں کوئی عذاب نہ آیا تو آخرت کے عذاب سے بچنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں۔

8 اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ : اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے اس عظیم شخص نے دونوں مراد لیے ہوں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو راہِ راست کی ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا سخت جھوٹا ہو، جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) میں حد سے بڑھنے کی کوئی بات نہیں ہے، پھر کذاب تو بہت دور کی بات ہے اس پر جھوٹ کا الزام ایک بار بھی نہیں لگا۔ اس کی واضح دلیلوں اور معجزوں سے اس کا سچا ہونا ثابت ہو رہا ہے، کسی مُسرف و کذاب پر اللہ تعالیٰ کا اتنا فضل و کرم کیسے ہو سکتا ہے اور ایسے شخص کو قتل کرنا کیسے روا ہو سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ یہ دونوں اوصاف بیان کرتے ہوئے درحقیقت وہ فرعون پر طعن کر رہا تھا، جو رب ہونے کا دعویٰ کر کے اپنی حد سے بے حساب تجاوز بھی کر رہا تھا اور زبردست جھوٹ بھی بول رہا تھا، اس کی طرف سے قتل کا ارادہ بھی اس کے مسرف و کذاب ہونے کا نتیجہ تھا کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ صحیح فیصلے کی توفیق نہیں دیتا۔

آیت 29 1 يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ...... : اس مرد مومن نے ''اے میری قوم!'' کہہ کر ان کے ساتھ اپنے اس تعلق کا

وَ قَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝۳۰

**اور اس شخص نے کہا جو ایمان لایا تھا، اے میری قوم! بے شک میں تم پر (گزشتہ) جماعتوں کے دن کی مانند سے ڈرتا ہوں ۝۳۰**

اظہار کیا جو وہ فرعون کے خاندان کا ایک قبطی فرد ہونے کی بنا پر ان سے رکھتا تھا اور "الْيَوْمَ" (آج) کہہ کر اس نے انھیں زمانے کے انقلابات کی طرف توجہ دلائی کہ یہ غلبہ و اقتدار دائمی چیز نہیں، اگر یہ کل یوسف (علیہ السلام) اور ان کے جانشین اسرائیلیوں کے پاس تھا اور آج اس سرزمین مصر میں تمھارے پاس ہے اور تم اسرائیلیوں پر غالب ہو تو اسرائیلیوں کی طرح تم سے بھی چھن سکتا ہے اور کفر و شرک اور ظلم و تعدی کی وجہ سے پہلی اقوام کی طرح تم بھی اللہ کے عذاب کا نشانہ بن سکتے ہو۔ تو اگر وہ آ گیا تو ہمیں اس سے کون بچائے گا؟ "الْاَرْضِ" میں "الف لام" عہد کا ہونے کی وجہ سے ترجمہ "اس سرزمین" کیا گیا ہے، مراد مصر ہے۔

② قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى: بعض مفسرین کا خیال ہے کہ فرعون کو پتا نہیں چل سکا کہ موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے فیصلے کے خلاف رائے دینے والا شخص حقیقت میں ان پر ایمان لا چکا ہے، اس لیے فرعون نے اس کی اس جرأت پر کوئی گرفت نہیں کی۔ مگر زیادہ قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ وہ پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزوں اور ہیبت کی وجہ سے خوف زدہ تھا، جس کی دلیل اس کا یہ کہنا ہے: ﴿ذَرُوْنِيْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى﴾ [المؤمن: ۲۶] "مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں" اب اس نے دیکھا کہ اس کے خاص لوگوں میں بھی موسیٰ علیہ السلام کی حمایت آ گئی ہے تو اسے جرأت ہی نہیں ہوئی کہ اس مردِ مومن کو کچھ کہے اور نہ ہی وہ اس کی کسی دلیل کا جواب دے سکا، بلکہ اس نے جواب سے گریز اختیار کیا اور اپنے سرداروں اور قوم کے لیے اپنے اخلاص کا اظہار کیا کہ میں تمھارے لیے وہی سوچتا ہوں جو اپنے لیے سوچتا ہوں اور تمھارے سامنے وہی رائے پیش کرتا ہوں جو میری بہترین سوچ کا نتیجہ ہے۔ مگر اس مُسرف و کذاب کا یہ کہنا سراسر جھوٹ تھا، کیوں کہ وہ دل سے موسیٰ علیہ السلام کو سچا جان چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جھوٹ متعدد آیات میں بیان فرمایا ہے۔ (دیکھیے نمل: ۱۲ تا ۱۴۔ بنی اسرائیل: ۱۰۲) اس کا مقصد اپنی قوم کو بے وقوف بنانا تھا اور واقعی اس نے انھیں بے وقوف بنا لیا، جیسا کہ سورۂ زخرف میں ہے: ﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾ [الزخرف: ٥٤] "غرض اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔"

اس کے علاوہ اس کا یہ کہنا کہ "میں تمھارے لیے وہی سوچتا ہوں جو اپنے لیے سوچتا ہوں" اس لیے بھی صاف جھوٹ تھا کہ اپنے لیے تو وہ رب الاعلیٰ سے نیچے کسی مقام پر قناعت کے لیے تیار نہ تھا، مگر قوم کے لیے اس کے پاس انھیں اپنا غلام بنا کر رکھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ آج کے حکمرانوں کے قول و عمل کا بھی یہی حال ہے۔

③ وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ: اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں واضح فرمایا کہ اس کا یہ کہنا بھی غلط تھا کہ "میں تمھیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں۔" دیکھیے سورۂ ہود (۹۷) اور سورۂ طٰہٰ (۷۹)۔

آیت 30 وَ قَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ ...... : "يَوْمِ" سے مراد کوئی نادر واقعہ ہوتا ہے جو کسی قوم کو کسی ہولناک عذاب

مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾
وَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿ۙ۳۲﴾

نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں کے حال کی مانند سے جو ان کے بعد تھے اور اللہ اپنے بندوں پر کسی طرح کے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا ﴿۳۱﴾ اور اے میری قوم! یقیناً میں تم پر ایک دوسرے کو پکارنے کے دن سے ڈرتا ہوں ﴿۳۲﴾

یا اعلیٰ درجے کی نعمت کی صورت میں پیش آیا ہو، مثلاً یوم بدر مسلمانوں کے لیے نعمت اور کفار کے لیے عذاب تھا۔ ''اَلْاَحْزَابِ'' ''حِزْبٌ'' کی جمع ہے، وہ جماعتیں جو کسی کی مخالفت میں اکٹھی ہوئی ہوں۔ مردِ مومن نے جب فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی رائے پر اصرار اور تمام سرداروں کا خاموش رہ کر اس کی تائید کرنا دیکھا تو اس نے مصلحت کا لبادہ اتار کر صریح الفاظ میں ان سے کہا، اے میری قوم! اگر تم نے اللہ کے رسول کو قتل کرنے یا کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ ترک نہ کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر ان جماعتوں پر آنے والے عذابوں جیسا عذاب آ جائے گا جو اپنے انبیاء کے خلاف اکٹھی ہوئیں اور انھیں جھٹلا دیا، پھر تمھاری یہ شان و شوکت اور لاؤ لشکر تمھارے کسی کام نہ آ سکیں گے۔

**آیت 31** : ❶ **مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ** ...... : ''دَأَبَ يَدْأَبُ دَأْبًا'' (ف) کسی کام میں مسلسل لگے رہنا۔ ''دَاْبِ'' اصل میں عادت کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں ہمیشگی ہوتی ہے، پھر کسی کے حال یا معاملے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یعنی میں تمھارے بارے میں ڈرتا ہوں کہ تمھارا حال قومِ نوح، عاد و ثمود اور ان لوگوں جیسا نہ ہو جو ان کے بعد تھے، مثلاً قومِ لوط اور قومِ شعیب وغیرہ، جنھوں نے اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا اور انھیں ایذا پہنچانے کی کوشش کی تو ان پر اللہ تعالیٰ کا ایسا عذاب آیا جس نے انھیں بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔

❷ **وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ** : ''ظُلْمًا'' کی تنوین تنکیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''کسی طرح کا ظلم'' کیا گیا ہے۔ یعنی ان اقوام پر جو عذاب آیا وہ ان کے اپنے اعمالِ بد کا نتیجہ تھا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کسی طرح کے ظلم کا ارادہ تک نہیں کرتا تو وہ ظلم کیوں کرے گا، پھر ظلم بھی اپنے بندوں پر؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ [ یونس : ۴۴ ] ''بے شک اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا اور لیکن لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔''

**آیت 32** : ❶ **وَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ** : ''التَّنَادِ'' ''نِدَاءٌ'' سے باب تفاعل ہے، ایک دوسرے کو آواز دینا۔ دنیوی عذاب سے ڈرانے کے بعد اس نے آخرت کے عذاب سے ڈرایا۔ ''يَوْمَ التَّنَادِ'' (ایک دوسرے کو پکارنے کے دن) سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو محبت سے آواز دیں گے اور مشرکین کو اپنے شرکاء پیش کرنے کے لیے آواز دیں گے۔ اس دن اس کے فرشتے نیک و بد کو ان کی حیثیت کے مطابق آواز دیں گے۔ جنتی ایک دوسرے کو آوازیں دیں گے، اسی طرح جہنمی ایک دوسرے کو آواز دیں گے۔ اہلِ جنت جہنمیوں کو اور وہ جنتیوں کو

يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

جس دن تم پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگو گے، تمھارے لیے اللہ سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ﴿۳۳﴾

آواز دیں گے۔ حق لینے والے حق دینے والوں کو اور مظلوم ظالموں کو آوازیں دے رہے ہوں گے۔ جہنمی آگ کے خازن کو پکاریں گے، پھر رب تعالیٰ کو آواز دیں گے۔ جنت و جہنم بھی آواز دے رہی ہوں گی۔ موت کو ذبح کر دیا جائے گا اور جنتیوں اور جہنمیوں کو آواز دی جائے گی کہ اب ہمیشگی ہے، موت نہیں۔ غرض، اس دن ایک دوسرے کو پکارنے کا عجیب عالم ہوگا۔ یہاں قرآن مجید سے اس "يَوْمَ التَّنَادِ" کے بارے میں چند مقامات درج کیے جاتے ہیں، احباب تھوڑی سی محنت فرما کر تفصیل ملاحظہ فرما لیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۴۳ تا ۵۰)، زخرف (۷۷)، حدید (۱۳)، قصص (۶۲، ۶۵، ۷۴)، کہف (۵۲)، مومن (۱۰)، حم سجدہ (۴۴)، ق (۴۱)، بنی اسرائیل (۵۲، ۷۱)، یٰس (۵۲، ۶۰)، حاقہ (۱۹ تا ۳۲)، عبس (۳۴ تا ۳۷) اور سورۂ معارج (۱۷)۔

❷ بعض مفسرین نے فرمایا کہ "مِثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ" سے جو مراد ہے وہی "يَوْمَ التَّنَادِ" سے مراد ہے، یعنی "يَوْمَ التَّنَادِ" سے بھی وہی دنیا میں آنے والا عذاب مراد ہے کہ جب وہ دن آئے گا تو تم ایک دوسرے کو مدد کے لیے آواز دو گے، مگر کوئی مدد کو نہیں آئے گا اور تم عذاب سے بچنے کے لیے بھاگو گے، مگر تمھیں اللہ تعالیٰ سے کوئی نہیں بچائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ﴾ [ الأنبیاء : ۱۲، ۱۳ ] "تو جب انھوں نے ہمارا عذاب محسوس کیا اچانک وہ ان (بستیوں) سے بھاگ رہے تھے۔ بھاگو نہیں اور ان (جگہوں) کی طرف واپس آؤ جن میں تمھیں خوش حالی دی گئی تھی اور اپنے گھروں کی طرف، تاکہ تم سے پوچھا جائے۔" اگرچہ اکثر مفسرین نے "يَوْمَ التَّنَادِ" سے مراد قیامت کا دن لیا ہے، مگر آیات کے سیاق کے لحاظ سے اس تفسیر کی بھی گنجائش ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: "(يَوْمَ التَّنَادِ) ہانک پکار کا دن ان پر آیا جس دن غرق ہوئے قلزم میں، ایک دوسرے کو پکارنے لگے ڈوبتے میں۔"

**آیت 33** ❶ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ: اس میں "يَوْمَ التَّنَادِ" کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں تم اللہ کے عذاب سے پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگو گے۔

❷ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ: مگر تمھیں اللہ سے، یعنی اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمُسْتَقَرُّ﴾ [ القیامۃ : ۱۰ تا ۱۲ ] "انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے۔"

❸ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ: یعنی میں نے تمھیں نصیحت کر دی، مگر تمھاری ضد اور عناد کی وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۚۖ ﴿۳۴﴾

اور بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے تمھارے پاس یوسف واضح دلیلیں لے کر آیا تو تم اس کے بارے میں شک ہی میں رہے، جو وہ تمھارے پاس لے کر آیا، یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گیا تو تم نے کہا اس کے بعد اللہ کبھی کوئی رسول نہ بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ ہر اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا ہو ﴿۳۴﴾

نے تمھیں گمراہی میں ہی پڑا رہنے کا ارادہ کر لیا ہے تو جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶، ۲۷)۔

**آیت 34** ① وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ : ''تمھارے پاس'' سے مراد تمھارے آبا و اجداد کے پاس ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بنی اسرائیل کو فرمایا: ﴿ وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ﴾ [ البقرة : ٤٩ ] ''اور جب ہم نے تمھیں فرعون کی قوم سے نجات دی۔'' ظاہر ہے اس سے مراد ان کے آبا و اجداد کو نجات دینا ہے۔ مرد مومن نے قبطیوں کو نصیحت کرتے ہوئے ان کے آبا و اجداد کے زمانے کا حال یاد دلایا کہ موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے تمھارے پاس یوسف (علیہ السلام) آئے، اس وقت بھی تمھارا حال یہی تھا۔

② بِالْبَيِّنٰتِ : اپنی رسالت کی واضح دلیلوں کے ساتھ۔ ''واضح دلیلوں'' میں یوسف علیہ السلام کا صدق و ایفائے عہد، ان کی امانت اور کمال درجے کی پاک دامنی، مصر کی عورتوں کی طرف سے ان کی عفت کی شہادت، قید میں ان کا صبر، قید کے ساتھیوں اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر، سات سالہ خوفناک قحط کی یقینی اطلاع، اس کے لیے پہلے سات سالوں میں غلے کو محفوظ رکھنے اور بعد کے سات سالوں میں ان کی نہایت درست طریقے سے عادلانہ تقسیم کی تدبیر، بے مثال عدل و انصاف، موقع ملنے پر قید کے ساتھیوں کو ناقابل تردید دلائل کے ساتھ توحید کی دعوت، یعنی: ﴿ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ يوسف : ٣٩، ٤٠ ] ''کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، نہایت زبردست ہے؟ تم اس کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند ناموں کی، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے بارے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' اور تہمت کی صفائی تک قید سے نہ نکلنا اور دیگر بہت سی چیزیں شامل ہیں جن سے ان کا اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ رسول ہونا ثابت ہوتا ہے۔

③ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ : یعنی اس سے پہلے یوسف علیہ السلام جب مصر میں آئے تو غلام تھے، جنھیں عزیز مصر نے بیٹا بنا لیا، پھر بہت سی آزمائشوں اور امتحانوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں حکومت کے ساتھ رسالت سے بھی سرفراز فرمایا، انھیں

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

**وہ لوگ جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں، بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، بڑی ناراضی کی بات ہے اللہ کے نزدیک اور ان کے نزدیک جو ایمان لائے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر، سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے ﴿۳۵﴾**

نبوت و رسالت کے ثبوت کے لیے کئی دلائل اور معجزے عطا فرمائے۔ تم ان پر ایمان لائے، مگر شک کے ساتھ۔ تمھارا ان پر ایمان ایسا ہی تھا جیسا کسی فقیر کا دولت مند پر یا کمزور کا طاقتور پر ہوتا ہے۔ اس میں یقین کی قوت نہ تھی، بلکہ تمھیں ان کی رسالت میں شک ہی رہا۔

④ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا : ان کی زندگی میں تمھیں ان کی لائی ہوئی شریعت پر شک رہا، مگر جب وہ فوت ہوئے تو تم ان کی تعریف میں اس حد تک بڑھ گئے کہ تم نے کہا، اب ان کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی رسول نہیں بھیجے گا، اب اس شان کا رسول کہاں آئے گا؟ یہ کہہ کر بعد میں رسولوں کے آنے ہی کا انکار کر دیا۔ یا ان کی بے قدری کی وہ انتہا کہ ان کی نبوت پر مسلسل شک کرتے رہے، یا ان کی تعریف کی یہ انتہا کہ ان کے بعد کسی کو رسول ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اس سے پہلے تم نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ معاملہ کیا، دیکھنا! اب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی یہ معاملہ نہ کرنا کہ جیتے جی ان پر ایمان نہ لاؤ اور مرنے کے بعد انھیں ان کی حد سے بڑھا دو۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زندگی میں قائل نہ ہوئے، بعد ان کی موت کے جب سلطنت کا بندوبست بگڑ گیا تو کہنے لگے، یوسف کا قدم اس شہر پر کیا مبارک تھا، ایسا نبی کوئی نہ ہوگا۔ یا وہ انکار یا یہ اقرار، یہی یاوہ گوئی ہے۔'' مرد مومن کا مطلب یہ تھا کہ نعمت کی قدر زوال کے بعد ہوتی ہے، فی الحال تمھیں موسیٰ (علیہ السلام) کی قدر نہیں۔

⑤ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ : "مُرْتَابٌ'' "رَيْبٌ" سے "اِرْتَابَ يَرْتَابُ اِرْتِيَابًا" (افتعال) کا اسم فاعل ہے، شک کرنے والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ گمراہی میں انھی لوگوں کو مبتلا کرتا ہے جن میں تین صفات پائی جاتی ہیں، ایک "مُسْرِفٌ" یعنی جو اپنی بداعمالی، اللہ کی نافرمانی اور کبر و غرور میں حد سے بڑھنے والے ہوں۔ دوسرے "مُرْتَابٌ" یعنی اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کی کہی ہوئی باتوں میں شک کرنے والے ہوں۔

آیت 35 ① الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ...... : یہ ان لوگوں کی تیسری صفت ہے جنھیں اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا، بلکہ انھیں ضلالت میں مبتلا کر دیتا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی واضح اور روشن آیات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور انھیں سعادت مندی کے ساتھ تسلیم کرنے کے بجائے انھیں ٹھکرانے کے لیے صحیح عقل یا نقل سے آنے والی کسی دلیل کے بغیر جھگڑتے اور کج بحثی کرتے ہیں۔ فرمایا، ان کا کل سرمایہ شور و غوغا، استہزا اور ہٹ دھرمی ہوتا ہے۔ یہ تین عیوب جن لوگوں میں پیدا ہو جاتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ بھی گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

# وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾

اور فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں پر پہنچ جاؤں ﴿۳۶﴾

② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: "كَبُرَ" کا فاعل وہ جدال ہے جو "يُجَادِلُوْنَ" کے ضمن میں بطور مصدر موجود ہے، "مَقْتًا" تمیز ہے۔ یعنی بلا دلیل جھگڑا اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اور ایمان والوں کے ہاں بھی سخت ناپسندیدگی، نفرت اور ناراض ہونے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔

③ بلا دلیل جھگڑا اللہ تعالیٰ اور مومنوں کے نزدیک سخت ناپسندیدہ بتلانے میں اہلِ ایمان کو تلقین ہے کہ ایسے جھگڑے سے اجتناب کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [ القصص : ٥٥ ] ''اور جب وہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کرتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ [ الفرقان : ٦٣ ] ''اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ [ الفرقان : ٧٢ ] ''اور جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو باعزت گزر جاتے ہیں۔'' ناحق جھگڑے سے اپنی شدید نفرت کے ذکر کے ساتھ ایمان والوں کی شدید نفرت کا تذکرہ بھی فرمایا، اس سے ایمان والوں کی شان کی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

④ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ: معلوم ہوتا ہے کہ " كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ" سے یہاں تک چند فقرے آلِ فرعون کے کلام کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمائے گئے ہیں اور ان میں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے کے متکبر و جبار کفار کے کفر پر اصرار کا باعث بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ جن لوگوں کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں ان میں سے بھی کوئی شخص جب تکبر اور سرکشی میں حد سے گزر جاتا ہے اور کوئی صحیح بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اس کے دل پر اسی طرح مہر لگا دی جاتی ہے جس طرح آلِ فرعون کے دل پر مہر لگا دی گئی، پھر اس کا کام اسراف (زیادتی)، ارتیاب (شک) اور جدال بالباطل (ناحق جھگڑا) ہی رہ جاتا ہے، کوئی صحیح بات یا نصیحت اس پر اثر نہیں کرتی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اسے ہدایت کی توفیق دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ [ الصف : ٥ ] ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ١١٠ ] ''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے اور انھیں چھوڑ دیں گے، اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں گے۔''

**آیت 36** وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا......: "صَرْحًا" بلند و بالا عمارت جو دور سے صاف نظر آئے۔ ''صراحت'' کسی بات کے خوب ظاہر اور واضح ہونے کو کہتے ہیں۔ "الْاَسْبَابَ" "سَبَبٌ" کی جمع ہے، کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ، مراد راستے اور دروازے ہیں۔ فرعون نے جب دیکھا کہ اس کے پاس اس مردِ مومن کی کسی بات کا جواب نہیں تو اس نے اس کی نصیحت کا اثر ختم کرنے اور مذاق اڑانے کے لیے اپنے وزیر ہامان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے ایک بلند و بالا

اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾ ع

آسمانوں کے راستوں پر، پس موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں اور بے شک میں اسے یقیناً جھوٹا گمان کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل خوش نما بنا دیا گیا اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا اور فرعون کی تدبیر تباہی ہی میں تھی ﴿۳۷﴾

عمارت بناؤ، تاکہ میں راستوں تک پہنچ جاؤں۔

آیت 37 ① اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى: فرعون نے پہلے صرف یہ کہا: ''تاکہ میں اسباب تک پہنچ سکوں'' مقصد تجسس پیدا کرنا تھا کہ وہ کس چیز کے اسباب تک پہنچنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے دوبارہ وضاحت کی، تاکہ میں آسمانوں کے راستوں اور دروازوں تک پہنچ جاؤں، جہاں سے آسمانوں تک رسائی ہوتی ہے، پھر موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں، جو اس کے کہنے کے مطابق آسمانوں کے اوپر ہے۔

② وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا: "اِنَّ" اور ''لام'' کے ساتھ تاکید کی وجہ سے یہاں ظن ( گمان ) یقین کے معنی میں ہے، یعنی موسیٰ جو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، یا یہ کہ اس کا رب آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے، تو مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر عرش پر ہے، اس پر تمام انبیاء و رسل، صحابہ و تابعین اور ائمۂ دین کا اتفاق ہے۔ افسوس! اس مقام پر کئی مفسرین نے، جو یونان کے مشرک فلسفیوں سے متاثر ہیں، اللہ تعالیٰ کے آسمان پر یا بلندی کی طرف یا عرش پر ہونے کا انکار کیا ہے، بلکہ بعض نے تو اتنی جرأت کی ہے کہ اسے فرعون کا عقیدہ قرار دیا ہے، حالانکہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ ہے جس کا فرعون انکار کر رہا ہے اور اس میں موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا کہہ رہا ہے، اس کے علاوہ قرآن مجید کی "ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" والی تمام آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں۔ اسی طرح وہ آیات بھی جن میں اللہ تعالیٰ کے آسمانوں کے اوپر ہونے کا ذکر ہے۔ دیکھیے سورۂ ملک (۱۶، ۱۷)، حاقہ (۱۷) اور طٰہٰ (۵) کی تفسیر۔

③ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ ...... : یعنی اس طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل، یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار، اپنے رب الاعلیٰ ہونے پر اصرار، موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور بنی اسرائیل پر ظلم و ستم خوش نما بنا دیا گیا اور وہ ان کاموں کو اچھا سمجھ کر ان پر چلتا رہا۔ خوش نما بنانے والا کون تھا؟ تو یہ اس کی خواہش نفس، شیطان، برے ساتھی (دیکھیے انعام: ۱۲۲، ۱۳۷۔ انفال: ۴۸) اور خود اللہ تعالیٰ تھا، کیونکہ ہر چیز کا خالق وہی ہے۔ (دیکھیے انعام: ۱۰۸۔ نمل: ۴) اور جو مخالفت پر کمر باندھ لے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۵)۔

④ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ: "تَبَابٍ" "تَبَّ يَتُبُّ" (ن) کا مصدر ہے، ہلاکت، تباہی اور خسارہ۔ یہ لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یعنی اس نے جتنی چالیں چلیں سب اس کی تباہی کا سبب بنتی چلی گئیں، بالآخر وہ اپنے لشکروں

وَ قَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوۡنِ اَهۡدِكُمۡ سَبِیۡلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ یٰقَوۡمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الۡاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الۡقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنۡ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَهَا ۚ وَ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ یُرۡزَقُوۡنَ فِیۡهَا بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾

اور اس شخص نے کہا جو ایمان لایا تھا، اے میری قوم! میرے پیچھے چلو، میں تمھیں بھلائی کا راستہ بتاؤں گا ﴿۳۸﴾ اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی تو معمولی فائدے کے سوا کچھ نہیں اور یقیناً آخرت، وہی رہنے کا گھر ہے ﴿۳۹﴾ جس نے کوئی برائی کی تو اسے ویسا ہی بدلا دیا جائے گا اور جس نے کوئی نیک عمل کیا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہوا تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اس میں بے حساب رزق دیے جائیں گے ﴿۴۰﴾

سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ یہی حال ہر جھوٹے اور مکار آدمی کا ہوتا ہے۔

⑤ فرعون نے وہ محل بنایا یا نہیں، اس کی وضاحت اور ان دونوں آیتوں کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۳۸ تا ۴۰)۔

**آیت 38** وَ قَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوۡنِ...... : مردِ مومن نے فرعون کے استہزا سے صرفِ نظر کرتے ہوئے قوم کو نصیحت جاری رکھی اور کہا کہ اے میری قوم! "سَبِیۡلَ الرَّشَادِ" (بھلائی کا راستہ) وہ نہیں جو فرعون بتلاتا ہے، بلکہ تم میری بات مانو، میں تمھیں بھلائی کا راستہ بتاتا ہوں۔

**آیت 39** یٰقَوۡمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا مَتَاعٌ...... : مردِ مومن نے اپنی بات کی دلیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں تمھیں جو راستہ بتاتا ہوں حقیقت میں صحیح راستہ وہی ہے، کیونکہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کا مطمحِ نظر اور ساری تگ و دو صرف دنیا کے لیے ہے، انھوں نے آخرت کی زندگی سے بالکل آنکھیں بند کر رکھی ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی معمولی سا فائدہ ہے، (مَتَاعٌ کی تنوین تحقیر کے لیے ہے) جو بہت تھوڑی مدت کے لیے ہے۔ عیش و آرام سے گزرے تو حاصل کچھ نہیں، کیونکہ ناپائیدار ہے اور تنگی ترشی سے گزرے تب بھی گزر ہی جائے گی۔ فکر تو آخرت کی زندگی کی کرنی چاہیے جو دائمی اور لازوال ہے، جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ وہاں دنیا کا یہ حقیر سامان کسی کام نہیں آئے گا، بلکہ صالح اعمال کام آئیں گے۔

**آیت 40** مَنۡ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَهَا...... : یہ دنیا دار الامتحان ہے، اس کے باوجود رحمان و رحیم رب تعالیٰ نے اتنی زبردست رعایت رکھی ہے کہ جو شخص کوئی برائی کرے، اسے صرف اس ایک برائی ہی کا بدلا دیا جائے گا، مگر جو شخص ایمان لا کر کوئی صالح عمل کرے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اس میں انھیں بے حساب رزق دیا جائے گا، انھیں نیکیوں کی جزا بھی دس گنا سے سات سو گنا بلکہ حساب و شمار سے بھی زیادہ دی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ برائی کی جزا اتنی ہی دی جائے گی جتنی کسی نے برائی کی ہے اور یہ کہ کافر کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا، کیونکہ اگر اس نے اپنے خیال میں کوئی

وَ يٰقَوْمِ مَا لِيْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَى النَّارِ ۝۴۱ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۫ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝۴۲

**اور اے میری قوم! مجھے کیا ہے کہ میں تمھیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو ۝۴۱ تم مجھے بلاتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤں جس کا مجھے کچھ علم نہیں اور میں تمھیں سب پر غالب، بے حد بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں ۝۴۲**

---

نیکی کی بھی ہے تو اس کا اعتبار ایمان کے بغیر نہیں کیا جائے گا۔ عمل صالح کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے اور عمل صالح وہ ہے جس میں نیت درست ہو، یعنی وہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور طریقہ درست ہو، یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیا جائے۔ دیکھیے سورۂ کہف کی آخری آیت کی تفسیر۔

**آیت 41** ❶ **وَ يٰقَوْمِ** : یہاں زمخشری نے ایک سوال اور اس کا جواب ذکر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نے بار بار "**يٰقَوْمِ**" کیوں کہا اور کیا وجہ ہے کہ اس نے تیسری دفعہ "واؤ" کے اضافے کے ساتھ "**وَ يٰقَوْمِ**" کہا، جب کہ دوسری دفعہ "واؤ" کے بغیر "**يٰقَوْمِ**" کہا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بار بار "**يٰقَوْمِ**" کہنے کا مقصد ایک تو انھیں خبردار اور خواب غفلت سے بیدار کرنا ہے، دوسرا اس بات کا اظہار ہے کہ تم میری قوم اور میرا خاندان ہو، اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ میں تمھاری خیر خواہی کروں۔ چنانچہ وہ ان سے نہایت نرمی اور محبت کے ساتھ بات کرتا ہے، ان کے بارے میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے، تاکہ وہ اس کی نیت پر شک نہ کریں، کیونکہ ان کی خوشی اس کی خوشی اور ان کا غم اس کا غم ہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو نصیحت کرتے ہوئے ہر جملے کی ابتدا "**يٰۤاَبَتِ**" (اے میرے باپ!) سے کی۔ (دیکھیے مریم: ۴۱ تا ۴۵) اور تیسری دفعہ "واؤ" لانے اور دوسری دفعہ "واؤ" نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دوسری دفعہ "**يٰقَوْمِ**" والے جملے کے ساتھ اس سے پہلے جملے ہی کی وضاحت کی ہے، جب کہ تیسری دفعہ اس نے ایک نئی بات کی ہے۔

❷ **مَا لِيْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ** ...... : قوم سے یہ سوال اظہار تعجب کے لیے ہے، یعنی یہ تمھاری کس قسم کی قوم پروری اور حق شناسی ہے کہ میں تو تمھیں اللہ کی توحید اور اس کے رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں، جس کا نتیجہ آگ سے نجات ہے اور تم مجھے اللہ کے ساتھ شرک اور رسول کی تکذیب پر قائم رہنے کے لیے اصرار کرتے ہوئے آگ کی دعوت دے رہے ہو۔

❸ قرآن مجید کے رسم الخط میں "نَجَاةٌ" کے الف کو واؤ کی شکل میں "**النَّجٰوةِ**" لکھا گیا ہے، اس کی وجہ اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ الف واؤ سے بدلا ہوا ہے، جیسا کہ "صَلَاةٌ" اور "زَكَاةٌ" کو "صَلٰوةٌ" اور "زَكٰوةٌ" لکھا جاتا ہے۔

**آیت 42** ❶ **تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ** ...... : یعنی میں تو اللہ پر ایمان لے آیا ہوں اور مجھے یقینی علم حاصل ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اور تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک مانوں جن کا مجھے علم ہی نہیں۔ علم نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کہیں ہیں ہی نہیں تو میں ایسوں کو آنکھیں بند کر کے کیسے مان لوں۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَا فِي الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾

کوئی شک نہیں کہ تم مجھے جس کی طرف بلاتے ہو اس کے لیے کسی طرح پکارنا نہ دنیا میں (درست) ہے اور نہ آخرت میں اور یہ کہ ہمارا لوٹنا اللہ کی طرف ہے اور یہ کہ حد سے بڑھنے والے، وہی آگ میں رہنے والے ہیں ﴿۴۳﴾ پس عنقریب تم یاد کرو گے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، بے شک اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۴۴﴾

② وَ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ : اور میں تمھیں اس ذاتِ عالی کی طرف دعوت دیتا ہوں جو سب پر غالب ہے، کوئی اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔ اس کے باوجود وہ ظالم و جابر نہیں، بلکہ اپنے فرماں بردار بندوں کے گناہوں پر بہت پردہ ڈالنے والا اور انھیں بخش دینے والا ہے، اس لیے عبادت کا حق دار وہی ہے۔

آیت 43 ① لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ : یہاں "اَنَّمَا" کلمۂ حصر نہیں، جو اکٹھا لکھا جاتا ہے، بلکہ "اَنَّ" الگ ہے اور "مَا" موصولہ الگ ہے، معنی "وہ جو۔" قرآن مجید کے اولین کاتبوں نے اسے یہاں اکٹھا لکھا، اس لیے اسے اکٹھا لکھا جاتا ہے۔

② "لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ" (اس کے لیے کوئی دعوت نہیں) کے کئی معانی ہو سکتے ہیں اور سب درست ہیں۔ ایک یہ کہ نہ دنیا میں اس کا حق ہے کہ اسے پکارا جائے نہ آخرت میں۔ دوسرا یہ کہ نہ دنیا میں اسے پکارنے کا کوئی فائدہ ہے نہ آخرت میں۔ تیسرا یہ کہ نہ وہ دنیا میں کسی کی دعا قبول کر سکتا ہے نہ آخرت میں۔ گویا یہ وہی بات ہے جو سورۂ احقاف میں فرمائی ہے: ﴿ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ۵] "اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انھیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔" مزید دیکھیے سورۂ فاطر (۱۴)۔

③ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ : یعنی آخر کار ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس واپس جانا ہے جو ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا یا سزا دے گا۔

④ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ : یہاں "الْمُسْرِفِيْنَ" (حد سے بڑھنے والوں) سے مراد کافر و مشرک ہیں، کیونکہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے وہی ہیں، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ۴۸، ۱۱۶] "بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔"

آیت 44 ① فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ : معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد مومن اس تقریر کے دوران فرعون کی گفتگو سن کر اور

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۟ۚ﴿۴۵﴾

تو اللہ نے اسے ان کے برے نتائج سے بچالیا جو انھوں نے تدبیریں کیں اور آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا﴿۴۵﴾

قوم کا رویہ دیکھ کر ان کے ایمان لانے اور موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قتل کا فیصلہ بدلنے سے مایوس ہو گیا تھا اور اپنے متعلق بھی اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے اس نے آخری فقرہ اس شخص کے لہجے میں کہا جو اللہ کی راہ میں جان دینے کے لیے تیار کھڑا ہو اور جسے اللہ کی مدد پر پورا یقین ہو۔

② وَ اُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ : یہی وہ بات ہے جو اللہ کے خاص بندے اس وقت بھی کہتے ہیں جب تمام ظاہری اسباب ختم ہو جائیں، اس وقت بھی ان کا اللہ تعالیٰ پر بھروسا پوری طرح قائم رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کے اعتماد کو کبھی نہیں توڑتا، بلکہ جس طرح چاہتا ہے انھیں بچالیتا ہے۔ اللہ کے ان بندوں کے الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں مگر مفہوم ایک ہی ہوتا ہے کہ ہم نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں گرائے جانے کے وقت ”حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ“ کہا۔ [ بخاري، التفسير، باب قوله تعالٰی : ﴿ الذين استجابوا لله...... ﴾ : ٤٥٦٤ ] جنگ اُحد کے بعد زخم خوردہ ہونے کے باوجود دشمنوں کی آمد کی خبر سن کر ایمان والوں نے یہ بات ان الفاظ میں کہی: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ [آل عمران : ۱۷۳ ] ”ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔“ اور اصحاب الاخدود والے لڑکے نے یہی بات ان الفاظ میں کہی تھی: ((اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ بِمَا شِئْتَ)) [ مسلم، الزهد، باب قصة أصحاب الأخدود...... : ۳۰۰۵ ] ”اے اللہ! مجھے ان سے کافی ہو جا جس طرح تو چاہے۔“ اور آلِ فرعون کے مومن نے کہا: ﴿ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ ”میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔“

③ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ : یعنی وہ تمھارے کفر و شرک اور ظلم و ستم پر اصرار کو اور میری بے چارگی اور اس کی خاطر استقامت کو خوب دیکھ رہا ہے، وہ خود ہی فیصلہ فرما دے گا۔

آیت 45 ① فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا : فرعون اس مردِ مومن کی واشگاف الفاظ میں نصیحت پر جتنا بھی غضب ناک ہوا ہو اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی وجہ سے علی الاعلان اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکا، بلکہ اس نے اور اس کے دربار والوں نے اس کے خلاف کارروائی کے لیے کئی خفیہ منصوبے طے کیے، مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے برے نتائج سے بھی بچالیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ نہیں بتایا کہ کس طرح بچایا۔ بعض مفسرین نے بیان کیا کہ وہ ان سے بچ کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ بعض نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد جلد ہی موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو وہ بھی ان کے ساتھ سمندر پار ہو گیا۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس طرح بچایا۔ شاید اللہ تعالیٰ کے یہ بات نہ بتانے میں یہ حکمت ہو کہ تم اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو، پھر یہ اس کا کام ہے کہ وہ تمھیں کس طرح بچاتا ہے۔ اس کے بچانے کے طریقے تمھاری سوچ سے بہت بلند ہیں۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ

جو آگ ہے، وہ اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہو گی، آلِ فرعون کو

② وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ : وہ مردمومن تو آلِ فرعون کی سازشوں کے برے نتائج سے بچ کر دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو گیا، مگر آلِ فرعون کو دنیا اور آخرت کے دوہرے عذاب نے گھیر لیا۔ دنیا میں وہ سمندر میں غرق ہوئے۔

آیت 46 ① اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا : سمندر میں غرق کیے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں گھیرنے والے دو بدترین عذابوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک قیامت تک ہونے والا عذاب، عذابِ قبر یا عذابِ برزخ ہے، جو موت اور آخرت کے درمیانے وقفے میں انھیں آگ کی صورت میں ہو رہا ہے، جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔ خواہ ان کے جسم سمندری جانوروں کی خوراک بنے ہوں یا کسی عجائب گھر میں محفوظ ہوں، یا خاک میں مل گئے ہوں، ان کا ہر ذرہ جہاں بھی ہے وہی اس کی قبر ہے اور قیامت تک اسے یہ عذاب ہو گا۔ صبح و شام سے مراد ہر وقت ہے اور یہ محاورہ عربی ہی نہیں ہر زبان میں بولا جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۶۲)۔

② وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ : یہ دوسرا عذاب ہے جو قیامت کے دن شروع ہو گا۔ یہ آیت عذابِ قبر کی واضح دلیل ہے۔ بعض لوگوں نے واضح آیات و احادیث کے باوجود عذابِ قبر کا انکار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ''كِتَابُ الْجَنَائِزِ'' کے تحت '' بَابُ مَا جَاءَ فِيْ عَذَابِ الْقَبْرِ'' میں عذابِ قبر ثابت کرنے کے لیے تین آیات اور متعدد احادیث ذکر فرمائی ہیں۔ پہلی آیت: ﴿ اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ ﴾ [ الأنعام : ۹۳ ] ''جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، نکالو اپنی جانیں، آج تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔'' دوسری آیت: ﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴾ [ التوبۃ : ۱۰۱ ] ''عنقریب ہم انھیں دو بار عذاب دیں گے، پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔'' تیسری یہ آیت جو یہاں زیرِ تفسیر ہے۔

عذابِ قبر سے متعلق صحیح بخاری میں مذکور احادیث میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهِ ، وَ تَوَلّٰى عَنْهُ أَصْحَابُهُ، وَ إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ، أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهِ فَيَقُوْلَانِ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهُ فَيُقَالُ لَهُ انْظُرْ إِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ ، قَدْ أَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ، فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا، قَالَ قَتَادَةُ وَ ذُكِرَ لَنَا أَنَّهُ يُفْسَحُ لَهُ فِيْ قَبْرِهِ ثُمَّ رَجَعَ إِلٰى حَدِيْثِ أَنَسٍ قَالَ وَ أَمَّا

## أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾

## سخت ترین عذاب میں داخل کرو ﴿۴۶﴾

الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي، كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ، فَيُقَالُ لَا دَرَيْتَ وَ لَا تَلَيْتَ وَ يُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً، فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ، غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ ﴾ [ بخاري، الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر : ۱۳۷۴ ] ''آدمی جب اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اس سے واپس لوٹتے ہیں اور وہ ان کے جوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے، تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''تو اس آدمی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتا تھا؟'' تو جو مومن ہے وہ کہتا ہے: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔'' تو اس سے کہا جاتا ہے: ''آگ میں اپنے ٹھکانے کو دیکھ لے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں تجھے جنت میں ٹھکانا دے دیا ہے۔'' تو اسے وہ دونوں ٹھکانے اکٹھے دکھائے جاتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: ''ہمیں بتایا گیا کہ پھر اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔'' پھر قتادہ نے انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث آگے بیان فرمائی: ''اور جو منافق یا کافر ہے، اس سے کہا جاتا ہے: ''تو اس آدمی کے بارے میں کیا کہتا تھا؟'' وہ کہتا ہے: ''میں نہیں جانتا، میں وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔'' تو اس سے کہا جاتا ہے: ''نہ تو نے جانا اور نہ کسی کے پیچھے چلا۔'' پھر اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے ایک ایسی ضرب ماری جاتی ہے، جس سے وہ ایسی چیخ مارتا ہے جسے انسانوں اور جنوں کے سوا اس کے آس پاس کے سب سنتے ہیں۔''

ابو ایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سورج غروب ہونے کے بعد باہر نکلے، آپ ﷺ نے ایک آواز سنی، تو فرمایا: ﴿ يَهُوْدُ تُعَذَّبُ فِيْ قُبُوْرِهَا ﴾ [ بخاري، الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر : ۱۳۷۵ ] ''یہود کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ﴿ إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ، ثُمَّ قَالَ بَلٰى، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَسْعٰى بِالنَّمِيْمَةِ، وَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ ﴾ [ بخاري، الجنائز، باب عذاب القبر من الغيبة والبول : ۱۳۷۸ ] ''بلاشبہ یقیناً ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑی چیز کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''کیوں نہیں! (وہ واقعی بڑی ہیں) ان میں جو ایک ہے وہ چغلی کھایا کرتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دعا کیا کرتے تھے: ﴿ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ ﴾ [ بخاري، الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر : ۱۳۷۷ ] ''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور آگ کے عذاب سے اور زندگی اور موت کے فتنے سے اور مسیح دجال کے فتنے سے۔''

وَ اِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْٓا اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا

اور جب وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ ان سے کہیں گے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ بے شک ہم تمھارے ہی پیچھے چلنے والے تھے، تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی حصہ ہٹانے والے ہو؟ ﴿۴۷﴾ وہ لوگ کہیں گے جو بڑے بنے تھے بے شک ہم سب اس میں ہیں، بے شک اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے ﴿۴۸﴾ اور وہ لوگ جو آگ میں ہوں گے جہنم کے نگرانوں سے کہیں گے اپنے رب سے دعا کرو، وہ ہم سے ایک دن کچھ عذاب ہلکا کر دے ﴿۴۹﴾ وہ کہیں گے اور کیا تمھارے پاس تمھارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آیا کرتے تھے؟ کہیں گے

**آیت 48،47** ❶ وَ اِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا ...... : فرعون اور آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلنے والوں کا انجام آگ اور قیامت کے دن "اَشَدَّ الْعَذَابِ" بیان فرمانے کے بعد بتایا کہ صرف فرعون ہی نہیں، ہر متکبر اور اس کے اندھا دھند پیروکار جہنم میں جائیں گے اور وہاں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے۔ "يَتَحَآجُّوْنَ" (ایک دوسرے سے جھگڑیں گے) کے لفظ سے ظاہر ہے کہ کمزور لوگوں کا بڑا بننے والوں سے کہنا: ﴿اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ﴾ (کہ ہم دنیا میں تمھارے تابع تھے، تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی حصہ ہٹاؤ گے؟) ان سے آگ ہٹانے کی درخواست کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ انھیں ذلیل کرنے کے لیے اور اپنے دل کا اُبال نکالنے کے لیے ہوگا۔ ان بڑے بننے والوں کے پاس بھی یہ کہنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم خود آگ میں ہیں، تمھارے کس کام آ سکتے ہیں!؟ اس پر وہ ایک دوسرے کو لعنت کریں گے، مگر کسی کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جھگڑے کا کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)، سورۂ ابراہیم (۲۱، ۲۲)، سورۂ اعراف (۳۸، ۳۹) اور سورۂ سبا (۳۱ تا ۳۳)۔

❷ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ : یعنی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نازل ہو چکا، اب تم اپنی سزا بھگتو ہم اپنی بھگت رہے ہیں، اس عذاب میں کمی بیشی ہمارے بس میں نہیں ہے۔

**آیت 49** وَ قَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ...... : یعنی آپس کے جھگڑے کو بے سود سمجھ کر سردار اور پیروکار سب جہنم کے دربانوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے ہمارے لیے بھی دعا کرو کہ کسی ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے۔

**آیت 50** قَالُوْٓا اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ...... : جہنم کے دربان ان پر واضح کرنے کے لیے کہ تم اس قابل ہی

ع ۱۴ فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾

کیوں نہیں، وہ کہیں گے پھر دعا کرو اور کافروں کی دعا تو بالکل ہی بے کار ہے ﴿۵۰﴾ بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے ﴿۵۱﴾

---

نہیں کہ تمھاری بات سنی جائے یا تمھاری سفارش کی جائے، ان سے کہیں گے، کیا تمھارے رسول تمھارے پاس واضح دلیلیں لے کر نہیں آیا کرتے تھے؟ وہ کہیں گے، کیوں نہیں! اس پر فرشتے ان سے کہیں گے، پھر جب تم نے ان کی پکار پر لبیک نہیں کہا تو تمھاری پکار بھی کوئی نہیں سنے گا، سو پکارتے رہو، کافروں کی پکار بالکل بے سود اور بے کار ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''دوزخ کے فرشتے کہیں گے، سفارش ہمارا کام نہیں، ہم تو عذاب پر مقرر ہیں۔ سفارش کام ہے رسولوں کا، سو رسولوں سے تو تم برخلاف ہی تھے۔'' (موضح) دوسری جگہ فرمایا کہ وہ مالک (یعنی جہنم کے بڑے دربان) کو پکار کر کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارا کام ہی تمام کر دے، مگر وہ کہے گا، تمھیں یہیں رہنا ہے۔ (دیکھیے زخرف: ۷۷) اور وہ رب تعالیٰ سے بھی جہنم سے نکالنے کی درخواست کریں گے، مگر وہاں سے بھی انھیں دھتکار کر کہا جائے گا کہ مجھ سے بات مت کرو۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۱۰۷، ۱۰۸)۔

**آیت 51** ❶ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... : سورت کی ابتدا سے یہاں تک آیات کا حاصل یہ تھا کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے اور ان کے بعد آنے والے رسولوں کی امتوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا، حق کو شکست دینے کے لیے باطل طریقے سے کج بحثی کی اور ہر ایک نے اپنے رسول کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا، مگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں ہلاک کیا اور آخرت میں ان کے لیے شدید ترین عذاب رکھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کا دفاع کرنے والے مومن کی بھی اسی طرح مدد فرمائی، مگر اللہ تعالیٰ کی اپنے لوگوں کے ساتھ امداد مخفی ہوتی ہے۔ پہلے کئی طرح سے ان کی آزمائش ہوتی ہے، پھر انجام ان کے حق میں ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کی نظر چونکہ ظاہری اسباب پر ہوتی ہے اور وہ ایمانی فراست سے محروم ہوتے ہیں، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی مدد نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان واقعات کے ذکر کے بعد جن میں ''اِنَّ'' کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا بیان ہے، اب ''اِنَّ'' اور لام تاکید کے ساتھ اور اپنی عظمت کے اظہار کے لیے اپنا ذکر جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ کرتے ہوئے نہایت زور دار الفاظ میں فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کہ بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں، خواہ وہ کسی کی سمجھ میں آ رہی ہو یا نہ، ہمارا قاعدہ یہی ہے۔

❷ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : یہاں ایک سوال ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی رسول دنیا میں اپنی قوم پر غالب نہ آ سکے، کئی انبیاء قتل ہوئے، ایمان والوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ پھر اتنی تاکید کے ساتھ یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں، دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسولوں اور مومنوں کی مدد کی کئی صورتیں ہیں۔ سب سے بڑی مدد تو یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات میں

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾

جس دن ظالموں کو ان کا عذر کرنا کوئی فائدہ نہ دے گا اور انھی کے لیے لعنت ہے اور انھی کے لیے بدترین گھر ہے ﴿۵۲﴾

حق پر ثابت قدم رہتے ہیں، بڑے سے بڑے لالچ یا بڑی سے بڑی آزمائش، حتیٰ کہ شہادت کی صورت میں بھی ان کے قدم ایمان سے نہیں ڈگمگاتے۔ یہ استقامت اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۳۰، ۳۱ ] ”بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ ہم تمھارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔“ اس نصرت کی ایک مثال اصحاب الاخدود ہیں۔ ایک صورت مدد کی یہ ہے کہ دلیل و برہان کے لحاظ سے وہ ہمیشہ اپنے دشمنوں پر غالب رہتے ہیں، جیسا کہ فرعون نے اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود دلیل کے میدان میں شکست کھائی، حتیٰ کہ وہ جادوگر جو مقابلے پر لائے گئے تھے، سجدے میں گر گئے اور ایمان لے آئے۔ ایک صورت مدد کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ایسی ذہنی اور قلبی برتری عطا فرماتا ہے کہ ہر قسم کی قوت و شوکت اور ملک و سلطنت کے باوجود ان کی نظر میں کفار کی حیثیت گھاس کے ایک تنکے سے بھی کم ہوتی ہے۔ ایک صورت مدد کی یہ ہے کہ ان کے دشمنوں سے دنیا میں ان زیادتیوں کا بدلا لیا جاتا ہے جو وہ رسولوں اور ایمان والوں پر کرتے رہے۔ (دیکھیے روم : ۴۷) پھر خواہ وہ بدلا رسول کی موجودگی میں لیا جائے، جیسا کہ قوم نوح اور عاد و ثمود کے ساتھ ہوا، خواہ رسول کے بعد لیا جائے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے اپنے بعض رسولوں کو قتل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے سخت لڑائی والے بندے مسلط کر کے انھیں نہایت عبرت ناک سزا دی، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں مذکور ہے، اور جن یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کا منصوبہ بنایا ان پر رومیوں کو مسلط کیا گیا، جنھوں نے انھیں ہر طریقے سے ذلیل و خوار کیا اور وہ دنیا میں ایسے منتشر ہوئے کہ آج تک کسی نہ کسی قوم کی پناہ کے بغیر کسی جگہ ان کا قیام مشکل ہے۔ (دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل : ۴ تا ۷) اور مدد کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں دنیا میں مادی لحاظ سے فتح و نصرت اور حکومت و سلطنت عطا کر دی جائے، جیسا کہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی مدد ہوئی۔ ان صورتوں میں سے کسی نبی کو صرف ایک قسم کی مدد حاصل ہوئی، کسی کو دو قسم کی اور کسی کو زیادہ کی۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم ہر قسم کی مدد سے فیض یاب ہوئے۔

③ وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ : ”الْاَشْهَادُ“ ”شَاهِدٌ“ کی جمع بھی ہو سکتی ہے، جیسے ”صَاحِبٌ“ کی جمع ”أَصْحَابٌ“ ہے اور ”شَهِيْدٌ“ کی بھی، جیسے ”شَرِيْفٌ“ کی جمع ”أَشْرَافٌ“ ہے۔ یعنی اس دن بھی ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی مدد کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ مراد قیامت کا دن ہے جب انبیاء، فرشتے، اہل ایمان، زمین اور انسان کے اعضا آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو جنت عطا فرما کر اور ان کے دشمنوں کو جہنم میں پھینک کر اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد فرمائے گا۔ دیکھیے سورۂ مطففین (۲۹ تا ۳۶)۔

آیت 52 ① يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ : ”الظّٰلِمِيْنَ“ سے مراد مشرک ہیں۔ (دیکھیے انعام : ۸۲) انھیں

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ۙ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا ﴿۵۳﴾ جو عقلوں والوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ﴿۵۴﴾

---

ان کی معذرت اس لیے فائدہ نہیں دے گی کہ ان کے پاس کوئی صحیح عذر ہوگا ہی نہیں۔ رسولوں کے پیغام پہنچانے کی وجہ سے لاعلمی کا عذر وہ کر نہیں سکیں گے۔ اس دن ان کے پاس عذر یا تو صریح جھوٹ ہوگا کہ وہ کہیں گے: ﴿وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ [الأنعام: ۲۳] ''اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے! ہم مشرک نہیں تھے۔'' یا تقدیر کا عذر کرکے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کریں گے، جیسا کہ سورۂ مومنون میں ان کا قول ہے: ﴿رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ [المؤمنون: ۱۰۶] ''اے ہمارے رب! ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی۔'' ظاہر ہے ان میں سے کوئی عذر اس قابل ہی نہیں کہ سنا جائے، فائدہ پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔

❷ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ: ''لَهُمْ'' کو پہلے لانے سے حصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: ''اور انھی کے لیے لعنت ہے اور انھی کے لیے بدترین گھر ہے۔'' یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا نتیجہ ہے کہ اللہ کے رسول اور ایمان والے اس دن لعنت اور بدترین گھر دونوں سے محفوظ رہیں گے۔

**آیت 53** ❶ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى: اس آیت میں اس نصرت کا بیان ہے جس کا ذکر پچھلی آیت ''اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا'' میں ہوا۔ واؤ کے ساتھ عطف اس بات پر ہے جس کا ذکر پیچھے گزرا اور جو یہاں مقدر ہے کہ ''ہم نے موسیٰ اور ایمان والوں کی مدد فرعون اور اس کے لشکروں کو غرق کرکے انھیں نجات دینے کے ساتھ کی'' اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی۔ اس ہدایت میں نبوت، معجزات، تورات اور ہر مشکل میں رہنمائی سب شامل ہیں۔

❷ وَاَوْرَثْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ: نبوت تو موسیٰ علیہ السلام کو ملی اور وہ صرف نبی ہی کو ملتی ہے، البتہ اس کی کتاب اور اس کے علوم کی وارث اس کی امت بنی ہے، جیسا کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: ((إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا، وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ)) [أبوداوٗد، العلم، باب في فضل العلم: ۳۶۴۱] ''علما ہی انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے کسی کو دینار اور درہم کا وارث نہیں بنایا، انھوں نے صرف علم کا وارث بنایا۔ تو جس نے اسے حاصل کر لیا، اس نے بہت زیادہ حصہ حاصل کر لیا۔'' اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ملنے والی کتاب تورات کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا، وہ نسلاً بعد نسل اسے پڑھتے پڑھاتے اور اس پر عمل کرتے رہے۔

**آیت 54** ❶ هُدًى وَّ ذِكْرٰى: ''هُدًى'' اور ''ذِكْرٰى'' دونوں مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہیں، یعنی ایسی ہدایت دینے والی اور نصیحت کرنے والی کہ اس کا وجود ہی سراسر ہدایت اور نصیحت تھا۔ ''ذِكْرٰى'' کا معنی نصیحت بھی ہے اور

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ اور دن کے پچھلے اور پہلے پہر اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر ﴿۵۵﴾

یاد دہانی بھی، یعنی وہ کتاب انھیں پیش آنے والے معاملات میں رہنمائی بھی کرتی تھی اور بھولی ہوئی چیزیں مثلاً موت، قبر، آخرت اور جنت وجہنم وغیرہ یاد دلا کر نصیحت بھی کرتی تھی۔ دوسری جگہ تورات کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ١ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ﴾ [المائدة : ٤٤] ''بے شک ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے انبیاء جو فرماں بردار تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی بنے اور رب والے اور علماء، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے۔''

② لِاُولِي الْاَلْبَابِ : "الْاَلْبَابِ" "لُبٌّ" کی جمع ہے، عقل۔ یعنی اس کتاب سے ہدایت اور نصیحت صرف عقلوں والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ "الْاَلْبَابِ" کا لفظ جمع ہی آیا ہے۔ یعنی اللہ کی کتاب میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت نہیں جو عقل نہیں رکھتے، یا جو صرف دنیا کے ظاہری معاملات کی عقل رکھتے ہیں، جیسا کہ کفار کے متعلق فرمایا: ﴿وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا١ۖۚ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [الروم : ٦، ٧] ''اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہ دنیا کی زندگی کے کچھ ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے، وہی غافل ہیں۔'' بلکہ اس میں ان کے لیے ہدایت و نصیحت ہے جو ہر قسم کی عقل رکھتے ہیں، دنیا کے ظاہری اور حقیقی معاملات کی بھی اور آخرت کی بھی۔ میں نے ہر جگہ قرآن کے الفاظ کے مطابق "اُولُوا الْاَلْبَابِ" کا ترجمہ ''عقلوں والے'' کیا ہے، جب کہ عام طور پر اس کا ترجمہ ''عقل والے'' کیا جاتا ہے۔ یقیناً قرآن مجید کے الفاظ پر غور کرنے سے عجیب اسرار کھلتے ہیں۔

آیت 55 ① فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ : موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور آلِ فرعون کی طرف سے جو ایذائیں پہنچیں، جن پر انھوں نے صبر کیا اور اس کے انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی تائید و نصرت سے نوازا، اس کے ذکر کے بعد اب ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے امت کے ہر آدمی کو تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ دعوتِ حق میں پیش آنے والی مشکلات اور کفار کی طرف سے ملنے والی ایذاؤں پر صبر کریں، یقیناً اللہ تعالیٰ کا مدد کا وعدہ حق ہے، اس لیے بے صبری یا جلد بازی مت کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾ [الأحقاف : ٣٥] ''پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کر۔''

② وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ : اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور امت کے ہر فرد کو استغفار کا حکم ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: «وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً» [بخاري، الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة : ٦٣٠٧] ''اللہ کی قسم! میں ہر روز ستر (۷۰) سے زیادہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیات میں کسی دلیل کے بغیر جھگڑتے ہیں جو ان کے پاس آئی ہو، ان کے سینوں

مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔“

یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو رسول اللہ ﷺ کے پہلے اور پچھلے گناہ معاف فرما دیے تھے، جیسا کہ سورۂ فتح (۲) میں ہے، پھر استغفار کا حکم کیوں دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ مومن مکی سورت ہے، جو اس بشارت سے پہلے کی ہے، اس لیے اس پر یہ سوال وارد ہی نہیں ہوتا، جب کہ سورۂ فتح ۶ ہجری میں اتری۔ البتہ سورۂ نصر میں مذکور آیت (۳): ﴿ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ﴾ پر یہ سوال وارد ہوتا ہے، کیونکہ یہ سورت فتح مکہ کے بعد نبی ﷺ کی وفات کے قریب اتری۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: (( كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُكْثِرُ أَنْ يَقُوْلَ فِيْ رُكُوْعِهِ وَسُجُوْدِهِ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ، يَتَأَوَّلُ الْقُرْآنَ )) [ بخاري، الأذان، باب التسبيح والدعاء في السجود : ۸۱۷ ] ”رسول اللہ ﷺ اپنے رکوع اور سجود میں کثرت سے کہا کرتے تھے: ” سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ “ ”اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تو (ہر عیب سے) پاک ہے اور اپنی تعریف کے ساتھ، اے اللہ! مجھے بخش دے“ آپ قرآن کے حکم پر عمل کرتے تھے۔“ جواب اس کا یہ ہے کہ ہر آدمی کا گناہ اس کے مرتبے کو پیش نظر رکھ کر ہوتا ہے، سید الانبیاء ﷺ معمولی سی غفلت کے لیے بھی استغفار ضروری سمجھتے تھے۔ اغر مزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَإِنِّيْ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ )) [ مسلم، الذكر والدعاء، باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه : ۲۷۰۲ ] ”میرے دل پر ہلکا سا پردہ آ جاتا ہے اور میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔“ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”حضرت رسول خدا (ﷺ) دن میں سو سو بار گناہ سے استغفار کرتے تھے۔ ہر بندے سے تقصیر ہوتی ہے، اس کے موافق ہر کسی کو استغفار ضروری ہے۔“ (موضح)

③ بعض حضرات کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں بھی رسول اللہ ﷺ کو اپنے گناہوں سے استغفار کا حکم ہے، اس سے مراد امت کے گناہوں کے لیے استغفار ہے، مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ سورۂ محمد (ﷺ) میں یہ تاویل ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴾ [محمد : ۱۹ ] ”پس جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی اور اللہ تعالیٰ تمھارے چلنے پھرنے اور تمھارے ٹھہرنے کو جانتا ہے۔“

④ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ : اللہ تعالیٰ کی مدد کے وعدے کا حق دار بننے کے لیے صبر اور استغفار کے ساتھ ساتھ صبح و شام رب تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتے رہنے کا حکم دیا۔ اس میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا بھی شامل ہے اور نماز بھی، کیونکہ صبر اور نماز ہی اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ﴾ [ البقرة : ۴۵ ] ”اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔“ تسبیح و تحمید سے مراد نماز ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۰) کی تفسیر۔

آیت 56 ① اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ ...... : اس میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ

هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

**میں ایک بڑائی کے سوا کچھ نہیں، جس تک وہ ہرگز پہنچنے والے نہیں ہیں، سو اللہ کی پناہ مانگ۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۵۶﴾ یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۵۷﴾**

---

اللہ تعالیٰ کی آیات کو ٹھکرانے کے لیے جھگڑتے اور کج بحثی کرتے ہیں اس کا سبب یہ نہیں کہ ان آیات کو سمجھنا کچھ مشکل ہے، یا ان کے مضامین (توحید، قیامت اور رسالت وغیرہ) کے لیے بیان کردہ دلائل کم یا کمزور ہیں، بلکہ اس کا باعث ان لوگوں کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور اپنے مقام سے بہت اونچا بننے کی خواہش و کوشش ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی رسول پر ایمان لا کر اس کے تابع فرمان ہونا انھیں گوارا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی جھوٹی بڑائی برقرار رکھنے کے لیے رسول کو جھٹلاتے ہیں، حق کا انکار کرتے ہیں، مسلمانوں کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور انھیں نیچا دکھانے کے لیے ہر ذلیل سے ذلیل حربہ اختیار کرتے ہیں۔

❷ **مَا هُمْ بِبَالِغِيْهِ:** ''باء'' کے ساتھ ''مَا'' نافیہ کی تاکید ہو رہی ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''جس تک وہ ہرگز پہنچنے والے نہیں۔'' یعنی ان جھوٹے اور حقیر لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں اپنے لیے جو بڑائی سوچ رکھی ہے وہ انھیں ہرگز میسر نہیں ہو سکے گی اور نہ ہی وہ کسی صورت اس مقام تک پہنچنے والے ہیں۔

❸ **فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ:** یعنی جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی طرف سے قتل کی دھمکی پر ہر متکبر سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگی، جو یوم حساب پر ایمان نہ رکھتا ہو، اسی طرح آپ بھی ایسے تمام متکبروں اور ان کی ظاہری مخالفت اور پوشیدہ سازشوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں۔

❹ **اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ:** وہی ہے جو ہر بلند اور آہستہ بات کو سنتا اور ہر ظاہر اور پوشیدہ کو دیکھتا ہے۔ وہی آپ کو ہر قسم کے نقصان سے بچا سکتا ہے اور بچائے گا۔

**آیت 57** **لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ......:** یہاں سے ان بنیادی عقائد کو ایک بار پھر دلائل سے ثابت کیا جا رہا ہے جن کا کفار انکار کرتے اور اس مقصد کے لیے کج بحثی اور جھگڑا کرتے تھے۔ کفار قریش اور ان کے ہم خیال لوگ قیامت کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو گئے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ دوبارہ زندہ ہوں۔ ان کے مطابق یہ ممکن ہی نہیں اور عقل کسی صورت اسے تسلیم نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یقیناً آسمانوں اور زمین کو کسی نمونے اور پہلے سے موجود کسی مادے کے بغیر پیدا کرنا انسانوں کو پہلی دفعہ پیدا کرنے سے یا دوبارہ پیدا کرنے سے بہت ہی بڑا کام ہے۔ تو جس نے اتنے بلند اور وسیع و عریض آسمانوں کو ان میں موجود بے شمار مخلوقات، لامحدود کہکشاؤں اور سیاروں سمیت پیدا کر دیا

وَ مَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور نہ اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتا ہے اور نہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور نہ وہ جو برائی کرنے والا ہے، بہت کم تم نصیحت حاصل کرتے ہو ﴿۵۸﴾

---

ہے اور اتنی بڑی زمین اور اس میں موجود بے شمار مخلوق پیدا کر دی ہے، اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے۔ ظاہر ہے بڑی چیز بنانے والے کے لیے چھوٹی چیز بنانا بالکل آسان ہے، مگر اکثر لوگ اتنی واضح اور آسان بات کو بھی نہیں جانتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ مٹی ہو کر ہم کیسے زندہ ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی پیدائش کو انسان کی دوبارہ پیدائش کی دلیل کے طور پر متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۸۱)، صافات (۱۱)، بنی اسرائیل (۹۹)، احقاف (۳۳) اور نازعات (۲۷ تا ۳۳)۔

**آیت 58** ❶ **وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ** ...... : یہ بھی قیامت کی دلیل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اندھا اور بینا برابر نہیں، اسی طرح وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے صالح عمل کیے اور جنھوں نے کفر کیا اور برے عمل کیے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ تو اگر قیامت کا انکار کیا جائے اور اس دن پر ایمان نہ رکھا جائے جس میں سب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے اور ہر نیک و بد کو اس کی جزا یا سزا ملے گی، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بینا و نابینا ایک ہیں اور نیک و بد برابر ہیں۔ بلکہ ایک حساب سے برے اعمال کرنے والا زیادہ فائدے میں ہے کہ وہ ساری عمر من مانی بھی کرتا رہا، دل میں آنے والی ہر بری خواہش بھی پوری کرتا رہا، اس کے باوجود کسی نے نہ اسے پوچھا نہ پوچھے گا کہ تم نے یہ ظلم و تعدی کیوں اختیار کیے رکھی۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہو سکتا، عقلِ سلیم اس کا انکار کرتی ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ قیامت قائم ہو اور بینا و نابینا برابر نہ ہوں اور نہ ہی نیک و بد یکساں ہوں۔

❷ یہاں ایک سوال ہے کہ "**وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ**" جمع ہے، جب کہ اس کا مقابل "**وَلَا الْمُسِيْٓءُ**" واحد ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کے بیان کا حسن ہے کہ ایک لمبی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایک جانب کے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں اور ان کے مقابل حذف کر دیے گئے ہیں۔ اسے بلاغت کی اصطلاح میں احتباک کہتے ہیں۔ گویا پوری عبارت یہ تھی: "وَمَا يَسْتَوِي الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَمِلُوا الْقَبَائِحَ وَلَا الْمُسِيْءُ وَالْمُحْسِنُ" یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے صالح عمل کیے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور قبیح عمل کیے، وہ برابر نہیں اور نہ ہی برائی کرنے والا اور نیکی کرنے والا برابر ہیں۔ (مہائمی، کچھ تفصیل کے ساتھ)

❸ **قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ** : منکرینِ قیامت کو فرمایا، تم بہت ہی کم نصیحت حاصل کرتے ہو، حالانکہ قیامت کے دلائل بالکل واضح ہیں۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ قَالَ رَبُّكُمُ

بے شک قیامت ضرور آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے ﴿۵۹﴾ اور تمھارے رب نے

آیت 59 ❶ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا: وہ بات جو اس سے پہلی دو آیات میں دلیلوں کے ساتھ بیان فرمائی، اب نہایت صریح الفاظ میں "اِنَّ" اور "لام" کی تاکید کے ساتھ بیان فرمائی۔ ان دونوں لفظوں کا اکٹھا آنا اہلِ عرب کے ہاں تاکید کی قوت میں قسم کے برابر ہے۔ پچھلی آیات میں قیامت کے حق ہونے کی دلیلیں ذکر فرمائیں، اب کائنات کے خالق و مالک نے قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت آنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قسم کھا کر یہ بات کہنا بجائے خود دلیل ہے اور سب سے بڑی دلیل ہے۔

❷ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ: اور لیکن اکثر لوگ اتنی واضح اور سچی بات ماننے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ اسے ماننے کے بعد انھیں اپنی سرکش خواہشوں اور لذتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے، جس کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ قیامہ (۵)۔

آیت 60 ❶ وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ...... : آخرت کی یاد دہانی کے ساتھ ہی توحید کی تاکید فرمائی، جو رسول اللہ ﷺ اور کفار کے درمیان جھگڑے کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ آیت کے آخر میں جہنم کے ذکر کی صورت میں آخرت کا تذکرہ بھی فرما دیا۔

❷ "دعا" کا واحد حق دار ہونے کی دلیل کے طور پر اپنا تعارف "رَبُّكُمُ" (تمھارا رب) کے لفظ کے ساتھ کروایا کہ "ادْعُوْنِيْۤ" (مجھے پکارو) کا حکم تمھیں وہ دے رہا ہے جو ہر لمحے کسی کی شرکت کے بغیر تمھاری پرورش کر رہا ہے اور تمھاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔

❸ تمھارے رب نے فرمایا، تم مجھے پکارو، مجھ سے مانگو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا، میں تمھیں دوں گا۔ نہ مجھ سے بدگمان ہو، نہ کسی اور کو پکارتے یا اس سے مانگتے پھرو، یہ سمجھ کر کہ وہ تمھیں کچھ دے گا، یا تمھاری درخواستیں میرے دربار سے منظور کروا دے گا۔

❹ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، مگر دوسری جگہ قبولیت کے وعدے کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ذکر فرمائیں، فرمایا: ﴿ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴾ [ البقرة : ۱۸۶ ] "اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔" اور رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ دعا تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ضرور قبول ہوتی ہے، یا تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے، یا آخرت میں اس کا ذخیرہ کر لیتا ہے، یا اس سے اتنی برائی ٹال دیتا ہے۔ [ دیکھیے مسند أحمد : ۱۸/۳، ح : ۱۱۱۳۹، صحیح ] دعا کی قبولیت کی شرطوں اور صورتوں کی

ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ۧ ع ۱۱

فرمایا مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے ۝

تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۸۶) کی تفسیر۔

⑤ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ : یہ جملہ دلیل ہے کہ دعا ہی عبادت اور پکارنا ہی بندگی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے، اس سے مانگتا ہے اور اس سے فریاد کرتا ہے وہ اس کی عبادت کرتا ہے اور جو مافوق الاسباب اشیاء کے لیے اس کے سوا کسی اور کو پکارتا ہے، یعنی ''یا علی مدد'' کہتا ہے، '' يَا شَيْخُ عَبْدَ الْقَادِرِ جِيْلَانِيْ شَيْئًا لِلّٰهِ '' کہتا ہے، بہاؤ الحق یا کسی خود ساختہ داتا، دستگیر، گنج بخش یا غریب نواز کو پکارتا ہے اور ڈوبتی کشتی کو کنارے لگانے کی درخواست کرتا ہے، درحقیقت وہ اس کی عبادت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، جو اس کے ہاں ناقابلِ معافی ہے۔ یہ کہنا کہ ہم ان بزرگ ہستیوں کو صرف پکارتے ہیں، ان کی عبادت نہیں کرتے، سراسر دھوکا ہے، جو مشرک اپنے آپ کو اور اللہ کے بندوں کو دے رہے ہیں، کیونکہ پکارنا ہی تو عبادت ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ )) ''پکارنا ہی بندگی ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة البقرة : ۲۹۶۹، و قال الألباني صحيح ]

⑥ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ...... : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کے منکروں کے جھگڑے اور کج بحثی کا سبب بیان فرمایا تھا کہ وہ محض ان کے دلوں کا کبر اور جھوٹی بڑائی ہے جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب فرمایا کہ جو لوگ اس کبر میں مبتلا ہیں، میری آیات اور میرے رسولوں پر ایمان نہیں لاتے اور مجھ سے دعا نہیں کرتے وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ دنیا میں وہ جس قدر اونچے بنتے تھے قیامت کے دن اتنے ہی ذلیل و حقیر ہوں گے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''بندگی کی شرط ہے اپنے رب سے مانگنا، نہ مانگنا غرور ہے۔ اگر دنیا نہ مانگے تو مغفرت ہی مانگے۔'' (موضح)

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْثَالَ الذَّرِّ فِيْ صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَيُسَاقُوْنَ إِلٰى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُسَمّٰى بُوْلَسَ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْأَنْيَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ أَهْلِ النَّارِ طِيْنَةِ الْخَبَالِ )) [ ترمذي، صفة القيامة والرقائق، باب ما جاء في شدة الوعيد للمتكبرين : ۲٤۹۲، و قال الألباني حسن ] ''تکبر کرنے والوں کو قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح آدمیوں کی شکل میں اٹھایا جائے گا، ہر طرف سے ذلت انھیں ڈھانک رہی ہو گی، پھر انھیں جہنم میں ایک قید خانے کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا، جس کا نام ''بُولَس'' ہے۔ ان پر آگوں کی آگ چڑھ رہی ہو گی، انھیں جہنمیوں کے جسموں سے نکلنے والا لہو اور پیپ پلائی جائے گی۔''

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن (بنایا)۔ بے شک اللہ یقیناً لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ۝

اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے کہ اس سے مانگا جائے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّهُ مَنْ لَّمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ )) [ ترمذي، الدعوات، باب منه : ۳۳۷۳، و حسنه الألباني ] ''جو اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس پر غصے ہو جاتا ہے۔'' کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے ؎

اَللّٰهُ يَغْضَبُ إِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ وَ تَرَى ابْنَ آدَمَ حِيْنَ يُسْأَلُ يَغْضَبُ

''اللہ تعالیٰ غصے ہوتا ہے اگر تو اس سے مانگنا چھوڑ دے اور تو ابن آدم کو دیکھے گا کہ جب اس سے مانگا جائے غصے ہوتا ہے۔''

آیت 61 ① اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان کرتے ہوئے توحید اور آخرت دونوں مضامین ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

② وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا: اس جملے میں احتباک ہے، یعنی دو جملوں کا ایک ایک حصہ دوسرے جملے کے قرینے کی وجہ سے حذف کر دیا ہے، جو کلام کے کمال جامعیت اور بلاغت کا آئینہ دار ہے۔ مفصل عبارت یوں تھی: " اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ مُظْلِمًا لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا لِتَعْمَلُوْا فِيْهِ " یعنی ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے رات کو تاریک بنا دیا، تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا، تاکہ تم اس میں کام کرو۔'' اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ نعمت متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے یاد کروائی ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۷)، فرقان (۴۷)، بنی اسرائیل (۱۲)، قصص (۷۱ تا ۷۳) اور لقمان (۲۹)۔

③ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ: "لَذُوْ فَضْلٍ" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو کچھ عطا فرمایا ہے (زمین و آسمان، رات دن، سورج، چاند اور خود ان کا وجود وغیرہ) وہ ان کا اللہ پر کوئی حق یا قرض نہیں بلکہ محض اس کا فضل ہے اور فضل بھی بہت بڑا کہ اس نے انھیں ضرورت کی ہر چیز بخشی، فرمایا: ﴿ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ [ إبراهيم : ۳٤ ] ''اور تمھیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔'' پھر انھیں عقل و تمیز عطا فرما کر مہلت بخشی اور نافرمانیوں کے باوجود فوراً گرفت نہیں فرمائی۔ مومن و کافر سب کو نعمتوں سے نوازتا ہے۔ یہ سب اس اکیلے کی پیدا کردہ اور عطا کردہ نعمتیں ہیں۔

④ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ: جب اس اکیلے نے رات دن کا یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور یہ تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں، کسی اور کا ان میں ذرہ برابر دخل نہیں، تو حق تو یہ تھا کہ اس کا شکر ادا کرتے، صرف اسی کو اپنا رب مانتے، اسی سے دعا

# ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾

یہی ہے اللہ تمھارا رب، ہر چیز کا پیدا کرنے والا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں بہکائے جاتے ہو ﴿۶۲﴾

کرتے اور اس کی آیات اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے، مگر ایسے لوگ بہت کم نکلے۔ اکثر لوگ ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے، بلکہ مالک کے ساتھ شریک بنا کر اس کی ناشکری اور غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز انھیں نیند اور بیداری کی صورت میں موت کے بعد زندگی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حق یہ تھا کہ اس روزانہ کے موت وحیات کے مشاہدے کے بعد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے تمام مخلوق کو زندہ کرنے کی قدرت پر ایمان رکھتے اور اس دن کے لیے تیاری کرتے، مگر انھوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر نہیں کیا، بلکہ ناشکری کی اور قیامت کے انکار پر جمے رہے۔

**آیت 62** ① ذٰلِكُمُ اللّٰهُ : "ذٰلِكُمْ" اسم اشارہ بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر یہاں قریب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قریب کے لیے اسم اشارہ بعید لا کر اس ذات کی عظمت و بلندی اور اس کے انسانی سوچ سے بے حساب بالاتر ہونے کا اظہار مقصود ہے، اور "ذٰلِكَ" کے بجائے "ذٰلِكُمْ" کے استعمال کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف کی آیت (۳۲): ﴿قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ﴾ کی تفسیر۔

② خبر معرفہ ہو تو کلام میں حصر پیدا ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "یہی ہے اللہ تمھارا رب۔" یہاں "ذٰلِكُمْ" مبتدا ہے، جس کے بعد چار خبریں ہیں، یعنی وہ جس کے متعلق تم نے ابھی سنا کہ وہ آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے، جو رات کو سکون کے لیے تاریک اور دن کو حرکت و عمل کے لیے روشن بنانے والا ہے، اسی کا نام اللہ ہے (جس میں تمام صفاتِ کمال جمع ہیں)، کوئی اور اللہ ہونے کا دعوے دار ہے تو لاؤ۔ زمین و آسمان اور لیل و نہار کو پیدا کرنے اور چلانے والے کے سوا کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ میں اللہ ہوں۔

③ رَبُّكُمْ : یہی تمھارا رب ہے، تمھاری پرورش کرنے والا اور تمھیں ضرورت کی ہر چیز مہیا کرنے والا۔ اس کے علاوہ اور کوئی تمھارا رب نہیں۔

④ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ : زمین و آسمان اور دن رات ہی کا نہیں بلکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے، اس کے سوا کسی نے ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حج (۷۳، ۷۴)۔

⑤ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : یہ چوتھی خبر ہے جو پہلے سارے کلام کا خلاصہ ہے کہ (یہ جو رات کو سکون والا اور دن کو روشن بنانے والا ہے) ① یہی اللہ (تمام صفاتِ کمال کا جامع) ہے۔ ② یہی رب ہے۔ ③ یہی ہر چیز کا خالق ہے۔ ④ اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

⑥ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ : "أَنّٰى" اصل میں جگہ کے متعلق استفہام کے لیے آتا ہے، یعنی "کہاں سے؟ کس جگہ سے؟" مگر موقع محل کے مطابق کیفیت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی "کس طرح؟ کیسے؟" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اکیلا مستحقِ عبادت اور

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

اسی طرح وہ لوگ بہکائے جاتے تھے جو اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۶۳﴾ اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو رہنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور تمھاری صورت بنائی تو تمھاری صورتیں اچھی بنائیں اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، یہ ہے اللہ تمھارا رب، سو بہت برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۶۴﴾

پکارنے کے لائق ہونا ان دلائل کی روشنی میں بالکل واضح ہے، پھر وہ کون سا مقام ہے جہاں سے کسی نے تمھیں اس کی عبادت سے پھیر کر اس مخلوق کی عبادت اور اسے پکارنے کی طرف لگا دیا جس کا اپنا وجود اس کے اختیار میں نہیں؟ اور تم کس طرح اس واضح اور روشن راستے سے بھٹک کر شرک و ضلالت کے اندھیروں میں گم ہو رہے ہو؟

**آیت 63** كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا ...... : اگرچہ "اِفْكٌ" کا معنی جھوٹ اور بہتان بھی ہے، مگر یہاں " اَفَكَ يَأْفِكُ اَفْكًا" (ض) (ہمزہ کے فتح کے ساتھ) سے ہے، جس کا معنی "پھیرنا" ہے، جیسا کہ سورۂ احقاف میں ہے: ﴿ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ۲۲] "انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہمارے معبودوں سے ہٹا دے، سو ہم پر وہ (عذاب) لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو سچوں سے ہے۔" "كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ" میں "كَانَ" کی وجہ سے استمرار ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: "اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔" "جَحَدَ يَجْحَدُ جُحُوْدًا" (ف) جاننے کے باوجود انکار کر دینا۔ یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اتنے واضح دلائل کے باوجود آخر ان لوگوں کے حق سے انحراف کا اصل باعث کیا ہے اور یہ کہ ان سے پہلے بھی کسی نے یہ روش اختیار کی ہے یا یہ صرف انھی کا کام ہے؟ فرمایا، یہ لوگ ہی نہیں بلکہ ان سے پہلے وہ سب لوگ بھی انھی کی طرح حق سے پھیر دیے جاتے رہے ہیں جو علم کے باوجود اللہ کی آیات کا ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ تکبر و جحود ان کی بیماری ہے، یہی بیماری پہلوں کی بھی تھی۔ اب جو طے کر لے کہ اس نے ماننا ہی نہیں، اسے کون منوائے؟ جس طرح سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے، لیکن جو جاگتا ہونے کے باوجود آنکھیں بند کر کے پڑ جائے اسے کون جگائے؟

**آیت 64** ① اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا ...... : اس سے پہلے لیل و نہار کے ذکر کے ساتھ زمانی نعمتوں کا ذکر فرمایا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنی بے شمار نعمتوں میں سے مزید پانچ نعمتوں کا ذکر فرما کر اپنے اکیلے رب ہونے کی یاد دہانی فرمائی۔ ان نعمتوں کا تعلق مکان سے ہے یا انسان کی ذات سے۔ پہلی نعمت زمین کو رہنے کی جگہ بنانا ہے۔ اس میں کئی چیزیں شامل ہیں، ایک یہ کہ اس نے زمین کو پیدا کیا تو وہ ہچکولے کھاتی تھی، پھر اس میں ایسے توازن و تناسب سے

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۵﴾

وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سو اسے پکارو، اس حال میں کہ اسی کے لیے دین کو خالص کرنے والے ہو، سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۶۵﴾

پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ انسانوں اور تمام جانداروں کے لیے جائے قرار بن گئی۔ اگر اس میں مسلسل زلزلے کی کیفیت رہتی تو کوئی متنفس اس پر نہ بس سکتا۔ (دیکھیے نحل: ۱۵۔ انبیاء: ۳۱۔ لقمان: ۱۰) دوسری یہ کہ زمین انسان کو اور تمام جانداروں کو زندگی میں بسیرا مہیا کرتی ہے اور مرنے کے بعد بھی انھیں سمیٹتی ہے، اگر اس میں یہ وصف نہ ہوتا تو تعفن کی وجہ سے کوئی جاندار زندہ و سلامت نہ رہتا۔ (دیکھیے مرسلات: ۲۵، ۲۶) اور تیسری یہ کہ انسان کی تمام ضروریات کھانا پینا اور لباس وغیرہ سب زمین سے وابستہ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ اس میں یہ صفت نہ رکھتا تو کوئی جاندار یہاں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ بات بیان ہوئی ہے۔ دوسری نعمت آسمان کو چھت بنانا ہے، چھت بھی ستونوں کے بغیر اور گرنے سے اور ہر قسم کی آفات سے محفوظ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء (۳۲)، رعد (۲) اور لقمان (۱۰)۔

تیسری نعمت انسان کی صورت بنانا ہے، وہ بھی نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے۔ (دیکھیے سورۂ ص: ۳۸) چوتھی نعمت انسان کی صورت اچھی بنانا ہے، دوسرے جانوروں کے برعکس وہ سیدھے قد کے ساتھ دو پاؤں پر چلتا ہے اور ہاتھ کے ساتھ کھاتا پیتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۷۰): ﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ...... ﴾ کی تفسیر دیکھیں۔ پانچویں نعمت ''طیبات'' (پاکیزہ چیزیں) بطور رزق عطا کرنا ہے۔ ''الطَّيِّبٰتِ'' کا لفظ حرام و حلال کے سلسلے میں آئے تو مراد حلال چیزیں ہوتی ہیں اور انعام کے طور پر ذکر کیا جائے تو اس سے مراد لذیذ چیزیں ہوتی ہیں۔ یہاں یہی مراد ہے، کیونکہ تمام جانوروں کے برعکس انسان کی خوراک ہر چیز میں سے اس کا لذیذ ترین حصہ ہے۔ خوراک کے علاوہ اس میں نکاح، لباس، زینت اور بُود و باش کی بے شمار طیبات شامل ہیں۔

❷ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ : اس کی تفسیر پچھلی آیات میں گزر چکی ہے۔

❸ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ : ''تَبٰرَكَ'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ملک کی پہلی آیت۔

**آیت 65** ❶ هُوَ الْحَيُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : ''الْحَيُّ'' خبر پر الف لام نے کلام میں حصر کا مفہوم پیدا کر دیا ہے کہ وہی زندہ ہے، یعنی ہمیشہ سے زندہ اور ہمیشہ زندہ رہنے والا وہی ہے، تو عبادت کے لائق بھی وہی ہے۔ اس کے سوا سب موت کی وادی سے وجود میں آئے ہیں اور موت کی آغوش میں جانے والے ہیں۔ تو مرنے والے عبادت کے حق دار کیسے بن گئے؟ مزید دیکھیے آیت الکرسی (بقرہ: ۲۵۵) اور سورۂ نحل (۲۱) کی تفسیر۔

❷ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ : تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۲۹) اور سورۂ مومن (۱۴) کی تفسیر۔

❸ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : یعنی جب یہ سب نعمتیں اس اکیلے کی عطا کردہ ہیں اور یہ سب اوصاف اور خوبیاں اس اکیلے

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۫ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ

کہہ دے بے شک مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، جب میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح دلیلیں آئیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام جہانوں کے رب کا فرماں بردار ہو جاؤں ﴿۶۶﴾ وہی ہے جس نے تمھیں کچھ مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر ایک جمے ہوئے خون سے، پھر وہ تمھیں

میں پائی جاتی ہیں جو رب العالمین ہے، تو کسی اور کا حق نہیں کہ اس کی تعریف کی جائے اور شکر ادا کرنے کے لیے اس کی عبادت کی جائے، بلکہ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے جو رب العالمین ہے۔

آیت 66 ① قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اکیلے اللہ کی عبادت کے حکم کے بعد صریح الفاظ میں یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو بھی تم پکارتے ہو مجھے ان کی عبادت کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، یعنی انھیں پکارنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ کفار کی خواہش اور مطالبہ تھا کہ کچھ عبادت اللہ کی کر لی جائے اور کچھ ان کے مشکل کشاؤں کی۔ فرمایا، ان سے کہہ دو کہ مجھے ان سب کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اللہ کی توحید کے خلاف نہ تمھاری کوئی بات مانی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس پر کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ قلم (۹) اور سورۂ کافرون۔

② لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ : ان "الْبَيِّنٰتُ" میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی وہ نقلی دلیلیں بھی شامل ہیں جو رب تعالیٰ کی طرف سے قرآنی آیات اور احادیث کی صورت میں آپ ﷺ پر نازل ہوئیں اور وہ بے شمار عقلی دلائل اور نشانیاں بھی جو کائنات کی ہر چیز میں سلیم الفطرت انسان کے لیے موجود ہیں۔ یعنی اتنے واضح نقلی و عقلی دلائل کے ہوتے ہوئے تم مجھ سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ میں تمھارا کہنا مانوں گا اور تمھارے ان جھوٹے معبودوں کی بندگی کرنے لگوں گا؟

③ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنا آپ مکمل طور پر رب العالمین کے سپرد کر دوں اور اسی کا تابع فرمان ہو جاؤں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۱ تا ۱۶۴)۔

آیت 67 ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ...... : یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور قیامت قائم ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی تفسیر سورۂ حج (۵) اور سورۂ مومنون (۱۲ تا ۱۴) میں تفصیل سے گزر چکی ہے۔ البتہ یہاں چند الفاظ کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔

② "ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ" اور "ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا" دونوں میں "لامِ کَیْ" فعل محذوف کے متعلق ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے: "ثُمَّ يُرَبِّيْكُمْ" یعنی پھر وہ تمھاری پرورش کرتا رہتا ہے (تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، پھر تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ) یا "ثُمَّ يُبْقِيْكُمْ" ہے، یعنی پھر وہ تمھیں باقی رکھتا ہے (تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، پھر تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ)۔

ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۶۸﴾ ع ۸ ۱۲

ایک بچہ بنا کر نکالتا ہے، پھر تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، پھر تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ اور تم میں سے بعض وہ ہے جو اس سے پہلے قبض کر لیا جاتا ہے اور تا کہ تم ایک مقرر وقت کو پہنچ جاؤ اور تا کہ تم سمجھو ﴿۶۷﴾ وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، پھر جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے صرف یہ کہتا ہے کہ ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتا ہے ﴿۶۸﴾

③ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ: یعنی کوئی پیدا ہونے سے پہلے (اسقاط کی صورت میں)، کوئی جوانی کو پہنچنے سے پہلے اور کوئی بوڑھا ہونے سے پہلے فوت کر لیا جاتا ہے۔

④ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى: اس ''لِتَبْلُغُوْٓا'' کا تعلق پہلے ''لِتَبْلُغُوْٓا'' کے لیے مقدر فعل کے ساتھ نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے الگ فعل مقدر ماننا پڑے گا، مثلاً ''وَ فَعَلَ لَكُمْ ذٰلِكَ لِتَبْلُغُوْا أَجَلًا مُّسَمًّى'' ''اور اس نے تمھارے ساتھ یہ معاملہ اس لیے کیا ہے کہ تم موت کے اس وقت تک پہنچ جاؤ جو تم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔'' یعنی کوئی علقہ بننے تک، کوئی مضغہ یا عظام بننے تک، کوئی ولادت تک، کوئی لڑکپن تک، کوئی جوانی تک اور کوئی بڑھاپے تک پہنچ کر مرے۔ (ابن جزیّ)

⑤ وَ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں زندگی کے ان مختلف مراحل سے اس لیے گزارتا ہے کہ جب تم اس حیرت انگیز نظام پر غور کرو تو سمجھ جاؤ کہ کوئی خالق ہے جس نے یہ سب کچھ پیدا فرمایا ہے اور وہ ایک ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ ورنہ کائنات کے اس سلسلے میں ہر چیز کی ایک دوسرے کے ساتھ نہ اتنی زبردست موافقت و مناسبت ہوتی اور نہ ہی یہ نظام ایک لمحے کے لیے چل سکتا یا باقی رہ سکتا۔ اور تا کہ یہ بھی سمجھ جاؤ کہ یہاں ہر مرحلے کے بعد اگلا مرحلہ ہے، مٹی اور نطفے سے پیدا کرنے والے اور اسے ایک وقت تک پہنچانے کے بعد قبض کر لینے والے کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہ تمھیں دوبارہ زندہ کر لے اور تمھارا حساب لے۔ یعنی اگر غور کرو تو پیدائش کے اس سلسلے سے اللہ تعالیٰ کا وجود، اس کی وحدانیت اور تمھیں دوبارہ زندہ کرنے پر اس کا قادر ہونا آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''یعنی اتنے احوال تم پر گزرے، شاید ایک حال اور بھی گزرے (اور) وہ (ہے) مر کر جینا۔'' (موضح)

آیت 68 ① هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ: توحید اور آخرت کو ثابت کرنے کے لیے اپنی نعمتوں اور قدرتوں کے تذکرے سے بھرپور آیات کے اس سلسلے کو اس آیت پر ختم فرمایا کہ ''وہی ہے جو (جسے چاہتا ہے) زندگی عطا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) موت دیتا ہے۔'' موت و حیات مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کا اس میں کچھ دخل نہیں۔

② فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ: یعنی اسے پہلی مرتبہ یا دوبارہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز بنانے میں، یا کسی کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور قیامت برپا کرنے میں کیا مشکل ہو سکتی ہے؟ وہ تو جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو بس

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَ بِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾ فِي الْحَمِيْمِ ۙ۬ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں، کہاں پھیرے جا رہے ہیں ﴿۶۹﴾ وہ لوگ جنھوں نے کتاب کو اور جو کچھ ہم نے اپنے رسولوں کو دے کر بھیجا اسے جھٹلا دیا، سو عنقریب جان لیں گے ﴿۷۰﴾ جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، گھسیٹے جا رہے ہوں گے ﴿۷۱﴾ کھولتے پانی میں، پھر آگ میں جھونکے جائیں گے ﴿۷۲﴾

"کُنْ" (ہو جا) کہتا ہے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں، بلکہ اسباب اس کے حکم سے وجود میں آتے ہیں۔

آیت 69 اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ ...... : اس سورت میں شروع سے یہاں تک کفار کے ناحق جدال کا اور اس کی مذمت کا پانچ مرتبہ ذکر آیا ہے۔ دیکھیے آیت (۴، ۵، ۳۵، ۵۶، ۶۹) یہاں نبی ﷺ کو اور ان آیات کے سننے یا پڑھنے والے ہر شخص کو فرمایا کہ (سورت کے شروع سے یہاں تک کی تقریر سے) کیا تمھیں معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کی آیات میں ناحق جھگڑا اور کج بحثی کرنے والے لوگ ان کے صحیح ہونے کے دلائل جاننے کے باوجود کہاں سے ٹھوکر کھا کر گمراہی کے گڑھے میں گر رہے ہیں؟

آیت 70 الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ ...... : یعنی ان کے اللہ کی کتاب اور اس کے رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات (توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ) پر ایمان لانے کے بجائے ان کے بارے میں جھگڑنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قبول کرنے کے ارادے سے ان پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ جھگڑالو پن سے ان کا مقابلہ کرنے اور انھیں جھٹلانے کا راستہ اختیار کیے رکھا۔ سو وہ اپنے اس عمل کا انجام بہت جلد جان لیں گے۔

آیت 72،71 ① اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ...... : "اَلْاَغْلٰلُ" "غُلٌّ" (غین کے ضمہ کے ساتھ) کی جمع ہے، طوق۔ "اَلسَّلٰسِلُ" "سِلْسِلَةٌ" کی جمع ہے، زنجیریں۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ رعد (۵)۔

② "يُسْحَبُوْنَ" "سَحَبَ يَسْحَبُ سَحْبًا" (ف) گھسیٹ کر لے جانا۔ "يُسْجَرُوْنَ" "سَجَرَ يَسْجُرُ سَجْرًا" (ن) "اَلتَّنُّوْرَ" تنور میں ایندھن جھونکنا۔ یعنی اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں کج بحثی کرنے والے ان کفار کو جب پیاس لگے گی تو فرشتے انھیں گھسیٹتے ہوئے اس جگہ لے جائیں گے جہاں شدید گرم پانی اُبل رہا ہوگا۔ وہاں سے گرم پانی پلانے کے بعد انھیں پھر ان کی اصل جگہ جہنم میں ایندھن کی طرح جھونک دیا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ صافات (۶۶ تا ۶۸) کی تفسیر۔

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

پھر ان سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ جو تم شریک ٹھہراتے تھے؟ ﴿۷۳﴾ اللہ کے سوا۔ کہیں گے وہ ہم سے گم ہو گئے، بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہیں پکارتے تھے۔ اسی طرح اللہ کافروں کو گمراہ کرتا ہے ﴿۷۴﴾

**آیت 74-73:** ❶ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: پھر انھیں ذلیل کرنے کے لیے اور ان کے خود ساختہ مشکل کشاؤں اور حاجت رواؤں کی بے بسی واضح کرنے کے لیے ان سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے سوا شریک بناتے تھے؟ اگر وہ واقعی شریک تھے اور تم اس لیے ان کی عبادت کرتے تھے کہ وہ مشکل وقت میں تمھاری دستگیری کریں گے تو لاؤ، وہ کہاں ہیں، تمھاری مدد کیوں نہیں کر رہے؟

❷ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا: یہ انسانی ضمیر کا اصل سچ ہے، اس کے مطابق پہلے وہ بے اختیار اقرار کریں گے کہ وہ ہم سے گم ہو گئے، نہ کہیں ملتے ہیں نہ دکھائی دیتے ہیں۔

❸ بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا: پھر یہ سوچیں گے کہ یہ کہنا کہ وہ ہم سے گم ہو گئے ہیں، یہ تو اعتراف ہے کہ واقعی ہم اللہ کے سوا کسی کو پکارتے رہے ہیں اور ہمارا یہ اعتراف ہمارے خلاف شہادت بن رہا ہے۔ چنانچہ طبیعت کی کمینگی اور جھوٹ کی عادت کی وجہ سے اسی قدم پر اس اعتراف سے پھر جائیں گے اور صاف جھوٹ بول دیں گے اور کہیں گے کہ یہ بات تو ویسے ہی ہمارے منہ سے نکل گئی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم کسی بھی چیز کو نہیں پکارتے تھے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر دنیا میں اپنے شرک کرنے سے انکار کر دیں گے، فرمایا: ﴿ وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ [ الأنعام: ۲۲ تا ۲۴ ] ”اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے، کہاں ہیں تمھارے وہ شریک جنھیں تم گمان کرتے تھے۔ پھر ان کا فریب اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ کہیں گے اللہ کی قسم! جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے۔ دیکھ انھوں نے کیسے اپنے آپ پر جھوٹ بولا اور ان سے گم ہو گیا جو وہ جھوٹ بنایا کرتے تھے۔“

❹ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ: ایسے ہی اللہ کافروں کو گمراہ اور حواس باختہ کر دیتا ہے، ان کے منہ سے کبھی کچھ نکلتا ہے کبھی کچھ۔ وہ ایک بات کہتے ہیں پھر خود ہی اس سے مکر جاتے ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے ایک اور تفسیر کی ہے، وہ بھی بہت عمدہ ہے، فرماتے ہیں: ”اول منکر ہو چکے تھے کہ ہم نے شریک نہیں پکڑا۔ اب گھبرا کر منہ سے نکل جاوے گا، پھر سنبھل کر انکار کریں گے تو وہ انکاران کا اللہ نے بچلا دیا (پھسلا دیا، بھلا دیا) اپنی حکمت سے۔“ (موضح) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انھیں ان کے انکار سے پھسلا کر ان کے منہ سے شرک کرنے کا اقرار کروا لیا۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾

یہ اس لیے ہے کہ تم زمین میں حق کے بغیر خوش ہوتے تھے اور اس لیے کہ تم اکڑتے تھے ﴿۷۵﴾

5 ایک تفسیر اس آیت کی یہ ہے کہ وہ پہلے کہیں گے کہ ہم جنھیں پکارتے تھے وہ ہم سے گم ہو گئے، پھر کہیں گے، اصل بات یہ ہے کہ ہم جنھیں پکارتے رہے وہ کوئی شے ہی نہ تھے، نہ کہیں ان کا وجود تھا، بلکہ ہم محض "لَا شَيْءٌ" کو اور اپنے وہم و گمان کو پوجتے اور پکارتے رہے ہیں۔ اگر فی الواقع ان کا وجود ہوتا تو آج وہ کہیں مل جاتے یا ہمارے کام آتے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴾ [یونس: ۶۶] "اور جو لوگ اللہ کے غیر کو پکارتے ہیں وہ کسی بھی قسم کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انکلیں دوڑاتے ہیں۔" اور فرمایا: ﴿ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ﴾ [النجم: ۲۳] "یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں۔" "لَا شَيْءٌ" کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [المائدۃ: ۶۸] "کہہ دے اے اہل کتاب! تم کسی چیز پر نہیں ہو، یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو قائم کرو اور اس کو جو تمھارے رب کی جانب سے تمھاری طرف نازل کیا گیا۔"

**آیت 75** 1 ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ: "فَرِحٌ" "خوشی سے پھول جانا" یہ دل کی حالت کا نام ہے اور "مَرِحٌ" "اکڑنا" یہ اس خوشی کے نتیجے میں اعضائے بدن سے ظاہر ہونے والے تکبر کا نام ہے، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿ وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ [بني إسرائيل: ۳۷] "اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔" یعنی قیامت کے دن تمھاری اس ساری رسوائی اور عذاب کا باعث دنیا میں تمھارا اپنے پاس موجود نعمتوں اور اپنے دنیوی علوم پر پھول جانا، اکڑنا اور تکبر کرنا ہے، جیسا کہ آگے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ﴾ [المؤمن: ۸۳] "پھر جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے تو وہ اس پر پھول گئے جو ان کے پاس کچھ علم تھا۔"

2 بِغَيْرِ الْحَقِّ: یعنی تم ناحق زمین میں خوشی سے پھولتے تھے۔ "فِي الْاَرْضِ" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ دنیا خوشی کا مقام نہیں، خوشی کا مقام صرف جنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْكَافِرِ )) [مسلم، الزھد والرقائق: ۲۹۵۶] "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔" کافر اس میں اس لیے خوش ہوتا ہے کہ اس کی جنت یہی ہے مگر اس کی یہ خوشی ناحق ہے، کیونکہ ناپائیدار چیز اس قابل نہیں کہ آدمی اس پر خوش ہو۔ اور تم ناحق اکڑتے اور بڑے بنتے تھے، حالانکہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، تمھارا یا کسی اور مخلوق کا حق نہیں۔ تمھارا حق اللہ کے سامنے عاجز ہونا اور اس کی آیات کے مقابلے میں جھگڑنے کے بجائے انھیں تسلیم کرنا تھا۔ پھر تم زمین پر رہ کر، جو پستی کی انتہا ہے، عرش والے کے سامنے اکڑتے تھے، جس کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں۔

اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ

جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو، پس وہ تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے ﴿۷۶﴾ پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، پھر اگر کبھی ہم واقعی تجھے اس کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا تجھے اٹھا ہی لیں تو یہ لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۷۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسول بھیجے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے سنایا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے نہیں سنایا۔

---

**آیت 76** اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ...... : ”اُدْخُلُوْٓا“ کی مناسبت سے ” فَبِئْسَ مَدْخَلُ الْمُتَكَبِّرِيْنَ “ (متکبروں کے داخل ہونے کی جگہ بری) ہونا چاہیے تھا، مگر ”خٰلِدِيْنَ فِيْهَا“ کی مناسبت سے ”فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ“ فرمایا، یعنی وہ متکبرین کے رہنے کی بری جگہ ہے۔ ”مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ“ کے لفظ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جہنم میں ہمیشہ کے لیے داخل ہونے کا باعث تکبر ہے، جس نے انھیں اللہ کی آیات کو جھٹلانے پر اور ان کے بارے میں جدال پر ابھارا، جس جدال کی مذمت اس سورت کا ایک بنیادی موضوع ہے۔

**آیت 77** ❶ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ : یعنی یہ لوگ جو آپ کو نیچا دکھانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، آپ ان کی ایذا پر صبر کا دامن تھامے رکھیں، کیونکہ اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے (کہ ہم دنیا اور آخرت میں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد فرماتے ہیں)۔ ہاں، اس میں کچھ تاخیر ہو سکتی ہے اور اس تاخیر میں بھی ہماری کئی حکمتیں ہیں۔ ہمارا یہ وعدہ دو طرح سے پورا ہو سکتا ہے۔

❷ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ ...... : ایک یہ کہ ہم آپ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھا ہی دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر آپ دنیا ہی میں ہماری مدد کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان کا عبرتناک انجام دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، جیسا کہ بدر اور فتح مکہ میں ہوا۔ ”فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ“ کا یہ جواب یہاں مقدر ہے اور سیاق سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم تجھے دنیا میں ان کا انجام دکھانے سے پہلے اٹھا لیں، تب بھی یہ لوگ کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے، بلکہ انھیں ہمارے پاس ہی واپس لایا جائے گا اور وہاں ان پر عذاب کا وعدہ پورا ہو گا جو آپ کی اور اہلِ ایمان کی نصرت کا ایک اظہار ہو گا۔

**آیت 78** ❶ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ : کفار نے آپ ﷺ کو پریشان کرنے اور نیچا دکھانے کے لیے اور اللہ کی آیات کا مقابلہ کرنے اور ان کے بارے میں کج بحثی کے لیے جو ناجائز مطالبے کیے ان میں سے ایک مطالبہ ان کی

اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ ع ۱۴

اور کسی رسول کا اختیار نہ تھا کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی لے آئے، پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور اس موقع پر اہل باطل خسارے میں رہے ﴿۷۸﴾

طلب اور تقاضے کے مطابق عجیب و غریب نشانیاں اور معجزے دکھاتا تھا، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں گزرا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے بطور اسوہ و نمونہ پہلے رسولوں کا ذکر فرمایا کہ آپ ان کے ایسے مطالبوں سے پریشان یا غم زدہ نہ ہوں، آپ سے پہلے بہت سے رسول گزرے، مگر معجزہ دکھانا ان میں سے بھی کسی کے اختیار میں نہ تھا۔ سو اگر آپ انھیں ان کی طلب کے مطابق معجزہ نہ دکھا سکیں تو اس سے آپ کی رسالت کے سچا ہونے میں کوئی خلل نہیں آتا، جیسا کہ پہلے رسولوں کی رسالت میں کوئی خلل نہیں آیا۔

❷ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْكَ: ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جن انبیاء کا بیان نہیں ہوا وہ تعداد میں ان پیغمبروں سے بہت ہی زیادہ ہیں جن کا قرآن میں ذکر ہوا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۶۴) کی تفسیر۔

❸ ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''کسی قوم کے قدیم رہنما کے متعلق (جو ہمارے رسول ﷺ سے پہلے ہو گزرے ہیں) قطعی طور پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ نبی نہ تھا، ممکن ہے کہ وہ نبی ہو اور اس نے توحید ہی کی دعوت پیش کی ہو، مگر بعد کے لوگوں نے اس کی تعلیمات کو مسخ کر دیا ہو۔'' (اشرف الحواشی) ایسی کسی شخصیت کو یقین سے نبی بھی نہیں کہا جا سکتا۔

❹ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: مطلب یہ ہے کہ معجزہ کوئی کھیل نہیں کہ کافروں نے جب چاہا نبی سے اس کا مطالبہ کر دیا اور نبی نے جب چاہا اسے دکھا دیا، کسی رسول کے پاس اللہ کے اذن کے بغیر کوئی معجزہ بھی لانے کا اختیار نہیں۔ اس میں ان لوگوں کا واضح رد ہے جو انبیاء تو ایک طرف اولیاء کے متعلق بھی یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو بھی واپس لانے کی قدرت رکھتے ہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

❺ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ: یعنی مطالبے پر جو معجزہ پیش کیا جاتا ہے اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے دوٹوک فیصلے کی ہوتی ہے، اگر کوئی قوم اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے۔

❻ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ: ''هُنَالِكَ'' زمان و مکان دونوں کے لیے آتا ہے، ''اس جگہ''، ''اس وقت'' اور ''اس موقع پر'' کے الفاظ میں دونوں معانی آ جاتے ہیں۔ یعنی عذاب کی آمد کے موقع پر ایمان والے نجات پا جاتے ہیں اور باطل والے خسارے میں رہ جاتے ہیں اور ان کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝۸۰ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ۝۸۱

اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے چوپائے بنائے، تاکہ ان میں سے بعض پر تم سوار ہو اور انھی میں سے بعض کو تم کھاتے ہو ۝ اور تمھارے لیے ان میں بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ تم ان پر اس حاجت تک پہنچو جو تمھارے سینوں میں ہے اور انھی پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو ۝۸۰ اور وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے ۝۸۱

آیت 79 تا 81 ❶ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا...... : "جَعَلَ" یہاں "خَلَقَ" کے معنی میں ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ﴾ [ الأنعام : ۱ ] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا۔'' "الْاَنْعَامَ" "نَعَمٌ" (نون اور عین کے فتحہ کے ساتھ ) کی جمع ہے، اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریاں، نر و مادہ دونوں۔ (دیکھیے انعام: ۱۴۲، ۱۴۳) یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ عموماً یہ لفظ اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں مذکور زیادہ تر فوائد اونٹوں کے بیان ہوئے ہیں۔ ان آیات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۵ تا ۸، ۶۶، ۸۰) اور سورۂ مومنون (۲۱، ۲۲)۔

❷ "لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا" میں جانوروں پر سواری کا ذکر فرمایا، پھر اس سے اگلی آیت میں کشتیوں کے ساتھ ساتھ دوبارہ ان پر سواری کا ذکر فرمایا۔ بعض مفسرین نے اس میں یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ "لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا" میں عام شہروں اور بستیوں کے درمیان معمول کی سواری مراد ہے اور "تُحْمَلُوْنَ" سے مراد دور دراز کے سفر ہیں۔ (ابن عطیہ) (واللہ اعلم)

❸ مفسر عبد الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں: ''کفارِ مکہ رسول اللہ ﷺ سے طرح طرح کے حسّی معجزات کا مطالبہ کیا کرتے تھے، جس کا ایک جواب تو سابقہ آیت میں دیا گیا ہے کہ ایسا معجزہ پیش کرنا رسول کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان آیات میں کفار کے اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تمھیں اپنے دائیں بائیں، اندر باہر اور اوپر نیچے ہر طرف ہی مل سکتی ہیں۔ اگر تم سوچو تو تمھارے راہِ راست کو قبول کرنے کے لیے راہنمائی ان میں بھی موجود ہے۔ مثلاً جو مویشی تم پالتے ہو ان پر بھی نظر ڈال کر دیکھ لو، ان کی ساخت اور ان کی فطرت ہی ہم نے ایسی بنا دی ہے کہ وہ فوراً تمھارے تابع بن جاتے ہیں، پھر ان سے تم ہزاروں قسم کے فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان کے دودھ سے بالائی، مکھن، پنیر، گھی اور لسّی بناتے ہو اور یہ چیزیں تمھارے جسم کا انتہائی اہم جزو ہیں۔ پھر تم ان پر سواری کرتے ہو۔ تمھارے بوجھل سامان کو یہ اٹھاتے ہیں، تمھاری کھیتی میں ہل یہ چلاتے ہیں، کنویں سے پانی یہ کھینچتے ہیں، تم مشقت کے سب کام ان سے لیتے ہو۔ پھر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھاتے ہو، ان کے بالوں سے پوشاک تیار کرتے ہو اور مرنے کے بعد ان کی ہڈیوں، کھالوں اور دانتوں تک کو اپنے کام میں

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸۳

تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، وہ (تعداد میں) ان سے زیادہ تھے اور قوت میں اور زمین میں یادگاروں کے اعتبار سے ان سے بڑھ کر تھے، تو ان کے کسی کام نہ آیا، جو وہ کماتے تھے ۝۸۲ پھر جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے تو وہ اس پر پھول گئے جو ان کے پاس کچھ علم تھا اور انھیں اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے ۝۸۳

لاتے ہو۔ ان مویشیوں میں انسان کے لیے یہ خوئے غلامی کس نے پیدا کی؟ تمھاری پیدائش سے بھی پہلے تمھاری ضروریات کا اس قدر خیال رکھنے والا کون ہے؟

اب دوسری طرف نظر ڈالو، زمین کے تین چوتھائی حصے پر پانی یا سمندر پھیلے ہوئے ہیں، خشکی صرف چوتھا حصہ ہے، جس پر تم اور تمھارے مویشی سب رہتے ہیں۔ اتنے سے خشکی کے حصے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا پانی کا ذخیرہ کیوں پیدا کر دیا؟ کیا کبھی تم نے اللہ کی اس نشانی پر غور کیا؟ پھر پانی اور ہواؤں کو ایسے طبعی قوانین کا پابند کر دیا کہ تم دریاؤں اور سمندروں میں کشتی بانی اور جہاز رانی کے قابل ہو گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے طبعی قوانین ہی بدل ڈالے اور وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اس میں جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے، تو کیا تم جہاز رانی کر سکتے تھے، یا اس زمین پر زندہ رہ سکتے تھے؟ پھر یہ بھی سوچو کہ جس حکمتوں والے پروردگار نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں تمھارے تصرف میں دے رکھی ہیں، کیا وہ انسان کو اتنے اختیارات دے کر اس کو یونہی چھوڑ دے گا اور اس سے اپنی نعمتوں کا کبھی حساب نہ لے گا؟ اور یہ نہ پوچھے گا کہ جس رحیم پروردگار نے تمھاری جملہ ضروریات کا اس قدر خیال رکھا، پھر اس کے ساتھ اپنی رحمتیں بھی نازل فرماتا رہا تو کیا انسان نے اللہ کی ان نعمتوں کی قدر کی اور اس کا شکریہ ادا کیا، یا وہ نمک حرام اور ناشکرا ثابت ہوا اور اپنی نیاز مندیاں اللہ کے بجائے دوسروں کے سامنے نچھاور کرنے لگا۔‘‘ (تیسیر القرآن)

**آیت 82** ❶ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ روم کی آیت (۹) کی تفسیر۔

❷ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ : یعنی جب ان پر اللہ کا عذاب آیا تو ان کے قد و قامت، جسمانی قوت، مال و دولت کی کثرت، فنِ تعمیر کے عظیم الشان نمونے اور دوسری فنی مہارتیں ان کے کسی کام نہ آسکیں، پھر اے اہلِ مکہ! تم جو ہر لحاظ سے ان سے کمزور اور کمتر ہو، اللہ کا عذاب آنے پر کس طرح بچ سکو گے؟

**آیت 83** ❶ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ...... : ’’مِنَ الْعِلْمِ‘‘ میں ’’مِنْ‘‘ تبعیض کے لیے ہے، یعنی علم کا وہ معمولی سا حصہ جو ان کے پاس تھا۔ اس علم سے مراد دو چیزیں ہو سکتی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کے وہ عقائد و رسوم جو

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ ع ۱۴

**پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا ہم اس اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے ان کا انکار کیا جنھیں ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے تھے ﴿۸۴﴾ پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور اس موقع پر کافر خسارے میں رہے ﴿۸۵﴾**

ان کے فلسفیوں نے یا ان کے مذہبی پیشواؤں نے گھڑ رکھے تھے، جن کی بنیاد ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک پر تھی، جیسا کہ یونانیوں اور ہندوؤں کا دیوی دیوتاؤں پر مبنی سلسلہ تھا اور جیسا کہ نوح، ہود، صالح، ابراہیم اور دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کی بت پرست اقوام کا عقیدہ تھا، جسے وہ علم سمجھتے تھے، حالانکہ وہ سراسر جہل تھا۔ چنانچہ جب ان کے رسول ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے متعلق خود اس کے عطا کردہ توحید و آخرت کے واضح عقائد اور ان کے حق ہونے کے روشن دلائل لے کر آئے تو وہ انسانی دماغوں کے گھڑے ہوئے عقائد و رسوم کو برتر علم سمجھ کر انھی پر پھولے اور اکڑے رہے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے واضح عقائد اور ان کے روشن دلائل کو ٹھکرا دیا۔

دوسرا مطلب "مِنَ الْعِلْمِ" کا دنیوی علم و فن ہے، جس میں وہ مہارت رکھتے تھے، جو درحقیقت علم کا ایک معمولی اور حقیر سا حصہ ہے، کیونکہ اس کا تعلق صرف اس ناپائیدار دنیا کے چند دنوں یا لمحوں کے ساتھ ہے۔ حقیقی اور اَبدی علم، یعنی آخرت کے علم سے وہ بالکل بے بہرہ تھے۔ (دیکھیے روم: ۶، ۷) چنانچہ رسولوں کی تشریف آوری پر ایمان لانے اور اطاعت کے بجائے وہ دنیا کے اس حقیر علم پر پھولے اور اکڑے رہے جو انھیں حاصل تھا اور جسے وہ بہت بڑی بات سمجھتے تھے۔ یہ معنی الفاظ کے زیادہ قریب ہے۔

﴿۲﴾ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: یعنی انھیں اسی عذاب نے چاروں طرف سے گھیر لیا، جس سے رسول انھیں ڈراتے تھے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اسے جلد از جلد لانے کا مطالبہ کرتے تھے۔

**آیت 85،84** فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ......: ان دونوں آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۸)، انعام (۱۵۸) اور سورۂ یونس (۵۱، ۹۰، ۹۱)۔

سورۂ حٰمٓ السجدۃ ۴۱ مکیۃ ۶۱ ﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴾ اٰیاتہا ۵۴ رکوعاتہا ۶

حٰمٓ ۞ تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۞ كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حٰمٓ ① اس بے حد رحم والے، نہایت مہربان کی طرف سے اتاری ہوئی ہے ② ایسی کتاب جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی قرآن ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں ③

''سورۂ حم السجدہ'' کا ایک نام ''سورۂ فصلت'' بھی ہے۔

آیت 1 حٰمٓ: حروف مقطعات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 2 ① تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ : "تَنۡزِيۡلٌ" کا معنی ''تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا'' ہے۔ قرآن مجید کو ایک ہی دفعہ نازل کرنے کے بجائے تیئیس (۲۳) برس میں نازل کرنے کی حکمتوں کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۱۰۶) کی تفسیر۔ "الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کا مفہوم اور باہمی فرق سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں دیکھیے۔ کفار قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب نہیں مانتے تھے، بلکہ اسے رسول اللہ ﷺ کا خود ساختہ کلام کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں یقین دلانے کے لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل شدہ ہے، اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف انداز سے بیان فرمایا۔ پچھلی سورت میں یہ بات اپنی صفات ''عزیز و علیم'' کے ذکر کے ساتھ بیان فرمائی، یہاں ''رحمان و رحیم'' کے ساتھ ذکر فرمائی۔

② "الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ساری مخلوق محتاج ہے، جس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا رحمان و رحیم ہے۔ وہ سب ضعیف اور بیمار ہیں، ان کی غذا اور ہر ضرورت کا اہتمام اور ان کی بیماریوں اور کمزوریوں کا مداوا وہی کرتا ہے جو رحمان ہے، جس کی رحمت کی کوئی حد نہیں اور رحیم بھی ہے کہ اس کی رحمت دائمی ہے، جسے کبھی زوال نہیں۔ اس نے رحم کرتے ہوئے یہ کتاب نازل فرمائی ہے، تاکہ لوگ ضلالت کی تاریکیوں سے ہدایت کی روشنی میں آ جائیں اور دنیا اور آخرت دونوں میں اس بہت بڑی ہلاکت سے بچ جائیں جو مشرکین کا مقدر ہے، جس کا ذکر آیت (۶) میں آ رہا ہے۔ کتاب کا اتارنا اس کی صفت رحمت کا اظہار ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۵۷) اور سورۂ عنکبوت (۵۱)۔

آیت 3 ① كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ: "فُصِّلَتۡ" کا کچھ بیان سورۂ ہود کی پہلی آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ یہاں ہمارے استاذ محمد عبدہ لکھتے ہیں: ''یعنی ان میں مختلف مضامین عقائد، حرام و حلال، گزشتہ اقوام کے واقعات اور مثالیں وغیرہ کھول کھول کر واضح انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔'' (اشرف الحواشی) یہ "كِتٰبٌ" کی پہلی صفت ہے۔

② قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا: یہ دوسری صفت ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۲) اور سورۂ شعراء (۱۹۵)۔

بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۴

بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، تو ان کے اکثر نے منہ موڑ لیا، سو وہ نہیں سنتے ۝۴

③ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ : یہ تیسری صفت ہے۔ ”لِقَوْمٍ“ کا لام ”تَنْزِيْلٌ“ کے متعلق بھی ہو سکتا ہے اور ”فُصِّلَتْ“ کے بھی۔ یعنی یہ کتاب ان لوگوں کے لیے نازل کی گئی ہے اور انھی کے لیے اس کی آیات کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں جو جانتے ہیں، یا جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ گویا یہ ان کے لیے ہے ہی نہیں جو علم کے بجائے اپنی خواہش نفس یا آبا و اکابر کی تقلید کے پیروکار ہیں، کیونکہ ان کا عناد اور تعصب انھیں سوچنے سمجھنے حتیٰ کہ سننے کی بھی اجازت نہیں دیتا (دیکھیے حم السجدہ : ۲۶) اور نہ سننا اور نہ سمجھنا ہی لوگوں کو جہنم میں لے جائے گا، جیسا کہ سورۂ ملک میں ہے : ﴿ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴾ [ الملك : ۱۰ ] ”اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔“ یہی بات متعدد آیات میں بیان فرمائی، فرمایا : ﴿ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ [ العنکبوت : ٤٣ ] ”اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں۔“ اور فرمایا : ﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ [ العنکبوت : ٤٩ ] ”بلکہ یہ تو واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے۔“ اور فرمایا : ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴾ [ الروم : ۲۲ ] ”بے شک اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔“ اور فرمایا : ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ [ یوسف : ۲ ] ”بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تا کہ تم سمجھو۔“

آیت 4 ① بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا : یہ چوتھی اور پانچویں صفت ہے کہ یہ کتاب ایمان لانے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں بہترین انجام کی بشارت دیتی ہے اور جھٹلانے والوں کو دنیا اور آخرت کے بدترین انجام سے ڈراتی ہے۔

② فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ : قرآن مجید کی صفات بیان کرنے کے بعد اس پر لوگوں کا ردعمل بیان فرمایا کہ ان میں سے اکثر نے منہ موڑ لیا، سو وہ سنتے ہی نہیں۔ اکثر سے مراد یہاں کفار ہیں۔ نہ سننے سے مراد یہ ہے کہ وہ سرے سے سنتے ہی نہیں، بلکہ مجلس سے اٹھ جاتے ہیں (دیکھیے ص : ٦) یا کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں اور کپڑے اوڑھ لیتے ہیں۔ (دیکھیے نوح : ۷) یا شور و غل ڈال کر نہ خود سنتے ہیں نہ کسی کو سننے دیتے ہیں، جیسا کہ اسی سورۂ حم السجدہ کی آیت (۲٦) میں ہے اور نہ سننے سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ اسے قبول نہیں کرتے، کیونکہ جب ماننا ہی نہیں تو سننا نہ سننا برابر ہے، جیسا کہ فرمایا : ﴿ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ۱۷۹ ] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھٹکے

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ وَ فِيْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ

اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں

ہوئے ہیں، یہی ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔'' اور اسی سورت کی اگلی آیت: ﴿ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ وَ فِيْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۵ ] ''اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں ایک بوجھ ہے اور ہمارے درمیان اور تیرے درمیان ایک حجاب ہے، پس تو عمل کر، بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔''

❸ قرآن مجید نے لوگوں کی اکثریت کے متعلق فرمایا: ﴿ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۰۰ ] ''ان کے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔'' اور فرمایا: ﴿ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۳۷ ] ''ان کے اکثر نہیں جانتے۔'' اور فرمایا: ﴿ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [ الأنعام : ۱۱۱ ] ''ان کے اکثر جہالت برتتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ۱۷ ] ''اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ۱۰۲ ] ''اور بے شک ہم نے ان کے اکثر کو فاسق ہی پایا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ﴾ [ یونس : ۳۶ ] ''اور ان کے اکثر پیروی نہیں کرتے مگر ایک گمان کی۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ [ یونس : ۶۰ ] ''اور لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [ یوسف : ۱۰۶ ] ''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۸ ] ''بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے۔'' جب کہ ایمان والوں اور شکر گزار بندوں کے متعلق فرمایا کہ وہ بہت تھوڑے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ﴾ [ صٓ : ۲۴ ] ''مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور یہ لوگ بہت ہی کم ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [ سبا : ۱۳ ] ''اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔''

ان آیات سے کفار کے رائج کردہ نظامِ جمہوریت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، جس کی بنیاد ہی عوام کی اکثریت پر ہے، وہ مسلم ہوں یا کافر، متقی ہوں یا فاسق۔ پھر اس اکثریت کو دستور اور قانون سازی کا بھی اختیار ہے، خواہ وہ اللہ کے دین کے مطابق ہو یا اس سے متصادم۔ اس لیے دنیا بھر کے کفار تمام مسلمان ملکوں میں جمہوریت رائج کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش استعمال کرتے ہیں، کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ ان ملکوں میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو نافذ ہونے سے روک سکتے ہیں اور اپنا دخل جاری رکھ سکتے ہیں۔

آیت 5 ❶ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ ...... : ''اَكِنَّةٍ'' ''كِنَانٌ'' کی جمع ہے، پردہ، جیسا کہ ''غِطَاءٌ'' کی جمع ''أَغْطِيَةٌ''

فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝

ایک بوجھ ہے اور ہمارے درمیان اور تیرے درمیان ایک حجاب ہے، پس تو عمل کر، بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں ۝

ہے۔ ترکش، یعنی تیروں کا تھیلا جس میں تیر چھپے ہوتے ہیں " کِنَانَةٌ " کہلاتا ہے۔ " وَقْرٌ " کا اصل معنی "بوجھ" ہے، مراد بہرا پن ہے۔

❷ فرمایا، کفار کا آیتِ الٰہی سے اعراض اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ صرف یہ نہیں کہ وہ سنتے نہیں یا منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں، بلکہ ان کی نفرت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ انھوں نے واشگاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا اور اس کی تین وجہیں بیان کیں۔ پہلی یہ کہ تم ہمیں جس بات کی طرف دعوت دیتے ہو ہمارے دل اس سے بھاری پردوں میں محفوظ ہیں۔ ( اَكِنَّةٍ کی تنوین تعظیم کے لیے ہے ) وہ دعوت ہمارے دلوں تک پہنچتی ہی نہیں۔ دوسری یہ کہ ہمارے کانوں میں بھاری بوجھ ہے۔ ( وَقْرٌ کی تنوین تعظیم کے لیے ہے ) وہ تمھاری بات سننے سے شدید بہرے ہیں اور تیسری یہ کہ ہمارے اور تمھارے درمیان بھاری پردہ ہے۔ غرض، ہماری آنکھیں یا کان یا دل تمھاری کوئی بھی بات سننے یا سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ کفار نے یہ بات اپنی خوبی کے طور پر بیان کی۔ سورۂ بقرہ میں ہے: ﴿ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۸۸ ] "اور انھوں نے کہا ہمارے دل غلاف میں ( محفوظ ) ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی، پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔"

❸ وَ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ: بقاعی نے اس "مِنْ" سے تبعیض کا مفہوم اخذ کیا ہے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کے بعض معاملات میں ایک پردہ ہے، یعنی ایک دوسرے کے دنیوی معاملات تو ہم دیکھتے، سنتے اور سمجھتے ہیں، مگر دین کے معاملات میں ہمارے اور تمھارے درمیان بھاری پردہ ہے، لہٰذا تم اپنے دین پر عمل کرو اور ہم اپنے دین پر عمل کرنے والے ہیں۔

❹ دوسری جگہ فرمایا کہ ان کے دلوں، آنکھوں اور کانوں پر یہ پردے ہم نے ڈالے ہیں اور اس کی وجہ خود ان کا اعراض اور گریز ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴾ [ الكهف : ۵۷ ] "اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی تو اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور اسے بھول گیا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا، بے شک ہم نے ان کے دلوں پر پردے بنا دیے ہیں، اس سے کہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ رکھ دیا ہے اور اگر تو انھیں سیدھی راہ کی طرف بلائے تو اس وقت وہ ہرگز کبھی راہ پر نہ

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ ؕ وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ۝۶ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ

کہہ دے میں تو تمھارے جیسا ایک بشر ہی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، سو اس کی طرف سیدھے ہو جاؤ اور اس سے بخشش مانگو اور مشرکوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ⑥ وہ جو زکوٰۃ نہیں

آئیں گے۔'' اور ضد اور عناد کی وجہ سے مخالفت پر ڈٹ جانے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے، فرمایا: ﴿ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾ [ النساء : ۱۱۵ ] ''اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ [ الصف : ۵ ] ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔''

⑤ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ : بار بار دعوت اور نصیحت سے امید ہوتی ہے کہ شاید کسی وقت ہی اثر کر جائے، اس لیے کفار نے رسول اللہ ﷺ کو پوری طرح مایوس کرنے کے لیے یہ جملہ کہا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ کفار کو '' لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ '' (تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے) کہہ کر اس بات سے پوری طرح مایوس کر دیں کہ آپ ان کے معبودوں کی کبھی کسی صورت میں بھی عبادت کر سکتے ہیں۔ (دیکھیے کافرون: ۲)

**آیت 6، 7** ① قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ : یعنی مجھ سے تمھاری اس قدر دوری کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ نہ تو میں فرشتہ یا جن یا نظر نہ آنے والی کوئی اور مخلوق ہوں کہ میرے اور تمھارے درمیان کوئی پردہ ہو، جس کی وجہ سے تم مجھے دیکھ نہ سکو یا میری بات سن نہ سکو، بلکہ میں ایک بشر ہی ہوں جو تم میں پیدا ہوا، پلا بڑھا اور نبوت سے سرفراز ہوا۔ نہ یہ بات ہے کہ میری زبان تم سے مختلف ہے، بلکہ تمھاری طرح عرب ہوں، کھانے پینے، سونے جاگنے، تندرستی، بیماری، شادی، غمی اور آل اولاد، غرض تمام انسانی صفات میں تمھارے جیسا ہوں، پھر مجھ سے یہ اجتناب اور ایسی دوری کیوں؟

② يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ : دوری کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں اپنی کوئی ذاتی بات تمھارے سامنے پیش کر کے اسے منوانا چاہتا ہوں۔ ایسا بھی نہیں، بلکہ میں تو تمھارے پاس وحی الٰہی کی بات لے کر آیا ہوں اور یہی میرا امتیاز ہے، اور یہ بھی نہیں کہ وہ وحی الٰہی کوئی پیچیدہ یا عقل میں نہ آنے والی بات ہو، یا اس کے تم سے بے شمار مطالبات ہوں جنھیں پورا کرنے سے تم قاصر ہو، بلکہ وہ صاف، سچی اور عقل کے عین مطابق ہے اور وہ ہے صرف ایک مختصر سی بات کہ تمھاری عبادت کا

هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

دیتے اور آخرت کا انکار کرنے والے بھی وہی ہیں ۝

حق دار صرف ایک معبود ہے۔ ایسی واضح اور مختصر بات نہ سننے یا نہ سمجھنے کا اور اس کے کہنے والے کو نہ دیکھنے کا تمھارے پاس کوئی عذر نہیں، تمھیں روکنے والی چیز صرف تمھارا کفر پر اصرار ہے۔ سو اسے چھوڑو، تاکہ تم بھی وہ حقیقت سمجھ سکو جو تمھارے جیسا ایک بشر ہو کر میں سمجھتا ہوں اور تمھیں سمجھا رہا ہوں، لہٰذا اپنا رخ اپنے واحد معبود کی طرف بالکل سیدھا کر لو۔

3 فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ: استقامت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۱۱۲)۔ یعنی جب تمھاری عبادت کا حق دار صرف ایک معبود ہے تو تمام معبودانِ باطلہ سے منہ پھیر کر اپنا رخ پوری طرح اس کی طرف سیدھا کر لو اور صرف اسی کی عبادت کرو، جیسا کہ خلیل اللہ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [ الأنعام : ۷۹ ] ”بے شک میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ایک (اللہ کی) طرف ہو کر اور میں مشرکوں سے نہیں۔“

4 وَاسْتَغْفِرُوْهُ: یعنی اس سے پہلے اس کی جو ناشکری اور اس کے ساتھ شرک کرتے رہے ہو اس کی اس سے معافی مانگو اور اس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی پہلے ہوئی یا آئندہ ہوگی سب کی بخشش کی دعا کرتے رہو۔

5 آیت کی جو تفسیر اوپر بیان کی گئی ہے یہ بقاعی اور کچھ اور مفسرین کے مطابق ہے۔ ایک اور تفسیر یہ ہے: ”میں تو تمھارے جیسا ایک انسان ہوں، تمھارے کانوں اور آنکھوں کو کھولنا اور دلوں کے پردے دور کرنا نہ میرے اختیار میں ہے اور نہ ہی میں اس کا مکلف ہوں، میری ذمہ داری وہ وحی الٰہی تم تک پہنچا دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے میری طرف کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمھارا سچا معبود بس ایک ہے۔ سو اس کی طرف پوری طرح سیدھے ہو جاؤ اور اپنی گزشتہ اور موجودہ نافرمانیوں اور لغزشوں کی اس سے معافی مانگو۔“ (ابن عاشور) یہ تفسیر بھی بہت عمدہ ہے۔

6 وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: یعنی جو لوگ اللہ واحد اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے بہت بڑی ہلاکت ہے۔ اگرچہ ان کی ہلاکت کے بے شمار اسباب ہیں، مگر یہاں ان میں سے تین بنیادی اسباب ذکر فرمائے، کیوں کہ سعادت کے بنیادی اسباب بھی تین ہیں، یعنی اللہ کا حق ادا کرنا، مخلوق کا حق ادا کرنا اور آخرت کا یقین رکھ کر اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے تیاری رکھنا۔ جس طرح سب سے اونچے اعمال یہ ہیں اسی طرح سب سے بڑی خست اور کمینگی بھی ان کا ادا نہ کرنا ہے۔ فرمایا، ان لوگوں کے لیے بہت بڑی ہلاکت ہے جو مشرک ہیں، اپنے مالک کے غدار ہیں، اللہ کی طرف سے مخلوق کے لیے عائد ہونے والا کم از کم فریضہ بھی ادا نہیں کرتے اور آخرت کے سرے ہی سے منکر ہیں، جس میں حساب ہوگا اور جس کے بعد زندگی دائمی اور ابدی ہے۔

7 یہاں ایک سوال ہے کہ یہ سورت مکی ہے، جب کہ زکوٰۃ مدینہ میں فرض ہوئی۔ اس کے جواب میں بعض مفسرین نے فرمایا کہ

ع ۸ / ۱۵

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے ختم نہ کیا جانے والا اجر ہے ⑧

زکوٰۃ کا لفظی معنی پاکیزگی ہے، اس لیے یہاں توحید کے اقرار کے ساتھ نفس کی پاکیزگی مراد ہے کہ مشرک کلمۂ توحید کے ساتھ اپنے آپ کو پاک نہیں کرتے۔ مگر اس میں یہ اشکال ہے کہ اگر آیت کے الفاظ "لَا يَأْتُوْنَ الزَّكَاةَ" ہوتے تو اس معنی کی گنجائش تھی، "لَا يُؤْتُوْنَ" میں اس کی گنجائش مشکل ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے "وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔" اس لیے طبری اور اکثر مفسرین رحمہ اللہ نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ رہا یہ سوال کہ مکہ میں تو زکوٰۃ فرض ہی نہیں ہوئی تھی، تو جواب اس کا یہ ہے کہ اگرچہ زکوٰۃ کا نصاب اور دورانیہ مدینہ میں مقرر ہوا مگر اصل زکوٰۃ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ابتدائے اسلام ہی میں فرض تھا۔ ہرقل نے جب ابوسفیان سے پوچھا کہ وہ نبی تمھیں کیا حکم دیتا ہے تو انھوں نے کہا تھا: (( يَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصِّلَةِ وَالْعَفَافِ )) [ بخاري، الزكوة، باب وجوب الزكوة، قبل ح : ۱۳۹۵، تعليقاً ] "وہ نبی ہمیں نماز، زکوٰۃ، صلہ رحمی اور پاک دامنی کا حکم دیتا ہے۔" اور ظاہر ہے کہ ابوسفیان نے وہی احکام ذکر کیے جو مکہ میں اس نے سنے۔ علاوہ ازیں کئی سورتوں میں جا بجا صدقے، زکوٰۃ اور کھیتی میں سے حق ادا کرنے کا ذکر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ﴾ [الأنعام : ۱۴۱] "اور اس کا حق اس کی کٹائی کے دن ادا کرو۔" اور فرمایا: ﴿ وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴾ [ الليل : ۱۷، ۱۸ ] "اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیز گار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴾ [ المعارج : ۲۴، ۲۵ ] "اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حصہ ہے۔ سوال کرنے والے کے لیے اور (اس کے لیے) جسے نہیں دیا جاتا۔" اور فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۶۰ ] "اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں کہ یقیناً وہ اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔" اور یہ تمام آیات مکی سورتوں کی ہیں۔ سورۂ مزمل ابتدا میں اترنے والی مکی سورت ہے، اس کی آخری آیت میں اس کا صراحتاً ذکر ہے۔

معلوم ہوا کہ کفار توحید و رسالت پر ایمان کے علاوہ زکوٰۃ اور دوسرے احکام پر عمل کے بھی مکلف ہیں اور ان کی عدم ادائیگی پر بھی ان کو عذاب ہوگا۔ رہی یہ بات کہ ان کی نماز اور زکوٰۃ تو ایمان لانے کے بعد ہی معتبر ہوگی، پہلے اس کا فائدہ ہی نہیں، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھیں نماز یا زکوٰۃ کا حکم نہیں، جیسا کہ نماز اسی وقت درست ہوگی جب وضو ہوگا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک وضو نہ ہو نماز کا حکم ہی نہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مدثر (۳۹ تا ۴۸) کی تفسیر۔

**آیت 8** اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... : "مَمْنُوْنٍ" "مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا" (ن) " اَلْحَبْلَ " رسی کو کاٹ دینا۔ کفار کے ساتھ ہی ایمان اور عمل صالح والوں کا انجام ذکر فرمایا کہ ان کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی قطع نہیں کیا جائے گا۔ مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں جو کبھی ختم یا کم ہونے والی نہیں، بلکہ دائمی اور ہر دن زیادہ ہونے والی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹

کہہ کیا بے شک تم واقعی اس کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور اس کے لیے شریک بناتے ہو؟ وہی سب جہانوں کا رب ہے ۝۹

مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ﴾ [ الواقعة : ۳۳ ] ''(جنت کے پھل) نہ کبھی ختم ہوں گے اور نہ ان سے کوئی روک ٹوک ہو گی۔'' اور فرمایا: ﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ [ هود : ۱۰۸ ] ''ایسا عطیہ جو قطع کیا جانے والا نہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴾ [ صٓ : ٥٤ ] ''بلاشبہ یقیناً یہ ہمارا رزق ہے، جس کے لیے کسی صورت ختم ہونا نہیں ہے۔''

بعض مفسرین نے اس لفظ کو ''مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا'' (احسان جتانا) سے قرار دے کر مطلب یہ کیا ہے کہ جنت کی نعمتوں کا ان پر احسان نہیں جتایا جائے گا۔ مگر ابن کثیر ﷫ نے فرمایا کہ یہ معنی درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو احسان جتلاتا ہے اور جتلائے گا اور یہ اس کا حق ہے، کیونکہ ایمان کی ہدایت اور توفیق اس نے عطا فرمائی، فرمایا: ﴿ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ الحجرات : ۱۷ ] ''کہہ دے مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کے لیے ہدایت دی، اگر تم سچے ہو۔'' اور جنتی کہیں گے : ﴿ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴾ [ الطور : ۲۷ ] ''پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں زہریلی لُو کے عذاب سے بچالیا۔''

آیت 9 ① قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ ...... : مشرکین کا آخرت کا انکار ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس پر قادر ہونے، بلکہ ہر چیز پر قادر ہونے کے دلائل کا ذکر شروع فرمایا اور دلیل میں ان چیزوں کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا جو ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں اور جن کا خالق وہ خود اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے۔ بات کا آغاز ہمزۂ استفہام، ''إِنَّ'' اور لام کی تاکید کے ساتھ ہوا ہے۔ اس میں ان کے شرک پر تعجب اور ڈانٹ بھی ہے اور اس بات کا اظہار بھی کہ یقیناً تم شرک کی کمینی حرکت کرتے ہو، حالانکہ کوئی عقل مند سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی انسان زمین و آسمان کے خالق کے ساتھ کفر کرے گا اور اس کے ساتھ شریک بنائے گا۔ تعجب اور ڈانٹ کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان کی تخلیق کی تاریخ بھی بیان فرما دی ہے۔ ہمزۂ استفہام اور تاکید کے دونوں حرفوں کو ملحوظ رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے: ''کہہ کیا بے شک تم واقعی اس کا انکار کرتے ہو......۔''

② لَتَكْفُرُوْنَ : یہاں ماضی کا صیغہ '' كَفَرْتُمْ '' (تم نے انکار کیا) لانے کے بجائے فعل مضارع ''لَتَكْفُرُوْنَ'' کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ صرف یہ نہیں کہ تم اس سے پہلے کفر کر بیٹھے جو کر بیٹھے، بلکہ اتنے دلائل دیکھ اور سن کر بھی کفر سے باز نہیں آئے، بلکہ کفر کرتے ہی چلے جاتے ہو۔

③ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ : جب زمین و آسمان کو پیدا فرمایا اس وقت سورج کا وجود ہی نہیں تھا جس سے دن

وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۝۱۰

اور اس نے اس میں اس کے اوپر سے گڑے ہوئے پہاڑ بنائے اور اس میں بہت برکت رکھی اور اس میں اس کی غذائیں اندازے کے ساتھ رکھیں، چار دن میں، اس حال میں کہ سوال کرنے والوں کے لیے برابر (جواب) ہے۝۱۰

رات وجود میں آتے ہیں، تو پھر دو دنوں سے کیا مراد ہے؟ اس کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف کی آیت (۵۴) کی تفسیر۔

آیت 10 ❶ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ : "رَوَاسِيَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۱۹) اور سورۂ انبیاء (۳۱)۔

❷ مِنْ فَوْقِهَا : اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پورے کے پورے زمین کے اندر گاڑ دینے کے بجائے ان کا ایک حصہ زمین کے اوپر رکھا۔ اس میں بے شمار حکمتیں اور آدمی کے لیے فائدے ہیں، کیونکہ اگر پہاڑ پورے ہی زمین کے اندر ہوتے تو آدمی برف کے ان ذخیروں سے فیض یاب نہ ہو سکتا جو پہاڑ محفوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی جنگلوں اور دریاؤں کے یہ سلسلے ہوتے۔ اس کے علاوہ بے شمار سونے، چاندی اور دوسری دھاتوں، گیسوں اور ہیرے جواہرات سے محروم رہتا جو وہ پہاڑوں کے زمین سے اوپر ہونے کی وجہ سے نکالتا ہے۔

❸ وَ بٰرَكَ فِيْهَا : یعنی اس میں خیر کی بے شمار اشیاء کے خزانے رکھ دیے، جن میں درخت اور پودے بھی شامل ہیں۔ مٹی، پتھر، دھاتیں، گیسیں اور دوسرے وہ بے شمار عناصر بھی جو زمین میں موجود ہیں۔ چرند پرند، درندے اور آبی جانور بھی، پوری زمین کو گھیرے ہوئے ہوا بھی اور اس کے تقریباً ستر (۷۰) فی صد حصے پر مشتمل پانی بھی، جن پر زندگی کا دارومدار ہے اور جن پر ہزاروں لاکھوں سال گزرنے کے باوجود کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ ہر دن نئی سے نئی برکت کا ظہور ہوتا ہے۔ بتاؤ، اللہ کے سوا کون ہے جس نے ان میں سے ایک چیز ہی پیدا کی ہو، جس کی وجہ سے تم نے اسے اپنا حاجت روا اور خدا بنا لیا؟

❹ وَ قَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا : "اَقْوَاتٌ" "قُوْتٌ" کی جمع ہے، غذا، خوراک اور روزی۔ زمین کی غذاؤں سے مراد اس میں رہنے والی تمام مخلوقات کی غذائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے اس کے حسب حال اس کی ضرورت کے مطابق پورے اندازے کے ساتھ رکھ دیں، کسی مخلوق کی غذا کی کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھیے سورۂ حجر (۱۹ تا ۲۱)۔

❺ فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ : یہاں ایک سوال ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش چھ دنوں میں ہوئی ہے۔ (دیکھیے اعراف: ۵۴۔ یونس: ۳۔ ہود: ۷۔ فرقان: ۵۹۔ سجدہ: ۴۔ ق: ۳۸۔ حدید: ۴) جب کہ ان آیات سے ان کی پیدائش آٹھ دنوں میں ظاہر ہو رہی ہے، اس لیے کہ پہلے زمین کو دو دنوں میں پیدا کرنے کا ذکر فرمایا، پھر چار دنوں میں اس کے اوپر پہاڑ گاڑنے اور اس میں غذائیں رکھنے کا ذکر فرمایا، اس کے بعد والی آیات میں دو دنوں میں آسمانوں کو پورا کرنے کا ذکر فرمایا، تو یہ کل آٹھ دن بنتے ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ زیر تفسیر آیت میں مذکور "اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ" (چار دن) میں پہلے دو دن بھی شامل ہیں، یعنی زمین کی پیدائش اور اس میں پہاڑ گاڑنے اور غذائیں رکھنے کا کام کل چار دن میں ہوا۔ اس

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ ⑪ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا

**پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ ایک دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ آؤ خوشی سے یا مجبوری سے۔ دونوں نے کہا ہم خوشی سے آ گئے ⑪ تو اس نے انھیں دو دنوں میں سات آسمان پورے بنا دیا اور ہر آسمان میں اس کے کام کی وحی فرمائی اور ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت دی اور خوب محفوظ کر دیا۔ یہ**

کے بعد دو دنوں میں آسمانوں کی پیدائش کا کام پورا ہوا، یہ کل چھ دن بنتے ہیں۔ مفسر شنقیطی نے فرمایا: ''اس آیت کی یہ تفسیر جو ہم نے کی ہے اس کے علاوہ کوئی تفسیر کسی طرح بھی درست نہیں۔''

⑥ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے روزی کا سوال کرنے والوں کے لیے، خواہ وہ زبان حال سے مانگیں یا زبان قال سے، ان کی خوراکیں پورے اندازے کے ساتھ زمین میں رکھ دی ہیں اور اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ مزید دیکھیے سورۂ ابراہیم کی آیت (۳۴): ﴿وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ﴾ کی تفسیر۔ زمین و آسمان کی تمام مخلوق اپنی ہر ضرورت کا سوال اللہ تعالیٰ سے کر رہی ہے اور وہ ہر لمحے اسے پورا کر رہا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ﴾ [الرحمٰن: ۲۹] ''اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔''

**آیت 11** ① ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ......: ''اسْتَوٰی'' کے بعد ''اِلٰی'' ہو تو اس کا معنی قصد کرنا ہوتا ہے۔ یعنی پھر اللہ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی، وہ اس وقت دھویں کی صورت میں تھا، تو اسے یعنی آسمان اور زمین دونوں سے کہا ''ائْتِیَا'' (آ جاؤ) یعنی میرے حکم کی اطاعت کرو، خوشی سے کرو یا مجبوری سے، ہر حال میں کرنا پڑے گی۔

② قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ: ان دونوں نے کہا، ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں جو چیزیں طبعی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں، مثلاً فرشتے اس کے حکم کے بغیر کوئی بات کرتے ہیں نہ کوئی کام، اسی طرح سورج، چاند، ستارے، بادل، ہوائیں، سمندر، نباتات اور حیوانات و جمادات، غرض ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چل رہی ہے، ذرہ برابر ادھر ادھر نہیں ہوتی، تو یہ سب چیزیں مجبور ہو کر نہیں بلکہ اپنی رضا اور خوش دلی سے مالک کے حکم پر چل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی اسلام (فرماں برداری اور اطاعت) بنائی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اپنے رب کے احکام سننے، سمجھنے، ان کا جواب دینے اور ان پر عمل کرنے کی پوری سمجھ رکھتی ہے، خواہ ہم اسے ''لَا یَعْقِلُ'' (بے سمجھ) خیال کرتے رہیں، کیونکہ لفظ ''طَآىِٕعِیْنَ'' (جمع مذکر سالم) عربی لغت میں ذوی العقول کے لیے آتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کی گفتگو یا تسبیح نہ سمجھ سکیں۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴۴)۔

**آیت 12** ① فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ: یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کو جو دخان کی صورت میں تھا، دو دنوں میں پورے سات آسمان بنا دیا۔

السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۱۲﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾

اس کا اندازہ ہے جو سب پر غالب، سب کچھ جاننے والا ہے ⑫ پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دے میں نے تمھیں ایک ایسی کڑک سے خبردار کر دیا جو عاد اور ثمود کی کڑک جیسی ہوگی ⑬

② وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا : یعنی کائنات کے اس نظام میں ہر آسمان کی اور اس میں رہنے والی ہر مخلوق کی جو ذمہ داری تھی وہ اس کی طرف وحی فرما دی کہ تمھیں یہ کام کرنا ہے اور اس طرح کرنا ہے۔

③ وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَ حِفْظًا : " حِفْظًا " " حَفِظْنَاهَا " کا مفعول مطلق ہے جو یہاں مقدر ہے، اور اس کا عطف لفظ مقدر " زِيْنَةً " پر ہے جو "زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا" کا مفعول مطلق ہے۔ گویا اصل جملہ یہ تھا: " وَ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ زِيْنَةً وَ حَفِظْنَاهَا بِهَا حِفْظًا." لفظ "زَيَّنَّا" کی دلالت کی وجہ سے " زِيْنَةً " کو حذف کر دیا اور "حِفْظًا" کی دلالت کی وجہ سے "حَفِظْنَاهَا" کو حذف کر دیا۔ اس طرح نہایت خوب صورتی کے ساتھ ایک لمبی بات مختصر لفظوں میں سمیٹ دی۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے اور اسے احتباک کہتے ہیں۔ (بقاعی) "حِفْظًا" کے مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا گیا ہے "خوب محفوظ کر دیا۔" اس زینت و حفاظت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۂ حجر (۱۶ تا ۱۸)، صافات (۶ تا ۱۰) اور سورۂ ملک (۵)۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ان آیات میں اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر غائب کے صیغے "بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ" کے ساتھ کیا ہے، "زَيَّنَّا السَّمَآءَ" میں متکلم کے صیغے کے ساتھ اور "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ" میں پھر غائب کے ساتھ فرمایا ہے، اسے التفات کہتے ہیں، اس سے کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے اور کئی حکمتیں بھی ملحوظ ہوتی ہیں۔

④ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ : یہ سب اس ہستی کا اندازہ اور مقرر کردہ نظام ہے جو عزت و علم کے ساتھ پوری طرح موصوف ہے۔ وہ سب پر غالب ہے، کوئی اس پر غالب نہیں، وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ گزشتہ، موجودہ یا آئندہ کوئی بھی چیز اس سے مخفی نہیں، اس لیے اس کے اس نظام میں کوئی غلطی، کوئی حادثہ نہیں اور کسی اور کا اس نظام میں ذرہ برابر دخل نہیں۔ سلسلۂ کلام "قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ" سے شروع ہوا تھا اور "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ" پر ختم ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پوری کائنات جس نے چھ دن میں پیدا فرمائی، اس میں موجود ہر چیز حتیٰ کہ تمھیں اور ان چیزوں کو بھی پیدا کیا جنھیں تم نے معبود بنا رکھا ہے، کیا تم اس عظیم ہستی کے ساتھ کفر کرتے ہو اور اس کے ساتھ شریک بناتے ہو جس نے یہ سب کچھ کیا ہے؟

آیت 13 فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ ...... : "صٰعِقَةً" کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ رعد (۱۳)۔ سورت کی

اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَ قَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَ لَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۱۵﴾

جب ان کے پاس ان کے رسول ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے آئے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو، انھوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو ضرور کوئی فرشتے نازل کر دیتا، پس بے شک ہم اس سے جو دے کر تم بھیجے گئے ہو، منکر ہیں ﴿۱۴﴾ پھر جو عاد تھے وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور انھوں نے کہا ہم سے قوت میں کون زیادہ سخت ہے؟ اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے انھیں پیدا کیا، قوت میں ان سے کہیں زیادہ سخت ہے اور وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۱۵﴾

ابتدائی آیات (۴، ۵) میں اللہ کی کتاب سے اکثر لوگوں کے اعراض کا ذکر فرمایا، اس کے بعد چھ دنوں میں زمین و آسمان کی تخلیق کی تفصیل بیان فرمائی، اب فرمایا کہ اگر یہ لوگ اب بھی نہ مانیں کہ معبود برحق صرف ایک ہے، جس نے یہ زمین و آسمان اور ساری کائنات بنائی ہے اور اس حقیقت سے اعراض پر اڑے رہیں، تو ان سے کہہ دیں کہ تم سے پہلے بھی کئی اقوام نے یہ روش اختیار کی جو تم اختیار کر رہے ہو۔ سو میں تمھیں اس جیسے عذاب اور کڑکنے والی بجلی سے ڈراتا ہوں جو تم سے پہلی اقوام عاد و ثمود پر گری تھی۔ عاد و ثمود کے تعارف کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۶۵ تا ۷۹)۔

**آیت 14** ① اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ : دونوں قوموں کی طرف آنے والے دو رسولوں ہود اور صالح علیہما السلام کے لیے جمع کا لفظ استعمال فرمایا ہے، یا مراد دونوں پیغمبروں میں سے ہر ایک کے ساتھ پیغام حق پہنچانے والے مومن بھی ہیں، جنھوں نے ہر طرح اور ہر جانب سے آ کر انھیں اللہ کا پیغام پہنچایا۔ آگے پیچھے سے مراد ہر طرف سے اور ہر طرح سے آ کر سمجھانا ہے، جیسا کہ ابلیس نے کہا تھا: ﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَ عَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَ عَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ ﴾ [ الأعراف : ۱۷ ] ”پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔“

② اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ : ”اَلَّا“ ”أَنْ لَا“ ہے، اس میں ”أَنْ“ تفسیر یہ ہے، یعنی تمام رسولوں کی دعوت یہ تھی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو۔

③ قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ابراہیم (۹، ۱۰) اور سورۂ بنی اسرائیل (۹۴، ۹۵)۔

**آیت 15** ① فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ...... : اللہ تعالیٰ نے قومِ عاد کو ایسے لمبے قد، جسمانی قوت اور دنیوی

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَ هُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

تو ہم نے ان پر ایک سخت تند ہوا چند منحوس دنوں میں بھیجی، تاکہ ہم انھیں دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب چکھائیں اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ رسوا کرنے والا ہے اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی ﴿۱۶﴾

ترقی کے اسباب عطا فرمائے تھے کہ اس کے فرمان کے مطابق اس جیسی کوئی قوم پیدا ہی نہیں کی گئی، فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴾ [ الفجر : ۶ تا ۸ ] ”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کس طرح کیا۔ (وہ عاد) جو ارم (قبیلہ کے لوگ) تھے، ستونوں والے۔ وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔“ اور فرمایا: ﴿ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۙ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۚ وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۱۲۸ تا ۱۳۰ ] ”کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک یادگار بناتے ہو؟ اس حال میں کہ لاحاصل کام کرتے ہو۔ اور بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہو، شاید کہ تم ہمیشہ رہو گے۔ اور جب تم پکڑتے ہو تو بہت بے رحم ہو کر پکڑتے ہو۔“ جب ہود علیہ السلام نے انھیں توحید کی دعوت دی تو انھوں نے یہ جان لینے کے باوجود کہ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں، محض اپنی بڑائی اور سرداری کے گمان میں انھیں جھٹلا دیا، کیونکہ انھیں رسول ماننے کی صورت میں ان کی اطاعت اختیار کرنا پڑتی تھی، جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔

② وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً: جب ہود علیہ السلام نے انھیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو وہ کہنے لگے کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے جس سے ہم خوف کھائیں؟ ہم آنے والا ہر عذاب ہٹا سکتے ہیں۔ آج کل بھی ملحد لوگ آسمانی آفات کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”ان کے جسم بڑے بڑے ہوتے تھے، بدن کی قوت پر غرور آیا، غرور کا دم بھرنا اللہ کے ہاں وبال لاتا ہے۔“ (موضح)

③ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ ...... : ”اَوَ لَمْ يَرَوْا“ کا معنی ”اَوَ لَمْ يَعْلَمُوْا“ ہے، یہ رؤیت علمی ہے۔ یعنی کیا انھیں معلوم نہ تھا کہ وہ کتنی قوت والے سہی، اس اللہ سے زیادہ قوت والے نہیں ہو سکتے جس نے انھیں پیدا کیا؟ یقیناً انھیں یہ معلوم تھا، استفہام انکاری ہے۔

④ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ: ”جُحُوْدٌ“ کا معنی ”جاننے کے باوجود انکار کرنا“ ہے۔ یعنی دل میں ان کا حق ہونا سمجھتے تھے، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کرتے چلے جاتے تھے۔ آیات سے مراد انبیاء پر نازل ہونے والی آیات بھی ہیں، ان کے معجزات بھی اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی پھیلی ہوئی بے شمار نشانیاں بھی۔

**آیت 16** ① فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا: ”صَرْصَرًا“ ”صِرٌّ“ (صاد پر کسرہ) سے ہے، سردی کی شدت جو بدن سکیڑ کر رکھ دے، یعنی شدید ٹھنڈی ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ ﴾ [ آل عمران : ۱۱۷ ]

وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾

اور جو ثمود تھے تو ہم نے انھیں سیدھا راستہ دکھایا مگر انھوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنے کو پسند کیا تو انھیں ذلیل کرنے والے عذاب کی کڑک نے پکڑ لیا، اس کی وجہ سے جو وہ کماتے تھے ﴿۱۷﴾

''اس ہوا کی مثال جیسی ہے جس میں سخت سردی ہے۔'' یا ''صَرَّةٌ'' سے ہے، جس کا معنی ''خوفناک چیخ'' ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ ﴾ [ الذاریات : ۲۹ ] ''تو اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی۔'' یہاں دونوں معنی اکٹھے ملحوظ ہیں کہ وہ ہوا نہایت ٹھنڈی اور خوفناک چیخ جیسی آواز والی تھی۔ ''صَرْصَرًا'' میں حروف مکرر ہونے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے، یعنی ہم نے ان پر نہایت خوفناک آواز والی شدید ٹھنڈی تیز و تند آندھی بھیجی اور اسی ہوا کو جو ان کی زندگی کے قیام اور دل کی راحت کا باعث تھی اور جسے وہ بالکل معمولی اور بے ضرر سمجھتے تھے، ان کی ہلاکت کا سامان بنا دیا اور ان کی کوئی قوت انھیں بچا نہ سکی۔

② فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ : ''نَحِسَاتٍ'' ''نَحْسٌ'' (نون کے فتحہ اور حاء کے سکون کے ساتھ) کی جمع ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴾ [ القمر : ۱۹ ] ''ایسے دن میں جو دائمی نحوست والا تھا۔'' ''نَحْسٌ'' اور ''مَنْحُوْسٌ'' (بدقسمتی والا) ''سَعْدٌ'' (خوش قسمتی والا) کی ضد ہے۔ فی الحقیقت اپنی ذات میں کوئی چیز منحوس نہیں، یہ صرف اضافی چیز ہے، یعنی ایک ہی شے کسی کے حق میں خوش قسمتی کا باعث ہوتی ہے اور کسی کے حق میں بدقسمتی کا، جیسا کہ آندھی کے یہ ایام قوم عاد کے حق میں منحوس تھے مگر ہود علیہ السلام اور ایمان والوں کے لیے ان دنوں سے زیادہ خوش قسمتی والا دن اور کون سا ہو گا۔ اس آندھی کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۲)، قمر (۱۸ تا ۲۰)، ذاریات (۴۱، ۴۲) اور سورۂ حاقہ (۶ تا ۸)۔ بعض مسلمان کہلانے والے بھی بعض دنوں کو منحوس سمجھتے ہیں، جیسے دس محرم، کیونکہ اس میں حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، حالانکہ اس دس محرم کو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی، جس کی خوشی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھتے تھے۔ بعض لوگ صفر کے کچھ دنوں کو منحوس سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا عقیدہ باطل ہے۔

③ لِنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : یہ ذلت و رسوائی ان کے غرور اور تکبر کا جواب تھا کہ وہی زمین جس پر وہ بڑے بنے ہوئے تھے اسی پر ان کے بے جان لاشے کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح گرے پڑے تھے۔

④ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى ...... : یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ رسوائی والا ہے، اس لیے کہ وہ تمام پہلے اور پچھلے لوگوں کے سامنے ہو گا، پھر دنیا میں تو ظاہری اسباب کے ساتھ شاید کوئی مدد کے لیے پہنچ جائے، وہاں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر دنیا کی رسوائی تو ایک وقت تک ہے، جب کہ وہاں کی رسوائی ہمیشہ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھے۔ آمین!

آیت 17 ① وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ ...... : قوم ثمود کے تعارف کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۳ تا ۷۹)۔ ہدایت کی

وَ نَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَ يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾

ع ۲ / ۱۶

اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے ﴿۱۸﴾ اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، پھر ان کی الگ الگ قسمیں بنائی جائیں گی ﴿۱۹﴾

تفسیر کے لیے سورۂ فاتحہ کی آیت: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ یعنی ہم نے انھیں راہِ حق دکھا دیا، مگر انھوں نے ہدایت قبول کرنے کے بجائے اندھا اور گمراہ رہنے کو ترجیح دی۔

② فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ.....: "اَلْهُوْنِ" اور "اَلْهَوَانُ" معنی ذلت، یہ مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے۔ ثمود پر آنے والے عذاب کو کہیں "الرَّجْفَةُ" (زلزلہ) کہا گیا ہے، کہیں "الصَّيْحَةُ" (سخت چیخ) یہاں اسے بجلی کی کڑک کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک سخت چیخ تھی جس میں بجلی کی کڑک اور شعلہ تھا، ساتھ ہی شدید زلزلہ تھا جس سے ان کے جگر پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ یہ ذلت کا عذاب ان کے اعمال بد کا انجام تھا۔

آیت 18 وَ نَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا......: یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب قدرت ہے کہ اتنے شدید عذاب، زلزلے، خوف ناک چیخ اور بجلیاں چمکنے اور گرنے کے باوجود کسی مسلمان کا بال تک بیکا نہیں ہوا، وہ سب اللہ کے فضل سے صحیح سلامت رہے۔

آیت 18 ① وَ يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ: لفظ "يَوْمَ" "اُذْكُرْ" کا مفعول ہے جو یہاں مقدر ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ واؤ کا عطف کس پر ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس سے پہلے انبیاء کو جھٹلانے والے منکرین پر دنیا میں آنے والے عذابوں کا ذکر فرمایا تھا، اب آخرت میں ان کے ہونے والے حال کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ آخرت کا حال یاد دلانے والے اس جملے کا عطف اس مقدر جملے پر ہے جس میں ان پر دنیا میں آنے والے عذاب یاد دلائے گئے ہیں۔ گویا اصل عبارت یہ تھی: " اُذْكُرْ أَيَّامَ أَعْدَاءِ اللّٰهِ فِي الدُّنْيَا فِيْ إِنْزَالِ الْعَذَابِ لَهُمْ وَاذْكُرْ يَوْمَ يُحْشَرُوْنَ إِلَى النَّارِ." یعنی "انھیں اللہ کے دشمنوں پر دنیا میں آنے والے عذابوں کی یاد دہانی کروا اور انھیں وہ دن یاد دلا جب وہ آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔"

آیات کی ابتدا میں آنے والی واؤ عاطفہ کی مناسبت ہر جگہ " نَظْمُ الدُّرَرِ فِيْ تَنَاسُبِ الْآيَاتِ وَالسُّوَرِ " کے مصنف نے نہایت عمدہ بیان فرمائی ہے۔ میں نے اختصار کے پیشِ نظر صرف چند ایک مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے، اصحابِ ذوق اصل کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

② فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ: " وَزَعَ يَزَعُ " کا اصل معنی روکنا، ترتیب دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے دشمنوں کو آگ کی طرف اکٹھا کرکے لے جایا جائے گا اور انھیں اس طرح اکٹھا کیا جائے گا کہ آگے والوں کو آگے جانے سے اور پیچھے والوں کو پیچھے جانے سے روک کر اکٹھا کر لیا جائے گا، پھر ان کی الگ الگ ترتیب لگائی جائے گی، ان کے جرائم کے مطابق ان کی

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

یہاں تک کہ جوں ہی اس کے پاس پہنچیں گے ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۲۰﴾ اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا اور اسی نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو ﴿۲۱﴾ اور تم اس سے پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمھارے خلاف تمھارے کان گواہی دیں گے اور نہ تمھاری آنکھیں اور نہ تمھارے چمڑے اور لیکن تم نے گمان کیا کہ بے شک اللہ بہت سے کام، جو تم کرتے ہو، نہیں جانتا ﴿۲۲﴾

ٹولیاں بنائی جائیں گی اور انھیں دھکیل کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۱۹) اور سورۂ صافات (۲۲ تا ۲۶)۔

**آیت 20** حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ ...... : زمخشری نے فرمایا: "اِذَا" کے بعد لفظ "مَا" اس کی تاکید کے لیے ہے، تاکید کا مطلب یہ ہے کہ آگ کے پاس پہنچنے کا وقت ہی ان پر شہادت کا وقت ہوگا، یہ نہیں کہ کچھ وقت شہادت سے خالی ہو۔" (کشاف) اس لیے میں نے "اِذَا مَا" کا ترجمہ "جوں ہی" کیا ہے۔ یعنی آگ کے پاس پہنچنے پر جب وہ اپنے جرائم سے انکار کریں گے تو فوراً ہی ان کے کان، آنکھیں اور چمڑے ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ اس کی تفصیل سورۂ یٰس کی آیت (۶۵): ﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ ﴾ میں گزر چکی ہے۔

**آیت 21** ① وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا: اپنے چمڑوں سے یہ بات وہ پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ تعجب کے اظہار اور ملامت کے لیے کہیں گے کہ تمھی کو بچانے کے لیے تو ہم اللہ تعالیٰ سے جھوٹ بول رہے تھے اور تمھی ہمارے خلاف شہادت دے رہے ہو۔

② قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ: اعضا ان کے تعجب اور ملامت دونوں کا جواب دیں گے۔ تعجب کا جواب تو یہ دیں گے کہ ہمارا بولنا کوئی تعجب کی بات نہیں، زبان بولتی تھی تو اللہ کے حکم سے اور اس کے گویائی عطا کرنے سے بولتی تھی، اسی طرح ہر بولنے والی چیز اسی کے حکم سے بولتی ہے، تو اب اس نے ہمیں بلوا دیا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

③ وَ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: یہ چمڑوں کا کلام بھی ہو سکتا ہے اور آخرت کے منکروں سے اللہ تعالیٰ کا خطاب بھی ہو سکتا ہے۔

**آیت 22** ① وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ ...... : یہ ان کی ملامت کا جواب ہے کہ تم گناہ کا کام

وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور یہی تمھارا گمان تھا جو تم نے اپنے رب کے بارے میں کیا، اسی نے تمھیں ہلاک کر دیا، سو تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گئے ﴿۲۳﴾

---

کرتے ہوئے لوگوں سے چھپنے اور پردہ کرنے کا تو پورا اہتمام کرتے تھے، مگر تمھیں اس بات کا خوف نہ تھا کہ تمھارے کان، آنکھیں اور چمڑے ہی تمھارے خلاف تمھارے اعمالِ بد کی شہادت دیں گے۔ اگر تمھیں اس بات کا خوف ہوتا تو تم برے اعمال کر ہی نہیں سکتے تھے، کیونکہ انھی اعضا کے ساتھ ہی تو تم نے اللہ کی نافرمانی کرنا تھی۔

② وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ ...... : یعنی بات صرف اتنی نہ تھی کہ تمھیں یقین نہ تھا کہ قیامت قائم ہو سکتی ہے اور تمھارے اعضا تمھارے خلاف گواہی دے سکتے ہیں، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ تم اللہ تعالیٰ کے علم کے بھی منکر تھے، تم نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے بہت سے اعمال کو جانتا ہی نہیں۔ ورنہ اگر تمھیں یقین ہوتا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے، تمھاری ہر بات سن رہا ہے اور تمھارے ہر حال کا علم رکھتا ہے تو تم گناہ پر اتنے دلیر نہ ہوتے۔ مشرکینِ قریش کی اس نادانی کا ذکر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں: (( اِجْتَمَعَ عِنْدَ الْبَيْتِ قُرَشِيَّانِ وَثَقَفِيٌّ، أَوْ ثَقَفِيَّانِ وَ قُرَشِيٌّ، كَثِيْرَةٌ شَحْمُ بُطُوْنِهِمْ، قَلِيْلَةٌ فِقْهُ قُلُوْبِهِمْ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَتُرَوْنَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْمَعُ مَا نَقُوْلُ؟ قَالَ الْآخَرُ يَسْمَعُ إِنْ جَهَرْنَا وَلَا يَسْمَعُ إِنْ أَخْفَيْنَا، وَ قَالَ الْآخَرُ إِنْ كَانَ يَسْمَعُ إِذَا جَهَرْنَا فَإِنَّهُ يَسْمَعُ إِذَا أَخْفَيْنَا، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ : ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، سورة حمٓ السجدة، باب : ﴿ وذلكم ظنكم الذي ...... ﴾ : ۴۸۱۷ ] "بیت اللہ کے پاس دو قریشی اور ایک ثقفی یا دو ثقفی اور ایک قریشی جمع ہوئے، جن کے پیٹ کی چربی بہت تھی، (مگر) دلوں کی سمجھ بہت کم تھی۔ تو ان میں سے ایک نے کہا: "کیا تمھارا خیال ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے اللہ تعالیٰ سن رہا ہے؟" دوسرے نے کہا: "اگر ہم اونچی آواز سے کہیں تو وہ سنتا ہے اور اگر آہستہ کہیں تو نہیں سنتا۔" ایک اور بولا: "اگر وہ اس وقت سنتا ہے جب ہم اونچی آواز سے بات کریں تو یقیناً وہ اس وقت بھی سنتا ہے جب ہم آہستہ بات کریں۔" تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار دی: "اور تم اس سے پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمھارے خلاف تمھارے کان گواہی دیں گے اور نہ تمھاری آنکھیں اور نہ تمھارے چمڑے اور لیکن تم نے گمان کیا کہ بے شک اللہ بہت سے کام، جو تم کرتے ہو، نہیں جانتا۔"

یاد رہے کہ اس بات کا مطلب کہ یہ آیت فلاں موقع پر اتری، یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بھی انھی دنوں میں ہوا، یا رسول اللہ ﷺ نے فلاں موقع پر یہ آیت پڑھی، یا یہ کہ وہ آیت اس واقعہ پر بھی منطبق ہوتی ہے، جیسا کہ اصولِ تفسیر میں واضح کیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ آیات کا سیاق تو قیامت کے دن کے متعلق ہے۔

آیت 23 وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ ......: "ذٰلِكُمْ" کی خبر "ظَنُّكُمْ" معرفہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ

فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۱۷

پس اگر وہ صبر کریں تو آگ ان کے لیے ٹھکانا ہے اور اگر وہ معافی کی درخواست کریں تو وہ معاف کیے گئے لوگوں سے نہیں ہیں ﴿۲۴﴾ اور ہم نے ان کے لیے کچھ ساتھی مقرر کر دیے تو انھوں نے ان کے لیے ان کے سامنے اور ان کے پیچھے جو کچھ تھا، خوش نما بنا دیا اور ان پر بات ثابت ہوگئی، ان قوموں کے ساتھ ساتھ جو جنوں اور انسانوں میں سے ان سے پہلے گزر چکی تھیں، بے شک وہ خسارہ اٹھانے والے تھے ﴿۲۵﴾

''یہی تمھارا گمان تھا'' کیا گیا ہے۔ ''أَرْدٰی یُرْدِيْ'' (افعال) ہلاک کرنا۔ یعنی تمھارے اسی باطل گمان اور غلط عقیدے نے کہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے بہت سے اعمال کا علم نہیں ہوتا، تمھیں ہلاک کر دیا، کیونکہ اس سے تم اس کی نافرمانی پر دلیر ہو گئے اور خسارا پانے والوں میں سے ہو گئے۔

یاد رہے کہ گمراہی کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب صحیح غور و فکر نہ کرنا اور محض گمان کے پیچھے چلتے رہنا ہے۔ مشرکین کی اصل گمراہی بھی یہی تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ﴾ [ الأنعام : ۱۱۶ ] ''وہ تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے۔'' اور فرمایا: ﴿ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾ [ آل عمران : ۱۵٤ ] ''وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلیت کا گمان کر رہے تھے۔''

**آیت 24** ﴿ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ...... : یعنی دنیا میں کئی مصیبتیں صبر کرنے سے ٹل جاتی ہیں یا آسان ہو جاتی ہیں اور بعض مصیبتیں منتیں کرنے سے ٹل جاتی ہیں، لیکن وہاں کافر صبر کریں یا نہ کریں ان کے لیے جہنم ٹھکانا طے ہو چکا اور منتیں جتنی چاہیں کریں کوئی قبول نہیں ہوگی۔

**آیت 25** ﴿ ① وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ ......: ''قُرَنَآءَ'' ''قَرِيْنٌ'' کی جمع ہے، ساتھ رہنے والا۔ ''اَلْقَيْضُ'' انڈے کے چھلکے کو کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح چھلکا انڈے کے ساتھ پیوست ہوتا ہے اسی طرح ہم نے ایسے برے لوگ ان مشرکین کے ساتھ لگا دیے جو ان کے ساتھ اس طرح چمٹے رہتے ہیں جس طرح انڈے کا چھلکا چمٹا رہتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اگر انسان برا ہو تو اسے ساتھی بھی برے میسر آتے ہیں، جو اسے سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان برائیوں میں مگن ہو جاتا ہے اور آخر کار خود کو اپنے ساتھیوں سمیت لے ڈوبتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ زخرف (۳۶) اور سورۂ ق (۲۳ تا ۲۹)۔

② فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ ...... : ''مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ'' سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ دنیا میں کر رہے تھے اور ''وَ مَا خَلْفَهُمْ'' سے مراد وہ اعمالِ بد ہیں جو اس سے پہلے کر چکے تھے۔ یعنی وہ برے ساتھی ان کے لیے ان کے موجودہ اور

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو ﴿۲۶﴾

گزشتہ تمام برے اعمال کو خوش نما بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ انھی پر جمے رہتے ہیں اور ان لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صادق آتا ہے: ﴿ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ هود : ۱۱۹ ] ”میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا۔“

بعض مفسرین نے ”مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ“ سے مراد دنیا اور ”وَ مَا خَلْفَهُمْ“ سے مراد آخرت لی ہے۔ یعنی ان کے برے ساتھی آخرت کے متعلق بھی انھیں خوش گمانی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ اول تو وہ ہوگی ہی نہیں اور اگر ہوئی بھی تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھیں دنیا میں نعمتوں سے نوازا ہے وہاں بھی نوازے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ مریم (۷۷)۔

آیت 26 : ❶ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا ... : کفار قرآن کی تاثیر سے واقف تھے کہ جو شخص عناد سے خالی ہو کر اسے سن لے وہ یقیناً اس سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ نہ خود قرآن سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ یہ ان کا واضح اعترافِ شکست تھا، وہ اس جیسی ایک سورت بھی بنا کر نہ لا سکے تو حق یہ تھا کہ اس پر ایمان لے آتے، مگر وہ اس کی مخالفت پر ڈٹ گئے اور ہر طریقے سے لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔

❷ لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ : یعنی پہلی کتابیں پڑھنے سننے پر کوئی پابندی نہیں، کیونکہ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ قرآن جو محمد (ﷺ) لے کر آئے ہیں، یہ مت سنو، کیونکہ یہ دلوں کو کھینچتا ہے۔

❸ وَالْغَوْا فِيْهِ : ”اَلْغَوْا“ ”لَغِيَ يَلْغَى“ (س، ف) بغیر سوچے سمجھے بولنا، شور مچانا۔ یعنی اگر کبھی سننے کا اتفاق ہو تو اس میں شور ڈال دو، تاکہ تم غالب رہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مان رہے تھے کہ اگر نبی ﷺ یا مسلمان قرآن سنانے میں کامیاب ہو گئے تو وہی غالب رہیں گے۔ عربی مقولہ ہے: ” وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ “ ”اصل برتری وہ ہے جس کی شہادت دشمن دیں۔“ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس بات کے برعکس فرمایا: ﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ۲۰۴ ] ”اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“ یعنی جعلی غلبے کے بجائے حقیقی رحمت کے طلب گار ہو۔

❹ کفار کی یہ بدتمیزی صرف اس وقت نہیں تھی جب رسول اللہ ﷺ انھیں قرآن سنانے کی کوشش کرتے، بلکہ جب آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کو قرآن سنا رہے ہوتے، یا انھیں نماز پڑھاتے ہوئے بلند آواز سے قراءت کرتے تو وہ اس وقت بھی بدزبانی اور گالی گلوچ شروع کر دیتے، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۱۱۰ ] ”اور اپنی نماز نہ بلند آواز سے پڑھ اور نہ اسے پست کر اور اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کر۔“ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی اسی آیت کی تفسیر۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو یقیناً ہم ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، ضرور بہت سخت عذاب چکھائیں گے اور یقیناً ہم انھیں ان بدترین اعمال کا بدلا ضرور دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۲۷﴾ یہ اللہ کے دشمنوں کی جزا آگ ہی ہے، انھی کے لیے اس میں ہمیشہ رہنے کا گھر ہے، اس کی جزا کے لیے جو وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہیں گے اے ہمارے رب! تو ہمیں جنوں اور انسانوں میں سے وہ دونوں دکھا جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا، ہم انھیں اپنے قدموں کے نیچے ڈالیں، تاکہ وہ سب سے نچلے لوگوں سے ہو جائیں ﴿۲۹﴾

**آیت 27** ① **فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا** : چونکہ یہ ان کا صریح ظلم اور عناد تھا اور ان کی ہدایت کی امید ہی نہ تھی، اس لیے عبرت ناک سزا اور عذاب کے سوا ان کی کوئی جزا نہ تھی۔ "**فَلَنُذِيْقَنَّ**" کی فا تعلیل کے لیے ہے، یعنی ان کے قرآن سننے سے روکنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب چکھائیں گے۔

② "فَلَنُعَذِّبَنَّ" (ہم انھیں ضرور عذاب دیں گے) کے بجائے "**فَلَنُذِيْقَنَّ**" (ہم انھیں ضرور چکھائیں گے) کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ جو چیز چکھی جاتی ہے وہ معمولی سی زبان پر لگتی ہے، تو جس کا معمولی سا لگنا اتنا سخت ہوگا وہ پورا عذاب کس قدر سخت ہوگا۔

③ **وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** : کفار نے اگرچہ بے شمار گناہ کیے ہوں گے، مثلاً چوری، زنا وغیرہ، مگر ان کے سب سے برے اعمال کفر و شرک اور دوسروں کو ایمان سے روکنا تھے۔ چنانچہ انھیں ملنے والی سزا کفر و شرک اور ایمان سے روکنے کے پیمانے کے مطابق ہوگی، جس کے مقابلے میں دوسرے گناہوں کی سزا کی کچھ حقیقت نہیں ہوگی۔

**آیت 28** ① **ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ......** : اللہ کے دشمنوں کی یہی جزا، یعنی آگ ہے، جنھوں نے کفر و شرک کیا، زبان اور ہاتھ کو ہر طرح سے اس کی کتاب سننے سے روکا، اس کے نبی اور ایمان والوں کا مقابلہ کیا، ان سے جنگ کی اور دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

② **بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ** : یعنی اس جزا کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ ہماری آیات حق ہیں، پھر جان بوجھ کر ضد اور عناد کی وجہ سے ان کا انکار کرتے تھے، پھر اللہ ایسے دشمنوں کو سزا دینے میں کیوں کمی کرے گا؟ "جُحُوْدٌ" کا معنی جانتے ہوئے انکار کرنا ہے۔

**آیت 29** ① **وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَاۤ اَرِنَا......**: اس سے پہلے آیت (۲۵): ﴿وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ ......﴾ میں

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا

بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا ہمارا رب صرف اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور

کفار کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان پر جن و انس کے وہ قرین مسلط کرنے کا ذکر ہے جو ان کے لیے ان کے برے اعمال خوش نما بنا کر پیش کرتے رہے، حتیٰ کہ ان پر جہنمی ہونے کا ٹھپا پکا ہو گیا۔ اب جہنم میں کفار کی اپنے ان دوستوں سے متعلق خواہش اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کا ذکر ہے۔

❷ کفار یہ بات جہنم میں جانے کے بعد کہیں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ماضی کا صیغہ "قَالَ" استعمال فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بات اتنی یقینی ہے کہ سمجھو یہ کام ہو چکا۔

❸ قیامت کے دن جہنمی اپنے گمراہ کرنے والے جن و انس میں سے شیاطین دوستوں پر سخت ناراض ہوں گے اور ان کی خواہش ہوگی کہ انھیں زیادہ سے زیادہ عذاب ہو۔ "اَرِنَا" کا لفظی معنی اگرچہ "ہمیں دکھا" ہے، مگر مراد یہ ہے کہ پروردگارا! تو انھیں ہمارے حوالے کر، تاکہ ہم انھیں اپنے قدموں کے نیچے روندیں، تاکہ وہ سب سے نچلے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہر کافر خود گمراہ ہونے کے ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا مجرم بھی ہے۔ کفار کی یہ خواہش پوری ہوگی یا نہیں، اس کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۳۸، ۳۹) اور سورۂ ص (۵۵ تا ۶۱)۔

❹ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن صرف ایمان والوں کی دوستی باقی رہے گی، دوسرے سب ایک دوسرے میں سے دشمن ہو جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷) اور سورۂ زخرف (۶۸)۔

**آیت 30** ❶ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا ... : کفار کے برے عقیدہ و عمل کی وجہ سے ان پر جن و انس میں سے شیاطین مسلط کرنے اور ان کے برے انجام کے ذکر کے بعد ایمان اور اس پر استقامت اختیار کرنے والوں کی تائید و نصرت کے لیے فرشتے نازل کرنے کا اور ان کے حسن انجام کا ذکر فرمایا۔

❷ رَبُّنَا اللّٰهُ : "ہمارا رب صرف اللہ ہے" یہ مختصر سا جملہ معانی کا سمندر ہے۔ مبتدا کے بعد خبر معرفہ ہو تو کلام میں حصر پیدا ہو جاتا ہے، کتب بلاغت میں اس کی مشہور مثال "صَدِيْقِيْ زَيْدٌ" ہے، یعنی "میرا دوست صرف زید ہے۔" اس لیے "رَبُّنَا اللّٰهُ" کا معنی ہے "ہمارا رب صرف اللہ ہے۔" یہ بات دل سے کہہ لینے کے بعد آدمی کسی اور کو داتا، دستگیر، گنج بخش، غریب نواز، بگڑی بنانے والا اور ڈوبتوں کو پار لگانے والا نہیں مان سکتا۔ پھر اس کی قولی، بدنی اور مالی عبادت، بلکہ پوری زندگی اور موت صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے، وہ صرف اسی سے مانگتا اور اسی کے حکم پر چلتا ہے۔ جو وہ کہے کرتا ہے، جس سے روک دے رک جاتا ہے۔ عمل میں کوتاہی ہو سکتی ہے اور گناہ کا ارتکاب بھی ہو سکتا ہے، مگر وہ اسی کے دروازے پر رہتا اور اسی سے معافی مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ۬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ

تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾

نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے ﴿۳۰﴾

وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّ ہُوَ رَبُّ کُلِّ شَیۡءٍ﴾ [ الأنعام : ۱٦۱ تا ۱٦٤ ] ''کہہ دے بے شک مجھے تو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر دی ہے، جو مضبوط دین ہے، ابراہیم کی ملت، جو ایک ہی طرف کا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا۔ کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔ کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں، حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے۔''

''رَبُّنَا اللّٰہُ'' کہنے کے بعد کسی اور کی عبادت، اس کا دین یا اس کا بتایا ہوا زندگی گزارنے کا طریقہ اختیار کرنے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اسی لیے کہا ہے ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

''جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو لرز جاتا ہوں، کیونکہ میں ''لا الٰہ'' کی مشکلات کو جانتا ہوں۔''

③ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا: اس میں سین اور تاء مبالغے کے لیے ہے، یعنی پھر اس پر خوب قائم رہے اور موت تک ڈٹے رہے، کوئی خوف یا لالچ انھیں اس عقیدے اور عمل سے نہ پھیر سکا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ [الحجر : ۹۹] ''اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آ جائے۔''

طبری نے اسود بن ہلال سے روایت کی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا﴾ اور فرمایا: ''اس آیت کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟'' لوگوں نے کہا: (( قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا مِنۡ ذَنۡبٍ )) ''انھوں نے ''رَبُّنَا اللّٰہُ'' کہا، پھر گناہ سے بچنے پر ڈٹے رہے۔'' تو انھوں نے فرمایا: (( لَقَدۡ حَمَلۡتُمُوۡہُ عَلٰی غَیۡرِ الۡمَحۡمَلِ ، قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا ثُمَّ لَمۡ یَلۡتَفِتُوۡا إِلٰی إِلٰہٍ غَیۡرِہٖ )) [ طبري : ۳۰۷۷۰ ] ''تم نے اسے اس کے اصل محمل کے غیر پر محمول کیا ہے، مقصد ''قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا'' کا یہ ہے کہ پھر انھوں نے اس کے سوا کسی اور معبود کی طرف جھانک کر نہیں دیکھا۔'' حاکم نے بھی اسے اسود بن ہلال کے طریق سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ دیکھیے مستدرک حاکم میں ''سورۂ حم السجدہ'' کی تفسیر۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: ''قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا عَلٰی أَدَاءِ فَرَائِضِہٖ'' یعنی ''ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا'' کا

مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے فرائض کی ادائیگی پر خوب قائم رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''ثُمَّ اسْتَقَامُوْا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ موت تک توحید پر خوب قائم رہ کر رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتے رہے اور فرائض ادا کرتے رہے، اگر کوئی کوتاہی یا گناہ ہوا بھی ہو تو انھوں نے توحید و سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

④ سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! حَدِّثْنِيْ بِأَمْرٍ أَعْتَصِمُ بِهِ، قَالَ قُلْ رَبِّيَ اللّٰهُ، ثُمَّ اسْتَقِمْ، قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا أَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَيَّ؟ قَالَ فَأَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهِ، ثُمَّ قَالَ هٰذَا )) [ مسند أحمد : ۴۱۳/۳، ح : ۱۵۴۲۵ ] ''یا رسول اللہ! آپ مجھے ایسا کام بتائیں جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کہہ، میرا رب صرف اللہ ہے، پھر اس پر خوب قائم رہ۔'' میں نے کہا: ''یا رسول اللہ! سب سے خوف ناک چیز جس سے آپ میرے بارے میں ڈرتے ہوں، کیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑ کر فرمایا: ''یہ (زبان)۔'' مسند احمد کے محقق حضرات نے اسے صحیح کہا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے، سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قُلْ لِيْ فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا بَعْدَكَ، وَ فِيْ حَدِيْثِ أَبِيْ أُسَامَةَ غَيْرَكَ، قَالَ قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ )) [ مسلم، الإیمان، باب جامع أوصاف الإسلام : ۳۸ ] ''یا رسول اللہ! آپ مجھے اسلام میں ایسی بات بتا دیں کہ میں اس کے متعلق آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کہہ، میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر خوب قائم رہ۔''

اس سے معلوم ہوا کہ '' رَبِّيَ اللّٰهُ '' اور '' آمَنْتُ بِاللّٰهِ '' کا مفہوم ایک ہے اور یہ جامع کلمہ ہے، جس میں اسلام کے تمام ارکان آ گئے ہیں، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ کے صحیح مسلم پر باب کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

⑤ **تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ......** : ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو۔ بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ '' رَبُّنَا اللّٰهُ '' کہہ کر استقامت اختیار کرنے والوں پر فرشتوں کا نزول موت کے وقت ہوتا ہے، پھر قبر میں اور آخر میں حشر کے دن ہوگا، حالانکہ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ ان حضرات کی اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ایمان والوں پر فرشتوں کا نزول نظر نہیں آتا، وہ موت کے وقت نظر آنا شروع ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ وہ نظر نہیں آتے، مگر یقیناً دنیا میں بھی اہل استقامت پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے، جس سے ان کے دلوں میں سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے، ایمان اور میدان میں انھیں استقامت اور ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے اور وہ ان کے دلوں میں نیکی کی رغبت، برائی سے نفرت اور بہترین خیالات پیدا ہونے کا باعث بنتے ہیں، جیسا کہ بدر میں فرشتے نازل ہوئے، فرمایا: ﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [ الأنفال : ۹، ۱۰ ] ''جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی کہ بے شک میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرنے والا ہوں، جو ایک دوسرے کے پیچھے

آنے والے ہیں۔ اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر ایک خوش خبری اور تا کہ اس کے ساتھ تمھارے دل مطمئن ہوں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے۔ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴾ [ الأنفال: ۱۲ ] ''جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں، عنقریب میں ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دوں گا۔ پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ۔''

فرشتے ایمان والوں پر اترتے ہیں مگر ایک آدھ استثنائی صورت کے علاوہ رسول کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے اور جب تک یہ مادی زندگی ختم نہیں ہو جاتی اور مادیت کے پردے چاک نہیں ہو جاتے تب تک فرشتوں کا نزول اسی صورت میں ہوتا ہے۔ البتہ مرنے کے ساتھ ہی جب یہ پردے اور حجاب اٹھ جائیں گے تو فرشتے موت کے وقت، پھر قبر میں، پھر قیامت میں ہر جگہ یقیناً انسانوں کو نظر آئیں گے اور ایمان والوں کو ان الفاظ میں تسلی دیں گے جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔ دنیا میں اگر فرشتے نظر آنا لگ جائیں تو امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، اس لیے یہاں وہ اسی وقت عام لوگوں کو نظر آتے ہیں جب وہ عذاب لے کر آتے ہیں اور امتحان کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر کی آیت (۸) کی تفسیر۔

فرشتوں کا ایمان والوں پر اترنا ایسے ہی ہے جیسے کفار اور خبیث لوگوں پر شیاطین کا نزول ہے کہ وہ ان کے دلوں میں گندے خیالات اور فاسد عقائد ڈالتے اور برائی پر ابھارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴾ [ الشعراء: ۲۲۱ تا ۲۲۳ ] ''کیا میں تمھیں بتاؤں شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر زبردست جھوٹے، سخت گناہ گار پر اترتے ہیں۔ وہ سنی ہوئی بات لا ڈالتے ہیں اور ان کے اکثر جھوٹے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ﴾ [ الأنعام: ۱۲۱ ] ''اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ضرور باتیں ڈالتے ہیں، تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ﴾ [ الأنفال: ۴۸ ] ''اور جب شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے اور کہا آج تم پر لوگوں میں سے کوئی غالب آنے والا نہیں اور یقیناً میں تمھارا حمایتی ہوں۔''

(6) اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا : مفسر عبد الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں: ''یعنی جب فرشتے ڈٹ جانے والوں پر نازل ہوتے ہیں تو انھیں یہ تلقین کرتے ہیں یا ان کے دل میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ باطل کی طاقتیں خواہ کتنی ہی چیرہ دست ہوں ان سے خوف زدہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور حق پرستی کی وجہ سے جو مظالم تم پر ڈھائے جا رہے ہیں ان پر رنج نہ کرو، کیونکہ اللہ نے تمھارے لیے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی سب نعمتیں ہیچ ہیں۔ اور موت کے وقت بھی فرشتے ہر

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲ ع

ہم تمھارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تمھارے دل چاہیں گے اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے ۝۳۱ یہ بے حد بخشنے والے، نہایت مہربان کی طرف سے مہمانی ہے ۝۳۲

مومن سے یہی کلمات کہتے ہیں، اس وقت وہ فرشتوں کو دیکھتا بھی ہے اور ان کی بات سمجھتا بھی ہے، تو اس وقت ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو اس سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ جنت تمھاری منتظر ہے اور دنیا میں جنھیں تم چھوڑ کر جا رہے ہو ان کے لیے بھی رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم تمھارے ولی اور رفیق ہیں۔'' (تیسیر القرآن)

❼ دنیا میں انسانوں کے ساتھ کئی طرح کے فرشتے مقرر ہیں، جن میں کراماً کاتبین بھی ہیں (دیکھیے انفطار ۱۰ تا ۱۲) اور آفات و مصائب سے حفاظت کرنے والے فرشتے بھی۔ (دیکھیے رعد: ۱۱) یہ فرشتے مومن و کافر سب کے ساتھ ہیں، مگر جن فرشتوں کا ان آیات میں ذکر ہے یہ صرف اہلِ ایمان و استقامت کے ساتھ خاص ہیں، انھی پر اترتے ہیں اور انھی کو حوصلہ دیتے، نیکیوں کی رغبت دلاتے اور خیر کا الہام کرتے ہیں۔

**آیت 31** ❶ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ : دنیا میں دوستی یہ کہ ہم تمھارے لیے دعائیں کرتے ہیں (دیکھیے مومن: ۷)، تمھیں نیکی کا الہام کرتے ہیں اور دشمنوں کے مقابلے میں تمھاری مدد کرتے ہیں اور آخرت میں یہ کہ جب متقی لوگوں کے سوا سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے تو ہماری دوستی تمھارے ساتھ قائم رہے گی، ہم آنے والے ہر مرحلے میں تمھارے ساتھی اور مددگار رہیں گے اور تمھیں حفاظت سے جنت میں پہنچائیں گے۔ فرشتے ہر مومن کو اس کی موت کے وقت یہ بشارت دیتے ہیں۔

❷ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ : "مَا تَدَّعُوْنَ" "دَعَا يَدْعُوْ" سے باب افتعال ہے، جو تم طلب کرو گے، مانگو گے۔ جنت کی نعمتوں کے لیے دیکھیے سورۂ سجدہ کی آیت (۱۷) کی تفسیر۔ "مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ" (جو تمھارے دل چاہیں گے) سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ان کی ذاتی خواہش ہوں گی اور "مَا تَدَّعُوْنَ" (جو تم مانگو گے) کا لفظ عام ہے، اس میں ذاتی خواہش کی اشیا بھی شامل ہیں اور وہ بھی جو ان کی ذاتی خواہش نہیں بلکہ مثال کے طور پر کسی اور کی خاطر طلب کریں گے۔ (ابو السعود)

**آیت 32** نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ سجدہ کی آیت (۱۹) کی تفسیر۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝۳۳

اور بات کے اعتبار سے اس سے اچھا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ بے شک میں فرماں برداروں میں سے ہوں (۳۳)

**آیت 33** ❶ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ...... : پچھلی آیات میں ایمان لا کر اس پر استقامت اختیار کرنے والوں کو فرشتوں کے نزول، دنیا و آخرت میں ان کی دوستی، جنت میں داخلے اور غفور و رحیم کی مہمانی کی بشارت دے کر ان کے قلبی سکون و اطمینان اور دلی راحت کا سامان فرمایا، اب ایک ایسے کام کا ذکر فرمایا جو "رَبُّنَا اللّٰهُ" کہنے کا فطری تقاضا ہے کہ وہ اس نعمت کو اپنے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ان کی کوشش اسے دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچانے کی ہوتی ہے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جو نعمت انھیں عطا ہوئی ہے وہ ہر شخص کو عطا ہو جائے۔ یہ کام سرانجام دیتے ہوئے جب وہ تین باتوں کا اہتمام کریں تو بات میں ان سے بہتر اور درجے میں ان سے بلند کوئی نہیں ہو سکتا۔ پہلی بات "دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ" یعنی وہ صرف اللہ کی طرف بلائیں۔ نہ اپنی ذات کی طرف، نہ کسی شخصیت کی طرف اور نہ کسی قبیلے، جماعت، نسل یا وطن کی طرف، بلکہ ان کی دعوت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو کہ سب اسی کے بندے اور فرماں بردار بن جاؤ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [ یوسف : ۱۰۸ ] "کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں۔" یہ پیغمبروں کا اور ان کے جانشینوں کا کام ہے اور اتنا عظیم کام ہے کہ ان کی دعوت سے جو لوگ راہ ہدایت اختیار کریں گے ان کا اجر ان کے علاوہ انھیں بھی ملے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ دَعَا إِلٰى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا، وَمَنْ دَعَا إِلٰى ضَلَالَةٍ، كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا )) [ مسلم، العلم، باب من سن سنة حسنة أو سيئة ..... : ۲٦٧٤ ] "جو شخص ہدایت کی کسی بات کی طرف دعوت دے اس کے لیے ان لوگوں کے اجروں جیسا اجر ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے اجروں میں کوئی کمی نہیں کرے گا اور جو شخص گمراہی کی کسی بات کی طرف دعوت دے اس پر ان لوگوں کے گناہوں جیسا گناہ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔"

یہی وجہ ہے کہ پوری امت مل کر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجے کو نہیں پا سکتی، نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے ان کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں، یہی حال بعد میں دعوت الی اللہ دینے والوں کا ہے۔ پھر بات میں ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے جسے ان اعمال کا اجر بھی مل رہا ہو جو اس نے نہیں کیے۔ کوئی شخص خود کتنا بھی عمل کر لے یہ مقام کیسے حاصل کر سکتا ہے؟

❷ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت زبان کے ساتھ بھی ہے اور ہاتھ کے ساتھ بھی۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے ساتھ تلوار دے کر

لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ

ر نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) کے ساتھ ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ

جا گیا، آپ کے اصحاب نے آپ کا ساتھ دیا، پھر زبانی دعوت اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ اسلام مشرق سے مغرب
ب پھیل گیا۔ یہی مناسبت ہے: ﴿ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۭ وَ كَفٰی
لّٰهِ شَهِیْدًا ﴾ [ الفتح : ۲۸ ] کے بعد: ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ...... ﴾
فتح : ۲۹ ] میں۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۰۴، ۱۱۰)۔

❷ قول میں سب سے بہتر ہونے کے لیے دوسری ضروری بات "وَ عَمِلَ صَالِحًا" ہے، یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے کے
تھ وہ خود بھی عمل صالح کریں۔ صالح عمل کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالص اللہ کے لیے ہو اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے
یقے کے مطابق ہو۔ (دیکھیے سورۂ کہف کی آخری آیت) جو شخص دوسروں کو دعوت دے مگر خود اس کے خلاف عمل کرے اس
ے لیے شدید وعید آئی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۴)۔

❸ تیسری بات "وَ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" یعنی وہ ڈنکے کی چوٹ یہودی، نصرانی، ہندو، سکھ، کمیونسٹ، ڈیموکریٹ
لبرل وغیرہ ہونے کے بجائے اپنے مسلم ہونے کا اعلان کرے، اس پر فخر کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ
رے۔ "مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" یعنی مسلمانوں کی جماعت کا فرد ہونے پر اسے خوشی ہو اور کسی دین، مذہب، ملت یا معاشرے کو
لام اور مسلمانوں سے بہتر نہ سمجھے۔ آج کل کے بعض ملحدوں کی طرح نہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہو گئے، مگر وہ کفار سے اس قدر
عوب ہیں کہ بعض اوقات یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ہم بدقسمتی سے مسلمانوں میں پیدا ہو گئے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

نہ بہ نظم شاعرِ خوش غزل، نہ بہ نثرِ ناثرِ بے بدل ... بہ غلامئ شہِ عزوجل و بعاشقئ نبی خوشم

"نہ کسی خوب صورت غزل والے شاعر کی نظم پر اور نہ کسی بے مثال نثر لکھنے والے کی نثر پر، بلکہ میں کائنات کے
بادشاہ عز و جل کی غلامی پر اور نبی ﷺ کی محبت پر خوش ہوں۔"

عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: (( ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ
اللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا ))[ مسلم، الإيمان، باب الدليل على أن من رضي بالله ربا...... : ۳۴۔
مذي : ۲۶۲۳ ] "اس شخص نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے
سول ہونے پر راضی ہو گیا۔"

آیت 34 ❶ وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ ...... : اس آیت میں دعوت کے مخاطب لوگوں کی زیادتی اور برائی کا جواب
ینے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ عام طور پر "وَ لَا السَّيِّئَةُ" کے "لَا" کو زائد کہہ کر ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "نیکی اور برائی برابر

وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾

شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہو گا جیسے وہ دلی دوست ہے ﴿۳۴﴾

نہیں۔'' بعض حضرات اسے زائد برائے تاکید کہہ دیتے ہیں، حالانکہ قرآن مجید کے کسی لفظ بلکہ حرف کو زائد کہنے کے بجائے وہ فائدہ سمجھنے کی کوشش ضروری ہے جس کے لیے وہ لفظ لایا گیا ہے، جو بظاہر زائد ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے اس بات سے کہ بلاضرورت کوئی لفظ لائے۔ اصل میں یہاں بات بیان ہو رہی ہے کہ نیکی برابر نہیں، نہ اپنی جنس کے افراد کے لحاظ سے، کیونکہ نیکیوں کے بے شمار درجے ہیں، کوئی کمتر درجے کی نیکی، کوئی اس سے برتر اور کوئی سب سے برتر، جیسا کہ حدیث میں ہے: « فَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَأَرْفَعُهَا قَوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ » [ ترمذي، الإيمان، باب في استكمال الإيمان ...... : ۲٦۱٤ ] ''سب سے کمتر نیکی راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا اور سب سے اونچی لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے۔'' اور نہ ہی ایک نیکی اپنے درجات کے اعتبار سے برابر ہے، مثلاً کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کے کئی درجے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی نیکی اپنے کرنے والوں کے مختلف ہونے کے لحاظ سے بھی برابر نہیں، کوئی اسے خالص نیت سے کرتا ہے اور کوئی ریا سے، کوئی پوری کوشش سے کرتا ہے، کوئی درمیانی کوشش سے اور کوئی بے دلی سے۔ غرض کوئی بھی نیکی نہ دوسری نیکیوں کے ساتھ برابر ہے، نہ اپنی ذات میں برابر ہے اور نہ کرنے والوں کے لحاظ سے برابر ہے۔

② وَ لَا السَّيِّئَةُ : برائی کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر نہیں۔ زبانی دشمنی اور تیر تلوار کے ساتھ دشمنی میں فرق ہے، ابوطالب اور ابوجہل کے کفر میں فرق ہے۔ اس لیے آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔'' شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین دونوں کے ترجمہ میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے۔

③ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ......: یعنی برائی کا جواب صرف یہ نہیں کہ نیکی کے ساتھ دو، بلکہ اس طریقے سے دو جو سب سے اچھا ہے اور نیکی کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ یہ سب سے اچھا طریقہ بعض اوقات اچھی بات اور اچھا لہجہ ہوتا ہے، جیسا کہ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: « أَمَرَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ بِالصَّبْرِ عِنْدَ الْغَضَبِ، وَ الْحِلْمِ وَالْعَفْوِ عِنْدَ الْإِسَاءَةِ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنَ الشَّيْطَانِ، وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ، كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ » [ طبري : ۳۰۷۹٤۔ السنن الكبرى للبيهقي : ۷/ ٤٥، ح : ۱۳٦۸۰ ] ''اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو غصے کے وقت صبر کا اور بدسلوکی کے وقت حلم اور عفو کا حکم دیا، تو جب وہ ایسا کریں گے اللہ تعالیٰ انھیں شیطان سے بچائے گا اور ان کا دشمن ان کے لیے زیر ہو جائے گا، گویا کہ وہ دلی دوست ہے۔'' اور بعض اوقات سب سے اچھا طریقہ خوش اخلاقی اور بہترین بات کے ساتھ ساتھ جہاد بالید ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو سب سے بہتر امت قرار دیا (دیکھیے آل عمران: ۱۱۰) اور جس کی وجہ سے بڑے بڑے دشمن دلی دوست بن جاتے ہیں، جیسے ثمامہ بن اثال، ابوسفیان، صفوان بن امیہ، حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم اور بے شمار کفار جو جہاد کی برکت سے جگری دوست بن گئے۔ آج بھی جب تک کافر ملکوں کے فرماں رواؤں کی

وَ مَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَ مَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انھی کو جو صبر کریں اور یہ نہیں دی جاتی مگر اسی کو جو بہت بڑے نصیب والا ہے ﴿۳۵﴾ اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ تجھے ابھار ہی دے تو اللہ کی پناہ طلب کر، بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۳۶﴾ اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن، اور سورج اور چاند ہیں، نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو ﴿۳۷﴾

گردنوں کے سریے کاٹ کر انھیں ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کی طرح مسجد نبوی کے ستون سے باندھ کر اسلام کی تعلیمات کا آنکھوں سے مشاہدہ نہ کروایا جائے ان کا مسلمان ہونا یا دلی دوست بننا مشکل ہے۔ (مزید دیکھیے رعد: ۲۲) مومن نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو ہوتا ہے۔

**آیت 35** ❶ وَ مَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا: یعنی برائی کا جواب سب سے اچھے طریقے کے ساتھ دینے کی توفیق انھی لوگوں کو عطا کی جاتی ہے جنھوں نے اس سے پہلے بھی صبر کی عادت اپنائی ہوتی ہے۔ "صَبَرُوْا" ماضی کا صیغہ ہے۔

❷ وَ مَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ: یعنی یہ خوبی کہ برائی کا جواب سب سے اچھے طریقے کے ساتھ دیں، صرف انھی لوگوں کو عطا کی جاتی ہے جو بہت بڑے نصیب والے ہوں۔ معلوم ہوا یہ حوصلہ انسان کے بس کی بات نہیں، محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اس لیے اپنی کوشش کے ساتھ ساتھ اسی سے صبر اور حوصلے کی دعا کرنا لازم ہے۔

**آیت 36** وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ ... : "نَزْغٌ" کا لفظی معنی "کسی سوئی یا نوک دار چیز کے ساتھ چوکا مارنا" ہے، مراد شیطان کا غصہ دلا کر برانگیختہ کر دینا ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ اعراف (۲۰۰) اور سورۂ مومنون (۹۶ تا ۹۸) میں گزر چکی ہے۔

**آیت 37** ❶ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ ... : اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کو سب سے اچھی بات قرار دیا، اب اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کے لیے چند اور چیزیں بطور دلیل ذکر فرمائیں، جن میں سے بعض آسمان سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض زمین سے اور واضح فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

❷ انسان کو نظر آنے والی اشیا میں سے سب سے عظیم اور سب سے روشن چیزیں سورج اور چاند ہیں، اس لیے بہت سے لوگ انھی کو رب تعالیٰ سمجھ بیٹھے۔ بعض نے انھیں اللہ تعالیٰ کا مظہر سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور ان کی پرستش

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا يَسْــَٔمُوْنَ ۩ ﴿۳۸﴾

پھر اگر وہ تکبر کریں تو وہ (فرشتے) جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ رات اور دن اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ نہیں اکتاتے ﴿۳۸﴾

---

اور انھیں سجدہ کرنے لگے، جیسے صابی اور پارسی لوگ ہیں۔ (ابراہیم علیہ السلام کی قوم شرک کی متعدد صورتوں میں مبتلا تھی، وہ دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ سورج، چاند اور ستاروں کی بھی پرستش کرتی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے نہایت حکمت کے ساتھ ان کا بے اختیار ہونا اور رب نہ ہونا واضح فرمایا۔ دیکھیے سورۂ انعام: ۷۶ تا ۸۲) زیر تفسیر آیات سے ان مشرکین کا ردّ مقصود ہے۔ چنانچہ بتایا کہ رات دن اور سورج چاند اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کی نشانیوں اور دلیلوں میں سے ہیں۔ سورج اور چاند سے پہلے رات اور دن کا ذکر اس لیے فرمایا کہ رات کو سورج کا چھپنا اور چاند کا نکل آنا اور دن کو چاند کا چھپنا اور سورج کا نمودار ہو جانا صاف دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی رب یا رب تعالیٰ کا مظہر نہیں کہ اس کی صورت میں وہ خود ظاہر ہو رہا ہے، بلکہ یہ دونوں مجبور اور لاچار پیدا کیے گئے ہیں، جو رب تعالیٰ کے فرمان کے تحت مسخر ہیں اور اپنی گردش اور طلوع وغروب میں اس کے حکم کے پابند ہیں۔ اگر یہ خود رب ہوتے تو دن کے وقت کا سورج رات اور چاند کو نہ آنے دیتا، اسی طرح رات دن کے مقابلے میں ڈٹ جاتی اور اسے قدم نہ رکھنے دیتی، مگر ان سب کا بے اختیار ہو کر گردش کرتے چلے جانا اور ان میں کبھی کسی حادثے کا رونما نہ ہونا اکیلے رب تعالیٰ کے وجود کی دلیل ہے، جو ہر چیز کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہا ہے۔

③ رات دن کے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہونے اور ان آیات کے حوالے کے لیے جن میں اس کی تفصیل ہے، دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۱۲) کی تفسیر۔

④ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ مخلوق کو سجدہ کرنا حرام ہے، سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے جس نے یہ سب کچھ پیدا فرمایا۔

⑤ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ : کچھ لوگ عقلی ڈھکوسلے گھڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ ان کے واسطے سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں، جیسا کہ مشرکین کہتے تھے: ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [ الزمر: ۳ ] ''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔'' اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا، اگر تم واقعی اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے، سیدھے اسی کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟!

⑥ سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیم میں فرق اور سجدۂ تعظیم کی حرمت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۴) اور سورۂ یوسف (۱۰۰)۔

**آیت 38** ① فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا : ''پھر اگر وہ تکبر کریں'' یعنی یہ سب کچھ سن کر بھی اگر وہ اپنی بات چھوڑنے کو ذلت سمجھیں، سورج، چاند اور مخلوق کو سجدہ کرنے پر اڑے رہیں اور اپنی جھوٹی عزت اور بڑائی کی وجہ سے جہالت اور شرک پر اصرار کرتے چلے جائیں۔

② یعنی اگر مشرکین اس قدر مغرور اور متکبر ہو گئے ہیں کہ اکیلے اللہ کو سجدہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں، اللہ تعالیٰ ان کا محتاج نہیں۔ اس کی عظمت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ مقرب ترین فرشتے جو اس کے پاس ہیں، اس کا عرش اٹھائے

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِيْۤ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْۤ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دبی ہوئی (بنجر) دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور پھولتی ہے۔ بے شک وہ جس نے اسے زندہ کیا، یقیناً مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، یقیناً وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۳۹﴾ بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات کے بارے میں ٹیڑھے چلتے ہیں، وہ ہم پر مخفی نہیں رہتے، تو کیا وہ شخص جو آگ میں پھینکا جائے بہتر ہے، یا جو امن کی حالت میں قیامت کے دن آئے؟ تم کرو جو چاہو، بے شک وہ اسے جو تم کر رہے ہو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۴۰﴾

ہوئے ہیں، یا عرش کے اردگرد یا اس کے نیچے عاجزی سے کھڑے ہیں۔ (دیکھیے مومن : ۷) جن کے ذریعے سے ساری کائنات کے معاملات کی تدبیر ہو رہی ہے۔ وہ سب دن رات اس کی تسبیح کر رہے ہیں، یعنی اس بات کی شہادت دے رہے ہیں اور اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ ان کا مالک اس سے پاک ہے کہ اس کے رب ہونے میں یا اس کے معبود برحق ہونے میں کوئی اس کا شریک ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۱۹، ۲۰) اور سورۂ اعراف (۲۰۶)۔ اب اگر چند احمق سمجھانے پر نہیں سمجھتے اور ساری کائنات کی شہادت کو رد کر کے اپنی عزت اور بڑائی کے جھوٹے گمان پر اڑے ہوئے ہیں تو وہ اپنا ہی نقصان کریں گے، اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی بھی ہے۔

③ جو لوگ عرشِ الٰہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو کائنات سے الگ سب سے بلندی پر نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ کائنات کے اندر ہے نہ اس سے باہر، وہ لفظ "فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ" (وہ فرشتے جو تیرے رب کے پاس ہیں) کی عجیب و غریب تاویلیں کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے ہاں بڑا مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ، مگر رحمٰن کے عرش کو فرشتوں کے اٹھائے ہونے کے صریح الفاظ ان کی ایسی تمام تاویلوں کا تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مومن (۷) اور سورۂ حاقہ (۱۷)۔

**آیت 39** وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً ...... : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۶۵) اور سورۂ حج (۵ تا ۷)۔ یہاں بنجر زمین کے لیے "خَاشِعَةً" (دبی ہوئی، عاجز) کا لفظ استعمال ہوا ہے، کیونکہ بات ایک اللہ کو سجدے کی ہو رہی ہے، یعنی خشوع کی ہو رہی ہے، جب کہ سورۂ حج میں اسی بنجر زمین کے لیے "هَامِدَةً" (مردہ) کا لفظ استعمال ہوا ہے، کیونکہ وہاں مرنے کے بعد زندگی کی بات ہو رہی ہے۔ (طنطاوی)

**آیت 40** ① اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا : "يُلْحِدُوْنَ" کا مادہ "لَحْدٌ" ہے۔ لحد اس قبر کو کہتے ہیں جو نیچے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾

بے شک وہ لوگ جنھوں نے اس نصیحت کے ساتھ کفر کیا، جب وہ ان کے پاس آئی (وہ بھی ہم پر مخفی نہیں ہیں) اور بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت کتاب ہے ﴿۴۱﴾

سیدھی کھودنے کے بجائے کچھ نیچے جا کر ایک طرف کھود کر بنائی جاتی ہے۔ "اِلْحَادٌ" کا معنی ہے سیدھے راستے سے انحراف، یعنی ایک طرف کو ہٹ جانا، کج روی اور ٹیڑھا چلنا، یعنی جو لوگ حق سے ہٹ کر ٹیڑھی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیات میں الحاد (ٹیڑھا چلنا) یہ ہے کہ ان کا انکار کر دے، یا ان کا سیدھا سادا اور واضح مطلب لینے کے بجائے غیر متعلق بحثیں کرے اور انھیں غلط مطلب پہنانے کی کوشش کرے۔ جو لوگ مسلمان ہو کر باطل نظریات مثلاً مشرکانہ عقائد، بدعت، انکارِ حدیث، اشتراکیت، سرمایہ داری اور دہریت وغیرہ کے حامی بن جاتے ہیں وہ یہی طرز اختیار کرتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ یہاں آیاتِ الٰہی میں کج روی اختیار کرنے والوں کے لیے وعید آئی ہے اور سورۂ اعراف کی آیت (۱۸۰) میں اسمائے الٰہی میں کج روی اختیار کرنے والوں سے علیحدگی کا حکم اور ایسے لوگوں کا انجام بیان فرمایا ہے۔

❷ لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا : یہ پہلی شدید وعید ہے جو یہاں آیاتِ الٰہی میں ٹیڑھا چلنے والوں کے لیے آئی ہے کہ یہ لوگ ہم پر مخفی نہیں ہیں، بلکہ ہر لمحے ہماری نگاہ میں ہیں اور ہماری گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ ہم اگر ان کے عذاب میں تاخیر کر رہے ہیں اور انھیں مہلت دے رہے ہیں تو اس لیے کہ جلدی تو وہ کرے جسے خطرہ ہو کہ مجرم روپوش ہو جائے گا اور قابو سے نکل جائے گا۔ مطلب یہ کہ ہم انھیں اس الحاد کی سزا ضرور دیں گے۔

❸ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْۤ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ : یہ دوسری دھمکی ہے کہ آیاتِ الٰہی کا مطلب توڑنے مروڑنے والے اور ان کے بارے میں ٹیڑھے چلنے والے آگ میں پھینکے جائیں گے اور آیاتِ الٰہی میں الحاد سے اجتناب کرنے والے قیامت کے دن امن کی حالت میں آئیں گے۔ تو بتاؤ، جو آگ میں پھینکا جائے گا وہ بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں آئے گا؟

❹ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ...... : یہ تیسری دھمکی ہے، "کرو جو چاہو" کا مطلب اپنی مرضی کرنے کی اجازت دینا نہیں بلکہ ڈانٹ ہے کہ اس مہلت میں تم جو چاہو کر لو، پھر اس کی سزا کے لیے ہم جو چاہیں گے کریں گے۔ تمھارے ہر عمل کو ہم خوب دیکھ رہے ہیں، یہ خیال نہ کرنا کہ تم اپنے کسی عملِ بد کی سزا سے اس لیے بچ جاؤ گے کہ وہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی عظیم فرماں روا اپنے کچھ غلاموں پر ناراض ہو کر شدید غصے سے کہے، جو چاہو کرو۔

**آیت 41** ❶ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ : زمخشری نے فرمایا: "یہ جملہ "اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا" سے بدل ہے۔" (کشاف) اس لیے اس کی خبر وہی ہے جو پہلے جملے کی خبر ہے اور وہ ہے "لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا" اس صورت میں محذوف خبر نکالنے کی ضرورت نہیں، گویا عبارت اس طرح ہوئی کہ "یقیناً وہ لوگ جو ہماری آیات کے بارے میں

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾

**اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے ﴿۴۲﴾**

ٹیڑھے چلتے ہیں، جنھوں نے اس نصیحت کا اسی وقت انکار کر دیا جب وہ ان کے پاس آئی، وہ ہم پر مخفی نہیں ہیں۔'' بعض مفسرین نے فرمایا ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ '' کی خبر محذوف ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، مقام کی مناسبت سے محذوف خبر '' يُجْزَوْنَ عَلٰى كُفْرِهِمْ'' یا اس سے ملتی جلتی ہو گی۔ یعنی وہ لوگ جنھوں نے اس نصیحت کے ساتھ کفر کیا جب وہ ان کے پاس آئی انھیں ان کے کفر کی جزا دی جائے گی۔

② ''بِالذِّكْرِ'' سے مراد قرآن کریم ہے، جیسا کہ آگے اس کی صفات بیان ہو رہی ہیں۔

③ لَمَّا جَآءَهُمْ : یعنی انھوں نے قرآن مجید کی آیات کا نزول ہوتے ہی ان کا انکار کر دیا، غور سے سننے اور سوچنے سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔

④ وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ : ''عَزِيْزٌ'' کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ یہ سب پر غالب ہے، زبان و بیان میں، دلیل و برہان میں، علم و حکمت میں، صدق و حقانیت میں، غرض ہر لحاظ سے یہ دوسری ہر کتاب پر غالب اور زبردست ہے، دوسری سب کُتب اس کے مقابلے میں زیر ہیں۔ ''عَزِيْزٌ'' کا دوسرا معنی ہے عدیم النظیر، بے مثال، کیونکہ پوری کائنات اس کی ایک سورت کی مثال لانے سے عاجز ہے۔

**آیت 42** ① لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ : اس کے پاس نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ باطل آ کر اس پر غلبہ نہیں پا سکتا، یعنی باطل کی مجال نہیں کہ کسی پہلو سے آ کر اس پر غلبہ پا سکے، نہ کھلم کھلا سامنے آ کر اور نہ چوری چھپے پیچھے سے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ پہلے کی کوئی کتاب یا تحقیق اس قرآن کی کسی بات کو غلط یا باطل ثابت نہیں کر سکتی اور نہ ہی بعد کی کوئی کتاب یا تحقیق اس کی کسی بات کو غلط ثابت کر سکے گی، اور یہ مطلب بھی ہے کہ اس میں باطل کی آمیزش نہ کوئی کھلم کھلا کر سکتا ہے نہ چوری چھپے، جیسا پہلی کتابوں کے ساتھ ہوا، بلکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [ الحجر : ۹ ] ''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

② تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ : قرآن مجید کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی، اس میں کسی باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی اور نہ ہی دلیل میں باطل کسی طرح اس پر غالب آ سکتا ہے، کیونکہ یہ حکیم و حمید کی طرف سے تنزیل ہے۔ ''تَنْزِيْلٌ'' کے مفہوم کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۱۰۶)۔ یعنی یہ کتاب اس نے تھوڑی تھوڑی کر کے نازل فرمائی ہے جو کمال حکمت والا ہے، ہر تعریف کا مستحق اور ہر خوبی کا مالک ہے۔ ''حَكِيْمٍ'' وہ جس کی کسی تدبیر میں خطا نہ ہو اور ''حَمِيْدٍ'' وہ جس کے کسی فعل کی مذمت نہ ہو سکے۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝۴۳ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَ اَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ ؕ قُلْ

تجھے نہیں کہا جائے گا مگر وہی جو ان رسولوں سے کہا گیا جو تجھ سے پہلے تھے اور بے شک تیرا رب یقیناً بڑی بخشش والا اور بہت دردناک عذاب والا ہے۝۴۳ اور اگر ہم اسے عجمی قرآن بنا دیتے تو یقیناً وہ کہتے اس کی آیات کھول کر کیوں نہ بیان کی گئیں، کیا عجمی زبان اور عربی (رسول)؟ کہہ دے یہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور

آیت 43 ❶ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ ......: اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اگر کفار مکہ آپ کو جادوگر، شاعر، کاہن، دیوانہ، کذاب، متکبر یا اس قسم کے دوسرے ناموں سے یاد کرکے آپ کو ایذا دیتے ہیں تو آپ اطمینان رکھیں، ان کے رکھے ہوئے ناموں میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جس کا طعنہ آپ سے پہلے رسولوں کو نہ مل چکا ہو، نہ آپ پہلے رسول ہیں جسے جھٹلایا گیا ہو اور نہ پہلے شخص ہیں جسے اللہ تعالیٰ کی خاطر تکلیف اٹھانا پڑی ہو۔ سورۂ ذاریات میں فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ [الذاریات : ۵۲، ۵۳] ”اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے، کوئی رسول نہیں آیا مگر انھوں نے کہا یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ۔ کیا انھوں نے ایک دوسرے کو اس (بات) کی وصیت کی ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ (خود ہی) سرکش لوگ ہیں۔“ کفار کی ایسی تمام باتوں پر رسولوں نے صبر کیا اور پوری ہمت سے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے رہے، یہی فریضہ آپ کا ہے، فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ﴾ [ الأحقاف : ۳۵ ] ”پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کر۔“

❷ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ : یعنی اتنی ایذا اور بدزبانی کے باوجود اگر یہ لوگ توبہ کر کے ایمان لے آئیں تو تیرا رب بڑی مغفرت والا ہے (مَغْفِرَةٍ کی تنوین تعظیم کے لیے ہے) اور اگر اپنے کفر پر اصرار کریں تو وہ نہایت دردناک عذاب والا بھی ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں ان کی اس بدزبانی کا بدلا دینا آپ کا کام نہیں ہے، یہ ہمارا اختیار اور ہماری مرضی ہے کہ ہم انھیں ایمان کی توفیق سے نواز کر بخش دیں یا انھیں کفر پر رہنے دیں اور عذاب الیم چکھائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۲۸ ] ”تیرے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں، یا وہ ان پر مہربانی فرمائے یا انھیں عذاب دے، کیوں کہ بلاشبہ وہ ظالم ہیں۔“

آیت 44 ❶ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا ...... : سورت کے شروع میں ذکر فرمایا کہ ”رحمان و رحیم کی طرف سے یہ ایسی کتاب نازل کی گئی ہے جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، جو عربی قرآن ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔“ مشرکین مکہ جو عرب تھے ان کا حق تھا کہ اپنی زبان میں اترنے والی کتاب کو سنتے اور اس پر غور و فکر کرتے، تو اس کے نتیجے میں انھیں ایمان کی دولت بھی نصیب ہو جاتی، مگر انھوں نے اپنی زبان میں ہونے کے باوجود اپنے کانوں، آنکھوں اور دلوں کے

هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ؕ وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾

شفا ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ ان کے حق میں اندھا ہونے کا باعث ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں بہت دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے ﴿۴۴﴾

دریچے اس کے لیے بند کر دیے اور کہنے لگے: ﴿ قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ وَ فِيْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۵ ] ''ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں دعوت دیتا ہے اور ہمارے کانوں میں بھاری بوجھ ہے اور ہمارے درمیان اور تیرے درمیان بھاری پردہ ہے۔'' بلکہ انھوں نے عملاً طے کر لیا کہ یہ عربی قرآن نہ خود سنیں گے اور نہ کسی کو سننے دیں گے، جیسا کہ اسی سورت میں ہے: ﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۲۶ ] ''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔''

اب انھیں قائل کرنے کے لیے ایک صورت رہ جاتی تھی کہ قرآن عربی زبان کے بجائے کسی اور زبان میں اتارا جاتا، جس سے انھیں یقین ہو جائے کہ یہ عربی رسول جو عجمی زبان جانتا ہی نہیں، عجمی قرآن لے کر آیا ہے، تو یہ اللہ کی طرف سے معجزہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہوتا، پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے، بلکہ نہ ماننے کے لیے ایک اور بہانہ پیش کر دیتے، کیونکہ جو طے کر چکا ہو کہ میں نے ماننا ہی نہیں اسے منوانے کی کوئی صورت نہیں۔

ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یہ کفار مکہ بھی عجیب تھے ہیں، اگر ان کے پاس انھی میں سے ایک آدمی عربی میں قرآن لے کر آیا ہے تو کہتے ہیں کہ ایک عرب کا عربی قرآن پیش کرنا کوئی کمال نہیں، کمال تو اس وقت ہوتا جب یہ شخص کسی عجمی زبان فارسی، رومی یا ترکی میں قرآن پیش کرتا۔ حالانکہ اگر ہم ان کا مطالبہ مان لیتے اور آپ ﷺ پر کسی عجمی زبان میں قرآن نازل کر دیتے تو یہی لوگ اس وقت اعتراض کرتے کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ پیغمبر تو عربوں کو دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا ہے، لیکن قرآن ایسی زبان میں لے کر آیا ہے جسے عرب سمجھ بھی نہیں سکتے۔'' (اشرف الحواشی)

❷ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ: اس کی تفسیر گزر چکی ہے، دیکھیے سورۂ یونس (۵۷) اور سورۂ بنی اسرائیل (۸۲)۔

❸ وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ ...... : یعنی قرآن اگرچہ رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے، لیکن وہ ان کافروں کے حق میں کانوں کا بوجھ اور آنکھوں کا پردہ ہے۔ اس کی وجہ ان کی اپنی ہٹ دھرمی اور تعصب ہے، اس میں قرآن کا کوئی قصور نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے سورج روشنی دینے والی چیز ہے، لیکن اس کے طلوع ہوتے ہی چمگادڑ کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

❹ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ: یہ ایک محاورہ ہے اور اس شخص کے حق میں استعمال ہوتا ہے جو کوئی بات نہ سمجھتا ہو۔ (قرطبی) یعنی یہ لوگ قرآن کو دل سے سننے کی کوشش نہیں کرتے، صرف اوپرے دل سے سنتے ہیں، اس لیے اس سے کوئی

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے پہلے طے ہو چکی تو ان کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور بلاشبہ وہ اس کے متعلق یقیناً ایسے شک میں ہیں جو بے چین رکھنے والا ہے ﴿۴۵﴾

---

ہدایت نہیں پاتے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی شخص کو دور سے پکارا جائے اور وہ آواز تو محسوس کرے مگر مطلب مراد کچھ نہ سمجھے۔

آیت 45 ① وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ: اس سے بھی مقصود رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے، یعنی اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی گئی، مگر لوگوں نے اس کے ماننے اور نہ ماننے میں اختلاف کیا، اسی طرح اگر یہ کفارِ مکہ قرآن کی مخالفت کر رہے ہیں تو آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ (قرطبی)

② وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ: یعنی اگر پہلے یہ طے نہ ہو چکا ہوتا کہ کفار کے اعمالِ بد پر فوری گرفت کے بجائے دنیا میں ایک وقت تک انھیں مہلت دی جائے گی اور اصل فیصلہ آخرت میں ہوگا، تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۴۲)، نحل (۶۱) اور فاطر (۴۵)۔

"لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ" میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ طے نہ کر دیا ہوتا کہ ان کفار سے پیدا ہونے والی نسلیں مسلمان ہوں گی، جو اسلام کا علم بلند کریں گی تو ان کا قصہ تمام کر دیا گیا ہوتا، جیسا کہ طائف میں ہونے والی بدسلوکی پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دل جوئی کے لیے ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتے) کو بھیجا اور اس نے آکر رسول اللہ ﷺ کو پیش کش کی کہ اگر آپ کہیں تو میں ان کفار پر اخشبین (دو پہاڑوں) کو ملا دوں۔ (یہ مکہ کے دو پہاڑ ہیں، ایک ابوقبیس ہے اور دوسرا اس کے بالمقابل قُعیقعان ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( بَلْ أَرْجُوْ أَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلاَبِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لاَ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا )) [ بخاري، بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمين...... : ۳۲۳۱، عن عائشة رضی اللہ عنہا ] "بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ان لوگوں کو نکالے گا جو اکیلے اللہ عزوجل کی عبادت کریں گے، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنائیں گے۔"

"لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ" میں یہ بات بھی شامل ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد طے کر دیا گیا کہ اب پہلی اقوام پر آنے والے عذابوں کے بجائے دنیا میں کفار کو جہاد کے ذریعے سے مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دی جائے گی اور آخری فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ یہ پوری آیت اور اس کی تفسیر سورۂ ہود کی آیت (۱۱۰) میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

جس نے نیک عمل کیا سو اپنے لیے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہوگی اور تیرا رب اپنے بندوں پر ہرگز کوئی ظلم کرنے والا نہیں ﴿۴۶﴾

❸ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ : "شَكٍّ" اور "مُرِيْبٍ" کی لغوی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۶۲)۔

آیت 46 ❶ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ...... : اس میں رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ پر اس کا کوئی وبال نہیں۔ جو صالح عمل کرے گا اس کا فائدہ اسی کو ہے اور جو برائی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہے۔

❷ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ : اور اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں کہ کسی کو اس کی نیکی کا بدلا نہ دے، یا ایک کی بدی دوسرے پر ڈال دے۔

❸ یہاں لفظ "بِظَلَّامٍ" پر ایک مشہور سوال ہے، اس سوال اور اس کے جواب کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۸۲)، انفال (۵۱) اور سورۂ حج (۱۰) کی تفسیر۔

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۭ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿۴۷﴾

اسی کی طرف قیامت کا علم لوٹایا جاتا ہے اور کسی قسم کے پھل اپنے غلافوں سے نہیں نکلتے اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔ اور جس دن وہ انھیں پکارے گا کہاں ہیں میرے شریک؟ وہ کہیں گے ہم نے تجھے صاف بتا دیا ہے، ہم میں سے کوئی (اس کی) شہادت دینے والا نہیں ﴿۴۷﴾

**آیت 47** ① اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ : پچھلی آیت کے ضمن میں ہر نیک و بدعمل کی جزا کا ذکر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اکثر لوگ جزا کے بغیر فوت ہو جاتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا وعدہ فرما رکھا ہے۔ اسی کا نام ہی ''یوم الدین'' (جزا کا دن) ہے، کیونکہ اگر وہ نیک و بد کو جزا نہ دے تو یہ ظلم ہے، جب کہ وہ اپنے بندوں پر ذرّہ برابر ظلم کرنے والا نہیں۔ کفار چونکہ قیامت قائم ہونے اور اس پر اللہ تعالیٰ کے پوری طرح قادر ہونے کی بات کو دلیل کے ساتھ نہیں جھٹلا سکتے تھے، اس لیے انھوں نے جھٹلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ بار بار پوچھتے، قیامت کب ہوگی؟ گویا ان کی فرمائش پر وہ فوراً قائم نہ ہوئی تو کہہ سکیں گے کہ قیامت ہوتی تو آ جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ قیامت کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ یعنی انسان، جن اور فرشتے، غرض جس کسی سے قیامت کے متعلق پوچھو وہ بے خبر ہوگا۔ کسی دوسرے سے پوچھنے کو کہے گا تو وہ بھی بے خبر ہوگا۔ پوچھتے پوچھتے سبھی جس کی طرف لوٹائیں گے کہ وہی بتا سکتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، باقی سب بے خبر ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ نازعات (۴۲ تا ۴۴)، انعام (۵۹) اور سورۂ اعراف (۱۸۷) جبریل علیہ السلام نے انسانی شکل میں آ کر نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کب ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ )) [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ ...... : ۵۰ ] ''جس سے اس کے متعلق پوچھا گیا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔'' مطلب یہ ہے کہ تم جس بات کے پیچھے پڑے ہو تمھیں اس سے کچھ حاصل نہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں، اس لیے تم یہ فکر کرو کہ اس دن تمھارا بنے گا کیا اور تم نے اس کے لیے تیاری کیا کی ہے؟

② وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا : "أَكْمَامٌ" "كِمٌّ" (کاف کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، وہ غلاف یا پردہ جس کے اندر شروع میں پھل چھپا ہوتا ہے۔ "ثَمَرٰتٍ" جمع ہے اور نکرہ ہے، اس پر "مِنْ" آنے سے عموم میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان سب باتوں کو ملحوظ رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے ''کسی قسم کے پھل اپنے غلافوں سے نہیں نکلتے۔'' مطلب یہ ہے کہ صرف قیامت کا علم ہی نہیں، غیب کے متعلق جتنے بھی امور ہیں ان سب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، کسی نبی، ولی یا فرشتے کو غیب کے معاملات کا علم اسی حد تک ہو سکتا ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اسے خبر دی ہوتی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۵۹) اور سورۂ اعراف (۱۸۷)۔

③ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ : دیکھیے سورۂ رعد (۸) اور سورۂ فاطر (۱۱)۔ یعنی قیامت کے علاوہ کسی پھل کے

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَ ظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۴۸﴾

اور ان سے غائب ہو جائیں گے وہ جنھیں وہ اس سے پہلے پکارتے تھے اور سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ﴿۴۸﴾

اپنے غلاف سے نکلنے یا کسی مادہ کے حاملہ ہونے یا بچہ جننے کے وقت کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، تو کیا آج تک تم نے اس وجہ سے کسی پھل کے اپنے غلاف سے نکلنے یا کسی مادہ کے حاملہ ہونے یا بچہ جننے سے اور دوسری بے شمار چیزوں کے واقع ہونے سے اس لیے انکار کیا ہے کہ اس کا متعین وقت تمھیں نہیں بتایا گیا، تو قیامت کا انکار صرف اس لیے کیوں کہ تمھیں اس کے بپا ہونے کا وقت نہیں بتایا گیا!؟

④ وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ : "يَوْمَ" فعل محذوف "اُذْكُرْ" کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ قیامت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دن یاد کرو جب اللہ تعالیٰ مشرکین کو پکار کر کہے گا، کہاں ہیں میرے شریک؟ "شُرَكَآءِيْ" (میرے شریک) سے مراد وہ ہیں جو انھوں نے بنا رکھے تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ کا شریک کون ہو سکتا ہے!؟ اللہ تعالیٰ کا انھیں یہ کہنا صرف انھیں ذلیل کرنے کے لیے ہوگا، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں جسے وہ لے آئیں گے۔

⑤ قَالُوْۤا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ : یعنی وہ اپنے مشرک ہونے کا انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے تجھے صاف بتا دیا ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کی شہادت دینے والا نہیں کہ تیرا کوئی شریک ہے، یعنی ہم نے تیرے ساتھ کبھی شرک کیا ہی نہیں۔ (دیکھیے انعام: ۲۲ تا ۲۴) حقیقت یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ کبھی اپنے مشرک ہونے سے انکار کریں گے، کبھی بے اختیار اس کا اقرار کریں گے، پھر انکار کریں گے۔ (دیکھیے مومن: ۷۳، ۷۴) پھر شہادتیں پیش ہونے پر اقرار کے سوا کچھ چارہ نہ ہوگا۔

آیت 48 ① وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ : یعنی پریشانی کے عالم میں وہ چاروں طرف نظر دوڑائیں گے کہ عمر بھر جنھیں پکارتے رہے، شاید ان میں سے کوئی مدد کو آ جائے، انھیں عذاب سے چھڑا لے، یا اس میں کچھ کمی ہی کروا دے، مگر کوئی مددگار نظر نہیں آئے گا۔

② وَ ظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ : "حَاصَ يَحِيْصُ حَيْصًا" (ض) بھاگنا۔ "مَّحِيْصٍ" مصدر میمی ہے یا ظرف۔ مصدر کا معنی ہوگا بھاگنے کی کوئی صورت اور ظرف کا معنی ہے بھاگنے کی کوئی جگہ۔ "ظن" کا لفظ گمان کے علاوہ یقین کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۴۶) یہاں بھی "ظَنُّوْا" یقین کے معنی میں ہے، کیونکہ قیامت کے دن تمام حقیقتیں کھل کر سامنے آ جائیں گی اور کسی کو کوئی شک باقی نہیں رہے گا، حتیٰ کہ کفار خود کو یقین ہو جانے کا اقرار کریں گے، فرمایا: ﴿ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ [ السجدة : ۱۲ ] "اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، پس ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔" اور دیکھیے سورۂ مریم (۳۸)، سورۂ ق (۲۲) اور سورۂ انعام (۳۰)۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کے حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں میں سے کوئی انھیں نظر نہیں آئے گا اور انھیں

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ١ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾

انسان بھلائی مانگنے سے نہیں اکتاتا اور اگر اسے کوئی برائی آ پہنچے تو بہت مایوس، نہایت ناامید ہوتا ہے ﴿۴۹﴾

یقین ہو جائے گا کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ ہے نہ اس کی کوئی صورت۔

آیت 49 ❶ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ ...... : یہاں سے انسانی طبیعت پر کفر و شرک اور قیامت کے انکار کا ایک بہت برا اثر ذکر فرمایا۔ "الْاِنْسَانُ" سے مراد عام انسان ہے جو ایمان و یقین کی دولت سے خالی ہو، اس میں طبعی طور پر یہ کمزوری رکھی گئی ہے۔ توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان کے بعد اس کی اس کمزوری کا علاج ہو جاتا ہے اور ایمان جس قدر قوی ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کمزوری سے پاک ہوتا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآىِٕمُوْنَ ۝ ... اُولٰٓىِٕكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [ المعارج : ۱۹ تا ۳۵ ] "بلاشبہ انسان تھڑدلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔ سوائے نماز ادا کرنے والوں کے۔ وہ جو اپنی نماز پر ہمیشگی کرنے والے ہیں ... یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں۔" مزید دیکھیے سورۂ ہود (۹ تا ۱۱) کی تفسیر۔

❷ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ : "الْخَيْرِ" سے مراد دنیوی بھلائی ہے جس میں مال، اولاد، عزت، صحت اور قوت سبھی کچھ شامل ہے۔ "دُعَآءِ" سے مراد خیر کی طلب ہے، یعنی انسان دنیوی بھلائی کی طلب سے نہ اکتاتا ہے اور نہ تھکتا ہے، خواہ اسے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: (( لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا، وَ لَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ، وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ )) [ بخاري، الرقاق، باب ما يتقى من فتنة المال : ۶۴۳۶ ] "اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ کوئی تیسری تلاش کرے گا اور ابن آدم کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی اور اللہ اس پر پھر مہربان ہو جاتا ہے جو واپس پلٹ آئے۔"

❸ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ : "مَسَّ يَمَسُّ" (س) چھونا۔ "فَيَـُٔوْسٌ" "يَئِسَ يَيْئَسُ يَأْسًا" (س، ح) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت ناامید۔ "قَنُوْطٌ" "قَنِطَ يَقْنَطُ قُنُوْطًا" (س، ن) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت ناامید۔ بعض مفسرین نے فرمایا "فَيَـُٔوْسٌ" اور "قَنُوْطٌ" دونوں کا معنی ایک ہے، تاکید کے لیے "فَيَـُٔوْسٌ" کے بعد "قَنُوْطٌ" لایا گیا ہے اور بعض نے فرمایا، دونوں کے معنی میں فرق ہے۔ ابو حیان نے فرمایا: "یأس" دل کی حالت ہے کہ آدمی کا دل خیر کی امید سے خالی ہو جائے اور "قنوط" یہ ہے کہ ناامیدی کے آثار اس کے چہرے اور بدن پر بھی ظاہر ہو جائیں۔" ظاہر ہے یہ فرق اس وقت ہے جب یہ دونوں لفظ اکٹھے آئیں، ورنہ یاس اور قنوط دونوں میں قلبی اور بدنی ہر طرح کی ناامیدی مراد ہوتی ہے، جیسا کہ ایمان و اسلام کا معاملہ ہے۔ "مَسَّ" (چھونے) کے لفظ سے معلوم ہوا کہ کافر اتنا بے حوصلہ ہوتا ہے کہ برائی چھو جانے ہی سے آخری حد تک امید توڑ بیٹھتا ہے۔ مومن ایسا نہیں ہوتا، یہ صرف کافر کا حال ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ

وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّ لَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ٞ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾ وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾

اور یقیناً اگر ہم اسے کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو، اپنی طرف سے کسی رحمت کا مزہ چکھائیں تو ضرور ہی کہے گا یہ میرا حق ہے اور میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے اور اگر واقعی مجھے اپنے رب کی طرف واپس لے جایا گیا تو یقیناً میرے لیے اس کے پاس ضرور بھلائی ہے۔ پس ہم یقیناً ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ضرور بتائیں گے جو کچھ انھوں نے کیا اور یقیناً ہم انھیں ایک سخت عذاب میں سے ضرور چکھائیں گے ﴿۵۰﴾ اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں وہ منہ موڑ لیتا ہے اور اپنا پہلو دور کر لیتا ہے اور جب اسے مصیبت پہنچتی ہے تو (لمبی) چوڑی دعا والا ہے ﴿۵۱﴾

مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [ یوسف : ۸۷ ] ''بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔''

**آیت 50** ❶ وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا .... : یعنی ایک طرف وہ نا امیدی کہ شر کے چھو جانے ہی سے آخری حد تک نا امید ہوتا ہے، دوسری طرف یہ احسان فراموشی کہ مصیبت کے بعد کسی رحمت کا ذائقہ چکھتے ہی پھول جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو جاتا ہے، حالانکہ نہ وہ شر اور مصیبت دائمی تھی نہ اس دنیوی نعمت کو دوام ہے۔ پھر یہ نعمت اس کی محنت کا نتیجہ نہیں کہ اس پر پھول جائے، بلکہ یہ محض ہماری عطا ہے۔ ''رَحْمَةً مِّنَّا'' کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۹، ۱۰) کی تفسیر۔

❷ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ : یعنی کافر آدمی دنیوی نعمت کا ذائقہ چکھتے ہی تین کفریہ باتیں کہے گا، اس کے دل میں یہی باتیں ہوں گی اور زبان سے بھی یہی کہے گا۔ پہلی بات یہ کہ یہ نعمت میری جدوجہد کا نتیجہ اور میرا حق ہے، جیسا کہ فرعون کے لوگ کہتے تھے (دیکھیے اعراف : ۱۳۰، ۱۳۱) اور جیسا کہ قارون نے کہا تھا (دیکھیے قصص : ۷۸) حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صریح ناشکری اور احسان فراموشی ہے۔

❸ وَ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّ لَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى : ان دونوں باتوں کی تفصیل سورۂ کہف کی آیت (۳۶) کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

**آیت 51** وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ : ''نَأَى يَنْأَى نَأْيًا'' (ف) دور ہونا۔ یہ فعل لازم ہے، ''بِجَانِبِهٖ'' پر آنے والی ''باء'' کے ساتھ متعدی ہو گیا، اس لیے ''نَاٰ بِجَانِبِهٖ'' کا معنی ہے اپنا پہلو دور کر لیتا ہے۔ پچھلی آیت

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۵۳﴾

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر وہ اللہ کی طرف سے ہوا، پھر تم نے اس کا انکار کر دیا تو اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو بہت دور کی مخالفت میں پڑا ہو ﴿۵۲﴾ عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں میں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان کے لیے واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے اور کیا تیرا رب کافی نہیں اس بات کے لیے کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۵۳﴾

میں کافر انسان کا قول بیان ہوا ہے، اس آیت میں اس کا حال بیان ہوا ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۱۲)، ہود (۱۰، ۱۱) اور سورۂ زمر (۴۹)۔

**آیت 52** قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ ...... : یہ پوری سورت قرآن کریم، توحید و رسالت اور قیامت کے حق ہونے کے دلائل سے بھری ہوئی ہے، جنھیں کفار نہ صرف یہ کہ مانتے نہیں تھے بلکہ سننے پر بھی تیار نہیں تھے، جیسا کہ آیت (۵) میں گزرا: ﴿ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ ﴾ ''اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں۔'' اور آیت (۲۶) میں ہے: ﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ﴾ ''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو۔'' تو سورت کے آخر میں نبی ﷺ کو حکم ہوا کہ ان سے کہیں کہ تم جو قرآن کو سننے تک کے لیے تیار نہیں اسے باطل یا جھوٹ کیسے کہہ سکتے ہو؟ کیونکہ اسے غلط تو تب کہہ سکتے ہو کہ اسے سنو، پھر حق ہو تو قبول کرو، ورنہ دلیل سے اسے باطل قرار دو، اتنا تم میں حوصلہ نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمھیں اس کے باطل ہونے کا یقین نہیں، ورنہ ایسی چیز جس کا غلط ہونا بالکل واضح ہو، اس کے سننے پر اتنی شدید پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمھارے ذہن میں بھی اس کے حق ہونے کا امکان موجود ہے۔ اس لیے یہ بتاؤ کہ یہ قرآن جسے تم سننے ہی کے روادار نہیں، اگر واقعی اللہ کی طرف سے حق ہوا، پھر سنے سمجھے بغیر تم نے اسے جھٹلا دیا اور اسی حالت میں تمھاری موت آ گئی، پھر حشر بپا ہوا تو اس وقت تو تم اتنی دور کی مخالفت میں پڑ چکے ہو گے جو بہت دور کی مخالفت ہے، جس سے واپسی تم چاہو گے بھی تو ممکن نہیں۔ پھر جو خواہ مخواہ کی ایسی غلط مخالفت پر ڈٹ جائے، جس سے واپسی ممکن نہ ہو، اس سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے؟ آیت کا مقصد کفار کو سننے اور سوچنے پر آمادگی کی ترغیب اور اس وقت سے ڈرانا ہے جب ان کی مخالفت کے نقصان کا مداوا نہیں ہو سکے گا۔

**آیت 53** ① سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ...... : ''اَلْاٰفَاقِ'' ''اُفُقٌ'' کی جمع ہے، کنارے۔ دور وہ جگہ جہاں آسمان و زمین ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، افق کہلاتی ہے۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی ہے، ایک یہ کہ

اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴿۵۴﴾

سنو! یقیناً وہ لوگ اپنے رب سے ملنے کے بارے میں شک میں ہیں۔ سن لو! یقیناً وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۵۴﴾

"اِنَّهُ" کی ضمیر سے مراد قرآن اور نبی کریم ﷺ ہیں۔ یعنی ہم انھیں دنیا بھر میں اور خود ان میں اپنی ایسی نشانیاں دکھا دیں گے جن سے ثابت ہو جائے گا کہ آپ ﷺ کی نبوت اور قرآن حق ہے۔ نشانیوں سے مراد ظاہری اسباب کی قلت کے باوجود اسلام کی فتوحات ہیں۔ "الْاٰفَاقِ" سے مراد مکہ کے گرد و پیش میں اسلام کا غلبہ ہے جو بدر، اُحد، خندق اور دوسرے معرکوں کے ساتھ جزیرۂ عرب پر اور آخر کار پوری زمین کے مشرقی اور مغربی کناروں تک پھیل گیا اور "اَنْفُسِهِمْ" سے مراد مکہ کی فتح ہے جو بجائے خود اسلام کے حق ہونے کی بہت بڑی دلیل تھی، جس کے بعد لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے۔ مطلب یہ کہ عنقریب جب گرد و پیش کے ممالک اور خود ان (قریش) پر فتوحات حاصل ہوں گی جو آپ ﷺ اور خلفائے اسلام کے عہد میں حاصل ہوئیں، تب انھیں یقین حاصل ہوگا کہ قرآن اور پیغمبر حق تھے اور یہ ناحق انھیں جھٹلاتے رہے۔

دوسری تفسیر یہ کہ "اِنَّهُ" کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کے دلائل پر غور کریں گے، جو تمام آفاق یعنی زمین و آسمان میں پائے جاتے ہیں، مثلاً سورج چاند، نباتات و جمادات و حیوانات وغیرہ اور جو خود ان کی ذات میں پائے جاتے ہیں، مثلاً نطفے سے لے کر پیدائش تک، پھر بچپن سے لے کر موت تک، پھر ان کے وجود کی حیرت انگیز بناوٹ پر، جن کے عجائبات کے متعلق ہر روز نئے سے نئے انکشافات ہوتے رہیں گے، تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے۔ پہلے مطلب کو ابن جریر طبری نے ترجیح دی ہے، جبکہ دوسرا مطلب بعض تابعین نے اختیار فرمایا ہے۔ دونوں مطلب بیک وقت بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

② اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ ...... : یعنی مسلمانوں کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی کہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ کفارِ قریش پر اور کل عالم پر کیسے ممکن ہے تو اسے کہو، کیا تمھارا رب یہ کام کرنے کے لیے اکیلا کافی نہیں؟ اس لیے کہ وہ اکیلا ہر چیز اور ہر کام کا نگران اور اس پر شاہد ہے، اسے کسی کی مدد یا مشورے کی کوئی حاجت نہیں۔

**آیت 54** : ① اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ : یعنی یہ لوگ قرآن اور اللہ کے رسول کو اس لیے جھٹلا رہے ہیں کہ انھیں قیامت کا یقین نہیں، بلکہ وہ اپنے رب کی ملاقات کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

② اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ : یعنی وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے، کوئی چیز اس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں، اس لیے وہ اس کی گرفت سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔

سورۃ الشوریٰ ۴۲ — آیاتھا ۵۳ — رکوعاتھا ۵ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝۱ عٓسٓقٓ ۝۲ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ② اسی طرح وحی کرتا ہے تیری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے، وہ اللہ جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ③

آیت 1، 2 حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ: یہ حروف مقطعات ہیں، ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 3 ① كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ: ''كَذٰلِكَ'' (اسی طرح) سے مراد ایک تو وہ مضامین و معانی ہیں جو اس قرآن یا اس سورت میں ہیں، یعنی آپ کی طرف توحید، آخرت، نبوت اور دوسرے عقائد و اعمال اور واقعات پر مشتمل جو وحی کی گئی ہے یہ کوئی نرالی نہیں کہ کفار کو اس پر تعجب ہو رہا ہے، بلکہ ایسے ہی مضامین کی وحی اللہ تعالیٰ آپ کی طرف اور آپ سے پہلے پیغمبروں کی طرف کرتا چلا آیا ہے۔ بعض وقتی احکام میں فرق ہو سکتا ہے، مگر اصل دعوت جس کے لیے آپ کو اور پہلے تمام پیغمبروں کو مبعوث کیا گیا ایک ہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [ الأنبیاء: ۲۵ ] ''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ، أُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَ دِيْنُهُمْ وَاحِدٌ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول اللّٰه تعالٰی: ﴿ واذكر في الكتاب مريم ...... ﴾: ۳۴۴۳ ] ''انبیاء علاتی (مختلف ماؤں سے پیدا ہونے والے) بھائی ہیں، ان کی مائیں الگ الگ ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔'' اور ''كَذٰلِكَ'' (اسی طرح) سے مراد وحی کرنے کا طریقہ بھی ہے، یعنی جس طرح یہ سورت یا یہ کتاب آپ کی طرف وحی کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح آپ سے پہلے پیغمبروں کی طرف بھی وحی کرتا چلا آیا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رسالت کے لیے چن لیتا ہے، پھر اس کے ساتھ وحی کی ان صورتوں میں سے کسی صورت کے ساتھ کلام کرتا ہے جو اس نے اس سورت کے آخر میں کسی بھی بشر کے ساتھ کلام کرنے کی بیان فرمائی ہیں۔ (دیکھیے شوریٰ: ۵۱، ۵۲) کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کیوں نازل نہیں کی، یا مجھ سے کلام کیوں نہیں فرمایا۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''یا رسول اللہ! آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَحْيَانًا يَأْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيُفْصَمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ، وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ فَأَعِيْ مَا يَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَ إِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا )) [ بخاري،

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ④ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہی بے حد بلند، بڑی عظمت والا ہے ④ آسمان قریب

بدء الوحي إلى الرسول ﷺ، باب : ۲ | ''میرے پاس وحی کبھی تو گھنٹی کی مسلسل آواز کی طرح آتی ہے جو مجھ پر وحی کی سب سے زیادہ سخت صورت ہے، پھر وہ مجھ سے اس حال میں ختم ہوتی ہے کہ جو کچھ مجھے کہا ہے وہ میں یاد کر چکا ہوتا ہوں اور کبھی فرشتہ ایک آدمی کی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے، تو جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''میں نے آپ کو سخت سردی والے دن میں آپ پر وحی اترنے کی حالت میں دیکھا کہ وہ کیفیت آپ سے ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی پسینے سے ٹپک رہی ہوتی تھی۔''

② وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی آیات (۱۶۳ تا ۱۶۵)۔

③ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : سورۂ نساء کی آیات، جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، ان میں پیغمبروں کی طرف وحی کا ذکر فرما کر بات کا خاتمہ اپنے ہمیشہ سے عزیز و حکیم ہونے کے ساتھ کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ [ النساء : ١٦٥ ] ''اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' قرآن مجید میں جہاں جہاں وحی نازل کرنے کا ذکر ہے اس کے بعد مقام کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء و صفات کا ذکر بھی ہے۔ کتاب اللہ نازل کرنے کے ساتھ عزیز و حکیم کے ذکر کی مناسبت کے لیے دیکھیے سورۂ زمر کی پہلی آیت کی تفسیر، ساتھ سورۂ مومن کی پہلی آیت کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 4 ① لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اگر محمد (ﷺ) پر یہ کتاب پہلے پیغمبروں کی طرح نازل ہوئی ہے تو ہوتی رہے، ہم پر کیوں لازم ہے کہ ہم اس کے احکام کی پابندی کریں اور اپنی مرضی پر عمل نہ کریں؟ فرمایا، اس لیے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، خود تم بھی اس کی ملکیت ہو۔ بھلا وہ مالک برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی ملکیت میں کسی اور کی خدائی چلے اور اس کا مملوک ہو کر کوئی اپنی مرضی کرتا پھرے اور اس کے بھیجے ہوئے احکام پر عمل نہ کرے۔ مزید دیکھیے آیت الکرسی یعنی سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵۵) میں اس جملے کی تفسیر۔

② وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ : بے حد بلندی اور بے انتہا عظمت والا صرف وہی ہے ( الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ خبر پر الف لام آنے سے قصر پیدا ہو گیا کہ وہی علیّ و عظیم ہے ) تو وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی مخلوق اس کے مقابلے میں بے حد پست اور بے انتہا حقیر ہو کر اس کے احکام نہ مانے۔

آیت 5 ① تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ: ''وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ'' کے بعد یہ فرمانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آسمان قریب ہیں کہ اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے علیّ و عظیم ہونے کی وجہ سے اس کے رعب اور جلال کا یہ عالم ہے کہ آسمان اس کی ہیبت و قوت برداشت نہ کرتے ہوئے پھٹ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت کا آسمانوں پر جو اثر ہے اس کا کچھ اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے جو ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنِّيْ أَرٰى مَا

فَوْقِهِنَّ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ

ہیں کہ اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا

لَا تَرَوْنَ وَأَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ أَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ مَا فِيْهَا مَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلَّا وَ مَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهُ سَاجِدًا لِلّٰهِ، وَاللّٰهِ! لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشِ وَلَخَرَجْتُمْ إِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُوْنَ إِلَى اللّٰهِ» [ ترمذي، الزهد، باب في قول النبي ﷺ لو تعلمون …… : ۲۳۱۲، و حسنه الترمذي، و قال الألباني حسن ] ’’میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چر چرا رہا ہے اور اس کا حق ہے کہ چر چرائے، اس میں چار انگلیوں کی جگہ نہیں مگر کوئی نہ کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھ کر اللہ کے لیے سجدے میں ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو بہت کم ہنسو اور بہت زیادہ روؤ، اور تم بستروں پر عورتوں سے لذت حاصل نہ کرو اور تم اللہ کی طرف گڑگڑاتے ہوئے بیابانوں کی طرف نکل جاؤ۔‘‘ اور ایک مطلب یہ ہے کہ اس عزیز و حکیم اور علیّ و عظیم مالک کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لانے اور اس اکیلے کی عبادت کے بجائے کسی مخلوق کو، جس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں، مشکل کشا، حاجت روا، داتا، دستگیر، غریب نواز، بگڑی بنانے والا اور ڈوبتے ہوئے کو پار لگانے والا مان لینا، یا اسے اللہ تعالیٰ کی بیوی یا بیٹا یا اس کے ذاتی نور کا ٹکڑا قرار دے کر اس کی عبادت اور اس سے مانگنا شروع کر دینا کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ اتنی خوفناک بات ہے کہ قریب ہے یہ بات کہنے پر آسمان اپنے اوپر سے گر پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں۔ سورۂ مریم کی آیات (۸۸ تا ۹۵) میں یہ بات تفصیل سے بیان ہوئی ہے، وہ آیات مع تفسیر ملاحظہ فرمالیں۔

❷ مِنْ فَوْقِهِنَّ : آسمانوں کے اپنے اوپر سے پھٹنے کا مطلب یہ ہے کہ قریب ہے کہ یہ آسمان اپنے اوپر کی جانب سے پھٹ جائیں۔ چنانچہ سب سے اوپر والا آسمان پھٹ کر نیچے والے آسمان پر گرے، وہ اس سے نچلے پر گرے، اس طرح تمام آسمان پھٹیں اور نیچے والوں کے اوپر گر جائیں۔ آسمانوں کے اپنے اوپر سے پھٹنے کی وجہ وہاں بے شمار فرشتوں کا سجدہ ریز ہونا اور عرش الٰہی کے قریب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی ہیبت کے آثار کا بہت زیادہ ہونا ہے۔

❸ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ : تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر عیب اور ہر کمی سے پاک قرار دینا اور حمد سے مراد اسے ہر خوبی کا مالک قرار دینا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی توحید ہے اور اس کی طرف منسوب کیے جانے والے تمام عیوب میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ کوئی اس کا شریک ہے یا اس کی اولاد یا بیوی ہے۔ سب سے بڑا عیب اس لیے کہ یہ مان لینے کی صورت میں اس کا محتاج اور عاجز ہونا ثابت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے لیے گالی قرار دیا۔ فرشتے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جمال و جلال اور صفاتِ کمال کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

❹ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ : اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ ” لِمَنْ فِي الْاَرْضِ “ سے مراد مومن ہیں اور فرشتے زمین والوں میں سے صرف ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، کیونکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ

هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۝

کرتے ہیں جو زمین میں ہیں، سن لو! بے شک اللہ ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۝

وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ [ المؤمن : ۷ ] ''وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم سے گھیر رکھا ہے، تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا۔'' مگر بعض مفسرین نے فرمایا: ''آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ (فرشتے ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے ہیں جو زمین میں ہیں) اس میں مومن و کافر دونوں شامل ہیں اور فرشتوں کے مسلم و کافر سب کے لیے استغفار کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام زمین والوں کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، خواہ مومن ہوں یا کافر کہ اے اللہ! ان کے لیے ایسے اسباب مہیا فرما جن کی بدولت ان سے عذاب ٹلے، کافر ہیں تو ایمان لائیں، فاسق ہیں تو توبہ کریں، تاکہ ان کی بخشش ہو جائے۔'' قرطبی نے اس بات کو راجح قرار دیا ہے۔

اس تفسیر پر ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ اور ایمان والوں کو مشرکین کے لیے استغفار سے منع فرمایا ہے، آپ استغفار کا کوئی بھی معنی کر لیں فرشتوں کا کفار و مشرکین کے لیے استغفار ممکن ہی نہیں، کیونکہ وہ اپنے رب کے کسی حکم کی نافرمانی کرتے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ [ التحریم : ٦ ] ''وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انھیں حکم دے اور وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں۔'' اس سوال کا جواب اسی آیت میں موجود ہے جس میں مشرکین کے لیے استغفار سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴾ [ التوبة : ۱۱۳ ] ''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔'' معلوم ہوا مشرکین کے لیے استغفار اس وقت منع ہے جب ان کا جہنمی ہونا واضح اور یقینی ہو جائے اور ظاہر ہے کسی کے جہنمی ہونے کا یقین اس کے کفر پر مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک کوئی زندہ ہے کسی وقت بھی اسے ایمان کی توفیق عطا ہو سکتی ہے اور یہ علم کہ کس نے کفر پر مرنا ہے کسی انسان، جن یا فرشتے کو نہیں، اس لیے کفار کے لیے ہدایت کی دعا کرنا، جس سے ان کی بخشش ہو جائے، جائز بلکہ سنت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! دوس قبیلے نے نافرمانی کی ہے اور ایمان لانے سے انکار کر دیا ہے، آپ ان پر بد دعا کریں۔'' لوگوں نے کہا: ''دوس قبیلہ ہلاک ہو گیا۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَائْتِ بِهِمْ )) [ بخاري، الجهاد، باب الدعاء للمشركين بالهدى ليتألفهم : ۲۹۳۷ ] ''اے اللہ! دوس قبیلے کو ہدایت دے اور انھیں لے آ۔''

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖٞ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۶ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا وَ تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ

اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا کوئی اور کارساز بنا لیے اللہ ان پر نگران ہے اور تو ہرگز ان کا کوئی ذمہ دار نہیں ۝۶ اور اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن وحی کیا، تاکہ تو بستیوں کے مرکز ( مکہ ) کو ڈرائے اور ان لوگوں کو بھی جو اس کے ارد گرد ہیں اور تو اکٹھا کرنے کے دن سے ڈرائے جس میں کوئی شک نہیں، ایک گروہ جنت

⑤ اس آیت سے فرشتوں کی صاف دلی اور زمین والوں کے لیے خیر خواہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھی انسانوں کے باپ کو سجدے کے حکم سے انکار پر ابلیس ملعون ٹھہرا تھا، جب کہ اللہ کے حکم سے فرشتوں نے سجدہ بھی کیا اور ان کے حق میں دعائیں بھی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ متکبر تھا ملعون ٹھہرا، یہ متواضع تھے مقرب ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی ہی صاف دلی عطا فرمائے اور ہماری طرف سے فرشتوں کو بہترین بدلا عطا فرمائے۔ ( آمین )

⑥ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ : خبر ”الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ“ پر الف لام اور ضمیر فصل ”هُوَ“ سے قصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: ”سن لو! بے شک اللہ تعالیٰ ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ یعنی کسی اور میں یہ صفات نہیں ہیں۔ اس میں مشرکین کو تنبیہ ہے کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اگر یہ بات فرشتوں کے اختیار میں ہوتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کیوں کرتے؟

**آیت 6** ① وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ......: اس جملے میں مشرکین کے لیے بہت شدید ڈانٹ اور دھمکی ہے کہ اوپر آیات میں جس اللہ کا ذکر ہوا، جو عزیز و حکیم اور علی و عظیم ہے، جس کی ہیبت سے آسمان پھٹنے کے قریب رہتے ہیں اور جس کی تسبیح و حمد تمام فرشتے کرتے ہیں، جن لوگوں نے اس اللہ کے سوا کسی قسم کے کارساز بنائے، جو ان کے خیال میں فوق الفطرت طریقے سے ان کی حاجتیں و مرادیں بر لاتے اور ان کی دستگیری و فریاد رسی کرتے ہیں، ان کے ایک ایک عمل کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، وہ سب اس کے پاس محفوظ ہیں اور بہت جلد وہ انھیں ان کا بدلا دے گا۔

② وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ: ”مَاۤ“ نافیہ کی تاکید ”بِوَكِيْلٍ“ کی باء کے ساتھ ہو رہی ہے اور ”بِوَكِيْلٍ“ کی تنوین تنکیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”تو ہرگز ان کا کوئی ذمہ دار نہیں“ کیا گیا ہے۔ ”وَكَلَ يَكِلُ“ (ض) سپرد کرنا۔ ”وَكِيْلٌ“ جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے، ذمہ دار، یعنی ان کفار و مشرکین کی نگرانی اور ان کے اعمال کی جزا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، آپ انھیں ہدایت دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو زیادہ پریشان یا غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ [ ھود : ۱۲ ] ”تُو تو صرف ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔“ مزید دیکھیے سورۂ یونس (۹۹، ۱۰۰) اور سورۂ انعام (۳۵)۔

**آیت 7** ① وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا: قرآن عربی زبان میں نازل کرنے کی چند حکمتوں کے جاننے کے

لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝

میں ہوگا اور ایک گروہ بھڑکتی آگ میں ۝

لیے دیکھیے سورۂ یوسف کی آیت (۲) کی تفسیر۔

❷ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا: "اُمَّ الْقُرٰى" کا معنی بستیوں کی ماں یا بستیوں کی جڑ یا اصل ہے، یعنی بستیوں کا مرکز۔ مراد مکہ معظمہ ہے، کیونکہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے سب سے پہلا گھر یہیں تعمیر ہوا، جسے تمام دنیا کی ہدایت کا مرکز قرار دیا گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ آل عمران : ۹۶ ] "بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا، یقیناً وہی ہے جو بکہ میں ہے، بہت با برکت اور جہانوں کے لیے ہدایت ہے۔" تمام دنیا کے لوگوں کے لیے اس شہر میں موجود بیت اللہ کا حج صاحب استطاعت لوگوں پر فرض کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے تمام روئے زمین سے بہتر قرار دیا۔ عبد اللہ بن عدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو "حَزْوَرَةُ" (شہر مکہ کی ایک جگہ) پر کھڑے دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: (( وَاللّٰهِ ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ وَلَوْلَا أَنِّيْ أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ )) [ ترمذي، المناقب، باب في فضل مكة : ۳۹۲۵، و قال الألباني صحيح ] "اللہ کی قسم! یقیناً تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر اور اللہ کی زمین میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور اگر مجھے اس سے نکالا نہ جاتا تو میں نہ نکلتا۔" آپ ﷺ پر وحی کی ابتدا یہاں سے ہوئی اور آپ کی دعوت کا آغاز یہیں سے ہوا۔

❸ یہاں ایک سوال ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو کل عالم اور تمام روئے زمین کے لیے ڈرانے والے تھے، پھر یہاں آپ کے بھیجنے کا مقصد صرف مکہ اور اس کے اردگرد کو کیوں بتایا گیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو "مَنْ حَوْلَهَا" میں پوری زمین شامل ہے، مکہ پوری زمین کا مرکز ہے، سب اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اس کے حج کے لیے جاتے ہیں۔ اگر "مَنْ حَوْلَهَا" سے قریب قریب اردگرد کی بستیاں مراد لی جائیں تب بھی آپ کو مکہ اور اس کے اردگرد ڈرانے کے لیے بھیجنے کی بات کا مقصد یہ نہیں کہ آپ دوسری اقوام کی طرف مبعوث نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۲۱۴ ] "اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرا۔" سب جانتے اور مانتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ آپ صرف قریبی رشتہ داروں کے لیے مبعوث ہوئے تھے، ورنہ اہل مکہ و مدینہ کو دعوت دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اسی طرح نبی ﷺ کو ام القریٰ اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو ڈرانے کے لیے بھیجنے کا مقصد آپ ﷺ کی دعوت کو یہاں تک محدود کرنا نہیں۔ اس بات کا ذکر کہ آپ ﷺ کی بعثت تمام جن و انس کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۹)، اعراف (۱۵۸)، فرقان (۱)، احقاف (۲۹ تا ۳۲) اور سورۂ سبا (۲۸)۔

❹ وَ تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ : "اَنْذَرَ يُنْذِرُ" (ڈرانا) کے دو مفعول ہوتے ہیں، کیونکہ ڈرانے میں دو چیزیں ملحوظ ہوتی ہیں، ایک یہ کہ کسے ڈرایا جا رہا ہے اور دوسری یہ کہ اسے کس چیز سے ڈرایا جا رہا ہے۔ اس آیت میں "لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۸﴾

**اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور انھیں ایک امت بنا دیتا اور لیکن وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو ظالم ہیں ان کے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ﴿۸﴾**

حَوْلَهَا" اور "وَ تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ" دو جملے ہیں، دونوں میں " تُنْذِرَ " کے دو دو مفعول ہیں۔ پہلے جملے میں پہلا مفعول ذکر فرمایا اور دوسرا حذف کر دیا، جو آیت کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے: "أَيْ لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا الْعَذَابَ" "یعنی تاکہ تو ام القریٰ اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو عذاب سے ڈرا دے۔" دوسرے جملہ میں پہلا مفعول حذف کر دیا اور دوسرا ذکر فرمایا: "أَيْ لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا يَوْمَ الْجَمْعِ" "یعنی تاکہ تو ام القریٰ اور اس کے اردگرد کی بستیوں کو یوم الجمع سے ڈرا دے۔"

مطلب یہ ہے کہ اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن وحی کیا، تاکہ تو بستیوں کے مرکز اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو گزشتہ اقوام پر آنے والے عذاب سے ڈرائے اور تاکہ تو ام القریٰ اور اس کے اردگرد کی بستیوں کو گزشتہ اقوام جیسے عذاب کے ساتھ ساتھ یوم الجمع سے بھی ڈرائے۔ اتنی لمبی بات کو ان مختصر الفاظ میں سمیٹ دیا: ﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا وَ تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ﴾ اسے احتباک کہتے ہیں اور اس سے کلام میں اختصار، جامعیت اور حسن پیدا ہوتا ہے۔

⑤ "يَوْمَ الْجَمْعِ" قیامت کے دن کو کہتے ہیں، کیونکہ اس دن سب پہلے پچھلے جمع ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ [ التغابن : ۹ ] "جس دن وہ تمھیں جمع کرنے کے دن کے لیے جمع کرے گا، وہی ہار جیت کا دن ہے۔"

⑥ لَا رَيْبَ فِيْهِ : "جس میں کوئی شک نہیں" کیونکہ یہ بات فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ مالک اپنے غلاموں کو کسی کام پر مقرر کرے، پھر وہ ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کریں تو ضروری ہے کہ وہ کسی دن انھیں اکٹھا کر کے مظلوم کو ظالم سے انصاف دلائے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو بے انصاف شمار ہوگا۔ تو احکم الحاکمین کے سب کو جمع کرنے کے دن میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ رہی یہ بات کہ کچھ لوگ اس میں شک کرتے ہیں، تو ان کے شک کو کالعدم قرار دیا کہ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔

⑦ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ : یہ "يَوْمَ الْجَمْعِ" کا انجام ہے کہ ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک گروہ بھڑکتی ہوئی آگ میں جائے گا۔

**آیت 8** ① وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فریق جنتی اور ایک جہنمی کیوں بنایا، سبھی کو ایک جیسا کیوں نہیں بنا دیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا تو جس طرح اس نے کائنات کی تمام چیزوں کو بے اختیار بنایا ہے وہ جن و انس کو بھی کسی قسم کا اختیار نہ دیتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ سب دین حق پر رہتے، مگر اس نے انھیں اختیار اور ارادہ میں آزادی دے کر پیدا فرمایا، تاکہ ان کا امتحان ہو اور اس کی صفات رحمت، غضب اور عدل کا ظہور ہو۔ یہ اس کی

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَ هُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ۹ ع۲

**یا انھوں نے اس کے سوا اور کارساز بنا رکھے ہیں؟ سو اللہ ہی اصل کارساز ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ⑨**

---

مشیت ہے، جس میں بے شمار حکمتیں ہیں، جنھیں پوری طرح وہی جانتا ہے، انسان چاہے بھی تو ان کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا، وہ اتنا ہی جان سکتا ہے جتنا پروردگار چاہے۔

② **وَ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ :** نیکی و بدی کی تمیز اور ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی دینے کے بعد وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، مگر اس کی یہ مشیت اندھی نہیں کہ اس کا کوئی قاعدہ نہ ہو، بلکہ اس سے اگلے جملے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے حق دار بنتے ہیں اور وہ کون ہیں جو اس سے محروم رہتے ہیں۔

③ **وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ :** قرآن مجید کی اصطلاح میں ''ظلم'' اور ''ظالمین'' کا لفظ شرک اور مشرکین کے لیے استعمال ہوتا ہے (دیکھیے انعام: ۸۲) اور ''قسط'' اور ''عدل'' کا لفظ توحید کے لیے آیا ہے، کیونکہ سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور سب سے بڑا عدل توحید ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ﴾ [ آل عمران : ۱۸ ] ''اللہ نے گواہی دی کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔'' ارادہ و عمل کا اختیار ملنے کے بعد جن لوگوں نے اپنی جان پر ظلم کیا، اپنے خالق و مالک اور رازق کو اکیلا معبود بنانے اور اسی کی عبادت پر قائم رہنے کے بجائے غیروں کو معبود بنایا، جن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں، تو ان کا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔ معلوم ہوا ایسے لوگ اللہ کی رحمت میں داخل نہیں ہوں گے، کیونکہ انھیں اپنی رحمت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ کے عدل اور مشیت کے خلاف ہے اور وہ خود بھی اللہ کی رحمت سے ناامید ہیں، ورنہ کبھی غیروں کی طرف نہ جاتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ يَىِٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ ﴾ [ العنکبوت : ۲۳ ] ''وہ میری رحمت سے ناامید ہو چکے ہیں۔'' یہی بات نہایت وضاحت کے ساتھ سورۂ دہر (۳۰،۲۹) میں بیان فرمائی گئی ہے۔ ہاں، جو لوگ ایمان لائے اور اس میں ظلم عظیم یعنی شرک کی آمیزش نہیں کی وہی اللہ تعالیٰ کی رحمت میں داخل ہوں گے اور وہی اس کی امید رکھ سکتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ﴾ [ البقرۃ : ۲۱۸ ] ''وہی اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔''

④ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر کچھ لوگ حق واضح ہونے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے اور کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں تو آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا، مگر یہ جبر ہوتا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت نہیں۔ اس نے اپنی حکمت اور مشیت کے تحت انسان کو اختیار دے رکھا ہے، جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر کرے، اس لیے لوگوں میں یہ اختلاف ہمیشہ رہے گا۔ یہ مضمون متعدد آیات میں بیان ہوا ہے، دیکھیے سورۂ یونس (۹۹، ۱۰۰)، ہود (۱۱۸، ۱۱۹) اور سورۂ سجدہ (۱۳)۔

**آیت 9** اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ...... : پچھلی آیت میں جو فرمایا کہ ظالموں کے لیے نہ ولی (دوست) ہے نہ

**وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ**

**اور وہ چیز جس میں تم نے اختلاف کیا، کوئی بھی چیز ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر**

کوئی مددگار، یہ اس کی تفصیل ہے کہ آیا انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر کوئی اولیاء، کارساز اور دوست بنا رکھے ہیں۔ سو اصل دوست جو فی الواقع کارسازی اور مدد کر سکتا ہے وہ تو صرف اللہ ہے۔ ساتھ ہی اس کی دو زبردست دلیلیں بیان فرمائیں کہ وہی مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور بخشے گا اور وہی ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، کیونکہ اس کا حق وہی رکھتا ہے جس میں یہ صفات ہوں۔ پھر اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ ایسی ہستیوں کو اولیاء اور کارساز بنا لیا جائے جو کسی کو زندگی بخشنا تو درکنار خود مرنے والے ہیں، فرمایا: ﴿ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [ النحل : ۲۱ ] ''مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں اور وہ نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے۔'' ہر چیز پر قدرت تو بہت دور، ایک ذرے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ دیکھیے سورۂ سبا (۲۲)۔

**آیت 10** ❶ وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ...... : یہ آیت اگرچہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مگر یہ بات رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کہلوائی گئی ہے، جیسا کہ سورۂ فاتحہ بندوں کی زبانی کہلوائی گئی ہے۔

❷ اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک اور ولی و کارساز ہے، موت و حیات اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، ان صفات سے خود بخود وہ بات ثابت ہو رہی ہے جو اس آیت میں فرمائی ہے کہ جب مالک وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہے اور انسانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کا فیصلہ بھی اسی کا کام ہے۔ وہ اختلاف عقیدہ میں ہو یا عمل میں، عبادات میں ہو یا معاملات میں، نیکی و بدی قرار دینے میں ہو یا حلال و حرام ٹھہرانے میں، غرض ہر بات میں فیصلہ اسی کا چلے گا۔ کسی اور کو یہ حق دینا کہ وہ شریعت سازی کرے یا حلال و حرام کا فیصلہ کرے درحقیقت اس کی عبادت اور اسے اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا ہے، فرمایا: ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ﴾ [ یوسف : ۴۰ ] ''حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو۔'' مزید دیکھیے سورۂ یوسف (۶۷)، انعام (۵۷)، مائدہ (۴۴)، کہف (۲۶) اور سورۂ قصص (۷۰، ۸۸)۔

رسول اللہ ﷺ ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے سے اور اس کے حکم کے تحت کرتے، اس لیے آپ ﷺ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر تنازع کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کرنے کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [ النساء : ۵۹ ] ''پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [ النساء : ۶۵ ] ''پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ

# وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ⑩

## میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں ⑩

کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کر لیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔“

③ یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام کے فیصلے کا اختیار دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو ”اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ بنا لیا۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۳۱) کی تفسیر۔

④ یہود و نصاریٰ نے ایک مدت تک حلال و حرام قرار دینے کا اختیار آسمانی شریعت کے بجائے اپنے احبار و رہبان کو دیے رکھا، آخر کار انھوں نے یہ تکلف بھی برطرف کیا اور اپنی آسمانی کتاب یا احبار و رہبان کے بجائے جمہوریت کے نام پر یہ اختیار خود سنبھال لیا کہ عوام کی اکثریت جو فیصلہ کرے وہ حق ہے، ان کے منتخب نمائندے اپنی اکثریت کے ساتھ جسے حلال کہہ دیں وہ حلال اور جسے حرام کہہ دیں وہ حرام ہے۔ آج اگر اکثریت کسی چیز کو حلال کہہ رہی ہے تو وہ حلال ہے، کچھ دن بعد اکثریت اگر حرام کہہ دے تو وہ حرام ہے۔ اب تورات کی ہر قید جو طبیعتوں پر گراں تھی توڑ دی گئی، باہمی رضا سے زنا جائز قرار دیا گیا، رجم کو کالعدم کر دیا گیا، قومِ لوط کا عمل جائز قرار دے دیا گیا، قتل اور قطع اعضا میں قصاص ختم کر دیا گیا اور سود حلال ٹھہرا۔ غرض جمہوریت کے نام پر ایک نئی شریعت ایجاد کی گئی جس کا رب، رسول اور شریعت سب کچھ انسان قرار پائے، اس طرح بندوں کو مالک کی گدی پر بٹھا دیا گیا۔

⑤ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: «لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا شِبْرًا وَذِرَاعًا ذِرَاعًا، حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ، قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ فَمَنْ؟» [ بخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول النبي ﷺ: "لتتبعن سنن من كان قبلكم": ۷۳۲۰، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ ] ”تم ہر صورت اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر چل پڑو گے، جیسے بالشت بالشت کے ساتھ اور ہاتھ ہاتھ کے ساتھ برابر ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کے بل میں داخل ہوئے تو تم ان کی پیروی کرو گے۔“ ہم نے کہا: ”یا رسول اللہ! یہود و نصاریٰ کے طریقوں پر؟“ آپ نے فرمایا: ”تو اور کون؟“

مسلمان خیر القرون میں اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک صرف اور صرف قرآن و سنت پر کار بند رہے، یہ اسلام کی ترقی و عروج کا دور ہے، پھر بعض ائمہ کی تقلید شروع ہوئی اور ان کے نام پر ایسی گروہ بندی اور فرقہ سازی ہوئی کہ بعض لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے امام کا قول اللہ اور اس کے رسول کے صریح خلاف ہے، اپنے امام کے قول پر اڑ گئے۔ احبار و رہبان کو ارباب بنانے کا نقشہ اہل کتاب کی طرح اہل اسلام میں بھی نظر آنے لگا، حتیٰ کہ یہ دین حق کئی مذہبوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہر کسی کی مساجد الگ، عدالتیں اور قاضی الگ ہو گئے، امت کی وحدت جو صرف کتاب و سنت کو حاکم ماننے سے حاصل ہوتی تھی پارہ پارہ ہو گئی، مسلمانوں کی توانائیاں کفار کے ساتھ جہاد اور اس کی تیاری کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔ یہی لوگ حاکم تھے یہی قاضی، اصلاح کی آوازیں اٹھتی رہیں، مگر بے سود۔ چنانچہ کچھ مدت تک تو کتاب و سنت سے انحراف

کے باوجود الگ الگ سلطنتوں کی شکل میں مسلمانوں کی حکمرانی کا سلسلہ چلتا رہا، پھر باہمی فساد اور ترکِ جہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو چار ملکوں کے سوا تمام مسلم ممالک نصرانی یا کمیونسٹ کفار کے قبضے میں چلے گئے، جنھوں نے جبراً ان ممالک میں اپنے کفریہ احکام نافذ کر دیے، پھر نہ کتاب و سنت کے احکام باقی رہے نہ ائمہ کے مذاہب۔ ہر جگہ کفار کا حکم چلنے لگا اور بنی اسرائیل کی طرح مسلمانوں پر بھی اللہ کے عذاب کا کوڑا کفار کی غلامی کی صورت میں برسنے لگا۔ مسلمان آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلسل جد و جہد اور دعائیں کرتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور ان کی آزادی کے لیے جد و جہد اور کفار کی باہمی جنگِ عظیم کے نتیجے میں بہت سے مسلم ممالک کو آزادی ملی۔ اس کے بعد جہاد کے نتیجے میں بہت سے ممالک کمیونسٹوں کے تسلط سے بھی آزاد ہوئے، مگر تمام ممالک میں برسر اقتدار طبقے نے کفر کا وہی نظامِ حکومت برقرار رکھا جو کفار کے زمانے میں تھا، جس میں فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق نہیں بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے اہل کتاب کے نقش قدم پر چلنے کی پیش گوئی پوری ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا دین صرف نماز روزے وغیرہ کے لیے باقی رہ گیا، گھروں، بازاروں، عدالتوں اور حکومت کے ایوانوں سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو جلاوطن کر کے اس کی جگہ جمہوریت کے بت کی پرستش شروع کر دی گئی۔ البتہ بعض ملکوں میں یہ تکلف کیا گیا کہ اس کا نام اسلامی جمہوریت رکھ دیا گیا، حالانکہ اسلام میں حکم اللہ کا ہوتا ہے اور جمہوریت میں بندوں کا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے شراب کو اسلامی شراب اور سود کو اسلامی سود کہہ کر حلال کر لیا جائے، جیسا کہ یہ ظلم بھی اس سے پہلے مسلمان اپنی جانوں پر کر چکے ہیں۔ ان کے بہت سے برسر اقتدار طبقوں نے ان علماء کے اقوال کو اپنی مملکتوں میں نافذ کیا جنھوں نے صرف انگور اور کھجور کی شراب کو حرام قرار دے کر دوسرے تمام نشہ آور مشروبات پینے پر حد ختم کر دی، خواہ ان سے نشہ بھی آ جائے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی عظیم سلطنتیں شراب کے سمندر میں غرق ہوگئیں کہ حکمران بھی پیتے تھے اور رعایا بھی اور جائز سمجھ کر پیتے تھے۔ اسی طرح سود کی بہت سی قسموں کو جائز قرار دے کر اسلامی سود رائج ہونے کے نتیجے میں طمع و ہوس کے طوفان نے ہمدردی و ایثار کا سلسلہ ختم کر دیا اور حرام ہوسِ زر نے مسلمانوں کو آخرت سے غافل کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اب بھی دنیا اور آخرت دونوں میں مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ دوبارہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کی طرف واپس پلٹیں اور اپنی پوری زندگی میں اس کی اطاعت اختیار کریں۔ ان شاء اللہ وہ وقت آنے والا ہے جب دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی، جس میں اللہ کی زمین پر صرف اللہ کا حکم چلے گا۔ یہ رسول صادق ﷺ کی پیش گوئی ہے اور ہر صورت پوری ہوگی۔ ہمارا کام جد و جہد ہے، اللہ چاہے گا تو ہم اپنی آنکھوں سے وہ مبارک دن دیکھیں گے، ورنہ ہمارے بعد آنے والے اسے ضرور دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ان بندوں میں شامل فرمائے جو قیامت تک دین حق قائم رکھنے کے لیے لڑتے رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَنْ يَبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ» [مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : "لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق ....." : ۱۹۲۲، عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ] ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس پر لڑتی رہے گی،

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ

(وہ) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے تمھارے لیے تمھارے نفسوں سے جوڑے بنائے اور جانوروں سے

یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔"

6 فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ: ہر جھگڑے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہونے میں شرعی احکام کا فیصلہ بھی شامل ہے، جیسا کہ اوپر گزرا اور یہ بھی کہ دنیا میں لوگوں کے درمیان جتنے جھگڑے ہیں ان کا واضح فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔ دنیا میں کفار اپنے آپ کو حق پر کہتے رہیں، مگر وہاں انبیاء اور ان کے متبعین کا حق پر ہونا اور کفار کا باطل پر ہونا سب کے سامنے واضح ہو کر آ جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ [ الزمر : ٤٦ ] "تو کہہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! ہر چھپی اور کھلی کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔"

7 ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ: یعنی وہی اللہ جس کی چند صفات اوپر کی آیات میں بیان ہوئیں، جنھیں تم بھی مانتے ہو، جو مختصراً یہ ہیں کہ وہ عزیز و حکیم ہے، علی و عظیم ہے، غفور و رحیم ہے، حقیقی ولی ہے، مردوں کو زندہ کرنے والا اور ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے والا ہے، وہی اللہ میرا رب ہے، ان میں سے ایک بھی صفت جب کسی اور میں پائی ہی نہیں جاتی تو میں کسی اور کو اپنا رب کیسے مان لوں؟

8 "عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ" (اسی پر میں نے بھروسا کیا) فعل ماضی ہے اور "وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ" (اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں) فعل مضارع ہے، جس میں استمرار اور ہمیشگی پائی جاتی ہے۔ "عَلَيْهِ" اور "اِلَيْهِ" پہلے آنے سے قصر کا معنی پیدا ہوا، اس لیے ترجمہ "اسی پر" اور "اسی کی طرف" کیا گیا ہے۔ یعنی میں شروع سے اسی پر بھروسا کر چکا اور اب ہر بات میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں، ہر مسئلے کا حکم اسی سے لیتا ہوں، ہر جھگڑے کا فیصلہ اسی سے کرواتا ہوں اور ہر گناہ پر اسی سے معافی مانگتا ہوں اور اسی کو حق سمجھتا ہوں۔

**آیت 11** 1 فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : یہ اللہ ہی کو رب ماننے، اسی پر توکل اور اسی کی طرف رجوع کی مزید دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہی کسی نمونے اور مادے کے بغیر آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، جب کہ تمھارے بنائے ہوئے معبودوں نے نہ ایک ذرہ پیدا کیا نہ کر سکتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حج (۷۳)۔

2 جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ...... : آسمان و زمین کو پیدا کرنے کے بعد اس نے تمھارے لیے خود تمھی میں سے تمھارے جوڑے بنائے، تاکہ تمھاری نسل جاری ہو اور مسلسل چلتی رہے۔ اپنی جنس سے جوڑے بنانے سے جو باہمی انس حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور جنس سے جوڑا بنانے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ابن عاشور نے فرمایا کہ عربوں میں جنیوں وغیرہ سے نکاح کی جھوٹی داستانیں مشہور ہیں سب جھوٹی اور خود ساختہ ہیں، کچھ لوگوں کے تخیل نے انھیں ایسا دکھایا، ورنہ حقیقت میں ان کا

يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪

**بھی جوڑے۔ وہ تمھیں اس (جہاں) میں پھیلاتا ہے، اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ⑪**

کوئی وجود نہیں۔ اور تمھاری ضروریات کے لیے چوپاؤں کے جوڑے بنائے، تاکہ وہ بڑھتے پھیلتے رہیں اور تم ان سے اپنی ضروریات پوری کرتے رہو۔

③ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ : یعنی جوڑے اس لیے بنائے تاکہ توالد و تناسل کا سلسلہ قائم رہے اور تمھاری نسل پھلتی پھولتی اور پھیلتی رہے۔

④ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ : انسانوں کے درمیان اگرچہ رنگوں اور زبانوں کا اختلاف پایا جاتا ہے اور ہر انسان دوسرے سے الگ تشخص رکھتا ہے، اس کے باوجود وہ بہت سی چیزوں میں ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے کے مثل ہیں۔ چوپاؤں اور دوسرے حیوانات کا بھی یہی حال ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کا امتیاز ہے کہ کوئی چیز اس کی ذات یا صفات کی مثل کسی طرح بھی نہیں۔

⑤ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ : اپنے سلسلۂ ازدواج اور سلسلۂ توالد و تناسل کو دیکھ کر یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ اللہ تعالیٰ بھی تمھاری طرح ہے۔ نہیں، خالق و مخلوق ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں، نہ ذات میں، نہ صفات میں اور نہ افعال و حقوق میں۔ اس کا کوئی جوڑا نہیں اور وہ نہ کسی کی اولاد ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا شریک و ہمسر ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ اخلاص۔

⑥ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" پر ایک مشہور سوال ہے کہ جب کہنا یہ مقصود ہے کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں تو "لَيْسَ مِثْلَهُ شَيْءٌ" کافی تھا، "کاف" لانے کی کیا ضرورت تھی؟ "کاف" لانے سے تو بظاہر ایسا معنی پیدا ہو رہا ہے جو محال ہے، کیونکہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" کا ترجمہ ہو گا "اس کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں" جب کہ اس ترجمے سے دو محال باتیں لازم آتی ہیں، پہلی یہ کہ اللہ کی مثل کوئی ہے جب کہ یہ محال ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں، حالانکہ جب وہ اللہ کی مثل ہے تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ اس جیسا ہے، تبھی وہ اس کی مثل ہے۔ اس سوال کا حل اہلِ علم نے مختلف طریقوں سے کیا ہے، ایک یہ ہے کہ اس میں "کاف" زائد ہے۔ زائد کا یہ مقصد نہیں کہ بے فائدہ ہے، بلکہ وہ "مِثْلٌ" کی تاکید اور اس میں مبالغہ کے لیے لایا گیا ہے۔ گویا یہ بات کہ "اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں" دو دفعہ کہی گئی ہے، ایک "کاف" کے ساتھ اور ایک "مِثْلٌ" کے ساتھ، مگر مثلیث کے معنی میں یہ مبالغہ محلِ نظر ہے۔

دوسرا حل یہ ہے کہ عرب کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے "مِثْلٌ" کا لفظ کسی جیسے کے لیے نہیں بلکہ اس کی ذات اور شخصیت کے لیے استعمال کرتے ہیں، مثلاً "مِثْلِيْ لَا يَكْذِبُ" سے مراد یہ نہیں کہ میرے جیسا شخص جھوٹ نہیں بولتا، بلکہ یہ ہے کہ "میں جھوٹ نہیں بولتا۔" اسی طرح "مِثْلُهُ لَا يُعْبَؤُ بِهٖ" کا معنی یہ نہیں کہ اس جیسے شخص کی پروا نہیں کی جاتی، بلکہ مراد یہ ہے کہ "اس کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔" اسی طرح "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں، بلکہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں۔" یہاں "کاف" کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر "کاف" نہ لایا جاتا تو

عربی محاورہ ذہن میں آنے سے خیال ایک غلط مفہوم کی طرف جا سکتا تھا، جیسے "مِثْلُهٗ لَا يُعْبَؤُ بِهٖ" کا معنی ہے کہ فلاں شخص کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ اسی طرح ''کاف'' کے بغیر "لَيْسَ مِثْلَهٗ شَيْءٌ" کا معنی یہ ہو سکتا تھا کہ (معاذ اللہ) اس کی ذات کوئی شے نہیں، یا اس کی کچھ حیثیت نہیں۔ اب "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" کہنے سے یہ اندیشہ دور ہو گیا اور بات صاف ہو گئی کہ اس کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں۔ طبری، بقاعی، ابن ہشام اور بہت سے ائمہ نے یہاں "مِثْل" کو شخص، ذات یا نفس کا ہم معنی قرار دے کر اس کے شواہد پیش فرمائے ہیں۔ یہ حل معنوی طور پر بہت مضبوط ہے۔

تیسرا حل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر "مَثَل" کا لفظ صفت شان کے معنی میں آیا ہے، جیسے یہ آیت: ﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّاۗءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ﴾ [ محمد : ۱۵ ] ''اس جنت کی صفت جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں کئی نہریں ایسے پانی کی ہیں جو بگڑنے والا نہیں۔'' اسی طرح یہ آیت: ﴿ وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ [ الروم : ۲۷ ] ''اور آسمانوں اور زمین میں سب سے اونچی صفت (شان) اسی کی ہے۔'' اس لیے "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" کا معنی یہ ہے کہ ''اللہ کی صفت جیسی کوئی چیز نہیں۔'' یہ حل سمجھنے میں سب سے آسان ہے، معنوی طور پر بالکل درست ہے اور ائمہ تفسیر سے منقول ہے۔ سیاق کے لحاظ سے بھی بہت مناسب ہے، کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات بیان فرمائی گئی ہیں، پھر فرمایا کہ اس کی صفت جیسی کوئی چیز نہیں۔

❼ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ : "السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" "هُوَ" مبتدا کی خبر ہے۔ خبر پر الف لام لانے سے قصر کا مفہوم پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' یہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (اس کی ذات و صفات جیسی کوئی چیز نہیں) سے پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب ہے کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" کے باوجود یہ کیا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے اور انسان بھی سمیع و بصیر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴾ [ الدھر : ۲ ] ''سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔'' بلکہ سمع و بصر انسان کے علاوہ جانوروں میں بھی موجود ہیں اور حنانہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جمادات بھی سمع و بصر سے بے بہرہ نہیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ بے مثل کیسے ہوا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کامل اور اصل سمیع و بصیر صرف اللہ تعالیٰ ہے، کسی اور میں پائی جانے والی یہ صفات اللہ تعالیٰ کی صفات سے کچھ مشابہت نہیں رکھتیں اور نہ ان کے مقابلے میں کوئی حقیقت رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بہت سے لوگوں کو ایسے اشکالات پیدا ہوئے کہ بے شمار مخلوق گمراہ ہو گئی، انھوں نے دیکھا کہ وہی الفاظ اللہ تعالیٰ کے متعلق آ رہے ہیں اور وہی مخلوق کے متعلق، مثلاً اللہ تعالیٰ کے متعلق آیا ہے: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ [ الأعراف : ۵۴ ] (پھر وہ عرش پر بلند ہوا) اور مخلوق کے متعلق الفاظ ہیں: ﴿ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ﴾ [ الزخرف : ۱۳ ] (تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو) اور یہ الفاظ: ﴿ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ ﴾ [ المؤمنون : ۲۸ ] (پھر جب تو اور جو تیرے ساتھ ہیں، کشتی پر چڑھ جاؤ)۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ [ الفتح : ۱۰ ] (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے) میں لفظ ''ید'' اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں کے لیے آیا ہے، یہی حال سمیع و بصیر

کا ہے۔اب کچھ لوگ اس وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیا۔اس کے استواء، اس کے ید، اس کے سمع و بصر اور اس کی دوسری صفات کو مخلوق کے استواء، اس کے ید، اس کے سمع و بصر اور اس کی دوسری صفات کی طرح سمجھ بیٹھے، ان لوگوں کو ''مشبہہ'' کہتے ہیں اور کچھ اس وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ انھوں نے یہ کہہ کر کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں، اس کی اُن صفات کا بھی انکار کر دیا جو اس نے خود اپنی بیان فرمائی ہیں۔انھوں نے کہا، اللہ تعالیٰ نہ عرش پر مستوی ہے، نہ اس کا ہاتھ ہے، نہ اس کا سمع و بصر ہے، نہ وہ کلام کرتا ہے، کیونکہ اگر ہم اس کے لیے یہ چیزیں تسلیم کریں تو وہ مخلوق جیسا ٹھہرتا ہے۔ان منکرینِ صفات کو ''معطلہ'' کہتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تشبیہ و تعطیل دونوں سے بلند و برتر ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی صفات کا مسئلہ انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے، اس میں کوئی پیچیدگی یا اشکال باقی نہیں رہنے دیا۔خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ آیاتِ صفات میں حق دو چیزوں سے مرکب ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی صفات کی مشابہت سے پاک سمجھا جائے۔دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی جو بھی صفت بیان فرمائی ہے، یا اس کے رسول ﷺ نے اس کی جو بھی صفت بیان فرمائی ہے اس پر مکمل ایمان رکھا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت اس سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ﴾ [ البقرۃ : ۱۴۰ ] ''کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ؟'' اور اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم رکھنے والا کوئی نہیں۔ آپ ﷺ کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [ النجم : ۳، ۴ ] ''اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔'' اب جو شخص کسی ایسی صفت کی نفی کرے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے لیے بیان فرمائی ہے، یا اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمائی ہے، یہ کہہ کر کہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے لائق نہیں، تو وہ اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول سے بھی زیادہ علم رکھنے والا سمجھتا ہے کہ اللہ کی شان کے لائق کون سی بات ہے اور کون سی نہیں۔اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ ہیں وہ بھی ملحد اور گمراہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور یہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ سمجھتا ہے۔ہاں، جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ان تمام صفات کو مانتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے بیان کی ہیں، یا اس کے رسول نے اس کے لیے بیان کی ہیں اور ساتھ ہی اللہ عز و جل اور اس کی صفات کو مخلوق کی مشابہت سے پاک قرار دیتا ہے، یہ صحیح مومن ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال پر بھی ایمان رکھتا ہے اور اس کی مخلوق کی مشابہت سے پاک ہونے پر بھی ایمان رکھتا ہے۔زیرِ تفسیر آیت: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ نے اس حقیقت کو خوب واضح فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سمع و بصر کی صفات بھی رکھتا ہے اور کوئی چیز اس کی مثل اور مشابہ بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں '' وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ '' کے بجائے '' وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ '' اس لیے فرمایا کہ سمع و بصر کی دونوں صفات تمام حیوانات میں بھی پائی جاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ دونوں صفات رکھتا ہے، لیکن

اس کی ان صفات کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور مخلوق کی صفات میں کوئی مماثلت نہیں، اس لیے ”وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ“ کا لفظ ”لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ“ کہنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اس لیے انکار کیا ہے کہ صفات کے لیے وہی الفاظ مخلوق پر بھی آئے ہیں، انھیں لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے وجود اور اس کی حیات کا بھی انکار کر دیں، کیونکہ مخلوق کی بھی ذات ہے، وہ بھی وجود رکھتی ہے اور اس میں بھی حیات پائی جاتی ہے، مگر جس طرح خالق اور مخلوق میں کوئی مماثلت نہیں اور دونوں کی ذات، وجود اور حیات میں کوئی مماثلت نہیں، اسی طرح خالق و مخلوق کی کسی صفت میں بھی کوئی مماثلت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کامل اور حقیقی ہیں۔ مخلوق کی صفات اگرچہ ان کے حسبِ حال موجود ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابلے میں کالعدم ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ وہی سمیع و بصیر ہے اور کوئی نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو سمیع و بصیر بتایا ہے۔

اس کی تھوڑی سی تفصیل سنیے، متکلمین اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے سات صفات کو صفاتِ معانی کہتے ہیں، وہ ہیں حیات، قدرت، ارادہ، علم، سمع، بصر اور کلام۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ حیات خود بیان فرمائی، فرمایا: ﴿هُوَ الْحَيُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ [ المؤمن : ٦٥ ] ”وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ﴾ [الفرقان : ٥٨ ] ”اور اس زندہ پر بھروسا کر جو نہیں مرے گا۔“ اور دوسری بہت سی آیات۔ مخلوق کی صفت بھی حیات بیان فرمائی، فرمایا: ﴿وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾ [ مریم : ١٥ ] ”اور سلام اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن فوت ہوگا اور جس دن زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا۔“ اور فرمایا: ﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ [ الأنبياء : ٣٠ ] ”اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔“ اور فرمایا: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ [ الروم : ١٩ ] ”وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔“ یہاں دیکھیے ”هُوَ الْحَيُّ“ (صرف وہ زندہ ہے) کہنے کے باوجود مخلوق کی حیات کا بھی ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی اور کامل حیات صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، مخلوق کو بھی اس کے حسبِ حال ایک طرح کی حیات حاصل ہے، مگر خالق و مخلوق کی حیات میں اتنی ہی منافات ہے جتنی دونوں کی ذات میں ہے، خالق والی حیات کا ایک شمہ بھی مخلوق کو حاصل نہیں۔

دوسری صفت قدرت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ صفت خود بیان فرمائی ہے، فرمایا: ﴿وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [البقرة : ٢٨٤ ] ”اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“ مخلوق کے متعلق بھی یہ لفظ استعمال فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ﴾ [ المائدة : ٣٤ ] ”مگر جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پاؤ۔“ اللہ تعالیٰ کی قدرت حقیقی، کامل اور اس کی شان کے لائق ہے، جبکہ مخلوق کی قدرت صرف اس کے حسبِ حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مخلوق کی قدرت میں اتنی منافات ہے جتنی دونوں کی ذات میں ہے۔

تیسری صفت ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [ هود : ١٠٧ ] ”کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [ يٰس : ٨٢ ] ”اس کا حکم تو، جب وہ کسی

چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۸۵ ] ''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔'' اور دوسری آیات۔ مخلوق کے ارادے کا بھی ذکر کیا، فرمایا: ﴿ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ﴾ [ الأنفال : ٦٧ ] ''تم دنیا کا سامان چاہتے ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴾ [ الأحزاب : ١٣ ] ''وہ بھاگنے کے سوا کچھ چاہتے ہی نہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ ﴾ [ الصف : ٨ ] ''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں۔'' اور دوسری آیات۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا ارادہ حقیقی، کامل اور اس کی ذات کے لائق ہے، جبکہ مخلوق کا ارادہ اس کے حسبِ حال ہے۔ دونوں کے ارادوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا دونوں کی ذات میں ہے۔

چوتھی صفت علم ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ [ البقرۃ : ٢٨٢ ] ''اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ﴾ [ النساء : ١٦٦ ] ''لیکن اللہ شہادت دیتا ہے اس کے متعلق جو اس نے تیری طرف نازل کیا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے۔'' اور مخلوق کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ ﴾ [ یوسف : ٦٨ ] ''اور بلاشبہ وہ یقیناً بڑے علم والا تھا، اس وجہ سے کہ ہم نے اسے سکھایا تھا۔'' اور اس جیسی آیات۔ تو اللہ تعالیٰ کا علم کامل، حقیقی اور اس کے کمال و جلال کے لائق ہے، جب کہ مخلوق کا علم اس کے حال کے مناسب ہے۔ خالق و مخلوق کے علم میں اتنی ہی منافات ہے جتنی خالق و مخلوق کی ذات میں ہے۔

پانچویں اور چھٹی صفت سمع و بصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [ الشوریٰ : ١١ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴾ [ الحج : ٦١ ] ''اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' اور مخلوق کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ١ۖۗ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴾ [ الدھر : ٢ ] ''بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔'' اور فرمایا: ﴿ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ١ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا ﴾ [ مریم : ٣٨ ] ''کس قدر سننے والے ہوں گے وہ اور کس قدر دیکھنے والے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے۔'' اور اس جیسی آیات۔ تو اللہ عز وجل کے سمع و بصر حقیقی، کامل اور اس کی شان کے لائق ہیں اور مخلوق کے سمع و بصر ان کے حال کے مناسب ہیں۔ جس طرح خالق و مخلوق کی ذات میں کوئی مماثلت نہیں، ان کے سمع و بصر میں بھی کوئی مماثلت نہیں۔

ساتویں صفت کلام ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ [ النساء : ١٦٤ ] ''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ ﴾ [الأعراف : ١٤٤ ] ''بے شک میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر چن لیا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ [ التوبۃ : ٦ ] ''تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔'' اور مخلوق کے متعلق فرمایا:

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اسی کے پاس آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں ہیں، وہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے، بے شک وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۲﴾

﴿فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ﴾ [ یوسف : ٥٤ ] ''پھر جب اس نے اس سے بات کی تو کہا بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار، امانت دار ہے۔'' اور فرمایا: ﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ﴾ [ یٰس : ٦٥ ] ''آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے۔'' اور فرمایا: ﴿قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ [ مریم : ۲۹ ] ''انھوں نے کہا ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ کا کلام حقیقی، کامل اور اس کی شان کے لائق ہے اور مخلوق کی صفت بھی کلام ہے جو اس کے حسب حال ہے اور خالق و مخلوق کے کلام میں اتنی ہی منافات ہے جتنی ان دونوں کی ذات میں ہے۔ اہل علم یہ بحث تفصیل سے پڑھنا چاہیں تو مفسر شنقیطی کی '' أَضْوَاءُ الْبَيَانِ '' میں سورۂ اعراف کی آیت (۵۴): ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ اتنی واضح بات بڑے بڑے مفسر اور مصنف نہیں سمجھ سکے۔ وہ جہاں ''استواء علی العرش'' کا لفظ آئے گا اس کا انکار کرتے ہوئے کہیں گے اس سے مراد حکومت کرنا ہے، سمع و بصر آئے گا تو کہیں گے اس سے مراد علم ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت، رضا، غضب، انتقام، اس کے نزول اور دوسری صفات کا مطلب کچھ اور ہی بیان کرتے ہوئے اصل صفات کا انکار کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ سلف صالحین اور محدثین ہی اس مقام پر سلامت رہے ہیں، ان کی ترجمانی امام مالک رحمہ اللہ نے فرمائی، جب ان سے اللہ تعالیٰ کے عرش پر استواء کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: '' اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ '' ''اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے اور یہ بات کہ کیسے مستوی ہے، کسی کو معلوم نہیں اور یہ پوچھنا کہ کیسے مستوی ہے بدعت ہے۔'' بالکل اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع ہے، بصیر ہے، اس کے ہاتھ ہیں، آنکھیں ہیں، چہرہ ہے، وہ محبت کرتا ہے، ناراض ہوتا ہے، کلام کرتا ہے، ہنستا ہے، اترتا ہے اور قیامت کے دن زمین پر آئے گا، مگر ہمیں ان صفات کی کیفیت معلوم نہیں، نہ ہم عاجز مخلوق اس بے نہایت خالق کی ذات یا صفات کی حقیقت یا کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہم اس کی ان تمام صفات کو انھی الفاظ و معانی میں مانتے ہیں جو خود اس نے یا اس کے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں اور ان تمام لوگوں کی باتوں سے بری ہونے کا اعلان کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات نہیں ہیں، یا کہتے ہیں کہ مخلوق جیسی ہیں، یا کہتے ہیں کہ ہمیں ان صفات کے معنی ہی کا علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر استقامت عطا فرمائے۔ (آمین)

آیت 12 ﴿۱﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ زمر (۶۳)۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖ

اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری

② يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۲)۔

آیت 13 ① شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا: سورت کے شروع میں جو بات فرمائی : ﴿ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (اسی طرح وحی کرتا ہے تیری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے، وہ اللہ جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ) یہاں سے وہی بات مزید تفصیل کے ساتھ بیان ہو رہی ہے۔ "لَكُمْ" سے خطاب ہماری امت کو ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے کوئی اجنبی یا انوکھا دین مقرر نہیں فرمایا، یہ وہی دین ہے جو اس نے پہلے تمام انبیاء کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہے اور وہ ہے اسلام، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ [ آل عمران : ۱۹ ] "بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔" جس کا معنی مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہو جانا ہے۔ اس دین کا عنوان "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" یعنی اللہ واحد کی عبادت و اطاعت ہے۔ تمام انبیاء و رسل کی طرف اسی ایک دین کی وحی کی گئی ہے، فرمایا: ﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [ الأنبياء : ۲۵ ] "اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔" سورۂ انعام میں توحید کی تاکید اور شرک کا رد کرنے کے بعد نوح اور ابراہیم علیہما السلام سمیت اٹھارہ پیغمبروں کا ذکر ان کا نام لے کر فرمایا، پھر ان کے آباء، اولاد اور بھائیوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر یہ لوگ شرک کرتے تو ان کا وہ سب کچھ ضائع ہو جاتا جو وہ کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو ان کے طریقے پر چلنے کا حکم دیا اور فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ [ الأنعام : ۹۰ ] "یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔"

② دین کن چیزوں کا نام ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ﴾ [ البينة : ۵ ] "اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ واحد کی عبادت کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا دین ہے، جس کا پہلی امتوں کو بھی حکم تھا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مروی مشہور حدیثِ جبریل میں رسول اللہ ﷺ نے اسلام، ایمان اور احسان کی تفصیل فرمائی، پھر قیامت اور اس کی چند علامات کا ذکر فرمایا، جب جبریل علیہ السلام چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( فَإِنَّهُ جِبْرِيْلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ )) [ مسلم، الإيمان، باب بيان الإيمان و الإسلام...... : ۸۔ بخاري : ۵۰ ] "وہ جبریل (علیہ السلام) تھے، تمھارے پاس آئے تھے، تمھیں تمھارا دین سکھا رہے تھے۔" اس سے معلوم ہوا کہ

اِبۡرٰهِيۡمَ وَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰۤى اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الۡمُشۡرِكِيۡنَ

طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ

اسلام کے پانچوں ارکان دین ہیں، اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، یوم آخرت اور تقدیر پر ایمان دین ہے، عمل میں اخلاص اور احسان دین ہے، قیامت کے معاملات کی فکر دین ہے۔ پھر جب ایمان دین ہے تو ایمان میں شامل وہ تمام چیزیں بھی دین ہیں جنھیں قرآن مجید یا حدیث میں ایمان یا ایمان کی شاخ قرار دیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب أمور الإيمان" میں قرآن مجید کی دو آیات نقل فرمائی ہیں، ایک سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ لٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِيۡلِ ۙ وَ السَّآئِلِيۡنَ وَ فِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ وَ الصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ﴾ [البقرۃ: ۱۷۷] "نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں۔" اور سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ وَ الَّذِيۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَيۡرُ مَلُوۡمِيۡنَ ۚ فَمَنِ ابۡتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ ۚ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَوٰتِهِمۡ يُحَافِظُوۡنَ ۘ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ۙ الَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴾ [المومنون: ۱ تا ۱۱] "یقیناً کامیاب ہو گئے مومن۔ وہی جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور وہی جو لغو کاموں سے منہ موڑنے والے ہیں۔ اور وہی لوگ جو (ہر عمل) پاک ہونے ہی کے لیے کرنے والے ہیں۔ اور وہی جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں، یا ان (عورتوں) پر جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں تو بلاشبہ وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر جو اس کے سوا تلاش کرے تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور وہی جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔ اور وہی جو اپنی نمازوں کی خوب حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" اس کے بعد یہ حدیث بیان فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً، وَالْحَيَاءُ

مَا تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَيۡهِ ؕ اَللّٰهُ يَجۡتَبِيۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَ يَهۡدِيۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يُّنِيۡبُ ﴿۱۳﴾

ہو جاؤ۔ مشرکوں پر وہ بات بھاری ہے جس کی طرف تو انھیں بلاتا ہے، اللہ اپنی طرف چن لیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف راستہ اسے دیتا ہے جو رجوع کرے ﴿۱۳﴾

شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيْمَانِ ﴾ [ بخاري، الإيمان، باب أمور الإيمان : ۹۔ مسلم : ۳۵ ] ''ایمان کی ساٹھ (۶۰) سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کا جزو ہے۔'' اس کے بعد مختلف ابواب میں امورِ دین کا بیان فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام انبیاء کا اصل دین ایک ہے، البتہ کسی عمل کی ادائیگی کی کیفیت میں فرق ہوسکتا ہے۔ مثلاً نماز ہر امت پر فرض تھی، اس کے اوقات اور رکعات کی تعداد وغیرہ میں فرق ہوسکتا ہے۔ روزہ سب پر فرض تھا، مگر اس کی کیفیت میں اختلاف معلوم ہے۔ زکوٰۃ ہر امت پر فرض تھی، مگر اس کے نصاب اور مقدار وغیرہ میں فرق ہوسکتا ہے۔ اسی طرح مختلف اقوام اور اوقات کے لحاظ سے بعض اشیاء کی تحلیل و تحریم میں اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق نسخ ہوسکتا ہے، تبدیلی ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ بعض امتوں میں کئی معاملات میں تخفیف اور بعض میں سختی ہوسکتی ہے، مگر اصل دین ایک ہے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جو اس سورت کی تیسری آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے: ﴿ اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ ﴾ [ بخاري : ۳۴۴۳ ] ''انبیاء علاتی (مختلف ماؤں سے پیدا ہونے والے) بھائی ہیں۔'' یہاں تک کہ خاتم النبیین ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل فرما دیا، فرمایا: ﴿ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِيۡ وَ رَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا ﴾ [ المائدة : ۳ ] ''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

③ وَالَّذِيۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَ مَا وَصَّيۡنَا بِهٖۤ ...... : اگرچہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا، مگر یہاں صرف پانچ پیغمبروں کا ذکر فرمایا اور ان کی ترتیب بھی ان کے زمانے کے حساب سے نہیں رکھی۔ مفسرین فرماتے ہیں تمام انبیاء کا نام لینا تو ممکن نہ تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی (دیکھیے مومن : ۷۸) اس لیے ہر مقام پر اس کے مناسب انبیاء کا ذکر فرمایا۔ یہاں پہلے دو رسولوں کا ذکر فرمایا جن میں سے نوح علیہ السلام زمین والوں کی طرف سب سے پہلے رسول تھے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے۔ [ دیکھیے بخاري : ۳۳۴۰ ] اس سے پہلے آدم علیہ السلام بے شک نبی تھے، مگر انھیں کسی امت کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے رسول کے ساتھ ہی سب سے آخری نبی ﷺ کا ذکر کیا گیا، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ دین پہلے رسول سے آخری رسول تک ایک ہی ہے۔ اس کے بعد تین جلیل القدر رسولوں کا ذکر فرمایا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت آسمانی مذاہب میں سے انھی تینوں کے پیروکار ہونے کے مدعی تمام دنیا میں پائے جاتے تھے۔ عرب کے مشرکین ابراہیمی ہونے کے دعوے دار تھے، یہودی موسیٰ علیہ السلام اور نصرانی عیسیٰ علیہ السلام کے امتی کہلاتے تھے۔ ان کے علاوہ کسی پیغمبر کی طرف منسوب کوئی قابل ذکر قوم نہ تھی۔ اس لیے فرمایا کہ ان سب کا دین ایک ہے، جو محمد ﷺ لے کر آئے ہیں۔ سورۂ احزاب میں بھی ان پانچ انبیاء کا ذکر ایک آیت میں آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۷)۔

④ اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ : یعنی اللہ تعالیٰ نے ان تمام پیغمبروں کو حکم دیا کہ دین قائم کرو۔ دین قائم کرنے میں خود اس پر عمل کرنا

بھی شامل ہے، اس کی دعوت و تبلیغ بھی اور عملاً اسے نافذ کرنا بھی۔ دعوت کے ساتھ ساتھ حسبِ استطاعت کفار سے جنگ کا بھی حکم دیا، اس وقت تک کہ وہ کلمہ پڑھیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ سورۂ توبہ میں مشرکین کے متعلق حکم دیا کہ انھیں چار ماہ تک مکہ میں آنے جانے کی اجازت ہے، فرمایا: ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ التوبۃ : ۵ ] ”پس جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَ يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ، وَ يُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ» [ بخاري، الإيمان، باب : ﴿ فإن تابوا و أقاموا الصلاة...... ﴾ : ۲۵ ] ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں، یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، تو جب وہ ایسا کریں تو انھوں نے مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔“

اہلِ کتاب میں سے جو لوگ دینِ حق قبول نہیں کرتے ان سے جزیہ وصول کرنے تک لڑتے رہنے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۲۹ ] ”لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یومِ آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دینِ حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔“

ظاہر ہے دین کا قیام اور اس پر پوری طرح عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ دوسرے تمام ادیان پر غالب ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ [ الفتح : ۲۸ ] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اور اللہ گواہ کے طور پر کافی ہے۔“

دینِ اسلام میں نماز پڑھنا اور اپنی زکوٰۃ دے دینا کافی نہیں، اللہ کی زمین پر اس کا نظام قائم کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر شخص مسجد میں آکر نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے، فرمایا: ﴿ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ [ الحج : ۴۰، ۴۱ ] ”اور یقیناً اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے۔ وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے اور برے کام سے روکیں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔“ اسلام کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جس پر عمل

اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب حکومت کی باگ ڈور ایمان والوں کے ہاتھ میں ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب نازل کرنے کا مقصد بیان فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ﴾ [ النساء : ۱۰۵ ] ''بے شک ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دکھایا ہے۔'' ظاہر ہے لوگوں کے درمیان اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ تبھی ہو سکے گا جب اس کے مطابق فیصلہ کرنے والوں کی حکومت ہوگی، کفار کی سلطنت میں نماز کا وہ نظام جس میں ہر مسلم حتیٰ کہ منافقین بھی مسجد میں آ کر نماز پڑھتے ہیں، خواہ سست کھڑے ہو کر پڑھیں یا دکھاوے کے لیے پڑھیں، قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ (دیکھیے نساء: ۱۴۲) زکوٰۃ کی تحصیل (توبہ: ۱۰۳) اور اس کی اللہ کے حکم کے مطابق تقسیم (توبہ: ۶۰) مسلمانوں کی اپنی حکومت کے علاوہ ممکن نہیں۔ سود کو بند کرنے کا حکم اور سود خوری جاری رکھنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ اسی وقت عمل میں آ سکتا ہے کہ ملک کی حکومت اور معیشت ایمان والوں کے ہاتھ میں ہو۔ کتاب اللہ میں قتل اور جراحات کے قصاص کا حکم (بقرہ: ۱۷۸۔ مائدہ: ۴۵)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (مائدہ: ۳۸) اور زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (نور: ۲ تا ۴) مسلم حکام کو دیا گیا ہے، کفار کی عدالت اور ان کی پولیس کو نہیں دیا گیا اور نہ ہی وہ کبھی اسے نافذ کریں گے۔ اس کتاب میں مسلمانوں پر کفار سے قتال اس لیے فرض نہیں کیا گیا (بقرہ: ۱۹۰، ۲۱۶) کہ وہ کفار کی حکومت میں رہ کر ان کی فوج میں بھرتی ہو کر کفر کی خاطر لڑیں گے اور کفار سے جزیہ لینے کا حکم (توبہ: ۲۹) اس مفروضے کے ساتھ نہیں دیا گیا کہ مسلمان کفار کے محکوم رہ کر ان سے جزیہ وصول کریں گے۔ اسلامی احکام کا یہ نقشہ صرف مدینہ میں جا کر ہی پیش نہیں ہوا، مکی سورتوں میں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۸۰، ۸۱)، قصص (۸۵)، روم (۱ تا ۷)، صافات (۱۷۱ تا ۱۷۳)، ص (۱۱)، قمر (۴۳ تا ۴۵) اور سورۂ مزمل (۲۰)۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اقامتِ دین کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے دین قائم کرنے کے لیے دعوت و تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو حلقہ بگوش اسلام کیا اور ایسی حکومت قائم کر دی جو اللہ تعالیٰ کے پورے دین پر عمل کی ضامن تھی۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے اسلام نے اس فریضہ کی تکمیل کی، حتیٰ کہ اللہ کا دین زمین کے مشرق و مغرب میں قائم ہو گیا۔ پھر مسلمان اپنی نااہلی اور کتاب اللہ کے تقاضوں کو نہ سمجھنے یا جان بوجھ کر اسے پس پشت پھینک کر جہاد ترک کر دینے کے نتیجے میں کفار کے محکوم ہو گئے۔ اب ان میں سے کسی کے ہاتھ میں اسلام کی دو چار چیزیں ہیں اور کسی کے ہاتھ میں پانچ دس یا کم و بیش۔ ان کی باقی ساری زندگی کفر کے نظام کی پابند ہے اور افسوس یہ کہ وہ اس پر قانع ہیں اور کفر کے نظام کے پرزے بن چکے ہیں اور ان کے بہت سے لوگ دین اسلام کے غلبے سے مایوس ہو کر جمہوریت اور کفر کے دوسرے نظاموں کو توڑنے کی کوشش کے بجائے انھیں اسلام ثابت کرنے کی جدوجہد میں لگ گئے ہیں۔ ہاں! رسول اللہ ﷺ کی بشارت کے مطابق ایک مجاہدین کی جماعت ''طائفہ منصورہ'' باقی ہے اور ہمیشہ رہے گی، جو کبھی کفر کی بالادستی قبول نہیں کرے گی اور دین کے غلبہ کے لیے زبانی کلامی فلسفوں کے بجائے دعوت کے ساتھ ساتھ قتال کا فریضہ بھی سر انجام دیتی رہے گی اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے بہرہ یاب رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس مبارک طائفہ میں شامل فرما دے۔ (آمین)

5 ﴿ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ : دین میں جدا جدا ہونے کی کئی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اہل کتاب کی طرح بعض باتوں میں کتاب اللہ پر عمل کیا جائے اور بعض میں کتاب اللہ کے بجائے اپنی مرضی پر عمل کیا جائے، جیسا کہ اہل کتاب کے متعلق فرمایا: ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ [ البقرة : ٨٥ ] ”پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟“ ایک صورت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جو بات ثابت نہیں اسے دین بنالیا جائے۔ اسے بدعت کہتے ہیں۔ سنت ہمیشہ ایک ہوگی، کیونکہ جس کی سنت ہے وہ ایک ہے، جبکہ بدعات کا شمار نہیں ہوگا، کیونکہ انھیں ایجاد کرنے والوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ پھر جب آدمی اصل سنت سے بھٹکتا ہے تو ایک بدعت پر نہیں رہتا بلکہ بدعات اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنا الگ فرقہ بنالیتا ہے۔ اسے معلوم ہو بھی جائے کہ اس کی یا اس کے فرقے یا پیشوا کی فلاں بات کتاب اللہ یا حدیث رسول ﷺ کے خلاف ہے پھر بھی وہ اپنے دھڑے کی غلط بات پر اڑا رہے گا، حق کی طرف رجوع نہیں کرے گا اور اپنی یا اپنے امام کی بات کو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے تابع کرنے کے بجائے آیات و احادیث کے معانی میں تحریف کر کے انھیں اپنے مطابق ثابت کرے گا۔ نام اس کا تاویل رکھے گا اور کہے گا کہ ہر وہ آیت یا حدیث جو ہمارے فرقے کے بزرگوں کے خلاف ہے اس کی تاویل ہوگی یا وہ منسوخ ہے۔ حالانکہ وہ آیت یا حدیث اس کے بزرگوں کے خلاف نہیں، کیونکہ وہ تو ان بزرگوں سے بہت پہلے نازل ہو چکی ہیں، بلکہ اس کے بزرگوں کی بات آیت یا حدیث کے خلاف ہے کہ انھیں اس کا علم نہیں ہو سکا، یا ان کے ذہن میں نہیں رہی۔ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: (( أَلَا إِنَّ مَنْ قَبْلَكُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوْا عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَ إِنَّ هٰذِهِ الْمِلَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَسَبْعِيْنَ، ثِنْتَانِ وَ سَبْعُوْنَ فِي النَّارِ وَ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ، وَإِنَّهُ سَيَخْرُجُ مِنْ أُمَّتِيْ أَقْوَامٌ تَجَارٰى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ لِصَاحِبِهِ لَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ )) [ أبوداؤد، السنة، باب شرح السنة : ٤٥٩٧ ] ”سنو! تم سے پہلے اہل کتاب کے لوگ بہتر (٧٢) ملتوں میں جدا جدا ہو گئے اور یہ ملت تہتر (٧٣) ملتوں میں جدا جدا ہو جائے گی، بہتر (٧٢) آگ میں اور ایک جنت میں ہوگی اور وہی ”الجماعۃ“ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میری امت میں کئی اقوام نکلیں گی جن میں یہ خواہشات (بدعات) اس طرح سرایت کر جائیں گی جیسے کتے کے باؤ کی بیماری اس کے مریض میں سرایت کر جاتی ہے، نہ اس کی کوئی رگ باقی رہتی ہے اور نہ کوئی جوڑ مگر وہ اس میں داخل ہو جاتی ہے۔“ مزید دیکھیے سورۂ انعام کی آیت (١٥٩): ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ﴾ کی تفسیر۔

6 ﴿ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ﴾ : وہ بات جس کی دعوت آپ مشرکین کو دیتے ہیں وہ ان پر بہت بھاری ہے، مراد اس سے ایک اللہ کی عبادت کی دعوت ہے۔ کفار پر یہ دعوت اس قدر بھاری ہے کہ اس کا ماننا تو در کنار وہ اس کا سننا بھی برداشت نہیں کرتے، فرمایا: ﴿ وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ

دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ [ الزمر : ٤٥ ] ”اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔“ وہ اس مجلس سے اٹھ جاتے ہیں جس میں ایک معبود کی بات ہو، فرمایا: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ﴾ [ صٓ : ٥، ٦ ] ”کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے۔ اور ان کے سرکردہ لوگ چل کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو، یقیناً یہ تو ایسی بات ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔“ مزید تفصیل کے لیے مذکورہ بالا آیات کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

⑦ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ : ”يَجْتَبِيْ“ ”جَبٰى يَجْبِيْ جِبَايَةً“ (ض) سے باب افتعال ہے، جس کا معنی ”کھینچ کر لے جانا“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [ القصص : ٥٧ ] ”اور کیا ہم نے انھیں ایک باامن حرم میں جگہ نہیں دی؟ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔“ باب افتعال کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی مشرکین پر یہ دعوت جتنی بھی بھاری ہو وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اسے پھیلنے اور غالب آنے سے روک سکیں گے۔ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، مشرکین کی ناگواری کے باوجود یہ دینِ حق تمام دینوں پر غالب آ کر رہے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ [ التوبة : ٣٣ ] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک لوگ برا جانیں۔“ یہی لوگ جن پر ایک اللہ کی طرف دعوت بھاری گزر رہی ہے ان میں سے اور ان کی اولادوں میں سے اللہ جسے چاہے گا چن لے گا اور اپنی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا، ابوجہل کا بیٹا عکرمہ اور بھائی حارث بن ہشام مسلمان ہو گئے، ابوسفیان خود اور اس کے بیٹے مسلمان ہو گئے، ولید کا بیٹا خالد مسلمان ہو گیا۔ غرض جو ضد پر اڑ گئے ان کا اللہ تعالیٰ نے صفایا کر دیا اور جن کی طبیعت میں ضد اور عناد کے بجائے انابت اور حق کی طرف رجوع تھا وہ اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں پورے جزیرۂ عرب سے شرک اور مشرکین کا خاتمہ ہو گیا۔

⑧ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ : اس میں اللہ تعالیٰ کے ہدایت دینے کا قانون بیان ہوا ہے کہ وہ اندھے کی لاٹھی کی طرح نہیں، بلکہ وہ انھی کو ہدایت دیتا ہے جن میں قبولِ حق کی استعداد اور خواہش ہوتی ہے اور اس بات کا علم بھی اسی کو ہے کہ انابت کس میں موجود ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾ [ القصص : ٥٦ ] ”بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔“

وَ مَا تَفَرَّقُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾

اور وہ جدا جدا نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپس کی ضد کی وجہ سے اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے ایک مقرر وقت تک پہلے طے ہو چکی تو ضرور ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک وہ لوگ جو ان کے بعد اس کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کے متعلق یقیناً ایسے شک میں مبتلا ہیں جو بے چین رکھنے والا ہے ﴿۱۴﴾

**آیت 14** ① **وَ مَا تَفَرَّقُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ** : یعنی ان کے فرقوں میں بٹ جانے کا باعث یہ نہیں تھا کہ انھیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا علم نہیں تھا اور لاعلمی کی وجہ سے انھوں نے اپنے اپنے الگ مذاہب اور مکاتب فکر بنا لیے، بلکہ یہ تفرقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم آ جانے کے بعد پیدا ہوا۔

② **بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ** : یعنی الگ الگ گروہ اور فرقے بنانے کا باعث ان کا باہمی حسد، ضد اور عناد تھا، جس کی وجہ سے اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکانے کے بجائے انھوں نے اپنے اپنے قیاس و آراء کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنائے اور کتاب اللہ میں تحریف تک سے گریز نہ کیا، حتیٰ کہ نوبت باہمی اختلاف سے بڑھ کر ایک دوسرے کی مخالفت اور پھر جنگ و جدل تک پہنچ گئی۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۳) کی تفسیر۔

③ **وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ ......** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حم سجدہ (۴۵) کی تفسیر۔

④ **وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ......** : یعنی شروع میں فرقے بنانے والوں نے علم ہونے کے باوجود حق سے انحراف کیا اور اللہ کی کتاب میں ایسی لفظی و معنوی تحریفیں کیں کہ بعد میں آنے والے لوگ، جو اس کتاب کے وارث بننے کے قابل تو نہ تھے مگر انھیں اس کا وارث بنا دیا گیا، وہ اس کتاب میں کی گئی لفظی اور معنوی تحریفات کی وجہ سے اس کی حقانیت کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہو گئے جو انھیں شدید مضطرب اور بے چین رکھتا تھا۔ انھیں اپنی کتابوں کے الہامی ہونے کا یقین باقی نہ رہا، بلکہ وہ کسی دلیل و برہان کے بغیر محض آنکھیں بند کر کے آبا و اکابر کی تقلید کرتے چلے گئے۔

⑤ مفسر عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں: ''ان وارثوں کے اپنی الہامی کتابوں کے بارے میں شک میں پڑنے کی کئی وجوہ تھیں، جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں کی اصل زبان اور اصل عبارت کو محفوظ رکھ کر آنے والی نسلوں تک نہ پہنچایا گیا، صرف تراجم سے کام لیا جانے لگا اور ان تراجم کو ہی الہامی کتاب سمجھا جانے لگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بزرگوں کے اقوال اور الحاقی مضامین ان میں شامل کر دیے گئے، حتیٰ کہ ان دونوں قسم کی عبارتوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کی

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ

**سو تو اسی کی طرف پھر دعوت دے اور مضبوطی سے قائم رہ، جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی مت کر اور کہہ دے کہ اللہ نے جو بھی کتاب نازل فرمائی میں اس پر ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب اور تمھارا رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے**

تاریخی سند بھی ضائع کر دی گئی (بلکہ سند رکھی ہی نہیں گئی)۔ ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ بعد میں آنے والے علماء خود اس کتاب سے شک میں پڑ گئے کہ کون سا حصہ درست اور الہامی ہے اور کون سی عبارت بزرگوں کے اقوال وغیرہ ہیں اور کسی بات کا صحیح فیصلہ کرنے میں یہی شک وشبہ انھیں اضطراب میں ڈالے رکھتا تھا۔'' (تیسیر القرآن)

**آیت 15** ① فَلِذٰلِكَ فَادْعُ : مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہ آیت کریمہ دس جملوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر جملہ اپنی جگہ مستقل مضمون ہے۔ آیت الکرسی کے سوا کوئی اور آیت ایسی نہیں۔'' (ابن کثیر) ''فَلِذٰلِكَ'' جار مجرور ''فَادْعُ'' کے متعلق ہے، پہلے لانے سے اس میں اختصاص پیدا ہو گیا، یعنی لوگوں کو کسی اور نہیں بلکہ دین کے اسی طریقے کی دعوت دیں جو اس نے وحی کے ذریعے سے تمام انبیاء کے لیے مقرر فرمایا ہے اور وہ ہے ایک اللہ کی عبادت۔ اس کے دین کو قائم کرنا اور اس میں جدا جدا نہ ہو جانا، بلکہ اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینا۔

② وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ : دوسروں کو دعوت کے لیے خود اس پر عمل اور استقامت ضروری ہے، اس لیے اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا حکم دیا۔ ''وَاسْتَقِمْ'' اور ''كَمَاۤ اُمِرْتَ'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۱۱۲)۔

③ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ : یعنی آپ اس کی پیروی کریں جس کا اللہ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے محض خواہشات ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یا ان سے صلح کی خاطر ان کی خواہشات کی پیروی مت کریں اور نہ دین میں کسی قسم کی مداہنت سے کام لیں۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۵) اور سورۂ مائدہ (۴۹)۔

④ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ : اہل کتاب چونکہ کسی آسمانی کتاب کو مانتے اور کسی کو نہیں مانتے تھے، اسی طرح اپنی کتاب کے بھی بعض حصوں کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں مانتے تھے۔ (دیکھیے بقرہ: ۸۵) حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر کتاب اور اس کی ہر بات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس لیے فرمایا، ان سے کہہ دیں کہ میں فرقہ پرستوں کی طرح نہیں جو مرضی کی بات مانتے ہیں دوسری نہیں، بلکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہر کتاب پر ایمان رکھتا ہوں، وہ خواہ کوئی ہو۔ میں پہلے انبیاء کی تکذیب کے لیے نہیں بلکہ ان کی تصدیق کے لیے آیا ہوں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ تمھاری کتابوں میں میری اور قرآن کی جو تصدیق موجود ہے اس پر بھی ایمان لاؤ، تاکہ تمھارا ایمان بھی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہر کتاب پر ہو۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

تمھارے اعمال۔ ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ ہمیں آپس میں جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۱۵﴾

مزید دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۳۶): ﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ کی تفسیر۔

⑤ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ : عدل کا معنی انصاف اور برابری ہے، اس کے مقابلے میں ظلم ہے۔ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان عدل کروں، تمام لوگوں کو انصاف مہیا کروں، دنیا میں جو ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اس کا خاتمہ کروں اور فیصلہ کرتے ہوئے اپنے پرائے میں فرق نہ کروں، بلکہ سب کو برابر رکھوں۔ اسی طرح چھوٹے و بڑے، کمزور و طاقتور اور امیر و غریب کے درمیان فرق نہ کروں۔ اس جملے میں اس غلبہ و اقتدار کی طرف بھی اشارہ ہے جو مدینہ جا کر حاصل ہونے والا تھا، کیونکہ بے اختیار شخص کیا عدل کرے گا اور اس کے پاس عدل طلب کرنے کے لیے کون جائے گا۔

⑥ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ : تمام بندوں میں عدل کا حکم اس لیے ہے کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور وہی تمھارا رب ہے، ہم تم سب اس کے بندے ہیں۔ سو عدل کا حکم بھی سب کے لیے ہے، خواہ اپنا ہو یا پرایا، ضعیف ہو یا شریف، حکمران ہو یا رعایا۔

⑦ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک اظہارِ براءت، جیسے فرمایا: ﴿ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴾ [ الکافرون : ٦ ] ''تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔'' اور جیسا کہ سورۂ انعام (۱۳۵)، ہود (۹۳، ۱۲۱) اور سورۂ زمر (۳۹) میں اظہارِ براءت فرمایا ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ ہمارے اچھے یا برے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے ہیں، نہ ہمارے اچھے اعمال تمھیں دیے جائیں گے اور نہ تمھارے اچھے اعمال ہمیں دیے جائیں گے۔ اسی طرح نہ تم ہمارے بد اعمال میں پکڑے جاؤ گے اور نہ ہم تمھارے بد اعمال میں پکڑے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ﴾ [ النور : ٥٤ ] ''تو اس کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمھارے ذمے وہ جو تم پر بوجھ ڈالا گیا۔'' مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۳۹)، یونس (۴۱)، ہود (۳۵) اور قصص (۵۵)۔

⑧ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ : یعنی جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں، جو بات حق تھی وہ ہم نے دلائل کے ساتھ واضح کر دی، ہمیں تمھارے باطل پر اور اپنے حق پر ہونے کا پورا یقین ہے۔ تم اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو، اس لیے جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں، تم جھگڑو بھی تو ہم جھگڑنے کے لیے تیار نہیں، اب تلوار کے ساتھ فیصلہ باقی رہ جاتا ہے، وہ اپنے وقت پر ہو جائے گا۔

⑨ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا : باطل پر جمے رہنے اور اس پر ناحق جھگڑا کرنے سے ڈراتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں جمع کرے گا، کیا تمھیں اس بات سے خوف نہیں آتا کہ ناحق جھگڑے کا وہاں کیا جواب دو گے؟

⑩ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ : اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے، وہاں پورا انصاف ہو جائے گا۔

وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾

اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، اس کے بعد کہ اس کی دعوت قبول کر لی گئی، ان کی دلیل ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت سخت سزا ہے ﴿۱۶﴾

آیت 16 ① وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ...... : "دَاحِضَةٌ" "دَحَضَ يَدْحَضُ دَحْضًا و دُحُوْضًا" (ف) "دَحَضَتِ الْحُجَّةُ" دلیل باطل ہونا اور "دَحَضَتِ الرِّجْلُ" پاؤں کا پھسل جانا۔ "حُجَّةٌ" کا معنی جھگڑا بھی ہے اور دلیل بھی۔ پچھلی آیت میں فرمایا: ﴿ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ﴾ کہ "ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں" کیونکہ جو بات حق تھی وہ ہم نے تمھیں پہنچا دی، اب جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں، اس آیت میں فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کی بات قبول کر لی گئی، اس کا حق ہونا واضح ہو گیا، حتیٰ کہ بہت سے سمجھ دار لوگ اسے قبول کر چکے اور بہت سے دل میں تسلیم کر چکے ہیں تو لوگ اب بھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہیں اور اپنے خیال میں بڑی مضبوط دلیلیں لا رہے ہیں، کبھی اس کی توحید میں بحث کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ [ صٓ : ۵ ] "کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟" کبھی اس کی دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کے بارے میں جھگڑتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ﴾ [ یٰسٓ : ۷۸ ] "کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جب کہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟" کبھی اس کے انسان کو رسول بنا کر بھیجنے کے بارے میں جھگڑتے ہیں، فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [ الفرقان : ۷ ] "اور انھوں نے کہا اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔" کبھی اس کے شرکاء بنانے کے جواز میں اپنے معبودوں کو اللہ کے ہاں سفارشی اور اس کے قریب کرنے والے قرار دیتے ہیں، فرمایا: ﴿ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [ یونس : ۱۸ ] "یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔" اور فرمایا: ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [ الزمر : ۳ ] "ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔" ان کی مزعومہ یہ اور اس جیسی سب دلیلیں اللہ تعالیٰ کے ہاں باطل اور بے کار ہیں، انھیں اس جھگڑے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

② وَ عَلَيْهِمْ غَضَبٌ : "غَضَبٌ" پر تنوین تعظیم کی ہے، یعنی ان پر بھاری غضب ہے۔

③ وَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ : جس کا دنیا میں مظاہرہ اہلِ مکہ پر مسلط خوف، قحط، جنگِ بدر اور دوسرے معرکوں میں ہوا اور جس کی شدت قیامت کے دن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ أَهْوَنَ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَرَجُلٌ تُوضَعُ فِيْ أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَةٌ يَغْلِيْ مِنْهَا دِمَاغُهُ » [ بخاري، الرقاق، باب صفة الجنة والنار : ۶۵۶۱ ] "قیامت کے دن آگ والوں میں سب سے ہلکے عذاب والا شخص وہ ہو گا جس کے دونوں پاؤں کے تلووں میں ایک انگارا رکھا جائے گا، جس سے اس کا دماغ کھول رہا ہو گا۔"

اَللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِيْزَانَ ؕ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾

اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی اور میزان بھی، اور تجھے کون سی چیز آگاہ کرتی ہے، شاید کہ قیامت قریب ہو ﴿۱۷﴾

آیت 17 ① اَللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِيْزَانَ : "الْكِتٰبَ" میں الف لام جنس کا ہو تو مراد تمام روحانی کتابیں ہیں اور اگر عہد کا ہو تو مراد یہ کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔ یعنی کیا جانتے بھی ہو کہ جس اللہ کے بارے میں تم جھگڑ رہے ہو وہ کون ہے اور اس کی صفات اور اس کے احکام کیسے معلوم ہو سکتے ہیں؟ فرمایا اللہ وہی ہے جس نے یہ کتاب یعنی قرآن مجید حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے، اس کی ہر بات حق ہے، اس میں باطل کی آمیزش ہو ہی نہیں سکتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۴۲ ] ''اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔'' اور اسی نے میزان اتارا ہے جس کے ساتھ لوگ اپنے تمام معاملات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر سکیں۔ "الْمِيْزَانَ" سے مراد اکثر مفسرین نے عدل و انصاف لیا ہے، بعض نے اس سے مراد دین حق اور بعض نے جزا و سزا کا قانون لیا ہے۔ ان میں سے جو بھی مراد لیں بات ایک ہی ہے اور اس میزان سے مراد اللہ کے دین اور اس کی شریعت پر مشتمل یہ کتاب ہی ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان معاملات اور مخلوق کے باہمی معاملات اور تمام تنازعات کے لیے میزان ہے، جو ہر بات ترازو کی طرح تول کر صحیح یا غلط اور حق یا باطل کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اوپر فرمایا تھا: ﴿وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ [الشوریٰ : ۱۵ ] (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں ) اور اس آیت میں بتا دیا کہ اس کتاب پاک کی صورت میں میزان آ گئی ہے، جس کے ساتھ وہ عدل قائم کیا جائے گا۔ یہ کتاب دوسرے معاملات کی طرح پہلی کتابوں کے لیے بھی میزان اور ان کی نگران ہے کہ ان میں کون سی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور کون سی ملا دی گئی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ [ المائدۃ : ۴۸ ] ''اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ بھیجی، اس حال میں کہ اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو کتابوں میں سے اس سے پہلے ہے اور اس پر محافظ ہے۔''

② یہاں ایک سوال ہے کہ آیت میں "الْكِتٰبَ" اور "الْمِيْزَانَ" کے درمیان واؤ عطف ہے جو مغایرت کے لیے ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ کتاب اور میزان الگ الگ چیزیں ہیں، اب اگر میزان سے مراد کتاب ہی ہو تو مغایرت ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر میزان سے مراد عدل و انصاف لیں تب بھی کتاب اور میزان کے درمیان مغایرت نہیں رہتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتابیں عین عدل و انصاف ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ایک ہی چیز کا ذکر جب اس کی مختلف صفات کے ساتھ کیا جائے تو اس کا عطف خود اس پر ہو سکتا ہے، کیونکہ صفات کے تغایر کو ذوات کے تغایر کی طرح قرار دے لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ۙ

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۸﴾

اسے وہ لوگ جلدی مانگتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ اس سے ڈرنے والے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔ سنو! بے شک وہ لوگ جو قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں یقیناً وہ بہت دور کی گمراہی میں ہیں ﴿۱۸﴾

﴿وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى﴾ [ الأعلى : ۱ تا ٤ ] ان آیات میں "الَّذِيْ" (وہ ذات) کو عطف کے ساتھ الگ الگ بیان کیا گیا ہے، حالانکہ وہ ایک ہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر جملے میں وہ الگ الگ صفت کے ساتھ مذکور ہے۔ کلام عرب میں سے اس کی مثال یہ شعر ہے ؎

إِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَابْنِ الْهُمَامِ     وَ لَيْثِ الْكَتِيْبَةِ فِي الْمُزْدَحَمِ

[ أضواء البيان ]

③ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ: اور تجھے کیا چیز آگاہ کرتی ہے شاید کہ وہ قیامت بالکل نزدیک ہو اور جو سانس تم لے رہے ہو یہی آخری ہو، اس لیے اس فکر میں مت پڑو کہ وہ کب ہے، بلکہ یہ فکر کرو کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بادیہ والوں میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! مَتَى السَّاعَةُ قَائِمَةٌ؟ قَالَ وَيْلَكَ وَمَا أَعْدَدْتَ لَهَا؟ قَالَ مَا أَعْدَدْتُ لَهَا إِلَّا أَنِّيْ أُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ، قَالَ إِنَّكَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ، فَقُلْنَا وَ نَحْنُ كَذٰلِكَ ؟ قَالَ نَعَمْ، فَفَرِحْنَا يَوْمَئِذٍ فَرَحًا شَدِيْدًا، فَمَرَّ غُلَامٌ لِلْمُغِيْرَةِ وَكَانَ مِنْ أَقْرَانِيْ فَقَالَ إِنْ أُخِّرَ هٰذَا فَلَنْ يُدْرِكَهُ الْهَرَمُ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ )) [ بخاري، الأدب، باب ما جاء في قول الرجل ويلك : ٦١٦٧ ] "یا رسول اللہ! قیامت کب قائم ہونے والی ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "افسوس تم پر! تم نے اس کے لیے تیاری کیا کی ہے؟" اس نے کہا: "میں نے اس کے لیے اس کے سوا کوئی تیاری نہیں کی کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم یقیناً اس کے ساتھ ہو گے جس سے تمھیں محبت ہو گی۔" تو ہم نے کہا: "اور ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو گا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں!" تو ہم اس دن بہت زیادہ خوش ہوئے۔ مغیرہ کا ایک غلام وہاں سے گزرا، وہ میرا ہم عمر تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر اس کی عمر دراز ہوئی تو اسے سخت بڑھاپا آنے سے پہلے پہلے قیامت قائم ہو جائے گی۔" مراد اس وقت موجود لوگوں کی قیامت ہے۔ حدیث میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آدمی کی موت کو اس کے لیے قیامت قرار دیا، کیونکہ اس کے ساتھ اس کے لیے عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔

④ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ "السَّاعَةَ" مؤنث ہے، اس کی خبر "قَرِيْبٌ" مذکر ہے، حالانکہ دونوں میں مطابقت ہونی چاہیے؟ جواب کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف کی آیت (۵٦): ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 18** ① يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا: "اِسْتِعْجَالٌ" کا معنی ہے کسی چیز کے وقت سے پہلے اس کے لانے کا مطالبہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت سے اور اس کے قریب ہونے سے ڈراتے تو کفار اسے جلد از جلد لانے کا مطالبہ

ع ۲ ۱۰

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہی بہت قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۱۹﴾

کرتے۔ مقصد ان کا صرف قیامت کا انکار اور اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا کہ جب وہ ان کے مطالبے پر فوراً بپا نہیں ہوگی تو وہ اسے جھٹلائیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے کہ اگر قیامت ہوتی تو ہمارے مطالبے پر آ جاتی، حالانکہ وہ ان کی فرمائش پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت پر آئے گی جس کا اس کے سوا کسی کو علم نہیں۔ اس آیت میں ان کی اس جرأت کی وجہ بیان فرمائی کہ ان کے اس مطالبے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے جس میں اعمال کی باز پرس ہوگی۔ اگر انھیں اس بات کا یقین ہوتا تو وہ کبھی اس کے لیے جلدی نہ مچاتے، بلکہ اس کی تیاری کی فکر کرتے۔

❷ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ...... : یعنی منکرین قیامت کے برعکس جو لوگ اس پر یقین و ایمان رکھتے ہیں وہ ہر وقت اس بات سے سخت ڈرتے رہتے ہیں کہ کب موت آ کر عمل کی مہلت ختم کر دے، پھر قیامت کبریٰ بپا ہونے پر حساب کے وقت ان کا کیا حال ہو۔ (دیکھیے انبیاء: ۴۹۔ نور: ۳۷۔ دہر: ۷) کیونکہ انھیں یقین ہے کہ وہ ہو کر رہنے والی ہے۔

❸ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ : "يُمَارُوْنَ" کا معنی ''شک کرتے ہیں'' بھی ہے اور ''جھگڑتے ہیں'' بھی۔ یعنی قیامت کا یقین ہو تو انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور حق واضح ہونے پر اسے قبول بھی کر لیتا ہے، مگر جسے اس کے آنے ہی میں شک ہو اور وہ اس کے متعلق جھگڑا کرتا رہتا ہو وہ ایمان لانے اور نیک اعمال اختیار کرنے کو بے کار سمجھے گا اور محاسبے کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے ہر گناہ پر دلیر ہوگا اور بڑے سے بڑے ظلم سے بھی گریز نہیں کرے گا، ایسے لوگ راہِ حق سے بہت دور جا چکے ہیں، جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں۔ "ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ" میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ سیدھے راستے سے اتنے دور جا چکے ہیں کہ ان کی آنکھیں قیامت کے دن ہی کھلیں گی، جب واپس پلٹنا ممکن نہیں ہوگا۔ دیکھیے سورۂ سبا (۵۱ تا ۵۴)۔

آیت 19 ❶ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ : "لَطِيْفٌ" ایسی چیز جو گرفت میں نہ آ سکے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ''لطیف'' اس لحاظ سے ہے کہ وہ باریک سے باریک چیز کی خبر رکھنے والا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی تدبیر نہایت باریک ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے اس کا معنی لطف و کرم کرنے والا بھی ہے کہ وہ ایسے باریک طریقے سے مہربانی فرماتا ہے کہ نظر ہی نہیں آتا کہ یہ کیسے ہوگئی۔ (مفردات) گویا "لَطِيْفٌ" میں دو صفتیں جمع ہیں، ایک نہایت باریک بین اور دوسری نہایت مہربانی والا۔ ان کے ضمن میں کمال علم بھی ہے جس کے بغیر باریک بینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بندوں پر لطیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے ان کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی مادی یا روحانی ضرورت پوشیدہ نہیں اور وہ اپنی کمال مہربانی اور باریک طریقوں سے ایسے انتظام فرماتا ہے کہ ہر بندے کی بلکہ ہر مخلوق کی ضرورت جو اس کے حسبِ حال ہو، پوری ہو اور اسے خبر بھی نہ ہو کہ وہ کیسے پوری ہوگئی۔ بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ "بِعِبَادِهٖ" کا لفظ اگرچہ عام ہے مگر اس سے مراد یہاں اللہ کے مومن بندے ہیں اور بعض نے فرمایا کہ "بِعِبَادِهٖ" میں مومن و کافر دونوں شامل ہیں، دنیا میں دونوں اس کے لطفِ عام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، البتہ آخرت میں اس کا لطف و کرم مومنوں کے لیے خاص ہوگا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝۲۰

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ۝۲۰

② يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ : اسی لیے ان میں سے بے شمار لوگوں کو جھٹلانے اور مذاق اڑانے کے باوجود بھوکا نہیں مارتا، بلکہ ان کی تمام ضرورتیں اپنے لطف وکرم سے پوری کرتا ہے۔ مگر جسے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور جس کی روزی کا دفتر بند کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ یہ بات یہاں ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ اکثر لوگ رزق کے پیچھے رزّاق کو بھول جاتے ہیں۔

③ وَ هُوَ الْقَوِيُّ : یعنی وہ جو کرنا چاہے، جسے جتنا رزق دینا چاہے اس کی پوری قوت رکھتا ہے، کسی کام میں کسی کا محتاج نہیں۔

④ الْعَزِيْزُ : یعنی دوسرے تمام معاملات کی طرح رزق کے معاملے میں بھی کسی کا اس پر زور نہیں کہ وہ دینا چاہے تو کوئی اسے روک سکے، یا نہ دینا چاہے تو کوئی اس سے لے سکے۔ خبر "الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ" پر الف لام سے قصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی دونوں صفتیں صرف اس میں ہیں، کسی اور میں نہیں، جیسا کہ فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ ، وَلاَ مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ)) [ بخاري، القدر، باب لا مانع لما أعطى الله : ٦٦١٥ ] "اے اللہ! تو جو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو روک دے وہ کوئی دینے والا نہیں۔"

آیت 20 ① مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ ...... : اللہ تعالیٰ نے دنیا کو آدمی کے لیے کھیت بنایا ہے، وہ اس میں جو بوئے گا وہی کاٹے گا اور جس چیز کا ارادہ کرے گا وہی ملے گی۔ اسی طرح اس نے دنیا کو تجارت کی جگہ بنایا ہے، اگر خیر کا سودا کرے گا تو نفع میں خیر ملے گی، اگر شر کا سودا کرے گا تو نتیجہ میں شر پائے گا۔ اسی طرح دنیا کو آخرت کا راستہ بنایا ہے، اگر خیر کے راستے پر چلے گا تو منزل مراد پا لے گا اور ہمیشہ کی جنت میں پہنچ جائے گا، اگر شر کے راستے پر چلے گا تو ہمیشہ کے عذاب اور دائمی غم میں جا پڑے گا۔ اس تجارت کے نفع ونقصان کا کئی آیات میں ذکر فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ [ التوبة : ١١١ ] "بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ﴾ [ البقرة : ٢٠٧ ] "اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو اللہ کی رضا مندی تلاش کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ﴾ [ البقرة : ٨٦ ] "یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے خریدی۔"

② پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رزق کا قانون بیان فرمایا کہ وہ سب کے لیے یکساں نہیں، وہ جسے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور اس میں اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ (دیکھیے زخرف: ۳۲) اس آیت میں فرمایا کہ آدمی کی کوشش اور نیت کے مختلف ہونے کے لحاظ سے بھی اسے ملنے والا رزق مختلف ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

**کیا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی اور اگر فیصلہ شدہ بات نہ ہوتی تو ضرور ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۲۱﴾**

③ آخرت کی کھیتی کا ارادہ رکھنے والے کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ اسے دنیا میں کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا تو نیک ہو یا بد ہر ایک کو تھوڑی یا زیادہ ملنی ہی ملنی ہے، آخرت کے متعلق بشارت دی کہ ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے، کیونکہ اس کی نیت اور کوشش اسی کی ہے۔ اضافہ یہ ہے کہ دنیا میں اسے مزید نیکیوں کی توفیق دیں گے اور آخرت میں ایک نیکی کو دس گنا سے ہزاروں لاکھوں تک بلکہ شمار سے بھی زیادہ بڑھائیں گے اور دائمی نعمتیں عطا کریں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ [ بني إسرائيل : ۱۹ ] ”اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی جو اس کے لائق کوشش ہے، جب کہ وہ مومن ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی کوشش ہمیشہ سے قدر کی ہوئی ہے۔“

④ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ......: ”مِنْهَا“ میں ”مِنْ“ تبعیض کے لیے ہے۔ یعنی جو شخص دنیا کی کھیتی کا ارادہ کرے گا اور دنیا ہی کے لیے کوشش اور محنت کرے گا، ایک تو یہ کہ اسے وہ نہیں ملے گا جو وہ چاہتا ہے بلکہ ہم اسے اس میں سے کچھ حصہ ہی دیں گے، دوسرا یہ کہ وہ حصہ بھی ہم دنیا ہی میں دے دیں گے، آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں، کیونکہ آخرت کی نیت سے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہی بات ایک اور آیت میں یوں بیان فرمائی: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ [ بني إسرائيل : ۱۸ ] ”جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہوگا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا۔“ اور فرمایا: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ [ البقرة : ۲۰۰ ] ”پھر لوگوں میں سے کوئی تو وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے دے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔“

**آیت 21** ① اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ ......: ظاہر ہے اس آیت میں ”شُرَكٰٓؤُا“ سے مراد وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے اور پوجا پاٹ کرتے ہیں، کیونکہ وہ دین کا کوئی طریقہ مقرر کر سکتے ہیں نہ حلال و حرام قرار دینے میں ان کا کوئی دخل ہے اور نہ وہ کوئی قانون یا ضابطہ مقرر کر سکتے ہیں۔ لامحالہ اس سے مراد کوئی انسان یا

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا

تو ان ظالموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو انھوں نے کمایا، حالانکہ وہ ان پر آ کر رہنے والا ہے اور

انسانوں کی کوئی جماعت ہی ہے جنھوں نے اللہ کی شریعت کے مقابلے میں اپنی شریعت چلا رکھی ہو، حرام و حلال قرار دینے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہوں اور لوگوں کے لیے ایسے نظام اور قانون مقرر کرتے ہوں جو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے خلاف ہوں، پھر انھیں لوگوں میں رائج اور نافذ بھی کرتے ہوں۔ ایسے لوگ پارلیمنٹ یا ایوانوں کے ممبر بھی ہو سکتے ہیں، خودسر حکمران بھی، آستانوں اور مزاروں کے مجاور اور متولی بھی اور گمراہ قسم کے فلسفی اور مصنف بھی۔ علاوہ ازیں یہ شرکاء ایسے صالح اور متقی ائمہ بھی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے مقابلے میں قانون سازی کا سوچ بھی نہ سکتے ہوں مگر لوگوں نے ان کے نام پر قرآن و سنت کے بالمقابل شریعت سازی کر کے انھیں اللہ کا شریک بنا رکھا ہو۔ شرک کسی بھی طرح کا ہو ظلم عظیم ہے، خواہ شرک فی العبادۃ ہو یا شرک فی الحکم۔ جس طرح وہ شخص مشرک ہے جو اللہ کے سوا کسی کی پوجا کرتا ہے، اس کی نذر و نیاز دیتا ہے، مصیبت کے وقت اسے پکارتا ہے، اسے حاجت روا یا مشکل کُشا سمجھتا ہے، خواہ کسی زندہ کی پوجا کرے یا مردہ کی، جن کی کرے یا انسان یا فرشتے کی، قبر کی پوجا کرے یا بت کی، اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زندگی کا نظام بنانے کا یا قانون بنانے کا یا حلال و حرام قرار دینے کا اختیار دیتا ہے وہ بھی مشرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی قسم کا بھی شریک بنانے کی اجازت نہیں دی۔

② وَ لَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ : یعنی یہ شرک اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی ایسی جسارت ہے کہ اگر لوگوں کو مہلت دینے کا فیصلہ نہ ہوتا اور یہ طے نہ کر دیا گیا ہوتا کہ فیصلے قیامت کے دن ہوں گے تو دنیا ہی میں ان لوگوں پر عذاب آ جاتا جو اللہ کے دین کے مقابلے میں اپنی شریعت اور قانون بناتے ہیں، یا ایسی شریعت کو قبول کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

③ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : "الظّٰلِمِيْنَ" میں الف لام عہد کا ہے، یعنی ان ظالموں کے لیے عذاب الیم ہے جو شرک کے ظلم عظیم کا ارتکاب کرتے ہیں اور وہ عذابِ الیم جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے اور جنت ان پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ [ المائدۃ : ۷۲ ] ”بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔“

آیت 22 ① تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا...... : "الظّٰلِمِيْنَ" سے یہاں بھی وہی ظالم یعنی کافر و مشرک مراد ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، کیونکہ کوئی اسم معرف باللام ہو کر دوبارہ آئے تو اس سے پہلا ہی مراد ہوتا ہے اور اس لیے کہ ان کے مقابلے میں ایمان اور عمل صالح والے لوگوں کا ذکر آ رہا ہے، یعنی "وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......" اس آیت میں قیامت کے دن ان مشرکین کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ عذاب سے پہلے اس کا شدید خوف بجائے خود ایک بڑا عذاب ہے، پھر ہر حال میں ان کے کفر و شرک کا وبال ان پر آ کر رہنے والا ہے، خواہ ڈریں یا نہ ڈریں۔ دنیا میں کفار قیامت

الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وہ جنتوں کے باغوں میں ہوں گے۔ ان کے لیے جو وہ چاہیں گے ان کے رب کے پاس ہوگا، یہی بہت بڑا فضل ہے ﴿۲۲﴾

سے بے خوف تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے، جیسا کہ پیچھے گزرا ہے: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ﴾ [ الشوریٰ : ۱۸ ] ”اسے وہ لوگ جلدی مانگتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے“ تو قیامت کے دن وہی کافر سخت خوف زدہ ہوں گے۔ ان کے برعکس ایمان والے دنیا میں قیامت سے سخت خوف زدہ رہتے تھے، جیسا کہ پہلے گزرا ہے: ﴿ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ﴾ [ الشوریٰ : ۱۷ ] ”اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ اس (قیامت) سے ڈرنے والے ہیں“ سو اب وہ جنتوں کے باغوں میں بے خوف ہوں گے۔

❷ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ......: ”رَوْضَةٌ“ کا معنی ہے ”اَلْمَوْضِعُ النَّزِهُ الْكَثِيْرُ الْخُضْرَةِ“ کہ نہایت صاف ستھری اور بہت سرسبز جگہ۔ ”رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ“ سے ظاہر ہے کہ جنتیں بھی بہت سی ہیں اور روضات بھی بہت سے ہیں، یعنی (مومن کسی درجے کے بھی ہوں جنت میں ہوں گے، مگر) ایمان اور عمل صالح والے جنت کے بھی پاکیزہ ترین اور سب سے سرسبز مقامات میں ہوں گے۔ جن میں سب سے عالی مقام رسول کریم ﷺ کا ہوگا، جیسا کہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے ایک طویل خواب روایت کیا ہے، جس میں ہے کہ دو فرشتوں نے پہلے آپ ﷺ کو مختلف گناہوں کے عذاب کا منظر دکھایا، اس کے بعد ان دونوں نے آپ ﷺ کو آگے چلنے کے لیے کہا، آپ ﷺ نے فرمایا: (( فَانْطَلَقْنَا حَتّٰی انْتَهَيْنَا إِلٰی رَوْضَةٍ خَضْرَاءَ، فِيْهَا شَجَرَةٌ عَظِيْمَةٌ، وَ فِيْ أَصْلِهَا شَيْخٌ وَصِبْيَانٌ، وَإِذَا رَجُلٌ قَرِيْبٌ مِنَ الشَّجَرَةِ بَيْنَ يَدَيْهِ نَارٌ يُوْقِدُهَا، فَصَعِدَا بِيْ فِي الشَّجَرَةِ، وَ أَدْخَلَانِيْ دَارًا لَمْ أَرَ قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهَا، فِيْهَا رِجَالٌ شُيُوْخٌ وَشَبَابٌ، وَ نِسَاءٌ وَصِبْيَانٌ، ثُمَّ أَخْرَجَانِيْ مِنْهَا فَصَعِدَا بِي الشَّجَرَةَ فَأَدْخَلَانِيْ دَارًا هِيَ أَحْسَنُ وَ أَفْضَلُ، فِيْهَا شُيُوْخٌ وَ شَبَابٌ، فَقُلْتُ طَوَّفْتُمَانِي اللَّيْلَةَ، فَأَخْبِرَانِيْ عَمَّا رَأَيْتُ ؟ قَالَا نَعَمْ، ( فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ حَتّٰی قَالَ ) وَالشَّيْخُ فِيْ أَصْلِ الشَّجَرَةِ إِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالصِّبْيَانُ حَوْلَهُ فَأَوْلَادُ النَّاسِ، وَالَّذِيْ يُوْقِدُ النَّارَ مَالِكٌ خَازِنُ النَّارِ، وَالدَّارُ الْأُوْلَی الَّتِيْ دَخَلْتَ، دَارُ عَامَّةِ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَأَمَّا هٰذِهِ الدَّارُ، فَدَارُ الشُّهَدَاءِ، وَ أَنَا جِبْرِيْلُ، وَ هٰذَا مِيْكَائِيْلُ، فَارْفَعْ رَأْسَكَ، فَرَفَعْتُ رَأْسِيْ، فَإِذَا فَوْقِيْ مِثْلُ السَّحَابِ، قَالَا ذَاكَ مَنْزِلُكَ، قُلْتُ دَعَانِيْ أَدْخُلْ مَنْزِلِيْ، قَالَا إِنَّهُ بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ، فَلَوِ اسْتَكْمَلْتَ أَتَيْتَ مَنْزِلَكَ )) [ بخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين : ۱۳۸٦ ] ”پھر ہم چل پڑے یہاں تک کہ ہم ایک سرسبز روضہ (باغ) میں پہنچے جس میں ایک بہت بڑا درخت تھا، اس کی جڑ (تنے) کے پاس ایک بزرگ اور کچھ بچے تھے اور اس درخت کے قریب ایک آدمی تھا جس کے سامنے آگ تھی، جسے وہ بھڑکا رہا تھا، پھر وہ دونوں مجھے لے کر درخت پر چڑھ گئے اور مجھے ایک ایسے گھر کے اندر لے گئے جس سے خوبصورت گھر میں نے نہیں دیکھا، اس میں کچھ بزرگ اور جوان آدمی اور عورتیں اور بچے تھے، پھر انھوں نے مجھے اس

ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا

یہ ہے وہ چیز جس کی خوش خبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔ کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر رشتہ داری کی وجہ سے دوستی۔ اور جو کوئی نیکی کمائے گا ہم اس کے

گھر سے نکالا اور مجھے لے کر اس درخت کے اوپر چڑھے اور ایک گھر کے اندر لے گئے جو پہلے سے زیادہ خوبصورت اور برتر تھا، اس میں کچھ بزرگ تھے اور کچھ جوان۔ میں نے کہا: ''تم دونوں نے آج رات مجھے خوب گھمایا ہے، اب جو کچھ میں نے دیکھا ہے مجھے اس کی حقیقت بتاؤ؟'' تو انھوں نے کہا: ''ہاں، ٹھیک ہے (پھر انھوں نے عذاب والے مناظر کی حقیقت بتانے کے بعد کہا) اور درخت کی جڑ کے پاس جو بزرگ تھے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے اردگرد بچے لوگوں کی اولاد تھے اور جو آگ بھڑکا رہا تھا وہ آگ کا خازن مالک تھا اور پہلا گھر جس میں آپ داخل ہوئے عام ایمان والوں کا گھر تھا۔ رہا یہ گھر تو یہ شہداء کا گھر ہے اور میں جبریل ہوں اور یہ میکائیل ہے، اب سر اٹھاؤ!'' میں نے سر اٹھایا تو اچانک میرے اوپر بادل کی طرح کی چیز تھی۔ دونوں نے کہا: ''وہ تمھارا گھر ہے۔'' میں نے کہا: ''مجھے چھوڑو میں اپنے گھر جاؤں۔'' انھوں نے کہا: ''آپ کی کچھ عمر باقی ہے جو آپ نے پوری نہیں کی، اگر پوری کر لو گے تو اپنے گھر میں آ جاؤ گے۔'' اس حدیث سے ''رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ'' کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے اور یہ بھی کہ ''رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ'' میں سب سے اعلیٰ ''رَوْضَةُ الْجَنَّةِ'' ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے خاص ہے۔

③ ان آیات میں متعدد وجوں سے مومنوں کو ملنے والے ثواب کی عظمت بیان کی گئی ہے، ایک یہ کہ وہ ''رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ'' میں ہوں گے، دوسری یہ کہ ''لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ'' یعنی انھیں وہاں جو چاہیں گے ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھیں حاصل ہونے والی نعمتوں کی انتہا نہیں ہوگی، کیونکہ آدمی ہر نعمت کے بعد اس سے اعلیٰ نعمت کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تیسری ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' کہ ان کی رہائش گاہیں ان کے رب کے پڑوس میں ہوں گی۔ یہ وہ چیز ہے جس کی دعا فرعون کی بیوی نے کی تھی: ﴿رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ﴾ [التحریم: ۱۱] ''اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا۔'' چوتھی یہ کہ انھیں عطا ہونے والی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے فضل کبیر قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ﴾ پھر جسے اللہ تعالیٰ اکبر اور کبیر قرار دے اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ پانچویں وجہ سے انھیں ملنے والے ثواب کی عظمت کا بیان اگلی آیت میں ہے۔

④ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ : اس سے معلوم ہوا کہ جنت محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اس پر کسی کا حق واجب نہیں۔

**آیت 23** ① ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ...... : یہ پانچویں وجہ ہے۔ ''ذٰلِكَ'' اسم اشارہ بعید اس ثواب کی عظمت کے بیان کے لیے ہے۔ جنتوں کے باغوں اور ان کی نعمتوں کی طرف اشارہ کر کے ان کی طرف دوبارہ توجہ دلانے سے مقصود ان کی عظمت کا اظہار ہے اور ساتھ ہی ایمان اور عمل صالح کا ذکر اس لیے ہے کہ اتنی بڑی نعمتوں کے حصول کے لیے ایمان اور عمل صالح ضروری ہے۔

اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

لیے اس میں خوبی کا اضافہ کریں گے۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے ﴿۲۳﴾

❷ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى : " قَرِبَ يَقْرَبُ قُرْبًا وَ قُرْبَانًا وَ قِرْبَانًا " (س،ک) قریب ہونا۔ " قُرْبٰى " اور " قَرَابَةٌ " بھی مصدر ہیں، جیسے " بُشْرٰى " اور " رُجْعٰى " ہیں۔ ان کا معنی رشتہ داری اور قرابت ہے۔ رشتہ دار اور قرابت دار کے لیے " ذوالقربیٰ " (قرابت والا) کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ [ بني إسرائیل : ۲٦ ] " اور رشتہ دار کو اس کا حق دے۔" " فِي الْقُرْبٰى " میں " فِيْ " تعلیل کے لیے ہے : " أَيْ مِنْ أَجْلِ الْقُرْبٰى " یعنی رشتہ داری کی وجہ سے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِيْ هِرَّةٍ حَبَسَتْهَا، حَتّٰى مَاتَتْ جُوْعًا، فَدَخَلَتْ فِيْهَا النَّارَ )) [ بخاري، المساقاة، باب فضل سقي الماء : ۲۳٦٥ ] " ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اس نے اسے باندھ کر رکھا، یہاں تک کہ وہ بھوک سے مر گئی، تو اس کی وجہ سے وہ آگ میں داخل ہو گئی۔" یعنی آپ کہہ دیں کہ میں اس تبلیغِ دین پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، سوائے رشتہ داری کی وجہ سے دوستی کے کہ کچھ نہ سہی، کم از کم میرے اور تمھارے درمیان جو قرابت اور رشتہ داری ہے اس کی وجہ سے میرا حق ہے کہ مجھ سے دوستی رکھو، اس حق کا مطالبہ میں تم سے ضرور کرتا ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے، اگر نہیں مانتے تو سارے عرب میں سب سے بڑھ کر دشمنی تو نہ کرو۔ کم از کم اس قرابت کا تو خیال رکھو جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ جیسا کہ ابوطالب اگرچہ ایمان نہیں لایا مگر وہ قرابت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی حمایت اور آپ ﷺ کا دفاع کرتا رہا۔

آیت کا یہی مطلب ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ طاؤس فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے " اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى " کے متعلق سوال کیا گیا تو سعید بن جبیر کہنے لگے کہ اس سے مراد " قُرْبٰى آلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " (آلِ محمد ﷺ کی قرابت) ہے، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( عَجِلْتَ، إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ بَطْنٌ مِنْ قُرَيْشٍ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيْهِمْ قَرَابَةٌ فَقَالَ إِلَّا أَنْ تَصِلُوْا مَا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ مِنَ الْقَرَابَةِ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿إلا المودة فی القربی﴾ : ٤٨١٨ ] " تم نے جلدی کی، قریش کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس میں نبی ﷺ کی قرابت اور رشتہ داری نہ ہو، تو آپ ﷺ نے فرمایا: " (میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا) مگر یہ کہ تم اس رشتہ داری کو ملاؤ جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔"

❸ بعض لوگ خصوصاً شیعہ اس آیت کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ آپ کہہ دیں کہ میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا مگر قرابت والوں سے دوستی کا، یعنی میں تم سے اس پر اس کے سوا کچھ نہیں مانگتا کہ تم میرے قرابت داروں سے دوستی رکھو۔ نبی کریم ﷺ کے مومن قرابت داروں سے دوستی اپنی جگہ مسلمہ ہے، جو دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مگر اس آیت کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو ان لوگوں نے بیان کیا ہے، کیونکہ " الْقُرْبٰى " کا معنی رشتہ داری ہے، رشتہ دار نہیں۔ رشتہ داروں کے لیے

"ذوِي الْقُرْبٰى" کا لفظ آتا ہے۔ اگر "الْقُرْبٰى" کا معنی رشتہ دار ہو بھی تو آیت کے الفاظ یہ ہونے چاہئیں: " اِلَّا مَوَدَّةَ الْقُرْبٰى " "مگر رشتہ داروں کی دوستی کا۔" جب کہ الفاظ ہیں: ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ ان الفاظ کا وہ معنی ہو ہی نہیں سکتا جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ پھر دیکھیں کہ آپ ﷺ یہ سوال کن لوگوں سے کر رہے ہیں، ظاہر ہے کفار سے کر رہے ہیں جو آپ کے شدید مخالف تھے، جو آپ سے بھی دوستی کے روادار نہیں تھے، آیا ممکن بھی ہے کہ آپ ان سے کہیں کہ میرے رشتہ داروں سے دوستی کرو۔ اگر مان بھی لیں کہ آپ ان سے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ دوستی کا سوال کر رہے ہیں تو وہ رشتے دار کون سے ہیں؟ کیا آپ ﷺ اپنے پورے قبیلۂ قریش کے ساتھ دوستی کا سوال کر رہے ہیں یا اپنے قریب ترین خاندان بنو عبد المطلب کے ساتھ؟ دونوں میں مخلص مسلمانوں کے علاوہ ابوجہل اور ابولہب جیسے آپ کے بدترین دشمن بھی موجود تھے، جن کے ساتھ دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر اس سے مراد علی و فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم ہیں، جیسا کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں، تو یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں فاطمہ اور علی رضی اللہ عنہما کا نکاح تک نہیں ہوا تھا اور نہ ہی حسن و حسین رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے تھے، لہٰذا اس سے یہ لوگ مراد ہو ہی نہیں سکتے۔

❹ بعض مفسرین نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ کہنا کہ میں تم سے صرف رشتہ داری کی وجہ سے دوستی کا سوال کرتا ہوں، یہ دین کی تبلیغ کی اجرت یا مزدوری نہیں جو آپ ان سے مانگ رہے ہیں، بلکہ آپ اپنے اس حق کا مطالبہ کر رہے ہیں جو تمام دنیا کے ہاں مسلّم ہے، خواہ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں۔ غرض اس آیت میں بھی وہی بات بیان ہوئی ہے جو تمام انبیاء نے اپنی اپنی قوم سے کہی کہ میں تم سے اس تبلیغ دین پر کسی قسم کی مزدوری کا سوال نہیں کرتا، کیونکہ میری مزدوری صرف اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، جیسا کہ سورۂ شعراء میں ہے: ﴿وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [ الشعراء : ۱۰۹ ] "اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے۔" قواعد نحو میں یہ بات ان الفاظ میں بیان کی جائے گی کہ یہاں استثنا متصل نہیں منقطع ہے، یعنی صلہ رحمی کے سوال کا تبلیغ دین پر اجرت سے کوئی تعلق نہیں۔

❺ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا : "حَسَنَةً" میں تنوین تنکیر کے لیے ہے۔ جو شخص کوئی بھلائی کرے گا، خواہ کتنی معمولی ہو، ہم اس کے لیے اس کے حسن و خوبی میں اضافہ کر دیں گے۔ یہ اضافہ کئی طرح سے ہے، ایک تو وہ جتنی نیکی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس سے زیادہ نیکی کی توفیق دے گا۔ دوسرا جو لوگ اسے دیکھ کر وہ نیکی کریں گے ان سب کے اجر اسے بھی ملیں گے جس سے اس کی نیکی میں اضافہ ہوگا۔ تیسرا اللہ تعالیٰ ہر نیکی کو دس گنا سے سات سو گنا بلکہ شمار سے زیادہ تک بڑھا دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [ النساء : ۴۰ ] "اگر ایک نیکی ہوگی تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا۔" چوتھا یہ کہ نیکیوں کے ساتھ گناہ معاف ہوتے ہیں، فرمایا: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [ ہود : ۱۱۴ ] "بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔"

❻ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ : "اِنَّ" تعلیل کے لیے آتا ہے، یعنی نیکی کرنے والے کی نیکی میں ہم اضافہ اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گناہوں پر بہت پردہ ڈالنے والا اور نیک عمل کی بے حد قدر کرنے والا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾

یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے، سو اگر اللہ چاہے تو تیرے دل پر مہر کر دے اور اللہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنی باتوں کے ساتھ ثابت کر دیتا ہے، یقیناً وہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۲۴﴾

**آیت 24** ① **اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا** : "اَمْ" کے لفظ سے پہلے ایک جملہ ظاہر یا مقدر ہوتا ہے جو ہمزہ استفہام سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرنے کے بعد کہ تمھیں دین کی دعوت دینے سے مقصود سراسر تمھارا فائدہ اور تمھاری نجات ہے، اس میں تم سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں، نہ ہی میں اس پر تم سے کسی مزدوری کا سوال کرتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ کم از کم رشتہ داری کی وجہ سے میرا دوستی کا حق تو ادا کرو۔ اس سے آگے اس مفہوم کی عبارت مقدر مانی جائے گی کہ آیا وہ یہ دعوت قبول کرتے ہوئے آپ پر ایمان لاتے ہیں "**اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى**" یا ضد اور عناد پر قائم رہ کر یہی بات کہے جاتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے۔

② **فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ** : مفسرین نے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی ہے، زیادہ واضح دو تفسیریں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "اگر تو نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہو، جیسا کہ یہ جاہل کہہ رہے ہیں تو اگر وہ چاہے تو "**يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ**" وہ تیرے دل پر مہر لگا دے اور جتنا قرآن تجھے عطا کیا ہے وہ تجھ سے سلب کر لے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: ﴿**وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ**﴾ [ الحاقة : ٤٤ تا ٤٧ ] "اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔" یعنی ہم اس سے شدید ترین انتقام لیں اور کوئی شخص اسے بچا نہ سکے۔ (ابن کثیر) مزید تفصیل سورۂ حاقہ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ مفسر قاسمی نے فرمایا: "یہ قرآنی آیات کی تفسیر قرآن کی آیات کے ساتھ ہے، جہاں ممکن ہو یہ تفسیر سب سے بہتر ہوتی ہے، کیونکہ قرآنی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں۔ اس مفہوم کے مطابق آیت کا مآل جیسا کہ ابو السعود نے وضاحت فرمائی کفار کی بات کی تردید ہے، یعنی اگر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑتے تو اللہ آپ کو ہر حال میں اس سے روک دیتا اور آپ کے دل پر ایسی مہر لگاتا کہ نہ آپ کی زبان پر وحی کا کوئی لفظ آتا اور نہ آپ کے دل میں اس کا کوئی مفہوم آتا، جب ایسا نہیں ہوا بلکہ وحی تواتر کے ساتھ جاری رہی تو ثابت ہو گیا کہ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔"

دوسری تفسیر مفسر شہاب کے الفاظ میں یہ ہے: "اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو تیرے دل پر مہر لگا دے، جیسے اس نے ان (بہتان لگانے والے کافروں) کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس میں آپ ﷺ کو تسلی دلائی ہے اور آپ پر اپنا احسان و اکرام یاد دلایا ہے (کہ اس نے آپ کے دل پر مہر نہیں لگائی) تاکہ آپ اس کی وجہ سے شکر ادا کریں اور ان لوگوں کے حال پر

وَ هُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۲۵﴾

ترس کھائیں جن کے دل پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور وہ اپنے رب کے غضب کے حق دار بن گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی یہ جرأت نہ کرتے کہ آپ پر یہ بہتان باندھیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر ان پر گمراہی کی مہر نہ لگ گئی ہوتی تو وہ یہ محال بات کہنے کی جرأت نہ کرتے۔'' (منقول از قاسمی)

③ وَ یَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ ...... : ''یَمْحُ'' اصل میں ''یَمْحُوْ '' ہے۔ اس کا عطف ''یَخْتِمْ'' پر نہیں اور نہ ہی حالت جزم میں ہونے کی وجہ سے اس کی ''واؤ'' گری ہے، بلکہ یہ نیا جملہ ہے اور رفعی حالت میں ہونے کی وجہ سے ''واؤ'' اپنی جگہ قائم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے رسم الخط میں یہاں ''واؤ'' نہیں لکھی گئی، کیونکہ بعض مقامات پر پڑھنے میں جو حروف نہیں آتے تھے انھوں نے وہ لکھنے میں بھی حذف کر دیے ہیں، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۱۱): ﴿ وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ﴾ اور سورۂ علق کی آیت (۱۸): ﴿ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ ﴾ میں ''واؤ'' نہیں لکھی گئی۔ مسلمانوں نے بعد میں قرآن مجید کے لیے اسی رسم الخط کو محفوظ رکھا۔ بعض اہلِ علم نے ''یَمْحُ'' کی واؤ حذف کرنے میں یہ نکتہ نکالا ہے کہ باطل کو مٹانے اور محو کرنے میں مبالغے کے اظہار کے لیے ''یَمْحُوْ '' کی ''واؤ'' کو بھی محو کر دیا ہے۔

④ یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ وہ باطل کو مٹاتا ہے اور حق کو اپنے کلمات کے ساتھ ثابت کر دیتا ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اللہ پر جھوٹ گھڑیں اور اللہ تعالیٰ اسے نہ مٹائے، بلکہ آپ کو ہر قدم پر اپنی فتح و نصرت کے ساتھ نوازتا جائے۔ یہ دلیل ہے کہ آپ حق لے کر آئے ہیں اور وہ شخص بدترین بہتان باز ہے جو کہتا ہے کہ آپ نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے۔

⑤ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ : یعنی اسے سینوں میں چھپی ہوئی نیتوں اور ارادوں کا خوب علم ہے، وہ اپنی رسالت کے ساتھ کبھی بھی بدطینت و جھوٹ گھڑنے والوں کو نہیں نوازتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [ الأنعام : ۱۲٤ ] ''اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔'' اس نے اپنے کامل علم ہی کی بنا پر آپ کو اس منصب کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

**آیت 25** ① وَ هُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ : پچھلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے، اب اپنی توبہ قبول کرنے کی صفت فرمائی کہ توبہ قبول کرنا اور گناہوں سے درگزر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے (دیکھیے توبہ: ۱۰۴) اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، کیونکہ اگر وہ چاہے تو مجرم کے معافی مانگنے پر بھی اسے معاف نہ کرے۔ مقصود انھیں توبہ کی ترغیب دلانا اور کفر پر اصرار کے انجامِ بد سے ڈرانا ہے۔ کفر سے توبہ اسلام قبول کرنے سے ہوتی ہے اور گناہ سے توبہ میں تین چیزیں شامل ہیں، ایک پچھلے گناہ پر ندامت، دوسرا اسے ترک کر دینا، تیسرا آئندہ وہ گناہ نہ کرنے کا عزم اور اگر گناہ کا تعلق بندوں کے حق سے ہے تو حسب استطاعت

اسے ادا کر دینا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا۔ اگر آئندہ وہ گناہ نہ کرنے کا عزم نہ ہو تو توبہ کا کچھ مطلب نہیں۔ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

سبحہ در کف، توبہ بر لب، دل پُر از ذوقِ گناہ    معصیت را خندہ مے آید ز استغفارِ ما

''ہاتھ میں تسبیح ہے، زبان پر توبہ اور دل گناہ کی لذت سے بھرا ہوا ہے، گناہ کو ہمارے استغفار پر ہنسی آتی ہے۔''

❷ **عَنْ عِبَادِهٖ:** اس میں توبہ قبول کرنے کی ایک وجہ بیان فرمائی ہے کہ گناہ کر کے توبہ کرنے والے اس کے اپنے بندے ہیں اور وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۷)، آل عمران (۱۳۵) اور سورۂ نساء (۱۱۰)۔

❸ **وَ يَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ:** توبہ مستقبل کے لیے قبول ہوتی ہے اور برائیاں گزشتہ معاف کر دی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسا کریم ہے کہ توبہ پر گزشتہ تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے، بلکہ سورۂ فرقان کی آیت (۷۰) کے مطابق توبہ کرنے والوں کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ بندے کی توبہ پر اللہ تعالیٰ کس قدر خوش ہوتا ہے، اس کی تفصیل انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَلّٰهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ حِيْنَ يَتُوْبُ إِلَيْهِ، مِنْ أَحَدِكُمْ كَانَ عَلٰى رَاحِلَتِهِ بِأَرْضِ فَلَاةٍ، فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ، وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَأَيِسَ مِنْهَا، فَأَتٰى شَجَرَةً فَاضْطَجَعَ فِيْ ظِلِّهَا، قَدْ أَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهِ، فَبَيْنَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذَا هُوَ بِهَا قَائِمَةً عِنْدَهُ، فَأَخَذَ بِخِطَامِهَا ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ عَبْدِيْ وَأَنَا رَبُّكَ، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ )) [ مسلم، التوبة، باب في الحض على التوبة والفرح بها : ۲۷۴۷ ] ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر، جب وہ اس کی طرف توبہ کرتا ہے، اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا تم میں سے کوئی شخص خوش ہوتا ہے، جو کسی بیابان میں اپنی اونٹنی پر سوار تھا تو وہ اس سے چھوٹ کر نکل گئی، اس کا کھانا اور پانی بھی اسی پر تھا۔ تو وہ اس سے ناامید ہو گیا اور ایک درخت کے پاس جا کر اس کے سائے میں لیٹ گیا۔ حال اس کا یہ تھا کہ وہ اپنی اونٹنی سے مایوس ہو چکا تھا، وہ اسی حال میں تھا کہ اچانک اس نے اسے دیکھا کہ وہ اونٹنی اس کے پاس کھڑی تھی، چنانچہ اس نے اس کی مہار پکڑ لی، پھر شدید خوشی میں کہنے لگا: ''اے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب۔'' خوشی کی شدت سے غلطی کر بیٹھا۔''

❹ اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ بعض اوقات توبہ کے بغیر بھی گناہ معاف فرما دیتا ہے، جیسا کہ ہجرت کے بعد پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، حج مبرور کے بعد پہلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، شہادت فی سبیل اللہ سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور نیکیوں کی کثرت سے گناہ مٹ جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ [ هود : ۱۱۴ ] ''بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔'' اور کبیرہ گناہوں کے اجتناب سے صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کبیرہ گناہ کے مرتکب مومن کو، اگر وہ توبہ نہ کرے تو کافر یا ابدی جہنمی قرار دیتے ہیں، ان کی بات درست نہیں۔

❺ **وَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ:** اس جملے میں بشارت بھی ہے اور نذارت بھی۔ عمل کا دارو مدار دل کی حالت پر ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اخلاص سے توبہ کی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اسے قبولیت سے نوازے گا اور اگر توبہ اپنے

وَ يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾ وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ

اور ان لوگوں کی دعا قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دیتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے ﴿۲۶﴾ اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق فراخ کر دیتا تو یقیناً وہ

کسی دنیوی مقصد کے لیے کی گئی ہو، مثلاً ریا کے طور پر یا آئندہ توڑ ڈالنے کے ارادے سے، یا کسی دنیوی فائدے کے لیے، مثلاً صحت وقوت کے لیے زنا، سگریٹ یا شراب کو ترک کیا گیا ہے تو وہ اسے بھی جانتا ہے۔

**آیت 26** ① **وَ يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ:** اجابت کا معنی قبول کرنا ہے اور استجابت میں ''سین'' مبالغے کے لیے ہے۔ یہ لفظ کسی حکم پر بہت جلد عمل کرنے یا کسی دعوت پر بہت جلدی لبیک کہنے یا کسی دعا کو بہت جلدی قبول کرنے کے لیے آتا ہے۔ (ابن عاشور) یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی دعا بہت جلد اور خوشی سے قبول فرماتا ہے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۸۶، ۲۱۸) ان معنوں میں کفار کی دعا قبول ہوتی ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ [ الرعد : ۱٤ ] ''اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سراسر بے سود۔'' ہاں، رسی دراز کرنے کے لیے اور حجت تمام کرنے کے لیے کفار کی بھی دعائیں قبول ہوتی ہیں، مگر وہ استجابت نہیں استدراج ہے اور ناراضی کی علامت ہے، جیسا کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو گمراہ کرنے کے لیے مہلت مانگی تو اسے دے دی گئی۔

② **وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ:** اس میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک یہ کہ صالح اعمال والے مومن اپنی دعا اور عملِ صالح سے جو امید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں وہ بھی دیتا ہے اور ان کی امید سے کہیں زیادہ بھی عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح ان کا ہر عمل قبول بھی کرتا ہے اور اسے دس گنا سے سات سو گنا تک یا بلاحساب تک بڑھا بھی دیتا ہے۔ دوسری یہ کہ انھیں اپنے فضل سے مزید وہ کچھ بھی عطا کرتا ہے جس کی درخواست انھوں نے نہیں کی ہوتی، کیونکہ وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اور ان کی ضروریات سے پوری طرح آگاہ ہے۔

③ **وَ الْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ:** یہ قرآن مجید کا عام طریقہ ہے کہ ترغیب کے ساتھ ترہیب بھی ہوتی ہے۔ یعنی جو لوگ توبہ کے بجائے کفر پر اصرار کرتے اور اسی حالت میں مر جاتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے۔

**آیت 27** ① **وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ:** یہ ایک سوال کا جواب ہے جو یہاں ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایمان اور عملِ صالح والوں کی دعا بہت جلدی قبول فرماتا ہے تو یہ لوگ تو رزق کی فراخی کی دعا بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود ان پر رزق کی تنگی کیوں ہے؟ ابتدائے اسلام میں ایمان والوں پر رزق کی بہت تنگی آئی، خصوصاً جب کفار نے ان کے ساتھ میل جول اور خرید و فروخت، غرض تمام چیزوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جواب یہ دیا گیا کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ جتنا رزق مانگیں انھیں اتنا ہی دے دیا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا رزق ان کی مصلحت کے مطابق ایک اندازے کے ساتھ

مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۲۷

**زمین میں سرکش ہو جاتے اور لیکن وہ ایک اندازے کے ساتھ اتارتا ہے، جتنا چاہتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۷﴾**

---

جتنا چاہتا ہے نازل فرماتا ہے۔ اگر وہ ان کے تقاضے کے مطابق ان کے لیے رزق فراخ کر دیتا تو یقیناً وہ زمین میں سرکش ہو جاتے، کیونکہ عام طور پر آدمی جب غنی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴾ [ العلق : ۶، ۷ ] ''ہرگز نہیں، بے شک انسان یقیناً حد سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غنی ہو گیا ہے۔'' اور مال و دولت کی کثرت اسے لوگوں پر زیادتی پر ابھارتی ہے۔ قارون اور فرعون کا حال دیکھ لو! اگر ان کے پاس اتنی دولت نہ ہوتی تو اس طرح برباد نہ ہوتے۔ اس لیے مومنوں کے حق میں خیر یہی ہے کہ ان کا رزق زیادہ فراخ نہ کیا جائے، اگرچہ اس کے خیر ہونے کا پورا ادراک انھیں دیر سے یعنی قیامت کے دن ہوگا۔ اس کے علاوہ مال کی کمی کا مومن کو ایک اور فائدہ بھی ہے کہ اسے عملِ صالح کے لیے فراغت حاصل رہتی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ دنیا کمانے میں مشغول رہ کر آخرت کی تیاری سے غافل نہیں ہوتا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بحرین سے جزیے کا مال لے کر آئے تو انصار صبح کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل ہوئے اور بعد میں آپ کے سامنے آ بیٹھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: (( أَظُنُّكُمْ قَدْ سَمِعْتُمْ أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ قَدْ جَاءَ بِشَيْءٍ؟ قَالُوْا أَجَلْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ فَأَبْشِرُوْا وَأَمِّلُوْا مَا يَسُرُّكُمْ، فَوَاللّٰهِ ! لَا الْفَقْرَ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ، وَلٰكِنْ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ ، فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ )) [ بخاري، الجزية والموادعة، باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب : ۳۱۵۸ ] ''میرا خیال ہے تم نے سنا ہے کہ ابوعبیدہ کچھ لے کر آئے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''جی ہاں، یا رسول اللہ!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو خوش ہو جاؤ اور خوش کرنے والی چیزوں کی امید رکھو، پس اللہ کی قسم! میں تم پر فقیری سے تو ڈرتا ہی نہیں، بلکہ تم پر اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا فراخ کر دی جائے، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فراخ کر دی گئی، تو تم ایک دوسرے سے زیادہ اس میں رغبت کرنے لگو، جیسا کہ انھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر اس میں رغبت کی اور وہ تمھیں اسی طرح ہلاک کر دے جس طرح اس نے انھیں ہلاک کر دیا۔''

❷ ''وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ'' میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا احسان بھی جتلایا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لوگ زمین میں سرکشی کریں گے ان کا رزق فراخ کر دیتا، جیسا کہ اس نے فرعون کا رزق یہ جاننے کے باوجود فراخ کر دیا۔ چنانچہ اگر اسے ملک مصر نہ ملتا تو وہ کبھی خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔ لہٰذا رزق کی تنگی بھی اہلِ ایمان کے لیے ایک انعام ہے جس کا شکر ان پر واجب ہے۔

❸ آیت کے الفاظ ''وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ'' مومن و کافر دونوں کے لیے عام ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تکوینی تدبیر کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مومن ہوں یا کافر سب کا رزق برابر نہیں رکھا، کسی کا زیادہ ہے کسی کا

وَ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ يَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَ هُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾

**اور وہی ہے جو بارش برساتا ہے، اس کے بعد کہ وہ ناامید ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی مدد کرنے والا ہے، تمام تعریفوں کے لائق ہے ﴿۲۸﴾**

---

کم، تاکہ لوگ ایک دوسرے کے محتاج رہیں اور ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ (دیکھیے زخرف: ۳۲) اسی طرح اس نے کسی کو ایک حد سے زیادہ رزق نہیں دیا، ورنہ لوگ زیادہ روزی پا کر زمین میں سرکشی اور فساد کرتے۔ رہے وہ لوگ جو رزق کی فراخی کی وجہ سے زمین میں فساد کرتے ہیں ان کا فساد اس فساد کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا جو وہ اپنی مرضی کے مطابق مال ملنے کی صورت میں برپا کرتے۔ اب اگر کوئی فساد فی الارض کرتا ہے تو وہ ایک حد سے نہیں بڑھ سکتا۔ کوئی کتنا بھی بڑا باغی ہو سب اپنی حد میں رہنے پر مجبور ہیں۔

④ وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۲۱)، رعد (۸) اور سورۂ قمر (۴۹) کی تفسیر۔

⑤ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۳۰) کی تفسیر۔

**آیت 28** ① وَ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا : "الْغَيْثَ" وہ بارش جو خشک سالی کے بعد آئے، کیونکہ اس کے ذریعے سے لاچار اور بے بس انسانوں اور جانوروں کی مدد ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ ﴾ [ یوسف : ٤٩ ] ''پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر بارش ہوگی۔'' یہ بیان کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کی ضرورت سے زیادہ نہیں دیتا، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ان کے تقاضے کے مطابق رزق میں اضافہ ان کی سرکشی اور نظامِ عالم کی خرابی کا باعث ہے، یہ ذکر فرمایا کہ اگر انھیں بارش کی ضرورت ہو، جس پر تمام جانداروں کی زندگی کا دارو مدار ہے، خواہ انسان ہوں یا حیوان، چرند پرند ہوں یا درندے یا حشرات الارض ہوں تو وہ انھیں اپنی رحمت سے ضرور نوازتا ہے۔ چنانچہ فرمایا، اور وہی ہے جو بارش برساتا ہے۔

② مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا : "قُنُوْطٌ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حم السجدہ کی آیت (۴۹) کی تفسیر۔ اس کے بعد کہ وہ ناامید ہو چکے ہوتے ہیں اور اس ناامیدی کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں، یعنی وہ ایک مدت کی قحط سالی کی وجہ سے بارش برسنے سے ناامید ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس آیت میں مادہ پرستوں کا رد بھی ہے جن کا کہنا ہے کہ دنیا میں اسباب کے مطابق سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے، نہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور نہ کوئی اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانے والا ہے۔ رد اس طرح ہے کہ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق طبعی طور پر سورج کی تپش کے ساتھ سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں جو بادلوں کی صورت اختیار کرتے اور زمین پر برستے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر ایک زمین، ایک سمندر، ایک سورج اور تمام اسباب یکساں ہونے کے باوجود ہر جگہ ہمیشہ ایک جیسی بارش کیوں نہیں ہوتی؟ یقیناً یہ سب کچھ ان تمام چیزوں کے مالک کے اختیار میں ہے، وہ جہاں چاہتا ہے سالہا سال تک قحط اور خشک سالی مسلط کر دیتا ہے، پھر جب چاہتا ہے دوبارہ بارش کا سلسلہ شروع فرما دیتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

اور اسی کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے اور وہ جو اس نے ان دونوں میں کوئی بھی جاندار پھیلا دیے ہیں اور وہ ان کو اکٹھا کرنے پر جب چاہے پوری طرح قادر ہے ﴿۲۹﴾

③ وَ يَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ : یعنی بارش کی صورت میں اپنی رحمت میدانوں، پہاڑوں، جنگلوں اور سمندروں میں ہر جگہ پھیلا دیتا ہے، ہوا کے کاندھے پر سوار اتنے وزنی بادلوں سے زمین کو بھر دینے والی بارش برساتا ہے، جنھیں پوری مخلوق بھی اٹھانا چاہے تو نہ اٹھا سکے اور سب مل کر اس زمین پر چھڑکاؤ ہی کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں۔ پھر ہر طرف ندی نالے، تالاب، سبزہ، پودے، درخت، کھیت، مینڈک، جھینگر، حشرات الارض اور دوسرے جاندار پھیل جاتے ہیں۔ اس بارش کے ساتھ اتنی سخت زمین سے، جو کدالوں کے ساتھ کھودنی مشکل ہوتی ہے، ریشم سے نرم کونپلیں نکال دیتا ہے اور اس بارش کے ساتھ درختوں کے سخت تنوں سے، جنھیں تراشنے والے اوزار مشکل سے تراش سکیں، پرندوں کی زبانوں سے بھی نازک شگوفے نکال دیتا ہے، پھر کس قدر جاہل اور فریب خوردہ ہیں وہ لوگ جو مردوں کے قبروں سے زندہ ہونے کو نہیں مانتے۔ (بقاعی)

④ وَ هُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ : یعنی کائنات کے تمام معاملات کا متولی اور ذمہ دار وہی ہے اور ہر خوبی کا مالک بھی وہی ہے۔

آیت 29 ① وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : اس کی تفسیر متعدد مقامات پر گزر چکی ہے۔

② وَ مَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ : "دَآبَّةٍ" "دَبَّ يَدِبُّ دَبًّا وَ دَبِيْبًا" (ض) سے اسم فاعل ہے۔ یہ لفظ "دَابٌّ" کا مؤنث ہے، مگر مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جمع "دَوَابُّ" ہے، کیونکہ اس میں تاء وحدت کے لیے ہے، یعنی چلنے والا جانور خواہ سانپ کی طرح پیٹ کے بل چلے یا دو یا چار ٹانگوں پر چلے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [ النور : ۴۵ ] ''اور اللہ نے ہر چلنے والا (جاندار) ایک قسم کے پانی سے پیدا کیا، پھر ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو چار پر چلتا ہے، اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' یہ آیت دلیل ہے کہ "دَآبَّةٍ" سے مراد جانور ہیں فرشتے نہیں۔

زمین میں پھیلائے ہوئے مختلف جانوروں کا مشاہدہ تو ہر آدمی کرتا رہتا ہے، اس آیت میں زمین و آسمان دونوں میں پھیلائے ہوئے جانوروں کا ذکر فرمایا۔ اس لیے بعض مفسرین نے یہ خیال فرما کر کہ آسمانوں میں جانوروں کے وجود کا صراحت کے ساتھ قرآن و حدیث میں ذکر نہیں اس کی مختلف تاویلیں فرمائی ہیں۔ چنانچہ بعض نے فرمایا، اس سے مراد زمین کے جانور ہی ہیں، کیونکہ وہ زمین و آسمان کے اندر ہی ہیں۔ بعض نے فرمایا، اس سے مراد آسمانوں کے فرشتے ہیں، کیونکہ وہ اڑنے کے

وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝۳۰

اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۝۳۰

ساتھ ساتھ چل بھی سکتے ہیں، مگر ان تاویلوں کی ضرورت تب ہے جب آسمانوں میں جانوروں کا وجود ناممکن ہو۔ جب اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اللہ کی نشانیوں میں سے وہ جانور بھی ہیں جو اس نے زمین و آسمان میں پھیلا دیے ہیں تو ہمیں یہ بات ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ آسمانوں میں بھی جانور موجود ہیں، خصوصاً جنت میں جہاں ہر نعمت موجود ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں کتنی قسم کے خوبصورت سے خوبصورت جانور موجود ہیں۔

③ وَ هُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ : جس طرح زمین و آسمان کے جانوروں کو پیدا کرنا اور پھیلانا اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے اسی طرح انھیں جمع کرنے پر قدرت بھی بہت بڑی نشانی ہے۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ وہ پرندوں کے ایک جھنڈ کے بکھرنے والے پرندوں کو جمع نہیں کر سکتا، نہ شہد کے کسی چھتے سے بکھرنے والی مکھیوں کو جمع کر سکتا ہے، حتیٰ کہ اپنے ہم سبق ساتھیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتا، خواہ وہ زندہ ہی ہوں۔ یہ رب تعالیٰ ہی ہے جو تمام جانوروں کو، زندہ ہوں یا مردہ، جمع کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن وہ انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی دوبارہ زندہ فرمائے گا، فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ [ التغابن : ۹ ] ”جس دن وہ تمھیں جمع کرنے کے دن کے لیے جمع کرے گا، وہی ہار جیت کا دن ہے۔“

**آیت 30** ① وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ : اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے، اس سلسلے میں لوگوں کے بارش سے ناامید ہونے کے بعد بارش برسانے کا ذکر ہوا ہے۔ اس پر سوال ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس قدر مہربان ہے تو وہ بارش روک کیوں دیتا ہے؟ فرمایا، تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ تمھاری کمائی کا نتیجہ ہے۔ وہ گناہ بھی ہو سکتے ہیں اور اونچی شان والے حضرات پر اللہ تعالیٰ کے جس قدر انعامات ہیں ان کا حق ادا کرنے میں کسی طرح کی کمی بھی۔ اس لیے پیغمبر بھی اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَاللّٰهِ ! إِنِّيْ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ أَتُوْبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً )) [ بخاري، الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة : ۶۳۰۷ ] ”اللہ کی قسم! میں دن میں ستر (۷۰) بار سے زیادہ اللہ سے استغفار اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔“ انسان پر آنے والی ان مصیبتوں کا انجام مومن و کافر کے حق میں ایک جیسا نہیں ہوتا، بلکہ وہ کافر کے لیے عذاب ہوتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [ السجدۃ : ۲۱ ] ”اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔“ اور مومن کے لیے گناہوں کی معافی، اجر اور درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہیں۔ ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ

وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۚۖ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۳۱﴾
وَ مِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ﴿ؕ۳۲﴾

اور نہ تم زمین میں (اللہ کو) کسی صورت عاجز کرنے والے ہو اور نہ اللہ کے علاوہ تمھارا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ﴿۳۱﴾ اور اسی کی نشانیوں سے سمندر میں چلنے والے جہاز ہیں، جو پہاڑوں جیسے ہیں ﴿۳۲﴾

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ، وَلَا وَصَبٍ، وَلَا هَمٍّ، وَلَا حُزْنٍ، وَلَا أَذًى، وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ )) [ بخاري، المرضى، باب ما جاء في كفارة المرض : ٥٦٤١، ٥٦٤٢ ] ''مومن کو جو بھی دکھ یا چوٹ یا فکر یا حزن یا تکلیف یا غم پہنچتا ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی جو اسے لگتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے کچھ گناہ دور فرما دیتا ہے۔''

یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ بچے اور دیوانے پر آنے والی مصیبتیں بھی کیا ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں؟ جواب یہ ہے کہ آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو مکلّف ہیں، بچے اور دیوانے مکلّف ہی نہیں، نہ ان پر آنے والی مصیبتیں ان کے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت آتی ہیں، جسے وہی بہتر جانتا ہے۔

بیماری اور مصیبت کے اجر اور درجات کی بلندی کا باعث بننے کی دلیل قرآن مجید کی آیات، مثلاً سورۂ توبہ کی آیت (۱۲۰) کے علاوہ بہت سی احادیث بھی ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا، آپ ﷺ بخار میں تپ رہے تھے۔ میں نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ کو بہت سخت بخار ہوتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( أَجَلْ، إِنِّيْ أُوْعَكُ كَمَا يُوْعَكُ رَجُلَانِ مِنْكُمْ، قُلْتُ ذٰلِكَ بِأَنَّ لَكَ أَجْرَيْنِ ؟ قَالَ أَجَلْ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ، مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيبُهُ أَذًى، شَوْكَةٌ فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا سَيِّئَاتِهِ، كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا )) [ بخاري، المرضى، باب أشد الناس بلاء الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل : ٥٦٤٨ ] ''ہاں، مجھے اتنا بخار ہوتا ہے جتنا تم میں سے دو آدمیوں کو ہوتا ہے۔'' میں نے کہا: ''یہ اس لیے کہ آپ کو دو اجر ملتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! یہی بات ہے، جس مسلم کو بھی کوئی تکلیف پہنچے، کانٹا ہو یا اس سے اوپر، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اس کی برائیاں گرا دیتا ہے جیسے درخت اپنے پتے گرا دیتا ہے۔''

❷ وَ يَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۶۱) اور سورۂ فاطر (۴۵) کی تفسیر۔

**آیت 31** وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ …… : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نور (۵۷) اور سورۂ عنکبوت (۲۲) کی تفسیر۔

**آیت 32** وَمِنۡ اٰيٰتِهِ الۡجَوَارِ فِى الۡبَحۡرِ كَالۡاَعۡلَامِ : "اَلۡجَوَارِ" " جَارِيَةٌ " (چلنے والی) کی جمع ہے، یعنی کشتی یا بحری جہاز، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰكُمۡ فِى الۡجَارِيَةِ ﴾ [ الحاقة : ۱۱ ] ''بے شک ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا تمھیں کشتی میں سوار کیا۔'' "اَلۡاَعۡلَامُ" "عَلَمٌ" کی جمع ہے، پہاڑ۔ اصل میں کوئی نشان جس سے کسی چیز کا علم ہو،

اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ فَیَظۡلَلۡنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَہۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿۳۳﴾ اَوۡ یُوۡبِقۡہُنَّ بِمَا کَسَبُوۡا وَ یَعۡفُ عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۳۴﴾

اگر وہ چاہے ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ اس کی سطح پر کھڑے رہ جائیں۔ بے شک اس میں ہر ایسے شخص کے لیے یقیناً کئی نشانیاں ہیں جو بہت صبر کرنے والا، بہت شکر کرنے والا ہے ﴿۳۳﴾ یا وہ انھیں اس کی وجہ سے ہلاک کر دے جو انھوں نے کمایا اور (چاہے تو) بہت سے لوگوں سے درگزر کر دے ﴿۳۴﴾

مثلاً جھنڈا وغیرہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے سمندر میں چلنے والے بحری جہاز بھی ہیں جو پہاڑوں کی طرح بلند ہیں اور دور سے نظر آتے ہیں۔ پانی میں مخصوص حجم اور وزن والی چیز کو اٹھائے رکھنے کی خاصیت اللہ واحد کی پیدا کردہ ہے، جس کی وجہ سے وہ ہزاروں لاکھوں ٹن کے بحری جہازوں کو اپنے سینے پر اٹھائے رکھتا ہے، جن سے تم بے شمار منافع حاصل کرتے ہو۔ یہاں جہازوں کے لیے "اَلْفُلْكُ" کے بجائے "اَلْجَوَارِ" کے لفظ کے ساتھ اس نعمت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ ان جہازوں کو پانی میں ڈوبنے سے بچائے رکھنے کے ساتھ انھیں پانی میں چلانے کی نعمت پر بھی غور کرو، اگر یہ نعمت نہ ہوتی تو جس طرح خشک زمین پر کھڑی عمارتیں اگرچہ زمین میں نہیں دھنستیں، مگر جتنی بھی تیز ہوا آ جائے ایک انچ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتیں، اسی طرح یہ جہاز بھی پانی پر کھڑے رہتے۔ تو کوئی اور ہے تو لاؤ جو کہے کہ میں نے سمندر کو پیدا کیا، یا پانی میں یہ تاثیر رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و قدرت کی اس نشانی اور عظیم نعمت کا متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۴۱ تا ۴۴)، بقرہ (۱۶۴)، نحل (۱۴) اور سورۂ فاطر (۱۲)۔

**آیت 34،33** ① **اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ ......** : "رَوَاکِدَ" "رَكَدَ يَرْكُدُ رُكُوْدًا" (ن) سے اسم فاعل "رَاكِدَةٌ" کی جمع ہے۔ نزول قرآن کے وقت سمندر میں بادبانی کشتیاں اور جہاز چلتے تھے، جن کے چلنے نہ چلنے کا اور سست یا تیز رفتار سے چلنے کا دارومدار ہوا پر ہوتا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے سمندروں میں جہازوں کو چلانے والی ہواؤں کی تین حالتیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو ساکن کر دے اور جہاز جہاں کھڑے ہیں وہیں کھڑے رہ جائیں، پھر اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو اس ہوا کو چلا دے؟

② **اَوۡ یُوۡبِقۡہُنَّ بِمَا کَسَبُوۡا**: اس کا عطف "یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ" پر ہے، گویا عبارت اس طرح ہے: "اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا" یعنی "اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے یا اگر وہ چاہے تو ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے تند و تیز طوفانی ہوا کے ساتھ انھیں ہلاک کر دے۔" یہ ہوا کی دوسری حالت ہے، تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر ایک اور آیت میں ہے، فرمایا: ﴿ حَتّٰۤی اِذَا کُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡکِ ۚ وَ جَرَیۡنَ بِہِمۡ بِرِیۡحٍ طَیِّبَۃٍ وَّ فَرِحُوۡا بِہَا جَآءَتۡہَا رِیۡحٌ عَاصِفٌ ﴾ [ یونس: ۲۲ ] "یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں لے کر عمدہ ہوا کے ساتھ چل پڑتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں تو ان (کشتیوں) پر سخت تیز ہوا آ جاتی ہے۔"

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾

پس تمھیں جو بھی چیز دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا معمولی سامان ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں ﴿۳۶﴾

آئیں۔ بعض مفسرین نے محذوف جملے کے لیے اس سے مختلف الفاظ بھی ذکر فرمائے ہیں، مقصد سب کا یہی ہے کہ "وَ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا" میں گزشتہ چیزوں کی علت بیان ہوئی ہے۔ علت والے جملے کے حذف کی قرآن مجید میں کئی مثالیں ملتی ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ [ مریم : ۲۱ ] ''اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی بنائیں۔'' اور جیسے فرمایا: ﴿وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ﴾ [ الجاثیۃ : ۲۲ ] ''اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلا دیا جائے جو اس نے کمایا۔''

آیت 36 ① فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: "مَتَاعٌ" وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جائے، برتنے کی چیز جو جلدی ختم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور قدرت و سلطنت کے دلائل مثلاً بندوں کے لیے بارش برسانے، انھیں حسبِ حکمت رزق عطا فرمانے، آسمان و زمین کو پیدا کرنے، ان میں بے شمار جانداروں کو پھیلانے، سمندروں میں پہاڑوں جیسے بلند جہازوں کے چلنے اور انھیں پیش آنے والے احوال ذکر کرنے کے بعد دنیا کی زندگی کے ساز و سامان کے بے وقعت اور عارضی ہونے کا ذکر فرمایا، کیونکہ دنیا کی زیب و زینت ہی انسان کو دلائل پر غور و فکر کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ جب وہ اس کی حقیقت سے آگاہ ہوگا اور وہ اس کی نگاہ میں حقیر ہوگی تو اسے آخرت کی طرف توجہ کا موقع ملے گا اور وہ دلائل پر غور بھی کرے گا۔

② دنیا میں انسان کو جو چیز بھی دی گئی ہے، وہ خواہ کتنی زیادہ ہو یا کتنی قیمتی ہو، اس میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جس پر انسان پھول جائے اور آخرت سے بے پروا ہو جائے، کیونکہ ایک تو وہ بہت تھوڑی مدت کے لیے اس کے استعمال میں آتی ہے، پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ملکیت میں خواہ کتنی لمبی چوڑی جائداد یا دولت ہو عملاً اس کے استعمال میں اس کا معمولی سا حصہ ہی آتا ہے۔ اے انسان! تیرے لیے اس لمبی چوڑی جائداد میں سے وہی ہے: « مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ » [ مسلم، الزھد و الرقائق، باب : ۲۹۵۸ ] ''جو تو نے کھا لیا اور فنا کر دیا، یا جو پہن لیا اور پرانا کر دیا۔'' ایسی ناپائیدار چیز کے پیچھے اپنی عمر عزیز وہ شخص کبھی برباد نہیں کر سکتا جو اس کی حقیقت سے آگاہ ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ رعد (۲۶)۔

③ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى: جو دولت و نعمت اللہ کے پاس ہے وہ ہر لحاظ سے دنیا کے ساز و سامان سے بہتر بھی ہے اور پائیدار اور لازوال بھی۔

④ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ: یہاں سے ان لوگوں کی صفات بیان فرمائیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں

وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور وہ لوگ جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور جب بھی غصے ہوتے ہیں وہ معاف کر دیتے ہیں۔

ملنے والی نعمتوں کے حق دار ہوں گے۔ ان میں سب سے پہلی صفت "اٰمَنُوْا" ماضی کے صیغے کے ساتھ ہے اور "يَتَوَكَّلُوْنَ" مضارع کے صیغے کے ساتھ کا مطلب یہ ہے کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ایمان لا چکے اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، اس کی تقدیر اور اس کے روز جزا پر پورا یقین آ چکا، اب ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے ہر کام میں ہمیشہ صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں، کسی اور سے انھیں نہ نفع کی امید ہے نہ کسی نقصان کا خوف۔ "يَتَوَكَّلُوْنَ" مضارع کا صیغہ ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے۔

آیت 37 ① وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ : ایمان و توکل کے بعد پہلے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جن سے اجتناب ضروری ہے، وہ ہیں کبائر و فواحش اور غضب۔ ''کبائر'' کی تعریف کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۳۱)۔ "اَلْفَوَاحِشَ" "فَاحِشَةٌ" کی جمع ہے، کوئی بھی قول یا فعل جس کی قباحت حد سے بڑھی ہوئی ہو، مثلاً زنا، قوم لوط کا عمل اور شدید بخل وغیرہ۔ (دیکھیے سورۂ بقرہ: ۲۶۸) آیت میں ''کبائر'' کا لفظ عام ہے، جس میں فواحش بھی آ جاتے ہیں، مگر ''فواحش'' کا ذکر ان سے نفرت دلانے کے لیے خاص طور پر الگ بھی فرمایا۔ شیخ عبد الرحمان السعدی نے فرمایا کہ فواحش ان بڑے گناہوں کو کہتے ہیں جن کی رغبت انسانی طبیعت میں پائی جاتی ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۳۲)۔

② وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ : غصے کی حالت میں معاف کر دینے کا ذکر خاص طور پر فرمایا، کیونکہ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہایت مضبوط ارادے کے مالک ہوں، کیونکہ عموماً غصے میں آدمی عقل و ہوش سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس حال میں اپنے آپ پر قابو رکھنا آدمی کی کمالِ عقل اور ضبطِ نفس کی دلیل ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ» [ بخاري، الأدب، باب الحذر من الغضب: ۶۱۱۴ ] ''پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے، پہلوان صرف وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں عفو و درگزر کی خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ (دیکھیے آل عمران: ۱۵۹) عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «مَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ فِيْ شَيْءٍ يُؤْتٰی إِلَيْهِ حَتّٰی يُنْتَهَكَ مِنْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ» [ بخاري، الحدود، باب کم التعزیر و الأدب ؟ : ۶۸۵۳ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کسی معاملے کا انتقام نہیں لیا جو آپ سے کیا گیا۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کی حرمتوں میں سے کسی کو توڑا جاتا تو آپ اللہ کی خاطر انتقام لیتے۔'' مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۳۳، ۱۳۴) خلفائے راشدین میں بھی یہ وصف بدرجہ کمال موجود تھا، جیسا کہ ان کی سیرت سے ظاہر ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۚ﴿۳۸﴾

اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۳۸﴾

آیت 38 ① وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ : واجب الاجتناب چیزوں کے بعد ان اوصاف کا ذکر فرمایا جن سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ وہ چار ہیں، جن پر عمل اتحادِ امت کا اور دنیا و آخرت میں کامیابی کا ضامن ہے۔ اجابت اور استجابت دونوں کا معنی ''قبول کرنا'' ہے، مگر استجابت میں حروف زائد ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا رب انھیں جس کام کے لیے بلاتا ہے وہ فوراً اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، نہ دیر کرتے ہیں نہ ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں اور ان کے رب کا ان سے تقاضا بھی یہی ہے۔ دیکھیے سورۂ انفال (۲۴)۔

② وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ : ان چار اوصاف میں سے سب سے پہلے نماز قائم کرنے کا ذکر فرمایا، کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد سب سے پہلا اور سب سے اہم فریضہ یہی نماز قائم کرنا ہے جو سب کے سامنے مسلم و کافر کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۵، ۱۱)۔

③ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ : " شَارَ يَشُوْرُ شَوْرًا " (ن) "وَاشْتَارَ الْعَسَلَ" چھتے سے شہد نکالنا۔ مشورے کو مشورہ اور شوریٰ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بہت سے لوگوں کی رائے حاصل کرنے کا نام ہے۔ یہ دوسرا وصف ہے۔ وہ کام جن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے واضح احکام موجود ہیں ان میں مشورے کی ضرورت ہے نہ اجازت کی، ان میں استجابت کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی بہتر سے بہتر رائے سے آگاہ ہو کر بہترین بات تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی شخص اپنے آپ کو عقلِ کل نہیں سمجھتا کہ اپنی رائے کو حرفِ آخر قرار دے کر اس پر اصرار کرے اور فرعون کی طرح کہے: ﴿مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ [ المؤمن : ۲۹ ] ''میں تو تمھیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود رائے رکھتا ہوں اور میں تمھیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں۔'' کیونکہ یہ رویہ کوئی متکبر شخص ہی اختیار کرتا ہے، جو دوسروں کو اور ان کی رائے کو کوئی وزن نہ دے، مومن کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا﴾ [ القصص : ۸۳ ] ''یہ آخری گھر، ہم اسے ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو نہ زمین میں کسی طرح اونچا ہونے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کسی فساد کا۔'' مومن ہمیشہ خائف رہتا ہے کہ اس سے فہم کی غلطی ہو جائے یا لاعلمی کی وجہ سے یا شیطان یا نفس کے دخل سے غلط فیصلہ کر بیٹھے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں

# وَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ۝۳۹

اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی واقع ہوتی ہے وہ بدلا لیتے ہیں ۳۹

سے مشورہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو بھی اپنے صحابہ سے مشورے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے ہمیشہ ان امور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح حکم نہیں تھا۔

۴ آج کل بہت سے لوگ ''شوریٰ'' سے مراد جمہوریت اور ووٹ لیتے ہیں، حالانکہ مشورہ تو خلیفہ بھی کرتا ہے، بادشاہ بھی، جیسے ملکہ سبا نے کیا اور چھوٹے سے چھوٹے کنبے کا سربراہ بھی، کیونکہ اس کے بغیر کوئی کام درست طریقے سے چل ہی نہیں سکتا۔ اگر نہ کرنا چاہے تو جمہوری وزیر اعظم بھی مشورے کے بجائے اپنی پارٹی کے ارکان کو اپنی استبدادی رائے پر مجبور کر سکتا ہے، جیسا کہ ہم اپنے ملک میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مشورے اور جمہوریت کے فرق کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ آلِ عمران کی آیت (۱۵۹): ﴿ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ کی تفسیر۔ سورۂ نمل کی آیت (۳۲) کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

۵ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ: یہ تیسرا وصف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳) کی تفسیر۔

آیت 39 وَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ ......: یہ چوتھا وصف ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس سے پہلے ان کا وصف غصے کے وقت معاف کر دینا ذکر فرمایا ہے اور یہاں انتقام کو ان کی خوبی قرار دیا ہے، تطبیق کیا ہے؟ اس کا بہترین جواب مشہور تابعی ابراہیم نخعی نے دیا ہے، انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل بیان کرتے ہوئے فرمایا: " كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ يَكْرَهُوْنَ أَنْ يَّسْتَذِلُّوْا وَ كَانُوْا إِذَا قَدَرُوْا عَفَوْا" [ ابن كثير بحواله ابن أبي حاتم : ١٨٤٨٦، وقال حكمت بن بشير سنده صحيح ] ''مومن یہ بات ناپسند کرتے تھے کہ ذلت قبول کریں، مگر جب قدرت پاتے تو معاف کر دیتے تھے۔'' خلاصہ یہ ہے کہ اگر معاف کرنا مجرم کے جرم سے باز آنے کا باعث ہو تو عفو افضل ہے، لیکن اگر معاف کرنے سے اس کی سرکشی میں اور جرم پر جرأت میں اضافہ ہو تو انتقام لینا چاہیے۔ دلیل اس کی لفظ "الْبَغْيُ" (سرکشی) ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهُ ۔۔۔ وَ إِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

''جب تم کسی معزز آدمی کی عزت کرو گے تو اس کے مالک بن جاؤ گے اور اگر تم کمینے کی عزت کرو گے تو وہ سرکش ہو جائے گا۔''

ابن کثیر نے فرمایا، یعنی ان میں اس شخص سے انتقام لینے کی قوت ہوتی ہے جو ان پر ظلم اور زیادتی کرے، نہ وہ عاجز ہوتے ہیں نہ ذلیل، بلکہ جو سرکشی کرے اس سے انتقام کی قدرت رکھتے ہیں، اس کے باوجود جب قابو پا لیتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ [ يوسف : ٩٢ ]

**وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ**

**اور کسی برائی کا بدلا اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔**

''آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھیں بخشے۔'' حالانکہ وہ ان کے مؤاخذے پر اور اس سلوک کا بدلا لینے پر پوری قدرت رکھتے تھے جو انھوں نے ان کے ساتھ کیا تھا اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ان لوگوں سے فرمایا جنھوں نے آپ سے دشمنی کی انتہا کر دی تھی اور جن کی گردنیں آپ کے ایک اشارے سے تن سے جدا ہو سکتی تھیں: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ [ السنن الکبریٰ للنسائی : ۱۱۲۹۸ ] اور جیسا کہ آپ ﷺ نے ان اسی (۸۰) آدمیوں کو معاف کر دیا جو کوہ تنعیم سے آپ پر حملہ آور ہونے کے لیے اترے تھے۔ جب آپ ﷺ نے ان پر قابو پا لیا تو قدرت کے باوجود ان پر احسان فرما دیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے غورث بن حارث کو معاف کر دیا، جس نے آپ کو اچانک قتل کرنے کا ارادہ کیا، جب آپ ﷺ سوئے ہوئے تھے تو اس نے آپ کی تلوار میان سے نکال لی، آپ بیدار ہوئے تو وہ ننگی اس کے ہاتھ میں تھی، آپ ﷺ نے اسے جھڑکا تو اس نے نیچے رکھ دی، رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو بلا کر ساری بات بتائی اور اسے معاف کر دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۱۳۶) اسی طرح لبید بن اعصم کو معاف کر دیا جس نے آپ پر جادو کیا تھا، اس سے باز پرس بھی نہیں فرمائی۔ (دیکھیے بخاری: ۵۷۶۵) اسی طرح اس یہودی عورت زینب کو معاف فرما دیا جو خیبر کے یہودی مرحب کی بہن تھی، جسے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا، جس نے خیبر کے موقع پر بکری کے بازو میں زہر ملا دیا تھا، بکری کے اس بازو نے آپ کو اس کی اطلاع دے دی، آپ ﷺ نے اس عورت کو بلایا تو اس نے اعتراف کر لیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تمھیں اس کام پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ اس نے کہا، میرا ارادہ یہ تھا کہ اگر آپ نبی ہوئے تو یہ آپ کو نقصان نہیں دے گی اور اگر نبی نہ ہوئے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا، مگر جب اس زہر کی وجہ سے بشر بن براء رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان کے قصاص میں اسے قتل کر دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۳۱۶۹۔ ابوداؤد: ۴۵۰۹، ۴۵۱۱) ایسی احادیث اور بھی بہت ہیں۔ (وللہ الحمد) یہ تمام واقعات بخاری و مسلم دونوں میں یا ان میں سے ایک میں موجود ہیں۔

آیت 40 ❶ **وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا:** سرکشی کرنے والوں سے انتقام کا ذکر مدح کے انداز میں کرنے پر خطرہ تھا کہ انتقام میں حد سے تجاوز نہ ہو جائے، اس لیے اس آیت میں کئی طرح سے زیادتی سے باز رکھنے کا اہتمام فرمایا۔ سب سے پہلے تو یہ کہہ کر کہ '' **جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ** '' (برائی کا بدلا برائی ہے) حالانکہ بدلا تو برائی نہیں، مگر دونوں کی صورت ایک ہونے کی وجہ سے بدلے پر بھی '' **سَيِّئَةٌ** '' کا لفظ بولا۔ پھر یہ پابندی لگائی کہ انتقام زیادتی کے عین برابر ہو، اس سے زیادہ نہ ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ** ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۴ ] ''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ **وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ** ﴾ [ النحل : ۱۲۶ ] ''اور اگر تم بدلا لو تو اتنا ہی بدلا لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے۔''

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔﴿۴۰﴾

❷ "وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" سے جو احکام حاصل ہوتے ہیں ان میں سے چند کے لیے دیکھیے سورۂ نحل کی آیت (۱۲۶) کی تفسیر۔

❸ **فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ** : ظاہر ہے انتقام لیتے ہوئے اس زیادتی سے ذرہ برابر اضافہ نہ ہونے دینا جو کی گئی ہے محال نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے، اس لیے آخر میں پھر عفو و اصلاح کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کا اجر اپنے ذمے لیا۔ "**فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ**" (تو اس کا اجر اللہ پر ہے) اس جملے میں اجر کی جو عظمت بیان ہوئی ہے وہ کسی بھی تفصیل سے اس طرح بیان نہیں ہو سکتی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَ مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ )) [ مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو و التواضع: ۲۵۸۸ ] ''صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ معاف کر دینے کی وجہ سے بندے کی عزت ہی میں اضافہ کرتا ہے اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی خاطر نیچا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اونچا کر دیتا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا بہت عمدہ کلام نقل فرمایا ہے، جس میں انھوں نے دو آیات کے حوالے سے اور طبعی و عقلی حوالے سے عفو کی فضیلت بیان کی ہے۔ انھوں نے فرمایا: ''جب کوئی شخص تمھارے پاس کسی شخص کی شکایت لے کر آئے تو اسے کہو، میرے بھائی! اسے معاف کر دو، کیونکہ عفو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿**وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى**﴾ [ البقرة : ۲۳۷ ] ''اور یہ (بات) کہ تم معاف کر دو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔'' اگر وہ کہے میرا دل معاف کرنے کو برداشت نہیں کرتا، میں تو انتقام لوں گا، جیسے مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو اسے کہو، اگر تم اچھے طریقے سے انتقام لے سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ عفو کی طرف پلٹ آؤ، یہ بہت وسعت والا دروازہ ہے، کیونکہ جو معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، فرمایا: ﴿**فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ**﴾ [ الشورٰی : ۴۰ ] ''پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔'' اور معاف کر دینے والا رات سکون سے بستر پر سو جاتا ہے، جبکہ انتقام لینے والا مختلف معاملات کی وجہ سے پہلو بدلتا رہتا ہے۔'' [ ابن أبي حاتم : ۱۰ / ۳۲۸۰، ح : ۱۸۴۸۸، قال المحقق سنده صحيح ]

❹ **اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ** : سب سے پہلے تو ظالم وہ ہے جو ظلم کرنے میں پہل کرتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِئِ مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ )) [ مسلم، البر و الصلة، باب النهي عن السباب : ۲۵۸۷ ] ''دو گالی گلوچ کرنے والے جو کچھ بھی کہیں وہ پہل کرنے والے پر ہے، جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے۔'' پھر مظلوم اگر انتقام میں حد سے بڑھ جائے تو ظالم شمار ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم ہوگا۔

❺ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بدلے کے تین مراتب بیان فرمائے ہیں، عدل، فضل اور ظلم۔ عدل کا مرتبہ "**جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ**

وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾

اور بے شک جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلا لے لے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی راستہ نہیں ﴿۴۱﴾ راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۴۲﴾ اور بلاشبہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ یقیناً بڑی ہمت کے کاموں سے ہے ﴿۴۳﴾

سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" میں بیان ہوا ہے کہ بدلے میں نہ زیادتی ہو نہ کمی، جان کے بدلے جان، ہر عضو کے بدلے اس کے برابر عضو، اسی طرح مال پر زیادتی کا معاملہ ہے۔ فضل کا مرتبہ زیادتی کرنے والے سے عفو اور اس کی اصلاح ہے۔ "فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ" اس جملے میں عفو کی ترغیب ہے کہ جس طرح تم اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواہش مند اور امید وار ہو اسی طرح تم بھی عفو و درگزر سے کام لو، فرمایا: ﴿وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ [ النور : ۲۲ ] ''اور لازم ہے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں بخشے۔'' اگر عفو سے مجرم کی اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اس کی سرکشی میں اضافہ ہوتا ہے تو مصلحت عفو نہیں انتقام ہے۔ اور ظلم کا مرتبہ یہ ہے کہ اس پر جتنی زیادتی کی گئی تھی اس سے بڑھ کر زیادتی کرے۔ پہلے مظلوم تھا اب ظالم بن جائے گا اور اللہ کی محبت سے محروم ہو جائے گا۔ (سعدی)

**آیت 41** وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ ...... : یعنی مظلوم ظالم سے بدلا لے لے تو اس پر کوئی مؤاخذہ یا ملامت نہیں، کیونکہ اس نے اپنا حق لیا ہے، کوئی زیادتی نہیں کی، بشرطیکہ اتنا ہی بدلا لے جتنا اس پر ظلم ہوا ہے۔

**آیت 42** اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ ...... : یعنی مؤاخذہ اور ملامت ان لوگوں پر ہے جو ظلم کی ابتدا کرتے ہیں، لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کرتے ہیں اور اگر بدلا لیں تو بدلا لینے میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ اس طرح زمین میں سرکشی اور تکبر سے فساد پھیلاتے ہیں، جس کا انھیں کوئی حق نہیں۔ ان لوگوں کے لیے سخت درد پہنچانے والا عذاب ہے۔

**آیت 42** وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ : "عَزْمِ" کا معنی ہے کسی کام کا پختہ ارادہ کر لینا، اسے اپنے آپ پر واجب کر لینا کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ "عَزْمِ" مصدر بمعنی اسم مفعول ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہے: " أَيِ الْأُمُوْرُ الْمَعْزُوْمَةُ " یعنی یہ کام ان امور میں سے ہے جن کا بڑی ہمت سے عزم کیا جاتا ہے۔ یقیناً جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے، جب کہ معاف کرنے میں ظلم اور سرکشی کی حوصلہ افزائی نہ ہو تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے، جو ہر عقل مند کو اپنے آپ پر واجب کر لینا چاہیے۔ مزید دیکھیے سورۂ لقمان (۱۷)۔

وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ وَّلِیٍّ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَ تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ یَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ اِلٰی مَرَدٍّ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۴۴﴾ وَ تَرٰىهُمۡ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡهَا خٰشِعِیۡنَ مِنَ الذُّلِّ یَنۡظُرُوۡنَ مِنۡ طَرۡفٍ خَفِیٍّ ؕ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَهۡلِیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابٍ مُّقِیۡمٍ ﴿۴۵﴾

اور جسے اللہ گمراہ کر دے، پھر اس کے بعد اس کا کوئی مددگار نہیں اور تو ظالموں کو دیکھے گا کہ جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے کیا واپس جانے کی طرف کوئی راستہ ہے ﴿۴۴﴾ اور تو انھیں دیکھے گا کہ وہ اس ( آگ ) پر پیش کیے جائیں گے، ذلت سے جھکے ہوئے، چھپی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں گے اور وہ لوگ جو ایمان لائے، کہیں گے اصل خسارے والے تو وہ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں گنوا دیا۔ سن لو! بے شک ظالم لوگ ہمیشہ رہنے والے عذاب میں ہوں گے ﴿۴۵﴾

**آیت 44** ① وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ وَّلِیٍّ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ: یعنی جس شخص کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ حال ہو کہ نہ وہ عفو و درگزر کا اعلیٰ درجہ اختیار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور نہ کم از کم عدل و انصاف سے کام لینے پر تیار ہو تو ظاہر ہے کہ وہ خیر سے محروم اور محض شر ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ بھی خیر کی توفیق نہیں دیتا، بلکہ گمراہی میں دھکیل دیتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے پھر اس کا کوئی مددگار نہیں جو اسے ہدایت پر لے آئے۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۸، ۱۸۶) اور سورۂ کہف (۱۷)۔

② وَ تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ: اور تو ان ظالموں کو دیکھے گا جو عذاب دیکھنے سے پہلے ظلم و فساد اور زمین میں سرکشی سے باز آنے پر کسی طرح تیار نہیں تھے، اس لیے یہ ظالم نہ اپنے مالک کی گرفت سے ڈرتے تھے اور نہ انھیں حساب کتاب کا کوئی خوف تھا۔ "الظّٰلِمِیۡنَ" سے مراد یہاں کفار و مشرکین ہیں، کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں انھی کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہاں اس کی دلیل ایک تو یہ ہے کہ آگے ان کے متعلق فرمایا: ﴿ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابٍ مُّقِیۡمٍ ﴾ [ الشوریٰ : ٤٥ ] ''سن لو! بے شک ظالم لوگ ہمیشہ رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔'' اور یہ بات طے شدہ ہے کہ دائمی عذاب کفار و مشرکین ہی کو ہوگا۔ دوسری دلیل یہ کہ ان کے قول کے مقابلے میں مومنوں کا قول ذکر فرمایا: ﴿ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَهۡلِیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ﴾ [ الشوریٰ : ٤٥ ] ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے، کہیں گے اصل خسارے والے تو وہ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں گنوا دیا۔''

③ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ یَقُوۡلُوۡنَ ......: وہی متکبر اور ظالم لوگ جو پہلے نہ رب تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور نہ اس کے عذاب یا حساب کتاب سے ڈرتے تھے، جب عذاب دیکھیں گے تو ان کی ساری اکڑ ختم ہو جائے گی اور کہیں گے، کیا واپس جانے کا کوئی راستہ ہے کہ ہم دنیا میں جا کر اپنی کوتاہی کی تلافی کر لیں؟ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۲۷، ۲۸) اور سورۂ اعراف (۵۳)۔

**آیت 45** ① وَ تَرٰىهُمۡ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡهَا خٰشِعِیۡنَ مِنَ الذُّلِّ یَنۡظُرُوۡنَ......: آگ پر حاضری کے وقت ان کی حالت

وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ﴿۴۶﴾ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾

**اور ان کے لیے کوئی حمایتی نہیں ہوں گے جو اللہ کے سوا ان کی مدد کریں۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے، پھر اس کے لیے کوئی بھی راستہ نہیں ﴿۴۶﴾ اپنے رب کی دعوت قبول کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی اللہ کی طرف سے کوئی صورت نہیں، اس دن نہ تمھارے لیے کوئی جائے پناہ ہوگی اور نہ تمھارے لیے انکار کی کوئی صورت ہوگی ﴿۴۷﴾**

کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ ذلت سے سر جھکائے ہوئے چھپی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں گے، جیسے کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر تلوار سے مارنے لگیں تو وہ ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے، پھر کبھی کبھی تھوڑی سی آنکھ کھول کر دیکھتا ہے کہ تلوار کب اس پر گرتی ہے۔ خوف کے مارے پوری طرح آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

② **وَ قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ......** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ زمر کی آیت (۱۵) کی تفسیر۔

③ **اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ** : یہ ایمان والوں کے کلام کا آخری حصہ بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی۔ دائمی عذاب میں رہنے والے ظالم کافر و مشرک ہی ہیں، فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ [ المائدۃ : ۷۲ ] ''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔''

**آیت 46** ① **وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ......** : اس آیت میں مشرکوں کا رد ہے جو اپنے بنائے ہوئے داتاؤں اور مشکل کُشاؤں کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ان کے حمایتی اور مددگار ہیں، سختی اور مصیبت کے وقت ان کے کام آئیں گے اور انھیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ اس امید پر یہ ان کی عبادت کرتے اور انھیں پکارتے ہیں، حالانکہ یہ اعتقاد سراسر گمراہی ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اس کے لیے کوئی بھی راستہ نہیں۔

② **وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ** : اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اس کے لیے کوئی بھی راستہ نہیں، نہ دنیا میں ہدایت پانے کا اور نہ آخرت میں عذاب سے نجات کا۔

**آیت 47** ① **اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ......** : ''**مَرَدَّ**'' ''رَدَّ يَرُدُّ رَدًّا'' (ن) سے مصدر میمی بھی ہو سکتا ہے، ظرف زمان بھی اور ظرف مکان بھی، ہٹانے یا ٹالنے کی کوئی صورت یا کوئی وقت یا کوئی جگہ۔ اس جملے میں اللہ تعالیٰ کی دعوت کو جلد از جلد قبول کرنے کی تاکید کئی طرح سے فرمائی ہے۔ سب سے پہلے '' أَجِيْبُوْا '' کے بجائے '' **اِسْتَجِيْبُوْا** '' کے لفظ کے ساتھ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۳۸) کی تفسیر۔ پھر اپنی ربوبیت کے احسان کی یاد دہانی کے ساتھ اور آخر

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ

پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو ہم نے تجھے ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمے پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں اور بے شک ہم، جب ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھاتے ہیں وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے اور اگر انھیں اس کی

میں اس دن سے ڈرانے کے ساتھ جس کے آنے کے بعد نہ اس کے ٹالے جانے کی کوئی صورت ہے، نہ وہ کسی وقت ٹالا جا سکے گا اور نہ کسی مقام پر ٹلے گا۔

❷ لَا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ: اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ اس کے آنے کے بعد اللہ کی طرف سے اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اسے کسی صورت نہیں ہٹائے گا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے آنے کے بعد کوئی ایسی ہستی نہیں جو اسے ہٹا سکے۔

❸ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ: "نَكِيْرٍ" مصدر ہو تو اس کا معنی انکار بھی ہے اور نکرہ (اجنبی اور بے پہچان) ہونا بھی اور اگر "فَعِيْلٌ" بمعنی اسم فاعل ہو یعنی "مُنْكِرٌ" تو معنی "بدلنے والا" ہوگا۔ یعنی قیامت کے دن تم اپنے جرائم کا کسی طرح انکار نہیں کر سکو گے، بلکہ نامۂ اعمال اور فرشتوں کی شہادتوں حتیٰ کہ اپنے اعضا کی گواہی کی وجہ سے تمھارے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ "مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ" کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ تمھیں جو سزا دی جائے گی تم اس پر کوئی احتجاج نہیں کر سکو گے، نہ کوئی انکار کہ ہم یہ سزا قبول نہیں کرتے، نہ ہی تم یا کوئی اور اس حالت کو بدلنے والا ہوگا جس میں تم مبتلا ہو گے اور یہ بھی نہیں ہوگا کہ تمھاری پہچان نہ ہو سکے اور تم اجنبی اور غیر معروف بن کر چھوٹ جاؤ یا بھیس بدل کر چھپ جاؤ۔

آیت 48 ❶ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا: پچھلی آیت میں کفار کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن سے پہلے جلد از جلد اپنے رب کی دعوت قبول کر لو، اب ان کے کفر پر اصرار کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینے کے لیے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر یہ آپ کی دعوت سے منہ موڑیں تو ہم نے آپ کو ان کا نگران اور ذمہ دار نہیں بنایا کہ ہر حال میں انھیں منوا کر چھوڑیں اور نہ آپ سے اس بات کی باز پرس ہوگی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے۔

❷ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ: آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے (جو آپ سرانجام دے چکے ہیں)۔ ان الفاظ میں نبی ﷺ کے لیے سند موجود ہے کہ آپ نے پیغام واقعی پہنچا دیا ہے اور آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔

❸ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا: اس آیت میں آپ کو تسلی دلائی ہے کہ ان کفار کا صرف آپ کے ساتھ یہ سلوک نہیں بلکہ ان کا ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ یاد رہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں خواہ کتنی بڑی ہوں آخرت کے مقابلے میں چکھنے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ پھر "رَحْمَةً" پر تنوین بھی تنکیر اور تقلیل کے لیے ہے۔ فرمایا، انسان ایسا کم ظرف ہے کہ جب ہم اسے تھوڑی سی رحمت چکھا بھی دیتے ہیں تو یہ پھول جاتا ہے اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے، ہمیں بھول کر اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ یہاں نعمت چکھانے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے، کیونکہ نعمت صرف اللہ تعالیٰ

مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۝٤٨ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ

وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو بے شک انسان بہت ناشکرا ہے ﴿۴۸﴾ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے

کی عطا ہے، کسی کے استحقاق کی وجہ سے اسے نہیں ملتی اور لفظ "اِذَآ" (جب) استعمال فرمایا، کیونکہ دنیا میں رحمت ہر انسان کو ملتی ہے۔

④ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ...... : اور اگر انھیں ان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں کوئی برائی یا مصیبت آ پہنچے تو یقیناً انسان بہت ناشکرا ہے، پھر اسے ہماری کوئی نعمت یاد نہیں رہتی، بلکہ اس ایک مصیبت کی وجہ سے ہماری تمام نعمتوں کا صاف انکار کر دیتا ہے۔ جس طرح خاوند ساری عمر بیوی پر احسان کرے، پھر اس سے اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو کہتی ہے: «مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ» [ بخاري، الإيمان، باب كفران العشير و كفر دون كفر : ٢٩ ] "میں نے تم سے کبھی کوئی خیر نہیں دیکھی۔" یہاں برائی کی نسبت اللہ کی طرف نہیں فرمائی، حالانکہ سبھی کچھ اللہ کی طرف سے ہے، کیونکہ اس کا باعث ان کے اعمالِ بد بنتے ہیں اور "اِنْ" (اگر) کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس میں مصیبت پہنچنے یا نہ پہنچنے دونوں کا امکان ہے، کیونکہ رحمت کے مقابلے میں انسان پر آنے والی مصیبتیں بہت کم ہیں۔

⑤ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو کفار کے آپ کی دعوت سے اعراض سے بھی بڑی بات کے ارتکاب کا ذکر کر کے تسلی دلائی ہے کہ جن کا مالک کے ساتھ یہ حال ہے وہ آپ سے کیا کچھ نہیں کریں گے، جیسا کہ دوسرے مقام پر یہود کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سلوک کا ذکر کر کے آپ ﷺ کو تسلی دلائی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۵۳)۔

⑥ یہاں "الْاِنْسَانَ" سے بعض مفسرین نے کافر انسان مراد لیا ہے، کیونکہ مومن ایسا نہیں ہوتا اور بعض نے فرمایا، مطلب یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایسا ہی ہے، مگر ایمان اور عملِ صالح میں جیسے جیسے ترقی ہوتی ہے آدمی اس خصلت سے چھٹکارا حاصل کرتا جاتا ہے، ایمان کے کمال کے ساتھ وہ پوری طرح اس سے پاک ہو جاتا ہے اور مصیبت پر صبر اور نعمت پر شکر اس کی طبیعت بن جاتے ہیں، جو دونوں اس کے حق میں خیر ہی ہوتے ہیں، مگر کافر کا حال وہی رہتا ہے۔ اسی طرح کمزور ایمان کی حالت میں بھی اس بدخصلت کا اثر باقی رہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ...... اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [ المعارج : ١٩ تا ٣٥ ] "بے شک انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے خیر پہنچتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔ سوائے نماز ادا کرنے والوں کے...... یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں۔" یہ دوسرا قول بہتر معلوم ہوتا ہے۔

آیت 50، 49 ① لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ : اس سے پہلی آیت میں انسان کا ذکر فرمایا کہ اگر اسے

الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

بیٹے عطا کرتا ہے ﴿۴۹﴾ یا انھیں ملا کر بیٹے اور بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے، یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۵۰﴾

اس کے اپنے اعمالِ بد کے نتیجے میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو انسان بہت ناشکرا ہے، وہ فوراً اللہ تعالیٰ کا شکوہ شروع کر دیتا ہے کہ اس نے مجھ سے نعمت چھین لی اور مجھ پر ظلم کیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ اس کی طرف ظلم کی نسبت سے بڑا ظلم کوئی نہیں، کیونکہ ایک تو انسان کو پہنچنے والی مصیبت اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے، دوسرے اللہ تعالیٰ آسمان و زمین یعنی پوری کائنات اور اس میں موجود ہر نعمت کا بادشاہ اور مالک ہے۔ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اپنی جو نعمت جسے چاہے دیتا ہے، جسے چاہے نہیں دیتا یا چھین لیتا ہے۔ بندے پر اس کے اعمال کے نتیجے میں جو مصیبت آئی ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کوئی نعمت نہیں دی، یا آئندہ کے لیے روک لی ہے، مثلاً صحت، دولت یا ایمان وغیرہ۔ ظلم تو تب ہوتا جب وہ اس کی ملکیت والی کوئی چیز اسے نہ دیتا یا اس سے لے لیتا۔ جب ہر چیز اس کی ملکیت ہے تو اس کی مرضی، جسے چاہے دے جسے چاہے نہ دے، کسی کے پاس شکوے اور ناشکری کا کیا موقع ہے۔ ایمان کی نعمت سے نوازنا بھی اس کی مرضی پر موقوف ہے، وہ چاہتا تو سب کو یہ نعمت دے دیتا مگر یہ نعمت بھی وہ اسی کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے تقدیر کے بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں اور آدمی اللہ تعالیٰ کے شکوے، اس کی ناشکری اور اسے ظالم کہنے سے بچ جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴾ [ الشوریٰ : ۸ ] ”اور اگر اللہ چاہتا تو انھیں ایک ہی امت بنا دیتا اور لیکن وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو ظالم ہیں ان کے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔“

❷ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا ...... : یہ اس بات کی مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے دیتا ہے اور جو چاہے دیتا ہے، چنانچہ وہ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، یا لڑکے لڑکیاں دونوں عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہے مرد ہو یا عورت عقیم (بانجھ) بنا دیتا ہے، کسی کو اس پر اعتراض یا شکوے کا کوئی حق نہیں۔

❸ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ : مخلوق کو نعمت عطا کرنے میں یہ تفاوت اندھی تقسیم نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ وہ ہر چیز کا علم اور پوری قدرت رکھنے والا ہے، اس کا ہر فعل اس کے علم و قدرت کے تحت ہے اور اسی علم و قدرت کے ساتھ اس نے بعض کو اولاد سے محروم رکھا، کسی کو ہدایت سے اور کسی کو لڑکی یا لڑکے یا دونوں کی نعمت سے نواز دیا، کسی کو ہدایت کے تمام مرتبوں سے اونچے مرتبے نبوت سے نواز دیا، جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے اور یہ سب کچھ اس کی مشیت کے تحت ہے، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ [ الشوریٰ : ۱۳ ] ”اللہ اپنی طرف چن لیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف راستہ اسے دیتا ہے جو رجوع کرے۔“

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے، بے شک وہ بے حد بلند، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۱﴾

④ اس آیت میں یہ حقیقت واشگاف الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں، جباروں اور سرداروں کے حوالے نہیں کر دی گئی اور نہ ہی اس میں کسی نبی یا ولی، داتا، دستگیر یا دیوی دیوتا کا کوئی حصہ ہے، اس کا مالک اکیلا اللہ تعالیٰ ہے۔ کتنے جابر بادشاہ اور سپہ سالار، کتنے انبیاء و اولیاء اور کتنے ماہر ڈاکٹر اور حکیم اولاد سے محروم رہے، کتنے لڑکے کو ترستے رہے اور کتنے لڑکی کی خواہش دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر مشرکین اس حقیقت کو سمجھ لیں تو کبھی شرک کی حماقت نہ کریں۔

⑤ ''يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا'' میں لڑکیوں کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ قرار دیا ہے۔ جو لوگ لڑکیوں کو نحوست یا عار کا باعث سمجھتے ہیں انھیں ان الفاظ پر غور کرنا چاہیے اور کسی ایسے جوڑے کے احساسات معلوم کرنے چاہییں جنھیں لڑکی بھی عطا نہیں ہوئی۔

**آیت 51** ① وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ: کفار کا کہنا تھا: ﴿لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ﴾ [ البقرۃ : ۱۱۸ ] ''اللہ ہم سے (خود) کلام کیوں نہیں کرتا؟'' بلکہ ان کی خواہش تھی کہ جس طرح نبی ﷺ کو کتاب عطا ہوئی ہم میں سے ہر ایک کو اسی طرح کتاب ملے، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً﴾ [ المدثر : ۵۲ ] ''بلکہ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں۔'' اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے کلام نہیں کرتا، بلکہ وہ اس کے لیے فرشتوں اور انسانوں میں سے انتخاب کرتا ہے، فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ [ الحج : ۷۵ ] ''اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔'' اس نعمت سے بھی وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ نعمت کیوں نہیں ملی۔ اس آیت میں فرمایا کہ وہ اپنے ان چنے ہوئے بندوں کے ساتھ بھی آمنے سامنے کلام نہیں کرتا اور نہ ہی یہ بات دنیا میں کسی بشر کے لیے ممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « حِجَابُهُ النُّوْرُ وَ فِيْ رِوَايَةِ أَبِيْ بَكْرٍ النَّارُ، لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهٰى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ » [ مسلم، الإیمان، باب في قوله علیه السلام "إن الله لا ینام"...... : ۱۷۹ ] ''اللہ تعالیٰ کا حجاب ''نور'' ہے۔'' ابوبکر کی روایت میں ہے کہ ''نار'' ہے ''اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرے کی شعاعیں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے اس کی مخلوق کو جلا دیں۔'' ہاں آخرت میں ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قیامہ (۲۲، ۲۳)۔

② اِلَّا وَحْيًا: فرمایا اللہ تعالیٰ انسانوں سے ان تین طریقوں کے علاوہ کلام نہیں کرتا، ایک وحی کے ذریعے سے، یعنی یہ کہ وہ اپنے بندے کے دل میں کسی واسطے کے بغیر کوئی بات ڈال دے جس سے اسے یقین ہو جائے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، خواہ

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ

بیداری کی حالت میں ہو یا نیند میں، کیونکہ انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ صافات (۱۰۲)۔

3 اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ: یا یہ کہ وہ پردے کے پیچھے سے کلام کرے، جیسے اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، مگر جب انھوں نے دیکھنے کی درخواست کی تو وہ قبول نہیں ہوئی۔

4 اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا: یا اللہ تعالیٰ کوئی فرشتہ بھیج کر جو بات پہنچانا چاہے پہنچا دے، جیسے جبریل علیہ السلام یا دوسرے فرشتوں کے ذریعے سے آپ کے پاس وحی آتی تھی۔

5 اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ: یعنی وہ اس سے بہت بلند ہے کہ کسی بشر سے رُو در رُو کلام کرے، یا ہر ایک اس کے کلام کا شرف حاصل کر سکے اور وہ کمال حکمت والا ہے، جس کے تحت وہ ہر بشر سے کلام نہیں کرتا۔

آیت 52 1 وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا: ''رُوْحًا'' سے مراد وحی ہے، خواہ قرآن کی صورت میں ہو یا سنت کی صورت میں، کیونکہ وہ دونوں وحی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [ النجم : ۳، ۴ ] ''اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔'' اسے ''روح'' اس لیے کہا گیا ہے کہ حقیقی زندگی اسی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے، دل کی زندگی بھی اور آخرت کی زندگی بھی، جیسے فرمایا: ﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ ﴾ [ النحل : ۲ ] ''وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔''

2 مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ: اس فرمان میں ایک تو نعمت کی یاد دہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علم عطا فرمایا جو آپ پہلے نہیں جانتے تھے۔ دوسرا یہ آپ کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے کہ اُمی ہونے اور کتاب و ایمان کا علم نہ رکھنے کے باوجود آپ کا قرآن کریم جیسی عظیم کتاب لانا محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی وحی ہی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔

3 یہاں ایک سوال ہے کہ اس بات میں تو کوئی اشکال نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے پہلے کتاب کا علم نہ تھا، مگر یہ بات قابل غور ہے کہ آپ کو ایمان کا علم بھی نہیں تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا نبوت ملنے سے پہلے کم از کم اللہ تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر ایمان تو ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غارِ حرا میں جا کر عبادت کرنے کا ذکر موجود ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ آپ ہی نہیں سارے عرب اُمی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ وہی زمین و آسمان کا خالق ہے اور پوری کائنات کی تدبیر کرنے والا ہے، مگر وہ شرک کی بیماری میں مبتلا تھے۔ انبیاء کی فطرت نہایت سلیم ہوتی ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اللہ پر ایمان تھا۔ نبوت سے پہلے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک یا کبائر کا ارتکاب نہیں ہوا، مگر یہ ایمان اجمالی تھا۔ تفصیل کے ساتھ ایمان جو حدیثِ جبریل کے مطابق اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں،

جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍۙ

ایمان کیا ہے اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے ﴿۵۲﴾

یومِ آخرت اور تقدیر پر ایمان کا نام ہے، اس کی تفصیلات آپ کو وحی کے بعد ہی معلوم ہوئیں۔ اس کے علاوہ جب لفظ ایمان اکیلا بولا جائے تو اس میں تصدیق، قول اور عمل تینوں چیزیں شامل ہوتی ہیں، جیسا کہ وفد عبدالقیس کی مشہور حدیث میں ہے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۴۳): ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ میں نماز کو ایمان قرار دیا اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَ سَبْعُوْنَ أَوْ بِضْعٌ وَ سِتُّوْنَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ )) [ مسلم، الإيمان، باب بيان عدد شعب الإيمان...... : ۳۵ ] ''ایمان کی ستر (۷۰) یا (فرمایا) ساٹھ (۶۰) سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا ہے اور سب سے کم راستے سے تکلیف دہ چیز دور کرنا ہے۔'' ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز، زکوٰۃ، حج اور دوسری ایمانیات کی تفصیلات وحیٔ الٰہی سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

❹ یہاں جو فرمایا کہ آپ ﷺ ان معاملات کو نہیں جانتے تھے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی اور کتاب اللہ کے ذریعے سے آپ کو ہدایت کا نورِ عظیم عطا فرمایا، یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ﴾ [ النساء : ۱۱۳ ] ''اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ [ یوسف : ۳ ] ''اور بے شک تو اس سے پہلے یقیناً بے خبروں سے تھا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ [ العنکبوت : ۴۸ ] ''اور تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا، اس وقت باطل والے لوگ ضرور شک کرتے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ يُّلْقٰۤى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ [ القصص : ۸۶ ] ''اور تو امید نہ رکھتا تھا کہ تیری طرف کتاب نازل کی جائے گی مگر تیرے رب کی طرف سے رحمت کی وجہ سے (یہ نازل ہوئی)۔'' اور فرمایا: ﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ﴾ [ ھود : ۴۹ ] ''یہ غیب کی خبروں سے ہے جنھیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انھیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔'' ان آیات کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

❺ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا: ''نُوْرًا'' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے اور '' جَعَلْنٰهُ'' میں '' ہٗ '' ضمیر وحیٔ الٰہی کی طرف جا رہی ہے، جس کا ذکر '' رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا'' میں ہے۔ یعنی ہم نے اس وحی کو جو قرآن اور سنت کی صورت میں ہے، عظیم نور بنا دیا۔ نور اس لیے فرمایا کہ اس کے ساتھ حق روشن ہوتا ہے اور جہالت، شک اور شرک کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔

صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ ع ۵

اس اللہ کے راستے کی طرف کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے، سن لو! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں ﴿۵۳﴾

⑥ نَهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا : یعنی ہم نے اس وحی کو ایسا نور بنایا جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متعدد مقامات پر نورِ ہدایت قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۷۴)، اعراف (۱۵۷)، مائدہ (۱۵، ۱۶) اور سورۂ تغابن (۸)۔

⑦ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : ہدایت اور صراطِ مستقیم کی تفسیر کے لیے سورۂ فاتحہ کا مطالعہ فرمائیں۔

**آیت 53** ① صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ : یعنی سیدھا راستہ وہ ہے جس پر چل کر انسان زمین و آسمان کے مالک اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور وہ صرف وحیِ الٰہی کے ذریعے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے سوا جتنے راستے ہیں سب شیطان کے راستے ہیں، جو اللہ تعالیٰ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ دیکھیے سورۂ نحل (۹)۔

② اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ : یعنی دنیا اور آخرت کے تمام امور کی تدبیر اللہ ہی کی طرف لوٹتی ہے، بظاہر کسی کام کی تدبیر کوئی کر رہا ہو، ظاہر میں لوگ اسے کسی کا کارنامہ سمجھیں، مگر حقیقت میں تمام امور کی تدبیر اللہ ہی کا کام ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۳، ۳۱)، رعد (۲) اور سجدہ (۵)۔ ''تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں'' میں یہ بھی شامل ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے نیک و بد تمام کام اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے، وہی ان کا فیصلہ فرمائے گا اور نیکوں کو ثواب اور بدوں کو عذاب دے گا۔

[ اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا فِيْ زُمْرَةِ الصَّالِحِيْنَ ]

سورۃ الزخرف ۴۳ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — آیاتہا ۸۹ رکوعاتہا ۷

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۚ﴿۳﴾ وَ اِنَّهٗ فِيۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَيۡنَا لَعَلِيٌّ حَكِيۡمٌ ؕ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حٰمٓ ﴿۱﴾ اس کتاب کی قسم جو کھول کر بیان کرنے والی ہے! ﴿۲﴾ بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنایا، تاکہ تم سمجھو ﴿۳﴾ اور بے شک وہ ہمارے پاس اصل کتاب میں یقیناً بہت بلند، کمال حکمت والا ہے ﴿۴﴾

**آیت 1** حٰمٓ : حروف مقطعات کی بحث کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱) کی تفسیر۔

**آیت 2** وَ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ : قسم اس بات کا یقین دلانے کے لیے اٹھائی جاتی ہے جو اس کے جواب میں کہی جاتی ہے، پھر بعض اوقات کسی چیز کی قسم اس کی عظمت کے پیشِ نظر کھائی جاتی ہے، تاکہ مخاطب کو بات کا یقین آ جائے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی قسم اور بعض اوقات قسم جوابِ قسم کی دلیل ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی اکثر قسمیں ایسی ہی ہیں۔ "الۡكِتٰبِ" پر الف لام عہد کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''اس کتاب کی قسم'' کیا گیا ہے۔ یہاں قرآن مجید کی صفت "الۡمُبِيۡنِ" کو اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اسے عربی قرآن بنا کر نازل کرنے والے ہم ہیں۔ اس کا ہر بات کو اتنے عمدہ طریقے سے کھول کر بیان کرنا شاہد ہے کہ یہ کسی انسان یا دوسری مخلوق کا کلام نہیں بلکہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔

**آیت 2** اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا ...... : اس آیت میں یہ یقین دلانے کے ساتھ کہ اس کتاب کو ہم نے ہی نازل کیا ہے، اسے عربی قرآن بنا کر نازل کرنے کی حکمت بیان فرمائی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف کی آیت (۲) کی تفسیر۔

**آیت 4** ❶ وَ اِنَّهٗ فِيۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ : "اُمِّ الۡكِتٰبِ" کا معنی ہے ''کتاب کا اصل۔'' اکثر مفسرین نے اس سے مراد لوح محفوظ لیا ہے، جہاں سے تمام آسمانی کتابیں نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ ۙ فِيۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴾ [البروج : ۲۱، ۲۲] ''بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے۔ اس تختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ۙ فِيۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ [الواقعۃ : ۷۷ تا ۸۰] ''کہ بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے۔ ایک ایسی کتاب میں جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا مگر جو بہت پاک کیے ہوئے ہیں۔ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔''

بعض مفسرین نے فرمایا کہ "اُمِّ الۡكِتٰبِ" سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جو ہر آسمانی کتاب کا اصل ہے۔ لوح محفوظ کا اصل بھی وہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ عَلِيۡمٍ ﴾ [النمل : ۶] ''اور بلاشبہ یقیناً تجھے قرآن ایک کمال حکمت والے، سب کچھ جاننے والے کے پاس سے عطا کیا جاتا ہے۔''

❷ لَدَيۡنَا لَعَلِيٌّ حَكِيۡمٌ : "لَدَيۡ" اور "عِنۡدَ" دونوں کا معنی ''کسی کے پاس'' ہوتا ہے، مگر "لَدَيۡ" خاص قرب کے لیے

# اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ۝

**کیا ہم تم سے اس نصیحت کو ہٹالیں، اعراض کرتے ہوئے، اس وجہ سے کہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۝**

اور "عِنْدَ" عام کے لیے۔ چنانچہ "اَلْمَالُ عِنْدَ زَيْدٍ" (مال زید کے پاس ہے) اس مال کے لیے بھی آتا ہے جو اس کے پاس حاضر ہو اور اس مال کے لیے بھی جو اس کے خزانے میں ہو، جبکہ "اَلْمَالُ لَدَىٰ زَيْدٍ" صرف اس مال کے لیے آتا ہے جو اس کے پاس حاضر ہو۔ (تفسیر ثنائی) "**لَعَلِيٌّ**" یعنی یہ قرآن ہمارے علم میں (یا لوحِ محفوظ میں) ہمارے پاس یعنی ہمارے خاص قرب میں بہت بلند مرتبے والا ہے، ملاءِ اعلیٰ میں اس کا بہت اونچا مقام ہے، تمام کتابوں اور تمام علوم سے برتر اور بلند ہے۔ "**حَكِيْمٌ**" یعنی کمال حکمت اور دانائی کی باتوں سے بھرا ہوا ہے، اس کی ہر بات دانائی پر مشتمل اور صحیح عقل کے عین مطابق ہے۔ "**حَكِيْمٌ**" کا معنی محکم بھی ہے، یعنی یہ قرآن ایسا مضبوط و محکم ہے کہ نہ اس میں کسی طرح باطل کی آمیزش ہو سکتی ہے نہ باطل اس کے مقابلے میں ٹھہر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿**لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ**﴾ [ حمٓ السجدۃ : ۴۲ ] ''اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ ہود (۱) مراد اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قرآن کی قدر و منزلت ذہن نشین کروانا ہے، تاکہ کوئی شخص اسے معمولی سمجھ کر اس پر ایمان لانے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم نہ رہے۔ اسی بلند مرتبے کا اظہار "**اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ**" اور "**بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ**" کے الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ واقعہ (۷۷) اور سورۂ بروج (۲۱)۔

آیت 5 ۞ ❶ **اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا** : "ضَرَبَ" کا صلہ جب "عَنْ" آئے تو اس کا معنی "صَرَفَ عَنْهُ" (پھرنا، اعراض کرنا) آتا ہے۔ "**صَفْحًا**" "صَفَحَ عَنْهُ" کا مصدر ہے، اس کا معنی بھی اعراض کرنا ہے۔ اب "**اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا**" کی کئی ترکیبیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ مصدر مفعول مطلق ہے تاکید کے لیے، کیونکہ "**اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمْ**" کا معنی بھی اعراض کرنا ہے اور "**صَفْحًا**" کا بھی یہی معنی ہے۔ گویا یہ مصدر مفعول مطلق فعل کے ہم معنی لفظ کے ساتھ ہے، جیسے "قَعَدْتُ جُلُوْسًا" ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ''کیا ہم یہ نصیحت تم سے ہٹا لیں، بالکل ہٹا لینا؟'' اور ایک یہ کہ "**صَفْحًا**" مفعول لہ یا حال ہے، یعنی ''کیا ہم تم سے یہ نصیحت اپنے اعراض کی وجہ سے یا اعراض کرتے ہوئے ہٹا لیں؟''

❷ **اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ** : "اَنْ" سے پہلے لام جارہ محذوف ہے اور "**كُنْتُمْ**" میں استمرار ہے: "أَيْ لِأَنْ كُنْتُمْ" ''اس لیے کہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ چلے آئے ہو۔'' آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اتنا بلند مرتبہ قرآن تمھاری زبان میں تمھارے سمجھانے کے لیے نازل کیا، مگر تم زیادتی اور اسراف پر ڈٹے رہے اور مسلسل انکار کرتے رہے، تو کیا تمھارے اس مسلسل اسراف و انکار کی وجہ سے ہم اعراض کرتے ہوئے تم سے اس نصیحت کو ہٹا لیں اور تمھیں سمجھانا چھوڑ دیں؟ یعنی ہم ایسا نہیں کریں گے اور نہ یہ ہماری رحمت کا تقاضا ہے، کیونکہ تمھارا اسراف اور گمراہی تو قرآن اتارے جانے کا اصل سبب ہے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝٦ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٧ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝٩

اور کتنے ہی نبی ہم نے پہلے لوگوں میں بھیجے ⑥ اور ان کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تھا مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے ⑦ تو ہم نے ان سے زیادہ سخت پکڑ والوں کو ہلاک کر دیا اور پہلے لوگوں کی مثال گزر چکی ⑧ اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً ضرور کہیں گے کہ انھیں سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے نے پیدا کیا ہے ⑨

---

چنانچہ ان کے انکار کے باوجود قرآن تیئیس برس تک اترتا رہا، بے شمار سعید روحیں اس پر ایمان لائیں اور جو کفر پر ڈٹے رہے ان پر حجت قائم ہوگئی اور ان کی پشتوں سے بھی لاتعداد لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے۔

**آیت 7، 6** وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ...... : اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور جھٹلانے والوں کے لیے تنبیہ۔ یعنی آپ پہلے نبی نہیں جسے جھٹلایا گیا ہو اور جس کا مذاق اڑایا گیا ہو اور نہ یہ پہلے مذاق اڑانے والے ہیں، بلکہ آپ سے پہلے لوگوں میں ہم نے کتنے ہی نبی بھیجے، ان کا حال بھی یہی تھا کہ ان کے پاس جو نبی آتا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے، مگر نہ ہم نے نصیحت کا سلسلہ ترک کیا اور نہ پیغمبروں کا سلسلہ بند کیا، تو ان کے مسرف و منکر ہونے کی وجہ سے ہم انھیں نصیحت کرنا کیوں چھوڑیں گے؟

**آیت 8** ❶ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا : یعنی ان کفار مکہ کی کیا حیثیت ہے، جو لوگ قوت اور گرفت میں ان سے کہیں زیادہ تھے ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو انھیں بھی اپنا انجام سوچ لینا چاہیے۔ "اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ" میں جن قریش مکہ کو مخاطب کیا تھا اب "اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا" میں ان کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ ہے، یہ التفات ہے، مقصود ناراضی کا اظہار ہے۔

❷ وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ : یعنی قرآن میں ایسے پہلے لوگوں کی مثال گزر چکی ہے۔ "مَثَلٌ" کا معنی صفت اور حال بھی ہوتا ہے، یعنی پہلے لوگوں کا حال گزر چکا ہے، جیسے قوم نوح اور عاد و ثمود وغیرہ۔ "مَضٰى يَمْضِيْ" کا معنی ہے جاری ہونا، یعنی پہلے لوگوں کی مثال چل پڑی اور ان کے قصے مشہور ہوگئے، جنھیں لوگ نسل در نسل بیان کرتے چلے آئے۔

**آیت 9** ❶ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ : یہاں سے کفار کے قول و فعل کا تضاد واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہو کر پیش ہونے کو ناممکن قرار دیتے ہیں، حالانکہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یقیناً کہیں

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۟ۚ

وہ جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے بنائے، تاکہ تم راہ پاؤ ⑩

گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ تو پھر یہ کیا ستم ہے کہ یہ لوگ اس ذات کے ساتھ جس نے آسمان و زمین اور پوری کائنات کو پیدا کیا، ایسی ہستیوں کو شریک کر رہے ہیں جنھوں نے ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کیا۔ پھر ظاہر ہے کہ یہ بات کہ آسمانوں اور زمین کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، پہلے رسولوں کے بتانے ہی سے لوگوں کو معلوم ہوئی۔ اہلِ عرب کو بھی اس بات کا علم ابراہیم اور اسماعیل ؑ کے بتانے سے ہوا، کیونکہ عوام الناس اتنی اہلیت ہی نہیں رکھتے کہ کائنات کی حقیقتیں خود معلوم کر سکیں۔ تو جب یہ پہلے رسولوں کو مانتے ہیں تو انھی کی تعلیم لے کر آنے والے اس پیغمبر پر کیوں ایمان نہیں لاتے؟ ایک طرف تو یہ اللہ تعالیٰ کو اس وقت آسمان و زمین پیدا کرنے پر قادر مانتے ہیں جب ان کا وجود ہی نہیں تھا تو دوسری طرف اسے اتنا بے بس قرار دیتے ہیں کہ وہ اس چیز کو دوبارہ نہیں بنا سکتا جو اس نے پہلے بنائی تھی۔

② لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ : مشرکینِ عرب کی طرف سے اس سوال کا جواب کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا بھی تھا کہ انھیں ''اللہ'' نے پیدا کیا ہے، جیسا کہ سورۂ لقمان (۲۵) اور سورۂ زمر (۳۸) میں فرمایا: ﴿ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ ''اور بلاشبہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔'' یہاں اسی بات کو ان الفاظ میں ادا فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ انھیں اسی عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ ان کے اس اعتراف کا کہ ''انھیں اللہ نے پیدا کیا'' لازمی تقاضا ہے کہ وہ یہ اعتراف بھی کریں کہ وہ عزیز و علیم ہے، کیونکہ کامل غلبے اور کمال علم کے بغیر آسمان و زمین کا پیدا کرنا ممکن نہیں۔

آیت 10 ① الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے اپنے احسانات گنوانے شروع فرمائے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، ان کا قول نہیں، ورنہ الفاظ یہ ہوتے: ''اَلَّذِيْ جَعَلَ لَنَا الْأَرْضَ مَهْدًا...... '' ''وہ جس نے ہمارے لیے زمین کو بچھونا بنا دیا......''

② ''مَهْدًا'' کا معنی بچھونا بھی ہے اور بچے کا گہوارہ بھی، یعنی جس طرح آدمی بچھونے میں آرام سے لیٹا ہوتا ہے ایسے ہی تمھارے لیے اس عظیم الشان کُرے کو آرام کی جگہ بنا دیا، جو فضا میں معلق ہے، جو ایک طرف اپنے محور پر ایک ہزار (۱۰۰۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہا ہے اور دوسری طرف چھیاسٹھ ہزار چھ سو (۶۶۶۰۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں دواں ہے، جس کے پیٹ میں پتھروں تک کو پگھلا دینے والی اور شدید زلزلے پیدا کرنے والی آگ موجود ہے، جو کبھی کبھی آتش فشانوں کی شکل میں لاوا اگل کر تمھیں بھی اپنے وجود سے آگاہ کرتی ہے، مگر اس کے باوجود تمھارے مالک نے پہاڑوں کے ساتھ اسے ایسا متوازن اور پُرسکون بنا دیا ہے کہ تم آرام سے اس پر چلتے پھرتے، سوتے اور آرام کرتے ہو۔ تمھیں معمولی جھٹکا بھی نہیں لگتا اور احساس تک نہیں ہوتا کہ تم بندوق کی گولی سے بھی تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو۔ ہاں، کبھی کبھی اس کی کوئی ہلکی

وَ الَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝۱۱ وَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝۱۲

اور وہ جس نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کر دیا، اسی طرح تم نکالے جاؤ گے (۱۱) اور وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے اور تمھارے لیے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو (۱۲)

---

سی جھرجھری زلزلے کی شکل میں تمھیں آگاہ کرتی ہے کہ کتنی خوفناک بلا کو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے تابع فرمان کر رکھا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ حجر (۱۹)، رعد (۳) اور سورۂ نحل (۱۵)۔

③ وَ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے یہاں زمین میں راستے بنانے کو اپنا احسان قرار دیا۔ پہاڑوں کے اندر درے اور میدانوں اور پہاڑوں میں دریاؤں کے کنارے وہ قدرتی راستے ہیں جن کی مدد سے انسان ساری زمین پر پھیلا ہے اور ایک دوسرے کے پاس آمد و رفت رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ صحراؤں اور میدانوں میں امتیازی نشانات آدمی کو راستے مقرر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر پہاڑ ٹھوس دیوار کی شکل میں ہوتے یا میدانوں اور صحراؤں میں راستوں کی علامات نہ ہوتیں تو آدمی جہاں پیدا ہوا تھا وہیں مقید ہو کر رہ جاتا۔ مزید دیکھیے سورۂ نحل (۱۵، ۱۶)۔

**آیت 11** ① وَ الَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون کی آیت (۱۸) کی تفسیر۔

② فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا: "وَ الَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ" میں اپنا ذکر غائب کے صیغے سے کیا اور "فَاَنْشَرْنَا بِهٖ" میں جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ فرمایا، اس سے مقصود اپنی شہنشاہی اور عظمت کا اظہار ہے کہ ہم ہیں جو بارش کے ساتھ مردہ شہر کو زندہ کر دیتے ہیں، کسی دوسرے میں نہ یہ طاقت ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا اس میں شریک ہے۔

③ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ: بارش کے ساتھ مردہ زمین زندہ کر دینے کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا کہ جس طرح ہم مردہ زمین کو بارش کے ساتھ زندہ اور آباد کر دیتے ہیں ایسے ہی تمھیں زندہ کر کے قبروں سے نکال کھڑا کریں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ نحل (۶۵)، حج (۵، ۶)، روم (۵۰)، فاطر (۹) اور سورۂ یٰس (۳۳، ۳۴)۔

**آیت 12** ① وَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا: تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یٰس کی آیت (۳۶) کی تفسیر۔

② وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ: اس سے پہلے زمین میں راستے بنانے کا ذکر فرمایا ہے جن کے ذریعے سے لوگ مختلف جگہوں کی طرف اپنی ضروریات کے لیے سفر کرتے ہیں، اب یہ نعمت یاد دلائی کہ شہروں، میدانوں، صحراؤں اور پہاڑوں میں سفر کے لیے اللہ تعالیٰ نے چوپائے پیدا فرمائے اور سمندروں میں قریب و دور سفروں کے لیے کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز بنائے۔ بقاعی نے "خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا" کے ساتھ چوپاؤں اور کشتیوں کے ذکر کی بھی ایک مناسبت

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝۱۳ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝۱۴

**تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو، پھر اپنے رب کی نعمت یاد کرو، جب ان پر جم کر بیٹھ جاؤ اور کہو پاک ہے وہ جس نے یہ ہمارے لیے تابع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہیں تھے ۝۱۳ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں ۝۱۴**

ذکر فرمائی ہے کہ "**الْاَزْوَاجَ**" سے ذہن مختلف جوڑوں کی طرف منتقل ہوتا ہے، مثلاً نر اور مادہ، اس لیے یہ واضح کرنے کے لیے کہ "**الْاَزْوَاجَ**" سے مراد صرف جوڑے ہی نہیں بلکہ وہ تمام اصناف ہیں جن کی ایک دوسرے سے مناسبت یا موافقت یا مخالفت ہوتی ہے، جیسے زمین و آسمان، شب و روز، نیک و بد اور جنت و جہنم وغیرہ، اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں اور کشتیوں کا ذکر فرمایا کہ دونوں کی بناوٹ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، مگر مقصود دونوں سے ایک ہے "**مَا تَرْكَبُوْنَ**" یعنی انسان کے لیے بحر و بر میں سواری مہیا کرنا۔

**آیت 14،13** ❶ **لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ** ...... : انسان جب گھوڑوں، گدھوں، خچروں، اونٹوں یا کشتیوں پر سوار ہوتا ہے اور جم کر بیٹھ جاتا ہے تو عام عادت بن جانے کی وجہ سے اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سواریوں کو تابع کر دیے جانے کی کتنی بڑی نعمت عطا ہوئی ہے۔ ذرا کسی شیر یا چیتے یا کسی اور جنگلی جانور پر اس طرح جم کر بیٹھے، پھر اسے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر ہو گی۔ یہی حال سمندر میں پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیان بحری جہازوں پر سکون و اطمینان کے ساتھ سواری کا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے کشتیوں اور چوپاؤں میں سے تمھارے لیے سواریاں بنائیں، تاکہ ان کی پشتوں پر جم کر بیٹھو، پھر جب ان پر جم کر بیٹھ جاؤ تو اپنے رب کی انھیں تمھارے لیے مسخر کرنے کی نعمت یاد کرو۔

❷ **وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا** ...... : اور دل میں یاد کرنے کے ساتھ زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح ان الفاظ میں بیان کرو، تاکہ تمھیں احساس رہے اور اقرار بھی ہوتا رہے کہ ان سواریوں کو قابو میں لانا کبھی ہمارے بس کی بات نہ تھی اور یہ بھی کہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ان سواریوں کی محتاجی ہم مجبور بندوں کی ضرورت ہے۔ ہمارا مالک ہر قسم کے احتیاج اور مجبوری سے پاک ہے۔ اگر انسان سوچے تو سواریوں سے پہلے زمین کی پشت بھی چوپاؤں اور کشتیوں کی پشت کی طرح ہے، جس پر سوار وہ زمانے کے حوادث اور تھپیڑوں کے درمیان جم کر محو سفر ہے۔ سو ہماری ابتدا ہمارے رب کی طرف سے ہوئی، اس نے زندگی بسر کرنے کے لیے زمین کی پشت کو ہمارے لیے بچھونا بنا دیا، پھر اس نے چوپاؤں اور کشتیوں کی پشت کو ہمارے لیے جائے سکون بنا دیا، اب ساری عمر ہم ان پر سکون و اطمینان کے ساتھ سوار ہوتے رہتے ہیں۔

❸ **وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ** : اور یہ بات یقینی ہے کہ ہم دنیا کی زندگی کا سفر پورا کرنے کے بعد اپنے رب کی طرف واپس

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ؁ؕ۱۵

**اور انھوں نے اس کے لیے اس کے بعض بندوں کو جز بنا ڈالا، بے شک انسان یقیناً صریح ناشکرا ہے ⑮**

پلٹنے والے ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس میں دنیا کے سفر سے آخرت کے سفر کی طرف تنبیہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیوی زاد سے آخرت کے زاد کی طرف تنبیہ فرمائی، فرمایا: ﴿ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ [ البقرۃ : ۱۹۷ ] ''اور زادِ راہ لے لو کہ بے شک زاد راہ کی سب سے بہتر خوبی (سوال سے) بچنا ہے۔'' اور دنیوی لباس کے ساتھ آخرت کے لباس کی طرف تنبیہ فرمائی ہے، فرمایا: ﴿ وَ رِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ [ الأعراف : ۲٦ ] ''اور زینت بھی اور تقویٰ کا لباس! وہ سب سے بہتر ہے۔''

④ ''عَلٰى ظُهُوْرِهٖ'' میں '' ہٖ '' ضمیر ''مَا تَرْكَبُوْنَ'' میں اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ اس کے معنی میں عموم ہے، مگر لفظ واحد ہونے کی وجہ سے ضمیر واحد لائی گئی ہے۔

⑤ یہ دعا سواری پر سوار ہونے کے بعد کی ہے، سوار ہوتے وقت ''بِسْمِ اللّٰہِ'' پڑھنا چاہیے، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کو فرمایا تھا: ﴿ وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖ۪ىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ ھود : ٤١ ] ''اور اس نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ ہی کے نام کے ساتھ ہے، بے شک میرا رب یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

علی ازدی کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انھیں سکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر کی طرف نکلتے ہوئے سواری پر جم کر بیٹھ جاتے تو تین دفعہ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہتے، پھر کہتے: (( سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَ إِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ، اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهٗ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَ الْأَهْلِ )) ''پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے تابع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہ تھے اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم اپنے اس سفر میں تجھ سے نیکی اور تقویٰ کا سوال کرتے ہیں اور عمل میں سے ایسے عمل کا جسے تو پسند فرمائے۔ اے اللہ! ہم پر ہمارا یہ سفر آسان کر دے اور اس کی دوری کو ہم سے لپیٹ دے۔ اے اللہ! تو ہی سفر میں ساتھی اور گھر والوں میں جانشین ہے۔ اے اللہ! میں سفر کی مشقت اور غم ناک منظر دیکھنے سے اور مال اور اہل میں ناکام لوٹنے کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' اور جب سفر سے واپس لوٹتے تو یہی الفاظ کہتے اور یہ الفاظ مزید کہتے: (( آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ )) [ مسلم، الحج، باب استحباب الذکر إذا رکب دابتہ ...... : ۱۳٤۲ ] ''ہم واپس لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اپنے رب ہی کی حمد کرنے والے ہیں۔'' کتب احادیث میں سفر کی اور دعائیں بھی مذکور ہیں۔

آیت 15 ﴾ ① وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا : اس آیت کا تعلق آیت (۹): ﴿ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾

یا اس نے اس (مخلوق) میں سے جسے وہ پیدا کرتا ہے (خود) بیٹیاں رکھ لیں اور تمھیں بیٹوں کے لیے چن لیا؟ ﴿۱۶﴾ حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوش خبری دی جائے جس کی اس نے رحمان کے لیے مثال بیان کی ہے تو اس کا منہ سارا دن سیاہ رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے ﴿۱۷﴾

وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴾ کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مشرکین کی جہالت پر تعجب دلاتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ دیکھو یہ لوگ مانتے ہیں کہ آسمان و زمین کا خالق اور ان کی ہر چیز کا مدبر اللہ تعالیٰ ہے، جو مخلوق سے جدا ہے اور کسی طرح محتاج نہیں، پھر اس کے لیے شریک اور اس کی اولاد بناتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جو آسمان و زمین کو پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ مدد کے لیے یا دل لگانے کے لیے کسی کا محتاج نہیں، کیونکہ یہ دونوں نقص کی علامتیں ہیں۔ پھر ظلم دیکھو کہ عباد (غلاموں) کو اولاد قرار دے رہے ہیں، جب کہ اولاد غلام ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ وہ تو باپ کا جز ہوتی ہے۔ جب کوئی اللہ کا جز ثابت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کا اس کا محتاج ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ ”عِبَادِهٖ“ میں فرشتے، جن اور انسان سبھی داخل ہیں۔ یہود و نصاریٰ نے عزیر و مسیح کو ابن اللہ قرار دیا، تو کچھ نام نہاد مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے نور کا ٹکڑا قرار دیا اور بعض نے کہا کہ پنج تن اللہ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۳۰) کی تفسیر۔ مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انھوں نے ان کے بت عورتوں کی شکل میں بنا رکھے تھے۔ یہی دیویاں تھیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔

❷ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ : صریح ناشکرا اس لیے کہ جس پروردگار نے اسے پیدا کیا، زمین و آسمان اور کل کائنات پیدا فرمائی، اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کو ایک مان کر اس اکیلے کی بندگی کرنے کے بجائے اس نے اس کے بندوں کو اس کی اولاد قرار دے کر صفات ہی میں نہیں اس کی ذات میں بھی شریک ٹھہرا دیا۔

**آیت 16** اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ ...... : ان کی ناشکری کی انتہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ٹھہرائی تو بیٹیاں جو بیٹوں سے کم تر ہوتی ہیں، جب کہ اپنے لیے وہ بیٹوں کے خواہش مند ہیں۔ ”اَمْ“ (یا) سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے، یعنی (کیا اسے زبردستی لڑکیاں دے دی گئی ہیں جنھیں وہ ہٹا نہیں سکا) یا خود ہی اپنی ساری قدرت و اختیار کے باوجود لڑکیاں لینے پر راضی ہو گیا اور تمھیں بیٹے دینے کے لیے چن لیا، حالانکہ کم تر چیز پر تو کوئی بے وقوف ہی راضی ہوتا ہے۔ سوچو! تم اللہ کی کتنی بڑی گستاخی کر رہے ہو۔

**آیت 17** وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ...... : کتنی بڑی ناشکری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے وہ چیز لگا دی جس سے وہ خود شدید نفرت اور کراہت کرتے ہیں۔ بیٹیوں سے ان کی نفرت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نحل کی آیات (۵۸، ۵۹) کی تفسیر۔ ”ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا“ (اس کا منہ سارا دن سیاہ رہتا ہے) اس لیے فرمایا کہ چہرے کی سیاہی دن کو نظر آتی ہے، ورنہ چہرہ تو رات کو بھی سیاہ رہتا ہے۔

اَوَ مَنۡ یُّنَشَّؤُا فِی الۡحِلۡیَۃِ وَ ہُوَ فِی الۡخِصَامِ غَیۡرُ مُبِیۡنٍ ﴿۱۸﴾ وَ جَعَلُوا الۡمَلٰٓئِکَۃَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عِبٰدُ الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَہِدُوۡا خَلۡقَہُمۡ ؕ سَتُکۡتَبُ شَہَادَتُہُمۡ وَ یُسۡـَٔلُوۡنَ ﴿۱۹﴾

**اور کیا (اس نے اسے رحمان کی اولاد قرار دیا ہے) جس کی پرورش زیور میں کی جاتی ہے اور وہ جھگڑے میں بات واضح کرنے والی نہیں؟ ﴿۱۸﴾ اور انھوں نے فرشتوں کو، وہ جو رحمان کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی گواہی ضرور لکھی جائے گی اور وہ پوچھے جائیں گے ﴿۱۹﴾**

آیت 18 ① **اَوَ مَنۡ یُّنَشَّؤُا فِی الۡحِلۡیَۃِ ......** : اس آیت میں دو وجہوں سے لڑکیوں کا لڑکوں سے کم تر ہونا بیان فرمایا ہے، ایک یہ کہ عورتوں کا حسن زیور وغیرہ کی زینت کا محتاج ہے، اس لیے بچپن ہی سے ان کی پرورش زیور میں کی جاتی ہے، جب کہ مرد کو اس کی ضرورت نہیں، اس کا حسن ویسے ہی کامل ہے۔ دوسری یہ کہ مرد مضبوط، دلیر اور شجاع ہوتا ہے جو خم ٹھونک کر دشمن کے مقابلے میں اترتا ہے، جب کہ عورت نرم و نازک اور کمزور ہوتی ہے جس کی بہادری یہ ہے کہ جب بس نہ چلے تو رو کر دکھا دے۔ فرمایا ایسی کمزور جنس کو اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دیتے ہو اور لڑکے جو مردِ میدان اور صاحبِ عزم و ہمت ہوتے ہیں اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

② اس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کا جواز ثابت ہوتا ہے، اس لیے ان کے لیے سونا اور ریشم پہننا حلال کر دیا گیا جو مردوں کے لیے حرام ہے اور یہ بھی کہ مردوں کو نسوانی آرائش اختیار کرنے سے اجتناب لازم ہے۔ دونوں مسئلوں کی احادیث معروف ہیں۔

آیت 18 ① **وَ جَعَلُوا الۡمَلٰٓئِکَۃَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عِبٰدُ الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا** : فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے میں انھوں نے دو ظلم کیے، ایک یہ کہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں انھیں ان کے مرتبے سے بڑھا کر اللہ تعالیٰ کی اولاد بنا دیا جو صریح شرک ہے اور عبودیت اور ولدیت کسی صورت جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا ظلم یہ کہ فرشتے جو تذکیر و تانیث سے بلند و برتر ہیں اور جن کی پیدائش ہی انسانوں سے مختلف ہے، انھیں اتنا گرایا کہ ان کے لیے برتر جنس مرد کے بجائے کمزور جنس عورت ہونا تجویز کیا۔ جھوٹے اور بہتان باز لوگوں کا جھوٹ ایسے ہی تناقض سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔

② **اَشَہِدُوۡا خَلۡقَہُمۡ** : اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا کیا، کیا اس وقت یہ لوگ حاضر تھے کہ انھیں ان کا مؤنث ہونا معلوم ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ کیا انھوں نے ان کے جسم کی ساخت کو دیکھا ہے کہ انھیں عورت قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو پھر ان کے پاس اس دعویٰ کی کیا دلیل ہے؟

③ **سَتُکۡتَبُ شَہَادَتُہُمۡ وَ یُسۡـَٔلُوۡنَ** : یعنی یہ جو فرشتوں کے عورت ذات ہونے کی جھوٹی شہادت دے رہے ہیں اسے ان کے نامۂ اعمال میں لکھ لیا جائے گا اور قیامت کے دن ان سے ان کی جھوٹی شہادت کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔

④ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”یہ جو فرمایا کہ بندے رحمان کے ہیں یعنی بیٹیاں نہیں اور معلوم ہوا کہ فرشتے اگرچہ نہ مرد نہ عورت مگر ان کے لیے الفاظ مردوں والے بولنے چاہییں۔“ (موضح)

وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ؕ﴿۲۰﴾ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور انھوں نے کہا اگر رحمان چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ انھیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، وہ تو صرف اٹکل دوڑا رہے ہیں ﴿۲۰﴾ یا کیا ہم نے انھیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے؟ پس وہ اسے مضبوطی سے تھامنے والے ہیں ﴿۲۱﴾

آیت 20 ❶ **وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ** : یہ اپنی گمراہی اور مشرکانہ گستاخی پر کفارِ مکہ کا ایک اور استدلال تھا، یعنی وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے کے بجائے سارا الزام تقدیرِ الٰہی پر دھرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی یہ مشیت تھی اور اس نے ہماری قسمت میں لکھ دیا تھا کہ ہم فرشتوں کو دیویاں سمجھ کر ان کی پرستش کریں۔ تقدیرِ الٰہی سے اس قسم کا غلط استدلال باطل پرستوں کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چیز ہے اور اس کی پسند دوسری چیز ہے۔ اگر ایسے ہی ہوتا جیسے یہ مشرک کہتے تھے تو اللہ تعالیٰ کو پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر شرک سے روکنے کی کیا ضرورت تھی۔ (ابن کثیر) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۸) اور سورۂ نحل (۳۵) کی تفسیر۔

❷ **مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ** : یعنی وہ تقدیر کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کو غلط معنی پہناتے ہیں۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''یعنی یہ تو سچ ہے کہ بن چاہے خدا کے کوئی چیز نہیں، پر اس کا بہتر ہونا نہیں نکلتا۔ اس نے قُوت (خوراک) بھی پیدا کی اور زہر بھی، پر زہر کون کھاتا ہے۔'' (موضح)



❸ **اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ** : یعنی جہالت کی وجہ سے ایسی باتیں بناتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔

آیت 21 **اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ ....** : ''**اَمْ**'' سے پہلے ہمزہ استفہام پر مشتمل کوئی جملہ ہوتا ہے جو بعض اوقات مذکور اور بعض اوقات محذوف ہوتا ہے۔ یہاں ذکر یہ ہو رہا ہے کہ مشرکین نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دے کر انھیں اللہ تعالیٰ کا شریک بنا لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کا رد فرمایا۔ ظاہر ہے فرشتوں کے مؤنث ہونے کا علم یا تو مشاہدے سے ہو سکتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے بتانے سے، جو اس کی نازل کردہ کسی کتاب میں موجود ہو۔ ''**اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ**'' (کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے) میں پہلی صورت کا رد اور ان کے مشاہدے کی نفی ہے، یعنی انھوں نے ان کی پیدائش کو نہیں دیکھا کہ وہ مذکر ہیں یا مؤنث اور ''**اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ**'' (یا کیا ہم نے انھیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے) میں دوسری صورت کا رد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس فرشتوں کے مؤنث ہونے کی اور ان کی پرستش کی کوئی نقلی دلیل بھی نہیں ہے۔ کسی آسمانی کتاب میں انھیں یہ لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں یا اس کی بادشاہت میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر دہرائی ہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۳۵)، فاطر (۴۰)، صافات (۱۵۶، ۱۵۷)، احقاف (۴)، نمل (۶۴)، حج (۸) اور انعام (۴۸)۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾

**بلکہ انھوں نے کہا کہ بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا ہے اور بے شک ہم انھی کے قدموں کے نشانوں پر راہ پانے والے ہیں ﴿۲۲﴾ اور اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے خوش حال لوگوں نے کہا کہ بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا اور بے شک ہم انھی کے قدموں کے نشانوں کے پیچھے چلنے والے ہیں ﴿۲۳﴾**

**آیت 22** بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ …… : یعنی ایسا نہیں کہ ان کے پاس اپنی گمراہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب کی کوئی دلیل یا سند موجود ہے، بلکہ ان کی دلیل اور سند یہی ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی راہ پر پایا ہے اور ہم انھی کے قدموں کے نشانوں پر راہ پانے والے ہیں۔ اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورۂ ذاریات (۵۲، ۵۳)۔ باطل اور ناحق باتوں (شرک و بدعت اور رسوم) میں بڑوں اور بزرگوں کی پیروی کو دلیل بنانا وہ گمراہی ہے جو قدیم زمانے سے چلی آئی ہے اور کفار کا شیوہ رہا ہے کہ وہ انبیاء کے مقابلے میں اس کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، قرآن نے متعدد آیات میں ان کی مذمت فرمائی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس بات میں اللہ اور رسول کی کوئی سند نہ ہو اس میں باپ دادا یا کسی امام، مرشد یا بزرگ کی تقلید کرنا اور یہ کہنا کہ ہمارے بزرگ چونکہ ایسے ہی کرتے چلے آئے ہیں، لہٰذا ہم بھی اسی راہ پر چلیں گے، سراسر باطل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مقلدین کی یہ تقلید صرف دین کے معاملے میں ہوتی ہے، اگر انھیں اپنے باپ دادا کے کسی دنیوی کاروبار میں روپے پیسے کا نقصان نظر آئے تو کبھی ان کی پیروی نہیں کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک دین اور آخرت کا خسارہ کچھ خسارہ ہی نہیں، ورنہ وہ کبھی ایسا نہ کریں۔

**آیت 23** ① وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ …… : اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اس سفاہت وحماقت میں یہی لوگ مبتلا نہیں، بلکہ ان سے پہلے لوگ بھی اپنے رسولوں کو یہی کہتے چلے آئے ہیں، اس لیے آپ ان کی باتوں پر صبر کریں۔

② مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ''اس آیت سے **معلوم ہوتا** ہے کہ تقلیدِ آباء کے سب سے زیادہ مؤید اور اس پر اصرار کرنے والے کھاتے پیتے یعنی آسودہ حال اور چودھری قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ رسول کی بات مان لیں تو انھیں اپنی اس چودھراہٹ کے منصب سے نیچے اتر کر عام لوگوں کی صف میں شامل ہونا اور رسول کا مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ رسول ان کے کسبِ معاش کے طریقوں پر بھی کئی طرح کی پابندیاں لگاتا ہے، مال و دولت

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾

اس نے کہا اور کیا اگر میں تمھارے پاس اس سے زیادہ سیدھا راستہ لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا؟ انھوں نے کہا بے شک ہم اس سے جو دے کر تم بھیجے گئے ہو، منکر ہیں ﴿۲۴﴾ تو ہم نے ان سے بدلا لیا، سو دیکھ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا ﴿۲۵﴾ اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا بے شک میں ان چیزوں سے بالکل بری ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو ﴿۲۶﴾ سوائے اس کے جس نے مجھے پیدا کیا، پس بے شک وہ مجھے ضرور راستہ دکھائے گا ﴿۲۷﴾

کمانے پر بھی اور اس کے خرچ کرنے پر بھی۔ اگر وہ یہ پابندیاں قبول کرلیں تو ان کی آسودہ حالی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے، لہٰذا وہ اپنی عاقبت اس میں سمجھتے ہیں کہ تقلید آباء پر ڈٹ جائیں اور عوام کو اپنے ساتھ ملائے رکھیں۔'' (تیسیر القرآن)

**آیت 24** ① قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ : یعنی پہلے آنے والے رسول نے کہا کہ کیا اگر میں تمھارے پاس اس سے زیادہ سیدھا راستہ لے آؤں تو پھر بھی تم میری بات نہ مانو گے اور اسی ڈگر پر چلتے رہو گے؟

② قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ : یعنی انھوں نے کہا کہ اگر تم ہمارے آباء سے زیادہ سیدھا راستہ لے آؤ تب بھی یقیناً ہم اس سے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو، تمھارے لائے ہوئے حق کو بھی ہم نہیں مانتے۔

**آیت 25** فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ ...... : یعنی جب وہ ضد اور عناد میں اس حد تک پہنچ گئے کہ رسولوں کی بات حق بھی ہے تو ہم ماننے والے نہیں، تو ہم نے ان سے انتقام لیا، پھر دیکھو ان جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

**آیت 27،26** ① وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖۤ ...... : یہاں ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی مناسبت یہ ہے کہ قریش اور قوم عرب سے کہا جا رہا ہے کہ تمھارے پیشوا اور جد امجد نے باپ کی راہ غلط دیکھ کر چھوڑ دی تھی، تم بھی ایسا ہی کرو۔

② اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ...... : "بَرَآءٌ" مصدر ہے، واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، جو "بَرِيْءٌ" کے معنی میں ہے، مگر اس میں مبالغہ ہے، جیسے "زَيْدٌ عَادِلٌ" میں وہ زور نہیں جو "زَيْدٌ عَدْلٌ" (زید اتنا عادل ہے کہ سراپا عدل ہے) میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں تمھارے تمام معبودوں سے سراپا براءت ہوں، دل، زبان اور عمل کے ساتھ۔ غرض ہر طرح سے ان سے براءت کا اعلان کرتا ہوں، سوائے اس معبود کے جس نے مجھے پیدا کیا۔

③ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ : اپنے اس کلام میں ابراہیم علیہ السلام نے صرف اللہ واحد کی عبادت کی دلیل بھی بیان فرمائی ہے۔ وہ ہے :

وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۝۲۸

اور اس نے اس (توحید کی بات) کو اپنے پچھلوں میں باقی رہنے والی بات بنا دیا، تاکہ وہ رجوع کریں ۲۸

﴿ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ﴾ "جس نے مجھے پیدا کیا۔" یعنی عبادت اسی کا حق ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔ یہاں ابراہیم علیہ السلام کے اللہ کے سوا تمام معبودوں سے اعلانِ براءت کا ذکر ہے، دوسرے مقامات پر براءت کے علاوہ ان سے عداوت کا بھی اعلان ہے اور تقریباً ہر جگہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کی صفت کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ (دیکھیے شعراء: ۷۵ تا ۷۸۔ انعام: ۷۸، ۷۹) سورۂ ممتحنہ (۴) میں باطل معبودوں کے ساتھ ان کے پجاریوں سے بھی براءت و انکار کے علاوہ کھلم کھلا بغض و عداوت کا اعلان ہے، جب تک وہ اکیلے اللہ پر ایمان نہ لائیں۔

④ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ: سورۂ شعراء میں ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: ﴿ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴾ [ الشعراء: ۷۸ ] "وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی مجھے راستہ دکھاتا (اور اس پر چلاتا) ہے۔" یہاں فرمایا: ﴿ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴾ یعنی جس نے مجھے پیدا کیا آئندہ بھی وہی مجھے سیدھی راہ پر چلاتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ یعنی ہدایت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے جس کے ہاتھ میں خلق ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۷۷)، شعراء (۷۸) اور سورۂ صافات (۹۹)۔

**آیت 28** ① وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً: "جَعَلَهَا" میں ضمیر "ھا" سے مراد کلمہ توحید "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے، کیونکہ "اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ" کا خلاصہ "لَا إِلٰهَ" ہے اور "اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ" کا خلاصہ "إِلَّا اللّٰهُ" ہے۔

② بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ: "جَعَلَهَا" میں ضمیر فاعل سے مراد ابراہیم علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کلمہ کو اپنی اولاد میں باقی رہنے والا بنا دیا۔ دو طرح سے، ایک تو انھوں نے اپنی اولاد کو اور ان کی اولاد نے اپنی اولاد کو اس کی وصیت کی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [ البقرۃ: ۱۳۲ ] "اور اسی کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی اور یعقوب نے بھی کہ اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمھارے لیے یہ دین چن لیا ہے، تو تم ہرگز فوت نہ ہونا مگر اس حال میں کہ تم فرماں بردار ہو۔" دوسرے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس بات کی دعا کی کہ یہ کلمہ ان کی اولاد میں باقی رہے، ان کی اولاد میں سے ایک امت مسلم یعنی اللہ کی فرماں بردار رہے، وہ بت پرستی سے بچے رہیں، ایمان اور عمل صالح پر قائم رہیں اور ان میں انبیاء و رسل اور اس کلمے کی دعوت دینے والے موجود رہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [ البقرۃ: ۱۲۴ ] "اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں کے ساتھ آزمایا تو اس نے انھیں پورا کر دیا۔ فرمایا بے شک میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ کہا اور میری اولاد میں سے بھی؟ فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔" اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿ وَ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾ [ ابراہیم: ۳۵ ] "اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾

**بلکہ میں نے انھیں اوران کے باپ دادا کو برتنے کا سامان دیا، یہاں تک کہ ان کے پاس حق آ گیا اور وہ رسول جو کھول کر بیان کرنے والا ہے ﴿۲۹﴾**

کریں۔'' اور دعا کی: ﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ﴾ [ إبراھیم : ٤٠ ] ''اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔'' اور ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے دعا کی: ﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۲۸ ] ''اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا۔'' اور یہ دعا بھی کی: ﴿ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ﴾ [ البقرۃ : ۱۲۹ ] ''اے ہمارے رب! اور ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انھیں کتاب و حکمت سکھائے اور انھیں پاک کرے۔''

اور اگر ''جَعَلَهَا'' میں ضمیر فاعل سے مراد اللہ تعالیٰ ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمے کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں باقی رہنے والا بنا دیا اور ان میں ہمیشہ اس کلمے پر ایمان رکھنے والے اور اس کی دعوت دینے والے موجود رہے اور رہیں گے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی دعا قبول فرما کر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَنَا دَعْوَةُ أَبِيْ إِبْرَاهِيْمَ )) [ سلسلة الأحاديث الصحيحة، ح : ١٥٤٦ ] ''میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔'' اسی طرح ان کی اولاد میں اسحاق، یعقوب اور بہت سے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے، فرمایا: ﴿ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ ﴾ [ العنکبوت : ۲۷ ] ''اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔''

● **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** : یعنی اگر ان میں سے کچھ لوگ گمراہ ہو کر شرک کرنے لگیں تو توحید پرستوں کی دعوت پر اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آئیں۔ اس میں مکہ والوں کو تنبیہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہی کلمہ لے کر آئے ہیں جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں باقی چھوڑا تھا، اس لیے تم ان کی دعوت قبول کر لو اور شرک سے باز آ جاؤ۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ساری اولاد ایمان والی نہیں ہوئی بلکہ ان میں نیک و بد ہر قسم کے لوگ رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۴)، صافات (۱۱۳)، نساء (۵۵،۵۴) اور سورۂ حدید (۲۶) اگلی آیت میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔

29 **بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ ......** : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں جو کلمہ اس لیے چھوڑا تھا کہ شرک میں گرفتار واپس پلٹ آئیں تو کیا وہ واپس پلٹے؟ فرمایا نہیں، وہ سب لوگ واپس نہیں پلٹے، بلکہ ان لوگوں یعنی قریش اور ان کے آباء کو ان کے کفر و شرک پر فوراً پکڑنے کے بجائے میں نے واپس پلٹنے کے لیے مہلت دی اور دنیا کا ساز و سامان اور مال و متاع کچھ وقت تک رہنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے دیا، مگر وہ ان دنیوی لذتوں ہی کو اپنا مقصد سمجھ

وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

اور جب ان کے پاس حق آیا تو انھوں نے کہا یہ جادو ہے اور بے شک ہم اس سے منکر ہیں ﴿۳۰﴾ اور انھوں نے کہا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟ ﴿۳۱﴾

بیٹھے اور ان میں ایسے بدمست ہوئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی راہ کو بھول گئے، حتیٰ کہ ان کے پاس یہ حق اور رسول مبین آ گیا۔ "**الْحَقُّ**" سے مراد قرآن ہے اور "رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ" کا معنی کھول کر بیان کرنے والا رسول بھی ہے اور واضح رسول بھی، یعنی جس کا رسول برحق ہونا بالکل واضح ہے۔

**آیت 30** **وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ** ...... : جب ان کے پاس حق یعنی قرآن آیا تو کہنے لگے، یہ جادو ہے اور ہم اسے نہیں مانتے۔ قرآن مجید کی دلوں پر زبردست تاثیر کا جب وہ کوئی توڑ نہ کر سکے، جس کی وجہ سے اس پر ایمان لانے والا اپنے رشتہ داروں کو تو چھوڑ سکتا تھا مگر ایمان سے کبھی پیچھے نہ ہٹتا تھا اور نہ ہی وہ اس پر ایمان لانے والوں کو روک سکے، تو بجائے اس کے کہ اس پر ایمان لے آتے اسے جادو کہہ کر جھٹلا دیا کہ یہ سب اثر جادو کا ہے۔ حالانکہ ظالم جانتے تھے کہ کہاں جادو جیسی پلید چیز اور جادوگروں جیسے خبیث لوگ اور کہاں اللہ کا پاکیزہ کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا پاکیزہ اور بلند اخلاق والا شخص۔ محض عناد اور ضد کی وجہ سے انھوں نے یہ بات کہی۔

**آیت 31** **وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ** ...... : پچھلی آیت میں ان کے قرآن پر طعن کا ذکر تھا تو اس آیت میں قرآن لانے والے پر اعتراض کا ذکر ہے۔ کفار پہلے تو کسی بشر کا رسول ہونا ہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے، ان کا مطالبہ تھا کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیے۔ جب ناقابل تردید دلائل سے انھیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام رسول بشر ہی بھیجے ہیں، تمھارے جد امجد ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور دوسرے پیغمبر، مثلاً موسیٰ علیہ السلام، سب بشر ہی تھے، تو فرشتہ رسول کا مطالبہ چھوڑ کر یہ مطالبہ داغ دیا کہ یہ قرآن دو بستیوں میں سے کسی عظیم آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ دو بستیوں سے مراد مکہ اور طائف ہیں، کیونکہ ان کی مرکزی بستیاں یہ دو ہی تھیں۔ "**عَظِيْمٍ**" سے مراد دنیاوی مال و دولت اور جاہ و مرتبہ کے لحاظ سے عظیم ہے۔ مفسرین مکہ کے ان عظیم آدمیوں میں سے ولید بن مغیرہ یا عتبہ بن ربیعہ کا اور طائف کے عظماء میں سے عروہ بن مسعود، حبیب بن عمرو یا کنانہ بن عبد یالیل یا اس قبیلے کے دوسرے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کفار کے خیال میں مال کی کثرت اور قوم کے سردار ہونے کی وجہ سے یہ لوگ نبوت کے حق دار تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مال و جاہ کی کمی کی وجہ سے اس کے اہل نہیں تھے، کیونکہ آپ کے پاس دولت کی کثرت تھی نہ کسی قبیلے کی سرداری۔ یہ کفار کی جہالت اور سخت نادانی تھی کہ انھوں نے نبوت کے منصب کے لیے مال و جاہ کو شرط قرار دیا۔

أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا

کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے خود ان کے درمیان ان کی معیشت دنیا کی زندگی میں تقسیم کی

آیت 32 ❶ أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ : یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے۔ "رَحْمَتَ" کا لفظ اگرچہ عام ہے، جس میں ہر رحمت شامل ہے، مگر یہاں اس سے مراد نبوت و رسالت ہے، کیوں کہ ان کا اعتراض اسی پر تھا۔ "رَحْمَتَ رَبِّكَ" (تیرے رب کی رحمت) کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرنے میں آپ ﷺ کی شان کی بلندی کا اظہار ہو رہا ہے۔ یعنی کیا تیرے رب کی رحمت نبوت و رسالت کی تقسیم ان کے ہاتھوں میں ہے کہ جسے چاہیں دیں اور جسے چاہیں نہ دیں؟ نہیں، یہ اختیار اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ یہ رحمت کسے عطا کرنی ہے۔ یہ جاہل اپنی حیثیت کو بھول کر اس قدر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کا ہر شخص چاہتا ہے کہ اللہ کی کتاب اسی کو دی جائے، فرمایا: ﴿ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴾ [المدثر : ۵۲] "بلکہ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں۔" حتیٰ کہ انھوں نے ایمان لانے کی شرط ہی نبوت دیا جانا ٹھہرائی، فرمایا: ﴿ وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴾ [الأنعام : ۱۲٤] "اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہمیں اس جیسا دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔ عنقریب ان لوگوں کو جنھوں نے جرم کیے، اللہ کے ہاں بڑی ذلت پہنچے گی اور بہت سخت عذاب، اس وجہ سے کہ وہ فریب کیا کرتے تھے۔"

خلاصہ یہ کہ تیرے رب کی رحمت کی تقسیم اسی کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون اس کے قابل ہے۔ یہ کافر دنیا کے مال و جاہ کی وجہ سے ان لوگوں کو رسالت کے قابل سمجھ رہے ہیں جو اللہ کے ہاں ایک تنکے کا وزن نہیں رکھتے اور مال نہ ہونے کی وجہ سے اس شخص کو نبوت کے لیے نااہل قرار دے رہے ہیں جو سب سے زیادہ پاکیزہ قلب و نفس والا، خاندانی شرافت میں سب سے بلند اور انسانی خوبیوں میں سب سے ممتاز ہے۔

❷ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : یعنی نبوت و رسالت تو بہت ہی بلند چیز ہے، ہم نے تو دنیا میں ان کی روزی کی تقسیم کا اختیار بھی ان کو یا کسی دوسرے کو نہیں دیا، بلکہ اسے خود تقسیم کیا ہے، حالانکہ وہ ہمارے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں، تو قرآن نازل کرنے کا اختیار انھیں کیسے دے سکتے ہیں!؟

❸ وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ : اس مختصر سے جملے میں اللہ تعالیٰ نے کئی حقیقتیں بیان فرما دی ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتوں اور روزیوں کی تقسیم میں برابری نہیں رکھی، بلکہ ان میں درجات رکھے ہیں۔ کسی کو غنی بنا دیا کسی کو فقیر، کوئی ذہین ہے کوئی کند ذہن، کوئی بے وقوف ہے کوئی عقل مند اور کوئی اس سے بڑھ کر عقل مند، کوئی طاقتور ہے کوئی کمزور، کوئی خادم

بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا ؕ وَ رَحۡمَتُ رَبِّكَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۲﴾

اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا، تاکہ ان کا بعض، بعض کو تابع بنالے اور تیرے رب کی رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ﴿۳۲﴾

ہے کوئی مخدوم، کوئی مالک ہے کوئی مملوک، کوئی اندھا ہے کوئی بینا، کوئی باعزت ہے کوئی ذلیل اور کوئی حاکم کوئی محکوم۔ کمیونسٹوں کا نعرہ کہ ہم تمام لوگوں میں دولت کی مساوات پیدا کریں گے، سخت دھوکا تھا۔ یہ اللہ کے فیصلے کے خلاف ہے، نہ ایسا ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں سے ہو سکا۔ رزق اور اللہ تعالیٰ کی دوسری عنایتوں کی عطا میں یکسانیت کے بجائے درجات کی کمی بیشی ناقابل تردید حقیقت ہے۔ دنیا میں اس کا مقصد آزمائش ہے۔ (دیکھیے انعام: ۱۶۵) درجات کا یہ فرق آخرت میں اس سے بھی زیادہ ہو گا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۷۱)، بنی اسرائیل (۲۱) اور سورۂ روم (۲۸)۔

دوسری حقیقت یہ کہ یہ کمی بیشی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے، کسی دوسرے کا اس میں کوئی دخل نہیں اور اللہ تعالیٰ نے جسے جس درجے میں رکھا ہے اس پر قناعت کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ کسی کو خوبصورت بنایا یا بدصورت، قوی بنایا یا ضعیف، عقل مند بنایا یا بے وقوف، آنکھیں عطا کر دیں یا نابینا کر دیا، ہر ایک کو اسی طرح رہنا پڑے گا جس طرح خالقِ عالم نے اس کے لیے طے کر دیا ہے۔

❹ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا: "اِتَّخَذَ فُلَانٌ فُلَانًا سُخۡرِيًّا" یعنی فلاں نے فلاں کو اپنا تابع بنا لیا، یا اپنے کام یا خدمت میں لگا لیا۔ یہ تیسری حقیقت ہے، کسی مال دار کا مال یا دنیوی عزو جاہ اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر خوش ہے اور نہ ہی کسی فقیر کا فقر اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہے، بلکہ درجات کا یہ تفاوت اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کی ضرورت رہے اور وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا نظام معطل ہو جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے ایک شخص کو مال نہیں دیا، مگر اسے کسی کام کی صلاحیت اور قوت بخش دی، دوسرے کو کمزور بنا دیا جو خود نہ کام کر سکتا ہے نہ محنت، مگر اسے دولت بخش دی جس کے ساتھ وہ ان لوگوں کو مزدور رکھ سکتا ہے جن کے پاس مال نہیں۔ اسی طرح کسی کے پاس ایک ہنر ہے دوسرے کے پاس دوسرا، دونوں ایک دوسرے سے کام لیتے ہیں۔ اس میں ضروری نہیں کہ کام لینے والا مرتبے میں بھی اس سے اونچا ہو جس سے کام لے رہا ہے۔ کتنے ہی ڈاکٹر، انجینئر اور دوسرے کمالات کے مالک ان لوگوں کے پاس ملازمت کر رہے ہیں جو مطلق جاہل ہیں۔ یہاں کوئی بڑے سے بڑا ایسا نہیں جو چھوٹے سے چھوٹے کا محتاج نہ ہو، حتیٰ کہ بادشاہ بھی حجام، باورچی اور دوسرے خدمت گاروں کا محتاج ہے اور خدمت گار اس کے محتاج ہیں، اسی سے نظامِ عالم چل رہا ہے۔ اگر سب برابر ہو جائیں تو وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔

❺ وَ رَحۡمَتُ رَبِّكَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ: "رَحۡمَتُ رَبِّكَ" کے متعلق دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد نبوت ہے، یعنی

وَ لَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی امت ہو جائیں گے تو یقیناً ہم ان لوگوں کے لیے جو رحمان کے ساتھ کفر کرتے ہیں، ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی، جن پر وہ چڑھتے ہیں ﴿۳۳﴾ اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی، جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں ﴿۳۴﴾ (چاندی کے بنا دیتے) اور سونے کے بھی اور یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کے سامان کے سوا کچھ نہیں اور آخرت تیرے رب کے ہاں متقی لوگوں کے لیے ہے ﴿۳۵﴾

نبوت و رسالت کا شرف تو دنیوی مال و جاہ اور ساز و سامان سے کہیں اعلیٰ ہے۔ جب دنیا کی دولت اس نے ان کی تقسیم پر نہیں رکھی تو رسالت ان کی تجویز پر کیسے دے گا!؟ دوسرا یہ کہ اس سے مراد آخرت کی وہ نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں، یعنی یہ لوگ دنیا کے جس فانی مال و متاع اور عز و جاہ کو سمیٹنے کی تگ و دو میں دن رات لگے ہوئے ہیں، تیرے رب کی رحمت یعنی آخرت کی دائمی نعمتیں ان سے بدرجہا بہتر ہیں۔

**35-33** ① **وَ لَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ......**: **"سُقُفًا"** "سَقْفٌ" کی جمع ہے، چھتیں۔ **"مَعَارِجَ"** (سیڑھیاں) "مِعْرَجٌ" یا "مِعْرَاجٌ" کی جمع ہے، جیسے "مَفَاتِحُ" اور "مَفَاتِيْحُ" "مِفْتَاحٌ" کی جمع ہیں۔ **"سُرُرًا"** "سَرِيْرٌ" کی جمع ہے، چارپائیاں، تخت۔ **"زُخْرُفًا"** کا معنی سونا ہے، جیسا کہ کفار نے نبی ﷺ سے کہا تھا: ﴿ **اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ** ﴾ [ بني إسرائيل : ۹۳ ] "یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر ہو۔" اس کا معنی زینت و آرائش بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ** ﴾ [ یونس : ۲٤ ] "یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی آرائش حاصل کر لی اور خوب مزین ہو گئی۔" **"زُخْرُفًا"** منصوب ہونے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ اصل میں "سُقُفًا مِنْ فِضَّةٍ وَ مِنْ زُخْرُفٍ" ہے، حرف جار حذف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو گیا، یعنی "ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سونے کی۔" دوسری وجہ یہ کہ یہ **"لَجَعَلْنَا"** کے مفعول **"سُقُفًا"** پر عطف ہے، یعنی "لَجَعَلْنَا لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِنْ فِضَّةٍ وَ لَجَعَلْنَا لَهُمْ زُخْرُفًا" کہ "ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور ہم ان کے لیے سونا مہیا کر دیتے۔" **"وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا"** میں "اِنْ" نافیہ ہے اور "لَمَّا" بمعنی "اِلَّا" ہے، جیسے فرمایا: ﴿ **اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ** ﴾ [ الطارق : ٤ ] "نہیں کوئی جان مگر اس کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے۔"

● آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب **"وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ"** (اور تیرے رب کی رحمت اس سے

وَ مَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَیِّضۡ لَہٗ شَیۡطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیۡنٌ ﴿۳۶﴾

اور جو شخص رحمٰن کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کے سا
رہنے والا ہوتا ہے ﴿۳۶﴾

بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں ) میں آخرت کی عظمت و شان اور دنیا کی حقارت بیان فرمائی تو ساتھ ہی بیان فرمایا کہ اس کے نزدیک دنیا بالکل ہی حقیر اور بے قدر و قیمت ہے، اس کے ہاں کوئی قیمت ہے تو صرف آخرت کی، اس لیے اس نے آخرت کی نعمتیں صرف مسلمانوں کے لیے خاص کر رکھی ہیں، کفار کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔ دنیا کی نعمتوں میں اس نے مومن و کافر سب کو شریک رکھا ہے اور دونوں کو ان نعمتوں میں شریک رکھنے کی حکمت بیان فرمائی کہ اگر ہمیں یہ بات ناپسند نہ ہوتی کہ تمام لوگ ایک ہی امت یعنی سبھی کافر ہو جائیں گے تو ہم دنیا کی زیب و زینت کی تمام اشیاء کفار کو دے دیتے، لیکن چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ لوگوں کے دلوں میں دنیوی زیب و زینت کی شدید رغبت اور محبت موجود ہے، اگر ہم نے یہ سبھی کچھ کفار کو دے دیا تو دنیا کی رغبت کے نتیجے میں سبھی لوگ کافر ہو جائیں گے، (جب کہ یہ بات ہماری رحمت کو منظور نہیں) اس لیے ہم نے کافر و مومن دونوں میں غنی بھی رکھے ہیں، فقیر بھی اور دنیا کی زندگی کے ساز و سامان میں دونوں کو شریک رکھا ہے۔ آیت کے آخری جملوں ﴿ وَ اِنۡ کُلُّ ذٰلِکَ لَمَّا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ الۡاٰخِرَۃُ عِنۡدَ رَبِّکَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴾ (اور یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کے سامان کے سوا کچھ نہیں اور آخرت تیرے رب کے ہاں متقی لوگوں کے لیے ہے ) میں بیان فرمایا کہ آخرت صرف ایمان والوں کے لیے ہے۔ یہی مضمون سورۂ اعراف (۳۲) میں بیان ہوا ہے۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ )) [ ترمذي، الزهد، باب ما جاء في هوان الدنيا على الله عز و جل : ۲۳۲۰ ] ”اگر دنیا اللہ کے ہاں مچھر کے ایک پر کے برابر ہوتی تو وہ اس میں سے کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ پینے کو نہ دیتا۔“

آیت 36 ① وَ مَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ : زمخشری نے فرمایا، ”عَشِيَ يَعْشٰى“ (ع) جب نظر میں خرابی آ جائے اور ”عَشَا يَعْشُوْ“ (ن) جب اس شخص کی طرح دیکھے جس کی نظر خراب ہے، حالانکہ اس میں کوئی خرابی نہ ہو۔ دونوں میں وہی فرق ہے جو ”عَمِيَ“ (اندھا ہو گیا) اور ”تَعَامٰى“ (اندھا بن گیا) میں ہے۔ ”ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ“ کا معنی رحمان کی یاد بھی ہے، اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت بھی اور یہ قرآن بھی۔ دنیا کی زیب و زینت میں ہمہ تن مشغول ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے فرشتے اس سے نفرت کرتے ہیں اور شیطان اس سے چمٹ جاتے ہیں، جو اسے ہر برائی میں مبتلا کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡہِکُمۡ اَمۡوَالُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ ۚ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴾ [ المنافقون : ۹ ] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے تو وہی لوگ خسارہ

وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝۳۷ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ۝۳۸

**اور بے شک وہ ضرور انھیں اصل راستے سے روکتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں ۳۷ یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا اے کاش! میرے درمیان اور تیرے درمیان دو مشرقوں کا فاصلہ ہوتا، پس وہ برا ساتھی ہے ۳۸**

اٹھانے والے ہیں۔'' اور جو شخص خواہشِ نفس پر قابو رکھ کر دنیا کے فتنوں سے بچے اور اللہ کے ذکر پر دوام کرے تو شیطان اس سے دور ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ فرشتہ مقرر کر دیتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر سے جان بوجھ کر غفلت کے لیے اندھا بننے کا لفظ استعمال فرمایا اور لفظ "الرَّحْمٰنِ" اس لیے ذکر فرمایا کہ انسان کے لائق نہیں کہ اس بے حد رحم والے کے ذکر سے غفلت کرے۔

❻ **نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ:** اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۲۵)۔ "شَيْطٰنًا" نکرہ ہے، کوئی نہ کوئی شیطان، وہ انسانوں میں سے ہو یا ابلیس کی اولاد میں سے۔ شیطان مقرر کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی، حالانکہ یہ انسان کے اللہ کے ذکر سے غافل ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ ہر کام کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ [البقرة : ۲۱۰] ''اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔''

آیت 37 ❶ **وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ:** "اِنَّهُمْ" میں ضمیر شیاطین کی طرف اور "لَيَصُدُّوْنَهُمْ" میں ضمیر "هُمْ" رحمان کے ذکر سے غفلت کرنے والوں کی طرف جا رہی ہے، حالانکہ پچھلی آیت میں دونوں کا ذکر واحد کی ضمیر کے ساتھ آیا ہے، لیکن وہاں بھی لفظ "مَنْ" واحد ہونے کے باوجود معنی کے لحاظ سے جمع ہے۔ یعنی اس کی یاد سے جان بوجھ کر غفلت کرنے والوں کو کوئی نہ کوئی شیطان چمٹ جاتے ہیں، خواہ انسانی شیطان ہوں یا ابلیس کی اولاد، وہ ان کے لیے گناہوں کو خوبصورت کر کے دکھاتے ہیں، ان کی نفسانی خواہشات کو ابھارتے اور انھیں اللہ کی نافرمانی میں مشغول کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ انھیں صراطِ مستقیم سے بالکل روک دیتے ہیں اور جہنم میں پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔

❷ **وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ:** یعنی راہِ راست سے رک جانے والے وہ غافل سراسر گمراہ ہونے کے باوجود اپنے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ سیدھے راستے پر ہیں۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گمراہ کرنے والے شیاطین کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ سیدھے راستے پر ہیں، اس لیے آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے چلتے چلے جاتے ہیں۔

آیت 38 ❶ **حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ ......:** دنیا میں ہر وقت شیطان کے ساتھ رہنے کے بعد قیامت کے دن اللہ کے ذکر سے اندھا بننے والا انسان جب اپنے قرین کے ہمراہ اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہوگا تو حسرت و افسوس کے ساتھ اس سے

وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ مَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾

**اور آج یہ بات تمھیں ہرگز نفع نہ دے گی، جب کہ تم نے ظلم کیا کہ بے شک تم (سب) عذاب میں شریک ہو ﴿۳۹﴾ کیا تو بہروں کو سنائے گا، یا اندھوں کو راہ دکھائے گا اور ان کو جو صاف گمراہی میں پڑے ہیں ﴿۴۰﴾**

کہے گا، کاش! میرے اور تیرے درمیان دو مشرقوں کی دوری ہوتی۔ دو مشرقوں سے مراد مشرق و مغرب ہیں۔ دونوں کو ''مشرقین'' کہہ دیا ہے، جیسے ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کو ''عمرین'' کہہ دیتے ہیں اور کھجور اور پانی کو ''اسودین'' کہہ دیتے ہیں۔ دو مشرق بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ سردیوں میں سورج طلوع ہونے کی جگہ اور گرمیوں میں طلوع ہونے کی جگہ کے درمیان بہت فاصلہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ [ الرحمان : ۱۷ ] ''(وہ) دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب۔''

② **فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ** : ''أَيْ بِئْسَ الْقَرِيْنُ أَنْتَ'' یعنی تو برا ساتھی ہے، جس نے دوست بن کر مجھے خراب و برباد کیا اور ہمیشہ کے عذاب میں پھنسا دیا۔ بعض مفسرین نے اسے اللہ تعالیٰ کا کلام قرار دے کر معنی کیا ہے: '' فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ هُوَ '' یعنی پس وہ برا ساتھی ہے۔

**آیت 39 وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ** ...... : دنیا میں اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو اسے اس بات سے کچھ تسلی ہوتی ہے کہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اس کے علاوہ دوستوں کی صحبت کے احساس سے بھی تکلیف میں کچھ کمی ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے اور حوصلہ دلاتے ہیں۔ عام مقولہ ہے: ''ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت'' کہ دوزخ میں گئے تو سب دوست اکٹھے جائیں گے اور بہشت میں گئے تو بھی اکٹھے جائیں گے۔

قرین کی مناسبت سے فرمایا کہ اگر تم اس بات سے کچھ تسلی حاصل کرنا چاہو کہ میں عذاب میں ہوں تو میرا قرین بھی تو عذاب میں ہے تو تمھارا یہ خیال غلط ہے، جب تم دنیا میں ظلم کرتے رہے تو آج تمھیں اس بات سے ہرگز کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہو، کیونکہ وہ عذاب ہی اتنا سخت ہے کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا، بلکہ مجرم اپنے تمام خویش و اقارب فدیے میں دے کر اس عذاب سے نجات پانے کی خواہش کرے گا۔ (دیکھیے معارج : ۱۱ تا ۱۴) شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''یعنی کافر کہیں گے خوب ہوا کہ انھوں نے ہمیں عذاب میں ڈلوایا، یہ بھی نہ بچے، لیکن اس کا کیا فائدہ اگر دوسرا پکڑا گیا۔'' (موضح)

**آیت 40 اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ** ...... : رحمٰن کے ذکر سے دانستہ آنکھیں بند کرنے کی سزا شیطان کو ایسے لوگوں کا ساتھی بنانے کی صورت میں دی جاتی ہے جو انھیں راہِ حق سے اس طرح روکتے ہیں کہ وہ حق سننے سے بہرے اور اس کی نشانیاں دیکھنے سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ اس آیت سے مقصود نبی ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ ان کافروں کے ایمان نہ لانے پر آپ غمزدہ

فَاِمَّا نَذۡهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنۡهُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ ۝۴۱ اَوۡ نُرِيَنَّكَ الَّذِىۡ وَعَدۡنٰهُمۡ فَاِنَّا عَلَيۡهِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ ۝۴۲ فَاسۡتَمۡسِكۡ بِالَّذِىۡۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ‌ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝۴۳ وَاِنَّهٗ لَذِكۡرٌ لَّكَ وَلِقَوۡمِكَ‌ ۚ وَسَوۡفَ تُسۡـَٔلُوۡنَ ۝۴۴

**پس اگر کبھی ہم تجھے لے ہی جائیں تو بے شک ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں ۝۴۱ یا ہم واقعی تجھے وہ (عذاب) دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تو بے شک ہم ان پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں ۝۴۲ پس تو اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھ جو تیری طرف وحی کیا گیا ہے، یقیناً تو سیدھے راستے پر ہے ۝۴۳ اور بلاشبہ وہ یقیناً تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے ایک نصیحت ہے اور عنقریب تم سے پوچھا جائے گا ۝۴۴**

نہ ہوں، کیونکہ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لے آنا آپ کے بس میں نہیں، آپ ان تک اللہ کا پیغام پہنچاتے رہیں اور ہدایت کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔

**آیت 41، 42** فَاِمَّا نَذۡهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنۡهُمۡ ...... : یہ بھی رسول اللہ ﷺ کو ایک اور طرح سے تسلی دلائی ہے کہ یہ کفار جو آپ کی موت کے منتظر ہیں اور ہر وقت آپ کو کسی نہ کسی طرح قتل کرنے کی کوشش اور مشورہ کرتے رہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ آپ کی موت سے ان کی مشکل ختم ہو جائے گی اور سب کچھ ان کے حق میں ہو جائے گا۔ فرمایا ان کا یہ خیال غلط ہے، کیونکہ اگر ہم آپ کو اپنے پاس لے جائیں تو پھر بھی یہ لوگ سزا سے بچ نہیں سکیں گے، بلکہ ہم ہر حال میں ان سے انتقام لینے والے ہیں، یا آپ کی زندگی میں آپ کو اس سزا کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تو یہ بھی کچھ بعید نہیں، کیونکہ ہم ان پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے بدر اور دوسرے معرکوں میں کفار کو ملنے والی سزا آپ ﷺ کو آنکھوں سے دکھا دی۔ مزید دیکھیے سورۂ مومن (۷۷)۔

**آیت 43** فَاسۡتَمۡسِكۡ بِالَّذِىۡۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ ...... : یعنی آپ کو ان کافروں کی مخالفت سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے، آپ کے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ آپ راہِ حق پر ہیں، اس لیے نتائج سے بے فکر ہو کر دعوت کا کام جاری رکھیں اور خود اس پر پوری طرح کاربند رہیں۔

**آیت 44** ➊ وَاِنَّهٗ لَذِكۡرٌ لَّكَ وَلِقَوۡمِكَ : ذکر کا معنی نصیحت و یاددہانی بھی ہے اور عز و شرف اور شہرت و ناموری بھی، یہاں دونوں مراد ہیں۔ یعنی یہ قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نصیحت اور یاددہانی ہے اور آپ کے لیے اور آپ کی قوم قریش اور عرب کے لیے عز و شرف کا باعث بھی ہے۔ یہ عربی زبان میں نازل ہوا اور اس کے اوّلین مخاطب اور سب سے پہلے عمل کرنے والے قریش اور عرب ہیں۔ جو عجمی قومیں اس پر ایمان لائیں گی ان کو قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عربی زبان سیکھنا پڑے گی اور عربوں کا شاگرد بننا پڑے گا۔ قریش اور عربوں کے لیے یہ عز و شرف کیا کم ہے کہ بعد میں آنے

وَسۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِهَةً يُّعۡبَدُوۡنَ ﴿۴۵﴾

اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟ ﴿۴۵﴾

والے تمام لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ زمین کے مشرق و مغرب ان کے جہاد کے ساتھ فتح اور حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی خلافت ان میں رکھی جب تک انھوں نے دین کو قائم رکھا، کیونکہ قرآن شرف کا باعث اسی کے لیے ہے جو اس پر عمل کرے، اس کے لیے محض عرب یا قریشی ہونا کافی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ ))[مسلم، الطھارۃ، باب فضل الوضوء: ۲۲۳، عن أبي مالك الأشعري رضی اللہ عنہ ] ”قرآن تیرے حق میں حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے۔“

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نیک نامی کی خواہش اچھی چیز ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اس کا ذکر اپنے نبی محمد ﷺ پر احسان کے طور پر نہ فرماتے اور ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے یہ دعا نہ کرتے: ﴿وَاجۡعَلۡ لِّيۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِي الۡاٰخِرِيۡنَ﴾ [ الشعراء: ۸٤ ] ”اور پیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ۔“

② وَ سَوۡفَ تُسۡـَٔلُوۡنَ : یعنی قیامت کے دن تم سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنے عز و شرف کا باعث بننے والی نصیحت کی اس کتاب کی کیا قدر کی، اس پر کہاں تک عمل کیا اور اسے تمام اقوامِ عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری کہاں تک ادا کی؟

**آیت 45** ① وَسۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ ...... : یہاں ایک سوال ہے کہ پہلے رسول تو فوت ہو چکے، ان سے کس طرح پوچھا جا سکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ رسولوں سے پوچھنے سے مراد ان کی کتابوں سے معلوم کرنا ہے، جیسا کہ اللہ کے فرمان: ﴿فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِيۡ شَيۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ﴾ [ النساء: ٥٩ ] (پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ) کا مطلب اب یہ نہیں کہ اگر تمھارا کسی معاملے میں تنازع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی طرف رجوع کرو۔ اسی طرح اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تمام رسولوں کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے دیکھ لو، کیا کسی میں یہ بات ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمان کے سوا بھی کوئی ہستیاں مقرر کی ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے اور کیا کسی بھی پیغمبر نے شرک کی اجازت دی ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے۔ شرک کے حق میں نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے نہ نقلی۔ (دیکھیے احقاف: ۴) آیت سے مقصود قریش کو باور کروانا ہے کہ تمام انبیاء اللہ واحد کی عبادت کے داعی تھے، شرک کسی بھی شریعت میں جائز نہیں رہا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِيۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ﴾ [ الأنبیاء: ٢٥ ] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“ اور جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَقَدۡ بَعَثۡنَا فِيۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ﴾ [ النحل: ٣٦ ] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾

بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا تو اس نے کہا بے شک میں تمام جہانوں کے رب کا بھیجا ہوا ہوں ﴿۴۶﴾ تو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آیا، اچانک وہ ان کے بارے میں ہنس رہے تھے ﴿۴۷﴾

میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔"

❷ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ کی انبیاء سے ملاقات ہو، جیسے معراج کی رات ہوئی تو آپ ان سے یہ سوال کریں، مگر قرآن یا حدیث میں کہیں ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے شبِ معراج یا کسی اور موقع پر کسی پیغمبر سے یہ سوال کیا ہو۔ اگر آیت کا یہ مطلب ہوتا تو آپ ﷺ ان سے ضرور سوال کرتے۔ کسی ضعیف روایت میں اگر آپ ﷺ کے پیغمبروں سے اس سوال کا ذکر مل بھی جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

آیت 46 ❶ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ : یہاں موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی مناسبت کئی طرح سے ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے سے پہلے رسولوں سے سوال کا حکم دیا کہ کیا اس نے اپنے سوا کوئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے، تو جن رسولوں کی کتابوں یا پیروکاروں سے یہ معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں ان میں سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام تھے، کیونکہ ان کی کتاب موجود تھی اور ان کی امت کے لوگ بھی موجود تھے۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے والے قوم کے سردار تھے، جو حق واضح ہونے کے باوجود اپنے مال و جاہ کی وجہ سے آپ کو حقیر کہہ کر آپ ﷺ کو رسالت کا اہل ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دلانے کے لیے یہ واقعہ ذکر فرمایا کہ یہی معاملہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کا تھا۔ فرعون نے بھی معجزات دیکھنے اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت دل سے ماننے کے باوجود ملک مصر کا مالک ہونے پر فخر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو ذلیل و حقیر قرار دے کر ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنا اور اپنے لشکروں سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ مقصد قریش اور عربوں کو فرعون جیسے برے انجام سے ڈرانا ہے۔

❷ "بِاٰيٰتِنَاۤ" میں آیات سے مراد عصا اور ید بیضا ہیں، کیونکہ سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے تو ان کے پاس یہی نشانیاں تھیں۔

❸ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : موسیٰ علیہ السلام نے وہ نشانیاں پیش کر کے فرعون کو رب ہونے کے دعوے سے منع کیا، اسے تمام پیغمبروں کی طرح توحید کی دعوت دی اور اکیلے رب العالمین پر ایمان لانے کا حکم دیا۔

آیت 47 فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ : "اِذَا" اچانک کے معنی میں ہے۔ یہاں کچھ عبارت

وَ مَا نُرِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝

**اور ہم انھیں کوئی نشانی نہیں دکھلاتے تھے مگر وہ اپنے جیسی (پہلی نشانی) سے بڑی ہوتی اور ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، تاکہ وہ لوٹ آئیں ۝ اور انھوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے لیے اپنے رب سے اس کے ذریعے دعا کر جو اس نے تجھ سے عہد کر رکھا ہے، بے شک ہم ضرور ہی سیدھی راہ پر آنے والے ہیں ۝**

محذوف ہے جو خود سمجھ میں آ رہی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے سرداروں کو رب العالمین کی توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انھوں نے کوئی نشانی پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ جب انھوں نے ان کے سامنے ہماری عطا کردہ نشانیاں عصا اور ید بیضا پیش کیں تو بجائے اس کے کہ وہ ان پر غور و فکر کرتے اور ایمان لے آتے، فوراً ہی ان پر ہنسنے اور ان کا مذاق اڑانے لگے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے، کیونکہ قریش کے سردار بھی آپ کی پیش کردہ نشانیاں دیکھ کر مذاق اڑاتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ بَلْ عَجِبْتَ وَ يَسْخَرُوْنَ ۝ وَ اِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝ وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۱۲ تا ۱٤ ] ”بلکہ تو نے تعجب کیا اور وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جب انھیں نصیحت کی جائے وہ قبول نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو خوب مذاق اڑاتے ہیں۔“

**آیت 48** وَ مَا نُرِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا …… : فرعون اور اس کے سرداروں نے جب موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہا اور ان کے معجزوں کو جادو قرار دے کر اپنے تمام ماہر جادوگر جمع کر کے ان کا مقابلہ کیا اور صاف شکست کے باوجود اپنے کفر پر اڑے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر قحط مسلط کر دیا۔ اس پر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے عذاب ہٹانے کی دعا کی درخواست کی اور قحط دور ہونے پر ایمان لانے کا اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ جب قحط دور ہوا تو وعدے سے مکر گئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر یکے بعد دیگرے کئی عذاب بھیجے، جن میں سے ہر ایک پہلے سے بڑی نشانی تھا اور ان عذابوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ کفر و تکبر سے پلٹ آئیں اور ایمان قبول کر لیں۔ تفصیل اس کی سورۂ اعراف (۱۳۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 49** ① وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ …… : یہاں یہ بات اختصار کے ساتھ ذکر ہوئی ہے، سورۂ اعراف میں تفصیل کے ساتھ ہے، فرمایا: ﴿ وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [ الأعراف : ۱۳٤ ] ”اور جب ان پر عذاب آتا تو کہتے اے موسیٰ! اپنے رب سے ہمارے لیے اس عہد کے واسطے سے دعا کر جو اس نے تیرے ہاں دے رکھا ہے، یقیناً اگر تو ہم سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ضرور ہی تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ضرور ہی بھیج دیں گے۔“

② یہاں ایک سوال ہے کہ اتنی مشکل گھڑی میں جب وہ عذاب میں گرفتار تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کر رہے تھے اس وقت بھی وہ موسیٰ علیہ السلام کو ”يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ“ (اے جادوگر!) کے ساتھ مخاطب کر رہے ہیں، حالانکہ اس وقت تو انھیں کسی

# فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾

## پھر جب ہم ان سے عذاب ہٹا لیتے، اچانک وہ عہد توڑ دیتے تھے ﴿۵۰﴾

اچھے لفظ سے مخاطب کرنا چاہیے تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام یہ صریح بہتان سن کر بھی انھیں کچھ نہیں کہتے، بلکہ ان کے لیے دعا کر کے انھیں عذاب سے نجات دلواتے ہیں۔ مفسرین نے اس کے کئی جواب دیے ہیں، یہاں ان میں سے دو جواب ذکر کیے جاتے ہیں۔ ابن کثیر نے فرمایا: ''ساحر سے مراد عالم ہے، یہی ابن جریر نے فرمایا ہے۔ ان کے زمانے کے علماء جادوگر ہی تھے اور ان کے ہاں جادو بری چیز نہ تھا، اس لیے انھوں نے یہ الفاظ تنقیص کے لیے نہیں کہے، کیونکہ ان کی مجبوری کی حالت اس سے مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ ان کے گمان کے مطابق یہ تعظیم کا لفظ تھا۔'' (ابن کثیر)

دوسرا جواب یہ ہے کہ انھوں نے خطاب '' یَا مُوْسٰی '' کے الفاظ کے ساتھ ہی کیا تھا، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت (۱۳۴) میں ہے، مگر وہ دل سے انھیں جادوگر سمجھتے تھے اور وہ جادو اور جادوگروں کو مذموم ہی سمجھتے تھے، جیسا کہ اس سے پہلے فرعون اور اس کے درباریوں نے صاف الفاظ میں کہا تھا: ﴿ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴾ [ المؤمن: ۲٤ ] ''تو انھوں نے کہا جادوگر ہے، بہت جھوٹا ہے۔'' اب ان کا حال دیکھیے کہ وہی شخص جسے وہ جادوگر سمجھتے تھے نہایت عاجزی کے ساتھ اسی سے دعا کی درخواست کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی درخواست کا ذکر فرماتے ہوئے ان کے دل کی حالت کا ذکر اپنے الفاظ میں فرمایا ہے۔ مقصود ان پر طعن ہے کہ جب جادوگر سمجھتے ہو اور ہمیشہ اسے اسی لفظ سے یاد کرتے ہو تو اس سے دعا کی درخواست کیسی؟ اور اگر مستجاب الدعاء کہتے ہو تو جادوگر کیوں سمجھتے ہو؟ یہ ایسے ہی ہے کہ قریش جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر کہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑاتے تھے، مشکل وقت میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست بھی کیا کرتے تھے، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کا حال بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: « وَ إِنَّ قُرَيْشًا أَبْطَئُوْا عَنِ الْإِسْلَامِ فَدَعَا عَلَيْهِمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوْسُفَ، فَأَخَذَتْهُمْ سَنَةٌ حَتّٰى هَلَكُوْا فِيْهَا، وَأَكَلُوا الْمَيْتَةَ وَالْعِظَامَ وَ يَرَى الرَّجُلُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ كَهَيْئَةِ الدُّخَانِ، فَجَاءَهُ أَبُوْ سُفْيَانَ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ ! جِئْتَ تَأْمُرُنَا بِصِلَةِ الرَّحِمِ، وَ إِنَّ قَوْمَكَ قَدْ هَلَكُوْا فَادْعُ اللّٰهَ »[ بخاري، التفسير، سورة الروم: ٤٧٧٤ ] ''قریش نے اسلام قبول کرنے میں دیر کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر بددعا کی: ''اے اللہ! ان کے خلاف یوسف (علیہ السلام) کے قحط والے سات سالوں جیسے سات سالوں کے ساتھ میری مدد فرما۔'' تو انھیں قحط نے آ لیا، یہاں تک کہ وہ اس میں برباد ہو گئے اور مردار اور ہڈیاں کھا گئے اور آدمی کو آسمان و زمین کے درمیان دھواں سا نظر آتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ابوسفیان آیا اور کہنے لگا: ''اے محمد! آپ ہمیں صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ آپ کی قوم برباد ہو گئی ہے، اس لیے اللہ سے دعا کیجیے۔'' اس حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے قحط دور ہوا تو پھر منکر ہو گئے۔ مجھے یہ دوسرا جواب بہتر معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت 50 فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ : '' إِذَا '' مفاجاتیہ ہے، جس کا معنی ''اچانک'' ہے، یعنی عذاب

وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی، اس نے کہا اے میری قوم! کیا میرے پاس مصر کی بادشاہی نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے تحت نہیں چل رہیں؟ تو کیا تم نہیں دیکھتے؟ ﴿۵۱﴾

ہٹتے ہی فوراً عہد توڑ دیتے۔ نہ سوچنے کی زحمت کرتے، نہ عہد توڑنے میں انھیں کوئی حیا مانع ہوتی تھی۔

آیت 51 ① وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ: فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھے، جن سے انھیں ان کی نبوت کا یقین ہو گیا، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے، بلکہ مقابلے میں جادوگروں کو لے آئے۔ اس میں منہ کی کھائی پھر بھی ایمان نہ لائے، پھر بطور نشانی کتنے عذاب ان پر آئے جو اس وعدے کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام سے دعا کروانے پر دور ہوئے کہ ہم عذاب دور ہونے پر ایمان لے آئیں گے اور تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے، مگر وہ کسی صورت موسیٰ علیہ السلام کو رسول ماننے پر تیار نہ تھے۔ ادھر انھیں خطرہ تھا کہ عوام ان معجزات کے نتیجے میں ان کی طرف مائل ہو جائیں گے، اس لیے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے رسالت کے اہل نہ ہونے کے اپنے خیال میں کئی دلائل گھڑے اور ابلاغ کے جتنے وسائل ہو سکتے تھے ان کے ساتھ پوری قوم میں ان کی منادی کروائی، جیسا کہ اس نے عصائے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے تمام شہروں میں آدمی بھیج کر جادوگر اکٹھے کیے تھے، فرمایا: ﴿ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ﴾ [ الشعراء : ۵۳ ] ”تو فرعون نے شہروں میں اکٹھا کرنے والے بھیج دیے۔“ ”فِيْ قَوْمِهٖ“ کے الفاظ اس منادی کی وسعت پر دلالت کر رہے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ سنانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم نہ کرنے کے لیے کفار نے جو دلائل تصنیف کیے ہیں وہ سبھی اس سے پہلے فرعون بھی پیش کر چکا ہے۔ وہ دلائل نہ اسے عذاب سے بچا سکے اور نہ ان لوگوں کو کفر پر اصرار کی صورت میں بچا سکیں گے۔

② قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ: یعنی برتری اور افضلیت کا پیمانہ دنیاوی مال و دولت اور حکومت و اقتدار ہے، جو موسیٰ کے پاس نہیں میرے پاس ہے۔ کیا میں مصر کے اقتدار کا مالک نہیں ہوں؟ دریائے نیل سے نکالی ہوئی نہروں کے ذریعے سے آب پاشی کا نظام میرے احکام کے تحت چل رہا ہے۔ یہی بات کفار مکہ نے کہی تھی: ﴿ لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [ الزخرف : ۳۱ ] کہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی عظیم آدمی پر اترنا چاہیے تھا۔

③ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ: مصر کے لوگ جو موسیٰ علیہ السلام کے کمالات اور معجزات دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے، فرعون انھیں اپنی مادی اور دنیوی شان و شوکت کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ حقیقت میں یہ اس کی شکست خوردگی کی دلیل ہے، کیونکہ یہ سب کچھ تو وہ مدت سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔

## اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ۬ وَّ لَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾

بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں، وہ جو حقیر ہے اور قریب نہیں کہ وہ بات واضح کرے ﴿۵۲﴾

آیت 52 ① اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ : " مَهُنَ يَمْهُنُ مَهَانَةً " ( ک ) کے معنی ہیں "حَقُرَ وَضَعُفَ." "مَهِيْنٌ" بروزن "فَعِيْلٌ" "حقیر، ضعیف۔ "اَمْ" سے پہلے ایک جملہ ہمزہ استفہام پر مشتمل ہوتا ہے، جو یہاں اس مفہوم کا ہوگا کہ ''کیا یہ شخص یعنی موسیٰ (علیہ السلام) بہتر ہے یا میں بہتر ہوں......؟'' "اَمْ" " بَلْ" کے معنی میں بھی آتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا: ''بلکہ میں بہتر ہوں......۔''

② فرعون موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر کے لیے زیادہ سے زیادہ جو الفاظ استعمال کر سکتا تھا اس نے وہ کہے۔ ان میں سے لفظ "هٰذَا" بھی حقارت کے اظہار کے لیے ہے، یعنی ''اس شخص سے جو حقیر ہے۔'' وہ موسیٰ علیہ السلام کو اس لیے حقیر کہہ رہا تھا کہ ان کے پاس اس جیسی نہ دولت تھی نہ قوت و سلطنت، بلکہ وہ اس کی غلام قوم کے ایک فرد تھے اور غلام تو حقیر ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ عجیب حقیر شخص تھا جس سے فرعون بھی شدید خوف زدہ تھا، ہر عذاب پر اس کے سامنے دعا کے لیے منت و سماجت کرتا تھا، اپنی ساری شان و شوکت، قوت و اقتدار اور افواجِ قاہرہ کے باوجود اسے اپنے دربار میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا تھا، جب کہ اس کے پاس فوج تھی نہ اسلحہ، صرف ایک عصا ہاتھ میں لیے جب چاہتا اس کے سر پر پہنچ جاتا۔ اور یہ عجیب حقیر شخص تھا جس کے متعلق وہ اپنے سرداروں سے کہتا تھا: ''مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں۔'' (دیکھیے مومن: ۲۶) حالانکہ کسی نے اسے قتل کرنے سے نہیں روکا تھا اور فرعون میں یہ جرأت نہیں تھی کہ انھیں ہاتھ بھی لگا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا مال یا اقتدار حقارت یا عظمت کا پیمانہ ہے ہی نہیں اور نہ ہی موسیٰ علیہ السلام حقیر تھے، بلکہ وہ ظالم خود ہی حقیر و ذلیل تھا جو دنیا کے عارضی متاع پر مغرور ہو کر حق سے انکار پر اَڑا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کفار بھی دنیا کی دولت نہ ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہونا قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

③ وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ : بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا اشارہ اس لکنت کی طرف تھا جو موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں پائی جاتی تھی، مگر یہ بات درست نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے بعد وہ لکنت دور ہو گئی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰ! تمھاری دعا قبول کر لی گئی ہے۔ (دیکھیے طٰہٰ: ۳۶) قرآن مجید میں فرعون کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے کئی مناظرے مذکور ہیں، جن میں انھوں نے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں اپنا مدعا بیان فرمایا اور ہر موقع پر فرعون کو لاجواب کیا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی مدد کے لیے ہارون علیہ السلام کو زیادہ فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے مانگ کر لیا تھا، مگر کہیں بھی انھیں اظہار مقصد کے لیے ہارون علیہ السلام کی ضرورت نہیں پڑی۔ رہا فرعون کا ان کے متعلق کہنا کہ ''قریب نہیں کہ وہ اپنی بات واضح کر سکے'' تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کفار و مشرکین کی سمجھ میں پیغمبروں کی بات آتی ہی نہیں، جیسا کہ شعیب علیہ السلام جیسے زبردست خطیب کو ان کی قوم نے کہا: ﴿ يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ﴾ [ هود : ۹۱ ] ''اے شعیب! ہم اس میں سے بہت سی باتیں نہیں سمجھتے جو تو

فَلَوْ لَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

پس اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے، یا اس کے ہمراہ فرشتے مل کر کیوں نہیں آئے؟ ﴿۵۳﴾

کہتا ہے اور بے شک ہم تو تجھے اپنے درمیان بہت کمزور دیکھتے ہیں۔'' فرعون موسیٰ علیہ السلام پر وہی دو طعن کر رہا تھا جو اس سے پہلے شعیب علیہ السلام پر ان کی قوم نے کیے تھے کہ بات سمجھ میں نہ آنا اور ان کی نگاہ میں ان کا حقیر اور ضعیف ہونا۔ ہمارے نبی ﷺ کی بات بھی مشرکین کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، نہ ہی وہ اپنے جیسے دولت مندوں کی موجودگی میں آپ ﷺ کو نبی ماننے کے لیے تیار تھے، فرمایا: ﴿ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ﴾ [ ص : ٤ تا ٩ ] ''اور انھوں نے اس پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا اور کافروں نے کہا یہ ایک سخت جھوٹا جادوگر ہے۔ کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے۔ اور ان کے سرکردہ لوگ چل کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو، یقیناً یہ تو ایسی بات ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہ بات آخری ملت میں نہیں سنی، یہ تو محض بنائی ہوئی بات ہے۔ کیا ہمارے درمیان میں سے اسی پر نصیحت نازل کی گئی ہے؟ بلکہ وہ میری نصیحت سے شک میں ہیں، بلکہ انھوں نے ابھی تک میرا عذاب نہیں چکھا۔ کیا انھی کے پاس تیرے رب کی رحمت کے خزانے ہیں، جو سب پر غالب ہے، بہت عطا کرنے والا ہے۔''

آیت 53 فَلَوْ لَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ...... : ''اَسْوِرَةٌ'' ''سِوَارٌ'' کی جمع ہے، کنگن۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ نہ موسیٰ علیہ السلام سونے کے کنگن پہنیں گے، نہ ان کے ساتھ فرشتے آئیں گے اور نہ ہمیں ان پر ایمان لانا پڑے گا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے لیے بھی کفار نے دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ سونے کے مکان اور اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لانے کی شرط عائد کی تھی، فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ﴾ [ بني إسرائيل : ٩٠ تا ٩٣ ] ''اور انھوں نے کہا ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کرے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پس تو اس کے درمیان نہریں جاری کر دے، خوب جاری کرنا۔ یا آسمان کو ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے، جیسا کہ تو نے دعویٰ کیا ہے، یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے۔''

حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت ایک تھی اور سبھی کو دعوت کے سلسلے میں ایک جیسے مراحل سے گزرنا پڑا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے پیغمبروں خصوصاً موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بار بار بیان فرمائے ہیں، تاکہ آپ ﷺ کو تسلی ہو اور آپ صبر و استقامت

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

ع ۱۱/۵

پس اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے ﴿۵۴﴾ پھر جب انھوں نے ہمیں سخت غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا، پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا ﴿۵۵﴾ پس ہم نے انھیں پیچھے آنے والوں کے لیے پیش رو اور مثال بنا دیا ﴿۵۶﴾

سے کام لیں اور آپ کے زمانے کے کفار کو پہلی کافر اقوام کے انجام سے عبرت ہو اور وہ کفر سے باز آ جائیں۔

آیت 54 ① فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ: لفظی معنی ہے ''اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا۔'' یعنی اس نے اپنی قوم کے لوگوں کی رائے کو کوئی وزن نہ دیا اور نہ ہی انھیں اپنی عقل سے سوچنے سمجھنے کا موقع دیا، بلکہ انھیں مجبور کیا کہ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا لیں۔ (دیکھیے مومن: ۲۹) چنانچہ وہ انھیں پھسلانے اور اُلّو بنانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ سب اس کے پیچھے لگ گئے۔

● اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: ''اِنَّ'' تعلیل کے لیے ہوتا ہے، یعنی انھوں نے اس کی اطاعت اس لیے اختیار کی کہ فسق و فجور ان کی سرشت بن چکا تھا۔ وہ گمراہی کے راستے پر ہی چل سکتے تھے، سیدھی راہ پر چلنا ان کے بس کی بات ہی نہ تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ﴾ [ الأعراف: ١٤٦ ] ''عنقریب میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں حق کے بغیر بڑے بنتے ہیں اور اگر ہر نشانی دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لاتے اور اگر بھلائی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے راستہ نہیں بناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اسے راستہ بنا لیتے ہیں، یہ اس لیے کہ انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے۔''

آیت 55 فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ......: اس آیت سے ظاہر ہے کہ غصے ہونا اور انتقام لینا بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جیسا کہ راضی ہونا اور انعام دینا اس کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی اور عذاب کے ساتھ بھی انھیں ہلاک کر سکتا تھا، مگر فرعون نے نہروں کے اپنے تحت چلنے پر فخر کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے پانی ہی میں غرق کر کے انتقام لیا۔ عموماً انسان جس چیز پر فخر کرتا ہے اللہ کی طرف سے وہی چیز اس کی ہلاکت کا سامان بن جاتی ہے۔

آیت 56 فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ: ''سَلَفًا'' ''سَالِفٌ'' کی جمع ہے، جیسے ''خَادِمٌ'' اور ''حَارِسٌ'' کی جمع ''خَدَمٌ'' اور ''حَرَسٌ'' ہے۔ ''سالف'' اسے کہتے ہیں جو وجود میں یا کسی عمل یا کسی جگہ میں دوسرے سے پہلے ہو۔ چونکہ

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾

اور جب ابن مریم کو بطور مثال بیان کیا گیا، اچانک تیری قوم (کے لوگ) اس پر شور مچا رہے تھے ﴿۵۷﴾

یہاں ذکر انتقام کا آیا ہے، اس لیے "سَلَفًا" سے مراد وہ ہیں جو انتقام میں پہلے ہیں، یعنی ان کے بعد والوں کو بھی ان جیسے انتقام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ "مَثَلًا" کا معنی مشابہ چیز ہے، مراد عبرت ہے جو اپنے جیسے لوگوں کو دیکھ کر لی جاتی ہے کہ اگر ہم نے ان جیسے عمل جاری رکھے تو ہمارا انجام بھی وہی ہوگا۔ "لِلْاٰخِرِيْنَ" وہ لوگ جو اس کلام میں مذکور آلِ فرعون کے ساتھ آخری مشابہ ہیں۔ مراد رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والے مشرکین ہیں، کیونکہ بت پرستی اور رسول کو جھٹلانے میں ان کے آخری مشابہ وہی ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم نے انھیں ان آخری مشرکوں کے لیے عبرت بنا دیا، اس لیے ان پر لازم ہے کہ ان کے انجام سے نصیحت حاصل کریں۔

**آیت 57** وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا ...... : رسول اللہ ﷺ جس طرح تمام پیغمبروں کا ذکر عزت و اکرام کے ساتھ کرتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی ہمیشہ عزت و تکریم کے ساتھ کرتے اور ان کی مثال آدم علیہ السلام کے ساتھ دیا کرتے تھے کہ جس طرح ماں باپ کے بغیر آدم علیہ السلام کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے اسی طرح باپ کے بغیر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی اس کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے۔ مدینہ جانے کے بعد وفد نجران کی آمد پر سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [ آل عمران : ۵۹ ] "بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے کہ اسے تھوڑی سی مٹی سے بنایا، پھر اسے فرمایا ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے۔"

پچھلی آیات میں مشرکین مکہ کے فرشتوں کی عبادت پر رد کے بعد فرمایا تھا: ﴿ وَ سْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [ الزخرف : ۴۵ ] "اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں جن کی عبادت کی جائے؟" اس پر مشرکین میں سے کسی نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے معبود ہونے کا اعتراض جڑ دیا۔ ساتھ ہی دوسرے مشرکین نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسیح (علیہ السلام) کو دیکھو! نصرانی ان کی عبادت کرتے ہیں، پھر بھی مسلمان ان کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ ہمارے بت اور دیوی دیوتا فرشتے ہیں، کیا ہمارے معبود فرشتے بہتر ہیں یا نصرانیوں کے معبود عیسیٰ (علیہ السلام) بہتر ہیں؟ پھر ان کا نام عزت کے ساتھ کیوں لیا جاتا ہے اور ہمارے بتوں کو برا کیوں کہا جاتا ہے؟ میں نے بہت غور و فکر اور متعدد تفاسیر کے مطالعہ کے بعد آیات کے الفاظ اور سیاق و سباق کو ملحوظ رکھ کر جو تفسیر سمجھی ہے ذکر کر دی ہے۔ (واللہ اعلم) ابن عاشور نے فرمایا: "یہ مقام قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے۔" شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: "یعنی قرآن میں ان کا ذکر آوے تو اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو بھی خلق پوجتے ہیں، انھیں کیوں خوبی سے یاد کرتے ہو اور ہمارے پوجوں (معبودوں، بتوں) کو برا کہتے ہو۔" (موضح)

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور انھوں نے کہا کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟ انھوں نے تیرے لیے یہ (مثال) صرف جھگڑنے ہی کے لیے بیان کی ہے، بلکہ وہ جھگڑالو لوگ ہیں ﴿۵۸﴾

58 ① وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ : اس جملے کی وضاحت اوپر کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔

② مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ : یعنی ان مشرکین نے مسیح علیہ السلام کا ذکر محض جھگڑے کے لیے کیا ہے، ورنہ وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان ان کا عزت و تکریم سے ذکر معبود ہونے کے لحاظ سے نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ ہونے کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں ہی سخت جھگڑالو کہ متکلم کی مراد اپنے پاس سے گھڑ کر جھگڑنا اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔

اکثر مفسرین نے ان آیات کی شانِ نزول یہ بیان فرمائی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ [ الأنبیاء : ۹۸ ] (بے شک تم اور جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں) تو عبد اللہ بن زبعری کہنے لگا کہ اللہ کے سوا تو عیسیٰ ابن مریم کی پوجا بھی کی جاتی ہے، اگر وہ جہنم میں گئے تو ہمیں اپنے معبودوں کا جہنم میں جانا بھی منظور ہے۔ یہ سنتے ہی مشرکین نے بہت شور مچایا کہ محمد (ﷺ) لاجواب ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۱۰۱ ] "بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی طے ہو چکی وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں گے۔" اور اس سورت کی آیت (۵۷) نازل ہوئی: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴾ "اور جب ابن مریم کو بطورِ مثال بیان کیا گیا، اچانک تیری قوم کے لوگ اس پر شور مچا رہے تھے۔" [ "زِبَعری" زاء کے کسرہ، باء کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے، راء کے بعد الف مقصورہ ہے، یہ عبد اللہ بن زبعری بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ]

اور یہ تفسیر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند کے ساتھ مروی ہے۔ [ دیکھیے مشکل الآثار، باب بیان مشکل ما روي عن رسول اللہ ﷺ في المراد بقول اللہ عزوجل : ﴿ إنکم و ما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم ﴾، ح : ۹۸۶ ] مسند احمد میں یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش سے کہا: (( يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ ! إِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ يُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فِيْهِ خَيْرٌ )) "اے جماعتِ قریش! حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کی جاتی جس میں کوئی خیر ہو۔" انھوں نے کہا: "اے محمد! کیا تم یہ نہیں کہتے کہ عیسیٰ نبی تھا اور اللہ کے بندوں میں سے نیک بندہ تھا، تو اگر تم سچے ہو تو مسیح اور ان کے معبود ایک جیسے ہو گئے۔" (یہ کہہ کر انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴾ [ الزخرف : ۵۷ ] "جب ابن مریم کو بطورِ مثال بیان کیا گیا، اچانک تیری قوم کے لوگ اس پر شور مچا رہے تھے۔" [ مسند أحمد : ۳۱۸/۱، ح : ۲۹۲۴ ] مسند کے محققین نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

اِنۡ هُوَ اِلَّا عَبۡدٌ اَنۡعَمۡنَا عَلَيۡهِ وَجَعَلۡنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۞ وَلَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ مَّلٰٓئِكَةً فِى الۡاَرۡضِ يَخۡلُفُوۡنَ ۞

نہیں ہے وہ مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک مثال بنا دیا ۞ اور اگر ہم چاہیں تو ضرور تمھارے عوض فرشتے بنا دیں، جو زمین میں جانشین ہوں ۞

واضح رہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ تفسیر اس تفسیر کے خلاف نہیں جو آیات کے سیاق کے لحاظ سے اوپر کی گئی ہے، کیونکہ اصول تفسیر میں یہ بات مسلّم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "نَزَلَتْ فِي كَذَا" (یہ آیت فلاں کے بارے میں نازل ہوئی) ان واقعات کے متعلق بھی فرما دیتے ہیں جن پر کوئی آیت منطبق ہوتی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے مواقع پر پہلے اتری ہوئی کوئی آیت پڑھ دیتے تھے۔ ظاہر ہے مشرکین جن کی عادت ہی جھگڑنا اور کج بحثی کرنا تھا، جھگڑنے کا کوئی موقع کم ہی ہاتھ سے جانے دیتے تھے۔ ان مواقع میں سے ایک موقع: ﴿ اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ [الأنبیاء: ۹۸] کا نزول بھی تھا، اس پر کفار نے جو شور مچایا، آیت: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابۡنُ مَرۡيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوۡمُكَ مِنۡهُ يَصِدُّوۡنَ ﴾ اس پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔

**آیت 59** ❶ اِنۡ هُوَ اِلَّا عَبۡدٌ ......: یعنی مسیح علیہ السلام کا اکرام ان کے معبود ہونے کی وجہ سے نہیں، کیونکہ نہ وہ رب تھے نہ رب کے بیٹے، بلکہ صرف عبد بمعنی اللہ کا غلام اور اس کی بندگی کرنے والا ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ قصر قلب ہے، یعنی مسیح وہ کچھ نہیں جو نصاریٰ یا دوسرے مشرک کہہ رہے ہیں، بلکہ وہ صرف بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا ہے۔

❷ اَنۡعَمۡنَا عَلَيۡهِ: ان انعامات میں سے چند انعامات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیات (۱۱۰ تا ۱۱۵) میں اور سورۂ آل عمران کی آیات (۴۵، ۴۶) میں اور دوسری آیات میں فرمایا ہے۔

❸ وَجَعَلۡنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ: بنی اسرائیل کے لیے مثال بنانے سے مراد ان کے لیے نمونۂ قدرت بنانا ہے کہ انھیں باپ کے بغیر پیدا کیا اور انھیں ایسے معجزات عطا فرمائے جو ان کے زمانے میں کسی کو نہیں ملے، جنھیں دیکھ کر لوگوں کو ان کی نبوت کا یقین ہوتا تھا۔

**آیت 60** وَلَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ ......: یعنی اس زمین پر انسان باپ اور ماں سے پیدا ہوتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو اس سے وہ معبود نہیں بن گئے، بلکہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح مخلوق ہیں، جیسا کہ فرشتے ماں باپ کے بغیر پیدا ہونے اور آسمانوں پر رہنے کے باوجود مخلوق ہیں، معبود نہیں بن گئے۔ بلکہ اگر ہم چاہیں تو تمھاری جگہ ان کو زمین پر لا کر تمھارے جانشین بنا دیں، نہ تم انکار کر سکتے ہو نہ انھیں انکار کی مجال ہے، تو وہ معبود کیسے بن گئے۔ اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو تمھیں ہلاک کر دیں اور تمھاری جگہ فرشتوں کو لے آئیں جو زمین کو آباد کریں اور ہماری عبادت کریں۔

وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾

اور بلاشبہ وہ یقیناً قیامت کی ایک نشانی ہے تو تم اس میں ہرگز شک نہ کرو اور میرے پیچھے چلو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۶۱﴾

آیت 61 ❶ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ : "عِلْمٌ" سے مراد علم کا ذریعہ اور نشانی ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور پہلی مرتبہ دنیا میں آنا تو خاص بنی اسرائیل کے لیے ایک نشان تھا، دوبارہ آنا قیامت کا نشان ہوگا۔ ان کے نزول سے لوگ معلوم کریں گے کہ اب قیامت بالکل قریب آ گئی ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "اس سے مراد قیامت سے پہلے ان کا نزول ہے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ۱۵۹] "اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر اس کی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔" اس معنی کی تائید دوسری قراءت "وَ إِنَّهُ لَعَلَمٌ لِلسَّاعَةِ" سے بھی ہوتی ہے، یعنی وہ قیامت واقع ہونے کا ایک نشان اور دلیل ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا، "وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ" یعنی قیامت کی ایک نشانی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا قیامت سے پہلے نکلنا ہے۔ ایسے ہی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابوالعالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہ سے مروی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر احادیث آئی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے پہلے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے عادل و منصف امام بن کر نازل ہونے کی خبر دی۔" (ابن کثیر)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ، لَيُوْشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيْكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا، فَيَكْسِرَ الصَّلِيْبَ، وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيْرَ، وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ، وَ يَفِيْضَ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ، حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا، ثُمَّ يَقُوْلُ أَبُوْ هُرَيْرَةَ وَاقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ : ﴿ وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ۱۵۹] )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب نزول عيسى ابن مريم عليهما السلام : ۳۴۴۸ ] "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً قریب ہے کہ تم میں ابن مریم (علیہ السلام) انصاف کرنے والا حاکم بن کر نازل ہو، پھر وہ صلیب توڑ دے گا اور خنزیر کو قتل کرے گا اور جزیہ ختم کرے گا اور مال عام ہو جائے گا، حتیٰ کہ اسے کوئی قبول نہیں کرے گا، حتیٰ کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔" پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے: "اور اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: "اور اہل کتاب میں کوئی نہیں مگر وہ اس کی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔" سورۂ نساء کی آیت (۱۵۸، ۱۵۹) کی تفسیر پر بھی نگاہ ڈال لیں۔

● "وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ" کا مطلب یہ بھی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا وجود قیامت قائم ہونے کی نشانی اور دلیل ہے، کیونکہ وہ عام دستور کے خلاف باپ کے بغیر پیدا ہوئے، پھر وہ اللہ کے اذن سے مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت کا نشان ہیں کہ وہ قیامت برپا کرنے پر بھی یقیناً قادر ہے۔

● بعض مفسرین نے "ہٗ" ضمیر سے مراد قرآن لیا ہے۔ ابن عاشور نے فرمایا: "وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ" کا عطف "وَ اِنَّهٗ

وَ لَا یَصُدَّنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۶۲﴾ وَ لَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۶۳﴾

اور کہیں شیطان تمھیں روک نہ دے، بے شک وہ تمھارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۶۲﴾ اور جب عیسیٰ واضح دلیلیں لے کر آیا تو اس نے کہا بے شک میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ باتیں واضح کر دوں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ﴿۶۳﴾

لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ" پر ہے، یعنی یہ قرآن تمھارے لیے قیامت کا علم حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، جس سے تمھیں اس کے قیام اور اس میں پیش آنے والے معاملات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔'' ابن کثیر نے قتادہ، حسن بصری اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ کا یہی قول بیان کیا ہے کہ "ہٗ" ضمیر سے مراد قرآن ہے۔

④ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا ...... : یعنی قرآن تمھیں قیامت کے وقوع سے آگاہ کرتا ہے، اس لیے تم اس میں ہرگز شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہ صراط مستقیم ہے جس کی میں تمھیں دعوت دیتا ہوں۔

آیت 62 وَ لَا یَصُدَّنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ ...... : یعنی دیکھنا شیطان اپنے ہتھکنڈوں کے ساتھ تمھیں قیامت پر ایمان سے روک نہ دے، کیونکہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اس نے کبھی اپنی عداوت کو چھپایا نہیں، بلکہ ڈنکے کی چوٹ آدم (علیہ السلام) اور اس کی اولاد کو گمراہ کرتے رہنے کا اعلان کیا، اس لیے تم بھی اسے دشمن سمجھو اور اس سے خبردار رہو۔ (دیکھیے فاطر: ٦۔ کہف: ٥٠) معلوم ہوا جو شخص قیامت کے بارے میں شک کرتا ہے وہ شیطان کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ شیطان کی بہت بڑی دشمنی اور گمراہ کرنا یہ ہے کہ وہ کسی شخص کو قیامت پر یقین سے محروم کر دے۔ شیطان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات پر سیدھا چلتا جائے، ادھر ادھر بالکل توجہ نہ دے۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ نے انھیں قیامت کے آنے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ہی تاکید فرمائی کہ دیکھنا، وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں رکھتے تمھیں اس پر ایمان سے روک نہ دیں، ورنہ انجام ہلاکت ہوگا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۵، ۱۶)۔

آیت 63 ① وَ لَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ : "اَلْبَيِّنَاتُ" "بَيِّنَةٌ" کی جمع ہے، واضح، روشن چیز۔ یہ محذوف موصوف کی صفت ہے جو معجزات بھی ہیں، دلائل بھی اور آیات بھی۔ یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام واضح اور روشن معجزات، توحید الٰہی اور اپنی رسالت کے واضح دلائل اور اللہ تعالیٰ کی واضح اور روشن آیات لے کر آئے۔

② قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ : "اَلْحِكْمَةُ" محکم اور پکی بات، دانائی کی بات جو صحیح عقل کے عین مطابق ہو۔

③ وَ لِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ...... : یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام بینات لے کر بنی اسرائیل کے پاس آئے تو انھیں بتایا کہ میں تمھارے پاس اللہ کی شریعت لے کر آیا ہوں، جو نہایت محکم اور مضبوط ہے اور سراسر دانائی پر مشتمل ہے، تاکہ وہ تمھیں سکھاؤں اور تاکہ بعض باتیں جن میں تمھارے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے ان میں محکم اور پختہ بات کے ساتھ حق

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝

**بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ۝ پھر کئی گروہوں نے ان میں اختلاف کیا، سوان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے بڑی ہلاکت ہے ۝**

واضح کر دوں۔ بعض اس لیے فرمایا کہ پیغمبر کا کام دینی احکام کی رہنمائی ہے، دنیوی معاملات مثلاً تجارت، زراعت اور صنعت وغیرہ کو لوگوں کے تجربہ وعقل پر رہنے دیا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ )) [ مسلم، الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا...... : ۲۳۶۳ ] ''اپنا دنیاوی معاملہ تم بہتر جانتے ہو۔'' یا بعض اس لیے فرمایا کہ بعض کا فیصلہ آخری پیغمبر کے آنے پر چھوڑ دیا گیا۔

واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں توحید، قیامت اور مختلف اشیاء کی حلت وحرمت کے بارے میں کئی طرح کا اختلاف پیدا ہو گیا تھا، مثلاً ان میں سے کچھ حق پر قائم تھے تو بعض عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے لگ گئے تھے۔ قیامت کے متعلق انھوں نے ایسے عقائد گھڑ لیے تھے جن سے اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہی کا معاملہ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مثلاً ان کا کہنا: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ﴾ [ المائدۃ : ۱۸ ] ''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔'' یعنی ہم بنی اسرائیل اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں ( جس طرح مسلمانوں میں کئی سید بادشاہ اپنے بارے میں باور کرواتے ہیں ) اور یہ کہ جنت ہمارا حق ہے، اگر جہنم میں گئے بھی تو چند روز کے لیے جائیں گے۔ کچھ چیزیں ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان پر حرام کی گئی تھیں، کچھ ان کے احبار ورہبان نے حرام کر دی تھیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمھارے ان اختلافات میں حق واضح کرنے کے لیے آیا ہوں، اس لیے تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

**آیت 64** ① **اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ :** یہ ہے وہ حکمت جس کے لیے تمام انبیاء مبعوث ہوئے۔ ''رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ'' خبر معرفہ ہونے کی وجہ سے حصر پیدا ہو رہا ہے اور ضمیر فصل ''هُوَ'' لانے سے تاکید مزید ہو گئی ہے کہ میرا رب اور تمھارا رب صرف اللہ ہے، کوئی فرشتہ یا پیغمبر یا کوئی اور رب نہیں۔

② **فَاعْبُدُوْهُ :** فاء تعلیل کے لیے ہے، یعنی جب ''رب'' (پرورش کرنے والا ) صرف اللہ تعالیٰ ہے تو عبادت بھی اسی کی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ میں خود اللہ ہوں یا اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہوں، اس لیے تم میری عبادت کرو، بلکہ ان کی دعوت وہی تھی جو تمام انبیاء (علیہم السلام ) کی تھی اور جس کی طرف محمد (ﷺ) تمھیں بلا رہے ہیں۔

**آیت 65** ① **فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ :** عیسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے باوجود بنی اسرائیل اختلاف سے باز نہیں آئے، بلکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کے بارے میں مزید گروہوں میں بٹ گئے۔ بعض نے انھیں سچا رسول تسلیم کر لیا اور بعض نے انھیں جھوٹا اور مکار قرار دیا۔ پھر انکار کرنے والے کئی اس حد تک جا پہنچے کہ ان کی والدہ پر تہمت لگا کر انھیں ولد الزنا

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝

وہ قیامت کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان پر اچانک آ جائے اور وہ سوچتے بھی نہ ہوں ۝ سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ ۝

قرار دیا اور اس قدر مخالفت کی کہ اپنے گمان میں صلیب پر چڑھا کر دم لیا۔ اور ایمان لانے والے اگر کچھ راہِ راست پر رہے تو بعض نے انھیں اللہ تعالیٰ کا بیٹا، بعض نے تین خداؤں میں سے ایک اور بعض نے اللہ ہی قرار دے لیا اور ہر فرقے نے ایسی ہٹ دھرمی سے کام لیا کہ بے شمار فرقے وجود میں آ کر ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ "مِنْۢ بَيْنِهِمْ" کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف کا باعث بیرونی نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی تھے۔

② فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ : ظلم کرنے والوں سے مراد وہ گروہ ہیں جنھوں نے انھیں جھوٹا قرار دیا اور وہ بھی جنھوں نے ان کی عقیدت میں غلو اختیار کرتے ہوئے انھیں اللہ کا بیٹا یا خود اللہ قرار دے کر شرک کا ارتکاب کیا۔ " يَوْمٍ اَلِيْمٍ " سے مراد قیامت کا دن ہے۔

آیت 66 ① هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً : یہ اس سوال کا جواب ہے جو پچھلی آیت کے آخری جملے سے پیدا ہو سکتا ہے کہ ظالموں کے لیے "ویل" (ہلاکت) کا وہ دن کب ہو گا اور اس عذابِ الیم کی کیفیت کیا ہو گی؟ جواب یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے، جلدی آئے یا دیر سے، اس لیے اس کی تیاری کرو، اس بحث میں مت پڑو کہ وہ کب آئے گی۔ "بَغْتَةً" (اچانک) کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمھیں اس کے آنے کا وقت معلوم نہیں ہو سکتا، کیونکہ جس کے آنے کا وقت معلوم ہو جائے وہ اچانک نہیں ہوتی۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۷) اور سورۂ یٰس (۴۹، ۵۰)۔

② وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ : یہاں ایک سوال ہے کہ "بَغْتَةً" (اچانک) کے لفظ کے بعد "وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ" کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسی چیزیں بھی اچانک آ جاتی ہیں جن کے متعلق انسان سوچ رہا ہوتا ہے اور ایک جواب یہ ہے کہ یہ "بَغْتَةً" کی تاکید ہے۔

آیت 67 ① اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : یہ اس دن کے عذابِ الیم کی ہولناکی کا کچھ بیان ہے۔ اس دن متقین کے سوا تمام دلی دوستوں کے ایک دوسرے کے دشمن ہو جانے کا خاص طور پر ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ مشرکین نے دنیا میں ایک دوسرے کی دوستی ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں ایکا کیا ہوا تھا اور باہمی گٹھ جوڑ ہی کی وجہ سے شرک پر جمے ہوئے تھے۔ یہی دوستی قیامت کے دن دشمنی میں بدل جائے گی اور ہر شخص دوسرے کو اپنی بربادی کا باعث قرار دے گا اور کہے گا: ﴿ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴾ [ الفرقان : ۲۸ ] "ہائے میری بربادی! کاش کہ میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا۔" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب نقل فرمایا: ﴿ وَ قَالَ اِنَّمَا

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَ لَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۶۸ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۶۹ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝۷۰

اے میرے بندو! آج نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے ۝۶۸ وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور وہ فرماں بردار تھے ۝۶۹ جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمھاری بیویاں، تم خوش کیے جاؤ گے ۝۷۰

---

اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [ العنکبوت : ۲۵ ] ”اور اس نے کہا بات یہی ہے کہ تم نے اللہ کے سوا بت بنائے ہیں، دنیا کی زندگی میں آپس کی دوستی کی وجہ سے، پھر قیامت کے دن تم میں سے بعض بعض کا انکار کرے گا اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت کرے گا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہی ہے اور تمھارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔“

❷ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ : متقین کی دوستی اس دن بھی قائم رہے گی، کیونکہ اس کا باعث اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ دوسرے تمام دوستوں کی دوستی کا باعث کوئی نہ کوئی دنیوی مفاد ہوتا ہے جس کے ختم ہونے کے ساتھ دوستی بھی ختم ہو جائے گی بلکہ دشمنی میں بدل جائے گی، کیونکہ وہ دوستی ہی اس دن کے عذاب کا باعث بنی۔

**آیت 68** يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ...... : قیامت کے دن باہمی محبت کرنے والے متقین کو ملنے والی نعمتوں کا ذکر ہے، جن میں سے سب سے پہلی اللہ تعالیٰ کا ”اے میرے بندو!“ کہہ کر محبت سے خطاب ہے، پھر خوف اور غم سے مکمل نجات ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۲)۔

**آیت 69** اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا ...... : اس میں ان لوگوں کی چند صفات بیان فرمائیں جو قیامت کے دن خوف اور غم سے آزاد ہوں گے۔ آیت کے الفاظ سے یہاں ایمان اور اسلام کا الگ الگ ہونا ظاہر ہے۔ (دیکھیے حجرات: ۱۴) البتہ جب کہیں اکیلے ایمان یا اسلام کا ذکر آئے تو دونوں ایک ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ہماری آیات پر یقین کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی پوری طرح تابع فرمان تھے۔

**آیت 70** ❶ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ : ”اَزْوَاجُكُمْ“ کی تفسیر میں دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو دنیا میں ان کے ہم مشرب اور ساتھی رہے۔ دوسری یہ کہ مراد ان کی بیویاں ہیں جنھوں نے نیک اعمال میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ دونوں بیک وقت بھی مراد ہو سکتے ہیں، مگر بیویاں مراد لینا زیادہ قریب ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ان کا بار بار ذکر ہے اور ان کے ساتھ مل کر جانے میں جو لذت اور خوشی ہے وہ دوسرے ہم مشرب ساتھیوں کے ساتھ نہیں۔ دیکھیے سورۂ یٰس (۵۶،۵۵)، دخان (۵۴)، واقعہ (۲۳،۲۲)، رحمان (۷۰ تا ۷۲)، صافات (۴۸) اور سورۂ ص (۵۲)۔

❷ تُحْبَرُوْنَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ روم کی آیت (۱۵) کی تفسیر۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ ۚ وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾

ان کے گرد سونے کے تھال اور پیالے لے کر پھرا جائے گا اور اس میں وہ چیز ہوگی جس کی دل خواہش کریں گے اور آنکھیں لذت پائیں گی اور تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو ﴿۷۱﴾ اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، اس کی وجہ سے جو تم عمل کرتے تھے ﴿۷۲﴾ تمھارے لیے اس میں بہت سے میوے ہیں، جن سے تم کھاتے ہو ﴿۷۳﴾ بے شک مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۷۴﴾

**آیت 71** ① **يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ** : "صِحَافٌ" "صَحْفَةٌ" کی جمع ہے، تھال جو بہت بڑا نہ ہو، رکابیاں۔ "اَكْوَابٍ" "كُوْبٌ" کی جمع ہے، پینے کا برتن جس کی دستی نہ ہو، ایسے برتن دستی نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ صاف ہوتے ہیں۔ تھالوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے ہوں گے اور پیالوں میں طرح طرح کی پینے کی چیزیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا: "صِحَافٌ" جمع کثرت ہے اور "اَكْوَابٍ" جمع قلت، کیونکہ کھانے کے برتن پینے کے برتنوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔

② **وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حم سجدہ (۳۱) اور سورۂ سجدہ (۱۷)۔

③ **وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ** : آنکھوں کی لذت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

**آیت 72** **وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا......** : اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۴۳)، مومنون (۱۰، ۱۱) اور سورۂ مریم (۶۳)۔

**آیت 73** **لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ** : انسان کی مطلوبہ چیزوں یعنی کھانے پینے، نکاح اور آرام و آسائش وغیرہ میں سب سے عام ضرورت اور طلب کھانے کی چیزوں کی ہوتی ہے، جن میں پھلوں کو خاص مقام حاصل ہے، کیونکہ لذت میں انھیں بہت برتری حاصل ہے۔ "فَاكِهَةٌ" کے لفظ ہی میں لذت کا مفہوم شامل ہے۔ دنیا میں فواکہ جتنے بھی ہوں کم ہیں، جبکہ آخرت میں مسلمانوں کے لیے فواکہ کثیر تعداد میں ہوں گے، جو اتنے وافر ہوں گے کہ وہ ان میں سے کچھ ہی کھا سکیں گے، یعنی "مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ" اور وہ کبھی ختم نہیں ہوں گے، فرمایا: ﴿لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ﴾ [ الواقعۃ : ۳۳ ] "جو نہ کبھی ختم ہوں گے اور نہ ان سے کوئی روک ٹوک ہوگی۔"

**آیت 74** **اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ** : ایمان والوں کا حسنِ انجام بیان کرنے کے بعد کفار کا انجامِ بد بیان فرمایا۔ یہاں "الْمُجْرِمِيْنَ" سے مراد کفار ہیں، کیونکہ ان کا ذکر "مُسْلِمِيْنَ" کے مقابلے میں آیا ہے اور جہنم میں ہمیشہ رہنے

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

وہ ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں نا امید ہوں گے ﴿۷۵﴾ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ خود ہی ظالم تھے ﴿۷۶﴾ اور وہ پکاریں گے اے مالک! تیرا رب ہمارا کام تمام ہی کر دے۔ وہ کہے گا بے شک تم (یہیں) ٹھہرنے والے ہو ﴿۷۷﴾

والے کفار ہی ہیں۔ سورۂ مطففین میں بھی کفار کے لیے "الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا" کا لفظ استعمال ہوا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴾ [ المطففین : ۲۹ ] "بے شک وہ لوگ جنھوں نے جرم کیے، ان لوگوں پر جو ایمان لائے، ہنسا کرتے تھے۔"

**آیت 75** ❶ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ : "فُتُوْرٌ" کسی چیز میں وقفہ یا ٹھہراؤ آنا، یا اس کی قوت یا رفتار میں آہستہ آہستہ کمی آتے جانا، جیسے کہا جاتا ہے: "فَتَرَتِ الْحُمّٰى" "بخار میں کمی یا وقفہ آ گیا۔" "لَا يُفَتَّرُ" (باب تفعیل) کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عذاب میں کسی قسم کا وقفہ یا کمی نہیں آنے دی جائے گی۔

❷ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ : مصیبت سے نجات کی امید بھی کچھ نہ کچھ راحت کا باعث ہوتی ہے، یہ کہہ کر امید کی بھی نفی فرما دی کہ وہ اسی جہنم میں مایوس اور ناامید ہو کر رہنے والے ہیں۔

**آیت 76** وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا ...... : یہاں خیال ہو سکتا تھا کہ اتنی بڑی اور دائمی سزا تو ظلم ہے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا، کیونکہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم کرے، بلکہ وہ خود ہی ظلم کرنے والے تھے، حتیٰ کہ ظالم ہونا ان کی صفت اور پہچان بن گیا، کیونکہ ظلم ان کا دائمی عمل اور ان کی عادت اور جبلت بن چکا تھا، ان کی نیت اور ارادہ یہی تھا کہ جب تک رہیں گے اسی پر قائم رہیں گے، اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی نہ مرتے اور ہمیشہ ظلم و شرک پر جمے رہتے۔ چونکہ اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے، اس لیے انھیں ہمیشہ ظلم کی نیت پر ہمیشہ کا عذاب دیا گیا اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ظالم تھے۔

**آیت 77** وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ...... : "قَضٰى عَلَيْهِ" کا معنی کام تمام کرنا، یعنی موت دے دینا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ﴾ [ القصص : ۱۵ ] "تو موسیٰ نے اسے گھونسا مارا تو اس کا کام تمام کر دیا۔" "مالک" جہنم کے خازن (دربان) فرشتے کا نام ہے۔ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں ہے کہ خواب میں جبریل اور میکائیل علیہما السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کروایا اور بعد میں ان کی حقیقت بیان کی۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَانْطَلَقْنَا فَأَتَيْنَا عَلٰى رَجُلٍ كَرِيْهِ الْمَرْآةِ كَأَكْرَهِ مَا أَنْتَ رَاءٍ رَجُلاً مَرْآةً، فَإِذَا عِنْدَهُ نَارٌ يَحُشُّهَا وَيَسْعٰى حَوْلَهَا، قَالَ قُلْتُ لَهُمَا مَا هٰذَا؟ )) "پھر ہم آگے بڑھے تو ایک آدمی کے پاس پہنچے جو دیکھنے میں

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

بلاشبہ ہم تو تمھارے پاس حق لے کر آئے ہیں اور لیکن تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے ہیں ﴿۷۸﴾ یا انھوں نے کسی کام کی پختہ تدبیر کر لی ہے؟ تو بے شک ہم بھی پختہ تدبیر کرنے والے ہیں ﴿۷۹﴾

بہت بدصورت تھا، اتنا جتنا کہ کوئی دیکھنے میں زیادہ سے زیادہ بدصورت ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس آگ ہے، وہ اسے بھڑکا رہا ہے اور اس کے اردگرد دوڑ رہا ہے۔" نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں سے پوچھا: "یہ کون ہے؟" حدیث کے آخر میں جب فرشتے نے سب چیزوں کے متعلق بتایا تو کہا: « وَأَمَّا الرَّجُلُ الْكَرِيْهُ الْمَرْآةِ الَّذِيْ عِنْدَ النَّارِ يَحُشُّهَا وَيَسْعٰى حَوْلَهَا فَإِنَّهُ مَالِكٌ خَازِنُ جَهَنَّمَ » [ بخاري، التعبير، باب تعبير الرؤيا بعد صلاة الصبح : ۷۰۴۷ ] "آگ کے پاس دیکھنے میں جو بدصورت آدمی تم نے دیکھا جو اسے بھڑکا رہا تھا اور اس کے گرد دوڑ رہا تھا وہ جہنم کا خازن مالک ہے۔" کفار جہنم کے فرشتوں کو اللہ سے ان کے عذاب میں کچھ نہ کچھ تخفیف کرنے کی دعا کے لیے کہیں گے۔ جب اس سے ناامید ہوں گے تو جہنم کے خازن مالک کو آواز دیں گے کہ اپنے رب سے دعا کر کہ ہمیں موت دے دے۔ وہ کہے گا تم یہیں رہنے والے ہو۔ غرض وہ اس عذاب سے کسی طرح نجات نہیں پائیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴾ [ فاطر : ۳۶ ] "اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس کا کچھ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ایسے ہی ہر ناشکرے کو بدلا دیا کرتے ہیں۔"

**آیت 78** لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا خطاب اہل جہنم سے بھی مراد ہو سکتا ہے اور دنیا میں قریش اور دوسرے کفار سے بھی۔ پہلی صورت میں جو فرمایا کہ تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے تھے تو اس لیے کہ ان کے قلیل لوگ حق کو ناپسند کرنے والے نہیں تھے، وہ تو اپنے اکابر و سادات کی اندھا دھند پیروی کرنے کی وجہ سے کفر پر قائم رہنے والے تھے۔ اکثر وہی تھے جو حق کو پہچانتے تھے مگر اپنے مفادات اور خواہشات سے متصادم ہونے کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے تھے۔ دوسری صورت میں دنیا میں کفار کا حال بیان فرمایا کہ ان کے اکثر حق آنے کے بعد اپنی خواہشات کے خلاف ہونے کی وجہ سے اسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں۔ رہے کم لوگ تو وہ پسند یا ناپسند کی وجہ سے نہیں بلکہ تقلید کی وجہ سے کفر پر جمے رہتے ہیں۔

**آیت 79** اَمْ اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ : "اِبْرَامٌ" کا معنی کسی چیز کو پختہ اور مضبوط کرنا ہے۔ اصل میں یہ رسی کو مضبوطی کے ساتھ بٹنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: "أَبْرَمَ فُلَانٌ الْحَبْلَ" "فلاں نے رسی کو خوب مضبوط کیا۔" یعنی

اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّہُمۡ وَ نَجۡوٰىہُمۡ ؕ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیۡہِمۡ یَکۡتُبُوۡنَ ﴿۸۰﴾ قُلۡ اِنۡ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ٭ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾

یا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کا راز اور ان کی سرگوشی نہیں سنتے، کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے رہتے ہیں ﴿۸۰﴾ کہہ دے اگر رحمان کی کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوں ﴿۸۱﴾

یا انھوں نے کسی کام کی پختہ تدبیر اور اس کا پکا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے مراد کفار کی خفیہ مجلسوں میں ان کے طے کردہ فیصلے ہیں جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو قید یا قتل کرنے یا مکہ سے نکالنے کا پکا فیصلہ کر لیا۔ (دیکھیے انفال: ۳۰) فرمایا، انھوں نے ایسے کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو ہم بھی پکی تدبیر کرنے والے ہیں۔ پھر سب نے دیکھا کہ وہ کس طرح ناکام و نامراد ہوئے اور اللہ کا دین کس طرح غالب رہا۔

**آیت 80** ❶ اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّہُمۡ وَ نَجۡوٰىہُمۡ : یہاں "سِرَّہُمۡ" سے مراد وہ باتیں ہیں جو وہ راز کے طور پر ایک دوسرے کے ساتھ خفیہ طور پر آہستہ آواز میں کرتے ہیں، کیونکہ اگر "سِرٌّ" سے دل میں موجود بات مراد ہو تو وہ سنی نہیں جاتی، بلکہ اس کا علم ہوتا ہے اور "نَجۡوٰىہُمۡ" سے مراد ان کی مجلس مشاورت کی باتیں ہیں۔

❷ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیۡہِمۡ یَکۡتُبُوۡنَ : یعنی صرف یہی نہیں کہ ہم سنتے ہیں، بلکہ ہمارے فرشتے ثبوت کے طور پر لکھ بھی لیتے ہیں۔ (دیکھیے ق: ۱۷، ۱۸) یعنی ان کی خفیہ تدبیریں تو ہم سن رہے ہوتے ہیں، پھر وہ ان کی کامیابی کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

**آیت 81** قُلۡ اِنۡ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ...... : کفار فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا۔ اب رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے کہہ دیں کہ اگر رحمان کی کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوں۔ مطلب یہ کہ میرا اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ماننا اور جنھیں تم اللہ کی اولاد قرار دیتے ہو ان کی عبادت سے انکار کسی ضد یا ہٹ دھرمی کی بنا پر نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ اس ذات پاک کی اولاد ہو جس کا نام رحمان ہے۔ تفصیل کے لیے سورۂ مریم کی آیات (۸۸ تا ۹۸) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رحمان کی کوئی اولاد ہو، جیسا کہ کفار کہتے ہیں، تو سب سے پہلے اس اولاد کی عبادت کرنے والا میں ہوں، کیونکہ میرا اس کے ساتھ بندگی کا تعلق سب سے زیادہ ہے، جیسا کہ بادشاہ کے نوکر چاکر بادشاہ کی اولاد کی تعظیم ان کے والد کی تعظیم کی وجہ سے کرتے ہیں، لیکن رحمان کی اولاد ہے ہی نہیں، اس لیے میں اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت کرنے والا نہیں۔

یاد رہے کہ یہ جملہ شرطیہ ہے، اس میں شرط کا وجود بلکہ اس کا امکان بھی ضروری نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ناممکن چیز کو بھی بفرض محال شرط کے طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَوۡ اَرَادَ اللّٰہُ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰی مِمَّا یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ ہُوَ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ ﴾ [ الزمر : ٤ ] "اگر اللہ چاہتا کہ (کسی کو) اولاد بنائے تو ان میں سے جنھیں وہ پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ضرور چن لیتا، وہ پاک ہے۔ وہ تو اللہ ہے، جو اکیلا ہے، بہت غلبے والا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَ يَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝ وَ هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ وَ تَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۚ وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

پاک ہے آسمانوں اور زمین کا رب، جو عرش کا رب ہے، اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں ۝ پس انھیں چھوڑ دے فضول بحث کرتے رہیں اور کھیلتے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن کو جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہی کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے اور بہت برکت والا ہے وہ جس کے پاس آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۝

اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [ الأنبیاء : ۲۲ ] ”اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔“

**آیت 82** سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ : یعنی اولاد ہونا کمزوری، محتاجی اور عجز کی دلیل ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل : ۱۱۱) جب کہ اللہ تعالیٰ عجز اور احتیاج سے پاک ہے۔ وہ آسمانوں کا، زمین کا اور عرش کا مالک اور پروردگار اولاد سے اور ان تمام کمزوریوں اور عیبوں سے پاک ہے جو مشرک لوگ اس کے لیے بیان کرتے ہیں۔

**آیت 83** فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَ يَلْعَبُوْا ...... : یعنی اگر یہ ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کرتے تو انھیں ان کی فضول بحث اور کھیل کود میں لگا رہنے دیں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ اس وقت ان پر سب حقیقت کھل جائے گی۔ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے یا موت کا دن یا دنیا میں عذاب کا دن۔

**آیت 84** ① وَ هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ ...... : مشرکوں نے کچھ معبود آسمان میں بنا رکھے تھے، مثلاً فرشتے، سورج، چاند اور بعض ستارے اور کچھ زمین میں، جیسے انبیاء، اولیاء، ان کی قبریں اور بت، درخت اور پتھر وغیرہ۔ فرمایا، زمین اور آسمان میں الگ الگ معبود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی دونوں کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ دونوں جگہ اسی کی عبادت ہوتی ہے اور دونوں جگہ عبادت اسی کا حق ہے۔

② وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ : ”الْحَكِيْمُ“ کمال حکمت والا، جس نے ہر چیز محکم و مضبوط اور حکمت و دانائی کے ساتھ بنائی ہے اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ یہ معبود واحد ہونے کی دلیل ہے کہ کوئی دوسرا نہ حکیم ہے نہ علیم، تو پھر اس کی عبادت کیوں ہو؟

**آیت 85** وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... : یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اکیلا معبود ہونے کی دلیل ہے کہ بے شمار خیر و خوبی کا مالک ہے وہ کہ آسمانوں میں اور زمین میں ہر جگہ اسی کی بادشاہی ہے۔ قیامت کا علم بھی اسی کے پاس ہے اور تم اسی

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور وہ لوگ جنھیں یہ اس کے سوا پکارتے ہیں، وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر جس نے حق کے ساتھ شہادت دی اور وہ جانتے ہیں ﴿۸۶﴾ اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر کہاں بہکائے جاتے ہیں ﴿۸۷﴾

کی طرف لوٹائے جاؤ گے، نہ کہ کسی اور کی طرف۔ لہٰذا وہی ہے جو تمھیں تمھارے نیک یا بد اعمال کا بدلا دے گا۔

آیت 86 ① وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ ......: پچھلی آیت میں ''من دون اللہ'' کے پاس آسمانوں اور زمین کی اور ان کے درمیان کی کسی بھی چیز کی ملک ہونے کی نفی تھی، اس آیت میں ان سے شفاعت کی ملکیت کی بھی نفی فرما دی۔

② اس آیت کی دو تفسیریں ہیں، دونوں مراد ہو سکتی ہیں اور یہ قرآن کا اعجاز ہے۔ پہلی یہ کہ مشرکین جن ہستیوں کو یہ سمجھ کر پکارتے ہیں کہ وہ ان کی شفاعت کریں گی ان کے پاس شفاعت کا کوئی اختیار نہیں، مگر وہ لوگ جنھوں نے کلمۂ حق یعنی ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شہادت دی اور صرف زبانی نہیں بلکہ وہ اس کا یقین رکھتے تھے، مثلاً فرشتے، عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے دوسرے مقرب بندے۔ وہ چونکہ حق (توحید) کا یقین رکھ کر اس کی گواہی دیتے تھے اور انھوں نے کبھی لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم نہیں دیا، اس لیے وہ اللہ کے اِذن سے سفارش کر سکیں گے۔ رہے بت اور دوسرے جھوٹے مشکل کُشا اور حاجت روا، جن کی مشرکین پوجا کرتے ہیں، وہ تو اپنے آپ کو نہیں بچا سکیں گے بلکہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے، کسی کی سفارش کیا کریں گے؟ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ''مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ'' سے پہلے لام جارہ محذوف ہے: ''أَيْ إِلَّا لِمَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ'' یعنی سفارش کرنے والوں کو صرف ان لوگوں کے حق میں سفارش کا اختیار دیا جائے گا جنھوں نے حق یعنی کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شہادت دی اور صرف زبانی نہیں بلکہ اس کا علم اور یقین بھی رکھتے تھے۔ رہے کفار یا منافقین، تو ان کے حق میں کوئی شفاعت نہیں کرے گا۔ شفاعت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے آیت الکرسی، سورۂ مریم (۸۷)، انبیاء (۲۸)، سبا (۲۳)، نجم (۲۶) اور سورۂ نبا (۳۸)۔

③ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہادت وہی معتبر ہے جو علم کے ساتھ دی جائے۔ دنیا میں اگرچہ ہر اس شخص کو مسلمان تصور کر لیا جاتا ہے جو زبانی کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شہادت دے، مگر قیامت کے دن اسی کی شہادت معتبر ہو گی جس نے دل کے یقین کے ساتھ یہ شہادت دی ہو گی۔

آیت 87 ① وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ ......: اس آیت میں مشرکین کے قول و فعل کا تضاد واضح فرمایا ہے، یعنی جب مانتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو پیدا کرنے والے کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کیوں کر کرتے ہیں؟ مالک کو چھوڑ کر ان کو مشکل کشا اور حاجت روا کیسے مان بیٹھے ہیں جنھوں نے کچھ پیدا ہی نہیں کیا؟

وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

قسم ہے رسول کے ”یارب“ کہنے کی! کہ بے شک یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے ﴿۸۸﴾

② فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ: یعنی پھر بہکانے والے انھیں بہکا کر کہاں لے جا رہے ہیں؟ ایک معنی ”فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ“ کا یہ بھی ہے ”مِنْ أَيْنَ يُؤْفَكُوْنَ“ کہ پھر وہ کہاں سے بہکائے جاتے ہیں، کون سی دلیل یا کیا سبب ہے جس کی وجہ سے یہ بہکائے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اصل میں توحید پر ہوتا ہے، پھر شیاطین انسان ہوں یا جن اسے توحید سے بہکا کر شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں سے بہت ہوشیار اور خبردار رہنا چاہیے، جیسا کہ عیاض بن حمار المجاشعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے خطبہ میں فرمایا: « أَلَا ! إِنَّ رَبِّيْ أَمَرَنِيْ أَنْ أُعَلِّمَكُمْ مَا جَهِلْتُمْ مِمَّا عَلَّمَنِيْ يَوْمِيْ هٰذَا، كُلُّ مَالٍ نَحَلْتُهُ عَبْدًا حَلَالٌ وَ إِنِّيْ خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَ إِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ وَ حَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ وَأَمَرَتْهُمْ أَنْ يُشْرِكُوْا بِيْ مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا » [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها و أهلها، باب الصفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة و أهل النار : ۲۸۶۵ ] ”سنو! میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں وہ باتیں سکھاؤں جن سے تم ناواقف ہو، ان باتوں میں سے جو اس نے مجھے آج سکھائی ہیں۔ (وہ فرماتا ہے کہ) ہر وہ مال جو میں نے کسی بندے کو عطا کیا (وہ اس کے لیے) حلال ہے اور میں نے اپنے تمام بندوں کو حنفاء (ایک اللہ کی طرف ہو جانے والے) پیدا کیا، لیکن ان کے پاس شیاطین آئے تو انھوں نے انھیں ان کے دین سے بہکا دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں اور انھیں حکم دیا کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک بنائیں جن کی میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔“

**آیت 88** وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ......: ”قِيْلٌ، قَالٌ“ اور ”قَوْلٌ“ تینوں ”قَالَ يَقُوْلُ“ کے مصدر ہیں، معنی ہے کہنا۔ ”قِيْلِهٖ“ میں ضمیر ”ہ“ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس آیت کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں، ان میں سب سے واضح تین ہیں۔ پہلی یہ کہ ”وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ“ قسم ہے: ”أَيْ أُقْسِمُ بِقَوْلِهٖ يَا رَبِّ“ اور ”اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ“ جواب قسم ہے۔ یہ تفسیر زمخشری نے کی ہے اور ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں رسول کے ”يَا رَبِّ يَا رَبِّ“ کہنے کی قسم کھاتا ہوں کہ یقیناً یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ﴾ اس لیے ان سے درگزر کر اور کہہ سلام ہے، پس عنقریب وہ جان لیں گے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ ساری آیت قسم ہے، جواب اس کا محذوف ہے جو قرینے سے معلوم ہو رہا ہے۔ قرینے کے پیش نظر قسم کا جواب حذف کرنا کلام عرب میں عام ہے۔ یعنی میں رسول کے ”اے میرے رب! یہ تو ایسے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہی نہیں“ کہنے کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ضرور کافروں کے اس رویے کے خلاف اس کی مدد کروں گا۔ قرینہ اگلی آیت ہے کہ پس تو ان سے درگزر کر اور کہہ سلام ہے، کیونکہ وہ بہت جلد جان لیں گے کہ رسول کی مدد کیسے ہوتی ہے اور ان لوگوں سے انتقام

رکوع ۱۴

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

پس ان سے درگزر کر اور کہہ سلام ہے، پس عنقریب وہ جان لیں گے ﴿۸۹﴾

لیا جاتا ہے۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ واؤ بمعنی "رُبَّ" ہے جو حرف جار ہے، "قِيْلِهٖ" اس کے ساتھ مجرور ہے۔ یعنی کئی دفعہ
ول کا حسرت و افسوس کے ساتھ کہنا یہ ہوتا ہے کہ اے میرے رب! یہ تو ایسے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہی نہیں۔
ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ "وَقِيْلِهٖ" میں "قِيْلِ" کا عطف اوپر گزری ہوئی آیت "وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" میں لفظ
"السَّاعَةِ" پر ہے، یعنی "وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ عِلْمُ قِيْلِهٖ يَا رَبِّ هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُوْنَ" یعنی "اسی کے پاس
قیامت کا علم ہے اور رسول کے اس قول کا بھی کہ اے میرے رب! یہ تو ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔" مگر معطوف علیہ
اور معطوف کے درمیان اتنا لمبا فاصلہ بعید بات ہے۔

آیت 89: فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ...: یعنی آپ کی فریاد ہم نے سن لی، اب ہم جانیں اور وہ، آپ ان سے
درگزر کریں اور ان سے براءت اور قطع تعلق کے اظہار کے لیے کہہ دیں کہ سلام ہے۔ چنانچہ وہ بہت جلد جان لیں گے کہ ان
کے ایمان نہ لانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

سورۃ الدخان ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ آیاتہا ۵۹ رکوعاتہا ۳

حٰمٓ ① وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ③ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ④

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حٰمٓ ① اس بیان کرنے والی کتاب کی قسم ! ② بے شک ہم نے اسے ایک بہت برکت والی رات میں [اتارا]، بے شک ہم ہی ڈرانے والے تھے ③ اسی میں ہر محکم کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے ④

آیت 1 تا 3 ① حٰمٓ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ : اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مبین کی قسم کھا کر فرمایا کہ یقیناً ہم ہی اسے نازل فرمایا ہے۔ یعنی یہ کتاب مبین خود اس بات کی شاہد ہے کہ یہ محمد ﷺ یا کسی اور کی تصنیف نہیں، بلکہ اسے ہم ہی نازل کیا ہے۔ اگر کوئی اسے مخلوق کی تصنیف کہتا ہے تو وہ اس کی ایک سورت کی مثل ہی تصنیف کر کے لے آئے۔

② فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ : کتاب کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ رات بڑی خیر و برکت والی ہے جس میں ہم نے [اسے] نازل فرمایا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرما دیا کہ وہ مبارک رات لیلۃ القدر ہے، جیسا کہ سورۂ قدر میں ہے: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ [القدر : ۱] ''بلاشبہ ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا۔'' اور وہ ماہِ رمضان میں ہے، جیسا [کہ] فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [البقرة : ۱۸۵] ''رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن ا[تارا] گیا۔'' کتاب اتارنے سے مراد اتارنے کی ابتدا ہے جو غارِ حرا میں ماہ رمضان کی اس مبارک رات میں ہوئی۔ کچھ لوگ [کہتے] ہیں کہ وہ رات نصف شعبان کی رات ہے، مگر یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ یہ قرآن مجید کے صریح خلاف ہے۔ قاضی ابوبکر [ابن] العربی نے ''احکام القرآن'' میں لکھا ہے کہ نصف شعبان کی رات سے متعلق کوئی روایت قابل اعتماد نہیں، نہ اس کی فضیل[ت] کے بارے میں اور نہ اس بارے میں کہ اس رات قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ مفسر شنقیطی نے فرمایا: ''ابن العربی کے ع[لاوہ] دوسرے محققین کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ ایسی روایات کی کوئی بنیاد نہیں، نہ ان میں سے کسی کی سند صحیح ہے۔''

③ ''لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ'' کی برکات کی تفصیل سورۂ قدر میں ملاحظہ فرمائیں۔

④ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ : یعنی ہم نے یہ کتاب اس لیے نازل کی کہ بندوں کو اچھے اور برے کاموں سے آگاہ کر دیا جا[ئے] اور نافرمانی کی صورت میں انھیں ان کے انجامِ بد سے ڈرا دیا جائے، تاکہ ان کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہمیں خبردار [نہیں] کیا گیا۔ یہاں صرف ڈرانے کا ذکر فرمایا بشارت کا نہیں، کیونکہ اکثر لوگوں کے حسبِ حال یہی ہوتا ہے۔ ویسے ڈرانے کے [ضمن] میں بشارت بھی ہوتی ہے، اس شخص کے لیے جو ڈر جائے۔

آیت 4 فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ : ''فَرْقٌ'' کا معنی فیصلہ ہے، اسی لیے قرآن کو ''فرقان'' کہا جاتا ہے۔ ''حَكِيْ[مٍ]''

أَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿٥﴾ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦﴾

ہماری طرف سے حکم کی وجہ سے۔ بے شک ہم ہی بھیجنے والے تھے ⑤ تیرے رب کی رحمت کے باعث، یقیناً وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ⑥

کے مفہوم میں دو باتیں شامل ہیں، ایک یہ کہ وہ حکم حکمت اور دانائی پر مبنی ہوتا ہے، اس میں کسی غلطی یا خامی کا امکان نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ وہ حکم محکم اور پختہ ہوتا ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ یعنی ہم نے اسے خاص طور پر اس بابرکت رات میں اس لیے نازل کیا کہ یہ قرآن ایک امرِ حکیم ہے اور اسی رات میں ہر امرِ حکیم کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ سورۂ قدر میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ﴾ [ القدر : ٤ ] ”اس میں فرشتے اور روح (جبریل امین) اپنے رب کے حکم سے ہر امر کے متعلق اترتے ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ آئندہ سال سے متعلق افراد و اقوام کی قسمتوں کے تمام فیصلے فرشتوں کے حوالے کر دیتے ہیں، مثلاً زندگی، موت، بیماری، رزق، عروج و زوال اور ہدایت و گمراہی وغیرہ، پھر وہ ان پر عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( إِنَّكَ لَتَرَى الرَّجُلَ يَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ، وَقَدْ وَقَعَ اسْمُهُ فِي الْمَوْتٰى، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ [ الدخان : ٣، ٤ ] يَعْنِيْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَفِيْ تِلْكَ اللَّيْلَةِ يُفْرَقُ أَمْرُ الدُّنْيَا إِلٰى مِثْلِهَا مِنْ قَابِلٍ )) [ مستدرك حاكم، تفسير سورة الدخان : ٢/٤٤٨، ح : ٣٦٧٨ ] ”تم آدمی کو بازاروں میں چلتا پھرتا دیکھتے ہو، حالانکہ اس کا نام مُردوں میں درج ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ کہ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے، اس رات میں دنیا کے معاملات کا آئندہ سال کی اسی رات تک فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔“ حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح کہا اور بیہقی نے ”شعب الایمان“ میں اسے حاکم سے روایت کیا ہے اور اس کے محقق نے کہا کہ اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔

**آیت 5** ① **اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا :** یعنی یہ سارے فیصلے ہمارے حکم سے ہوتے ہیں۔ مراد ان فیصلوں کی اہمیت اور عظمت پر متنبہ کرنا ہے کہ وہ فیصلے کسی معمولی ہستی کے نہیں ہوتے، بلکہ کائنات کے مالک کی طرف سے صادر ہوتے ہیں۔

② **اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ :** یعنی ہم یہ کتاب نازل کرتے وقت رسول کو بھیجنے والے تھے۔

**آیت 6** ① **رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ :** یہ ”مُرْسِلِيْنَ“ کا مفعول لہ ہے۔ یعنی ہم تیرے رب کی رحمت کی وجہ سے رسول کو بھیجنے والے اور کتاب کو نازل کرنے والے تھے۔ ”اپنی رحمت“ کے بجائے ”تیرے رب کی رحمت“ کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف کے اظہار کے لیے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نہیں بلکہ کل کائنات کا رب ہے، جیسا کہ آگے یہ بات آ بھی رہی ہے: ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴾ ”آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کا رب جو ان دونوں کے درمیان ہیں، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔“ ”رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ“ میں لفظ ”رَبٌّ“ کا مطلب یہ ہے کہ بندوں پر یہ رحمت

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ⑦ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ⑧ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ⑨

آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کا رب جو ان دونوں کے درمیان ہیں، اگر تم یقین کرنے والے ہو ⑦ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، تمھارا رب ہے اور تمھارے پہلے باپ دادا کا رب ہے ⑧ بلکہ وہ ایک شک میں کھیل رہے ہیں ⑨

ہمارے رب ہونے کا تقاضا ہے، کیونکہ "رَبٌّ" کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے جسم کی پرورش کا انتظام کیا جائے اور ان کی روحانی پرورش کا انتظام نہ کیا جائے، بلکہ انھیں گمراہی میں بھٹکتا چھوڑ دیا جائے۔

② اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ : "اِنَّ" پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، یعنی ہم نے رسول اس لیے بھیجا کہ تیرا رب خوب سننے اور جاننے والا تھا کہ کس طرح مشرکین بتوں اور باطل معبودوں کی پرستش کر رہے ہیں، کفر کے امام لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور طاقتور کمزوروں پر ظلم کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کے تمام اقوال و افعال اور نیتوں کو جانتا اور سن رہا تھا، اس لیے اس نے ان کی اصلاح کے لیے رسولوں کو بھیجا۔

**آیت 7** رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ...... : پچھلی آیت میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب تھا۔ کفارِ مکہ یہ اقرار کرتے تھے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات کا رب اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اب ان سے دوبارہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ کائنات میں موجود ساری مخلوق کی ربوبیت اور پرورش کی ذمہ دار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو پھر تمھیں یہ بھی یقین کر لینا چاہیے کہ یہ رسول فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی نے تمھاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے، کیونکہ وہ صرف تمھاری جسمانی پرورش ہی کا ذمہ دار نہیں بلکہ تمھاری روحانی پرورش اور تمھیں سیدھا راستہ بتانا بھی اسی کے ذمے ہے۔

**آیت 8** ① لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : یہ پچھلی آیت کا نتیجہ ہے کہ جب آسمان و زمین اور ساری کائنات کا مالک اور رب اللہ تعالیٰ ہے تو پھر معبود بھی وہی ہے۔

② يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ : یہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے معبود واحد ہونے کی مزید تاکید کے لیے ہیں، فرمایا کہ معبود اسی کو مانو جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور جو تمھارا اور تمھارے پہلے آباء کا رب ہے۔

**آیت 9** بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ : اس مختصر سے فقرے میں ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دہریے ہوں یا مشرکین، ان سب پر وقتاً فوقتاً ایسی ساعتیں آتی رہتی ہیں جب ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھے بیٹھے ہو اس میں کہیں نہ کہیں جھول موجود ہے۔ دہریا اپنے انکارِ خدا میں بظاہر کتنا ہی سخت ہو، کسی نہ کسی وقت اس کا دل یہ شہادت دے گا کہ خاک کے ایک ذرے سے لے کر کہکشاؤں تک اور گھاس کی ایک پتی سے لے کر انسان کی تخلیق تک، یہ حیرت انگیز حکمت سے لبریز نظام کسی صانع حکیم کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسی طرح ایک مشرک انسان اپنے شرک میں خواہ کتنا

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

سو انتظار کر جس دن آسمان ظاہر دھواں لائے گا ⑩ جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا۔ یہ دردناک عذاب ہے ⑪

گہرا ڈوبا ہوا ہو، کبھی نہ کبھی اس کا دل بھی پکار اٹھتا ہے کہ جنھیں میں معبود بنائے بیٹھا ہوں یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس قلبی شہادت کا نتیجہ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ انھیں خدا کے وجود اور اس کی توحید کا یقین حاصل ہو جائے اور نہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں اپنے شرک اور اپنی دہریت میں کامل یقین اور اطمینان حاصل رہے۔ اس کے بجائے اس کا دین درحقیقت شک پر قائم ہوتا ہے، خواہ اس میں یقین کی کتنی ہی شدت وہ دکھا رہے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وہ سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کیوں نہیں کرتے کہ شک کی بے چینی سے نکل کر یقین و اطمینان کے سکون سے بہرہ ور ہو سکیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں سنجیدگی ہی سے تو وہ محروم ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیت صرف دنیا کی کمائی اور اس کے عیش کی ہوتی ہے، جس کی فکر میں وہ اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری طاقتیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ رہے دین کے مسائل، تو وہ حقیقت میں ان کے لیے ایک کھیل، ایک تفریح اور ایک ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتے، جن پر وہ سنجیدگی کے ساتھ چند لمحے بھی صرف نہیں کر سکتے۔ مذہبی مراسم ہیں تو تفریح کے طور پر ادا کیے جا رہے ہیں، انکار و دہریت کی بحثیں ہیں تو تفریح کے طور پر کی جا رہی ہیں۔ دنیا کے مشاغل سے اتنی فرصت کسے ہے کہ بیٹھ کر یہ سوچے کہ کہیں ہم حق سے منحرف تو نہیں ہیں اور اگر حق سے منحرف ہیں تو اس کا انجام کیا ہے۔ (تفہیم القرآن بادنیٰ تصرف)

**آیت 10، 11** فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ...... : اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دلائی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ پریشان نہ ہوں، بلکہ اس دن کا انتظار کریں جس میں آسمان کی جانب سے ایک واضح دھواں ان لوگوں کو ڈھانپ لے گا جو نہایت تکلیف دہ عذاب ہو گا۔ واضح ہونے اور ڈھانپ لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خیالی دھواں نہیں ہو گا بلکہ حقیقی ہو گا اور سب لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ''يَوْمَ'' سے مراد وہ وقت ہے جس میں دھواں رہا، کیونکہ وہ دھواں ایک دن تو نہیں رہا، بلکہ کئی دن اور مہینے رہا۔ اس دھویں سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے اس سے قیامت کے دن کا دھواں مراد نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان آیات میں کفار کو اسے دور کرنے کی دعا کے بعد اسے کچھ دور کرنے اور ان کے دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کا ذکر ہے، جب کہ قیامت کے دن کا عذاب کسی صورت دور ہونے والا نہیں۔ اس لیے اس سے مراد ایسا دھواں ہے جو جلد ہی دنیا میں انھیں ڈھانپنے والا ہے۔ اس دھویں کے متعلق دو قول ہیں، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نہایت جزم کے ساتھ اسے اس قحط کے نتیجے میں پھیلنے والا دھواں قرار دیتے ہیں جو ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے مکہ میں واقع ہوا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: « إِنَّمَا كَانَ هٰذَا لِأَنَّ قُرَيْشًا لَمَّا اسْتَعْصَوْا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ دَعَا عَلَيْهِمْ بِسِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ، فَأَصَابَهُمْ قَحْطٌ وَجَهْدٌ حَتّٰى أَكَلُوا الْعِظَامَ، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَنْظُرُ إِلَى السَّمَاءِ فَيَرٰى مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا كَهَيْئَةِ الدُّخَانِ مِنَ الْجَهْدِ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ

﴿ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ قَالَ فَأُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اسْتَسْقِ اللّٰهَ لِمُضَرَ، فَإِنَّهَا قَدْ هَلَكَتْ، قَالَ لِمُضَرَ؟ إِنَّكَ لَجَرِيْءٌ، فَاسْتَسْقٰى فَسُقُوْا فَنَزَلَتْ: ﴿ اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ ﴾ فَلَمَّا أَصَابَتْهُمُ الرَّفَاهِيَةُ عَادُوْا إِلٰى حَالِهِمْ، حِيْنَ أَصَابَتْهُمُ الرَّفَاهِيَةُ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ قَالَ يَعْنِيْ يَوْمَ بَدْرٍ ﴾ [ بخاري، التفسير، سورة الدخان : ۴۸۲۱ ] ''اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش نے جب رسول اللہ ﷺ کے خلاف سخت سرکشی کی تو آپ ﷺ نے ان پر قحط سالیوں کی بددعا کی، جیسے یوسف علیہ السلام کے قحط کے سال تھے۔ تو انھیں قحط اور بھوک نے آ لیا، حتیٰ کہ وہ ہڈیاں کھا گئے۔ آدمی آسمان کی طرف دیکھنے لگتا تو بھوک کی وجہ سے اسے اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں سا نظر آتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [ الدخان : ۱۰، ۱۱ ] ''سو انتظار کر جس دن آسمان ظاہر دھواں لائے گا۔ جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا، یہ دردناک عذاب ہے۔'' تو ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے کہا: ''یا رسول اللہ! مضر (قبیلے) کے لیے بارش کی دعا کریں، کیونکہ وہ تو ہلاک ہو گئے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مضر کے لیے (وہ تو سخت کافر و مشرک ہیں)؟ تو بڑا جرأت والا ہے۔'' خیر، آپ ﷺ نے بارش کے لیے دعا کر دی اور ان پر بارش ہو گئی تو یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ ﴾ [ الدخان : ۱۵ ] ''بے شک تم دوبارہ وہی کچھ کرنے والے ہو۔'' پھر جب انھیں خوش حالی ملی تو وہ اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ [ الدخان : ۱۶ ] ''جس دن ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے، بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں۔'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس سے مراد یوم بدر ہے۔'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر کو امام طبری اور بہت سے مفسرین نے راجح قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق یہ عذاب گزر چکا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت کے قریب نکلے گا۔ حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آپس میں کسی بات کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (( مَا تَذَاكَرُوْنَ؟ قَالُوْا نَذْكُرُ السَّاعَةَ، قَالَ إِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّابَّةَ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَ نُزُوْلَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يَأْجُوْجَ وَ مَأْجُوْجَ وَ ثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ، خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلٰى مَحْشَرِهِمْ )) [ مسلم، الفتن و أشراط الساعة، باب في الآيات التي تكون قبل الساعة : ۲۹۰۱ ] ''تم کس بات کا ذکر کر رہے ہو؟'' ہم نے کہا: ''ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس وقت تک قائم نہیں ہو گی کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں دیکھ لو۔'' تو آپ ﷺ نے ان نشانیوں کا ذکر فرمایا، (جو یہ ہیں) دھواں، دجال، دابہ، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ ابن مریم ﷺ کا نزول، یاجوج و ماجوج، تین خسف (زمین میں دھنس جانا) ایک خسف مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرۂ عرب میں اور ان سب کے آخر میں ایک آگ ہو گی جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ان کے حشر کے مقام کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَ قَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾

**اے ہمارے رب! ہم سے یہ عذاب دور کر دے، بے شک ہم ایمان لانے والے ہیں ﴿۱۲﴾ ان کے لیے نصیحت کہاں؟ حالانکہ یقیناً ان کے پاس بیان کرنے والا رسول آ چکا ﴿۱۳﴾ پھر انھوں نے اس سے منہ پھیر لیا اور انھوں نے کہا سکھلایا ہوا ہے، دیوانہ ہے ﴿۱۴﴾**

« بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سِتًّا، طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا أَوِ الدُّخَانَ أَوِ الدَّجَّالَ أَوِ الدَّابَّةَ أَوْ خَاصَّةَ أَحَدِكُمْ أَوْ أَمْرَ الْعَامَّةِ » [ مسلم، الفتن و أشراط الساعة، باب في بقية من أحاديث الدجال : ۲۹۴۷ ] ”چھ چیزیں ظاہر ہونے سے پہلے اعمال میں جلدی کر لو، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا یا دھواں یا دجال یا دابہ یا تم میں سے کسی پر انفرادی عذاب یا سب پر اجتماعی عذاب۔“

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس دوسرے قول کو ترجیح دی ہے کہ اس دخان سے مراد قیامت کے قریب نمودار ہونے والا دھواں ہے، جس کا ابھی انتظار ہے، مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات ہی صحیح ہے، کیونکہ آیات میں اس دھوئیں کا ذکر ہے جو تھوڑا سا دور کیا جائے گا اور اس میں کفار کے لیے ایمان لانے کا موقع ہوگا، جب کہ قیامت کے قریب والی نشانیوں کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ﴾ [ الأنعام : ۱۵۸ ] ”جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی کسی شخص کو اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔“ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ بات بھی بطور دلیل پیش فرمائی کہ بھلا قیامت کا عذاب بھی دور ہو سکتا ہے!؟

**آیت 12** ﴿ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴾ : یعنی کفار عذاب دیکھ کر یہ بات کہیں گے، جیسا کہ فرعون کی قوم ہر عذاب آنے پر یہی وعدہ کرتی رہی۔

**آیت 14,13** ﴿ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَ قَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴾ ...: یعنی انھیں دھوئیں کے عذاب کی دلیل سے نصیحت کیسے ہوگی جب کہ ان کے پاس اس سے بہت ہی بڑی دلیل پہلے آ چکی اور وہ ہے رسول مبین، جس کا رسول ہونا بالکل واضح ہے اور جس نے ہر بات کھول کر بیان کر دی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے منہ موڑ لیا اور کہنے لگے کہ یہ کسی کا سکھایا ہوا ہے، دیوانہ ہے۔ ”ثُمَّ“ (پھر) کا لفظ ان کے حال پر تعجب کے اظہار کے لیے ہے کہ رسول مبین کا آنا اس قدر واضح اور روشن نشانی تھی کہ اسے نہ ماننے کی گنجائش ہی نہ تھی، پھر بھی انھوں نے اس پر معلّم اور مجنون کا بہتان لگا کر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کلام مختصر کر دیا ہے، ورنہ یہ ایک شخص یا ایک مجلس کی بات نہیں بلکہ کسی شخص نے معلّم کہا اور کسی نے مجنون، کسی مجلس میں ایک تہمت جڑ دی گئی تو کسی میں دوسری۔ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ کوئی آدمی آپ کو یہ قرآن

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾
وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾

بے شک ہم یہ عذاب تھوڑی دیر کے لیے دور کرنے والے ہیں، بے شک تم دوبارہ وہی کچھ کرنے والے ہو ﴿۱۵﴾ جس دن ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے، بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں ﴿۱۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمایا اور ان کے پاس ایک بہت باعزت رسول آیا ﴿۱۷﴾

سکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا۔ (دیکھیے نحل: ۱۰۳۔ فرقان: ۴ تا ۶) انھیں اس شخص کو دیوانہ کہتے ہوئے حیا نہیں آتی تھی جو اس سے پہلے چالیس برس ان میں رہا اور وہ اسے صادق اور امین کہتے رہے۔ پھر وہ ایسی کتاب لے کر آیا جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا جواب لانے سے بھی وہ عاجز رہے اور رہیں گے۔ بھلا دیوانے ایسے ہوتے ہیں!؟

آیت 15 اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا ...... : یعنی ہم تمھارے رسول کی دعا سے عذاب کو تھوڑی مدت کے لیے ہٹانے والے ہیں، تاکہ تمھارے ایمان لانے کے وعدے کی حقیقت سامنے آ جائے اور تم پر حجت پوری ہو جائے، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ عذاب ہٹنے پر تم دوبارہ وہی کچھ کرو گے جو پہلے کرتے تھے۔

آیت 16 يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ : "اِنَّ" علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ یعنی یہ قحط کا عذاب تو ہم نے ہٹا لیا مگر قیامت کے دن جب ہم تمھیں بڑی گرفت میں پکڑیں گے تو وہ کسی صورت دور نہیں ہوگی، کیونکہ ہم انتقام لے رہے ہوں گے۔ دنیا کی گرفت تمھیں کفر سے واپس لانے کے لیے تھی، اس لیے اس کے بعد تمھیں رجوع کا موقع ملتا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [ السجدة : ۲۱ ] "اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔" لیکن قیامت کے دن کی بڑی گرفت انتقام کے لیے ہوگی، اس کے بعد تمھیں مہلت نہیں ملے گی۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ "اَلْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى" يَوْمُ بَدْرٍ، وَ أَنَا أَقُوْلُ هِيَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ )) [ الطبري : ۲۷/۲۱، ح : ۳۱۳۳۸ ] "ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "اَلْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى" (بڑی پکڑ) یوم بدر ہے اور میں کہتا ہوں کہ وہ قیامت کا دن ہے۔" ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قول کی سند کو صحیح کہا ہے۔ ان کی تفسیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے بھی اس قول کی سند کو صحیح کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات قوی ہے۔

آیت 17 ① وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ : یعنی ان کفار مکہ سے پہلے ہم نے فرعون کی قوم کو آزمایا، کبھی وسعت اور فراخی دے کر اور کبھی کوئی عذاب بھیج کر۔ ان کا بھی یہی حال تھا کہ جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے، یہ ہمارے ہنر کا کمال ہے اور جب ان پر عذاب آتا تو اسے موسیٰ علیہ السلام کی نحوست قرار دیتے، مگر پھر انھی سے درخواست کرتے کہ اپنے رب سے دعا کر، اگر اس نے یہ عذاب ہم سے ہٹا دیا تو ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ مگر

اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ۙ﴿۱۸﴾

یہ کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، بے شک میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ﴿۱۸﴾

جب ان کی دعا سے وہ عذاب دور ہوتا تو فوراً عہد توڑ ڈالتے۔ آخر انجام ان کا یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے ہم نے انھیں سمندر میں غرق کر دیا۔ (دیکھیے اعراف: ۱۳۰ تا ۱۳۶) مقصود ان آیات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور کفار کو عبرت دلانا ہے۔

② وَ جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ كَرِيۡمٌ : "كَرِيۡمٌ" کا لفظ کسی بھی چیز میں سے اعلیٰ درجے کی چیز پر بولا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو کریم اس لیے فرمایا کہ وہ حسب نسب میں ان سب سے اونچے اور اخلاق و صفات میں نہایت بلند تھے اور اللہ کے ہاں اتنے عالی مرتبے والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے کلام فرمایا۔

آیت 18 ① اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ...... : یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جو اقوال یہاں نقل ہوئے ہیں وہ ایک وقت کے نہیں بلکہ کئی سالوں میں مختلف مواقع پر انھوں نے فرعون اور اس کے درباریوں سے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔

② اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ : اس جملے کی تفسیر دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ "عِبَادَ اللّٰهِ" کا لفظ "اَدُّوۡۤا اِلَیَّ" کا مفعول بہ ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو۔ "عِبَادَ اللّٰهِ" (اللہ کے بندوں) سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جنھیں فرعون نے غلام بنا رکھا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو اسلام کی دعوت کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نجات دلانا بھی تھا۔ اس تفسیر کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿ فَاْتِيٰهُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّكَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۙ وَ لَا تُعَذِّبۡهُمۡ ﴾ [ طٰہٰ : ۴۷ ] "تو اس کے پاس جاؤ اور کہو بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، پس تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انھیں عذاب نہ دے۔" یہاں بنی اسرائیل کو "عِبَادَ اللّٰهِ" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور غلام ہیں، تمھیں کوئی حق نہیں کہ انھیں غلام بنا کر رکھو۔ یہی بات جنگ قادسیہ کے موقع پر ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کے سردار رستم سے کہی تھی، جب اس نے ان سے پوچھا: (( مَا جَاءَ بِكُمۡ؟ )) "تمھیں کیا چیز لے کر آئی ہے؟" تو انھوں نے جواب میں جو تقریر کی اس کے چند جملے یہ ہیں: (( اَللّٰهُ ابۡتَعَثَنَا لِنُخۡرِجَ مَنۡ شَاءَ مِنۡ عِبَادَةِ الۡعِبَادِ إِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ وَ مِنۡ ضِيۡقِ الدُّنۡيَا إِلٰى سَعَتِهَا وَمِنۡ جَوۡرِ الۡأَدۡيَانِ إِلٰى عَدۡلِ الۡإِسۡلَامِ )) [ البداية والنهاية : ۴۷/۷، سن ۱۴ هجري کے واقعات ] "اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ ہم جسے وہ چاہے اسے بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف اور تمام دینوں کے ظلم و جور سے نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔"

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "عِبَادَ اللّٰهِ" سے پہلے حرفِ ندا "یا" محذوف ہے اور وہ منادیٰ مضاف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور "اَدُّوۡۤا اِلَیَّ" کا مفعول محذوف ہے: " أَيۡ أَدُّوۡا إِلَيَّ مَا وَجَبَ عَلَيۡكُمۡ يَا عِبَادَ اللّٰهِ! " "یعنی اے اللہ کے بندو!

وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْۤ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۹ وَ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝۲۰

اور یہ کہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو، بے شک میں تمھارے پاس واضح دلیل لانے والا ہوں ۝۱۹ اور بے شک میں اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ پکڑتا ہوں، اس سے کہ تم مجھے سنگسار کر دو ۝۲۰

جو حقوق تم پر واجب ہیں وہ مجھے ادا کرو۔‘‘ یعنی مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو۔ اس تفسیر کے مطابق ”عِبَادَ اللّٰهِ“ سے مراد قبطی ہیں۔ یہ تفسیر بھی درست ہے، بعد کا جملہ ”اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ“ اس تفسیر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ حرف ندا کا حذف کلامِ عرب میں عام ہے، جیسا کہ عزیزِ مصر نے کہا تھا: ﴿يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا﴾ [ یوسف : ۲۹ ] ”أَيْ يَا يُوْسُفُ! أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا“ یعنی اے یوسف! اس معاملے سے درگزر کر۔

❸ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ: یہ پہلے جملے کی علت ہے، یعنی میرے حقوق جو تم پر واجب ہیں ادا کرو، کیونکہ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں، تمھیں اللہ کا پیغام ٹھیک ٹھیک کسی کمی یا زیادتی کے بغیر پہنچاتا ہوں۔ یہ الفاظ اس وقت کے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام نے شروع میں اپنی دعوت پیش فرمائی۔

آیت 19 ❶ وَ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ: اور اللہ کے سامنے اونچے مت بنو، اس کے مقابلے میں سرکشی مت کرو۔ یعنی تمھارا مجھ پر ایمان نہ لانا دراصل اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ مجھے بھیجنے والا وہ ہے اور جو کچھ میں نے تمھیں کہا ہے وہ میری بات نہیں بلکہ اللہ کی بات ہے جو میں پوری امانت کے ساتھ تمھیں پہنچا رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ کسی دوسرے کے غلام کو اپنا غلام بنا لینا بہت بڑی سرکشی ہے جو تم نے اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنا کر اس کے مقابلے میں اختیار کر رکھی ہے، اس لیے یہ سرکشی چھوڑ کر انھیں آزاد کر دو۔

❷ اِنِّيْۤ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ: یعنی اگر تمھیں شک ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نہیں بھیجا تو میں اللہ کی طرف سے اپنے رسول ہونے کی واضح دلیل پیش کرنے والا ہوں جس سے تمھیں میری رسالت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا۔ ”بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ“ اگرچہ نکرہ ہے مگر اسم جنس ہونے کی وجہ سے اس سے مراد صرف ایک دلیل نہیں بلکہ عصائے موسیٰ سے لے کر وہ تمام معجزے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام پہلی مرتبہ فرعون کے پاس آنے سے لے کر مصر میں قیام کے آخری وقت تک دکھاتے رہے۔

آیت 20 وَ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ: یہ اس وقت کی بات ہے جب موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اندر ہی اندر دور تک پھیل گئی، حتیٰ کہ فرعون کی قوم کے کئی آدمی بھی پوشیدہ طور پر ان پر ایمان لے آئے، اس وقت فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ فرعونیوں کا ارادہ انھیں سنگسار کر کے بدترین طریقے سے قتل کرنے کا ہے، تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں اس بات سے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ پکڑتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کرو، کیونکہ وہ میرا ہی نہیں تمھارا بھی مالک ہے، تم اس سے زبردست ہو کر مجھے رجم نہیں کر سکتے۔ سورۂ مومن (۲۶، ۲۷) میں فرعون کے قتل کے

وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ سے الگ رہو ﴿۲۱﴾ آخر اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں ﴿۲۲﴾ پس میرے بندوں کو رات کے کسی حصے میں لے جا، بے شک تم پیچھا کیے جانے والے ہو ﴿۲۳﴾

اعلان اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اللہ کی پناہ میں جانے کا مفصل ذکر ہے۔

آیت 21 وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ: یعنی اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، مجھے ایذا نہ پہنچاؤ اور بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ جانے سے نہ روکو۔

آیت 22 فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ: یہاں ایک لمبا قصہ حذف کر دیا گیا ہے جو کئی سال تک موسیٰ علیہ السلام کی دعوت، ہر طرح کی آزمائشوں کے باوجود فرعون کی سرکشی، بنی اسرائیل پر بے پناہ مظالم اور ان کے بے مثال صبر پر مشتمل ہے۔ "فَدَعَا رَبَّهٗۤ" کے ساتھ اس قصے کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ جب انھوں نے تمام معجزے دیکھنے، ہر بار ایمان لانے کا عہد کرنے اور اسے توڑ دینے کے بعد صاف لفظوں میں کہہ دیا: ﴿مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [ الأعراف : ۱۳۲ ] "تو ہمارے پاس جونشانی بھی لے آئے، تاکہ ہم پر اس کے ساتھ جادو کرے تو ہم تیری بات ہرگز ماننے والے نہیں۔" تو ان کے ایمان لانے سے پوری طرح مایوس ہونے کے بعد نوح علیہ السلام کی طرح موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کے خلاف اپنے رب سے دعا کی کہ یہ لوگ مجرم ہیں، کسی طرح ماننے والے نہیں۔ سورۂ یونس میں ہے: ﴿وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴾ [ یونس : ۸۸ ] "اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں بہت سی زینت اور اموال عطا کیے ہیں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ تیرے راستے سے گمراہ کریں، اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔"

آیت 23 ❶ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا ......: موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور حکم ہوا کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ، تاکہ فرعون کو فوری خبر نہ ہو سکے اور یاد رکھو! تمھارا تعاقب کیا جائے گا، اس لیے تمھیں ہجرت کا یہ سفر پوری احتیاط کے ساتھ ہوشیار رہ کر کرنا ہوگا۔

❷ "بِعِبَادِيْ" (میرے بندوں) سے مراد بنی اسرائیل ہیں اور ان کے ساتھ قبطیوں کے وہ لوگ بھی جو ایمان لا چکے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ شعراء (۵۲ تا ۶۸)، یونس (۸۸ تا ۹۲) اور سورۂ طٰہٰ (۷۷)۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۣ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور سمندر کو اپنے حال پر ٹھہرا ہوا چھوڑ دے، بے شک وہ ایسا لشکر ہیں جو غرق کیے جانے والے ہیں ﴿۲۴﴾ کتنے ہی چھوڑ گئے باغات اور چشمے ﴿۲۵﴾ اور کھیتیاں اور عمدہ مقام ﴿۲۶﴾ اور خوش حالی، جن میں وہ مزے اڑانے والے تھے ﴿۲۷﴾ اسی طرح ہوا اور ہم نے ان کا وارث اور لوگوں کو بنا دیا ﴿۲۸﴾ پھر نہ ان پر آسمان وزمین روئے اور نہ وہ مہلت پانے والے ہوئے ﴿۲۹﴾

**آیت 24** وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ...... : "رَهَا، يَرْهُوْ رَهْوًا" (ن) "اَلْبَحْرُ" سمندر کا ساکن ہونا۔ "رَهَا الرَّجُلُ رَهْوًا" جب آدمی دونوں ٹانگیں کھول لے اور انھیں الگ الگ کر لے۔ یہاں اس قصے کا وہ حصہ حذف کر دیا ہے جس میں ذکر ہے کہ بنی اسرائیل سمندر پر پہنچے تو پیچھے سے فرعون بھی پہنچ گیا، بنی اسرائیل سخت خوف زدہ ہو گئے کہ اب دوبارہ پکڑے جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ اپنی لاٹھی سمندر پر مار۔ انھوں نے ایسا کیا تو سمندر پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ اپنی جگہ ایک بڑے پہاڑ کی شکل میں کھڑا ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل خیریت سے گزر گئے تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا: ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا﴾ "اور سمندر کو اپنے حال پر ٹھہرا ہوا چھوڑ دے۔" دیکھیے سورۂ شعراء (۵۲ تا ۶۸) سمندر سے پار ہونے پر موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ سمندر کو اسی حالت میں ٹھہرا ہوا چھوڑ دیں کہ اس میں الگ الگ راستے کھلے ہوں، تعاقب کی فکر مت کریں، اس لشکر کو اسی سمندر میں غرق کیا جانا ہے۔

**آیت 28،25** كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ...... : ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ شعراء کی آیات (۵۵ تا ۵۹) کی تفسیر۔

**آیت 29** ① فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ : اس آیت کی تفسیر میں تین قول ہیں، تینوں میں سے جو بھی مراد لے لیں درست ہے۔ ایک یہ کہ "السَّمَآءُ" سے پہلے لفظ "اَهْلُ" محذوف ہے، جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے والد کو جا کر بتایا کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، جس کی وجہ سے عزیز مصر نے اسے اپنے پاس روک لیا ہے۔ پھر یقین دلانے کے لیے کہا: ﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا﴾ [ یوسف : ۸۲ ] "اور آپ اس بستی سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ اس بستی والوں سے پوچھ لیں۔ اسی طرح یہاں مطلب یہ ہے کہ نہ ان پر آسمان والے روئے اور نہ زمین والے، بلکہ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا اور ہر ظالم حکمران ٹولے کا یہی حشر ہوتا ہے۔

دوسرا قول یہ کہ اس سے مراد ان کی تحقیر اور ان کا مذاق اڑانا ہے۔ عرب کے ہاں جب کوئی بڑا آدمی فوت ہوتا تو وہ اس کی

وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی ﴿۳۰﴾ فرعون سے، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے ایک سرکش شخص تھا ﴿۳۱﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں علم کی بنا پر جہانوں سے چن لیا ﴿۳۲﴾**

بات کو بہت بڑا حادثہ بتانے کے لیے کہتے کہ اس پر آسمان رویا، زمین روئی اور پہاڑ لرز اٹھے۔ مطلب یہ کہ اتنی شان وشوکت والے اور خدائی کا ڈنکا بجانے والے مرے تو ان لوگوں کی طرح جن کی نہ کوئی حیثیت ہوتی ہے اور نہ کسی کو ان کے مرنے کی پروا ہوتی ہے۔ تیسرا قول یہ کہ آیت کے ظاہر الفاظ کے مطابق آسمان وزمین نیک لوگوں کے مرنے پر روتے ہیں، مگر ان کے مرنے پر نہ آسمان رویا نہ زمین۔ یہ معنی بھی کچھ بعید نہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے ڈر سے پتھروں سے نہریں پھوٹنے، ان کے پھٹ جانے اور اللہ کے خوف سے گر پڑنے کا ذکر فرمایا ہے (دیکھیے بقرہ: ۷۴) اور جس طرح کھجور کے درخت کا تنا (حنانہ) رسول اللہ ﷺ کے اسے چھوڑ کر منبر پر خطبہ دینے کے وقت رویا تھا۔

② وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ: اور نہ وہ مہلت پانے والے ہوئے کہ توبہ کر لیتے، بلکہ آن کی آن میں ڈبو دیے گئے۔

آیت 30 وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ: موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں فرعون اور آل فرعون کو غرق کرنے کا ذکر کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا۔ اس میں قریش کے جباروں کو فرعون اور آلِ فرعون کے انجام سے ڈرایا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ نہ کفر کے یہ سردار فرعون جیسی قوت وشوکت کے مالک ہیں نہ مسلمان بنی اسرائیل جتنے مظلوم اور بے بس۔ تو جب فرعون کی قوت وشوکت کا یہ حال ہوا تو یہ بے چارے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور جب بنی اسرائیل جیسے بے بس اور مظلوم ظلم سے نجات پا سکتے ہیں تو مسلمانوں کو بھی اس کی امید رکھنی چاہیے۔

''لام'' اور ''قَدْ'' تاکید کے لیے قسم کا مفہوم رکھتے ہیں۔ یقین دلانے کے لیے قسم کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی کسی بات کا منکر ہو، یہاں یہ بات اتنی تاکید کے ساتھ اس لیے فرمائی کہ ماننے میں نہیں آتا کہ ظلم میں اس قدر جکڑی ہوئی قوم، جن کے لڑکے ذبح کیے جا رہے ہوں، لڑکیوں کو زندہ رکھ کر ان سے ہر خدمت لی جا رہی ہو اور وہ اُف تک نہ کر سکتے ہوں اور دنیا میں کہیں سے انھیں مدد مل سکتی ہو نہ کوئی ان کے حق میں آواز اٹھانے والا ہو، انھیں بھی اتنی ذلت سے نجات مل سکتی ہے؟ فرمایا، ہاں، ہاں! ایسا ہوا ہے اور یقیناً ہوا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی۔

آیت 31 ① مِنْ فِرْعَوْنَ: وہ عذاب کیا تھا؟ وہ فرعون تھا، اس کی ذات ہی بنی اسرائیل کے لیے مجسمۂ عذاب تھی۔

② اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ: اس کی سرکشی اور زیادتی کے لیے دیکھیے سورۂ قصص کی آیت (۴) کی تفسیر۔

آیت 32 ① وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ: ''اِخْتَرْنَا'' ''اِخْتَارَ يَخْتَارُ اِخْتِيَارًا'' (افتعال) سے جمع متکلم ماضی معلوم ہے۔ یہاں بھی ''لَقَدْ'' لانے کا مقصد یہی ہے کہ اتنی پسی ہوئی قوم کو یکا یک تمام دنیا پر برتری کیسے مل سکتی ہے؟ فرمایا قسم ہے کہ ہم نے

وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ۝۳۳ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝۳۴ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝۳۵

اور ہم نے انھیں وہ نشانیاں دیں جن میں واضح آزمائش تھی ۝۳۳ بے شک یہ لوگ یقیناً کہتے ہیں ۝۳۴ کہ ہماری اس پہلی موت کے سوا کوئی (موت) نہیں اور نہ ہم کبھی دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں ۝۳۵

انھیں تمام جہانوں پر چن لیا، پھر ہمارے چنے ہوؤں کو برتری کیوں حاصل نہ ہوگی۔

② عَلٰى عِلْمٍ : یعنی ہم نے بلا وجہ ان کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ ہمیں ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا علم تھا اور ہم ان کی خامیوں اور کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ اس علم ہی کی بنا پر ہم نے ان کے زمانے کی تمام قوموں میں سے ان کا انتخاب کیا۔

③ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ : "الْعٰلَمِيْنَ" سے مراد ان کے زمانے کے جہان ہیں، کل جہان نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امت محمد ﷺ کو: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ [ آل عمران : ۱۱۰ ] کہہ کر تمام امتوں سے بہتر قرار دیا ہے، کیونکہ "كَانَ" استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔ ہاں بعض جزوی فضائل بنی اسرائیل میں ایسے ہیں جو انھی کی خصوصیت ہیں، مثلاً اتنے انبیاء کا ان میں مبعوث ہونا، مگر مجموعی اور کلی لحاظ سے امت محمد (ﷺ) افضل ہے۔

**آیت 33** وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ...... : "بَلٰٓؤٌا" کا معنی آزمائش ہے، یہ لفظ مصیبت اور انعام دونوں معنوں میں آتا ہے، کیونکہ آزمائش دونوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہاں مراد ان پر کیے جانے والے احسانات ہیں، جن میں آزادی، صحرا میں کھانے پینے اور دھوپ سے بچنے کی تمام ضرورتوں کا انتظام اور پھر ارض مقدس کی تولیت کا شرف سب چیزیں شامل ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۹)۔

**آیت 34** اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ : یہاں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ختم ہوا جو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا تھا اور دوبارہ سلسلۂ کلام کفار قریش کے ساتھ جوڑ دیا گیا، جو پہلے سے چلا آ رہا تھا اور کفار سے فرمایا تھا: ﴿ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴾ [ الدخان : ۸، ۹ ] "اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، تمھارا رب ہے اور تمھارے پہلے باپ دادا کا رب ہے۔ بلکہ وہ ایک شک میں کھیل رہے ہیں۔" ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے زندگی بخشنے اور موت دینے کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ کفار شک ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ فرعون کی سرکشی اور غرقابی کے ذکر کے بعد کفار قریش کا ذکر "هٰٓؤُلَآءِ" (یہ لوگ) کہہ کر حقارت کے ساتھ فرمایا کہ فرعون جیسے قوت و شوکت اور رعب و دبدبے والے منکروں کا انجام سن چکے، اب ان لوگوں کی بات سنو جو اس کے مقابلے میں کچھ قوت نہیں رکھتے، یہ بھی ہمارے دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کو ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ کہتے ہیں۔

**آیت 35** اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ : کہتے یہ ہیں کہ پہلی دفعہ ہم مریں گے تو قصہ ختم، پھر کوئی

فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۳۷﴾

تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۳۶﴾ کیا یہ لوگ بہتر ہیں، یا تبع کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، بے شک وہ مجرم تھے ﴿۳۷﴾

زندگی نہیں اور نہ ہمیں اٹھایا جائے گا۔

آیت 36 فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: یعنی ہم نے آج تک کسی فوت شدہ کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا، اگر تمھارا دعویٰ ہے کہ دوسری زندگی ہے تو ہمارے آبا و اجداد کو قبروں سے اٹھا لاؤ، اگر تم سچے ہو، ورنہ ہم تمھیں جھوٹا سمجھیں گے۔ وہ اپنی اس دلیل کو بہت مضبوط سمجھتے تھے! حالانکہ یہ کئی وجہوں سے بالکل فضول ہے، کیونکہ انھیں یہ کس نے کہا کہ وہ اسی دنیا میں آئے گی؟ وہ تو ایک نئی دنیا ہوگی جس میں تمام مردے بیک وقت اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پھر انھیں یہ کس نے کہا ہے کہ مردوں کا زندہ کرنا پیغمبر کے اختیار میں ہے؟ اس کا کام تو صرف پیغام پہنچانا ہے، مردے زندہ کرنا یا معجزوں کے مطالبے پورے کرنا نہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کا ایک وقت مقرر ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، وہ اسی وقت آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ اب قیامت سے پہلے قیامت کا مطالبہ کون سی دانش مندی ہے؟ اگر کسی کو آئندہ ہونے والے کسی کام کی اطلاع دی جائے تو کیا یہ کہہ کر اسے جھٹلایا جا سکتا ہے کہ یہ کام فوراً کر کے دکھاؤ، اگر ابھی نہیں ہوتا تو کبھی بھی نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے یہ نہایت بے عقلی کی بات ہے۔

آیت 37 ❶ اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ: تُبّع یمن کے قبیلہ حمیر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جیسے کسریٰ ایران کے بادشاہوں کا، قیصر روم کے بادشاہوں کا، فرعونِ مصر کے بادشاہوں کا اور نجاشی حبشہ کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔ یہ حمیر کا بادشاہ تُبّع مومن تھا اور اس کی قوم کافر تھی، اس لیے اس کی قوم کی مذمت کی ہے، اس کی نہیں۔

❷ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: پہلے لوگوں سے مراد عاد و ثمود، قومِ ابراہیم، قومِ لوط، اصحابِ مدین اور قومِ فرعون وغیرہ ہیں۔

❸ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ: یہ کفار کے اعتراض کا تاریخ سے جواب ہے کہ جو شخص یا قوم آخرت کا انکار کرے گی اسے کوئی چیز مجرم بننے سے روک نہیں سکتی، کیونکہ اسے باز پرس کی فکر ہی نہیں ہوتی، وہ اپنی خواہشات کے پیچھے بے لگام گھوڑے چلے جاتے ہیں۔ پھر ان کی سرکشی، ظلم و زیادتی اور حد سے بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ''یہ لوگ بہتر ہیں یا قومِ تُبّع اور اس سے پہلے کے لوگ'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفارِ مکہ تو اس خوش حالی اور قوت و شوکت کو پہنچ ہی نہیں سکے جو تُبّع کی قوم اور اس سے پہلے کی اقوام کو حاصل رہی ہے، جب ان کی خوش حالی انھیں اس زوال سے نہیں بچا سکی جو قیامت کے انکار کی وجہ سے ان پر آیا تو ان بے چاروں کی کیا حیثیت ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۳۸ مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۹ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۴۰ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۱ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۴۲

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیلتے ہوئے نہیں بنایا ۝۳۸ ہم نے ان دونوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ۝۳۹ یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا مقرر وقت ہے ۝۴۰ جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ۝۴۱ مگر جس پر اللہ نے رحم کیا، بے شک وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ۝۴۲

**آیت 39،38** وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ...... : یہ منکرینِ قیامت کے اعتراض کا عقلی جواب ہے کہ اگر سب لوگوں کو زندہ کرکے ان سے باز پرس کا اور نیک و بد کی جزا و سزا کا کوئی دن نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی عظیم کائنات محض کھیلنے کے لیے بنائی ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں، اس کے ہاں نیک و بد اور ظالم و مظلوم برابر ہیں، نہ اس کے ہاں عدل ہے نہ حکمت۔ فرمایا ایسا نہیں ہے، ہم نے آسمان و زمین کو حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور قیامت قائم کرنا ہماری حکمت اور عدل کا تقاضا ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے، اس لیے آخرت کی تیاری سے غافل ہیں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے، دیکھیے سورۂ انبیاء (۱۶ تا ۱۸)، مومنون (۱۱۵، ۱۱۶) اور سورۂ قیامہ (۳۶ تا ۴۰)۔

**آیت 40** اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ : یہ ان کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ "ہمارے باپ دادا کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔" فرمایا، موت کے بعد زندگی کوئی کھیل نہیں کہ جب کوئی اس کا مطالبہ کرے اسے کوئی مردہ زندہ کرکے دکھا دیا جائے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر فرما رکھا ہے جس میں وہ سب کو جمع کرکے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

**آیت 41** ❶ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا : "مَوْلًى" کا معنی دوست بھی ہے، قریبی رشتہ دار بھی، غلام بھی اور غلام کا مالک بھی۔ یعنی قیامت کے دن کوئی شخص کسی ایسے شخص کے کام نہیں آ سکے گا جس سے اس کی دوستی یا رشتہ داری یا اس کی حمایت حاصل کرنے کا کوئی تعلق ہو۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۱۰۱) اور سورۂ معارج (۱۰، ۱۱)۔

❷ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ : اور نہ کسی اور طرف سے مدد مل سکے گی۔

**آیت 42** ❶ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ : یعنی جس پر اللہ نے رحم فرما دیا وہی بچے گا، جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَنْ يُنَجِّيَ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ، قَالُوْا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ وَ لَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ » [ بخاري، الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل : ٦٤٦٣ ] "تم میں کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔" صحابہ نے کہا: "یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی نہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے بھی نہیں، اِلّا یہ کہ اللہ مجھے

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝۴۳ طَعَامُ الْأَثِيْمِ ۝۴۴ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝۴۵ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝۴۶ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ إِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝۴۷ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَأْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝۴۸

بے شک زقوم کا درخت ۝۴۳ سخت گناہ گار کا کھانا ہے ۝۴۴ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح، پیٹوں میں کھولتا ہے ۝۴۵ گرم پانی کے کھولنے کی طرح ۝۴۶ اسے پکڑو، پھر اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک گھسیٹ کر لے جاؤ ۝۴۷ پھر کھولتے پانی کا کچھ عذاب اس کے سر پر انڈیلو ۝۴۸

اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے۔"

❺ إِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ : یہ اس بات کا جواب ہے کہ کوئی کسی کی مدد کیوں نہیں کر سکے گا؟ فرمایا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب پر غالب ہے، وہ جو فیصلہ کر دے گا وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ کسی میں اسے رد کرنے یا بدلنے کی یا اس کی مرضی کے بغیر سفارش کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ "الرَّحِيْمُ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب پر غالب ہونے کے باوجود بے حد مہربان ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ چاہے تو قصور وار کی سزا معاف کر دے یا اس میں کمی کر دے یا کسی کو اس عمل سے بہت زیادہ جزا دے دے، مگر وہ جرم کے بغیر کسی کو سزا نہیں دیتا۔

**آیت 43** إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ : "الزَّقُّوْمِ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۶۲ تا ۶۵)۔

**آیت 44** طَعَامُ الْأَثِيْمِ : "الْأَثِيْمِ" سے مراد یہاں کافر و مشرک اور قیامت کا منکر ہے، کیونکہ پیچھے انھی کا ذکر آ رہا ہے اور آگے آیت (۵۰): ﴿إِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ﴾ (یہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے) سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہوں گے، کیونکہ ایمان تو یقین کا نام ہے۔ سورۂ قلم میں بھی "اثیم" کا لفظ کافر کے متعلق آیا ہے، فرمایا: ﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيْمٍ﴾ [القلم : ۱۲] "خیر کو بہت روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، سخت گناہ گار ہے۔" سورۂ جاثیہ میں فرمایا: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ﴾ [الجاثیۃ : ۷] "بڑی ہلاکت ہے ہر سخت جھوٹے، گناہ گار کے لیے۔"

**آیت 45** كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ : "الْمُهْلُ" کے کئی معنی ہیں، پگھلا ہوا تانبا، لوہا یا کوئی دھات، گرم تیل کی تلچھٹ، پیپ اور لہو۔ مزید دیکھیے سورۂ کہف (۲۹)۔

**آیت 46** كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ : "الْحَمِيْمِ" نہایت گرم پانی۔

**آیت 47** خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ إِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ : "عَتَلَ يَعْتِلُ" (ض، ن) سختی سے گھسیٹ کر لے جانا۔ "سَوَآءِ" کا معنی درمیان ہے، کیونکہ درمیان کی چیز ہر طرف سے برابر ہوتی ہے۔

**آیت 48** ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَأْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حج کی آیت (۱۹، ۲۰) کی تفسیر۔

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۗ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾

چکھ، بے شک تو ہی وہ شخص ہے جو بڑا زبردست، بہت باعزت ہے ﴿۴۹﴾ بے شک یہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے ﴿۵۰﴾ بے شک متقی لوگ امن والی جگہ میں ہوں گے ﴿۵۱﴾ باغوں اور چشموں میں ﴿۵۲﴾ وہ باریک ریشم اور گاڑھے ریشم کا لباس پہنیں گے، اس حال میں کہ آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ﴿۵۳﴾ اسی طرح ہوگا اور ہم ان کا نکاح سفید جسم، آنکھوں والی عورتوں سے کر دیں گے، جو بڑی آنکھوں والی ہیں ﴿۵۴﴾

**آیت 49** ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ: "ذُقْ" "ذَاقَ يَذُوْقُ ذَوْقًا" (ن) سے امر ہے، چکھو۔ یہ بات ان سے طنز اور مذاق کے طور پر کہی جائے گی، کیونکہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتے اور باور کرواتے تھے۔ جملے کی خبر "الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ" پر الف لام اور ضمیر فصل "اَنْتَ" سے حصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ تو ہی وہ شخص ہے جو عزیز و کریم ہے۔

**آیت 50** اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ: یعنی یہ ہے وہ جہنم جس کا تمھیں یقین نہیں تھا۔ فرشتے انھیں جہنم کی مار دے دے کر جتلائیں گے کہ یہ وہ آگ ہے جس میں تم شک کرتے تھے اور جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ دیکھیے سورۂ طور (۱۳ تا ۱۵)۔

**آیت 51** اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ: کفار کے برے انجام کے ذکر کے بعد متقین کے حسن انجام کا ذکر فرمایا۔ "مَقَامٍ اَمِيْنٍ" (امن والی جگہ) سے مراد وہ جگہ جہاں نہ موت کا کھٹکا ہے نہ نکالے جانے کی فکر، نہ کوئی غم نہ پریشانی اور نہ محنت نہ مشقت۔ ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يُنَادِيْ مُنَادٍ إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَصِحُّوْا فَلاَ تَسْقَمُوْا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَحْيَوْا فَلاَ تَمُوْتُوْا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَشِبُّوْا فَلاَ تَهْرَمُوْا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَنْعَمُوْا فَلاَ تَبْأَسُوْا أَبَدًا » [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب في دوام نعيم أهل الجنة : ۲۸۳۷ ] "(اہل جنت کو) ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ تمھیں یہ نعمت حاصل ہے کہ تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے اور تمھیں یہ نعمت حاصل ہے کہ زندہ رہو گے کبھی نہیں مرو گے اور تمھیں یہ نعمت حاصل ہے کہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمھیں یہ نعمت حاصل ہے کہ خوش حال رہو گے کبھی خستہ حال نہیں ہو گے۔"

**آیت 52** فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ: یہ امن والی جگہ کا بیان ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۴۵)۔

**آیت 52** يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ: "سُنْدُسٍ" باریک ریشمی کپڑا۔ "اِسْتَبْرَقٍ" گاڑھے دبیز ریشم کا کپڑا۔ "مُتَقٰبِلِيْنَ" آمنے سامنے، کسی کی پشت دوسرے کی طرف نہیں ہو گی۔

**آیت 50** كَذٰلِكَ: ① "أَيِ الْأَمْرُ كَذٰلِكَ" یا "يَكُوْنُ كَذٰلِكَ" یعنی ایسے ہی ہوگا، نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَ وَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾

وہ اس میں ہر پھل بے خوف ہو کر منگوا رہے ہوں گے ﴿۵۵﴾ وہ اس میں موت کا مزہ نہیں چکھیں گے، مگر وہ موت جو پہلی تھی اور وہ انھیں بھڑکتی آگ کے عذاب سے بچائے گا ﴿۵۶﴾

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ : " حُوْرٌ " "حَوْرَاءُ" کی جمع ہے، نہایت گوری عورت جس کی آنکھوں کی سیاہی بہت سیاہ اور سفیدی بہت سفید ہو، جسے دیکھتے ہی بندہ حیران رہ جائے۔ بعض نے معنی کیا، سیاہ آنکھ والی عورت جس کی آنکھ میں سفیدی کا حصہ بہت کم ہو۔ "عِيْنٍ" "عَيْنَاءُ" کی جمع ہے، بڑی آنکھوں والی عورت۔

آیت 55 يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ : بے خوف ہو کر منگوانے کا مطلب یہ ہے کہ نہ انھیں یہ فکر ہو گا کہ وہ چیز موجود نہ ہو، نہ یہ کہ قیمت کہاں سے ادا کریں گے، نہ یہ کہ ختم ہو جائے گی، نہ یہ کہ کھانے سے بدہضمی نہ ہو جائے، پھر نہ قبض کا خوف نہ اسہال کا۔ غرض جو چاہیں گے بے فکر ہو کر جنت کے خادموں کو لانے کا حکم دیں گے۔

آیت 56 ① لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى : ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يُؤْتٰى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا ؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ، هٰذَا الْمَوْتُ وَ كُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، ثُمَّ يُنَادِيْ يَا أَهْلَ النَّارِ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا ؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ، هٰذَا الْمَوْتُ وَ كُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، فَيُذْبَحُ ثُمَّ يَقُوْلُ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ : ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ وَ هٰؤُلَاءِ فِيْ غَفْلَةٍ أَهْلُ الدُّنْيَا ﴿ وَ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ » [ بخاري، التفسير، باب قوله عز وجل: ﴿ و أنذرهم يوم الحسرة ﴾ : ۴۷۳۰ ] "موت کو ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: "اے جنت والو!" تو وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے۔ وہ کہے گا: "کیا تم اسے پہچانتے ہو؟" وہ کہیں گے: "ہاں! یہ موت ہے۔" اور وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے، پھر وہ آواز دے گا: "اے آگ والو!" تو وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے، وہ کہے گا: "کیا تم اسے پہچانتے ہو؟" وہ کہیں گے: "ہاں! یہ موت ہے۔" اور وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے، تو اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر وہ کہے گا: "اے جنت والو! (اب) ہمیشگی ہے، کوئی موت نہیں اور اے آگ والو! (اب) ہمیشگی ہے، کوئی موت نہیں۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ [ مریم : ۳۹ ] "اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں۔" یعنی وہ سراسر دنیا کی غفلت میں ہیں "اور وہ ایمان نہیں لاتے۔" مزید دیکھیے سورۂ مریم (۳۹)۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝

ع ۱۶

تیرے رب کی طرف سے فضل کی وجہ سے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ۝ سو حقیقت یہی ہے کہ ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا، تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں ۝ پس انتظار کر، بے شک وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں ۝

② وَ وَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ : یہاں ایک سوال ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو گیا اس کا جہنم سے بچنا تو خود بخود ظاہر ہے، پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ انھیں بھڑکتی آگ سے بچا لے گا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جنت کی قدر پوری طرح اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کے پیشِ نظر یہ بات بھی ہو کہ اگر میں جہنم میں ہوتا تو میرا کیا حال ہوتا۔

آیت 57 ﴿ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ : یعنی جنت میں داخلہ کسی کے استحقاق یا اعمال کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوگا، کیونکہ آدمی جتنے اعمال بھی کرے وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اس سے پہلے آیت (۴۲) کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث گزر چکی ہے کہ کسی بھی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 58 ﴿ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ : سورت کی ابتدا قرآن کریم کی عظمت و اہمیت کے بیان سے ہوئی تھی، آخر میں پھر اسی کی طرف توجہ دلائی کہ ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان عربی میں آسان کر دیا ہے، تا کہ عرب لوگ اسے اپنی زبان میں ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ سمجھ لیں اور غیر عرب لوگوں کو سمجھائیں۔ مزید دیکھیے سورۂ مریم کی آیت (۹۷) کی تفسیر۔

آیت 59 ﴿ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ : یعنی اگر قرآن آسان ہونے کے باوجود یہ لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے تو آپ انتظار کیجیے کہ کب اللہ کی پکڑ ان پر آتی ہے۔ یہ لوگ بھی انتظار کر رہے ہیں کہ آپ کب زمانے کی کسی گردش میں آتے ہیں اور کب ان کی جان چھوٹتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴾ [ الطور : ۳۰، ۳۱ ] ”یا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس پر ہم زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں؟ کہہ دے انتظار کرو، پس بے شک میں (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں۔“

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حٰمٓ ① اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ② بلاشبہ آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ③

آیت 1 حٰمٓ : حروف مقطعات کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت۔

آیت 2 تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ : اس آیت میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ یہ کتاب محمد ﷺ کی تصنیف نہیں بلکہ یہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتدریج نازل کی گئی ہے، کیونکہ "تَنۡزِیۡلُ" کے مفہوم میں تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کرنا بھی ہے۔ دوسری یہ کہ اسے نازل کرنے والی کوئی معمولی ہستی نہیں کہ چاہو تو اس کی بات مان لو، چاہو تو نہ مانو، بلکہ اسے نازل کرنے والا وہ ہے جو سب پر غالب ہے، کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا اور اگر کرتا ہے تو اس کی سزا سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ کمال حکمت والا ہے، اس کے کسی کام میں غلطی نہیں نکالی جا سکتی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ زمر اور سورۂ مومن کی ابتدا۔

آیت 3 اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ : سورۂ بقرہ (۱۶۴) میں "اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ" فرمایا، جبکہ یہاں "اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ" فرمایا، تو یہ اس سے عام ہے، کیونکہ اس میں آسمان و زمین کی پیدائش بھی شامل ہے اور ان کی ذات بھی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں اور ان کے بعد مذکور چیزوں میں کس چیز کی نشانیاں ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم تھی کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی توحید کو اور قیامت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، کچھ دہریے بھی تھے جو اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کو نہیں مانتے تھے، جیسا کہ اسی سورت کی آیت (۲۴) میں آ رہا ہے: ﴿ وَ قَالُوۡا مَا ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا وَ مَا یُہۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّہۡرُ ﴾ "اور انھوں نے کہا ہماری اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی (زندگی) نہیں، ہم (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے کے سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا۔" اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود، اپنی توحید اور قیامت پر دلالت کرنے والی بہت سی نشانیوں کا ذکر فرمایا۔ جن میں سب سے پہلے آسمان و زمین کا ذکر فرمایا کہ ان کے وجود میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، کیونکہ نشانیوں کا فائدہ انھی کو ہوتا ہے جو ماننے کے لیے تیار ہوں، غفلت میں پڑے ہوئے لوگ اور ہٹ دھرم لوگ، جنھوں نے طے کر رکھا ہے کہ ماننا ہی نہیں ان کے لیے ان نشانیوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

## وَ فِيْ خَلْقِكُمْ وَ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

**اور تمھارے پیدا کرنے میں اور ان جاندار چیزوں میں جنھیں وہ پھیلاتا ہے، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین رکھتے ہیں ④**

رہی یہ بات کہ آسمان و زمین میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور قیامت کی نشانیاں کس طرح ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات اور اس کا نظام شاہد ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود نہیں بن گیا، بلکہ اسے کسی بنانے والے نے بنایا ہے اور وہ ایک ہی ہے، کیونکہ اس میں الگ الگ خداؤں کی خدائی چلنے کی گنجائش ہی نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [ الأنبیاء : ۲۲ ] ”اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔“ اس آیت کی تفسیر پر نظر ڈال لیں۔ آسمان و زمین کا وجود اس بات کی بھی شہادت دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ اس نے یہ سب کچھ انسان کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے اور قیامت کے دن ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا دی جائے گی، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [ آل عمران : ۱۹۰، ۱۹۱ ] ”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، سو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔“ اور جیسا کہ اسی سورت میں آگے آ رہا ہے: ﴿وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [ الجاثیۃ : ۲۲ ] ”اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلا دیا جائے جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

**آیت 4** ① وَ فِيْ خَلْقِكُمْ وَ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ : یعنی جو لوگ انسان کی پیدائش میں اور خشکی اور سمندر میں پھیلائی ہوئی جاندار مخلوقات میں، جن کا شمار نہیں، غور کریں گے انھیں بے شمار ایسی نشانیاں ملیں گی جنھیں دیکھ کر کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا کہ یقیناً یہ سب کچھ ایک ہی خالق و مالک کا بنایا ہوا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے اور سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ یقیناً ایک دن ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا ملنے والی ہے۔

② اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ : یعنی جو لوگ شک کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہنے کا یا انکار کا فیصلہ کر چکے ہوں ان کی بات دوسری ہے، مگر جو لوگ بات ثابت ہو جانے پر یقین کرنے والے ہیں ان کے لیے انسان کی پیدائش میں اور زمین میں پھیلی ہوئی بے شمار جاندار مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور قیامت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

اور رات اور دن کے بدلنے میں اور اس رزق میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور ہواؤں کے پھیرنے میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ⑤ یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انھیں تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، پھر اللہ اور اس کی آیات کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ ⑥

آیت 5 ❶ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ: اس میں دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا بھی شامل ہے، رات کا دن سے لمبا ہونا اور دن کا رات سے لمبا ہونا بھی اور سارا سال ہر روز طلوع و غروب کی جگہوں کا مختلف ہونا بھی۔

❷ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ ...... : یہاں آسمان سے نازل کی جانے والی چیز کے لیے "مَآءٌ" (پانی) کے بجائے "رِزْقٍ" کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ آسمان سے بارش کے علاوہ بھی بہت کچھ اترتا ہے جس سے تمام جانداروں کے رزق کا اہتمام ہوتا ہے۔ مثلاً سورج اور چاند کی کرنیں اور روشنی، ہوائیں اور بہت سی چیزیں جو نظر نہیں آتیں مگر موجود ہیں اور اوپر کی جانب سے نازل ہوتی ہیں۔

❸ وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ: ہواؤں کی تقسیم بھی کئی طرح کی ہے، مثلاً مشرقی، مغربی، جنوبی یا شمالی یا ان کے درمیان کی ہوائیں، ٹھنڈی یا گرم یا معتدل ہوائیں، بار آور یا عقیم ہوائیں اور فائدہ پہنچانے والی یا نقصان پہنچانے والی ہوائیں وغیرہ۔ یاد رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی جن نشانیوں کا ذکر ہوا ہے سورۂ بقرہ (۱۶۴) میں یہی نشانیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

❹ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: مفسر قاسمی نے فرمایا: "منصف لوگ جب آسمان و زمین کو دیکھیں گے تو ایمان لے آئیں گے کہ یقیناً انھیں ایک بنانے والا ہے، اس لیے وہاں فرمایا: ﴿ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ الجاثیۃ : ۳ ] "ایمان والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔" پھر جب اپنی پیدائش اور دوسرے جانداروں میں غور کریں گے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوگا اور وہ یقین کر لیں گے، اس لیے وہاں فرمایا: ﴿ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾ [ الجاثیۃ : ٤ ] "ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔" پھر دوسری تمام مخلوقات پر غور و فکر کریں گے تو بہت اچھی طرح سمجھ جائیں گے، اس لیے یہاں فرمایا: ﴿ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ "ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔" (نظم الدرر)

آیت 6 ❶ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ: یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جو ہم تجھے حق کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے ہیں، ان میں کوئی بات باطل نہیں، نہ ان میں کوئی جھوٹ ہے نہ جادو اور نہ یہ محض خیالی باتیں ہیں۔

وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۝۷ يَّسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتۡلٰى عَلَيۡهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝۸

بڑی ہلاکت ہے ہر سخت جھوٹے، گناہ گار کے لیے ⑦ جو اللہ کی آیات سنتا ہے، جبکہ اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، پھر وہ تکبر کرتے ہوئے اڑا رہتا ہے، گویا اس نے وہ نہیں سنیں، سو اسے دردناک عذاب کی بشارت دے دے ⑧

② فَبِاَيِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ : یہاں ایک لمبی بات کو مختصر فرما دیا ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ کی آیات سن کر بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر اللہ کے بعد کون سی ہستی ہے اور اس کی آیات کے بعد کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے؟

آیت 7 ① وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ : آیات سن کر ان کا اثر قبول کرنے کے لحاظ سے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جو ایمان و یقین اور عقل سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو تکبر کی وجہ سے اللہ کی آیات کے انکار پر اصرار کرنے والے ہیں۔

② "وَيۡلٌ" کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۷۹) "إِفْكٌ" بدترین جھوٹ، بہتان۔ "اَفَّاكٍ" مبالغے کا صیغہ ہے، سخت جھوٹا۔ "اَثِيۡمٍ" سخت گناہ گار۔ یعنی ہر ایسے انسان کے لیے بہت بڑی ہلاکت اور بربادی ہے جو قول میں سخت جھوٹا اور فعل میں سخت گناہ گار ہے۔

آیت 8 ① يَّسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتۡلٰى عَلَيۡهِ ...... : جو اللہ کی آیات سنتا ہے، جو اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، پھر تکبر کرتے ہوئے اپنے کفر و شرک پر ڈٹا رہتا ہے جیسے اس نے انھیں سنا ہی نہیں، سو اسے دردناک عذاب کی بشارت دے دے۔

② ثُمَّ يُصِرُّ مُسۡتَكۡبِرًا : یہاں "ثُمَّ" کا لفظ اظہارِ تعجب کے لیے ہے کہ اگر اس نے اللہ کی آیات نہ سنی ہوتیں تو الگ بات تھی، تعجب اس بات پر ہے کہ اللہ کی آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں پھر وہ تکبر کرتے ہوئے کفر پر اصرار کرتا ہے، حالانکہ انسان کو تکبر زیب ہی نہیں دیتا، کیونکہ بڑائی تو صرف اللہ کی شان ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سورۂ انعام کے شروع میں فرمایا: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ ؕ ثُمَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ يَعۡدِلُوۡنَ﴾ [ الأنعام : ۱ ] "سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر (بھی) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں۔"

③ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ : بشارت خوش خبری کو کہتے ہیں، یعنی خوشی کی وہ خبر جس کے آثار بشرہ پر ظاہر ہو جائیں۔ یہاں یہ لفظ تہکم یعنی استہزا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں عذابِ الیم کا ذکر فرمایا، اگلی آیت میں عذابِ مہین کا اور اس سے اگلی آیت میں عذابِ عظیم کا۔ اس آیت میں کفر پر اصرار اور استکبار کی مناسبت سے عذابِ الیم کی بشارت سنائی ہے۔

وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۙ﴿۹﴾ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ؕ﴿۱۰﴾

اور جب وہ ہماری آیات میں سے کوئی چیز جان لیتا ہے تو اسے مذاق بنا لیتا ہے، یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ⑨ ان کے آگے جہنم ہے اور نہ وہ ان کے کچھ بھی کام آئے گا جو انھوں نے کمایا اور نہ وہ جو انھوں نے اللہ کے سوا حمایتی بنائے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ⑩

آیت 9 ① وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا : "اتَّخَذَهَا" میں ضمیر "هَا" "شَيْـًٔا" کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، کیونکہ "شَيْـًٔا" کا لفظ اگرچہ مذکر ہے مگر اس سے مراد کوئی "آيَةٌ" (آیت) ہے، اس لیے ضمیر مؤنث "هَا" استعمال فرمائی ہے اور "اٰيٰتِنَا" کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ ہماری آیات میں سے کوئی آیت معلوم کر لیتا ہے (جسے وہ صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتا یا جس کا مطلب الٹا نکال لیتا ہے) تو اسے مذاق بنا لیتا ہے۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہماری آیات میں سے کوئی آیت معلوم کر لیتا ہے تو صرف اس کا مذاق اڑانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ہماری تمام آیات کو مذاق بنا لیتا ہے۔ مثلاً جب اس کے ہاتھ قرآن مجید کی کوئی ایسی بات آتی ہے جس کا مطلب توڑ مروڑ کر اس کا مذاق اڑا سکتا ہے تو تمام آیات کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ قرآن کی سبھی آیات ایسی ہیں۔ یہ اس کے بدترین "افاک" و "اثیم" ہونے کا بیان ہے کہ آیاتِ الٰہی سن کر وہ کفر پر اصرار ہی نہیں کرتا بلکہ ناحق ان کا مذاق بھی اڑاتا ہے اور اتنا کہ انھیں مذاق بنا لیتا ہے۔

② اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ : آیاتِ الٰہی کی اہانت کے بدلے میں ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اس آیت میں آیات سے استہزا اور ان کی توہین کی مناسبت سے ان کے لیے عذابِ مہین کی خبر دی۔

آیت 10 ① مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ : "وَرَاءٌ" کا معنی "پیچھے" بھی ہے اور "آگے" بھی۔ (دیکھیے کہف: ۷۹) کیونکہ یہ لفظ اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نگاہ سے اوجھل ہو۔ یعنی جہنم ان کے تعاقب میں ہے، یا جہنم ان کے آگے تیار ہے۔ دونوں معنی درست ہیں۔

② وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا : یعنی نہ ان کا مال ان کے کام آئے گا، نہ ان کی آل اولاد (دیکھیے آل عمران: ۱۰) اور نہ ان کے اچھے اعمال، کیونکہ انھوں نے دنیا میں اگر کچھ اچھے اعمال کیے بھی ہوں گے تو صرف دنیا کی نیت سے کیے جانے کی وجہ سے آخرت میں کام نہیں آسکیں گے، بلکہ برباد ہو جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان (۲۳) اور سورۂ کہف (۱۰۳ تا ۱۰۶)۔

③ وَلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ...... : یعنی ان کے وہ داتا و دستگیر جنھیں وہ قیامت کے دن عذاب سے بچانے کی امید پر پکارتے رہے اور ان کی پوجا کرتے رہے، وہ ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ظلمِ عظیم ہے، فرمایا:

هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

یہ سراسر ہدایت ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے عذاب میں سے دردناک عذاب ہے ﴿۱۱﴾ اللہ ہی ہے جس نے تمھاری خاطر سمندر کو مسخر کر دیا، تاکہ جہاز اس میں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۲﴾ اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿۱۳﴾

﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان : ۱۳ ] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔'' اسی مناسبت سے ان کے لیے عذابِ عظیم سنایا۔

**آیت 11** ① هٰذَا هُدًى: یعنی یہ قرآن سراسر ہدایت ہے۔ ''هُدًى'' مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے، جیسے ''زَيْدٌ عَدْلٌ'' کا مطلب یہ ہے کہ زید اتنا عادل ہے کہ سراپا عدل ہے۔ ''هٰذَا هُدًى'' کے معنی کی ایک تعبیر یہ ہے کہ ''یہ قرآن ہدایت میں کامل ہے۔'' زمخشری نے فرمایا: ''هٰذَا هُدًى'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن ہدایت میں کامل ہے، جیسے تم کہتے ہو ''زَيْدٌ رَجُلٌ'' یعنی ''زید رُجُولیّت میں کامل ہے۔''

② وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ ...... : ''رِجْزٍ'' کا لفظ عذاب کی سخت ترین صورتوں پر بولا جاتا ہے۔

**آیت 12** ① اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ ...... : اس سے پہلی آیات میں کائنات کی تخلیق اور اس میں موجود بہت سی چیزوں کا ذکر اس لحاظ سے ہوا ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور قیامت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں سے سمندر کی تسخیر اور دوسری چیزوں کا اس لحاظ سے ذکر شروع ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، جن کا شکر اس پر واجب ہے، مگر انھوں نے اسے چھوڑ کر ایسی ہستیوں کو اپنا داتا و دستگیر، مشکل کشا اور حاجت روا بنا رکھا ہے جن کا ان نعمتوں میں کوئی دخل نہیں اور اس طرح وہ یہ تمام نعمتیں عطا کرنے والے کے شکر کے بجائے اس کی نعمتوں کا صاف انکار اور ناشکری کر رہے ہیں۔

② لفظ ''اَللّٰهُ'' مبتدا اور ''الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ ......'' اس کی خبر ہے، جو معرفہ ہے، اس سے کلام میں حصر پیدا ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمھاری خاطر سمندر کو مسخر کر رکھا ہے۔ اس آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل کی آیت (۱۴) کی تفسیر۔

**آیت 13** ① وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ: پچھلی آیت اور اس آیت میں ''سَخَّرَ لَكُمْ'' کا

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

**ان لوگوں سے جو ایمان لائے کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جو اللہ کے دنوں کی امید نہیں رکھتے، تاکہ وہ کچھ لوگوں کو اس کا بدلا دے جو وہ کماتے رہے تھے ﴿۱۴﴾**

''لام'' انتفاع کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اور آسمان و زمین میں موجود ہر چیز کو تمھارے فائدے کے لیے مسخر اور اپنا تابع فرمان بنا دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے یہ سب کچھ تمھارے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ آسمان و زمین، سورج چاند اور سمندر تو بہت دور کی بات ہے انسان کا اپنا سانس اور دل کی دھڑکن اس کے اپنے تابع فرمان نہیں، پھر اس کا تسخیرِ کائنات کا دعویٰ دیوانے کی بڑ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ لفظ ''جَمِيْعًا مِّنْهُ'' اس بات کی تصریح کے لیے ہے کہ ان تمام چیزوں کو تمھارے فائدے کے لیے کام میں لگا دینا صرف اس کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات متعدد مقامات پر فرمائی ہے کہ اس نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ دیکھیے سورۂ حج (۶۵) اور سورۂ لقمان (۲۰)۔

② اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ: یعنی جو بھی اپنے آپ کو ضد اور ہٹ دھرمی سے الگ کر کے غور و فکر سے کام لے گا، وہ یہ دیکھ کر کہ یہ تمام نعمتیں عطا کرنے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کا شکر کرے گا اور اس اکیلے کی عبادت کرے گا۔

**آیت 14** ① قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ: ''رَجَا يَرْجُوْ رَجَاءً'' (ن) کا معنی امید کرنا ہے۔ اس کے ضمن میں خوف بھی ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ امید پوری نہ ہو۔ غرض اس کے معنی امید اور خوف دونوں کر لیے جاتے ہیں۔

② ''اَيَّامَ اللّٰهِ'' (اللہ کے دنوں) سے مراد کسی قوم کے یادگار تاریخی دن ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو خاص سزا دیتا ہے، یا اپنے فرماں بردار بندوں کو خاص انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ایک ہی دن کچھ لوگوں کے لیے سزا اور کچھ لوگوں کے لیے عطا کا دن ہوتا ہے، جیسے آلِ فرعون کا غرق ہونا ان کے لیے سزا کا دن تھا اور بنی اسرائیل کے لیے نجات کا۔ صحیح مسلم میں اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی لمبی حدیث ہے، جس کے شروع میں ہے: «سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّهُ بَيْنَمَا مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ قَوْمِهِ يُذَكِّرُهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ، وَأَيَّامُ اللّٰهِ نَعْمَاؤُهُ وَ بَلَاؤُهُ» [ مسلم، الفضائل، باب من فضائل الخضر ﷺ: ۲۳۸۰/۱۷۲ ] ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں انھیں اللہ کے ایام کے ساتھ نصیحت کر رہے تھے اور ایام اللہ سے مراد اس کی نعمتیں اور اس کی مصیبتیں ہیں۔'' لہٰذا ''جو لوگ اللہ کے دنوں کی امید نہیں رکھتے'' یا ''جو لوگ اللہ کے دنوں کا خوف نہیں رکھتے'' سے مراد کفار ہیں جو اس کی رحمت سے مایوس اور اس کی گرفت سے بے خوف ہیں۔ مومن تو ہر وقت اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے غضب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ⑮

جس نے کوئی نیک عمل کیا تو وہ اسی کے لیے ہے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہے، پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ⑮

③ یعنی ایمان والوں سے کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ کے دنوں سے بے خوف لوگ یعنی کفار ان پر جو زیادتی کریں یا تکلیف پہنچائیں تو اس کے بدلے کی فکر کے بجائے ان سے درگزر کریں اور انھیں معاف کر دیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ حکم مکہ معظمہ میں دیا گیا تھا جب کفار کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، بعد میں جب قتال کی اجازت مل گئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور بعض نے فرمایا کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے، کیونکہ زیادتی برداشت کرنے کی تلقین اب بھی باقی ہے۔ رہی اسلام کی بنا پر کفار سے جنگ، تو اس کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ہجرت اور کفار سے لڑائی کی اجازت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَتُبۡلَوُنَّ فِيۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ۟ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴾ [ آل عمران : ۱۸۶ ] ''یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔'' خود رسول اللہ ﷺ نے مدینہ جا کر بھی، جب آپ کے پاس قوت و سلطنت موجود تھی، کبھی اپنی ذات پر ہونے والی کسی زیادتی کا انتقام نہیں لیا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: (( مَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لِنَفْسِهِ فِيْ شَيْءٍ يُؤْتٰى إِلَيْهِ حَتّٰى يُنْتَهَكَ مِنْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمَ لِلّٰهِ )) [ بخاري، الحدود، باب كم التعزير والأدب؟ : ٦٨٥٣ ] ''رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کسی چیز کا انتقام نہیں لیا، جس کا آپ سے معاملہ کیا گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو چاک کیا جاتا تو آپ ﷺ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔''

④ لِيَجۡزِيَ قَوۡمًۢا بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ : ''قَوۡمًا'' سے مراد کافر ہوں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان لوگوں کی زیادتی اور اذیت رسانی کو معاف کر دیں جو اللہ کی گرفت کے ایام کی توقع نہیں رکھتے، تاکہ بجائے اس کے کہ وہ ان سے بدلا لیں خود اللہ تعالیٰ انھیں ان کے اعمال کا بدلا دے جو وہ کماتے رہے تھے۔ ''قَوۡمًا'' نکرہ ہے، اس لیے ترجمہ ''کچھ لوگوں کو'' کیا گیا ہے۔ اور اگر ''قَوۡمًا'' سے مراد مومن ہوں تو مطلب ہوگا کہ ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی زیادتی اور تکلیف کو معاف کر دیں جو اللہ کی گرفت کے ایام کی توقع نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ انھیں اس صبر اور عفو و درگزر کا بدلا عطا فرمائے جو وہ کفار کی اذیت رسانی کے مقابلے میں کرتے رہے تھے۔

**آیت 15** مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ...... : اس آیت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حم سجدہ کی آیت (۴۶) کی تفسیر۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی اور انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور انھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ﴿۱۶﴾ اور ہم نے انھیں (دین کے) معاملے میں واضح احکام عطا کیے، پھر انھوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپس میں ضد کی وجہ سے، بے شک تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۷﴾**

**آیت 16** ① وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ...... : پچھلی آیات ”اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ“ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چند نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اس نے تمام انسانوں پر فرمائی ہیں، تاکہ وہ اس کا شکر ادا کریں اور کفر و شرک سے اجتناب کریں اور اس آیت میں ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اس نے خصوصاً بنی اسرائیل پر کیں۔ ”الْكِتٰبَ“ سے مراد کوئی ایک کتاب نہیں بلکہ جنس کتاب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں بہت سے صاحب کتاب انبیاء مبعوث فرمائے۔ تورات، انجیل اور زبور تو عام معروف ہیں، ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس نے انھیں کتنی کتابیں عطا فرمائیں۔

② وَ الْحُكْمَ : ”الْحُكْمَ“ کا معنی فیصلہ اور قوتِ فیصلہ ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو آزادی اور حکومت بخشی، جس میں وہ اپنے فیصلے خود کر سکتے تھے، کیونکہ اپنی حکومت کے بغیر اسلام پر پوری طرح عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے نجات اور آزادی ملنے پر بنی اسرائیل کو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں بادشاہ بنا دیا، کیونکہ آزاد قوم کا ہر فرد ہی بادشاہ ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ المائدۃ : ۲۰ ] ”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تمھیں بادشاہ بنا دیا اور تمھیں وہ کچھ دیا جو جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا۔“ بعد میں داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام اور دوسرے اسرائیلی حکمرانوں کی حکومتیں بھی انھیں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس ”الْحُكْمَ“ میں شامل ہیں۔

③ وَ النُّبُوَّةَ : بنی اسرائیل میں جتنے نبی مبعوث ہوئے کسی اور قوم میں اتنے زیادہ نبیوں کے آنے کا کہیں ذکر نہیں۔

④ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ : ان طیبات میں صحرا کے اندر کھانے کے لیے من و سلویٰ، پینے کے لیے بارہ چشمے اور بادلوں کا سایہ بھی شامل ہے اور بعد میں شام و مصر کی زرخیز و بابرکت زمین کی حکومت اور وہاں سے حاصل ہونے والی بے شمار نعمتیں بھی شامل ہیں۔

⑤ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۷) اور سورۂ دخان (۳۲)۔

**آیت 17** ① وَ اٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ : یعنی ہم نے انھیں دین کے بارے میں واضح احکام دیے، جن میں کوئی ابہام

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾

پھر ہم نے تجھے (دین کے) معاملے میں ایک واضح راستے پر لگا دیا، سو اسی پر چل اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چل جو نہیں جانتے ﴿۱۸﴾ بلاشبہ وہ اللہ کے مقابلے میں ہرگز تیرے کسی کام نہ آئیں گے اور یقیناً ظالم لوگ، کے بعض بعض کے دوست ہیں اور اللہ متقی لوگوں کا دوست ہے ﴿۱۹﴾

یا پیچیدگی نہیں تھی، نہ ان سے اختلاف یا ان سے فرار کی کوئی صورت تھی۔

② فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ …… : یعنی ان میں جو اختلاف رُونما ہوا وہ جہل یا ناواقفیت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ وہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے صحیح راستے کا علم آ جانے کے بعد ہوا اور اس کی بنیاد سراسر ضد اور خود پسندی پر تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۹۳) اور سورۂ شوریٰ (۱۵) کی تفسیر۔ اس آیت میں ہماری امت کے لیے بھی زبردست تنبیہ ہے کہ اگر انھوں نے اللہ کی طرف سے آنے والے علم یعنی قرآن و سنت کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تھا تو ان کا انجام بھی انھی جیسا ہو گا۔

**آیت 18** ① ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ : "شَرِيْعَةٍ" کا معنی صاف راستہ اور واضح طریقہ ہے۔ "الْاَمْرِ" سے مراد "امرِ دین" ہے۔ یعنی بنی اسرائیل جب اپنی سرکشی، ضد اور عناد کی وجہ سے دین کے واضح احکام پر قائم نہ رہے بلکہ بہت سے گمراہ فرقوں میں بٹ گئے اور واضح اور صحیح دین کی دعوت دینے والوں سے عداوت اور گمراہی میں اس حد تک بڑھ گئے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا، بلکہ اپنے گمان میں انھیں صلیب پر چڑھا کر دم لیا۔ جب وہ سرکشی کی اس حد تک آ پہنچے تو اس فضیلت سے محروم کر دیے گئے جو انھیں دنیا کی امامت کی صورت میں حاصل تھی۔ پھر اے محمد! ہم نے تجھے اس امر (یعنی دین) کے واضح راستے اور طریقے پر لگا دیا اور وہ خدمت جو پہلے پیغمبروں کے سپرد تھی وہ آپ کے سپرد کر دی۔

② فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ : اس لیے آپ ہمارے مقرر کردہ طریقے پر چلیں اور ہمارے نازل کردہ احکام کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں جو نہیں جانتے، یعنی وحی الٰہی کا علم نہیں رکھتے، یا علم کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتے، کیونکہ وہ بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں جو نہیں جانتے۔ ان سے مراد اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب ہیں۔ صرف اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کی تاکید اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۴۸ تا ۵۰) اور سورۂ اعراف (۳)۔

**آیت 19** ① اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا : "اِنَّ" تعلیل یعنی کسی بات کی وجہ بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ پچھلی آیت میں فرمایا کہ آپ اللہ کی نازل کردہ شریعت کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو نہیں

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾

ع ۱۸

یہ لوگوں کے لیے سمجھ کی باتیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہے ﴿۲۰﴾ یا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، انھوں نے گمان کرلیا ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے؟ ان کا جینا اور ان کا مرنا برابر ہوگا؟ برا ہے جو وہ فیصلہ کر رہے ہیں ﴿۲۱﴾

جانتے۔ اب فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ انھیں خوش کرنے کے لیے ان کی خواہشات کے پیچھے چلیں گے اور دین میں کسی قسم کا ردو بدل کریں گے تو اپنے اللہ کو ناراض کر لیں گے، پھر یہ لوگ آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کسی طرح نہ بچا سکیں گے۔

② وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ...... : یہ ایسے لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے منع کرنے کی دوسری وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کی پیروی متقی لوگوں کا کام ہے اور اس کے غیر کی خواہشات کی پیروی ظالموں کا کام ہے، کیونکہ ظلم کسی کا حق دوسرے کو دینے کا نام ہے اور وہ اللہ کا حق دوسروں کو دے رہے ہیں۔ ایسے ظالم لوگ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر ایک دوسرے کے دوست اور ان کے کہنے پر چلنے والے ہوتے ہیں۔ (دیکھیے عنکبوت : ۲۵) جب کہ متقی اللہ تعالیٰ کے دوست اور وہ ان کا دوست ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۵۷) اب اگر آپ نے اللہ کی شریعت کے بجائے کسی اور کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ دوستی کا رشتہ اپنے مالک سے توڑ کر ظالموں کے ساتھ جوڑ لیں گے، پھر اس سے بڑھ کر خسارا کیا ہوگا؟

آیت 20 ① هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ : "بَصَآئِرُ" "بَصِيْرَةٌ" کی جمع ہے، سمجھ میں آنے والی بات۔ "لِلنَّاسِ" کا لفظ عام ہے جس میں مسلم و کافر سب شامل ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی باتیں ایسی ہیں جو سب لوگوں کی سمجھ میں آنے والی ہیں اور انھیں ان کے نفع و نقصان سے آگاہ کرنے والی ہیں، خواہ وہ انھیں مانیں یا نہ مانیں۔

② وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ : یعنی اگرچہ قرآن کی باتیں ایسی ہیں جو سب لوگوں کی سمجھ میں آنے والی ہیں مگر اس سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو اس پر یقین رکھتے ہوں اور انھی کے لیے یہ ہدایت و رحمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [ بني إسرائيل : ۸۲ ] "اور ہم قرآن میں سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے کے سوا کسی چیز میں زیادہ نہیں کرتا۔"

آیت 21 ① اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ ...... : توحید کی دعوت کے بعد یہاں سے آخرت پر کلام شروع ہو رہا ہے اور یہ آیت آخرت کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ص (۲۸) اور سورۂ قلم (۳۴ تا ۳۸)۔

وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلا دیا جائے جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۲﴾ پھر کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش ہی کو بنا لیا اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ پھر اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۲۳﴾

② سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ...... : یعنی کفار زندگی میں اپنی مرضی کرتے رہے اور بے لگام ہو کر اپنی خواہشات پوری کرتے رہے، جس کے نتیجے میں انھوں نے زمین میں فساد برپا کیے رکھا اور لوگوں پر اور اپنی جانوں پر بے حساب ظلم کرتے رہے، جب کہ مومن اپنی خواہشات کو روک کر رب تعالیٰ کے احکام کے پابند رہے۔ اب اگر مرنے کے بعد بھی کفار کو ان کے جرائم کی سزا اور ایمان والوں کو ان کے اعمال صالحہ کی جزا نہ ملے تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل اور صفت حکمت دونوں کے خلاف ہے۔ جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں وہ ایمان و کفر، نیکی و بدی اور ظلم و عدل کو برابر قرار دے رہے ہیں جو ان کا بہت برا فیصلہ ہے۔

آیت 22 وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ...... : یہ آخرت کے حق ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ص (۲۷) کی تفسیر۔

آیت 23 ① اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ: سلسلۂ کلام سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ آخرت کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے نفس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں۔ آخرت کا عقیدہ ان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے، اس لیے وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں، پھر ان کے دل میں جو آتا ہے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح ایک مومن اپنے رب کو اپنا معبود مانتا ہے، اسی کے حکم پر چلتا ہے، اس کے حلال کردہ کو حلال اور حرام کردہ کو حرام سمجھتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے منکروں کا معبود ان کے نفس کی خواہش ہی ہوتا ہے، وہ جو چاہے ان کے لیے حلال اور جو نہ چاہے ان کے ہاں حرام ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آخرت کی باز پرس سے بے فکر ہو جاتے ہیں تو ان کی گمراہی بڑھتی ہی جاتی ہے، نہ کوئی چیز انھیں برائی سے روکنے والی ہوتی ہے نہ نیکی پر مائل کرنے والی۔

② تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں بھی ”هَوٰى“ (خواہشِ نفس) کا ذکر فرمایا ہے، مذمت ہی کے طور پر فرمایا ہے، مثلاً فرمایا: ﴿ وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ﴾ [ الأعراف : ۱۷۶ ] ”مگر وہ زمین کی طرف چمٹ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، تو اس کی مثال کتے کی مثال کی طرح ہے۔“ اور فرمایا:

وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ

اور انھوں نے کہا ہماری اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی (زندگی) نہیں، ہم (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے

﴿ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴾ [ الكهف : ۲۸ ] ''اور اس شخص کا کہنا مت مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ﴾ [ الروم : ۲۹ ] ''بلکہ وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا وہ جانے بغیر اپنی خواہشوں کے پیچھے چل پڑے، پھر اسے کون راہ پر لائے جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [ القصص : ۵۰ ] ''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [ص : ۲۶ ] ''اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾ [ النازعات : ۴۰، ۴۱ ] ''اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔''

③ " اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ " کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان (۴۳) کی تفسیر۔

④ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ : اس کی تفسیر دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ ازل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ راہِ راست پر آنے والا نہیں بلکہ اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنانے والا اور آخرت کے انکار پر اصرار کرنے والا ہے، اس لیے اس نے اپنے علم کی بنا پر اسے گمراہی میں پھینک دیا۔ دوسری یہ کہ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے اور قیامت یقیناً قائم ہونے والی ہے فسق و فجور کی آزادی کے لیے قیامت کے انکار پر اڑ گیا۔ (دیکھیے قیامہ: ۱ تا ۶) تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسے گمراہی میں پھینک دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾ [النساء:۱۱۵] ''اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے، ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے۔''

⑤ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۷) کی تفسیر۔

⑥ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ: " أَيْ مِنْ بَعْدِ مَا أَضَلَّهُ اللّٰهُ " یعنی جب اللہ تعالیٰ ہی نے اسے گمراہ کر دیا تو اب کون اسے ہدایت دے گا۔

⑦ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: " تَذَكَّرُوْنَ " اصل میں " تَتَذَكَّرُوْنَ " ہے، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی ہے۔

آیت 24 ① وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون (۳۷)، یہاں

مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

کے سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا، حالانکہ انھیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، وہ محض گمان کر رہے ہیں ﴿۲۴﴾

ایک سوال ہے کہ یہ کہنے کے بجائے کہ " نَحْیَا وَ نَمُوْتُ "(ہم جیتے ہیں اور مرتے ہیں ) یہ کیوں کہا: ﴿نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ ''ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں؟'' اس کا جواب کئی طرح سے ہے، ایک تو یہ کہ ''واؤ'' میں ترتیب ضروری نہیں ہوتی اور یہاں ان کی بات نقل کرتے ہوئے کلام کے حسن کے لیے ایسا کیا گیا ہے، کیونکہ "مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا" کے بعد "نَمُوْتُ وَنَحْيَا" کے جملے میں جو حسن اور موافقت ہے وہ "نَحْیَا وَ نَمُوْتُ" میں نہیں۔ دوسرا جواب یہ کہ "نَمُوْتُ وَنَحْيَا" کا مطلب یہ ہے کہ ہم مر جاتے ہیں اور ہماری اولادیں رہتی ہیں، یا ہم میں سے کچھ مر جاتے ہیں کچھ جیتے رہتے ہیں اور تیسرا جواب یہ کہ "نَمُوْتُ" کا مطلب ہے کہ پہلے ہم عدم اور موت کی حالت میں ہوتے ہیں اور "نَحْيَا" کا مطلب ہے کہ پھر ہم دنیا کی حیات کی حالت میں آ جاتے ہیں، سو زندگی ہے تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں۔

❷ وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ : ان کی اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ انھیں ہلاک کرنے والا کوئی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ وہی پوری کائنات کا خالق و مالک اور مدبر ہے، مگر چونکہ ان کی بے قید خواہشات کی راہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے سامنے پیش ہونے کا عقیدہ زبردست رکاوٹ ہے، اس لیے انھوں نے آخرت کی زندگی ہی کا انکار کر دیا اور یہ ماننے کے بجائے کہ موت و حیات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ جب چاہے پہلے کی طرح انھیں دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور کرے گا، یہ کہہ دیا کہ زمانے کے سوا کوئی نہیں جو ہمیں ہلاک کرے، بس یہ دن رات کی گردش ہی ہے جو ہمیں فنا کر دیتی ہے۔ درحقیقت یہ ان کا اپنے آپ کو فریب دینا ہے، کیونکہ زمانہ اور دن رات کی گردش اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے، ان کی ڈور تو ایک مالک کے ہاتھ میں ہے جو اللہ تعالیٰ ہے، جس کا نام وہ نہیں لینا چاہتے، اس کے بجائے زمانے کا نام لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے زمانے کے ملحد مسلمان ہیں جو خود بدکردار ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حدود کو وحشیانہ سزائیں قرار دیتے ہیں، مگر کھل کر یہ کہہ نہیں سکتے، اس لیے مولوی کو گالی دیتے ہیں کہ مولوی لوگوں کو وحشیانہ سزائیں دلانا چاہتے ہیں، چوروں کے ہاتھ کٹوانا، زانی کو دُرّے مروانا اور قاتل کو قتل کروانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ بے چارے مولوی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اس نے تو وہ حکم سنایا جو اس کے مالک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔ اسی طرح وہ مشرک اپنی ہلاکت اور فنا کا باعث زمانے کو قرار دے رہے ہیں، حالانکہ بے چارہ زمانہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے زمانے کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ، يَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ، بِيَدِي الْأَمْرُ، أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ)) [ بخاري، التفسير، سورة الجاثية : ۴۸۲۶ ] ''اللہ عزوجل نے فرمایا، ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے، وہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ زمانہ تو میں ہوں، تمام معاملہ میرے ہاتھ میں ہے، دن رات کو الٹ پلٹ میں کرتا ہوں۔'' اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ )) [ مسلم، الألفاظ من الأدب وغيرها، باب النهي عن سب الدهر : ۵/۲۲۴۶ ] ''زمانے کو برا بھلا

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کی دلیل اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ کہتے ہیں ہمارے باپ دادا کو لے آؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۲۵﴾

مت کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے۔" ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ، يَقُوْلُ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ! فَلَا يَقُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ! فَإِنِّيْ أَنَا الدَّهْرُ أُقَلِّبُ لَيْلَهُ وَنَهَارَهُ فَإِذَا شِئْتُ قَبَضْتُهُمَا )) [ مسلم، الألفاظ من الأدب وغيرها، باب النهي عن سب الدهر : ۲۲۴۶/۳ ] "اللہ عزوجل نے فرمایا، ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے۔ کہتا ہے، ہائے زمانے کی ناکامی! سو تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ ہائے زمانے کی ناکامی! کیونکہ میں ہی تو زمانہ ہوں۔ اس کے رات دن کو الٹ پلٹ میں کرتا ہوں، پھر جب چاہوں گا دونوں کو قبض کر لوں گا۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "شافعی، ابو عبیدہ اور کئی اور ائمہ رحمہم اللہ نے "لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ" (زمانے کو برا بھلا نہ کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے) کی تفسیر میں فرمایا: "عرب اپنی جاہلیت میں جب انھیں کوئی شدت یا بلا یا تکلیف پہنچتی تو کہتے تھے: " يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ!" (ہائے زمانے کی ناکامی!) چنانچہ وہ ان کاموں کو زمانے کی طرف منسوب کرتے اور اسے برا بھلا کہتے، حالانکہ وہ سب کام کرنے والا تو اللہ تعالیٰ تھا، تو گویا انھوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا کہا، کیونکہ حقیقی فاعل وہی ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے زمانے کو برا بھلا کہنے سے منع فرما دیا، کیونکہ وہ جسے مراد لے رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہے۔" اس کی یہ شرح سب سے اچھی ہے اور یہی مراد ہے۔ (واللہ اعلم) اور ابن حزم اور ان کے طریقے پر چلتے ہوئے جن لوگوں نے اس حدیث کو لے کر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے " اَلدَّهْرُ " (زمانہ) کو شمار کیا ہے انھوں نے غلطی کی ہے۔" (ابن کثیر)

❺ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ : یعنی وہ یہ بات کہ "اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں" اور یہ کہ "انسان کو فوت کرنے والا اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ زمانہ ہی اسے ہلاک کرتا ہے" کسی علم کی بنا پر نہیں کہہ رہے، بلکہ صرف گمان کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں اور ہم نہیں جانتے کہ روح کیسے نکلتی ہے اور ہمیں کون ہلاک کرتا ہے۔" کیونکہ جب وہ آئندہ ہونے والی کسی بات کا علم ہی نہیں رکھتے تو وہ یہ بات یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ دراصل ان کی خواہش یہ ہے کہ نہ موت کے بعد کوئی زندگی ہو اور نہ ان سے کوئی پوچھنے والا ہو کہ تم نے کیا کیا، تاکہ وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور جانتے بوجھتے ہوئے اپنے مالک سے اور قیامت کے دن کی باز پرس سے آنکھیں اور کان بند کر رکھے ہیں۔

25 ❶ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا ...... : یہ کفار کی سب سے وزنی دلیل تھی جو وہ آخرت کی نفی کے لیے پیغمبروں کے سامنے پیش کرتے تھے کہ "اگر تم اپنے اس عقیدہ میں سچے ہو کہ مرنے کے بعد ہم پھر جی اٹھیں گے تو ہمارے آبا و اجداد

قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَىِٕذٍ یَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾

کہہ دے اللہ ہی تمھیں زندگی بخشتا ہے، پھر تمھیں موت دیتا ہے، پھر تمھیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۲۶﴾ اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن باطل والے خسارہ پائیں گے ﴿۲۷﴾

میں سے کسی کو لے آؤ۔'' حالانکہ قیامت سے پہلے فرداً فرداً اس دنیا میں زندہ ہو کر واپس آنے کو قرآن نے محال اور ناممکن بتایا ہے، جبکہ قیامت کے دن دوبارہ زندگی کے امکان پر عقلی دلائل قائم کیے ہیں جو اٹل اور ناقابلِ انکار ہیں۔ رہا آخرت پر ایمان، تو اس کا انحصار سراسر انبیاء ؑ کی تصدیق پر ہے۔ اس آیت کی مفصل تفسیر سورۂ دخان کی آیت (۳۶) کے تحت گزر چکی ہے۔

② مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ...... : ظاہر ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ ''اگر تم سچے ہو کہ قیامت آئے گی تو ابھی ہمارے آباو اجداد کو زندہ کر کے لاؤ'' کوئی حجت یا دلیل نہیں، بلکہ نہایت فضول بات ہے، جیسا کہ سورۂ دخان (۳۶) میں تفصیل گزری۔ یہاں اسے حجت کہا گیا تو یہ واضح کرنے کے لیے کہ ان کے پاس کوئی حجت ہے ہی نہیں، کیونکہ اپنے گمان میں وہ جسے حجت سمجھ رہے ہیں فی الواقع اس کا حجت اور دلیل سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اسے ان کی حجت کہنے میں ان سے تہکم اور استہزا بھی مراد ہے کہ ان عقل مندوں کی حجت اور دلیل اس طرح کی ہوتی ہے۔

آیت 26 ① قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ : یہ ان کی مزعومہ حجت کا جواب ہے کہ تم اپنے اختیار سے اتفاقاً پیدا نہیں ہو گئے، نہ تمھاری موت تمھارے اختیار سے یا اتفاقاً واقع ہوتی ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہے جو تمھیں زندگی بخشتا ہے اور تمھیں موت دیتا ہے۔ پھر جب چاہے گا دوبارہ زندہ کر دے گا، اس میں تمھارا کوئی اختیار یا عمل دخل نہیں ہوگا۔

② ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ...... : یعنی تمھیں الگ الگ زندہ نہیں کرے گا کہ کچھ لوگوں کو ایک وقت زندہ کیا، دوسروں کو کسی اور وقت اور باقی کو کسی تیسرے وقت، بلکہ سب اگلے پچھلوں کو قیامت کے دن تک لے جا کر ایک ہی وقت میں جمع کر دے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۸)۔

③ لَا رَیْبَ فِیْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ : یعنی قیامت واقع ہونے میں تو کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ اس کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ وہ جاہل ہیں۔ وہ حقیقت کو نہ جانتے ہیں نہ جاننا چاہتے ہیں اور اپنی خواہش کے خلاف نہ کسی کی بات سنتے ہیں نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ﴾ [ الملك : ۱۰ ] ''اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے، یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔''

آیت 27 ① وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : پچھلی آیت میں پہلی دفعہ زندگی بخشنے اور موت دینے کو قیامت کے دن

وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور تو ہر امت کو گھٹنوں کے بل گری ہوئی دیکھے گا، ہر امت اپنے اعمال نامہ کی طرف بلائی جائے گی، آج تمھیں اس کا بدلا دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾

---

دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا، اس آیت میں آسمان و زمین یعنی ساری کائنات کے اکیلے مالک ہونے کو قیامت کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا کہ وہ اپنی ملکیت میں جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ ساری کائنات بنا سکتا ہے، اسے فنا بھی کر سکتا ہے اور پھر دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد قیامت کے کچھ احوال ذکر فرمائے۔

② وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَىِٕذٍ یَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ : جس طرح کوئی تاجر اپنے سرمائے کے ذریعے سے نفع حاصل کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو زندگی، صحت اور عقل کا سرمایہ عطا فرما کر آخرت کی کامیابی کا نفع حاصل کرنے کے لیے محنت کرنے کا حکم دیا۔ اہلِ باطل یعنی کفار نے اپنے اس عزیز سرمائے کے ذریعے سے نفع حاصل کرنے کے بجائے اسے اللہ کے ساتھ شرک، اس کی نافرمانی اور قیامت کا انکار کرنے میں صرف کر دیا اور صریح خسارے میں رہے۔ اس خسارے کا پوری طرح اظہار اس وقت ہو گا جب قیامت قائم ہو گی، کیونکہ دنیا میں تو اس خسارے کی تلافی کا پھر بھی موقع موجود ہے مگر اس وقت بازارِ عمل میں واپس جانے کی اجازت ہی نہیں ہو گی کہ وہ اپنے خسارے کی تلافی کر سکیں۔ خسارے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عصر کی تفسیر۔

**آیت 28** ① وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةً : ''جَاثِیَةً'' ''جَثَا یَجْثُوْ جُثُوًّا'' (ن) یا ''جَثٰی یَجْثِيْ جُثِیًّا'' (ض) سے اسم فاعل ہے، گھٹنوں کے بل گری ہوئی۔ یعنی میدانِ حشر کا ایسا ہول اور رعب ہو گا کہ ہر امت شدید خوف زدہ ہو کر گھٹنوں کے بل گری ہوئی ہو گی۔ نیک ہوں یا بد، سب خوف و دہشت کے ساتھ اسی حالت میں فیصلے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس وقت بڑے سے بڑے متکبر کی بھی ساری شیخی اور اکڑ ختم ہو جائے گی۔

② كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا : ''كِتَابٌ'' سے مراد کتابِ اعمال ہے، جس میں ان کی زندگی کی ساری روداد حرف بحرف لکھی ہو گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَ یَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّ لَا كَبِیْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ﴾ [ الکھف : ۴۹ ] ''اور کتاب رکھی جائے گی، پس تو مجرموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو اس میں ہو گا اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے۔'' بعض نے فرمایا، اس کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو ہر امت کی طرف ان کے پیغمبر کے ذریعے سے بھیجی گئی، یعنی ہر امت کو اس کی کتاب کی طرف بلایا جائے گا، تاکہ وہ دیکھے کہ اس نے اس پر کہاں تک عمل کیا اور اس کے مطابق اسے جزا دی جائے۔ سیاق کی مناسبت سے پہلا معنی زیادہ درست ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۳، ۱۴)۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۹ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰

یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر حق کے ساتھ بولتی ہے، بے شک ہم لکھواتے جاتے تھے، جو تم عمل کرتے تھے ۝۲۹ پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو انھیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یہی واضح کامیابی ہے ۝۳۰

③ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: اس سے پہلے کچھ الفاظ محذوف ہیں: ''أَيْ يُقَالُ لَهُمْ'' یعنی ان سے یہ بات کہی جائے گی۔

آیت 29 ① هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ: اس میں ''يَنْطِقُ'' کا لفظ قابلِ توجہ ہے، کیونکہ کتاب تو پڑھی جاتی ہے مگر وہ کتاب بول کر سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتائے گی۔ عموماً مفسرین لکھتے آئے ہیں کہ یہ استعارہ ہے، مگر اب ثابت ہو رہا ہے کہ یہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور وہ کتاب فی الواقع بولے گی۔ اللہ تعالیٰ کی شان تو بہت ہی بلند ہے اور قیامت کا معاملہ دنیا سے بہت مختلف ہے، مگر اب انسان نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل سے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کر لی ہیں جو وہ سب کچھ دکھا اور سنا دیتی ہیں جو انسان کرتا ہے یا بولتا ہے۔ البتہ وہ کسی کی نیت کو سامنے نہیں لا سکتیں، مگر اللہ تعالیٰ کی تیار کروائی ہوئی وہ کتاب لوگوں کے افعال، اقوال، احوال اور نیتیں سب کچھ سامنے لے آئے گی۔

② اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اس دن وہ کتاب اتنی مدت بعد کیسے بول کر بتائے گی؟ انھوں نے تو وہ اعمال دنیا میں کیے تھے جو دنیا کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ فرمایا اس لیے کہ تم جو کچھ کیا کرتے تھے ہم فرشتوں کے ذریعے سے لکھوا لیا کرتے تھے، تاکہ وہ سند رہیں اور قیامت کے دن تم پر حجت قائم ہو سکے، ورنہ ہمیں تو ہر چیز کا پہلے ہی سے علم ہے۔

آیت 30 ① فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہاں بشارت کا ذکر پہلے فرمایا، کیونکہ اس سے بشارت میں مزید خوشی شامل ہوئی ہے۔ عمل صالح سے مراد وہ عمل ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا گیا ہو، ہر قسم کے شرک حتیٰ کہ ریا سے بھی پاک ہو اور سنت کے مطابق ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ کہف کی آخری آیت۔

② فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ: انھیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ ''رَبُّهُمْ'' کے لفظ میں ان کے ساتھ اپنے تعلق اور اپنی محبت کا اظہار ہے اور ''اپنی رحمت'' سے مراد یہاں جنت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى لِلْجَنَّةِ أَنْتِ رَحْمَتِيْ أَرْحَمُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ مِنْ عِبَادِيْ وَقَالَ لِلنَّارِ إِنَّمَا أَنْتِ عَذَابٌ أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ مِنْ عِبَادِيْ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله: ﴿ و تقول هل من مزيد ﴾ : ٤٨٥٠ ] ''اللہ تبارک و تعالیٰ نے جنت سے فرمایا، تو میری رحمت ہے، میں اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا تیرے

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ٝ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو کیا میری آیات تمھارے سامنے نہ پڑھی جاتی تھیں؟ پھر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے ﴿۳۱﴾

ذریعے سے رحم کروں گا اور آگ سے فرمایا، تو محض عذاب ہے، میں اپنے بندوں میں سے جسے چاہوں گا تیرے ذریعے سے عذاب دوں گا۔“

③ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ : جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ [ آل عمران : ۱۸۵ ] ”پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔“

آیت 31 ① وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ٝ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ : ”وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا“ کے بعد کچھ الفاظ محذوف ہیں، کیونکہ ”اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا“ جملہ خبریہ کا ایک حصہ ہے اور ”اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ“ خطاب اور استفہام ہے جو جملہ انشائیہ ہے۔ وہ محذوف الفاظ کچھ پچھلی آیت سے واضح ہو رہے ہیں اور کچھ بعد کے الفاظ ”اَفَلَمْ تَكُنْ......“ سے سمجھ میں آ رہے ہیں، جو اس طرح کے ہو سکتے ہیں: ”وَ أَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيُدْخِلُهُمْ فِيْ عَذَابِهِ وَ يَقُوْلُ أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ“ ”یعنی رہے کافر تو وہ انھیں اپنے عذاب میں داخل کرے گا اور فرمائے گا، تو کیا میری آیات تمھارے سامنے پڑھی نہ جاتی تھیں؟“ (واللہ اعلم) مطلب یہ ہے کہ جہنم کے عذاب کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کا عتاب اور اس کی ڈانٹ بھی سنیں گے جو اپنی جگہ بہت بڑا عذاب ہو گا۔

② فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ : قرآن میں ”مجرم“ کا لفظ ”مسلم“ کے مقابلے میں آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ٝ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾ [ القلم : ۳۵، ۳۶ ] ”تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ کیا ہے تمھیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟“ یعنی تم نے میری آیات سننے کے باوجود اپنے آپ کو میرا تابع فرمان بنانے سے بڑا اور اونچا سمجھا اور مسلم بننے کے بجائے مجرم بننے پر اڑے رہے، جب کہ یہ بات مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ جاثیہ (۷ تا ۱۱) اور سورۂ اعراف (۳۶، ۴۰) کی تفسیر۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ إِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ» [ أبو داؤد، اللباس، باب ما جاء في الكبر : ۴۰۹۰، وقال الألباني صحيح ] ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کبریائی میری اوپر کی چادر ہے اور عظمت میری ازار ہے تو جو کوئی ان میں سے ایک بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے آگ میں پھینکوں گا۔“ اور عبد اللہ بن

وَ اِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾

اور جب کہا جاتا تھا کہ یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے اور جو قیامت ہے اس میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، ہم تو محض معمولی سا گمان کرتے ہیں اور ہم ہرگز پورا یقین کرنے والے نہیں ﴿۳۲﴾

مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيْمَانٍ)) [ ابن ماجه، المقدمة، باب في الإيمان : ۵۹، قال الألباني صحيح ] ’’وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہوگا اور وہ شخص جہنم میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوگا۔‘‘ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبر کی وضاحت خود فرمائی کہ وہ خوبصورت کپڑے یا خوبصورت جوتے پہننے کا نام نہیں، بلکہ فرمایا: ((اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ)) [ مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه : ۹۱ ] ’’تکبر حق سے انکار کر دینے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔‘‘

**آیت 32** ❶ **وَ اِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ ......** : اللہ تعالیٰ کفار کے جرائم بیان کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ جب تم سے کہا جاتا تھا کہ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے اور انکار کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے؟ جیسے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [ الشعراء : ۲۳ ] ’’اور رب العالمین کیا چیز ہے؟‘‘ یہ جھٹلانے کا بدترین انداز ہے جس میں انکار کے ساتھ استہزا بھی شامل ہے۔

❷ **اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا** : یہاں ایک سوال ہے کہ اس جملے کا لفظی معنی ہے ’’ہم نہیں گمان کرتے مگر گمان کرنا‘‘ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے ’’اِنْ نَّاْكُلُ اِلَّا اَكْلًا‘‘ ’’ہم نہیں کھاتے مگر کھانا۔‘‘ ظاہر ہے اس سے کوئی مفید مطلب بات حاصل نہیں ہوتی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ’’ظَنًّا‘‘ پر تنوین تقلیل و تحقیر کے لیے ہے، یعنی ہم گمان نہیں کرتے مگر ہلکا اور معمولی سا گمان، یعنی پیغمبروں کے وعظ اور لوگوں کے کہنے کی وجہ سے ہمیں اس کا معمولی سا گمان ہوتا ہے جس کی کچھ حیثیت نہیں۔ واضح رہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر ظن یقین کے معنی میں آیا ہے، مگر یہاں شک کے معنی میں ہے، کیونکہ وہ یقین کے مقابلے میں آ رہا ہے۔

❸ **وَ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ** : ’’باء‘‘ یہاں نفی کی تاکید کے لیے ہے اور ’’مُسْتَيْقِنِيْنَ‘‘ میں سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی ہم پورا یقین کرنے والے ہرگز نہیں ہیں، کبھی معمولی سا گمان یا دھندلا سا خیال آ جائے تو وہ الگ بات ہے۔

❹ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، یوم آخرت اور تقدیر میں سے کسی چیز میں شک ہو (گو انکار نہ بھی ہو) تو وہ کافر ہے۔ ایمان نام ہی یقین یعنی زوال شک کا ہے، کیونکہ انسان کو اللہ کے احکام کا پابند بنانے والی چیز ہے ہی یقین۔ آگے یقین کے درجات مختلف ہو سکتے ہیں اور ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے،

وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۳ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۴ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝۳۵ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۶

اور ان کے لیے ان اعمال کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی جو انھوں نے کیے اور انھیں وہ چیز گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۝۳۳ اور کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمھیں بھلا دیں گے جیسے تم نے اپنے اس دن کے ملنے کو بھلا دیا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے اور تمھارے کوئی مدد کرنے والے نہیں ۝۳۴ یہ اس لیے کہ تم نے اللہ کی آیات کو مذاق بنا لیا اور تمھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا، سو آج نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا ۝۳۵ پس اللہ ہی کے لیے سب تعریف ہے جو آسمانوں کا رب اور زمین کا رب، تمام جہانوں کا رب ہے ۝۳۶

جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں والے واقعہ سے ظاہر ہے۔

**آیت 33** وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا...... : یعنی ان کے سامنے ان کے اعمال کے برے نتائج ظاہر ہو جائیں گے اور وہی قیامت اور جہنم جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، وہ انھیں اپنے گھیرے میں گھیر لیں گے۔

**آیت 34** وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۱) کی تفسیر۔

**آیت 34** وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۸۴) کی تفسیر۔

**آیت 36** ❶ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ...... : یہ ان تمام باتوں کا خلاصہ اور نتیجہ ہے جو اس سے پہلے سورت میں بیان ہوئی ہیں۔ جن میں اس اکیلے کا کائنات کو پیدا کرنا، اسے مسخر کرنا، اسے نہایت اعلیٰ انتظام اور عدل کے ساتھ چلانا، مسلمانوں کو دنیا اور آخرت میں اپنے انعامات سے نوازنا، کفار کے آیاتِ الٰہی سے اعراض کی مذمت، نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ ان کے کفر و شرک کی تردید اور آخرت میں انھیں ان کے نہایت برے انجام کی وعید سنانا سب کچھ شامل ہے۔ یہ آیات اور ان میں مذکور حقائق اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام خوبیوں اور صفاتِ کمال کا مالک ہے اور وہ اکیلا تمام نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ اس بات کو بطور نتیجہ بیان فرمایا۔ "فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ" میں "لِلّٰهِ" کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا اور ''فاء'' کے ساتھ پچھلی ساری سورت کے ساتھ کلام کا تعلق قائم ہو گیا کہ جب وہ سب کچھ ثابت ہوا جو پہلے مذکور ہے تو ثابت ہو گیا کہ تمام حمد صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ اب "فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ" سے تین معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس میں خبر دی جا رہی ہے کہ تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے، دوسرا یہ کہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ ہی کی حمد کرو اور تیسرا یہ کہ اس میں حمد

ع
۱۶

وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۠ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾

اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں سب بڑائی ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۳۷﴾

کی انشاء ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حمد فرما رہا ہے جس کا وہ یقیناً حق دار ہے اور اکیلا حق دار ہے۔ پچھلے کلام کا خلاصہ اور نتیجہ ہونے میں اس آیت کی مثال یہ آیت بھی ہے: ﴿ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ الأنعام: ٤٥ ] ''تو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا رب ہے۔'' (ابن عاشور)

② رَبِّ السَّمٰوٰتِ...... : یہاں ''رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ'' بھی کہا جا سکتا تھا، مگر حمد کا مستحق ہونے میں رب ہونے کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے اسے تین دفعہ دہرایا: ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت ہماری حمد کا مستحق ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے، کیونکہ ہمارا وجود، ہماری بقا، ہماری زندگی کا ہر لحہ اور دنیا اور آخرت میں ہمیں ملنے والی ہر نعمت اسی کا نتیجہ ہے، یہ نہ ہو تو ہمارا وجود تک نہ ہو۔ اس لیے قرآن مجید کی سب سے عظمت والی اور پہلی سورت کی ابتدا اسی کے ساتھ فرمائی: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ الفاتحۃ : ۱ ] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' سورۂ صافات اور زیر تفسیر سورت کا خاتمہ اس کے ساتھ فرمایا اور جنتیوں کے متعلق بتایا: ﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [ یونس : ۱۰ ] ''ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ''پاک ہے تو اے اللہ!'' اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

آیت 37 ① وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : یہ جملہ لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بندوں کو اپنی حمد کی تلقین و تاکید انھی کے فائدے کے لیے کی ہے، ورنہ وہ خود نہ ان کی تعریف کا محتاج ہے، نہ اسے اس کی ضرورت ہے اور نہ ان کی تعریف سے اس کی شان میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ پہلے سے اور ہمیشہ سے ساری بڑائی اور عظمت کا اکیلا مالک ہے، کوئی اور اس کی بڑائی میں کیا اضافہ کرے گا۔

② وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : یہ دو صفات اس بات کی دلیل کے طور پر ذکر فرمائیں کہ وہ اکیلا ہر کبریائی اور عظمت کا مالک ہے، کیونکہ وہی عزیز ہے اور وہی حکیم ہے (خبر پر الف لام سے حصر کا معنی پیدا ہو رہا ہے)، دوسرا کوئی نہ عزیز ہے نہ حکیم، تو اس میں کبریائی کیا ہوگی؟ ''الْعَزِيْزُ'' میں قدرت و اختیار کی ہر صورت آ جاتی ہے اور ''الْحَكِيْمُ'' میں علم کا ہر مفہوم آ جاتا ہے۔ وہ ''الْعَزِيْزُ'' (سب پر غالب) ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی کام ایسا نہیں جو وہ نہ کر سکے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اسے روک سکے اور وہ ''الْحَكِيْمُ'' (کمال حکمت والا) ہے، جو کرتا ہے عین حکمت اور بالکل درست ہوتا ہے، کوئی اس میں نہ غلطی نکال سکتا ہے نہ اس سے بہتر کی نشان دہی کر سکتا ہے۔

سورۃ الاحقاف ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

حٰمٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ② مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حٰمٓ ① اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ② ہم نے آسمانوں اور زمین

آیت 1 حٰمٓ : حروف مقطعات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 2 تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ …… : اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ زمر، سورۂ مومن اور سورۂ جاثیہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر۔

آیت 3 ① مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ : قرآن مجید کے بنیادی مضامین میں سب سے اہم مضمون توحید اور آخرت ہیں۔ ان دونوں کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کے لیے "تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ" کو بطور تمہید ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ایک متفق علیہ بات کا ذکر فرمایا کہ یہ سب مانتے ہیں کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد اس کائنات کے متعلق کوئی بھی بات اسی کی معتبر ہوگی جس نے اسے بنایا ہے۔ چنانچہ اس کا فرمان ہے کہ ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو حق ہی کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز باطل نہیں کہ اس میں کوئی خامی یا غلطی ہو یا وہ بے مقصد ہو یا محض کھیل کے لیے بنائی گئی ہو، بلکہ ان کے پیدا کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ قرآن مجید نے آسمان و زمین کی پیدائش میں ملحوظ بہت سی حکمتیں بیان فرمائی ہیں، جن میں سب سے بڑی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر دلالت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۶۳، ۱۶۴ ] "اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ چیزیں لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیا ہوا ہے، ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔" یعنی یہ حقیقت کہ معبود برحق اکیلا اللہ تعالیٰ ہی ہے، عقل والوں کو زمین و آسمان کی پیدائش اور ان دونوں میں پائی جانے والی مذکورہ اشیاء پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت بار بار دہرائی ہے کہ عبادت کا حق دار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ اس بات پر ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والا کون ہے؟ جو پیدا کرنے والا ہے سچا معبود وہی ہے، جو کچھ پیدا ہی نہیں کر سکتا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا۔ خالق ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اکیلے مستحق عبادت

بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝

کو اور جو ان دونوں کے درمیان ہے حق اور مقررہ میعاد ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اس چیز سے جس سے وہ ڈرائے گئے، منہ پھیرنے والے ہیں ۝

ہونے کی متعدد آیات میں سے چند آیات ملاحظہ فرمائیں، سورۂ بقرہ (۲۱، ۲۲)، اعراف (۱۹۱)، ہود (۷)، رعد (۱۶)، سورۂ نحل (۳ تا ۲۰) (ان آیات میں ''خلق'' کے بار بار دہرائے کو ملحوظ رکھیں)، سورۂ حج (۷۳)، فرقان (۲، ۳) اور سورۂ اعلیٰ (۱، ۲)۔
زمین و آسمان کی پیدائش میں ایک حکمت ان کی اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کے کمال پر دلالت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ [ الطلاق : ۱۲ ] ''اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھنے والا ہے اور یہ کہ اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے۔'' سورۂ طلاق کی اس آیت میں ''لِتَعْلَمُوْۤا'' (تاکہ تم جان لو) کا ''لام'' ''خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ'' کے متعلق ہے۔
آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کرنے میں ایک حکمت مخلوق کی آزمائش ہے کہ ان میں سے عمل کے لحاظ سے بہتر کون ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [ هود : ۷ ] ''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔'' یہی بات سورۂ کہف (۷) اور سورۂ ملک (۲، ۳) میں فرمائی۔ اسی کی وضاحت سورۂ ذاریات میں فرمائی: ﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴾ [ الذاريات : ۵۶، ۵۷ ] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔''
حق کے ساتھ پیدا کرنے میں ایک حکمت ان کی اس بات پر دلالت ہے کہ ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا ملے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴾ [ النجم : ۳۱ ] ''اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جنھوں نے برائی کی اس کا بدلا دے جو انھوں نے کیا اور ان لوگوں کو جنھوں نے بھلائی کی بھلائی کے ساتھ بدلا دے۔'' اس کی وضاحت سورۂ یونس کی آیت (۴) سے بھی ہوتی ہے۔ کفار چونکہ سمجھتے تھے کہ آسمان و زمین کی پیدائش کا کوئی مقصد نہیں، نہ اللہ کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری عائد ہوئی ہے، نہ حساب ہوگا اور نہ جزا و سزا کا کوئی معاملہ ہے۔ ان کے مطابق تو زمین و آسمان کا یہ سب سلسلہ باطل اور بے مقصد ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس بات کی سخت تردید فرمائی، فرمایا: ﴿ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴾ [ ص : ۲۷ ] ''اور ہم نے آسمان و زمین کو اور ان دونوں کے درمیان کی

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ

کہہ دے کیا تم نے دیکھا جن چیزوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ انھوں نے زمین میں سے کون سی چیز پیدا

چیزوں کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا، سو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا آگ کی صورت میں بڑی ہلاکت ہے۔'' یہی بات سورۂ مومنون (۱۱۵، ۱۱۶)، آل عمران (۱۹۰، ۱۹۱) اور سورۂ دخان (۳۸، ۳۹) میں بیان ہوئی ہے۔

② وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى : یعنی ہم نے کائنات کا یہ نظام دائمی اور ابدی نہیں بنایا، بلکہ اس کا ایک وقت مقرر ہے، جس کے بعد ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلا ملے گا۔

③ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ : ''انذار'' کا معنی آگاہ کرنا ہے جس کے ساتھ ڈرانا بھی ہو۔ یعنی اگرچہ کفار کو آگاہ کر دیا گیا کہ زمین و آسمان کی پیدائش بے مقصد نہیں، نہ یہ سلسلہ دائمی ہے بلکہ یہ تمھاری آزمائش کے لیے ہے اور ایک مقرر وقت پر تم سب اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جاؤ گے، اس کے باوجود جس آخرت اور جس اُخروی عذاب سے انھیں ڈرایا گیا وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہیں، نہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور نہ اس سے بچنے کی تیاری کرتے ہیں۔

**آیت 4** ① قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ...... : جیسا کہ پچھلی آیت کی تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اکیلے معبود ہونے کی اور اس کے سوا تمام معبودوں کے باطل ہونے کی سب سے بڑی اور واضح دلیل اس کا کائنات کو پیدا کرنا ہے۔ یہ عقلی دلیل ہے جسے کوئی صاحبِ عقل رد نہیں کر سکتا، کفار کی اس کے جواب سے بے بسی واضح کرنے کے لیے اسے مناظرانہ انداز میں پیش کرنے کا حکم دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ مجھے بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو، ذرا مجھے دکھاؤ زمین کی وہ کون سی چیز ہے جو انھوں نے پیدا کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے تو وہ دکھاؤ؟ ظاہر ہے وہ ایسی کوئی چیز دکھا ہی نہیں سکتے، تو پھر کسی اور معبود کی عبادت کیوں کرتے ہیں۔ یہاں ایک لمبی بات کو مختصر کر دیا ہے، اصل یہ تھا کہ مجھے دکھاؤ کہ زمین و آسمان کی کون سی چیز ہے جو پوری کی پوری انھوں نے پیدا کی ہو، یا زمین و آسمان کی کوئی چیز دکھاؤ جو پوری نہ سہی اس کے بنانے یا چلانے میں ان کا کچھ حصہ ہی ہو۔ پہلے جملے میں سے صرف زمین کا ذکر فرمایا آسمان کو حذف کر دیا، دوسرے جملے میں آسمانوں کا ذکر فرمایا زمین کو حذف کر دیا۔ یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ دونوں جملوں میں دونوں مراد ہیں، اسے بلاغت کی اصطلاح میں احتباک کہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہاں لکھا ہے کہ آیت میں زمین کی کسی چیز کو پیدا کرنے کی نفی اور آسمانوں کی چیز میں شرکت کی نفی اس لیے فرمائی ہے کہ بظاہر زمین کی بعض اشیاء میں ان کی شرکت ہے جو آسمانوں میں بظاہر بھی نہیں۔ مگر یہ درست نہیں، کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں زمین و آسمان دونوں کی کسی چیز میں ان کی شرکت کی نفی فرمائی ہے۔ اس لیے وہی تفسیر درست ہے جو اوپر کی گئی ہے۔ دیکھیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : ﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴾ [ سبا : ۲۲ ]

فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ④

کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ لاؤ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب، یا علم کی کوئی نقل شدہ بات، اگر تم سچے ہو ④

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔''

❷ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ ........: ''اَثٰرَةٍ'' ''أَثَرَ يَأْثُرُ أَثْرًا وَ أَثَارَةً وَ أَثْرَةً'' (ض،ن) الْحَدِيْثَ ''بات کو نقل کرنا۔ ''مَأْثُوْرٌ'' بمعنی ''منقول''۔ ''اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ'' نقل شدہ یا پہلے لوگوں کا باقی ماندہ علم۔ یہ شرک کی تردید کی نقلی دلیل ہے، یعنی شرک کی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے تو کوئی معتبر نقلی دلیل ہی لے آؤ۔ قرآن سے پہلے کی کسی آسمانی کتاب مثلاً تورات یا انجیل وغیرہ سے شرک کا ثبوت لے آؤ، جو کسی قابلِ اعتماد طریقے سے ہم تک پہنچی ہو، کیونکہ اس کے بغیر اس کا آسمانی کتاب ہونا ثابت ہی نہیں ہوتا۔ یا پہلے انبیاء کی احادیث میں سے منقول کوئی حدیث لے آؤ، جو محض ظن و تخمین سے منقول نہ ہو بلکہ اس سے علم و یقین حاصل ہوتا ہو۔ اس طرح کہ وہ صحیح سند یا تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہو، کیونکہ وہم و گمان پر مبنی چیز کو علم نہیں کہا جاتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا ﴾ [ النجم : ۲۸ ] ''حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور بے شک گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا۔'' مگر تمھیں ایسی کوئی معتبر قدیم آسمانی کتاب یا کسی نبی کی حدیث نہیں ملے گی جس میں شرک کا شائبہ تک موجود ہو، کیونکہ ہر رسول نے توحید ہی کی تعلیم دی، فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [ النحل : ۳٦ ] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [ الأنبیاء : ۲۵ ] ''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ ''اگر یہاں کتاب سے مراد کتابِ الٰہی اور بقیہ علم سے مراد انبیاء و صلحاء کا چھوڑا ہوا علم نہ بھی لیا جائے تو دنیا کی کسی علمی کتاب اور دینی یا دنیوی علوم کے کسی ماہر کی تحقیقات میں بھی آج تک اس امر کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ زمین یا آسمان کی فلاں چیز کو خدا کے سوا فلاں بزرگ یا دیوتا نے پیدا کیا ہے، یا انسان جن نعمتوں سے اس کائنات میں متمتع ہو رہا ہے ان میں سے فلاں نعمت خدا کے بجائے فلاں معبود کی آفریدہ ہے۔'' مگر یہ بات کلی طور پر درست نہیں، کیونکہ کئی دہریہ سائنسدان اپنی تحقیق کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کائنات خود بخود پیدا ہوئی اور خود بخود ہی چل رہی ہے۔ زمانے کو خالق و مالک قرار دینے والے لوگ اپنی اس جہالت کو تحقیق ہی کہتے ہیں۔ اس لیے کتاب سے مراد آسمانی

وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ۝۵

اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انھیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۝۵

کتاب ہی لینا چاہیے، کیونکہ دوسری آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [ فاطر : ۴۰ ] ''کہہ دے کیا تم نے اپنے شریکوں کو دیکھا، جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ زمین میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے، یا ہم نے انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اس کی کسی دلیل پر قائم ہیں؟ بلکہ ظالم لوگ، ان کے بعض بعض کو دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتے۔'' ان آیات سے معلوم ہوا کہ دین میں دلیل کے طور پر آسمانی کتاب پیش کی جاسکتی ہے یا آسمانی وحی پر مشتمل احادیث، ان کے علاوہ کسی کی تصنیف کو یا اس کے اقوال کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔

**آیت 5** ﴿ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... ﴾ : یہ استفہام انکار کے لیے ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کو پکارے جو قیامت کے دن تک ان کی دعا قبول نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کے پاس یہ اختیار ہی نہیں، بلکہ انھیں ان کے پکارنے کی خبر ہی نہیں۔ عام طور پر ان سے مراد پتھر اور بت لیے جاتے ہیں، مگر لفظ ''مَنْ'' ذوی العقول کے لیے آتا ہے، اس لیے اس سے مراد وہ سب ہستیاں ہیں جنھیں لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، جن میں انسان، جن، فرشتے، نبی، ولی، نیک، بد، زندہ، مردہ سب شامل ہیں۔ رہے پتھر، بت اور قبریں وغیرہ تو انھیں پکارتے اور پوجتے وقت بھی مشرکین دراصل ان بتوں یا قبروں کے بجائے ان ہستیوں ہی کو پکار رہے ہوتے ہیں جن کے وہ بت یا قبریں ہیں، ورنہ انھیں بت بنانے کی ضرورت کیا تھی، کسی بھی پتھر کی پوجا کر لیتے۔ چنانچہ مشرکین عرب نے عین کعبہ کے اندر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی صورتیں بنا کر رکھی ہوئی تھیں، جنھیں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کعبہ سے نکالا گیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۲۸۸)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی کی پکار نہ سنتا ہے نہ اس کی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ قرآن مجید نے یہ بات بار بار دہرائی ہے، فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾ [ فاطر : ۱۳، ۱۴ ] ''اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے مالک نہیں۔ اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن لیں تو تمھاری درخواست قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھے ایک پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ

وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اور جب سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہوں گے ⑥ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا حق کے بارے میں، جب وہ ان کے پاس آیا، کہتے ہیں یہ کھلا جادو ہے ⑦

فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [ الأعراف : ۱۹۴ ] ”بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمھارے جیسے بندے ہیں، پس انھیں پکارو تو لازم ہے کہ وہ تمھاری دعا قبول کریں، اگر تم سچے ہو۔“ اور فرمایا: ﴿ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ [ الرعد : ۱۴ ] ”برحق پکارنا صرف اسی کے لیے ہے اور جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کچھ بھی قبول نہیں کرتے، مگر اس شخص کی طرح جو اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلانے والا ہے، تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، حالانکہ وہ اس تک ہرگز پہنچنے والا نہیں اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سراسر بے سود۔“ قارئین ”لَا يَسْتَجِيْبُ“ کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑی زحمت کر کے ان مذکورہ بالا مقامات کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

**آیت 6** وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً ...... : یعنی قیامت کے دن جب انھیں بتایا جائے گا کہ یہ لوگ تمھیں پکارتے رہے اور تم سے فریاد کرتے رہے تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں اس بات کی کوئی خبر نہیں کہ یہ ہمیں پکارتے رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴾ [ يونس : ۲۸، ۲۹ ] ”اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے جنھوں نے شریک بنائے تھے، کہیں گے اپنی جگہ ٹھہرے رہو، تم اور تمھارے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان علیحدگی کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ سو اللہ ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان کافی گواہ ہے کہ بے شک ہم تمھاری عبادت سے یقیناً بے خبر تھے۔“ اور دیکھیے سورۂ قصص (۶۳) اور سورۂ نحل (۸۶) مسیح علیہ السلام بھی اپنی عبادت کرنے والوں سے اپنے بے خبر ہونے کی صراحت فرما دیں گے (دیکھیے مائدہ: ۱۱۶، ۱۱۷) اور فرشتے بھی۔ (دیکھیے فرقان: ۱۷، ۱۸۔ سبا: ۴۰، ۴۱) بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی بھی پوجا کی گئی وہ پوجا کرنے اور پکارنے والوں کے شدید مخالف اور دشمن بن جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۸۱، ۸۲)۔

**آیت 7** وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ...... : قرآن پر ایمان نہ لانے کے لیے وہ جو بہانے کرتے تھے ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اختصار کا تقاضا یہ تھا کہ کہا جاتا: ” وَ إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ “ (جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں یہ کھلا جادو ہے) مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ⑧

یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے خود گھڑ لیا ہے، کہہ دے اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم میرے لیے اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے، وہ ان باتوں کو زیادہ جاننے والا ہے جن میں تم مشغول ہوتے ہو، وہی میرے درمیان اور تمھارے درمیان گواہ کے طور پر کافی ہے اور وہی بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ⑧

بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ ''اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا حق کے بارے میں، جب وہ ان کے پاس آیا، کہتے ہیں یہ کھلا جادو ہے۔'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اختصار کے بجائے تین باتوں ''قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا''، ''لِلْحَقِّ'' اور ''لَمَّا جَآءَهُمْ'' کی صراحت فرمائی۔ ''قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کا مقصد یہ ہے کہ ان کے جھٹلانے کا اصل باعث ان کا کفر و انکار ہے، جب کوئی طے کر لے کہ ماننا ہی نہیں تو بڑی سے بڑی دلیل بھی اس کے لیے بے کار ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [ البقرة : ٦ ] ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انھیں ڈرایا ہو یا انھیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔'' ''لِلْحَقِّ'' کہہ کر آیات بینات کی عظمت و اہمیت اور کفار کی بدنصیبی نمایاں فرمائی کہ دیکھو وہ اس چیز کو جادو کہہ رہے ہیں جو حق ہے، جب کہ جادو سراسر باطل ہوتا ہے اور ''لَمَّا جَآءَهُمْ'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کے پاس حق نہ آتا تو انھیں معذور سمجھا جاتا، حق آنے کے بعد اسے جادو کہنا بہت بڑی جرأت ہے۔ ''وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ'' اور ''لَمَّا جَآءَهُمْ'' سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات پر غور و فکر کی زحمت ہی نہیں کرتے، بلکہ سنتے ہی انھیں جھٹلا دیتے ہیں اور جب جھٹلانے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں پاتے تو اس کی شدتِ تاثیر کی وجہ سے اسے جادو کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں، حالانکہ کہاں جادو اور کہاں یہ پاکیزہ اور عظیم الشان کلام، جس کی ایک سورت کی مثال وہ نہ لا سکے نہ لا سکتے ہیں اور کہاں نجس اور پلید جادوگر اور کہاں محمد رسول اللہ ﷺ جیسا پاک باز اور صادق و امین انسان، جس کی پاک بازی اور صدق و امانت کا انھیں نبوت سے چالیس برس پہلے کا بھی تجربہ تھا۔

آیت 8 ① اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ : یہ ایمان نہ لانے کا ایک اور بہانہ ہے۔ ''واؤ'' کے ساتھ عطف کے بجائے حرف ''اَمْ'' لایا گیا ہے، یعنی ان کی یہ بات کہ یہ جادو ہے ایک طرف رہی، اس سے بھی عجیب بات سنو، وہ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن خود تصنیف کیا ہے اور جھوٹ باندھتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ حالانکہ اس میں وہ اپنی ہی بات کی نفی کر رہے ہیں، کیونکہ اگر یہ جادو ہے تو آپ ﷺ کا اپنا کلام نہیں اور اگر آپ ﷺ کا کلام ہے تو جادو نہیں۔

② قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا : ''اِنِ افْتَرَيْتُهٗ'' کا جواب محذوف ہے جو ''فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ'' سے سمجھ میں آ رہا ہے: ''أَيْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ عَاقَبَنِيَ اللّٰهُ عَلَى الْإِفْتِرَاءِ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا'' یعنی آپ ان سے

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى

کہہ دے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ

کہہ دیں کہ اگر میں نے جھوٹ گھڑنے کا جرم کیا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ مجھے جھوٹ گھڑنے کی سزا دے گا، پھر تم اللہ تعالیٰ سے چھڑانے کے لیے میرے کسی کام نہ آؤ گے۔" ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴾ [ الحاقة : ٤٤ تا ٤٧ ] "اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔"

③ **هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ** ...... : یعنی جب تم اس حد تک آ گئے کہ اس کلام کو افترا اور انسانی کلام کہنے لگے جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال لانے سے بھی تم قاصر رہے اور سب کے سامنے واضح ہو گیا کہ وہ انسان کا کلام نہیں اور نہ کوئی انسان ایسا کلام کر سکتا ہے تو اب تم سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں، میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ ان باتوں کو خوب جانتا ہے جو تم بناتے رہتے ہو۔ کبھی اسے جادو کہتے ہو، کبھی کہانت، کبھی شعر اور کبھی خود تصنیف کر کے اللہ تعالیٰ پر باندھا ہوا طوفان۔ وہی میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے، کیونکہ وہ ہم دونوں کی ہر بات سے واقف اور ہر موقع کا گواہ ہے۔

④ **وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ** : اس جملے کی مناسبت اس مقام پر دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ تمھارا قرآن کو افترا اور نبی کو مفتری کہنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ غفور و رحیم نہ ہوتا، بلکہ کوئی بے رحم اور سخت گیر مالک ہوتا تو تمھیں ایک سانس کی مہلت بھی نہ ملتی۔ یہ اس کی مغفرت اور رحمت ہی ہے کہ ایسی گستاخیوں کے باوجود وہ تمھیں فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ مہلت دیتا ہے کہ تم کسی وقت ہی پلٹ آؤ۔ دوسری مناسبت یہ ترغیب ہے کہ اب بھی اس ہٹ دھرمی سے باز آ جاؤ تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت تمھارا انتظار کر رہی ہیں، کیونکہ وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔ نہ اس کی مغفرت کی کوئی انتہا ہے نہ رحمت کی، تم نے جو کچھ کیا وہ اب بھی معاف کر دے گا۔ "**الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ**" ضمیر "**هُوَ**" کی خبر ہے، جس پر الف لام آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی غفور و رحیم بس وہی ہے اور کوئی ہے ہی نہیں جو تمھارے گناہوں پر پردہ ڈال دے اور تم پر بے حد رحم کرنے والا ہو، پھر اس سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟

آیت 9 ① **قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ** : "بَدَعَ يَبْدَعُ بَدْعًا" (ف) "اَلشَّيْءَ" کسی چیز کو ایجاد کرنا، کسی پہلی مثال کے بغیر بنانا۔ سورۂ بقرہ (۱۱۷) اور سورۂ انعام (۱۰۱) میں "**بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ**" اسی سے ہے۔ "بَدُعَ يَبْدُعُ بَدْعًا وَ بَدَاعَةً وَ بُدُوْعَةً" (ک) نیا ہونا، جس کی پہلے کوئی مثال نہ ہو۔ "**بِدْعًا**" صفت مشبہ فعل لازم سے بمعنی اسم فاعل ہے، جیسے "خِفٌّ" بمعنی خفیف ہے، یا فعل متعدی سے بمعنی اسم مفعول ہے، جیسے "حِبٌّ" بمعنی محبوب ہے۔ "**بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ**" نیا

اِلَيَّ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۝۹

(یہ کہ) تمھارے ساتھ (کیا)، میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور میں تو بس واضح ڈرانے والا ہوں۝۹

یا انوکھا رسول۔ کفار ایمان نہ لانے کے لیے جو بہانے اور اعتراض کرتے تھے ان میں سے چند کا ذکر اور ان کا جواب پچھلی دو آیات میں گزرا۔ اس آیت میں ان کے بہت سے اعتراضات کا صرف جواب ذکر کیا گیا ہے، اعتراضات کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ خود بخود جواب سے سمجھ میں آ رہے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کا ذکر صراحت کے ساتھ بھی موجود ہے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ ہمارے جیسا ایک بشر رسول کیسے بن گیا، جو ہماری طرح کھاتا پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا اور بیوی بچے رکھتا ہے۔ ایک اعتراض یہ کرتے کہ توحید کی جو تعلیم یہ نبی پیش کرتا ہے ہم نے اپنے آباو اجداد میں نہیں سنی۔ (دیکھیے ص: ۴ تا ۸۔ فرقان: ۷) ایک یہ کہ اگر یہ رسول ہے تو ہمارے مطالبے کے مطابق معجزے کیوں پیش نہیں کرتا، مثلاً پہاڑ ہٹا دے، دریا بہا دے، سونے کا مکان بنا لے، آسمان پر چڑھ جائے اور وہاں سے کتاب لا کر دکھائے وغیرہ۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳) اور ایک یہ کہ غیب کی خبریں ہمارے مطالبے کے مطابق کیوں نہیں بتاتا، کم از کم یہی بتا دے کہ قیامت کب ہوگی۔ (دیکھیے اعراف: ۱۸۷) اللہ تعالیٰ نے ان سب کے جواب میں یہ کہنے کا حکم دیا کہ میں کوئی پہلا رسول نہیں جو بشر ہو، مجھ سے پہلے تمام رسول بشر ہی تھے، وہ کھاتے پیتے، بازاروں میں چلتے پھرتے اور بیوی بچوں والے تھے۔ ان پر انسانی عوارض آتے تھے، سب کی تعلیم توحید تھی، وہ خدائی اختیارات نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی وہ اپنی مرضی سے معجزے پیش کر سکتے تھے۔ پھر اگر وہ سب، جن میں تمھارے جد امجد ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اور بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء شامل ہیں، رسول اور نبی ہو سکتے ہیں اور تم انھیں نبی مانتے ہو تو میرا رسول ہونا کون سی انوکھی بات ہے؟

❷ **وَمَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ** : یہ ان کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ یہ ہمیں ہمارے مطالبے کے مطابق غیب کی خبریں کیوں نہیں دیتا۔ فرمایا ان سے کہہ دو کہ میں خود کچھ بھی نہیں جانتا، نہ یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا، تو میں تمھیں اپنے پاس سے تمھاری طلب کردہ باتیں کیسے بتا سکتا ہوں؟ "**مَا يُفْعَلُ**" فعل مجہول اس لیے لایا گیا تاکہ فاعل عام رہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا کرے گا اور لوگ کیا کریں گے۔ پھر یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ کس وقت کیا کیا جائے گا، تاکہ عام رہے کہ ہمارے ساتھ دنیا میں کیا کیا جائے گا اور آخرت میں کیا کیا جائے گا۔

یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً جانتے تھے کہ دنیا اور آخرت میں آپ کے ساتھ کیا کیا جائے گا اور آپ پر ایمان لانے والوں یا نہ لانے والوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ آپ کے پہلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے اور صحابہ کرام کے تمام گناہ معاف کر کے انھیں جنت میں داخل کیا جائے گا اور کفار و منافقین کو جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔ (دیکھیے فتح: ۱ تا ۶) دنیا میں بھی آپ کو اور ایمان والوں کو عزت و غلبہ اور کفار کو ذلت و رسوائی ملے گی

اور آپ کا دین تمام دینوں پر غالب آئے گا۔ دیکھیے سورۂ مجادلہ (۲۱)، فتح (۲۸)، صف (۸، ۹) اور دوسری متعدد آیات۔ پھر یہ کہنے کا حکم کیوں دیا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا ہوں کہ تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ اہل علم نے اس سوال کے مختلف جواب دیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ اجمالی طور پر تو یہ جانتے تھے مگر تفصیلی طور پر آپ کو معلوم نہ تھا کہ آپ کے ساتھ یا آپ کے مخاطبین کے ساتھ دنیا یا آخرت میں کیا ہوگا۔ ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ پہلے آپ کو یہ معلوم نہ تھا بعد میں معلوم ہو گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب اس آیت کے جملہ "وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ" میں اور اگلے جملے "اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ" میں موجود ہے۔

③ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ : یعنی میں خود آئندہ کی کوئی بات نہیں جانتا، نہ یہ کہ میرے ساتھ کیا ہوگا اور نہ یہ کہ تمھارے ساتھ کیا ہوگا، میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یعنی میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں جو مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی جاتی ہے اور واقعی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آئندہ ہونے والی جو بات رسول اللہ ﷺ کو بتائی وہ آپ جان گئے اور جو نہیں بتائی وہ آپ کو معلوم نہیں ہوئی۔ اس کی دلیل سیکڑوں واقعات ہیں، مثلاً واقعۂ افک، بئر معونہ کے شہداء اور آپ ﷺ کا چند کفار کا نام لے کر ایک ماہ تک قنوت میں ان پر لعنت کرنا، مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں اور پھر ان سب کا مسلمان ہو جانا وغیرہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نمل کی آیت (۶۵): ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کی تفسیر۔ سورۂ اعراف میں فرمایا: ﴿قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [ الاعراف : ۱۸۸ ] "کہہ دے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں نہیں ہوں مگر ایک ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔" اسی طرح آخرت کے متعلق جو بات بتائی وہ آپ جان گئے جو نہیں بتائی وہ نہیں جانتے تھے، جیسا کہ حدیثِ شفاعت میں ہے کہ میں عرش کے نیچے سجدے میں گر جاؤں گا اور اللہ تعالیٰ مجھے وہ تعریفیں الہام کرے گا جو اب مجھے یاد نہیں۔ [ دیکھیے بخاری، التوحید، باب کلام الرب عزوجل یوم القیامة مع الأنبیاء وغیرھم : ۷۵۱۰ ]

الغرض، رسول اللہ ﷺ اور پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کو آئندہ کی کسی بات کا نہ اجمالی علم تھا اور نہ تفصیلی، صرف ان باتوں کا علم تھا جو اللہ تعالیٰ نے انھیں بتائیں، خواہ اجمالاً بتائیں یا تفصیلاً۔ یوسف اور یعقوب علیہما السلام کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ دیکھیے سورۂ یوسف کی آیت (۹۴) کی تفسیر۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے تمام واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ پیغمبر کو آنے والے واقعات کا صرف اتنا علم ہوتا ہے جتنا اسے بتا دیا جائے۔ اگر کہا جائے کہ وہ سب کچھ جانتے ہوتے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں پھینکے جانے، بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم، ہجرت میں بیوی کی عزت خطرے میں پڑنے، بیوی بچے کو بے آب و گیاہ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر یہ اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کر دیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت

وادی میں چھوڑنے، غرض کسی بھی امتحان میں سرخرو ہونے کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

خلاصہ یہ کہ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اے نبی! کہہ دے نہ میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا، مجھے تو صرف اس بات کا پتا چلتا ہے اور میں اسی کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے، اس کے سوا میں اپنے یا تمھارے متعلق آئندہ کی کوئی بات نہیں جانتا۔ اس لیے مجھ سے قیامت کے وقت یا آئندہ کی دوسری کسی بات کے متعلق بتانے کا مطالبہ مت کرو، کیونکہ یہ میرے دائرۂ اختیار میں نہیں ہیں۔

❹ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ: یعنی میرا کام یہ نہیں کہ میں تمھیں بتاؤں کہ قیامت کب آئے گی، یا اپنے پاس سے تمھیں آئندہ کی خبریں بتاؤں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ میں اللہ کا عذاب آنے سے پہلے تمھیں اس سے واضح طور پر ڈرا دوں۔

❺ مفسر علی بن احمد مہائمی نے اپنی تفسیر ''تبصیر الرحمان'' میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے نہایت عمدہ الفاظ میں بحث کا خلاصہ بیان فرما دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ آتِيكُم بِالْمُؤَاخذَةِ الْأُخْرَوِيَّةِ ﴿وَ﴾ مِنْ أَيْنَ لِيْ تَعْيِيْنُ وَقْتِهَا مَعَ أَنِّيْ ﴿مَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَ لَا بِكُمْ﴾ فِيْمَا لَمْ يُوْحَ إِلَيَّ وَالْوَحْيُ بِبَعْضِ الْأُمُوْرِ لَا يَسْتَلْزِمُ الْعِلْمَ بِالْبَاقِيْ وَلَمْ يَكُنْ لِيْ أَنْ أَضُمَّ إِلَى الْوَحْيِ كَذِبًا مِنْ عِنْدِيْ ﴿اِنْ اَتَّبِعُ﴾ فِيْ تَقْرِيْرِ الْأُمُوْرِ الْغَيْبِيَّةِ ﴿اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَ﴾ مَعَ ذٰلِكَ لَا يُفَوَّضُ إِلَيَّ شَيْءٌ مِمَّا يُوْحٰى إِلَيَّ مِنْ تَعْذِيْبِ مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِيْ بَلْ ﴿مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ﴾ عَنْهُ ﴿مُّبِيْنٌ﴾ لَهُ بِالدَّلَائِلِ الْقَطْعِيَّةِ.'' '' (کہہ دے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں) کہ تم پر آخرت کا عذاب لے آؤں (اور) میں اس کے وقت کی تعیین کیسے کر سکتا ہوں جب کہ (میں جانتا ہی نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا) ان معاملات میں جن کی میری طرف وحی نہیں کی گئی اور بعض معاملات کے وحی کیے جانے سے لازم نہیں آتا کہ مجھے تمام معاملات کا بھی علم ہو گیا اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ باقی معاملات میں وحی کے ساتھ اپنے پاس سے جھوٹ ملا دوں۔ (میں پیروی نہیں کرتا) غیبی معاملات بیان کرنے میں (مگر اسی کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور) اس کے ساتھ یہ کہ مجھے جو وحی کی جاتی ہے اس میں مجھ پر ایمان نہ لانے والوں کو عذاب دینے میں کسی چیز کا معاملہ میرے سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ (میں نہیں ہوں مگر ڈرانے والا) اس کی طرف سے (بالکل واضح) جو اپنے ڈرانے کو قطعی دلائل کے ساتھ واضح کر کے بیان کرنے والا ہوں۔''

**آیت 10** ❶ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ...... : ''اَرَءَيْتُمْ'' کا لفظی معنی ہے ''کیا تم نے دیکھا۔'' اہل عرب اسے ''أَخْبِرُوْنِيْ'' (مجھے بتاؤ) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی کیا تم نے دیکھا؟ اگر دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ۔

اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰

دینے والے نے اس جیسے (قرآن) کی شہادت دی، پھر وہ ایمان لے آیا اور تم نے تکبر کیا (تو تم سے بڑھ کر ظالم کون ہے) بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۝۱۰

"شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ" میں "اس جیسے کی شہادت" سے مراد یہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت دینے والے نے اس کی شہادت دی ہو۔ کیونکہ بعض اوقات کسی چیز کی مثل سے مراد خود وہ چیز ہوتی ہے، جیسے کہتے ہیں: "مِثْلُكَ لَا يَفْعَلُ هٰذَا" "تیرے جیسا یہ کام نہیں کرتا" یعنی تو یہ کام نہیں کرتا۔ اس لیے آگے "فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ" کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس جیسے پر ایمان لایا، بلکہ اس کا مطلب ہے "پھر وہ اس پر ایمان لے آیا اور تم نے تکبر کیا۔" لفظ "مِثْلٌ" کو خود کسی کی ذات کے لیے استعمال کرنے کی ایک مثال ایک تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ [الأنعام: ۱۲۲] "أَيْ كَمَنْ هُوَ (نَفْسُهُ) فِي الظُّلُمَاتِ" یہاں "اس شخص کی طرح ہے جس کی مثل اندھیروں میں ہے" سے مراد ہے "اس شخص کی طرح ہے جو (خود) اندھیروں میں ہے۔" اسی طرح: ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ [البقرۃ: ۱۳۷] (پس اگر وہ اس جیسی چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے) سے مراد یہ ہے کہ "اگر وہ اس چیز پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو ....." (اضواء البیان) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ شوریٰ کی آیت (۱۱): ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کی تفسیر۔

اس آیت میں "اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" سے لے کر "وَاسْتَكْبَرْتُمْ" تک شرط ہے، جس کی جزا محذوف ہے اور وہ بعد والے جملے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" سے ظاہر ہو رہی ہے: "أَيْ فَمَنْ أَظْلَمُ مِنْكُمْ" "تو تم سے بڑھ کر ظالم کون ہے۔" اس کی تائید سورۂ حم السجدہ (۵۲) سے بھی ہوتی ہے۔

قرآن کو جھٹلانے کے لیے کفار کے مختلف اعتراضات اور ان کے جوابات ذکر کرنے کے بعد اب انھیں اس پر ایمان نہ لانے کے انجامِ بد سے ڈرایا جا رہا ہے کہ یہ بتاؤ کہ اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کرو، حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت دینے والا بھی اس کے حق ہونے کی شہادت دے چکا ہو، پھر وہ خود بھی اس پر ایمان لے آیا ہو مگر (تم یہ جان لینے کے باوجود کہ یہ حق ہے) محض تکبر اور جھوٹی بڑائی قائم رکھنے کے لیے اسے ماننے سے انکار کر دو (تو یقیناً تم ظالم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ تمھیں ہدایت کی توفیق نہیں دے گا) کیونکہ جو لوگ تکبر کرتے ہوئے حق سے انکار کر دیں ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ بھی سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق نہیں دیتا۔

❷ اس آیت میں "شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" سے کون مراد ہے؟ مفسرین کے اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ سب سے مشہور قول یہ ہے کہ اس سے مراد عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کی دلیل سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ

فرماتے ہیں: « مَا سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ لِأَحَدٍ يَمْشِيْ عَلَى الْأَرْضِ إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ إِلَّا لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ وَ فِيْهِ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ: ﴿ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ ﴾ » [ بخاري، مناقب الأنصار، مناقب عبد الله بن سلام رضی اللہ عنہ : ۳۸۱۲ ] ''میں نے نبی ﷺ کو عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے سوا کسی ایسے شخص کے بارے میں جو زمین پر چل پھر رہا ہو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ وہ جنتیوں میں سے ہے۔'' سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انھی کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ ﴾ [ الأحقاف : ۱۰ ] ''اور بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت دینے والے نے اس جیسے (قرآن) کی شہادت دی۔'' مگر اس میں یہ اشکال ہے کہ یہ سورت مکی ہے جب کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ مدینہ میں مسلمان ہوئے۔ جو حضرات اس ''شاہد'' سے مراد عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ لیتے ہیں وہ اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ بے شک سورت مکی ہے مگر یہ آیت مدنی ہو سکتی ہے، یا ہو سکتا ہے کہ مکہ میں پہلے ہی بنی اسرائیل میں سے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا پیش گوئی کے طور پر ذکر کر دیا گیا ہو۔ مگر زیادہ قرینِ قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے بنی اسرائیل میں سے رسول اللہ ﷺ کے حق ہونے کی شہادت دی اور آپ پر ایمان لائے۔ کیونکہ اصولِ تفسیر میں یہ بات طے ہے کہ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں مسئلے یا فلاں شخص کے بارے میں اتری، حالانکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت اس شخص یا اس مسئلے پر منطبق ہوتی اور صادق آتی ہے۔

دوسرا اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام یا بقول بعض عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حق ہونے کی شہادت تورات اور انجیل میں دی۔ خصوصاً عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کا نام لے کر آپ کی آمد کی بشارت دی اور آپ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے آپ کی تصدیق کی، فرمایا: ﴿ وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ﴾ [ الصف : ٦ ] ''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اس کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے تورات کی صورت میں ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہے۔'' تورات و انجیل میں تحریف کے باوجود اب بھی ان میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی آمد کی بشارت دی گئی ہے اور آپ کی تصدیق کی گئی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ صف (۶) اور سورۂ اعراف (۱۵۷) کی تفسیر۔

چوتھا قول جو زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کا تجارت کے سلسلے میں مدینہ، خیبر اور شام میں آنا جانا عام تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے سورۂ قریش میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ ان سفروں میں ان کی ملاقات اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ سے بھی ہوتی تھی اور وہ ان سے نبی ﷺ کے متعلق پوچھتے تھے اور ان میں سے منصف لوگ حق بات کی شہادت سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مکی سورتوں میں بھی اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب کے اہلِ علم بھی اس پیغمبر ﷺ اور اس کتاب کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں، اس لیے ''شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ'' میں

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪

اور ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا، ان لوگوں کے بارے میں کہا جو ایمان لائے اگر یہ کچھ بھی بہتر ہوتا تو یہ ہم سے پہلے اس کی طرف نہ آتے اور جب انھوں نے اس سے ہدایت نہیں پائی تو ضرور کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے ⑪

لفظ "شَاهِدٌ" جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا اسم جنس ہے اور اس سے مراد ان تمام لوگوں میں سے کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملک میں موجود ہونے کے وقت آپ کے سچا نبی ہونے کی شہادت دی، جیسا کہ نجاشی رضی اللہ عنہ کا آپ پر ایمان لانا اور آپ کے حق ہونے کی شہادت دینا سب کو معلوم ہے، اگرچہ مدینہ میں ایمان لانے والے اسرائیلی صحابہ بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ اب مکی سورتوں کی وہ آیات ملاحظہ فرمائیں جن میں اہل کتاب کی شہادت کو بطور تائید ذکر کیا گیا ہے: ﴿ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴾ [ الرعد : ۴۳ ] "کہہ دے میرے درمیان اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ شخص بھی جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔" اور فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۱۰۷، ۱۰۸ ] "بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہمارے رب کا وعدہ یقیناً ہمیشہ پورا کیا ہوا ہے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴾ [ القصص : ۵۳ ] "اور جب ان کے سامنے اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یقیناً یہی ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بے شک ہم اس سے پہلے فرماں بردار تھے۔" اور فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [ الشعراء : ۱۹۷ ] "اور کیا ان کے لیے یہ ایک نشانی نہ تھی کہ اسے بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں۔"

**آیت 11** ① وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا ...... : "لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" میں "لام" کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے مخاطب ہو کر کہا، بلکہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں کہا۔ پچھلی آیت میں مشرکین کے ایمان نہ لانے کا باعث ان کا تکبر ذکر فرمایا تھا، اب ان کے تکبر اور خود پسندی کی ایک مثال ذکر فرمائی جس کی بنا پر وہ ایمان کی نعمت سے محروم رہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دنیا کی نعمتوں پر اس قدر مغرور ہیں کہ اس کی ہر نعمت کا مستحق صرف اپنے آپ ہی کو سمجھتے ہیں۔ بلال، عمار، عبد اللہ بن مسعود، سمیہ اور زنیرہ رضی اللہ عنہم جیسے مسکین اور ضعیف مسلمانوں کو وہ اللہ تعالیٰ کے کسی انعام کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اسلام کے ہر خیر سے خالی ہونے کی دلیل یہ تصنیف کی کہ اگر اسلام میں کوئی خوبی ہوتی تو یہ لوگ ہم سے پہلے اس کی طرف نہ آتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی: (( اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانه : ۹۱ ] "تکبر حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔" مشرکین مسلمانوں کو

وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۟

**اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی اور یہ ایک تصدیق کرنے والی کتاب عربی زبان میں ہے، تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے ظلم کیا اور نیکی کرنے والوں کے لیے بشارت ہو ⑫**

کس قدر حقیر جانتے تھے، اس کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے: ﴿ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ﴾ [ الأنعام : ٥٣ ] ''اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کی بعض کے ساتھ آزمائش کی ہے، تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے احسان فرمایا ہے؟'' نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں کا اندازِ تحقیر ملاحظہ فرمائیں، انھوں نے نوح علیہ السلام سے کہا: ﴿ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴾ [ هود : ٢٧ ] ''ہم تجھے نہیں دیکھتے مگر اپنے جیسا ایک بشر اور ہم تجھے نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کے سوا کسی نے تیری پیروی کی ہو جو ہمارے سب سے رذیل ہیں، سطحی رائے کے ساتھ اور ہم تمھارے لیے اپنے آپ پر کوئی برتری نہیں دیکھتے، بلکہ ہم تمھیں جھوٹے گمان کرتے ہیں۔''

② وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ ...... : کفار کے جن اقوال کا یہاں ذکر ہوا ان سب کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو جھٹلانا تھا، مثلاً یہ کہنا کہ یہ سحر ہے، افترا ہے، اس میں کوئی خیر نہیں وغیرہ۔ فرمایا، جب وہ اس قرآن کے ذریعے سے سیدھا راستہ حاصل نہ کر سکے تو وہ یہی کہتے رہیں گے کہ یہ قدیم جھوٹ ہے۔ یعنی اگر وہ ضد اور عناد پر اڑے رہے تو کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے اور نہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل تسلیم کریں گے، بلکہ ان کے سامنے پہلے انبیاء اور اہلِ علم کی شہادت پیش کی گئی تو وہ تمام پیغمبروں اور کتابوں کو بھی یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ یہ قدیم جھوٹ ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ ان کے اس رویے کے باعث صرف ان کا کفر اور تکبر ہے، جب تک وہ اس پر قائم رہیں گے یہی بات کہتے رہیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۚۛ وَ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴾ [ الفرقان : ٤، ٥ ] ''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ نہیں ہے مگر ایک جھوٹ، جو اس نے گھڑ لیا اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر اس کی مدد کی، سو بلاشبہ وہ بھاری ظلم اور سخت جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ اور انھوں نے کہا یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، جو اس نے لکھوا لی ہیں، تو وہ پہلے اور پچھلے پہر اس پر پڑھی جاتی ہیں۔''

آیت 12 ① وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً : ''كِتٰبُ مُوْسٰى'' کا عطف ''شَاهِدٌ'' پر ہے اور ''قَبْلِهٖ'' کی ضمیر اس ''شَاهِدٌ'' کی طرف جا رہی ہے: ''أَيْ شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلٰی مِثْلِهٖ وَ شَهِدَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتَابُ مُوْسٰی عَلٰی مِثْلِهٖ'' یعنی بنی اسرائیل کے ایک شہادت دینے والے نے اس کی شہادت دی اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب نے بھی اس کے حق ہونے کی شہادت دی جو لوگوں کی پیشوائی کرنے والی تھی۔ لوگ اس کی پیروی اور اس کے احکام پر

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ

بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۳﴾ یہ لوگ جنت والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے، اس کے بدلے کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴﴾ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کی، اس کی ماں نے اسے ناگواری کی حالت میں اٹھائے

عمل کرتے تھے (دیکھیے مائدہ: ۴۴) اور وہ لوگوں کے لیے سراسر رحمت تھی۔

② اکثر مفسرین نے "قَبْلِهٖ" کی ضمیر کا مرجع قرآن کو قرار دیا ہے، یعنی اس قرآن سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی، لیکن مجھے وہ ترکیب بہتر معلوم ہوتی ہے جو اوپر ذکر ہوئی۔

③ **وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا:** اور یہ کتاب یعنی قرآن موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے، یعنی یہ عین ان پیش گوئیوں کے مطابق ہے جو تورات میں کی گئی تھیں، جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور دونوں کی بنیادی تعلیم بھی یک ہے۔ حالانکہ وہ عبرانی زبان میں تھی اور یہ عربی زبان میں ہے اور ایسے شخص پر نازل ہوئی جو عبرانی جانتا ہی نہیں بلکہ اُمّی ہے، عربی بھی نہیں پڑھ سکتا۔ یہ دلیل ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں جو تمام زبانیں پیدا کرنے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

④ **لِيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ......:** تاکہ یہ ان لوگوں کو ان کے برے انجام سے ڈرائے جنھوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے اور نیک عمل کرنے والوں کے لیے عظیم خوش خبری ہو۔

**آیت 14،13** اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ......: ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حم سجدہ (۳۰، ۳۱) کی تفسیر۔

**آیت 15** ① **وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا:** سورت کے شروع سے یہاں تک اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی نازل کردہ کتاب کے حق ہونے اور اس کی عبادت پر استقامت کا بیان فرمایا، اب ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کا بیان ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے حق توحید اور اخلاصِ عبادت کے ساتھ ماں باپ کے حق کا ذکر فرمایا ہے۔ اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۸۳)، بنی اسرائیل (۲۳، ۲۴)، عنکبوت (۸) اور سورۂ لقمان (۱۴، ۱۵)۔

② **حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا:** "كَرِهَ يَكْرَهُ كَرْهًا وَ كُرْهًا وَ كَرَاهَةً وَ كَرَاهِيَةً" (ع) "اَلشَّيْءَ" یہ "أَحَبَّ الشَّيْءَ" کی ضد ہے، ناپسند کرنا۔ "اَلْكَرْهُ" اور "اَلْكُرْهُ" کا معنی انکار اور مشقت بھی ہے۔ "**كُرْهًا**" حال ہے: "أَيْ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ ذَاتَ كُرْهٍ" یعنی اس کی ماں نے اسے اس حالت میں اٹھائے رکھا کہ وہ ناگواری یا مشقت والی تھی۔ یا اس سے پہلے حرف جار باء محذوف ہے، جس کے حذف کرنے سے اس پر نصب آیا ہے: "أَيْ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ بِكُرْهٍ" یعنی اس کی ماں نے اسے ناگواری یا مشقت کے ساتھ اٹھایا، "**وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا**" اور اسے ناگواری اور مشقت کے ساتھ جنا۔

③ آیت میں اگرچہ ماں اور باپ دونوں کے ساتھ احسان کی تاکید کی گئی ہے، مگر ماں کی تین قربانیوں کا ذکر خاص طور پر کیا

اِحۡسٰنًا ؕ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّ وَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَ حَمۡلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ حَتّٰۤى

**رکھا اور اسے ناگواری کی حالت میں جنا اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے، یہاں تک کہ**

گیا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ حمل کی پوری مدت اسے اپنے پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے، اس دوران اس پر کئی ناگوار حالتیں گزرتی ہیں، مثلاً متلی، بے چینی، تھکاوٹ، بیماری کی سی حالت، دن بدن بڑھتی ہوئی کمزوری، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ ﴾ [ لقمان : ۱۴ ] ”اس کی ماں نے اسے کمزوری پر کمزوری کی حالت میں اٹھائے رکھا۔“ خصوصاً حمل کے آخری ایام میں تو یہ بوجھ اس کی جان کا روگ بنا ہوتا ہے۔ حقیقت ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی ماں کا حق ادا کرنے کے لیے اسے کمزوری کی حالت میں اٹھا کر لیے پھرے تب بھی وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ کہاں پوری مدتِ حمل مسلسل اپنے شکم میں اٹھائے پھرنا اور کہاں کسی وقت کچھ دیر کے لیے اٹھا لینا۔ پھر ماں ان سب ناگوار کیفیتوں کو آنے والے فرزند کی امید پر خوشی سے برداشت کرتی ہے، جب کہ اولاد اسے بوجھ سمجھ کر یا صرف اللہ کا حکم سمجھ کر اٹھاتی ہے، دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسری قربانی وضع حمل کا نہایت تکلیف دہ مرحلہ ہے جس میں اس کی جان داؤ پر لگی ہوتی ہے، کتنی مائیں اس مرحلے میں جان سے گزر جاتی ہیں، وہ اپنے فرزند کی امید پر اس ناگوار مرحلے کو بھی برداشت کرتی ہے۔ تیسری قربانی دو سال تک اس کی پرورش، اپنے آرام کی قربانی دے کر اس کے لیے ہر آسائش مہیا کرنا اور اپنا خون دودھ کی صورت میں دو سال تک پلاتے جانا ہے۔ ان تین قربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ماں کا حق باپ سے تین گنا زیادہ رکھا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، کہنے لگا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِيْ؟ قَالَ أُمُّكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ثُمَّ أُمُّكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ثُمَّ أُمُّكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ثُمَّ أَبُوْكَ )) [ بخاري، الأدب، باب من أحق الناس بحسن الصحبة : ۵۹۷۱ ] ”یا رسول اللہ! لوگوں میں سے میرے حسنِ صحبت کا زیادہ حق دار کون ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمھاری ماں۔“ اس نے کہا: ”پھر کون؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر تمھاری ماں۔“ اس نے کہا: ”پھر کون؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر تمھاری ماں۔“ اس نے کہا: ”پھر کون؟“ آپ ﷺ نے (چوتھی مرتبہ) فرمایا: ”پھر تمھارا باپ۔“

❹ **وَ حَمۡلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا:** اس آیت کو اور سورۂ لقمان کی آیت (۱۴): ﴿ وَّ فِصٰلُهٗ فِیۡ عَامَیۡنِ ﴾ (اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے) اور سورۂ بقرہ کی آیت (۲۳۳): ﴿ وَ الۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَیۡنِ كَامِلَیۡنِ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ (اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے) ان تینوں آیتوں کو ملانے سے ثابت ہوتا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے، کیونکہ تیس ماہ میں سے دودھ پلانے کی مدت دو سال نکال دی جائے تو باقی چھ ماہ بچتے ہیں۔ ابن کثیر نے سورۂ زخرف کی آیت (۸۱): ﴿ قُلۡ اِنۡ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ٭ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِیۡنَ ﴾ کی تفسیر میں ابن جریر طبری سے نقل فرمایا ہے: (( عَنْ بَعْجَةَ بْنِ زَيْدِ الْجُهَنِيِّ، أَنَّ امْرَأَةً مِّنْهُمْ دَخَلَتْ عَلٰی زَوْجِهَا، وَ هُوَ رَجُلٌ مِّنْهُمْ أَيْضًا، فَوَلَدَتْ لَهُ فِيْ سِتَّةِ أَشْهُرٍ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ زَوْجُهَا

إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَ بَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ

جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو اس نے کہا اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں

لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُرْجَمَ، فَدَخَلَ عَلَيْهِ عَلِيُّ بْنُ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ فِيْ كِتَابِهِ : ﴿ وَحَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ وَ قَالَ : ﴿ وَ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ قَالَ فَوَاللّٰهِ! مَا عَبِدَ عُثْمَانُ أَنْ بَعَثَ إِلَيْهَا تُرَدُّ » [ الطبري : ۲۰/ ۶۵۷، ح : ۳۱۲۷۰ ] ”بعجہ بن یزید جہنی کہتے ہیں کہ ان کے قبیلے کی ایک عورت اپنے خاوند کے پاس آئی، وہ آدمی بھی اسی قبیلے کا تھا، تو اس عورت نے چھ مہینے میں بچے کو جنم دیا۔ اس کے خاوند نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے اس بات کا ذکر کیا تو انھوں نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ اس پر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور کہا: ”اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ (کہ اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے) اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ (اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے)۔“ بعجہ بن یزید کہتے ہیں: ”تو اللہ کی قسم! عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی بات کا کوئی انکار نہیں کیا اور فوراً آدمی بھیجا کہ اسے واپس لایا جائے۔“

ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا، اس کی سند صحیح ہے۔ یہ استدلال نہایت مضبوط ہے، علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کے علاوہ صحابہ کی ایک جماعت نے ان کی موافقت کی ہے۔ (ابن کثیر) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”عورت جب نو (۹) ماہ میں بچہ جنے تو اسے اکیس (۲۱) ماہ دودھ پلانا کافی ہے، جب سات (۷) ماہ میں جنے تو اسے تیئیس (۲۳) ماہ دودھ پلانا کافی ہے اور جب چھ (۶) ماہ میں جنے تو پورے دو سال دودھ پلائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ ”اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔“ [ ابن أبي حاتم : ۱۸۵۶۷۔ ابن کثیر وقال المحقق سندہ حسن ]

5 حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَ بَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ...... : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے والدین کا حق پہچاننے کے اعتبار سے دو قسم کے آدمیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں اس آدمی کا ذکر ہے جو اپنی جوانی کو پہنچتا ہے تو اپنے والدین کا حق پہچانتا ہے اور یہ پہچان اسے اپنے اصل مالک اور مربی کی پہچان اور اس کا شکر ادا کرنے تک پہنچا دیتی ہے۔ ”بَلَغَ أَشُدَّهُ“ کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف (۲۲) کی تفسیر۔ اس سلسلے میں چالیس سال کی عمر کا ذکر بلوغت کی آخری حد کے طور پر فرمایا ہے، کیونکہ اس عمر میں آدمی کی قوتیں اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے بعد انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ہر جوان کو عموماً اور چالیس برس والے آدمی کو خصوصاً خبردار کیا گیا ہے کہ اسے چاہیے کہ اپنی پرورش کرنے والے والدین کا اور اپنے اور اپنے والدین کے اصل مربی اور مالک کا حق پہچانے اور اپنے اور اپنے والدین پر اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے اس سے توفیق مانگتا رہے، کیونکہ اس کی توفیق کے بغیر کوئی نیکی نہیں ہو سکتی اور ساتھ ہی اپنی اولاد کی اصلاح کی دعا بھی کرتا رہے۔ اس طرح والدین کے حقوق کی پہچان اور ان کی ادائیگی اس کے لیے اپنے رب کے حقوق کی پہچان، اس کی توحید پر

اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۵﴾

تیری اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جسے تو پسند کرتا ہے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح فرما دے، بے شک میں نے تیری طرف توبہ کی اور بے شک میں حکم ماننے والوں سے ہوں ﴿۱۵﴾

استقامت، اس کی عبادت میں اخلاص اور اس کی نعمتوں پر شکر کا ذریعہ بن جائے گی، جو انسان کی زندگی کا اصل مقصود ہے۔

⑥ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ: عمل اگرچہ وہی صالح ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور اخلاص کے ساتھ ہو، مگر اخلاصِ نیت اور ریا سے پاک ہونے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اس کا الگ بھی ذکر فرمایا۔ یعنی مجھے ایسے عمل کی توفیق دے جو ظاہر میں درست یعنی تیری کتاب اور تیرے نبی ﷺ کی سنت کے مطابق ہو اور حقیقت میں بھی تیری رضا کے مطابق اور تیری جناب میں قبول ہونے کے لائق ہو، یعنی اخلاصِ نیت پر مبنی اور ریا سے پاک ہو۔

⑦ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ: اس دعا میں دو الفاظ قابلِ غور ہیں، ایک "لِیْ" اور دوسرا "فِیْ"۔ "اَصْلِحْ لِیْ" (میرے لیے اصلاح فرما دے) کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ایسی اصلاح فرما جس کا فائدہ مجھے بھی حاصل ہو۔ "فِیْ ذُرِّیَّتِیْ" یہاں بظاہر "أَصْلِحْ لِيْ ذُرِّيَّتِيْ" (میرے لیے میری اولاد کی اصلاح فرما دے) کافی تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ﴾ [الأنبیاء: ۹۰] "اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی کی اصلاح فرما دی۔" مگر "فِیْ" لانے کا مطلب یہ ہے کہ میری اولاد میں اصلاح کا عمل جاری و ساری فرما دے جو آگے تک چلتا رہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ﴾ [الزخرف: ۲۸] "اور اس نے اس (توحید کی بات) کو اپنے پچھلوں میں باقی رہنے والی بات بنا دیا۔"

⑧ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ: یعنی میں اپنی جوانی کی سرکشی اور جہالت سے اور تیری ہر قسم کی نافرمانی سے باز آیا اور میں تیرے مکمل فرماں برداروں سے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خصوصی اہتمام کے ساتھ چالیس (۴۰) برس کی عمر میں اور اس کے بعد توبہ کی تجدید کرتے رہنا چاہیے۔

⑨ یہ دعا اولاد کی اصلاح کے لیے اکسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی تعلیم دی ہے اور یہ مقبول دعاؤں میں سے ہے، کیونکہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے قبول ہونے کی بشارت دی ہے، فرمایا: ﴿نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ﴾ "ہم ان سے قبول کرتے ہیں۔" جیسا کہ سورۂ فاتحہ ہے اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات والی دعائیں ہیں۔ اس لیے کسی صاحبِ اولاد کو، خصوصاً جو چالیس سال یا اس سے اوپر ہو اسے اس دعا سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ مالک بن مغول نے طلحہ بن مصرف کے پاس اپنے بیٹے کی شکایت کی تو انھوں نے فرمایا: "اس کے لیے اس دعا سے مدد حاصل کرو۔" [قرطبي: ۱۶/۱۹۵]

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَ الَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَ هُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۷﴾

یہی وہ لوگ ہیں کہ ہم ان سے وہ سب سے اچھے عمل قبول کرتے ہیں جو انھوں نے کیے اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں، جنت والوں میں، سچے وعدے کے مطابق جو ان سے وعدہ کیا جاتا تھا(۱۶) اور وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا اُف ہے تم دونوں کے لیے! کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو کہ مجھے (قبر سے) نکالا جائے گا، حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں۔ جب کہ وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے (ہوئے کہتے) ہیں تجھے ہلاکت ہو! ایمان لے آ، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ تو وہ کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کی فرضی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں (۱۷)

**آیت 16** ① أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا ... : آیت کے ضمن میں یہ مفہوم موجود ہے کہ ماں باپ کے ساتھ احسان، ان کے لیے دعا، اللہ تعالیٰ سے شکر اور عمل صالح کی توفیق مانگنا اور اولاد کے لیے اصلاح کی دعا انسان کے سب سے اچھے اعمال میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ یہ عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اس بہترین عمل کو قبول فرمائے گا اور ان کی برائیوں سے درگزر فرمائے گا۔

② فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ : یہ "اُولٰٓئِكَ" سے حال کی جگہ میں ہے: "أَيْ كَائِنِيْنَ فِيْ أَصْحَابِ الْجَنَّةِ" بہترین اعمال کی قبولیت اور گناہوں سے درگزر کے ساتھ یہ تیسرا انعام ہے کہ انھیں اصحاب الجنۃ میں شامل کیا جائے گا جو بہترین ساتھی ہیں۔ کیونکہ ان میں شامل ہونا بجائے خود بہت بڑا اعزاز ہے، جس کی دعا انبیاء علیہم السلام کرتے رہے ہیں، جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ النمل : ۱۹ ] "اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔" یوسف علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ یوسف : ۱۰۱ ] "مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔" اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت کے الفاظ ہیں: (( فِي الرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى )) [ بخاري، المغازي، باب مرض النبي صلی اللہ علیہ وسلم و وفاته : ۴۴۳۶ ] "مجھے بلند ترین ساتھیوں میں شامل فرما۔" [ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ بِفَضْلِكَ وَ رَحْمَتِكَ ]

③ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ : یعنی اس سچے وعدے کے مطابق جو قرآن و حدیث میں والدین سے احسان کرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

**آیت 17** ① وَ الَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ : "اُفٍّ" کا لفظ اکتاہٹ اور تنگ پڑ جانے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْإِنْسِ ۔
إِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

**یہی وہ لوگ ہیں جن پر بات ثابت ہو گئی ان امتوں سمیت جو جن و انس میں سے ان سے پہلے گزر چکیں، یقیناً وہ خسارہ پانے والے تھے ﴿۱۸﴾**

پچھلی آیت میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والی سعادت مند مومن اولاد کا اور ان کے حسن انجام کا ذکر تھا، اس آیت میں ان کے مقابلے میں اس بدبخت اور نافرمان اولاد کا اور ان کے برے انجام کا ذکر ہے جس کے والدین مومن ہیں اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ ان کی اولاد ایمان لے آئے، مگر ان کی اولاد اس دعوت پر شدید اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے انھیں کہتی ہے، تم دونوں کے لیے ''اُف'' ہے، تم نے مجھے تنگ کر دیا۔ مکہ میں ایسے بہت سے خاندان تھے جن میں والدین ایمان لے آئے تھے مگر اولاد مشرک اور قیامت کی منکر تھی، یا اولاد ایمان لے آئی تھی اور والدین مشرک تھے۔

② أَتَعِدَانِنِيْٓ أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ : کیا تم مجھے ڈراتے ہو کہ مجھے دوبارہ قبر سے زندہ کر کے نکالا جائے گا جب میں مٹی اور ہڈیوں کی صورت ہو چکا ہوں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے صدیاں گزر چکیں، آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔ یہاں اس بدبخت کی اس بات کا جواب ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اس کا جواب آ چکا ہے۔

③ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ : اور وہ دونوں اس کی اتنی گستاخانہ اور کفریہ بات کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے فریاد کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں اس کے شر سے بچا اور اسے ہدایت دے۔

④ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ : ''وَيْلَكَ'' کا لفظ اگرچہ بددعا ہے، مگر بعض دفعہ اسے نہایت محبت و شفقت اور دردمندی کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے '' ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ '' (تجھے گم کرنے والیاں گم پائیں)۔ یعنی ماں باپ اسے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں، تیرا ستیاناس ہو، ایمان لے آ اور آخرت کا انکار نہ کر، کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، مگر وہ نہایت نفرت کے ساتھ انھیں جھڑک دیتا ہے۔

⑤ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۳۱)، مومنون (۸۳) اور نمل (۶۸)۔

آیت 18 ① أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ : یعنی والدین کے گستاخ اور آخرت کے منکر ہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بات ثابت ہو چکی، جو اس نے پہلے فرما دی تھی: ﴿لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ﴾ [ ھود: ۱۱۹ ] ''کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا۔'' مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸)۔

② فِيْٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ : یعنی جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں میں شامل ہو کر جو اہلِ جہنم میں سے ان سے پہلے گزرے۔ ان بدترین لوگوں کا ساتھ خود بدترین سزا ہے۔

③ إِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ : ''إِنَّ'' تعلیل کے لیے ہے، یعنی ان کا یہ انجام اس لیے ہوا کہ انھیں جو سرمایۂ حیات دنیا میں

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَ لِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ

اور ہر ایک کے لیے الگ الگ درجے ہیں، ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے کیے اور تاکہ اللہ انھیں ان کے اعمال پورا بدلا دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۱۹﴾ اور جس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، آگ پر پیش کیے جائیں گے

آخرت کی تیاری کے لیے دیا گیا تھا انھوں نے اس سے نفع حاصل کرنے کے بجائے اصل راس المال بھی گنوا دیا اور یہی حقیقی خسارہ ہے جو انھوں نے اٹھایا۔

آیت 19 وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا...... : اس آیت سے پہلے مضمون کی تاکید مقصود ہے، یعنی ہر ایک کو، وہ مومن ہو یا کافر، اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔ یہ نہیں ہو گا کہ بروں پر ایسے گناہ لاد دیے جائیں جو انھوں نے نہ کیے ہوں، یا نیکوں کو ان کی نیکی سے محروم کر دیا جائے۔ واضح رہے یہاں مومن و کافر سب کے لیے "دَرَجٰتٌ" کا لفظ تغلیباً استعمال ہوا ہے، ورنہ تو اصل میں منازلِ جنت کو ''درجات'' اور منازلِ جہنم کو ''درکات'' کہا جاتا ہے، جس طرح منافقوں کے بارے میں "فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" آیا ہے۔ (روح المعانی)

آیت 20 ① وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ : پچھلی آیات سے اس کا ربط دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ والدین سے بدسلوکی کرنے والے قیامت کے منکر کے انجام کے ذکر کے بعد تمام کفار کا انجام بیان فرمایا۔ دوسرا یہ کہ پچھلی آیت میں ذکر ہوا کہ مومن ہوں یا کافر سب کو ان کے اعمال کے مطابق جزا ملے گی اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا، تو اب اس سوال کا جواب دیا کہ کفار دنیا میں جو نیکیاں کرتے رہے ان کا کیا بنے گا؟ کم از کم ان کا بدلا تو ضرور ملنا چاہیے، اگر انھیں ان کی جزا نہ دی گئی تو یہ ظلم ہے۔ فرمایا اس وقت کو یاد کرو جب وہ لوگ جنھوں نے حق قبول کرنے سے انکار کیا، آگ پر پیش کیے جائیں گے۔

② اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا : کفار چونکہ اپنے تکبر اور فسق کی وجہ سے ایمان قبول کرنے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور نہ ہی آخرت ان کا مقصود ہوتی ہے، اس لیے انھیں ان کے نیک اعمال کا بدلا دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ ان میں سے جو اعمال انھوں نے دنیا کے کسی مفاد مثلاً شہرت وغیرہ کے لیے کیے تھے ان کا تو آخرت سے کوئی تعلق ہی نہیں، البتہ جو اعمال انھوں نے اللہ کے لیے کیے ہوتے ہیں ان کا بدلا بھی انھیں یہیں دنیا میں دے دیا جاتا ہے، جو اور کچھ نہ ہو تو اتنا ہی بہت زیادہ ہے کہ ان کے کفر و شرک پر فوری گرفت نہیں ہوتی، بلکہ انھیں مہلت دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ کہ انھیں دنیا کی کئی نعمتیں بھی دی جاتی ہیں۔ (دیکھیے ہود: ۱۵، ۱۶) انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مُؤْمِنًا حَسَنَةً، يُعْطٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا وَيُجْزٰى بِهَا فِي الْآخِرَةِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِحَسَنَاتِ مَا عَمِلَ بِهَا لِلّٰهِ فِي الدُّنْيَا حَتّٰى إِذَا أَفْضٰى إِلَى الْآخِرَةِ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَةٌ يُجْزٰى بِهَا )) [ مسلم، صفات المنافقین، باب جزاء المؤمن بحسناته في الدنيا والآخرة...... :

عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿٢٠﴾ ع ٢

تم اپنی نیکیاں اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور تم ان سے فائدہ اٹھا چکے، سو آج تمھیں ذلت کے عذاب کا بدلا دیا جائے گا، اس لیے کہ تم زمین میں کسی حق کے بغیر تکبر کرتے تھے اور اس لیے کہ تم نافرمانی کیا کرتے تھے ﴿٢٠﴾

۲۸۰۸ ] ''اللہ تعالیٰ کسی مومن کی کسی ایک نیکی میں بھی کمی نہیں کرے گا، اسے اس کے عوض دنیا میں بھی دیا جائے گا اور آخرت میں بھی اس کی جزا دی جائے گی۔ رہا کافر تو اسے ان نیکیوں کے عوض جو اس نے اللہ کے لیے کی ہوتی ہیں دنیا میں کھلایا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی جس کی اسے جزا دی جائے۔''

③ **فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ......** : اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر نیکی کی جزا اور ہر بدی کی سزا اس نیکی یا بدی کی مناسبت سے دی جائے گی، جیسا کہ روزہ داروں کے لیے ''باب الریان'' سے داخلہ ہوگا۔ تو کفار کو ذلیل کرنے والا عذاب اس تکبر کی مناسبت سے ہوگا جو انھوں نے کیا، وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے، ان کی عزت انھیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، لامحالہ انھیں ایسا عذاب دیا جائے گا جو ان کے تکبر کا بدلا ہو۔ قیامت کے بعض مواقع میں ان کی ذلت کا نقشہ اس حدیث میں بیان ہوا جو عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْثَالَ الذَّرِّ فِي صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَيُسَاقُوْنَ إِلٰى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُسَمّٰى بُوْلَسَ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْأَنْيَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ أَهْلِ النَّارِ طِيْنَةِ الْخَبَالِ )) [ ترمذي، صفة القيامة، باب ما جاء في شدة الوعيد للمتكبرين : ۲٤۹۲، قال الألباني حسن ] ''متکبر لوگ قیامت کے دن آدمیوں کی شکل میں چیونٹیوں کی طرح اٹھائے جائیں گے، ہر جگہ سے ذلت انھیں ڈھانپ رہی ہوگی۔ پھر انھیں ہانک کر جہنم کے ایک قید خانے کی طرف لے جایا جائے گا جس کا نام ''بولس'' ہے۔ ان پر آگوں کی آگ چڑھ رہی ہوگی، انھیں جہنمیوں کا نچوڑ پلایا جائے گا، جو تباہ کن کیچڑ ہوگا۔'' رہی یہ بات کہ تکبر کیا ہے؟ تو اس کی تفصیل عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه : ۹۱ ] ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا۔'' ایک آدمی نے کہا: ''آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ تکبر ہے)؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر تو حق کو ٹھکرا دینے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔''

● **تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ** : ''تم زمین میں بڑے بنتے تھے'' اگرچہ بڑائی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حق نہیں خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمانوں میں، مگر زمین کے رہنے والوں کو تو بدرجہ اولیٰ اپنی حیثیت مدنظر رکھنی چاہیے۔ پستی کے مکین کو بلندی کی ہوس کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی، فرمایا: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ

اور عاد کے بھائی کو یاد کر جب اس نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا، جب کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کئی

[ بنی إسرائیل : ۳۷ ] ”اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک تو نہ کبھی زمین کو پھاڑے گا اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچے گا۔“

5 بِغَيْرِ الْحَقِّ : اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ اس کی صراحت اس لیے فرمائی کہ تکبر اللہ کے سوا کسی کا حق ہے ہی نہیں، جو بھی تکبر کرتا ہے ناحق کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ناحق تکبر حرام ہے، جس کا ذکر اوپر گزرا، البتہ جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہوئے کفار کے مقابلے میں تکبر حق ہے اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

6 وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ : استکبار سے مراد ایمان سے انکار اور فسق سے مراد دوسرے گناہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ذلت کے عذاب کے دو سبب ہوں گے، ایک زمین میں ناحق تکبر، یعنی ایمان لانے سے انکار اور دوسرا فسق، یعنی معاصی اور نافرمانیاں اور یہ دونوں کفار کا شیوہ ہیں، مسلمانوں کو اس سے پناہ مانگنی چاہیے۔

7 واضح رہے کہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو دنیا کی نعمتیں کم از کم استعمال کرنی چاہییں، تاکہ اس کی آخرت کی نعمتوں میں کمی نہ ہو اور یہاں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کے زہد اور سادہ زندگی اور دنیا کی لذتوں سے اجتناب کے واقعات لکھے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے بارے میں ہے ہی نہیں، اس کا تعلق کفار سے ہے۔ کفار کے لیے صرف دنیا کی نعمتیں ہیں جبکہ ایمان والوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتیں ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [ الأعراف : ۳۲ ] ”تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟ کہہ دے یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں (بھی) ہیں، جبکہ قیامت کے دن (ان کے لیے) خالص ہوں گی۔“ مومن کو اس کی نیکیوں کا بدلا دنیا اور آخرت دونوں جگہ ملتا ہے، جیسا کہ اس آیت کے فائدہ (۲) میں حدیث گزری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دنیا کی لذتوں سے اجتناب اس آیت کی بنا پر نہ تھا، کیونکہ یہ کفار کے لیے ہے، ان کا اجتناب اس لیے تھا کہ وہ دنیا کی لذتوں میں منہمک ہو کر آخرت سے غافل نہ ہو جائیں اور اس صبر و زہد پر انھیں زیادہ ثواب حاصل ہو۔ (خلاصہ اضواء البیان)

آیت 21 1 وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ : ”اُذْكُرْ“ ”ذِكْر“ سے ہو تو مطلب یہ ہے کہ اپنی قوم کے سامنے ان کا ذکر کرو، تاکہ انھیں نصیحت ہو اور اگر ”ذُكْر“ سے ہو تو مطلب یہ ہے کہ اسے یاد کرو، تاکہ تمھیں اس سے تسلی حاصل ہو۔ دونوں باتیں بیک وقت بھی مراد ہو سکتی ہیں، کیونکہ ”اُذْكُرْ“ دونوں سے فعل امر ہے۔ قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کا حال بیان کرنے کے بعد دنیا میں چند متکبر اقوام کا ذکر فرمایا، جن میں سے عاد کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ اور دوسری اقوام کا حال آیت (۲۷): ﴿ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى ﴾ میں اجمال کے ساتھ بیان فرمایا۔ عاد کے بھائی سے مراد ہود علیہ السلام ہیں، جیسا کہ

خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۲۱﴾

والے گزر چکے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، بے شک میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۲۱﴾

فرمایا: ﴿وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا﴾ [ الأعراف : ٦٥ ] ''اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)۔'' تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۶۵) کی تفسیر۔ ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی اس لیے فرمایا کہ وہ ان کے ایک فرد تھے۔ عاد کا تفصیلی ذکر اس لیے فرمایا کہ عرب اقوام میں سے یہ پہلی قوم ہے جس کے پاس نوح علیہ السلام کی عام رسالت کے بعد کوئی رسول آیا۔ ہود اور صالح علیہما السلام کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ سردارانِ قریش جو اپنی بڑائی کا زعم رکھتے تھے، انھیں قوم عاد کا قصہ سنایا جو ان کی سرزمین کی سب سے طاقتور قوم تھی۔

❷ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ: ''اَلْأَحْقَافُ'' ''حِقْفٌ'' کی جمع ہے، ریت کے بلند اور مستطیل ٹیلے کو ''حِقْفٌ'' کہتے ہیں، جو کچھ ٹیڑھا ہو۔ ''اِحْقَوْقَفَ الشَّيْءُ'' ''جب کوئی چیز ٹیڑھی ہو۔ یہاں ''احقاف'' سے مراد یمن کے مشرق میں حضر موت کا وہ علاقہ ہے جو عرب کے صحرائے اعظم (ربع خالی) کا حصہ ہے۔ ہود علیہ السلام کی قوم وہاں آباد تھی اور اس زمانے میں وہ نہایت زرخیز اور ترقی یافتہ علاقہ تھا، جس میں چشمے، باغات اور مال مویشی کثرت کے ساتھ موجود تھے، جیسا کہ سورۂ شعراء (۱۳۲ تا ۱۳۴) میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے بعد وہ علاقہ ایسا برباد ہوا کہ اب تک وہاں آبادی کا نام و نشان نہیں، ہر طرف ریگستان ہے اور ریت کے لمبے چوڑے ٹیلے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کو ''احقاف'' اس کی موجودہ حالت کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔

تفہیم القرآن میں ہے: ''احقاف کی موجودہ حالت دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی ایک طاقتور قوم آباد ہو گی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہو گا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگزار بنا دیا ہو گا۔ آج اس کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک لق و دق ریگستان ہے، جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا، وہ کہتا ہے کہ حضر موت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑا ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے، اس میں جگہ جگہ ایسے سفید خطے ہیں جن میں اگر کوئی چیز گر جائے تو ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے پر راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے، میں نے دور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ پانچ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا اور اس رسی کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔ مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہو:

Arabia and the Isles By Harold Ingrams, London 1946.
The Unveiling of Arabia. By Reginald Hugh Kiernan, London 1937.
The Empty Quarter By st. john philby. London 1933."

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۲ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۳

انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہمارے معبودوں سے ہٹا دے، سو ہم پر وہ (عذاب) لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو سچوں سے ہے ۝۲۲ اس نے کہا یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تمھیں وہ پیغام پہنچاتا ہوں جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اور لیکن میں تمھیں ایسے لوگ دیکھتا ہوں کہ تم جہالت برتتے ہو ۝۲۳

③ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ ...... : اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہود علیہ السلام سے پہلے بھی کئی ڈرانے والے گزرے اور ان کے بعد بھی اپنی اپنی قوم کو ڈرانے والے کئی پیغمبر گزر چکے، سب کی تعلیم یہی تھی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ڈرانے والوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بشارت ماننے والوں کو دی جاتی ہے۔ اس سورت کی ابتدا بھی اسی بات سے ہوئی ہے، فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ﴾ [ الأحقاف : ۳ ] ''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اس چیز سے جس سے وہ ڈرائے گئے، منہ پھیرنے والے ہیں۔''

④ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ : ''عَظِيْمٍ'' ''يَوْمٍ'' کی صفت ہے۔ اس عظیم دن سے مراد آخرت کا دن بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں آنے والے تباہ کن عذاب کا دن بھی، جو قومِ عاد پر آندھی کی صورت میں آیا۔ یوم (دن) کو ان عظیم واقعات کی وجہ سے عظیم کہا ہے جو اس میں واقع ہوں گے۔

آیت 22 قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ...... : اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۳۲) کی تفسیر۔

آیت 22 ① قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ : ہود علیہ السلام نے ان کے اس گستاخانہ مطالبے پر کسی تلخی کے اظہار کے بجائے انھیں مزید سمجھانے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ فرمایا، عذاب کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کا اختیار بھی وہی رکھتا ہے، وہی جانتا ہے کہ تم پر دنیا میں عذاب آئے گا یا آخرت میں اور یہ بھی وہی جانتا ہے کہ تمھیں کب تک مہلت دی جائے گی۔ میرے پاس نہ اس کا اختیار ہے کہ جب چاہوں تم پر عذاب لے آؤں اور نہ ہی مجھے اس کے وقت کا علم ہے۔

② وَاُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ : میرا کام وہ پیغام تم تک پہنچا دینا ہے جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ﴾ [ الشورٰی : ۴۸ ] ''پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو ہم نے تجھے ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمے پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں۔''

③ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ : ''جہل'' اکھڑ پن کو بھی کہتے ہیں اور لاعلمی کو بھی۔ اگر پہلا معنی ہو تو جہالت برتنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک تم کفر پر اصرار کر رہے ہو، اچھی بات قبول کرنے کے بجائے عذاب مانگ رہے ہو اور دوسرے مجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہو جو میرے اختیار میں نہیں ہے، اور اگر یہ جہل علم کے مقابلے میں ہو تو مطلب یہ ہے کہ تمھیں علم ہی

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ﴿۲۴﴾

تو جب انھوں نے اسے ایک بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کا رخ کیے ہوئے دیکھا تو انھوں نے کہا یہ بادل ہے جو ہم پر مینہ برسانے والا ہے۔ بلکہ یہ وہ (عذاب) ہے جو تم نے جلدی مانگا تھا، آندھی ہے، جس میں دردناک عذاب ہے ﴿۲۴﴾

نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کیا ہوتا ہے اور وہ تمھارے کس قدر قریب آ چکا ہے اور نہ یہ علم ہے کہ رسول پیغام پہنچانے کے لیے آتے ہیں، عذاب لانا ان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

آیت 24 ❶ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا...... : "رَاَوْهُ" کی ضمیر عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا وہ مطالبہ کرتے آتے تھے۔ "عَرَضَ يَعْرِضُ" سامنے آنا۔ "عَارِضٌ" عظیم بادل جو پہاڑوں کی طرح افق پر سامنے آیا ہوا ہو۔ قوم کے ہود علیہ السلام کو جھٹلانے اور ان پر عذاب کے درمیان کا لمبا قصہ مختصر کر کے نتیجہ بیان فرمایا ہے۔ اس آیت میں ان کے الفاظ "هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا" (یہ بادل ہے جو ہم پر مینہ برسانے والا ہے) سے ظاہر ہے کہ اس عذاب سے پہلے مدت تک بارش بند رہی۔ ہود علیہ السلام نے کفر و شرک سے توبہ اور اللہ تعالیٰ سے استغفار پر انھیں بارش کی بشارت بھی دی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ﴾ [ هود : ۵۲ ] "اور اے میری قوم! اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تم پر بادل بھیجے گا، جو خوب برسنے والا ہوگا اور تمھیں تمھاری قوت کے ساتھ اور قوت زیادہ دے گا اور مجرم بنتے ہوئے منہ نہ موڑو۔" اس سے ظاہر ہے کہ انھیں بارش کی شدید ضرورت تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کفر پر جمے رہے اور یہ کہہ کر عذاب لانے کا مطالبہ کرتے رہے کہ اگر سچے ہو تو عذاب لے آؤ، یعنی اگر فوراً عذاب نہیں لاتے تو تم جھوٹے ہو۔ ہود علیہ السلام کا جواب پیچھے گزر چکا ہے۔ آخر عذاب کا وقت آ پہنچا اور اس نے بادل کی صورت میں ان کی وادیوں کی طرف بڑھنا شروع کیا، جب انھوں نے اس عذاب کو بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ یہ بادل ہم پر بارش برسائے گا۔

❷ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ : ممکن ہے کہ انھیں یہ جواب ہود علیہ السلام نے دیا ہو یا صورتِ حال انھیں پکار کر کہہ رہی ہو۔

❸ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ : "رِيْحٌ" میں تنوین تہویل کے لیے ہے، بلکہ یہ وہ ہے جسے تم نے جلدی طلب کیا ہے، یہ خوفناک آندھی ہے جس میں عذابِ الیم ہے۔ اس کی کیفیت سورۂ قمر (۱۹، ۲۰) اور سورۂ حاقہ (۶ تا ۸) میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ قومِ عاد آندھی والے بادلوں کو بارش برسانے والے سمجھتے رہے، حالانکہ وہ ان پر آنے والا عذاب تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بادل اٹھتے یا ہوا تیز چلتی تو پریشان ہو جاتے تھے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (( مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ضَاحِكًا حَتّٰى أَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهِ، إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ، قَالَتْ وَكَانَ إِذَا رَأٰى غَيْمًا أَوْ رِيْحًا عُرِفَ فِيْ وَجْهِهِ، قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الْغَيْمَ فَرِحُوْا، رَجَاءَ أَنْ يَكُوْنَ فِيْهِ الْمَطَرُ، وَ أَرَاكَ

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

جو ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی، پس وہ اس طرح ہو گئے کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی، اسی طرح ہم مجرم لوگوں کو بدلا دیتے ہیں ﴿۲۵﴾

إِذَا رَأَيْتَهُ عُرِفَ فِيْ وَجْهِكَ الْكَرَاهِيَةُ، فَقَالَ يَا عَائِشَةُ! مَا يُؤْمِنِّيْ أَنْ يَكُوْنَ فِيْهِ عَذَابٌ، عُذِّبَ قَوْمٌ بِالرِّيْحِ، وَقَدْ رَأَى قَوْمٌ الْعَذَابَ فَقَالُوْا : ﴿ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ﴾ » [ بخاري، التفسير، تفسير سورة الأحقاف : ۴۸۲۸، ۴۸۲۹ ] ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ مجھے آپ کا تالو میں لٹکا ہوا گوشت کا ٹکڑا نظر آ جائے، آپ صرف مسکراتے تھے۔“ فرماتی ہیں: ”اور آپ ﷺ جب بادل یا ہوا دیکھتے تو وہ آپ کے چہرے میں پہچانی جاتی۔“ انھوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! لوگ جب بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں، اس امید پر کہ اس میں بارش ہو گی اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ آپ جب اسے دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے میں ناگواری پہچانی جاتی ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے عائشہ! مجھے اس سے کیا چیز بے خوف کرتی ہے کہ اس میں کوئی عذاب ہو؟ ایک قوم کو آندھی کے ساتھ عذاب دیا گیا اور ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہنے لگے: ”یہ بادل ہم پر بارش برسانے والا ہے۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی بیان کرتی ہیں: « كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ يَوْمُ الرِّيْحِ وَالْغَيْمِ عُرِفَ ذٰلِكَ فِيْ وَجْهِهِ وَأَقْبَلَ وَأَدْبَرَ، فَإِذَا مَطَرَتْ سُرَّ بِهِ وَذَهَبَ عَنْهُ ذٰلِكَ، قَالَتْ عَائِشَةُ فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ يَكُوْنَ عَذَابًا سُلِّطَ عَلٰى أُمَّتِيْ، وَيَقُوْلُ إِذَا رَأَى الْمَطَرَ، رَحْمَةٌ » [ مسلم، صلاة الاستسقاء، باب التعوذ عند رؤية الريح .... : ۸۹۹ ] ”جب ہوا اور بادل والا دن ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے چہرے میں پہچانا جاتا اور آپ (بے چینی کے عالم میں) کبھی اندر آتے کبھی باہر جاتے، جب بارش برسنے لگتی تو خوش ہو جاتے اور آپ کی وہ کیفیت ختم ہو جاتی۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، میں نے آپ سے اس بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں ڈرتا ہوں کہیں وہ عذاب نہ ہو جو میری امت پر مسلط کیا گیا ہو۔“ اور جب آپ ﷺ بارش کو دیکھتے تو کہتے: ”(یا اللہ! اسے) رحمت (بنا)۔“

**آیت 25** ① **تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا:** یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی“ حالانکہ کئی چیزیں اس کے بعد بھی موجود رہیں، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ ہود (۵۸) میں فرمایا ہے کہ ہود علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے اس عذاب سے محفوظ رہے۔ اہلِ علم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ لفظ ”كُلٌّ“ سے کائنات کی ہر چیز مراد نہیں ہوتی، بلکہ ہر مقام پر اس کی مناسبت سے کل چیزیں مراد ہوتی ہیں، جیسا کہ ہد ہد نے ملکہ سبا کے متعلق کہا تھا: ﴿ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [ النمل : ۲۳ ] ”اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔“ ظاہر ہے اس

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۫ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۲٦

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں ان چیزوں میں قدرت دی جن میں ہم نے تمھیں قدرت نہیں دی اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انھیں اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۝۲٦

سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کی حکومت کے لیے ضرورت ہوتی ہے، ورنہ ہر چیز میں سے تو اسے حصہ نہیں دیا گیا تھا۔ اسی طرح یہاں ہر چیز کو برباد کرنے سے مراد ہر اس چیز کو برباد کرنا ہے جسے برباد کرنے کا اسے حکم دیا گیا تھا، جیسا کہ "بِاَمْرِ رَبِّهَا" (اپنے رب کے حکم کے ساتھ) کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ چنانچہ ہود علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو اس آندھی نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا، کیونکہ اسے یہی حکم تھا، جیسا کہ سورۂ ہود (۵۸) میں ہے۔

❷ فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ …… : "فَاَصْبَحُوْا" سے مراد یہاں ''انھوں نے صبح کی'' نہیں، بلکہ یہاں "اَصْبَحَ" "صَارَ" کے معنی میں ہے، یعنی ''وہ اس طرح ہو گئے'' کیونکہ وہ ہوا صرف ایک رات نہیں چلی کہ صبح ان کی یہ حالت ہوئی ہو، بلکہ سات راتیں اور آٹھ دن چلتی رہی اور ایسی تند و تیز اور غضب ناک ہو کر چلی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ﴾ [ الذاريات : ٤٢ ] ''جو کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی جس پر سے گزرتی مگر اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح کر دیتی تھی۔'' درخت، آدمی، جانور، مکان، غرض ہر چیز ہوا نے اکھاڑ پھینکی۔ آخر مکانوں کے کھنڈروں یا گری ہوئی کھوکھلی کھجوروں کے تنوں جیسے لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، جو نشانِ عبرت بنے ہوئے تھے کہ اللہ کے مجرموں کا یہ حال ہوتا ہے۔ مراد کفار مکہ کو سمجھانا ہے کہ کفر پر اصرار کے نتیجے میں تمھارا بھی یہ حال ہو سکتا ہے۔

آیت 26 ❶ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ : "مَكَّنَ يُمَكِّنُ تَمْكِيْنًا" کسی چیز پر قدرت دینا۔ "اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ" میں "اِنْ" شرطیہ نہیں بلکہ نافیہ ہے، یعنی ''اگر'' کے بجائے ''نہیں'' کے معنی میں ہے۔ قریش مکہ کو یہ بات کہی جا رہی ہے کہ جسمانی ڈیل ڈول، مال، اولاد، قوت، سلطنت، غرض وہ دنیوی اسباب جن پر ہم نے قومِ عاد کو قدرت عطا کی تھی تمھیں ان پر قدرت عطا نہیں کی، جب اللہ کے عذاب کے سامنے ان کی تمام تر قوت و شوکت تنکوں کی طرح اڑ گئی تو تمھاری کیا بساط ہے؟ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر فرمائی ہے، دیکھیے سورۂ روم (۹) اور سورۂ مومن (۲۱)۔

❷ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً …… : دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا: ﴿وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ﴾ [ العنکبوت : ۳۸ ] ''حالانکہ وہ بہت سمجھ دار تھے۔'' یعنی ہم نے انھیں سننے کے لیے کان، دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سوچ بچار کے لیے دل دیے تھے، مگر انھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو سننے، اس کی نشانیوں کو عبرت کے لیے دیکھنے اور آخرت کی زندگی کے متعلق غور و

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھارے اردگرد کی بستیوں کو ہلاک کر دیا اور ہم نے پھیر پھیر کر آیات بیان کیں، شاید وہ لوٹ آئیں ﴿۲۷﴾ پھر ان لوگوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں انھوں نے قرب حاصل کرنے کے لیے اللہ کے سوا معبود بنایا؟ بلکہ وہ ان سے گم ہو گئے اور یہ ان کا جھوٹ تھا اور جو وہ بہتان باندھتے تھے ﴿۲۸﴾**

فکر کے بجائے ان سے اتنا ہی کام لیا جو دنیا کے مال و متاع کے حصول کے لیے مفید ہو۔ دنیا کے کام میں عقل مند تھے، لیکن وہ عقل نہ آئی جس سے آخرت درست ہو، آیاتِ الٰہی سنتے وقت ان کے کان بہرے ہو جاتے تھے اور آیاتِ الٰہی دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں بند ہی رہتی تھیں۔ پھر جب ان پر اللہ کا عذاب آیا تو ان کی عقل مندی ان کے کسی کام نہ آ سکی، کیونکہ وہ اللہ کی آیات تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا کرتے تھے۔

③ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ : یعنی وہ عذاب جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو وہ کب آ رہا ہے، اسی عذاب نے انھیں گھیر لیا اور ایسا گھیرا کہ پھر اس سے نکل نہ سکے۔

**آیت 27** ① وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى : انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم اپنے اردگرد کی بستیوں پر نظر ڈالو اور دیکھو کس قدر قومیں نیست و نابود کر دی گئیں اور کس طرح انھوں نے اپنے کرتوتوں کے بدلے پائے ہیں۔ اردگرد سے مراد احقاف ہے جو یمن کے حضر موت کے علاقے میں ہے، وہاں کے بسنے والے عادیوں کے انجام پر نظر ڈالو۔ تمھارے اور شام کے درمیان مقامِ حجر میں ثمود کا جو حشر ہوا اسے دیکھو، یمن کی قوم سبا کے انجام پر غور کرو، مدین جو تمھارے اور غزہ کے درمیان ہے، تم وہاں آتے جاتے رہتے ہو اور قومِ لوط کی بستیاں بھی تمھارے راستے میں پڑتی ہیں، ان سب کے واقعات عرب میں مشہور و معروف تھے۔ (ابن کثیر)

② وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ : اس کی تفسیر دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ ہم نے ان بستیوں کے رہنے والوں کے لیے آیات کو پھیر پھیر کر اور کئی طرح سے کھول کر بیان کیا، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کفارِ مکہ کے متعلق فرما رہے ہیں کہ ہم نے ان کے لیے آیات کو پھیر پھیر کر بیان کیا، تاکہ وہ کفر و شرک سے پلٹ آئیں۔ اس صورت میں کلام میں التفات ہے کہ پچھلے جملے "وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى" میں کفارِ مکہ کو مخاطب فرمایا، پھر "وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ" میں ناراضی کے اظہار کے لیے ان کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ فرمایا۔

**آیت 28** ① فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا ...... : "قُرْبَانًا" حال ہے یا مفعول لہ ہے، ترجمہ مفعول لہ کے مطابق کیا

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝۲۹

**اور جب ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تیری طرف پھیرا، جو قرآن غور سے سنتے تھے تو جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پورا کیا گیا تو اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر واپس لوٹے ۝۲۹**

گیا ہے۔ اہل مکہ اور ان کے اردگرد کی قوموں کا سب سے بڑا اور مشترکہ جرم یہ تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کئی ایسے الٰہ بنا رکھے تھے جن کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ وہ مصیبت کے وقت ان کے کام آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں، اس کے پاس ان کی فریادیں پہنچاتے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ سورۂ زمر میں گزر چکا ہے کہ مشرکینِ مکہ بھی اپنے پیش رو لوگوں کی طرح کہا کرتے تھے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [ الزمر : ۳ ] ''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔'' اور سورۂ یونس میں ہے: ﴿هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [ یونس : ۱۸ ] ''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔'' پھر چاہیے تو یہ تھا کہ جب اس جرم کی پاداش میں ان پر عذاب آیا تو وہ ان کی مدد کو پہنچتے، مگر کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر ان کے ان داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں ان لوگوں نے قرب حاصل کرنے کے لیے اللہ کے سوا معبود بنایا ہوا تھا؟

② **بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ** : یعنی جب وہ وقت آیا جس کے لیے ان کی پوجا کی جاتی تھی اور ان کے سامنے نذرانے پیش کیے جاتے تھے، تو وہ معبود یوں غائب ہو گئے کہ کہیں ان کا سراغ نہ ملا۔

③ **وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ** : معلوم ہوا کہ ان کی وہ باتیں جو انھوں نے اپنے معبودوں کی دھاک بٹھانے کے لیے گھڑ رکھی تھیں سب جھوٹ تھیں اور وہ سراسر بہتان تھیں جو وہ باندھتے رہتے تھے۔

**آیت 29** ① **وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ ......** : ''اِذْ'' سے پہلے ''اُذْكُرْ'' محذوف ہے جس کا عطف اس سے پہلے مذکور آیت ''وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ'' پر ہے۔ یعنی کفارِ مکہ کے لیے ہود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کا ذکر کیجیے جو ان سے کہیں زیادہ قوت و شوکت والے تھے کہ اپنے رسول کو جھٹلانے پر ان کا کیا حال ہوا، اسی طرح اہلِ مکہ کے اردگرد کی بستیوں کے کفر پر اصرار کا انجام کیا ہوا، تاکہ اہلِ مکہ کو ان کے انجام سے عبرت ہو اور وہ کفر و شرک سے باز آ جائیں۔ ''وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ'' اور ان کفار کے لیے اس وقت کا ذکر کیجیے جب ہم نے جنوں کے ایک گروہ کا رخ آپ کی طرف پھیرا اور انھوں نے آپ سے قرآن سنا۔ مقصد کفارِ مکہ کو شرم دلانا ہے کہ اپنی جنس انسان، اپنی نسل عرب، اپنی قوم قریش اور اپنے شہر مکہ میں مبعوث رسول کی زبان سے ان پر نازل شدہ قرآن جیسی فصیح و بلیغ اور معجز کتاب مدت سے سننے کے باوجود نہ تم پر قرآن کا کچھ اثر ہوا، نہ تم رسول پر ایمان لائے اور نہ شرک کی نجاست سے پاک ہو سکے، ذرا جنوں کے اس گروہ کو بھی دیکھو جو اچانک اس موقع پر پہنچا جب رسول اللہ ﷺ قرآن پڑھ رہے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کی جنس یا قوم کے فرد نہیں تھے

قَالُوْا يٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾

انھوں نے کہا اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے، وہ حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے ﴿۳۰﴾

بلکہ ایک الگ جنس سے تھے، شہر بھی ان کا کوئی اور تھا، راستے میں انھیں قرآن سننے کا اتفاق ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو علم بھی نہ تھا کہ جنوں کا کوئی گروہ میرا قرآن سن رہا ہے، اس کے باوجود ان کے طرزِ عمل اور اپنے طرزِ عمل کا موازنہ کرلو۔

② فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا: جب وہ اس موقع پر حاضر ہوئے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ خاموش ہو جاؤ، تاکہ ہم غور سے قرآن سن سکیں۔ ان جنوں کو دیکھو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے خود ہی اس حکم پر عمل کر رہے ہیں جو سورۂ اعراف میں ہے: ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ [ الأعراف : ۲۰۴ ] ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اور اپنے آپ کو دیکھو، تمھاری روش وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حم السجدہ میں فرمایا ہے: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ۲۶ ] ''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔'' وہ ایک دوسرے کو خاموش رہ کر سننے کی تلقین کر رہے ہیں اور تم ایک دوسرے کو سننے سے روک رہے ہو۔ کم از کم سن تو لو، تاکہ ان کی طرح رحم کا دروازہ تمھارے لیے بھی کھل سکے، صرف تکبر اور غلبے کی ہوس میں نہ پڑے رہو، ایسا نہ ہو کہ یہ ہوس قومِ عاد کی طرح تمھیں بھی برباد کر دے۔

③ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ: جب قرآن کی قراءت پوری ہو چکی تو وہ نہ صرف یہ کہ خود ایمان لے آئے بلکہ اپنی قوم کو بھی کفر کے انجام سے خبردار کرنے کے لیے ان کی طرف واپس پلٹ گئے، کیونکہ ایمان کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے چند نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی: « وَ أَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ، تَكُنْ مُؤْمِنًا » [ ابن ماجه، الزهد، باب الورع والتقوى : ۴۲۱۷ ] ''لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، مومن بن جاؤ گے۔''

④ طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ''وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ '' کے بارے میں فرمایا: ''یہ اہلِ نصیبین میں سے سات (مرد جن) تھے، رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنی قوم کی طرف پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا۔'' [ الطبري : ۳۱۵۷۴ ] ابن کثیر کے محقق نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

⑤ جنوں کا یہ گروہ کس موقع پر آیا؟ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ جن کی شانِ نزول اور اس کی ابتدائی آیات کی تفسیر۔

آیت 30 ① قَالُوْا يٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى: جنوں نے نازل کردہ کتابوں میں سے آخری

يٰقَوْمَنَاۤ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾

**اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمھیں تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور تمھیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا ﴿۳۱﴾**

کتاب انجیل کا نام لینے کے بجائے تورات کا نام لیا۔ بعض مفسرین کے مطابق اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ یہود کے دین پر تھے، یا انھیں انجیل کے نزول کا علم نہیں تھا، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن سے پہلے آخری کتاب جو شریعت کے احکام پر مشتمل تھی وہ تورات تھی۔ داؤد علیہ السلام کی زبور اور عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اس کی تکمیل یا تفسیر و تبیین کرنے والی کتابیں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء حتیٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی تورات ہی پر عمل کے پابند تھے۔ (دیکھیے مائدہ: ۴۴) اسی سورۂ احقاف میں بھی قرآن سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا ذکر ہے، فرمایا: ﴿ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ﴾ [ الأحقاف : ۱۲ ] ''اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی۔'' رسول اللہ ﷺ پر غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول پر جب ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں تو انھوں نے آپ ﷺ سے سارا معاملہ سن کر کہا تھا: (( هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلٰی مُوْسٰی )) [ بخاري، التعبیر، باب أول ما بدئ به رسول الله ﷺ …… : ۶۹۸۲ ] ''یہ وہی صاحبِ راز فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا۔'' حالانکہ ورقہ بن نوفل اس سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کا دین قبول کر چکے تھے اور انجیل کے عالم تھے۔

② **مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ**: یعنی یہ کتاب اس سے پہلی تمام آسمانی کتابوں کو سچا ثابت کرنے والی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے وہ تمام باتیں اور پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں جو ان کتابوں میں کی گئی ہیں، جن میں نبی کریم ﷺ کی آمد کی پیش گوئی بھی شامل ہے۔

③ **يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ** : ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یعنی عقائد و اخبار میں حق اور اعمال میں سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتی ہے، کیونکہ قرآن خبر اور طلب دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اس کی خبر صدق اور طلب عدل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ﴾ [ الأنعام : ۱۱۵ ] ''اور تیرے رب کی کتاب صدق اور عدل کے اعتبار سے پوری ہوگئی۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ ﴾ [ التوبة : ۳۳ ] ''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔'' چنانچہ ہدایت علم نافع ہے اور دین حق عمل صالح ہے اور جنوں نے بھی یہی بات کہی کہ "يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ" (اعتقادات میں حق کی راہنمائی کرتی ہے) "وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (اور عملیات میں سیدھے راستے کی)۔''

**آیت 31** ① **يٰقَوْمَنَاۤ** …… : "يٰقَوْمَنَاۤ" کے ساتھ دوبارہ مخاطب کرنے کا مقصد اس بات کے اہم ہونے کی طرف متوجہ کرنا ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ جس طرح خطیب کسی اہم بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اثنائے کلام میں "أَيُّهَا النَّاسُ" کہتا ہے۔ (ابن عاشور)

وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾

**اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول نہ کرے گا تو نہ وہ زمین میں کسی طرح عاجز کرنے والا ہے اور نہ ہی اس کے سوا اس کے کوئی مددگار ہوں گے، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں ﴿۳۲﴾**

② اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ: "دَاعِيَ اللّٰهِ" سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت اپنی ذات یا کسی بھی مخلوق کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اسی کی اطاعت کی طرف تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [ یوسف : ۱۰۸ ] "کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں۔" یہاں ایک سوال ہے کہ جنوں نے نبی ﷺ کی صبح کی نماز کے دوران قرآن مجید کی جو تلاوت سنی آپ نے اس میں کون سی آیات پڑھیں، جن میں وہ باتیں موجود تھیں جن کی تلقین جنوں نے اپنی قوم کو کی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگر ہمیں اور کوئی آیات معلوم نہ ہو سکیں تو سورۂ فاتحہ کی قراءت تو یقینی ہے جو قرآن مجید کے تمام مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

③ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ : "يَغْفِرْ" اور "يُجِرْ" "اَجِيْبُوْا" اور "اٰمِنُوْا" (فعل امر) کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ "يُجِرْ" اصل میں "يُجِيْرُ" ہے، جو باب افعال کا مضارع معلوم ہے۔ راء پر جزم آنے کی وجہ سے یاء اور راء دو ساکن جمع ہونے پر یاء کو حذف کر دیا گیا تو "يُجِرْ" ہو گیا۔

④ "يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ" میں "مِنْ" لانے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کے لیے دیکھیے سورۂ نوح (۴) کی تفسیر۔

⑤ اللہ کے داعی کی دعوت قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے پر دو بشارتیں دیں، ایک اس فائدے کے حصول کی بشارت جو تمھیں ایمان لانے سے حاصل ہو گا کہ وہ تمھارے گناہ بخش دے گا اور دوسری ناقابلِ تلافی نقصان سے بچنے کی بشارت کہ وہ تمھیں عذابِ الیم سے پناہ دے گا۔

**آیت 32** ① وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ...... : بشارت کے بعد یہ نذارت ہے، جس میں اس کتاب پر ایمان نہ لانے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ جن میں ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے: ﴿وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا﴾ [ الجن : ۱۲ ] "اور یہ کہ ہم نے یقین کر لیا کہ بے شک ہم کبھی اللہ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی بھاگ کر کبھی اسے عاجز کر سکیں گے۔"

② وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ : یعنی اللہ تعالیٰ کی دعوت قبول نہ کرنے والا نہ خود دنیا یا آخرت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بھاگ کر کہیں جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی طرح کے مددگار اس کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۳۳

اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے نہیں تھکا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ کیوں نہیں! یقیناً وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ۳۳

آیت 33 ❶ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ ...... : "اَوَلَمْ يَرَوْا" سے مراد "أَوَ لَمْ يَعْلَمُوْا" ہے، یعنی "کیا انھیں معلوم نہیں؟" کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کو پیدا کرتے ہوئے دیکھا نہیں تھا، بلکہ یہ بات وہ جانتے تھے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ یہ بات ان کے ہاں مسلّم تھی کہ آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ قیامت کا ذکر بھی یہ کہہ کر فرمایا: ﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ﴾ [ الأحقاف : ۳ ] "ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان دونوں کے درمیان ہے حق اور مقررہ میعاد ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اس چیز سے جس سے وہ ڈرائے گئے، منہ پھیرنے والے ہیں۔" سورت کے درمیان میں بھی یہ مضمون ذکر فرمایا: ﴿وَ الَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِيْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَ هُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [ الأحقاف : ۱۷ ] "اور وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا اف ہے تم دونوں کے لیے! کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو کہ مجھے (قبر سے) نکالا جائے گا، حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں۔ جب کہ وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے (ہوئے کہتے) ہیں تجھے ہلاکت ہو! ایمان لے آ، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ تو وہ کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کی فرضی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں۔" توحید کے ساتھ رسالت کے دلائل، منکرین پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے نزول اور جنوں کے ایمان لانے کے ذکر کے بعد آخر میں پھر قیامت کے حق ہونے کا اور اس کی ایک زبردست دلیل کا ذکر فرمایا۔ یعنی یہ کفار جو انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کو محال سمجھ رہے ہیں، کیا انھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمان و زمین پیدا فرمائے وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی پیدائش کو انسان کے دوبارہ پیدا کرنے کی دلیل کے طور پر متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۫ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۪ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ۪ وَ الْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۙ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ﴾ [ النازعات : ۲۷ تا ۳۳ ] "کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا۔ اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا۔ اور زمین، اس کے بعد اسے بچھا دیا۔ اس سے اس کا پانی اور اس کا چارا نکالا۔ اور پہاڑ، اس نے انھیں گاڑ دیا۔ تمھاری اور تمھارے چوپاؤں کی زندگی کے سامان کے لیے۔" اور فرمایا: ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [ المؤمن : ۵۷ ] "یقیناً

وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور جس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، آگ پر پیش کیے جائیں گے، کیا یہ حق نہیں ہے؟ کہیں گے کیوں نہیں، ہمارے رب کی قسم! وہ کہے گا پھر چکھو عذاب اس کے بدلے جو تم کفر کیا کرتے تھے ﴿۳۴﴾

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

❷ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ : یہود و نصاریٰ کی الہامی کتاب تورات کی دوسری کتاب "خروج" میں مذکور ہے: "چھ دن میں خداوند نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا اور تازہ دم ہوا۔" [ خروج، باب : ۳۱، فقرہ ۱۷ ] تازہ دم وہ ہوتا ہے جو تھکے اور تھکنا نقصانِ قدرت پر مبنی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ میں کسی قسم کا نقصان نہیں، اس لیے تورات کی اس عبارت کی اصلاح اور یہودیوں عیسائیوں کے عقیدے کی غلطی کا اظہار کرنے کو قرآن مجید کی اس آیت میں فرمایا: ﴿ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ ﴾ اللہ آسمان و زمین کو پیدا کر کے تھکا نہیں، یہ تمھارا خیال غلط ہے۔ (تفسیر ثنائی) دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ٭ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ [ قٓ : ۳۸ ] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے نہیں چھوا۔"

❸ "بِقٰدِرٍ" میں "باء" لانے کی توجیہ ابن ہشام نے بہت عمدہ فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں: "بعض اوقات کسی چیز کو اس کے معنی یا لفظ میں یا دونوں میں مشابہ چیز کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ پہلی کی کئی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے فرمان " اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ " میں "اَنَّ" کی خبر "قادرٌ" پر باء کا داخل ہونا ہے، کیونکہ یہ " أَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِقَادِرٍ " کے معنی میں ہے۔ یہ "باء" اس لیے آئی ہے کہ "اَنَّ" کے اسم اور خبر میں بہت فاصلہ ہے۔ اسی لیے دوسری آیت : ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ﴾ [ بني إسرائيل : ۹۹ ] میں "قَادِرٌ" پر باء نہیں آئی۔ اسی کی ایک مثال " كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا " ہے، کیونکہ اس میں " اِكْتَفِ بِاللّٰهِ شَهِيْدًا " کا معنی پایا جا رہا ہے۔" (اعراب القرآن از درویش)

" اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ ... " کے جواب میں " بَلٰى " آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ " أَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِقَادِرٍ " کے معنی میں ہے، کیونکہ " بَلٰى " سابقہ نفی کی تردید کے لیے لایا جاتا ہے، جب کہ " نَعَمْ " پہلی نفی کی تاکید کے لیے لایا جاتا ہے۔

**آیت 34** ❶ وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ...... : قیامت کے حق ہونے کو دلیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد اس دن کا ایک منظر پیش فرمایا، یعنی وہ دن یاد کرو جب ان لوگوں کو جو قیامت اور جہنم کا انکار کرتے تھے آگ پر پیش کیا جائے گا (اور کہا جائے گا) کیا یہ حق نہیں؟ سوال کا مقصد پوچھنا نہیں ہوگا بلکہ انھیں ذلیل کرنا اور وہ دنیا میں جہنم اور قیامت کا جو مذاق اڑاتے رہے اس کے بدلے میں ان کا مذاق اڑانا ہوگا۔ جہنم کے عذاب کے ساتھ ملامت، ڈانٹ ڈپٹ اور طنز و تہکم کا

**فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا**

**پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کر، جس دن وہ اس چیز**

---

یہ عذاب بجائے خود بہت بڑی سزا ہوگی، دوسری جگہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۞ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۞ اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [ الطور : ۱۳ تا ۱۵ ] ''جس دن انھیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا، سخت دھکیلا جانا۔ یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے۔ تو کیا یہ جادو ہے، یا تم نہیں دیکھ رہے؟''

② **قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا** : دنیا میں جس جہنم کا انکار کرتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے اب اس کا اقرار ہی نہیں کریں گے بلکہ اس کے حق ہونے پر قسم کھائیں گے، کیونکہ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔

③ **فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ** : مگر اس وقت کا اقرار و اعتراف انھیں کچھ فائدہ نہیں دے گا، بلکہ ان سے کہا جائے گا کہ اگر یہ حق ہے تو پھر اس حق کو نہ ماننے کی وجہ سے اس کی سزا کا مزہ چکھو۔

**آیت 35** ① **فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ** : توحید و رسالت اور قیامت کو دلائل سے ثابت کرنے اور کفار کے شہادت کا جواب دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو صبر و استقامت کی نصیحت فرمائی، کیونکہ آپ کو دعوت الی اللہ کے جواب میں کفار کی بدزبانی، استہزا اور اذیت رسانی سے شدید قلق اور سخت تکلیف ہوتی تھی، اس لیے فرمایا کہ اے نبی! جس طرح پختہ ارادے اور مضبوط عزم و ہمت والے رسولوں نے صبر کیا، آپ بھی صبر کریں۔ رہی یہ بات کہ ان اولو العزم رسولوں سے مراد کون ہیں؟ تو عموماً پانچ رسولوں کو اولو العزم کہا جاتا ہے جن میں نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے ساتھ پانچویں خود رسول اللہ ﷺ ہیں، کیونکہ ان کا اکٹھا ذکر قرآن مجید میں دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورۂ احزاب میں ہے، فرمایا: ﴿ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۪ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴾ [ الأحزاب : ۷ ] ''اور جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا پختہ عہد لیا اور تجھ سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا۔'' اور دوسری آیت سورۂ شوریٰ کی ہے، فرمایا: ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ [ الشوریٰ : ۱۳ ] ''اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ ہو جاؤ۔'' مگر ان آیات میں نہ ان پیغمبروں کے اولو العزم ہونے کا ذکر ہے اور نہ دوسرے پیغمبروں کے اولو العزم نہ ہونے کا، اس لیے اسے عام رکھا جائے اور ''مِنْ'' کو بیانیہ قرار دیا جائے تو بہتر ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس طرح صبر کر جس طرح پختہ ارادے والوں نے کیا، جو رسول تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ﴾ [ الحج : ۳۰ ] ''پس گندگی سے بچو، جو بت ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ آپ سے پہلے پیغمبر اپنی قوم کی بے رخی، مخالفت اور ایذا رسانیوں کا جس طرح عزم و ہمت اور صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے اسی طرح آپ بھی کریں۔

يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ۠ ﴿۳۵﴾

کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو گویا وہ دن کی ایک گھڑی کے سوا نہیں رہے۔ یہ پہنچا دینا ہے، پھر کیا نافرمان لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک کیا جائے گا؟ ﴿۳۵﴾

بعض مفسرین نے فرمایا کہ اولوا العزم سے تمام رسول مراد لینا درست نہیں، کیونکہ بعض رسولوں کے متعلق عزم کی نفی آئی ہے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴾ [ طٰہٰ : ۱۱۵ ] ''پھر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادے کی کچھ پختگی نہ پائی۔'' اور یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ [ القلم : ۴۸ ] ''اور تو مچھلی والے کی طرح نہ ہو۔'' اس لیے اولوا العزم سے اونچے درجے کے صاحبِ عزم رسول مراد ہیں، اگرچہ ان کی تعیین مشکل ہے۔ مگر ان مفسرین کی یہ بات اس لیے درست نہیں کہ اگرچہ آدم علیہ السلام سے یہ فعل سرزد ہو گیا مگر بعد میں ان کا درجہ پہلے سے بھی اونچا ہو گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۱۲۲ ] ''پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، تو اس پر مہربانی فرمائی اور ہدایت دی۔'' اور یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [ القلم : ۵۰ ] ''پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، پس اسے نیکوں میں شامل کر دیا۔'' اس لیے توبہ کے بعد ان دونوں پیغمبروں کے بھی اولوا العزم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

② وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ : صبر کے حکم کے ساتھ ہی جلد بازی سے منع فرمایا، یعنی ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کریں کہ یہ لوگ جلدی ایمان کیوں نہیں لاتے، یا ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان پر جلدی عذاب کیوں نہیں آ جاتا۔

③ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ...... : یعنی جب وہ اللہ کا عذاب دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو انھیں ایسا معلوم ہو گا کہ وہ دنیا میں ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے، کیونکہ عذاب کی شدت انھیں سال و ماہ کی وہ مدت فراموش کروا دے گی جو انھوں نے دنیا میں بسر کی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ○ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ○ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [ المؤمنون : ۱۱۲ تا ۱۱۴ ] ''فرمائے گا تم زمین میں سالوں کی گنتی میں کتنی مدت رہے؟ وہ کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے، سو شمار کرنے والوں سے پوچھ لے۔ فرمائے گا تم نہیں رہے مگر تھوڑا ہی، کاش کہ واقعی تم جانتے ہوتے۔'' کبھی انھیں وہ مدت ایک پہر معلوم ہو گی (دیکھیے نازعات : ۴۶) اور کبھی وہ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ وہ دنیا میں صرف ایک گھڑی رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ روم (۵۵)۔

④ بَلٰغٌ : یہ ''هٰذَا'' کی خبر ہے، یعنی یہ قرآن تو پیغام کا پہنچا دینا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ ﴾ [ إبراھیم : ۵۲ ] ''یہ لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے اور تاکہ انھیں اس کے ساتھ ڈرایا جائے۔''

⑤ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ : یعنی قرآن کے پہنچ جانے کے بعد حجت تمام ہو گئی، اب بھی اگر کوئی فسق اور نافرمانی میں پڑا رہتا ہے تو وہ اپنی شامت کو خود دعوت دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جاتا، وہاں وہی لوگ ہلاک کیے جاتے ہیں جو فاسق اور نافرمان ہوں۔

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اٰيَاتُهَا ۳۸ رُكُوْعَاتُهَا ۴ ۹۵

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اس نے ان کے اعمال برباد کر دیے ①

اس سورت کا نام سورۂ محمد (ﷺ) ہے، کیونکہ اس میں آپ کا اسم گرامی آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا نام سورۂ قتال بھی ہے، کیونکہ اس میں لفظِ قتال دو مرتبہ آیا ہے اور اس کا مرکزی مضمون کفار کے ساتھ قتال ہے۔

**آیت 1:** ① اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... : چونکہ اس سورت کا اکثر حصہ مشرکین کے خلاف جنگ کے لیے ابھارنے پر مشتمل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورت کا آغاز کفار پر اپنے غضب اور ایمان والوں پر اپنی رحمت کے اظہار کے ساتھ کیا ہے، تاکہ ان کے کفر اور اللہ کی راہ سے روکنے کے جرم کی بنا پر مسلمانوں کو ان سے لڑنے کی ترغیب دی جا سکے۔ چنانچہ اس تمہید کے بعد فرمایا: ﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ [ محمد : ٤ ] ''تو جب تم ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو خوب گردنیں مارنا ہے۔''

② صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ : ''صَدُّوْا'' ''صَدَّ يَصُدُّ'' (ن) لازم بھی آتا ہے ''اعراض کرنا'' اس کا مصدر ''صُدُوْدًا'' ہے اور متعدی بھی ''روکنا'' اس کا مصدر ''صَدًّا'' ہے، یہاں دوسرا معنی مراد ہے، کیونکہ خود اعراض کرنے کی بات تو ''اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' میں آ گئی، بلکہ کفر اعراض سے زیادہ سخت ہے۔ اس لیے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا اور دوسرے لوگوں کو بھی اللہ کے راستے یعنی اسلام قبول کرنے سے روکا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع اور برباد کر دیے۔ یعنی کافر رہتے ہوئے ان لوگوں نے جو بظاہر اچھے کام کیے تھے، جیسے صدقہ و خیرات، مہمان نوازی، صلہ رحمی، خانہ کعبہ کی مرمت اور اس کا حج، مظلوم کی مدد وغیرہ، ان پر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کو کوئی اجر نہیں ملے گا، کیونکہ ایمان کے بغیر کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان (۲۳) کی تفسیر۔ کافروں کے اعمال برباد کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ تمام اعمال یعنی سازشیں اور منصوبے ناکام کر دیے جو وہ اسلام کو نیچا دکھانے کے لیے کام میں لاتے تھے۔

③ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی کئی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کسی کو زبردستی ایمان لانے سے روک دے۔ دوسری یہ کہ وہ ایمان لانے والوں پر ایسے ظلم و ستم ڈھائے کہ ان کے لیے ایمان پر قائم رہنا مشکل ہو جائے اور ان کی حالت زار دیکھ کر ایمان لانے کا ارادہ رکھنے والے ایمان لانے کی جرأت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لفظ ''فتنہ'' استعمال فرمایا ہے۔ تیسری یہ کہ وہ مختلف طریقوں سے اسلام کے خلاف لوگوں کو ورغلائے اور ان کے دلوں میں ایسے وسوسے ڈالے کہ وہ دین اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ چوتھی یہ کہ ہر کافر اپنے بچوں اور زیر کفالت لوگوں کی تربیت کفر پر کرتا ہے، جس سے ان کے لیے دینِ حق قبول کرنا مشکل ہوتا ہے، اس طرح وہ اللہ کے راستے سے روکنے کا مجرم بنتا

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اس نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۲

ہے۔ اللہ کے راستے سے روکنے کی ان تمام صورتوں کو ختم کرنے کے لیے کفار سے لڑنے کا حکم دیا۔

آیت 2 ① وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ...... : "اٰمَنُوْا" میں اگرچہ عمل صالح بھی شامل ہے، کیونکہ عمل بھی ایمان کا جزو ہے، مگر اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے اسے علیحدہ بھی ذکر فرمایا۔ دیکھیے سورۂ عصر کی تفسیر۔ اسی طرح "اٰمَنُوْا" میں اگرچہ دوسری ایمانیات کے ساتھ محمد ﷺ اور آپ پر نازل شدہ وحی پر ایمان بھی شامل ہے مگر اس کا شرف نمایاں کرنے کے لیے اس کا الگ بھی ذکر فرمایا۔ خصوصاً اس لیے کہ مدینہ میں کچھ ایسے یہود موجود تھے جو ایمان بالغیب کی تمام جزئیات پر ایمان رکھتے تھے اور نیک اعمال بھی بجا لاتے تھے مگر نبی کریم ﷺ کو نبی ماننے کے باوجود یہ کہہ کر ایمان لانے سے انکار کر دیتے تھے کہ آپ اُمیوں کے نبی ہیں۔ اب بھی کئی لوگ کہتے ہیں کہ کوئی یہودی رہے یا نصرانی یا مسلمان، اگر اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں تو سب ٹھیک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اب ایمان وہی معتبر ہو گا جس میں ہمارے نبی محمد ﷺ پر ایمان اور آپ کی اطاعت کا عہد شامل ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ )) [ مسلم، الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالة نبینا محمد ﷺ : ۱۵۳ ] "قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی بھی شخص، یہودی ہو یا نصرانی، جو میرے بارے میں سنے، پھر اس حال میں فوت ہو کہ مجھے جو کچھ دے کر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان نہ لایا ہو تو وہ آگ والوں میں سے ہو گا۔" مزید دیکھیے سورۂ سبا (۲۸)۔

② وَ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ : "الْحَقُّ" جو واقع میں ثابت ہو اور کسی چیز کے اصل کے عین مطابق ہو۔ "الْحَقُّ" خبر پر الف لام لانے سے حصر پیدا ہو گیا۔ "وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ" مبتدا ہے اور "كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ" اس کی خبر ہے اور "وَ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ" درمیان میں جملہ معترضہ ہے جو محمد ﷺ پر نازل شدہ وحی پر ایمان کی مزید تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ یعنی محمد ﷺ پر نازل کردہ وحی ہی کامل حق ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔

③ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ : ایمان اور عمل صالح کی بدولت اللہ تعالیٰ پہلے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( فَلَمَّا جَعَلَ اللّٰهُ الْإِسْلَامَ فِيْ قَلْبِيْ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ ابْسُطْ يَمِيْنَكَ

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③

یہ اس لیے کہ جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور جو لوگ ایمان لائے وہ اپنے رب کی طرف سے حق کے پیچھے چلے۔ اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کے حالات بیان کرتا ہے ③

فَلْأُبَايِعْكَ فَبَسَطَ يَمِيْنَهُ قَالَ فَقَبَضْتُ يَدِيْ، قَالَ مَا لَكَ يَا عَمْرُو!؟ قَالَ قُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ بِمَاذَا؟ قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِيْ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ ؟ وَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا ؟ وَ أَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ » [ مسلم، الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله...... : ۱۲۱ ] ''جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کا خیال ڈالا تو میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میں نے کہا: ''اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھائیں تاکہ میں آپ سے بیعت کروں۔'' آپ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمرو! تمھیں کیا ہوا؟'' میں نے کہا: ''میں شرط کرنا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کس بات کی شرط کرتے ہو؟'' میں نے کہا: ''یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اسلام اسے مٹا دیتا ہے جو اس سے پہلے ہو اور ہجرت اسے مٹا دیتی ہے جو اس سے پہلے ہو اور حج اسے مٹا دیتا ہے جو اس سے پہلے ہو۔''

④ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ : طبری نے فرمایا: '' بَالٌ '' مصدر کی طرح ہے، جیسا کہ '' شَأْنٌ '' ہے، اس سے کوئی فعل نہیں بنایا جاتا۔ ضرورت شعری کے بغیر عرب اس کی جمع استعمال نہیں کرتے، اگر جمع بنائیں تو '' بَالَاتٌ '' بناتے ہیں۔'' شہاب نے فرمایا: '' بَالٌ '' حال اور شان کے معنی میں ہوتا ہے، بعض اوقات کسی عظیم معاملے کے ساتھ خاص ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ )) [ ابن ماجه: ۱۸۹٤ ] ''ہر بڑی شان والا کام۔'' اور کبھی دلی خیال کے لیے آتا ہے، مجازاً دل کو بھی کہہ لیا جاتا ہے۔'' اگر یہاں اس کی یہ تفسیر کی جائے تو یہ بھی اچھی تفسیر ہے۔ سفاقسی نے اس کی تفسیر فکر (سوچ) کے ساتھ کی ہے، کیونکہ جب دل اور سوچ درست ہو جائیں تو عقیدہ اور عمل سب درست ہو جاتے ہیں۔'' (تفسیر قاسمی)

مطلب یہ ہے کہ کفار کے اعمال کو اللہ تعالیٰ ضائع اور برباد کر دیتا ہے، اس کے برعکس ایمان اور عمل صالح والوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے، ان کا حال درست کر دیتا ہے اور ان کے دل اور سوچ کی اصلاح کر دیتا ہے اور انھیں شرک کے بجائے توحید کی، نافرمانی کے بجائے اتباعِ سنت کی اور گناہوں کے بجائے اعمالِ صالحہ کی توفیق سے نوازتا ہے، حتیٰ کہ ان کے گزشتہ گناہوں کو بھی نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۷۰)۔

آیت 3 ① ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ ...... : یعنی کفار کے اعمال برباد کرنے اور ایمان والوں کے گناہ دور کرنے اور ان کا حال درست کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کفار نے باطل کی پیروی اختیار کی اور اس کے پیچھے چل پڑے، جبکہ ایمان والے اس حق پر چلتے رہے جو ان کا اپنا طے کردہ نہیں تھا، بلکہ ان کے رب کی طرف سے نازل کیا ہوا تھا۔ دونوں

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا

تو جب تم ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب انھیں خوب قتل کر چکو تو (ان کو

کے راستے مختلف تھے، اس لیے ان کا انجام بھی مختلف ہوا۔

② كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ : " أَمْثَالٌ " "مَثَلٌ" کی جمع ہے، اس کا معنی مثال بھی ہے اور کسی چیز کا حال اور وصف بھی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، فرمایا: ﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ﴾ [ محمد : ١٥ ] ''اس جنت کا حال اور وصف جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں کئی نہریں ایسے پانی کی ہیں جو بگڑنے والا نہیں۔'' یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ہی سب لوگوں کے احوال بیان فرماتا ہے۔

آیت 4 ① فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ : "فَاِذَا" میں فاء کا تعلق پہلے کلام سے ہے کہ جب کفار باطل کے پیروکار اور مومن حق کے پیروکار ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ حق کے پیروکار باطل کے پیروکار کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ زمین میں فساد پھیلاتے پھریں، لہٰذا جب تم (میدانِ جنگ میں) ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو ان کی گردنیں خوب اڑاؤ۔

② "فَاِذَا لَقِيْتُمُ" کا لفظی معنی اگرچہ ''جب تم ملو'' ہے، مگر اس سے مراد یہ ہے کہ جب تمھارا ان سے مقابلہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ جب کوئی کافر سامنے آ جائے تو اسے قتل کر دو، کیونکہ قرآن مجید اور کلامِ عرب میں ''لقاءِ عدو'' سے مراد دشمن سے مقابلہ لیا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [ الأنفال : ٤٥ ] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو جمے رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

③ ''فَضَرْبَ الرِّقَابِ'' اصل میں "فَاضْرِبُوا الرِّقَابَ ضَرْبًا" ہے، فعل امر "فَاضْرِبُوْا" کو حذف کر کے مفعول مطلق "ضَرْبًا" کو اس کے قائم مقام کر دیا اور اسے مفعول بہ "الرِّقَابِ" کی طرف مضاف کر دیا۔ اس سے اختصار کے علاوہ کلام میں ہیبت اور زور بھی پیدا ہو گیا کہ کفار سے مقابلے کی صورت میں بس ایک ہی کام ہے اور وہ ہے گردنیں مارنا۔ ''ضرب'' کا لفظ عربی زبان میں تلوار کی کاٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے، نیزے کے لیے ''طعن'' اور تیر کے لیے ''رمی'' کا لفظ آتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قوت و شجاعت اور ہیبت کا مظاہرہ آمنے سامنے تیغ زنی میں ہے، خصوصاً جب تلوار گردن پر پڑے، اس لیے "فَضَرْبَ الرِّقَابِ" فرمایا، کیونکہ جو زورِ بیان اس لفظ میں ہے کسی اور میں نہیں۔ ورنہ مراد کسی بھی طریقے سے قتل کرنا ہے، تلوار سے ہو یا تیر سے یا نیزے سے یا کسی جدید اسلحہ سے اور اس اسلحے کی چوٹ خواہ گردن پر پڑے یا جسم کے کسی اور حصے پر۔ یا بلا اسلحہ ہی دشمن کو قتل کر دیا جائے، خواہ گلا گھونٹ کر، مکا مار کر یا جسم کے کسی نازک حصے پر چوٹ مار کر، غرض مقصد دشمن کو کسی بھی طریقے سے قتل کرنا ہے۔

④ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ : " أَثْخَنَ يُثْخِنُ إِثْخَانًا " (افعال) قتل اور خون ریزی میں مبالغہ کرنا۔ "شَدَّ يَشُدُّ شَدًّا" (ن) "اَلشَّيْءَ" کسی چیز کو باندھنا۔ "شَدَّ الْعُقْدَةَ أَوِ الْوَثَاقَ" گرہ یا رسی کو مضبوطی سے باندھنا۔

مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ۟ ذٰلِكَ ؕۛ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ

مضبوط باندھ لو، پھر بعد میں یا تو کسی طرح احسان کرنا ہے اور یا کسی طرح فدیہ لے لینا، یہاں تک کہ لڑائی اپنے

"اَلْوَثَاقُ" رسی وغیرہ جس کے ساتھ باندھا جائے۔ یعنی جنگ کا اصل ہدف دشمن کی جنگی قوت کو توڑنا ہے، اس لیے جنگ کی ابتدا ہی میں دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کرنے میں نہیں لگ جانا چاہیے، بلکہ زیادہ سے زیادہ خونریزی اور قتل کے بعد جب ان کا اچھی طرح قلع قمع ہو جائے اور لڑائی اختتام کو پہنچ چکی ہو تو پھر بچے کھچے لوگوں کو قیدی بنانا چاہیے، تاکہ ان میں دوبارہ مقابلے کی سکت باقی نہ رہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں نے دشمن کو اچھی طرح تہ تیغ کرنے سے پہلے ہی اس کے آدمیوں کو قیدی بنایا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [الأنفال: ٦٧] "کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے، تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔"

5 فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً: "مَنًّا" اور "فِدَآءً" مفعول مطلق ہیں جن کا فعل حذف کر دیا گیا ہے اور تنوین تنکیر کے لیے ہے: "أَيْ إِمَّا تَمُنُّوْنَ عَلَيْهِمْ مَنًّا بَعْدَ ذٰلِكَ وَ إِمَّا تُفَادُوْنَهُمْ فِدَاءً" "یعنی اس کے بعد یا تو ان پر احسان کر دو، کسی طرح احسان کرنا یا ان سے فدیہ لے لو، کسی طرح فدیہ لینا۔"

کسی طرح احسان کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں قتل نہ کیا جائے، بلکہ ان کی جان بخشی کر کے انھیں لونڈی و غلام بنا کر مسلمان افراد کے حوالے کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دائمی قید یا قتل کے مقابلے میں غلام بنا لینا کوئی کم احسان نہیں، خصوصاً اسلام میں لونڈی و غلام سے جس حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے اس کے ہوتے ہوئے دائمی قید یا قتل کے مقابلے میں یہ بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ بہت سے کاموں کے کفارے کی صورت میں اور مکاتبت یعنی کمائی کر کے اپنی قیمت ادا کرنے کی صورت میں ان کی آزادی کے مواقع موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے مفتوح لوگوں کو لونڈی و غلام بنانا تواتر سے ثابت ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر لونڈیوں اور غلاموں کا ذکر موجود ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۳، ۲۴، ۳۶)، مومنون (۵، ۶)، احزاب (۵۰)، نحل (۷۱)، روم (۲۸)، نور (۳۱ تا ۳۳، ۵۸) اور دوسری متعدد آیات۔ ان آیات و احادیث اور خلفائے راشدین کے عمل کے ہوتے ہوئے اسلام میں غلامی سے انکار کوئی ملحد ہی کر سکتا ہے، یا کوئی جاہل جسے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کا علم نہ ہو۔

قیدیوں پر کسی طرح احسان کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ایسا کرنا مصلحت کا تقاضا ہو، مثلاً امید ہو کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرگرمیوں سے باز آ جائیں گے، جیسا کہ آپ ﷺ نے نجد کے سردار ثمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہ کو بلا معاوضہ رہا کر دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۳۷۲)

وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ④

ہتھیار رکھ دے، (بات) یہی ہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو ضرور ان سے انتقام لے لے اور لیکن تاکہ تم میں سے بعض کو بعض کے ساتھ آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے تو وہ ہرگز ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا④

جنگ حنین کے کئی ہزار قیدیوں کو احسان فرما کر رہا کر دیا۔ (دیکھیے بخاری : ۴۳۱۸، ۴۳۱۹) صلح حدیبیہ کے موقع پر اسّی (۸۰) آدمی تنعیم کی طرف سے آئے اور فجر کی نماز کے قریب انھوں نے آپ ﷺ پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا، مگر وہ سب کے سب پکڑ لیے گئے، پھر آپ نے سب کو چھوڑ دیا، تاکہ یہ معاملہ لڑائی کا باعث نہ بن جائے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ﴾ [ الفتح : ۲٤ ] ”اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمھیں ان پر فتح دے دی۔“ [ دیکھیے مسلم، الجهاد، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ وهو الذی کف أیدیهم عنکم ﴾ : ۱۸۰۸ ] فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے چند آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے تمام اہلِ مکہ کو بطور احسان معاف فرما دیا۔ غزوۂ بنی مصطلق کے بعد جب اس قبیلے کے قیدی لائے گئے اور لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے، تو اس وقت جویریہ ؓ جس شخص کے حصے میں آئی تھیں اسے ان کا معاوضہ ادا کر کے آپ ﷺ نے خریدا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ اس پر تمام مسلمانوں نے اپنے حصے کے قیدی یہ کہہ کر رہا کر دیے کہ یہ اب رسول اللہ ﷺ کے سسرالی رشتہ دار بن چکے ہیں۔ [ دیکھیے مسند أحمد : ۶/ ۲۷۷، ح : ۲٦٤۱۹ ]

قیدیوں کے ساتھ احسان کی ایک صورت یہ ہے کہ ان پر جزیہ لگا کر انھیں مسلمانوں کا ذمی بنا لیا جائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [ التوبة : ۲۹ ] ”یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔“

قیدیوں پر احسان میں یہ بھی شامل ہے کہ جب تک وہ قید میں رہیں ان سے اچھا سلوک کیا جائے، ان کے کھانے پینے، لباس اور صحت وغیرہ کا خیال رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ دہر کی آیت (۸): ﴿ وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ﴾ کی تفسیر۔

” وَ اِمَّا فِدَآءً “ فدیہ لینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ان سے کچھ مال لے کر انھیں آزاد کر دیا جائے، جیسا کہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۶۷) کی تفسیر۔ اور فدیے کی ایک صورت یہ ہے کہ رہائی کی شرط کے طور پر کوئی خاص خدمت لینے کے بعد ہی انھیں رہا کیا جائے، مثلاً وہ ان لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں جو ان کے سپرد کیے جائیں۔ اور فدیے کی ایک صورت یہ ہے کہ کفار کے ہاتھوں گرفتار کسی مسلم قیدی کی رہائی کے بدلے میں انھیں رہا کر دیا جائے، جیسا کہ سلمہ بن اکوع ؓ نے بیان فرمایا کہ بنوفزارہ پر حملے میں جو قیدی آئے امیرِ لشکر ابوبکر ؓ نے ان میں سے ایک نہایت حسین لونڈی انھیں زائد عطیہ کے طور پر دی، جب وہ مدینہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے وہ لونڈی اصرار کے ساتھ

کے طور پر مانگ لی، انھوں نے وہ آپ ﷺ کو دے دی، تو: (( فَبَعَثَ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى أَهْلِ مَكَّةَ فَفَدٰى بِهَا نَاسًا مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ كَانُوْا أُسِرُوْا بِمَكَّةَ )) [ مسلم، الجهاد و السير، باب التنفيل و فداء المسلمين بالأسارى : ۱۷۵۵ ] ''رسول اللہ ﷺ نے اس لونڈی کو کچھ مسلمانوں کے فدیے کے طور پر اہل مکہ کی طرف بھیج دیا، جو مکہ میں قید کیے ہوئے تھے۔''

⑤ اس آیت کے الفاظ سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ کفار کو قیدی بنا لینے کے بعد احسان یا فدیہ ہی میں سے کوئی ایک صورت اختیار کی جائے گی، انھیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے امیر کو انھیں قتل کرنے کا بھی اختیار ہے، جیسا کہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں میں سے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو قتل کیا۔ بنو قریظہ کے قیدیوں کو، جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر اپنے قلعوں سے نیچے اترے انھیں قتل کیا۔ فتح مکہ کے دن ابن خطل اور مقیس بن صبابہ کو قتل کیا اور اُحد کے بعد ابوعزہ شاعر کو قتل کیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ عمل کے بعد کسی کو یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ کافر کو قید کرنے کے بعد کسی صورت قتل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ آپ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآن مجید کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ اگر کوئی شخص آیت کے الفاظ پر غور کرے تو خود اس میں قیدیوں کو قتل کرنے کا اختیار موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کو مضبوطی سے باندھنے کے حکم کے بعد فرمایا: ﴿ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً ﴾ "مَنًّا" کا معنی انعام واحسان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک "اَلْمَنَّانُ" بھی ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ انعام کرنے والے پر لازم نہیں ہوتا کہ وہ انعام کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو انعام کیے ہیں وہ نہ اللہ پر واجب تھے نہ بندوں کا حق تھے، جسے ادا کرنا اللہ کے ذمے لازم ہو۔ اس لفظ "مَنًّا" (انعام واحسان) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا قیدیوں کو زندہ رکھنا ان کی طرف سے قیدیوں کے لیے انعام ہے۔ اگر انھیں قتل کرنے کا اختیار ہی نہ ہو بلکہ انھیں ہر حال میں زندہ رکھنا ان پر واجب ہو تو انھیں چھوڑ دینا ان پر کوئی احسان و انعام نہیں ہوگا، بلکہ انھیں چھوڑ کر ان کا حق ادا کیا جائے گا جو مسلمانوں کے ذمے واجب تھا۔ اس لیے "مَنًّا" اور "فِدَآءً" کے دو الفاظ میں وہ چاروں صورتیں آ جاتی ہیں جن کا مسلمانوں کے امیر کو اختیار ہے اور وہ ہے قتل کرنا یا غلام بنانا یا بلامعاوضہ چھوڑنا یا فدیہ لے کر چھوڑنا۔ (بقاعی) صحیح بخاری میں ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے قول سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قیدی کو چھوڑنا اس کا استحقاق نہیں، اس پر انعام ہے۔ چنانچہ اس نے کہا: (( إِنْ تَقْتُلْنِيْ تَقْتُلْ ذَا دَمٍ، وَإِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَاكِرٍ، وَإِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ مِنْهُ مَا شِئْتَ )) [ بخاري، المغازي، باب وفد بني حنيفة ... : ۴۳۷۲۔ مسلم : ۱۷۶۴ ] ''(اے محمد!) اگر تم مجھے قتل کرو تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر انعام کرو تو ایک شکر گزار پر انعام کرو گے اور اگر مال چاہتے ہو تو مانگو جتنا چاہتے ہو۔''

⑥ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا: "اَوْزَارَهَا" "وِزْرٌ" کی جمع ہے جس کا معنی بوجھ ہے، مراد اس سے لڑائی کے ہتھیار ہیں، کیونکہ جب تک لڑائی باقی رہے ہتھیار اٹھانا پڑتے ہیں جو اٹھانے والوں کے لیے بوجھ ہوتے ہیں، یعنی کفار کی گردنیں مارتے

رہو اور ان سے لڑائی جاری رکھو، حتیٰ کہ لڑائی ختم ہو جائے اور کسی کافر میں مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کی جرأت اور طاقت نہ رہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان پوری زمین پر غالب ہوں اور کفار میں ان کے مقابل آنے کی اور ان کے حکم سے سر پھیرنے کی جرأت و ہمت باقی نہ رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ [الأنفال : ۳۹] ''اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے۔'' رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق کفر و اسلام کا یہ معرکہ قیامت تک جاری رہے گا۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَنْ يَّبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا، يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ )) [ مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : "لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق......" : ۱۹۲۲ ] ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس پر لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔''

8 ذٰلِكَ : یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے: "أَيِ الْأَمْرُ ذٰلِكَ" یعنی بات یہی ہے جو گردنیں مارنے، قید کرنے، احسان کرنے اور فدیہ لینے کی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی، یا یہ فعل محذوف کا مفعول بہ ہے: "أَيِ افْعَلُوْا ذٰلِكَ" یعنی یہ کام کرو۔ یہ مختصر سا لفظ گزشتہ پوری تفصیل کو ذہن میں پختہ کرنے اور اس کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔

9 وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اگر کفار اتنے ہی برے ہیں تو اللہ تعالیٰ خود انھیں سزا کیوں نہیں دیتا؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے گردنیں مارنے اور دوسری باتوں کا حکم تمھیں دیا ہے، حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ خود کفار سے انتقام لے سکتا ہے۔ اس کے لیے اس کی طرف سے زلزلے کا ایک جھٹکا، بجلی کی ایک کڑک، سیلاب کا ایک ریلا یا آندھی کا ایک جھونکا کافی ہے، جیسا کہ اس نے گزشتہ کئی کافر اقوام کے ساتھ کیا۔ (دیکھیے عنکبوت: ۴۰) لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو سب لوگ ہلاکت سے بچنے کے لیے ایمان لے آتے جو جبری اور اضطراری ہوتا، اپنی مرضی اور اختیار سے نہ ہوتا، اس طرح آزمائش اور امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا۔

10 وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ : "لِيَبْلُوَاۡ" فعل محذوف کے متعلق ہے: "أَيْ وَلٰكِنَّهٗ أَمَرَكُمْ بِالْجِهَادِ لِيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ" ''یعنی لیکن اس نے تمھیں جہاد کا حکم اس لیے دیا ہے کہ تمھارے بعض کو بعض کے ساتھ آزمائے'' اور ظاہر ہو جائے کہ کون مخلص مومن ہے اور کون منافق، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [آل عمران : ۱٤۲] ''یا تم نے گمان کر لیا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک اللہ نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور تاکہ وہ صبر کرنے والوں کو جان لے۔'' ایمان والوں کو جہاد کا حکم دینے میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتوں میں سے چند حکمتیں اس آیت میں بیان ہوئی ہیں، فرمایا: ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ [التوبة : ۱٤، ۱۵] ''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں

سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝

وہ ضرور انھیں راستہ دکھائے گا اور ان کا حال درست کر دے گا۵ اور انھیں اس جنت میں داخل کرے گا جس کی اس نے انھیں پہچان کروا دی ہے۶

سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا۔ اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔'' اس کی تفصیل سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیات میں ملاحظہ فرمائیں۔

⑪ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ : یعنی شہداء کے اللہ کی راہ میں قتل کیے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی جان سے گئے، انھیں کچھ بھی نہ ملا اور ان کی قربانی سے فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا جو اس دنیا میں زندہ رہے۔ فرمایا ایسا ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا، بلکہ اس سودے کا اصل نفع خود انھی کو حاصل ہوگا۔ مزید دیکھیے سورۂ توبہ (۱۱۱) کی تفسیر۔ شہداء کو ملنے والی چند نعمتوں کا ذکر اس آیت کے بعد متصل آیات میں بھی آ رہا ہے۔

آیت 5 سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ : یعنی اللہ تعالیٰ ان کی محنت ٹھکانے لگائے گا، انھیں جنت کے راستے پر لے جائے گا اور آخرت میں پیش آنے والے تمام مراحل میں ان کی حالت کو درست رکھے گا۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ )) [ مسلم، الإمارة، باب من قتل في سبيل الله كفرت خطاياه إلا الدين : ۱۸۸٦ ] ''قرض کے سوا شہید کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔'' شہادت اور شہداء کے مزید بہت سے فضائل کی تفصیل کے لیے کتبِ احادیث میں سے جہاد کے ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 6 وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ : یعنی اللہ تعالیٰ انھیں اس جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان اس نے قرآن کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بہت اچھی طرح کروا دی ہے۔ اس سورت کی آیت (۱۵) میں بھی اس کی کچھ شناخت آ رہی ہے۔ جب وہ اس جنت میں جائیں گے تو وہ ان کے لیے اجنبی نہیں ہوگی، بلکہ عین اس وعدے اور شناخت کے مطابق ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے انھیں کروا رکھی ہے۔ ''عَرَّفَهَا لَهُمْ'' میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی جنتی کو جنت میں اپنے گھر جانے کے لیے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَخْلُصُ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ، فَيُحْبَسُوْنَ عَلٰى قَنْطَرَةٍ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، فَيُقَصُّ لِبَعْضِهِمْ مِّنْ بَعْضٍ مَظَالِمُ كَانَتْ بَيْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا، حَتّٰى إِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا أُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ، فَوَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَأَحَدُهُمْ أَهْدٰى بِمَنْزِلِهِ فِي الْجَنَّةِ مِنْهُ بِمَنْزِلِهِ كَانَ فِي الدُّنْيَا )) [ بخاری، الرقاق، باب القصاص يوم القيامة : ٦٥٣٥ ] ''مومن آگ سے بچ کر نکلیں گے تو انھیں ایک پل پر روک لیا جائے گا، جو جنت اور آگ کے درمیان ہے، پھر انھیں ایک دوسرے سے ان زیادتیوں کا قصاص دلایا جائے گا جو دنیا میں ہوئیں، یہاں تک کہ جب وہ خوب صاف ستھرے ہو جائیں گے تو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جما دے گا ⑦ اور جن لوگوں نے کفر کیا سو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اس نے ان کے اعمال برباد کر دیے ⑧

انھیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ سو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! ان میں سے ہر ایک کو جنت میں اپنے گھر کا راستہ اس سے زیادہ معلوم ہوگا جتنا اسے دنیا میں اپنے گھر کا راستہ معلوم تھا۔''

آیت 7 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ : اللہ کی مدد کرنے سے مراد اللہ کے دین اور اللہ کے دوستوں کی مدد کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے، اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں فرمایا: ﴿وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ﴾ [ محمد : ٤ ] ''اور اگر اللہ چاہے تو ضرور ان سے انتقام لے لے۔'' اللہ کے دین کی مدد اس کی راہ میں جہاد اور جان و مال کی قربانی سے بھی ہوتی ہے اور اس کے دشمنوں پر دینِ حق کے دلائل و براہین قائم کرنے کے ساتھ بھی۔

② يَنْصُرْكُمْ : اللہ تعالیٰ کی مدد دو طرح سے آتی ہے، ایک یہ کہ وہ ہمیں دنیا میں دشمنوں پر فتح اور غلبہ عطا فرما دے، مگر ایسا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ وہ ہمیں آخرت عطا فرما دے، خواہ دنیا میں کسی موقع پر شکست سے بھی دو چار ہونا پڑے۔

③ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ : یعنی وہ تمھیں دین پر قائم رکھے گا کسی شک و شبہ کا شکار نہیں ہونے دے گا، جنگ میں ثابت قدمی عطا فرمائے گا کبھی فرار کا خیال تک نہیں آنے دے گا، خواہ دشمن کتنی زیادہ تعداد میں ہوں اور قیامت کے دن ''صراط'' پر تمھارے قدم جمائے رکھے گا اور پھسلنے اور جہنم میں گرنے سے محفوظ رکھے گا، جب سب لوگ '' اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ'' (اے اللہ! سلامت رکھنا، سلامت رکھنا ) کہہ رہے ہوں گے۔ [ دیکھیے بخاري : ٦٥٧٣ ]

آیت 8 ① وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ : '' تَعْسًا '' کا معنی ٹھوکر کھا کر گرنا اور پھر اٹھ نہ سکنا ہے، یا کسی گڑھے میں گر کر ہلاک ہو جانا ہے۔ (مفردات ) گویا اللہ کے دین کی مدد کرنے والوں کے تو اللہ تعالیٰ پاؤں جما دیتا ہے، اس کے برعکس منکروں کو منہ کے بل گرا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور مومنوں کی تو مدد کی جاتی ہے جب کہ کافروں کے تمام اعمال برباد اور ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ ( کیلانی )

② '' تَعْسًا '' کا فعل '' مَنَعَ '' اور '' سَمِعَ '' دونوں سے آتا ہے۔ ''تَعْسًا'' مصدر مفعول مطلق ہے جس کا فعل حذف ہونا واجب ہے: '' أَيْ تَعِسُوْا تَعْسًا. '' پھر '' تَعِسُوْا '' کو حذف کر کے ''تَعْسًا'' مصدر کو اس کے قائم مقام کر دیا اور فعل کے فاعل جمع مذکر غائب کی ضمیر کو ظاہر کر دیا۔ ابن ہشام نے فرمایا کہ '' لَهُمْ '' میں لام تبیین کا ہے جو '' تَعْسًا '' کے فاعل کے بیان کے لیے ہے۔ معنی یہی ہے کہ وہ ہلاک ہوئے، بری طرح ہلاک ہونا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ⑨ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ⑩ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ⑪ ع

یہ اس لیے کہ انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے ⑨ تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ اللہ نے ان پر تباہی ڈال دی اور ان کافروں کے لیے بھی اسی جیسی (سزائیں) ہیں ⑩ یہ اس لیے کہ اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے اور (اس لیے کہ) جو کافر ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں ⑪

**آیت 9** ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ … : یعنی اس انجام کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت کو ناپسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال برباد کر دیے، کیونکہ اعمال کے بارآور ہونے کی شرط ان کا اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق ہونا ہے۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی پہلی آیت کی تفسیر۔

**آیت 10** ① اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ …… : یہ "فَتَعْسًا لَّهُمْ" ہی کی وضاحت ہے کہ کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر پہلی تباہ شدہ قوموں کے آثار دیکھ کر ان کی ہلاکت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟ نزول قرآن کے وقت ان میں سے بہت سے آثار موجود تھے اور بعض اب بھی باقی ہیں۔ "اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا" کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ روم (۹) اور سورۂ مومن (۲۱)۔

② دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ : "دَمَّرَ" ہلاک کر دیا۔ "اَلدَّمَارُ" ہلاکت۔ "دَمَّرَ" خود بھی متعدی ہے، اصل میں "دَمَّرَهُمُ اللّٰهُ" تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہلاک کر دیا۔ مگر "عَلَيْهِمْ" لانے سے ہلاک کرنے میں مبالغے کا اظہار مقصود ہے: " أَيْ أَلْقَى عَلَيْهِمُ الدَّمَارَ " یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر ہلاکت اور تباہی ڈال دی۔

③ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا : "اَمْثَالُهَا" میں ضمیر "هَا" "عَاقِبَةُ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ "أَمْثَالٌ" کو جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اس جیسے بے شمار عذاب موجود ہیں۔ "وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ پہلی قوموں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور سرکشی کی راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے عذاب بھیج کر انھیں تباہ و برباد کر دیا اور ان موجودہ کافروں کے لیے بھی سرکشی اختیار کرنے کی صورت میں اس جیسے بے شمار عذاب تیار ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ اقوام پر رسولوں کی نافرمانی کی پاداش میں دنیا میں تباہی اور بربادی نازل کی، جس کا سبب ان کا کفر تھا اور ان کافروں کے لیے دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی ایسے کئی عذاب تیار ہیں۔

**آیت 11** ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا …… : یعنی کافروں پر ہلاکت نازل کرنے کا باعث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ⑫

**یقیناً اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا فائدہ اٹھاتے اور کھاتے ہیں، جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور آگ ان کا ٹھکانا ہے ⑫**

ایمان والوں کا مددگار ہے اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں جو انھیں ہلاکت سے بچا سکے۔ جب جنگِ اُحد میں ابوسفیان نے اپنی عارضی فتح پر مغرور ہو کر نعرہ لگایا: « إِنَّ لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ » (ہمارا مددگار عزیٰ ہے اور تمھارا کوئی بھی مددگار نہیں) تو رسول اللہ ﷺ نے جواب میں یہ کہنے کا حکم دیا: « اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ » [ بخاري، الجهاد، باب ما يكره من التنازع ...... : ۳۰۳۹ ] ''اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمھارا کوئی مددگار نہیں۔'' یہ جواب اسی آیت سے ماخوذ ہے۔

**آیت 12** ① **إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ......** : دنیا میں پہلی قوموں پر آنے والے عذابوں کا اور ایمان والوں کی نصرت کا ذکر فرمانے کے بعد آخرت میں دونوں کا انجام ذکر فرمایا۔ چونکہ مومن اپنے ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کے پابند رہے، انھوں نے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے فائدہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند رہ کر اٹھایا۔ وہی کھایا اور پہنا جو ان کے رب نے ان کے لیے حلال فرمایا، وہ تمام حرام کردہ اشیاء سے بچے۔ شراب، ریشم اور سونے کے استعمال سے پرہیز کرتے رہے۔ زنا، چوری، دوسرے کا حق کھانے، غرض ہر معصیت سے اجتناب کیا۔ ان کی لذتیں اٹھانے کی بے شمار حسرتیں ان کے دل میں رہ گئیں اور انھوں نے یہاں ایک قیدی کی سی زندگی گزاری، جو صرف انھی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو انھیں قید کرنے والا مہیا کرے۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ انھیں عظیم الشان باغات میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور فرمائے گا کہ یہاں تمھارے دل کی ہر خواہش اور ہر طلب پوری ہو گی، بلکہ وہ کچھ ملے گا جو نہ تمھاری آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی آیا۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اور اکثر جگہ باغات اور نہروں ہی کا ذکر فرمایا ہے، اس لیے کہ دنیا کے مکانوں اور کوٹھیوں کا ایک حصہ گھر کے چمن پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے کہ پودوں، چشموں اور نہروں سے انسان کو فطری طور پر محبت ہے، مگر اصل مکان ان سے کہیں وسیع، خوبصورت اور قیمتی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مکانات اور ان میں موجود رہنے سہنے، کھانے پینے، بیوی بچوں اور دوسری بے شمار اشیاء کی عظمت و شوکت کا اندازہ ان باغوں اور نہروں سے لگا لو جو بطورِ چمن ان مکانوں کے ساتھ ہیں۔

② **وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ** : ایمان والوں کے برعکس کفار کھانے پینے اور دنیا کی لذتیں اٹھانے میں کسی پابندی کی پروا نہیں کرتے، انھیں حلال و حرام، اپنے یا دوسرے کے حق سے کوئی غرض نہیں، وہ خنزیر، مردار اور ہر حرام چیز کھاتے، شراب پیتے، زنا کرتے، غرض دل کا ہر ارمان پورا کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ کسی

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو تیری اس بستی سے قوت میں زیادہ تھیں جس نے تجھے نکالا، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر کوئی ان کا مددگار نہ تھا ﴿۱۳﴾

لذت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، کیونکہ دنیا میں ہر شخص کو اتنا ہی ملتا ہے جو مالک نے لکھ دیا ہے، مگر اپنی حسرتیں پوری کرنے میں وہ کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے۔ دنیا ان کے لیے جنت ہے جہاں وہ ہر قید اور پابندی سے آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا حال ہو بہو جانوروں جیسا ہے جو کھانے پینے، رہنے سہنے اور اپنی جنسی خواہش کی تکمیل میں کسی قید کے پابند نہیں ہیں، ان میں سے ہر طاقتور کمزور سے اس کا حق بھی چھین لیتا ہے۔ انھیں نہ عاقبت یاد ہے نہ باز پرس کی کوئی فکر ہے۔

③ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ : چونکہ انھوں نے اپنے رب سے کفر کیا، نہ ایمان لائے نہ عمل صالح کیا، نہ اس کے احکام کی پابندی کی، اس لیے ان کا مستقل ٹھکانا آگ ہے۔

④ بعض لوگ اس آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جانور کھڑے ہو کر کھاتے پیتے ہیں، اس لیے کھڑے ہو کر کھانا پینا منع ہے، مگر اس مقصد کے لیے اس آیت کے بجائے احادیث سے استدلال کرنا چاہیے اور اس مسئلے میں اتنی ہی سختی کرنی چاہیے جتنی احادیث سے ثابت ہے، کیونکہ ضرورت کے وقت سنت سے اس کی اجازت بھی ثابت ہے۔

⑤ چونکہ جانوروں کی ساری جدوجہد ہی کھانے پینے کے لیے ہوتی ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی مشابہت سے بچنے کے لیے کم کھانے پر زور دیا ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِيْ مِعًى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِيْ سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ )) [ بخاري، الأطعمة، باب المؤمن يأكل في معى واحد ...... : ۵۳۹۳ ] ''مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔'' اور مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ، بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهِ وَثُلُثٌ لِشَرَابِهِ وَثُلُثٌ لِنَفَسِهِ )) [ ترمذي، الزهد، باب ما جاء في كراهية كثرة الأكل : ۲۳۸۰، و قال الألباني صحيح ] ''کسی آدمی نے پیٹ سے بُرا برتن نہیں بھرا۔ ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں۔ سو اگر کوئی چارہ نہیں تو تیسرا حصہ اس کے کھانے کے لیے، تیسرا اس کے پینے کے لیے اور تیسرا سانس کے لیے ہے۔'' جس طرح شریعت نے ہر بات میں انسانی فطرت کا خیال رکھا ہے اسی طرح یہاں بھی اگر کبھی پیٹ بھر کر کھا لے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے بار بار اصرار پر دودھ پینا ہے، حتیٰ کہ انھیں کہنا پڑا کہ اب میرے پیٹ میں اس کی گنجائش نہیں۔ [ دیکھیے بخاري، الرقاق، باب كيف كان عيش النبي ﷺ ...... : ٦٤٥٢ ]

آیت 13 ① وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً ...... : اس کا عطف ''اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا'' پر ہے، درمیان میں بات سے بات نکلتی گئی ہے، دوبارہ پھر وہی سلسلۂ کلام شروع فرمایا ہے۔ اس میں کفار مکہ کے لیے وعید اور رسول اللہ ﷺ

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہے اس شخص کی طرح ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال مزین کر دیے گئے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی؟ ﴿۱۴﴾

کے لیے تسلی ہے کہ اہلِ مکہ جنھوں نے آپ کو اپنی بستی سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اپنی قوت و شوکت پر مغرور نہ ہوں اور آپ ان کی قوت دیکھ کر دل برداشتہ نہ ہوں، ان بے چاروں کی کیا حیثیت ہے۔ ان سے پہلے کتنی ہی بستیاں تھیں جو قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر ان کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ دیکھیے سورۂ روم (۹، ۱۰) اور سورۂ مومن (۲۱)۔

❷ "قَرْيَةٍ" سے مراد قریہ والے ہیں، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد ماجد سے کہا: ﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا﴾ [ یوسف: ۸۲ ] ''اور اس بستی سے پوچھ لے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں۔'' اس لیے آگے "أَهْلَكْنَا هَا" کے بجائے "اَهْلَكْنٰهُمْ" (ہم نے انھیں ہلاک کر دیا) فرمایا، یعنی اس بستی والوں کو ہلاک کر دیا۔ پوری بستی کو نکالنے والا قرار دینے میں ناراضی کا اظہار ہے، کیونکہ کچھ نکالنے والے تھے اور کچھ خاموش رہ کر ان کا ساتھ دینے والے، جیسا کہ قومِ عاد کے متعلق فرمایا: ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا﴾ [الشمس: ۱٤] ''تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، پس اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ دیں۔'' حالانکہ اونٹنی کو کاٹنے والا تو ایک ہی شخص تھا۔

❸ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی اس لیے بھی دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکلنے کا شدید رنج اور صدمہ تھا۔ عبد اللہ بن عدی بن حمراء الزہری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''حزورہ'' مقام پر کھڑے ہوئے دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَاللّٰهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ وَ لَوْ لَا أَنِّيْ أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ » [ ترمذي، المناقب، باب في فضل مكة: ۳۹۲۵، و قال الألباني صحيح ] ''اللہ کی قسم! تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر ہے اور اللہ کی زمین میں سے اللہ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ مجھے تجھ سے نکال دیا گیا تو میں نہ نکلتا۔''

آیت 14 ❶ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ...... : اس آیت میں مومن و کافر کے درمیان ایک اور فرق بیان فرمایا ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح والوں کو جنت میں داخل فرمائے گا اور کفر کرنے والوں کا ٹھکانا آگ ہو گا۔ "بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ" (اپنے رب کی طرف سے دلیل) سے مراد ایک تو انسانی فطرت میں رکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی توحید ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب سے حاصل ہونے والی ہدایت اور علم ہے جس کی وجہ سے مومن کو اپنے حق پر ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ زندہ رہتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ میں حق پر ہوں اور دشمن کے مقابلے میں لڑتا اور شہید ہوتا ہے تو اسی یقین کے ساتھ۔ وہ جس راستے پر چل رہا ہے اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ فرمایا کیا یہ شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں، حتیٰ کہ رسول اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنا بھی اسے اچھا کام نظر آتا ہے اور وہ وحی اور ہدایت کے نور سے منہ موڑ کر کفر و شرک اور اندھا دھند اپنی

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ

اس جنت کا حال جس کا وعدہ متقی لوگوں سے کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں کئی نہریں ایسے پانی کی ہیں جو بگڑنے والا

خواہش کی پیروی کی راہ پر چل نکلا ہے جس سے اس کا نورِ فطرت بھی بجھ چکا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کا انجام بھی کسی صورت ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے، دیکھیے سورۂ رعد (۱۹)، سورۂ ص (۲۸) اور سورۂ جاثیہ (۲۱)۔

② احسن التفاسیر میں ہے: ''حاصل مطلب ان آیتوں کا یہ ہے کہ جو لوگ خالص اللہ کی عبادت کرتے ہیں ان کے پاس یہ سند (بینہ اور دلیل) ہے کہ انسان کو اور انسان کی سب ضرورتوں کو اس طرح اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے کہ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے تو لائق تعظیم و عبادت بھی وہی وحدہٗ لاشریک لہ ہے اور جو لوگ اللہ کی عبادت میں غیروں کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی شرعی یا عقلی دلیل نہیں ہے۔ بت پرستی جیسی بری چیز کو شیطان نے ان کی نظر میں اچھا کر کے دکھا دیا ہے، اس لیے وہ لوگ اسی شیطانی وسوسے کے سبب اپنی خواہش پر چلتے ہیں۔ اسی کو ''وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ'' فرمایا۔'' (مختصراً)

③ ''كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ'' (اس کے لیے اس کے برے اعمال مزین کر دیے گئے) میں برے اعمال مزین کرنے والے کا ذکر مجہول رکھا ہے، کیونکہ آدمی کے لیے اس کے اعمالِ بد کو مزین کرنے والی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن میں اس کی خواہشِ نفس بھی ہے، انسانی اور جنی شیطان بھی اور اس کے اعمالِ بد کی نحوست بھی۔ فعل مجہول (مزین کر دیے گئے) میں مزین کرنے والی یہ سب اشیاء آ جاتی ہیں۔

**آیت 15** ① مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ...... : ''مَثَلُ'' کا معنی یہاں حال یا صفت ہے۔ اس سے پہلے مومنوں کو جنتوں میں داخل کرنے کا ذکر فرمایا، جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور کفار کا ٹھکانا آگ بیان فرمایا۔ اب اس جنت اور جہنم کا کچھ مزید حال بیان فرمایا، خصوصاً جنت کی نہروں کا، کیونکہ قرآن مجید میں اکثر جنت کے ساتھ اس کی نہروں کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس آیت میں جنت کی چار قسم کی نہروں کا ذکر فرمایا ہے۔ واضح رہے کہ جنت کی تمام نہروں کا سرچشمہ عرش کے نیچے جنت الفردوس ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَسَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ، وَ فَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ، وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ )) [ بخاري، التوحيد، باب : ﴿ و كان عرشه على الماء ﴾ ...... : ۷۴۲۳ ] ''تو جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا افضل اور جنت کا سب سے بلند مقام ہے اور اس سے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔'' اور معاویہ بن حیدہ قشیری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ فِي الْجَنَّةِ بَحْرَ الْمَاءِ وَ بَحْرَ الْعَسَلِ وَبَحْرَ اللَّبَنِ وَبَحْرَ الْخَمْرِ ثُمَّ تُشَقَّقُ الْأَنْهَارُ بَعْدُ )) [ ترمذي، صفة الجنة، باب ما جاء في صفة أنهار الجنة : ۲۵۷۱، و قال الترمذي و الألباني صحيح ] ''جنت میں پانی کا سمندر ہے اور شہد کا سمندر ہے اور دودھ کا سمندر ہے اور شراب کا سمندر ہے، پھر بعد میں نہریں پھوٹتی ہیں۔''

طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَا

نہیں اور کئی نہریں دودھ کی ہیں، جس کا ذائقہ نہیں بدلا اور کئی نہریں شراب کی ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہیں اور کئی نہریں خوب صاف کیے ہوئے شہد کی ہیں اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل اور ان کے رب کی طرف سے

❷ **فِيْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ :** "اٰسِنٍ" "أَسِنَ يَأْسَنُ" سے اسم فاعل ہے، جس طرح "أَمِنَ يَأْمَنُ" سے "آمِنٌ" اسم فاعل ہے۔ یہ باب "ضَرَبَ" اور "نَصَرَ" کے وزن پر بھی آتا ہے: "أَيْ مُتَغَيِّرُ اللَّوْنِ وَالرِّيْحِ وَالطَّعْمِ" "جس کا رنگ، بو اور ذائقہ بدلا ہوا ہو۔" یعنی جنت میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو ایسا صاف ہے کہ اس کے ذائقے یا رنگ یا بو میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی، بخلاف دنیا کے پانی کے جو کچھ عرصہ گزرنے پر اپنے رنگ، ذائقہ اور بو کی صفائی کھو بیٹھتا ہے، اس پر کائی آ جاتی ہے، گرد و غبار کے ساتھ گندا ہو جاتا ہے اور اس میں پیدا ہونے والے جراثیم اور دوسری چیزیں اسے پینے کے قابل نہیں چھوڑتیں۔

❸ **وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ :** دنیا میں جانوروں کے تھنوں سے جو دودھ نکلتا ہے اس میں کچھ تو تھنوں کی آلائش کی آمیزش ہو جاتی ہے اور کچھ دوہنے والے کے ہاتھوں اور ماحول کے گرد و غبار کی، پھر اگر دودھ کچھ دیر پڑا رہے تو پھٹ جاتا ہے، اس کا ذائقہ ترش اور بدمزہ ہو جاتا ہے اور اس میں سے بدبو آنے لگتی ہے۔ جنت میں دودھ تھنوں سے نہیں نکلے گا بلکہ پانی کی طرح چشموں سے رواں ہوگا اور اپنی اصلی حالت میں بدستور قائم رہے گا، اس کے ذائقے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

❹ **وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ :** "لَذَّةٍ" "لَذٌّ" کی مؤنث ہے، کیونکہ یہ "خَمْرٍ" کی صفت ہے جو مؤنث سماعی ہے۔ "لَذٌّ" اور "لَذِيْذٌ" دونوں صفت مشبہ ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ دنیا میں لوگ شراب صرف اس سرور کے لیے پیتے ہیں جو اس کے پینے سے حاصل ہوتا ہے اور وہ اس سرور کی خاطر شراب کی ان تمام قباحتوں کو برداشت کرتے ہیں جو اس میں پائی جاتی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں کہ وہ نہایت بدبودار ہوتی ہے، تلخ اور بدذائقہ ہوتی ہے۔ اس کے پینے سے آدمی عقل کھو بیٹھتا ہے، اُلٹیاں آتی ہیں اور جب نشہ ٹوٹتا ہے تو سر چکرانا اور درد شروع ہو جاتا ہے۔ جنت کی شراب میں دنیا کی شراب کی کوئی خرابی نہیں ہوگی، نہ دردِ سر، نہ چکر، نہ بدبو اور نہ ذائقے کی تلخی، بلکہ وہ نہایت لذیذ ہوگی اور فرحت و سرور لائے گی، عقل پر پردہ یا کوئی اور خرابی نہیں لائے گی۔

❺ **وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى :** دنیا کا شہد مکھی کے پیٹ سے نکلتا ہے، اسے حاصل کرتے وقت مکھیوں اور اس کے بچوں کے کچھ اجزا، موم، گرد و غبار اور تنکے وغیرہ لازماً شامل ہو جاتے ہیں، پھر دیر تک پڑا رہنے سے کھٹا ہو جاتا ہے، اس میں خمیر پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض اس کے پوری طرح صاف ہونے اور رہنے کی کوئی صورت ہی نہیں، جب کہ جنت کی نہروں کا شہد مکھیوں کے پیٹ کا مرہونِ منت نہیں بلکہ براہِ راست شہد کے سمندر سے نکل کر ہر جنتی کے گھر پہنچتا ہے اور ہمیشہ نہایت صاف شفاف اور ہر قسم کی کدورت سے پاک رہتا ہے۔

صاحب احسن التفاسیر لکھتے ہیں: "اگرچہ جنت میں کھانے پینے، پہننے، برتنے کی جتنی چیزیں ہیں ان کے فقط نام دنیا کی

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ⑮

سے بڑی بخشش ہے۔ (کیا یہ متقی لوگ) ان جیسے ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں اور جنھیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ ان کی انتڑیاں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا ⑮

چیزوں سے ملتے ہیں، لیکن جنت کی چیزوں اور دنیا کی چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً دنیا میں ایسا دودھ کہاں ہے جس کی ہمیشہ نہر بہتی ہو اور پھر دوسرے دن ہی وہ کھٹا نہ ہو جائے۔ وہ شہد کہاں ہے جس کی نہر بہتی ہو اور مکھیوں کی بھنکار اس میں جم جم کر نہ مرے اور ہوا سے خاک اور کوڑا کرکٹ اس پر نہ پڑے۔ وہ شراب کہاں ہے جس کی نہر ہو اور بدبو کے سبب اس نہر کے آس پاس کا راستہ کچھ دنوں میں بند نہ ہو جائے۔''

⑥ وَ لَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ : پینے کی چیزوں کے بعد کھانے کی چیزوں کا اختصار کے ساتھ ذکر فرمایا اور ان میں سے بھی اَناج وغیرہ کے بجائے پھلوں کا ذکر فرمایا، کیونکہ جنت کے کھانے بھوک مٹانے کے لیے نہیں بلکہ محض لذت کے لیے ہوں گے، فرمایا: ﴿ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۱۱۸ ] ''بے شک تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا۔'' اور لذت میں پھلوں کا مقام سب جانتے ہیں۔

⑦ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ : "مَغْفِرَةٌ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی یا عظیم مغفرت'' ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت یہ ہوگی کہ انھیں عظیم مغفرت سے نوازا جائے گا۔ "غَفَرَ يَغْفِرُ" کا اصل معنی پردہ ڈالنا ہے، یعنی جنت میں ان کے گناہوں پر ان کے رب کی طرف سے ایسا عظیم پردہ ڈالا جائے گا کہ ان کا ذکر تک ان کے سامنے نہیں آئے گا کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہوں۔

⑧ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ : یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو پچھلی آیت: ﴿ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴾ سے سمجھ میں آ رہا ہے: " أَيْ أَفَمَنْ هُوَ مِنْ أَهْلِ هٰذِهِ الْجَنَّةِ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ " ''یعنی تو کیا وہ شخص جو ان اوصاف والی جنت والوں میں سے ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو ہمیشہ آگ میں رہنے والا ہے؟''

⑨ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا : اور جنھیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ اس سے پہلے جملے " كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ " میں لفظ "مَنْ" کے مفرد ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ واحد کا صیغہ "هُوَ" استعمال ہوا ہے اور اس جملے میں "مَنْ" کے معنی کے عام ہونے کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمع کا صیغہ "سُقُوْا" استعمال ہوا ہے۔

⑩ فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ : "قَطَعَ يَقْطَعُ قَطْعًا" (ف) کاٹنا۔ " قَطَّعَ يُقَطِّعُ تَقْطِيْعًا " (تفعیل) میں مبالغہ ہے، ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ "اَمْعَآءَ" "مِعًى" کی جمع ہے جو اصل میں "مِعَيٌ" بروزن "عِنَبٌ" ہے۔ یاء پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے گرا

وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جنھیں علم دیا گیا ہے، کہتے ہیں ابھی اس نے کیا کہا تھا؟ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چل پڑے ﴿۱۶﴾

دیا، یاء اور نونِ تنوین دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے یاء کو گرا دیا تو "مِعًی" ہو گیا، جس کا تثنیہ "مِعْيَانِ" اور "مِعْيَيْنِ" آتا ہے۔ اس جیسا ایک اور لفظ "آنَاءٌ" ہے جو "إِنًى" کی جمع ہے۔ "آنَاءَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" "دن رات کی گھڑیاں۔" یعنی جہنمیوں کو انتہائی درجے کا گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

**آیت 16** ❶ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ: مشرکین اور ان کے انجامِ بد کے ذکر کے بعد اہلِ کتاب کفار اور کفار کی بدترین قسم منافقین کا ذکر فرمایا جو آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے، آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے، مگر ماننے کے لیے نہیں، بلکہ اپنی مفید مطلب باتیں ڈھونڈنے کے لیے، جن کے ساتھ وہ لوگوں کو اسلام سے بدظن کرتے۔ چونکہ ان کے دل و دماغ پر کفر حاوی تھا، قیامت پر ایمان وہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی باتیں اجنبی تھیں، ان کے دل میں وہ مفہوم بیٹھتا ہی نہیں تھا جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص ان کے خیال میں موہوم آخرت کے لیے اپنی دنیا کا نقصان بھی کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کی ساری تگ و دو ہی دنیا کے لیے ہو وہ پیغمبروں کی بات سمجھ ہی نہیں سکتا، جیسا کہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ﴿ يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ ﴾ [ھود: ۹۱] "اے شعیب! ہم اس میں سے بہت سی باتیں نہیں سمجھتے جو تو کہتا ہے۔"

❷ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ...... : "اُوْتُوا الْعِلْمَ" سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی ذات و صفات، اپنے پیغمبروں، اپنی کتابوں، اپنے فرشتوں، یوم آخرت اور تقدیر کے علم اور ان سب پر ایمان کی روشنی عطا فرما رکھی تھی۔ یعنی جب وہ آپ ﷺ کی مجلس سے نکلتے ہیں تو آپ کی باتوں کی تحقیر کرتے ہوئے اور ان کا مذاق اڑاتے ہوئے علم و ایمان سے آراستہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا کہ ابھی ابھی اس نے کیا کہا ہے، کیا آپ لوگوں کی سمجھ میں کچھ آیا ہے؟

❸ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ : فرمایا ان کے نہ سمجھنے کی دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ ان کے کفر پر اصرار اور عناد کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے، اس لیے وہ سمجھ سکتے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ [النساء: ۱۵۵] "اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر کر دی تو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم۔"

وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی وَّ اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ۝۱۷ فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰی لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ۝۱۸

اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت قبول کی اس نے انھیں ہدایت میں بڑھا دیا اور انھیں ان کا تقویٰ عطا کر دیا۝۱۷ تو وہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے قیامت کے کہ وہ ان پر اچانک آ جائے، پس یقیناً اس کی نشانیاں آ چکیں، پھر ان کے لیے ان کی نصیحت کیسے ممکن ہوگی، جب وہ ان کے پاس آ جائے گی۝۱۸

❹ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ : یہ نہ سمجھنے کی دوسری وجہ ہے کہ وہ کوئی عقلی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں، بلکہ صرف وہ کام کرنا چاہتے ہیں جو ان کی خواہش کے مطابق ہوں اور مرضی کے خلاف وہ کوئی پابندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب کسی کی یہ حالت ہو جائے تو فی الواقع اس کی خواہش کے خلاف کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، نہ ہی وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی اچھی ہو۔

**آیت 17** وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی ...... : یعنی وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چل پڑتے ہیں تو وہی باتیں ان کی ہدایت میں اضافے کا باعث بن جاتی ہیں جو منافقین کی سمجھ میں نہیں آتیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے انھیں مزید ہدایت عطا فرماتا ہے اور انھیں ان کاموں کی توفیق عطا فرماتا ہے جن کے ذریعے سے وہ جہنم کی آگ سے بچ جاتے ہیں۔

**آیت 18** ❶ فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً : یعنی کون سی نصیحت اور کون سی وعید ہے جو انھیں نہیں سنائی گئی اور کون سی دلیل ہے جو ان کے سامنے پیش نہیں کی گئی، مگر وہ اتنے بدبخت ہیں کہ جب تک قیامت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ایمان لانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے گویا اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ اچانک ان کے سامنے آ کھڑی ہو، نہ پہلے علم ہونے کی وجہ سے اس پر ایمان لا سکیں نہ اس کی تیاری کر سکیں۔

❷ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا : یعنی جس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں اس کے آنے میں دیر بھی کیا رہ گئی ہے، اس کی نشانیاں تو آ ہی چکی ہیں، اب اس کے آنے میں کیا شبہ باقی ہے؟ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''بڑی نشانی قیامت کی ہمارے نبی ﷺ کا پیدا ہونا ہے۔ سب نبی خاتم النبیین کی راہ دیکھتے تھے، جب وہ آ چکے تو قیامت ہی آنی رہ گئی ہے۔'' (موضح) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ )) [ بخاري، الرقاق، باب قول النبي ﷺ: " بعثت أنا والساعة كهاتين .... " : ٦٥٠٥ ] ''میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں جس طرح یہ دو (انگلیاں) ہیں۔'' یعنی جس طرح شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں اسی طرح قیامت میرے بعد متصل آ رہی ہے۔ قیامت کی بڑی نشانیوں میں سے شق قمر کی نشانی بھی رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ظاہر ہو چکی تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ [ القمر : ۱ ] ''قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔'' آلوسی نے فرمایا: ''ظاہر یہ ہے کہ ان نشانیوں سے

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ

پس جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن

وہی نشانیاں مراد ہیں جو اس آیت کے نزول کے وقت نمودار ہو چکی تھیں۔‘‘

③ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ : ’’ذِكْرٰىهُمْ‘‘ مبتدا ہے اور ’’فَاَنّٰى لَهُمْ‘‘ اسم استفہام خبر مقدم ہے۔ ’’فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ‘‘ (پھر جب وہ ان کے پاس آ گئی تو ان کے لیے ان کی نصیحت کیسے ممکن ہو گی)، ’’اِذَا جَآءَتْهُمْ‘‘ میں ’’جَاءَتْ‘‘ کا فاعل ’’السَّاعَة‘‘ کی ضمیر ہے۔ (التسہیل) یعنی جب ان کے پاس قیامت آ گئی تو نصیحت قبول کرنے یا مان لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ یہی بات اس آیت میں بیان ہوئی ہے: ﴿يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى﴾ [الفجر: ۲۳] ’’اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں۔‘‘ مزید دیکھیے سورۂ سبا (۵۱، ۵۲) اور سورۂ مومن (۸۴، ۸۵)۔

آیت 19 ① فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ : اس فاء کو فصیحہ (اظہار کرنے والی) کہتے ہیں، یعنی اس سے اس شرط کا اظہار ہوتا ہے جو گزشتہ کلام سے معلوم ہوتی ہے۔ اس آیت کا تعلق سورت کی گزشتہ تمام آیات کے ساتھ ہے، یعنی جب تم کفار اور ایمان والوں کا حال جان چکے اور یہ بھی کہ بھلائی اور کامیابی کا دارومدار توحید اور اطاعت پر ہے اور برائی اور ناکامی کا دارومدار شرک اور نافرمانی پر ہے تو یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ (ابو السعود) ابو العالیہ اور ابن عیینہ نے فرمایا کہ اس کا تعلق اس سے پہلی آیت کے ساتھ ہے، یعنی جب ان کے پاس قیامت آ گئی تو جان لو کہ اس کے قائم ہونے پر اللہ کے سوا بھاگنے یا پناہ حاصل کرنے کی کوئی جگہ نہیں (کیونکہ معبود برحق وہی ہے)۔ (بغوی)

② یہاں ایک سوال ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو اس حقیقت کو پہلے ہی جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَ أَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ أَنَا )) [ بخاري، الإيمان، باب قول النبي ﷺ : " أنا أعلمكم بالله ...... : ۲۰ ] ’’یقیناً میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا علم رکھنے والا ہوں۔‘‘ پھر یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ’’جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔‘‘ اہل علم نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں اور وہ سب درست ہیں۔ ایک یہ کہ ’’فَاعْلَمْ‘‘ کے مخاطب اگرچہ بظاہر رسول اللہ ﷺ ہیں مگر خطاب امت کے ہر فرد کو ہے۔ دلیل اس کی آیت کے آخری الفاظ ہیں جن میں صراحتاً سب کو مخاطب فرمایا ہے: ﴿وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ﴾ ’’اور اللہ تمھارے چلنے پھرنے کو اور تمھارے ٹھہرنے کو جانتا ہے۔‘‘ جیسا کہ سورۂ طلاق کے شروع میں فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ [الطلاق: ۱] ’’اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے، نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ کوئی

مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾

عورتوں کے لیے بھی اور اللہ تمھارے چلنے پھرنے اور تمھارے ٹھہرنے کو جانتا ہے ﴿۱۹﴾

کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔''

دوسرا جواب یہ ہے کہ ''فَاعْلَمْ'' کا معنی یہ ہے کہ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کے علم پر ثابت اور قائم رہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ﴾ [النساء: ۱۳٦] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی۔'' اکثر مفسرین نے یہاں ''فَاعْلَمْ'' کا یہی معنی بیان فرمایا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ کسی حقیقت کے علم کی ابتدا اس کی معرفت سے ہوتی ہے کہ دل اسے جان لے، پھر اس کے یقین کا مرتبہ آتا ہے اور اس علم کی تکمیل اس سے ہوتی ہے کہ اس کے تقاضے کے مطابق عمل کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی معرفت اور اس کا یقین حاصل کرو اور اس کے تقاضوں پر عمل کرو۔ ظاہر ہے کہ علم اور یقین کے بے شمار درجے ہیں اور عمل کے لحاظ سے درجوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا قول: ﴿ وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ﴾ [البقرۃ: ۲٦۰] (اور لیکن اس لیے کہ میرا دل پوری تسلی حاصل کر لے) اس کی دلیل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا: ﴿ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۱٤] ''اور تو کہہ اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔'' اور کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم — کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

''جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو لرز جاتا ہوں، کیونکہ میں ''لا الٰہ'' کی مشکلات کو جانتا ہوں۔''

سورۂ نساء کی آیت (۱۳٦): ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اپنے ایمان کے تقاضے کے مطابق عمل کرو۔ خلاصہ یہ کہ ہر لمحے ''لا الٰہ الا اللہ'' کی معرفت، اس کے یقین اور اس پر عمل میں اضافے کی کوشش کرتے رہو۔ چوتھا یہ کہ ہر وقت اس حقیقت کو یاد اور نظر کے سامنے رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، گویا ''اِعْلَمْ'' بمعنی ''اُذْكُرْ'' ہے۔

③ اس آیت سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ہر قول اور عمل سے پہلے علم کا حصول لازم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ﴾ [الحدید: ۲۰] ''جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل ہے۔'' اس کے بعد فرمایا: ﴿ سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ﴾ [الحدید: ۲۱] ''اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔'' اور امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں فرمایا: ''بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ لِقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى :

﴿ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ" [ بخاري، العلم، قبل ح : ٦٨ ] ''علم مقدم ہے قول اور عمل پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورۂ محمد میں ) فرمایا: ''پس تو جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' اس آیت میں اللہ نے علم کو پہلے بیان کیا ہے۔''

④ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ : قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے استغفار کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے رہے اور امت کو بھی اس کی تاکید فرماتے رہے۔ چنانچہ اس سے متعلق یہاں دو احادیث نقل کی جاتی ہیں، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: « اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ وَجَهْلِيْ وَ إِسْرَافِيْ فِيْ أَمْرِيْ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ جِدِّيْ وَهَزْلِيْ وَخَطَئِيْ وَعَمْدِيْ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ » [ مسلم، الذكر و الدعاء، باب في الأدعية : ٢٧١٩ ] ''اے اللہ! میری خطا کو، میرے جہل کو، میرے کام میں میری زیادتی کو اور ان تمام گناہوں کو میرے لیے بخش دے جنھیں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اے اللہ! میرے سنجیدگی سے کیے ہوئے کاموں کو، میرے مذاق سے کیے ہوئے کاموں کو، میرے بھول کر کیے ہوئے اور جان بوجھ کر کیے ہوئے گناہوں کو میرے لیے بخش دے اور یہ سب میرے پاس موجود ہیں۔ اے اللہ! تو مجھے وہ سب گناہ بخش دے جو میں نے پہلے کیے اور جو میں نے بعد میں کیے اور جو چھپا کر کیے اور جو علانیہ کیے اور جنھیں تو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے۔ تو ہی آگے کرنے والا ہے اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے اور تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔'' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: « وَاللّٰهِ! إِنِّيْ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ أَتُوْبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً » [ بخاري، الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة: ٦٣٠٧ ] ''اللہ کی قسم! میں دن میں ستر (۷۰) بار سے زیادہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔''

⑤ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ : یہ حکم نبی ﷺ کو بھی ہے اور امت کے تمام افراد کو بھی کہ وہ اپنے علاوہ دوسرے تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی استغفار کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان والوں پر اپنے مومن بھائیوں کے لیے استغفار واجب ہے۔ پہلے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی عمل رہا ہے، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے دعا کی: ﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴾ [ نوح : ٢٨ ] ''اے میرے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اس کو جو مومن بن کر میرے گھر میں داخل ہو اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو اور ظالموں کو ہلاکت کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا۔'' اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾ [ إبراهيم : ٤١ ] ''اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہوگا۔''

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ﴿۲۰﴾

**اور وہ لوگ جو ایمان لائے کہتے ہیں کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی؟ پھر جب کوئی محکم سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں لڑائی کا ذکر کیا جاتا ہے تو تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں بیماری ہے، وہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے جیسے اس شخص کا دیکھنا ہوتا ہے جس پر موت کی غشی ڈالی گئی ہو۔ پس ان کے لیے بہتر ہے ﴿۲۰﴾**

6 اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور تمام ایمان والوں کو مومن مردوں اور عورتوں کے لیے استغفار کا جب خود حکم دیا تو یہ دلیل ہے کہ وہ اسے قبول بھی فرمائے گا۔ ظاہر ہے کہ ہر مومن، مرد ہو یا عورت، زندہ ہو یا فوت شدہ، استغفار کی ان دعاؤں میں شامل ہے جو رسول اللہ ﷺ سے لے کر امت کے آخری آدمی نے ایمان والوں کے حق میں کی ہیں اور جس کے حق میں نبی کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے بے شمار مقبول بندوں کی مغفرت کی دعائیں ہوتی ہوں اس کی مغفرت سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے کسی بھی مومن کے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ وہ جہنمی ہے، یا اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کرے گا، خواہ وہ کتنا زیادہ گناہ گار ہو۔ شرط یہ ہے کہ وہ ایمان کی دولت اپنے دامن میں رکھتا ہو اور شرک کی نجاست سے آلودہ نہ ہو۔

7 **وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ** : "مُتَقَلَّبٌ" اور "مَثْوٰى" "تَقَلَّبَ يَتَقَلَّبُ" (تفعّل) اور "ثَوٰى يَثْوِيْ" (ض) سے مصدر میمی بھی ہو سکتے ہیں اور ظرف مکان بھی۔ پہلی صورت میں معنی ہے تمھارا چلنا پھرنا اور تمھارا ٹھہرنا اور دوسری صورت میں معنی ہے "تمھارے چلنے پھرنے کی جگہ اور تمھارے ٹھہرنے کی جگہ۔" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری نقل و حرکت کو اور تمھارے ٹھہرنے کو اور تمھارے چلنے پھرنے کے اور تمھارے ٹھہرنے کے مقامات کو خوب جانتا ہے۔ اس میں کفار اور نافرمانوں کے لیے وعید ہے اور اللہ کے فرماں بردار بندوں کے لیے بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری جائز یا ناجائز ہر حرکت و سکون سے واقف ہے اور واقف ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ فرماں برداروں کو انعام دے گا اور نافرمانوں کو سزا دے گا۔

**آیت 20** 1 **وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ**: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور ایمان والوں کا حال ان آیات کو سننے کے وقت فرمایا جو توحید، قیامت اور دوسرے اعتقادی معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ "**وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ**" میں منافقین کا حال بیان فرمایا اور "**وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى**" میں ایمان والوں کا حال بیان فرمایا۔ اب عمل سے تعلق رکھنے والی آیات مثلاً جہاد، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق ان کا طرز عمل بیان فرمایا۔ وہ یہ کہ مخلص مومن ہمیشہ ایسے کاموں کے بارے میں وحی کے نزول کے منتظر اور امیدوار رہتے، تاکہ ان پر عمل کر کے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں، جب اس کے نزول میں تاخیر ہوتی تو کہتے کہ ایسی کوئی آیت یا سورت کیوں نازل نہیں کی گئی اور منافقین کا یہ حال تھا کہ جب مشقت والی ایسی کوئی سورت یا آیت اترتی تو ان پر بہت شاق گزرتی، خصوصاً جہاد کا ذکر آنے پر تو خوف

طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿۲۱﴾

حکم ماننا اور اچھی بات کہنا، پھر جب حکم لازم ہو جائے تو اگر وہ اللہ سے سچے رہیں تو یقیناً ان کے لیے بہتر ہو ﴿۲۱﴾

اور دہشت کے مارے ان کی آنکھیں کھلی رہ جاتیں۔

**2 وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ :** ہجرت کے بعد اگرچہ سورۂ حج کی آیت (۳۹): ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾ (ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا) کے ساتھ کفار سے قتال کی اجازت ہو چکی تھی، مگر اس کی فرضیت کا واضح حکم ابھی نہیں آیا تھا۔ مخلص مومن جو کفار کے ظلم و ستم سے شدید تنگ دل تھے اور فتح یا شہادت کے متمنی تھے، کہتے رہتے تھے کہ جہاد کے حکم والی کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی۔

**3 فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ :** محکم سورت سے مراد ایسی سورت ہے جس میں دیا جانے والا حکم واضح ہو، جس میں کوئی تاویل نہ کی جا سکے اور نہ وہ منسوخ ہو۔ مراد اس سے یہی سورۂ محمد (ﷺ) ہے جس کا نام سورۂ قتال بھی ہے، کیونکہ اس میں "جَاهِدُوْا" (جہاد کرو) یا "قَاتِلُوْا" (لڑو) کے بجائے قتال کا حکم "**فَضَرْبَ الرِّقَابِ**" کے بالکل صریح الفاظ کے ساتھ دیا گیا کہ کفار سے مڈ بھیڑ ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو اور خوب خون ریزی کے بعد انھیں قیدی بناؤ وغیرہ۔

**4 رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ...... :** یعنی جب قتال کے واضح حکم والی سورت نازل کی گئی تو منافقین کا یہ حال ہوا۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''مسلمان سورت مانگتے تھے، یعنی کافروں کی ایذا سے عاجز ہو کر آرزو کرتے کہ اللہ جہاد کا حکم دے تو جو ہم سے ہو سکے کر گزریں۔ جب جہاد کا حکم آیا تو منافق اور کچے لوگوں پر بھاری ہوا، خوف زدہ اور بے رونق آنکھوں سے پیغمبر کی طرف دیکھنے لگے کہ کاش! ہم کو اس حکم سے معاف رکھیں۔ بے حد خوف میں بھی آنکھ کی رونق نہیں رہتی، جیسے مرتے وقت آنکھوں کا نور جاتا رہتا ہے۔'' (موضح) اس مضمون کی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۷۷) اور سورۂ احزاب (۱۹)۔

**5 فَاَوْلٰى لَهُمْ :** مفسرین نے اس لفظ کی مختلف تفسیریں کی ہیں جن میں سب سے واضح اور تکلف سے خالی یہ ہے کہ یہ "وَلِيَ يَلِيْ وَلْيًا" (ض) سے اسم تفضیل ہے، جس کا معنی ہے زیادہ لائق، زیادہ قریب، بہتر۔ اب اس کی ترکیب دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو اس سے پہلے جملے سے معلوم ہو رہا ہے، یعنی "فَالْمَوْتُ اَوْلٰى لَهُمْ" ''پس موت ہی ان کے لیے بہتر ہے، یا موت ہی ان کے لائق ہے۔'' دوسری تفسیر حافظ ابن کثیر نے فرمائی ہے کہ "**فَاَوْلٰى لَهُمْ**" خبر مقدم ہے اور اگلی آیت میں "**طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ**" مبتدا مؤخر ہے۔ ان کے الفاظ میں عبارت یوں ہے: " طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ اَوْلٰى لَهُمْ، أَيْ وَكَانَ الْاَوْلٰى لَهُمْ اَنْ يَّسْمَعُوْا وَ يُطِيْعُوْا " یعنی ان کے لیے بہتر تھا کہ وہ سنتے اور اطاعت کرتے۔

**آیت 21** **1 طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ :** اس کا تعلق یا تو پچھلی آیت کے آخری لفظ "**فَاَوْلٰى لَهُمْ**" کے ساتھ ہے، جیسا کہ گزرا اور اگر اسے نیا جملہ سمجھا جائے تو اس کی ترکیب دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر "خَيْرٌ لَّهُمْ" محذوف ہے، یعنی حکم ماننا اور اچھی بات کہنا ان کے لیے بہتر ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ مبتدا محذوف "اَمْرُنَا" کی خبر ہے، یعنی وہ

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾

**پھر یقیناً تم قریب ہو اگر تم حاکم بن جاؤ کہ زمین میں فساد کرو اور اپنے رشتوں کو بالکل ہی قطع کر دو ﴿۲۲﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی۔ پس انھیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں ﴿۲۳﴾**

کہتے ہیں کہ ہمارا کام تو اطاعت کرنا اور اچھی بات کہنا ہے۔

2 فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ …… : یعنی کہتے تو وہ یہی ہیں کہ ہمارا کام "سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا" یعنی حکم ماننا اور اچھی بات کہنا ہے، مگر جب جہاد کا قطعی اور لازمی حکم آ جائے تو وہ اپنی بات میں جھوٹے نکلتے ہیں، اگر وہ اس وقت اپنی بات میں اللہ سے سچے رہیں تو یقیناً ان کے لیے بہتر ہے۔

**آیت 22** فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ …… : "هَلْ" کے معنی کی تحقیق کے لیے دیکھیے سورۂ دہر کی پہلی آیت: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ کی تفسیر۔ یہاں یہ "قَدْ" (یقیناً) کے معنی میں ہے۔ "عَسَيْتُمْ" تم قریب ہو، تم سے امید ہے۔ "تَوَلَّيْتُمْ" یا تو "تَوَلَّى الْوِلَايَةَ" سے ہے، حاکم یا صاحب اقتدار ہونا، یا "تَوَلّٰى عَنْهُ" سے ہے، منہ موڑنا، اعراض کرنا۔ اگر حاکم ہونے سے ہو تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ طاعت اور قول معروف اختیار کرو، کیونکہ اگر تم اسی نفاق کی حالت میں حکومت پر متمکن ہو جاؤ تو یقیناً تم قریب ہو کہ ایمان سے خالی ہونے کی وجہ سے اسلام سے پہلے والی حالت کی طرف پلٹ جاؤ گے، اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرنے کے لیے زمین میں فساد کرو گے اور اپنی رشتہ داریاں بری طرح قطع کر دو گے۔ اور اگر "تَوَلَّيْتُمْ" کا معنی اعراض اور منہ موڑنا ہو تو مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ جب جہاد کا حکم قطعی اور لازمی ہو جائے تو اپنا صدق ثابت کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، کیونکہ اگر تم نے جہاد سے منہ موڑا تو ہرگز امن و امان سے نہیں رہو گے، بلکہ نافرمانی اور قطع رحمی کرو گے، جس کے نتیجے میں خانہ جنگی، نافرمانی اور لوٹ مار کی وہی حالت لوٹ آئے گی جو اسلام سے پہلے تھی۔ "تُقَطِّعُوْۤا" (تفعیل) میں مبالغہ ہے، یعنی تم اپنی رشتہ داریاں بری طرح قطع کرو گے، یا بالکل قطع کر دو گے۔

**آیت 23** اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ …… : یعنی یہ لوگ جو قریب تھے کہ حکومت میں آ جائیں تو اندھے بہرے ہو کر ظلم و فساد پھیلائیں اور قطع رحمی کرنے لگیں، یا قریب تھے کہ اطاعت اور جہاد سے منہ موڑیں تو زمین میں فساد پھیلائیں اور رشتہ داریوں کو بری طرح قطع کر دیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی اور انھیں ایسا بہرا، اندھا اور سنگ دل بنا دیا کہ وہ جہاد کی برکات سمجھ ہی نہ سکے کہ اس کی بدولت مسلمانوں کی پریشانیاں اور مصیبتیں ختم ہوتی ہیں، انھیں عزت اور سر بلندی ملتی ہے، فتنہ وفساد اور شرک و کفر ختم ہوتا ہے اور زمین امن کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ [ المنافقون : ۳ ] "یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا تو

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝۲۴ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ۝۲۵ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝۲۶

تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا کچھ دلوں پر ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں؟ ۝۲۴ بے شک وہ لوگ جو اپنی پیٹھوں پر پھر گئے، اس کے بعد کہ ان کے لیے سیدھا راستہ واضح ہو چکا، شیطان نے ان کے لیے (ان کا عمل) مزین کر دیا اور ان کے لیے مہلت لمبی بتائی ۝۲۵ یہ اس لیے کہ انھوں نے ان لوگوں سے کہا جنھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی، عنقریب ہم بعض کاموں میں تمھارا کہا مانیں گے اور اللہ ان کے چھپانے کو جانتا ہے ۝۲۶

ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، سو وہ نہیں سمجھتے۔''

**آیت 24** اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ...... : اوپر کی آیت کے سیاق کو ملحوظ رکھا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ ملعون ہونے کی وجہ سے یا تو قرآن پر غور و تدبر ہی نہیں کرتے، یا کرتے ہیں تو اس کے معانی و مطالب ان کی سمجھ میں نہیں آتے، کیونکہ ان کے دلوں پر کفر و نفاق کے قفل چڑھے ہوتے ہیں۔ ہاں، اگر صدقِ نیت سے غور کرتے تو ضرور سمجھ لیتے کہ جہاد میں کس قدر دنیوی اور اخروی فوائد ہیں۔

**آیت 25** ➊ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ ...... : ان سے مراد منافقین ہی ہیں جنھوں نے راہِ حق واضح ہونے اور اسلام کا اقرار کرنے کے بعد جہاد سے گریز کرتے ہوئے کفر و ارتداد کی راہ اختیار کی۔

➋ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ : یعنی شیطان نے ان کے لیے ان کے کفر و ارتداد اور جہاد سے فرار کو خوش نما بنا دیا اور ان کے لیے مہلت لمبی بتائی، یعنی ان کے دلوں میں ڈال دیا کہ اگر جہاد نہ کرو گے تو لمبی مدت تک زندہ رہو گے اور دنیا کے عیش و آرام سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ شیطان کا کام ہی خواہش اور آرزوئیں دلا کر گمراہ کرنا ہے۔ (دیکھیے نساء : ۱۱۹، ۱۲۰) حالانکہ انھیں سمجھنا چاہیے تھا کہ موت اپنے وقت پر آتی ہے، اس میں لحہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، پھر جہاد سے بھاگنے کا کیا فائدہ؟

**آیت 26** ➊ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ : "لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ" سے مراد کفار ہیں، جیسا کہ اسی سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ﴾ [محمد : ۹] ''یہ اس لیے کہ انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

➋ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ : بعض کاموں سے مراد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور عداوت ہے اور یہ کہ جب جنگ کا موقع آئے مسلمانوں کو دھوکا دیا جائے اور ہر طریقے سے ان کے دشمنوں کی مدد کی جائے۔ یعنی ان کے ایمان قبول کرنے کے

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع

**تو کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے، ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوں گے ﴿۲۷﴾ یہ اس لیے کہ انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے ﴿۲۸﴾**

بعد کفر و ارتداد کی طرف پلٹنے، جہاد سے فرار اور منافقت اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ دوسرے مخلص مسلمانوں کی طرح وہ تمام کاموں میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والے کفار سے کہا کہ ہم اسلام قبول کرنے اور مسلمانوں میں رہنے کی وجہ سے تمھاری ہر بات نہیں مان سکتے، نہ کھلم کھلا اپنے کفر کا اظہار کر سکتے ہیں، مگر ہم کچھ کاموں میں تمھاری اطاعت ضرور کریں گے۔ وہ اس طرح کہ جنگ کے موقع پر تمھاری مدد کریں گے، جیسا کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی اُحد کے موقع پر عین میدانِ جنگ سے تین سو آدمیوں کو واپس لے گیا اور جس طرح منافقین نے بنو نضیر کے یہودیوں کو تسلی دی کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ڈٹے رہو، اگر تمھیں نکالا گیا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمھارے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ دیکھیے سورۂ حشر (۱۱)۔

❸ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ : اور اللہ تعالیٰ ان کی سرگوشیوں اور سازشوں کو جو وہ چھپ کر کرتے ہیں خوب جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ انھیں اس کی سزا ضرور دے گا۔ اس آیت کا مضمون سورۂ نساء کی آیت (۸۱) میں بھی بیان ہوا ہے۔

**آیت 28،27** ❶ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ...... : یعنی دنیا میں تو انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار کا ساتھ اس لیے دیا کہ کفر و اسلام کی جنگ میں دونوں جانب سے مفادات حاصل کر سکیں، اپنے آپ کو جنگ کے نقصانات اور خطرات سے بچائیں اور اپنے چہروں اور پیٹھوں کو تیر و تلوار کی مار سے بچائے رکھیں، مگر مرتے وقت ان کے چہروں اور پیٹھوں کو فرشتوں کی مار سے کون بچائے گا؟

❷ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ : یعنی وہ تمام اعمال جو مسلمان بن کر وہ انجام دیتے رہے، مثلاً ان کی نماز، ان کے روزے، زکوٰۃ اور تمام عبادتیں جو بظاہر نیکیاں تھیں، اللہ تعالیٰ نے برباد کر دیے، کیونکہ یہ سب کچھ تب قبول ہوتا جب وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ہوتا۔ جب اسلام اور مسلمانوں سے بے وفائی اور غداری کر کے وہ چل ہی اس راستے پر پڑے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہی پسند نہ رہا تو ان کے نماز روزے، صدقات اور دوسری نیکیوں سے کیا حاصل۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

یا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں کوئی بیماری ہے، یہ خیال کر لیا ہے کہ اللہ ان کے کینے کبھی ظاہر نہیں کرے گا ﴿۲۹﴾ اور اگر ہم چاہیں تو ضرور تجھے وہ لوگ دکھا دیں، پھر یقیناً تو انھیں ان کی نشانی سے پہچان لے گا اور تو انھیں بات کے

آیت 29 اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ...... : ’’ أَضْغَانٌ ‘‘ ’’ضِغْنٌ‘‘ کی جمع ہے، شدید کینہ، مراد اس سے وہ شدید حسد اور عداوت ہے جو منافقین رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف دلوں میں رکھتے تھے۔ یعنی کیا ان منافقین نے گمان کر رکھا ہے کہ انھوں نے اپنے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو شدید حسد اور بغض کی بے شمار باتیں چھپا رکھی ہیں اللہ تعالیٰ انھیں ظاہر نہیں کرے گا اور ان پر پردہ ہی پڑا رہے گا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے خبثِ باطن کو ضرور ظاہر کرے گا۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں منافقین کی سازشوں، عداوتوں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی زہریلی باتوں کو ’’ وَمِنْهُمْ ‘‘، ’’ وَمِنْهُمْ ‘‘ کہہ کر اس طرح کھول کر رکھ دیا کہ ان کی پہچان میں کوئی مشکل باقی نہ رہی۔ اس لیے سورۂ توبہ کا نام سورۂ فاضحہ یعنی منافقین کو رسوا کرنے والی سورت بھی ہے۔

آیت 30 ① وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ : ’’سِيْمَا‘‘ علامت۔ پچھلی آیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ منافقین کی دلی عداوتوں اور ان کے نفاق کو ظاہر کر دے گا۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر اس نے منافقین کا نام لے کر یا ان پر کوئی علامت لگا کر انھیں کیوں ظاہر نہیں کیا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ اس کی وجہ منافقین کا خوف یا کوئی اور خطرہ نہیں بلکہ محض ہماری مشیّت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات لفظ ’’ لَوْ ‘‘ کے ساتھ بیان فرمائی ہے، جس کا استعمال ایسی شرط کے لیے ہوتا ہے جو واقع نہیں ہوتی، اس لیے اس کی جزا بھی واقع نہیں ہوتی۔ یعنی اگر ہم چاہتے تو ہر منافق کا نام لے کر یا اس پر خاص نشانی لگا کر اسے شخصی طور پر آپ کو دکھا دیتے، جس کے ساتھ آپ ان سب کو صاف پہچان لیتے، مگر ہم نے یہ چاہا نہ کوئی ایسی علامت مقرر کر کے شخصی طور پر آپ کو ان کی پہچان کروائی، کیونکہ ہماری مصلحت و حکمت اور ہمارے ستر و حلم کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو اس طرح رسوا نہ کیا جائے کہ کوئی توبہ کرنا چاہے تو نہ کر سکے، کیونکہ ہمارے ہاں منافقین کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [ الأحزاب : ۲٤ ] ’’تا کہ اللہ سچوں کو ان کے سچ کا بدلا دے اور منافقوں کو عذاب دے اگر چاہے، یا ان کی توبہ قبول فرمائے۔ بلاشبہ اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔‘‘ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ بھی حکمت تھی کہ لوگ ظاہر کے مطابق فیصلہ کریں اور باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔

② وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ : ’’ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ ‘‘ تاکید کا لام اور نون ثقیلہ قسم کے جواب میں آتا ہے، یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ

## اَعۡمَالَكُمۡ ۝۳۰

**انداز سے ضرور ہی پہچان لے گا اور اللہ تمھارے اعمال جانتا ہے ۝۳۰**

نے آپ ﷺ کو منافقین کا نام لے کر یا ان کے چہروں پر کوئی نشانی لگا کر ان کی اطلاع نہیں دی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ انھیں بالکل نہیں پہچانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا کہ آپ ان کی بات کے لہجے اور انداز سے یقیناً انھیں پہچان لیں گے۔ سورۂ توبہ میں منافقین کے بہت سے اقوال و احوال اور افعال ذکر فرمائے ہیں جن سے ان کی شناخت میں کچھ مشکل پیش نہیں آتی۔ ایسی ہی باتوں کا حوالہ دے کر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو عبد اللہ بن اُبی کا جنازہ پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کی قبر پر کھڑے ہونے سے صراحت کے ساتھ منع فرما دیا۔ منافقین کی یہ پہچان بھی اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر یا ان پر نشانی لگا کر نہیں کروائی بلکہ بلا عذر جنگ تبوک سے پیچھے رہنے کو ان کی شناخت بنا دیا۔ چنانچہ جہاں ان پر جنازہ پڑھنے یا ان کی قبر پر کھڑا ہونے سے منع فرمایا ہے اس سے پہلے ان کا جرم بیان فرمایا ہے: ﴿ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ﴾ [ التوبة : ۸۱ ] ”وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اللہ کے رسول کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور انھوں نے کہا اس گرمی میں مت نکلو۔“ پھر فرمایا: ﴿ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ [ التوبة : ۸۳، ۸۴ ] ”پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے، پھر وہ تجھ سے (جنگ کے لیے) نکلنے کی اجازت طلب کریں تو کہہ دے تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے۔ بے شک تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے، سو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔“ منافقین کی ایسی ہی حرکتوں اور باتوں سے رسول اللہ ﷺ کو ان کی پہچان ہو جاتی تھی اور کئی مواقع پر آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بعض منافقین کے بارے میں آگاہ بھی فرمایا۔ صحیح مسلم کی ”كِتَابُ صِفَاتِ الْمُنَافِقِيْنَ وَ أَحْكَامِهِمْ“ میں مذکور احادیث میں ایسے کئی منافقین کا ذکر ہے۔

③ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو بعض منافقوں کے بارے میں جو آگاہ فرمایا مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے اس کی اور توجیہ فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اس آیت کے نزول تک آں حضرت ﷺ کو منافقین کی تشخیص کا علم نہ تھا، بعد اس کے کرایا گیا، جیسا کہ

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا۠ اَخْبَارَكُمْ ۝۳۱ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝۳۲

اور ہم ضرور ہی تمھیں آزمائیں گے، یہاں تک کہ تم میں سے جہاد کرنے والوں کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں اور تمھارے حالات جانچ لیں ۝۳۱ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول کی مخالفت کی، اس کے بعد کہ ان کے لیے سیدھا راستہ صاف ظاہر ہو گیا، وہ ہرگز اللہ کا کچھ نقصان نہ کریں گے اور عنقریب وہ ان کے اعمال ضائع کر دے گا ۝۳۲

حدیثوں سے ثابت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت حذیفہ صحابی کو بتا دیا تھا۔'' (تفسیر ثنائی)

❹ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ : یعنی ممکن ہے بندوں کو کسی کے نفاق کا علم نہ ہو سکے مگر اللہ تعالیٰ تمھارے سب کام جانتا ہے، اس سے کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی۔

**آیت 31** ❶ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ ...... : یہ مسلمانوں سے عام خطاب ہے کہ منافقوں کے ذکر سے یہ خیال نہ کرنا کہ تم امتحان سے مستثنیٰ ہو۔ ہرگز نہیں، بلکہ ہم ہر حال میں مختلف احکام کے ساتھ تمھاری آزمائش کریں گے، حتیٰ کہ تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لیں اور تمھارے حالات کی خوب جانچ پڑتال کر لیں۔

❷ یہاں ایک سوال ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح گزشتہ اور موجودہ کاموں کا علم ہے وہ ان کاموں کو بھی جانتا ہے جو آئندہ ہونے والے ہیں، پھر اس بات کا کیا مطلب کہ یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لیں؟ حافظ ابن کثیر نے فرمایا: ''مراد یہ ہے کہ ہم اس بات کا واقع ہونا جان لیں۔ اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس جیسے الفاظ کے بارے میں فرمایا کہ ''نَعْلَمَ'' کا معنی ''نری'' ہے، یعنی حتیٰ کہ ہم دیکھ لیں۔'' (ابن کثیر) یعنی بے شک اللہ تعالیٰ پہلے جانتا ہے کہ آئندہ کیا ہو گا، مگر یہ بات کہ وہ کام واقع ہو چکا ہے اس کے علم میں اسی وقت آتی ہے جب وہ کام واقع ہو اور اس وقت ہی وہ اس کے واقع ہونے کو جانتا اور دیکھتا ہے۔ جو کام واقع ہی نہیں ہوا اس کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ واقع ہو چکا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۴۲)۔

**آیت 32** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : یعنی منافقین اور یہود جنھیں یہ معلوم ہو چکا کہ آپ ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کی بشارتیں موجود ہیں مگر انھوں نے ضد اور عناد کی وجہ سے آپ کی مخالفت کی، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، نہ اللہ کے رسول اور اللہ کے بندوں کا کچھ نقصان کر سکیں گے، بلکہ وہ سراسر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، کیونکہ اپنے خیال میں وہ جو اچھے کام کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں برباد کر دے گا اور

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾

**اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور اس رسول کا حکم مانو اور اپنے اعمال باطل مت کرو ﴿۳۳﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، پھر اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے تو انھیں اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا ﴿۳۴﴾**

مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنے کے لیے وہ جو سازشیں اور منصوبے تیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں ناکام بنا دے گا۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی پہلی آیت میں "اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ" کی تفسیر۔

**آیت 33** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ...... : یعنی اعمال کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند رہے۔ اگر کوئی شخص اطاعت سے نکل کر مخالفت پر اتر آئے اور دشمنوں کے ساتھ ساز باز شروع کر دے تو اس کے سارے اعمال باطل ہیں، خواہ وہ اپنے خیال میں کتنے اچھے عمل کرتا رہے، جیسا کہ منافقین تھے کہ انھوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اور عہدِ اطاعت کے بعد مخالفت کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں آیت سے یہی مراد ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی منافقین کا ذکر ہے اور بعد میں بھی۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہوا: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی طرح اپنے اعمال باطل مت کرو جن کے اعمال ان کے کفر اور اللہ کے راستے سے روکنے اور رسول کی مخالفت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے برباد کر دیے۔'' آیت کا یہ مطلب نہیں کہ اگر آدمی کسی نافرمانی یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کے پہلے تمام اعمال باطل ہو گئے، کیونکہ یہ اس آیت کے خلاف ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ٤٨] ''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا اور جو اللہ کا شریک بنائے تو یقیناً اس نے بہت بڑا گناہ گھڑا۔'' ہاں، آیت کا یہ مطلب ضرور ہو سکتا ہے کہ ہر عمل جس میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہ ہو اور وہ ان کے بتائے ہوئے طریقے پر نہ ہو وہ باطل ہے، کیونکہ عمل کی قبولیت کے لیے اخلاص اور اتباعِ سنت شرط ہے، جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ )) [ مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة و رد محدثات الأمور : ١٨/ ١٧١٨ ] ''جو شخص وہ عمل کرے جس پر ہمارا عمل نہیں وہ مردود ہے۔'' بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ بات نکالی ہے کہ کوئی نفلی عمل، نماز ہو یا روزہ یا کوئی اور، اگر شروع کرے تو اسے پورا کرنا واجب ہے، کیونکہ اگر اسے پہلے چھوڑ دے گا تو اس نے عمل باطل کر دیا مگر یہ بات درست نہیں نہ آیت سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ نفل پہلے بھی نفل ہوتا ہے بعد میں بھی۔ جس کا شروع کرنا واجب نہیں اسے پورا کرنا بھی واجب نہیں۔ تفصیل امہات الکتب میں دیکھیں۔

**آیت 34** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : اس آیت میں کفار و منافقین کے لیے ترغیب ہے کہ کفر و

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ

پس نہ کمزور بنو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی سب سے اونچے ہو اور اللہ تمھارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تم

نفاق اور اسلام کی مخالفت سے مرنے سے پہلے پہلے توبہ کر لو تو اللہ تعالیٰ تمھارے گزشتہ گناہ معاف کر دے گا، ورنہ اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو تمھاری بخشش کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں دہرائی ہے، دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۱)، بقرہ (۱۶۱، ۱۶۲، ۲۱۷) اور سورۂ نساء (۱۸)۔

**آیت 35** ① **فَلَا تَهِنُوْا:** "**فَلَا تَهِنُوْا**" کی فاء فصیحہ کہلاتی ہے۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۹): ﴿ **فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** ﴾ کی تفسیر۔ یعنی جب تم منافقین کا جہاد سے فرار اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس سے روکنا، کفار کے ساتھ دوستی اور اسلام اور مسلمانوں سے بے وفائی کرنا، رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنا، اس کے نتیجے میں ان پر لعنت ہونا اور ان کے اعمال برباد ہونا جان چکے تو تم وہ کام نہ کرنا جن کے نتیجے میں ان کا یہ انجام ہوا۔

② **فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ:** منافقین چونکہ بزدلی اور موت کے خوف کی وجہ سے جنگ کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اس لیے صلح اور سمجھوتے کی باتیں بہت کرتے تھے، وہ مسلمانوں کو بھی مشورہ دیتے رہتے تھے کہ جنگ کے بجائے صلح سے معاملات طے کرنے چاہییں۔ حالانکہ ان کی صلح جوئی کے پیچھے ان کی بے ہمتی، بزدلی اور کمزوری کے سوا کچھ نہیں تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی راہ اختیار کرنے سے منع فرما دیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ آیات اس زمانے میں نازل ہوئیں جب مدینہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، جس میں مہاجرین و انصار کی مٹھی بھر جماعت اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھی اور اس کا مقابلہ صرف عرب کے سب سے طاقتور قبیلے قریش کے ساتھ نہیں تھا بلکہ پورے عرب کے کفار و مشرکین اور یہود کے ساتھ تھا۔ اس حالت میں فرمایا کہ ہمت ہار کر دشمنوں سے صلح کی درخواست مت کرو، بلکہ سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ بدر و احد اور خندق میں تعداد کی کمی، بے حد کمزوری اور بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں نے نہ ہمت ہاری، نہ کمزوری دکھائی، نہ صلح کی پیش کش کی، بلکہ ڈٹ کر لڑے، یہاں تک کہ جب جنگِ خندق کی گرد چھٹی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا، نَحْنُ نَسِيْرُ إِلَيْهِمْ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب : ٤١١٠ ] ''اب ہم ان پر حملے کے لیے جائیں گے، وہ ہم پر حملے کے لیے نہیں آئیں گے، ہم ہی ان پر فوج کشی کیا کریں گے۔'' طالوت و جالوت کی جنگ بھی اس کی واضح مثال ہے۔

③ "**فَلَا تَهِنُوْا**" کے بعد "**تَدْعُوْۤا**" بھی نہی کے اس "لَا" کی وجہ سے مجزوم ہے جو "**تَهِنُوْا**" پر آیا ہے اور اسی کی وجہ سے اس سے نون اعرابی گرا ہے، کیونکہ یہ اصل میں " تَدْعُوْنَ " تھا، لائے نہی کی وجہ سے نون گر گیا تو "**تَدْعُوْۤا**" رہ گیا۔ گویا اصل کلام "فَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَدْعُوْا إِلَى السَّلْمِ " ہے، واؤ عطف کی وجہ سے "لَا" کو دوبارہ لانے کی ضرورت نہ رہی، اس لیے ترجمہ ہوگا: ''پس تم نہ کمزور بنو (نہ ہمت ہارو) اور نہ صلح کی طرف دعوت دو۔'' اس کی ایک مثال یہ آیت ہے: ﴿ **وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ**

## اَعۡمَالَكُمۡ ﴿۳۵﴾

سے تمھارے اعمال کم نہ کرے گا ﴿۳۵﴾

بِالۡبَاطِلِ وَ تَكۡتُمُوا الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [ البقرۃ : ۴۲ ] ''اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، جب کہ تم جانتے ہو۔'' مطلب یہ ہے کہ دشمن سے جنگ میں ہمت نہ ہارو اور نہ ان کا خوف تم پر مسلط ہو بلکہ صبر کرو، ثابت قدم رہو، اپنے آپ کو لڑائی اور مقابلے پر جمائے رکھو اور صلح اور جنگ بندی کے سمجھوتے کی دعوت مت دو۔

❹ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ ٭ۖ وَ اللّٰهُ مَعَكُمۡ ...... : ''لَنۡ يَّتِرَكُمۡ'' ''وَتَرَ يَتِرُ'' (وَعَدَ يَعِدُ) وَتْرًا وَ تِرَةً '' کسی کا حق مارنا، اس میں کمی کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمت نہ ہارنے اور دشمن کو صلح کی دعوت نہ دینے کی تین وجہیں بیان فرمائی ہیں، جن میں سے پہلی وجہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم نے ہمت نہ ہاری تو تم ہی غالب رہو گے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ لَا تَهِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴾ [ آل عمران : ۱۳۹ ] ''اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔'' دوسری وجہ '' وَ اللّٰهُ مَعَكُمۡ '' ہے کہ اللہ تمھارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمت ہارے اور صلح کی پیش کش کرے۔ اسی حوصلے پر رسول اللہ ﷺ نے کفارِ مکہ کے مقابلے میں اس وقت بھی ہمت نہیں ہاری جب آپ ﷺ دو میں سے دوسرے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِيَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِي الۡغَارِ اِذۡ يَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا السُّفۡلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الۡعُلۡيَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴾ [ التوبۃ : ۴۰ ] ''اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے ان لوگوں نے نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' تیسری وجہ '' وَ لَنۡ يَّتِرَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ '' ہے کہ وہ ہرگز تم سے تمھارے اعمال کم نہیں کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جہاد میں تم جو عمل بھی سرانجام دو گے تمھیں اس کا پورا پورا اجر ملے گا، اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ تمھارے اور تمھارے دشمن کے درمیان یہ بنیادی فرق ہے کہ تمھیں اس پر اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب، شہادت اور جنت کی امید ہے جب کہ کفار اس سے محروم ہیں۔ پھر ہمت ہارنے یا صلح کی پیش کش کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لَا تَهِنُوۡا فِي ابۡتِغَآءِ الۡقَوۡمِ ؕ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ يَاۡلَمُوۡنَ كَمَا تَاۡلَمُوۡنَ ۚ وَ تَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرۡجُوۡنَ ﴾ [ النساء : ۱۰۴ ] ''اور اس قوم کا پیچھا کرنے میں ہمت نہ ہارو، اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو یقیناً وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں، جیسے تم تکلیف اٹھاتے ہو اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو وہ امید نہیں رکھتے۔'' اور فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِاَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ وَ مَنۡ حَوۡلَهُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ يَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرۡغَبُوۡا بِاَنۡفُسِهِمۡ

عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا یُصِیْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ وَ لَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِیْرَةً وَّ لَا كَبِیْرَةً وَّ لَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾

[التوبة : ۱۲۰، ۱۲۱] ”مدینہ والوں کا اور ان کے اردگرد جو بدوی ہیں، ان کا حق نہ تھا کہ وہ رسول اللہ سے پیچھے رہتے اور نہ یہ کہ اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ عزیز رکھتے۔ یہ اس لیے کہ وہ، اللہ کے راستے میں انھیں نہ کوئی پیاس پہنچتی ہے اور نہ کوئی تکان اور نہ کوئی بھوک اور نہ کسی ایسی جگہ پر قدم رکھتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور نہ کسی دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اور نہ وہ خرچ کرتے ہیں کوئی چھوٹا خرچ اور نہ کوئی بڑا اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہیں، مگر وہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ انھیں اس عمل کی بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے۔“

(5) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دشمن کو صلح کی دعوت دینے سے منع فرمایا ہے، جبکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ [الأنفال : ۶۱] ”اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تُو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔“ ان دونوں آیت میں کوئی تعارض نہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمت ہار کر دشمن کو صلح کی پیش کش کرنے سے منع فرمایا ہے اور اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو اس کی طرف مائل ہو جانے کا حکم دیا ہے، کیونکہ یہ پیش کش دشمن کی طرف سے ہے۔

(6) ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: ”پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا: ﴿فَلَا تَهِنُوْا﴾ یعنی دشمن کے مقابلے میں کمزور مت بنو اور: ﴿وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ﴾ یعنی کفار کو صلح کی اور ایک دوسرے سے جنگ ترک کرنے کی دعوت مت دو، اس حال میں کہ تمھاری قوت، تعداد اور تیاری دشمن سے زیادہ ہو۔ اسی لیے فرمایا: ﴿فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ﳓ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ یعنی دشمن پر تمھارے غلبے کی حالت میں انھیں صلح کی دعوت مت دو۔ لیکن جب کفار تمام مسلمانوں کے مقابلے میں قوت و کثرت میں زیادہ ہوں اور امام صلح اور جنگ بندی میں مصلحت دیکھے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت کیا جب کفار قریش نے آپ کو مکہ جانے سے روک دیا اور انھوں نے آپ ﷺ کو صلح کی اور آپس میں دس سال تک جنگ ختم کرنے کی دعوت دی تو آپ ﷺ نے ان کی دعوت قبول فرمائی۔“ (ابن کثیر) مفسر شنقیطی نے اضواء البیان میں وہ تفسیر جو پہلے ذکر ہوئی ہے، بیان کرنے کے بعد فرمایا: ”یہ معنی جو ہم نے اس آیت کا بیان کیا ہے اس تفسیر سے بہتر اور زیادہ درست ہے جو ابن کثیر نے کی ہے کہ اس وقت صلح اور سمجھوتے کی دعوت مت دو جب تم غالب ہو، یعنی تم جہاد کی قوت و طاقت رکھتے ہو۔ یعنی اگر تم کمزور ہو اور طاقت نہیں رکھتے تو اس بات سے کوئی مانع نہیں کہ تم صلح اور سمجھوتے کی دعوت دو۔“

شنقیطی کے ابن کثیر سے اتفاق نہ کرنے کی کئی وجہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ابن کثیر نے صرف ”وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ“ کو حال بنایا ہے، حالانکہ یہاں تین چیزیں بیان ہوئی ہیں: ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ﳓ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ یَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ دوسری یہ ہے کہ حدیبیہ کے زمانے میں مسلمان قوت میں کفار پر غالب تھے، جیسا کہ پیچھے صحیح بخاری کی حدیث ”اَلْآنَ

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾

دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور دل لگی کے سوا کچھ نہیں اور اگر تم ایمان لاؤ اور بچے رہو، تو وہ تمھیں تمھارے اجر دے گا اور تم سے تمھارے اموال نہیں مانگے گا۔ ﴿۳۶﴾

تغزوھم" گزری۔ آپ نے انھیں صلح کی پیش کش اپنے کمزور ہونے کی وجہ سے نہیں کی تھی، ورنہ آپ اس سے بہت پہلے بدر و احد اور خندق میں صلح کی پیش کش کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کا انھیں صلح کی پیش کش کا مطلب یہ تھا کہ آپس کے میل جول سے اسلام کی تعلیم پھیلے گی تو یہ لوگ اسلام لے آئیں گے۔ کفار پہلے لڑائی پر آمادہ تھے مگر جب انھوں نے بیعتِ رضوان کے متعلق سنا تو ڈر گئے اور صلح پر آمادہ ہو گئے، جیسا کہ صحیح بخاری کی مفصل حدیث میں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابن کثیر نے فرمایا کہ صلح کی دعوت کفار کی طرف سے تھی جو رسول اللہ ﷺ نے قبول فرمائی۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ واقعہ اس مقصد کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان کمزور ہوں تو ان کا امام صلح کی دعوت دے سکتا ہے، کیونکہ ابن کثیر کے اس قول کے مطابق تو صلح کی دعوت کفار کی طرف سے تھی، رسول اللہ ﷺ نے صرف اسے قبول فرمایا تھا، حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود صلح کا پیغام بھیجا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری کی "كِتَابُ الشُّرُوْطِ، بَابُ الشُّرُوْطِ فِي الْجِهَادِ وَالْمُصَالَحَةِ مَعَ أَهْلِ الْحَرْبِ وَ كِتَابَةِ الشُّرُوْطِ" کی حدیث (۲۷۳۱، ۲۷۳۲)۔

❼ یہاں ایک سوال ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ "تم صلح کے لیے دعوت مت دو" تو رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر صلح کی دعوت کیوں دی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ صلح کی دعوت دینے کی ممانعت اس وقت ہے جب مسلمان ہمت ہارتے ہوئے اور بزدلی اور ذلت اختیار کرتے ہوئے صلح کی دعوت دیں، جیسا کہ " **فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ** " (پس ہمت نہ ہارو اور نہ صلح کی طرف دعوت دو) کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ حدیبیہ کی صلح کی دعوت دشمن کی طاقت توڑنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا، جیسا کہ آگے سورۂ فتح میں آ رہا ہے۔ بھلا جو صلح دشمن کے غالب اور مسلمانوں کے مغلوب ہونے کی صورت میں کی جائے اسے فتح مبین کہا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا کرنا فتح مبین ہوتا تو یہ کام رسول اللہ ﷺ بدر و اُحد سے بہت پہلے کر لیتے۔ پھر نہ ہجرت کی نوبت آتی، نہ جنگیں لڑنا پڑتیں اور نہ ہی اتنی شہادتیں ہوتیں، مگر یاد رکھیں! پھر مشرق سے مغرب تک اسلام کا پھریرا بھی نہیں لہرا سکتا تھا۔

❽ ان آیات میں ان مسلمانوں کا ذکر ہے جو میدانِ قتال میں اتر چکے ہیں، جو مسلمان کفار کے نرغے سے نکل ہی نہ سکیں کہ ہجرت کے بعد جہاد کر سکیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں مستضعفین کہہ کر معذور قرار دیا ہے۔ (دیکھیے نساء: ۹۷ تا ۹۹) اور ایسے مستضعفین کو آزادی دلانے کے لیے تمام مسلمانوں کو لڑنے کا حکم دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۷۵)۔

**آیت 36** ❶ **اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ** ......: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت کی آیت (۶۴) کی تفسیر۔

اِنۡ یَّسۡـَٔلۡكُمُوۡهَا فَیُحۡفِكُمۡ تَبۡخَلُوۡا وَ یُخۡرِجۡ اَضۡغَانَكُمۡ ﴿۳۷﴾

اگر وہ تم سے ان کا مطالبہ کرے، پھر تم سے اصرار کرے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمھارے کینے ظاہر کر دے گا ﴿۳۷﴾

جہاد سے روکنے والی سب سے بڑی چیز دنیا کی زندگی، اس کے مال و دولت اور اس کی دل فریبیوں سے محبت ہے، کیونکہ جہاد میں جان و مال دونوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ چند دن کا کھیل اور دل لگی ہے، اس کی محبت میں پھنس کر اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرو اور یقین رکھو کہ اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو گے، جس میں جان و مال پیش کر دینا بھی شامل ہے تو اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے اجر پورے پورے دے گا اور تم سے تمھارے سارے اموال کا مطالبہ نہیں کرے گا بلکہ ان میں سے معمولی حصے پر اکتفا کرے گا۔ مثلاً سال کے بعد اموال میں سے چالیسواں حصہ، کھیتی میں سے بیسواں یا دسواں حصہ، جنگ کے بعد غنیمت میں سے پانچواں حصہ اور دوسرے پیش آنے والے مواقع پر ضرورت کے مطابق مال کا کچھ حصہ۔ لیکن اگر تم نے ایمان و تقویٰ کے بجائے کفر و عناد پر اصرار کیا تو وہ اپنے مجاہد بندوں کے ذریعے سے تم سے تمھارے سارے اموال چھین لے گا۔ ایمان و تقویٰ کے تقاضے کے مطابق وہ معمولی حصہ جو تم نے خرچ کیا ہے اس کا بھی پورا پورا بدلا وہ تمھیں دنیا اور آخرت میں دے دے گا۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ''حق تعالیٰ نے ملک فتح کر دیے، مسلمانوں کو تھوڑے ہی دن مال خرچ کرنا پڑا، سو جتنا خرچ کیا تھا اس سے سو سو گنا ہاتھ لگا۔ اسی لیے (قرآن کریم میں کئی جگہ) فرمایا ہے کہ اللہ کو قرض دو۔''

② وَ لَا یَسۡـَٔلۡكُمۡ اَمۡوَالَكُمۡ : ''اور تم سے تمھارے اموال نہیں مانگے گا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے تمھارے اموال پورے کے پورے نہیں مانگے گا۔ ہاں، وہ تمھارے اموال میں سے ایک حصہ خرچ کرنے کی دعوت ضرور دیتا ہے۔ اس مطلب کے کئی قرینے ان آیات میں موجود ہیں جن میں سے ایک قرینہ '' أَمْوَالٌ '' کی اضافت ضمیر ''كُمْ'' کی طرف ہے۔ ظاہر ہے ''تمھارے اموال'' میں وہ تمام اموال آ جاتے ہیں جو تمھاری ملکیت ہیں۔ دوسرا قرینہ ''یُؤۡتِكُمۡ اُجُوۡرَكُمۡ '' ہے، کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمھیں تمھارے اجر پورے پورے دے گا۔ تو جس طرح ''اُجُوۡرَكُمۡ '' سے پورے اجر مراد ہیں اسی طرح ''اَمۡوَالَكُمۡ '' سے بھی پورے اموال مراد ہیں۔ تیسرا قرینہ اس آیت سے اگلی آیت میں لفظ ''فَیُحۡفِكُمۡ '' ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے ان کے اموال کا ''إِحْفَاءٌ '' نہیں چاہتا، یعنی پورے نہیں مانگتا۔ ان تمام قرائن کی وجہ سے ''لَا یَسۡـَٔلۡكُمۡ اَمۡوَالَكُمۡ '' کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے تمھارے سارے اموال نہیں مانگے گا۔

آیت 37 اِنۡ یَّسۡـَٔلۡكُمُوۡهَا فَیُحۡفِكُمۡ تَبۡخَلُوۡا ...... : ''فَیُحۡفِكُمۡ '' '' أَحْفٰی يُحْفِيْ إِحْفَاءٌ '' (افعال) کا معنی کسی چیز کو سمیٹ کر پوری کی پوری لے لینا، یا کسی چیز کا اصرار کے ساتھ مطالبہ کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمھارے سارے اموال مانگ لے تو یہ اس کا حق ہے، کیونکہ وہ سب اسی کے دیے ہوئے ہیں مگر یہ اس کا کرم ہے کہ وہ تم سے تمھارے اموال پورے کے پورے نہیں مانگتا، کیونکہ اگر وہ سب کے سب اصرار کے ساتھ مانگ لے تو تم بخل کرو گے اور تمھارا بخل تمھارے دل میں

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝۳۸

ع ۸

سنو! تم وہ لوگ ہو کہ تم بلائے جاتے ہو، تا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، تو تم میں سے کچھ وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ ہی بے پروا ہے اور تم ہی محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے ۝۳۸

پیدا ہونے والے تمام کینے ظاہر کر دے گا، جو سارا مال مانگنے کی وجہ سے تمھارے دل میں پیدا ہوں گے، کیونکہ مال تمھارا محبوب ہے اور جس کے محبوب کو اس سے مانگا جائے اس کے دل میں مانگنے والے کے خلاف کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تم سے مطالبہ ہی اتنا کیا ہے جس سے تم اتنی سخت آزمائش میں نہ پڑو اور اگر کسی دل میں نفاق یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کینے کی کوئی بات ہو بھی تو اس پر پردہ پڑا رہے۔ آیات کا مقصد اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب اور یہ حوصلہ دلانا ہے کہ تم سے کوئی مشکل مطالبہ نہیں کیا جا رہا جو تم پورا نہ کر سکو، اس لیے خوش دلی کے ساتھ جہاد میں اپنے اموال خرچ کرو۔

**آیت 38** ❶ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا ...... : "هَا" حرف تنبیہ ہے، خبردار، یاد رکھو، سن لو۔ "اَنْتُمْ" مبتدا اور "هٰۤؤُلَآءِ" اس کی خبر ہے جو "اَلَّذِيْنَ" کے معنی میں ہے اور "تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" "هٰۤؤُلَآءِ" کا صلہ ہے۔ یعنی یاد رکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تمھیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو تو تم میں سے کچھ وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں۔

❷ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ : یعنی جو شخص اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے بخل کرتا ہے وہ اپنے خیال میں سمجھتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے بخل کیا ہے اور اسے مال نہیں دیا، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے اور اپنے آپ پر وہ مال خرچ نہیں کر رہا، کیونکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے کہنے پر خرچ کرتا تو اس کا سارا فائدہ اسی کو ہونا تھا۔ اب اس نے بخل کیا تو اپنی ذات سے بخل کیا اور خود ہی محروم رہا۔

❸ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ : "الْغَنِيُّ" اور "الْفُقَرَآءُ" پر الف لام آنے سے حصر پیدا ہو گیا، یعنی اللہ ہی غنی ہے اور کوئی غنی نہیں اور تم ہی محتاج ہو اللہ تعالیٰ کو کوئی محتاجی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں خرچ کرنے کا حکم اپنی کسی ضرورت کے لیے نہیں دیا، وہ تو غنی ہے، محتاج تم ہی ہو اور تم جو کچھ خرچ کرو گے وہ بے حساب اضافے کے ساتھ تمھی کو لوٹا دے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [ البقرۃ : ۲۴۵ ] "کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، پس وہ اسے اس کے لیے بہت زیادہ گنا بڑھا دے اور اللہ بند کرتا اور کھولتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

❹ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ کی آیت (۵۴) کی تفسیر۔

سورۃ الفتح ۴۸ ﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴾ آیاتہا ۲۹

## اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بے شک ہم نے تجھے فتح دی، ایک کھلی فتح ﴿۱﴾

یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ سے واپس آ رہے تھے۔ یہ ذوالقعدہ سنہ ۶ ہجری کی بات ہے، آپ ﷺ چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے، حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین نے آپ کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا۔ قصہ لمبا ہے، مختصر یہ کہ دونوں طرف سے بار بار سفیروں کی آمد و رفت کے بعد دس سال کے لیے صلح اور جنگ بندی کا معاہدہ ہو گیا۔ اس کی کچھ شروط مسلمانوں کو پسند نہیں تھیں، مگر رسول اللہ ﷺ نے صلح کی مصلحتوں کے پیش نظر انھیں قبول فرمایا۔ بعد میں مسلمانوں نے صلح کے خوشگوار اثرات دیکھے تو وہ بھی مطمئن ہو گئے۔

**آیت 1** ﴿۱﴾ **اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا:** لفظ "**فَتۡحًا**" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ اور اس کے قریب ہونے والی فتوحات ہیں اور یقیناً یہ الفاظ فتح مکہ پر بھی صادق آتے ہیں، مگر صحابہ کرام اور محقق اہل علم نے اس کا سبب نزول صلح حدیبیہ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ قتادہ بیان کرتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ نے "**اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا**" کے متعلق فرمایا کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔[ بخاري، التفسير، سورة الفتح : ٤٨٣٤ ]اور براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو اور واقعی فتح مکہ فتح تھی مگر ہم حدیبیہ کے دن بیعت رضوان کو فتح شمار کرتے ہیں۔'' [ بخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية : ٤١٥٠ ] زید بن اسلم اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ایک سفر میں چل رہے تھے، رات کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ چل رہے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے انھیں جواب نہ دیا، انھوں نے پھر سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب نہ دیا، انھوں نے پھر آپ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب نہ دیا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمر! تیری ماں تجھے گم پائے، تو نے اصرار کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے تین مرتبہ سوال کیا، لیکن ہر بار آپ نے جواب نہیں دیا۔'' عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، چنانچہ میں اپنی اونٹنی کو حرکت دے کر مسلمانوں سے آگے نکل گیا، اس خوف سے کہ کہیں میرے بارے میں قرآن نازل نہ ہو جائے۔ کچھ دیر بعد ہی اچانک سنا تو ایک اعلان کرنے والا میرا نام لے کر بلانے کے لیے اعلان کر رہا تھا، میں واپس رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور میں یہی سمجھ رہا تھا کہ میرے بارے میں قرآن نازل ہوا ہے۔ میں نے سلام کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( لَقَدْ أُنْزِلَتْ عَلَيَّ اللَّيْلَةَ سُوْرَةٌ لَهِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ **اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا** ﴾ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية : ٤١٧٧ ] ''رات مجھ پر وہ سورت اتری ہے جو مجھے ہر اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پڑھا: ﴿ **اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا** ﴾ ''بے شک ہم نے تجھے فتح دی، ایک کھلی فتح۔''

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ

تاکہ اللہ تیرے لیے بخش دے تیرا کوئی گناہ جو پہلے ہوا اور جو پیچھے ہوا اور اپنی نعمت تجھ پر پوری کرے اور

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر سورۂ فتح نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا اور انھیں سورۂ فتح پڑھوائی۔ انھوں نے کہا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَوَ فَتْحٌ هُوَ ؟ )) ''اے اللہ کے رسول! کیا یہ فتح ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( نَعَمْ )) ''ہاں!'' تو ان کا دل خوش ہو گیا اور وہ چلے گئے۔ [ مسلم، الجهاد والسير، باب صلح الحديبية : ۱۷۸۵ ]

❷ حقیقت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ اسلام اور مسلمانوں کی عظیم فتح تھی، کیونکہ اس کے ساتھ مسلمانوں کو بے شمار فوائد حاصل ہوئے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ قریش نے مسلمانوں کا وجود تسلیم کر لیا، جو اس سے پہلے وہ کسی صورت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک یہ کہ دشمن کی حقیقی قوت کا اندازہ ہو گیا اور یہ کہ وہ کس حد تک مزاحمت کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں مخلص ایمان والوں اور منافقین کی پہچان ہو گئی، کیونکہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلنے کی جرأت ہی نہیں کر سکے تھے، جیسے کہ آگے "سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ" میں آ رہا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرۂ عرب میں امن قائم ہو جانے سے کفار اور مسلمانوں کا ایک دوسرے سے میل جول شروع ہو گیا۔ کفار نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی بات سنی، ان کے اخلاق دیکھے، آپس میں بحث و مناظرہ ہوا اور دعوت کا دائرہ وسیع ہوا، جس کے نتیجے میں بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سے پہلے حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ آئے تھے، لیکن صرف دو سال بعد فتح مکہ کے سال آپ ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے۔

❸ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین طرح کی تاکید کے ساتھ اس فتح کی اہمیت بیان فرمائی، ایک اس کی عظمت کے اظہار کے لیے اس کی نسبت اپنی طرف دو دفعہ جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ فرمائی، ایک "اِنَّا" اور دوسرا "فَتَحْنَا" اور دوسری یہ کہ "فَتَحْنَا" کی تاکید مفعول مطلق "فَتْحًا" کے ساتھ فرمائی اور تیسری یہ کہ اسے "فَتْحًا مُّبِيْنًا" (فتح مبین) قرار دیا، یعنی بے شک ہم نے تیرے لیے فتح دی، ایک کھلی فتح۔

❹ "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ" میں "لَكَ" (تیرے لیے) کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کی تکریم و تشریف کا اظہار ہو رہا ہے، جس سے امت کو آپ ﷺ کی قدر پہچاننے اور آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کی تعلیم دینا مقصود ہے۔

**آیت 2** ❶ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ : "لِيَغْفِرَ" کا لام 'لام عاقبت' ہے، یعنی ہم نے آپ کو یہ فتح مبین عطا فرمائی تاکہ آپ کو اس کے نتیجے میں چار عظیم نعمتیں حاصل ہوں۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو فرما رہے ہیں کہ آپ نے اپنی رسالت کا حق ادا کیا، میرا پیغام پہنچایا، جان مار کر محنت کی، اپنی زبان اور تلوار کے ساتھ جہاد کیا، مسلمانوں کی ایک مخلص ترین جماعت تیار کی، سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی کی اور مختصر سے عرصے میں وہ کامیابی حاصل کی

صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲﴾

تجھے سیدھے راستے پر چلائے ②

جو طویل مدتوں میں کوئی حاصل نہ کر سکا، حتیٰ کہ وہ کام پورا کر دکھایا جو ہم نے آپ کے ذمے لگایا تھا۔ اب آپ اپنی محنت کا پھل اٹھائیں گے، جس سے دنیا اور آخرت میں آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، چنانچہ ہم نے آپ کے لیے واضح فتح عطا کی، جس کے نتیجے میں پہلی نعمت آپ کو یہ ملی کہ نبوت سے پہلے اور بعد کے گناہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخش دیے۔

② یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ کیا نبی سے بھی گناہ کا صدور ہو سکتا ہے؟ بعض حضرات نے انبیائے کرام ﷩ سے گناہ صادر ہونے کو ناممکن قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک نبی سے گناہ کا صادر ہونا اس کی شان کے خلاف ہے، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ قرآن مجید نے آپ ﷺ کے متعلق لفظ "ذَنْبٌ" استعمال کیا ہے، جس کا معروف و مشہور معنی "گناہ" ہے۔ اس لیے فارسی اور اردو تقریباً تمام مترجمین نے یہاں "ذَنْبٌ" کا معنی گناہ کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ آپ کی طرف لفظ گناہ کی نسبت سے آپ کی شان میں کمی کا اظہار ہوتا ہے، تو جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انبیاء کے گناہوں کو اپنے گناہوں کی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء ﷩ کو جتنا عظیم اور بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی معمولی کوتاہیوں اور لغزشوں کو گناہ قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی انھیں "ذنوب" کہہ کر ان سے استغفار کا حکم دیتا ہے، اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں استغفار کرتے ہیں جس سے ان کا مرتبہ پہلے سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ مثلاً موسیٰ ﷤ سے خطا کے ساتھ قبطی قتل ہو گیا تو انھوں نے دعا کی: ﴿رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ﴾ [ القصص : ١٦ ] "اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، سو تو مجھے بخش دے، تو اللہ نے اسے بخش دیا۔" آدم ﷤ منع کرنے کے باوجود بھول کر اس پودے میں سے کھا بیٹھے تو کہا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [ الأعراف : ٢٣ ] "اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔" تو اللہ تعالیٰ نے اس استغفار کے نتیجے میں انھیں "مجتبیٰ" بنا لیا، فرمایا: ﴿ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى﴾ [ طٰه : ١٢٢ ] "پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، تو اس پر مہربانی فرمائی اور ہدایت دی۔" یونس ﷤ بغیر اجازت قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تو مچھلی کے پیٹ سے اللہ تعالیٰ کو پکارا: ﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ٗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ٨٧] "تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں۔" اس استغفار کے نتیجے میں انھیں وہ مقام حاصل ہوا جو خطا نہ ہونے اور استغفار نہ کرنے کی صورت میں کبھی حاصل نہ ہوتا، فرمایا: ﴿فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [ القلم : ٥٠ ] "پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، پس اسے نیکوں میں شامل کر دیا۔"

بنی آدم کا فرشتوں سے یہی فرق ہے کہ فرشتوں سے نہ خطا ہوتی ہے، نہ انھیں استغفار کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ

استغفار سے حاصل ہونے والا بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام ہماری طرح کبیرہ گناہوں کا ارتکاب یا دیدہ و دانستہ نافرمانی نہیں کرتے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے فرماں بردار بندے ہوتے ہیں، البتہ ان سے بشری تقاضوں کے پیشِ نظر کوئی معمولی کوتاہی یا اجتہادی خطا ہو جاتی ہے۔ انبیاء کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس خطا یا کوتاہی پر قائم نہیں رہنے دیتا، بلکہ وحی کے ذریعے سے فوراً اصلاح فرما دیتا ہے، انبیاء کے معصوم ہونے کا یہی مطلب ہے۔ کسی امتی کو، خواہ وہ کتنے بلند منصب پر فائز ہو یہ امتیاز حاصل نہیں کہ اس کی خطا کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے سے اصلاح کی جائے۔ انبیاء سے سرزد ہونے والی یہ معمولی کوتاہیاں یا اجتہادی خطائیں بھی ان کے مقام کے پیشِ نظر خود انھیں اتنی بڑی نظر آتی ہیں کہ وہ بار بار اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ''ذنوب'' سے مغفرت مانگنے کا حکم دیا، جس پر عمل کرتے ہوئے آپ بے حد استغفار کرتے تھے۔ دیکھیے سورۂ محمد کی آیت (۱۹) کی تفسیر۔ استغفار کی وہ مختلف دعائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جناب میں کیا کرتے تھے ان تمام دعاؤں میں لفظ ''ذنب'' استعمال ہوا ہے۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا معاملہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذنوب کا اقرار کر کے استغفار کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے اور پچھلے ذنوب کی مغفرت کی خوش خبری دے رہے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس بات کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آپ کے پہلے اور پچھلے ذنوب معاف فرما دیے ہیں، جیسا کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: « أَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ حَتّٰى تَتَفَطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ أَفَلَا أُحِبُّ أَنْ أَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا؟ » [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ ليغفر لك الله ما تقدم...... ﴾ : ٤٨٣٧ ] ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات اتنا قیام کرتے حتیٰ کہ آپ کے قدم پھٹ جاتے تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آپ کے پہلے اور پچھلے گناہ بخش دیے ہیں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو کیا میں شکر گزار بندہ بننا پسند نہ کروں؟''

یہی وجہ ہے کہ پہلے تقریباً سبھی ترجمہ کرنے والوں نے ''ذنب'' کا معنی گناہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ کرنے والے قرآن مجید کے سب خدّام کیا نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے ناآشنا تھے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گناہ گار ٹھہرتے ہیں۔ آپ ان حضرات سے پوچھیں کہ آپ ''ذنب'' کا ترجمہ کر کے بتایئے، ان میں سے ایک صاحب نے ''**لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ**'' کا ترجمہ کیا ہے: ''**تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف فرما دے۔**'' ایک اور صاحب نے ترجمہ کیا ہے: ''**تاکہ اللہ تعالیٰ تمھاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے۔**'' اپنے خیال میں ان حضرات نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گناہ گار ہونے سے تو بچا لیا مگر انھیں خطا کار اور کوتاہی کا مرتکب ہونے سے تو نہ بچا سکے، بتایئے آپ نے کون سا معرکہ سر کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک آدھ معمولی گناہ و خطا سے آدمی نہ گناہ گار کے لقب کا حق دار بنتا ہے اور نہ ہی اسے خطا کار یا کوتاہ کار کہہ سکتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہاں ذنب کا معنی الزام کیا ہے اور ترجمہ کیا ہے: ''تاکہ اللہ تعالیٰ آپ پر لگائے گئے پہلے پچھلے تمام

الزامات دور کر دے۔'' ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی جن کاموں پر باز پرس فرمائی اور ساتھ ہی انھیں معاف کر دینے کی بشارت بھی دے دی، کیا وہ سب الزامات تھے جو اللہ تعالیٰ نے غلط قرار دے کر دور فرما دیے؟ مثلاً فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ التحريم : ۱ ] ''اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟ تو اپنی بیویوں کی خوشی چاہتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ [التوبة : ٤٣ ] ''اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انھیں کیوں اجازت دی، یہاں تک کہ تیرے لیے وہ لوگ صاف ظاہر ہو جاتے جنھوں نے سچ کہا اور تو جھوٹوں کو جان لیتا۔'' اور فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [ الأنفال : ٦٧ ] ''کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے، تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ﴾ [ الأحزاب : ۳۷ ] ''اور تو لوگوں سے ڈرتا تھا، حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تو اس سے ڈرے۔''

اصل بات یہ ہے کہ ایسے حضرات غلو کی وجہ سے ہر اس شخص کو گستاخِ رسول قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں جو ان کی طرح نبی ﷺ کو خدائی صفات کا مالک قرار نہ دے، آپ کو عالم الغیب نہ مانے، مختارِ کل تسلیم نہ کرے، یا یہ نہ مانے کہ آپ ﷺ سے خطا ہو سکتی ہی نہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے اس مقام پر ذنب کا معنی تو گناہ ہی کیا ہے، مگر اس آیت کے ترجمے میں تحریفِ قرآن کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا اس امت کو مہلت دینے کا فیصلہ نہ ہوتا تو ان کا نام و نشان مٹا دیا جاتا۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ" کا ترجمہ کیا ہے: ''تا کہ اللہ تمھارے سبب سے گناہ بخشے تمھارے اگلوں کے اور تمھارے پچھلوں کے۔'' ایک اور صاحب نے ترجمہ کیا ہے: ''تا کہ آپ کی خاطر اللہ آپ کی امت (کے ان تمام افراد) کی اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے (جنھوں نے آپ کے حکم پر جہاد کیے اور قربانیاں دیں)۔'' ان لوگوں کی تحریف پر جرأت دیکھیے، لفظ "ذَنْۢبِكَ" کا معنی ''تیرے گناہ'' کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتا، مگر یہ لوگ اس کا ترجمہ ''تیری امت کے اگلے پچھلے گناہ'' کر رہے ہیں اور حبِ رسول کے اتنے بڑے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں کہ جو ان کی طرح تحریف نہ کرے، یا ان کی تحریف پر شاباش نہ کہے وہ ان کی نظر میں حبِ رسول سے آشنا ہی نہیں۔ ان لوگوں کے ترجمے کے مطابق تو تمام امتیوں کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں، اب اگر کوئی قتل یا زنا یا چوری کرتا ہے تو اس پر حد کیسی؟ اسے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی مل چکی ہے۔ یہ سب نتیجہ اسی غلو کا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا: (( لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ، فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ واذكر في الكتاب مريم...... ﴾ : ٣٤٤٥ ] ''مجھے حد سے مت بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے مسیح ابنِ مریم کو حد سے بڑھا دیا، کیونکہ میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، سو تم ''اللہ کا بندہ اور اس کا رسول'' کہو۔''

وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ③

اور (تاکہ) اللہ تیری مدد کرے، زبردست مدد۔③

③ اس مقام پر اکثر مفسرین نے نبی کریم ﷺ کے متعلق لفظ ذنب کی توجیہ کرتے ہوئے ایک جملہ مسلّم قول کے طور پر ذکر فرمایا ہے: " حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ " ''نیک لوگوں کی نیکیاں مقرب لوگوں کی برائیاں ہوتی ہیں۔'' یہ جملہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کا تو ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ بات کہنے والا کون ہے، مگر اکثر مفسر اور مصنف اسے اندھا دھند بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ یہ سوچتے ہیں کہ نیکی بدی کیسے بن سکتی ہے اور نہ یہ خیال فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے مطابق ابرار و مقربین کی یہ تقسیم سرے سے غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کون مقرب ہوگا؟ اور آپ ﷺ پچھلی رات اُٹھ کر جن آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے ان میں مذکور دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے: ﴿ وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۳] ''اور ہمیں ابرار کے ساتھ فوت کر۔'' پھر وہ کون سے ابرار ہیں جن کی نیکیاں مقربین کی بدیاں ہیں؟

④ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ: یہ دوسری نعمت ہے جو صلح حدیبیہ کے نتیجے میں حاصل ہونے کی خوش خبری دی گئی۔ اس سے مراد وہ بہت سی نعمتیں عطا کرنا ہے جو اس سے پہلے آپ کو عطا نہیں کی گئی تھیں، مثلاً قریش، اہلِ مکہ اور دوسرے لوگوں کا فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا، تمام دشمنوں اور مخالفوں کا زیر ہو جانا، پورے ملک عرب کا آپ کے زیرِ نگیں ہو جانا اور دین کی تکمیل وغیرہ، جن کا اس موقع پر آپ ﷺ سے وعدہ کیا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد پورا کر دیا گیا اور اعلان ہو گیا: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدة: ۳] ''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

⑤ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: یہ تیسری نعمت کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام پر عمل، ان کی تبلیغ و جہاد، سلطنت کے معاملات اور فتح و کامرانی کے حصول کے بارے میں آپ کو بالکل سیدھے راستے پر چلائے گا۔ اگرچہ یہ سب کچھ پہلے بھی آپ کو حاصل تھا، مگر اس کے بعد جس وسعت کے ساتھ حاصل ہوا وہ پہلے حاصل نہ تھا۔ مزید دیکھیے سورۂ فاتحہ کی آیت: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ کی تفسیر۔

آیت 3 وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا: چوتھی اور آخری نعمت یہ ہے کہ '' نصرِ عزیز'' کا ذکر اپنے سب سے باعظمت نام ''اللہ'' کے ساتھ فرمایا، تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی ایسی مدد فرمائے گا جس سے آپ کو عزت و قوت اور غلبہ حاصل ہوگا اور آپ کے دشمن عاجز اور مغلوب ہو جائیں گے۔ یہاں مبالغے کے لیے ''عزیز'' کی نسبت ''نصر'' کی طرف فرمائی ہے، ورنہ عزیز تو اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نے ہونا ہی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہتے ہیں: " فُلَانٌ نَهَارُهٗ صَائِمٌ وَلَيْلُهٗ قَائِمٌ " ''فلاں کا دن روزہ رکھنے والا اور رات قیام کرنے والی ہے۔''

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ④

**وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی، تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں زیادہ ہو جائیں اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ④**

آیت 4 ① هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ : "السَّكِيْنَةَ" سے مراد وہ سکون و اطمینان اور ثباتِ قلب ہے جس کا اتارنا اللہ تعالیٰ نے مدینہ سے نکلنے سے لے کر اس فتح مبین کے حصول تک مومنوں کے دلوں پر مسلسل جاری رکھا اور جو اس فتح کا اہم سبب بنا، ورنہ اگر مسلمان مدینہ سے عمرہ کے لیے نکلتے وقت منافقین کی طرح سوچنے لگتے کہ یہ تو صریحاً موت کے منہ میں جانا ہے، یا راستے میں جب اطلاع ملی کہ قریش لڑنے مرنے پر تلے ہوئے ہیں تو ہمت ہار جاتے، یا حدیبیہ میں پہنچنے پر جس طرح کفار نے مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکا اور چھاپے اور شب خون مار مار کر انھیں اشتعال دلانے کی کوشش کی، پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پھیلی، ان میں سے کسی موقع پر اگر مسلمان اپنے آپ پر قابو نہ رکھتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر قائم نہ رہتے تو یہ فتح مبین کبھی حاصل نہ ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت ہی تھی جس نے ہر موقع پر انھیں اطاعت پر ثابت قدم رکھا۔ پھر جب صلح کی وہ شرائط ان کے سامنے آئیں جو مسلمانوں کو سخت ناپسند اور ان کے خیال میں ان کی ذلت کا باعث تھیں، خصوصاً ابوجندل رضی اللہ عنہ مظلومیت کی تصویر بنے ہوئے مجمع عام میں آ کھڑے ہوئے، اس موقع پر اس سکینت ہی کی برکت تھی کہ سب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

② لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ : یعنی ایمان انھیں پہلے بھی حاصل تھا مگر ان تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کی وجہ سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب اس ثابت قدمی کے خوش گوار نتائج سامنے آئے تو ان کا ایمان مزید بڑھ گیا۔ یہ آیت بھی ان بہت سی آیات و احادیث میں سے ایک ہے جو ایمان میں زیادتی اور کمی کی دلیل ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے متعدد آیات و احادیث کے ساتھ اس مسئلے کو مدلل ذکر فرمایا ہے۔ روح المعانی میں ہے: ''بخاری نے فرمایا، میں بہت سے شہروں میں ایک ہزار سے زائد علماء سے ملا، میں نے ان میں سے ایک شخص بھی نہیں دیکھا جو اس بات سے اختلاف کرتا ہو کہ ایمان قول اور عمل ہے اور اس میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے اور انھوں نے اس کی عقلی اور نقلی دلیلیں بیان کی ہیں۔ عقلی دلیل تو یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت میں تفاوت نہ ہو تو امت کے عام آدمیوں کا ایمان، جو فسق و فجور میں منہمک رہتے ہیں، انبیاء کے ایمان کے برابر ہوگا اور یہ لازم باطل ہے، سو ملزوم بھی ایسا ہی ہے اور نقلی دلیل یہ کہ اس مفہوم کی آیات و احادیث بہت زیادہ ہیں جن میں سے ایک یہ آیت ہے جو زیر تفسیر ہے۔'' (ملخصاً) یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی کا مطلب اعمال کے لحاظ سے زیادتی ہی نہیں بلکہ دل کی تصدیق اور اس کے یقین میں بھی زیادتی اور کمی ہوتی ہے۔ کبھی یقین کا یہ حال ہوتا ہے کہ آدمی اپنی جان، مال اور ہر چیز اللہ کی راہ میں لٹانے پر تیار ہو جاتا ہے اور کبھی اس یقین میں ایسی کمی ہوتی ہے کہ اسلام قبول کرتے

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۟ۙ

**تاکہ وہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان باغوں میں داخل کرے جن کے تلے نہریں چلتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے اور ان سے ان کی برائیاں دور کرے اور یہ ہمیشہ سے اللہ کے نزدیک بہت بڑی کامیابی ہے۔⑤**

وقت ایمان کا جو سرمایہ اسے حاصل ہوا تھا وہ بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ تعجب اور افسوس ہے ان بڑے بڑے شیوخ الحدیث پر جو اتنی صریح آیات واحادیث کے باوجود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ایمان میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے، ان کے علم کا کمال یہی ہے کہ وہ تاویل کے ذریعے سے ثابت کر دیتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا ایمان برابر ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے دھڑے کے کسی بزرگ نے کہہ دیا ہے کہ ایمان میں نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔

③ **وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ:** یعنی آپ کو ظاہری اسباب کی کمی کے باوجود یہ فتح مبین آپ کی جد و جہد یا ذاتی کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کی بدولت حاصل ہوئی، کیونکہ وہی آسمانوں کے اور زمین کے بے شمار لشکروں کا مالک ہے، جس کی چاہتا ہے جس لشکر کے ساتھ چاہتا ہے مدد کر دیتا ہے۔ آسمانوں کے لشکروں کی مثال بدر میں نازل ہونے والے فرشتے، احزاب میں آنے والی آندھی اور بدر میں اترنے والی بارش ہیں اور زمین کے لشکروں کی مثال فتح مکہ کے موقع پر آنے والے دس ہزار مجاہدین کا عظیم الشان لشکر ہے۔ "**لِلّٰهِ**" کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہوا، جس کا مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ مانتا ہی نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں اس کے علاوہ بھی کسی کے پاس کوئی لشکر ہے، کیونکہ اس کے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔

④ **وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا:** یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے لشکروں کا اکیلا مالک ہے اور لشکر بھی ایسے کہ ان میں سے کسی لشکر کا ایک فرد اگر اللہ کا حکم ہو تو تمام کفار کو نیست و نابود کر دے، مگر اس نے یہ فتح مبین اور نصر عزیز صلح کی صورت میں عطا فرمائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔ اس کے علم میں یہ بات تھی اور اس کی حکمت کا تقاضا تھا کہ اب کفار کو تلوار کی مار کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے اور ان کی دعوت سننے کا موقع دیا جائے، تاکہ کافر مسلمان ہو جائیں اور دشمن دوست بن جائیں۔ واضح رہے، یہاں "**عَلِيْمًا حَكِيْمًا**" فرمایا ہے، جبکہ آگے جہاں کفار و منافقین کے لیے عذاب اور لعنت کا ذکر فرمایا ہے وہاں "**عَزِيْزًا حَكِيْمًا**" فرمایا ہے، کیونکہ عذاب و غضب کے ذکر کے مناسب صفت علم کے بجائے صفت عزیز ہے۔

**آیت 5** ① **لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ……:** سب سے واضح اور صحیح بات یہی ہے کہ "**لِيُدْخِلَ**" کا لام "**هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ**" کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی، تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں اور زیادہ ہو جائیں (اور) تاکہ اس سکینت اور ایمان کی زیادتی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان باغوں میں داخل کرے جن کے تلے نہریں چلتی ہیں۔"

وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾

اور (تاکہ) ان منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے بارے میں گمان کرنے والے ہیں، برا گمان، انھی پر بری گردش ہے اور اللہ ان پر غصے ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم تیار کی اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ﴿۶﴾

② وَ الْمُؤْمِنٰتِ: مومن عورتوں کا ذکر خاص طور پر یہاں اس لیے فرمایا کہ جہاد کا اجر صرف مردوں کے ساتھ خاص نہ سمجھ لیا جائے، کیونکہ مومن عورتیں بھی جہاد میں شریک ہوتی ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں، خاوندوں، بیٹوں، باپوں اور دوسرے عزیزوں کے جہاد پر نکلنے میں رکاوٹ نہیں بنتیں، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، ان کی عدم موجودگی میں تنہائی اور دوسری پریشانیوں پر صبر کرتی ہیں اور ان کی شہادت کی صورت میں بیوہ ہونے اور بچوں کے یتیم ہونے پر صبر کرتی ہیں۔ ان میں سے کئی لشکر کے ساتھ جا کر کھانا پکانے، کپڑے دھونے، صفائی کرنے کی اور دوسری خدمات سرانجام دیتی ہیں۔ لڑائی کی صورت میں مجاہدوں کو پانی پلانے، زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کی تیمارداری کا اہتمام کرتی ہیں۔ (ابن عاشور)

③ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ...... : جنتوں میں داخل کرنے سے مراد یہاں خاص داخلہ ہے جو مجاہدین کے ساتھ خاص ہے، وہ داخلہ نہیں جو محض ایمان اور عمل صالح کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی فرمایا: ﴿ وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ ''اور تاکہ وہ ان سے ان کی برائیاں دور کرے۔'' (ابن عاشور) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ۔ أُرَاهُ قَالَ وَ فَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ۔ وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب درجات المجاهدين في سبيل الله : ۲۷۹۰ ] ''جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار فرمائے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے، تو جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا افضل اور جنت کا اعلیٰ حصہ ہے۔ (یحییٰ بن صالح نے کہا) میں سمجھتا ہوں یوں کہا کہ اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔''

آیت 6 ① وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ ...... : اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت کی بدولت ایمان والے مجاہد مردوں اور عورتوں کے جنت میں داخلے کے ذکر کے بعد ان لوگوں کو عذاب دینے کا ذکر فرمایا جو اس غزوہ کے نتیجے میں اللہ کے غضب اور لعنت کا نشانہ بنے اور جہنم ان کا ٹھکانا بنی۔ منافقین و کفار کو یہ عذاب مسلمانوں کی تلواروں کے ساتھ بھی دیا گیا، جیسا کہ

وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۷ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَ مُبَشِّرًا وَ نَذِيْرًا ۸

**اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ⑦ بے شک ہم نے تجھے گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ⑧**

فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [التوبۃ : ۱٤] ''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔'' اور مسلسل خوف اور رسوائی کے ساتھ بھی اور مسلمانوں کی کامیابیاں اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی صورت میں بھی۔ آخرت کا عذاب اس کے علاوہ اور ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہاں منافقین کا ذکر کفار سے پہلے کرنے کا مقصد مسلمانوں کو آگاہ کرنا ہے کہ منافقین کا کفر پوشیدہ ہے، اس لیے وہ زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو نہ انھیں بھولنا چاہیے اور نہ ان سے کبھی غافل ہونا چاہیے۔ منافق اور مشرک مردوں کے ساتھ منافق اور مشرک عورتوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ وہ بھی ان کی پوری طرح راز دار، ہر طرح سے معاون اور تمام سازشوں میں شریک ہیں۔

② الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ: ''منافقین'' سے مراد مدینہ منورہ کے منافقین ہیں اور ''مشرکین'' سے مراد مکہ معظمہ کے مشرکین۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ذلت و رسوائی کا عذاب دیا، اس لیے کہ منافقین کا اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ غلط گمان تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو عمرۂ حدیبیہ ادا کرنے کے لیے آپ کے ساتھ گئے ہیں وہ واپس مدینہ نہیں آ سکیں گے، مشرکین انھیں وہیں تباہ و برباد کر دیں گے اور مشرکین نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے دین کو مٹنے سے نہیں بچا سکے گا اور کفر کا کلمہ بلند ہو کر رہے گا۔ (قرطبی وغیرہ)

③ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ: اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۹۸) کی تفسیر۔ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے: " أَيِ الظَّانِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ وَالْمُتَرَبِّصِيْنَ لَكُمُ الدَّوَائِرَ، عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ " ''(تاکہ ان منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو عذاب دے) جو اللہ کے متعلق برا گمان کرنے والے اور تم پر زمانے کی گردشوں کا انتظار کرنے والے ہیں، بری گردش خود انھی پر آنے والی ہے۔''

آیت 7 وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : یہ جملہ پہلے بھی گزر چکا ہے، یہاں اللہ کے جنود سے ڈرانا اور کفار و منافقین کو عذاب، غضب اور لعنت کی وعید سنانا مقصود ہے، جس کے ساتھ عزیز کی صفت مناسبت رکھتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جسے عذاب دینا چاہے یا ذلیل و رسوا کرنا چاہے کوئی اسے روک نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی اس کے مقابلے میں غالب آ سکتا ہے، مگر وہ حکیم بھی ہے، اس لیے اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق نافرمانوں کو فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ انھیں مہلت دیتا ہے، تاکہ وہ باز آ جائیں، مگر جب پکڑتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے جس سے بچ کر کوئی نکل نہیں سکتا۔

آیت 8 اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا: سورت کے شروع سے یہاں تک رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے

لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا۹

تا کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور دن کے شروع اور آخر میں اس کی تسبیح کرو۹

لیے فتح ونصرت، مغفرت، تکفیر سیئات اور جنت میں داخلے کی بشارت اور وعدے کا بیان ہے، جس کے ساتھ منافقین و کفار کے لیے عذاب، غضب، لعنت اور جہنم میں داخلے کی وعید کا بیان ہے۔ اب یہاں سے اس فتح مبین کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل کا آغاز ہوتا ہے جس کی تمہید کے طور پر رسول اللہ ﷺ کا مقام ومنصب بیان فرمایا، تا کہ مسلمان اسے پہچانیں اور آپ ﷺ کی اطاعت اور جاں نثاری میں کوئی دریغ نہ کریں۔ چنانچہ فرمایا کہ ہم نے آپ کو دنیا میں لوگوں کے سامنے حق کی شہادت دینے والا، اسے تمام لوگوں تک پہنچا دینے والا، آخرت میں ان پر پیغام حق پہنچا دینے کی شہادت دینے والا، فرماں برداروں کو بشارت دینے والا اور نافرمانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اس مقام پر اصل مقصود فتح کی بشارت اور اس سے متعلقہ معاملات ہیں، اس لیے آپ ﷺ کی تعریف میں صرف تین الفاظ "شَاهِدًا"، "مُبَشِّرًا" اور "نَذِيْرًا" بیان فرمائے، جبکہ سورۂ احزاب میں مقصود رسول اللہ ﷺ کے اپنے متبنّٰی زید رضی اللہ عنہ کی مطلقہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح اور دوسرے معاملات پر منافقین کی اُڑائی ہوئی گرد سے آپ ﷺ کا دامن پاک کرنا ہے، اس لیے وہاں سورۂ احزاب (۴۶) میں آپ ﷺ کی زیادہ تعریف فرمائی اور ان تینوں اوصاف کے ساتھ "وَ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا" (اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے اذن سے اور روشنی کرنے والا چراغ) بھی فرمایا۔ (ابن عاشور) "شَاهِدًا" کی تفسیر کے لیے مزید دیکھیے سورۂ احزاب (۴۵)، بقرہ (۱۴۳) اور سورۂ نساء (۴۱)۔

**آیت 9** لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ......: "تعزیر" کا معنی ہے تعظیم کے ساتھ مدد کرنا۔ (راغب) اور "توقیر" وقار سے نکلا ہے، تعظیم کرنا۔ اس بات پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ "تُسَبِّحُوْهُ" (اس کی تسبیح کرو) سے مراد اللہ تعالیٰ کی تسبیح ہے، کیونکہ تسبیح اللہ کے سوا کسی کی ہو ہی نہیں سکتی۔ اکثر مفسرین کے مطابق اس سے پہلے دونوں الفاظ "تُعَزِّرُوْهُ" اور "تُوَقِّرُوْهُ" میں بھی ضمیر غائب کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہونا چاہیے، تا کہ تمام ضمیروں میں موافقت رہے۔ مطلب یہ ہوگا: "تا کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (اللہ) کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور دن کے شروع اور آخر میں اس کی تسبیح کرو۔" اللہ کی مدد سے مراد اس کے دین کی مدد ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ﴾ [ محمد: ۷ ] "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا۔"

بعض مفسرین نے فرمایا کہ "وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ" میں ضمیر غائب اس سے پہلے "لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ" میں مذکور "رَسُوْلِهٖ" کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ وہ "تُعَزِّرُوْهُ" کے قریب تر ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذکر کے ساتھ آپ کی تعزیر وتوقیر کا حکم دے کر آخر میں اپنی تسبیح کا حکم دیا۔ اس مقام پر رسول اللہ ﷺ کی توقیر وتعزیر کے بیان کی مناسبت

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا

بے شک وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں

بالکل واضح ہے کہ آگے آپ کی بیعت کو اللہ تعالیٰ سے بیعت قرار دیا۔ مطلب یہ ہوگا: ''تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (رسول) کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور دن کے شروع اور آخر میں اس (اللہ) کی تسبیح کرو۔'' یہ معنی بھی درست ہے، اگرچہ اس میں ضمیروں میں موافقت نہیں رہتی، مگر قرینہ موجود ہو تو ضمیروں کا اتفاق ضروری نہیں ہوتا۔ اس معنی کی تائید سورۂ اعراف کی آیت سے ہوتی ہے جس میں تعزیر کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے لیے آیا ہے، فرمایا: ﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [ الأعراف : ۱۵۷ ] ''سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' قرآن و حدیث میں لفظ ''تعزیر'' قوت دینے یا مدد کرنے کے معنی میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ ہاں ''توقیر'' کا مادہ ''وَقَارٌ'' اللہ تعالیٰ کے لیے سورۂ نوح میں آیا ہے، فرمایا: ﴿ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴾ [ نوح : ۱۳ ] ''تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے؟'' اس لیے سیاق کے لحاظ سے دوسرا معنی درست ہے، اگرچہ اتحاد ضمائر کی جو خوبی پہلی تفسیر میں موجود ہے وہ دوسری میں نہیں۔

**آیت 10** : ① اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ : سیاق کے لحاظ سے اس بیعت سے مراد بیعت رضوان ہے اور مفسرین نے اس کا مصداق اسی کو قرار دیا ہے، اگرچہ ''يُبَايِعُوْنَكَ'' کے لفظ میں ہر وہ بیعت شامل ہے جو رسول اللہ ﷺ سے کی گئی، خواہ بیعتِ رضوان ہو یا اس سے پہلے یا بعد کی کوئی بیعت۔ اسے بیعت اس لیے کہتے ہیں کہ مسلمان اس عہد کے ذریعے سے اپنی جان اور اپنا مال جنت کے بدلے میں فروخت کر دیتا ہے۔ اسلام کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس نے اسلام قبول کیا وہ اپنی جان اور اپنا مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کر چکا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [ التوبة : ۱۱۱ ] ''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوب خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی تعظیم و تکریم اور اس کا شرف بیان کرنے کے لیے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ﴾ ''بے شک وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔'' یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [ النساء : ۸۰ ] ''اور جو رسول کی اطاعت کرے

عٓ ۹

يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾

**کے اوپر ہے، پھر جس نے عہد توڑا تو درحقیقت وہ اپنی ہی جان پر عہد توڑتا ہے اور جس نے وہ بات پوری کی جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا تھا تو وہ اسے جلد ہی بہت بڑا اجر دے گا ﴿۱۰﴾**

تو بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' کیونکہ رسول، اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے، اس لیے اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اس کے ہاتھ پر بیعت اس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے بیعت ہے۔

❷ **يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ** : '' يَدُ اللّٰهِ '' کا لفظی معنی ہے ''اللہ کا ہاتھ'' اور اللہ کے ہاتھ کی کیفیت مخلوق کے علم و ادراک سے بلند ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے فرمائے ہوئے الفاظ پر اکتفا کرنا چاہیے کہ ''اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔'' رہی یہ بات کہ کیسے ہے؟ تو یہ بات اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مفسرین نے یہاں مختلف تاویلیں کی ہیں اور سب تاویلوں کا باعث یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں جیسا سمجھا اور اس کا ہاتھ اوپر ہونے کو اپنا ہاتھ اوپر ہونے کی طرح سمجھا، اس لیے اس کا انکار کر دیا یا تاویل کر دی۔ حالانکہ یہ بات بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے بھی یہ آیات سنیں، کسی نے تاویل کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، نہ کسی نے انکار کیا، جو الفاظ جس طرح آئے اسی طرح مان لیے۔ ہمیں بھی اس چکر میں نہیں پڑنا چاہیے کہ اللہ کا ہاتھ کیسا ہے اور ان کے ہاتھوں کے اوپر کس طرح ہے۔

❸ بیعتِ رضوان وہ بیعت ہے جو حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے ایک درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کی تھی۔ ان کی تعداد اکثر صحیح روایات کے مطابق چودہ سو تھی، بعض صحابہ نے پندرہ سو بھی بیان کی ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ چودہ سو اور پندرہ سو دونوں روایتیں موجود ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تطبیق یہ دی ہے کہ ان کی تعداد چودہ سو اور پندرہ سو کے درمیان تھی، بعض اوقات زائد کو چھوڑ کر چودہ سو بیان کر دیے اور بعض اوقات درمیان کا عدد پورا کر کے پندرہ سو بیان کر دیے۔ احادیث میں ہے کہ ان تمام صحابہ نے یہ بیعت کی، صرف جد بن قیس نامی شخص نے بیعت نہیں کی۔

اس بیعت کا باعث یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ سے اہلِ مکہ کی طرف بات چیت کے لیے بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو بیت اللہ کا عمرہ ادا کرنے سے نہ روکیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے واپس آنے میں دیر ہوئی تو افواہ پھیل گئی کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑنے کا پختہ ارادہ فرما لیا اور صحابہ کو بیعت کی دعوت دی۔ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے حدیبیہ میں درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو دفعہ بیعت کرنے کا ذکر کیا تو (ان کے شاگرد) یزید نے پوچھا: ''اے ابو مسلم! آپ اس دن کس چیز پر بیعت کرتے تھے؟'' انھوں نے فرمایا: ''موت پر۔'' [ بخاري، الجهاد والسير، باب البيعة في الحرب على أن لا يفروا: ۲۹۶۰ ] جبکہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے موت پر بیعت نہیں کی بلکہ اس بات پر بیعت کی کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔'' [ مسلم، الإمارة، باب استحباب مبايعة الإمام الجيش ... : ۱۸۵۶/۶۸ ] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ نے موت پر بیعت کی اور بعض نے اس بات پر کہ ہم کسی صورت میدان سے فرار اختیار نہیں

کریں گے اور دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے، کیونکہ کسی صورت نہ بھاگنے کا مطلب موت کے لیے تیار رہنا ہی ہے۔ چونکہ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر یقینی نہیں تھی، بلکہ ان کے زندہ ہونے کا بھی امکان تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اس بیعت میں شریک فرما لیا۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( فَلَوْ كَانَ أَحَدٌ أَعَزَّ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ عُثْمَانَ لَبَعَثَهُ مَكَانَهُ، فَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُثْمَانَ وَكَانَتْ بَيْعَةُ الرِّضْوَانِ بَعْدَ مَا ذَهَبَ عُثْمَانُ إِلٰى مَكَّةَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذِهِ يَدُ عُثْمَانَ فَضَرَبَ بِهَا عَلٰى يَدِهِ، فَقَالَ هٰذِهِ لِعُثْمَانَ )) [ بخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب عثمان بن عفان أبي عمرو القرشي رضی اللہ عنہ: ۳۶۹۹ ] ''اگر وادیٔ مکہ میں عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی شخص عزت والا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بجائے اسے بھیجتے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا اور بیعتِ رضوان عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ جانے کے بعد ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔'' پھر اسے دوسرے ہاتھ پر مار کر فرمایا: ''یہ عثمان کی بیعت ہے۔'' کفار کو جب اس بیعت کے متعلق پتا چلا تو وہ ڈر گئے اور انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو واپس بھیج دیا اور صلح کی کوششیں شروع کر دیں جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہوئی۔

④ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ : یہ بات مسلّم ہے کہ ان صحابہ میں سے کسی نے اس بیعت میں کیا ہوا عہد نہیں توڑا، خصوصاً اس لیے کہ یہ بیعت خونِ عثمان کے قصاص کے لیے لڑائی کے متعلق لی گئی تھی اور اس کا دورانیہ بیعت سے لے کر صلح ہونے تک تھا۔ اس بیعت سے حاصل شدہ رضوانِ الٰہی کے لیے اتنا ہی کافی ہے، اگرچہ بعد میں بھی ان صحابہ میں سے کسی سے میدان جہاد سے فرار ثابت نہیں۔

⑤ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ ...... : اللہ تعالیٰ کے اس عہد کو پورا کرنے والوں کے لیے اجرِ عظیم ہے اور جیسا کہ آگے آ رہا ہے اللہ تعالیٰ کے راضی ہو جانے کی بشارت کے بعد جو لوگ ان مبارک ہستیوں سے بغض یا عداوت رکھیں ان کی بدنصیبی میں کیا شک ہے۔

⑥ بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ : جمہور قراء نے ''عَلَيْهُ'' کی ''ہاء'' پر کسرہ پڑھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضمیر اصل میں ''هُوَ'' ہے، واؤ حذف کرنے کے بعد بھی یہ مضموم ہی رہتی ہے، جیسے '' لَهُ '' اور '' ضَرَبَهُ '' میں ہے، البتہ اس سے پہلے ''یاء'' ہو تو اس کی رعایت سے اس پر کسرہ پڑھا جاتا ہے، جیسے ''فِيْهِ ، اِلَيْهِ ، عَلَيْهِ'' وغیرہ میں ہے۔ یہاں حفص نے جو اس پر ضمہ پڑھا ہے آلوسی نے اس کی دو مناسبتیں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک کی تفصیل یہ ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت اور عہد کا ذکر ہے جو لفظ ''اللّٰهَ'' کو ایسے طریقے سے ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے جس سے اس کی عظمت اور جلال کا اظہار ہوتا ہو کہ کتنی عظیم ہستی سے عہد کیا گیا ہے اور معلوم ہے کہ لفظ '' اَللّٰهُ '' سے پہلے اگر کسرہ ہو تو اس کے لام کو باریک پڑھا جاتا ہے، اسے تفخیم کے ساتھ (پُر کر کے) نہیں پڑھا جاتا۔ اس لیے ''عَلَيْهُ'' کی ''ہاء'' پر کسرہ کے بجائے ضمہ لایا گیا ہے، تاکہ لفظ ''اللّٰهَ'' کی ادائیگی پوری شان و شوکت اور جلال و عظمت کے اظہار کے ساتھ ہو۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ ''عَلَيْهُ'' میں ''ہاء'' اصل میں ''هُوَ'' ہے، جیسا کہ پیچھے گزرا، لہٰذا اس کا اصل اعراب ضمہ ہے نہ کہ کسرہ، اس لیے اصل ضمہ کو باقی رکھنا اصل عہد کے قائم رکھنے اور پورا

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَاۤ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾

عنقریب بدویوں میں سے پیچھے چھوڑ دیے جانے والے تجھ سے کہیں گے کہ ہمارے اموال اور ہمارے گھر والوں نے ہمیں مشغول رکھا، سو تو ہمارے لیے بخشش کی دعا کر۔ وہ اپنی زبانوں سے کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ کہہ دے پھر کون ہے جو اللہ سے تمھارے لیے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو، اگر وہ تمھارے بارے میں کسی نقصان کا ارادہ کرے، یا وہ تمھارے ساتھ کسی فائدے کا ارادہ کرے، بلکہ اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پورا باخبر ہے ﴿۱۱﴾

کرنے کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

**آیت 11** ❶ **سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ :** رسول اللہ ﷺ نے جب عمرہ کے لیے جانے کا ارادہ فرمایا تو مدینہ کے اردگرد کے اعراب کو ساتھ چلنے کے لیے کہا، تاکہ اہلِ مکہ مسلمانوں کی تعداد دیکھ کر انھیں عمرہ سے نہ روکیں، مگر ان میں سے اکثر لوگ جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے۔ یہ لوگ اگرچہ منافق نہیں تھے مگر ابھی تک ایمان ان کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں نہیں ہوا تھا۔ اس کی دلیل آگے آنے والی آیات ”قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ ...... “ ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مظفر و منصور واپس روانہ ہوئے تو ان لوگوں نے اپنے دلوں میں عذر بہانے تیار کیے جو وہ آپ کی آمد پر آپ کے سامنے پیش کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پہلے ہی راستے میں ان کے بہانوں کی اطلاع دے دی جو وہ پیش کرنے والے تھے اور ان کے پیچھے رہنے کا حقیقی سبب بھی بتا دیا۔ یہ قرآن مجید کے معجزات میں سے ہے کہ اس نے وہ بات پہلے ہی بتا دی جو بعد میں ہونے والی تھی۔

❷ ”**الْمُخَلَّفُوْنَ**“ کا لفظی معنی ”پیچھے چھوڑ دیے جانے والے“ ہے، جبکہ یہ لوگ جان بوجھ کر خود پیچھے رہے تھے، تو بظاہر ان کے لیے لفظ ”مُتَخَلِّفُوْنَ“ (پیچھے رہنے والے) استعمال ہونا چاہیے تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ”**الْمُخَلَّفُوْنَ**“ کا لفظ استعمال فرمایا۔ یعنی ان کی بدنیتی اور شامتِ اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ساتھ جانے کی توفیق ہی نہیں دی، بلکہ انھیں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کا نیک اعمال سے محروم رہنا اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس کے اعمالِ بد کی وجہ سے نیک اعمال کی توفیق سلب کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ تبوک کے مخلفین کے متعلق فرمایا:

﴿ وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴾ [التوبۃ : ۴۶] ”اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے کچھ سامان ضرور تیار کرتے اور لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو انھیں روک دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔“ مزید دیکھیے سورۂ توبہ (۸۱)۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ⑫

**بلکہ تم نے گمان کیا کہ رسول اور ایمان والے کبھی اپنے گھر والوں کی طرف واپس نہیں آئیں گے اور یہ بات تمھارے دلوں میں خوش نما بنا دی گئی اور تم نے گمان کیا، برا گمان اور تم ہلاک ہونے والے لوگ تھے ⑫**

③ شَغَلَتْنَاۤ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا : یعنی یہ اعراب کہیں گے کہ ہمارے مال مویشی اور بیوی بچے ہمارے آپ کے ساتھ چلنے کی راہ میں رکاوٹ بن گئے، کیونکہ ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے ہماری اس کوتاہی پر آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں معاف فرما دے۔

④ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ : یعنی یہ لوگ تمھارے مدینہ پہنچنے پر اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہیں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں۔ مال مویشی اور اہل و عیال کی رکاوٹ ان کا جھوٹا بہانہ ہے۔ اسی طرح ان کا استغفار کے لیے کہنا محض بناوٹ ہے، ورنہ گناہ کا ایسا ہی احساس ہوتا تو ساتھ کیوں نہ جاتے۔ ان کے نہ جانے کا اصل سبب اللہ علام الغیوب نے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

⑤ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ...... : یہ ان کی دونوں باتوں کا جواب ہے، فرمایا تم جو اپنے کہنے کے مطابق اپنے مال و اہل کی دیکھ بھال اور حفاظت کی وجہ سے ساتھ نہیں گئے، بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے اور تمھارے جہاد سے پیچھے رہنے پر گھر میں موجود ہونے کے باوجود تمھارے اموال اور گھر والوں کو تباہ و برباد کر دے تو تمھیں اس سے کون بچا سکتا ہے؟ یا اگر وہ تمھیں کوئی فائدہ پہنچانا چاہے اور تمھارے جہاد پر جانے کے باوجود تمھارے اموال اور گھر والوں کی حفاظت کرے اور ان میں برکت اور اضافہ فرما دے تو کون اسے روک سکتا ہے؟ جب نفع و نقصان کو کوئی روک نہیں سکتا تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مقابلے میں ان چیزوں کی پروا کیوں کرتے ہو؟ اور تم نے جو استغفار کے لیے کہا ہے، اگر تم فی الواقع اپنے کیے پر نادم ہو اور اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کرنا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے؟ پھر اگر میں تمھارے لیے استغفار نہ بھی کروں تو تمھارا کچھ نقصان نہیں اور اگر تم نادم نہیں ہو، صرف بناوٹ کے طور پر استغفار کے لیے کہہ رہے ہو تو اس صورت میں اگر میں تمھارے لیے استغفار کر بھی دوں اور اللہ تعالیٰ تمھیں معاف نہ کرنا چاہے، بلکہ سزا دینا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے؟

⑥ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا : یعنی بات وہ نہیں جو تم نے سمجھ رکھی ہے کہ ہم زبان سے جو کچھ کہہ دیں گے مان لیا جائے گا اور ہمارے دل کا حال چھپا رہے گا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف موجود وقت ہی میں نہیں بلکہ ہمیشہ سے ان تمام اعمال سے پورا باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ ہمیشگی کا مفہوم "كَانَ" ادا کر رہا ہے۔ مفسر طبری کے الفاظ ہیں: " بَلْ لَمْ يَزَلِ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مِنْ خَيْرٍ وَ شَرٍّ خَبِيْرًا " "بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان کے تمام اچھے اور برے اعمال کی پوری خبر رکھنے والا رہا ہے۔"

آیت 12 ① بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ...... : یعنی تمھارے پیچھے رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ تم

وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لایا تو یقیناً ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے ﴿۱۳﴾ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، وہ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴﴾

نے سمجھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان، جو احرام باندھ کر جا رہے ہیں، پورا اسلحہ بھی ساتھ لے کر نہیں جا رہے اور اس دشمن کے پاس جا رہے ہیں جس نے سیکڑوں میل دور سے آ کر مدینہ میں ان کے کئی آدمی قتل کر دیے اور سخت نقصان پہنچایا، یہ وہیں کاٹ ڈالے جائیں گے، کوئی بچ کر واپس نہیں آئے گا۔

② وَ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ : یعنی تمھیں اپنے پیچھے رہنے پر کوئی ندامت بھی نہ تھی، بلکہ دل میں خوش تھے کہ ہم نے بہت اچھا کیا کہ ساتھ نہیں گئے۔ ''یہ بات تمھارے دلوں میں مزین کر دی گئی'' اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے فعل مجہول "زُيِّنَ" کا لفظ استعمال فرمایا۔ مزین کس نے کیا، اس کی صراحت نہیں فرمائی، کیونکہ وہ متعدد چیزیں ہیں، مثلاً دنیا کی مرغوبات، آدمی کا نفس، شیطان اور برے ساتھی وغیرہ۔

③ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا : "بُوْرًا" "بَائِرٌ" کی جمع ہے جو "بَارَ يَبُوْرُ بَوْرًا" (ن) سے اسم فاعل ہے، ہلاک ہونے والے۔ یعنی اصل بات یہ ہے کہ تم شروع سے اپنی نامردی اور بزدلی کی وجہ سے تھے ہی ہلاک ہونے والے، کیونکہ بہادر مومن تو ایک دفعہ مرتا ہے جبکہ بزدل منافق ہر گھڑی مرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ﴾ [ المنافقون : ۴ ] ''(ایسے بزدل ہیں کہ) ہر اونچی آواز کو اپنے آپ پر آنے والی (آفت) ہی سمجھتے ہیں۔''

**آیت 13** وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے متعلق برا گمان رکھے، مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں کے نقصان پر اور اپنی جان بچانے پر خوش ہو وہ مومن نہیں بلکہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کلمۂ اسلام کہنے اور مسلمانوں کے ساتھ مسلمان بن کر رہنے کی وجہ سے دنیوی احکام میں انھیں مسلمان ہی سمجھا جائے گا، مگر آخرت میں ان کے لیے کھلے کافروں سے بھی سخت عذاب تیار ہے، فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [ النساء : ۱۴۵ ] ''بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔''

**آیت 13** ① وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : یہ ان پیچھے چھوڑ دیے جانے والے اعراب کو فرمایا جن کا اوپر ذکر ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، اگر تم نے نفاق پر اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد پر جانے سے گریز پر اصرار کیا تو کسی میں طاقت نہیں کہ وہ جو عذاب دینا چاہے اس سے تمھیں بچا سکے، یا اگر وہ تمھاری ندامت اور توبہ پر

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾

عنقریب پیچھے چھوڑ دیے جانے والے لوگ کہیں گے جب تم کچھ غنیمتوں کی طرف چلو گے، تاکہ انھیں لے لو، ہمیں چھوڑو کہ ہم تمھارے ساتھ چلیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔ کہہ دے تم ہمارے ساتھ کبھی نہیں جاؤ گے، اسی طرح اللہ نے پہلے سے کہہ دیا ہے۔ تو وہ ضرور کہیں گے بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو۔ بلکہ وہ نہیں سمجھتے تھے مگر بہت تھوڑا۔ ﴿۱۵﴾

تمھیں معاف کر دے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

② يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ...... : اس میں ان اعراب کو توبہ کی اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی طرف پلٹ آنے کی ترغیب دی ہے کہ اب بھی وقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پیچھے بیٹھ رہنے سے توبہ کر لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو معاف کرنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے اور اس کی یہ صفت آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔

③ "يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ" کی تقسیم سے معلوم ہوا کہ پیچھے رہنے والوں میں سے کچھ ایسے ہوں گے جو نفاق سے توبہ کر کے اخلاص کی نعمت سے سرفراز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت سے فیض یاب ہوں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو نفاق سے توبہ نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں عذاب دے گا۔ آگے آیت: ﴿ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ ...... ﴾ سے بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے۔

آیت 15 ① سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ ...... : اللہ تعالیٰ نے بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ پر اپنے بہت سے انعامات کے علاوہ، جن کا ذکر آیت (۱۸، ۱۹) میں آ رہا ہے، انھیں ایک بہت جلدی حاصل ہونے والی فتح کا وعدہ بھی فرمایا جس میں انھیں بہت سی غنیمتیں حاصل ہوں گی۔ مقصد ان کی اس دل شکنی کا ازالہ تھا جو حدیبیہ کے موقع پر ہوئی، اس کے علاوہ اس اطاعت، وفاداری اور جاں فروشی کا انعام دینا بھی تھا جس کا مظاہرہ انھوں نے اس سارے غزوہ کے دوران کیا۔ ان غنیمتوں سے مراد خیبر ہے جس کا فتح کرنا یہودیوں کی مسلسل شرارتوں اور عہد شکنیوں کی وجہ سے نہایت ضروری تھا، مگر قریش کی حمایت کی وجہ سے اس میں مشکلات درپیش تھیں۔ اب قریش کی طرف سے بے فکری ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر چڑھائی کا ارادہ فرمایا۔ اس مہم میں مسلمانوں کی فتح اور بے شمار غنیمتوں کا حصول سب کو صاف نظر آ رہا تھا اور ایسے ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ کے تین ماہ بعد ہی رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر چڑھائی کی اور بڑی آسانی سے اسے فتح فرما لیا، بلکہ خیبر کے اردگرد کی یہودیوں کی بہت سی بستیاں بھی کسی خاص مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آ گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی آگاہ فرما دیا کہ جب

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ

بدویوں میں سے پیچھے چھوڑے جانے والوں سے کہہ دے عنقریب تم ایک سخت لڑنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ

تم خیبر کی طرف غنیمتیں حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو گے تو یہ پیچھے رہنے والے کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دو۔

② يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ : یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان غنیمتوں کا وعدہ اس درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں سے کیا تھا اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ غنیمتیں ان لوگوں کو بھی مل جائیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کے لیے گھر ہی سے نہیں نکل سکے، بیعت انھوں نے خاک کرنا تھی۔ اب ان کی بات مان لی جائے تو اللہ کی بات تو اپنی جگہ نہ رہی۔

③ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا : آپ ان سے کہیے، تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤ گے، کیونکہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جنھوں نے اس وقت رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا جب موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔

④ كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ : یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ پہلے ہی کر دیا ہے کہ فتح کے ثمرات کے حق دار بھی صرف وہ ہیں جنھوں نے اس وقت ساتھ دیا جب جان و مال کی بازی لگانے کا وقت تھا۔

⑤ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا : فرمایا، یہ لوگ ساتھ جانے کی اجازت نہ ملنے پر کہیں گے، بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو کہ ان غنیمتوں کے حصول سے ہماری مالی حالت اچھی نہ ہو جائے۔

⑥ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا : فرمایا، مسلمانوں کو ان پر کوئی حسد نہیں اور نہ ان کی پاک فطرت میں اس کی گنجائش ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو خواہ مخواہ موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں، اپنے قصور کی سمجھ نہ انھیں پہلے آئی نہ اب تک اسے سمجھ رہے ہیں، (كَانُوْا میں استمرار ہے) کہ جب اس سے پہلے وہ کوئی جانی و مالی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو اب آسانی سے ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت میں انھیں کیسے حصے دار بنایا جا سکتا ہے اور جب پہلے ان کے اموال اور گھر والوں نے انھیں گھر سے نکلنے سے روکے رکھا تو اب وہ انھیں نکلنے سے کیوں نہیں روک رہے؟ بہت کم سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل نہیں سمجھتے۔ قرآن مجید اور کلامِ عرب میں قلیل کا لفظ مطلق نفی کے لیے عام استعمال ہوا ہے۔

آیت 16 ① قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ ...... : اس آیت میں پیچھے رہنے والے اعراب کو تسلی دلائی ہے کہ آئندہ غزوات میں انھیں شرکت کا اور غنیمتیں حاصل کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا، تا کہ انھیں اطمینان ہو جائے کہ انھیں اسلامی لشکر کے ساتھ خیبر میں جانے سے اس لیے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اسلام سے نکل گئے ہیں، بلکہ اس کا ایک خاص سبب ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ چنانچہ آئندہ جس طرح دوسرے مسلمانوں کو کفار سے لڑنے کی دعوت دی جائے گی انھیں بھی دی جائے گی۔ اس آیت میں ان کی اس دل شکنی کا مداوا فرمایا ہے جو خیبر میں شریک نہ کیے جانے سے ہوئی اور ان کے حق میں یہ عظیم خوش خبری بھی دی کہ وہ خیبر سے پیچھے رہ جانے کی کوتاہی کی تلافی کر سکتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ حدیبیہ سے پیچھے رہنے والے اعراب کے یہ قبائل آئندہ جنگوں مثلاً فتح مکہ، جنگ حنین، جنگ تبوک اور جنگ یمامہ میں شریک ہوئے، ان میں سے کم

یُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶﴾

گے، تم ان سے لڑو گے، یا وہ تابع فرمان ہو جائیں گے، پھر اگر تم حکم مانو گے تو اللہ تمھیں اچھا اجر دے گا اور اگر پھر جاؤ گے، جیسے تم اس سے پہلے پھر گئے تو وہ تمھیں سزا دے گا، دردناک سزا ﴿۱۶﴾

ہی کوئی شخص ان جنگوں سے پیچھے رہا۔ یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ لوگ ایمان سے محروم نہیں ہوئے تھے، کیونکہ اس کے بعد جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والے منافقین، جو دل میں کفر چھپائے ہوئے تھے، ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا گیا، نہ انھیں آئندہ کسی جنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی اور نہ ان کے حق میں یہ اجازت ملی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ۝ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۸۳، ۸۴ ] ”پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے، پھر وہ تجھ سے (جنگ کے لیے) نکلنے کی اجازت طلب کریں تو کہہ دے تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے۔ بے شک تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے، سو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔“

② سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ: جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والے منافقین کے برعکس غزوۂ حدیبیہ سے پیچھے رہنے والے اعراب کے متعلق فرمایا کہ آئندہ تمھیں سخت لڑائی والے لوگوں سے جنگ کے لیے بلایا جائے گا۔ ”سَتُدْعَوْنَ“ (عنقریب تمھیں بلایا جائے گا) کا لفظ عام ہے، تاکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے خلفاء کا جنگ کے لیے دعوت دینا بھی شامل ہو جائے۔ ان سخت لڑائی والے لوگوں کے بارے میں مفسرین کے چار اقوال ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد ثقیف و ہوازن ہیں جن کے ساتھ جنگ حنین ہوئی۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد رومی ہیں جن سے جنگ کے لیے رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک میں سب لوگوں کو ساتھ جانے کی دعوت دی اور بعد میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی ان سے جنگ ہوئی۔ تیسرا یہ کہ اس سے مراد بنو حنیفہ کے مرتدین ہیں جن سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ کی اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل فارس ہیں جن کے ساتھ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانے میں جنگ ہوئی۔ امام طبری رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے اعراب کے ان مخلفین کے متعلق فرمایا کہ انھیں سخت لڑائی والے اور بہادر لوگوں سے لڑنے کی دعوت دی جائے گی اور کسی عقلی یا نقلی دلیل سے ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے مراد خاص ہوازن ہیں یا بنو حنیفہ یا فارس یا روم۔ ہو سکتا ہے ان سے مراد ان میں سے بعض ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور لوگ ہوں۔ اور اس قول سے زیادہ کوئی قول صحیح نہیں

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

**نہیں ہے اندھے پر کوئی تنگی اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی اور نہ بیمار پر کوئی تنگی اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے گا وہ اسے ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور جو پھر جائے گا وہ اسے سزا دے گا، دردناک سزا ﴿۱۷﴾**

ہوسکتا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انھیں ایک سخت لڑنے والی قوم کی طرف بلایا جائے گا، سو اسی پر اکتفا ہونا چاہیے۔“

③ **تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ** : یعنی تم ان سے لڑو گے یا وہ لڑائی کے نتیجے میں یا لڑائی کے بغیر ہی تابع فرمان ہو جائیں گے، یا جزیہ دینا قبول کر لیں گے۔ بعض مفسرین نے ”اَوْ يُسْلِمُوْنَ“ کا معنی کیا ہے ”یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔“ ان کے مطابق اس آیت میں ان لوگوں سے جنگ کی پیش گوئی ہے جن سے جزیہ لینے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ ان کے لیے دو ہی راستے تھے کہ یا مسلمان ہو جائیں یا جنگ کے لیے تیار رہیں۔ یہود و نصاریٰ سے بالاتفاق جزیہ لینا درست ہے، ہجر کے مجوس سے بھی رسول اللہ ﷺ کا جزیہ لینا ثابت ہے۔ البتہ مشرکینِ عرب کے متعلق سورۂ توبہ (۵) میں یہ حکم اترا کہ ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں، ان میں سے کسی سے رسول اللہ ﷺ نے جزیہ نہیں لیا۔ ان مفسرین کے قول کے مطابق اس آیت سے مراد ثقیف و ہوازن ہو سکتے ہیں جو جنگِ حنین میں قتل ہو گئے یا گرفتار ہونے کے بعد سب کے سب مسلمان ہو گئے، یا بنو حنیفہ کے مرتدین ہیں جن سے اس وقت تک جنگ کی گئی جب تک وہ دوبارہ مسلمان نہیں ہو گئے۔ البتہ پہلے قول کے مطابق ”تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ“ (تم ان سے لڑو گے یا وہ تابع فرمان ہو جائیں گے) سے مراد ہوازن، روم و فارس، مرتدین اور وہ تمام کفار ہو سکتے ہیں جن سے مسلمان آئندہ جنگ کرنے والے تھے اور یہ قول زیادہ جامع ہے۔

④ **فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا** : یعنی اگر تم ان جنگجو لوگوں سے لڑنے کے حکم کی اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں بہت اچھا بدلا دے گا، دنیا میں فتح و نصرت اور عزت و غنیمت سے نوازے گا اور آخرت میں جنت عطا کرے گا۔

⑤ **وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا** : اور اگر اطاعت سے پھر جاؤ گے، جیسا کہ اس سے پہلے حدیبیہ کے موقع پر پھر گئے تھے تو تمھیں دردناک سزا دے گا کہ دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کرو گے اور آخرت میں جہنم میں جاؤ گے۔

آیت 17 ① **لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ ......** : ان تینوں میں سے اندھے اور لنگڑے کا عذر دائمی ہے اور بیمار کا عارضی، جو بیماری ختم ہونے پر ختم ہو جاتا ہے۔ جہاد سے پیچھے رہنے والوں پر عتاب کے بعد فرمایا کہ نابینا، لنگڑا اور بیمار اگر جہاد کے

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ

بلاشبہ یقیناً اللہ ایمان والوں سے راضی ہوگیا، جب وہ اس درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے، تو اس نے

لیے نہ نکلیں تو ان پر کوئی حرج نہیں۔

② وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ...... : جو شخص واقعی عذر کی وجہ سے جہاد کے لیے نہ نکل سکے مگر خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کا مطیع اور خیر خواہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں۔ ایسے لوگ پیچھے رہنے کے باوجود جہاد میں شریک ہی سمجھے جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۹۱): ﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ﴾ کی تفسیر میں مذکور حدیث۔

③ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ...... : بقاعی نے اس کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ واؤ عطف کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے: "أَيْ فَمَنْ تَخَلَّفَ مِنَ الضُّعَفَاءِ فَلَا حَرَجَ عَلَيْهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ......" یعنی پھر اندھے، لنگڑے اور مریض میں سے جو شخص پیچھے رہ جائے اس پر کوئی حرج نہیں اور جو پیچھے نہ رہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہوئے عذر کے باوجود نکل پڑے تو اللہ تعالیٰ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور جو عذر کی وجہ سے نہیں بلکہ اطاعت سے جی چراتے ہوئے جہاد سے منہ پھیرے گا اللہ تعالیٰ اسے عذابِ الیم دے گا۔ جہاد کے لیے نہ نکلنے کے بعض مقبول عذر اس سے پہلے سورۂ توبہ (۹۱، ۹۲) میں بیان ہو چکے ہیں۔

**آیت 18** ① لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ...... : اس سے پہلے "اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ" میں حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ تعالیٰ سے بیعت قرار دینے کے بعد اس سے پیچھے رہنے والوں کا حال بیان فرمایا، اب دوبارہ بیعت کرنے والوں پر اپنی رضا کا اور دوسری بشارتوں کا ذکر فرمایا۔

② اس درخت کے نیچے بیعت کرنے والے صحابہ کرام کو بیعت کے وقت ہی کائنات کی سب سے بڑی نعمت مل گئی اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی، کیونکہ اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ [التوبۃ: ۷۲] "اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی ہے۔" کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ "بلاشبہ یقیناً اللہ ایمان والوں سے اس وقت راضی ہوگیا جب وہ اس درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔" اس رضا ہی کی وجہ سے اس کا نام بیعتِ رضوان ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کا داخلہ لازم و ملزوم ہیں۔ (دیکھیے مجادلہ: ۲۲۔ توبہ: ۷۲) جب ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے شہادت دے دی کہ وہ ان پر راضی ہوگیا تو کس قدر بدنصیب ہے وہ گروہ جو ان مقبول بندوں سے ناراض اور ان سے بغض و عداوت رکھے اور کہے کہ وہ بعد میں نعوذ باللہ مرتد ہوگئے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو آئندہ کا علم نہیں تھا اور وہ رضا کیسی ہے جس کے باوجود وہ بندے مرتد ہو جائیں جن پر وہ راضی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے علاوہ مزید حاصل ہونے والی نعمتوں کا بیان آگے آ رہا ہے۔

# فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾

## جان لیا جو ان کے دلوں میں تھا، پس ان پر سکینت نازل کر دی اور انھیں بدلے میں ایک قریب فتح عطا فرمائی ﴿۱۸﴾

قرآن مجید کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ بیان کرتے ہیں: ''حدیبیہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: (( أَنْتُمْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ )) ''تم زمین والوں میں سب سے بہتر ہو۔'' اور (اس وقت) ہم چودہ سو تھے اور اگر آج مجھے دکھائی دیتا ہوتا تو میں تمھیں اس درخت کی جگہ دکھاتا۔'' [ بخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية : ٤١٥٤ ] ام مبشر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: (( لَا يَدْخُلُ النَّارَ، إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنْ أَصْحَابِ الشَّجَرَةِ أَحَدٌ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا تَحْتَهَا )) [ مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أصحاب الشجرة...... : ٢٤٩٦ ] ''ان شاء اللہ اس درخت والوں میں سے کوئی بھی آگ میں داخل نہیں ہوگا جنھوں نے اس کے نیچے بیعت کی۔'' جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حاطب رضی اللہ عنہ کا ایک غلام حاطب رضی اللہ عنہ کی شکایت لے کر آیا اور کہنے لگا: ''یا رسول اللہ! حاطب ضرور آگ میں داخل ہوگا۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَذَبْتَ لَا يَدْخُلُهَا فَإِنَّهُ شَهِدَ بَدْرًا وَالْحُدَيْبِيَةَ )) [ مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل حاطب بن أبي بلتعة...... : ٢٤٩٥ ] ''تو نے غلط کہا، وہ آگ میں داخل نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے تو بدر اور حدیبیہ میں شرکت کی ہے۔''

③ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( كُنَّا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ أَلْفًا وَ أَرْبَعَ مِائَةٍ فَبَايَعْنَاهُ وَعُمَرُ آخِذٌ بِيَدِهِ تَحْتَ الشَّجَرَةِ وَهِيَ سَمُرَةٌ )) [ مسلم، الإمارة، باب استحباب مبايعة الإمام الجيش...... : ١٨٥٦ ] ''ہم حدیبیہ کے دن چودہ سو تھے، ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور عمر رضی اللہ عنہ درخت کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور وہ کیکر کا درخت تھا۔''

④ طارق بن عبداللہ نے بیان کیا کہ میں حج کرنے کے لیے گیا تو میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں، میں نے پوچھا: ''کیا یہ نماز کی جگہ ہے؟'' انھوں نے کہا: ''یہ وہ درخت ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعتِ رضوان لی تھی۔'' میں سعید ابن مسیب کے پاس آیا اور انھیں بتایا تو سعید نے فرمایا: ''میرے والد نے مجھے بتایا کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، تو جب ہم اگلے سال آئے تو ہمیں وہ درخت بھلا دیا گیا، ہم اسے پا ہی نہ سکے۔'' سعید نے فرمایا: ''اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو وہ معلوم نہ ہوا اور تم نے اسے جان لیا، پھر تم زیادہ جاننے والے ہوئے؟'' [ بخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية : ٤١٦٣ ] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( رَجَعْنَا مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ فَمَا اجْتَمَعَ مِنَّا اثْنَانِ عَلَى الشَّجَرَةِ الَّتِيْ بَايَعْنَا تَحْتَهَا، كَانَتْ رَحْمَةً مِّنَ اللّٰهِ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب البيعة في الحرب أن لا يفروا : ٢٩٥٨ ] ''ہم آئندہ سال دوبارہ آئے تو ہم میں سے دو شخص بھی اس درخت پر متفق نہ ہو سکے جس کے نیچے ہم نے بیعت کی تھی، یہ اللہ کی طرف سے رحمت تھی۔'' فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے

# وَّ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾

**اور بہت سی غنیمتیں، جنھیں وہ حاصل کریں گے اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۹﴾**

فرمایا: ''اس میں حکمت یہ تھی کہ اس درخت کے نیچے خیر کے اس کام کی وجہ سے لوگ فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں، کیونکہ اگر اس کی پہچان باقی رہتی تو بعض جاہل لوگوں سے اس کی تعظیم کا خطرہ تھا، حتیٰ کہ ممکن تھا کہ وہ یہ عقیدہ رکھ لیتے کہ اس درخت میں نفع اور نقصان پہنچانے کی طاقت ہے، جیسا کہ اب اس سے بھی معمولی چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔'' ابنِ حجر نے اپنے زمانے کی بات کی ہے، ہمارے دور میں تو آثار پرستی کا معاملہ اس سے بھی کہیں دور پہنچ چکا ہے۔ آج کل جو لوگ پیروں فقیروں کے آستانوں کے درختوں، پتھروں اور قبروں کو پوجنے سے نہیں چوکتے اگر انھیں وہ درخت مل جاتا تو وہ کیا کچھ نہ کرتے۔

⑤ **فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ** : یعنی اللہ تعالیٰ نے اس صدق، اخلاص اور سمع و طاعت کو جان لیا جس کی وجہ سے انھوں نے دشمن کے اعتبار سے تعداد میں بہت کم ہونے اور تقریباً نہتے ہونے کے باوجود آخر دم تک میدان میں جمے رہنے کی بیعت کی اور اس سخت اضطراب اور بے قراری کو بھی جوان کے دل میں صلح کی ناگوار شرطوں پر پیدا ہوئی، جس کا باعث کوئی نافرمانی نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی محبت اور ان کی عزت اور سربلندی کا جذبہ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق و اخلاص کی بدولت ان کے دل پر سکینت نازل فرمائی، جس کی بدولت انھیں رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم پر دلی اطمینان اور سکون حاصل ہو گیا اور وہ جس طرح موت تک لڑنے کے لیے تیار تھے رسول اللہ ﷺ کی قبول کردہ شرطوں پر صلح کے لیے بھی تیار ہو گئے۔

⑥ یہ آیت بیعتِ رضوان والے صحابہ کے مخلص مومن ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے دلوں کے اخلاص کی شہادت دی ہے۔ نہایت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ایسے مخلص ایمان والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ منافق تھے۔ [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ ]

⑦ **وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا** : عام مفسرین اس ''فتح قریب'' سے مرادِ فتحِ خیبر لیتے ہیں اور یہ کچھ بعید بھی نہیں، مگر اہلِ علم کا ایک قول اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے، کیونکہ بیعتِ رضوان کے بعد یہی وہ بنیادی اور اہم فتح تھی جس سے مسلمانوں کے لیے دوسری تمام فتوحات کے راستے کھل گئے اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد خیبر فتح ہوا، پھر مکہ مکرمہ کی فتح ہوئی، حتیٰ کہ پورا جزیرۂ عرب رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔ اس سورت کی ابتدا میں اس صلح ہی کو فتح مبین فرمایا ہے۔

آیت 19 ① **وَ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا** : اس سے مراد خیبر اور یہود کی دوسری بستیاں ہیں جو کسی خاص مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔ صفی الرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں: ''خیبر مدینہ سے شمال کی طرف اسی (۸۰) میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا شہر تھا، جس میں کئی قلعے اور بہت سے باغات تھے۔ ابنِ اسحاق نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ حدیبیہ سے واپس آ کر

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَ لِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۟ۙ﴿۲۰﴾

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا جنھیں تم حاصل کرو گے، پھر اس نے تمھیں یہ جلدی عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے اور تا کہ یہ ایمان والوں کے لیے ایک نشانی بنے اور (تا کہ) وہ تمھیں سیدھے راستے پر چلائے ﴿۲۰﴾

مدینہ میں ذوالحجہ اور محرم کا کچھ حصہ ٹھہرے، پھر محرم کے باقی دنوں میں خیبر کی طرف نکلے۔'' (الرحیق المختوم) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: « اِفْتَتَحْنَا خَيْبَرَ، وَلَمْ نَغْنَمْ ذَهَبًا وَلَا فِضَّةً، إِنَّمَا غَنِمْنَا الْبَقَرَ وَالْإِبِلَ وَالْمَتَاعَ وَالْحَوَائِطَ » [ بخاري، المغازي، باب غزوۃ خیبر : ۴۲۳۴ ] ''ہم نے خیبر فتح کیا اور ہمیں سونا چاندی غنیمت میں نہیں ملا، ہمیں صرف گائے بیل، اونٹ، سامان اور باغات غنیمت میں ملے۔'' خیبر کی فتح کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہونے والی غنیمتوں کا اندازہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے ہوتا ہے، انھوں نے فرمایا: « مَا شَبِعْنَا حَتّٰى فَتَحْنَا خَيْبَرَ » [ بخاري، المغازي، باب غزوۃ خیبر : ۴۲۴۳ ] ''ہم نے سیر ہو کر نہیں کھایا حتیٰ کہ خیبر فتح کیا۔'' اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: « لَمَّا فُتِحَتْ خَيْبَرُ قُلْنَا الْآنَ نَشْبَعُ مِنَ التَّمْرِ » [ بخاري، المغازي، باب غزوۃ خیبر : ۴۲۴۲ ] ''جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا، اب ہم کھجوریں پیٹ بھر کر کھائیں گے۔'' الرحیق المختوم میں ہے: ''اس فتح کے نتیجے میں مہاجرین کے حصے میں اتنی زمین اور باغات آئے کہ انھوں نے کھجوروں کے وہ درخت انصار کو واپس کر دیے جو انصار نے مدینہ میں انھیں دے رکھے تھے۔''

❷ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا : چونکہ کفار کی تعداد اور سازو سامان کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت کے پیش نظر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی تھی، اس جملے کے ساتھ اس فتح و غنیمت کا سبب بیان فرمایا۔ بقاعی نے فرمایا: ''اس واؤ کے ساتھ مقدر جملے پر عطف ہے: ''أَيْ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَ حِكْمَتِهٖ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا'' یعنی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عزت و حکمت کی بدولت ہوا اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔ نہ اس پر کوئی غالب آ سکتا ہے، نہ اس کی تدبیر میں کسی خطا کی نشاندہی کر سکتا ہے۔

**آیت 20** ❶ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا : ان بہت سی غنیمتوں سے مراد صلح حدیبیہ، خیبر اور اس کے اردگرد کے علاقوں اور بستیوں کی فتح ہے، کیونکہ اس سے پہلے گزر چکا ہے: ﴿ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [ الفتح : ۱۵ ] ''عنقریب پیچھے چھوڑ دیے جانے والے لوگ کہیں گے جب تم کچھ غنیمتوں کی طرف چلو گے، تا کہ انھیں لے لو، ہمیں چھوڑو کہ ہم تمھارے ساتھ چلیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل

وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

اور کئی اور (غنیمتوں کا بھی)، جن پر تم قادر نہیں ہوئے۔ یقیناً اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۱﴾

دیں۔ کہہ دے تم ہمارے ساتھ کبھی نہیں جاؤ گے، اسی طرح اللہ نے پہلے سے کہہ دیا ہے۔ تو وہ ضرور کہیں گے بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو۔ بلکہ وہ نہیں سمجھتے تھے مگر بہت تھوڑا۔''

② فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ: تو اس نے تمھیں ان غنیمتوں میں سے یہ صلح حدیبیہ جلدی عطا فرما دی جس میں تمھارے اور قریش کے درمیان معاہدہ ہو گیا کہ دس سال تک جنگ بند رہے گی اور مسلمان آئندہ سال اسی ماہ آ کر عمرہ ادا کریں گے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں اور قریش کا ایک دوسرے کے پاس آنا جانا، ملنا جلنا شروع ہو گیا اور بے شمار لوگ مسلمان ہوئے، خیبر اور دوسرے علاقوں کی فتح کا دروازہ کھل گیا، غرض یہ صلح فتح بھی تھی اور اپنے بے شمار فوائد کے لحاظ سے غنیمت بھی۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد فتح خیبر لی ہے، یہ بھی ممکن ہے، مگر پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے، کیونکہ یہ آیات حدیبیہ سے واپسی پر اتری ہیں۔

③ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ : مسلمانوں سے لوگوں کے ہاتھ روک دینے میں مسلمانوں کی قلت کے باوجود قریش مکہ کو لڑائی سے روک دینا بھی شامل ہے اور خیبر اور دوسرے علاقوں کے یہود کو مدینہ پر حملہ آور ہونے سے روک دینا بھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ رعب تھا کہ جب مسلمانوں کی پوری جنگی قوت مدینہ سے باہر تھی، اگر اس وقت یہود اپنے حلیفوں اور منافقین کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوتے تو ان کے لیے میدان خالی تھا، کیونکہ وہاں عورتوں، بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی موجود نہ تھا، مگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ کسی کو یہ جرأت ہی نہیں ہونے دی۔

④ وَ لِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: اس جملے کا واؤ کے ساتھ مقدر جملے پر عطف ہے اور اسے مقدر اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ کئی جملوں میں سے کوئی ایک جملہ ہو سکتا ہے، مثلاً: '' فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ لِتَشْكُرُوْهُ وَ لِتَكُوْنَ الْمُعَجَّلَةُ وَ كَفُّ اَيْدِي النَّاسِ عَنْكُمْ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ '' ''یعنی اس نے یہ غنیمت تمھیں جلدی دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے، تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور تاکہ جلد عطا کی جانے والی یہ غنیمت اور لوگوں کے ہاتھوں کا تم سے روک دیا جانا ایمان والوں کے لیے ایک نشانی بن جائے (کہ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اسی طرح ہماری مدد فرمائے گا)۔'' ''لِتَشْكُرُوْهُ'' کے بجائے مقدر جملہ ''لِيَحْصُلَ لَهُمُ السَّكِيْنَةُ'' یا ''لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا'' وغیرہ بھی ہو سکتا ہے اور اسے حذف اسی لیے کیا گیا ہے کہ اگر ذکر کیا جاتا تو ایک آدھ بات ذکر ہو سکتی تھی، حالانکہ وہ بہت سی چیزیں ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ غنیمت پہلے عطا کر دی۔

⑤ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: یہ جملہ بھی قرآن مجید کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے، کیونکہ اہل حدیبیہ میں سے کوئی ایک شخص بھی صراطِ مستقیم سے ادھر ادھر نہیں ہوا، بلکہ سب کے سب آخر دم تک اسلام پر قائم رہے۔

آیت 21 ① وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا ...... : ''اُخْرٰى'' ''مَغَانِمَ'' کی صفت ہے جو یہاں محذوف ہے اور اس کا

وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۝۲۲

**اور اگر وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تم سے لڑتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے ، پھر وہ نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار ۝۲۲**

عطف "مَغَانِمَ كَثِيْرَةً" پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان غنیمتوں کے علاوہ، جن کا اوپر ذکر ہوا، کئی اور غنیمتوں کا بھی وعدہ فرمایا ہے جن پر تم قادر نہیں ہوئے ، مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں گھیرے میں لے لیا ہے۔ اس سے مراد سب سے پہلے فتح مکہ ہے جو فتح الفتوح تھی۔ مسلمان حدیبیہ والے سال اور اس سے اگلے سال اسے حاصل نہیں کر سکے مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کا فیصلہ ہو چکا تھا، چنانچہ صلح حدیبیہ ہی اس کا پیش خیمہ بنی۔ اس صلح کی ایک شرط یہ تھی کہ جو قبیلہ چاہے مسلمانوں کا حلیف بن جائے اور جو چاہے قریش مکہ کا حلیف بن جائے اور کوئی کسی کے خلاف یا اس کے حلیف کے خلاف جنگ نہ کرے۔ اس موقع پر بنوخزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف اور بنو بکر قریش مکہ کے حلیف بن گئے۔ مشرکین صلح کے بعد صرف دو سال تک معاہدہ پر قائم رہے، پھر ان کے حلیف قبیلہ بنو بکر نے رسول اللہ ﷺ کے حلیف بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا، جس میں قریش نے اسلحے اور آدمیوں کے ساتھ ان کی مدد کی اور کعبہ میں پناہ لینے کے باوجود انھیں قتل کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کے معاہدہ توڑنے کی اطلاع ملی تو آپ نے نہایت اخفا کے ساتھ دس ہزار صحابہ کرام کے ساتھ مکہ کی طرف کوچ فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح فرما دیا۔ لفظ عام ہونے کی وجہ سے فتح مکہ کے علاوہ وہ تمام فتوحات "وَ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا" میں داخل ہیں جو اس کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئیں، جن میں ثقیف و ہوازن کی فتح اور تبوک وغیرہ کی فتح بھی شامل ہیں۔ روم و فارس، مصر و شام، ہند و سندھ اور زمین کے مشرق و مغرب کے وہ تمام ممالک بھی جو قیامت تک مسلمانوں کے قبضے میں آنے والے تھے۔

② قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا : یہ اس سوال کا جواب ہے جو یہاں پیدا ہو سکتا تھا کہ مدینہ کی بستی کے یہ چودہ پندرہ سو آدمی، جن کے پاس اسلحہ اور دوسری ضروریات حتیٰ کہ سامانِ خورونوش کی بھی کمی ہے، اتنی کثیر فتوحات اور غنیمتیں کیسے حاصل کر سکتے ہیں، جب کہ پورا عرب ان کے خلاف ہے، جن کے پاس آدمیوں، اسلحے اور ساز و سامان کی فراوانی ہے؟ فرمایا یہ لوگ واقعی وہ فتوحات اور غنیمتیں حاصل نہیں کر سکتے ، مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان کا گھیرا کر لیا ہو اور انھیں مسلمانوں کو عطا فرمانا چاہتا ہو تو پھر کون ہے جو اسے روک سکے؟ اور اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔

**آیت 22** ① وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ اس نے کفار کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ وہ لڑائی سے باز رہے، اب فرمایا کہ حدیبیہ کے مقام پر بظاہر دب کر جو صلح کی جا رہی تھی وہ بزدلی کی بنا پر یا اس خطرے کے پیش نظر نہیں تھی کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے گی، بلکہ اس میں بہت سی حکمتیں ملحوظ تھیں، جن میں بعض

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ

اللہ کے اس طریقے کے مطابق جو پہلے سے گزر چکا ہے اور تو اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائے گا ﴿۲۳﴾ اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمھیں

کا ذکر گزر چکا اور کچھ آگے بیان ہو رہی ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر اس موقع پر کفار تم سے لڑ پڑتے تو یقیناً پیٹھیں پھیر کر بھاگ جاتے اور مکہ اسی وقت فتح ہو جاتا مگر یہ مصلحت کے خلاف تھا۔

② ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا: " ثُمَّ " (پھر) کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد خواہ کتنی مدت گزر جائے اور خواہ ان مشرکین کی تعداد کتنی ہو جائے کسی وقت بھی انھیں کوئی حمایتی ملے گا نہ کوئی مددگار۔

آیت 23 سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ...... : مراد اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ہے جو اس کے انبیاء کو جھٹلانے والی اقوام کے بارے میں ہمیشہ سے جاری ہے کہ جب وہ حد سے گزر جاتی ہیں تو انھیں ایسی سزا دی جاتی ہے کہ انھیں کوئی حمایتی ملتا ہے نہ مددگار اور اللہ تعالیٰ کی اس سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہاں عذاب کئی طرح سے آ سکتا ہے، قدرتی آفات کے ساتھ بھی، جیسا کہ قومِ نوح، عاد و ثمود اور آلِ فرعون پر آیا اور مومن بندوں کے ہاتھوں بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [ التوبة : ١٤ ] ''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔''

آیت 24 ① وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ ...... : جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حدیبیہ میں تھے تو صلح کی بات چیت کے دوران اور صلح ہو جانے کے بعد بھی مشرکین نے کوششیں کیں کہ کسی طرح لڑائی چھڑ جائے اور صلح نہ ہو سکے۔ ان کے متعدد گروہ چھپ کر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے خلاف کارروائی کے لیے آئے، مگر کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، بلکہ ہر مرتبہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ انھیں قتل بھی کیا جا سکتا تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے انھیں چھوڑ دیا، کیونکہ سزا دینے کی صورت میں جنگ ناگزیر ہو جاتی جب کہ مسلمانوں کی مصلحت صلح میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے اس احسان کی یاد دہانی کروائی ہے۔ یہاں کفار کی ان کوششوں کے تین واقعات درج کیے جاتے ہیں:

① سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہتا تھا، ان کے گھوڑے کو پانی پلاتا، اس کی مالش کرتا، ان کی خدمت کرتا اور انھی کے ہاں کھانا کھایا کرتا تھا اور میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے اپنا اہل و مال چھوڑ آیا تھا۔ پھر جب ہماری اور اہلِ مکہ کی صلح ہوگئی اور ہم ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے تو میں ایک درخت کے نیچے کانٹے وغیرہ صاف کر کے اس کے سائے میں لیٹ گیا۔ اہلِ مکہ میں سے چار مشرک میرے پاس آئے اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق بدزبانی کرنے لگے۔ میں ان سے نفرت کی وجہ سے ایک اور درخت کے نیچے چلا گیا اور وہ اپنا اسلحہ درخت کے ساتھ لٹکا کر لیٹ

اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾

ان پر فتح دے دی اور اللہ اس کو جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۴﴾

گئے۔ اسی دوران وادی کے نیچے سے کسی نے آواز دی: ''او مہاجرو! ابن زُنیم کو قتل کر دیا گیا۔'' میں نے اپنی تلوار لی اور ان چاروں پر حملہ کر دیا، وہ سوئے ہوئے تھے، میں نے ان کا اسلحہ لے کر اپنی مٹھی میں اکٹھا کر لیا اور ان سے کہا: ''قسم اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کے چہرے کو عزت بخشی ہے! تم میں سے جو بھی سر اٹھائے گا میں اس کا سر اڑا دوں گا جس میں اس کی آنکھیں ہیں۔'' خیر میں انھیں ہانکتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا اور میرا چچا عامر عَبلات میں سے ''مکرز'' نامی ایک مشرک کو کھینچتا ہوا لایا۔ یہاں تک کہ ہم نے انھیں ستر (۷۰) مشرکین سمیت رسول اللہ ﷺ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: (( دَعُوْهُمْ يَكُنْ لَهُمْ بَدْءُ الْفُجُوْرِ وَ ثِنَاهُ )) ''انھیں چھوڑ دو، تاکہ عہد شکنی کی ابتدا اور دہرائی انھی کے ذمے رہے۔'' غرض رسول اللہ ﷺ نے انھیں معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ﴾ [ الفتح : ٢٤ ] ''اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمھیں ان پر فتح دے دی۔'' [ مسلم، الجهاد، باب غزوة ذي قرد وغيرها : ١٨٠٧ ]

③ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہل مکہ میں سے اسی (۸۰) مسلح آدمی جبل تنعیم سے اتر کر آئے۔ وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، مگر آپ نے انھیں زندہ سلامت گرفتار کر لیا۔ پھر انھیں زندہ ہی رہنے دیا تو اللہ عز وجل نے یہ آیت اتاری: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ﴾ [ الفتح: ٢٤ ] ''اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمھیں ان پر فتح دے دی۔'' [ مسلم، الجهاد، باب قول الله تعالى : ﴿ وهو الذى كف أيديهم عنكم ﴾ : ١٨٠٨ ]

④ عبد اللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں اس درخت کے نیچے موجود تھے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ اس کی ٹہنیاں رسول اللہ ﷺ کی کمر سے لگ رہی تھیں اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور سہیل بن عمرو آپ کے سامنے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''لکھو، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' تو سہیل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ''ہم نہیں جانتے رحمان کیا ہوتا ہے، ہمارے معاملے میں وہی لکھو جو ہمارے ہاں معروف ہے۔'' اس نے کہا: ''یہ لکھو: '' بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ .'' پھر انھوں نے لکھا: ''یہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ سے صلح کی ہے۔'' تو سہیل بن عمرو نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ''اللہ کی قسم! اگر آپ اللہ کے رسول ہوں تو ہم نے آپ پر ظلم کیا، ہمارے معاملے میں وہ لکھو جو ہمارے ہاں معروف ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''لکھو، یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب نے صلح کی ہے اور میں اللہ کا رسول بھی ہوں۔'' یہ معاملہ ہو رہا تھا کہ تیس مسلح نوجوان نکل کر ہمارے سامنے آ گئے اور ہمارے سامنے آ کر

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَ لَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ

یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی، اس حال میں کہ وہ اس سے روکے ہوئے تھے کہ اپنی جگہ تک پہنچیں۔ اور اگر کچھ مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جنھیں تم نہیں جانتے تھے

مشتعل ہو گئے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان پر بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اندھا کر دیا، ہم نے بڑھ کر انھیں گرفتار کر لیا۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''کیا تم کسی کے عہد میں آئے ہو یا کسی نے تمھیں امان دی ہے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں!'' تو آپ ﷺ نے انھیں رہا کر دیا، اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴾ [ الفتح : ٢٤ ] ''اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمھیں ان پر فتح دے دی اور اللہ اس کو جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے خوب دیکھنے والا ہے۔'' [ مسند أحمد: ٨٦/٤، ٨٧، ح: ١٦٨٠٥ ] مسند احمد کے محققین نے اسے صحیح کہا ہے۔

❷ یہاں بیت اللہ والے شہر کا نام ''مکہ'' بیان فرمایا ہے، جب کہ سورۂ آلِ عمران (۹۶) میں اس کا نام ''بکہ'' قرار دیا ہے، معلوم ہوا اس شہر کے دونوں نام ہیں۔

❸ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا : یعنی اللہ تعالیٰ کفار کی سراسر زیادتی اور تمھارے صبر اور اطاعت کو خوب دیکھ رہا تھا، اس کے باوجود اس نے بہت سی مصلحتوں کے پیشِ نظر ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے۔

آیت 25 ❶ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : اس سے اہلِ مکہ کی اس زیادتی کا بیان مقصود ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عار قرار دیا اور وہ یہ کہ اللہ کے رسول پر ایمان لانے کے بجائے کفر پر اڑ گئے اور انھوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخلے اور اس کے طواف سے اور عمرہ کے دوسرے ارکان ادا کرنے سے روک دیا اور لڑائی پر آمادہ ہو گئے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان لڑنے کی نیت سے نہیں آئے تھے، نہ وہ پوری طرح ہتھیار لائے تھے، بلکہ وہ حالت احرام میں تھے۔ لڑنا تو ایک طرف رہا وہ اس حالت میں کسی کو ایذا بھی نہیں دے سکتے تھے۔

❷ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ : "الْهَدْيَ" مصدر بمعنی اسم مفعول : "أَيِ الْأَنْعَامُ الْمُهْدِيَّةُ" وہ چوپائے جو کعبہ میں قربانی کے لیے لائے جاتے ہیں۔ یہ لفظ مصدر ہونے کی وجہ سے واحد جمع اور مذکر و مؤنث سب پر استعمال ہوتا ہے۔ "مَعْكُوْفًا" "عَكَفَ يَعْكُفُ" (ن) سے اسم مفعول ہے۔ "عَكَفَ" لازم بھی آتا ہے جس کا معنی ''ایک جگہ ٹھہرنے کو لازم کر لینا'' ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ [ البقرة : ١٨٧ ] ''جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔'' یہاں متعدی استعمال ہوا ہے: "عَكَفَهُ أَيْ حَبَسَهُ." "مَعْكُوْفًا" جسے ایک جگہ روک کر رکھا گیا ہو۔ "الْهَدْيَ" پر نصب اس لیے آیا ہے کہ اس کا عطف "صَدُّوْكُمْ" میں ضمیر مخاطب پر ہے اور "مَعْكُوْفًا" "الْهَدْيَ" سے حال ہونے کی وجہ سے

مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾

**(اگر یہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے تو تم پر لاعلمی میں ان کی وجہ سے عیب لگ جائے گا (تو ان پر حملہ کر دیا جاتا) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کر لے، اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ضرور ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے کفر کیا تھا، سزا دیتے، دردناک سزا ﴿۲۵﴾**

منصوب ہے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روک دیا، اس حال میں کہ وہ اپنے حلال ہونے کی جگہ پہنچنے سے روکی ہوئی تھیں۔ یعنی قربانیوں کو بھی مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جو عمرہ اور حج کی قربانیوں کے حلال ہونے کی اصل جگہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ ہدی یعنی قربانی کے اونٹ لے کر آئے تھے، جب کفار نے اس سال مکہ میں داخلے اور عمرہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اسے آئندہ سال کے لیے مؤخر کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر وہ جانور قربان کر دیے اور سر منڈا کر احرام کھول دیا۔

③ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ...... : "تَطَـُٔوْهُمْ" "وَطِئَ يَطَأُ وَطْأً" (س) روندنا، پامال کرنا۔ یہ مضارع معلوم سے جمع مذکر حاضر ہے۔ "مَعَرَّةٌ" عیب، گناہ، نقصان۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس موقع پر جنگ نہ ہونے دینے کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ مکہ میں مشرکین کے ساتھ کئی مومن مرد اور مومن عورتیں بھی موجود تھیں، جن کا مسلمانوں کو علم نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جو مسلمان ہو چکے تھے مگر انھوں نے اپنا ایمان چھپا رکھا تھا اور کچھ وہ تھے جو کھلم کھلا مسلمان ہو چکے تھے مگر بے بسی کی وجہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور کفار کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اگر مکہ پر حملہ ہوتا تو مشرکین کے ساتھ وہ مومن مرد اور مومن عورتیں بھی روند دیے جاتے جو مسلمانوں کے لیے عیب کا باعث ہوتا کہ انھوں نے اپنے ہی بھائی بہنوں کو قتل کر دیا، حالانکہ ان کا یہ قتل لاعلمی کی بنا پر ہوتا۔ عیب کا باعث ہونے سے مراد کفار کی طرف سے عیب لگانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ہی بھائی مار دیے اور وہ رنج و الم بھی جو اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوتا، ورنہ جنگ کے دوران کفار میں رہنے والے کسی مسلمان کو قتل کرنے پر نہ دیت ہے نہ کفارہ اور نہ ہی ملامت۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ روک کر یہ نوبت ہی نہ آنے دی کہ مسلمانوں پر کوئی الزام آ سکے۔ واضح رہے کہ "وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ" سے "بِغَيْرِ عِلْمٍ" تک جملہ شرط ہے، جزا اس کی محذوف ہے، کیونکہ وہ خود واضح ہو رہی ہے، یعنی اگر یہ مانع نہ ہوتا "تو تمھارے ہاتھ نہ روکے جاتے، بلکہ اہلِ مکہ پر حملہ کر دیا جاتا۔"

④ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ : یہ اس وقت جنگ سے مسلمانوں کے ہاتھ روک دینے کی دوسری وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین میں سے بہت سے لوگوں کو ایمان کی توفیق عطا فرما کر اپنی رحمت میں داخل کرنا چاہتا تھا، جو کفار اور مسلمانوں کی

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾

ع ۳

جب ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا، اپنے دلوں میں ضد رکھ لی، جو جاہلیت کی ضد تھی تو اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اتار دی اور انھیں تقویٰ کی بات پر قائم رکھا اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے لائق تھے اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۲۶﴾

صلح اور باہمی میل جول ہی سے ممکن تھا۔ اگر لڑائی ہو جاتی تو انھیں سوچنے سمجھنے اور اسلام قبول کرنے کا موقع ہی نہ ملتا اور نہ معلوم کتنے ہی کفر کی حالت میں مارے جاتے۔ پھر واقعی اس صلح کی بدولت بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے، سنہ ۶ ہجری میں آنے والے مسلمان صرف چودہ سو تھے، دو سال کے قلیل عرصے میں مکہ فتح کرنے کے لیے آنے والوں کی تعداد دس ہزار تھی اور مکہ فتح ہونے اور مشرکین کو عام معافی کے اعلان پر پورا مکہ مسلمان ہو گیا۔ (والحمد للہ)

5 لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...: "تَزَيَّلُوْا" "تَزَيَّلَ يَتَزَيَّلُ تَزَيُّلًا" (تفعل) ایک دوسرے سے جدا ہونا۔ یعنی اگر اس موقع پر مکہ میں رہنے والے مسلم و کافر کی پوری طرح تمیز ہوتی اور وہ لوگ جو مسلمان ہو چکے تھے یا آئندہ ان کی قسمت میں مسلمان ہونا لکھا تھا، کفار سے الگ اور نمایاں ہوتے تو ہم اہل مکہ کے کفار کو ایسی دردناک سزا دیتے کہ یا تو لڑائی میں مارے جاتے یا قید ہو کر ذلیل و خوار ہوتے۔

6 اس آیت سے ظاہر ہے کہ ایمان والوں کا وجود دنیا میں کفار کے لیے بھی باعث رحمت ہے، اس طرح کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے بعض اوقات کفار بھی عذاب سے بچ جاتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ انفال (۳۳)۔

آیت 26 1 اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ: لفظ "اِذْ" پچھلی آیت کے آخر میں "لَعَذَّبْنَا" کا ظرف ہے، یعنی اگر وہ مومن مرد اور مومن عورتیں کفار سے الگ ہو گئے ہوتے "تو ہم ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، دردناک سزا دیتے، جب ان کفر کرنے والوں نے اپنے دل میں ضد رکھ لی تھی۔ ..." اور فعل محذوف "اُذْكُرْ" کا مفعول بہ بھی ہو سکتا ہے، یعنی اس وقت کو یاد کر جب .....

2 حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ: جاہلیت کی ضد سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے وہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا جو تمام عرب کے ہاں مسلم تھی کہ اللہ کے گھر سے کسی طواف یا عمرہ یا حج ادا کرنے والے کو روکا نہیں جا سکتا اور حرمت والے مہینوں میں لڑنے کی اجازت نہیں۔ بلکہ وہ لڑنے پر تیار ہو گئے اور کہنے لگے، ہم یہ عار برداشت نہیں کر سکتے کہ ہم سے زبردستی کوئی مکہ میں داخل ہو، اس لیے اس سال مسلمان واپس چلے جائیں، آئندہ سال آ کر عمرہ ادا کر لیں، وہ بھی صرف تین دن ٹھہریں اور اسلحہ میں صرف تلوار لا سکتے ہیں جو نیام میں ہو۔ اس کے علاوہ ان کا بات بات پر رسول اللہ ﷺ سے الجھنا اور صلح کے لیے ناروا شرطیں لگانا

لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡيَا بِالۡحَقِّ ۚ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ ۙ

**بلاشبہ یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو خواب میں حق کے ساتھ سچی خبر دی کہ تم مسجد حرام میں ضرور بالضرور داخل ہو گے،**

بھی جاہلیت کی ضد تھی، مثلاً یہ کہنا کہ "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کے بجائے "بِاسۡمِكَ اللّٰهُمَّ" لکھو اور ''محمد رسول اللہ'' کے بجائے ''محمد بن عبد اللہ'' لکھو اور کوئی شخص مسلمان ہو کر تمھارے پاس جائے تو اسے واپس کرو، لیکن اگر کوئی مرتد ہو کر ہمارے پاس آئے تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ اسی طرح سہیل بن عمرو کا اپنے مسلمان ہو جانے والے بیٹے ابوجندل کو عین معاہدے کے درمیان آ کر اپنی حالت زار دکھانے کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ جانے کی اجازت دینے سے انکار اور سب کے سامنے اس پر تشدد بھی جاہلیت کی ضد تھی۔

③ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ : سکینت سے مراد وہ تحمل و حوصلہ اور صبر و وقار ہے جس کے ساتھ نبی ﷺ اور مسلمانوں نے کفارِ مکہ کی جاہلانہ حمیت کا مقابلہ کیا کہ نہ مشتعل ہوئے، نہ کوئی ناحق بات زبان سے کہی اور نہ اپنے کسی عمل سے کفار کو لڑائی چھیڑنے کا موقع دیا۔

④ اس آیت کے الفاظ پر غور کریں تو کفار اور مسلمانوں کے طرزِ عمل کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ معاملے کے درمیان فرق کا اندازہ ہوتا ہے: ① کفار نے اپنے دلوں میں حمیت یعنی ضد رکھ لی، سوچے سمجھے بغیر یہ ضد رکھنے والے وہ خود تھے۔ اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے دلوں میں سکینت تھی، جو اپنے خزانے سے نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ تھا۔ ② کفار کے دلوں میں موجود ضد جاہلیت کی ضد تھی، جبکہ رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے دلوں میں سکینت ربانی سکینت تھی۔

⑤ وَاَلۡزَمَهُمۡ كَلِمَةَ التَّقۡوٰى : وہ تقویٰ کی بات یہ تھی کہ مسلمان تنگی ترشی، جوش، غضب، غرض ہر طرح کے حالات میں اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند بنائے رکھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ اس نے اپنے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشتعل جذبات کو سکون بخش کر اور اپنے حکم کی پابندی پر قائم رکھ کر صلح کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

⑥ وَكَانُوۡۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهۡلَهَا : اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے تھے اور انھیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور آپ کی تربیت پانے کا شرف حاصل تھا۔

⑦ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمًا : اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اس علم ہی کے ساتھ اس نے ان پاکیزہ ہستیوں کو تقویٰ کے سب سے زیادہ حق دار اور اہل جان کر اپنے رسول کی صحبت کے لیے چنا، اس کی اطاعت کی توفیق بخشی اور انھیں تقویٰ کی بات پر قائم رکھا۔

**آیت 27** ① لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡيَا بِالۡحَقِّ : اس کی ترکیب دو طرح سے کی جاتی ہے، ایک یہ کہ "صَدَقَ اللّٰهُ" فعل اور فاعل ہے، "رَسُوۡلَهٗ" اس کا مفعول بہ ہے اور "الرُّءۡيَا" سے پہلے حرف جار "فِيۡ" محذوف ہے، جس کے حذف کی وجہ سے "الرُّءۡيَا" منصوب ہے، اسے منصوب بنزع الخافض کہتے ہیں: "أَيْ فِي الرُّؤْيَا." ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق کیا

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا

محمد اللہ کا رسول ہے اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں، تو

جائے گا۔ تفسیر قاسمی میں ہے، ابن تیمیہ نے فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو علم، حجت اور بیان کے ساتھ ہر دین پر غالب فرما دیا، جیسا کہ اسے قوت، نصرت اور تائید کے ساتھ غالب فرمایا اور پوری زمین اس دین سے اور آپ ﷺ کی امت سے مشرق و مغرب تک بھر گئی۔ اہلِ اسلام کی سلطنت دائمی ہے، کوئی اسے اس طرح ختم نہیں کر سکتا جس طرح یہود کی سلطنت ختم ہو گئی اور ان کے بعد کتنی ہی قوموں کا اقتدار زمین کے بہترین علاقوں سے مٹ گیا۔'' یہ آیت اس سے پہلے سورۂ توبہ (۳۳) میں گزر چکی ہے، وہاں اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ تیسری بار سورۂ صف (۹) میں آئے گی۔

آیت 29 ① مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ : ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''لفظ ''مُحَمَّدٌ'' مبتدا اور ''رَسُوْلُ اللّٰهِ'' خبر ہے۔ محمد ﷺ کو ''رسول اللہ'' کہنے کے بعد اور کسی تعریف کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ اس میں تمام انسانی کمال اور خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اس لیے آگے ''وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ'' کی صفت بیان فرمائی ہے۔'' اس مقام پر اس جملے سے کئی باتیں واضح ہو رہی ہیں، ایک یہ کہ قرآن مجید میں عموماً آپ ﷺ سے خطاب یا آپ کا ذکرِ خیر آپ کے نام کے بجائے آپ کے القاب کے ساتھ ہوا ہے، مثلاً ''يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ''، ''يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ''، ''شَاهِدًا''، ''مُبَشِّرًا''، ''نَذِيْرًا''، ''دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ'' اور ''سِرَاجًا مُّنِيْرًا'' وغیرہ۔ آپ ﷺ کا اسم گرامی ''محمد'' صرف چار جگہ آیا ہے، دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۴۴)، احزاب (۴۰)، سورۂ محمد (۲) اور زیرِ تفسیر آیت۔ ان چاروں مقامات میں آپ کا نام لانے میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ یہاں حکمت یہ ہے کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ اگر کفارِ مکہ نے حمیتِ جاہلیت میں آ کر اصرار کیا ہے کہ معاہدے میں ''محمد رسول اللہ'' نہ لکھو اور ان کے اصرار پر صلح کی خاطر ''محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب'' لکھ دیا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اللہ کے رسول نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، کفار کے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ دوسرا مقصد اس سوال کا جواب دینا ہے کہ تمام ادیان پر یہ دین کیسے غالب ہو گا؟ فرمایا محمد ﷺ کا تمام دینوں پر غلبہ اپنے ذاتی کمال یا ذاتی جد و جہد کی وجہ سے نہیں ہو گا بلکہ اس لیے ہو گا کہ محمد ﷺ ''رسول اللہ'' ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں، جنھیں اس نے بھیجا ہی اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرنے کے لیے ہے، پھر اللہ کے بھیجے ہوئے کو غالب آنے سے کون روک سکتا ہے؟

② وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ : اس میں ان پاکباز ہستیوں کا ذکر فرمایا جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اس ہدایت اور دینِ حق کو روئے زمین پر غالب کرنے والا تھا۔ ''وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ'' (وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں) اس لفظ میں تمام صحابہ کرام شامل ہیں، خواہ انھیں آپ کے ساتھ رہنے کی لمبی مدت ملی ہو یا تھوڑی۔ حدیبیہ میں جو لوگ آپ کے ساتھ تھے وہ اس لفظ کا اوّلین مصداق ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی صحبت ایسی اکسیر تھی کہ جس مومن کو حاصل ہو گئی اس کی طبیعت کا رنگ ہی بدل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں شہادت اور جنت کا ایسا شوق عطا فرمایا، انھیں ایسی شجاعت بخشی اور ان میں ایسی برکت رکھی کہ جب وہ حملہ آور ہوتے تو دشمن چند لمحوں

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ

انھیں اس حال میں دیکھے گا کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اپنے رب کا فضل اور (اس کی)

میں بھاگ کھڑا ہوتا، کسی لشکر میں ایک صحابی کی موجودگی اس کی فتح کی ضمانت سمجھی جاتی۔ ان سے ملنے والوں میں بھی یہی برکت تھی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَأْتِي زَمَانٌ يَغْزُو فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ، فَيُقَالُ فِيكُمْ مَنْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيُقَالُ نَعَمْ، فَيُفْتَحُ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ فَيُقَالُ فِيكُمْ مَنْ صَحِبَ أَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيُقَالُ نَعَمْ، فَيُفْتَحُ، ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ فَيُقَالُ فِيكُمْ مَنْ صَحِبَ صَاحِبَ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيُقَالُ نَعَمْ، فَيُفْتَحُ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب : ۲۸۹۷ ] ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کرے گی تو کہا جائے گا: ''کیا تم میں کوئی شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں!'' تو انھیں فتح عطا کی جائے گی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کرے گی تو کہا جائے گا: ''کیا تم میں کوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے ساتھ رہا ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں!'' تو انھیں فتح عطا کی جائے گی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کرے گی تو کہا جائے گا: ''کیا تم میں کوئی ہے جو اس کے ساتھ رہا ہو جو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں!'' تو انھیں فتح عطا کی جائے گی۔''

③ **وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ** : جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا کہ ''**وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ**'' (وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں) سے مراد سب سے پہلے وہ صحابہ ہیں جنھوں نے بیعتِ رضوان کی، پھر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں خواہ انھیں ایک لحہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ مفسر بقاعی نے فرمایا: ''**وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ**'' میں وہ تمام مسلمان بھی شامل ہیں جنھیں احسان اور نیکی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے کی وجہ سے آپ کے ساتھ ہونے کا شرف حاصل ہے۔'' پچھلے فائدے میں مذکور حدیث سے مفسر بقاعی کی اس بات کی تائید ہوتی ہے اور قرآن مجید میں صاف الفاظ میں احسان اور نیکی کے ساتھ اتباع کرنے والوں کو سابقون اولون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت میں داخلے کی بشارت دی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے سورۂ توبہ کی آیت (۱۰۰): ﴿ **وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ** ﴾ کی تفسیر پر نظر ڈال لیں۔ زیرِ تفسیر آیت میں کھیتی کی مثال صحابہ کے ساتھ قیامت تک ان کے پیروکاروں کو بھی ملانے سے پوری طرح مکمل ہوتی ہے۔

④ **اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ** : ان الفاظ میں صحابہ کرام اور امتِ مسلمہ کی تعریف فرمائی ہے کہ ان کا اللہ اور اس کے رسول پر ایسا ایمان ہے کہ ان کی دوستی اور دشمنی کے جذبات بھی ان کے ایمان کے تابع ہو گئے ہیں۔ کوئی کافر ہے تو وہ اس کے دشمن اور اس کے مقابلے میں نہایت سخت ہیں اور اگر کوئی مومن ہے تو وہ اس کے دلی دوست اور اس پر بے حد مہربان ہیں۔

مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ

رضا ڈھونڈتے ہیں، ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے، سجدے کرنے کے اثر سے۔ یہ ان کا وصف تورات میں ہے اور انجیل میں ان کا وصف اس کھیتی کی طرح ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کو کفار پر سختی کرنے اور ان کے ساتھ جہاد کا حکم دیا، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ﴾ [ التوبۃ : ۷۳ ] ”اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔“ اور مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ﴾ [ التوبۃ : ۱۲۳ ] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں سے لڑو جو کافروں میں سے تمھارے قریب ہیں اور لازم ہے کہ وہ تم میں کچھ سختی پائیں۔“ اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا کہ ایمان والوں کا کفار کے ساتھ تعلق ان کے ایمان لانے تک ابدی عداوت و بغض کا ہے، خواہ وہ کفار ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا قریبی رشتہ دار ہوں۔ دیکھیے سورۂ ممتحنہ کی پہلی چار آیات اور سورۂ مجادلہ کی آخری آیت۔

اس کے مقابلے میں ایمان والوں پر ہمارے نبی ﷺ بے حد مہربان اور شفیق تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ التوبۃ : ۱۲۸ ] ”بلاشبہ یقیناً تمھارے پاس تمھی سے ایک رسول آیا ہے، اس پر بہت شاق ہے کہ تم مشقت میں پڑو، تم پر بہت حرص رکھنے والا ہے، مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔“ اور ایمان والوں کی صفت بھی یہی ہے، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [ المائدۃ : ۵۴ ] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى )) [ بخاري، الأدب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۰۱۱ ] ”تو ایمان والوں کو ان کے ایک دوسرے پر رحم، ایک دوسرے سے دوستی اور ایک دوسرے پر شفقت میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا، جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم اس کی وجہ سے بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا )) [ بخاري، المظالم، باب نصر المظلوم: ۲۴۴۶ ] ”مومن مومن کے

فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا

خوب موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی، کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے، تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے

لیے ایک دیوار کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔''

5 واضح رہے کہ کافروں پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کسی کافر پر رحم نہیں کرتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر اللہ اور اس کے رسول کا حکم کفار پر سختی کرنے کا ہوتا ہے وہاں ان کو رشتے ناتے یا دوستی وغیرہ کے علاقے اس کام میں مانع نہیں اور جہاں تک ان کے ساتھ رحم و کرم کے معاملے کا تعلق ہے تو خود قرآن نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے، فرمایا: ﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [ الممتحنة : ۸، ۹ ] ''اللہ تمھیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنھوں نے نہ تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور نہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تو تمھیں انھی لوگوں سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو۔ اور جو ان سے دوستی کرے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔'' یعنی جو کفار مسلمانوں کے لیے باعث آزار اور ان کے ساتھ برسر جنگ نہیں ان کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں کرتا۔ چنانچہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے بے شمار واقعات ہیں جن میں ضعیف و مجبور یا ضرورت مند کفار کے ساتھ احسان و کرم کے معاملات کیے گئے ہیں۔ ان کے معاملہ میں عدل و انصاف کو برقرار رکھنا تو اسلام کا عام حکم ہے، عین میدان کارزار میں بھی عدل و انصاف کے خلاف کوئی کارروائی جائز نہیں۔

6 تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا: پچھلے جملے ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کا لوگوں کے ساتھ معاملہ ذکر فرمایا اور اس جملے میں ان کا اللہ کے ساتھ تعلق بیان فرمایا کہ تو انھیں رکوع کرتے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھے گا۔ ان کے اکثر اوقات نماز کے مبارک عمل میں گزرتے ہیں جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب کرنے والا عمل ہے، کیونکہ ان کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے: (( أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ )) [ مسلم، الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود؟ : ٤٨٢ ] ''بندہ اپنے رب کے سب سے قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔ تو بہت زیادہ دعا کیا کرو۔'' ان کے دل مسجد کے ساتھ ہی مُعلّق ہوتے ہیں، روزانہ پانچ مرتبہ اللہ کے گھر میں آ کر یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور وہاں سے نکلتے ہیں تو دھیان ادھر ہی رہتا ہے، پھر رات کو بھی قیام کرتے ہیں۔

ع ۱۲

الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

بڑی بخشش اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے ﴿۲۹﴾

⑦ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا: چونکہ رکوع و سجود ریا کے لیے بھی ہو سکتے ہیں اس لیے اس جملے میں صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ کے پیروکار ساتھیوں کے اخلاص کی شہادت دی ہے کہ ان کے رکوع و سجود ریا یا دکھلاوے کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں اور اس کی رضا کی طلب کے لیے ہوتے ہیں۔ اس میں ان کی ہمت کی بلندی کا بھی بیان ہے کہ وہ اعلیٰ چیز کے طلب گار ہیں جس سے بڑی کوئی چیز نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ [ التوبة : ۷۲ ] "اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی و رضا سب سے بڑی چیز ہے۔" دنیائے دنی یا دوسری ادنیٰ چیزیں ان کی بلند نگاہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتیں۔

⑧ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ: بعض لوگوں نے سجدے کے اثر سے مراد پیشانی پر پڑنے والا گٹا لیا ہے، جسے عام طور پر محراب کہا جاتا ہے۔ کسی مخلص مسلمان کے ماتھے پر سجدے کی رگڑ سے پڑنے والا نشان بھی یقیناً اس شناخت میں شامل ہے، مگر یہاں اس سے مراد وہ رونق اور حسن و شرافت کے آثار ہیں جو اخلاص، حسن نیت، خشیت و خشوع اور نماز کی کثرت سے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر دو آدمی رات بھر بیدار رہیں، ایک شراب نوشی اور گناہ کے کاموں میں مصروف رہے، دوسرا نماز یا قرآن کی تلاوت اور ذکر میں مصروف رہے تو صبح دونوں کے چہروں میں صاف فرق نظر آئے گا۔ یہی فرق سچے و جھوٹے، دغا باز و باوفا، ظالم و عادل، بدکار و پاک دامن اور متکبر و متواضع کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: « "سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ" يَعْنِي السَّمْتَ الْحَسَنَ » [ طبری : ۳۱۸۹۱ ] "یعنی اس سے مراد خوب صورت انداز اور ہیئت ہے۔" ابن کثیر میں ہے، منصور نے مجاہد سے سنا کہ اس سے مراد خشوع ہے۔ منصور کہتے ہیں، میں نے کہا، میں تو اس سے مراد وہی نشان سمجھتا تھا جو چہرے پر پڑ جاتا ہے، تو انھوں نے فرمایا: "وہ نشان تو بعض اوقات ایسے لوگوں کے ماتھے پر بھی ہوتا ہے جو فرعون سے بھی زیادہ سنگ دل ہوتے ہیں۔" خلاصہ یہ کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے چہروں پر، صحابہ ہوں یا ان کے متبعین، خاص قسم کا نور اور رونق ہوتی ہے جس سے وہ دوسرے تمام لوگوں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں بعض مفسرین نے ایک روایت رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے نقل کی ہے: « مَنْ كَثُرَ صَلَاتُهُ بِاللَّيْلِ حَسُنَ وَجْهُهُ بِالنَّهَارِ » "جو شخص رات کو کثرت سے نماز پڑھے دن کو اس کا چہرہ خوبصورت ہوگا۔" مگر اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، بلکہ یہ ایک راوی شریک کا قول ہے۔

⑨ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ: "مَثَلٌ" کا معنی مثال بھی ہوتا ہے اور وصف بھی، یہاں مراد وصف ہے، یعنی ان کا یہ وصف کہ سجدے اور عبادت کی تاثیر سے ان کی شناخت ان کے چہروں سے ظاہر ہوتی ہے، یہ تورات میں بیان ہوا ہے۔ اس وقت یہود و نصاریٰ کے ہاتھ میں جو تورات ہے اگرچہ انھوں نے اس میں کئی طرح کی تحریف کی ہے، رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کی

صفات اکثر حذف کر دی ہیں اور بعض میں تبدیلی کر دی ہے، اس کے باوجود اس کی پانچویں کتاب ''استثنا'' کے باب (۳۳) اور فقرہ (۲) میں ہے: ''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔'' اس پیش گوئی کا مصداق رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس میں جبلِ فاران سے جلوہ گر ہونے اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آنے کا صاف حوالہ موجود ہے اور یہ مسلّم بات ہے کہ فاران حجاز کے ایک پہاڑ کا نام ہے اور فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ آئے تھے۔ ظاہر ہے قدوسیوں سے مراد اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ صفات اور عبادت گزار بندے ہیں، قرآن مجید میں اس کی جگہ '' تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ'' کے الفاظ ہیں اور آتشیں شریعت کے بجائے '' اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ'' کہہ کر جہادی شریعت کا ذکر فرمایا ہے۔

تنبیہ: ''دس ہزار'' کے الفاظ بائبل کے سابقہ ایڈیشنوں میں موجود ہیں، حالیہ ایڈیشنوں میں تحریف کر کے بعض سے یہ عدد نکال دیا گیا ہے اور بعض میں اسے ''لاکھوں'' میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

⑩ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ ......: تورات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے تقویٰ و تقدس، جہادی شریعت اور ان کے غلبہ و اقتدار کی صفت بیان ہوئی ہے اور انجیل میں امتِ محمد ﷺ کے بتدریج قلت سے کثرت کی طرف اور کمزوری سے قوت کی طرف بڑھنے کو مثال کے ساتھ واضح فرمایا ہے کہ ان کی ابتدا اگرچہ کمزور ہوگی لیکن آخر کار وہ ایسے تناور درخت کی شکل اختیار کر جائیں گے جس کے سائے میں بڑی بڑی قومیں پناہ لیں گی۔ چنانچہ انجیل متی، باب (۱۳)، فقرہ (۳ تا ۹) میں یہ مثال اس طرح بیان ہوئی ہے: ''اس (مسیح) نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے لیکن جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔'' یہی مثال الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ انجیل مرقس، باب (۴)، فقرہ (۳۔۹) اور انجیل لوقا، باب (۱۳)، فقرہ (۱۸۔۲۱) میں بھی آئی ہے۔ (منقول از تفسیر ثنائی)

قرآن مجید میں کھیتی کی مثال دینے کا مطلب یہ ہے کہ اگر حدیبیہ والے سال تم مکہ میں داخل نہیں ہو سکے تو اس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں اور تمھیں یہ سبق سکھانا بھی مقصود ہے کہ اسلام کا عروج و کمال یک لخت نہیں بلکہ تدریج کے ساتھ ہوگا، جیسا کہ کھیتی بتدریج کمال کو پہنچتی ہے۔ پہلے وہ بیج سے نازک سی کونپل یا سوئی نکالتی ہے، پھر اسے مضبوط کرتی ہے، پھر خوب موٹی ہو جاتی ہے، پھر اس کا پودا اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے، پھر اس کے ساتھ اور پودے اگتے چلے جاتے ہیں اور کھیت بھر جاتا ہے جس سے کاشت کرنے والوں کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دن آنے والا ہے کہ ہدایت اور دین حق کی یہ کھیتی جو اوّل اوّل سرزمین عرب میں کاشت کی گئی، اپنے کمال کو پہنچے گی، مشرق و مغرب اس سے بھر جائیں گے، اپنی آبیاری اور دیکھ بھال کرنے والوں کے دلوں کو خوش کرے گی اور ان لوگوں کے دلوں کو غم و غصہ سے جلائے گی جنھوں نے

اس کی نشوونما کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ : "لِيَغِيْظَ" کا لام فعل مقدر کے متعلق ہے جو گزشتہ عبارت سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے: "أَيْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ كَذٰلِكَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ" یعنی اللہ تعالیٰ صحابہ کرام اور ان کے متبعین کو اس طرح بتدریج کمال و عروج تک پہنچائے گا، تاکہ ان کے ساتھ کفار کو غصہ دلائے اور ان کے دلوں کو جلائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو دعوت حق لے کر آئے اسے قبول کرنے والے اور اسے پوری دنیا پر غالب کرنے کے لیے اپنی جان، اپنا مال اور سب کچھ قربان کرنے والے صحابہ کرام تھے اور ان کے بعد ان سے محبت رکھنے والے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تابعین اور بعد کے لوگ تھے جن کے ذریعے سے یہ دین حق ساری دنیا میں پھیلا اور غالب ہوا۔ ایمان والوں کے دل صحابہ کرام اور ان کے متبعین کے حالات دیکھ کر اور سن کر خوش ہوتے ہیں اور کفار کے دل انھیں دیکھ کر اور ان کے حالات سن کر غصے سے بھر جاتے ہیں اور جل اٹھتے ہیں۔ تفسیر التحریر والتنویر (۱۷۷/۲۶) میں ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: « مَنْ أَصْبَحَ مِنَ النَّاسِ فِيْ قَلْبِهِ غَيْظٌ عَلٰى أَحَدٍ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ أَصَابَتْهُ هٰذِهِ الْآيَةُ » "لوگوں میں سے جس شخص کے دل میں اصحاب رسول ﷺ میں سے کسی ایک پر بھی غصہ اور جلن ہو، یہ آیت اس پر یقیناً لاگو ہوتی ہے۔" ابن عاشور نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ امام مالک پر رحم کرے، ان کا استنباط کس قدر باریک ہے۔"

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ ......﴾ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "اور کھیتی کی کہاوت یہ کہ اول ایک آدمی تھا اس دین پر، پھر دو ہوئے پھر قوت بڑھتی گئی حضرت ﷺ کے وقت اور خلیفوں کے اور یہ وعدہ دیا ان کو جو ایمان لائے اور بھلے کام کرتے ہیں۔ حضرت ﷺ کے سب اصحاب ایسے ہی تھے، مگر خاتمہ کا اندیشہ رکھا۔ حق تعالیٰ بندوں کو ایسی خوش خبری نہیں دیتا کہ نڈر ہو جائیں، مالک سے اتنی شاباش بھی غنیمت ہے۔"

سورۃ الحجرات ۴۹ — آیاتھا ۱۸ — رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ①

آیت 1 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: رازی نے فرمایا: ''اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو مکارمِ اخلاق کا سبق دیا ہے، ان کا تعلق یا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملے میں ہوگا یا اس کے رسول کے ساتھ یا فاسق لوگوں کے ساتھ یا ان ایمان والوں کے ساتھ جو حاضر ہوں یا ان ایمان والوں کے ساتھ جو غائب ہوں اور پانچوں قسموں میں سے ہر ایک کی ابتدا "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کے ساتھ کی ہے۔''

② لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ: "لَا تُقَدِّمُوْا" باب تفعیل ہے، جس کا مجرد "قَدَمَ يَقْدُمُ" (ن) آتا ہے، جس کا معنی ''دوسرے کے آگے چلنا'' ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [ ھود: ۹۸ ] ''وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا۔'' "تَقَدَّمَ يَتَقَدَّمُ" (تفعّل) کا معنی بھی ''آگے بڑھنا'' ہے۔ باب تفعیل کے لحاظ سے اس کا معنی ''آگے کرنا'' ہوگا، یعنی اپنی کوئی بات یا کوئی فعل اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ کرو۔ بعض اوقات "قَدَّمَ" "تَقَدَّمَ" کے معنی میں بھی آ جاتا ہے، یعنی وہ آگے بڑھا، جیسے "كَأَنَّهُ قَدَّمَ نَفْسَهُ" ''گویا اس نے اپنے آپ کو آگے بڑھا لیا۔'' اس صورت میں آیت کا معنی ہوگا: ''اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو۔'' اور یہاں یہی معنی راجح ہے۔ اسی سے "مُقَدِّمَةُ الْجَيْشِ" (لشکر کا سب سے اگلا حصہ) ہے۔ باب تفعیل باب تفعّل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے "وَجَّهَ أَيْ تَوَجَّهَ" اور "بَيَّنَ أَيْ تَبَيَّنَ." آیت میں اس شخص کو جو اللہ اور اس کے رسول کی اجازت یا حکم کے بغیر کوئی کام یا بات کرتا ہے اس شخص کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کسی دوسرے کو پیچھے چھوڑ کر اس سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ (ابن عاشور)

③ "لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ" میں اللہ اور اس کے رسول کو اکٹھا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول سے آگے بڑھنا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے آگے بڑھنا ہے، کیونکہ رسول وہی کہتا اور کرتا ہے جس کی وحی اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، فرمایا: ﴿ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [ النجم: ۳، ۴ ] ''اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔''

④ اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا بنیادی تقاضا بیان کیا گیا ہے کہ جب تم اللہ کو اپنا رب اور رسول کو اپنا ہادی اور رہبر مانتے ہو تو پھر ان کے پیچھے چلو، آگے مت بڑھو! اپنے فیصلے خود ہی نہ کر لو، بلکہ پہلے یہ دیکھو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم کیا ہے۔ یہ حکم سورۂ احزاب میں موجود حکم سے بھی ایک قدم آگے ہے، فرمایا: ﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو اور نہ بات کرنے میں اس کے لیے آواز

اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ [ الأحزاب : ٣٦ ] ''اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے سو یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا۔'' یعنی سورۂ احزاب میں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو کسی ایمان والے مرد یا ایمان والی عورت کو خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا اور یہاں فرمایا کہ ایمان والوں کو پہل کرتے ہوئے اپنے فیصلے خود نہیں کر لینے چاہییں، بلکہ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کا حکم کیا ہے۔ یہ حکم مسلمانوں کے انفرادی معاملات میں بھی ہے اور اجتماعی معاملات میں بھی۔ کسی بھی شخص کو خواہ وہ کوئی عالم ہو یا امام یا پیر فقیر، یہ حق حاصل نہیں اور نہ ہی کسی جماعت یا پارلیمنٹ کا حق ہے کہ وہ اپنی طرف سے شریعت بنائے، کسی کام کو حلال یا حرام کہے، یا باعث ثواب یا گناہ قرار دے۔ اگر کوئی کسی کو یہ حق دیتا ہے تو وہ اسے اپنا رب بناتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۳۱): ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ کی تفسیر۔

➎ اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و سنت سے آگے مت بڑھو، ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ چنانچہ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل فرمائی ہے: « ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ يَقُوْلُ لَا تَقُوْلُوْا خِلَافَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ » [ طبري : ٣١٦٩٢ ] یعنی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و سنت کے خلاف کوئی بات نہ کہو۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی شان نزول رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ رکھنا بیان کی ہے اور بعض نے عید الاضحیٰ کی نماز سے پہلے قربانی کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام کام اس آیت کے مضمون میں شامل ہیں، البتہ یہ بات ثابت نہیں کہ یہ آیت خاص ان کے بارے میں اتری ہے۔

➏ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ : ''اِنَّ'' تعلیل یعنی پہلی بات کی وجہ بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سننے والا اور ہر کام کو جاننے والا ہے، خواہ وہ سب کے سامنے کیا جائے یا چھپ کر، عمل میں آ چکا ہو یا دل میں اس کا ارادہ ہو، اگر تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھو گے تو اس سے تمھارا جرم چھپا نہیں رہے گا اور وہ تمھیں اس کی سزا دے گا۔

آیت 2 ➊ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ : آلوسی نے فرمایا کہ پچھلی آیت میں ایمان والوں کو اپنے قول یا فعل میں رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھنے سے منع فرمایا، اس آیت میں آپ کے سامنے بولنے کی کیفیت میں بھی آپ سے بڑھنے کو منع فرما دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ ﷺ کی موجودگی یا آپ کی مجلس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی اپنی آوازیں آپ ﷺ کی آواز سے اونچی نہ کریں۔ صحیح بخاری میں اس آیت کا سبب نزول بیان ہوا ہے، ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں: « كَادَ الْخَيِّرَانِ أَنْ يَهْلِكَا، أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، رَفَعَا أَصْوَاتَهُمَا عِنْدَ

بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۲﴾

اونچی کرو، تمھارے بعض کے بعض کے لیے آواز اونچی کرنے کی طرح، ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم شعور نہ رکھتے ہو ﴿۲﴾

النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ قَدِمَ عَلَيْهِ رَكْبُ بَنِيْ تَمِيْمٍ، فَأَشَارَ أَحَدُهُمَا بِالْأَقْرَعِ بْنِ حَابِسٍ أَخِيْ بَنِيْ مُجَاشِعٍ وَأَشَارَ الْآخَرُ بِرَجُلٍ آخَرَ قَالَ نَافِعٌ لَا أَحْفَظُ اسْمَهُ، فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ لِعُمَرَ مَا أَرَدْتَ إِلَّا خِلَافِيْ قَالَ مَا أَرَدْتُّ خِلَافَكَ، فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا فِيْ ذٰلِكَ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ : ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ ﴾ اَلْآيَةَ، قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ فَمَا كَانَ عُمَرُ يُسْمِعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ هٰذِهِ الْآيَةِ حَتّٰى يَسْتَفْهِمَهُ » [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ لا ترفعوا أصواتكم فوق صوت النبي ﴾ : ۴۸۴۵ ] ''دو سب سے بہتر آدمی قریب تھے کہ ہلاک ہو جاتے، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما، دونوں نے اپنی آوازیں بلند کیں جب بنو تمیم کے شتر سوار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ تو ان دونوں (بہترین آدمیوں) میں سے ایک نے بنی مجاشع کے اقرع بن حابس (کو بنو تمیم کا امیر مقرر کرنے) کا اشارہ کیا اور دوسرے نے ایک اور کا اشارہ کیا۔ نافع نے کہا، مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''تم نے صرف میری مخالفت کا ارادہ کیا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''میں نے آپ کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا۔'' اس میں دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو۔'' ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، پھر اس آیت کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی نہیں دیتی تھی جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دوبارہ پوچھتے نہیں تھے۔''

❷ کسی مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کا تقاضا ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی شخص کا قول ذکر نہ کیا جائے اور نہ اسے رد کرنے کے لیے کسی قسم کے عقلی ڈھکوسلے پیش کیے جائیں، کیونکہ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا کرنا ہے، بلکہ مخالفت کی وجہ سے یہ اس سے بھی سنگین بے ادبی ہے۔

❸ بعض لوگوں کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ وہ لوگوں کو باور کرواتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مجلس میں موجود ہیں، پھر اتنی اونچی آواز سے بولتے ہیں کہ سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹنے کے قریب ہوتے ہیں، اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے واحد اجارہ دار بھی بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب کسی مجلس میں موجود ہوتے یا تشریف لاتے ہیں اور نہ ہی آپ کو موجود سمجھتے ہوئے آپ کی محبت یا ادب میں اتنی بلند آواز کے ساتھ بولنے کی کوئی گنجائش ہے۔

❹ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ: اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس ادب کی تعلیم اس لیے دی کہ بعض اکھڑ اعرابی آپ سے اسی طرح اونچی آواز میں بات کرتے اور آپ کو اسی طرح نام لے کر خطاب کرتے جس طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے یا مخاطب کرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا، اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح اونچی آواز میں بات کرو جس طرح ایک دوسرے

سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو اور نہ ہی اس طرح آپ کو نام لے کر مخاطب کرو جس طرح ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہو، بلکہ ''اے محمد'' کہنے کے بجائے ''اے اللہ کے رسول'' یا ''اے اللہ کے نبی'' وغیرہ کہا کرو۔ یہ ادب سورۂ نور میں بھی سکھایا گیا ہے، فرمایا: ﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴾ [ النور : ٦٣ ] ''رسول کے بلانے کو اپنے درمیان اس طرح نہ بنالو جیسے تمھارے بعض کا بعض کو بلانا ہے۔'' خود اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید میں کسی جگہ آپ ﷺ کو نام کے ساتھ مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ مختلف القاب کے ساتھ ہی مخاطب فرمایا ہے، جیسے ''يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ''، ''يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ''، ''يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ'' اور ''يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ'' وغیرہ۔ حالانکہ دوسرے انبیاء کو نام لے کر خطاب فرمایا ہے، جیسے ''يٰاٰدَمُ''، ''يٰنُوْحُ''، ''يٰاِبْرٰهِيْمُ''، ''يٰمُوْسٰى''، ''يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ'' اور ''يٰدَاوٗدُ'' وغیرہ۔ اس کے باوجود اکثر جاہل ''یا محمد'' کہنے اور لکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور دعویٰ آپ ﷺ سے محبت کا رکھتے ہیں۔ اس آیت سے آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم کا اندازہ ہوتا ہے۔

⑤ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی موجودگی میں آپ کی آواز سے آواز اونچی کرنا یا آپ سے ایسے لہجے میں بات کرنا جس سے آپ کی توقیر و تکریم میں فرق آتا ہو اعمالِ ضائع ہو جانے کا موجب ہے، خواہ یہ کام کوئی مومن ہی کیوں نہ کرے، کیونکہ ساتھ ہی فرمایا: ﴿ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ ''اور تم شعور نہ رکھتے ہو۔'' منافقین تو ایمان سے خالی تھے، اس لیے وہ جان بوجھ کر آپ سے گستاخی کے ساتھ پیش آتے تھے اور انھیں اپنے اعمال کے ضائع ہونے کی کوئی فکر بھی نہیں تھی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اعمال ایسے منحوس ہیں کہ وہ اعمال صالحہ کو بھی ضائع کرنے کا باعث بن جاتے ہیں، خصوصاً جن میں اللہ تعالیٰ یا رسول کریم ﷺ کی بے ادبی پائی جائے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ہوتے ہیں۔ ابن کثیر نے فرمایا: ''﴿ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی ہم نے تمھیں آپ ﷺ کے پاس آواز بلند کرنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے آپ ﷺ غصے ہو جائیں تو آپ کے غصے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی غصے ہو جائے اور اس شخص کے اعمال برباد کر دے جس نے آپ کو غصہ دلایا اور اسے معلوم بھی نہ ہو، جیسا کہ صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَاتٍ وَ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَهْوِيْ بِهَا فِيْ جَهَنَّمَ )) [ بخاري، الرقاق، باب حفظ اللسان : ٦٤٧٨ ] ''بندہ اللہ کو راضی کرنے والی کوئی بات کرتا ہے، جس کا وہ کوئی دھیان نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے کئی درجے بلند کر دیتا ہے اور بندہ اللہ کو غصہ دلانے والی کوئی بات کرتا ہے، جس کا وہ کوئی دھیان نہیں کرتا، تو اس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر جاتا ہے۔''

⑥ اس آیت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے پاس آواز بلند کرنے سے کس قدر ڈرتے اور اس سے بچتے تھے اس کا اندازہ ایک تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عمل سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ اسی آیت کی تفسیر کے پہلے فائدے میں ہوا ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے خطیب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا رویہ بھی اس کی ایک مثال ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب یہ آیت

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ③

بے شک وہ لوگ جو اللہ کے رسول کے پاس اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ نے تقویٰ کے لیے آزما لیے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ③

اتری: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ اب ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کی آواز بہت بلند تھی تو وہ کہنے لگے: ''میں ہی اپنی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند کیا کرتا تھا، میرا عمل تو ضائع ہو گیا، میں اہل نار سے ہوں۔'' اور وہ غمگین ہو کر گھر میں بیٹھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نہ دیکھا تو ان کے بارے میں پوچھا۔ کچھ لوگ ان کے پاس گئے اور ان سے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں تلاش کر رہے تھے، تمھیں کیا ہوا؟'' کہنے لگے: ''میں ہی ہوں جو اپنی آواز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند کرتا تھا اور اونچی آواز سے بات کرتا تھا، میرا عمل ضائع ہو گیا اور میں اہل نار سے ہوں۔'' لوگوں نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بات بتائی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا، بَلْ هُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ )) ''نہیں، بلکہ وہ اہل جنت سے ہے۔'' انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''پھر ہم انھیں اپنے درمیان چلتا پھرتا دیکھتے تھے اور جانتے تھے کہ وہ جنتی ہیں۔ تو جب یمامہ (مسیلمہ کذاب سے جنگ) کا دن ہوا تو ہم میں پیچھے ہٹنے کے کچھ آثار ظاہر ہوئے۔ ایسے میں ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ آئے، انھوں نے میت والی خوشبو لگا رکھی تھی اور کفن پہنا ہوا تھا۔ کہنے لگے: ''تم نے اپنے ساتھیوں کو (پیچھے ہٹنے کی) بہت بری عادت ڈال دی ہے۔'' یہ کہہ کر لڑنے لگے، حتیٰ کہ قتل کر دیے گئے۔'' [ مسند أحمد : ۱۳۷/۳، ح : ۱۲۴۰۸ ] اس کی سند صحیح ہے۔

تفسیر ابن کثیر کے محقق لکھتے ہیں کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو یہ خیال اس لیے ہوا کہ بنو تمیم (جن کے بارے میں یہ آیات اتریں) ان کے سامنے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) انھوں نے ہی خطبہ دیا تھا۔ دیکھیے البدایہ والنہایہ (۴۲/۵) اور فتح الباری (۵۹۱/۸)۔

**آیت 3** ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ ...... : اس میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کا خیال رکھتے ہوئے آپ کے پاس اپنی آوازیں پست رکھتے تھے، جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق گزرا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کے تقویٰ کا امتحان کر کے دیکھ لیا کہ وہ پرہیز گاری کے امتحان میں پوری طرح کامیاب ہیں، جیسے سونے کو آگ میں ڈال کر دیکھا جاتا ہے اور وہ خالص نکلتا ہے، تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے اس کے خالص ہونے کی آزمائش کر لی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی آواز پست نہیں رکھتا اس کا دل تقویٰ سے خالی ہے، پھر جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سننے کے بعد اس کے خلاف آواز اٹھائے وہ تقویٰ اور ایمان سے کس قدر دور ہو گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ④

بے شک وہ لوگ جو تجھے دیواروں کے باہر سے آوازیں دیتے ہیں ان کے اکثر نہیں سمجھتے ④

آیت 4 ① اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ : "حُجْرَةٌ" زمین کا وہ قطعہ جس کے گرد دیوار بنی ہوئی ہو، گھر کے صحن کی چار دیواری۔ طبری نے فرمایا: "حُجْرَةٌ" کی جمع "حُجَرٌ" ہے اور اس کی جمع "حُجُرَاتٌ" ہے۔'' روح المعانی میں ان حجرات کی کیفیت بیان کی گئی ہے: ''یہ نو حجرے تھے، ہر بیوی کے پاس ایک حجرہ تھا اور جیسا کہ ابن سعد نے عطاء خراسانی سے روایت کی ہے، یہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنے ہوئے تھے، ان کے دروازوں پر سیاہ بالوں کے ٹاٹ کے پردے تھے۔ بخاری نے ''الادب المفرد'' میں اور ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے داؤد بن قیس سے بیان کیا ہے، انھوں نے فرمایا: ''میں نے وہ حجرے دیکھے ہیں، کھجور کی ٹہنیوں سے بنے ہوئے تھے، جنھیں باہر کی جانب سے بالوں کے ٹاٹوں سے ڈھانپا ہوا تھا اور میرا گمان ہے کہ صحن کے دروازے سے کمرے کے دروازے تک چھ یا سات ہاتھ (نو یا ساڑھے دس فٹ) کا فاصلہ تھا اور کمرے کا اندرونی حصہ دس ہاتھ (پندرہ فٹ) تھا اور میرا گمان ہے کہ گھر کی چوڑائی سات آٹھ ہاتھ (ساڑھے دس بارہ فٹ) کے درمیان تھی۔'' اور حسن سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ''میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے کمروں میں جایا کرتا تھا تو ان کی چھت کو ہاتھ لگا لیتا تھا۔ ولید بن عبد الملک رحمہ اللہ کے عہد میں ان کے حکم سے ان گھروں کو مسجد نبوی میں شامل کر دیا گیا جس پر لوگ بہت روئے۔'' اور سعید بن میسب نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! مجھے پسند تھا کہ ان حجروں کو ان کی حالت پر رہنے دیا جاتا، تاکہ اہلِ مدینہ کے بچے بڑے ہوتے اور تمام دنیا سے آنے والے آتے تو دیکھتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کیسے گھروں پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی حرص اور اس پر فخر کے بجائے زہد اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی۔'' اور ابوامامہ بن سہل بن حنیف نے بھی ایسی ہی بات فرمائی۔'' (روح المعانی)

گزشتہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے ادب کا بیان تھا، ان آیات میں اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کو ملحوظ رکھنے کا بیان ہے جب آپ گھر میں ہوں۔ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ کچھ اعرابی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کی چار دیواری کے باہر کھڑے ہو کر آپ کو بلانے کے لیے آوازیں دیں، تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو "لَا يَعْقِلُوْنَ" قرار دیا۔ "لَا يَعْقِلُوْنَ" قرار دینے سے مقصود انھیں ڈانٹنا اور تمام مسلمانوں کو آپ کے ادب کی تعلیم دینا ہے۔

② اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ: ابن جزی (صاحب التسہیل) نے فرمایا: ''اس میں دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ ان میں کچھ لوگ عقل رکھنے والے بھی تھے، اس لیے ان کے اکثر کو "لَا يَعْقِلُوْنَ" فرمایا، سب کو نہیں۔ دوسری یہ کہ مراد سب ہی کو "لَا يَعْقِلُوْنَ" قرار دینا ہے، عقل والوں کو کم قرار دینے سے مراد ان کی نفی ہے۔ الفاظ کے مطابق پہلی وجہ زیادہ ظاہر ہے، دوسری میں زیادہ بلیغ طریقے سے سب کی مذمت کا بیان ہے۔''

وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا

اور اگر وہ صبر کرتے، یہاں تک کہ تو ان کی طرف نکلتا تو یقیناً ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ⑤ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کر لو،

آیت 5 ① وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ ...... : یعنی اگر وہ آوازیں دینے کے بجائے صبر کرتے اور آپ ﷺ کے تشریف لانے کا انتظار کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا، کیونکہ اس صبر و انتظار میں اور آپ ﷺ کا ادب ملحوظ رکھنے میں انھیں اجر و ثواب ملتا، رسول اللہ ﷺ زیادہ خوش دلی کے ساتھ ان سے ملتے اور زیادہ بہتر طریقے سے ان کی ضرورتیں پوری فرماتے۔ ظاہر ہے جس شخص پر پوری امت کی ذمہ داری کا بوجھ ہے اور وہ ہر وقت اسی فکر و عمل میں مصروف ہے، اگر اس وقت جب وہ گھر میں ہے یہ خیال کیے بغیر کہ اس وقت وہ آرام کر رہا ہے یا گھر کے کسی کام میں مصروف ہے، آوازیں دینا شروع کر دیا جائے تو اس خیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی جو صبر و انتظار کے ساتھ اس سے حاصل ہونا تھی۔ اس سے اساتذہ کرام، اہلِ علم اور مسلمانوں کے امراء و اکابر کے اکرام کی بھی تعلیم ملتی ہے۔

② وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : یعنی حق تو یہ تھا کہ ان لوگوں کو ان کی اس بے ادبی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی سزا ملتی، مگر چونکہ ان سے یہ فعل بے عقلی کی وجہ سے سرزد ہوا تھا، بدنیتی کی وجہ سے نہیں، اس لیے آخر میں اپنے غفور و رحیم ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی مغفرت کا اشارہ فرما دیا۔

③ رسول اللہ ﷺ جب زندہ تھے اور دیوار کے باہر سے آپ تک آواز بھی پہنچتی تھی اس وقت آپ کو آواز دینے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بے عقل قرار دیا تو اب جبکہ رسول اللہ ﷺ فوت ہو چکے اور یہ ممکن ہی نہ رہا کہ آپ ﷺ ہماری بات سنیں یا ہم آپ ﷺ کی بات سنیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۰۰] ''اور ان کے پیچھے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے، ایک پردہ ہے۔'' تو جو لوگ اب ہزاروں میل دور سے آپ ﷺ کو آوازیں دیتے ہیں اور آوازیں بھی اس مقصد کے لیے دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پورا نہیں کر سکتا، تو ان کے ''لَا يَعْقِلُوْنَ'' (بے عقل) ہونے میں کیا شبہ ہے۔

آیت 6 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا : ''فَاسِقٌ'' جو دین کی کسی حد سے یا تمام حدوں سے نکل جائے، جن کی پابندی لازم ہے۔ اس کا اشتقاق ''فَسَقَ الرُّطَبُ'' (تازہ کھجور چھلکے سے باہر نکل گئی، یعنی پھٹ گئی) سے ہے۔ اس کا اکثر استعمال نافرمانی کے مرتکب مسلمان پر ہوتا ہے، کافر پر بھی یہ لفظ بول لیا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؔ لَا يَسْتَوٗنَ﴾ [السجدۃ: ۱۸] ''تو کیا وہ شخص جو مومن ہو وہ اس کی طرح ہے جو نافرمان ہو؟ برابر نہیں ہوتے۔'' ''نَبَاٌ'' کوئی اہم خبر۔ راغب نے فرمایا: ''خبر کو 'نبا' اس وقت کہتے ہیں جب اس سے کوئی عظیم فائدہ

فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۞

ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو، پھر جو تم نے کیا اس پر پشیمان ہو جاؤ ۞

حاصل ہوتا ہو، ایسی ہی خبر سے کسی بات کا یقین یا غلبۂ ظن حاصل ہوتا ہے۔ ’’فَتَبَيَّنُوْۤا‘‘ ’’تَبَیَّنَ یَتَبَیَّنُ‘‘ (تفعّل) لازم بھی آتا ہے، یعنی کسی چیز کا خوب واضح ہو جانا اور متعدی بھی، یعنی کسی چیز پر پوری طرح غور و فکر اور اس کی تحقیق کرنا، اس کی حقیقت معلوم کر لینا، یہاں متعدی کے معنی میں ہے۔ اکثر قراءتوں میں ’’فَتَبَيَّنُوْۤا‘‘ ہے، حمزہ اور کسائی کی قراءت میں ’’فَتَثَبَّتُوْا‘‘ ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔

❷ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسے ادب کی تعلیم دی ہے جس کا اہتمام ان کے دین و دنیا کے معاملات میں نہایت ضروری ہے اور جس کی پابندی نہ کرنے سے بے پناہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ وہ یہ کہ جب ان کے پاس کوئی فاسق، جو کھلم کھلا دین کی حد پامال کرنے والا ہے، کوئی اہم خبر لے کر آئے تو اسے سنتے ہی سچا نہ سمجھ لیں اور نہ ہی پوری تحقیق کے بغیر اس کی بات کا اعتبار کریں، کیونکہ جو فسق سے پرہیز نہیں کرتا وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

❸ **اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ:** اس سے معلوم ہوا کہ فاسق کی خبر پر بلاتحقیق عمل کرنا جہالت ہے، جو خطا سے بڑھ کر ہے، کیونکہ مجتہد اگر غلطی کرے تو اسے مخطی کہہ سکتے ہیں، جاہل نہیں، جب کہ بلاتحقیق فاسق کے قول پر فیصلہ کرنے والا اگر غلط فیصلہ کرے تو وہ جاہل ہے۔ (رازی) یعنی ایسا نہ ہو کہ تم کسی فاسق کی خبر پر بلاتحقیق کوئی کارروائی کر گزرو اور لاعلمی میں کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا دو، ان پر حملہ کر کے انھیں زخمی یا قتل کر دو، ان کی غیبت کر بیٹھو یا ان سے قطع تعلق کر لو، غرض تمھاری طرف سے انھیں کوئی بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کتنے ہی فتنے اور فساد ہیں جو بلاتحقیق ایسی خبروں پر عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اور بات بگڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

❹ **فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ:** پھر تم اس پر پشیمان ہو جاؤ، کیونکہ جلد بازی اور بلاتحقیق کام کا نتیجہ پشیمانی ہی ہے۔

❺ یہ آیت اس عظیم الشان علم کی بنیاد ہے جسے اصولِ حدیث کہا جاتا ہے، جو ہماری امت کی خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے افعال و اقوال اور احوال و تقریرات محفوظ طریقے سے ہم تک پہنچے ہیں اور قیامت تک پہنچتے جائیں گے۔ اس علم کی تکمیل کے لیے امت مسلمہ نے ایک لاکھ سے زیادہ راویوں کے حالاتِ زندگی، ان کا صدق و کذب، عدالت و فسق، حافظ ہونا یا نہ ہونا وغیرہ سب کچھ محفوظ کر دیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے دیکھا جاتا ہے کہ کوئی خبر بیان کرنے والا فاسق ہے یا عادل، اگر فاسق ہے تو اس کی خبر کی تحقیق کی جائے گی، اگر کسی دوسرے ذریعے سے اس کا درست ہونا ثابت ہو جائے تو اسے مان لیا جائے گا ورنہ اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر خبر دینے والا عادل ہے تو مزید تحقیق کی ضرورت نہیں اور اس کی خبر قبول کی جائے گی، خواہ خبر دینے والا ایک ہی ہو۔ اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ خبرِ واحد حجت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجہول آدمی کی خبر بھی بلاتحقیق قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس کے فاسق ہونے کا احتمال ہے۔

❻ آیت کے الفاظ میں ”فَاسِقٌ“ اور ”بِنَبَاٍ“ دونوں نکرہ ہیں، اس میں کسی خاص شخص کو متعین نہیں کیا گیا، بلکہ ایک عام قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی فاسق شخص کوئی بھی خبر لے کر تمھارے پاس آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو مصطلق سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ بنو مصطلق اور ان کے قبیلہ میں اسلام سے پہلے سے دشمنی چلی آ رہی تھی، وہ لوگ مسلح ہو کر استقبال کے لیے آئے، تو یہ ڈر گئے کہ شاید یہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور وہیں سے واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ بنو مصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے، بلکہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر بنو مصطلق کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا، ابھی یہ لشکر راستے میں تھا کہ ادھر سے بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ (ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد) اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آتے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے لشکر والوں سے دریافت کیا کہ آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ تمھاری طرف ہی جا رہے ہیں۔ انھوں نے سبب پوچھا تو لشکر والوں نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو تمھارے پاس بھیجا اور تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، بلکہ اسے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا، اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق دے کر مبعوث کیا ہے! ولید نہ ہمارے پاس آیا اور نہ ہم نے اس کی شکل دیکھی۔ پھر یہی بات انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہی اور مزید کہا کہ ہم تو خود آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کی طرف سے کوئی زکوٰۃ وصول کرنے نہیں پہنچا اور ہم ڈر گئے کہ کہیں آپ ہم سے ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ ان روایات کا خلاصہ ہے جو ابن کثیر وغیرہ نے نقل فرمائی ہیں۔

❼ عام مفسرین نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو فاسق اور ان کی خبر کو تحقیق کے بغیر ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ بعض کج دماغوں نے اسے اس مسلّم قاعدے پر طعن کا ذریعہ بنایا ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب کے سب عادل ہیں اور کسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ ثابت نہیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی کوئی بھی ہو اس کی بیان کردہ ہر روایت معتبر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کو ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے متعلق قرار دینے والی کسی بھی روایت کی سند صحیح نہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مقام پر چار روایتیں نقل کی ہیں اور ان میں سب سے بہتر حارث بن ضرار خزاعی رضی اللہ عنہ کی روایت کو قرار دیا ہے۔ اس کی سند یہ ہے: ” قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ فِيْ مُسْنَدِهِ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَابِقٍ حَدَّثَنَا عِيْسَى بْنُ دِيْنَارٍ حَدَّثَنَا أَبِيْ أَنَّهُ سَمِعَ الْحَارِثَ بْنَ ضِرَارٍ الْخُزَاعِيَّ قَالَ “ [ مسند أحمد : ۲۷۹/۴، ح : ۱۸۴۵۹ ] تفسیر ابن کثیر کے محقق سامی بن محمد سلامہ لکھتے ہیں: ”بہت سے مفسرین اس قول کی طرف گئے ہیں (کہ یہ آیت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے) حالانکہ اس قول میں نظر ہے، کیونکہ جتنی بھی روایات میں یہ قصہ بیان ہوا ہے وہ سب معلول ہیں (ان میں خرابی ہے)، ان میں سب سے بہتر امام احمد کی حارث بن ضرار خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے اور

قاضی ابوبکر بن العربی نے اپنی کتاب ''العواصم من القواصم (ص: ۱۰۲)'' میں اس قصے کا انکار کیا ہے۔''

تفسیر ابن کثیر کی تخریج "هداية المستنير" (تالیف ابوعبد الرحمٰن عادل بن یوسف العزازی) میں ہے: ''اس روایت میں دینار کوفی ہے، حافظ نے فرمایا، مقبول ہے، یعنی جب اس کی کوئی متابعت موجود ہو۔'' ظاہر ہے یہاں کسی نے اس کی متابعت نہیں کی، اس لیے اس کی یہ روایت قبول نہیں۔ مسند احمد کے محققین نے اس روایت پر لکھا ہے: ''حارث بن ضرار کے اسلام کا قصہ چھوڑ کر باقی روایت اپنے شواہد کی وجہ سے حسن ہے اور یہ سند ضعیف ہے، کیونکہ عیسیٰ کا والد دینار مجہول ہے۔ وہ کوفے کا رہنے والا ہے اور عمرو بن حارث کا مولیٰ ہے، اس سے اس کے بیٹے عیسیٰ نے اکیلے ہی یہ روایت بیان کی ہے اور ابن المدینی نے فرمایا: "لَا أَعْرِفُهُ" (میں اسے نہیں پہچانتا) اس کے باوجود ابن حبان نے اس کا ذکر ''الثقات'' میں کیا ہے۔''

اس آیت کے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہونے کی دوسری روایت ابن کثیر نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیان کی ہے۔ ابن کثیر (طبع دار ابن الجوزی) کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا: ''اس کی سند موسیٰ بن عبیدہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔'' ابن کثیر میں اس مفہوم کی تیسری روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جو عوفی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ چوتھی روایت مجاہد اور قتادہ نے بیان کی ہے جو تابعی ہیں اور ان کی روایت مرسل ہے جو حجت نہیں۔ آپ غور فرمائیں! یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی سب سے بہتر روایت کو حسن کہنے والے بھی اس کی سند کے ضعیف ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، حسن صرف شواہد کی وجہ سے کہتے ہیں اور شواہد بھی ایسے کہ سب کی سند ضعیف ہے۔ ایسی کمزور روایت کے ساتھ ایک صحابی کو فاسق قرار دینا کیسے درست ہو سکتا ہے، جو اس جماعت کا فرد ہے جسے اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند حاصل ہو چکی ہے۔

⑧ اگر اس قصے کو درست مان لیا جائے تو بھی اس سے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا فاسق ہونا لازم نہیں آتا۔ سب سے پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقات کی وصولی کے لیے ان کا انتخاب ان کے فاسق ہونے کی نفی کرتا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے عمال کو صدقات وغیرہ کی وصولی پر مقرر فرماتے تھے جو نہایت امین ہوتے تھے، جیسا کہ ابوعبیدہ امین ہذہ الامہ کو یمن کی طرف بھیجنے سے ظاہر ہے۔ پھر ولید رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ بنو مصطلق نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور میرے قتل کا ارادہ کیا ہے، اس کی وجہ خود اس روایت میں موجود ہے کہ ان کے درمیان سابقہ دشمنی موجود تھی اور مسلح افراد کی بہت بڑی تعداد کو دیکھ کر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ مجھے قتل کرنے آئے ہیں اور زکوۃ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایسا گمان پیدا ہونا فطری بات ہے۔ آپ اسے گمان کی غلطی کہہ سکتے ہیں مگر جھوٹ یا فسق نہیں کہہ سکتے۔ رہا آیت کا نزول تو اس میں نہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ولید فاسق ہے نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ آیت میں مسلمانوں کو ایک حکم دیا گیا ہے کہ ان کے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کریں، اندھا دھند اس پر کارروائی نہ کریں۔

⑨ شیخ عبد الرحمان معلمی یمانی نے ''الانوار الکاشفہ (ص: ۲۶۳)'' میں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث منقول ہی نہیں، اس لیے اس واقعہ سے کسی صحابی کی نقل کردہ روایت کا مردود ہونا لازم ہی نہیں آتا، کیونکہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نقل ہی نہیں کی۔ شیخ معلمی نے ان سے مروی

دوسری روایات کے علاوہ اس روایت کی بھی نفی کی ہے جو مسند احمد میں ہے کہ ولید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « لَمَّا فَتَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ جَعَلَ أَهْلُ مَكَّةَ يَأْتُوْنَهُ بِصِبْيَانِهِمْ فَيَمْسَحُ عَلٰى رُؤُوْسِهِمْ وَيَدْعُوْ لَهُمْ، فَجِيْءَ بِيْ إِلَيْهِ وَ إِنِّيْ مُطَيَّبٌ بِالْخَلُوْقِ، فَلَمْ يَمْسَحْ عَلٰى رَأْسِيْ، وَلَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ ذٰلِكَ إِلَّا أَنَّ أُمِّيْ خَلَّقَتْنِيْ بِالْخَلُوْقِ فَلَمْ يَمَسَّنِيْ مِنْ أَجْلِ الْخَلُوْقِ » [ مسند أحمد : ۴/ ۳۲، ح : ۱۶۳۷۹ ] ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو اہلِ مکہ اپنے بچے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے لگے، آپ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور ان کے لیے برکت کی دعا کرتے۔ مجھے بھی آپ کے پاس لایا گیا مگر آپ نے میرے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا اور آپ کے ہاتھ نہ پھیرنے کی وجہ یہی تھی کہ میری ماں نے مجھے خَلوق (زعفران سے مرکب ایک خوشبو) لگائی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلوق کی وجہ سے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔'' مسند احمد کے محققین نے لکھا ہے: ''اس کی سند عبداللہ ہمدانی کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، کنیت اس کی ابوموسی ہے۔ اس سے روایت میں ثابت بن حجاج الکلابی منفرد ہے اور ذہبی اور ابن حجر نے تقریب میں اسے مجہول کہا ہے۔ بخاری نے ''تاریخ کبیر'' (۲۲۴/۵) میں کہا ہے: ''لَا يَصِحُّ حَدِيْثُهُ'' (اس کی حدیث صحیح نہیں) اور ابن عبد البر نے کہا ہے کہ یہ ابوموسیٰ مجہول ہے اور یہ خبر منکر ہے، صحیح نہیں۔'' اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو فاسق کہنے کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس سے فتح مکہ کے موقع پر ولید کا بچہ ہونا ثابت ہوتا ہے، جسے صدقات کا عامل بنا کر بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

Ⓑ بعض لوگوں نے صحیح مسلم (۱۷۰۷) وغیرہ کی اس روایت کی وجہ سے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو فاسق قرار دیا ہے جس میں ہے کہ انھوں نے شراب پی کر صبح کی جماعت دو رکعتیں پڑھانے کے بعد کہا کہ مزید پڑھاؤں، جس پر عثمان رضی اللہ عنہ نے ان پر شراب کی حد لگائی۔ واضح رہے کہ بعض روایات میں دو کے بجائے چار رکعتیں پڑھانے کا ذکر ہے مگر ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں۔ بعض اہلِ علم نے لکھا ہے: ''علامہ آلوسی نے روح المعانی میں فرمایا: ''اس معاملے میں حق بات وہ ہے جس کی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں ہیں، ان سے گناہ کبیرہ بھی سرزد ہو سکتا ہے جو فسق ہے اور اس گناہ کے وقت ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں، یعنی شرعی سزا جاری کی جائے گی، لیکن اہل سنت والجماعہ کا عقیدہ قرآن وسنت کی نصوص کی بنا پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کر کے پاک نہ ہو گیا ہو۔ قرآن کریم نے علی الاطلاق ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ فرما دیا ہے، فرمایا: ﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [ التوبۃ : ۱۰۰ ] ''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کی رضا گناہ کے معاف ہونے کے بغیر نہیں ہوتی، جیسا کہ قاضی ابویعلیٰ نے فرمایا: ''رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے، وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انھی کے لیے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات ان کاموں پر ہوگی جن پر اللہ تعالیٰ راضی ہے۔'' [ كَذَا فِي الصَّارِمِ الْمَسْلُوْلِ لِابْنِ تَيْمِيَّةَ ] خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم الشان جماعت میں سے اگر کسی سے

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ١ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ١ؕ اُولٰٓىِٕكَ

**اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے، اگر وہ بہت سے کاموں میں تمھارا کہا مان لے تو یقیناً تم مشکل میں پڑ جاؤ اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور**

کبھی کوئی گناہ سرزد ہوا بھی ہے تو اسے فوراً توبہ کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ نے ان کو رسول کریم ﷺ کی صحبت کی برکت سے ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی، خلاف شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا۔ ان کے اعمال صالحہ، نبی کریم ﷺ اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے اتباع کو وظیفۂ زندگی بنانا اور اس کے لیے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پچھلی امتوں میں نہیں ملتی، ان بے شمار اعمال صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہو جانا اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت وعظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت ان کا خوف، خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لیے خود پیش کر دینا روایاتِ حدیث میں مشہور و معروف ہے اور بحکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ تیسرے قرآن کے ارشاد کے مطابق اعمال صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ [ ھود : ۱۱۴ ] ''بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔'' خصوصاً جب ان کی حسنات عام لوگوں کی طرح نہیں، بلکہ ان کا حال وہ ہے جو ابوداؤد اور ترمذی نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے (جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں) نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: (( لَمَشْهَدُ رَجُلٍ مِّنْهُمْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْبَرُّ فِيْهِ وَجْهُهُ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِ أَحَدِكُمْ عُمْرَهُ وَلَوْ عُمِّرَ عُمْرَ نُوْحٍ )) [ أبوداؤد، السنة، باب في الخلفاء : ۴۶۵۰، قال الألباني صحیح ] ''اللہ کی قسم! ان میں سے کسی شخص کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جس میں ان کے چہرے پر غبار پڑ گیا ہو، تم میں سے کسی شخص کی عمر بھر کی عبادت و اطاعت سے افضل ہے۔ اگرچہ اس کو نوح علیہ السلام کی عمر دے دی گئی ہو'' اس لیے ان سے صدورِ گناہ کے وقت اگرچہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لیے مقرر تھا، مگر اس کے باوجود بعد میں کسی کے لیے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو فاسق قرار دے۔ اس لیے اگر نبی کریم ﷺ کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجب فسق سرزد بھی ہوا اور اس وقت ان کو فاسق کہا بھی گیا ہو تو اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتا کہ اس فسق کو ان کے لیے ہمیشہ کا حکم سمجھ کر معاذ اللہ فاسق کہا جائے۔'' (کذا فی الروح)

**آیت 7** ① وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ : ظاہر ہے کہ ہر صحابی یہ جانتا تھا کہ اللہ کا رسول ہم میں موجود ہے، اس کے باوجود فرمایا: ''اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں رسول اللہ ﷺ کے بنفس نفیس موجود

هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝

نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں ⑦

ہونے اور آپ کی وفات کے بعد کتاب وسنت کے موجود ہونے کے باوجود جو شخص اپنی رائے پر اصرار کرتا ہے اور آپ ﷺ اور آپ کی حدیث سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اپنی بات منوانا چاہتا ہے درحقیقت وہ اس بات سے جاہل ہے کہ ہم میں اللہ کا رسول موجود ہے، ہمیں ہر معاملے میں ان کی بات ماننی چاہیے، کیونکہ اگر اسے یہ بات معلوم ہوتی تو وہ رسول کی اطاعت کرتا اور رسول کو اپنی اطاعت کروانے کی کوشش نہ کرتا۔ سو جس طرح وہ شخص جاہل ہے جو چار دیواری کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتا ہے اور وہ شخص جاہل ہے جو کسی فاسق کی لائی ہوئی خبر پر بلا تحقیق کارروائی کر گزرتا ہے، اسی طرح وہ شخص بھی جاہل ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی حدیث کے ہوتے ہوئے اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے یہ بتانے کی شدید ضرورت ہے کہ جان لو! تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

② لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ : یعنی رسول کے احکام چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے اور اس کا ہر حکم علم و حکمت اور رحمت و مصلحت پر مبنی ہے اس لیے رسول کی اطاعت کرنے سے تم ہر طرح کی مشقت اور مصیبت سے بچے رہو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵] ''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔'' اور رسول کو بھی تمھارا مشقت میں پڑنا کسی صورت گوارا نہیں، فرمایا: ﴿ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ ﴾ [التوبۃ: ۱۲۸] ''اس پر بہت شاق ہے کہ تم مشقت میں پڑو، تم پر بہت حرص رکھنے والا ہے۔'' اس کے برعکس اگر رسول تمھاری اطاعت کرے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، کیونکہ اول تو تمھاری سب کی بات ایک نہیں ہوگی، ہر شخص وہ بات منوانے کی کوشش کرے گا جو اس کے خیال میں اس کے فائدے کی ہے، تو رسول کس کس کی بات مانے گا اور کس کی بات کا امت کو حکم دے گا؟ پھر تمھارا علم ناقص ہے، نہ تمھیں مستقبل کی کوئی خبر ہے نہ تم غیب کا علم رکھتے ہو، تمھیں کیا معلوم کہ تم جسے اپنے لیے فائدہ مند سمجھ رہے ہو وہ انجام کے لحاظ سے کس قدر نقصان دہ ہے۔ اس لیے جس طرح کائنات کا نظام درست اس لیے چل رہا ہے کہ وہ ایک اللہ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے اسی طرح شریعت کا نظام بھی صرف رسول کی اطاعت سے صحیح چل سکتا ہے، کیونکہ اس کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، فرمایا: ﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ﴾ [المؤمنون: ۷۱] ''اور اگر حق ان کی خواہشوں کے پیچھے چلے تو سب آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، یقیناً بگڑ جائیں۔''

③ ''لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ'' میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رسول بعض تدبیری امور میں تمھارا مشورہ مان بھی لیتا ہے، کیونکہ اسے اللہ کی طرف سے مشورے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ [آل عمران: ۱۵۹] ''سو ان سے درگزر کر اور ان کے لیے بخشش کی دعا کر اور کام میں ان سے

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑧

اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کی وجہ سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ⑧

مشورہ کر۔'' مگر یاد رکھو! تمھارا کام حکم دینا نہیں، مشورہ دینا ہے، رسول مناسب سمجھے تو مان لے مناسب نہ سمجھے تو نہ مانے، آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے ساتھ اسی نے کرنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ [ آل عمران : ۱۵۹ ] ''پھر جب تو پختہ ارادہ کرے تو اللہ پر بھروسا کر۔''

④ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ : ایمان سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے جس میں تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالارکان تینوں شامل ہیں۔ یعنی اگر رسول بہت سی باتوں میں تمھاری اطاعت کرے تو یقیناً تم مشکل میں پڑ جاؤ، لیکن اللہ تعالیٰ نے (تمھیں مشکل میں پڑنے سے بچالیا اور) ایمان یعنی رسول ﷺ کی اطاعت کو تمھارے لیے محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں ایسا مزین کر دیا کہ تم خوش دلی سے رسول کی اطاعت پر کار بند ہو گئے۔ اس لیے بعض اوقات بتقاضائے بشریت تم سے غلطی ہو جاتی ہے مگر ایمان کی محبت اور کفر سے نفرت کی بدولت تم جلد ہی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہو اور گناہوں سے باز رہتے ہو۔

⑤ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ : یعنی کفر، فسوق اور عصیان کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا۔ رازی نے فرمایا: ''ایمان میں تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالارکان تینوں شامل ہیں۔ کفر دل کی تصدیق نہ ہونا ہے، فسوق زبان سے اقرار نہ کرنا ہے اور عصیان عمل نہ کرنا ہے۔'' شیخ عبد الرحمان السعدی نے فرمایا: ''(کفر کا معنی تو ظاہر ہے) فسوق سے مراد بڑے گناہ (کبائر) اور عصیان سے مراد ان سے کم تر درجے کے گناہ ہیں۔'' (واللہ اعلم)

⑥ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ : یعنی یہ لوگ جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اسے ان کے دلوں میں مزین کر دیا ہے اور کفر و فسوق و عصیان کو ان کے لیے ناپسندیدہ بنا دیا ہے، یہی لوگ ہیں جو کامل ہدایت والے ہیں۔ ''الف لام'' بیانِ کمال کے لیے ہے اور حصر کا فائدہ بھی دے رہا ہے کہ صحابہ ہی ہدایت پر ہیں، ان کے دشمن اور مخالف گمراہ ہیں۔ اس آیت میں صحابہ کرام کی بے حد فضیلت بیان ہوئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کے وہ اوصافِ حمیدہ بیان کیے جو اس نے انھیں عطا فرمائے اور آخر میں صریح الفاظ میں ان کے راہِ راست پر ہونے کی شہادت دی۔

آیت 8 ① فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً : یہ ''الرّٰشِدُوْنَ'' کا مفعول لہ ہے، یعنی یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی نعمت کی وجہ سے کامل ہدایت والے ہیں۔ یہ ''حَبَّبَ'' اور ''كَرَّهَ'' کا مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے۔

② وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ نے اندھا دھند نہیں بلکہ اپنے کمال علم و حکمت کی بنا پر انھیں اپنے نبی ﷺ کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا۔ ان کے دلوں میں ایمان کو محبوب و مزین کر دیا، کفر و فسوق اور عصیان کو ناپسندیدہ بنا دیا اور انھیں راہِ راست پر گامزن فرما دیا، کیونکہ وہ ان کی استعداد و اہلیت پوری طرح جانتا تھا اور اس کی حکمت کا تقاضا تھا کہ وہ انھیں اس مقام پر فائز فرمائے۔

**وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى**

**اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر دونوں میں سے ایک**

آیت 9 ❶ **وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا:** فاسق لوگوں کی خبر پر بلاتحقیق اعتماد کر لینے سے کئی دفعہ آپس میں لڑائی ہو جاتی ہے اور کئی دفعہ ہر قسم کی پیش بندی کے باوجود لڑائی ہو جاتی ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی کے موقع پر ان لوگوں پر لازم ہے جو اس لڑائی میں شریک نہیں کہ لڑنے والوں کے درمیان صلح کروا دیں۔ ان کے لیے جائز نہیں کہ مسلمانوں کو لڑتے ہوئے ان کے حال پر چھوڑ دیں اور تماشا دیکھتے رہیں۔

❷ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: (( أَنَّ أَهْلَ قُبَاءٍ اقْتَتَلُوْا حَتّٰى تَرَامَوْا بِالْحِجَارَةِ فَأُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذٰلِكَ فَقَالَ اذْهَبُوْا بِنَا نُصْلِحُ بَيْنَهُمْ )) [ بخاري، الصلح، باب قول الإمام لأصحابه اذهبوا...... : ۲۶۹۳ ] ”قبا میں رہنے والے لڑ پڑے، حتیٰ کہ انھوں نے ایک دوسرے پر پتھر پھینکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہمارے ساتھ چلو، تاکہ ہم ان کے درمیان صلح کروائیں۔“ اور انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ اگر آپ عبداللہ بن اُبی کے پاس جائیں تو بہتر ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سوار ہو کر گئے، مسلمان بھی آپ کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔ وہ زمین شور والی تھی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے تو وہ کہنے لگا: ”مجھ سے دور رہو، اللہ کی قسم! تمھارے گدھے کی بدبو سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ ایک انصاری صحابی نے کہا: ”اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گدھے کی خوشبو تجھ سے اچھی ہے۔“ عبداللہ بن اُبی کی طرف سے اس کی قوم کا ایک آدمی غصے میں آ گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا، پھر دونوں طرف سے دونوں کے حمایتی مشتعل ہو گئے اور چھڑی، ہاتھوں اور جوتوں کے ساتھ ایک دوسرے کو مارنے لگے۔ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی: ﴿ وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ [ بخاري، الصلح، باب ما جاء في الإصلاح بين الناس : ۲۶۹۱ ]

❸ قرطبی نے فرمایا: ”طائفہ کا لفظ ایک آدمی پر، دو پر اور زیادہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ ”طَآىِٕفَتٰنِ“ میں لڑنے والے دو آدمی بھی شامل ہیں اور دو جماعتیں بھی، چھوٹی ہوں یا بڑی۔ آیت میں لڑنے والے فریقوں کے درمیان صلح کروانے کا حکم ہے، خواہ دو مسلمان آپس میں لڑ رہے ہوں یا زیادہ۔“

❹ بعض احادیث میں کسی مسلمان سے لڑنے کو کفر اور لڑنے والوں کو کافر کہا گیا ہے، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَ قِتَالُهُ كُفْرٌ )) [ بخاري، الإيمان، باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله ...... : ۴۸ ] ”مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔“ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: (( لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ )) [ بخاري، الفتن، باب قول النبي ﷺ : ”لا ترجعوا بعدي كفارا......“ : ۷۰۷۷ ] ”میرے بعد پھر کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔“

فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ

امام بخاری اور دوسرے ائمہ کرام نے فرمایا کہ آیت: ﴿ وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ دلیل ہے کہ مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے کے باوجود مسلمان ہی رہتے ہیں، اسلام سے خارج یا مرتد نہیں ہو جاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لڑنے والے دونوں فریقوں کو مومن قرار دیا ہے اور اس سے اگلی آیت میں بھی فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ [ الحجرات : ۱۰ ] ''مومن تو (آپس میں) بھائی ہی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔'' اسی طرح آیت قصاص میں قاتل کو مقتول کے وارث کا بھائی قرار دیا، فرمایا: ﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ﴾ [ البقرۃ : ۱۷۸ ] ''پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو معروف طریقے سے پیچھا کرنا اور اچھے طریقے سے اس کے پاس پہنچا دینا (لازم) ہے۔'' رہا حدیث میں مسلمان سے لڑائی کو کفر قرار دینا تو اس سے وہ کفر مراد نہیں جس کی وجہ سے آدمی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے مراد ''کفر دون کفر'' یعنی کفر اکبر (جس سے انسان اسلام سے خارج ہوتا ہے) سے کم تر درجے کا کفر ہے، کیونکہ گناہ کے تمام کام کفر اور جاہلیت ہیں اور ایسے شخص کو کافر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کفر کے کام کا ارتکاب کیا ہے، اس کا ایمان کامل نہیں بلکہ وہ ناقص الایمان مومن ہے، یہ نہیں کہ وہ ملت اسلام سے خارج ہو گیا۔ دلیل اس کی زیر تفسیر آیت اور دوسری بہت سی آیات و احادیث ہیں جو امام بخاری نے اپنی صحیح کی ''کتاب الایمان'' میں اور دوسرے ائمہ نے اپنی تصانیف میں بیان فرمائی ہیں۔ اس آیت سے خوارج کے عقیدے کی نفی ہوتی ہے جو کسی بھی کبیرہ گناہ کے مرتکب کو، جس نے توبہ نہ کی ہو، کافر اور ابدی جہنمی سمجھتے ہیں اور معتزلہ کے عقیدے کی بھی جو کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر۔ انجام کے لحاظ سے وہ بھی اسے ابدی جہنمی قرار دیتے ہیں۔

❺ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى : ''بَغَتْ'' ''بَغَى يَبْغِي بَغْيًا'' (ض) سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ اگر ان دو فریقوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے، یعنی وہ کتاب و سنت کے فیصلے کے مطابق صلح پر اور اختلاف دور کرنے پر آمادہ ہی نہ ہو، بلکہ دوسرے پر چڑھتا چلا جائے اور ظلم و زیادتی پر کمر باندھ لے۔

❻ فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ : تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، کیونکہ اس لڑائی کا حکم اللہ نے دیا ہے، اس لیے یہ واجب ہے اور جہاد کے حکم میں ہے۔ اس حکم کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو طاقت استعمال کر کے زیادتی کا ازالہ کرنے پر قادر ہوں۔

❼ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ : ''تَفِيْٓءَ'' ''فَاءَ يَفِيءُ فَيْئًا'' (ض) لوٹنا، پلٹنا۔ یہ واحد مؤنث غائب مضارع معلوم ہے۔ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آنے کا مطلب یہ ہے کہ جو بات کتاب و سنت کی رو سے حق ہے باغی گروہ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ باغی گروہ سے لڑتے وقت یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ لڑنے سے مقصود انھیں صلح پر مجبور کرنا ہے، انھیں ختم کرنا یا ان کا نام و نشان مٹانا مقصود نہیں۔

❽ یہ آیت مسلمانوں کی باہمی جنگ کے بارے میں شرعی فیصلوں کی بنیاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کی

وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۹﴾

**آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۹﴾**

---

آپس میں کوئی بڑی لڑائی نہیں ہوئی، چند موقعوں پر جھگڑا ہوا مگر نوبت ہاتھا پائی اور چھڑی جوتے سے آگے نہیں بڑھی۔ ان آیات کی عملی تفسیر اس وقت سامنے آئی جب علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں کی آپس میں لڑائیاں ہوئیں۔ اس وقت چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام کثیر تعداد میں موجود تھے، جو قرآن و سنت کا علم بعد میں آنے والے کسی بھی شخص سے زیادہ رکھتے تھے، اس لیے ان کے عمل اور ان کے بیان کردہ احکام سے قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ایک اسوہ اور ضابطہ مرتب ہو گیا۔ اس طرح یہ جنگیں ناگوار اور نہایت تکلیف دہ ہونے کے باوجود خیر سے خالی نہیں رہیں، کیونکہ اگر یہ نہ ہوتیں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ بعد میں آنے والے مسلمان آپس کی لڑائیوں میں ایک دوسرے پر کیا کیا ظلم و ستم کرتے۔ اس ضابطے کا ضروری خلاصہ یہ ہے:

① جب لڑنے والے دو گروہ کسی مسلم حکومت کی رعایا ہوں اور عام مسلمان انھیں صلح پر آمادہ نہ کر سکیں تو ان کے درمیان صلح کرانا یا یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں زیادتی کرنے والا گروہ کون ہے، پھر طاقت کے ذریعے سے اس کو حق پر مجبور کرنا حکومت کا فریضہ ہے۔

② لڑنے والے دونوں فریق بہت بڑے طاقتور گروہ ہوں، یا دو مسلمان حکومتیں ہوں اور دونوں کی لڑائی دنیا کی خاطر ہو تو اس صورت میں اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ اس فتنے میں حصہ لینے سے قطعی اجتناب کریں اور دونوں فریقوں کو اللہ کا خوف دلا کر جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔

③ مسلم حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے رعایا کا کوئی گروہ اگر اس کے خلاف خروج کرے تو اس کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا متفقہ حکمران موجود ہو اور اس کے خلاف خروج کرنے والوں کے پاس خروج کے لیے شرعی دلیل اور حکمران کا کفر بواح یعنی کھلم کھلا کافر ہو جانا موجود نہ ہو، ایسے گروہ کے خلاف حکومت کی جنگ بالاتفاق جائز ہے اور اس کا ساتھ دینا ایمان والوں پر واجب ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حکومت عادل ہو یا نہ ہو، کیونکہ عادل نہ ہونے کا بہانہ بنا کر کوئی بھی گروہ کسی بھی وقت حکومت کے خلاف خروج کر سکتا ہے، جس کا نتیجہ افتراق و انتشار اور کفار کو مسلمانوں پر حملے کی جرأت دلانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ظالم حکمران کے خلاف خروج ہے، جس کی امارت جبراً قائم ہوئی ہو اور جس کے امراء فاسق ہوں اور خروج کرنے والا گروہ عدل اور حدود اللہ کی اقامت کے لیے اٹھا ہو اور اس کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ نیک لوگ ہیں۔ اہلِ سنت کا موقف یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نسق اس کے انتظام میں چل رہا ہو اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہے، الّا یہ کہ وہ کفرِ بواح کا ارتکاب کرے، یعنی کھلم کھلا کافر ہو جائے۔ امام نووی نے اس پر

اجماع کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض لوگ ایسے حکمران کے خلاف خروج کو جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اہلِ بیت کے بعض خروج کرنے والے حضرات کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور بعض فقہاء کا نام بھی لیا جاتا ہے جنھوں نے مسلم حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھانے کو جائز قرار دیا، مگر محدثین اور جمہور فقہاء ان کے اس موقف کو غلط قرار دیتے ہیں، بلکہ اسے یہ موقف رکھنے والوں کے لیے باعثِ طعن قرار دیتے ہیں کہ ”فُلَانٌ كَانَ يَرَى السَّيْفَ“ کہ فلاں صاحب مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے کو جائز قرار دیتے تھے۔ امام احمد ابن حنبل اور دوسرے محدثین نے حکمرانوں کے بے حد ظلم و ستم کے باوجود ان کے خلاف نہ خروج کیا نہ خروج کو جائز رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ پوری تاریخ اسلام پڑھ جائیں کسی خروج کے نتیجے میں مسلمانوں کو تشتّت و انتشار اور کفار سے جہاد کے رک جانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا، خواہ حکمران عادل تھا یا ظالم۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حکمرانوں کے سامنے حق کہنے اور ان کو نصیحت کرنے کی تلقین فرمائی، مگر ان کے خلاف خروج سے سختی کے ساتھ منع فرما دیا۔ چند احادیث ملاحظہ فرمائیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيْرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ ، فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ يُفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَيَمُوْتُ إِلَّا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً )) [ بخاري، الأحكام، باب السمع والطاعة للإمام ما لم تكن معصية : ۷۱۴۳ ] ”جو شخص اپنے امیر میں کوئی چیز دیکھے جو اسے بری لگے تو وہ صبر کرے، کیونکہ جو بھی شخص جماعت سے ایک بالشت جدا ہوا پھر فوت ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔“
عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں : (( دَعَانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْنَاهُ فَقَالَ فِيْمَا أَخَذَ عَلَيْنَا أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِيْ مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَأَثَرَةً عَلَيْنَا، وَ أَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ )) [ بخاري، الفتن، باب قول النبي ﷺ : " سترون بعدي أمورا تنكرونها " : ۷۰۵۵، ۷۰۵۶ ] ”رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دعوت دی تو ہم نے آپ سے بیعت کی۔ آپ نے ہم سے جو عہد لیا اس میں یہ تھا کہ ہم نے بیعت کی سننے اور اطاعت کرنے پر، اپنی خوشی اور ناخوشی میں اور اپنی تنگی اور آسانی میں اور اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیے جانے پر بھی اور اس بات پر کہ ہم صاحب امر (حکمران) سے امارت میں جھگڑا نہیں کریں گے، الا یہ کہ تم صریح کفر دیکھو، جس کے متعلق تمھارے پاس اللہ کے ہاں واضح دلیل ہو۔“

④ علی رضی اللہ عنہ کا عمل اپنے خلاف جنگ کرنے والوں کو باغی سمجھنے اور ان سے لڑنے کے باوجود یہ تھا کہ وہ مسلمان ہیں، ان کے زخمیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، ان کے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کیا جائے گا، ان کے اسیروں کو قتل نہیں کیا جائے گا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی و غلام نہیں بنایا جائے گا، بلکہ ان کی آبرو کی حفاظت کی جائے گی اور ان کا مال غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں دونوں فریق ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے اور ایک دوسرے کا جنازہ پڑھتے تھے۔ احکام کی تفصیل اور دلائل کے لیے دیکھیے ”المغنی“ از ابن قدامہ میں ”كِتَابُ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ“ اور دوسری کتب فقہ۔

⑨ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ: زیادتی کرنے والے گروہ کے اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آنے پر دونوں

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۰

**مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ⑩**

گروہوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروانے کا حکم دیا، یہ نہیں کہ کسی فریق کی بے جا رعایت کرکے اور دوسرے کو دبا کر صرف لڑائی روکنے کے لیے صلح کروائی جائے، کیونکہ ایسی صلح نہ پائیدار ہوتی ہے، نہ اس سے آئندہ کے لیے لڑائی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ اس لیے ایک فریق پر دوسرے کا جو حق ثابت ہوتا ہے وہ اسے دلا کر عدل کے ساتھ صلح کروانی چاہیے۔

⑩ **اَقْسِطُوْا** : یہاں ایک سوال ہے کہ اس سے پہلے فرمایا، دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کروا دو، پھر دوبارہ "اَقْسِطُوْا" کہنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ لڑائی کے موقع پر بعض لڑنے والوں کے خلاف دل میں شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے انسان درست فیصلہ نہیں کر سکتا، اس لیے تاکید کے لیے دوبارہ انصاف کا حکم دیا اور انصاف کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت کی نوید سنائی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ پہلے جملے میں لڑنے والوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروانے کا حکم ہے اور "اَقْسِطُوْا" میں اپنے تمام معاملات میں انصاف سے کام لینے کا حکم ہے۔ انصاف کیا ہے؟ اس کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۹۰) کی تفسیر۔

⑪ **اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ** : ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ، إِمَامٌ عَدْلٌ...... )) [ بخاري، الزكوة، باب الصدقة باليمين : ۱۴۲۳ ] "سات آدمی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ (سب سے پہلے جس کا ذکر فرمایا وہ ہے) عادل حکمران......" عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ الْمُقْسِطِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ عَنْ يَمِيْنِ الرَّحْمٰنِ عَزَّ وَجَلَّ وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ الَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ فِيْ حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيْهِمْ وَمَا وَلُوْا )) [ مسلم، الإمارة، باب فضيلة الإمام العادل...... : ۱۸۲۷ ] "انصاف کرنے والے اللہ کے پاس نور کے منبروں پر رحمان عزوجل کی دائیں جانب ہوں گے اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے گھر والوں میں اور جس کے ذمہ دار ہیں سب میں انصاف کرتے ہیں۔"

**آیت 10** ① **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ** : لڑائی سے باز رکھنے کا سب سے مؤثر ذریعہ لڑنے والوں کو قرابت کا احساس دلانا ہے کہ دیکھو تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اپنے ہی بھائی سے، یہ کتنی بری بات ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی دینی قرابت کا احساس دلایا، جو نسبی قرابت سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے جو لوگ نسبی قرابت کے باوجود ایک دوسرے کے شدید دشمن تھے، جیسا کہ اوس اور خزرج کا معاملہ تھا، اللہ کی نعمت سے اسلام کی بدولت بھائی بھائی بن گئے۔ (دیکھیے آل عمران : ۱۰۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ، وَلَا يُسْلِمُهٗ )) [ بخاري، المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه : ۲۴۴۲، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کوئی قوم کسی قوم سے مذاق نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ کوئی

ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔“

② فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ : ”أَخٌ“ کا تثنیہ ”أَخَوَانِ“ اور ”أَخَوَيْنِ“ ہے جو ”كُمْ“ کی طرف مضاف ہوا تو نون اعرابی گر گیا اور ”أَخَوَيْ“ باقی رہا جو ”كُمْ“ کے ساتھ مل کر ”اَخَوَيْكُمْ“ ہو گیا، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کروا دو، وہ دو خواہ ایک ایک فرد ہوں یا ایک ایک جماعت ہوں۔

③ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ : یعنی صلح کرواتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھو کہ تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کروا رہے ہو، جن کا تمھارے ساتھ بھی اخوت کا رشتہ ہے۔ لہٰذا اس رشتے کا خیال رکھو اور پوری طرح عدل و انصاف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس طرح صلح کرواؤ کہ نہ کسی فریق کی حق تلفی ہو اور نہ کسی پر زیادتی ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے ہوئے یہ فریضہ سرانجام دو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا۔ ”لَعَلَّ“ کا لفظ امید دلانے کے لیے ہوتا ہے، مگر بڑے لوگوں کے کلام میں اس سے یقین حاصل ہوتا ہے، کیونکہ امید دلا کر اسے پورا نہ کرنا ان کی شان کے لائق نہیں ہوتا۔ پھر جو شاہوں کا شاہ اور ساری کائنات کا مالک ہے وہ امید دلائے تو اس کے یقینی ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اس کے علاوہ ”لَعَلَّ“ کا لفظ ”تاکہ“ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا رحم انھی لوگوں پر ہوتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں، اس لیے بھائیوں کے درمیان صلح کرواتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور عدل کے ساتھ صلح کرواؤ، تاکہ تم پر اللہ کا رحم ہو۔

④ یہ آیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دیتی ہے۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی دوسرے کونے میں ہو، دوسرے سب مسلمان اسے بھائی سمجھتے ہیں۔ اسلام کے سوا ایسا رشتہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ (کیلانی)

آیت 11 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... : گزشتہ آیات میں مسلمانوں کے آپس میں لڑنے کی صورت میں ان کے درمیان صلح کروانے کا حکم دیا، اس سے پہلے بلا تحقیق خبر پر عمل سے منع فرمایا تھا، کیونکہ اس سے لڑائی پیدا ہو سکتی ہے اور لاعلمی میں نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتی ہے۔ یہاں سے مزید ان چیزوں سے منع فرمایا جو اسلامی اخوت کو نقصان پہنچاتی ہیں اور باہمی عداوت اور لڑائی کا باعث بنتی ہیں۔ اس آیت میں ایسی تین چیزیں ذکر فرمائیں: ① کسی کا مذاق اڑانا۔ ② کسی پر عیب لگانا۔ ③ کسی کو برے لقب سے پکارنا۔

② لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ : ”سَخِرَ يَسْخَرُ سَخَرًا وَسَخْرًا وَ سُخُرًا وَ سِخْرًا وَ سُخْرَةً و مَسْخَرًا بِهِ وَ مِنْهُ“ (ع) استہزا، مذاق اڑانا، ٹھٹھا کرنا، وہ ہنسی جس سے دوسرے کی تحقیر اور دل آزاری ہو۔ وہ ہنسی جس سے دوسرے کا دل خوش ہو وہ مزاح کہلاتی ہے، وہ جائز ہے بلکہ مسنون ہے۔ کشاف میں ہے: ”قوم کا لفظ مردوں کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ مرد عورتوں کے ”قوّام“ ہوتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

نِسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ

عورتیں دوسری عورتوں سے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ اپنے لوگوں پر عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو

وَلَا أَدْرِيْ وَ سَوْفَ إِخَالُ أَدْرِيْ أَقَوْمٌ آلُ حِصْنٍ أَمْ نِسَاءُ

''اور میں نہیں جانتا اور میرا خیال ہے کہ میں جلد ہی جان لوں گا کہ آلِ حصن قوم (یعنی مرد) ہیں یا عورتیں۔''

یہ آیت بھی اس بات کی دلیل ہے، کیونکہ قوم کو ٹھٹھا کرنے سے منع کرنے کے بعد عورتوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔ رہی یہ بات کہ قرآن میں مذکور قومِ فرعون اور قومِ ثمود وغیرہ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں تو اصل یہ ہے کہ وہاں مردوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے، کیونکہ عورتیں ان کے تابع ہیں۔

③ پہلی چیز جس سے منع فرمایا وہ کسی کا مذاق اڑانا یا تمسخر ہے، کیونکہ اس سے دلوں میں شدید بغض پیدا ہوتا ہے۔ جس کا مذاق اڑایا جائے وہ اسے اپنی تذلیل سمجھ کر ہر وقت انتقام کے موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور ظاہر ہے انتقام میں بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ کوئی شخص کسی کا ٹھٹھا اسی وقت اڑاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو اس سے بہتر اور اس کو اپنے سے حقیر اور کمتر سمجھتا ہے اور یہ سمجھنا تکبر ہے، جس پر شدید وعید آئی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانہ : ۹۱ ] ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا۔'' ایک آدمی نے کہا: ''آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے)؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔'' یہاں قوم کو قوم کا مذاق اڑانے سے منع فرمایا، کیونکہ عموماً کسی مجلس ہی میں کسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ورنہ اکیلے کا مذاق اڑانا بھی منع ہے۔

④ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ : مذاق اڑانے سے منع کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ جسے تم حقیر سمجھ کر ذلیل کر رہے ہو، ہوسکتا ہے وہ اللہ کے ہاں تم سے بہتر ہو، کیونکہ اچھا یا برا ہونے کا دارومدار ظاہری شکل وصورت پر نہیں، بلکہ دل کے تقویٰ پر ہے اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ پھر دار و مدار موجودہ حالت پر نہیں بلکہ خاتمے پر ہے، تمھیں کیا معلوم کہ اس کا خاتمہ تم سے اچھا ہو جسے تم حقیر سمجھ کر ذلیل کر رہے ہو۔

⑤ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ : قرآن مجید میں عموماً احکام کے لیے مردوں ہی کو مخاطب کیا گیا ہے، عورتوں کا ذکر تابع ہونے کی وجہ سے الگ نہیں کیا گیا۔ یہاں عورتوں کو الگ بھی خطاب فرمایا، اس سے ظاہر ہے کہ عورتوں کو اس گناہ سے روکنے کی خاص ضرورت ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس آیت میں مردوں کو مردوں سے اور عورتوں کو عورتوں سے ٹھٹھا کرنے سے منع فرمایا تو کیا مرد عورتوں سے یا عورتیں مردوں سے ٹھٹھا کرسکتی ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ مسلم

الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ ۚ وَ مَنۡ لَّمۡ یَتُبۡ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۱۱﴾

برے ناموں کے ساتھ پکارو، ایمان کے بعد فاسق ہونا برا نام ہے اور جس نے توبہ نہ کی تو وہی اصل ظالم ہیں ﴿۱۱﴾

معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے ملے جلے معاشرے کی گنجائش ہی نہیں، جس میں وہ ایک دوسرے کا بے تکلف مذاق اڑا سکیں۔ یہاں مردوں اور عورتوں کی مجلسیں الگ الگ ہوتی ہیں، اس لیے دونوں کو الگ الگ منع فرمایا۔

❻ مذاق خواہ زبان کے ساتھ اڑایا جائے یا کسی کے نقص کی طرف اشارہ کرکے یا نقل اتار کر، ہر طرح کا مذاق حرام ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: (( حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا، قَالَ غَيْرُ مُسَدَّدٍ تَعْنِيْ قَصِيْرَةً، فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْهُ قَالَتْ وَحَكَيْتُ لَهُ إِنْسَانًا فَقَالَ مَا أُحِبُّ أَنِّيْ حَكَيْتُ إِنْسَانًا وَ أَنَّ لِيْ كَذَا وَكَذَا )) [ أبوداؤد، الأدب، باب في الغيبة : ٤٨٧٥، وقال الألباني صحيح ] ''آپ کو صفیہ سے یہی کچھ کافی ہے کہ وہ ایسے ایسے ہے۔'' مسدد کے علاوہ دوسرے راوی نے وضاحت کی کہ مراد ان کے قد کا چھوٹا ہونا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر سمندر کے پانی میں ملا دی جائے تو سارے پانی کو خراب کر دے۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: ''اور میں نے آپ کے سامنے کسی انسان کی نقل اتاری ( تو اس کا کیا حکم ہے )؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں پسند نہیں کرتا کہ میں کسی انسان کی نقل اتاروں، خواہ مجھے یہ یہ کچھ مل جائے۔''

❼ **وَ لَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ** : "لَمَزَ يَلْمِزُ لَمْزًا" (ض،ن) کسی پر عیب لگانا، خفی کلام کے ساتھ آنکھ کا اشارہ کرنا، دھکا دینا، مارنا۔ مزید دیکھیے سورۂ ہمزہ کی آیت (۱): ﴿ **وَیۡلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ** ﴾ کی تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہنے کے بجائے کہ کسی پر عیب نہ لگاؤ، یہ فرمایا کہ اپنے آپ پر عیب نہ لگاؤ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ **لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ** ﴾ [ النساء: ۲۹ ] ''اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔'' اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تمام مسلمان "كَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ" (ایک جسم کی مانند) ہیں، عیب لگانے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب وہ کسی مسلم بھائی پر عیب لگا رہا ہے تو درحقیقت وہ اپنے آپ ہی پر عیب لگا رہا ہے، سو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یہ دوسروں پر عیب لگائے گا تو عیب سے خالی تو یہ بھی نہیں اور دوسروں کی آنکھیں بھی ہیں اور زبان بھی، پھر اس کے عیوب بھی ظاہر کیے جائیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اپنے آپ پر عیب مت لگاؤ۔'' اس آیت میں لوگوں کے سامنے کسی کے عیب ظاہر کرنے اور ان کا طعنہ دینے سے منع فرمایا، اگلی آیت میں کسی کی عدم موجودگی میں اس کے عیب ذکر کرنے یعنی غیبت سے بھی منع کیا۔ صرف ایک بات کی اجازت ہے اور وہ ہے نصیحت کہ اپنے بھائی کو الگ لے جا کر اسے اس کی غلطی بتا کر درست کرنے کی نصیحت کرے، جس طرح آئینہ غلطی بتاتا ہے مگر شور نہیں ڈالتا۔ لوگوں کے سامنے کسی مسلم کے منہ پر یا اس کی عدم موجودگی میں اس کے عیب کا اظہار کرنے کے بجائے اس پر پردہ ڈالنے کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَ مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا

سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ [ بخاري ، المظالم ، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه : ۲۴۴۲ ، عن ابن عمر ﷺ ]
''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یارو مددگار چھوڑتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کے کام میں ہو اللہ اس کے کام میں ہوتا ہے اور جو کسی مسلم سے کوئی تکلیف دور کرے اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف اس سے دور فرمائے گا اور جو کسی مسلم پر پردہ ڈالے، اللہ تعالیٰ اس پر پردہ ڈالے گا۔''

⑧ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ: ''اَلنَّبَزُ'' (نون اور باء کے فتحہ کے ساتھ) برے لقب کو کہتے ہیں، مثلاً لنگڑا، لولا، اندھا، کالا، ٹھگنا، کبڑا، گدھا، لومڑ یا کوئی بھی نام جس سے کسی کو تکلیف ہوتی ہو، مثلاً کسی سے کوئی گناہ ہوا ہو، تائب ہونے کے بعد عار دلانے کے لیے اسے چور یا زانی یا شرابی کہہ کر پکارنا۔ لقب ایسے نام کو کہتے ہیں جس سے کسی خوبی یا خامی کا اظہار ہوتا ہو، خواہ آدمی نے خود اپنے لیے رکھ لیا ہو یا کسی دوسرے نے رکھ دیا ہو۔ یہاں ''لَا تَنَابَزُوْا'' کے قرینے سے لقب سے مراد برا نام ہے، کیونکہ اچھے القاب سے پکارنا تو قابلِ تعریف ہے، جیسے ابوبکر صدیق، عمر فاروق، حمزہ اسد اللہ، خالد سیف اللہ، ابوعبیدہ امین الامت، حذیفہ صاحب سر رسول اللہ، عبداللہ بن مسعود صاحب المطہرۃ والوسادۃ والنعلین (ﷺ)۔ اس کے علاوہ عرب کا طریقہ اکرام کرتے ہوئے کنیت کے ساتھ پکارنے کا تھا، جسے اسلام نے برقرار رکھا۔ مومن کا حق یہ ہے کہ اسے اس نام سے پکارا جائے جو اسے اپنے لیے سب سے زیادہ پسند ہو، کیونکہ یہ محبت پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کا باعث ہے۔ ''وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ'' یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کا برا نام نہ رکھے جس سے وہ ناراض ہو، یا اس کی توہین و تذلیل ہوتی ہو اور نہ ایسے نام کے ساتھ اسے آواز دے کر پکارے۔ جاہلیت میں یہ بات عام تھی کہ ایک شخص نے دوسرے کا برا لقب رکھا تو اس نے اس کا رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا۔

ابوجبیرہ بن ضحاک ﷺ بیان کرتے ہیں: ''آیت: ﴿ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ﴾ ہم بنو سلمہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں آئے تو ہم میں سے ہر آدمی کے دو دو، تین تین نام تھے۔ نبی ﷺ کسی کو کوئی نام لے کر بلاتے تو لوگ کہتے: ''یا رسول اللہ! اسے اس نام سے نہ بلائیں، کیونکہ وہ اس سے ناراض ہوتا ہے۔'' تو اس پر یہ آیت: ﴿ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ﴾ اتری۔'' [ أبوداوٗد، الأدب، باب في الألقاب : ۴۹۶۲ ]

⑨ اس حکم سے وہ القاب مستثنیٰ ہیں جو کسی کی پہچان بن چکے ہوں، نہ اس نام والا اسے برا سمجھتا ہو اور نہ اس سے مقصود تحقیر یا تذلیل ہو، بلکہ مقصود صرف تعارف ہو، جیسے سلیمان الاعمش (چندھیائی ہوئی آنکھوں والا)، واصل الاحدب (کبڑا)، حمید الطویل (لمبا)، ابوہریرہ اور ذوالیدین وغیرہ۔

⑩ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ: اس سے معلوم ہوا کہ اوپر جن چیزوں سے روکا گیا ہے وہ سب فسوق ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو شخص ان کاموں کا ارتکاب کرے وہ مومن ہونے کے باوجود فاسق ہے اور یہ بہت بری بات ہے کہ آدمی کا نام فاسق رکھا جائے، اس کے بعد کہ اس کا نام مومن ہے۔ ''بَعْدَ الْاِيْمَانِ'' (ایمان کے بعد) اس لیے فرمایا کہ اگر تم ایمان کا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ؕ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا

**اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت سے گمان سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہیں اور نہ جاسوسی کرو اور نہ تم میں سے کوئی**

شرف حاصل نہ کر چکے ہوتے تو فاسق یا بدمعاش کہلانے میں عار کی کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن اب ایمان لے آنے کے بعد یہ نام تم پر آنا بہت بری بات ہے۔ تمھیں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اب تم وہ ہو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ﴾ [ الحجرات : ۷ ] ''اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا۔'' تو تمھیں ہر ایسے کام سے اجتناب کرنا چاہیے جس سے تم پر فسق کا نام آئے۔

⑪ وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: ''الف لام'' کمال کا ہے، یعنی اگرچہ جو بھی گناہ کرے ظالم ہے مگر توبہ سے اس ظلم کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اصل ظالم وہی ہیں جو گناہوں پر اصرار کرتے ہیں اور توبہ کیے بغیر فوت ہو جاتے ہیں۔

آیت 12 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا...... : پچھلی آیت میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات خراب کرنے والی ایسی چیزوں سے منع فرمایا تھا جو ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہوتی ہیں، یعنی مذاق اڑانا، عیب لگانا اور برے نام سے پکارنا، اب ان تین چیزوں سے منع فرمایا جو دوسرے بھائیوں سے تعلق رکھتی ہیں مگر انھیں ان کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ وہ ہیں بدگمانی، جاسوسی اور غیبت۔ یہ تینوں کام انتہائی کمینگی اور بزدلی کے کام ہیں، کیونکہ انھیں کرنے والے میں جرأت ہی نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کے سامنے آ سکے۔ یہ اس سورت کی پانچویں آیت ہے جس کا آغاز '' يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' سے ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ تینوں کام ایمان اور اس کے دعوے کے منافی ہیں، اس لیے ان سے بچ جاؤ۔

② اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ...... : پہلی بات یہ فرمائی کہ اس چیز سے بچو کہ کسی کے متعلق جو سنو یا دیکھو اس سے اس کے متعلق برا گمان ہی قائم کر لو، بلکہ جہاں تک ہو سکے مومن کے تمام اقوال و اعمال کے متعلق اچھا گمان رکھنے کی کوشش کرو، کیونکہ بعض گمان بالکل بے بنیاد اور گناہ ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ گمان سے بچو، کیونکہ اس کا نتیجہ ایسے گمانوں میں پڑ جانا ہے جو گناہ ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بعض گمانوں کو گناہ قرار دیا ہے، سب گمانوں کو نہیں، کیونکہ ظن کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ظن غالب ہے، جو کسی دلیل یا مضبوط علامت کے ساتھ قوی ہو جائے، اس پر عمل کرنا درست ہے۔ شریعت کے اکثر احکام اس پر مبنی ہیں اور دنیا کے تقریباً تمام کام اسی پر چلتے ہیں، مثلاً عدالتوں کے فیصلے، گواہوں کی گواہی، باہمی تجارت، ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے سے اطلاعات اور خبرِ واحد کے راویوں کی روایات۔ ان سب چیزوں میں غور و فکر، جانچ پڑتال اور پوری کوشش سے حاصل ہونے والا علم بھی ظن غالب ہے، مگر اس پر عمل واجب ہے۔ اسے ظن اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی مخالف جانب کا یعنی اس کے درست نہ ہونے کا نہایت ادنیٰ سا امکان رہتا ہے، مثلاً ہو سکتا ہے کہ گواہ کی گواہی درست نہ ہو، اطلاع دینے والا جھوٹ بول رہا ہو، یا راوی کو غلطی لگی ہو، مگر اس امکان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس امکان پر جائیں تو دنیا کا کوئی کام ہو ہی نہ سکے۔

وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ

**دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کا گوشت کھائے، جب کہ وہ مردہ ہو، سو تم**

اس لیے اپنی پوری کوشش کے بعد دلائل سے جو علم حاصل ہو اس پر بھی اگرچہ ظن کا لفظ بول لیا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ علم ہی ہے اور اس پر عمل واجب ہے۔

ظن کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی وجہ سے دل میں ایک خیال آ کر ٹھہر جاتا ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ دلیل نہ ہونے کی وجہ سے دل میں اس کے ہونے یا نہ ہونے کا امکان برابر ہوتا ہے، اسے شک بھی کہتے ہیں، یا اس کے ہونے کا امکان اس کے نہ ہونے کے امکان سے کم ہوتا ہے، یہ وہم کہلاتا ہے۔ ظن کی یہ صورتیں مذموم ہیں اور ان سے اجتناب واجب ہے۔ ''اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ'' (بے شک بعض گمان گناہ ہیں) سے یہی مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا﴾ [ یونس : ۳۶ ] (بے شک گمان حق کے مقابلے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا) اور اللہ کے فرمان: ﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ﴾ [ النجم : ۲۳ ] (یہ لوگ صرف اپنے گمان کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں) میں اسی ظن کا ذکر ہے اور اسی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ )) [ بخاري، الأدب، باب : ﴿ يأيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن...... ﴾ : ۶۰۶۶ ] ''گمان سے بچو! کیونکہ گمان سب سے جھوٹی بات ہے۔'' اسے سب سے جھوٹی بات اس لیے کہا گیا کہ جب کوئی شخص کسی کے متعلق بدگمانی کرتا ہے تو وہ دلیل کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ شخص ایسا ایسا ہے۔ چونکہ حقیقت میں وہ شخص ایسا نہیں ہوتا، اس لیے اس کے اس فیصلے کو جھوٹ کہا گیا ہے اور سب سے بڑا جھوٹ اس لیے کہ اس نے بغیر کسی قرینے یا سبب کے محض نفس یا شیطان کے کہنے پر اسے برا قرار دے لیا، جب کہ اس کے برے ہونے کی کوئی بنیاد ہی نہیں۔

③ آیت میں ایسے گمان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے جو بے دلیل ہو، مثلاً ایک آدمی جو ظاہر میں صالح ہے، اس کے عیوب پر اللہ کی طرف سے پردہ پڑا ہوا ہے، عام مشاہدہ میں وہ عفیف اور امانت دار ہے اور اس کے بددیانت یا گناہ گار ہونے کی کوئی دلیل یا علامت موجود نہیں، اس کے متعلق بدگمانی کرنا حرام ہے۔ ہاں، اگر گمان کرنے کی کوئی واقعی دلیل یا علامت موجود ہے تو اس وقت گمان منع نہیں۔ مثلاً ایک شخص کا اٹھنا بیٹھنا ہی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو چوری یا زنا کے ساتھ معروف ہیں، یا رات کو وہاں پھرتا ہے جہاں اس کا کوئی کام نہیں، اس کے متعلق گمان پیدا ہونا فطری بات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر گمان سے منع نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: ﴿اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''بہت سے گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں فرمایا: ''بَابُ مَا يَجُوْزُ مِنَ الظَّنِّ'' ''وہ گمان جو جائز ہیں۔'' اور اس باب میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَا أَظُنُّ فُلَانًا وَ فُلَانًا يَعْرِفَانِ مِنْ دِيْنِنَا شَيْئًا قَالَ اللَّيْثُ

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اسے ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے (۱۲)

يَكُونَا نِ يَعْرِفَانِ مِنْ دِيْنِنَا شَيْئًا ، قَالَ اللَّيْثُ كَانَا رَجُلَيْنِ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ ﴾ [ بخاري، الأدب، باب ما يجوز من الظن : ۶۰۶۷ ] ''میں فلاں اور فلاں کے متعلق گمان نہیں کرتا کہ وہ ہمارے دین میں سے کچھ بھی جانتے ہیں۔'' لیث نے فرمایا: ''یہ دونوں آدمی منافق تھے۔'' اس جائز گمان سے مراد وہ گمان ہے جس کی علامات یا دلیلیں واضح ہوں۔

❹ جس طرح دوسرے مسلمان کے حق میں بدگمانی کرنا منع ہے اسی طرح خود مسلمان کو بھی لازم ہے کہ ایسے ہر کام سے اجتناب کرے جس سے کسی کے دل میں اس کے متعلق برا گمان پیدا ہو۔ علی بن حسین بیان کرتے ہیں کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی بیوی صفیہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ نبی ﷺ مسجد میں تھے اور آپ ﷺ کی بیویاں بھی آپ کے پاس تھیں۔ وہ جانے لگیں تو آپ ﷺ نے صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''جلدی نہ کرنا، یہاں تک کہ میں تمھارے ساتھ جاؤں۔'' ان کا مکان اسامہ کی حویلی میں تھا۔ چنانچہ نبی ﷺ ان کے ساتھ نکلے تو آپ کو دو انصاری ملے، انھوں نے نبی ﷺ کو دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا: (( تَعَالَيَا إِنَّهَا صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ )) ''ادھر آؤ! یہ (میری بیوی) صفیہ بنت حیی ہے۔'' انھوں نے کہا: ''سبحان اللہ! یا رسول اللہ! (بھلا ہم آپ کے متعلق برا گمان کر سکتے ہیں)۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ، وَ إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ يُلْقِيَ فِيْ أَنْفُسِكُمَا شَيْئًا )) [ بخاري، الاعتكاف، باب زيارة المرأة زوجها في اعتكافه : ۲۰۳۸ ] ''شیطان انسان میں خون کے پھرنے کی طرح پھرتا ہے، تو میں ڈرا کہ وہ تمھارے دلوں میں کوئی بات ڈال دے۔''

❺ **وَلَا تَجَسَّسُوْا**: "جَسَّ يَجُسُّ جَسًّا" (ن) کسی چیز کو معلوم کرنے کے لیے ہاتھ سے ٹٹولنا، تجسس، جاسوسی کرنا، خفیہ باتیں معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔ جاسوسی برے گمان کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ آدمی جب کسی کے متعلق دل میں برا گمان قائم کر لیتا ہے تو اسے ثابت کرنے کے لیے اس کی جاسوسی کرتا ہے اور اس کے ان عیوب کی ٹوہ لگاتا رہتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال رکھا ہے، تاکہ یہ اپنے گمان کو سچا ثابت کر سکے۔ یہ ایمانی مودّت و اخوت کے سراسر خلاف ہے۔ جب مسلمان بھائی کے ان عیوب پر بھی پردہ ڈالنے کا حکم ہے جو آدمی کو معلوم ہوں تو ان عیوب کی ٹوہ لگانا کیسے جائز ہو سکتا ہے جو محض اس کے گمان کی پیداوار ہیں، یا جن پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ، وَلَا تَحَسَّسُوْا، وَلَا تَجَسَّسُوْا، وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا )) [ بخاري، الفرائض، باب تعليم الفرائض : ۶۷۲۴، ۶۰۶۶ ] ''گمان سے بچو! کیونکہ گمان سب سے جھوٹی بات ہے اور نہ ٹوہ لگاؤ، نہ جاسوسی کرو، نہ دھوکے سے (خرید و فروخت میں) بولی بڑھاؤ، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے دل میں کینہ رکھو، نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔'' ابو برزہ

اسلمی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ قَلْبَهُ ! لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَإِنَّهُ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِهِمْ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ، وَ مَنْ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ فِيْ بَيْتِهِ )) [ أبوداؤد، الأدب، باب في الغيبة : ۴۸۸۰، قال الألباني حسن صحيح ] ''اے ان لوگوں کی جماعت جو اپنی زبان کے ساتھ ایمان لائے ہیں اور ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا! مسلمانوں کی غیبت مت کرو اور نہ ہی ان کے چھپے ہوئے عیبوں کا پیچھا کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیبوں کا پیچھا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں کا پیچھا کرے گا اور جس کے عیبوں کا پیچھا اللہ تعالیٰ کرے وہ اسے اس کے گھر میں رسوا کر دے گا۔''

بعض اوقات آدمی اصلاح کی نیت سے جاسوسی کرتا ہے، مگر یہ اصلاح کا طریقہ نہیں، اس سے باہمی عداوت پیدا ہوتی ہے اور خرابی بڑھتی ہے، اصلاح نہیں ہوتی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: (( إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَهُمْ أَوْكِدْتَ أَنْ تُفْسِدَهُمْ )) ''یقیناً جب تو لوگوں کے عیبوں کا پیچھا کرے گا تو انھیں خراب کر دے گا'' یا فرمایا: ''قریب ہے تو انھیں خراب کر دے۔'' ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ ایسی بات تھی جو معاویہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کے ساتھ نفع دیا ( کہ انھوں نے بیس سال شام کی امارت کی اور بیس سال پورے عالمِ اسلام پر خلافت کی اور رعایا کو ان سے کوئی خاص شکایت پیدا نہیں ہوئی )۔'' [ أبوداؤد، الأدب، باب في النهي عن التجسس : ۴۸۸۸، و قال الألباني صحيح ]

❻ جس طرح کوئی دلیل یا قرینہ موجود ہو تو بدگمانی کی گنجائش ہے اسی طرح اسلام کے دشمنوں کی جاسوسی یا امن و امان کی خرابی کا باعث بننے والوں کی جاسوسی بھی جائز ہے، بلکہ مسلم حکمران پر لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا کے حالات سے واقف رہے اور اللہ کی حدود کو پامال کرنے والوں کا سدِباب کرتا رہے، مگر اس کے لیے کسی طرح جائز نہیں کہ محض گمان کی بنا پر تجسس یا کوئی کارروائی کرے۔

❼ **وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا:** ''لَا يَغْتَبْ'' (غ، ی، ب ) سے باب افتعال ہے: ''اِغْتَابَ يَغْتَابُ اِغْتِيَابًا'' کسی کے غائب ہونے کی حالت میں اس کی وہ بات کرنا جس کا ذکر اسے ناپسند ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ ؟ )) ''کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ )) ''تمھارا اپنے بھائی کا ذکر ایسی چیز کے ساتھ کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔'' عرض کیا گیا: ''آپ یہ بتائیں کہ اگر میرے بھائی میں وہ چیز موجود ہو جو میں کہہ رہا ہوں ( تو کیا پھر بھی غیبت ہے )؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ وَ إِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهُ )) [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم الغيبة : ۲۵۸۹ ] ''اگر اس میں وہ چیز موجود ہے جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ چیز اس میں موجود نہیں تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔''

❽ **اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ:** اس جملے میں غیبت سے کئی طریقوں سے شدید نفرت دلائی گئی

ہے۔ چنانچہ اس میں غیبت کے ساتھ کسی بھائی کی عزت وآبرو تار تار کرنے کو انسان کا گوشت کھانا قرار دیا، پھر کسی دوسرے انسان کا نہیں بلکہ اپنے بھائی کا اور وہ بھی زندہ کا نہیں بلکہ مردہ بھائی کا۔ پھر ایسی شدید قابلِ نفرت چیز سے محبت کرنے کی عار دلاتے ہوئے پوچھا کہ اتنی گندی اور مکروہ چیز سے تو شدید نفرت ہونی چاہیے تھی، تو کیا تم نفرت کے بجائے اس سے محبت کرتے ہو۔ پھر "اَحَدُكُمْ" فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی ایک یہ پسند کرتا ہے؟ مطلب یہ کہ لاکھوں کروڑوں میں سے کوئی ایک بھی یہ پسند نہیں کرے گا تو تم میں سے کوئی ایک یہ کام کیوں کرے!؟

⑨ فَكَرِهْتُمُوْهُ: یعنی اگر تمھارے سامنے یہ چیز پیش کی جائے تو یقیناً تم اس سے نفرت کرو گے۔

⑩ غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی ہے کہ جس طرح مردہ اپنا گوشت کھانے سے کسی کو ہٹا نہیں سکتا اسی طرح جس کی غیبت کی جارہی ہے وہ پاس موجود نہ ہونے کی وجہ سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔

⑪ جس طرح غیبت کرنا حرام ہے اسے سننا بھی حرام ہے، کیونکہ سننے والا بھی غیبت میں برابر کا شریک ہے، اگر وہ خاموش رہ کر تائید نہ کرے تو غیبت کرنے والے کو اس کام کی جرأت ہو ہی نہیں سکتی۔ دونوں ہی اپنے مردہ بھائی کے گوشت سے لذت حاصل کر رہے ہیں، ایک غیبت کر کے اور دوسرا اسے سن کر۔ اس لیے غیبت سننے سے بھی بہت پرہیز کرنا چاہیے، بلکہ اپنے مسلم بھائی کی عزت کا دفاع کرتے ہوئے غیبت کرنے والے کو اس سے منع کرنا چاہیے۔

⑫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ: یعنی اللہ کا ڈر ہی ہے جو ان کاموں سے آدمی کو باز رکھ سکتا ہے جن سے ان آیات میں منع فرمایا گیا ہے، وہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اللہ سے ڈرو اور ان تمام گناہوں سے توبہ کرو، یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔

⑬ نووی نے ''الاذکار'' میں غیبت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''خواہ وہ چیز اس کے بدن سے تعلق رکھتی ہو یا دین سے یا دنیا سے، اس کی شکل وصورت کے بارے میں ہو یا اخلاق کے، اس کے مال، اولاد، والدین اور بیوی بچوں کے متعلق ہو یا اس کے لباس، چال ڈھال، بول چال، خندہ پیشانی یا ترش روئی کے متعلق، غرض اس سے تعلق رکھنے والی کسی بھی چیز کا ذکر جو اسے ناپسند ہو غیبت ہے۔ پھر خواہ یہ ذکر زبان سے کیا جائے یا تحریر سے، اشارے سے ہو یا کنائے سے، تمام صورتوں میں غیبت ہے۔ اشارہ خواہ آنکھ سے ہو یا ہاتھ سے، سر کے ساتھ ہو یا جسم کے کسی حصے کے ساتھ، غیبت میں شامل ہے۔''

بدن کی غیبت مثلاً اس کی تنقیص کے لیے اندھا، لنگڑا، کانا، گنجا، مُھگنا، لمبوترا، کالا، کبڑا یا اس قسم کا کوئی اور لفظ استعمال کرے۔ دین کے بارے میں غیبت یہ ہے کہ اسے فاسق، چور، خائن، ظالم، نماز میں سست، پلید، ماں باپ کا نافرمان یا بدمعاش وغیرہ کہے۔ دنیا کے بارے میں مثلاً اسے نکما، باتونی، پیٹو وغیرہ کہے۔ اخلاق کے متعلق مثلاً اسے بدخلق، متکبر، ریا کار، جلد باز، بزدل یا سڑیل قرار دے۔ اس کے والد کے متعلق مثلاً جولاہا، موچی، کالا، حبشی وغیرہ کہہ کر اس کی تنقیص کرے۔ پھر زبان، ہاتھ اور جسم کے ساتھ غیبت کی ایک صورت اس کی نقل اتارنا ہے، مثلاً اس کے اٹک اٹک کر بات کرنے یا ناک میں

بولنے کی، لنگڑا کر چلنے کی، کبڑا ہونے کی یا چھوٹے قد کا ہونے کی نقل اتارے۔ غرض قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی حرکت جس کا مقصد کسی مسلم بھائی کی تنقیص ہو غیبت ہے اور حرام ہے۔

⑭ بعض اوقات کسی مسلم بھائی کی غیبت جائز بھی ہو جاتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اس کا عیب بیان کیا جا سکتا ہے۔ قاعدہ اس کا یہ ہے کہ جب دین کا کوئی ضروری مقصد اس کے بغیر حاصل نہ ہوسکتا ہو تو اس وقت یہ جائز ہے۔ نووی نے اور ان سے پہلے غزالی نے غیبت کے جواز کے چھ مواقع گنوائے ہیں: ① ظلم پر فریاد، یعنی مظلوم کو حق ہے کہ ظالم کے خلاف بات کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ [ النساء : ۱۴۸ ] ''اللہ بری بات کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا جائے۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا )) [ بخاري، الاستقراض، باب استقراض الإبل : ۲۳۹۰ ] ''یقیناً حق والے کو بات کرنے کی گنجائش ہے۔'' بہتر یہ ہے کہ وہ بادشاہ یا قاضی یا کسی ایسے شخص کے پاس اپنی مظلومیت کا تذکرہ کرے جو اس کی مدد کر سکتا ہو۔ ② کسی گناہ یا برے کام سے روکنے کے لیے ایسے لوگوں کو اطلاع دینا جو اس کے ساتھ مل کر یا خود اسے روک سکیں۔ اگر مقصد صرف اس کام کرنے والے کی تذلیل ہو تو یہ جائز نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آیات و احادیث اس کی دلیل ہیں۔ ③ فتویٰ لینے کے لیے مفتی کے سامنے کسی کا نقص ذکر کرے تو یہ جائز ہے، مثلاً ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے خاوند ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا: ''ابوسفیان بخیل آدمی ہے ( مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے اور میرے بچوں کے لیے کافی ہو ) تو کیا مجھ پر کوئی گناہ تو نہیں اگر میں اس کے علم کے بغیر اس کے مال میں سے کچھ لے لوں؟'' آپ نے فرمایا: (( خُذِيْ أَنْتِ وَ بَنُوْكِ مَا يَكْفِيْكِ بِالْمَعْرُوْفِ )) [ بخاري، البيوع، باب من أجرى أمر الأمصار...... : ۲۲۱۱، ۵۳۶۴ ] ''تمھارے اور تمھارے بچوں کے لیے جتنا کافی ہو معروف طریقے کے ساتھ لے لیا کرو۔'' رسول اللہ ﷺ نے ہند رضی اللہ عنہا کو اپنے خاوند کا عیب بیان کرنے پر منع نہیں فرمایا، کیونکہ اس کا مقصد مسئلہ پوچھنا تھا۔

④ مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے اور انھیں شر سے بچانے کے لیے کسی کی برائی سے آگاہ کرے تو یہ جائز ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، آپ نے فرمایا: (( اِئْذَنُوْا لَهُ، بِئْسَ أَخُو الْعَشِيْرَةِ )) [ بخاري، الأدب، باب ما يجوز من اغتياب ...... : ۶۰۵۴ ] ''اسے اجازت دے دو، یہ خاندان کا برا آدمی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس شخص کی برائی سے آگاہ کرنا ضروری خیال کیا۔ مسلمانوں کی خیر خواہی میں اور انھیں شر سے بچانے میں بہت سی چیزیں آ جاتی ہیں، مثلاً حدیث کے راویوں پر اور مقدمے کے گواہوں پر جرح جائز بلکہ واجب ہے اور اس پر امت کا اتفاق ہے۔ دوسرے جب کوئی شخص کسی کے ساتھ رشتہ کرنے یا امانت رکھنے یا مشارکت کرنے یا ہمسائیگی اختیار کرنے، کاروبار یا کوئی اور معاملہ کرنے کے متعلق مشورہ پوچھے تو صحیح صحیح بات بتا دے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے معاویہ اور ابوجہم رضی اللہ عنہما میں سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( أَمَّا أَبُوْ جَهْمٍ فَلَا يَضَعُ عَصَاهُ عَنْ عَاتِقِهِ،

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ

اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے،

وَأَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُعْلُوكٌ لَا مَالَ لَهُ، اِنْكِحِي أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ ﴾ [ مسلم، الطلاق، المطلقة البائن لا نفقة لها : ۱۴۸۰ ] ''ابوجہم تو عورتوں کو بہت مارتا ہے اور معاویہ کنگال آدمی ہے، اس کے پاس کچھ نہیں ہے، تم اسامہ بن زید سے نکاح کر لو۔'' اور صحیح مشورہ دینا مومن کا حق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ وَ إِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْ لَهُ ﴾ [ مسلم، السلام، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام : ۵/۲۱۶۲ ] ''اور جب وہ تم سے مشورہ مانگے تو اس کی خیر خواہی کر۔''

⑤ جو شخص کھلم کھلا اللہ کی نافرمانی کرتا ہو، لوگوں کو لوٹتا ہو، علانیہ شراب پیتا ہو تو اس کے ان گناہوں کا ذکر جائز ہے جن کو چھپانے کی وہ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور جن کا ذکر کیا جائے تو اسے برا محسوس ہی نہیں ہوتا، کیونکہ غیبت ان چیزوں کا ذکر ہے جسے وہ ناپسند کرے۔ ⑥ کوئی شخص کسی لقب کے ساتھ مشہور ہو، اس کے بغیر اس کی پہچان نہ ہوتی ہو اور وہ اسے برا بھی نہ جانتا ہو تو اسے اس لقب سے ذکر کرنا جائز ہے، خواہ اس میں اس کا کوئی نقص ہی بیان ہو رہا ہو، مثلاً اعمش (جس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہوں)، اعرج (لنگڑا)، اصم (بہرا) اور اعمیٰ (نابینا) وغیرہ۔ شرط یہ ہے کہ مقصد اس کی تنقیص نہ ہو۔

⑮ قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ کہ مسلمان ایک دوسرے کی غیبت نہ کریں۔ اسی طرح ''ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ'' سے بھی ظاہر ہے کہ صرف مسلمان کی غیبت ناجائز ہے، کیونکہ کافر ہمارا دینی بھائی نہیں، اس لیے اس کی غیبت میں کوئی گناہ نہیں۔

**آیت 13** ① **يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى :** پچھلی آیات میں جن چھ گناہوں سے منع فرمایا ان کا بنیادی سبب اپنے آپ کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھنا ہے۔ جاہلیت میں اپنے قبیلے کی خوبیوں پر فخر اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کی بیماری عام تھی۔ اس کی وجہ سے ہر قبیلے کے شاعر اور خطیب اپنے قبیلے کی برتری ثابت کرنے کے لیے دوسرے قبیلے کو استہزا، تمسخر اور طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے، اس کے لیے وہ ان کے عیب تلاش کرتے، جاسوسی کرتے، غیبت، بہتان اور ہجو کا بازار گرم رکھتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے کئی قبیلوں کو بالکل ہی لوگوں کی نگاہوں سے گرا دیا۔ دنیا میں اپنی برتری پر فخر کا باعث کسی خاص قبیلے یا قوم میں پیدا ہونا ہی نہیں رہا، اس کے علاوہ بھی کئی چیزوں کو اپنے لیے باعثِ فخر اور دوسروں پر برتری کی دلیل قرار دیا گیا۔ چنانچہ رنگ، نسل، وطن اور زبان کی بنا پر نوعِ انسان تقسیم ہوئی اور ہر طبقے نے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور دوسروں کو حقیر قرار دیا، جس کے نتیجے میں بے شمار جنگیں ہوئیں اور لاکھوں کروڑوں لوگ ہلاک یا زخمی ہوئے۔ وطن سے بے وطن ہوئے، غربت، بیماری اور بے آبروئی کا نشانہ بنے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پانچ آیات میں ''**يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا**'' کے ساتھ خطاب کے بعد یہاں تمام انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ''**يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ**'' کہ اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک

اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ ﴿۱۳﴾

بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۳﴾

عورت ( آدم و حوا علیہما السلام ) سے پیدا کیا ہے، اس لیے انسان ہونے میں تم سب برابر ہو۔ کسی خاص قوم، قبیلے یا ملک میں پیدا ہونے کی وجہ سے، یا کسی رنگ یا زبان کی وجہ سے کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں، کیونکہ اصل سب کی ایک ہے۔ پھر کسی قوم، ملک یا قبیلے میں پیدا ہونے یا کسی رنگ یا زبان والا ہونے میں کسی کا اپنا کوئی دخل یا اختیار نہیں، یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس لیے ان میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی نعمت یا عطیہ تو ہو سکتی ہے، جس پر اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، مگر دوسروں پر برتری کا باعث نہیں ہو سکتی، کیونکہ برتری اس چیز میں کامیابی کی بدولت حاصل ہوتی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دے کر دنیا میں بھیجا ہے اور وہ ہے اللہ کا تقویٰ۔ اس لیے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔ اس کے بغیر کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر یا آزاد کو غلام پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ ہاں، تقویٰ کے ساتھ فضیلت کی کوئی اور وجہ بھی جمع ہو جائے تو اسے برتری حاصل ہوگی، جیسے کسی کو متقی ہونے کے ساتھ قریشی یا ہاشمی ہونے کا شرف بھی حاصل ہو، یا ایسی قوم کا فرد ہونے کا جو شجاعت یا ذہانت یا کسی اور خوبی میں معروف ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دو آدمی قرآن کی قراءت میں برابر ہوں تو امامت کے وقت ان میں سے بڑی عمر والے کو جوان پر مقدم کیا جائے گا۔

② وَ جَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ: "شُعُوْبًا" "شَعْبٌ" (شین کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے، بہت بڑا قبیلہ، جیسے ربیعہ، مضر، اوس اور خزرج وغیرہ۔ یہ ان چھ طبقوں میں سب سے پہلا طبقہ ہے جن میں عرب تقسیم ہوتے ہیں۔ وہ چھ طبقے یہ ہیں: ① شعب ② قبیلہ ③ عمارہ ④ بطن ⑤ فخذ ⑥ فصیلہ۔ شعب میں کئی قبائل ہوتے ہیں، قبیلہ میں کئی عمائر، عمارہ میں کئی بطون، بطن میں کئی افخاذ، اور فخذ میں کئی فصائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ عرب میں خزیمہ شعب، کنانہ قبیلہ، قریش عمارہ، قصی بطن، ہاشم فخذ اور عباس فصیلہ ہیں۔ بعض اوقات ان میں سے ایک لفظ دوسرے کی جگہ بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ شعب کا معنی شاخ ہے، اسے شعب اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان سے قبائل کی شاخیں نکلتی ہیں۔ قرآن مجید میں ان چھ طبقوں میں سے تین کا ذکر آیا ہے، دو کا اس آیت میں اور ایک کا سورۂ معارج میں، فرمایا: ﴿وَ فَصِيۡلَتِهِ الَّتِيۡ تُـْٔوِيۡهِ﴾ [ المعارج : ۱۳ ] "اور اپنے خاندان کو جو اسے جگہ دیا کرتا تھا۔" ( قرطبی و شنقیطی )

③ لِتَعَارَفُوۡا: یعنی قوموں، قبیلوں یا خاندانوں میں تقسیم کا مطلب کسی کی برتری نہیں، بلکہ ہم نے یہ تقسیم تمھاری ایک دوسرے سے پہچان کے لیے بنائی ہے۔ مثلاً عبداللہ نام کے کئی آدمی ہیں، ان میں سے ایک کی تعیین قریشی، اس کے بعد ہاشمی اور اس کے بعد عباسی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس پہچان ہی کے ذریعے سے آدمی اپنی رشتہ داری سے آگاہ ہوتا ہے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتا اور صلہ رحمی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( تَعَلَّمُوْا مِنْ أَنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُوْنَ بِهِ أَرْحَامَكُمْ، فَإِنَّ

صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِي الْأَهْلِ، مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ، مَنْسَأَةٌ فِي الْأَثَرِ ﴾ [ ترمذي، البر والصلة، باب ما جاء في تعليم النسب : ۱۹۷۹، عن أبي هريرة رضي الله عنه، وقال الألباني صحيح ] ”اپنے نسب سیکھو، جن کے ذریعے سے تم اپنی رشتہ داریاں ملاؤ، کیونکہ رشتہ داری کو ملانا رشتہ داروں میں محبت، مال میں ثروت اور زندگی میں اضافے کا باعث ہے۔“

④ **اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ** : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ، مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَ فَاجِرٌ شَقِيٌّ، أَنْتُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ لَيَدَعَنَّ رِجَالٌ فَخْرَهُمْ بِأَقْوَامٍ إِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِنْ فَحْمِ جَهَنَّمَ، أَوْ لَيَكُوْنُنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجِعْلَانِ الَّتِيْ تَدْفَعُ بِأَنْفِهَا النَّتْنَ ﴾ [ أبو داوٗد، الأدب، باب في التفاخر بالأحساب : ٥١١٦، عن أبي هريرة رضي الله عنه و قال الألباني صحيح ] ”اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور اس کے آبا و اجداد پر فخر کو ختم کر دیا ہے۔ (آدمی دو ہی قسم کے ہیں) متقی مومن ہے یا بدبخت فاجر۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ کچھ آدمی ایسے لوگوں پر اپنا فخر ترک کر دیں گے جو جہنم کے کوئلوں میں سے محض ایک کوئلہ ہیں، یا پھر وہ (فخر کرنے والے) اللہ تعالیٰ کے سامنے پاخانے کے کیڑوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے، جو گندگی کو اپنی ناک کے ساتھ دھکیلتے رہتے ہیں۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ﴿ أَيُّ النَّاسِ أَكْرَمُ؟ ﴾ ”لوگوں میں سب سے عزت والا کون ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ أَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاهُمْ ﴾ ”ان میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“ انھوں نے کہا: ”ہم آپ سے اس کے متعلق نہیں پوچھ رہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ فَأَكْرَمُ النَّاسِ يُوْسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ”تو سب سے زیادہ عزت والے یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ کے نبی ہیں، نبی کے بیٹے ہیں، دادا بھی نبی ہے اور پردادا اللہ کا خلیل ہے۔“ انھوں نے کہا: ”ہم آپ سے اس کے متعلق بھی نہیں پوچھ رہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْأَلُوْنِّيْ؟ ﴾ ”تو پھر تم مجھ سے عرب کے خاندانوں کے متعلق پوچھ رہے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”جی ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ فَخِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا ﴾ [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ لقد كان في يوسف و إخوته...... ﴾ : ٤٦٨٩ ] ”تو جاہلیت میں جو تم میں سب سے بہتر تھے وہی اسلام میں تم سب سے بہتر ہیں، جب وہ (دین کی) سمجھ حاصل کر لیں۔“ ابو نضرہ کہتے ہیں کہ مجھے اس صحابی نے بیان کیا جس نے ایام تشریق کے درمیان والے دن میں رسول اللہ ﷺ کا خطبہ سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَ إِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوٰى ﴾ [ مسند أحمد : ٤١١/٥، ح : ٢٣٤٨٩، قال شعيب الأرنؤوط إسناده صحيح ] ”اے لوگو! سن لو! تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ سن لو! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی سرخ کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی سرخ پر، مگر تقویٰ کی بنا پر۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَ أَمْوَالِكُمْ

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ

بدویوں نے کہا ہم ایمان لے آئے، کہہ دے تم ایمان نہیں لائے اور لیکن یہ کہو کہ ہم مطیع ہو گئے اور ابھی تک ایمان

وَ لٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ» [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم ...: ٢٥٦٤/٣٤ ] ”اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے عملوں کو دیکھتا ہے۔“ عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ نے ایک لمبی حدیث میں بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَ إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ وَلَا يَبْغِيْ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ» [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب الصفات التي يعرف بها ...: ٢٨٦٥/٦٤ ] ”اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ آپس میں تواضع اختیار کرو، حتیٰ کہ نہ کوئی کسی پر فخر کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔“

5 اہل علم نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نکاح میں کفو (جوڑ) ہونے کے لیے اسلام کے علاوہ کوئی شرط معتبر نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ اس لیے یہ جو مشہور ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید سے نہیں ہو سکتا، درست نہیں۔ ویسے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کو لفظ ”سید“ کے ساتھ خاص کرنا بھی محض رواج ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ہونے کے باوجود ابولہب جہنمی ہے اور غلام ہونے کے باوجود بلال رضی اللہ عنہ کے جوتوں کی آواز جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے (بطور خادم) سنائی دے رہی ہے اور جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: «أَبُوْ بَكْرٍ سَيِّدُنَا، وَأَعْتَقَ سَيِّدَنَا يَعْنِيْ بِلَالًا» [ بخاري، فضائل أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب بلال بن رباح ...: ٣٧٥٤ ] ”ابوبکر ہمارا سید ہے اور اس نے ہمارے سید بلال کو آزاد کیا۔“

6 اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں تقویٰ زیادہ ہے، جس کی وجہ سے اسے سب سے زیادہ معزز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ تو جب کسی کو دلوں کا حال معلوم ہی نہیں تو کوئی کسی پر فخر کیسے کر سکتا ہے اور کسی کو حقیر کیوں جانتا ہے!؟

**آیت 14** 1 قَالَتِ الْاَعْرَابُ : ”اَلْاَعْرَابُ“ کی تشریح کے لیے دیکھیں سورۂ توبہ (۹۷) کی تفسیر۔ یہاں ”اَلْاَعْرَابُ“ پر الف لام جنس کا نہیں بلکہ عہد کا ہے اور اس سے مراد تمام اعراب نہیں، کیونکہ ان میں کئی مخلص مومن بھی تھے۔ (دیکھیے توبہ: ۹۹) بلکہ مراد وہ بعض اعراب ہیں جو مدینہ کے گرد رہتے تھے اور اسلام کی قوت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے، دل میں تکذیب بھی نہیں تھی کہ انھیں منافق کہا جا سکے، مگر ابھی تک کچھ تردد باقی تھا اور ایمان و یقین پوری طرح دل میں داخل نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ عمرۂ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے۔ ان کا ذکر اس سے پہلے سورۂ فتح کی آیت (۱۱): ﴿ سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ ﴾ میں بھی گزرا ہے۔

2 اٰمَنَّا : سورت کی ابتدا میں ان اعراب کا ذکر ہے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب

قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

**تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو گے تو وہ تمھیں تمھارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴﴾**

---

اور اسلام کے دوسرے احکام سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان آداب و احکام کی تلقین فرمائی اور جاہلیت کے فخر و غرور اور اس سے پیدا ہونے والی قباحتوں سے منع فرمایا۔ اس سلسلے میں واضح فرمایا کہ آدمی کو دوسروں پر فخر کا حق ہی نہیں، کیونکہ وہ عزت جو دوسروں پر برتری دلاتی ہے وہ صرف تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے، جس کا تعلق دل سے ہے اور دل کا حال صرف علیم و خبیر جانتا ہے۔ یہاں سے ان اعراب کے کچھ دعوے ذکر فرما کر، جن سے ان کے فخر کا اظہار ہوتا تھا، ان کی تردید فرمائی۔ سب سے پہلے ان کے اس دعوے کا ذکر فرما کر کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، اس کی نفی فرمائی۔

③ **قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا** : اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ واضح رہے کہ قرآن و حدیث میں عام طور پر ایمان اور اسلام ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، جس میں دل کا یقین اور ظاہری فرماں برداری دونوں شامل ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو عبد القیس کو ایمان کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ ایمان کلمۂ شہادت، نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور غنیمت میں سے خمس ادا کرنے کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ نے "**اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ**" کہہ کر اپنی جناب میں معتبر دین اسلام کو قرار دیا اور ظاہر ہے وہاں وہی دین معتبر ہے جو دل کے یقین سے ہو، صرف ظاہری اعمال تو وہاں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض اوقات اسلام سے مراد ظاہری احکام کی پابندی اور ایمان سے مراد قلبی یقین ہوتا ہے، جیسا کہ حدیثِ جبریل میں ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ ایمان سے مراد دلی یقین اور اسلام سے مراد ظاہری اعمال ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات اسلام سے مراد دل سے مان لینا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿**فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ**﴾ [الأنعام: ١٢٥] "تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔" جس طرح بعض اوقات ایمان سے مراد صرف زبانی کلمہ پڑھنا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿**يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ**﴾ [النساء: ١٣٦] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! (یعنی جنھوں نے ایمان کا اقرار کیا ہے) ایمان لے آؤ (یعنی دل سے مان لو)۔" یہاں فرمایا، ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔ یعنی ہم کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے ہیں اور اس کے ظاہری احکام پر عمل شروع کر دیا ہے۔

یہاں الفاظ پر غور فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ " قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ أَسْلَمْتُمْ " "ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ تم مسلم ہو گئے ہو۔" بلکہ فرمایا: ﴿**لَمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا**﴾ "تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے مومن ہونے کی نفی کے بعد ان کے مسلم ہونے کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾

مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انھوں نے شک نہیں کیا اور انھوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں ﴿۱۵﴾

کہ تم مسلم ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلم وہی تسلیم ہو سکتا ہے جو مومن بھی ہو۔ اس کے ہاں اگر کسی کے دل میں یقین نہیں تو ظاہری اعمال کا بھی کچھ اعتبار نہیں۔ ہاں، ظاہری طور پر اسلامی احکام کی پابندی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کا دعویٰ کرنے کی اجازت ہے۔

④ وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ : ''اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا'' اس جملے سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ اگرچہ پکے مومن نہیں تھے مگر منافق بھی نہیں تھے، کیونکہ وہ دل سے رسول اللہ ﷺ کو جھوٹا نہیں جانتے تھے۔ ان کے شک کی وجہ سے ان کے ایمان کی نفی کی گئی اور اگلی آیت میں مومن ان لوگوں کو قرار دیا جو ایمان لائے پھر انھوں نے شک نہیں کیا۔ ''لَمَّا'' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ اگرچہ وہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، مگر آئندہ ان کے دلوں کے اندر ایمان داخل ہونے کی امید تھی۔

⑤ وَ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ ......: '' لَا يَلِتْ '' اصل میں '' لَا يَلِيْتُ '' تھا، ''اِنْ تُطِيْعُوْا'' شرط کا جواب ہونے کی وجہ سے تاء پر جزم آ گئی، تو یاء اور تاء دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے یاء گر گئی۔ ''لَاتَ يَلِيْتُ'' کسی کے حق میں کمی کرنا۔ یعنی اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے ان دونوں کی اطاعت کی شرط اول ان پر سچے دل سے ایمان و یقین رکھنا ہے۔ اس میں انھیں اخلاص و یقین کی ترغیب دلائی ہے، یعنی اسلام کے احکام پر ثواب کی امید بھی اس وقت ہو سکتی ہے جب ظاہر و باطن سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد اعمال کا پورا ثواب دینا اور اس میں کمی نہ کرنا صرف اللہ کا کام ہے، رسول کا نہیں۔ اس لیے ''لَا يَلِتْ'' واحد کا صیغہ استعمال فرمایا۔

⑥ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : یعنی اطاعت کے بعد پہلی کوتاہیوں کو اللہ معاف کر دے گا، کیونکہ وہ گناہوں پر بے حد پردہ ڈالنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔

آیت 15 اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ......: ''لَمْ يَرْتَابُوْا'' ''رَيْبٌ'' سے باب افتعال ہے۔ اعراب (بدویوں) کے ایمان کے دعوے کی نفی کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایمان کی ایک باطنی اور ایک ظاہری شرط بیان فرمائی۔ چنانچہ فرمایا مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، پھر شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنے ایمان و یقین کا ثبوت مال و جان کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے ساتھ دیا۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔ رہے وہ لوگ

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

کہہ دے کیا تم اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو، حالانکہ اللہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۶﴾ وہ تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے، کہہ دے مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کے لیے ہدایت دی، اگر تم سچے ہو ﴿۱۷﴾

جو دعویٰ ایمان کا کرتے ہیں مگر جب جہاد کا موقع آتا ہے تو اس سے جان بچاتے ہیں، وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

**آیت 16** قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ...... : "تُعَلِّمُوْنَ" "عَلَّمَ يُعَلِّمُ تَعْلِيْمًا" (تفعیل) کا معنی سکھانا پڑھانا ہے۔ تعلیم کسی کو کوئی بات بتانے کا سب سے مضبوط اور پختہ طریقہ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ بار بار اپنے ایمان کا اور دین دار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، ان کے بار بار دعوے کو اللہ تعالیٰ نے سکھانا پڑھانا قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو سکھانے چلے ہو کہ تم پکے مومن اور دین دار ہو اور یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ اسے تمھارے دل کا حال معلوم نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو آسمانوں کی ہر چیز کو اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اس آیت میں قابلِ توجہ بات لفظ "اللّٰهَ" کا بار بار ذکر ہے: ﴿اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ اپنا نام بار بار ذکر کرنے سے مقصود اپنی ہیبت اور عظمت کا احساس دلانا ہے کہ سوچو تم بار بار ایمان کا دعویٰ کر کے کسی عام ہستی کو نہیں بلکہ کائنات کے خالق و مالک کو سکھانے جا رہے ہو، جس کا نام "اللہ" ہے اور جس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

**آیت 17** ❶ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا: اعراب یہ کہتے ہوئے کہ "اٰمَنَّا" (ہم ایمان لے آئے) دراصل رسول اللہ ﷺ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان جتلا رہے تھے۔ ان کے خیال میں یہ ان کا رسول اللہ ﷺ پر احسان تھا جس کا آپ ﷺ کو خیال رکھنا چاہیے تھا اور اس کے بدلے میں ان کے تقاضے اور فرمائشیں پوری کرنی چاہییں تھیں، جیسے چودھری اور سردار کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر اس پر احسان رکھتے ہیں اور پارٹی کے سربراہ سے اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔

❷ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ : اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہہ دیجیے کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان مت رکھو، کیونکہ کوئی مسلمان ہوتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو ہے، اگر نہیں ہوتا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا﴾ [ حٰمٓ السجدة : ٤٦ ] "جس نے کوئی نیک عمل کیا تو وہ اس کے لیے ہے اور جس نے برائی کی تو وہ اسی پر ہے۔" تمھارے اسلام لانے یا نہ لانے سے میرا کوئی مفاد وابستہ نہیں۔

❸ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ : یہاں بظاہر یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت رکھو، بلکہ میرا تم پر

اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸﴾

بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کو جانتا ہے اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو ﴿۱۸﴾

احسان ہے کہ میری وجہ سے تم اسلام لائے، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ کہنے کی تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا احسان جتلاتا اور یاد کرواتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان لانے کی ہدایت دی، یعنی اس کی توفیق بخشی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ بھی اگرچہ ہدایت دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكَ لَتَهۡدِيۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴾ [ الشوریٰ : ۵۲ ] ''اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' مگر آپ صرف صراطِ مستقیم کی راہنمائی کر سکتے ہیں، وہ ہدایت جو صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے اس کی توفیق صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهۡدِيۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ ﴾ [ القصص : ۵۶ ] ''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔'' اور اگر اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایمان کی توفیق دی تو اس میں سراسر تمھارا فائدہ ہے، اللہ تعالیٰ کو تم کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، نہ نقصان پہنچا سکتے ہو۔ تم ہی کیا، اگر ساری مخلوق بھی جمع ہو جائے تو نہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے، پھر اس پر یا اس کے رسول پر احسان رکھنے کا کیا مطلب؟

④ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ : یعنی اللہ تعالیٰ کا ایمان کی ہدایت دینے کا احسان بھی تم پر اسی صورت میں ہے اگر تم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہو، ورنہ ابھی تک تمھارے دعوے کی تصدیق نہیں ہوئی۔

آیت 18 اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ...... : اس سے پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ تمام چیزیں جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اس آیت میں اسی کی مزید تاکید فرمائی کہ یہ نہ سمجھنا کہ وہ آسمان و زمین کی انھی اشیاء کو جانتا ہے جو ظاہر ہیں، بلکہ وہ ان اشیاء کو بھی جانتا ہے جو نگاہوں سے غائب ہیں، خواہ پہلے گزر چکی ہیں یا اب موجود ہیں یا آئندہ ہوں گی اور تم جو کچھ کر رہے ہو یا آئندہ کرو گے اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھنے والا ہے۔ نظم الدرر میں ہے، قُشیری نے کہا: ''جو شخص یہاں ٹھہر کر تھوڑا سا غور و فکر کرے گا اس کا عیش مکدّر ہو جائے گا، کیونکہ کسی کو خبر نہیں کہ اس کے غیب میں کیا لکھا ہے اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے اور ایمان کی نعمت اس کے پاس موت تک رہے گی یا نہیں۔ پھر دعویٰ کس بات کا اور احسان کیسا؟ یہی معنی اس شعر میں ادا ہوا ہے ؎

أَبْكِيْ وَ هَلْ تَدْرِيْنَ مَا يُبْكِيْنِيْ أَبْكِيْ حَذَرًا أَنْ تُفَارِقِيْنِيْ

وَ تَقْطَعِيْ حَبْلِيْ وَ تَهْجُرِيْنِيْ

''میں روتا ہوں اور کیا تو جانتی ہے کہ مجھے کیا چیز رلاتی ہے؟ میں اس ڈر سے روتا ہوں کہ تو مجھ سے جدا نہ ہو جائے، مجھ سے قطع تعلق نہ کر لے اور مجھے چھوڑ نہ دے۔''

سورۃ ق ۵۰ ۔ مکیۃ ۳۴ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ آیاتھا ۴۵ ۔ رکوعاتھا ۳

# قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قٓ۔ قسم ہے قرآن کی جو بہت بڑی شان والا ہے! ①

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ بڑے مجمعوں کے مواقع پر عموماً اس سورت کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، مثلاً عید اور جمعہ۔ اس کے علاوہ فجر کی نماز میں بھی اس کی قراءت فرمایا کرتے تھے، کیونکہ یہ ابتدائے خلق، بعث، نشور، معاد، قیام، حساب، جنت، جہنم، ثواب، عقاب اور ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہے۔'' (ابن کثیر) عبید اللہ بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں کیا پڑھا کرتے تھے؟'' تو انھوں نے کہا: ''آپ ﷺ ان دونوں نمازوں میں ''قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ'' اور ''اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ'' پڑھا کرتے تھے۔'' [ مسلم، صلاۃ العيدين، باب ما يقرأ به في صلاة العيدين : ۸۹۱ ] ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میں نے سورۂ ق رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر ہی یاد کی ہے، آپ ہر جمعہ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے اسے پڑھا کرتے تھے۔'' [ مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة و الخطبة : ۸۷۳ ] جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ بِ ﴿قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ وَكَانَ صَلَاتُهُ بَعْدُ تَخْفِيفًا » [ مسلم، الصلاۃ، باب القراءة في الصبح : ۴۵۸ ] ''رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں سورۂ ق پڑھا کرتے تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ کی نماز ہلکی ہوتی تھی۔'' بعض علماء نے '' وَكَانَ صَلَاتُهُ بَعْدُ تَخْفِيفًا '' کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اس کے بعد کی باقی نمازیں ہلکی ہوتی تھیں۔

**آیت 1** ① قٓ : مفسر ابن کثیر نے فرمایا: ''قٓ'' ان حروف تہجی میں سے ہے جو سورتوں کی ابتدا میں مذکور ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''صٓ''، ''نٓ''، ''الٓمٓ''، ''حٰمٓ''، ''طٰسٓ'' وغیرہ۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ہم سورۂ بقرہ کے شروع میں اس پر کلام کر چکے ہیں جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ (ہماری اس تفسیر میں بھی سورۂ بقرہ کے شروع میں اس پر کلام گزر چکا ہے) بعض سلف سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ''قٓ'' ایک پہاڑ ہے جو ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اسے جبل قاف کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ یہ بنی اسرائیل کی خرافات سے ہے جو بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر لے لی ہیں کہ بنی اسرائیل سے وہ روایات لینا جائز ہیں جنھیں ہم نہ سچا کہیں نہ جھوٹا۔ میرے نزدیک یہ اور اس جیسی دوسری باتیں بنی اسرائیل کے دشمن دین اور زندیق لوگوں کی گھڑی ہوئی ہیں، جن کے ذریعے سے وہ لوگوں کے دلوں میں ان کے دین کے بارے میں شکوک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ہماری امت میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء و حفاظ اور ائمہ کی موجودگی کے باوجود نبی ﷺ سے جھوٹی روایات گھڑ کر بیان کی گئی ہیں، حالانکہ کوئی زیادہ مدت بھی نہیں گزری۔ تو اتنی لمبی مدت میں بنی اسرائیل کا کیا حال ہوگا جن میں تنقید کرنے والے حفاظ بہت کم تھے، شرابیں پی جاتی تھیں اور ان کے علماء اللہ کے کلام اور اس کی آیات

میں لفظی اور معنوی تحریف اور تبدیلی کیا کرتے تھے۔ شارح نے یہ کہہ کر کہ "حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ" (بنی اسرائیل سے بیان کرو اور کوئی حرج نہیں) صرف ان روایات کی اجازت دی ہے جنھیں عقل ممکن قرار دیتی ہو، رہی وہ باتیں جو عقلاً محال اور واضح طور پر باطل ہیں، وہ اس فرمان میں شامل نہیں ہیں۔'' (ابن کثیر) "حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ" کی تفسیر جو ابنِ حبان رحمہ اللہ نے فرمائی ہے، اس تفسیر کے مقدمہ میں اسرائیلیات پر کلام میں ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے بعد ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے ایک روایت نقل فرما کر اس کی تردید کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے پیچھے ایک سمندر پیدا فرمایا ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے، پھر اس کے پیچھے ایک پہاڑ پیدا فرمایا ہے جسے ''کوہِ قاف'' کہا جاتا ہے، جس کے اوپر آسمان دنیا ہے۔ اسی طرح سات زمینیں ہیں جن میں ہر ایک کے پیچھے ایک سمندر اور ایک کوہِ قاف ہے۔ غرض لمبی روایت ہے جو عقل و نقل اور مشاہدے کے صریح خلاف ہے۔ اگر واقعی قاف کسی پہاڑ کا نام بھی ہوتا تو اسے ''قٓ'' کے بجائے ''قاف'' لکھا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے مسلمانوں میں کوہِ قاف اور اس کی پریوں کے افسانے ایسی ہی روایتوں سے رائج ہوئے ہیں اور کتبِ تفسیر میں نقل ہونے کی وجہ سے ملحد اور بے دین لوگوں کو اسلام اور قرآن و سنت پر اعتراض کا موقع مل گیا ہے، حالانکہ قرآن و سنت دونوں ایسی فضول باتوں سے پاک ہیں۔ غیر محتاط اور مکھی پر مکھی مارنے والے مفسرین کی باتوں کو لے کر اسلام پر اعتراض صرف بدباطن اور بدنیت لوگ ہی کرتے ہیں، اہلِ تحقیق کا یہ شیوہ نہیں۔

❷ **وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ** : قسم کسی بات کی تاکید کے لیے اٹھائی جاتی ہے، وہ تاکید یا تو اس چیز کی عظمت کی بنا پر ہوتی ہے جس کی قسم اٹھائی گئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کے اسمائے حسنیٰ کی قسم ہے، یا قسم کے اس بات کی دلیل اور شاہد ہونے کی بنا پر ہوتی ہے جو قسم کے جواب میں آ رہی ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی قسم اس کے عظیم مجد و شرف کی بنا پر اٹھائی ہے اور اس بنا پر بھی کہ قرآن آپ ﷺ کے رسول برحق ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا جوابِ قسم محذوف ہے جو اگلی آیت: ﴿ **بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ** ﴾ سے سمجھ میں آ رہا ہے۔ اگلی آیت میں پہلی بات جس پر کفار کے تعجب کا ذکر ہے، یہ ہے کہ ان کی طرف خود ان میں سے ایک پیغمبر کیسے مبعوث ہو گیا؟ وہ تو کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا۔ جواب قسم اس مفہوم کا جملہ ہوگا: " إِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا وَ مَا رَدُّوْا أَمْرَكَ بِحُجَّةٍ وَلَا كَذَّبُوْكَ بِبُرْهَانٍ " یعنی یہ عظیم الشان قرآن اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور کفار نے آپ کی نبوت کا انکار کسی دلیل یا حجت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ محض اس تعجب کی بنا پر کیا ہے کہ ان کے پاس ان میں سے ایک ڈرانے والا کیسے آ گیا؟ سورۂ یٰس میں اس قسم کا جواب محذوف نہیں بلکہ مذکور ہے، فرمایا: ﴿ **يٰسٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ** ﴾ [ یٰس : ۱ تا ۳ ] ''یٰسٓ۔ اس حکمت سے بھرے ہوئے قرآن کی قسم! بلاشبہ تو یقیناً بھیجے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر کفار کے اس تعجب اور شبہے کا ذکر فرما کر اس کا رد فرمایا ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل : ۹۴) سورۂ ص میں بھی "**وَ الْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ**" کا جواب محذوف ہے جو اس سے اگلی آیت: ﴿ **بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ** ﴾ سے معلوم ہو رہا ہے۔

بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝

بلکہ انھوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا، تو کافروں نے کہا یہ ایک عجیب چیز ہے ۝ کیا جب ہم مر گئے اور ہم مٹی ہو گئے؟ یہ واپس لوٹنا بہت دور ہے ۝

آیت 2 ① بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ : "عَجِبُوْۤا" (انھوں نے تعجب کیا) میں ضمیر کفارِ قریش کے لیے ہے اور ڈرانے والے سیدنا محمد ﷺ ہیں۔ بعض نے کہا کہ ضمیر سے مراد تمام لوگ ہیں اور ''ان میں سے'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کی جنس سے ایک انسان ہیں۔ اور آپ ﷺ کی صفات میں سے ''مُنْذِرٌ'' کا ذکر اس لیے فرمایا کہ آپ انھیں دوبارہ زندہ کیے جانے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اس کے عذاب سے ڈراتے تھے۔

② فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ : یہ دوسری بات ہے جسے کفار نے عجیب قرار دیا اور وہ ہے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا۔ یہاں "فَقَالُوْا" کہنے کے بجائے جو یہ فرمایا "فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ" تو لفظ "الْكٰفِرُوْنَ" ان کی مذمت کے اظہار کے لیے ہے کہ اس تعجب کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں، کیونکہ جس نے پہلی دفعہ انھیں پیدا کیا، جب ان کا نام و نشان تک نہ تھا، وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے، بلکہ یہ تعجب محض ان کے کفر اور ''میں نہ مانوں'' کی ضد کی وجہ سے ہے۔

آیت 3 ① ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا : "اِذَا" فعل محذوف کا ظرف ہے: "أَيْ أَنَرْجِعُ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا" ''یعنی کیا ہم اس وقت دوبارہ لوٹیں گے جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے۔'' مزید دیکھیے سورۂ رعد (۵) اور سورۂ صافات (۱۶)۔

② ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ : یہ لوٹنا تو عقل سے بہت دور ہے، یعنی ان کے خیال میں ممکن ہی نہیں۔

③ حقیقت یہ ہے کہ کفار نے جن باتوں کو باعث تعجب قرار دیا وہ قابل تعجب نہیں، بلکہ قابل تعجب کفار کی باتیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کو قابل تعجب قرار دیا کہ انھیں خبردار کرنے اور ڈرانے والا خود ان میں سے آیا، حالانکہ اپنی جنس کا فرد ڈرانے اور آگاہ کرنے میں زیادہ مخلص اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے کوئی فرشتہ آتا، یا عربوں کی طرف کوئی چینی آتا۔ پھر وہ اس بات پر تعجب کر رہے ہیں کہ انسان رسول کیسے ہو گیا اور انھیں اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ وہ پتھر کو رب مان کر اس کی پرستش کر رہے ہیں۔ پھر وہ مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو عجیب کہہ رہے ہیں اور انھیں اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ پہلی مرتبہ اسی مٹی سے انھیں پیدا کیا گیا اور زندگی عطا کی گئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے قیامت کے انکار کی بات کو عجیب قرار دیا، فرمایا: ﴿وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ [ الرعد : ۵ ] ''اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم یقیناً ایک نئی پیدائش میں ہوں گے۔'' (بقاعی)

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ④ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْۤ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ⑤

**بے شک ہم جان چکے ہیں جو کچھ زمین ان میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو خوب محفوظ رکھنے والی ہے ④ بلکہ انھوں نے سچ کو جھٹلا دیا جب وہ ان کے پاس آیا۔ پس وہ ایک الجھے ہوئے معاملے میں ہیں ⑤**

آیت 4 ① قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ : وہ دوبارہ زندہ ہونے کو اس لیے بعید کہہ رہے تھے کہ مٹی ہونے کے بعد اس کے ذرات تو سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں، پھر جب ان کی مٹی کی دوسری مٹی سے پہچان ہی ختم ہوگئی تو وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہے کو رد کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قَدْ عَلِمْنَا﴾ ”یقیناً ہم جان چکے“ یعنی ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ مرنے کے بعد زمین ان کے جسم میں سے جن جن اجزا کو کم کرے گی اور انھیں مٹی میں بدلتی جائے گی وہ کہاں کہاں ہوں گے، ہمارے علم سے ایک ذرہ بھی باہر نہیں ہے۔ ”مِنْهُمْ“ میں لفظ ”مِنْ“ تبعیض کے لیے ہے، اس میں اشارہ ہے کہ انسان کے تمام اجزا مٹی نہیں ہوتے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَيْسَ مِنَ الْإِنْسَانِ شَيْءٌ إِلَّا يَبْلٰى إِلَّا عَظْمًا وَاحِدًا وَ هُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ وَ مِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » [ مسلم، الفتن، باب ما بين النفختين : ۲۹۵۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”انسان کی ہر چیز بوسیدہ ہو جاتی ہے سوائے ایک ہڈی کے جو دُم کی ہڈی ہے اور قیامت کے دن مخلوق کو اسی سے جوڑا جائے گا۔“

② وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ : ”حَفِيْظٌ“ مبالغے کا صیغہ ہے۔ چونکہ لوگ لکھی ہوئی بات کو زیادہ معتبر سمجھتے ہیں اس لیے ان کی عام عادت کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا، ان کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہونے کے علاوہ اس کتاب میں بھی درج ہے جو خوب محفوظ رکھنے والی ہے۔ پھر ہمارے لیے ان ذرات کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ ”كِتٰبٌ حَفِيْظٌ“ سے اکثر مفسرین نے لوحِ محفوظ مراد لی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو آئندہ ہونے والا ہے، اس میں ان کے ہر ذرے کے متعلق بھی درج ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔ ”كِتٰبٌ حَفِيْظٌ“ سے مراد ایسی کتاب بھی ہو سکتی ہے جس میں ہر انسان کا نام، اس کے اعمال اور اس پر زندگی میں اور موت کے بعد گزرنے والے تمام احوال ساتھ ساتھ درج ہوتے جاتے ہوں، حتیٰ کہ یہ بھی کہ مرنے کے بعد اس کے جسم کا کوئی بھی ذرہ کہاں کہاں منتقل ہوا اور کہاں موجود ہے۔ اس لیے قیامت کا انکار اس بنا پر درست نہیں کہ مٹی ہو جانے کے بعد وہ ذرات کیسے جمع کیے جائیں گے۔ کفار کو دوبارہ زندگی کا یقین دلانے کے لیے ”كِتٰبٌ حَفِيْظٌ“ کا یہ مفہوم الفاظ کے زیادہ قریب ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت 5 ① بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ : یعنی صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں نے اپنی جنس میں سے رسول کی آمد کو اور دوبارہ زندہ کیے جانے کو عجیب قرار دیا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب ان کے پاس حق آیا تو اسے سنتے ہی کسی غور و فکر کے بغیر جھٹلا دیا۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶

تو کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کیسے اسے بنایا اور اسے سجایا اور اس میں کوئی درزیں نہیں ہیں۞

❷ فَهُمْ فِيْۤ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ: "مَرِجَ الْأَمْرُ، أَيْ اِضْطَرَبَ وَالْتَبَسَ وَ فَسَدَ" "اَمْرٍ مَّرِيْجٍ" الجھا ہوا معاملہ۔ یعنی سوچے سمجھے بغیر جھٹلا دینے کے بعد اب رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے بارے میں ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ انھیں جھٹلانے کا کیا جواز پیش کریں، اس لیے وہ کبھی ایک بات کرتے ہیں کبھی دوسری۔ ایک بات پر انھیں قرار نہیں ہے اور وہ سخت ذہنی الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔ کبھی رسول اللہ ﷺ کو شاعر کہتے ہیں، کبھی کاہن، کبھی مجنون (پاگل) اور کبھی ساحر۔ اسی طرح قرآن کو کبھی نبی ﷺ کا اپنا تصنیف کیا ہوا کلام کہتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ کوئی عجمی شخص انھیں سکھا جاتا ہے اور کبھی اسے جادو کہہ دیتے ہیں۔ الغرض، ہر موقع پر کوئی نہ کوئی بات گھڑ لیتے ہیں۔

آیت 6 ❶ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ: کفار نے جن چیزوں کو جھٹلایا ان میں سے ایک اہم چیز دوبارہ زندگی تھی، اس لیے یہاں سے اس کے کچھ مزید دلائل بیان فرمائے۔ "اَفَلَمْ يَنْظُرُوْۤا" میں "نظر" کا معنی اگرچہ غور و فکر بھی ہے، مگر اولین معنی دیکھنا ہے اور اس میں زیادہ زور ہے کہ ان مخلوقات کے دوبارہ زندگی پر دلالت کے لیے انھیں صرف آنکھوں کے ساتھ دیکھ لینا ہی کافی ہے۔ یعنی آسمانوں کا بنانا، انھیں ستاروں کے ساتھ سجانا اور زمین کو پیدا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انھیں بنانے والا انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوسری جگہ یہی بات زیادہ صریح الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۧ الْمَوْتٰى بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [الأحقاف: ۳۳] "اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ کیوں نہیں! یقیناً وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

❷ فَوْقَهُمْ: یہ "السَّمَآءِ" سے حال ہے، یعنی ان کے لیے آسمان کو دیکھنا کچھ مشکل نہیں، نہ اس کے لیے کسی سفر کی ضرورت ہے، نہ دوربین یا کسی آلے کی، بس اوپر سر اٹھائیں اور اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

❸ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا: "السَّمَآءِ" سے مراد پورا عالم بالا ہے، جس میں فضا، چاند، تارے، سورج اور خیمے کی طرح چاروں طرف سے زمین کو گھیرے میں لیے ہوئے نیلا آسمان سبھی کچھ شامل ہے۔ "كَيْفَ" کے ساتھ انھیں بنانے اور مزین کرنے کی کیفیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کی بلندی، ان کی عظمت، ان کی مضبوطی، خوب صورتی اور ان کا کسی بھی خرابی یا خامی سے پاک ہونا سب ایسی چیزیں ہیں جنھیں دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ انھیں بنانے والا ہر چیز پر قادر ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پھر آسمان، سورج، چاند اور ستاروں کے اس نظام کو دیکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے میں لوگوں کے اپنی عقل اور علم کے لحاظ سے مختلف درجے ہیں، آیت میں تمام طبقات کے لیے ہدایت کی روشنی موجود ہے۔

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ﴿۷﴾

**اور زمین، ہم نے اسے پھیلایا اور اس میں گڑے ہوئے پہاڑ رکھے اور اس میں خوبی والی ہر قسم اگائی ﴿۷﴾**

تفہیم القرآن میں ہے: ''اس نظام کو آدمی کسی آلے کے بغیر اپنی آنکھ ہی سے دیکھ لے تو اس پر حیرت طاری ہو جاتی ہے، لیکن اگر دور بین لگا لے تو ایک ایسی وسیع و عریض کائنات اس کے سامنے آتی ہے جو ناپید اکنار ہے۔ ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑے سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پورا نظام شمسی اس کی صرف ایک کہکشاں (Galaxy) کے ایک کونے میں پڑا ہوا ہے۔ تنہا اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے تارے (ثوابت) موجود ہیں اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی دس لاکھ کہکشاؤں کا پتا دے رہا ہے۔ ان لاکھوں کہکشاؤں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ تو کائنات کے صرف اس حصے کی وسعت کا حال ہے جو اب تک انسان کے علم اور مشاہدے میں آئی ہے، خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے اس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہوسکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات اس کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اس عظیم کارگاہ ہست و بود کو جو خدا وجود میں لایا ہے اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوانِ ناطق، جس کا نام انسان ہے، اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا تو یہ اس کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے، کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی؟''

﴿۴﴾ وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ: "فُرُوْجٍ" "فَرْجٌ" کی جمع ہے، شگاف، دراڑ، درز۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ملک (۴،۳) کی تفسیر۔ تفہیم القرآن میں ہے: ''یعنی اپنی اس حیرت انگیز وسعت کے باوجود یہ عظیم الشان نظامِ کائنات ایسا مسلسل اور مستحکم ہے اور اس کی بندش اتنی چست ہے کہ اس میں کسی جگہ کوئی دراڑ یا شگاف نہیں اور اس کا تسلسل کہیں جا کر ٹوٹ نہیں جاتا۔ اس چیز کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت دانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے جسے وہ ''منبع ۳ ج ۲۹۵'' (Source 3c, 285) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے متعلق ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اب ہم تک پہنچ رہی ہیں وہ چار ارب سال سے بھی زیادہ مدت پہلے اس میں سے روانہ ہوئی ہوں گی۔ اس بعید ترین فاصلے سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا آخر کیسے ممکن ہوتا اگر زمین اور اس کہکشاں کے درمیان کائنات کا تسلسل کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہوتا اور اس کی بندش میں کہیں شگاف پڑا ہوا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت [illegible]
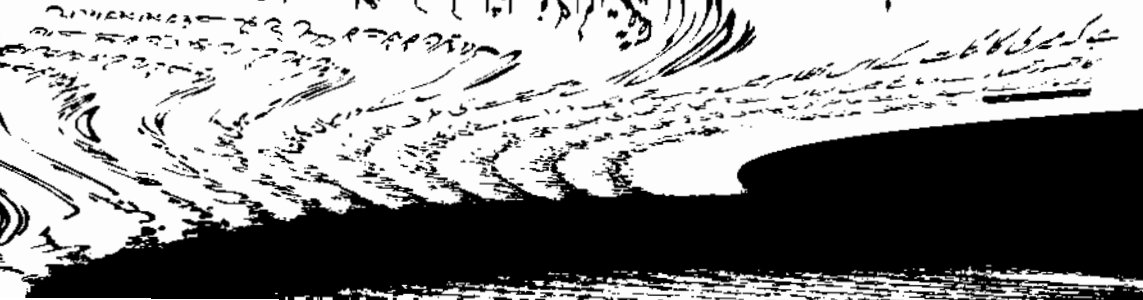
تَبۡصِرَةً وَّ ذِكۡرٰی لِكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ﴿۸﴾ وَ نَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الۡحَصِیۡدِ ﴿۹﴾ وَ النَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِیۡدٌ ﴿۱۰﴾

ہر اس بندے کو دکھانے اور یاد دلانے کے لیے جو رجوع کرنے والا ہے ⑧ اور ہم نے آسمان سے ایک بہت بابرکت پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ باغات اور کاٹی جانے والی (کھیتی) کے دانے اگائے ⑨ اور کھجوروں کے درخت لمبے لمبے، جن کے تہ بہ تہ خوشے ہیں ⑩

دیکھیے سورۂ حجر (۱۹)، نحل (۱۵)، طٰہٰ (۵۳)، نمل (۶۰، ۶۱)، لقمان (۱۰)، زخرف (۱۰ تا ۱۴) اور سورۂ مرسلات (۲۵ تا ۲۷)۔

**آیت 8** تَبۡصِرَةً وَّ ذِكۡرٰی ...... : "تَبۡصِرَةً" اور "ذِكۡرٰی" یہ دونوں مفعول لہ ہیں، یعنی ہم نے یہ سب کچھ بنایا اور اس کا یہاں ذکر کیا ہے ہر اس آدمی کو دکھانے اور یاد دلانے کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہے، کیونکہ وہی ان سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔ جو دھیان ہی نہ کرے اس کے لیے یہ سب کچھ بے فائدہ ہے ؎

انّھے نوں بازار پھرایا، سارا شہر وکھایا  آخر اُتے آکھن لگا کجھ نہیں نظری آیا

"یعنی اندھے کو بازار دکھایا اور سارے شہر کی سیر کروائی، مگر اس نے آخر میں یہی کہا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔"

**آیت 9** ① وَ نَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا: "مَآءً مُّبٰرَكًا" وہ پانی جس میں بہت برکت یعنی خیر کثیر رکھی گئی ہے۔ یہاں باب مفاعلہ مشارکت کے لیے نہیں بلکہ مبالغے کے لیے ہے۔ جس پانی کو اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اس کی خیر کی کثرت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ موت کے بعد زندگی کے اثبات کے لیے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد اب بارش کا اور اس کی برکت سے زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ مقصود اس سے بھی موت کے بعد زندگی کا اثبات ہے، چنانچہ آخر میں فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ الۡخُرُوۡجُ ﴾ [ قٓ : ۱۱ ] "اسی طرح (دوبارہ زندہ ہو کر) نکلنا ہے۔" آسمان سے پانی اتارنے کے لیے باب تفعیل "نَزَّلۡنَا" استعمال فرمایا جس میں تدریج ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بارش کے قطروں کے بجائے کروڑوں اربوں ٹن پانی دفعتاً گرا دے تو زمین پر کوئی چیز باقی ہی نہ رہے۔

② فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الۡحَصِیۡدِ: "حَصَدَ يَحْصُدُ حَصْدًا وَ حِصَادًا" (ن) کھیتی کاٹنا۔ "الۡحَصِیۡدِ" بمعنی "اَلْمَحْصُوْدُ" کاٹی ہوئی کھیتی۔ بارش سے پیدا ہونے والی چیزیں دو قسم کی ہیں، کچھ وہ جن کے درخت باقی رہتے ہیں اور ان کے پھل پھول، گوند، پتوں، ٹہنیوں اور لکڑی وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور کچھ وہ جنھیں کاٹ کر ان سے غلہ، دالیں، سبزیاں، ادویات اور بے شمار مفید چیزیں حاصل کی جاتی ہیں۔ یہاں خصوصاً پھل دار درختوں اور غلہ جات کا ذکر فرمایا، کیونکہ یہ دوسری اشیاء پر برتری رکھتے ہیں اور انسان اور اس کے پالتو جانوروں کی خوراک بنتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ﴾ [ النازعات : ۳۳ ] "تمھاری اور تمھارے چوپاؤں کی زندگی کے سامان کے لیے۔"

**آیت 10** ① وَ النَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ: "النَّخۡلَ" اسم جنس ہے جو کھجور کے درختوں پر بولا جاتا ہے، زیادہ ہوں یا ایک۔ اگر

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ⑪ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ⑫ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ⑬ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ⑭

بندوں کو روزی دینے کے لیے اور ہم نے اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کر دیا، اسی طرح نکلنا ہے ⑪ ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور کنویں والوں نے اور ثمود نے ⑫ اور عاد اور فرعون نے اور لوط کے بھائیوں نے ⑬ اور درختوں کے جھنڈ والوں نے اور تبع کی قوم نے، ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرے عذاب کا وعدہ ثابت ہو گیا ⑭

کھجور کا ایک درخت ہو تو اسے ''نَخْلَةٌ'' کہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ [ مریم: ۲۳ ] ''پھر درد زہ اسے کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔'' ''بَسَقَ يَبْسُقُ بُسُوْقًا'' (ن) ''اَلنَّخْلُ'' کھجور کے درختوں کا لمبا اور بلند ہونا۔ چنانچہ زمین پر پڑے ہوئے کھجور کے لمبے تنے کو ''باسق'' نہیں کہتے۔

② لَهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ: ''طَلْعٌ'' کھجور کے پھل کا خوشہ جو شروع میں طلوع ہوتا ہے اور اس پر پردہ ہوتا ہے۔ ''نَضِيْدٌ'' بمعنی ''مَنْضُوْدٌ'' تہ بہ تہ۔ یعنی پردے کے اندر انار کے دانوں کی طرح کھجور کے دانوں کی ابتدا تہ بہ تہ قطاروں کی شکل میں ہوتی ہے، جب غلاف سے باہر نکل آئیں تو ''نَضِيْدٌ'' نہیں رہتے، بلکہ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

**آیت 11** وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ: یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھنے میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ کیا تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ ایک زمین بارش نہ ہونے کی وجہ سے بنجر پڑی ہوتی ہے، جیسے اس میں زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں، پھر یکایک بارش ہوتی ہے تو اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور درخت اگتے ہیں، گویا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے۔

**آیت 12 تا 14** ① كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ ...... : یعنی یہ آپ کو جھٹلانے والے پہلے لوگ نہیں جنھوں نے ہمارے کسی رسول کو جھٹلایا ہو، بلکہ اس سے پہلے کئی اقوام نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا اور ہمارے عذاب کا نشانہ بنے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی اور آپ ﷺ کو جھٹلانے والوں کے لیے تنبیہ ہے۔ آیت میں مذکور اکثر اقوام کا ذکر متعدد مقامات پر گزر چکا ہے۔ اصحاب الرس کا ذکر سورۂ فرقان (۳۸) میں، اصحاب الایکہ کا ذکر سورۂ حجر (۷۸) اور سورۂ شعراء (۱۷۶) میں اور قوم تُبَّع کا ذکر سورۂ دخان (۳۷) میں دیکھیے۔

② كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ: ان سب قوموں نے تمام رسولوں کو جھٹلا دیا، کیونکہ یہ سب نہ اپنی طرح کے کسی انسان کو رسول ماننے کے لیے تیار تھے اور نہ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کو۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو تمام رسولوں کو جھٹلانے والا قرار دیا۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾

تو کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کرنے کے ساتھ تھک کر رہ گئے ہیں؟ بلکہ وہ ایک نئے پیدا کیے جانے کے متعلق شک میں مبتلا ہیں ﴿۱۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان چیزوں کو جانتے ہیں جن کا وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں ﴿۱۶﴾

③ فَحَقَّ وَعِيْدِ : "وَعِيْدِ" اصل میں "وَعِيْدِيْ" ہے۔ آیات کے فواصل کی مطابقت کے لیے یاء کو حذف کر دیا، دال پر کسرہ یاء کے حذف ہونے کی دلیل ہے، ورنہ "حَقَّ" کا فاعل ہونے کی وجہ سے "وَعِيْدِ" کے دال پر ضمہ ہونا چاہیے تھا۔

آیت 15 ① اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ : یہ خلاصہ اور نتیجہ ہے اس دلیل کا جس کی تفصیل سورت کے شروع سے آ رہی ہے کہ جب ہم نے اس وقت جب کچھ بھی نہیں تھا آسمان و زمین، بارش اور اوپر مذکور تمام چیزیں پیدا کر لیں اور ہمیں ان کے پیدا کرنے سے کوئی تھکاوٹ لاحق نہیں ہوئی تو کیا یہ بے چارہ انسان ضعیف البنیان ہی ایسی مخلوق ہے جسے پہلی دفعہ پیدا کر کے ہم تھک گئے ہیں اور اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے، حالانکہ ہمارا تخلیق کا عمل مسلسل جاری ہے اور دوبارہ زندگی تو پہلی دفعہ کے مقابلے میں معمولی بات ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز سے کئی جگہ بیان فرمائی ہے، دیکھیے سورۂ روم (۲۷)، یٰس (۷۸، ۷۹)، نازعات (۲۷) اور سورۂ قٓ (۳۸)۔

② بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ : یعنی یہ اس چیز کے منکر نہیں ہیں کہ ان کو پہلی بار ہم نے ہی پیدا کیا اور یہ کہ پہلی بار پیدا کر کے ہم تھک کر نہیں رہ گئے، لیکن اس کے باوجود انھیں شک ہے کہ ہم دوبارہ بھی پیدا کر سکیں گے یا نہیں، حالانکہ معمولی غور و فکر سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر ہمیں دشواری پیش آتی تو پہلی دفعہ آتی، دوسری بار پیدا کرنے کا کام تو پہلی بار کی بہ نسبت کہیں آسان ہے۔

آیت 15 ① وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ : وسوسہ کا اصل معنی وہ ہلکی یا دبی ہوئی حرکت یا آواز ہے جو عام طور پر محسوس نہ ہوتی ہو۔ اس سے مراد وہ بات بھی ہوتی ہے جو بالکل آہستہ آواز سے کسی کے کان میں کہی جائے اور صرف اسی کو سنائی دے اور وہ بات بھی جو بغیر آواز کے کسی کے دل میں ڈال دی جائے، جیسے شیطان یا نفس انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ قیامت کے منکروں کے اس شبہ کا جواب کہ جب ہم مر کر مٹی ہو گئے تو دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے، اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ ہم انسان کے مٹی ہو جانے والے ہر ذرے کو جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے، وہ نہ ہمارے علم سے باہر ہے اور نہ ہماری دسترس اور قدرت سے، ہم جب چاہیں گے اسے دوبارہ زندہ کر دیں گے، اب فرمایا خاک کے ذرات کا وجود تو پھر بھی باقی رہتا ہے اور نظر آتا ہے، ہم تو انسان کی وہ چیزیں بھی جانتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ مخفی ہیں اور بظاہر ان کا وجود بھی باقی نہیں رہتا، کیونکہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے تو ہم سے بڑھ کر اسے کون جان سکتا ہے؟ فرمایا: ﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ [الملك: ۱٤] "کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝

جب (اس کے ہر قول وفعل کو) دو لینے والے لیتے ہیں، جو دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہیں ۝

نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے۔" چنانچہ ہم اس کے اقوال و افعال ہی کو نہیں اس کی ان باتوں کو بھی جانتے ہیں جن کا خیال اور وسوسہ اس کا نفس اس کے دل میں ڈالتا ہے۔ سو ہم صرف اسے زندہ ہی نہیں کریں گے، بلکہ زندہ کرنے کے بعد اس کے تمام اعمال کا محاسبہ بھی کریں گے اور محاسبے کے لیے اگرچہ ہمارا علم ہی کافی ہے، مگر ہم نے حجت پوری کرنے کے لیے اس کے ہر قول وفعل کو فرشتوں کے ذریعے سے لکھ کر محفوظ کرنے کا بھی بندوبست کیا ہے۔

② وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ: "الْوَرِيْدِ" دل سے نکلنے والی رگ جس کے کٹنے سے انسان مر جاتا ہے۔ دل میں اس کا نام "وتین" ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴾ [ الحآقة : ٤٦ ] "پھر ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔" اور گردن میں اس کا نام "ورید" ہے، جو "وَرَدَ يَرِدُ" سے "فَعِيْلٌ" کے وزن پر ہے، کیونکہ خون دل سے اس میں وارد ہوتا ہے۔ "حَبْلِ" کا معنی بھی رگ ہے۔ "حَبْلِ" کی اضافت "الْوَرِيْدِ" کی طرف بیانیہ ہے، یعنی وہ رگ جو ورید ہے، جیسا کہ مسجد الجامع کی اضافت ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: "گردن کی رگ مراد ہے جس میں جان پھرتی ہے دل سے دماغ تک۔ اس کے کٹنے سے موت ہے۔"

③ "ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں" کیونکہ انسان کے جسم کے حصے تو ایک دوسرے کو چھپائے ہوئے ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ مفسر ابن کثیر نے یہاں "نَحْنُ" سے مراد فرشتے لیے ہیں، جیسا کہ سورۂ واقعہ کی آیت (۸۵): ﴿ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (اور ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں اور لیکن تم نہیں دیکھتے) میں بعض ائمہ نے فرشتوں کا قریب ہونا مراد لیا ہے۔ اگرچہ اس معنی کی بھی گنجائش ہے، مگر الفاظ کے ظاہر کا تقاضا یہی ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ اپنے متعلق فرما رہے ہیں اور اس بات کا یقین اور احساس کہ میرا رب میری رگِ جاں سے بھی زیادہ مجھ سے قریب ہے، انسان کو گناہوں کے ارتکاب سے زیادہ باز رکھنے والا اور اس سے محبت پیدا کرنے کا زیادہ باعث ہے۔ فتح البیان میں ہے، قشیری نے فرمایا: " فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ هَيْبَةٌ وَ فَزَعٌ وَ خَوْفٌ لِقَوْمٍ وَ رَوْحٌ وَ اُنْسٌ وَ سُكُوْنُ قَلْبٍ لِقَوْمٍ " "اس آیت میں کچھ لوگوں کے لیے ہیبت، گھبراہٹ اور خوف کا اور کچھ لوگوں کے لیے راحت، انس اور سکونِ قلب کا سامان موجود ہے۔"

④ قرآن مجید نے صریح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا بیان فرمایا ہے: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ [ طٰه : ٥ ] "وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔" پھر اس کا انسان کے قریب ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہ بحث ان شاء اللہ سورۂ حدید کی آیت (۴): ﴿ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾ میں آئے گی۔

آیت 17 ① اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ: "تَلَقّٰى يَتَلَقّٰى" (تفعل) لینا، استقبال کرنا۔ "يَتَلَقّٰى" اور "الْمُتَلَقِّيٰنِ"

# مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴿۱۸﴾

وہ کوئی بھی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک تیار نگران ہوتا ہے ﴿۱۸﴾

کا مفعول محذوف ہے: "أَيْ جَمِيعَ أَقْوَالِهِ وَ أَفْعَالِهِ." "إِذْ" پچھلی آیت میں "أَقْرَبُ" کا ظرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان کے دائیں اور بائیں جانب بیٹھے ہوئے دو فرشتے اس کے ہر قول و فعل کو لے کر لکھ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں اور اس کے دل میں آنے والے وسوسے اور سینے کے راز بھی خوب جانتے ہوتے ہیں۔

❷ "قَعِيدٌ" بمعنی "مُقَاعِدٌ" ہے، جیسے "جَلِيسٌ" بمعنی "مُجَالِسٌ" ہے۔ یعنی وہ انسان کے ساتھ لازم رہتے ہیں۔ "قَعِيدٌ" (ساتھ بیٹھے ہوئے) کا لفظ ان کے بیدار اور ہشیار رہنے کی کیفیت کے بیان کے لیے ہے کہ وہ انسان سے سرزد ہونے والے کسی بھی قول یا فعل کو لکھنے کے لیے ہر وقت تیار بیٹھے ہیں، کسی لمحے بھی ان کے الگ ہونے یا غفلت یا نیند کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

❸ یہاں ایک سوال ہے کہ فرشتے تو دو ہیں مگر ان کی کیفیت بیان کرنے کے لیے لفظ "قَعِيدٌ" لایا گیا ہے جو واحد ہے، اسے تثنیہ بنا کر "قَعِيدَانِ" کیوں نہیں کہا گیا؟ مفسرین نے اس کے دو جواب دیے ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد "كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا" ہے، یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک تیار بیٹھا ہے۔ دوسرا یہ کہ "قَعِيدٌ" "فَعِيلٌ" کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے اور "فَعِيلٌ" اور "فَعُولٌ" واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے اسی طرح استعمال کر لیا جاتا ہے۔ دونوں جواب درست ہیں۔

**آیت 18** ﴿ مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴾: "رَقِيبٌ" نگرانی کرنے والا اور "عَتِيدٌ" تیار۔ اس آیت کے مفہوم کے قریب یہ آیات ہیں: ﴿ وَ اِنَّ عَلَیۡكُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۙ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ۙ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴾ [ الانفطار: ۱۰ تا ۱۲ ] "حالانکہ بلاشبہ تم پر یقیناً نگہبان (مقرر) ہیں۔ جو بہت عزت والے ہیں، لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔" اگرچہ انسان کا ہر قول و فعل اور ارادہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، مگر فرشتوں کے ذریعے سے کتابِ اعمال کی تیاری قیامت کے دن اس پر حجت قائم کرنے کے لیے ہے، فرمایا: ﴿ وَ نُخۡرِجُ لَهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَّلۡقٰىهُ مَنۡشُوۡرًا ۝ اِقۡرَاۡ کِتٰبَكَ ؕ کَفٰی بِنَفۡسِكَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡكَ حَسِیۡبًا ﴾ [ بني إسرائيل: ۱۳، ۱۴ ] "اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا۔ اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب بہت کافی ہے۔" آج کل آڈیو اور وڈیو کے ذریعے سے انسان کے تقریباً ہر قول و فعل کا مکمل نقشہ محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ انسانی ایجادات کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو عطا کردہ صلاحیتوں کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب کو دیکھ کر بندوں کا جو حال ہوگا وہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں بیان فرمایا ہے: ﴿ وَ وُضِعَ الۡكِتٰبُ فَتَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡهِ وَ یَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَةً وَّ لَا کَبِیۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا ۚ وَ وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَ لَا یَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾

وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾

**اور موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آ گئی۔ یہ ہے وہ جس سے تو بھاگتا تھا ﴿۱۹﴾ اور صور میں پھونکا گیا، یہی عذاب کے وعدے کا دن ہے ﴿۲۰﴾**

[ الکھف : ٤٩ ] ''اور کتاب رکھی جائے گی، پس تو مجرموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو اس میں ہوگا اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے، اور انھوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

**آیت 19** ❶ **وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ:** یہ ذکر کرنے کے بعد کہ انسان جو کچھ کرتا ہے سب اللہ کو معلوم ہے اور انسان کی کتابِ اعمال میں بھی لکھا ہوا اور محفوظ ہے اور اس کے سامنے پیش آنے والا ہے، اب اس حقیقت کے انسان کے سامنے آنے کے دو وقت بیان فرمائے، پہلا موت کا وقت اور دوسرا قیامت کا وقت۔ اس آیت میں موت کا ذکر ہے، موت کی بے ہوشی سے مراد اس کی سختی اور شدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں موت اور قیامت کے لیے ماضی کے صیغے استعمال فرمائے ہیں، یعنی "**وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ**" (اور موت کی بے ہوشی آ گئی) اور "**وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ**" (اور صور میں پھونکا گیا) حالانکہ یہ کام آئندہ ہونے والے ہیں، تو مقصد وہ نقشہ سامنے لانا اور یہ باور کروانا ہے کہ ان کا آنا اتنا یقینی ہے کہ سمجھو وہ آ چکے۔

❷ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پانی کا ایک پیالہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈالتے اور انھیں چہرے پر پھیرتے جاتے تھے اور ساتھ یہ فرماتے تھے: « لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ، إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ » [ بخاري، المغازي، باب مرض النبي ﷺ و وفاته : ٤٤٤٩ ] ''لا الٰہ الا اللہ، یقیناً موت کی بہت سختیاں ہیں۔''

❸ **بِالْحَقِّ:** موت کی بے ہوشی کے حق کو لے کر آنے کا مطلب یہ ہے کہ جان نکلنے کی سختی کے ساتھ ہی وہ حقیقت سامنے آ جائے گی جس پر دنیا میں پردہ پڑا ہوا ہے اور آدمی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ رسولوں نے جو بات بتائی تھی وہ حق اور سچ تھی۔

❹ **ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ:** "حَادَ يَحِيْدُ حَيْدَةً" ( بَاعَ يَبِيْعُ) کسی چیز سے کنی کترانا، بچ کر نکلنا، دور بھاگنا۔ ہر انسان ہی طبعی طور پر موت سے بھاگتا ہے، مگر اس سے چارہ نہیں اور نہ ہی انسان کی سدا زندہ رہنے کی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ دیکھیے سورۂ جمعہ (۸) اور سورۂ احزاب (۱٦) کی تفسیر۔ یعنی یہ وہ حقیقت ہے جس کا سامنا کرنے سے تو پہلوتہی کرتا اور کنی کتراتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس سے بچ کر اپنی من مانی کرتا رہے۔

**آیت 20** **وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ......:** موت کے بعد یہ دوسرا موقع ہے جب انسان کے سامنے یہ حقیقت کھل کر آ جائے گی کہ وہ جو کچھ کرتا تھا سب اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور کراماً کاتبین کے ذریعے سے محفوظ ہو رہا تھا۔ یہاں صور میں پھونکے جانے

وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآىِٕقٌ وَّ شَهِيْدٌ ۝۲۱ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝۲۲ وَ قَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۝۲۳

اور ہر شخص آئے گا، اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہی دینے والا ہے ۝۲۱ بلاشبہ یقیناً تو اس سے بڑی غفلت میں تھا، سو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ دور کر دیا، تو تیری نگاہ آج بہت تیز ہے ۝۲۲ اور اس کا ساتھی (فرشتہ) کہے گا یہ ہے وہ جو میرے پاس تیار ہے ۝۲۳

---

سے مراد دوسری دفعہ پھونکا جانا ہے، جب ہر آدمی قبر سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جائے گا۔ ''وعید'' دھمکی اور سزا کے وعدے کو کہتے ہیں، یعنی تمھیں نافرمانی پر جو وعید سنائی گئی تھی یہ اس کے پورے ہونے کا دن ہے۔ ''نفخ صور'' کے لیے دیکھیے سورۂ ابراہیم (۴۷ تا ۵۱)، طٰہٰ (۱۰۲)، حج (۱)، یٰس (۵۱) اور سورۂ زمر (۶۸)۔

**آیت 21** وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآىِٕقٌ وَّ شَهِيْدٌ : "سَآىِٕقٌ" "سَاقَ يَسُوْقُ سَوْقًا" سے اسم فاعل ہے، ہانکنے والا جو جانوروں کو یا کسی گروہ کو ہانک کر کسی جگہ پہنچاتا ہے۔ "شَهِيْدٌ" شہادت دینے والا۔ یعنی قبر سے نکلتے ہی ہر کافر کے ساتھ ایک فرشتہ ہانکنے والا ہو گا جو اسے ہانک کر محشر کی طرف لے جائے گا اور ایک اس کے اعمالِ بد کی شہادت دینے والا ہو گا۔ یہ فرشتہ کراماً کاتبین میں سے بھی ہو سکتا ہے جو اس کا نامۂ اعمال لے کر شہادت کے لیے حاضر ہو گا۔ گویا مجرم بھی حاضر ہو گا اور اس کے خلاف مکمل شہادتیں بھی حاضر ہوں گی۔ "كُلُّ نَفْسٍ" سے مراد یہاں ہر کافر و مشرک ہے، کیونکہ اس اہانت اور تذلیل کے ساتھ کفار ہی کو لے جایا جائے گا۔ بعد کی آیات سے بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے۔

**آیت 22** ❶ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا : "غَفْلَةٍ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی غفلت'' کیا گیا ہے۔ یہاں یہ الفاظ محذوف ہیں کہ ''ہر کافر و مشرک سے کہا جائے گا کہ......'' یہ آیت بھی دلیل ہے کہ "كُلُّ نَفْسٍ" سے مراد کفار ہیں، کیونکہ وہی آخرت سے غافل ہیں، مومن تو آخرت کا یقین رکھتے ہیں اور اس کی فکر میں رہتے ہیں۔ کفار کو یہ بات ذلیل کرنے کے لیے طنز کے طور پر کہی جائے گی۔

❷ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ...... : یعنی تیری آنکھوں پر پڑا ہوا غفلت کا پردہ، جس کی وجہ سے تو آخرت کا انکار کرتا تھا، وہ پردہ اب ہم نے دور کر دیا ہے، اس لیے تیری نظر تیز ہو چکی ہے اور تو اپنی آنکھوں کے ساتھ ان تمام حقیقتوں کو دیکھ سکتا ہے جن کا انکار کرتا تھا۔

**آیت 23** وَ قَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ : "قَرِيْنٌ" ساتھی۔ یعنی وہ فرشتہ جو اسے ہانک کر محشر میں لانے پر مقرر تھا کہے گا، اے رب! وہ مجرم جسے لانے پر تو نے مجھے مقرر فرمایا تھا یہ میرے پاس حاضری کے لیے تیار ہے اور وہ فرشتہ جو شہادت کے لیے ساتھ تھا کہے گا، اس کے متعلق جس جس شہادت کی ضرورت ہے وہ یہ ہے جو میرے پاس تیار ہے۔

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِۣ ﴿۲۵﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ وَ لٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾

جہنم میں پھینک دوتم دونوں (فرشتے) ہر زبردست ناشکرے کو، جو بہت عناد رکھنے والا ہے ﴿۲۴﴾ جو خیر کو بہت روکنے والا، حد سے گزرنے والا، شک کرنے والا ہے ﴿۲۵﴾ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنالیا، سو دونوں اسے بہت سخت عذاب میں ڈال دو ﴿۲۶﴾ اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا اے ہمارے رب! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا اور لیکن وہ خود ہی دور کی گمراہی میں تھا ﴿۲۷﴾ فرمایا میرے پاس جھگڑا مت کرو، حالانکہ میں نے تو تمھاری طرف ڈرانے کا پیغام پہلے بھیج دیا تھا ﴿۲۸﴾

**آیت 24 تا 26** اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ...... : اللہ تعالیٰ ان دونوں فرشتوں سے فرمائے گا کہ ہر ایسے شخص کو جہنم میں پھینک دو جو سخت ناشکرا، بہت عناد رکھنے والا، خیر کو بہت روکنے والا، حد سے گزرنے والا اور شک کرنے والا ہے، جس نے اللہ کے ساتھ اور معبود بنا رکھا تھا، سو اسے شدید عذاب میں پھینک دو۔ اس میں اسے جہنم میں پھینکنے کے فیصلے کے ساتھ اس فیصلے کی وجہ اور اس کے دلائل بھی بیان فرما دیے ہیں اور یہ بھی کہ صرف ایک کو نہیں بلکہ ان جرائم کے مرتکب تمام مجرموں کو جہنم میں پھینک دو۔

**آیت 27** قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ ...... : کافر جب یہ حکم سنے گا تو کہے گا، اے میرے رب! میرا کوئی گناہ نہیں، مجھے تو میرے قرین (ساتھی) نے گمراہ کیا۔ اس کے جواب میں اس کا قرین (ساتھی) کہے گا، اے ہمارے رب! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا، بلکہ یہ خود ہی بہت دور کی گمراہی میں مبتلا تھا، میں نے اس پر کوئی زبردستی نہیں کی۔ اگر یہ خود انتہائی گمراہ نہ ہوتا تو میرے کہنے سے کبھی سرکشی اختیار نہ کرتا۔ ''قرین'' سے مراد وہ شیطان بھی ہے جو انسان کے ساتھ رہ کر اسے گمراہ کرتا رہتا ہے اور انسانوں میں سے برے ساتھی بھی جو اسے برائی کا درس دیتے اور اس پر ابھارتے رہتے ہیں۔ قیامت کے دن جب مجرم یہ بہانہ بنائے گا کہ ان لوگوں نے مجھے گمراہ کیا تو وہ اس سے صاف براءت کا اظہار کر دیں گے۔ ان گمراہ کرنے والے شیاطین الانس والجن کے اپنے گمراہ کردہ لوگوں سے بری ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۷)، اعراف، (۳۸، ۳۹)، ابراہیم (۲۱)، سبا (۳۱ تا ۳۳) اور سورۂ ص (۵۵ تا ۶۱)۔

**آیت 28** قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ : اللہ تعالیٰ ان کا جھگڑا سن کر فرمائے گا، اب یہاں میرے پاس مت جھگڑو، اس جھگڑے سے تمھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ میں نے تو تمھیں پہلے ہی رسول بھیج کر نافرمانی کی سزا سے آگاہ کر دیا تھا، مگر تم نے پروا نہیں کی، اب اپنے کفر و عناد کی سزا بھگتو۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَ مَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾

میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ہرگز کوئی ظلم ڈھانے والا نہیں ﴿۲۹﴾ جس دن ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ مزید ہے؟ ﴿۳۰﴾ اور جنت پرہیز گاروں کے لیے قریب کر دی جائے گی، جو کچھ دور نہ ہوگی ﴿۳۱﴾

آیت 29 ① مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ : یعنی میں نے جو تمھیں جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ کر دیا ہے وہ اب بدل نہیں سکتا۔ مزید دیکھیے سورۂ ص (۸۴، ۸۵) کی تفسیر۔ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ میرے پاس کوئی بات کو بدل نہیں سکتا اور نہ یہاں کسی کا جھوٹ چل سکتا ہے، کیونکہ میں تمام باتیں جانتا ہوں۔ اس کے مطابق اشارہ قرین کے یہ کہنے کی طرف ہوگا: ﴿ مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ ﴾ ''میں نے اسے سرکش نہیں بنایا۔'' (التسہیل) یعنی یہاں نہ مجرم کا جھوٹ چل سکتا ہے نہ اس کے قرین کا، دونوں ''کفار عنید'' ہیں اور ''کفار عنید'' جو بھی ہے اسے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

② وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ : یعنی اگر میں نے پہلے نہ بتایا ہوتا اور تمھیں جہنم میں ڈالتا تو یہ شدید ظلم ہوتا جو میں اپنے بندوں پر کسی صورت کرنے والا نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ آلِ عمران (۱۸۲) اور سورۂ حج (۱۰)۔

آیت 30 يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ...... : یعنی یہ سب کچھ اس دن واقع ہوگا جب ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھر گئی۔ اس کی سب سے صحیح تفسیر وہ ہے جو انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يُلْقٰى فِي النَّارِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ حَتّٰى يَضَعَ قَدَمَهٗ فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ » [ بخاري، التفسير، سورة ق، باب قوله : ﴿ وتقول هل من مزيد ﴾ : ٤٨٤٨ ] ''جہنم میں لوگ ڈالے جائیں گے اور وہ یہی کہتی رہے گی، کیا کچھ اور بھی ہے؟ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا تو وہ کہہ اٹھے گی، بس بس۔'' بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق جہنم یہ بات زبانِ حال سے کہے گی، مگر اس تاویل کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت ممکن نہ ہو اور یہاں تو ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے زبان دے رکھی ہے جس کی بولی اگر ہم نہیں سمجھتے تو پیدا کرنے والا خوب سمجھتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ [ بني إسرائيل : ٤٤ ] ''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [ حٰمٓ السجدة : ٢١ ] ''اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا۔''

آیت 31 وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ : قرآن کے عام اُسلوب کے مطابق جہنمیوں کے ساتھ اہلِ جنت کا ذکر بھی فرمایا۔ یعنی متقی لوگوں کی تکریم کے لیے جنت ان کے قریب لائی جائے گی، تاکہ انھیں چلنے کی تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾

یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع والا، خوب حفاظت کرنے والا ہو ﴿۳۲﴾ جو رحمان سے بغیر دیکھے ڈر گیا اور رجوع کرنے والا دل لے کر آیا ﴿۳۳﴾ اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہی ہمیشہ رہنے کا دن ہے ﴿۳۴﴾

''غَيْرَ بَعِيْدٍ'' کا لفظ تاکید کے لیے ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى﴾ [ طٰہٰ : ۷۹ ] ''اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے پر نہ ڈالا۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے بارش کی دعا میں فرمایا: (( نَافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ آجِلٍ )) [ أبو داوٗد، صلاۃ الاستسقاء، باب رفع الیدین في الاستسقاء : ۱۱۶۹ ] ''(اے اللہ! وہ بارش) نفع آور ہو، کسی ضرر کا باعث نہ بنے اور جلدی آئے، دیر نہ کرے۔''

**آیت 32** هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ: ''اَوَّابٍ'' ''آبَ يَؤُوْبُ أَوْبًا'' (ن) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت رجوع کرنے والا، جو ہر معاملے میں اللہ کی طرف بہت رجوع کرے اور کوئی قدم اپنی خواہش کی بنا پر نہ اٹھائے، اسی طرح ہر لغزش کے بعد اللہ کی طرف رجوع کر کے توبہ و استغفار کرے۔ ''حَفِيْظٍ'' جو اللہ کے احکامات کی خوب حفاظت اور پابندی کرنے والا ہو۔ یعنی جنتیوں سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جنت جس کا تم سے ہر ایسے شخص کے لیے وعدہ کیا جاتا تھا جو اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا، اس کے احکام کی خوب پابندی کرنے والا ہو۔

**آیت 33** ① مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ: یعنی رحمان کو دیکھے بغیر اس سے ڈرتا ہے اور اس وقت بھی ڈرتا ہے جب وہ لوگوں سے غائب ہوتا ہے، کوئی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ یہاں ایک سوال ہے کہ خشیت کے ساتھ لفظ ''رحمان'' لانے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ رحمان کا لفظ لانے میں اس شخص کی تعریف مقصود ہے کہ وہ اللہ کی رحمت اور اس کے معاف کر دینے کی صفت کا علم رکھنے کے باوجود اس سے ڈرتا ہے۔ (زمخشری) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ )) ''سات آدمی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جب اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔'' ان میں سے پانچویں کے بارے میں فرمایا: (( وَ رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّيْ أَخَافُ اللّٰهَ )) ''اور وہ آدمی ہے جسے اونچے حسب اور جمال والی عورت نے دعوت دی تو اس نے کہا میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔'' اور آخر میں فرمایا: (( وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ )) [ بخاري، الزکاۃ، باب الصدقۃ بالیمین : ۱۴۲۳ ] ''اور ایک وہ آدمی جس نے اکیلے ہونے کی حالت میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھیں بہ پڑیں۔''

② وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ: یعنی اس کے دل کا رجوع اللہ ہی کی طرف رہتا ہے۔

**آیت 34** ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ...... : یعنی ان کی عزت افزائی کے لیے کہا جائے گا کہ سلام کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿٣٥﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٦﴾

ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے اس میں ہوگا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے ﴿٣٥﴾ اور ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلیں ہلاک کر دیں، جو پکڑنے میں ان سے زیادہ سخت تھیں۔ پس انھوں نے شہروں کو چھان مارا، کیا بھاگنے کی کوئی جگہ ہے؟ ﴿٣٦﴾

سلام کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے خوف، غم اور فکر سے سلامت رہ کر اس میں داخل ہو جاؤ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں اس حال میں داخل ہو جاؤ کہ تم پر فرشتوں اور پروردگار کی طرف سے سلام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ [ یٰسٓ : ٥٨ ] ''سلام ہو۔ اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔'' اب تم ہمیشہ یہاں رہو گے، کبھی اس سے نکالے نہیں جاؤ گے۔

آیت 35 ﴿١﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حم السجدہ (٣١) اور سورۂ زخرف (٧١)۔

﴿٢﴾ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ: یعنی جو کچھ وہ چاہیں گے وہ بھی ملے گا اور ہمارے پاس مزید بھی بہت کچھ ہے، جس میں وہ چیزیں ہیں جن کا خیال تک کسی کو نہیں آیا۔ (دیکھیے سجدہ: ١٧) اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی۔ دیکھیے سورۂ یونس (٢٦)۔

آیت 36 ﴿١﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ......: ''فَنَقَّبُوْا'' نقب کا معنی سوراخ ہے۔ ''نَقَبَ (ن) فِي الْأَرْضِ'' زمین میں گھوما پھرا۔ ''نَقَّبَ تَنْقِيْبًا'' (تفعیل) میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ ہے، خوب گھوما پھرا۔ نقب (سوراخ) کی مناسبت سے ''فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ'' کا ترجمہ کیا گیا ہے: ''پس انھوں نے شہروں کو چھان مارا۔'' اس سے پہلے کفار کو آخرت میں دیے جانے والے عذاب کا ذکر فرمایا، درمیان میں ایمان والوں کے حسن انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب کفار کو دنیا میں دیے جانے والے ہولناک عذابوں کا ذکر فرمایا۔ مقصود کفار کو ڈرانا اور رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کو تسلی دلانا ہے کہ وہ کفار کی شان و شوکت سے مرعوب نہ ہوں۔

﴿٢﴾ یعنی ہم نے ان کفار سے پہلے بہت سی نسلیں ہلاک کر دیں جو گرفت میں ان سے بہت سخت اور ان سے زیادہ قوت والی تھیں، جیسا کہ قومِ نوح، عاد، ثمود اور قومِ فرعون وغیرہ۔ تو ان کے مقابلے میں ان بے چاروں کی کیا بساط ہے؟ مزید دیکھیے سورۂ روم (٩)۔

﴿٣﴾ فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ: یعنی وہ اہلِ مکہ سے تجارت اور کاروبار میں بھی بہت آگے تھے، چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے لیے دنیا کے شہروں کو چھان مارا تھا۔ بعض اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے ملک ہی پر قوت و گرفت نہیں رکھتے تھے بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی جا گھسے تھے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ ۝۳۷ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖۗ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝۳۸

بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے یقیناً نصیحت ہے جس کا کوئی دل ہو، یا کان لگائے، اس حال میں کہ وہ (دل سے) حاضر ہو ۝۳۷ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے نہیں چھوا ۝۳۸

④ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ: ''مَحِيْص'' ''حَاصَ يَحِيْصُ حَيْصًا'' سے ظرف ہے، بھاگنے کی جگہ۔ یعنی جب ان پر عذاب آیا تو وہ اس سے بھاگنے کی جگہ ڈھونڈتے پھرے کہ کیا بھاگنے کی کوئی جگہ ہے، مگر انھیں کہیں جائے پناہ نہ ملی۔

**آیت 37** اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ...... : ''قَلْبٌ'' نکرہ ہے، اس لیے ترجمہ ''کوئی دل'' کیا گیا ہے۔ نصیحت حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہیں، یا تو آدمی خود غور وفکر کرے اور عقل سے کام لے یا کسی خیر خواہ کی بات توجہ سے سن کر اس پر عمل کر لے۔ یعنی اس سورت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے نصیحت وہی حاصل کر سکتا ہے جو کوئی دل رکھتا ہو جس کے ساتھ اس پر غور وفکر کرے۔ ''کوئی دل'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل کے ساتھ معمولی سا غور وفکر بھی کرے، یا دل کی حاضری کے ساتھ ان آیات کو سن لے۔ مگر کفار کا حال یہ ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ [ الأعراف : ۱۷۹ ] ''ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں۔'' اور قیامت کے دن وہ خود تسلیم کریں گے: ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [ الملك: ۱۰ ] ''اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں سے نہ ہوتے۔''

**آیت 38** ① وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ...... : قیامت کی دلیل کے طور پر آسمان و زمین کے پیدا کرنے کا دوبارہ ذکر فرمایا کہ بلاشبہ یقیناً ہم نے یہ سارے آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا کیے اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے چھوا تک نہیں، تو ہم انسان کو دوبارہ کیوں زندہ نہیں کر سکتے؟ یہی بات پہلے فرمائی تھی: ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ [ قٓ : ۱۵ ] ''تو کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کرنے کے ساتھ تھک کر رہ گئے ہیں؟'' دوبارہ اس لیے ذکر فرمائی کہ بار بار دہرانے سے بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔

② وَ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ: اس میں یہود و نصاریٰ کا رد بھی ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا اور ساتویں دن آرام کیا۔ کتاب مقدس میں تورات کے سفر التکوین (۲:۲) کے الفاظ ہیں: ''فَاسْتَرَاحَ فِي الْيَوْمِ السَّابِعِ'' یعنی ''ساتویں دن میں آرام کیا۔''

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾

سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر ﴿۳۹﴾ اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کی تسبیح کر اور سجدے کے بعد کے اوقات میں بھی ﴿۴۰﴾ اور کان لگا کر سن جس دن پکارنے والا ایک قریب جگہ سے پکارے گا ﴿۴۱﴾

**آیت 39، 40** ① **فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ** ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۰) کی تفسیر۔

② **وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ** : صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا : « أَمَرَهُ أَنْ يُسَبِّحَ فِيْ أَدْبَارِ الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا يَعْنِيْ قَوْلَهُ : ﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ » [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ و سبح بحمد ربك ﴾ : ۴۸۵۲ ] "**وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ**" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ تمام نمازوں کے بعد تسبیح پڑھا کریں۔" ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "جو شخص ہر نماز کے بعد تینتیس (۳۳) دفعہ سبحان اللہ، تینتیس (۳۳) دفعہ الحمد للہ اور تینتیس (۳۳) دفعہ اللہ اکبر کہے تو یہ ننانوے (۹۹) ہو گئے اور سو (۱۰۰) پورا کرنے کے لیے کہے : « لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ » تو اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں، خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔" [ مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة ...... : ۵۹۷ ]

**آیت 41** ① **وَ اسْتَمِعْ** ...... : پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بے ہودہ گوئی پر صبر اور اپنی تسبیح و تحمید کا حکم دیا، اس آیت میں آپ کی تسلی کے لیے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ تھوڑا صبر کریں ان کی جزا کے لیے قیامت کا دن آیا ہی چاہتا ہے۔ ابن عطیہ نے "**اسْتَمِعْ**" کا معنی "اِنْتَظِرْ" کیا ہے، یعنی صبر کے ساتھ اس دن کا انتظار کریں۔ اگر اس کا لفظی معنی "کان لگا کر سن" کیا جائے تو اس سے مراد بھی آپ کو تسلی دینا ہے کہ قیامت اتنی قریب ہے کہ گویا اس میں پکارنے والے کی منادی کی آواز آپ کے کانوں میں آ رہی ہے۔ زمخشری نے فرمایا : "**وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ**" کا مطلب یہ ہے کہ کان لگا کر سن قیامت کے دن کا حال جو میں تمھیں بتانے لگا ہوں۔"

② **يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ** : اس سے مراد صور میں دوسری دفعہ پھونکے جانے کا وقت ہے، جب فرشتہ صور میں پھونک مار کر سب لوگوں کو قبروں سے نکل کر محشر میں جمع ہو جانے کے لیے آواز دے گا۔ دیکھیے سورۂ قمر (۶ تا ۸)۔

③ **مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ** : یعنی قبروں میں پڑے ہوئے ہر شخص کو وہ آواز بالکل قریب سے آتی ہوئی سنائی دے گی۔ موجودہ سائنسی ایجادات سے یہ بات سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ اِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾

ع ۱۶ / ۱۴

جس دن وہ چیخ کو حق کے ساتھ سنیں گے، یہ نکلنے کا دن ہے ﴿۴۲﴾ یقیناً ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ﴿۴۳﴾ جس دن زمین ان سے پھٹے گی، اس حال میں کہ وہ تیز دوڑنے والے ہوں گے، یہ ایسا اکٹھا کرنا ہے جو ہمارے لیے نہایت آسان ہے ﴿۴۴﴾ ہم اسے زیادہ جاننے والے ہیں جو یہ کہتے ہیں اور تو ان پر کوئی زبردستی کرنے والا نہیں، سو قرآن کے ساتھ اس شخص کو نصیحت کر جو میرے عذاب کے وعدے سے ڈرتا ہے ﴿۴۵﴾

**آیت 42** يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ...... : یعنی تمام لوگ وہ ہولناک آواز سنیں گے۔ "بِالْحَقِّ" کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات مجازاً نہیں کہی جا رہی بلکہ وہ اس ہولناک چیخ کو حقیقتاً، فی الواقع اور یقیناً سنیں گے۔ یہ بات اتنی تاکید کے ساتھ اس لیے فرمائی کہ کفار اس کا انکار کرتے تھے اور اسے ناممکن قرار دیتے تھے۔

**آیت 43** اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ...... : یعنی دنیا میں مسلسل زندگی اور موت کا سلسلہ صرف ہمارے ہاتھ میں ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ ہم بے شمار لوگوں کو زندگی بخشتے ہیں اور موت دے دیتے ہیں، پھر اور لوگوں کو زندگی عطا کرتے ہیں اور موت بھی دیتے ہیں۔ اسی طرح لاتعداد مخلوقات پیدا ہوتی اور مرتی چلی جا رہی ہیں اور آخر کار ان سب کو ہماری طرف ہی واپس آنا ہے۔

**آیت 44** ① يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا : "سِرَاعًا" "سَرِيْعٌ" کی جمع ہے۔ "يَوْمَ" "اِلَيْنَا الْمَصِيْرُ" کا ظرف ہے، یعنی ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اس دن جب زمین ان سے پھٹے گی اور وہ اس سے نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے نکلیں گے۔

② ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ : یہ کفار کی اس بات کا جواب ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو چکے تو کیا اس وقت ہمیں زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا؟ یہ تو عقل سے بعید اور ناممکن ہے۔ فرمایا یہ حشر یعنی سب اگلے پچھلے انسانوں کو ایک آواز کے ساتھ اکٹھا کر لینا ہمارے لیے بالکل آسان ہے۔

**آیت 45** ① نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ : یہ جملہ کفار کے لیے وعید اور دھمکی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی و تشفی کا باعث ہے۔

② وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ : یعنی آپ کا کام یہ نہیں کہ انھیں زبردستی مسلمان بنا لیں، آپ کا کام صرف پیغام پہنچانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ؕ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ [ الغاشیة : ۲۱، ۲۲ ] "تو صرف نصیحت کرنے والا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الذّٰریٰت ۵۱ — آیاتہا ۶۰ — رکوعاتہا ۳

وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝۱ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو اڑا کر بکھیرنے والی ہیں! ۝۱ پھر ایک بھاری بوجھ (بادل) کو اٹھانے والی ہیں ۝۲

ہے۔ تو ہرگز ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے۔‘‘

❸ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ: ’’وَعِيْدِ‘‘ اصل میں ’’وَعِيْدِيْ‘‘ ہے، میری وعید۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ دوسروں کو نصیحت نہ کریں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نصیحت سے فائدہ وہی اٹھائے گا جو میری وعید سے ڈرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ [ فاطر : ۱۸ ] ’’تُو تو صرف ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔‘‘

## سورۃ الذاریات

آیت 1 ❶ وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا: قسم کا مقصد کسی بات کی تاکید اور اسے سچا ثابت کرنا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی قسمیں دراصل اپنے جواب قسم کی دلیل اور شاہد ہیں جنھیں قسم کی صورت میں لایا گیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے حق ہونے کی دلیل کے طور پر چار قسمیں اٹھائی ہیں۔

❷ وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا: ’’الذّٰرِيٰتِ‘‘ ’’ذَرَا يَذْرُوْ ذَرْوًا‘‘ سے اسم فاعل ’’ذَارِيَةٌ‘‘ کی جمع ہے۔ اس کا معنی ’’ہوا کا کسی چیز کو اڑانا اور بکھیرنا‘‘ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ﴾ [ الکھف : ۴۵ ] ’’پھر وہ چورا بن گئی، جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں۔‘‘ ’’ذَرْوًا‘‘ مفعول مطلق ہے جو ’’الذّٰرِيٰتِ‘‘ کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ ’’الذّٰرِيٰتِ‘‘ کا لفظی معنی ہے اڑانے والیاں۔ اب ان اڑانے والیوں سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کا اتفاق ہے کہ ان سے مراد ہوائیں ہیں جو تیز چلتی ہیں تو گرد و غبار اور خس و خاشاک کو اڑا کر بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔

آیت 2 فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا: ’’وِقْرًا‘‘ بوجھ، اس پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، بھاری بوجھ۔ یہ بھی ہواؤں ہی کی صفت ہے کہ پھر وہ ہوائیں سورج کی حرارت کے ساتھ سمندر سے اٹھنے والے آبی بخارات سے بننے والے کروڑوں اربوں ٹن وزنی بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عربی زبان میں عام طور پر جب صفات کا عطف فاء کے ساتھ ہو تو ایک تو وہ سب ایک ہی موصوف کی صفتیں ہوتی ہیں، دوسرا ان میں ترتیب ہوتی ہے، جیسا کہ سورۂ عادیات میں ہے: ﴿ وَ الْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴾ [ العادیات : ۱ تا ۵ ] ’’قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پیٹ اور سینے سے آواز نکالتے ہوئے دوڑنے والے ہیں! پھر جو سم مار کر چنگاریاں نکالنے والے

فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝۳ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶

**پھر آسانی سے چلنے والی ہیں ۝۳ پھر ایک بڑے کام (بارش) کو تقسیم کرنے والی ہیں ۝۴ کہ بلاشبہ جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے یقیناً سچا ہے ۝۵ اور بلاشبہ جزا یقیناً واقع ہونے والی ہے ۝۶**

ہیں! پھر جو صبح کے وقت حملہ کرنے والے ہیں! پھر اس کے ساتھ غبار اڑاتے ہیں۔ پھر وہ اس کے ساتھ بڑی جماعت کے درمیان جا گھستے ہیں۔'' یہاں فاء کے ساتھ عطف سے ظاہر ہے کہ یہ اور اس کے بعد آیات میں مذکور سب صفات ہواؤں ہی کی ہیں۔

آیت 3 فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا: یہ بھی ان ہواؤں ہی کی صفت ہے کہ پھر وہ اتنے بے حساب وزنی بادلوں کو اٹھا کر آسانی کے ساتھ چلتی ہیں، انھیں اس بوجھ کی وجہ سے چلنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔

آیت 4 فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا: یہ بھی وہ ہوائیں ہی ہیں جو بھاری بادلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے انھیں اللہ کے حکم سے زمین کے مختلف حصوں میں لے جا کر ان کے حصے کی بارش برساتی ہیں، جس سے مردہ زمین زندہ ہوتی ہے اور ہر علاقے کے لوگوں میں ان کا رزق تقسیم ہوتا ہے۔

آیت 5، 6 ❶ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ...... : یہاں ''اِنَّمَا'' اکٹھا لفظ نہیں جو کلمۂ حصر ہے اور جس کا معنی ہے ''اس کے سوا نہیں'' بلکہ اس میں ''اِنَّ'' حرف تاکید الگ ہے اور ''مَا'' الگ ہے جو اسم موصول ہے اور اس کا معنی ہے ''وہ جو۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں رسم الخط پوری طرح ضبط نہیں ہوا تھا، انھوں نے ان دونوں کو اکٹھا لکھ دیا، تو بعد میں امت نے قرآن مجید کی حفاظت کا اتنا زبردست اہتمام کیا کہ صحابہ نے جو لفظ جس طرح لکھا تھا قرآن مجید کے رسم الخط میں اسے اسی طرح باقی رکھا گیا۔

❷ یعنی ان چاروں صفات کی حامل ہوائیں شاہد ہیں کہ تم سے دوبارہ زندہ کیے جانے اور قبروں سے نکل کر اللہ کے سامنے پیش ہونے کا جو وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً سچا ہے اور ہر عمل کی جزا بلاشبہ یقیناً واقع ہونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ہواؤں کی مُردوں کے زندہ کرنے پر دلالت کو ایک اور آیت میں خوب واضح فرمایا ہے، فرمایا: ﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ [الأعراف: ۵۷] ''اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں، پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کئی پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' قرآن مجید نے بارش کے ساتھ مردہ زمین کے زندہ کرنے کو قیامت کے دن مُردوں کو زندہ

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸

قسم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے! ۝۷ کہ بلاشبہ تم یقیناً ایک اختلاف والی بات میں پڑے ہوئے ہو ۝۸

کرنے کی دلیل کے طور پر بار بار بیان فرمایا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ فاطر (۹) اور سورۂ روم (۴۸ تا ۵۰)۔

**آیت 7** **وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ**: "حَبَكَ يَحْبُكُ حَبْكًا" (ن، ض) کسی چیز کو باندھنا، مضبوط بنانا، جولاہے کا کپڑے کو مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ بننا۔ "**الْحُبُكِ**" "حَبِيْكَةٌ" کی جمع ہے۔ "حُبُكُ الرَّمْلِ وَالْمَاءِ وَالشَّعْرِ" ٹھہرے ہوئے پانی یا ریت پر ہوا سے جو لہریں سی بن جاتی ہیں، گھونگھریالے بالوں کی لہریں۔ "حُبُكُ السَّمَاءِ" آسمان میں ستاروں کے راستے۔ (قاموس)

**آیت 8** **اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ**: یعنی یہ آسمان جو نہایت مضبوط و مستحکم اور بے حد خوبصورت ہے، جس میں ستاروں کے راستے ہیں اور جو بادلوں کی لہروں سے آراستہ ہے، شاہد ہے کہ تم ایسی بات میں پڑے ہوئے ہو جس میں تمھارا بہت اختلاف ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس میں آسمان کی شہادت کیسے ہے اور یہ کہنے سے حاصل کیا ہے کہ تم ایسی بات میں پڑے ہوئے ہو جس میں بہت اختلاف ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اتنا مستحکم و مضبوط، بلند و بالا، خوبصورت اور مزین آسمان شاہد ہے کہ اس کے بنانے والے کے لیے قیامت برپا کرنا اور تمھیں دوبارہ زندہ کرنا کچھ مشکل نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا﴾ [النازعات: ۲۷] "کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔" رہا یہ سوال کہ جواب قسم "**اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ**" کی مناسبت قسم کے ساتھ کیا ہے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ دراصل یہاں بات مختصر کی گئی ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مضبوط و مستحکم آسمان کی قسم کھا کر فرمایا کہ اے گروہ کفار! اس آسمان کی قسم ہے کہ قیامت کے متعلق اللہ کا قول حق اور تمھارا قول باطل ہے، کیونکہ تم ایسے قول میں پڑے ہوئے ہو جو باہم مختلف اور متناقض ہے، جب کہ حق میں اختلاف نہیں ہوتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ [النساء: ۸۲] "اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔" چنانچہ تم میں سے کوئی تو کہتا ہے کہ یہ دنیا ایسے ہی چلی آئی ہے، کچھ لوگ مرتے ہیں اور دوسرے پیدا ہوتے ہیں، نہ آج تک کوئی دوبارہ آیا نہ کوئی دوبارہ زندگی ہے۔ کوئی تناسخ کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ اچھے اور برے اعمال کا بدلا تو لازم ہے مگر اس کے لیے کوئی دن مقرر نہیں، بلکہ انسان دنیا میں بار بار اچھی یا بری مخلوق کی صورت میں جنم لیتا رہتا ہے۔ کوئی آخرت کو تو مانتا ہے مگر کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ ایسی زور آور ہیں کہ اپنی شفاعت کے ساتھ اس دن اپنے نام لیواؤں کو زبردستی چھڑا لیں گی۔ یہ اختلاف دلیل ہے کہ قیامت کے متعلق تمھارا قول باطل ہے۔ قیامت کے متعلق کفار کے اختلاف کا ذکر سورۂ نبا کے شروع میں بھی فرمایا: ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ﴾ [النبا: ۱ تا ۳] "کس چیز کے بارے میں وہ آپس میں سوال کر رہے ہیں؟ (کیا) اس بڑی خبر کے بارے میں؟ وہ کہ جس میں وہ اختلاف کرنے والے ہیں۔"

يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴿٩﴾ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿١١﴾ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٢﴾

اس (قیامت) سے وہی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے سے) بہکایا گیا ہے ⑨ اٹکل لگانے والے مارے گئے ⑩ وہ جو خود بڑی غفلت میں بھولے ہوئے ہیں ⑪ پوچھتے ہیں جزا کا دن کب ہے؟ ⑫

**آیت 9** يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ: ”عَنْهُ“ کی ضمیر کا مرجع یا تو ”اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ“ میں لفظ ”الدِّيْنَ“ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اس (قیامت) سے وہی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے ہی) بہکایا گیا ہو، کسی صحیح الدماغ آدمی کو اس سے پھیرا اور بہکایا نہیں جا سکتا۔ یا ”عَنْهُ“ کی ضمیر کا مرجع ”قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ“ ہے، اس صورت میں ”عَنْ“ تعلیل کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ یقیناً تم ایک اختلاف والی بات میں پڑے ہوئے ہو جس کی وجہ سے وہی آدمی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے ہی) بہکایا گیا ہو، ایسی مختلف باتوں کی وجہ سے کسی صحیح دماغ والے کو بہکایا نہیں جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ ”عَنْ“ کے معانی میں سے تعلیل مسلّم معنی ہے، اس معنی کی مثال یہ آیت ہے: ﴿وَ مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ﴾ [ هود : ۵۳ ] ”اور ہم اپنے معبودوں کو تیرے کہنے کی وجہ سے ہرگز چھوڑنے والے نہیں۔“

**آیت 10** قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ: ”خَرَصَ يَخْرُصُ خَرْصًا“ (ن) اندازہ لگانا، اٹکل لگانا، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ [ الزخرف : ۲۰ ] ”وہ تو صرف اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔“ ”خَرَّاصٌ“ مبالغے کا صیغہ ہے، بہت اٹکل لگانے والا۔ کفار کے پاس آسمانی ہدایت کی روشنی نہیں اس لیے وہ علم اور یقین سے محروم ہیں، ان کا سارا دارو مدار ظن وتخمین اور وہم و گمان پر ہے۔ چنانچہ شرک کی بنیاد سراسر گمان اور اندازوں پر ہے (دیکھیے نجم: ۲۳، ۲۸) اور قیامت کا انکار بھی محض خرص وتخمین (اٹکل اور اندازوں) پر ہے۔ ظاہر ہے اٹکل اور اندازوں کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں، اس لیے فرمایا، اٹکل لگانے والے مارے گئے۔

**آیت 11** الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ: ”غَمَرَ يَغْمُرُ غَمْرًا“ (ن) ”اَلْمَاءُ“ کا معنی ”پانی کا کسی چیز کو ڈھانپ لینا“ ہے، اس لیے گہرے پانی کو ”غَمْرَةٌ“ کہتے ہیں۔ سختی اور موت کو اور جہالت وغفلت کو بھی ”غَمْرَةٌ“ کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی آدمی کی عقل کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ ”غَمْرَةٍ“ پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی غفلت“ کیا گیا ہے۔ ”سَاهُوْنَ“ ”سَهَا يَسْهُوْ سَهْوًا“ (ن) سے اسم فاعل کی جمع ہے، بھولے ہوئے۔ یعنی انھوں نے آخرت کا انکار محض خیال اور اندازے کی بنا پر کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس کی تیاری سے بہت بڑی غفلت میں مبتلا ہو کر اپنے خوفناک انجام کو بھولے ہوئے ہیں۔

**آیت 12** يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ: یعنی جب انھیں قیامت کے انکار کی کوئی معقول دلیل نہیں ملتی تو وہ کہتے ہیں، اچھا یہ بتاؤ جزا کا دن کب ہے؟ ظاہر ہے ان کا یہ سوال محض انکار اور استہزا کے لیے ہے، کیونکہ تاریخ کا تعیّن کوئی دلیل نہیں

يَوۡمَ هُمۡ عَلَى النَّارِ يُفۡتَنُوۡنَ ۝۱۳ ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَكُمۡ ؕ هٰذَا الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ۝۱۴ اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوۡنٍ ۝۱۵ اٰخِذِيۡنَ مَاۤ اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِكَ مُحۡسِنِيۡنَ ۝۱۶

جس دن وہ آگ پر تپائے جائیں گے ۝۱۳ اپنے جلنے کا مزہ چکھو، یہی ہے جسے تم جلدی مانگتے تھے ۝۱۴ بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے ۝۱۵ لینے والے ہوں گے جو ان کا رب انھیں دے گا، یقیناً وہ اس سے پہلے نیکی کرنے والے تھے ۝۱۶

جس سے کوئی منکر اقرار پر آمادہ ہو جائے، بلکہ اس کے بعد ان کا اگلا سوال یہ ہوگا کہ اس کے آنے سے پہلے آخر ہم یہ یقین کیسے کر لیں کہ اس دن وہ واقعی آ جائے گی؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کا وقت نہیں بتایا۔

آیت 13 ﴿ يَوۡمَ هُمۡ عَلَى النَّارِ يُفۡتَنُوۡنَ : "فَتَنَ يَفْتِنُ" (ن،ض) کا معنی آزمانا بھی ہے اور جلانا بھی۔ کھرے یا کھوٹے کی پہچان کے لیے سونے کو آگ میں پگھلایا جائے تو کہتے ہیں: "فَتَنْتُ الذَّهَبَ." فرمایا، وہ روزِ جزا اس دن ہوگا جب انھیں آگ پر رکھ کر تپایا اور جلایا جائے گا۔

آیت 14 ﴿ ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَكُمۡ ...... : یہ بات انھیں ذلیل کرنے کے لیے بطور طنز کہی جائے گی۔

آیت 13 ﴿ اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوۡنٍ : مکذبین کے بعد متقین کا ذکر فرمایا۔ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حجر کی آیت (۴۵) کی تفسیر۔ آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جنتوں میں داخلے کا سبب تقویٰ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ تِلۡكَ الۡجَـنَّةُ الَّتِىۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِيًّا ﴾ [ مریم : ٦٣ ] "یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو بہت بچنے والا ہو۔"

آیت 14 ﴿ ❶ اٰخِذِيۡنَ مَاۤ اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ : اس کے لفظی معنی اگرچہ یہی ہیں کہ "وہ لینے والے ہوں گے جو ان کا رب انھیں دے گا" مگر موقع و محل کی مناسبت اور "اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ" کے لفظ کے تقاضے سے ظاہر ہے کہ یہاں صرف لینا ہی مراد نہیں بلکہ مراد ان کے رب کا انھیں بے حساب دینا اور ان کا اس سے جی بھر کر خوشی خوشی لینا ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ لِأَهْلِ الْجَنَّةِ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَقُوْلُوْنَ لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ، فَيَقُوْلُ هَلْ رَضِيْتُمْ؟ فَيَقُوْلُوْنَ وَ مَا لَنَا لَا نَرْضٰى يَا رَبِّ! وَقَدْ أَعْطَيْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ؟ فَيَقُوْلُ أَلَا أُعْطِيْكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ ؟ فَيَقُوْلُوْنَ يَا رَبِّ! وَ أَيُّ شَيْءٍ أَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ ؟ فَيَقُوْلُ أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِيْ فَلَا أَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهُ أَبَدًا » [ بخاري، التوحيد، باب كلام الرب مع أهل الجنة : ٧٥١٨ ] "اللہ تعالیٰ اہلِ جنت سے کہے گا: "اے جنت والو!" وہ کہیں گے: "ہم حاضر ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں اور ساری خیر

## كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

**وہ رات کے بہت تھوڑے حصے میں سوتے تھے ﴿۱۷﴾**

تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔'' فرمائے گا: ''کیا تم راضی ہو گئے؟'' وہ کہیں گے: ''ہمیں کیا ہے کہ ہم راضی نہ ہوں جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں کیا۔'' فرمائے گا: ''کیا میں تمھیں اس سے بھی افضل چیز نہ دوں؟'' وہ کہیں گے: ''اے ہمارے رب! بھلا اس سے افضل چیز کیا ہے؟'' فرمائے گا: ''میں تمھیں اپنی رضا اور خوشنودی عطا کرتا ہوں، سو اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا۔''

② **اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ:** ''اِنَّ'' تعلیل کے لیے ہوتا ہے، یعنی یہ نعمت انھیں اس لیے ملے گی کہ وہ اس سے پہلے دنیا میں احسان کرنے والے تھے۔ احسان کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی ہے: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ )) [ بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ : ۵۰ ] ''(احسان یہ ہے) کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، سو اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو یقیناً وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔'' ''**مُحْسِنِيْنَ**'' کا لفظی معنی ''عَامِلِيْنَ الْحَسَنَاتِ'' ہے، یعنی وہ نیکیاں کرنے والے تھے۔ آگے ان نیکیوں کی کچھ تفصیل ہے۔

**آیت 17** **كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ:** ''هَجَعَ يَهْجَعُ هُجُوْعًا'' (ف) سونا، رات کا سونا، ہلکا سا سونا، تینوں معنوں میں آتا ہے۔ ''**مَا يَهْجَعُوْنَ**'' کے دو معنی کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ ''مَا'' مصدریہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ رات میں سے بہت تھوڑا حصہ سوتے تھے۔ ابن کثیر نے یہ مطلب احنف بن قیس، حسن بصری اور زہری سے نقل فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مزمل میں فرمایا: ﴿ **يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا** ﴾ [ المزمل : ۱ تا ۴ ] ''اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات کو قیام کر مگر تھوڑا۔ آدھی رات (قیام کر)، یا اس سے تھوڑا کم کر لے۔ یا اس سے زیادہ کر لے اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔'' ان آیات کے نازل ہونے پر آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ ایک سال تک اس پر عمل کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مزمل کا آخری حصہ نازل کیا، جس میں فرمایا: ﴿ **اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ٭ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ** ﴾ [ المزمل : ۲۰ ] ''بلاشبہ تیرا رب جانتا ہے کہ تو رات کے دو تہائی کے قریب اور اس کا نصف اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتا ہے اور ان لوگوں کی ایک جماعت بھی جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ اس نے جان لیا کہ تم ہرگز اس کی طاقت نہیں رکھو گے، سو اس نے تم پر مہربانی فرمائی تو قرآن میں سے جو میسر ہو پڑھو، اس نے جان لیا کہ یقیناً تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں لڑیں گے، پس اس میں سے جو میسر ہو پڑھو۔'' تو صحیح مسلم (۷۴۶) میں مذکور

عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق قیام اللیل جو فرض تھا، نفل ہو گیا اور اس میں تخفیف ہو گئی اور رات کے اکثر حصے کے بجائے حکم ہوا: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ کہ جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کر لو۔ اس آیت کی تفسیر اور قیام اللیل کی فضیلت کے لیے سورۂ مزمل کی ابتدائی اور آخری آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

" كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ " کا مطلب اگر یہ کیا جائے کہ جنت میں وہ متقی جائیں گے جو رات کا تھوڑا حصہ سوتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دائمی عمل سے اس مطلب کی تائید نہیں ہوتی۔ ہاں، مندرجہ ذیل حدیث کو سامنے رکھا جائے تو " مَا يَهْجَعُوْنَ " کا یہ مطلب بالکل درست ہے۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: (( مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ ، وَ مَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ )) [ مسلم، المساجد و مواضع الصلاۃ، باب فضل صلاۃ العشاء والصبح في جماعۃ : ۶۵۶ ] "جو شخص عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جو شخص صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے ساری رات قیام کیا۔" مزید بحث سورۂ سجدہ کی آیت (۱۶): ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

" مَا يَهْجَعُوْنَ " کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس میں " مَا " نافیہ ہے۔ ابن کثیر نے یہ مطلب ابن عباس، مطرف بن عبد اللہ اور مجاہد سے نقل فرمایا ہے اور تفسیر ابن کثیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے طبری اور دوسری کتابوں میں مذکور ان کی سندوں کو حسن یا صحیح قرار دیا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ اور ابو جعفر باقر کے اقوال بھی اسی پر مبنی ہیں کہ " مَا " نافیہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (( لَمْ تَكُنْ تَمْضِيْ عَلَيْهِمْ لَيْلَةٌ إِلَّا يَأْخُذُوْنَ مِنْهَا وَ لَوْ شَيْئًا )) [ ابن کثیر : ۴۱۷/۷ ] "یعنی ان پر جو رات بھی گزرتی تھی اس میں سے کچھ نہ کچھ حصہ لیتے تھے خواہ تھوڑا ہی ہو۔" مطرف بن عبد اللہ نے فرمایا: " قَلَّ لَيْلَةٌ لَا تَأْتِيْ عَلَيْهِمْ إِلَّا يُصَلُّوْنَ فِيْهَا لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ ، إِمَّا مِنْ أَوَّلِهَا وَ إِمَّا مِنْ أَوْسَطِهَا " [ ابن کثیر : ۴۱۷/۷ ] "ان پر کم ہی کوئی رات آتی تھی مگر وہ اس میں اللہ عزوجل کے لیے نماز پڑھتے تھے، یا اس کے شروع میں یا اس کے درمیان میں۔" مجاہد نے فرمایا: " قَلَّ مَا يَرْقُدُوْنَ لَيْلَةً حَتَّى الصَّبَاحِ لَا يَتَهَجَّدُوْنَ " [ ابن کثیر : ۴۱۷/۷ ] "کم ہی کوئی رات ہوتی تھی جس میں وہ صبح تک سوئے رہیں اور تہجد نہ پڑھیں۔" انس بن مالک اور ابو العالیہ نے فرمایا: " كَانُوْا يُصَلُّوْنَ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَ الْعِشَاءِ " [ ابن کثیر : ۴۱۷/۷ ] "وہ مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے تھے۔" اور ابو جعفر باقر نے فرمایا: " كَانُوْا لَا يَنَامُوْنَ حَتّٰى يُصَلُّوا الْعَتَمَةَ " [ ابن کثیر : ۴۱۷/۷ ] "وہ جب تک عشاء نہ پڑھ لیتے سوتے نہیں تھے۔"

" مَا يَهْجَعُوْنَ " میں " مَا " کو نافیہ ماننے کی صورت میں ترجمہ ہو گا "وہ سوتے نہیں تھے" یعنی جاگتے تھے۔ اس کے مطابق آیت کا ترجمہ، تفسیر اور اس پر حاشیہ تفسیر ثنائی سے نقل کیے جاتے ہیں۔ ترجمہ ہے: "یہ لوگ راتوں کو کسی قدر جاگا کرتے اور صبح کے وقت خدا سے بخشش مانگا کرتے تھے۔" تفسیر ہے: "ان کی نیکی کا نمونہ یہ ہے کہ یہ لوگ راتوں کو بغرض عبادت کسی قدر جاگا کرتے اور تہجد کے بعد یا شب خیزی کے بعد صبح کے وقت خدا سے بخشش مانگا کرتے تھے۔ یعنی صبح سے پہلے تھوڑی رات رہتے اٹھتے تھے اور خدا کی یاد جتنی بھی ہو سکے کر کے صبح سویرے اپنے لیے اور اپنے ماں باپ کے لیے بلکہ جملہ مومنین کے لیے استغفار کرتے تھے۔" حاشیہ ہے: " مَا يَهْجَعُوْنَ " میں دو لفظ ہیں۔ " هَجَعَ " کے معنی ہیں رات کی نیند۔

وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ⑱ وَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ⑲ وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ⑳

اور رات کی آخری گھڑیوں میں وہ بخشش مانگتے تھے ⑱ اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم کے لیے ایک حصہ تھا ⑲ اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں ⑳

قاموس میں ہے: "اَلْهُجُوْعُ النَّوْمُ لَيْلًا." "مَا" نافیہ ہے، پس معنی یہ ہیں "رات کو تھوڑا سا وقت نیند ترک کر دیتے تھے۔" وہ تھوڑا سا وقت چاہے نماز تہجد کا ہو، جیسے سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ [ بني إسرائيل: ۷۹ ] یا نماز عشاء کا ہو، جیسے: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ [ هود: ۱۱۴ ] میں "زُلَفًا" سے مراد عشاء کی نماز ہے، ممکن ہے یہی مراد "مَا يَهْجَعُوْنَ" سے ہو۔ (واللہ اعلم)" (ثنائی)

معارف القرآن میں ہے: "﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ میں "يَهْجَعُوْنَ" "هُجُوْعٌ" سے مشتق ہے، جس کے معنی رات کو سونے کے آتے ہیں۔ اس میں مومنین متقین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے ہیں، سوتے کم ہیں جاگتے زیادہ ہیں اور یہ وقت نماز و عبادت میں گزارتے ہیں۔ یہ تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے اور حسن بصری سے یہی منقول ہے کہ متقین حضرات رات کو جاگنے اور عبادت کرنے کی مشقت اٹھاتے ہیں اور بہت کم سوتے ہیں۔ اور ابن عباس اور قتادہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جملے کا مطلب حرف "مَا" کو اس میں نفی کے لیے قرار دے کر یہ بتلایا ہے کہ "رات کو تھوڑا سا حصہ ان پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں، بلکہ عبادت و نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سب لوگ اس کا مصداق ہو جاتے ہیں جو رات کے کسی بھی حصہ میں عبادت کر لیں، خواہ شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں۔ اسی لیے انس اور ابو العالیہ نے اس کا مصداق ان لوگوں کو قرار دیا جو مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں اور امام ابو جعفر باقر نے فرمایا کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سوئیں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ (ابن کثیر)"

**آیت 18** ﴿وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾: "اَسْحَارٌ" "سَحَرٌ" (سین اور حاء کے فتحہ کے ساتھ) رات کا آخری حصہ۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِيْنَ يَبْقٰى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرُ يَقُوْلُ مَنْ يَّدْعُوْنِيْ فَأَسْتَجِيْبَ لَهٗ؟ مَنْ يَّسْأَلُنِيْ فَأُعْطِيَهٗ؟ مَنْ يَّسْتَغْفِرُنِيْ فَأَغْفِرَ لَهٗ؟» [ بخاري، التهجد، باب الدعاء والصلاة من آخر الليل: ۱۱۴۵ ] "ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات، جب رات کا آخری ثلث باقی رہ جاتا ہے، آسمان دنیا کی طرف اترتا ہے اور فرماتا ہے: "کون ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے تو میں اسے بخشوں؟"

**آیت 19** ﴿وَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ﴾: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ معارج (۲۴، ۲۵) کی تفسیر۔

**آیت 20** ① ﴿وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ﴾: شروع سورت میں چار طرح کی ہواؤں کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ قیامت حق

# وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ١ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۝۲۱

اور تمھارے نفسوں میں بھی، تو کیا تم نہیں دیکھتے؟ (۲۱)

ہے، پھر اس پر آسمان کی قسم اٹھائی۔ اب ''واؤ'' کے ذریعے سے اسی کے ساتھ سلسلہ کلام جوڑ کر فرمایا: ''اور زمین میں بھی یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔'' یہ وہی استدلال ہے جو قرآن میں قیامت حق ہونے کے لیے جا بجا موجود ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ١ؕ اِنَّ الَّذِيْۤ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۳۹ ] ''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دبی ہوئی (بنجر) دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور پھولتی ہے۔ بے شک وہ جس نے اسے زندہ کیا، یقیناً مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ زمین کی پہلی ساری کھیتی چورا بن کر ختم ہو جاتی ہے، پھر دوبارہ نئی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو ہر شخص کے مشاہدے میں آتی ہے، اس پر بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں، صرف یقین کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس آیت میں غور و فکر کی دعوت نہیں دی، جس طرح اس کے بعد والی آیت میں ''اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'' فرمایا ہے، بلکہ فرمایا: ''زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔'' یہ اس لیے فرمایا کہ ان نشانیوں سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو یقین کرتے ہیں۔

② ''وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ'' (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں) اس میں صریح الفاظ میں یہ نہیں بتایا کہ کس چیز کی نشانیاں ہیں، کیونکہ اس میں صرف قیامت حق ہونے ہی کی نشانیاں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی لامحدود قدرت کی بھی بے شمار نشانیاں ہیں۔ زمخشری نے فرمایا: ''اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جو صانع اور اس کی قدرت و حکمت اور تدبیر پر دلالت کرتی ہیں، چنانچہ زمین اپنے اوپر والی چیزوں کے لیے بچھونے کی طرح ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا﴾ [ طٰہٰ : ۵۳ ] ''وہ جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا۔'' اور چلنے والوں کے لیے اس میں راستے اور وسیع شاہراہیں ہیں جو اس کے کندھوں پر چلتے پھرتے ہیں اور اس کے مختلف حصے ہیں، جیسے میدان، پہاڑ، ریگستان، سمندر وغیرہ اور کئی ٹکڑے ہیں، مثلاً سخت، نرم، زرخیز، شور وغیرہ۔ وہ حاملہ جانور کی طرح ہے جس کے پیٹ سے بے شمار پودے، درخت اور پھل پیدا ہوتے ہیں، جن کے رنگ، خوشبو اور ذائقے مختلف ہیں، حالانکہ سبھی ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے پر برتری رکھتے ہیں اور یہ سب کچھ زمین پر رہنے والوں کی ضروریات، ان کی صحت و بیماری کی مصلحتوں کے عین موافق ہے۔ پھر اس میں پھوٹنے والے چشمے، رنگا رنگ معدنیات اور خشکی، ہوا اور سمندر میں پھیلے ہوئے مختلف شکلوں، صورتوں اور کاموں والے وحشی، پالتو، مفید اور زہریلے جانور اور اس کے علاوہ شمار سے باہر چیزیں ہیں جن میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، کیونکہ وہی دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔''

آیت 21 ① وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ١ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ: یعنی خود تمھارے نفسوں میں دوبارہ زندہ ہونے کی بے شمار نشانیاں موجود

وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور آسمان ہی میں تمھارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو ﴿۲۲﴾

ہیں کہ مٹی اور نطفے سے لے کر موت تک ہر لحہ موت کے بعد زندگی کا شاہد ہے، کیونکہ جسم کا ہر خلیہ جو موجود ہوتا ہے فنا ہوتا اور اس کی جگہ نیا خلیہ وجود میں آتا رہتا ہے اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے، جس کے دوران انسان بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی طرف بھی منتقل ہوتا رہتا ہے، مگر موت و حیات کے اس سلسلے پر غور کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔ یہ بحث تفصیل کے ساتھ سورۂ مومنون (۱۲ تا ۱۶) کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

❷ انسان کی ذات میں قیامت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، حکمت، تدبیر، صنعت، قدرت اور دوسری صفات کی بھی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ''انسان کا اپنا وجود اور اس کی مشینری کائنات اصغر ہے اور اس میں جو نشانیاں ہیں وہ کائنات اکبر کی نشانیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ انسان کا معدہ ایک چکی کی طرح دن رات کام میں لگا رہتا ہے، جو غذا کو پیس کر ایک ملغوبہ تیار کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ جب یہ فارغ ہو جائے تو اور غذا طلب کرتا ہے جسے ہم بھوک کہتے ہیں۔ اس ملغوبہ کی تیاری میں اگر پانی کی کمی ہو تو ہمیں پیاس لگ جاتی ہے اور ہم کھانے پینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے اندر چھلنی بھی ہے جس سے چھن کر یہ ملغوبہ جگر میں چلا جاتا ہے، جہاں اچھالنے والی، دفع کرنے والی، صاف کرنے والی، کھینچنے والی مشینیں اور قوتیں کام کر رہی ہیں۔ یہیں دوسری اخلاط بنتی ہیں۔ فالتو پانی کو گردے پیشاب کے راستے خارج کر دیتے ہیں۔ قوت دافعہ فالتو مواد یا فُضلہ کو خارج کرنے کا کام کرتی ہے اور جس طرح انسان کھانے پینے پر مجبور ہوتا ہے اسی طرح رفع حاجت پر مجبور ہو جاتا ہے اور اگر روکے تو بیمار پڑ جاتا ہے۔ پھر انسان کے جسم میں اتنی باریک نالیاں ہیں جن کا سوراخ خورد بین کے بغیر نظر ہی نہیں آ سکتا، انھی کے ذریعے انسان کے جسم کے ہر حصے کو خون پہنچتا ہے۔ اس سلسلہ میں انسان کا دل پمپ کا کام کرتا ہے جو ایک منٹ بھی ٹھہر جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کا سانس لینا بھی ایک الگ پورا نظام ہے۔ سب سے زیادہ باریک آنکھ کے طبقے اور جھلیاں ہیں جو ایسی لطافت کے ساتھ بنائی گئی ہیں کہ اگر ذرا سا فتور آ جائے تو بینائی جواب دے جاتی ہے۔ (پھر سننے، سونگھنے، چکھنے، سوچنے، سمجھنے، یاد رکھنے، محسوس کرنے، سونے، جاگنے، بولنے اور دوسرے بے شمار افعال کے نظام ہیں جن میں سے ہر ایک پر غور کیا جائے تو آدمی حیرت کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے) انسان کا جسم ابتدا ہی سے حکیموں اور ڈاکٹروں کی تحقیق کا مرکز بنا ہوا ہے، مگر اس کے بیشتر اسرار آج تک پردۂ راز ہی میں ہیں۔'' (تیسیر القرآن)

❸ ''وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ'' میں آفاقی آیات کا ذکر ہے اور ''وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ'' میں انفسی آیات کا۔ مزید دیکھیے حم السجدہ (۵۳)۔

**آیت 22** ❶ وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ : اکثر مفسرین نے یہاں رزق سے مراد بارش لی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا﴾ [المؤمن: ۱۳] ''وہی ہے جو تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔'' مگر لفظ عام ہیں، اس لیے رزق سے مراد وہ سب کچھ ہے جو دنیا میں انسان کو جینے، کھانے پینے

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَاۤ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ۠ ﴿۲۳﴾

ع ۱ ۲۳ ۱۹

سو آسمان وزمین کے رب کی قسم ہے! بلاشبہ یہ (بات) یقیناً حق ہے اس (بات) کی طرح کہ بلاشبہ تم بولتے ہو ﴿۲۳﴾

اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یعنی تمھیں جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ آسمان میں اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اور تمھیں وہیں سے عطا ہوتا ہے۔ "فِي السَّمَآءِ" مقدم لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "تمھارا رزق آسمان ہی میں ہے۔" تو جب تمھارا رزق آسمان ہی میں ہے تو پھر کمائی کے لیے اتنی فکر کیوں کہ جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہ کی جائے اور حق والوں کو حق بھی نہ دیا جائے؟ پھر سائل اور محروم پر خرچ کرنے میں بخل اور دریغ کیسا؟ اور جب آتا آسمان سے ہے تو کسی پر خرچ کر کے اپنا احسان جتلانے کی کیا وجہ؟

❷ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ : یعنی حشر و نشر، جزا و سزا اور جنت و دوزخ وغیرہ، جن کے رونما ہونے کا وعدہ تمام انبیاء کی زبانی اور تمام آسمانی کتابوں کے ذریعے سے کیا گیا ہے، ان سب کا حکم آسمان ہی سے ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: "آنے والی جو بات ہے اس کا حکم آسمان ہی سے اترتا ہے۔" (موضح)

❸ اس مقام پر بعض مفسرین نے کچھ لوگوں کے واقعات لکھے ہیں جنھوں نے یہ آیت سن کر کمائی ترک کر دی اور اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے جنگل بیابان کی راہ لی اور وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں تازہ کھجوریں اور رزق ملنے لگا۔ چنانچہ طبری نے سفیان ثوری کی زبانی نقل کیا ہے کہ واصل احدب نے یہ آیت "وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ" پڑھی تو کہنے لگے: "میرا رزق تو مجھے آسمان میں نظر آ رہا ہے اور میں اسے زمین میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک خرابے میں چلے گئے۔ تین دن تک کھانے کو کچھ نہ ملا، جب تیسرا دن ہوا تو اچانک ان کے پاس تازہ کھجوروں کی ایک ٹوکری آ گئی۔ ان کا ایک بھائی تھا، جو ان سے بھی اچھی نیت والا تھا، وہ بھی اس خرابے میں ان کے ساتھ آ گیا تو ٹوکریاں دو ہو گئیں۔ ان کا یہی حال رہا، یہاں تک کہ موت نے ان کے درمیان جدائی ڈال دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی ہی کہانیوں نے اسلام کا رخ روشن مسخ کیا ہے۔ آسمان میں رزق ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آدمی کمانا ترک کر دے۔ یہ رہبانیت ہے جس کی اسلام میں گنجائش ہی نہیں، یہاں تو محنت کر کے کمانے اور دوسروں پر خرچ کرنے کی تلقین ہے، جنگلوں، بیابانوں یا خانقاہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف سے یا غیب سے آنے والے رزق کے انتظار کے بجائے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے پاکیزہ ترین رزق حاصل کرنے کی ترغیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے۔ آسمان میں رزق ہونے کا یقین دلانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی ساری جد و جہد کے باوجود بھروسا صرف آسمان والے پر رکھے اور ایک لحہ کے لیے بھی رزق کی خاطر اس کے حکم سے سرتابی نہ کرے۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ابن کثیر رحمہ اللہ جیسے محقق نے کسی تنقید کے بغیر یہ کہانی نقل کر دی ہے، حالانکہ طبری میں اس روایت کے راوی طبری کے استاذ محمد بن حمید رازی ہیں، جن کا ضعیف ہونا معروف ہے۔

آیت 23 ﴿ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ...... : کسی بات کا یقین دلانے کے لیے اس کی تشبیہ ایسی چیز کے ساتھ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۴ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۲۵

کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات آئی ہے؟ ۝۲۴ جب وہ اس پر داخل ہوئے تو انھوں نے سلام کہا۔ اس نے کہا سلام ہو، کچھ اجنبی لوگ ہیں ۝۲۵

دی جاتی ہے جو مخاطب کے نزدیک یقینی ہو، مثلاً کہا جاتا ہے: ''كَمَا أَنَّكَ هٰهُنَا'' کہ یہ بات ایسے ہی یقینی ہے جیسے تم یہاں موجود ہو، یا ''كَمَا أَنَّكَ تَسْمَعُ وَ تَرٰى'' جیسے یہ یقینی ہے کہ تم سن رہے ہو اور دیکھ رہے ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا یقین دلانے کے لیے جو اس سے پہلے گزری ہیں آسمان و زمین کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ سب کچھ ایسے ہی حق اور یقینی ہے جیسے تمھیں یقین ہے کہ تم بولتے ہو۔ اس سے پہلے مذکور چیزوں میں سب سے قریب یہ ہے کہ تمھارا رزق اور وہ تمام چیزیں جن کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان ہی میں ہیں۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ تمھارے رزق کا اور تم سے وعدہ کردہ چیزوں کا آسمان ہی میں ہونا ایسے ہی یقینی ہے جیسے تمھارا بولنا یقینی ہے اور تمھیں کوئی شک نہیں کہ تم واقعی بولتے ہو۔ ''اِنَّهٗ لَحَقٌّ'' (بلاشبہ یقیناً یہ حق ہے) سے مراد سورت کے شروع سے یہاں تک مذکور تمام چیزیں بھی ہو سکتی ہیں کہ بلاشبہ یقیناً تم سے کیے گئے وعدے، قیامت، جزا و سزا، جنت و جہنم، تمھارے رزق کا اور تم سے وعدہ کردہ چیزوں کا آسمان ہی میں ہونا ایسے ہی حق ہے جیسے یہ حق ہے کہ تم بول رہے ہو اور تمھیں اپنے بولنے میں شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سننے یا دیکھنے وغیرہ کے بجائے بولنے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ سننے یا دیکھنے میں بعض اوقات شبہ بھی پڑ جاتا ہے، مگر آدمی کو اپنے بولنے میں کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ میں بول رہا ہوں اور بات کر رہا ہوں۔

**آیت 24** ❶ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ...... : یہاں سے رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لیے چند انبیاء کی مدد کا اور انھیں جھٹلانے والی اقوام پر آنے والے عذابوں کا ذکر فرمایا۔ ابراہیم اور لوط علیہما السلام کے واقعات اور ان کے تفسیری فوائد سورۂ ہود (۶۹ تا ۸۳)، حجر (۵۱ تا ۷۷) اور سورۂ عنکبوت (۱۶ تا ۳۵) میں تفصیل سے گزر چکے ہیں۔ اس مقام سے تعلق رکھنے والی چند باتیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

❷ کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر آئی ہے؟ سوال سے مقصود اس واقعہ کی عظمت و شان اور اہمیت کا احساس دلانا ہے اور یہ بھی کہ آپ کو اس بات کی خبر نہ تھی، یہ ہم ہیں جو وحی کے ذریعے سے آپ کو اس سے آگاہ کر رہے ہیں۔

❸ ''الْمُكْرَمِيْنَ'' (معزز) اس لیے فرمایا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ [ الأنبیاء : ۲۶ ] ''بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔'' اور ہمارے نبی ﷺ کا بھی حکم ہے: (( مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ )) [ بخاري، الأدب، باب من كان يؤمن بالله...... : ۶۰۱۸ ] ''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔''

**آیت 25** ❶ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا ...... : ''سَلٰمًا'' اور ''سَلٰمٌ'' کے فرق کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۶۹) کی تفسیر۔

فَرَاغَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَیْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ﴿۲۸﴾

پس چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا، پس (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لے آیا ﴿۲۶﴾ پھر اسے ان کے قریب کیا کہا کیا تم نہیں کھاتے؟ ﴿۲۷﴾ تو اس نے ان سے دل میں خوف محسوس کیا، انھوں نے کہا مت ڈر! اور انھوں نے اسے ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دی ﴿۲۸﴾

② قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ: یہ بات دل میں کہی یا گھر والوں سے کہی اور ممکن ہے انسانی شکل میں آنے والے فرشتوں سے کہی ہو کہ آپ اس علاقے میں نئے تشریف لائے ہیں، پہلے کبھی آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔

آیت 26 ① فَرَاغَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ: "رَاغَ يَرُوْغُ رَوْغًا" (ن) کا معنی خفیہ طور پر جانا، حیلے کے ساتھ تیزی سے نکل جانا ہے۔ یہ "رَوَغَانُ الثَّعْلَبِ" سے ہے، لومڑی کا خفیہ طریقے سے آنا جانا۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے خاموشی سے گئے، تاکہ انھیں خبر نہ ہو سکے اور وہ جاتے ہوئے دیکھ کر مہمانی لانے سے منع نہ کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہمانوں سے پوچھنا کہ کیا آپ کھانا کھائیں گے تو ایک طرف، انھیں تو مہمانی کے اہتمام کا حتی الوسع پتا بھی نہیں لگنے دینا چاہیے۔

② فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ: سورۂ ہود میں "بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ" (بھنا ہوا بچھڑا) آیا ہے۔ معلوم ہوا موٹا تازہ بچھڑا بھون کر لائے تھے۔ بعض مفسرین نے "سَمِیْنٍ" کا معنی "گھی میں تلا ہوا" کیا ہے، کیونکہ "سمن" کا معنی موٹاپا بھی ہے اور گھی بھی۔ اس کے مطابق "سَمِیْنٍ" کا معنی موٹا بھی ہو سکتا ہے اور گھی میں تلا ہوا بھی۔ مگر "حَنِیْذٍ" کے ساتھ "سَمِیْنٍ" کا معنی "موٹا" زیادہ مناسب ہے، کیونکہ "حَنِیْذٍ" گرم پتھروں یا کوئلے پر بھنے ہوئے کو کہتے ہیں۔

آیت 27 فَقَرَّبَهٗۤ اِلَیْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی مہمان نوازی کے آداب میں سے ہے کہ جہاں تک ہو سکے مہمانوں کو کھانے تک جانے کی زحمت دینے کے بجائے اسے ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ اگر وہ کھانے میں تامل کریں تو شائستہ طریقے سے کھانے کی درخواست کرنی چاہیے۔

آیت 28 ① فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ...: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۷۰) کی تفسیر۔

② وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ: سورۂ ہود میں اس لڑکے کا نام اسحاق آیا ہے، وہ "غلام علیم" تھے اور اسماعیل علیہ السلام "غلام حلیم"۔ ان کا ذکر سورۂ صافات (۱۰۱) میں ہے۔ اسحاق علیہ السلام کو "بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ" فرمایا، حالانکہ "عَلِیْمٍ" تو انھوں نے جوانی میں بننا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو بچے حفظ شروع کر دیں انھیں آئندہ کا لحاظ کرتے ہوئے حافظ کہا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝۲۹ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝۳۰

تو اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی، پس اس نے اپنا چہرہ پیٹ لیا اور اس نے کہا بوڑھی بانجھ! ۝۲۹ انھوں نے کہا تیرے رب نے ایسے ہی فرمایا ہے، یقیناً وہی کمال حکمت والا، بے حد علم والا ہے ۝۳۰

**آیت 29** ① فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ ......: "صَرَّةٍ" صیحہ، چیخ۔ "صَرَّ يَصُرُّ" (ن) "صَرِيْرُ الْقَلَمِ" (قلم کی آواز) اور "صَرِيْرُ الْبَابِ" (دروازے کی آواز) بھی اسی سے مشتق ہے۔ "صَرَّةٍ" میں تنوین تعظیم کی ہے: "أَيْ صَيْحَةٌ عَظِيْمَةٌ وَ رَنَّةٌ." ابن کثیر نے فرمایا: "صَرَّةٍ" سے مراد اس کا "يٰوَيْلَتٰٓى" کہنا ہے جو سورۂ ہود (۷۲) میں مذکور ہے، یہاں اس کا قول مختصر ذکر فرمایا ہے۔ "عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ" "أَيْ أَنَا عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ" یعنی یہ بشارت سن کر اپنی عمر کو دیکھتے ہوئے حیرت و مسرت کے جذبات سے بے اختیار چیختی ہوئی فرشتوں کی طرف آئی۔

② فَصَكَّتْ وَجْهَهَا: "صَكَّ يَصُكُّ صَكًّا" (ن) چہرے پر زور سے ہاتھ مارنا، جیسا کہ عورتیں تعجب کے وقت کرتی ہیں۔ یعنی تعجب سے چہرے کو پیٹ کر کہنے لگی کہ میں تو بوڑھی ہوں، جوانی کی عمر سے بانجھ ہوں، اب خاک بچہ جنوں گی۔

③ بعض لوگوں نے اس سے ماتم اور سینہ کوبی کی دلیل کشید کی ہے، مگر یہ نہیں سوچا کہ کیا خوشی کی خبر پر بھی ماتم ہوتا ہے!؟

**آیت 30** قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ......: فرشتوں نے کہا بے شک آپ ایسی ہی ہیں، مگر ہم بھی اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے بلکہ آپ کے رب کی بات بتا رہے ہیں، اس نے ایسے ہی فرمایا ہے، یقیناً وہ کمال حکمت اور علم والا ہے، نہ اس کے علم سے کوئی چیز باہر ہے اور نہ اس کے کسی کام میں کوئی خامی یا غلطی ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾

کہا تو اے بھیجے ہوئے (قاصدو!) تمھارا معاملہ کیا ہے؟ ﴿۳۱﴾ انھوں نے کہا بے شک ہم کچھ گناہ گار لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۳۲﴾ تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر (کھنگر) پھینکیں ﴿۳۳﴾ جن پر تیرے رب کے ہاں حد سے بڑھنے والوں کے لیے نشان لگائے ہوئے ہیں ﴿۳۴﴾ سو ہم نے اس (بستی) میں ایمان والوں سے جو بھی تھا نکال لیا ﴿۳۵﴾ تو ہم نے اس میں مسلمانوں کے ایک گھر کے سوا کوئی نہ پایا ﴿۳۶﴾

آیت 31 ﴿ ❶ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ : جب ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے کھانا نہ کھانے پر خوف زدہ ہوئے اور صاف اظہار بھی کر دیا: ﴿ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴾ [ الحجر : ۵۲ ] ”ہم تو تم سے ڈرنے والے ہیں۔“ کیونکہ انھیں ان کے فرشتہ ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فرشتوں کا اس طرح آنا معمولی بات نہیں ہوتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴾ [ الحجر : ۸ ] ”ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق (عذاب) کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے۔“ اس لیے وہ شدید ڈر گئے، تو فرشتوں نے ان کا خوف دور کرنے کے لیے ان سے دو باتیں کہیں، ایک یہ: ﴿ لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴾ [ ھود : ۷۰ ] ”ڈرو نہیں، کیونکہ ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔“ یعنی آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں، ہماری منزل مقصود دوسری ہے۔ دوسری بات انھوں نے یہ کی کہ ہم آپ کو بیٹے اور پوتے اسحاق و یعقوب کی بشارت دینے آئے ہیں۔ (دیکھیے ہود : ۷۱) جب ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہو گیا تو انھوں نے پوچھا، تو اے بھیجے جانے والے فرشتو! (قوم لوط کے ساتھ) تمھارا معاملہ کیا ہے اور تم ان کے متعلق کیا کرنا چاہتے ہو؟ یاد رہے! ”خَطْبٌ“ کا لفظ عموماً کسی اہم یا سخت معاملے کے متعلق ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

❷ اس سارے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۶۲) کی تفسیر۔

آیت 32 تا 34 ﴿ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ...... : ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۸۳)، حجر (۵۸، ۷۴) اور سورۂ عنکبوت (۳۱ تا ۳۵)۔

آیت 35 ﴿ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ : عذاب آنے سے پہلے لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو اس بستی سے نکالنے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۸۱) اور سورۂ حجر (۶۵)۔

آیت 36 ﴿ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ : یعنی اس بستی میں مسلمانوں کا صرف ایک گھر تھا اور وہ لوط علیہ السلام

وَ تَرَكْنَا فِيْهَاۤ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ؕ۝۳۷ وَ فِيْ مُوْسٰۤى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۳۹ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ؕ۝۴۰

اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لیے ایک نشانی چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں ۝۳۷ اور موسیٰ میں (بھی ایک نشانی ہے) جب ہم نے اسے فرعون کی طرف ایک واضح دلیل دے کر بھیجا ۝۳۸ تو اس نے اپنی قوت کے سبب منہ پھیر لیا اور اس نے کہا یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ ۝۳۹ پس ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑ لیا، پھر انھیں سمندر میں پھینک دیا، اس حال میں کہ وہ قابل ملامت کام کرنے والا تھا ۝۴۰

کا گھر تھا، جنھیں بیوی کے سوا اس کے تمام افراد کو ساتھ لے کر نکل جانے کا حکم ہوا۔

ان دونوں آیات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جب اسلام حقیقی اور سچا ہو تو وہی ایمان بھی ہے، اس صورت میں اسلام و ایمان اور مسلم و مومن ایک ہی چیز ہیں۔ ہاں جب اسلام حقیقی نہ ہو، بلکہ صرف ظاہری اعمال پر مشتمل ہو تو اسلام اور ایمان میں فرق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور محدثین یہی فرماتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حجرات (۱۴، ۱۵) کی تفسیر۔

**آیت 37** وَ تَرَكْنَا فِيْهَاۤ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ : اس بستی کو عذاب الیم سے ڈرنے والوں کے لیے نشانی اس لیے قرار دیا کہ وہی اس سے عبرت حاصل کرتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ڈرنے کے بجائے سرکشی اختیار کرتے اور خواہش نفس کے پیچھے چلتے ہیں ان کے لیے ہر نشانی کفر اور سرکشی میں اضافے کا باعث ہی بنتی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ حجر (۷۵ تا ۷۷) اور سورۂ عنکبوت (۳۵)۔

**آیت 38** وَ فِيْ مُوْسٰۤى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ : یعنی لوط علیہ السلام کی بستی کے علاوہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو عذاب الیم سے ڈرتے ہیں، جب ہم نے انھیں صریح معجزات دے کر بھیجا، جو ان کے اللہ کا پیغمبر ہونے کی واضح دلیل تھے۔

**آیت 39** فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ : "بِرُكْنِهٖ" میں "باء" سببیہ ہے۔ "رُكْنٌ" کسی چیز کا سہارا اور آسرا، قوت۔ یعنی اس نے اپنی سلطنت اور فوجوں کی قوت کی وجہ سے ان واضح دلائل سے منہ پھیر لیا اور حق پہچان لینے کے باوجود ایمان لانے سے انکار کر دیا اور لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کہنے لگا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور ان کی فرعون کے ساتھ تفصیلی گفتگو، جس میں فرعون نے انھیں دیوانہ اور پھر جادوگر قرار دیا سورۂ شعراء (۱۰ تا ۳۵) میں ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 40** فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ...... : "اَلَامَ يُلِيْمُ" (افعال) ایسا کام کرنا جس پر ملامت کی

وَ فِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾ وَ فِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور عاد میں، جب ہم نے ان پر بانجھ (خیر و برکت سے خالی) آندھی بھیجی ﴿۴۱﴾ جو کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی جس پر سے گزرتی مگر اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح کر دیتی تھی ﴿۴۲﴾ اور ثمود میں، جب ان سے کہا گیا کہ ایک وقت تک فائدہ اٹھا لو ﴿۴۳﴾ پھر انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی تو انھیں کڑک نے پکڑ لیا اور وہ دیکھ رہے تھے ﴿۴۴﴾

جائے۔ "مُلِيْمٌ" مستحق ملامت، ایسا کام کرنے والا جس پر اسے ملامت کی جائے۔ یعنی وہ ایسا ظالم و سرکش تھا کہ اس کے سمندر میں لشکر سمیت غرق ہونے پر کسی نے اس کے حق میں کوئی کلمۂ خیر نہیں کہا، بلکہ ہر شخص کے منہ سے اس کے لیے ملامت اور پھٹکار ہی نکلی، جس نے سنا یہی کہا کہ ان کے ساتھ ایسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ خس کم جہاں پاک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ﴾ [ الدخان : ۲۹ ] "پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین۔" سمندر میں پھینکے جانے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۹۰ تا ۹۲)، طٰہٰ (۷۷، ۷۸) اور سورۂ شعراء (۵۲ تا ۶۷)۔

**آیت 41** وَ فِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ : یعنی قوم عاد میں بھی ہم نے ایک نشانی اور بڑی عبرت چھوڑی۔ "اَلْعَقِيْمَ" وہ رحم یا عورت جس سے بچہ پیدا نہ ہو، ایسے مرد کو بھی "عقیم" کہتے ہیں، پھر ہر اس چیز کو بھی جو خیر و برکت سے خالی ہو۔ قوم عاد پر جو آندھی مسلط کی گئی وہ بھی ہر خیر و برکت سے خالی اور سراسر بربادی اور تباہی تھی، اس لیے اسے "اَلْعَقِيْمَ" فرمایا۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حاقہ (۶ تا ۸)، قمر (۱۹، ۲۰) اور سورۂ احقاف (۲۴، ۲۵)۔

**آیت 42** مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ...... : "اَلرَّمِيْمُ" بوسیدہ، پرانی، گلی ہوئی ہڈی۔

**آیت 44،43** وَ فِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ...... : اس کی تفسیر میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ جب انھوں نے اونٹنی کو کاٹ دیا تو ان سے کہا گیا کہ تین دن تک خوب فائدہ اٹھا لو، اس کے بعد تم پر عذاب آ جائے گا۔ ان تین دنوں میں وہ تائب ہو سکتے تھے، مگر وہ اپنی سرکشی پر اور صالح علیہ السلام کی تکذیب پر اڑے رہے، تو تیسرے دن ان کے دیکھتے دیکھتے ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی (ہود : ۶۷) جس کے ساتھ نہایت خوفناک کڑک والی بجلی گری، جس نے انھیں بھسم کر دیا اور وہ اس طرح نیست و نابود ہوئے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔ فرمایا: ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ [ ہود : ۶۸ ] "جیسے وہ ان میں رہے ہی نہ تھے۔" دوسرا قول یہ ہے کہ اس "تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ" (ایک وقت تک خوب فائدہ اٹھا لو) کہنے سے مراد صالح علیہ السلام کا ان کی طرف مبعوث ہونے کے وقت کا خطاب ہے کہ دنیا میں تمھیں موت تک مہلت ہے، اس میں خوب فائدہ اٹھا لو، مگر اس اونٹنی کو نقصان نہ پہنچانا ورنہ تم پر عذاب آ جائے گا، مگر انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور اونٹنی کو کاٹ دیا تو انھیں صاعقہ نے پکڑ لیا۔ آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے اور دونوں بیک وقت بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾

پھر نہ انھوں نے کسی طرح کھڑے ہونے کی طاقت پائی اور نہ وہ بدلا لینے والے تھے ﴿۴۵﴾ اور اس سے پہلے نوح کی قوم کو، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے ﴿۴۶﴾ اور آسمان، ہم نے اسے عظیم قوت کے ساتھ بنایا اور بلاشبہ ہم یقیناً وسعت والے ہیں ﴿۴۷﴾

آیت 45 فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ …… : ”مُنْتَصِرِيْنَ“ ”اِنْتِصَار“ کے لفظ میں اپنے آپ کو کسی سے بچانے کا مفہوم بھی شامل ہے اور بدلا لینے کا بھی۔ یعنی جب وہ عذاب کے تھپیڑے سے زمین پر گرے تو پھر نہ کسی طرح اٹھ سکے اور نہ اس سے بچاؤ کر سکے، بدلا لینا تو بہت دور کی بات ہے۔

آیت 46 وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ …… : رازی نے یہاں ایک نکتہ بیان فرمایا ہے کہ ان پانچ اقوام کے ذکر میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انھی چیزوں کے ساتھ عذاب دیا جو ان کے وجود اور قیام کا باعث تھیں۔ وہ چار چیزیں ہیں، مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ قومِ لوط کھنگر مٹی کے پتھروں کے ساتھ ہلاک ہوئی، فرعون اور قومِ نوح پانی کے ساتھ، عاد ہوا کے ساتھ اور ثمود آگ کے ساتھ تباہ و برباد کیے گئے۔

آیت 47 ① وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ : سورت کی ابتدا سے قیامت اور جزا و سزا کے حق ہونے کا بیان چلا آ رہا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کئی قسمیں کھائیں اور دوبارہ زندہ کرنے پر اپنے قادر ہونے کے بہت سے دلائل پیش فرمائے، جن میں آسمان و زمین کا خصوصاً ذکر فرمایا۔ درمیان میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور کفار کو تنبیہ کے لیے قیامت اور پیغمبروں کو جھٹلانے والی اقوام کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا۔ منکرینِ قیامت کا سب سے بڑا شبہ یہ ہے کہ مرنے اور بوسیدہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندگی کیسے ممکن ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ اس شبہے کے رد کے لیے آسمان و زمین کا خاص طور پر ذکر فرماتے ہیں، کیونکہ انسان کو نظر آنے والی مخلوقات میں یہ سب سے بڑے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ المؤمن : ۵۷ ] ”یقیناً آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے بہت بڑا ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ یہاں آخرت کے حق میں تاریخی دلائل ذکر کرنے کے بعد دوبارہ پھر اس کے ثبوت میں آفاقی دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔ قرآن مجید اسی طرح بات کو مختلف انداز سے پھیر پھیر کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

② ”أَيْدٍ“ ”يَدٌ“ کی جمع کے طور پر بھی آتا ہے جس کا معنی ہاتھ ہے اور اگر یہ معنی کیا جائے کہ ”ہم نے آسمان کو ہاتھوں کے ساتھ بنایا“ تو اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی، کیونکہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں اور اس طرح ہیں جس طرح اس کی شان کے لائق ہے، ہم نہیں جانتے نہ جان سکتے ہیں کہ کیسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ [ ص : ۷۵ ] ”تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے

دونوں ہاتھوں سے بنایا؟'' مگر یہاں "بِاَیْىدٍ" "آدَ یَئِیْدُ" (قوی ہونا) کا مصدر ہے اور معنی اس کا ''قوت'' ہے، تنوین اس میں تعظیم کی ہے اور ﴿ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ [ البقرۃ : ٢٥٣ ] (اور ہم نے اسے روح القدس کے ساتھ قوت بخشی) بھی اسی سے مشتق ہے۔ اس مقام پر "بِاَیْىدٍ" کا یہ معنی طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ﴾ [ صٓ : ١٧ ] ''اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر جو قوت والا تھا۔'' یعنی اتنا عظیم آسمان بنانا معمولی کام نہیں، یہ ہماری ہی قوت ہے جس کے ساتھ ہم نے اسے اس وقت بنایا جب کچھ بھی نہیں تھا، تو ہم تمھیں دوبارہ کیوں نہیں بنا سکتے؟ آسمان کے لیے "خَلَقْنَاهَا" کے بجائے "بَنَيْنٰهَا" کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ دیکھنے میں وہ ایک خیمے کی مانند نظر آتا ہے، جس کے لیے لفظ "بِنَاءٌ" استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر لفظ "بِنَاءٌ" میں بناوٹ پر غور کرنے کی دعوت بھی ہے کہ اتنے عظیم آسمان کو ستونوں کے بغیر بنانے والے کے متعلق تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ انسان ضعیف البنیان کو دوبارہ نہیں بنا سکے گا۔ پھر یہ کہنے کے بجائے کہ "وَ بَنَيْنَا السَّمَاءَ" (اور ہم نے آسمان کو بنایا) یہ فرمایا: ﴿ وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا ﴾ (اور آسمان، ہم نے اسے بنایا) اتنے سے لفظوں میں آسمان کا ذکر دو دفعہ فرما دیا۔ ایک لفظ "السَّمَآءَ" کے ساتھ اور دوسرا اس کی ضمیر "هَا" کے ساتھ، مقصد آسمان اور اس کی بناوٹ کی طرف اچھی طرح متوجہ کرنا ہے۔

③ وَ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ: "مُوْسِعٌ" "أَوْسَعَ يُوْسِعُ" (افعال) سے اسم فاعل ہے، جب کوئی وسعت والا ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ﴾ [ البقرۃ : ٢٣٦ ] ''وسعت والے پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگی والے پر اس کی طاقت کے مطابق ہے۔'' وسعت کا لفظ قدرت اور فراخی دونوں معنوں کے لیے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے "وَاسِعٌ" بھی ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [ البقرۃ : ١١٥ ] ''بے شک اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی وسعت کی کوئی حد نہیں، اس کا وجود، حیات، علم، قدرت، حکمت وغیرہ سب لامحدود ہیں۔ "اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ" "اِنَّ" اور ''لام'' (تاکید کے دو حرفوں) کے ساتھ اس لیے فرمایا کہ قیامت کا منکر دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت و وسعت کا منکر ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ مخاطب جس قدر کسی بات کا منکر ہو اتنی ہی زیادہ تاکید کے ساتھ بات کی جاتی ہے۔

④ "أَوْسَعَ يُوْسِعُ" کا ایک معنی وسیع کرنا بھی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ ''آسمان، ہم نے اسے بنایا اور یقیناً ہم وسیع کرنے والے ہیں۔'' مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ''کائنات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن میں آج تک تخلیق اور توسیع کا عمل جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ (بلکہ ہر چیز کا یہی حال ہے) سب سے پہلے انسان ہی کو لیجیے، اس کی نسل بڑھ رہی ہے، تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہی کائنات کا شاہکار ہے۔ پھر زمین کی پیداوار بھی اللہ تعالیٰ اسی نسبت سے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ اس آیت میں بالخصوص آسمان کا ذکر ہے، تو آسمان کی پیدائش کا بھی یہی حال ہے، آسمان میں لاتعداد مجمع النجوم اور کہکشائیں ہیئت دانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر ان کے علم کو ہر آن چیلنج کر رہی ہیں۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ہیئت دان جوں جوں پہلے سے زیادہ طاقت ور اور جدید قسم کی دوربینیں ایجاد کر رہے ہیں توں توں اس بات کا بھی انکشاف ہو رہا ہے کہ کائنات میں ہر

وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾

**اور زمین، ہم نے اسے بچھا دیا، سو (ہم) اچھے بچھانے والے ہیں ﴿۴۸﴾ اور ہر چیز سے ہم نے دو قسمیں بنائیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۴۹﴾ پس دوڑو اللہ کی طرف، یقیناً میں تمھارے لیے اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۵۰﴾**

آن مزید وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ سیاروں کے درمیانی فاصلے بھی بڑھ رہے ہیں اور نئے نئے اجرام بھی مشاہدہ میں آ رہے ہیں۔"

**آیت 48** ① **وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا** : آسمان بنانے کی طرح زمین بچھانے کو بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور "وَفَرَشْنَا الْأَرْضَ" کے بجائے "وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا" میں بھی وہی بات ملحوظ ہے جو "وَ السَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا" میں ملحوظ ہے۔ زمین کی پیدائش میں اس کے گول ہونے کے ذکر کے بجائے، جو ہر ایک کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی، اس بات کا ذکر فرمایا جو ہر شخص کے مشاہدے اور استعمال میں ہے اور جس سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ اگر وہ ناہموار اور اونچی نیچی ہوتی تو اس پر ان کا اور ان کے جانوروں کا رہنا ہی ممکن نہ ہوتا، نہ وہ اس پر بیٹھ سکتے، نہ لیٹ سکتے اور نہ چل پھر سکتے اور اس خوشگوار زندگی اور آسائش کا تصور تک نہ ہوتا جو زمین کو بچھا کر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو عطا فرما رکھی ہے۔

② **فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ** : "أَيْ نَحْنُ" یعنی ہم بہت اچھے بچھانے والے ہیں۔ ان آیات میں جمع متکلم (ہم) کا صیغہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

**آیت 49** ① **وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ** : آسمان و زمین کی پیدائش کے بعد تمام موجودات کو پیدا کرنے کی کیفیت بیان فرمائی کہ جس طرح آسمان کے مقابلے میں زمین ہے اسی طرح ہم نے ہر چیز کی دو دو قسمیں بنائی ہیں، ہر ایک کے مقابلے میں دوسری چیز موجود ہے۔ چنانچہ آسمان و زمین، دن رات، خشکی و تری، اندھیرا اجالا، موت و حیات، نیکی و بدی، جنت و دوزخ، یہاں تک کہ نباتات و حیوانات کے بھی جوڑے ہیں۔

② **لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ** : تاکہ تم نصیحت حاصل کرو، توحید کو سمجھو اور جان لو کہ مخلوق جو بھی ہے اس کے مقابلے میں دوسری موجود ہے، مگر ان سب کا خالق ایک اللہ ہے، اس کا کوئی جوڑ ہے نہ ہمسر، نہ شریک اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی ہستی ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ اتنی عظیم الشان کائنات کو بنانے والا تمھیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور تمھیں دوبارہ زندہ ہو کر اس کے حضور پیش ہونا ہے۔

**آیت 50** ① **فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ** : یعنی جب آسمان و زمین اور کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے پر اور تمھیں دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت پر دلالت کر رہی ہے تو تم پر لازم ہے کہ اللہ کی طرف دوڑو، کفر کو ترک کرکے توحید کی طرف آؤ اور گناہوں سے توبہ کرکے اس کی رحمت کی پناہ میں آ جاؤ۔

② **اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ** : ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَثَلِيْ وَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتٰی قَوْمًا فَقَالَ رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ ، وَ إِنِّيْ أَنَا النَّذِيْرُ الْعُرْيَانُ فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ

وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بناؤ، بلاشبہ میں تمھارے لیے اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۵۱﴾ اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے، کوئی رسول نہیں آیا مگر انھوں نے کہا یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ ﴿۵۲﴾ کیا انھوں نے ایک دوسرے کو اس (بات) کی وصیت کی ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ (خود ہی) سرکش لوگ ہیں ﴿۵۳﴾

فَادَّلَجُوْا عَلٰى مَهْلِهِمْ فَنَجَوْا، وَكَذَّبَتْهُ طَائِفَةٌ فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَاجْتَاحَهُمْ» [ بخاري، الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصي : ۶۴۸۲ ] ''میری مثال اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دے کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا، میں نے لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ننگا ڈرانے والا ہوں، (عرب کا قدیم دستور تھا کہ دشمن کے حملے سے خبردار کرنے والا شخص کپڑے اتار دیتا اور ننگا ہو کر چیخ چیخ کر حملے سے ڈراتا) اس لیے دوڑو، دوڑو۔ تو ایک گروہ نے اس کی بات مان لی اور آرام کے ساتھ اندھیرے میں چل پڑے اور بچ کر نکل گئے اور ایک گروہ نے اسے جھٹلا دیا تو لشکر نے صبح صبح ان پر حملہ کیا اور انھیں تباہ و برباد کر دیا۔''

**آیت 51** وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ...... : یعنی صرف اللہ کی طرف رجوع کافی نہیں بلکہ اس کے سوا ہر معبود سے براءت بھی ضروری ہے، اس لیے اس کے ساتھ کسی اور کو معبود مت بناؤ۔ تاکید کے لیے دوبارہ فرمایا کہ میں اس کی طرف سے تمھیں کھلا ڈرانے والا ہوں۔

**آیت 52** كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ ..... : اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ معاملہ آپ ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا کہ توحید اور آخرت کی دعوت سن کر جھٹلایا گیا ہو اور جادوگر یا دیوانہ کہا گیا ہو، بلکہ آپ سے پہلے جس قوم کے پاس بھی کوئی رسول آیا اس کے جاہلوں نے یہی کہا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ وہ سب جب معجزوں کے سامنے لاجواب ہوتے تو انھیں جادو کہہ کر جھٹلا دیتے، جب رسول کے کلام کی بے پناہ تاثیر دیکھتے تو اسے جادوگر کہہ کر لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے اور جب دیکھتے کہ اکیلا شخص پوری قوم کے خلاف توحید اور آخرت کی بات کر رہا ہے، نہ اپنے کسی دنیوی مفاد کی پروا کرتا ہے اور نہ ساری قوم کی مخالفت، استہزا اور اذیت رسانی کے باوجود اپنی دعوت سے باز آتا ہے تو اسے دیوانہ قرار دیتے۔



**آیت 53** ❶ اَتَوَاصَوْا بِهٖ : '' تَوَاصٰى يَتَوَاصٰى تَوَاصِيًا '' باب تفاعل میں تشارک پایا جاتا ہے، ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ یعنی جب سب نے ایک ہی بات کہی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ سب ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کر گئے ہیں؟

❷ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ : یعنی یہ تو ممکن نہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کی ہو، کیونکہ ان کے درمیان مدتوں کا فاصلہ ہے، علاقے بھی ایک نہیں، تو اصل بات یہ ہے کہ یہ سرکش لوگ ہیں، پہلے لوگ بھی سرکش تھے اور اپنی خواہش نفس

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾ وَّ ذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۵۵﴾ وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾

**سو تو ان سے منہ پھیر لے، کیونکہ تو ہرگز کسی طرح ملامت کیا ہوا نہیں ﴿۵۴﴾ اور نصیحت کر، کیونکہ یقیناً نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے ﴿۵۵﴾ اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں ﴿۵۶﴾**

پر کوئی پابندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دونوں کی سرکشی ان کے لیے رسول کی اطاعت اور حق بات تسلیم کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی، اس لیے پچھلوں نے بھی وہی بات کہی جو ان کے پہلوں نے کہی۔

**آیت 54** ﴿ **فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ** : یعنی جب وہ سرکشی پر اڑے ہوئے ہیں اور حق واضح ہونے کے باوجود اسے قبول کرنے پر تیار نہیں تو آپ کی ذمہ داری یہ نہیں کہ انھی کے پیچھے پڑے رہیں، بلکہ آپ ان سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ آپ کا کام حق کا پیغام پہنچا دینا ہے، وہ آپ نے پہنچا دیا، اب اگر وہ اسے قبول نہیں کرتے تو آپ پر کوئی ملامت نہیں۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۴۸) کی تفسیر۔

**آیت 55** ﴿ **وَّ ذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ** : "ذَكَّرَ يُذَكِّرُ تَذْكِرَةً" کا معنی نصیحت بھی ہے اور یاد دہانی بھی۔ یعنی سرکشوں سے منہ پھیرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ انھیں یاد دہانی اور نصیحت کرنا بھی چھوڑ دیں، بلکہ آپ انھیں یاد دہانی اور نصیحت کرتے رہیں، کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے اور چونکہ آپ کو معلوم نہیں کہ کون ہے جو ایمان لے آئے گا اور کون ہے جو اس سے محروم رہے گا، اس لیے آپ ایمان لانے والی سعید روحوں کی تلاش میں ہر نیک و بد، موافق و مخالف کو نصیحت جاری رکھیں، بالآخر وہ لوگ جن کی فطرت مسخ نہیں ہوئی، اس نصیحت سے فائدہ اٹھائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَيَذَّكَّرُ مَنۡ يَّخۡشٰى ۙ وَ يَتَجَنَّبُهَا الۡاَشۡقَى ﴾ [ الأعلٰی : ۱۰، ۱۱ ] "عنقریب نصیحت حاصل کرے گا جو ڈرتا ہے۔ اور اس سے علیحدہ رہے گا جو سب سے بڑا بدنصیب ہے۔"

**آیت 56** ﴿ ① **وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ** : اس آیت میں بتایا کہ نصیحت کیا کرنی ہے اور کون سی بات یاد دلانی ہے۔ فرمایا انھیں یاد دلاؤ کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

② عبادت کا معنی بندگی ہے۔ غلام کو عربی میں عبد اور فارسی میں بندہ کہتے ہیں۔ عبادت وہ تعلق ہے جو غلام کا اپنے مالک یا عبد کا اپنے رب کے ساتھ ہوتا ہے۔

③ کائنات کی ہر چیز رب تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے، کسی کی مجال نہیں کہ ذرہ برابر سرتابی کر سکے۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے "کُنْ" کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔ اس ارادے کو ارادۂ کونیہ اور اس حکم کو تکوینی حکم کہتے ہیں، فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴾ [ یٰسٓ : ۸۲ ] "اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے۔"

④ اکثر معاملات میں انسان اور جن بھی اللہ تعالیٰ کے اس ارادۂ کونیہ اور تکوینی حکم کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح دوسری

مَاۤ اُرِیۡدُ مِنۡهُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ وَّ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ یُّطۡعِمُوۡنِ ۝

نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۝

تمام چیزیں، ان کی پیدائش، عمر، رزق، صحت، مرض اور ان کے اعضا کے افعال اور صلاحیتوں میں ان کی مرضی کا کچھ دخل نہیں۔ البتہ ان دونوں کو امتحان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک حد تک اختیار عطا فرمایا ہے اور زندگی گزارنے کے لیے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کچھ احکام دیے ہیں کہ میں تمھارا رب ہوں اور تم میرے بندے ہو، میں تمھارا مالک ہوں اور تم میرے غلام ہو، لہٰذا تم نے میری غلامی اور بندگی میں زندگی بسر کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو حکم شرعی اور اس ارادے کو ارادۂ شرعیہ کہتے ہیں۔ انسان اس حکم کی تعمیل اور اس ارادے کو پورا بھی کر سکتا ہے اور اسے اس حکم کی نافرمانی اور اس ارادے کو پورا نہ کرنے کا بھی اختیار ہے۔ اسی اختیار پر اس سے باز پرس ہوگی اور وہ ثواب یا عذاب کا مستحق بنے گا، فرمایا: ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا﴾ [ الملك : ۲ ] ”وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے اس کی یاد دہانی کے لیے پیغمبر بھیجے اور فرمایا: ﴿وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ﴾ ”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔“ یعنی ان دونوں کو پیدا کرنے سے میرا مقصد اور ارادۂ شرعیہ یہی ہے کہ وہ میری عبادت اور میری بندگی و غلامی کریں اور اپنی پوری زندگی میرے احکام کے مطابق گزاریں۔

5 بعض لوگوں نے رکوع و سجود، قیام، ذکر، نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج وغیرہ ہی کو عبادت سمجھ رکھا ہے، بے شک یہ بھی عبادت ہیں، مگر صرف یہی عبادت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم بھی دیا ہے اس کی اطاعت کرنا عبادت ہے، کیونکہ بندگی اور عبادت کا مطلب ہی مالک کے حکم بلکہ اشارے پر چلنا ہے۔ جو مالک کا حکم نہ مانے وہ غلام کیسا اور جو اپنے رب کے حکم پر نہ چلے وہ عبد کیسا؟ جو شخص مسجد میں تو نماز پڑھتا ہے مگر گھر، بازار اور عدالت میں اپنی مرضی پر چلتا ہے وہ نہ رب کا بندہ ہے اور نہ اس کا عبد۔ ہاں، اگر وہ ہر کام میں اس کے حکم پر چلتا ہے تو اس کا ہر کام عبادت ہے، حتیٰ کہ نماز ہی نہیں، اس کا کھانا پینا، سونا اور بیوی سے صحبت بھی عبادت ہے، کیونکہ رب کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اس نے مالک کے منع کیے ہوئے حرام سے اجتناب کیا اور اپنی خواہش پوری کی تو اپنے مالک کے حکم پر چلتے ہوئے پوری کی، یہی بندگی اور یہی عبادت ہے۔

6 رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس اکیلے کو اپنا رب اور مالک مانیں، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں۔ اس لیے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۱): ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ﴾ کی تفسیر فرمائی: ”أَيْ وَحِّدُوْا رَبَّكُمْ“ ”یعنی اپنے رب کو ایک مانو۔“ (طبری بسند حسن) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ﴾ [ الأنبياء : ۲۵ ] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“

آیت 57 ﴿مَاۤ اُرِیۡدُ مِنۡهُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ﴾ ...... : یہ کلام انسان کی عام عادت کے مطابق کیا گیا ہے، کیونکہ انسان جو کچھ بناتا

## اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾

بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے ﴿۵۸﴾

ہے اپنے کسی فائدے کے لیے بناتا ہے اور جو غلام خریدتا اور اپنی ملکیت میں رکھتا ہے اس سے مقصد اپنی ضروریات کے لیے ان سے کام لینا اور ان کی کمائی کھانا ہوتا ہے۔ فرمایا جن و انس سے نہ میں کسی طرح کا رزق چاہتا ہوں اور نہ میرا یہ مقصد ہے کہ وہ مجھے کھانے کو کچھ دیں۔ ان کے پیدا کرنے سے میرا اپنا کوئی نفع مقصود نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ میری بندگی کریں، میرے غلام بن کر رہیں اور اس میں انھی کا فائدہ ہے۔ آیت میں اپنے لیے پہلے رزق کی نفی کی جس میں انسان کی ہر ضرورت آتی ہے، اس کے بعد رزق میں سے انسان کے لیے سب سے ضروری چیز کھانے کی نفی فرمائی۔

آیت 58 ① اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ: "هُوَ" ضمیر فصل لانے سے اور "الرَّزَّاقُ" خبر پر ''الف لام'' لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا کہ رزاق صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور کوئی نہیں۔ "الرَّزَّاقُ" مبالغے کا صیغہ ہے، بے حد رزق دینے والا۔ "اِنَّ" تعلیل (علت بیان کرنے) کے لیے ہوتا ہے، اس میں پچھلی بات کی علت بیان فرمائی۔ یعنی میں نہ جن و انس سے کسی طرح کا رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، کیونکہ رزق دینے والا تو صرف میں ہوں، میرے سوا کوئی رزق دینے والا ہے ہی نہیں اور میں کھانے پینے اور ہر ضرورت سے غنی ہوں، تو میں جن و انس سے رزق کا یا کھلانے کا ارادہ کیوں کروں گا؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ﴾ [الأنعام : ١٤ ] ''کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی مالک بناؤں جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، حالانکہ وہ کھلاتا ہے اور اسے نہیں کھلایا جاتا۔''

② سیاق کا تقاضا یہ تھا کہ کہا جاتا: "إِنِّي أَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ" کہ (نہ میں ان سے کسی رزق کا ارادہ کرتا ہوں اور نہ یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں) کیونکہ میں ہی تو بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہوں۔ رسول اللہ ﷺ سے اس طرح پڑھنا بھی ثابت ہے، چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس طرح پڑھایا: « إِنِّيْ أَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ » [ أبو داوٗد، الحروف والقراءات ، باب : ۳۹۹۳۔ ترمذي : ۲۹٤۰، و صححه الألباني ] مصحف امام میں "اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ" ہے اور متواتر قراءت یہی ہے۔ "إِنِّي أَنَا الرَّزَّاقُ" کے بجائے "اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ" کہنے میں لفظ "اللّٰهَ" میں آنے والی تمام صفات، مثلاً اس کے جلال، اس کی کبریائی اور عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

③ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ: "ذُو الْقُوَّةِ" "ذُوْ" کا لفظ کسی اہم چیز کا مالک ہونے کے لیے آتا ہے، مثلاً "ذُوْ مَالٍ" اور "ذُوْ شَرَفٍ" یعنی ساری قوت کا مالک۔ "الْمَتِيْنُ" نہایت مضبوط۔ جسے کوئی نہ اس کے ارادے سے ہٹا سکتا ہے اور نہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾

ع ۳

**پس یقیناً ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا، ان کے ساتھیوں کی باری کی طرح (عذاب کی) ایک باری ہے، سو وہ مجھ سے جلدی (عذاب) نہ مانگیں ﴿۵۹﴾ پھر بڑی ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، ان کے اس دن سے جس کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۶۰﴾**

آیت 59 ① فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا ...... : "ذَنُوْبًا" (ذال کے فتحہ کے ساتھ) اصل میں بڑے ڈول کو کہتے ہیں اور "ذُنُوْبٌ" (ذال کے ضمہ کے ساتھ) "ذَنْبٌ" کی جمع ہے، گناہ۔ پہلے لوگ ایک ہی کنوئیں سے پانی لینے کے لیے آتے تو ہر ایک اپنا ڈول ساتھ لاتا تھا، پھر باری باری اپنا ڈول ڈالتے اور پانی بھر کر لے جاتے، اس لیے "ذَنُوْبٌ" (ڈول) کا لفظ باری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ سورت کے آخر میں کفار قریش کے متعلق فرمایا کہ جس طرح ان سے پہلے ان کے ساتھیوں پر عذاب باری باری آیا اسی طرح ان مشرکین پر عذاب کی نوبت (باری) بھی آ رہی ہے جنھوں نے ظلم کیا۔ ظلم سے مراد اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ باری آنے میں کچھ انتظار کرنا پڑتا ہے۔

② فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ : یہ اصل میں "فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِيْ" تھا، "یاء" حذف ہوگئی، نون وقایہ پر کسرہ یہ بتانے کے لیے باقی رہا کہ یہاں سے ''یاء'' حذف ہوئی ہے۔ سو وہ مجھ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ نہ کریں، باری آنے پر ان کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا۔

آیت 60 فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : "فَوَيْلٌ" پر تنوین تہویل کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی ہلاکت'' کیا گیا ہے۔ ''جس دن کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں'' سے مراد قیامت کا دن ہے، جس کا سورت کے شروع میں ذکر ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴾ [ الذاریات : ۵، ۶ ] ''کہ بلاشبہ جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے یقیناً سچا ہے۔ اور بلاشبہ جزا یقیناً واقع ہونے والی ہے۔'' سورۂ معارج میں قبروں سے نکلنے کے دن کے متعلق فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴾ [ المعارج : ٤٤ ] ''یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔''

سورۃ الطور ۵۲ مکیۃ ۷۶ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — آیاتھا ۴۹ رکوعاتھا ۲

وَ الطُّوۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَ كِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾ فِىۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ﴿۳﴾

**اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔**

**قسم ہے طور کی! ① اور ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے! ② ایسے ورق میں جو کھلا ہوا ہے ③**

آیت 1 ① وَ الطُّوۡرِ : اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی پانچ عظیم الشان مخلوقات کی قسم اٹھائی ہے، اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ اس کا عذاب قیامت کے دن اس کے دشمنوں پر واقع ہو کر رہنے والا ہے، اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ یہ پانچوں مخلوقات اللہ تعالیٰ کی عظیم اور لامحدود قوت وقدرت کی شاہد ہیں اور اس بات کی دلیل ہیں کہ ان عظیم مخلوقات کے خالق کے لیے قیامت برپا کرنا اور اپنے منکروں کو عذاب دینا معمولی بات ہے۔

② ''الطُّوۡرِ'' کا معنی وہ پہاڑ جس پر پودے اگتے ہوں۔ ایک خاص پہاڑ کا نام بھی ''طور'' ہے جس کے دامن میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور اگر اس پر ''الف لام'' جنس کا ہو تو تمام پہاڑ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے متعدد مقامات پر پہاڑوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ان کا زمین میں گڑا ہوا ہونا، آسمان کی طرف بلند ہونا، سمندر سے ہزاروں فٹ بلند ہونے کے باوجود ان پر چشموں، پودوں اور درختوں کا اور اتنی بلندی پر گلیشیروں کی صورت میں پانی کے بے حساب ذخیروں کا موجود ہونا، ان کے اندر چھپے ہوئے معدنیات کے بے شمار خزانے، اتنے بلند اور ٹھوس ہونے کے باوجود ان میں راستوں کا موجود ہونا، غرض پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ رعد (۳)، حجر (۱۹)، نحل (۱۵، ۸۱)، لقمان (۱۰)، فاطر (۲۷)، مرسلات (۲۷)، نبا (۷)، نازعات (۳۲) اور سورۂ غاشیہ (۱۹)۔

آیت 2، 3 وَ كِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾ فِىۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ : ''مَّسۡطُوۡرٍ'' ترتیب اور خوب صورتی کے ساتھ سطر میں لکھی ہوئی کتاب۔ ''رَقٍّ'' کا مادہ رقت اور باریکی کے لیے استعمال ہوتا ہے، مراد باریک چمڑا یا جھلی ہے جو مضبوط اور دیرپا ہونے کی وجہ سے لکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ کاغذ یا کسی طرح کا باریک ورق بھی ''رَقٍّ'' ہے۔ ''مَّنۡشُوۡرٍ'' کھلا ہوا، جسے کھول کر پڑھا جا سکے۔ اس ''کتاب مسطور'' کے متعلق مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، لوح محفوظ، اعمال نامے، تورات، آسمانی کتابیں اور قرآن مجید وغیرہ۔ لفظ عام ہونے کی وجہ سے ''کتاب مسطور'' میں یہ تمام کتابیں اور انسان، جن یا فرشتے جو کچھ لکھتے ہیں وہ سب کچھ شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بہت بڑی نشانی ہے، خواہ اس نے خود لکھا ہو، جیسے لوح محفوظ ہے، یا اس کے فرشتوں نے لکھا ہو، جیسے نامہ ہائے اعمال ہیں، یا اس کے سکھانے سے انسانوں نے لکھا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ''اکرم'' ہونے کا ذکر لکھنے کی تعلیم دینے کے حوالے سے فرمایا: ﴿ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ﴾ [ العلق : ۳، ۴ ] ''پڑھ اور تیرا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔'' اور سورۂ قلم میں تمام لکھنے والوں کی لکھی ہوئی تحریروں کو شاہد کے طور پر پیش کرنے کے لیے ان کی قسم کھائی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ نٓ

# وَّ الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝ۙ وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝ۙ

## اور آباد گھر کی! ۝ اور اونچی اٹھائی ہوئی چھت کی! ۝

﴿ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ ﴾ [ القلم : ۱ ] ''ن۔ قسم ہے قلم کی! اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں!'' یہاں قیامت کے قیام اور اس میں عذاب واقع ہونے کا ایک شاہد ''کتاب مسطور'' کو قرار دیا ہے۔

**آیت 4** ﴿ وَ الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴾ : آباد گھر۔ اس کے متعلق بھی مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے فرمایا، اس سے مراد حدیث میں مذکور ساتویں آسمان پر موجود ایک مکان ہے۔ انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (( ثُمَّ عَرَجَ بِنَا إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ فَاسْتَفْتَحَ جِبْرِيْلُ فَقِيْلَ مَنْ هٰذَا؟ قَالَ جِبْرِيْلُ، قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قِيْلَ وَقَدْ بُعِثَ إِلَيْهِ؟ قَالَ قَدْ بُعِثَ إِلَيْهِ، فَفُتِحَ لَنَا فَإِذَا أَنَا بِإِبْرَاهِيْمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْنِدًا ظَهْرَهُ إِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ وَإِذَا هُوَ يَدْخُلُهُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ لَا يَعُوْدُوْنَ إِلَيْهِ )) [ مسلم، الإیمان، باب الإسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلی السموات.... : ۱۶۲ ] ''پھر ہمارے ساتھ ساتویں آسمان کی طرف چڑھے تو جبریل نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا، کہا گیا: ''کون ہے؟'' کہا: ''جبریل ہوں۔'' کہا گیا: ''اور آپ کے ساتھ کون ہے؟'' کہا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔'' کہا گیا: ''کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟'' کہا: ''ہاں، پیغام بھیجا گیا ہے۔'' تو ہمارے لیے دروازہ کھول دیا گیا تو میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اپنی پیٹھ کی ٹیک بیت المعمور (آباد گھر) کے ساتھ لگا کر بیٹھے ہوئے تھے اور اس گھر میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، (اور جو ایک دفعہ داخل ہو جاتے ہیں وہ) پھر دوبارہ کبھی اس میں داخل نہیں ہوتے۔''

بعض مفسرین نے فرمایا اس سے مراد کعبہ ہے جو ہر وقت عمرہ، حج، قیام اور طواف کرنے والوں کے ساتھ آباد رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ'' کے لفظ میں ان دونوں عظیم الشان گھروں کے علاوہ ہر آباد گھر بھی شامل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت کا کھلا نشان ہے کہ اس نے زمین کے ہر حصے کو آباد کر دیا ہے۔ شہروں، بستیوں، میدانوں، صحراؤں، پہاڑوں، سمندروں غرض زمین کے جس حصے کو دیکھو وہیں آبادی نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ قطب شمالی، جہاں ہر طرف برف ہی برف ہے، وہاں بھی آبادی ملے گی۔ یعنی یہ آباد گھر (زمین) شاہد ہے کہ جس نے ابتداءً اتنی آبادی پھیلا دی ہے جب کچھ بھی نہیں تھا، تو وہ انھیں دوبارہ زندہ کر کے مجرموں کو عذاب دے سکتا ہے اور یقیناً دے گا، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو انسان کو پیدا کرنا بے مقصد ٹھہرتا ہے، جبکہ ایسا نہیں، فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴾ [ القیامۃ : ۳۶ ] ''کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بغیر پوچھے ہی چھوڑ دیا جائے گا؟''

**آیت 5** ﴿ وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴾ : اس سے مراد آسمان ہے جو زمین کے لیے چھت کی طرح ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۖ وَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۳۲ ] ''اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور

وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾

اور لبالب بھرے ہوئے سمندر کی! ﴿۶﴾ کہ یقیناً تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے ﴿۷﴾ اسے کوئی ہٹانے والا نہیں ﴿۸﴾

وہ اس کی نشانیوں سے منہ پھیرنے والے ہیں۔'' جسے اللہ تعالیٰ نے اتنی بلندی پر کسی ستون کے بغیر محض اپنے حکم کے ساتھ تھام کر رکھا ہوا ہے، فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ﴾ [ الرعد : ۲ ] ''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنھیں تم دیکھتے ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [ الحج : ٦٥ ] ''اور وہ آسمان کو تھام کر رکھتا ہے اس سے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کے اذن سے۔'' پھر اس بلند چھت کو سورج، چاند اور ستاروں کے ساتھ سجا رکھا ہے، فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ﴾ [ الملك : ٥ ] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی۔'' اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر آسمان کے پیدا کرنے کو انسان کی دوبارہ پیدائش کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ۞ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۞ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴾ [ النازعات : ٢٧ تا ٢٩ ] ''کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا۔ اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا۔''

**آیت 6** ﴿ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴾ : "سَجَرَ يَسْجُرُ" (ن) کئی معنوں میں آتا ہے۔ "سَجَرَ التَّنُّوْرَ" ''اس نے تنور ایندھن سے بھر کر بھڑکا دیا۔'' "سَجَرَ الْمَاءُ النَّهَرَ" ''پانی نے نہر کو بھر دیا۔'' "سَجَرَ الْكَلْبَ (شَدَّهٗ بِالسَّاجُوْرِ)" ''اس نے کتے کو پٹے کے ساتھ باندھ دیا۔'' اس آیت میں زمین کی سطح پر پائی جانے والی سب سے عظیم مخلوق سمندر کی قسم کھا کر اسے قیامت کے دن عذاب دینے پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ لفظ "الْمَسْجُوْرِ" لغت کے لحاظ سے جن کیفیتوں کا اظہار کرتا ہے وہ تینوں یہاں مراد لی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لبالب بھرا ہوا ہے، مدتیں گزرنے کے باوجود اس کی لبریزی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ قتادہ نے فرمایا: "اَلْمُمْتَلِئُ." [ طبري : ٣٢٥٩٤، بسند صحيح ] ''بھرا ہوا۔'' پھر وہ ساکن نہیں بلکہ اس میں ہر وقت اُبلنے اور جوش مارنے کی سی کیفیت جاری رہتی ہے۔ مجاہد نے فرمایا: "اَلْمُوْقَدُ" [ طبري : ٣٢٥٩٢، بسند حسن ] ''بھڑکایا ہوا۔'' مزید دیکھیے سورۂ تکویر کی آیت (۶): ﴿ وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴾ کی تفسیر۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے خشکی پر چڑھ دوڑنے سے باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ اگر کبھی اسے طوفان کی صورت میں نکلنے کی تھوڑی سی اجازت ملتی ہے تو شہروں کے شہر صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جاتے ہیں۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: (( "الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ" اَلْمَحْبُوْسُ )) [ طبري : ٣٢٥٩٦ ]

**آیت 7** ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴾ : یہ جواب قسم ہے، جس کا یقین دلانے کے لیے پانچوں قسمیں کھائی گئی ہیں۔

**آیت 8** ﴿ مَا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴾ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ روم (۴۳) اور سورۂ معارج (۲،۱) کی تفسیر۔

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ﴿۱۵﴾

جس دن آسمان لرزے گا، سخت لرزنا ⑨ اور پہاڑ چلیں گے، بہت چلنا ⑩ تو اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ⑪ وہ جو فضول بحث میں کھیل رہے ہیں ⑫ جس دن انھیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا، سخت دھکیلا جانا ⑬ یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے ⑭ تو کیا یہ جادو ہے، یا تم نہیں دیکھ رہے؟ ⑮

**آیت 9** يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا: "مَارَ يَمُوْرُ مَوْرًا" (ن) کسی چیز کا تیزی سے حرکت کرنا اور آگے پیچھے اور دائیں بائیں زور سے ہلنا، الٹ پلٹ ہونا، چکر کھانا۔ "مَوْرًا" مصدر تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''سخت لرزنا'' کیا گیا ہے۔ '' يَوْمَ'' "لَوَاقِعٌ" کا ظرف ہے، یعنی تیرے رب کا عذاب اس دن واقع ہونے والا ہے جب آسمان میں سخت لرزہ پیدا ہوگا اور وہ نہایت تیزی سے چکر کھائے گا اور آخر کار پھٹ جائے گا۔ قیامت کے دن آسمان پر گزرنے والے احوال کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان (۲۵)، رحمٰن (۳۷)، حاقہ (۱۶)، معارج (۸)، مزمل (۱۸)، مرسلات (۹)، نبا (۱۹)، تکویر (۱۱)، انفطار (۱)، انشقاق (۱)، ابراہیم (۴۸)، انبیاء (۱۰۴) اور سورۂ زمر (۶۷)۔

**آیت 10** وَتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا: قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے احوال کے لیے دیکھیے سورۂ نبا (۲۰) کی تفسیر۔

**آیت 12،11** فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ: "خَاضَ يَخُوْضُ خَوْضًا" (ن) اصل میں پانی کے اندر داخل ہونے کو کہتے ہیں، پھر یہ لفظ فضول اور بے ہودہ اقوال و اعمال میں مشغولیت کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جس طرح پانی میں جانے والے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا پاؤں کہاں پڑے گا، فضول کام یا بات کرنے والا بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس کا پاؤں کہاں پڑ رہا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ مدثر (۴۵) کی تفسیر۔

**آیت 13** يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا: "دَعَّ يَدُعُّ" سختی کے ساتھ دھکیلنا۔ "دَعًّا" مصدر مجہول برائے تاکید ہے، بری طرح دھکیلا جانا۔ یعنی فرشتے انھیں نہایت سختی کے ساتھ بری طرح دھکیلتے ہوئے جہنم کی آگ کی طرف لے جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ دخان (۴۷)، رحمان (۴۱)، قمر (۴۸) اور سورۂ مومن (۷۰ تا ۷۲)۔

**آیت 14** هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ: یعنی فرشتے انھیں ذلیل کرنے کے لیے کہیں گے، یہی وہ جہنم ہے جسے تم دنیا میں مسلسل جھٹلاتے رہے۔ "كَانَ" استمرار کے لیے ہے۔

**آیت 15** اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ: یعنی جس طرح تم دنیا میں ہر معجزے کو جادو کہہ کر جھٹلا دیتے تھے، اب اس آگ کو بھی جادو کہہ کر جھٹلا دو، تو بتاؤ کیا یہ جادو ہے؟ یا جس طرح تم دنیا میں کہتے تھے: ﴿مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ﴾

اِصۡلَوۡهَا فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا ۚ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۶ اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيۡمٍ ۝۱۷ فٰكِهِيۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ ۚ وَ وَقٰهُمۡ رَبُّهُمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ ۝۱۸ كُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا هَنِيۡٓـئًا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۹

اس میں داخل ہو جاؤ، پھر صبر کرو یا صبر نہ کرو، تم پر برابر ہے، تمھیں صرف اسی کا بدلا دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے ⑯ بے شک متقی لوگ باغوں اور بڑی نعمت میں ہیں ⑰ لطف اٹھانے والے اس سے جو ان کے رب نے انھیں دیا اور ان کے رب نے انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا لیا ⑱ کھاؤ اور پیو خوب مزے سے، اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے ⑲

[حٰم السجدۃ: ۵] کہ ہمارے اور تمھارے درمیان ایک پردہ ہے، جو کچھ تم بتاتے ہو ہمیں دکھائی نہیں دیتا، تو بتاؤ کیا اب بھی تم نہیں دیکھ رہے؟ یہ ساری بات کفار کو دنیا میں ان کی جھٹلانے کے لیے کہی ہوئی باتیں یاد کروا کر ذلیل کرنے کے لیے کہی جائے گی۔

**آیت 16** ① اِصۡلَوۡهَا : ظاہر ہے وہ یہی کہیں گے کہ پروردگارا! نہ یہ جادو ہے اور نہ اسے دیکھنے سے ہم اندھے ہیں، بس ایک دفعہ ہمیں واپس جانے دے، ہم کبھی انکار نہیں کریں گے۔ (دیکھیے انعام: ۲۷ تا ۳۰) مگر حکم ہوگا اب اس میں داخلے کے بغیر چارہ نہیں، اسی میں جھلستے رہو۔

② فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا ۚ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ : یعنی تمھارے لیے صبر کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں، کیونکہ نہ صبر سے تمھارے عذاب میں تخفیف ہوگی اور نہ جزع فزع اور واویلا کرنے سے، کیونکہ اب نہ عذاب میں کمی ہوگی، نہ اس میں وقفہ ہوگا اور نہ اس سے نکل سکو گے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۲)، زخرف (۷۵) اور سورۂ ابراہیم (۲۱)۔

③ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ : یعنی جس طرح تم نے طے کر رکھا تھا کہ کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے، اب اس کی جزا یہی ہے کہ کسی صورت آگ سے نکل نہیں سکو گے۔

**آیت 17** اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيۡمٍ : مکذبین کے برے انجام کے ذکر کے بعد متقین کے حسنِ انجام کا ذکر فرمایا۔ مزید دیکھیے سورۂ حجر (۴۵)۔

**آیت 18** ① "فٰكِهِيۡنَ" "فَكِهَ يَفْكَهُ فَكَهًا وَ فُكَاهَةً" (ع) سے اسم فاعل ہے، خوش ہونا، لطف اٹھانا، لذت لینا، ظریف الطبع ہونا۔

② بِمَاۤ اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ ذاریات (۱۶) کی تفسیر۔

③ وَ وَقٰهُمۡ رَبُّهُمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ دخان (۵۶) کی تفسیر۔

**آیت 19** كُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا هَنِيۡٓـئًا ...... : "هَنَأَ يَهْنِئُ وَ يَهْنَأُ وَيَهْنُؤُ الطَّعَامُ" کا مفہوم صرف مزیدار ہونے کے لفظ سے

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۲۰ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱

**ایسے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے جو قطاروں میں بچھائے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کا نکاح سفید جسم، سیاہ آنکھوں والی عورتوں سے کر دیا، جو بڑی بڑی آنکھوں والی ہیں ۝۲۰ اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان سے ان کے عمل میں کچھ کمی نہ کریں گے، ہر آدمی اس کے عوض جو اس نے کمایا گروی رکھا ہوا ہے ۝۲۱**

---

پورا ادا نہیں ہوتا، بلکہ لغت میں ''هَنِيْئًا'' سے مراد وہ چیز ہے جو کسی مشقت کے بغیر آسانی سے حاصل ہو جائے، کھانے میں لذیذ ہو اور گلے سے آسانی سے اتر جائے۔ اس سے بدہضمی یا بیماری کا کوئی اندیشہ نہ ہو اور اس کے ساتھ کوئی غم یا فکر نہ ہو۔

**آیت 20** ① **مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ:** ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ تخت قطار در قطار آمنے سامنے بچھے ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ [الصافات : ٤٤] ''تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔''

② **وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ:** اس کے لیے دیکھیے سورۂ دخان (۵۴) کی تفسیر۔

**آیت 21** ① **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ:** ''بِاِيْمَانٍ'' پر تنوین تنکیر و تقلیل کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی'' کیا گیا ہے۔

② **اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ:** طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر نقل فرمائی ہے: (( إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَرْفَعُ لِلْمُؤْمِنِ ذُرِّيَّتَهُ، وَإِنْ كَانُوْا دُوْنَهُ فِي الْعَمَلِ، لِيُقِرَّ اللّٰهُ بِهِمْ عَيْنَهُ )) [ طبری : ۳۲۶۲۲ ] ''اللہ تعالیٰ مومن کی خاطر اس کی اولاد کو اونچا لے جائے گا، خواہ وہ عمل میں اس سے کم ہوں گے، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے اس کی آنکھ ٹھنڈی کرے۔'' اس سے پہلے سورۂ رعد (۲۳) میں بیان فرمایا کہ اہل جنت کے آباء اور بیوی بچوں میں سے جو بھی صالح ہوں گے وہ ان کے ساتھ جنت میں جائیں گے اور سورۂ مومن (۸) میں فرمایا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ سے ایمان والوں کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ وہ انھیں اور ان کے آباء، بیویوں اور اولادوں کو جنت میں داخل کر دے۔

زیر تفسیر آیت میں جنت کے داخلے کے ساتھ ایک اور بڑی خوش خبری دی ہے کہ اگر اولاد کسی نہ کسی درجے کا ایمان لا کر اپنے صالح آباء کے نقش قدم پر چلتی رہی ہو تو خواہ وہ ایمان یا عمل کے لحاظ سے اس بلند درجے کے مستحق نہ بھی ہوئے جو ان کے آباء کو حاصل ہوگا، پھر بھی اللہ تعالیٰ انھیں ان کے آباء کے ساتھ ملا دے گا۔

③ **وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ:** ''أَلَتَ يَأْلِتُ أَلْتًا'' (ض) '' اَلشَّيْءَ '' ''کسی چیز کا کم ہونا۔'' ''أَلَتَ الرَّجُلَ حَقَّهُ''

وَ اَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحۡمٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ ﴿۲۲﴾ یَتَنَازَعُوۡنَ فِیۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِیۡهَا وَ لَا تَاۡثِیۡمٌ ﴿۲۳﴾

**اور ہم انھیں پھل اور گوشت زیادہ دیں گے اس میں سے جو وہ چاہیں گے ﴿۲۲﴾ وہ اس میں ایک دوسرے سے شراب کا پیالہ چھینیں جھپٹیں گے، جس میں نہ بے ہودہ گوئی ہوگی اور نہ گناہ میں ڈالنا ﴿۲۳﴾**

''کسی آدمی کے حق میں کمی کرنا، پورا نہ دینا۔'' یعنی یہ نہیں ہوگا کہ ہم آباء کو ان کے اعلیٰ درجے سے نیچے لا کر ان کی اولاد کے ساتھ ملا دیں، کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ان کے عمل کا اجر کم کر دیا جائے۔ اس لیے ہم ان کے عمل میں کسی طرح کمی نہیں کریں گے، بلکہ محض اپنے فضل سے اولاد کا درجہ بڑھا کر آباء کے اعلیٰ درجے میں پہنچا دیں گے۔

④ جس طرح آباء کے عمل کی برکت سے اولاد کے درجات میں اضافہ ہوگا اسی طرح اولاد کی دعا کی بدولت اللہ تعالیٰ آباء پر بھی فضل فرمائے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْجَنَّةِ، فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ! أَنّٰى لِيْ هٰذِهِ ؟ فَيَقُوْلُ بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ )) [ مسند أحمد : ۵۰۹/۲، ح : ۱۰۶۱۰، مسند احمد کے محققین نے اس کی سند کو حسن اور ابن کثیر نے صحیح قرار دیا ہے ] ''اللہ عزوجل جنت میں صالح بندے کا درجہ بلند فرمائے گا تو وہ کہے گا: ''اے میرے رب! مجھے یہ درجہ کیسے مل گیا؟'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تیری اولاد کے تیرے لیے استغفار کی وجہ سے۔'' اس کی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ )) [مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته : ۱۶۳۱ ] ''جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے کٹ جاتا ہے، سوائے تین اعمال کے، صدقہ جاریہ یا وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جاتا رہے یا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''

⑤ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ : ''رَهَنَ يَرْهَنُ رَهْنًا'' (ف) گروی رکھنا۔ ''رَهِيْنٌ'' گروی رکھا ہوا۔ اگر کوئی شخص کسی سے کچھ قرض لے اور قرض دینے والا اپنے حق کی وصولی کے لیے ضمانت کے طور پر اس کی کوئی چیز اپنے پاس رہن (گروی) رکھ لے تو جب تک وہ قرض ادا نہ کرے اس کی گروی رکھی ہوئی چیز چھوڑی نہیں جاتی اور اگر ادا کر ہی نہ سکے تو ضبط کر لی جاتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا فضل بیان فرمایا کہ صالح اولاد کے اعمال ان کے آباء کے درجے کے لائق نہ بھی ہوئے تو انھیں ان کے آباء کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اب اپنے عدل کا بیان فرمایا کہ کسی شخص کو دوسرے کے گناہ میں نہیں پکڑا جائے گا، بلکہ ہر آدمی اپنے کمائے ہوئے عمل کے بدلے ہی گرفتار ہوگا، خواہ وہ باپ ہو یا بیٹا۔ پھر یا تو آدمی وہ عمل پیش کر کے چھوٹ جائے گا جس کی ادائیگی اس کے ذمے تھی یا پیش نہ کر سکنے کی وجہ سے گرفتار رہے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۴)، فاطر (۱۸) اور سورۂ مدثر (۳۸)۔

**آیت 22** وَ اَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۲) کی تفسیر۔

**آیت 23** ① یَتَنَازَعُوۡنَ فِیۡهَا كَاۡسًا : ''كَاْسًا'' کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۵) کی تفسیر۔ اہلِ جنت

وَ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴿۲۴﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

اور ان پر چکر لگاتے رہیں گے انھی کے لڑکے، جیسے وہ چھپائے ہوئے موتی ہوں ﴿۲۴﴾ اور ان کے بعض بعض پر متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کرتے ہوں گے ﴿۲۵﴾ کہیں گے بلاشبہ ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرنے والے تھے ﴿۲۶﴾

ایک دوسرے سے شراب کے پیالے اس لیے نہیں چھینیں جھپٹیں گے کہ وہاں کسی کمی کا یا ختم ہونے کا اندیشہ ہوگا، بلکہ محض خوش طبعی کے طور پر ایسا کریں گے، کیونکہ چھیننے جھپٹنے کا الگ مزا ہے۔

❷ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ: دنیا کی شراب میں کئی قباحتیں ہیں، جن میں سے سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ آدمی کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے، حالانکہ عقل ہی اسے جانوروں سے امتیاز اور ان پر برتری عطا کرتی ہے۔ پھر وہ نشے کی حالت میں بکواس کرنے لگتا ہے، گناہ کے کام کر بیٹھتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات اپنی محرم عورتوں تک کی عزت برباد کر بیٹھتا ہے۔ جنت کی شراب میں دنیا کی شراب والی کوئی قباحت نہیں ہوگی، مگر اس میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوں گی جن کی وجہ سے یہ لوگ اس کی تلخی، بدبو اور بعد کے برے اثرات کے باوجود اسے پیتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ صافات (۴۷)۔

**آیت 24** : ❶ وَ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ دہر (۱۹) اور سورۂ واقعہ (۱۷، ۱۸) کی تفسیر۔

❷ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ: یعنی ان کی خوب صورتی، سفیدی اور پاکیزگی کا یہ عالم ہوگا جیسے موتی ابھی اپنی سیپ ہی میں محفوظ ہوں، یا جواہرات والی دنیا میں اس طرح چھپا کر رکھے ہوئے ہوں کہ نہ ان پر گرد و غبار کا کوئی ذرہ پڑا ہو اور نہ وہ ہاتھ لگنے سے میلے ہوئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اتنے خوب صورت اور صاف ستھرے ہوں گے کہ چھونے سے میلے ہوتے ہوں گے۔

**آیت 25** : وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ: یعنی اہلِ جنت ان نعمتوں سے جن کا ذکر اوپر گزرا شاد کام ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ ان میں سے ہر ایک پوچھنے والا بھی ہوگا اور دوسرے کو جواب دینے والا بھی کہ سناؤ دنیا میں تم پر کیا کچھ گزرا؟ پھر اس کی مصیبتوں اور فتنوں سے بچتے بچاتے یہاں جنت میں کیسے پہنچے؟ اس سے معلوم ہوا کہ انھیں گزشتہ تمام واقعات یاد ہوں گے، چنانچہ وہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے کہیں گے۔ ایک دوسرے سے اس سوال و جواب میں ان کے آباء اور ان کی اولاد کی گفتگو بھی شامل ہے جو ایک درجے میں اکٹھے ہوں گے۔ تو خوشی سے ایک دوسرے سے گزرے ہوئے احوال کے متعلق سوال کریں گے اور موجودہ حالت کے بارے میں بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے گناہ گاروں پر اتنا بڑا انعام کیسے کر دیا کہ ہمیں جنت میں داخل فرمایا اور پھر ہم میں سے بعض کے عمل کی کوتاہی کے باوجود سب کو یکجا کر دیا۔

**آیت 26** : قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ: یعنی وہ کہیں گے کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں اپنے گھر والوں میں رہتے

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾ فَذَكِّرْ فَمَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّ لَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾

**پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں زہریلی لو کے عذاب سے بچالیا ﴿۲۷﴾ بے شک ہم اس سے پہلے ہی اسے پکارا کرتے تھے، بے شک وہی تو بہت احسان کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۸﴾ پس نصیحت کر، کیونکہ تو اپنے رب کی مہربانی سے ہرگز نہ کسی طرح کاہن ہے اور نہ کوئی دیوانہ ﴿۲۹﴾**

ہوئے ہر قسم کی آسائشوں کے باوجود ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں ہم سے اللہ کی نافرمانی نہ ہو جائے، ہماری نیکیاں نامقبول نہ ہو جائیں اور ہمارے اعمال کی شامت سے ہمارا خاتمہ خراب نہ ہو جائے۔ "فِيْۤ اَهْلِنَا" (اپنے گھر والوں میں) کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم اپنے گھر والوں کے بارے میں ڈرتے رہتے تھے کہ وہ اللہ کے نافرمان نہ بن جائیں اور نافرمانی کے نتیجے میں جہنم کا ایندھن نہ بن جائیں، اور یہ بھی کہ ان کی وجہ سے کہیں ہم راہِ راست سے نہ بھٹک جائیں، ان کی خاطر کمائی کرتے کرتے حرام کاموں کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں، انھیں نمازی اور رب تعالیٰ کا فرماں بردار بنانے کی کوشش میں کوتاہی نہ کر بیٹھیں اور ان کی محبت اللہ کی اطاعت پر غالب نہ آ جائے۔

**آیت 27** فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ: "السَّمُوْمِ" "سَمٌّ" (زہر) سے مشتق ہے، زہریلی بو۔ اس کی جمع "سَمَائِمُ" آتی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ "مَسَامٌّ" سے ہے جو جسم کے ہر مسام میں داخل ہو جائے۔ یعنی ہم تو شدید خائف تھے کہ اپنی کوتاہیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے جہنم میں نہ پھینک دیے جائیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہماری خطائیں معاف فرما کر ہمیں جہنم کی زہریلی بو سے بچا لیا۔

**آیت 28** ① اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ: یعنی ہم اس سے پہلے دنیا میں ڈرتے تھے، مگر ڈرنے کے باوجود اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے، بلکہ اپنی امیدیں اسی سے وابستہ رکھیں۔ اس لیے اسی کو پکارتے رہے، اسی سے دعا کرتے رہے اور اسی سے جنت میں داخلے اور جہنم سے پناہ کی درخواست کرتے رہے۔

② اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ: "اِنَّ" تعلیل کے لیے آتا ہے، یعنی اس نے ہماری خطائیں معاف فرمائیں، ہمیں جہنم کی زہریلی بو سے بچایا، ہمیں جنت کی نعمتیں عطا کیں اور ہمارے پیاروں کو ہمارے ساتھ یکجا کر دیا، اس لیے کہ وہی ہے جو بے حد احسان کرنے والا اور نہایت رحم والا ہے، ہمیں جو کچھ عطا ہوا وہ محض اسی کے احسان اور رحم کا نتیجہ ہے۔

**آیت 28** ① فَذَكِّرْ فَمَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّ لَا مَجْنُوْنٍ: "کاہن" وہ شخص جو شیاطین سے تعلق رکھتا ہے اور ان سے سن کر غیب کی خبریں دیتا ہے، جن میں ایک آدھ وہ سچی خبر بھی ہوتی ہے جو انھوں نے آسمان کے نیچے فرشتوں کی باہمی گفتگو سے چرائی ہوتی ہے، پھر اس کے ساتھ سو باتیں جھوٹی ملا کر اپنے دوستوں کو بتاتے ہیں۔

② سورت کے شروع سے قیامت، جزا و سزا اور جنت و جہنم کی تفصیل اور دلائل ذکر کرنے کے بعد فرمایا: "فَذَكِّرْ" (پس

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾

یا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس پر ہم زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں؟ ﴿۳۰﴾ کہہ دے انتظار کرو، پس بے شک میں (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں ﴿۳۱﴾

نصیحت کر )یعنی جب ہم نے یہ سب کچھ آپ کو وحی کے ذریعے سے بتا دیا تو اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس کے ساتھ تمام لوگوں کو نصیحت کریں اور کفار و مشرکین کی بے ہودہ باتوں اور تہمتوں کی پروا نہ کریں۔ وہ آپ کو کاہن کہیں یا مجنون، آپ اللہ کے فضل سے کسی طرح بھی نہ کاہن ہیں نہ مجنون۔ کہانت یا دیوانگی کی کوئی بھی بات آپ میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ ”فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ“ میں ”مَا“ نافیہ کے بعد ”باء“ نفی کی تاکید کے لیے ہے اور ”بِكَاهِنٍ“ پر تنوین تنکیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”تو اپنے رب کی مہربانی سے ہرگز نہ کسی طرح کاہن ہے اور نہ کوئی دیوانہ۔“

③ اللہ تعالیٰ نے اور مقامات پر بھی رسول اللہ ﷺ سے کہانت اور جنون کی نفی فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ حاقہ (۴۱، ۴۲)، قلم (۲) اور سورۂ تکویر (۲۲)۔ سورۂ شعراء میں یہ بات کہ آپ ﷺ کاہن نہیں اور یہ کہ کاہن کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں، تفصیل سے گزر چکی ہے، دیکھیے سورۂ شعراء کی آیات (۲۱۰ تا ۲۲۳) اور ان کی تفسیر۔

**آیت 30** اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ: ”تَرَبَّصَ يَتَرَبَّصُ“ (تفعل) ”آنے والے کسی شر یا خیر کا انتظار کرنا۔“ ”الْمَنُوْنِ“ ”مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا“ (ن) کا معنی ”قطع کرنا“ ہے۔ ”الْمَنُوْنِ“ بروزن ”فَعُوْلٌ“ (کاٹنے والا) موت کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ زندگی کی رسی کو کاٹ دیتی ہے، اور زمانے کو بھی، کیونکہ وہ بھی زندگی کے ایام کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ ”رَيْبَ“ کا اصل معنی شک اور بے چینی ہے، لیکن جب اس کا استعمال زمانے کے ساتھ ہو تو مراد زمانے کے حوادث ہوتے ہیں، کیونکہ وہ آدمی کو بے چین رکھتے ہیں۔

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے انکار اور تعجب کے انداز میں ان مشرکین کی جہالت کی باتوں کا پندرہ (۱۵) دفعہ لفظ ”اَمْ“ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور ہر ”اَمْ“ کے بعد سوال کرتے ہوئے ان پر الزام قائم کیا ہے، جس کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ ﴾ ”یا وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے۔“ کفار کا یہ قول نقل فرما کر تردید کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ قرآن مجید کا وجود ہی اس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ البتہ ان کی اس بات کا جواب دیا ہے کہ ہم اس پر زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں کہ اس پر کوئی آفت آ جائے، یا اس کی موت کا وقت آ جائے، جس کے ساتھ اس کی دعوت کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

**آیت 31** قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ انتظار کر کے دیکھ لو، تم ہی مرو گے میں نہیں مروں گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم میرا انجام دیکھو میں تمھارا انجام دیکھتا ہوں۔ تمھارا انجام ناکامی اور ہلاکت ہے، میرا انجام کامیابی اور نجات ہے۔

اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۳۲﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۴﴾

یا انھیں ان کی عقلیں اس بات کا حکم دیتی ہیں، یا وہ خود ہی حد سے گزرنے والے لوگ ہیں؟ ﴿۳۲﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۳۳﴾ پس وہ اس جیسی ایک ہی بات بنا کر لے آئیں، اگر سچے ہیں ﴿۳۴﴾

**آیت 32** ﴿ اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ ...... ﴾ : ” أَحْلَامٌ “ ” حِلْمٌ “ کی جمع ہے، جو دراصل غصہ بھڑکنے کے وقت ضبطِ نفس کو کہتے ہیں۔ عقل کو ”حلم“ اس لیے کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں وہی طبیعت پر ضبط کا باعث ہوتی ہے۔ مشرکین اپنے آپ کو بڑا عقل مند باور کرواتے تھے، اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے متعلق ان کی تین باتیں ذکر فرمائیں، کاہن، مجنون اور شاعر، پھر ان کی عقلوں پر چوٹ فرمائی کہ کیا کوئی عاقل ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ اول تو رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اور آپ کا لایا ہوا قرآن سب کے سامنے ہے، کوئی شخص جس کی عقل قائم ہو وہ آپ کے متعلق یا قرآن کے متعلق ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتا، کیونکہ قرآن کریم کا اور رسولِ کریم ﷺ کا کہانت، جنون یا شعر کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو باتیں کہہ رہے ہیں وہ آپس میں اتنی متضاد ہیں کہ ایک شخص میں جمع ہو ہی نہیں سکتیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص شاعر بھی ہو، کاہن بھی اور پھر پاگل بھی اور اس کا پیش کیا ہوا کلام شعر بھی ہو، کہانت بھی اور دیوانگی بھی؟ پھر یہ کون سی عقل مندی ہے کہ کسی شاعر یا کاہن یا دیوانے سے اتنے شدید خوف زدہ ہو جاؤ کہ کسی کو اس کی بات نہ سننے دو؟ بھلا آج تک کسی شاعر، کاہن یا دیوانے کی اتنی شدید مخالفت کی گئی ہے جتنی یہ لوگ آپ ﷺ کی کر رہے ہیں۔ فرمایا، کیا ان کی عقلیں انھیں اس کا حکم دیتی ہیں؟ جواب ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ خود بخود ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ان کی عقلوں کا فیصلہ نہیں بلکہ بات کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ دراصل یہ سرکش لوگ ہیں اور ان کی سرکشی انھیں حق قبول نہیں کرنے دیتی۔

**آیت 33** ﴿ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴾ : ” تَقَوَّلَ يَتَقَوَّلُ تَقَوُّلًا “ (تفعّل) تکلف سے بات بنانا اور گھڑنا۔ ” فُلَانٌ تَقَوَّلَ عَلٰى فُلَانٍ “ ”فلاں نے فلاں پر جھوٹ گھڑ دیا۔“ یعنی یا وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ نبی نے یہ کلام اپنے پاس سے بنا کر اللہ کے ذمے لگا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ نہیں فرمایا کہ نہیں یہ نبی کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے، کیونکہ خود ان کا دل جانتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کا اپنا کلام نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ اہلِ زبان ہیں وہ اسے سن کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ پھر جو شخص رسول اللہ ﷺ کو جانتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ نبوت سے پہلے چالیس برس تک کسی انسان پر بھی جھوٹ نہ باندھنے والا شخص اللہ پر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴾ یعنی ان کی مخالفت کی وجہ یہ نہیں کہ آپ ﷺ نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ مانتے ہی نہیں، انھوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ہم کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے۔

**آیت 34** ﴿ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴾ : یعنی اگر یہ اسے رسول کا اپنے پاس سے گھڑا ہوا انسانی کلام سمجھتے

اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾

یا وہ کسی چیز کے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں، یا وہ (خود) پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿۳۵﴾ یا انھوں نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ وہ یقین نہیں کرتے ﴿۳۶﴾

ہیں تو وہ بھی اس جیسی ایک بات ہی بنا کر لے آئیں، اگر سچے ہیں۔ آخر وہ بھی اہلِ زبان ہیں، انھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز ہے، پھر انھیں یہ بھی پیش کش ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ساری کائنات کو ساتھ ملا کر اس جیسی ایک بات بنا کر لے آئیں۔ قرآن مجید کے ان مقامات پر بھی نظر ڈال لیں، سورۂ بقرہ (۲۳)، یونس (۳۸)، ہود (۱۳) اور بنی اسرائیل (۸۸)۔

**آیت 36,35** ① اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ ...... : اس سے پہلے تین سوال یہ ثابت کرنے کے لیے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول اور قرآن اللہ کی سچی کتاب ہے، اب یہاں سے اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور قدرتِ کاملہ کو ثابت کرنے کی بات کا آغاز فرمایا۔ یعنی محمد ﷺ نے ان کے سامنے جو دعوت پیش کی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارا خالق ہے، اس لیے تمھیں اسی کی عبادت کرنی چاہیے، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔ آخر اس پر ان کے بگڑنے کی کیا کوئی معقول وجہ ہے؟ اگر یہ رب تعالیٰ کو خالق نہیں مانتے تو بتائیں کہ کیا وہ کسی بنانے والے کے بغیر ہی بن گئے ہیں؟ ظاہر ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ضرور ہوتا ہے۔ یا پھر انھوں نے اپنے آپ کو خود بنا لیا ہے؟ یہ پہلی بات سے بھی زیادہ ناممکن بات ہے، کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز خالق بھی ہو اور مخلوق بھی۔ یا پھر یہ بتائیں کہ یہ آسمان و زمین انھوں نے بنائے ہیں؟ ظاہر ہے ایسا بھی نہیں، کیونکہ یہ کائنات اس وقت کی بنی ہوئی ہے جب ان لوگوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تین سوال کیے ہیں جن کا جواب ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ بالکل ظاہر ہے کہ نہ یہ لوگ کسی بنانے والے کے بغیر بنے ہیں، نہ یہ اپنے آپ کو خود بنانے والے ہیں اور نہ کائنات ان کی بنائی ہوئی ہے، بلکہ انھیں اور ساری کائنات کو بنانے والا کوئی اور ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس حقیقت کو وہ بھی مانتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ﴾ [الزخرف: ۸۷] ”اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر کہاں بہکائے جاتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ﴾ [لقمان: ۲۵] ”اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔“

② بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ: یعنی بات یہ نہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق نہیں مانتے اور اس کا اقرار نہیں کرتے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اقرار کے باوجود انھیں اس بات کا یقین نہیں ہے، کیونکہ اگر انھیں واقعی یقین ہوتا کہ ہمارا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو اسی کی عبادت کرتے، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بناتے اور نہ اس کی طرف دعوت دینے والے کی اس طرح مخالفت کرتے۔

اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآىِٕنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَيۡطِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ‌ۚ فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍؕ ﴿۳۸﴾ اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَلَكُمُ الۡبَنُوۡنَؕ ﴿۳۹﴾

یا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں، یا وہی حکم چلانے والے ہیں؟ ﴿۳۷﴾ یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر وہ اچھی طرح سن لیتے ہیں؟ تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل پیش کرے ﴿۳۸﴾ یا اس کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے؟ ﴿۳۹﴾

آیت 37 ① اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآىِٕنُ رَبِّكَ ...... : یہ کفار کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ آپ ﷺ ہی کو کیوں رسول بنایا گیا، مکہ اور طائف کے سرداروں میں سے کسی کو رسالت کے لیے کیوں نہ چنا گیا؟ فرمایا، یہ فیصلہ کرنا کہ کس کو رسول بنا کر بھیجا جائے مالک کا کام ہے۔ اب یہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے رسول کا انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو تیرے رب کے خزانوں کے مالک یہ ہیں، جسے چاہیں دیں جسے چاہیں نہ دیں، یا یہ کہ مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اس پر حکم انھی کا چلتا ہے۔ اب یہ خود ہی بتائیں کہ ان دونوں میں سے ان کا دعویٰ کیا ہے؟ مزید دیکھیے سورۂ ص (۸ تا ۱۰) اور سورۂ زخرف (۳۱، ۳۲)۔ خلاصہ یہ کہ کفار کے پاس رسول اللہ ﷺ کی رسالت سے انکار کی کوئی عقلی دلیل نہیں۔

② آیت کی تفسیر اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ یا یہ لوگ اس لیے اکیلے رب کی عبادت نہیں کرتے اور محمد ﷺ کو رسول نہیں مانتے کہ تیرے رب کے خزانوں کے مالک وہی ہیں، یا ان پر انھی کا حکم چلتا ہے، اس لیے وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں، جو چاہیں کرتے پھریں؟ ظاہر ہے ایسا بھی ہرگز نہیں۔

آیت 38 اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ ...... : یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر وہ عالم بالا کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں اور وہاں سے سن آئے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حق ہے اور یہ بھی سن آئے ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں اور نہ اس نے انھیں بھیجا ہے، بلکہ انھوں نے قرآن خود ہی تصنیف کر کے اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگا دیا ہے۔ اگر کسی کا یہ دعویٰ ہے تو وہ اس کی واضح دلیل پیش کرے، جس سے معلوم ہو کہ وہ واقعی آسمان تک گیا تھا اور وہاں اس نے واقعی اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی باتیں سنی ہیں۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۴) اور سورۂ فاطر (۴۰) اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے پاس رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانے کے لیے کوئی نقلی دلیل بھی نہیں۔

آیت 39 اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَلَكُمُ الۡبَنُوۡنَ: پھر جب انھیں عالم بالا تک رسائی نہیں تو انھیں کیسے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کا نظام چلانے کے لیے اولاد کی ضرورت ہے اور انھوں نے یہ کیسے طے کر دیا کہ اولاد بناتے وقت اس نے اپنے لیے بیٹوں کے بجائے بیٹیوں کا چناؤ کیا ہے اور انھیں بیٹوں کے لیے منتخب کیا ہے؟ حالانکہ یہ لوگ اپنے لیے کبھی بیٹیاں پسند نہیں کرتے۔ دیکھیے سورۂ نحل (۵۷ تا ۶۰) اور سورۂ زخرف (۱۶ تا ۱۸)۔

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ ﴿۴۰﴾ اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ ﴿۴۱﴾ اَمۡ يُرِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ؕ فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هُمُ الۡمَكِيۡدُوۡنَ ﴿۴۲﴾ اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۴۳﴾

یا تو ان سے کوئی اجرت مانگتا ہے؟ پس وہ تاوان سے بوجھل کیے جانے والے ہیں ﴿۴۰﴾ یا ان کے پاس غیب ہے؟ پس وہ لکھتے ہیں ﴿۴۱﴾ یا وہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ تو جن لوگوں نے کفر کیا وہی چال میں آنے والے ہیں ﴿۴۲﴾ یا ان کا اللہ کے سوا کوئی معبود ہے؟ پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۴۳﴾

**آیت 40** اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا ...... : "اَلۡغُرۡمُ وَ الۡغَرَامَةُ وَ الۡمَغۡرَمُ" تاوان، چٹی، جو مال آدمی کو نہ چاہنے کے باوجود دینا پڑ جائے۔ "اَجۡرًا" پر تنوین تنکیر کے لیے ہے، کسی بھی طرح کی اجرت۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت قبول نہ کرنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ آپ ان سے کسی طرح کی اجرت کا مطالبہ کرتے ہوں اور وہ تاوان سمجھ کر بوجھ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ جب آپ ان سے کسی طرح کی اجرت یا معاوضے کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اپنی مزدوری صرف اللہ تعالیٰ کے ذمے سمجھتے ہیں اور اپنی کمائی یا کاروبار کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے ہر وقت ان کی خیر خواہی کے لیے ان کے پیچھے پھرتے ہیں تو پھر وہ آپ سے دور کیوں بھاگتے ہیں؟ مزید دیکھیے سورۂ مومنون (۷۲)۔

**آیت 41** اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ: "عِنۡدَهُمۡ" پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا ہے، اس لیے ترجمہ "یا انھی کے پاس غیب ہے" کیا گیا ہے۔ یعنی یا پھر انھیں آپ کے اتباع کی ضرورت اس لیے نہیں کہ سارا غیب انھی کے پاس ہے اور وہ اپنے معاملات کے فیصلے خود ہی وہاں سے لکھ لیتے ہیں، اس لیے انھیں اس کتاب کی ضرورت ہی نہیں جو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔ یہاں بھی سوال ہی پر اکتفا فرمایا ہے، کیونکہ اس کا جواب ظاہر ہے کہ سارے غیب کا بلاشرکت غیرے مالک ہونا تو بہت ہی دور ہے، یہ تو غیب کے ایک ذرے سے بھی آگاہ نہیں۔ پھر یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے کس طرح مستغنی ہو سکتے ہیں۔

**آیت 42** اَمۡ يُرِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ؕ فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ...... : "اَلۡمَكِيۡدُوۡنَ" "كَادَ يَكِيۡدُ كَيۡدًا" سے اسم مفعول ہے، جو کسی کی چال میں آ چکے ہوں۔ یعنی یا وہ آپ کے خلاف کوئی چال چلنا چاہتے ہیں تو سن لیں کہ وہ لوگ جو حق کا انکار کر رہے ہیں، یا اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور کئی طرح کی چالیں چل رہے ہیں وہ خود ہی چال میں آنے والے ہیں۔ چنانچہ کفار نے آپ ﷺ کی ہجرت کے وقت یا کسی بھی موقع پر آپ ﷺ کے خلاف جو بھی سازش کی وہ ناکام ہوئی اور ان کی ہر چال انھی پر اُلٹی پڑی اور کفر پر اڑنے والے بدر اور دوسرے مواقع پر بری طرح قتل ہوئے۔ سعید روحوں نے اسلام قبول کر لیا اور پورا جزیرۂ عرب اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔

**آیت 43** ① اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ : یا پھر اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی اور معبود ہے جو عبادت کا مستحق ہے اور نفع ونقصان

وَ اِنۡ یَّرَوۡا کِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡکُوۡمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرۡہُمۡ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَہُمُ الَّذِیۡ فِیۡہِ یُصۡعَقُوۡنَ ﴿۴۵﴾ یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا عَذَابًا دُوۡنَ ذٰلِکَ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾

اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا دیکھ لیں تو کہہ دیں گے یہ ایک تہ بہ تہ بادل ہے ﴿۴۴﴾ پس انھیں چھوڑ دے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو جاملیں جس میں وہ بے ہوش کیے جائیں گے ﴿۴۵﴾ جس دن نہ ان کی چال ان کے کسی کام آئے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۴۶﴾ اور یقیناً ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا، اس (آخرت) سے پہلے بھی ایک عذاب ہے، اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۴۷﴾

کا اختیار رکھتا ہے۔

② سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ: "مَا" موصولہ بھی ہوسکتا ہے اور مصدریہ بھی۔ موصولہ ہو تو معنی ہے "پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔" مصدریہ ہو تو معنی ہے "پاک ہے اللہ ان کے شریک بنانے سے۔" یعنی اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے اور بنائے ہوئے شریکوں سے پاک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے معبودوں کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں، یہ محض اپنے وہم و گمان کی پوجا کر رہے ہیں۔

آیت 44 وَ اِنۡ یَّرَوۡا کِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا ...... : "کِسۡفًا" سین کی جزم کے ساتھ واحد ہے، ٹکڑا۔ بعض کہتے ہیں جمع ہے، جیسا کہ "سِدۡرَۃٌ" کی جمع "سِدۡرٌ" ہے، ٹکڑے۔ (اعراب القرآن از درویش) یعنی ان لوگوں نے ہر قیمت پر انکار کا تہیہ کر رکھا ہے اور ایمان لانے کی شرط کے طور پر جن معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ صرف لاجواب کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اگر ان کے تمام طلب کردہ معجزات بھی دکھا دیے جائیں پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (دیکھیے انعام: ۱۱۔ یونس: ۹۶، ۹۷) پھر یا تو اسے آنکھوں پر جادو کہہ کر رد کر دیں گے (دیکھیے حجر: ۱۵) یا کوئی اور بہانہ بنا کر ایمان لانے سے انکار کر دیں گے۔ مثلاً ان کا مطالبہ ہے کہ ہم پر آسمان کو ٹکڑے کر کے گرا دے (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۲) اگر ہم ان کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیں اور آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں تو اسے تہ بہ تہ بادل کہہ کر ایمان لانے سے انکار کر دیں گے، حالانکہ وہ دیکھ رہے ہوں گے اور انھیں یقین ہوگا کہ وہ تہ بہ تہ بادل نہیں ہے۔

آیت 45، 46 فَذَرۡہُمۡ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَہُمُ الَّذِیۡ فِیۡہِ یُصۡعَقُوۡنَ ...... : اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے جب صور میں پھونک کے ساتھ سب لوگ بے ہوش ہو کر مر جائیں گے۔ (دیکھیے سورۂ زمر: ۶۸) مزید دیکھیے سورۂ زخرف (۸۳) اور سورۂ معارج (۴۲، ۴۳)۔

آیت 47 ① وَ اِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا عَذَابًا دُوۡنَ ذٰلِکَ : یعنی کفار کے لیے قیامت سے پہلے بھی ایک عذاب ہے۔ اس

وَ اصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾

اور اپنے رب کا حکم آنے تک صبر کر، پس بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کر جب تو کھڑا ہو ﴿۴۸﴾

سے مراد دنیا میں آنے والے عذاب ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۲۶) اور سورۂ سجدہ (۲۱) کی تفسیر۔

❷ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ : یعنی دنیا میں ان پر مختلف مصیبتیں اور عذاب آتے ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پلٹ آئیں اور توبہ کر لیں، مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ نہیں جانتے کہ ہم پر یہ مصیبتیں کیوں آئیں۔ اس لیے جیسے ہی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نافرمان بن جاتے ہیں اور عذاب کو نہ عذاب سمجھتے ہیں نہ تنبیہ، بلکہ وہ عذاب کا کوئی سائنسی سبب اور نافرمانی پر جمے رہنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے یہاں "دُوْنَ ذٰلِكَ" (قیامت سے پہلے) کے الفاظ میں دنیا کے عذابوں کے علاوہ موت کے فرشتوں کی مار کو اور عذابِ قبر کو بھی شامل فرمایا ہے۔

**آیت 48** ❶ وَ اصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ : یہاں "لام" "عَلٰی" کے معنی میں ہو تو مطلب یہ ہے کہ اپنے رب کے حکم پر عمل کرنے میں صبر و استقامت اختیار کرو اور دعوت کا کام جاری رکھو، جیسے فرمایا: ﴿وَ اصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ [المزمل: ۱۰] "اور اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں۔" اور اگر "اِلٰی" کے معنی میں ہو تو مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ﴾ [یونس: ۱۰۹] "اور صبر کر یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے۔" اس مقام پر حرف "لام" لانے سے ایسا جامع مفہوم پیدا ہو رہا ہے جو کوئی اور حرف لانے سے پیدا نہیں ہوتا۔ "وَاصْبِرْ لِحُكْمِنَا" (اور ہمارے حکم پر صبر کر) کے بجائے فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر) مطلب یہ ہے کہ اس کے رب ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ تیری نگہداشت اور حفاظت کرے۔

❷ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا : کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، ہم ہر وقت تجھے دیکھ رہے ہیں اور تیری نگرانی اور حفاظت کر رہے ہیں، کسی کی مجال نہیں کہ تجھے نقصان پہنچا سکے۔ مزید دیکھیے سورۂ ہود (۳۷)۔

❸ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ : صبر کے ساتھ تسبیح و تحمید یعنی نماز کی تاکید فرمائی، کیونکہ ان دونوں کے ساتھ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ [البقرة: ۴۵] "اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔"

❹ "سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ" کا لفظی معنی اگرچہ یہ ہے کہ "اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر" مگر اس سے مراد نماز ہے۔ دلیل اور تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۰) کی تفسیر۔

❺ حِيْنَ تَقُوْمُ : اکثر مفسرین نے "سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ" سے "سبحان اللہ" اور "الحمد للہ" کہنا مراد لیا ہے اور "حِيْنَ تَقُوْمُ" سے مراد بعض نے یہ لیا ہے کہ نیند کے بعد بستر سے اٹھتے وقت "سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہو۔ بعض نے اس سے مجلس

ع ۲

## وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾

**اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے جانے کے بعد بھی ﴿۴۹﴾**

سے اٹھتے وقت کفارۂ مجلس کی دعا " سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَ أَتُوبُ إِلَيْكَ " مراد لی ہے اور بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد نماز شروع کرتے وقت "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ" (دعائے استفتاح) ہے۔ بعض نے کہا کہ ہر خطاب کے لیے کھڑے ہوتے وقت تسبیح و تحمید کرنا مراد ہے۔ مگر انھی مفسرین نے اگلی آیت "**وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ**" میں تسبیح سے مراد نمازِ تہجد اور " **اِدْبَارَ النُّجُوْمِ** " سے مراد نمازِ فجر لی ہے۔ حق یہ ہے کہ "سَبِّحْ" کا جو معنی "**مِنَ الَّيْلِ**" اور " **اِدْبَارَ النُّجُوْمِ** " کے ساتھ کیا گیا ہے وہی معنی "**حِيْنَ تَقُوْمُ** " کے ساتھ ہونا چاہیے۔ طبری نے یہاں پہلے دو قول ذکر فرمائے ہیں، ایک یہ کہ نیند سے اٹھ کر تسبیح و تحمید کرے، دوسرا یہ کہ جب فرض نماز کے لیے کھڑا ہو تو "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ......" دعا پڑھے۔ پھر فرمایا: ''صواب کے سب سے زیادہ قریب ان کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ "**سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ**" کا معنی ہے "صَلِّ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ مِنْ مَنَامِكَ وَ ذٰلِكَ نَوْمُ الْقَائِلَةِ، وَ إِنَّمَا عَنٰى صَلَاةَ الظُّهْرِ" یعنی اپنے رب کی حمد کے ساتھ نماز پڑھ جب تو اپنی نیند سے اٹھے۔ نیند سے مراد دوپہر کی نیند ہے اور نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے۔'' فرماتے ہیں: ''ہم نے اس قول کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ نماز شروع کرتے وقت "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ" پڑھنا کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں اور ہم نے دوپہر کی نیند سے اٹھنا اس لیے مراد لیا ہے کہ لوگوں کا معروف نیند سے اٹھنا یا تو رات کی نیند کے بعد ہوتا ہے اور وہ نمازِ فجر کا وقت ہے یا دوپہر کی نیند کے بعد ہوتا ہے اور وہ نمازِ ظہر کا وقت ہے۔ تو جب "**سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ** " کے بعد " **اِدْبَارَ النُّجُوْمِ** " کے وقت تسبیح کا حکم دیا جو رات کی نیند سے اٹھ کر نمازِ فجر کی دو رکعتیں ہیں، تو معلوم ہوا کہ "**حِيْنَ تَقُوْمُ** " سے مراد وہ نماز ہے جو رات کی نیند سے اٹھنے کے علاوہ ہے اور وہ نمازِ ظہر ہے۔'' (طبری) بعض حضرات نے لکھا ہے کہ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ "**حِيْنَ تَقُوْمُ** " سے مراد نیند سے اٹھ کر تسبیح و تحمید ہے، لیکن اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ طبری کی ترجیح یہ نہیں ہے۔

**آیت 49** ① **وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ**: اس سے مراد مغرب اور عشاء ہے۔

② **وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ** : اس سے مراد فجر کی فرض نماز ہے۔ بعض حضرات نے اس سے مراد فجر کی نماز سے پہلے کی دو رکعتیں لی ہیں، مگر امام طبری فرماتے ہیں کہ یہاں "**فَسَبِّحْهُ**" امر کا صیغہ ہے جو فرض کے لیے ہے، اس لیے اس سے مراد فرض رکعتیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں پانچوں نمازوں کا حکم ہے، اس طرح کہ "**حِيْنَ تَقُوْمُ** " میں ظہر و عصر کا، "**مِنَ الَّيْلِ**" میں مغرب و عشاء کا اور " **اِدْبَارَ النُّجُوْمِ** " میں فجر کی نماز کا ذکر ہے۔ (واللہ اعلم)

سورۃ النجم ۵۳ ... آیاتہا ۶۲ ... رکوعاتہا ۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَ مَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے! ① کہ تمھارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے ②

**آیت 1** ① **وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی** : "النَّجۡمِ" ستارہ۔ "الف لام" تعریف کے لیے ہو تو مراد "ثُریّا" ہے، کیونکہ عرب کے ہاں "النَّجۡمِ" بول کر "ثُریّا" مراد لینا معروف ہے اور اگر "الف لام" جنس کے لیے ہو تو ستاروں کی جنس مراد ہے، خواہ کوئی ہوں اور یہاں جنس مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ "هَوَى يَهْوِيْ هُوِيًّا" (ض) کا معنی گرنا اور غروب ہونا بھی آتا ہے اور چڑھنا اور طلوع ہونا بھی اور "هَوِيَ يَهْوٰى هَوًى" (س) کا معنی ہے محبت کرنا۔

② قرآن مجید کی قسمیں اپنے جوابِ قسم کی شہادت کے طور پر لائی جاتی ہیں اور قسم اور جوابِ قسم میں معنوی طور پر مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں "**وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی**" میں مذکور قسم بعد کی آیت "**مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَ مَا غَوٰی**" کے دعویٰ کی شہادت کے طور پر لائی گئی ہے اور دونوں میں معنوی مناسبت ہے۔ مفسرین نے اس مناسبت کی تقریر کئی طرح سے فرمائی ہے، ان میں سب سے واضح دو تقریریں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ "**النَّجۡمِ**" سے مراد عام ستارے ہیں، یعنی جس طرح تمام ستارے اپنے اپنے مدار میں چلتے ہیں، اپنی مقررہ جگہ سے طلوع ہوتے اور مقررہ جگہ غروب ہوتے ہیں اسی طرح محمد ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں، اس سے ذرہ برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے، حتیٰ کہ وحی الٰہی کے بغیر بولتے بھی نہیں اور ستاروں کے احوال میں سے غروب کا وقت خاص طور پر ذکر کرنے کی مناسبت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ عظیم مخلوق مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے۔ اپنی تمام تر وسعت، روشنی اور چمک کے باوجود اس کی مجال نہیں کہ غروب ہونے اور ڈوبنے سے انکار کر سکے۔ (واللہ اعلم) اس تقریر کی مزید تفصیل سورۂ تکویر کی آیات (۱۵ تا ۱۹): ﴿ **فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ** ... **اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ** ﴾ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری تقریر یہ ہے کہ ستاروں سے مراد شہاب ثاقب ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کی طرف بھیجی جانے والی وحی کی حفاظت کا ایسا زبردست انتظام کر رکھا ہے کہ اگر کوئی شیطان آسمان کے نیچے جا کر اسے سننے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر ہر طرف سے شہاب ثاقب پھینکے جاتے ہیں جو اسے جلا کر راکھ بنا دیتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ صافات (۶ تا ۱۰) اور سورۂ جن (۸، ۹)۔ حفاظت کا یہ زبردست انتظام شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر قائم ہیں اور ان پر نازل ہونے والی وحی الٰہی میں کسی قسم کی مداخلت یا کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی بات سورۂ واقعہ کی آیت (۷۵): ﴿ **فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ** ﴾ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

**آیت 2** ① **مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَ مَا غَوٰی** : "ضلالت" (راہ بھولنے) سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص لاعلمی کی وجہ سے غلط

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾

اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے ﴿۳﴾ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے ﴿۴﴾

راستے پر چل پڑے یا اسے سیدھا سمجھ لے اور ''غوایت'' کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر سیدھے راستے سے ہٹ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ تمھارا ساتھی نہ لاعلمی میں غلط راستے پر چل رہا ہے اور نہ جان بوجھ کر سیدھے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔ اتنی تاکید کے ساتھ نفی اس لیے فرمائی کہ مشرکین آپ کے متعلق یہ بات کہتے تھے۔

❷ "صَاحِبُكُمْ" (تمھارا ساتھی) کہہ کر رسول اللہ ﷺ کے صدق و امانت کی صفات کی طرف توجہ دلائی ہے، جو کفار کے ہاں بھی مسلّم تھیں کہ نبوت سے پہلے چالیس سال اس نے تمھارے ساتھ اور تمھارے درمیان گزارے ہیں، اس کے شب و روز کے معمولات اور اخلاق و عادات تمھارے سامنے ہیں۔ جس شخص نے کبھی کسی آدمی پر جھوٹ نہیں بولا وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کیسے باندھ سکتا ہے؟ مزید دیکھیے سورۂ یونس (۱۶)۔

آیت 3 وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى : بھولنے یا جان بوجھ کر غلط راستے پر چلنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی صحیح راستہ بتانے والے کے بجائے اپنے گمان یا خواہشِ نفس پر چل پڑتا ہے۔ مشرکین اور تمام گمراہ لوگوں کی گمراہی کا اصل باعث یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے کے بجائے گمان اور اپنی خواہشِ نفس پر چلتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ [النجم : ۲۳] ''یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آ چکی۔'' ہمارا رسول ضلالت وغوایت سے اس لیے محفوظ ہے کہ وہ صرف ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے، اپنی خواہش اور مرضی سے کوئی کام نہیں کرتا، حتیٰ کہ اپنی خواہش سے بولتا بھی نہیں۔

آیت 4 ❶ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى : "هُوَ" سے مراد یا تو قرآن مجید اور دین ہے جس کے متعلق مشرکین کہتے تھے کہ آپ ﷺ نے اسے اپنے پاس سے بنا لیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ [السجدة : ۳] ''یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ بلکہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہی ہے۔'' اس لیے قرآن اور دین کے متعلق فرمایا کہ وہ وحی کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾ [الأنعام : ۳۳] ''تو بلاشبہ وہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے اور لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔'' یا اس "هُوَ" سے مراد "يَنْطِقُ" کے ضمن میں پایا جانے والا ''منطوق بہٖ'' ہے، یعنی وہ بات جو وہ بولتا ہے وحی کے سوا کچھ نہیں، جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

یہاں ایک سوال ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ ہر بات وحی کے بعد ہی کرتے تھے؟ اگر ہاں کہا جائے تو ان متعدد باتوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جن کی اللہ تعالیٰ نے اصلاح فرمائی؟ مثلاً فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ [التوبة : ۴۳] ''اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انھیں کیوں اجازت دی۔'' اور فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى

﴿يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ﴾ [ الأنفال : ٦٧ ] ''کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے۔'' اور فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ﴾ [ التوبة : ١١٣ ] ''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں۔'' اور فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ [ التحریم : ١ ] ''اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟'' علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشورے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ [آل عمران : ١٥٩] ''اور کام میں ان سے مشورہ کر۔'' جب کہ وحی کے بعد نہ مشورے کی ضرورت ہے نہ اجازت کی۔ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ یہاں ان باتوں کو وحی قرار دیا جا رہا ہے جو آپ ﷺ لوگوں کے سامنے قرآنِ مجید یا شریعت کے حکم کے طور پر بیان فرماتے تھے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" أَيْ إِنَّمَا يَقُوْلُ مَا أُمِرَ بِهِ، يُبَلِّغُهُ إِلَى النَّاسِ كَامِلاً مُوَفَّرًا مِنْ غَيْرِ زِيَادَةٍ وَلَا نُقْصَانٍ " ''یعنی "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ وہی بات کہتے تھے جس کے متعلق آپ ﷺ کو حکم دیا جاتا تھا کہ کسی کمی یا زیادتی کے بغیر پوری پوری لوگوں تک پہنچا دیں۔''

اس وحی میں قرآن مجید بھی شامل ہے اور حدیث بھی۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتا اسے حفظ کرنے کے ارادے سے لکھ لیتا تھا، تو قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے جو بھی سنتے ہو لکھ لیتے ہو، حالانکہ رسول اللہ ﷺ ایک بشر ہیں، جو کبھی غصے میں بات کرتے ہیں اور کبھی خوشی میں، تو میں نے لکھنا ترک کر دیا۔ پھر میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: (( اُكْتُبْ فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ ! مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ ))[ أبو داوٗد، العلم، باب كتابة العلم : ٣٦٤٦، وقال الألباني صحيح ] ''لکھو، کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس (منہ) سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنِّيْ لَا أَقُوْلُ إِلَّا حَقًّا )) ''میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔'' تو آپ کے کسی صحابی نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ تو ہم سے خوش طبعی بھی کر لیتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنِّيْ لَا أَقُوْلُ إِلَّا حَقًّا )) ''بلاشبہ میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔'' [ مسند أحمد : ٢/ ٣٤٠، ح : ٨٤٨١ ] مسند احمد کے محقق نے فرمایا: "إِسْنَادُهُ قَوِيٌّ" کہ اس کی سند قوی ہے۔

2 اس مقام پر مفسر عبدالرحمٰن کیلانی نے ''تیسیر القرآن'' میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کی حیثیت کے متعلق بہت مفید بحث لکھی ہے جس میں منکرینِ حدیث کے مغالطوں کا جواب بھی آ گیا ہے۔ فوائد کے پیشِ نظر وہ بحث یہاں درج کی جاتی ہے: ''ان آیات کے اولین مخاطب تو کفار مکہ ہیں، مگر یہ آیتیں چونکہ آپ ﷺ کے اقوال کو وحی اور واجب الاتباع قرار دیتی ہیں، لہٰذا منکرین حدیث ان کو مقید بھی کرتے ہیں اور ان کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے یوں کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ اپنے گھر جا کر اپنی کسی زوجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ''میرا جوتا لاؤ'' تو کیا یہ بھی وحی ہوتی تھی؟ اور اکثر منکرین اس

کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی طرف جو کچھ وحی کی جاتی رہی وہ سب قرآن میں آ گئی ہے۔ اسی پر کفار کو اعتراض اور اسی پر آپ ﷺ سے ان کا تکرار اور جھگڑا رہتا تھا۔ اور آپ ﷺ کی قرآن کے علاوہ دوسری باتیں جو بحیثیت انسان کے ہیں، وہ قابلِ اتباع نہیں ہیں۔ اس طرح یہ حضرات چونکہ تمام ذخیرۂ حدیث کو اور آپ ﷺ کی سنت کو دین سے خارج اور ناقابلِ اتباع بلکہ واضح الفاظ میں بے کار ثابت کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا ہم اس پر ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔ ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ کی زندگی کے اقوال کو صرف دو حصوں میں تقسیم کر دیا، حالانکہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت سے کتاب اللہ کے معلّم، مفسر اور شارع بھی تھے اور آپ ﷺ نے قرآن کی جو تعلیم، تفسیر اور تشریح فرمائی وہ بھی دین ہی سے متعلق تھی۔ اس طرح آپ ﷺ کے اقوال دو کے بجائے تین حصوں میں تقسیم ہوئے۔ پھر آپ ﷺ صرف بولتے ہی نہ تھے، کچھ کرتے بھی تھے اور آپ ﷺ کے افعال بھی اسی طرح واجب الاتباع تھے جیسے اقوال۔ اس طرح تین کے بجائے اور بھی زیادہ حصے ہو گئے۔ مختصراً آپ ﷺ کی زندگی کے درج ذیل پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے گا کہ دین میں سنت کی کیا ضرورت اور کیا مقام ہے:

① تشریعی امور: قرآن میں نماز کا حکم تو بہت دفعہ آیا ہے مگر اس کی تفصیل کہیں بھی نہیں کہ اسے کیسے ادا کیا جائے، کتنی نمازیں ہوں، ان کے صحیح اوقات کیا ہیں، ہر نماز میں رکعات کی تعداد کتنی ہے اور اس کی ترکیب کیا ہے؟ اسی طرح حج کیسے ادا کیا جائے، زکوٰۃ کتنی وصول کی جائے؟ قضایا کا فیصلہ کیونکر کیا جائے۔ ہر قضیہ کے لیے شہادتوں کا نصاب اور طریق کار کیا ہے، یا نکاح میں عورت کی رضامندی کا حق اور اس کی اہمیت، خلع کا حق، صلح و جنگ کے قواعد کی تفصیلات وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام امور ایسے ہیں کہ انسان سنت یا آپ ﷺ کے اقوال و افعال سے بے نیاز ہو کر انھیں بجا لا ہی نہیں سکتا۔ گویا قرآن کو ماننے اور جاننے کا واحد ذریعہ آپ ﷺ کی سنت ہے۔ پھر یہ تمام مندرجہ امور ایسے ہیں جن میں آپ ﷺ نے صحابہ سے کبھی مشورہ نہیں کیا، حالانکہ آپ ﷺ کو مشورے کا تاکیدی حکم تھا، کیونکہ یہ امور انسانی بصیرت سے تعلق نہیں رکھتے۔ عام انسان تو کیا ایک نبی بھی ایسے امور کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ ایسے تمام امور آپ ﷺ کو بذریعہ وحی بتائے اور سکھائے جاتے تھے۔ خواہ یہ وحی بذریعہ القا ہو یا جبرئیل علیہ السلام کے بصورتِ انسان سامنے آ کر بتانے کی شکل میں ہو۔ گویا ایسے تمام امور بھی بذریعہ وحی طے پاتے تھے جسے عرف عام میں ''وحی خفی'' کہا جاتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایسی تمام تفصیلات قرآن میں مذکور نہیں۔

② تدبیری امور: ایسے امور میں آپ ﷺ کو صحابہ سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا، مثلاً جنگ کے لیے کون سا مقام مناسب رہے گا، قیدیوں سے کیا سلوک کیا جائے، نظامِ حکومت کیسے چلایا جائے؟ گویا یہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق انسانی بصیرت سے بھی ہے اور تجربہ سے بھی۔ ایسے امور میں وحی کی ضرورت نہیں ہوتی، الا یہ کہ مشورہ کے بعد فیصلہ میں کوئی غلطی رہ جائے۔ ایسی صورت میں اس فیصلہ کی اصلاح بذریعہ وحی کر دی جاتی ہے، جیسے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے متعلق مشورہ کے بعد فیصلہ کے متعلق وحی قرآن میں نازل ہوئی۔

③ اجتہادی امور: اس سے مراد ایسے دینی امور ہیں جن میں کسی پیش آمدہ مسئلہ کا حل سابقہ وحی کی روشنی میں تلاش کیا

جائے۔ گویہ معاملہ ہر ماہر علوم دین کی ذاتی بصیرت سے یکساں تعلق رکھتا ہے، تاہم آپ ﷺ اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ کے پاس آ کر مسئلہ پوچھا کہ میرے باپ پر حج فرض تھا اور وہ مر گیا ہے، کیا میں اب اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بھلا دیکھو! اگر اس کے ذمے قرض ہوتا تو تم اسے ادا نہ کرتی؟'' اس عورت نے کہا: ''ضرور کرتی۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر اللہ اس ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے۔'' [ بخاري، جزاء الصيد، باب الحج والنذور ..... : ۱۸۵۲ ] آپ ﷺ کے ایسے اجتہادات اور استنباطات کی فہرست بھی طویل ہے، تاہم اس سلسلہ میں بھی جب کبھی کوئی لغزش ہوئی تو اس کی بذریعہ وحی جلی یا خفی اصلاح کر دی گئی۔

اس کی مثال وہ حدیث ہے جسے سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے یوں روایت کیا کہ ایک آدمی نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! بتایئے اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، درآں حالیکہ میں صبر کرنے والا، ثواب کی نیت رکھنے والا، آگے بڑھنے والا، پیٹھ نہ پھیرنے والا ہوں، تو کیا اللہ میرے سب گناہ معاف کر دے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' وہ شخص چلا گیا تو آپ ﷺ نے اسے پھر آواز دے کر بلایا اور فرمایا: ''مگر قرضہ معاف نہ ہوگا، جبریل نے ابھی مجھے اس طرح بتایا ہے۔'' [ نسائي، الجهاد، باب من قاتل في سبيل الله تعالى و عليه دين : ۳۱۵۸۔ مسلم : ۱۸۸۵ ] یعنی سائل کے سوال پر رسول اللہ ﷺ نے تو جنت کی بشارت دے دی، کیونکہ شہادت ایسا افضل عمل ہے کہ خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی شہید جنت کا حق دار بن جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی وقت وحی بھیج کر اس میں ترمیم فرما دی۔

④ طبعی امور: جس میں انسان کی روزمرہ کی بول چال، خوراک، پوشاک اور دوسرے معاملات آ جاتے ہیں اور ان امور کا تعلق تمام لوگوں سے یکساں ہے۔ ایسے امور میں انسان اور ایسے ہی آپ ﷺ بھی نسبتاً وحی سے آزاد تھے، لیکن وہ کون سا پہلو ہے جس میں وحی نے ایسے معاملات پر پابندی نہ لگائی ہو؟ مثلاً انسان اس بات میں تو آزاد ہے کہ وہ چاہے تو گوشت کھائے، چاہے تو سبزی کھائے اور چاہے تو دال کھائے، لیکن وہ حلال اور پاکیزہ چیزیں ہی کھا سکتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی ہدایت ہے کہ کھانے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھے، اپنے دائیں ہاتھ سے کھائے، اپنے آگے سے کھائے، برتن کو صاف کرے اور بعد میں دعا پڑھے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس کے انتخاب کی حد تک تو آزاد ہے لیکن لباس کا ساتر ہونا اور ستر ڈھانکنا ضروری ہے اور عورتوں کے لیے پردہ بھی۔ عورت مردوں جیسا لباس نہ پہنے، نہ مرد عورتوں جیسا لباس پہنیں۔ وہ اپنے اہل خانہ سے گفتگو میں آزاد ہے لیکن اپنی بیوی سے حسن سلوک اور حسن معاشرت کا پابند ہے۔ وہ اپنا کاروبار اختیار کرنے میں آزاد ہے لیکن حرام کاروبار نہیں کر سکتا، نہ جائز کاروبار میں ناجائز طریقوں سے مال کما سکتا ہے۔ ماپ تول میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ کسی دوسرے سے فریب سے مال نہیں بٹور سکتا۔ نہ ہی سود اور اس کے مختلف طریقوں سے مال اکٹھا کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر وہ کون سا پہلو ہے جس میں وہ وحی سے بے نیاز ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ تشریعی امور کا انحصار کلیتاً وحی پر ہے اور قرآن میں احکام چونکہ مجملاً مذکور ہوئے ہیں اور ان کا تعلق انسانی بصیرت سے بھی نہیں، لہٰذا یہ احکام سنت کے بغیر انجام پا ہی نہیں سکتے۔ باقی تینوں قسم کے امور میں انسان نسبتاً

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۝۶ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝۹

اسے نہایت مضبوط قوتوں والے (فرشتے) نے سکھایا ⑤ جو بڑی طاقت والا ہے، سو وہ بلند ہوا ⑥ اس حال میں کہ وہ آسمان کے مشرقی کنارے پر تھا ⑦ پھر وہ نزدیک ہوا، پس اتر آیا ⑧ پھر وہ دو کمانوں کے فاصلے پر ہو گیا، بلکہ زیادہ قریب ⑨

آزاد ہے مگر ان تینوں پہلوؤں پر بھی وحی نے پابندیاں لگائی ہیں اور ہدایات بھی دی ہیں جن میں اکثر کا ذکر قرآن میں نہیں، تو پھر آخر سنت نبوی سے انکار کیسے ممکن ہے اور کیسے کہا جا سکتا ہے کہ "وَمَا يَنْطِقُ" کا تعلق صرف قرآن ہی سے ہے؟ اور اس نظریے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص سنت کا منکر ہو وہ قرآن کا بھی منکر ہوتا ہے۔'' (تیسیر القرآن)

آیت 5 عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى : بعض لوگ اس سے مراد اللہ تعالیٰ لیتے ہیں مگر یہ درست نہیں، بلکہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جنھوں نے آپ ﷺ تک اللہ تعالیٰ کی وحی پہنچائی۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ دوسری جگہ واضح طور پر یہ صفت جبریل علیہ السلام کی بیان ہوئی ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴾ [التکویر : ۱۹ تا ۲۱] ''بلاشبہ یقیناً یہ ایک ایسے پیغام پہنچانے والے کا قول ہے جو بہت معزز ہے۔ بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے۔ وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، نہایت امانت دار ہے۔'' "الْقُوٰى" "قُوَّةٌ" کی جمع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جبریل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک نہیں بہت سی قوتیں عطا فرمائی ہیں اور ہر قوت ہی نہایت مضبوط اور زبردست ہے، بھلا جسے اللہ تعالیٰ نہایت مضبوط قوتوں والا فرمائے اس کی قوتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ سید ولد آدم ﷺ نے انھیں ان کی اصل صورت میں صرف دو دفعہ دیکھا اور اس دیکھنے سے جو کیفیت آپ ﷺ پر گزری اس سے ان کی عظمت و ہیبت، حسن و جمال اور قوت و وسعت کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر ہزاروں سالوں کے فاصلے لمحوں میں طے کرنے سے ان کی رفتار کی سرعت و قوت کا معمولی اندازہ ہوتا ہے۔

آیت 6 تا 9 ① ذُوْ مِرَّةٍ : طاقت، توانائی اور مضبوطی والا۔ "مِرَّةٍ" کا لفظ اصل میں رسی کو بٹنے اور بل دے کر مضبوط کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی طاقت والا'' کیا گیا ہے۔ اس طاقت میں عملی اور علمی دونوں طاقتیں شامل ہیں۔ "شَدِيْدُ الْقُوٰى" کے بعد "ذُوْ مِرَّةٍ" کے ساتھ ان کی طاقت اور توانائی کو مزید اُجاگر فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے "شَدِيْدُ الْقُوٰى" سے عملی قوتیں اور "ذُوْ مِرَّةٍ" سے علمی اور عقلی قوتیں مراد لی ہیں، مگر دونوں لفظ ہر قسم کی قوتوں پر استعمال ہوتے ہیں، اس لیے تاکید مراد لینا راجح معلوم ہوتا ہے۔

② "فَاسْتَوٰى" برابر ہوا، بلند ہوا۔ ''اُفق'' دور سے نظر آنے والی وہ جگہ جہاں زمین و آسمان ملتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آسمان نیلے گنبد کی طرح بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ''اُفقِ اعلیٰ'' مشرقی کنارا، جہاں سے سورج طلوع کے وقت بلند ہوتا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ "اَلْاُفُقُ الْمُبِيْنُ" فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ [التکویر : ۲۳] ''اور

بلاشبہ یقیناً اس نے اس (جبریل) کو (آسمان کے) روشن کنارے پر دیکھا ہے۔‘‘

3 فَتَدَلّٰى: یہ ”دَلْو“ سے مشتق ہے، سورۂ یوسف میں ہے: ﴿فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ﴾ [یوسف : ۱۹] ’’تو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔‘‘ ”تَدَلّٰى“ لٹک آیا، یعنی فضا میں رہتے ہوئے کچھ نیچے آ گیا۔ ”قَابَ“ مقدار۔ ”اَوْ اَدْنٰى“ یا زیادہ قریب۔ یعنی اگر آدمی اس فاصلے کو دیکھے تو اسے یہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم نظر آئے۔ بعض اہلِ علم نے فرمایا، یہاں ” اَوْ “ ” بَلْ “ کے معنی میں ہے، یعنی دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم، جیسا کہ یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ﴾ [ الصافات : ۱٤۷ ] ’’اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا، بلکہ وہ زیادہ ہوں گے۔‘‘

4 رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں جبریل علیہ السلام کو دو بار ان کی اصل صورت میں دیکھا ہے۔ ان آیات میں پہلی بار دیکھنے کا ذکر ہے، جبریل علیہ السلام آسمان کے مشرقی کنارے پر نمودار ہوئے، تو زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ ان سے پُر ہو گیا، جیسا کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ (پہلی وحی کے بعد) وحی کے وقفے کے متعلق بیان فرما رہے تھے: (( فَبَيْنَا أَنَا أَمْشِيْ إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ قِبَلَ السَّمَاءِ فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَاءَنِيْ بِحِرَاءٍ قَاعِدٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَجُئِثْتُ مِنْهُ حَتّٰى هَوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ فَجِئْتُ أَهْلِيْ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْنِيْ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ إِلٰى ﴿فَاهْجُرْ﴾ ثُمَّ حَمِيَ الْوَحْيُ وَ تَتَابَعَ )) [ بخاري، التفسیر، سورۃ المدثر، باب : ﴿والرجز فاهجر﴾ : ٤٩٢٦ ] ’’ایک دفعہ میں چلا جا رہا تھا، اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی تو میں نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حرا میں آیا تھا وہ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے، تو میں اس سے ڈر گیا، یہاں تک کہ میں زمین پر گر گیا، پھر میں اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور کہا، مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو، تو انھوں نے مجھے چادر اوڑھا دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ پھر وحی گرما گرم ہو گئی اور پے در پے آنے لگی۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھنے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: (( حَدَّثَنَا الشَّيْبَانِيُّ قَالَ سَمِعْتُ زِرًّا عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى﴾ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ أَنَّهُ رَاٰى جِبْرِيْلَ لَهُ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ )) [ بخاري، التفسیر، سورۃ النجم، باب : ﴿فکان قاب قوسین أو أدنی﴾ : ٤٨٥٦ ] ’’زِر (بن حُبیش) نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى﴾ کی تفسیر روایت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے جبریل کو دیکھا، ان کے چھ سو پر تھے۔‘‘

ان آیات کا مقصد کفار کے اس الزام کی تردید ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ پر لگاتے تھے کہ کوئی عجمی آدمی اسے قرآن کی باتیں سکھا جاتا ہے اور یہ ہمیں سنا کر کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ کسی عجمی

# فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی ﴿۱۰﴾ مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾

**پھر اس نے وحی کی اس (اللہ) کے بندے کی طرف جو وحی کی ﴿۱۰﴾ دل نے جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا ﴿۱۱﴾**

شخص نے نہیں، بلکہ ایک نہایت مضبوط قوتوں اور بڑی طاقت والے فرشتے نے اسے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ شدید القُویٰ فرشتہ مشرقی اُفق پر بلند ہوا، اس وقت وہ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، پھر وہ فضا ہی میں نیچے اترتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے اتنا قریب ہوا کہ آپ سے دو کمانوں سے بھی کم فاصلے پر آ گیا۔

**آیت 10** ① **فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی:** "**فَاَوۡحٰی**" (پھر اس نے وحی کی) کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف بھی جا سکتی ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے (جبریل علیہ السلام کے واسطے سے) اپنے بندے کی طرف وحی کی اور "**فَاَوۡحٰی**" کی ضمیر جبریل علیہ السلام کی طرف بھی جا سکتی ہے، مگر اس صورت میں "**عَبۡدِہٖ**" میں ضمیر غائب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہوگی، کیونکہ "**عَبۡدِہٖ**" سے مراد ''اللہ کے بندے'' کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ آپ ﷺ ہی نہیں آسمان و زمین کا ہر شخص اللہ کا بندہ ہے، جبریل یا کسی اور کا کوئی بندہ نہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ''پھر جبریل نے اس اللہ کے بندے کی طرف وحی کی۔''

② "**مَاۤ اَوۡحٰی**" (جو وحی کی) کو مبہم رکھ کر اس کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ طٰہٰ کی آیت (۷۸): ﴿ **فَغَشِیَہُمۡ مِّنَ الۡیَمِّ مَا غَشِیَہُمۡ** ﴾ کی تفسیر۔ اس سے پچھلی آیات کے آخری فائدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وحی میں "**یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ**" سے "**وَ الرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ**" تک آیات بھی تھیں۔

**آیت 11** ① **مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی:** "**کَذَبَ**" کو سبعہ قراءات میں دو طرح پڑھا گیا ہے۔ چنانچہ ابن عامر نے اسے ذال کی تشدید کے ساتھ "کَذَّبَ" پڑھا ہے، جھٹلایا۔ اس وقت معنی ہوگا کہ نبی ﷺ نے آنکھوں سے جو کچھ دیکھا دل نے اسے نہیں جھٹلایا، بلکہ اس کی تصدیق کی۔ دوسرے قُراء نے ''ذال'' کو تشدید کے بغیر "**کَذَبَ**" پڑھا ہے، جھوٹ کہا۔ یعنی دل نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا تو جھوٹ نہیں کہا، بلکہ سچ کہا کہ اس نے جبریل کو دیکھا ہے، جیسے آنکھوں نے دیکھا تو جھوٹ نہیں کہا۔ جبریل علیہ السلام کو دیکھنے میں آنکھیں اور دل دونوں شریک تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن السعدی ''تیسیر الرحمٰن'' میں لکھتے ہیں: "أَيِ اتَّفَقَ فُؤَادُ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ رُؤْيَتُهُ عَلَى الْوَحْيِ الَّذِيْ أَوْحَاهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ وَ تَوَاطَأَ عَلَيْهِ سَمْعُهُ وَ قَلْبُهُ وَ بَصَرُهُ" ''یعنی رسول اللہ ﷺ کے دل اور آپ کی رؤیت نے اس وحی پر اتفاق کیا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف کی اور اس پر آپ کے کان، آنکھیں اور دل متفق ہو گئے۔'' سید امیر علی ملیح آبادی ''مواہب الرحمٰن'' میں اس جملے کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں: ''بالجملہ آں حضرت ﷺ نے جو دیکھا اس میں فواد اور آنکھ دونوں متفق و صادق ہیں۔'' بعض مفسرین نے "**کَذَبَ**" (تشدید کے بغیر) کا معنی ''جھٹلایا'' کیا ہے، جبکہ یہ "کَذَّبَ" (تشدیدِ ذال کے ساتھ) کا معنی ہے، "**کَذَبَ**" (بلا تشدید) کا نہیں۔

## اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ⑫ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ⑬

**پھر کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو وہ دیکھتا ہے ⑫ حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اُترتے ہوئے بھی دیکھا ہے ⑬**

② جو کچھ آنکھ نے دیکھا وہ یہ تھا کہ اس نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا، دن کی روشنی میں دیکھا تاریکی میں نہیں دیکھا، جاگتے ہوئے دیکھا نیند یا نیم خوابی یا اونگھ کی حالت میں نہیں دیکھا، دل نے بھی دیکھنے میں آنکھوں کی موافقت کی اور کہہ دیا کہ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جبریل فرشتے ہی کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتا ہے اور مسئلے میں کوئی شک و شبہ نہ رہا۔

**آیت 12** ① **اَفَتُمٰرُوْنَهٗ:** "تُمَارُوْنَ" "مَارٰى يُمَارِيْ مِرَاءً وَ مُمَارَاةً" (مفاعلہ) سے فعل مضارع معلوم جمع مذکر حاضر ہے، جھگڑا کرنا۔ یہ مشرکین مکہ سے خطاب ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بتایا کہ میرے پاس کوئی شیطان نہیں بلکہ جبریل فرشتہ آتا ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں، اس کی اصل صورت میں بھی میں نے اسے دیکھا ہے تو انھوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور جھگڑنے لگے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اپنے صاحب کو خود صادق و امین تسلیم کرتے ہو، جب وہ تم سے کہتا ہے کہ اس کے پاس جبریل فرشتہ آتا ہے اور وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو تم اس سے جھگڑنے لگتے ہو، آخر تمھارے پاس اسے جھٹلانے اور اس پر جھگڑا کرنے کی کیا دلیل ہے؟ ؎

إِذَا لَمْ تَرَ الْهِلَالَ فَسَلِّمْ لِأُنَاسٍ رَأَوْهُ بِالْأَبْصَارِ

"جب تمھیں چاند نظر نہیں آیا تو ان لوگوں کی بات مان لو جنھوں نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

② **عَلٰى مَا يَرٰى :** واضح رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "أَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰى مَا رَأٰى" "پھر کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو اس نے دیکھا" بلکہ فرمایا: ﴿ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴾ "پھر کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو وہ دیکھتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس بات کو وہ جھٹلاتے تھے وہ یہ تھی کہ میں جبریل فرشتے کو دیکھتا ہوں جب وہ میرے پاس آتا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ پہلی دفعہ جب جبریل علیہ السلام غارِ حرا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو اگرچہ اصل صورت میں نہ تھے، مگر بعد میں جب وہ اپنی اصل صورت میں اس شان سے سامنے آئے کہ زمین سے آسمان تک اور دائیں سے بائیں تک پورا اُفق ان سے بھرا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً پہچان گئے کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۶ تا ۹) کے آخری فائدہ میں مذکور حدیث۔ اس سے ظاہر ہے کہ جبریل علیہ السلام کے آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں پہچان لیتے تھے، خواہ کسی حالت میں آئیں۔

**آیت 13** **وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى:** "لام" اور "قَدْ" کے ساتھ تاکید قسم کے مفہوم کا فائدہ دیتی ہے۔ مشرکین کے انکار کی وجہ سے اتنی تاکید کے ساتھ بات کی ہے۔ یعنی تم زمین پر اس کے جبریل علیہ السلام کو دیکھنے کا انکار کرتے ہو، قسم ہے کہ اس

عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰی ﴿۱۴﴾ عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰی ﴿ؕ۱۵﴾

آخری حد کی بیری کے پاس ﴿۱۴﴾ اسی کے پاس ہمیشہ رہنے کی جنت ہے ﴿۱۵﴾

نے تو اسے ایک اور بار آسمانوں کے اوپر بھی اس کی اصل صورت میں اُترتے ہوئے دیکھا ہے۔

**آیت 14** ﴿ عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰی: "سِدۡرَةِ" بیری کا درخت۔ "الۡمُنۡتَهٰی" " اِنۡتَهٰی یَنۡتَهِيۡ اِنۡتِهَاءً " (افتعال) سے ظرف مکان ہے، انتہا کی جگہ۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس نام کی وجہ بیان فرمائی ہے، انھوں نے فرمایا: « لَمَّا أُسۡرِيَ بِرَسُوۡلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ انۡتُهِيَ بِهٖ إِلٰى سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى وَهِيَ فِي السَّمَاءِ السَّادِسَةِ، إِلَيۡهَا يَنۡتَهِيۡ مَا يُعۡرَجُ بِهٖ مِنَ الۡأَرۡضِ فَيُقۡبَضُ مِنۡهَا وَ إِلَيۡهَا يَنۡتَهِيۡ مَا يَهۡبِطُ بِهٖ مِنۡ فَوۡقِهَا فَيُقۡبَضُ مِنۡهَا » [ مسلم، الإیمان، باب في ذکر سدرۃ المنتھی : ۱۷۳ ] "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات (معراج کے لیے) لے جایا گیا تو آپ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا اور وہ چھٹے آسمان میں ہے۔ زمین سے اوپر جو کچھ چڑھتا ہے اس کی انتہا وہاں تک ہوتی ہے، پھر اسے وہاں سے لے لیا جاتا ہے اور اس کے اوپر سے جو کچھ اترتا ہے اس کی انتہا بھی وہیں تک ہوتی ہے، پھر اسے وہاں سے لے لیا جاتا ہے۔" مسلم کی شرح میں نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحیح مسلم کے تمام نسخوں میں اسی طرح چھٹے آسمان ہی کا ذکر ہے، جب کہ انس رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری روایات میں گزر چکا ہے کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ قاضی (عیاض) نے فرمایا، اس کا ساتویں آسمان پر ہونا ہی زیادہ صحیح اور اکثر کا قول ہے۔ یہی سدرۃ المنتہیٰ کے معنی اور نام کا تقاضا ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہو۔ نووی فرماتے ہیں کہ دونوں اقوال کو جمع کرنا ممکن ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان میں ہے اور زیادہ تر حصہ ساتویں آسمان میں ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ بہت بڑی ہے۔

اس آیت سے جبریل علیہ السلام کو دیکھنے کا وقت اور مقام بھی معلوم ہو گیا، کیونکہ سدرۃ المنتہیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات دیکھی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں کی سیر کروائی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « ثُمَّ رُفِعَتۡ إِلَيَّ سِدۡرَةُ الۡمُنۡتَهٰى فَإِذَا نَبِقُهَا مِثۡلُ قِلَالِ هَجَرَ، وَ إِذَا وَرَقُهَا مِثۡلُ آذَانِ الۡفِيۡلَةِ قَالَ هٰذِهٖ سِدۡرَةُ الۡمُنۡتَهٰى » [ بخاري، المناقب، باب المعراج : ۳۸۸۷، عن مالك بن صعصعة رضی اللہ عنہ ] "پھر سدرۃ المنتہیٰ میرے سامنے ظاہر ہوئی، دیکھا تو اس کے بیر (پھل) ہجر شہر کے مٹکوں کی طرح اور اس کے پتے ہاتھیوں کے کانوں کی طرح تھے۔"

**آیت 15** ﴿ عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰی: "الۡمَاۡوٰی" " أَوٰی یَأۡوِيۡ أُوِيًّا " (ض) "اَلۡبَيۡتَ وَ إِلَى الۡبَيۡتِ" سے مصدر میمی ہے، گھر میں قیام کرنا، رہائش رکھنا۔ یعنی وہ جنت جو متقی لوگوں کے قیام اور ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جنت جس میں ایمان والوں کا دائمی قیام ہوگا آسمانوں کے اوپر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سدرۃ المنتہیٰ کے بعد جنت میں لے جایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « حَتّٰى انۡتَهٰى بِيۡ إِلٰى سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى، وَغَشِيَهَا أَلۡوَانٌ لَا أَدۡرِيۡ مَا هِيَ، ثُمَّ أُدۡخِلۡتُ الۡجَنَّةَ، فَإِذَا فِيۡهَا حَبَايِلُ اللُّؤۡلُؤِ، وَ إِذَا تُرَابُهَا

## اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى ﴿۱۷﴾

جب اس بیری کو ڈھانپ رہا تھا جو ڈھانپ رہا تھا ﴿۱۶﴾ نہ نگاہ ادھر اُدھر ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی ﴿۱۷﴾

الْمِسْكُ ›› [ بخاري، الصلاة، باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء؟ : ۳۴۹ ] ’’پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا اور اسے ایسے رنگوں نے ڈھانپا ہوا تھا کہ میں نہیں جانتا وہ کیا تھے۔ پھر مجھے جنت میں داخل کیا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں موتیوں کی لڑیاں ہیں اور اس کی مٹی کستوری ہے۔‘‘

**آیت 16** ﴿ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى : سدرۃ المنتہیٰ کے مشاہدے کے وقت اس پر انوار کی بارش، فرشتوں کے ہجوم اور اس کے جلال و جمال کے منظر کی نقشہ کشی کے لیے انسان کے استعمال میں آنے والی زبانوں کی تنگ دامانی کی طرف اشارہ ہے۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۷۸) حدیث میں اس کے متعلق چند اشارے آئے ہیں، ان میں سے ایک کا ذکر پچھلی آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے: ‹‹ وَ غَشِيَهَا أَلْوَانٌ لَا أَدْرِيْ مَا هِيَ ›› [ دیکھیے بخاري : ۳۴۹ ] ’’اور اسے ایسے رنگوں نے ڈھانپا ہوا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا تھے۔‘‘ انس رضی اللہ عنہ نے حدیث معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے یہ الفاظ بیان فرمائے: ‹‹فَلَمَّا غَشِيَهَا مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ مَا غَشِيَ تَغَيَّرَتْ فَمَا أَحَدٌ مِّنْ خَلْقِ اللّٰهِ يَسْتَطِيْعُ أَنْ يَّنْعَتَهَا مِنْ حُسْنِهَا فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيَّ مَا أَوْحٰى ›› [ مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ ...... : ۱۶۲ ] ’’پھر جب اس کو اللہ کے حکم سے ڈھانکا جس چیز نے ڈھانکا تو اس کی حالت بدل گئی، پھر اس کا یہ حال تھا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس کی خوب صورتی بیان نہیں کر سکتا، اس وقت اس نے میری طرف وحی کی جو وحی کی۔‘‘ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ‹‹ ﴿ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴾ قَالَ فَرَاشٌ مِنْ ذَهَبٍ ›› [ مسلم، الإيمان، باب في ذكر سدرة المنتهى : ۱۷۳ ] ’’سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانک رہا تھا جو ڈھانک رہا تھا‘‘ سے مراد سونے کے پروانے ہیں۔‘‘ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو، جو آپ ﷺ کو ساتھ لے کر گئے تھے، ان کی اصل صورت میں ایک بار پھر دیکھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آیت: ﴿ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ‹‹ رَأَيْتُ جِبْرِيْلَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَهُ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ، يَنْتَثِرُ مِنْ رِيْشِهِ التَّهَاوِيْلُ الدُّرُّ وَالْيَاقُوْتُ ›› [ مسند أحمد : ۱/ ۴۶۰، ح : ۴۳۹۵ ] ’’میں نے جبریل ﷺ کو دیکھا، اس کے چھ سو بازو تھے اور اس کے پروں سے حیران کن رنگا رنگ موتی اور یاقوت جھڑ رہے تھے۔‘‘ مسند کے محقق نے فرمایا: "إِسْنَادُهُ حَسَنٌ" کہ اس کی سند حسن ہے، اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "هٰذَا إِسْنَادٌ جَيِّدٌ قَوِيٌّ" کہ اس کی سند جید قوی ہے۔

**آیت 17** ﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى : "زَاغَ يَزِيْغُ زَيْغًا" ٹیڑھا ہونا اور "طَغٰى يَطْغٰى طُغْيَانًا" حد سے بڑھنا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے کمالِ ادب، تحمل اور استقامت کا بیان ہے کہ جبریل علیہ السلام کو اور اللہ تعالیٰ کی دوسری آیاتِ کبریٰ کو دیکھتے ہوئے آپ کی نگاہ انھی پر مرکوز رہی، نہ دائیں یا بائیں طرف گئی اور نہ ان سے آگے بڑھی۔

# لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۸﴾

## بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں ﴿۱۸﴾

آیت 18 ① لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی: "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی قسم ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔ ان بہت بڑی نشانیوں میں سب سے پہلی نشانی تو جبریل علیہ السلام ہیں، جنھیں دو دفعہ دیکھنے کے ذکر کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں، اس کے علاوہ احادیثِ معراج میں اور بہت سی نشانیوں کا ذکر ہے جنھیں آپ ﷺ نے اس موقع پر دیکھا۔ ان میں براق، ساتوں آسمانوں کے عجائبات اور ان پر انبیائے کرام کی ملاقات، دجال، سدرۃ المنتہیٰ، جنت و جہنم، جہنم کا خازن مالک، نہر کوثر، بیت المعمور، چار دریا، وہ (مستوی) بلند ہموار جگہ جس پر چڑھے تو قلموں کے چلنے کی آوازیں سنیں اور دوسری نشانیاں شامل ہیں، اختصار کے پیشِ نظر ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے۔

② یہ آیت واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ "لَقَدْ" کے تاکیدی الفاظ کے ساتھ یہ نہ فرماتے کہ ''بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں'' بلکہ یہ فرماتے کہ ''بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب اعلیٰ کو دیکھا۔''

③ جیسا کہ پیچھے گزرا ہے کہ "شَدِيْدُ الْقُوٰى" اور "ذُوْ مِرَّةٍ" سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور "دَنَا فَتَدَلّٰى" اور "فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ" کی ضمیر غائب سے بھی وہی مراد ہیں اور "وَ لَقَدْ رَاٰهُ" میں ضمیر "هُ" سے مراد بھی جبریل علیہ السلام ہیں۔ قرآن مجید سے اس کی تائید اور صحیح روایات سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر بھی گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ [ دیکھیے مسلم، الإیمان، باب معنی قول اللہ عزوجل : ﴿ ولقد راٰہ نزلۃ أخرٰی ﴾ …… : ۱۷۵، ۱۷۷ ]

مگر بعض مفسرین نے ان الفاظ اور ضمیروں کا مصداق اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دو دفعہ دیکھا ہے۔ اس کی تائید میں انھوں نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا قول پیش کیا ہے: « عَنْ أَبِي الْعَالِيَةِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ : ﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴾، ﴿ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى ﴾ قَالَ رَآهُ بِفُؤَادِهِ مَرَّتَيْنِ » [ مسلم، الإیمان، باب معنی قول اللہ عزوجل : ﴿ ولقد راٰہ نزلۃ أخرٰی ﴾ …… : ۱۷۶ ] ''ابو العالیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى" اور "وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى" کی تفسیر میں فرمایا کہ آپ ﷺ نے اسے اپنے دل کے ساتھ دوبار دیکھا۔'' اس میں شک نہیں کہ آیات کے الفاظ میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہما والی تفسیر کی گنجائش موجود ہے، مگر صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کی صراحت کے بعد کسی اور تفسیر کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں، مسروق کہتے ہیں کہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا، انھوں نے فرمایا: « يَا أَبَا عَائِشَةَ! ثَلَاثٌ مَنْ تَكَلَّمَ بِوَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ فَقَدْ أَعْظَمَ عَلَى اللّٰهِ

الْفِرْيَةَ، قُلْتُ مَا هُنَّ؟ قَالَتْ مَنْ زَعَمَ أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاى رَبَّهُ فَقَدْ أَعْظَمَ عَلَى اللّٰهِ الْفِرْيَةَ، قَالَ وَكُنْتُ مُتَّكِئًا فَجَلَسْتُ فَقُلْتُ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ! أَنْظِرِيْنِيْ وَلَا تَعْجَلِيْنِيْ أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ : ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ [ التکویر : ۲۳ ]، ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ [ النجم : ۱۳ ] فَقَالَتْ أَنَا أَوَّلُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ سَأَلَ عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّمَا هُوَ جِبْرِيْلُ لَمْ أَرَهُ عَلٰى صُوْرَتِهِ الَّتِيْ خُلِقَ عَلَيْهَا غَيْرَ هَاتَيْنِ الْمَرَّتَيْنِ، رَأَيْتُهُ مُنْهَبِطًا مِنَ السَّمَاءِ سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ، فَقَالَتْ أَوَ لَمْ تَسْمَعْ أَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ : ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ [ الأنعام : ۱۰۳ ] أَوَ لَمْ تَسْمَعْ أَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ : ﴿ وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ [ الشورٰی : ۵۱ ] ) [ مسلم، الإیمان، باب معنی قول اللہ عزوجل: ﴿ولقد راہ نزلۃ أخری﴾ ...... : ۱۷۷ ]

’’اے ابو عائشہ! تین باتیں ایسی ہیں کہ جو ان میں سے ایک بات بھی کہے اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔‘‘ میں نے کہا: ’’وہ کیا ہیں؟‘‘ انھوں نے فرمایا: ’’جو شخص یہ گمان کرے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے، اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔‘‘ مسروق کہتے ہیں، میں ٹیک لگائے ہوئے تھا، یہ سن کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میں نے کہا: ’’ام المومنین! مجھے کچھ مہلت دیں، جلدی نہ کریں، کیا اللہ عز وجل نے یہ نہیں فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ [ التکویر : ۲۳ ] ’’اور بلاشبہ یقیناً اس نے اس کو ( آسمان کے ) روشن کنارے پر دیکھا ہے۔‘‘ اور فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ ’’حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔‘‘ تو انھوں نے فرمایا: ’’اس امت میں جس نے آپ ﷺ سے اس کے متعلق سب سے پہلے پوچھا وہ میں ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’وہ تو جبریل علیہ السلام ہیں، میں نے انھیں ان کی اس صورت میں، جس میں انھیں پیدا کیا گیا ہے، ان دو مرتبہ کے سوا نہیں دیکھا۔ میں نے انھیں آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا، ان کے عظیم وجود نے آسمان و زمین کے مابین کو پُر کر رکھا تھا۔‘‘ پھر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ’’کیا تم نے نہیں سنا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ [ الأنعام : ۱۰۳ ] ’’اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے اور وہی نہایت باریک بین، سب خبر رکھنے والا ہے۔‘‘ اور کیا تم نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : ﴿ وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ [ الشورٰی : ۵۱ ] ’’اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے، بے شک وہ بے حد بلند، کمال حکمت والا ہے۔‘‘

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ’’ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رسول اللہ ﷺ کو دل سے دیکھنا مروی ہے، ایک روایت میں مطلق دیکھنے کا

بھی ذکر ہے مگر اس سے مراد بھی دل سے دیکھنا ہی ہے اور جنھوں نے ان سے آنکھوں کے ساتھ دیکھنا روایت کیا ہے انھوں نے غریب بات کی ہے، کیونکہ اس (آنکھوں کے ساتھ دیکھنے) کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی چیز ثابت نہیں اور بغوی نے اپنی تفسیر میں جو فرمایا ہے کہ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں کے ساتھ دیکھا ہے اور یہ انس، حسن اور عکرمہ کا قول ہے، تو بغوی کی اس بات میں نظر ہے۔'' (ابن کثیر)

المختصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھنا کسی صحابی سے صحیح سند کے ساتھ مروی نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دل کے ساتھ دیکھنے کی جو بات کی ہے اگر ان آیات کے پیش نظر کی ہے تو وہ درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے خلاف ہے۔ ہاں، نیند کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہے اور یہ دیکھنا دل ہی کے ساتھ تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَا عَائِشَةُ! إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ )) [ بخاري، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان : ۲۰۱۳ ] ''اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔'' یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حالت نیند میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے متعلق ایک حدیث درج کی جاتی ہے، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے لیے ہمارے پاس آنے سے رکے رہے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ہم سورج کی ٹکیا کو دیکھ لیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی کے ساتھ آئے، نماز کی اقامت کہی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور نماز میں اختصار فرمایا۔ جب سلام پھیرا تو ہمیں اونچی آواز کے ساتھ فرمایا: ''اپنی اپنی صفوں میں بیٹھے رہو۔'' پھر فرمایا: (( أَمَا إِنِّيْ سَأُحَدِّثُكُمْ مَا حَبَسَنِيْ عَنْكُمُ الْغَدَاةَ، إِنِّيْ قُمْتُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَوَضَّأْتُ وَصَلَّيْتُ مَا قُدِّرَ لِيْ فَنَعَسْتُ فِيْ صَلَاتِيْ حَتَّی اسْتَثْقَلْتُ فَإِذَا أَنَا بِرَبِّيْ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی فِيْ أَحْسَنِ صُوْرَةٍ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ! قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ! قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰی؟ قُلْتُ لَا أَدْرِيْ رَبِّ! قَالَهَا ثَلَاثًا قَالَ فَرَأَيْتُهُ وَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ قَدْ وَجَدْتُ بَرْدَ أَنَامِلِهِ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَتَجَلّٰی لِيْ كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ )) [ ترمذي، التفسير، سورة ص : ۳۲۳۵ ] ''سنو! میں تمھیں بتاؤں گا کہ آج صبح مجھے تمھارے پاس آنے سے کس چیز نے روکے رکھا۔ آج رات میں اٹھا، وضو کیا اور جتنی میری قسمت میں نماز تھی وہ نماز میں نے پڑھی، پھر مجھے نماز میں اونگھ آ گئی، یہاں تک کہ میں بھاری ہو گیا۔ اچانک دیکھتا ہوں کہ میرا رب خوب صورت ترین شکل میں میرے سامنے ہے، تو اس نے فرمایا: ''اے محمد!'' میں نے کہا: ''میں حاضر ہوں اے میرے رب!'' فرمایا: ''ملأ اعلیٰ کس بات میں بحث کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا: ''میں نہیں جانتا۔'' تین دفعہ فرمایا۔ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا: ''تو میں نے اسے (اپنے رب کو) دیکھا کہ اس نے اپنی کف میرے کندھوں کے درمیان رکھی، تو میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان محسوس کی، تو میرے لیے (ملأ اعلیٰ کی بحث کے متعلق) ہر چیز روشن ہو گئی اور میں نے اسے جان لیا۔'' آگے لمبی حدیث ہے، ترمذی نے فرمایا: ''یہ حدیث حسن صحیح ہے اور میں نے محمد بن اسمٰعیل بخاری سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''یہ حدیث حسن صحیح ہے۔'' امام ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی معمولی فرق کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے اور شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ

**پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ﴿۱۹﴾ اور تیسری ایک اور (دیوی) منات کو ﴿۲۰﴾ کیا تمھارے لیے لڑکے ہیں اور**

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مسند احمد (۱/ ۲۸۵) میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث "رَأَيْتُ رَبِّيْ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى" (میں نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا) اسی سند والی حدیث کا اختصار ہے، کیونکہ امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خواب میں دیکھنے کی مفصل حدیث بھی روایت کی ہے جو پیچھے ترمذی کے حوالے سے گزری ہے۔

صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا ذکر ہے: (( وَدَنَا الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ فَتَدَلّٰى حَتّٰى كَانَ مِنْهُ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى فَأَوْحَى اللّٰهُ فِيْمَا أَوْحٰى إِلَيْهِ خَمْسِيْنَ صَلَاةً عَلٰى أُمَّتِكَ كُلَّ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ )) [ بخاري، التوحيد، باب ما جاء في قوله عزوجل : ﴿ و كلم الله موسى تكليما ﴾ : ۷۵۱۷ ] "اور جبار رب العزت قریب آیا پھر اتر آیا، یہاں تک کہ اس سے دو کمانوں کے فاصلے پر ہو گیا یا اس سے بھی قریب۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی فرمائی، اس میں آپ کی امت پر دن رات میں پچاس نمازوں کی وحی فرمائی۔" یہ لمبی حدیث ہے، اس حدیث کے شروع اور آخر میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ معاملہ نیند کا تھا اور نیند میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ رہی یہ بات کہ کیا معراج متعدد بار ہوا ہے، تو اہل علم نے فرمایا کہ بیداری کی حالت میں معراج ایک ہی دفعہ ہوا ہے، اس سے پہلے تمہید کے طور پر پہلے خواب میں آپ کو یہ سب کچھ دکھایا گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ابن کثیر میں تفسیر سورۂ بنی اسرائیل اور فتح الباری میں شرح حدیث مذکور۔ تفسیر ہذا میں سورۂ انعام کی آیت (۱۰۳) کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

آیت 19 تا 21 ﴿۱﴾ **اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى** ...... : گزشتہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صراطِ مستقیم پر استقامت اور آپ کی ہر بات اللہ تعالیٰ کی وحی پر موقوف ہونے کا ذکر ہوا، اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینے والے فرشتے کی قوت و عظمت کا ذکر ہوا، اس کے زمین پر اور آسمانوں پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس نزول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب آ کر وحی پہنچانے کا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے اور اللہ تعالیٰ کی دوسری بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھنے کا ذکر ہوا۔ ان سب باتوں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت، اس کا جلال اور اس کی وحدانیت خود بخود ظاہر ہو رہی ہے کہ جب اس کے رسول کا، فرشتوں کا اور اس کی زمین و آسمان پر بے شمار نشانیوں کی عظمت کا یہ عالم ہے تو وہ خود کتنی قدرتوں کا مالک ہوگا۔ اس لیے ساتھ ہی اپنی توحید کی طرف توجہ دلانے اور مشرکین کو ان کی حماقت پر متنبہ کرنے کے لیے فرمایا کہ جب تم میری قدرتوں کو سن اور دیکھ چکے تو پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو بھی دیکھا ہے؟ کیا سوچا بھی جا سکتا ہے کہ یہ معبود ہیں یا اس عظیم الشان کائنات میں ان کا کوئی دخل ہے؟ یہ انداز بیان ان بتوں کی انتہائی تحقیر اور ان پر طنز کا اظہار ہے، جیسے کوئی انتہائی کمزور اور ہاتھ پاؤں سے معذور شخص بادشاہ ہونے کا دعویٰ کر دے تو کہیں گے، اسے دیکھو یہ بادشاہ سلامت ہے۔

﴿۲﴾ طبری نے فرمایا: "مشرکین نے اپنے بتوں اور آستانوں کے نام اللہ تعالیٰ کے ناموں کی مؤنث بنا کر رکھے ہوئے تھے۔

## الْاُنْثٰى ۞

### اس کے لیے لڑکیاں؟ ۞

چنانچہ انھوں نے لفظ ''اَللّٰهُ'' کے ساتھ تاۓ تانیث ملا کر ''اَللَّاتُ'' بنا لیا، جیسے ''عَمْرٌو'' مذکر کے لیے ''عَمْرَةٌ'' مؤنث اور ''عَبَّاسٌ'' مذکر کے لیے ''عَبَّاسَةٌ'' مؤنث بنا لیتے ہیں اور ''عَزِيْزٌ'' سے ''عُزّٰى'' بنا لیا (جو ''أَعَزُّ'' اسم تفضیل کی مؤنث ہے)۔'' یہاں ایک سوال ہے کہ لفظ ''اَللّٰهُ'' کا مؤنث ''اَللَّاتُ'' کیسے بن گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''اَللّٰهُ'' اصل میں ''اَلْإِلٰهُ'' ہے، مؤنث اس کا ''اَلْإِلٰهَةُ'' بنے گا، مگر انھوں نے تخفیف کے لیے اسے ''اَللَّاتُ'' بنا لیا اور معلوم ہے کہ تخفیف کا کوئی طے شدہ قاعدہ نہیں۔ شیخ عبدالرحمٰن سعدی لکھتے ہیں: ''مَنَاةٌ'' ''مَنَّانٌ'' کی مؤنث بنا لی گئی ہے۔'' ظاہر ہے یہاں بھی تخفیف کا قاعدہ ہی استعمال ہوا ہے۔

طبری نے فرمایا: ''مشرکین نے اپنے اوثان کے نام اللہ تعالیٰ کے ناموں کی مؤنث بنا کر رکھے ہوئے تھے اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ان کے اس بہتان سے بہت بلند ہے) تو اللہ جلّ ثناؤہ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا کہ لات و عزیٰ اور تیسرے ایک اور منات کو اللہ کی بیٹیاں کہنے والو! ''اَلَكُمُ الذَّكَرُ'' کیا تم اپنے لیے اولاد لڑکے پسند اور لڑکیاں ناپسند کرتے ہو اور ''وَلَهُ الْاُنْثٰى'' اس کے لیے لڑکیاں قرار دیتے ہو، جنھیں اپنے لیے کسی صورت پسند نہیں کرتے، بلکہ ان سے اتنی شدید نفرت رکھتے ہو کہ انھیں زندہ درگور کر دیتے ہو۔''

③ ''اللّٰتَ'' کی قراءت میں اختلاف ہے۔ اکثر قراء اسے ''تاء'' کی تشدید کے بغیر پڑھتے ہیں، اس مفہوم کے مطابق جس کا اوپر ذکر ہوا ہے اور بعض اسے ''اَللَّاتُّ'' (تاء کی تشدید کے ساتھ) پڑھتے ہیں، جو ''لَتَّ يَلُتُّ'' (ن) سے اسم فاعل ہے، جس کا معنی بلونا اور لت پت کرنا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: « كَانَ اللَّاتُ رَجُلًا يَلُتُّ سَوِيْقَ الْحَاجِّ » [ بخاري، التفسير، سورۃ النجم : ۴۸۵۹ ] ''لات ایک مرد تھا جو ستو بلو کر حاجیوں کو پلاتا تھا۔'' پہلی قراءت اس لیے راجح ہے کہ اکثر قراء نے ایسے ہی پڑھا ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اس بات پر جھڑکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسری قراءت کے مطابق ''لات'' ایک مرد تھا۔ ''لات'' کے مؤنث ہونے کی ایک دلیل صحیح بخاری (۲۷۳۱، ۲۷۳۲) میں مذکور صلح حدیبیہ والی طویل حدیث ہے، جس میں ہے کہ جب کفار کے نمائندے سہیل بن عمرو نے کہا کہ تم مختلف لوگ اکٹھے ہو گئے ہو، جنگ ہوئی تو بھاگ جاؤ گے، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: « اُمْصُصْ بَظْرَ اللَّاتِ أَنَحْنُ نَفِرُّ عَنْهُ » ''لات کی شرم گاہ کو چوس، کیا ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟'' واضح رہے ''بَظْرٌ'' عورت کی شرم گاہ کو کہا جاتا ہے۔

④ عرب میں بتوں کے بے شمار آستانے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ان تین کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ ان کے سب سے مشہور اور بڑے بت تھے۔ مکہ، طائف، مدینہ اور حجاز کے اکثر علاقوں کے لوگ انھیں سب سے زیادہ پوجتے تھے۔ لات طائف میں تھا، بنو ثقیف اس کے پجاری اور متولی تھے۔ عزیٰ قریش کی خاص دیوی تھی جس کا اِستھان مکہ اور طائف کے

## تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾

یہ تو اس وقت سخت ناانصافی کی تقسیم ہے۔

درمیان مقام نخلہ پر تھا۔ وہاں عمارت کے علاوہ درخت بھی تھے جن کی پوجا ہوتی تھی۔ قریش کے ہاں اس کی تعظیم کا اندازہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ہوتا ہے جس میں ہے کہ جنگِ اُحد کے موقع پر جب کفار مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوئے تو پہاڑ پر چڑھ کر ابوسفیان نے فخر سے کہا: "لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ" (ہمارے پاس عزیٰ ہے، تمھارے پاس کوئی عزیٰ نہیں) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اسے جواب دو: « اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ » "اللہ ہمارا مولیٰ ہے، تمھارا کوئی مولیٰ نہیں۔" [ بخاري، الجهاد والسير، باب ما يكره من التنازع...... : ۳۰۳۹ ] منات کا مندر مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے مُشلّل کے قریب قُدید کے مقام پر تھا۔ [ دیکھیے بخاري، التفسير، سورة النجم : ۴۸۶۱ ] مدینہ کے اوس و خزرج اور ان کے ہمنوا اس کی پوجا کرتے تھے۔ ان تمام بتوں کے مندر تھے اور ان کے باقاعدہ پروہت اور پجاری بھی تھے۔ کعبہ کی طرح ان پر بھی جانور لا کر قربان کیے جاتے تھے۔ ابن کثیر نے اس مقام پر سیرت ابن اسحاق سے عرب کے بتوں کا تذکرہ تفصیل سے نقل کیا ہے کہ وہ کہاں کہاں تھے، ان کی شکل کیا تھی اور کون کون سے صحابہ نے انھیں منہدم کیا۔ یہ تفصیل ان کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

**5** **وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى** : یہاں ایک سوال ہے کہ "الثَّالِثَةَ" (تیسرا) کہنے کے بعد "الْاُخْرٰى" (ایک اور یا بعد والا) کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ مشرکین کے ہاں بتوں اور دیویوں کے بھی درجے ہیں، لات اور عزیٰ کو جو مقام حاصل تھا وہ منات کو حاصل نہ تھا۔ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں یہ ظاہر کرنے کے لیے فرمایا کہ اس کا نمبر تمھارے ہاں بھی تیسرا اور دونوں کے بعد ہے۔ یہ بھی شرک پر بہت بڑی چوٹ ہے کہ وہ معبود ہی کیا ہوا جو دوسرے معبود کو برداشت کرتا ہے اور متعدد معبود اپنی اپنی حیثیت پر قناعت کرتے اور خوش رہتے ہیں، بھلا معبود برحق ایسا ہونا چاہیے؟ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے بتوں میں بھی یہ تقسیم موجود تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ ﴾ [ الأنبياء : ۵۸ ] "پس اس نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، سوائے ان کے ایک بڑے کے۔"

**6** اس مقام پر بعض مفسرین نے ایک روایت بیان کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اس آیت پر پہنچے تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیے: "تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَ إِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى" اس روایت کی حقیقت کے لیے دیکھیے سورۂ حج کی آیت (۵۲) کی تفسیر۔

**آیت 22** **تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى** : "ضِيْزٰى" "ضَازَ يَضِيْزُ ضَيْزًا" (ض) سے "فُعْلٰى" (فاء کے ضمہ کے ساتھ) کے وزن پر ہے جو "أَفْعَلُ" (اسم تفضیل) کی مؤنث ہے۔ اس کا معنی "شَدِيْدُ الضَّيْزِ" (سخت ناانصافی والی) ہے۔ "ضَادٌ" کے ضمہ کو "یاء" کی موافقت کے لیے کسرہ سے بدل دیا گیا۔ یعنی ایک تو اللہ کے لیے اولاد بتانا، پھر اپنے لیے لڑکے اور اللہ تعالیٰ

اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿۲۳﴾ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ ع

یہ (بت) چند ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، ان کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔ یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آ چکی ﴿۲۳﴾ یا انسان کے لیے وہ (میسر) ہے جو وہ آرزو کرے ﴿۲۴﴾ سو اللہ ہی کے لیے پچھلا اور پہلا جہان ہے ﴿۲۵﴾

---

کے لیے لڑکیاں پسند کرنا، یہ تو بہت ہی سخت ناانصافی کی تقسیم ہے۔

**آیت 23** ① **اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ ......** : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۱) اور سورۂ یوسف (۴۰) کی تفسیر۔

② **اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ** : تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۳۶، ۶۶) کی تفسیر۔

③ **وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ ......** : یعنی یہ لوگ ان کی پرستش صرف اپنے دلوں کی خواہشات کی پیروی میں کر رہے ہیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسا معبود ہو جو دنیا میں ان کے کام بناتا رہے اور اگر آخرت آ ہی جائے تو وہاں بھی انھیں بخشوا دے، مگر ان پر حلال و حرام کی کوئی پابندی ہو نہ ان کی خواہشات پر کوئی قدغن ہو۔ اس لیے کبھی کسی کو اللہ کی اولاد بنا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں، جیسے کوئی مسیح یا عزیر علیہ السلام کو اس کا بیٹا بنا کر پوجتا ہے، جیسے یہود و نصاریٰ اور کوئی فرشتوں کو بیٹیاں بنا کر، جیسے مشرکین عرب اور کبھی کسی کو اس کا ایسا محبوب یا محبوبہ بنا کر پوجنے لگتے ہیں جس کی محبت کے ہاتھوں وہ مجبور ہے اور ان کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا، جیسا کہ عام بت پرست ہیں اور کئی جھوٹے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے اور دل میں امید باندھ لیتے ہیں کہ ان کے بنائے ہوئے یہ خیالی معبود قیامت کے دن انھیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچا لیں گے، کیونکہ ان کا اس کے ساتھ نسب یا محبت کا رشتہ ہے جس سے مجبور ہو کر اسے ان کی شفاعت ماننا پڑے گی۔ جب کہ حقیقت میں یہ سب ان کی ناکام تمنائیں اور آرزوئیں ہیں، بات یہ ہے: ﴿ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴾ ”اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آ چکی۔“ اور اصل ہدایت اور سیدھی راہ وہی ہے جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لے کر ان کے پاس آئے ہیں۔

**آیت 24، 25** **اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ......** : یعنی انھوں نے جو آرزوئیں دل میں پال رکھی ہیں کہ ان کے معبود دنیا میں ان کے کام آئیں گے اور آخرت میں انھیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچا لیں گے، یا اگر آخرت قائم ہوئی تو انھیں وہاں بھی وہی آسائشیں ملیں گی جو انھیں دنیا میں میسر ہیں، تو سب سے پہلے یہ سوچیں کہ آیا انسان کی ہر تمنا جو وہ کرے، کیا پوری ہوتی ہے؟

وَ كَمۡ مِّنۡ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِيۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ يَّاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَ يَرۡضٰى ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِكَةَ تَسۡمِيَةَ الۡاُنۡثٰى ﴿۲۷﴾ وَ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغۡنِيۡ مِنَ الۡحَقِّ شَيۡـًٔا ﴿۲۸﴾

**اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور (جسے) پسند کرے ﴿۲۶﴾ بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے ناموں کی طرح رکھتے ہیں ﴿۲۷﴾ حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور بے شک گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا ﴿۲۸﴾**

ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ دنیا کا مالک بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور آخرت کا مالک بھی وہی ہے، اس لیے کسی اور کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، بلکہ ہوتا وہی ہے جو مالک چاہے۔ پھر انھوں نے ان خود ساختہ معبودوں سے یہ توقع کیسے باندھ لی کہ وہ ان کی تمنائیں پوری کریں گے۔ یہاں تو بڑے سے بڑا شخص بھی خواہ اللہ کا خلیل ہو یا اس کا حبیب، اس کی مرضی کا پابند ہے اور اس کی وہی آرزو پوری ہوتی ہے جو مالک چاہتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے والد کو دیکھ لو، نوح علیہ السلام کے بیٹے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو دیکھ لو، تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کسی بھی شخص کی تمنا وہی پوری ہوتی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کا مالک چاہتا ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ ‏ ‏ ‏ ‏ تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

’’ایسا نہیں کہ آدمی جو تمنا کرے اسے حاصل کر ہی لے، کیونکہ بہت دفعہ ہوائیں کشتیوں کی خواہش کے خلاف چلتی ہیں۔‘‘

**آیت 26** ﴿ وَ كَمۡ مِّنۡ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِيۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا ...... : یعنی تمھارے یہ حاجت روا اور مشکل کشا اور فرشتوں کے ناموں پر بنائے ہوئے دیوی دیوتا تو محض تمھارے وہم و گمان کی پیداوار ہیں، حقیقت میں ان کا کہیں وجود ہی نہیں۔ یہاں تو حقیقی فرشتے جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے، ان کا بھی یہ حال ہے کہ ان میں سے کسی کی سفارش کام نہیں آتی، سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ اجازت دے اور اسی کو فائدہ دیتی ہے جس کے حق میں سفارش کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائے اور اس کے حق میں سفارش کی اجازت دے۔ غرض سفارش کا اختیار بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، فرمایا: ﴿ قُلۡ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيۡعًا ﴾ [ الزمر : ٤٤ ] ’’کہہ دے سفارش ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔‘‘ پھر اسے چھوڑ کر تم کسی اور کو کیوں پکارتے اور پوجتے ہو؟ شفاعت کے متعلق مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۵): ﴿ مَنۡ ذَا الَّذِيۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ﴾ (آیت الکرسی) اور سورۂ نبا (۳۸) کی تفسیر۔

**آیت 28,27** ﴿ (1) اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ ...... : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ زخرف (۱۹) کی تفسیر۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَ لَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾

سو اس سے منہ پھیر لے جس نے ہماری نصیحت سے منہ موڑا اور جس نے دنیا کی زندگی کے سوا کچھ نہ چاہا ﴿۲۹﴾ یہ علم میں ان کی انتہا ہے، یقیناً تیرا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے اسے جو اس کے راستے سے بھٹک گیا اور وہی زیادہ جاننے والا ہے اسے جو راستے پر چلا ﴿۳۰﴾ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جنھوں نے برائی کی، اس کا بدلا دے جو انھوں نے کیا اور ان لوگوں کو جنھوں نے بھلائی کی، بھلائی کے ساتھ بدلا دے ﴿۳۱﴾

② اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۳۶، ۶۶) کی تفسیر۔

**آیت 29** فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا ...... : یہاں یہ کہنے کے بجائے کہ "فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ" (سو ان سے منہ پھیر لے) یہ فرمایا: ﴿ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا ﴾ (سو اس سے منہ پھیر لے جس نے ہماری نصیحت سے منہ موڑا) تاکہ ان مشرکین سے اعراض کی وجہ بھی سامنے آ جائے کہ جو شخص ہماری وحی کے ذریعے سے آنے والی نصیحت کی طرف توجہ دینے کے لیے تیار ہی نہیں، بلکہ جان بوجھ کر اس سے منہ موڑے ہوئے ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا اس نے کچھ چاہا ہی نہیں ہے، آپ بھی اس کے پیچھے نہ پڑیں اور نہ ہی اس کی خاطر وقت ضائع کریں۔

**آیت 30** ① ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ: "مَبْلَغٌ" "بَلَغَ يَبْلُغُ" (ن) سے ظرف ہے، پہنچنے کی جگہ۔ "ذٰلِكَ" کا لفظ تحقیر کے لیے ہے کہ ان لوگوں کے علم کی پہنچ اور انتہا اس حقیر حیاتِ دنیا تک ہی ہے، جو آخرت کے مقابلے میں قلیل بھی ہے اور ناپائیدار بھی، اس سے آگے نہ انھیں کچھ علم ہے نہ وہ اس سے آگے جانے یا سوچنے کے لیے تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی ایک دعا میں آپ ﷺ کے یہ الفاظ آئے ہیں: (( وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا )) [ ترمذي، الدعوات، باب دعاء "اللهم اقسم لنا ....." : ۳۵۰۲، قال الألباني حسن ] "اور دنیا کو ہماری سب سے بڑی فکر نہ بنانا اور نہ اسے ہمارے علم کی انتہا بنانا۔"

② اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ...... : اس سے اللہ تعالیٰ کا کمال علم ثابت ہوتا ہے کہ اسے ان تمام لوگوں کا علم ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور ان کا بھی جو اس کی راہ پر قائم ہیں۔

**آیت 31** ① وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ: لفظ "لِلّٰهِ" پہلے لانے سے حصر پیدا ہو رہا ہے۔ اس جملے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اختیار کے کمال کا ذکر ہے کہ ساری کائنات کی ہر چیز کا وہی مالک ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾

ع ۷ ۲

وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں مگر صغیرہ گناہ، یقیناً تیرا رب وسیع بخشش والا ہے، وہ تمھیں زیادہ جاننے والا ہے جب اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے تھے۔ سو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو، وہ زیادہ جاننے والا ہے کہ کون بچا ﴿۳۲﴾

❷ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا...... : تو جب وہ علم اور قدرت دونوں میں کامل ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلا دے گا اور بھلائی کرنے والوں کو بھلائی کے ساتھ بدلا دے گا، ان میں سے کوئی بھی نہ اس کے علم سے اوجھل ہے نہ اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اس میں برائی کرنے والوں کے لیے وعید اور بھلائی کرنے والوں کے لیے وعدہ ہے۔

آیت 32 : ❶ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ شوریٰ (۳۷) کی تفسیر۔

❷ اِلَّا اللَّمَمَ : "اَلْاِلْمَامُ" اور "اَللَّمَمُ" کا اصل معنی "کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے اترنا" ہے۔ "أَلَمَّ فُلَانٌ بِالْمَكَانِ" جب کوئی شخص کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے اترا ہو۔ یعنی بھلائی کرنے والے لوگ جنھیں اللہ بھلائی کے ساتھ جزا دے گا، وہ ہیں جو کبیرہ گناہوں اور فواحش سے بچتے ہیں، مگر کبھی کسی وقت ان سے کوئی گناہ ہو جائے تو وہ اس پر اصرار نہیں کرتے بلکہ فوراً توبہ کر کے اس سے نکل جاتے ہیں۔ گناہ سے ان کی آلودگی تھوڑی دیر کے لیے ہوتی ہے۔ (دیکھیے نساء: ۱۷، ۱۸) طبری نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: "اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی فاحشہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے۔" "اللَّمَمَ" کا معنی "قریب ہونا" بھی ہے، "أَلَمَّ بِالشَّيْءِ إِذَا قَارَبَهُ وَلَمْ يُخَالِطْهُ" جب کوئی شخص کسی کام کے قریب ہوا ہو، مگر اس نے وہ کام نہ کیا ہو۔ اس لیے اکثر سلف نے "اللَّمَمَ" سے مراد صغیرہ گناہ لیے ہیں۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "میں نے "اللَّمَمَ" کے مشابہ اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں دیکھی جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا، أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ وَ زِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِيْ وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ كُلَّهُ وَ يُكَذِّبُهُ » [ بخاري، الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج : ٦٢٤٣ ] "اللہ تعالیٰ نے ابنِ آدم پر زنا میں سے اس کا حصہ لکھ دیا ہے، جسے لامحالہ اس نے پانا ہی پانا ہے۔ سو آنکھ کا زنا دیکھنا ہے اور زبان کا زنا بولنا ہے اور نفس تمنا کرتا اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس سب کو سچا کر دکھاتی ہے یا جھوٹا۔" مزید دیکھیے سورۂ نساء (۳۱) کی تفسیر۔

❸ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ : اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے "رَبٌّ" کا ذکر کر کے فرمایا کہ تیرا رب وسیع بخشش والا ہے، یعنی

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝ وَ اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّ اَكْدٰى ۝

پھر کیا تو نے دیکھا اسے جس نے منہ موڑ لیا ۝ اور تھوڑا سا دیا اور رک گیا ۝

اس کی ربوبیت کا نتیجہ ہے کہ وہ بندوں کے گناہوں پر پردہ ڈالتا ہے اور انھیں معاف فرماتا ہے، ورنہ اگر وہ ہر چھوٹے بڑے گناہ پر گرفت فرمائے تو زمین پر کوئی متنفس باقی نہ چھوڑے۔ اس کی مغفرت اتنی وسیع ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کا ہر گناہ حتیٰ کہ کفر وشرک بھی معاف کر دیتا ہے اور جسے چاہے کفر وشرک کے سوا توبہ کے بغیر بھی سب کچھ معاف کر دیتا ہے۔

4 هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ...... : "اَجِنَّةٌ" "جَنِيْنٌ" کی جمع ہے، بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں رہے، کیونکہ وہ وہاں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی مغفرت کی یہ وسعت اس کے علم کی وسعت کی وجہ سے ہے، وہ تم سے بھی زیادہ تمھارا علم رکھتا ہے، اسے تمھارا اس وقت کا حال بھی معلوم ہے جب تم اس قابل ہی نہیں تھے کہ کچھ جان سکو۔ چنانچہ وہ تمھارے اس وقت کا بھی علم رکھتا ہے جب اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور اس وقت کا بھی جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی حالت میں تھے۔ اسے تمھاری کمزوری اور گناہ کی طرف رغبت خوب معلوم ہے، اس لیے وہ چھوٹے موٹے گناہوں کو ویسے ہی معاف کر دیتا ہے۔

5 فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ١ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى : اس لیے اگر تمھیں کسی اچھے کام کی توفیق مل جائے تو نہ اس پر فخر کرو اور نہ اپنے آپ کو پاک قرار دو۔ ہمیشہ اپنی ابتدا پر نظر رکھو اور اپنی انتہا پر بھی، کیونکہ تمھارا انجام اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اچھا ہے یا برا۔ وہی جانتا ہے کہ حقیقی متقی کون ہے، جس کا خاتمہ تقویٰ پر ہوگا، تو جب تمھیں اپنا انجام ہی معلوم نہیں تو اپنے پاک ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو؟ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۴۹) کی تفسیر۔

6 اس حکم کی دھڑلے کے ساتھ مخالفت سب سے زیادہ بعض صوفی حضرات نے کی ہے۔ اس کی واضح دلیل ان کا ''وحدت الوجود'' کا عقیدہ ہے، بھلا جو شخص مردہ مٹی سے بنا، پھر رحم کی تین ظلمتوں میں غلیظ خون کے ساتھ پرورش پاتا رہا اور پیشاب کے راستوں سے دو دفعہ گزر کر وجود میں آیا، جسے اپنے انجام تک کا علم نہیں کہ جنت ہے یا جہنم، اسے خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے حیا نہیں آتی۔ ان لوگوں نے اپنی "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کی فرعونیت کو زہد وتقدس کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے: "سُبْحَانِيْ مَا أَعْظَمَ شَأْنِيْ" ''میں پاک ہوں، میری شان کس قدر عظیم ہے۔'' کوئی کہتا ہے: "مُلْكِيْ أَعْظَمُ مِنْ مُلْكِ اللّٰهِ" ''میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔'' کوئی کہتا ہے: ''میرا دل چاہتا ہے دوزخ کو بجھا دوں، جنت کو جلا دوں۔'' غرض اپنی پاکبازی کے دعوے کے ساتھ جو لاف زنی اور بے ہودہ گوئی یہ لوگ کرتے ہیں آپ کو اور کسی جگہ مشکل سے ملے گی۔

آیت 34، 33 1 اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى : اس سورت کا مضمون رسالت کا اثبات، شرک اور بت پرستی کی تردید اور مشرکین مکہ کی مذمت ہے۔ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے پاک ہونے کے گمان اور دعویٰ سے منع فرمایا۔ قریش مکہ اپنے

# اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾

## کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے؟ پس وہ دیکھ رہا ہے ﴿۳۵﴾

بارے میں کئی طرح کے گمان اور دعوے رکھتے تھے، جنھوں نے انھیں دھوکے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر ان کے وہ گمان ذکر فرمائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنی برتری کا گمان تھا، اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو مٹی سے، پھر ماں کے شکم سے پیدا کرنے کا ذکر فرما کر تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیا۔ ایک کام ان کا یہ تھا کہ انھوں نے عین کعبہ کے اندر ابراہیم، اسمٰعیل علیہما السلام اور دوسرے بزرگوں کی صورتیں رکھ کر ان کی عبادت کر کے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہمارے یہ وکیل اور سفارشی بڑے زبردست ہیں کہ وہ اپنے نام لیواؤں کو، خواہ وہ کچھ بھی کرتے رہیں، اپنے دامن میں پناہ دیں گے۔ (دیکھیے یونس : ۱۸) ایک گمان ان کا یہ تھا کہ کفر کے باوجود انھیں جس طرح دنیا میں نعمتیں ملی ہوئی ہیں اسی طرح آخرت میں بھی ملیں گی۔ (دیکھیے مریم : ۷۷) اسی طرح وہ دوسروں کو یہ کہہ کر اسلام قبول کرنے سے روکتے تھے کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، تمھارے گناہ ہم اٹھا لیں گے۔ (دیکھیے عنکبوت : ۱۲) ان سارے دعووں اور گمانوں کا نتیجہ یہ تھا کہ آخرت کے عذاب سے بے خوف ہونے کی وجہ سے ان میں دنیا کی شدید ہوس، بخل اور کمینگی آ چکی تھی۔ وہ کچھ خرچ کرتے بھی تھے تو نام و نمود کی خاطر، وہ بھی بس اتنا کہ نام ہو جائے، اس سے آگے ان کے ہاتھ کھلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے اور اتنا خرچ کر کے بھی وہ اپنی سخاوت اور دریا دلی کی لاف زنی کرتے کہ میں نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا، جیسا کہ سورۂ بلد میں ہے: ﴿ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ﴾ [ البلد : ٦ ] ''کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال برباد کر ڈالا۔'' اپنے آباؤ اجداد، پیشواؤں، وکیلوں اور سفارشیوں کے بل بوتے پر یہ کہہ کر گناہ کیے جاتے ہیں کہ ہمارے گناہ وہ اٹھا لیں گے، جیسے نصرانیوں کا کہنا ہے کہ ہمارے تمام گناہوں کے کفارہ میں مسیح علیہ السلام سولی پر چڑھ گئے ہیں، ہم ان کے نام لیوا ہیں، ہمارے سارے گناہ انھوں نے اپنے ذمے لے کر بخشوا لیے ہیں اور جیسا کہ آج کل مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت پا کر اپنے نام لیواؤں کے سارے گناہ بخشوا لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ایسے تمام گمانوں اور دعووں کی تردید فرمائی ہے۔

﴿۳۴﴾ وَ اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّ اَكْدٰى : ''اَكْدٰى'' ''كُدْيَةٌ'' سے ہے جس کا معنی چٹان ہے۔ کوئی شخص کنواں وغیرہ کھودنے لگے اور آگے چٹان یا پتھر آ جانے کی وجہ سے کھودنے سے رک جائے تو کہا جاتا ہے: ''اَكْدَى الرَّجُلُ.'' یہاں ''الَّذِيْ'' سے کوئی خاص شخص مراد نہیں، بلکہ مقصود مشرک آدمی کی نفسیات اور طرزِ عمل کا تذکرہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے، اگر کبھی دیتے بھی ہیں تو نام کے لیے، وہ بھی تھوڑا سا، پھر ان کے سامنے کنجوسی کی چٹان آ جاتی ہے اور وہ رک جاتے ہیں، خصوصاً جب انھیں اس سے شہرت یا دنیوی مفاد حاصل ہوتا دکھائی نہ دیتا ہو۔ فرمایا، کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے حق قبول کرنے سے منہ موڑ لیا، کچھ تھوڑا سا مال خرچ کیا اور رک گیا۔ شاہ عبد القادر نے فرمایا: ''یعنی تھوڑا سا ایمان لانے لگا، پھر رک گیا۔'' (موضح) اس معنی میں مراد وہ مشرک ہیں جنھوں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کی تعریف کی، مگر اس کے بعد ایمان لانے سے رک گئے۔

آیت 35 ﴿ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى : یعنی یہ شخص ایمان سے منہ موڑنے اور اس تمام تر بخل اور کنجوسی کے باوجود جو

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝۳۶ وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ۝۳۷ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝۳۸ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝۳۹

**یا اسے اس بات کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے ۝۳۶ اور ابراہیم کے (صحیفوں میں) جس نے (عہد) پورا کیا ۝۳۷ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی ۝۳۸ اور یہ کہ انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی ۝۳۹**

اپنے آپ کو پاک قرار دے رہا ہے اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہنے اور وہاں کی نعمتوں کے حق دار ہونے کا جو گمان اس نے کر رکھا ہے، کیا اس کے پاس علم غیب کی دوربین (آلہ) ہے جس کے ساتھ وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے؟

آیت 37،36 ❶ **اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ......** : یعنی اگر وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں اور اس کے پاس علم غیب بھی نہیں تو کیا پہلے انبیاء کی کتابوں میں جو بنیادی اصول لکھے ہیں وہ بھی کسی نے اسے نہیں بتائے؟ ان انبیاء میں سے ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کا خاص طور پر ذکر اس لیے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلنے کا وہ دعویٰ رکھتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام کے بعد احکام کی بنیادی کتاب موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی تورات ہی تھی جس پر بعد کے تمام انبیاء عمل کرتے تھے اور جو اس وقت بھی موجود تھی اور قریش یہودیوں سے اس کے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔

❷ **وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى** : "وَفّٰۤى" جس نے پورا کیا، یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کیا پورا کیا، تاکہ وہ عام رہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اور بندوں سے کیا ہوا ہر عہد پورا کیا۔ (دیکھیے توبہ: ۱۱۴) اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اسے پورا کیا اور جن باتوں کے ساتھ امتحان لیا سب پوری کر دکھائیں۔ (دیکھیے بقرۃ: ۱۲۴) "الَّذِيْ وَفّٰۤى" (جس نے پورا کیا) پر مفسر ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں: "میرے خیال میں "الَّذِيْ" موصول دونوں میں سے ہر ایک کی صفت ہے۔ (واللہ اعلم)" "أَيْ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا" یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام میں سے ہر ایک نے عہد پورا کیا۔

آیت 38 **اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى** : "اَلَّا تَزِرُ" اصل میں "أَنْ لَا تَزِرُ" ہے، "أَنْ" تفسیریہ ہے یا "أَنَّهُ" کی تخفیف ہے۔ یہاں سے ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں سے چند احکام نقل فرمائے ہیں، ان میں سے پہلا یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۶۴)، بنی اسرائیل (۱۵) اور فاطر (۱۸)۔

آیت 39 **وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** : یعنی جس طرح کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اس پر نہیں ڈالا جائے گا اسی طرح اسے اجر و ثواب بھی انھی اعمال کا ملے گا جو اس نے خود کیے ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ آدمی کو دوسروں کے نیک اعمال سے فائدہ پہنچتا ہے، مثلاً گناہ گاروں کے لیے انبیاء، فرشتوں اور صالحین کی شفاعت، مُردوں کے لیے زندوں کی دعا (دیکھیے مومن: ۷، ۸۔ حشر: ۱۰) اور باپ کے عمل سے اولاد کے درجوں کا بلند ہونا تو قرآن سے ثابت ہے (دیکھیے طور: ۲۱) اور میت کی طرف سے صدقہ، صیام اور حج وغیرہ کا نافع ہونا حدیث سے ثابت ہے، تو اس

وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝۴۰ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝۴۱ وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝۴۲

اور یہ کہ اس کی کوشش جلد ہی اسے دکھائی جائے گی ۝۴۰ پھر اسے اس کا بدلا دیا جائے گا، پورا بدلا ۝۴۱ اور یہ کہ تیرے رب ہی کی طرف آخر پہنچنا ہے ۝۴۲

آیت کے ساتھ اس کی مطابقت کیسے ہوگی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسی شخص کے لیے نافع ہوگا جو ایمان لے آیا، کافر کو ان میں سے کوئی چیز نفع نہیں دے گی۔ ایمان کے بعد ان چیزوں کا نافع ہونا اس کی اپنی سعی یعنی ایمان ہی کی برکت اور اسی کا نتیجہ ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب سے کہا تھا: « أَيْ عَمِّ! قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ » [ بخاري، مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب : ۳۸۸٤ ] ''اے چچا! تو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہہ لے، میں اس کلمے کے ساتھ تیری خاطر اللہ تعالیٰ کے پاس جھگڑوں گا۔'' اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴾ [ الشعراء : ۸۸، ۸۹ ] ''جس دن نہ کوئی مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔ مگر جو اللہ کے پاس سلامتی والا دل لے کر آیا۔'' کفر و شرک سے سلامت دل والے کو وہاں اس کے بیٹے بھی کام آئیں گے جو اس کے بعد اعمالِ صالحہ کرتے رہے اور اس کے لیے دعا کرتے رہے اور اس کا مال بھی جو صدقہ جاریہ کی صورت میں اس کے نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا رہا۔ بلند درجے والے مومن والدین کے ساتھ ان کی اسی اولاد کو ملایا جائے گا جو ایمان کی نعمت رکھتے ہوں گے، خواہ کسی بھی درجے کا ہو۔ دیکھیے سورۂ طور (۲۱) کی تفسیر۔

**آیت 40** **وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى:** ''يُرٰى'' '' رَأَى يَرَى رُؤْيَةً '' (ف) سے بھی فعل مجہول ہوسکتا ہے (اس کی کوشش دیکھی جائے گی) اور ''أَرٰى يُرِيْ إِرَاءَةً '' (افعال) سے بھی (اس کی کوشش اس کو دکھائی جائے گی)۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۳، ۱۴) اور سورۂ کہف (۴۹)۔

**آیت 41** **ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى:** اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۱۱۱) اور سورۂ آل عمران (۲۵) کی تفسیر۔

**آیت 42** **وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى:** یعنی ہر شخص نے آخر کار اپنے رب ہی کے پاس پہنچنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴾ [ الأنبياء : ۹۳ ] ''سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں۔'' ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ تمام علوم و افکار کا سلسلہ اللہ تعالیٰ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴾ [ النازعات : ٤٢ تا ٤٤ ] ''وہ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہے؟ اس کے ذکر سے تو کس خیال میں ہے؟ تیرے رب ہی کی طرف اس (کے علم) کی انتہا ہے۔''

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَ اَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾

اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ اسی نے ہنسایا اور رلایا ﴿۴۳﴾ اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ اسی نے موت دی اور زندگی بخشی ﴿۴۴﴾ اور یہ کہ اسی نے دو قسمیں نر اور مادہ پیدا کیں ﴿۴۵﴾ ایک قطرے سے، جب وہ ٹپکایا جاتا ہے ﴿۴۶﴾ اور یہ کہ اسی کے ذمہ دوسری دفعہ پیدا کرنا ہے ﴿۴۷﴾ اور یہ کہ اسی نے غنی کیا اور خزانہ بخشا ﴿۴۸﴾ اور یہ کہ وہی شِعریٰ (ستارے) کا رب ہے ﴿۴۹﴾ اور یہ کہ اسی نے پہلی قوم عاد کو ہلاک کیا ﴿۵۰﴾ اور ثمود کو، پس (کسی کو) باقی نہیں چھوڑا ﴿۵۱﴾

**آیت 43 تا 49** ❶ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ...... : اس سے پچھلی آیات میں ان معاملات کا ذکر تھا جو انسان کے اختیار میں ہیں، اختیار کے باوجود ان میں انسان کی کوتاہی ایک مسلّم امر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ﴾ [ عبس : ۲۳ ] ''ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا۔'' پھر کسی کے پاس اپنے تزکیے کی کیا گنجائش ہے؟ اب ان معاملات کا ذکر ہے جن میں انسان کا کچھ اختیار نہیں، مثلاً ہنسانا، رلانا، مارنا، جلانا (زندہ کرنا)، ایک نطفہ سے کسی کو مرد اور کسی کو عورت بنا دینا، مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا، غنی کر دینا، خزانے بخش دینا، مشرکین جن ستاروں کو پوجتے ہیں ان سب کا، خصوصاً ''شِعریٰ'' کا رب ہونا اور بڑی بڑی قوت والی قوموں کو نافرمانی پر ہلاک کر دینا، یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ پھر جب انسان اس قادر مطلق کے سامنے اتنا بے بس ہے کہ اس کا رونا، ہنسنا اور مرنا جینا بھی اس کے اختیار میں نہیں اور نہ ہی اسے اگلے لمحے تک کی خبر ہے کہ اسے ہنسنا ہے یا رونا، جینا ہے یا مرنا، تو وہ اپنا تزکیہ کس منہ سے کرتا ہے؟

❷ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى ...... : ''اَقْنٰى'' ''قِنْيَةٌ'' سے ہے جس کا معنی خزانہ ہے۔ یعنی اسی نے جمع کرنے اور خزانہ بنانے کے لیے مال عطا فرمایا۔ آیت: ﴿وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى﴾ اور یہ آیت: ﴿وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى﴾ دونوں میں ''اَنَّهٗ'' کے بعد ''هُوَ'' ضمیر سے حصر پیدا ہو رہا ہے، یعنی وہی ہے جس نے ہنسایا اور رلایا......

❸ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى: ہر چیز کا رب ہونے کے باوجود اس ستارے کا رب ہونے کا خاص طور پر ذکر اس لیے فرمایا کہ بعض عرب مثلاً خزاعہ وغیرہ اس کی پرستش کرتے تھے، اس لیے فرمایا کہ تم جس ستارے کی پرستش کرتے ہو تمھاری قسمتیں اس کے اختیار میں نہیں، وہ تو خود اپنی قسمت کا مالک نہیں، بلکہ اس کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

**آیت 50، 51** وَ اَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ...... : ''عاد اولیٰ'' وہ قدیم قوم جس کی طرف ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ انھیں ''اُولیٰ'' یا تو ان کے قدیم ہونے کی وجہ سے کہا گیا، جیسے فرمایا: ﴿لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ [ الاحزاب :

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

اور ان سے پہلے نوح کی قوم کو، یقیناً وہی زیادہ ظالم اور زیادہ حد سے بڑھے ہوئے تھے ﴿۵۲﴾ اور الٹ جانے والی بستی کو گرا مارا ﴿۵۳﴾ پس ڈھانپ دیا اسے جس سے ڈھانپا ﴿۵۴﴾ پس تو اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس میں شک کرے گا؟ ﴿۵۵﴾

۳۳) ''پہلی جاہلیت کے زینت ظاہر کرنے کی طرح زینت ظاہر نہ کرو۔'' یا اس وجہ سے کہ ان پر عذاب آنے کے وقت جو لوگ بچ گئے ان کی نسل کو عادِ اُخریٰ یا عادِ ثانیہ کہا گیا۔ اکثر کے مطابق ہود علیہ السلام کی قوم کو عادِ اُولیٰ اور صالح علیہ السلام کی قومِ ثمود کو عادِ اُخریٰ کہا جاتا ہے۔ قومِ عاد کی ہلاکت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۲)، حاقہ (۶ تا ۸)، حٰم سجدہ (۱۵، ۱۶)، قمر (۱۸ تا ۲۰)، ذاریات (۴۱، ۴۲) اور احقاف (۲۱ تا ۲۵) اور قومِ ثمود کے تعارف کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۳ تا ۷۹)۔

**آیت 52** ① وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ: یہاں عاد و ثمود کا ذکر قومِ نوح سے پہلے اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ عرب کے رہنے والے تھے اور قریش انھیں اچھی طرح جانتے تھے۔

② اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى: ضمیر ''هُمْ'' حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ ظلم اور سرکشی میں قومِ نوح ہی کو سب سے بڑھ کر اس لیے قرار دیا کہ اور کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کے پیغمبر نے انھیں ساڑھے نو سو سال نصیحت کی ہو اور اس کے باوجود وہ سرکشی پر اڑی رہی ہو۔

**آیت 53** وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى: ''الْمُؤْتَفِكَةَ'' ''اِئْتَفَكَ'' (افتعال) سے اسم فاعل ہے، الٹنے والی۔ مراد قومِ لوط ہے۔ سورۂ حاقہ (۹) میں ''الْمُؤْتَفِكٰتُ'' جمع کے ساتھ آیا ہے، مراد الٹ جانے والی بستیاں ہے۔ ''اَهْوٰى'' ''هَوٰى يَهْوِيْ'' (ض) گرنا۔ ''أَهْوٰى يُهْوِيْ'' (افعال) گرانا۔ ان کے اس نام کی وجہ کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۸۲) اور سورۂ حجر (۷۴)۔

**آیت 54** فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى: ''غَشِيَ يَغْشٰى'' (ع) کسی چیز کا دوسری کو ڈھانپ لینا۔ ''غَشّٰي يُغَشِّيْ'' (تفعیل) کسی چیز پر ڈھانپنے والی چیز ڈال دینا، کسی چیز کو دوسری سے ڈھانپ دینا۔ یہ اندازِ بیان اس عذاب کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۷۸)۔

**آیت 55** فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى: ''تَمَارٰى يَتَمَارٰى تَمَارِيًا'' (تفاعل) شک کرنا۔ ''اٰلَآءِ'' ''إِلًى'' (جو اصل میں ''إِلْيٌ'' تھا) کی جمع ہے، نعمتیں، جیسا کہ ''مِعًى'' کی جمع ''أَمْعَاءٌ'' ہے، انتڑیاں۔ یہاں سوال ہے کہ ان اقوام کی ہلاکت کے ذکر میں کون سی نعمت بیان ہوئی ہے جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ استاد محمد عبدہ لکھتے ہیں: ''سیاقِ کلام کی بنا پر یہاں نعمت سے مراد ظالم و سرکش قوم کی تباہی ہے، معلوم ہوا کہ کسی ظالم و سرکش قوم کو تباہ کرنا بھی انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔'' (اشرف الحواشی) ایک جواب اس کا یہ ہے کہ ظلم اور سرکشی کے انجام سے آگاہ کر دینا بھی بہت بڑا انعام ہے،

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝
اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ ۝

یہ پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے ۝ قریب آگئی وہ قریب آنے والی ۝ جسے اللہ کے سوا کوئی ہٹانے والا نہیں ۝ تو کیا اس بات سے تم تعجب کرتے ہو؟ ۝ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو ۝

جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں مجرموں کے لیے جہنم کا عذاب بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [ الرحمن : ٤٥ ] ''تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟''

آیت 56 هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى: یعنی یہ رسول بھی ان ہلاک کی جانے والی قوموں کو ڈرانے والے پہلے رسولوں کی جماعت کا ایک فرد ہے، جو تمھیں ڈرانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس کا آنا کوئی انوکھی بات نہیں جو تمھاری سمجھ میں نہ آ رہی ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ [ الأحقاف : ۹ ] ''کہہ دے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں ہوں۔''

آیت 57 اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ: ''الْاٰزِفَةُ'' کے معنی کے لیے دیکھیے سورۂ مومن (۱۸) کی تفسیر۔ یعنی یہ رسول تمھیں جس آنے والی قیامت سے ڈراتا ہے وہ بالکل قریب آ چکی ہے، اس لیے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سنبھل جاؤ، یہ مت سوچو کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے، کیونکہ کسی کو خبر نہیں کہ اگلا سانس آئے گا یا نہیں اور جس کی موت آ گئی اس کی قیامت تو قائم ہو گئی، کیونکہ اس کے ساتھ ہی عمل کی مہلت ختم ہے۔

آیت 58 لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ: ''كَاشِفَةٌ'' میں ''تاء'' مبالغہ کی بھی ہو سکتی ہے اور تانیث کی بھی، تانیث کی ہو تو یہ ''نَفْسٌ'' کی صفت ہے۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اسے ہٹانے والا نہیں، جیسے فرمایا: ﴿ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ﴾ [ الأنعام : ۱۷ ] ''اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں۔'' دوسرا یہ کہ اللہ کے سوا اسے کوئی کھولنے والا یعنی اس کا وقت جاننے اور بتانے والا نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ﴾ [ الأعراف : ۱۸۷ ] ''کہہ دے اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، اسے اس کے وقت پر اس کے سوا کوئی ظاہر نہیں کرے گا۔''

آیت 59 اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ: ''هٰذَا الْحَدِيْثِ'' سے مراد رسولوں کو جھٹلانے والی اقوام کے عبرتناک انجام کی اور قیامت قریب ہونے کی بات ہے جو ابھی بیان ہوئی ہے۔ فرمایا بھلا یہ کوئی انوکھی اور ناقابلِ یقین بات ہے جس پر تم تعجب کر رہے ہو؟

آیت 60 وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ: یعنی بجائے اس کے کہ تم یہ سن کر ڈر جاتے کہ کہیں ہم پر بھی ایسا عذاب نہ آ جائے اور رونے لگتے، الٹا اس کا مذاق اڑاتے اور ہنستے ہو۔

وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾

اور تم غافل ہو۔﴿۶۱﴾ تو اللہ کو سجدہ کرو اور (اس کی) بندگی کرو۔﴿۶۲﴾

آیت 61 وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ: " سَمَدَ يَسْمُدُ سُمُوْدًا " (ن) کھیل کود میں مشغول ہونا، غافل ہونا، گانا، تکبر سے سر اٹھا کر چلنا۔ یعنی بجائے رونے کے تم کھیل کود، گانے بجانے اور اپنے تکبر میں غافل رہ کر ہنستے پھرتے ہو۔

آیت 62 ❶ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا: یعنی رسول کے اس ڈرانے کا حق یہ ہے کہ تم اپنا تمام تر تکبر اور غفلت ترک کر کے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ اور اپنے بنائے ہوئے تمام شریکوں کو چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کرو۔

❷ یہ سورت مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اور پہلی سورت ہے جس میں سجدہ کی آیت نازل ہوئی۔ اس کی تاثیر اور زورِ بیان کا یہ عالم ہے کہ جب آپ ﷺ نے اسے عام مجمع میں پڑھا، جس میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین بھی موجود تھے تو مسلمانوں کے ساتھ مشرکین بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ صحیح بخاری میں اس کے متعلق دو احادیث آئی ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: « أَوَّلُ سُوْرَةٍ أُنْزِلَتْ فِيْهَا سَجْدَةٌ وَالنَّجْمِ قَالَ فَسَجَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَجَدَ مَنْ خَلْفَهُ، إِلَّا رَجُلًا رَأَيْتُهُ أَخَذَ كَفًّا مِنْ تُرَابٍ فَسَجَدَ عَلَيْهِ فَرَأَيْتُهُ بَعْدَ ذٰلِكَ قُتِلَ كَافِرًا، وَهُوَ أُمَيَّةُ بْنُ خَلَفٍ » [ بخاري، التفسير، سورة النجم، باب : ﴿فاسجدوا لله واعبدوا﴾ : ٤٨٦٣ ] ”پہلی سورت جس میں سجدہ کی آیت نازل ہوئی " وَالنَّجْمِ " تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا اور آپ کے پیچھے جتنے لوگ تھے سب نے سجدہ کیا، سوائے ایک آدمی کے۔ میں نے اسے دیکھا کہ اس نے مٹی کی ایک مٹھی پکڑی اور اس پر سجدہ کر لیا۔ پھر میں نے بعد میں دیکھا کہ وہ کافر ہونے کی حالت میں قتل ہوا اور وہ امیہ بن خلف تھا۔“ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: « سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّجْمِ وَسَجَدَ مَعَهُ الْمُسْلِمُوْنَ وَالْمُشْرِكُوْنَ وَالْجِنُّ وَالْإِنْسُ » [ بخاري، التفسير، سورة النجم، باب : ﴿ فاسجدوا لله واعبدوا ﴾ : ٤٨٦٢ ] ”رسول اللہ ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں اور جن و انس نے سجدہ کیا۔“

سُوْرَةُ الْقَمَر ٥٤ مَكِّيَّة ٣٧ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ٥٥ رُكُوْعَاتُهَا ٣

## اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ①

**اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔**

**قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا ①**

عبید اللہ بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں کیا قراءت کرتے تھے؟'' انھوں نے کہا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں میں "قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ" اور "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ" کی قراءت کیا کرتے تھے۔'' [ مسلم، صلاة العیدین، باب ما یقرأ به في صلاة العیدین : ۸۹۱ ]

**آیت 1** ① **اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ** : "اِقْتَرَبَتْ" "قَرُبَ يَقْرُبُ" (ک، ع) میں سے باب افتعال کا ماضی معلوم ہے۔ حروف میں اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے، جیسے "قَدَرَ" اور "اِقْتَدَرَ" ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''قیامت بہت قریب آ گئی ہے۔'' ویسے تو ہر آنے والی چیز قریب ہی ہے، مگر قیامت کو بہت قریب اس لیے فرمایا کہ دنیا پر گزرے ہوئے وقت کے مقابلے میں باقی رہنے والا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اب اس کے فنا اور قیامت کے قیام کا وقت بہت ہی قریب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی اور نبی نہیں، بلکہ قیامت ہی آئے گی۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: (( بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ )) [ مسلم، الفتن، باب قرب الساعة : ۲۹۵۰۔ بخاري : ۶۵۰۳ ] ''مجھے اور قیامت کو ان دو (انگلیوں) کی طرح بھیجا گیا ہے۔''

② **وَانْشَقَّ الْقَمَرُ** : یعنی چاند کا پھٹنا اس بات کی علامت ہے کہ قیامت، جس کی تمھیں خبر دی جاتی رہی ہے، بہت قریب آ گئی ہے، کیونکہ جب چاند جیسا عظیم کرہ پھٹ سکتا ہے تو زمین و آسمان، سورج اور ستارے بھی پھٹ کر دوسری صورت اختیار کر سکتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [ إبراهيم : ۴۸ ] ''جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور سب آسمان بھی اور لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، جو اکیلا ہے، بڑا زبردست ہے۔''

③ قرآن مجید میں ماضی کے صیغے مستقبل کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان کا واقع ہونا یقینی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ﴾ [ إبراهيم : ۲۲ ] ''اور شیطان کہے گا، جب سارے کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا، سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے تم سے خلاف ورزی کی۔'' اس مقام پر بھی بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چاند پھٹ جائے گا، مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ یہاں ماضی کا معنی ہی مراد ہے اور آیت کا مطلب

یہی ہے کہ چاند پھٹ گیا۔ ایک ہی آیت میں ایک فعل ماضی کا ترجمہ ماضی اور دوسرے فعل ماضی کا ترجمہ مستقبل کرنا ویسے ہی بے جوڑ لگتا ہے کہ کہا جائے ”قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ جائے گا۔“ پھر اگر مراد مستقبل میں چاند کا پھٹنا ہوتا تو الفاظ یہ ہونے چاہییں تھے: ”اَتَى السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ“ ”قیامت آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔“ پھر دونوں جگہ ماضی کا معنی مستقبل کرنا درست ہوتا۔ اس آیت سے بعد والی آیات سے بھی ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

صحیح احادیث سے بھی چاند کا پھٹنا ثابت ہے اور یہ واقعہ اتنی کثیر سندوں کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اکثر محدثین و مفسرین اسے متواتر قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”چاند پھٹنے کے واقعہ پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ نبی ﷺ کے زمانے میں ہو چکا ہے اور یہ آپ ﷺ کے حیران کن معجزات میں سے ایک تھا۔“ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مقام پر بہت سی احادیث نقل فرمائی ہیں، یہاں چند احادیث نقل کی جاتی ہیں: ① عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «اِنْشَقَّ الْقَمَرُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِرْقَتَيْنِ، فِرْقَةً فَوْقَ الْجَبَلِ وَ فِرْقَةً دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْهَدُوْا» [ بخاري، التفسير، باب: ﴿وانشق القمر......﴾ : ۴۸۶۴ ] ”رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑوں میں پھٹ گیا، ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر تھا اور ایک ٹکڑا اس کی دوسری جانب۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”گواہ ہو جاؤ۔“ ② ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «اِنْشَقَّ الْقَمَرُ فِيْ زَمَانِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ وانشق القمر ﴾ : ۴۸۶۶ ] ”رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند پھٹ گیا۔“ ③ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «سَأَلَ أَهْلُ مَكَّةَ أَنْ يُّرِيَهُمْ آيَةً فَأَرَاهُمُ انْشِقَاقَ الْقَمَرِ» [ بخاري، التفسير، باب: ﴿وانشق القمر﴾ : ۴۸۶۷ ] ”اہل مکہ نے آپ ﷺ سے کوئی معجزہ دکھانے کا سوال کیا تو آپ ﷺ نے انھیں چاند کا پھٹنا دکھایا۔“ ④ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «اِنْشَقَّ الْقَمَرُ بِمَكَّةَ حَتّٰى صَارَ فِرْقَتَيْنِ، فَقَالَ كُفَّارُ قُرَيْشٍ أَهْلُ مَكَّةَ هٰذَا سِحْرٌ، يَسْحَرُكُمْ بِهِ ابْنُ أَبِيْ كَبْشَةَ، انْظُرُوا السُّفَّارَ، فَإِنْ كَانُوْا رَأَوْا مَا رَأَيْتُمْ فَقَدْ صَدَقَ وَ إِنْ كَانُوْا لَمْ يَرَوْا مِثْلَ مَا رَأَيْتُمْ فَهُوَ سِحْرٌ سَحَرَكُمْ بِهِ. قَالَ فَسُئِلَ السُّفَّارُ قَالَ وَ قَدِمُوْا مِنْ كُلِّ وَجْهٍ فَقَالُوْا رَأَيْنَاهُ» [ دلائل النبوة للبيهقي : ۲/ ۲۶۶، ۲۶۷، و سنده صحيح ] ”مکہ میں چاند پھٹ گیا، یہاں تک کہ دو ٹکڑے ہو گیا تو مکہ والے کفارِ قریش کہنے لگے: ”یہ جادو ہے جو ابن ابی کبشہ نے تم پر کر دیا ہے، جو لوگ سفر میں گئے ہوئے ہیں ان کا انتظار کرو، اگر انھوں نے وہ دیکھا ہے جو تم نے دیکھا ہے تو اس نے واقعی سچ کہا ہے اور اگر انھوں نے وہ نہیں دیکھا جو تم نے دیکھا ہے تو یہ جادو ہے جو اس نے تم پر کر دیا ہے۔“ فرمایا: ”تو سفر سے آنے والوں سے پوچھا گیا جو ہر جانب سے آ رہے تھے تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔“ تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے اس پر لکھا ہے کہ ابن کثیر نے فرمایا: ”اسے ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے اور یہ الفاظ زائد بیان کیے ہیں: « فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ : ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ » ”یعنی اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔“

4 بعض واعظ حضرات بیان کرتے ہیں کہ چاند رسول اللہ ﷺ کی انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے ہوا، انگلی کے اشارے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح بعض کا کہنا ہے کہ چاند کا ایک ٹکڑا آپ کے گریبان سے ہو کر نکل گیا، بالکل ہی لغو بات ہے۔

5 انشقاقِ قمر پر کیے جانے والے شبہات اور اعتراضات کے متعلق مفسر عبدالرحمٰن کیلانی کا کلام بہت عمدہ ہے، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے: ’’آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت اور انشقاقِ قمر کا باہمی تعلق یہ ہے کہ انشقاقِ قمر قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے جو واقع ہو چکی ہے، لہٰذا اسے بس اب قریب ہی سمجھو۔ جب کفار نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ یا تو چاند پر جادو کر دیا گیا ہے یا ہماری نظروں پر جو ہمیں ایسا نظر آنے لگا ہے۔ اس حیرانی میں ایک شخص نے کہا کہ اگر ہماری نظر بند کر دی گئی ہے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھ لو۔ چنانچہ آس پاس کے لوگوں نے اس کی تصدیق کر دی، مگر یہ کافر اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔ اس آیت پر منکرین معجزات کئی طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ پہلا اعتراض معنی کی تاویل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں صیغۂ ماضی کا معنی استقبال میں لیا جائے گا اور معنی یہ ہوگا کہ ’’جب قیامت قریب آ جائے گی اور چاند پھٹ جائے گا۔‘‘ جیسا کہ ’’اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ‘‘ اور اس جیسی دوسری آیات کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تاویل اور دلیل اس لیے غلط ہے کہ جہاں قیامت کے حوادث کا ذکر آیا ہے، مثلاً آسمان پھٹ جائے گا، ستارے بے نور ہو جائیں گے اور جھڑنے لگیں گے، زمین پر سخت زلزلے آئیں گے، پہاڑ اڑتے پھریں گے وغیرہ، وہاں ان باتوں کو کفار کے سحر کہنے کا کوئی تعلق نہیں اور نہ قرآن میں ایسی آیات کے ساتھ سحر کا ذکر آیا ہے۔ کافروں کا چاند کے پھٹنے کو جادو کہنا اور اس پر کفار کی تکرار ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ ایک حسی معجزہ تھا جو وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ فی الواقع ظہور میں آ چکا ہے تو لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ رات کا ہے، دن کا نہیں، جب اکثر لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر اس وقت آدھی دنیا میں تو ویسے ہی سورج نکلا ہوا تھا جہاں یہ واقعہ نظر نہیں آ سکتا تھا اور باقی آدھی دنیا میں سے بھی صرف ان مقامات پر نظر آ سکتا تھا جو منیٰ کے مشرق میں واقع تھے۔ پھر اس واقعہ کا کوئی اعلان بھی نہیں ہوا تھا، جیسے آج کل جنتریوں اور اخباروں سے معلوم ہو جاتا ہے، یا رصد گاہوں کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے، لہٰذا لوگ کوئی اس بات کے منتظر بھی نہیں بیٹھے تھے کہ چاند پھٹے تو ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ چاند گرہن کئی گھنٹوں تک لگا رہتا ہے، لوگوں کو پہلے خبر بھی دی جا چکی ہوتی ہے لیکن لوگوں کی اکثریت چاند گرہن لگنے سے غافل ہوتی ہے اور یہ انشقاقِ قمر تو صرف ایک لمحہ کے لیے واقع ہوا تھا، اسے کون دیکھتا؟ اور آس پاس کے لوگوں نے شہادت دے ہی دی تھی۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ایسے اہم واقعہ کا تاریخ میں بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اس اعتراض کے کئی جواب ہیں، پہلا یہ کہ سب سے زیادہ مستند تاریخ حدیث کی کتابوں سے ہی دستیاب ہو سکتی ہے اور ان میں یہ واقعہ موجود ہے۔ دوسرا یہ کہ اس دور میں جیسی اور جتنی توجہ تاریخ نویسی پر دی جاتی تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ تیسرا یہ کہ جب دنیا کے لوگوں کی اکثریت اور ایسے ہی تاریخ نویسوں نے اسے دیکھا ہی نہ ہو تو لکھیں کیا؟ اور چوتھا یہ کہ تاریخ بھی اس واقعہ کے اندراج سے یکسر خالی نہیں۔ تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے، مالی بار کے مہاراجہ نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بالآخر یہ واقعہ اس کے اسلام لانے کا سبب بنا تھا۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ ہیئت دانوں اور منجمین نے بھی اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چاند پھٹنے سے اس کی رفتار میں فرق آتا یا وہ اپنا مدار بدل لیتا یا مدار سے ہٹ کر چلنے لگتا تو یہ باتیں اس قابل تھیں کہ ہیئت دان اس کا ذکر کرتے، لیکن جب ان میں سے کوئی چیز بھی واقع نہ ہوئی تو وہ کیا ذکر کریں؟

اور پانچواں اعتراض یہ ہے کہ یہ واقعہ خرقِ عادت ہے اور ان کا دراصل سب سے اہم یہی اعتراض ہے جو انھیں تسلیم کرنے سے روکتا ہے اور وہ ادھر ادھر ہاتھ مارتے اور مختلف قسم کے اعتراض اور شکوک پیدا کرتے ہیں اور حقیقتاً ان کا یہ انکار اللہ کی قدرتِ کاملہ کا انکار ہے۔ بہر حال یہ بات بھی آج بعید از عقل نہیں رہی۔ ہر سیارے کے پیٹ میں آتشیں مادے یا پگھلتی اور کھولتی ہوئی دھاتیں موجود ہیں جن کا درجہ حرارت ہزار ہا درجہ سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔ یہ مہیب لاوے ان عظیم الجثہ کروں کو کسی وقت بھی دولخت کر سکتے ہیں۔ پھر ان کی مرکزی مقناطیسی قوت، جسے آج کی زبان میں قوتِ ثقل کہتے ہیں وہ ان جدا شدہ ٹکڑوں کو ملا کر جوڑ بھی دیتی ہے اور ایسا عمل فضائے بسیط میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ کہکشائیں اسی طرح وجود میں آئی ہیں اور آج بھی یہ عمل بند نہیں ہوا بلکہ بدستور جاری ہے۔ علاوہ ازیں شہابِ ثاقب کسی سیارے کے اس طرح سے جدا شدہ ٹکڑے کا نام ہے جو کبھی علیحدہ ہو کر پھر جڑ جاتا ہے، کبھی فضا میں ہی گر کر گم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھار زمین پر بھی آ گرتا ہے۔ فضائے بسیط میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر انسان کو اس کا صحیح طور پر علم ہو جائے تو وہ انشقاقِ قمر کے واقعہ پر کبھی تعجب نہ کرے۔ انسان کو کیا معلوم کہ اللہ کی قدرتوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور وہ کس قدر حکمت بالغہ سے اس نظام کائنات کو چلا رہا ہے۔'' (تیسیر القرآن)

6 ایک اہم سوال یہاں یہ ہے کہ کفارِ مکہ جب اپنے سوال کے جواب میں اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر ایمان نہیں لائے تو ان پر پہلی قوموں کی طرح عذاب آ جانا چاہیے تھا جو نبیوں کے معجزے دیکھ کر ایمان نہیں لائی تھیں۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ پہلی امتوں کو دکھائے جانے والے معجزات ان کے ایمان لانے کی شرط کے ساتھ مشروط مطالبے پر دکھائے گئے تھے، جبکہ ہماری امت میں ایمان لانے کی شرط کے ساتھ بطورِ عناد جس معجزے کا بھی مطالبہ کیا گیا ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا گیا، بلکہ یہی کہنے کا حکم ہوا: ﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ [ بنی إسرائیل : ۹۳ ] ''تو کہہ میرا رب پاک ہے، میں تو ایک بشر کے سوا کچھ نہیں جو رسول ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) کی تفسیر۔ اس مقصد کے لیے آپ کو ایک ہی معجزہ پیش کرنے کا حکم تھا اور وہ ہے قرآن مجید کہ ہمت ہے تو اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ۔ اور یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس معجزے یا کسی بھی معجزے پر ایمان نہ لانے والوں پر عذابِ استیصال یعنی ایسا عذاب نہیں آیا اور نہ آئے گا جو ان کا نام و نشان ہی مٹا دے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۰، ۵۱) کی تفسیر۔ البتہ اس شرط کے بغیر لوگوں کی درخواست پر بہت سے معجزے صادر ہوئے ہیں، مثلاً سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں جن معجزوں کا کفار نے بطورِ شرط مطالبہ کیا اور ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا گیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں، لیکن ایسی شرط کے بغیر یہ معجزہ متعدد بار واقع ہوا ہے، جن میں سے آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی جاری ہونے اور حدیبیہ کے موقع پر کنویں میں تیر ڈالنے سے پانی جاری ہونے کے واقعات جو سب جانتے ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (( إِنَّكُمْ

## وَ اِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَ يَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ۝۲

**اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ) ایک جادو ہے جو گزر جانے والا ہے ۝۲**

تَعُدُّوْنَ الْآيَاتِ عَذَابًا وَ إِنَّا كُنَّا نَعُدُّهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرَكَةً لَقَدْ كُنَّا نَأْكُلُ الطَّعَامَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَسْمَعُ تَسْبِيْحَ الطَّعَامِ قَالَ وَ أُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِنَاءٍ فَوَضَعَ يَدَهُ فِيْهِ فَجَعَلَ الْمَاءُ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيَّ عَلَى الْوَضُوْءِ الْمُبَارَكِ وَالْبَرَكَةُ مِنَ السَّمَاءِ حَتّٰى تَوَضَّأْنَا كُلُّنَا ﴾ [ ترمذي، المناقب، باب في قول علي في استقبال كل جبل و شجر النبي ﷺ بالتسليم: ۳۶۳۳، و قال حسن صحيح، وقال الألباني صحيح ] ”تم نشانیوں کو عذاب شمار کرتے ہو جبکہ ہم انھیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں برکت شمار کرتے تھے۔ چنانچہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور ہم کھانے کی تسبیح سن رہے ہوتے تھے۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اور نبی ﷺ کے پاس ایک برتن لایا گیا، آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس میں رکھا تو پانی آپ ﷺ کی انگلیوں سے پھوٹنے لگا، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”اس بابرکت وضو کے پانی پر آ جاؤ اور برکت آسمان سے ہے۔“ یہاں تک کہ ہم سب نے وضو کر لیا۔“ انشقاقِ قمر کا معجزہ بے شک اہلِ مکہ کے اس سوال کے جواب میں صادر ہوا کہ ہمیں کوئی نشانی دکھائیں، مگر یہ ان کے اس مطالبے کے جواب میں نہیں ہوا کہ آپ ہمیں چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھائیں (جن روایتوں میں یہ بات ذکر ہوئی ہے وہ سب ضعیف ہیں) بلکہ انھیں ایک نشانی کے طور پر دکھایا گیا جسے انھوں نے جادو کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا، فرمایا: ﴿ وَ اِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَ يَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ﴾ [ القمر : ۲ ] ”اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ) ایک جادو ہے جو گزر جانے والا ہے۔“

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ اس امت میں بھی معجزات دیکھ کر ایمان نہ لانے والوں پر عذاب آیا، مگر اس کا طریقہ تبدیل کر دیا گیا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اب ایسے لوگوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دینے کا فیصلہ فرمایا اور فی الواقع ایسے تمام منکروں کو بدر اور دوسرے مقامات پر ذلت آمیز عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَاتِلُوۡهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ وَ يُخۡزِهِمۡ وَ يَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَ يَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝ وَ يُذۡهِبۡ غَيۡظَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴾ [ التوبة : ۱۴، ۱۵ ] ”ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا۔ اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔“

**آیت 2** وَ اِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا ...... : ”مَرَّ“ اور ”اِسۡتَمَرَّ“ گزرنا۔ ”مُسۡتَمِرٌّ“ گزر جانے والا۔ یعنی کفار کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ایمان لانے کے بجائے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک جادو ہے، جس طرح اور جادو گزر گئے ہیں یہ بھی گزر جانے والا ہے، یہ چاند بھی ہمیشہ پھٹا ہوا نہیں رہے گا۔ چنانچہ انھوں نے چاند پھٹنے کے عظیم الشان واقعہ کو بھی

وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴

**اور انھوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام انجام کو پہنچنے والا ہے ۝۳ اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس کئی خبریں آئی ہیں، جن میں باز آنے کا سامان ہے ۝۴**

رسول اللہ ﷺ کا جادو قرار دے کر ایمان لانے سے اعراض اختیار کیا۔

**آیت 3** ① **وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ** : "اَهْوَآءَ" "هَوًى" کی جمع ہے، خواہشات۔ یعنی کفار کے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے معجزات کو جھٹلانے کا باعث کوئی معقول بات نہ تھی، بلکہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی تھی۔ لفظ "هَوًى" (خواہش) اسم جنس ہے جو واحد پر صادق آتا ہے اور جمع پر بھی، مگر یہاں "اَهْوَآءَ" (جمع) اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ کفار کے رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کا باعث ان کی ایک خواہش نہ تھی بلکہ بہت سی خواہشیں تھیں جو انھیں آپ کے تابع فرمان ہونے سے روکتی تھیں، مثلاً سرداری کی خواہش، حسد، آباء کی پیروی کی خواہش، اپنے داتاؤں پر جمے رہنے کی خواہش، شتر بے مہار رہنے اور کسی کے تابع فرمان نہ ہونے کی خواہش وغیرہ۔

② **وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ** : "قَرَّ يَقِرُّ" (ض) قرار پکڑنا۔ "اِسْتَقَرَّ" میں مبالغہ ہے، یعنی جس طرح ہر چلنے والا آخر کار کہیں نہ کہیں جا کر ٹھہر جاتا ہے اور ہر کام کا، خواہ وہ اچھا ہو یا برا، کوئی نہ کوئی انجام ہوتا ہے، اسی طرح یہ مت سمجھو کہ رسول اللہ ﷺ تمھیں حق کی طرف بلاتے رہیں گے اور تم انھیں جھٹلاتے رہو گے اور آپ کا حق پر ہونا اور تمھارا باطل پر ہونا کبھی ثابت نہیں ہو گا، بلکہ ایک وقت آئے گا جب ہر چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی اور ثابت ہو جائے گا کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول تھے اور آپ ﷺ کو جھٹلانا اور جادوگر قرار دینا غلط تھا۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام کی آیت (۶۷): ﴿ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ٞ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 4** **وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ......** : "نَبَاٌ" کسی اہم خبر کو کہتے ہیں، "الْاَنْۢبَآءِ" اس کی جمع ہے۔ "مُزْدَجَرٌ" "زَجَرَ يَزْجُرُ زَجْرًا" (ن) (روکنا، منع کرنا، ڈانٹنا) سے باب افتعال کا مصدر میمی ہے، جس کا معنی "باز آنا" ہے۔ کہا جاتا ہے: "زَجَرْتُهُ فَازْدَجَرَ" "میں نے اسے منع کیا تو وہ باز آ گیا۔" یہ اصل میں "مُزْتَجَرٌ" (بروزن مُفْتَعَلٌ) تھا، "زاء" کی وجہ سے باب افتعال کی "تاء" کو دال سے بدل دیا تو "مُزْدَجَرٌ" ہو گیا۔ تنوین اس میں تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی قرآن کی صورت میں ان کے پاس رسولوں کو جھٹلانے والی اقوام کی خبروں میں سے ایسی اہم خبریں یقیناً پہنچی ہیں جن میں آدمی کے لیے ہوائے نفس کی پیروی اور رسولوں کی تکذیب سے باز آنے کا مکمل سامان موجود ہے۔ اگلی آیات میں ان میں سے چند خبروں کا ذکر فرمایا ہے۔

حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝۷

کامل دانائی کی بات ہے، پھر (بھی) ڈرانے والی چیزیں کوئی فائدہ نہیں دیتیں ⑤ سو ان سے منہ پھیر لے۔ جس دن پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا ⑥ ان کی نظریں جھکی ہوں گی، وہ قبروں سے نکلیں گے جیسے وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہوں ⑦

آیت 5 ﴿ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ : "بَالِغَةٌ" کا لفظی معنی پہنچنے والی ہے، مراد انتہا اور کمال کو پہنچی ہوئی حکمت ہے۔ "النُّذُرُ" "نَذِيْرٌ" کی جمع ہے، ڈرانے والی چیزیں۔ "نَذِيْرٌ" مصدر بھی ہو سکتا ہے، جس طرح "نَكِيْرٌ" ہے، یعنی تنبیہات، ڈراوے۔ "حِكْمَةٌ" پچھلی آیت میں مذکور "مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ" سے بدل ہے۔ یعنی پچھلی امتوں کے واقعات میں سے وہ واقعات جن میں کفر و تکذیب سے باز آنے کا سامان موجود ہے، کامل حکمت اور دانائی کی باتیں ہیں، مگر یہ ڈرانے اور خبردار کرنے والی چیزیں نہ ماننے والوں کو کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۰۱)۔

آیت 6 ﴿ ① فَتَوَلَّ عَنْهُمْ : یعنی جب ان لوگوں کو کسی تنبیہ یا ڈرانے کا کچھ فائدہ ہی نہیں ہوتا تو آپ بھی ان سے منہ پھیر لیں اور انھیں ان کے حال پر رہنے دیں۔ آپ کے ذمے پہنچانا تھا، وہ آپ نے پہنچا دیا۔

② يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ : "يَوْمَ" منصوب بنزع الخافض ہے، یعنی اس سے پہلے حرفِ جار "إِلٰى" ہے جسے حذف کرنے کی وجہ سے یہ منصوب ہے۔ (بغوی) آلوسی نے کہا: "هٰذَا قَوْلُ الْحَسَنِ" کہ یہ حسن کا قول ہے یعنی "فَتَوَلَّ عَنْهُمْ إِلٰى يَوْمِ يَدْعُ الدَّاعِ فِيْهِ إِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ" ''سو ان سے منہ پھیر لے، اس دن تک جس میں پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔'' یا "يَوْمَ" فعل محذوف "اُنْظُرْ" کے ساتھ منصوب ہے، یعنی ''ان سے منہ پھیر لے اور اس دن کا انتظار کر جب......'' پکارنے والے سے مراد اسرافیل علیہ السلام ہیں، جن کے نفخہ سے تمام لوگ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ "يَدْعُ" اصل میں "يَدْعُوْ" ہے، واؤ چونکہ یہاں پڑھنے میں نہیں آتی اس لیے مصحفِ عثمان میں لکھی نہیں گئی۔ "الدَّاعِ" اصل میں "الدَّاعِيْ" ہے، ''یاء'' تخفیف کے لیے حذف کی گئی ہے اور "شَيْءٍ نُّكُرٍ" سے مراد حساب کتاب ہے۔ "نُكُرٍ" بمعنی ''مُنْكَرٌ'' ہے، ناگوار، اجنبی، انوکھی چیز جو کبھی دیکھی نہ ہو گی۔

آیت 7 ﴿ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ...... : "خُشَّعًا" "خَاشِعٌ" کی جمع ہے، جیسے "رَاكِعٌ" کی جمع "رُكَّعٌ" ہے۔ یعنی ذلت کی وجہ سے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ (دیکھیے شوریٰ: ۴۵) "الْاَجْدَاثِ" "جَدَثٌ" (دال کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے، قبریں۔ "جَرَادٌ" اسم جمع ہے، اس کا واحد "جَرَادَةٌ" ہے، ٹڈیاں جو بے شمار تعداد میں زمین سے نکلتی ہیں اور ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ "مُنْتَشِرٌ" پھیلی ہوئی۔ قبروں سے نکلنے والوں کی حالت کو یہاں پھیلی ہوئی

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝۸ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّ ازْدُجِرَ ۝۹

پکارنے والے کی طرف گردن اٹھا کر دوڑنے والے ہوں گے، کافر کہیں گے یہ بڑا مشکل دن ہے ⑧ ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا تو انھوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور انھوں نے کہا دیوانہ ہے اور جھڑک دیا گیا ⑨

ٹڈیوں کے ساتھ اور سورۂ قارعہ میں ”كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ“ بکھرے ہوئے پروانوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ دونوں ہی جب نکلتے ہیں تو بے شمار تعداد میں ایک دوسرے کے گرد اڑتے، گھومتے اور آپس میں ٹکراتے ہوئے تیزی سے بڑھتے چلے جاتے ہیں، پروانے آگ کی طرف اور ٹڈیاں اس طرف جدھر ان کا رخ ہو جائے۔ اسی طرح قبروں سے نکلنے والے تیزی کے ساتھ صُور کی آواز کی طرف بے شمار پھیلی ہوئی ٹڈیوں کی طرح گرتے پڑتے، چکر کھاتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے بے اختیار دوڑتے چلے جا رہے ہوں گے۔

**آیت 8** : ① مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ...... : ”أَهْطَعَ يُهْطِعُ“ (افعال) کسی چیز کی طرف ٹکٹکی باندھے یا گردن اٹھائے ہوئے تیزی سے دوڑنا۔ (دیکھیے ابراہیم: ۴۳) ”عَسِرٌ“ ”عُسْرٌ“ سے صفت مشبہ ہے، بہت مشکل۔

② مفسر ابن عاشور نے فرمایا: ”يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ“ سے ”يَوْمٌ عَسِرٌ“ تک اس دن کی ہولناکی سات طرح سے ظاہر ہو رہی ہے: ① ”يَدْعُ الدَّاعِ“ اسرافیل علیہ السلام کا بلانا ہی اتنا ہولناک ہے جو بیان میں نہیں آ سکتا۔ ② ”اِلٰى شَيْءٍ“ میں ”شَيْءٍ“ پر تنوینِ تنکیر سے پیدا ہونے والی تعظیم اور ابہام اس ہول میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ③ ”نُكُرٍ“ ④ ”خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ“ ⑤ ”جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ“ کے ساتھ تشبیہ۔ ⑥ ”مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ“ ⑦ اور ان کا کہنا ”هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ“ ”کہ یہ بڑا مشکل دن ہے۔“

**آیت 9** : ① كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ ...... : اس سے پہلے جو فرمایا تھا : ﴿ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴾ تو یہاں سے ان واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ ان واقعات میں جھٹلانے والوں کے لیے عبرتیں ہیں جنھیں دیکھ کر اور سن کر وہ تکذیب سے باز آ سکتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان کے لیے تسلی اور حوصلے کا سامان ہے۔ یعنی ان اہلِ مکہ سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے انھیں جھٹلایا۔

② وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ : ”مَجْنُوْنٌ“ جسے جنون ہو، پاگل، دیوانہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون (۲۵) کی تفسیر۔

③ وَ ازْدُجِرَ : یہ ”زَجْرٌ“ (جھڑکنا) سے باب افتعال کا ماضی مجہول ہے، اصل میں ”اُزْتُجِرَ“ تھا، جس میں تائے افتعال مبالغہ کے لیے ہے، یعنی اسے سخت جھڑکا گیا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ نوح علیہ السلام کو سخت جھڑکا گیا، سب و شتم کی بوچھاڑ کی گئی، ان کا مذاق اڑایا گیا اور انھیں دھمکیاں دی گئیں۔ (دیکھیے اعراف: ۶۰۔ ہود: ۳۸۔ شعراء: ۱۱۶) دوسرا مطلب یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ یہ مجنون ہے اور اسے ہمارے معبودوں کی جھڑک پڑی ہوئی ہے، جس سے اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہی، جیسا کہ ہود علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ﴿ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰ فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝۱۱ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝۱۲ وَ حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ۝۱۳ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝۱۴

تو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں، سو تو بدلا لے ⑩ تو ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیے، ایسے پانی کے ساتھ جو زور سے برسنے والا تھا ⑪ اور زمین کو چشموں کے ساتھ پھاڑ دیا، تو تمام پانی مل (کر ایک ہو) گیا، اس کام کے لیے جو طے ہو چکا تھا ⑫ اور ہم نے اسے تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کر دیا ⑬ جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، اس شخص کے بدلے کی خاطر جس کا انکار کیا گیا تھا ⑭

﴿ بِسُوْٓءٍ ﴾ [ ھود : ۵٤ ] ”ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھے کوئی آفت پہنچا دی ہے۔“

**آیت 10** ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ : نوح علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اطلاع دی کہ اب تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ نوح (۲۶، ۲۷) کی تفسیر۔ ”اِنْتَصَرَ يَنْتَصِرُ“ انتقام لینا۔

**آیت 11** ﴿ فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴾ : ”مُنْهَمِرٍ“ ”اِنْهَمَرَ يَنْهَمِرُ“ (انفعال) سے اسم فاعل ہے، شدت اور کثرت کے ساتھ گرنے والا پانی۔

**آیت 12** ① ﴿ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا ﴾ : یعنی ہم نے زمین کو پانی کے ساتھ اس طرح پھاڑا کہ وہ ساری کی ساری چشمے بن گئی۔

② ﴿ فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴾ : یعنی زمین اور آسمان کا پانی مل کر ایک ہو گیا، اس کام کے لیے جو طے کر دیا گیا تھا۔ مراد قومِ نوح کی ہلاکت ہے۔

**آیت 13** ﴿ وَ حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ﴾ : ”اَلْوَاحٍ“ ”لَوْحٌ“ کی جمع ہے، لکڑی وغیرہ کے تختے۔ ”دُسُرٍ“ ”دِسَارٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”كِتَابٌ“ کی جمع ”كُتُبٌ“ ہے، کیل یا میخیں خواہ لکڑی کی ہوں یا لوہے وغیرہ کی، جن کے ساتھ تختے جوڑے جاتے ہیں۔ مراد کشتی ہے جو نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق طوفان آنے سے پہلے تیار کر لی تھی۔ مزید دیکھیے سورۂ ہود (۳۷ تا ۴۱) کی تفسیر۔

**آیت 14** ① ﴿ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ﴾ : جب آسمان کے دروازے پانی کے ساتھ کھلنے اور زمین کے چشموں کے ساتھ پھٹ جانے سے زمین و آسمان کا پانی ایک ہو گیا تو اس پانی کی بلندی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس کشتی میں بیٹھے ہوئے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کچھ معلوم نہیں کہ کدھر جانا ہے اور اسے موجوں سے کس طرح بچانا ہے، نہ کشتی پر یا پانی پر ان کا کوئی اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس وقت وہ کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، اس کے نگران و محافظ ہم تھے، پھر اسے کوئی گزند کیسے پہنچ سکتا تھا۔

وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۱۵ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ۝۱۶ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۱۷

**اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے ایک نشانی بنا کر چھوڑا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ (۱۵) پھر میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟ (۱۶) اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ (۱۷)**

(۲) **جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ** : اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ یہ سب کچھ اس شخص کا بدلا لینے کی خاطر کیا گیا جس کا انکار کیا گیا اور اسے نبی تسلیم نہیں کیا گیا۔ "**كُفِرَ**" کا دوسرا معنی ناشکری اور ناقدر شناسی ہے، یعنی نوح علیہ السلام اس قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت تھے اور انھوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ یعنی اس شخص کا انتقام لینے کی خاطر جو ایک عظیم نعمت تھا مگر اس کی قدر نہیں پہچانی گئی۔

**آیت 15** (۱) **وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۴۴) اور سورۂ عنکبوت (۱۵) کی تفسیر۔

(۲) **فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ** : "**مُّدَّكِرٍ**" "ذَكَرَ يَذْكُرُ" میں سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، جو اصل میں "مُذْتَكِرٌ" ہے، تائے افتعال کو دال سے بدل دیا گیا، اسی طرح ذال کو بھی دال سے بدل کر اس میں ادغام کر دیا گیا، جیسا کہ سورۂ یوسف میں گزرا ہے: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ﴾ [ یوسف : ٤٥ ] "اور ان دونوں میں سے جو رہا ہوا تھا اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا۔"

**آیت 16** **فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ** : "**نُذُرِ**" فراء نے فرمایا: "إِنْذَارٌ" اور "نُذُرٌ" مصدر ہیں۔" (فتح القدیر) یہاں "**نُذُرِ**" اصل میں "نُذُرِيْ" (میرا ڈرانا) تھا، آیات کے فواصل کی مطابقت کے لیے "یاء" حذف ہوگئی، اس کی دلیل کے طور پر "راء" پر کسرہ باقی رہا۔

**آیت 17** (۱) **وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ** ...... : یعنی ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، اس کے الفاظ آسان ہیں، معنی بھی آسان ہے، نہ پڑھنے میں دقت ہے نہ سمجھنے میں، تو کیا کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے اور نافرمانی سے باز آ جائے؟ اس میں قرآن مجید پڑھنے، پڑھانے، سمجھنے، سمجھانے اور اس سے نصیحت حاصل کرنے کی ترغیب ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں میں بہت سے لوگ وہ ہیں جن کا کہنا ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں، یہ بڑے بڑے عالم و فاضل لوگوں کا کام ہے، جو چودہ یا اکیس علوم پڑھے ہوئے ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر متعدد مشکل سے مشکل علوم وفنون پڑھتے رہتے ہیں، مگر قرآن کے قریب نہیں جاتے، اپنے چودہ یا اکیس علوم پورے کرتے کرتے ہی دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ کئی تو ایسے ظالم ہیں، جو کہتے ہیں کہ عام آدمی کے لیے قرآن کا ترجمہ پڑھنا ممنوع ہے، کیونکہ اس سے گمراہی کا خطرہ ہے۔ حالانکہ قرآن مجید عربی مبین میں اترا اور لوگوں کی ہدایت کے لیے اترا، ہر عام و خاص اور عالم و جاہل عرب نے اسے سنا، سمجھا، اس پر عمل کیا اور آگے پہنچایا۔ ہماری زبان اردو میں قرآن مجید کے تقریباً ستر (۷۰) فیصد الفاظ موجود ہیں، تھوڑی سی توجہ کے ساتھ ہر آدمی قرآن کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے قرآن و حدیث کے مقابلے میں نیا دین بنا لیا اور توحید کے مقابلے میں شرک اور

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۲۴﴾

ع ۲۲ / ۸

عاد نے جھٹلا دیا تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟ ﴿۱۸﴾ بے شک ہم نے ان پر ایک تند آندھی بھیجی، ایسے دن میں جو دائمی نحوست والا تھا ﴿۱۹﴾ لوگوں کو اکھاڑ پھینکتی تھی، جیسے وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہوں ﴿۲۰﴾ پھر میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟ ﴿۲۱﴾ اور بلا شبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۲۲﴾ ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلا دیا ﴿۲۳﴾ پس انھوں نے کہا کیا ایک آدمی جو ہمیں سے ہے اکیلا، ہم اس کے پیچھے لگ جائیں؟ یقیناً ہم تو اس وقت بڑی گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے ﴿۲۴﴾

سنت کے مقابلے میں بدعت کو اختیار کر لیا ہے، ان کی پوری کوشش ہے کہ لوگ اصل قرآن مجید اور حدیث سے آگاہ نہ ہو جائیں، ورنہ وہ ان کے پنجے سے نکل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور مسلمانوں کو قرآن و سنت کی طرف پلٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔

2 قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسان کیے جانے کا ایک کرشمہ اور معجزہ یہ ہے کہ یہ سہولت کے ساتھ حفظ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی کتاب نہیں جس کے ہزاروں لاکھوں حافظ ہر زمانے میں پائے گئے ہوں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا غیبی تصرف ہے کہ اس نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے دلوں میں اس کے حفظ کا شوق رکھ دیا ہے، گناہ گار سے گناہ گار مسلمان کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بچہ قرآن کا حافظ بنے۔ کمیونسٹوں نے اپنے زیر تسلّط ملکوں میں قرآن کو مٹانے کی کوشش جتنی کر سکتے تھے کی، مگر مسلمانوں نے اپنے گھروں کے تہ خانوں میں کمیونسٹ جاسوسوں سے چھپ کر حفظِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا، جس کی برکت یہ ہوئی کہ کمیونسٹ قرآن کو مٹانے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اس وقت بھی دنیا میں قرآن کے حافظ لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ (والحمدللہ) مزید دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۹) کی تفسیر۔

**آیت 19،18** كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۱۵، ۱۶) کی تفسیر۔

**آیت 20** تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ : "نَزَعَ يَنْزِعُ نَزْعًا" (ع) "اَلشَّيْءَ مِنْ مَّكَانِهٖ" کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھاڑ پھینکنا۔ "مُنْقَعِرٍ" "قَعْرٌ" (گہرائی) سے ہے، اکھڑا ہوا۔ مزید دیکھیے سورۂ حاقہ (۷) کی تفسیر۔

**آیت 24،23** 1 كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ...... : صالح علیہ السلام کی قوم ثمود نے اپنے رسول کو نہ ماننے کی تین وجہیں بیان کیں، ایک یہ کہ یہ بشر ہے (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۴)، دوسری یہ کہ بشر بھی ہم جیسا عام بشر، کوئی سردار یا سرمایہ دار نہیں (دیکھیے ص:

ءَ اُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَ اصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾

کیا یہ نصیحت ہمارے درمیان میں سے اسی پر نازل کی گئی ہے؟ بلکہ وہ بہت جھوٹا ہے، متکبّر ہے ﴿۲۵﴾ عنقریب وہ کل جان لیں گے کہ بہت جھوٹا، متکبّر کون ہے؟ ﴿۲۶﴾ بے شک ہم یہ اونٹنی ان کی آزمائش کے لیے بھیجنے والے ہیں، سو ان کا انتظار کر اور اچھی طرح صبر کر ﴿۲۷﴾ اور انھیں بتا دے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہوگا، پینے کی ہر باری پر حاضر ہوا جائے گا ﴿۲۸﴾ تو انھوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، سو اس نے (اسے) پکڑا، پس کونچیں کاٹ دیں ﴿۲۹﴾

۸) اور تیسری یہ کہ یہ اکیلا آدمی ہے، اس کے ساتھ کوئی جتھا یا پارٹی نہیں ہے۔

② اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ : ”سُعُرٍ“ جنون، دیوانگی۔ ”ضَلٰلٍ“ اور ”سُعُرٍ“ پر تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی گمراہی اور بڑی دیوانگی“ کیا گیا ہے۔

آیت 26،25 ① ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ص (۸) کی تفسیر۔

② بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ : ”اَشِرٌ“ ”أَشَرَ يَأْشِرُ أَشْرًا“ (ض) سے اسم فاعل ہے، متکبّر، اکڑنے والا۔

آیت 27 اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۶۴) اور سورۂ شعراء (۱۵۵) کی تفسیر۔ ”فَارْتَقِبْهُمْ“ ”رَقَبَ يَرْقُبُ“ (ن) سے باب افتعال ہے۔ ”وَاصْطَبِرْ“ ”صَبَرَ يَصْبِرُ صَبْرًا“ (ض) سے باب افتعال ہے، ”تاء“ کو ”طاء“ سے بدل دیا۔ حروف کے اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے، ان کا حوصلے سے انتظار کر اور اچھی طرح صبر کر۔ یعنی اس آزمائش میں یہ لوگ کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں حوصلے کے ساتھ اس کا انتظار کر اور بہت اچھے طریقے سے صبر کر۔ آزمائش اس لیے تھی کہ ان کا امتحان مقصود تھا کہ اس نشانی کو دیکھ کر وہ پیغمبر پر ایمان لاتے ہیں یا اسے نقصان پہنچا کر عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔

آیت 28 وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ...... : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ شعراء (۱۵۵) کی تفسیر۔

آیت 29 فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ : ”فَتَعَاطٰى“ ”عَطَا يَعْطُوْ عَطْوًا“ (ن) ”اَلشَّيْءَ“ کسی چیز کو پکڑنا۔ ”تَعَاطَى الشَّيْءَ“ کسی چیز کو پکڑنا اور ”تَعَاطَى الْأَمْرَ“ کسی کام کا ذمہ اٹھانا۔ ایک مدت تک یہ ایک دن کی باری کا سلسلہ جاری رہا۔ صالح علیہ السلام نے انھیں تنبیہ کی تھی کہ اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا، ورنہ تم پر عذاب آ جائے گا۔ ایمان نہ لانے کے باوجود دل سے وہ انھیں سچا جانتے تھے، اس لیے وہ اونٹنی کو نقصان پہنچانے سے خائف تھے، لیکن آخر کار صبر نہ کر سکے اور انھوں نے اس کا قصہ تمام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے ایک سردار کو ابھارا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا سب

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ۝۳۰ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝۳۱ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۳۲ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝۳۳ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝۳۴

**تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟ ۝۳۰ بے شک ہم نے ان پر ایک ہی چیخ بھیجی تو وہ باڑ لگانے والے کی کچلی، روندی ہوئی باڑ کی طرح ہو گئے ۝۳۱ اور بلا شبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ۝۳۲ لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو جھٹلا دیا ۝۳۳ بے شک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ایک ہوا بھیجی، سوائے لوط کے گھر والوں کے، انھیں ہم نے صبح سے کچھ پہلے نجات دی ۝۳۴**

سے شقی آدمی قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴾ [ الشمس : ۱۲ ] ”جب اس کا سب سے بڑا بد بخت اٹھا۔“ چنانچہ سب نے مل کر اسے مدد کے لیے پکارا کہ تو بڑا بہادر اور جری ہے۔ اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر اسے مار ڈالا۔ مزید دیکھیے سورۂ شمس (۱۱، ۱۲) کی تفسیر۔ ”فَتَعَاطٰى“ کا مفعول محذوف ہے: ”أَيْ تَعَاطَى السَّيْفَ“ (اس نے تلوار پکڑی) ”أَوْ تَعَاطَى الْأَمْرَ“ (یا اس نے اس کام کا ذمہ اٹھایا)۔

**آیت 31** ① اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۸) کی تفسیر۔

② فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ: ”هَشَمَ يَهْشِمُ هَشْمًا“ (ض) ”اَلشَّيْءَ“ ”کسی چیز کو توڑ کر اور کچل کر ریزہ ریزہ کر دینا۔ ”هَشِيْمٌ“ روندی، کچلی ہوئی۔ ”حَظِيْرَةٌ“ باڑ کو کہتے ہیں جو جانوروں کے اردگرد ٹہنیوں وغیرہ کے ساتھ بنائی جاتی ہے۔ اور ”الْمُحْتَظِرِ“ باڑ بنانے والا۔ باڑ کے پتے اور ٹہنیاں جو خشک ہو کر ٹوٹتی اور نیچے گرتی ہیں اور جانوروں کے پاؤں کے نیچے آ کر کچلی اور روندی جاتی ہیں اور چورا بن جاتی ہیں انھیں ”هَشِيْمٌ“ کہا جاتا ہے۔ قومِ ثمود کا عذاب کے ساتھ جو حال ہوا اسے ان پتوں اور ٹہنیوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو باڑ سے گر کر جانوروں کے پاؤں میں آ کر چورا بن جاتے ہیں۔

**آیت 34** ① اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا: قومِ لوط کی بستیاں الٹانے کے بعد ان پر پتھروں کی جو بارش ہوئی وہ مراد ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ ہود (۸۳)۔

② اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ: لوط علیہ السلام پر ان کی قوم میں سے ایک آدمی بھی ایمان نہیں لایا، حتیٰ کہ ان کی بیوی بھی کافر ہی رہی۔ (دیکھیے ذاریات: ۳۶۔ ہود: ۸۱) اس لیے یہاں ”آلِ لوط“ سے مراد صرف ان کی اولاد ہے، جن کے ساتھ وہ خود بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو پیغمبر کی آل اور اہل تسلیم نہیں کیا خواہ بیوی ہو، جیسے لوط علیہ السلام کی بیوی، یا بیٹا ہو جیسے نوح علیہ السلام کا بیٹا، اس کے بارے میں فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ﴾ [ هود : ٤٦ ] ”بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں۔“

③ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۸۱) کی تفسیر۔

نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾

اپنی طرف سے انعام کرتے ہوئے، اسی طرح ہم بدلا دیتے ہیں اسے جو شکر کرے ﴿۳۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً اس نے انھیں ہماری پکڑ سے ڈرایا تو انھوں نے ڈرانے میں شک کیا ﴿۳۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً انھوں نے اسے اس کے مہمانوں سے بہکانے کی کوشش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، پس چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ﴿۳۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً صبح سویرے ہی ان پر ایک نہ ٹلنے والے عذاب نے حملہ کر دیا ﴿۳۸﴾

**آیت 35** نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ...... : اس میں اپنی نعمت کی عظمت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو اس عذاب سے بچانا ہماری خاص نعمت تھی۔ اس سے اگلے جملے " كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ " سے ان کے اس نعمت کا اہل بننے کی وجہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے، اس لیے ہم نے انھیں اس عظیم نعمت سے نوازا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ [ إبراھیم : ۷ ] "بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمھیں زیادہ دوں گا۔" اور صرف انھی کو نہیں بلکہ جو بھی ہماری نعمتوں کی قدر کرے ہم اسے ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

**آیت 36** وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ : "تَمَارٰى يَتَمَارٰى تَمَارِيًا" (تفاعل) شک کرنا، جھگڑنا۔ "لام" اور " قَدْ " کے ساتھ تاکید قسم کے مفہوم کی قوت رکھتی ہے، یعنی قسم ہے کہ لوط علیہ السلام نے انھیں ہماری گرفت سے ڈرایا تھا، مگر انھوں نے اس ڈرانے پر یقین نہیں کیا، بلکہ شک میں پڑے رہے اور اس کے متعلق بحث اور جھگڑا ہی کرتے رہے۔

**آیت 37** وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ ...... : " رَاوَدُوْهُ " باب مفاعلہ سے ہے۔ " مُرَاوَدَةٌ " نرمی اور ملائمت سے بار بار مطالبہ کرنا، پھسلانا، بہکانا، فریب سے غلط کام پر آمادہ کرنا۔ یہاں باب مفاعلہ مشارکت کے لیے نہیں مبالغہ کے لیے ہے۔ " ضَيْفِهٖ " سے مراد فرشتے ہیں جو خوبصورت لڑکوں کی شکل میں مہمان بن کر آئے تھے۔ قوم کو ان کے آنے کا علم ہوا تو انھوں نے لوط علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ انھیں ان کے حوالے کر دیں۔ " رَاوَدُوْهُ " کے لفظ سے ظاہر ہے کہ انھوں نے لوط علیہ السلام پر دھوکے، فریب، بہکانے، پھسلانے، دھونس اور دھاندلی کا ہر طریقہ آزمایا کہ کسی طرح ہی وہ دھوکے میں آ کر انھیں ان کے حوالے کر دیں۔ وہ لوگ جو اس مقصد کے لیے آئے تھے جب حد سے بڑھ گئے اور ان لڑکوں کو زبردستی چھیننے کے لیے گھر میں داخل ہونے لگے اور لوط علیہ السلام سخت گھبرا گئے تو فرشتوں نے بتایا کہ ہم آپ کے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ آپ تک کسی صورت نہیں پہنچ سکیں گے۔ (دیکھیے ہود: ۸۱،۸۰) اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، انھیں اندھا کر دیا کہ بڑا عذاب آنے سے پہلے میرے اس عذاب اور میری تنبیہ کا مزا چکھو۔

**آیت 38** وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۸۳،۸۲) کی تفسیر۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓىِٕكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾

سو چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ﴿۳۹﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۴۰﴾ اور بلاشبہ یقیناً فرعون کی آل کے پاس ڈرانے والے آئے ﴿۴۱﴾ انھوں نے ہماری سب کی سب نشانیوں کو جھٹلا دیا تو ہم نے انھیں پکڑا، جیسے اس کی پکڑ ہوتی ہے جو سب پر غالب، بے حد قدرت والا ہو ﴿۴۲﴾ کیا تمھارے کفار ان لوگوں سے بہتر ہیں، یا تمھارے لیے (پہلی) کتابوں میں کوئی چھٹکارا ہے؟ ﴿۴۳﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں، جو بدلا لے کر رہنے والے ہیں؟ ﴿۴۴﴾

---

**آیت 39، 40** فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ...... : یہاں قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط چاروں کے تذکرے میں یہ دونوں باتیں بار بار دہرائی ہیں، تاکہ متعدد مرتبہ ذکر کے دوران کسی بار ہی ان کی طرف توجہ ہو جائے۔ سورۂ رحمن میں "فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" اور سورۂ مرسلات میں "وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ" کو بار بار دہرانے میں بھی یہی حکمت ملحوظ ہے۔

**آیت 41** وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ : آلِ فرعون کو ڈرانے اور خبردار کرنے والوں سے مراد ان کے پاس آنے والے پیغمبر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام بھی ہیں اور ان کو دیے جانے والے نو (۹) معجزات بھی، جنھیں اللہ تعالیٰ نے "تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ" قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۰۱) کی تفسیر۔

**آیت 42** كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ ...... : "عَزِيْزٍ" سب پر غالب، جو کرنا چاہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ "مُقْتَدِرٍ" "قَدَرَ يَقْدِرُ" (ض) سے باب افتعال ہے، حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے "مُقْتَدِرٍ" میں "قَادِرٌ" اور "قَدِيْرٌ" کی بہ نسبت قدرت کا معنی زیادہ ہے، یعنی جو کرنا چاہے اس کی پوری قدرت رکھتا ہے، کسی طرح عاجز نہیں۔ آلِ فرعون پر آنے والی گرفت کی شدت اور ہولناکی کا بیان مقصود ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ ہود (۱۰۲)۔

**آیت 43** ❶ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓىِٕكُمْ : یہ خطاب قریش کے لوگوں سے ہے کہ ان اقوام پر کفر و تکذیب کے نتیجے میں یہ عذاب آئے، اگر تم کفر اختیار کرو گے تو کیا تم میں سے کفر کرنے والے کسی بھی لحاظ سے ان سے بہتر ہیں کہ ان پر عذاب نہیں آئے گا؟ استفہام انکاری ہے، یعنی ایسا نہیں ہے۔ قریش کے علاوہ قیامت تک کے تمام لوگ بھی اس کے مخاطب ہیں، کیونکہ وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت ہیں۔

❷ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ : یا پہلی آسمانی کتابوں میں تمھارے متعلق لکھا ہوا ہے کہ تم جو چاہو کرو، تم پر پہلی قوموں کی طرح عذاب نہیں آئیں گے؟ ظاہر ہے ایسا بھی نہیں۔

**آیت 44** اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ : یہاں "جَمِيْعٌ" "كُلٌّ" (تمام) کے معنی میں نہیں بلکہ "یاء" کے اضافے

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ ﴿۴۶﴾

عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے ﴿۴۵﴾ بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے اور قیامت زیادہ بڑی مصیبت اور زیادہ کڑوی ہے ﴿۴۶﴾

کے ساتھ "جَمْعٌ" کے معنی میں ہے، مضبوط جماعت۔ "اِنْتَصَرَ يَنْتَصِرُ اِنْتِصَارًا" ظالم سے بچاؤ کرنا، دشمن سے انتقام لینا، مدِمقابل پر غالب آنا۔ یا پھر ان کا کہنا یہ ہے کہ نہ ہم پہلوں سے بہتر ہیں اور نہ کسی کتاب میں ہمارے عذاب سے محفوظ رہنے کی کوئی بات موجود ہے، مگر ہم ایک مضبوط جماعت ہیں جو اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں، بدلا بھی لے سکتے ہیں اور مدِمقابل پر غالب بھی آ سکتے ہیں، اس لیے ہمیں کوئی خوف نہیں۔ آیت میں التفات ہے، یعنی پچھلی آیت "اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ" میں خطاب کا صیغہ ہے اور یہاں غائب کے صیغے کے ساتھ ان کا ذکر ہے، مراد ان کی تحقیر ہے کہ ایسی ڈینگیں مارنے والے خطاب کے قابل نہیں۔

**آیت 45** **سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ** : "الْجَمْعُ" پر الف لام عہد خارجی کا ہے، یعنی وہ جماعت جس کا پچھلی آیت کے لفظ "جَمِيْعٌ" میں ذکر ہے۔ اس لیے ترجمہ "یہ جماعت" کیا گیا ہے۔ یعنی اگر ان کا یہ کہنا ہے تو یاد رکھیں کہ یہ جماعت اپنے خیال میں جتنی بھی زبردست ہو بہت جلد شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ "الدُّبُرَ" کا لفظ واحد ہے، مراد جنس ہے: "أَيْ يُوَلِّيْ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ دُبُرَهُ" "یعنی ان میں سے ہر ایک پیٹھ پھیر کر بھاگے گا۔" یہ آیات کے آخری حروف کی موافقت کے لیے ہے۔ یہ آیات مکہ میں نازل ہوئیں، جب مسلمان مظلوم و مقہور تھے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قریشِ مکہ جیسے قوت و شوکت والے لوگ بھی کسی وقت ان کمزور اور بے بس مسلمانوں سے شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ جن مسلمانوں میں سے کچھ جان بچا کر حبش میں پناہ لے چکے تھے، کچھ شعبِ ابی طالب میں محصور تھے اور قریش کے مقاطع اور محاصرے کی وجہ سے بھوکوں مر رہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق وہ وقت آیا اور فی الواقع تھوڑے ہی عرصے میں بدر و احزاب اور دوسری جنگوں کے موقع پر یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ بدر کے موقع پر معرکہ برپا ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی، تب صحابہ کو معلوم ہوا کہ یہ وہ ہزیمت تھی جس کی وعید اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو سنائی تھی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ اپنے خیمے میں تھے، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَنْشُدُكَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ، اَللّٰهُمَّ إِنْ تَشَأْ لَا تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ » "اے اللہ! میں تجھے تیرے عہد اور تیرے وعدے کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو چاہتا ہے کہ آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے (تو اس تھوڑی سی جمعیت کو مٹ جانے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دے، ورنہ اس کی ضرور مدد فرما)۔" تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے: "اے اللہ کے رسول! بس کیجیے، آپ نے اپنے رب سے نہایت اصرار کے ساتھ دعا کی ہے۔" تو آپ ﷺ زرہ پہنے ہوئے اچھلتے ہوئے نکلے اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ "عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔" [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿سيهزم الجمع﴾ : ۴۸۷۵ ]

**آیت 46** **بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ ......** : "دَاهِيَةٌ" بڑی مصیبت کو کہتے ہیں اور "اَدْهٰى" زیادہ بڑی مصیبت۔ "مُرٌّ"

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾

**یقیناً مجرم لوگ بڑی گمراہی اور دیوانگی میں ہیں ﴿۴۷﴾ جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں پر گھسیٹے جائیں گے، چکھو آگ کا چھونا ﴿۴۸﴾ بے شک ہم نے جو بھی چیز ہے، ہم نے اسے ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے ﴿۴۹﴾**

(میم کے ضمہ کے ساتھ ) تلخ، کڑوا۔ "مَرَّ یَمُرُّ مَرَارَةً" (ن ) کڑوا ہونا۔ "اَمَرُّ" اس سے اسم تفضیل ہے، زیادہ تلخ۔ یعنی دنیا میں ہونے والی شکست بھی اگرچہ بڑی مصیبت اور بہت تلخ ہے کہ اس میں قتل، گرفتاری، غلامی، ذلت و رسوائی اور کئی طرح کی سزائیں ہیں، مگر اصل سزا کا وعدہ تو قیامت کے دن ہے اور قیامت دنیا کی مصیبتوں سے کہیں زیادہ بڑی مصیبت اور بہت زیادہ تلخ ہے، کیونکہ دنیا کی مصیبت اور تلخی آخر کار ختم ہونے والی ہے، مگر آخرت کی سزا کبھی ختم ہونے والی نہیں، پھر وہاں کی آگ دنیا کی آگ سے ستر (۷۰ ) گنا زیادہ سخت ہے۔

**آیت 47** اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ : مجرمین سے مراد مشرکین ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ﴾ [ المطففین : ۲۹ ] "بے شک وہ لوگ جنھوں نے جرم کیے، ان لوگوں پر جو ایمان لائے، ہنسا کرتے تھے۔" اور فرمایا: ﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ [ الرحمن : ۴۳ ] "یہی ہے وہ جہنم جسے مجرم لوگ جھٹلاتے تھے۔" یعنی مشرکین اپنی دانست میں بڑے دانا اور صحیح راستے پر چلنے والے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت بڑی گمراہی اور دیوانگی میں مبتلا ہیں۔

**آیت 48** يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ...... : "سَقَرَ" جہنم کا علم (نام ) ہے اور مؤنث سماعی ہے، اس لیے غیر منصرف ہے اور اس پر تنوین نہیں آتی۔ اشتقاق اس کا "سَقَرَتْهُ النَّارُ" (آگ نے اسے جھلس دیا ) سے ہے، یعنی ان پر ان کی ضلالت اور دیوانگی اس دن واضح ہوگی جب انھیں ان کے چہروں کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا اور کہا جائے گا کہ جہنم کے چھونے کا مزہ چکھو۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان (۳۴)۔

**آیت 49** ① اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ : "بِقَدَرٍ" پر تنوین تعظیم کی ہے۔ یعنی اگر انھیں شبہ ہے کہ قیامت ابھی واقع کیوں نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ہر چیز کو اپنے عظیم مستحکم اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے جو کبھی غلط نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہمیں گزشتہ کی طرح آئندہ کا بھی پورا علم ہے کہ کوئی بھی چیز کس طرح ہوگی، کتنی ہوگی اور کب ہوگی؟ غرض ہم نے اس کی شکل و صورت، زمان و مکاں، قوت و ضعف وغیرہ ہر چیز کا اندازہ طے کر دیا ہے، مثلاً جس کے قد کا اندازہ چھ فٹ طے کیا ہے وہ چھ فٹ ہی ہوگا، جسے سعید طے کر دیا ہے وہ سعید ہوگا اور جسے شقی طے کر دیا ہے وہ شقی ہوگا، جس کا جتنا وقت مقرر کیا ہے اس سے ایک لحہ آگے پیچھے نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہم نے قیامت کا بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، نہ وہ اس سے پہلے آسکتی

وَ مَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾

اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے آنکھ کی ایک جھپک ﴿۵۰﴾

ہے نہ اس سے ایک لحہ کی تاخیر ہو گی۔ تمھارے مطالبے کے مطابق اگر وہ ابھی واقع نہیں ہوتی تو یہ مت سمجھو کہ وہ واقع ہو گی ہی نہیں۔ اس آیت سے ملتی جلتی یہ آیت ہے: ﴿وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ﴾ [ الرعد : ۸ ] ''اور ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازے سے ہے۔'' اور سورۂ مرسلات کی یہ آیت: ﴿فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ﴾ [ المرسلات : ۲۳ ] ''پس ہم نے اندازہ کیا تو ہم اچھے اندازہ کرنے والے ہیں۔''

❷ "قَدَرٌ" سے مراد تقدیر ہے جو ان چھ چیزوں میں شامل ہے جن پر ایمان کا دارومدار ہے۔ حدیثِ جبریل میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ مجھے ایمان کے متعلق بتایئے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: « أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ » [ مسلم، الإيمان، باب بيان الإيمان و الإسلام والإحسان ...... : ۸ ] ''یہ کہ تو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور تقدیر اچھی یا بری، اس پر ایمان لائے۔'' یعنی اچھی تقدیر کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور بری کا بھی، مجوس کی طرح نہیں جو دو خالق مانتے ہیں، ایک خالقِ خیر اور ایک خالقِ شر۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: « كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ » [ مسلم، القدر، باب حجاج آدم و موسى صلى الله عليهما وسلم: ۲٦٥۳ ] ''اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں آسمان و زمین پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیں۔'' فرمایا: ''اور (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزِ وَالْكَيْسِ » [ مسلم، القدر، باب كل شيء بقدر : ۲٦٥٥ ] ''ہر چیز تقدیر سے ہے، حتیٰ کہ عاجزی اور ہوشیاری بھی۔'' یعنی بعض لوگ جو بے کار اور نکھٹو ہوتے ہیں اور بعض عقل مند اور ہوشیار، تو یہ بھی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔

**آیت 50** ❶ وَ مَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ : یعنی بے شک قیامت بہت بڑی چیز ہے، جس کی ہیبت سے آسمان و زمین لرزتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [ الأعراف : ۱۸۷ ] ''وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری واقع ہوئی ہے۔'' مگر یہ مت سمجھو کہ ہمارے لیے اس کا قائم کرنا کچھ دشوار ہے، یا ہم لانا چاہیں تو اس کے آنے میں دیر ہو جائے گی، ہمارا تو صرف ایک حکم ہوتا ہے اور آنکھ جھپکنے میں کام ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [ يٰس : ۸۲ ] ''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ نحل (۷۷)۔

❷ یہاں ایک سوال ہے کہ "وَ مَاۤ اَمْرُنَاۤ" کے بعد "إِلَّا وَاحِدٌ" ہونا چاہیے تھا، "وَاحِدَةٌ" کیوں فرمایا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس سے مراد "كَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ" ہے، یعنی ہمارا حکم صرف ایک کلمہ "كُنْ" ہوتا ہے۔

وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَاۤ اَشۡيَاعَكُمۡ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَ كُلُّ شَيۡءٍ فَعَلُوۡهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَ كُلُّ صَغِيۡرٍ وَّ كَبِيۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِيۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

ع ۳ ۱۵ ۱۰

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھارے جیسی کئی جماعتوں کو ہلاک کر ڈالا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۵۱﴾ اور ہر چیز جسے انھوں نے کیا وہ دفتروں میں درج ہے ﴿۵۲﴾ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے ﴿۵۳﴾ بے شک بچ کر چلنے والے باغوں اور نہروں میں ہوں گے ﴿۵۴﴾ صدق کی مجلس میں، عظیم بادشاہ کے پاس، جو بے حد قدرت والا ہے ﴿۵۵﴾

**آیت 51** وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَاۤ اَشۡيَاعَكُمۡ …… : قیامت پر قادر ہونے کا ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ قسم ہے کہ ہم نے تمھارے جیسی کئی جماعتوں مثلاً عاد و ثمود وغیرہ کو ہلاک کر ڈالا۔ وہ بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان پر عذاب آ سکتا ہے، مگر جب عذاب آیا تو اچانک آیا۔ ایسے ہی قیامت بھی اچانک آئے گی، تو کیا ہے کوئی جو اپنے جیسے ان گروہوں سے عبرت حاصل کرے اور قیامت کی تیاری کرے؟ یہاں پھر التفات ہے، یعنی مشرکین کو مخاطب فرما لیا ہے، کیونکہ مقصود ڈانٹنا ہے۔ "أَشْيَاعٌ" "شِيعَةٌ" کی جمع ہے، ایک جیسا عقیدہ رکھنے والی جماعت کے لوگ جو ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوں۔ یہاں "اَشۡيَاعَكُمۡ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی کفر و شرک میں تمھارے جیسے تھے۔

**آیت 52، 53** وَ كُلُّ شَيۡءٍ فَعَلُوۡهُ فِي الزُّبُرِ …… : "مُّسۡتَطَرٌ" "مَسْطُوْرٌ" کے معنی میں ہے۔ افتعال کی تاء کی وجہ سے معنی میں مبالغہ مقصود ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بات بہت اچھی طرح لکھی ہوئی ہے، مراد اعمال نامے ہیں۔ یعنی ان مجرموں نے جو کچھ کیا ہے سب دفتروں میں درج ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ کہف (۴۹) اور سورۂ انفطار (۱۰ تا ۱۲)۔

**آیت 54** اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ : کفار کے بعد متقی لوگوں کا انجام ذکر فرمایا کہ وہ باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔ (دیکھیے طور: ۱۷) آیات کے آخری حروف کی موافقت کے لیے "نَهَرٍ" کا لفظ مفرد لایا گیا، مراد جنس ہے، جس میں ہر قسم کی نہریں شامل ہیں۔ جنت کی نہروں کے لیے دیکھیے سورۂ محمد کی آیت (۱۵) کی تفسیر۔

**آیت 55** ① فِيۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ : یہاں "مُّقۡتَدِرٍ" بمعنی "صَادِقٌ" برائے مبالغہ ہے، جیسے "عَدْلٌ" بمعنی "عَادِلٌ" برائے مبالغہ ہے اور "مَقۡعَدِ" موصوف اپنی صفت "صِدۡقٍ" (بمعنی صَادِقٌ) کی طرف مضاف ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "مَسْجِدُ الْجَامِعِ." "صِدۡقٍ" کا اصل معنی خبر کا واقع کے مطابق ہونا ہے۔ "فلاں شخص صادق ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو بات کہتا ہے وہ واقع میں اسی طرح ہوتی ہے جیسے اس نے کہا۔ پھر یہ لفظ کسی بھی چیز کی تعریف کے لیے اور اس کے اپنے اوصاف میں کامل ہونے کے لیے بولا جانے لگا۔ "فُلَانٌ رَجُلُ صِدْقٍ" یعنی وہ رُجولیّت میں کامل ہے۔ اردو میں کہا جاتا ہے "فلاں سچ مچ مرد ہے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ﴾ [یونس: ۹۳] "اور ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھکانا دیا جو ٹھکانا ہونے میں کامل تھا، سچ مچ کا باعزت ٹھکانا تھا۔" اور فرمایا: ﴿وَاجۡعَلۡ لِّيۡ

لِسَانَ صِدۡقٍ فِي الۡاٰخِرِيۡنَ﴾ [ الشعراء : ۸۴ ] ’’اور پیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ۔‘‘ اور فرمایا: ﴿وَ قُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِيۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ﴾ [ بني إسرائیل : ۸۰ ] ’’اور کہہ اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا۔‘‘ ”فِيۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی مجلس میں ہوں گے جو مجلس ہونے کے لحاظ سے ہر طرح کامل ہوگی، مجلس کے تمام لوازمات ومناسبات سے آراستہ ہوگی، سچ مچ کی مجلس ہوگی۔

❷ یاد رہے کہ یہاں ”مَقۡعَدِ“ کا ترجمہ جو ’’مجلس‘‘ کیا گیا ہے وہ اس کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا، کیونکہ ” قَعَدَ“ اور ”جَلَسَ“ دونوں کا معنی اگرچہ ’’بیٹھنا‘‘ ہے، مگر ”مَقۡعَدِ“ میں ٹھہرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے جو ’’مجلس‘‘ میں نہیں پایا جاتا، مثلاً سورۂ توبہ کی آیت (۸۱): ﴿فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِهِمۡ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ﴾ میں ”بِمَقۡعَدِهِمۡ“ کا معنی صرف بیٹھنا نہیں بلکہ ’’بیٹھ رہنا‘‘ ہے اور سورۂ نساء کی آیت (۹۵): ﴿لَا يَسۡتَوِي الۡقٰعِدُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ میں ”الۡقٰعِدُوۡنَ“ کا معنی ’’بیٹھ رہنے والے مومن‘‘ ہے۔ اسی طرح سورۂ نور کی آیت (۶۰): ﴿وَ الۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ میں ”الۡقَوَاعِدُ“ کا معنی ’’بیٹھ رہنے والیاں‘‘ ہے۔ یہاں ”الۡقَوَاعِدُ“ کے بجائے ”اَلۡجَوَالِسُ“ کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ سورۂ ق کی آیت (۱۷): ﴿عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيۡدٌ﴾ میں فرشتوں کے مسلسل ساتھ بیٹھے ہونے کا جو مفہوم ادا ہو رہا ہے وہ ”جَلِيۡسٌ“ میں نہیں۔ اب اس کے مقابلے میں سورۂ مجادلہ کی آیت (۱۱) دیکھیے، فرمایا: ﴿اِذَا قِيۡلَ لَكُمۡ تَفَسَّحُوۡا فِي الۡمَجٰلِسِ فَافۡسَحُوۡا يَفۡسَحِ اللّٰهُ لَكُمۡ ۚ وَ اِذَا قِيۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا﴾ ’’جب تمھیں کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل جاؤ تو کھل جاؤ، اللہ تعالیٰ تمھارے لیے فراخی کر دے گا اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔‘‘ یہاں ”تَفَسَّحُوۡا“ (کھل جاؤ) سے مجلس میں حرکت کا ثبوت ملتا ہے اور ”انۡشُزُوۡا“ (اٹھ کھڑے ہو) سے ظاہر ہے کہ مجلس میں جلوس ترک بھی ہو سکتا ہے، لیکن ”قُعُوۡدٌ“ کا معاملہ یہ نہیں۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ متقی لوگ ’’مقعدِ صدق‘‘ میں ہوں گے جو پائیدار ہوگی۔ ’’مجلس صدق‘‘ کے لفظ سے یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ مفسر رازی نے یہ بات بہت مفصل اور مدلل لکھی ہے۔

❸ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ: ”مَلِيۡكٍ“ ”مُلۡكٌ“ میں سے ”فَعِيۡلٌ“ کا وزن ہے، ملک والا۔ اس میں ”مَلِكٌ“ سے زیادہ مبالغہ ہے، اس لیے ترجمہ ’’عظیم بادشاہ‘‘ کیا گیا ہے۔ ”مُقۡتَدِرٍ“ میں ” قَادِرٌ“ یا ” قَدِيۡرٌ“ سے زیادہ مبالغہ ہے، جیسا کہ پیچھے ”اَخۡذَ عَزِيۡزٍ مُّقۡتَدِرٍ“ کے تحت گزرا ہے، اس لیے ترجمہ ’’بے حد قدرت والا‘‘ کیا گیا ہے۔ کسی بھی گھر یا مکان کے مرتبے کا تعین اس جگہ سے ہوتا ہے جہاں وہ واقع ہو، فرعون کی بیوی آسیہ علیہا السلام نے دنیا کی تمام سہولتیں چھن جانے پر اللہ تعالیٰ سے اپنے پاس گھر بنا کر دینے کی دعا کی تھی: ﴿رَبِّ ابۡنِ لِيۡ عِنۡدَكَ بَيۡتًا فِي الۡجَنَّةِ﴾ [ التحریم : ۱۱ ] ’’اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے۔‘‘ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں سے ”مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ“ کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ لوگ بادشاہوں کی مجلس میں اور ان کے پڑوس میں رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور جتنا زیادہ اقتدار والا بادشاہ ہو اتنی ہی اس کے قرب کی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متقین کو بشارت سنائی کہ ان کی رہائش بادشاہوں کے بادشاہ کے پاس ہوگی جو سارے اقتدار کا مالک ہے۔ پھر ان کی عزت وشوکت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ [ اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ ]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الرحمٰن ۵۵ — آیاتہا ۷۸

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اس بے حد رحم والے نے ① یہ قرآن سکھایا ②

اس سورت کی فضیلت میں ایک حدیث مشہور ہے: « لِكُلِّ شَيْءٍ عَرُوْسٌ وَ عَرُوْسُ الْقُرْآنِ الرَّحْمٰنُ » ''ہر چیز کا ایک دولھا ہوتا ہے اور قرآن کا دولھا سورۂ رحمٰن ہے۔'' (عروس کا معنی دولھا بھی ہے اور دلہن بھی) سیوطی نے اسے '' اَلْجَامِعُ الصَّغِيْرُ '' میں '' شُعَبُ الْإِيْمَانِ لِلْبَيْهَقِيِّ '' کے حوالے سے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف لکھا ہے۔ دیکھیے ضعیف الجامع (۴۷۲۹)۔

**آیت 2،1** : ① اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ : اس سورت کا آغاز اللہ کے مبارک نام '' اَلرَّحْمٰنُ '' کے ساتھ ہوا ہے اور پوری سورت اس کی بے حد و بے حساب رحمت کی تفصیل ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر ہر نعمت کا ذکر کر کے بار بار اپنا احسان یاد دلایا ہے۔ ان نعمتوں میں وہ نعمتیں بھی ہیں جو دنیا میں تمام لوگوں پر کی گئی ہیں اور وہ بھی جو صرف ایمان والوں پر ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی نعمت دین کا ذکر سب سے پہلے فرمایا ہے، کیونکہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی اسی پر موقوف ہے اور دین کا مدار قرآن مجید پر ہے، اس لیے فرمایا: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾ ''اس بے حد رحم والے نے۔ یہ قرآن سکھایا۔''

② '' اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ '' میں نعمت کے بیان کے ساتھ کفار کے اس بہتان کا رد بھی ہے کہ ﴿ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ﴾ [ النحل : ۱۰۳ ] یعنی آپ (ﷺ) کو کوئی بشر ہی سکھاتا ہے۔ فرمایا، آپ کو سکھلانے والا کوئی بشر یا کوئی اور ہستی نہیں، بلکہ وہ رحمٰن ہی ہے جس نے آپ کو قرآن سکھایا۔ ابن عاشور نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ مسند کو فعل کی صورت میں مسند الیہ کے بعد تخصیص کا فائدہ دینے کے لیے لایا گیا ہے۔ کیونکہ کفار کا کہنا تھا کہ قرآن کسی اور نے آپ کو سکھایا ہے، گویا وہ یہ مان گئے کہ یہ آپ نے خود نہیں بنایا بلکہ کسی اور نے آپ کو سکھایا ہے، مگر وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ آپ کو قرآن سکھانے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے فرمایا: ''اس رحمان ہی نے (آپ کو) یہ قرآن سکھایا ہے۔'' '' عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ '' '' اَلرَّحْمٰنُ '' مبتدا کی پہلی خبر ہے، اس کے بعد مسلسل تین خبریں ہیں جو حرف عطف کے بغیر لائی گئی ہیں۔ ان نعمتوں کے اس انداز میں ذکر کرنے سے جہاں ان نعمتوں کا اظہار ہو رہا ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ یہ نعمتیں رحمان ہی نے عطا کی ہیں، انھیں عطا کرنے میں کسی اور کا نہ کوئی دخل ہے نہ کسی قسم کی شرکت ہے۔ مشرکین یہاں تک تو مانتے تھے، مگر اس سے لازم آنے والی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ جب یہ سب نعمتیں رحمان ہی کی ہیں تو عبادت بھی اسی کی ہے۔ گویا نعمتوں کے شمار کرنے میں مشرکین

# خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۳

## اس نے انسان کو پیدا کیا ③

کو ان کی غلطی پر تنبیہ اور اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

❸ "عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" میں "عَلَّمَ" کا ایک مفعول "الْقُرْاٰنَ" ذکر فرمایا ہے کہ اس رحمٰن نے یہ قرآن سکھایا، دوسرا مفعول ذکر نہیں فرمایا کہ کسے سکھایا؟ یہ حذف فرما دیا ہے، تاکہ عام رہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا، اس محذوف سے مراد نبی کریم ﷺ ہی ہیں، مگر بہتر ہے کہ اسے عام رکھا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی، مگر ظاہر ہے کہ آپ کے واسطے سے اور بعد میں قرآن کے معلّمین کے واسطے سے تمام لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے والی اصل ذات گرامی اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ تعلیم نہ دے تو نہ نبی ﷺ تعلیم دے سکتے ہیں، نہ صحابہ اور نہ ہی بعد کا کوئی معلّم۔ اس لیے تعلیم قرآن کو خاص اللہ تعالیٰ کی نعمت کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔

❹ اکثر مفسرین نے چونکہ یہاں "الْقُرْاٰنَ" سے مراد رسول کریم ﷺ پر نازل شدہ قرآن کریم لیا ہے، اس لیے اوپر تفسیر اس کے مطابق کی گئی ہے۔ آیت کے الفاظ میں ایک اور تفسیر کی بھی گنجائش ہے، وہ یہ کہ "الْقُرْاٰنَ" کا لفظی معنی "قِرَاءَةٌ" (پڑھنا) ہے، جیسا کہ سورۂ قیامہ (۱۸) میں فرمایا: ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ "تو جب ہم اسے پڑھیں تو تُو اس کے پڑھنے کی پیروی کر۔" اس تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ انسان کو پڑھنے کی تعلیم کی نعمت یاد دلا رہے ہیں، یعنی "اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" کا معنی ہے: "اس رحمٰن ہی نے پڑھنا سکھایا۔" یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی سب سے پہلی وحی میں لکھنے کی تعلیم کی نعمت کا ذکر خاص طور پر فرمایا تھا، فرمایا: ﴿اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ [العلق: ۳، ۴] "پڑھ اور تیرا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔" تو سورۂ رحمٰن میں پڑھنے کی تعلیم کی نعمت کا ذکر فرمایا۔ اس تفسیر کے مطابق یہ نعمت مزید عام ہو جاتی ہے، جس میں قرآن کا پڑھنا بھی شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنا، پڑھنا اور بیان تینوں انسان پر اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں میں سے ہیں جو اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ انھی کے ذریعے سے وہ دور و نزدیک دوسرے انسانوں سے رابطہ کرتا ہے، وحی الٰہی سے حاصل ہونے والے علوم کو اور انسانی عقل اور تجربے سے حاصل ہونے والے علوم و فنون کو سیکھتا سکھاتا ہے، لکھ کر محفوظ کرتا ہے اور آنے والی نسلوں کو پہنچاتا ہے۔

**آیت 3** ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ﴾: یہ بھی لفظ "اَلرَّحْمٰنُ" کی خبر ہے اور اسے فعل کی صورت میں لانے سے تخصیص کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی دو باتیں بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ رحمان ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے، سو عبادت بھی اس اکیلے کی ہے۔ دوسری انسان کو پیدا کرنے کی نعمت کا بیان ہے۔ زمین و آسمان میں موجود دوسری تمام نعمتوں کا ذکر اس کے بعد فرمایا ہے، کیونکہ وہ سب انسان کی پیدائش کے بعد ہیں، اگر وہ موجود ہی نہ ہو تو کسی نعمت کا اسے کیا فائدہ۔ البتہ تعلیم قرآن کی نعمت کا ذکر اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس سے بھی پہلے فرما دیا۔ "رحمٰن ہی نے انسان کو پیدا فرمایا" یہ ایسی

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝

اسے بات کرنا سکھایا۝ سورج اور چاند ایک حساب سے (چل رہے ) ہیں۝

بات نہیں جسے مشرکین نہ مانتے ہوں، مگر اسے صریح لفظوں میں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین فی الحقیقت یہ بات نہیں مانتے، کیونکہ اگر مانتے ہوتے تو کسی غیر کی پرستش کیوں کرتے؟

آیت 4 عَلَّمَهُ الْبَيَانَ: سکھانے میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، یعنی اس میں بیان کی صلاحیت رکھی، اسے اپنے مطلب کے اظہار کے لیے مختلف زبانوں کے الفاظ وضع کرنے اور ان کے استعمال کا سلیقہ بخشا، جس سے ہزاروں زبانیں وجود میں آئیں اور اسے قدرت دی کہ اپنا ما فی الضمیر نہایت وضاحت اور حسن وخوبی کے ساتھ ادا کر سکے اور دوسروں کی بات سمجھ سکے۔ اپنی اس صفت کی بدولت وہ خیر و شر، ہدایت و ضلالت، ایمان و کفر اور دنیا و آخرت کی باتیں سمجھتا اور سمجھاتا ہے اور ان کو کام میں لا کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳۱): ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ اور سورۂ روم کی آیت (۲۲): ﴿وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ کی تفسیر۔ یہ جملہ بھی لفظ "اَلرَّحْمٰنُ" کی خبر ہے اور فعل کی صورت میں آنے سے اس میں بھی پچھلے جملوں کی طرح تخصیص پیدا ہو رہی ہے۔

آیت 5 اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ: "حُسْبَانٌ" "حَسِبَ يَحْسُبُ" کا مصدر ہے، جس میں "الف نون" زیادہ کر دیا گیا ہے، جس سے معنی میں اضافہ ہو گیا ہے، جیسے "طُغْيَانٌ" "رُجْحَانٌ" اور "كُفْرَانٌ" وغیرہ میں ہے۔ یعنی سورج اور چاند نہایت محکم اور باریک حساب کے ساتھ چل رہے ہیں، آسمان کے نیچے ثوابت و سیار ستاروں کا کوئی شمار نہیں، جن میں سے بعض سورج اور چاند سے بھی ہزاروں گنا بڑے ہیں۔ ان کی پیدائش اور گردش میں اللہ تعالیٰ کی بے حساب حکمتوں کا بھی کچھ شمار نہیں، مگر خاص طور پر سورج اور چاند کا ذکر اس لیے فرمایا کہ نمایاں نظر آنے کی وجہ سے زمین کے رہنے والوں کے معاملات کا ان دونوں کے ساتھ زیادہ تعلق ہے۔ مفسر کیلانی لکھتے ہیں: "سورج اور چاند کا ایک مقررہ رفتار کے مطابق چلنا، پھر اس میں ایک لحظہ کی بھی تاخیر نہ ہونا انسان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ سورج سے دن رات ادل بدل کر آتے رہتے ہیں اور موسموں میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نمازوں کے اوقات کا تعلق بھی سورج سے ہے، فصلوں کے پکنے کا انحصار بھی سورج سے ہے۔ چاند سے ہمیں رات کو روشنی حاصل ہوتی ہے، ہم مہینوں اور سالوں کا حساب رکھ سکتے ہیں اور یہی حقیقی اور فطری تقویم (کیلنڈر) ہے۔ اسی لیے رمضان کے روزے، حج، عیدین اور دوسری قابل شمار مدتوں، مثلاً مدت حمل، مدت رضاعت و عدت وغیرہ کا تعلق چاند سے ہوتا ہے۔ پھر سورج اور زمین کے درمیان ایسا مناسب فاصلہ رکھا گیا ہے کہ اس میں کمی بیشی سے اس زمین پر انسان اور دوسرے سب جانداروں کی زندگی ہی ناممکن ہے اور سب فائدے اسی صورت میں حاصل ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان عظیم الجثہ کروں کو ایسے طبعی قوانین میں جکڑ رکھا ہے جس سے وہ ادھر ادھر ہو ہی نہیں سکتے اور اپنے مقررہ مداروں پر مقررہ رفتار سے ہمہ وقت محو گردش رہتے ہیں۔" (تیسیر القرآن) مزید دیکھیے سورۂ انعام (۹۶) اور سورۂ بنی اسرائیل (۱۲)۔

وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۞ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ ۞ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۞

**اور بے تنے کے پودے اور درخت سجدہ کر رہے ہیں⑥ اور آسمان، اس نے اسے اونچا اٹھایا اور اس نے ترازو رکھی ⑦ تاکہ تم ترازو میں زیادتی نہ کرو⑧**

آیت 6 وَ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ : "النَّجْمُ" کا معنی ستارا بھی ہے اور وہ پودے بھی جو تنے کے بغیر ہوتے ہیں، جیسے گندم، جَو، چنے، جڑی بوٹیاں، بیلیں، سبزیاں وغیرہ۔ یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ یہ "الشَّجَرُ" کے مقابلے میں آیا ہے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی نقل فرمایا اور اسے ترجیح دی ہے۔ ان کے سجدہ کرنے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حج (۱۸)۔

آیت 7 ❶ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا : یہاں بھی " رَفَعَ السَّمَاءَ " کے بجائے "وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا" میں آسمان کو پہلے لا کر اس کی اہمیت کی طرف اور اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اسے بلند کرنا اس اکیلے کا کام ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں، پھر کسی اور کی پرستش کیوں ہو؟ آسمان کو اونچا اٹھانے میں اس کے پیدا کرنے کا ذکر خود بخود آ گیا۔ اونچا اٹھانے کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ اتنے بڑے آسمان کو اس طرح ستونوں کے بغیر پیدا کرنا اور اسے اتنا بلند بنانا بے حد تعجب انگیز ہے کہ اس کے نیچے سورج، چاند اور ان سے ہزاروں گنا بڑے سیاروں پر مشتمل کہکشائیں محوِ گردش ہیں، نہ انھیں راستے میں کسی ستون کی رکاوٹ پیش آتی ہے، نہ ہزاروں نوری سالوں کے فاصلے سے ان کی روشنی زمین پر آنے کے درمیان کوئی چیز حائل ہوتی ہے۔

❷ وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ : "الْمِيْزَانَ" "وَزَنَ" سے "مِفْعَالٌ" کے وزن پر ہے جو اصل میں "مِوْزَانٌ" ہے، وزن کا آلہ۔ "وزن" چیزوں کے ایک دوسرے کے مقابلے میں برابر یا کم و بیش ہونے کے اندازے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے انسان کو ہر چیز کی مقدار معلوم کرنے کے لیے میزان کا طریقہ سکھایا۔ اس میزان میں ہر قسم کے پیمانے آ جاتے ہیں، وزن، کیل، مساحت، حرارت، برودت، دباؤ، نمی، غرض ہزار ہا قسم کے پیمانے بنانے کا سلیقہ عطا فرمایا، جن سے وہ اپنے معاملات درست اور بہتر سے بہتر طریقے کے ساتھ چلاتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی کام بھی درست انجام نہیں پا سکتا، پھر انھی پیمانوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے لین دین کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو دلی اطمینان کے ساتھ باہمی لین دین ممکن نہیں تھا۔

آیت 8 اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ : اس سے پہلے "لام" جارہ محذوف ہے: "أَيْ لِئَلَّا تَطْغَوْا" یعنی اس نے میزان اس لیے بنایا ہے کہ تم ہر معاملے میں وزن کرتے ہوئے صحیح وزن کرو، کمی بیشی مت کرو، کیونکہ یہ حد سے تجاوز ہے۔

وَ اَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِيۡزَانَ ﴿۹﴾ وَ الۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّ النَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَكۡمَامِ ﴿۱۱﴾

**اور انصاف کے ساتھ تول سیدھا رکھو اور ترازو میں کمی مت کرو ﴿۹﴾ اور زمین، اس نے اسے مخلوق کے لیے بچھا دیا ﴿۱۰﴾ اس میں پھل ہیں اور کھجور کے درخت جو (خوشوں پر) غلافوں والے ہیں ﴿۱۱﴾**

آیت 9 ﴿ ❶ وَ اَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ ...... : "اَلْقِسْطُ" عدل، انصاف۔ ان آیات میں "الْمِيْزَانَ" کا لفظ تین دفعہ آیا ہے، پہلا آلہ (ترازو) کے معنی میں ہے، دوسرا مصدر (وزن) کے معنی میں اور تیسرا اسم مفعول (مَوْزُوْنٌ) کے معنی میں۔ (ابن عادل، اللباب) اس سے ماپ تول اور دوسرے پیمانوں میں انصاف کی تاکید مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا ایک بہت بڑا باعث ماپ تول میں کمی بیشی کو قرار دیا ہے اور قرآن مجید کی ایک سورت کا نام "مطففین" ہے، جس میں کمی بیشی کرنے والوں کے لیے "ویل" کی وعید سنائی ہے۔

❷ بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ "وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ" میں "وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ" سے مراد عدل ہے، جس کی ایک شاخ ماپ تول میں عدل ہے۔ اس لیے "وَضَعَ الْمِيْزَانَ" میں عام عدل کا ذکر ہے اور ماپ تول کی اہمیت کے پیش نظر "اَقِيْمُوا الْوَزْنَ" (تول سیدھا رکھو) میں عدل کی صورتوں میں وزن کا خاص طور پر الگ ذکر فرمایا ہے۔

آیت 10 ﴿ وَ الۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ : "اَلْاَنَامُ" کا معنی ہر جان دار مخلوق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس طرح بنایا اور بچھایا ہے کہ مخلوق کی تمام ضروریات اس سے پوری ہوتی ہیں، ان کا پیدا ہونا، کھانا پینا، پہننا، رہنا سہنا، چلنا پھرنا، زندہ رہنا اور دفن ہونا غرض ہر ضرورت اور ہر سہولت اسی سے وابستہ ہے۔ "اَلْاَنَامُ" کے لفظ میں اگرچہ تمام مخلوق شامل ہے، مگر یہاں اس سے مراد جن و انس ہیں، کیونکہ محاسبہ انھی دو کا ہونا ہے اور آگے انھی پر احسانات کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے زمین کی ہر چیز انسانوں کی خاطر بنائی ہے، فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِي الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا﴾ [ البقرة: ۲۹ ] "وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔" اور فرمایا: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا﴾ [ الجاثية : ۱۳ ] "اور اس نے تمھاری خاطر ان تمام چیزوں کو مسخر کر دیا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔" زمین کو انسان کے لیے بنانے اور بچھانے کے متعلق دیکھیے سورۂ رعد (۳)، نمل (۶۰، ۶۱)، یٰس (۳۳ تا ۳۵)، حم السجدہ (۹، ۱۰)، زخرف (۹، ۱۰)، جاثیہ (۳، ۴)، ق (۷، ۸)، ملک (۱۵)، مرسلات (۲۵، ۲۶)، نبا (۶) اور سورۂ نازعات (۳۰ تا ۳۳)۔

آیت 11 ﴿ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّ النَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَكۡمَامِ : "فَاكِهَةٌ" ان پھلوں اور چیزوں کا نام ہے جو بطورِ خوراک نہیں بلکہ لذت اور خوشی کے لیے کھائی جاتی ہیں۔ یہ "فَكِهَ يَفْكَهُ" (فَرِحَ يَفْرَحُ) سے مشتق ہے، جس کا معنی باتوں اور ہنسی وغیرہ کے ساتھ خوش وقت ہونا ہے۔ "فَاكِهَةٌ" پر تنوین تکثیر و تعظیم کے اظہار کے لیے ہے۔ "النَّخْلُ" کھجور کے درخت، یہ

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۱۳﴾

اور دانے جو بھس والے ہیں اور خوشبو دار پھول ﴿۱۲﴾ تو (اے جن و انس!) تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۳﴾

اسم جنس ہے، ایک درخت کہنا ہو تو "نَخْلَةٌ" کہتے ہیں۔ "الْأَكْمَامِ" "كِمٌّ" (کاف پر کسرہ) کی جمع ہے، کھجور کے خوشے کے اوپر والا غلاف۔ یہ غلاف کھایا نہیں جاتا، اس لیے مراد خوشوں کے حسن کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے درختوں کے اوپر اور درختوں سے اترنے کے بعد بھی پھلوں کی جس طرح پیکنگ کی ہے ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی عظیم صناعی کا نمونہ ہے۔

**آیت 12** ﴿ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴾ : "الْحَبُّ" دانے، جیسے گندم، چنے، چاول وغیرہ، یعنی غلہ جو انسان کی خوراک بنتا ہے۔ "الْعَصْفِ" دانوں کے اوپر کا چھلکا، بھوسا، جو جانوروں کی خوراک بنتا ہے، سورۂ فیل میں ہے: ﴿ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ﴾ [ الفیل : ۵ ] "کھائے ہوئے بھوسے کی طرح۔" "الرَّيْحَانُ" خوشبودار پودے اور پھول جو آدمی کے دماغ کو معطر کرتے ہیں۔ "فَاكِهَةٌ" سے وہ پھل مراد ہیں جو صرف لذت کے لیے کھائے جاتے ہیں اور "النَّخْلُ" سے وہ پھل مراد ہیں جو لذت اور خوراک دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور "الْحَبُّ" سے مراد غلے وغیرہ ہیں جو خوراک کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور "الرَّيْحَانُ" سے مراد جو خوشبو کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

**آیت 12** ❶ ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ : "آلَاءِ" "إِلًى" کی جمع ہے جو اصل میں "إِلْيٌ" ہے، جیسے "مِعًى" (انتڑی) کی جمع "أَمْعَاءٌ" ہے۔ اس کا ایک معنی نعمت ہے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل فرمائی ہے: "فَبِأَيِّ نِعْمَةِ اللّٰهِ تُكَذِّبَانِ" "تم دونوں اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟" اور ایک معنی قدرت ہے، چنانچہ طبری ہی نے ابن زید کی تفسیر نقل فرمائی ہے، انھوں نے فرمایا: "اَلْآلَاءُ اَلْقُدْرَةُ، فَبِأَيِّ قُدْرَةِ اللّٰهِ تُكَذِّبَانِ" یعنی "تم دونوں اللہ کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے؟"

❷ مفسر سلیمان الجمل نے فرمایا، نعمتوں کے بیان اور ان کی یاد دہانی کے لیے یہ آیت یہاں اکتیس (۳۱) مرتبہ دہرائی گئی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی آدمی نے کسی پر احسان کیے ہوں اور وہ ان احسانوں کو نہ مانتا ہو تو اسے کہتا ہے، کیا تو فقیر نہیں تھا؟ میں نے تجھے مال دیا، کیا تو اس کا انکار کرتا ہے؟ کیا تو ننگا نہیں تھا؟ میں نے تمھیں لباس پہنایا، کیا تو اس کا انکار کرتا ہے ...؟ اللہ تعالیٰ نے آٹھ مرتبہ یہ آیت ان آیات کے بعد دہرائی جن میں اس کی مخلوق کے عجائب اور ان کی ابتدا و انتہا کا ذکر ہے، پھر جہنم کے دروازوں کی تعداد کے مطابق سات مرتبہ ان آیات کے بعد دہرائی ہے جن میں آگ اور اس کی ہولناکیوں کا بیان ہے۔ پھر جنت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق آٹھ مرتبہ دو جنتوں کے وصف میں اسے دہرایا ہے۔ پھر ان دو جنتوں کے علاوہ دوسری دو جنتوں کے وصف میں آٹھ مرتبہ دہرایا ہے۔ تو جو شخص پہلی آٹھ چیزوں کا عقیدہ و یقین رکھے گا اور ان کے تقاضے پر عمل کرے گا وہ اللہ کی طرف سے ان آٹھ نعمتوں کا مستحق ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ساتھ اسے پہلی ساتوں سے محفوظ رکھیں گے۔ (ملخصاً)

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾

اس نے انسان کو بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، جو ٹھیکری کی طرح تھی ﴿۱۴﴾ اور جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا ﴿۱۵﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۶﴾ (وہ) دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب ﴿۱۷﴾

③ یہاں ایک سوال ہے کہ اس سورت کی کئی آیات میں جہنم اور عذاب کا بھی ذکر ہے، تو ان کے بعد "فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" کہنے میں کون سی نعمت یاد دلائی جا رہی ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ "اٰلَآءِ" کا معنی قدرت بھی ہے، جیسا کہ اوپر گزرا۔ تو اللہ تعالیٰ کی صفات اور جہنم و عذاب کے بیان کے بعد کہا جا رہا ہے کہ تم دونوں اللہ تعالیٰ کی کون کون سی قدرت کو جھٹلاؤ گے؟ اور ایک جواب یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے اس کے متعلق خبردار کر دینا بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ اس سے بندہ اس سے بچنے کی جدوجہد کر سکتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

**آیت 14** خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ : "صَلْصَلَةٌ" وہ آواز جو کسی چیز کو بجانے یا کھڑکانے سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث (۲) میں "صَلْصَلَةُ الْجَرَسِ" کا ذکر ہے۔ "صَلْصَالٍ" بجنے والی، کھنکھنانے والی (مٹی)۔ بعض کہتے ہیں یہ "صِلُّ اللَّحْمِ" سے مشتق ہے، جس کا معنی گوشت کا بدبودار ہونا ہے۔ مراد بدبودار مٹی ہے۔ آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حجر (۲۶)۔

**آیت 14** وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ : طبری نے فرمایا "مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ" ایک دوسرے سے ملی جلی سرخ، زرد اور سبز رنگ کی آگ۔ مراد آگ کا شعلہ اور اس کی نوک ہے۔ یہ "مَرَجَ أَمْرُ الْقَوْمِ" سے ہے، جس کا معنی ہے "قوم کا معاملہ مل جل گیا۔" اسی طرح یہ نبی ﷺ کے اس فرمان سے ہے جو آپ ﷺ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو فرمایا: (( يَا عَبْدَ اللّٰهِ ابْنَ عَمْرٍو! كَيْفَ بِكَ إِذَا بَقِيْتَ فِيْ حُثَالَةٍ مِّنَ النَّاسِ وَ فِيْ أَبِيْ دَاوٗدَ : قَدْ مَرِجَتْ عُهُوْدُهُمْ وَ أَمَانَاتُهُمْ )) [ بخاري، الصلاة، باب تشبيك الأصابع ...... : ۴۸۰۔ أبو داوٗد : ۴۳۴۲ ] "اے عبداللہ بن عمرو! تمھارا کیا حال ہوگا جب تم چھان بورے جیسے لوگوں میں باقی رہ جاؤ گے۔" ابوداؤد میں ہے: "جن کے عہد اور امانتیں مل جل گئے ہوں گے۔" اور طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ "مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ" کا معنی "خَالِصُ النَّارِ" نقل فرمایا ہے۔

**آیت 16** فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ : جن و انس کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی ہے اور ان دونوں پر نعمت بھی۔

**آیت 17** رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ : سورج ہمیشہ مشرقی سمت کے درمیان سے طلوع نہیں ہوتا، بلکہ گرمیوں میں اس کا مشرق شمال کی طرف سرکتا جاتا ہے اور سردیوں میں جنوب کی طرف اور ہر روز سورج کے طلوع ہونے کی جگہ الگ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے سال بھر میں سورج کے ۳۶۵ مشرق ہوتے ہیں، یہی حال اس کے مغربوں کا ہے۔ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سورۂ صافات (۵) میں اپنی صفت "رَبُّ الْمَشَارِقِ" اور سورۂ معارج (۴۰) میں "بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ"

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

ع ۲۵ / ۱۱

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۸﴾ اس نے دو سمندروں کو ملا دیا، جو اس حال میں مل رہے ہیں کہ ﴿۱۹﴾ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے (جس سے) وہ آگے نہیں بڑھتے ﴿۲۰﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۱﴾ ان دونوں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں ﴿۲۲﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۳﴾ اور اسی کے ہیں بادبان اٹھائے ہوئے جہاز سمندر میں، جو پہاڑوں کی طرح ہیں ﴿۲۴﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۵﴾

---

بیان فرمائی ہے۔ یہاں سردی اور گرمی کے آخری دو مقامات کے اعتبار سے "رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ" فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ صافات (۵)۔

**آیت 18** فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: سورج کے طلوع و غروب، اس کی گردش اور اس کے متعدد مطالع و مغارب میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار قدرتیں ہیں اور اس سے موسموں کے بدلنے، بارشیں برسنے، برف گرنے، بے شمار قسم کی فصلیں اُگنے اور انسان کی راحت و آرام کے بے حساب سامان مہیا کرنے کی بے شمار نعمتیں ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ یاد دلا رہے ہیں۔

**آیت 19 تا 21** مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان (۵۳) کی تفسیر۔

**آیت 22** يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ: مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ''مرجان دراصل جمادات اور نباتات کے درمیان برزخی پیدائش ہے، جس طرح سب موتی پتھروں ہی کی قسم ہوتے ہیں، مرجان بھی پتھر ہی کی قسم ہے، لیکن یہ نباتات کی طرح بڑھتا ہے، جمادات کی طرح جامد نہیں۔ مرجان کا ایک چھوٹا سا پودا ہوتا ہے جس کی شاخیں بھی ہوتی ہیں۔ موتی اور مرجان عموماً کھاری پانی کی پیداوار ہیں، مگر اسی کھاری پانی کے نیچے اللہ کی قدرت سے میٹھے پانی کے چشمے بھی ابل رہے ہوتے ہیں، یا ساتھ ساتھ رواں دواں ہوتے ہیں، اس لیے " مِنْهُمَا" کا لفظ ارشاد فرمایا، یعنی یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے حیرت انگیز تخلیقی کارناموں کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔'' (تیسیر القرآن) مزید دیکھیے سورۂ نحل (۱۴)۔

**آیت 23** فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا بیان بھی ہے اور نعمتوں کا بھی۔

**آیت 24، 25** وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ...... : "الْمُنْشَئٰتُ" "أَنْشَأَ يُنْشِئُ" (افعال) (بنانا) سے اسم مفعول ہے، پہاڑوں جیسے لمبے چوڑے اور کئی منزلہ اونچے بحری جہاز ''جو بنائے گئے ہیں۔'' اس میں بحری جہاز بنانے کا طریقہ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۞ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞

ہر ایک جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والا ہے (۲۶) اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی شان اور عزت والا ہے (۲۷) تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ (۲۸)

سکھانے کی نعمت کی یاد دہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سکھانے سے انسان چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑتے ہوئے کتنا بڑا بحری جہاز بنا لیتا ہے۔ طبری رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد سے "الْمُنْشَئٰتُ" کا ایک اور معنی بھی نقل فرمایا ہے: "مَا رُفِعَ قِلْعُهُ مِنَ السُّفُنِ فَهِيَ مُنْشَئَاتٌ وَ إِذَا لَمْ يُرْفَعْ قِلْعُهَا فَلَيْسَتْ بِمُنْشَئَاتٍ" "وہ جہاز جن کے بادبان اٹھائے ہوئے ہوں وہ "مُنْشَئَاتٌ" ہیں اور جب ان کے بادبان اٹھائے ہوئے نہ ہوں تو وہ "مُنْشَئَاتٌ" نہیں ہیں۔"

واضح رہے کہ انجن کی ایجاد سے پہلے بحری جہازوں کا سفر موافق ہواؤں کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ چنانچہ اونچے اونچے ستونوں کے ساتھ کپڑے باندھ دیے جاتے، ہوا انھیں دھکیلتی ہوئی منزلِ مقصود پر پہنچا دیتی، انھیں بادبان کہا جاتا تھا۔ "باد" ہوا کو کہتے ہیں۔ اگر کہیں رکنا مقصود ہوتا تو وہ کپڑے اکٹھے کر دیے جاتے، اسے بادبان گرانا کہا جاتا تھا۔ اس معنی کے لحاظ سے بحری جہازوں پر اللہ تعالیٰ کی ایک اور نعمت کا ذکر ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ شوریٰ (۳۲) کی تفسیر۔ "وَلَهُ الْجَوَارِ" میں "لَهٗ" کو پہلے لانے سے تخصیص پیدا ہو گئی کہ یہ جہاز، ان کے بنانے کا طریقہ سکھانا، ہزاروں ٹن وزنی ہونے کے باوجود انھیں سمندر کے سینے پر قائم رکھنا اور ڈوبنے نہ دینا اور لوگوں کو اور ان کے سامان کو دور دراز ملکوں تک پہنچانا وغیرہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

**آیت 26** كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ: "فَانٍ" "فَنِيَ يَفْنٰى فَنَاءً" (س) سے اسم فاعل ہے۔ اس سے پہلے آیت (۱۰) میں زمین کا تذکرہ فرمایا ہے، اس کے بعد زمین پر موجود چیزوں کا ذکر فرمایا، جس میں جن و انس بھی شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نعمت کے رنگا رنگ نمونے بھی۔ اس کے بعد بتایا کہ ان میں سے کسی کو بھی بقا و دوام حاصل نہیں، سب فنا ہونے والے ہیں۔ بقا و دوام صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لیے ہے۔ (دیکھیے آلِ عمران: ۱۸۵۔ فرقان: ۵۸) آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۸۸) کی تفسیر۔

**آیت 27** وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ: "الْجَلٰلِ" کا معنی عظمت و کبریائی ہے اور "الْاِكْرَامِ" "أَكْرَمَ يُكْرِمُ" (افعال) کا مصدر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے "ذُوالْإِكْرَامِ" ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ عزت دینے والا وہی ہے، کوئی اور نہیں، جیسے فرمایا: ﴿ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ﴾ [ الحج: ۱۸ ] "اور جسے اللہ ذلیل کر دے پھر اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔" اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کا حق ہے کہ اس کا اِکرام کیا جائے، اس کے بندے اس کی توحید و تسبیح اور عبادت کے ساتھ اس کا اِکرام کرتے ہیں۔

**آیت 28** فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: زمین پر موجود ہر شخص کے فنا میں اللہ تعالیٰ کی قدرت تو ظاہر ہی ہے، اس میں اس

## یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ ۚ۝۲۹

### اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے ۲۹

کی نعمت بھی ہے، کیونکہ مرنے کے بغیر کوئی شخص اس کی جنت کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ اس کا دیدار حاصل کر سکتا ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

بے فنائے خود میسر نیست دیدار شما — مے فروشند خویش را اول خریدار شما

”اپنے فنا کے بغیر تمھارا دیدار میسر نہیں ہوتا، تمھیں خریدنے والے کو پہلے اپنا آپ بیچنا پڑتا ہے۔“

**آیت 29** ❶ **یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ:** یہ ہر چیز کے فانی ہونے اور اللہ تعالیٰ کے باقی ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ باقی ہے، کیونکہ وہ غنی ہے، اپنے وجود یا بقا یا کسی بھی چیز میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں، مگر اس کے سوا جو بھی ہے خواہ آسمان ہوں یا زمین یا جو ان دونوں میں ہے، سب اپنے وجود، اپنی بقا اور اپنی ہر ضرورت کے لیے ہر لمحے اس کے محتاج ہیں۔ اپنی ہر ضرورت اسی سے مانگ رہے ہیں، کوئی زبانِ قال سے مانگ رہا ہے، کوئی زبانِ حال سے اور کوئی دونوں سے۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ مانگنے پر موقوف ہے وہ کیا خاک باقی رہے گا۔

❷ **كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ:** ”**كُلَّ یَوْمٍ**“ سے مراد ہر وقت ہے۔ ”**شَاْنٍ**“ میں تنوین تنکیر کے لیے ہے، یعنی وہ ہر لمحے ایک نئی سے نئی شان میں ہے، کسی کو پیدا کر رہا ہے اور کسی کو مار رہا ہے، کسی کو اٹھا رہا ہے اور کسی کو گرا رہا ہے، کسی کو بیمار کر رہا ہے اور کسی کو شفا بخش رہا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَدُ اللّٰهِ مَلْأَى لَا تَغِيْضُهَا نَفَقَةٌ سَحَّاءُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ قَالَ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ فَإِنَّهُ لَمْ يَغِضْ مَا فِيْ يَدِهٖ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ وَبِيَدِهِ الْمِيْزَانُ يَخْفِضُ وَ يَرْفَعُ » [ بخاري، التفسير، سورة هود، باب قوله : ﴿ وكان عرشه على الماء ﴾ : ٤٦٨٤ ] ”اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، کسی قسم کا خرچ کرنا اس میں کمی نہیں لاتا، رات دن بے حساب برسنے والا ہے۔ تم نے دیکھا اس نے جب سے آسمان و زمین پیدا کیے، کیا کچھ خرچ کیا، تو اس (خرچ کرنے) نے اس میں کوئی کمی نہیں کی جو اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا عرش پانی پر تھا اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے۔ نیچے کرتا ہے اور اونچا کرتا ہے۔“ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ”**كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ**“ کی تفسیر کے بیان میں روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مِنْ شَأْنِهٖ أَنْ يَّغْفِرَ ذَنْبًا وَ يُفَرِّجَ كَرْبًا وَ يَرْفَعَ قَوْمًا وَ يَخْفِضَ آخَرِيْنَ » [ ابن ماجه، المقدمة، باب فيما أنكرت الجهمية : ۲۰۲، و قال الألباني حسن ] ”اس کی شان سے ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی گناہ بخش رہا ہے، کوئی نہ کوئی مصیبت دور کر رہا ہے اور کسی قوم کو اونچا کر رہا ہے اور کسی کو نیچا کر رہا ہے۔“

❸ اس میں یہود کا بھی رد ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان پیدا فرمائے اور ہفتہ کے دن آرام کیا۔ فرمایا وہ ہر دن ہی نئی شان میں ہے، اسے نہ تھکاوٹ ہوتی ہے نہ آرام کی ضرورت ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۰ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝۳۱

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ۝۳۰ ہم جلد ہی تمھارے لیے فارغ ہوں گے اے دو بھاری گروہو! ۝۳۱

۵ یونان کے فلسفی آسمانی ہدایت سے محروم تھے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کا وجود ماننے کے باوجود اپنے دیوتاؤں کی گنجائش نکالنے کے لیے ایک قاعدہ وضع کیا، جو یہ تھا کہ ''ہر محلّ حوادث حادث ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے، اس لیے اس پر حوادث نہیں آسکتے۔'' افسوس! بعض مسلمان متکلمین نے بھی ان کا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کر دیا۔ بعض نے تاویل کی اور ایسی تاویل کی جو درحقیقت بدترین تحریف ہے۔ مثلاً اللہ کی صفت کلام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ [ النساء : ١٦٤ ] ''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ [ التوبة : ٦ ] ''اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [ يٰسٓ : ٨٢ ] ''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔'' یہ ساری کائنات اس کے کلمہ کُنْ سے وجود میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کلام کا ہر لفظ حادث ہے، پہلے موجود نہیں ہوتا، پھر وجود میں آتا ہے، اس لیے متکلمین نے اللہ تعالیٰ کے کلام کا انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، سنتا ہے، اترتا ہے، بلند ہوتا ہے، خوش ہوتا ہے، ناراض ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ صفات اور اس جیسی دوسری صفات اللہ تعالیٰ میں ہمیشہ سے ہیں، ان کی انواع قدیم ہیں مگر افراد حادث ہیں، ان کا اظہار مختلف اوقات میں ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کلام کرتا ہے، نیچے اترتا ہے، بلند ہوتا ہے، پیدا کرتا ہے، مارتا ہے، ہر ایک کو ہر لمحے روزی بخشتا ہے، ہر لمحے ہر ایک کو دیکھتا ہے، اس کی سنتا ہے، اس کی ضرورت پوری کرتا ہے، مگر یونانی فلسفیوں کی تقلید میں متکلمین نے اللہ تعالیٰ کو سننے، دیکھنے، بولنے، خوش ہونے، ناراض ہونے، غرض اس طرح کی تمام صفات سے عاری قرار دیا۔ اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کے سوال کو سنتا ہے اور ہر لمحے نئی سے نئی شان میں ہے؟ اب ہم یونان کے کافر فلاسفر اور ان کے مقلد بعض متکلمین کی بات مانیں کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی نئی شان وارد نہیں ہو سکتی یا اللہ تعالیٰ کی بات پر ایمان رکھیں کہ وہ ہر لمحے ایک نئی سے نئی شان میں ہے؟ ظاہر ہے جس کے دل میں ایمان ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی بات مانے گا، خواہ کوئی فلسفی اسے مانے یا نہ مانے۔

**آیت 31** سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ: ''الثَّقَلٰنِ'' ''ثَقَلٌ'' کی جمع ہے، بھاری اور وزنی چیز۔ مراد زمین پر آباد جاندار مخلوق میں سے دو بھاری اور کثیر التعداد جماعتیں جن و انس ہیں۔ مخلوقات میں سے شرعی احکام کی تکلیف ان دونوں ہی کو دی گئی ہے، اس لیے انھی کو مخاطب فرمایا۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ''سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ'' کے

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۲﴾ اے جن و انس کی جماعت! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ، کسی غلبے کے سوا نہیں نکلو گے ﴿۳۳﴾

بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل کی ہے: "وَعِیْدٌ مِنَ اللّٰهِ لِلْعِبَادِ وَلَیْسَ بِاللّٰهِ شُغُلٌ وَ هُوَ فَارِغٌ" یعنی "یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے وعید ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کو دوسرے کسی کام سے روکنے والی کوئی مشغولیت نہیں اور وہ فارغ ہے۔" امام بخاری نے فرمایا: "سَنَفْرُغُ لَكُمْ سَنُحَاسِبُكُمْ لَا یَشْغَلُهٗ شَیْءٌ عَنْ شَیْءٍ وَهُوَ مَعْرُوْفٌ فِیْ كَلَامِ الْعَرَبِ یُقَالُ لَأَتَفَرَّغَنَّ لَكَ وَمَا بِهٖ شُغُلٌ یَقُوْلُ لَآخُذَنَّكَ عَلٰی غِرَّتِكَ" [ بخاري، التفسير، سورة الرحمن، قبل الحديث : ٤٨٧٨ ] یعنی "سَنَفْرُغُ لَكُمْ" (ہم جلد ہی تمھارے لیے فارغ ہوں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ہم جلد ہی تمھارا حساب لیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز دوسری چیز سے رکاوٹ نہیں بنتی اور یہ کلام عرب میں معروف ہے۔ کہا جاتا ہے، میں تمھارے لیے فارغ ہوں گا، حالانکہ اسے کوئی مشغولیت نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں تمھاری غفلت میں تمھیں پکڑوں گا۔" "سَنَفْرُغُ لَكُمْ" کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اے جنو اور انسانو! ہم نے تمھارے لیے ایک نظام الاوقات طے کر دیا ہے، دنیا میں تمھارے پاس عمل کی مہلت ہے، یہاں ہم ہر لمحے تمھاری ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، جو مانگتے ہو دے رہے ہیں، بہت جلد ہم اس مرحلے سے فارغ ہوں گے، پھر قیامت قائم ہوگی اور تمھارے محاسبے کا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔

**آیت 32** فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اس نظام عالم کو درہم برہم کر کے قیامت برپا کرنا، ان دونوں جماعتوں سے حساب لینا، پھر اس کے مطابق جزا و سزا دینا اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی عظیم قدرت کا اظہار بھی ہے اور اہل ایمان کے لیے بہت بڑی نعمت بھی، جس کے متعلق فرمایا: ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ "کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟"

**آیت 33** یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ ...... : "مَعْشَرٌ" "عَشْرٌ" سے "مَفْعَلٌ" کے وزن پر ہے، کثیر التعداد جماعت کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بہت سے عشرات پائے جاتے ہیں، جن کا شمار کیے بعد دیگرے دہائیوں میں ہوتا ہے۔ "اَقْطَارِ" "قُطْرٌ" کی جمع ہے، کنارا۔ "سُلْطَانٌ" "قدرت اور غلبہ۔" یعنی اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! دنیا میں اگر تم موت سے بچنے کے لیے آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ، مگر تم اللہ تعالیٰ پر غالب آ کر ہی نکل سکو گے، جس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ﴾ [ النساء : ۷۸ ] "تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔" اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

**تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۴﴾ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا، پھر تم اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے ﴿۳۵﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۶﴾**

کے محاسبے اور اس کی گرفت سے بچنے کے لیے اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ...... اس سے ملتا جلتا مفہوم اس آیت کا ہے، فرمایا: ﴿ **فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ۙ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۚ کَلَّا لَا وَزَرَ ؕ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ ۣ الْمُسْتَقَرُّ** ﴾ [ القیامۃ : ۷ تا ۱۲ ] ”پھر جب آنکھ پتھرا جائے گی۔ اور چاند گہنا جائے گا۔ اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے۔“ آج کل راکٹ یا خلائی گاڑی کے ذریعے سے چاند پر یا کسی اور کُرے پر جانے کے تجربات ہو رہے ہیں، بعض لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ” **لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ** “ (تم غلبے کے بغیر نہیں نکل سکو گے ) سے مراد یہ ہے کہ ان مشینوں کے ذریعے سے ” **اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** “ سے نکلنا ممکن ہے، حالانکہ ان کوششوں کی آیت کے مفہوم کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ یہ بے چارے تو زمین و آسمان کے درمیان خلا میں پھر رہے ہیں، آسمان و زمین کے کناروں تک رسائی تو بہت دور ہے۔ پھر وہ ذرۂ بے مقدار، جس کا ایک سانس بھی اس کے اپنے اختیار میں نہیں، وہ اپنی قوت کے ساتھ ” **اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** “ سے نکلنے کی بات کرے تو یہی کہا جا سکتا ہے ؎

شان ہے تیری کبریائی کی بت کریں آرزو خدائی کی

آیت 34 ﴿ **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** : یہاں ” **اٰلَآء** “ کا معنی ”قدرتیں“ واضح ہے اور وعید گناہوں سے باز آنے کا باعث ہونے کی وجہ سے عظیم نعمت بھی ہے۔

آیت 35 ﴿ **یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ** ...... : ” **شُوَاظٌ** “ آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو اور ” **نُحَاسٌ** “ دھواں۔ ” **نُحَاسٌ** “ کا معنی تانبا بھی ہے، مراد پگھلا ہوا تانبا ہے۔ ” اِنْتَصَرَ یَنْتَصِرُ اِنْتِصَارًا “ اپنا بچاؤ کرنا، انتقام لینا۔ یعنی تم ہمارے قبضے سے کسی صورت بھی نکل کر بھاگ نہیں سکتے، اگر تم یہ ارادہ کرو گے تو تم پر خالص آگ کے شعلے برسائے جائیں گے، جو تمھیں جلا کر بھسم کر دیں گے اور دھواں جو تمھارے سانس تک بند کر دے گا، پھر نہ تم اپنا بچاؤ کر سکو گے اور نہ کسی طرح انتقام لے سکو گے۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ تم پر آگ کے شعلوں کے ساتھ پگھلا ہوا تانبا پھینکا جائے گا، جو دونوں تمھیں جلا کر راکھ بنا دیں گے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۚ﴿۳۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ ۚ﴿۴۱﴾

**پھر جب آسمان پھٹ جائے گا، تو وہ سرخ چمڑے کی طرح گلابی ہو جائے گا ﴿۳۷﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۸﴾ پھر اس دن نہ کسی انسان سے اس کے گناہ کے متعلق پوچھا جائے گا اور نہ کسی جن سے ﴿۳۹﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۰﴾ مجرم اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے، پھر پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑا جائے گا ﴿۴۱﴾**

**آیت 37** فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ ...... : ”وَرْدَةً“ گلاب کے پھول کی طرح گلابی۔ ”اَلدِّهَانُ“ میں علماء کے دو قول ہیں، ایک سرخ چمڑا اور دوسرا ”تیل“ جو ملا جاتا ہے۔ اس معنی میں بعض کہتے ہیں: ”اَلدِّهَانُ“ ”دُهْنٌ“ کی جمع ہے اور بعض کہتے ہیں مفرد ہے۔ تیل کو ”دُهْنٌ“ بھی کہتے ہیں اور ”دِهَانٌ“ بھی۔ ”فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حاقہ (۱۶)، فرقان (۲۵) اور سورۂ انشقاق (۱، ۲)۔

اگر ”اَلدِّهَانُ“ کا معنی سرخ چمڑا کریں تو اس وقت آیت میں آسمان کے ایک وصف کا بیان ہے کہ آسمان جو آج نیلگوں ہے اس وقت سرخ چمڑے کی طرح لال گلابی ہو جائے گا اور اگر ”اَلدِّهَانُ“ کا معنی تیل کیا جائے تو آیت میں آسمان کے پھٹنے کے وقت اس کے دو وصفوں کا بیان ہوگا، ایک یہ کہ وہ حرارت کی شدت سے سرخ ہوگا اور دوسرا یہ کہ پگھل کر تیل کی طرح ہو جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴾ [ المعارج : ۸ ] ”جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے (یا تلچھٹ) کی طرح ہو جائے گا۔“ (شنقیطی)

**آیت 39** فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ : یعنی اس دن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون مجرم ہے اور اس نے کیا گناہ کیا ہے، کسی انسان یا جن سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، کیونکہ تمام مجرم اپنی علامت ہی سے پہچانے جائیں گے، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے: ﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ﴾ ”مجرم اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے۔“ اور جیسا کہ سورۂ قصص میں فرمایا: ﴿ وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ [ القصص: ۷۸ ] ”اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔“ ہاں ڈانٹنے، ذلیل کرنے اور ملامت کرنے کے لیے ضرور پوچھا جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَوَ رَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الحجر : ۹۲، ۹۳ ] ”سو تیرے رب کی قسم ہے! یقیناً ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے۔ اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۲٤ ] ”اور انھیں ٹھہراؤ، بے شک یہ سوال کیے جانے والے ہیں۔“

**آیت 41** ① يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ...... : ”اَلنَّوَاصِيْ“ ”نَاصِيَةٌ“ کی جمع ہے، پیشانی کے بال۔ (دیکھیے ہود:

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۲﴾ یہی ہے وہ جہنم جسے مجرم لوگ جھٹلاتے تھے ﴿۴۳﴾ وہ اس کے درمیان اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر کاٹتے رہیں گے ﴿۴۴﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۵﴾ اور اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا، دو باغ ہیں ﴿۴۶﴾

۵۶) یعنی ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ [ آل عمران : ۱۰۶ ] ''جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔'' آنکھیں نیلی ہوں گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا﴾ [ طٰہٰ : ۱۰۲ ] ''اور ہم مجرموں کو اس دن اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے۔'' اور اعمال نامے پیٹھ کے پیچھے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھے ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ انشقاق (۱۰) اور سورۂ حاقہ (۲۵)۔
② فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ : یعنی ہر مجرم کو پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

آیت 43 هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ : یہ بات مجرموں سے کہی جائے گی (دیکھیے طور : ۱۴) اور یہ بھی ہے کہ ہمیں سمجھانے کے لیے یہ بات بتائی جا رہی ہے۔

آیت 44 يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ : ''اٰنٍ'' ''أَنٰى يَأْنِيْ إِنًى'' (ض) سے اسم فاعل ہے، جیسا کہ ''قَاضٍ'' ہے، انتہائی گرم، کھولنے والا۔ سورۂ غاشیہ میں ہے: ﴿تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ﴾ [الغاشیۃ:۵] ''وہ ایک کھولتے ہوئے چشمے سے پلائے جائیں گے۔'' ''إِنًى'' کھانے کا پک کر تیار ہونا، جیسے فرمایا: ﴿غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ﴾ [ الأحزاب : ۵۳ ] ''اس حال میں کہ اس کے پکنے کا انتظار کرنے والے نہ ہوں۔'' ''يَطُوْفُوْنَ'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۶۶ تا ۶۸)۔

آیت 46 ① وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ : ''مَقَامَ'' ''قَامَ يَقُوْمُ قِيَامًا'' (ن) سے ظرف بھی ہو سکتا ہے ''کھڑا ہونے کی جگہ یا وقت'' اور مصدر میمی بھی ہو سکتا ہے ''کھڑا ہونا۔'' جہنم اور اہلِ جہنم کے تذکرے کے بعد اہلِ جنت کا ذکر فرمایا۔ ''مَقَامَ رَبِّهٖ'' کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں قرآن مجید کی آیات میں ملتے ہیں، ایک یہ کہ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اس کے لیے دو باغ ہیں۔ اس صورت میں ''مَقَامَ رَبِّهٖ'' سے مراد بندے کا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے، فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [ المطففین : ۶ ] ''جس دن لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے۔'' دوسرا یہ کہ جو شخص اپنے رب کے (اپنے اوپر ہر وقت) قائم (نگران) ہونے سے ڈر گیا۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے، فرمایا: ﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا

كَسَبَتْ ﴾ [ الرعد : ۳۳ ] ”تو کیا وہ جو ہر جان پر اس کا نگران ہے جو اس نے کمایا (کوئی دوسرا اس کے برابر ہو سکتا ہے)؟“ آیت سے دونوں معنی بیک وقت مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی قرآن مجید کا ایک کمال ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ متعدد معانی کا حامل ہے۔ یعنی جو شخص اس بات سے ڈر گیا کہ اس نے قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اس بات سے بھی ڈرتا رہا کہ اس کا رب اس کی ہر چھوٹی بڑی حرکت کو دیکھ رہا ہے، تو اس کے لیے دو باغ ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ جنت کی وراثت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، کیونکہ یہی وہ جوہر ہے جو انسان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو موقع میسر ہونے پر انسان کو کوئی بھی چیز کسی بھی جرم کے ارتکاب سے نہیں روک سکتی اور جب یہ موجود ہو تو آدمی کے قدم مشکل سے مشکل مقام پر نہیں ڈگمگاتے۔ صحیح بخاری (٦٦٠) میں قیامت کے دن جن سات آدمیوں کو عرش کا سایہ ملنے کی بشارت دی گئی ہے ان سب کے اعمال میں اصل اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی ہے اور اس کفن چور کی مغفرت کا باعث بھی اللہ کا ڈر تھا جس نے وصیت کی تھی کہ مجھے جلا کر میری کچھ راکھ کو ہوا میں اڑا دیا جائے اور کچھ کو پانی میں بہا دیا جائے۔ (دیکھیے بخاری: ۳۴۵۲) ”مَقَامَ رَبِّهٖ“ کے لفظ میں خوف کے ساتھ محبت کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ وہ کسی اجنبی یا ظالم سے نہیں ڈر رہا، بلکہ اپنے مالک سے ڈر رہا ہے جس نے اسے پیدا کیا، پھر ہر لمحے اس کی پرورش کر رہا ہے اور اس کی ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔

② جَنَّتٰنِ: ”جَنَّةٌ“ کا اصل معنی باغ ہے۔ قرآن مجید میں کہیں یہ لفظ مفرد آیا ہے اور تمام اہلِ ایمان کے ایک ہی جنت میں داخلے کا ذکر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ المؤمن : ٤٠ ] ”اور جس نے کوئی نیک عمل کیا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہوا تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اس میں بے حساب رزق دیے جائیں گے۔“ اور کہیں جمع آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ [ البقرة : ۲۵ ] ”اور ان لوگوں کو خوش خبری دے دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے کہ ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہتی ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اس بڑے باغ میں بے شمار باغات ہیں، جن میں سے ہر مومن کو دو دو باغ عطا کیے جائیں گے، جن کا وہ مالک ہوگا (لام تملیک کے لیے ہے) اور جن میں وہ سب کچھ ہوگا جس کا آگے ذکر ہو رہا ہے۔

③ ان آیات میں ہر اس شخص کو دو دو باغ ملنے کا ذکر ہے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا۔ چند آیات کے بعد اور دو باغوں کا ذکر ہے، فرمایا: ﴿ وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾ جس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ بھی دو باغ ہیں اور یہ بھی کہ ان دونوں سے کم درجے والے بھی دو باغ ہیں۔ دونوں آیات کو ملائیں تو مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ دو اور باغ ہیں جو پہلے باغوں سے کم درجے کے ہیں۔ تحقیق یہی ہے کہ پہلے دو باغ اعلیٰ ہیں جو مقرّبین کے لیے ہیں اور دوسرے دو باغ ان سے کم درجے والے ہیں جو اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔ سورۂ واقعہ میں بھی سابقین کو مقرّبین قرار دے کر

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾

**تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۷﴾ دونوں بہت شاخوں والے ہیں ﴿۴۸﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۹﴾ ان دونوں میں دو چشمے ہیں، جو بہ رہے ہیں ﴿۵۰﴾**

انھیں ملنے والی نعمتوں کا پہلے الگ ذکر فرمایا ہے، اس کے بعد اصحاب الیمین کا ذکر کر کے انھیں ملنے والی نعمتوں کا الگ ذکر فرمایا، یہاں بھی ایسے ہی ہے، تقریباً ہر نعمت میں دونوں کا فرق نمایاں ہے، تفسیر میں اس فرق کی طرف اشارہ آ رہا ہے۔
امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں یہ حدیث ذکر فرمائی ہے کہ عبداللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری) رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( جَنَّتَانِ مِنْ فِضَّةٍ، آنِيَتُهُمَا وَمَا فِيْهِمَا، وَجَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ آنِيَتُهُمَا وَمَا فِيْهِمَا، وَمَا بَيْنَ الْقَوْمِ وَ بَيْنَ أَنْ يَّنْظُرُوْا إِلٰى رَبِّهِمْ إِلَّا رِدَاءُ الْكِبْرِ عَلٰى وَجْهِهِ فِيْ جَنَّةِ عَدْنٍ )) [ بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ ومن دونهما جنتان ﴾ : ۴۸۷۸ ] ”دو باغ ایسے ہیں جن کے برتن اور جو کچھ ان دونوں میں ہے چاندی کا ہے اور دو باغ ایسے ہیں جن کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے سونے کا ہے۔ اور جنت عدن میں جنتیوں کے درمیان اور ان کے اپنے رب کو دیکھنے کے درمیان کبریائی کی چادر کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں جو اس کے چہرے پر ہے۔“ صحیح بخاری میں اس کی سند اس طرح ہے: ”حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَبِي الْأَسْوَدِ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ الصَّمَدِ الْعَمِّيُّ، حَدَّثَنَا أَبُوْ عِمْرَانَ الْجَوْنِيُّ عَنْ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ قَيْسٍ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ......“ فتح الباری (۶۲۴/۸) میں ہے کہ اسی حدیث کو ابن مردویہ نے (عبدالعزیز کے بجائے) ”حَمَّادٌ عَنْ أَبِيْ عِمْرَانَ“ بیان کیا ہے، اس میں یہ لفظ ہیں: (( مِنْ ذَهَبٍ لِلسَّابِقِيْنَ وَ مِنْ فِضَّةٍ لِلتَّابِعِيْنَ )) یعنی سابقین کے لیے سونے والے اور تابعین کے لیے چاندی والے باغ ہوں گے۔ اور ابوبکر سے ثابت کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: (( مِنْ ذَهَبٍ لِلْمُقَرَّبِيْنَ وَ مِنْ فِضَّةٍ لِأَصْحَابِ الْيَمِيْنِ )) یعنی سونے والے باغ مقربین کے لیے اور چاندی والے اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔ اس حدیث کے طرق سے واضح ہے کہ پہلے دو باغ مقربین کے لیے ہیں اور دوسرے دو باغ اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔

**آیت 48** ﴿ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴾: ”اَفْنَانٍ“ ”فَنَنٌ“ کی جمع ہے، سیدھی لمبی شاخ اور ”فَنٌّ“ کی جمع بھی ہے جس کا معنی نوع ہے۔ بہت شاخوں والے سے مراد شاخوں، پتوں اور پھلوں کی کثرت ہے، ورنہ باغوں کی ٹہنیاں تو ہوتی ہی ہیں اور اگر ”اَفْنَانٍ“ ”فَنٌّ“ کی جمع ہو تو مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں باغ بہت سی قسموں کے پودوں اور درختوں والے ہیں۔

**آیت 50** ﴿ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴾: چشمے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن سے اتنا پانی نکلتا ہے جو آگے بہنے لگتا ہے اور ندی نالے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایک وہ جن سے پانی نکلتا ہے مگر اتنا ہی جتنا ان میں سے نکالا جاتا ہے، جیسا کہ زمزم کا چشمہ پھوٹ کر نکلا اور ہاجرہ علیہا السلام نے اس کے گرد ریت وغیرہ کی منڈیر بنا دی تو وہ وہیں رک گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیۡہِمَا مِنۡ کُلِّ فَاکِہَۃٍ زَوۡجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّکِـِٕیۡنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُہَا مِنۡ اِسۡتَبۡرَقٍ ؕ وَ جَنَا الۡجَنَّتَیۡنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیۡہِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ لَمۡ یَطۡمِثۡہُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَہُمۡ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۱﴾ ان دونوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں ﴿۵۲﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۳﴾ ایسے بستروں پر تکیہ لگائے ہوئے، جن کے استر موٹے ریشم کے ہیں اور دونوں باغوں کا پھل قریب ہے ﴿۵۴﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۵﴾ ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں، جنھیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ کسی جن نے ﴿۵۶﴾

''اللہ ام اسماعیل پر رحم فرمائے، اگر وہ اس کے گرد منڈیر نہ بناتی تو وہ ندی کی صورت میں جاری ہو جاتا۔'' (دیکھیے، بخاری: ۲۳٦۸) مطلب یہ ہے کہ ان دونوں چشموں کا پانی ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہیں بلکہ بہ رہا ہے۔

**آیت 52** فِیۡہِمَا مِنۡ کُلِّ فَاکِہَۃٍ زَوۡجٰنِ: ہر پھل کی دو قسموں سے مراد یا تو ایک وہ ہے جو دنیا میں تھی اور دوسری وہ جو نہ کسی نے سنی، نہ دیکھی اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی پھل میں متعدد ذائقے ہوں گے، جیسا کہ دنیا میں آم ہی کو لے لیجیے، ہر آم کا ذائقہ جدا ہے۔ دنیا کے پھلوں کی جنت کے پھلوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ''زَوۡجٰنِ'' تثنیہ کا لفظ جمع اور کثرت کے معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ''التحریر والتنویر'' میں اس کے کئی شواہد ذکر کیے گئے ہیں۔

**آیت 54** ① مُتَّکِـِٕیۡنَ عَلٰی فُرُشٍ......: ''مُتَّکِـِٕیۡنَ'' ''وَکِیٌٔ'' سے ''اِتَّکَأَ یَتَّکِیُٔ اِتِّکَاءً'' (افتعال) سے اسم فاعل ''مُتَّکِیٌٔ'' کی جمع ہے، پہلو پر کہنی کے سہارے لیٹے ہوئے یا ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے شخص کو کہتے ہیں۔ ''فُرُشٍ'' ''فِرَاشٌ'' کی جمع ہے، جیسے ''کِتَابٌ'' کی جمع ''کُتُبٌ'' ہے۔ ''بَطَائِنُ'' ''بِطَانَۃٌ'' کی جمع ہے، گدّے کے بیرونی حصے کو ''ظِھَارَۃٌ'' اور اندرونی حصے کو ''بِطَانَۃٌ'' کہتے ہیں۔ اردو میں ''بِطَانَۃٌ'' کو استر اور ''ظِھَارَۃٌ'' کو ابرا کہتے ہیں۔ ''اِسۡتَبۡرَقٍ'' موٹا ریشم جس میں سونے کی تاریں ہوں۔ یعنی اپنے رب سے ڈرنے والے یہ جنتی بے فکری کے ساتھ ایسے بستروں پر ٹیک لگا کر بیٹھے یا لیٹے ہوں گے جن کے استر موٹے ریشم کے ہوں گے۔ جب استر ایسے ہوں گے تو ابرے کس شان کے ہوں گے۔

② وَجَنَا الۡجَنَّتَیۡنِ دَانٍ: ''جَنَا'' ''جَنٰی یَجۡنِیۡ'' (ض) (پھل چننا) سے مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، پھل۔ ''دَانٍ'' ''دَنَا یَدۡنُوۡ دُنُوًّا'' (ن) سے اسم فاعل ہے، قریب۔ یعنی دونوں باغوں کا پھل قریب ہوگا، کھڑے، بیٹھے اور لیٹے جب چاہیں گے چن سکیں گے۔

**آیت 56** ① فِیۡہِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ: ''فِیۡہِنَّ'' کی ضمیر ''فُرُشٍ'' کی طرف جا رہی ہے۔ ''قٰصِرٰتُ'' ''قَصَرَ یَقۡصُرُ''

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟﴿۵۷﴾ گویا وہ (عورتیں) یاقوت اور مرجان ہیں ﴿۵۸﴾

قَصْرًا" (روکنا) سے اسم فاعل ہے، آنکھوں کو خاوندوں پر روک کر رکھنے والیاں۔ جنت کے محلوں، چشموں اور باغوں میں بچھے ہوئے بستروں میں جنتیوں کا دل لگانے والی عورتوں کے ظاہری و باطنی اوصاف اور ان کے کمال و جمال کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا معنوی حسن بیان فرمایا کہ ان کی آنکھیں خاوندوں کے سوا کسی اور کی طرف نہیں اٹھیں گے اور نہ ہی ان کی نگاہ میں ان کے خاوندوں سے بڑھ کر کوئی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وصف ہی ہزاروں اوصاف پر بھاری ہے، کوئی عورت کتنی ہی حسین و جمیل ہو، اس وصف سے عاری ہو تو مرد غیور کی نگاہ میں اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں رہتی۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

وَ أَتْرُكُ حُبَّهَا مِنْ غَيْرِ بُغْضٍ    وَ ذَاكَ لِكَثْرَةِ الشُّرَكَاءِ فِيْهِ
إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ عَلٰى طَعَامٍ    رَفَعْتُ يَدِيْ وَ نَفْسِيْ تَشْتَهِيْهِ
وَ تَجْتَنِبُ الْأُسُوْدُ وُرُوْدَ مَاءٍ    إِذَا كَانَ الْكِلَابُ وَلَغْنَ فِيْهِ

''میں اس کی محبت کسی بغض کے بغیر ترک کر رہا ہوں، کیونکہ اس محبت میں اور بھی کئی شریک ہیں۔ جب مکھی کھانے پر آ گرے تو میں اپنا ہاتھ اٹھا لیتا ہوں، حالانکہ میرا دل اسے چاہ رہا ہوتا ہے۔ اور شیر پانی پر آنے سے اجتناب کرتے ہیں، جب کتوں نے اس میں منہ ڈال دیا ہو۔''

﴿2﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ: "طَمَثَ يَطْمِثُ طَمْثًا" (ض) چھونا۔ یعنی وہ عورتیں کنواری ہوں گی، اگر دنیا میں خاوندوں کے پاس رہی ہوں گی تب بھی جنت میں آ کر نئے سرے سے کنواری ہو جائیں گی اور جنت میں ملنے والے خاوندوں سے پہلے کسی نے انھیں چھوا تک نہ ہوگا۔ اصحاب الیمین کو ملنے والی عورتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ عُرُبًا اَتْرَابًا ۙ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴾ [ الواقعة : ۳۵ تا ۳۸ ] ''بلاشبہ ہم نے ان (بستروں والی عورتوں) کو پیدا کیا، نئے سرے سے پیدا کرنا۔ پس ہم نے انھیں کنواریاں بنا دیا۔ جو خاوندوں کی محبوب، ان کی ہم عمر ہیں۔ دائیں ہاتھ والوں کے لیے۔'' پھر مقربین کو ملنے والی بیویوں کا معاملہ تو ان سے کہیں بڑھ کر ہوگا۔

﴿3﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جن بھی جنت میں جائیں گے، وہاں انسانوں کو ان کی جنس سے بیویاں ملیں گی اور جنوں کو ان کی جنس سے، کیونکہ دوسری جنس سے نہ موافقت ہوتی ہے نہ انس، پھر "اَتْرَابًا" (مٹی میں کھیلنے والے ہم جولی) ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آیت 58 ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ: "الْيَاقُوْتُ" سرخ رنگ کا پتھر جو اتنا صاف شفاف ہوتا ہے کہ اس کے درمیان سوراخ میں دھاگا ڈالا جائے تو باہر سے نظر آتا ہے۔ "الْمَرْجَانُ" مونگے (چھوٹے موتی) کو کہتے ہیں۔ جنتی عورتوں کی سرخ و سفید رنگت، دلکشی، صفائی اور شفافیت میں انھیں یاقوت اور مرجان سے تشبیہ دی ہے۔ محمد (ابن سیرین) کہتے ہیں:

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ ۵۹ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ ۶۰

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ (۵۹) نیکی کا بدلا نیکی کے سوا کیا ہے (۶۰)

(( إِمَّا تَفَاخَرُوْا وَ إِمَّا تَذَاكَرُوا الرِّجَالُ فِي الْجَنَّةِ أَكْثَرُ أَمِ النِّسَاءُ ؟ فَقَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ أَوَ لَمْ يَقُلْ أَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَوَّلَ زُمْرَةٍ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰى صُوْرَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا عَلٰى أَضْوَإِ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِي السَّمَاءِ لِكُلِّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ زَوْجَتَانِ اثْنَتَانِ يُرٰى مُخُّ سُوْقِهِمَا مِنْ وَّرَاءِ اللَّحْمِ وَمَا فِي الْجَنَّةِ عَزَبٌ )) [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب أول زمرة تدخل الجنة : ٢٨٣٤ ] ”یا تو اس بات پر کہ لوگوں نے عورتوں اور مردوں کے مابین فخر کا ذکر کیا، یا ویسے ہی گفتگو ہوئی کہ جنت میں مرد زیادہ ہوں گے یا عورتیں؟ تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”کیا ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہو گی چودھویں کے چاند کی طرح ہو گی اور اس کے بعد والی جماعت آسمان کے سب سے زیادہ روشن چمکدار ستارے کی طرح ہو گی، ان میں سے ہر مرد کی دو بیویاں ہوں گی، جن کی پنڈلیوں کا مغز گوشت کے پار سے نظر آ رہا ہو گا اور جنت میں کوئی شخص بیوی کے بغیر نہیں ہو گا۔“ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَرَوْحَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَوْ غَدْوَةٌ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا ، وَلَقَابُ قَوْسِ أَحَدِكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ أَوْ مَوْضِعُ قِيْدٍ يَعْنِيْ سَوْطَهُ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا وَلَوْ أَنَّ امْرَأَةً مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ اطَّلَعَتْ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ لَأَضَاءَتْ مَا بَيْنَهُمَا وَلَمَلَأَتْهُ رِيْحًا ، وَلَنَصِيْفُهَا عَلٰى رَأْسِهَا خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا )) [بخاري، الجهاد و السير، باب حور العين وصفتهن: ٢٧٩٦ ] ”اللہ کے راستے میں ایک شام یا ایک صبح دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور جنت میں تمھارے کسی ایک کی ایک کمان یا ایک کوڑے کے برابر جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور اگر اہلِ جنت کی کوئی عورت زمین والوں کی طرف جھانک لے تو زمین و آسمان کے درمیان کا سارا حصہ روشن ہو جائے اور یہ سارا خلا خوشبو سے بھر جائے اور اس کے سر کا دوپٹا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔“

آیت 60 ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾: پہلے احسان کا معنی نیکی اور دوسرے احسان کا معنی اس نیکی کا نیک صلہ یعنی جنت ہے۔ حدیثِ جبریل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کا مطلب یہ بیان فرمایا: (( أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ ، فَإِنَّكَ إِنْ لَا تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ )) [مسلم ، الإيمان ، باب الإيمان ما هو ؟ ...... : ٩ ] ”تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔“ ظاہر ہے جس شخص نے اپنی زندگی اپنے پروردگار کو ہر وقت اپنے اوپر نگران ہونے کے یقین اور احتیاط کے ساتھ گزاری اس کا بدلا بھی ایسا ہی اچھا اور خوبصورت ہونا چاہیے، جس کا بیان ان آیات میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حصر کے ساتھ جو فرمایا کہ ”نیکی کا بدلا نیکی کے سوا کیا ہے؟“ تو اس سے عدل و انصاف کے تقاضے کے مطابق بدلا مراد ہے، ورنہ مشرک اور ظالم تو نیکی کا بدلا برائی سے دیتے ہیں، گویا یہ ایک طرح ان پر طنز بھی ہے۔ کفار کے طرزِ عمل کی مثالوں کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۵، ۶۶)، اعراف (۱۹۰) اور سورۂ واقعہ (۸۲)۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ وَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدۡہَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِیۡہِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِیۡہِمَا فَاکِہَۃٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِیۡہِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۱﴾ اور ان دو (باغوں) کے علاوہ اور دو باغ ہیں ﴿۶۲﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۳﴾ دونوں سیاہی مائل گہرے سبز ہیں ﴿۶۴﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۵﴾ ان دونوں میں جوش مارتے ہوئے دو چشمے ہیں ﴿۶۶﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۷﴾ ان دونوں میں پھل اور کھجوروں کے درخت اور انار ہیں ﴿۶۸﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۹﴾ ان میں کئی خوب سیرت، خوبصورت عورتیں ہیں ﴿۷۰﴾

آیت 62 وَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا جَنَّتٰنِ: جیسا کہ "وَ لِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ" کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ پہلی دو جنتیں جن کا ذکر اوپر گزرا، اللہ سے ہمیشہ ڈرنے والے مقربین کے لیے ہیں اور یہاں سے عام اہل ایمان یعنی اصحاب الیمین کو ملنے والی جنتوں کا ذکر ہوتا ہے، جو کئی باتوں میں پہلی دونوں جنتوں کے ساتھ مشترک اور کئی باتوں میں ان سے کم تر ہیں۔

آیت 64 مُدۡہَآمَّتٰنِ: "اِدۡهَمَّ يَدۡهَمُّ اِدۡهِمَامًا" (افعلال) سیاہ ہونا اور "اِدۡهَامَّ يَدۡهَامُّ اِدۡهِيمَامًا" (افعیلال) بہت سیاہ ہونا۔ یعنی وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے جیسے بہت سیاہ ہوں۔ پہلے دو باغوں میں شاخوں اور پتوں کی کثرت کا ذکر ہے جن کے ضمن میں ان کا گہرا سبز ہونا خود بخود آ جاتا ہے اور یہاں صرف ان کے گہرے سبز رنگ کا ذکر ہے۔

آیت 66 فِیۡہِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ: "نَضَخَ يَنۡضَخُ نَضۡخًا" (ف) "اَلۡمَاءُ" پانی کا جوش سے نکلنا۔ یعنی ان دونوں جنتوں میں دو جوش مارنے والے چشمے ہوں گے۔ "عَیۡنٰنِ تَجۡرِیٰنِ" اور "عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ" کے تقابل کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۵۰) کی تفسیر۔

آیت 68 فِیۡہِمَا فَاکِہَۃٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ: "فَاکِہَۃٌ" اسم جنس ہے، اس میں ہر پھل آ جاتا ہے۔ کھجور اور انار بھی "فَاکِہَۃٌ" میں شامل ہیں، مگر عرب میں ان کی کثرت اور ان کے پسندیدہ پھل ہونے کی وجہ سے ان کا الگ ذکر فرمایا ہے۔ مقربین کے لیے "مِنۡ کُلِّ فَاکِہَۃٍ زَوۡجٰنِ" اور اصحاب الیمین کے لیے "فَاکِہَۃٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ" فرمایا۔ دونوں کا فرق واضح ہے۔

آیت 70 ① فِیۡہِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ: "خَیۡرٰتٌ" "خَيۡرَةٌ" کی جمع ہے جو اصل میں "یاء" کی تشدید کے ساتھ "خَيِّرَةٌ" ہے۔ مذکر اس کا "خَيِّرٌ" (بروزن فَيۡعِلٌ) ہے، جس میں "یاء" کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا ہے، جیسے "هَيِّنٌ، لَيِّنٌ" اور "مَيِّتٌ" کو "هَيۡنٌ، لَيۡنٌ" اور "مَيۡتٌ" کر دیتے ہیں۔ یہ تفضیل والا "خَيۡرٌ" نہیں جو "شَرٌّ" کے مقابلے میں آتا

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ۞ سفید جسم، سیاہ آنکھوں والی عورتیں، جو خیموں میں روکی ہوئی ہیں ۞ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ۞ ان سے پہلے نہ کسی انسان نے انھیں ہاتھ لگایا ہے اور نہ کسی جن نے ۞ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ۞

---

ہے، کیونکہ اس کا اصل " أَخْيَرُ " ( أَفْعَلُ ) ہے۔ "حِسَانٌ" "حَسْنَاءُ" کی جمع ہے۔ "خَيْرٰتٌ" نیک، یعنی خوب سیرت اور "حِسَانٌ" خوبصورت عورتیں۔

② یہاں یہ بات زیر نظر رہنا ضروری ہے کہ اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ "فِيْهِمَا خَيْرَاتٌ حِسَانٌ" (ان دونوں باغوں میں خوب سیرت و خوبصورت عورتیں ہیں ) بلکہ فرمایا: ﴿ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴾ یعنی ان سب جنتوں میں جن کا ذکر گزرا ہے خوب سیرت اور خوبصورت عورتیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں جو اوصاف مذکور ہوئے ہیں وہ چاروں جنتوں میں سابقون اور اصحاب الیمین دونوں کو ملنے والی عورتوں میں مشترک ہیں۔

آیت 72 ① "حُوْرٌ" "حَوْرَاءُ" کی جمع ہے، مادہ اس کا "حَوَرٌ" ہے، ''گورے رنگ کی عورتیں'' جنھیں دیکھ کر آنکھ حیران رہ جائے اور جن کی آنکھ کی سفیدی بہت سفید اور سیاہی بہت سیاہ ہو۔ [ دیکھیے بخاري : الجهاد والسير، باب الحور العين و صفتهن، قبل ح: ۲۷۹٥ ]

② مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ : لفظ "حُوْرٌ" میں ان کی صورت کا حُسن بیان ہوا ہے اور " مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ " میں ان کی سیرت کا حُسن بیان ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ عورت کی خوبی گھر رکے رہنے میں ہے۔ ان الفاظ میں ان عورتوں کے لیے ہر طرح کی خوش حالی اور نعمت میسر ہونے کا اشارہ بھی ہے، کیونکہ دنیا میں سردار عورتوں کو کسی کی نوکری یا خدمت یا کھیتوں وغیرہ میں کام کرنے کے لیے گھر سے باہر نہیں جانا پڑتا، حتیٰ کہ میل ملاقات کے لیے بھی دوسری عورتیں ہی ان کے پاس آتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نہایت معزز اور مخدوم ہیں، جیسا کہ ابوقیس بن الاسلت نے کہا ہے ؎

وَيُكْرِمُهَا جَارَاتُهَا فَيَزُرْنَهَا وَ تَعْتَلُّ عَنْ إِتْيَانِهِنَّ فَتُعْذَرُ

''اس کی پڑوسنیں اس کا اِکرام کرتی ہیں، اس لیے اس سے ملنے کے لیے خود آتی ہیں اور یہ ان کے پاس آنے سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی ہے تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔'' [ التحرير و التنوير ]

③ فِي الْخِيَامِ : "الْخِيَامِ" "خَيْمَةٌ" کی جمع ہے، جو عموماً پشم یا بالوں کے بنے ہوئے کپڑے سے بنایا جاتا ہے۔ پھر جتنے خوشحال لوگوں کا ہو اتنا ہی قیمتی، اونچا اور شاندار بنایا جاتا ہے۔ جنت کے خیموں کا وصف رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا،

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞
تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۞

رکوع ۱۴

وہ ایسے قالینوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں جو سبز ہیں اور نادر، نفیس ہیں ⑯ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ⑰ بہت برکت والا ہے تیرے رب کا نام جو بڑی شان اور عزت والا ہے ⑱

عبداللہ بن قیس (ابوموسیٰ اشعری) رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ فِي الْجَنَّةِ خَيْمَةً مِنْ لُؤْلُؤَةٍ مُجَوَّفَةٍ عَرْضُهَا سِتُّوْنَ مِيْلًا فِيْ كُلِّ زَاوِيَةٍ مِّنْهَا أَهْلٌ مَا يَرَوْنَ الْآخَرِيْنَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمُ الْمُؤْمِنُوْنَ» [ بخاري، التفسير، باب: ﴿حور مقصورات في الخيام﴾: ۴۸۷۹ ] ”جنت میں ایک خولدار موتی کا خیمہ ہے جس کا عرض ساٹھ (۶۰) میل ہے، اس کے ہر کونے میں ایک گھر والے ہیں جو دوسروں کو نہیں دیکھتے، مومن ان پر چکر لگائیں گے۔“

**آیت 76** ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ : ”رَفْرَفٍ“ اسم جنس یا اسم جمع ہے، مفرد اس کا ”رَفْرَفَةٌ“ ہے، منقش قالین جو بستر پر بچھایا جائے۔ ”عَبْقَرِيٍّ“ کوئی بھی چیز جو اپنی جنس میں سب سے فائق اور نادر الوجود ہو۔ اس کی نسبت ”عَبْقَر“ کی طرف ہے جو جاہلیت کے افسانوں میں جنوں کا شہر تھا، جسے اردو میں پرستان کہتے ہیں۔ عرب میں فوق العادت خوبصورت یا باکمال چیز کی نسبت اس کی طرف کر دیتے تھے، گویا یہ انسانوں کی سرزمین کی نہیں بلکہ جنوں اور پریوں کی سرزمین کی چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کنویں سے پانی کھینچنے والے خواب کے ذکر میں فرمایا: «ثُمَّ أَخَذَهَا عُمَرُ، فَاسْتَحَالَتْ بِيَدِهِ غَرْبًا، فَلَمْ أَرَ عَبْقَرِيًّا فِي النَّاسِ يَفْرِيْ فَرِيَّهُ» [ بخاري، المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام: ۳۶۳۴ ] ”پھر وہ ڈول عمر (رضی اللہ عنہ) نے پکڑا تو وہ ایک بڑے ڈول کی شکل میں بدل گیا۔ تو میں نے کوئی نادر قوت والا شخص نہیں دیکھا جو اس جیسی کاٹ کاٹتا ہو۔“ اس لیے اس کا ترجمہ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ نے ”نادر“ کیا ہے اور ”حِسَانٍ“ کا ترجمہ ”نفیس“ کیا ہے۔ ”رَفْرَفٍ“ کا لفظ مفرد ہے، اس کے مطابق ”عَبْقَرِيٍّ“ صفت مفرد لائی گئی ہے اور اسم جنس یا اسم جمع ہونے کی وجہ سے اس میں جمع کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس لیے اس کی صفات ”خُضْرٍ“ اور ”حِسَانٍ“ جمع لائی گئی ہیں۔

**آیت 78** ﴿ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ : ”تَبٰرَكَ“ باب تفاعل ہے، جب اس میں تشارک مقصود نہ ہو تو مبالغہ مراد ہوتا ہے، یعنی بہت برکت والا ہے تیرے رب کا نام۔ پھر جب اس کا نام بہت برکت والا ہے تو اس کی ذات پاک کس قدر بابرکت ہوگی۔ ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین دفعہ استغفار کرتے اور یوں کہتے: «اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ» [ مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة ...... : ۵۹۱ ] ”اے اللہ! تو ہی سلامتی والا ہے اور تجھی سے سلامتی ہے اے جلال اور اکرام والے!“ اس دعا میں کئی لوگ ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں: ” وَإِلَيْكَ يَرْجِعُ السَّلَامُ حَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَ أَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ۔“ یہ الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں۔

سورة الواقعة ٥٦ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ آياتها ٩٦

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب وہ واقع ہونے والی واقع ہوگی ①

" ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ " اللہ تعالیٰ کا ایسا بابرکت نام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کثرت سے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: « أَلِظُّوا بِيَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ » [ ترمذي، الدعوات، باب : ٣٥٢٤، وقال الألباني صحيح ] " يَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْإِكْرَام " سے چمٹ جاؤ، اسے لازم پکڑ لو۔" "أَلِظُّوا" "أَلَظَّ يُلِظُّ إِلْظَاظًا" سے ہے جس کا معنی "چمٹ جانا" ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس کو لازم پکڑنے کے حکم سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کس قدر بابرکت نام ہے۔

## سورۃ الواقعہ

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: « يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَدْ شِبْتَ، قَالَ شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَالْوَاقِعَةُ وَالْمُرْسَلَاتُ وَ ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ وَ ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ » [ ترمذي، التفسير، باب و من سورة الواقعة : ٣٢٩٧۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٩٥٥ ] "یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے ہود، واقعہ، مرسلات، نبا اور تکویر نے بوڑھا کر دیا۔"

بہت سے لوگ روزانہ سورۂ واقعہ کی تلاوت اس حدیث کی وجہ سے کرتے ہیں جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ كُلَّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَدًا » "جو شخص ہر رات سورۂ واقعہ پڑھے اسے کبھی فاقہ نہیں آئے گا۔" مگر ایسی کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے "سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة ( ح : ٢٨٩ تا ٢٩١ )" میں ایسی تمام روایات کا ضعف بیان فرمایا ہے۔

**آیت 1** ﴿ إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ : "الْوَاقِعَةُ" قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جیسے "الطَّآمَّةُ ، الْاٰزِفَةُ ، الصَّآخَّةُ" اور "اَلْقَارِعَةُ" اس کے نام ہیں۔ ان میں "تاء" مبالغہ کے لیے ہے۔ اس کا نام "الْوَاقِعَةُ" اس کے یقینی ہونے کی وجہ سے رکھا گیا ہے، کیونکہ وہ ہر حال میں ہو کر رہنے والی ہے۔ یعنی جب قیامت قائم ہوگی، جیسا کہ سورۂ حاقہ میں ہے: ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴾ [ الحاقة : ١٣ تا ١٥ ] "پس جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک بار پھونکنا۔ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا۔ تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی۔"

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۝ وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝

اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ② پست کرنے والی، بلند کرنے والی ③ جب زمین ہلائی جائے گی، سخت ہلایا جانا ④ اور پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے، خوب ریزہ ریزہ کیا جانا ⑤ پس وہ پھیلا ہوا غبار بن جائیں گے ⑥

**آیت 2** لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ: "كَاذِبَةٌ" مصدر ہے بمعنی "كِذْبٌ" جیسے "اَلْعَافِيَةُ" بمعنی "مُعَافَاةٌ" اور "اَلْعَاقِبَةُ" بمعنی "عُقْبٰی" مصادر ہیں۔ یعنی اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں۔

**آیت 3** خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ: یعنی وہ بڑے بڑے متکبروں کو جو دنیا میں معزز اور بلند مرتبہ سمجھے جاتے تھے، گرا کر جہنم میں پھینک دے گی اور مستضعفین اہل ایمان کو جو دنیا میں حقیر اور کم مرتبہ سمجھے جاتے تھے، اٹھا کر جنت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچا دے گی۔ مزید دیکھیے سورۂ مطففین (۲۹ تا ۳۵)۔

**آیت 4** إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا: یہ "إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" سے بدل ہے۔ "رَجَّ يَرُجُّ رَجًّا" (ن) شدید حرکت دینا۔ "رَجًّا" مصدر کے ساتھ تاکید میں مبالغہ مقصود ہے۔ یہ وہی بات ہے جو "إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا" اور "إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ" میں بیان فرمائی گئی ہے۔

**آیت 5** وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا: "بَسَّ يَبُسُّ بَسًّا" (ن) ریزہ ریزہ کرنا۔ "بَسًّا" مصدر کے ساتھ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے میں مبالغے کا اظہار مقصود ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا﴾ [ طٰہٰ : ۱۰۵ تا ۱۰۷ ] "اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھیں گے تو تو کہہ دے میرا رب انھیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر انھیں ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا۔ جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری جگہ۔"

**آیت 6** ① فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا: "هَبَآءً" غبار کے ان ذرات کو کہتے ہیں جو روشن دان سے کمرے میں آنے والی دھوپ میں چمک رہے ہوتے ہیں، پکڑنا چاہیں تو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ "بَثَّ يَبُثُّ بَثًّا" (ن) پھیلانا۔ "اِنْبَثَّ اِنْبِثَاثًا" (انفعال) پھیلنا۔ "مُّنْۢبَثًّا" اسم فاعل ہے، پھیلنے والا۔ قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے احوال کے لیے دیکھیے سورۂ نبا کی آیت (۲۰) کی تفسیر۔

② ان آیات میں "إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" سے لے کر "وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً" تک بعض واقعات صور میں پہلے نفخہ کے وقت کے بیان فرمائے ہیں، جیسے "إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا" اور "بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا" ہے اور بعض دوسرے نفخہ کے وقت کے ہیں، جیسے "خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ" اور "كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً" اور بعض دونوں نفخوں میں مشترک ہیں، جیسے "إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" اور "لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ" ہے۔ چونکہ پہلے اور دوسرے نفخے کا سارا وقت قیامت ہی کا ہے، اس لیے اس کے ہر

وَ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝۷ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸ وَ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝۹ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰

اور تم تین قسم (کے لوگ) ہو جاؤ گے ۝۷ پس دائیں ہاتھ والے، کیا (خوب) ہیں دائیں ہاتھ والے ۝۸ اور بائیں ہاتھ والے، کیا (برے) ہیں بائیں ہاتھ والے ۝۹ اور جو پہل کرنے والے ہیں، وہی آگے بڑھنے والے ہیں ۝۱۰

جز کو ہر واقعہ کا وقت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں عموماً دونوں نفخوں کے نتیجے میں واقع ہونے والے معاملات اکٹھے ہی ذکر کیے گئے ہیں۔

**آیت 7** وَ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً : یہ تمام لوگوں کو خطاب ہے، کیونکہ قیامت کے دن سب لوگ ان تین قسموں میں تقسیم ہوں گے، سابقون، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال۔ سورت کے آخر میں موت کے وقت بھی لوگوں کی یہی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

**آیت 8، 9** فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ .... : "أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ" مبتدا ہے اور " مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ" جملہ ہو کر خبر ہے۔ دائیں ہاتھ والے جنھیں دائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جائیں گے۔ (دیکھیے حاقہ: ۱۹) استفہام سے مراد ان کی عظمتِ شان کا اظہار ہے، یعنی وہ اتنی بلند شان والے ہیں کہ ان کے متعلق سوال کیا جاتا ہے کہ "أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ" کیا ہیں؟ یہاں ان کی شان اجمالاً بیان ہوئی ہے، تفصیل آگے "وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ" میں آ رہی ہے۔ اسی طرح "وَ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ" میں بائیں ہاتھ والوں کی بری حالت کا اظہار مقصود ہے کہ وہ کیا ہی بری ہے، تفصیل اس کی "وَ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ" میں آ رہی ہے۔

**آیت 10** وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ پہلے "السّٰبِقُوْنَ" سے مراد عمل میں سبقت والے اور دوسرے "السّٰبِقُوْنَ" سے مراد درجے میں سبقت لینے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ ایمان لانے میں اور اعمال صالحہ میں دوسروں سے پہل کرنے والے اور آگے بڑھنے والے ہیں وہ جنت کے داخلے میں بھی دوسروں سے پہلے اور اس کے مراتب میں دوسروں سے آگے ہوں گے۔ دوسرا مطلب یہ کہ دونوں "السّٰبِقُوْنَ" سے مراد ایک ہی ہے اور مقصود ان کی شان کا بیان ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "أَنْتَ أَنْتَ" کہ تم، تم ہی ہو، تمھارا کیا کہنا، کوئی اور تمھارے جیسا نہیں اور جیسے شاعر نے کہا ہے ؂

أَنَا أَبُو النَّجْمِ وَ شِعْرِيْ شِعْرِيْ

"میں ابو النجم ہوں اور میرا شعر میرا ہی شعر ہے۔"
یعنی میرے شعر کی کیا بات ہے۔ یعنی سابقون سابقون ہی ہیں، کوئی اور ان کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔

اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۱۲ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۴

یہی لوگ قریب کیے ہوئے ہیں ۝۱۱ نعمت کے باغوں میں ۝۱۲ بہت بڑی جماعت پہلوں سے ۝۱۳ اور تھوڑے سے پچھلوں میں سے ۝۱۴

آیت 11، 12 اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ : یعنی ایمان لانے میں اور ہر خیر کے کام میں دوسروں سے سبقت لے جانے والوں کا درجہ بھی عام اہلِ ایمان سے زیادہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کا خاص قرب بھی انھی کو حاصل ہوگا اور انھیں ملنے والی جنت اصحاب الیمین کو ملنے والی جنت سے درجے اور نعمتوں میں افضل ہوگی، جیسا کہ اس سے پہلے سورۂ رحمان میں گزرا ہے اور یہاں بھی "عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ" سے اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ "جَنّٰتِ النَّعِيْمِ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۳)۔

آیت 13، 14 ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ : "ثُلَّةٌ" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، ایک بڑی جماعت۔ اللہ تعالیٰ نے سابقون کے متعلق "ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ" اور اصحاب الیمین کے متعلق "ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ" فرمایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں جگہ "الْاَوَّلِيْنَ" اور "الْاٰخِرِيْنَ" سے مراد کیا ہے؟ تو اس کے متعلق اہلِ علم کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ "الْاَوَّلِيْنَ" سے مراد پہلی امتیں ہیں اور "الْاٰخِرِيْنَ" سے مراد ہماری امت ہے۔ انھیں "الْاٰخِرِيْنَ" اس لیے کہا گیا کہ وہ تمام امتوں میں سے آخری امت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سابقون پہلی امتوں میں سے ایک بڑی جماعت ہیں اور آخری امت میں سے قلیل ہیں۔ طبری نے تفسیر میں یہی قول ذکر فرمایا ہے، کوئی اور قول ذکر ہی نہیں کیا اور راجح قول بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مشہور قول کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ تو انبیاء ہی گزرے ہیں، انبیاء سمیت ان کی امتوں کے سابقون یقیناً بہت بڑی جماعت ہوں گے، ان کی نسبت سے ہماری امت کے سابقون کی تعداد کم ہوگی۔ ہاں اصحاب الیمین جس طرح پہلی امتوں کے بہت بڑی جماعت ہوں گے ہماری امت کے بھی بہت بڑی جماعت ہوں گے، حتیٰ کہ ہماری امت کے افراد اہلِ جنت کا نصف ہوں گے، جیسا کہ "ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ" کی تفسیر میں احادیث آ رہی ہیں۔

اس قول کے راجح ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں قیامت کا ذکر ہو رہا ہے اور اس دن یہ تین گروہ صرف ہماری امت کے نہیں ہوں گے بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر آخری ابنِ آدم تک سب لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہوں گے۔ اس اعتبار سے بھی اوّلین سے مراد پہلی امتیں ہیں اور آخرین سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بَيْدَ أَنَّهُمْ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِيْ فُرِضَ عَلَيْهِمْ فَاخْتَلَفُوْا فِيْهِ، فَهَدَانَا اللّٰهُ، فَالنَّاسُ لَنَا فِيْهِ تَبَعٌ، الْيَهُوْدُ

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيۡنَ عَلَيۡهَا مُتَقٰبِلِيۡنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿۱۷﴾

سونے اور جواہر سے بُنے ہوئے تختوں پر (آرام کر رہے ہوں گے) ان پر تکیہ لگائے ہوئے آمنے سامنے بیٹھنے والے (ہوں گے) ﴿۱۶﴾ ان پر چکر لگا رہے ہوں گے وہ لڑکے جو ہمیشہ (لڑکے ہی) رکھے جائیں گے ﴿۱۷﴾

غَدًا وَالنَّصَارٰی بَعْدَ غَدٍ ›› [ بخاري، الجمعة، باب فرض الجمعة...... : ۸۷۶، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ’’ہم آخر میں آنے والے ہیں، قیامت کے دن پہلے ہوں گے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی، پھر یہ (جمعہ کا) دن جو ان پر فرض کیا گیا تو انھوں نے اس میں اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی۔ چنانچہ لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں، یہود اگلے دن اور نصاریٰ اس سے اگلے دن۔‘‘

دوسرا قول جسے ابن کثیر نے ترجیح دی ہے، یہ ہے کہ دونوں جگہ اولین اور آخرین سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین و آخرین ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سابقون اس امت کے شروع کے لوگوں میں سے ایک بہت بڑی جماعت ہوں گے اور بعد کے لوگوں میں سے کم تعداد میں ہوں گے۔ البتہ اصحاب الیمین امت کے شروع کے لوگوں میں سے بہت بڑی جماعت ہوں گے اور آخر حصے کے لوگوں سے بھی بہت بڑی جماعت ہوں گے۔ شروع کے لوگوں سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان سے قریب زمانوں کے لوگ ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ‹‹ خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَجِيْءُ قَوْمٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ أَحَدِهِمْ يَمِيْنَهُ وَيَمِيْنُهُ شَهَادَتَهُ ›› [ بخاري، فضائل الصحابة، باب فضائل أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم ...... : ۳۶۵۱ ] ’’سب لوگوں سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو ان سے ملیں گے، پھر وہ لوگ جو ان سے ملیں گے، پھر کچھ لوگ آئیں گے جن کی شہادت ان کی قسم سے پہلے اور ان کی قسم ان کی شہادت سے پہلے ہوگی۔‘‘ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک تیسرا قول ذکر فرمایا ہے کہ ہر امت کے ابتدائی لوگوں میں سابقون کی ایک بڑی جماعت ہوئی ہے جب کہ بعد کے لوگوں میں وہ قلیل ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں، اپنی اپنی جگہ تینوں درست ہیں، البتہ آیات کے سیاق کے مطابق یہاں پہلا معنی راجح معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

**آیت 15** عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ : ’’ سُرُرٍ ‘‘ ’’ سَرِيْرٌ ‘‘ کی جمع ہے، جس کا معنی تخت بھی ہے اور چارپائی بھی اور ’’ وَضَنَ يَضِنُ وَضْنًا ‘‘ (ض) بُننا، مضبوطی اور باریکی سے بُننا، سونے اور جواہر کے ساتھ بُننا۔ طبری نے مجاہد کے طریق سے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر فرمایا ہے: ’’ مَرْمُوْلَةٌ بِالذَّهَبِ، أَيْ مَنْسُوْجَةٌ بِالذَّهَبِ ‘‘ ’’یعنی سونے کے تاروں کے ساتھ بُنے ہوئے۔‘‘

**آیت 16** مُّتَّكِـِٕيۡنَ عَلَيۡهَا مُتَقٰبِلِيۡنَ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۴) کی تفسیر۔

**آیت 17** يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ : اس کے لیے دیکھیے سورۂ دہر کی آیت (۱۹) کی تفسیر۔

بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ ۙ۬ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا يُنْزِفُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ؕ﴿۲۱﴾ وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۙ﴿۲۲﴾

ایسے کوزے اور ٹونٹی والی صراحیاں اور لبالب بھرے ہوئے پیالے لے کر جو بہتی ہوئی شراب کے ہوں گے ﴿۱۸﴾ وہ نہ اس سے دردِ سر میں مبتلا ہوں گے اور نہ بہکیں گے ﴿۱۹﴾ اور ایسے پھل لے کر جنھیں وہ پسند کرتے ہیں ﴿۲۰﴾ اور پرندوں کا گوشت لے کر جس کی وہ خواہش رکھتے ہیں ﴿۲۱﴾ اور (ان کے لیے وہاں) سفید جسم، سیاہ آنکھوں والی عورتیں ہیں، جو فراخ آنکھوں والی ہیں ﴿۲۲﴾

---

**آیت 18** ❶ **بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ:** "اَكْوَابٌ" "كُوْبٌ" کی جمع ہے، برتن جس کی نہ دستی ہو نہ ٹونٹی۔ "**اَبَارِيْقَ**" "اِبْرِيْقٌ" کی جمع ہے، مادہ اس کا "بَرْقٌ" (چمک) ہے، وہ برتن جس کی ٹونٹی یا پکڑنے کی دستی ہو یا دونوں ہوں۔ چمک کی وجہ سے اس کا نام "اِبْرِيْقٌ" رکھا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ فارسی لفظ "آبریز" کا معرب ہے۔

❷ **وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ** اس کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۵) کی تفسیر۔

**آیت 19** **لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا يُنْزِفُوْنَ:** "اَلصُّدَاعُ" دردِ سر کو کہتے ہیں، "صُدِعَ وَ صُدِّعَ فُلَانٌ" (مجہول) اسے دردِ سر ہو گیا۔ "**يُنْزِفُوْنَ**" سورۂ صافات (۴۷) میں "زاء" کے فتحہ کے ساتھ مضارع مجہول ہے، یہاں "زاء" کے کسرہ کے ساتھ مضارع معلوم ہے۔ "نُزِفَ مَاءُ الْبِئْرِ" کنویں کا سارا پانی نکال لیا گیا۔ "نُزِفَ الرَّجُلُ" آدمی کی عقل جاتی رہی، وہ نشے میں مدہوش ہو گیا۔ "اَنْزَفَ الرَّجُلُ" آدمی کے پاس کوئی چیز باقی نہ رہی، اس کی عقل جاتی رہی، نشے میں مدہوش ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ "**يُنْزِفُوْنَ**" معروف و مجہول دونوں کا معنی نشے میں بے ہوش ہونا اور عقل کا مارا جانا ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۷)۔

**آیت 20** **وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ:** "**فَاكِهَةٍ**" کا عطف "**بِاَكْوَابٍ**" پر ہے، یعنی سونے سے بنے ہوئے تختوں پر آمنے سامنے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے جنتیوں پر "**وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ**" شراب کے جام اور ان کے پسند کردہ پھل اور ان کی خواہش کے مطابق پرندوں کا گوشت لے کر چکر لگا رہے ہوں گے۔ خدمت گاروں کے پھل لا کر پیش کرنے میں جو لطف ہے وہ بھی انھیں حاصل ہوگا اور اپنے ہاتھوں سے توڑ کر کھانا چاہیں گے تو وہ بھی انھیں ہر وقت میسر ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿**وَ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ**﴾ [الرحمٰن: ۵٤] "اور دونوں باغوں کا پھل قریب ہے۔" اور فرمایا: ﴿**قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ**﴾ [الحاقۃ: ۲۳] "جس کے میوے قریب ہوں گے۔" "**فَاكِهَةٍ**" کے معنی کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۲)۔

**آیت 21** **وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ:** "**يَشْتَهُوْنَ**" "شَهْوَةٌ" (خواہش) سے باب افتعال کا مضارع معلوم ہے۔ پرندوں کا گوشت لذت، غذائیت اور قوت تینوں اعتبار سے چوپاؤں کے گوشت سے اعلیٰ اور عمدہ ہوتا ہے۔

**آیت 22** **وَ حُوْرٌ عِيْنٌ:** "**حُوْرٌ عِيْنٌ**" مرفوع ہے، اس کا عطف "**وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ**" پر ہے، مطلب یہ ہے کہ

كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝٢٣ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝٢٤ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا ۝٢٥ إِلَّا قِيلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝٢٦ وَأَصْحٰبُ الْيَمِينِ ۙ مَآ أَصْحٰبُ الْيَمِينِ ۝٢٧ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۝٢٨

چھپا کر رکھے ہوئے موتیوں کی طرح ۝٢٣ اس کے بدلے کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے ۝٢٤ وہ اس میں نہ بے ہودہ گفتگو سنیں گے اور نہ گناہ میں ڈالنے والی بات ۝٢٥ مگر یہ کہنا کہ سلام ہے، سلام ہے ۝٢٦ اور دائیں ہاتھ والے، کیا (ہی اچھے) ہیں دائیں ہاتھ والے ۝٢٧ (وہ) ایسی بیریوں میں ہوں گے جن کے کانٹے دور کیے ہوئے ہیں ۝٢٨

شراب کے جام، پھل اور گوشت وغیرہ لے کر "ولدان مخلدون" ان پر چکر لگا رہے ہوں گے اور "حور عین" بھی۔ بعض نے فرمایا کہ یہ مبتدا ہے اور خبر اس کی محذوف ہے: "أَيْ وَلَهُمْ فِيهَا حُوْرٌ عِيْنٌ" یعنی ان کے لیے اس میں حوریں ہوں گی۔ ترجمہ اس کے مطابق کیا گیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ دخان (۵۴)۔

**آیت 23** **كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ**: اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ رحمٰن (۵۸) اور سورۂ صافات (۴۹) کی تفسیر۔

**آیت 25، 26** **لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا ......**: "تَأْثِيمًا" "إِثْمٌ" سے باب تفعیل کا مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، گناہ گار کرنے والی بات۔ "قِيْلٌ" اور "قَوْلٌ" دونوں "قَالَ يَقُوْلُ" کے مصدر ہیں۔ "سَلٰمًا سَلٰمًا" "قِيلًا" سے بدل ہے یا اس کا مقولہ ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مریم (۶۲) اور سورۂ نبا (۳۵)۔

**آیت 23** **وَأَصْحٰبُ الْيَمِينِ ۙ مَآ أَصْحٰبُ الْيَمِينِ**: سابقون کا حال بیان کرنے کے بعد اب اصحاب الیمین یعنی عام مومنوں کی خوش حالی اور عیش و تنعیم کا بیان ہے۔ "وَأَصْحٰبُ الْيَمِينِ ۙ مَآ أَصْحٰبُ الْيَمِينِ" سے وہی مراد ہیں جو "فَأَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ" سے ہیں۔

**آیت 28** **فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ**: "سِدْرٍ" (بیری) اسم جنس ہے جو ایک اور زیادہ سب پر بولا جاتا ہے۔ لفظ مفرد ہونے کی وجہ سے صفت "مَّخْضُودٍ" مفرد آئی ہے۔ "طَلْحٍ مَّنْضُودٍ" بھی اسی طرح ہے۔ ایک بیری کہنا ہو تو "سِدْرَةٌ" کہتے ہیں۔ "خَضَدَ" (ض) "الشَّجَرَ" درخت کے کانٹے کاٹ دینا۔ دنیا کی بیریوں میں کانٹے ہوتے ہیں، جنت کے بیری کے درختوں میں کانٹے نہیں ہوں گے۔ اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ عرب بیری سے آشنا تھے، کیونکہ ان کے بادیہ میں یہ درخت بہت ہوتا ہے، مگر اکثر خار دار ہوتا ہے۔ باغوں میں کاشت کیے جانے والے درختوں کے کانٹے کم اور پھل لذیذ ہوتا ہے، پھر کانٹے جتنے کم ہوں پھل اتنا ہی زیادہ و لذیذ اور نفیس ہوتا ہے۔ جنت کی بیریوں میں کانٹے بالکل نہیں ہوں گے اور حقیقت یہ ہے کہ جنت کے پھلوں کے صرف نام دنیا کے پھلوں والے ہیں، ان کے ذائقے، لذت اور نفاست سے دنیا کے پھلوں کی کوئی نسبت نہیں۔

وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۲۹﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ﴿۳۰﴾ وَّ مَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ ﴿۳۱﴾ وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَةٍ ﴿۳۳﴾

اور ایسے کیلوں میں جو تہ بہ تہ لگے ہوئے ہیں ﴿۲۹﴾ اور ایسے سائے میں جو خوب پھیلا ہوا ہے ﴿۳۰﴾ اور ایسے پانی میں جو گرایا جارہا ہے ﴿۳۱﴾ اور بہت زیادہ پھلوں میں ﴿۳۲﴾ جو نہ کبھی ختم ہوں گے اور نہ ان سے کوئی روک ٹوک ہوگی ﴿۳۳﴾

آیت 29 ﴿ وَطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ : "طَلۡحٍ" کیکر کو بھی کہتے ہیں اور کیلے کو بھی۔ "مَنۡضُوۡدٍ" (تہ بہ تہ) سے تعیین ہوگئی کہ یہاں کیلے مراد ہیں۔

آیت 30 ﴿ وَظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ : ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ فِي الْجَنَّةِ شَجَرَةً يَسِيرُ الرَّاكِبُ فِيْ ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ لَا يَقْطَعُهَا وَاقْرَءُوا إِنْ شِئْتُمْ : ﴿ وَظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ﴾ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ و ظل ممدود ﴾ : ۴۸۸۱ ] ''جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں سوار سو سال چلتا رہے گا۔ چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿ وَظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ﴾ ''اور ایسے سائے میں جو خوب پھیلا ہوا ہے۔'' "مَمۡدُوۡدٍ" میں سائے کا جگہ کے لحاظ سے پھیلاؤ بھی شامل ہے اور زمانے کے لحاظ سے بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ﴾ [ الرعد : ۳۵ ] ''اس کا پھل دائمی ہے اور اس کا سایہ بھی۔''

آیت 31 ﴿ وَمَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ : "سَكَبَ يَسْكُبُ سَكْبًا وَ تَسْكَابًا" (ن) "اَلْمَاءَ" پانی گرانا۔ "اَلسَّكْبُ" لگاتار بارش۔ "مَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ" سے مراد آبشاروں سے گرنے والا اور مسلسل بہنے والا پانی ہے۔ "تَسۡنِيۡمٍ" میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ (دیکھیے مطففین : ۲۷) واضح رہے کہ جنت کی بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو سابقون اور اصحاب الیمین دونوں کے لیے مشترک ہیں، البتہ ان کی کیفیت میں فرق ہوسکتا ہے۔ اگلی آیت میں "فَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ" کا بھی یہی معاملہ ہے۔

آیت 32 ﴿ وَفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ : ''بہت زیادہ'' میں پھلوں کی قسموں کا بہت زیادہ ہونا بھی شامل ہے اور مقدار میں بہت زیادہ ہونا بھی۔ اس کثرت کا مقصد اصحاب الیمین کی ضیافت اور عزت افزائی ہے، آگے ان کی مرضی ہے، جتنا چاہیں جب چاہیں کھائیں۔

آیت 33 ﴿ ① لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ : دنیا میں ہر پھل کا ایک موسم ہے، اس کے بعد وہ ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح اس کا ایک علاقہ ہے دوسرے علاقے میں نہیں ملتا۔ جنت کے پھل ایسے نہیں کہ کسی موسم یا کسی جگہ میں نہ ملیں، بلکہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت تیار ملیں گے۔
② وَلَا مَمۡنُوۡعَةٍ : دنیا میں پھلوں کے حصول میں کئی رکاوٹیں ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ کسی اور کی ملکیت ہیں، خریدنے کے لیے قیمت موجود نہیں، اپنے بھی ہیں تو ابھی تیار نہیں یا درختوں سے اتارنا مشکل ہے۔ جنت کے پھلوں کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہیں، ان کی ملکیت وراثتی ملکیت ہے اور دائمی ہے، فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ۙ الَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴾ [ المؤمنون : ۱۰، ۱۱ ] ''یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے

وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۞ اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۞ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۞ عُرُبًا اَتْرَابًا ۞ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۞

ع ۱۴/۴۸

اور اونچے بستروں میں ۞ بلاشبہ ہم نے ان (بستروں والی عورتوں) کو پیدا کیا [illegible] ۞ پس ہم نے انھیں کنواریاں بنا دیا ۞ جو خاوندوں کی محبوب، ان کی ہم عمر ہیں ۞ دائیں ہاتھ والوں [illegible]

والے ہیں۔'' اور اس کے پھل ہر وقت تیار ہیں اور ہر طرح کھانے والوں کی دسترس میں ہیں۔

**آیت 34** ﴿ وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ : اونچے بستروں سے مراد عالی شان بستر ہیں۔ ترمذی وغیرہ کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ ان کی بلندی اتنی ہے جتنی آسمان و زمین کے درمیان ہے، جو پانچ سو سال کا فاصلہ ہے، مگر ایسی کوئی روایت صحیح نہیں اور نہ ہی بظاہر ایسی بلندی سے کچھ فائدہ ہے۔

**آیت 35** ﴿ اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً : "اَنْشَاْنٰهُنَّ" میں "هُنَّ" کی ضمیر ان عورتوں کی طرف جا رہی ہے جن کا پچھلی آیت "وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ" کے ضمن میں ذکر ہے، کیونکہ جنتیوں کے بستروں میں ان کے ساتھ ان کی بیویاں بھی ہوں گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ مُتَّكِـُٔوْنَ﴾ [ یٰس : ۵٦ ] ''وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔'' "أَنْشَأَ يُنْشِئُ إِنْشَاءً" کا معنی ''نیا پیدا کرنا'' ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مومن عورتیں بوڑھی یا بدصورت یا جیسی بھی تھیں، اللہ تعالیٰ انھیں نئے سرے سے جوان، کنواری، خوبصورت اور ان اوصاف والی بنا دے گا جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ان الفاظ میں وہ ''حور عین'' بھی شامل ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ جنتیوں ہی کے لیے پیدا فرمائے گا۔

**آیت 35** ﴿ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا : "اَبْكَارًا" "بِكْرٌ" کی جمع ہے، کنواریاں۔ یعنی دنیا میں شوہر والی مومن عورتوں کو بھی اللہ تعالیٰ باکرہ بنا دے گا۔ اس کے علاوہ دنیا کی عورتیں ہوں یا جنتیوں کے لیے پیدا کی گئی نئی عورتیں، سب ہمیشہ باکرہ رہیں گی، ان کے خاوند جب بھی ان سے ملاپ کریں گے انھیں باکرہ پائیں گے۔

**آیت 37، 38** ﴿ عُرُبًا اَتْرَابًا ۞ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ : "عُرُبًا" "عَرُوْبٌ" (بفتح عین) کی جمع ہے، جیسے "رَسُوْلٌ" کی جمع "رُسُلٌ" ہے۔ یہ "أَعْرَبَ فُلَانٌ فِيْ قَوْلِهِ" سے ہے، جب کوئی شخص فصاحت اور حسنِ بیان سے بات کرے۔ یعنی میٹھی میٹھی باتوں اور ناز و انداز سے خاوند کا دل لبھانے والی اور اس کی محبت حاصل کرنے والی عورتیں، خاوند کی محبوب عورتیں۔ "اَتْرَابًا" "تِرْبٌ" کی جمع ہے، ہم عمر جو مل کر مٹی میں کھیلتے رہے ہوں۔ "لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ" "اَتْرَابًا" سے متعلق ہے، یعنی وہ اصحاب الیمین کی ہم عمر ہوں گی۔ ہم عمری میں جو موافقت پائی جاتی ہے وہ اس کے سوا میں حاصل نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ ان آیات کا یہ مطلب نہیں کہ سابقون کو ملنے والی نعمتیں اور ہوں گی اور اصحاب الیمین کو ملنے والی دوسری، بلکہ دونوں کو ملنے والی بے شمار نعمتیں مشترک ہوں گی، مثلاً جنت کے پھل، مکانات، نہریں، بیویاں، خدام وغیرہ۔ ہاں، ان کی کیفیت میں ضرور فرق ہو گا کہ سابقون کو ملنے والی نعمتیں اصحاب الیمین کو ملنے والی نعمتوں سے اعلیٰ درجے کی ہوں گی۔ دونوں کے لیے نعمتوں کے بیان سے

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ۙ۳۹ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝ؕ۴۰ وَ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ؕ۴۱ فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ۝ۙ۴۲ وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ۙ۴۳ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا كَرِيْمٍ ۝۴۴

ایک بڑی جماعت پہلے لوگوں سے ہیں ۳۹ اور ایک بڑی جماعت پچھلوں سے ۴۰ اور بائیں ہاتھ والے، کیا (ہی برے) ہیں بائیں ہاتھ والے ۴۱ (وہ) ایک زہریلی لو اور کھولتے ہوئے پانی میں ۴۲ اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں ہوں گے ۴۳ جو نہ ٹھنڈا ہے اور نہ باعزت ۴۴

---

مقصود ترغیب اور ان کا شوق دلانا ہے۔

**آیت 40، 39** ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ : یعنی اصحاب الیمین پہلی امتوں میں سے بہت بڑی جماعت ہوں گے اور آخری امت سے بھی بہت بڑی جماعت ہوں گے۔ اس میں یہ وضاحت نہیں کہ دونوں میں سے کون سی جماعت تعداد میں دوسری سے زیادہ ہوگی، یہ بات رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمائی ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ قُبَّةٍ نَحْوًا مِّنْ أَرْبَعِيْنَ رَجُلًا فَقَالَ أَتَرْضَوْنَ أَنْ تَكُوْنُوْا رُبُعَ أَهْلِ الْجَنَّةِ؟ قَالَ قُلْنَا نَعَمْ، فَقَالَ أَتَرْضَوْنَ أَنْ تَكُوْنُوْا ثُلُثَ أَهْلِ الْجَنَّةِ ؟ فَقُلْنَا نَعَمْ . فَقَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ ! إِنِّيْ لَأَرْجُوْ أَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَذَاكَ أَنَّ الْجَنَّةَ لَا يَدْخُلُهَا إِلَّا نَفْسٌ مُّسْلِمَةٌ وَمَا أَنْتُمْ فِيْ أَهْلِ الشِّرْكِ إِلَّا كَالشَّعْرَةِ الْبَيْضَاءِ فِيْ جِلْدِ الثَّوْرِ الْأَسْوَدِ أَوْ كَالشَّعْرَةِ السَّوْدَاءِ فِيْ جِلْدِ الثَّوْرِ الْأَحْمَرِ» [ مسلم، الإیمان، باب كون هذه الأمة نصف أهل الجنة : ۲۲۱/۳۷۷ ] ”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک خیمہ میں تقریباً چالیس آدمی تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اہل جنت کا چوتھا حصہ ہو؟“ ہم نے کہا: ”ہاں!“ پھر فرمایا: ”کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اہل جنت کا تیسرا حصہ ہو؟“ ہم نے کہا: ”ہاں!“ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں امید کرتا ہوں کہ تم اہل جنت کا نصف ہو گے اور یہ اس لیے کہ جنت میں مسلمان کے سوا کوئی نہیں جائے گا۔ اور مشرکوں کے مقابلے میں تمھاری تعداد اتنی ہی ہے جتنی سیاہ بیل کی جلد میں ایک سفید بال یا سرخ بیل کی جلد میں ایک سیاہ بال۔“

**آیت 41 تا 44** وَ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ...... : ”سَمُوْمٍ“ کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ طور (۲۷) کی تفسیر۔ ”يَحْمُوْمٍ“ سیاہ دھواں۔ یہ ”حُمَمٌ“ (بروزن ”صُرَدٌ“ بمعنی کوئلہ) سے ”يَفْعُوْلٌ“ کے وزن پر ہے۔ ”أَحَمُّ“ سیاہ۔ یعنی وہ دھواں جس میں سیاہی اور گرمی دونوں ہوں۔ یعنی جہنمیوں کو کہیں سایہ نہیں ملے گا، ملے گا تو سخت سیاہ اور گرم دھوئیں کا، جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہوگی اور نہ کوئی راحت یا آسائش ہوگی۔ مزید دیکھیے سورۂ مرسلات (۲۹ تا ۳۳)۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾ وَ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ۬ اَىِٕذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ۬ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾

بے شک وہ اس سے پہلے نعمتوں میں پالے ہوئے تھے ﴿۴۵﴾ اور وہ بہت بڑے گناہ (شرک) پر اڑے رہتے تھے ﴿۴۶﴾ اور وہ کہا کرتے تھے کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم ضرور اٹھائے جانے والے ہیں؟ ﴿۴۷﴾ اور کیا ہمارے پہلے باپ دادا بھی؟ ﴿۴۸﴾ کہہ دے بے شک تمام پہلے اور پچھلے ﴿۴۹﴾ ایک معلوم دن کے مقرر وقت پر یقیناً اکٹھے کیے جانے والے ہیں ﴿۵۰﴾ پھر بے شک تم اے گمراہو! جھٹلانے والو! ﴿۵۱﴾ یقیناً تھوہر کے پودے میں سے کھانے والے ہو ﴿۵۲﴾ پھر اس سے پیٹ بھرنے والے ہو ﴿۵۳﴾ پھر اس پر کھولتے پانی سے پینے والے ہو ﴿۵۴﴾ پھر پیاس کی بیماری والے اونٹوں کے پینے کی طرح پینے والے ہو ﴿۵۵﴾ یہ جزا کے دن ان کی مہمانی ہے ﴿۵۶﴾

**آیت 45** اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ: یعنی ان کا یہ انجام بد اس لیے ہوا کہ اس سے پہلے دنیا میں انھیں ہر طرح کی خوش حالی عطا کی گئی تھی، مگر اس خوش حالی نے ان پر الٹا اثر کیا اور وہ شکر گزار ہونے کے بجائے نافرمانی پر تل گئے اور حلال و حرام کی پروا کیے بغیر اپنے نفس کی لذتوں میں منہمک ہو گئے۔

**آیت 46** وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ: بہت بڑے گناہ سے مراد شرک ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [ لقمان: ۱۳ ] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔'' یعنی ان کے عذاب کا باعث اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ خوش حالی کو نافرمانی کے لیے استعمال کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک پر اصرار کرنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ قیامت اور پیغمبروں کو بھی جھٹلاتے تھے، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

**آیت 48،47** وَ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ......: ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون (۸۲، ۸۳) اور سورۂ صافات (۱۶، ۱۷)۔

**آیت 50،49** قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ......: تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ تغابن (۹)، نساء (۸۷)، آل عمران (۹)، ہود (۱۰۳)، مرسلات (۳۸) اور سورۂ کہف (۴۷)۔

**آیت 56 تا 51** ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ......: ''الْهِيْمِ'' ''أَهْيَمُ'' (مذکر) اور ''هَيْمَاءُ'' (مؤنث) کی جمع

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْ لَا تُصَدِّقُوْنَ ۝۵۷ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝۵۸ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۵۹

**ہم نے ہی تمھیں پیدا کیا تو تم (دوبارہ اٹھنے کو) کیوں سچ نہیں مانتے؟ ۝۵۷ تو کیا تم نے دیکھا وہ (نطفہ) جو تم ٹپکاتے ہو؟ ۝۵۸ کیا تم اسے پیدا کرتے ہو، یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں؟ ۝۵۹**

ہے، بروزن "فُعُلٌ۔" "ہاء" پر اصل میں ضمہ تھا، "یاء" کی مناسبت سے ضمہ کو کسرہ سے بدل دیا، جیسے "أَبْيَضُ" اور "بَيْضَاءُ" کی جمع "بِيضٌ" ہے۔ وہ اونٹ جنھیں ہیام (بروزن زکام) کا مرض لاحق ہو، یعنی ایسی پیاس جس سے اونٹ پانی پیتے جاتے ہیں مگر وہ بجھتی ہی نہیں، حتیٰ کہ وہ مر جاتے ہیں یا قریب الموت ہو جاتے ہیں۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۶۲ تا ۶۸)۔

آیت 57 ① **نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ** : قیامت کے دن لوگوں کے تین گروہوں میں تقسیم ہونے اور تینوں گروہوں کے ثواب و عقاب کے ذکر کے بعد یہاں سے آیت (۷۴) تک جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان میں آخرت اور توحید دونوں پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ مشرکین ان دونوں کے منکر تھے۔ یہ دلائل محض خیالی یا فلسفی باتیں نہیں بلکہ وہ واقعی اور حقیقی چیزیں ہیں جنھیں آدمی اپنی ذات میں محسوس کرتا ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ان میں اس کی اپنی پیدائش کا ذکر ہے، کھیتی کا ذکر ہے جسے وہ خود کاشت کرتا ہے، پانی کا ذکر ہے جسے وہ پیتا ہے اور آگ کا ذکر ہے جس سے وہ بے شمار فوائد حاصل کرتا ہے۔

② **فَلَوْ لَا تُصَدِّقُوْنَ** : یعنی تم جانتے ہو کہ ہم ہی نے تمھیں پیدا کیا، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں، پھر تم کیوں نہیں مانتے کہ عبادت بھی صرف ہمارا حق ہے اور اس بات کو سچ کیوں نہیں مانتے کہ جس طرح ہم نے تمھیں پہلے پیدا کیا اسی طرح دوبارہ بھی پیدا کریں گے۔

آیت 58، 59 **اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ......** : "**تُمْنُوْنَ**" "أَمْنٰى يُمْنِيْ إِمْنَاءً" (افعال) (گرانا، ٹپکانا) سے جمع مذکر حاضر مضارع معلوم ہے۔ "**اَفَرَءَيْتُمْ**" میں رؤیت سے مراد رؤیت علمی ہے، کیونکہ یہ آنکھوں سے نظر آنے والی چیز نہیں۔ (دیکھیے سورۂ یٰس: ۷۷) منی کے قطرے سے انسان کی پیدائش کا قیامت کی دلیل ہونا ایسی بات ہے جس پر غور کرنا ہر شخص پر واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، فرمایا: ﴿ **فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ** ﴾ [الطارق: ۵، ۶] "پس انسان کو لازم ہے کہ دیکھے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ وہ ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔" تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ طارق (۵ تا ۸) کی تفسیر۔

مفسر عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں: "پہلی قابلِ غور بات یہ ہے کہ انسان کا نطفہ بذات خود کیا چیز ہے؟ وہ کن چیزوں سے بنتا ہے؟ پھر جن چیزوں سے بنتا ہے وہ زندہ تھیں یا مردہ؟ اور اس نطفہ کے بننے یا بنانے میں تمھارا بھی کچھ عمل دخل یا اختیار تھا؟

# نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾

## ہم نے ہی تمھارے درمیان موت کا وقت مقرر کیا ہے اور ہم ہرگز عاجز نہیں ہیں ﴿۶۰﴾

پھر اس نطفہ کو رحم مادر میں ٹپکانے کی حد تک تو اختیار انسان کو ہے، اس کے بعد اس کا اختیار کلی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ نطفہ کا ایک قطرہ لاکھوں جراثیم، کیڑوں پر مشتمل ہوتا ہے جو صرف طاقتور خورد بین سے نظر آ سکتے ہیں۔ اسی طرح رحم مادر میں نسوانی بیضہ کا وجود بھی خورد بین کے بغیر نظر نہیں آ سکتا۔ نطفہ کا ایک جرثومہ جب نسوانی بیضہ میں داخل ہوتا ہے، پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خلیہ (Cell) بن جاتا ہے، یہی انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے اور اسی کا نام استقرارِ حمل ہے، نطفہ ٹپکانے کی حد تک مرد کو اختیار ہے، مگر یہ طاقت نہ مرد میں ہے نہ عورت میں اور نہ دنیا کی کسی اور ہستی میں کہ وہ نطفہ سے حمل کا استقرار کرا دے، پھر اس نقطۂ آغاز سے ماں کے پیٹ کی تاریکیوں میں بچے کی درجہ بدرجہ پرورش، ہر بچے کی الگ الگ صورت گری، ہر بچے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک امتیازی انسان بن کر اٹھے، کیا یہ ایک خالق کے سوا کسی اور کا کام ہو سکتا ہے؟ یا اس میں ذرہ برابر بھی کسی (ڈاکٹر، ولی یا پیر فقیر یا کسی) دوسرے کا کوئی دخل ہے؟ پھر یہ فیصلہ کرنا بھی اللہ کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکا ہو یا لڑکی، خوش شکل ہو یا بدشکل، اس کے نقوش تیکھے ہوں یا بھرے؟ طاقتور اور قد کاٹھ والا ہو یا کمزور، نحیف اور تھوڑے وزن والا، تندرست ہو یا اندھا بہرا لنگڑا، ذہین ہو یا کند ذہن۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو خالصتاً اللہ تعالیٰ خالق کائنات کے اختیار میں ہیں، کیا ان سب باتوں کو سمجھ لینے کے بعد بھی انسان یہ تصدیق نہیں کر سکتا کہ اسے پیدا کرنے والا اکیلا رب العالمین ہے اور یہ کہ وہ جو مردہ نطفے سے ہر روز لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں انسان اور دوسرے جاندار پیدا کر رہا ہے وہ مرنے کے بعد انسانوں کے بے جان ذرات کو دوبارہ بھی زندگی بخش سکتا ہے؟'' (تیسیر القرآن) اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر پہلی دفعہ پیدا کرنے کو دوبارہ پیدا کرنے کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۷)، انبیاء (۱۰۴)، حج (۵)، یٰس (۷۷ تا ۷۹)، بنی اسرائیل (۵۱)، مریم (۶۷) اور سورۂ قیامہ (۳۶ تا ۴۰)۔

**آیت 60:** ❶ **نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ:** یعنی تمھاری پیدائش کی طرح تمھاری موت بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے اور ہم ہی نے یہ طے کر دیا ہے کہ کس کی موت کس وقت ہوگی، ماں کے پیٹ میں مر جائے گا یا پیدا ہوتے ہی یا جوان ہو کر یا ادھیڑ عمر میں یا ارذل العمر کو پہنچ کر۔ اس سے پہلے نہ کوئی اسے مار سکتا ہے اور نہ اس کے بعد کوئی اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ مومن (۶۷)، فاطر (۱۱)، منافقون (۱۱)، اعراف (۳۴)، نوح (۴) اور سورۂ آل عمران (۱۴۵)۔

❷ ''**بَيْنَكُمْ**'' کے لفظ میں ایک اور معنی بھی ہے کہ موت ایسی چیز ہے جو تمھارے درمیان رکھ دی گئی ہے، سب میں تقسیم ہوگی مگر ایک وقت میں نہیں، بلکہ باری باری ہر ایک پر آئے گی، جیسے کوئی مال لوگوں میں تقسیم ہونا ہو اور انھیں اس کے لیے بلایا جائے تو وہ سب اس کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب ان کے نام کی آواز آئے اور انھیں ان کا حصہ ملے، مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ

عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْ لَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾

اس بات سے کہ تمھاری جگہ تمھارے جیسے اور لوگ لے آئیں اور نئے سرے سے تمھیں ایسی صورت میں پیدا کر دیں جو تم نہیں جانتے ﴿۶۱﴾ اور بلاشبہ یقیناً تم پہلی دفعہ پیدا ہونے کو جان چکے ہو تو تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ﴿۶۲﴾ پھر کیا تم نے دیکھا جو کچھ تم بوتے ہو؟ ﴿۶۳﴾ کیا تم اسے اگاتے ہو، یا ہم ہی اگانے والے ہیں؟ ﴿۶۴﴾ اگر ہم چاہیں تو ضرور اسے ریزہ ریزہ کر دیں، پھر تم تعجب سے باتیں بناتے رہ جاؤ ﴿۶۵﴾ کہ بے شک ہم تو تاوان ڈال دیے گئے ہیں ﴿۶۶﴾ بلکہ ہم بے نصیب ہیں ﴿۶۷﴾

اس کی باری کب آئے گی۔

③ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ : " سَابِقٌ " جو آگے نکل جائے، غالب آ جائے۔ "مَسْبُوْقٌ" جو پیچھے رہ جائے، مغلوب ہو جائے، عاجز رہ جائے۔ باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "اور ہم ہرگز عاجز نہیں۔"

**آیت 61** عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ ...... : یعنی ہم ہرگز اس سے عاجز نہیں کہ تمھاری جگہ تمھارے جیسے اور لوگ لے آئیں اور تمھاری شکلیں ایسی بنا دیں جنھیں تم نہیں جانتے، مثلاً تمھاری صورتیں مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنا دیں۔ اس میں شدید ڈانٹ ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۳)، انعام (۱۳۳) اور سورۂ ابراہیم (۱۹، ۲۰)۔

**آیت 62** وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى ...... : یعنی جب تم جانتے ہو اور اس کا اقرار بھی کرتے ہو کہ تمھیں پہلی بار ہمیں نے پیدا کیا، جب تم کچھ تھے ہی نہیں، تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ جب تم مر جاؤ گے تو ہم تمھیں دوبارہ بھی زندہ کریں گے؟ دوبارہ پیدا کرنا تو پہلی بار سے آسان ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ روم (۲۷) اور سورۂ مریم (٦۷)۔

**آیت 63، 64** اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت کی زبردست دلیل بیان ہوئی ہے، یعنی یہ بتاؤ کہ وہ کھیت جس کا بیج تم زمین میں دفن کر کے آ جاتے ہو، کیا اسے زمین سے تم نکالتے اور بڑھاتے ہو، حتیٰ کہ وہ کھانے کے قابل ہو جاتا ہے، جس پر تمھاری زندگی کا دارو مدار ہے، یا اسے اُگانے والے ہم ہیں؟ اس کا جواب اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا کہ اے ہمارے رب! یہ تیرا ہی کام ہے، یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ تو ہر عقل مند کہے گا کہ جس نے اس بیج سے جو زمین کی تہ میں گل سڑ چکا تھا، اناج سے بھرے ہوئے یہ خوشے اگا دیے، وہ تمھیں بھی مرنے کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا دہرائی ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۵۷)، روم (۵۰) اور حم السجدہ (۳۹)۔

**آیت 65 تا 67** ① لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا ...... : "حُطَامًا" "حَطَمَ یَحْطِمُ حَطْمًا" (ض) (توڑنا) سے مشتق

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾
لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

پھر کیا تم نے دیکھا وہ پانی جو تم پیتے ہو؟ ﴿۶۸﴾ کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے، یا ہم ہی اتارنے والے ہیں؟ ﴿۶۹﴾
اگر ہم چاہیں تو اسے سخت نمکین بنا دیں، پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ ﴿۷۰﴾

ہے، بمعنی ''مَحْطُوْمٌ''، جیسے ''فُتَاتًا'' ''فَتٌّ'' سے اور ''جُذَاذًا'' ''جَذٌّ'' سے مشتق ہے۔ سب کا معنی ''ریزہ ریزہ کیا ہوا'' ہے۔ ''**فَظَلْتُمْ** '' اصل میں باب ''سَمِعَ'' سے ''فَظَلِلْتُمْ'' ہے، پہلا لام تخفیف کے لیے حذف کر دیا ہے۔ (دیکھیے طٰہٰ: ۹۷) ''**تَفَكَّهُوْنَ** '' اصل میں ''تَتَفَكَّهُوْنَ'' ہے، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی گئی ہے۔ ''تَفَكُّهٌ'' کا اصل معنی ''ایک پھل سے دوسرے پھل کی طرف منتقل ہونا'' ہے، پھر ایک بات سے دوسری کی طرف منتقل ہونے میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں کھیتی برباد ہونے کے بعد طرح طرح کی باتیں کرنا مراد ہے۔ ''مُغْرَمُوْنَ'' غرم، تاوان اور چٹی کو کہتے ہیں، باب افعال سے اسم مفعول کی جمع ہے، تاوان ڈالے گئے لوگ۔

❷ مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ''کھیتی کو چُورا چُورا یا ریزہ ریزہ کر دینے کی بھی کئی صورتیں ہیں، مثلاً جس زمین میں بیج ڈالا گیا اس میں اللہ تعالیٰ شور پیدا کر دے، فصل کمزور اور زرد پیدا ہو اور پوری طرح بارآور نہ ہو، یا فصل اگنے کے بعد اسے کیڑا لگ جائے، یا کسی ارضی یا سماوی آفت، مثلاً کہر اور شدید بارش وغیرہ سے فصل کی نشوونما رک جائے اور لہلہاتے کھیت زرد پڑ جائیں تو کیا تم میں سے کسی کو یہ اختیار ہے کہ فصل کو ان مصیبتوں سے بچا سکے؟ اور اگر تم خود اللہ کی مہربانی سے پیدا ہو گئے اور اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی سے تمھیں کھانے کو ملتا ہے تو پھر اس کے سامنے تمھاری اکڑ اور سرتابی کا کیا مطلب؟ اس صورت میں تم طرح طرح کی باتیں ہی بناتے رہ جاتے ہو کہ ہمارا تو بیج بھی ضائع ہو گیا، خرچے کی چٹی پڑی، محنت بھی ضائع ہوئی اور آئندہ کھانے کو بھی کچھ نہ ملا، ہم تو مارے گئے۔ یہ بات تمھیں پھر بھی نصیب نہیں ہوتی کہ اللہ کی طرف رجوع کرو اور اسے اللہ کی طرف سے تنبیہ سمجھو۔'' (تیسیر القرآن)

**آیت 68 تا 70** ❶ **اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ** ..... : ''**الْمُزْنِ**'' اسم جمع ہے، بادل۔ مفرد اس کا ''مُزْنَةٌ'' ہے۔ تیسیر القرآن میں ہے: ''یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک اور کرشمہ ہے، سطح سمندر سے سورج کی حرارت کی وجہ سے آبی بخارات اٹھتے ہیں۔ یہی بخارات بعد میں بادلوں کی شکل اختیار کر کے بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ سمندر کا پانی جس سے بخارات اٹھتے ہیں، سخت نمکین اور چھاتی جلانے والا ہوتا ہے، مگر جو بارش برستی ہے اس میں نمکینی نام کو نہیں ہوتی۔ حالانکہ جن جڑی بوٹیوں یا دواؤں کا ہم اس طرح عرق کشید کرتے ہیں ان میں ذائقہ بھی منتقل ہوتا ہے اور بُو بھی۔ مثلاً سونف یا اجوائن یا گاؤ زبان یا گلاب کے عرق میں ان اشیاء کا ذائقہ بھی منتقل ہو جاتا ہے اور بُو بھی، لیکن سمندر کے پانی کی نمکینی آبی بخارات کے ساتھ منتقل نہیں ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے، ورنہ اس زمین کا کوئی جاندار ایسا پانی پی کر زندہ ہی نہ رہ سکتا اور نہ

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿٧١﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿٧٢﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾

پھر کیا تم نے دیکھی وہ آگ جو تم سلگاتے ہو؟ ﴿٧١﴾ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا، یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿٧٢﴾ ہم نے ہی اسے ایک عظیم نصیحت اور مسافروں کے لیے زندگی کا سامان بنایا ہے ﴿٧٣﴾ سو تو اپنے بہت عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر ﴿٧٤﴾

---

ہی ایسے پانی سے پیداوار اُگ سکتی ہے جو پانی کے بعد جانداروں کی زندگی کا دوسرا بڑا سہارا ہے۔‘‘ (بتصرف)

﴿2﴾ قیامت کی دلیل کے طور پر انسان کی پہلی پیدائش کا ذکر فرمایا اور زمین سے مردہ بیج سے کھیتی اگانے کا ذکر فرمایا۔ کھیتی اگانے میں پانی خصوصاً بارش کا دخل ظاہر ہے، اس لیے اس کا ذکر فرمایا۔ قیامت کے دن انسانی جسم بھی بارش سے اگیں گے۔ حدیث کے لیے دیکھیے سورۂ نمل (٨٧) کی تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے بارش کو قیامت کے علاوہ اپنی توحید کی دلیل کے طور پر بھی جا بجا پیش فرمایا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ (٢١، ٢٢)، نمل (٦٠)، عنکبوت (٦٣) اور سورۂ روم (٤٨ تا ٥١)۔

**آیت 72،71** اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ......: ’’أَوْرٰی يُوْرِيْ‘‘ (افعال) ’’النَّارَ‘‘ آگ سلگانا۔ یہ چوتھی دلیل ہے جو یہاں اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت کے حق ہونے کے ثبوت کے لیے لائی گئی ہے۔ (دیکھیے یٰس: ٨٠) ’’اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ‘‘ میں خبر پر الف لام سے حصر پیدا ہو رہا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ’’یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں۔‘‘

**آیت 73** نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ: ’’قَوِيَ يَقْوٰی قِيًّا وَ قَوَايَةً‘‘ (س) ’’اَلدَّارُ‘‘ گھر خالی ہو گیا۔ ’’وَقَوٰی‘‘ سخت بھوکا ہونا۔ ’’اَلْمَطَرُ‘‘ بارش رک جانا۔ ’’اَلْقَوَاءُ‘‘ خالی زمین، بیابان، بھوک۔ ’’بَاتَ الْقَوٰی‘‘ اس نے بھوکے رات گزاری۔ ’’اَلْمُقْوِيْنُ‘‘ اس مادہ کے باب افعال ’’أَقْوٰی يُقْوِيْ إِقْوَاءً‘‘ سے اسم فاعل ’’مُقْوِی‘‘ کی جمع ہے، اس کا معنی قواء (جنگل بیابان) کے مسافر یا اس میں ٹھہرنے یا رہنے والے خانہ بدوش بھی ہے اور بھوکے لوگ بھی۔ کوئی شک نہیں کہ آگ کی ضرورت ہر ایک کو پڑتی ہے، مگر ان لوگوں کو اس سے بہت زیادہ کام لینا پڑتا ہے جن کا آیت میں ذکر ہے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آگ دوسرے لوگوں کے لیے نصیحت یا زندگی کا سامان نہیں، بلکہ ان دونوں کا خصوصاً ذکر اس لیے فرمایا کہ سفر اور بھوک میں یہ احساس زیادہ واضح ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔

**آیت 74** فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ: تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعلیٰ کی پہلی آیت کی تفسیر۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ’’انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، آپ اپنے رکوع میں ’’سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ‘‘ اور سجدے میں ’’سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰی‘‘ پڑھتے تھے اور کسی بھی رحمت کی آیت کے پاس سے گزرتے تو اس پر ٹھہر جاتے اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے اور کسی بھی عذاب کی آیت کے پاس سے گزرتے تو اس پر ٹھہر جاتے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے۔‘‘ [ أبوداوٗد، الصلاة، باب ما يقول الرجل في ركوعه و سجوده: ۸۷۱، و قال الألباني صحيح ]

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ

پس نہیں! میں ستاروں کے گرنے کی جگہوں کی قسم کھاتا ہوں! ۝ اور بلاشبہ یہ یقیناً ایسی قسم ہے کہ اگر تم جانو تو بہت بڑی ہے ۝ کہ بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے ۝ ایک ایسی کتاب میں جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے ۝ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا مگر جو بہت پاک کیے ہوئے ہیں ۝ تمام جہانوں کے

**آیت 76،75** فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ …… "فَلَآ اُقْسِمُ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ قیامہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔ "مَوَاقِعُ" "مَوْقِعٌ" کی جمع ہے جو "وَقَعَ يَقَعُ" سے ظرف ہے یا مصدر میمی، گرنے کی جگہیں۔ اس سے مراد ستاروں کے غروب ہونے کے مقامات ہیں، یا شہابِ ثاقب کی صورت میں شیاطین پر برسنے والے ستاروں کے گرنے کے مقامات۔

**آیت 77 تا 80** ❶ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ …… "كَرِيْمٌ" ہر چیز میں سے اپنی قسم میں سب سے اعلیٰ اور عمدہ چیز کو "کریم" کہتے ہیں۔ "اَلْقُرْآنُ" مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، یعنی پڑھا جانے والا۔ یہ نام اس لیے ہے کہ یہ کتاب اتنی پڑھی گئی اور قیامت تک پڑھی جائے گی کہ پڑھے جانے میں کسی اور کتاب کو اس کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ یعنی یہ کتاب جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، تمام پڑھی جانے والی چیزوں میں سب سے اعلیٰ ہے اور ہر قسم کی کمی بیشی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ کسی شیطان کی مجال نہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے سے پہلے یا نازل ہونے کے دوران اس پر مطلع ہی ہو سکے، کیوں کہ یہ اس کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں درج ہے جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے، جن و انس میں سے کسی کی اس تک رسائی ہی نہیں۔ اسے پڑھنا تو درکنار، کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا، سوائے اللہ تعالیٰ کے ان فرشتوں کے جنھیں ہر قسم کی خیانت اور معصیت سے ہر طرح پاک پیدا کیا گیا ہے۔ ان پاک باز فرشتوں نے رب العالمین کی طرف سے اسے رسول اللہ ﷺ کے دل پر نازل فرمایا ہے۔ یہ نہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، نہ یہ کسی انسان یا دوسری مخلوق کا کلام ہے اور نہ شیاطین کا اس میں کوئی دخل ہو سکتا ہے، بلکہ یہ ہر طرح کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والا کلام ہے۔ "كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ" سے مراد لوحِ محفوظ ہونے کی دلیل یہ آیت ہے، فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ [ البروج : ۲۱، ۲۲ ] "بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے۔ اس تختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے۔" مزید دیکھیے سورۂ عبس (۱۱ تا ۱۶) اور سورۂ شعراء (۱۹۲ تا ۱۹۴ اور ۲۱۰ تا ۲۱۲)۔

❷ یہ چاروں آیات "فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ" کا جوابِ قسم ہیں۔ اس قسم اور جواب قسم کی مناسبت کے لیے سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

❸ جیسا کہ آیت کی تفسیر بیان ہوئی، تو "لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" میں حدث اصغر یا حدث اکبر کی صورت میں قرآن مجید کو ہاتھ لگانے یا نہ لگانے کا کوئی حکم بیان نہیں کیا گیا، بلکہ یہ بات بیان فرمائی گئی ہے کہ قرآن مجید جس کتاب مکنون میں ہے اسے

الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۰

رب کی طرف سے اتاری ہوئی ہے ۝۸۰

فرشتوں کے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس لیے جو اہلِ علم اس آیت سے یہ مسئلہ نکالتے ہیں کہ جنبی یا حائضہ یا بے وضو شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ قرآن مجید کو ہاتھ لگائے، ان کی بات درست نہیں، کیونکہ انسان جتنی بھی طہارت کر لے اس کے لیے فرشتوں جیسا مطہر بننا مشکل ہے۔ (الاّ ما شاء اللہ)

④ بہت سے اہلِ علم نے فرمایا کہ یہ مسئلہ قرآن مجید کی اس آیت سے نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ موطا امام مالک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جو خط لکھ کر دیا اس میں یہ بھی لکھا کہ "لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ" "قرآن کو طاہر کے سوا کوئی ہاتھ نہ لگائے۔" شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ''ارواء الغلیل'' کی حدیث (۱۲۲) میں اس حدیث کی تمام سندوں پر مفصل کلام کے بعد لکھا ہے: ''خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کے جتنے طُرق ہیں کوئی بھی ضعف سے خالی نہیں، لیکن یہ معمولی ضعف ہے، کیونکہ ان میں سے کسی میں بھی ایسا راوی نہیں جس پر جھوٹ کی تہمت ہو، علت صرف ارسال ہے یا سوئے حفظ اور اُصول حدیث میں طے ہے کہ کئی سندیں ہوں تو وہ ایک دوسری کو قوت دیتی ہیں، جب ان میں کوئی متہم شخص نہ ہو، جیسا کہ نووی نے اپنی تقریب میں، پھر سیوطی نے اس کی شرح میں قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق دل کو اس حدیث کی صحت پر اطمینان ہوتا ہے......۔'' (ارواء الغلیل) مگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو اس سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا، ہمارے استاذ محمد عبدہ لکھتے ہیں: ''مگر یہ اپنے مفہوم میں صریح نہیں ہے، کیونکہ اس کے معنی ''کفر و شرک'' سے پاک ہونے کے بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ مسلمان تو جنابت کی حالت میں بھی پاک ہی رہتا ہے۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ." (اشرف الحواشی) استاذ مرحوم نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''مجھے رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی راستے میں ملے، جب کہ میں جنابت کی حالت میں تھا۔ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، میں آپ کے ساتھ چلتا رہا، یہاں تک کہ آپ ﷺ بیٹھ گئے تو میں کھسک گیا، گھر آیا، غسل کیا، پھر آیا تو آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا: (( أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هِرٍّ !؟ )) ''ابو ہریرہ! تم کہاں تھے؟'' میں نے آپ کو بات بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( سُبْحَانَ اللّٰهِ ! يَا أَبَا هِرٍّ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ )) [ بخاري، الغسل، باب الجنب يخرج...... : ۲۸۵ ] ''سبحان اللہ! ابو ہریرہ! مومن تو نجس نہیں ہوتا۔''

حائضہ کے لیے نماز اور روزہ کی اجازت نہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہاتھ نجس ہے جسے وہ قرآن کو نہیں لگا سکتی، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( نَاوِلِيْنِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ )) ''مجھے مسجد سے چٹائی پکڑاؤ۔'' میں نے کہا: ''میں تو حائضہ ہوں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتْ فِيْ يَدِكِ )) [ مسلم، الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها...... : ۲۹۸ ] ''تمھارا حیض تمھارے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ''ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تھے، آپ نے فرمایا: (( يَا عَائِشَةُ ! نَاوِلِيْنِي الثَّوْبَ )) ''اے عائشہ! مجھے

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَوْ لَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَ اَنْتُمْ حِيْنَىِٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْ لَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾

پھر کیا اس کلام سے تم بے توجہی کرنے والے ہو؟ ﴿۸۱﴾ اور تم اپنا حصہ یہ ٹھہراتے ہو کہ بے شک تم جھٹلاتے ہو ﴿۸۲﴾ پھر کیوں نہیں کہ جب وہ (جان) حلق کو پہنچ جاتی ہے ﴿۸۳﴾ اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو ﴿۸۴﴾ اور ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں اور لیکن تم نہیں دیکھتے ﴿۸۵﴾ سو اگر تم (کسی کے) محکوم نہیں تو کیوں نہیں ﴿۸۶﴾ تم اسے واپس لے آتے، اگر تم سچے ہو ﴿۸۷﴾

کپڑا پکڑاؤ۔“ انھوں نے کہا: ”میں حائضہ ہوں۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتْ فِيْ يَدِكِ » ”تمھارا حیض تمھارے ہاتھ میں تو نہیں۔“ تو انھوں نے آپ کو وہ کپڑا پکڑا دیا۔“ [ مسلم، الحیض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها...... : ۲۹۹ ]

شیخ ناصر الدین البانی نے ”تمام المنة“ کے ”بَابُ مَا يَجِبُ بِهِ الْوُضُوْءُ“ میں فرمایا: ”تو زیادہ قریب بات (واللہ اعلم) یہ ہے کہ اس حدیث میں ”طَاهِرٌ“ سے مراد مومن ہی ہے، خواہ وہ حدثِ اکبر (جنابت) کی حالت میں ہو یا حدثِ اصغر (بے وضو ہونے) کی حالت میں، یا حائضہ ہو یا اس کے جسم پر کوئی نجاست لگی ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ » ”مومن نجس نہیں ہوتا۔“ اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے اور ”لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ“ کا مطلب یہ ہے کہ مشرک کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ یہ اس حدیث ہی کی طرح ہے جس میں ہے: « نَهٰى أَنْ يُّسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلٰى أَرْضِ الْعَدُوِّ » ”آپ ﷺ نے دشمن کی سرزمین کی طرف قرآن لے کر سفر کرنے سے منع فرمایا۔“ یہ حدیث بھی متفق علیہ ہے۔ اور شوکانی نے ”نیل الأوطار“ (بَابُ إِيْجَابِ الْوُضُوْءِ لِلصَّلَاةِ وَ الطَّوَافِ وَ مَسِّ الْمُصْحَفِ) میں اس مسئلے پر تفصیل سے کلام کیا ہے، اگر زیادہ تحقیق چاہو تو اس کی طرف مراجعت کرو۔“

اور ”تمام المنة“ کے ”بَابُ مَا يَحْرُمُ عَلَى الْجُنُبِ“ میں لکھتے ہیں: ”وَالْبَرَاءَةُ الْأَصْلِيَّةُ مَعَ الَّذِيْنَ قَالُوْا بِجَوَازِ مَسِّ الْقُرْآنِ مِنَ الْمُسْلِمِ الْجُنُبِ وَلَيْسَ فِي الْبَابِ نَقْلٌ صَحِيْحٌ يُجِيْزُ الْخُرُوْجَ عَنْهَا“ یعنی ”یہ قاعدہ کہ جس کام کی ممانعت نہ ہو اس میں اصل یہی ہے کہ وہ جائز ہے، ان لوگوں کی تائید میں ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمان جنبی بھی ہو تو قرآن کو ہاتھ لگا سکتا ہے اور اس مسئلے میں کوئی صحیح حدیث نہیں جس کی وجہ سے اسے اس سے خارج کیا جا سکے۔“

**آیت 82,81** اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ...... : پھر کیا اس ساری تفصیل کے بعد کہ قیامت حق ہے اور اللہ تعالیٰ اکیلا معبود برحق ہے اور قسم کے ساتھ تاکید کے بعد بھی کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے، تم اس سے بے توجہی کرتے ہو اور اس پر ایمان لانے میں سستی کرتے ہو اور اتنی بڑی نعمت میں سے تم یہی حصہ حاصل کرتے ہو کہ اسے جھٹلا دیتے ہو۔

**آیت 83 تا 87** فَلَوْ لَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ...... : ”مَدِيْنِيْنَ“ ”دَانَ يَدِيْنُ دَيْنًا“ (جزا دینا، مالک ہونا، حساب لینا،

فَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ۬ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾

پس لیکن اگر وہ ان لوگوں سے ہوا جو قریب کیے ہوئے ہیں ﴿۸۸﴾ تو (اس کے لیے) راحت اور خوشبو دار پھول اور نعمت والی جنت ہے ﴿۸۹﴾

حاکم ہونا) سے اسم مفعول "مَدِيْنٌ" کی جمع ہے جو اصل میں "مَدْيُوْنٌ" تھا، بدلا دیے گئے، محاسبہ کیے گئے، محکوم، مملوک۔ ان آیات میں "فَلَوْلَآ" دو دفعہ آیا ہے اور دونوں کی جزا "تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ" ہے۔ ان آیات میں نزع کے عالم کا نقشہ کھینچ کر قیامت کے منکروں سے کہا گیا ہے کہ ایسا کیوں نہیں کہ مرتے وقت جب جان حلق تک آ پہنچتی ہے اور تم پاس بیٹھے مرنے والے کو دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم تم سے زیادہ اس مرنے والے کے قریب ہوتے ہیں، تو پھر اگر تم کسی کے محکوم نہیں اور نہ تم سے کوئی محاسبہ کرنے والا ہے اور تم خود ہی ہر طرح صاحب اختیار ہو، تو اگر تم سچے ہو تو نکلنے والی اس جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ تمھاری بے بسی سے ثابت ہوا کہ تم سب اللہ تعالیٰ کے مملوک اور اس کے حکم کے پابند ہو، جب وہ لے جانا چاہے گا لے جائے گا اور جب زندہ کر کے محاسبے کے لیے اپنے سامنے کھڑا کرنا چاہے گا کر دے گا۔ اس لیے تمھاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کی توحید پر، اس کے رسول پر اور یوم قیامت پر ایمان لے آؤ، تاکہ تمھیں اس دن شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ جان نکلنے کے وقت انسان کی حالت اور اس کے غم گساروں کی بے بسی کا نقشہ سورۂ قیامہ کی آیات (۲۶ تا ۳۰) میں بھی خوب کھینچا گیا ہے۔

**آیت 88، 89** فَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ...... : "فَرَوْحٌ" اور "رَيْحَانٌ" پر تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ "رَوْحٌ" کے معنی ہیں راحت، خوشی اور رحمت اور "رَيْحَانٌ" ہر خوشبودار پودے اور پھول کو کہتے ہیں۔ "رَيْحَانٌ" کا ایک معنی رزق بھی ہے۔ سورت کے آخر میں تینوں گروہوں کا جان کنی کے وقت کا حال بیان فرمایا۔ مقصد ترغیب و ترہیب ہے، یعنی اگر مرنے والا مقربین سے ہوا تو مرتے وقت اس کے لیے عظیم راحت، خوشی اور اللہ کی رحمت ہے، خوشبو دار پھول ہیں اور نعمتوں سے بھری ہوئی جنت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْمَيِّتُ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ فَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوا اخْرُجِيْ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ ! كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ، اخْرُجِيْ حَمِيْدَةً وَأَبْشِرِيْ بِرَوْحٍ وَ رَيْحَانٍ وَ رَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا إِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هٰذَا ؟ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانٌ، فَيُقَالُ مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الطَّيِّبَةِ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ ادْخُلِيْ حَمِيْدَةً، وَ أَبْشِرِيْ بِرَوْحٍ وَ رَيْحَانٍ وَ رَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ، فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهَا إِلَى السَّمَاءِ الَّتِيْ فِيْهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ )) [ ابن ماجه، الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له: ۴۲۶۲، وقال الألباني صحيح ] "مرنے والے کے پاس فرشتے آتے ہیں تو جب آدمی صالح ہو تو وہ کہتے ہیں: "نکل اے پاک جان جو پاک جسم میں تھی! نکل، تو تعریف والی ہے اور عظیم راحت کی اور خوشبو دار پھولوں کی اور غصے نہ ہونے والے رب کی خوش خبری پر خوش ہو جا۔" وہ اسے یہی کہتے رہتے

وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ﴿۹۱﴾ وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّ تَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ ﴿۹۴﴾

اور لیکن اگر وہ دائیں ہاتھ والوں سے ہوا ﴿۹۰﴾ تو (کہا جائے گا) تجھ پر سلام (کہ تو) دائیں ہاتھ والوں سے ہے ﴿۹۱﴾ اور لیکن اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں سے ہوا ﴿۹۲﴾ تو اس کے لیے کھولتے ہوئے پانی کی مہمانی ہے ﴿۹۳﴾ اور جہنم میں داخل کیا جانا ہے ﴿۹۴﴾

ہیں حتیٰ کہ وہ نکل آتی ہے۔ پھر اسے آسمان کی طرف اوپر لے جایا جاتا ہے اور اس کے لیے دروازہ کھولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ''یہ کون ہے؟'' وہ کہتے ہیں: ''فلاں ہے۔'' تو کہا جاتا ہے: ''اس پاک جان کو مرحبا جو پاک جسم میں تھی، اندر آ جا، تو تعریف والی ہے اور عظیم راحت کی اور خوشبو دار پھولوں کی اور غصے نہ ہونے والے رب کی خوش خبری پر خوش ہو جا۔'' پھر اسے یہی الفاظ کہتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ اسے اس آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے جس میں اللہ عزوجل ہے۔''

**آیت 90، 91** ﴿ وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ...... ﴾ : مفسرین نے ان دونوں آیات کی ترکیب کئی طرح سے فرمائی ہے، ایک سادہ سی ترکیب یہ ہے کہ پوری عبارت اس طرح ہے: "وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِ فَيُقَالُ لَهُ سَلَامٌ لَّكَ لِكَوْنِكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِ" ''اور لیکن اگر وہ دائیں ہاتھ والوں سے ہوا تو اسے کہا جائے گا کہ تجھ پر سلام ہے، کیونکہ تو اصحاب الیمین سے ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اصحاب الیمین کو فوت کرتے وقت فرشتے سلام کہتے ہیں اور بشارت دیتے ہیں کہ اب تم ہر رنج و غم اور ہر خوف سے سلامت رہو گے، کیونکہ تم اصحاب الیمین میں سے ہو۔ یعنی فرشتے اسے اصحاب الیمین میں سے ہونے کی بشارت دے کر سلام کہیں گے۔ یہی بات تفصیل کے ساتھ سورۂ حم السجدہ کی آیت (۳۰ تا ۳۲) میں کہی گئی ہے۔

**آیت 92 تا 94** ﴿ وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ...... ﴾ : "نُزُلٌ" مہمانی۔ (دیکھیے کہف: ۱۰۲) "تَصْلِيَةٌ" "صَلِيَ يَصْلٰى" (ع) سے باب تفعیل کا مصدر ہے، داخل کرنا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا ایک حصہ آیت (۸۸، ۸۹) کی تفسیر میں گزر چکا ہے، اس میں کفار کی موت کا بھی حال بیان ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَ إِذَا كَانَ الرَّجُلُ السُّوْءُ قَالَ اخْرُجِيْ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ ! كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الْخَبِيْثِ، اخْرُجِيْ ذَمِيْمَةً وَأَبْشِرِيْ بِحَمِيْمٍ وَغَسَّاقٍ وَآخَرَ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا إِلَى السَّمَاءِ فَلَا يُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هٰذَا؟ فَيُقَالُ فُلَانٌ، فَيُقَالُ لَا مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الْخَبِيْثَةِ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الْخَبِيْثِ ارْجِعِيْ ذَمِيْمَةً فَإِنَّهَا لَا تُفْتَحُ لَكِ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، فَيُرْسَلُ بِهَا مِنَ السَّمَاءِ ثُمَّ تَصِيْرُ إِلَى الْقَبْرِ )) [ ابن ماجه، الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له: ٤٢٦٢، وقال الألباني صحيح ] ''اور جب آدمی برا ہوتا تو اسے (فرشتہ) کہتا ہے: ''نکل اے خبیث جان جو خبیث جسم میں تھی! اور بشارت سن کھولتے ہوئے پانی اور پیپ کی اور دوسری اس کی ہم شکل کئی قسموں کی۔'' پھر اسے مسلسل

ع ۳ ۱۶

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝﴿۹۶﴾

بلاشبہ یقیناً یہی ہے وہ سچ جو یقینی ہے ﴿۹۵﴾ سوتو اپنے بہت عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر ﴿۹۶﴾

یہی کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ نکل آتی ہے۔ پھر اسے اوپر آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے، مگر اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا اور کہا جاتا ہے: ''یہ کون ہے؟'' بتایا جاتا ہے کہ یہ فلاں ہے تو کہا جاتا ہے: ''اس خبیث جان کو جو خبیث جسم میں تھی کوئی مرحبا نہیں، مذمت کی ہوئی حالت میں واپس لوٹ جا، کیونکہ تیرے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔'' پھر اسے آسمان سے چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر وہ قبر کی طرف لوٹ جاتی ہے۔''

**آیت 95، 96** اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ...... : ''حَقُّ'' موصوف ہے جو اپنی صفت ''الْيَقِيْنِ'' کی طرف مضاف ہے، یعنی یہ ایسی ثابت شدہ بات اور ایسا سچ ہے جو یقینی ہے۔ ان دونوں آیات کے لیے دیکھیے سورۂ حاقہ کی آخری دو آیات کی تفسیر۔

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ ۹۴ — ۵۷ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا ۲۹ رُكُوْعَاتُهَا ۴

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا پاک ہونا بیان کیا ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ①

آیت 1 ① سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: یعنی زمین و آسمان کی ہر چیز نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کا خالق و مالک اللہ عزوجل ہر عیب اور کمی سے پاک ہے، اس کی ذات و صفات، افعال و احکام غرض ہر چیز کسی بھی طرح کے عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اس سورت میں اور سورۂ صف اور سورۂ حشر کے شروع میں "سَبَّحَ" (ماضی) آیا ہے، سورۂ جمعہ اور سورۂ تغابن میں "يُسَبِّحُ" (مضارع) آیا ہے، جس میں حال و استقبال دونوں شامل ہیں اور سورۂ بنی اسرائیل میں "سُبْحٰنَ" (مصدر) آیا ہے، جس میں دوام پایا جاتا ہے۔ یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا ہر عیب سے پاک ہونا بیان کرتا چلا آیا ہے، اب بھی کر رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ سورۂ اعلیٰ میں "سَبِّحْ" امر کے ساتھ بھی آیا ہے۔

② اس میں مشرکین پر چوٹ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ہر عیب سے پاک ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور تم ہو کہ اس کے لیے شریک اور اس کے لیے اولاد بنا کر اس پر اتنا بڑا عیب لگا رہے ہو جس سے بڑا عیب اور جس سے بڑی گالی اس کے لیے ہو ہی نہیں سکتی۔ تمھیں پیدا اس نے کیا، تمھاری پرورش وہ کر رہا ہے اور تمھاری ہر ضرورت پوری وہ کرتا ہے، تمھاری موت و حیات اس کے ہاتھ میں ہے، مگر تم اس کے بے بس بندوں میں سے کسی کو داتا کہتے ہو، کسی کو دستگیر، کسی کو مشکل کشا اور کسی کو گنج بخش، کسی کو تم نے اولاد دینے والا بنا رکھا ہے تو کسی کو حکومت دینے والا، کسی کو خزانے بخشنے والا تو کسی کو شفا دینے والا، کسی کے متعلق کہتے ہو کہ وہ اللہ کی تقدیر کا رخ پھیر دیتا ہے اور کسی کے بارے میں کہتے ہو کہ وہ کمان سے نکلا ہوا تیر راستے سے واپس لے آتا ہے۔ اب آسمان و زمین کی ہر چیز کی گواہی کو دیکھو اور اپنے طرز عمل کو دیکھو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں: « قَالَ اللّٰهُ كَذَّبَنِيَ ابْنُ آدَمَ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِيْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، فَأَمَّا تَكْذِيْبُهُ إِيَّايَ فَزَعَمَ أَنِّيْ لَا أَقْدِرُ أَنْ أُعِيْدَهُ كَمَا كَانَ وَ أَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ لِيْ وَلَدٌ، فَسُبْحَانِيْ أَنْ أَتَّخِذَ صَاحِبَةً أَوْ وَلَدًا » [ بخاري، التفسير، سورة البقرة، باب: ﴿ وقالوا اتخذ الله ولدا سبحانه ﴾ : ٤٤٨٢ ] ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ابن آدم نے مجھے جھٹلا دیا، حالانکہ یہ اس کا حق نہیں تھا اور اس نے مجھے گالی دی، حالانکہ یہ اس کا حق نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے دوبارہ بنانے پر قادر نہیں ہوں اور اس کا مجھے گالی دینا اس کا یہ کہنا ہے کہ میری کوئی اولاد ہے، حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ میں کوئی بیوی یا اولاد بناؤں۔'' اس سورت میں اور مذکورہ بالا دوسری سورتوں کی آیات میں ''تسبیح'' کے لفظ اور اس حدیث میں "سُبْحَانِيْ" کے لفظ پر غور فرمائیں تو تسبیح کا مفہوم کافی حد تک واضح ہو جائے گا۔ یہی وجہ

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲

**اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ۝۲**

ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تسبیح کے ذکر کے بعد اپنی دس سے زیادہ صفات بیان فرمائیں اور سب کے بعد کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانے کی دعوت دی، فرمایا: ﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ [ الحدید : ۷ ] ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن میں اس نے تمھیں (پہلوں کا) جانشین بنایا ہے۔''

③ تسبیح کا لغوی معنی کیا ہے، قرآنی آیات میں اس کا مفہوم کیا ہے، یہ تسبیح زبان حال سے ہے یا قول کے ساتھ؟ ان سب باتوں کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴۳، ۴۴) کی تفسیر۔

④ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : "الْعَزِيْزُ" "عَزَّ يَعِزُّ" (ض) سے مبالغے کا صیغہ ہے، سب پر غالب، کوئی کام ایسا نہیں جو وہ کرنا چاہے اور نہ کر سکے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اسے کسی کام سے روک سکے۔ "الْحَكِيْمُ" کمال حکمت والا۔ اس کا ہر کام محکم ہے اور دانائی پر مشتمل ہے، اس لیے کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کا کامل علم رکھتا ہے۔ اس کے کسی کام میں کوئی غلطی نہیں، وہ عزیز ہے تو حکیم بھی ہے، اس کا غلبہ اندھے کی لاٹھی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ کمال حکمت بھی شامل ہے۔ "الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" خبر پر الف لام سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا کہ عزیز و حکیم صرف وہ ہے، کوئی اور نہیں۔

**آیت 2** ① لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : "لَهٗ" خبر کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا، یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، کسی اور کی نہیں۔ دوسرے کسی کے پاس بادشاہی اگر ہے تو سارے آسمانوں اور زمین کی نہیں بلکہ زمین کے کسی چھوٹے سے قطعے کی تھوڑے سے وقت کے لیے اور وہ بھی اسی کی عطا کردہ اور ہر لمحے دوسروں کی محتاج۔ مزید دیکھیے سورۂ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر۔ پھر کائنات کے سارے اختیارات کے مالک کے مقابلے میں کسی اور کی عبادت کا کیا جواز ہے؟

② يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ : اگرچہ یہ دونوں صفات "لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" کے مضمون میں شامل ہیں، مگر انھیں خاص طور پر الگ اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ دونوں کام زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے ان تصرفات میں سے ہیں جن کی حقیقت اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور مخلوق میں سے کوئی دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں اس کا کوئی دخل ہے اور اس میں قیامت کے امکان کی بھی دلیل ہے جس کا مشرک انکار کرتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے خداؤں کے باطل ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے، یعنی "لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا" کہ باطل معبود تو نہ کسی موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ اٹھائے جانے کے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۳)۔

③ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ③

وہی سب سے پہلے ہے اور سب سے پیچھے ہے اور ظاہر ہے اور چھپا ہوا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے③

آیت 3 ① هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ...... : "ظَهَرَ يَظْهَرُ" (ف) کا معنی پوشیدہ کے مقابلے میں ظاہر ہونا بھی ہے اور بلند اور غالب ہونا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [ التوبۃ : ۳۳ ] ''تا کہ وہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔'' یہاں بھی "هُوَ" مبتدا کی چاروں خبروں "الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ" پر الف لام کی وجہ سے حصر پیدا ہو رہا ہے، یعنی وہی ہے جو سب سے پہلے ہے، اس کی کوئی ابتدا نہیں اور وہی سب سے آخر ہے، اس کے بعد کوئی نہیں، اس کی انتہا بھی کوئی نہیں، اس کے سوا سب فنا ہونے والے ہیں، اس پر فنا نہیں۔ وہی ہے جس کا وجود ظاہر ہے، جو کائنات کی ہر چیز سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اسے بنانے والا موجود ہے، جو ہر چیز پر غالب ہے کہ اس نے جو چاہا بنا دیا اور جو چاہتا ہے بنا دیتا ہے، کوئی اس سے اوپر نہیں جو اسے روک سکے اور وہی ہے جس کی ذات پوشیدہ ہے جس کا آنکھیں ادراک نہیں کر سکتیں۔ اس کے سوا کسی میں ان چاروں صفات میں سے ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی۔ اس آیت کی بہترین تفسیر خود رسول اللہ ﷺ سے آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ جب ہم اپنے بستر پر لیٹیں تو یہ کہیں: (( اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَ رَبَّ الْأَرْضِ وَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، وَ مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْفُرْقَانِ، أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَ أَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَ أَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَ أَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ، اقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَأَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ )) [ مسلم، الذکر والدعاء، باب ما یقول عند النوم وأخذ المضجع : ۲۷۱۳ ] ''اے اللہ! اے آسمانوں کے رب اور زمین کے رب اور عرش عظیم کے رب! ہمارے رب اور ہر چیز کے رب! دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑ نکالنے والے اور تورات و انجیل اور فرقان کو نازل کرنے والے! میں ہر اس چیز کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کی پیشانی کے بالوں کو تو پکڑے ہوئے ہے۔ اے اللہ! تو ہی اول ہے، سو تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں اور تو ہی آخر ہے، سو تیرے بعد کوئی چیز نہیں اور تو ہی ظاہر ہے، سو تجھ سے اوپر کوئی چیز نہیں اور تو ہی باطن ہے، سو تجھ سے ''دُون'' (بعد) کوئی چیز نہیں۔ تو ہم سے قرض ادا کر دے اور ہمیں فقر سے غنی کر دے۔''

② "الْبَاطِنُ" کی ایک تفسیر وہ ہے جو عام طور پر کی جاتی ہے، یعنی پوشیدہ۔ اس کے مطابق "لَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ" کا مطلب یہ ہے کہ تو ہی پوشیدہ ہے، سو تجھ سے زیادہ پوشیدہ کوئی چیز نہیں۔ یہ مفہوم "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" میں بیان ہوا ہے، دیکھیے سورۂ انعام (۱۰۳) کی تفسیر اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے، انھوں نے فرمایا: (( قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِيْ لَهٗ أَنْ يَّنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَ يَرْفَعُهٗ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجَابُهُ النُّوْرُ

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ يَعْلَمُ

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں

وَفِيْ رِوَايَةِ أَبِيْ بَكْرٍ النَّارُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهٰى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ ﴾ [ مسلم، الإيمان، باب في قوله عليه السلام : " إن الله لا ينام...... " : ۱۷۹ ] ''رسول اللہ ﷺ نے ہم میں کھڑے ہو کر پانچ باتیں بیان فرمائیں، چنانچہ آپ نے فرمایا: ''اللہ عزوجل سوتا نہیں اور اس کے لائق نہیں کہ وہ سوئے، وہ ترازو کو جھکاتا ہے اور اسے اٹھاتا ہے، رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے اس کی طرف اوپر لے جایا جاتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے (اور ابوبکر کی روایت میں ہے کہ نار ہے) اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرے کی کرنیں اس کی مخلوق میں سے ان تمام چیزوں کو جلا دیں جن تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے۔''

③ اور ''الْبَاطِنُ'' کی ایک تفسیر وہ ہے جو مفسر طبری نے بیان فرمائی ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں: "وَالظَّاهِرُ" يَقُوْلُ وَهُوَ الظَّاهِرُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ دُوْنَهُ، وَهُوَ الْعَالِيْ فَوْقَ كُلِّ شَيْءٍ، فَلَا شَيْءَ أَعْلٰى مِنْهُ، "وَالْبَاطِنُ" يَقُوْلُ وَهُوَ الْبَاطِنُ جَمِيْعَ الْأَشْيَاءِ، فَلَا شَيْءَ أَقْرَبُ إِلٰى شَيْءٍ مِّنْهُ، كَمَا قَالَ : ﴿ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ [ ق : ١٦] ''یعنی ''وَ الظَّاهِرُ'' کا مطلب یہ ہے کہ وہی اپنے سوا ہر چیز پر ظاہر ہے اور وہی ہر چیز کے اوپر بلند ہے، کوئی چیز اس سے بلند نہیں اور ''وَ الْبَاطِنُ'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء سے باطن ہے، چنانچہ کوئی چیز کسی چیز سے اس سے زیادہ قریب نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ [ ق : ١٦] ''اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' خلاصہ یہ کہ ہر چیز سے زیادہ بلند بھی وہی ہے اور ہر چیز کے زیادہ سے زیادہ قریب بھی وہی ہے۔ بہت سے اہلِ علم نے اس قرب سے مراد علم کے لحاظ سے قریب ہونا اور ''الْبَاطِنُ'' کا معنی علم کے لحاظ سے ہر چیز کے قریب کیا ہے۔ یہ بحث آگے آیت (۴) ''وَهُوَ مَعَكُمْ'' میں کچھ تفصیل سے آ رہی ہے۔

**آیت 4** ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴) کی تفسیر۔

② ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۴) اور سورۂ طٰہٰ (۵) کی تفسیر۔ اس آیت میں مذکور تمام جملے لانے کا مقصد بھی یہ ہے کہ جب یہ سب کچھ اللہ واحد نے کیا ہے تو پھر اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے اور اس کے ساتھ شریک کیوں ٹھہراتے ہو، جیسا کہ یہ بات آگے آیت (۷) ''اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ'' میں صراحت کے ساتھ آ رہی ہے۔

③ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا...... : اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں سے ان چیزوں کے بجائے جو زمین پر موجود ہیں ان چیزوں کا ذکر فرمایا جو اس میں داخل ہوتی ہیں یا اس سے نکلتی ہیں۔ اسی طرح آسمان میں موجود چیزوں کے ذکر کے بجائے ان کا ذکر فرمایا جو اس سے اترتی ہیں یا اس کی طرف چڑھتی ہیں۔ کیونکہ جو زمین میں داخل

مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ

داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمھارے ساتھ

ہونے والی اور اس سے نکلنے والی چیزوں کو جانتا ہے وہ اس کے اوپر موجود چیزوں کو بالاولی جانتا ہے اور جو آسمان سے اترنے والی اور اس میں چڑھنے والی چیزوں کو جانتا ہے وہ فضا اور خلا میں موجود نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی چیزوں کو اور ستاروں کی گردش اور ان کے نظام کو بالاولی جانتا ہے۔

زمین میں داخل ہونے والی چیزوں میں سے بارش کا پانی ہے جو زمین کی گہرائیوں میں داخل ہوتا ہے، نباتات کے بیج ہیں اور زمین میں دفن ہونے والے اجسام وغیرہ ہیں اور اس سے نکلنے والی چیزوں میں سے نباتات، معدنیات، گیسیں اور وہ جانور ہیں جو اپنے غاروں اور ٹھکانوں سے نکلتے ہیں۔ آسمان سے اترنے والی چیزوں میں سے بارش، برف، ہوائیں، اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کے فرشتے اور اس کی رحمت وغیرہ ہیں اور اس میں چڑھنے والی چیزوں میں سے وہ چیزیں ہیں جو فضا کے طبقات میں بلند ہوتی ہیں۔ مثلاً سمندر وغیرہ سے اٹھنے والے آبی بخارات، مٹی اور ریت وغیرہ کی آندھیاں اور بگولے، فضا میں اڑنے والے پرندے، جسموں سے جدا ہو کر اوپر جانے والی ارواح اور عالم بالا سے معلومات چرانے کے لیے اوپر جانے والے شیاطین، بندوں کے اعمال اور فرشتے جو اترتے اور چڑھتے ہیں۔ [ التحریر و التنویر فی سورۃ سبا ]

❹ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ: ''اور وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو'' اس جملے سے پہلے اسی آیت میں یہ جملہ گزر چکا ہے: ﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ ''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔'' تو یہ آیت دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بیک وقت کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ اس معاملے میں بعض لوگوں نے ان دونوں کا انکار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نہ عرش پر ہے اور نہ کسی اور جگہ، بلکہ وہ لامکان ہے اور جو شخص یہ پوچھ بھی لے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اس کے لیے مکان (جگہ) تسلیم کرنے سے اس کا اس جگہ کا محتاج ہونا لازم آتا ہے۔ ان نادانوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کا فتویٰ کس کس پر لگ رہا ہے اور نہ یہ خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ کہ پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ پھر قیامت کے دن آٹھ فرشتوں کے عرش الٰہی کو اٹھائے ہونے کا ذکر سورۂ حاقہ میں موجود ہے، فرمایا: ﴿ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴾ [ الحاقۃ: ۱۷ ] ''اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔'' اور قیامت کے دن فرشتوں کے عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہونے کا ذکر سورۂ زمر میں موجود ہے، فرمایا: ﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ ﴾ [ الزمر: ۷۵ ] ''اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے۔'' اور یہ سوال کرنا کہ اللہ کہاں ہے، خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''میری ایک لونڈی اُحد اور جوانیہ کی طرف میری بکریاں چراتی تھی،

اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ④

ہے، جہاں بھی تم ہو اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ④

ایک دن میں نے دیکھا تو بھیڑیا اس کی بکریوں سے ایک بکری لے جا چکا تھا، میں بھی بنی آدم سے ہوں، مجھے اسی طرح غصہ آ جاتا ہے جیسے انھیں غصہ آتا ہے، تو میں نے اسے ایک تھپڑ مار دیا۔ پھر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے اسے مجھ پر بہت بڑا (گناہ) قرار دیا، میں نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا میں اسے آزاد نہ کر دوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( اِئْتِنِيْ بِهَا )) ''اسے میرے پاس لاؤ۔'' میں اسے لے کر آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے اس سے کہا: (( أَیْنَ اللّٰهُ ؟ )) ''اللہ کہاں ہے؟'' اس نے کہا: (( فِي السَّمَاءِ )) ''آسمان میں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ أَنَا؟ )) ''میں کون ہوں؟'' اس نے کہا: (( أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ )) ''آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ )) ''اسے آزاد کر دو، کیونکہ یہ مومنہ ہے۔'' [ مسلم، المساجد ومواضع الصلاۃ، باب تحریم الکلام في الصلاۃ ...... : ۵۳۷ ]

خلاصہ یہ ہے کہ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے، قرآن و حدیث کا صریح انکار ہے اور یہ عقیدہ رکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ بھی ہے، مگر اس طرح سے جسے وہی جانتا ہے اور جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے عرش پر مستوی ہونے کے انکار کی ایک انتہا یہ تھی کہ وہ کسی جگہ بھی نہیں، جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہستی ہی کا انکار ہے۔ دوسری انتہا ان لوگوں نے اختیار کی جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے اور ہم جہاں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ اس طرح ہے جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر یہ بات بھی غلط ہے، کیونکہ اسی آیت میں ''وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ'' (اور وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو) سے پہلے ''ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'' میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر بھی موجود ہے۔ اب اگر ''وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ'' کا مطلب یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ اس طرح ہمارے ساتھ ہے جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں تو ایک ہی آیت کے دو جملے ایک دوسرے سے ٹکراتے اور متعارض ٹھہرتے ہیں، اس لیے ''وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ'' کا وہی مطلب درست ہو گا جو ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى'' کے خلاف نہ ہو اور کلام عرب کے بھی خلاف نہ ہو، کیونکہ جس طرح ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى'' پر ایمان لازم ہے اسی طرح ''وَهُوَ مَعَكُمْ'' پر ایمان بھی لازم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلام عرب میں معیت (ساتھ ہونے) کا معنی اگرچہ اس طرح ساتھ ہونا بھی ہے جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر یہ لفظ مختلف مواقع کے لحاظ سے اس کے علاوہ معانی کے لیے بھی آتا ہے۔ چنانچہ معیت کا ایک معنی وہ ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت (۱۵۳): ﴿ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴾ (بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اور سورۂ توبہ کی آیت (۴۰): ﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ (غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے) میں ہے۔ ظاہر ہے ان آیات کے مطابق اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بے صبروں کے ساتھ نہیں، اسی طرح وہ ہجرت کے وقت

غارِ ثور میں اور سارے سفر میں رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، مشرکین کے ساتھ نہیں۔ ''وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ '' میں یہ معنی بھی مراد نہیں، کیونکہ اس معنی میں معیت صرف اللہ کے مخلص بندوں کا نصیب ہے۔

معیت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ ایک چیز دور ہونے کے باوجود ان چیزوں کے ساتھ بھی ہو جن سے وہ دور ہے۔ چنانچہ ''وَهُوَ مَعَكُمْ '' میں معیت سے یہی معنی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ بھی ہے۔ رہی یہ بات کہ کس طرح ہے؟ تو اس کی اصل اور پوری کیفیت وہی جانتا ہے۔ اگر مخلوق میں ایسا ہونا ممکن نہ بھی ہو تو اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [ الشوریٰ : ۱۱ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' مگر مخلوق میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک چیز کسی ایک جگہ ہونے کے باوجود دوسری جگہ موجود لوگوں کے ساتھ ہو۔ اس کی ادنیٰ سی مثال سورج اور چاند ہیں کہ بلندی پر ہونے کے باوجود ہم جہاں جاتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، حالانکہ وہ زمین پر ہمارے اندر موجود نہیں ہوتے، مگر سب کہتے ہیں کہ رات میں سفر کرتا رہا اور چاند سارے سفر میں میرے ساتھ رہا۔ معیت کا یہ معنی معروف ہے اور اپنے مقام پر حقیقی معنی ہے۔ جب سورج اور چاند کا یہ معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت تو ان کی صفت سے کہیں بلند ہے، چنانچہ وہ عرش پر ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ ہے، خواہ ہم کہیں بھی ہوں، اگرچہ اپنی صفت ''اَلْبَاطِنُ'' کی وجہ سے اور حجاب میں ہونے کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتا۔ قیامت کے دن جب وہ اہلِ جنت کو اپنے دیدار کی نعمت سے سرفراز فرمانے کا ارادہ کرے گا اور اپنا حجاب کھولے گا تو تمام جنتی اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے کسی تکلیف کے بغیر اور کسی قسم کے ہجوم یا بھیڑ کے بغیر اسے دیکھیں گے اور یہ مثال خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے کہا: (( يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! هَلْ نَرٰى رَبَّنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تُضَارُّوْنَ فِي الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ؟ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ فَهَلْ تُضَارُّوْنَ فِي الشَّمْسِ لَيْسَ دُوْنَهَا سَحَابٌ ؟ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ فَإِنَّكُمْ تَرَوْنَهُ كَذٰلِكَ )) [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿ وجوه يومئذ...... ﴾ : ۷۴۳۷ ] ''یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم چودھویں کی رات کو چاند دیکھنے میں کوئی تکلیف محسوس کرتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں اے اللہ کے رسول!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کیا تم سورج کو دیکھنے میں کوئی تکلیف محسوس کرتے ہو جس کے سامنے کوئی بادل نہ ہو؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں یا رسول اللہ!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو تم اسے اسی طرح دیکھو گے۔''

یہاں شیخ محمد بن صالح بن عثیمین رحمہ اللہ کی تالیف ''القواعد المثلى في صفات الله وأسماءه الحسنٰى'' (اَلْمِثَالُ الْخَامِسُ وَالسَّادِسُ ) سے ان کی ایک تحریر کا ترجمہ لکھا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''دوسری وجہ یہ ہے کہ ''معیت'' کے معنی کی حقیقت ''عُلُوّ'' کے مناقض اور خلاف نہیں، کیونکہ دونوں کا جمع ہونا مخلوق کے حق میں ممکن ہے ( کہ ایک چیز بلندی پر بھی ہو اور ساتھ بھی ہو ) کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ہم چلتے رہے اور چاند بھی ہمارے ساتھ تھا اور اسے تناقض نہیں سمجھا جاتا اور نہ کوئی اس سے یہ سمجھتا ہے کہ چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ تو جب یہ مخلوق کے حق میں ممکن ہے تو خالق کے حق میں تو بالاولیٰ ممکن ہے، جو اپنے عُلُوّ

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ⑤

کے ساتھ ہر چیز کو محیط بھی ہے، کیونکہ معیت کی حقیقت کے لیے ضروری نہیں کہ دونوں ایک جگہ اکٹھے ہوں۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے " الفتوی الحمویة (ص ۱۰۳)" (دیکھیے ابن القاسم کے مرتب کردہ "مجموع الفتاویٰ" کی جلد پنجم) میں اسی وجہ کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ انھوں نے لکھا ہے: "یہ اس لیے کہ لغت میں جب لفظ "مع" کسی قید کے بغیر بولا جاتا ہے تو اس کا معنی لغت میں مطلق ساتھ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، پھر جب اسے کسی خاص معنی کے ساتھ مقید کیا جائے تو اس معنی میں ساتھ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہم چلتے رہے اور چاند یا ستارہ ہمارے ساتھ تھا اور کہا جاتا ہے کہ فلاں سامان میرے ساتھ ہے، کیونکہ وہ تمھارے پاس ہوتا ہے، خواہ وہ تمھارے سر کے اوپر ہو۔ سو اللہ تعالیٰ حقیقت میں اپنی مخلوق کے ساتھ ہے اور حقیقت میں اپنے عرش پر بھی ہے۔"

⑤ سلف صالحین میں سے بہت سے اہل علم نے "وَهُوَ مَعَكُمْ" کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے اور وہ اپنے علم، رویت اور قدرت کے ساتھ ہمارے ساتھ ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ زیر تفسیر آیت میں "وَهُوَ مَعَكُمْ" سے پہلے ہر چیز کے علم کا ذکر ہے اور بعد میں ہر چیز کو دیکھنے کا۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ بھی ہے ہم جہاں بھی ہوں، مگر وہ زمین پر اپنی مخلوق کے ساتھ اس طرح نہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھنے والا، اسے دیکھنے والا اور اس پر پوری قدرت اور تصرف رکھنے والا ہے۔ یہ تمام صفات حسنیٰ اس کے لیے ثابت ہیں، مگر معیت کا معنی علم یا قدرت نہیں بلکہ یہ بذات خود ایک صفت ہے جس کی اصل کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لیے اس بات پر ایمان رکھنا لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے ہم جہاں بھی ہوں۔ رہی یہ بات کہ کس طرح ہے؟ تو اس کی اصل کیفیت وہی جانتا ہے، چاند یا سورج کی مثالیں صرف سمجھانے کے لیے ہیں کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش کے اوپر ہے، وہ مخلوق کے ساتھ ہو سکتا ہے اور ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ایک اور ادنیٰ سی مثال بجلی ہے کہ وہ اپنے اصل ٹھکانے میں ہونے کے باوجود ہزاروں میل دور تک موجود ہوتی ہے اور اس کا وجود سب محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معیت اور مخلوق پر مؤثر ہونے کے لیے یہ مثال بھی نہایت ادنیٰ مثال ہے، جبکہ اللہ کی صفات بہت اعلیٰ ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ [ النحل : ۶۰ ] "اور اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے۔" اس کے لیے عرش پر رہ کر ہر ایک کے ساتھ ہونا بالکل معمولی بات ہے۔

**آیت 5** ① لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: یہ جملہ آیت (۲) میں گزرا ہے، دوبارہ تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔

② وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ: "اِلَى اللّٰهِ" پہلے لانے کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ وَ هُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ۝۶ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن میں اس نے تمھیں (پہلوں کا) جانشین بنایا ہے، پھر وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے خرچ کیا ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے ۝۷

ہیں، کسی اور کی طرف نہیں، لہٰذا وہی تمام اعمال کا فیصلہ فرمائے گا اور ان کی جزا یا سزا دے گا۔

**آیت 6** يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ ...... : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۷)، حج (۶۱)، لقمان (۲۹)، ہود (۵) اور سورۂ رعد (۱۰)۔

**آیت 7** ❶ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ : سورت کے شروع سے یہاں تک اس حقیقت کے اعلان کے بعد کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز نے اللہ کا (ہر عیب اور کمی سے) پاک ہونا بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی دس سے زیادہ صفات بیان ہوئی ہیں جو یہ ہیں: "الْعَزِيْزُ ، الْحَكِيْمُ ، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ، يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ، وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ، وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ، يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ" ان صفات کے بیان کے بعد اس بات کی دعوت دی ہے کہ ان صفات کے مالک اللہ تعالیٰ پر اور اس کا پیغام لے کر آنے والے پر ایمان لاؤ۔ اس کے مخاطب اگرچہ کفار بھی ہیں، مگر بعد میں پورے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں سے خطاب ان مسلمانوں کو ہے جو ایمان لا چکے تھے، مگر ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں کوتاہی کر رہے تھے اور جہاد فی سبیل اللہ میں جان و مال کی قربانی سے گریز کر رہے تھے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ نساء کی آیت (۱۳۶): ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر) میں بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے ایمان میں پختگی پیدا کرو اور اس کے تقاضوں پر عمل کرو، جن میں سے ایک بہت بڑا تقاضا اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

❷ وَ اَنْفِقُوْا : یہاں خرچ کرنے سے مراد عام بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا نہیں بلکہ جہاد فی سبیل اللہ اور مجاہدین و مہاجرین کی ضروریات کے لیے خرچ کرنا ہے۔ دلیل اس کی آگے آنے والی آیت (۱۰) ہے: ﴿ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ "اور تمھیں کیا ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔" اور "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا خاص اطلاق جہاد پر ہوتا ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۶۰) کی تفسیر۔

❸ مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ : اس میں کئی طرح سے خرچ کرنے کی ترغیب ہے، ایک یہ کہ یہ مال تمھارا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ

وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۸

**اور تمھیں کیا ہے تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے، جب کہ رسول تمھیں دعوت دے رہا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ اور یقیناً وہ تم سے پختہ عہد لے چکا ہے، اگر تم ایمان والے ہو ⑧**

کا ہے جو اس نے تم سے پہلے لوگوں کو دیا تھا، اب اس نے تمھیں اس میں پہلوں کا جانشین بنا دیا ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ تم اس کی مرضی کے مطابق خرچ کرتے ہو یا نہیں۔ (دیکھیے انعام : ۱۶۵) غلام کا یہ کام نہیں کہ مالک کے مال کو وہاں خرچ نہ کرے جہاں وہ اسے خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے، بلکہ اپنی مرضی سے خرچ کرتا پھرے یا جمع کرنے لگ جائے۔ دوسرا یہ کہ پہلے لوگوں کی طرح یہ تمھارے پاس بھی نہیں رہے گا۔ اگر تم نے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر لیا تو یہ آخرت کے لیے تمھارا ذخیرہ بن جائے گا اور اگر تم نے خرچ نہ کیا تو کچھ اور لوگ اس میں تمھارے جانشین بن جائیں گے۔ پھر اگر انھوں نے اسے نیکی میں خرچ کیا تو وہ تم سے بہتر رہے کہ وہ مال جو تم نیکی میں خرچ نہ کر سکے انھوں نے کر دیا، تم محروم رہے اور اگر انھوں نے بدی میں خرچ کیا تو تمھاری دولت بھی ان کی بدی میں معاون ٹھہری۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِيْ مَالِيْ، إِنَّمَا لَهُ مِنْ مَّالِهِ ثَلَاثٌ، مَا أَكَلَ فَأَفْنٰى أَوْ لَبِسَ فَأَبْلٰى أَوْ أَعْطٰى فَاقْتَنٰى، وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ )) [ مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب الدنيا سجن للمؤمن وجنة للكافر : ۲۹۵۹ ] ''بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال، اس کے مال میں سے اس کی اپنی تو صرف تین چیزیں ہیں، جو اس نے کھایا اور فنا کر دیا، یا پہنا اور بوسیدہ کر دیا، یا دے دیا اور ذخیرہ بنا لیا اور جو اس کے علاوہ ہے تو یہ جانے والا ہے اور اسے لوگوں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے۔''

④ **فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا:** یہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے خرچ کیا ان میں سب سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائے اور تبوک کے موقع پر صدقہ کے اعلان پر سارا مال لے آئے، ان میں عمر رضی اللہ عنہ بھی ہیں جو آدھا مال لے آئے اور عثمان رضی اللہ عنہ بھی اور وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جنھوں نے خوش حالی میں بھی خرچ کیا اور تنگ دستی کے باوجود محنت مشقت کر کے بھی صدقہ کیا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۷۹) کی تفسیر۔

⑤ **لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ :** ''فی سبیل اللہ'' خرچ کرنے والوں کی فضیلت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۷۴) اور سورۂ انفال (۶۰)۔

**آیت 8** ① **وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ......** : یہ خطاب بھی مسلمانوں ہی سے ہے، اس کی دلیل آیت کا آخری جملہ ''وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (اور یقیناً وہ تم سے پختہ عہد لے چکا ہے اگر تم مومن ہو) ہے۔ اسی طرح بعد والی آیت (۱۰) : ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ﴾ بھی اس کی دلیل ہے۔ جس طرح پچھلی آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے اور خرچ کرنے کا حکم ہے، اسی طرح اس آیت میں بھی انھیں جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ آخر وجہ کیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے؟ یعنی اس پر ایمان کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے اس کے راستے میں خرچ نہیں کرتے،

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ١ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹

وہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات اتارتا ہے، تاکہ تمھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے اور بلاشبہ اللہ تم پر یقیناً بے حد نرمی کرنے والا، نہایت مہربان ہے ۝۹

حالانکہ رسول خود تمھارے درمیان موجود ہے اور بہ نفس نفیس تمھیں اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ اور اس پر یقین رکھتے ہوئے اس کی راہ میں خرچ کرو۔

② وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: ”اَخَذَ“ کا فاعل ”الرَّسُوْلُ“ کی ضمیر بھی ہو سکتی ہے اور لفظ ”اللّٰهِ“ کی ضمیر بھی، یعنی جب تم نے ایمان قبول کیا تھا اس وقت اللہ نے تم سے اطاعت کا پختہ عہد لیا تھا، اسی طرح کلمۂ اسلام کے ساتھ تم رسول کو بھی اپنی اطاعت کا پختہ عہد دے چکے ہو، تو اب اطاعت سے گریز اور جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنے سے دریغ کیوں کر رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ کے عہد لینے کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ١ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا١ٞ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ [ المائدۃ : ۷ ] ”اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کا عہد جو اس نے تم سے مضبوط باندھا، جب تم نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے۔“ اور رسول اللہ ﷺ کو عہد دینے کا ذکر اس حدیث میں ہے جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: (( بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، وَأَنْ نَقُوْمَ أَوْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ حَيْثُمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ )) [ بخاري، الأحکام، باب کیف یبایع الإمام الناس؟ : ۷۱۹۹، ۷۲۰۰ ] ”ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی کہ نشاط اور ناگواری دونوں حالتوں میں سمع و طاعت کریں گے اور صاحب امر سے امارت میں جھگڑا نہیں کریں گے اور جہاں بھی ہوں گے حق کہیں گے، اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“

③ بعض مفسرین نے ”وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ“ سے ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ“ والا عہد مراد لیا ہے، جس کا ذکر سورۂ اعراف (۱۷۲) میں ہے، مگر یہاں آیات کا سیاق اس کی موافقت نہیں کرتا، اس لیے پہلی تفسیر ہی درست ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔

**آیت 9** ① هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ...: اس آیت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۵، ۱۶) کی تفسیر۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ

اور تمھیں کیا ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، جب کہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی اور ان سب سے اللہ نے اچھی

2 لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حج (۶۵)۔

آیت 10 1 وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : ''میراث'' اصل میں اس ملکیت کو کہتے ہیں جو پچھلے مالک کے انتقال پر اس کے زندہ رہنے والے وارثوں کو ملتی ہے۔ یہ ملکیت جبری ہوتی ہے، مرنے والا چاہے یا نہ چاہے، جو وارث ہوتا ہے اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ''لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ'' میں خبر ''لِلّٰهِ'' کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا کہ زمین و آسمان کی وراثت صرف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ آخر کار سب نے فنا ہونا ہے اور جن چیزوں کے مالک تم سمجھے جاتے ہو سب اسی کی طرف لوٹ جانے والی ہیں۔ تو جب یہ مال تمھارے پاس رہنے والا ہی نہیں بلکہ اس نے تمھارے ہاتھ سے نکلنا ہی نکلنا ہے اور اگر تم خرچ نہیں کرو گے تو جبراً تم سے لے لیا جائے گا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم اسے اللہ کی راہ میں خوشی سے خود ہی خرچ نہ کرو کہ اس صورت میں مالک بھی راضی ہو جائے گا اور جو کچھ تم دو گے اللہ کے ذمے قرض ہو جائے گا، جو بے حساب اضافے کے ساتھ تمھارے لیے محفوظ رکھے گا، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ آدمی کے مال کی طرح اس کی جان کا بھی یہی حال ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

جاں بجاناں دہ، وگرنہ از تو بستاند اجل　　　خودتو منصف باش اے دل ایں نکو یا آں نکو

''جان محبوب کو دے دے، ورنہ موت تجھ سے لے لے گی۔ اے دل! تو خود ہی انصاف کر کہ یہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے؟''

2 لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ : یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جو بعد میں آنے والے جملے ''اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا'' سے واضح ہو رہی ہے۔ گویا پوری عبارت اس طرح ہے: ''لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ وَمَنْ أَنْفَقَ مِنْ بَعْدِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ'' یعنی ''تم میں سے وہ شخص جس نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی اور وہ شخص جس نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جنگ کی برابر نہیں ہیں۔'' ''الْفَتْحِ'' سے مراد فتح مکہ ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ﴾ [ النصر : ۱ ] ''جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔'' یا صلح حدیبیہ ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ [ الفتح : ۱ ] ''بے شک ہم نے تجھے فتح دی، ایک کھلی فتح۔'' اور دونوں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ اس طرح صحابہ کے تین درجے ہوں گے، پہلے درجے میں صلح

وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾

جزا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، خوب باخبر ہے ﴿۱۰﴾

حدیبیہ سے پہلے ایمان لا کر خرچ اور قتال کرنے والے سابقین اولین اور مہاجرین و انصار، دوسرے درجے میں صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ہجرت و نصرت کا شرف حاصل کرنے والے صحابہ کرام اور تیسرے درجے میں فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والے صحابہ کرام ہوں گے، جو ہجرت یا نصرت کا شرف حاصل نہیں کر سکے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ )) [ بخاري، الجهاد والسير، باب فضل الجهاد والسير : ۲۷۸۳ ] ”فتح مکہ کے بعد (اب) ہجرت نہیں رہی۔“

اس بات کی دلیل کہ صلح حدیبیہ سے پہلے خرچ اور قتال کرنے والے ان لوگوں سے درجے میں بلند ہیں جو فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لائے، وہ حدیث ہے جو انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: (( كَانَ بَيْنَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ، وَ بَيْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ كَلَامٌ، فَقَالَ خَالِدٌ لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ تَسْتَطِيْلُوْنَ عَلَيْنَا بِأَيَّامٍ سَبَقْتُمُوْنَا بِهَا، فَبَلَغَنَا أَنَّ ذٰلِكَ ذُكِرَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ دَعُوْا لِيْ أَصْحَابِيْ ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ ! لَوْ أَنْفَقْتُمْ مِثْلَ أُحُدٍ، أَوْ مِثْلَ الْجِبَالِ ذَهَبًا مَا بَلَغْتُمْ أَعْمَالَهُمْ )) [ مسند أحمد : ۲۶٦/۳، ح : ۱۳۸۱۲۔ مسند احمد کے محقق نے اسے صحیح کہا ہے ] ”خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ بات ہو گئی تو خالد رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے کہا: ”تم ہم پر ان چند دنوں کی وجہ سے بڑھ کر باتیں بنا رہے ہو جن میں تم ہم سے پہلے اسلام لے آئے۔“ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس بات کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے ساتھیوں کو میری خاطر چھوڑ دو، قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم اُحد کے برابر یا پہاڑوں کے برابر سونا خرچ کرو، تب بھی تم ان کے اعمال کو نہیں پہنچ سکتے۔“

③ فتح سے پہلے خرچ اور قتال کرنے والوں کا درجہ اس لیے بڑا ہے کہ فتح سے پہلے مسلمان تعداد میں کم اور قوت میں کمزور تھے، ان کی مالی حالت بھی بہت کمزور تھی، ان حالات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور جہاد میں حصہ لینا دونوں نہایت مشکل اور دل گردے کے کام تھے، جب کہ فتح کے بعد یہ صورت حال بدل گئی، مسلمان قوت و تعداد میں بڑھتے چلے گئے اور ان کی مالی حالت بھی پہلے سے بہت بہتر ہو گئی اور پورا جزیرۂ عرب فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگا۔ اس لیے فرمایا کہ پہلے مشکل کے دور اور بعد کے دور میں مسلمان ہونے والے اور جہاد میں خرچ کرنے والے اور لڑنے والے برابر نہیں ہو سکتے، بلکہ پہلوں کا درجہ بڑا ہے۔

④ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ شرف اور فضیلت میں امت کے تمام افراد سے بڑھ کر ہیں، کیونکہ ایمان لانے میں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور لڑنے میں وہ تمام صحابہ سے پہلے ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنی زندگی میں نماز کے لیے آگے کیا اور اسی بنا پر مسلمانوں نے انھیں خلافت کے منصب کے لیے مقدم رکھا۔

⑤ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى: اس میں یہ صراحت فرما دی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اگرچہ درجے اور فضیلت میں

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾

کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، تو وہ اسے اس کے لیے کئی گنا کر دے اور اس کے لیے باعزت اجر ہو ﴿۱۱﴾ جس دن تو ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو دیکھے گا ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کی دائیں طرفوں میں دوڑ رہی ہوگی۔ آج تمھیں ایسے باغوں کی خوش خبری ہے جن کے تلے نہریں چلتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہو، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۲﴾

تفاوت ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں مسلمان ہونے والے صحابہ کرام کو کوئی فضیلت حاصل نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ سے اچھی جزا یعنی جنت کا وعدہ کیا ہے اور تمام اصحاب رسول ﷺ جنتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور زیارت میں تاثیر ہی ایسی تھی کہ جس شخص نے بھی ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی اور ایمان پر فوت ہوا، بعد کا کوئی آدمی اس کے درجے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیت کی تفسیر میں مذکور حدیث، جس میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے والے آدمی کی برکت و فضیلت کا ذکر ہے۔ بڑے بدنصیب ہیں وہ لوگ جنھیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت و رفاقت کا شرف رکھنے والی مبارک ہستیوں سے بغض اور عداوت ہے اور وہ ان کے جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ سے آنکھیں بند کر کے ان کی معمولی لغزشوں کی وجہ سے ان پر تبرے بازی اور دشنام طرازی کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ، فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهُ» [ بخاري، فضائل الصحابة، باب قول النبي ﷺ: " لو كنت متخذا خليلا " : ۳۶۷۳ ] ”میرے ساتھیوں کو برا بھلا مت کہو، کیونکہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد کے برابر سونا بھی خرچ کرے تو ان کے کسی شخص کے ایک مُد (آدھا کلو اناج) کے برابر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کے نصف کے برابر ہو سکتا ہے۔“

﴿۶﴾ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ : ایمان، انفاق اور قتال فی سبیل اللہ کی ترغیب کے آخر میں فرمایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے، وہ ہر ایک کے عمل کو خوب جانتا ہے کہ کس درجے کا ہے اور اس میں کتنا اخلاص ہے اور وہ اس کے مطابق ہی اسے جزا دے گا۔

**آیت 11** مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۴۴، ۲۴۵) اور ”اَجْرٌ كَرِيْمٌ“ کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۴) اور سورۂ حج (۵۰)۔

**آیت 12** يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ...... : یعنی قیامت کے دن جب سورج لپیٹ دیا جائے گا (دیکھیے تکویر: ۱) اور

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ان لوگوں سے کہیں گے جو ایمان لائے ہمارا انتظار کرو کہ ہم تمھاری روشنی سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پس کچھ روشنی تلاش کرو، پھر ان کے درمیان ایک دیوار بنا دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا، اس کی اندرونی جانب، اس میں رحمت ہوگی اور اس کی بیرونی جانب، اس کی طرف عذاب ہوگا ﴿۱۳﴾

چاند بے نور ہو جائے گا (دیکھیے قیامہ : ۸) اور ستارے بکھر کر گر جائیں گے (دیکھیے انفطار : ۲) تو اس وقت سب لوگ سخت اندھیرے میں ہوں گے، جہنم کے اوپر صراط (پل) رکھا جائے گا جس پر سے ہر ایک کو گزرنا ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴾ [ مریم : ۷۱ ] ”اور تم میں سے جو بھی ہے اس پر وارد ہونے والا ہے۔ یہ ہمیشہ سے تیرے رب کے ذمے قطعی بات ہے، جس کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔“ وہاں روشنی صرف ایمان اور عملِ صالح کی ہوگی، جتنا ایمان کامل ہوگا اتنی ہی روشنی تیز ہوگی۔ کافر اور منافق دنیا میں گمراہی کے اندھیرے میں رہے تو وہاں بھی وہ اندھیرے میں ہوں گے۔ مومن مردوں اور عورتوں کی روشنی ان کے ایمان و عمل کے مراتب کے مطابق ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہی ہوگی اور وہاں انھیں یہ کہہ کر جنت کی بشارت دی جائے گی: ﴿ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [ الحدید : ۱۲ ] ”آج تمھیں ایسے باغوں کی خوش خبری ہے جن کے تلے نہریں چلتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہو، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔“

آیت 13 ① يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ ...... : دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی طرح منافقین وہاں بھی شروع میں ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے، مگر جب وہ اپنے ایمان کی روشنی میں جنت کی جانب روانہ ہوں گے کہ تو منافق مرد اور عورتیں ان سے کہیں گے ہمارے پاس روشنی نہیں، تم ہمیں اندھیرے میں چھوڑ کر اتنی تیزی سے نہ جاؤ، بلکہ تھوڑا انتظار کر لو اور ہمیں موقع دو کہ ہم بھی تمھاری روشنی میں جنت کی طرف چلتے جائیں۔

② قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ان سے کہا جائے گا کہ میدان حشر جہاں جنت یا جہنم میں بھیجے جانے کا فیصلہ ہوا ہے اور جہاں سے روشنی ملتی ہے، تم وہیں واپس جاؤ اور وہاں روشنی تلاش کرو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایمان و عمل کی روشنی ہے جو یہاں حاصل نہیں ہو سکتی، اسے حاصل کرنے کی جگہ دنیا ہے، وہاں جاؤ اور وہاں سے یہ روشنی لے کر آؤ۔

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ

وہ انھیں آواز دیں گے کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں اور لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈالا اور تم انتظار کرتے رہے اور تم نے شک کیا اور (جھوٹی) آرزوؤں نے تمھیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور اس دغا باز نے تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا ﴿۱۴﴾ سو آج نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے

③ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ……: مومن و منافق یہ باتیں کر ہی رہے ہوں گے کہ ان کے درمیان ایک عظیم دیوار حائل کر دی جائے گی، (بِسُوْرٍ میں تنوین تعظیم کی ہے) جس سے انھیں دور سے دکھائی دینے والی مومنوں کی روشنی بھی نظر آنا ختم ہو جائے گی۔ اس دیوار کی اندرونی جانب رحمت ہوگی اور بیرونی جانب جدھر منافق ہوں گے، عذاب ہوگا۔ اس دیوار میں ایک عظیم دروازہ ہوگا، جس سے مومن اس کی اندرونی جانب چلے جائیں گے، پھر دروازہ بند کر دیا جائے گا اور منافق اس سے باہر عذاب میں رہ جائیں گے۔

**آیت 14** ① يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ: منافق انھیں پکار پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے، کیا ہم کلمہ نہیں پڑھتے تھے، کیا ہم تمھارے ساتھ نمازیں نہیں پڑھتے تھے، زکوٰۃ اور حج ادا نہیں کرتے تھے اور ہر کام میں تمھارے ساتھ نہیں ہوتے تھے؟ اب تم ہمیں ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟

② قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ: یعنی تم مسلمان ہو کر بھی نہ دل سے مسلمان ہوئے اور نہ پوری طرح ایک طرف ہو کر مسلمانوں کے ساتھی بنے، بلکہ تم نے اپنے آپ کو نفاق کے فتنے ہی میں مبتلا رکھا۔

③ وَ تَرَبَّصْتُمْ: اور تم انتظار میں رہے کہ کب مسلمانوں پر کوئی آفت آتی ہے۔

④ وَارْتَبْتُمْ: یہ "رَيْبٌ" سے باب افتعال "اِرْتَابَ يَرْتَابُ اِرْتِيَابًا" کے ماضی معلوم کا صیغہ ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان و یقین کے بجائے تم شک اور تذبذب میں رہے۔

⑤ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ: "الْاَمَانِيُّ" "اُمْنِيَّةٌ" کی جمع ہے، یعنی تمھیں ان آرزوؤں نے دھوکے میں رکھا کہ بس چند دن میں مسلمان تباہ ہو جائیں گے اور اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

⑥ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ: حتیٰ کہ تمھیں موت آ گئی اور توبہ اور اخلاصِ عمل کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

⑦ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ: "الْغَرُوْرُ" سے مراد شیطان ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ فاطر (۵، ۶)۔

**آیت 15** فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ……: اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کفار و منافقین کا ٹھکانا ایک ہی ہوگا، جو آگ ہے۔ وہاں وہ مال نہ منافقین کے کام آئے گا جس کی وجہ سے وہ نفاق کا شکار رہے، نہ کفار کے کہ اس کے ساتھ فدیہ دے کر عذاب سے چھوٹ جائیں اور نہ ہی آگ کے سوا ان کا کوئی یار و مددگار ہوگا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ مزید دیکھیے

مِنۡكُمۡ فِدۡيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ مَاۡوٰٮكُمُ النَّارُ ؕ هِىَ مَوۡلٰٮكُمۡ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۵﴾ اَلَمۡ يَاۡنِ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَـقِّ ۙ وَلَا يَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَيۡهِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾

جنھوں نے انکار کیا، تمھارا ٹھکانا ہی آگ ہے، وہی تمھاری دوست ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۱۵﴾ کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے اور اس حق کے لیے جھک جائیں جو نازل ہوا ہے اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں ﴿۱۶﴾

سورۂ آل عمران (۹۱)۔

**آیت 16** : ① اَلَمۡ يَاۡنِ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا ......: ”لَمۡ يَاۡنِ“ ”أَنٰى يَأْنِيْ أَنْيًا وَ إِنًى“ (ض) ناقص یائی سے جحد معلوم ہے، کسی چیز کے وقت کا آ جانا، جیسا کہ فرمایا: ﴿غَيۡرَ نٰظِرِيۡنَ اِنٰىهُ﴾ [الأحزاب: ۵۳] ”اس (کھانے) کے (پکنے کے) وقت کا انتظار نہ کرنے والے۔“ پچھلی آیت میں قیامت کے دن مومن مردوں اور عورتوں اور منافق مردوں اور عورتوں کا حال ذکر فرمایا، جسے سن کر دل لرز اٹھتے ہیں اور خوف زدہ ہو کر عاجزی سے اپنے رب کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سے کماحقہ اثر قبول نہ کرنے پر ایمان والوں کو متنبہ فرمایا کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی نصیحت کی وجہ سے اور اس کی طرف سے نازل ہونے والے حق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجز ہو کر جھک جائیں؟ ایمان والوں سے مراد وہ تمام ایمان والے ہیں جنھیں اس سے پہلے ایمان لانے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور لڑنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں سستی اور کوتاہی پر عتاب کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں اتنا عتاب سن کر اور قیامت کے دن منافقین کا انجامِ بد سن کر بھی کیا ایمان والوں کے لیے اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کے احکام پر تن دہی سے عمل کرنے کا وقت نہیں آیا؟ جب کہ ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ کی آیات سن کر دل نرم ہو جائے اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے فوراً نصیحت کا اثر قبول کرے، کیونکہ ایمان والوں کی یہی شان ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ﴾ [الأنفال: ۲] ”(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: ۲۳] ”اللہ نے

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷﴾

جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے، بلاشبہ ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو ﴿۱۷﴾

سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے، (ایسی آیات) جو بار بار دہرائی جانے والی ہیں، اس سے ان لوگوں کی کھالوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔"

❷ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... : "قَسَتْ" اصل میں "قَسَوَتْ" ہے، باب اس کا " قَسَا يَقْسُوْ قَسْوَةً وَقَسَاوَةً " آتا ہے، سخت ہو جانا۔ یعنی کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ...... اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں اس سے پہلے کتاب یعنی تورات اور اس کے بعد انجیل دی گئی کہ شروع میں ان کا یہ حال تھا کہ اللہ کی آیات سن کر ان کے دل نرم ہو جاتے اور وہ ڈر جاتے تھے اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے تھے، پھر جیسے جیسے انبیاء کے زمانے سے دوری ہوتی گئی وہ خواہشات اور دنیا کی لذتوں کے پیچھے پڑتے گئے اور اللہ کے احکام جاننے کے باوجود ان پر عمل چھوڑ بیٹھے، جس سے ان کے دل سخت ہو گئے اور انھوں نے دانستہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر لیا۔ شرک، زنا، قتلِ ناحق، چوری، سود خوری اور دوسرے گناہ عام ہو گئے۔ اللہ کی آیات سن کر دل نرم ہونے اور ان کے سامنے جھک جانے کے بجائے انھوں نے ان میں تحریف شروع کر دی، جس کے نتیجے میں وہ راہِ راست سے بہت دور چلے گئے اور باہمی ضد اور عناد میں بہت سے فرقوں میں بٹ گئے۔

❸ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ : یعنی اب بھی ان کا یہی حال ہے کہ ان میں سے بہت زیادہ لوگ فاسق ہیں۔ "فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ" میں ان کی قلبی حالت کا بیان ہے اور "فٰسِقُوْنَ" میں ان کی عملی حالت کا بیان ہے۔ دوسری جگہ اس قسوتِ قلب کا سبب اور اس کا نتیجہ کچھ تفصیل سے بیان فرمایا ہے، وہاں ان کے دوسرے عہد توڑنے کے ساتھ قرضِ حسن دینے کا عہد توڑنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ کی آیت (۱۲، ۱۳) کی تفسیر۔

**آیت 17** ❶ اِعْلَمُوْٓا : "جان لو" اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے، بلکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ﴾ [ البقرۃ : ۲۳۵ ] ''اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے، پس اس سے ڈرو۔'' مقصد یہ ہے کہ یہ بات پوری توجہ سے سنو، اس پر غور کرو اور ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھو۔

❷ اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا...... : اس میں اللہ کی طرف رجوع کی اور گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کی ترغیب اور اپنی

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖۗ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾ ع ۱۸ / ۲

**بلاشبہ صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور جنھوں نے اللہ کو اچھا قرض دیا، انھیں کئی گنا دیا جائے گا اور ان کے لیے باعزت اجر ہے ﴿۱۸﴾ اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی اپنے رب کے ہاں بہت سچے اور شہادت دینے والے ہیں، انھی کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ بھڑکتی آگ میں رہنے والے ہیں ﴿۱۹﴾**

رحمت و مغفرت کی امید دلائی ہے، یعنی اگر تمھاری کوتاہیوں کی وجہ سے دلوں میں سختی پیدا ہو چکی ہے اور ان میں آیاتِ الٰہی سننے سے نرمی پیدا نہیں ہوتی تو اب بھی موقع ہے کہ اس کی تلافی کر لو، پھر جب تم پلٹ آؤ گے تو وہ اللہ جو زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے، وہ تمھارے مردہ دلوں کو بھی زندگی بخش دے گا۔

**آیت 18** ① **اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ:** "**الْمُصَّدِّقِيْنَ**" اصل میں باب تفعّل سے "اَلْمُتَصَدِّقِيْنَ" ہے، تاء کو صاد سے بدل کر صاد میں ادغام کر دیا۔ صاد کی تشدید سے صدقے میں مبالغے اور کثرت کا اظہار مقصود ہے، یعنی بہت صدقہ کرنے والے مرد اور بہت صدقہ کرنے والی عورتیں۔ "**الْمُزَّمِّلُ**" اور "**الْمُدَّثِّرُ**" میں بھی ایسے ہی ہے۔

② **وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ......:** یہاں ایک سوال ہے کہ "**اَقْرَضُوا اللّٰهَ**" فعل کا "**الْمُصَّدِّقِيْنَ**" اسم فاعل پر عطف کس طرح ڈالا گیا ہے؟ اس کے جوابات میں سے ایک جواب یہ ہے کہ "**الْمُصَّدِّقِيْنَ**" دراصل "اَلَّذِيْنَ تَصَدَّقُوْا" کے معنی میں ہے، اس لیے "**اَقْرَضُوْا**" کا عطف "تَصَدَّقُوْا" پر ہے جو "مُتَصَدِّقِيْنَ" کے ضمن میں موجود ہے۔ "مُتَصَدِّقِيْنَ" کو اسم فاعل کی صورت میں دوام کے اظہار کے لیے لایا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے اسی سورت کی آیت (۱۱) کی تفسیر دیکھیے۔ البتہ یہاں "**الْمُصَّدِّقِيْنَ**" کے لفظ میں صدقے کی کثرت اور اس پر دوام کی بات اس سے زائد ہے۔

**آیت 19** ① **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ......:** "**الصِّدِّيْقُوْنَ**" اور "**الشُّهَدَآءُ**" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۶۹) کی تفسیر۔ اس آیت پر بھی ایک سوال ہے کہ صدیقین اور شہداء تو ایمان کے بلند درجے پر فائز لوگ ہوتے ہیں، جب کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والے سب لوگوں کو صدیقین اور شہداء کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لانے والوں سے مراد یہاں اس ایمان میں کامل لوگ ہیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ آیت (۷): ﴿ **اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ** ﴾ میں ایمان والوں کو ایمانِ کامل لانے کا حکم ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسولوں پر کامل ایمان رکھنے والے ہی صدیقین اور شہداء ہیں۔ "**اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ**" میں

اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ

جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل ہے اور دل لگی ہے اور بناؤ سنگار ہے اور تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر بڑائی جتانا ہے اور اموال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے، اس بارش کی طرح جس سے اگنے والی کھیتی نے کاشت کاروں کو خوش کر دیا، پھر وہ پک جاتی ہے، پھر تو اسے دیکھتا ہے کہ زرد ہے،

حصر کا مفہوم ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین اور شہداء کے لیے جو درجے ہیں وہ ہر مدعیٔ ایمان کو حاصل نہیں ہو جائیں گے، بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان لائیں گے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ کمال ایمان کے کئی مراتب ہیں، جیسا کہ صدیقیت و شہادت کے کئی مراتب ہیں، اگرچہ سب پر صدیق یا شہید کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلشَّهَادَةُ سَبْعٌ سِوَی الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الْمَطْعُوْنُ شَهِيْدٌ، وَالْغَرِيْقُ شَهِيْدٌ، وَصَاحِبُ ذَاتِ الْجَنْبِ شَهِيْدٌ، وَالْمَبْطُوْنُ شَهِيْدٌ، وَصَاحِبُ الْحَرِيْقِ شَهِيْدٌ، وَالَّذِيْ يَمُوْتُ تَحْتَ الْهَدْمِ شَهِيْدٌ، وَالْمَرْأَةُ تَمُوْتُ بِجُمْعٍ شَهِيْدَةٌ )) [ مستدرك حاكم: ۳۵۲/۱، ح : ۱۳۰۰، وصححه الألباني في صحيح الجامع : ۳۷۳۹ ] ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے کے علاوہ شہادت کی سات قسمیں ہیں، طاعون سے مرنے والا شہید ہے اور غرق ہونے والا شہید ہے اور ذات الجنب والا شہید ہے اور پیٹ کی تکلیف سے مرنے والا شہید ہے اور آگ سے مرنے والا شہید ہے اور گرنے والی دیوار وغیرہ کے نیچے آ کر مرنے والا شہید ہے اور ولادت کے وقت مرنے والی عورت شہید ہے۔'' ظاہر ہے کہ حدیث میں مذکور سب لوگ شہید ہیں، مگر اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کا درجہ سب سے بلند ہے۔

② لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ : یعنی صدیقیت یا شہادت کے مراتب کے مطابق اجر اور نور اہل ایمان ہی کا حصہ ہے، کفار یا منافقین کا نہیں۔

③ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ جہنم میں ہمیشہ وہی لوگ رہیں گے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کیا اور ان کی تکذیب کی، کیونکہ "اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ" (بھڑکتی آگ کے ساتھی اور اس میں رہنے والے) وہی ہیں، گناہ گار مومن جہنم میں گئے بھی تو ہمیشہ اس میں نہیں رہیں گے، اس لیے وہ "اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ" نہیں ہیں۔

آیت 20 ① اِعْلَمُوْۤا : پچھلی آیات سے اس آیت کی مناسبت یہ ہے کہ نفاق کا سبب اور اللہ کی راہ میں جہاد سے گریز اور مال خرچ کرنے سے دریغ کا باعث دنیا کی زندگی کی محبت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی۔

② اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا : "اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا" سے مراد انسان کے وہ کام ہیں جو وہ اس زندگی میں صرف دنیا میں حاصل

يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰

پھر وہ چُورا بن جاتی ہے اور آخرت میں بہت سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے بڑی بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں ۝۲۰

ہونے والے فوائد کے لیے کرتا ہے، ورنہ اس زندگی میں وہ آخرت کے لیے اعمالِ صالحہ کے ذریعے سے ہمیشہ کی سعادت بھی حاصل کر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [ النحل : ۹۷ ] ”جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انھیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے۔“

③ لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۶۴) کی تفسیر۔

④ وَ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ: یہ سچے اور مخلص اہل ایمان یعنی صدیقین و شہداء کے مقابلے میں ایمان سے محروم دنیا دار لوگوں کا حال ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام خواہشوں اور دلچسپیوں کا ذکر ان پانچ باتوں میں فرما دیا ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”آدمی کو اول عمر میں کھیل چاہیے، پھر تماشا، پھر بناؤ سنگار، پھر ساکھ بڑھانا اور نام و نمود حاصل کرنا اور جب مرنا قریب ہو تو مال اور اولاد کی فکر کرنا کہ میرے بعد میرا گھر بنا رہے اور اولاد آسودگی سے زندگی بسر کرے۔ یہ سب دھوکے کا سامان ہے، آگے کچھ اور کام آئے گا (ایمان اور عملِ صالح) یہ کچھ کام نہ آئے گا۔“ (موضح بتصرف)

⑤ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ......: ”غَيْثٍ“ بارش، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا ﴾ [ الشوریٰ : ۲۸ ] ”اور وہی ہے جو بارش برساتا ہے، اس کے بعد کہ وہ نا امید ہو چکے ہوتے ہیں۔“ ”الْكُفَّارَ“ سے مراد یہاں کاشت کار ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ [ الفتح : ۲۹ ] ”کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے۔“ کیونکہ کفر کا معنی چھپانا ہے اور کاشت کار بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ آیت کے دوسرے الفاظ اور تمثیل کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۲۴)، زمر (۲۱) اور سورۂ کہف (۴۵) کی تفسیر۔ اس کے علاوہ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۵،۱۴) کی تفسیر۔ بعض مفسرین نے ”الْكُفَّارَ“ سے مراد حقیقی کافر لیے ہیں، ان کے مطابق اگرچہ بارش سے اگنے والی کھیتی مومن و کافر سبھی کو خوش کرتی ہے، مگر کفار کا ذکر خصوصاً اس لیے فرمایا کہ وہ اس پر زیادہ خوش ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی خوشی کا تمام سرمایۂ حیات دنیا ہے۔

⑥ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ: یعنی بات صرف اتنی نہیں کہ دنیا کی زندگی ختم ہو اور جان چھوٹ جائے، بلکہ اصل معاملہ اس کے بعد آخرت کا اور اس کی ہمیشہ کی زندگی کا ہے کہ وہاں دو میں سے ایک بات سے

سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ١ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾

اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۲۱﴾

---

ہر حال میں واسطہ پڑنے والا ہے، ایک طرف شدید عذاب ہوگا اور دوسری طرف اللہ کی بخشش اور اس کی زبردست رضا ہوگی۔ "رِضْوَانٌ" مصدر میں مبالغے کا مفہوم ہے۔

⑦ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ : یعنی جس نے ساری جدوجہد دنیا کی زندگی بنانے کے لیے کی وہ دھوکے میں پڑ گیا، کیونکہ اس نے جو کچھ کمایا دنیا کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو گیا اور آخرت میں اس کے لیے کچھ باقی نہ رہا۔ البتہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی دھوکا نہیں جنھوں نے اسے آخرت کے حصول کا ذریعہ بنایا، کیونکہ ان کے اعمال دنیا کے فنا ہونے کے باوجود باقی رہنے والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴾ [ الکھف : ۴۶ ] "مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب میں بہتر اور امید کی رو سے زیادہ اچھی ہیں۔"

**آیت 21** ① سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ : "سَابِقُوْۤا" "سَبَقَ يَسْبِقُ سَبْقًا" (ض،ن) سے باب مفاعلہ کا امر حاضر ہے۔ اس میں مقابلے کا مفہوم پایا جاتا ہے، یعنی ایک دوسرے کے مقابلے میں ایسے اعمال کی طرف آگے بڑھو جن سے تم مغفرت اور جنت کے مستحق بن سکو۔ مثلاً میدان قتال کی پہلی صف میں ہونا، امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ میں شامل ہونا اور اللہ کی راہ میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر خرچ کرنا وغیرہ۔ یہ آیت سورۂ آل عمران کی آیت (۱۳۳) سے ملتی جلتی ہے، اس کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

② وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ : "السَّمَآءِ" کا لفظ یہاں بطور جنس استعمال ہوا ہے، مراد تمام آسمان ہیں۔ دلیل اس کی سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے: ﴿ وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ﴾ [آل عمران : ۱۳۳] "اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دوڑو اپنے رب کی جانب سے بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے۔"

③ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ : یہاں اتنا ہی ذکر ہے کہ جنت ایمان والوں کے لیے تیار کی گئی ہے، جبکہ سورۂ آل عمران (۱۳۳ تا ۱۳۵) میں ان ایمان والوں کے چند اعمال کا بھی ذکر ہے جن کی وجہ سے وہ اللہ کے فضل کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ ان میں پہلا عمل خوشی اور تکلیف میں خرچ کرنا ہے، جس کا ذکر یہاں "اَنْفِقُوْا" میں گزر چکا ہے۔

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡـرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۚ ﴿۲۲﴾

کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۲۲﴾

④ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں داخلہ محض اللہ کے فضل کے ساتھ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں اور انسان جتنے بھی عمل کر لے وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک نعمت کا بھی بدل نہیں ہو سکتے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: (( لَنْ يُدْخِلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، قَالُوْا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !؟ قَالَ لَا، وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَ رَحْمَةٍ )) [ بخاري، المرضى، باب تمني المريض الموت : ۵۶۷۳ ] ''کسی بھی شخص کو اس کا عمل جنت میں ہرگز داخل نہیں کرے گا۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟'' فرمایا: ''نہیں، مجھے بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔'' البتہ اعمال صالحہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے حصول کا سبب بنتے ہیں، دیکھیے سورۂ اعراف (۴۳) کی تفسیر۔

**آیت 22** ① مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ ...... : ''أَصَابَ'' کا مفعول بہ محذوف ہے: '' أَيْ مَا أَصَابَكُمْ أَوْ مَا أَصَابَ أَحَدًا مِنْ مُّصِيْبَةٍ ...... '' ''یعنی تمھیں یا کسی کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے خواہ زمین میں ہو یا تمھاری جانوں میں ...... '' سورت کی ابتدا سے جہاد میں مال و جان خرچ کرنے کی تاکید آ رہی ہے، چونکہ اس راہ میں کئی طرح کی جسمانی و ذہنی اور مالی و جانی مصیبتیں پیش آتی ہیں، مثلاً بھوک، پیاس، فقر، خوف، غم، تھکاوٹ، بیماری، زخم، چوٹ، گرفتاری اور قتل وغیرہ، اس لیے آدمی جہاد پر جانے سے گریز کرتا ہے اور اپنے آپ کو ان مصیبتوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر جہاد کے لیے چلا جائے تو ان مصائب کے پیش آنے پر پریشان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو مالی یا جانی مصیبت تمھیں پیش آتی ہے وہ ہر حال میں آکر رہے گی، تم اس سے بچنے کی جتنی بھی کوشش کر لو اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہر آنے والی مصیبت یا راحت اللہ تعالیٰ نے اس کے پیدا کرنے اور تمھاری جانوں کو پیدا کرنے، بلکہ زمین کو پیدا کرنے سے بھی پہلے ایک کتاب میں لکھ دی ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ اس لکھے ہوئے کو مٹا دے یا بدل دے۔ مزید دیکھیے سورۂ قمر (۴۹) اور سورۂ توبہ (۵۱) کی تفسیر۔

② فِى الۡاَرۡضِ : اس سے زمین پر آنے والی عام مصیبتیں مراد ہیں، مثلاً قحط، طوفان، سیلاب، زلزلے اور وبائیں وغیرہ، جن سے انسان متاثر ہوتا ہے۔

③ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ : اس سے وہ مصیبتیں مراد ہیں جو انسان کی ذات پر آتی ہیں، مثلاً بیماری، زخم، بھوک، پیاس، گرفتاری، فقر، خوف، غم، پیاروں کی موت اور اپنی موت وغیرہ۔ '' وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ '' میں حرف نافیہ '' لَا '' کو دوبارہ ان مصیبتوں کی اہمیت کی وجہ سے ذکر فرمایا، کیونکہ آدمی اپنی جان پر آنے والی مصیبتوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، دوسروں پر آنے والی مصیبتوں سے وہ

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ

تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے اور اللہ کسی تکبر

ذہنی طور پر متاثر ہوتا ہے، جسمی طور پر نہیں۔

④ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا: "بَرَأَ يَبْرَأُ بَرْأً وَ بُرُوْأً" (ف) پیدا کرنا۔ "هَا" ضمیر "مُصِيْبَةٍ" کی طرف بھی جا سکتی ہے، "الْاَرْضِ" کی طرف بھی اور "اَنْفُسِكُمْ" کی طرف بھی۔ یہ کلام الٰہی کی بلاغت ہے کہ تینوں مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مصیبت کو اس مصیبت کے پیدا کرنے سے پہلے، انسان کے پیدا کرنے سے پہلے اور زمین کے پیدا کرنے سے بھی پہلے لکھ دیا ہے۔

⑤ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ: یعنی انسان کو چونکہ آئندہ کا کچھ علم نہیں، اس لیے اس کے لیے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ آئندہ کی بات پہلے لکھ دے، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بالکل ہی معمولی بات ہے، کیونکہ وہ گزشتہ اور موجودہ کی طرح آئندہ کی ہر بات کو بھی جانتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ قمر (۴۹) کی تفسیر۔

آیت 23 ① لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ ......: "لَا تَأْسَوْا" "أَسِيَ يَأْسٰى أَسًى" (خَشِيَ يَخْشٰى) (غمگین ہونا) سے نفی مضارع معلوم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ﴿فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [ المائدۃ : ۲۶ ] ''پس تو ان نافرمان لوگوں پر غم نہ کر۔'' اور شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے ہلاک ہونے پر فرمایا: ﴿فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ﴾ [ الأعراف : ۹۳ ] ''تو میں نہ ماننے والے لوگوں پر کیسے غم کروں۔'' "اٰتٰىكُمْ" "أَتٰى يَأْتِيْ إِتْيَانًا" (ض) آنا اور "آتٰى يُؤْتِيْ إِيْتَاءً" (افعال) دینا۔ یعنی ہم نے تمھیں یہ بات بتا دی ہے، تاکہ جو چیز تمھارے ہاتھ سے نکل جائے، خواہ ملنے کے بعد چلی جائے یا مل ہی نہ سکے، اس پر تم غم نہ کرو اور اللہ تعالیٰ تمھیں جو کچھ دے اس پر پھول نہ جاؤ، کیونکہ جب تم جان لو گے کہ ہر چیز اللہ کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے تو ہاتھ سے نکلنے والی چیز پر تم زیادہ غمگین نہیں ہو گے اور ملنے والی چیز پر اِتراؤ گے نہیں، کیونکہ جسے معلوم ہو کہ جانے والی چیز نے جانا ہی تھا تو وہ اس کے جانے پر زیادہ جزع فزع نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو اس کے لیے تیار رکھتا ہے۔ اسی طرح جب اسے معلوم ہو کہ جو فائدہ اسے حاصل ہونا ہے وہ ہونا ہی ہونا ہے، ممکن ہی نہیں کہ حاصل نہ ہو تو وہ اس کے حاصل ہونے پر اترائے گا نہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری بہادری سے حاصل نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی اللہ کی تقدیر سمجھ کر نقصان پر صبر کرے گا اور فائدے پر اپنی خوبی سمجھنے کے بجائے اللہ کا شکر کرے گا۔

② اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے آدمی کو کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوشش کے بعد اگر ناکامی ہو تو غم نہیں بلکہ صبر کرنا چاہیے اور کامیابی کی صورت میں فخر و غرور نہیں بلکہ شکر بجا لانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کو تقدیر پر ایمان کا فائدہ قرار دیا ہے اور اسی عقیدہ پر کاربند رہ کر زندگی میں اعتدال رہتا ہے اور آدمی افراط و تفریط سے محفوظ رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ وَ فِيْ كُلٍّ خَيْرٌ، احْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ وَ إِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّيْ فَعَلْتُ كَانَ

فَخُوْرِۣ ﴿۲۳﴾

کرنے والے، بہت فخر کرنے والے سے محبت نہیں رکھتا ﴿۲۳﴾

كَذَا وَ كَذَا وَلٰكِنْ قُلْ قَدَرُ اللّٰهِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ ﴾ [ مسلم، القدر، باب في الأمر بالقوة وترك العجز ...... : ٢٦٦٤، عن أبي هريرة ﷺ ] ''طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے اور ہر ایک میں بھلائی موجود ہے۔ جو چیز تجھے نفع دے اس کی حرص کر اور اللہ سے مدد مانگ اور عاجز نہ ہو اور اگر تجھے کوئی (نقصان دہ) چیز پہنچے تو یہ مت کہہ کہ اگر میں اس طرح کرتا تو اس طرح اور اس طرح ہو جاتا، بلکہ یوں کہہ کہ اللہ نے قسمت میں (اسی طرح) لکھا تھا اور جو اس نے چاہا کر دیا، کیونکہ ''لَوْ'' (اگر) کا لفظ شیطان کا کام کھول دیتا ہے۔''

③ یہاں ایک سوال ہے کہ مصیبت پر غم اور راحت پر خوشی انسانی فطرت ہے، پھر ہاتھ سے نکلنے والی چیز پر غم سے اور عطا ہونے والی چیز پر خوش ہونے سے کیوں منع فرمایا، جب کہ ان پر ہمارا اختیار ہی نہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ منع اس غم سے کیا گیا ہے جو اس حد تک پہنچ جائے کہ آدمی جزع فزع اور اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرنے لگے۔ اگر اللہ کی رضا پر راضی رہے تو غم پر کوئی مؤاخذہ نہیں، بلکہ اس پر صبر کا اجر بھی ملتا ہے۔ اگر غم ہی نہ ہو تو صبر کس بات پر ہوگا؟ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: « إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا وَ إِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيْمُ! لَمَحْزُوْنُوْنَ » [ بخاري، الجنائز، باب قول النبي ﷺ : " إنا بك لمحزونون " : ١٣٠٣ ] ''آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے اور ہم اس کے سوا جو ہمارا رب پسند فرمائے کچھ نہیں کہتے اور یقیناً تیری جدائی سے اے ابراہیم! ہم غمزدہ ہیں۔'' اسی طرح منع اس خوش ہونے سے کیا گیا ہے جو آدمی کو شکر کے بجائے فخر و غرور تک پہنچا دے۔ دلیل اس کی آیت کے آخری الفاظ ''وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ'' ہیں۔ ہر خوشی سے منع نہیں کیا گیا، کیونکہ اگر خوشی ہی نہ ہو تو شکر کس بات پر کرے گا؟

④ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ : ''مُخْتَالٍ'' ''خ ی ل'' سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، جو اپنے خیال میں بڑا بننے والا ہو، متکبر۔ ''فَخُوْرِ'' ''فَخْرٌ'' میں سے مبالغے کا صیغہ ہے، جو دوسروں کے سامنے بہت فخر کرنے والا ہو۔ تقدیر کو مدنظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہر کامیابی کو اپنی بہادری اور کارکردگی سمجھنا ہے، جس سے آدمی میں تکبر اور فخر پیدا ہوتا ہے، حالانکہ اگر آدمی کی اپنی کارکردگی بھی ہو تو وہ، بلکہ اس کا اپنا وجود سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس نے یہ سب کچھ پہلے لکھ دیا ہے، پھر جو شخص اس پر شکر کے بجائے تکبر و فخر کرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ محبت کیسے کر سکتا ہے؟

⑤ بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں بیان فرمائی ہیں، ایک ''اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ......'' اور دوسری ''مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ......'' پھر فرمایا: ﴿ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ﴾ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمھیں دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کا فانی ہونا مثال دے کر اس لیے سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں جو کچھ دے اس پر پھول نہ جاؤ، بلکہ یاد رکھو کہ یہ عارضی اور فانی ہے اور

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ

وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو منہ موڑ جائے تو یقیناً اللہ ہی ہے جو بڑا بے پروا ہے، بہت تعریفوں والا ہے ﴿۲۴﴾ بلاشبہ یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔

---

ہم نے یہ بات کہ ہر مصیبت پہلے سے لکھی ہوئی ہے، اس لیے بتائی ہے کہ تم اس کے آنے پر زیادہ غم نہ کرو۔ گویا یہ لف نشر غیر مرتب ہے۔ یہ تفسیر بھی پُر لطف ہے۔

**آیت 24** ① الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ: مراد اس سے منافقین ہیں جو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے، مگر جب جہاد کا موقع آتا تو جنگ میں شرکت سے گریز کرتے اور خرچ کرنے سے بخل کرتے، بلکہ اپنے ہم نواؤں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرتے تھے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ [ المنافقون : ۷ ] ”یہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، حالانکہ آسمانوں کے اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں اور لیکن منافق نہیں سمجھتے۔“

② وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ: ضمیر فصل ”هُوَ“ لانے سے اور خبر ”الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ“ پر الف لام لانے سے حصر پیدا ہو رہا ہے کہ اللہ ہی غنی و حمید ہے، کوئی اور نہیں۔ یعنی جو شخص اتنی نصیحت سن کر بھی جہاد میں خرچ کرنے سے منہ موڑے اور سمجھے کہ اس کے خرچ نہ کرنے سے اسلام اور مسلمانوں کا کوئی نقصان ہو جائے گا تو اس کا یہ خیال باطل ہے، کیونکہ آسمان و زمین کے تمام خزانوں کا مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہے (جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا) اور غنی وہ اکیلا ہی ہے، دوسرے سب اس کے محتاج ہیں، جو کوئی بھی خرچ کرتا ہے اس کے دیے میں سے خرچ کرتا ہے اور اپنے فائدے کے لیے خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے خرچ کرنے سے بے نیاز ہے۔ غنی کے ساتھ حمید کی صفت بیان فرمائی، کیونکہ بہت سے اغنیاء عارضی غنٰی کے مالک ہونے کے باوجود اپنی غنٰی کو مذموم کاموں میں استعمال کرتے ہیں مگر اللہ ایسا غنی ہے کہ وہ ہر مذموم صفت اور فعل سے پاک ہے اور تمام کمالات اور خوبیوں کا مالک ہے۔

**آیت 25** ① لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ......: اوپر کی آیات میں جس خرچ کی تاکید کی گئی ہے اس کا تعلق جہاد سے

وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۲۵﴾

ہے۔ کفار اور اہل کتاب کو جب بدر اور دوسرے مقامات پر شکستوں پر شکستیں ہوئیں تو انھوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا جو آج تک جاری ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول اور اسلام اللہ کا دین کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان کے نزدیک تو سب سے بڑی نیکی جنگ اور خون ریزی ہے، بھلا اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کا خون ریزی سے کیا تعلق؟ وہ تو امن و سلامتی والے ہوتے ہیں اور دنیا کے دھندوں سے الگ تھلگ رہبانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں تین باتیں واضح فرمائیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول بھیجے انھیں واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل فرمائی، تاکہ لوگ راہِ راست پر چل سکیں اور باہمی معاملات میں عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ دوسری یہ کہ عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ظلم و جور کا خاتمہ کیا جائے، جو قوت و سلطنت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتاب و میزان کے ساتھ لوہا اتارا، جس میں دوسرے بے شمار فائدوں کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے جہاد ہوتا ہے، جس کے ساتھ عدل و انصاف قائم ہوتا ہے اور ایمان والوں کا امتحان ہوتا ہے کہ اللہ کے دین کی مدد کرنے والے مومن کون ہیں اور اس سے جان چھڑانے والے منافق کون ہیں۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ نوح اور ابراہیم علیہما السلام اور ان کی اولاد میں جتنے رسول آئے سب کا مقصد حق اور عدل کا قیام ہی تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی انھی کے طریقے پر تھے، یہود کی سنگ دلی کے مقابلے میں ان کے پیروکاروں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رافت و رحمت رکھی تھی۔ اس نرمی کا بہانہ بنا کر ان کے بعض نام لیواؤں نے رہبانیت اختیار کی اور جہاد چھوڑ دیا، حالانکہ یہ ان کی اپنی ایجاد کردہ بدعت تھی، اللہ کا حکم ہرگز نہ تھا۔ مسلمانوں میں ترکِ جہاد کا باعث بھی نصرانیوں کی تقلید میں یہی رہبانیت بنی۔

❷ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ …… : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ شوریٰ کی آیت (۱۷) کی تفسیر۔

❸ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ : لوہا اگرچہ زمین سے نکلتا ہے مگر اس نعمت کی عظمت کا احساس دلانے کے لیے "اَنْزَلْنَا" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جیسا کہ چوپاؤں کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾ [الزمر: ۶] "اور اس نے تمھارے لیے چوپاؤں میں سے آٹھ قسمیں (نر و مادہ) اتاریں۔" اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر نعمت کا اصل سرچشمہ آسمان ہی ہے، جہاں سے اللہ کا حکم صادر ہوتا ہے تو ہر چیز وجود میں آتی ہے اور اس تعلیم کی طرف بھی اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں میں لوہے کو حاصل کرنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کا القا فرماتا ہے۔

❹ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ : اس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ لوہے کے دوسرے "منافع" کو بعد میں ذکر فرمایا ہے اور سخت لڑائی کا ذکر پہلے فرمایا ہے۔ اس سے جہاد اور اسلحہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ منافع سے مراد وہ بے شمار مشینیں، آلات اور سواریاں ہیں جو ایجاد ہو چکی ہیں اور آئندہ ہوں گی۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی، پھر ان میں سے کچھ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں اور ان میں سے زیادہ نافرمان ہیں ۞ پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر پے درپے اپنے رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور اسے انجیل دی اور ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے

5 وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ: جہاد کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ایک لمحے میں کفار کو نیست و نابود کر سکتا ہے، مگر وہ جہاد کے ذریعے سے اپنے بندوں کا امتحان کرتا ہے کہ اسے دیکھے بغیر کون اس کی خاطر لڑتا اور اس کے دین کی مدد کرتا ہے اور کون پیچھے رہتا ہے۔ "وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ" کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۴۰ تا ۱۴۲) اور سورۂ عنکبوت (۳) کی تفسیر۔

6 اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ: یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جہاد کا حکم اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں دیا، بلکہ انھی کے فائدے کے لیے اور امتحان کے لیے دیا ہے، کیونکہ وہ تو بڑی قوت والا اور سب پر غالب ہے۔

آیت 26 1 وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ ......: اس آیت میں پہلے نوح اور ابراہیم علیہما السلام کی بہت بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام انھی کی اولاد سے تھے، اس کے بعد اس میں بینات اور کتاب و میزان لے کر آنے والے تمام انبیاء کا ذکر ہے اور یہ کہ ان کی امتوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ان میں بگاڑ کا باعث کیا تھا۔

2 فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ: "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی ان میں سے بعض راہِ راست پر چلنے والے ہیں اور ان کے زیادہ لوگ نافرمان ہیں۔ یعنی ان کے بگاڑ کا اصل باعث یہ تھا کہ وہ اپنی خواہش کے خلاف کسی کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایمان اور عمل صالح والے لوگ کم اور نافرمان لوگ ہمیشہ زیادہ رہے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ ص (۲۴) کی تفسیر۔

آیت 27 1 ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا: "قَفَّیْنَا" "قَفًا" سے مشتق ہے، جس کا معنی گدی (گردن کا پچھلا حصہ) ہے۔ "اٰثَارِ" "اَثَرٌ" کی جمع ہے، نشانِ قدم۔ مراد یہ ہے کہ پہلے رسولوں کے بعد دوسرے رسول اس طرح بھیجے جس طرح ایک کی گردن کے پیچھے دوسرا اس کے نشانِ قدم پر چلتا ہوا آ رہا ہو۔ سب کی تعلیم ایک تھی اور سب ایک ہی راستے کے مسافر تھے۔

2 وَ قَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَ اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ: عیسیٰ علیہ السلام کا الگ خاص طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سب سے آخر میں وہی تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں انجیل عطا فرمائی، جس میں تورات پر عمل کی تاکید تھی اور اس کے بعض سخت احکام میں نرمی کا اعلان تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ ﴾ [ آل عمران: ۵۰ ] "اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔" البتہ وہ بھی اسی راستے پر چلنے والے تھے جس پر پہلے رسول چلتے تھے، جس میں جہاد کی تعلیم بھی تھی۔

وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ۬ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ

اس کی پیروی کی نرمی اور مہربانی رکھ دی اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں

③ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً: " رَاْفَةً " وہ رحمت جو کسی سے تکلیف یا نقصان دور کرنے سے تعلق رکھتی ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [ النور : ۲ ] ''اور تمھیں ان کے متعلق اللہ کے دین میں کوئی نرمی نہ پکڑے، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔'' جبکہ " رَحْمَةً " کا لفظ عام ہے، جس میں ہر طرح کا رحم شامل ہے، خصوصاً جس میں نفع پہنچانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ حج کی آیت (۶۵): ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ کی تفسیر۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والوں کے دلوں میں رافت و رحمت رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب انجیل عطا فرمائی تھی وہ بنیادی طور پر احکام کی نہیں بلکہ وعظ و تذکیر کی کتاب تھی، جس میں انھیں خاص طور پر نرمی اور رحم کے اخلاق اختیار کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس پر عمل کیا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر عمل نے ان میں یہ صفت مزید پختہ کر دی، چونکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کے فضل سے ہوا، اس لیے فرمایا کہ ہم نے اس کی پیروی کرنے والوں کے دلوں میں رافت و رحمت رکھ دی۔

انجیل میں رافت و رحمت پر زور دینے کی وجہ یہ تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے نفوس کی اصلاح کے لیے اور ان کے دلوں سے اس سختی کو دور کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا تھا جو طویل مدتیں گزرنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں پیدا ہو چکی تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ [ البقرۃ : ۷۴ ] ''پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں۔'' عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب یہود کے برعکس آپس میں نہایت نرم اور مہربان تھے، ہمارے رسول ﷺ کے اصحاب میں بھی یہ وصف بہت نمایاں تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [ الفتح : ۲۹ ] ''اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔''

④ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا: " رَهِبَ يَرْهَبُ رَهْبًا " (ف) ڈرنا۔ " رَاهِبٌ " ڈرنے والا۔ " رُهْبَانٌ " (بروزن فُعْلَانٌ) بہت ڈرنے والا۔ " رَهْبَانِيَّةٌ " کی نسبت اسی " رُهْبَانٌ " کی طرف ہے، یعنی رہبان کا طریقہ اختیار کرنا، جو شدت خوف سے شادی نہیں کرتا کہ بیوی بچے اس کی عبادت میں رکاوٹ نہ بنیں، لوگوں سے علیحدگی اختیار کرتا ہے کہ اسے عبادت سے غافل نہ کریں۔ کھانے پینے کی لذیذ اشیاء سے اجتناب کرتا ہے کہ دنیا کی حرص اور نفس کی خواہشوں سے بچ سکے، اس لیے وہ آبادی سے الگ جنگل بیابان میں کٹیا بنا کر عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ انبیاء کا طریقہ نہیں، نہ انھوں نے اس کی تعلیم دی ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ ان کا طریقہ تو اللہ کی توحید اور اس کے دین کی طرف دعوت دینا اور لوہے کے استعمال کے ساتھ اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ سو جن لوگوں نے ترک دنیا کا راستہ اختیار کر کے

ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيۡنَا

**لکھا تھا مگر اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے (انھوں نے یہ کام کیا) پھر انھوں نے اس کا خیال نہ رکھا جیسے اس کا**

دعوت و جہاد کا کام چھوڑ دیا، یہ طریقہ ان کی اپنی ایجاد تھی، اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: (( لَمَّا كَانَ مِنْ أَمْرِ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ الَّذِيْ كَانَ مِنْ تَرْكِ النِّسَاءِ بَعَثَ إِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا عُثْمَانُ! إِنِّيْ لَمْ أُوْمَرْ بِالرَّهْبَانِيَّةِ أَرَغِبْتَ عَنْ سُنَّتِيْ ؟ قَالَ لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ إِنَّ مِنْ سُنَّتِيْ أَنْ أُصَلِّيَ وَأَنَامَ، وَأَصُوْمَ وَأَطْعَمَ، وَ أَنْكِحَ وَ أُطَلِّقَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ )) [ سنن دارمي : ۱۷۹/۲، ح : ۲۱۶۹، قال المحقق حسین سلیم أسد الداراني إسناده صحیح و الحدیث متفق علیه ] ''جب عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے عورتوں کو ترک کرنے والا معاملہ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور فرمایا: ''اے عثمان! مجھے رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا، کیا تم نے میرے طریقے سے بے رغبتی اختیار کر لی ہے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں یا رسول اللہ!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے طریقے میں سے یہ ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا (بھی) ہوں اور روزہ رکھتا ہوں اور کھاتا (بھی) ہوں اور میں نکاح بھی کرتا ہوں اور طلاق بھی دیتا ہوں، تو جو شخص میرے طریقے سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔''

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے گھروں کی طرف آئے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ جب انھیں (اس کے بارے) بتایا گیا تو گویا انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے: ''کہاں ہم اور کہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے آپ کے تو پہلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہیں۔'' تو ان میں سے ایک نے کہا: ''میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔'' دوسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی روزے کے بغیر نہیں رہوں گا۔'' تیسرے نے کہا: ''میں عورتوں سے الگ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: (( أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَ كَذَا ؟ أَمَا وَاللّٰهِ ! إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَ أُفْطِرُ، وَ أُصَلِّيْ وَ أَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ )) [ بخاري، النكاح، باب الترغيب في النكاح ...... : ۵۰۶۳ ] ''تمھی لوگوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور اس کے تقویٰ والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو میرے طریقے سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔''

⑤ **مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ**: یعنی ہم نے انھیں رہبانیت کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ انھوں نے اسے خود ہی ایجاد کر لیا تھا۔

⑥ **اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ**: یہ استثنا منقطع ہے اور ''اِلَّا'' ''لٰكِنْ'' کے معنی میں ہے: ''أَيْ مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ لٰكِنْ فَعَلُوْهَا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ'' ''یعنی ہم نے انھیں اس کا حکم نہیں دیا، مگر انھوں نے (ترکِ دنیا کا) یہ کام اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا۔'' یہ معنی بھی ہو سکتا ہے: '' لٰكِنْ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ'' یعنی ہم نے انھیں رہبانیت کا حکم تو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

خیال رکھنے کا حق تھا، تو ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائے ان کا اجر دے دیا اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں ﴿۲۷﴾

---

نہیں دیا، لیکن ہم نے انھیں اللہ کی رضا حاصل کرنے کا حکم دیا۔

❼ **فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا**: رہبانیت اختیار کرنے والوں کی دو طرح سے مذمت فرمائی، ایک یہ کہ انھوں نے دین میں وہ بات ایجاد کی جس کا انھیں اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے رہبانیت ایجاد کر کے اپنے آپ پر ترکِ دنیا کی جو پابندیاں عائد کی تھیں انھیں اس طرح نہ نبھا سکے جس طرح نبھانے کا حق تھا۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں: ”یعنی انھوں نے دو جرم کیے، ایک رہبانیت (درویشی) کو دین کا جزو لاینفک قرار دے لیا اور پھر اس درویشی کے حقوق و آداب کی بھی نگہداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے ابتدا میں توحید اور درویشی کو ایک ساتھ نبھانے کی کوشش کی، لیکن مسیح علیہ السلام کے تیسری صدی بعد سے اپنے بادشاہوں کے بہکانے میں آ گئے اور تثلیث کے چکر میں پھنس کر توحید کو چھوڑ دیا، پھر درویشی تو درکنار اصل ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ درویشی کو جاہ و ریاست طلبی کا ذریعہ بنا لیا اور باطل طریقوں سے لوگوں کا مال کھانے لگے۔ الغرض جہاد کے فریضہ کو چھوڑ کر تصوف کی رسوم اختیار کرنا ہی رہبانیت ہے، جس کی قرآن نے مذمت کی ہے اور پھر درویشی یا دینی پیشوائی کو (اللہ کی رضا کے بجائے) جاہ و ریاست اور دنیا طلبی کا ذریعہ بنانا تو ناقابل عفو گناہ ہے، جو یہود و نصاریٰ میں عام وبا کی شکل اختیار کر گیا تھا۔“ (اشرف الحواشی) شاہ عبد القادر فرماتے ہیں: ”یہ فقیری اور تارکِ دنیا بننا نصاریٰ نے رسم نکالی، جنگل میں تکیہ لگا کر بیٹھتے، نہ بیوی رکھتے نہ اولاد، نہ کماتے نہ جوڑتے، محض عبادت میں رہتے، خلق سے نہ ملتے۔ اللہ نے بندوں پر یہ حکم نہیں رکھا، مگر جب اپنے اوپر نام رکھا ترکِ دنیا کا، پھر اس پردے میں دنیا چاہنی بڑا وبال ہے۔“ (موضح) آج کل روزانہ اخبارات میں نصرانی چرچوں میں پادریوں اور راہبوں کے زنا اور قومِ لوط کے عمل کی خبریں اسی ”**فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا**“ کی عملی تفسیر ہیں۔

❽ رسول اللہ ﷺ کے فرمان ”لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ“ کے مطابق امت مسلمہ میں بھی رہبانیت تصوف کی صورت میں رائج ہو گئی۔ [ دیکھیے بخاری: ۳۴۵۶ ] دنیا میں اسلام کو غالب کرنے اور جہاد کے بجائے ترکِ دنیا کمال ٹھہرا، توحید کے بجائے پیر پرستی اور قبر پرستی پھیل گئی۔ احسان کی منزل یہ تھی کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے، سو اگر یہ اسے نہیں دیکھتا تو وہ اسے یقیناً دیکھ رہا ہے۔ تصوف میں اس کے بجائے کمال یہ ٹھہرا کہ شیخ کا تصور اس طرح رکھو کہ ایک لمحہ بھی دل و دماغ اور آنکھوں سے جدا نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا قرب حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا جو نہ بتایا ہو، یہاں ان طریقوں کو چھوڑ کر نصرانی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ٹھہرے۔ مثلاً روزے رکھنے کے بجائے ترکِ حیوانات جمالی و جلالی کیا گیا، یعنی کوئی حیوان یا اس سے نکلنے والی چیز مثلاً گوشت یا دودھ یا گھی نہ کھایا جائے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مسنون اذکار کے بجائے سانس بند کر کے خود ساختہ وظیفوں کو، جن کے ساتھ تصورِ شیخ کا

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا

شرک ہو، ولایت کے حصول کا مستند طریقہ قرار دیا گیا۔ محنت اور کمائی کے بجائے لوگوں کے نذرانوں یا گدائی کے ٹکڑوں پر گزر کرنا فقر کی منزل قرار پایا۔ قرآن کی دعوت کے ساتھ جہاد کی تلوار لے کر دنیا پر اسلام کو غالب کرنے کی جدو جہد کے بجائے جنگلوں بیابانوں یا مقبروں اور خانقاہوں میں ''ھُو حق'' کی ضربیں مقصد حیات قرار پائیں۔

مسجدیں ویران ہوئیں اور مقبرے آباد ہوئے اور یہ کام کرنے والوں کی پارسائی اور روحانی اقتدار کے اتنے جھوٹے قصے مشہور کیے گئے کہ نصرانی راہبوں اور ہندو جوگیوں کی ولایت کے افسانے ان کے مقابلے میں ہیچ ہو گئے۔ احبار و رہبان کے باطل طریقوں کے ساتھ لوگوں کے مال کھانے اور اللہ کی راہ سے روکنے کا کوئی طریقہ باقی نہ رہا جو یہاں اختیار نہ کیا گیا ہو۔ جو لوگ دنیاوی مصروفیت کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکے انھوں نے بھی کتاب و سنت پر عمل کے بجائے ان خدا رسیدہ ہستیوں کی خدمت کو نجات کے لیے کافی سمجھا اور انھیں قیامت کے دن اپنا کارساز سمجھ کر عمل سے فارغ ہو گئے۔ نتیجہ کفار کے غلبے اور مسلمانوں کی ذلت اور غلامی کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اس کا علاج اب بھی وہی ہے جو اس مبارک سورت میں بتایا گیا ہے کہ رہبانیت کے بجائے پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق بسر کی جائے، لوگوں کے بنائے ہوئے طریقوں کے بجائے کتاب و سنت سے ثابت اعمال کی پابندی کی جائے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اس کی راہ میں جہاد کیا جائے اور جان و مال کی قربانی سے کسی قسم کا دریغ نہ کیا جائے۔ کیونکہ جس طرح تورات و انجیل کی تعلیم رہبانیت کے بجائے قتال فی سبیل اللہ تھی اسی طرح قرآن مجید کی تعلیم بھی یہی ہے، دلیل اس کی یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ﴾ [ التوبة : ١١١ ] ''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے۔''

⑨ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ : ان میں دو قسم کے لوگ شامل ہیں، ایک وہ جو رہبانیت اور اس کے خود ساختہ عقائد و اعمال مثلاً تثلیث، قبر پرستی اور ترک دنیا کے بجائے صحیح ایمان و عمل پر قائم رہے، جو تورات و انجیل سے ثابت تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کا اجر عطا فرما دیا اور دوسرے وہ لوگ جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا اور آپ پر ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی ان کا اجر عطا فرما دیا۔

⑩ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ : یعنی ان میں سے بہت سے لوگ وہ تھے جو اپنی خواہش کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

آیت 28 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ...... : مفسرین نے اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی

لَکُمۡ نُوۡرًا تَمۡشُوۡنَ بِہٖ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۸﴾

اور تمھارے لیے ایسی روشنی کر دے گا جس کے ذریعے تم چلتے رہو گے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۸﴾

ہے، ایک یہ کہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا" کے الفاظ کے مخاطب اہلِ کتاب ہیں جو اس سے پہلے اپنے نبی پر ایمان کا دعویٰ رکھتے تھے، انھیں حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ سے ڈر جاؤ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ، تو اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ عطا فرمائے گا۔ اس کی تائید سورۂ قصص کی آیات (۵۲ تا ۵۴) سے ہوتی ہے اور اس حدیث سے بھی جو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ، وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ إِذَا أَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ، وَ رَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ يَطَؤُهَا فَأَدَّبَهَا، فَأَحْسَنَ تَأْدِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ » [ بخاري، العلم، باب تعليم الرجل أمته و أهله : ۹۷ ] ''تین آدمی ایسے ہیں کہ ان کے لیے دو اجر ہیں، ایک اہلِ کتاب میں سے کوئی آدمی جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور محمد ﷺ پر ایمان لایا اور ایک وہ غلام جو کسی کی ملکیت میں ہو، جب وہ اللہ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا حق ادا کرے اور ایک وہ آدمی جس کے پاس ایک لونڈی تھی، وہ اس سے صحبت کرتا تھا، تو اس نے اسے ادب سکھایا اور اچھی طرح ادب سکھایا اور اسے تعلیم دی اور اچھی طرح تعلیم دی، پھر اسے آزاد کر دیا اور اس سے نکاح کر لیا، تو اس کے لیے بھی دو اجر ہیں۔''

اس تفسیر میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ اپنی جگہ درست ہے، مگر یہاں "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا" سے اہلِ کتاب میں سے مسلمان ہونے والے مراد لینا سیاق کے خلاف ہے، کیونکہ شروع سے آخر تک خطاب ان لوگوں سے ہے جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے، انھی کو اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرنے اور اللہ کی راہ میں قتال اور خرچ کا حکم آ رہا ہے۔ اس آیت میں بھی انھیں اللہ سے ڈرنے اور اس کے رسول پر کما حقہ ایمان لانے کا حکم اور اس کی جزا کے طور پر اپنی نعمت کا دوہرا حصہ اور نور عظیم عطا کرنے کی بشارت کا ذکر ہے۔ اس لیے صحیح تفسیر ان حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا" کے ساتھ خطاب ان لوگوں سے ہے جو محمد ﷺ پر ایمان لائے، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے اسلام لائے ہوں یا مشرکین میں سے، یا پیدا ہی اسلام پر ہوئے ہوں، ان سب سے کہا جا رہا ہے کہ صرف زبان سے ایمان کے اقرار اور دعویٰ پر اکتفا نہ کرو، بلکہ سچے دل کے ساتھ ایمان لاؤ، اس کا حق ادا کرو اور اس کے تقاضے پورے کرو، تو اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ عطا کرے گا۔

اس دوہرے حصے سے مراد ہماری اس امت کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے محض اپنے فضل سے پہلی امتوں کی بہ نسبت دوہرے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ نبی ﷺ نے یہ بات ایک مثال کے ساتھ واضح فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: « مَثَلُكُمْ وَمَثَلُ أَهْلِ الْكِتَابَيْنِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَأْجَرَ أُجَرَاءَ، فَقَالَ مَنْ يَّعْمَلُ لِيْ مِنْ غُدْوَةَ إِلٰى نِصْفِ النَّهَارِ عَلٰى قِيْرَاطٍ؟ فَعَمِلَتِ الْيَهُوْدُ، ثُمَّ قَالَ مَنْ يَّعْمَلُ لِيْ مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ إِلٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ عَلٰى قِيْرَاطٍ؟ فَعَمِلَتِ

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ

تاکہ کتاب والے یہ نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے اور (جان لیں) کہ فضل اللہ

النَّصَارٰى، ثُمَّ قَالَ مَنْ يَّعْمَلُ لِيْ مِنَ الْعَصْرِ إِلٰى أَنْ تَغِيْبَ الشَّمْسُ عَلٰى قِيْرَاطَيْنِ؟ فَأَنْتُمْ هُمْ، فَغَضِبَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى، فَقَالُوْا مَا لَنَا أَكْثَرَ عَمَلًا، وَأَقَلَّ عَطَاءً؟ قَالَ هَلْ نَقَصْتُكُمْ مِنْ حَقِّكُمْ؟ قَالُوْا لَا قَالَ فَذٰلِكَ فَضْلِيْ أُوْتِيْهِ مَنْ أَشَاءُ» [ بخاري، الإجارة، باب الإجارة إلى نصف النهار : ۲۲۶۸، ۳۴۵۹، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ] ”تمھاری مثال اور دونوں کتابوں (تورات و انجیل) والوں کی مثال اس آدمی کی مثال کی طرح ہے جس نے کئی مزدوروں کو اجرت پر رکھا اور کہا: ”کون ہے جو میرے لیے صبح سے نصف النہار تک ایک قیراط پر کام کرے گا؟“ تو یہود نے کام کیا۔ پھر اس نے کہا: ”کون ہے جو میرے لیے نصف النہار سے عصر تک ایک قیراط پر کام کرے گا؟“ تو نصاریٰ نے کام کیا۔ پھر اس نے کہا: ”کون ہے جو میرے لیے عصر سے سورج غروب ہونے تک دو قیراط پر کام کرے گا۔“ تو تم وہ لوگ ہو۔ اس پر یہود و نصاریٰ ناراض ہو گئے اور کہنے لگے: ”ہمیں کیا ہے کہ ہم نے کام زیادہ کیا اور اجرت کم ملی؟“ اس نے کہا: ”کیا میں نے تمھارے حق میں کوئی کمی کی ہے؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں!“ اس نے کہا: ”پھر یہ میرا فضل ہے، جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں۔“

2 وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی بدولت اللہ تعالیٰ تمھیں کتاب و سنت کی صورت میں وحیٔ الٰہی کا ایسا عظیم نور عطا کرے گا جس کے ذریعے سے تم دنیا و آخرت میں ہر جگہ آسانی کے ساتھ چلتے رہو گے، کسی مسئلے میں تمھیں کوئی الجھن یا اندھیرا پیش نہیں آئے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۷ ] ”اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔“ اور قیامت کے دن کے اندھیروں میں وہ نور عطا کرے گا جس میں چلتے ہوئے تم جنت تک پہنچ جاؤ گے، جس کا ذکر اس سے پہلے ”يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ“ میں گزر چکا ہے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

**آیت 29** 1 لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ : یعنی اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنی رحمت میں سے دو حصے اور عظیم نور دینے کی بشارت اس لیے دی ہے تاکہ اہلِ کتاب تمھارے متعلق یہ نہ جانیں کہ یہ مسلمان اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

2 وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ...... : سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے ”وَلِيَعْلَمُوْا“ (اور تاکہ وہ جان لیں) محذوف ہے، یعنی اور تاکہ وہ جان لیں کہ فضل اہلِ کتاب یا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی مشیت سے اس آخری نبی پر اخلاص کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے خاص فضل کے لیے منتخب فرمایا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔

اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

ع ۴ / ۲۰

کے ہاتھ میں ہے، وہ اسے اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۲۹﴾

③ ابن جریر اور دوسرے کئی مفسرین نے فرمایا کہ "لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ" کا معنی " لِيَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ" ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنی رحمت میں سے دو حصے اور نورِ عظیم کی بشارت اس لیے دی ہے تاکہ اہل کتاب (جو اپنے سوا کسی کو اللہ تعالیٰ کا فضل عطا ہونے کے قائل ہی نہیں) جان لیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل سارے کا سارا اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔

اس تفسیر پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں "لَا" کو زائد مانا گیا ہے، حالانکہ اللہ کے کلام میں کوئی لفظ زائد کیسے ہوسکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں "لَا" زائد ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے کار ہے، بلکہ اسے بعد میں آنے والے "اَلَّا يَقْدِرُوْنَ" میں موجود نفی کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ﴾ [ صٓ : ۷۵ ] "تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ کرے؟" اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ﴾ [ الأعراف : ۱۲ ] "تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا؟" یہاں "اَلَّا تَسْجُدَ" میں "لَا" اس نفی کی تاکید کے لیے ہے جو "مَنَعَكَ" کے ضمن میں موجود ہے۔ "لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ" کی یہ تفسیر بھی درست ہے اور بہت عمدہ ہے۔

سورۃ المجادلۃ ۵۸ مدنیۃ ۱۰۵ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — آیاتھا ۲۲ رکوعاتھا ۳

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ کی طرف شکایت کر رہی

**آیت 1** ❶ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا : یہ آیات خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اتریں۔ بعض روایات میں ان کا نام خویلہ اور بعض میں جمیلہ آیا ہے۔ ان کے خاوند اوس بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ تھے جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے، بوڑھے تھے اور خولہ کے ان سے بچے بھی تھے۔ انھوں نے کسی بات پر ناراض ہو کر ان سے ظہار کر لیا، یعنی یہ کہہ دیا: ”أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّيْ“ ”تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔“ جاہلیت میں جو شخص بیوی سے ظہار کرتا وہ اسے ماں ہی کی طرح ہمیشہ کے لیے حرام سمجھ لیتا تھا۔ خولہ کے سامنے تو دنیا اندھیر ہو گئی، اس عمر میں کہاں رہوں گی، بچوں کا کیا کروں گی؟ باپ کے پاس رہے تو ضائع ہو جائیں گے، میرے پاس رہے تو انھیں کہاں سے کھلاؤں گی؟ وہ یہ شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ سنن ابو داؤد میں ہے کہ خویلہ بنت مالک بن ثعلبہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میرے خاوند اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے مجھ سے ظہار کر لیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کرتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے تھے اور فرماتے تھے: « اِتَّقِي اللّٰهَ فَإِنَّهُ ابْنُ عَمِّكِ » ”اس کے بارے میں اللہ سے ڈر، کیونکہ وہ تمھارا چچا زاد ہے۔“ مگر میں نہیں ٹلی، حتیٰ کہ ”قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا“ سے لے کر کفارہ کے فرض کے بیان تک قرآن نازل ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يُعْتِقُ رَقَبَةً » ”وہ ایک گردن آزاد کرے۔“ اس نے کہا: ”وہ تو اس کے پاس ہے نہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « فَيَصُوْمُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ » ”پھر دو ماہ پے در پے روزے رکھے۔“ اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! وہ بڑا بوڑھا ہے، روزے رکھ نہیں سکتا۔“ فرمایا: « فَلْيُطْعِمْ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا » ”پھر ساٹھ (۶۰) مسکینوں کو کھانا کھلائے۔“ اس نے کہا: ”اس کے پاس کوئی چیز نہیں جس کا صدقہ کرے۔“ کہتی ہیں کہ اس وقت کھجوروں کا ایک ٹوکرا لایا گیا، میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! میں ایک اور ٹوکرے کے ساتھ اس کی مدد کر دیتی ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « قَدْ أَحْسَنْتِ اذْهَبِيْ فَأَطْعِمِيْ بِهَا عَنْهُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا وَارْجِعِيْ إِلَى ابْنِ عَمِّكِ » [ أبو داوٗد، الطلاق، باب في الظهار : ۲۲۱٤، وقال الألباني حسن ] ”تم نے بہت اچھا کیا، جاؤ اس کی طرف سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور اپنے چچا زاد کے پاس واپس چلی جاؤ۔“

❷ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ : حرف ”قَدْ“ تحقیق کے لیے آتا ہے اور اس کام کے واقع ہونے کے لیے بھی جس کی توقع کی جا رہی ہو۔ یہاں پہلے معنی کا تو محل نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سننے میں کسی کو شک نہیں کہ اس کا یقین دلانے کے لیے حرف تحقیق لایا جائے، تو مطلب یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا کرنے والی عورت اپنی فریاد سنے جانے کی جو توقع کر رہی تھی اللہ تعالیٰ نے پوری فرما

تَحَاوُرَكُمَا ۚ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ①

تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ①

دی۔ سننے سے مراد یہاں صرف سن لینا ہی نہیں بلکہ سننا اور سن کر مراد پوری کرنا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا سن لی، یعنی سن کر قبول فرمائی۔

③ **تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا:** وہ جھگڑا یہی تھا کہ وہ کہتی تھی میرے بارے میں کوئی گنجائش نکالیں، میرے خاوند نے مجھے طلاق نہیں دی، صرف "أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّيْ" کہا ہے۔ اب میں بڑھاپے میں کہاں جاؤں اور بچوں کا کیا کروں؟ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح حکم نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اکٹھے رہنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

④ **وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ:** " شَكَا يَشْكُوْ شَكْوًى وَشِكَايَةً " اپنے دکھ تکلیف کا اظہار کرنا۔ "**تَشْتَكِيْ**" (افتعال) میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ ہے، یعنی وہ جھگڑنے والی اللہ تعالیٰ کی جناب میں بہت شکایت کر رہی تھی اور اپنے دکھ درد کا شدت سے اظہار کر رہی تھی۔

⑤ **وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ:** "اِنَّ" تعلیل کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، کیونکہ اللہ تو سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ ''سمع'' (سننا) وہ صفت ہے جس کے ساتھ آوازوں کا علم ہوتا ہے اور ''بصر'' (دیکھنا) وہ صفت ہے جس کے ساتھ نظر آنے والی چیزوں کا علم ہوتا ہے۔ یونان کے مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر بعض مسلم متکلمین نے ان کا یہ قاعدہ مان لیا کہ محل حوادث حادث ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کو سمیع و بصیر ماننا ممکن نہ رہا، کیونکہ اگر مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام آوازوں کو سنتا ہے اور تمام چیزوں کو دیکھتا ہے تو سنائی دینے والی اور نظر آنے والی چیزیں تو حادث ہیں، نئی سے نئی وجود میں آتی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ سنتا اور دیکھتا ہو تو وہ محل حوادث ہوگا اور ان کے قاعدے کے مطابق خود بھی حادث ہوگا، ہمیشہ سے اور قدیم نہیں ہوگا، اس لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سننے، دیکھنے، کلام کرنے اور ایسی تمام صفات کا یا تو انکار کر دیا جن میں حدوث پایا جاتا ہے یا ان کی ایسی تاویل کر دی جو درحقیقت انکار ہی ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی روش اختیار کی ہے۔ تفسیر جلالین کو دیکھ لیجیے، اس میں ہے: "اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ" عَالِمٌ " حالانکہ سب جانتے ہیں کہ سننا، دیکھنا اور جاننا تینوں الگ الگ صفات ہیں، صرف عالم مان لینے سے سمیع و بصیر نہیں مانا جا سکتا اور یہ قاعدہ کہ ''محل حوادث حادث ہوتا ہے'' قرآن مجید کے صریح الفاظ سے ٹکراتا ہے، اس لیے غلط ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ رحمٰن کی آیت (۲۹): ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ کی تفسیر۔ اگر کوئی کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو سمیع و بصیر مانیں تو وہ بندوں کی مثل ٹھہرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ''علیم'' ماننے سے وہ بندوں جیسا نہیں ٹھہرتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ''علیم'' کا لفظ بندوں پر بھی بولا ہے: ﴿ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [ الحجر : ٥٣ ] (بے شک ہم تجھے ایک علیم لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں) تو سمیع و بصیر ماننے سے بندوں کی مثل کیسے بن جائے گا؟ مزید دیکھیے سورۂ شوریٰ کی آیت (۱۱):

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۲

وہ لوگ جو تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں ان کے سوا کوئی نہیں جنھوں نے انھیں جنم دیا اور بلاشبہ وہ یقیناً ایک بری بات اور جھوٹ کہتے ہیں اور بلاشبہ اللہ یقیناً بے حد معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے ۲

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ کی تفسیر۔

6 ام المومنین عائشہ ؓ نے فرمایا: « اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَسِعَ سَمْعُهُ الْأَصْوَاتَ، لَقَدْ جَاءَتِ الْمُجَادِلَةُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَنَا فِيْ نَاحِيَةِ الْبَيْتِ، تَشْكُوْ زَوْجَهَا وَمَا أَسْمَعُ مَا تَقُوْلُ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ : ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ » [ ابن ماجه، المقدمة، باب فيما أنكرت الجهمية : ۱۸۸ ] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس کی سماعت تمام آوازوں پر وسیع ہے، وہ جھگڑنے والی عورت نبی ﷺ کے پاس آئی جب کہ میں گھر کے ایک طرف موجود تھی، وہ اپنے خاوند کی شکایت کر رہی تھی اور میں وہ نہیں سنتی تھی جو وہ کہہ رہی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ ''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔'' اس حدیث سے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے سننے کا کیا مطلب سمجھتے تھے۔ اس لیے امام ابن ماجہ نے اپنی سنن کے شروع ہی میں یہ حدیث اس باب میں ذکر فرمائی ہے جس کا عنوان ہے: " بَابٌ فِيْمَا أَنْكَرَتِ الْجَهْمِيَّةُ" ''یہ باب ان چیزوں کو ثابت کرنے کے لیے ہے جن کا جہمیہ نے انکار کیا ہے۔'' اور امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری کی " كِتَابُ التَّوْحِيْدِ" کے "بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى : ﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾" کے تحت اسے اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و بصر ثابت کرنے کے لیے ذکر فرمایا ہے۔

آیت 2 1 اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ...... "يُظٰهِرُوْنَ" "ظَهْرٌ" سے نکلا ہے جس کا معنی ''پیٹھ'' ہے۔ عرب سواری کو "ظَهْرٌ" کہتے ہیں۔ یہ استعارہ ہے، جس میں بیوی سے جماع کو گھوڑے وغیرہ کی پشت پر سوار ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ "أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّيْ" (تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح میرے لیے اپنی ماں پر سوار ہونا اور اس سے جماع حرام ہے، اسی طرح تم بھی میرے لیے میری ماں کی طرح ہو۔ جاہلیت میں لوگ بیوی کو ماں کہہ دیتے تو اسے ماں کی طرح حرام قرار دے لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس رسمِ بد کو ختم کر دیا، فرمایا منہ کے ساتھ بیوی کو ماں کہنے سے وہ ماں نہیں بن جاتی، آدمی کی ماں وہی ہے جس نے اسے جنم دیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ احزاب (۴) کی تفسیر۔

2 وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا: "مُنْكَرًا" "أَنْكَرَ يُنْكِرُ" (افعال) سے اسم مفعول ہے، وہ بات جسے

وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۳

اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اس سے رجوع کر لیتے ہیں جو انھوں نے کہا، تو ایک گردن آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، یہ ہے وہ (کفارہ) جس کے ساتھ تم نصیحت کیے جاؤ گے، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو پوری طرح باخبر ہے ۳

انسانی طبیعت یا عقل یا شرع نہ پہچانتی ہو بلکہ اس کا انکار کرتی ہو۔ ”زُوْرًا“ جھوٹ۔ یعنی بیوی کو ماں کی طرح کہنے والے ایسی بات کہتے ہیں جو نہ انسانی طبیعت مانتی ہے، نہ عقل اور نہ ہی شرع، کیونکہ ماں کے ساتھ بیٹے کا رشتہ اکرام و احترام کا ہے، جبکہ بیوی کے ساتھ خاوند کا رشتہ ایک خاص تعلق کا ہے جو ماں کے ساتھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ پھر جس عورت نے آدمی کو جنم ہی نہیں دیا بلکہ اس کا اس کے ساتھ مباشرت کا تعلق رہا، اسے ماں کہنا بری بات اور کتنا بڑا جھوٹ ہے۔

3 وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ تمھاری کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود ان سے بہت درگزر کرنے والا اور ان پر پردہ ڈالنے والا ہے۔ خصوصاً جب غلطی کرنے والا پلٹ آئے اور توبہ کر کے آئندہ ایسی باتوں سے باز رہے۔

4 اس آیت میں کئی چیزیں ظہار کے حرام ہونے پر دلالت کر رہی ہیں، پہلی اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ ”مَا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ“ (وہ ان کی مائیں نہیں)، اس میں ظہار کرنے والے کو جھوٹا قرار دیا ہے، دوسری اور تیسری یہ کہ اللہ نے ان کا نام منکر اور زُور رکھا ہے اور چوتھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ”اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ“ ہے، کیونکہ عفو و مغفرت گناہ ہی سے ہوتی ہے۔

**آیت 3** 1 وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا ...... : ”ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا“ کی تفسیر میں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں ان پر پہلی بار کوئی مؤاخذہ نہیں، البتہ اگر یہی بات دوبارہ کریں تو ان پر یہ کفارہ ہے، مگر یہ بات اس لیے درست نہیں کہ آیت جس واقعہ پر نازل ہوئی اس میں خاوند نے خولہ رضی اللہ عنہا کو ایک ہی بار ”أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّيْ“ کہا تھا۔ دوسری مرتبہ یا بار بار ایسا کہنے کا کہیں ذکر نہیں، اس لیے آیت کا وہی مطلب درست ہوگا جو صحیح حدیث کے مطابق ہو۔ چنانچہ ”يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا“ کا مطلب فَرَّاء اور بعض مفسرین نے تو یہ لیا ہے کہ یہاں ”لام“ بمعنی ”عَنْ“ ہے، یعنی پھر وہ اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انھوں نے کہی ہے، تو ان پر یہ کفارہ ہے اور بعض نے فرمایا کہ یہاں ”لام“ ”إِلٰی“ کے معنی میں ہے، کلام میں کچھ عبارت حذف بھی ہے اور ”مَا قَالُوْا“ کا مطلب ”مَا حَرَّمُوْا“ ہے: ”أَيْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ إِلٰی تَحْلِيْلِ مَا حَرَّمُوْا“ ”یعنی پھر دوبارہ لوٹیں اس کو حلال کرنے کی طرف جسے انھوں نے حرام کہا ہے۔“ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں الفاظ میں ابہام کیوں رکھا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ماں کہنے کے بعد پھر اس سے بیوی والا معاملہ کرنا ایک قسم کی کراہت رکھتا ہے، اس لیے اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صراحت کے بجائے کنایہ سے کام لیا ہے۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۴

پھر جو شخص نہ پائے تو دو پے در پے مہینوں کا روزہ رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ۴

---

② ظہار کا کفارہ مقرر کرنے سے ظاہر ہے کہ یہ طلاق نہیں بلکہ بیوی کو اپنے آپ پر حرام قرار دینے کے قبیل سے ہے۔ عام معاملات میں حلال کو اپنے آپ پر حرام کرنے کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے (دیکھیے تحریم: ۱،۲) مگر منکر و زُور بات ہونے کی وجہ سے ظہار کا کفارہ سخت ہے۔ اب ظہار کرنے والے کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں، اگر وہ بیوی سے قطع تعلق پر مُصِر ہے تو زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک اس کا انتظار کیا جائے گا کہ کفارہ ادا کر کے دوبارہ تعلق استوار کر لے (دیکھیے بقرہ: ۲۲۶) پھر اسے کہا جائے گا کہ یا اسے طلاق دو یا کفارہ ادا کر کے اسے بیوی بنا کر رکھو۔ پھر اگر وہ اپنی بات سے رجوع پر تیار ہو تو کفارہ بالترتیب تین چیزوں میں سے ایک چیز ہے، اگر آدمی کے پاس طاقت ہو تو ہاتھ لگانے یعنی جماع سے پہلے ایک گردن آزاد کرے۔ یہ شرط اس لیے لگائی ہے کہ بیوی کے پاس جانے کی رغبت میں اس کے لیے اتنا بھاری جرمانہ آسان ہو جائے گا۔

③ **فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا**: "رَقَبَةٍ" کا معنی گردن ہے، مراد لونڈی یا غلام ہے، یعنی جز بول کر کُل مراد لیا گیا ہے، تو ظہار کا کفارہ یہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس طاقت ہو تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک لونڈی یا غلام آزاد کرے۔ پہلے کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ بیوی کے پاس جانے کی رغبت میں اس کے لیے اتنا بھاری جرمانہ آسان ہو جائے گا۔

④ **ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ**: یعنی ہاتھ لگانے سے پہلے گردن آزاد کرنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اس سے تمھیں آئندہ کے لیے نصیحت ہوگی کہ ایسا کام نہیں کیا کرتے۔

⑤ **وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ**: یعنی اگر تم ظہار کے بعد گردن آزاد کیے بغیر ایک دوسرے کو ہاتھ لگاؤ گے تو کسی اور کو خبر ہو یا نہ ہو اللہ تعالیٰ تمھارے ہر کام سے پوری طرح باخبر ہے، تم نہ اس سے چھپ سکتے ہو اور نہ اس کی گرفت سے بچ سکتے ہو۔

⑥ بیوی کو ماں کی طرح اپنے آپ پر حرام ٹھہرانے پر جو کفارہ ہے اگر اسے بہن یا بیٹی یا کسی بھی ایسی عورت کی طرح حرام کہہ دے جس سے نکاح حرام ہے تو اس پر بھی وہی کفارہ ہے، کیونکہ نکاح کی حرمت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، اس لیے جو حکم ماں کہنے کا ہے وہی سب کا ہوگا۔

**آیت 4** ① **فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا**: اس سے معلوم ہوا کہ اگر گردن آزاد کرنے کی طاقت ہے تو روزوں سے یا کھانا کھلانے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا۔

② **فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ**: پھر جو شخص ہاتھ لگانے سے پہلے دو ماہ کے پے در پے روزے رکھنے کی طاقت نہ رکھے وہ ساٹھ مسکینوں

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۟ؕ﴿۵﴾

بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ذلیل کیے جائیں گے، جیسے وہ لوگ ذلیل کیے گئے جو ان سے پہلے تھے اور بلاشبہ ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ﴿۵﴾

کو کھانا کھلائے۔ ظہار کرنے والا خواہ کمزوری کی وجہ سے پے در پے اتنے روزے نہ رکھ سکتا ہو یا شدتِ شہوت کی وجہ سے اتنے دن صبر نہ کر سکتا ہو، "فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ" میں دونوں شامل ہیں، جیسا کہ سلمہ بن صخر بیاضی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ماہِ رمضان گزرنے تک کے لیے ماں کہہ دیا، پھر کسی رات اس سے جماع کر بیٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( حَرِّرْ رَقَبَةً )) "ایک گردن آزاد کرو۔" انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! میرے پاس اس گردن کے سوا کوئی گردن نہیں۔" فرمایا: (( فَصُمْ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ )) "پھر دو ماہ پے در پے روزے رکھو۔" انھوں نے کہا: "مجھ پر روزوں ہی کی وجہ سے تو یہ مصیبت آئی ہے۔" فرمایا: (( فَأَطْعِمْ وَسْقًا مِنْ تَمْرٍ بَيْنَ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا )) [ أبو داوٗد، کتاب الطلاق، باب في الظھار : ۲۲۱۳ ] "پھر ساٹھ مسکینوں میں ایک وسق کھجور تقسیم کر دو۔"

❸ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا: اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن کھانا کھلانے سے یا ساٹھ دنوں کا کھانا دینے سے یہ کفارہ ادا نہیں ہوگا، بلکہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا پڑے گا، خواہ ایک وقت میں کھلا دے یا مختلف وقتوں میں۔ آیت کے الفاظ کے مطابق اس کا بالکلف مطلب یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو ایک دفعہ پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے۔ (شوکانی)

❹ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان سے مراد ان کے احکام کے سچا ہونے پر یقین رکھنا اور ان پر عمل کرنا ہے، کیونکہ ایمان میں تصدیق، اقرار اور عمل تینوں چیزیں شامل ہیں۔

❺ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ: یعنی ظہار کا حرام ہونا اور اس سے رجوع کی صورت میں اس پر کفارہ لازم ہونا اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں، جن سے تجاوز حرام ہے۔

❻ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: "الْكَافِرِيْنَ" انکار کرنے والے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ کے حکموں کو نہیں مانتے وہ حقیقت میں کافر ہیں، چاہے دنیوی احکام میں اور مردم شماری کی رو سے مسلمانوں میں شمار ہوتے ہوں۔

آیت 5 ❶ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ...... "يُحَآدُّوْنَ" "حَدٌّ" سے مشتق ہے جس کا معنی جانب ہے۔ باب مفاعلہ عموماً مقابلے کے معنی کے لیے آتا ہے، یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، اللہ اور اس کے

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۶﴾ ع

جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا، پھر انھیں بتائے گا جو انھوں نے کیا۔ اللہ نے اسے محفوظ رکھا اور وہ اسے بھول گئے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ⑥

رسول ایک جانب ہوں تو وہ ان کے مقابلے میں دوسری جانب ہوتے ہیں۔ "كُبِتُوْا" "كَبَتَ يَكْبِتُ كَبْتًا" (ض) ذلیل کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، دھکے دے کر نکال دینا۔ اللہ تعالیٰ نے شروع سورت سے یہاں تک ظہار کی حرمت اور اس کے کفارہ کے احکام بیان فرمائے اور بتایا کہ یہ احکام اس لیے مقرر کیے گئے ہیں کہ لوگ ظہار اور اس جیسی بری رسوم سے باز آ جائیں جن کے وہ جاہلیت میں عادی تھے، تاکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کے خوگر ہو جائیں اور ان کے احکام پر اخلاص کے ساتھ عمل کریں۔ اس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کریں گے، ان کے احکام کی نافرمانی کریں گے اور ان کے مقابلے پر اتر آئیں گے انھیں دنیا میں ذلیل کیا جائے گا، جس طرح ان قوموں کو ذلیل کیا گیا جنھوں نے ان سے پہلے اللہ اور اس کے رسولوں کی مخالفت کی اور یہ احکام اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور ان کا انکار کرنے والوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

② "كُبِتُوْا" ماضی مجہول کا صیغہ ہے، لفظی معنی ہے "ذلیل کیے گئے۔" مراد یہ ہے کہ "ذلیل کیے جائیں گے۔" آئندہ ہونے والی بات کو ماضی کے صیغے کے ساتھ اس لیے فرمایا کہ اس کا ہونا اتنا یقینی ہے کہ سمجھو یہ کام ہو ہی چکا ہے۔ اس میں کفار کے لیے وعید اور مسلمانوں کے لیے خوش خبری ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بدر اور دوسرے معرکوں میں کفار اور ان کے مددگار یہود و منافقین بری طرح ذلیل ہوئے، انھیں شکستوں پر شکستیں ہوئیں اور انھیں قتل، قید، مال و اولاد سے محرومی، غلامی اور جلاوطنی کی ذلتیں اٹھانا پڑیں، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں مکہ فتح ہو گیا۔ پھر پورے جزیرۂ عرب پر اسلام کے مکمل غلبے کے ساتھ کفار و منافقین پر ذلت و رسوائی کی مہر ثبت ہو گئی اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء کے ہاتھوں مشرق سے مغرب تک اسلام غالب ہوا اور کفار و منافقین ذلیل و رسوا ہوئے۔

**آیت 6** ① يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ......: اس کا تعلق پچھلی آیت کے آخری جملے "وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ" سے ہے، یعنی ان کافروں کے لیے اس دن بھی رسوا کرنے والا عذاب ہے جب اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع فرمائے گا، پھر وہ جو کرتے رہے اس سے انھیں آگاہ کرے گا، تاکہ وہ اس کا نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

② اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ ہزاروں لاکھوں سالوں کے بعد اگر سب لوگوں کو زندہ کر بھی لیا گیا تو انھوں نے جو کچھ کیا اسے مدتیں گزر چکی ہوں گی، اللہ تعالیٰ اتنی بے شمار مخلوق کے بے شمار اعمال انھیں کیسے بتائے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ کوئی پانچ آدمیوں کی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں بھی ہوں، پھر وہ انھیں قیامت کے دن بتائے گا جو کچھ انھوں نے کیا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔⑦

گا؟ فرمایا وہ اپنا کیا ہوا بے شک بھول چکے ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ محفوظ کر رکھا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ کہف (۴۹) کی تفسیر۔

③ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ: کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، وہ ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۱۱۷۔ نجم: ۱۷) اگلی آیت میں اس کی مزید تاکید ہے۔

آیت 7 ① اَلَمْ تَرَ: اس کے لیے دیکھیے سورۂ فیل کی پہلی آیت اور سورۂ نور کی آیت (۴۱) کی تفسیر۔

② اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کے اعمال ہی کو نہیں بلکہ آسمان و زمین کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو جانتا ہے۔

③ یہاں سے آیت (۱۹) تک مسلسل منافقین کے طرزِ عمل پر گرفت کی گئی ہے۔

④ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ ......: " نَجَا يَنْجُوْ نَجْوًا وَنَجْوٰى وَ نَاجٰى مُنَاجَاةً وَ نِجَاءً، الرَّجُلَ " کسی آدمی سے اپنے دل کی بات دوسروں سے چھپا کر کرنا۔ " نَجْوٰى " اس سے اسم مصدر ہے، سرگوشی۔ زیادہ تر اس کا استعمال برے کاموں کی سرگوشیوں اور سازشوں کے لیے ہوتا ہے، مثلاً چوری، ڈاکے، قتل یا کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ مشورہ کرنا۔ خیر کے کاموں میں اس کا استعمال کم ہوتا ہے، کیونکہ عموماً انھیں چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یعنی تھوڑے سے تھوڑے یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی کوئی مجلس، کوئی سرگوشی اور کوئی خفیہ سے خفیہ مشورہ نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ سے مخفی ہو اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ نہ ہو، بلکہ جو بھی تین آدمی چھپ کر مشورہ کر رہے ہوں ان کے ساتھ چوتھا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور جو بھی پانچ آدمی چھپ کر مشورہ کر رہے ہوں ان کے ساتھ چھٹا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور اس سے کم یا زیادہ جہاں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ " اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ " کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حدید (۴) کی تفسیر۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ يَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَ يَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۸

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں سرگوشی کرنے سے منع کیا گیا، پھر وہ اس چیز کی طرف لوٹتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا اور آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے ہیں اور جب تیرے پاس آتے ہیں تو (ان لفظوں کے ساتھ) تجھے سلام کہتے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے تجھے سلام نہیں کہا اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں اس پر سزا کیوں نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں؟ انھیں جہنم ہی کافی ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے، پس وہ برا ٹھکانا ہے ۸

**آیت 8** ❶ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ...... یہاں سے یہود اور منافقین کے طرز عمل پر گرفت کا آغاز ہو رہا ہے، جو انھوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ یہود نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر رکھا تھا اور آپ کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے اور منافقین بظاہر ایمان لا چکے تھے اور مسلمانوں کی جماعت کے فرد تھے، مگر ان کی دوستی یہود ہی کے ساتھ تھی۔ منافقین اور یہود نے اندر ہی اندر اپنا الگ جتھا بنا رکھا تھا، انھیں جب بھی موقع ملتا خفیہ مجالس میں مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے، فتنہ برپا کرنے اور مشرکین سے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آتے تو آپس میں کھسر پھسر کرتے رہتے، جس سے مجلس کی بے وقعتی ہوتی اور اس بات کا اظہار ہوتا کہ انھیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض اوقات وہ آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے کسی مسلمان کو دیکھ کر آپس میں آنکھ مارتے، تاکہ وہ سمجھے کہ وہ اس کے متعلق کوئی بات کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے اس رویے سے سخت تکلیف ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایسی مجالس سے منع کیا جن میں وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ مشورے اور سازشیں کرتے تھے اور مسلمانوں کی مجلسوں میں علیحدہ سرگوشیوں سے بھی منع کیا، مگر وہ باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ آیات نازل فرما کر ان پر اپنی ناراضی کا اظہار فرمایا۔

❷ وَ يَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ: اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان کے خفیہ مشورے اور سرگوشیاں یا تو ایسے گناہوں پر مشتمل ہوتی تھیں جن کا تعلق ان کی ذات سے تھا یا ایسے گناہوں پر جن میں دوسروں پر ظلم و زیادتی ہوتی، یا پھر ان کی سرگوشیاں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی پر مشتمل ہوتی تھیں۔

❸ وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ: "حَيِيَ يَحْيٰي حَيَاةً" (خَشِيَ يَخْشٰي) زندہ ہونا۔ "حَيّٰي يُحَيِّيْ تَحِيَّةً" (تفعیل) زندگی اور سلامتی کی دعا دینا، سلام کہنا۔ (دیکھیے نساء: ۸۶) یعنی جب یہ یہودی اور ان کے ہم نوا منافقین آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو ایسے الفاظ کے ساتھ آپ کو سلام کہتے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ کے آپ ﷺ کو سلام کا ذکر خاص اس آیت میں ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۹

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو اور نیکی اور تقویٰ کی سرگوشی کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ۹

[الأحزاب : ٥٦] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام بھیجو، خوب سلام بھیجنا۔" اور ذکرِ عام اس آیت میں ہے: ﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى﴾ [النمل : ٥٩] "کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جنھیں اس نے چن لیا۔" یہودی آپ کو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کے بجائے "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" (تم پر موت ہو) کہتے۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے بھی یہود کی دیکھا دیکھی یہ کام شروع کر دیا تھا، جیسا کہ انھوں نے یہود سے سیکھ کر آپ ﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے استعمال ہونے والا لفظ "رَاعِنَا" گالی کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا اور اس کے بجائے "اُنْظُرْنَا" کہنے کا حکم دیا۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۰۴) عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ کچھ یہودی لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور انھوں نے کہا: « اَلسَّامُ عَلَيْكَ يَا أَبَا الْقَاسِمِ ! » "اے ابوالقاسم! تجھ پر موت ہو۔" آپ ﷺ نے فرمایا: « وَ عَلَيْكُمْ » "اور وہ تمھی پر ہو۔" عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے کہا: « بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ وَالذَّامُ » "بلکہ تم پر موت اور مذمت ہو۔" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَا عَائِشَةُ! لَا تَكُوْنِيْ فَاحِشَةً » "اے عائشہ! نازیبا الفاظ کہنے والی نہ بن۔" عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "آپ نے وہ نہیں سنا جو انھوں نے کہا ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: « أَوَ لَيْسَ قَدْ رَدَدْتُ عَلَيْهِمُ الَّذِيْ قَالُوْا، قُلْتُ وَعَلَيْكُمْ » "تو کیا میں نے وہ بات انھی پر لوٹا نہیں دی جو انھوں نے کہی ہے؟ میں نے کہہ دیا "وَعَلَيْكُمْ" کہ "وہ تمھی پر ہو۔" تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرما دی: ﴿وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ﴾ "اور جب تیرے پاس آتے ہیں تو (ان لفظوں کے ساتھ) تجھے سلام کہتے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے تجھے سلام نہیں کہا۔" [مسلم، السلام، باب النھي عن ابتداء أھل الکتاب بالسلام..... : ۱۱/ ۲۱٦٥۔ مسند أحمد : ٦/ ۲۲۹، ۲۳۰، ح : ۲٥۹۷۸]

❹ وَ يَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ...... : اور وہ اپنے دل میں یا آپس کی مجلس میں اسے رسول اللہ ﷺ کے رسول نہ ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے کہ اگر یہ رسول ہوتے تو یہ الفاظ کہتے ہوئے ہم پر عذاب آ جاتا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے سچا ہونے کے لیے یہی دلیل کافی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی اس حرکت سے آگاہ کر دیا۔ رہا عذاب، تو اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ گناہ پر اسی وقت گرفت فرمائے، اس نے تو ان لوگوں کو بھی مہلت دے رکھی ہے جو اسے گالی دیتے ہیں، تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں مہلت نہیں ملی اور اس نے ہر کام کی طرح ان کے عذاب کے لیے بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ مرنے کے بعد ان کے لیے جہنم کا عذاب تیار ہے اور وہ انھیں کافی ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور سزا کی ضرورت نہ رہے گی۔

آیت 9 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ ...... : جیسا کہ آیت (۷) کے فوائد میں گزرا کہ "نَجْوٰى" کا لفظ عموماً

إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑩

**یہ سرگوشی تو شیطان ہی کی طرف سے ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو غم میں مبتلا کرے جو ایمان لائے، حالانکہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر انھیں ہرگز کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ⑩**

برے مقاصد کے لیے سرگوشیوں پر استعمال ہوتا ہے جو حرام ہیں، لیکن بعض اوقات "نَجْوٰی" (خفیہ مشورہ) اچھے مقاصد کے لیے بھی ہوسکتا ہے، اس کی اجازت ہے بلکہ اس کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ باعث اجر ہے۔ (دیکھیے نساء: ۱۱۴) اس آیت میں ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو گناہ، زیادتی اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی والی سرگوشیوں اور خفیہ مجلسوں سے منع فرمایا، کیونکہ یہ ایمان کے دعویٰ کے خلاف ہے اور نیکی اور تقویٰ والی سرگوشیوں کی اجازت بلکہ نصیحت فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے سرگوشی کی ہر ایسی صورت سے منع فرمایا جس سے کسی مسلمان کی دل آزاری ہوتی ہو۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاجٰى رَجُلَانِ دُوْنَ الْآخَرِ حَتّٰى تَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ، أَجْلَ أَنْ يُحْزِنَهُ » [ بخاري، الاستئذان، باب إذا كانوا أكثر من ثلاثة فلا بأس بالمسارة المناجاة : ۶۲۹۰۔ مسلم : ۲۱۸۴ ] "جب تم تین آدمی ہو تو دو آدمی تیسرے کے بغیر آپس میں سرگوشی نہ کریں، یہاں تک کہ تم دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جاؤ، کیونکہ یہ چیز اسے غمگین کرے گی۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تین سے زیادہ آدمی ہوں تو کوئی دو آدمی آپس میں سرگوشی کر سکتے ہیں۔ البتہ چار یا پانچ یا زیادہ آدمی ایک شخص کو اکیلے چھوڑ کر الگ سرگوشی کریں تو اس اکیلے کا غمگین اور پریشان ہونا تو لازمی بات ہے، اس لیے اس حدیث کے مطابق وہ بھی ناجائز ہے۔ تین آدمیوں میں سے دو اگر ایسی زبان میں بات شروع کر دیں جو تیسرا نہیں جانتا تو اس حدیث کے مطابق وہ بھی جائز نہیں۔ ہاں، اگر دو آدمی تیسرے سے اجازت لے کر آپس میں سرگوشی کر لیں تو یہ جائز ہے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاجَ اثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَإِنَّ ذٰلِكَ يُحْزِنُهُ » [ مسند أحمد: ۱۴۶/۲، ح : ۶۳۳۸۔ مصنف عبد الرزاق، ح : ۱۹۸۰۶، وسنده صحيح ] "جب تم تین آدمی ہو تو دو آدمی تیسرے کے بغیر سرگوشی نہ کریں، مگر اس کی اجازت کے ساتھ، کیونکہ یہ چیز اسے غمگین کرے گی۔"

**آیت 10** **إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا......** : "حَزِنَ يَحْزَنُ" (س) غمگین ہونا اور "حَزَنَ يَحْزُنُ" (ن) غمگین کرنا۔ اس میں مسلمانوں کو تسلی دلائی ہے کہ یہود و منافقین کی یہ سرگوشیاں دراصل شیطان کی کارستانی ہے، جس سے وہ ایمان والوں کو غمگین کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم ایسی کوئی بات دیکھو تو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو تو شیطان تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور نہ ان سرگوشیوں سے تمھارا کچھ نقصان ہوسکتا ہے، اس لیے اللہ ہی پر توکل رکھو اور غمگین ہو کر شیطان کو خوش ہونے کا موقع نہ دو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل جاؤ تو کھل جاؤ، اللہ تمھارے لیے فراخی کر دے گا

آیت 11 ① يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا...... : پچھلی آیات میں مجلس کے آداب میں سے سرگوشی سے ممانعت کا ادب بیان ہوا، اس آیت میں اس کے مزید کچھ آداب بیان ہوئے ہیں۔ ان آداب کی ضرورت اس لیے پڑی کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ہر شخص آپ کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی خواہش رکھتا تھا، جس سے مجلس میں تنگی پیش آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ادب سکھایا کہ جب حاضرینِ مجلس کی سہولت کے لیے کہا جائے کہ کھل جاؤ، تاکہ سب لوگ آسانی سے کھلے ہو کر بیٹھ سکیں تو کھل جاؤ، صرف میرِ مجلس کے قرب کے پیشِ نظر ایک دوسرے کے اوپر چڑھ کر بیٹھے رہنے پر اصرار نہ کرو۔ اسی طرح اگر مجلس میں کچھ اور لوگ آ جائیں اور ان کی جگہ بنانے کے لیے کھل جانے کے لیے کہا جائے تو کھل جاؤ اور دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔

② يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ : "يَفْسَحِ" فعل مضارع معلوم ہے جو "تَفَسَّحُوْا" امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، آگے ملانے کے لیے اسے کسرہ دیا گیا ہے، یعنی تم مجلس میں کشادگی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھارے لیے فراخی کر دے گا، اس فراخی میں سب سے پہلی فراخی تو دل کی فراخی ہے کہ خوش دلی سے کھل جاؤ گے تو دلوں کی تنگی دور ہوگی اور ان میں بھائیوں کے لیے وسعت پیدا ہوگی۔ اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کے ہر معاملے میں تمھیں فراخی عطا فرمائے گا، کیونکہ ہر عمل کا بدلا اسی جیسا ہوتا ہے، جیسا کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ بَنٰى مَسْجِدًا لِلّٰهِ بَنَى اللّٰهُ لَهُ فِي الْجَنَّةِ مِثْلَهُ )) [ مسلم، المساجد، باب فضل بناء المساجد والحث علیها: ۲۵/۵۳۳۔ بخاري: ٤٥٠ ] ''جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے اللہ اس کے لیے اس کی مثل جنت میں (گھر) بنائے گا۔'' اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ )) [ مسلم، الذکر، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر: ۲۶۹۹ ] ''جو شخص کسی مومن سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور کرے اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور فرمائے گا۔ اور جو کسی تنگی والے پر آسانی کرے اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا اور جو شخص کسی مسلم (کے عیبوں) پر پردہ ڈالے اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس (کے عیبوں) پر پردہ ڈالے گا اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے۔''

③ وَ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا : " نَشَزَ يَنْشِزُ نَشْزًا " (ض،ن) "اَلرَّجُلُ عَنْ مَّكَانِهٖ" آدمی کا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہونا۔ جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو جاؤ تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ، یعنی جب مجلس کا امیر یا مجلس کے منتظمین حاضرین میں سے کسی

قِيۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ۙ وَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ

**اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ، اللہ ان لوگوں کو درجوں میں بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان**

کے علم و فضل اور شرف و مرتبہ کے پیش نظر اسے امیر کے قریب لانے کے لیے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھ جانے کے لیے کہیں تو اسے چاہیے کہ اٹھ جائے اور اپنے دل میں کوئی تنگی یا ملال نہ لائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لِيَلِنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ » [ مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف و إقامتها ...... : ۴۳۲ ] ''تم میں سے میرے قریب وہ لوگ ہوں جو سمجھ اور عقل والے ہوں، پھر جو ان سے (سمجھ اور عقل میں) قریب ہوں۔'' اسی طرح اگر امیر کسی شخص سے یا کچھ لوگوں سے مشورہ کرنے کے لیے یا ان کی بات سننے کے لیے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھ جانے کے لیے کہے تو اسے کسی ملال کے بغیر اٹھ جانا چاہیے۔ یہ ادب اس لیے مقرر فرمایا کہ بعض اوقات عام سمجھ والے مسلمان رسول اللہ ﷺ سے محبت کی وجہ سے یا منافقین اپنے خبثِ باطن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے قریب ساری جگہ گھیر لیتے، پھر کوئی بزرگ صحابی مثلاً ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ آتے تو ان کے لیے جگہ نہ چھوڑتے اور اگر اٹھنے کے لیے کہا جاتا تو برا مناتے۔ ظاہر ہے اگر اس ادب کا خیال نہ رکھا جائے تو کسی امیر کی کوئی مجلس صحیح طریقے سے چل ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر امیر مجلس کو برخاست کر دے اور سب کو اٹھ جانے کے لیے کہے تو انھیں اٹھ جانا چاہیے اور اس میں اپنی توہین محسوس نہیں کرنی چاہیے۔

④ **يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا......** : "**يَرۡفَعِ**" فعل مضارع ہے جو "**فَانۡشُزُوۡا**" امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، کسرہ اسے آگے ملانے کے لیے دیا گیا ہے۔ یعنی جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو جاؤ تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ جب تم اللہ کا حکم سمجھ کر تواضع اختیار کرو گے اور اٹھنے میں کسی طرح کی توہین یا کسرِ شان کا خیال دل میں نہیں لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو درجوں میں بلند کر دے گا جو ایمان لائے، کیونکہ ایمان کا تقاضا تواضع ہے اور ایمان اور کبر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيْمَانٍ » [ أبو داوٗد، اللباس، باب ما جاء في الكبر : ۴۰۹۱، وقال الألباني صحيح ] ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہوگا اور وہ شخص آگ میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے برابر ایمان ہوگا۔''

⑤ **يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ** : بظاہر یہاں الفاظ یہ ہونے چاہییں تھے کہ "يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ نَشَزُوْا مِنْكُمْ" یعنی ''(جب تمھیں کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو جاؤ تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ) تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اٹھ کھڑے ہوں گے درجات میں بلند کر دے گا'' مگر اللہ تعالیٰ نے منافقین کو نکالنے کے لیے "**اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ**" کی قید لگا دی کہ منافقین اس حکم پر اٹھ کھڑے ہوں تب بھی انھیں رفع درجات کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا، ان کا ٹھکانا "**الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ**" (آگ کا سب سے نچلا درجہ) ہی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۴۵)۔

وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

لائے اور جنھیں علم دیا گیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پوری طرح باخبر ہے ﴿۱۱﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم رسول سے سرگوشی کرو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ پیش کرو، یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا اور زیادہ پاکیزہ ہے، پھر اگر نہ پاؤ تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۲﴾

---

❻ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ: یہ "الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" ہی کی صفت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو "الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ محمد (۱۶) کی تفسیر اور ایمان کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [ محمد : ۱۹ ] "پس جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔" ہاں، علم اور ایمان کے مدارج میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اسی طرح جنت میں علم کے لحاظ سے اہل ایمان کے مدارج میں بلندی ہوگی۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَ رَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَؤُهَا )) [ أبو داوٗد، الوتر، باب كيف يستحب الترتيل في القراءة : ۱٤٦٤، وقال الألباني حسن صحيح ] "قرآن والے شخص سے کہا جائے گا پڑھ اور چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جس طرح تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا، تیرا مقام آخری آیت کے پاس ہے جسے تو پڑھے گا۔" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِيْنَ )) [ مسلم، صلاۃ المسافرین، باب فضل من يقوم بالقرآن و يعلمه : ۸۱۷، عن عمر رضی اللہ عنہ ] یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا درجات میں بلندی عطا فرمائے گا، وہ جس قدر ایمان اور علم میں زیادہ ہوں گے، اتنے ہی درجوں میں بلند ہوں گے۔ اس آیت سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

❼ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ" اور "وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" کو عطف کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، جو مغایرت کے لیے ہوتا ہے، تو یہ دونوں ایک ہی موصوف کی صفت کیسے ہو سکتے ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں موصوف میں مغایرت مراد نہیں صفات میں مغایرت مراد ہے اور بعض اوقات ایک ہی موصوف کی صفات اس طرح بھی لائی جاتی ہیں، جیسا کہ سورۂ اعلیٰ میں ہے: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ وَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى﴾ [ الأعلٰی : ۱ تا ٤ ] "اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے۔ وہ جس نے پیدا کیا، پس درست بنایا۔ اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر ہدایت کی۔ اور وہ جس نے چارا اُگایا۔"

❽ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: یعنی اللہ تعالیٰ تمھارے تمام اعمال سے پوری طرح باخبر ہے کہ تم اٹھنے کا حکم ملنے پر خوش دلی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہو یا نفاق اور کبر کی وجہ سے مجبوراً اٹھتے ہو اور وہ تمھیں تمھارے عمل کے مطابق ہی جزا دے گا۔

آیت 12 ❶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ ...... : ہر مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مناجات اور خلوت میں

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑬ ع

کیا تم اس سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقے پیش کرو، سو جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تم پر مہربانی فرمائی تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو ⑬

---

گفتگو کی خواہش رکھتا تھا، جس سے نبی ﷺ کو مشقت اٹھانا پڑتی تھی۔ اس پر مزید منافقین کا رویہ تھا کہ انھوں نے محض اپنی بڑائی جتانے کے لیے نبی ﷺ سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ایک ایک آدمی آپ کا خاصا وقت لے جاتا، اس سے دوسرے لوگوں کو تکلیف ہوتی، کیونکہ انھیں عام فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملتا، خود نبی ﷺ پر بھی ان کا یہ طرز عمل شاق گزرتا، مگر آپ مروت و اخلاق کی وجہ سے کسی کو منع نہ فرماتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو شخص بھی آپ ﷺ سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہے وہ اس سے پہلے صدقہ دے کر آئے، البتہ نادار مسلمانوں کے لیے گنجائش رکھی کہ اگر صدقہ کرنے کے لیے تمھارے پاس کچھ نہ ہو اور تمھیں علیحدگی میں گفتگو کرنا ضروری ہو تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ منافقین عموماً مال دار تھے مگر سخت بخیل تھے، لہٰذا انھوں نے بخل کی وجہ سے علیحدگی میں گفتگو کر کے آپ کا وقت ضائع کرنا ترک کر دیا۔

② ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ : یعنی اس حکم کا مقصد صرف رسول اللہ ﷺ سے مشقت ہٹانا نہیں بلکہ تمھاری تربیت بھی ہے کہ جب بھی تمھیں رسول اللہ ﷺ سے علیحدگی میں گفتگو کی خواہش ہوگی اور ہر بار اس سے پہلے تم صدقہ کرو گے تو اس سے فقراء کا فائدہ ہوگا اور تمھیں خرچ کرنے کی عادت پڑے گی، بخل کی کمینگی دور ہوگی، مال میں برکت ہوگی، آفات و مصائب اور جہنم سے حفاظت ہوگی اور اموال و قلوب کو طہارت حاصل ہوگی۔

**آیت 13** ① ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ: اس سے ظاہر ہے کہ اس حکم کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ علیحدگی میں گفتگو کا رجحان، جو بہت بڑھ گیا تھا، رک گیا۔ منافقین اپنے بخل کی وجہ سے رک گئے اور مخلص مسلمان، جو نادار تھے، غربت کی وجہ سے محتاط ہو گئے۔

② فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ : اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے نزول کے بعد کسی نے نہ تو رسول اللہ ﷺ سے کوئی رازدارانہ بات کرنے کی جراُت کی اور نہ اس مقصد کے لیے صدقہ دینے کی نوبت آئی، بلکہ انھیں احساس ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ سے رازدارانہ گفتگو کے بارے میں ان کی روش اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئی، اس لیے وہ اس پر نادم ہوئے اور اپنے رویے سے باز آ گئے۔ "وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" یعنی اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر مہربانی فرمائی اور آپ سے مناجات سے پہلے صدقے کا حکم منسوخ کر دیا۔

③ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ...... : یعنی جب یہ وقتی حکم تم سے اٹھا لیا گیا تو ان احکام کی پابندی کرتے رہو جن پر

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لَا مِنْهُمْ ۙ وَ يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے ان لوگوں کو دوست بنا لیا جن پر اللہ غصے ہو گیا، وہ نہ تم سے ہیں اور نہ ان سے اور وہ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۱۴﴾

عمل تمھارے لیے ہمیشہ لازم ہے۔ ان میں سب سے اہم نماز اور زکوٰۃ ہے، اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی اطاعت پر کاربند رہو اور یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔

④ یہ حکم اگرچہ منسوخ ہو گیا مگر اس سے جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، مسلمان تو آپ ﷺ سے محبت اور آپ کے ادب کی وجہ سے علیحدگی میں لمبی گفتگو سے اجتناب کرنے لگے اور منافقین اس خوف سے کہ ہم نے ایسا کیا تو ہمارا نفاق کھل جائے گا اور ہم پہچان لیے جائیں گے۔

**آیت 14** ① **اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ** : اس آیت میں منافقین کے تین اوصاف بیان کرتے ہوئے ان کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے، ان میں سے پہلا وصف یہ ہے کہ ایمان کے دعوے کے باوجود ان کی دوستی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ایمان والوں کے بدترین دشمن ہیں اور جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ اگرچہ تمام کفار ہی پر اللہ کا غضب ہے اور منافقین تمام کفار سے دوستی کرتے تھے، مگر "مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ" خاص طور پر یہود کا لقب ہے، جیسا کہ "**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ**" کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۱، ۹۰)، آل عمران (۱۱۲)، اعراف (۱۵۲)، مائدہ (۶۰) اور سورۂ ممتحنہ (۱۳) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو یہود و نصاریٰ اور کفار کی دوستی سے صریح الفاظ میں منع فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۸)، نساء (۱۴۴)، مائدہ (۵۱) اور سورۂ توبہ (۲۳)۔

② **مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لَا مِنْهُمْ** : یہ منافقین کا دوسرا وصف ہے کہ بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود فی الواقع وہ تم میں سے نہیں ہیں، کیونکہ اگر وہ حقیقی مومن ہوتے تو کفار کو کبھی دوست نہ بناتے۔ (دیکھیے مائدہ: ۸۱) اور اسی طرح وہ یہود میں سے بھی نہیں، کیونکہ وہ انھیں بھی حق پر نہیں سمجھتے، ان کی دوستی محض غرض کی دوستی ہے کہ اگر مسلمانوں پر کوئی گردش آئی تو ان کی دوستی کام آئے گی۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۴۲، ۱۴۳) کی تفسیر۔

③ **وَ يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ** : یعنی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں جھوٹ بولتے ہیں اور اس پر قسمیں بھی کھاتے ہیں۔ اس جھوٹ سے مراد ایک تو مومن ہونے کا دعویٰ ہے۔ (دیکھیے منافقون: ۱۔ توبہ: ۵۶) پھر مختلف اوقات میں اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے خلاف ان کے کسی قول یا فعل پر جب گرفت کی جاتی تو وہ جھوٹ بول دیتے کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی، نہ یہ کام کیا ہے اور اس پر قسمیں کھا جاتے۔ (دیکھیے توبہ: ۶۲، ۷۴، ۹۵، ۹۶۔ منافقون: ۲، ۷)

أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ إِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾

اللہ نے ان کے لیے بہت سخت عذاب تیار کیا ہے، بے شک یہ لوگ، برا ہے جو کچھ کرتے رہے ہیں ﴿۱۵﴾ انھوں نے اپنی قسموں کو ایک طرح کی ڈھال بنا لیا، پس انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، سو ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ﴿۱۶﴾ ان کے اموال اللہ کے مقابلے میں ہرگز ان کے کسی کام نہ آئیں گے اور نہ ہی ان کی اولاد۔ یہ لوگ آگ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۷﴾ جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ بے شک وہ کسی چیز پر (قائم) ہیں، سن لو! یقیناً وہی اصل جھوٹے ہیں ﴿۱۸﴾

---

سیرت کی کتابوں میں ایسے بہت سے واقعات مذکور ہیں۔

**آیت 15** أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا...... : عذاب شدید سے مراد "الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۴۵)۔

**آیت 16** ❶ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً...... : یعنی ایک طرف انھوں نے اپنی جانیں اور اپنے مال بچانے کے لیے مسلمان ہونے کی جھوٹی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر جب موقع ملتا ہے شکوک و شبہات پیدا کر کے بہت سے لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے روک دیتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۵۶، ۱۶۸)، نساء (۷۲) اور سورۂ احزاب (۱۸)۔

❷ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: دنیا میں یہ رسوائی کہ نہ مسلمانوں میں ان کی کوئی عزت ہے اور نہ کفار میں سے کوئی ان پر اعتماد کرتا ہے اور قیامت کے دن ان کے لیے "الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" کی شکل میں عذاب تیار ہے۔

**آیت 17** لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ...... : نفاق کا بڑا باعث مال و اولاد کی محبت ہے، اس لیے فرمایا قیامت کے دن یہ اموال و اولاد ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۰، ۱۱۶، ۱۱۷)۔

**آیت 18** يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ...... : یعنی منافقین کی جھوٹ بولنے اور اس پر قسم کھانے کی عادت اتنی پکی ہے کہ موت اور حشر و نشر کے بعد بھی نہیں جائے گی اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی طرح جھوٹی قسمیں کھا جائیں گے جس طرح دنیا میں مسلمانوں کے سامنے کھاتے ہیں اور سمجھیں گے کہ قسم کی صورت میں ان کے پاس کچھ نہ کچھ بنیاد موجود ہے،

اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ الشَّيۡطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّيۡطٰنِ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحَآدُّوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الۡاَذَلِّيۡنَ ﴿۲۰﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيۡزٌ ﴿۲۱﴾

شیطان ان پر غالب آ گیا، سو اس نے انھیں اللہ کی یاد بھلا دی، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ سن لو! یقیناً شیطان کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۱۹﴾ بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں ﴿۲۰﴾ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول، یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۲۱﴾

جس پر وہ قائم ہیں۔ فرمایا سن لو، وہی اصل اور کامل جھوٹے ہیں کہ علام الغیوب کے سامنے بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۲ تا ۲۴)۔

**آیت 19** ❶ اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ..... : یعنی منافقین کے ان اعمال کی وجہ سے ان پر شیطان غالب آ گیا اور اس طرح مسلط ہو گیا ہے کہ اس نے انھیں اللہ کی یاد تک بھلا دی ہے۔ یہ لوگ شیطانی گروہ ہیں اور شیطان کا گروہ ہی کامل خسارے والے لوگ ہیں۔

❷ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال کے نتیجے میں شیطان کا آدمی پر غلبہ ہو جاتا ہے، ان اعمال میں سے ایک نماز باجماعت کا ترک ہے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِيْ قَرْيَةٍ وَلَا بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِيْهِمُ الصَّلَاةُ إِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِيَةَ » [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب التشدید في ترك الجماعۃ : ۵۴۷ ] ”کوئی بھی بستی یا بادیہ نہیں جس میں تین آدمی (ہی) ہوں اور ان میں نماز باجماعت نہ ہوتی ہو مگر اس پر شیطان غالب آ چکا ہے، اس لیے تم جماعت کو لازم پکڑو، کیونکہ بھیڑیا صرف اسی بکری کو کھاتا ہے جو ریوڑ سے دور جانے والی ہو۔“ قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے، فرمایا: ﴿ وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوۡا كُسَالٰى ﴾ [ النساء : ۱۴۲ ] ”اور جب وہ (منافق) نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔“

**آیت 20** اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحَآدُّوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ..... : یہ حزب الشیطان کے اس خسارے کا بیان ہے جو پچھلی آیت میں مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۵، ۶) اور سورۂ توبہ کی آیت (۶۳) کی تفسیر۔

**آیت 21** ❶ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىۡ : کفار کے ”الۡاَذَلِّيۡنَ“ ہونے کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور اہل ایمان کی عزت اور ان کے غلبے کا بیان فرمایا۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۱۷۱ تا ۱۷۳) کی تفسیر۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

تو ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کا خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ قوت بخشی ہے اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ

② اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ: یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے غالب آنے کی علت ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت قوت والا اور سب پر غالب ہے، پھر اس پر غالب کون آ سکتا ہے؟

آیت 22 ① لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ......: یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں سے دوستی دو ایسی چیزیں ہیں جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں، خواہ وہ آدمی کے کتنے قریبی رشتہ دار ہوں، اس لیے منافقین جو ایمان کے دعوے کے باوجود کفار سے دوستی رکھتے ہیں ان کا ایمان کا دعویٰ غلط ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ آلِ عمران (۲۸) اور سورۂ توبہ (۲۳، ۲۴)۔

② اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ: یعنی یہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھنے والوں سے دوستی نہیں رکھتے، خواہ وہ کتنے قریبی رشتہ دار ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان نقش کر دیا ہے۔ اس کا مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ انھوں نے ان تمام لوگوں سے دوستی اور دلی تعلق کا رشتہ کاٹ پھینکا تھا جو اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت اور دشمنی رکھتے تھے، خواہ وہ ان کے باپ تھے یا بیٹے یا بھائی یا خاندان کے لوگ۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کفر کی حمایت میں مسلمانوں سے لڑنے والے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی قتل یا قید کرنے سے دریغ نہیں کیا، خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی تھے یا کوئی اور رشتہ دار۔ جنگِ بدر میں جب قیدیوں کے متعلق مشورہ ہوا کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا قتل کر دیا جائے، تو عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ ان کافر قیدیوں میں سے ہر ایک کو اس کے رشتہ دار کے سپرد کیا جائے، جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے قتل کرے اور اللہ تعالیٰ کو عمر رضی اللہ عنہ ہی کا مشورہ پسند آیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۶۷) کی تفسیر۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس اور عقیل بن ابی طالب (رضی اللہ عنہما) اسیر ہوئے تو دوسرے قیدیوں کی طرح فدیہ دے کر رہا ہوئے۔ اسی طرح آپ کے داماد ابو العاص اس شرط پر رہا ہوئے کہ آپ کی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو واپس بھجوا دیں گے۔

فِيهَا ۚ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ۚ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۚ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾

ع ۳

رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ اللہ کا گروہ ہیں، یاد رکھو! یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۲۲﴾

3 وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ: یعنی انھیں اپنی طرف سے ایک عظیم روحانی قوت عطا فرما کر ان کی مدد فرمائی۔

4 وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ...... : یہ ہے جنتوں میں داخلے، اس میں ابدی قیام اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا وہ تصدیق نامہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل ہوا۔ پھر ان لوگوں کی بدنصیبی کا کیا عالم ہو سکتا ہے جو ان سے دشمنی رکھتے اور ان کے بارے میں بدزبانی کرتے ہیں۔

5 اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ... : ''حِزْبُ اللّٰهِ'' خبر معرفہ ہونے سے حصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے، یعنی اللہ کی جماعت اور گروہ صرف یہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کو اپنا بنا لیا اور اپنے ان عزیزوں سے بیگانہ ہو گئے جو اس سے اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے تھے۔ یاد رکھو! صرف اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔

سُوْرَةُ الْحَشْرِ ۵۹ مدنیۃ ۱۰۱ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰیَاتُھَا ۲۴ رُکُوْعَاتُھَا ۳

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

**اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔**

**اللہ کا پاک ہونا بیان کیا ہر چیز نے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ①**

اس سورت کا نام ''الحشر'' اس کی دوسری آیت میں مذکور لفظ "لِاَوَّلِ الْحَشْرِ" کی وجہ سے ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال ہوا کہ سورۂ حشر کس کے بارے میں نازل ہوئی، تو انھوں نے فرمایا: « نَزَلَتْ فِيْ بَنِي النَّضِيْرِ » [ بخاري، التفسیر، سورة الحشر : ٤٨٨٢ ] ''یہ سورت (مشہور یہودی قبیلے) بنو نضیر کے بارے میں اتری۔'' صحیح بخاری ہی میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس (اسے) سورۂ حشر کہا تو انھوں نے فرمایا: ''(اسے) سورۂ نضیر کہو۔'' [ بخاري، التفسیر، سورة الحشر : ٤٨٨٣ ] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بات یا تو اس لیے فرمائی کہ کوئی شخص لفظ حشر سے یہاں قیامت مراد نہ لے لے، بلکہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اس میں مرکزی مضمون بنو نضیر کا معاملہ ہے، یا پھر انھوں نے یہ بتانے کے لیے یہ بات کہی کہ اس سورت کا نام سورۂ حشر کے علاوہ سورۂ نضیر بھی ہے۔

**آیت 1** سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ...... : اس آیت کی تفسیر سورۂ حدید کی پہلی آیت اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۴۴) میں گزر چکی ہے، یہاں صرف چند باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس مقام سے متعلق ہیں: ① سورۂ حدید میں "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" ہے، جب کہ یہاں "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ" ہے۔ ابن عاشور رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ یہ فرمائی ہے کہ سورۂ حدید کی ابتدا میں زمین و آسمان کی ہر چیز کے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے کو بطور دلیل بیان کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور ان صفات کے ثبوت کے لیے جو بعد کی آیات میں بیان ہوئی ہیں۔ چونکہ وہ سب کچھ جو زمین و آسمان میں پایا جاتا ہے مجموعی طور پر اس کی دلیل ہے، اس لیے "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" میں اسے اکٹھا کر دیا ہے۔ جب کہ سورۂ حشر کی ابتدا میں اللہ کی تسبیح کا ذکر مسلمانوں پر اس احسان کی یاد دلانے کے لیے ہے جو زمین پر پیش آنے والے ایک واقعہ کی صورت میں ہوا اور وہ ہے بنو نضیر کی جلا وطنی اور مسلمانوں کا ان کی اراضی اور اموال کا مالک بن جانا۔ اس لیے اس میں زمین والوں کو خاص طور پر الگ ذکر کرنے کے لیے "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" فرمایا۔ یہی معاملہ سورۂ صف، سورۂ جمعہ اور سورۂ تغابن کا ہے، ان سب میں "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" کے بجائے "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" کہا گیا ہے، کیونکہ ان کے بعد مذکور چیزوں کا تعلق خاص طور پر زمین والوں کے ساتھ ہے۔

② بنو نضیر کے واقعہ کے ذکر سے پہلے "سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ" لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس جیسے طاقتور

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؔ مَا

وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا پہلے اکٹھ ہی میں ان کے گھروں سے نکال

قبیلے کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ مسلمانوں کی طاقت کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ تھا، جو ہر عیب اور عجز سے پاک ہے۔ یہ کام جو مسلمانوں کی تعداد اور قوت کے لحاظ سے ممکن ہی نہ تھا، اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل معمولی ہے، کیونکہ وہ سبحان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات ''الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' لانے میں بھی یہی حکمت ہے کہ جب وہ کسی کو غالب کرنا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور اس واقعہ میں بھی اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں مسلمانوں کے لیے سبق بھی ہے کہ جب آسمانوں کی ہر چیز اور زمین کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے تو تمھیں بھی اس کی بے شمار نعمتوں پر، جن میں بنونضیر کی جلاوطنی کی نعمت بھی ہے اس کی تسبیح کرنی چاہیے۔

**آیت 2** ❶ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ : ''هُوَ'' مبتدا کے بعد ''الَّذِيْٓ'' خبر معرفہ لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جس کی تسبیح ہر وہ چیز کرتی ہے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز بھی جو زمین میں ہے اور جو اکیلا ہی عزیز و حکیم ہے، اسی نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا جنھوں نے کفر کیا، اس کے سوا انھیں نکالنے والا اور کوئی نہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ مسلمان جنگ کے بغیر ان کے جلاوطن ہو جانے کو اپنی بہادری نہ سمجھیں، بلکہ اللہ کا انعام سمجھ کر اس کی تسبیح و تحمید کریں اور اسی کا شکر بجا لائیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' کے متعلق فرمایا کہ اس سے مراد بنونضیر کے یہود ہیں۔ یہ بات ابن عباس، مجاہد، زہری اور بہت سے لوگوں نے کہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ان سے صلح کر لی اور معاہدہ کیا کہ نہ آپ ان سے لڑیں گے اور نہ وہ آپ سے لڑیں گے، مگر انھوں نے آپ کے ساتھ کیے ہوئے اس عہد کو توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا وہ عذاب نازل فرمایا جو ہٹایا نہیں جا سکتا اور ان پر اپنا وہ فیصلہ جاری فرمایا جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے انھیں جلاوطن کر دیا اور انھیں ان کے ان مضبوط و محفوظ قلعوں سے نکال باہر کیا جن کے حاصل ہونے کا مسلمانوں کو کبھی طمع تک پیدا نہ ہوا تھا اور جن کے متعلق یہود یہ سمجھتے تھے کہ وہ انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا لینے والے ہیں، مگر وہ ان کے کسی کام نہ آئے اور اللہ کی طرف سے ان پر ایسی گرفت آئی جو ان کے وہم و گمان میں نہ تھی۔

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات مذکور ہیں جن میں ان کے عہد توڑنے کے متعدد واقعات کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو سنن ابو داؤد میں مروی ہے، عبد الرحمن بن کعب بن مالک نے نبی ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی سے بیان کیا: ''رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تھے، ابھی بدر کا معرکہ نہیں ہوا تھا کہ کفار قریش نے عبداللہ بن ابی کی طرف اور اوس و خزرج میں سے اس کے بت پرست ساتھیوں کی طرف خط لکھا کہ تم نے ہمارے ساتھی کو جگہ دے رکھی ہے، ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ہر حال میں اس سے لڑو گے یا اسے نکال دو گے یا ہم سب اکٹھے ہو کر تم پر حملہ آور ہوں گے،

ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ

باہر کیا تم نے گمان نہ کیا تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور انھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ ان کے قلعے انھیں اللہ سے بچانے

تمھارے لڑنے والوں کو قتل کریں گے اور تمھاری عورتیں لوٹ کر لے جائیں گے۔ جب یہ خط عبد اللہ بن اُبی اور اس کے بت پرست ساتھیوں کے پاس پہنچا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے جمع ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ان سے ملے اور فرمایا: « لَقَدْ بَلَغَ وَعِيْدُ قُرَيْشٍ مِّنْكُمُ الْمَبَالِغَ مَا كَانَتْ تَكِيْدُكُمْ بِأَكْثَرَ مِمَّا تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَكِيْدُوْا بِهِ أَنْفُسَكُمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تُقَاتِلُوْا أَبْنَاءَ كُمْ وَ إِخْوَانَكُمْ » ”قریش کی دھمکی تم پر بہت گہرا اثر کر گئی ہے، وہ تمھارے نقصان کی اس سے زیادہ کوئی تدبیر نہیں کر سکتے تھے جتنی تم خود اپنے خلاف کر رہے ہو کہ تم اپنے ہی بیٹوں اور بھائیوں سے جنگ کرنا چاہتے ہو۔“ جب انھوں نے نبی ﷺ سے یہ بات سنی تو وہ منتشر ہو گئے۔ کفارِ قریش کو بھی یہ خبر پہنچ گئی، چنانچہ انھوں نے بدر کے واقعہ کے بعد یہود کو خط لکھا کہ تم اسلحے اور قلعوں والے لوگ ہو، تمھیں ہر حال میں ہمارے ساتھی سے لڑنا ہوگا، یا ہم یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے اور ہمارے درمیان اور تمھاری عورتوں کی پازیبوں کے درمیان کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکے گی۔ جب یہ خط بنو نضیر کو پہنچا تو انھوں نے عہد توڑنے پر اتفاق کر لیا اور رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ اپنے ساتھیوں میں سے تیس آدمیوں کے ساتھ ہماری طرف آئیں، ہم میں سے بھی تیس علماء آپ کی طرف آئیں گے اور ہم ایک درمیانی جگہ میں ملیں گے۔ وہ آپ کی بات سنیں گے، اگر انھوں نے آپ کی تصدیق کر دی اور آپ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ صحابی نے ان کا واقعہ بیان کیا کہ جب اگلا دن ہوا تو نبی ﷺ نے لشکروں کو لے جا کر ان کا محاصرہ کر لیا اور انھیں فرمایا: « إِنَّكُمْ وَاللّٰهِ ! لَا تَأْمَنُوْنَ عِنْدِيْ إِلَّا بِعَهْدٍ تُعَاهِدُوْنِيْ عَلَيْهِ » ”اللہ کی قسم! تمھیں میرے ہاں امن نہیں ہوگا جب تک تم نئے سرے سے میرے ساتھ کوئی عہد نہیں کرو گے۔“ انھوں نے آپ کو کسی قسم کا عہد و پیماں دینے سے انکار کر دیا، تو آپ ﷺ نے اس دن ان سے جنگ جاری رکھی، پھر اگلے دن لشکروں کو لے کر بنی قریظہ کی طرف گئے اور بنو نضیر کو چھوڑ دیا اور انھیں بھی معاہدہ کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے آپ ﷺ سے معاہدہ کر لیا۔ آپ انھیں چھوڑ کر واپس آ گئے اور لشکر لے کر بنو نضیر کے پاس پہنچ گئے اور ان سے جنگ جاری رکھی، حتیٰ کہ وہ جلا وطنی کی شرط پر قلعوں سے اتر آئے۔ چنانچہ بنو نضیر جلا وطن ہو گئے اور اپنے ساز و سامان، گھروں کے دروازوں اور ان کی لکڑیوں میں سے جو اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے تھے لے گئے۔ بنو نضیر کے کھجوروں کے درخت صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھے، وہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائے تھے اور صرف آپ کے لیے مخصوص فرمائے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَاۤ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ ﴾ [ الحشر : ٦ ] ”اور جو (مال) اللہ نے ان سے اپنے رسول پر لوٹایا تو تم نے اس پر نہ کوئی گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ۔“ یعنی وہ لڑائی کے بغیر حاصل ہوئے۔ تو نبی ﷺ نے ان کا زیادہ تر حصہ مہاجرین کو دے دیا اور اسے ان کے درمیان تقسیم کر دیا اور ان میں سے کچھ حصہ دو انصاریوں کو بھی دیا جو ضرورت مند تھے۔

حَيۡثُ لَمۡ يَحۡتَسِبُوۡا ۚ وَ قَذَفَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ يُخۡرِبُوۡنَ بُيُوۡتَهُمۡ بِاَيۡدِيۡهِمۡ

والے ہیں۔ تو اللہ ان کے پاس آیا جہاں سے انھوں نے گمان نہیں کیا تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال

ان دو کے سوا انصار میں سے کسی کو اس میں سے نہیں دیا اور اس میں سے رسول اللہ ﷺ کا صدقہ باقی رہ گیا جو بنو فاطمہ کے پاس رہا۔" [ أبو داوٗد، الخراج والفيء والإمارة، باب في خبر النضير : ۳۰۰٤، قال الألباني صحيح الإسناد ] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو نضیر نے نہ صرف عہد توڑ دیا تھا بلکہ معاہدے کی تجدید سے بھی صاف انکار کر دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے عہد توڑنے کی وجہ سے ان کا محاصرہ کیا اور آخر کار انھیں جلا وطن کر دیا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرمایا: "اصحاب سیر و مغازی نے غزوۂ بنو نضیر کا قصہ اور اس کا سبب جو بیان کیا ہے وہ اختصار کے ساتھ اس طرح ہے کہ جب بئر معونہ پر رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو شہید کر دیا گیا، جن کی تعداد ستر (۷۰) تھی، تو ان میں سے ایک عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ بچ کر بھاگ نکلے، مدینہ کی طرف واپس آتے ہوئے انھوں نے موقع پا کر قبیلہ بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا (اور یہ سمجھے کہ وہ بئر معونہ کے شہداء کا کچھ بدلا لے رہے ہیں)، حالانکہ یہ قبیلہ نبی ﷺ سے معاہدہ کر چکا تھا اور آپ نے انھیں امن و امان دے رکھا تھا، لیکن اس کی خبر عمرو رضی اللہ عنہ کو نہیں تھی۔ جب وہ مدینہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم نے انھیں قتل کر ڈالا، اب میں ہر صورت ان کی دیت دوں گا۔" بنو نضیر اور بنو عامر میں بھی حلف و عقد اور آپس میں مصالحت تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ ان کی طرف چلے تاکہ کچھ وہ دیں اور کچھ آپ ﷺ دیں اور بنو عامر کو راضی کر لیا جائے۔ قبیلہ بنو نضیر کے قلعے مدینہ کے مشرق کی جانب کئی میل کے فاصلے پر تھے، جب آپ ﷺ ان کی دیت کے سلسلے میں تعاون حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچے تو انھوں نے کہا: "ہاں، اے ابو القاسم! جیسے آپ پسند فرمائیں گے، ہم ہر طرح سے آپ کی مدد کریں گے۔" ادھر آپ سے ہٹ کر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے بہتر موقع کب ہاتھ لگے گا، اس وقت آپ (ﷺ) قبضے میں ہیں، آؤ کام تمام کر ڈالو۔ چنانچہ یہ مشورہ ہوا کہ جس دیوار سے آپ لگے بیٹھے ہیں اس گھر پر کوئی چڑھ جائے اور وہاں سے بڑا سا پتھر آپ پر پھینک دے اور ہماری جان ان سے چھڑا دے۔ عمرو بن جحاش بن کعب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور چھت پر چڑھ گیا۔ چاہتا تھا کہ پتھر لڑھکا دے، اتنے میں اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو نبی ﷺ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ آپ ﷺ یہاں سے اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ فوراً اٹھ گئے، آپ کے ساتھ اس وقت آپ کے صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی، جن میں ابوبکر و عمر اور علی رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ آپ ﷺ وہاں سے فوراً مدینہ کی طرف چل پڑے۔ ادھر جو صحابہ آپ کے ساتھ نہیں تھے اور مدینہ میں آپ کے منتظر تھے، وہ آپ کے دیر کر دینے کی وجہ سے آپ ﷺ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس دوران انھیں مدینہ سے آنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ آپ ﷺ مدینہ پہنچ گئے ہیں، چنانچہ وہ صحابہ واپس پلٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ ﷺ نے انھیں اپنے ساتھ یہود کے غدر کی بات بتائی اور ان کے ساتھ جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا اور صحابہ کو لے کر ان کی طرف چل پڑے۔ یہود لشکروں کو دیکھ کر اپنے قلعوں میں قلعہ بند ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا، پھر حکم دیا کہ ان کے کھجور کے

وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۲

دیا، وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں کے ساتھ برباد کر رہے تھے، پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو!۲

درخت جو آس پاس ہیں، وہ کاٹ دیے جائیں۔ اب تو یہود چیخنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ تو زمین میں فساد کرنے سے اوروں کو روکتے تھے اور فسادیوں کو برا کہتے تھے، پھر یہ کیا ہونے لگا؟ پس ادھر تو درخت کٹنے کا غم اور ادھر جو کمک آنے والی تھی اس کی طرف سے مایوسی، ان دونوں چیزوں نے ان یہودیوں کی کمر توڑ دی۔'' (ابن کثیر)

② لِاَوَّلِ الْحَشْرِ : "الْحَشْرِ" کا معنی ''اکٹھا کرنا'' ہے۔ "أَوَّلُ" صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہے۔ گویا اصل میں " لِلْحَشْرِ الْأَوَّلِ" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کو پہلے ہی اکٹھ پر ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ یا "أَوَّلُ" کا لفظ "الْحَشْرِ" کی طرف مضاف حقیقی ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اکٹھ کے اول (شروع) ہی میں نکال باہر کیا، لڑنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ خود ہی جلا وطنی پر آمادہ ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''در اول جمع کردن لشکر۔'' اور شاہ عبدالقادر نے ترجمہ کیا ہے: ''پہلے ہی بھیڑ (ٹکراؤ) ہوتے۔''

③ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا : بنونضیر مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر آباد تھے، یہ لوگ صنعت و حرفت اور تجارت کے علاوہ سود خوری کی وجہ سے بہت مال دار تھے، ان کے پاس ہر قسم کا سامانِ حرب موجود تھا اور انھوں نے نہایت مستحکم قلعے بنا رکھے تھے۔ تعداد میں بھی وہ مسلمانوں سے کم نہ تھے، بنوقریظہ اور خیبر کے یہودی ان کی پشت پر تھے اور انھیں عبد اللہ بن اُبی اور منافقین کی اشیر باد بھی حاصل تھی کہ ہم لڑائی میں ہر طرح سے تمھاری مدد کریں گے۔ اس لیے مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مڈبھیڑ ہوتے ہی لڑائی کے بغیر نکل جائیں گے۔

④ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ : "ظَنٌّ" کا معنی گمان بھی ہے اور یقین بھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۴۶): ﴿ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ ﴾ میں ہے۔ یعنی یہود کو گمان بلکہ یقین تھا کہ وہ اتنے محفوظ ہیں کہ ان کے قلعے انھیں اللہ سے بھی بچا لینے والے ہیں۔

⑤ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا : "حَسِبَ يَحْسِبُ" گمان کرنا۔ "اِحْتَسَبَ" میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے مبالغہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان کے پاس وہاں سے آیا جہاں سے انھیں ادنیٰ گمان بھی نہ تھا۔

⑥ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ : "قَذَفَ" کا معنی پتھر وغیرہ پھینکنا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دفعتاً اچانک شدت کے ساتھ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ اس میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں سے ان کے پاس آیا، یعنی وہ اپنے قلعے، ان کی دیواریں، دروازے اور چھتیں مضبوط کرتے رہے اور گلی کوچوں سے داخل ہونے کے راستے بند کرتے رہے، مگر اللہ تعالیٰ نے براہِ راست ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب یعنی شدید خوف ڈال دیا۔ جب دل ہی قائم نہ رہا تو ان کے قلعے انھیں کیا

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ؕ وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ان پر جلاوطن ہونا لکھ دیا تھا تو یقیناً وہ انھیں دنیا میں سزا دیتا اور ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب ہے ③

بچاتے؟ جتنے حمایتی تھے سب انھی کی طرح شدید خوف زدہ ہو کر انھیں چھوڑ گئے۔ چنانچہ انھوں نے خود ہی اس شرط پر اتر آنے کی درخواست کی کہ ہمیں جان و مال کی امان دی جائے، ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسلحہ کے سوا جو چیز بھی وہ لے جا سکیں ساتھ لے جانے کی اجازت دی اور انھیں جلا وطن کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا آباد ہوئے اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔ دشمن کے دل میں رعب ڈال دینا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مدد ہے اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی اس کے ساتھ جتنی مدد کی گئی اتنی کسی اور پیغمبر کی نہیں کی گئی۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ )) [ بخاري، التيمم، باب : ۳۳۵ ] ”مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں (وہ یہ کہ) ایک مہینے کے فاصلے سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔“ آگے باقی چار چیزیں بیان فرمائیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں میں ان کے شرک کرنے کی وجہ سے رعب ڈالنے کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کا بھی وعدہ فرمایا ہے، دیکھیے سورۂ آلِ عمران (۱۵۰، ۱۵۱)۔

⑦ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ : جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب جانا ہی جانا ہے تو انھوں نے اندر ہی اندر اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو گرانا شروع کر دیا۔ اس کا باعث ایک تو مسلمانوں پر حسد تھا کہ وہ ان کے کام نہ آسکیں اور دوسرا یہ کہ ان کے دروازے، کھڑکیاں، شہتیر اور بالے وغیرہ ساتھ لے جا سکیں۔

⑧ وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ : وہ لوگ محاصرے کے اندر اپنے مکان گرا رہے تھے اور مسلمان باہر سے ان کی فصلیں، دیواریں اور مکان گرا رہے تھے، تاکہ اندر داخلے کا راستہ کھلا ہو جائے اور لڑائی ہو تو وسیع میدان میسر ہو سکے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جتنی چیزیں لے جا سکتے تھے نکال کر لے جا رہے تھے اور مسلمان ان کے گرائے ہوئے گھروں سے باقی سامان نکالنے کے لیے انھیں مزید تہ و بالا کر رہے تھے۔

⑨ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ : تو اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو کہ کفر و سرکشی اور بدعہدی کا انجام کیا ہوتا ہے، کیونکہ سعادت مند وہی ہے جو دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کر لے۔ ابن جزی نے اپنی تفسیر ”اَلتَّسْهِيْلُ لِعُلُوْمِ التَّنْزِيْلِ“ میں فرمایا: ”جو لوگ فقہ میں قیاس کو ثابت کرتے ہیں انھوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، حالانکہ ان کا اس آیت سے استدلال ضعیف ہے اور آیت کے مفہوم سے خارج ہے۔“

آیت 3 ① وَ لَوْ لَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ...... : ”جَلَا يَجْلُوْ جَلَاءً“ (ن) ”اَلرَّجُلَ“ آدمی کو اس کے شہر

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرے تو بلاشبہ اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے ④ جو بھی کھجور کا درخت تم نے کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑا تو وہ اللہ کی اجازت سے تھا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے ⑤

سے نکال دینا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ان کے متعلق پہلے سے فیصلہ انھیں جلاوطن کرنے پر اکتفا کا تھا، تاکہ انھیں عبرت ہو اور وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ اگر اس نے پہلے یہ نہ لکھا ہوتا تو انھیں دنیا ہی میں عذاب دیتا، ان کے مرد قتل کیے جاتے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی اور غلام بنا لیا جاتا، جیسے بعد میں بنو قریظہ کو عبرت حاصل نہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۰۳۲) یہاں ایک سوال ہے کہ جلا وطنی بھی تو عذاب ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ عذاب سے مراد جسمانی سزا ہے، جس کا احساس واضح اور شدید ہوتا ہے۔

② وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ : یعنی اگر وہ جلا وطنی کی وجہ سے دنیا کے عذاب، قتل، اسیری اور غلامی سے بچ گئے تو بے فکر نہ ہوں، اگر وہ اسی طرح کفر پر قائم رہے تو ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب تیار ہے۔

**آیت 4** ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۱۳) کی تفسیر۔ یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں "وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ" کے بعد "وَرَسُوْلَهُ" کو حذف کر دیا ہے، اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ رسول کی مخالفت اللہ تعالیٰ ہی کی مخالفت ہے۔

**آیت 5** ① مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ...... : "لِّيْنَةٍ" کے متعلق تین قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ ابن جریر نے اسے ترجیح دی ہے۔ دوسرا قول یہ کہ "لِّيْنَةٍ" برنی اور عجوہ کے سوا کھجور کا درخت ہے اور تیسرا قول یہ کہ ہر درخت کو "لِّيْنَةٍ" کہا جاتا ہے، کیونکہ جب تک وہ زندہ ہے اس میں "لَيُوْنَةٌ" (نرمی) پائی جاتی ہے۔ (شنقیطی) بنو نضیر کی بستیوں کے ساتھ ان کا ایک نہایت خوب صورت باغ تھا جسے "بُوَیرہ" کہتے تھے، اس میں کھجوروں کے بہت سے درخت تھے۔ (یہ آج کل بھی بُوَیرہ کے نام سے معروف ہے جو مسجد قبا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ شنقیطی) رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا تو بعض ضرورتوں اور حکمتوں کے پیشِ نظر بعض درختوں کو کاٹنے کا اور بعض کو جلانے کا حکم دیا اور بعض اسی طرح رہنے دیے، جیسا کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: « حَرَّقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَخْلَ بَنِي النَّضِيْرِ وَقَطَعَ وَهِيَ الْبُوَيْرَةُ فَنَزَلَتْ : ﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ » [ بخاري، المغازي، باب حديث بني النضير...... : ٤٠٣١ ] "رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کے کھجوروں کے درخت جلوا دیے اور کٹوا دیے۔ یہی بُوَیرہ جگہ ہے (جس کا حسان رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا) تو یہ آیت اتری: ﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا

قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [ الحشر : ۵ ] ''جو بھی کھجور کا درخت تم نے کاٹا یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑا تو وہ اللہ کی اجازت سے تھا۔''

درختوں کے کاٹنے اور جلانے پر یہود اور منافقین نے شور مچایا کہ محمد (ﷺ) درختوں کو کاٹ کر ''فساد فی الارض'' کا ارتکاب کر رہے ہیں، جب کہ ان کا دعویٰ اصلاح کا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دلائی کہ تم نے جو بھی درخت کاٹا یا اسے اس کی جڑوں پر قائم رہنے دیا تو یہ سب کچھ اللہ کے اِذن سے تھا، یعنی اگرچہ جنگ کے موقع پر عام حکم یہی ہے کہ درخت اور کھیت جلانے اور کاٹنے سے اجتناب کیا جائے، مگر اس موقع پر جو درخت جلائے گئے یا کاٹے گئے یا باقی رہنے دیے گئے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے ہوا، اس لیے مخالفین کی باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

❷ وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ : ''الْفٰسِقِيْنَ'' میں بنونضیر کے علاوہ انھیں عہد توڑنے اور لڑائی کے لیے ابھارنے والے یہودی، مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین سبھی شامل ہیں۔ یعنی کھجوروں کے درخت کاٹنے، جلانے یا باقی رکھنے کا عمل دوسری بہت سی مصلحتوں کے علاوہ اس لیے بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ فاسقوں کو ذلیل کرے۔ کاٹنے اور جلانے میں ان کی تذلیل تو ظاہر ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی زندگی بھر کی کمائی کو جلایا اور کاٹا گیا مگر وہ کاٹنے اور جلانے والوں کا ہاتھ نہ روک سکے۔ اس میں بنونضیر، دوسرے یہودیوں، منافقینِ مدینہ اور مشرکینِ مکہ سب کی تذلیل تھی کہ انھوں نے یہ سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا اور اُف تک نہ کر سکے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے شاعر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مشرکینِ مکہ پر طنز و تشنیع کے تیر برساتے ہوئے کہا ؎

وَهَانَ عَلٰى سَرَاةِ بَنِيْ لُؤَيٍّ حَرِيْقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيْرُ

''بنولؤی (قریش) کے سرداروں نے وہ آگ آسانی سے برداشت کر لی جو بُویرہ کے مقام پر پھیل رہی تھی (یعنی انھیں اس پر کوئی غصہ آیا نہ غیرت اور نہ ہی وہ حسبِ وعدہ بنونضیر کی مدد کو پہنچے)۔'' [ بخاري، المغازي، باب حديث بني النضير ...... : ۴۰۳۲ ] اور جو درخت باقی رہے ان میں ان سب کی تذلیل یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے قبضے سے چھڑا سکیں۔

❸ ''وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ'' (اور تاکہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے) میں حرفِ عطف واؤ سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کچھ عبارت محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ اِذن اس لیے دیا تاکہ بنونضیر کے محاصرے کے لیے راستہ صاف ہو جائے، ان کے لیے کوئی چھپاؤ باقی نہ رہے، محاصرے میں سختی پیدا کی جائے، انھیں قلعوں سے نکل کر میدان میں آ کر لڑنے پر اُبھارا جائے اور تاکہ مسلمانوں کو عزت عطا فرمائے اور تاکہ نافرمانوں کو ذلیل کرے۔

❹ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر جنگی ضرورت کا تقاضا ہو تو درختوں اور کھیتوں کو کاٹا، جلایا اور عمارتوں کو گرایا جا سکتا ہے، بلاضرورت یہ کام جائز نہیں۔

وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۶﴾

اور جو (مال) اللہ نے ان سے اپنے رسول پر لوٹایا تو تم نے اس پر نہ کوئی گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ اور لیکن اللہ اپنے رسولوں کو مسلّط کر دیتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ⑥

⑤ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے علاوہ اور احکام بھی دیے گئے، کیونکہ یہاں جس کے متعلق فرمایا کہ ''وہ اللہ کے اذن سے تھا'' وہ ''اِذن'' قرآن میں نہیں بلکہ وحی خفی کے ذریعے سے دیا گیا ہے، جسے حدیث کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وحیِ الٰہی صرف قرآن تک محدود نہیں۔

**آیت 6** ① **وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ ......** : ''فَاءَ يَفِيْءُ فَيْئًا'' (ض) لوٹنا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [ الحجرات : ۹ ] ''یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔'' ''أَفَاءَ يُفِيْءُ'' (افعال) لوٹانا۔ ''فے'' ان اموال کو کہا جاتا ہے جو جنگ کے بغیر دشمن سے حاصل ہوں اور جو اموال جنگ کے ساتھ حاصل ہوں انھیں غنیمت کہا جاتا ہے (بعض اوقات غنیمت پر بھی فے کا لفظ بول دیا جاتا ہے)۔ ان اموال کو ''فے'' اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام اموال حقیقت میں مسلمانوں کی ملکیت ہیں اور ان پر کفار کا قبضہ ناجائز ہے، جب مسلمان انھیں حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنے اموال واپس لیتے ہیں۔ ''**اَوْجَفْتُمْ**'' ''وَجَفَ يَجِفُ وَجْفًا وَ وَجِيْفًا'' (ض) ''اَلْفَرَسُ'' گھوڑے کا دوڑنا۔ ''أَوْجَفَ يُوْجِفُ إِيْجَافًا'' دوڑانا۔ ''**خَيْلٍ**'' گھوڑوں کی جماعت۔ ''**رِكَابٍ**'' سواری کے اونٹوں کے لیے اسم جمع ہے۔

② ''**وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ**'' اس جملے کا عطف ''**مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ ......**'' پر ہے اور مقصد غزوۂ بنی نضیر میں مسلمانوں کو عطا ہونے والی نعمتوں میں سے ایک اور نعمت کا بیان ہے۔

③ بنونضیر اپنی جلا وطنی کے ساتھ جو مکان، باغات اور زمینیں چھوڑ گئے ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے جو اموال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واپس لوٹائے ہیں ان پر تمھارا کوئی حق نہیں، کیونکہ تم نے انھیں گھوڑے یا اونٹ دوڑا کر یعنی جنگ کر کے حاصل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل کے ساتھ کسی قابل ذکر لڑائی کے بغیر وہ سب اپنے رسول کو عطا فرما دیے ہیں۔ یاد رہے کہ بنونضیر کی بستیاں مدینہ سے صرف دو میل کے فاصلے پر تھیں اور مسلمانوں نے پیدل جا کر ہی ان کا محاصرہ کر لیا تھا، صرف رسول اللہ ﷺ سوار ہو کر گئے اور انھوں نے اس رعب کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ڈالا، جنگ کیے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو نبی ﷺ کے فیصلے کے حوالے کر دیا۔

④ **وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ......** : یعنی بنونضیر کے اموال پر قبضہ تمھارے گھوڑے یا اونٹ دوڑانے کے نتیجے میں نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اپنے دشمنوں میں سے جن پر چاہتا ہے مسلّط کر دیتا ہے، وہ اس کے ڈالے ہوئے رُعب کی وجہ سے لڑائی کے بغیر ہی اپنے آپ کو حوالے کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔

⑤ یہ پہلے اموال تھے جو جنگ کے بغیر محض محاصرے کے نتیجے میں حاصل ہوئے۔ انھیں اصطلاح میں ''فے'' کہا جاتا

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى

جو کچھ بھی اللہ نے ان بستیوں والوں سے اپنے رسول پر لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار

ہے۔ اس سے پہلے بدر میں لڑائی کے نتیجے میں جو اموال حاصل ہوئے انھیں ''غنیمت'' کہا جاتا ہے۔ ان کی تقسیم کا قاعدہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال میں بیان فرمادیا: ﴿وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ﴾ [ الأنفال : ٤١ ] ''اور جان لو کہ تم جو کچھ بھی غنیمت حاصل کرو تو بے شک اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے۔'' یعنی اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول، ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل کے لیے ہوگا اور باقی چار حصے لڑنے والوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ رہے اموالِ فے جو بنونضیر سے حاصل ہوئے، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان پر تمھارا کوئی حق نہیں، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو عطا فرمائے ہیں۔ یہی معاملہ ان تمام بستیوں کا ہے جو بعد میں جنگ کے بغیر حاصل ہوئیں، مثلاً بنوقریظہ کی بستیاں اور خیبر کے وہ علاقے جو جنگ کے بغیر فتح ہوئے، مثلاً فدک وغیرہ، ان سب کو مکمل طور پر رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا گیا کہ آپ جس کو جتنا چاہیں دے دیں یا اپنے پاس رکھیں۔ البتہ مستحقین کی چند اقسام متعین کر دی گئیں کہ مال کی تقسیم انھی میں رہنی چاہیے۔ ان مستحقین کا بیان اگلی آیت میں فرمایا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: « كَانَتْ أَمْوَالُ بَنِي النَّضِيْرِ مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا لَمْ يُوْجِفِ الْمُسْلِمُوْنَ عَلَيْهِ بِخَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ، فَكَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاصَّةً، يُنْفِقُ عَلٰى أَهْلِهٖ مِنْهَا نَفَقَةَ سَنَتِهٖ، ثُمَّ يَجْعَلُ مَا بَقِيَ فِي السِّلَاحِ وَالْكُرَاعِ، عُدَّةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ » [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ ما أفاء الله على رسوله﴾ : ٤٨٨٥ ] ''بنونضیر کے اموال اُن اموال میں سے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بطور فے عطا فرمائے تھے، جن پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے تھے اور نہ اونٹ، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھے۔ آپ ان میں سے اپنے گھر والوں کو ایک سال کا خرچ دیتے، پھر جو باقی ہوتا اسے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لیے اسلحے اور گھوڑوں میں صَرف کر دیتے تھے۔''

آیت 7 ① مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى : "الْقُرٰى" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ''ان بستیوں'' کیا گیا ہے۔

② فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى ...... : اس آیت میں ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو اموال بھی جنگی کارروائیوں کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں وہ بیت المال کی ملکیت تصوّر ہوں گے، ان میں سے مجاہدین کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ یہ ان کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس اجتماعی قوت کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ، اس کی امت اور اس کے قائم کردہ نظام کو عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ اموال اموالِ غنیمت سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، انھیں اموالِ فے کہا جاتا ہے اور ان کا اطلاق منقولہ اور غیر منقولہ دونوں قسم کے اموال پر ہوگا۔ اموالِ فے میں جزیہ و خراج کی آمدنی بھی شامل ہے جو ایک اسلامی

وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ

اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے، تاکہ وہ تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو

ریاست کو غیر مسلموں سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کی تقسیم کا مکمل اختیار رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا گیا اور آپ کے بعد یہ اختیار مسلمانوں کے امیر کو حاصل ہوتا ہے، جسے وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ مدات میں خرچ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اموالِ فے کی وہ مدات بھی بیان فرما دیں جہاں انھیں خرچ کیا جائے گا۔ یہ وہی مدات ہیں جن میں اموالِ غنیمت کا خمس خرچ کیا جاتا ہے، اموالِ فے کا خمس نہیں بلکہ وہ پورے کے پورے انھی میں خرچ کیے جائیں گے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۴۱) کی تفسیر۔

③ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ : "دُوْلَةً" "دَالَ يَدُوْلُ دَوْلَةً" (ن) "اَلزَّمَانُ" زمانے کا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ [ آل عمران : ۱٤٠ ] "اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔" "دُوْلَةً" وہ چیز جو ایک دوسرے سے لی جائے، کبھی اس کے پاس ہو کبھی اس کے پاس۔

"تاکہ مالِ فے تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو" ربطِ مضمون کے لحاظ سے تو اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اموالِ فے کو مجاہدین پر تقسیم نہ کیا جائے، جن کے اکثر پہلے ہی غنی ہو چکے ہیں، محتاج اور مسکین نہیں رہے، بلکہ انھیں نادار لوگوں تک پہنچایا جائے، تاہم اس میں اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد بھی بیان کر دی گئی ہے کہ مسلمانوں میں دولت کا بہاؤ فقراء سے اغنیاء کی طرف نہیں ہوتا کہ دولت مند زیادہ سے زیادہ دولت مند اور غریب زیادہ سے زیادہ غریب ہوتے چلے جائیں، بلکہ دولت کا بہاؤ اغنیاء سے فقراء کی طرف ہوتا ہے اور اس سے پورے معاشرے کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دے دیا۔ دولت کی تقسیم کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی، اموالِ غنیمت میں سے خمس نکالنے کا حکم دیا گیا، مال فے سارا ہی پانچ مدات میں تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا، نفلی صدقات کی بار بار تلقین کی گئی، بہت سی فروگزاشتوں پر کفارے رکھے گئے اور میراث کا ایسا قانون بنا دیا کہ ہر مرنے والے کی دولت یکجا رہنے کے بجائے پھیل جائے۔ بخل کی شدید مذمت کی گئی اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بار بار تاکید کی گئی اور اس کی فضیلت بیان کی گئی۔ ان احکام پر عمل کیا جائے تو دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو ہی نہیں سکتی۔

④ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا : سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اموالِ فے میں سے رسول تمھیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے روک دے اس سے رک جاؤ۔ آپ کے فیصلے کو کسی چون و چرا اور ملال کے بغیر تسلیم کر لو۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ یہ تھا کہ بنونضیر کے اموال مہاجرین ہی میں تقسیم کر دیے جائیں، تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں، تو گویا انصار سے کہا جا رہا ہے کہ اگر رسول کسی موقع پر تمھیں نہ دے تو مطالبہ نہ کرو، یہ

الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے ۝

رسول کی صواب دید پر ہے کہ وہ تمام مستحقین کو دے یا بعض کو زیادہ مستحق سمجھ کر دے اور دوسروں کو نہ دے۔ سیاق کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے یہ صرف اموال کی تقسیم تک محدود نہیں بلکہ اس میں حکم دیا گیا ہے کہ ہر معاملے میں آپ ﷺ کی اطاعت کرو۔ اس کی وضاحت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: " مَا أٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا مَنَعَكُمْ فَلَا تَأْخُذُوْهُ" کہ رسول تمھیں جو دے وہ لے لو اور جو نہ دے وہ نہ لو، بلکہ فرمایا جس سے روک دے اس سے رک جاؤ، جس سے منع کر دے اس سے باز آ جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا مقصد آپ کے حکم کی اطاعت ہے۔ چنانچہ اس آیت نے آپ ﷺ کے حکم کو مستقل قانون کی حیثیت دے دی ہے اور یہ شرط نہیں رکھی کہ وہی حکم مانو جو قرآن مجید میں ہو، اس لیے آپ ﷺ کا جو حکم بھی صحیح حدیث سے ثابت ہو واجب العمل ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « دَعُوْنِيْ مَا تَرَكْتُكُمْ ، إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِسُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰى أَنْبِيَائِهِمْ ، فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوْهُ ، وَ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ » [ بخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ : ۷۲۸۸ ] "مجھے اس وقت تک رہنے دو جب تک میں تمھیں چھوڑے رکھوں، کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء سے سوال اور ان سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ تو جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے دور رہو اور جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اس میں سے جتنا کر سکتے ہو کرو۔" اور جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے۔ چنانچہ ان کے شاگرد علقمہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انھوں نے فرمایا: « لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُوْتَشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ ، الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ » "اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو جلد میں سوئی کے ساتھ نیل بھر کر نقش و نگار بنانے والی ہیں اور جو بنوانے والی ہیں اور جو چہرے کے بال اکھاڑنے والی ہیں اور جو خوب صورتی کے لیے سامنے کے دانتوں میں فاصلہ بنانے والی ہیں، اللہ کی پیدا کردہ شکل کو بدلنے والی ہیں۔" بنو اسد کی ایک عورت امّ یعقوب کو یہ بات پہنچی تو وہ آئی اور کہنے لگی: "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے فلاں فلاں کام کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے؟" تو انھوں نے فرمایا: "میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے اور جو اللہ کی کتاب میں موجود ہے؟" اس عورت نے کہا: "میں نے دو تختیوں کے درمیان جتنا قرآن ہے سارا پڑھا ہے، مگر مجھے اس میں یہ بات نہیں ملی جو آپ کہہ رہے ہیں۔" عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر تم اسے پڑھتی تو تمھیں ضرور مل جاتی، کیا تم نے یہ نہیں پڑھا: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [ الحشر : ۷ ] "اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۸

(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں ۝۸

اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔'' اس نے کہا: ''کیوں نہیں؟'' فرمایا: ''تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔'' اس نے کہا: ''میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کے گھر والے یہ کام کرتے ہیں۔'' فرمایا: ''جاؤ اور دیکھو'' وہ گئی، دیکھا مگر اسے اپنے مطلب کی کوئی چیز دکھائی نہ دی، تو (ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے) فرمایا: ''اگر وہ (میری بیوی) ایسی ہوتی تو ہمارے ساتھ نہ رہتی۔''
[ بخاري، التفسیر، باب : ﴿وما آتاكم الرسول فخذوه﴾ : ۴۸۸۶ ]

5 وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ : یعنی اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو! اگر تم نے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل نہ کی یا آپ کے منع کردہ سے باز نہ آئے تو اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔

آیت 8 1 لِلْفُقَرَآءِ : یہ پچھلی آیت میں مذکور "وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ" سے بدل ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ان چاروں سے مراد فقراء مہاجرین ہیں اور انصار اور ان کے بعد آنے والے جو ان کے نقش قدم پر چلنے والے، ان سے محبت کرنے والے اور ان کے لیے دعا کرنے والے ہیں۔

2 الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ : یعنی ایک تو وہ فقراء ہیں پھر مہاجر ہیں۔ مراد ان سے وہ لوگ ہیں جو اس وقت مکہ معظمہ اور عرب کے دوسرے علاقوں سے صرف اس جرم میں نکال دیے گئے تھے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ اپنے وطن میں گھر بار اور جائداد وغیرہ سب کچھ رکھتے تھے مگر اب خالی ہاتھ تھے، نہ ان کے پاس رہنے کے لیے گھر تھے نہ ضرورت کے لیے مال۔ بنو نضیر کا علاقہ فتح ہونے سے پہلے ان کی رہائش اور معاش کا کوئی مستقل بندوبست نہ تھا۔ انصار نے انھیں اپنے ساتھ اپنے گھروں میں رکھا ہوا تھا اور انھیں اپنے باغات اور زمینوں کی آمدنی میں بھی شریک کر رکھا تھا۔ اس آیت میں فرمایا کہ یہ لوگ مال فے کے حق دار ہیں، تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کے مشورے سے بنو نضیر کے باغات اور زمینیں فقراء مہاجرین میں تقسیم کر دیں اور ان کے پاس انصار کی جو زمینیں اور باغات تھے وہ انصار کو واپس کر دیے گئے۔ صرف دو انصاریوں کو ان اموال میں سے کچھ نہ کچھ دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مال فے میں صرف اس زمانے کے مہاجرین کا حصہ تھا، بلکہ قیامت تک جو لوگ مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے ملک سے نکال دیے جائیں انھیں جگہ دینا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانا مسلمان ملکوں کا فرض ہے۔ اس کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ اموال فے بھی خرچ کیے جائیں گے۔

3 يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا : یعنی ہجرت سے ان کا مقصد دنیا کی کوئی چیز نہیں، بلکہ انھوں نے محض اللہ کا فضل

وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ

اور (ان کے لیے) جنھوں نے ان سے پہلے اس گھر میں اور ایمان میں جگہ بنالی ہے، وہ ان سے محبت کرتے ہیں جو

یعنی جنت اور اس کی رضا کی تلاش کے لیے ہجرت کی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے وعدہ فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۷۲) کی تفسیر۔

④ وَ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ : اور وہ اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی یعنی ان کے دین کی مدد کرتے ہیں۔

⑤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ : یعنی یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے عمل کے ساتھ اپنے قول میں سچے ہونے کو ثابت کر دیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے صادق ہونے کی شہادت دی ہے، اگلی آیت میں انصار کے بھی "الْمُفْلِحُوْنَ" ہونے کی شہادت دی ہے۔ سورۂ انفال میں دونوں کے متعلق فرمایا: ﴿اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ [ الأنفال : ۷۴ ] ''وہی سچے مومن ہیں۔'' اب اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو ان کے صدق یا ایمان میں شک کرے یا ان کے متعلق زبان درازی کرے!؟

آیت 9 ① وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ : " بَوَّأَ يُبَوِّئُ " (تفعیل) جگہ دینا، ٹھکانا دینا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ﴾ [ یونس : ۹۳ ] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھکانا دیا، باعزت ٹھکانا۔'' " تَبَوَّأَ يَتَبَوَّأُ " کسی جگہ میں ٹھکانا بنانا، مقیم ہونا۔ "الدَّارَ" میں الف لام عہد کا ہے، اس گھر میں جہاں مہاجرین ہجرت کر کے پہنچے۔ ''دارِ ہجرت'' مدینہ منورہ کا لقب ہے، امام مالک رحمہ اللہ کو اسی لیے "إِمَامُ دَارِ الْهِجْرَةِ" کہا جاتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ یعنی اموالِ فے فقراء مہاجرین کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جنھوں نے مہاجرین کے آنے سے پہلے ہی دارِ ہجرت اور ایمان میں جگہ بنالی تھی، یعنی پہلے ہی مدینہ میں رہتے تھے اور ایمان لے آئے تھے۔ ایمان لانے کے لیے یہاں ایمان میں جگہ اور ٹھکانا بنانے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یہ استعارہ ہے جس میں ایمان کو ایک مضبوط پناہ گاہ اور ٹھکانے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جس میں وہ پہلے ہی داخل ہو چکے تھے۔ ان لوگوں سے مراد تمام انصار ہیں جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس وقت ایمان لائے جب کوئی مہاجر مدینہ میں نہیں آیا تھا، یعنی بیعتِ عقبہ اولیٰ والے انصار اور وہ بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ایمان لا چکے تھے جب کچھ مہاجرین آ چکے تھے اور کچھ آنے والے تھے اور مکہ فتح ہونے تک مسلمان ہونے والے تمام انصار بھی، کیونکہ وہ بھی کئی مہاجرین سے پہلے ایمان لے آئے تھے۔

② يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ : یہ انصار کی دوسری فضیلت ہے کہ وہ ہجرت کر کے اپنے پاس آنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انصار نے ہجرت کر کے آنے والوں کو گلے لگایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے مہاجرین کو اپنی جائداد، گھر بار، زمینوں اور باغوں میں شریک کر لیا اور اتنے اصرار کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کو اپنے گھروں میں ٹھہرانے کی کوشش کی کہ مہاجرین کو قرعہ ڈال کر ان کے گھروں میں تقسیم کیا گیا، جیسا کہ ام علاء انصاریہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (( أَنَّهُمْ

فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ۫

ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں اور وہ اپنے سینوں میں اس چیز کی کوئی خواہش نہیں پاتے جو ان (مہاجرین ) کو دی

اقْتَسَمُوا الْمُهَاجِرِيْنَ قُرْعَةً، قَالَتْ فَطَارَ لَنَا عُثْمَانُ بْنُ مَظْعُوْنٍ، وَأَنْزَلْنَاهُ فِيْ أَبْيَاتِنَا ›› [ بخاري، التعبير، باب رؤيا النساء : ۷۰۰۳ ] ’’انصار نے مہاجرین کو قرعہ کے ساتھ تقسیم کیا، ہمارے حصے میں عثمان بن مظعون آئے، تو ہم نے انھیں اپنے گھروں میں ٹھہرا لیا۔‘‘

اس محبت کا ایک مظہر مواخات تھی، جس کی وجہ سے سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنی ساری جائداد اور تمام مکانوں میں سے نصف کی اور دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق کے بعد ان کے نکاح میں دینے کی پیش کش کی، جس پر انھوں نے انھیں برکت کی دعا دی مگر یہ پیش کش قبول نہ کی۔ (دیکھیے بخاری: ۲۰۴۹ ) انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مہاجرین نے کہا: ‹‹ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا رَأَيْنَا مِثْلَ قَوْمٍ قَدِمْنَا عَلَيْهِمْ أَحْسَنَ مُوَاسَاةً فِيْ قَلِيْلٍ، وَلَا أَحْسَنَ بَذْلًا فِيْ كَثِيْرٍ، لَقَدْ كَفَوْنَا الْمَئُوْنَةَ، وَأَشْرَكُوْنَا فِي الْمَهْنَأِ، حَتّٰى لَقَدْ حَسِبْنَا أَنْ يَّذْهَبُوْا بِالْأَجْرِ كُلِّهِ، قَالَ لَا، مَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ، وَدَعَوْتُمُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَهُمْ ›› [ مسند أحمد : ۳/ ۲۰۰، ۲۰۱، ح : ۱۳۰۷۵، قال المحقق إسناده صحيح على شرط الشيخين۔ ترمذي : ۲٤۸۷ ] ’’اے اللہ کے رسول! ہم نے ان جیسے لوگ نہیں دیکھے جن کے پاس ہم آئے ہیں، جو تھوڑے میں اچھی سے اچھی غم خواری کرتے ہوں اور زیادہ میں بہتر سے بہتر خرچ کرتے ہوں۔ وہ ہماری جگہ خود محنت مشقت کر رہے ہیں اور انھوں نے آمدنی میں ہمیں شریک کر رکھا ہے، یہاں تک کہ ہمیں گمان ہوتا ہے کہ سارا اجر وہی لے جائیں گے۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرتے رہو گے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کرتے رہو گے۔‘‘ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلایا تاکہ بحرین کا علاقہ بطور جاگیر ان کے لیے لکھ دیں۔ انھوں نے کہا: ’’جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ دیں ہم نہیں لیں گے۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ‹‹ إِمَّا لَا، فَاصْبِرُوْا حَتّٰى تَلْقَوْنِيْ، فَإِنَّهُ سَيُصِيْبُكُمْ بَعْدِيْ أَثَرَةٌ ›› [ بخاري، مناقب الأنصار، باب قول النبي ﷺ للأنصار : "اصبروا حتى تلقوني على الحوض" : ۳۷۹٤ ] ’’اگر تم نہیں لیتے تو صبر کرو، یہاں تک کہ مجھ سے آ ملو، کیونکہ میرے بعد تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔‘‘ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ’’اے اللہ کے رسول! ہمارے کھجوروں کے درخت ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیجیے۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’نہیں۔‘‘ تو انصار نے (مہاجرین سے ) کہا: ’’تم ہماری جگہ محنت کرو گے اور ہم تمھیں پھلوں کی پیداوار میں شریک کر لیں گے۔‘‘ مہاجرین نے کہا: ’’ہم نے تمھاری بات سنی اور مان لی۔‘‘ [ بخاري، الحرث والمزارعة، باب إذا قال اكفني مؤونة النخل...... : ۲۳۲۵ ]

③ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا : یعنی انصار کے دل میں مہاجرین کی ایسی محبت اور ہمدردی ہے کہ مہاجرین کو کوئی چیز دی جائے تو انصار کے دل میں اپنے لیے اس کی خواہش تک پیدا نہیں ہوتی، اس کا مطالبہ تو بہت دور کی

وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۹

جائے اور اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کی حرص سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں ۝۹

بات ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کی چھوڑی ہوئی تمام زمینیں اور باغات مہاجرین کو دے دیے اور انصار نے بخوشی اسے قبول کیا۔

④ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ: ”خَصَّ يَخَصُّ خَصَاصَةً وَخَصَاصًا وَخَصَاصَاءً (ع) “اِفْتَقَرَ” محتاج ہونا۔ ”خَصَاصَةٌ“ فقر و فاقہ۔ اپنی ضرورت سے زائد چیز خرچ کرنا بھی اگرچہ خوبی ہے، مگر وہ تھوڑا بہت جو آدمی کے پاس ہو، خود فقر و فاقہ برداشت کرتے ہوئے اسے دوسرے پر خرچ کر دینا بہت ہی اونچی بات ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! کون سا صدقہ سب سے بہتر ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: (( جُهْدُ الْمُقِلِّ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ )) [ أبو داؤد، الزکاۃ، باب الرخصۃ في ذلك : ۱۶۷۷، وقال الألباني صحیح ] ”کم مال والے کی کوشش اور ابتدا اس سے کرو جس کی تم پرورش کر رہے ہو۔“

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کے پاس پیغام بھیجا، ان کی طرف سے جواب آیا کہ ہمارے پاس پانی کے سوا کچھ نہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ يَضُمُّ أَوْ يُضِيْفُ هٰذَا؟ )) ”اس مہمان کو اپنے ساتھ کون لے جائے گا؟“ انصار میں سے ایک آدمی نے کہا: ”میں لے جاؤں گا۔“ چنانچہ وہ اسے لے کر اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس سے کہا: ”رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی خاطر تواضع کرو۔“ اس نے کہا: ”ہمارے پاس بچوں کے کھانے کے سوا کچھ نہیں۔“ اس نے کہا: ”کھانا تیار کر لو، چراغ جلا لو اور بچے جب کھانا مانگیں تو انھیں سلا دو۔“ اس نے کھانا تیار کر لیا، چراغ جلا دیا اور بچوں کو سلا دیا۔ پھر وہ اس طرح اٹھی جیسے چراغ درست کرنے لگی ہے اور اس نے چراغ بجھا دیا۔ میاں بیوی دونوں اس کے سامنے یہی ظاہر کرتے رہے کہ وہ کھا رہے ہیں، مگر انھوں نے وہ رات خالی پیٹ گزار دی۔ جب صبح ہوئی اور وہ انصاری رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( ضَحِكَ اللّٰهُ اللَّيْلَةَ أَوْ عَجِبَ مِنْ فَعَالِكُمَا )) ”آج رات تم دونوں میاں بیوی کے کام پر اللہ تعالیٰ ہنس پڑا یا فرمایا کہ اس نے تعجب کیا۔“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [ الحشر : ۹ ] ”اور اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کی حرص سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔“ [ بخاري، مناقب الأنصار، باب قول اللہ عزوجل: ﴿ و یؤثرون علی أنفسھم ...... ﴾ : ۳۷۹۸۔ مسلم : ۲۰۵۴ ] صحیح مسلم میں اس انصاری کا نام بھی مذکور ہے کہ وہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ تھے۔

⑤ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ ...... : ”يُوْقَ“ ”وَقٰى يَقِيْ وِقَايَةً“ (ض) (بچانا) سے فعل مضارع مجہول ہے، اصل میں

"یُوْقٰی" تھا، "مَنْ" کے جزم دینے کی وجہ سے الف گر گیا۔ راغب نے فرمایا: "اَلشُّحُّ بُخْلٌ مَعَ حِرْصٍ وَ ذٰلِكَ فِيْمَا كَانَتْ عَادَةً" "شح" وہ بخل ہے جس کے ساتھ حرص بھی ہو اور یہ آدمی کی عادت ہو۔" یعنی "شح" یہ نہیں کہ آدمی کسی وقت بخل کر جائے یا حرص سے کام لے لے، بلکہ یہ دونوں چیزیں اس کی عادت ہوں۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ "شح" یہ ہے کہ جو آدمی کے پاس ہو اس پر بخل کرے اور جو نہیں اس کی حرص رکھے۔ "وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ" سے ظاہر ہے کہ ہر انسان میں یہ عادت پائی جاتی ہے، بچتا وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ بچائے اور جنھیں اس بری خصلت سے بچا لیا جائے وہی کامیاب ہیں۔ آیت میں "شح" سے بچنے کی تاکید اور فضیلت کا بیان ہے، پھر جو کوشش کرے اللہ تعالیٰ اسے بچا لیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [ العنكبوت : ٦٩ ] "اور وہ لوگ جنھوں نے ہمارے بارے میں پوری کوشش کی ہم ضرور ہی انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے اور بلاشبہ اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ، وَمَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ، وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَ أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ )) [ بخاري، الزكاة، باب الاستعفاف عن المسئلة : ١٤٦٩ ] "اور جو (سوال سے) بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچا لے گا اور جو غنی بننے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے غنی بنا دے گا اور جو صبر کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے صبر عطا کر دے گا اور کسی شخص کو کوئی ایسا عطیہ نہیں دیا گیا جو صبر سے اچھا اور زیادہ وسیع ہو۔" اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اِتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلٰی أَنْ سَفَكُوْا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ )) [ مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم : ٢٥٧٨ ] "ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی تاریکیاں ہوگا اور "شُحّ" (بخل و حرص) سے بچو، کیونکہ شح نے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو تم سے پہلے تھے۔ اس نے انھیں اس بات پر ابھارا کہ انھوں نے اپنے خون بہائے اور اپنے اوپر حرام چیزوں کو حلال کر لیا۔"

6 اس آیت میں انصار کی جو صفات بیان ہوئی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انھی کے ساتھ خاص ہیں بلکہ وہ مہاجرین میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کی ہجرت ہی ان تمام صفات کی جامع ہے، کیونکہ آدمی کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ، اس کے رسول اور ایمان والوں کی محبت اور انھیں اپنے جان و مال پر ترجیح دیے بغیر ہجرت کر سکے۔ پھر ہر موقع پر انصار کی طرح مہاجرین نے بھی جس طرح اپنے مال و جان کو اللہ کی راہ میں قربان کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ جنگ تبوک کے موقع پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھر میں جو کچھ تھا سب لے آئے اور عمر رضی اللہ عنہ آدھا سامان لے آئے۔ یہ "شح" سے محفوظ ہونے اور ایثار کی بلند ترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح پہلی آیت میں مہاجرین کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف انھی کے ساتھ خاص ہیں، بلکہ وہ انصار میں بھی موجود تھے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا ذکر اکٹھا فرمایا ہے اور دونوں کو

وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰﴾ ع

اور (ان کے لیے ) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰﴾

ایک دوسرے کے دوست اور سچے مومن قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾ [ الأنفال : ۷۲ ] ”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، یہ لوگ! ان کے بعض بعض کے دوست ہیں۔“ اور اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ﴾ [ الأنفال : ۷۴ ] ”اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔“ غرض مہاجرین و انصار میں سے کوئی بھی فضیلت میں کم نہیں، تاہم مہاجرین کو اپنی ہجرت کی وجہ سے انصار پر ایک قسم کی برتری حاصل ہے، اس لیے ان آیات میں ان کا ذکر پہلے آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حنین کی غنیمتوں کی تقسیم کے موقع پر انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: « أَتَرْضَوْنَ أَنْ يَذْهَبَ النَّاسُ بِالشَّاةِ وَالْبَعِيْرِ، وَتَذْهَبُوْنَ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى رِحَالِكُمْ؟ لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِنَ الْأَنْصَارِ، وَلَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِيًا وَشِعْبًا لَسَلَكْتُ وَادِيَ الْأَنْصَارِ وَشِعْبَهَا، الْأَنْصَارُ شِعَارٌ وَالنَّاسُ دِثَارٌ » [ بخاري، المغازي، باب غزوة الطائف في شوال سنة ثمان : ۴۳۳۰ ] ”کیا تم پسند کرتے ہو کہ لوگ بھیڑ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم نبی ﷺ کو اپنے گھروں کی طرف لے جاؤ؟ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار میں سے ایک آدمی ہوتا اور اگر لوگ کسی وادی اور گھاٹی میں چلیں تو میں انصار کی وادی اور ان کی گھاٹی میں چلوں گا۔ انصار شعار (جسم کے ساتھ ملا ہوا کپڑا) ہیں اور دوسرے لوگ دثار (اوپر لیا جانے والا کپڑا) ہیں۔“

**آیت 10** ① وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ : اس کا عطف مہاجرین و انصار پر ہے جن کا ذکر پچھلی دو آیات میں گزرا۔ یعنی اموالِ فے مہاجرین و انصار کے فقراء کے لیے ہیں اور ان فقراء کے لیے جو ان کے بعد آئے۔ یہ اموالِ فے کے مستحقین کی تیسری قسم ہے۔ ان میں تابعین، تبع تابعین اور قیامت تک آنے والے تمام مسلمان شامل ہیں، اگر ان میں وہ صفات موجود ہوں جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔

② يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ...... : ان میں سے پہلی صفت جو ”الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے منافقت کی، وہ اپنے ان بھائیوں سے کہتے ہیں جنھوں نے اہل کتاب

بِالْاِيْمَانِ" سے ظاہر ہے، یہ ہے کہ وہ مہاجرین و انصار کو مومن مانتے ہوں اور انھی چیزوں پر ایمان رکھتے ہوں جن پر ان کا ایمان تھا۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوں۔ تیسری صفت یہ ہے کہ وہ مہاجرین و انصار صحابہ اور ان کے پیروکاروں سے نہ صرف محبت رکھتے ہوں بلکہ دعا بھی کرتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ان کے بارے میں کوئی کینہ یا دشمنی باقی نہ رہنے دے اور نہ ہی پیدا ہونے دے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیت سے کیا ہی خوب صورت استنباط کیا ہے کہ رافضی جو صحابہ کو گالی دیتا ہو، اس کا مال فے میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ اس میں وہ اوصاف نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان "وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" میں ذکر فرمائے ہیں۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کے مفہوم کے پیش نظر اپنے بھانجے عروہ بن زبیر سے فرمایا: « يَا ابْنَ أُخْتِي! أُمِرُوْا أَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِأَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبُّوْهُمْ » [ مسلم، التفسیر، باب في تفسير آيات متفرقة : ۳۰۲۲ ] "اے میرے بھانجے! ان لوگوں کو حکم دیا گیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے مغفرت کی دعا کریں، لیکن وہ انھیں گالیاں دینے لگے۔" بعض نے فرمایا، جس کے دل میں کسی صحابی کے متعلق کینہ ہو اور وہ تمام صحابہ کے لیے رحم کی دعا نہ کرتا ہو وہ ان لوگوں میں شامل نہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بالترتیب ایمان والوں کے تین مراتب بیان فرمائے ہیں، مہاجرین، انصار اور ان کے وہ پیروکار جن میں وہ اوصاف ہوں جو آیت میں مذکور ہیں، سو جو شخص ان صفات والے پیروکاروں میں سے نہ ہو وہ مومنوں کی اقسام سے خارج ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رافضی لوگوں سے، جو صحابہ کو گالی دیتے ہیں، یہود و نصاریٰ ہی اچھے رہے، کیونکہ یہود سے پوچھا گیا کہ تمھاری ملت میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ انھوں نے کہا، موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب۔ نصاریٰ سے پوچھا گیا، تمھاری ملت میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ انھوں نے کہا، عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب۔ رافضیوں سے پوچھا گیا کہ تمھاری ملت میں سب سے برے لوگ کون ہیں؟ تو انھوں نے کہا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب۔ [ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ ]

3 رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ : اپنے سے پہلے ایمان والوں کے لیے مغفرت کی دعا اور اپنے سینوں کو ان کے کینے سے پاک رکھنے کی دعا کے آخر میں اللہ تعالیٰ کو اس کے ان دو اسمائے حسنیٰ کا واسطہ دیا، کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس کی رافت و رحمت ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

**آیت 11** 1 اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا...... : اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیات عبداللہ بن اُبی اور اس کے دوسرے منافق ساتھیوں کے بارے میں اتریں کہ انھوں نے بنو نضیر کے یہود کی طرف پیغام بھیجا کہ اپنے قلعوں میں ڈٹ جاؤ، اگر

أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ
وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ⑪

میں سے کفر کیا، یقیناً اگر تمھیں نکالا گیا تو ضرور بالضرور ہم بھی تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے بارے میں کبھی کسی کی بات نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ضرور بالضرور ہم تمھاری مدد کریں گے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں ⑪

---

تمھیں نکالا گیا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یقیناً یہ لوگ جھوٹے ہیں، اگر انھیں نکالا گیا تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔ مفسر آلوسی نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ سورت بنو نضیر کے واقعہ سے پہلے اتری ہے، جب کہ محدثین اور سیرت نگاروں کے مطابق یہ سورت بنو نضیر کے واقعہ کے بعد اتری ہے، جب وہ جلا وطن کیے جا چکے تھے۔ آلوسی نے اشارے ہی پر اکتفا کیا ہے کہ ان آیات کو بنو نضیر کے متعلق سمجھنا درست نہیں۔ ابن عاشور نے اپنی تفسیر ''التحریر والتنویر'' میں لکھا ہے کہ منافقین نے جن کفار اہل کتاب کو یہ بات کہی تھی وہ بنو نضیر نہیں بلکہ بنو قریظہ اور خیبر کے یہودی تھے، کیونکہ بنو نضیر کا قصہ تو اس سے پہلے تمام ہو چکا تھا۔ اب وہ منافقین باقی ماندہ یہودیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی تلقین کر رہے تھے اور انھیں یقین دلا رہے تھے کہ ہم ہر حال میں تمھارا ساتھ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو حوصلہ دلایا کہ فکر مت کرو، یہ کسی صورت میں بھی ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔

ابن عاشور کی بات ہی درست ہے۔ ان آیات کو طبری میں مذکور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جس قول کے مطابق بنو نضیر کے متعلق قرار دیا گیا ہے اس کی سند ثابت نہیں، اس میں طبری کے شیخ محمد بن حمید رازی ضعیف ہیں۔

❷ ''أَلَمْ تَرَ'' ''أَلَمْ تَعْلَمْ'' کے معنی میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بہت سے دلائل میں سے یہ بھی ایک دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کی اس بات سے آگاہ کر دیا جو ان کے درمیان انتہائی راز کی بات تھی۔

❸ يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ : جیسا کہ اوپر گزرا کہ ان کفار اہل کتاب سے مراد بنو قریظہ اور خیبر کے یہودی ہیں، انھیں منافقین کے بھائی قرار دینے سے ظاہر ہے کہ جس طرح ایمان والے آپس میں دوست اور بھائی ہیں (دیکھیے حجرات: ۱۰۔ انفال: ۷۲) اسی طرح کفار بھی کفر میں ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ [الأنفال: ۷۳] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے بعض بعض کے دوست ہیں۔'' بھائی ہونے سے مراد نسبی اخوت نہیں ہے، کیونکہ عبداللہ بن اُبی اور دوسرے اکثر منافقین اوس و خزرج کے مشرکین میں سے تھے، اہل کتاب سے ان کی اخوت کفر ہی میں تھی۔

❹ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا : اس میں منافقین یہود کے دل میں آنے والے اس

لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَ لَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَ لَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۳﴾

یقیناً اگر انھیں نکالا گیا تو وہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور یقیناً اگر ان سے جنگ کی گئی تو وہ ان کی مدد نہ کریں گے اور یقیناً اگر انھوں نے ان کی مدد کی تو وہ ضرور بالضرور پیٹھیں پھیریں گے، پھر وہ مدد نہیں کیے جائیں گے ﴿۱۲﴾ بلاشبہ تم ان کے سینوں میں خوف کے اعتبار سے اللہ سے زیادہ سخت ہو، یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں سمجھتے ﴿۱۳﴾

خطرے کا تدارک کر رہے ہیں کہ یہ لوگ اپنے قبیلوں اوس و خزرج میں سے مسلمان ہونے والوں کے رشتہ دار ہیں، ان مسلمانوں نے انھیں ہماری مدد سے منع کیا تو یہ مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے، اس لیے منافقین کہہ رہے ہیں کہ فکر مت کرو، ہم تمھارے بارے میں کسی کی بات نہیں مانیں گے۔

⑤ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ : اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی ہی بات کافی تھی کہ قسم کھا کر فرما دیا کہ بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں ان کی ایک ایک بات ذکر کر کے فرمایا کہ وہ ان میں سے کوئی وعدہ پورا نہیں کریں گے۔ علم بلاغت میں اسے اطناب کہتے ہیں، یعنی کسی جگہ مختصر بات کا موقع ہوتا ہے، کسی جگہ توسط کا اور کہیں ضرورت ہوتی ہے کہ بات کو خوب لمبا کر کے بیان کیا جائے۔ یہاں منافقین کے جھوٹ کو واضح کرنے اور انھیں ذلیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بات کو لمبا کیا ہے۔ (ابن عاشور)

**آیت 12** ① لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ : اور ایسا ہی ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، بنو قریظہ تہ تیغ کر دیے گئے اور خیبر والوں کو آخر کار جلا وطن ہونا پڑا مگر کوئی منافق ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔

② وَلَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ : یہ بات بطور فرض کہی گئی ہے۔

③ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ : عربوں کا عام طریقہ تھا کہ بعض اوقات وہ میدان سے بھاگ جاتے اور پلٹ کر پھر حملہ آور ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر بالفرض یہ منافقین ان کی مدد کے لیے آئے بھی تو پیٹھ دے کر بھاگ جائیں گے اور ایسے بھاگیں گے کہ ان اہل کتاب کی مدد کے لیے دوبارہ کوئی نہیں آئے گا۔

**آیت 13** ① لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ : اس میں مسلمانوں کا حوصلہ بڑھایا ہے، کیونکہ جب انھیں معلوم ہوگا کہ دشمن ان سے شدید خوف زدہ ہے تو وہ بڑھ چڑھ کر حملے کریں گے۔

② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ : کیونکہ اگر وہ سمجھ دار ہوتے تو مخلوق کے بجائے خالق سے ڈرتے۔

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

وہ اکٹھے ہو کر تم سے نہیں لڑیں گے مگر قلعہ بند بستیوں میں، یا دیواروں کے پیچھے سے، ان کی لڑائی آپس میں بہت سخت ہے۔ تو خیال کرے گا کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں، یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے ﴿۱۴﴾

آیت 14 ① لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ ...... : "حِصْنٌ" کا معنی قلعہ ہے۔ "مُحَصَّنَةٍ" قلعہ بنائی ہوئی محفوظ بستیاں۔ "جُدُرٍ" "جِدَارٌ" کی جمع ہے، دیواریں۔ یعنی یہ یہودی ایسے نامرد اور بزدل ہیں کہ کبھی اکٹھے ہو کر میدان میں تمھارا سامنا نہیں کریں گے، بلکہ قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کے پیچھے رہ کر ہی لڑیں گے۔ اس طرح لڑنے والے ہمیشہ ذلیل ہی ہوتے ہیں، کیونکہ جو میدان میں نکلنے کی جرأت نہیں رکھتا اسے قلعے اور دیواریں بھی نہیں بچا سکتیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اصحاب رسول ﷺ کھلے میدان میں لڑنا پسند کرتے تھے اور چونکہ وہ شہادت کی تلاش میں لڑتے تھے، اس لیے دشمن پہلی چوٹ ہی میں پیٹھ پھیر کر بھاگ اٹھتا تھا۔ یہودی چونکہ موت سے بچتے تھے اس لیے وہ میدان میں آنے کے بجائے قلعوں اور دیواروں کی پناہ کے ذریعے سے زندگی بچانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی قلعہ بند بستیاں بھی انھیں ذلت اور موت سے نہ بچا سکیں۔

② بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ : یعنی یہ یہودی اور منافقین تمھارے مقابلے میں تبھی آ سکتے تھے جب وہ آپس میں ایک ہوتے، جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اسلام دشمنی میں اکٹھے ہیں، ورنہ ان کی آپس کی لڑائی بہت سخت ہے۔ منافقین و یہود اور مشرکین کا ایک دوسرے سے یہی معاملہ ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک گروہ کے افراد آپس میں بھی ایک نہیں بلکہ ایک دوسرے سے شدید دشمنی رکھتے ہیں، ایسے لوگوں میں یہ حوصلہ کہاں کہ وہ تمھارے مقابلے میں اکٹھے ہو کر میدان میں نکلیں۔

③ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى : "شَتّٰى" "شَتِيْتٌ" کی جمع ہے، جیسے "قَتِيْلٌ" کی جمع "قَتْلٰى" ہے، یعنی تم انھیں گمان کرو گے کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔

④ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ : اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو کام کے انجام کو نہیں سوچتے اور عقل سے کام نہیں لیتے، بلکہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں، جس کا نتیجہ باہمی اختلاف اور عداوت ہی ہے۔ "قَوْمٌ" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ ان کے ایک آدھ آدمی کا معاملہ نہیں بلکہ پوری قوم کا مزاج ہی یہ ہے۔

⑤ ان آیات میں مسلمانوں کی تربیت ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مخالفت، عناد اور دشمنی سے بہت زیادہ اجتناب کریں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ کوئی بھی قوم دشمن پر اسی وقت غالب ہو سکتی ہے جب ان کے دل ایک دوسرے کے کینے اور عداوت سے پاک اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں اور وہ قومی و اجتماعی مفاد کو اپنے ذاتی مفادات پر ترجیح دیتے ہوئے یک زبان و یک جان ہوں۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

ان لوگوں کے حال کی طرح جو ان سے پہلے قریب ہی تھے، انھوں نے اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے لیے دردناک سزا ہے ﴿۱۵﴾ شیطان کے حال کی طرح، جب اس نے انسان سے کہا کفر کر، پھر جب وہ کفر کر چکا تو اس نے کہا بلاشبہ میں تجھ سے لاتعلق ہوں، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۱۶﴾

6 مفسر ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں: ''اس آیت کے حکیمانہ مضمون کو اور مسلمانوں کی اندرونی حالت نوعی وصنفی، پھر صنفی در صنفی کو دیکھیں تو بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے کہ یہ آیت ہمارے ہی حق میں اتری ہے۔ خواجہ حالی نے اس حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

نہ سُنّی میں اور جعفری میں ہو ملّت ۔۔۔ نہ نعمانی و شافعی میں ہو الفت
وہابی سے صوفی کی کم نہ ہو نفرت ۔۔۔ مقلد کرے نامقلد پہ لعنت
رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم ۔۔۔ کہ دینِ خدا پر ہنسے سارا عالم

کسی ایک غرضِ عام کے لیے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، ابتدا میں اگر ہوتے ہیں تو انتہا میں بگڑ جاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ یہ اطوار انھی لوگوں میں ہوتے ہیں جو قومی اغراض عامہ سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے ان کے حق میں یہ الٰہی فیصلہ بالکل حق اور بجا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾ ''یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔'' (ثنائی)

**آیت 15** كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ...... : ''كَمَثَلِ الَّذِيْنَ'' سے پہلے مبتدا محذوف ہے: ''أَيْ مَثَلُهُمْ'' یعنی ان بنو قریظہ کا حال جنھیں منافقین لڑنے پر ابھار رہے ہیں اور اپنی ہر طرح کی مدد کا یقین دلا رہے ہیں ان لوگوں کے حال جیسا ہے جو ان سے پہلے قریب ہی تھے۔ مراد ان سے بنو نضیر ہیں جنھوں نے اپنی بدعہدی کا وبال چکھا، وہ اپنی تمام تر قلعہ بندیوں، فوجی تیاریوں، بہادری کے دعووں اور منافقین و مشرکین کی امداد کے وعدوں کے باوجود پہلی چوٹ بھی نہ سہ سکے اور اپنی زمینیں، باغات اور مکانات مسلمانوں کے لیے چھوڑ کر ذلیل و رسوا ہو کر جلا وطن ہو گئے اور ان کے لیے آئندہ بھی دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے۔

**آیت 16** كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ...... : یعنی بنو قریظہ کو لڑنے پر ابھارنے والے منافقوں کا حال شیطان کے حال جیسا ہے اور وہ انھیں اسی طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے جیسے شیطان انسان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے کہ وہ انسان کو گمراہ کرتا ہے، پھر جب وہ اس کے پیچھے لگ کر کفر کا ارتکاب کر لیتا ہے تو شیطان کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

پس ان دونوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ دونوں آگ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی ظالموں کا بدلا ہے ⑰ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو ⑱

تعلق نہیں ، میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے کتنے انسانوں کو اس طرح گمراہ کیا اور گمراہ کرنے کے بعد ان سے بری ہو گیا۔ قرآن مجید میں اس کی مثال دنیا میں بدر کے موقع پر شیطان کی کفارِ قریش کو اپنی حمایت کا یقین دلا کر عین موقع پر فرار اختیار کرنا اور ان سے براءت کا اظہار کرنا بیان ہوئی ہے (دیکھیے انفال: ۴۸) اور قیامت کے دن اس کا اپنے تمام پیروکاروں سے براءت کا اعلان سورۂ ابراہیم (۲۲) میں مذکور ہے۔

آیت 17 فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ...... : یعنی قیامت کے دن نہ شیطان اور دوسرے گمراہ کرنے والے آگ سے یہ کہہ کر بچ سکیں گے کہ ہم نے انھیں کفر کی صرف دعوت دی تھی، اس پر مجبور نہیں کیا تھا، اب ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کفار یہ کہہ کر بچ سکیں گے کہ ہمیں تو شیطان نے یا ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا، اس لیے ہمارے بجائے انھیں عذاب دیا جائے، بلکہ گمراہی کی دعوت دینے والے بھی جہنم میں جائیں گے اور ان کے کہنے پر گمراہ ہونے والے سب لوگ بھی اور تمام ظالموں کی یہی جزا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۳۸، ۳۹)، عنکبوت (۱۲، ۱۳)، سبا (۳۱، ۳۲) اور سورۂ ق (۲۳ تا ۲۹)۔

آیت 18 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ : غزوۂ بنو نضیر میں مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات، یہود کی عہد شکنی کی سزا اور منافقین کی ریشہ دوانیوں اور ان کے انجام کے ذکر کے بعد تمام مسلمانوں کو نصیحت کی جا رہی ہے۔ ”يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا“ کے الفاظ کے ساتھ مخلص مسلمانوں کو بھی خطاب ہے اور منافق مسلمانوں کو بھی جو یہود سے دوستی رکھتے اور انھیں اپنی مدد کا یقین دلاتے تھے۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور قیامت کے دن کی تیاری کی نصیحت کی گئی ہے، تا کہ مخلص مسلمان دنیا میں ملنے والی فتوحات اور نعمتوں کی خوشی میں آخرت کی تیاری کو نہ بھول جائیں اور منافقین میں سے جن کے دلوں میں ایمان کی کوئی رمق باقی ہے وہ اپنی رَوش پر نادم ہوں اور اللہ سے ڈر کر نفاق سے باز آ جائیں اور آنے والے وقت کی فکر کر لیں۔

② وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ : ”اتَّقُوا اللّٰهَ“ پر ”وَانْظُرُوْا“ کے ساتھ عطف کے بجائے ”وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ“ کے ساتھ عطف یہ احساس دلانے کے لیے ڈالا گیا ہے کہ یہ حکم ہر شخص کے لیے ہے۔ ”نَفْسٌ“ کو نکرہ لانے سے بھی عموم مراد ہے۔ گویا ”نَفْسٌ“ یہاں ”كُلُّ نَفْسٍ“ کے معنی میں ہے، کیونکہ جس طرح نکرہ نفی کے سیاق میں آئے تو عموم مراد ہوتا ہے، اسی طرح اگر نکرہ امر،

## وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں ان کی جانیں بھلوا دیں، یہی لوگ نافرمان ہیں ﴿۱۹﴾

دعا اور ان جیسی چیزوں مثلاً شرط کے سیاق میں آئے تو وہاں بھی عموم مراد ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ ﴾ [ التوبۃ: ۶ ] ''اور اگر مشرکین میں سے کوئی ایک تجھ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دے۔'' (ابن عاشور)

③ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ : ''غَدٌ'' (کل) سے مراد آخرت ہے۔ دنیا آج ہے اور آخرت کل، جو مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ دور ہونے کے باوجود اسے ''غَدٌ'' کہنے میں یہ سبق ہے کہ اسے دور مت سمجھو، کیونکہ جو آنے والا ہے وہ قریب ہی ہے، خصوصاً جس کا علم ہی نہ ہو کہ کب آئے گا اور جو اگلے لمحے ہی آ سکتا ہو اس کے ''غَدٌ'' ہونے میں کیا شبہ ہے۔

④ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ : یہاں ''اتَّقُوا اللّٰهَ'' کو دوبارہ لایا گیا ہے، اس کی تین توجیہیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں، ایک یہ کہ تکرار کا مقصد اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی تاکید ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ پہلے ''اتَّقُوا اللّٰهَ'' کے ساتھ اللہ سے ڈرنے کا اور آخرت کی تیاری کا حکم دیا، اس کے بعد ''اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ'' کے ساتھ اس کی وجہ بیان کرنا تھی، کیونکہ ''اِنَّ'' تعلیل کے لیے ہوتا ہے، لیکن چونکہ پہلے ''اتَّقُوا اللّٰهَ'' کے بعد فاصلہ زیادہ ہو رہا تھا، اس لیے ''اتَّقُوا اللّٰهَ'' کو دوبارہ لا کر اس کی وجہ بیان فرما دی کہ اللہ سے ڈر جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ تمھارا کوئی کام اس سے مخفی نہیں جس پر تم اس کی گرفت سے بچ جاؤ، یا اچھا ہے تو اس کے انعام سے محروم رہو۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ پہلے ''اتَّقُوا اللّٰهَ'' سے مراد تقویٰ یعنی اللہ سے ڈرنے کا حکم ہے جس کی بدولت آدمی نیکی کرتا ہے اور گناہ سے بچتا ہے اور دوسرے ''اتَّقُوا اللّٰهَ'' سے مراد اس پر دوام ہے، یعنی ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو، کیونکہ تم جو کچھ کرتے ہو یا کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس معنی کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعد میں فرمایا: ﴿ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ ﴾ اور ان لوگوں یعنی منافقین کی طرح نہ ہو جاؤ جو (ایمان لانے کے بعد) اللہ کو بھول گئے، بلکہ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو۔

**آیت 19** ① وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ ...... : ایمان والوں کو اللہ کے تقویٰ اور آخرت کی تیاری کے حکم کے بعد اس کے احکام سے بے توجہی اور غفلت سے منع فرمایا، کیونکہ اس کا نتیجہ فسق اور نافرمانی ہوتا ہے اور اس کے لیے یہ اسلوب اختیار فرمایا کہ انھیں ان لوگوں کی طرح ہو جانے سے منع فرمایا جنھوں نے اللہ کے احکام پر عمل کو ترک کر دیا، تاکہ ایسے لوگ اور ان کا انجام ان کے سامنے رہے اور وہ ان کے نقش قدم پر چلنے سے بچتے رہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کے بعد ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ'' فرمایا ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ کون لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: ﴿ نَسُوا اللّٰهَ ﴾ کہ وہ اللہ کو بھول گئے، تو قرآن مجید میں یہ الفاظ منافقین کے متعلق آئے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ

لَا يَسْتَوِيْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾

آگ والے اور جنت والے برابر نہیں ہیں، جو جنت والے ہیں، وہی اصل کامیاب ہیں ﴿۲۰﴾

بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [ التوبة : ٦٧ ] ''منافق مرد اور منافق عورتیں، ان کے بعض بعض سے ہیں، وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں بھلا دیا۔ یقیناً منافق لوگ ہی نافرمان ہیں۔'' ان کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے متعلق بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ چنانچہ یہود کے متعلق فرمایا: ﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ﴾ [ المائدة : ١٣ ] ''وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور وہ اس میں سے ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی۔'' اور نصاریٰ کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ﴾ [ المائدة : ١٤ ] ''اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا بے شک ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان کا پختہ عہد لیا، پھر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی۔'' اور مشرکین کے متعلق فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ﴾ [ الأعراف : ٥١ ] ''وہ جنھوں نے اپنے دین کو دل لگی اور کھیل بنا لیا اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا تو آج ہم انھیں بھلا دیں گے، جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے۔'' اس سورت میں چونکہ اس سے پہلے بنونضیر کے یہود کا اور انھیں بدعہدی پر ابھارنے والے منافقین کا ذکر ہے، اس لیے بظاہر یہاں ''كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ'' سے یہی دونوں مراد ہیں، اگرچہ الفاظ کے عموم میں ہر کافر و منافق داخل ہے۔

❷ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ : یعنی اللہ تعالیٰ کو بھلانے اور اس کی عبادت ترک کرنے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی اپنی جانوں کی فکر بھی فراموش کروا دی۔ چنانچہ وہ اپنے اچھے برے کی فکر سے بھی بے پروا ہو گئے، نہ دنیا میں اپنی جانوں کی بھلائی کا اہتمام کیا اور نہ ہی آخرت کے عذاب سے انھیں بچانے کی کوشش کی، اس بنا پر گناہوں اور نافرمانیوں میں پڑے رہے۔

❸ نسیان سے مراد یہاں اللہ کے احکام پر عمل ترک کرنا ہے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۱۵، ۱۲۶)۔

**آیت 20** لَا يَسْتَوِيْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ...... : یہ اوپر کی آیات کا خلاصہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے اور آخرت کی تیاری کرنے والے جنتی ہیں اور اسے بھول جانے والے اور گناہ اور نافرمانی کی زندگی بسر کرنے والے جہنمی ہیں اور جہنمی اور جنتی دونوں برابر نہیں ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ ص (۲۸)، سجدہ (۱۸) اور سورۂ جاثیہ (۲۱) کی تفسیر۔ ''اَصْحٰبُ النَّارِ'' سے مراد کفار ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [ البقرة : ٣٩ ] ''اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔'' اور ''اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ''

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا، ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا دیکھتا اور یہ مثالیں ہیں، ہم انھیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ غور و فکر کریں ﴿۲۱﴾ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چھپی اور کھلی چیز کو جاننے والا ہے، وہی بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ﴿۲۲﴾

سے مراد مومن ہیں۔ (دیکھیے احقاف: ۱۳، ۱۴) "اَصْحٰبُ النَّارِ" اور "اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ" دونوں کا ایک ہی جگہ ذکر دیکھنے کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۸۱، ۸۲)۔

**آیت 21** ① لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ...... : یعنی یہ یہود اور منافقین قرآن مجید کی آیات سننے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے، حالانکہ وہ تو ایسی عظیم الشان اور پُر تاثیر کتاب ہے کہ اگر ہم اسے کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ بھی اللہ کے ڈر سے دب جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ [البقرۃ: ۷۴] "پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں یا سختی میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔" اس سے معلوم ہوا کہ پہاڑوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے ادراک اور سوجھ بوجھ رکھی ہے۔ ان کے سامنے امانت پیش کی گئی مگر وہ اس سے ڈر گئے اور انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ (دیکھیے احزاب: ۷۲) پہاڑوں اور جمادات میں ادراک کے وجود کے لیے سورۂ بقرہ (۷۴)، بنی اسرائیل (۴۴)، نحل (۴۸، ۴۹) اور سورۂ ص (۱۸) کی تفاسیر پر نظر ڈال لیں۔

② وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ... : یعنی ہم یہ مثالیں لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ غور و فکر کریں کہ ایسی زبردست تاثیر والی چیز بھی ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی تو اس کا سبب کیا ہے، پھر اس سبب کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

**آیت 22** ① هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے نام اور اس کی ضمیروں اور صفات کا ذکر چالیس (۴۰) مرتبہ آیا ہے، چوبیس (۲۴) بار لفظ "اللہ" کے ساتھ اور سولہ (۱۶) مرتبہ ضمیر ظاہر یا صفات عالیہ کے ساتھ۔ غرض پوری سورت ہی اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور اس کے عجیب و غریب تصرّفات کے ذکر سے بھری ہوئی ہے، اس لیے اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور اس کی صفات عزیز و حکیم کے ساتھ ہوئی ہے اور اختتام بھی اس کی ایسی صفات کے ساتھ ہوا ہے جن کے ذکر سے ایمان والوں کے دلوں میں اس کی خشیت و محبت میں اضافہ ہو اور سرکشوں کو اس کی گرفت اور ہیبت و جلال سے خوف دلایا جائے۔ ساتھ ہی ان صفات میں توحید کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کے دلائل بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہر صفت کا سورت میں مذکور واقعات و مضامین میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ تعلق بھی ہے۔ (ابن عاشور، ملخص)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ

وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، سب پر

❷ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : اللہ تعالیٰ کی صفات میں سب سے پہلے اس کے ''الٰہ واحد'' ہونے کی صفت بیان فرمائی، کیونکہ یہ دوسری تمام صفات کی اصل ہے۔ دوسری تمام صفات اس صفت کی دلیل ہیں کہ عبادت اس اکیلے کا حق ہے، اس لیے قرآن مجید میں اسم مبارک ''اللّٰهُ'' کے بعد اکثر اس صفت کا ذکر آتا ہے، جیسا کہ آیت الکرسی میں اور سورۂ آلِ عمران کے شروع میں فرمایا: ﴿اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ ''اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے۔''

❸ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ : ''الْغَیْبِ'' اور ''الشَّهَادَةِ'' مصدر ہیں جو اسم فاعل کے معنی میں ہیں، یعنی غائب و شاہد۔ مبالغے کے لیے اسم فاعل کی جگہ مصدر کا لفظ استعمال کیا گیا، جیسا کہ '' زَیْدٌ عَادِلٌ '' کے بجائے مبالغے کے لیے '' زَیْدٌ عَدْلٌ '' کہہ دیتے ہیں کہ زید سراپا عدل ہے۔ ''الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ'' پر الف لام استغراق کا ہے، یعنی وہ ہر غائب و حاضر کو جاننے والا ہے۔ وحدانیت کے بعد دوسری صفت علم بیان فرمائی، کیونکہ معبود ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہو اور اس کا علم کامل ہو۔ وہ معبود کیسا جسے معلوم ہی نہیں کہ کوئی میری عبادت کر رہا ہے۔ (دیکھیے احقاف : ۵، ۶) ''الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ'' دوسروں کے اعتبار سے فرمایا، ورنہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز غائب نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ''عالم الغیب'' تو واقعی صرف اللہ تعالیٰ ہے مگر ''عالم الشہادت'' تو اور لوگ بھی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ''الشہادت'' کا علم بھی اس کے سوا کسی کے پاس نہیں، چند چیزیں جاننے والے کو ''عالم الشہادت'' نہیں کہا جا سکتا۔ مزید دیکھیے سورۂ رعد (۹، ۱۰) اور سورۂ اعلیٰ (۷) کی تفسیر۔

❹ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فاتحہ کی تفسیر۔

آیت 23 ❶ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : مزید صفات کے بیان کے لیے یہ جملہ دوبارہ ذکر فرمایا۔ تکرار سے مقصود اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک ''اللّٰهُ'' کی عظمت اور اس کی وحدانیت کا خاص اہتمام ہے۔

❷ اَلْمَلِكُ : یہ دوسری خبر ہے، اس پر الف لام کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ وہی ہے، کوئی اور نہیں، کیونکہ دوسرا کوئی اگر بادشاہ ہے تو چند لوگوں کا ہے، سب کا نہیں اور کچھ وقت کے لیے ہے، ہمیشہ کے لیے نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ سب کا بادشاہ اور ہمیشہ کے لیے بادشاہ ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ـــ حکمران ہے اک وہی باقی بتان آزری

مزید دیکھیے سورۂ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر۔ قرآن مجید میں اکیلے اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا ذکر متعدد مقامات پر ہے، دیکھیے سورۂ روم (۲۶)، حدید (۵)، فرقان (۲)، یٰس (۸۳) اور آلِ عمران (۲۶)۔

❸ اَلْقُدُّوْسُ: نہایت پاک۔ ''اَلْمَلِكُ'' کے بعد ''اَلْقُدُّوْسُ'' لانے میں ایک مناسبت یہ ہے کہ بادشاہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کے حکمرانوں میں پائے جانے والے عیوب اور خامیوں سے بالکل پاک ہے۔

الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾

غالب، اپنی مرضی چلانے والا، بے حد بڑائی والا ہے، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۲۳﴾

④ السَّلٰمُ : سراسر سلامتی ہے، یعنی سلامتی والا ہے۔ خود ہر آفت اور مصیبت سے سالم ہے اور سب کو سلامتی دینے والا اور محفوظ رکھنے والا ہے، دوسرے صاحبِ قوت لوگوں کی طرح ناحق تباہی و بربادی پھیلانے والا نہیں۔ ایک دعا میں یہ الفاظ ہیں:
« اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ » [ مسلم، المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ و بیان صفته : ۵۹۲ ]
''اے اللہ! تو ہی سراسر سلامتی والا ہے اور تجھی سے سلامتی ملتی ہے۔''

⑤ الْمُؤْمِنُ : امن دینے والا۔ جسے بھی امن ملتا ہے اُسی سے ملتا ہے۔

⑥ الْمُهَيْمِنُ : نگران، نگہبان۔ تیسیر القرآن میں ہے: "الْمُهَيْمِنُ" کہتے ہیں: " هَيْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰى فِرَاخِهٖ " یعنی پرندے نے اپنے پَر اپنے بچوں پر بچھا دیے، جیسے مرغی خطرے کے وقت اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ لہٰذا "الْمُهَيْمِنُ" وہ ذات ہے جو ① کسی کو خوف سے امن دے، ② ہر وقت نگہبانی رکھے اور ③ کسی کا کوئی حق ضائع نہ ہونے دے۔ (منتہی الارب)

⑦ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ : "الْجَبَّارُ" اپنی مرضی منوانے والا، جو دوسرے کو اپنا کام کرنے پر مجبور کر دے۔ اللہ تعالیٰ ساری مخلوق پر جبار ہے، کیونکہ ان میں سے کسی کی جرأت نہیں کہ وہ اس سے جو کروانا چاہے وہ نہ کرے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۱۱ ] ''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ ایک دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ آؤ خوشی سے یا مجبوری سے۔ دونوں نے کہا ہم خوشی سے آ گئے۔'' کوئی اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے، جیسا کہ انسان ایک ٹانگ تو اٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے مگر دونوں نہیں۔ جبر کا ایک معنی ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنا اور نقصان پورا کرنا بھی ہے، یعنی وہی ہے جو ہر ایک کا نقصان پورا کرنے والا ہے۔

⑧ الْمُتَكَبِّرُ : اس کے دو مفہوم ہیں، ایک یہ کہ کوئی شخص فی الحقیقت بڑا نہ ہو مگر بڑا بننے کی کوشش کرے، خواہ وہ کوئی جن ہو یا انسان اور یہ صفت انتہائی مذموم ہے۔ دوسرا وہ جو فی الحقیقت بڑا ہو اور بڑا ہی ہو کر رہے اور یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سزاوار ہے اور اس کے حق میں یہ ایک خوبی ہے جو دوسری کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔ کائنات کی باقی تمام چیزیں خواہ جان دار ہوں یا بے جان اس کے مقابلے میں چھوٹی اور حقیر ہیں۔ (تیسیر القرآن)

⑨ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ : یعنی یہ صفات دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے پاک ہے جنھیں مشرکین نے اس کا شریک بنا رکھا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾

ع۳

وہ اللہ ہی ہے جو خاکہ بنانے والا، گھڑنے ڈھالنے والا، صورت بنا دینے والا ہے، سب اچھے نام اسی کے ہیں، اس کی تسبیح ہر وہ چیز کرتی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۴﴾

آیت 24 ① هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ: "خلق، برء اور تصویر" پیدائش کے تین مراحل ہیں، پہلا مرحلہ یہ کہ کوئی چیز بنانے سے پہلے اس کا پورا اندازہ لگانا اور نقشہ و خاکہ بنانا ہوتا ہے، یہ خلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا پہلے ہی ایک اندازہ اور نقشہ طے کر دیا ہے کہ وہ کیسی ہوگی، مثلاً انسان کی کیا شکل ہوگی، درخت کیسا ہوگا وغیرہ۔ دوسرا مرحلہ ان چیزوں کو وجود میں لانا ہے جن سے اسے بنایا جانا ہے اور انھیں تراش خراش اور ڈھال کر وہ صورت قبول کرنے کے قابل بنانا جو اس کے لیے طے کی گئی ہے۔ یہ "برء" ہے۔ مثلاً انسان کو مٹی سے بنایا، مٹی کو گارا بنایا، پھر آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنایا۔ تیسرا اور آخری مرحلہ تصویر ہے جس کے ساتھ کوئی چیز مکمل ہو کر وجود میں آ جاتی ہے۔ کائنات کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اللہ تعالیٰ نے تصویر عطا فرمائی ہے، زمین و آسمان ہوں یا چیونٹی اور ذرہ، ہر چیز کو پیدا کرنے کے تمام مراحل اسی کے ہاتھ میں ہیں، انسان اگر کچھ بناتا بھی ہے تو اس کے ہر کام کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [ الصافات : ۹۶ ] "اور اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔" ان تینوں اسماء میں سے ہر ایک مطلق بنانے اور پیدا کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۱) کی تفسیر۔

② لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى : یعنی ان آیات میں جو اسماء اور صفات بیان ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ صرف انھی کے ساتھ متصف نہیں، بلکہ ہر بہترین اسم و صفت کا وہی مستحق ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۰) کی تفسیر۔

③ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : سورت کی ابتدا بھی اسی بات سے ہوئی ہے اور انتہا بھی۔ ابتدا میں "سَبَّحَ لِلّٰهِ" ہے اور انتہا میں "يُسَبِّحُ لَهٗ" ہے۔ اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے آ گئے۔ آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حدید کی پہلی آیت اور سورۂ بنی اسرائیل (۴۴) کی تفسیر۔

④ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ " أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ " کہے، پھر سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں پڑھے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے مقرر کر دیتے ہیں جو شام تک اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ اس دن فوت ہو جائے تو شہید فوت ہوگا اور جو شام کو انھیں پڑھ لے اسے بھی یہ مرتبہ ملے گا۔" [ ترمذي، فضائل القرآن، باب في فضل قراءة آخر سورة الحشر : ۲۹۲۲۔ مسند أحمد : ۲۶/۵، ح : ۲۰۳۰۶ ] مسند احمد کے محققین اور شیخ ناصر الدین البانی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ تفصیل مسند احمد کی تحقیق میں ملاحظہ فرمائیں۔

سورۃ الممتحنۃ ۶۰ — مدنیۃ ۹۱ — آیاتہا ۱۳ — رکوعاتہا ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
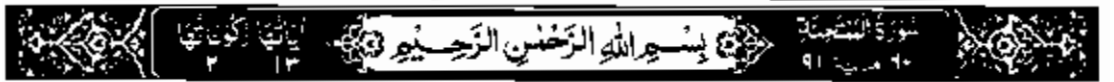
اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سورۂ حشر میں منافقین کی کفار اہل کتاب کے ساتھ دوستی اور اس کے برے انجام کا بیان تھا، اس سورت میں مشرکین کے ساتھ دوستی سے منع فرمایا، خصوصاً ان مہاجرین کو جن کے بیوی بچے یا عزیز مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اس خیال سے مشرکین سے تعلق قائم رکھنا چاہتے تھے کہ مشرکین اس وجہ سے ان کے بیوی بچوں اور عزیزوں کا خیال رکھیں گے۔

۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور کفارِ قریش کے درمیان دس سال کے لیے صلح کا جو معاہدہ ہوا اس کی ایک شق یہ تھی کہ جو قبائل چاہیں رسول اللہ ﷺ کے حلیف بن جائیں اور جو چاہیں کفارِ قریش کے حلیف بن جائیں اور کوئی فریق دوسرے فریق کے حلیف پر نہ حملہ کرے اور نہ حملہ کرنے والوں کی مدد کرے۔ چنانچہ مکہ کے قریب رہنے والے قبائل میں سے بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے اور بنو خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف بن گئے۔ ابھی معاہدے کو تقریباً ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ بنو بکر نے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے آدمیوں اور اسلحہ سے ان کی مدد کی، وہ بھاگ کر حرم میں آئے تو انھوں نے وہاں بھی انھیں نہیں چھوڑا بلکہ قتل کر دیا۔ بنو خزاعہ کا ایک وفد فریاد لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ پہنچا۔ یہ قریش کی صریح عہد شکنی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں سزا دینے اور مکہ پر حملہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس کے لیے خفیہ طور پر تیاری شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ اچانک حملے میں کفار مزاحمت نہیں کر سکیں گے اور کشت و خون کی نوبت نہیں آئے گی۔ مسلمانوں کی قیمتی جانیں بھی محفوظ رہیں گی اور کفار میں سے جن کی قسمت میں سعادت لکھی ہوئی مسلمان ہو سکیں گے اور آگے چل کر اسلام کی سربلندی میں حصہ لے سکیں گے۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک مہاجر صحابی تھے اور بدری تھے، مکہ میں ان کی اولاد اور مال اسباب تھا۔ وہ اصلاً قریش میں سے نہیں تھے، بلکہ ان کے حلیف تھے۔ انھوں نے قریش کو رسول اللہ ﷺ کے ارادے کی اطلاع دینے کے لیے ان کی طرف ایک خط لکھا اور ایک عورت کے ہاتھ بھیج دیا۔

صحیح بخاری میں اس کی تفصیل آئی ہے، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے، زبیر اور مقداد کو رسول اللہ ﷺ نے بھیجا کہ تم چلتے جاؤ یہاں تک روضۂ خاخ (خاخ نامی باغ) تک جا پہنچو، وہاں اونٹنی پر سوار ایک عورت ہوگی، اس سے خط لے آؤ۔ چنانچہ ہم گھوڑے دوڑاتے ہوئے روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ ہم اس باغ کے پاس جا پہنچے۔ دیکھا تو اونٹنی پر سوار وہ عورت وہاں تھی، ہم نے اس سے کہا: ''خط نکال۔'' اس نے کہا: ''میرے پاس کوئی خط نہیں۔'' ہم نے کہا: ''تم ہر صورت خط نکالو گی یا ہم تمھارے کپڑے اتاریں گے۔'' چنانچہ اس نے وہ خط اپنی چوٹی سے نکال کے دے دیا۔ ہم اسے لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مکہ کے کچھ لوگوں کے نام ہے، جو مشرکین میں سے تھے۔ اس میں انھوں نے انھیں رسول اللہ ﷺ کے بعض امور کی خبر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( یَا حَاطِبُ! مَا هٰذَا ؟ )) ''حاطب! یہ کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! مجھ پر جلدی نہ کریں، میں ایسا آدمی تھا جو قریش کے ساتھ جڑا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ یقیناً انھوں نے اس حق سے انکار کیا جو تمھارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور خود تمھیں اس لیے نکالتے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان لائے ہو، جو تمھارا رب ہے، اگر تم میرے راستے میں جہاد کے لیے اور میری رضا تلاش کرنے

ہوا تھا، ان کا حلیف تھا، اصلاً ان میں سے نہیں تھا اور آپ کے ساتھ جو مہاجرین ہیں ان کی وہاں کئی قرابتیں ہیں، جن کے ذریعے سے وہ اپنے اہل و عیال اور اموال کی حفاظت رکھتے ہیں۔ تو میں نے چاہا کہ جب میرا ان سے کوئی نسبی رشتہ نہیں تو میں ان پر ایک احسان کر دوں جس کی وجہ سے وہ میرے گھر والوں کی حفاظت رکھیں۔ میں نے یہ کام نہ اپنے دین سے مرتد ہونے کی وجہ سے کیا ہے اور نہ ہی اسلام لانے کے بعد کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے کیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكُمْ )) ''سن لو! اس نے یقیناً تم سے سچ کہا ہے۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیں، میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ عَلٰى مَنْ شَهِدَ بَدْرًا قَالَ اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ )) ''یہ تو بدر میں شریک ہوا ہے اور تجھے کیا معلوم شاید اللہ نے بدر میں شریک ہونے والوں کو جھانک کر کہا ہو کہ تم جو چاہو کرو، کیونکہ میں نے تمھیں بخش دیا ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما دی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ...... فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ...... تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔'' [ بخاري، المغازي، باب غزوة الفتح : ٤٢٧٤ ]

**آیت 1** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ : '' عَدُوٌّ '' ''عَدَا يَعْدُوْ عَدْوًا وَعَدَاوَةً'' سے '' فَعُوْلٌ '' بمعنی ''فَاعِلٌ'' کے وزن پر ہے، دشمن۔ ''فَعِيْلٌ'' اور '' فَعُوْلٌ '' دونوں صیغے واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث کے لیے ایک ہی لفظ کے ساتھ آ جاتے ہیں، اس لیے ترجمہ ''میرے دشمنوں'' کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہنے کے بجائے کہ کفار اور مشرکین کو دوست نہ بناؤ، یہ فرمایا کہ میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ پھر '' عَدُوِّيْ '' (میرے دشمنوں ) کا ذکر پہلے کیا اور '' عَدُوَّكُمْ '' (اپنے دشمنوں ) کا ذکر بعد میں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافر و مشرک کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان کی دشمنی کی بنیاد نہ وطن ہے نہ نسب اور نہ مال، بلکہ انھوں نے مسلمانوں کی دشمنی صرف اللہ تعالیٰ کی دشمنی کی وجہ سے اختیار کر رکھی ہے۔ اللہ کی دشمنی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی توحید، اس کے دین اور اس کے رسول کو نہیں مانتے، اس لیے انھوں نے ان کی شدید مخالفت اور دشمنی اختیار کر رکھی ہے۔ '' عَدُوِّيْ '' کو '' عَدُوَّكُمْ '' سے پہلے لانے کی مناسبت یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے دین کے دشمن پہلے ہیں، پھر اس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ آیت میں

اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۚ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۚ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ①

کے لیے نکلے ہو۔تم ان کی طرف چھپا کر دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ میں زیادہ جاننے والا ہوں جو کچھ تم نے چھپایا اور جو تم نے ظاہر کیا اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا①

کفار و مشرکین کی عداوت کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو ان کی دوستی سے منع فرمایا گیا ہے۔قرآن مجید میں کئی مقامات پر کفار کی دوستی سے منع کیا گیا ہے اور ساتھ ہی دوستی سے ممانعت کی کوئی نہ کوئی وجہ بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۸)، نساء (۱۴۴)، مائدہ (۵۱، ۵۷) اور سورۂ توبہ (۲۳، ۲۴) ان تمام وجوہات میں بنیادی بات یہی ہے کہ وہ تمھارے اور تمھارے دین کے دشمن ہیں، جب تک تم کافر نہ ہو جاؤ وہ کبھی تمھارے دوست نہیں ہو سکتے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۲۰) اور سورۂ نساء (۸۹)۔

② تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "اَلْمَوَدَّةُ" "تُلْقُوْنَ" کا مفعول بہ ہے اور اس پر "باء" تاکید کے لیے آئی ہے، اس صورت میں معنی یہ ہے کہ تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو۔ دوسرا معنی یہ کہ "تُلْقُوْنَ" کا مفعول بہ محذوف ہے: "أَيْ تُلْقُوْنَ إِلَيْهِمُ الْأَخْبَارَ بِالْمَوَدَّةِ" "یعنی تم دوستی کی وجہ سے ان کی طرف خبریں پہنچاتے ہو (جن کا اللہ کے دشمنوں اور تمھارے دشمنوں کو کسی صورت علم نہیں ہونا چاہیے)۔"

③ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ: یعنی انھوں نے تو وہ حق ماننے ہی سے انکار کر دیا ہے جو تمھارے پاس آیا ہے اور تم ہو کہ ان کی طرف دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

④ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ : "اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ" سے پہلے لام محذوف ہے، یعنی انھوں نے صرف کفر اور معمولی دشمنی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رشتہ داری اور محبت کے تمام سلسلے قطع کر کے رسول کو اور تمھیں اتنی ایذا دی کہ تم سب کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا، صرف اس وجہ سے کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو۔ اس جملے کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ بروج (۸) اور سورۂ حج (۴۰) "يُخْرِجُوْنَ" مضارع کا صیغہ لانے کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ انھوں نے تمھیں نکالا ہے بلکہ وہ تمھیں نکالنے پر ابھی تک قائم ہیں اور اب بھی تمھیں تمھارے گھروں میں واپس نہیں آنے دے رہے۔ اس میں مسلمانوں کو کفار کی دشمنی کے لیے ابھارا گیا ہے کہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ تمھارے رسول کو اور تمھیں نکال رہے ہیں اور تم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو۔

⑤ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ...... : "جِهَادًا" اور "ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ" دونوں "خَرَجْتُمْ" کے مفعول لہٗ ہیں اور "اِنْ كُنْتُمْ" شرط کی جزا محذوف ہے جو آیت کے پہلے جملے "لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ" سے معلوم ہو رہی ہے، یعنی اگر تم میرے راستے میں جہاد کے لیے اور میری رضا تلاش کرنے کے لیے نکلے ہو تو میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ؕ۝۲

اگر وہ تمھیں پائیں تو تمھارے دشمن ہوں گے اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تمھاری طرف برائی کے ساتھ بڑھائیں گے اور پسند کریں گے کہ تم کفر کرو ۝۲

۶ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ...... : یعنی تم پر تعجب ہے کہ تم چھپ کر ان کی طرف دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ میں ان باتوں کو جو تم نے چھپائیں اور جو ظاہر کیں تم سے اور ہر ایک سے بڑھ کر جاننے والا ہوں۔ سو تمھیں یہ سوچ کر بھی ایسی حرکت سے اجتناب کرنا چاہیے کہ تمھارا مالک تمھارے ہر کام سے پوری طرح آگاہ ہے اور تم اپنی کوئی حرکت اس سے کسی طرح بھی نہیں چھپا سکتے۔

۷ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ : یعنی یہ صرف حاطب رضی اللہ عنہ یا کسی مہاجر کی مشرکین مکہ کے ساتھ دوستی کا معاملہ نہیں، بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں میں سے جو بھی یہ کام کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

۸ اس آیت سے مخلصین پر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا اظہار بھی ہو رہا ہے کہ اتنی بڑی غلطی کرنے والوں کو "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کے ساتھ خطاب ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت اور گناہ کی وجہ سے آدمی کافر نہیں ہوتا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضی اللہ عنہ کی غلطی سے درگزر فرمایا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی آدمی کے معاملات میں اس کی سابقہ زندگی کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔

**آیت 2** ۱ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً ...... : اس میں پچھلی آیت کے آخری جملے کی وجہ بیان فرمائی ہے، یعنی تم میں سے جو شخص اس توقع پر کفار و مشرکین سے دوستی رکھے اور ان کی طرف خفیہ پیغام بھیجے کہ وہ مشکل وقت میں اس کے کام آئیں گے یا اس کے اہل و عیال کا خیال رکھیں گے، تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر غلط راستے پر چل پڑا ہے، کیونکہ ان کافروں کے دلوں میں تمھارے لیے اس قدر بغض و عناد ہے کہ وہ تمھیں زندہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، کسر صرف اتنی ہے کہ ان کا بس نہیں چل رہا اور تم ان کے قابو میں نہیں آ رہے۔ اگر کسی وقت ان کا بس چل جائے اور تم ان کے قابو میں آ جاؤ تو وہ پہلے کی طرح تمھارے دشمن ہی ہوں گے اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ تمھاری طرف بڑھائیں گے، تم پر دست درازی اور زبان درازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ﴾ [ التوبۃ : ۸ ] "(مشرکین کے کسی عہد کا اعتبار) کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ اگر تم پر غالب آ جائیں تو تمھارے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کریں گے اور نہ کسی عہد کا۔"

۲ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ : "لَوْ" مصدریہ ہے: "أَيْ وَدُّوْا كُفْرَكُمْ" یعنی ان کی خواہش یہی ہوگی کہ تم کافر ہو جاؤ، اس کے بغیر وہ تم سے کسی طرح بھی راضی نہیں ہوں گے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۰۹، ۱۲۰) اور سورۂ نساء (۸۹)۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ③ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؗ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ

قیامت کے دن ہرگز نہ تمھاری رشتہ داریاں تمھیں فائدہ دیں گی اور نہ تمھاری اولاد، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے ③ یقیناً تمھارے لیے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے ایک اچھا نمونہ تھا، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک ہم تم سے اور ان تمام چیزوں سے بری ہیں جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم تمھیں نہیں مانتے اور ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا، یہاں تک کہ تم اس اکیلے اللہ پر ایمان لاؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے کہنا (تمھارے لیے نمونہ نہیں) کہ بے شک میں تیرے لیے بخشش کی دعا ضرور کروں گا اور میں تیرے لیے اللہ سے کسی چیز (کے دلوانے) کا مالک نہیں

**آیت 3** ① لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ : "اَرْحَامٌ" "رَحِمٌ" کی جمع ہے، رشتہ داری۔ مراد "ذَوُو الْاَرْحَامِ" ہے، رشتہ دار۔ یعنی وہ رشتہ دار اور اولاد جن کی خاطر تم اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہو قیامت کے دن وہ تمھیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں دیں گے کہ تمھیں اس گناہ کی سزا سے یہ کہہ کر بچا لیں کہ انھوں نے ہماری خاطر یہ غلطی کی تھی۔

② يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ قیامت کے دن تمھارے درمیان اور تمھارے ارحام و اولاد کے درمیان جدائی ڈال دے گا، کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۞ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ۞ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ۞ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ [ عبس : ۳۴ تا ۳۷ ] "جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ (سے)۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔ اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی۔" پچھلی آیت میں ان لوگوں کا حال بتایا جن سے دوستی کی جا رہی ہے اور اس آیت میں ان لوگوں کا حال بیان کیا جن کی خاطر کفار سے دوستی کی جا رہی ہے۔

③ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ : اس میں فرماں برداروں کے لیے وعدہ اور نافرمانوں کے لیے وعید ہے۔

**آیت 4** ① قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ : "اُسْوَةٌ" اور "قُدْوَةٌ" کے معنی ہیں جس کی پیروی کی جائے، نمونہ (اچھا ہو یا برا)، اس لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اسوۂ حسنہ فرمایا۔ یعنی اللہ کے دشمن کفار و مشرکین کے ساتھ دوستی کے سلسلے میں تمھارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں پہلے سے ایک اچھا نمونہ موجود تھا جو

وَ مَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ١ؕ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَیْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ④

ہوں، اے ہمارے رب! ہم نے تجھی پر بھروسا کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ④

تمھارے پیش نظر رہنا چاہیے تھا۔ ” وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ “ سے مراد ان پر ایمان لانے والے ساتھی ہیں۔

❷ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ ...... ”بُرَءٰٓؤُا“ ”بَرِیْءٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”كَرِیْمٌ“ کی جمع ”كُرَمَاءُ“ ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھی تمھارے لیے اس بات میں نمونہ ہیں کہ انھوں نے اپنی مشرک قوم سے، ان کے شرک سے اور ان کے معبودوں سے بری اور لاتعلق ہونے کا اعلان کر دیا۔ ”وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ“ میں ”مَا“ مصدریہ بھی ہو سکتا ہے اور موصولہ بھی۔

❸ كَفَرْنَا بِكُمْ: ہم تمھیں نہیں مانتے، نہ تمھارے دین کو، نہ تمھارے خداؤں کو اور نہ ان کی عبادت کو۔

❹ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا ...... : یعنی ہمارے اللہ پر ایمان لانے اور تمھارے کفر پر قائم رہنے کے بعد ہمارے اور تمھارے درمیان کھلی دشمنی اور دلی بغض ہمیشہ کے لیے ظاہر ہو گیا ہے، یہاں تک کہ تم اکیلے اللہ پر ایمان لے آؤ۔

❺ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ: یعنی ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے، سوائے اس بات کے جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہی کہ میں تمھارے لیے بخشش کی دعا ضرور کروں گا۔ اس بات میں وہ تمھارے لیے نمونہ نہیں ہیں اور نہ ہی اس میں ان کی پیروی جائز ہے۔ مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت اور ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ کی آیات (۱۱۳، ۱۱۴) کی تفسیر۔

❻ وَ مَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ: یعنی میں تمھارے لیے استغفار ضرور کروں گا، مگر میں تمھارے لیے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کے دلوانے کا مالک نہیں، وہ چاہے گا تو تمھیں بخش دے گا، نہیں تو عذاب دے گا۔ معلوم ہوا کہ یہ اختیار پیغمبروں کے پاس بھی نہیں کہ وہ جسے چاہیں بخشوائیں، خواہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے والد ہوں یا نوح علیہ السلام کا بیٹا یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب ہوں۔

❼ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا: یہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا کلام ہے جو ” اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ ...... “ سے پہلے کلام کے ساتھ ملا ہوا ہے اور ان چیزوں میں شامل ہے جن میں ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی پیروی کا حکم ہے۔ گویا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے یہ کہا: ﴿ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ ...... حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ ﴾ اور اپنے رب سے یہ کہا: ﴿ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا ...... اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴾ یہ دونوں باتیں کہنے میں وہ ہمارے لیے نمونہ ہیں اور ہمیں ان کی پیروی کا حکم ہے۔

❽ وَ اِلَیْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ: ”اَنَبْنَا“ ”اَنَابَ یُنِیْبُ اِنَابَةً“ (افعال) سے جمع متکلم ماضی معلوم کا صیغہ ہے۔ ”الْمَصِیْرُ“ ”صَارَ یَصِیْرُ“ سے مصدر میمی ہے۔ ”عَلَیْكَ“ اور ”اِلَیْكَ“ پہلے آنے سے قصر کا مفہوم حاصل ہو رہا ہے کہ اے ہمارے رب! ہم نے تجھی پر بھروسا کیا، کسی اور پر نہیں اور تیری ہی طرف رجوع کیا، کسی اور کی طرف نہیں، (تو نے ہی سب کو پیدا کیا) اور (آخر کار) تیری ہی طرف واپس آنا ہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اے ہمارے رب! ہمیں ان لوگوں کے لیے آزمائش نہ بنا جنھوں نے کفر کیا اور ہمیں بخش دے اے ہمارے رب! یقیناً تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ⑤ بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے ان میں اچھا نمونہ تھا، اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور جو کوئی منہ پھیرے تو یقیناً اللہ ہی وہ ذات ہے جو بے پروا ہے، تمام تعریفوں کے لائق ہے ⑥ قریب ہے کہ اللہ تمھارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تم ان میں سے دشمنی رکھتے ہو، دوستی پیدا کر دے اور اللہ بہت قدرت رکھنے والا ہے اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ⑦

**آیت 5** ① رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۸۵) کی تفسیر۔

② وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ...... : پہلی تمام دعائیں حرفِ عطف کے بغیر ہیں اور یہ واؤ عطف کے ساتھ ہے، کیونکہ پہلی تمام دعاؤں میں دنیوی زندگی میں اپنے دین کی اصلاح اور اس پر استقامت مانگی گئی ہے اور اس میں اخروی زندگی کی اصلاح کی درخواست ہے۔ دونوں کے درمیان مغایرت کی وجہ سے درمیان میں واؤ عطف لائی گئی ہے۔ (ابن عاشور)

**آیت 5** ① لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ......: اس سے پہلے "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ" میں یہی بات ذکر ہوئی ہے، لامِ قسم کے ساتھ اسے دوبارہ لانے سے ایک تو اس حکم کی تاکید مقصود ہے اور ایک اس کے بعد "لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ" لا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھی ان لوگوں کے لیے نمونہ نہیں جن کی ساری جدوجہد دنیا کے لیے ہے، بلکہ وہ صرف ان لوگوں کے لیے نمونہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتے ہیں۔

② لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ احزاب (۲۱) کی تفسیر۔

③ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ: یعنی جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کی امید سے منہ موڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ وہ تو غنی و حمید ہے اور غنی و حمید بھی ایسا کہ اس کے سوا کوئی غنی و حمید ہے ہی نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ فاطر (۱۵)، حج (۶۴) اور سورۂ حدید (۲۴) کی تفسیر۔

**آیت 7** ① عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے مشرک رشتہ داروں سے قطع تعلق کا جو حکم دیا اس کے مطابق اپنے عزیزوں سے ناتا توڑنا اگرچہ نہایت مشکل کام تھا مگر انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی اور کسی قرابت کی پروا نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق و اخلاص کو دیکھ کر اس آیت کے ساتھ

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۸

اللہ تمھیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنھوں نے نہ تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور نہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۸

ان کی دلجوئی فرمائی اور انھیں بشارت دی کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ دین کی وجہ سے تمھاری دشمنی ہے دوستی پیدا کر دے، تمھارے یہ عزیز مسلمان ہو جائیں اور دشمنی پھر محبت میں بدل جائے۔

2 وَ اللّٰهُ قَدِیْرٌ : بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کو مکہ سے نکالا، مدینے میں بھی چین نہ لینے دیا، بدر و احد، خندق اور دوسرے معرکے برپا کیے وہ دوبارہ دوست بن جائیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لیے دلوں کو پھیر دینا کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے بعد تھوڑی مدت ہی گزری تھی کہ مکہ فتح ہو گیا، قریش اور دوسرے قبائل فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے اور سوائے ان کفار کے جو قتل ہو گئے تھے، آخر کار سب مسلمان ہو گئے، حتیٰ کہ جزیرۂ عرب میں کوئی مشرک باقی نہ رہا۔ ابوسفیان اور دوسرے قریشی سردار جو مسلمانوں کے خلاف لڑتے آئے تھے، اب اسلام کی سربلندی کے لیے سربکف ہو کر لڑنے لگے۔

3 وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ : یعنی مشرکین نے اب تک اہل ایمان سے جو عداوت رکھی اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت و رحمت کی وجہ سے اس سے درگزر فرما کر انھیں ایمان لانے اور مسلمانوں کے دوست بن جانے کی توفیق عطا فرمانے والا ہے۔

آیت 8 1 لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ ...... : اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو دو گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ ایک محارب جو مسلمانوں سے ضد اور عناد رکھتے تھے، انھیں ایذا دیتے، ان کے گھروں سے نکالنے اور ان سے لڑنے میں سرگرم تھے، یا ایسے لوگوں کی پشت پناہی اور مدد کرتے تھے۔ دوسرے مسالم جو کافر تو تھے مگر روادار تھے، غیر جانبدار بن کر رہے، مسلمانوں کو نہ کوئی دکھ پہنچایا اور نہ ان کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لیا۔ ان میں مکہ کے اردگرد رہنے والے کئی قبائل تھے، جیسے بنو خزاعہ اور بنو حارث وغیرہ جو مسلمانوں کے حلیف تھے یا کفار قریش کے مقابلے میں مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اہل مکہ میں بھی اس طرح کے کئی لوگ تھے، خصوصاً بنو ہاشم اور بنو مطلب کے اکثر لوگوں کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ مہاجرین کی بہت سی رشتہ دار عورتیں اور بچے جو مکہ میں تھے اور ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر ان سے اُنس اور تعلق رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی دلی خواہش ایسے لوگوں سے تعلق رکھنے کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ایسے لوگوں سے نیک سلوک اور ان کے حق میں انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا۔

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میری ماں نبی ﷺ کے زمانے میں (معاہدۂ صلح کے دوران حسن سلوک کی) امید

اِنَّمَا يَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قٰتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَ اَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ وَ ظٰهَرُوۡا عَلٰۤى اِخۡرَاجِكُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ‌ۚ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۞ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا جَآءَكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامۡتَحِنُوۡهُنَّ‌ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِهِنَّ‌ۚ فَاِنۡ عَلِمۡتُمُوۡهُنَّ مُؤۡمِنٰتٍ فَلَا تَرۡجِعُوۡهُنَّ اِلَى الۡكُفَّارِ‌ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمۡ وَلَا هُمۡ يَحِلُّوۡنَ لَهُنَّ‌ؕ وَاٰتُوۡهُمۡ

اللہ تو تمھیں انھی لوگوں سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو۔ اور جو ان سے دوستی کرے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں ⑨ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمھارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کی جانچ پڑتال کرو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جاننے والا ہے۔ پھر اگر تم جان لو کہ وہ مومن ہیں تو انھیں کفار کی طرف واپس نہ کرو، نہ یہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان کے لیے حلال ہوں گے۔ اور انھیں دے دو جو انھوں

---

رکھتے ہوئے میرے پاس آئی، میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''کیا میں اس سے حسن سلوک کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' ابن عیینہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَا يَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ﴾ ''اللہ تمھیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی۔'' [بخاري، الأدب، باب صلة الوالد المشرك : ٥٩٧٨ ] اسی طرح ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ریشمی حلہ عطا فرمایا، انھوں نے وہ اپنے ایک مشرک بھائی کو دے دیا جو مکہ میں رہتا تھا۔ [ بخاري، الأدب، باب صلة الأخ المشرك : ٥٩٨١ ]

**آیت 9** اِنَّمَا يَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قٰتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ...... : ان لوگوں سے مراد وہ کفار ہیں جن کا تذکرہ شروع سورت سے آ رہا ہے۔

**آیت 10** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا جَآءَكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ...... : ان آیات میں مشرکین سے قطع تعلق کی وجہ سے پیش آنے والے کئی معاملات کا حکم بیان فرمایا، مثلاً کفار کی بیویاں جو مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مسلمانوں کے پاس آ جائیں، انھیں واپس کیا جائے گا یا نہیں اور میاں بیوی میں سے کسی ایک کے مسلمان ہو جانے سے ان کا باہمی نکاح باقی رہتا ہے یا نہیں وغیرہ۔

② حدیبیہ کے موقع پر کفار کے نمائندے سہیل بن عمرو نے صلح کی جو شرائط طے کی تھیں ان میں سے ایک شرط جو مسلمانوں کو منظور نہ تھی مگر سہیل نے اس کے بغیر صلح کرنے سے انکار کر دیا، یہ تھی: (( لَا يَأْتِيْكَ مِنَّا أَحَدٌ وَّ إِنْ كَانَ عَلٰی دِيْنِكَ إِلَّا رَدَدْتَهُ إِلَيْنَا وَخَلَّيْتَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ )) [ بخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية : ٤١٨٠، ٤١٨١ ] ''ہم میں سے جو بھی آپ کے پاس آئے گا خواہ وہ آپ کے دین پر ہو، آپ اسے ہماری طرف واپس کریں گے اور ہمارے اور اس کے درمیان کوئی دخل

مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَ لَا تُمْسِكُوْا

نے خرچ کیا ہے اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ ان سے نکاح کر لو، جب انھیں ان کے مہر دے دو۔ اور کافر عورتوں کی

نہیں دیں گے۔'' اللہ تعالیٰ کا عجیب تصرّف دیکھیے کہ سہیل اس میں یہ صراحت نہ لکھوا سکا کہ اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے: (( فَقَالَ سُهَيْلٌ وَ عَلٰى أَنَّهُ لَا يَأْتِيْكَ مِنَّا رَجُلٌ وَّ إِنْ كَانَ عَلٰى دِيْنِكَ إِلَّا رَدَدْتَهُ إِلَيْنَا )) [ بخاري، الشروط، باب الشروط في الجهاد و المصالحة ...... : ۲۷۳۱، ۲۷۳۲ ] ''سہیل نے کہا، یہ شرط بھی کہ ہماری طرف سے جو آدمی بھی آپ کے پاس جائے گا، چاہے وہ آپ کے دین ہی پر کیوں نہ ہو، آپ اسے ہمیں واپس کر دیں گے۔'' اب اس کے بعد کفار یہ کہہ ہی نہیں سکتے تھے کہ آپ مسلمان ہونے والی عورتوں کو واپس کیوں نہیں کرتے۔ جب معاہدہ طے ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے تمام صحابہ کو قربانی کرنے اور سر منڈ وانے کے ساتھ احرام کھولنے کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر سہیل کا بیٹا ابو جندل رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے باپ کے مطالبے پر اسے واپس کر دیا، اس کے علاوہ بھی صلح کی اس مدت میں آپ کے پاس مکہ سے جو مرد آیا آپ نے اسے واپس کر دیا خواہ وہ مسلمان ہی تھا۔ اب کئی عورتیں جو ایمان لے آئی تھیں ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں، ان میں ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط بھی تھیں۔ اس وقت وہ جوان تھیں، ان کے گھر والے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انھیں واپس کر دینے کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہدایات نازل فرمائیں۔
[ بخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية : ۴۱۸۰، ۴۱۸۱ ]

3 فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ...... : ایمان والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمھارے پاس آئیں تو ان کی جانچ پڑتال کرو کہ وہ ایمان ہی کی وجہ سے ہجرت کر کے آئی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔ اس جانچ پڑتال میں تم اس بات کے مکلف نہیں کہ ان کے دل میں چھپی ہوئی بات معلوم کرو، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، تمھارا کام یہ ہے کہ اگر وہ ان باتوں کا عہد کریں جو اگلی آیت (۱۲) میں آ رہی ہیں تو انھیں کفار کی طرف واپس مت کرو۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کر کے آنے والے کسی مرد کے امتحان کا حکم نہیں دیا، کیونکہ ان کے امتحان کے لیے ہجرت اور جہاد کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مہاجرین کے صادق الایمان ہونے کی شہادت دی ہے۔ (دیکھیے حشر : ۸) جب کہ عورتوں پر جہاد فرض نہیں جس سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ (شنقیطی)

4 لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ : اس میں انھیں واپس نہ کرنے کی علت بیان فرمائی ہے کہ نہ مومن عورتیں کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ ہی کافر مرد مومن عورتوں کے لیے حلال ہیں، اس لیے اگر کوئی عورت مسلمان ہو جائے تو اسے اس کے کافر خاوند سے جدا کر لیا جائے گا۔ پھر اگر وہ اپنے خاوند کے مسلمان ہونے کا انتظار کرے اور خاوند مسلمان ہو جائے تو نکاح برقرار رہے گا، خواہ عورت پہلے ہجرت کر کے آئی ہو اور خاوند بعد میں ہجرت کرے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: (( رَدَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلٰى أَبِي الْعَاصِ بْنِ الرَّبِيْعِ، بَعْدَ سِتِّ سِنِيْنَ

بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑩

عصمتیں روک کر نہ رکھو اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا ہے اور وہ (کفار) مانگ لیں جو انھوں نے خرچ کیا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ⑩

بِالنِّكَاحِ الْأَوَّلِ وَلَمْ يُحْدِثْ نِكَاحًا ﴾ [ ترمذي، النكاح، باب ما جاء في الزوجين المشركين يسلم أحدهما : ۱۱۴۳، وقال الألباني صحيح ] ''رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے ساتھ چھ سال کے بعد پہلے نکاح ہی میں واپس بھیج دیا اور نیا نکاح نہیں کیا۔'' اور اگر عورت اپنے خاوند کے مسلمان ہونے کا انتظار نہ کرے تو اسے اجازت ہے، کہ کسی مسلمان کے ساتھ نکاح کر لے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

⑤ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا: یعنی ہجرت کر کے آنے والی مسلم عورتوں کے مشرک خاوندوں نے ان کے نکاح پر جو خرچ کیا ہے وہ انھیں واپس کر دو۔ یاد رہے کہ یہ احکام ان مشرکین کی عورتوں کے بارے میں ہیں جن کی مسلمانوں کے ساتھ صلح ہو۔

⑥ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ: یعنی اگر وہ اپنے خاوندوں کے مسلمان ہو کر آنے کا انتظار نہ کریں اور نکاح کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو ان سے نکاح کرنے کی اجازت ہے، جب ان شرطوں کو ملحوظ رکھا جائے جو نکاح کے لیے ضروری ہیں، مثلاً ولی کی اجازت، عدت پوری ہونا، مہر کی ادائیگی وغیرہ۔

⑦ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ: ''عِصَمٌ'' ''عِصْمَةٌ'' کی جمع ہے، مراد نکاح ہے اور ''الْكَوَافِرِ'' ''كَافِرَةٌ'' کی جمع ہے، جیسے ''ضَارِبَةٌ'' کی جمع ''ضَوَارِبُ'' ہے، کافر عورتیں۔ یعنی جو مرد مسلمان ہو جائیں اور ان کی بیویاں کفر پر قائم رہیں ان کے لیے انھیں اپنے نکاح میں باقی رکھنا جائز نہیں، بلکہ طلاق دے دینا لازم ہے۔ چنانچہ مِسور اور مَروان بن حکم سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دن کفار قریش سے معاہدہ کیا تو آپ کے پاس کچھ مومن عورتیں آئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ ...... وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ [ الممتحنة : ۱۰ ] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمھارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں ...... اور کافر عورتوں کی عصمتیں روک کر نہ رکھو۔'' تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس دن اپنی دو (مشرک) عورتوں کو طلاق دے دی، جن میں سے ایک کے ساتھ معاویہ بن ابوسفیان نے اور دوسری کے ساتھ صفوان بن امیہ نے نکاح کر لیا (جو اس وقت شرک پر تھے)۔ [ بخاري، الشروط، باب الشروط في الجهاد ...... : ۲۷۳۱، ۲۷۳۲ ] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قُریبہ بنت ابی امیہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھی، انھوں نے اسے طلاق دے دی تو اس سے معاویہ بن ابوسفیان نے نکاح کر لیا اور ام حکم بنت ابوسفیان عیاض بن غنم فہری کے نکاح میں تھی، انھوں نے اسے طلاق دے دی تو اس سے عبداللہ بن عثمان ثقفی نے نکاح کر لیا۔ [ بخاري، الطلاق، باب نكاح من أسلم من المشركات و عدتهن : ۵۲۸۷ ]

وَ اِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ⑪

اور اگر تمھاری بیویوں میں سے کوئی کافروں کی طرف چلی جائے، پھر تم بدلا حاصل کرو تو جن لوگوں کی بیویاں چلی گئی ہیں انھیں اتنا دے دو جتنا انھوں نے خرچ کیا ہے اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھنے والے ہو ⑪

⑧ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ...... : اس کا عطف "وَ اٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا" پر ہے۔ ہجرت کر کے آنے والی عورتیں یا تو ان مشرکین میں سے ہوتی تھیں جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی جنگ تھی، ان کے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مشرکین کا تعلق رسول اللہ ﷺ اور مومنوں سے دو طرح کا تھا، ایک اہل حرب (لڑائی والے) مشرک، آپ ﷺ ان سے لڑتے اور وہ آپ ﷺ سے لڑتے تھے اور ایک اہل عہد (معاہدے والے) مشرک۔ اہل حرب مشرکین میں سے کوئی عورت جب ہجرت کر کے آتی تو اسے اس وقت تک نکاح کا پیغام نہیں دیا جاتا تھا جب تک وہ حیض آنے کے بعد پاک نہیں ہوتی تھی۔ جب پاک ہو جاتی تو اس کے لیے نکاح حلال ہو جاتا، پھر اگر اس کا خاوند اس کے نکاح کرنے سے پہلے ہجرت کر کے آ جاتا تو وہ اسے واپس کر دی جاتی اور اگر ان کا کوئی غلام یا لونڈی ہجرت کر کے آتے تو دونوں آزاد ہو جاتے اور انھیں وہ حقوق حاصل ہو جاتے جو دوسرے مہاجرین کو حاصل تھے۔ (پھر معاہدے والوں کے متعلق مجاہد کی حدیث کی طرح ذکر کیا) اور اگر معاہدے والے مشرکین کا کوئی غلام یا لونڈی ہجرت کر کے آتے تو انھیں واپس نہیں کیا جاتا تھا اور ان کی قیمتیں دے دی جاتی تھیں۔" [ بخاري، الطلاق، باب نكاح من أسلم من المشركات و عدتهن : ۵۲۸۶ ]

ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورتوں کی دوسری قسم ان مشرکین کی بیویاں تھیں جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا معاہدۂ صلح تھا۔ اس آیت میں ان کا حکم بیان ہوا ہے کہ انھیں مشرکین کی طرف واپس مت کرو، بلکہ انھوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ انھیں دے دو اور کافر عورتوں کو بھی روک کر مت رکھو، بلکہ انھیں طلاق دے دو اور چونکہ تمھاری آپس میں صلح ہے اس لیے جن مشرک عورتوں کو تم نے چھوڑا ہے ان پر کیا ہوا خرچ تم مشرکین سے مانگ لو اور وہ ان عورتوں پر کیا ہوا خرچ تم سے مانگ لیں جو ہجرت کر کے تمھارے پاس آئی ہیں۔

**آیت 11** وَ اِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ ...... : یعنی اگر کافر ان عورتوں کا مہر مسلمانوں کو واپس نہ کریں جو کافر ہو کر یا کافر رہ کر دارالاسلام سے کفار کے ہاں چلی جائیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ کافروں کا جو مال لوٹیں اس میں سے ان مسلمان شوہروں کا خرچ ادا کریں جن کی بیویاں دارالکفر کو بھاگ جائیں، یا دارالکفر سے جو عورتیں مسلمان ہو کر دارالاسلام میں آ جائیں ان کے مہر کافروں کو واپس کرنے کے بجائے ان مسلمان شوہروں کو ادا کریں جن کی بیویاں دارالکفر کو بھاگ جائیں۔ "فَعَاقَبْتُمْ" (پھر تم بدلا حاصل کرو) کے مفہوم میں دونوں چیزیں شامل ہیں، یعنی لڑائی میں مال غنیمت حاصل کرنا یا مقابلہ میں ان کی عورتوں کا مہر ادا کرنا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں، اس "فَعَاقَبْتُمْ" کے مفہوم میں وسعت ہے، اگر کفار کا مہر ادا کرنا

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا

اے نبی! جب تیرے پاس مومن عورتیں آئیں، تجھ سے بیعت کرتی ہوں کہ وہ نہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک

باقی ہو تو مسلمانوں کو وہ دے دیا جائے، ورنہ مال غنیمت سے اس کے نقصان کی تلافی کر دی جائے۔ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (اشرف الحواشی)

آیت 12 ❶ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ ...... : عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جو مومن عورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آتیں آپ ان کا امتحان اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ لیتے تھے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ ...... غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ تو ان مومن عورتوں میں سے جو اس شرط کا اقرار کر لیتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرماتے: « قَدْ بَايَعْتُكِ » ''میں نے تم سے بیعت لے لی۔'' صرف کلام کے ساتھ اور اللہ کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ نے بیعت لیتے وقت کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا، آپ ان سے صرف ان الفاظ کے ساتھ بیعت لیتے تھے: « قَدْ بَايَعْتُكِ عَلٰى ذٰلِكَ » [ بخاري، التفسير، سورة الممتحنة، باب : ﴿ إذا جاءكم المؤمنات مهاجرات ﴾ : ٤٨٩١ ] ''میں نے ان باتوں پر تم سے بیعت لے لی۔''

اُمیمہ بنت رُقیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں چند عورتوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ سے بیعت کرنے کے لیے آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے قرآن کی اس آیت کے مطابق بیعت لی: ﴿ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا ...... ﴾ اور فرمایا: « فِيْمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَأَطَقْتُنَّ » ''جتنی تم استطاعت اور طاقت رکھو۔'' ہم نے کہا: ''اللہ اور اس کا رسول ہم سے زیادہ ہم پر رحم کرنے والے ہیں۔'' ہم نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا آپ ہم سے مصافحہ نہیں کرتے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنِّيْ لَا أُصَافِحُ النِّسَاءَ إِنَّمَا قَوْلِيْ لِامْرَأَةٍ وَاحِدَةٍ كَقَوْلِيْ لِمِائَةِ امْرَأَةٍ » [ مسند أحمد : ٣٥٧/٦، ح : ٢٧٠٠٩۔ ترمذي، السير، باب ما جاء في بيعة النساء : ١٥٩٧، وصححه الترمذي والألباني ] ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، میری بات ایک عورت سے اسی طرح ہے جیسے ایک سو عورتوں سے ہو۔''

❷ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت جیسے اہم موقع پر کسی عورت سے مصافحہ نہیں کیا تو کسی اور کے لیے غیر محرم عورت سے مصافحہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ کفار کی تقلید میں غیر محرم عورتوں سے مصافحے کا رواج اور تقدّس کے پردے میں پیروں کا اجنبی عورتوں سے مصافحہ دونوں حرام ہیں، کیونکہ نیت کے خلل کے ساتھ وہ زنا کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں اور سدّ ذرائع (گناہ کے ذریعوں سے روکنا) شریعت کا مسلّم اصول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « فَالْعَيْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظَرُ وَالْأُذُنَانِ زِنَاهُمَا الْاِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ زِنَاهُ الْكَلَامُ وَالْيَدُ زِنَاهَا الْبَطْشُ وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا وَالْقَلْبُ يَهْوٰى وَيَتَمَنّٰى وَيُصَدِّقُ ذٰلِكَ الْفَرْجُ وَيُكَذِّبُهُ » [ مسلم، القدر، باب قدر على ابن آدم حظه من الزنى وغيره : ٢٦٥٧/٢١ ] ''پس آنکھیں، ان کا زنا دیکھنا ہے اور کان، ان کا زنا توجہ سے سننا ہے اور زبان، اس کا زنا کلام ہے اور ہاتھ، اس کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں، اس کا

يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ

ٹھہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ کوئی بہتان لائیں گی جو اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان گھڑ رہی ہوں اور نہ کسی نیک کام میں تیری نافرمانی کریں گی تو اُن سے بیعت لے

زنا چلنا ہے اور دل خواہش کرتا ہے اور تمنا کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق کر دیتی ہے یا اس کی تکذیب کر دیتی ہے۔‘‘

3 جاہلی معاشرے میں اللہ کے ساتھ شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد اور بہتان کا رواج عام تھا، اس لیے ان کا خاص طور پر ذکر کر کے ان سے منع فرمایا، جیسا کہ وفد عبدالقیس کو خاص طور پر ان برتنوں کے استعمال سے بھی منع فرمادیا جن میں شراب بنائی جاتی تھی، کیونکہ وہ مسلمان ہو چکے تھے مگر ابھی تک ان میں شراب نوشی کا رواج باقی تھا۔ رہی دوسری منع کردہ چیزیں یا وہ چیزیں جن پر عمل کا حکم دیا ہے، تو وہ سب ”وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ“ میں آ گئی ہیں۔ یہاں چونکہ عورتوں کی آمد کا ذکر ہے اس لیے ان کا نام لیا، ورنہ رسول اللہ ﷺ مردوں سے بھی انھی باتوں پر بیعت لیتے تھے۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر جب آپ کے گرد آپ کے اصحاب کی ایک جماعت موجود تھی فرمایا: (( بَايِعُوْنِيْ عَلٰی أَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَّلَا تَسْرِقُوْا، وَلَا تَزْنُوْا، وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ، وَلَا تَأْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ أَيْدِيْكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ، فَمَنْ وَفٰی مِنْكُمْ فَأَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهٗ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَی اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَ إِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ، فَبَايَعْنَاهُ عَلٰی ذٰلِكَ )) [ بخاري، الإيمان، باب علامة الإيمان حب الأنصار : ١٨ ] ”مجھ سے اس پر بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرو گے اور چوری نہیں کرو گے اور زنا نہیں کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے اور کوئی بہتان نہیں لاؤ گے جسے تم اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ کر لا رہے ہو گے اور کسی نیک کام میں نافرمانی نہیں کرو گے۔ پھر تم میں سے جس نے اس عہد کو پورا کیا اس کا اجر اللہ پر ہے اور جس نے ان میں سے کوئی کام کر لیا، پھر اسے دنیا میں اس کی سزا مل گئی تو وہ اس کے لیے گناہ دور کرنے کا باعث ہے اور جس نے ان میں سے کوئی کام کیا، پھر اللہ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو وہ اللہ کے سپرد ہے، اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے۔“ تو ہم نے اس پر آپ ﷺ سے بیعت کر لی۔‘‘

حدیبیہ اور فتح مکہ کے موقع پر ہجرت کر کے آنے والی عورتوں کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے عورتوں سے ان باتوں پر بیعت لی ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے موقع پر مردوں کو خطبہ دینے کے بعد عورتوں کی طرف آئے اور فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ ...... ﴾ پھر جب آپ آیت کی تلاوت سے فارغ ہوئے تو عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا: (( أَنْتُنَّ عَلٰی ذٰلِكَ؟ )) ”کیا تم اس پر قائم ہو؟“ ان میں سے ایک عورت نے کہا، جس کے سوا کسی نے جواب نہیں دیا: (( نَعَمْ )) ”جی ہاں!“ [ بخاري، العيدين، باب موعظة الإمام النساء يوم العيد : ٩٧٩ ]

وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

لے اور ان کے لیے اللہ سے بخشش کی دعا کر۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۲﴾

❹ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ: اس میں حمل گرانا بھی شامل ہے، خواہ جائز ہو یا ناجائز۔

❺ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ: "بُهْتَانٌ" کسی کے ذمے گھڑ کر لگایا ہوا جھوٹ جسے سن کر وہ مبہوت اور ششدر رہ جائے۔ اکثر مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کا بچہ لا کر خاوند اور دوسرے لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرے کہ اس کی ولادت اس کے شکم سے ہوئی ہے، خواہ وہ کوئی گرا ہوا بچہ اٹھا کر لے آئی ہو یا کسی اور طرح سے لے آئی ہو۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب خاوند مدت تک غائب رہا ہو، یا خاوند کے بجائے کسی اور سے بچے کو جنم دے کر اسے خاوند کا بچہ ظاہر کرے۔ "بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ" (ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان) کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ولادت عورت کے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ہوتی ہے۔ مگر "بہتان" کو انھی صورتوں کے ساتھ خاص کرنا مشکل ہے، کیونکہ ایک تو بہتان کا لفظ عام ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے مردوں سے بیعت لی تو ان کے لیے بھی یہ الفاظ استعمال فرمائے: «وَلَا تَأْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ أَيْدِيْكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ» [ بخاري : ۱۸ ] "اور نہ تم کوئی بہتان لاؤ گے جو اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان گھڑ رہے ہوں۔" جیسا کہ پچھلے فائدے میں یہ حدیث گزری ہے۔ ظاہر ہے بہتان کی یہ صورتیں مردوں سے متعلق تصور نہیں کی جا سکتیں۔ عربی زبان میں "بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ" کا معنی "سامنے" ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾ [ البقرۃ : ۲۵۵ ] "وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے۔" "وَأَرْجُلِهِمْ" کا لفظ اس کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے اس کا سادہ مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کا وجود ہی نہیں اسے گھڑ کر پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے سامنے لا کر پیش نہ کر دیا کریں۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اس بات کی پروا نہ کرتے ہوئے کہ قیامت کے دن ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف شہادت دیں گے، وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے کسی پر بہتان نہ لگا دیا کریں، بلکہ انھیں چاہیے کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ چار گواہوں کی موجودگی میں بہتان لگا رہی ہیں۔ اس مطلب کی تائید دوسری جگہ بہتان باندھنے والوں کے ملعون ہونے کے سلسلے میں ہاتھوں اور پاؤں کی شہادت کے ذکر سے ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَىِٕذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ﴾ [ النور : ۲۳ تا ۲۵ ] "بے شک وہ لوگ جو پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں لعنت کیے گئے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں ان کا صحیح بدلا پورا پورا دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے، جو ظاہر کرنے والا ہے۔" الغرض آیت میں

بہتان کی ایک صورت نہیں بلکہ ہر قسم کے بہتان سے اجتناب کا عہد لیا گیا ہے۔

6 وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ : اس جملے میں پوری شریعت پر عمل کا اقرار آ گیا۔ اس اقرار میں ”فِيْ مَعْرُوْفٍ“ کی شرط لگانے کی کئی توجیہیں ہیں، ایک یہ کہ اس سے اس بات کی صراحت مقصود ہے کہ رسول حکم ہی معروف کا دیتا ہے، پھر اس کی معصیت کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم معروف کے سوا ہو ہی نہیں سکتا، مگر اس کے ساتھ ”مَعْرُوْفٍ“ (نیک) ہونے کی قید اس لیے لگائی تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ مخلوق کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کام میں جائز نہیں، یہاں تک کہ رسول کی اطاعت بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ تیسری یہ کہ یہاں معاملہ عورتوں کا ہے، انھیں مطلق اطاعت کے حکم سے کہ وہ آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گی، شیطان کسی کے دل میں گمراہی کا وسوسہ پیدا کر سکتا تھا، اس کا راستہ روکنے کے لیے یہ قید لگا دی۔

7 رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی کئی صورتیں مروی ہیں، جن میں سے ایک اسلام کی بیعت ہے، ایک جہاد کی، ایک بعض باتوں کی پابندی کی، مثلاً یہ کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے اور ایک کبائر سے توبہ اور اطاعت کے عہد کی۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام سے یہ تو ثابت ہے کہ انھوں نے لوگوں سے اسلام لانے کی بیعت لی اور امراء سے اطاعت کی بیعت کی، مگر خلیفہ یا امیر کے علاوہ کسی اور شخص کا لوگوں سے اپنا مرید بنانے کی بیعت لینا، جیسا کہ صوفیہ کا طریقہ ہے، صحابہ کرام کے دور بلکہ پورے خیر القرون میں ثابت نہیں، کیونکہ اس سے مسلمانوں میں فرقے اور گروہ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یہ معاملہ نقشبندی، سہروردی، چشتی اور قادری تک محدود نہیں رہتا، بلکہ ہر ایک اپنی الگ گدی اور الگ حلقہ قائم کر لیتا ہے جو صرف اس کے حکم کا پابند ہوتا ہے اور ہر پیر و مرشد کا تقاضا ہوتا ہے کہ مرید کا علم چونکہ ناقص ہے اس لیے اگر اس کا مرشد اسے شریعت کے صریح خلاف حکم دے تو وہ بھی اس کے لیے ماننا ضروری ہے، کیونکہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان حضرات نے ”فِيْ مَعْرُوْفٍ“ کی قید بھی اڑا دی، چنانچہ ان کے لسان الغیب حافظ شیرازی کہہ گئے ہیں ؎

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید  که سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

”اگر پیر مغاں تمھیں حکم دیتا ہے تو مصلے کو شراب سے رنگ لو، کیونکہ سالک منزلوں کے راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔“

حقیقت یہ ہے کہ پیری مریدی کا یہ سلسلہ امت کے کتاب و سنت سے دوری اور اس کے باہمی افتراق کا خوف ناک باعث ہے۔ آپ لاکھ قرآن و سنت سنائیں، پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والا یہی کہے گا کہ کیا ہمارے پیر کو یہ معلوم نہیں۔ رہی یہ بات کہ ہم بطور استاذ اور ہادی پیر کی بیعت کرتے ہیں، تو ایک تو اس کے لیے بیعت کی ضرورت نہیں، پھر اپنے آپ کو ایک ہی استاذ اور ہادی کے حکم کا پابند بنانا کہاں سے ثابت ہوا؟ آپ متعدد اساتذہ اور رہنماؤں سے تعلیم اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور کرنی چاہیے۔ ہاں، رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی ہر صورت ہی درست تھی، کیونکہ وہ نبی تھے، ان کے ہوتے کسی اور کی بیعت نہ تھی اور نہ ہی اس سے افتراق یا انتشار پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ پھر خلیفہ اور امیر کی بیعت درست ہے، کیونکہ اللہ اور اس کے

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ غصے ہو گیا، جو آخرت سے اسی طرح ناامید ہو چکے ہیں جس طرح وہ کافر ناامید ہو چکے جو قبروں والوں سے ہیں ﴿۱۳﴾

رسول ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے کسی اور کی بیعت جائز نہیں۔

⑧ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : یعنی اگر وہ ان باتوں کا عہد کریں تو آپ ان کی بیعت قبول کر لیں اور اس سے پہلے ان سے جو لغزشیں ہوئیں یا آئندہ بشری کمزوری کی بنا پر ہوں گی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

آیت 13 ① يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ : سورت کے شروع میں "لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ" میں مشرکین کی دوستی سے منع فرمایا تھا، آخر میں یہود کی دوستی سے منع فرمایا۔ قرآن مجید میں ''مغضوب علیہم'' عموماً یہود کو کہا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ فاتحہ میں "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" کی تفسیر۔

② قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ: اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے، ایک یہ کہ "مِنْ" بیانیہ ہے اور "اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ" "الْكُفَّارُ" کا بیان ہے۔ یعنی ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ تعالیٰ غصے ہو گیا، (کیونکہ انھوں نے حق کو جانتے ہوئے اور یہ پہچانتے ہوئے کہ آپ ﷺ سچے نبی ہیں، آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، اس لیے) وہ آخرت (کی ہر خیر) سے ناامید ہو چکے، جس طرح وہ کافر آخرت (کی ہر خیر) سے ناامید ہو چکے جو قبروں والوں میں سے ہیں، یعنی وہ کافر جو فوت ہو چکے اور اپنی آنکھوں سے اپنے عذاب کو دیکھ کر ہر خیر سے مایوس ہو چکے، ان کی طرح یہ یہودی بھی جان بوجھ کر حق کو جھٹلانے کی وجہ سے آخرت (کی ہر بھلائی) سے مایوس ہیں، سو انھیں دوست مت بناؤ۔ متن میں ترجمہ اسی مفہوم کے مطابق کیا گیا ہے اور طبری نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ "مِنْ" ابتدائیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ تعالیٰ غصے ہوا، جو آخرت کے واقع ہونے سے اسی طرح ناامید ہیں جس طرح کفار قبروں والوں کے واپس آنے سے ناامید ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں تفسیریں درست ہیں۔

③ بعض اہل علم نے ''مغضوب علیہم'' کو عام رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ جس طرح "عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ" کے الفاظ عام ہیں، اسی طرح ''مغضوب علیہم'' کے الفاظ بھی عام ہیں، ان میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین سبھی شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے سبھی کی دوستی سے منع فرمایا ہے اور ان سب پر اللہ کا غضب بھی ہے۔ سبھی آخرت میں کسی بھی خیر کی توقع سے محروم ہیں اور سب کافر اس بات سے بھی ناامید ہو چکے ہیں کہ مرنے والے ان کے پاس دوبارہ آئیں گے۔ قرآن مجید میں یہود کے علاوہ دوسرے کفار کے لیے بھی ''غضب'' کا لفظ آیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۷۱)، نحل (۱۰۶)، شوریٰ (۱۶) اور سورۂ فتح (۶)۔

سورۃ الصف ۶۱ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — آیاتہا ۱۴ رکوعاتہا ۲

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

**اللہ کا پاک ہونا بیان کیا ہر چیز نے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ① اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے ② اللہ کے نزدیک سخت ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے ③**

**آیت 1** سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ...... : اس سورت کا مضمون اللہ کے راستے میں جہاد و قتال ہے، ابتدا اس کی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ذکر سے کی گئی ہے۔ اللہ کی تسبیح سے ابتدا کی سورت کے مضمون سے مناسبت یہ ہے کہ وہ ہستی جس کی تسبیح ہر وہ چیز کرتی ہے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز بھی جو زمینوں میں ہے، تو تمام مخلوق کی طرح انسان کے لیے بھی اس کی تسبیح کرنا لازم ہے۔ پھر جو لوگ تسبیح کے بجائے اس کے ساتھ کفر و شرک کرتے ہیں تو ایمان والوں پر ان کے ساتھ لڑنا فرض ہے، کیونکہ وہ ساری کائنات کے الٹ چل رہے ہیں اور تسبیح کے بجائے اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بنا کر اس کے تمام عیوب و نقائص سے پاک ہونے کی نفی کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر توہین کیا ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک لہ اور تمام صفات کمال کا مالک ماننے کے بجائے اس کے لیے اولاد اور شریک بنا کر اسے عاجز و محتاج ثابت کر رہے ہیں اور اس اکیلے کی عبادت کے بجائے ان چیزوں کو اس کی عبادت میں شریک بنا رہے ہیں جن کا زمین و آسمان کی پیدائش یا بقا میں کوئی حصہ ہی نہیں۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی چوٹ ہے جو ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں قتال کے وعدے اور دعوے کے باوجود اس کی راہ میں لڑنے سے گریز کرتے ہیں کہ انھوں نے اللہ کی تسبیح کا حق عملاً ادا نہیں کیا۔

"سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ......" کی تفسیر سورۂ حدید اور سورۂ حشر کی ابتدا میں گزر چکی ہے، اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی صفت "الْعَزِيْزُ" لانے میں اشارہ ہے کہ جب وہ ہر ایک پر غالب ہے تو تم اس کے دشمنوں کے ساتھ لڑنے سے کیوں ڈرتے ہو اور صفت "الْحَكِيْمُ" لانے میں اشارہ ہے کہ اس نے تمھیں جو حکم دیا ہے کہ کفار سے لڑو اور انھیں اور ان کے کفر و شرک کو کسی صورت غالب نہ آنے دو تو یہ حکم بے مقصد نہیں، بلکہ کمال حکمت پر مبنی ہے اور دنیا و آخرت میں تمھاری عزت اور کامیابی کا ضامن ہے۔ (ابن عاشور)

**آیت 3، 2** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ: ان آیات میں ان لوگوں پر تعجب اور شدید ناراضی کا اظہار ہے جو وہ بات کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ اس میں کئی طرح کے لوگ شامل ہیں، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم

نے آپس میں یہ ذکر کیا کہ کون ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس جائے اور آپ سے پوچھے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، مگر ہم میں سے کوئی بھی نہ اٹھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف ایک آدمی بھیجا اور ہمیں جمع کرنے کے بعد یہ سورت یعنی سورۂ صف پوری پڑھ کر سنائی۔'' [ مسند أحمد : ۴۵۲/۵، ح : ۲۳۷۸۸ ] مسند احمد کے محققین نے فرمایا: '' إِسْنَادُہٗ صَحِیْحٌ عَلٰی شَرْطِ الشَّیْخَیْنِ. '' طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: « كَانَ نَاسٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَبْلَ أَنْ يُّفْرَضَ الْجِهَادُ يَقُوْلُوْنَ لَوَدِدْنَا أَنَّ اللّٰهَ دَلَّنَا عَلٰی أَحَبِّ الْأَعْمَالِ إِلَيْهِ فَنَعْمَلَ بِهِ، فَأَخْبَرَ اللّٰهُ نَبِيَّهُ أَنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَيْهِ إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ لَا شَكَّ فِيْهِ، وَجِهَادُ أَهْلِ مَعْصِيَتِهِ الَّذِيْنَ خَالَفُوا الْإِيْمَانَ وَلَمْ يُقِرُّوْا بِهِ فَلَمَّا نَزَلَ الْجِهَادُ، كَرِهَ ذٰلِكَ أُنَاسٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَشَقَّ عَلَيْهِمْ أَمْرُهُ، فَقَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالٰی : ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [ الصف : ۲ ] » [ طبري : ۶۰۶/۲۲، ح : ۳۴۳۵۹ ] ''مومنوں میں سے کچھ لوگ جہاد فرض ہونے سے پہلے کہتے تھے: ''ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ہاں سب اعمال سے زیادہ محبوب عمل بتائے تو ہم وہ کریں۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو بتایا کہ تمام اعمال میں سے محبوب وہ ایمان باللہ ہے جس میں کوئی شک نہ ہو اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے جہاد ہے جنھوں نے ایمان کی مخالفت کی اور اس کا اقرار نہیں کیا۔ پھر جب جہاد (کا حکم) نازل ہوا تو مومنوں میں سے کچھ لوگوں نے اسے ناپسند کیا اور اس کا حکم ان پر شاق گزرا، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ان آیات سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد فرض ہونے سے پہلے اس کی تمنا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب سے محبوب عمل کون سا ہے تو ہم وہ کریں گے، مگر جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اس سے گریز کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ [ النساء : ۷۷، ۷۸ ] ''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، پھر جب ان پر لڑنا لکھا گیا اچانک ان میں سے کچھ لوگ، لوگوں سے ڈرنے لگے، جیسے اللہ سے ڈرنا ہو یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! تو نے ہم پر لڑنا کیوں لکھ دیا، تو نے ہمیں ایک قریب وقت تک مہلت کیوں نہ دی۔ کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے اور تم پر دھاگے برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔'' اور فرمایا: ﴿وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ

الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴾ [ محمد : ۲۰ ] ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے کہتے ہیں کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی؟ پھر جب کوئی محکم سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں لڑائی کا ذکر کیا جاتا ہے تو تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں بیماری ہے، وہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے جیسے اس شخص کا دیکھنا ہوتا ہے جس پر موت کی غشی ڈالی گئی ہو۔'' اسی طرح وہ لوگ بھی مراد ہیں جنھوں نے تمھیں کہا تھا کہ ہم جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے، مگر اس عہد پر قائم نہ رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴾ [ الأحزاب : ١٥ ] ''حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ کا عہد ہمیشہ پوچھا جانے والا ہے۔''

❷ "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" کے الفاظ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ایسے کاموں کا دعویٰ کرتے ہیں جو انھوں نے نہ کیے ہیں نہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم نے جہاد کیا، ہم نے دشمن کا منہ موڑ دیا، ہم نے یہ کیا اور وہ کیا، حالانکہ انھوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہوتا، ان کی خواہش ان کارناموں پر اپنی تعریف کی ہوتی ہے جو انھوں نے نہیں کیے۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [ آل عمران : ١٨٨ ] ''ان لوگوں کو ہرگز خیال نہ کر جو ان ( کاموں ) پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیے اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ان ( کاموں ) پر کی جائے جو انھوں نے نہیں کیے، پس تو انھیں عذاب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہرگز خیال نہ کر اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

❸ "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو کسی سے کوئی بھی ایسا وعدہ کرتے ہیں جسے پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن میری امی نے مجھے بلایا، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف رکھتے تھے، کہنے لگی: ''آؤ، میں تمھیں کچھ دوں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: (( وَمَا أَرَدْتِ أَنْ تُعْطِيَهِ؟ )) ''تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میں اسے کھجوریں دوں گی۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَمَا إِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِيهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ )) [ أبو داوٗد، الأدب، باب التشديد في الكذب : ٤٩٩١، و قال الألباني حسن ] ''یاد رکھو! اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو تم پر ایک جھوٹ لکھا جاتا۔''

❹ بعض حضرات اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ آدمی جو عمل خود نہ کرتا ہو کسی دوسرے کو بھی اس کی دعوت نہ دے، حالانکہ یہاں اس کام کے وعدے یا دعوے پر سرزنش ہے جو انسان نہ کرتا ہو، ایسے کام کی دعوت پر سرزنش نہیں۔ فرائض پر عمل اور ان کی دعوت تو ہر ایک پر لازم ہے، اگر ان کی دعوت دے مگر خود عمل نہ کرے تو اس پر واقعی گرفت ہے، مگر وہ ترک عمل پر ہے دعوت پر نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۴۴): ﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ﴾ کی تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر خود عمل نہ کرو تو دوسروں کو کہنا چھوڑ دو، بلکہ اپنی کوتاہی پر ندامت اور شرمندگی کے

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④

بلاشبہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں، جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہوں ④

احساس کے ساتھ دعوت و تبلیغ جاری رکھنی چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کوتاہی دور کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے گا۔ علاوہ ازیں ہر مسلمان پر دین کی ہر بات آگے پہنچانا فرض ہے۔ فرائض کے بارے میں خود عمل اور دوسروں تک پہنچانا دو کام فرض ہیں، جب کہ مستحبات و فضائل کو آگے پہنچانا فرض ہے، خود عمل کرے تو اجر ہے، نہ کر سکے تو مؤاخذہ نہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (( بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل : ۳۴۶۱، عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ] ”مجھ سے آگے پہنچا دو، خواہ ایک آیت ہو۔“ اور فرمایا: (( فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ )) [ بخاري، الحج، باب الخطبة أيام منى : ۱۷۴۱، عن أبي بكرة رضی اللہ عنہ ] ”تو جو موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے جو موجود نہیں، کیونکہ بہت سے لوگ جنھیں پہنچایا جائے، سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔“ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۰۴، ۱۱۰)۔

⑤ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ ...... : ”مَقَتَ يَمْقُتُ مَقْتًا“ (ن) ”أَبْغَضَهُ بُغْضًا شَدِيْدًا“ ان آیات میں اس وعدے یا دعوے پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شدید ناراضی کا اظہار کئی طرح سے فرمایا ہے جس پر عمل نہ کیا جائے۔ سب سے پہلے ڈانٹ اور ملامت کے لیے استفہام انکاری کے ساتھ فرمایا کہ ایمان لانے کے باوجود تم وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، پھر اس کام کی شناعت کے اظہار کے لیے اس کی ضمیر لانے کے بجائے دوسری آیت میں انھی الفاظ کو دہرایا ہے، چنانچہ پہلے فرمایا: ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ پھر فرمایا: ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ پھر ناراضی کی شدت کے اظہار کے لیے ”مَقْتًا“ کا لفظ استعمال فرمایا، جس کا معنی شدید بغض ہے اور اس کے ساتھ ”كَبُرَ“ فرمایا کہ یہ شدید بغض ”کبیر“ بھی ہے۔ پھر ”عِنْدَ اللّٰهِ“ کا لفظ ہے کہ یہ شدید بغض کسی عام شخص کا نہیں بلکہ اس عمل سے تم اللہ جل جلالہ کی شدید ناراضی کا نشانہ بن رہے ہو۔

**آیت 4** ① اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ ...... : ”مَرْصُوْصٌ“ ”اَلرَّصَاصُ“ سیسہ (سکہ) ”رَصَّ يَرُصُّ رَصًّا“ (ن) ایک چیز کو دوسری کے ساتھ خوب جوڑ دینا، چمٹا دینا۔ اس میں سیسے کے اجزا کے باہم متصل ہونے کی تشبیہ ملحوظ ہے۔ ”بُنْيَانٌ“ ”بَنٰى يَبْنِيْ بِنَاءً“ (ض) سے مصدر ہے بمعنی اسم مفعول، بنائی ہوئی عمارت۔ ”بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ“ ایسی عمارت جس کے اجزا ایک دوسرے سے سیسے کی طرح ملے ہوئے ہوں۔

② اس جگہ اس آیت کا آنا دلیل ہے کہ پچھلی آیات کا تعلق قتال فی سبیل اللہ سے ہے۔

③ اس آیت سے قتال فی سبیل اللہ کرنے والوں کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف دیتے ہو، حالانکہ یقیناً تم جانتے ہو کہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۝۵

مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ، قَالُوْا ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ مُؤْمِنٌ فِيْ شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ يَتَّقِي اللّٰهَ وَ يَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ ﴾ [ بخاري، الجهاد والسير، باب أفضل الناس مؤمن مجاهد بنفسه : ۲۷۸۶ ] ''لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! لوگوں میں سے افضل (سب سے بہتر) کون ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ مومن جو اللہ کے راستے میں اپنی جان اور اپنے مال کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''پھر کون؟'' فرمایا: ''وہ مومن جو گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔''

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن میں یہ اوصاف موجود ہوں، ایک یہ کہ وہ جان بچانے والے نہ ہوں بلکہ لڑنے والے اور جان و مال قربان کرنے والے ہوں۔ دوسرا یہ کہ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے لڑیں۔ تیسرا یہ کہ وہ صف باندھ کر نظم و ترتیب کے ساتھ لڑیں، اس میں اطاعت امیر بھی شامل ہے کہ جہاں ان کی ذمہ داری لگا دی جائے وہاں ڈٹے رہیں، اس کے بغیر نہ صف بنتی ہے نہ قائم رہتی ہے۔ چوتھا یہ کہ وہ عقیدہ و مقصد میں، ایک دوسرے سے محبت میں اور ایک دوسرے پر اعتماد میں پوری طرح یک جان ہوں، جس طرح ''بنیان مرصوص'' میں کوئی رخنہ نہیں ہوتا ان میں بھی کسی قسم کا کوئی رخنہ نہ پایا جائے۔ پھر جس طرح ''بنیان مرصوص'' اپنی جگہ سے نہیں ہٹتی ان کے قدم بھی کسی صورت میدان سے اکھڑنے نہ پائیں، جیسا کہ اصحاب رسول ﷺ میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے۔ دیکھیے سورۂ فتح کی آیت (۲۹): ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ کی تفسیر۔

**آیت 5** ① وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ ...... : قتال فی سبیل اللہ کی فضیلت کے ذکر اور اس سے گریز پر ملامت کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب ذکر فرمایا، جس میں انھوں نے ان کی اس اذیت رسانی کا شکوہ اور اس پر ملامت کی جو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ روا رکھی کہ جب وہ انھیں اپنے لیے اللہ کا رسول جانتے اور مانتے تھے تو ان پر لازم تھا کہ وہ ان کی تکریم کرتے، ان کی اطاعت کرتے اور ان کے ساتھ مل کر دشمنان اسلام سے جہاد کرتے، مگر انھوں نے ان کے ساتھ عام رویے میں، ان کے احکام کی تعمیل میں اور جہاد کے لیے نکلنے کے معاملے میں، غرض ہر طرح سے انھیں تکلیف پہنچائی۔ یہاں جس ایذا کی طرف خصوصاً اشارہ ہے اور جس کی وجہ سے انھیں موسیٰ علیہ السلام سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ'' کا لقب ملا وہ ان کا جہاد کے لیے نکلنے سے صاف انکار ہے۔ مقصود مسلمانوں کو ان کا طریقہ اپنانے

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا

اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اس کی تصدیق کرنے

سے اجتناب کی تلقین ہے۔ تکریم واطاعت کے معاملے میں ان کی ایذا کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ احزاب (۶۹) کی تفسیر اور جہاد کے لیے نکلنے سے ان کے صاف انکار کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۲۰ تا ۲۶) کی تفسیر۔

❷ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ : "زَاغُوْا" "زَاغَ يَزِيْغُ زَيْغًا" (ض) ٹیڑھا ہونا۔ "اَزَاغَ" اس سے باب افعال ہے، ٹیڑھا کر دیا۔ یعنی جب وہ اطاعت کے بجائے ہر کام میں ٹیڑھے چلے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی راہ پر ڈال دیا، کیونکہ وہ ٹیڑھی راہ پر چلنے والوں کو زبردستی سیدھی راہ پر نہیں چلاتا، کیونکہ اس سے آزمائش کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ﴾ [ النساء : ۱۱۵ ] "ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا۔"

❸ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ : جہاد سے انکار کی وجہ سے سورۂ مائدہ کی آیت (۲۵) میں موسیٰ علیہ السلام نے اور سورۂ مائدہ ہی کی آیت (۲۶) میں اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کو "الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ" کا خطاب دیا ہے۔

❹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے علاوہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے منافقین سے بھی بہت اذیت پہنچی۔ زبانی اذیت کے علاوہ جہاد کے مواقع پر انھوں نے کئی دفعہ غداری کی، جنگِ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن اُبی تین سو (۳۰۰) آدمیوں کو، جو لشکر کا تقریباً تیسرا حصہ تھے، عین میدان جنگ سے نکال کر لے گیا۔ جنگ خندق میں بھی انھوں نے کفار سے مل کر سازشوں میں اور مسلمانوں کی حوصلہ شکنی میں کوئی کمی نہیں کی۔ سورۂ آل عمران (۱۵۴ تا ۱۶۸) اور سورۂ احزاب (۹ تا ۲۰) میں اللہ تعالیٰ نے اس کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ زبانی اذیت کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۵۸، ۶۱، ۷۴)، احزاب (۵۷) اور منافقون (۸)۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے اعلان ہی سے کفار کی طرف سے مسلسل اور بے پناہ تکلیفیں پہنچیں، مگر اپنی جماعت میں شامل لوگوں کی طرف سے ایذا کا احساس زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دلائی ہے کہ اگر کچھ منافق قسم کے لوگ آپ کو تکلیف دیتے ہیں اور جہاد میں جانے سے پس وپیش کرتے ہیں تو آپ غم نہ کریں، آپ کے ساتھ تو پھر بھی جہاد کرنے والوں اور جان و مال قربان کرنے والوں کی عظیم جماعت موجود ہے، موسیٰ علیہ السلام کو تو اپنوں کی طرف سے اس سے بھی زیادہ تکلیف دی گئی، ان کی قوم نے جہاد کے لیے نکلنے ہی سے صاف انکار کر دیا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چیزیں تقسیم کیں تو ایک آدمی نے کہا: "یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ کے چہرے کا ارادہ نہیں کیا گیا۔" میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے حتیٰ کہ میں نے غصے کے آثار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک میں دیکھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوْسٰى لَقَدْ أُوْذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ )) [ بخاري، الدعوات، باب قول اللہ تبارك وتعالٰى : ﴿وصل عليهم﴾...... : ۶۳۳۶ ] "اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے، انھیں اس سے زیادہ اذیت دی گئی مگر انھوں نے صبر کیا۔" اللہ تعالیٰ نے یہاں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ذکر فرمایا، کیونکہ ان کے ساتھ بھی چند لوگوں کے سوا بنی اسرائیل نے ایسا ہی سلوک کیا۔

آیت 6 ❶ وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ...... : "مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ" کے دو معنی

بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا

والا ہوں جو مجھ سے پہلے تورات کی صورت میں ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے

ہیں اور دونوں ہی درست ہیں، ایک یہ کہ میں اپنے سے پہلے نازل شدہ کتاب تورات کی تردید نہیں بلکہ تصدیق کرنے والا ہوں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۴۶) کی تفسیر۔ دوسرا یہ کہ میرا وجود ان بشارتوں کو سچا ثابت کرنے والا ہے جو میرے متعلق تورات میں دی گئی ہیں، میں ان کا مصداق ہوں، لہٰذا تم پر لازم ہے کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔

❷ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ: اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک "اَحْمَدُ" کی صراحت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خوش خبری دی تھی۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: «إِنَّ لِيْ أَسْمَاءً، أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَنَا أَحْمَدُ وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِيْ يَمْحُو اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ، وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِيْ، وَ أَنَا الْعَاقِبُ» [ بخاري، التفسير، باب قوله تعالٰى: ﴿ يأتي من بعدي اسمه أحمد ﴾ : ۴۸۹۶ ] "میرے کئی نام ہیں، میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی (مٹانے والا) ہوں کہ میرے ساتھ اللہ کفر کو مٹائے گا اور میں حاشر (اکٹھا کرنے والا) ہوں کہ لوگ میرے پیچھے جمع کیے جائیں گے اور میں عاقب (سب نبیوں کے بعد آنے والا) ہوں۔"

"اَحْمَدُ" (أَفْعَلُ) اسم تفضیل ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ اسم فاعل کے معنی میں ہو تو مطلب ہوگا "بہت زیادہ حمد کرنے والا" اور حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ حمد کرنے والے اور آپ کی امت کے لوگ "حَمَّادُوْنَ" (بہت زیادہ حمد کرنے والے) ہیں۔ اگر اسم مفعول کے معنی میں ہو تو معنی ہے "جس کی بہت زیادہ تعریف کی گئی۔" اس صورت میں یہ اسم مبارک "محمد" کا ہم معنی ہے۔ اسم تفضیل کے اسم مفعول کے معنی میں آنے کی مثال قرآن مجید میں ملتی ہے، فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴾ [ النساء: ۵۱ ] "کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں۔" اس آیت میں "اَهْدٰى" اسم فاعل کے معنی میں (زیادہ ہدایت دینے والے) نہیں بلکہ اسم مفعول کے معنی میں ہے، یعنی "زیادہ ہدایت دیے گئے۔" اسی طرح سورۂ فاطر (۴۲) میں بھی "اَهْدٰى" اسم مفعول کے معنی میں ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت میں دو چیزیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں، ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے زمانے کی تعیین کہ وہ مسیح علیہ السلام کے بعد آئے گا، دوسرا اسم مبارک "اَحْمَدُ" کی صراحت، تاکہ آپ کے متعلق کوئی ابہام یا پوشیدگی نہ رہے۔ جہاں تک نام کا تعلق ہے تو قرآن کے بیان کے مطابق یہ بات یقینی ہے کہ انجیل میں یہ نام موجود تھا۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن کا یہ بیان غلط ہوتا تو نزول قرآن کے زمانے کے نصرانی ضرور اس کی تردید کرتے۔ موجودہ انجیلوں میں اس نام کا مذکور

جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

گا، اس کا نام احمد ہے۔ پھر جب وہ ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے ۝

نہ ہونا اس کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ اس وقت اصل انجیل دنیا میں موجود ہی نہیں۔ ہمارے سامنے جو انجیلیں عربی، انگریزی یا اردو میں ہیں یہ سب ترجمہ در ترجمہ ہیں۔ ان ترجموں میں باہمی اختلاف اس قدر ہے جتنا خود ان انجیلوں میں ہے۔ یہ ترجمہ کرنے والے حضرات ہر لفظ کا ترجمہ کرتے جاتے ہیں خواہ وہ کسی کا نام ہو، حالانکہ نام میں تبدیلی یا اس کا ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ پھر جب کتمان حق اور تحریف کی عادت بھی ہو تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچے گی۔ اس کے باوجود زمانے کی تعیین کے ساتھ اور رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کے ساتھ انجیل میں یہ بشارت کئی جگہ موجود ہے جو آپ کے سوا کسی اور پر منطبق نہیں ہوتی۔ یہاں انجیل یوحنا سے چند حوالے نقل کیے جاتے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی آمد کی بشارت دی گئی ہے۔ مسیح علیہ السلام نے فرمایا: ''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح۔'' [ یوحنا، باب ۱٤، فقرہ: ۱۶، ۱۷ ] ''لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔'' [ یوحنا، باب ١٤، فقرہ: ٢٦ ] ''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔'' [ یوحنا، باب ١٤، فقرہ: ٣٠ ] ''لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔'' [ یوحنا، باب ١٥، فقرہ: ٢٦ ] ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا۔'' [ یوحنا، باب ١٦، فقرہ: ١٢، ١٣ ]

یہ حوالے یوحنا کی انجیل سے نقل کیے گئے ہیں جو نصرانیوں کے تمام فرقوں کے ہاں مسلّم ہے۔ انجیل برنباس میں آپ ﷺ کے نام ''محمد'' کی صراحت بار بار آئی ہے، مگر موجودہ نصرانی جو پال کے پیروکار ہیں وہ چونکہ اسے نہیں مانتے، اس لیے یوحنا کی انجیل کے حوالے نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں رسول اللہ ﷺ کی بشارت ایسی صفات کے ساتھ دی گئی ہے جو آپ کے سوا کسی اور پر صادق ہی نہیں آتیں۔ مثلاً ''وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔'' اور ''وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا۔'' اور ''دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔'' غور کیجیے! مسیح علیہ السلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کون ہے جس پر یہ صفات صادق آتی ہوں۔

**③ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ:** بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد مسیح علیہ السلام ہیں، کیونکہ آیت کے شروع میں ان کے خطاب کا ذکر ہے، مگر راجح بات یہ ہے کہ اس سے مراد نبی ﷺ ہیں، یعنی پھر جب وہ ''احمد'' جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس آیا تو انھوں نے اسے پہچاننے کے باوجود کھلا جادو کہہ کر جھٹلا دیا۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَلَمَّا

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَ ہُوَ یُدۡعٰۤی اِلَی الۡاِسۡلَامِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۷﴾ یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸﴾ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۹﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ ع

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، جب کہ اسے اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ⑦ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کے ساتھ بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، اگرچہ کافر لوگ ناپسند کریں ⑧ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے، اگرچہ مشرک لوگ ناپسند کریں ⑨ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیا میں تمھاری ایسی تجارت کی طرف رہنمائی کروں جو تمھیں دردناک عذاب سے بچا لے؟ ⑩

جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۚ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ [ البقرۃ : ۸۹ ] ”پھر جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کے ساتھ کفر کیا، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔“ ابن جریر طبری نے یہی معنی کیا ہے اور ابن کثیر اور بہت سے مفسرین نے اسی معنی پر اکتفا کیا ہے، اس کی تائید بعد کی آیت میں ”وَهُوَ يُدۡعٰۤى اِلَى الۡاِسۡلَامِ“ کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ اس سورت کے نزول کے وقت اسلام کی دعوت دینے والے احمد ﷺ تھے نہ کہ مسیح علیہ السلام۔

④ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ: یعنی آپ جو نشانیاں اور معجزات لے کر آئے ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ یہ کھلا جادو ہے، یا مبالغے کے لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو جادوگر کے بجائے مجسم جادو کہہ دیا، جیسے ” زَيۡدٌ عَادِلٌ“ کے بجائے ” زَيۡدٌ عَدۡلٌ“ کہہ دیتے ہیں۔

**آیت 7** وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُوَ يُدۡعٰۤى ..... : یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اسلام میں داخل ہونے کی اور اللہ کا فرماں بردار بن جانے کی دعوت دی جا رہی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ دے۔ اللہ پر جھوٹ یہ ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے رسول کو، جس کی بشارت اس سے پہلے ان کے نبی عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام دے چکے تھے، انھوں نے جادوگر اور اس کی لائی ہوئی بینات کو جادو کہہ دیا۔ دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھنے والے ایسے ظالم لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ یہی مضمون سورۂ انعام (۲۰، ۲۱) میں بیان ہوا ہے۔

**آیت 8، 9** يُرِيۡدُوۡنَ لِيُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ ......: ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۳۲، ۳۳) کی تفسیر۔

**آیت 10** يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى تِجَارَةٍ ..... : یہی مضمون ایک اور انداز میں سورۂ توبہ (۱۱۱) میں بیان

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۙ﴿۱۲﴾

تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۱۱﴾ وہ تمھیں تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور تمھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور رہنے کی پاکیزہ جگہوں میں، جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۲﴾

ہوا ہے، تفسیر وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں ایمان و جہاد پر عذابِ الیم سے نجات کی بشارت سنائی ہے، جب کہ سورۂ توبہ (۳۹،۳۸) میں ترکِ جہاد پر عذابِ الیم کی وعید سنائی ہے۔

**آیت 11** ﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ...... : یہ اس تجارت کی تفسیر ہے، یعنی وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ "تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ" فعل مضارع فعل امر کے معنی میں ہے، اسے مضارع لانے سے امر کی تاکید مقصود ہے، جیسا کہ کسی کام کی تاکید مقصود ہو تو یہ کہنے کے بجائے کہ یہ کام کرو، کہا جاتا ہے کہ تم یہ کام کرو گے۔

**آیت 12** ① يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ : "يَغْفِرْ" اور "يُدْخِلْ" پر جزم "تُؤْمِنُوْنَ" اور "تُجَاهِدُوْنَ" کا جواب ہونے کی وجہ سے آئی ہے، کیونکہ وہ امر کے معنی میں ہیں اور امر کے جواب میں مضارع آئے تو اس پر جزم آتی ہے۔

② وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ : "مَسٰكِنَ طَيِّبَةً" کا خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ آدمی کی پسندیدہ ترین چیزوں میں اس کا مسکن بھی ہے جسے چھوڑے بغیر جہاد ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ مساکن چھوڑنے کے عوض "مَسٰكِنَ طَيِّبَةً" کی بشارت سنائی، جن میں دوام کی خوبی بھی ہے، جب کہ دنیا کے مساکن کسی کے پاس رہنے والے نہیں۔ سورۂ توبہ میں فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ا۟قْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [ التوبة : ٢٤ ] "کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات، جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو

وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى

اور ایک اور چیز جسے تم پسند کرتے ہو اللہ کی طرف سے مدد اور قریب فتح ہے اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دے ۝۱۳ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کے مددگار بن جاؤ، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا اللہ کی طرف

انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

③ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ : خبر "الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" پر الف لام سے حصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے، یعنی فوزِ عظیم صرف یہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کے سوا کوئی اور چھوٹی کامیابی بھی ہے، بلکہ "الْعَظِيْمُ" کا لفظ صرف اس کامیابی کی عظمت کے بیان کے لیے آیا ہے، ورنہ کامیاب صرف وہ ہے جو آخرت میں کامیاب ہے، کوئی دوسرا حقیقت میں کامیاب ہے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ [ آل عمران : ١٨٥ ] ’’پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہوگیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔‘‘

**آیت 13** وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ...... : "اُخْرٰى" محذوف موصوف "نِعْمَةٌ" کی صفت ہے جو مبتدا ہے، خبر اس کی "لَكُمْ" محذوف ہے: "أَيْ وَلَكُمْ نِعْمَةٌ أُخْرٰى" یعنی اور تمھارے لیے مغفرتِ ذنوب اور دخولِ جنت کے علاوہ ایک اور نعمت "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ" بھی ہے جو تمھیں پسند ہے۔ آخرت کی نعمتوں کے ساتھ دنیوی نعمتوں کا ذکر کر کے جہاد کی ترغیب دلائی ہے، دنیا میں فتح و کامرانی بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، مگر یہ مومن کے لیے اصل مقصود نہیں۔ اس لیے پہلے حاصل ہونے کے باوجود اس کا ذکر بعد میں فرمایا اور آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کا ذکر پہلے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے ساتھ اپنی نصرت اور فتح قریب کا یہ وعدہ پورا فرمایا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں مکہ فتح ہوگیا، پھر پورا جزیرۂ عرب مشرکین سے پاک ہوگیا۔ اس کے بعد اتنی تھوڑی مدت میں اسلام کا جھنڈا پوری دنیا پر لہرانے لگا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، چنانچہ مسلمان قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مالک بن گئے اور انھوں نے ایسے عمدہ طریقے سے کاروبار سلطنت چلایا جس کی خوبی دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں۔

**آیت 14** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ ......: "اَلْحَوَارِيُّ" "حَارَ يَحُوْرُ حَوْرًا" (ن) "اَلثَّوْبَ" کپڑے کو دھونا اور خوب سفید کرنا۔ دھوبی کو اسی لیے حواری کہتے ہیں کہ وہ کپڑے کو دھو کر سفید کر دیتا ہے۔ "حُوَّارٰی" صاف سفید میدے کو کہتے ہیں جس سے چھان نکال دیا گیا ہو۔ خالص دوست اور بے غرض مددگار کو اسی لیے حواری کہتے ہیں کہ اس کا دل ہر قسم کے کھوٹ سے پاک صاف اور خیر خواہی اور محبت میں خالص ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَ إِنَّ حَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ بْنُ الْعَوَّامِ )) [ بخاري، فضائل الصحابة، باب مناقب الزبير بن العوام رضی اللہ عنہ : ٣٧١٩ ]

اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ

میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لے آیا

''ہر نبی کا کوئی حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر بن عوام (رضی اللہ عنہ) ہے۔''

❷ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ : ''اِلَى اللّٰهِ'' کی ترکیب دوطرح سے ہے، ایک یہ کہ ''مَنْ أَنْصَارِيْ فِي الدَّعْوَةِ إِلَى اللّٰهِ'' ''اللہ کی طرف دعوت میں میرے مددگار کون ہیں؟'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ﴾ [ یوسف : ۱۰۸ ] ''کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔'' اور دوسری ترکیب یہ ہے: ''مَنْ أَنْصَارِيْ ذَاهِبًا إِلَى اللّٰهِ'' ''اللہ کی طرف جاتے ہوئے میرے مددگار کون ہیں؟'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَ قَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾ [ الصافات : ۹۹ ] ''اور اس نے کہا میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، وہ مجھے ضرور راستہ دکھائے گا۔'' مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۲) کی تفسیر۔

❸ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ...... : جہاد فی سبیل اللہ کے دوران کئی مرحلے آتے ہیں جن میں سب سے آخری مرحلہ اللہ کے دشمنوں سے قتال اور جنگ کا ہوتا ہے، جس کی ترغیب اور اس کی فضیلت کا بیان سورت کے شروع سے آ رہا ہے۔ اس سے بھی مشکل مرحلہ وہ ہوتا ہے جب حق کی طرف دعوت دینے والا اکیلا ہوتا ہے یا اس کے ساتھ چند آدمی ہوتے ہیں۔ دوسرے تمام لوگ اس کے دشمن ہوتے ہیں جو گالی گلوچ، استہزا، مار پیٹ، غرض ہر طرح کی تکلیف دے کر اسے دعوت حق سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات اس کے ساتھیوں کو یا ان کے ساتھ اسے بھی قتل کر دیا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں حق کی طرف دعوت دینے والے کے ساتھ کھڑا ہونا، اپنی جان و مال کی پروا نہ کرتے ہوئے تمام تکلیفیں برداشت کرنا اور حق پر ثابت قدم رہنا بڑے عزم و ہمت والے لوگوں کا کام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ١۫ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا١ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ [ آل عمران : ۱۸۶ ] ''یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔'' پھر یہ سب کچھ سہتے ہوئے کئی لوگ قید کر دیے جاتے ہیں، کئی معذور ہو جاتے ہیں، کئی شہید ہو جاتے ہیں اور آخر میں وہ مرحلہ آتا ہے جب اللہ کے دشمنوں سے جنگ ہوتی ہے اور اس وقت جو لوگ دشمنوں کے مقابلے میں قلیل اور ضعیف ہونے کے باوجود میدان میں ڈٹ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی خاص مدد فرماتا ہے اور انھیں فتح و نصرت سے ہم کنار کر کے دشمن پر غلبہ عطا فرما دیتا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھیوں کا نمونہ پیش کر کے انھیں حکم دیا ہے کہ وہ بھی ان کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت (مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ) پر لبیک کہیں اور ہر تکلیف پر صبر کرتے ہوئے جان و مال کی قربانی کے ذریعے سے ان کا ساتھ دیں۔

طَآىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾

اور ایک گروہ نے کفر کیا، پھر ہم نے ان لوگوں کی جو ایمان لائے تھے، ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی تو وہ غالب ہو گئے ﴿۱۴﴾

یہ بات معلوم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں سے قتال کا مرحلہ پیش نہیں آیا، اس وقت کے یہود نے انھیں پہچان لینے کے باوجود اتنا ستایا اور تنگ کیا کہ ان کے لیے دعوت دینا بھی مشکل ہو گیا۔ اس وقت انھوں نے یہ کہا کہ اللہ کی طرف دعوت دینے میں اور اس کے راستے پر چلنے میں میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا، ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ اس وقت بنی اسرائیل کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جو ان پر ایمان لے آئے اور ان کے فرمان "مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" پر "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" کہہ کر لبیک کہا، پھر جان و مال کے ساتھ ہر طرح سے ان کی مدد کی اور اس راستے میں دشمنوں کی طرف سے دی جانے والی تکلیفوں پر صبر کیا۔ دوسرے وہ جنھوں نے انھیں رسول ماننے سے انکار کر دیا، انھیں جھوٹا کہا اور ان کی ماں پر تہمتیں لگائیں، حکومتِ وقت سے مل کر انھیں گرفتار کروایا اور اپنے گمان کے مطابق انھیں سولی پر چڑھا کر دم لیا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمان کی تردید فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ آلِ عمران (۵۲ تا ۵۵) اور سورۂ نساء (۱۵۷، ۱۵۸)۔

ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی سب سے پہلے یہی مرحلہ پیش آیا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپ نے اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تو کفار مکہ کی طرف سے شدید مزاحمت کی گئی اور آپ کو اور آپ کے ساتھ مسلمان ہونے والے مردوں اور عورتوں کو سخت تکلیفیں دی گئیں، جس کی وجہ سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لانے کی جرأت کر سکے۔ پھر کئی حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور کئی مکہ ہی میں ظلم و ستم سہتے رہے۔ آزمائشوں اور تکلیفوں کا یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا، حتیٰ کہ کفار قریش نے آپ کو دعوت سے مطلق روک دیا۔ آپ ہر سال حج کے لیے آنے والے قبائل کے پاس جا کر ایک ایک قبیلہ کو کہتے کہ کون ہے جو مجھے اپنے ساتھ لے جا کر اللہ کا پیغام پہنچانے میں میری مدد کرے۔ کئی سال کے بعد وہ موقع آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے کچھ لوگوں کو آپ کی دعوت پر انصار اللہ بننے کی توفیق عطا فرمائی۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْرِضُ نَفْسَهُ عَلَى النَّاسِ بِالْمَوْقِفِ فَيَقُوْلُ هَلْ مِنْ رَجُلٍ يَحْمِلُنِيْ إِلٰى قَوْمِهِ، فَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ مَنَعُوْنِيْ أَنْ أُبَلِّغَ كَلَامَ رَبِّيْ عَزَّوَجَلَّ، فَأَتَاهُ رَجُلٌ مِّنْ هَمْدَانَ فَقَالَ مِمَّنْ أَنْتَ؟ فَقَالَ الرَّجُلُ مِنْ هَمْدَانَ، قَالَ فَهَلْ عِنْدَ قَوْمِكَ مِنْ مَنَعَةٍ؟ قَالَ نَعَمْ، ثُمَّ إِنَّ الرَّجُلَ خَشِيَ أَنْ يَخْفِرَهُ قَوْمُهُ، فَأَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ آتِيْهِمْ، فَأُخْبِرُهُمْ، ثُمَّ آتِيْكَ مِنْ عَامٍ قَابِلٍ، قَالَ نَعَمْ، فَانْطَلَقَ وَجَاءَ وَفْدُ الْأَنْصَارِ فِيْ رَجَبٍ » [ مسند أحمد : ۳۹۰/۳، ح : ۱۵۱۹۲، قال المحقق إسناده صحيح على شرط البخاري ]

''نبی ﷺ اپنے آپ کو حج کے موقع پر موقف میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور کہتے تھے: ''کیا کوئی آدمی ہے جو مجھے اپنے ساتھ اپنی قوم کے پاس لے جائے؟ کیونکہ قریش نے مجھے میرے رب کا کلام پہنچانے سے منع کر دیا ہے۔'' تو ہمدان کا ایک آدمی آپ کے پاس آیا، آپ نے فرمایا: ''تم کن لوگوں سے ہو؟'' اس آدمی نے کہا: ''ہمدان سے۔'' آپ نے فرمایا: ''تو کیا

تیری قوم کے پاس کچھ حفاظت اور دفاع مل سکتا ہے؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ پھر وہ آدمی ڈر گیا کہ کہیں اس کی قوم اس کا کیا ہوا عہد پورا نہ کرے، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ”میں ان کے پاس جاؤں گا اور انھیں بتاؤں گا، پھر آئندہ سال آپ کے پاس آؤں گا۔“ آپ نے فرمایا: ”ٹھیک ہے۔“ چنانچہ وہ چلا گیا اور انصار کا وفد رجب میں آ گیا۔“

④ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ: یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لے آیا اور ایک گروہ نے انھیں رسول ماننے سے انکار کر دیا۔ انکار کرنے والے یہودی تھے اور ایمان لانے والے نصرانی۔ ایمان لانے والے قلیل تھے اور کفر کرنے والے بہت زیادہ تھے۔ ان یہودیوں نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا پیغام پہنچانے سے روکنے کی ہر کوشش کی اور مسیح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر بدترین مظالم کیے، مگر نہ عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی طرف دعوت کو ترک کیا اور نہ ہی ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ دینے سے کوئی کوتاہی کی، حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا تو اس وقت بھی ایمان والوں کی استقامت میں کمی نہیں آئی، وہ بدستور ڈٹے رہے اور اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کفار کے ساتھ قتال کی توفیق عطا فرمائی۔ پھر جب وہ قلت تعداد کے باوجود میدان میں ڈٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں قوت بخشی اور ان کی مدد فرمائی، تو وہ اپنے دشمن پر غالب آ گئے اور ان کے دشمن یہودی مغلوب ہو گئے جو آج تک مغلوب چلے آ رہے ہیں۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا شرک میں مبتلا ہو گئے اور انھیں رب تعالیٰ یا رب کا بیٹا کہنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو، جو عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح ایمان لانے والی تھی، ان پر غالب کر دیا۔

⑤ ہمارے نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھی بھی کفار کے ظلم و ستم سہتے رہے اور سہ رہے تھے، اس میں ان کے لیے بشارت ہے کہ اگر تم عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے انصار ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں بھی تمھارے دشمنوں پر غالب کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کفار پر غلبہ عطا فرما دیا، اس فرق کے ساتھ کہ مسیح علیہ السلام اپنے ساتھیوں کا غلبہ دیکھنے سے پہلے اٹھا لیے گئے، جب کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وہ نظارہ آنکھوں سے دکھا دیا، جس کا ذکر سورۂ نصر میں ہے، فرمایا: ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴾ [ النصر : ۱، ۲ ] ”جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔ اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔“ ہاں، عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ تشریف لائیں گے تو وہ بنفس نفیس اس فتح اور غلبے میں شریک ہوں گے جو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھی مسلمانوں کو ان کے دشمنوں اور دجال پر عطا فرمائے گا۔

سورة الجمعة ٦٢ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ آياتها ١١ ركوعاتها ٢

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

**اللہ کا پاک ہونا بیان کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، (جو) بادشاہ ہے، بہت پاک ہے، سب پر غالب ہے، کمال حکمت والا ہے ① وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ**

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھا کرتے تھے۔ [ مسلم، الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الجمعة : ٨٧٧ ]

آیت 1 ① يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ...... : اس آیت کے معانی سورۂ حدید (۱) اور سورۂ حشر (۱، ۲۴) میں گزر چکے ہیں۔ اس سے پہلے تمام سورتوں کی ابتدا میں "سَبَّحَ" ماضی کے صیغے کے ساتھ آیا ہے، یہاں مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو حال اور استقبال کے لیے ہے، جس میں تجدد اور استمرار پایا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز ہر عیب اور کمی سے اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ پاک ہونے کی شہادت دے رہی ہے اور ہمیشہ دیتی رہے گی۔

② اس آیت میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا آئندہ آیت کے ساتھ تعلق اسی کی تفسیر میں آ رہا ہے۔

آیت 2 ① هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ : اس آیت کو دلیل بنا کر بعض اہل کتاب کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف عربوں کے لیے رسول تھے، کیونکہ "الْاُمِّيّٖنَ" عرب قوم کو کہتے ہیں، لہٰذا آپ غیر عرب لوگوں اور یہود و نصاریٰ کے لیے رسول نہیں تھے۔ لیکن ان کی یہ بات درست نہیں، کیونکہ قرآن مجید میں "الْاُمِّيّٖنَ" کا لفظ ایک معنی میں نہیں بلکہ مختلف مواقع پر مختلف معانی کے لیے آیا ہے۔ کہیں وہ اہلِ کتاب کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ﴾ [ آل عمران : ٢٠ ] ''اور ان لوگوں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے اور اُمّیوں (اَن پڑھ لوگوں) سے کہہ دے کیا تم تابع ہو گئے؟'' یہاں اُمّیوں سے مراد مشرکینِ عرب ہیں، انھیں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے الگ گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کہیں یہ لفظ خود اہلِ کتاب کے ان پڑھ لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ ﴾ [ البقرة : ٧٨ ] ''اور ان میں سے کچھ اُمّی (اَن پڑھ) ہیں، جو کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے چند آرزوؤں کے۔'' اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس کے مطابق اس سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو یہودی نہیں ہیں، جیسا کہ فرمایا:

وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ۝۲

بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے ۝۲

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ [ آل عمران : ۷۵ ] ''یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا ہم پر اَن پڑھوں کے بارے میں (گرفت کا) کوئی راستہ نہیں۔'' یعنی ان کے اندر غیر یہود کا مال مار کھانے کی بد دیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کہا کہ اُمیوں کے بارے میں ہم پر گرفت کا کوئی راستہ نہیں۔ یہود کی اس اصطلاح کا پس منظر یہ ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کے متعلق تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھے کہ ان میں کوئی نبی مبعوث ہو سکتا ہے، یا انھیں آسمانی کتاب مل سکتی ہے۔ (دیکھیے آل عمران: ۷۳) وہ اپنے سوا تمام اقوام کو ناشائستہ، بد مذہب اور حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

زیر تفسیر آیات میں "الْاُمِّيّٖنَ" سے مراد صرف عرب نہیں، یہودی اصطلاح کے مطابق وہ سب لوگ ہیں جو یہودی نہیں، کیونکہ یہاں "الْاُمِّيّٖنَ" کے تحت دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، یعنی "هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ" میں عرب ''امیین'' کا ذکر ہے، جنھیں یہ شرف حاصل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نسباً ان میں سے تھے اور اس سے اگلی آیت میں غیر عرب امیین کا ذکر ہے جو بعد میں اسلام لانے والے تھے، اس میں فرمایا: ﴿وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''اور ان (امیین) میں سے کچھ اور لوگوں میں بھی (اس رسول کو بھیجا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔'' اس کی دلیل کہ ان امیین سے مراد غیر عرب ہیں، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں: « كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ : ﴿وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ قَالَ قُلْتُ مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ فَلَمْ يُرَاجِعْهُ حَتّٰى سَأَلَ ثَلَاثًا، وَفِيْنَا سَلْمَانُ الْفَارِسِيُّ، وَضَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ عَلٰى سَلْمَانَ ثُمَّ قَالَ لَوْ كَانَ الْإِيْمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رِجَالٌ أَوْ رَجُلٌ مِنْ هٰؤُلَاءِ » [ بخاري، التفسير، سورۃ الجمعۃ : ٤٨٩٧ ] ''ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے تو آپ پر سورۂ جمعہ نازل ہوئی: ﴿وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾، میں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟'' آپ نے جواب نہ دیا، یہاں تک کہ میں نے تین مرتبہ سوال کیا۔ ہم میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ سلمان پر رکھا، پھر فرمایا: ''اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہوتا تو ان لوگوں میں سے کچھ آدمی یا (فرمایا) ایک آدمی اسے ضرور حاصل کر لیتا۔''

در اصل اس سورت میں یہود پر چوٹ ہے کہ وہ لوگ جنھیں تم اُمّی کہتے ہو اور اپنے مقابلے میں ذلیل اور حقیر سمجھتے ہو انھی میں اس اللہ نے ایک رسول مبعوث کیا ہے جو "الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ" اور "الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ" ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے، جسے وہ چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تمھیں اس کا ٹھیکیدار کس نے اور کب بنایا ہے کہ جسے تم چاہو اسی کو یہ فضل عطا ہو، دوسرے کو عطا نہ ہو؟

رہی یہ بات کہ اگر مان بھی لیں کہ رسول اللہ ﷺ کو عرب و عجم کے امیین کی طرف مبعوث کیا گیا ہے، تو اس سے آپ کا یہود و نصاریٰ کی طرف مبعوث ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ آپ یہود

کے سوا سب لوگوں کی طرف رسول ہیں، مگر اس میں یہ صراحت نہیں کہ آپ یہود و نصاریٰ کی طرف رسول نہیں۔ یہ مطلب اس آیت کا مفہوم مخالف ہے جو حجت نہیں ہوتا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ﴾ [ العنکبوت : ٤٨ ] ''اور تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔'' اب اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے نہیں لکھتے بلکہ بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے تو یہ غلط ہے۔ خصوصاً یہاں تو مفہوم مخالف مراد لیا ہی نہیں جا سکتا، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے متعدد مقامات پر اس بات کی صراحت فرما دی ہے کہ آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [ سبا : ٢٨ ] ''اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے اس حال میں کہ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [ الأعراف : ١٥٨ ] ''کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' ان دونوں آیات کی تفسیر میں مزید دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

2 سورت کی پہلی آیت "يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ" میں مذکور اللہ تعالیٰ کی صفات کی اس آیت میں مذکور رسول اللہ ﷺ کی صفات کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اس کے ہر عیب اور کمی سے پاک ہونے کی شہادت دے رہی ہے جو "الْمَلِكِ" (بادشاہ) ہے۔ (دیکھیے حشر: ۲۳) اپنی سلطنت کا انتظام کرنے والا، اس میں اپنے احکام بھیجنے والا ہے اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جسے چاہتا ہے منتخب فرماتا ہے۔ اس نے اپنے شہنشاہی اختیار کے تحت ان لوگوں میں سے رسول بھیجنے کے بجائے جو اپنے آپ کو اہلِ کتاب، پڑھے لکھے اور مہذب سمجھتے تھے اور دوسروں کو حقیر جانتے تھے، اُمی لوگوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیج دیا۔ "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ" جو اس کے احکام پر مشتمل آیات انھیں مسلسل پڑھ کر سناتا ہے۔ "الْقُدُّوْسِ" وہ بادشاہ قدوس ہے (دیکھیے حشر: ۲۳) اس نے ان میں ایسا رسول بھیجا جو انھیں ہر قسم کے کفر و شرک اور تمام قباحتوں اور آلودگیوں سے پاک کرتا ہے۔ "الْعَزِيْزِ" (سب پر غالب) ہے، اس کا رسول انھیں اس کی کتاب کی تعلیم دیتا ہے جو اس کے کامل غلبے کی دلیل اور ترجمان ہے۔ "الْحَكِيْمِ" (کمال حکمت والا) ہے، اس کا رسول انھیں اس کی عطا کردہ حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

3 قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات چار مقامات پر آئی ہیں، سورۂ بقرہ کی آیت (۱۲۹) میں اہلِ عرب کو اپنا احسان یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ ان صفات والا پیغمبر وہ ہے جس کے لیے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے کہ وہ اسے ان کی اولاد میں مبعوث فرمائے، سو تمھیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ سورۂ بقرہ ہی کی آیت (۱۵۱) میں فرمایا کہ ان اوصاف والا پیغمبر عطا کرنے پر میری نعمت کو پہچانو، مجھے یاد رکھو، میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری مت کرو۔ سورۂ آلِ عمران (۱۶۴) میں یہ احسان یاد دلایا کہ اتنی اعلیٰ صفات کا رسول اس نے خود ان میں مبعوث فرمایا، جس پر وہ سب احوال گزرتے ہیں جو بطورِ انسان ان سب پر گزرتے ہیں۔ اُحد اور دوسرے مقامات پر دوسروں کی طرح اسے بھی زخم کھانا پڑتے

ہیں، سو وہ ان کے لیے ایک کامل نمونہ ہے۔ چوتھا مقام یہ آیت ہے جس میں یہود کے زعم کو باطل کرنا مقصود ہے، اس لیے بعد میں "مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ" سے ان کی نالائقیوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

④ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام انسانوں کے لیے ہے، مگر آپ ﷺ کو عرب امیین میں پیدا کرنے اور انھیں اسلام کی دعوت کے اوّلین مخاطب بنانے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ کارفرما تھی۔ تفسیر قاسمی میں یہ بات نہایت خوبصورت اور جامع الفاظ میں بیان کی گئی ہے، وہ لکھتے ہیں: " وَ إِنَّمَا أُوْثِرَتْ بِعْثَتُهُ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ فِي الْأُمِّيِّيْنَ، لِأَنَّهُمْ أَحَدُّ النَّاسِ أَذْهَانًا، وَأَقْوَاهُمْ جَنَانًا، وَ أَصْفَاهُمْ فِطْرَةً، وَأَفْصَحُهُمْ بَيَانًا، لَمْ تَفْسُدْ فِطْرَتُهُمْ بِغَوَاشِي الْمُتَحَضِّرِيْنَ وَلَا بِأَفَانِيْنِ تَلَاعُبِ أُولٰئِكَ الْمُتَمَدِّنِيْنَ، وَلِذَا انْقَلَبُوْا إِلَى النَّاسِ بَعْدَ الْإِسْلَامِ بِعِلْمٍ عَظِيْمٍ وَحِكْمَةٍ بَاهِرَةٍ، وَسِيَاسَةٍ عَادِلَةٍ، قَادُوْا بِهَا مُعْظَّمَ الْأُمَمِ وَدَوَّخُوْا بِهَا أَعْظَمَ الْمَمَالِكِ " "اُمّی لوگوں میں آپ ﷺ کی بعثت کو اس لیے ترجیح دی گئی کہ وہ ذہن کے لحاظ سے سب لوگوں سے تیز، دل کے لحاظ سے سب سے قوی، فطرت کے لحاظ سے سب سے صاف اور بیان میں سب سے زیادہ فصیح تھے۔ ان کی فطرت شہری لوگوں کی آلودگیوں سے بگڑی نہیں تھی اور نہ ہی ان نام نہاد تمدن و تہذیب والوں کے مختلف کھیل تماشوں سے فاسد ہوئی تھی۔ اسی لیے اسلام لانے کے بعد وہ لوگوں کے پاس ایسا عظیم علم، حیران کن حکمت و دانائی اور عدل پر مبنی سیاست لے کر آئے جس کے ساتھ انھوں نے دنیا کی بڑی بڑی اقوام کی قیادت کی اور عظیم ترین ممالک کو اپنا زیر فرمان بنا کر چھوڑا۔"

⑤ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: "اِنْ" اصل میں "اِنَّهُمْ" ہے، تخفیف کے لیے "اِنَّ" کو "اِنْ" کر دیا اور اس کے اسم "هُمْ" ضمیر کو حذف کر دیا اور اس بات کی دلیل کہ یہ "اِنْ" نافیہ یا شرطیہ نہیں وہ "لام" ہے جو "لَفِيْ ضَلٰلٍ" پر آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے اُمّی لوگ کس طرح کی کھلی گمراہی میں تھے اس کا حال رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں بیان کیا، جب اس بادشاہ نے کفار قریش کے وفد کی شکایت پر انھیں ساتھیوں سمیت بلا کر حقیقت حال دریافت کی۔ انھوں نے فرمایا: « أَيُّهَا الْمَلِكُ ! كُنَّا قَوْمًا أَهْلَ جَاهِلِيَّةٍ نَعْبُدُ الْأَصْنَامَ، وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ وَنَأْتِي الْفَوَاحِشَ، وَنَقْطَعُ الْأَرْحَامَ، وَنُسِيْءُ الْجِوَارَ، يَأْكُلُ الْقَوِيُّ مِنَّا الضَّعِيْفَ، فَكُنَّا عَلٰى ذٰلِكَ حَتّٰى بَعَثَ اللّٰهُ إِلَيْنَا رَسُوْلًا مِّنَّا نَعْرِفُ نَسَبَهُ، وَصِدْقَهُ ، وَأَمَانَتَهُ ، وَعَفَافَهُ، فَدَعَانَا إِلَى اللّٰهِ لِنُوَحِّدَهُ، وَنَعْبُدَهُ، وَنَخْلَعَ مَا كُنَّا نَعْبُدُ نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ دُوْنِهِ مِنَ الْحِجَارَةِ وَالْأَوْثَانِ » [ مسند أحمد : ۲۰۲/۱، ح : ۱۷٤۰، قال المحقق إسناده حسن ] "اے بادشاہ! ہم جاہلیت والے لوگ تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فواحش کا ارتکاب کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، پڑوسیوں سے بدسلوکی کرتے تھے اور ہم میں سے قوت والا کمزور کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے نسب، صدق، امانت اور پاک دامنی کو ہم جانتے تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی کہ ہم اسے ایک مانیں، اس کی عبادت کریں اور ان پتھروں اور تھانوں سے یکسر علیحدگی اختیار کریں جن کی عبادت اللہ کو چھوڑ کر ہمارے آباواجداد کرتے تھے (اس کے بعد جعفر رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلام کے احکام بیان فرمائے )۔"

وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ④ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ

اور ان میں سے کچھ اور لوگوں میں بھی (آپ کو بھیجا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ③ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ④ ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بوجھ رکھا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اٹھایا، گدھے کی مثال کی سی ہے جو کئی کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، ان لوگوں کی مثال بری ہے جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا اور

**آیت 3** وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ...... : ”اٰخَرِيْنَ“ کا عطف ”فِي الْاُمِّيّٖنَ“ پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس رسول کو عرب اُمیوں میں بھیجا جن کی وہ نسل میں سے ہے اور اسے غیر عرب اُمیوں میں بھی بھیجا جو ابھی مسلمان ہو کر عربوں کے ساتھ نہیں ملے، مگر آئندہ مسلمان ہو کر ان کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی سورت کی آیت (۲) کی تفسیر کا پہلا فائدہ ملاحظہ فرمائیں۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”یعنی یہی رسول دوسرے اَن پڑھوں کے واسطے بھی ہے، وہ فارس کے لوگ (ہیں)، وہ بھی نبی کی کتاب نہ رکھتے تھے۔ حق تعالیٰ نے اول عرب پیدا کیے اس دین کو تھامنے والے، پیچھے عجم میں ایسے کامل لوگ اٹھے۔“ (موضح)

**آیت 4** ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ...... : یعنی اُمیوں میں نبی مبعوث کرنا اور اسے بعد میں قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لیے رسول بنانا اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، وہ یہود یا کسی اور کی خواہش کا پابند نہیں کہ اسی کو اپنے فضل سے نوازے جسے وہ چاہیں اور نہ ہی یہ کسی کی محنت و کوشش پر موقوف ہے کہ کوئی ریاضت اور محنت کے ساتھ نبوت کا منصب حاصل کر لے، بلکہ یہ سراسر اللہ کے انتخاب اور اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ﴾ [ الحج : ۷۵ ] ”اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔“ اور فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [ الأنعام : ۱۲۴ ] ”اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ [ البقرۃ : ۱۰۵ ] ”اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔“

**آیت 5** ① مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا ......: ”اَسْفَارًا“ ”سِفْرٌ“ کی جمع ہے، بڑی کتاب۔ ”سَفَرَ يَسْفُرُ“ (ن) ”اَلْكِتَابَ“ لکھنا۔ ”اَلسَّافِرُ أَيِ الْكَاتِبُ“ جمع اس کی ”سَفَرَةٌ“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴾ [ عبس : ۱۵، ۱۶ ] ”ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ جو معزز ہیں، نیک ہیں۔“

② بعض اہل علم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تین باتوں میں یہود کا رد فرمایا، انھوں نے فخر کیا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں جب کہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵

اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۝۵

عرب اُمی ہیں، تو اس کی تردید کرتے ہوئے انھیں اس گدھے کے ساتھ تشبیہ دی جو بڑی بڑی کتابیں اٹھائے ہوئے ہو۔ انھوں نے فخر کیا کہ وہ اللہ کے دوست اور محبوب ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ ﴾ [ الجمعة : ٦ ] ''(اگر ایسا ہے) تو موت کی تمنا کرو۔'' تیسرا یہ کہ ان کے ہاں ''سبت'' (ہفتے کا دن) ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یوم جمعہ کی صورت میں مسلمانوں پر اپنے احسان کا ذکر فرمایا، جس سے یہود اپنی نادانی کی وجہ سے محروم رہ گئے۔ (الکشاف)

❸ تورات کا بوجھ رکھا جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کی ذمہ داری ڈالی گئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ﴾ [ الأحزاب: ٧٢ ] ''بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔'' ''ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا'' پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا، یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح وہ لوگ ہیں جن پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا کہ اس پر عمل کریں، مگر انھوں نے پروا ہی نہیں کی کہ اس میں کیا ہے اور وہ ان سے کیا چاہتی ہے۔

❹ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے مراد ان بشارتوں کو جھٹلانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق نازل فرمائیں۔ (دیکھیے اعراف : ۱۵۷) ''بِئْسَ'' فعل ذم ہے، ''مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' اس کا فاعل ہے اور اس کا مخصوص بالذم محذوف ہے، یعنی ''هٰذَا الْمَثَلُ.'' یعنی ان لوگوں کی یہ مثال جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا بری مثال ہے، جس کا مصداق ایمان والوں کو نہیں بننا چاہیے۔ جیسا کہ کسی مسلمان کو کتے کی مثال کا مصداق بھی نہیں بننا چاہیے کہ اس پر کتے کی مثال صادق آئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ ، الَّذِيْ يَعُوْدُ فِيْ هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِيْ قَيْئِهِ )) [ بخاري، الهبة و فضلها، باب لا يحل لأحد أن يرجع في هبته وصدقته : ٢٦٢٢ ] ''یہ بری مثال ہمارے لیے نہیں ہے، وہ شخص جو اپنے ہبہ میں لوٹتا ہے اس کتے کی مانند ہے جو اپنی قے میں لوٹتا ہے۔''

❺ استاد محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''کیا وجہ ہے کہ ان علماء کا حال اس سے مختلف ہو جو قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے، یا یہودیوں کی طرح ان کی من مانی تاویلیں کرتے ہیں۔'' شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہود کے عالم ایسے تھے کتاب پڑھی اور دل میں کچھ اثر نہ ہوا، اللہ ہم کو پناہ دے۔'' (موضح)

❻ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ : یعنی جاننے کے باوجود نہ ماننا صریح ظلم ہے اور ایسے ظالموں کو اللہ بھی راہِ راست پر چلنے کی توفیق نہیں دیتا، کیونکہ نہ چاہنے والوں کو زبردستی راہِ راست پر چلانا اس کا دستور نہیں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَ لَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ ع

کہہ دے اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو! اگر تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم ہی اللہ کے دوست ہو (دوسرے) لوگوں کے سوا تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو⑥ اور وہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے، اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے⑦ کہہ دے بلاشبہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، سو یقیناً وہ تم سے ملنے والی ہے، پھر تم ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم

**آیت 6 تا 8** قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ ...... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۹۴ تا ۹۶) کی تفسیر۔

**آیت 9** ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ ...... : اہل کتاب کی شقاوت اور امتِ مسلمہ کی سعادت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہود و نصاریٰ پر جمعہ کا دن فرض کیا گیا تو انھوں نے اسے قبول کرنے میں اختلاف کیا۔ یہود نے اپنے لیے ہفتے کا دن اور نصاریٰ نے اتوار کا دن عبادت کے لیے مقرر کر لیا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو جمعہ کے دن کی ہدایت عطا فرما دی، جس سے انھیں یہود و نصاریٰ دونوں پر سبقت حاصل ہو گئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نحل کی آیت (۱۲۴): ﴿ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ﴾ کی تفسیر۔

② يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا ...... : یہ آیت واضح دلیل ہے کہ جمعہ ان تمام لوگوں پر فرض ہے جو ایمان لا چکے ہیں، خواہ وہ شہر میں رہتے ہوں یا کسی بستی یا بادیہ میں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم کیا ہے: "بَابُ الْجُمُعَةِ فِي الْقُرٰى وَالْمُدُنِ" (بستیوں اور شہروں میں جمعہ کا باب) اور اس میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث لائے ہیں، انھوں نے فرمایا: « إِنَّ أَوَّلَ جُمُعَةٍ جُمِّعَتْ بَعْدَ جُمُعَةٍ فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَسْجِدِ عَبْدِ الْقَيْسِ بِجُوَاثٰى مِنَ الْبَحْرَيْنِ » [ بخاري، الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن : ۸۹۲ ] "پہلا جمعہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں جمعہ کے بعد ادا کیا گیا عبد القیس قبیلے کی مسجد میں ہوا جو بحرین کے جواثی مقام پر تھی۔" ابو داؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: « بِجُوَاثَاءَ قَرْيَةٍ مِّنْ قُرَى الْبَحْرَيْنِ » [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب الجمعة في القرى : ۱۰۶۸ ] "جواثا بحرین کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔" آیت میں جمعہ کے دن صلاۃ کی ندا پر اللہ کے ذکر کی طرف سعی کا حکم ہے اور باجماعت صلاۃ ادا کرنا صرف شہر میں نہیں بلکہ ہر بستی اور بادیہ میں فرض ہے۔

ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ فرما رہے تھے: « مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِيْ قَرْيَةٍ وَلَا بَدْوٍ

مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الۡبَيۡعَ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ

کیا کرتے تھے ⑧ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی

لَا تُقَامُ فِيهِمُ الصَّلَاةُ إِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِيَةَ ﴾ [ أبوداوٗد، الصلاۃ، باب في التشدید في ترك الجماعة : ٥٤٧ ] ”کوئی تین آدمی نہیں جو کسی بستی یا بادیہ میں ہوں، جن میں نماز قائم نہ کی جاتی ہو مگر ان پر شیطان غالب آ چکا ہوتا ہے۔ سو جماعت کو لازم پکڑو، کیونکہ بھیڑیا صرف اس بکری کو کھاتا ہے جو ریوڑ سے دور ہو۔“ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے عمر (بن خطاب رضی اللہ عنہ) کو خط لکھ کر جمعہ کے متعلق سوال کیا، انھوں نے لکھا: ﴿ جَمِّعُوْا حَيْثُمَا كُنْتُمْ ﴾ [ مصنف ابن أبي شیبة : ۱۰۱/۲، ح : ۵۱۰۸ ] ”تم جہاں بھی ہو جمعہ ادا کرو۔“ اس کی سند بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ جن لوگوں نے جمعہ کے لیے شہر یا حاکم وغیرہ کی شرط لگائی ہے ان کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل نہیں اور مشہور روایت ” لَا جُمُعَةَ وَلَا تَشْرِيْقَ إِلَّا فِيْ مِصْرٍ جَامِعٍ “ (جمعہ اور عید جامع شہر کے سوا نہیں ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ یہ علی رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے، جو عمر رضی اللہ عنہ کے صحیح سند کے ساتھ مروی قول کے خلاف ہے، جب صحابہ میں اختلاف ہو تو اصل کتاب و سنت کی طرف رجوع واجب ہے (دیکھیے نساء: ۵۹ ) اور کتاب و سنت کے مطابق تمام مسلمانوں پر ہر جگہ جمعہ فرض ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، البتہ چند لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةً عَبْدٌ مَمْلُوْكٌ أَوِ امْرَأَةٌ أَوْ صَبِيٌّ أَوْ مَرِيْضٌ ﴾ [ أبوداوٗد، الصلاۃ، باب الجمعة للمملوك والمرأة : ۱۰٦٧، قال الألباني صحیح ] ”جمعہ ہر مسلم پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب حق ہے سوائے چار کے، غلام جو کسی کی ملکیت میں ہو یا عورت یا بچہ یا مریض۔“ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلٰى مُسَافِرٍ جُمُعَةٌ ﴾ [ المعجم الأوسط للطبراني : ۲٤۹/۱، ح : ۸۱۸، وقال الألباني صحیح۔ دیکھیے الجامع الصغیر : ٥٤٠٥ ] ”مسافر پر جمعہ نہیں ہے۔“

جن لوگوں پر جمعہ فرض نہیں اگر وہ جمعہ کے لیے آئیں تو اجر کا باعث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں بھی جمعہ کے لیے آتی تھیں، اس سے اجر کے علاوہ قرآن کی آیات سن کر انھیں یاد کرنے کا موقع ملتا، قرآن و سنت سن کر علم میں اضافہ ہوتا اور نصیحت سن کر اصلاح ہوتی تھی۔ ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ﴿ مَا أَخَذْتُ ﴿قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ إِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَؤُهَا كُلَّ يَوْمِ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسَ ﴾ [ مسلم، الجمعة، باب تخفیف الصلاۃ و الخطبة : ۸۷۳/۵۲ ] ”میں نے سورۂ ﴿قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن کر یاد کی، آپ اسے ہر جمعہ کے دن خطبہ دیتے ہوئے منبر پر پڑھا کرتے تھے۔“ صحیح مسلم کے اسی باب کی ایک روایت (۸۷۳) میں ام ہشام رضی اللہ عنہا ہی کے الفاظ ہیں: ﴿ مَا حَفِظْتُ ﴿قٓ﴾ إِلَّا مِنْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ بِهَا كُلَّ جُمُعَةٍ ﴾ مطلب اوپر گزر چکا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو منع فرمایا کہ وہ عورتوں کو اس بات سے روکیں کہ وہ مسجد میں آ کر اجر اور قرآن و سنت کے علم سے اپنا حصہ حاصل کریں۔

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹

طرف لپکو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ۝۹

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُظُوْظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ إِذَا اسْتَأْذَنُوْكُمْ » [ مسلم، الصلاۃ، باب خروج النساء إلی المساجد ...... : ۴۴۲/۱۴۰ ] ''عورتوں کو مساجد میں سے ان کے حصے میں آنے والی چیزوں سے مت روکو، جب وہ تم سے اجازت مانگیں۔''

جمعہ کے دن کی بدعات میں سے ایک بدعت ظہر احتیاطی ہے۔ کچھ لوگ جن کا خیال ہے کہ اسلامی حاکم کے بغیر جمعہ نہیں ہوتا اور دیہات میں بھی جمعہ نہیں ہوتا، شہروں اور گاؤں میں جمعہ کی دو رکعتیں پڑھانے کے بعد احتیاطاً ظہر کی چار رکعتیں بھی پڑھتے ہیں، یہ بدترین بدعت ہے، کیونکہ اس کی بنیاد شک پر ہے جو کفار کا معمول ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴾ [ الدخان : ۹ ] ''بلکہ وہ ایک شک میں کھیل رہے ہیں۔''

③ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ : " اَلصَّلَاةُ " پر ''الف لام'' عہد کا ہے، مراد وہ نماز ہے جو جمعہ کے دن کے ساتھ خاص ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہ نماز جمعہ ہے جو اس دن ظہر کی جگہ ادا کی جاتی ہے اور ندا سے مراد اذان ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ کی آیت (۵۸) کی تفسیر۔ آج کل عام طور پر جمعہ کے دن خطبے سے پہلے دو اذانیں کہی جاتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں یہ دو اذانیں نہیں بلکہ ایک ہی اذان تھی۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: « كَانَ النِّدَاءُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَوَّلُهُ إِذَا جَلَسَ الْإِمَامُ عَلَى الْمِنْبَرِ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَ النِّدَاءَ الثَّالِثَ عَلَى الزَّوْرَاءِ » [ بخاري، الجمعة، باب الأذان يوم الجمعة : ۹۱۲ ] ''جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں یہی معمول تھا۔ پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور لوگ زیادہ ہو گئے تو انھوں نے (بازار میں ایک مقام) زَوراء پر تیسری اذان کا اضافہ کر دیا۔'' یاد رہے کہ اس تیسری اذان سے مراد وہ اذان ہے جو آج کل خطبے سے پندرہ منٹ یا آدھ گھنٹہ پہلے کہی جاتی ہے، اس کے بعد کی دو اذانوں سے مراد اذان اور اقامت ہیں۔ یہ تیسری اذان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں نہیں کہی جاتی تھی، عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی کثرت کے پیشِ نظر اس کا اضافہ کیا، مگر ان کے زمانے میں یہ اذان مسجد میں نہیں کہی جاتی تھی بلکہ بازار میں کہی جاتی تھی، تاکہ لوگوں کو اطلاع ہو جائے۔ آج کل نہ اس اذان کا اہتمام مسجد سے الگ بازار میں کیا جاتا ہے، نہ لاؤڈ سپیکر کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی ہے اور نہ ہی مسجد میں خطبے سے پہلے دو اذانیں عثمان رضی اللہ عنہ کا طریقہ ہے۔ اس لیے خطبے سے پہلے مسجد میں ایک ہی اذان کہی جانی چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طریقہ ہے اور عثمان رضی اللہ عنہ کا عمل بھی یہی ہے۔

④ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ : "سَعٰى يَسْعٰى سَعْيًا" (ف) کا معنی دوڑنا بھی ہے اور کوشش کرنا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [ النجم : ۳۹ ] ''اور یہ کہ انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔'' یہاں دوسرا

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ⑩

پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ⑩

معنی مراد ہے، یعنی نہایت کوشش اور اہتمام کے ساتھ آؤ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لیے دوڑ کر آنے سے منع فرمایا ہے۔

⑤ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ : اگرچہ جمعہ کے لیے پہلے آنا بہت فضیلت کا باعث ہے اور اس کے متعلق احادیث مشہور و معروف ہیں، مگر آخری حد جس کے بعد جمعہ کی طرف روانگی یا اس کے لیے درکار کام کے سوا ہر کام حرام ہو جاتا ہے وہ جمعہ کی اذان ہے۔ یہاں "الْبَيْعَ" کا ذکر اس خاص واقعہ کے پیشِ نظر آیا ہے جو اگلی آیت میں آ رہا ہے، ورنہ اللہ کے ذکر کی طرف سعی جس طرح بیع ترک کرنے کے سوا نہیں ہو سکتی دوسرے تمام کام ترک کرنے کے بغیر بھی نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ جب سعی فرض ہے تو ہر وہ کام حرام ہے جو اس سے روکنے والا ہے۔

⑥ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ : ظاہر ہے آخرت کے ثواب کے مقابلے میں دنیا کے فائدوں کی کوئی حیثیت نہیں۔

⑦ جمعہ کے دن غسل کرنا، اچھے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، پہلے آنا، خاموشی کے ساتھ خطبہ سننا اور دوسرے متعلقہ احکام و فضائل کتب احادیث میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

**آیت 10** ① فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ...... : یہاں ایک سوال ہے کہ آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، تو کیا نماز کے بعد مسجد سے نکلنا ضروری ہے اور کیا کاروبار بھی ضروری ہے یا گھر میں آرام بھی کیا جا سکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگرچہ اصل یہی ہے کہ جس کام کا حکم دیا جائے وہ فرض ہوتا ہے، مگر قرینہ موجود ہو تو امر استحباب کے لیے بھی ہوتا ہے اور بیانِ جواز کے لیے بھی۔ یہاں اذان کے بعد بیع سے منع فرمایا تھا، اب اس ممانعت کی حد بیان فرما دی کہ یہ ممانعت نماز پوری ہونے تک ہے، اس کے بعد بیع کی اجازت ہے اور تمھیں اختیار ہے کہ مسجد سے نکل کر کاروبار میں مصروف ہو جاؤ، لیکن اگر کوئی مسجد میں رہے یا گھر چلا جائے، کاروبار نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ اللہ نے احرام کی حالت میں شکار سے منع فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ [ المائدۃ : ۹۵ ] "شکار کو مت قتل کرو، اس حال میں کہ تم احرام والے ہو۔" پھر فرمایا: ﴿وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ [ المائدۃ : ۲ ] "اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو۔" یہاں شکار کا حکم دینے کا یہ مطلب نہیں کہ احرام کھولنے والے شخص پر شکار کرنا فرض ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ احرام کھولنے کے بعد شکار کی اجازت ہے۔

② وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ : اللہ کے فضل سے مراد یہاں روزی تلاش کرنا ہے، یعنی جس طرح یہود کے لیے یوم السبت (ہفتہ) کو سارا دن شکار منع تھا تم پر ایسی کوئی پابندی نہیں، صرف اذان سے لے کر نماز سے فراغت تک خطبہ اور نماز میں حاضری کے سوا ہر کام منع ہے، اس کے بعد جس حلال طریقے سے روزی کما سکتے ہو کماؤ۔

وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ

اور جب انھوں نے کوئی تجارت دیکھی یا تماشا تو اٹھ کر اس کی طرف چلے گئے اور انھوں نے تجھے کھڑا چھوڑ دیا، کہہ

③ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ : یعنی روزی کی تلاش میں مصروفیت کے دوران بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو جاؤ، بلکہ اسے بہت زیادہ یاد کرتے رہو۔ اللہ کی یاد دل سے بھی ہوتی ہے، زبان سے بھی اور ہر کام اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہوئے اس کے حکم کے مطابق ادا کرنے کے ساتھ بھی۔ مزید دیکھیے سورۂ احزاب (۴۱، ۴۲) کی تفسیر۔

آیت 11 ① وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا...... : اس سے پہلے عام تراجم کے مطابق اس آیت کا ترجمہ ''اور جب وہ کوئی تجارت یا تماشا دیکھتے ہیں تو اٹھ کر اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں'' کیا گیا تھا۔ اس ترجمہ کی وجہ یہ ہے کہ لفظ "اِذَا" عموماً مستقبل کے لیے آتا ہے، حالانکہ اس مقام پر یہ لفظ مستقبل نہیں بلکہ ماضی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لہٰذا آیت کا مذکورہ بالا ترجمہ درست نہیں، بلکہ درست ترجمہ یہ ہے: ''اور جب انھوں نے کوئی تجارت دیکھی یا تماشا تو اٹھ کر اس کی طرف چلے گئے اور انھوں نے تجھے کھڑا چھوڑ دیا۔'' قرینہ اس کا یہ ہے کہ یہ فعل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صرف ایک دفعہ سرزد ہوا ہے، اس کے بعد انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اس لیے یہ کہنا کہ وہ جب بھی کوئی تجارت یا تماشا دیکھتے تھے تو اٹھ کر چلے جاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا چھوڑ جاتے تھے، ہرگز درست نہیں، بلکہ یہاں ماضی میں ہونے والے معاملے کا ذکر ہے جو صرف ایک دفعہ واقع ہوا ہے۔

مفسر ابراہیم میر سیالکوٹی نے ''شہادۃ القرآن'' (جلد دوم) میں اس کے متعلق بہت عمدہ بحث لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں: " إِذْ " اور" إِذَا " دو کلمے ظروف زمانیہ میں سے ہیں۔ " إِذْ " ماضی کے لیے آتا ہے اور کبھی بمعنی مستقبل بھی ہوتا ہے، جیسا کہ " إِذَا " مستقبل کے لیے اور کبھی ماضی کے لیے بھی آتا ہے، چنانچہ مغنی (مغني اللبيب) میں " إِذَا " کی بحث میں لکھا ہے: " أَحَدُهُمَا أَنْ تَجِيْءَ لِلْمَاضِيْ كَمَا تَجِيْءُ إِذْ لِلْمُسْتَقْبَلِ. " " إِذَا " بمعنی " إِذْ " کی مثال یہ آیت ہے: ﴿ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ﴾ [ الجمعۃ : ۱۱ ] ''اور جس وقت انھوں نے تجارت یا کھیل کا سامان دیکھا تو اس کی طرف اٹھ گئے اور تجھے کھڑا چھوڑ دیا۔'' اور یہ آیت: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ ﴾ [ التوبۃ : ۱۱۸ ] ''یہاں تک کہ جس وقت زمین ان پر باوجود فراخ ہونے کے تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان کو گراں معلوم ہوئیں۔'' اور "إِذْ" بمعنی " إِذَا " یعنی مستقبل کی مثال یہ آیت ہے: ﴿ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ ﴾ [ المؤمن : ۷۰، ۷۱ ] ''پس یہ لوگ اس وقت ضرور جان لیں گے، جب ان کی گردنوں میں طوق پڑیں گے۔'' کیونکہ " سَوْفَ " جو خاص استقبال کے لیے موضوع ہے، قرینہ موجود ہے۔'' اس کے بعد مولانا میر سیالکوٹی نے اشعار عرب سے اس کی مثالیں ذکر فرمائی ہیں۔

② وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا...... : " فَضَّ يَفُضُّ فَضًّا " (ن) "اَلشَّيْءَ" کسی چیز کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دینا۔ " اِنْفَضَّ " (انفعال) بکھر جانا، منتشر ہو جانا۔ مدینہ میں ایک تجارتی قافلے کی آمد پر صحابہ کے اٹھ کر چلے جانے پر

ع ۲ ۱۲

اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

دے جو اللہ کے پاس ہے وہ تماشے سے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے۔ ﴿۱۱﴾

ناراضی کا اظہار ہو رہا ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جمعہ کے دن ایک قافلہ آیا جب کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، تو بارہ آدمیوں کے سوا سب اس کی طرف اٹھ کر چلے گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا﴾ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿و إذا رأوا تجارة أو لهوا﴾ : ۴۸۹۹ ] جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، اس دوران مدینہ میں ایک قافلہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جلدی سے اٹھ کر چلے گئے، حتیٰ کہ آپ کے پاس صرف بارہ آدمی رہ گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَوْ تَتَابَعْتُمْ حَتّٰى لَا يَبْقٰى مِنْكُمْ أَحَدٌ لَسَالَ بِكُمُ الْوَادِي النَّارَ، فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ : ﴿وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا﴾ وَ قَالَ فِي الْاِثْنَيْ عَشَرَ الَّذِيْنَ ثَبَتُوْا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ » [ مسند أبي يعلى : ۴۶۸/۳، ح : ۱۹۷۹، قال المحقق حسين سليم أسد إسناده صحيح ] ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم سب ایک دوسرے کے پیچھے چلے جاتے، حتیٰ کہ تم میں سے ایک بھی باقی نہ رہتا تو یہ وادی تمھیں آگ کے ساتھ بہا کر لے جاتی۔“ اس پر یہ آیت اتری: ﴿وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا﴾ جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ان باقی رہنے والے بارہ آدمیوں میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔“

3 اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے، اس لیے عذر کے بغیر بیٹھ کر خطبہ نہیں دینا چاہیے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن کھڑے ہو کر خطبہ دیتے، پھر بیٹھ جاتے، پھر کھڑے ہو جاتے، جیسا کہ آج کل کرتے ہیں۔“ [ مسلم، الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة و ما فيهما من الجلسة : ۸۶۱ ]

4 جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: « كَانَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُطْبَتَانِ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَ يُذَكِّرُ النَّاسَ » [ مسلم، الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة و ما فيهما من الجلسة : ۸۶۲ ] ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے دیا کرتے تھے، ان دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے، آپ قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے۔“ اس حدیث سے کئی باتیں ثابت ہوئیں، ایک یہ کہ جمعہ کے دو خطبے ہیں، جو کھڑے ہو کر دیے جاتے ہیں اور ان کے درمیان بیٹھا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ جمعہ کے خطبے میں یہ دو چیزیں ہوں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا خطبہ ہے ورنہ نہیں، ایک یہ کہ اس میں قرآن مجید ضرور پڑھا جائے خواہ ایک آیت ہی ہو اور دوسری یہ کہ اس میں نصیحت کی جائے، اگر کسی خطبے میں تذکیر (نصیحت) نہیں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا خطبہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ نصیحت کا مقصد یہی ہے کہ لوگ اسے سمجھیں اور اس پر عمل کریں اور یہ مقصد تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب لوگوں کو ان کی زبان میں سمجھایا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر، اس کی حمد و ثنا، قرآن و سنت کی تعلیم اور

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اہتمام ہوتا ہے اور وہ آئندہ سات دنوں کے لیے نئے سرے سے مصروف عمل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ مذہبی شعار ہے اس لیے کوئی حکومت بھی اس اجتماع کو ختم نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کو عمل کے اندر کوتاہی یا دین حق سے انحراف یا کفار سے جہاد میں غفلت کی صورت میں ان کے علماء انھیں ان کا فریضہ یاد دلاتے ہیں، مگر جس طرح دوسرے کئی شعار کا حال خراب ہوا جمعہ کے متعلق بھی بعض لوگوں نے اپنے پاس سے ایسی کئی پابندیاں لگا دیں جن کی وجہ سے مسلمان عملاً اس کے فوائد سے محروم ہو گئے۔ ہر جمعہ کو تمام مسلمان قرآن وسنت کا جو علم حاصل کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے آگاہ ہوتے تھے، اب اپنے مسائل کے لیے ان علماء کے محتاج ہو گئے جو قرآن وحدیث سے مسائل لینے کے بجائے کسی ایک فقہی مکتب کے مقلد تھے، ان علماء کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ عام آدمی کے لیے پڑھنا ہی درست نہ تھا۔ مدت تک برصغیر میں قرآن مجید کے فارسی یا اردو ترجمے کی کسی کو جرأت ہی نہیں ہوئی۔ ان کے مطابق عام مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ خود قرآن یا حدیث دیکھنے کے بجائے عالم سے مسئلہ پوچھے اور اس عالم کا کام یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں سے مسئلہ بتانے کے بجائے اپنے امام کا قول بیان کرے۔ اس جمعہ میں قرآن یا حدیث کے بیان کا جو امکان تھا وہ انھوں نے اس طرح ختم کیا کہ اس کے لیے شہر اور حاکم کی شرط لگا دی، تو چند مقامات کے سوا باقی ہر جگہ جمعہ ویسے ہی بند ہو گیا، جبکہ عورتوں کے لیے مسجد میں آنا سرے سے ممنوع قرار دیا۔ پھر یہ شرط لگائی کہ جمعہ کا خطبہ صرف عربی میں ہوگا، تاکہ کوئی شخص قرآن وسنت سے واقف نہ ہو سکے، حالانکہ جس امام کے وہ مقلد ہیں ان کے نزدیک نماز میں بھی قرآن کی تلاوت فارسی یا کسی اور زبان میں کی جا سکتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مدتوں یہی سلسلہ جاری رہا، آخر کار جب عمل بالحدیث کا غلغلہ بلند ہوا اور تقلید کی پابندیوں سے آزاد علماء نے اردو میں خطبہ شروع کیا اور لوگوں کو اصل قرآن وسنت سننے کا موقع ملا تو بجائے اس کے کہ وہ حضرات بھی اردو میں خطبہ دیتے، انھوں نے اذان کے بعد والے دو خطبے عربی میں ضروری قرار دینے پر اصرار جاری رکھا، مگر اس کے ساتھ اپنے مذہب کے دفاع کے لیے اردو میں ایک خطبے کا اضافہ کر دیا اور اس کا نام تقریر رکھ دیا، حالانکہ خطبہ ہو یا خطاب یا تقریر، ایک ہی چیز ہے۔ ان حضرات نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس طرح انھوں نے اردو میں خطبہ دے کر ایک تو وہی کام کیا جس سے وہ دوسروں کو روکتے تھے اور ایک یہ کہ انھوں نے دو خطبوں کے بجائے تیسرے خطبے کی بدعت ایجاد کر لی۔ یاد رکھیں کہ اگر ہم رسول اللہ ﷺ والا خطبہ جمعہ دینا چاہتے ہیں تو اس میں تذکیر (نصیحت) ضروری جز ہے، بلکہ یہ خطبے کا اصل مقصود ہے اور وہ لوگوں کو ان کی زبان میں سمجھائے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے خطبے صرف دو ہونے چاہییں اور عربی کے ساتھ ساتھ اسے مخاطب لوگوں کی زبان میں بھی سمجھانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔



❶ **قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ** ...... : یعنی اللہ کی خاطر تم جس لہو (کھیل تماشے) اور تجارت کو چھوڑو گے اللہ کے پاس اس سے کہیں بہتر بدلا دنیا اور آخرت دونوں میں موجود ہے۔

❷ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نادانی میں یہ عمل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی، اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس طرح اللہ کے ذکر اور نماز کو تجارت وغیرہ پر ترجیح دی اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور (۳۶، ۳۷) میں فرمایا ہے۔

سورۃ المنٰفقون ۶۳ — آیاتہا ۱۱ — رکوعاتہا ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ ۘ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُہٗ ؕ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے کہ تو

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھا کرتے تھے۔
[ مسلم، الجمعة، باب ما یقرأ فی صلاۃ الجمعة : ۸۷۷ ]

آیت 1 ① اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ : "اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ" "اَلنَّافِقَاءُ" سے مشتق ہے جو "یربوع" (چوہے سے ملتے جلتے ایک جنگلی جانور) کے بل کا ایک منہ ہوتا ہے، وہ اسے اس طرح بناتا ہے کہ اس جگہ مٹی کی صرف اتنی تہ رہنے دیتا ہے کہ سر مارے تو کھل جائے، اس منہ کو وہ چھپا کر رکھتا ہے اور دوسرا منہ ظاہر کر دیتا ہے۔ منافق بھی چونکہ اپنا کفر چھپاتا اور ایمان ظاہر کرتا ہے، اس لیے اس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ یہ ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے، مراد اس سے عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی ہیں۔

② رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے کچھ عرصہ پہلے اوس اور خزرج کے درمیان ہونے والی جنگ بعاث میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ وہ اپنا ایک متفقہ سردار مقرر کر لیں، بلکہ طے کر چکے تھے کہ عبداللہ بن اُبی کی باقاعدہ تاج پوشی کر کے اسے اپنا سردار بنا لیں۔ اسی اثنا میں چند سعادت مند حج کے لیے مکہ گئے اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر مسلمان ہو گئے۔ اگلے دو سالوں میں مزید لوگوں نے جا کر بیعت کی اور آخری بار انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ ان سالوں میں مدینہ کے ہر گھر میں اسلام پہنچ چکا تھا، رسول اللہ ﷺ کی آمد پر اوس و خزرج کے بااثر لوگوں سمیت ان کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ آپ ﷺ کی وجہ سے عبداللہ بن اُبی اور اس کے حامیوں کی سرداری کی امید ناکام ہوئی تو وہ آپ ﷺ کے شدید دشمن بن گئے۔ کچھ مدت تک تو وہ کھلم کھلا عداوت کا اظہار کرتے رہے، مگر بدر کی عظیم الشان فتح کے بعد ان کے پاس مدینہ میں رہنے کے لیے مسلمان ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو وہ مسلمان ہو گئے، حتیٰ کہ عبداللہ بن اُبی بھی مسلمان ہو گیا، مگر ان کا اسلام صرف جان بچانے کے لیے اور وہ فوائد حاصل کرنے کے لیے تھا جو مسلمانوں کو عزت و قوت اور فتح و غنیمت کی صورت میں حاصل تھے۔ یہ لوگ نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے، زکوٰۃ دیتے اور جہاں غنیمت کی امید ہوتی جہاد میں بھی جاتے تھے، مگر دل سے اب بھی ایمان نہیں لائے تھے بلکہ ہر موقع پر انھوں نے مسلمانوں کو دھوکا دیا اور نقصان پہنچایا۔ جنگ احد میں یہ لوگ لشکر کا تیسرا حصہ لے کر میدان جنگ سے واپس چلے گئے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر والوں کو جنگ پر اور مسلمانوں کے خلاف ڈٹ جانے پر ابھارتے رہے، خندق اور دوسرے مواقع پر انھوں نے کفار کے ساتھ ساز باز رکھی اور جب موقع ملتا رسول اللہ ﷺ، مسلمانوں اور

وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①

یقیناً اس کا رسول ہے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں①

اسلام کے متعلق گستاخانہ باتیں کرتے، جیسا کہ اگلی آیات میں آ رہا ہے۔ لیکن جب ایسی باتیں سامنے آنے پر ان سے باز پرس کی جاتی تو وہ قسمیں کھا جاتے کہ ہم مسلمان ہیں اور آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی گستاخیوں سے درگزر فرماتے رہے، کیونکہ یہ لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے اور مخلص مسلمانوں کے عزیز اور رشتہ دار بھی تھے۔ اگر آپ انھیں قتل کرتے تو بہت سی بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے آپ سب کچھ برداشت کرتے رہے، حتیٰ کہ آخر کار آپ ﷺ کے صبر و ضبط اور عفو و حلم کی وجہ سے ان کی حقیقت کھل کر سب کے سامنے آ گئی اور وہ مخلص مسلمانوں کی نگاہ میں بالکل بے قدر و قیمت ہو کر رہ گئے، ان کا کوئی اعتبار باقی نہ رہا۔ ان کا کچھ حال سورۂ بقرہ (۸ تا ۲۰)، آل عمران، نساء، مائدہ، توبہ، سورۂ احزاب اور دوسرے مقامات پر گزر چکا ہے۔

③ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ: "إِنَّ" اور "لام تاکید" عموماً قسم کے جواب میں آتے ہیں اور قسم جیسی تاکید کا فائدہ دیتے ہیں۔ شہادت اس بات کی خبر دینے کو کہتے ہیں جس کا دل سے یقین ہو۔ منافقین کی عادت تھی کہ وہ قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے، جب کہ مخلص مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ مزید دیکھیے سورۂ نساء (۶۲)، توبہ (۵۶، ۶۲، ۷۴، ۹۶) اور سورۂ مجادلہ (۱۸) کی تفسیر۔

④ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ...... : یہ منافقین کا قول نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، اس لیے اگر وقف کرنا ہو تو "اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ" پر کرنا چاہیے، آیت شروع کر کے "اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ" پر وقف سے وہم پڑھتا ہے کہ یہ دونوں جملے منافقین کا قول ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصدیق فرمائی کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں تو یہ کیوں فرمایا کہ اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں اور منافق جھوٹے کس طرح ہوئے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا جھوٹ نہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، بلکہ یہ سچ ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اس کی تصدیق فرمائی کہ "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ" یعنی اللہ جانتا ہے کہ بلاشبہ آپ یقیناً اس کے رسول ہیں، منافقین کو جھوٹا اس لیے فرمایا کہ انھوں نے کہا کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، حالانکہ وہ اس بات کی شہادت نہیں دیتے بلکہ یہ بات صرف زبان سے کہہ رہے ہوتے ہیں، دل سے وہ آپ کو اس کا رسول نہیں مانتے۔ شہادت میں سچے وہ تب ہوتے جب وہ دل اور زبان دونوں سے آپ کی رسالت کا اقرار کرتے۔

زمخشری نے فرمایا کہ اگر درمیان میں جملہ "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ" نہ ہوتا تو کلام اس طرح ہوتا تھا: "إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ" "جب تیرے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم شہادت دیتے ہیں کہ بلاشبہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافق یقیناً

اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳ وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ

انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا، پس انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا۔ یقیناً یہ لوگ جو کچھ کرتے رہے ہیں برا ہے ۝۲ یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، سو وہ نہیں سمجھتے ۝۳ اور جب تو انھیں دیکھے تجھے ان کے جسم اچھے لگیں گے اور اگر وہ بات کریں تو تُو ان کی بات پر کان لگائے گا، گویا وہ

جھوٹے ہیں'' لیکن اس سے وہم پڑ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس بات میں جھوٹا کہہ رہے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس لیے درمیان میں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں، پھر فرمایا اور اللہ تعالیٰ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں، یعنی ان کا یہ کہنا جھوٹ ہے کہ ہم شہادت دیتے ہیں۔

**آیت 2** اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مجادلہ کی آیت (۱۶) کی تفسیر۔ ''سَبِيْلِ اللّٰهِ'' سے مراد اسلام بھی ہے اور جہاد بھی۔

**آیت 3** ① ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا : ''ذٰلِكَ'' کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا مومن ہونے کی جھوٹی قسمیں کھانا اور اللہ کی راہ سے روکنا وغیرہ اس لیے ہے کہ وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا۔ ایمان لا کر کفر تین طرح سے ہے، ایک یہ کہ وہ ظاہر میں ایمان لائے اور مسلمان ہو گئے مگر دل میں کافر ہی رہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے پاس آئے تو ایمان کی شہادت دی، پھر کفار کے پاس گئے تو انھیں اپنے کفر کا یقین دلایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ﴾ [ البقرۃ : ۱۴ ] ''اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیطانوں کی طرف اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں بے شک ہم تمھارے ساتھ ہیں۔'' منافقین کی اکثریت ایسی ہی تھی اور ایک یہ کہ ان میں سے بعض شروع میں تو صحیح ایمان لائے، پھر دنیوی اغراض کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین میں سے جو لوگ تائب ہوئے اور ان کا اسلام خالص ہوا وہ اس گروہ سے تھے۔

② فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ : یعنی ان کے ایمان لانے کے بعد کفر کرنے کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی تو وہ نہ دنیا اور آخرت میں نفاق کے نقصان کو سمجھتے ہیں نہ انھیں اس پر کوئی شرمندگی ہوتی ہے اور نہ ہی توبہ کی توفیق ملتی ہے۔

**آیت 4** ① وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ : اکثر منافقین خوش حال، صاحبِ حیثیت، تیز طرار اور ہوشیار لوگ تھے، ان کی خوش حالی اور مال کی حرص ہی ان کے نفاق کا باعث تھی۔ ان کا سردار عبداللہ بن اُبی معاشی لحاظ سے بھی رئیس تھا اور دیکھنے میں بھی بڑا خوب صورت، لمبے قد والا اور جسیم تھا۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا:

اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ④

ٹیک لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں، ہر بلند آواز کو اپنے خلاف گمان کرتے ہیں۔ یہی اصل دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہ۔ اللہ انھیں ہلاک کرے، کہاں بہکائے جا رہے ہیں④

« كَانُوْا رِجَالًا أَجْمَلَ شَيْءٍ »[ بخاري : ٤٩٠٣ ] ''وہ بہت خوبصورت آدمی تھے۔'' مزید تفصیل آگے آیت (۷) کی تفسیر میں دیکھیے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (بدر کے قیدیوں میں سے ) عباس مدینہ میں تھے، انصار نے انھیں پہنانے کے لیے کپڑا تلاش کیا مگر انھیں عبداللہ بن اُبی کی قمیص کے علاوہ کوئی قمیص نہ ملی جو ان کے جسم پر پوری آتی ہو، چنانچہ انھوں نے وہی ان کو پہنا دی۔[ نسائي ، الجنائز ، باب القميص في الكفن : ١٩٠٣ ، وقال الألباني صحيح ]اہل علم فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبی کی وفات پر آپ ﷺ نے اسے اپنی قمیص جو پہنائی اس پر دوسری مصلحتوں کے علاوہ اس احسان کا بدلا اتارنا بھی مقصود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلی آیت میں ''فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ'' کے الفاظ کے ساتھ منافقین کی ناسمجھی بیان کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ اے مخاطب! جب تو انھیں دیکھے تو ڈیل ڈول اور خوبصورتی کی وجہ سے ان کے جسم تجھے بہت اچھے دکھائی دیں گے اور اگر وہ بات کریں تو ایسے فصیح و بلیغ ہیں کہ تو ان کی بات سنتا ہی رہ جائے۔ ان کی چرب زبانی کا ذکر سورۂ بقرہ (۲۰۴) میں بھی آیا ہے۔ یہاں بعض مفسرین نے ''وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ'' میں مخاطب رسول اللہ ﷺ کو قرار دیا ہے، مگر بہتر ہے کہ اسے ہر مخاطب کے لیے عام رکھا جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو شروع سے انھیں دیکھتے آ رہے تھے۔

② ظاہر ہے کہ ''اِذَا رَاَيْتَهُمْ'' (جب تو انھیں دیکھے ) سے عبداللہ بن اُبی اور اس جیسے منافق مراد ہیں، کیونکہ تمام منافق تو حسین و جمیل نہیں تھے اور نہ ہی ایسے فصیح و بلیغ تھے۔ (التسہیل )

③ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ : ''خُشُبٌ'' ''خَشَبَةٌ'' کی جمع ہے، لکڑیاں۔ اس وزن کی یہ جمع بہت کم آتی ہے۔ مفسرین نے اس کی نظیر ''ثَمَرَةٌ'' کی جمع ''ثُمُرٌ'' لکھی ہے۔ ''مُسَنَّدَةٌ'' باب تفعیل سے اسم مفعول ہے، دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر رکھی ہوئی۔ یعنی جیسے لکڑیوں میں طول و عرض اور خوبصورتی کے باوجود عقل اور سمجھ نہیں ہوتی اسی طرح یہ بھی عقل اور سمجھ سے عاری ہیں۔ جب یہ آپ کی مجلس میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں تو یہ مت سمجھیں کہ یہ آدمی ہیں، بلکہ یوں سمجھیں کہ لکڑیاں ہیں جو ٹیک لگا کر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں، گو بظاہر خوبصورت نظر آتے ہیں۔ زمخشری نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حسین و جمیل اور جسیم و عریض ہونے کے باوجود ان سے کسی نفع کی امید نہیں، جس طرح کارآمد لکڑی چھت، دروازے یا کھڑکیوں میں یا کہیں نہ کہیں استعمال ہوتی ہے، مگر بے کار لکڑیوں کو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر رکھ دیا جاتا ہے۔

● يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ : اس میں ان کی بزدلی کا نقشہ کھینچا ہے کہ جوں ہی کوئی آواز بلند ہوتی ہے یا شور اٹھتا ہے

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۞ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۞

اور جب ان سے کہا جائے آؤ اللہ کا رسول تمھارے لیے بخشش کی دعا کرے تو وہ اپنے سر پھیر لیتے ہیں اور تو انھیں دیکھے گا کہ وہ منہ پھیر لیں گے، اس حال میں کہ وہ تکبر کرنے والے ہیں ۞ ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے، یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا، بے شک اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۞

تو وہ اسے اپنے آپ پر پڑنے والی افتاد ہی سمجھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کفار کا حملہ ہو گیا ہو جس میں ہمیں لڑنا پڑے اور اس میں ہماری موت ہو۔ (دیکھیے احزاب : ۱۹) یا رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو ہمارے خبث باطن کا پتا چل گیا ہو اور ہمارے خلاف کارروائی کا حکم آ گیا ہو، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں رسوا کرنے والی یا ہمارے قتل کے حکم والی کوئی آیت یا سورت اتری ہو۔ (دیکھیے توبہ: ۶۴)

❺ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ : "اَلْعَدُوُّ" خبر پر الف لام لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو رہا ہے کہ تمھارے اصل دشمن یہی ہیں، کیونکہ کھلم کھلا کفار کی عداوت ظاہر ہے جس سے بچاؤ آسان ہے، یہ گھر کے بھیدی اور آستین کے سانپ ہیں جو مسلمان بن کر ہر وقت تمھارے ساتھ ہیں۔ ان کی عداوت زیادہ خطرناک ہے اور اس سے بچنا بہت مشکل ہے، اس لیے ان سے ہوشیار رہیں۔

❻ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ : یہ بد دعا کا کلمہ ہے، اللہ انھیں ہلاک کرے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دعا یا بد دعا کی کیا ضرورت ہے، وہ تو جو چاہے کر سکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ان کے حق میں لوگوں کی زبان پر آنے والی بد دعا نقل کی گئی ہے۔ مراد ان کی مذمت ہے۔

❼ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ : یعنی اتنے واضح دلائل کے باوجود ایمان چھوڑ کر یہ لوگ کہاں بہکائے جا رہے ہیں۔

**آیت 5** ❶ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ ...... : "لَوَّوْا" "لَوٰى يَلْوِيْ لَيًّا" (ض) (پھیرنا) سے باب تفعیل ہے، جس سے سر پھیرنے میں مبالغہ یا اس کا تکرار مقصود ہے۔ آیت (۷) میں اس کا سبب نزول آ رہا ہے۔

❷ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ : "صَدَّ يَصُدُّ صَدًّا وَ صُدُوْدًا" (ن) "صَدًّا" (متعدی) روکنا اور "وَصُدُوْدًا" (لازم) اعراض کرنا، منہ پھیر لینا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر معذرت کر لینے کی ترغیب پر تم انھیں دیکھو گے کہ وہ تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیں گے۔

**آیت 6** سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ...... : "اَسْتَغْفَرْتَ" اصل میں "ءَاِسْتَغْفَرْتَ" ہے،

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۷

یہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، حالانکہ آسمانوں کے اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں اور لیکن منافق نہیں سمجھتے ۷

ہمزۂ تسویہ آنے کے بعد ہمزۂ وصل کی ضرورت نہ رہی، اس لیے وہ گر گیا۔ اس میں ہمزہ استفہام کا نہیں ہے، بلکہ اسے ہمزۂ تسویہ کہتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۶) آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۸۰) کی تفسیر۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کی ان کے لیے معافی کی امید کو ختم کرنا ہے، کیونکہ منافقوں کی تمام شرارتوں اور بے ادبیوں کے باوجود آپ ﷺ اپنی طبعی رحمت و شفقت کی بنا پر چاہتے تھے کہ ان کے لیے معافی کی دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لیے معافی کی دعا سے منع فرما دیا، کیونکہ ان کا فسق حد سے بڑھ چکا تھا۔

**آیت 7** ① هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ...... : اس آیت میں اور اس سے اگلی آیت میں ان منافقین کے فسق کے نمونے کے طور پر ان کے کچھ گستاخانہ جملے ذکر فرمائے ہیں، جن سے ان کی اسلام اور مسلمانوں سے شدید نفرت اور دلی بغض کا اظہار ہو رہا ہے۔ گویا بتایا جا رہا ہے کہ یہ ہے ان کا بدترین فسق جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت نہیں دیتا اور جس کی وجہ سے ان کے حق میں رسول اللہ ﷺ کے استغفار کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ أَصَابَ النَّاسَ فِيْهِ شِدَّةٌ، فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ لِأَصْحَابِهِ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِهِ وَقَالَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرْتُهُ فَأَرْسَلَ إِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أُبَيٍّ فَسَأَلَهُ، فَاجْتَهَدَ يَمِيْنَهُ مَا فَعَلَ، قَالُوْا كَذَبَ زَيْدٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ مِمَّا قَالُوْا شِدَّةٌ، حَتّٰى أَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ تَصْدِيْقِيْ فِيْ: ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ ﴾ فَدَعَاهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَسْتَغْفِرَ لَهُمْ فَلَوَّوْا رُؤُوْسَهُمْ وَقَوْلُهُ: ﴿ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ﴾ قَالَ كَانُوْا رِجَالًا أَجْمَلَ شَيْءٍ» [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ و إذا رأيتهم تعجبك أجسامهم ﴾ : ۴۹۰۳ ] ”ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، اس سفر میں لوگوں کو بہت سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا تو عبداللہ بن اُبی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ اس کے گرد سے منتشر ہو جائیں۔“ اور اس نے کہا: ”اگر ہم مدینہ واپس پہنچے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل تر کو اس میں سے ضرور نکال باہر کرے گا۔“ یہ سن کر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو یہ بات بتائی۔ آپ ﷺ نے عبداللہ بن اُبی کی طرف پیغام بھیج کر اسے بلایا اور اس سے یہ بات پوچھی تو اس نے بہت

يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ ع

وہ کہتے ہیں یقیناً اگر ہم مدینہ واپس گئے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ اس میں سے ذلیل تر کو ضرور ہی نکال باہر کرے گا، حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے اور لیکن منافق نہیں جانتے ﴿۸﴾

پکی قسم کھا کر کہا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ لوگوں نے کہا: ”زید نے رسول اللہ ﷺ سے جھوٹ کہا ہے۔“ تو میرے دل میں ان کی بات سے بہت تکلیف پہنچی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ”اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ“ میں میری تصدیق نازل فرما دی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں بلایا، تاکہ ان کے لیے استغفار کریں تو انھوں نے اپنے سر پھیر لیے۔“ اور (زید رضی اللہ عنہ نے) اللہ کے فرمان ”خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ“ کے متعلق فرمایا: ”وہ بہت خوبصورت آدمی تھے۔“

❷ وَ لِلّٰهِ خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : ”لِلّٰهِ“ کو پہلے لانے کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور کوئی نہیں۔ منافقین نے خود تو کیا خرچ کرنا تھا، وہ تو پرلے درجے کے حریص اور بخیل تھے، وہ مخلص مسلمانوں کو بھی مہاجرین پر خرچ کرنے سے روک رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اگر وہ ان پر خرچ نہیں کریں گے تو وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ حالانکہ سارے خزانوں کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس طرح چاہے انھیں رزق دے سکتا ہے، مگر یہ منافقین کی بے سمجھی ہے کہ وہ مہاجرین کا رزق اپنے ہاتھ میں سمجھ رہے ہیں، اس لیے یہاں ”لَا يَفْقَهُوْنَ“ کا لفظ فرمایا کہ ایسا سمجھنے والا بے سمجھ ہے۔

**آیت 8** ❶ يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ: جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: «كُنَّا فِيْ غَزَاةٍ قَالَ سُفْيَانُ مَرَّةً فِيْ جَيْشٍ فَكَسَعَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ الْأَنْصَارِيُّ يَا لَلْأَنْصَارِ وَقَالَ الْمُهَاجِرِيُّ يَا لَلْمُهَاجِرِيْنَ فَسَمِعَ ذٰلِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا بَالُ دَعْوٰى جَاهِلِيَّةٍ؟ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! كَسَعَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ دَعُوْهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ، فَسَمِعَ بِذٰلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ فَقَالَ فَعَلُوْهَا؟ أَمَا وَاللّٰهِ! لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ عُمَرُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! دَعْنِيْ أَضْرِبْ عُنُقَ هٰذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ لَا يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ وَكَانَتِ الْأَنْصَارُ أَكْثَرَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ حِيْنَ قَدِمُوا الْمَدِيْنَةَ، ثُمَّ إِنَّ الْمُهَاجِرِيْنَ كَثُرُوْا بَعْدُ» [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿سواء عليهم استغفرت لهم﴾ : ۴۹۰۵ ] ”ایک بار ہم ایک لشکر میں تھے تو ایک مہاجر آدمی نے ایک انصاری کو اس کے پیچھے کی جانب

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ⑨

**اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے تو وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں⑨**

لات مار دی۔'' تو انصاری نے کہا: ''او انصاریو!'' اور مہاجر نے کہا: ''او مہاجرو!'' رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا: ''جاہلیت کی اس پکار کا کیا معاملہ ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کے پیچھے کی جانب لات مار دی ہے، تو آپ نے فرمایا: ''اس (جاہلیت کی پکار) کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ بہت بدبو دار ہے۔'' یہ بات عبداللہ بن اُبی نے سنی تو کہنے لگا: ''انھوں نے ایسا کیا ہے؟ یاد رکھو! اگر ہم مدینہ واپس پہنچے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل تر کو اس سے ضرور نکال باہر کرے گا۔'' یہ بات نبی ﷺ کو پہنچی تو عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کہا: ''یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیں کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''اسے رہنے دو، لوگ یہ بات نہ کریں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔'' اور انصار مہاجرین سے زیادہ تھے جب وہ مدینہ میں آئے، پھر بعد میں مہاجرین زیادہ ہو گئے۔''

② وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی یہ منافقین جو کہہ رہے ہیں کہ زیادہ عزت والا ذلیل تر کو نکال باہر کرے گا، تو انھیں معلوم نہیں کہ زیادہ عزت والا بلکہ ساری عزت کا مالک کون ہے۔ سو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ عزت کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے، پھر وہ ہے جسے وہ عزت عطا فرمائے۔ (دیکھیے نساء: ۱۳۹۔ آل عمران: ۲۶) اور اس نے عزت اپنے رسول اور مومن بندوں کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ سو یہ سوچ لیں کہ اگر عزت والے نے ذلیل تر کو مدینہ سے نکالنے کا ارادہ کر لیا تو اس فیصلے کی زد بھی انھی منافقین پر پڑے گی، مگر ان جاہلوں کو علم ہی نہیں۔

③ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے، ترمذی میں اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: (( فَقَالَ لَهُ ابْنُهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ : وَاللّٰهِ ! لَا تَنْقَلِبُ حَتّٰى تُقِرَّ أَنَّكَ الذَّلِيْلُ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْعَزِيْزُ فَفَعَلَ )) [ ترمذي، تفسير القرآن، سورة المنافقون : ۳۳۱۵، وقال الألباني صحيح ] ''تو اس (عبداللہ بن اُبی) کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''اللہ کی قسم! تم واپس نہیں جاؤ گے حتیٰ کہ اقرار کرو کہ تم ہی ذلیل ہو اور رسول اللہ ﷺ ہی عزیز ہیں۔'' چنانچہ اس نے ایسے ہی کیا۔''

آیت 9 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ: ''لَا تُلْهِ'' ''لَهْوٌ'' میں سے باب افعال ''أَلْهٰى يُلْهِيْ'' کا نہی مؤنث غائب کا صیغہ ہے، ''كُمْ'' اس کا مفعول بہ اور ''اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ'' فاعل ہے۔ فاعل جمع مکسر ہونے کی وجہ سے فعل واحد مؤنث کا صیغہ لایا گیا ہے۔

② منافقین کے برے اعمال کا حال بیان کرنے کے بعد تمام ایمان لانے والوں کو خواہ وہ مخلص ہیں یا منافق، ان دو چیزوں سے

وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰﴾

اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں دیا ہے، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے، پھر وہ کہے اے میرے رب! تو نے مجھے قریب مدت تک مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا ﴿۱۰﴾

ہوشیار رہنے کی نصیحت فرمائی جو انسان کے لیے فتنہ ہیں اور نفاق کا باعث بنتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ [ التغابن : ١٥ ] ''تمھارے مال اور تمھاری اولاد تو محض ایک آزمائش ہیں۔'' اور فرمایا، دیکھنا! تمھارے اموال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں کہ ان کی وجہ سے نماز چھوڑ دو، یا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یا جہاد کے لیے نکلنا چھوڑ دو، یا ان کی وجہ سے جھوٹ اور خیانت کا ارتکاب کرنے لگو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آدمی کو اس کے اموال و اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کریں تو وہ قابل مذمت نہیں ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اموال و اولاد کے علاوہ کوئی اور چیز اللہ کے ذکر سے غافل کرتی ہے تو وہ بھی مذموم ہے، مثلاً کھیل تماشے، دوستوں کی مجلس اور نام و نمود کی خواہش وغیرہ۔ کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: (( إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً، وَإِنَّ فِتْنَةَ أُمَّتِي الْمَالُ )) [ مسند أحمد : ٤/ ١٦٠، ح : ١٧٤٧١، قال المحقق حديث صحيح ] ''ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔'' یعلیٰ عامری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دوڑتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے، آپ نے انھیں اپنے ساتھ چمٹا لیا اور فرمایا: (( إِنَّ الْوَلَدَ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ )) [ ابن ماجه، الأدب، باب بر الوالد و الإحسان إلى البنات : ٣٦٦٦ ] ''بے شک اولاد بخیل بننے اور بزدل بننے کا باعث ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ کہف کی آیت (۴۶): ﴿ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ کی تفسیر۔

③ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ: ''ذِكْرِ اللّٰهِ'' سے صرف نماز، روزہ اور زبانی ذکر مراد نہیں، بلکہ ہر کام کے وقت اپنے رب کو یاد رکھنا مراد ہے کہ اگر مالک کی اجازت ہے تو وہ کام کرے، اگر نہیں تو نہ کرے۔ اسی طرح ہر وہ کام کرنے کی حتی الوسع کوشش کرے جس کا اس نے حکم دیا ہے اور اس سے رک جائے جس سے اس نے منع فرمایا ہے۔

④ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: ''الْخٰسِرُوْنَ'' پر الف لام لانے اور اس سے پہلے ضمیر فصل سے تاکید اور حصر کا مفہوم پیدا ہو گیا کہ اصل خسارے والے صرف وہ لوگ ہیں جنھیں ان کے اموال و اولاد اللہ کی یاد سے غافل کر دیں۔ اگر اللہ کی یاد پر قائم رہنے کی وجہ سے اموال و اولاد کا نقصان ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے خسارہ تسلیم ہی نہیں فرمایا، کیونکہ اموال و اولاد فانی ہیں اور اللہ کی یاد باقی ہے۔ جو باقی کو چھوڑ کر فانی میں مشغول ہو جائے اصل خسارے میں پڑنے والا وہ ہے۔

آیت 10 ① وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ...... : ''مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ'' کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی تیسری

وَ لَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱ ع ۲ ۱۴

اور اللہ کسی جان کو ہرگز مہلت نہیں دے گا جب اس کا وقت آ گیا اور اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو ⑪

آیت کی تفسیر۔ نفاق سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے جتنا ہو سکے مرنے سے پہلے خرچ کرنے کا حکم دیا۔

② مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ...... : یعنی مرتے وقت یہ دعا اور تمنا کرنا بے کار ہے، عقل مند کا کام یہ ہے کہ مہلت سے فائدہ اٹھائے اور مرنے سے پہلے آخرت کا سامان تیار کرے۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۴۴) اور سورۂ مومنون (۹۹، ۱۰۰)۔

③ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ: ”فَاَصَّدَّقَ“ اصل میں ”فَأَتَصَدَّقَ“ ہے، اس پر نصب اس لیے آیا ہے کہ یہ ”لَوْ لَآ“ کے جواب میں ہے جو تحضیض کے لیے ہے اور اس میں طلب اور شرط کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس پر ”فاء“ آ رہی ہے جس کے بعد ”أَنْ“ ناصبہ مقدر ہے اور ”اَكُنْ“ مجزوم اس لیے ہے کہ اس کا عطف جواب شرط کے محل پر ہے اور اس پر ”فاء“ نہیں آ رہی، گویا اصل کلام اس طرح ہے: ”رَبِّ أَخِّرْنِيْ إِلٰی أَجَلٍ قَرِيْبٍ فَإِنْ أَخَّرْتَنِيْ أَتَصَدَّقْ وَ أَكُنْ مِّنَ الصَّالِحِيْنَ .“

آیت 11 ① وَ لَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس کی آیت (۴۹) کی تفسیر۔

② وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ : اس میں تنبیہ ہے کہ ہر کام کرتے وقت یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے ہر عمل کی پوری خبر ہے۔ اس کے علاوہ اس میں نیک عمل والوں کے لیے وعدہ ہے اور برے عمل والوں کے لیے وعید ہے۔

سورۃ التغابن ۶۴ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — آیاتھا ۱۸ رکوعاتھا ۲

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ لَہُ الۡمُلۡکُ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱﴾ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا پاک ہونا بیان کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کی سب تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱﴾ وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور تم میں سے کوئی ایمان دار ہے اور اللہ اسے جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲﴾

**آیت 1** ❶ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ حدید (۱) اور سورۂ حشر (۱) کی تفسیر۔ "یُسَبِّحُ" (مضارع) کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ جمعہ کی پہلی آیت کی تفسیر اور تسبیح کے مفہوم کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۴۴) کی تفسیر۔

❷ "لَہُ الۡمُلۡکُ" کے لیے دیکھیے سورۂ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر اور "وَ لَہُ الۡحَمۡدُ" کے لیے دیکھیے سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

❸ فرمایا آسمان و زمین میں جو بھی چیز ہے وہ زبان قال و حال سے شہادت دے رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور ہر کمی سے پاک ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات خلق، قدرت اور علم وغیرہ اور ان کے مظاہر بیان فرمائے جن سے اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید، تسبیح، قیامت اور رسالت کا حق ہونا ثابت ہوتا ہے، پھر کفار کے قیامت اور رسولوں کے انکار کا رد فرمایا اور انھیں اللہ، اس کے رسول اور اس پر نازل کردہ وحی پر ایمان لانے کا حکم دیا۔

**آیت 2** ❶ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ : یعنی اتنی صفات کے مالک ہی نے تمھیں پیدا کیا اور دوسری مخلوقات کی طرح تمھیں بھی ہر بات میں اپنے تکوینی حکم کا پابند کر دینے کے بجائے ایمان و کفر دونوں راستے واضح فرما کر تمھیں ان میں سے کسی ایک پر چلنے کا اختیار بخشا۔ اب حق تو یہ تھا کہ تم اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کرتے ہوئے اس پر ایمان لاتے، مگر اس کے بجائے تم دو گروہوں میں بٹ گئے۔ چنانچہ تم میں سے کچھ کفر کرنے والے ہیں اور کچھ ایمان لانے والے۔ اب یہ خیال مت کرنا کہ تمھارے اس کفر پر تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، یا ایمان لانے پر کوئی جزا نہیں ملے گی، بلکہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے پوری طرح دیکھنے والا ہے، وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔ یہاں "فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ" کا ذکر پہلے اس لیے فرمایا کہ مقصود ناراضی کا اظہار ہے کہ اتنی صفات کے مالک اور اپنے خالق کے ساتھ بھی تم میں سے کئی کفر کرنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا اظہار بھی ہے کہ کفر کرنے والے زیادہ ہیں۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۸۹۔ سبا: ۲۰) اس آیت میں وہی بات بیان ہوئی ہے جو تفصیل کے ساتھ

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③

اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور اس نے تمھاری صورتیں بنائیں تو تمھاری صورتیں اچھی بنائیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ③

سورۂ دہر کی ان آیات میں ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴾ [ الدھر : ۲ تا ۵ ] ''بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔ بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔ یقیناً ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔ بلاشبہ نیک لوگ ایسے جام سے پئیں گے جس میں کافور ملا ہوا ہوگا۔''

② اس آیت سے معلوم ہوا کہ خلق کے وقت کوئی کافر نہیں ہوتا، بلکہ پیدا ہوتے وقت ہر انسان فطرت پر ہوتا ہے، پھر بعد میں کفر اختیار کرتا ہے یا ایمان پر قائم رہتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ روم (۳۰ تا ۳۲) کی تفسیر۔

③ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام لوگوں کی دو ہی قسمیں ہیں، یا تو مومن ہیں جو اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں یا پھر کافر ہیں، تیسری کوئی قسم نہیں جو نہ مومن ہوں نہ کافر۔ مومن گناہ کرے تو اس کی وجہ سے اسے ایمان سے خارج یا کافر قرار نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ یہ نہ مومن ہے نہ کافر، بلکہ وہ ناقص ایمان والا مومن ہے اور اسے اس وقت تک مومن ہی کہا جائے گا جب تک وہ ان چیزوں پر ایمان رکھتا ہے جن کا دین ہونا سب کو معلوم ہے۔ اگر وہ ان میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا ایسا کام کرے جو مرتد ہونے کی علامت ہے تو پھر وہ مومن نہیں بلکہ کافر ہے۔

**آیت 3** ① خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ: حق سے مراد یہاں حکمت و مصلحت ہے اور ان کی پیدائش کی بے شمار حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی تمام چیزیں پیدا فرما دیں جو انسان کی بقا کے لیے ضروری تھیں اور انھیں انسان کی خدمت پر مامور کر دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ [ البقرۃ : ۲۹ ] ''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔'' مزید دیکھیے سورۂ زمر (۵)۔

② وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ: اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا فرمائی اچھی پیدا فرمائی۔ (دیکھیے سجدہ: ۷) یہاں فرمایا کہ اس نے تمھاری صورت بنائی تو تمھاری صورتیں اچھی بنائیں۔ (دیکھیے مومن: ۶۴۔ انفطار: ۶ تا ۸) دوسری جگہ فرمایا کہ ہم نے انسان کو (اچھی ہی نہیں بلکہ) سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ [ التین : ٤ ] ''بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔'' ظاہری شکل و صورت میں بھی اور

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

**وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور اللہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ④ کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا، پھر اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ⑤**

ذہنی اور عقلی استعداد کے لحاظ سے بھی انسان کو بہترین بناوٹ عطا ہوئی ہے، کسی دوسری مخلوق میں ایسی عقلی استعداد نہیں ہے۔ کوئی انسان کتنا بھی بدصورت ہو، کبھی نہیں چاہے گا کہ اسے کسی اور مخلوق کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے، خواہ وہ کتنی خوبصورت ہو۔

③ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ : یعنی ساری کائنات کی پیدائش خصوصاً انسان کو اتنی بہترین بناوٹ میں پیدا کرنا بے مقصد نہیں بلکہ تمھاری آزمائش کے لیے ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [ هود : ۷ ] ”تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔“ اور اس کے لیے تمھیں مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہو کر اس کی طرف واپس جانا ہے۔

**آیت 4** يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ ...... : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ جب انسان کے جسم کا ہر ذرّہ منتشر ہو جائے گا اور اس نے جو کچھ کیا وہ معدوم ہو چکا ہو گا تو اسے دوبارہ کیسے زندہ کیا جائے گا اور اس کے اعمال کی کسی کو کیا خبر ہوگی کہ ان کے مطابق اسے جزا یا سزا دی جائے۔ فرمایا وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے (اور وہ ہر جاندار کے زندگی میں ٹھکانے کو جانتا ہے اور اس بات کو بھی کہ مرنے کے بعد وہ کہاں ہے۔ دیکھیے ہود: ۶ ) اس لیے اسے کچھ مشکل نہیں کہ جو جہاں بھی ہے اسے دوبارہ زندہ کر دے اور وہ تمھارے تمام اعمال سے واقف ہے خواہ تم انھیں چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو۔ (دیکھیے رعد: ۹، ۱۰ ) بلکہ وہ سینوں کی بات اور نیتوں کو بھی خوب جاننے والا ہے، سو اس کے لیے تمھارے اعمال کا محاسبہ کچھ مشکل نہیں۔ پچھلی آیات میں مذکور صفات خصوصاً خلق میں اس کی کامل قدرت کا بیان تھا، اس آیت میں اس کے کامل علم کا بیان ہے، پھر جو علیم بھی ہے اور قدیر بھی اور جس نے پہلے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے، وہ تمھیں دوبارہ پیدا کیوں نہیں کر سکتا اور محاسبہ کیوں نہیں کر سکتا؟

**آیت 5** ① اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ : یعنی اگر تم اپنے اس خالق پر ایمان نہ لائے اور اس کے ساتھ کفر پر ڈٹے رہے جو ان صفات کا مالک ہے اور جس کی طرف تمھیں واپس جانا ہے، تو کیا تمھیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنھوں نے اس سے پہلے اپنے خالق و مالک کے علاوہ اس کے رسولوں اور آخرت کا بھی انکار کیا، مثلاً قومِ نوح، عاد و ثمود اور آلِ فرعون وغیرہ جو مال و دولت اور قوت و شوکت میں تم سے کہیں زیادہ تھے۔ (دیکھیے روم: ۹ ) قریشِ مکہ کا

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ٚ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۶﴾

یہ اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آتے تھے تو انھوں نے کہا کیا کوئی بشر ہماری رہنمائی کریں گے؟ پس انھوں نے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ نے پروا نہ کی اور اللہ بے پروا ہے، تمام خوبیوں والا ہے ﴿۶﴾

گزر اکثر شام اور یمن کی طرف سفر میں ان کی برباد شدہ بستیوں پر ہوتا تھا اور عرب میں ان کے واقعات مشہور تھے۔

② فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : یعنی انھوں نے دنیا ہی میں اپنے کفر اور سرکشی کا وبال چکھ لیا، مگر یہ ان کی پوری اور اصل سزا نہ تھی بلکہ یہ صرف دنیا میں ان کے اعمالِ بد کا نتیجہ تھا جو دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے دکھایا گیا تھا، جس سے تمھیں بھی عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اصل سزا کے طور پر ان کے لیے نہایت دردناک عذاب تیار ہے۔

آیت 6 ① ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ : "بِاَنَّهٗ" میں "ہٗ" ضمیر کو ضمیرِ شان کہا جاتا ہے، اس کا مقصد اس بات کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے جو بعد میں آ رہی ہوتی ہے۔ ''بینات'' کا لفظی معنی واضح اور روشن چیزیں ہے۔ رسول جو بینات لے کر آئے ان میں وہ معجزے بھی شامل ہیں جو ان کی رسالت کی واضح دلیل تھے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات اور عقلی دلائل بھی جو بالکل واضح اور روشن تھے، جنھیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی، ان بینات کو دیکھ اور سن کر ان کے رسول ہونے کا یقین حاصل ہوتا تھا۔

② فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا : "بَشَرٌ" اسم جنس ہے جو جمع پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ یہاں "يَهْدُوْنَنَا" سے ظاہر ہے اور واحد پر بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ﴾ [ القمر : ۲٤ ] ''کیا ایک آدمی جو ہمیں سے ہے اکیلا، ہم اس کے پیچھے لگ جائیں؟'' کفار کے قول میں "بَشَرٌ" کو تحقیر کے لیے بطور نکرہ استعمال کیا گیا ہے، گویا وہ کہہ رہے ہیں ''کیا یہ عام سے بشر ہماری رہنمائی کریں گے؟'' وہ کسی بشر کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، خواہ اس کی رسالت ہر طرح سے ثابت ہو جائے۔ ان کے خیال میں رسول فرشتہ ہونا چاہیے یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کے پاس آنا چاہیے۔ (دیکھیے فرقان : ۲۱) یہی وتیرہ پہلے تمام انبیاء کے منکرین کا تھا اور یہی کفار قریش نے اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر ان کے اس باطل خیال کا ذکر کیا اور اس کا رد فرمایا۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۹۴، ۹۵)، ابراہیم (۱۰، ۱۱)، کہف (۱۱۰)، مومنون (۳۳)، شعراء (۸۶)، یٰس (۱۵) اور سورۂ انعام (۹۱)۔

③ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ...... : جب انھوں نے بشر کی رسالت کو محال قرار دیا تو اس کا واضح نتیجہ یہی تھا کہ انھوں نے رسولوں پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی کچھ پروا نہ کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، وہ ساری کائنات سے مستغنی اور بے پروا ہے۔ وہ اکیلا تمام خوبیوں کا مالک ہے، کسی کے کفر سے اسے کوئی نقصان نہیں

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

**وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا انھوں نے گمان کیا کہ وہ ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔ کہہ دے کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم! تم ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر تمھیں ضرور بالضرور بتایا جائے گا جو تم نے کیا اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے ۝**

اور نہ ہی کسی کے ایمان سے اس کا کوئی فائدہ ہے۔ ایمان کا فائدہ اور کفر کا نقصان خود انسان ہی کو ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ آلِ عمران (۹۷) اور سورۂ زمر (۷) کی تفسیر۔

④ کفار کا معاملہ عجیب ہے، وہ بشر کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں مگر پتھر، لکڑی اور دھات کے بتوں کو رب مانتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ بیّنات دیکھ کر بھی یہ کہہ کر ایمان نہیں لاتے کہ ''کیا کوئی بشر ہماری رہنمائی کریں گے؟'' گویا انھیں کسی بشر کی رہنمائی قبول نہیں، خواہ وہ کتنی درست اور کتنی عمدہ ہو، جبکہ وہ اپنے بڑوں کی غلط راہ پر اندھا دھند چل رہے ہیں، حالانکہ وہ بھی بشر تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [ الزخرف : ۲۲ ] ''انھوں نے کہا کہ بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا ہے اور بے شک ہم انھی کے قدموں کے نشانوں پر راہ پانے والے ہیں۔'' اگر کسی بشر کی راہ پر چلنا انھیں منظور نہیں تو بڑوں کی راہ پر کیوں چلتے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ پر چلنے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ شیطان نے انھیں اور ان کے بڑوں کو اپنی راہ پر لگا رکھا ہے۔

**آیت 7** ① زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا : '' زَعَمَ '' کا لفظ گمان کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، کسی بات کا دعویٰ کرنے کے معنی میں بھی اور جھوٹ کہنے کے معنی میں بھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کا دعویٰ حرف تاکید ''لَنْ'' کے ساتھ ذکر فرمایا، مگر یہ دعویٰ کرنے کو زعم قرار دیا۔ گویا ان کا تاکید کے ساتھ کہنا کہ انھیں ہرگز اٹھایا نہیں جائے گا، سراسر گمان اور جھوٹ ہے۔ گمان اس لیے کہ ان کے پاس کوئی ایسا ذریعۂ علم نہیں جس کی بنیاد پر وہ یقین سے کہہ سکیں کہ دوبارہ زندگی نہیں ہو سکتی۔ انسان کے پاس ایسا ذریعۂ علم نہ کبھی آج سے پہلے تھا، نہ آج ہے اور نہ ہی آئندہ ہو سکتا ہے، پھر اس دعویٰ کو اس زور شور سے بیان کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان زیادہ سے زیادہ یہی کچھ کہہ سکتا ہے کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے اور نہ اٹھنے کے دونوں احتمال موجود ہیں، لیکن جی اٹھنے کی تردید میں وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔

② قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ: یعنی جب وہ محض گمان کی بنیاد پر اتنی تاکید کے ساتھ قیامت کا انکار کر رہے ہیں تو آپ ان کے رد میں اس سے زیادہ تاکید کے ساتھ کہیں کہ میں تمھارے اس دعوے کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے وحی کے علم کی بنیاد پر پورے یقین کے ساتھ اپنے رب کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ تم ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخاطب مانتے

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِيْۤ اَنْزَلْنَا ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑧

سو تم اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، خوب باخبر ہے ⑧

تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قسم کے ساتھ یہ بات کہنے کا حکم دیا، تاکہ انھیں اس کا یقین ہو جائے، کیونکہ انسان کی عادت ہے کہ قسم کھا کر بات کی جائے تو اسے یقین ہو جاتا ہے۔ یہ تیسری جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قسم کھا کر قیامت کا یقین دلانے کا حکم دیا ہے۔ پہلے سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿وَ يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ﴾ [ یونس : ۵۳ ] ''اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا یہ سچ ہی ہے؟ تو کہہ ہاں! مجھے اپنے رب کی قسم! یقیناً یہ ضرور سچ ہے اور تم ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہو۔'' پھر سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ﴾ [ سبا : ۳ ] ''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ کہہ دے کیوں نہیں، قسم ہے میرے رب کی! وہ تم پر ضرور ہی آئے گی۔''

③ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ : اس میں دوبارہ زندہ کیے جانے کا مقصد بیان فرمایا کہ ساری کائنات کو تمھارے فائدے کے لیے مسخر کرنے اور تمھیں ایمان و کفر میں اختیار دینے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم سے کوئی باز پرس ہی نہ کی جائے؟ اس لیے اٹھائے جانے کے بعد تمھیں وہ سب کچھ ضرور بالضرور بتایا جائے گا جو تم نے کیا۔ بتانے سے مراد محاسبہ اور سزا دینا ہے، جیسا کہ دھمکی دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ میں بہت جلد تمھیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کیا۔

④ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ : یعنی تمھیں دوبارہ زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان اور بالکل معمولی بات ہے، کیونکہ جس نے تمھیں پہلی دفعہ بنا لیا اس کے لیے دوبارہ بنا لینا تو زیادہ آسان ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ یٰس (۷۸، ۷۹)، لقمان (۲۸) اور سورۂ روم (۲۷) کی تفسیر۔ کفار مکہ جیسا کہ متعدد آیات سے ظاہر ہے، اس بات کے قائل تھے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔

آیت 8 ① فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِيْۤ اَنْزَلْنَا : اس ''فاء'' کو فصیحہ کہتے ہیں، کیونکہ وہ اس شرط کا اظہار کر رہی ہوتی ہے جو وہاں مقدر ہے، یعنی جب تم یہ سب کچھ جان چکے تو اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل کیا ہے، یعنی دل اور زبان سے انھیں سچا مان کر ان کے احکام کی پیروی کرو۔ "النُّوْرِ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی ہے، کیونکہ اسی سے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ روشن ہوتا ہے، اس میں قرآن و سنت دونوں شامل ہیں۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۵۲) کی تفسیر۔

② وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ : خبیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھیں تمھارے اعمال کی جزا دے گا۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے وعدہ اور ایمان نہ لانے والوں کے لیے وعید ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰ مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ

جس دن وہ تمھیں جمع کرنے کے دن کے لیے جمع کرے گا، وہی ہار جیت کا دن ہے اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے وہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں ہمیشہ، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ۹ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ آگ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے اور وہ لوٹ کر جانے کی بری جگہ ہے ۱۰ کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر

آیت 9 ① يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ: یہ "لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ" کا ظرف ہے، قیامت کے دن کو "يَوْمُ الْجَمْعِ" اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دن تمام پہلے اور پچھلے ایک میدان میں جمع کیے جائیں گے۔ (دیکھیے ہود: ۱۰۳۔ صافات: ۴۹، ۵۰۔ شوریٰ: ۷۔ مرسلات: ۳۸) "يَوْمُ الْجَمْعِ" کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دن انسان کے جسم کی ہر ہڈی اور ہر ذرہ جو منتشر ہو چکا ہوگا جمع کر دیا جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴾ [ القیامۃ : ۳ ] "کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔"

② ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ: "غَبَنَ" (ن) "فُلَانًا فِي الْبَيْعِ" بیع میں دوسرے کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ حاصل کر لینا۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے، انھوں نے "ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ" کے متعلق فرمایا: «هُوَ اسْمٌ مِّنْ أَسْمَاءِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَذٰلِكَ أَنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَغْبُنُوْنَ أَهْلَ النَّارِ» "یعنی یوم التغابن قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور یہ نام اس لیے ہے کہ اس دن جنتی جہنمیوں کو نقصان میں رکھ کر خود فائدہ حاصل کریں گے۔" ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس نفع نقصان کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے آگے بیان فرما دی ہے کہ ایمان اور عمل صالح والوں کو کیا حاصل ہوگا اور کفر و تکذیب والوں کے حصے میں کیا آئے گا۔

③ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا ...... : یہ اس دن کی ہار جیت میں سے جیت والوں کے حصے کا بیان ہے۔

آیت 10 وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ ...... : یہ اس دن کی ہار والوں کے حصے کا بیان ہے۔

آیت 11 ① مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ ...... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حدید کی آیت (۲۲) کی تفسیر۔

② اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ : اس سے پہلی آیات میں اللہ کی توحید، رسولوں کی رسالت اور قیامت کا بیان تھا، اس آیت میں تقدیر پر ایمان کا بیان ہے، جس سے آدمی کے دل میں تکلیفیں برداشت کرنے اور ان پر صبر کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ

يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑪

اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ⑪

اس آیت میں ایمان والوں کے لیے تسلی اور کفار کے اس اعتراض کا جواب بھی ہے کہ ایمان والوں پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں۔ فرمایا جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ کے اِذن سے آتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے سے مقدر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ دنیا میں مومن و کافر سب پر آتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر امتحان اور آزمائش کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ مومن و کافر پر اس کا اثر اور نتیجہ مختلف ہوتا ہے، مومن اپنے رب پر راضی رہتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت کی روشنی، یقین اور اطمینان کی نعمت اور آخرت میں جنت عطا فرماتا ہے اور کافر اپنے رب پر ناراض ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ دنیا کے اندر ہر وقت پریشان اور سراپا شکوہ بنا رہتا ہے اور آخرت میں اس کے لیے جہنم ہے۔

③ یعنی جو بھی مصیبت پہنچتی ہے اللہ کے حکم سے اور اس کے طے شدہ فیصلے اور تقدیر کے مطابق پہنچتی ہے۔

④ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ: یعنی جسے کوئی مصیبت پہنچے اور وہ جان لے کہ یہ اللہ کے فیصلے اور اس کی تقدیر سے ہے، پھر اس پر صبر کرے، ثواب کی نیت رکھے اور اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے فیصلے کے سپرد کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور دنیا میں اس کے ہاتھ سے جو کچھ نکلا یعنی اس سے جو کچھ لیا گیا اس کے بدلے میں اس کے دل میں سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق اور سچا یقین عطا فرماتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ اس سے لیا گیا اس کی جگہ وہی یا اس سے بہتر چیز عطا فرما دیتا ہے۔ اس آیت کی طرح سورۂ بقرہ (۱۵۵ تا ۱۵۷) میں مصیبت پر صبر کرنے والوں کو "الْمُهْتَدُوْنَ" (ہدایت والے) قرار دیا ہے۔

طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ "وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ" کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: «يَعْنِيْ يَهْدِ قَلْبَهُ لِلْيَقِيْنِ فَيَعْلَمُ أَنَّ مَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ وَمَا أَخْطَأَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَهُ» [ طبري : ۱۲/۲۳، ح : ۳٤٥۰۹ ] "یعنی (آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ پر ایمان رکھے) اللہ تعالیٰ اس کے دل کو یقین کی ہدایت دیتا ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ اس پر جو مصیبت آئی وہ کسی صورت اس سے خطا کرنے والی نہیں تھی اور جو خطا کر گئی وہ کسی صورت اس پر آنے والی نہیں تھی۔" اور اعمش نے ابوظبیان سے بیان کیا کہ ہم علقمہ کے پاس تھے، ان کے پاس یہ آیت پڑھی گئی: ﴿وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ اور اس کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: "اس سے مراد وہ آدمی ہے جسے کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اسے تسلیم کر لیتا ہے۔" (ابن جریر و ابن ابی حاتم بسند صحیح)

صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» [ مسلم،

وَ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۲﴾
اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۳﴾

**اور اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو، پس اگر تم پھر جاؤ تو ہمارے رسول کے ذمے تو صرف کھلم کھلا پہنچا دینا ہے ﴿۱۲﴾ اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ﴿۱۳﴾**

الزهد والرقائق، باب المؤمن أمره كله خير : ۲۹۹۹ ] ’’مومن کے معاملے پر تعجب ہے، کیونکہ اس کا سارا معاملہ ہی خیر ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی ملتی ہے تو شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لیے خیر ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور وہ بھی اس کے لیے خیر ہوتا ہے۔‘‘

⑤ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا پوری طرح علم ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کی تقدیر پر ایمان رکھ کر صبر و شکر کرتا ہے اور کون نہیں کرتا، پھر وہ ہر ایک کو اس کے مطابق جزا و سزا دے گا۔

**آیت 12** ① وَ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ : سلسلۂ کلام کے مطابق مطلب یہ ہے کہ مصیبت آنے پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے منہ نہ موڑو، بلکہ تمام حالات میں، اچھے ہوں یا برے، اللہ کا حکم مانو اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ "اَطِيۡعُوۡا" کو "الرَّسُوۡلَ" کے ساتھ دوبارہ لانے سے ظاہر ہے کہ جس طرح اللہ کا حکم مستقل شریعت ہے اسی طرح رسول کا حکم بھی مستقل شریعت ہے، دونوں میں سے کسی کی مخالفت کی گنجائش نہیں۔ دوسرے لوگ جن کا حکم مانا جاتا ہے وہ یہ مقام نہیں رکھتے، ان کا وہی حکم مانا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ اس نکتے کی وضاحت سورۂ نساء کی آیت (۵۹) : ﴿ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِي الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ﴾ سے ہوتی ہے کہ " اُولِي الۡاَمۡرِ " کے ساتھ "اَطِيۡعُوۡا" کو دوبارہ نہیں لایا گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۵۹) کی تفسیر۔

② فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ: پھر اگر مصیبتوں سے گھبرا کر تم نے اطاعت سے منہ موڑ لیا تو اپنا ہی نقصان کرو گے، ہمارے رسول کے ذمے صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام صاف صاف تم تک پہنچا دیں، سو وہ اس نے پہنچا دیے۔

**آیت 13** اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ...... : یعنی جس طرح تقدیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جو بھی مصیبت یا راحت ہے اسی کے حکم سے آتی ہے، اسی طرح یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو ہر عبادت کی مستحق ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے رنج ہو یا راحت ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی پر توکل رکھو، کیونکہ پکارنا بھی عبادت ہے اور توکل بھی عبادت ہے اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اس کے پاس اس اکیلے پر بھروسا کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں رنج یا راحت میں سے کچھ ہے ہی نہیں کہ اس پر بھروسا کیا جا سکے۔

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَ أَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ وَ إِنْ تَعْفُوا وَ تَصْفَحُوا وَ تَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک تمھاری بیویوں اور تمھارے بچوں میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں، سو ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴﴾

**آیت 14** يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَ أَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ ...... : "عَدُوًّا" "فَعُولٌ" کا وزن ہے، واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، "فَاحْذَرُوهُمْ" سے ظاہر ہے کہ یہاں جمع کے لیے استعمال ہوا ہے۔ "مِنْ أَزْوَاجِكُمْ" میں "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی بعض بیویاں اور اولادیں دشمن ہوتی ہیں سب نہیں، بلکہ بعض دین میں مددگار اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہوتی ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اب ایک ایسی چیز سے ہوشیار رہنے کا حکم دیا جو عموماً اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور وہ آدمی کی بیوی اور اس کی اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی صورت گوارا نہیں کہ اس کا مومن بندہ اس سے بڑھ کر اور اس کے رسول سے بڑھ کر کسی سے محبت کرے، یا کسی عزیز سے عزیز شخص کے تقاضے کو اللہ اور اس کے رسول کے تقاضے پر ترجیح دے۔ (دیکھیے توبہ: ۲۴) یہاں خاص طور پر بعض بیویوں اور بعض اولاد کا ذکر فرمایا، کیونکہ آدمی ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے اور طبعی طور پر ان سے محبت ہوتی ہے، اس لیے بعض اوقات وہ ان کی محبت میں آ کر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو پسِ پُشت پھینک دیتا ہے اور ان کے آرام و آسائش کی خاطر حلال و حرام میں تمیز نہیں کرتا۔ ان کے اصرار پر کئی فرائض ترک کر دیتا ہے، کئی ناجائز کاموں کا ارتکاب کر لیتا ہے اور اس طرح اپنی آخرت تباہ کر لیتا ہے، ظاہر ہے جو اہل و عیال آخرت کی بربادی کا باعث بنیں ان سے بڑھ کر آدمی کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔ بعض بیویاں اور اولاد ناموافقت یا سرکشی کی وجہ سے فی الواقع بھی اپنے خاوند یا باپ کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، مگر یہ ایسے دشمن ہیں کہ آدمی ان سے مسلسل دشمنی نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی ان سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ گزارا ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ان کی دشمنی کا یہ علاج نہیں کہ انھیں مارو پیٹو، خرچہ بند کر دو یا ان سے علیحدگی اختیار کر لو، بلکہ مارنے پیٹنے اور سختی کرنے کے بجائے اگر انھیں معاف کر دو، ان سے درگزر کرو اور ان کی غلطیوں پر پردہ ڈال دو تو تمھارے لیے بہتر اور اللہ کو پسند ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بے حد پردہ ڈالنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔ البتہ اس عفو و درگزر کے باوجود جتنی طاقت ہے اللہ کے تقویٰ پر قائم رہو اور انھیں اس کی تلقین کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں یقیناً بہت سی حکمتیں ہیں، کیونکہ بعض اوقات آدمی کی سختی کی وجہ سے اولاد بغاوت پر اتر آتی ہے، جب کہ عفو و درگزر، مسلسل نصیحت اور خود تقویٰ پر قائم رہنے سے ان کی اصلاح کی توقع زیادہ ہوتی ہے۔

عکرمہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت "يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَ أَوْلَادِكُمْ

اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾

تمھارے مال اور تمھاری اولاد تو محض ایک آزمائش ہیں اور جو اللہ ہے اسی کے پاس بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۵﴾ سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو اور سنو اور حکم مانو اور خرچ کرو، تمھارے اپنے لیے بہتر ہوگا اور جو اپنے نفس کے بخل سے بچا لیے جائیں سو وہی کامیاب ہیں ﴿۱۶﴾

عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ " کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ''یہ اہلِ مکہ میں سے کچھ لوگ تھے جو مسلمان ہو گئے اور انھوں نے نبی ﷺ کے پاس آنے کا ارادہ کر لیا (یاد رہے کہ ان دنوں ہر مسلمان ہونے والے کے لیے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا) مگر انھیں ان کی بیویوں اور بچوں نے نہیں چھوڑا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے۔ پھر جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو انھوں نے دوسرے لوگوں کو دیکھا کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کر چکے تھے تو انھوں نے ارادہ کیا کہ اپنے بیوی بچوں کو سزا دیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔'' [ ترمذي، التفسير، سورة التغابن : ۳۳۱۷ وقال الألباني حسن ]

**آیت 15** اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ...... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۴)، انفال (۲۸)، کہف (۴۶) اور سورۂ منافقون (۹)۔

**آیت 15** ① فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ...... : مال و اولاد کے فتنے سے بچنے کے لیے چند چیزوں کی تاکید فرمائی، جن میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا حسب استطاعت تقویٰ ہے، پھر سمع و طاعت اور آخر میں فتنہ بننے والے اس مال کو خرچ کرنا ہے اور اس میں بخل سے گریز کرنا ہے۔

② مَا اسْتَطَعْتُمْ : اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے لیے اللہ کے احکام پر اتنا عمل ہی فرض ہے جتنی اس میں طاقت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [ البقرة : ۲۸۶ ] ''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔'' جہاں آدمی بے بس ہو جائے وہاں مؤاخذہ نہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۷۳۔ انعام: ۱۱۹۔ نحل: ۱۰۶) مؤاخذہ اسی صورت میں ہے جب آدمی استطاعت کے باوجود اللہ کی اطاعت نہ کرے۔ رہی یہ بات کہ آدمی بہانہ بنا لے اور فرض کر لے کہ فلاں کام میری استطاعت سے باہر ہے، حالانکہ وہ اس کی استطاعت میں ہو تو اس پر اس کا ضرور مؤاخذہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر بات کا علم ہے۔

③ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا : یعنی اللہ اور اس کے رسول کے احکام سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سمع و طاعت کی بیعت لیا کرتے تھے، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی بیعت والی حدیث کے الفاظ ہیں: (( بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

اگر تم اللہ کو قرض دو گے، اچھا قرض تو وہ اسے تمھارے لیے کئی گنا کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بڑا قدردان، بے حد بردبار ہے ﴿۱۷﴾

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ ﴾ [ بخاري، الأحكام، باب كيف يبايع الإمام الناس ؟ : ۷۱۹۹ ] ''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے خوش دلی اور ناگواری (ہر حال) میں سننے اور فرماں برداری کرنے پر بیعت کی۔''

④ وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ : "خَيْرًا" "يَكُنْ" کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جو یہاں "اَنْفِقُوْا" کے جواب میں مقدر ہے۔ یعنی خرچ کرو یہ تمھارے لیے بہتر ہوگا۔ یہ مال کے فتنے کا تریاق ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ خرچ کیا جائے، جمع کر کے نہ رکھا جائے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ اس وقت کعبہ کے سائے میں تھے اور فرما رہے تھے : ﴿ هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ، هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ ﴾ ''وہی سب سے زیادہ خسارے والے ہیں رب کعبہ کی قسم! وہی سب سے زیادہ خسارے والے ہیں رب کعبہ کی قسم!'' میں نے کہا: ''میرا کیا معاملہ ہے، کیا مجھ میں کوئی (خسارے والی) چیز دکھائی دے رہی ہے، میرا معاملہ کیا ہے؟'' خیر میں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور آپ یہی فرماتے رہے۔ مجھ میں خاموش رہنے کی سکت نہ رہی، اللہ کو جو منظور تھا (یعنی بے قراری اور اضطراب) وہ مجھ پر طاری ہو گیا، تو میں نے پوچھا: ''وہ کون ہیں یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ هُمُ الْأَكْثَرُوْنَ أَمْوَالًا إِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَ هٰكَذَا وَ هٰكَذَا ﴾ [ بخاري، الأيمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبي ﷺ ؟ : ۶۶۳۸۔ مسلم : ۹۹۰ ] ''وہ لوگ جو بہت زیادہ اموال والے ہیں، سوائے اس کے جو اس طرح اور اس طرح اور اس طرح (بے دریغ) خرچ کرے۔''

⑤ "اَنْفِقُوْا" (خرچ کرو) کا مصرف ذکر نہیں فرمایا، تاکہ عام رہے اور فرض و نفل ہر قسم کا خرچ کرتے رہنے کی تاکید ہو جائے۔ اس میں اپنی ذات پر، اہل و عیال پر اور ان لوگوں پر خرچ کرنا بھی شامل ہے جن کی پرورش اس کے ذمے ہے۔ ضرورت کی دوسری جگہوں پر بھی، صدقات کے ان آٹھ مصارف میں بھی جن کا سورۂ توبہ کی آیت (۶۰) "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ......" میں ذکر ہے اور ان میں سے بھی خاص طور پر ان لوگوں پر جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۷۳) کی تفسیر۔

⑥ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ ... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حشر کی آیت (۹) کی تفسیر۔ ''شح'' سے بچنے کی تاکید سے ظاہر ہے کہ اہل و عیال پر خرچ بھی اللہ کے ساتھ قرض حسن کے معاملے میں شامل ہے۔

**آیت 17** ① اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۴۵) کی تفسیر۔

ع ۲ ۸ ۱۶

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۸﴾

ہر پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۸﴾

2 وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِیْمٌ : اللہ "شَكُوْرٌ" (بڑا قدر دان) ہے کہ تھوڑا سا خرچ کرنے پر اسے بے حساب بڑھاتا ہے اور گناہ بھی بخشتا ہے اور "حَلِیْمٌ" (بے حد بردبار) ہے کہ بڑی بڑی غلطیوں پر بھی فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ مہلت پر مہلت دیتا چلا جاتا ہے۔ اس میں ازواج و اولاد کے ساتھ معاملے میں ''شکر و حلم'' اختیار کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ میاں بیوی اور والد و اولاد دونوں ایک دوسرے کے معمولی حسن سلوک کی بھی قدر کریں اور ایک دوسرے کی کوتاہیوں پر بردباری سے کام لیں۔

آیت 18 عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ : یہ صفات یہاں ذکر کرنے سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ میاں بیوی اور والد و اولاد کے باہمی معاملات سے پوری طرح واقف اللہ تعالیٰ ہی ہے، لوگوں کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ ان سے الگ رہتے ہیں۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو ہر وقت اس عالم الغیب والشہادہ کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور اس کی گرفت سے ڈرتے رہنا چاہیے، کیونکہ وہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔

سورۃ الطلاق ۶۵ — مدنیۃ ۹۹ — آیاتھا ۱۲ — رکوعاتھا ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سورۂ تغابن میں بیویوں کے ساتھ رہن سہن میں کشادہ دلی اور عفو و درگزر کے ساتھ مدارات اور گزارا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن اگر میاں بیوی کا اختلاف حد سے بڑھ جائے اور گزارے کی کوئی صورت نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کی بھی اجازت دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح زنا کو حرام قرار دینا اور نکاح کا حکم دینا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ اس سے نسب اور نسل کی حفاظت ہوتی ہے اور معاشرے میں فسق و فجور اور قتل و غارت کے بجائے پاکیزگی اور امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے، اسی طرح زوجین میں موافقت نہ رہے تو مرد کو طلاق کی اور عورت کو خلع کی اجازت بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے، جس سے وہ ایسی زندگی سے نکل آتے ہیں جو ہر لحہ ان کے لیے شدید اذیت کا باعث تھی اور دونوں کو نیا نکاح کر کے آئندہ کے لیے خوشگوار زندگی گزارنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے سے جدا ہونے والے مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت کے ساتھ غنی کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور اسے اپنی وسعت و حکمت کا ایک مظہر قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا﴾ [ النساء : ۱۳۰ ] ''اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے غنی کر دے گا اور اللہ ہمیشہ سے وسعت والا، کمال حکمت والا ہے۔'' جن اقوام نے طلاق پر پابندی لگائی اور اسے ناجائز قرار دیا ہے یا اس پر نامناسب پابندیاں لگائی ہیں، مثلاً یہ کہ طلاق دینے والا مرد ساری عمر اپنی مطلقہ کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہوگا وغیرہ، انھوں نے ایک دوسرے سے موافقت نہ رکھنے والے میاں بیوی پر شدید ظلم کیا ہے اور ساری عمر ان پر دل کی اس خوشی کا دروازہ بند کر دیا ہے جو میاں بیوی کو نکاح سے حاصل ہوتی ہے۔ کفار کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نکاح کرنا ہی چھوڑ دیا، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکیں گے، یا جدا ہوئے تو انھیں ناقابل برداشت پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب ان میں کم ہی کوئی نکاح کرتا ہے، مردوں اور عورتوں کی اکثریت نکاح کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر حرام اولاد کو جنم دے رہی ہے اور جس کا دوسرے سے دل بھر جاتا ہے وہ اسے چھوڑ کر آگے روانہ ہو جاتا ہے۔

طلاق صرف ایک دوسرے سے جدا ہونے کا ذریعہ نہیں بلکہ میاں بیوی کے بگڑے ہوئے معاملات کو درست کرنے کا آخری ذریعہ بھی ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق طلاق دی جائے تو عدت کی صورت میں مرد کے پاس رجوع کا اور عورت کے پاس خاوند کو منا لینے کا موقع موجود ہوتا ہے اور تین حیض یا وضع حمل تک ایک گھر میں اکٹھے رہنے کی وجہ سے امید ہوتی ہے کہ جدائی کا باعث بننے والی کشیدگی ختم ہو جائے اور وہ دونوں آپس میں صلح کر لیں۔ سورۂ طلاق کی پہلی آیت " لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا " میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ جس طرح ہر کام میں ہمارے لیے نمونہ ہیں نکاح و طلاق میں بھی نمونہ ہیں۔ آپ ﷺ نے نکاح بھی کیے ہیں اور بعض کو طلاق بھی دی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے بنت الجون کو " أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ " کہنے پر طلاق دے دی۔ [دیکھیے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا

بخاري، الطلاق، باب من طلق وهل يواجه الرجل امرأته بالطلاق؟ : ٥٢٥٤ ] اور آپ ﷺ نے طلاق دے کر رجوع بھی کیا ہے، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں: (( أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَّقَ حَفْصَةَ ثُمَّ رَاجَعَهَا )) [ أبو داوٗد، الطلاق، باب في المراجعة : ٢٢٨٣، وقال الألباني صحيح ] ”نبی ﷺ نے حفصہ (رضی اللہ عنہا) کو طلاق دے دی، پھر ان سے رجوع کر لیا۔“

آیت 1 ① يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ...... : یہاں ایک سوال ہے کہ پہلے ” يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ “ کے ساتھ صرف نبی ﷺ کو خطاب کیا، پھر ” اِذَا طَلَّقْتُمْ “ میں جمع کے صیغے کے ساتھ خطاب کیوں کیا گیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ چونکہ طلاق کے احکام میں آپ ﷺ اور آپ کی امت دونوں مشترک ہیں، اس لیے آپ کو اور آپ کی امت دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ” اِذَا طَلَّقْتُمْ “ فرمایا، مگر پہلے خاص طور پر آپ کو خطاب آپ کی تعظیم کے لیے ہے، جیسے کسی قوم کے سردار سے کہا جاتا ہے، اے فلاں! تم ایسا کرو، یعنی تم اور تمھاری قوم ایسا کرو۔ گویا یوں فرمایا کہ اے نبی! جب تم لوگ طلاق دو، یعنی آپ اور آپ کی امت طلاق دے۔

② ” اِذَا طَلَّقْتُمْ “ (جب تم طلاق دو) سے مراد یہ ہے کہ جب تم طلاق کا ارادہ کرو، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت (۶) ” اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ “ میں ہے۔

③ ” النِّسَآءَ “ سے مراد صرف وہ عورتیں ہیں جن کے ساتھ نکاح کے بعد دخول ہو چکا ہو، کیونکہ جن عورتوں کو دخول سے پہلے طلاق دے دی جائے ان کی کوئی عدت نہیں۔ (دیکھیے سورۂ احزاب: ۴۹)۔

④ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ : جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو یہ نہیں کہ جب چاہو طلاق دے دو، بلکہ ان کی عدت کے وقت طلاق دو، یعنی جب عورت حیض سے پاک ہو تو طہر کی حالت میں جماع کے بغیر طلاق دو، تاکہ اس کی عدت کسی کمی یا زیادتی کے بغیر پوری ہو، کیونکہ اگر تم حالت حیض میں طلاق دو گے تو اگر اس حیض کو عدت میں شمار کرو تو عدت تین حیض سے کم رہ جائے گی اور اگر شمار نہ کرو تو تین حیض سے زیادہ ہو جائے گی، کیونکہ بعد میں آنے والے تین حیضوں کے ساتھ اس حیض کے وہ ایام بھی شامل ہوں گے جو طلاق کے بعد باقی ہوں گے۔ اسی طرح اگر تم انھیں ایسے طہر میں طلاق دو گے جس میں ان کے ساتھ جماع کیا ہے تو ممکن ہے کہ حمل قرار پا جائے، اس صورت میں معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس کی عدت کے لیے تین حیض کا اعتبار ہوگا یا وضع حمل کا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی جب وہ حیض کی حالت میں تھی، عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (( مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ لِيُمْسِكْهَا حَتّٰى تَطْهُرَ ثُمَّ تَحِيْضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدُ وَ إِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ، فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِيْ أَمَرَ اللّٰهُ أَنْ تُطَلَّقَ

رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ

رب ہے، نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔ اور یہ اللہ

لَهَا النِّسَاءُ ﴾ [ بخاري، الطلاق، باب قول الله تعالى : ﴿يا أيها النبي...... ﴾ : ٥٢٥١ ] ”اسے حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر اسے اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو، پھر اسے حیض آئے، پھر پاک ہو، پھر اگر چاہے تو اپنے پاس رکھے اور اگر چاہے تو چھونے سے پہلے طلاق دے دے، کیونکہ یہ ہے وہ عدت جس کے وقت اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔“ اگر عورت حاملہ ہو تو اسے کسی بھی وقت طلاق دی جا سکتی ہے، کیونکہ اس کی عدت وضع حمل معلوم اور واضح ہے، جیسا کہ آگے ” وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ “ میں آ رہا ہے۔

⑤ اللہ تعالیٰ نے طلاق کے لیے یہ وقت اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ جہاں تک ہو سکے میاں بیوی کا تعلق قائم رہے، اگر کبھی آدمی کو غصہ آئے تو فوراً طلاق نہ دے بلکہ اس وقت کا انتظار کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اتنی دیر میں غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور حیض سے فراغت کے بعد خاوند کو بیوی کی طرف جو رغبت ہوتی ہے وہ طلاق سے باز رکھنے کا باعث ہوگی۔ اسی طرح حمل کی حالت خاوند کو طلاق سے روکنے کا باعث ہے، کیونکہ آنے والے مہمان کی امید اسے اس اقدام سے باز رکھنے والی ہے۔ ان دونوں وقتوں میں طلاق دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طلاق کسی وقتی اشتعال کی وجہ سے نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر دی جا رہی ہے، اس کے بعد عدت کی صورت میں ایک خاصی مدت تک دونوں کو ایک گھر میں رہنے کا حکم دیا گیا، ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق باقی رہنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ افسوس! مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پروا ہی نہیں کی، (اِلَّا ما شاء اللہ) حالانکہ اگر وہ طلاق کے لیے اس وقت کا انتظار کرتے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے تو طلاق کی نوبت ہی بہت کم آتی، پھر عدت کی برکت سے دوبارہ رجوع کی بھی بہت امید تھی۔

⑥ ایک وقت میں صرف ایک طلاق دینا ہی جائز ہے، اس سے زیادہ دینا حرام ہے۔ اگر کوئی شخص ایک وقت میں ایک سے زیادہ طلاقیں دے دے تو صرف ایک طلاق ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۲۹، ۲۳۰) کی تفسیر۔

⑦ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ : "أُحْصٰى يُحْصِيْ" اچھی طرح شمار کرنا، گننا۔ یہ "حَصًى" (کنکریاں) سے مشتق ہے۔ عرب اُمی تھے، جب انھیں ایسی چیز گننا ہوتی جو تعداد میں زیادہ ہوتی تو ہر ایک کے لیے ایک کنکری رکھتے جاتے، آخر میں کنکریوں کو گن لیتے۔ "الْعِدَّةَ" (بروزن فِعْلَةٌ) بمعنی "مَعْدُوْدٌ" ہے، گنے ہوئے دن، جیسے "طِحْنٌ" بمعنی "مَطْحُوْنٌ" (پسا ہوا آٹا) ہے۔ یعنی وہ دن جن کے گزر جانے کے بعد کسی اور شخص سے نکاح حلال ہو جاتا ہے۔ اس پر ”الف لام“ عہد کا ہے، یعنی وہ عدت جو دوسری آیات میں بتائی گئی ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۲۸۔ طلاق: ۴) عدت کو اچھی طرح گننے کا حکم اس لیے دیا کہ ایسا نہ ہو کہ عدت گزرنے کے بعد بھی تم رجوع کر لو یا عدت گزرنے سے پہلے عورت کسی اور مرد سے نکاح کر لے، جب کہ یہ دونوں کام ناجائز ہیں۔

⑧ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ : ذاتی نام "اللّٰہ" اور وصفی نام "رَبٌّ" کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے، جو ہر لمحے انسان کی پرورش کر رہا

وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①

کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے ①

ہے، ڈرنے کا حکم دیا، یعنی ان ایام میں طلاق دینے سے اللہ سے ڈرتے رہو جن میں طلاق دینا ممنوع ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی نافرمانی بھی ہے اور عورت کو اذیت رسانی بھی۔ اسی طرح عدت کے ایام میں عورتوں کو گھروں سے نکالنے سے بھی ڈرو۔

⑨ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ : "بُيُوْتِهِنَّ" سے مراد خاوندوں کے گھر ہیں جن میں عورتیں رہ رہی ہیں، ان میں رہنے کی وجہ سے انھیں ان کے گھر فرمایا ہے۔ یعنی عورت کے لیے عدت کے ایام خاوند کے گھر میں گزارنا ضروری ہے، نہ خاوندوں کو انھیں ان کے گھروں سے نکالنے کی اجازت ہے نہ انھیں خود ان سے نکل جانے کی۔ اس کی حکمت آگے "لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا" میں بیان فرمائی کہ اتنی مدت ایک گھر میں اکٹھے رہنے سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی باہمی صلح اور رجوع کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے اسی وقت الگ ہو گئے اور ملاقات کا موقع ہی نہ رہا تو رجوع کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا خوف دلا کر نہایت تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا ہے، مگر مسلمانوں نے کم ہی اس کی پروا کی ہے، شاید ہی کوئی ایسا مرد ہو جو طلاق کے بعد عورت کو اپنے گھر میں رہنے دے یا کوئی ایسی عورت ہو جو وہاں رہے۔

⑩ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ : " فَاحِشَةٌ " کوئی بھی قول یا فعل جس میں بہت بڑی قباحت ہو۔ "مُّبَيِّنَةٍ" کھلی اور واضح۔ "بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ" میں زنا، چوری وغیرہ کے علاوہ عورت کا خاوند سے یا اس کے اہلِ خانہ سے بدزبانی اور گالی گلوچ کرنا بھی شامل ہے۔ طبری نے محمد بن ابراہیم کی حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے، انھوں نے فرمایا: « اَلْفَاحِشَةُ أَنْ تَبْذُوَ عَلٰی أَهْلِهَا » "فاحشہ یہ ہے کہ گھر والوں پر زبان درازی کرے۔"

⑪ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ : یعنی وہ مرد جو عورت کو اس وقت طلاق دیتا ہے جب طلاق دینے کا وقت نہیں، یا عدت میں عورت کو گھر سے نکال دیتا ہے، یا وہ عورت جو خود ہی نکل جاتی ہے، یہ نہ سمجھیں کہ وہ معمولی خطا کر رہے ہیں، بلکہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں پھلانگ رہے ہیں اور جو اللہ کی حدیں پھلانگتا ہے یقیناً وہ اپنی جان پر ظلم کر رہا ہے۔

⑫ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا : یعنی طلاق کے بعد عورت کو عدت کے دوران خاوند کے گھر میں رہنے کا حکم اس لیے ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان کی باہمی موافقت کی کوئی صورت پیدا فرما دے اور خاوند اس سے رجوع

فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّ اَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ

پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنوں

کر لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاوند کے گھر میں رہ کر عدت گزارنے کا حکم اس طلاق میں ہے جس سے رجوع ہو سکتا ہو اور وہ صرف پہلی اور دوسری طلاق ہے، ان دونوں کو رجعی طلاق کہتے ہیں، ان کی عدت کے دوران عورت کی رہائش اور نفقہ خاوند کے ذمے ہے۔ رہی تیسری طلاق کی عدت، تو اگرچہ عورت اس کے دوران آگے نکاح نہیں کر سکتی مگر خاوند رجوع بھی نہیں کر سکتا، اس لیے اس کے دوران اس کی رہائش نہ صرف یہ کہ خاوند کے ذمے نہیں بلکہ اس کا خاوند کے ساتھ اس کے گھر میں رہنا ہی ٹھیک نہیں، کیونکہ اس میں سابقہ بے تکلفی کی وجہ سے ان کے حد سے تجاوز کا خطرہ ہے جب کہ وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَیۡرَهٗ﴾ [ البقرۃ : ۲۳۰ ] ''پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔'' اگرچہ بہت سے ائمہ نے اس کی رہائش خاوند کے ذمے قرار دی ہے، مگر اس آیت کے مطابق اور رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث کے مطابق تیسری طلاق کے بعد اس کی رہائش خاوند کے ذمے نہیں ہے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « أَنَّهُ طَلَّقَهَا زَوْجُهَا فِيْ عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كَانَ أَنْفَقَ عَلَيْهَا نَفَقَةَ دُوْنٍ، فَلَمَّا رَأَتْ ذٰلِكَ قَالَتْ وَاللّٰهِ ! لَأُعْلِمَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنْ كَانَ لِيْ نَفَقَةٌ أَخَذْتُ الَّذِيْ يُصْلِحُنِيْ وَإِنْ لَمْ تَكُنْ لِيْ نَفَقَةٌ لَمْ آخُذْ مِنْهُ شَيْئًا، قَالَتْ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا نَفَقَةَ لَكِ وَلَا سُكْنٰى » [ مسلم، الطلاق، باب المطلقۃ البائن لا نفقۃ لھا : ۳۷ / ۱۴۸۰ ] ''نبی ﷺ کے زمانے میں ان کے خاوند نے انھیں طلاق دے دی اور انھیں معمولی خرچہ دیا۔ جب انھوں نے یہ دیکھا تو کہا: ''اللہ کی قسم! میں یہ بات رسول اللہ ﷺ کے علم میں لاؤں گی، پھر اگر میرے لیے خرچہ ہوا تو اتنا لوں گی جو میری حالت درست رکھ سکے اور اگر میرے لیے خرچہ نہ ہوا تو میں اس سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔'' فرماتی ہیں، میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرے لیے نہ خرچہ ہے نہ رہائش۔'' یاد رہے کہ صحیح مسلم کے اسی باب کی ایک روایت میں صراحت ہے کہ ان کے خاوند نے انھیں تیسری طلاق دے دی تھی۔

**آیت 2** ① **فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ** : یعنی جب ان کی عدت ختم ہونے کے قریب پہنچ جائے، کیونکہ عدت ختم ہونے کے بعد تو رجوع ہو نہیں سکتا۔

② **فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ......** : یعنی جب عورتوں کی عدت ختم ہونے کے قریب ہو، صرف اتنی باقی ہو جس میں ان سے رجوع ہو سکتا ہو تو انھیں معروف (اچھے طریقے) کے ساتھ روک لو یا معروف کے ساتھ ان سے جدا ہو جاؤ۔ معروف کے ساتھ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اچھے طریقے سے ان کے ساتھ رہنے کی نیت سے ان سے رجوع

عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ

**میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنا لو اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو۔ یہ وہ (حکم) ہے جس سے اس شخص کو**

کر کے حسب سابق بیوی بنا کر رکھ لو اور اس رجوع پر گواہ بناؤ اور معروف طریقے سے جدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے رجوع نہ کرو بلکہ انھیں ان کے حال پر رہنے دو، تاکہ عدت ختم ہو جائے اور وہ خود بخود تم سے جدا ہو جائیں، پھر کسی لڑائی جھگڑے یا برا بھلا کہنے کے بغیر انھیں رخصت کر دو۔ اس میں اچھائی یہ ہے کہ اگرچہ عدت گزرنے کی وجہ سے وہ آزاد ہیں کہ جس مرد سے چاہیں شادی کر لیں، مگر انھیں پہلے خاوندوں سے شادی کا بھی اختیار ہے۔

③ سورۂ بقرہ میں اور یہاں پہلی یا دوسری طلاق کے بعد دو ہی صورتیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لو، دوسری یہ کہ اچھے طریقے سے چھوڑ دو، یعنی رجوع نہ کرو بلکہ عدت ختم ہونے دو اور اچھے طریقے سے جدا ہو جاؤ، عدت ختم ہونے سے پہلے دوسری یا تیسری طلاق دینے کا حکم نہیں دیا۔ جس عورت کو حیض آتا ہو اس کے لیے طلاقِ سنت یہی ہے۔ بعض حضرات طلاق کا سنت طریقہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب عورت حیض سے پاک ہو تو جماع کے بغیر اسے ایک طلاق دو، اگلے طہر میں دوسری طلاق دو اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق دو، حالانکہ یہ ہرگز طلاقِ سنت نہیں ہے۔ یہ طلاقِ سنت کیسے ہو سکتی ہے جب کہ ابھی پہلی طلاق کی عدت جاری ہے، نہ وہ آخر کو پہنچی ہے نہ اس سے رجوع ہوا ہے، تو دوسری اور تیسری طلاق کا کیا مطلب؟ پھر اس میں بلا ضرورت عورت کو ہمیشہ کے لیے حرام کرنے کی تلقین کی گئی ہے جو شریعت کے مقصد ہی کے خلاف ہے۔ طلاق سنت صرف دو ہی ہیں، ایک وہ جو آیت میں مذکور ہے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ عورت حیض سے پاک ہو تو جماع کے بغیر اسے طلاق دی جائے، پھر اگر اسے بسانے کی نیت ہو تو عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لے، یا عدت ختم ہو جانے دے، جس سے وہ خود بخود جدا ہو جائے گی۔ طلاقِ سنت کی دوسری صورت یہ ہے کہ حمل کی حالت میں طلاق دے، پھر وضع حمل سے پہلے یا تو رجوع کر لے یا عدت ختم ہونے پر علیحدگی اختیار کر لے۔

ہر طہر میں طلاق کو سنت قرار دینے والے دلیل میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بیان کرتے ہیں، سنن نسائی میں ہے:
« أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى بْنِ أَيُّوبَ قَالَ حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ قَالَ حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ أَبِي الْأَحْوَصِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّهُ قَالَ طَلَاقُ السُّنَّةِ تَطْلِيقَةٌ وَهِيَ طَاهِرٌ فِي غَيْرِ جِمَاعٍ فَإِذَا حَاضَتْ وَطَهُرَتْ طَلَّقَهَا أُخْرٰى فَإِذَا حَاضَتْ وَطَهُرَتْ طَلَّقَهَا أُخْرٰى ثُمَّ تَعْتَدُّ بَعْدَ ذٰلِكَ بِحَيْضَةٍ » [ نسائي، الطلاق، باب طلاق السنة : ۳۴۲۳ ] ''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''طلاق سنت یہ ہے کہ عورت کو طہر کی حالت میں جماع کے بغیر ایک طلاق دے، پھر جب اسے حیض آئے اور وہ پاک ہو تو اسے دوسری طلاق دے، پھر جب اسے حیض آئے اور وہ پاک ہو تو اسے تیسری طلاق دے، پھر اس کے بعد ایک حیض عدت گزارے۔'' مگر اس روایت میں طلاقِ سنت کی جو تفصیل آئی ہے درست نہیں، کیونکہ یہ قرآن کی آیت کے خلاف ہے اور خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے طلاق کا طریقہ آیت کے مطابق اس سند

الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾

نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا ﴿۲﴾

سے بہتر سند کے ساتھ ثابت ہے۔ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (( حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ إِسْرَائِيلَ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ أَبِي الْأَحْوَصِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ مَنْ أَرَادَ الطَّلَاقَ الَّذِي هُوَ الطَّلَاقُ فَلْيُطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً، ثُمَّ يَدَعُهَا حَتّٰى تَحِيضَ ثَلَاثَ حِيَضٍ )) [ مصنف ابن أبي شيبة، الطلاق، باب ما يستحب من طلاق السنة : ۴/۵، ح : ۱۸۰۳۶ ]
''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو شخص طلاق دینا چاہے، جو اصل طلاق ہے، وہ عورت کو ایک طلاق دے، پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دے یہاں تک کہ اسے تین حیض آ جائیں۔''

واضح رہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی دونوں روایتوں کی سند ابو اسحاق سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تک ایک ہی ہے، پھر نسائی کی روایت میں ابو اسحاق سے بیان کرنے والے اعمش ہیں جو مشہور مدلس ہیں، جب کہ ابن ابی شیبہ کی سند میں ابو اسحاق سے بیان کرنے والے ان کے پوتے اسرائیل بن یونس بن اسحاق ہیں جن کے متعلق ابو حاتم نے فرمایا: ''هُوَ مِنْ أَتْقَنِ أَصْحَابِ أَبِي إِسْحَاقَ'' ''وہ ابو اسحاق کے سب سے پختہ شاگردوں میں سے ہیں۔'' یاد رہے کہ اسرائیل پر تدلیس کی تہمت بھی نہیں، اس لیے انھی کی روایت معتبر ہوگی۔ نسائی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے طلاقِ سنت کی جو تعریف اعمش نے روایت کی ہے وہ صحیح نہیں۔

❹ وَ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ : یعنی جب رجوع کا ارادہ کرو تو دو صاحب عدل آدمی گواہ بنا لو، تاکہ بعد میں کسی قسم کے جھگڑے کا یا گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ مثلاً اگر خاوند نے رجوع کر لیا ہو مگر گواہ نہ بنائے ہوں اور فوت ہو جائے تو اس کے وارث اس کی بیوی کو اس کی میراث سے یہ کہہ کر محروم کر سکتے ہیں کہ تمھیں تو طلاق ہو چکی تھی اور رجوع کا کوئی گواہ نہیں، اس لیے تم نہ اس کی بیوی رہی ہو اور نہ میراث میں تمھارا حق ہے۔ اسی طرح اگر خاوند گواہوں کے بغیر رجوع کر لے اور عورت اللہ سے نہ ڈرتی ہو اور کہیں اور نکاح کرنا چاہتی ہو تو عدت ختم ہونے پر کہہ سکتی ہے کہ خاوند نے مجھ سے رجوع نہیں کیا، اب میں آزاد ہوں اور جہاں چاہوں نکاح کروں۔ اسی طرح اگر گواہی کی شرط نہ ہو تو عدت ختم ہونے کے بعد بھی خاوند دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیا تھا۔ رجوع کی طرح عدت کے خاتمے پر ایک دوسرے سے علیحدگی کی صورت میں بھی گواہ بنانے کا حکم ہے، تاکہ اس طرح کی قباحتوں میں سے کوئی قباحت پیدا نہ ہو جن کا اوپر ذکر ہوا۔

واضح رہے کہ سنت یہی ہے کہ طلاق اور رجوع دونوں پر گواہ بنائے جائیں، مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں: (( أَنَّ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يُطَلِّقُ امْرَأَتَهُ ثُمَّ يَقَعُ بِهَا وَلَمْ يُشْهِدْ عَلٰى طَلَاقِهَا وَلَا عَلٰى رَجْعَتِهَا فَقَالَ طَلَّقْتَ لِغَيْرِ سُنَّةٍ وَرَاجَعْتَ لِغَيْرِ سُنَّةٍ أَشْهِدْ عَلٰى طَلَاقِهَا وَعَلٰى رَجْعَتِهَا وَلَا تَعُدْ )) [ أبو داوٗد، الطلاق، باب الرجل يراجع

ولا یشهد : ۲۱۸٦ ] ’’عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں سوال کیا گیا جو اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے پھر اس سے جماع کر لیتا ہے، لیکن نہ اس نے اس کی طلاق پر کوئی گواہ بنایا ہے اور نہ اس کے رجوع پر؟ تو انھوں نے فرمایا: ’’تم نے سنت کے خلاف طلاق دی اور سنت کے خلاف ہی رجوع کیا۔ اس کی طلاق پر گواہ بناؤ اور اس کے رجوع پر بھی گواہ بناؤ اور دوبارہ ایسا نہ کرنا۔‘‘

5 وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ : یہ گواہوں کو حکم ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے شہادت دو۔ یہ حکم اس لیے دیا کہ گواہی دینے میں آدمی کو کئی مشکلات درپیش ہوتی ہیں، اسے اپنے نہایت اہم کام ترک کرنا پڑتے ہیں، حاکم کے پاس حاضری دینا پڑتی ہے اور بعض اوقات دور دراز سے آنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی لوگوں کی ناراضی کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے اور کئی اور موانع بھی ہوتے ہیں، صرف اللہ کی رضا ایسی چیز ہے جس کی خاطر آدمی ہر مشقت برداشت کرتے ہوئے شہادت دیتا ہے اور سچی شہادت دیتا ہے۔

6 ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ...... : بعض حضرات نے یہاں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اوپر طلاق کا وقت مقرر کرنے یا اس کا شمار کرنے، عدت کے دوران گھر سے نہ نکالنے، عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لینے یا علیحدگی اختیار کرنے اور گواہ بنانے کے جو احکام دیے گئے ہیں ان کی حیثیت وعظ و نصیحت کی ہے، قانون کی نہیں۔ ان حضرات کی یہ بات درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ احکام بھی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں، طلاق یا رجوع یا جو بھی عمل ان کے خلاف ہوگا اس کا کچھ اعتبار نہیں، مثلاً کوئی شخص عدت کا شمار ہی نہیں کرتا تو اس کا رجوع یا فراق کیسے معتبر ہو سکتا ہے؟ ہاں اگر کسی دوسری دلیل سے ثابت ہو جائے کہ ان میں سے فلاں حکم استحباب کے لیے ہے تو الگ بات ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں وعظ کا لفظ نہایت تاکید والے احکام کے لیے آتا ہے، جن کے قانون ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ دیکھیے سورۂ مجادلہ (۳)، بقرہ (۲۳۱)، نحل (۹۰) اور سورۂ نور (۱۷)۔

7 وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا : میاں بیوی کے باہمی معاملات کو ان کے سوا یا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اگر ان میں سے کوئی ظلم، زیادتی یا خیانت کے بعد غلط بیانی پر اتر آئے تو دنیا میں اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا، صرف اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی ایسی چیز ہے جو انھیں ہر قسم کے گناہ سے باز رکھ سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر معاملے کی طرح نکاح و طلاق کے معاملے میں بھی اپنے تقویٰ کی تاکید فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کے موقع پر جو تین آیات پڑھتے تھے ان تینوں میں تقویٰ کی تاکید فرمائی ہے۔ یہاں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ گھریلو جھگڑوں میں آدمی اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کے لیے غلط کام یا غلط بات کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طرح میرے مسائل حل ہو جائیں گے اور اگر میں اللہ سے ڈر کر صحیح کام کروں گا یا صحیح بات کروں گا تو پھنس جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آسان یا مشکل ہر موقع پر تم اللہ سے ڈرتے رہو اور وہی کام کرو جو اس کے تقویٰ کا تقاضا ہے۔ پھنسنے سے مت گھبراؤ، جو بھی اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے نکلنے کا راستہ بنا دے گا اور تقویٰ اختیار کرنے میں اگر کوئی نقصان ہوتا ہے، بیوی ساتھ نہیں رہتی یا مال کا نقصان ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کے لیے اس سے بھی بہتر چیز وہاں سے دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے بگڑے ہوئے

وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ

اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے، بے شک اللہ

معاملات کو درست کرنے کے لیے چالاکی اختیار کرنے اور جھوٹ فریب سے اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کے بجائے اللہ سے ڈرنے اور سیدھی اور صاف بات کہنے کا حکم دیا اور اس پر تمام بگڑے ہوئے معاملات کو درست کر دینے اور گزشتہ غلطیوں پر پردہ ڈال دینے کا وعدہ کیا، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴾ [ الأحزاب : ۷۰، ۷۱ ] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور بالکل سیدھی بات کہو۔ وہ تمھارے لیے تمھارے اعمال درست کر دے گا اور تمھارے لیے تمھارے گناہ بخش دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے تو یقیناً اس نے کامیابی حاصل کر لی، بہت بڑی کامیابی۔''

❽ ''وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ۝ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ'' کی جو تفسیر اوپر کی گئی ہے وہ اس مقام کی مناسبت سے ہے، ورنہ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس لیے صرف نکاح و طلاق ہی نہیں، کسی مسئلے میں بھی جو شخص اللہ سے ڈرے گا اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی اس کی نافرمانی سے بچے گا اللہ تعالیٰ جلدی یا دیر سے اس کے لیے نکلنے کا راستہ ضرور نکال دے گا اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح جو اللہ سے ڈرتا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا کے غم، آخرت کی فکر اور موت اور قیامت کی سختیوں سے نکلنے کا راستہ بھی بنا دے گا۔

❾ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: (( إِنَّ أَجْمَعَ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ ﴾ [ النحل : ۹۰ ] وَإِنَّ أَكْبَرَ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ فَرَجًا : ﴿ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴾ [ الطلاق : ۲ ] )) ''قرآن کی سب سے جامع آیت ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ'' ہے اور قرآن کی مشکل سے نکلنے کی سب سے بڑی آیت ''وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا'' ہے۔'' ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا کہ اس کی سند جید ہے۔

❿ واضح رہے کہ اس مقام پر ابن کثیر نے مالک بن اشجعی رضی اللہ عنہ کے بیٹے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا ہے جو دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور انھوں نے اسے باندھ رکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی طرف پیغام بھیجو کہ وہ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' کثرت سے پڑھے، جس کے نتیجے میں اس کی ہتھکڑیاں گر گئیں اور وہ دشمن کے اونٹ سمیت کر خیریت سے واپس آ گیا۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ۝ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کے لحاظ سے ایسا ہونا کچھ مشکل نہیں، مگر تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے لکھا ہے کہ اس کی سب سندیں مرسل یا منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہیں۔

آیت 3 ❶ وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ : مفسر عبدالرحمن کیلانی لکھتے ہیں: ''اس مقام پر رزق کا ذکر اس لیے کیا

# اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ③

اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، یقیناً اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے ③

گیا کہ انسان دوران عدت مطلقہ عورت پر خرچ کرنے اور اس کو بھلے طریقے سے رخصت کرنے میں بخل سے کام نہ لے، بلکہ اس سے جتنا بہتر سلوک کر سکتا ہے کرے۔ نیز بعض دفعہ صورت حال یہ ہوتی ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں ٹھنی رہتی ہے، مگر عورت صاحب جائداد ہوتی ہے یا اچھا کما سکتی ہے تو خاوند اس کو چھوڑنے ہی پر آمادہ نہیں ہوتا، مگر اس سے اچھا سلوک کرنے میں بھی ناکام ثابت ہوتا ہے، لہٰذا وہ عورت کو اپنے ہاں لٹکائے رکھتا ہے۔ ایسی سب صورتوں میں اللہ سے ڈرتے ہوئے وہی کام کرنا چاہیے جو اللہ کا حکم ہو، تنگ دستی سے نہیں ڈرنا چاہیے، کیونکہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس سے ڈر کر اس کے حکم کے مطابق چلے گا تو اس کی تنگدستی کو دور کرنا اللہ کے ذمے ہے، وہ اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچانے کا انتظام فرما دے گا جو پہلے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔'' (تیسیر القرآن)

② وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ …… : یعنی جو شخص غلط کام سے بچتے ہوئے حق پر قائم رہے اور اپنا معاملہ اور نفع و نقصان اللہ کے سپرد کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو جائے گا، کیونکہ ہر قسم کے ظاہری اور باطنی اسباب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، جب کہ انسان کی نظر صرف چند ظاہری اسباب تک محدود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اپنے ڈرنے والے کے لیے پریشانیوں سے نجات کی راہ پیدا کر سکتا ہے اور وہ پریشانی اور تنگدستی دور کرنے کے لیے نئے اسباب بھی پیدا فرما سکتا ہے اور اسباب کے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے، کیونکہ اس کی قدرت اسباب کی پابند نہیں بلکہ اسباب اس کی مشیت کے تابع ہیں۔ وہ ظاہری اسباب سے بھی ایسے نتائج ظاہر کر سکتا ہے جو انسانی عقل کے برعکس ہوں، وہ نہ چاہے تو مجرب دوا بھی شفا کے بجائے بیماری کا باعث بن جاتی ہے اور چاہے تو مضر صحت چیز شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

③ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا : یعنی اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے باوجود نکلنے کی راہ نہیں ملی اور نہ ہی اللہ پر توکل کے باوجود اس کی پریشانی دور ہوئی ہے تو اسے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ صبر اور حوصلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کشادگی کا منتظر رہنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا اسے ہر حال میں پورا کرنے والا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ اور وقت اپنے کامل علم کے ساتھ شروع سے مقرر فرمایا ہے، اس مقرر وقت پر اس کا توکل کرنے والوں کے لیے کافی ہو جانے کا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقدیر پر ایمان ہی انسان کو مشکلات میں صبر اور حوصلہ دلاتا ہے، فرمایا: ﴿ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۵۱ ] ''کہہ دے ہمیں ہرگز نہیں پہنچے گا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا، وہی ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ ایمان والے بھروسا کریں۔'' مزید دیکھیے سورۂ قمر (۴۹)، فرقان (۲)، رعد (۸) اور سورۂ حجر (۲۱)۔

وَ الّٰٓـِٔیْ یَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ الّٰٓـِٔیْ

اور وہ عورتیں جو تمھاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں، اگر تم شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور

آیت 4 ① وَ الّٰٓـِٔیْ یَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ ...... : "الّٰٓـِٔیْ" "اَللَّاتِیْ" کی طرح "اَلَّتِیْ" کی جمع ہے، وہ عورتیں۔ "ارْتَبْتُمْ" "رَیْبٌ" (شک) میں سے باب افتعال ماضی مطلق معروف جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے، اصل میں "اِرْتَیَبْتُمْ" تھا۔ یعنی وہ عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اور وہ عورتیں جنھیں حیض آیا ہی نہیں، اگر انھیں دخول کے بعد طلاق ہو تو ان کی عدت تین قمری مہینے ہے، جب کہ دخول کے بغیر طلاق ہو تو ان پر کوئی عدت نہیں۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۴۹)۔

② "اِنِ ارْتَبْتُمْ" (اگر تمھیں شک ہو) کے تین مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اگر تمھیں شک ہو کہ عدت تو حیض سے شمار ہوتی ہے اور ان عورتوں کا حیض بند ہے یا آیا ہی نہیں تو ان کی عدت کا کیا کیا جائے، تو ہم تمھیں بتاتے ہیں کہ ان کی عدت تین قمری مہینے ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ سعید بن جبیر سے مروی ہے اور ابن جریر نے یہی معنی پسند فرمایا ہے اور معنی کے لحاظ سے زیادہ ظاہر یہی ہے۔ ابن جریر نے اس پر اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت بطور دلیل ذکر فرمائی ہے کہ انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کئی طرح کی عورتوں کی عدت کا ذکر قرآن میں نہیں آیا، یعنی چھوٹی عمر کی عورتیں، عمر رسیدہ عورتیں اور حاملہ عورتیں۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَ الّٰٓـِٔیْ یَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ﴾ ''اور وہ عورتیں جو تمھاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں۔'' ابن کثیر نے اس کے علاوہ ابن ابی حاتم کی سند کے ساتھ اسی مفہوم کی مفصل روایت ذکر کی ہے، مگر تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا کہ ان دونوں کی سند میں عمرو بن سالم (ابوعثمان انصاری) راوی ہے جسے تقریب میں مقبول کہا گیا ہے، یعنی اس کی متابعت ہو تو اس کی روایت قبول ہے ورنہ کمزور ہے اور یہاں اس کی متابعت نہیں کی گئی، لہٰذا اس کی سند ضعیف ہے۔ اس تفسیر کے مطابق "اِنِ ارْتَبْتُمْ" کے الفاظ کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ایسی عورتوں کو جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں، بیماری کا خون (استحاضہ) شروع ہو جائے اور تم فیصلہ نہ کر سکو کہ یہ حیض ہے یا استحاضہ تو ان کی عدت تین قمری مہینے ہے۔ یہ مجاہد اور زہری کا قول ہے۔ [ طبري : ۲۳/ ٦٩، ح : ٣٤٦١٧، ٣٤٦١٨، بسند صحيح ] اس سے ظاہر ہے کہ جب شک کی صورت میں ان کی عدت تین ماہ ہے تو اگر انھیں کسی قسم کا خون آتا ہی نہیں اور ان کے حیض سے مایوس ہونے میں کوئی شک ہی نہیں تو ان کی عدت بالاولیٰ تین ماہ ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عام قاعدہ یہی ہے کہ جن عورتوں کا حیض بند ہو گیا ہو یا شروع ہی نہ ہوا ہو انھیں حمل نہیں ہوتا، مگر شاذ و نادر ایسی عورتوں کو بھی حمل ہو جاتا ہے اور یہاں مسئلہ ان عورتوں کا بیان ہو رہا ہے جنھیں دخول کے بعد طلاق دی گئی ہے، اس میں حمل کا امکان بہرحال رہتا ہے۔ سو اگر تمھیں آثار سے ان کے حاملہ ہونے کا شک پڑ جائے تو ان کی عدت تین ماہ ہے، اتنی مدت میں ان کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا واضح ہو جائے گا۔ اگر حاملہ نہ ہوں تو عدت تین ماہ ہی ہے اور اگر حمل ظاہر

لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ④

ان کی بھی جنھیں حیض نہیں آیا اور جو حمل والی ہیں ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے اس کے کام میں آسانی پیدا کر دے گا ④

ہو جائے تو ان کی عدت وضع حمل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ کہ حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر حیض سے مایوس عمر رسیدہ عورت یا ایسی عورت جسے حیض آیا ہی نہیں اور ان کے متعلق حمل کا کوئی شک بھی نہ ہو تو ان کی عدت بالا ولی تین ماہ ہے۔

③ وَالّٰٓئِیْ لَمْ يَحِضْنَ : یعنی وہ عورتیں جنھیں حیض آیا ہی نہیں ان کی عدت بھی تین ماہ ہے۔ اس میں چھوٹی عمر کی لڑکیاں بھی شامل ہیں جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو اور بڑی عمر کی عورتیں بھی جنھیں کسی وجہ سے حیض شروع ہی نہیں ہو سکا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ چھوٹی عمر کی لڑکی سے نکاح ہو سکتا ہے اور اس کا خاوند اس سے جماع بھی کر سکتا ہے۔ کفار کے کہنے پر چھوٹی عمر کی شادی پر پابندی لگانا یا بالغ ہو جانے والی لڑکیوں کی شادی پر اٹھارہ سال کی یا کسی مخصوص عمر کی پابندی لگانا اللہ تعالیٰ کے احکام کی صریح مخالفت ہے۔

④ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ : "اُولَاتُ" "ذَاتُ" کی جمع ہے جیسا کہ "اُولُوْ" "ذُوْ" کی جمع ہے۔ "اُولَاتُ الْاَحْمَالِ" حمل والیاں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہی ہے، خواہ اس کے خاوند نے اسے طلاق دی ہو یا اس کا خاوند فوت ہو جائے۔ صحیح احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہے کہ حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو بچہ پیدا ہونے کے ساتھ اس کی عدت ختم ہو جائے گی، خواہ خاوند فوت ہونے کے فوراً بعد بچہ پیدا ہو جائے یا کئی ماہ کے بعد پیدا ہو۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ سبیعہ اسلمیہ کے ہاں ان کے خاوند کے قتل ہونے کے چالیس دن بعد بچہ پیدا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں نکاح کرنے کی اجازت دے دی۔ [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ و أولات الأحمال أجلهن...... ﴾ : ۴۹۰۹ ] رہی وہ عورتیں جو حاملہ نہ ہوں اور ان کے خاوند فوت ہو جائیں تو ان کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۳۴)۔

⑤ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا : اس سورت میں بار بار اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے مسائل بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک آدمی ہر وقت اللہ سے ڈرتا نہ رہے وہ اپنی بیوی کے معاملہ میں بے راہ رو ہو جاتا ہے، اس لیے کتاب و سنت میں اپنی بیویوں سے حسن سلوک کی بار بار تاکید آئی ہے۔ (کیلانی) اس مقام کی مناسبت سے اس کے کام میں آسانی پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ سے ڈرے گا اول تو طلاق کے وقت کے انتظار کی وجہ سے طلاق کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور اگر اللہ کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق طلاق دے گا تو عدت کے اندر

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۵ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَ اْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ۶

یہ اللہ کا حکم ہے جسے اس نے تمھاری طرف نازل کیا ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے بڑا اجر دے گا ⑤ انھیں وہاں سے رہائش دو جہاں تم رہتے ہو، اپنی طاقت کے مطابق اور انھیں اس لیے تکلیف نہ دو کہ ان پر تنگی کرو اور اگر وہ حمل والی ہوں تو ان پر خرچ کرو، یہاں تک کہ وہ اپنا حمل وضع کر لیں، پھر اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو انھیں ان کی اجرتیں دو اور آپس میں اچھے طریقے سے مشورہ کرو اور اگر تم آپس میں تنگی کرو تو عنقریب اسے کوئی اور عورت دودھ پلا دے گی ⑥

---

اسے رجوع کا حق حاصل رہے گا اور اگر عدت ختم ہو جائے تو دوبارہ نکاح کا موقع باقی رہے گا۔

**آیت 5** ① ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ : اس میں طلاق اور عدت کے احکام کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہے۔

② وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ ...... : اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے پانچ فائدے بیان فرمائے ہیں، سب سے پہلا فائدہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا، دوسرا یہ کہ اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان نہیں ہوگا، تیسرا یہ کہ اس کے لیے اس کے معاملات میں آسانی پیدا فرما دے گا، چوتھا یہ کہ اس کے گناہ معاف فرما دے گا اور پانچواں یہ کہ اسے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

**آیت 6** ① اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ : اس میں ان عورتوں کا حکم بیان فرمایا ہے جنھیں پہلی یا دوسری طلاق دی گئی ہو۔ پہلے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ عدت پوری ہونے تک انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں، اب اسی کی تفصیل ہے۔ "مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ" میں "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی جہاں تم رہتے ہو اس کے کسی حصے میں انھیں بھی رہنے کے لیے جگہ دو۔ "مِنْ وُّجْدِكُمْ" اپنی وسعت کے مطابق، یعنی مکان ذاتی ہے یا کرائے کا یا خیمہ وغیرہ ہے، جہاں رہتے ہو وہیں انھیں رکھو۔ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بیان فرمایا ہے کہ اتنی مدت ایک جگہ رہنے کی وجہ سے ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ دوبارہ موافقت کی صورت پیدا فرما دے اور رجوع ہو جائے، اس دوران ان کا نفقہ بھی خاوند کے ذمے ہے۔ تیسری طلاق کے بعد چونکہ رجوع کی گنجائش نہیں، اس لیے خاوند کے ساتھ رہائش کا حکم بھی نہیں اور نہ ہی ان کا خرچ خاوند کے ذمے ہے، جیسا کہ پہلی آیت کے فائدہ (۱۳) میں فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث میں گزر چکا ہے۔

② وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ : یعنی انھیں نفقہ میں کمی یا نامناسب رہائش یا بدزبانی یا مار پیٹ کے ساتھ تکلیف

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۠ ع ۱۷

لازم ہے کہ وسعت والا اپنی وسعت میں سے خرچ کرے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کی جو اس نے اسے دیا ہے، عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی پیدا کر دے گا۔⑦

پہنچا کر تنگ نہ کرو کہ وہاں رہیں تو تنگی میں مبتلا رہیں یا پھر مکان چھوڑ کر چلی جائیں یا مہر چھوڑ دیں۔

③ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ...... : مطلقہ عورت اگر حاملہ نہیں تو رجعی طلاق کی صورت میں اس کا نفقہ اور رہائش خاوند کے ذمے ہے، تیسری طلاق کی صورت میں اس کا نفقہ یا رہائش خاوند کے ذمے نہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ البتہ اگر وہ حاملہ ہے تو رجعی طلاق کی صورت میں بچہ پیدا ہونے تک اس کا نفقہ اور رہائش دونوں خاوند کے ذمے ہیں اور اگر تیسری طلاق ہے تو وضع حمل تک صرف اس کا خرچہ خاوند کے ذمے ہے۔

④ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ : اس جملے سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بچہ باپ کا ہوتا ہے ماں کا نہیں، کیونکہ ماں اس بچے کے باپ کے لیے دودھ پلا رہی ہے اور اجرت لے رہی ہے، اگر بچہ ماں کا ہو تو اجرت لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ عورت اپنے دودھ کی خود مالک ہے، وہ طلاق دینے والے خاوند سے بھی اسی طرح اجرت لے سکتی ہے جیسے دوسروں سے۔

⑤ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ : "وَاْتَمِرُوْا" "اِئْتَمَرَ يَأْتَمِرُ اِئْتِمَارًا" (افتعال) مشورہ کرنا، جیسا کہ سورۂ قصص میں فرمایا: ﴿ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ ﴾ [ القصص : ۲۰ ] "اے موسیٰ! بے شک سردار تیرے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔" طلاق کے بعد عموماً میاں بیوی کی باہمی ناچاقی اور ناراضی کی وجہ سے کشیدگی پیدا ہو چکی ہوتی ہے، ایسی صورت میں میاں بیوی دونوں کو اور ان کے تعلق والوں کو حکم دیا کہ بچے کو دودھ پلانے، اس کے علاج و تربیت اور اس کی بہتری کے لیے آپس میں اچھے طریقے سے مشورہ کرتے رہو، ایسا نہ ہو کہ تمھاری کشیدگی بچے کو نقصان پہنچانے کا باعث بن جائے۔

⑥ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى : یعنی اگر ماں کسی بیماری یا کمزوری کی وجہ سے دودھ پلانے سے انکار کر دے، یا اجرت اتنی زیادہ مانگے جو خاوند کی استطاعت یا معروف رواج سے زیادہ ہو، یا خاوند اس کی طلب کردہ اجرت دینے پر تیار نہ ہو، یا کسی اور وجہ سے آپس میں ضد پیدا ہو جائے اور ماں دودھ نہ پلائے تو ضروری نہیں کہ ہر حال میں ماں ہی دودھ پلائے، بلکہ کوئی اور عورت اسے دودھ پلا دے گی۔

**آیت 7** ① لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ...... : اس سے معلوم ہوا کہ نفقہ میں بیوی کی حالت کا اعتبار نہیں کیا جائے

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۞ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۞

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا، بہت سخت محاسبہ اور انھیں سزا دی، ایسی سزا جو دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی ۞ تو انھوں نے اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام خسارہ تھا ۞

گا، بلکہ خاوند کی حالت کے مطابق نفقہ واجب ہوگا۔ اگر خاوند وسعت والا اور مال دار ہے تو اس کے مطابق خرچ کرے گا اور اگر وہ تنگدست ہے تو اللہ نے اسے جو کچھ دیا ہے اس میں سے اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرے۔

❷ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا : اس میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو خاوند حسب مقدور وہ خرچے پورے کرتے ہیں جو ان کے ذمے ہیں اور ان میں بخل نہیں کرتے، تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے تنگی کے بعد آسانی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا فرما دے گا۔ "سَيَجْعَلُ" میں ''سین'' استقبال کے علاوہ تاکید کا مفہوم بھی رکھتا ہے۔ "عُسْرٍ" اور "يُّسْرًا" دونوں میں تنوین تنکیر کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس آسانی پیدا کرنے کی بے شمار صورتیں ہیں، تنگی خواہ کسی قسم کی ہو اللہ تعالیٰ اس میں آسانی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرما سکتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ تنگی میں اپنی طاقت کے مطابق دریغ نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتا رہے، تو اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد خواہ کوئی ہو ضرور ہی آسانی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرما دے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۞ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [ الانشراح : ٥، ٦ ] ''پس بے شک ہر مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہے۔ بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔''

**آیت 8، 9** وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ ...... : "عَتَتْ" "عَتَا يَعْتُوْ عُتُوًّا" (ن) سے ماضی معلوم ہے، اصل میں "عَتَوَتْ" ہے۔ "نُكْرًا" اجنبی، نہ پہچانا ہوا، جو نہ دیکھا ہو نہ سنا۔ اب تک اللہ تعالیٰ نے طلاق وغیرہ کے متعلق اپنے احکام کا ذکر فرمایا تھا، یہاں سے بتایا جا رہا ہے کہ پچھلی جن بستیوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے احکام سے سرکشی اختیار کی ان کا انجام کیا ہوا۔ مقصد مسلمانوں کو ان احکام کی اہمیت بتانا اور ان کی پابندی کی تلقین کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی اقوام کی بربادی میں شرک و کفر کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسولوں کے ان تفصیلی احکام کی مخالفت بھی تھی جو زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے دیے، جس کی وجہ سے ان کے اندر حد سے بڑھی ہوئی سرکشی اور فساد پیدا ہوا۔ مثلاً جب انھوں نے شرک و کفر پر اصرار کے ساتھ نکاح و طلاق کے ضابطوں کی پابندی سے سرکشی اختیار کی تو زنا اور قوم لوط کا عمل عام ہوا، جس کی وجہ سے قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا بہت سخت محاسبہ کیا اور انھیں ایسی سزا دی جو کسی نے نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ آج کے دور میں کفار نے شرک و کفر پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان ضابطوں کی بھی شدید مخالفت اختیار کر رکھی ہے، جس کے نتیجے میں ان کا معاشرہ بے پناہ بداخلاقی، بدامنی اور قتل و غارت کا شکار ہو چکا ہے اور بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا

أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ ⑩ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ⑪

اللہ نے ان کے لیے بہت سخت عذاب تیار کیا ہے، سو اللہ سے ڈرو اے عقلوں والو جو ایمان لائے ہو! یقیناً اللہ نے تمھاری طرف عظیم نصیحت نازل کی ہے ⑩ جو ایسا رسول ہے کہ تمھارے سامنے اللہ کی واضح بیان کرنے والی آیات پڑھتا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے وہ اسے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ، بلاشبہ اللہ نے اس کے لیے اچھا رزق بنایا ہے ⑪

ہے۔ اب ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان بھی ان احکام سے آزاد ہو جائیں اور ان میں بھی زنا، قومِ لوط کا عمل اور قتل و غارت پھیل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کے عذاب کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو ان کے انجام سے ڈرایا ہے۔

**آیت 10** ① اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا: پچھلی آیات میں دنیا کے عذاب کا ذکر تھا، اس میں آخرت کے عذاب کا ذکر ہے۔

② فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ "فاء" فصیحہ ہے جو محذوف شرط کا اظہار کر رہی ہے، یعنی جب تم ان بستیوں کا حال سن چکے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے احکام سے سرکشی اختیار کی تو اے عقلوں والو جو ایمان لا چکے ہو! تم اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی سے بچ جاؤ۔

③ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا: "ذِكْرًا" پر تنوین تعظیم کی ہے، عظیم نصیحت۔

**آیت 11** ① رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ: "رَسُوْلًا" پچھلی آیت میں مذکور "ذِكْرًا" سے بدل ہے، یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف عظیم ذکر نازل کیا ہے جو رسول ہے، یعنی رسول ﷺ کا وجود سراپا نصیحت ہے کہ اس کا قول، فعل، حال اور تقریر سب نصیحت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سورۂ حجر (۹) میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ (بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں) اس میں "الذِّكْرَ" سے مراد صرف قرآن مجید نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ ساری وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی بھی حفاظت فرمائی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور احوال و تقریرات کی بھی حفاظت فرمائی ہے۔

② لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ...... : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ

اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے، تا کہ تم

(۲۵۷) کی تفسیر۔

آیت 12 ① اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ...... : سورت کے آخر میں اس کے اندر مذکور احکام کی عظمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے آسمان و زمین کی پیدائش، ان میں اپنے اوامر کے نزول اور اپنے علم و قدرت کا ذکر فرمایا، تا کہ یہ بات مدِّنظر رہے کہ یہ احکام دینے والا کون ہے۔ بارہ (۱۲) آیات پر مشتمل اس سورت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے تقویٰ کے ساتھ شروع ہوا ہے جو اس کے نام، اس کی ضمیر اور اس کی طرف نسبت کی صورت میں تقریباً تیس (۳۰) مرتبہ آیا ہے اور آخر میں پھر اس عظیم ہستی کا تعارف ان صفات کے ساتھ دہرایا ہے۔ (ابن عاشور)

② خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ : سات آسمانوں کی کیفیت تو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴾ [ نوح : ۱۵ ] ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا کیا۔''

③ وَ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ : قرآن مجید میں آسمان کا ذکر واحد کے صیغے ''السَّمَآءُ'' کے ساتھ بھی آیا ہے اور جمع کے صیغے ''سَمٰوٰتٌ'' کے ساتھ بھی، مگر زمین کا ذکر واحد کے صیغے کے ساتھ ہی آیا ہے، آسمانوں کی طرح اوپر تلے سات زمینیں ہونے کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہاں فرمایا کہ اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مثل یعنی مانند۔ مانند ہونے کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ زمین بھی اپنی عظمت، برکت، آبادی اور کرویت (گول ہونے) میں آسمانوں کی طرح ہے۔ دوسرا مطلب جو اکثر مفسرین نے مراد لیا ہے، یہ ہے کہ سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی اوپر تلے سات ہیں۔ اس کی دلیل میں وہ صحیح حدیث پیش کی ہے جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ خُسِفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلٰى سَبْعِ أَرَضِيْنَ )) [ بخاري، المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض : ۲٤٥٤ ] ''جو شخص زمین میں سے کچھ بھی اس کے حق کے بغیر لے گا اسے قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنسایا جائے گا۔''

حدیث میں مذکور سات زمینوں سے مراد تو ظاہر ہے کہ اسی زمین کے سات طبقات ہیں جس پر ہم رہتے ہیں، لیکن کیا آیت میں مذکور سات زمینوں سے بھی یہی طبقات مراد ہیں یا ہماری زمین جیسی اور چھ زمینیں ہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ کائنات کی بے پناہ وسعتوں کو دیکھیں تو کچھ بعید نہیں کہ ہماری زمین جیسی اور زمینیں بھی ہوں جو ہماری زمین ہی کی طرح آباد ہوں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ [ المدثر : ۳۱ ] ''اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے اکیلے ہی آسمان و زمین کو پیدا فرمایا، کوئی اس وقت موجود نہ تھا کہ ان کے اسرار سے پوری طرح واقف ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ [ الكهف : ٥١ ] ''میں نے انھیں آسمانوں اور

ع ۱۹

اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۟﴿۱۲﴾

جان لو کہ اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھنے والا ہے اور یہ کہ اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے ﴿۱۲﴾

زمین کے پیدا کرنے میں حاضر نہیں کیا۔" اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایجاد کا جو سلیقہ عطا فرمایا ہے جس سے بڑی بڑی طاقتور دوربینیں ایجاد ہوئی ہیں، ہیئت دان ان کے ساتھ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہر دن نئے سے نیا انکشاف ہوتا ہے۔ ہمارے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی سات پیدا فرمائی ہیں۔ رہی ان کی کیفیت اور متعین مراد، تو وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس نے اسے مجمل رکھا ہے تو اس میں ہماری بہتری ہے، کیونکہ اگر اس کی واقعی کیفیت بیان ہوتی تو اپنی ذہنی نارسائی کی وجہ سے ممکن تھا کہ کئی لوگ انکار ہی کر دیتے۔

❹ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ : اللہ تعالیٰ کا امر دو قسم کا ہے، ایک امر کونی ہے، یعنی وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے " کُنْ " (ہو جا) کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے اور ایک امر شرعی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے اپنے احکام نازل فرماتا رہتا ہے، یعنی آسمانوں اور زمینوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے اوامر کونی اور اوامر شرعی اترتے رہتے ہیں۔ اس میں بھی اس سورت میں مذکور احکام کی اہمیت کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ ان عظیم الشان آسمانوں اور زمینوں کے خالق و مالک کے احکام ہیں۔

❺ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا : یعنی زمین و آسمان کی پیدائش کی یہ بات تمھیں اس لیے بتائی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ہر چیز پر پوری قدرت کو اور اس کے ہر چیز پر علم کے ساتھ احاطے کو جان لو۔ پھر جب تم اس کی قدرت اور علم سے واقف ہو جاؤ گے تو اس کے احکام کی نافرمانی کی جرأت نہیں کرو گے۔

سورۃ التحریم ۶۶ مدنیۃ ۱۰۷ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ آیاتھا ۱۲ رکوعاتھا ۲

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبۡتَغِيۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟ تو اپنی بیویوں کی خوشی چاہتا ہے، اور اللہ بہت

آیت 1 ① يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ : وہ چیز کیا تھی جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ پر حرام کی اور یہ آیات نازل ہوئیں؟ اس کے متعلق ایک تو وہ مشہور واقعہ ہے جو صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ میں نقل ہوا ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: « كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْرَبُ عَسَلًا عِنْدَ زَيْنَبَ ابْنَةِ جَحْشٍ وَ يَمْكُثُ عِنْدَهَا فَوَاطَأْتُ أَنَا وَ حَفْصَةُ عَنْ أَيَّتُنَا دَخَلَ عَلَيْهَا فَلْتَقُلْ لَهُ أَكَلْتَ مَغَافِيْرَ، إِنِّيْ أَجِدُ مِنْكَ رِيْحَ مَغَافِيْرَ، قَالَ لَا وَلٰكِنِّيْ كُنْتُ أَشْرَبُ عَسَلًا عِنْدَ زَيْنَبَ ابْنَةِ جَحْشٍ فَلَنْ أَعُوْدَ لَهُ وَ قَدْ حَلَفْتُ لَا تُخْبِرِيْ بِذٰلِكَ أَحَدًا » [ بخاري، التفسير، باب: ﴿يا أيها النبي لم تحرم﴾ : ۴۹۱۲۔ مسلم: ۱۴۷۴ ] ''رسول اللہ ﷺ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پیا کرتے تھے اور ان کے پاس ٹھہر جاتے تھے، تو میں نے اور حفصہ نے آپس میں اس بات پر اتفاق کر لیا کہ آپ ﷺ ہم میں سے جس کے پاس بھی آئیں وہ آپ سے یہ کہے کہ آپ نے مغافیر کھائی ہے، کیونکہ مجھے آپ سے مغافیر کی بُو آ رہی ہے۔ (جب آپ ﷺ کے آنے پر یہ بات کہی گئی تو) آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، لیکن میں زینب بنت جحش کے پاس شہد پیا کرتا تھا، دوبارہ کبھی نہیں پیوں گا اور میں نے (اس بات کی) قسم کھالی ہے، تم یہ بات کسی کو نہ بتانا۔'' امام بخاری رحمہ اللہ نے ''كِتَابُ الطَّلَاقِ'' میں بھی یہ حدیث نقل فرمائی ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: « فَنَزَلَتْ : ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ﴾ » [ بخاري، الطلاق، باب: ﴿لم تحرم ما أحل الله لك﴾ : ۵۲۶۷ ] ''یعنی اس واقعہ پر یہ آیت اتری: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ﴾ ''اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟'' واضح رہے کہ مغافیر ایک بدبودار میٹھی گوند ہوتی ہے جو عرفط نامی پودے پر پیدا ہوتی ہے۔ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ تھا کہ آپ کو بدبو سے بہت نفرت ہے، آپ یہ سوچ کر شہد پینا چھوڑ دیں گے کہ مغافیر کی بو شہد ہی سے آ رہی ہوگی، کیونکہ ممکن ہے شہد کی مکھیوں نے اس کے پودے عرفط کا رس چوس کر شہد بنایا ہو۔

دوسرا وہ واقعہ ہے جو امام نسائی نے انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے: « أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهُ أَمَةٌ يَطَؤُهَا فَلَمْ تَزَلْ بِهِ عَائِشَةُ وَ حَفْصَةُ حَتّٰى حَرَّمَهَا عَلٰى نَفْسِهِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ : ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ﴾ إِلٰى آخِرِ الْآيَةِ » [ نسائي، عشرة النساء، باب الغيرة : ۳۴۱۱ ] ''رسول اللہ ﷺ کی ایک لونڈی تھی جس سے آپ صحبت کیا کرتے تھے، تو عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما مسلسل آپ سے اصرار کرتی رہیں، حتیٰ کہ آپ نے اسے اپنے آپ پر

رَّحِيْمٌ ①

بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ①

حرام کر لیا، تو اللہ عزوجل نے یہ مکمل آیت نازل فرمائی: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ ''اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟'' علامہ البانی نے فرمایا: "إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ" اور حافظ ابن حجر نے "كِتَابُ الطَّلَاقِ، بَابُ : ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ﴾" کی شرح کرتے ہوئے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔ یہ لونڈی ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم کی ماں تھیں۔ ضیاء مقدسی نے " اَلْأَحَادِيثُ الْمُخْتَارَةُ " میں روایت کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: « قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَفْصَةَ لَا تُحَدِّثِي أَحَدًا وَّ إِنَّ أُمَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيَّ حَرَامٌ فَقَالَتْ أَتُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ؟ قَالَ فَوَاللّٰهِ ! لَا أَقْرَبُهَا، قَالَ فَلَمْ يَقْرَبْهَا، حَتّٰى أَخْبَرَتْ عَائِشَةَ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ » [ الأحاديث المختارة : ١٨٩ ] ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم کسی کو نہ بتانا یہ کہ ام ابراہیم مجھ پر حرام ہے۔'' انھوں نے کہا: ''کیا آپ وہ چیز حرام کر رہے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا۔'' تو آپ اس کے قریب نہیں گئے، حتیٰ کہ اس (حفصہ رضی اللہ عنہا) نے یہ بات عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو بتا دی تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرما دی: ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ ''بے شک اللہ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔'' ضیاء مقدسی نے حدیث کے آخر میں فرمایا: "إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ" اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ہیثم بن کلیب کی مسند کے حوالے سے اسے نقل کر کے فرمایا، یہ اسناد صحیح ہے اور کتب ستہ میں سے کسی نے اسے روایت نہیں کیا اور ضیاء مقدسی نے اپنی " اَلْمُسْتَخْرَجُ " میں اس کا انتخاب کیا ہے۔

اس سلسلے میں کچھ اور واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں مگر ان میں سے کسی کی سند صحیح نہیں۔ ان دونوں واقعات میں سے شہد والے واقعہ کی سند زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ صحیحین میں ہے، اس لیے بعض مفسرین نے صرف اسی کو ان آیات کا سبب نزول قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرطبی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام اقوال میں سب سے صحیح پہلا ہے اور صحیح یہ ہے کہ آپ نے حرام شہد کو کیا تھا جو آپ زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں پیا کرتے تھے اور ابن کثیر نے اس کے متعلق بہت سی روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا: ''صحیح یہ ہے کہ یہ معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہد کو حرام کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔'' اور آلوسی نے فرمایا: ''نووی نے مسلم کی شرح میں کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت شہد کے واقعہ کے بارے میں ہے نہ کہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کے بارے میں، جو صحیحین کے علاوہ کتابوں میں آیا ہے اور ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ کسی صحیح سند کے ساتھ نہیں آیا۔'' مگر جیسا کہ اوپر گزرا کہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے قصے کی سند کو ضیاء مقدسی، ابن کثیر، ابن حجر اور البانی رحمہم اللہ نے صحیح کہا ہے، شہد والے واقعہ سے اس کا کوئی تعارض بھی نہیں اور ایک آیت کا سبب نزول کئی واقعات بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ دونوں واقعات ان آیات کا سبب نزول ہیں، شوکانی نے بھی یہی فیصلہ فرمایا ہے۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۲

بے شک اللہ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے اور اللہ تمھارا مالک ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ۝۲

② احادیث سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے شہد کو امت کے لیے حرام قرار نہیں دیا تھا، بلکہ صرف خود اسے نہ پینے کی قسم کھائی تھی۔ اسی طرح امت کے لیے ان کی لونڈیوں کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ صرف اپنی ایک لونڈی کو اپنے آپ پر حرام قرار دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر بھی ناراضی کا اظہار فرمایا، کیونکہ آپ کے ایسا کرنے سے آپ کا ان نعمتوں سے محروم ہونا لازم آتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کی تھیں۔ اس کے علاوہ اندیشہ تھا کہ آپ کو دیکھ کر امت کے لوگ، جن کے لیے نبی ﷺ اسوۂ حسنہ و کاملہ ہیں، شہد کے قریب نہیں جائیں گے اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کو گوارا نہیں تھیں۔

③ اس سے معلوم ہوا کہ صوفی حضرات جو ترک حیوانات جلالی و جمالی کرتے ہیں، یعنی اپنے چلوں اور وظیفوں کے درمیان کوئی جاندار چیز یا اس سے نکلنے والی چیز مثلاً گوشت، مچھلی، انڈا، دودھ، گھی اور شہد وغیرہ نہیں کھاتے، ان کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ کے خلاف ہے۔ حقیقت میں یہ عمل ہندو جوگیوں یا نصرانی راہبوں سے لیا گیا ہے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

④ "يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ" کے الفاظ کے ساتھ خطاب کا مقصد یہ ہے کہ آپ کا کام وحی الٰہی پر چلنا اور اسے آگے پہنچانا ہے، آپ کو اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

⑤ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے ہر قول، فعل اور تقریر پر وحی الٰہی کی مہر ہے اور وہ سب کا سب دین ہے، کیونکہ اگر آپ کا کوئی اجتہاد درست نہیں ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی اصلاح فرما دیتا تھا۔ آپ ﷺ کے معصوم ہونے کا یہی مطلب ہے، انبیاء کے علاوہ کسی کو یہ چیز حاصل نہیں کہ وحی کے ذریعے سے ان کی خطا کی اصلاح ہوتی ہو۔ اس لیے کسی صحابی یا امام یا پیر فقیر کی بات امت کے لیے حجت نہیں، کیونکہ وہ درست بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔

⑥ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ: اس میں نبی ﷺ اور امت کو تعلیم ہے کہ بیویوں کو خوش رکھنا اگرچہ اچھی بات ہے، مگر اس وقت تک جب وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر قائم رہ کر ہو، رب تعالیٰ کو ناراض کر کے انھیں راضی کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

⑦ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کریم ﷺ پر خاص انعام و فضل ہے کہ عتاب کرتے ہوئے ساتھ ہی معافی اور مغفرت و رحمت کی خوش خبری بھی سنا دی، جیسا کہ فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ [التوبة: ۴۳] "اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے ان (منافقین) کو پیچھے رہنے کی اجازت کیوں دی؟"

آیت 2 ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ: "تَحِلَّةَ" "حَلَّلَ" (تفعیل) کا مصدر "تَحْلِيْلٌ" اور "تَحِلَّةٌ" دونوں آتے ہیں، جیسے "كَرَّمَ" کا مصدر "تَكْرِيْمٌ" اور "تَكْرِمَةٌ" دونوں آتے ہیں۔ معنی ہے حلال کرنا، مراد قسم کا کفارہ ہے جس کے ادا کرنے کے بعد وہ چیز حلال ہو جاتی ہے جو قسم کھا کر حرام کی تھی، یعنی آپ نے قسم کھا کر جو شہد اور ماریہ کو حرام کیا

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۳﴾

اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے پوشیدہ طور پر کوئی بات کہی، پھر جب اس (بیوی) نے اس بات کی خبر دے دی اور اللہ نے اس (نبی) کو اس کی اطلاع کر دی تو اس (نبی) نے (اس بیوی کو) اس میں سے کچھ بات جتلائی اور کچھ سے اعراض کیا، پھر جب اس (نبی) نے اسے یہ (راز فاش کرنے کی) بات بتائی تو اس نے کہا تجھے یہ کس نے بتایا؟ کہا مجھے اس نے بتایا جو سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے ﴿۳﴾

ہے، اس قسم کا کفارہ دے دیں۔ قسم کا کفارہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ (۸۹) میں بیان فرما دیا ہے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَ إِنِّيْ وَاللّٰهِ! إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَا أَحْلِفُ عَلٰى يَمِيْنٍ فَأَرٰى غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا إِلَّا كَفَّرْتُ عَنْ يَمِيْنِيْ، وَأَتَيْتُ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ » [ بخاري، الأيمان والنذور، باب قول اللّٰه تعالٰى : ﴿ لا يؤاخذكم الله ...... ﴾ : ۶۶۲۳ ] ”اور اللہ کی قسم! میں، اگر اللہ نے چاہا تو کسی بھی بات پر قسم کھاؤں گا، پھر اس کے خلاف کو اس سے بہتر دیکھوں گا تو اپنی قسم کا کفارہ دوں گا اور وہ کام کروں گا جو بہتر ہے۔“ ناجائز کام کی قسم کھالے تو اسے توڑنا اور اس کا کفارہ دینا ضروری ہے۔

② وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ : ”مَوْلٰی“ کا معنی ہے مالک، دوست، مددگار۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمھارا مالک، تمھارا مددگار اور تم پر بے حد مہربان ہے، اسی لیے اس نے تمھیں ایسی چیزوں سے منع فرمایا ہے جو تمھیں مشکل میں مبتلا کر دیں اور اگر قسم کھا کر ایسی کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو اس سے نکلنے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے، کیونکہ: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۸۵ ] ”اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ اور وہی ہے جو سب کچھ جاننے والا اور کمال حکمت والا ہے، اس لیے اس کے کسی حکم میں کوئی خطا نہیں، کیونکہ اس کے تمام احکام کامل علم و حکمت پر مبنی ہیں۔

آیت 3 ① وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا : اس بیوی سے مراد حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے شہد اور ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا والے واقعات میں گزر چکا ہے کہ آپ نے ان سے کہا تھا کہ یہ بات کسی کو نہ بتانا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات فرمائی ہو جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا۔

② فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ : پھر جب حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ بات جس کے راز رکھنے کی انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی تھی، عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا دی اور اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع دے دی۔

③ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو اس میں سے کچھ بات جتلائی کہ تم نے یہ بات آگے بتا دی ہے اور کچھ سے اعراض کیا۔ آپ نے انھیں کیا جتلایا اور کیا نہیں جتلایا اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر نہیں فرمایا، اس لیے

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ

اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو تو یقیناً تمھارے دل مائل ہو گئے ہیں اور اگر تم اس کے خلاف ایک

سلامتی اسی میں ہے کہ اسے اسی طرح مبہم رہنے دیا جائے۔

④ اس سے رسول اللہ ﷺ کا کمال حسن خلق اور حلم و کرم ظاہر ہے کہ ناراضی کا اظہار کرتے وقت ایک ایک بات کا ذکر کر کے طعن و تشنیع نہیں فرمائی، بلکہ کچھ بات کا ذکر کیا اور کچھ سے اعراض فرمایا۔

⑤ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ : حفصہ رضی اللہ عنہا نے خیال کیا کہ آپ کو یہ بات عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتائی ہوگی، اس لیے پوچھ لیا کہ آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟ آپ نے فرمایا، مجھے اس نے بتائی ہے جو سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

آیت 4 ① اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ ...... : اس آیت میں خطاب عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما سے ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: « لَمْ أَزَلْ حَرِيْصًا أَنْ أَسْأَلَ عُمَرَ عَنِ الْمَرْأَتَيْنِ مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّتَيْنِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾ حَتّٰى حَجَّ عُمَرُ وَحَجَجْتُ مَعَهُ، فَلَمَّا كُنَّا بِبَعْضِ الطَّرِيْقِ عَدَلَ عُمَرُ وَعَدَلْتُ مَعَهُ بِالْإِدَاوَةِ فَتَبَرَّزَ ثُمَّ أَتَانِيْ فَسَكَبْتُ عَلٰى يَدَيْهِ فَتَوَضَّأَ فَقُلْتُ يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! مَنِ الْمَرْأَتَانِ مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّتَانِ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُمَا : ﴿ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾؟ قَالَ عُمَرُ وَاعَجَبًا لَكَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! هِيَ حَفْصَةُ وَ عَائِشَةُ » [ مسلم، الطلاق، باب في الإيلاء ...... : ۱۴۷۹/۳۴ ] ''مجھے ہمیشہ خواہش رہی کہ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نبی ﷺ کی بیویوں میں سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾ یہاں تک کہ انھوں نے حج کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ حج کیا، ایک جگہ وہ راستے سے ہٹ کر (قضائے حاجت کے لیے) ایک طرف کو گئے تو میں بھی پانی کا لوٹا لے کر ان کے ساتھ اس طرف کو چلا گیا۔ پھر وہ فارغ ہو کر آئے تو میں نے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالا، انھوں نے وضو کیا تو میں نے کہا: ''اے امیر المومنین! نبی ﷺ کی بیویوں میں سے وہ دو عورتیں کون ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾؟'' انھوں نے فرمایا: ''ابن عباس! تم پر تعجب ہے، وہ دونوں حفصہ اور عائشہ (رضی اللہ عنہما) ہیں۔''

② فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا : ''صَغَا يَصْغُوْ صَغْوًا'' (ن) اور ''صَغِيَ يَصْغٰى صَغْيًا'' (س) مائل ہونا، ایک طرف جھک جانا۔ اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی ان دو بیویوں کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ تھا، جن کی وجہ سے آپ ﷺ نے شہد اور ماریہ رضی اللہ عنہا سے اجتناب کی قسم کھائی تھی، اب انھیں مخاطب کر کے توبہ کی تلقین فرمائی ہے۔ اس آیت کی تفسیر تقریباً تمام قدیم مفسرین نے یہ کی ہے کہ اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور تمھیں توبہ کرنی ہی چاہیے، کیونکہ

وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝

دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن اور اس کے بعد تمام فرشتے مددگار ہیں ④

تمھارے دل درست بات سے دوسری طرف مائل ہو گئے ہیں اور تم نے رسول اللہ ﷺ کو ان کی پسندیدہ چیزوں شہد اور ماریہ رضی اللہ عنہا سے اجتناب کی قسم تک پہنچا کر درست کام نہیں کیا۔لفظوں کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ آیت کا یہی مفہوم طبری، قرطبی، رازی، ابن جزی، ابن عطیہ، ابو السعود، بغوی، ابن جوزی، سمرقندی اور دوسرے جلیل القدر مفسرین نے بیان فرمایا ہے اور ظاہر بھی یہی ہے، کیونکہ ان ازواج مطہرات کی دلی خواہش کہ رسول اللہ ﷺ زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں شہد نہ پئیں اور اپنی ام ولد ماریہ رضی اللہ عنہا کے پاس نہ جائیں، کسی طرح بھی درست قرار نہیں دی جاسکتی۔ خود اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کو پورا کرنے کی وجہ سے نبی ﷺ پر محبت آمیز عتاب فرمایا۔

موجودہ دور کے بعض حضرات نے اس معنی کو ان ازواج مطہرات کی توہین قرار دے کر اس کا انکار کر دیا، ان کے خیال میں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ازواج مطہرات کے دل حق سے ہٹے ہوئے تھے، حالانکہ کسی ایک بات میں کسی شخص کے دل کا میلان نا درست بات کی طرف ہو جائے تو اسے پورے راہ صواب سے ہٹا ہوا نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی کسی مفسر کے کسی حاشیۂ خیال میں امہات المومنین کے متعلق کوئی ایسی بات ہے اور یہاں تو امہات المومنین نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر سر تسلیم خم کیا اور سچے دل سے توبہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں ان کے لیے ازواج رسول ہونے کا شرف برقرار رکھا، پھر ان کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دل راہِ صواب سے ہٹے ہوئے تھے!؟

ایک مطلب آیت کا یہ ہے اور بعض حضرات نے اسی کو درست اور دوسرے ہر مطلب کو غلط قرار دیا ہے کہ ''اگر تم اللہ کی طرف توبہ کرو تو تم سے کچھ بعید نہیں، کیونکہ تمھارے دل پہلے ہی توبہ کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔'' مفسر قرطبی نے پہلے معنی کے علاوہ اس معنی کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر اسی کو درست اور دوسرے معنی کو غلط اور لغت عرب سے ناواقفیت قرار دینا اہلِ علم کا شیوہ نہیں۔ اہلِ علم کا شیوہ تو وہ ہے جو قرطبی نے اختیار فرمایا ہے کہ دونوں معنی ذکر فرما دیے، جو راجح تھا اسے پہلے ذکر فرمایا مگر دوسرے کا انکار نہیں کیا۔ یہ بات تسلیم کہ "صَغَا يَصْغُوْ" اور "صَغِيَ يَصْغٰى" کے الفاظ کسی چیز کی طرف مائل ہونے کے لیے آتے ہیں، مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ حق ہی کی طرف مائل ہونے کے لیے آتے ہیں، ناحق کی طرف مائل ہونے کے لیے نہیں آتے۔ ناحق کی طرف مائل ہونے کا مفہوم حق سے ہٹنے کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ سورۂ انعام کی آیت (۱۱۳): ﴿ وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ میں جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے اس میں ان کے دل حق کی طرف مائل ہونے کا نہیں بلکہ ناحق ہی کی طرف مائل ہونے کا ذکر ہے۔ اس لیے شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، احمد علی لاہوری، فتح محمد جالندھری اور دوسرے مترجمین نے پہلے مفہوم والا ترجمہ ہی کیا ہے، حتیٰ کہ ایک مترجم صاحب جو رسول اللہ ﷺ

کی محبت کا بہت بلند بانگ دعویٰ رکھتے ہیں اور اہلِ توحید کو گستاخ اور بے ادب قرار دیتے نہیں تھکتے، انھوں نے بھی یہ ترجمہ کیا ہے: ''نبی کی دونوں بیویو! اگر اللہ کی طرف تم رجوع کرو تو ضرور تمھارے دل راہ حق سے کچھ ہٹ گئے ہیں۔'' تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک ازواج مطہرات کے دل راہ حق سے کچھ ہٹے ہوئے تھے؟

③ وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ : "تَظٰهَرَا" باب تفاعل سے فعل مضارع ہے جو اصل میں "تَتَظَاهَرَانِ" تھا، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی گئی اور حرفِ شرط "اِنْ" کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا۔ اس کا مادہ "ظَهْرٌ" (پُشت) ہے۔ باب تفاعل میں تشارک کا معنی ہوتا ہے، ایک دوسرے کی پشت پناہی کرنا، ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ "تَظٰهَرَا" کے بعد "عَلَيْهِ" کا معنی ہے، اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو۔

④ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ : "مَوْلٰى" کا معنی مالک بھی ہے اور مددگار بھی۔ اگر مالک معنی کریں تو یہ جملہ "مَوْلٰىهُ" پر مکمل ہو گیا اور "جِبْرِيْلُ" سے "ظَهِيْرٌ" تک الگ جملہ ہے، کیونکہ مالک صرف اللہ ہے اور کوئی مالک نہیں، جب کہ مدد اللہ کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور بندوں کی طرف سے بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [ الأنفال : ٦٢ ] ''وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قوت بخشی۔'' اور فرمایا: ﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ ﴾ [ التوبة : ٤٠ ] ''اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ﴾ [ الحشر : ٨ ] ''اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [ آل عمران : ٥٢ ] ''کون ہیں جو اللہ کی طرف میرے مددگار ہیں؟'' یعنی اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو تو بہتر ہے اور اگر تم دونوں رسول اللہ ﷺ کے خلاف ایک دوسری کی مدد کرو تو ہمارے رسول کو تمھاری کچھ پروا نہیں، کیونکہ اللہ اس کا مالک ہے اور جبریل اور صالح مومنین اور اس کے بعد تمام فرشتے اس کے مددگار اور پشت پناہ ہیں۔ اور اگر "مَوْلٰى" کا معنی مددگار کریں تو پہلا جملہ "صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ" پر پورا ہو گا اور دوسرا جملہ "وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ" (مبتدا) سے شروع ہو کر "ظَهِيْرٌ" پر ختم ہو گا، یعنی اگر تم دونوں اس کے خلاف ایک دوسری کی مدد کرو تو یقیناً اللہ اور جبریل اور صالح مومنین اس کے مددگار ہیں اور اس کے بعد تمام فرشتے اس کے پشت پناہ اور مددگار ہیں۔ یہ دوسرا معنی راجح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک تو ہر ایک کا ہے، صرف نبی ﷺ کا نہیں، ہاں! خاص نصرت اس کی اپنے رسولوں اور ایمان والوں کے ساتھ ہے، کفار کے ساتھ نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [ المؤمن : ٥١ ] ''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

⑤ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ : "صَالِحُ" اسم جنس ہے جو واحد و جمع سب پر بولا جاتا ہے، اس لیے جمع کا لفظ "صَالِحُو الْمُؤْمِنِيْنَ" بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

⑥ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ : یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ مبتدا "الْمَلٰٓىِٕكَةُ" جمع کی خبر "ظَهِيْرٌ" واحد کیوں ہے؟

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ

اس کا رب قریب ہے، اگر وہ تمھیں طلاق دے دے کہ تمھارے بدلے اسے تم سے بہتر بیویاں دے دے، جو اسلام

جواب اس کا یہ ہے کہ "فَعِيْلٌ" کا وزن واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

**آیت 5** ① عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ ...: اس آیت میں عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ دوسری بیویوں کو بھی خطاب میں شامل فرما لیا ہے، کیونکہ بعض باتوں خصوصاً خرچ میں اضافے کے مطالبے کے ساتھ انھوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا پریشان کیا کہ آپ نے ایک ماہ کے لیے ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی، جس کے مکمل ہونے پر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اپنی بیویوں کو اختیار دیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ احزاب (۲۸، ۲۹) کی تفسیر۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: « اِجْتَمَعَ نِسَاءُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْغَيْرَةِ عَلَيْهِ فَقُلْتُ لَهُنَّ عَسٰى رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ » [ بخاري، التفسير، باب: ﴿عسى ربه إن طلقكن......﴾: ۴۹۱۶ ] "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں غیرت (رشک و رقابت) میں آپ کے خلاف اکٹھی ہو گئیں تو میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں طلاق دے دیں تو آپ کا رب قریب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے بہتر بیویاں دے دے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ مجھے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار کی تو میں مسجد میں داخل ہوا، دیکھا کہ لوگ (متفکر بیٹھے ہوئے) کنکریوں کے ساتھ زمین پر نکتے بنا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی ہے اور یہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ تو میں نے کہا، میں آج یہ بات ضرور معلوم کر کے رہوں گا۔" خیر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کے پاس جانے اور انھیں نصیحت کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا: "میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام رباح (رضی اللہ عنہ) بالا خانے کی دہلیز پر موجود ہے، (جس بالا خانے میں آپ نے ایک ماہ بیویوں سے علیحدہ رہ کر گزارا) میں نے اسے آواز دی اور کہا اے رباح! میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے پاس جانے کی اجازت مانگو۔" مختصر یہ کہ عمر رضی اللہ عنہ اجازت ملنے پر اندر گئے اور آپ کو مانوس کرنے کے لیے کچھ باتیں کہیں۔ فرماتے ہیں: "میں نے کہا، یا رسول اللہ! آپ پر عورتوں کے معاملے میں کیا مشکل پیش آ گئی؟ سو اگر آپ نے انھیں طلاق دے دی ہے تو اللہ آپ کے ساتھ ہے اور اس کے فرشتے اور جبریل اور میں اور ابوبکر اور تمام مومن آپ کے ساتھ ہیں۔ اور میں نے کم ہی کبھی کوئی بات کی اور میں اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں، مگر یہ امید رکھی کہ اللہ تعالیٰ میری بات کو سچا کر دے گا، تو یہ آیت یعنی آیت تخییر اتری: ﴿ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ ﴾ [ التحریم: ۵ ] "اس کا رب قریب ہے، اگر وہ تمھیں طلاق دے دے کہ تمھارے بدلے اسے تم سے بہتر بیویاں دے دے۔" اور یہ آیت اتری: ﴿ وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ

ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ۞ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ

والیاں، ایمان والیاں، اطاعت کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں ہوں، شوہر دیدہ اور کنواریاں ہوں ۞

ظَهِيْرٌ ﴾ [ التحریم : ٤ ] ''اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن اور اس کے بعد تمام فرشتے مددگار ہیں۔'' [ مسلم، الطلاق، باب في الإيلاء و اعتزال النساء وتخييرهن...... : ١٤٧٩ ]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ''صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' سے مراد سب سے پہلے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، پھر ان کے ساتھ تمام مومن شامل ہیں اور یہ آیت بھی موافقات عمر رضی اللہ عنہ میں سے ہے، یعنی وہ آیات جو ان باتوں کے موافق اتریں جو عمر رضی اللہ عنہ نے کہی تھیں۔ ان میں بدر کے قیدیوں کا معاملہ، حجاب کا معاملہ، مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانے کا معاملہ اور دوسری کئی باتیں شامل ہیں۔

2 اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو تنبیہ ہے کہ تم اس خیال میں نہ رہنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے بہتر بیویاں نہیں مل سکتیں، اس لیے تم جس طرح چاہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دباؤ ڈالتی رہو، بلکہ اگر آپ نے تمھیں طلاق دے دی تو آپ کا رب قریب ہے کہ آپ کو تم سے کہیں بہتر بیویاں عطا فرما دے۔

3 مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ : ان صفات کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ (دیکھیے احزاب : ۳۵ ) ''تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ'' کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۱۱۲)۔

4 ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا : ''ثَيِّبٰتٍ'' ''ثَيِّبٌ'' کی جمع ہے، طلاق یافتہ یا بیوہ عورت۔ یہ ''ثَابَ يَثُوْبُ ثَوْبًا'' (ن) سے مشتق ہے، اسے ''ثیب'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خاوند سے واپس لوٹ آتی ہے اور پھر اسی طرح خاوند کے بغیر رہ جاتی ہے جیسے پہلے تھی۔ ''اَبْكَارًا'' ''بِكْرٌ'' کی جمع ہے، کنواری۔ اسے ''بکر'' اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ابھی اپنی اسی پہلی حالت پر ہوتی ہے جس پر پیدا ہوئی تھی اور ہر جنس میں سب سے پہلی چیز کو بکر کہتے ہیں۔ پہلی صفات کے درمیان واؤ عطف نہیں لائی گئی، کیونکہ وہ سب ایک وقت میں جمع ہو سکتی ہیں، مگر کسی عورت میں ان دونوں میں سے ایک وقت میں ایک ہی صفت ہو سکتی ہے، اس لیے واؤ عطف لائی گئی۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنواری عورتوں کے ساتھ نکاح کی ترغیب دلائی مگر بعض اوقات ثیبات میں علم و عقل اور تجربے وغیرہ کی ایسی صفات ہوتی ہیں جو انھیں ابکار پر ترجیح دینے کا باعث ہوتی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں طرح کی بیویاں عطا فرمائیں۔

5 اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی ازواج سے بہتر ازواج عطا کرنے کی امید اس شرط پر دلائی تھی کہ آپ موجودہ بیویوں کو طلاق دے دیں، مگر نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں طلاق دی اور نہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہتر بیویاں آپ کو دیں، بلکہ انھی کو بہتر ہونے کا اور دنیا اور آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج رہنے کا شرف عطا فرمایا۔

6 اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدمی کو بیوی کے انتخاب کے وقت ان صفات کی حامل عورت کو ترجیح دینی چاہیے جو اس آیت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اس پر سخت دل، بہت مضبوط فرشتے مقرر ہیں، جو اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انھیں حکم دے اور وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں۞

میں مذکور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ : لِمَالِهَا وَ لِحَسَبِهَا وَ جَمَالِهَا وَ لِدِيْنِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ » [ بخاري، النكاح، باب الأكفاء في الدين : ۵۰۹۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ] ”عورت سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب اور اس کے جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، سو تو دین والی عورت کے ساتھ نکاح میں کامیابی حاصل کر، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔“

❼ اس مقام پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ”ثیب“ سے مراد آسیہ زوجہ فرعون ہیں اور ”بکر“ سے مراد مریم بنت عمران ہیں، ان دونوں کا نکاح جنت میں نبی ﷺ سے کیا جائے گا، مگر ایک تو اس بات کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ اس میں پہلی بیویوں کو طلاق دینے کی صورت میں ان کے بدلے میں ان سے بہتر ثیبات و ابکار بیویاں عطا کرنے کا ذکر ہے اور جب آپ نے پہلی بیویوں کو طلاق ہی نہیں دی تو ان کے بدلے میں اور بیویوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ جنت میں ان دونوں عظیم خواتین کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے کر دے تو یہ ناممکن نہیں، مگر یہ ثابت ہونا تو ضروری ہے، جب کہ کسی صحیح دلیل سے یہ بات ثابت نہیں۔

**آیت 6** ❶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا : پچھلی آیات میں امہات المومنین کی تربیت اور ان کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کا بیان تھا، اب تمام ایمان والوں کو اس کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ”نَارًا“ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اس عظیم آگ سے بچ جاؤ۔ ”قُوْۤا“ (بچاؤ) ”وَقٰى يَقِيْ وَقْيًا وَ وِقَايَةً“ (ض) سے امر حاضر جمع مذکر ہے۔ اس میں ایمان والوں کو ایک نہایت اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائیں اور اس کے ساتھ اپنے گھر والوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کر کے انھیں بھی جہنم کی آگ سے بچائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ » [ بخاري، الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن : ۸۹۳ ] ”تم میں سے ہر ایک راعی (نگہبان) ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جانے والا ہے۔“ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ اور امت کے ہر فرد کو اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دینے اور اس پر پابند رہنے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ [ طٰہٰ : ۱۳۲ ] ”اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ

اے لوگو جنھوں نے کفر کیا! آج بہانے مت بناؤ، تم صرف اسی کا بدلا دیے جاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے ⑦ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی طرف توبہ کرو، خالص توبہ، تمھارا رب قریب ہے کہ تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے اور

اور اس پر خوب پابند رہ۔‘‘ اس مقصد کے لیے بچپن ہی سے انھیں نماز روزے اور اسلام کے دوسرے احکام پر عمل کی عادت ڈالنی چاہیے اور سمجھ دار ہونے پر اس کے لیے سختی کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرنی چاہیے، خواہ ابھی بالغ نہ ہوئے ہوں اور سن تمیز شروع ہونے کے ساتھ ہی انھیں جنسی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِيْنَ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ )) [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ : ٤٩٥، و قال الألباني حسن صحیح ] ’’اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہوں اور اس پر انھیں مارو جب وہ دس برس کے ہوں اور بستروں میں انھیں ایک دوسرے سے الگ کر دو۔‘‘

② وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (٢٤) کی تفسیر۔

③ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ ... : ’’غِلَاظٌ‘‘ ’’غَلِيْظٌ‘‘ کی جمع ہے، سخت دل والے، بے رحم اور ’’شِدَادٌ‘‘ ’’شَدِيْدٌ‘‘ کی جمع ہے، سخت قوت والے، نہایت مضبوط۔ یہاں جہنم پر مقرر فرشتوں کے چار اوصاف بیان ہوئے ہیں: ① وہ نہایت سخت دل ہیں، انھیں کسی پر رحم نہیں آئے گا۔ ② سخت قوت والے ہیں، کوئی ان کی گرفت سے نکل نہیں سکے گا۔ ③ اللہ تعالیٰ انھیں جو حکم بھی دے اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ ④ اور وہ کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کرتے، بلکہ وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (٢٧)۔

**آیت 7** يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ... : یعنی جب وہ سخت دل اور سخت قوت والے فرشتے جہنمیوں کو جہنم میں ڈالیں گے تو وہ مختلف عذر کریں گے اور بہانے بنائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے مختلف بہانے قرآن مجید میں ذکر فرمائے ہیں۔ (دیکھیے اعراف: ٣٨۔ انعام: ٢٣، ٢٤، ٢٧) مگر انھیں کہا جائے گا کہ آج کوئی عذر بہانہ نہ کرو، کیونکہ تمھیں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا، تمھیں انھی اعمال کی جزا دی جا رہی ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ مزید دیکھیے سورۂ روم (٥٧) اور سورۂ مومن (٥٢)۔

**آیت 8** : ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا : ’’تَوْبَةً‘‘ ’’تَابَ يَتُوْبُ تَوْبَةً‘‘ (ن) پلٹ آنا۔ ’’نَصُوْحًا‘‘ ’’نَصَحَ يَنْصَحُ نُصْحًا‘‘ (ف) سے ’’فَعُوْلٌ‘‘ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے، بہت خالص۔ یہ وزن مذکر و مؤنث اور واحد، جمع و تثنیہ سب کے لیے اسی طرح استعمال ہوتا ہے، اس لیے ’’نَصُوْحًا‘‘ مذکر ہونے کے باوجود ’’تَوْبَةً‘‘ (مؤنث) کی صفت ہے۔ ’’نَصَحَ الشَّيْءُ‘‘ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی چیز خالص ہو، اس میں کھوٹ نہ ہو۔ شہد یا کوئی اور چیز جب

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑧

تمھیں ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، جس دن اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، رسوا نہیں کرے گا، ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں طرفوں میں دوڑ رہا ہوگا، وہ کہہ رہے ہوں گے اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر اور ہمیں بخش دے، یقیناً تو ہر چیز پر خوب قادر ہے ⑧

خالص ہو تو اسے "اَلنُّصْحُ" کہتے ہیں۔ "اَلنُّصْحُ" (خالص ہونا) "اَلْغِشُّ" (کھوٹا ہونے) کا متضاد ہے۔

اس آیت میں جہنم سے بچنے کا طریقہ بتلایا ہے، فرمایا اے ایمان والو! اللہ کی طرف پلٹ آؤ، خالص اور سچا پلٹنا۔ یعنی اگر نافرمانی کر کے اللہ تعالیٰ سے دور ہو گئے ہو تو اسے ترک کر کے واپس اس کی طرف پلٹ آؤ۔ توبۂ نصوح کی پہلی شرط یہ ہے کہ محض اللہ کے خوف کی وجہ سے آدمی گناہ پر نادم ہو، کسی دنیاوی نقصان کی وجہ سے ندامت توبہ نہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ » [ ابن ماجه، الزهد، باب ذكر التوبة : ٤٢٥٢، وقال الألباني صحيح ] "ندامت توبہ ہے۔" دوسری شرط یہ ہے کہ گناہ چھوڑ دے اور فوراً چھوڑ دے۔ (دیکھیے نساء: ۱۷۔ اعراف: ۲۰۱) تیسری شرط یہ کہ آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے، گناہ پر قائم نہ رہے۔ (دیکھیے آل عمران: ۱۳۵) اور چوتھی شرط یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے تو جہاں تک ممکن ہو انھیں ادا کرے یا معافی مانگ لے۔

② عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ...... : اس میں توبۂ نصوح پر گناہوں کی معافی اور جنتوں میں داخلے کی خوش خبری سنائی ہے۔

③ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ : "يَوْمَ" کا لفظ "يُدْخِلَكُمْ" کا ظرف ہے، یعنی گناہوں کی معافی اور جنت میں داخلہ اس دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ ایمان لانے والوں میں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ان کے بعد قیامت تک آنے والے تمام مسلمان شامل ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیت کی تفسیر۔ ان میں ازواج مطہرات بالاولیٰ شامل ہیں، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف بخشا اور جب انھیں اللہ، اس کے رسول اور آخرت اور دنیا میں سے کسی ایک چیز کو قبول کرنے کا اختیار دیا گیا تو انھوں نے اللہ، اس کے رسول اور آخرت کو قبول کیا۔ (دیکھیے احزاب: ۲۸ تا ۳۴) اور ان کے ایثار اور صبر کی وجہ سے ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید عورتوں کے ساتھ یا ان کو بدل کر دوسری عورتوں کے ساتھ نکاح سے منع فرما دیا۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۵۲)۔

اس دن کی رسوائی سے دنیا میں بھی انبیاء اور مومن بندے پناہ مانگتے رہے تھے۔ (دیکھیے آل عمران: ۱۹۴۔ شعراء: ۸۷)

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ⑨ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ⑩

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ⑨ اللہ نے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، وہ ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، پھر انھوں نے ان دونوں کی خیانت کی تو وہ اللہ سے (بچانے میں) ان کے کچھ کام نہ آئے اور کہہ دیا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں آگ میں داخل ہو جاؤ ⑩

سو اللہ تعالیٰ انھیں اس رسوائی سے بچا لے گا۔

④ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ : اس کے لیے دیکھیے سورۂ حدید کی آیت (۱۲) کی تفسیر۔

⑤ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا : حشر کے میدان میں جب ایمان والوں اور منافقین کے درمیان دیوار حائل ہونے پر منافقین اندھیرے میں کھڑے رہ جائیں گے تو ایمان والے اس خوف سے کہ منافقین کی طرح ہماری روشنی بھی نہ بجھ جائے اللہ تعالیٰ سے اپنے نور کو پورا کرنے اور پورا رکھنے کی دعا کریں گے، تاکہ اس روشنی میں وہ جنت تک پہنچ جائیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حدید (۱۳ تا ۱۵)۔

**آیت 9** یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ...... : پچھلی آیات میں ایمان والوں کا ٹھکانا بتایا تھا، اب دنیا اور آخرت میں کفار کے معاملے کا ذکر فرمایا کہ دنیا میں ان کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور ان پر سختی کرنی ہے، کسی قسم کی مداہنت یا چشم پوشی سے کام نہیں لینا، تاکہ اسلام کا کلمہ سر بلند رہے اور یہ لوگ اس کے سامنے سر جھکا کر زندگی بسر کریں اور آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ منافقین کے ساتھ جہاد سے کیا مراد ہے، اس کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۷۳) کی تفسیر۔

**آیت 10** ① ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ...... : کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کے حکم کے بعد کفر کی نحوست اور ایمان کی برکت بیان فرمائی کہ قیامت کے دن کافر کو کسی مسلمان کے ساتھ کسی طرح کی قرابت کام نہیں آئے گی، حتیٰ کہ اگر پیغمبر کی بیوی کافر ہے تو وہ پیغمبر اسے بھی جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکے گا۔ اس سے پہلے قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کے بیٹے اور ابراہیم علیہ السلام کے والد کی صورت میں نسبی قرابت کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ یہاں نوح علیہ السلام کی بیوی اور لوط علیہ السلام کی بیوی کو کافر لوگوں کی مثال کے طور پر ذکر فرمایا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ قصہ ازواج مطہرات کو سنایا گیا ہے، مگر یہ بات غلط اور بے دلیل ہے، کیونکہ اس آیت میں کافر عورتوں کا ذکر ہے جن کے کفر کی وجہ سے ان کے خاوند ان کے کچھ کام

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾

اور اللہ نے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی، جب اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے ﴿۱۱﴾

---

نہ آ سکے اور انھیں آگ میں داخل کر دیا گیا۔ امہات المومنین کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے جن کے ایمان، تقویٰ اور پاکیزگی کی شہادت قرآن مجید نے دی ہے!؟ حقیقت یہ ہے کہ ازواج مطہرات کا قصہ اوپر ختم ہو چکا ہے اور اس آیت کے مضمون کا تعلق "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ" کے ساتھ ہے، کیونکہ ایمان والوں کا اپنے ایمان والے قرابت داروں کو فائدہ پہنچانا قرآن مجید (طور: ۲۱) اور احادیثِ شفاعت میں ثابت ہے۔

❷ کتبِ تفاسیر میں نوح اور لوط ﷤ کی ان بیویوں کے نام مختلف آئے ہیں، مگر صحیح سند سے کوئی بھی ثابت نہیں۔

❸ فَخَانَتٰهُمَا : اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ خیانت کیا تھی اور نہ ہی کسی صحیح طریق سے اس خیانت کا ذکر آیا ہے۔ اگر اس کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ذکر فرما دیتے، اسے مبہم رکھنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ بندہ ہر قسم کی خیانت سے ڈرتا رہے۔

**آیت 11** ❶ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ : یہ ایمان کی برکت کی مثال ہے کہ "ربِ اعلیٰ" ہونے کا دعویٰ کرنے والے "کافرِ اعظم" کی بیوی جب ایمان لے آئی تو خاوند کی فرعونیت نہ اسے ایمان لانے سے روک سکی اور نہ ہی آخرت کے معاملے میں اس کا کوئی نقصان کر سکی۔ اس عظیم خاتون کا نام آسیہ ہے، وہ موسیٰ ﷤ پر ایمان لے آئی تو فرعون نے ایک طرف اسے عالی شان محلات اور ہر قسم کی دنیوی آسائشوں کا لالچ دیا اور دوسری طرف ایمان سے باز نہ آنے پر سب کچھ چھین لیا اور اسے بے پناہ اذیتیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس پر اس نے اللہ تعالیٰ سے فرعون کے محلات اور آسائشوں کے بدلے میں اپنے پڑوس میں جنت کے اندر گھر عطا کرنے اور فرعون اور اس کے مشرکانہ اور ظالمانہ کاموں سے اور اس کی ظالم قوم سے نجات عطا کرنے کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرما کر اس کی روح قبض کر لی اور اس نے جو مانگا تھا عطا فرما دیا۔ ابن جزی صاحب التسہیل لکھتے ہیں: " وَرُوِيَ فِيْ قَصَصِهَا غَيْرُ هٰذَا مِمَّا يَطُوْلُ وَهُوَ غَيْرُ صَحِيْحٍ " "اس کے قصے میں اس کے علاوہ کئی طویل چیزیں ذکر کی گئی ہیں مگر وہ ثابت نہیں ہیں۔"

❷ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ : اہلِ علم فرماتے ہیں کہ آسیہ ؓ نے جنت میں گھر بنانے کی دعا سے پہلے سب سے بہتر ہمسائیگی ملنے کی دعا کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اچھی جگہ اچھے مکان کی دعا سے پہلے اچھی ہمسائیگی کی دعا

وَ مَرۡیَمَ ابۡنَتَ عِمۡرٰنَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا فَنَفَخۡنَا فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِنَا وَ صَدَّقَتۡ بِکَلِمٰتِ رَبِّہَا وَ کُتُبِہٖ وَ کَانَتۡ مِنَ الۡقٰنِتِیۡنَ ﴿۱۲﴾

ع۲

اور عمران کی بیٹی مریم کی (مثال دی ہے) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی ایک روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت کرنے والوں میں سے تھی ﴿۱۲﴾

کرنی چاہیے اور آخرت میں وہ جنت الفردوس ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَ أَعْلَى الْجَنَّةِ، أُرَاهُ قَالَ فَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ، وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ » [ بخاري، الجهاد، باب درجات المجاهدين في سبيل الله : ۲۷۹۰ ] ”جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے افضل اور سب سے بلند حصہ ہے اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔“

③ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَمَلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ، وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا آسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ، وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَ إِنَّ فَضْلَ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ » [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ وضرب الله مثلا...... ﴾ : ۳۴۱۱ ] ”مردوں میں بہت سے کامل ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں سے آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسے ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے۔“

**آیت 12** **وَ مَرۡیَمَ ابۡنَتَ عِمۡرٰنَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا ...** : یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے مثال کے طور پر فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنت عمران کا بیان فرمایا ہے کہ دونوں اعلیٰ درجے کے ایمان والی تھیں۔ قرآن مجید میں مریم بنت عمران کا نام صرف اس مقام پر نہیں بلکہ کئی جگہ آیا ہے اور یہ واحد خاتون ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نام لیا ہے۔ آیت کے اکثر الفاظ کی تشریح سورۂ انبیاء (۹۱) میں اور دوسرے الفاظ کی تشریح مختلف آیات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

سُوْرَةُ الْمُلْكِ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ آیاتھا ٣٠ رکوعاتھا ٢

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بہت برکت والا ہے وہ کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ①

اس سورت کی فضیلت میں کئی روایات آتی ہیں، جن میں سے چند صحیح یا حسن احادیث درج ذیل ہیں: ① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ سُوْرَةً مِّنَ الْقُرْآنِ ثَلَاثُوْنَ آيَةً شَفَعَتْ لِرَجُلٍ حَتّٰى غُفِرَ لَهُ وَهِيَ سُوْرَةُ : ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ » [ ترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء في فضل سورة الملك : ٢٨٩١۔ ابو داؤد : ١٤٠٠، و حسنه الألباني ] ”قرآن کی ایک سورت نے جس کی تیس آیات ہیں، ایک آدمی کے لیے سفارش کی یہاں تک کہ اسے بخش دیا گیا اور وہ سورت ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ ہے۔“ ② انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « سُوْرَةٌ مِّنَ الْقُرْآنِ مَا هِيَ إِلَّا ثَلَاثُوْنَ آيَةً خَاصَمَتْ عَنْ صَاحِبِهَا حَتّٰى أَدْخَلَتْهُ الْجَنَّةَ، وَهِيَ سُوْرَةُ تَبَارَكَ » [ المعجم الصغير للطبراني : ٢٩٦/١، ح : ٤٩٠، وصححه الألباني۔ صحيح الجامع الصغير : ٣٦٤٤ ] ”قرآن کی ایک سورت نے، جس کی صرف تیس آیات ہیں، اپنے پڑھنے والے کی طرف سے جھگڑا کیا یہاں تک کہ اسے جنت میں داخل کروا دیا اور وہ سورت ”تَبٰرَكَ“ (الملک) ہے۔“ ③ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ ﴿ الٓمّٓ ۙ تَنْزِيْلُ ﴾ اور ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ پڑھتے۔ [ سلسلة الأحاديث الصحيحة، ح : ٥٨٥ ] ④ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ ﴿ الٓمّٓ ۙ تَنْزِيْلُ ﴾ اور ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ پڑھتے۔ [ ترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء في فضل سورة الملك : ٢٨٩٢، وصححه الألباني ]

آیت 1 ① تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ : ”تَبٰرَكَ“ ”بَرَكَةٌ“ سے باب تفاعل ہے۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے، اسی مناسبت سے ترجمہ ”بہت برکت والا“ کیا گیا ہے۔ ”بَرَكَةٌ“ کے معنی ہیں زیادہ ہونا، بڑھا ہونا۔ ”تَبٰرَكَ“ یعنی وہ خیر اور بھلائی میں ساری کائنات سے بے انتہا بڑھا ہوا ہے اور بلندی، بڑائی اور احسان، غرض ہر لحاظ سے اس کی ذات بے حد و حساب خوبیوں اور بھلائیوں کی جامع ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان کی پہلی آیت کی تفسیر۔

② ”بِيَدِهِ“ پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ ”صرف اس کے ہاتھ میں ہے“ کیا گیا ہے۔

③ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں بادشاہ تو بہت ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرما دیا کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے؟ جواب یہ ہے کہ دنیا کا سارا نظام ایک دوسرے کی محتاجی پر چل رہا ہے، رعایا اپنی ضروریات مثلاً جان و مال، عزت و آبرو اور دین و ایمان کی حفاظت کے لیے بادشاہ کی محتاج ہے اور بادشاہ اپنے کام چلانے کے لیے رعایا کا محتاج ہے، اگر وہ اس کا ساتھ نہ دیں اور اسے ٹیکس نہ دیں تو وہ ایک لمحہ کے لیے بادشاہ نہیں رہ سکتا۔ سورۂ زخرف میں یہی نکتہ بیان کیا گیا

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۟ۙ﴿۲﴾

وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے ﴿۲﴾

ہے، فرمایا: ﴿ لِیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا ﴾ [ الزخرف : ۳۲ ] ”تاکہ ان کا بعض بعض کو تابع بنا لے۔“ ایک شاعر نے دنیوی بادشاہوں کی محتاجی کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

اس کے علاوہ دنیا میں کوئی بادشاہ ہے یا محکوم، ایک دوسرے کے محتاج ہونے کے باوجود دونوں میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں فی الحقیقت کچھ بھی نہیں۔ ان کی اپنی دولت و فقر، صحت و بیماری، عزت و ذلت، فتح و شکست، جوانی و بڑھاپا، نفع و نقصان اور موت و حیات، غرض سب کچھ اللہ مالک الملک کے ہاتھ میں ہے، تو پھر یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ تمام بادشاہی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے؟ دوسرا کوئی بادشاہ ہے بھی تو نام کا ہے۔ حقیقت میں بادشاہ ایک ہی ہے، باقی سب گدا ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [ فاطر : ۱۵ ] ”اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو۔“

④ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ : ”شَیْءٌ“ ”شَاءَ یَشَاءُ“ کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، چاہت۔ یعنی وہ اپنی ہر چاہت اور ہر چیز پر قادر ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں کہ جن کی بے شمار چاہتیں پوری ہونے کے بجائے حسرتیں بن کر ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتی ہیں۔

**آیت 2** ① الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ ...... : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی چند چیزوں کا ذکر فرمایا جو مخلوق کی قدرت سے باہر ہیں، تاکہ انسان کے دل میں اللہ کی قدرت کا پورا یقین جم جائے۔ اس مقام پر اپنی قدرتوں میں سے پہلی چیز موت و حیات ذکر فرمائی، کیونکہ موت اور زندگی میں انسان کے تمام احوال پورے پورے آ جاتے ہیں۔

② اللہ تعالیٰ نے انسان کی دنیا میں آنے سے پہلے کی حالت کو موت قرار دیا اور دنیا میں آنے کے بعد یہاں سے جانے کو بھی موت قرار دیا۔ اسی طرح دنیا میں آنے کو زندگی قرار دیا، پھر موت کے بعد اٹھنے کو زندگی قرار دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۲۸ ] ”تم کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

یہاں فرمایا کہ اللہ نے موت و حیات کو پیدا فرمایا۔ معلوم ہوا کہ موت بھی ایک مخلوق ہے، یہ عدم محض (بالکل نہ ہونے) کا نام نہیں، کیونکہ دنیا میں آنے سے پہلے بھی انسان اللہ کے علم اور اس کی تقدیر میں موجود تھا اور اس کے دنیا میں آنے کا

وقت مقرر تھا مگر روح و جسم کا اتصال نہیں تھا، اسے موت قرار دیا، پھر دنیا میں آنے کے بعد روح جسم سے جدا ہوئی تو اسے بھی موت قرار دیا۔ قیامت کے دن موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يُؤْتَى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فَيُنَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا ؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ، هٰذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، ثُمَّ يُنَادِي يَا أَهْلَ النَّارِ! فَيَشْرَئِبُّوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ، فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا؟ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ هٰذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَآهُ، فَيُذْبَحُ ثُمَّ يَقُوْلُ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ وَهٰؤُلَاءِ فِيْ غَفْلَةٍ أَهْلُ الدُّنْيَا ﴿ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ » [ بخاري، التفسير، باب قوله عزو جل: ﴿ وأنذرهم يوم الحسرة ﴾ : ٤٧٣٠ ] ”موت کو ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، پھر ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا: ”اے اہلِ جنت!“ وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ”اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے۔“ وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے، پھر وہ اعلان کرے گا: ”اے اہلِ نار!“ وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ”اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے۔“ وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے۔ تو اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر کہے گا: ”اے اہلِ جنت! (اب تمھارے لیے) ہمیشہ زندہ رہنا ہے، موت نہیں اور اے اہلِ نار! (تمھارے لیے بھی) ہمیشہ زندہ رہنا ہے، موت نہیں۔“ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ (اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب ہر کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں) یعنی یہ دنیا والے سراسر غفلت میں ہیں ”اور وہ ایمان نہیں لا رہے۔“

③ زندگی اور موت دونوں اس امتحان کے لیے پیدا کی گئی ہیں کہ انسانوں میں سے اچھے عمل کون کرتا ہے؟ اگر موت اور موت کے بعد والی زندگی نہ ہوتی تو آدمی اچھے اعمال کے لیے جدوجہد اور برے اعمال سے پرہیز کیوں کرتا؟ اور موت اور حیات بعد الموت نہ ہوتی تو اچھے اور برے اعمال کا بدلا کہاں ملتا اور اگر دنیا میں انسان کو زندگی نہ ملتی اور نہ عمل کا موقع ملتا تو جزا و سزا کس چیز پر ہوتی؟

④ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ : وہ عزیز ہے، ایسا زبردست ہے کہ اعمال کی جزا و سزا پر پورا اختیار رکھتا ہے اور ایسا غالب کہ کوئی اس پر غالب نہیں، مگر اتنی قوت و عزت کے باوجود ظالم یا سخت گیر نہیں بلکہ غفور ہے اور ایسا غفور کہ کوئی توبہ کرے تو جتنے بھی گناہ کیے ہوں بخش دیتا ہے۔ توبہ کے بغیر بھی اگر اس کے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو جسے چاہے گا بخش دے گا، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [ النساء: ١١٦ ] ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے جسے چاہے گا بخش دے گا۔“ اور شرک اس لیے معاف نہیں کرے گا کہ یہ اس کے عزیز ہونے کے خلاف ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ۴

وہ جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا فرمائے۔ رحمان کے پیدا کیے ہوئے میں تو کوئی کمی بیشی نہیں دیکھے گا۔ پس نگاہ کو لوٹا، کیا تجھے کسی طرح کی کوئی کٹی پھٹی جگہیں نظر آتی ہیں؟ ۳ پھر بار بار نگاہ لوٹا، نظر ناکام ہو کر تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی ۴

آیت 3 ① الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا: "طِبَاقًا" یعنی تہ بہ تہ اوپر نیچے بنایا، یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ حدیث معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آسمان ایک دوسرے سے جدا ہے، چنانچہ ہر آسمان میں رسول اللہ ﷺ کی ملاقات کسی نہ کسی رسول سے ہوئی۔ [ دیکھیے بخاري، الصلاۃ، باب کیف فرضت الصلاۃ في الإسراء: ۳۴۹ ]

② مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ: رحمان کے (آسمانوں کو) پیدا کرنے میں تم کوئی تفاوت نہیں دیکھو گے۔ جب تم آسمانوں جیسی عظیم الشان مخلوق میں کوئی تفاوت نہیں نکال سکتے تو دوسری مخلوق جو اس سے کہیں چھوٹی ہے، اس میں تم کس طرح تفاوت نکال سکو گے؟ "تَفٰوُتٍ" کا معنی ہے کہ تم اتنے بڑے آسمان یا کسی بھی مخلوق کی کوئی چیز دوسری چیز سے بے جوڑ یا بے ترتیب نہیں پاؤ گے، بلکہ سب میں ایک توازن و ترتیب اور یکسانی پاؤ گے، جس سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی خالق کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ "مِنْ تَفٰوُتٍ" کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم کسی چیز میں کوئی عیب یا کمی نہیں پاؤ گے کہ کہہ سکو کہ اگر اس طرح ہوتا تو بہتر تھا۔ (قاموس) "خَلْقِ الرَّحْمٰنِ" کے لفظ سے توجہ دلائی کہ اتنے عظیم الشان آسمان اور دوسری ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان کا نتیجہ ہے۔

③ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ: "فُطُوْرٍ" "فَطْرٌ" کی جمع ہے، جیسے "فَلْسٌ" کی جمع "فُلُوْسٌ" ہے، پھٹی ہوئی جگہ، دراڑ، شگاف۔ یعنی پہلی دفعہ اگر تمھیں رحمان کے پیدا کیے ہوئے آسمان میں کوئی عیب یا کمی بیشی نظر نہیں آئی تو دوبارہ نظر دوڑا کر دیکھ لو، کیا کوئی دراڑیں یا کٹی پھٹی ہوئی جگہیں نظر آتی ہیں؟ مطلب یہ کہ پوری کائنات میں ذروں سے لے کر آسمانوں تک اور ستاروں سے لے کر بڑی بڑی کہکشاؤں تک ہر چیز مستحکم اور مربوط ہے، جتنا چاہو تلاش کر لو تمھیں ایک رخنہ بھی نہیں ملے گا۔

آیت 4 ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ ...... : "كَرَّتَیْنِ" کا لفظی معنی دو مرتبہ ہے، مگر یہاں مراد صرف دو مرتبہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ (دوبارہ غور کرنے سے بھی کوئی خلل نہ ملے تو) بار بار دیکھ! جیسا کہ "لَبَّیْكَ" کا لفظ تثنیہ ہے مگر اس کا معنی یہ نہیں کہ "میں دو دفعہ حاضر ہوں" بلکہ یہ ہے کہ "میں بار بار حاضر ہوں۔" "خَاسِئًا" کسی چیز کو طلب کرنے والا جو اس سے

وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ﴿۵﴾ وَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۶﴾ اِذَاۤ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّ هِيَ تَفُوْرُ ﴿۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی اور ہم نے انھیں شیطانوں کو مارنے کے آلے بنایا اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۵﴾ اور خاص ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ﴿۶﴾ جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے، اس کے لیے گدھے کے زور سے چیخنے جیسی آواز سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی ﴿۷﴾

دور ہٹا دیا جائے۔ ”حَسِيْرٌ“ جو تھک کر عاجز رہ جائے۔ بار بار دیکھنے کا حکم ان کی بے بسی واضح کرنے کے لیے ہے۔

**آیت 5** وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ...... : ”الدُّنْيَا“ ”دَنَا يَدْنُوْ“ میں سے ”أَدْنٰى“ کی مؤنث ہے، سب سے قریب۔ اگرچہ سات آسمانوں میں سے ہر آسمان خالق کی کاریگری کا عظیم الشان نمونہ ہے، مگر زمین کے سب سے قریب آسمان کی زینت و حفاظت کا جو اہتمام ہم نے کیا ہے وہ تو کچھ کچھ تمھیں بھی نظر آ رہا ہے، اس کے لیے تو کسی خاص آلے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ستاروں کے تین فائدے بیان فرمائے ہیں، پہلا فائدہ زینت ہے، رات کو چھوٹے بڑے لاتعداد ستاروں کے ساتھ آسمان جس قدر مزیّن ہوتا ہے اور حسین و جمیل نظر آتا ہے اگر ستارے نہ ہوتے تو اتنا ہی بدصورت دکھائی دیتا اور بے زیب ہوتا۔ دوسرا فائدہ روشنی ہے جو ”مَصَابِيْحَ“ (چراغوں) کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے۔ اگر یہ چراغ نہ ہوتے تو ہر رات انتہائی تاریک ہوتی۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ان ستاروں کے ذریعے سے ان شیطانوں کو مار بھگایا جاتا ہے جو فرشتوں کی باتیں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ وہ لوگوں کو غیب دانی کے دعویٰ سے گمراہ کر سکیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۶ تا ۱۰) کی تفسیر۔ چوتھا فائدہ دوسری جگہ بیان فرمایا: ﴿وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ [النحل: ۱۶] ”اور ستاروں کے ساتھ وہ راستہ معلوم کرتے ہیں۔“ یعنی ستارے بحر و بر میں راستہ اور سمت معلوم کرنے کے کام آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ستاروں میں سعادت یا نحوست سمجھنا یا انھیں کسی اختیار کا مالک سمجھنا شرک ہے۔

**آیت 6** وَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ...... : پہلی پانچ آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید اور قیامت کے دلائل بیان فرمائے ہیں، اب ان لوگوں کا انجام ذکر ہو رہا ہے جنھوں نے اکیلے اللہ کو اپنا رب نہیں مانا کہ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ ”لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا“ خبر پہلے آنے کی وجہ سے ترجمہ ”خاص ان لوگوں کے لیے“ کیا گیا ہے۔

**آیت 7** اِذَاۤ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّ هِيَ تَفُوْرُ : ”شَهِيْقٌ“ گدھے کے ہینگنے کے آخر کی آواز اور ”زَفِيْرٌ“ شروع کی آواز۔ (قاموس) سورۂ فرقان (۱۲) میں فرمایا کہ جہنم جب انھیں دور سے دیکھے گی تو وہ جہنم کے سخت غصے کی اور گدھے کی

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

قریب ہوگی کہ غصے سے پھٹ جائے۔ جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ ⑧ وہ کہیں گے کیوں نہیں؟ یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو ⑨ اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے ⑩

طرح چلانے کی آوازسنیں گے۔ ساتھ ہی جہنمیوں کے چیخنے چلانے کی جو آوازیں آرہی ہوں گی وہ بھی گدھے کی آوازوں جیسی ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴾ [ ھود : ۱۰۶ ] ”تو وہ لوگ جو بد بخت ہوئے سو وہ آگ میں ہوں گے، ان کے لیے گدھے کی طرح آواز کھینچنا اور نکالنا ہے۔“

**آیت 8، 9** تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ...... : ”تَمَيَّزُ“ اصل میں ”تَتَمَيَّزُ“ (تفعّل) ہے، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی گئی۔ ”قریب ہے کہ غصے سے پھٹ جائے“ اس سے آگ کا صاحبِ شعور ہونا اور کفار پر سخت غصے ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ جہنم کے اس وقت کے سخت غصے اور جوش و خروش کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا۔ جہنم میں جب بھی کسی نئے گروہ کے لوگ پھینکے جائیں گے تو جہنم کے نگران فرشتے ان سے پوچھیں گے، کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ یہ سوال ہر گروہ سے ہوگا اور اس لیے نہیں ہوگا کہ فرشتوں کو معلوم نہیں کہ ان کے پاس ڈرانے والے آئے تھے یا نہیں، بلکہ ایک تو تعجب کے اظہار کے لیے ہوگا کہ اللہ کی طرف سے پیغمبروں اور دین کی دعوت دینے والوں کے ڈرانے کے باوجود تم ایمان نہ لائے اور جان بوجھ کر جہنم کا ایندھن بنے، دوسرا ان پر حجت تمام کرنے کے لیے اور خود ان کے منہ سے نکلوانے کے لیے کہ انھیں نہ تو بے خبری میں جہنم میں پھینکا جا رہا ہے اور نہ بلا جرم، بلکہ وہ فی الواقع اس کے حق دار ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہیں گے، کیوں نہیں، ہمارے پاس ڈرانے والے آئے اور انھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی پوری تعلیم بھی ہم تک پہنچائی، مگر ہم نے انھیں جھٹلا دیا اور اس بات سے سرے سے انکار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل کی ہے، بلکہ الٹا انھی کو بڑی گمراہی میں مبتلا قرار دیا۔

**آیت 10** وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ ...... : اب وہ حسرت و افسوس سے کہیں گے کہ ہم جس گمراہی میں مبتلا رہے، اس سے نکلنے کی دو ہی صورتیں تھیں، پہلی یہ کہ ہم رسولوں اور اہلِ ایمان کی باتیں سن لیا کرتے تو ایمان کی نعمت مل جاتی، دوسری یہ کہ خود کچھ عقل سے کام لیا کرتے تو توحید و رسالت اور آخرت کے عقائد تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔ دونوں صورتوں میں آج جہنمیوں میں شامل نہ ہوتے، مگر ہم اپنی مرضی اور آباو اجداد کے طریقے کے خلاف کوئی بات نہ سنا کرتے تھے اور نہ سمجھنے کی

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑪ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑫ وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑬

پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، سو دوری ہے بھڑکتی ہوئی آگ والوں کے لیے ⑪ یقیناً جو لوگ اپنے رب سے بغیر دیکھے ڈرتے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور بڑا اجر ہے ⑫ اور تم اپنی بات کو چھپاؤ، یا اسے بلند آواز سے کرو (برابر ہے)، یقیناً وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ⑬

کوشش کیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ رسولوں کی بات دلیل سمعی ہے اور اسے سمجھنا دلیل عقلی ہے، جبکہ اپنی مرضی پر چلنا یا آبا و اجداد کی تقلید نہ دلیل سمعی ہے اور نہ دلیل عقلی، بلکہ دلیل ہے ہی نہیں۔

آیت 11 فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ...... : وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، یہ نہیں فرمایا کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے، کیونکہ ان کو جہنم میں لے جانے والا اصل گناہ ایک ہی تھا، یعنی رسولوں کو جان بوجھ کر جھٹلا دینا، مگر ایسے اقرار کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ جانتے بوجھتے جہنمی بننے والوں کو یہی کہا جائے گا کہ جہنمی اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں۔ "سُحْقًا" "سَحِقَ" (س، ک) کا مصدر ہے، دور ہونا اور "سَحِيْقٌ" بعید۔

آیت 12 اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ...... : پچھلی آیات میں جہنمیوں کا ذکر تھا جو نہ اپنے رب سے ڈرتے تھے نہ انھیں قیامت کا یا اپنی بداعمالیوں کی سزا کا خوف تھا، کیونکہ نہ وہ اَن دیکھی چیزوں پر ایمان لانے پر تیار تھے اور نہ ان سے ڈرنے پر۔ ان کے مقابلے میں اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو عقل سلیم کے تقاضے اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور برگزیدہ بندوں کے بتانے سے دیکھے بغیر اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ ان سے اگر کوئی غلطی ہو بھی گئی تو ان کے بن دیکھے ڈرتے رہنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے گا اور اسی خشیت بالغیب کی وجہ سے انھوں نے جو نیکیاں کیں ان کا انھیں بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ خشیت کا معنی شدتِ خوف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نیکی کی اصل ایمان بالغیب اور خشیت بالغیب ہے اور گناہ سے بچنے کا اصل باعث بھی یہی ہے۔

آیت 13 وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ...... : شروع سورت سے اللہ تعالیٰ کی ان قدرتوں کا بیان ہو رہا تھا جو مخلوق کی استطاعت سے باہر ہیں، درمیان کی سات آیات میں ان سے کفر کرنے والوں اور ان پر ایمان رکھنے والوں کا انجام ذکر فرمایا، اب دوبارہ اللہ کی قدرتوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ فرمایا تم اپنی بات چھپا کر کرو یا بلند آواز سے کرو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، بلکہ وہ اس سے بڑھ کر دلوں کے ارادے اور نیتیں جو زبان پر آ کر قول بننے کی منزل تک نہیں پہنچیں، انھیں بھی جانتا ہے۔ مخلوق بے چاری نہ چھپی بات کو جانتی ہے اور نہ ایک وقت میں بہت سے لوگوں کی اونچی آواز سے کی ہوئی باتوں کو جان سکتی ہے،

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۴﴾ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ ع۴

کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۴﴾ وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو تابع بنا دیا، سو اس کے کندھوں پر چلو اور اس کے دیے ہوئے میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف (دوبارہ) اٹھ کر جانا ہے ﴿۱۵﴾ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمھیں زمین میں

---

دلوں کی بات جاننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید دیکھیے سورۂ اعلیٰ (۷) کی تفسیر۔

**آیت 14** اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ...... : یہ "عَلِیْمٌ" ہونے کی دلیل ہے کہ جو دل کا خالق اور دل میں چھپی ہوئی چیزوں کا خالق ہے، زبان کا اور اس سے ادا ہونے والے اقوال کا خالق ہے، کیا وہ اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اسرار و اقوال نہیں جانے گا؟ "اَللَّطِیْفُ" کے مفہوم میں باریک سے باریک چیز جاننے کے ساتھ ساتھ نہایت مہربان ہونا بھی شامل ہے۔ اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کلیات کو جانتا ہے جزئیات کو نہیں جانتا۔

**آیت 15** ① هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا ...... : "ذَلُوْلًا" جو تمھارے تابع ہو جائے، سرکشی نہ کرے۔ یہاں زمین کو اس چوپائے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو پوری طرح انسان کے تابع ہوتا ہے، خواہ اس پر سواری کرے یا ہل میں جوت لے۔ یعنی تم اس پر چل پھر سکتے ہو اور اسے کام میں لا سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ کر اسے ہر وقت زلزلے کی حالت میں رہنے سے محفوظ کر دیا، تاکہ تم سکون سے رہ سکو۔ اسے لوہے کی طرح سخت نہیں بنایا، ورنہ نہ اس سے کچھ اگتا، نہ عمارتیں بنتیں، نہ نہریں یا کنویں کھودے جا سکتے اور نہ انسان اور جانوروں کے رزق کا انتظام ہوتا اور اسے ضرورت سے زیادہ نرم بھی نہیں بنایا، ورنہ سب کچھ اس کے اندر دھنس جاتا۔ مشرک اقوام کی کم عقلی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو انسان کے تابع کیا، انھوں نے اسے دھرتی ماتا کے نام سے اپنا معبود بنا لیا۔ "مَنَاكِبُ" کا لفظی معنی کندھے ہے۔ جس طرح بالکل مطیع جانور پیٹھ کے علاوہ کندھوں پر بھی سواری کر لینے دیتا ہے، زمین بھی تمھارے لیے ایسے ہی مسخر ہے، اس پر جہاں چاہو چلو پھرو۔

② وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ...... : اس کے دیے ہوئے میں سے کھاؤ، مگر آزادی سے نہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کا دیا ہوا کھا رہے ہو اور آخر کار تمھیں اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے جو تم سے ایک ایک چیز کا حساب لے گا کہ اسے کن ذرائع سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا؟ (اشرف الحواشی)

**آیت 16** ① ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ ...... : "تَمُوْرُ" حرکت کرنے لگے، یعنی زبردست زلزلے سے لرزنے لگے۔ (دیکھیے طور: ۹) پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا ذکر فرمایا تھا اور اس آیت میں اپنی شان قہاریت کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین اگرچہ تمھارے تابع کر دی گئی ہے کہ تم جیسے چاہو اس میں تصرف کر سکو،

الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾

دھنسا دے، تو اچانک وہ حرکت کرنے لگے؟ ﴿۱۶﴾

لیکن یاد رکھو کہ یہ اسی آسمان والے کی ملکیت ہے، وہ چاہے تو تمھیں اس کے اندر دھنسا دے (جس طرح قارون کو دھنسا دیا۔ دیکھیے قصص : ۸۱) اور چاہے تو بھونچال سے لرزنے لگے۔ لہٰذا اس پر سرکش و خود مختار ہو کر نہیں بلکہ فرماں برداروں کی طرح ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرو۔ (اشرف الحواشی) اس آیت کا اور اس کے بعد والی آیت کا مفہوم سورۂ انعام (۶۵) اور سورۂ کہف (۶۸، ۶۹) میں بیان ہوا ہے۔

2 ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ : "اَلسَّمَآءُ" "سُمُوٌّ" سے مشتق ہے، جس کا معنی بلندی ہے۔ ہر وہ چیز جو اوپر ہو اسے "سَمَاءٌ" کہہ لیتے ہیں۔ ان دونوں آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اوپر کی طرف ہے۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر رحمان کا عرش پر ہونا بیان فرمایا ہے۔ معاویہ بن حکم سُلَمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی لونڈی کے متعلق پوچھا کہ کیا میں اسے آزاد کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اِئْتِنِیْ بِهَا » "اسے میرے پاس لاؤ۔" میں اسے آپ کے پاس لے کر آیا تو آپ نے اس سے پوچھا: « أَیْنَ اللّٰهُ ؟ » "اللہ کہاں ہے؟" اس نے کہا: « فِی السَّمَاءِ » "آسمان میں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَنْ أَنَا ؟ » "میں کون ہوں؟" اس نے کہا: « أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ » "آپ اللہ کے رسول ہیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ » [ مسلم، المساجد، باب تحریم الکلام فی الصلاۃ ۔۔۔ : ۵۳۷ ] "اسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے۔" تمام سلف صالحین کا یہی عقیدہ ہے، بعد کے لوگ جو یونانی فلسفے سے متاثر ہو گئے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفت علو (اوپر ہونے کی صفت) کا انکار کر دیا، کسی نے کہا وہ لا مکان ہے، کسی نے کہا وہ ہر جگہ ہے اور قرآن و حدیث کی صاف نصوص کی تاویل کی۔ بعض لوگ تو یہاں تک پہنچ گئے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ سوال ہی کفر ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ انھوں نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ سوال تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس کے جواب میں بھی اللہ تعالیٰ کے آسمانوں پر ہونے کے عقیدے کو آپ نے ایمان قرار دیا ہے۔ (دیکھیے مسلم : ۵۳۷) تو کیا نعوذ باللہ یہ فتویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی لگایا جائے گا؟

قرآن مجید "ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ" میں اللہ تعالیٰ کا آسمان پر ہونا فرما رہا ہے اور یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ وہ دعا کرتا ہے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے، مگر فلسفے کے مارے ہوئے یہ حضرات کبھی کہتے ہیں کہ اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ وہ آسمانوں پر بیٹھا ہوا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ پھر کیا وہ آسمان میں رہتا ہے؟ اس طرح تو وہ آسمان کا محتاج ہوا جبکہ آسمان و زمین خود اس نے پیدا کیے ہیں۔ حالانکہ سلف صالحین کے عقیدہ کے مطابق وہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال کرنا جائز نہیں جو اس نے خود اپنے متعلق استعمال نہ کیا ہو۔ اب یہ کس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کھڑا ہے یا بیٹھا ہے؟ قرآن و حدیث سے اللہ تعالیٰ کا بلندی کی جانب ہونا اور عرش پر ہونا ثابت ہے، اس کی کیفیت کسی کو معلوم نہیں اور وہ عرش کا یا بلندی کا محتاج نہیں بلکہ اس کے عرش پر ہونے کے باوجود عرش خود اس کا محتاج ہے اور اس نے عرش اور آسمان و

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾ اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ؕۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾

یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھراؤ والی آندھی بھیج دے، پھر عنقریب تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟ ﴿۱۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے (بھی) جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، پھر کس طرح تھا میرا سزا دینا؟ ﴿۱۸﴾ اور کیا انھوں نے اپنے اوپر پرندوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ وہ پر پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سکیڑ لیتے ہیں۔ رحمان کے سوا انھیں کوئی تھام نہیں رہا ہوتا۔ یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۹﴾

زمین کو تھام رکھا ہے۔ مخلوق میں کئی چیزیں ہیں جو اوپر ہیں، مگر ان کے نیچے کی چیزیں اپنے قیام میں ان کی محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ کی مثال تو اس سے بہت بلند ہے۔ مومن جب بھی اللہ تعالیٰ کا تصور کرتا ہے یا اس سے دعا کرتا ہے، تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا پروردگار آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے اور اسے اپنے رب سے تعلق جوڑنے میں کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ تاویلوں کی مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگ یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ ان کا رب کہاں ہے جس کی طرف وہ توجہ کریں۔ وہ لا مکان کے چکر ہی سے نہیں نکل سکتے۔ اسلام کے فطری اور سادہ عقائد کو چھوڑ کر فلسفی بھول بھلیاں اختیار کرنے کا یہی انجام ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فجر (۲۲) کی تفسیر۔

**آیت 17** ① اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا : جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ ہوا، فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴾ [ القمر : ٣٤ ] ''بے شک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ایک ہوا بھیجی، سوائے لوط کے گھر والوں کے، انھیں صبح سے کچھ پہلے بچا کر نکال لیا۔''

② ''نَذِيْرِ'' مصدر ہے، اصل میں ''نَذِيْرِيْ'' تھا، میرا ڈرانا۔ یاء حذف کر دی اور راء پر کسرہ باقی رہنے دیا، ورنہ اس پر رفع ہونا تھا۔

**آیت 18** وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... : تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کے لیے پہلے لوگوں کا حال دیکھ لو۔ عرب میں عاد و ثمود، فرعون و قارون اور قوم لوط و شعیب کے واقعات معروف تھے۔

**آیت 19** ① اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک اور قدرت بیان فرمائی کہ عام مشاہدے میں مادی چیزیں جو وزن رکھتی ہیں وہ نیچے کی طرف میلان رکھتی ہیں، مگر پرندے وزن رکھنے کے باوجود فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اڑتے وقت اکثر وہ پر پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، کبھی سکیڑ بھی لیتے ہیں، انھیں تھامنے والا اس رحمان (بے حد مہربان) کے علاوہ کوئی نہیں۔ ''صٰٓفّٰتٍ'' اسم فاعل ہے جو دوام پر دلالت کرتا ہے اور ''يَقْبِضْنَ'' فعل مضارع

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۚ﴿۲۰﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

یا کون ہے وہ جو تمھارا لشکر ہو، تمھاری مدد کرے، رحمان کے مقابلے میں؟ کافر دھوکے کے سوا کسی کھاتے میں نہیں ہیں ﴿۲۰﴾ یا وہ کون ہے جو تمھیں رزق دے، اگر وہ اپنا رزق روک لے؟ بلکہ وہ سرکشی اور بدکنے پر اڑے ہوئے ہیں ﴿۲۱﴾

---

ہے جو تجدد پر دلالت کرتا ہے۔ فضا کی بلندی میں اڑنے والے پرندے اکثر پر پھیلائے ہوئے اڑ رہے ہوتے ہیں، کبھی پر مار بھی لیتے ہیں۔

❷ **اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ** : یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے۔ فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کو وہی تھامے ہوئے ہے، ہوا میں مُعلّق زمین کو گرنے سے بچانے والا وہی ہے اور آسمانوں کو ستونوں کے بغیر ان کی جگہ قائم رکھنے والا بھی وہی ہے۔ غرض اس کائنات کی ہر چیز کی مسلسل نگرانی اور دیکھ بھال وہی کر رہا ہے اور وہی اسے تھامے ہوئے ہے، اگر وہ ایک لحظہ کے لیے توجہ ہٹا لے تو سب کچھ فنا ہو جائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَ لَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [ فاطر : ٤١ ] ''بے شک اللہ ہی آسمانوں کو اور زمین کو تھامے رکھتا ہے، اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلیں اور اگر فی الواقع وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی نہیں جو انھیں تھام لے گا، بے شک وہ ہمیشہ سے نہایت بردبار، بے حد بخشنے والا ہے۔''

**آیت 20** **اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ ......** : بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اتنی قدرتوں والا رحمان تمھیں پکڑنے پر آ جائے تو وہ کون ہے جو تمھارا لشکر بن کر اس کے مقابلے میں تمھاری مدد کر سکے؟ کوئی نہیں، بالکل نہیں۔ کافر لوگ جن کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ فلاں ہستی اور فلاں مشکل کُشا اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ان کی مدد کریں گے اور زبردستی سفارش کر کے چھڑا لیں گے، محض دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، جس میں انھیں شیطان نے مبتلا کر رکھا ہے۔ ''**مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ**'' کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رحمان کے علاوہ وہ کون ہے جو کسی مصیبت میں لشکر بن کر تمھاری مدد کر سکے؟

**آیت 21** **اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ......** : یعنی اگر اللہ تعالیٰ بارش ہی روک لے تو وہ کون ہے جو بارش برسا دے؟ یا زمین کو پیداوار سے روک دے یا کسی بھی طریقے سے تمھاری روزی روک دے تو وہ کون ہے جو تمھیں روزی مہیا کر دے؟ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قریشِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں نافرمانی کی حد کر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یوسف علیہ السلام جیسی قحط سالی کی بد دعا فرمائی تو ان پر ایسا قحط آیا کہ وہ ہڈیاں تک کھا گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ قحط اس وقت دور ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ [ دیکھیے بخاری، التفسیر، باب : ﴿ يغشى الناس هذا عذاب أليم ﴾ : ٤٨٢١ ] لات و منات کے بت بلکہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے جو

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل الٹا ہو کر چلتا ہے زیادہ ہدایت والا ہے، یا وہ جو سیدھا ہو کر درست راستے پر چلتا ہے؟ ﴿۲۲﴾ کہہ دے وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تم کم ہی شکر کرتے ہو ﴿۲۳﴾

بت انھوں نے بنائے ہوئے تھے، ان کے کسی کام نہ آ سکے۔

**آیت 22** ﴿ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ ...... : " مُكِبًّا " "أَكَبَّ يُكِبُّ إِكْبَابًا " ( افعال ) اوندھا گرنا۔ مزید فیہ ہونے کے باوجود یہ باب لازم ہے، اس کا مجرد "كَبَّ يَكُبُّ كَبًّا" (ن) متعدی ہے، جس کا معنی کسی کو اوندھا گرانا ہے۔ " اَهْدٰى " "هَدٰى يَهْدِيْ هِدَايَةً " (ض) سے اسم تفضیل ہے جو عموماً اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے، مگر کبھی کبھی اسم مفعول کے معنی میں بھی آ جاتا ہے اور یہاں یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے، اس لیے اس کا معنی زیادہ ہدایت دینے والا نہیں بلکہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ یہ موحد مومن اور مشرک کافر کی مثال ہے۔ کافر سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے گمراہی کے گڑھوں میں پڑ جانے کی وجہ سے منہ کے بل گرتا پڑتا چلا جا رہا ہوتا ہے۔ ایسا شخص منزل مقصود پر کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اس کے برعکس مومن توحید و سنت کے صراطِ مستقیم پر سیدھا ہو کر چل رہا ہوتا ہے، اسے دائیں بائیں اور سامنے ہر طرف سے اپنا راستہ اور اس کا گرد و پیش نظر آ رہا ہوتا ہے۔ وہ یقیناً اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا جو جنت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ کافروں کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ﴾ [ بني إسرائيل : ٩٧ ] "اور قیامت کے دن ہم انھیں ان کے چہروں پر اندھے اور گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔" اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت میں ان کے اوندھے منہ اٹھائے جانے کا سبب یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ الٹے ہی چلتے تھے، سیدھے ہو کر راہِ راست پر چلنا انھیں گوارا نہ تھا۔

**آیت 23** ﴿ قُلْ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ ...... : اللہ تعالیٰ ہی نے تمھیں پیدا فرمایا اور تمھیں کان، آنکھیں اور دل عطا فرمائے۔ اب پیدا کرنے کا شکر تو یہ تھا کہ صرف اسی کی عبادت کرتے اور کان، آنکھیں اور دل عطا فرمانے کا شکر یہ تھا کہ انھیں وہیں استعمال کرتے جہاں یہ نعمتیں دینے والے کی رضا تھی اور ان کے ذریعے سے اس کی خوشنودی کا راستہ تلاش کرتے، مگر تم نے نہ کانوں سے حق بات سنی، نہ آنکھوں سے اللہ کی قدرتیں دیکھ کر عبرت پکڑی اور نہ دل سے اس کی توحید سمجھنے کی کوشش کی۔ بے شمار نعمتوں میں سے یہ تین نعمتیں اس لیے ذکر فرمائیں کہ یہ تینوں علم کے ذرائع ہیں، انھی کے ذریعے سے آدمی حق تک پہنچ سکتا ہے۔ اس آیت میں خطاب کفار سے ہے اور " قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ " (تم کم ہی شکر کرتے ہو ) سے مراد یہ ہے کہ تم بالکل

قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۴ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۵ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲۶ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ۝۲۷ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ

کہہ دے وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا اور تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے (۲۴) اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ (۲۵) کہہ دے یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تو بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں (۲۶) پس جب وہ اس کو قریب دیکھیں گے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنھوں نے انکار کیا اور کہا جائے گا یہی ہے وہ جو تم مانگا کرتے تھے (۲۷) کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر اللہ مجھے اور ان کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے، یا

شکر ادا نہیں کرتے۔

**آیت 24** قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ ...... : جو تمھیں روئے زمین پر پھیلا سکتا ہے وہ تمھیں دوبارہ اکٹھا بھی کر سکتا ہے اور کرے گا۔

**آیت 25** وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ...... : ان کا یہ پوچھنا معلوم کرنے کے لیے نہیں تھا، وہ تو یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں سے ان کا یہ پوچھنا صرف طنز و استہزا کے لیے تھا۔

**آیت 26** قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ...... : یعنی قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، میں نہ قیامت لانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ مجھے اس کے وقت کا علم ہے، میرا کام صرف یہ ہے کہ وقت سے پہلے تمھیں قیامت کے متعلق آگاہ کر دوں اور اس کی ہولناکیوں سے ڈرا دوں، سو یہ کام میں نے کر دیا ہے۔ قیامت کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کا آنا یقینی ہے مگر وقت معلوم نہیں۔ موت ہی کو دیکھ لو، تو کیا اس لیے قیامت یا موت کی تیاری نہ کی جائے کہ بے شک اس نے آنا ہے مگر اس کا وقت معلوم نہیں؟

**آیت 27** فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ ...... : "زُلْفَةً" "زَلَفَ يَزْلُفُ" (ن) سے اسم مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، قریب۔ "تَدَّعُوْنَ" "دَعَا يَدْعُوْ" کے باب افتعال سے فعل مضارع ہے، جس میں تائے افتعال کو دال سے بدل کر دال کو دال میں اِدغام کر دیا ہے۔ اب وہ جس قیامت کو مذاق سمجھ رہے ہیں اور جس کا مطالبہ بڑے دھڑلے سے بار بار کر رہے ہیں، جب قریب آتی ہوئی دیکھیں گے تو سب ہنسی مذاق اور شیخی شوخی بھول جائیں گے، خوف اور دہشت سے ان کے چہرے بگڑ جائیں گے اور کہا جائے گا یہی ہے وہ قیامت جس کا تم مطالبہ کیا کرتے تھے۔

**آیت 28** قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ ...... : "يُجِيْرُ" "أَجَارَ يُجِيْرُ إِجَارَةً" افعال اجوف واوی۔ کفارِ مکہ اسلام کے پھیلنے سے پریشان ہو کر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف اپنی تمام کوششوں کا ناکام ہونا دیکھ کر اس

اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۲۸
قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۲۹
قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۳۰

ہم پر رحم فرمائے تو کون ہے جو کافروں کو دردناک عذاب سے پناہ دے گا؟ ۲۸ کہہ دے وہی بے حد رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے اسی پر بھروسا کیا، تو تم عنقریب جان لوگے کہ وہ کون ہے جو کھلی گمراہی میں ہے ۲۹ کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تمھارا پانی گہرا چلا جائے تو کون ہے جو تمھارے پاس بہتا ہوا پانی لائے گا؟ ۳۰

امید پر جی رہے تھے کہ کبھی نہ کبھی زمانے کی گردش ان کا کام تمام کر دے گی۔ (دیکھیے طور: ۳۰) اس پر حکم ہوا کہ ان سے کہو کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے، تو تمھیں اس سے کیا غرض ہے؟ تم اپنی فکر کرو کہ کفر کے نتیجے میں جو عذاب الیم تم پر آنے والا ہے، تمھیں اس سے کون بچائے گا؟

**آیت 29** قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ ...... : یعنی وہ ہمیں ہلاک کرے یا ہم پر رحم کرے، دونوں صورتوں میں ہماری امیدیں اسی سے وابستہ ہیں، وہی رحمان ہے، کوئی اور نہیں جو ہم پر رحم کر سکے۔ ہمارا اس پر ایمان اور اسی پر بھروسا ہے، تم جو اس کے علاوہ بھی کسی سے رحم کے امیدوار اور طلب گار ہو، بہت جلد آنکھیں بند ہوتے ہی جان لو گے کہ ہم میں سے صریح گمراہ کون تھا۔

**آیت 30** ❶ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا ...... : "غَوْرًا" "غَارَ يَغُوْرُ غَوْرًا" (ن) گہرا چلا جانا۔ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ "مَعِيْنٍ" کے لیے دیکھیے سورۂ صافات (۴۵)۔

❷ اس آیت سے تعلق رکھنے والا ایک عجیب واقعہ صاحب کشاف نے ذکر کیا ہے کہ ایک مُلحِد کے پاس یہ آیت پڑھی گئی تو اس نے کہا کہ (اگر وہ پانی گہرا چلا جائے تو) کسیاں اور بیلچے اسے نکال لائیں گے، تو اس کی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اور اپنی آیات کی گستاخی سے اپنی پناہ میں رکھے۔ (آمین) پچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنا رزق روک لے اور بارش نہ برسائے تو کون ہے جو تمھیں بارش عطا فرمائے؟ قحط کے وقت اپنے خداؤں کی بے بسی تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اب حکم ہوتا ہے ان سے پوچھو کہ یہی پانی جس پر تمھاری زندگی کا دارومدار ہے، اگر گہرا ہو جائے اور تمھاری دسترس سے باہر ہو جائے تو کون ہے جو بہتا ہوا پانی تمھارے پاس لے آئے؟ ظاہر ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے پاس یہ قوت نہیں ہے۔

سُوْرَةُ الْقَلَمِ ۶۸ مکیۃ ۲ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — آیاتھا ۵۲ رکوعاتھا ۲

نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔
نٓ۔ قسم ہے قلم کی! اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں! ①

آیت 1 ① "نٓ" حروف تہجی میں سے ایک حرف ہے۔ مختلف سورتوں کی ابتدا میں آنے والے ان حروف سے اصل مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، سب سے قریب بات یہ ہے کہ ان حروف کے ذکر سے تمام دنیا کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ان حروف تہجی ہی میں اتارا ہے، اگر تمھیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو حروف تہجی تمھارے بھی علم اور استعمال میں ہیں، تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر لے آؤ۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ عموماً یہ حروف جہاں بھی آتے ہیں ان کے بعد قرآن مجید، کتاب یا وحی کا ذکر آیا ہے۔ (واللہ اعلم)

بعض مفسرین نے فرمایا "نٓ" کا معنی مچھلی ہے اور یہاں اس عظیم مچھلی کی قسم کھائی گئی ہے جس کی پشت پر ساتوں زمینیں رکھی ہوئی ہیں، لیکن یہ بات درست نہیں۔ ایک تو اس لیے کہ کسی صحیح حدیث سے ایسی کسی مچھلی کا وجود ہی ثابت نہیں، دوسرا اس لیے کہ بے شک کلام عرب میں "نون" کا معنی مچھلی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ [ الأنبياء : ۸۷ ] "اور مچھلی والے کو جب وہ غصے میں بھرا ہوا چلا گیا۔" مگر یہاں یہ لفظ "ن" کی شکل میں ہے، "نون" کی شکل میں نہیں۔ علاوہ ازیں اگر اس سے مراد مچھلی ہوتی تو اس پر رفع، نصب یا جر کا اعراب ہونا چاہیے تھا اور آخر میں تنوین آنی چاہیے تھی، جب کہ یہاں اس کے آخر میں وقف ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دوسرے حروف مقطعات مثلاً "الٓمٓ" کی طرح حرف تہجی ہی ہے۔ بعض نے "نٓ" کا معنی دوات بتایا ہے، مگر یہ لغت میں غیر معروف ہے اور اس پر اعراب اور تنوین نہ ہونے سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔

② وَ الْقَلَمِ ......: "الْقَلَمِ" سے مراد لوح محفوظ پر لکھنے والا قلم بھی ہوسکتا ہے، جس کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ أَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ تَعَالَى الْقَلَمُ وَ أَمَرَهُ أَنْ يَّكْتُبَ كُلَّ شَيْءٍ يَكُوْنُ )) [ سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني : ۲۵۷/۱، ح : ۱۳۳ ] "سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی وہ قلم ہے اور اسے حکم دیا کہ ہر وہ چیز لکھ دے جو آئندہ ہوگی۔" یہ حدیث ترمذی (۳۳۱۹)، ابو داؤد (۴۷۰۰) اور مسند احمد (۳۱۷/۵) میں بھی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور وہ قلم بھی مراد ہوسکتا ہے جس سے لوگ لکھتے ہیں۔ لفظ عام ہے، اس لیے اسے کسی ایک قلم کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ "وَ مَا يَسْطُرُوْنَ" میں لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے آسمانی صحیفے، قرآن مجید اور ابتدائے خلق سے لکھی ہوئی تمام کائنات کی تقدیر بھی شامل ہے اور انسان یا فرشتے جو کچھ لکھتے ہیں وہ سب کچھ بھی شامل ہے۔

مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۝۲ وَ اِنَّ لَکَ لَاَجۡرًا غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۝۳ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۝۴

کہ تو اپنے رب کی نعمت سے ہرگز دیوانہ نہیں ہے ۝۲ اور بے شک تیرے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جو منقطع ہونے والا نہیں ۝۳ اور بلاشبہ یقیناً تو ایک بڑے خلق پر ہے ۝۴

**آیت 2 تا 4** ❶ مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ .... : اللہ تعالیٰ نے قلم کی اور اس چیز کی قسم کھائی جو لکھنے والے لکھتے ہیں اور اس کے جواب میں تین باتیں ارشاد فرمائیں، پہلی یہ کہ آپ اللہ کے فضل سے مجنون (دیوانے) نہیں ہیں، دوسری یہ کہ آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع ہونے والا نہیں اور تیسری یہ کہ یقیناً آپ خلق عظیم پر ہیں۔ قسم جواب قسم کی تاکید کے لیے کھائی جاتی ہے اور عام طور پر اس کے لیے شاہد اور دلیل ہوتی ہے، یہاں قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ قلم اور قلم سے لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کفار کا یہ کہنا غلط ہے کہ آپ دیوانے ہیں۔ تقدیر کے قلم نے لوح محفوظ میں ہزاروں سال پہلے آپ کی قسمت میں جو صدق و امانت، نبوت و رسالت اور دنیا و آخرت میں کامیابی اور عزت و رفعت لکھ دی ہے اور پہلے صحائف میں آپ کے متعلق جو پیش گوئیاں اور فضائل لکھے ہوئے ہیں، کراماً کاتبین آپ کے اعمال نامے میں جو کچھ لکھ رہے ہیں اور کسی بھی شخص کے اعمال نامے میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے، قرآن مجید میں جو عقائد، احکام، قصص اور گزشتہ و آئندہ کی خبریں لکھی ہوئی ہیں، جن کا ایک شوشہ بھی نہ غلط ثابت ہوا ہے نہ ہوگا اور جس کی مثل چھوٹی سے چھوٹی سورت کوئی شخص پیش کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔ آپ ﷺ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ، آپ کے افعال و احوال اور آپ کا بعض مواقع پر خاموش رہنا، یہ سب کچھ جو یاد کرنے والوں نے یاد کیا اور لکھنے والوں نے لکھا ہے اور قیامت تک یاد کرتے اور لکھتے چلے جائیں گے، اگر کوئی ان تمام لکھی ہوئی چیزوں پر غور کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے بڑے بڑے عقل مندوں کی تحریروں کا موازنہ کرے اور سارے جہان کے دیوانوں، یاوہ گو شاعروں، گپ بازوں اور افسانہ نویسوں کی لکھی ہوئی فضولیات کا بھی جائزہ لے تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ لوح محفوظ میں جس کی قسمت میں اتنی سعادتیں لکھ دی گئی ہیں، جس کی پیش گوئیاں پہلے آسمانی صحائف میں لکھی ہوئی ہیں، جو امی ہونے کے باوجود قرآن جیسی عظیم کتاب لے کر آیا ہے، جس کے اقوال و احوال اور افعال و تقریرات میں سے ہر چیز بے حد محبت و عقیدت سے لکھی گئی ہے اور قیامت تک محفوظ ہے اور تمام جہانوں کے لیے ہدایت کی روشنی مہیا کرتی ہے، اس کے متعلق کفار کا کہنا "اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ" کہ آپ دیوانے ہیں (دیکھیے حجر: ۶) بالکل غلط ہے، آپ اللہ کے فضل سے ہرگز دیوانے نہیں ہیں۔

کفار کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ زمانے کی گردش کے ساتھ آپ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ (طور: ۳۰) اور یہ کہ آپ ابتر ہیں (کوثر: ۳) اور یہ کہ آپ کے بعد آپ کا نام لینے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ نہیں، بلکہ یقین رکھو کہ آپ کے لیے وہ اجر ہے جو کبھی

فَسَتُبۡصِرُ وَ يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵﴾ بِاَيِّكُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ ﴿۶﴾

پس جلد ہی تو دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے ﴿۵﴾ کہ تم میں سے کون فتنے میں ڈالا ہوا ہے ﴿۶﴾

منقطع نہیں ہوگا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی امت کے اعمال حسنہ بھی آپ کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے رہیں گے، کیونکہ وہ آپ کی تعلیم ہی سے کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهٖ )) [ مسلم، الإمارة، باب فضل إعانة الغازي في سبيل الله...... : ۱۸۹۳ ] ”جو کسی نیکی کی طرف رہنمائی کرے تو اسے وہ نیکی کرنے والے کی طرح اجر ملے گا۔“ اور کفار کا آپ کے متعلق یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آپ شاعر ہیں یا کاہن ہیں یا نعوذ باللہ کذاب یا متکبر ہیں۔ (دیکھیے قمر: ۲۵) نہیں، بلکہ آپ خلق عظیم پر ہیں۔ ان تینوں آیات میں مخاطب اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر اصل میں یہ باتیں کفار کو سمجھائی جا رہی ہیں۔

④ وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ : ”خُلُقٍ“ کے لفظی معنی ہیں وہ عادتیں جو پیدائشی طور پر انسان میں پائی جاتی ہیں، یعنی وہ خصلتیں جو طبیعت میں پختہ ہو جائیں اور اس طرح عادت بن جائیں کہ بغیر سوچے سمجھے خود بخود سرزد ہوتی رہیں ”خُلُق“ کہلاتی ہیں۔ عام طور پر خلق سے مراد لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا اور انھیں خندہ پیشانی سے ملنا لیا جاتا ہے، اگرچہ خلق کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے مگر یہ خلق کا محدود مفہوم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ” خُلُقٍ عَظِیۡمٍ “ کی تفسیر دین سے کی ہے۔ (طبری) اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے خلق کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: (( کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ )) [ مسند أحمد : ۶/ ۹۱، ح : ۲۴۶۰۱۔ مسلم : ۷۴۶ ] ”آپ کا خلق قرآن تھا۔“

یعنی ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق دین اسلام کی ہر بات پر آپ کا اس طرح عمل تھا جیسے وہ آپ کی طبعی عادت ہو اور بقول عائشہ رضی اللہ عنہا قرآن مجید آپ کا خلق یعنی آپ کی طبیعت بن گیا تھا۔ وہ سب کچھ جو قرآن میں ہے آپ سے بلا تکلف خود بخود عمل میں آتا تھا، جیسے وہ آپ کی طبعی خصلت ہے۔ قرآن میں جو حکم دیا گیا اس پر آپ کا مکمل عمل تھا اور جس سے منع کیا گیا اس سے مکمل اجتناب تھا، جو خوبیاں اختیار کرنے کی تلقین کی گئی آپ ان سے پوری طرح آراستہ تھے اور جن صفات کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ الغرض، آپ میں تمام انسانی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں، مثلاً شرفِ نسب، کمال عقل، درستی فہم، کثرتِ علم، شدتِ حیا، کثرتِ عبادت، سخاوت، صدق، شجاعت، صبر، شکر، مروت، دوستی و محبت، میانہ روی، زہد، تواضع، شفقت، عدل، عفو، برداشت، صلہ رحمی، حسنِ معاشرت، حسنِ تدبیر، فصاحتِ لسان، قوتِ حواس، حسنِ صورت وغیرہ، جیسا کہ آپ کی زندگی کے حالات و واقعات میں مذکور ہے۔

آیت 5، 6 فَسَتُبۡصِرُ وَ یُبۡصِرُوۡنَ ...... : آپ کے خلق عظیم کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے مجنون کہنے اور دوسری تکلیف دہ باتوں پر صبر کریں۔ ”جلد ہی“ سے مراد وہ مواقع ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی مختلف طریقوں سے مدد کی، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ آخر کار آپ کے جانی دشمن فوج در فوج آپ پر ایمان لا کر آپ کے جاں نثار دوست بن گئے اور جو مخالف

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٧﴾ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٨﴾ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ﴿٩﴾

**یقیناً تیرا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے اس کو جو اس کی راہ سے بھٹک گیا اور وہی زیادہ جاننے والا ہے ان کو جو سیدھی راہ پر ہیں ﴿٧﴾ پس تو ان جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان ﴿٨﴾ وہ چاہتے ہیں کاش! تو نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کریں ﴿٩﴾**

رہے وہ بدر و احد اور خندق و فتح مکہ وغیرہ میں مردار ہوئے یا ذلیل و خوار ہوئے اور تمام جزیرۂ عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی۔ پھر قیامت تک آپ کی امت کے ہاتھوں ہونے والی فتوحات اور اسلام کی سربلندی سے بھی واضح ہوگیا کہ پاگل کون تھا؟ اس کے علاوہ ''جلد ہی'' سے مراد قیامت کا دن بھی ہے جب رسول اللہ ﷺ مقامِ محمود پر تشریف فرما ہوں گے، آپ کے ہاتھ میں '' لِوَاءُ الْحَمْدِ '' (حمد کا جھنڈا) ہوگا اور جب آپ حوض پر اپنے امتیوں کو پانی پلا رہے ہوں گے اور آپ کو جھٹلانے والے مجرم جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے، تب آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی کہ دیوانہ کون ہے؟

**آیت 8** **فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ** : اس آیت میں اور آئندہ آنے والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان اور نہ کسی ایسے شخص کا کہنا مان جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل ہے۔ معلوم ہوا یہ کام کرنے والے اللہ تعالیٰ کی نظر میں اتنے برے ہیں کہ وہ کوئی بات بھی کہیں مسلمان کے لیے ان کے کہنے پر چلنا جائز نہیں تو اللہ تعالیٰ کو یہ کس طرح گوارا ہوسکتا ہے کہ مسلمان خود ان جیسے کام کرنے لگیں۔ گویا جب ان صفات والوں کی اطاعت سے منع کیا گیا تو خود یہ صفات اختیار کرنے سے تو بدرجۂ اولیٰ منع کر دیا۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ کافر جو بات بھی مسلمان سے منوانا چاہتے ہیں، بظاہر وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اس کے پیچھے ان کا کوئی نہ کوئی خبیث مقصد ضرور ہوتا ہے، اس لیے ان کا کہنا کسی صورت میں بھی نہیں ماننا چاہیے۔

**آیت 9** **وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ** : ''تُدْهِنُ'' ''دُهْنٌ'' (تیل) سے مشتق ہے۔ جس طرح چمڑے وغیرہ کو تیل لگا کر نرم کیا جاتا ہے اس طرح بات کو نرم کر دینا۔ یعنی ان کی خواہش ہے کہ آپ اسلام کی تبلیغ میں اپنی سرگرمیاں کم کر دیں تو وہ بھی آپ کو ستانے میں کمی کر دیں، آپ اپنے دین میں کچھ ترمیم کر کے اس میں ان کے شرک اور دوسری گمراہیوں کی کچھ گنجائش نکال لیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ صلح کر لیں گے۔ آپ خود جو چاہیں کریں، مگر تمام لوگوں کی زندگی کے ہر شعبہ مثلاً ان کے عقائد، معیشت اور معاشرت و حکومت وغیرہ میں اللہ کے حکم کی تنفیذ پر اصرار چھوڑ دیں تو وہ بھی آپ کے نماز روزے کو برداشت کر لیں، جیسا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیکولر لوگوں کا کہنا ہے کہ دین ذاتی مسئلہ ہے، حکومت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ یاد رہے! جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ بات کو نرم کر دینا ہے، لہجے میں نرمی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ خلقِ عظیم پر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ کفار کو نرم کرنے کے لیے آپ اپنے موقف اور عقیدے میں نرمی

وَ لَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيۡنٍ ⑩ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيۡمٍ ⑪ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَيۡرِ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ ⑫

**اور تو کسی بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا مت مان ⑩ جو بہت طعنہ دینے والا، چغلی میں بہت دوڑ دھوپ کرنے والا ہے ⑪ خیر کو بہت روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، سخت گناہ گار ہے ⑫**

کر دیں۔ رہی انداز اور لہجے میں نرمی تو وہ آپ کے خلق عظیم کا بھی تقاضا ہے اور اللہ کا حکم بھی۔ گویا آپ کو مداہنت سے منع کیا جا رہا ہے، مدارات سے نہیں۔

**آیت 10** ① **وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيۡنٍ** : "**حَلَّافٍ**" "حَلَفَ يَحۡلِفُ" (ض) سے مبالغہ ہے، بہت قسمیں کھانے والا۔ "**مَهِيۡنٍ**" "مَهُنَ يَمۡهُنُ مَهَانَةً" (ک) (حقیر، ذلیل ہونا) سے "فَعِيۡلٌ" کے وزن پر ہے، حقیر، ذلیل۔ یہ دونوں صفتیں ایک دوسرے کو لازم ہیں، زیادہ قسمیں کھانے سے آدمی لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو جاتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل اور بے اعتبار ہونے ہی کی وجہ سے وہ زیادہ قسمیں کھاتا ہے، تاکہ اپنی بات کا یقین دلائے، کیونکہ وہ خود سمجھتا ہے کہ لوگوں کے دل میں نہ اس کی عزت ہے نہ اعتبار۔

② ان چھ آیات (۱۰ تا ۱۵) میں مذکور بری خصلتوں والے شخص سے بعض مفسرین نے ایک خاص شخص مراد لیا ہے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں: ﴿**وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيۡنٍ**﴾ کہ "ایسی خصلتوں والے کسی شخص کا کہنا مت مان" اس لیے ان خصلتوں والا ہر شخص آیت کا مصداق ہے۔ اس سے پہلی آیات میں مکذبین کی اطاعت سے منع فرمایا تھا، اب انھی جھٹلانے والوں کا ذکر ان خصلتوں کے ساتھ کیا ہے جو دین کو جھٹلانے کی وجہ سے عام طور پر آدمی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ سب کفر کی صفات ہیں، آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی خصلت اس کے اندر پیدا نہ ہونے پائے۔

**آیت 11** **هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيۡمٍ** : "**هَمَّازٍ**" "هَمَزَ يَهۡمُزُ هَمۡزًا" (ن) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت طعنہ دینے والا، عیب لگانے والا۔ "**مَشَّآءٍ**" "مَشٰى يَمۡشِيۡ مَشۡيًا" (ض) (چلنا) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت چلنے والا، بہت دوڑ دھوپ کرنے والا۔ "نَمِيۡمٌ" چغلی، خرابی ڈالنے کی نیت سے کسی کی بات دوسرے شخص تک پہنچانا۔ ان دونوں صفتوں کا خلاصہ دوسروں پر عیب لگانا ہے۔ "**هَمَّازٍ**" وہ جو دوسرے کے منہ پر عیب لگاتا اور طعنہ دیتا ہے۔ "**مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيۡمٍ**" وہ جو پیٹھ پیچھے چغلی کرتا ہے۔ یعنی بس چلے تو جرأت سے منہ پر طعنہ زنی اور عیب جوئی کرتا ہے اور بس نہ چلے تو پیٹھ پیچھے دوڑ دھوپ جاری رکھتا ہے۔

**آیت 12** **مَّنَّاعٍ لِّلۡخَيۡرِ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ** : ظلم کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کسی کا حق جو آدمی کے ذمے ہو روک لینا، ادا نہ کرنا اور دوسری قسم کسی پر زیادتی کرنا۔ "**مَنَّاعٍ لِّلۡخَيۡرِ**" میں پہلی قسم مبالغے کے ساتھ پائی جاتی ہے اور "**مُعۡتَدٍ**" میں دوسری۔ "**اَثِيۡمٍ**" کا ذکر اس کے ساتھ اس طرح ہے جس طرح "**وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ**" (اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو) میں ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۲)

عُتُلٍّۭ بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ ﴿۱۳﴾ اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُہٗ عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾ اِنَّا بَلَوۡنٰہُمۡ کَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَیَصۡرِمُنَّہَا مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۱۷﴾

سخت مزاج ہے، اس کے علاوہ بدنام ہے ﴿۱۳﴾ اس لیے کہ وہ مال اور بیٹوں والا رہا ہے ﴿۱۴﴾ جب اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ﴿۱۵﴾ جلد ہی ہم اسے تھوتھنی پر داغ لگائیں گے ﴿۱۶﴾ یقیناً ہم نے انھیں آزمایا ہے، جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا، جب انھوں نے قسم کھائی کہ صبح ہوتے ہوتے اس کا پھل ضرور ہی توڑ لیں گے ﴿۱۷﴾

**آیت 13** عُتُلٍّۭ بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ : ”عُتُلٍّ“ ”عَتَلَ یَعْتُلُ“ (ن، ض) سختی سے گھسیٹنا، جیسے فرمایا: ﴿خُذُوۡہُ فَاعۡتِلُوۡہُ اِلٰی سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ﴾ [الدخان : ۴۷] ”اسے پکڑو، پھر سختی سے کھینچتے ہوئے اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک لے جاؤ۔“ ”عُتُلٍّ“ موٹے جسم، موٹے دماغ اور سخت مزاج والا۔ ”زَنِیۡمٍ“ کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جو کسی قوم سے نہ ہو مگر اس میں سے ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسرا معنی لئیم، جو کمینگی اور شرارت میں مشہور ہو۔ ”بدنام“ کے لفظ میں دونوں مفہوم ادا ہو رہے ہیں۔

**آیت 14** اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ : ”اَنۡ کَانَ“ سے پہلے لام محذوف ہے، یعنی ”لِاَنْ کَانَ“ یہ ”لَا تُطِعۡ“ کے متعلق ہے، یعنی محض اس لیے آپ اس کا کہنا نہ مانیں کہ وہ مال اور بیٹوں والا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ ہماری آیات کو پہلے لوگوں کی کہانیاں کہہ کر محض اس لیے جھٹلاتا ہے کہ وہ مال اور بیٹوں والا ہے، اگر ہم اسے مال اور بیٹے عطا نہ کرتے تو ایسا تکبر اور ایسی سرکشی اختیار نہ کرتا۔ اس صورت میں یہ بعد والی آیت سے متعلق ہے۔

**آیت 16** سَنَسِمُہٗ عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ : ”الۡخُرۡطُوۡمِ“ کا لفظ اصل میں درندوں کی ناک (تھوتھنی) یا ہاتھی کی سونڈ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان بدخصلتوں والے انسان کی ناک کو تحقیر و مذمت کے لیے ”خرطوم“ کہا گیا ہے۔ سرکش آدمی چونکہ اپنی ناک اونچی رکھنے ہی کے لیے حق سے انکار کرتا ہے، اس لیے قیامت کے دن اسی ناک پر داغ لگایا جائے گا جو اس کی ذلت کا نشان ہوگا۔ ”وَسَمَ یَسِمُ“ (ض) کا معنی داغ اور نشان لگانا ہے۔

**آیت 17** ❶ اِنَّا بَلَوۡنٰہُمۡ کَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ ...... : اہل مکہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ تمام لوگ حج کے لیے ان کے پاس آتے اور اپنی ضروریات کے لیے ان کے گاہک بنتے تھے، وہ جہاں جاتے اہل حرم ہونے کی وجہ سے انھیں کوئی کچھ نہ کہتا۔ ہر قسم کا میوہ ان کے شہر پہنچ جاتا، ان کی تجارت خوب چمکی ہوئی تھی اور وہ نہایت مال دار اور مکمل امن کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ ان نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ انعام بھی کیا کہ ان میں اپنا آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا، مگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وَ لَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝۱۸

اور وہ کوئی استثنا نہیں کر رہے تھے ۝۱۸

کے مدینہ چلے جانے کے بعد قریش نے آپ کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے وہ خود بھی غیر محفوظ ہو گئے اور ان کی تجارت بھی برباد ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے ان پر قحط مسلط ہو گیا، یہاں تک کہ وہ مردار تک کھا گئے۔ [ دیکھیے بخاري : ۴۸۲۱، ۴۸۰۹ ] اللہ تعالیٰ نے اہلِ مکہ کی اس حالت کا ذکر ان آیات میں بھی بیان کیا ہے: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ [ النحل : ۱۱۲، ۱۱۳ ] ”اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس انھی میں سے ایک رسول آیا تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، تو انھیں عذاب نے اس حال میں آ پکڑا کہ وہ ظالم تھے۔“

یہاں اہلِ مکہ کی ناشکری اور اس پر سزا کے لیے بطور مثال ایک باغ والوں کا قصہ بیان کیا اور فرمایا: ﴿ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ﴾ ”بے شک ہم نے مکذبین کو نعمت دے کر آزمایا جس طرح باغ والوں کو نعمت دے کر آزمایا تھا۔“ یہ چند بھائی تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے بہت شاندار باغ عطا فرمایا تھا، مگر بجائے اس کے کہ وہ اسے اللہ کی نعمت سمجھ کر اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حصہ نکالتے، انھوں نے قسم کھالی کہ صبح ہوتے ہی اس کا پھل توڑ لیں گے، کسی مسکین کو نہ آنے دیں گے اور نہ انھیں کچھ دیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے جانے سے پہلے ہی آگ لگنے یا کسی اور آسمانی آفت سے باغ برباد ہو گیا۔ صبح گئے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

❷ ”بَلَوْنٰهُمْ“ ”بَلَا يَبْلُوْ“ (ن) آزمانا، مصیبت میں مبتلا کرنا، انعام کرنا۔ ”لَيَصْرِمُنَّهَا“ ”صَرَمَ يَصْرِمُ“ (ض) کاٹنا، کٹنا۔ ”صَرِيْمٌ“ کٹا ہوا۔ یہ باغ کہاں تھا اور باغ والے کون تھے؟ قرآن نے ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ قرآن واقعات کو بطورِ تاریخ نہیں بلکہ بطور عبرت بیان کرتا ہے اور اس کے لیے نفس واقعہ ہی کافی ہے۔ اس مقام پر سورۂ کہف کی آیات (۳۲ تا ۴۴) بھی دیکھ لیں، وہاں بھی عبرت دلانے کے لیے دو باغ رکھنے والے کی مثال بیان کی گئی ہے۔

**آیت 18** وَ لَا يَسْتَثْنُوْنَ : ”اَلْاِسْتِثْنَاءُ“ کسی چیز کو عام حکم سے علیحدہ کرنا، ان شاء اللہ کہنا۔ آیت کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ انھیں اپنے منصوبے کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ انھوں نے ان شاء اللہ بھی نہیں کہا اور وہ اللہ کی قدرت و مشیت کو بھی بھول گئے۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے سارا پھل اتار لینے کی قسم کھائی۔ عام طور پر پھل چنتے وقت کچھ پھل مساکین کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن انھوں نے اس کا استثنا بھی نہیں کیا۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿١٩﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿٢٠﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿٢١﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَانْطَلَقُوْا وَ هُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿٢٤﴾ وَّ غَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿٢٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾

پس اس پر تیرے رب کی طرف سے ایک اچانک عذاب پھر گیا، جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے ﴿١٩﴾ تو صبح کو وہ (باغ) کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا ﴿٢٠﴾ پھر انھوں نے صبح ہوتے ہی ایک دوسرے کو آواز دی ﴿٢١﴾ کہ صبح صبح اپنے کھیت پر جا پہنچو، اگر تم پھل توڑنے والے ہو ﴿٢٢﴾ چنانچہ وہ چل پڑے اور وہ چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے ﴿٢٣﴾ کہ آج اس (باغ) میں تمھارے پاس کوئی مسکین ہرگز داخل نہ ہونے پائے ﴿٢٤﴾ اور وہ صبح سویرے پختہ ارادے کے ساتھ اس حال میں نکلے کہ (اپنے خیال میں پھل توڑنے پر) قادر تھے ﴿٢٥﴾ پس جب انھوں نے اسے دیکھا تو انھوں نے کہا بلاشبہ ہم یقیناً راستہ بھولے ہوئے ہیں ﴿٢٦﴾ بلکہ ہم بے نصیب ہیں ﴿٢٧﴾ ان میں سے بہتر نے کہا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے ﴿٢٨﴾ انھوں نے کہا ہمارا رب پاک ہے، بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے ﴿٢٩﴾

**آیت 20،19** فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ ...... : " طَآئِفٌ " پھر جانے والا، چکر لگانے والا۔ مراد اللہ کی طرف سے اچانک عذاب ہے جس کے ایک ہی چکر سے باغ کا نام و نشان مٹ گیا، یعنی رات باغ کو آگ لگ گئی اور صبح زمین صاف تھی، جس طرح کھیتی کٹنے کے بعد ہوتی ہے۔

**آیت 22،21** فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ...... : " عَلٰى حَرْثِكُمْ " اپنے کھیت پر۔ معلوم ہوا کہ باغ کے ساتھ کھیتی بھی تھی۔

**آیت 25** وَّ غَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ : " حَرْدٍ " کا ایک معنی ہے قصد و ارادہ، یعنی وہ پختہ ارادے کے ساتھ نکلے کہ کسی مسکین کو باغ میں گھسنے نہیں دیں گے اور دوسرا معنی ہے شدید غصہ، یعنی وہ مساکین پر سخت غصے کے عالم میں نکلے۔ دونوں صورتوں میں " قٰدِرِيْنَ " کا معنی ہے " اس حال میں کہ وہ اپنے خیال میں باغ کے پھل پر قادر تھے۔ " " حَرْدٍ " کا تیسرا معنی ہے روکنا، یعنی وہ صبح صبح اس حال میں نکلے کہ (اپنے خیال میں) مساکین کو روکنے پر قادر تھے۔

**آیت 27،26** فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ...... : جب باغ نظر نہ آیا تو پہلے تو یہ سمجھے کہ ہم بھول گئے ہیں، پھر جب یقین ہو گیا کہ یہ صاف زمین ہمارا ہی باغ ہے تو کہنے لگے ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

**آیت 29،28** قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ...... : " اَوْسَطُهُمْ " کا معنی ان کے درمیان والا بھی ہے اور ان میں سے

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝۳۰ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝۳۱ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝۳۲ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۳ ع

پھر ان کا ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوا، آپس میں ملامت کرتے تھے ۝۳۰ انھوں نے کہا ہائے ہماری ہلاکت! یقیناً ہم ہی حد سے بڑھے ہوئے تھے ۝۳۱ امید ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس کے بدلے میں اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔ یقیناً (اب) ہم اپنے رب ہی کی طرف راغب ہونے والے ہیں ۝۳۲ اسی طرح (ہوتا) ہے عذاب۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب کہیں بڑا ہے، کاش! وہ جانتے ہوتے ۝۳۳

افضل بھی، جیسے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ [ البقرة : ۱٤۳ ] ''اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا۔'' تو ان میں سے جو بہتر تھا اس نے انھیں ان کے خبیث ارادے کے وقت نصیحت کی تھی ''لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ'' کہ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں کرتے اور اس بری نیت سے توبہ کیوں نہیں کرتے؟ مگر انھوں نے اس کی بات نہیں مانی تھی، اب اس نے انھیں وہ بات یاد دلائی۔ ''لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ'' کا معنی بعض نے یہ کیا ہے کہ ''تم ان شاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟'' مگر سارا پھل توڑنے کا ارادہ کر کے ''ان شاء اللہ'' پڑھ بھی لیتے تو کچھ فائدہ نہ تھا، اس لیے یہی معنی درست معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کہا تم اپنے رب کو یاد کیوں نہیں کرتے، اس کا ہر عیب سے پاک ہونا خصوصاً اس قسم کے بخل سے اور مسکینوں کو محروم کرنے کے ارادے سے پاک ہونا کیوں یاد نہیں کرتے کہ تم بھی اس بخل اور کمینگی سے بچ جاؤ۔ اس معنی کے درست ہونے کا ایک قرینہ یہ ہے کہ جب ان کے بھائی نے انھیں اپنی بات یاد دلائی تو انھوں نے ''سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ'' کہہ کر اس وقت ''سبحان اللہ'' نہ کہنے کی تلافی کی کوشش کی۔

**آیت 30 تا 32** ﴿ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ...... ﴾ : ''يَتَلَاوَمُوْنَ'' ''لَامَ يَلُوْمُ'' سے باب تفاعل ہے جس کے معنی میں تشارک ہوتا ہے، ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ''طٰغِيْنَ'' ''طَغٰي يَطْغٰي'' (ف) سے اسم فاعل کی جمع ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو ملامت شروع کر دی، کوئی کسی کو قصور وار ٹھہراتا تو کوئی کسی کو، پھر خود ہی کہنے لگے کہ ہائے ہماری بربادی! ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے کہ اللہ کے مال کو اپنا مال سمجھ بیٹھے اور حق دار کو محروم کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اب ہم توبہ کرتے ہیں، اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے رب سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کے بدلے میں اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔

**آیت 33** ﴿ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ...... ﴾ : اہل مکہ کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ نعمت کی ناشکری پر عذاب اس طرح ہوتا ہے جس طرح باغ والوں پر آیا اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑا ہے، کیونکہ دنیا کے عذاب کے بعد تو

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾

بلاشبہ ڈرنے والوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت والے باغات ہیں ﴿۳۴﴾ تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ ﴿۳۵﴾ کیا ہے تمھیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ ﴿۳۶﴾ یا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے، جس میں تم (یہ) پڑھتے ہو ﴿۳۷﴾ کہ تمھارے لیے آخرت میں یقیناً وہی ہوگا جو تم پسند کرو گے ﴿۳۸﴾

توبہ و استغفار کی گنجائش ہے، جیسا کہ اس باغ والوں نے توبہ کر لی اور توبہ کے بعد عذاب سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی بھی امید ہے، جیسا کہ باغ والوں نے بہتر باغ ملنے کی امید رکھی، مگر آخرت کے عذاب کے بعد ان میں سے کسی چیز کی گنجائش نہیں۔

**آیت 34** اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ: پچھلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنے کی پاداش میں کس طرح باغ والوں کا باغ برباد ہوا اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی بڑا ہے۔ دنیا کے باغ کے بعد آخرت کے باغات کا ذکر کیا اور فرمایا کہ رب تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے ان کے رب کے پاس ایک نہیں بلکہ نعمت والے کئی باغ ہیں۔

**آیت 36،35** اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ ......: مشرکین کہا کرتے تھے کہ اول تو مرنے کے بعد زندگی کی بات ہی غلط ہے، اگر یہ سچ ہے اور مرنے کے بعد عذاب یا ثواب ہونا ہے تو ہم یہاں مسلمانوں کی بہ نسبت خوش حال ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے ہم پر راضی ہونے کی دلیل ہے، آخرت میں بھی وہ نعمتیں اور باغات ہمیں کو ملیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کی تردید کی اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں اندھیر نہیں کہ حکم ماننے والوں سے اور مجرموں سے ایک جیسا سلوک کیا جائے۔

**آیت 38،37** ① اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ......: کفار جو کہتے تھے کہ ہمیں آخرت میں بھی جنت و نعمت ملے گی، اس بات کی تردید ایک اور طرح سے ہے، فرمایا تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ اگر کہو کہ تمھیں خود اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے تو بتاؤ تمھارے پاس اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب ہے جس میں تم نے پڑھا ہے کہ آخرت میں تمھیں تمھاری پسند ہی کی چیزیں ملیں گی؟ صاف ظاہر ہے کہ نہ تمھارے پاس ایسی کوئی کتاب ہے اور نہ تمھارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے۔

② "تَخَيَّرُوْنَ" باب تفعّل میں سے "تَتَخَيَّرُوْنَ" ہے، ایک تاء حذف کر دی ہے۔ "اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ" جملہ بن کر "تَدْرُسُوْنَ" کا مفعول بہ ہے۔ "اِنَّ" کا ہمزہ مفتوح ہونا چاہیے تھا، لیکن "تَخَيَّرُوْنَ" پر لام آنے کی وجہ سے مکسور ہو گیا۔ ترجمہ یہ ہوگا "کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ بات پڑھتے ہو کہ تمھارے لیے آخرت میں وہی ہوگا جو تم پسند کرو گے؟"

اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۞ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۞ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۞ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۞

یا تمھارے پاس ہمارے ذمے کوئی حلفیہ عہد ہیں، جو قیامت کے دن تک جاپہنچنے والے ہیں کہ تمھارے لیے یقیناً وہی ہوگا جو تم فیصلہ کرو گے (۳۹) ان سے پوچھ ان میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ (۴۰) یا ان کے کوئی شریک ہیں؟ تو وہ اپنے شریک لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں (۴۱) جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور وہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے تو وہ طاقت نہیں رکھیں گے (۴۲)

---

**آیت 39** اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ ...... : "اَيْمَانٌ" "يَمِيْنٌ" کی جمع ہے، قسم، حلفیہ عہد۔ فرمایا، یا پھر تمھارے پاس ہمارے کوئی حلفیہ عہد ہوں جو قیامت تک کے لیے ہوں کہ تمھیں وہی ملے گا جو تم فیصلہ کرو گے۔ ظاہر ہے ہمارا عہد اگر ہے بھی تو ان سے ہے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہیں، مجرموں اور ظالموں سے تو ہمارا کوئی عہد ہے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۱۲۴ ] ''میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔''

**آیت 40** سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ : ان سے پوچھیے! ان میں سے کون اس کا ذمہ لیتا ہے کہ آخرت میں انھیں وہی ملے گا جو وہ کہیں گے۔

**آیت 41** اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ...... : یا اگر یہ خود ضمانت نہیں دے سکتے تو کیا ان کے پاس ایسی ہستیاں ہیں جو اللہ کے شریک ہوں اور انھیں آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے زبردستی چھڑوا کر جنت دلوانے کا ذمہ دے سکیں؟ اگر سچے ہیں تو وہ شریک سامنے لائیں۔

**آیت 42** ① يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ...... : "يَوْمَ" یا تو پچھلی آیت "فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ" کے متعلق ہے، یعنی دنیا میں تو ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے جھوٹ موٹ شریک گنوا دیں جو ان کی رہائی کے ذمہ دار بننے کا دعویٰ کریں، مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر سچے ہیں تو اس دن اپنے شریک سامنے لائیں جس دن پنڈلی سے پردہ ہٹایا جائے گا اور لوگوں کو سجدے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہیں کرسکیں گے۔ یا یہ "اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ" کے متعلق ہے، یعنی متقین کو نعمت والی جنتیں اس دن ملیں گی جب پنڈلی سے پردہ ہٹایا جائے گا۔

② "يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ" کا ایک معنی تو وہ ہے جو ان لفظوں کا سادہ ترجمہ ہے اور خود بخود ظاہر ہو رہا ہے اور ایک وہ ہے جو ان لفظوں کے سادہ ترجمہ سے ہٹ کر کیا گیا ہے اور جو لغت عرب کا ایک محاورہ ہے۔ وہ معنی جو لفظوں کا سادہ ترجمہ ہے

اور خود بخود ظاہر ہو رہا ہے یہ ہے کہ ''جس دن پنڈلی کھول جائے گی۔'' یعنی اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی ظاہر فرمائے گا اور لوگوں کو سجدے کے لیے بلایا جائے گا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے اور صحیح سند کے ساتھ آپ سے یہی مروی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَكْشِفُ رَبُّنَا عَنْ سَاقِهِ فَيَسْجُدُ لَهُ كُلُّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ وَ يَبْقَى مَنْ كَانَ يَسْجُدُ فِي الدُّنْيَا رِيَاءً وَ سُمْعَةً فَيَذْهَبُ لِيَسْجُدَ فَيَعُوْدُ ظَهْرُهُ طَبَقًا وَاحِدًا» [ بخاري، التفسير، باب : ﴿يوم يكشف عن ساق﴾ : ٤٩١٩ ] ''ہمارا رب اپنی پنڈلی کھولے گا تو ہر مومن مرد اور مومن عورت اس کو سجدہ کریں گے اور وہ شخص باقی رہ جائے گا جو دنیا میں دکھانے اور سنانے کے لیے سجدہ کرتا تھا، وہ سجدہ کرنے لگے گا تو اس کی پیٹھ ایک طبق ہو جائے گی (یعنی دوہری نہیں ہو سکے گی)۔'' اس حدیث میں صاف الفاظ موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا، بلکہ صحیح بخاری میں ایک اور مقام پر ہے کہ ہر قوم جس کسی کی پرستش کرتی تھی اس کے پیچھے چلی جائے گی، صلیب والے صلیب کے پیچھے، بتوں والے بتوں کے پیچھے اور دوسرے معبودوں والے اپنے اپنے معبودوں کے پیچھے چلے جائیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے، خواہ نیک ہوں یا بد وہ اللہ تعالیٰ کا انتظار کر رہے ہوں گے، اللہ ان سے پوچھے گا: «هَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُ آيَةٌ تَعْرِفُوْنَهُ؟ فَيَقُوْلُوْنَ السَّاقُ فَيَكْشِفُ عَنْ سَاقِهِ فَيَسْجُدُ لَهُ» [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالٰى : ﴿وجوه يومئذ ناظرة﴾ : ٧٤٣٩ ] ''کیا تمھارے اور تمھارے رب کے درمیان کوئی نشانی ہے جسے تم پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''پنڈلی ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا اور ہر مومن اسے سجدہ کرے گا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ پنڈلی کھولنے سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کے درمیان اور اہل ایمان کے درمیان طے شدہ نشانی ہوگی اور اس نشانی کو دیکھ کر اہل ایمان رب تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر جائیں گے۔ یہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ حدیث کی دوسری بہت سی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اتنی اعلیٰ درجے کی صحیح سند کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ سے آیت کی تفسیر آنے کے بعد کسی اور تفسیر کی نہ ضرورت رہتی ہے اور نہ گنجائش، مگر چونکہ بہت سے مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر کی ہے اس لیے وہ بھی ذکر کی جاتی ہے۔

ان مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ ''کشف ساق'' لغت عرب کا ایک محاورہ ہے، جو شدت سے کنایہ ہے، یعنی **"يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ"** کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا دن بہت سخت ہوگا، کیونکہ جب کوئی سختی یا مشکل پیش آتی ہے تو آدمی پنڈلی سے کپڑا اٹھا کر کمر کس لیتا ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور بعض تابعین جیسے مجاہد، عکرمہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ وغیرہ سے بھی آئی ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ درست ہے اور لغت عرب میں یہ محاورہ استعمال بھی ہوتا ہے، مگر پہلی تفسیر (یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا) میں قرآن کے صریح الفاظ کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور یہ تفسیر اس ذات گرامی نے کی ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا، اس لیے یہی مقدم ہے۔ البتہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں، اس دن اللہ تعالیٰ کی پنڈلی بھی ظاہر ہوگی اور اس دن کی شدت میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ خود ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر ہونے کا کبھی انکار نہیں فرمایا اور

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَ قَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَ هُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہوگی، حالانکہ انھیں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا، جب کہ وہ صحیح سالم تھے ﴿۴۳﴾

نہ دیگر صحابہ میں سے کسی نے ان الفاظ کا انکار کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق اس سلسلے میں قرآن یا حدیث میں آئے ہیں۔ قرآن مجید میں چونکہ یہ صراحت نہیں کہ اللہ کی پنڈلی ظاہر ہوگی بلکہ صرف پنڈلی کا لفظ ہے، اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا مفہوم یہ لیا کہ کشفِ ساق سے اس دن کی شدت مراد ہے اور یہ مراد لینا لغت عرب کے بالکل مطابق ہے، مگر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت نقل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر ہوگی، اس لیے مقدم وہی مفہوم ہوگا جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، اگرچہ قیامت کے دن کی شدت بھی اپنی جگہ حقیقت ہے۔

افسوس تو ان لوگوں پر ہے جنھوں نے صاف کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر نہیں ہوگی، نہ اس کی پنڈلی ہے۔ ان لوگوں نے اس سے بڑھ کر اس قسم کے ان تمام الفاظ کا انکار کر دیا جو قرآن میں آئے ہیں، مثلاً ہاتھ، چہرہ، آنکھ، پاؤں وغیرہ اور کہا کہ اگر ہم یہ مانیں تو اللہ تعالیٰ کا جسم لازم آتا ہے اور اس کا ہمارے جیسا ہونا لازم آتا ہے، جب کہ اس نے خود فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [ الشورٰی : ۱۱ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' یہ لوگ ان تمام الفاظ کی کوئی نہ کوئی تاویل کرتے اور ان صفات کے ماننے والوں کو ''مُشبِّہہ'' قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی اس بات کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے جسے وہ اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [ الشورٰی : ۱۱ ] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' یعنی یہ بھی مانو کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مانو کہ وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی۔ یہ خیال کر کے اس کے سمیع و بصیر ہونے کا انکار نہ کر دینا کہ ہم بھی سمیع اور بصیر ہیں، اگر اسے سمیع و بصیر مانا تو اس کا ہمارے مشابہ ہونا لازم آئے گا۔ نہیں، اس کا سمیع و بصیر ہونا تمھارے سمیع و بصیر ہونے کے مشابہ نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پنڈلی، اس کا چہرہ، اس کا قدم اور جو کچھ اس نے خود اپنے متعلق بتایا سب برحق ہے، مگر اس کی پنڈلی مخلوق کی پنڈلی کے مشابہ نہیں، نہ کوئی اور صفت مخلوق کی صفت کے مشابہ ہے، وہ اسی طرح ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی والی آیات و احادیث کے متعلق سلف صالحین کا طریقہ یہی ہے کہ ان کے ظاہر الفاظ پر ایمان لانا چاہیے اور ان کی کیفیت اللہ کے سپرد کر دینی چاہیے۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا انکار کیا ہے درحقیقت وہ خود تشبیہ میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے اللہ کی پنڈلی، اس کے چہرے اور دوسری صفات کو اپنے اعضا جیسا سمجھا اور یہ سمجھ کر ان سے انکار کر دیا۔ اگر وہ ان صفات کو اپنی صفات کی مثل خیال نہ کرتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔

**آیت 43** ﴿ وَ قَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَ هُمْ سٰلِمُوْنَ : گویا آخرت میں ان کی پیٹھ کا تختہ بن جانا اور ان کا سجدے کے قابل نہ رہنا اس بات کی سزا ہے کہ انھوں نے دنیا میں صحیح سالم ہوتے ہوئے ایک اللہ کو سجدہ کرنے کی دعوت قبول نہ کی۔

فَذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ یُّکَذِّبُ بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ ؕ سَنَسۡتَدۡرِجُہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَ اُمۡلِیۡ لَہُمۡ ؕ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ ﴿۴۵﴾ اَمۡ تَسۡـَٔلُہُمۡ اَجۡرًا فَہُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾ اَمۡ عِنۡدَہُمُ الۡغَیۡبُ فَہُمۡ یَکۡتُبُوۡنَ ﴿۴۷﴾ فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَ لَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ ۘ اِذۡ نَادٰی وَ ہُوَ مَکۡظُوۡمٌ ﴿۴۸﴾

پس چھوڑ مجھے اور اس کو جو اس بات کو جھٹلاتا ہے، ہم ضرور انھیں آہستہ آہستہ (ہلاکت کی طرف) اس طرح سے لے جائیں گے کہ وہ نہیں جانیں گے ﴿۴۴﴾ اور میں انھیں مہلت دوں گا، یقیناً میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے ﴿۴۵﴾ یا تو ان سے کوئی مزدوری طلب کرتا ہے کہ وہ تاوان سے بوجھل ہیں ﴿۴۶﴾ یا ان کے پاس غیب کا علم ہے، تو وہ لکھتے جاتے ہیں ﴿۴۷﴾ پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو، جب اس نے پکارا، اس حال میں کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا ﴿۴۸﴾

**آیت 45،44** فَذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ یُّکَذِّبُ بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ ...... : یعنی جھٹلانے والوں کو سزا دینے میں اگر تاخیر ہو رہی ہے تو آپ فکر مت کریں، انھیں ہمارے سپرد کر دیں، پھر ہم جانیں اور وہ۔ ”سَنَسۡتَدۡرِجُہُمۡ“ ہم انھیں درجہ بدرجہ ہلاکت کی طرف لے جائیں گے، یعنی ہم انھیں عمر، صحت اور دوسری نعمتیں مسلسل دیتے جائیں گے، وہ شکر کے بجائے کفر میں بڑھتے جائیں گے اور انجام کار جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ کفر و فسق کے باوجود نعمتیں بڑھتی جائیں تو یہ اللہ کی طرف سے استدراج اور اس کی خفیہ تدبیر ہے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۵۶)، انعام (۴۴) اور سورۂ اعراف (۱۸۳)۔

**آیت 46** اَمۡ تَسۡـَٔلُہُمۡ اَجۡرًا ...... : ان کے اسلام قبول نہ کرنے کا ایک عذر یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہوں جو ان کے لیے خواہ مخواہ کی چٹی اور بوجھ ہو، ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

**آیت 47** اَمۡ عِنۡدَہُمُ الۡغَیۡبُ ...... : یا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس غیب کا علم ہے اور وہ خود کتاب الٰہی لکھ سکتے ہیں تو انھیں آپ پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے؟ یا انھوں نے غیب سے معلوم کر کے لکھ دیا ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں، یا انھوں نے اپنے متعلق غیب سے معلوم کر کے لکھ رکھا ہے کہ انھیں آخرت میں بھی دنیا جیسی نعمتیں ملتی رہیں گی، ظاہر ہے کہ ایسا بھی ہرگز نہیں ہے۔

**آیت 48** فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ ...... : مچھلی والے سے مراد یونس علیہ السلام ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار صبر سے کریں، عذاب آنے میں دیر سے پریشان نہ ہوں اور انھیں دی ہوئی مہلت کو لمبا سمجھ کر جلد بازی اور اکتاہٹ میں کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھیں جیسا مچھلی والے (یونس علیہ السلام) سے سرزد ہوا کہ وہ اجازت کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یونس علیہ السلام کے واقعہ کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۹۸)، انبیاء (۸۸،۸۷) اور صافات (۱۳۹ تا ۱۴۸)۔

لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾

اگر یہ نہ ہوتا کہ اسے اس کے رب کی نعمت نے سنبھال لیا تو یقیناً وہ چٹیل زمین پر اس حال میں پھینکا جاتا کہ وہ مذمت کیا ہوا ہوتا ﴿۴۹﴾ پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، پس اسے نیکوں میں شامل کر دیا ﴿۵۰﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا یقیناً قریب ہیں کہ تجھے اپنی نظروں سے (گھور گھور کر) ضرور ہی پھسلا دیں، جب وہ ذکر کو سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یقیناً یہ تو دیوانہ ہے ﴿۵۱﴾

یونس علیہ السلام کی ندا یہ تھی: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [ الأنبياء : ۸۷ ] ”تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں میں سے تھا۔“ ”وَهُوَ مَكْظُوْمٌ“ (غم سے بھرے ہوئے ہونے) کا مطلب یہ ہے کہ اس دن ان کے دل میں کئی غم اور صدمے اکٹھے ہو گئے تھے، ایک قوم کے ایمان نہ لانے کا غم، دوسرا صریح اجازت کے بغیر اپنے چلے آنے کا، تیسرا سمندر میں پھینک دیے جانے کا اور چوتھا مچھلی کے پیٹ میں قید ہو جانے کا۔ ان سب غموں اور صدموں کا علاج انھوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا، تسبیح اور استغفار سے کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر غم سے نجات عطا فرما دی۔

**آیت 49** لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ......: اگر یونس علیہ السلام تسبیح و استغفار نہ کرتے تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ (دیکھیے صافات: ۱۴۳، ۱۴۴) تسبیح کے بعد دائمی قید کا فیصلہ ختم ہو گیا، مگر مرتبے میں جو کمی ہوئی اور اپنی خطا کی وجہ سے جس ملامت کے سزاوار ٹھہرے، اگر ان کے رب کی نعمت انھیں نہ سنبھالتی اور ان کی خطا معاف نہ کر دی جاتی اور اسی حالت میں عراء (چٹیل زمین) میں پھینک دیے جاتے تو اس حالت میں وہ مذموم ہوتے، مگر نعمت الٰہی سے تمام کوتاہیوں کی تلافی کے بعد عراء میں پھینکے گئے تو وہ مذموم نہ تھے بلکہ محمود تھے۔

**آیت 50** فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ: چنے ہوئے تو پہلے بھی تھے، اب ان کا مرتبہ اور بڑھا دیا اور انھیں اعلیٰ درجے کے نیک اور صالح بندوں میں داخل کر دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا يَنْبَغِي لِعَبْدٍ أَنْ يَقُوْلَ إِنِّيْ خَيْرٌ مِّنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى )) [ بخاري، الأنبياء، باب قول اللّٰه تعالٰى: ﴿ و إن يونس...... ﴾ : ۳۴۱۳ ] ”کسی بندے کو لائق نہیں کہ وہ کہے میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔“

**آیت 51** وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ ......: اس آیت میں ”اِنْ“ اصل میں ”إِنَّ“ (نون مشدد کے ساتھ) تھا، کیونکہ بعد میں ”لَيُزْلِقُوْنَكَ“ پر لام آ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کفار کو اللہ تعالیٰ کی آیات سناتے اور بت پرستی کی

# وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾

حالانکہ وہ تمام جہانوں کے لیے نصیحت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ﴿۵۲﴾

مذمت کرتے تو وہ سخت غصے میں آ کر آپ کو قہر کی نظر سے گھور گھور کر دیکھتے اور آپ کو دیوانہ قرار دیتے۔ سورۂ حج (۷۲) میں ہے کہ قریب ہے کہ وہ ہماری آیات پڑھنے والوں پر حملہ ہی کر دیں۔ "لَيُزْلِقُوْنَكَ" "أَزْلَقَ يُزْلِقُ" (افعال) پھسلانا۔ اس کا معنی "ہلاک کرنا" بھی آتا ہے، کیونکہ پھسل کر گرنے سے آدمی ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ جب ذکر سنتے ہیں تو آپ کو اتنے غصے اور اتنی تیز نظروں سے گھور گھور کر دیکھتے ہیں جیسے آپ کو آپ کے موقف ہی سے پھسلا دیں گے۔ دوسرا معنی ہے جیسے آپ کو ہلاک ہی کر دیں گے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے، فلاں شخص نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے مجھے کھا ہی جائے گا۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بعض قبیلے ایسے تھے کہ جن کی نظر بہت جلد لگ جاتی تھی، اس لیے وہ آپ ﷺ کو بری نظروں سے دیکھتے تھے، تاکہ آپ کو نظر لگ جائے۔ اگرچہ نظر کا حق ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن یہاں اس تفسیر کا موقع نہیں، کیونکہ اگر کوئی کسی چیز کو اچھا سمجھ کر دیکھے تو نظر لگا کرتی ہے، غصے کی نظر سے نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں ان کے دیکھنے کو "لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ" سے مقید کیا ہے، یعنی جب وہ ذکر سنتے ہیں تو آپ کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایسے غصے کے وقت نظر لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور وہ روایتیں بھی مضبوط نہیں ہیں۔ [ كَذَا قَالَ صَاحِبُ أَحْسَنِ التَّفَاسِيْرِ وَ ابْنُ الْجَوْزِيِّ فِيْ زَادِ الْمَسِيْرِ ]

**آیت 52** وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ: یعنی قرآن کی آیات میں تو وہ نصیحتیں ہیں جن کے اثر سے ایک دو نہیں بلکہ بے شمار جہان راہِ راست پر آنے والے ہیں، ایسی نصیحت کے سنانے والے کو جو دیوانہ بتاتا ہے وہ خود دیوانہ ہے۔

سورۃ الحاقۃ ٦٩ مکیۃ ٧٨ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰیاتھا ٥٢ رکوعاتھا ٢

اَلْحَآقَّةُ ① مَا الْحَآقَّةُ ② وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ③ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ④ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ⑤

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ ہو کر رہنے والی ① کیا ہے وہ ہو کر رہنے والی؟ ② اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ ہو کر رہنے والی کیا ہے؟ ③ ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی (قیامت) کو جھٹلا دیا ④ سو جو ثمود تھے وہ حد سے بڑھی ہوئی (آواز) کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے ⑤

**آیت 1 تا 3** اَلْحَآقَّةُ ۙ مَا الْحَآقَّةُ ...... : "اَلْحَآقَّةُ" "حَقَّ يَحِقُّ" (ض، ن) (ثابت ہونا، واجب ہونا) سے "فَاعِلَةٌ" کے وزن پر ہے، ہو کر رہنے والی، واجب ہونے والی، جس کا ہونا حق ہے۔ مراد قیامت ہے، کیونکہ وہ ہو کر رہے گی، اسی لیے اس کا نام "اَلْوَاقِعَةُ" (واقع ہونے والی) بھی ہے۔ (دیکھیے حاقہ : ۱۵) قیامت کا ذکر استفہامیہ فقروں سے شروع کیا گیا ہے، یہ اہلِ بلاغت کا خاص اسلوب ہے۔ اس سے ایک تو سننے والے کو متوجہ کرنا اور شوق دلانا مقصود ہوتا ہے، دوسرا قیامت کی عظمت اور ہولناکی بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ اتنی عظیم الشّان ہے کہ نہ تمھاری سمجھ میں پوری طرح آ سکتی ہے اور نہ کوئی اور ایسا ہے جو تمھیں معلوم کروا سکے کہ وہ کیا ہے؟

**آیت 4** كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ : "اَلْقَارِعَةُ" "قَرَعَ" (ف) کھٹکھٹانا، کسی سخت چیز پر دوسری چیز سے ضرب لگانا۔ یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، کیونکہ وہ بھی اسی طرح یک لخت آ کھٹکھٹائے گی جیسے کوئی آنے والا زور سے دروازہ آ کھٹکھٹاتا ہے اور آدمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ کفار کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ قیامت کا انکار کرنے والے پہلے لوگ تم ہی نہیں، بلکہ تم سے پہلے عاد و ثمود نے، جو قوت و شوکت میں تم سے کہیں بڑھ کر تھے، اس کھٹکھٹانے والی (قیامت) کو جھٹلایا، پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ ثمود جو عرب کے شمال مغرب اور عاد جو عرب کے جنوب مشرق کی متمدن ترین قومیں تھیں، توحید کے انکار کے بعد ان کا سب سے بڑا جرم قیامت اور آخرت کا انکار تھا، جس نے انھیں سرکش بنا دیا تھا اور جس کی پاداش میں آخر کار انھیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ موجودہ زمانے کی مادہ پرست بزعم خویش مہذّب قوموں کی سرکشی کا اصل باعث بھی قیامت اور جزا و سزا کا انکار ہے۔

**آیت 5** فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ : "اَلطَّاغِيَةُ" "طَغٰى يَطْغٰى" (ف) سے اسم فاعل ہے، یہ "عَافِيَةٌ" کی طرح مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اسم فاعل ہو تو "اَلطَّاغِيَةُ" کا معنی "حد سے بڑھنے والی" ہے اور یہ "اَلرَّجْفَةُ" یا "اَلصَّيْحَةُ" یا "اَلصَّعِقَةُ" کی صفت ہوگی، یعنی ثمود اس زلزلے سے یا آواز سے یا بجلی کی کڑک سے ہلاک کر دیے گئے جو آوازوں کی حد سے

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷

اور جو عاد تھے وہ سخت ٹھنڈی، تند آندھی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے، جو قابو سے باہر ہونے والی تھی ۝۶ اس نے اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھا۔ سو تو ان لوگوں کو اس میں اس طرح (زمین پر) گرے ہوئے دیکھے گا جیسے وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے ہوں ۝۷

بہت بڑھی ہوئی تھی۔ یہ فرشتے کی آواز تھی یا بجلی کی کڑک تھی جس کے ساتھ زلزلہ بھی تھا، یا زلزلے کے ساتھ آنے والی خوفناک آواز تھی۔ "الرَّجْفَةُ" کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۷۸)، "الصَّيْحَةُ" کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۶۷) اور "الصَّعِقَةُ" کے لیے دیکھیے حم سجدہ (۱۷)۔

مصدر ہو تو معنی "حد سے بڑھنا" ہے، "باء" سببیہ ہوگی: "اَيْ بِطُغْيَانِهِمْ" یعنی ثمود اپنے حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے، جیسے فرمایا: ﴿ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴾ [ الشمس : ۱۱ ] "قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے (صالح علیہ السلام کو) جھٹلا دیا۔"

**آیت 6** وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا ...... : "رِيْحٌ" ہوا، "صَرْصَرٍ" "صِرٌّ" سے مشتق ہے، جس کا معنی سخت ٹھنڈک اور تیزی ہے، یعنی سخت ٹھنڈی اور تند آندھی، یا یہ "صَرْصَرَ يُصَرْصِرُ صَرْصَرَةً" (چیخنا، سخت آواز نکالنا) سے مشتق ہے، یعنی سخت آواز والی آندھی۔ "عَاتِيَةٍ" "عَتَا يَعْتُوْ عُتُوًّا" (ن) قابو سے باہر ہونا، سرکشی کرنا۔ یعنی وہ ہوا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بھی قابو کرنے والے کے قابو سے باہر تھی۔

**آیت 7** سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ ...... : "حُسُوْمًا" کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "پے در پے" کیا ہے۔ (ابن جریر) اس صورت میں یہ "حَسَمْتُ الدَّابَّةَ" (میں نے جانور کو پے در پے داغ لگائے) سے مشتق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ آندھی ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھی، ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکی۔ "حَسَمَ يَحْسِمُ" (ض) کا معنی "جڑ سے کاٹنا" بھی ہے۔ اس صورت میں یہ "حَاسِمٌ" کی جمع ہے، جیسے "شَاهِدٌ" کی جمع "شُهُوْدٌ" ہے، معنی ہوگا "ان پر وہ آندھی جڑ سے کاٹ ڈالنے والی سات راتوں اور آٹھ دنوں تک چلائے رکھی۔" "حُسُوْمًا" مصدر بھی ہو سکتا ہے، جیسے "شُكُوْرٌ" اور "كُفُوْرٌ" ہے، اس صورت میں یہ مفعول لہ ہوگا، یعنی ان پر وہ آندھی سات راتیں اور آٹھ دن جڑ سے کاٹ ڈالنے کے لیے چلائے رکھی۔ مزید تراکیب کے لیے دیگر کتب تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔ "صَرْعٰى" "صَرِيْعٌ" کی جمع ہے، پچھاڑ کر گرائے ہوئے، ہلاک کیے ہوئے۔ "اَعْجَازُ" "عَجُزٌ وَ عَجْزٌ" کی جمع ہے، کسی چیز کا آخری حصہ، درخت کا تنا۔ "خَاوِيَةٍ" "خَوٰي يَخْوِيْ" (ض) گر پڑنا، خالی ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے قوم عاد سے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ایک عرصہ تک بارش روکے رکھی، ادھر وہ پیغمبر کو زچ کرنے کے لیے

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۸ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۹ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۱۰ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۱۱

تو کیا تو ان کا کوئی بھی باقی رہنے والا دیکھتا ہے؟ ⑧ اور فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے اور الٹ جانے والی بستیوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ⑨ پس انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اس نے انھیں ایک سخت گرفت میں پکڑ لیا⑩ بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمھیں کشتی میں سوار کیا⑪

بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، جب عذاب بادل کی صورت میں نمودار ہوا اور انھوں نے اسے اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو خوش ہو گئے کہ اب بارش ہو گی، مگر تھوڑی ہی دیر میں عذاب شروع ہو گیا، جو مغرب کی طرف سے آنے والی تیز ٹھنڈی آندھی کی صورت میں تھا، جس نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ احقاف (۲۱ تا ۲۶)۔ سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلنے کے بعد آندھی تھمی تو ان کی لاشیں اس طرح گری ہوئی تھیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔ اہل ایمان کے علاوہ ایک شخص بھی باقی نہ بچا۔ اس تشبیہ سے اس قوم کا مضبوط جسامت اور لمبے قدوں والا ہونا صاف معلوم ہو رہا ہے۔ سورۂ احقاف (۲۶) اور سورۂ فجر (۸ تا ۱۰) میں ان کی قوت و شوکت کا کچھ حال بیان ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( نُصِرْتُ بِالصَّبَا، وَ أُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ )) [ بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وأما عاد......﴾ : ۳۳۴۳۔ مسلم : ۹۰۰ ] ''(خندق کے موقع پر) میری مدد صبا یعنی مشرق سے آنے والی ہوا کے ساتھ کی گئی اور عاد کو دبور یعنی مغرب سے آنے والی ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔''

**آیت 9 تا 10** وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ...... : "اَلْمُؤْتَفِكٰتُ" "اِئْتَفَكَ" (افتعال) سے اسم فاعل ہے اور محذوف لفظ "اَلْقُرٰی" (بستیوں) کی صفت ہے، یعنی الٹ جانے والی بستیاں۔ مراد لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں جن کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا گیا اور پھر ان پر کھنگر کے پتھروں کی بارش برسا دی گئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۷۷ تا ۸۳) اور سورۂ حجر (۶۱ تا ۷۴)۔ "اَلْخَاطِئَةُ" "عَافِيَةٌ" کے وزن پر مصدر ہے، گناہ، خطا۔ "رَابِيَةً" "رَبَا يَرْبُوْ" (ن) (زیادہ ہونا، بڑھنا) سے اسم فاعل ہے، یعنی وہ گرفت اپنی شدت میں دوسری گرفتوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی، یعنی فرعون نے اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور قومِ لوط نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی سخت گرفت میں پکڑ لیا۔ گناہ کیا تھا؟ یہ کہ "**فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ**" انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی۔

**آیت 11** اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ...... : نوح علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان کا ذکر کیا ہے، فرمایا نوح (علیہ السلام) کی قوم کے کفر و شرک پر اصرار کی وجہ سے جب پانی اتنا بڑھا کہ عام حدوں سے کہیں اونچا ہو گیا تو ہمیں تھے جنھوں نے تمھیں اس سے پہلے ہی کشتی میں سوار کر لیا اور پھر اتنے بے حساب پانی میں اس کشتی کو محفوظ رکھا، ورنہ اس

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾

تاکہ ہم اسے تمھارے لیے ایک یاد دہانی بنا دیں اور یاد رکھنے والا کان اسے یاد رکھے ﴿۱۲﴾ پس جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک بار پھونکنا ﴿۱۳﴾ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا ﴿۱۴﴾ تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی ﴿۱۵﴾

طوفان سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہاں اگرچہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد کے زمانے کے لوگوں سے خطاب ہو رہا ہے، مگر مراد یہی ہے کہ تمھارے آباء کو سوار کیا، وہ سوار ہوئے تو تم بھی سوار ہوئے، کیونکہ تم ان کی پشتوں میں تھے۔ اگر وہ اس کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے نجات نہ پاتے تو آج تمھارا وجود بھی نہ ہوتا۔

**آیت 12** لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً : "لِنَجْعَلَهَا" میں "هَا" ضمیر اس واقعہ کی طرف جا رہی ہے، یعنی "تاکہ ہم اس واقعہ کو تمھارے لیے ایک نصیحت اور یادگار بنا دیں۔" نوح علیہ السلام کی قوم کا یہ واقعہ پشت در پشت نقل ہو کر آ رہا تھا اور عرب کے لوگ اچھی طرح اس سے واقف تھے۔ بعض مفسرین نے اس ضمیر "هَا" سے مراد "الْجَارِيَةِ" (کشتی) بھی لیا ہے، مگر اس کے بعد آنے والے الفاظ "وَتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ" (اور اسے یاد رکھنے والا کان یاد رکھے) سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ضمیر سے مراد "واقعہ" ہے، کیونکہ "وَعٰى يَعِي" کا معنی سوچ سمجھ کر سننا اور یاد رکھنا ہوتا ہے۔ "اُذُنٌ" (کان) سے مراد کانوں والے انسان ہیں، جو واقعہ کو سنیں تو اس سے عبرت پکڑیں کہ آخرت کے انکار اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے کا انجام کتنا ہولناک ہوتا ہے۔

**آیت 14،13** فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ...... : قرآن مجید میں بعض مقامات پر پہلے نفخہ کے وقت پیش آنے والے واقعات ذکر کیے گئے ہیں، بعض پر دوسرے نفخہ کے وقت اور بعض مقامات پر انھیں اکٹھا ہی ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان آیات میں بھی پہلے نفخہ سے لے کر دوسرے نفخہ کے بعد تک کے حالات بیان ہوئے ہیں، زمین اور پہاڑوں کے ٹوٹنے کا سلسلہ تو پہلے نفخہ کے وقت کا ہے اور آسمان کا پھٹنا، فرشتوں کا اس کے کناروں پر ہونا، عرشِ الٰہی کو آٹھ فرشتوں کا اٹھائے ہوئے ہونا، اللہ تعالیٰ کا میدانِ محشر میں نزول فرمانا اور سب بندوں کا حساب کتاب کے لیے پیش کیا جانا، یہ سب کچھ دوسرے نفخہ کے بعد کا ہے۔

**آیت 15** فَيَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ : "الْوَاقِعَةُ" واقع ہونے والی۔ یعنی قیامت کے منکروں کا دنیا میں انجام ذکر کرنے کے بعد اب اس کے واقع ہونے کی کیفیت بیان ہوتی ہے کہ صور میں اچانک ایک پھونک ماری جائے گی، اس کے ساتھ ہی زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی بار ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور تمام زندہ لوگ مر کر گر جائیں گے۔ یہ واقعہ یک لخت ہوگا، اس کے وقت کا کسی کو بھی علم نہیں، حتیٰ کہ صور میں پھونکنے والے کو بھی نہیں۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾

**اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن کمزور ہوگا ﴿۱۶﴾ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے ﴿۱۷﴾ اس دن تم پیش کیے جاؤ گے، تمھاری کوئی چھپی ہوئی بات چھپی نہیں رہے گی ﴿۱۸﴾**

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الْقَرْنِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ وَاسْتَمَعَ الْأُذُنَ مَتٰى يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَيَنْفُخُ» [ ترمذي، صفة القيامة والرقائق، باب ماجاء في شأن الصور : ۲۴۳۱، و صححه الألباني، أنظر صحيح الجامع الصغير : ۴۵۹۲ ] ''میں کیسے خوش حال ہو کر رہوں جب کہ صور والا (فرشتہ) صور منہ میں لیے ہوئے اور کان لگائے ہوئے ہے (اور پیشانی جھکا کر انتظار کر رہا ہے) کہ اسے صور میں پھونکنے کا حکم کب ہوتا ہے، تو وہ (صور میں) پھونکے۔''

**آیت 16، 17:** ❶ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ ...... ''وَاهِيَةٌ'' ''وَهٰى يَهِيْ وَهْيًا'' (ض، س، ف) (کمزور ہونا، بودا ہونا) سے اسم فاعل ہے۔ دوسرے نفخہ کے ساتھ یہ مضبوط آسمان جس میں لاکھوں کروڑوں سال سے ایک شگاف بھی نہیں پڑا، بالکل کمزور ہو کر پھٹ جائے گا اور فرشتے اس کے کناروں پر چلے جائیں گے۔ اس دن آٹھ فرشتے عرش الٰہی کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ اور فرشتے صف در صف زمین پر تشریف لائیں گے۔ ادھر ایک طرف جہنم لائی جائے گی (دیکھیے فجر: ۲۱ تا ۲۳)، دوسری طرف جنت قریب لائی جائے گی۔ (دیکھیے شعراء: ۹۰، ۹۱) اس وقت سب لوگ اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جائیں گے، کسی شخص کا کوئی عمل چھپا نہیں رہ سکے گا۔

❷ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے عرش کے وجود کی زبردست دلیل ہے۔ جو لوگ عرشِ الٰہی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف حکومت ہے، قیامت کے دن آٹھ فرشتوں کا عرشِ الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہونا ان کی تردید کرتا ہے۔ یہ حضرات نہ عرش کے وجود کے قائل ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا مانتے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کا قیامت کے دن زمین پر آنا مانتے ہیں اور نہ اس کا اوپر کی جانب ہونا مانتے ہیں، حالانکہ یہ سب کچھ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں موجود ہے۔ ایک بزرگ جنھوں نے ہر جگہ عرشِ الٰہی کی تاویل حکومت و فرماں روائی سے کی ہے، اس مقام پر آٹھ فرشتوں کے عرشِ الٰہی کو اٹھانے کے صریح الفاظ کی کوئی تاویل نہیں کر سکے تو انھوں نے اسے آیاتِ متشابہات میں سے قرار دے کر تسلیم کیا ہے کہ ''ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے اور نہ سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی۔'' کیا ہی بہتر ہوتا کہ اسی طرح وہ اللہ کے عرش کے اوپر ہونے کو بھی مانتے اور اس کے زمین پر آنے کو بھی مانتے اور اس کی کیفیت اللہ کے سپرد کر دیتے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر کس طرح ہے اور وہ زمین پر کس طرح اترے گا، کیونکہ قرآن و حدیث کی نصوص اور سلف صالحین کا یہی طریقہ ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ فجر (۲۲) کی تفسیر۔ تفسیر ماجدی میں ہے: ''یہ کہنا کہ فرشتوں کا حامل عرش ہونا حق تعالیٰ کی شانِ قیومیت

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾

سو جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا لو پکڑو، میرا اعمال نامہ پڑھو ﴿۱۹﴾ یقیناً میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں ﴿۲۰﴾ پس وہ ایک خوشی والی زندگی میں ہوگا ﴿۲۱﴾ ایک بلند جنت میں ﴿۲۲﴾

کے منافی ہے، محض اپنی سطحیت کا اظہار کرنا ہے، اگر قیومیت کے یہ معنی لے لیے جائیں تو ایک اس مسئلہ پر کیا موقوف ہے، ملائکہ کو واسطہ بنا کر ان سے کام لیتے رہنے کا سارا نظام ہی باطل ہو جاتا ہے۔''

**آیت 19** فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ...... : "هَآؤُمُ" اسم فعل ہے، ابن عطیہ نے فرمایا: ''اس کا معنی ہے، آؤ!'' زمخشری نے فرمایا: "هَآؤُمُ" ایک آواز ہے جس سے "خُذْ" یعنی ''لو پکڑو'' کا مفہوم سمجھا جاتا ہے۔'' (التسہیل) "كِتٰبِيَهْ" اصل میں "كِتَابِيْ" ہے، اس میں "ہْ" وقف کے لیے ہے، ضمیر نہیں ہے، جیسے "مَاهِيَهْ" میں ہے۔ (دیکھیے قارعہ: ۱۰) "حِسَابِيَهْ"، "مَالِيَهْ" اور "سُلْطٰنِيَهْ" میں بھی ایسے ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا وہ اتنا خوش ہوگا کہ دوسروں کو بلا بلا کر دکھاتا پھرے گا، جیسے دنیا میں بھی انسان کوئی بڑی خوشی ملنے پر پکار پکار کر دوسروں کو اس میں شریک کرتا ہے۔

**آیت 20** اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ : "اِنِّيْ ظَنَنْتُ" یقیناً میں نے سمجھ لیا تھا۔ ''ظن'' کا لفظ وہم، گمان اور یقین تینوں چیزوں کے لیے آتا ہے، کیونکہ یہ اصل میں علامات اور نشانیوں کے ذریعے سے حاصل ہونے والی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نشانیاں کمزور ہوں تو وہم یا گمان تک معاملہ رہتا ہے، اگر مضبوط ہوں تو غالب گمان اور علم و یقین کا معنی دیتا ہے۔ خصوصاً جب اس کے ساتھ "اِنَّ" بھی ہو۔ (مفردات) یہاں "ظَنَنْتُ" کا لفظ غالب گمان کے معنی میں ہے، جو دن بدن دلائل کے ساتھ یقین میں بدلتا جاتا ہے، اسی غالب گمان ہی کی وجہ سے انسان قیامت کے دن کے حساب سے ڈر کر اللہ کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ اگر مکمل یقین کے بغیر وہ اللہ کی نافرمانی چھوڑنے پر تیار نہ ہو تو مکمل یقین تو قیامت سامنے آنے ہی پر ہوگا اور اس وقت اس یقین کا کوئی فائدہ نہیں۔ صاحب احسن التفاسیر فرماتے ہیں: ''قرآن شریف میں یقین کی جگہ ظن کا لفظ عقبیٰ کی باتوں میں اس لیے بولا گیا ہے کہ ان باتوں کا پورا یقین مرنے کے بعد ہوگا۔'' خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ وہ اپنی خوش قسمتی کی وجہ یہ بتائے گا کہ اس نے دنیا میں یہ سمجھ کر زندگی بسر کی کہ آخر ایک دن اس کا حساب ہونا ہے۔

**آیت 21، 22** فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ...... : جنت میں کوئی فکر و غم ہوگا نہ مرض، نہ موت، نہ تھکاوٹ، نہ بڑھاپا، نہ کوئی نقص، نہ عیب اور نہ کمزوری۔ ہر نعمت جو دل چاہے گا بلکہ جو خیال کی رسائی سے بھی بلند ہے، ملے گی۔ ان تمام باتوں کو "عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ" کے لفظ سے ادا فرما دیا ہے۔

قُطُوۡفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا هَنِيۡٓـئًا بِمَاۤ اَسۡلَفۡتُمۡ فِى الۡاَيَّامِ الۡخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾ وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ لَمۡ اُوۡتَ كِتٰبِيَهۡ‌ ۚ‏ ﴿۲۵﴾ وَلَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِيَهۡ‌ ۚ‏ ﴿۲۶﴾ يٰلَيۡتَهَا كَانَتِ الۡقَاضِيَةَ‌ ۚ‏ ﴿۲۷﴾ مَاۤ اَغۡنٰى عَنِّىۡ مَالِيَهۡ‌ ۚ‏ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّىۡ سُلۡطٰنِيَهۡ‌ ۚ‏ ﴿۲۹﴾

جس کے میوے قریب ہوں گے ﴿۲۳﴾ کھاؤ اور پیو مزے سے، ان اعمال کی وجہ سے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں آگے بھیجے ﴿۲۴﴾ اور لیکن جسے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا ﴿۲۵﴾ اور میں نہ جانتا میرا حساب کیا ہے ﴿۲۶﴾ اے کاش کہ وہ (موت) کام تمام کر دینے والی ہوتی ﴿۲۷﴾ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا ﴿۲۸﴾ میری حکومت مجھ سے برباد ہوگئی ﴿۲۹﴾

**آیت 23** **قُطُوۡفُهَا دَانِيَةٌ** : "قَطَفَ يَقْطِفُ" (ض) پھل توڑنا۔ "قُطُوْفٌ" "قِطْفٌ" (قاف کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، وہ پھل جو توڑے جائیں۔ "دَانِيَةٌ" قریب۔ یعنی وہ خوشے اور پھل جھکے ہوئے ہوں گے کہ آدمی کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں انھیں لے سکے گا۔

**آیت 24** **كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا هَنِيۡٓـئًا......** : "هَنِيْٓـئًا" "هَنُؤَ يَهْنُؤُ" (ک) سے "فَعِيْلٌ" کے وزن پر ہے، جس کے حاصل ہونے میں کوئی مشقت ہو نہ کھانے کے بعد معدے پر کوئی بوجھ ہو، ادھر کھایا ادھر ہضم ہوا۔ "بِمَاۤ اَسۡلَفۡتُمۡ" ان اعمال کی وجہ سے جو تم نے آگے بھیجے۔ معلوم ہوا نیک اعمال جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔

**آیت 25 تا 29** **وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ......** : جن لوگوں کو بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا وہ نہایت پریشانی میں یہ باتیں کہیں گے جو ان آیات میں ذکر ہوئی ہیں۔ یہ بائیں ہاتھ میں اعمال نامے والے لوگ کافر ہوں گے، اس کی دلیل آگے آنے والی آیت (۳۳) ہے: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ الۡعَظِيۡمِ ﴾ "وہ عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔" ایمان والوں کو دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا، البتہ وہ ایمان والے جو کچھ عرصہ آگ میں رہیں گے ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ انھیں اعمال نامہ آگ میں جانے سے پہلے ملے گا یا آگ سے نکلنے کے بعد، راجح یہی ہے کہ آگ سے نکلنے کے بعد ملے گا، کیونکہ اعمال نامہ ملنے کے بعد اگر انھیں آگ میں بھیجا جا رہا ہو تو ان کے منہ سے "هَآؤُمُ اقۡرَءُوۡا كِتٰبِيَهۡ" کے خوشی کے الفاظ نہیں نکل سکتے۔ (التسہیل)

"يٰلَيۡتَهَا كَانَتِ الۡقَاضِيَةَ" یعنی موت میرا کام تمام کر دیتی، اور مجھے دوبارہ نہ اٹھایا جاتا۔ "مَاۤ اَغۡنٰى عَنِّىۡ مَالِيَهۡ ۚ هَلَكَ عَنِّىۡ سُلۡطٰنِيَهۡ" مال اور سرداری کی حرص کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهِ» [ ترمذي، الزهد، باب ما ذئبان جائعان : ۲۳۷۶، قال الألباني صحيح ] "دو بھوکے بھیڑیے جو بھیڑ بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں، وہ انھیں اس سے زیادہ تباہ و برباد

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾

اسے پکڑو، پس اسے طوق پہنادو ﴿۳۰﴾ پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو ﴿۳۱﴾ پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، پس اسے داخل کردو ﴿۳۲﴾ بلاشبہ وہ بہت عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا ﴿۳۳﴾ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا ﴿۳۴﴾ سو آج یہاں نہ اس کا کوئی دلی دوست ہے ﴿۳۵﴾

نہیں کرتے جتنا آدمی کی مال اور سرداری کی حرص اس کے دین کو تباہ و برباد کرتی ہے۔'' تمام عمر انھی دو چیزوں کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں گزار دینے کے بعد اس وقت افسوس سے کہے گا کہ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا اور میری سرداری بھی برباد ہو گئی۔ ''سُلْطٰنِيَهْ'' ''سُلْطَانٌ'' سے مراد دلیل و حجت ہو تو مطلب یہ ہے کہ میرے سارے دلائل اور حجت بازیاں، جن سے میں حق والوں کو لاجواب کرتا تھا، آج بے کار ہو گئے اور سرداری و حکومت ہو تو مطلب یہ ہے کہ آج میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا۔ وہ جتھے اور پارٹیاں، وہ فوج اور پولیس کے دستے، وہ اہلِ خانہ، وہ نوکر چاکر جن پر میرا حکم چلتا تھا سب غائب ہو گئے۔ دوسروں پر اقتدار تو دور کی بات ہے اپنے ہی اعضا نے میری سرداری ماننے سے انکار کر دیا ہے، بلکہ میرے خلاف شہادتیں دے رہے ہیں۔ ''سُلْطٰنِيَهْ'' سے حجت و دلیل اور حکومت و سرداری دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

**آیت 30 تا 32** خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ...... : حکم ہوگا اسے پکڑو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو، پھر اسے ایک زنجیر میں جکڑ دو جو ستر (۷۰) ہاتھ لمبی ہے۔ جہنمیوں کو جہنم میں طوقوں اور زنجیروں سے جکڑ کر لمبے لمبے ستونوں سے باندھ دیا جائے گا تاکہ وہ حرکت نہ کر سکیں، کیونکہ حرکت سے بھی عذاب میں کچھ تخفیف ہوتی ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۸﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴾ [ الهمزة : ۸، ۹ ] ''یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی ہے۔ لمبے لمبے ستونوں میں۔'' ستر ہاتھ سے مراد یہ پیمائش بھی ہو سکتی ہے اور بہت زیادہ لمبائی بھی، کیونکہ عربوں کے ہاں ستر کا عدد کثرت کے لیے بھی آتا ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ یہ زنجیر ہر مجرم کے لیے الگ الگ ہو اور یہ بھی کہ ایک ہی زنجیر میں سب کو پروتے چلے جائیں۔ (التسہیل)

**آیت 33، 34** اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ...... : عذاب کا باعث یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ یہ تھا کہ اس پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا، یعنی اسے مانتا ہی نہیں تھا، یا اس کے ساتھ کچھ شریک بنا رکھے تھے اور بندوں کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ مسکین کو خود کھلانا تو دور کی بات ہے، کسی دوسرے کو اسے کھلانے کی ترغیب بھی نہیں دیتا تھا۔ اس نے اللہ کا حق پہچانا نہ بندوں کا۔

**آیت 35** فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ : ''حَمِيْمٌ'' دوست یا رشتہ دار، جسے اس کی خاطر گرمی آئے۔ ''حَمَّةٌ'' چشمے سے نکلنے والا گرم پانی۔ ''حَمِيْمٌ'' گرم پانی کو بھی کہتے ہیں۔

ع وَ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور نہ اس کے لیے زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے ﴿۳۶﴾ جسے گناہ گاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا ﴿۳۷﴾ پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس کی جسے تم دیکھتے ہو! ﴿۳۸﴾ اور جسے تم نہیں دیکھتے! ﴿۳۹﴾ بلاشبہ یہ (قرآن) یقیناً ایک معزز پیغام لانے والے کا قول ہے ﴿۴۰﴾ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو ﴿۴۱﴾ اور نہ کسی کاہن کا قول

**آیت 36** وَ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ: "غِسْلِيْنٍ" "غَسَلَ يَغْسِلُ" (ض) سے "فِعْلِيْنٌ" کا وزن ہے، زخم یا کوئی گندی چیز دھونے سے نکلنے والا پانی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "اس سے مراد جہنمیوں کے زخموں سے نکلنے والا لہو اور پیپ ہے۔" [ طبري بسند حسن ]

**آیت 37** لَا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ : "الْخَاطِـُٔوْنَ" "خَاطِئٌ" کی جمع ہے، جو جان بوجھ کر نادرست کام کرے، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴾ [ بني إسرائيل : ۳۱ ] "بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے۔" اگر کسی سے قصد وارادہ کے بغیر نادرست کام ہو جائے تو وہ "مخطی" ہے۔ (المفردات والتسہیل)

**آیت 38، 39** فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ...... : کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شاعر کہتے، کبھی کاہن، کبھی یہ کہتے کہ اس نے یہ کلام اپنے پاس سے بنا کر اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا ہے، کبھی کہتے کسی دوسرے آدمی نے اسے بنا کر دیا ہے، کبھی کہتے یہ پریشان خواب و خیال ہیں، کبھی آپ کو دیوانہ قرار دیتے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۵)، صافات (۳۶)، طور (۲۹) اور سورۂ نحل (۱۰۳) ان تمام باتوں کا اللہ تعالیٰ نے الگ الگ جواب بھی دیا ہے، مگر ان آیات میں ایک ہی جگہ دلیل کے ساتھ سب باتوں کی تردید فرما دی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ "پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس کی جسے تم دیکھتے ہو! اور جسے تم نہیں دیکھتے!" قسم سے پہلے "لَا" کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست نہیں۔ قسم کا مقصد کسی بات کی تاکید ہوتا ہے اور عام طور پر قسم اس بات کے لیے دلیل اور شاہد ہوتی ہے، یہاں جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس میں خالق و مخلوق، ماضی، حال و مستقبل، زمین و آسمان اور دنیا و آخرت، غرض سب کچھ آ جاتا ہے۔ قرآن میں مذکور قسموں میں یہ سب سے جامع قسم ہے، یعنی جو کچھ تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے، میں ان سب کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔

**آیت 40 تا 43** ❶ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ...... : یہ چار آیات جواب قسم ہیں، پہلی یہ کہ یہ قرآن ایک معزز پیغام لانے والے کا قول ہے، دوسری یہ کہ یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تیسری یہ کہ یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں اور چوتھی یہ کہ یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اس قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ ان چاروں چیزوں کے حق ہونے کی شہادت دے رہا ہے اور جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے وہ یہ بات

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿٤٣﴾

ہے، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو ﴿٤٢﴾ (یہ) جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے ﴿٤٣﴾

جاننے کے لیے کافی تھا کہ یہ قرآن جس شخص کی زبان سے ادا ہو رہا ہے وہ نہ شاعر ہے نہ کاہن، نہ جھوٹا ہے نہ اپنے پاس سے بات گھڑنے والا اور نہ کسی ذاتی مفاد یا عہدے کا طالب، بلکہ وہ اللہ کا معزز رسول ہے۔ یہی بات ہرقل نے کہی تھی، جب اس نے ابوسفیان سے آپ کے متعلق سوال کیے اور ابوسفیان کو آپ کے اوصافِ حمیدہ کی شہادت دینا پڑی۔ (دیکھیے بخاری: ۷) اور یہی بات آپ نے اللہ کے حکم سے اہلِ مکہ سے کہی تھی: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهٖ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ [ یونس: ۱۶ ] ''اعلانِ نبوت سے پہلے میں نے (چالیس سال کی) ایک عمر تم میں گزاری ہے، کیا تم عقل نہیں کرتے؟'' وہ رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق، صدق و امانت، ایفائے عہد اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کو بھی دیکھ رہے تھے اور شاعروں کے جھوٹ، مبالغے، قول و فعل کے تضاد اور خوشامد و تملق جیسی کمینگیوں کو بھی جانتے تھے۔

❷ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی کہی ہوئی باتوں کا بھی مشاہدہ کیا تھا کہ نہ ماضی کے متعلق آپ کی بتائی ہوئی کوئی بات خلافِ واقعہ نکلی نہ آئندہ کے متعلق آپ کی کوئی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی اور کاہنوں کی غیب کے متعلق بتائی باتوں کا بھی تجربہ کیا تھا کہ ان کی ملأ اعلیٰ سے چرائی ہوئی کوئی ایک بات اگر درست نکلتی ہے تو سو باتیں جھوٹ بھی نکلتی ہیں۔ شاعروں اور کاہنوں کے مقابلے میں آپ کے احوال کا مشاہدہ اس بات کے یقین کے لیے کافی تھا کہ آپ نہ شاعر ہیں نہ کاہن۔ انھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، مگر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ قرآن مجید کے چیلنج کے باوجود وہ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی سورت بھی نہیں لا سکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ بھی شہادت دے رہا ہے کہ یہ قرآن ایک معزز رسول کی زبان سے پہنچایا جا رہا ہے۔ یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے، نہ کاہن کا اور جو کچھ تم نہیں دیکھتے خواہ وہ عقل سے سمجھ میں آنے والی چیزیں ہوں، جو حواسِ خمسہ کی دسترس سے باہر ہیں یا عقل سے بھی ماورا ہوں، سب کی شہادت وہی ہے جو تمھاری دیکھی ہوئی چیزوں کی ہے۔ میں ہر چیز کو پیدا کرنے والا اس بات پر تمھاری دیکھی ہوئی اور تمھاری نہ دیکھی ہوئی تمام چیزوں کی قسم اٹھاتا ہوں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام پر قرآن کو رسول اللہ ﷺ کا قول قرار دیا گیا ہے، جب کہ سورۂ مدثر (۲۵) میں اس شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے جس نے کہا تھا: ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ کہ یہ قرآن تو بشر کا قول ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ مدثر میں جہنم کی وعید اس لیے سنائی گئی کہ اس شخص نے قرآن کو بشر کا اپنا قول قرار دیا تھا، جب کہ زیرِ تفسیر آیت میں اسے بشر کا یا انسان کا اپنا قول نہیں کہا گیا بلکہ اسے رسول کریم، یعنی ایک معزز پیغام لانے والے کا قول کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے پیغام لانے والے کی بات اپنی نہیں ہوتی بلکہ اسے جو پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے وہ اسے آگے پہنچا دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی بات کرتا ہے تو وہ رسول نہیں۔ اس کی ایک اور دلیل بعد میں آنے والی آیت ''تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِينَ'' (یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے) بھی ہے۔ بشر کی اپنی بات میں اور قاصد ہونے کی حیثیت سے پہنچائی ہوئی بات میں جو فرق ہے

وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝

**اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا ۝ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے ۝ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے ۝ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا ۝**

وہ بالکل واضح ہے۔ سورۂ تکویر میں جو قرآن مجید کو ''رسول کریم'' کا قول قرار دیا گیا ہے، وہاں اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہاں انھی کی صفتیں بیان ہوئی ہیں، مثلاً: ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ [ التکویر : ۲۰، ۲۱ ] ''بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے۔ وہاں اس کی بات مانی ہوئی ہے، امانت دار ہے۔''

بعض مفسرین نے یہاں بھی جبریل علیہ السلام مراد لیے ہیں مگر یہاں نبی ﷺ مراد لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ یہاں قرآن کو رسول کریم کا قول قرار دینے کے بعد فرمایا، یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں۔ ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریل علیہ السلام کو نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کو شاعر و کاہن قرار دیتے تھے۔ بہر حال اسے جبریل علیہ السلام کا قول قرار دیا جائے یا رسول اللہ ﷺ کا، دونوں صورتوں میں ان کا قول اس حیثیت سے ہے کہ وہ رسول تھے اور انھوں نے وہی آگے پہنچایا جو دے کر انھیں بھیجا گیا تھا۔ ''**كَاهِنٍ**'' ستاروں وغیرہ کا حساب لگا کر یا جنّوں سے سن کر غیب کی خبریں بتانے والا۔

**آیت 44 تا 47** **وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ**...... : ان آیات میں کفار کی اس بات کا رد ہے کہ یہ باتیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے دل سے بنا کر اللہ کے ذمے لگا دی ہیں۔ فرمایا جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور آپ کی کہی ہوئی ہر بات اللہ کی بات ہے تو اب اگر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے ذمے باتیں لگانے دے اور اس پر انھیں کچھ نہ کہے تو وہ سب باتیں اللہ کی باتیں سمجھی جائیں گی، اللہ تعالیٰ اس کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے؟ فرمایا، اگر ہمارا یہ سچا رسول کوئی بات گھڑ کر ہمارے ذمے لگا دیتا تو اس جعل سازی کے جرم میں ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے اور کوئی شخص رستے میں رکاوٹ نہ بن سکتا۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے غلط استدلال کیا ہے کہ اگر کسی مدعی نبوت کی جان کی رگ دعوائے نبوت کرتے ہی نہ کاٹ دی جائے تو یہ اس کے نبی ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ سچے نبی کے بارے میں ہے، نبوت کے جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ جھوٹے مدعی تو نبوت ہی نہیں خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور مدتوں زمین پر دندناتے رہتے ہیں، یہ ان کے سچے ہونے کا ثبوت نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جس طرح بادشاہ کسی شخص کو کسی منصب پر مقرر کر کے سند وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں، اب اگر وہ کوئی بات جھوٹ گھڑ کر بادشاہ کے ذمے لگا دے تو فوراً بادشاہ کی طرف سے اس کی تردید کی جاتی ہے اور ایسا کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی سڑک کوٹنے والا مزدور یا صفائی کرنے والا بھنگی اعلان کرتا پھرے کہ بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا ہے تو نہ سننے والے اس کی پروا کرتے

وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۸ وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ۝۴۹ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰

**اور بے شک یہ (قرآن) ڈرنے والوں کے لیے یقیناً ایک نصیحت ہے ۝۴۸ اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ بے شک تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں ۝۴۹ اور بے شک وہ یقیناً کافروں کے لیے حسرت (کا باعث) ہے ۝۵۰**

ہیں اور نہ حکومت فوراً اس سے تعرض کرتی ہے۔ ہمارے زمانے کے دجال قادیانی کا اس آیت سے استدلال اور خود اس کے کلام میں سے اس کا رد دیکھنے کے لیے تفسیر ثنائی ملاحظہ فرمائیں۔ [ فَإِنَّهٗ يَكْفِي وَ يَشْفِي رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى رَحْمَةً وَاسِعَةً ]

"**تَقَوَّلَ**" کا معنی ہے، کسی کے ذمے وہ بات لگانا جو اس نے نہیں کہی۔ "**الْاَقَاوِيْلِ**" "أُقْوُوْلَةٌ" کی جمع ہے، جس طرح "أُعْجُوْبَةٌ" اور "أُضْحُوْكَةٌ" کی جمع "أَعَاجِيْبُ" اور "أَضَاحِيْكُ" ہے۔ "**لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ**" سے مراد یا تو یہ ہے کہ ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی گردن کی رگ کاٹ دیتے۔ یہ سزا کی ہولناکی دکھانے کے لیے قتل کی تصویر کشی ہے، کیونکہ جب قتل کرنے والا کسی مجرم کو تلوار مارنے لگتا ہے تو اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگِ جان کاٹ دیتے۔ بعض مفسرین نے "اَلْيَمِيْنُ" کا معنی قوت کیا ہے، یعنی ہم اسے پوری قوت سے پکڑ کر اس کی رگِ جان کاٹ دیتے۔ عرب کے محاورہ میں یہ معنی بھی استعمال ہوتا ہے، مگر یہ معنی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا انکار کر دینا درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ**﴾ [ المائدۃ : ۶۴ ] "بلکہ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( كِلْتَا يَدَيْ رَبِّيْ يَمِيْنٌ مُبَارَكَةٌ )) [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب : ۳۳۶۸۔ مسند : ۱۸۲۷ ] "میرے رب کے دونوں ہاتھ دائیں اور برکت والے ہیں۔" البتہ اس بات میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں جیسے نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿**لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ**﴾ [ الشوریٰ : ۱۱ ] "اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔" بلکہ اس طرح ہیں جس طرح اس کی شان کے لائق ہیں۔ "**الْوَتِيْنَ**" گردن کی وہ رگ جو دل سے ملتی ہے، جس کے کٹنے سے آدمی فوراً مر جاتا ہے۔ (اشرف الحواشی)

**آیت 48** **وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ** : یعنی اس نصیحت سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

**آیت 49** **وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ ......** : "**اِنَّا لَنَعْلَمُ**" (ہم جانتے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان جھٹلانے والوں کو سزا دیں گے، جیسے فسادیوں کو ڈانٹنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو سب ہمیں معلوم ہے۔

**آیت 50** **وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ ......** : یعنی یہ جھٹلانا کفار کے لیے باعث حسرت ہوگا، یا یہ قرآن کفار کے لیے باعث حسرت و افسوس ہوگا کہ انھوں نے اسے کیوں جھٹلایا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿**رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ**﴾ [ الحجر : ۲ ] "بہت بار کافر آرزو کریں گے کہ کاش! وہ کسی طرح کے مسلم ہوتے۔"

وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۵

اور بلاشبہ وہ یقیناً ثابت شدہ یقین ہے ﴿۵۱﴾ پس اپنے بہت عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر ﴿۵۲﴾

آیت 51 وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ : "حَقٌّ" جو ثابت ہو اور "الْيَقِيْنِ" وہ بات جس میں کوئی شک نہ ہو۔ قرآن مجید سے یقین کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں، پہلا علم الیقین، وہ یقین جو خبر وغیرہ سے معلوم ہو جائے، جیسے فرمایا: ﴿ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ﴾ [التکاثر: ٥، ٦] "ہرگز نہیں، کاش! تم یقینی جاننا جان لیتے کہ تم ضرور جہنم کو دیکھو گے۔" دوسرا عین الیقین، وہ یقین جو آنکھوں کے دیکھنے سے حاصل ہو۔ آنکھوں سے دیکھی ہوئی بات کا یقین سنی ہوئی بات کے یقین سے قوی ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ )) [ مسند أحمد : ۱/ ۲۱۵، ح : ۱۸٤۲۔ صحیح الجامع الصغیر : ۵۳۷۳ ] "سننا دیکھنے کی طرح نہیں۔" ابراہیم علیہ السلام نے "رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى" کہہ کر یقین کے اس مرتبہ کی درخواست کی تھی۔ (دیکھیے بقرۃ: ۲٦۰) تیسرا حق الیقین، وہ یقین جو کسی چیز کو خود استعمال کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ہر طرح سے پختہ اور ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ پہلے دونوں درجوں سے بڑھ کر ہے۔ ان تینوں درجوں کی مثال یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بتانے سے جنت کا یقین ہے، یہ علم الیقین ہے۔ جب میدانِ محشر میں جنت قریب لائی جائے گی (دیکھیے شعراء: ۹۰) اور وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیں گے تو یہ عین الیقین ہے۔ پھر جب اس میں داخل ہوں گے اور اس کی نعمتوں سے لذت اٹھائیں گے تو انھیں حق الیقین حاصل ہوگا۔ فرمایا یہ قرآن حق الیقین ہے، یعنی قرآن میں جو علوم و معارف اور حقائق بیان ہوئے ہیں، جو شخص ان کی لذت سے آشنا ہو جائے اس کے لیے یہ ہر طرح سے ثابت شدہ یقین ہے۔ (خلاصہ بدائع التفسیر و تفسیر عبد الرحمٰن السعدی)

آیت 52 فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ : یعنی یہ مانیں یا نہ مانیں، آپ اپنے عظمت والے رب کے نام کی، جس کا یہ کلام ہے، تسبیح بیان کرتے رہیں۔ اس کی برکت سے آپ کے لیے ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ اس آیت کے بعد بھی اور رکوع میں بھی "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" پڑھنا چاہیے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں کھڑے ہو گئے، آپ ﷺ نے ایک ہی رکعت میں سورۂ بقرہ، نساء اور آل عمران پڑھیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے رہتے، جب آپ کسی ایسی آیت پر سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ تسبیح پڑھتے، جب کسی سوال والی آیت پر سے گزرتے تو سوال کرتے، جب پناہ مانگنے کی آیت پر سے گزرتے تو پناہ مانگتے۔ پھر آپ نے رکوع کیا اور آپ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" پڑھتے رہے، آپ کا رکوع قیام کی مثل تھا۔ پھر آپ نے "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہا، پھر آپ رکوع کے قریب دیر تک کھڑے رہے پھر آپ نے سجدہ کیا اور سجدہ میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" پڑھتے رہے۔ [ مسلم، صلاة المسافرین، باب استحباب تطویل القراءة في صلوة اللیل : ۷۷۲ ]

سورۃ المعارج ۷۰ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — آیاتھا ۴۴، رکوعاتھا ۲

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَہٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰہِ ذِی الۡمَعَارِجِ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کے متعلق سوال کیا جو واقع ہونے والا ہے ① کافروں پر، اسے کوئی ہٹانے والا نہیں ② اللہ کی طرف سے، جو سیڑھیوں والا ہے ③

آیت 2،1 ① سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ …… : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ایک پوچھنے والے نے عذاب کے متعلق سوال کیا ہے (کہ وہ کب آئے گا؟) اس صورت میں ''باء'' بمعنی ''عَنْ'' ہوگی اور مراد وہ کفریہ سوال ہے جو وہ بار بار عذاب کو جھٹلانے اور مذاق کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴾ [ الملک : ۲۵ ] ''اور وہ کہتے ہیں کہ وہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو؟'' دوسرا معنی یہ ہے کہ ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے۔ اس سے مراد کفار کے سرکش لوگوں کی وہ دعا ہے جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! محمد (ﷺ) جو کچھ لے کر آئے ہیں اگر یہ حق ہے تو تُو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی درد ناک عذاب لے آ۔ (دیکھیے انفال : ۳۲) اور کفار کا وہ مطالبہ بھی مراد ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے کرتے رہتے تھے کہ ہم پر جلد از جلد عذاب لے آؤ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ ﴾ [ العنکبوت : ۵۳ ] ''اور یہ لوگ آپ سے جلدی عذاب لانے کا سوال کرتے ہیں۔''

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، پوچھنے والا عذاب کے متعلق پوچھتا ہے کہ وہ کب آئے گا؟ مانگنے والا مطالبہ کرتا ہے کہ عذاب لے آؤ، تو سن لو کہ وہ عذاب کافروں پر ضرور آکر رہے گا اور کوئی اسے ہٹا نہیں سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر آئے گا۔ آپ ان کے مطالبے پر نہ اس کے جلدی آنے کا سوال کریں اور نہ ان کے مذاق اڑانے پر کسی قسم کی بے صبری کا مظاہرہ کریں، وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں اور ہمیں وہ بالکل قریب نظر آ رہا ہے۔

② لِّلۡکٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَہٗ دَافِعٌ : ''لِلۡکٰفِرِیۡنَ'' یا تو ''وَاقِعٍ'' کے متعلق ہے، یعنی وہ عذاب کافروں پر واقع ہونے والا ہے، کوئی اسے ہٹا نہیں سکتا، یا ''دَافِعٌ'' کے متعلق ہے، یعنی کافروں سے اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔

آیت 3 مِّنَ اللّٰہِ ذِی الۡمَعَارِجِ : ''الۡمَعَارِجِ'' ''عَرَجَ یَعۡرُجُ'' (ن) سے ''مِعۡرَجٌ'' کی جمع ہے، چڑھنے کا آلہ، سیڑھی، زینہ۔ یعنی اس عذاب کو معمولی نہ سمجھو، بلکہ وہ اس اللہ کی طرف سے ہوگا جو سیڑھیوں والا ہے، یعنی اس کی ذات بہت ہی بلند ہے۔ فرشتوں کو اس کے حضور پیش ہونے کے لیے کئی سیڑھیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ''الۡمَعَارِجِ'' (سیڑھیوں) سے مراد آسمان ہیں، کیونکہ فرشتے آسمانوں پر چڑھتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝

فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، (وہ عذاب) ایک ایسے دن میں (ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے ④

**آیت 4** ① **تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ** : فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں۔ یہاں "**الرُّوْحُ**" سے مراد یا تو جبریل علیہ السلام ہیں، کیونکہ قرآن میں ان کا نام "**الرُّوْحُ**" ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ [الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴] "اس قرآن کو روح الامین نے تمھارے دل پر نازل کیا ہے۔" اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۹۷] "کہہ دو جو جبریل کا دشمن ہے (وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟) کیونکہ بلاشبہ اس نے تو اسے تمھارے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے۔" دونوں آیتیں ملانے سے ثابت ہوتا ہے کہ "**الرُّوْحُ**" سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ فرشتوں سے ان کا الگ ذکر ان کی عظمت شان کی وجہ سے ہے۔ یا مراد مومنوں کی ارواح ہیں، کیونکہ نیک لوگ جب فوت ہوتے ہیں تو فرشتے ان کی ارواح کو آسمان کی طرف لے کر جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے ان کے لیے کھلتے چلے جاتے ہیں، جیسا کہ ابو ہریرہ اور براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی صحیح احادیث میں آیا ہے۔ [دیکھیے نسائي، الجنائز، باب ما یلقی به المؤمن ...: ۱۸۳۴۔ أبوداؤد: ۴۷۵۳] البتہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والوں کی ارواح کو لے کر فرشتے چڑھتے ہیں تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۴۰) اور مذکورہ بالا احادیث۔

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا بلندی پر ہونا اور فرشتوں اور روح کا اس کی طرف چڑھنا صاف ثابت ہو رہا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے اوپر کی جانب ہونے اور عرش پر ہونے کے منکر ہیں وہ قرآن مجید کی صریح آیات سن کر بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا رب اوپر کی جانب ہے۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زمان و مکان کی قیود سے منزہ ہے، حالانکہ یہ کسی نے کہا ہی نہیں کہ بلندی یا عرش اس کے لیے قید ہے یا وہ ان کا محتاج ہے۔

② "**فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ**" (ایک ایسے دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے، یعنی وہ اتنی بلندی پر ہے کہ فرشتوں اور روح کو اس کی بارگاہ میں پہنچنے کے لیے اتنی بلندیوں پر چڑھنا پڑتا ہے کہ کوئی اور چڑھے تو اسے پچاس ہزار سال لگ جائیں، مگر فرشتے اور روح وہ فاصلہ ایک دن میں طے کر لیتے ہیں۔ (ابن جریر) واضح رہے کہ پچاس ہزار سال کا عدد بھی صرف فاصلے کی دوری بیان کرنے کے لیے ہے، کیونکہ انسان کی محدود نظروں نے آلات کی مدد سے جو کچھ دیکھا ہے اس سے آسمان کے نیچے ہی اتنی وسیع کہکشائیں معلوم ہوئی ہیں کہ زمین سے ان کے ستاروں کے فاصلے ماپنے کے لیے "نوری سال" کی اصطلاح وضع کرنا پڑی۔ عربی زبان میں پچاس، سو، ہزار وغیرہ کا عدد کثرت کے بیان کے لیے عام استعمال ہوتا ہے، اس سے مراد گنتی نہیں ہوتی۔ فرشتے اور روح اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی قوت و سرعت کی بدولت

﴿ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ ﴾

پس تو صبر کر، بہت اچھا صبر ⑤ بے شک وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں ⑥ اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں ⑦

تحت الثریٰ سے لے کر ساتوں آسمانوں کے اوپر تک پچاس ہزار سال کا یہ فاصلہ ایک ہی دن میں طے کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت سے ہر کام سات آسمانوں پر سے اتنی جلدی ہو جاتا ہے تو ان عذاب مانگنے والوں پر عذاب کے آنے میں کیا دیر لگتی ہے، بس تھوڑا سا صبر کریں۔ آیت کے الفاظ کی رو سے یہ معنی قریب ہے، کیونکہ "فِيْ يَوْمٍ" سے متصل پہلے ہی "تَعْرُجُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ" آیا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب ایک ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے، اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس صورت میں "فِيْ يَوْمٍ" کا لفظ "وَاقِعٍ" کے متعلق ہے۔ یہ معنی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صحیح حدیث سے بھی۔ اس لیے حافظ ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ سورۂ طور کے شروع میں فرمایا: ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴾ [ طور : ۷ تا ۱۰ ] "یقیناً تیرے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہنے والا ہے۔ اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ جس دن آسمان لرزے گا سخت لرزنا اور پہاڑ چلیں گے، بہت چلنا۔" ان آیات میں بھی رب تعالیٰ کا عذاب، جسے کوئی ہٹانے والا نہیں، قیامت کے دن واقع ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ زیر تفسیر آیات میں بھی "فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ" کے چند آیات بعد فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴾ [ المعارج : ۸، ۹ ] "(یہ پچاس ہزار سال والے دن کا عذاب اس دن ہوگا) جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔" جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ "اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا" سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ نہ دینے والے کو قیامت کے دن ہونے والے عذاب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا: (( حَتّٰی يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَ عِبَادِهٖ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ )) [ أبو داوٗد، الزکاۃ، باب في حقوق المال : ۱۶۵۸۔ مسلم : ۹۸۷ ] "(زکوٰۃ نہ دینے والے کو عذاب ہوتا رہے گا) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھاری گنتی سے پچاس ہزار سال ہے۔" قیامت کے دن کی یہ درازی کفار کے لیے ہوگی اور یہ دوسرے عذاب کے ساتھ بجائے خود ایک عذاب ہوگی، ویسے بھی مصیبت کے دن لمبے ہوتے ہیں۔ رہے اہل ایمان تو وہ اس دن بالکل بے فکر ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ [ یونس : ۶۲ ] "نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔" اور فرمایا: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ﴾ [ الأنبیاء : ۱۰۳ ] "انھیں سب سے بڑی گھبراہٹ غمگین نہیں کرے گی اور انھیں فرشتے لینے کے لیے آئیں گے۔" اور فرمایا: ﴿ وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴾ [ النمل : ۸۹ ] "اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔" خوشی کے دن گزرنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔

**آیت 5 تا 7** ﴿ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴾ ...... : یعنی آپ کفار کی طرف سے عذاب کے مطالبے اور مذاق پر صبر کریں۔ "صَبْرًا

يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ۝۸ وَ تَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ ۝۹ وَ لَا يَسۡـَٔلُ حَمِيۡمٌ حَمِيۡمًا ۝۱۰ يُّبَصَّرُوۡنَهُمۡ ؕ يَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ يَفۡتَدِىۡ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِئِذٍۢ بِبَنِيۡهِ ۝۱۱ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيۡهِ ۝۱۲ وَ فَصِيۡلَتِهِ الَّتِىۡ تُـْٔوِيۡهِ ۝۱۳ وَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ ثُمَّ يُنۡجِيۡهِ ۝۱۴ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۝۱۵ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶

جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا ۸ اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے ۹ اور کوئی دلی دوست کسی دلی دوست کو نہیں پوچھے گا ۱۰ حالانکہ وہ انھیں دکھائے جا رہے ہوں گے۔ مجرم چاہے گا کاش کہ اس دن کے عذاب سے (بچنے کے لیے) فدیے میں دے دے اپنے بیٹوں کو ۱۱ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو ۱۲ اور اپنے خاندان کو، جو اسے جگہ دیا کرتا تھا ۱۳ اور ان تمام لوگوں کو جو زمین میں ہیں، پھر اپنے آپ کو بچا لے ۱۴ ہرگز نہیں! یقیناً وہ (جہنم) ایک شعلہ مارنے والی آگ ہے ۱۵ منہ اور سر کی کھال کو اتار کھینچنے والی ہے ۱۶

جَمِيۡلًا" جس میں نہ تنگدلی ہو نہ گھبراہٹ، نہ جلد بازی ہو، نہ شکوہ اور نہ شکایت۔ یہ لوگ اس عذاب کو بعید سمجھ رہے ہیں، کیونکہ ان کا اس پر ایمان نہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں، کیونکہ اس کا آنا یقینی ہے اور تمھارے پچاس ہزار سال ہمارے ہاں ایک دن شمار ہوتے ہیں۔

**آیت 8، 9** يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ...... : "كَالۡمُهۡلِ" یعنی آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح (سرخ اور گرم ہو کر پھٹ جائے گا)۔ (دیکھیے رحمان: ۳۷) "اَلۡعِهۡنُ" اُون، یعنی پہاڑ دھنی ہوئی اُون کی طرح بالکل ہلکے ہو کر اڑنے لگیں گے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۰۵)۔ قارعہ (۵)۔

**آیت 10 تا 14** وَ لَا يَسۡـَٔلُ حَمِيۡمٌ حَمِيۡمًا ...... : کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھے گا، اس لیے نہیں کہ وہ دکھائی نہیں دے رہا ہوگا، بلکہ "يُبَصَّرُوۡنَهُمۡ" ہر شخص کو اس کے عزیز دوست دکھلائے جا رہے ہوں گے اور آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ نہ پوچھنے کی وجہ یہ ہوگی کہ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی، مجرم دنیا میں جن جن پر اپنی جان قربان کرتا تھا اس دن سب کو، بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو اپنی جان بچانے کے لیے عذاب الٰہی کے حوالے کر دینا پسند کرے گا۔ اس مقام پر رشتہ داروں کی ترتیب میں پہلے ان کا ذکر کیا جو سب سے زیادہ محبوب ہیں، یعنی بیٹے، بیوی، بھائی، خاندان اور سورۂ عبس (۳۴ تا ۳۶) میں اس کا الٹ ہے۔ "فَصِيۡلَتِهِ" خاندان، کنبہ، کیونکہ وہ قبیلے سے جدا ہوتا ہے۔ "تُـْٔوِيۡهِ" "اٰوٰی يُؤۡوِيۡ" (افعال) جگہ دینا، پناہ دینا۔

**آیت 15** كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى : "كَلَّا" یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ وہ اپنے فدیے میں کسی اور کو عذاب کے حوالے کر کے بچ جائے، بلکہ وہ جہنم ایک شعلے مارنے والی آگ ہے۔ "لَظٰى" "لَظِيَ يَلۡظٰى لَظًى" (ع) آگ کا بھڑکنا، شعلے مارنا۔ مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے۔

**آیت 16** نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى : "نَزَّاعَةً" مبالغے کا صیغہ ہے، بہت اتار کھینچنے والی۔ "اَلشَّوٰى" "شَوَاةٌ" کی جمع ہے،

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ﴿۱۷﴾ وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾

وہ (ہر) اس شخص کو پکارے گی جس نے پیٹھ پھیری اور منہ موڑا ﴿۱۷﴾ اور (مال) جمع کیا اور اسے بند رکھا ﴿۱۸﴾ بلاشبہ انسان تھڑدلا بنایا گیا ہے ﴿۱۹﴾ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے ﴿۲۰﴾ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے ﴿۲۱﴾

سر اور چہرے کی کھال۔ جمع کا لفظ اس کے اجزا کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ مبالغے کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کے شعلے کی لپیٹ فوراً ہی سر اور چہرے کی کھال جلا کر اتار کھینچے گی اور یہ بھی کہ وہ کھال بار بار درست ہوتی رہے گی اور آگ کا شعلہ اسے بار بار جلاتا رہے گا، البتہ دل قائم رہے گا تاکہ عذاب کی تکلیف برقرار رہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۵۶)۔

**آیت 17، 18** ① **تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى :** یعنی جن لوگوں نے دنیا میں ایمان کی طرف بلائے جانے پر پیٹھ پھیر لی اور منہ موڑ لیا تھا اب جہنم انھیں اپنی طرف بلائے گی اور اس طرح نہیں بلائے گی کہ چاہیں تو جائیں اور چاہیں تو نہ جائیں۔

② **وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى :** "أَوْعٰى" "وِعَاءٌ" برتن کو کہتے ہیں، یعنی برتن میں بند رکھا۔ پچھلی آیت اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کے جہنم میں جانے کے دو بڑے اسباب ہیں، ایک ایمان نہ لانا بلکہ حق بات سن کر منہ پھیر لینا اور دوسرا شدید بخل۔ دیکھیے سورۂ حاقہ (۳۳، ۳۴)۔

③ جہنم کا کلام کرنا ان آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے اور سورۂ ق کی آیت (۳۰): ﴿وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ سے بھی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَخْرُجُ عُنُقٌ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَهُ عَيْنَانِ تُبْصِرَانِ وَأُذُنَانِ تَسْمَعَانِ وَلِسَانٌ يَنْطِقُ يَقُوْلُ إِنِّيْ وُكِّلْتُ بِثَلَاثَةٍ بِكُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ وَبِكُلِّ مَنْ دَعَا مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ وَ بِالْمُصَوِّرِيْنَ » [ ترمذي، صفة جهنم، باب ما جاء في صفة النار : ۲۵۷۴، وصححه الألباني ] "قیامت کے دن آگ سے ایک گردن نکلے گی جس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھتی ہوں گی اور دو کان ہوں گے جو سنتے ہوں گے اور ایک زبان ہوگی جو بولتی ہوگی۔ وہ کہے گی کہ مجھے تین (قسم کے آدمیوں) پر مقرر کیا گیا ہے، ہر جبار عنید پر اور ہر اس شخص پر جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنائے اور مصوروں پر۔" اسی طرح صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت اور دوزخ کی بحث کی حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، اس لیے جہنم کے کلام کا انکار کرنا یا اس کی تاویل کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید کے مطابق قیامت کے دن زمین بھی بات کرے گی اور ہاتھ پاؤں اور چمڑے بھی گفتگو کریں گے، پھر جنت یا جہنم کے بولنے میں کیا تعجب ہے؟

**آیت 19 تا 21** **اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ......:** یعنی انسان میں پیدائشی طور پر یہ کمزوری رکھی گئی ہے کہ وہ تھڑدلا ہے، بے صبرا ہے۔ تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جاتا ہے، مال یا کوئی اور نعمت ملتی ہے تو روک کر بیٹھ جاتا ہے اور حق داروں کو نہیں دیتا، مگر یہ کمزوری ایسی نہیں کہ انسان اس پر قابو نہ پا سکے۔ اہلِ ایمان نہ مصیبت میں گھبراتے ہیں اور نہ خوش حالی میں

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾

سوائے نماز ادا کرنے والوں کے ﴿۲۲﴾ وہ جو اپنی نماز پر ہمیشگی کرنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حصہ ہے ﴿۲۴﴾ سوال کرنے والے کے لیے اور (اس کے لیے) جسے نہیں دیا جاتا ﴿۲۵﴾

اتراتے ہیں۔ صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ )) [ مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير : ۲۹۹۹ ] ''مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے سب کام ہی (اس کے لیے) خیر ہیں اور مومن کے علاوہ یہ چیز کسی کو حاصل نہیں، (اس طرح کہ) اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے، سو وہ اس کے لیے خیر ہوتی ہے اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، سو وہ (بھی) اس کے لیے خیر ہوتی ہے۔'' مگر اس کے لیے کوشش یقیناً کرنا پڑتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( وَمَنْ يَّسْتَعِفَّ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ وَ مَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ )) [ مسلم، الزكاة، باب فضل العفف والصبر...... : ۱۰۵۳ ] ''جو شخص سوال سے بچے گا اللہ اسے بچا لے گا، جو اللہ سے غنا مانگے گا اللہ اسے غنی کر دے گا اور جو صبر کی کوشش کرے گا اللہ اسے صابر بنا دے گا۔''

**آیت 23،22** اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ...... : مگر نمازی بے صبرے اور تھڑدلے نہیں ہوتے، وہ نہ مصیبت پر شکوہ شکایت کرتے ہیں اور نہ نعمت ملنے پر بخل کرتے ہیں۔ نماز کی صحیح ادائیگی سے آدمی میں وہ عزم اور ہمت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی تمام کمزوریوں پر قابو پالیتا ہے، کیونکہ روزانہ پانچ وقت دنیا کے کسی لالچ کے بغیر پورے شروط و آداب کے ساتھ نماز ادا کرنا بہت ہی مشکل کام ہے جو اللہ کے خوف اور آخرت پر ایمان کے بغیر ادا ہو ہی نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [ البقرة : ٤٥، ٤٦ ] ''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو اور بے شک وہ بہت بڑی ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر۔ جو سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

آیات (۲۳) تا (۳۴) میں وہ صفات بیان فرمائی ہیں جن کے بغیر نمازی بھی ''ہلوع'' (تھڑدلا) ہی رہتا ہے۔ ان میں سے پہلی صفت اپنی نماز پر ہمیشگی ہے، یہ نہیں کہ کبھی پڑھ لی کبھی چھوڑ دی، کیونکہ جونہی نماز ترک کرے گا، تو صرف بے صبری اور بخل ہی واپس نہیں آئیں گے بلکہ کفر بھی دوبارہ اس میں پلٹ آئے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( بَيْنَ الْعَبْدِ وَ بَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ )) [ أبو داوٗد، السنة، باب في رد الإرجاء : ٤٦٧٨۔ مسلم : ۸۲ ] ''بندے اور کفر کے درمیان نماز ترک کرنے کی دیر ہے۔''

**آیت 25،24** وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ...... : اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ و زکوٰۃ مکہ میں بھی فرض تھے اور وہاں بھی اہل ایمان اپنے اموال میں سے ایک مقرر حصہ نکالتے تھے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے، بلکہ مشرکین بھی اپنی کھیتی اور

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٢٧﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿٣٢﴾

اور وہ جو جزا کے دن کو سچا مانتے ہیں ﴿٢٦﴾ اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں ﴿٢٧﴾ یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسا ہے جس سے بے خوف نہیں ہوا جا سکتا ﴿٢٨﴾ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ﴿٢٩﴾ مگر اپنی بیویوں پر، یا جس کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں، تو یقیناً وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ﴿٣٠﴾ پھر جو اس کے علاوہ کوئی راستہ ڈھونڈے تو وہی حد سے گزرنے والے ہیں ﴿٣١﴾ اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں ﴿٣٢﴾

مویشیوں میں سے بتوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک مقرر حصہ نکالتے تھے۔ (دیکھیے انعام: ۱۳۶) اس سے بہت پہلے اسماعیل علیہ السلام بھی اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔ (دیکھیے مریم: ۵۵) ہاں زکوٰۃ کا موجودہ مخصوص نصاب مدینہ میں مقرر ہوا، اتنے فرض کی ادائیگی کے بغیر تو آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اہل ایمان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، یہ ہر شخص کی اپنی صوابدید ہے کہ وہ اس کی راہ میں کتنا حصہ مقرر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ صحیح مسلم میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے جس کا نام لے کر بادلوں کو حکم ہوا کہ اس کے باغ کو پانی پلائیں۔ وہ شخص اپنے باغ کی آمدنی کے تین حصے کرتا تھا، جس میں سے ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا تھا۔ [ دیکھیے مسلم: ۲۹۸٤ ] حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیے بغیر بے صبری اور بخل کی کمینگی دور ہو ہی نہیں سکتی۔ " **الْمَحْرُوْمِ** " میں وہ بھی شامل ہے جس کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں یا کسی آفت کی وجہ سے اپنے سرمایہ سے محروم ہو گیا ہے اور وہ بھی جسے ضرورت مند ہونے کے باوجود سوال نہ کرنے کی وجہ سے کچھ نہیں دیا جاتا۔

**آیت 26 تا 28** وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ...... : یعنی ان کے اعمال کا اصل محرک قیامت پر ایمان اور رب تعالیٰ کے عذاب کا خوف ہے۔

**آیت 29 تا 31** وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ...... : ان آیات سے بیوی اور لونڈی کے علاوہ جنسی خواہش پوری کرنے کے تمام ذرائع مثلاً زنا، متعہ، لڑکوں یا جانوروں سے بدفعلی اور استمنا بالید وغیرہ کی حرمت ثابت ہوئی، بلکہ ان اسباب کی حرمت بھی معلوم ہوئی جو آدمی کو ان چیزوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ مثلاً عریانی، غیر محرموں سے میل جول، گناہ پر ابھارنے والے گیت، ناول، افسانے اور فلمیں وغیرہ۔ مزید دیکھیے سورۂ مومنون (۵ تا ۷)۔

**آیت 32** وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ ...... : امانت و عہد کی حفاظت ایمان کی اور خیانت و بدعہدی نفاق کی علامت ہے، جیسا کہ نفاق کی علامات والی مشہور حدیث میں ہے۔ [ دیکھیے بخاری: ۳۳۔ مسلم: ۵۸ ] " اَمَانَاتٌ " کو جمع لانے سے مراد

وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ بِشَهٰدٰتِهِمۡ قَآئِمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۳۵﴾ فَمَالِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا قِبَلَكَ مُهۡطِعِیۡنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ عِزِیۡنَ ﴿۳۷﴾ اَیَطۡمَعُ كُلُّ امۡرِیًٔ مِّنۡهُمۡ اَنۡ یُّدۡخَلَ جَنَّةَ نَعِیۡمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّمَّا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۹﴾

اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں ﴿۳۳﴾ اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ﴿۳۴﴾ یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں ﴿۳۵﴾ پھر ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، کیا ہے کہ تیری طرف دوڑتے چلے آنے والے ہیں ﴿۳۶﴾ دائیں اور بائیں طرف سے ٹولیاں بن کر ﴿۳۷﴾ کیا ان میں سے ہر آدمی طمع رکھتا ہے کہ اسے نعمت والی جنت میں داخل کیا جائے گا؟ ﴿۳۸﴾ ہرگز نہیں! یقیناً ہم نے انھیں اس چیز سے پیدا کیا ہے جسے وہ جانتے ہیں ﴿۳۹﴾

یہ ہے کہ وہ صرف مال ہی نہیں بلکہ ہر اس امانت کی حفاظت کرتے ہیں جس کی ادائیگی اللہ تعالیٰ یا بندوں کی طرف سے ان کے ذمے ہے۔ اس میں نماز، روزہ اور دوسری فرض عبادات اور واجب حقوق العباد سب شامل ہیں۔

**آیت 33** وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ بِشَهٰدٰتِهِمۡ قَآئِمُوۡنَ: شہادتوں پر قائم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کی شہادت نہ چھپاتے ہیں، نہ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، نہ جھوٹی شہادت دیتے ہیں اور نہ شہادت کی ادائیگی کے وقت اس میں کوئی ہیرا پھیری کرتے ہیں، کیونکہ یہ سب کام نفاق و کفر کے کام ہیں۔ ''شہادات'' میں ایمان، توحید و رسالت اور لوگوں کے باہمی معاملات، غرض ہر حق بات کی شہادت شامل ہے۔

**آیت 34** وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ: نمازیوں کے اوصاف کا آغاز نماز پر ہمیشگی سے کیا اور ان کا اختتام نماز پر محافظت سے کیا ہے۔ اس سے نماز کی اہمیت صاف واضح ہو رہی ہے۔ محافظت سے مراد اس کے اوقات کا خیال رکھنا اور اس کے شروط و ارکان کی صحیح ادائیگی کا خیال رکھنا ہے۔ منافق نہ صحیح وقت پر نماز پڑھتا ہے اور نہ اطمینان و سکون سے اس کے ارکان کو درست طریقے سے ادا کرتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: « تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى إِذَا كَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَهَا أَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا » [ مسلم، المساجد، باب استحباب التبكير بالعصر : ٦٢٢ ] ''یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھ کر سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے (یعنی غروب ہونے کے قریب ہو جاتا ہے) تو اٹھ کر اس کے لیے چار ٹھونگے مار لیتا ہے، اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر کم۔''

**آیت 35** اُولٰٓئِكَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّكۡرَمُوۡنَ: یہی لوگ ہیں جو تھڑدلی، بے صبری اور شدید بخل سے محفوظ ہیں اور انھی کو جنتوں میں عزت عطا ہوگی۔

**آیت 36 تا 39** فَمَالِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا...... : ''مُهۡطِعِیۡنَ'' ''أَهْطَعَ يُهْطِعُ'' (افعال) سے اسم فاعل ہے، تیزی سے

فَلَآ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ۝۴۰ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ ۙ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ۝۴۱

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی! کہ بے شک ہم یقیناً قدرت رکھنے والے ہیں ۝۴۰ اس پر کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم ہرگز عاجز نہیں ہیں ۝۴۱

دوڑنے والے۔ "عِزِیْنَ" جمع ہے "عِزَةٌ" کی، جو اصل میں "عِزْوَةٌ" یا "عِزْهَةٌ" تھا، ٹولیاں، گروہ۔ کفار رسول اللہ ﷺ کو مذاق کرنے کے لیے ٹولیاں بنا بنا کر کبھی دائیں طرف سے دوڑے چلے آتے، کبھی بائیں طرف سے، وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے، آخرت کو بھی جھٹلاتے اور مذاق سے کہتے کہ اگر بالفرض کوئی جنت ہے بھی تو وہ بھی ہمارے ہی لیے ہے، کیونکہ دنیا میں بھی ہمیں ہی زیادہ نعمتیں ملی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرح آنے پر تعجب کا اظہار فرمایا اور فرمایا، کیا ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو اتنا اونچا سمجھنے لگ گیا ہے کہ وہ نعمت والی جنت میں داخل ہونے کی طمع رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں! ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے اسے وہ خود بھی جانتے ہیں، حقیر قطرے سے پیدا ہونے والے انسان کو یہ تکبر بھلا زیب دیتا ہے؟ اس مضمون کے لیے دیکھیے سورۂ مرسلات (۲۰ تا ۲۳) اور سورۂ طارق (۵ تا ۷)۔

ان آیات سے تین باتیں مقصود ہیں، ایک انسان کو تکبر سے باز رکھنا اور یہ یاد دلانا کہ تم منی جیسی حقیر چیز سے پیدا ہو کر اتنے بڑے بن رہے ہو کہ جنت میں داخل ہونے کو اپنا حق سمجھ رہے ہو، حالانکہ جنت کے قابل تو رسول کی اطاعت سے ہو گے جس پر ٹولیاں بنا کر حملہ آور ہو رہے ہو۔ دوسری کفار کے اس طمع کا رد کہ وہ جنت میں جائیں گے، گویا بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمھیں بھی اسی چیز سے پیدا کیا جس سے دوسروں کو پیدا کیا ہے، جب سب کی پیدائش ایک جیسی ہے تو تم عمل کے بغیر جنت میں داخل ہونے کے امیدوار کیسے بن گئے؟ تیسری بات دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل پیش کرنا ہے کہ جب ہم نے اس حقیر پانی سے تمھیں بنا لیا تو دوبارہ بنانا کون سا مشکل کام ہے؟ جیسے فرمایا: ﴿ اَلَمۡ یَكُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ﴾ [ القیامۃ : ۳۷ ] "کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے۔"

**آیت 40، 41** فَلَآ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ ...... : سورج مشرق سے ہر روز نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں نئی جگہ غروب ہوتا ہے۔ وہ جگہیں بھی ہر شہر اور ہر جگہ کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہیں، اس لحاظ سے مشرقوں اور مغربوں کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ قسم سے پہلے "لَا" کہہ کر منکرین کے قول کی نفی کی گئی ہے، پھر مشارق و مغارب کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ انھیں ختم کر کے ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم کچھ عاجز نہیں ہیں۔ قسم کی مناسبت یہ ہے کہ ہم مشارق و مغارب کے رب ہیں، آسمان و زمین اور سورج وغیرہ سب ہمارے قبضے میں ہیں، کوئی شخص ہمیں عاجز کر کے ہماری گرفت سے نکل نہیں سکتا۔ ہم جب چاہیں انھیں ہلاک کر سکتے ہیں اور ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لا سکتے ہیں، مگر ہم نے اپنی حکمت کی وجہ سے انھیں مہلت دے رکھی ہے۔ اس قسم اور جوابِ قسم سے ایک اور بات بھی نکل رہی ہے کہ

فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَ یَلۡعَبُوۡا حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۲﴾ یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّهُمۡ اِلٰی نُصُبٍ یُّوۡفِضُوۡنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَۃً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّۃٌ ؕ ذٰلِكَ الۡیَوۡمُ الَّذِیۡ کَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ع ۲

پس انھیں چھوڑ دے کہ وہ بے ہودہ باتوں میں لگے رہیں اور کھیلتے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن کو جا پہنچیں جس کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۴۲﴾ جس دن وہ قبروں سے تیز دوڑتے ہوئے نکلیں گے، جیسے وہ کسی گاڑے ہوئے نشان کی طرف دوڑے جا رہے ہیں ﴿۴۳﴾ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہوگی، یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿۴۴﴾

جب ہم ان سے بہتر ایک بالکل نئی مخلوق پیدا کر سکتے ہیں تو انھیں دوبارہ کیوں پیدا نہیں کر سکتے؟

**آیت 42** فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَ یَلۡعَبُوۡا...... : مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ اس کے بعد "یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ" اس سے بدل ہے۔ دنیا کے کھیل کود کی مہلت موت تک ہے اور موت قیامت کا دروازہ ہے۔

**آیت 43، 44** یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ...... : "الۡاَجۡدَاثِ" "جَدَثٌ" (جیم اور دال کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے، قبریں۔ "سِرَاعًا" "سَرِیۡعٌ" کی جمع ہے، دوڑنے والے۔ قیامت کے دن قبروں سے اتنی تیزی سے نکل کر دوڑیں گے جس طرح وہ لوگ تیزی سے دوڑتے ہیں جو نشانہ بازی کے وقت ایک نشان گاڑ لیتے ہیں، پھر تیر چلا کر تیزی سے دوڑتے ہیں، تاکہ جا کر دیکھیں کہ نشانہ درست لگا ہے یا نہیں۔ "نُصُبٍ" ان پتھروں کو بھی کہتے ہیں جو عبادت کے لیے نصب کیے جاتے ہیں۔ مشرکین دنیا میں بتوں اور آستانوں کی طرف تیزی سے جایا کرتے تھے۔ قیامت کے دن ایسے ہی قبروں سے نکل کر حشر کے میدان کی طرف تیزی سے دوڑتے ہوئے جائیں گے۔

سورۃ نوح ۷۱ مکیۃ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — آیاتھا ۲۸ رکوعاتھا ۲

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ① قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ② اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ③

**اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔**

**بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کو ڈرا، اس سے پہلے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے ① اس نے کہا اے میری قوم! بلاشبہ میں تمھیں کھلا ڈرانے والا ہوں ② کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ③**

---

ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''آدم اور نوح علیہ السلام کے درمیان کتنی مدت تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( عَشَرَةُ قُرُوْنٍ )) ''دس قرن۔'' [ صحیح ابن حبان، التاریخ، باب ذکر الإخبار عما کان ...... : ٦١٩٠ ] حافظ ابن کثیر نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ [ البدایة والنهایة، جلد : ١، قصة نوح ] ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: (( كَانَ بَيْنَ نُوْحٍ وَ آدَمَ عَشَرَةُ قُرُوْنٍ كُلُّهُمْ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْحَقِّ فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ))[ مستدرك حاكم : ٢/٥٤٦، ح : ٤٠٠٩ ] ''آدم اور نوح کے درمیان دس قرن تھے اور وہ سارے کے سارے دین حق پر قائم تھے، پھر جب انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا (جو انھیں جنت کی) خوش خبری دیتے اور (عذاب سے) ڈراتے تھے۔'' محقق حکمت بن بشیر نے ابن کثیر میں سورۂ بقرہ کی آیت (۲۱۳) کے تحت کہا کہ یہ حدیث طبری میں بھی ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شروع میں سب لوگ اللہ کی توحید پر قائم تھے اور شرک و بت پرستی کا وجود نہیں تھا، پھر جیسا کہ زیر تفسیر سورت کی آیت (۲۳) کی تشریح میں آرہا ہے کہ شیطان کے سکھانے سے بت پرستی شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں شرک سے منع کرنے اور اللہ واحد کی عبادت کی تبلیغ کے لیے نوح علیہ السلام کو بھیجا، آپ اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف بھیجے گئے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے۔ [ دیکھیے بخاری، الأنبیاء، باب : ﴿ ذرية من حملنا ...... ﴾ : ٤٧١٢ ] رسالت ملنے کے بعد آپ علیہ السلام ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال اپنی قوم کو سمجھاتے رہے، جب وہ نافرمانی سے باز نہ آئے تو انھیں پانی کے طوفان سے غرق کر دیا گیا۔ (دیکھیے عنکبوت : ۱۴) یہ پوری سورت نوح علیہ السلام کی دعوت، اس کے جواب میں قوم کے طرز عمل اور ان کے انجام کی تفصیل پر مشتمل ہے اور اس کا نام بھی اسی جلیل القدر پیغمبر کے نام پر ہے۔

**آیت 1** اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ ...... : نوح علیہ السلام کی قوم جس شرک اور بت پرستی میں گرفتار تھی اس کا لازمی نتیجہ دنیا اور آخرت میں عذابِ الیم تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ آگاہ کرنے اور ڈرانے کے بغیر عذاب نہیں دیتا۔ (دیکھیے بنی اسرائیل : ۱۵) سو اس عذابِ الیم سے ڈرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔

**آیت 2، 3** قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ...... : نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو تین باتوں کا حکم دیا، پہلی یہ کہ بت پرستی اور

يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ④ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا ۙ⑤

**وہ تمھیں تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور ایک مقرر وقت تک تمھیں مہلت دے گا۔ یقیناً اللہ کا مقرر کردہ وقت جب آ جائے تو مؤخر نہیں کیا جاتا، کاش کہ تم جانتے ہوتے ④ اس نے کہا اے میرے رب! بلاشبہ میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا ⑤**

ہر قسم کا شرک چھوڑ کر اکیلے اللہ کی عبادت کرو۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یعنی ہر کام کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھو۔ اس کے بھیجے ہوئے احکام کی پابندی کرو۔ تیسری بات یہ کہ میرا حکم مانو، کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ کی عبادت بھی وہی قبول ہے جو میرے بتائے ہوئے طریقے پر ہوگی۔ تینوں کا خلاصہ توحید، شریعتِ الٰہی کی پابندی اور اطاعت رسول ہے۔

**آیت 4** ① **يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ** : "مِنْ" کا معنی عام طور پر "بعض" ہوتا ہے، اس صورت میں معنی ہوگا "اور وہ تمھارے کچھ گناہ معاف کر دے گا۔" مگر اس پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ کچھ گناہ تو پھر بھی باقی رہ گئے، ان کا کیا بنے گا؟ اس کا ایک جواب وہ ہے جو امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ یہاں "مِنْ" "عَنْ" کی جگہ آیا ہے اور "جَمِيْعٌ" کا معنی دے رہا ہے، گویا "يَغْفِرْ" کے ضمن میں "يَصْفَحُ" اور "يَعْفُوْ" کا معنی ملحوظ ہے: "أَيْ يَعْفُوْ لَكُمْ عَنْ جَمِيْعِ ذُنُوْبِكُمْ" "یعنی وہ تمھارے سب گناہ معاف کر دے گا۔" دوسرا یہ ہے کہ "مِنْ" "بَعْضٌ" ہی کے معنی میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر تم میری دعوت قبول کر کے ایمان لے آؤ گے تو تمھارے پہلے گناہ معاف ہو جائیں گے، کیونکہ اسلام پہلے سب گناہ مٹا دیتا ہے، البتہ آئندہ کے لیے گناہوں سے بچتے رہنا، یہ نہ سمجھنا کہ ایمان لانے سے پہلے پچھلے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

② **وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى** : یعنی طبعی موت کا ایک وقت مقرر ہے، وہ کفر کی وجہ سے یا ایمان نہ لانے کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ ہر مومن و کافر پر آتی ہے۔ وہ تو اپنے مقرر وقت پر آ کر رہے گی، البتہ ایمان لے آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اس عذاب سے جو کفر کے نتیجے میں آتا ہے، تمھیں محفوظ رکھے گا۔

③ **اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ** ...... : اس مقرر وقت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی قوم پر عذاب کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ کاش! تمھیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ وقت آنے پر مہلت ختم ہو جائے گی، پھر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو تم اس سے پہلے پہلے ایمان لے آؤ۔

**آیت 5** **قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا** : نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے۔ سیکڑوں برس کی تبلیغ کے باوجود جب چند قلیل آدمیوں کے علاوہ کسی نے ایمان قبول نہ کیا اور نوح علیہ السلام ان سے ہر طرح سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کی۔ اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَ اِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹

تو میرے بلانے نے دور بھاگنے کے سوا ان کو کسی چیز میں زیادہ نہیں کیا ۝۶ اور بے شک میں نے جب بھی انھیں دعوت دی، تاکہ تو انھیں معاف کر دے، انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے اور تکبر کیا، بہت بڑا تکبر کرنا ۝۷ پھر بے شک میں نے انھیں بلند آواز سے دعوت دی ۝۸ پھر بے شک میں نے انھیں کھلم کھلا دعوت دی اور میں نے انھیں چھپا کر دعوت دی، بہت چھپا کر ۝۹

دی، یعنی کوئی وقت نہیں چھوڑا جس میں دعوت نہ دی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے جتنا لمبا عرصہ مسلسل دعوت میں گزارا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ہر داعی اور عالم کو اسی جذبے اور محنت سے دعوت دینی چاہیے۔

آیت 6 فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا : مگر ان پر الٹا اثر ہوا، وہ ایمان قبول کرنے کے بجائے اور زیادہ دور بھاگنے لگے۔

آیت 7 ① وَ اِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ …… : اس آیت میں تھوڑا سا حصہ حذف ہے، یعنی میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ (ایمان لے آئیں، تاکہ اس کے نتیجے میں) تو انھیں معاف فرما دے تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، منہ سر کپڑوں میں لپیٹ لیے اور اپنی بات پر اڑ گئے …… یعنی ان کے پاس نوح علیہ السلام کی دعوت کو رد کرنے کا کوئی جواز نہ تھا اور نہ ہی آپ کے دلائل کا سامنا کرنے کی ہمت تھی، ادھر وہ شرک چھوڑنے پر بھی تیار نہیں تھے اور نہ اپنی بڑائی سے دستبردار ہونے پر تیار تھے۔ نوح علیہ السلام کی بات ماننے میں ان کی سرداری، بڑائی اور چودھراہٹ میں فرق آتا تھا، اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ نہ نوح علیہ السلام کی بات کانوں میں پڑے اور نہ ان کی نظر ان پر پڑے۔ غرض کسی صورت بھی ان سے آمنا سامنا نہ ہونے پائے، مبادا وہ پھر تبلیغ شروع کر دیں، اس لیے جیسے بھی ہو سکے ہر صورت منہ سر چھپا کر ان کے پاس سے نکل جائیں۔

② وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا : نوح علیہ السلام کی قوم کا تکبر یہ تھا کہ انھوں نے حق بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ )) [ مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر وبیانہ : ۹۱ ] ”جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“ ایک آدمی نے کہا: ”آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟)“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(یہ تکبر نہیں) اللہ خوبصورت ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق سے انکار کر دینا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔“

آیت 8، 9 ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا …… : جب ان کے کانوں میں انگلیاں لے لینے اور منہ سر کپڑوں میں چھپا لینے تک

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲

**تو میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگ لو، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا ہے ⑩ وہ تم پر بہت برستی ہوئی بارش اُتارے گا ⑪ اور وہ مالوں اور بیٹوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں باغات عطا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا ⑫**

---

نوبت پہنچ گئی تو پھر بھی میں نے انھیں سمجھانا نہیں چھوڑا، بلکہ پھر انھیں مزید بلند آواز سے دعوت دی۔ پھر انھیں کھلم کھلا مجمع عام میں بھی سمجھایا اور لوگوں سے چھپا کر ایک ایک کو نجی طور پر بھی سمجھایا، غرض جس طرح دن رات ہر وقت دعوت دی جا سکتی تھی، اسی طرح ہر طریقے سے دعوت دی۔

**آیت 10** **فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ** ...... : چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ اپنے رب سے بخشش مانگو، (ظاہر ہے ایمان لانے کے بعد ہی بخشش مانگنے کا مرحلہ آتا ہے) یقیناً وہ بہت ہی بخشنے والا ہے۔ "كَانَ" دوام اور استمرار کے لیے ہے، یعنی بخشنا اور معاف کرنا ہمیشہ سے اس کی صفت رہی ہے، پھر کسی واسطے یا وسیلے سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے، اپنے رب سے خود ہی معافی مانگ لو، وہ تمھیں بخش دے گا۔ جب معافی مل گئی تو آخرت میں سزا سے بچ جاؤ گے۔

**آیت 12،11** **يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا** ...... : نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اس سے بخشش مانگنے سے صرف تمھاری آخرت ہی درست نہیں ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی بے شمار نعمتیں عطا فرمائے گا، وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا، قسم قسم کے مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں باغات اور نہریں عطا فرمائے گا۔ نوح علیہ السلام کے علاوہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنی اپنی قوم کو ایمان و استغفار سے آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے علاوہ ان سے حاصل ہونے والی دنیوی برکتیں بھی بتائیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ ہود (۳، ۵۲)، مائدہ (۶۶) اور سورۂ اعراف (۹۶)۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ بارش کی ضرورت ہو یا مال و اولاد کی یا کسی بھی نعمت کی ضرورت ہو تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا چاہیے۔ اس مقام پر تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہوا ہے کہ وہ استسقا کے لیے نکلے تو انھوں نے استغفار سے زیادہ کچھ نہیں کیا اور واپس آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا: "امیر المومنین! ہم نے آپ کو بارش کی دعا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔" تو فرمایا: "میں نے آسمان کو حرکت دینے والی ان چیزوں کے ذریعے سے بارش طلب کی ہے جن کے ذریعے سے بارش کا سوال کیا جاتا ہے۔" پھر یہ آیت اور سورۂ ہود کی آیت (۵۲): ﴿ وَ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ ﴾ پڑھی۔

تفسیر طبری میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ شعبی سے روایت کیا گیا ہے، جن کی ملاقات عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں، اس لیے یہ واقعہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور امیر المومنین سے امید بھی نہیں کہ وہ بارش کی دعا کے لیے نکلے ہوں اور مسنون طریقہ پر نماز اور دعا کے بغیر صرف استغفار کر کے واپس آ گئے ہوں۔ صحیح بخاری (۱۰۱۰) میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ﴿۱۳﴾ وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾

تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے ﴿۱۳﴾ حالانکہ یقیناً اس نے تمھیں مختلف حالتوں میں پیدا کیا ﴿۱۴﴾ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا فرمایا ﴿۱۵﴾ اور اس نے ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنا دیا ﴿۱۶﴾ اور اللہ نے تمھیں زمین سے اُگایا، خاص طریقے سے اُگانا ﴿۱۷﴾ پھر دوبارہ وہ تمھیں اس میں لوٹائے گا اور تمھیں نکالے گا، خاص طریقے سے نکالنا ﴿۱۸﴾ اور اللہ نے تمھارے لیے زمین کو ایک فرش بنا دیا ﴿۱۹﴾ تاکہ تم اس کے کھلے راستوں پر چلو ﴿۲۰﴾

بارش کی دعا کرنا اور عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کروانا موجود بھی ہے۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ دعائے استسقا میں بھی استغفار زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے، مگر ہر مقام پر استغفار اس طریقے سے کیا جائے گا جس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔

**آیت 13** **مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا** : "لَا تَرْجُوْنَ" "رَجَا يَرْجُوْ رَجَاءً" (ن) امید رکھنا۔ اس کا معنی عقیدہ رکھنا اور ڈرنا بھی آتا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں اور امید آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ امید اسی چیز کی ہوتی ہے جس کے موجود ہونے کا عقیدہ ہو اور امید کا مطلب ہی یہ ہے کہ خوف بھی موجود ہے۔ "وَقَارًا" کا معنی عظمت ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تمھیں کیا ہے کہ اپنے بتوں کی عظمت تو تمھارے دلوں میں بہت ہے، مگر تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کا عقیدہ نہیں رکھتے؟ دوسرا معنی ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے۔ اگر تم اس کے وقار و عظمت کے معتقد ہوتے اور تمھیں اس کا خوف ہوتا تو اس کے ساتھ ایسی ہستیوں کو کبھی شریک نہ بناتے جو اس کے مقابلے میں کوئی وقار اور کوئی عظمت نہیں رکھتیں۔

**آیت 14** **وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا** : یعنی حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے دلائل خود تمھاری ذات میں موجود ہیں، اس نے تمھیں مختلف اطوار میں پیدا فرمایا ہے۔ پہلے مٹی، پھر نطفہ، پھر علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں، پھر ان پر گوشت، پھر بہترین شکل و صورت کا انسان، جس کا ہر روز نئے سے نیا طور (انداز) ہوتا ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا، پھر موت، اتنے اطوار کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے!؟ اگر تم ایسے خالق کی عظمت کا خیال نہ کرو اور اس کے حضور پیش ہونے کو محال سمجھتے رہو تو کتنے تعجب کی بات ہے۔ یہی بات تفصیل کے ساتھ سورۂ حج (۵، ۶) اور سورۂ مومنون (۱۲ تا ۱۶) میں بھی بیان ہوئی ہے۔ "خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا" کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمھیں مختلف انداز میں پیدا فرمایا کہ کوئی ایک شخص بھی شکل و صورت، قد و قامت، رنگ روپ، آواز اور ذہنی صلاحیت، غرض کسی بھی چیز میں دوسرے سے نہیں ملتا۔ یہی مفہوم سورۂ روم (۲۲) میں بیان ہوا ہے۔

**آیت 15 تا 20** **اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ ......** : نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان کی پیدائش میں توحید اور قیامت کے دلائل کی

قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ اِنَّهُمۡ عَصَوۡنِیۡ وَ اتَّبَعُوۡا مَنۡ لَّمۡ یَزِدۡهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَ مَكَرُوۡا مَكۡرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾

**نوح نے کہا اے میرے رب! بے شک انھوں نے میری بات نہیں مانی اور اس کے پیچھے چل پڑے جس کے مال اور اولاد نے خسارے کے سوا اس کو کسی چیز میں زیادہ نہیں کیا ﴿۲۱﴾ اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی، بہت بڑی خفیہ تدبیر ﴿۲۲﴾**

طرف توجہ دلانے کے بعد ان چیزوں پر غور وفکر کی دعوت دی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے گرد وپیش ان کی ضرورتوں کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ فرمایا، کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے سات آسمان، ان میں روشنی پھیلانے والا چاند اور جلتا ہوا چراغ یعنی سورج کس طرح پیدا فرمایا؟ زمین کو بچھونے کی طرح نرم کر دیا اور تمھاری سہولت کے لیے اس میں گھاٹیاں اور کشادہ رستے بنا دیے۔ یہ تمام انتظام اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ جس طرح اس نے تمھیں پہلے زمین سے پیدا کیا ہے اسی طرح زمین میں دفن کرنے کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس کے علاوہ تمھاری ضرورت کی یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں، تمھارے معبودانِ باطلہ نے تو کچھ بھی پیدا نہیں کیا، تم نے دونوں کو برابر کیسے سمجھ لیا؟

**آیت 21** قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ اِنَّهُمۡ عَصَوۡنِیۡ …… : یہ نوح علیہ السلام کی دوسری شکایت ہے کہ اے میرے رب! انھوں نے میرا کہا نہیں مانا اور ان سرداروں اور مال داروں کے پیچھے لگ گئے جنھیں تو نے مال اور اولاد عطا فرمائی، مگر وہ مال و اولاد انھیں کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے ان کے لیے اور زیادہ خسارے کا باعث بن گئے، کیونکہ اس مال و اولاد کے غرور ہی کی وجہ سے انھوں نے حق کو ٹھکرایا اور اسی مال و اولاد کو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کر کے قوم کو بہکایا اور یہی مال خرچ کر کے لوگوں کو اللہ کی راہ سے ہٹایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کافروں کو جتنا مال و اولاد یا نعمتیں ملیں درحقیقت ان کے لیے عذاب ہی کا سامان ہے، کیونکہ اس سے وہ مزید غفلت و سرکشی اختیار کر کے جہنم کا ایندھن بنتے ہیں۔

**آیت 22** وَ مَكَرُوۡا مَكۡرًا كُبَّارًا : "كُبَّارًا" (باء کی تشدید کے ساتھ) میں "كُبَار" (باء کی تشدید کے بغیر) سے زیادہ مبالغہ ہے اور "كُبَار" میں "كَبِيْر" سے زیادہ مبالغہ ہے، یعنی انھوں نے بہت ہی بڑی بڑی خفیہ تدبیریں کیں۔ "مَكْرًا" جنس ہے، اس سے صرف ایک ہی مکر مراد نہیں۔ یہ اسی قسم کے حربے تھے جو ہمیشہ کسی قوم کے چودھری اور مال دار لوگ اپنے اقتدار کی خاطر اہلِ حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں ان میں سے کئی حربے مذکور ہیں، مثلاً یہ کہ اگر نوح (علیہ السلام) اللہ کا نبی ہوتا تو فرشتہ ہوتا، یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے۔ اس کے پیروکار نیچ لوگ ہیں، اگر یہ رسول ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے، بڑے بڑے لوگ اس کے ساتھ ہوتے، یہ غیب جانتا ہوتا، یہ تو بس سرداری چاہتا ہے، یہ دیوانہ ہے وغیرہ۔ مزید تفصیل کے لیے سورۂ اعراف، سورۂ ہود اور سورۂ مومنون وغیرہ میں نوح علیہ السلام کے واقعات ملاحظہ فرمائیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی یہی حربے استعمال کیے گئے۔

وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ﴿۲۳﴾

اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وَدّ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو ﴿۲۳﴾

آیت 23 ① وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ ...... : ساڑھے نو سو سال میں اللہ بہتر جانتا ہے کتنی ہی نسلیں ختم ہوئیں اور کتنی نئی پیدا ہوئیں، مگر ہر پہلا پچھلے کو جیتے جی اور مرتے وقت یہی تاکید کرتا رہا کہ دیکھنا! نوح کے کہنے پر وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت ہرگز ہرگز نہ چھوڑنا۔ یہ وہ پانچ بت تھے جن کی عبادت قومِ نوح کرتی تھی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''یہ پانچوں نوح علیہ السلام کی قوم کے صالح لوگوں کے نام ہیں، جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ (بطور یادگار) جن مجلسوں میں وہ بیٹھتے تھے وہاں ان کے بت نصب کر دو اور ان کے وہی نام رکھ دو، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا تو اس وقت ان کی عبادت نہیں کی گئی، یہاں تک کہ جب وہ (بطور یادگار بت نصب کرنے والے) فوت ہو گئے اور (کسی کو اس بات کا) علم نہ رہا تو ان بتوں کی عبادت ہونے لگی۔'' [ بخاري، التفسير، باب: ﴿ودا ولا سواعا......﴾ : ٤٩٢٠ ] اس روایت سے معلوم ہوا کہ بت پرستی کا اصل باعث اکابر کی محبت میں غلو اور ان کے مجسمے بنا کر انھیں نصب کرنا تھا۔ شریعت میں تصویر کی حرمت کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اسی روایت میں جو اوپر گزری ہے، مذکور ہے کہ یہی بت جو قوم نوح میں تھے' بعد میں عرب کے اندر آ گئے۔ ''وَدّ'' دومۃ الجندل میں کلب قبیلے کا بت تھا، ''سواع'' ہذیل کا تھا، ''یغوث'' مراد قبیلے کا پھر (اس کی شاخ) بنو غطیف کا تھا، جو سبا کے قریب وادیٔ جرف میں (آباد) تھے۔ ''یعوق'' ہمدان کا اور ''نسر'' حمیر کا تھا جو ذوالکلاع کی آل تھے۔ [ بخاري، أيضًا ]

یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے طوفان کے بعد جس میں تمام مشرک غرق کر دیے گئے، وہ بت کیسے باقی رہ گئے اور دوبارہ ان کی پرستش کیسے شروع ہو گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان قدرتی طور پر اپنے سے پہلے لوگوں کے حالات جاننے کا شوق رکھتا ہے، چنانچہ علم تاریخ اسی شوق کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ باقی بچنے والے اہلِ ایمان سے بعد والی نسلوں نے ان بزرگوں کی نیکی اور کرامتوں کے واقعات سنے، وقت گزرنے کے ساتھ جب جہالت کا غلبہ ہوا تو شیطان نے ان کے ہاتھوں آثار قدیمہ کے طور پر وہی بت نکلوا کر یا ان سے ان اکابر کے فرضی مجسمے بنوا کر، جیسا کہ نصرانیوں نے مسیح اور مریم علیہما السلام کے فرضی مجسمے بنا رکھے ہیں، دوبارہ ان کی عبادت شروع کروا دی۔ بہرحال یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان پانچوں بتوں کی پرستش ہوتی تھی اور باقاعدہ ان کے آستانے موجود تھے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزرا ہے۔ عرب میں عبد وَدّ اور عبد یغوث وغیرہ نام بھی ملتے ہیں۔

② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''واقدی کا بیان ہے کہ ''وَدّ'' ایک آدمی کی شکل میں، ''سواع'' عورت کی شکل میں، ''یغوث'' شیر کی صورت میں، ''یعوق'' گھوڑے کی شکل میں اور ''نسر'' ایک پرندے کی صورت میں تھا، مگر یہ شاذ ہے۔ مشہور یہی ہے کہ یہ سب انسانی شکل میں تھے اور ان کی عبادت کے آغاز کا جو سبب بیان ہوا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔'' (فتح الباری) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی بات نوح علیہ السلام کے زمانے کے بتوں کے متعلق تو یقیناً درست ہے، مگر بعد میں جب فرضی بت بنائے گئے تو

وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ۬ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۝ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝۲۵

اور بلاشبہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا اور تو ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا (۲۴) اپنے گناہوں ہی کی وجہ سے وہ غرق کیے گئے، پس آگ میں داخل کیے گئے، پھر انھوں نے اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی مدد کرنے والے نہ پائے (۲۵)

ممکن ہے کہ ان جانوروں کی شکل پر بنائے گئے ہوں، جیسا کہ مشرک قوموں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

3 رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کو شرک سے بچانے کے لیے ان دروازوں کو بھی بند کرنے کا حکم دیا جہاں سے شرک داخل ہوسکتا ہے۔ قبر پرستی کے فتنے کی ابتدا قبروں پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے سے ہوتی ہے اور بت پرستی کی ابتدا تصویریں اور مجسمے بنانے سے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں چیزوں سے منع فرمایا اور اونچی قبروں کو (دوسری قبروں کے) برابر کر دینے اور ہر تصویر کو مٹا دینے کا حکم دیا۔ ابو الہیاج اسدی فرماتے ہیں کہ مجھے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «أَلَا أَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِيْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ أَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ» [مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر: ۹۶۹] ”کیا میں تمھیں اس کام پر مقرر کر کے نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا؟ وہ یہ تھا کہ کوئی مورتی نہ چھوڑو مگر اسے مٹا دو اور نہ کوئی اونچی قبر مگر اسے برابر کر دو۔“

**آیت 24** وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ...... : یعنی قوم کے ان سرداروں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ ”وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا“ (اور ان ظالموں کو گمراہی کے علاوہ کسی چیز میں نہ بڑھا) یہ دعا درحقیقت عذاب کے لیے ہے، کیونکہ گمراہی پر قائم رہنے اور اس میں مزید بڑھتے چلے جانے کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہو جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے آل فرعون کے حق میں یہی بد دعا کی تھی: ﴿ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ۸۸] ”اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“ ضمیر کی جگہ ”الظّٰلِمِيْنَ“ کے لفظ کی صراحت سے ان لوگوں کے عذاب کی بد دعا کے مستحق ہونے کا سبب بیان ہوا ہے۔

**آیت 25** 1 مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا ...... : یہ نوح علیہ السلام کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں۔ جار مجرور پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہوگیا ہے، یعنی صرف اپنے گناہوں (کفر و معصیت) کی وجہ سے انھیں غرق کیا گیا۔ ان کے غرق ہونے کا تفصیلی واقعہ سورۂ ہود، سورۂ مومنون اور سورۂ عنکبوت وغیرہ میں مذکور ہے۔ ”فَاُدْخِلُوْا نَارًا“ پس وہ آگ میں داخل کیے گئے، ”فَاءٌ“ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غرق ہوتے ہی انھیں آگ میں داخل کر دیا گیا، یعنی قیامت کے دن جہنم میں جانے سے پہلے برزخ و قبر ہی میں وہ آگ میں داخل کر دیے گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿ وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ

وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۲۶ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۲۷ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۲۸

ع ۲ ۸ ۱۰

اور نوح نے کہا اے میرے رب! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ ۲۶ بے شک تو اگر انھیں چھوڑے رکھے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور کسی نافرمان، سخت منکر کے سوا کسی کو نہیں جنیں گے ۲۷ اے میرے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اس کو جو مومن بن کر میرے گھر میں داخل ہو اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو اور ظالموں کو ہلاکت کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا ۲۸

سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ [ المؤمن : ۴۵، ۴۶ ] ''اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا جو آگ ہے، اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی، آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔'' خلاصہ یہ کہ نوح علیہ السلام کی قوم اور آل فرعون کو پہلے پانی میں غرق کیا گیا، پانی کے عذاب کے بعد اس کا الٹ یعنی آگ کا عذاب قبر ہی میں شروع ہو گیا، پھر قیامت کے دن جہنم کے ''اَشَدَّ الْعَذَابِ'' میں داخل کیے جائیں گے۔ یہ آیت اور سورۂ مومن کی آیت عذابِ قبر کی زبردست دلیلیں ہیں۔

2 فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا : یعنی اللہ کے عذاب سے نہ انھیں کوئی سردار بچا سکا اور نہ ان کے پاک پنج تنوں میں سے کوئی ان کی مدد کر سکا۔

آیت 26، 27 وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ ...... : یہاں سے نوح علیہ السلام کی دعا کا بقیہ حصہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو کیسے معلوم ہوا کہ اگر یہ لوگ زندہ رہے تو ان کی پشت سے کافر ہی پیدا ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے خود نوح علیہ السلام کو بتا دی تھی کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ اب کوئی شخص ایمان قبول نہیں کرے گا۔ (دیکھیے ہود : ۳۶ ) یہ بات معلوم ہونے کے بعد نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! زمین پر ان کافروں میں سے ایک ''دیار'' بھی باقی نہ چھوڑ۔ ''دَيَّارًا'' ''فَيْعَالٌ'' کے وزن پر ہے، یہ ''دَارَ يَدُوْرُ دَوْرًا'' ( گھومنا) سے ہو تو معنی ہوگا، ایک پھرنے والا بھی نہ چھوڑ اور اگر ''دَارٌ'' ( گھر) سے مشتق ہو تو معنی ہے، گھر میں بسنے والا ایک فرد بھی باقی نہ چھوڑ۔

آیت 28 رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ ...... : اس آیت میں نوح علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کا ذکر ہے جو انھوں نے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور ان اہلِ ایمان کے لیے کی جو عذاب کی پیش گوئی سچ مان کر اس سے بچنے اور کشتی میں سوار ہونے کے لیے ان کے گھر جمع ہو گئے تھے، اس کے ساتھ ہی انھوں نے پہلے تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے مغفرت کی دعا کی اور کافروں کے لیے مزید ہلاکت کی بد دعا کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کے والدین موحد تھے۔

سُورَةُ الْجِنِّ ۷۲ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — اٰیاتُھا ۲۸ رُکوعاتُھا ۲

قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ① یَّہۡدِیۡۤ اِلَی

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

**کہہ دے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے کان لگا کر سنا تو انھوں نے کہا کہ بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے ① جو سیدھی راہ کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور (اب) ہم**

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ سوق عُکاظ کی طرف جانے کے ارادے سے روانہ ہوئے، (یہ اس وقت کی بات ہے جب) شیاطین اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی اور (جب وہ اوپر خبریں سننے کے لیے گئے تو) ان پر انگارے پھینکے گئے۔ وہ شیطان (جب آسمان سے خبریں نہ سن سکے اور) اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو انھوں نے پوچھا: ''کیا معاملہ ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اور ہم پر انگارے پھینکے گئے ہیں۔'' انھوں نے کہا: ''تمھارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ کی وجہ کوئی نئی پیدا ہونے والی چیز ہی ہو سکتی ہے، اس لیے تم زمین کے مشارق و مغارب کا سفر کر کے دیکھو کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمھارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ بنی ہے۔'' تو وہ لوگ جو تہامہ کی طرف روانہ ہوئے تھے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت پہنچے جب آپ نخلہ میں تھے اور سوق عُکاظ کا ارادہ رکھتے تھے۔ آپ اس وقت اپنے اصحاب کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، جب انھوں نے قرآن سنا تو کان لگا کر سننے لگے اور کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! یہی وہ چیز ہے جو تمھارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ بنی ہے۔'' اس موقع پر جب وہ اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو انھوں نے کہا: ''اے ہماری قوم! ﴿اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ؕ وَ لَنۡ نُّشۡرِکَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾ [ الجن : ۱، ۲ ] ''بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا، جو سیدھی راہ کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم کبھی کسی کو اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ﴾ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جنوں کی گفتگو وحی کی گئی تھی۔ [ بخاري، الأذان، باب الجهر بقراءة صلاة الصبح : ۷۷۳۔ مسلم : ۴۴۹ ]

**آیت 2،1** ① قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ ...... : اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنوں کا قرآن سن کر ایمان لانا اور ان کی آپس کی ساری گفتگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے معلوم ہوئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: (( مَا قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْجِنِّ وَ مَا رَآهُمْ )) [ مسلم، الصلاة، باب الجهر بالقراءة في الصبح ...... : ۴۴۹ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ جنوں کے سامنے قرآن پڑھا اور نہ انھیں دیکھا (وہ تو آپ کے پاس اس وقت آئے جب آپ نخلہ میں تھے اور انھوں نے اس موقع پر قرآن سنا)۔'' ہاں، اس کے بعد کئی دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنوں سے ملاقات ہوئی اور آپ نے انھیں قرآن سنایا

الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَ لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۝۲

اپنے رب کے ساتھ کسی کو کبھی شریک نہیں کریں گے ②

اور پڑھایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے غائب رہے، صحابہ نے وہ رات سخت پریشانی میں گزاری، تلاش کرتے کرتے وہ آپ سے اس وقت ملے جب آپ حرا کی طرف سے آ رہے تھے۔ پوچھنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا: « أَتَانِيْ دَاعِي الْجِنِّ فَذَهَبْتُ مَعَهُ فَقَرَأْتُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ » ”میرے پاس جنوں کا دعوت دینے والا آیا تھا، چنانچہ میں اس کے ساتھ گیا اور انھیں قرآن پڑھ کر سنایا۔“ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”پھر آپ ہمیں لے گئے اور ہمیں ان کے نشان اور ان کی آگوں کے نشان دکھائے۔“ [ مسلم، الصلاۃ، باب الجهر بالقراءة في الصبح...... : ٤٥٠ ] اسی طرح ایک دفعہ آپ نے جنوں کے سامنے سورۂ رحمان پڑھی اور وہ: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ (تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) پر جواب دیتے رہے: « لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ » [ ترمذي، التفسير، باب و من سورة الرحمٰن : ۳۲۹۱، وقال الألباني صحيح ] ”ہم تیری کسی بھی نعمت کو نہیں جھٹلاتے اے ہمارے رب! اور تیرے ہی لیے سب تعریف ہے۔“

② ان آیات میں کفار قریش کو شرم دلائی گئی ہے کہ دیکھو اتنی مدت تک سننے کے باوجود تم پر قرآن کا کچھ اثر نہیں ہوا، نہ تم شرک کی نجاست سے پاک ہو سکے، جب کہ یہ اتنی اعلیٰ، مؤثر اور عجیب کتاب ہے کہ جنوں کی اس جماعت نے اسے سنتے ہی ایمان قبول کر لیا اور ہمیشہ کے لیے شرک چھوڑنے کا اعلان کر دیا، حالانکہ جنوں کی سرکشی مشہور و معروف ہے۔

③ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن وہ زبانیں جانتے ہیں جو انسانوں میں بولی جاتی ہیں، کم از کم وہ جن تو عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی باریکیوں تک کو اتنا سمجھتے تھے کہ انھوں نے قرآن کو عجیب قرار دیا اور فوراً اس پر ایمان لے آئے۔

④ جن بھی انسانوں کی طرح شریعت کے مخاطب ہیں اور ان کے رسول بھی وہی ہیں جو انسانوں کے ہیں۔ قرآن مجید یا حدیث میں جنوں میں سے کسی پیغمبر کا ذکر نہیں آیا، اس کے برعکس زیر تفسیر سورت میں صاف ذکر ہے کہ جن قرآن پر ایمان لائے اور سورۂ احقاف میں ہے کہ انھوں نے کہا، ہم نے ایک ایسی کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے۔ (دیکھیے احقاف: ۳۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کو اپنا رسول مانتے تھے۔ سورۂ رحمان کی تمام آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنوں کے سامنے انھیں پڑھنا اور ان کا جواب دینا بھی اس بات کی دلیل ہے۔ سورۂ انبیاء (۷، ۸) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

⑤ جنوں میں شرک کرنے والے بھی موجود ہیں، جیسا کہ یہ جن مشرک تھے اور انھوں نے قرآن مجید سننے کے بعد شرک چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی آیات پڑھ رہے تھے جس سے انھیں شرک کی خرابی معلوم ہوئی۔

وَ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ۝۳ وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵ وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶

اور یہ کہ بات یہ ہے کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے، اس نے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ کوئی اولاد ۝۳ اور یہ کہ بات یہ ہے کہ ہمارا بے وقوف اللہ پر زیادتی کی بات کہتا تھا ۝۴ اور یہ کہ ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن اللہ پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں بولیں گے ۝۵ اور یہ کہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے تو انھوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا ۝۶

**آیت 3** وَ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا ...... : ”اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے“ یعنی ہم اس پر بھی ایمان لے آئے کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے۔ یہ جن تثلیث کو ماننے والے نصرانی تھے یا کسی ایسے مذہب کو ماننے والے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی بیوی اور اولاد مانی جاتی ہے۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی بیوی ہو یا اولاد ہو۔ بیوی ماننے سے وہ بلند شان والا نہیں بلکہ محتاج ٹھہرتا ہے، کیونکہ خاوند شہوت کے ہاتھوں اس کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد بھی اسی شہوت کا نتیجہ ہے جو اسے بیوی کے پاس جانے پر مجبور کرتی ہے، تو پھر شان کیا بلند رہی۔ (طبری)

**آیت 4** وَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا ...... : ”سَفِيْهُنَا“ (ہمارا بے وقوف) سے مراد ایک فرد بھی ہو سکتا ہے اور ایک گروہ بھی۔ فرد ہو تو ابلیس یا ان جنوں کا سردار مراد ہے۔ گروہ ہو تو مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے کئی بے وقوف اور احمق لوگ اللہ تعالیٰ پر ایسی زیادتی کی باتیں تھوپا کرتے تھے کہ اس کا کوئی شریک ہے یا اس کی اولاد اور بیوی ہے۔

**آیت 5** وَ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ ...... : یعنی ہم یہی سمجھتے تھے کہ انسان اور جن کم از کم اللہ پر تو ہرگز جھوٹ نہیں باندھ سکتے، اس لیے ہم نے ان سے سن کر مان لیا کہ اللہ کے کچھ شریک ہیں اور اس کی اولاد اور بیوی بھی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ظالم جھوٹے تھے۔

**آیت 5** وَ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ ...... : عرب کے بعض مشرک جب کسی خوفناک جگہ یعنی جنگل وغیرہ میں جاتے تو کہتے کہ ہم اس علاقے میں جو جنوں کا سردار ہے اس کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس سے جنوں کی سرکشی اور بڑھ گئی، کیونکہ وہ جان گئے کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے ماننے والوں کو اور زیادہ ڈرانا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا آدمی کو نہ جنوں سے ڈرنا چاہیے، نہ ان کی پناہ مانگنی چاہیے اور نہ کسی غیر اللہ کی دہائی دینی چاہیے، کیونکہ یہ شرک ہے، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ کسی بھی چیز کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے قرآن مجید کی آخری دو سورتوں جیسی کوئی چیز نہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ان دو سورتوں کی تفسیر دیکھیں۔

وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝ وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ۝ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝

اور یہ کہ ان (انسانوں) نے گمان کیا جس طرح تم نے گمان کیا کہ اللہ کسی کو کبھی نہیں اٹھائے گا ⑦ اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ہاتھ لگایا تو ہم نے اسے اس حال میں پایا کہ وہ سخت پہرے اور چمکدار شعلوں سے بھر دیا گیا ہے ⑧ اور یہ کہ ہم اس کی کئی جگہوں میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے تو جو اب کان لگاتا ہے وہ اپنے لیے ایک چمکدار شعلہ گھات میں لگا ہوا پاتا ہے ⑨

خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: « إِذَا نَزَلَ أَحَدُكُمْ مَنْزِلاً فَلْيَقُلْ أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ، فَإِنَّهُ لَا يَضُرُّهُ شَيْءٌ حَتّٰى يَرْتَحِلَ مِنْهُ » [ مسلم، الذكر و الدعاء، باب في التعوذ من سوء القضاء..... : ٢٧٠٨/٥٥ ] ”جب تم میں سے کوئی شخص کسی منزل میں اترے تو اسے یہ کلمات کہنے چاہییں، تو اسے وہاں سے کوچ کرنے تک کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی: « أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ » ”میں اللہ کے کامل کلمات کی پناہ پکڑتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔“

**آیت 7** وَ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ …… : جن اپنی قوم کے لوگوں کو کافر انسانوں کے متعلق بتا رہے ہیں کہ شرک کے علاوہ ان انسانوں کا عقیدہ تمھاری طرح یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قیامت کے دن دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو (نبی بنا کر) نہیں بھیجے گا۔ کفار میں ہمیشہ، خواہ وہ انسان ہوں یا جن، توحید، آخرت اور رسالت تینوں کا انکار پایا جاتا رہا ہے۔

**آیت 8، 9** ① وَ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ …… : اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو آسمان کی زینت کے علاوہ ان شیاطین سے حفاظت کا ذریعہ بھی بنایا ہے جو آسمان کے قریب جا کر فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو ہٹانے کے لیے ہر طرف سے ان پر شہابوں (انگاروں) کی بارش ہوتی ہے۔ (دیکھیے صافات: ٦ تا ١٠) عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَنْزِلُ فِي الْعَنَانِ وَهُوَ السَّحَابُ فَتَذْكُرُ الْأَمْرَ قُضِيَ فِي السَّمَاءِ، فَتَسْتَرِقُ الشَّيَاطِيْنُ السَّمْعَ، فَتَسْمَعُهُ فَتُوْحِيْهِ إِلَى الْكُهَّانِ، فَيَكْذِبُوْنَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ » [ بخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم : ٣٢١٠ ] ”فرشتے عنان یعنی بادل میں اترتے ہیں اور (آپس میں) اس بات کا ذکر کرتے ہیں جس کا آسمان میں فیصلہ کیا گیا ہوتا ہے، تو شیطان چوری سے وہ بات سننے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے سن لیتے ہیں، پھر وہ یہ بات کاہنوں کو چپکے سے پہنچا دیتے ہیں، پھر کاہن اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا دیتے ہیں۔“

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا۝۱۰ وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ١ؕ كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا۝۱۱

اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کیا ان لوگوں کے ساتھ جو زمین میں ہیں، کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے رب نے ان کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے ⑩ اور یہ کہ ہم میں سے کچھ نیک ہیں اور ہم میں کچھ اس کے علاوہ ہیں، ہم مختلف گروہ چلے آئے ہیں ⑪

② مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا : رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی عالم بالا کی حفاظت کا انتظام تھا، مگر جن کوئی نہ کوئی بات سن لیتے تھے اور انھیں بالائی فضا میں چھپ کر بیٹھنے کی بھی کوئی نہ کوئی جگہ مل جاتی تھی، اب (آپ ﷺ کی بعثت کے بعد) جب وہ سننے کے لیے اوپر گئے تو ساری بالائی فضا سخت پہرے اور مسلسل شہابوں کی بارش سے بھری ہوئی تھی۔ ”مُلِئَتْ“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اب پہرے کا نظام پہلے سے بہت سخت ہو گیا تھا۔ اس سے انھیں پریشانی ہوئی اور وہ تلاش میں نکلے کہ اس بندوبست کا باعث کیا ہے؟ جیسا کہ اس سورت کی شان نزول میں گزر چکا ہے۔

③ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن انسانوں سے الگ مخلوق ہیں جو مٹی سے نہیں بلکہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں اور جو انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ جن آسمان کے قریب جا سکتے ہیں اور بعض اوقات عالم بالا کی ایک آدھ بات چرا سکتے ہیں، انھیں انسانوں ہی میں سے سرکش قوم یا چھپے ہوئے جراثیم قرار دے کر ان کا انکار کر دینا قرآن و حدیث کا انکار ہے۔ کسی چیز کے انکار کی یہ بنیاد کہ اگر وہ موجود ہوتی تو نظر آتی، بے حد کمزور بنیاد ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۲۷، ۳۸)، ہود (۱۱۹)، حم سجدہ (۲۵، ۲۹) اور سورۂ احقاف (۱۸، ۲۹، ۳۲)۔ آدم اور ابلیس کا قصہ جو قرآن مجید میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور سورۂ رحمان پوری اس بات کی شاہد ہے کہ جن اور انسان الگ الگ مخلوق ہیں۔

**آیت 10** ﴿ وَ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ ...... : اتنے سخت پہرے دیکھ کر جنوں نے سمجھ لیا کہ دو باتوں میں سے ایک ضرور ہے، یا تو اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے، یعنی کسی قوم پر اچانک عذاب آنے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور خبروں پر پہرا لگ گیا ہے، تاکہ اس قوم کو وقت سے پہلے اطلاع نہ ہو جائے، یا اللہ تعالیٰ نے ان کی بھلائی اور ہدایت کا ارادہ کیا ہے، یعنی کوئی رسول مبعوث ہوا ہے جس کی طرف بھیجی جانے والی وحی کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے، تاکہ شیطان نہ اس میں کوئی دخل دے سکیں اور نہ پہلے معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کی طرف کیا وحی کی جا رہی ہے۔ جب وہ اس جستجو کے لیے نکلے کہ ان دو باتوں میں سے کون سی بات حق ہے تو انھیں رسول اللہ ﷺ کو قرآن پڑھتے ہوئے سن کر معلوم ہو گیا کہ یہ بندوبست اسی رسول کی وجہ سے ہے۔ اس آیت میں جنوں کے اس گروہ کا حسنِ ادب ملاحظہ ہو کہ ارادۂ رشد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اور ارادۂ شر کی نسبت اس کی طرف نہیں کی۔

**آیت 11** ﴿ وَ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ......: ”طَرَآىِٕقَ“ ”طَرِيْقَةٌ“ کی جمع اور ”قِدَدًا“ ”قِدَّةٌ“ بروزن

وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

اور یہ کہ ہم نے یقین کرلیا کہ بے شک ہم کبھی اللہ کو زمین میں عاجز نہیں کرسکیں گے اور نہ ہی بھاگ کر کبھی اسے عاجز کرسکیں گے ﴿۱۲﴾ اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت سن لی، ہم اس پر ایمان لے آئے، پھر جو کوئی اپنے رب پر ایمان لائے گا تو وہ نہ کسی نقصان سے ڈرے گا نہ کسی زیادتی سے ﴿۱۳﴾ اور یہ کہ ہم میں سے کچھ فرماں بردار ہیں اور ہم میں سے کچھ ظالم ہیں، پھر جو فرماں بردار ہوگیا تو وہی ہیں جنھوں نے سیدھے راستے کا قصد کیا ﴿۱۴﴾ اور جو ظالم ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے ﴿۱۵﴾

"قِطْعَةٌ" کی جمع ہے، ٹکڑے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنوں میں صالح اور غیر صالح ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان میں اچھے عقائد، اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کے لوگ بھی ہیں اور اس کے برعکس بھی، ان میں موحد بھی ہیں اور مشرک بھی، متبع سنت بھی ہیں اور بدعتی بھی، خوش اخلاق بھی ہیں اور بد اخلاق بھی، وہ بھی ہیں جو آسمان سے کوئی خبر سن کر اس میں سو جھوٹ ملاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ایسا نہیں کرتے۔ مومن جنوں کا اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کے سب راہِ راست پر نہیں بلکہ ہم میں بھی غیر صالح لوگ موجود ہیں، جنھیں حق بات سمجھانا اور ان کا اسے قبول کرنا ضروری ہے۔

**آیت 13،12** ❀ وَ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ ...... : مشرک قومیں جنوں کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھتی ہیں اور انھیں غیب دان جانتی ہیں مگر جن خود اقرار کر رہے ہیں کہ ہم نے سمجھ لیا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں پکڑنا چاہے تو نہ ہم زمین میں کہیں چھپ کر اسے عاجز کرسکتے ہیں کہ وہ ہمیں پکڑ نہ سکے اور نہ کہیں بھاگ کر، غرض پھر کسی صورت ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل بے بس ہونے کے اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ جونہی ہم نے ہدایت کی بات سنی تو فوراً ایمان لے آئے۔ "بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا" نقصان یہ کہ جو نیکیاں کی ہیں ان میں کمی کر دی جائے اور زیادتی یہ کہ جو گناہ نہیں کیے وہ تھوپ دیے جائیں۔ ان آیات میں بھی مومن جن اپنے بھائیوں کو نصیحت کر رہے ہیں کہ جس ذات عالی سے نہ بھاگ سکتے ہو اور نہ چھپ سکتے ہو اس پر ایمان لے آؤ، اسی میں تمھاری خیریت ہے، پھر وہ ایسا مہربان ہے کہ جو اس پر ایمان لے آئے اسے نہ نقصان کا خوف ہے نہ زیادتی کا۔

**آیت 15،14** ❀ ① وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ...... : "الْقٰسِطُوْنَ" ظلم کرنے والے، راہِ حق سے ہٹنے والے۔ "قَسَطَ يَقْسِطُ" (ض) "قَسْطًا" (قاف کے فتحہ کے ساتھ) ظلم کرنا، سیدھی راہ سے ہٹنا۔ "اَلْقِسْطُ" (قاف کے کسرہ کے ساتھ) انصاف۔ "أَقْسَطَ يُقْسِطُ" (افعال) انصاف کرنا۔ یعنی ہدایت سننے کے بعد ہم میں سے کچھ وہ ہیں جو تابع فرمان ہوگئے۔ یہ وہ ہیں جن کا ارادہ ہے کہ پوری کوشش کے ساتھ سیدھی راہ پر چلیں۔ "تَحَرّٰى يَتَحَرّٰى تَحَرِّيًا" قصد

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾

اور (یہ وحی کی گئی ہے) کہ اگر وہ راستے پر سیدھے رہتے تو ہم انھیں ضرور بہت وافر پانی پلاتے ﴿۱۶﴾ تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں اور جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑے گا وہ اسے سخت عذاب میں داخل کرے گا ﴿۱۷﴾

کرنا، کوشش کے ساتھ ظن سے یقین تک پہنچنا۔ اور جو راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

2 یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں، وہ جہنم کا ایندھن کیسے بنیں گے؟ جواب یہ ہے کہ جس طرح انسان مٹی سے بنا ہے مگر مٹی کا ڈھیلا مارا جائے تو اسے تکلیف ہوتی ہے اور ہر زندہ چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ [ الأنبیاء : ۳۰ ] (اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی) مگر یہی پانی اسے غرق کر دیتا ہے۔ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے، مگر یہی پانی جنوں کے لیے جو آگ سے بنے ہیں نعمت ہے، جیسا کہ سورۂ رحمٰن کی آیات (۵۰، ۶۶) میں ہے اور اسی سورۂ جن کی آیت (۱۶) میں آ رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آگ سے پیدا کیے جانے کے باوجود جنوں کی ایک الگ شکل وصورت ہے جو آگ سے متاثر ہوتی ہے، جس طرح گوشت پوست کا انسان مٹی سے پیدا ہونے کے باوجود مٹی سے الگ شکل وصورت رکھتا ہے۔ یہاں سے جنوں کی تقریر جو اللہ تعالیٰ نے نقل فرمائی ہے ختم ہوئی، آئندہ آیات میں دوبارہ اللہ تعالیٰ کا خطاب شروع ہوتا ہے۔

**آیت 16** وَ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ ...... : اس کا عطف "اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ......" پر ہے اور "وَ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا" کا اصل "وَ أَنَّهُمْ لَوِ اسْتَقَامُوْا" ہے، یعنی کہہ دے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا...... اور میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ (یعنی قریش مکہ یا تمام بنی آدم اور جن) اصل راستے پر سیدھے چلتے رہتے تو ہم انھیں وافر پانی پلاتے۔ "غَدَقًا" کا معنی کثیر ہے۔ وافر پانی سے مراد وافر رزق ہے، کیونکہ زمین سے حاصل ہونے والی تمام برکات بارش ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر بیان فرمائی ہے: ﴿ وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ﴾ [ الأعراف : ۹۶ ] ''اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کھول دیتے۔'' سورۂ نوح (۱۰ تا ۱۲) اور سورۂ مائدہ (۶۶) میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔

**آیت 17** لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ يُّعْرِضْ...... : یعنی پانی کی کثرت اور رزق کی فراوانی کا مقصد بھی ان کی آزمائش ہے کہ وہ خوش حالی میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس کی توحید و اطاعت پر قائم رہتے ہیں یا بدمست ہو کر سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ معلوم ہوا مصیبت کی طرح نعمت بھی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ سورۂ انبیاء (۳۵)، اعراف (۱۶۸) اور سورۂ قلم (۱۷ تا ۲۰) میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ "صَعَدًا" "صَعِدَ يَصْعَدُ" (ع) کا مصدر ہے۔ لفظی معنی چڑھائی ہے، مراد ایسا سخت

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ وَ لَاۤ اُشۡرِکُ بِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلۡ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلۡ اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ ۬ۙ وَّ لَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا ﴿ۙ۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِسٰلٰتِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ﴿ؕ۲۳﴾

کہہ دے میں تو صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ﴿۲۰﴾ کہہ دے بلاشبہ میں تمھارے لیے نہ کوئی نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا ﴿۲۱﴾ کہہ دے یقیناً میں، مجھے اللہ سے کوئی بھی کبھی پناہ نہیں دے گا اور میں اس کے سوا کبھی پناہ کی کوئی جگہ نہیں پاؤں گا ﴿۲۲﴾ مگر (میں تو صرف) اللہ کے احکام پہنچانے اور اس کے پیغامات کا (اختیار رکھتا ہوں) اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں ہمیشہ ﴿۲۳﴾

**آیت 20** قُلۡ اِنَّمَاۤ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ...... : یعنی تمھیں جتنا بھی ناگوار ہو اور تم روکنے کے لیے جتنے بھی جمع ہو جاؤ، میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکاروں گا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔ ندائے غیر اللہ کی حرمت کی آیات کے لیے دیکھیں گزشتہ آیت (۱۸) کی تفسیر۔

**آیت 21** قُلۡ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ لَکُمۡ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صاف اعلان کرنے کا حکم دیا کہ آپ ﷺ دوسروں کے لیے نہ نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے اور نہ ہی ہدایت اور گمراہی کا اختیار رکھتے ہیں۔ "ضَرًّا" کے مقابلے میں "نَفۡعًا" اور "رَشَدًا" کے مقابلے میں "غَیًّا" حذف کر دیا ہے، کیونکہ وہ الفاظ خود بخود معلوم ہو رہے ہیں۔

ایک اور مقام پر یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ آپ ﷺ خود اپنے نفع یا نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ (دیکھیے اعراف: ۱۸۸) اور کئی مقامات پر واضح فرمایا کہ اللہ کے علاوہ جن لوگوں کو بھی پکارا جاتا ہے وہ ذرہ برابر چیز کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ (مثلاً دیکھیے سبا: ۲۲۔ فاطر: ۱۳) اتنی صراحت کے بعد بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو یا دوسرے انبیاء و اولیاء کو اپنے نفع و نقصان کا مالک سمجھے تو اسے خود ہی سوچنا چاہیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے فرمان کی کیا قدر کی۔

**آیت 22** قُلۡ اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ...... : یعنی آپ انھیں کہہ دیں کہ اگر میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکاروں یا اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی گرفت سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا اور نہ مجھے اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ مل سکے گی، تو تم اس کی گرفت سے کیسے بچ سکو گے اور کس کی پناہ میں جاؤ گے؟

**آیت 22** اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِسٰلٰتِہٖ...... : یہ "لَاۤ اَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا" سے استثنا ہے اور درمیان والی آیت پہلی آیت ہی کی مزید وضاحت ہے، یعنی میں تو صرف اللہ کے احکام پہنچانے کا اور اس کے پیغامات کا اختیار رکھتا ہوں، میرا کام بس اتنا ہی ہے، پیغام پہنچ جانے کے بعد جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس

حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

(یہ اسی طرح غفلت میں رہیں گے) یہاں تک کہ جب وہ چیز دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو ضرور جان لیں گے کہ کون ہے جو مددگار کے اعتبار سے زیادہ کمزور ہے اور جو تعداد میں زیادہ کم ہے؟ ﴿۲۴﴾ کہہ دے میں نہیں جانتا آیا وہ چیز قریب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، یا میرا رب اس کے لیے کچھ مدت رکھے گا ﴿۲۵﴾ (وہ) غیب کو جاننے والا ہے، پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ﴿۲۶﴾

میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ نافرمانی سے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہ لانا ہے، کیونکہ پچھلی آیات میں یہی مضمون آ رہا ہے۔ ابدی جہنمی صرف کفار ہیں، یہ مطلب نہیں کہ ہر گناہ اور نافرمانی کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے۔

**آیت 24** : حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ ...... : یعنی کفار اپنی تعداد کی کثرت اور اپنے مددگاروں کی قوت پر فخر اور مسلمانوں کی قلت تعداد اور کمزوری پر طعن کرتے ہیں تو کرتے رہیں، یہ سب کچھ تھوڑے وقت کے لیے ہے، یہاں تک کہ جب یہ لوگ وہ چیز (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ مددگاروں کے لحاظ سے کمزور اور تعداد میں کم کون ہے؟ وہ چیز جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اس سے مراد اسلام کا غلبہ اور کفار کی شکست بھی ہے، جیسے کہ بدر، خندق، فتح مکہ اور حنین میں انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، کفار پر خوف اور قحط کا مسلط ہونا بھی ہے اور مرتے وقت فرشتوں کا ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر مارنا بھی، قبر کا عذاب بھی ہے، قیامت کی ہولناکی اور جہنم کی آگ بھی۔ درجہ بدرجہ یہ سب کچھ دیکھتے جانے کے ساتھ ہی ان پر اپنی تعداد کی کثرت اور حمایتیوں کی قوت کی حقیقت کھلتی جائے گی۔

**آیت 25** : قُلْ اِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ ...... : یعنی یہ لوگ جو جلدی مچاتے اور پوچھتے ہیں کہ اسلام کا وہ غلبہ، کفار پر عذاب اور قیامت کا معاملہ کب ہوگا؟ تو آپ ان سے کہہ دیں کہ میرا کام تمھیں آگاہ کرنا ہے، وقت بتانا میرا کام نہیں اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ وہ وقت بالکل قریب آ چکا ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی اور مدت مقرر کرتا ہے۔

**آیت 25** : عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ ...... : یعنی یہ جاننا کہ کل کیا ہوگا اور قیامت کب آئے گی غیب میں شامل ہے اور غیب جاننے والا صرف اور صرف میرا رب ہے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ [لقمان : ۳۴] ”بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔“

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ ع ۲/۱۲

**مگر کوئی رسول، جسے وہ پسند کرلے تو بے شک وہ اس کے آگے اور اس کے پیچھے پہرا لگا دیتا ہے ﴿۲۷﴾ تاکہ جان لے کہ انھوں نے واقعی اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں اور اس نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہیں اور ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے ﴿۲۸﴾**

**آیت 27** اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ......: ''اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا'' لیکن اگر وہ اپنے غیب کی کوئی بات بتانا چاہے تو ہر ایک کو نہیں بتاتا بلکہ صرف اسی کو بتاتا ہے جسے وہ رسول کے طور پر پسند کرلے۔ "رَسُوْلٍ" کا معنی ہے وہ شخص جسے پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہو، یعنی وہ غیب کی بات کسی کو عالم الغیب بنانے کے لیے نہیں بلکہ اسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس چنے ہوئے رسول کو بھی جب غیب کی کسی بات کی اطلاع دیتا ہے تو اس کے چاروں طرف شہابِ ثاقب اور فرشتوں کا زبردست پہرا لگا دیتا ہے، تاکہ شیطان اس وحی میں نہ اپنی کوئی بات داخل کر سکیں اور نہ وقت سے پہلے معلوم کرکے کاہنوں کو اطلاع دے سکیں، بلکہ کلام الٰہی محفوظ طریقے سے رسول تک اور رسول کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچے۔

**آیت 28** ❶ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا......: اس سارے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ رسولوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر اس چھوٹی اور بڑی چیز کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہے اور ہر ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے۔ رسولوں کی مجال نہیں (خواہ وہ فرشتے ہوں جیسے جبریل علیہ السلام یا انسان ہوں جیسے تمام رسول علیہم السلام) کہ اللہ کے پیغامات میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی کر سکیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی ہر چیز کا علم رکھتا ہے، پھر "لِيَعْلَمَ" (تاکہ وہ جان لے) فرمانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک وہ پہلے ہی سب کچھ جانتا ہے کہ اس طرح ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ سب انتظام اس لیے کیا ہے تاکہ رسول اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیں اور اللہ تعالیٰ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں۔

❷ بعض لوگ ان آیات سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول بھی عالم الغیب ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انھیں غیب پر مطلع کرتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیب ذاتی ہے اور انبیاء کا علم غیب عطائی یعنی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [ النمل: ٦٥ ] ''کہہ دیجیے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کے علاوہ غیب نہیں جانتا۔'' یعنی عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر وہ کسی رسول کو کوئی بات بتا دے تو اس سے وہ عالم الغیب نہیں بن جاتا، کیونکہ ایک تو رسولوں کو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے جتنی بتائی جاتی ہے، وہ ہر بات نہیں جانتے اور یہ عالم الغیب کی شان کے خلاف ہے کہ اسے کچھ خبریں معلوم ہوں اور کچھ معلوم نہ ہوں۔ دوسرے جب کسی کو غیب کی کوئی بات بتانے سے معلوم ہو تو وہ عالم الغیب نہیں ہوتا، ورنہ ہم سب عالم الغیب

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے کپڑے میں لپٹنے والے! ﴿۱﴾

ہو جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو غیب کی جو باتیں بتائیں وہ لوگوں کو پہنچانے کے لیے بتائیں، قیامت، جنت، دوزخ اور حوض کوثر وغیرہ یہ سب غیب کی باتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بتانے سے ہمیں معلوم ہیں، تو کیا ہم بھی عالم الغیب ہیں؟ ظاہر ہے ایسا نہیں، سو حق یہی ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے، دوسرا کوئی عالم الغیب نہیں، نہ ذاتی نہ عطائی۔

## سورۃ المزمل

آیت 1 ❶ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ: "الْمُزَّمِّلُ" اصل میں "اَلْمُتَزَمِّلُ" تھا، تاء کو زاء سے بدل کر زاء میں ادغام کر دیا، کپڑے میں لپٹنے والا۔ یہ باب لازم ہے۔

❷ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ : ''اے کپڑے میں لپٹنے والے!'' ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان آیات کے اترنے کے وقت رسول اللہ ﷺ کپڑے میں لپٹ کر لیٹے ہوئے تھے۔ اس خطاب میں رسول اللہ ﷺ سے بہت لطف و کرم اور محبت کا اظہار ہے، کیونکہ اہل عرب کا طریقہ ہے کہ وہ مخاطب سے نرمی اور محبت سے بات کرنا چاہتے ہوں تو ایسے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں جو مخاطب کی اس وقت کی حالت پر دلالت کر رہا ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا: « قُمْ أَبَا تُرَابٍ! » [ بخاري، الصلاة، باب نوم الرجال في المسجد : ٤٤١ ] ''مٹی والے! اٹھ کھڑا ہو۔''

❸ آپ ﷺ کے چادر میں لپٹنے کی وجہ کیا تھی؟ اس میں تین قول ہیں، پہلا یہ کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ پہلی وحی: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ کے نزول کے موقع پر جب فرشتے نے آپ کو تین مرتبہ زور سے دبایا تو آپ گھر میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: « زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ » [ بخاري، الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...... : ٣ ] ''مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔'' اسی طرح جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کچھ عرصہ تک وحی بند رہنے کے بعد رسول اللہ ﷺ پر جب وحی اتری تو آپ نے اس کے متعلق بیان فرمایا: ''میں چلا جا رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں اس سے ڈر گیا اور واپس آ کر کہا: « زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ » تو اللہ عزوجل نے " يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ " سے لے کر " وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ " تک آیات اتاریں۔'' [ بخاري، الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...... : ٤ ] ان دونوں موقعوں پر "زَمِّلُوْنِيْ" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر فرشتے کی ملاقات اور وحی کے اترنے سے جو رعب اور خوف طاری ہوتا تھا اس کی وجہ سے آپ کپڑا لپیٹ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٢ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝٣ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝٤

رات کو قیام کر مگر تھوڑا ② آدھی رات (قیام کر)، یا اس سے تھوڑا سا کم کر لے ③ یا اس سے زیادہ کر لے اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ ④

کے اس بارگراں کو اٹھانے کے لیے تیار کرنے کی خاطر آپ کو قیام اللیل کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اللیل کے ساتھ آپ کو وحی کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، چنانچہ بعد میں وحی تسلسل اور کثرت سے اترنے لگی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ''اے چادر میں لپٹ کر سونے والے! سستی اور سونے کا وقت گیا، رات کو قیام کر......'' تیسرا قول یہ ہے کہ قریش مکہ دار الندوہ میں جمع ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے لیے کوئی ایسا نام طے کرنے لگے جسے سن کر لوگ آپ کے پاس آنے سے باز رہیں۔ کسی نے کہا کاہن ہے، کچھ دوسرے کہنے لگے کاہن نہیں ہے۔ کسی نے دیوانہ کہا، اس کی بھی تردید ہو گئی۔ کچھ بولے جادوگر ہے، دوسروں نے کہا جادوگر نہیں ہے۔ غرض مشرکین اس قسم کی باتیں کر کے چلے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ باتیں پہنچیں تو آپ کو بہت صدمہ ہوا اور اس پریشانی اور غم کی حالت میں آپ چادر لپیٹ کر لیٹ گئے۔ جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴾ ''اے کپڑے میں لپٹنے والے!'' اور فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ ''اے کمبل میں لپٹنے والے!'' مقصد یہ ہے کہ آپ ان کی باتوں سے بددل اور رنجیدہ ہو کر چادر لپیٹ کر نہ لیٹ جائیں بلکہ رات کو قیام کریں، اس سے آپ میں یہ بارگراں اٹھانے کی قوت پیدا ہو گی، ان لوگوں کی باتوں پر صبر کریں اور ان سے اچھے طریقے سے علیحدگی اختیار کریں۔ ابن کثیر نے یہ قول جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی روایت سے مسند بزار سے نقل کیا ہے، مگر اس کی سند میں ایک راوی معلّٰی بن عبد الرحمٰن ہے جس کے متعلق تقریب میں ہے: ''مُتَّهَمٌ بِالْوَضْعِ وَ قَدْ رُمِيَ بِالرَّفْضِ'' ''اس پر احادیث گھڑنے کی تہمت ہے اور رافضیت کا الزام بھی ہے۔''

**آیت 2 تا 4** ① قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ...... : تھوڑا حصہ چھوڑ کر ساری رات کا قیام کر۔ ''نِصْفَهٗۤ'' ''الَّيْلَ'' سے بدل ہے، مگر اس ''الَّيْلَ'' سے جس میں سے ''قَلِيْلًا'' کا استثنا ہو چکا ہے۔ ''قَلِيْلًا'' کا لفظ چونکہ مجمل ہے، اس لیے اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر جس حصے کا قیام کرنا ہے وہ کتنا ہونا چاہیے۔ فرمایا رات کا نصف قیام کریں یا نصف سے کچھ کم کر لیں یا نصف سے زیادہ کر لیں۔ اس سورت کی آخری آیت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ان آیات کے نزول کے بعد رات کی دو تہائی کے قریب اور رات کے نصف اور رات کی تہائی کے برابر قیام کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''نصف سے کچھ کم'' کا مطلب ثلث اور ''نصف سے زیادہ'' کا مطلب دو ثلث کے قریب ہے۔ ''مِنْهُ'' اور ''عَلَيْهِ'' کی ضمیریں ''نِصْفَهٗۤ'' کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ اس تقریر سے وہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ ''اِلَّا قَلِيْلًا'' کے بعد ''اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا'' میں تکرار ہے۔ اس سوال کا ایک اور حل یہ ہے کہ ''قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا'' کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ''رات کا قیام کر مگر کسی رات رہ جائے تو مضائقہ نہیں۔'' ''نِصْفَهٗۤ'' سے یہ بیان شروع ہوتا ہے کہ رات کا کتنا حصہ قیام میں گزارنا ہے، یہ

تفسیر بھی درست ہے۔

❷ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو قیامُ الّیل کا حکم دے کر اس کی تاکید فرمائی ہے۔ تہجد، وتر، قیام رمضان اور تراویح سب قیام اللیل ہی کے نام ہیں۔ اہلِ علم میں اختلاف ہے کہ یہ نماز فرض ہے یا سنت اور اگر فرض ہے تو صرف رسول اللہ ﷺ پر فرض تھی یا پوری امت پر فرض ہے؟ قرطبی میں ہے کہ حسن اور ابنِ سیرین اس بات کے قائل ہیں کہ رات کو نماز ہر مسلم پر فرض ہے خواہ بکری کا دودھ دوہنے کے برابر پڑھے، مگر اکثر علماء فرماتے ہیں اور صحیح بھی یہی ہے کہ قیام اللیل امت پر فرض نہیں بلکہ یہ ایسی سنت ہے جس کی بہت تاکید کی گئی۔ سورۂ مزمل کے آخر میں فرمایا: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ﴾ [ المزمل : ۲۰ ] یعنی آپ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ اتنا قیام کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ صحابہ کی صرف ایک جماعت قیام کرتی تھی، اگر یہ فرض ہوتا تو ایک جماعت کے بجائے تمام صحابہ قیام کرتے۔

صحیحین میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سائل کو ارکان دین بتائے اور نمازوں میں سے دن رات میں صرف پانچ نمازیں فرض بتائیں، اس نے پوچھا: ''کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی کچھ فرض ہے؟'' تو آپ نے فرمایا: (( لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ )) [ بخاري، الإيمان، باب الزكاة من الإسلام : ٤٦۔ مسلم : ١١ ] ''نہیں، اِلاّ یہ کہ تم اپنی خوشی سے پڑھو۔'' صحیحین ہی میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک رمضان میں تین راتیں لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جماعت کی صورت میں قیام میں شریک ہوتے رہے۔ چوتھی رات آپ باہر تشریف نہیں لائے اور فرمایا: (( أَنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ )) [ بخاري، التهجد، باب تحريض النبي ﷺ...... : ١١٢٩۔ مسلم : ٧٦١ ] ''میں اس بات سے ڈرا کہ تم پر (یہ نماز) فرض نہ ہو جائے۔'' اگر قیام اللیل فرض ہوتا تو آپ اس کے ان پر (یہ نماز) فرض ہو جانے سے کیوں ڈرتے؟ رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ پر قیام اللیل فرض تھا یا نہیں تو اس کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۷۹) کی تفسیر۔

فرض نہ ہونے کے باوجود قیام اللیل کی تاکید و فضیلت قرآن و حدیث میں بہت آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ الصَّلَاةُ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ )) [ مسلم، الصيام، باب فضل صوم المحرم : ٢٠٣/١١٦٣ ] ''فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن اور متقی بندوں کی شان میں فرمایا: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ [ السجدة : ١٦ ] ''ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں، اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے پکارتے ہیں اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴾ [ الذاريات : ١٧ ] ''وہ رات کے تھوڑے حصے میں سویا کرتے تھے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ [ بني إسرائيل : ٧٩ ] ''اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ، اس حال میں

کہ تیرے لیے زائد ہے۔ قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے۔" عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ قَامَ بِعَشْرِ آيَاتٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ وَمَنْ قَامَ بِمِائَةِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ وَمَنْ قَامَ بِأَلْفِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقَنْطِرِيْنَ » [ أبو داؤد، تفريع أبواب شهر رمضان، باب تحزيب القرآن : ١٣٩٨، وقال الألباني صحيح ] "جو شخص دس آیات کے ساتھ قیام کرے وہ غافلین میں نہیں لکھا جاتا، جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے وہ قانتین (عبادت گزاروں) میں لکھا جاتا ہے اور جو ہزار آیات کے ساتھ قیام کرے وہ مقنطرین (خزانے والوں) میں لکھا جاتا ہے۔" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلّٰى وَأَيْقَظَ امْرَأَتَهُ فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَ فِيْ وَجْهِهَا الْمَاءَ، رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ وَأَيْقَظَتْ زَوْجَهَا فَإِنْ أَبٰى نَضَحَتْ فِيْ وَجْهِهِ الْمَاءَ » [ أبوداؤد، التطوع، باب قيام الليل : ١٣٠٨، وقال الألباني حسن صحيح ] "اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جو رات کو اٹھا، نماز پڑھی اور اپنی بیوی کو جگایا (اور اس نے بھی نماز پڑھی)، اگر اس نے انکار کیا تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم کرے جو رات کو اٹھی اور نماز پڑھی، خاوند کو جگایا (اور اس نے بھی نماز پڑھی)، اگر اس نے انکار کیا تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔"

رات کے اوقات میں سے بھی رات کے آخری حصے میں قیام کی فضیلت زیادہ ہے۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ الْآخِرِ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَكُوْنَ مِمَّنْ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْ تِلْكَ السَّاعَةِ فَكُنْ » [ ترمذي، الدعوات، باب : ٣٥٧٩، و صححه الألباني في صحيح الجامع ] "رب تعالیٰ بندے کے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصے میں ہوتا ہے، اگر تو یہ کر سکے کہ اس وقت اللہ کا ذکر کرنے والوں میں سے ہو تو یہ کام کر۔" قیام اللیل کا سب سے بہتر طریقہ داؤد علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَحَبُّ الصَّلَاةِ إِلَى اللّٰهِ صَلَاةُ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَكَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُوْمُ ثُلُثَهُ وَيَنَامُ سُدُسَهُ » [ بخاري، التهجد، باب من نام عند السحر : ١١٣١ ] "اللہ تعالیٰ کو نمازوں میں سے سب سے محبوب نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے، وہ رات کا نصف سو جاتے اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتے اور چھٹا حصہ سو جاتے۔"

④ "وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ" اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ "تَرْتِيْلًا" مصدر تاکید کے لیے ہے، خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ اس میں بتایا ہے کہ رات کے قیام میں پڑھنا کیا ہے؟ سو حکم ہوا کہ قرآن پڑھیں اور خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ترتیل میں کئی چیزیں شامل ہیں، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ ٹھہر ٹھہر کر پورے غور و فکر کے ساتھ تلاوت کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ اس حکم کے مطابق خوب ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کیا کرتے تھے۔ حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « وَكَانَ يَقْرَأُ بِالسُّوْرَةِ فَيُرَتِّلُهَا حَتّٰى تَكُوْنَ أَطْوَلَ مِنْ أَطْوَلَ مِنْهَا » [ مسلم، صلاة المسافرين، باب جواز النافلة قائما و قاعدا ... : ٧٣٣ ] "اور آپ ﷺ سورت کی تلاوت کرتے اور اسے اتنا ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے کہ وہ اس سے لمبی سورت سے بھی لمبی ہو جاتی۔" دوسری چیز جو ترتیل میں شامل ہے، یہ ہے کہ ہر لفظ

# اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝

## یقیناً ہم ضرور تجھ پر ایک بھاری کلام نازل کریں گے ۝

الگ الگ سمجھ میں آئے، چنانچہ یعلیٰ بن مملک نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت اور نماز کے متعلق سوال کیا، انھوں نے پہلے آپ کی رات کی نماز کا حال بیان کیا: « ثُمَّ نَعَتَتْ قِرَاءَتَهُ فَإِذَا هِيَ تَنْعَتُ قِرَاءَةً مُفَسَّرَةً حَرْفًا حَرْفًا » [ ترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء كيف كانت قراءة النبي ﷺ : ۲۹۲۳ ] ”پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کی صفت بیان کی تو انھوں نے ایسی قراءت بیان کی جس کا ایک ایک حرف واضح کیا گیا تھا۔“

تیسری چیز ہر آیت پر ٹھہرنا ہے، بعض لوگ ایک ہی سانس میں وقف کے بغیر آیت کے ساتھ آیت ملائے جاتے ہیں اور اسے کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ سنت کے خلاف ہے، جیسا کہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَطِّعُ قِرَاءَتَهُ [ وَ فِيْ رِوَايَةِ أَبِيْ دَاوٗدَ : يُقَطِّعُ قِرَاءَتَهُ آيَةً آيَةً ] يَقْرَأُ : ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ثُمَّ يَقِفُ ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ ثُمَّ يَقِفُ » [ ترمذي، القراءات، باب في فاتحة الكتاب : ۲۹۲۷۔ أبو داوٗد : ۴۰۰۱، وصححه الألباني في صحيح الجامع الصغير ] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قراءت الگ الگ کر کے پڑھتے تھے۔“ اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: ”آپ اپنی قراءت ایک ایک آیت الگ کر کے پڑھتے تھے۔“ آپ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پڑھتے اور ٹھہر جاتے، پھر "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتے اور ٹھہر جاتے۔“ چوتھی چیز یہ ہے کہ حروف مدّہ کو لمبا کر کے پڑھا جائے۔ قتادہ فرماتے ہیں: « سُئِلَ أَنَسٌ كَيْفَ كَانَتْ قِرَاءَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ كَانَتْ مَدًّا ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ يَمُدُّ بِبِسْمِ اللّٰهِ وَ يَمُدُّ بِالرَّحْمٰنِ وَ يَمُدُّ بِالرَّحِيْمِ » [ بخاري، فضائل القرآن، باب مد القراءة : ۵۰۴۶ ] ”انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی تھی؟ تو انھوں نے فرمایا: ”آپ کی قراءت کھینچ کھینچ کر ہوتی تھی۔“ پھر انھوں نے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھی۔ وہ "بِسْمِ اللّٰهِ" کو لمبا کر کے پڑھتے تھے اور "الرَّحْمٰنِ" کو لمبا کر کے پڑھتے اور "الرَّحِيْمِ" کو لمبا کر کے پڑھتے تھے۔“ پانچویں یہ کہ قرآن کو خوب صورت لہجے اور خوش آوازی سے پڑھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ » [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿وأسروا قولكم......﴾ : ۷۵۲۷ ] ”جو شخص قرآن کو خوبصورت لہجے اور خوش آوازی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔“ غرض ترتیل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو خوب غور وفکر کے ساتھ، ٹھہر ٹھہر کر، الفاظ کی واضح ادائیگی کے ساتھ اور حروف مدّہ کو لمبا کر کے جس قدر خوش آوازی کے ساتھ ہو سکے پڑھا جائے۔

**آیت 5** ① اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ ...... : اس آیت میں اور اس کے بعد والی دو آیتوں میں رات کے قیام کے حکم کی حکمت بیان فرمائی گئی ہے کہ وحی الٰہی کا بھاری بوجھ اٹھانے کی استعداد پیدا کرنے کے لیے رات کا قیام اور اس میں پورے غور وفکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت نہایت ضروری ہے۔

# اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِيَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِيۡلًا ؕ﴿۶﴾

بلاشبہ رات کو اٹھنا (نفس کو) کچلنے میں زیادہ سخت اور بات کرنے میں زیادہ درستی والا ہے ﴿۶﴾

② "قَوۡلًا ثَقِيۡلًا" (بھاری کلام) سے مراد وحی الٰہی ہے جو اترتے وقت بھی بھاری ہے، ہر کلام اور ہر چیز سے بھاری ہے، اس پر عمل بھاری ہے اور اسے تمام دنیا تک پہنچانے کا فریضہ بھی بہت بھاری ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے: ① نزول وحی کے وقت آپ ﷺ پر بہت بوجھ پڑتا تھا، جسے برداشت کرنا آپ پر بہت بھاری تھا۔ عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ سخت سردی کے دن آپ پر وحی نازل ہوتی اور جب وہ حالت ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی سے پسینا ٹپک رہا ہوتا۔ [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...... : ۲ ] زید بن ثابت ؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ کی ران میری ران پر تھی، آپ کی ران کا اتنا بوجھ تھا، قریب تھا کہ وہ میری ران کو کچل دے۔ [ دیکھیے بخاري : ۲۸۳۲ ] عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہوتے، آپ پر وحی اترتی تو اونٹنی زمین پر گردن رکھ دیتی۔ [ دیکھیے مسند أحمد : ۱۱۸/٦، ح : ۲٤۹۲۱ ] ② یہ کلام دوسرے تمام کلاموں سے بھاری ہے، باقی سب کلام اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ ③ اس کے احکام پر عمل کرنا بھاری ہے۔ فرائض پنج گانہ اور دوسرے احکام بجا لانا اور اس کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کرنا نفس پر بہت بھاری ہے۔ ④ یہ اس لیے بھی بھاری ہے کہ اسے تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانے کا حکم ہے جو نہایت دشوار کام ہے۔ اس کے لیے آپ کو لوگوں کی مخالفت، طعن و ملامت، ٹھٹھا و مذاق، گالی گلوچ، جسمانی ایذا، قتل کی سازشیں اور ہجرت و جہاد سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔

**آیت 6** ① اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِيَ اَشَدُّ ...... : "نَاشِئَةَ الَّيۡلِ" (رات کا اٹھنا) "نَشَأَ يَنۡشَأُ" (ف، ک) کا مصدر بروزن "عَافِيَةٌ" اور "كَاذِبَةٌ" ہے۔ "نَشَأَ مِنۡ مَّكَانِهٖ" وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ "وَطۡاً" "وَطِئَ يَطَأُ" (س) کا مصدر ہے، پاؤں سے روندنا، کچلنا۔ "اَقۡوَمُ" زیادہ سیدھا، زیادہ درست۔ "قِيۡلًا" "قَوۡلًا" کی طرح مصدر ہے۔

② یعنی رات کا اٹھنا طبیعت پر بہت بھاری اور نفس کو کچلنے میں دوسری تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ واضح رہے کہ جو لوگ زیادہ سے زیادہ جسمانی ایذا برداشت کر لیتے ہیں بے خوابی کی ایذا کے سامنے ان کے حوصلے بھی جواب دے جاتے ہیں۔ نیند جیسی مرغوب چیز چھوڑ کر قیام کا مشکل ترین عمل کرنے سے نفس میں مشقت اٹھانے کی اتنی قوت پیدا ہو گی کہ وہ وحی الٰہی کو اٹھانے اور تبلیغ رسالت کے بھاری بوجھ کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ "اَقۡوَمُ قِيۡلًا" رات کو جب ہر طرف خاموشی ہوتی ہے اور لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت اٹھ کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس مبارک وقت میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کی توجہ خراب کرے، اس وقت منہ سے نکلنے والے الفاظ زبان اور دل دونوں سے نکل رہے ہوتے ہیں اور اس عمل میں کسی دکھاوے یا سناوے کی آمیزش بھی نہیں ہوتی، کیونکہ کوئی دوسرا نہ دیکھتا ہے نہ سن رہا ہوتا ہے، اس لیے اسے بات کرنے میں زیادہ درست قرار دیا۔ پھر رات کا آخری حصہ خاص قبولیت کا وقت بھی ہے، جیسا کہ

## اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا ؕ وَ اذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلۡ اِلَيۡهِ تَبۡتِيۡلًا ؕ

**بلاشبہ تیرے لیے دن میں ایک لمبا کام ہے ⑦ اور اپنے رب کا نام ذکر کر اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا ⑧**

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالَى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرِ يَقُولُ مَنْ يَدْعُونِي فَأَسْتَجِيبَ لَهُ؟ مَنْ يَسْأَلُنِي فَأُعْطِيَهُ؟ مَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَ لَهُ؟ » [ بخاري، التهجد، باب الدعاء والصلاة من آخر الليل : ۱۱۴۵۔ مسلم: ۷۵۸ ] ''ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، جب رات کا آخری ثلث باقی ہوتا ہے، فرماتا ہے: ''کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش کی درخواست کرے اور میں اسے بخشوں؟''

**آیت 7** **اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا:** ''سَبۡحًا'' اور ''سِبَاحَةٌ'' (ف) کا اصل معنی تیرنا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ﴾ [ النازعات : ۳ ] ''اور جو تیرنے والے ہیں! تیزی سے تیرنا۔'' مراد ادھر ادھر آنا جانا، کام کاج اور مشغولیت ہے، یعنی دن کے وقت آپ کو گھر کے کام، فکر معاش، تبلیغ دین، مہمان نوازی، مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح اور جہاد فی سبیل اللہ، غرض بے شمار مصروفیات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا مشغول وقت گزارا ہے ایسا مشغول وقت گزارنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ایسی مشغولیت میں دن کے وقت ذکر الٰہی، قیام اور تلاوت کے لیے الگ وقت نکالنا ممکن نہیں تھا، اس لیے خاص ان کاموں کے لیے رات کو اٹھنے کی تاکید فرمائی۔

**آیت 8** **وَ اذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ ......:** '' بَتَلَ يَبۡتُلُ'' (ن، ض) قطع کرنا۔ ''تَبَتُّلٌ'' منقطع ہونا۔ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ رات کو خاص طور پر اٹھ کر قیام، تلاوت اور ذکر الٰہی کے علاوہ دن رات کے ہر وقت میں بھی اللہ کا ذکر جاری رکھ اور اپنی تمام تر توجہ مخلوق سے ہٹا کر اپنے رب ہی کی طرف رکھ۔ اس مطلب کا قرینہ یہ ہے کہ اس میں ذکر و تبتّل کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا، عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ يَذۡكُرُ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ أَحۡيَانِهِ » [ مسلم، الحيض، باب ذكر الله تعالى في حال الجنابة وغيرها : ۳۷۳ ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔'' دوسرا مطلب یہ ہے کہ دن کی لمبی چوڑی مصروفیات سے فارغ ہو کر رات کو خاص طور پر اپنے رب کا ذکر کر اور ہر کام سے کلی طور پر منقطع ہو کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جا، جیسا کہ سورۂ انشراح میں فرمایا: ﴿ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۙ وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارۡغَبۡ ﴾ [ الانشراح : ۷، ۸ ] ''جب تو فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کر۔'' اس مطلب کا قرینہ شروع سورت سے آیات کا سیاق ہے۔ دونوں مطلب ہی درست ہیں، پہلے مطلب کی صورت میں عام ذکر و تبتّل مراد ہوگا، جو دوسرے اشغال کے ساتھ بھی جاری رہتا ہے اور دوسرے میں خاص، جو دوسرے کام چھوڑ کر رات کی تنہائی میں یکسوئی

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿۹﴾ وَ اصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ وَ ذَرْنِيْ وَ الْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَ مَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾

مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سو اس کو کارساز بنا لے ﴿۹﴾ اور اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور انھیں چھوڑ دے، خوبصورت طریقے سے چھوڑنا ﴿۱۰﴾ اور چھوڑ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو جو خوش حال ہیں اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے ﴿۱۱﴾

سے ادا ہوتا ہے۔

**آیت 9** رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ...... : یعنی مشرق و مغرب کا مالک و مربی وہی ہے، ہر وقت اسی کا ذکر کرو، عبادت بھی اسی کی کرو اور بھروسا بھی اسی پر رکھو، جب وہ معبود اور وکیل ہے تو تمام دنیا سے بے پروا ہو جانے میں فکر کس بات کی؟ عبادت و توکل دونوں کو اللہ کے لیے خاص کرنے کا حکم کئی آیات میں آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [ ھود : ۱۲۳ ] ”سو اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسا رکھ۔“ اور فرمایا: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [ الفاتحۃ : ۴ ] ”ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔“ ”وَكِيْلًا“ ”وَكَلَ يَكِلُ“ (ض) سپرد کرنا۔ وکیل وہ ہے جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے، یعنی اپنی پوری جدوجہد کے باوجود اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر رکھو اور اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دو۔

**آیت 10** وَ اصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ...... : یعنی ایک اللہ کو اپنا سہارا بنانے، ان کے معبودوں کو یکسر چھوڑنے اور اس عمل کی دعوت و تبلیغ پر یہ آپ کو جو کچھ بھی کہیں آپ صبر کریں، خواہ یہ آپ کو جھوٹا کہیں یا دیوانہ یا کاہن یا شاعر، یا محمد کے بجائے مذمم کہیں، غرض کچھ بھی کہیں یا جو بھی بہتان باندھیں آپ صبر کریں، انتقام کے چکر میں نہ پڑیں، نہ ان کی بدسلوکی کا شکوہ کریں۔ خوبصورت طریقے سے الگ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ لڑ جھگڑ کر اور بدزبانی کر کے نہیں بلکہ نہایت حسنِ سلوک، صبر اور شرافت کے ساتھ ان سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ دوسری بات یہ کہ ایسی علیحدگی نہ ہو کہ ان سے بائیکاٹ کر دیں اور بول چال ختم کر کے دعوت ہی سے کنارہ کش ہو جائیں۔ تیسری یہ کہ ظاہری کنارہ کشی کے باوجود ان کی خیر خواہی و ہمدردی اور ہدایت و رہنمائی میں کسی قسم کی کمی نہ کریں۔

**آیت 11** وَ ذَرْنِيْ وَ الْمُكَذِّبِيْنَ...... : یعنی جب تم نے مجھے اپنا وکیل بنا لیا اور اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا تو ان خوش حال جھٹلانے والوں کا معاملہ بھی مجھ پر چھوڑ دو جن کی نعمت و خوش حالی ایمان لانے کے بجائے ان کے انکار کا باعث بن گئی ہے، میں خود ان سے نمٹ لوں گا، آپ انھیں تھوڑی مہلت دیں۔ تھوڑی مہلت سے مراد دنیا ہی میں تھوڑی مہلت ہے، جیسا کہ کفار مکہ کو جھٹلانے کی سزا جلد ہی میدان بدر میں مل گئی۔ اس کے علاوہ اگر زیادہ سے زیادہ مہلت بھی ہو تو دنیا میں زندہ

اِنَّ لَدَيۡنَاۤ اَنۡكَالًا وَّ جَحِيۡمًا ۝۱۲ وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيۡمًا ۝۱۳ يَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ وَكَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِيۡبًا مَّهِيۡلًا ۝۱۴ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ۝۱۵ فَعَصٰى فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰهُ اَخۡذًا وَّبِيۡلًا ۝۱۶ فَكَيۡفَ تَتَّقُوۡنَ اِنۡ كَفَرۡتُمۡ يَوۡمًا يَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِيۡبَا ۝۱۷ السَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌ بِهٖ ؕ كَانَ

بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور سخت بھڑکتی ہوئی آگ ۝۱۲ اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب ۝۱۳ جس دن زمین اور پہاڑ کانپیں گے اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے ۝۱۴ بلاشبہ ہم نے تمھاری طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا ۝۱۵ سو فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے پکڑ لیا، نہایت سخت پکڑنا ۝۱۶ پھر تم کیسے بچو گے اگر تم نے کفر کیا، اس دن سے جو بچوں کو بوڑھے کر دے گا ۝۱۷ اس میں آسمان پھٹ جانے والا ہے، اس کا وعدہ

---

رہنے تک ہے جو یقیناً بالکل کم ہے، پھر اس کے بعد میں جانوں اور یہ جانیں، آپ ایک طرف ہو جائیں۔

**آیت 13-12** اِنَّ لَدَيۡنَاۤ اَنۡكَالًا ... : "اَنۡكَالًا" نِكۡلٌ (نون کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، جانور کے پاؤں کی زنجیر اور لگام کے لوہے والے حصے کو کہتے ہیں۔ "جَحِيۡمًا" "جَحۡمَةٌ" (آگ کا سخت بھڑکنا) سے مشتق ہے۔ (راغب)

"ذَا غُصَّةٍ" جو گلے میں پھنس جائے، نہ نگل سکے نہ اگل سکے۔

**آیت 14** يَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ ... : "كَثِيۡبًا" ریت کا ٹیلہ۔ "مَّهِيۡلًا" (گرایا ہوا) "هَالَ يَهِيۡلُ هَيۡلًا" سے اسم مفعول ہے۔ "هَالَ التُّرَابَ أَوِ الرَّمۡلَ" اس نے مٹی یا ریت کو گرایا۔ یعنی وہ عذاب اس دن ہوگا جب سخت زلزلے سے پہاڑ لرز اٹھیں گے، پھر اس زلزلے کی شدت سے ان کی سختی اور ذرات کی باہمی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ ٹھوس پہاڑوں کے بجائے ریت کے ٹیلوں کی صورت میں بدل جائیں گے، جو خود بخود اس طرح نیچے گر رہی ہوگی جیسے کوئی اسے گرا رہا ہو۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر پہاڑوں پر اس کے بعد گزرنے والی کیفیات بھی ذکر ہوئی ہیں کہ وہ دھنی ہوئی اُون کی طرح ہو جائیں گے، پھر بادلوں کی طرح اڑنے لگیں گے، پھر زمین چٹیل میدان بن جائے گی۔ مزید دیکھیے سورۂ نبا (۲۰) کی تفسیر۔

**آیت 19-15** ❶ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلًا ...... : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو دو طرح سے ڈرایا ہے، ایک فرعون کا قصہ یاد دلا کر کہ اگر تمھاری سرکشی فرعون کی طرح جاری رہی تو تمھارا انجام بھی فرعون اور اس کے لشکروں جیسا ہوگا، دوسرا یہ کہ اگر تم دنیا کے عذاب سے بچ بھی گئے تو قیامت کے اس عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟

❷ شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ : رسول اللہ ﷺ اس بات کی شہادت دیں گے کہ انھوں نے حق تعالیٰ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا اور یہ بھی کہ کس نے اسے مانا اور کس نے انکار کیا۔ یاد رہے کہ آپ انھی لوگوں کے متعلق یہ شہادت دیں گے جو آپ کی زندگی

وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾

ہمیشہ سے (پورا) ہو کر رہنے والا ہے ﴿۱۸﴾ یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ بنا لے ﴿۱۹﴾

میں موجود تھے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّهُ يُجَاءُ بِرِجَالٍ مِّنْ أُمَّتِيْ فَيُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ! أُصَيْحَابِيْ، فَيُقَالُ إِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ فَأَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ: ﴿ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ﴾ فَيُقَالُ إِنَّ هٰؤُلَاءِ لَمْ يَزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى أَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ )) [ بخاري، التفسير، باب: ﴿وكنت عليهم شهيدا﴾ : ۴۶۲۵ ] ”میری امت کے کچھ آدمی لائے جائیں گے اور انھیں بائیں طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا: ”اے میرے رب! یہ تو میرے ساتھی ہیں۔“ کہا جائے گا: ”آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا نیا کام کیا تھا۔“ تو میں وہی کہوں گا جو عبد صالح (عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے: ﴿ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ [ المائدۃ: ۱۱۷ ] ”میں ان پر اس وقت تک شہادت دینے والا تھا جب تک میں ان میں موجود تھا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو خود ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر شہادت دینے والا ہے۔“ کہا جائے گا کہ جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ لوگ اس وقت سے اپنی ایڑیوں پر پھرے رہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ”شَاهِدًا عَلَيْكُمْ“ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے تمام احوال دیکھتے، سنتے اور جانتے ہیں، کیونکہ اس کے بغیر شہادت ہو نہیں سکتی، ان لوگوں کا استدلال درست نہیں۔ علاوہ ازیں شہادت کے لیے خود دیکھنا اور سننا بھی ضروری نہیں، بلکہ اگر ایسے ذریعے سے کوئی بات معلوم ہو جس میں شک کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس پر بھی شہادت دی جا سکتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۴۳) کی تفسیر۔

❸ ”شِيْبًا“ ”أَشْيَبُ“ کی جمع ہے، سفید بالوں والا۔ ”شَابَ يَشِيْبُ شَيْبًا“ (ض) سفید بالوں والا ہونا۔ ”الْوِلْدَانَ“ ”وَلِيْدٌ“ کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کی ہولناکی سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا آدَمُ! يَقُوْلُ لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ، فَيُنَادٰی بِصَوْتٍ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تُخْرِجَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ بَعْثًا إِلَى النَّارِ قَالَ يَا رَبِّ! وَمَا بَعْثُ النَّارِ؟ قَالَ مِنْ كُلِّ أَلْفٍ، أُرَاهُ قَالَ، تِسْعَ مِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ فَحِيْنَئِذٍ تَضَعُ الْحَامِلُ حَمْلَهَا وَيَشِيْبُ الْوَلِيْدُ ﴿ وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَى النَّاسِ حَتّٰى تَغَيَّرَتْ وُجُوْهُهُمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ وَتِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ، وَمِنْكُمْ وَاحِدٌ، ثُمَّ أَنْتُمْ فِي النَّاسِ كَالشَّعْرَةِ السَّوْدَاءِ فِيْ جَنْبِ الثَّوْرِ الْأَبْيَضِ، أَوْ كَالشَّعْرَةِ الْبَيْضَاءِ فِيْ جَنْبِ الثَّوْرِ الْأَسْوَدِ )) [ بخاري، التفسير، باب قوله: ﴿وترى الناس سكرى﴾ : ۴۷۴۱ ] ”اللہ عزوجل قیامت کے دن آدم علیہ السلام سے کہیں گے: ”اے آدم!“ وہ

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ

**بلاشبہ تیرا رب جانتا ہے کہ تو رات کے دو تہائی کے قریب اور اس کا نصف اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتا ہے اور ان لوگوں کی ایک جماعت بھی جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ اس نے جان لیا کہ تم ہرگز**

عرض کریں گے: ''اے ہمارے پروردگار! میں بار بار حاضر ہوں تیری فرماں برداری کے لیے۔'' پھر (انھیں) آواز دی جائے گی: ''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کی جماعت نکالو۔'' وہ پوچھیں گے: ''اے میرے رب! جہنم کی جماعت کیا ہے؟'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔'' تو اس وقت حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور بچے بوڑھے ہو جائیں گے ﴿وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾ [ الحج : ۲ ] ''اور تو لوگوں کو دیکھے گا کہ بے ہوش ہیں، حالانکہ وہ بے ہوش نہیں ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔'' یہ بات لوگوں پر بہت گراں گزری، حتیٰ کہ ان کے چہروں کے رنگ بدل گئے تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''یاجوج ماجوج میں سے نو سو ننانوے اور تم میں سے ایک ہوگا۔ لوگوں کے مقابلے میں تمھاری تعداد اس طرح ہے جیسے سفید بیل کے پہلو میں ایک سیاہ بال یا سیاہ بیل کے پہلو میں ایک سفید بال ہوتا ہے۔'' آیت اور حدیث میں بچوں کے بوڑھے ہونے کے ذکر سے اس دن کی بے پناہ سختی اور ہولناکی کا اظہار ہو رہا ہے، کیونکہ عام غم سے آدمی کے بال فوراً سفید نہیں ہوتے۔ یقیناً وہ انتہائی غیر معمولی شدت اور ہولناکی ہوگی جو بچوں کے بالوں کو بھی سفید کر دے گی۔

④ **السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ**: ''باء'' ''في'' کے معنی میں ہے، یعنی اس دن میں آسمان پھٹ جائے گا، یا ''باء'' سببیہ ہے، یعنی اس دن کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن کی شدت سے آسمان جیسی عظیم مخلوق پھٹ جائے گی تو دوسری چیزوں کا کیا حال ہوگا اور اگر کفر پر قائم رہے تو تم اس دن سے کس طرح بچو گے؟ آسمان کے مقابلے میں تمھاری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔

**آیت 20** ① **اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ** ..... : سعد بن ہشام فرماتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: ''آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے قیام کے متعلق بتائیں؟'' انھوں نے فرمایا: ''تم ''یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ'' نہیں پڑھتے؟'' میں نے کہا: ''کیوں نہیں!'' تو انھوں نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع حصے میں قیام اللیل فرض فرمایا تو نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ ایک سال قیام کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا آخری حصہ بارہ ماہ تک آسمان میں روکے رکھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے آخری حصے میں تخفیف نازل فرمائی اور قیام اللیل فرض ہونے کے بعد نفل ہو گیا۔'' [ مسلم، صلاۃ المسافرین و قصرھا، باب جامع صلاۃ اللیل : ۷۴۶ ] سورۂ مزمل کے اول اور آخر کے نزول کے متعلق سند کے لحاظ سے یہی بات سب سے زیادہ صحیح ہے۔ صحیح مسلم کی اسی روایت کے آخر میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات کو درست قرار دیا،

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا

**اس کی طاقت نہیں رکھو گے، سو اس نے تم پر مہربانی فرمائی تو قرآن میں سے جو میسر ہو پڑھو۔ اس نے جان لیا کہ یقیناً تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور کچھ**

اس لیے بعض روایات میں آٹھ ماہ یا سولہ ماہ کا جو ذکر آیا ہے وہ روایات مرجوح ہیں اور سعید بن جبیر ( تابعی ) کا قول کہ سورۂ مزمل کا آخری حصہ دس سال بعد نازل ہوا، یہ عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ کے ثابت شدہ فرمان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

ہمارے دور کے بعض لوگوں نے عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے صحیح قول کو چھوڑ کر ایک تابعی سعید بن جبیر کے قول کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ سورۂ مزمل کے آغاز کے مضمون سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی، جب کہ آخری آیت میں جہاد اور زکوٰۃ کا ذکر ہے جو مدینہ میں فرض ہوئے، اس لیے اس کے اول و آخر میں دس سال کی مدت کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ بات ہی غلط ہے کہ مکی سورتوں میں جہاد یا زکوٰۃ کا ذکر نہیں، اگرچہ عملاً جہاد مدینہ میں شروع ہوا اور زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ مدینہ میں مقرر ہوا مگر مکی سورتوں میں جہاد کا ذکر بھی ہے اور زکوٰۃ کا بھی۔ مزید دیکھیے اسی آیت کا فائدہ (۷) اور (۸)۔

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال تک تقریباً دو تہائی رات یا نصف یا ثلث قیام کرتے رہے اور صحابہ کی ایک جماعت بھی آپ کے اتباع میں اتنا قیام کرتی رہی، گھڑیاں موجود نہیں تھیں، اسی خیال سے کہ حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہ ہو جائے زیادہ سے زیادہ قیام کی کوشش کرتے مگر رات کے نصف یا ثلث کا صحیح اندازہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو دن رات کا خالق ہے اور جسے دن رات کا خوب اندازہ ہے کہ رات کبھی لمبی ہوتی ہے کبھی چھوٹی، کبھی گرمی میں آتی ہے کبھی سردی میں، وہ خوب جانتا ہے کہ تم ہمیشہ یہ عمل ہرگز نہیں کر سکو گے، اس لیے اس نے مہربانی فرما کر آسانی فرما دی، اب جتنا آسانی سے قیام کر سکتے ہو کرو۔

③ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہرگز یہ طاقت نہیں رکھتے کہ ہمیشہ رات کا دو ثلث یا نصف یا ثلث قیام کر سکیں تو پھر بعض بزرگوں کے متعلق جو حکایات بیان کی جاتی ہیں کہ انھوں نے چالیس (۴۰) سال تک عشاء اور فجر کی نماز ایک وضو سے پڑھی، ان کے متعلق غور کرنا چاہیے کہ جس کام کی طاقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ میں بھی ہرگز نہیں وہ ان لوگوں میں کیسے آ گئی؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو رات کو گیارہ یا تیرہ رکعات پڑھتے تھے، مگر ان بزرگوں کا کمال بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہر رات ہزار ہزار رکعات پڑھتے تھے۔ اب یا تو ان حکایات کو جھوٹا ماننا پڑے گا یا ماننا پڑے گا کہ ان بزرگوں کی پوری کوشش تھی کہ ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھ کر دکھائیں۔

مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا

دوسرے اللہ کی راہ میں لڑیں گے، پس اس میں سے جو میسر ہو پڑھو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو،

④ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ: "أَيْ فَصَلُّوا مَا تَيَسَّرَ لَكُمْ مِّنْ قِيَامِ اللَّيْلِ" ''یعنی رات کا قیام جتنا آسانی سے ہو سکتا ہے اتنی نماز پڑھو۔'' قراءت کا لفظ بول کر نماز مراد لی گئی ہے، جیسا کہ اس کے دوسرے ارکان مثلاً قیام، رکوع اور سجدہ بول کر نماز مراد لی جاتی ہے۔ تو مطلب یہ کہ جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کرو۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ''جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لو'' کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ضروری نہیں کہ سورۂ فاتحہ ہی پڑھی جائے، آسانی سے جو آیت بھی پڑھ سکتا ہے پڑھ لے، نماز ہو جائے گی، مگر یہ بات درست نہیں۔ یہاں یہ ذکر ہی نہیں کہ نماز میں آسانی سے جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھ لو، بلکہ آیت کے سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ "مِنَ الْقُرْاٰنِ" سے مراد رات کا قیام ہے، یعنی تم اتنا لمبا قیام نہیں کر سکتے تو آسانی سے جتنا قیام کر سکتے ہو کر لو۔ نماز کے متعلق جُز بول کر کُل مراد لینا عام ہے۔ مثلاً قیام، رکوع، سجدہ سب نماز کے اجزا ہیں، مگر ان میں سے ہر لفظ بول کر پوری نماز مراد لی جاتی ہے۔ "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" میں بھی قرآن بول کر نماز مراد لی گئی ہے۔ صاحب روح المعانی آلوسی حنفی لکھتے ہیں: "أَيْ فَصَلُّوا مَا تَيَسَّرَ لَكُمْ مِّنْ قِيَامِ اللَّيْلِ عُبِّرَ عَنِ الصَّلَاةِ بِالْقِرَاءَةِ كَمَا عُبِّرَ عَنْهَا بِسَائِرِ أَرْكَانِهَا" ''یعنی تم جتنا آسانی سے رات کا قیام کر سکتے ہو کرو، یہاں قراءت بول کر نماز مراد لی گئی ہے، جس طرح باقی ارکانِ نماز بول کر نماز مراد لی جاتی ہے۔'' اگر صرف الفاظ کو لیا جائے تو یہ معنی ہو گا کہ تم اتنے لمبے قیام کی طاقت ہرگز نہیں رکھتے، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، خواہ نماز میں یا نماز کے بغیر، اتنا ہی رات کو پڑھ لیا کرو۔ صاحب روح المعانی نے اس معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مگر پہلا معنی ہی زیادہ درست ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ کوئی بھی آیت پڑھ لیں تو نماز ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں اور تقریباً حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ )) [ بخاري، الأذان، باب و جوب القراءة ...... : ۷۵٦ـ مسلم : ۳۹٤ ] ''جو شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہے۔'' ہاں، اگر کسی شخص کو سورۂ فاتحہ بھی یاد نہیں تو وہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" پڑھتا رہے اور رکوع میں چلا جائے۔ [ دیکھیے أبو داوٗد، الصلاة، باب ما يجزئ الأمي ...... : ۸۳۲ و حسنه الألباني ]

⑤ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ...... : قیام اللیل میں تخفیف کی وجہ پہلے یہ بیان فرمائی تھی کہ رات کے دو ثلث، نصف یا ثلث کے اندازے کے ساتھ ہمیشہ اتنا لمبا قیام کرنا تمھاری طاقت سے باہر ہے، اس لیے جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کرو۔ اب طاقت سے باہر ہونے کی تین وجہیں بیان فرمائیں جو ہر شخص کو پیش آ سکتی ہیں، پہلی وجہ بیماری ہے، اس میں بڑھاپا اور ہر قسم کی جسمانی معذوری شامل ہے۔ دوسری وجہ اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرنے کے لیے سفر ہے، اس میں طلب علم، زیارتِ

تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾

ع ٢ / ١٤

اچھا قرض دینا اور جو نیکی بھی تم اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں پاؤ گے کہ وہ بہتر اور ثواب میں کہیں بڑی ہے اور اللہ سے بخشش مانگو، بلاشبہ اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿٢٠﴾

احباب اور دوسرے تمام جائز مقاصد کے لیے سفر شامل ہے۔ تیسری وجہ اللہ کی راہ میں لڑائی ہے، اس میں جنگ کے علاوہ اس کی تیاری اور پہرا سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ اسباب بیان کرنے کے بعد دوبارہ فرمایا: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ یعنی ان عذروں کی وجہ سے جتنا قیام آسانی سے کر سکو کرو۔

⑥ "تَيَسَّرَ مِنْهُ" کی تعیین میں وہ حدیث بہت مناسب معلوم ہوتی ہے جو عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: (( مَنْ قَامَ بَعَشْرِ آيَاتٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ وَ مَنْ قَامَ بِمِائَةِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ وَ مَنْ قَامَ بِأَلْفِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقَنْطِرِيْنَ )) [ أبو داوٗد، تفريع أبواب شهر رمضان، باب تحزيب القرآن: ١٣٩٨، وصححه الألباني ] "جو شخص دس آیات کے ساتھ قیام کرے وہ غافلوں سے نہیں لکھا جاتا، جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے وہ قانتین (عبادت گزاروں) میں لکھا جاتا ہے اور جو ہزار آیات کے ساتھ قیام کرے وہ بڑے خزانے والوں میں لکھا جاتا ہے۔" اس آیت اور حدیث سے تخفیف کے باوجود کم از کم دس آیات کے ساتھ قیام اللیل کی تاکید صاف ظاہر ہو رہی ہے۔

⑦ "وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (اور کچھ دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں لڑائی کر رہے ہوں گے) کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں نبی ﷺ کی نبوت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے، کیونکہ یہ آیت بلکہ ساری سورت مکہ میں اتری جب کہ جہاد شروع نہیں ہوا تھا، اس وقت یہ پیش گوئی غیب کی ایک خبر ہے جو ایک نبی ہی کے ذریعے سے دی جاتی ہے۔

⑧ "وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ" سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی، اگرچہ مختلف چیزوں کے نصاب کی تعیین مدینہ میں جا کر ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ قیام اللیل جتنا آسانی سے ہو سکے کرو، مگر فرض نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی ہرگز نہ کرو۔

⑨ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا...... : زکوٰۃ کے بعد قرض حسنہ سے مراد نفلی صدقات ہیں، پھر زکوٰۃ ہو یا نفلی صدقات یا خیر کا کوئی بھی عمل وہ قیامت کے دن دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ کی صورت میں واپس ملیں گے۔

⑩ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ: یعنی کوئی بھی عمل ہو اس کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو، عمل پر پھول مت جاؤ۔ سورۂ ذاریات میں متقین کے متعلق فرمایا: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [ الذاريات: ١٧، ١٨ ] "وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور سحریوں کے وقت استغفار کرتے تھے۔" ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے سلام پھیرتے تو تین دفعہ استغفار کرتے۔ [ مسلم، المساجد و مواضع الصلاة، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته: ٥٩١ ]

سورۃ مدثر مکیہ ۷۴ ﴿ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴾ آیاتہا ۵۶ رکوعاتہا ۲
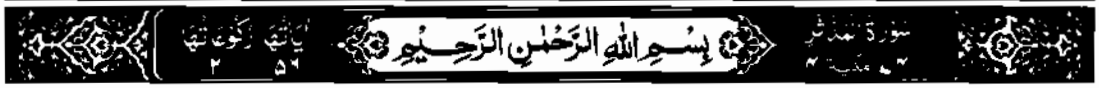
## یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے کمبل میں لپٹنے والے! ① اٹھ کھڑا ہو، پس ڈرا ② اور اپنے رب ہی کی پس بڑائی بیان کر ③

رسول اللہ ﷺ پر سب سے پہلی وحی ﴿ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ﴾ نازل ہوئی، اس کے بعد وحی کچھ عرصہ کے لیے رک گئی اور رسول اللہ ﷺ غمگین رہنے لگے۔ جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما نے وحی رک جانے کے اس عرصہ کے متعلق ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا: « بَيْنَا أَنَا أَمْشِيْ إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ، فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَاءَ نِيْ بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، فَرُعِبْتُ مِنْهُ، فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : ﴿ یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ﴾ إِلٰى قَوْلِهِ: ﴿ وَ الرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ﴾ فَحَمِيَ الْوَحْيُ وَ تَوَاتَرَ » [ بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...... : ٤ـ مسلم : ١٦١ ] ”اس حالت میں کہ میں چلا جا رہا تھا میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا زمین اور آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا، میں اس سے ڈر گیا اور واپس آ کر کہا: ”مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو۔“ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ﴾ سے ﴿ وَ الرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ﴾ تک، پھر وحی گرم ہو گئی اور مسلسل آنے لگی۔“ اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے سورۂ علق کی آیات نازل ہوئیں اور وحی رک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر نازل ہوئی۔

**آیت 1** یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ : ”اَلۡمُدَّثِّرُ“ اصل میں ”اَلْمُتَدَثِّرُ“ تھا ”تاء“ کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کر دیا گیا۔ جو کپڑا جسم کے ساتھ ملا ہوا ہو اسے ”شعار“ اور جو اس کے اوپر پہنا جائے اسے ”دثار“ کہتے ہیں۔ اس خطاب کی وجہ کے لیے دیکھیے سورۂ مزمل کی پہلی آیت کی تفسیر۔

**آیت 2** قُمۡ فَاَنۡذِرۡ : اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیات میں رسول اللہ ﷺ کو دعوت کے آغاز کا حکم ہوا۔ سورۂ علق کے شروع میں آپ کو وہ وحی پڑھنے کا حکم ہوا تھا جو آپ پر نازل ہوئی، اب وحی کے احکام کے مطابق لوگوں کو نصیحت کرنے اور ڈرانے کا حکم ہوا اور وہ اوصاف اختیار کرنے کا حکم دیا گیا جو داعی کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز سستی اور غفلت چھوڑ کر کمرِ ہمت باندھنا اور اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کی پرستش کرنے والوں کو اس کے وبال سے ڈرانا ہے۔

**آیت 3** وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ : ”رَبَّکَ“ کو پہلے لانے سے یہ معنی پیدا ہو گیا کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ ”فَکَبِّرۡ“ میں ”فاء“ پہلے ”قُمۡ“ کے جواب ہی میں ہے، یعنی ”قُمْ فَكَبِّرْ رَبَّكَ.“ اسی طرح ”وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ“ اور ”وَ الرُّجۡزَ

وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿۴﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿۵﴾

اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ ④ اور پلیدی کو پس چھوڑ دے ⑤

فَاهْجُرْ " میں بھی ''فاء'' اسی "قُمْ " کے جواب میں ہے۔ "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ " کے الفاظ میں ''صرف اپنے رب کو بڑا جان'' اور ''صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر'' دونوں معنی موجود ہیں، یعنی دعوت دیتے وقت کوئی کتنا بڑا سردار یا مال دار یا بادشاہ یا بدمعاش ہو اس کی بڑائی تمھاری دعوت کے لیے رکاوٹ نہ بنے، بلکہ صرف اپنے رب کو بڑا جانو۔ جب تمھارے دل و دماغ میں اور تمھاری آنکھوں کے سامنے صرف وہی بڑا ہوگا تو ساری مخلوق تمھاری نظروں میں ہیچ ہوگی اور تمھیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے احکام پہنچانے میں کسی کی بڑائی مانع نہیں ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا وصف بیان فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [ الأحزاب : ۳۹ ] ''وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور صرف اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے۔''

دوسرے معنی ہیں ''صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر'' یعنی جاہل اور مشرک لوگ جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں ان سب کی نفی کر دو اور صاف اعلان کر دو کہ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ کی شان ہے، اس کے علاوہ بڑا بننا کسی کا حق ہی نہیں ہے، اس لیے عبادت کے لائق بھی صرف اسی کی ہستی ہے۔

**آیت 4** ① وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ : کافر لوگ کتنے بھی صاف ستھرے ہوں اپنے کپڑے پاک نہیں رکھتے، نہ انھیں پیشاب سے پرہیز ہوتا ہے نہ استنجا کی فکر اور نہ غسلِ جنابت کا خیال۔ حکم ہوا کہ آپ اپنے کپڑے پاک رکھیں۔ جب کپڑے پاک رکھنا ضروری ہے تو جسم پاک رکھنا تو بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوا۔ آیت کے ظاہری الفاظ کا تقاضا یہی ہے اور سب سے پہلے مراد بھی یہی ہے۔ ہاں، محاورہ میں پاک دامنی سے مراد گناہوں کی آلودگی سے پاک ہونا بھی ہوتا ہے، اس لیے یہ معنی بھی ہے کہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھو۔ طبری نے پہلا معنی زیادہ ظاہر قرار دیا ہے۔

② "وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ " (اپنے کپڑے پاک رکھو) میں ٹخنے سے اوپر کپڑا اٹھا کر رکھنے کا حکم بھی داخل ہے، کیونکہ لٹکانے کی صورت میں اس کے پلید ہونے کا خطرہ بالکل ظاہر ہے۔

**آیت 5** وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ : اس کا لفظی معنی ہے ''اور پلیدی کو پس چھوڑ دے۔'' مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی پلیدی سے علیحدہ رہو۔ ''رجز'' اور ''رجس'' ایک ہی چیز ہے، اس کا سب سے پہلا مصداق بت اور غیر اللہ کے آستانے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴾ [ الحج : ۳۰ ] ''پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بچو۔'' یعنی پلیدی سے بچو، جو بت ہیں۔ علاوہ ازیں "الرُّجْزَ " (پلیدی) میں ہر قسم کے فاسد اعتقاد، برے اخلاق، جھوٹے اقوال، قبیح اخلاق اور نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی تمام نجاستیں شامل ہیں۔ ان دونوں آیتوں میں داعی کو خود کو ہر لحاظ سے پاک صاف رکھنے کی تاکید ہے، کیونکہ اگر وہ خود ہی ناپاک یا آلودہ ہوگا تو اس کی دعوت کیا اثر کرے گی؟

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝٦ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝٧ فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝٨ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝٩ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝١٠

اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے ⑥ اور اپنے رب ہی کے لیے پس صبر کر ⑦ سو جب صور میں پھونکا جائے گا ⑧ تو وہ اس دن، ایک مشکل دن ہے ⑨ کافروں پر آسان نہیں ⑩

آیت 6 وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ : "مَنَّ يَمُنُّ" احسان کرنا۔ "اِسْتَكْثَرَ" (استفعال) زیادہ طلب کرنا۔ "اِسْتَكْثَرَ الشَّيْءَ" کا معنی کسی چیز کو زیادہ سمجھنا بھی آتا ہے۔ یعنی آپ کسی پر احسان کریں تو اس نیت سے نہیں کہ مجھے اس سے زیادہ ملے گا۔ نہ راہ حق کی طرف رہنمائی کے احسان پر کسی سے کوئی توقع رکھیں، نہ کسی کو کچھ دے کر اس سے زیادہ حاصل ہونے کی طلب رکھیں، توقع اور طلب صرف اپنے پروردگار سے رکھیں۔ اس کے علاوہ یہ معنی بھی درست ہے کہ آپ کسی پر جتنا بھی احسان کریں اسے زیادہ نہ سمجھیں۔ اس آیت میں داعی کو ہر قسم کی طمع اور لالچ سے اجتناب کا حکم ہے، کیونکہ یہ چیز دعوت الی اللہ کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

آیت 7 وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ : یعنی آپ کسی پر جو احسان کریں یا کسی کو جو عطیہ دیں اس کی جزا صرف اپنے رب ہی سے لینے کے لیے صبر کریں۔ "وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ" میں یہ معنی بھی داخل ہے کہ آپ کو حق کا پیغام پہنچانے میں بہت سے مصائب و مشکلات کا سامنا ہوگا، عرب و عجم سے لڑائی درپیش ہوگی، آپ ان تمام مصائب پر صبر کریں اور یہ صبر صرف اور صرف اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے ہو، اس ہمت اور اولو العزمی کے بغیر دعوت کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ لقمان نے اپنے بیٹے کو فرمایا تھا: ﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ [ لقمان : ١٧ ]
"اور نیکی کا حکم کر اور برائی سے منع کر اور جو تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کر، یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔"

آیت 8، 9 فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ...... : "النَّاقُوْرِ" "نَقَرَ يَنْقُرُ" (ن) سے "فَاعُوْلٌ" کے وزن پر ہے جس کا معنی ہے پھونکنا، ایسی ضرب لگانا کہ سوراخ ہو جائے، مراد صور ہے۔ شروع سورت میں ڈرانے کا حکم ہے، اب اس کی تفصیل ہے کہ جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور ہر چیز فنا ہونے کے بعد دوبارہ سب لوگ قبروں سے نکل کر اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو وہ ایک مشکل دن ہوگا۔

آیت 10 عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ : پہلے: "يَوْمٌ عَسِيْرٌ" (وہ ایک مشکل دن ہے) فرمایا، پھر فرمایا: ﴿ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴾ "جو کافروں پر آسان نہیں ہے۔" اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشکل ہوتا ہی وہ ہے جو آسان نہ ہو، تو اس صراحت کا مطلب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مشکل دن میں کوئی نہ کوئی آسانی بھی ہو سکتی ہے، یا ممکن ہے شروع میں مشکل ہو مگر پھر آسانی ہو جائے، اس لیے فرمایا کفار کے لیے تو اس دن کوئی آسانی نہیں، نہ شروع میں نہ بعد میں۔ ہاں، اہل ایمان کے لیے آسانی ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ﴾ [ الأنبياء : ١٠٣ ] "وہ سب

ذَرْنِيْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾

**چھوڑ مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ﴿۱۱﴾ اور میں نے اسے لمبا چوڑا مال عطا کیا ﴿۱۲﴾ اور حاضر رہنے والے بیٹے (عطا کیے) ﴿۱۳﴾ اور میں نے اس کے لیے سامان تیار کیا، ہر طرح تیار کرنا ﴿۱۴﴾**

سے بڑی گھبراہٹ انھیں غمگین نہیں کرے گی۔'' اور اگر شروع میں کچھ شدت محسوس ہوئی بھی تو بعد میں آسانی ہو جائے گی۔

**آیت 11** ❶ **ذَرْنِيْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا:** رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو جھٹلانے میں سب سے پیش پیش مکہ کے بڑے بڑے سردار تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خوش حالی اور دنیوی نعمتیں عطا فرمائی ہوئی تھیں، مگر انھوں نے مال و اولاد، جاہ و حشمت اور اقتدار پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کے رسول ﷺ کو جھٹلا دیا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کے بجائے اسے جادو اور انسانی کلام قرار دیا۔ ان لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کے معاملے کو مجھ پر چھوڑ دیں، میں جانوں اور یہ جانیں، ان کا بندوبست میں خود کروں گا۔

ان آیات سے اکثر مفسرین نے اگرچہ ایک خاص شخص ولید بن مغیرہ مراد لیا ہے، مگر "مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا" میں "مَنْ" کا لفظ واحد ہونے کے باوجود معنی کے لحاظ سے عام ہے اور آیت میں مذکور مال و دولت اور اولاد و اقتدار صرف ولید ہی کے پاس نہ تھا اور نہ ہی وہ اکیلا قرآن کو جادو اور انسانی کلام قرار دیتا تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والے اکثر متکبرین کا یہی حال تھا، اس لیے ان آیات میں ان سب کو تنبیہ کی گئی ہے۔ ہاں، یہ درست ہے کہ یہ آیات ولید بن مغیرہ پر بھی صادق آتی ہیں اور وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے جو ان آیات سے مراد ہیں اور ان آیات کے اس کے متعلق نازل ہونے کا مطلب بھی یہی ہے، مگر وہ اکیلا ان آیات کا مصداق نہیں بلکہ ان سے ولید بن مغیرہ کے علاوہ ان صفات والے تمام متکبر مراد ہیں، خواہ وہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا دنیا کے کسی دوسرے خطہ میں رہنے والے ہوں۔

❷ "**خَلَقْتُ وَحِيْدًا**" کے دو معانی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ میں نے اسے اس حال میں پیدا کیا کہ وہ اکیلا تھا، نہ اس کی خدمت میں حاضر رہنے والے بیٹے تھے اور نہ کوئی مال و متاع۔ ہر انسان ماں کے پیٹ سے اکیلا آتا ہے، مال و اولاد، فوج و لشکر اور سامان وغیرہ کچھ ساتھ نہیں لاتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ [الأنعام: ۹٤] ''اور بے شک تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آ گئے، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔'' دوسرا یہ کہ میں نے اکیلے ہی اسے پیدا کیا اور اسے یہ سب کچھ عطا کیا، اسے پیدا کرنے میں یا یہ مال و اولاد عطا کرنے میں کوئی دوسرا میرے ساتھ شریک نہ تھا۔

**آیت 12 تا 14** **وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا ......:** "**مَمْدُوْدًا**" "مَدَّ يَمُدُّ" (ن) سے اسم مفعول ہے، پھیلایا ہوا۔ یعنی مال مویشی، کھیت، باغات، کاروبار اور تجارت وغیرہ ہر قسم کا لمبا چوڑا مال عطا کیا۔ "**شُهُوْدًا**" "شَاهِدٌ" کی جمع ہے، ہر وقت خدمت میں حاضر بیٹے عطا کیے۔ بیٹے اللہ کی نعمت ہیں اور پاس رہ کر سارا کام سنبھال لیں اور خدمت کے لیے مستعد رہیں تو مزید نعمت

ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝۱۵ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝۱۶ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝۱۷ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ۝۱۸ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰ ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ۝۲۲ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝۲۳ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝۲۴ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝۲۵

پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں ۝۱۵ ہرگز نہیں! یقیناً وہ ہماری آیات کا سخت مخالف رہا ہے ۝۱۶ عنقریب میں اسے ایک دشوار گھاٹی چڑھنے کی تکلیف دوں گا ۝۱۷ بے شک اس نے غور و فکر کیا اور بات بنائی ۝۱۸ پس وہ مارا جائے، اس نے کیسی بات بنائی! ۝۱۹ پھر مارا جائے، اس نے کیسی بات بنائی! ۝۲۰ پھر اس نے دیکھا ۝۲۱ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور برا منہ بنایا ۝۲۲ پھر اس نے پیٹھ پھیری اور تکبر کیا ۝۲۳ پھر اس نے کہا یہ جادو کے سوا کچھ نہیں، جو نقل کیا جاتا ہے ۝۲۴ یہ انسان کے قول کے سوا کچھ نہیں ۝۲۵

---

ہیں۔ ”مَهَّدْتُّ“ (تفعیل) بچھانا، مہیا کرنا۔ یعنی مال و اولاد کے ساتھ جاہ و حشمت اور سرداری کے تمام اسباب اس کے لیے ہموار کر دیے۔

**آیت 15** ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ: پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور دوں گا، یعنی اتنا کچھ ملنے کے باوجود دنیا میں اس کی حرص ختم نہیں ہوئی بلکہ آخرت میں اسے مزید ملنے کی توقع ہے۔ کفار کا کہنا تھا کہ اگر واقعی قیامت قائم ہوئی تو مال و اولاد وہاں بھی ہمیں کو ملیں گے۔ وہ دنیا میں ملنے والے مال و اولاد اور جاہ و حشمت کو آزمائش کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ان پر راضی ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے۔ دیکھیے سورۂ مریم (۷۷ تا ۸۰)۔

**آیت 16** كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا: ”عَنِيْدًا“ (ن، ض) حق کو پہچانتے ہوئے ضد کی وجہ سے مخالفت کرنے والا۔ ”كَانَ“ سے ہمیشگی کا مفہوم نکل رہا ہے، ”كَلَّا“ ہرگز نہیں۔ یعنی اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی، مزید نوازش و مہربانی کا حق دار تو تب تھا جب وہ ہماری بات مانتا، وہ تو ہمیشہ سے ہماری آیات کا شدید مخالف رہا ہے۔

**آیت 17** سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا: ”سَاُرْهِقُهٗ“ ”أَرْهَقَ يُرْهِقُ“ (افعال) کسی کو ایسے کام کی تکلیف دینا جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔ ”صَعُوْدًا“ ”صَعِدَ يَصْعَدُ“ (س) (چڑھنا) سے، سخت دشوار گھاٹی۔ یعنی میں اسے قیامت کے دن ایک دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے کے لیے مجبور کروں گا۔ قیامت کے دن کی اور جہنم کی مصیبتیں جھیلنے پر مجبور کرنے کو دشوار چڑھائی کی تکلیف دینے کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ترمذی میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”صعود“ آگ کا ایک پہاڑ ہے جس پر کافر ہمیشہ ستر (۷۰) برس چڑھتا رہے گا اور اتنا عرصہ ہی اترتا رہے گا۔ (دیکھیے ترمذی: ۲۵۷۶، ۳۳۲۶) مگر اس کی سند کمزور ہے۔

**آیت 18 تا 25** اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ...... : کفار کو مشکل یہ درپیش تھی کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید سے دور رکھنے کے لیے اس کے متعلق جو کچھ بھی کہتے کوئی اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، خود ان کے دل اس سے انکار کرتے تھے۔ وہ قرآن کو شعر،

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَ لَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾

میں اسے جلد ہی سقر (جہنم) میں داخل کروں گا ﴿۲۶﴾ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ سقر (جہنم) کیا ہے؟ ﴿۲۷﴾ وہ نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے ﴿۲۸﴾

کہانت اور جادو کہہ کر اس سے تنفر کرتے تھے، مگر جانتے اور مانتے تھے کہ نہ اس میں شاعروں کے شعر کا مبالغہ یا جھوٹ ہے، نہ کاہنوں کی تک بندی ہے اور نہ جادوگروں کے ٹونے ٹوٹکے۔ اس لیے ان کے بڑے بڑے سرداروں نے، جن میں ولید بن مغیرہ بھی شامل تھا، اپنے دماغ کی ساری صلاحیتیں صرف کر کے جو نتیجہ نکالا وہ دو باتوں پر مشتمل تھا، ایک یہ کہ یہ وہی جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آیا ہے، کیونکہ یہ قرآن اتنا پر تاثیر ہے کہ بھائی کو بھائی سے اور باپ کو بیٹے سے جدا کر دیتا ہے، حالانکہ وہ جادو اور جادوگروں سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ ہر مؤثر کلام جادو نہیں ہوتا۔ دوسرا نتیجہ قرآن کی عظمت گھٹانے کے لیے یہ نکالا کہ یہ ربانی کلام نہیں بلکہ انسان کا کلام ہے، حالانکہ ان کے سامنے یہ چیلنج موجود تھا کہ اگر یہ انسانی کلام ہے تو تم اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ۔ آج بھی یورپ و امریکہ اور دوسرے ممالک کے تحقیقی ادارے مسلمان طالب علموں کو بھاری وظیفے دے دے کر اپنے اداروں میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرواتے ہیں کہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، حالانکہ اتنی محنت کے بجائے یہی کافی تھا کہ وہ تین آیات ہی کی کوئی ایک سورت پیش کر دیتے جو وہ نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔

"اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ" سے "ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ" تک ان کیفیات کا ذکر ہے جن کا اظہار کر کے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے دماغ کی آخری قوت تک صرف کر کے یہ نتیجہ نکال رہے ہیں، حالانکہ ان کے تیوری چڑھانے، برا منہ بنانے اور تکبر سے پیٹھ پھیر کر بات کرنے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ بات انصاف سے نہیں کہہ رہے، بلکہ اس کا باعث صرف اور صرف عناد اور تکبر تھا۔

**آیت 27، 26** سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ...... : "سَقَرَ" جہنم کا ایک نام ہے، علم اور مؤنث ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

**آیت 28** لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ : "لَا تُبْقِيْ" "أَبْقٰى يُبْقِيْ" (افعال) باقی رکھنا۔ "أَبْقٰى عَلَيْهِ" رحم کرنا۔ یعنی وہ ان کی کوئی چیز جلانے سے باقی نہیں رکھے گی، اس پر بھی انھیں چھوڑے گی نہیں کہ ان کا قصہ تمام ہو جائے، بلکہ انھیں دوبارہ پہلے کی طرح بنا دیا جائے گا اور جہنم پھر انھیں جلائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ﴾ [ النساء : ۵٦ ] "جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم انھیں ان کے علاوہ اور کھالیں بدل دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں۔" اور فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴾ [ الأعلٰی : ۱۳ ] "پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔" اگر "لَا تُبْقِيْ" کے بعد "عَلَيْهِمْ" مقدر مانیں تو معنی ہوگا "نہ وہ ان پر رحم کرے گی اور نہ انھیں چھوڑے گی۔" یہ معنی بھی درست ہے۔

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَ مَا جَعَلْنَاۤ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِيْمَانًا وَّ لَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَ لِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْكٰفِرُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ

چمڑے کو جھلس دینے والی ہے ﴿۲۹﴾ اس پر انیس (مقرر) ہیں ﴿۳۰﴾ اور ہم نے جہنم کے محافظ فرشتوں کے سوا نہیں بنائے اور ان کی تعداد ان لوگوں کی آزمائش ہی کے لیے بنائی ہے جنھوں نے کفر کیا، تاکہ وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے اچھی طرح یقین کر لیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ایمان میں زیادہ ہو جائیں اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے اور ایمان والے شک نہ کریں اور تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو کفر کرنے والے ہیں کہیں اللہ نے اس کے ساتھ مثال دینے سے کیا ارادہ کیا ہے؟ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے

**آیت 29** لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ: "لَوَّاحَةٌ" "لَاحَ يَلُوْحُ" (ن) اور "لَوَّحَ يُلَوِّحُ" (تفعیل) کا معنی جلانا، متغیر کرنا بھی آتا ہے اور ظاہر ہونا اور چمکنا بھی آتا ہے۔ "اَلْبَشَرُ" "بَشَرَةٌ" کی جمع ہے، کھالیں، یا "اَلْبَشَرُ" بمعنی آدمی ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ وہ کھالوں کو جلا کر سیاہ کر دینے والی ہے (کھالوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ آدمی کو اپنے جس حسن و جمال پر ناز ہوتا ہے وہ اسی کھال ہی کی وجہ سے ہوتا ہے) یا وہ آدمیوں کو جلا دینے والی ہے۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہے کہ وہ جسم پر چمکتی ہوئی نظر آئے گی۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: "جیسے لوہا دہکتا سرخ نظر آتا ہے، آدمی کے پنڈے پر وہ سرخ نظر آئے گی۔" (موضح)

**آیت 31، 30** ① عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ...... : اللہ تعالیٰ نے جب جہنم پر مامور اشخاص کی تعداد انیس (۱۹) بتائی تو ساتھ ہی اس ٹھٹھے اور مذاق کا جواب بھی ذکر کر دیا جو کافر اڑا سکتے تھے اور انھوں نے اڑایا بھی کہ انیس (۱۹) شخص ہم ہزاروں لاکھوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ فرمایا، ہم نے جہنم پر جن لوگوں کو مقرر کیا ہے وہ فرشتے ہیں اور فرشتہ تو ایک بھی ہو تو تم سب کے لیے کافی ہے۔
② جہنم کے فرشتوں کی تعداد بتانے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ کافروں کی آزمائش ہو جائے گی، انھوں نے اپنے خبث باطن کا جو اظہار کرنا ہے کر لیں گے، جو مذاق اڑانا ہے اڑا لیں گے اور اہلِ کتاب کو اس کے حق ہونے کا یقین ہو جائے گا، کیونکہ یہ تعداد ان کی کتاب کے مطابق ہے، یا وہ اپنی کتابوں کی وجہ سے فرشتوں کی غیر معمولی قوتوں کو جانتے ہیں اور ایمان والوں کا ایمان مزید بڑھ جائے گا اور اہلِ کتاب اور ایمان والوں کو اس کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں رہے گا۔ ہاں کفار اور وہ لوگ جن کے دلوں میں حسد اور بغض کا مرض ہے، یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مثال بیان کرنے سے کیا مقصد ہے؟ فرمایا دیکھ لو

يَشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ مَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾

جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باتیں بشر کی نصیحت ہی کے لیے ہیں ﴿۳۱﴾

ایک ہی بات ہے، مگر کسی کے حصے میں اس سے انکار آیا اور کسی کو ایمان و یقین کی دولت نصیب ہوگئی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیّت سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے مچھر اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال بیان کرنے پر ایمان والے تو اس کے حق ہونے کی تصدیق کریں گے اور کافر یہی کہیں گے کہ اس قسم کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے؟ (دیکھیے بقرہ: ۲۶) اور اہل ایمان تو قرآن کی محکم و متشابہ ہر قسم کی آیات پر بلاچون و چرا ایمان لائیں گے، مگر جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی کے لیے متشابہات کے پیچھے لگے رہیں گے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۷)۔

معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کا تقاضا ہم سے یہ ہے کہ جو بات اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آئے اس پر ہم یقین کریں اور ایمان لائیں خواہ اس کی حکمت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو، جب یہ اعتراض فضول ہے کہ انسان کو مٹی سے کیوں بنایا؟ جنّوں کو آگ سے کیوں بنایا؟ بچہ ماں کے پیٹ میں نو ماہ کیوں رہتا ہے؟ انڈے سے بچہ اکیس دنوں میں کیوں نکلتا ہے؟ کچھوے کی عمر طویل کیوں ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ، تو یہ اعتراض کیوں کہ جہنم پر انیس (۱۹) فرشتے کیوں مقرر کیے ہیں؟ ایمان والوں کے پاس اس قسم کی تمام باتوں کا ایک ہی جواب ہے کہ مالک کی مرضی ہے جو چاہے کرے۔ اس مقام پر بعض مفسرین نے جہنم پر مامور فرشتوں کی تعداد انیس ہونے کی حکمت اپنی عقلی موشگافیوں سے بیان کی ہے جو سراسر تکلف ہے۔ یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اہل ایمان کا ایمان آیاتِ الٰہی سننے سے بڑھ جاتا ہے۔ تعجب ہے ان لوگوں پر جو قرآن کی واضح آیات کے باوجود کہتے ہیں کہ ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم۔ اب قرآن کی صاف آیات کے بعد انھیں قائل کرنے کے لیے کون سی چیز پیش کی جائے۔

③ **وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ** : یہ اس لیے فرمایا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کارکنوں کی کمی ہے، یعنی فرشتے تو اس کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہیں، اللہ کے پاس اتنے لشکر ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی انھیں جانتا ہی نہیں، پھر ان لشکروں میں سے ہر ایک کی تعداد بھی وہی جانتا ہے۔ حدیث معراج میں ساتویں آسمان کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَرُفِعَ لِيَ الْبَيْتُ الْمَعْمُوْرُ، فَسَأَلْتُ جِبْرِيْلَ فَقَالَ هٰذَا الْبَيْتُ الْمَعْمُوْرُ يُصَلِّيْ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ، إِذَا خَرَجُوْا لَمْ يَعُوْدُوْا إِلَيْهِ آخِرَ مَا عَلَيْهِمْ» [ بخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة ...... : ۳۲۰۷ ] ”پھر بیت معمور میرے سامنے ظاہر کیا گیا، میں نے جبریل سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ بیتِ معمور ہے، اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں، جب نکل جاتے ہیں تو اپنے آخری وقت تک دوبارہ یہاں نہیں آسکتے۔“ ”وَ مَا هِيَ“ سے مراد وہ آیات ہیں جن میں ”سَقَرَ“ کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾

ہرگز نہیں، چاند کی قسم! ﴿۳۲﴾ اور رات کی، جب وہ جانے لگے! ﴿۳۳﴾ اور صبح کی، جب وہ روشن ہو! ﴿۳۴﴾ بلاشبہ وہ (جہنم) یقیناً بہت بڑی چیزوں میں سے ایک ہے ﴿۳۵﴾ بشر کے لیے ڈرانے والی ہے ﴿۳۶﴾ اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ آگے بڑھے، یا پیچھے ہٹے ﴿۳۷﴾

**آیت 32 تا 37** كَلَّا وَالْقَمَرِ ...... : "كَلَّا" ہرگز نہیں، یعنی جہنم یا اس پر مامور فرشتوں کی تعداد سے انکار ہرگز درست نہیں۔ اس کے بعد تین چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جہنم یقیناً بہت ہی بڑی چیز ہے۔ ان قسموں کی مناسبت جواب قسم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہنم کا انکار کرنے والوں کا انکار اس لیے ہے کہ وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور ان کے خیال میں اتنی بڑی ہولناک اور عظیم الشان چیز کا موجود ہونا ممکن نہیں۔ فرمایا اس کائنات میں چاند کو دیکھو، وہ ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال ہونے تک روزانہ جن مراحل سے گزرتا ہے ان پر غور کرو، رات کو دیکھو جب وہ رخصت ہوتی ہے اور کائنات میں روزانہ ایک عظیم انقلاب رونما ہوتا ہے، پھر صبح کو دیکھو جب روشن ہوتی ہے تو رات کی ظلمت اپنا بوریا بستر سمیت لیتی ہے۔ ان میں سے ہر چیز اللہ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے، ان میں سے کوئی بھی چیز اگر تم نے دیکھی نہ ہوتی اور تمھیں اس کے متعلق جتایا جاتا تو تم اس کا اسی طرح انکار کر دیتے جس طرح جہنم کا انکار کر رہے ہو؟ جب اتنی بڑی بڑی حقیقتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور تمھیں ان کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں تو ان چیزوں کا پیدا کرنے والا تمھیں بتا رہا ہے کہ یقیناً جہنم بھی اس کی بہت بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے، اس میں تمھیں شک کیوں ہے؟

ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ تمھارا یہ جلدی مچانا بھی بے محل ہے کہ اگر سچے ہو تو ابھی لاؤ وہ قیامت اور جہنم جس سے ڈراتے ہو۔ فرمایا چاند کا ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال تک پہنچنا، رات کا جانا اور صبح کا روشن ہونا اور کائنات کے بڑے بڑے انقلابات میں سے ہر انقلاب اپنے مقرر وقت پر آتا ہے، کبھی وقت سے پہلے نہیں آتا، اسی طرح تم یقیناً درجہ بدرجہ قیامت کی طرف جا رہے ہو اور بہت جلد جہنم تمھارے سامنے آ جائے گی۔ سورۂ انشقاق کی آیات (۱۶ تا ۱۹) میں یہ مضمون بیان ہوا ہے، تفصیل کے لیے ان آیات کی تفسیر ملاحظہ کریں۔

"الْكُبَرِ" "كُبْرٰى" کی جمع ہے، جو "اَكْبَرُ" کی مؤنث ہے۔ "نَذِيْرًا" ڈرانے والی، "فَعِيْلٌ" کا وزن مذکر و مؤنث اور واحد، تثنیہ و جمع سب کے لیے آ جاتا ہے۔ یعنی یہ انسانوں کو ڈرانے والی ہے، ان انسانوں کو جنھیں اختیار ہے کہ یہ جہنم سے ڈرانے والی آیات سن کر چاہیں تو ایمان قبول کرکے جنت کی طرف بڑھ جائیں اور چاہیں تو پیچھے رہ کر جہنم کے سزاوار بن جائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ [ الكهف : ۲۹ ] "پھر جو چاہے سو ایمان لے آئے اور جو چاہے سو کفر کرے۔" یعنی ایمان و کفر دونوں کا اختیار ہے، ہاں، کفر کی اجازت نہیں اور نہ وہ اللہ کو پسند ہے، جیسا کہ فرمایا:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ؕ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾

ہر شخص اس کے بدلے جو اس نے کمایا، گروی رکھا ہوا ہے ﴿۳۸﴾ مگر دائیں طرف والے ﴿۳۹﴾ جنتوں میں سوال کریں گے ﴿۴۰﴾ مجرموں سے ﴿۴۱﴾ تمھیں کس چیز نے سقر میں داخل کر دیا؟ ﴿۴۲﴾

﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ [ الزمر : ۷ ] ”اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔“

**آیت 38، 39** ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ …… : یعنی جس طرح کوئی گروی رکھی ہوئی چیز اس وقت تک نہیں چھوٹتی جب تک وہ حق ادا نہ کر دیا جائے جس کے بدلے اسے گروی رکھا گیا ہے، اسی طرح ہر شخص اپنے عمل کے عوض گروی اور گرفتار ہوگا، جب تک وہ عمل پیش نہ کرے جس کی ادائیگی اس پر واجب تھی، رہائی نہیں پا سکتا۔ ہاں جنھیں دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا وہ گرفتار نہیں ہوں گے بلکہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے رہا ہو جائیں گے، جس طرح حق ادا کرنے سے گروی چھوٹ جاتی ہے۔

**آیت 40 تا 42** ﴿ ① فِيْ جَنّٰتٍ ؕ يَتَسَآءَلُوْنَ …… : یعنی اصحاب الیمین جنتوں میں ایک دوسرے سے مجرموں کے بارے میں سوال کریں گے کہ فلاں مجرم کا کیا بنا اور فلاں کدھر گیا؟ ذرا جہنم ہی میں انھیں تلاش کریں، پھر جہنم میں جھانک کر دیکھیں گے اور وہ انھیں وہاں نظر آئیں گے تو ان سے کہیں گے: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴾ ”تمھیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا؟“ آیات کی یہ تفسیر ”يَتَسَآءَلُوْنَ“ (تفاعل) اور ”عَنْ“ کے اس ترجمے کے مطابق ہے جو اکثر استعمال ہوا ہے۔ ”مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ“ سے پہلے ”يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ“ مقدر ہے۔ سورۂ صافات میں اس سے ملتا جلتا منظر مذکور ہے، فرمایا: ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝ يَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ۝ وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۝ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ﴾ [ الصافات : ٥٠ تا ٦١ ] ”پھر ان کے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا بے شک میں، میرا ایک ساتھی تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کیا واقعی تو بھی ماننے والوں میں سے ہے۔ کیا جب ہم مر گئے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا واقعی ہم ضرور جزا دیے جانے والے ہیں؟ کہے گا کیا تم جھانک کر دیکھنے والے ہو؟ پس وہ جھانکے گا تو اسے بھڑکتی آگ کے وسط میں دیکھے گا۔ کہے گا اللہ کی قسم! یقیناً تو قریب تھا کہ مجھے ہلاک ہی کر دے۔ اور اگر میرے رب کی نعمت نہ ہوتی تو یقیناً میں بھی ان میں ہوتا جو حاضر کیے گئے ہیں۔ تو کیا ہم کبھی مرنے والے نہیں ہیں۔ مگر ہماری پہلی موت اور نہ ہم کبھی عذاب دیے جانے والے ہیں۔ یقیناً یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس جیسی (کامیابی) ہی کے لیے پس لازم ہے کہ عمل کرنے والے عمل کریں۔“

آیات کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”يَتَسَآءَلُوْنَ“ ”يَسْأَلُوْنَ“ کے معنی میں ہے اور ”عَنْ“ زائد ہے: ”أَيْ يَسْأَلُوْنَ

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾

وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے ﴿۴۳﴾ اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے ﴿۴۴﴾ اور ہم بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر فضول بحث کیا کرتے تھے ﴿۴۵﴾ اور ہم جزا کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے ﴿۴۶﴾

الْمُجْرِمِيْنَ" یعنی اصحاب الیمین مجرموں سے سوال کریں گے کہ تمھیں کس چیز نے جہنم میں داخل کر دیا؟ اصحاب الیمین کا جہنمیوں سے یہ سوال پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ انھیں ذلیل وخوار اور شرمندہ کرنے کے لیے ہوگا۔

② ان آیات سے معلوم ہوا کہ جنت و جہنم کے درمیان بے حساب دوری کے باوجود جنتی جہنمیوں کو دیکھیں گے اور ان سے سوال و جواب بھی کریں گے۔

آیت 43 تا 46 ① قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ...... : جہنمی اپنے جہنم میں جانے کے چار اسباب بیان کریں گے، پہلا یہ کہ وہ نماز ادا کرنے والوں میں شامل نہ ہوئے، دوسرا یہ کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، تیسرا یہ کہ دین کی باتوں کو مذاق کرنے اور جھٹلانے کے لیے وہ مجلسوں میں بیٹھ کر فضول بحث کیا کرتے تھے اور چوتھا یہ کہ وہ روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے: ① نماز ایمان کے ان ارکان میں سے ہے جن کے بغیر کوئی شخص اسلامی برادری میں شامل ہی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اسے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" والی اُخوتِ دینی حاصل ہوسکتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ [ التوبۃ : ۱۱ ] "پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔" بلکہ جب تک کوئی شخص ایمان قبول کر کے صلوٰۃ و زکوٰۃ ادا نہ کرے اس سے جنگ کا حکم ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَلَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ )) [ بخاري، الإيمان، باب: ﴿ فإن تابوا وأقاموا الصلاة ...... ﴾ : ۲۵ ] "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑتا رہوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پھر جب وہ یہ کام کریں تو انھوں نے اپنے خون اور مال مجھ سے محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔"

② جہنمیوں کا یہ اقرار کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں مساکین کو کھانا کھلانا کس قدر ضروری ہے۔ ③ اللہ کی آیات سے مذاق کرنا اور ان کے متعلق فضول بحث کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اگر کوئی مسلمان اس کا ارتکاب کرے تو وہ بھی کافر ہو جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ

حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾

یہاں تک کہ ہمارے پاس یقین آ گیا ﴿۴۷﴾ پس انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی ﴿۴۸﴾

بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ﴾ [ التوبۃ : ٦٥، ٦٦ ] ”اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہیں گے ہم تو صرف بحث اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہہ دے کیا اللہ کے ساتھ، اس کے رسول اور اس کی آیات کے ساتھ ہی تمھیں ہنسی مذاق کرنا تھا؟ بہانے مت بناؤ، یقیناً تم ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے ہو۔“ ③ قیامت پر یقین ایمان کی بنیادی شرط ہے، اس کے بغیر آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا۔ حدیث جبریل میں رسول اللہ ﷺ نے ایمان کی تعریف یہ فرمائی: (( أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَ شَرِّهِ )) [ مسلم، الإیمان، باب بیان الإیمان والإسلام……: ۸ ] ”(ایمان یہ ہے) کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ اور تقدیر پر، خواہ اچھی ہو یا بری، ایمان لاؤ۔“

② بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کفار اسلام کے تفصیلی احکام کے مخاطب نہیں ہیں اور نہ اللہ کی طرف سے انھیں اسلام کے احکام مثلاً نماز و زکوۃ وغیرہ بجا لانے کا حکم ہے، بلکہ ان سے مطالبہ ایمان کا ہے اور مؤاخذہ بھی اسی پر ہوگا، کیونکہ ایمان کے بغیر وہ کوئی عمل کریں بھی تو بے فائدہ ہے، مگر ان آیات سے معلوم ہوا کہ کفار کے جہنم میں جانے کا باعث اعمال کا ترک بھی ہے اور وہ اسلام کے تمام اعمال بجا لانے کے مکلف ہیں۔ ایمان لانے سے پہلے انھیں اعمال سے مستثنیٰ قرار دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ وضو کے بغیر چونکہ نماز قبول نہیں ہوتی، اس لیے جب تک کوئی شخص وضو نہ کرلے وہ ”اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ“ کا مخاطب ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بے وضو شخص ”اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ“ کا مخاطب ہے اور اسے حکم ہے کہ وضو کرکے نماز ادا کرے، اسی طرح کفار بھی ”اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ“ اور دوسرے تمام احکام کے مخاطب ہیں اور انھیں حکم ہے کہ ایمان لا کر یہ تمام احکام ادا کریں۔

**آیت 47** حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ: ”الْيَقِيْنُ“ سے مراد موت ہے، کیونکہ اس کے آنے پر تمام شکوک و شبہات دور ہو کر حقیقت سامنے آجائے گی۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [ الحجر : ۹۹ ] ”اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آجائے۔“ اس سے مراد بھی موت ہے۔ دنیا میں کسی کو آخرت پر کتنا بھی یقین ہو وہ اس یقین کے برابر نہیں ہو سکتا جو موت آنے پر حاصل ہوگا۔

**آیت 48** ① فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ: کیونکہ کفار کے حق میں سفارش کی اجازت ہی نہیں ہوگی، اگر کوئی کرے گا بھی تو کافر کے حق میں قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے حق میں سفارش کریں گے تو قبول نہیں ہوگی۔ یاد رہے کہ کفار کو سفارشیوں کی سفارش کا فائدہ نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سفارش سے جہنم سے نہیں نکل سکیں گے، البتہ تخفیف عذاب کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ابوطالب کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔

② اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مومن موحد ہیں مگر اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے انھیں سفارش فائدہ

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۝ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝

تو انھیں کیا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں (۴۹) جیسے وہ سخت بدکنے والے گدھے ہیں (۵۰) جو شیر سے بھاگے ہیں (۵۱) بلکہ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں (۵۲) ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے (۵۳)

دے گی۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے انبیاء، شہداء اور صلحاء ان کی سفارش کریں گے اور وہ ان کی سفارش سے جہنم سے نکل آئیں گے، جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔

**آیت 49 تا 51** فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ ...... : "مُسْتَنْفِرَةٌ" باب استفعال سے اسم فاعل بمعنی "نَافِرَةٌ" ہے، جیسے "عَجِبَ" اور "اِسْتَعْجَبَ" اسی طرح "سَخِرَ" اور "اِسْتَسْخَرَ" ہم معنی ہیں۔ حروف زیادہ ہونے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہوگیا، سخت بدکنے والے۔ "قَسْوَرَةٍ" "قَسْرٌ" سے ہے جس کا معنی غلبہ اور قہر ہے، چونکہ شیر اپنے شکار کو مغلوب و مقہور کرتا ہے اس لیے اسے "قسورہ" کہتے ہیں۔ شکاریوں کی جماعت کو بھی "قسورہ" کہتے ہیں اور لوگوں کے شور و غل کو بھی "قسورہ" کہتے ہیں۔ کفار کے نصیحت اور آیات قرآنی سننے سے بھاگنے کو ان جنگلی گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو شیر کی آہٹ یا شکاریوں کے خطرے سے بِدک کر بے تحاشا بھاگتے ہیں۔

**آیت 52** بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ ...... : یعنی قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کا حق ہونا واضح ہو جانے کے باوجود ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے تازہ لکھی ہوئی تحریر دی جائے جو ابھی تہ بھی نہ کی گئی ہو اور ان کے ہر شخص کو باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خط آئے کہ محمد (ﷺ) ہمارے رسول ہیں، انھیں مان لو۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں اتنے بڑے بن رہے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کے لیے تیار ہی نہیں، بلکہ ان کی خواہش اور تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو نبی بنا دیا جائے، اسے کتاب عطا ہو اور وہ بھی خرق عادت کے طور پر کاغذ پر لکھی ہوئی سب کے سامنے کھلی ہوئی حالت میں ان پر نازل ہو۔ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر شخص ہی کو نبوت و کتاب عطا ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام: ۱۲٤] "اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے، کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمیں اس جیسی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے اس جگہ کو جہاں وہ اپنی رسالت رکھے۔" اس سے ملتا جلتا مضمون سورۂ فرقان (۲۱) میں بھی بیان ہوا ہے۔

**آیت 53** كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ : "كَلَّا" یعنی ایسا تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے ہر ایک کو کتاب دی جائے

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

ع ۱۴

ہرگز نہیں! یقیناً یہ ایک یاد دہانی ہے ﴿۵۴﴾ تو جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے ﴿۵۵﴾ اور وہ نصیحت حاصل نہیں کریں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے، وہی لائق ہے کہ (اس سے) ڈرا جائے اور لائق ہے کہ بخش دے ﴿۵۶﴾

اور ان کے انکار کی وجہ بھی یہ نہیں، بلکہ ان کے نصیحت سے بھاگنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا آخرت پر ایمان نہیں اور تمام خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ جب تک یہ لوگ دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے رہیں گے آپ ان کو ان کے تقاضوں کے مطابق کوئی معجزہ بھی دکھا دیں تو وہ اسے جادو قرار دے کر ماننے سے انکار کر دیں گے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۷)۔

**آیت 55،54** كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ...... : یعنی ان مشرکین نے جو قرآن کو جادو یا انسانی کلام قرار دیا ہے یہ بات ہرگز درست نہیں، بلکہ یہ قرآن تو اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے، اب جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

**آیت 56** وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ...... : یعنی انسان کو اگرچہ اختیار ہے کہ وہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا برائی کی، مگر اس کا یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کے چاہنے کے تحت ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ہدایت حاصل کرنا چاہے مگر اللہ کا ارادہ نہ ہو تو اسے ہدایت حاصل ہو ہی جائے گی، یا گمراہ ہونا چاہے مگر اللہ کی مشیت نہ ہو تو ضرور گمراہ ہو کر ہی رہے گا۔ پھر جب سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے تو وہی اس لائق ہے کہ ہر وقت اس سے ڈرا جائے اور اسی کی یہ شان ہے کہ جو اس سے ڈرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے وہ اسے بخش دے۔

# لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾ وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں! ① اور نہیں، میں بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں! ②

**آیت 1، 2** ① لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ...... : "الۡقِیٰمَۃِ" "قِیَامٌ" مصدر ہے، کھڑا ہونا، تاء "ایک دفعہ" کا معنی ادا کرنے کے لیے ہے، یعنی آدمی کا ایک دفعہ کھڑا ہونا۔ یہاں یہ تنبیہ کے لیے لائی گئی ہے کہ قیامت کا وقوع دفعتاً ہوگا۔ (راغب) "یَوْمُ الْقِیَامَۃِ" کا معنی ہوگا ایک ہی دفعہ اٹھ کھڑے ہونے کا دن۔ "اللَّوَّامَۃِ" "لَامَ یَلُوْمُ" سے مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بہت ملامت کرنے والا، جیسے "عَلَّامَۃٌ" اور "فَھَّامَۃٌ" ہے۔

② "لَاۤ اُقۡسِمُ" کا معنی یہ نہیں کہ میں قسم نہیں کھاتا، بلکہ "لَاۤ" الگ ہے اور "اُقۡسِمُ" الگ۔ معنی یہ ہے کہ نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔ عرب کے ہاں یہ محاورہ عام ہے "لَا وَاللّٰہِ" یعنی جب کوئی شخص انکار کر رہا ہو تو پہلے اس کے انکار کی نفی "لَا" سے کی جاتی ہے، پھر اپنی بات کی تاکید کے لیے قسم ذکر کی جاتی ہے۔ اردو میں بھی مخاطب کے غلط خیال کی تردید کے لیے ایسے ہی کہا جاتا ہے کہ نہیں، اللہ کی قسم! بات اس طرح ہے۔ کئی مفسرین نے فرمایا کہ "لَاۤ" زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں۔ مگر زائدہ ماننے کے بجائے بامعنی قرار دینا بلاغت قرآن کے زیادہ لائق ہے، جب کہ معنی بھی درست ہو رہا ہے اور پرزور ہو رہا ہے۔

③ قرآن میں انسانی نفس کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک وہ جو اسے گناہ پر ابھارتا ہے، اس کا نام "امارہ" ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ﴾ [ یوسف : ۵۳ ] "نفس تو برائی کا حکم دینے والا ہے۔" دوسرا وہ نفس جو آدمی کو برائی پر ملامت کرتا ہے، اس کا نام "لوامہ" ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ نیک ہو یا بد، نیک کام میں کوتاہی اور برے کام کے ارتکاب پر خود اس کا نفس اسے ملامت کرتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اسے عام طور پر اردو میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تمام باتوں پر یقین ہو اور ان کے حق ہونے پر اسے پورا اطمینان اور تسلی ہو، منافقین کی طرح شک و شبہ میں مبتلا نہ ہو، یہ "نفس مطمئنہ" ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ یہ ایک ہی نفس کی مختلف وقتوں میں تین حالتیں ہیں۔

④ "بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ" اور "بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ" کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہاں لفظوں میں مذکور نہیں، مگر بعد میں آنے والی آیات سے وہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ یہ ہے کہ ہم یقیناً انسان کی ہڈیاں اکٹھی کر کے اسے دوبارہ زندہ کریں گے۔

⑤ قسم سے مراد اس بات کی تاکید ہوتی ہے جس کے لیے قسم کھائی جاتی ہے، پھر بعض اوقات تاکید کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز نہایت عظیم الشان ہوتی ہے جس کی قسم کھائی گئی ہے اور اس کی عظمت ہی بات کی تاکید کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے اور

## اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝۴

**کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے ③ کیوں نہیں؟ (ہم انھیں اکٹھا کریں گے ) اس حال میں کہ ہم قادر ہیں کہ اس ( کی انگلیوں ) کے پورے درست کر ( کے بنا ) دیں ④**

بعض اوقات قسم اپنے جواب قسم کی دلیل ہوتی ہے جس سے اس کی تاکید ہوتی ہے۔ یہاں قیامت کے دن کی قسم قیامت کے حق ہونے کی تاکید کے لیے اٹھائی گئی ہے، اس کی وجہ قیامت کی عظمت بھی ہے اور یہ بھی کہ روز قیامت اپنی دلیل خود ہے، جیسا کہ سورۂ ص میں قرآن کے حق ہونے کے لیے خود قرآن کی قسم کھائی ہے، فرمایا: ﴿ صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ﴾ [ صٓ : ۱ ] "صٓ۔ اس نصیحت والے قرآن کی قسم۔" اور نفس لوّامہ کی قسم اس لیے کہ یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ اس کا نفس برے کام پر اسے ملامت کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کے نزدیک اچھائی یا برائی کا معیار کیا ہے اور قطع نظر اس سے کہ وہ ضمیر کی اس ملامت کی پروا کرتا ہے یا نہیں؟ ملامت کرنے والا یہ نفس اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر حجت ہے کہ جس طرح تمھارا اپنا نفس خود تم سے باز پرس کر رہا ہے لازم ہے کہ ایک ایسا وقت آئے جب تمھارا پیدا کرنے والا تم سے باز پرس کرے۔

**آیت 4،3** ① اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ...... : "قٰدِرِيْنَ" حال ہے، اس سے پہلے فعل محذوف ہے: "أَيْ بَلٰى نَجْمَعُهَا قَادِرِيْنَ......" "یعنی کیوں نہیں ہم انھیں جمع کریں گے، اس حال میں کہ ہم اس بات پر قادر ہیں......۔"

② قیامت کے منکرین یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ جب ان کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر ذرات کی صورت میں بکھر جائیں گی تو انھیں پھر دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ( انسان اگر یہ خیال کرے کہ اس کی ہڈیاں خود بخود جمع نہیں ہو سکتیں یا مخلوق میں سے کوئی انھیں دوبارہ جمع نہیں کر سکتا تو اسے یہ سمجھنے کا حق ہے، مگر ) کیا وہ ہمارے متعلق گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے؟ پہلی دفعہ جب اس کا نام و نشان تک نہ تھا، ہم نے اسے پیدا کر دیا تو اب اس کی ہڈیاں کیوں جمع نہیں کر سکتے؟ یقیناً ہم انھیں جمع کریں گے اور بڑی ہڈیاں ہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی قدرت رکھتے ہیں کہ اس کے پورے، جو نہایت باریک اور نازک ہڈیوں پر مشتمل ہیں، دوبارہ درست کر کے بنا دیں۔ سورۂ یٰس (۷۷ تا ۷۹ ) اور سورۂ بنی اسرائیل (۴۹ تا ۵۱ ) میں یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

③ ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ قیامت کے دن جسم دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور وہ بھی حساب، عذاب اور ثواب میں روح کے ساتھ شریک ہوں گے۔ صحیح بخاری (۳۴۸۱ ) میں بنی اسرائیل کے ایک آدمی کا ذکر آیا ہے جس کے بیٹوں نے اس کے کہنے کے مطابق اسے مرنے کے بعد جلا کر اور ہڈیوں کو پیس کر کچھ راکھ ہوا میں اڑا دی اور کچھ پانی میں بہا دی، تو اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دے کر اس کے ذرات اکٹھے کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ اگر روح ہی سے باز پرس ہو تو ذرات جمع کر کے اسے دوبارہ سامنے کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝۶ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ۝۹ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ اِ۟لْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲

بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے (آنے والے دنوں میں بھی) نافرمانی کرتا رہے ⑤ وہ پوچھتا ہے اٹھ کھڑے ہونے کا دن کب ہوگا؟ ⑥ پھر جب آنکھ پتھرا جائے گی ⑦ اور چاند گہنا جائے گا ⑧ اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے ⑨ انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ⑩ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں ⑪ اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے ⑫

**آیت 6،5** : بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ ..... : "لِيَفْجُرَ" "فَجَرَ فُجُوْرًا" (ن) جھوٹ بولنا، گناہ کرنا، زنا کرنا۔ یعنی قیامت کے انکار کی کوئی اور وجہ نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے یعنی آنے والے دنوں میں بھی نافرمانی اور گناہ کرتا رہے۔ اب اگر وہ قیامت پر ایمان لائے تو اس کا تقاضا ہے کہ گناہ چھوڑ دے جسے چھوڑنے پر وہ آمادہ نہیں۔ گویا وہ عقل کی وجہ سے قیامت کا انکار نہیں کر رہا بلکہ ہوس نے اسے اندھا کر رکھا ہے، اس لیے وہ تیاری کے لیے نہیں بلکہ مذاق اڑانے اور جھٹلانے کے لیے پوچھتا ہے کہ وہ دفعتاً اٹھ کھڑے ہونے کا وقت کب ہوگا؟

**آیت 7** : فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ : "بَرِقَ الْبَصَرُ" (س،ن) "بَرْقًا وَ بُرُوْقًا" آنکھ کا حیرت سے کھلا رہ جانا یا دہشت زدہ ہو کر کچھ نہ دیکھ سکنا۔ (قاموس) اللہ تعالیٰ نے قیامت کی تاریخ اور قیامت کے متعلق بتانے کے بجائے اس دن واقع ہونے والی چند چیزیں بیان فرما دیں۔ "فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ" یعنی قیامت کے دن کے عجیب و غریب حوادث و واقعات کو دیکھ کر آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جائیں گی اور خوف و دہشت کے مارے ان سے کچھ دکھائی نہ دے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ [ ابراھیم : ۴۲، ۴۳ ] "اور تو ہرگز خیال نہ کر کہ اللہ ان کاموں سے بے خبر ہے جو ظالم لوگ کر رہے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ حال یہ ہوگا کہ سر اٹھائے ہوئے تیز بھاگ رہے ہوں گے، ان کی نگاہیں ان کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔"

**آیت 8** : وَ خَسَفَ الْقَمَرُ : چاند گہنا جائے گا، یعنی بے نور ہو جائے گا۔

**آیت 9** : وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ : یعنی یہ نظام فلکی جس میں چاند سورج سے لاکھوں میل کے فاصلے پر ہے، درہم برہم ہو جائے گا اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكَوَّرَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر : ۳۲۰۰ ] "قیامت کے دن سورج اور چاند لپیٹے ہوئے ہوں گے۔"

**آیت 12،10** : يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ ..... : یہ انسان جو آج پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا، اس دن ایسا حیران

يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾

**اس دن انسان کو بتایا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا ﴿۱۳﴾ بلکہ انسان اپنے آپ کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۴﴾ اگرچہ وہ اپنے بہانے پیش کرے ﴿۱۵﴾**

اور خوف زدہ ہوگا کہ بھاگنے کے لیے جگہ تلاش کرے گا، مگر اس دن کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی اور سب لوگوں کو اپنے رب کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔

**آیت 13** يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ ......: ''جو آگے بھیجا'' سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس نے موت سے پہلے کیے اور ''جو پیچھے چھوڑا'' سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ » [ مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته : ۱۶۳۱، عن أبي هريرة رضي الله عنه ] ''جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل جاری رہتے ہیں، صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔'' اور فرمایا: « مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ » [ مسلم، العلم، باب من سن سنة حسنة أو سيئة...... : ۱۰۱۷، بعد الحديث : ۲۶۷۳ ] ''جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کرے پھر اس کے بعد اس طریقے پر عمل کیا جائے، تو اس کے لیے ان لوگوں کی مثل اجر لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے ثواب سے بھی کچھ کم نہیں ہوگا اور جو شخص اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کرے، پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا جائے، تو اس پر ان لوگوں کے گناہ کی مثل لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے گناہ میں سے بھی کچھ کم نہیں ہوگا۔''

"بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ" کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اس نے کیا اور جو کرنا تھا مگر نہیں کیا۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ جو کچھ اس نے پہلے وقت میں کیا اور جو بعد میں کیا سب تاریخ اور وقت کے ساتھ اسے بتایا جائے گا۔

**آیت 15،14** بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ......: "بَصِيْرَةٌ" "بَصُرَ" (ک) سے صفت کا صیغہ ہے۔ ''تاء'' مزید مبالغے کے لیے ہے، جیسے ''عَلَّامَةٌ'' میں ہے، یہ تائے تانیث نہیں ہے، خوب دیکھنے والا۔ "مَعَاذِيْرَ" "مَعْذِرَةٌ" کی جمع ہے، یعنی اس دن انسان کو پہلے اور پچھلے اعمال بتائے جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کرتا رہا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے متعلق خوب معلوم ہے کہ وہ اچھا کام کر رہا ہے یا برا۔ پھر دوسروں کے سامنے اپنے کفر و شرک، خالق کی

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾

**تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے، تا کہ اسے جلدی حاصل کر لے ﴿۱۶﴾ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور (آپ کا) اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے ﴿۱۷﴾ تو جب ہم اسے پڑھیں تو تُو اس کے پڑھنے کی پیروی کر ﴿۱۸﴾ پھر بلاشبہ اسے واضح کرنا ہمارے ذمے ہے ﴿۱۹﴾**

نافرمانی، اس کی مخلوق پر ظلم وستم اور اپنی خواہش پرستی کے جواز کے لیے مجبوری یا مصلحت کے لاکھ بہانے گھڑے، مگر خود اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور بہانہ بازی کر رہا ہے۔ اس کے نفس کی ملامت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے کرتوتوں سے آگاہ ہے۔ نامۂ اعمال پیش کیے جانے کا مطلب تو اس پر حجت تمام کرنا ہے اور یہ حجت صرف نامۂ اعمال کے ذریعے سے نہیں بلکہ اس کے ہر ہر عضو کو بلوا کر اور زمین کے ہر اس حصے کو بلوا کر جس پر اس نے نافرمانی کی تھی، پوری کی جائے گی۔

**آیت 16 تا 19** ① **لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ**...... : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید اترتے وقت بہت تکلیف محسوس کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ساتھ ساتھ ہونٹ ہلاتے جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ "تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے کہ اسے جلدی حاصل کرے۔ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا) اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔" ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے آپ کے سینے میں جمع کرنا اور آپ کا اسے پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ "**فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ**" تو جب ہم اسے پڑھیں تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ "**ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ**" پھر یہ ہمارے ذمے ہے کہ آپ اسے پڑھیں گے۔ اس کے بعد جب جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آتے تو آپ کان لگا کر سنتے رہتے، جب وہ چلے جاتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح پڑھ لیتے جیسے جبریل علیہ السلام نے پڑھا تھا۔ [بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي : ٥] "**جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ**" سے اوّلین مراد یہی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی، مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے قرآن جمع کرنے اور اسے پڑھنے کی تمام صورتیں اس میں شامل ہیں اور اس کے جمع ونشر کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ چنانچہ خلفاء کا قرآن مجید کو جمع کرنا، لکھوانا اور حُفّاظ کا حفظ کرنا، ریڈیو، ٹیلی وژن، پریس اور کمپیوٹر کے ذریعے سے قرآن کا جمع اور نشر ہونا بھی اس میں شامل ہے۔

② "**ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ**" سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی وضاحت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا ہے اور یہ وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے فرمائی ہے، جو حدیث وسنت کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ مثلاً قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نماز قائم کرنے کا حکم دیا تو اس کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور فرمان کے ساتھ کر دی کہ نمازوں کے اوقات کیا ہیں اور نمازیں کتنی ہیں۔ ان کی رکعات، قیام، رکوع، سجود وغیرہ کی ترتیب اور ان میں پڑھے جانے والے اذکار، غرض یہ سب کچھ قرآن کا بیان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱

ہرگز نہیں، بلکہ تم جلدی ملنے والی کو پسند کرتے ہو ⑳ اور بعد میں آنے والی کو چھوڑ دیتے ہو ㉑

نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [ النحل : ٤٤ ] ''اور (اے رسول!) ہم نے تیری طرف یہ ذکر نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کے لیے اس (ذکر) کی وضاحت اور تشریح کر دے جو ان کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔'' معلوم ہوا کہ حدیث قرآن ہی کا بیان ہے، اس لیے اس پر عمل کرنا بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن پر عمل کرنا واجب ہے۔

③ ''فَاِذَا قَرَاْنٰهُ'' (جب ہم اسے پڑھیں) سے مراد یہ ہے کہ جب جبریل علیہ السلام پڑھ رہے ہوں، کیونکہ ان کا پڑھنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، اس لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف فرمائی۔

④ سورت کے شروع میں منکرین حشر اور منکرین قیامت کا ذکر ہے، سورت کے آخر میں بھی یہی ذکر ہے، درمیان میں یہ آیات ہیں جن کا بظاہر ماقبل اور مابعد سے کوئی ربط نہیں۔ اس لیے بعض شیعہ مفسرین نے یہاں تک لکھ دیا کہ اس سورت میں کچھ آیات رہ گئی ہیں، مگر یہ بات غلط ہے، کیونکہ اس کا رد خود ان آیات میں موجود ہے کہ قرآن کا جمع کرنا اللہ کے ذمے ہے، پھر اس میں سے آیات کس طرح رہ سکتی ہیں؟ اور یہ بات بھی صحیح سندوں سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کی آیات کی یہ ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ہے، جیسا کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک وقت میں کئی سورتیں نازل ہو رہی ہوتی تھیں، جب کوئی چیز نازل ہوتی تو آپ کسی وحی لکھنے والے کو بلا کر فرماتے کہ یہ آیات اس سورت میں لکھو جس میں فلاں فلاں بات کا ذکر ہے اور جب آپ پر کوئی آیت اترتی تو فرماتے اسے اس سورت میں لکھ دو جس میں فلاں فلاں بات کا ذکر ہے۔ [ترمذي، التفسير، باب سورة التوبة : ٣٠٨٦] ابوداؤد، نسائی، مسند احمد، مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ان آیات کا ربط ماقبل اور مابعد کے ساتھ بنانے کی کوشش کی ہے مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے بعد جو بہترین سندوں کے ساتھ امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل فرمائی ہے، خود ساختہ ربط کی تکلیف اٹھانا سراسر تکلّف ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے وقت اور سورۂ طٰہٰ کی آیت (۱۱۴): ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ﴾ نازل ہونے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ پڑھنے کا موقع پیش آیا اور اس وقت ممانعت کا یہ حکم نازل ہوا اور اس مقام پر قرآن میں لکھ دیا گیا۔ اس کی مثال ایسے ہی سمجھیں جیسے کوئی استاذ شاگرد کو کوئی چیز پڑھا رہا ہو اور درمیان میں اس کی کسی حرکت کی اصلاح کے لیے کہے ''ایسا مت کرو'' اور پہلا سلسلہ کلام جاری کر دے تو ٹیپ ریکارڈر میں یہ بات بھی ریکارڈ ہو جائے گی اور لفظ بلفظ تحریر میں بھی اسی طرح نقل ہو گی۔ درمیان میں آنے والی اس بات کا معنوی ربط و تعلق ماقبل و مابعد سے جوڑنا تکلّف ہو گا، مگر اس بات کو بے محل نہیں کہہ سکتے، یقیناً اس موقع پر یہی بات ضروری تھی اور یہ بھی ربط کی ایک صورت ہے کہ موقع و محل کے تقاضے سے یہ الفاظ درمیان میں آ گئے۔

**آیت 21،20** كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ...... : یہاں سے پھر وہی سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے جو ''لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ''

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳ ﴾

اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے (۲۲) اپنے رب کی طرف دیکھنے والے (۲۳)

سے پہلے چل رہا تھا۔ فرمایا تمھارے قیامت کا انکار کرنے کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم دنیا سے محبت کرتے ہو اور اس کی محبت میں آخرت کو چھوڑ ہی بیٹھے ہو، کیونکہ دنیا جلدی ملنے والی اور نقد ہے جب کہ آخرت بعد میں آئے گی اور ادھار ہے، حالانکہ اس نقد کی راحتیں اور رنج عارضی ہیں اور آخرت ہمیشہ رہنے والی اور کہیں بہتر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴾ [ الأعلی : ١٦، ١٧ ] ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔''

**آیت 23،22** ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ...... ﴾: ''نَاضِرَةٌ'' '' نَضَرَ الْوَجْهُ وَالشَّجَرُ وَاللَّوْنُ '' (ن، ک، س) چہرے یا درخت یا رنگ کا تروتازہ، خوبصورت اور بارونق ہونا۔ معلوم ہوا کہ قیامت کے دن نیک بندوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا اور اس خوشی میں ان کے چہرے تروتازہ اور چمک رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انسان ہوں یا حیوان، نباتات ہوں یا جمادات، ایسا ایسا حسن و جمال ہے جسے دیکھ کر خوشی سے چہروں پر تازگی اور رونق آ جاتی ہے۔ جب حسن و جمال کے خالق کی ذات کو دیکھیں گے تو ان کی خوشی اور ان کے چہروں کی تازگی کا کیا ٹھکانا ہوگا!! حقیقت یہ ہے کہ جنت کی سب سے بڑی نعمت ہی یہ ہوگی کہ جنتی اپنی آنکھوں سے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى تُرِيْدُوْنَ شَيْئًا أَزِيْدُكُمْ؟ فَيَقُوْلُوْنَ أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوْهَنَا؟ أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ فَيَكْشِفُ الْحِجَابَ فَمَا أُعْطُوْا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلٰى رَبِّهِمْ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ : ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ﴾ )) [ مسلم، الإيمان، باب إثبات رؤية المؤمنين ...... : ١٨١ ] ''جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: ''تمھیں کوئی چیز چاہیے جو میں تمھیں مزید عطا کروں؟'' وہ کہیں گے: ''کیا تو نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور آگ سے نجات نہیں دی؟'' فرمایا: ''پھر اللہ تعالیٰ پردہ ہٹا دے گا اور انھیں کوئی بھی چیز نہیں دی گئی ہوگی جو انھیں اپنے رب کو دیکھنے سے زیادہ پیاری ہو۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ﴾ [ یونس : ٢٦ ] ''جن لوگوں نے اچھے اعمال کیے ان کے لیے اچھا اجر ہے اور مزید بھی (مزید سے رب تعالیٰ کا دیدار مراد ہے)۔''

جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا )) [ بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالٰى : ﴿ وجوه يومئذ ناضرة ...... ﴾ : ٧٤٣٥ ] ''تم اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے صاف دیکھو گے۔'' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ لوگوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( هَلْ تُضَارُّوْنَ فِي الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ؟ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ فَهَلْ تُضَارُّوْنَ فِي الشَّمْسِ لَيْسَ

وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ۝۲۴ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝۲۵ كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝۲۶ وَ قِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ۝۲۷ وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝۲۸ وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝۲۹ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِالْمَسَاقُ ۝۳۰ ع

اور کئی چہرے اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے ۝۲۴ وہ یقین کریں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑنے والی (سختی) کی جائے گی ۝۲۵ ہرگز نہیں، (وہ وقت یاد کرو) جب (جان) ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی ۝۲۶ اور کہا جائے گا کون ہے دم کرنے والا؟ ۝۲۷ اور وہ یقین کرلے گا کہ یہ جدائی ہے ۝۲۸ اور پنڈلی، پنڈلی کے ساتھ لپٹ جائے گی ۝۲۹ اس دن تیرے رب ہی کی طرف روانگی ہے ۝۳۰

دُوْنَهَا سَحَابٌ؟ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ فَإِنَّكُمْ تَرَوْنَهُ كَذٰلِكَ» [بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿وجوه يومئذ ناظرة......﴾: ۷۴۳۷۔ مسلم: ۱۸۲] ''کیا تمھیں چودھویں کا چاند دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں، اے اللہ کے رسول!'' فرمایا: ''کیا تمھیں سورج دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے جس کے سامنے بادل کی رکاوٹ بھی نہ ہو؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں، اے اللہ کے رسول!'' فرمایا: ''(یقین رکھو کہ) تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے۔'' قرآن مجید میں فاجر لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ [المطففین: ۱۵] ''ہرگز نہیں، بے شک وہ اس دن اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائیں گے۔'' اللہ تعالیٰ نے ان کے دیدار الٰہی سے محروم رکھے جانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اگر ابرار کو بھی اس دن رب کا دیدار نہ ہوا تو ان میں اور فجار میں کیا فرق رہا؟ بہت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اتنی واضح آیات و احادیث کے باوجود قیامت کے دن دیدارِ الٰہی کے منکر ہیں۔ اس انکار کا بدلا یہی ہے کہ انھیں قیامت کے دن اس سب سے بڑی نعمت سے محروم ہی رکھا جائے۔

**آیت 24، 25** ﴿وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ......﴾: ''بَاسِرَةٌ'' ''بَسَرَ يَبْسُرُ بُسُوْرًا'' (ن) تیوری چڑھانا، منہ بگاڑنا۔ ''فَاقِرَةٌ'' وہ سختی جو کمر توڑ دے۔ یہ ''فَقَرَاتُ الظَّهْرِ'' سے نکلا ہے جس کے معنی 'پیٹھ کے مہرے' ہیں۔ کہا جاتا ہے: ''فَقَرْتُ الرَّجُلَ'' ''میں نے اس آدمی کی پیٹھ کے مہرے توڑ دیے۔''

**آیت 26 تا 30** ❶ ﴿كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ......﴾: ''بَلَغَتْ'' کا فاعل ''نَفْسٌ'' ہے جو محذوف ہے، یعنی جان ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی۔ ''التَّرَاقِيَ'' ''تَرْقُوَةٌ'' کی جمع ہے، سینے کی اوپر والی ہڈی جو گلے کے ساتھ ہے، ہنسلی۔ ''رَاقٍ'' ''رَقٰى يَرْقِيْ'' (ض) سے اسم فاعل ہے، دم کرنے والا۔ ''ظَنَّ'' کا معنی گمان کرنا ہے، اگر اس کے بعد ''أَنَّ'' ہو تو یقین کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ''الْمَسَاقُ'' ''سَاقَ يَسُوْقُ سَوْقًا'' (ن) سے مصدر میمی ہے، ہانکنا، چلانا۔

❷ ''كَلَّا'' نہیں نہیں، یعنی تمھارا جلدی حاصل ہونے والی دنیا سے محبت کرنا اور آخرت کو چھوڑ دینا ہرگز درست نہیں،

فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾

سو نہ اس نے سچ مانا اور نہ نماز ادا کی ﴿۳۱﴾ اور لیکن اس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا ﴿۳۲﴾ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چلا ﴿۳۳﴾ یہی تیرے لائق ہے، پھر یہی لائق ہے ﴿۳۴﴾ پھر تیرے لائق یہی ہے، پھر یہی لائق ہے ﴿۳۵﴾

تمھارے سامنے کتنے لوگ دنیا سے رخصت ہوئے، ان کا آخری وقت یاد کرو جب جان پیروں سے اور تمام جسم سے نکل کر ہنسلیوں تک پہنچ جاتی ہے اور حکیموں ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر کسی دم کرنے والے کی تلاش شروع ہوتی ہے کہ شاید دم ہی سے اچھا ہو جائے۔ ادھر بیمار کو زندگی سے نا امیدی ہو گئی اور مرنے کا گمان قوی ہو گیا۔ پکے دنیا داروں کو جان بہت پیاری ہوتی ہے، وہ مرنا نہیں چاہتے، آخری وقت تک ان کو زندگی کی توقع رہتی ہے، اس لیے یقین کی جگہ گمان کا لفظ فرمایا، لیکن آخر یہ گمان یوں یقین کے درجے کو پہنچ گیا کہ پاؤں کا دم نکل گیا۔ پنڈلیاں سوکھ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں، یہاں تک کہ ٹانگوں کو کوئی دوسرا آدمی سیدھا نہ کرے تو سمٹی ہوئی ہی رہ جائیں، آخر سارے جسم میں سے کھنچ کر جو جان حلق میں آ گئی تھی اس نے بھی جسم کو چھوڑ دیا اور پھر اس کی روانگی اس رب تعالیٰ کی طرف ہو گئی جس نے پہلے جسم میں وہ جان ڈالی تھی۔ (خلاصہ احسن التفاسیر)

**آیت 31 تا 35:** ① فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ...... : "يَتَمَطّٰى" "م ط و" سے "تَمَطّٰى" کا مضارع ہے۔ "مَطَا" کا معنی پیٹھ ہے، یعنی اکڑتا ہوا۔ "اَوْلٰى" "و ل ی" سے اسم تفضیل ہے، زیادہ لائق، زیادہ حق دار، زیادہ قریب۔

② "فَلَا صَدَّقَ" (سو نہ اس نے سچ مانا) میں ضمیر "الْاِنْسَانُ" کی طرف جا رہی ہے جس کا اوپر "اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ" میں ذکر ہے۔ یعنی یہ دیکھنے کے بعد کہ موت کے وقت انسان پر کیا گزرتی ہے اور کس طرح بے بس ہو کر اسے اپنے رب کی طرف روانہ ہونا پڑتا ہے، حق تو یہ تھا کہ وہ آخرت کو سچ مانتا اور اس دن کی نجات کے لیے نماز ادا کرتا اور اللہ کی زمین پر عجز و بندگی اختیار کرتا، مگر اس نے نہ عقیدہ کی اصلاح کی اور نہ عمل کی اور نہ لوگوں کے ساتھ اپنی رَوش درست کی، بلکہ آخرت کو اور پیدا کرنے والے کو جھٹلایا اور ماننے کے بجائے منہ پھیر کر چلا گیا اور عجز و بندگی اختیار کرنے کے بجائے گھر کو گیا تو اکڑتا ہوا گیا۔

③ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى: اس آیت کی سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو حافظ ابن کثیر نے فرمائی ہے کہ اس کافر کو جس نے اپنے خالق سے کفر کیا اور متکبرانہ چال چلا، اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طنز اور دھمکی کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ جب تو نے جھٹلا دیا اور اپنے خالق سے کفر کی جرأت کر چکا تو تیرا حق بنتا ہے کہ یہ چال چلے اور یہی چال تیرے لائق ہے۔ ہم تمھاری چال دیکھ رہے ہیں اور تمھیں اس کا نتیجہ مل جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ﴾ [المرسلات: ۴۶] "کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ، تھوڑا، یقیناً تم مجرم ہو۔" اور فرمایا: ﴿فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ﴾ [الزمر: ۱۵] "اس اللہ کے علاوہ جس کی چاہو عبادت کرتے رہو۔" اور فرمایا: ﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ﴾ [المؤمن: ۴۰] "تم جو چاہو کرو۔" "اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى"

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بغیر پوچھے ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ ﴿۳۶﴾ کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے ﴿۳۷﴾ پھر وہ جما ہوا خون بنا، پھر اس نے پیدا کیا، پس درست بنا دیا ﴿۳۸﴾ پھر اس نے اس سے دو قسمیں نر اور مادہ بنائیں ﴿۳۹﴾ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ ﴿۴۰﴾

میں تکرار مزید وعید کے لیے ہے۔ یہ معنی اس لیے بھی بہتر ہے کہ "اَوْلٰى" کا معنی ''زیادہ لائق، زیادہ حق دار'' معروف ہے۔

④ بہت سے مفسرین نے "اَوْلٰى لَكَ" کا معنی ''خرابی ہے تیرے لیے، افسوس ہے تیرے لیے، ہلاکت ہے تیرے لیے'' کیا ہے، کیونکہ "اَوْلٰى لَكَ" کلام عرب میں "وَيْلٌ لَّكَ" کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مگر یہ معنی "اَوْلٰى لَكَ" کا لفظی معنی نہیں ہے، لفظی معنی ''زیادہ لائق، زیادہ حق دار'' ہی ہے، کیونکہ "اَوْلٰى" کے حروف اصلی ''و ل ی'' ہیں، ''و ی ل'' نہیں، بلکہ یہ معنی مرادی ہے اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ موقع و محل کے مطابق "اَوْلٰى لَكَ" کا مبتدا "اَلْهِلَاكُ" یا "اَلنَّارُ" محذوف مانا جائے، یعنی ہلاکت ہی تیرے زیادہ لائق ہے، یا آگ ہی تیرے زیادہ لائق ہے۔

**آیت 36 تا 40** ① اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى...... : "سُدًى" وہ اونٹ جو کھلے چھوڑ دیے جائیں، انھیں "اِبِلٌ سُدًى" کہتے ہیں، یعنی کھلا چھوڑا ہوا، جس سے کوئی باز پُرس نہ ہو۔ "يُمْنٰى" "أَمْنٰى يُمْنِيْ" (افعال) سے مضارع مجہول ہے، گرایا جاتا ہے، ٹپکایا جاتا ہے۔

② حشر و نشر کے منکر اس بات کو ناممکن قرار دیتے تھے کہ بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ زندہ ہوں گی اور ان کا محاسبہ ہوگا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوبارہ زندہ کر کے اس سے حساب لینے کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے پوچھے بغیر ہی رہنے دیا جائے گا؟ نہیں، یہ غلط سوچ ہے، جس قادر مطلق نے پانی جیسی پتلی چیز کی ایک بوند کو رحم مادر میں جمے ہوئے خون میں بدلنے کے بعد گوشت، ہڈیاں اور تمام اعضا مکمل کر کے روح پھونک کر مرد یا عورت کی صورت والا زندہ انسان بنا دیا، تو اس کے لیے اسی کی مٹی کو دوبارہ اصل شکل میں لے آنا کیا مشکل ہے؟

اس کے علاوہ اگر انسان اپنی اصل پر غور کرے کہ وہ ایک حقیر قطرہ تھا جو باپ کے ان اعضا سے ماں کے ان اعضا میں گرایا گیا جن کا نام بھی شرم و حیا کی وجہ سے نہیں لیا جاتا، پھر وہاں مختلف مراحل سے گزار کر اس کی مکمل صورت گری کے بعد اسے اسی راستے سے واپس لایا گیا جس کا ذکر ہی موجب حیا ہے۔ اب کیا انسان کو یہ زیب دیتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سرکشی کرے اور اکڑ کر چلے اور یہ سمجھے کہ اسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں؟

سورۃ الدھر ۷۶ مدنیۃ ۹۸ ﴿ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴾ آیاتھا ۳۱ رکوعاتھا ۲

## هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَكُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا ①

**اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔**

**کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس کا (کہیں) ذکر ہوا ہو؟ ①**

اس سورت کو "سُوْرَةُ الْاِنْسَانِ" اور "سُوْرَةُ هَلْ أَتٰی" بھی کہا جاتا ہے۔ (قاسمی) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْجُمُعَةِ فِيْ صَلَاةِ الْفَجْرِ: ﴿ الٓمّٓ ۚ تَنۡزِیۡلُ ﴾ [ السجدة : ۲،۱ ] وَ ﴿ هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ ﴾ [ الإنسان : ۱ ] » [ بخاري، الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الفجر يوم الجمعة : ۸۹۱ ] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت کیا کرتے تھے۔"

**آیت 1** ① هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ ...... : "هَلْ" (کیا) پوچھنے کے لیے آتا ہے۔ یہ پوچھنا کبھی تو کوئی خبر معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے "هَلْ فِي الدَّارِ زَيْدٌ" "کیا گھر میں زید ہے؟" اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ کبھی یہ سوال کسی بات کی نفی کے لیے ہوتا ہے، جیسے: "وَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ ذٰلِكَ أَحَدٌ" "بھلا یہ کام کوئی کر سکتا ہے؟" یعنی کوئی نہیں کر سکتا۔ عربی میں اسے نفی کے علاوہ جحد بھی کہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ پوچھنا بات منوانے کے لیے ہوتا ہے، اسے عربی میں تقریر کہتے ہیں، جیسے آپ نے کسی کو کچھ دیا ہو یا اس کی عزت کی ہو تو اسے کہیں "هَلْ أَعْطَيْتُكَ" "کیا میں نے تمھیں دیا؟" اور "هَلْ أَكْرَمْتُكَ" "کیا میں نے تمھاری عزت کی؟" اس وقت یہ "هَلْ" بمعنی "قَدْ" ہوتا ہے، یعنی یقیناً میں نے تمھیں دیا اور یقیناً میں نے تمھاری عزت کی۔ اس آیت میں "هَلْ" اسی آخری معنی کے لیے آیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے اس کا ترجمہ "یقیناً" یا "تحقیق" کیا ہے، لیکن "هَلْ" کا معنی اپنی اصل پر (کیا) ہو تب بھی مراد یہی ہے کہ یقیناً اس پر ایسا وقت گزرا ہے۔

② بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا، ان کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے خاک ہو جانے کے بعد اسے دوبارہ پیدا کیا جا سکے۔ یہاں ایسے لوگوں کو قائل کرنے کے لیے سوال ہے کہ کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے جب وہ کوئی ایسی چیز ہی نہ تھا جس کا ذکر ہوتا ہو؟ صاف ظاہر ہے کہ ان کا جواب یہ ہو گا کہ یقیناً انسان پر ایسا وقت گزرا ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس وقت بنا لیا جب یہ کچھ بھی نہ تھا بلکہ کہیں اس کا ذکر بھی نہ تھا تو پیدا کرنے کے بعد دوبارہ وہ کیوں نہیں بنا سکتا؟ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ یَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَیًّا ۝ اَوَ لَا یَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ یَكُ شَیۡـًٔا ﴾ [ مریم : ٦٧،٦٦ ] "اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا مجھے زندہ کر کے (قبر سے) نکالا جائے گا؟ کیا اسے یاد نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اسے پیدا کیا جب وہ کوئی چیز ہی نہ تھا۔"

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۲ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝۳

**بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۲ بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۳**

۳ "الْاِنْسَانِ" سے مراد یہاں صرف آدم علیہ السلام نہیں بلکہ نسل انسانی ہے، کیونکہ آئندہ آیت میں انسان کے نطفہ سے پیدا ہونے کا ذکر ہے۔

**آیت 2** ۱ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ : یعنی انسان کی پیدائش صرف مرد یا صرف عورت کے نُطفہ سے نہیں ہوئی بلکہ دونوں کے ملے جلے نُطفہ سے ہوئی ہے، کیونکہ دونوں کے ملنے ہی سے حمل منعقد ہوتا ہے۔ ام سُلیم رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ مَاءَ الرَّجُلِ غَلِيظٌ أَبْيَضُ وَ مَاءَ الْمَرْأَةِ رَقِيقٌ أَصْفَرُ فَمِنْ أَيِّهِمَا عَلاَ أَوْ سَبَقَ يَكُوْنُ مِنْهُ الشَّبَهُ » [ مسلم، الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأۃ...... : ۳۱۱ ] ''مرد کا پانی سفید گاڑھا اور عورت کا پانی پتلا زرد ہوتا ہے، ان میں سے جو غالب آ جائے یا سبقت کر جائے اسی سے مشابہت ہوتی ہے۔''

۲ نَّبْتَلِيْهِ : ہم اسے آزماتے ہیں، یعنی انسان کو پیدا کرنے کا مقصد اس کی آزمائش ہے کہ اچھے عمل کرتا ہے یا برے، جیسے فرمایا: ﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [ الملك : ۲ ] ''(اللہ تعالیٰ نے موت و حیات کو اس لیے پیدا فرمایا) تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون عمل میں بہتر ہے۔''

۳ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا : ''ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا'' اگرچہ جانور بھی سنتے اور دیکھتے ہیں مگر انھیں ''سمیع و بصیر'' نہیں کہا جاتا، کیونکہ وہ عقل کی نعمت سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سننے اور دیکھنے کی ایسی قوتیں دی ہیں جن سے وہ اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہے اور بہت دور تک سوچ سکتا ہے۔ گویا دوسرے جانور اس کے مقابل بہرے اور اندھے ہیں۔

**آیت 3** ۱ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ : یعنی ہم نے انسان کی آزمائش کرتے ہوئے اسے صرف سمع و بصر اور عقل کی نعمت عطا کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسے صحیح اور غلط راستہ بتانے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ نیکی و بدی کی یہ تمیز اس کی فطرت میں بھی رکھی ہے، جس کی وجہ سے اچھے کام اس کے لیے معروف ( جانے پہچانے ) اور برے کام منکر ( نہ پہچانے ہوئے ) ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے بھی اسے نیکی و بدی کا راستہ بتایا ہے۔

۲ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا : سمع و بصر، عقل و فہم، فطرتِ انسانی اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ملنے والی آسمانی رہنمائی کے بعد انسان کے لیے صحیح راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اب اس کی مرضی ہے کہ اس راستے پر چل کر اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا بن جائے، یا وہ سیدھا راستہ ترک کر کے اس کی نعمتوں کی ناشکری اور کفر کرنے والا بن جائے۔

اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغۡلٰلًا وَّ سَعِیۡرًا ﴿۴﴾ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ کَانَ مِزَاجُہَا کَافُوۡرًا ﴿۵﴾ عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِہَا عِبَادُ اللّٰہِ یُفَجِّرُوۡنَہَا تَفۡجِیۡرًا ﴿۶﴾

یقیناً ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے ﴿۴﴾ بلاشبہ نیک لوگ ایسے جام سے پییں گے جس میں کافور ملا ہوا ہوگا ﴿۵﴾ وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پییں گے، وہ اسے بہا کر لے جائیں گے، خوب بہا کر لے جانا ﴿۶﴾

**آیت 4** اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ...... : "سَلٰسِلَاۡ" "سِلْسِلَةٌ" کی جمع ہے، زنجیریں۔ "اَغۡلٰلًا" "غُلٌّ" کی جمع ہے، طوق۔ انسان کی پیدائش کی ابتدا اور راہ حق کی طرف اس کی رہنمائی ذکر کرنے کے بعد ہدایت قبول کرنے سے انکار کرنے والوں کا اور نیک لوگوں کا انجام ذکر فرمایا کہ ہم نے کفار کے لیے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ کفار کے لیے اغلال اور سلاسل کا ذکر سورۂ حاقہ (۳۰ تا ۳۲) اور سورۂ مومن (۶۹ تا ۷۲) میں دیکھیے۔

**آیت 5** ❶ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ...... : "الۡاَبۡرَارَ" "بَارٌّ" یا "بَرٌّ" کی جمع ہے، نیکی کرنے والے۔ "کَاۡسٍ" وہ برتن جس سے پیا جائے۔ عام طور پر "کَأْسٌ" کا لفظ اس برتن پر بولتے ہیں جس میں شراب موجود ہو۔ "مِزَاجٌ" آمیزش، ملونی، وہ چیز جو لذت یا خوشبو میں اضافے کے لیے مشروب میں ملائی جائے۔ "کَافُوۡرًا" ایک خوشبو دار پودا، اس پودے سے نکلنے اور حاصل ہونے والی خوشبو جو تاثیر میں نہایت ٹھنڈی ہوتی ہے۔

❷ کفار کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا ذکر کرنے کے بعد نیک لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ شراب کے ایسے جام پییں گے جن میں کافور کی آمیزش ہوگی، یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کے بجائے انھیں ایسی شراب ملے گی جس میں ٹھنڈی تاثیر اور خوشبودار کافور کی آمیزش ہوگی۔ واضح رہے کہ دنیا کے کافور اور جنت کے کافور میں صرف نام کی مشابہت ہے، جیسا کہ دنیا کی شراب اور جنت کی شراب میں صرف نام کی مشابہت ہے کہ جنت کی شراب میں سرور و نشاط وغیرہ کی وہ خوبیاں تو ہوں گی جو دنیا کی شراب میں ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوں گی، مگر وہ دنیا کی شراب کی خرابیوں مثلاً بد بو، زوالِ عقل، خُمار اور اعضا شکنی وغیرہ سے پاک ہوگی۔ اسی طرح جنت کے کافور میں وہ ٹھنڈک، لطافت اور خوشبو تو ہوگی جو دنیا کے کافور میں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگی، مگر وہ دنیوی کافور کی خرابیوں مثلاً اس کی زہریلی تاثیر اور بو میں ایک ناگوار سے احساس سے پاک ہوگا۔ "مِزَاجٌ" کا مطلب یہ ہے کہ اَبرار کو ملنے والی شراب میں خوشبو اور لذت کے اضافے کے لیے کافور کے چشمے سے آمیزش کی جائے گی، جس سے اس کی تیزی اور حرارت اعتدال پر آجائے گی۔

**آیت 6** عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِہَا عِبَادُ اللّٰہِ...... : "عِبَادُ اللّٰہِ" اگرچہ سب لوگ ہی اللہ کے بندے ہیں مگر یہاں مراد اللہ کے خاص بندے ہیں، جیسا کہ "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" (رحمان کے بندے)، "نَاقَةُ اللّٰهِ" (اللہ کی اونٹنی) اور "بَيْتُ اللّٰهِ" (اللہ کا گھر)

**یُوۡفُوۡنَ بِالنَّذۡرِ وَ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسۡتَطِیۡرًا ﴿۷﴾ وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ**

جو اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہوگی ﴿۷﴾ اور وہ کھانا

میں خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی اللہ کے یہ خاص بندے ابرار کافور کی آمیزش والا شراب کا جو جام پئیں گے وہ ایک جام ہی نہیں ہوگا بلکہ کافور کی آمیزش والا ایک چشمہ ہوگا جس سے مومن جہاں چاہے گا شاخ نکال کر لے جائے گا۔

بعض مفسرین نے "اَلۡاَبۡرَارَ" اور "عِبَادُ اللّٰہِ" کو الگ الگ قرار دے کر یہ معنی کیا ہے کہ ابرار یعنی نیک لوگوں کو پلائے جانے والے شراب کے جام میں کافور نامی چشمے میں سے کچھ ملاوٹ ہوگی، جس طرح کسی کے شربت میں کوئی خوشبودار شربت مثلاً روح افزا ملا دیا جائے، جب کہ "عباد اللہ" یعنی اللہ کے مقرب بندوں کو کافور کے چشمے کی صرف آمیزش ہی نہیں بلکہ اس کا خالص پانی جتنا وہ چاہیں گے ملے گا۔ مجھے پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

**آیت 7** ﴿ **یُوۡفُوۡنَ بِالنَّذۡرِ** ...... : "اَلنَّذۡرُ" اپنے آپ پر وہ چیز واجب کر لینا جو واجب نہیں ہے۔ "**مُسۡتَطِیۡرًا**" "طَارَ یَطِیۡرُ" اڑنا اور "اِسۡتَطَارَ یَسۡتَطِیۡرُ" باب استفعال میں الفاظ زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، یعنی بہت زیادہ اڑنے والا، مراد ہے بہت زیادہ پھیلنے والا، جیسے آگ یا صبح کی روشنی خوب پھیل جائے تو کہا جاتا ہے: "اِسۡتَطَارَ الۡحَرِیۡقُ" یا "اِسۡتَطَارَ الۡفَجۡرُ" کہ آگ بہت زیادہ پھیل گئی ہے، یا صبح کی روشنی خوب پھیل گئی ہے۔

اس آیت میں اور اس کے بعد کی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں کی چند صفات بیان کی گئی ہیں، ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں، یعنی جو کام ان پر واجب نہیں جب اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ پر واجب کر لیتے ہیں تو انھیں پورا کرتے ہیں، پھر جو کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی واجب ہیں ان پر کتنے اہتمام سے عمل کرتے ہوں گے۔ نذر کے مسائل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۷۰) اور سورۂ حج (۲۹) کی تفسیر۔ ان لوگوں کے نذر پوری کرنے کا باعث یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس سے ان صوفیوں کا رد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ جنت کے طمع یا جہنم کی خوف سے عبادت نہیں کرنی چاہیے۔

**آیت 8** ﴿ ❶ **وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ** ...... : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں، ایک یہ کہ خود کھانے کی خواہش و ضرورت کے باوجود وہ دوسرے مستحقین کو کھلا دیتے ہیں، دوسرا یہ کہ اللہ کی محبت کی وجہ سے ان لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ یہاں پہلا معنی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ دوسرا معنی تو اگلی آیت: ﴿ **اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡہِ اللّٰہِ** ﴾ (ہم تو تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں) میں آ ہی رہا ہے، لہٰذا تکرار سے بہتر ہے کہ الگ الگ مفہوم مراد لیا جائے۔ مزید دیکھیے سورۂ حشر کی آیت (۹): ﴿ **وَ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ** ﴾ کی تفسیر۔

❷ مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلانا ان اہم ترین مواقع میں سے ہے جہاں صدقہ کرنے کا حق ہے، کیونکہ مسکین وہ ہے جس کی کمائی سے اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، یتیم اس سے بھی عاجز ہے، کیونکہ اس کا کمانے والا فوت ہو چکا ہے اور وہ کم عمر

# مِسۡكِيۡنًا وَّ يَتِيۡمًا وَّ اَسِيۡرًا ⑧

## کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین اور یتیم اور قیدی کو⑧

ہونے کی وجہ سے کمائی نہیں کر سکتا اور قیدی ان دونوں سے زیادہ عاجز ہے، کیونکہ اسے کسی چیز کا اختیار ہی نہیں، وہ کلیتاً دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔

③ زمانۂ جاہلیت میں اسیروں سے بہت برا سلوک کیا جاتا تھا، انھیں بیڑیاں لگا کر ہر روز باہر نکالا جاتا تاکہ وہ گدائی کے ذریعے سے اپنی ضرورت کی چیزیں لوگوں سے حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اسیروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا اور ''ابرار'' کی صفت بیان فرمائی کہ وہ خود ضرورت مند ہونے کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابہ کو تاکید فرمائی کہ ان کا اکرام کریں۔ چنانچہ وہ کھانے کے وقت انھیں اپنے آپ پر مقدم رکھتے۔ (ابن کثیر) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کے ہاں اسیر کافر لوگ ہی تھے جو جنگوں میں گرفتار ہو کر آتے تھے، آپ کے زمانے میں مسلمان اسیر نہیں رکھے جاتے تھے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے کوئی مشرک اسیر ہو یا کسی جرم یا مطالبے میں گرفتار مسلم اسیر، سب سے حسنِ سلوک لازم ہے، بلکہ مسلمان اسیروں سے احسان بالاولیٰ لازم ہے۔ اس کے علاوہ غلام بھی اسیر میں شامل ہے، رسول اللہ ﷺ نے آخری وصیت میں فرمایا: (( اَلصَّلَاةَ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ )) [ ابن ماجه، الوصايا، باب هل أوصى رسول الله ﷺ : ۲۶۹۸۔ أبو داؤد : ۵۱۵۶، وقال الألباني صحيح ] ''نماز اور اپنے غلاموں کا خیال رکھنا۔''

④ اس آیت کی شان نزول میں علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی لونڈی فضہ کے حسنین رضی اللہ عنہما کی صحت کے لیے تین روزوں کی نذر ماننے اور افطار کے وقت قرض لائے ہوئے جَو سے تیار کردہ پانچ روٹیاں سب کی سب ایک دن مسکین، دوسرے دن یتیم اور تیسرے دن اسیر کو دے دینے کی جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ بالکل من گھڑت اور موضوع ہے۔ ابن جوزی نے اسے ''الموضوعات'' میں ذکر کیا ہے اور قرطبی نے تفصیل سے اس پر جرح کی ہے۔ اہلِ بیت نبوت کے فضائل کا ثبوت اس قسم کی موضوع روایات کا محتاج نہیں اور نہ ہی یہ کوئی نیکی ہے کہ مسکین کو ایک کے بجائے پانچوں روٹیاں دے دی جائیں اور تین دن رات بچوں کو بھوکا رکھا جائے۔

⑤ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یتیموں، مسکینوں اور اسیروں کو، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، کھانا کھلانے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ ہاں، فرض زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر خرچ ہوگی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ )) [ بخاري، الزكاة، باب أخذ الصدقة من الأغنياء... : ۱۴۹۶ ] ''(فرض صدقہ) مسلمانوں کے اغنیا سے لیا جائے گا اور ان کے فقرا پر خرچ کیا جائے گا۔''

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝۹ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ۝۱۱

(اور کہتے ہیں) ہم تو صرف اللہ کے چہرے کی خاطر تمھیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ ۝۹ یقیناً ہم اپنے رب سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت منہ بنانے والا، سخت تیوری چڑھانے والا ہوگا ۝۱۰ پس اللہ نے انھیں اس دن کی مصیبت سے بچالیا اور انھیں انوکھی تازگی اور خوشی عطا فرمائی ۝۱۱

**آیت 9** اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ...... : "شُكُوْرًا" مصدر ہے، بروزن "دُخُوْلٌ" اور "خُرُوْجٌ" یعنی وہ کھانا کھلاتے ہوئے یہ بات دل میں کہتے ہیں یا زبان سے انھیں اطمینان دلانے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلا رہے ہیں، تم سے نہ یہ خواہش ہے کہ تم اس کا بدلا دو اور ہمارے کسی کام آ ؤ، نہ یہ کہ ہمارا شکریہ ادا کرو اور لوگوں کے سامنے ہماری سخاوت کا ذکر کرو، تاکہ وہ اپنے آپ پر احسان کا بوجھ محسوس نہ کریں۔

**آیت 10** ❶ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا ...... : "عَبُوْسًا" تیوری چڑھانے والا، منہ بنانے والا۔ "قَمْطَرِيْرًا" سخت تیوری چڑھانے والا۔ سوال یہ ہے کہ اس دن کو "عَبُوْسًا" اور "قَمْطَرِيْرًا" کیوں کہا گیا، جبکہ تیوری چڑھانا اور منہ بگاڑنا آدمی کا کام ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس دن کی ہیبت اور سختی کی منظر کشی کے لیے اسے ایک ایسے شخص کی صورت میں پیش کیا ہے جس کے منہ اور ماتھے پر غصے کی وجہ سے سخت تیوری چڑھی ہوئی ہو۔ دوسرا یہ کہ جس طرح "نَهَارُهٗ صَائِمٌ" (اس کا دن روزہ دار ہے) اور "لَيْلُهٗ قَائِمٌ" (اس کی رات قیام کرنے والی ہے) میں صیام وقیام کی نسبت دن اور رات کی طرف کر دی ہے، حالانکہ روزہ رکھنا اور قیام کرنا آدمی کا کام ہے، اسی طرح یہاں بھی اگرچہ دن کو تیوری چڑھانے والا کہا ہے مگر مراد یہ ہے کہ اس دن میں کافر کا چہرہ سخت تیوری والا اور بگڑا ہوا ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴾ [ القیامۃ : ۲۴ ] "کئی چہرے اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے۔"

❷ "اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا" (یقیناً ہم اپنے رب سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت منہ بنانے والا، سخت تیوری چڑھانے والا ہوگا) میں ان جاہل صوفیوں کا رد ہے جو قیامت یا جہنم کے خوف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اخلاص کے خلاف سمجھتے ہیں۔

**آیت 11** فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ ...... : اللہ تعالیٰ اخلاص اور خوف کے ساتھ مذکورہ اعمال کرنے والے ابرار و عباد اللہ کو اس دن کی برائی سے بچالے گا اور انھیں تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا۔ تازگی چہرے کی اور خوشی دل کی۔ دل میں خوشی ہو تو چہرے پر تازگی آجاتی ہے۔ (دیکھیے عبس : ۳۸، ۳۹) ان کے برعکس کفار و فجار کے چہرے بگڑے ہوئے اور دل غم و فکر سے بھرے ہوں گے۔ دیکھیے سورۂ عبس (۴۰ تا ۴۲)۔

وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا ۝۱۲ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا ۝۱۳ وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝۱۴

اور انھیں ان کے صبر کرنے کے عوض جنت اور ریشم کا بدلا عطا فرمایا ۝۱۲ وہ اس میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، نہ اس میں سخت دھوپ دیکھیں گے اور نہ سخت سردی ۝۱۳ اور اس کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے خوشے تابع کر دیے جائیں گے، خوب تابع کیا جانا ۝۱۴

**آیت 12** وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا : اور انھیں اللہ تعالیٰ ان کے صبر کے عوض جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے گا۔ صبر کا مفہوم بہت وسیع ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر صبر، اس کی حرام کردہ چیزوں سے صبر، اس کے دین کی دعوت پر صبر، آزمائشوں اور تکلیفوں پر صبر، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانے پر صبر، غرض مومن کی زندگی اول تا آخر صبر ہی صبر ہے۔

**آیت 13** مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ...... : "شَمْسًا" سے مراد سخت دھوپ اور گرمی اور "زَمْهَرِيْرًا" سے مراد سخت سردی ہے، یعنی جنت کا موسم نہایت خوش گوار اور معتدل ہوگا، اس میں نہ تکلیف دہ گرمی ہوگی نہ سردی۔ اس کے برعکس جہنم میں شدید گرمی یعنی آگ کا عذاب بھی ہوگا اور شدید سردی (زمہریر) کا بھی، بلکہ دنیا میں شدید گرمی اور شدید سردی کا اصل بھی جہنم ہی سے ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَاشْتَكَتِ النَّارُ إِلٰى رَبِّهَا فَقَالَتْ يَا رَبِّ! أَكَلَ بَعْضِيْ بَعْضًا فَأَذِنَ لَهَا بِنَفَسَيْنِ، نَفَسٍ فِي الشِّتَاءِ، وَنَفَسٍ فِي الصَّيْفِ، فَهُوَ أَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ، وَأَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الزَّمْهَرِيْرِ » [ بخاري، مواقيت الصلاة، باب الإبراد بالظهر في شدة الحر : ۵۳۷ ] "آگ نے اپنے رب کے پاس شکایت کی اور کہا: "اے میرے رب! میرے بعض حصے بعض کو کھا گئے۔" تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس نکالنے کی اجازت دے دی، ایک سانس گرمی میں اور ایک سردی میں۔ یہ وہی ہے جو تم سخت گرمی محسوس کرتے ہو اور جو تم سخت زمہریر (سردی) محسوس کرتے ہو۔"

**آیت 14** وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا ...... : "دَانِيَةً" "دَنَا يَدْنُوْ" (ن) سے اسم فاعل ہے، قریب۔ "ذُلِّلَتْ" تابع کیے جائیں گے، جھکا دیے جائیں گے۔ "تَذْلِيْلًا" تاکید ہے، خوب جھکانا۔ "قُطُوْفٌ" "قِطْفٌ" کی جمع ہے، خوشہ، چنا ہوا پھل، یعنی جنت کے درختوں کے سائے نہایت گھنے اور جھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے پھلوں کے خوشے جنتیوں کے تابع اور ان کی دسترس میں ہوں گے جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے جس طرح چاہیں گے توڑ سکیں گے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَشَجَرَةً يَسِيْرُ الرَّاكِبُ فِيْ ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ لَا يَقْطَعُهَا » [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة : ۳۲۵۱ ] "جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں سوار سو برس تک چلتا رہے گا مگر اسے طے نہیں کر سکے گا۔"

وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۟ ﴿۱۵﴾ قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾

اور ان پر چاندی کے برتن اور آبخورے پھرائے جائیں گے، جو شیشے کے ہوں گے ﴿۱۵﴾ ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہوگا، انھوں نے ان کا اندازہ رکھا ہے، خوب اندازہ رکھنا ﴿۱۶﴾ اور اس میں انھیں ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہوگی ﴿۱۷﴾ وہ اس میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل رکھا جاتا ہے ﴿۱۸﴾

**آیت 16، 15** وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ ...... : "آنِيَةٌ" "إِنَاءٌ" کی جمع ہے، بروزن "أَفْعِلَةٌ" اور "اَكْوَابٍ" "كُوْبٌ" کی جمع ہے، برتن جس کی نہ ٹونٹی ہو نہ دستی، آبخورے۔ یعنی ان کی مجلس میں چاندی کے ایسے برتنوں اور آبخوروں کا دور چلے گا جو شیشے کے ہوں گے، ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہوگا۔ ایسے برتنوں کا دنیا میں کہیں وجود نہیں، کیونکہ دنیا کی چاندی کو کوٹ کر مچھر کے پر کے برابر باریک بھی کر دیا جائے تب بھی وہ شیشے کی طرح شفاف نہیں ہو سکتی۔ برتنوں کی یہ قسم جنت ہی میں ہوگی جو چاندی کی طرح سفید اور شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ "قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا" یعنی وہ پینے والوں کی ضرورت کے عین اندازے کے مطابق بنے ہوئے ہوں گے، نہ کم نہ زیادہ۔

**آیت 18، 17** وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا ...... : "كَاْسًا" وہ پیالہ جس میں شراب ہو، خالی پیالے کو کاس نہیں کہتے۔ "مِزَاجٌ" آمیزش، ملونی، یعنی وہ چیز جو لذت یا خوشبو میں اضافے کے لیے ملائی جائے۔ "زَنْجَبِيْلًا" ادرک، سونٹھ۔ "سَلْسَبِيْلًا" کے تین معانی ہیں: ① آسانی سے حلق میں اتر جانے والا۔ ② تیزی سے بہنے والا۔ ③ آسانی سے تابع ہونے والا کہ جدھر لے جانا چاہیں لے جائیں۔ عرب لوگ شراب کی لذت، حرارت، تلخی اور خوشبو میں اضافے کے لیے اس میں سونٹھ کی آمیزش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنتیوں کو جو جامِ شراب پلایا جائے گا اس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ گویا جنت میں ایک وہ شراب ہوگی جو ٹھنڈی ہوگی، جس میں کافور کی آمیزش ہوگی اور ایک گرم ہوگی جس میں سونٹھ ملی ہوگی۔ واضح رہے کہ جنت کی نعمتوں کے ذکر کے وقت دنیا کی جن چیزوں کا ذکر آیا ہے ان سے بعینہٖ وہی چیزیں مراد نہیں بلکہ ان سے بے حد و حساب اعلیٰ چیزیں مراد ہیں۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۱۷) کی تفسیر۔ صاحب احسن التفاسیر لکھتے ہیں: "اگرچہ جنت میں کھانے پینے، پہننے اور برتنے کی جتنی چیزیں ہیں ان کے نام دنیا کی چیزوں سے ملتے ہیں، لیکن جنت کی چیزوں اور دنیا کی چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً دنیا میں ایسا دودھ کہاں ہے جس کی ہمیشہ نہر بہتی ہو اور پھر دوسرے دن ہی وہ کھٹا نہ ہو جائے؟ وہ شہد کہاں ہے جس کی نہر بہتی ہو اور مکھیوں کی بھنکار اس میں جم جم کر نہ مرے اور ہوا سے خاک اور کوڑا کرکٹ اس پر تہ پڑے؟ اور وہ شراب کہاں ہے جس کی نہر ہو اور بدبو کے سبب سے اس نہر کے آس پاس کا راستہ کچھ دنوں میں بند نہ ہو جائے۔" (احسن التفاسیر)

وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾ وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾

**اور ان کے اردگرد لڑکے گھوم رہے ہوں گے، جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، جب تو انھیں دیکھے گا تو انھیں بکھرے ہوئے موتی گمان کرے گا ﴿۱۹﴾ اور جب تو وہاں دیکھے گا تو نعمت ہی نعمت اور بہت بڑی بادشاہی دیکھے گا ﴿۲۰﴾**

"عَيْنًا" "كَاْسًا" سے بدل ہے یا منصوب بہ نزع الخافض ہے، یعنی "يُسْقَوْنَ كَاْسًا مِّنْ عَيْنٍ." مطلب یہ کہ انھیں وہ جامِ شراب جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی، ایسے چشمے سے پلایا جائے گا جس کا نام سلسبیل ہے۔ یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا پانی نہایت خوش گوار، رقیق اور آسانی سے حلق سے اترنے والا ہوگا اور اس چشمے سے نکلنے والی نالیاں نہایت تیز رفتار اور اہلِ ایمان کے لیے نہایت تابع ہوں گی کہ وہ جدھر چاہیں گے انھیں لے جائیں گے۔

**آیت 19** وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ...... : یعنی جنتیوں کی مجلس میں خدمت کے لیے ایسے لڑکے گردش کرتے رہیں گے جن میں دو وصف نمایاں ہوں گے، ایک تو یہ کہ وہ ہمیشہ بچے ہی رہیں گے، کیونکہ خدمت کے لیے بڑی عمر کے آدمی کے بجائے بچے زیادہ مستعد اور موزوں ہوتے ہیں اور انھیں خدمت کے لیے کوئی کام کہنے میں حجاب نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ وہ اتنے خوبصورت ہوں گے کہ جب تم انھیں آتے جاتے دیکھو گے تو گمان کرو گے کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ ان کی خدمت کے لیے ہر طرف پھیلے ہوئے ہونے کو موتیوں کے بکھرنے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ لڑکے کوئی الگ مخلوق ہوگی، جو اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کی خدمت کے لیے پیدا فرمائے گا یا جنتیوں کے اپنے لڑکے ہوں گے؟ اگرچہ پہلی بات بھی ممکن ہے، مگر سورۂ طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتیوں کے اپنے بچے ہی ہوں گے، فرمایا: ﴿ وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ [ الطور : ٢٤ ] ''اور ان پر پھریں گے ان کے لڑکے، گویا وہ چھپائے ہوئے موتی ہیں۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکے ان کے اپنے ہی بچے ہوں گے جو دنیا میں فوت ہو گئے یا جنت میں اگر کسی کو اولاد کی خواہش ہوئی، تو وہ بچے انھیں عطا کیے جائیں گے۔ یہ بچے خدمت کے لیے ان کے اردگرد پھریں گے اور ان کے لیے مزید راحت و مسرت کا باعث ہوں گے۔ (واللہ اعلم) ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلْمُؤْمِنُ إِذَا اشْتَهَى الْوَلَدَ فِي الْجَنَّةِ، كَانَ حَمْلُهُ وَوَضْعُهُ وَسِنُّهُ فِي سَاعَةٍ وَّاحِدَةٍ، كَمَا يَشْتَهِيْ )) [ ابن ماجه، الزهد، باب صفة الجنة : ٤٣٣٨، وقال الألباني صحيح ] ''مومن جب جنت میں اولاد چاہے گا تو اس کا حمل اور وضع حمل اور اس کا بڑا ہونا ایک گھڑی میں ہو جائے گا، اس کی خواہش کے مطابق۔''

**آیت 20** ① وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا: اور نعمت کا حال کیا ہو گا؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰى صُوْرَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، وَالَّذِيْنَ عَلٰى إِثْرِهِمْ كَأَشَدِّ كَوْكَبٍ إِضَاءَةً، قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ، لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَلَا تَبَاغُضَ، لِكُلِّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾

**ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز کپڑے اور گاڑھا ریشم ہوگا اور انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب انھیں نہایت پاک شراب پلائے گا ﴿۲۱﴾**

زَوْجَتَانِ ، كُلُّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا يُرٰى مُخُّ سَاقِهَا مِنْ وَّرَاءِ لَحْمِهَا مِنَ الْحُسْنِ، يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا، لَا يَسْقَمُوْنَ وَلَا يَمْتَخِطُوْنَ، وَلَا يَبْصُقُوْنَ، آنِيَتُهُمُ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ، وَأَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ، وَ وَقُوْدُ مَجَامِرِهِمُ الْأُلُوَّةُ قَالَ أَبُو الْيَمَانِ يَعْنِي الْعُوْدَ وَ رَشْحُهُمُ الْمِسْكُ ﴾ [ بخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة...... : ۳۲٤٦ ] ''پہلے گروہ کے لوگ جو جنت میں داخل ہوں گے، چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے، ان کے بعد جو لوگ جائیں گے وہ سب سے زیادہ روشن ستارے کی طرح چمک رہے ہوں گے۔ ان کے دل ایک ہی آدمی کے دل کی طرح ہوں گے، ان میں نہ کوئی اختلاف ہوگا اور نہ بغض۔ ان میں ہر ایک آدمی کی دو بیویاں ہوں گی، حسن کی وجہ سے ان عورتوں کی پنڈلی کا مغز گوشت کے پیچھے سے دکھائی دے گا۔ وہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کریں گے۔ وہ نہ بیمار ہوں گے، نہ ناک سنکیں گے اور نہ تھوکیں گے۔ ان کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی، ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن ''اُلُوَّہ'' (ایک خوشبودار لکڑی عود ) ہوگی اور ان کا پسینا کستوری ہوگا۔'' عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے آخر میں جہنم سے نکل کر جنت میں جانے والے شخص کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہیں گے: ﴿ فَإِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشَرَةَ أَمْثَالِهَا ﴾ [ مسلم، الإيمان، باب آخر أهل النار خروجا : ۱۸٦ ] ''تجھے دنیا اور دنیا کے دس گنا کے برابر دیا جاتا ہے۔'' جب آخری جنتی کے ملک و سلطنت کا یہ حال ہے تو دوسروں کے عظیم الشان ملک کا کہنا ہی کیا ہے۔

پھر دوستوں کی ملاقاتیں، فرشتوں کی آمد و رفت، سلام اور اللہ تعالیٰ کا اہلِ جنت سے ہم کلام ہونا، سلام کہنا اور دیدار عطا فرمانا مزید نعمتیں ہیں۔ الغرض، جنت میں وہ نعمتیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی بشر کے دل میں ان کا خیال آیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے اہلِ جنت میں شامل فرمائے۔ ( آمین )

**آیت 21** ① **عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ......** : ''سُنْدُسٍ'' باریک ریشم۔ ''اِسْتَبْرَقٌ'' گاڑھا ریشم۔ ''حُلُّوْۤا'' ''حِلْيَةٌ'' سے ''فُعِلُوْا'' کے وزن پر ہے، اصل میں ''حُلِيُوْا'' تھا، زیور پہنائے جائیں گے۔ ''اَسَاوِرَ'' ''سِوَارٌ'' کی جمع ہے، کنگن۔ ''شَرَابًا'' مشروب، پینے کی چیز، ''طَهُوْرًا'' جو پاک ہو اور پاک کرنے والی ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴾ [ الفرقان : ٤٨ ] ''اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا۔''

② ''**عٰلِيَهُمْ**'' (ان کے اوپر ) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ جن نشستوں پر بیٹھے ہوں گے ان کے اوپر باریک سبز ریشم اور گاڑھے ریشم کے پردے لٹک رہے ہوں گے۔ جب پردے اتنے قیمتی ہوں گے تو ان کے لباس کا کیا کہنا۔ دوسرا یہ

# اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

## بلاشبہ یہ تمھارے لیے ہمیشہ کا بدلا ہے اور تمھاری کوشش ہمیشہ قدر کی ہوئی ہے ﴿۲۲﴾

کہ انھوں نے باریک سبز ریشم اور گاڑھے ریشم کا لباس پہن رکھا ہوگا، جیسا کہ سورۂ کہف میں فرمایا: ﴿وَ يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ﴾ [الکھف: ۳۱] ''اور وہ باریک اور گاڑھے سبز ریشم کے کپڑے پہنیں گے۔'' یہ معنی زیادہ درست ہے، کیونکہ سورۂ کہف کی آیت سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔ انس بن مالک، مجاہد اور قتادہ کی قراءت میں "عَلَيْهِمْ" ہے۔ [دیکھیے زاد المسیر لابن الجوزي] اس قراءت سے بھی دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے، اگرچہ پہلا معنی بھی غلط نہیں۔

3 سورۂ کہف میں فرمایا: ﴿يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾ [الکھف: ۳۱] ''ان میں انھیں کچھ کنگن سونے کے پہنائے جائیں گے۔'' جبکہ یہاں چاندی کے کنگن پہنائے جانے کا ذکر ہے، دونوں میں تطبیق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کئی جنتیں ہیں، جیسا کہ سورۂ رحمان میں الگ الگ دو دو جنتوں کا ذکر ہے اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( جَنَّتَانِ مِنْ فِضَّةٍ آنِيَتُهُمَا وَ مَا فِيْهِمَا، وَ جَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ آنِيَتُهُمَا وَ مَا فِيْهِمَا )) [ بخاري، التوحید، باب قول اللہ تعالٰی: ﴿وجوہ یومئذ ناظرۃ ......﴾: ۷۴۴۴ ] ''دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے چاندی کا ہے اور دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے سونے کا ہے۔'' اب جنتی کی مرضی ہے کہ سونے کے کنگن پہنے یا چاندی کے یا دونوں پہن لے اور بعض اہل علم نے فرمایا کہ شاید اہلِ جنت کے درجات کے لحاظ سے سونے کے کنگن مقربین کے لیے اور چاندی کے اصحاب الیمین کے لیے ہوں گے۔ (التسہیل) مگر یہ بات جزم سے نہیں کہی جا سکتی، اس لیے پہلی بات ہی زیادہ درست ہے۔

4 یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کنگن وغیرہ عام طور پر عورتیں پہنتی ہیں، جنت میں مردوں کو کنگن پہنانے کا کیا مقصد ہے؟ جواب یہ ہے کہ ریشمی لباس اور سونے چاندی کے کنگنوں سے مراد اہلِ جنت کی شاہانہ شان و شوکت بیان کرنا ہے۔ دنیا میں قدیم زمانے سے بادشاہ سونے چاندی کے کنگن پہنتے رہے ہیں، جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر طعن کیا تھا: ﴿فَلَوْلَاۤ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ﴾ [الزخرف: ۵۳] ''اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے؟''

5 وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا: آیت کے اس ٹکڑے میں جنتیوں کے لیے کئی بشارتیں ہیں، ایک یہ کہ انھیں ان کا رب خود شراب طہور پلائے گا۔ اس سے بڑی عزت افزائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ مشروب دنیا کے تمام سرور آور مشروبات کی ظاہری و باطنی نجاستوں سے اور ہر قسم کی خرابیوں سے پاک ہوگا، نہ اس میں نشہ ہوگا نہ دردِ سر، نہ متلی نہ قے، نہ اعضا شکنی، نہ زوالِ عقل، وہ سراسر لذت و سرور ہوگا۔ تیسری یہ کہ "طَهُوْرًا" کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے پینے سے اہلِ جنت کے دل پاک ہو جائیں گے اور ان سے حسد، بغض اور تمام کدورتیں دور ہو جائیں گی۔

**آیت 22** اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً ......: ''یہ سب کچھ تمھارے اعمال کا بدلا ہے اور تمھاری کوشش قدر کی ہوئی ہے'' یہ بات جنتیوں سے کہی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں تھوڑی سی عمر کے اعمال کے بدلے میں ابدالآباد کی یہ نعمتیں عطا فرمائے گا۔ اس سے بڑھ کر قدر دانی کیا ہو سکتی ہے؟

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِيۡلًا ۝۲۳ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا ۝۲۴ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ۝۲۵ وَمِنَ الَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ وَسَبِّحۡهُ لَيۡلًا طَوِيۡلًا ۝۲۶

**یقیناً ہم نے ہی تجھ پر یہ قرآن اتارا، تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ۝۲۳ پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور ان میں سے کسی گناہ گار یا بہت ناشکرے کا کہنا مت مان ۝۲۴ اور اپنے رب کا نام صبح اور پچھلے پہر یاد کیا کر ۝۲۵ اور رات کے کچھ حصہ میں پھر اس کے لیے سجدہ کر اور لمبی رات تک اس کی تسبیح کیا کر ۝۲۶**

آیت 23 اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِيۡلًا : سورت کے شروع سے یہاں تک کفار و ابرار کے انجام کا ذکر فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو کفار کے اعتراضات کے جواب میں تسلی دی جا رہی ہے اور صبر و استقامت اور ذکر و تسبیح اور سجود کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کفار رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کے لیے کہا کرتے تھے کہ آپ قرآن مجید اپنے پاس ہی سے بنا کر سناتے رہتے ہیں، ورنہ یہ اکٹھا ہی کیوں نازل نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس کا جواب مذکور ہے (مثلاً دیکھیے فرقان : ۳۲) مگر یہاں نہایت زور دار لہجے میں فرمایا کہ یقیناً ہم ہی نے یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے آپ پر نازل کیا ہے، یعنی ہمارے علاوہ کوئی ایسا کلام بنا ہی نہیں سکتا، ورنہ تم سب مل کر ایک سورت ہی بنا کر دکھا دو اور ہم ہی جانتے ہیں کہ حکمت کا تقاضا اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ہے، اس لیے آپ ان کے اعتراضات کی پروا نہ کریں۔

آیت 24 فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ ...... : یعنی وہ وقت آ رہا ہے جب آپ کا رب حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے گا، آپ اس وقت کا انتظار کرتے ہوئے صبر کریں۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ آپ جہاد کے لیے اپنے رب کا حکم آنے تک صبر کریں، یعنی خود بھی اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے رہیں، لوگوں کو بھی اسلام کی دعوت دیتے رہیں اور اس راہ میں آنے والی ہر آزمائش پر بھی صبر کریں اور اس سے روکنے والے کسی شخص کے کہنے پر، خواہ وہ کوئی گناہ گار یعنی بدعمل ہو یا ناشکرا یعنی بدعقیدہ ہو، نہ اپنا عمل چھوڑیں، نہ عقیدہ اور نہ اس کی دعوت۔

آیت 25، 26 وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ۝ وَمِنَ الَّيۡلِ ...... : دعوت کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرنے کے لیے قرآن مجید اللہ کے ذکر، نماز اور تسبیح کا حکم دیتا ہے، کیونکہ انھی چیزوں سے انسان ثابت قدم اور حوصلہ مند رہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ [ البقرۃ : ٤٥ ] ''اور نماز اور صبر کے ساتھ مدد طلب کرو۔'' اور سورۂ مزمل میں کلامِ الٰہی کی بھاری ذمہ داری اٹھانے کی استعداد کے لیے تہجد اور ذکر کا حکم دیا۔ یہاں بھی قرآن کی دعوت و تبلیغ کے راستے میں صبر کی تلقین کے ساتھ حکم دیا کہ صبح اور پچھلے پہر اپنے رب کا نام یاد کر اور رات کے کچھ حصے میں بھی اس کے لیے سجدہ کر۔ ذکر کی اعلیٰ ترین صورت نماز ہے۔ اوقات کی تعیین کے ساتھ ذکر کے حکم سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا بھی حکم

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝۲۷ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ۝۲۸ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۲۹

یقیناً یہ لوگ جلد ملنے والی چیز سے محبت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے ہیں ۝۲۷ ہم نے ہی انھیں پیدا کیا اور ہم نے ان (کے اعضا) کا بندھن مضبوط باندھا اور ہم جب چاہیں گے بدل کر ان جیسے اور لوگ لے آئیں گے، بدل کر لانا ۝۲۸ یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کر لے ۝۲۹

دیا جا رہا ہے، چنانچہ ”بُكْرَةً“ میں صبح کی نماز اور ”اَصِيْلًا“ میں ظہر و عصر کی نمازیں اور ”مِنَ الَّيْلِ“ (رات کے کچھ حصے) میں مغرب و عشاء کی نمازیں آ جاتی ہیں اور ”سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا“ سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ یہ پانچوں نمازیں اگرچہ ان رکعات و متعین اوقات کے ساتھ معراج کی رات فرض ہوئیں، مگر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ذکر و صلوٰۃ کے اوقات یہی تھے۔

آیت 27 ﴿ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ...... : اس آیت میں کفار و فجار کے کفر و فسوق کا اصل سبب بیان فرمایا کہ ان کے نصیحت قبول نہ کرنے کا سبب حبِ دنیا ہے۔ دنیا چونکہ جلد ہاتھ آنے والی چیز ہے، اس لیے یہ اسی کو چاہتے ہیں اور قیامت کے بھاری دن سے غافل ہیں، بلکہ اس کے آنے کا یقین ہی نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ جب مرنے کے بعد گل سڑ گئے تو کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ آگے اس کا جواب ہے۔

آیت 28 ﴿ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ...... : ”اَسْرَهُمْ“ ”أَسْرٌ“ کا معنی باندھنا ہے، اسیر بھی اسی سے نکلا ہے، یعنی ہم نے ان کے اعضا کا بندھن مضبوطی سے باندھا ہے، ہڈیوں اور پٹھوں کے جوڑ نہایت مضبوط بنائے ہیں، یعنی یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو عقل کے خلاف سمجھتے ہیں، لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ ہم نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، ان کے نرم و نازک رگ و ریشے، گوشت پوست، جوڑوں اور ہڈیوں کو مضبوطی سے باندھ دیا تو ہم دوبارہ انھیں کیوں زندہ نہیں کر سکتے؟ ہم تو جب چاہیں انھیں ختم کر کے ان کی جگہ ان جیسے اور لوگ لا سکتے ہیں، تو ان کا بنانا ہمیں کیا مشکل ہے؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴾ [ النساء : ۱۳۳ ] ”اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور دوسرے لوگوں کو لے آئے اور اللہ اس پر خوب قدرت رکھنے والا ہے۔“ مزید دیکھیے سورۂ ابراہیم (۱۹، ۲۰)۔

آیت 29 ﴿ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ...... : یعنی یہ سورت یا موعظت نصیحت ہے، اس سے صحیح راستہ واضح ہو گیا، کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا، اب جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔

وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۳۰﴾ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۳۱﴾ ع۹

اورتم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۳۰﴾ وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ظالم لوگ، اس نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے ﴿۳۱﴾

**آیت 30** وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ...... : مگر تمھارا چاہنا اللہ کے چاہنے کے تابع ہے، وہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے تقدیر کے منکروں کو اسی آیت سے لاجواب کیا تھا۔ خوارج کا ایک گروہ ان کے پاس آیا اور تقدیر کے انکار کی دلیل کے طور پر اسی سورت کی ابتدا میں سے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴾ [ الدھر : ۳ ] ''یعنی ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا ہے، اب چاہے تو شکر کرنے والا بن جائے اور چاہے تو کفر کرنے والا۔'' عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے فرمایا، آگے پڑھتے جاؤ، آخر میں یہ آیت آئی تو فرمایا، بے شک انسان جو راستہ چاہے اختیار کرے، مگر یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زبردست ہو کر کوئی شخص نہ نیک بن سکتا ہے نہ بد۔ "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا" یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت اندھی مشیت نہیں ہے، بلکہ وہ علیم و حکیم ہے اور اس کی مشیت اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ انھی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے علم و حکمت کے مطابق اس کے اہل ہیں۔

**آیت 31** ❶ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ: ''وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے'' یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو ہدایت کیوں نہیں دی؟ فرمایا ہدایت و رحمت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، مالک اپنی چیز جسے چاہے دے جسے چاہے نہ دے، کوئی اسے پوچھ نہیں سکتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [ الأنبیاء : ۲۳ ] ''اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔''

❷ وَ الظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا: یعنی اس نے ظالموں کے لیے عذابِ الیم تیار کر رکھا ہے۔ یہاں "الظّٰلِمِیْنَ" سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ سب سے بڑے ظالم وہی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔'' معلوم ہوا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے محروم انھی کو رکھتا ہے جو ظالم ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۙ۝۲۶ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [ البقرة : ۲۶، ۲۷ ] ''وہ اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو۔ وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو، اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی اپنی رحمت میں داخل فرمائے اور عذابِ الیم سے محفوظ رکھے۔ (آمین)
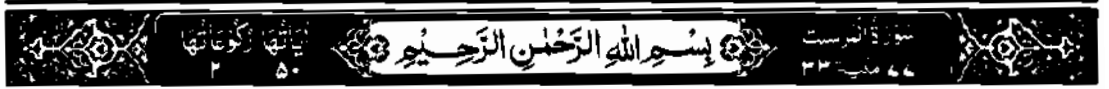
سورۃ المرسلٰت ۷۷ مکیۃ ۳۳ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — اٰیاتھا ۵۰ رکوعاتھا ۲

وَ الْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝۱ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝۲ وَّ النّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝۵ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝۶ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو جانے پہچانے معمول کے مطابق چھوڑی جاتی ہیں! ① پھر جو تند ہو کر تیز چلنے والی ہیں! ② اور جو (بادلوں کو اٹھا کر) پھیلا دینے والی ہیں! خوب پھیلانا ③ پھر جو (انھیں) پھاڑ کر جدا جدا کر دینے والی ہیں! ④ پھر جو (دلوں میں) یاد (الٰہی) ڈالنے والی ہیں! ⑤ عذر کے لیے یا ڈرانے کے لیے ⑥ بے شک تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جاتا ہے یقیناً ہو کر رہنے والی ہے ⑦

اس سورت کی ابتدا میں چند قسموں کے بعد فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴾ ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے یقیناً وہ ہو کر رہنے والی ہے۔'' یعنی یہ قسمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے ذکر کی گئی ہیں کہ قیامت برحق ہے۔ ان آیات میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان کا ذکر نام لے کر نہیں کیا گیا بلکہ صرف ان کی صفات بیان کی گئی ہیں، وہ صفات کئی چیزوں میں پائی جاتی ہیں، اس لیے مفسرین نے مختلف چیزیں ان کا مصداق قرار دی ہیں۔ اکثر مفسرین نے ان کا مصداق ہواؤں کو قرار دیا ہے، بعض نے ان کا مصداق فرشتے قرار دیے ہیں اور بعض نے پہلی چار صفات ہواؤں کی اور آخری صفت ''فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا'' فرشتوں کی بیان کی ہے، مگر کلام کے تسلسل کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ تمام صفات ایک ہی چیز کی ہونی چاہییں اور زیادہ واضح یہی ہے کہ ان سے مراد ہوائیں ہیں، کیونکہ ان آیات میں جو صفات مذکور ہوئی ہیں قرآن مجید کے مختلف مقامات پر یہ صفات ہواؤں ہی کی بیان ہوئی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ [ الروم : ٤٨ ] ''اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل کو اٹھاتی ہیں، پھر وہ اسے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور اسے کئی ٹکڑے بنا دیتا ہے تو تم بارش کے قطرے اس کے درمیان سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾ [ الأنبياء : ٨١ ] ''اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز و تند ہوا تابع کر دی اور وہ اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی۔'' علاوہ ازیں قیامت کے ثبوت کے لیے فرشتوں کے اوصاف پیش کرنے کے بجائے جو نظر ہی نہیں آتے، ایسی چیز پیش کرنا زیادہ مناسب ہے جو ہر شخص کو نظر آتی ہے۔

**آیت 1 تا 7** ﴿ وَ الْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ...... : ''الْمُرْسَلٰتِ'' یہ ''الرِّيَاحُ'' کی صفت ہے جو محذوف ہے، وہ ہوائیں جو چھوڑی گئی ہیں، بھیجی گئی ہیں۔ ''عُرْفًا'' یہ ''نُكْرٌ'' کی ضد ہے، جانی پہچانی چیز، بھلائی۔ گھوڑے کی گردن کے بالوں اور مرغ کی کلغی کو بھی

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۟ۙ وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۟ۙ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۟ۙ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۟ؕ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۟ؕ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۟ۚ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۟ؕ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۟

پس جب ستارے مٹا دیے جائیں گے ⑧ اور جب آسمان کھولا جائے گا ⑨ اور جب پہاڑ اڑا دیے جائیں گے ⑩ اور جب (وہ وقت آجائے گا) جو رسولوں کے ساتھ مقرر کیا گیا ⑪ (یہ سب چیزیں) کس دن کے لیے مؤخر کی گئی ہیں؟ ⑫ فیصلے کے دن کے لیے ⑬ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ ⑭ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ⑮

"عُرُف" کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایک سطر میں یکے بعد دیگرے ہوتی ہیں، اس لیے ان کی مشابہت سے پے در پے آنے والی چیزوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً: "جَاءُوْا عُرُفًا وَاحِدًا" "وہ سب پے در پے آگئے۔" "عُرْفًا" کا معنی اگر جانی پہچانی چیز کریں تو اس سے پہلے "باء" مقدر ہوگی: "أَيْ وَالْمُرْسَلَاتِ بِالْعُرْفِ" "یعنی ان ہواؤں کی قسم جو جانے پہچانے معمول کے مطابق چھوڑی جاتی ہیں!" اگر اس کا معنی بھلائی کریں تو اس سے پہلے "لام" مقدر ہوگا اور یہ مفعول لہٗ ہوگا: "أَيْ وَالْمُرْسَلَاتِ لِلْعُرْفِ" "یعنی ان ہواؤں کی قسم جنھیں (لوگوں کی) بھلائی کے لیے چھوڑا جاتا ہے!" اور اگر معنی پے در پے کریں تو "عُرْفًا" حال ہوگا، یعنی "ان ہواؤں کی قسم جو پے در پے چھوڑی جاتی ہیں!" تینوں معنی درست ہیں۔

قرآن مجید میں مذکور قسمیں عام طور پر اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہیں جو بعد میں مذکور ہوتا ہے۔ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ ان پانچ صفات والی ہواؤں میں زبردست شہادت ہے کہ قیامت جس کا وعدہ دیا جاتا ہے، ضرور آنے والی ہے۔ آپ دیکھیں! ہوائیں کبھی نرم رفتار سے چلتی ہیں، پھر کبھی تند و تیز ہو کر آندھیاں بن جاتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر لاتی اور پھیلا دیتی ہیں، پھر ان کے قطعے جدا جدا کر کے بارش برسانا شروع کر دیتی ہیں اور کہیں ایک قطرہ برسائے بغیر ہی آگے گزر جاتی ہیں۔ ہواؤں کے یہ مختلف اطوار کہ کبھی آہستہ چلنا، کبھی تند و تیز آندھی بن جانا، پھر بادلوں کو اٹھانا، انھیں پھیلا کر برسانا اور منتشر کر دینا، کہیں خوف ناک طوفان کی صورت میں عذاب بن کر آنا وغیرہ، یہ سب کچھ دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے۔ اسی طرح یہ ہوائیں دلوں میں اللہ کے ذکر کا القا کرتی ہیں اور اللہ کی طرف توجہ مبذول کرواتی ہیں، کبھی ترغیب کے ساتھ اور کبھی ترہیب کے ساتھ۔ ہوائیں اگر خوشگوار اور نفع بخش ہیں تو اللہ کی نعمت ہیں اور ان کا اثر بندے پر یہ پڑنا چاہیے کہ وہ شکر ادا کرے اور اپنے عمل کی کوتاہی کا عذر پیش کرے اور اگر اس کے برعکس خوف ناک طوفان اور بجلیوں کی صورت میں ہیں تو ان کا اثر بندے پر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ڈر کر گناہوں سے توبہ کی طرف متوجہ ہو۔ ان مختلف اطوار والی ہواؤں کو پیدا کرنے والے اور ان کا بندوبست کرنے والے پروردگار کے لیے قیامت برپا کرنا اور تمام فوت شدہ لوگوں کو زندہ کر کے ان سے باز پرس کرنا کون سا مشکل کام ہے؟

**آیت 8 تا 15** فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ...... : "اُقِّتَتْ" اصل میں "وُقِّتَتْ" تھا۔ "اَلتَّوْقِيْتُ" وقت مقرر کرنا۔ یہاں سے

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٧﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٨﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٩﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿٢١﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٢٢﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٤﴾

کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ ﴿١٦﴾ پھر ہم ان کے پیچھے دوسروں کو بھیجتے رہتے ہیں ﴿١٧﴾ ہم مجرموں کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں ﴿١٨﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿١٩﴾ کیا ہم نے تمھیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ ﴿٢٠﴾ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھکانے میں رکھا ﴿٢١﴾ ایک معلوم اندازے تک ﴿٢٢﴾ پس ہم نے اندازہ کیا تو ہم اچھے اندازہ کرنے والے ہیں ﴿٢٣﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿٢٤﴾

اس دن کی کچھ نشانیاں بیان فرمائیں کہ اس دن تاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔ (دیکھیے تکویر: ۲۔ انفطار: ۲) آسمان کھول دیا جائے گا اور اس میں دروازے ہی دروازے نمودار ہو جائیں گے۔ (دیکھیے انشقاق: ۱۔ انفطار: ۱۔ نبا: ۱۸، ۱۹۔ فرقان: ۲۵) اور پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا۔ (دیکھیے طٰہٰ: ۱۰۵۔ واقعہ: ۱ تا ۶۔ حاقہ: ۱۳ تا ۱۵۔ مزمل: ۱۴۔ قارعہ: ۵) اور وہ وقت آ جائے گا جو رسولوں کے ساتھ مقرر کیا گیا تھا کہ ایک دن انھیں جمع کیا جائے گا اور وہ اپنی اپنی امت کو دین حق پہنچانے کی شہادت دیں گے۔ (دیکھیے نساء: ۴۱۔ مائدہ: ۱۰۹) یہ سب چیزیں کس دن کے لیے مؤخر کی گئی ہیں؟ فیصلے کے دن کے لیے۔ پھر اس دن کی عظمت و ہیبت بیان کرنے کے لیے فرمایا: ”اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟“ مطلب یہ ہے کہ کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ وہ دن کتنا عظیم ہے کہ آپ کو بتا سکے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ خود کچھ بتا دے تو الگ بات ہے۔ مختصر یہ کہ وہ دن اتنا خوف ناک ہے کہ جھٹلانے والوں کے لیے اس دن ”وَيْلٌ“ یعنی خرابی اور بربادی ہے۔ اس سورت میں ”وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ“ دس مرتبہ آیا ہے، تکرار سے مقصود اس دن سے زیادہ سے زیادہ ڈرانا ہے۔

**آیت 16 تا 19** اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ...... : رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے پہلے کے کفار کو ”الْاَوَّلِيْنَ“ فرمایا، جن میں نوح علیہ السلام کے زمانے کے کفار سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے تمام کفار شامل ہیں اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد تمام زمانوں کے کفار کو ”الْاٰخِرِيْنَ“ فرمایا۔ پہلے لوگوں کی بربادی کا سبب بھی یہ تھا کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس دنیا کی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ آخر کار تباہ و برباد ہو گئے۔ اب بھی یہی قانون ہے کہ جو قوم آخرت کا انکار کرے گی تباہ و برباد ہوگی۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں پر جو ہلاکت آئے گی وہ اس دنیاوی بربادی کے علاوہ ہے اور ان کی اصل بربادی کا دن وہی ہوگا۔

**آیت 20 تا 24** ① اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ...... : اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حقیر پانی یعنی منی کے قطرے سے پیدا فرمایا، پھر اسے ایک محفوظ ٹھکانے یعنی ماں کے رحم میں رکھا، جو تین اطراف سے ہڈیوں سے گھرا ہوا ہے۔ حمل قرار پاتے ہی بچے کو اتنی مضبوطی سے رحم میں جمایا جاتا ہے اور اس کی حفاظت کا اتنا انتظام ہوتا ہے کہ شدید حادثے کے بغیر اس کا اسقاط نہیں ہو سکتا۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ

کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ ﴿۲۵﴾ زندوں کو اور مردوں کو ﴿۲۶﴾ اور ہم نے اس میں بلند پہاڑ بنائے اور ہم نے تمھیں نہایت میٹھا پانی پلانے کے لیے دیا ﴿۲۷﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۲۸﴾ اس چیز کی طرف چلو جسے تم جھٹلاتے تھے ﴿۲۹﴾ ایک سائے کی طرف چلو جو تین شاخوں والا ہے ﴿۳۰﴾ نہ سایہ کرنے والا ہے

② اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ : ”اس اندازے تک جو معلوم ہے“ یعنی نو ماہ یا اس سے کم یا زیادہ، جس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ وہ اتنے مہینوں، دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں پیدا ہوگا، کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں۔

③ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ : یعنی ہم نے ایک ایسی مدت مقرر کی جس میں بچے کی ساخت مکمل ہو جاتی ہے، نہ کوئی چیز ضرورت سے زائد بنتی ہے اور نہ کوئی ضروری چیز رہ جاتی ہے۔ جب تک اس کے لیے رحم کے اندر رہنا ضروری ہوتا ہے وہ اس میں رہتا ہے اور جب باہر آنا ضروری ہوتا ہے تو وہ باہر آ جاتا ہے۔ یہ مدت ہم نے مقرر کی ہے اور ہم کتنا ٹھیک اندازہ کرنے والے ہیں۔ ”فَقَدَرْنَا“ کا دوسرا ترجمہ ”ہم قادر ہوئے“ بھی ہو سکتا ہے، یعنی ہم نے پانی کی ایک بوند کو بتدریج ترقی دیتے دیتے کامل و عاقل انسان بنا دیا، اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ ہم کیا خوب قدرت رکھنے والے ہیں۔ (اشرف الحواشی)

④ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ : ایک حقیر قطرے سے اپنی تخلیق کو دیکھنے کے بعد جو لوگ آخرت کے دن کو ناممکن قرار دے کر جھٹلاتے ہیں ان کے لیے اس دن بڑی ہلاکت اور بربادی ہے۔

**آیت 25 تا 28** ① اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ...... : ”كِفَاتًا“ ”كَفَتَ يَكْفِتُ“ (ض) (سمیٹنا، جمع کرنا) سے مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی سمیٹنے والی۔ ”رَوَاسِيَ“ ”رَاسِيَةٌ“ کی جمع ہے اور ”رَسَا يَرْسُوْ“ (ن) زمین میں گڑا ہوا ہونا، مراد پہاڑ ہیں۔ ”شٰمِخٰتٍ“ بلند۔ ”فُرَاتًا“ بہت ہی میٹھا۔ زمین زندوں کو سمیٹتی ہے، وہ اسی پر زندگی گزارتے ہیں، وہ ان کی غلاظتیں سنبھالتی ہے اور مردوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، اگر زمین مرنے والے انسانوں اور دوسرے جانداروں کو نہ سمیٹتی تو تعفن سے زندگی دشوار ہو جاتی۔ اس آیت سے مردوں کو سنبھالنے کے لیے دفن کی دلیل ملتی ہے، جو قومیں اپنے مردوں کو جلاتی ہیں ان کی راکھ اور ہڈیاں بھی زمین ہی کے سپرد ہوتی ہیں۔

② وَ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ ...... : زمین بجائے خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک بہت بڑا نشان ہے، پھر اس پر بلند و بالا پہاڑ اور انسان کے پینے کے لیے نہایت میٹھا پانی اللہ کی قدرت کے اتنے بڑے عجائب ہیں کہ ان کو دیکھ کر بھی جو لوگ آخرت کو جھٹلاتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق کو دوبارہ بنانا ممکن نہیں، ان لوگوں کے لیے قیامت کے دن بہت بڑی خرابی اور ہلاکت ہے۔

**آیت 29 تا 34** اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ...... : ”شُعَبٍ“ ”شُعْبَةٌ“ کی جمع ہے، شاخیں۔ ”جِمٰلَتٌ“

اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾

ع ۲۱

اور نہ وہ شعلے سے کسی کام آتا ہے ﴿۳۱﴾ بلاشبہ وہ (آگ) محل جیسے شرارے پھینکے گی ﴿۳۲﴾ جیسے وہ زرد اونٹ ہوں ﴿۳۳﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۴﴾ یہ دن ہے کہ وہ نہیں بولیں گے ﴿۳۵﴾ اور نہ انھیں اجازت دی جائے گی کہ وہ عذر کریں ﴿۳۶﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۷﴾ یہ فیصلے کا دن ہے، ہم نے تمھیں اور پہلوں کو اکٹھا کر دیا ہے ﴿۳۸﴾ تو اگر تمھارے پاس کوئی خفیہ تدبیر ہے تو میرے ساتھ کر لو ﴿۳۹﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۴۰﴾

"حمال" کی جمع ہے، جیسے "حجارۃ" "حجر" کی جمع ہے۔ یہ بات قیامت کے دن جھٹلانے والوں سے کہی جائے گی، اس دن جب متقی لوگوں کو عرش الٰہی کا اور جنت کے گھنے درختوں کا سایہ ملے گا، تو جھٹلانے والوں کو ایسے سائے کی طرف جانے کا حکم ہوگا جو جہنم سے نکلنے والے دھویں کا ہوگا، جو پھیل کر تین تین شاخوں میں تقسیم ہو جائے گا، جس میں نہ سایہ ہوگا نہ ٹھنڈک۔ جہنم سے اتنی بڑی بڑی چنگاریاں اڑیں گی جیسے محل ہوں اور اس طرح دکھائی دیں گی جیسے زرد رنگ کے اونٹوں کی جماعت۔ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بہت بڑی بربادی ہے۔

**آیت 35 تا 37** هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ...... : یہاں فرمایا کہ جھٹلانے والے لوگ قیامت کے دن نہ بولیں گے نہ انھیں عذر کرنے کی اجازت ہوگی، جبکہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر مذکور ہے کہ وہ اپنے عذر پیش کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ایک طویل دن ہے، وقوعِ قیامت کے وقت وہ ہیبت سے بول نہیں سکیں گے، پھر اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹے عذر بہانے پیش کرنے لگیں گے، اپنے مجرم ہونے ہی سے انکار کر دیں گے اور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے کبھی شرک نہیں کیا، بلکہ مطالبہ کریں گے کہ ہمارے خلاف کوئی ثبوت ہو تو پیش کیا جائے۔ جب ان کے اعمال نامے پیش ہوں گے، ان کو حق پہنچانے والوں کی شہادتیں پیش ہوں گی اور ان کی زبانوں پر مہر لگا کر انھی کے اعضا کی گواہی پیش کر دی جائے گی تو پھر ان کا بولنا بند ہو جائے گا اور اب اجازت نہیں ہوگی کہ خواہ مخواہ عذر گھڑتے جائیں۔

**آیت 38 تا 40** هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ...... : مجرموں کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے کہا جائے گا کہ آج فیصلے کا دن ہے، جس میں ہم نے تمھیں اور تم سے پہلے سب جھٹلانے والوں کو جمع کر دیا ہے۔ دنیا میں تم زبردست چالیں چلتے اور سازشیں کرتے تھے، اب سب مل کر اپنے بچاؤ کی کوئی خفیہ تدبیر کر سکتے ہو تو کر لو۔ جسمانی عذاب کے ساتھ یہ ذہنی عذاب ہوگا۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

یقیناً پرہیز گار لوگ اس دن سایوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۴۱﴾ اور پھلوں میں، جس قسم میں سے وہ چاہیں گے ﴿۴۲﴾ مزے سے کھاؤ اور پیو، اس کے عوض جو تم کیا کرتے تھے ﴿۴۳﴾ یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلا دیتے ہیں ﴿۴۴﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۴۵﴾ (اے جھٹلانے والو!) کھالو اور تھوڑا سا فائدہ اٹھا لو، یقیناً تم مجرم ہو ﴿۴۶﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۴۷﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھک جاؤ تو وہ نہیں جھکتے ﴿۴۸﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۴۹﴾ پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ ﴿۵۰﴾

**آیت 41 تا 45** اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ...... : اب جھٹلانے والوں کے مقابلے میں متقین کو ملنے والی نعمتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ دھوئیں کے سائے کے بجائے گھنے درختوں اور جنت کے مکانوں کے ٹھنڈے سایوں، چشموں اور اپنی پسند کے پھلوں میں عیش کر رہے ہوں گے۔ انھیں کہا جائے گا کہ مزے سے کھاؤ پیو، اس عمل کے بدلے میں جو تم کیا کرتے تھے۔ "وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ" جھٹلانے والوں کے لیے اس دن بڑی ہلاکت ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ لوگ عیش و آرام میں ہوں گے جنھیں وہ تمام عمر مذاق کرتے رہے اور یہ خود ان کے سامنے آگ میں جل رہے ہوں۔ "هَنِيْٓـًٔا" جو کسی مشقت کے بغیر حاصل ہو جائے اور اسے کھانے کے بعد کسی قسم کی گرانی یا بدہضمی نہ ہو۔ (راغب) دنیا کے پھل مشقت سے ملتے ہیں اور کبھی موافق ہوتے ہیں، کبھی ناموافق، جبکہ جنت کے پھل سب موافق ہوں گے۔

**آیت 46، 47** كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا...... : سورت کے آخر میں قیامت کو جھٹلانے والوں کو پھر خطاب ہے کہ دنیا میں کھالو اور فائدہ اٹھالو، یہ سامان بالکل قلیل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ﴾ [النساء: ۷۷] ''کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے۔'' یقیناً تم مجرم ہو، قیامت کے دن تمھارے جیسے جھٹلانے والوں کے لیے بہت بڑی خرابی اور بربادی ہے۔

**آیت 48، 49** وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا...... : رکوع کا معنی جھکنا یعنی اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے اور رکوع بول کر نماز بھی مراد لی جاتی ہے، کیونکہ رکوع اس کا ایک حصہ ہے، یعنی ان مکذبین کے جھٹلانے کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی وہ نماز پڑھنے پر آمادہ ہیں، یہی کبر ان کے انکار کا باعث بن گیا ہے، جس طرح شیطان کے لیے بنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا اصل اللہ کے سامنے جھک جانا ہے اور کفر کا اصل اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار ہے اور ایسے لوگوں کے لیے قیامت کے دن بہت بڑی خرابی اور بربادی ہے۔

**آیت 50** فَبِاَيِّ...... : یعنی قرآن جو اللہ کا اپنا کلام ہے اور جس کا انداز انتہائی مؤثر اور دل نشیں ہے، جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا جواب کوئی پیش کر سکا ہے نہ کر سکے گا، اس پر یہ کفار ایمان نہیں لاتے تو پھر وہ کون سی بات پر ایمان لائیں گے؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ① عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ② الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ③ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ④ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ⑤ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ⑥

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کس چیز کے بارے میں وہ آپس میں سوال کر رہے ہیں؟ ① (کیا) اس بڑی خبر کے بارے میں؟ ② وہ کہ جس میں وہ اختلاف کرنے والے ہیں ③ ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے ④ پھر ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے ⑤ کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا ⑥

آیت 1 تا 3 ❶ عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ …… : اس سورت میں قیامت کے حق ہونے کے دلائل اور اس کے کچھ احوال بیان کیے گئے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے توحید و رسالت پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ یہ بتایا کہ ایک دن تمھیں زندہ ہو کر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور تمھیں تمام نیک و بد اعمال کی جزا ملنی ہے تو سننے والوں نے آپس میں سوال شروع کر دیے کہ کیا واقعی قیامت ہوگی؟ آیا یہ ممکن بھی ہے؟ پھر وہ قیامت کس طرح ہوگی؟ وغیرہ، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

❷ "النَّبَاِ الْعَظِيْمِ" سے مراد قیامت ہے۔ اس میں اختلاف یہ ہے کہ کوئی تو مانتا ہی نہیں کہ قیامت ہوگی، کوئی مانتا ہے مگر اسے یقین نہیں، کوئی کہتا ہے مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتے ہیں؟ یہ تو عقل ہی کے خلاف ہے اور کوئی کہتا ہے کہ جسم زندہ نہیں ہوں گے بلکہ سب خوشی اور غم روح ہی پر گزرے گا، وغیرہ وغیرہ۔

آیت 4، 5 ❶ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ …… : "كَلَّا" کا لفظ عربی میں عموماً اپنے سے پہلے والے کلام کو غلط اور بعد والے کلام کو صحیح قرار دینے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ کہ قیامت کے متعلق اختلاف ڈالنا، انکار کرنا یا شک کرنا بالکل غلط ہے اور اس کا آنا بالکل یقینی ہے۔

❷ سَيَعْلَمُوْنَ: "عنقریب وہ جان لیں گے" یعنی اگر ان کی عقل قیامت کو نہیں مانتی اور اس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں تو مرنے سے تو نہ یہ انکار کر سکتے ہیں، نہ شک کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں کسی کا اختلاف ہے، تو بس مرنے کی دیر ہے، اس کے ساتھ ہی قیامت اور دوسری تمام حقیقتیں جنھیں یہ لوگ خلاف عقل قرار دے رہے ہیں، سب ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی۔ تاکید کے لیے دوبارہ "ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ" فرمایا ہے۔

آیت 6 ❶ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا : اللہ تعالیٰ نے قیامت کا یقین دلانے کے لیے اور ان کی عقلوں کو جھنجھوڑنے کے لیے اپنی قدرت کے چند عجائب پیش فرمائے ہیں کہ عقل سے پوچھو کہ اتنے بڑے بڑے کام کرنے والے کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ اور وہ عجائب بھی خود تمھارے گرد و پیش اور تمھاری ذات میں موجود ہیں۔

وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷ وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۸ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳

اور پہاڑوں کو میخیں ۝۷ اور ہم نے تمھیں جوڑا جوڑا پیدا کیا ۝۸ اور ہم نے تمھاری نیند کو ( باعث ) آرام بنایا ۝۹ اور ہم نے رات کو لباس بنایا ۝۱۰ اور ہم نے دن کو روزی کمانے کے لیے بنایا ۝۱۱ اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط ( آسمان ) بنائے ۝۱۲ اور ہم نے ایک بہت روشن گرم چراغ بنایا ۝۱۳

---

❷ فرمایا جہاں رہتے ہو اسی کو دیکھ لو، کیا عقل میں آ سکتا ہے کہ اتنی بڑی زمین کو ہم نے کس طرح پیدا کیا اور کس طرح بچھونے کی طرح بچھا دیا ہے؟

**آیت 7** وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا : اور زمین کا توازن قائم رکھنے اور اسے مسلسل زلزلے کی کیفیت سے بچانے کے لیے اس میں پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ "اَوْتَادًا" "وَتَدٌ" کی جمع ہے، میخیں۔

**آیت 8** وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا : خود اپنے آپ کو دیکھ لو، ہم نے تمھیں نر اور مادہ پیدا کیا، مختلف رنگوں، بے شمار شکلوں اور صورتوں میں پیدا کیا۔ پہلی دفعہ پیدا کرنے پر تمھاری عقل کو تعجب نہیں ہوا تو دوبارہ پیدا کرنے پر کیوں ہوتا ہے؟ "اَزْوَاجًا" "زَوْجٌ" کی جمع ہے۔

**آیت 9 تا 11** وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا...... : "سُبَاتًا" اور "سَبْتٌ" باب "نَصَرَ" اور "ضَرَبَ" سے مصدر ہیں، راحت، سکون، قطع کرنا۔ اپنی نیند کو دیکھ لو جو موت کی طرح تمھاری تمام حرکات قطع کر کے تمھیں مکمل سکون کی وادی میں لے جاتی ہے۔ ہر روز مرنے اور جی اٹھنے کا یہ منظر دیکھ کر بھی تمھیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے؟ علاوہ ازیں تمھارے جسم کی ٹوٹ پھوٹ اور تھکن دور کرنے کے لیے نیند کو راحت و سکون کا ذریعہ بنا دیا۔ روشنی راحت میں خلل انداز ہو سکتی تھی، اس لیے ہم نے رات کو تاریک بنا دیا جو لباس کی طرح ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ پھر ہماری مہربانی دیکھو کہ مسلسل رات نہیں رکھی، بلکہ روزی کی تلاش کے لیے دن بنا دیا۔ اگر رات ہی رہتی تو تم روزی کس طرح تلاش کرتے؟

**آیت 12** وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا...... : آدمی کے نیچے اور گرد و پیش کے عجائب کے بعد اوپر کے عجائب کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے جن میں نہ شگاف ہے نہ کوئی کمزوری، نہ گرتے ہیں نہ وہاں کسی شیطان کا دخل ہے۔ "شِدَادًا" "شَدِيْدَةٌ" کی جمع ہے، محکم، مضبوط۔

**آیت 12** وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا : "وَهَّاجًا" "وَهَجٌ" سے مبالغہ ہے جس میں حرارت اور روشنی دونوں جمع ہوتی ہیں، بہت روشن اور گرم چراغ۔ مراد سورج ہے۔ ایسا دہکتا ہوا چراغ کہ کروڑوں میل دور ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص اسے تھوڑی دیر

وَّ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّ جَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ﴿۱۶﴾ اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِیۡقَاتًا ﴿۱۷﴾ یَّوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ اَبۡوَابًا ﴿۱۹﴾ وَّ سُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا ﴿۲۰﴾

اور ہم نے بدلیوں سے کثرت سے برسنے والا پانی اتارا ﴿۱۴﴾ تاکہ ہم اس کے ساتھ غلہ اور پودے اگائیں ﴿۱۵﴾ اور گھنے باغات ﴿۱۶﴾ یقیناً فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے ﴿۱۷﴾ جس دن صور میں پھونکا جائے گا، تو تم فوج در فوج چلے آؤ گے ﴿۱۸﴾ اور آسمان کھولا جائے گا تو وہ دروازے دروازے ہو جائے گا ﴿۱۹﴾ اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن جائیں گے ﴿۲۰﴾

مسلسل دیکھنے کی حماقت کر بیٹھے تو نظر ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

**آیت 16،14** وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ...... : "الۡمُعۡصِرٰتِ" وہ بادل جو پانی سے بھرے ہوئے ہوں۔ "ثَجٌّ" شدت اور کثرت سے بہنا یا بہانا۔ یہ لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے۔ "ثَجَّاجًا" کثرت سے برسنے والا۔ "اَلۡفَافًا" ابوعبیدہ نے فرمایا: "یہ "لَفِیۡفٌ" کی جمع ہے، جیسا کہ "شَرِیۡفٌ" کی جمع "اَشۡرَافٌ" ہے۔" (المراغی) اس کا معنی ہے گھنے، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے، جن میں کوئی فاصلہ نہیں۔

**آیت 17** اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِیۡقَاتًا : یعنی ہم نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنانے سے لے کر آخر آیات تک مذکور جو کچھ بنایا ہے، اگر دنیا کی پیدائش سے لے کر اس کے ختم ہونے تک اس میں جو نیکی یا بدی کی گئی ہے اس کی جزا و سزا کسی وقت بھی نہ ہو، نہ ظالم سے باز پرس ہو اور نہ مظلوم کی داد رسی ہو تو یہ سب کچھ تو بے نتیجہ رہا۔ اس لیے یقین رکھو کہ دنیا میں کیے گئے تمام اعمال کے فیصلے کے لیے ایک دن مقرر ہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: ﴿ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَ لِتُجۡزٰی كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴾ [ الجاثیۃ : ۲۲ ] "اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تاکہ ہر جان کو اس کی کمائی کا بدلا دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

**آیت 18** یَّوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا : یہاں صور میں دوسری دفعہ پھونکے جانے کا ذکر ہے، جس سے تمام لوگ قبروں سے نکل کر گروہ در گروہ میدانِ محشر میں آ جائیں گے۔

**آیت 19** وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ اَبۡوَابًا : آسمان میں اب بھی دروازے موجود ہیں، جیسا کہ سورۂ اعراف (۴۰) میں ہے اور حدیثِ معراج میں بھی اس کا ذکر ہے، مگر اس وقت آسمان اس طرح پھٹے گا جیسے وہ سارے کا سارا دروازوں کی شکل اختیار کر گیا ہے اور یہ پھٹنا فرشتوں کے اتارے جانے کے لیے ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ یَوۡمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ وَ نُزِّلَ الۡمَلٰٓئِكَةُ تَنۡزِیۡلًا ﴾ [ الفرقان : ۲۵ ] "جس دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے لگاتار اتارے جائیں گے۔"

**آیت 20** ❶ وَّ سُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا : "سَرَابًا" جو دوپہر کے وقت دور سے دیکھنے والے کو پانی کی طرح نظر

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾

یقیناً جہنم ہمیشہ سے ایک گھات کی جگہ ہے ﴿۲۱﴾ سرکشوں کے لیے ٹھکانا ہے ﴿۲۲﴾ وہ مدتوں اسی میں رہنے والے ہیں ﴿۲۳﴾

آتا ہے مگر حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح پہاڑ ریت بن جائیں گے جو دور سے پانی کی طرح نظر آتی ہے مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

② قرآن میں قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے مختلف احوال بیان ہوئے ہیں، سب سے پہلے صور کی آواز کے ساتھ زمین اور پہاڑ ایک چوٹ سے توڑ دیے جائیں گے، فرمایا: ﴿ وَ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴾ [ الحاقة : ۱۴ ] ''اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا اور دونوں ایک ہی بار ٹکرا دیے جائیں گے۔'' پھر بُھربُھری ریت ہو جائیں گے جو خود بخود گرتی جا رہی ہو، فرمایا: ﴿ وَ كَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴾ [ المزمل : ۱۴ ] ''اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔'' پھر دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہو جائیں گے، فرمایا: ﴿ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴾ [ القارعة : ۵ ] ''اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔'' پھر بکھرا ہوا غبار بن جائیں گے، فرمایا: ﴿ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴾ [ الواقعة : ۶ ] ''پس وہ پھیلا ہوا غبار بن جائیں گے۔'' پھر بادلوں کی طرح چلیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ [ النمل : ۸۸ ] ''حالانکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے۔'' پھر سراب بن جائیں گے، جیسے یہاں فرمایا ہے، پھر ان میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا، فقط چٹیل زمین رہ جائے گی جس میں کوئی بلندی یا پستی نہیں ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴾ [ طٰہٰ : ۱۰۶، ۱۰۷ ] ''پھر وہ اسے ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا، جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری ہوئی جگہ۔''

**آیت 22، 21** ﴿ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ...... : یہاں سے جہنم اور اہلِ جہنم کا کچھ حال بیان ہوتا ہے۔ ''مِرْصَادًا'' ( گھات ) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کسی دشمن یا شکار پر قابو پانے کے لیے تاک لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ بے خبری میں آ کر پھنس جائے۔ یعنی سرکش لوگ اللہ سے بے خوف ہو کر دنیا میں فساد مچا رہے ہیں، مگر انھیں یاد نہیں کہ جہنم ان کے لیے ایک ایسی چھپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ اچانک پھنسیں گے اور پھر وہی ان کے لیے ہمیشہ کا ٹھکانا ہوگی۔

**آیت 23** ﴿ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا: ''اَحْقَابًا'' ''حُقْبٌ'' (حاء کے ضمہ اور قاف کے سکون کے ساتھ) کی جمع ہے، اسی (۸۰) سال یا اس سے زیادہ مدت، زمانہ، سال۔ ( قاموس ) یعنی مدتوں، کئی زمانے، سالہا سال اس میں پڑے رہیں گے، ایک مدت ختم ہونے پر دوسری مدت شروع ہو جائے گی، ایسی مدتیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ کچھ مدتوں کے بعد عذاب کم یا ختم ہو جائے گا، کیونکہ اسی سلسلہ کلام میں آگے چل کر فرمایا: ﴿ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴾ [ النبا : ۳۰ ] ''پس چکھو کہ ہم تمھیں عذاب کے سوا ہرگز کسی چیز میں زیادہ نہیں کریں گے۔''

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾

نہ اس میں کوئی ٹھنڈ چکھیں گے اور نہ کوئی پینے کی چیز ﴿۲۴﴾ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ ﴿۲۵﴾ پورا پورا بدلا دینے کے لیے ﴿۲۶﴾ بلاشبہ وہ کسی حساب کی امید نہیں رکھتے تھے ﴿۲۷﴾ اور انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، بری طرح جھٹلانا ﴿۲۸﴾ اور ہر چیز، ہم نے اسے لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے ﴿۲۹﴾ پس چکھو کہ ہم تمھیں عذاب کے سوا ہرگز کسی چیز میں زیادہ نہیں کریں گے ﴿۳۰﴾ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے ﴿۳۱﴾ باغات اور انگور ﴿۳۲﴾ اور ابھری چھاتیوں والی ہم عمر لڑکیاں ﴿۳۳﴾ اور چھلکتے ہوئے پیالے ﴿۳۴﴾

**آیت 24 تا 26** لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا ...... : ”حَمِيْمًا“ اور ”غَسَّاقًا“ کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ ص (۵۷) کی تفسیر۔ ”بَرْدًا“ سے مراد خوش گوار ٹھنڈک ہے۔ جہنم میں ایک طبقہ زمہریر بھی ہے جہاں بے انتہا سردی ہے، اسے مزے کی ٹھنڈک نہیں کہہ سکتے۔ (وحیدی)

**آیت 27، 28** اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ ...... : ان کے جہنم میں جانے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ انھیں اعمال کے حساب کی امید نہ تھی، ورنہ وہ اپنے اعمال کو درست کر لیتے اور دوسری یہ کہ انھوں نے ہماری آیات کو بری طرح جھٹلا دیا۔ ”كِذَّابًا“ مصدر ہے ”كَذَّبُوْا“ کا، اس کے ساتھ ”كَذَّبُوْا“ کی تاکید فرمائی ہے۔ ترجمے میں اس تاکید کو ”بری طرح“ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

**آیت 30** فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا : یعنی جس طرح تم کفر و تکذیب میں برابر بڑھتے چلے گئے اسی طرح ہم بھی تمھارا عذاب برابر بڑھاتے رہیں گے اور کسی لمحہ اس میں تخفیف نہیں کریں گے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۵۶) اور سورۂ بنی اسرائیل (۹۷)۔

**آیت 31** اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا : جہنم اور جہنمیوں کے بعد جنت اور جنتیوں کا ذکر ہے۔ یہاں متقین کا ذکر ان لوگوں کے مقابلے میں آیا ہے جنھیں کسی حساب کی توقع نہ تھی اور جنھوں نے اللہ کی آیات کو بالکل جھٹلا دیا تھا، یعنی اعمال کے حساب سے ڈرنے والوں اور کفر و تکذیب سے ڈرنے والوں کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے۔ ”مَفَازًا“ مصدر ہو تو معنی ہے ”کامیابی“ اور ظرف ہو تو معنی ہے ”کامیابی کا مقام۔“ ”مَفَازًا“ میں تنوین ”ایک بڑی“ کا مفہوم ادا کر رہی ہے۔

**آیت 32 تا 34** حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ...... : ”حَدَآئِقَ“ ”حَدِيْقَةٌ“ کی جمع ہے، وہ باغ جس کے گرد چار دیواری ہو۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾

وہ اس میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ (ایک دوسرے کو) جھٹلانا ﴿۳۵﴾ تیرے رب کی طرف سے بدلے میں ایسا عطیہ ہے جو کافی ہوگا ﴿۳۶﴾ (اس رب کی طرف سے) جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا رب ہے، بے حد رحم والا، وہ اس سے کوئی بات کرنے کی قدرت نہیں رکھیں گے ﴿۳۷﴾ جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے، وہ کلام نہیں کریں گے، مگر وہی جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا ﴿۳۸﴾

"اَعْنَابًا" "عِنَبٌ" کی جمع ہے۔ انگور کو پھلوں میں ایک خصوصیت حاصل ہے، اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر فرمایا۔ "اَعْنَابًا" جمع لانے کا مطلب ہے کہ انگور کی بہت سی اقسام ہوں گی۔ "كَوَاعِبَ" "كَاعِبٌ" کی جمع ہے، وہ نوجوان لڑکی جس کا سینہ ایسے ابھرا ہوا ہو جیسے کعب یعنی ٹخنہ۔ "اَتْرَابًا" "تِرْبٌ" (تاء کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، مٹی میں ساتھ کھیلنے والے ہم عمر۔ آپس میں ہم عمر ہوں گی یا اپنے خاوندوں کی ہم عمر ہوں گی۔

**آیت 35** لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا: جنت کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ آدمی کے کان وہاں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ یہ سنیں گے کہ کوئی کسی کو جھوٹا کہہ رہا ہے۔ کوئی کسی سے جھگڑے گا ہی نہیں کہ اس کی بات کو جھٹلائے۔ گالی گلوچ اور دنگا فساد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نعمت کی قدر وہی جانتا ہے جسے ان کاموں سے نفرت ہو، پھر اس کا واسطہ بے ہودہ بکنے والوں اور ایک دوسرے کو جھٹلانے والے بدتمیزوں سے رہتا ہو۔

**آیت 36، 37** ① جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ......: یہ سب کچھ ان کے رب کی طرف سے ان کے اعمال کا بدلا ہے۔ بدلا دینے والا رب تعالیٰ ہو تو بدلا کتنا عظیم ہوگا، پھر برابر بدلا ہی نہیں، دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی بڑھا کر لامحدود گنا عطیہ ملے گا۔ البتہ گناہ کا بدلا اتنا ہی ہوگا جتنا گناہ ہے۔

② عَطَآءً حِسَابًا: اس کے دو معنی ہیں، پہلا یہ کہ وہ عطیہ حساب سے ہوگا، یعنی ان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ایسا نہ ہوگا جو حساب میں نہ آئے۔ دوسرا معنی ہے "کافی عطیہ" جیسے "حَسْبِيَ اللّٰهُ" کا معنی ہے مجھے اللہ کافی ہے، یعنی اتنا بدلا ہوگا جس سے زیادہ کی خواہش نہیں ہوگی۔

③ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا: یعنی انتہائی لطف و رحمت کے باوجود قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا جلال اس قدر ہوگا کہ کوئی اس کے سامنے لب کشائی نہیں کر سکے گا۔ (اشرف الحواشی)

**آیت 38** ① يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ......: "الرُّوْحُ" سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ نَزَلَ بِهِ

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝۳۹

یہی دن ہے جو حق ہے، پس جو چاہے اپنے رب کی طرف لوٹنے کی جگہ بنالے ۝۳۹

الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ [ الشعراء : ۱۹۳ ] ''اس (قرآن) کو امانت دار روح لے کر اترا ہے۔'' ان کا الگ ذکر ان کی شان کی عظمت کے اظہار کے لیے کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے : ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ [ البقرة : ۹۸ ] ''جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ سب کافروں کا دشمن ہے۔'' دوسرا معنی جو لفظ سے ظاہر ہے بنو آدم کی ارواح ہیں۔

❷ صحیح احادیث کے مطابق یہ اس وقت کا ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نیک و بد کے فیصلے کے لیے آسمان سے زمین پر میدانِ محشر میں نزول فرمائے گا اور لوگ سورج کی گرمی اور پسینے سے گھبرا جائیں گے اور وہ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سب انبیاء کے پاس جائیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں کہ حساب کتاب شروع ہو، لیکن کسی نبی کی جرأت اور طاقت اللہ تعالیٰ سے بات کرنے کی نہ ہوگی۔ آخر کار خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بات کرنے کا حکم ہوگا اور آپ کی شفاعت سے سب لوگوں کا حساب شروع ہوگا۔ (احسن التفاسیر) دیکھیے صحیح بخاری (۷۴۴۰، ۷۵۱۰)۔

❸ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ ...... : قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے بات (سفارش) کرنے والے کے لیے دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ رحمان اسے بات (سفارش) کرنے کی اجازت دے، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [ البقرة : ۲۵۵ ] ''کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟'' دوسری یہ کہ وہ درست بات کرے، سفارش کرنے میں غلطی نہ کرے۔ مثلاً غیر مستحق کی سفارش نہ کر بیٹھے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آزر کے لیے سفارش نہیں کر سکیں گے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ جس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے بات کی جائے اس کے لیے دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ رحمان اس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت دے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ [ الأنبياء : ۲۸ ] ''وہ فرشتے صرف اسی کے لیے سفارش کرتے ہیں جسے رحمان پسند کرے۔'' دوسری یہ کہ ''قَالَ صَوَابًا'' یعنی دنیا میں اس نے درست بات کہی ہو، یعنی کلمۂ توحید کہا ہو، مسلمان ہو۔ کافر و مشرک نے دنیا میں درست بات نہیں کہی ہوتی، اس لیے اس کے حق میں سفارش کی اجازت نہیں ملے گی۔ (جامع البیان)

آیت 39 ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ...... : یہ وہ دن ہے جو حق ہے، یعنی آ کر رہے گا۔ تو جب اس دن کا آنا یقینی ہے تو آدمی کو چاہیے کہ اپنے مولا کو منہ دکھانے کے قابل بننے اور اس کے پاس ٹھکانا بنانے کے لیے ابھی تیاری کر لے، مرنے کے بعد اس کا موقع نہیں ملے گا۔

اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰكُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا ۚۖ۬ یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰهُ وَ یَقُوۡلُ الۡكٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ كُنۡتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

ع ۲

بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک ایسے عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب ہے، جس دن آدمی دیکھ لے گا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کافر کہے گا اے کاش کہ میں مٹی ہوتا ﴿۴۰﴾

آیت 40 ① اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰكُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا...... : آخرت کے عذاب کو قریب فرمایا، کیونکہ عمر خواہ کتنی بھی ہو ختم ہونے والی ہے اور ہر آنے والا وقت قریب ہی ہوتا ہے۔ قیامت کو جب اٹھیں گے تو انھیں دنیا میں قیام کا وقت ایسے معلوم ہوگا جیسے دن کا ایک پہر گزرا ہو۔ (دیکھیے نازعات : ۴۶) بلکہ قیامت کے دن مجرم قسم اٹھا کر کہیں گے کہ ہم دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۵۵)۔

② یٰلَیۡتَنِیۡ كُنۡتُ تُرٰبًا : اے کاش کہ میں مٹی ہوتا، یعنی پیدا ہی نہ ہوا ہوتا، نہ حساب ہوتا نہ کتاب۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ کاش! میں مر کر مٹی ہو جاتا تو نہ حساب ہوتا نہ عذاب۔ بعض مفسرین نے ایک عجیب معنی کیا ہے کہ ”الۡكٰفِرُ“ سے مراد یہاں ابلیس ہے۔ جب آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو ان کے اعمال کا ثواب ملے گا تو ابلیس کہے گا کاش! میں مٹی ہوتا، آگ سے بنا ہوا نہ ہوتا، کیونکہ اس نے آگ سے بنا ہوا ہونے کی وجہ سے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم ٹھکرا دیا تھا۔ [ زاد المسیر لا بن جوزی ] پہلے معنوں کے ساتھ یہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

سورۃ النّٰزعٰت ٧٩ مکیۃ ٨١ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — آیاتھا ٤٦ رکوعاتھا ٢
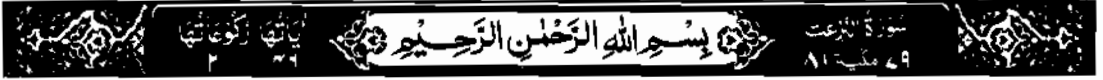
# وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ان (فرشتوں) کی قسم جو ڈوب کر سختی سے (جان) کھینچ لینے والے ہیں! ① اور جو بند کھولنے والے ہیں! آسانی سے کھولنا ② اور جو تیرنے والے ہیں! تیزی سے تیرنا ③ پھر جو آگے نکلنے والے ہیں! آگے بڑھ کر ④

آیت 1، 2 وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ...... : "النّٰزِعٰتِ" اور "النّٰشِطٰتِ" سے مراد سختی اور آسانی کے ساتھ جان نکالنے والے فرشتے ہیں۔ اگرچہ ان الفاظ کی تفسیریں اور بھی کی گئی ہیں، مگر تفسیر طبری میں حسن سندوں کے ساتھ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی تفسیر مروی ہے اور صحیح احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسا کہ مسند احمد میں براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَ إِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِّنَ الدُّنْيَا...... ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ فَيَقُوْلُ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ! اخْرُجِيْ إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ قَالَ فَتَخْرُجُ تَسِيْلُ كَمَا تَسِيْلُ الْقَطْرَةُ مِنْ فِي السِّقَاءِ...... وَ إِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِّنَ الدُّنْيَا...... ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ فَيَقُوْلُ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ! اخْرُجِيْ إِلٰى سَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ غَضَبٍ قَالَ فَتَفَرَّقُ فِيْ جَسَدِهِ فَيَنْتَزِعُهَا كَمَا يُنْتَزَعُ السَّفُّوْدُ مِنَ الصُّوْفِ الْمَبْلُوْلِ » [ مسند أحمد : ٤/٢٨٧، ٢٨٨، ح : ١٨٥٦١ ] "اور مومن آدمی جب دنیا سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے...... تو ملک الموت علیہ السلام اس کے سر کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: "اے پاکیزہ جان! اللہ کی مغفرت اور رضا کی طرف نکل آ۔" تو وہ اس طرح نکل آتی ہے جس طرح مشکیزے سے پانی کا قطرہ نکلتا ہے...... اور کافر جب دنیا سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے...... تو ملک الموت اس کے سر کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: "اے خبیث جان! اللہ کی ناراضی اور غصے کی طرف نکل آ۔" تو وہ جسم میں بکھر جاتی ہے تو وہ اسے اس طرح سختی سے کھینچ کر نکالتا ہے جس طرح بھیگی ہوئی اون سے گرم سلاخ کھینچ کر نکالی جاتی ہے۔" مشکوٰۃ میں شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

"النّٰزِعٰتِ" سختی سے کھینچ کر نکالنے والے۔ "غَرۡقًا" "ڈوب کر۔" یعنی ان فرشتوں کی قسم جو کفار کی جان ڈوب کر یعنی ان کے بدن کے ہر حصے میں پہنچ کر سختی سے کھینچ کر نکالتے ہیں، جب کہ وہ نکلنا نہیں چاہتی۔ "النّٰشِطٰتِ" "نَشَطَ الْعِقَالَ" (ن) رسی کی گرہ کھولنا۔ فرشتے مسلمان کی روح گرہ کھول کر نکالتے ہیں اور وہ خوشی سے اللہ کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑتی ہے۔ کافر اور مومن کا یہ فرق روح کی حالت میں ہے، بدن کی تکلیف الگ ہے، اس میں مسلمان اور کافر برابر ہیں۔ (خلاصہ موضح)

آیت 3، 4 وَ السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ...... : "سَبَحَ يَسْبَحُ سَبْحًا" (ف) تیرنا۔ "السّٰبِحٰتِ" تیرنے والے۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۝ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝

پھر جو کسی کام کی تدبیر کرنے والے ہیں! ⑤ جس دن ہلا ڈالنے والا (زلزلہ) سخت ہلائے گا ⑥ اس کے بعد ساتھ ہی پیچھے آنے والا (زلزلہ) آئے گا ⑦ کئی دل اس دن دھڑکنے والے ہوں گے ⑧ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی ⑨

"سَبْحًا" مصدر تاکید کے لیے ہے، ترجمہ میں یہ مفہوم "خوب تیزی سے" کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔ مراد وہ فرشتے ہیں جو احکامِ الٰہی کی تعمیل کے لیے تیزی سے آسمان میں تیرتے ہوئے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

**آیت 5** ﴿ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴾ : پھر دین و دنیا کے جس کام کا انھیں حکم دیا ہوتا ہے اس کی تدبیر کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے یا تو ان کی قدرت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے یا انھیں بعد میں آنے والے جوابِ قسم کی شہادت کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں جوابِ قسم صاف لفظوں میں مذکور نہیں مگر قیامت کے احوال ذکر کرنے سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ قسمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کھائی گئی ہیں کہ قیامت قائم ہو کر رہے گی۔ اہل عرب فرشتوں کا اللہ کی طرف سے قبضِ ارواح اور دوسرے معاملات کی تدبیر پر مامور ہونا مانتے تھے۔ فرشتوں کے یہ اوصاف ذکر کر کے ان کی قسم اس بنا پر کھائی گئی ہے کہ فرشتے جس اللہ کے حکم سے روح قبض کر سکتے ہیں، نہایت تیزی سے کائنات میں نقل و حرکت کر سکتے ہیں اور کائنات کے معاملات کی تدبیر کر سکتے ہیں، اسی اللہ کے حکم سے صور میں پھونک کر اس کائنات کو فنا بھی کر سکتے ہیں اور دوبارہ پھونک کر از سرِ نو زندہ بھی کر سکتے ہیں۔

**آیت 7،6** ﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ..... ﴾ : قاموس میں ہے: "رَجَفَ حَرَّكَ وَ تَحَرَّكَ وَ اضْطَرَبَ شَدِيْدًا" یعنی "رَجَفَ" کا معنی سخت حرکت کرنا اور حرکت دینا دونوں آتے ہیں۔ یہاں حرکت دینا زیادہ مناسب ہے۔ "الرَّاجِفَةُ" سے مراد پہلی دفعہ صور میں پھونکے جانے سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ "الرَّادِفَةُ" سے مراد دوسرے نفخہ سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے تمام لوگ زندہ ہو کر از سرِ نو قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ سورۂ زمر (۶۸) میں بھی انھی دونوں نفخوں کا ذکر ہے۔

**آیت 9،8** ﴿ قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ..... ﴾ : کئی دل اس دن دھڑک رہے ہوں گے، یعنی سخت خوف زدہ ہوں گے۔ "کئی دل" اس لیے فرمایا کہ صالح مومن اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ﴾ [ الأنبیاء : ۱۰۳ ] "(اس دن) سب سے بڑی گھبراہٹ انھیں غمگین نہیں کرے گی۔" دلوں اور آنکھوں کا حال بیان کرنے سے اس دن کفار کی ظاہری اور باطنی پریشانی کی مکمل تصویر سامنے آ گئی۔

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝۱۰ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝۱۱ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۱۵ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۱۷ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى ۝۱۸ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝۱۹

یہ لوگ کہتے ہیں کیا بے شک ہم یقیناً پہلی حالت میں لوٹائے جانے والے ہیں؟ ⑩ کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے ⑪ انھوں نے کہا یہ تو اس وقت خسارے والا لوٹنا ہوگا ⑫ پس وہ تو صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی ⑬ پس یک لخت وہ زمین کے اوپر موجود ہوں گے ⑭ کیا تیرے پاس موسیٰ کی بات پہنچی ہے؟ ⑮ جب اس کے رب نے اسے مقدس وادی طویٰ میں پکارا ⑯ فرعون کے پاس جا، یقیناً وہ حد سے بڑھ گیا ہے ⑰ پس کہہ کیا تجھے اس بات کی کوئی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے؟ ⑱ اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہ نمائی کروں، پس تو ڈر جائے ⑲

**آیت 11، 10** ﴿ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي ...... ﴾ : ''کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے تو دوبارہ پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟'' یہ کہنا رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے منکرین قیامت کا تھا، آج کے مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں، ان کے خیال میں ہڈیاں بوسیدہ ہونے کے بعد انسان کا دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے۔

**آیت 12** ﴿ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴾ : ان کا یہ کہنا بطور مذاق ہے، یعنی اگر نبی ﷺ کے کہنے کے مطابق ہم دوبارہ پہلی حالت میں آئے تو ان کے مطابق تو ہمارے لیے یہ بہت خسارے کا اٹھنا ہوگا۔

**آیت 14، 13** ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ...... ﴾ : یعنی تمھارا دوبارہ اٹھایا جانا تمھیں کتنا ہی ناممکن دکھائی دے، اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ اس کی طرف سے ایک ڈانٹ یعنی صور میں ایک پھونک پڑنے کی دیر ہے کہ سب زندہ ہو کر قبروں سے نکل کر سطح زمین پر موجود ہوں گے۔ ''سَهِرَ'' (س) جاگنا اور ''اَلسَّاهِرَةُ'' زمین کا اوپر کا حصہ، کیونکہ اسی پر انسانوں کا جاگنا اور سونا ہے۔ چٹیل میدان اور صحرا کو ''اَلسَّاهِرَةُ'' اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں خوف کی وجہ سے انسان بیدار رہتا ہے۔ (فتح القدیر)

**آیت 15** ﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴾ : ''کیا تیرے پاس موسیٰ کی بات پہنچی ہے؟'' قیامت اور اس کا انکار کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر فرمایا۔ اس سے ایک تو منکرین کو ڈرانا مقصود ہے کہ حق کا انکار کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے، دوسرا نبی ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ ان کافروں کے جھٹلانے پر رنجیدہ نہ ہوں، آپ سے پہلے لوگوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تو ان کا یہ انجام ہوا۔

**آیت 16** ﴿ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴾ : ''طُوًى'' طور سینا کے دامن میں واقع ایک وادی کا نام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر مدین سے واپسی پر پہلی وحی یہیں اتری۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۲)۔

**آیت 19، 17** ﴿ ❶ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ ...... ﴾ : فرعون کے پاس جانے کا حکم دینے کے ساتھ اسے دی جانے والی دعوت

فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝۲۰ فَكَذَّبَ وَ عَصٰى ۝۲۱ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝۲۲ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝۲۳ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝۲۴ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ۝۲۵ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۲۶ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۝۲۷ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝۲۸ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝۲۹

چنانچہ اس نے اسے بہت بڑی نشانی دکھائی ⑳ تو اس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی ㉑ پھر واپس پلٹا، دوڑ بھاگ کرتا تھا ㉒ پھر اس نے اکٹھا کیا، پس پکارا ㉓ پس اس نے کہا میں تمھارا سب سے اونچا رب ہوں ㉔ تو اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا ㉕ بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے جو ڈرتا ہے ㉖ کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا ㉗ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا ㉘ اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا ㉙

بھی سکھلائی، دعوت کے الفاظ میں اختصار کے باوجود نرمی اور ترغیب و ترہیب واضح طور پر نمایاں ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرمایا تھا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ [ طٰہٰ : ۴۴ ] ”فرعون سے نرم بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔“

② اِنَّهٗ طَغٰى : ”یقیناً وہ حد سے بڑھ گیا ہے۔“ فرعون کا حد سے بڑھنا ایک تو بندگی کی حد سے بڑھ کر یہ کہنا تھا کہ میں تمھارا رب اعلیٰ ہوں، دوسرا خلق خدا پر اس کی طغیانی یہ تھی کہ اس نے قوم کو طبقوں میں تقسیم کر کے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے بیٹے ذبح کرتا اور عورتیں زندہ رکھتا تھا۔

③ فَقُلْ هَلْ لَّكَ ...... : ”تَزَكّٰى“ پاک ہو جائے، یعنی شرک و کفر کی گندگی سے پاک ہو جائے۔ ”فَتَخْشٰى“ پس تو ڈر جائے، یعنی اپنے رب کا راستہ معلوم ہو جانے کے بعد تو ڈر جائے کہ پروردگار اپنی دی ہوئی حکومت چھین کر نعمتوں کی جگہ اپنی گرفت ہی میں نہ لے لے، چنانچہ تو اس ڈر سے اس کا شریک بننے اور بندوں پر ظلم کرنے سے بچ جائے، کیونکہ دل میں ڈر علم ہی سے پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [ فاطر : ۲۸ ] ”اللہ سے صرف اس کے علم والے بندے ہی ڈرتے ہیں۔“

**آیت 20** فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى : بڑی نشانی سے مراد لاٹھی کا سانپ بن جانا ہے۔ ”الْاٰيَةَ“ کو واحد کے بجائے جنس مان لیں تو عصائے موسیٰ اور ید بیضا دونوں مراد ہو سکتے ہیں، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے جانے والے ”تسع آیات بینات“ (۹ معجزے) بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۰۱)۔

**آیت 25** فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى : یعنی آخرت کو آگ میں جلے گا اور دنیا میں غرق ہوا۔

**آیت 27 تا 29** ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا ...... : شروع سورت میں قیامت حق ہونے کی دلیل کے طور پر فرشتوں کا اور ان چند

وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَ الْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

اور زمین، اس کے بعد اسے بچھا دیا ﴿۳۰﴾ اس سے اس کا پانی اور اس کا چارا نکالا ﴿۳۱﴾ اور پہاڑ، اس نے انھیں گاڑ دیا ﴿۳۲﴾ تمھاری اور تمھارے چوپاؤں کی زندگی کے سامان کے لیے ﴿۳۳﴾

امور کا ذکر فرمایا جو وہ سرانجام دیتے ہیں، یعنی ان فرشتوں کے رب کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ یہاں سے پھر قیامت کے دلائل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت (۲۷) سے (۳۳) تک اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی عظیم الشان مخلوقات کا ذکر فرمایا کہ اتنی قدرتوں والے پروردگار کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کرنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے؟

**آیت 30 تا 33** وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا...... : یہاں ایک سوال ہے کہ اس جگہ آسمان بنانے کے بعد زمین بچھانے کا ذکر فرمایا ہے، جب کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۲۹) اور حم سجدہ کی آیات (۹ تا ۱۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمین پیدا کی گئی پھر آسمان، ان دونوں کے درمیان تطبیق کیا ہوگی؟ اہل علم نے اس کے متعدد جوابات ذکر فرمائے ہیں: ① بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلے زمین بنی پھر آسمان، البتہ زمین کو بچھانے، اس کا پانی اور چارہ نکالنے اور اس میں پہاڑ گاڑنے کا کام بعد میں ہوا۔ گویا زمین کی خلق (پیدائش) آسمان سے پہلے ہے، البتہ "دَحْو" (بچھانا) بعد میں ہے۔ طبری نے یہ تفسیر علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اور اسے ترجیح دی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: « قَوْلُهُ حَيْثُ ذَكَرَ خَلْقَ الْأَرْضِ قَبْلَ السَّمَاءِ، ثُمَّ ذَكَرَ السَّمَاءَ قَبْلَ الْأَرْضِ، وَذٰلِكَ أَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْأَرْضَ بِأَقْوَاتِهَا مِنْ غَيْرِ أَنْ يَدْحُوَهَا قَبْلَ السَّمَاءِ، ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ، ثُمَّ دَحَا الْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ: ﴿وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ » [ طبري : ۹۲/۲٤، ح : ۳٦٦۳۲ ] "یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس میں موجود روزیوں سمیت اسے بچھائے بغیر آسمان سے پہلے پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انھیں درست کر کے سات آسمان بنا دیا، پھر زمین کو اس کے بعد بچھا دیا، یہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب ہے: ﴿وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ [ النازعات : ۳۰ ] "اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا۔" ابن کثیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے "وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا" کی تفسیر بعد والی آیات: ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ...﴾ کے ساتھ فرمائی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ زمین میں پہلے پیدا کر دیا تھا، مگر انھیں آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد زمین سے نکالا۔ ② بعض مفسرین نے سورۂ نازعات کی زیر تفسیر آیات اور حم سجدہ کی آیات (۹ تا ۱۲) کو ملا کر خلاصہ یوں نکالا ہے: "اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان پیدا کیا، اس حال میں کہ وہ دھوئیں کی مانند تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا، پھر اس پر پہاڑوں کو رکھ دیا، پھر زمین میں سبزیاں اور درخت وغیرہ کی پیدائش کا اندازہ مقرر کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کو، جو اب تک دھوئیں کی شکل میں تھا، سات آسمانوں میں تبدیل کیا اور آسمان کی چھت کو بلند کیا، پھر زمین کو بچھا دیا، اس میں سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو زمین میں مضبوطی سے گاڑ دیا۔" (تفسیر قرآن عزیز،

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾

پھر جب وہ ہر چیز پر چھا جانے والی سب سے بڑی مصیبت آجائے گی ﴿۳۴﴾ جس دن انسان یاد کرے گا جو اس نے کوشش کی ﴿۳۵﴾ اور جہنم (ہر) اس شخص کے لیے ظاہر کر دی جائے گی جو دیکھتا ہے ﴿۳۶﴾ پس لیکن جو حد سے بڑھ گیا ﴿۳۷﴾ اور اس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ﴿۳۸﴾ تو بے شک جہنم ہی (اس کا) ٹھکانا ہے ﴿۳۹﴾ اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا ﴿۴۰﴾

سورۃ النازعات )۳ تیسری تطبیق یہ ہے کہ یہاں سورۂ نازعات میں زمین و آسمان پیدا کرنے کی ترتیب زمانی بیان کرنا مقصود ہی نہیں، وہ تو وہی ہے جو سورۂ بقرہ اور سورۂ حم سجدہ میں ہے، بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر پہلے آسمان کو ذکر کیا گیا ہے پھر زمین کو۔ واضح رہے کہ بعد کا لفظ ہر جگہ زمانے کی ترتیب کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ترتیب ذکری کے لیے ہوتا ہے، یعنی موقع کی مناسبت سے زیادہ اہم چیز پہلے ذکر ہوتی ہے اور دوسری بعد میں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴾ [ القلم : ۱۳] ''سخت مزاج اس کے بعد بدنام۔'' ایسے موقع پر زمانی ترتیب کچھ بھی ہو لفظ بعد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلی چیز کے بعد اس کی خبر دی جا رہی ہے، اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ایسے موقع پر عموماً بعد کا معنی ''مع'' (ساتھ) ہوتا ہے، یعنی سخت مزاج ہونے کے ساتھ وہ بدنام بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ بلد کی آیات (۱۱ تا ۱۷) کی تفسیر بھی دیکھ لیں، جن میں ''فَكُّ رَقَبَةٍ ......'' کے بعد فرمایا: ﴿ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... ﴾ یہاں بھی ''ثُمَّ'' ترتیب زمانی کے لیے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ گردن چھڑانے اور کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ یہ تطبیق تقریباً تمام مفسرین نے ذکر کی ہے اور سب سے بہتر ہے، کیونکہ پہلی دونوں تطبیقوں میں چھ دن میں زمین و آسمان کی پیدائش کی تفصیل اور ترتیب پوری طرح واضح نہیں ہوتی اور نہ اصل اشکال دور ہوتا ہے۔

**آیت 34** فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى: ''الطَّآمَّةُ'' اس مصیبت کو کہتے ہیں جو ہر چیز پر چھا جائے، مراد قیامت ہے۔ مزید ہولناکی بیان کرنے کے لیے فرمایا ''الْكُبْرٰى'' کہ جو سب سے بڑی (مصیبت) ہے۔

**آیت 36** وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى: یعنی گمراہ لوگوں کے لیے جہنم سامنے کر دی جائے گی کہ یہ تمھارا ٹھکانا ہے، البتہ متقی لوگوں کے لیے جنت قریب کی جائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۹۰، ۹۱] ''جنت متقی لوگوں کے قریب کر دی جائے گی۔ اور جہنم گمراہوں کے لیے ظاہر کر دی جائے گی۔'' یہ معنی بھی درست ہے کہ مومن ہو یا کافر جہنم ہر دیکھنے والے کے سامنے ہوگی، مومن اس سے بچائے جانے پر اللہ کا شکر ادا کریں گے اور کافر شدید حسرت و افسوس میں مبتلا ہوں گے۔ میدان محشر میں جہنم لائے جانے کے متعلق دیکھیے سورۂ فجر (۲۳) کی تفسیر۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے ﴿۴۱﴾ وہ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہے؟ ﴿۴۲﴾ اس کے ذکر سے تو کس خیال میں ہے؟ ﴿۴۳﴾ تیرے رب ہی کی طرف اس (کے علم) کی انتہا ہے ﴿۴۴﴾ تُو تو صرف اسے ڈرانے والا ہے جو اس سے ڈرتا ہے ﴿۴۵﴾ گویا وہ جس دن اسے دیکھیں گے وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے، مگر دن کا ایک پچھلا حصہ یا اس کا پہلا حصہ ﴿۴۶﴾

**آیت 42** یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا : "مُرْسٰىهَا" "أَرْسٰی یُرْسِيْ" (افعال) سے مصدر ہو تو معنی ہوگا "اس کا وقوع یا قیام" اور اگر ظرف ہو تو معنی ہے "اس کے قیام کا وقت۔" کافر لوگ یہ سوال بار بار کرتے تھے، اس سے ان کا مقصد قیامت کا وقت اور تاریخ معلوم کرنا نہیں تھا بلکہ اسے جھٹلانا اور اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا۔

**آیت 43** فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا : یعنی جب آپ کو خود ہی اس کا مقرر وقت معلوم نہیں تو آپ انھیں کیا بتائیں گے اور آپ کا اس کے ذکر سے کیا تعلق؟

**آیت 44** اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا : "مُنْتَهٰىهَا" اس کی انتہا، جہاں جا کر بات ختم ہوتی ہے وہ رب تعالیٰ ہے، یعنی جس کسی سے قیامت کے متعلق پوچھو وہ بے خبر ہوگا، کسی دوسرے سے پوچھنے کو کہے گا تو وہ بھی بے خبر ہوگا، پوچھتے پوچھتے آخر میں جہاں بات ختم ہوگی اور جو بتا سکتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، درمیان میں سب بے خبر ہیں۔ (موضح القرآن)

**آیت 45** اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰىهَا : یعنی آپ کا کام اس کا وقت بتانا نہیں ہے بلکہ اس سے ڈرانا ہے اور اگرچہ آپ کا فریضہ تمام دنیا کو اس سے ڈرانا ہے مگر اس کا فائدہ صرف اس کو ہوگا جس کے دل میں اس کا خوف ہے اور وہ آپ کی تبلیغ سن کر تیاری کرے گا۔ جس کے دل میں قیامت پر ایمان اور اس کا خوف ہی نہیں اسے آپ کے ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، وہ اس کا وقت ہی پوچھتا رہ جائے گا۔

**آیت 46** كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا...... : یعنی وہ قیامت جسے یہ بہت دور سمجھ رہے ہیں جب آئے گی تو انھیں ایسے معلوم ہوگا جیسے وہ دنیا میں صرف دن کا پچھلا حصہ یا پہلا حصہ ہی رہے ہیں، پورا ایک دن بھی نہیں رہے۔ مثال سمجھنے کے لیے اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیں۔

سُوْرَةُ عَبَسَ ۸۰ مَكِّيَّةٌ ۲۴ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا ۴۲ رُكُوْعَاتُهَا ۱
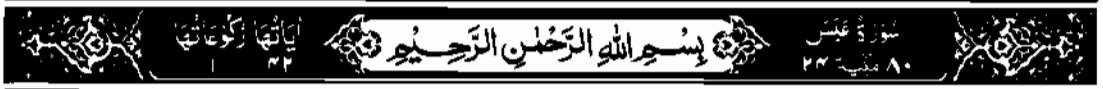
عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ②

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا① اس لیے کہ اس کے پاس اندھا آیا②

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورت نابینے صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین میں سے ایک بڑا آدمی بیٹھا تھا کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے اور کچھ مسائل پوچھنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور توجہ اس دوسرے کی طرف رکھی، اس پر یہ سورت اتری۔ [ ترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة عبس : ۳۳۳۱ ] البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ یہ مشرک اُبی بن خلف تھا اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ سورت اترنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا اکرام (عزت) کیا کرتے تھے۔ [ مسند أبي يعلى : ۴۳۱/۵، ح : ۳۱۲۳ ] اس کی سند صحیح ہے۔ صاحب احسن التفاسیر نے لکھا ہے کہ جن روایات میں ابی بن خلف کے بجائے ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ وغیرہ کا نام لکھا ہے ان کی سند صحیح نہیں۔ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ مکی، قرشی، مہاجرین اولین میں سے ہیں اور ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنے اکثر غزوات میں مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا کرتے تھے۔

**آیت 1** ① **عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى** : اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا، اگرچہ بعد میں "وَمَا يُدْرِيْكَ" سے مخاطب فرما لیا۔ اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینے صحابی سے بے توجہی کی تو اللہ تعالیٰ نے بطور عتاب آپ کے خطاب سے بے توجہی فرمائی۔ موضح القرآن میں ہے: ''یہ کلام گویا اوروں کے پاس گلہ ہے رسول کا۔ آگے رسول کو خطاب فرمایا۔'' بعض اہل علم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اکرام کی وجہ سے آپ کو مخاطب کر کے اظہار ناراضی نہیں فرمایا۔

② بعض حضرات نے ''تیوری چڑھانے والا'' اس مشرک کو قرار دیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا، مگر اس کے بعد آنے والی آیات میں صاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴾ یعنی آپ اس آنے والے (نابینے صحابی) سے بے توجہی کرتے ہیں۔ اس لیے مذکورہ تفسیر درست نہیں۔

**آیت 2** **اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى** : (اس لیے تیوری چڑھائی) کہ اس کے پاس نابینا آیا، حالانکہ نابینا تو زیادہ لطف و کرم کا مستحق تھا۔ پھر اگر اس کے دین کی بات پوچھنے سے کسی چودھری کے ساتھ کلام قطع ہوا ہے، جس کے اسلام لانے کی آپ کو امید تھی اور اس وجہ سے تیوری پڑی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ وہ تو نابینا ہے، اسے کیا پتا کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟

وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ۝۳ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝۴ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝۵ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝۶ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝۷ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝۸ وَ هُوَ يَخْشٰى ۝۹ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝۱۰ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۝۱۴

اور تجھے کیا چیز معلوم کرواتی ہے شاید وہ پاکیزگی حاصل کر لے ۝۳ یا نصیحت حاصل کرے تو وہ نصیحت اسے فائدہ دے ۝۴ لیکن جو بے پروا ہو گیا ۝۵ سو تو اس کے پیچھے پڑتا ہے ۝۶ حالانکہ تجھ پر (کوئی ذمہ داری) نہیں کہ وہ پاک نہیں ہوتا ۝۷ اور لیکن جو کوشش کرتا ہوا تیرے پاس آیا ۝۸ اور وہ ڈر رہا ہے ۝۹ تو تو اس سے بے توجہی کرتا ہے ۝۱۰ ایسا ہرگز نہیں چاہیے، یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے ۝۱۱ تو جو چاہے اسے قبول کر لے ۝۱۲ ایسے صحیفوں میں ہے جن کی عزت کی جاتی ہے ۝۱۳ جو بلند کیے ہوئے، پاک کیے ہوئے ہیں ۝۱۴

**آیت 3، 4** وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ..... : آپ نے جو یہ سمجھا کہ یہ نابینا تو مسلمان ہی ہے، کسی اور وقت مسئلہ پوچھ لے گا، مجھے کافر کو مسلمان بنانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تو یہ بات اگرچہ ایک حد تک درست ہے، مگر آپ کو اس بات کا خیال بھی ضروری تھا کہ وہ کافر تو آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے پر تیار ہی نہیں۔ خوف ناک بیماری میں مبتلا شخص کا علاج مقدم ہونا چاہیے مگر وہ دوا لینے پر آمادہ ہی نہ ہو تو اس کی امید میں آپ اپنے ساتھیوں سے کیوں بے توجہی کریں، جو دوائے دل کے طالب ہیں کہ آپ توجہ فرمائیں تو وہ جہل اور گناہ سے خوب پاک صاف ہو جائیں۔ "يَزَّكّٰى" میں مبالغہ ہے، یا آپ کی نصیحت سے انھیں نفع حاصل ہو جائے۔

**آیت 5 تا 10** اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ..... : "تَصَدّٰى" اصل میں "تَتَصَدّٰى" اور "تَلَهّٰى" اصل میں "تَتَلَهّٰى" فعل مضارع مخاطب ہیں۔ یعنی جسے اپنی دولت اور سرداری کی وجہ سے آپ کی پروا ہی نہیں آپ اس کے پیچھے پڑ رہے ہیں، حالانکہ اگر وہ کفر کی نجاست سے پاک نہیں ہوتا تو آپ پر کچھ الزام نہیں اور جو کوشش کر کے آیا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے تو آپ اس سے بے توجہی کرتے ہیں، حالانکہ آپ کی توجہ کا اصل حق دار وہ ہے جو طلب رکھتا ہے گو نادار ہے، وہ نہیں جو بے پروا ہے خواہ سرمایہ دار ہے۔

**آیت 11، 12** كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ..... : "كَلَّا" ہرگز نہیں، یعنی جو ہوا سو ہوا، آئندہ ہرگز اس طرح نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ قرآن تو ایک نصیحت ہے جو ہر خاص و عام کے لیے ہے، اس میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جانی چاہیے، پھر جو چاہے نصیحت قبول کر لے، اس کا اپنا فائدہ ہے اور کوئی متکبر اگر نصیحت سن لینے کے باوجود اسے قبول نہیں کرتا تو آپ کو بھی قبول کرنے والوں کو چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔

**آیت 13، 14** فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ..... : ان آیات میں قرآن مجید کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ یہ ایسے اوراق میں لکھا ہوا

بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ﴿۱۷﴾

ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں ﴿۱۵﴾ جو معزز ہیں، نیک ہیں ﴿۱۶﴾ مارا جائے انسان! وہ کس قدر ناشکرا ہے ﴿۱۷﴾

ہے جن کی عزت کی جاتی ہے، جو بلند شان والے اور پاک ہیں۔اس سے قرآن مجید کے وہ اوراق مراد ہیں جن میں سے فرشتوں نے لوح محفوظ سے نقل کر کے لکھا، وہ بھی جن میں قرآن کے کاتب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا اور وہ بھی جن میں ان سے نقل کر کے لکھا گیا اور قیامت تک لکھا جائے گا۔قرآن مجید کی جس طرح تکریم کی جاتی ہے اور جس طرح یہ شیاطین اور ملحدوں کی دخل اندازی سے محفوظ، ہر قسم کی تحریف اور رد و بدل سے مامون اور ہر قسم کے خلافِ عقل اور خلافِ حیا مضامین سے مطہر ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔اس کی ان خصوصیات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کا موازنہ دوسری آسمانی یا غیر آسمانی کتابوں سے کیا جائے۔ہمیں بھی قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تکریم کرنی چاہیے اور اسے اٹھاتے وقت، رکھتے وقت اور تلاوت کرتے وقت، غرض ہر موقع پر اس کا بے حد ادب ملحوظ رکھنا چاہیے، اس کی بات آجائے تو پھر کسی کی بات اس پر مقدم نہیں کرنی چاہیے۔

**آیت 16،15** ① **بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ......** : "سَفَرَةٍ" "سَافِرٌ" کی جمع ہے، لکھنے والا۔ "سِفْرٌ" کتاب، اس کی جمع "أَسْفَارٌ" ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ﴾ [ الجمعۃ : ۵ ] " (بے عمل یہود کی مثال ) گدھے کی طرح ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہو۔" ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید لکھنے والوں کی تعریف فرمائی ہے، خواہ وہ فرشتے ہوں یا کاتبین وحی، صحابہ ہوں یا دوسرے، فرمایا یہ لوگ اللہ کے ہاں بہت عزت والے اور نہایت نیک ہیں۔اس طرح کتابت کے علاوہ اس کا پڑھنا پڑھانا بھی سب سے بہتر اور نیک ہونے کی دلیل ہے، عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ )) [ بخاري، فضائل القرآن، باب خيركم من تعلم...... : ۵۰۲۷ ] "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔"

② "سَفَرَةٍ" "سِفَارَةٌ" ( سفارت ) سے بھی مشتق ہو سکتا ہے، تو اس سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے درمیان سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کے پاس وحی الٰہی لے کر آتے ہیں۔

**آیت 17** ① **قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ** : پچھلی آیات میں ان متکبر لوگوں کا ذکر گزرا ہے جو حق بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، اب انھی کافروں پر بددعا کی گئی ہے، فرمایا: ﴿ قُتِلَ الْإِنْسَانُ ﴾ "انسان مارا جائے" یہ سخت سے سخت بددعا ہے جو کسی کے لیے کی جا سکتی ہے، کیونکہ دنیا میں سب سے آخری سزا یہ ہے کہ کسی کو ختم ہی کر دیا جائے۔ ( زمخشری )

② سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو بددعا کرنے کی ضرورت ہی نہیں، تو اس طرح کیوں فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ یہ عرب کے اسلوب پر فرمایا ہے جو ان الفاظ میں بددعا کرتے تھے۔مطلب یہ ہے کہ اتنی نعمتوں کے باوجود یہ انسان جس طرح ناشکری کر رہا ہے اس پر کوئی بھی غور کرے گا تو اس کے منہ سے یہ بددعا نکلے گی۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾

اس نے اسے کس چیز سے پیدا کیا ⑱ ایک قطرے سے، اس نے اسے پیدا کیا، پس اس کا اندازہ مقرر کیا ⑲ پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا ⑳ پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا ㉑ پھر جب وہ چاہے گا اسے اٹھائے گا ㉒

③ "مَآ اَكْفَرَهٗ" کا معنی ہے "وہ کس قدر ناشکرا ہے!" دوسرا معنی ہے "(اتنی نعمتوں کے باوجود) وہ کون سی چیز ہے جس نے اسے ناشکرا بنا دیا ہے؟" (ابن جریر)

**آیت 19-18** مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ..... : یعنی اس شخص کو تکبر اور ناشکری کس طرح زیب دیتی ہے جسے اس کے بنانے والے نے منی کے ایک حقیر قطرے سے پیدا فرمایا؟ پیدا کرنے کے دوران اس کی ہر چیز کا اندازہ مقرر فرمایا کہ اتنی مدت نطفہ رہے گا، پھر علقہ، پھر مضغہ بے روح، پھر جاندار اور خوبصورت انسان بنے گا۔ پھر اس کی ہر چیز اندازے کے ساتھ بنائی، کوئی چیز بے ڈھب نہیں۔ پھر ماں کے شکم ہی میں وہ سب کچھ فرشتے کو لکھوا دیا جو اس نے زندگی بھر کرنا تھا۔ "فَقَدَّرَهٗ" میں تینوں چیزیں شامل ہیں۔

**آیت 20** ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ : پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا۔ اس کے تین معانی ہو سکتے ہیں، پہلا یہ کہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ آسان کر دیا، ورنہ ان تنگ ہڈیوں کے حصار سے نکل ہی نہ سکتا اور وہیں خود بھی مر جاتا اور ماں کی موت کا بھی باعث بنتا۔ دوسرا یہ کہ خیر و شر میں سے جس راستے پر چلنا چاہے وہی اس کے لیے آسان کر دیا اور تیسرا یہ کہ صحیح راستے کی پہچان اس کے لیے آسان کر دی، جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے پر ایمان لا سکتا ہے۔ تینوں معانی درست ہیں، مگر "مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ" کی مناسبت سے پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔ (التسہیل)

**آیت 21** ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ : پھر اسے موت دی جو آخرت کی مصلحت کے تحت ضروری تھی، پھر اسے قبر میں رکھوایا، اگر وہ یہ احسان نہ کرتا تو یہ جانوروں کی طرح زمین پر پڑا رہتا، متعفن ہو کر اللہ کی مخلوق کے لیے باعث آزار بنتا۔ اس کی بے حرمتی ہوتی، بے پردہ ہوتا اور اسے درندے نوچتے۔ "قَبَرَهٗ" قبر میں رکھا اور "اَقْبَرَهٗ" قبر میں رکھوایا۔ کوئی جل جائے، غرق ہو جائے یا اسے درندے کھا جائیں تو اس کے اجزا جہاں بھی ہیں وہ اس کے لیے قبر ہے۔ اگر کسی کو دفن نہ کیا جا سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے قبر نہیں ملی۔

**آیت 22** ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ : ان تمام قدرتوں کو دیکھ کر کیا یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا میں آدمی جو بھی کام کرتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی انجام ضرور سوچتا ہے، تو پروردگار نے اتنا بڑا سلسلہ کیا اس لیے پیدا فرمایا ہے کہ کوئی اس اکیلے کی پرستش کرے، کوئی اس کی نعمتوں کو بھول کر بتوں کی پرستش کرتا رہے اور کوئی ظلم کرے یا کسی پر ظلم ہو، مرنے کے بعد سب برابر

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾

ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا ﴿۲۳﴾ تو انسان کو لازم ہے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے ﴿۲۴﴾ کہ ہم نے پانی برسایا، خوب برسانا ﴿۲۵﴾ پھر ہم نے زمین کو پھاڑا، ایک عجیب طریقے سے پھاڑنا ﴿۲۶﴾ پھر ہم نے اس میں اناج اگایا ﴿۲۷﴾ اور انگور اور ترکاری ﴿۲۸﴾

ہو جائیں؟ نہ اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کر کے باز پرس فرمائے اور نہ کسی کو اس کے عمل کا بدلا ملے۔ نہیں، اللہ کے بارے میں یہ سوچنا ہی بے ادبی اور کفرانِ نعمت ہے۔ ان آیات میں اس بے ادبی پر اللہ تعالیٰ نے ”قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ“ کہہ کر خفگی کا اظہار فرمایا اور سورۂ مومنون میں فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ [ المؤمنون : ۱۱۵، ۱۱٦ ] ”تو کیا تم نے سمجھ لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ پس اللہ بہت بلند ہے جو سچا بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عزت والے عرش کا رب ہے۔“

**آیت 23** كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ : ”كَلَّا“ ہرگز نہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ کافر انسان جو سمجھتا ہے کہ اس کے مال و جان پر اللہ کا جو حق تھا وہ اس نے ادا کر دیا ہے، یہ ہرگز درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان نے بھی ابھی تک وہ فرائض ہی پورے ادا نہیں کیے جن کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا، حق کا ادا کرنا تو بہت دور ہے۔ ”لَمْ يَقْضِ“ پورا نہیں کیا۔ ”لَمَّا يَقْضِ“ ابھی تک پورا نہیں کیا۔ مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا: ” لَا يَقْضِيْ أَحَدٌ مَا أُمِرَ بِهٖ “ [ بخاري، التفسیر، باب سورۃ عبس، بعد ح : ٤٩٣٦ ] ”کوئی بھی شخص وہ کام پورا نہیں کرتا جس کا اسے حکم دیا گیا ہے ( کمی رہ ہی جاتی ہے )۔“

**آیت 24، 25** فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ ...... : پہلے آیت (۱۷) سے (۲۲) تک ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو انسان کی پیدائش اور اس کی ذات سے تعلق رکھتی تھیں، اب ان نعمتوں کا ذکر ہے جو اس کی ذات سے تو تعلق نہیں رکھتیں مگر ان کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ فرمایا اپنی قریب ترین چیز کھانے ہی کو دیکھ لو کہ اس کی تیاری کے لیے ہم نے کائنات کی کتنی قوتوں کو مصروفِ کار کر رکھا ہے۔ ”اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا“ میں مصدر کے ساتھ فعل کی تاکید فرمائی۔ ترجمہ میں اس تاکید کو ”خوب برسانا“ کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔

**آیت 26** ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا : ”شَقًّا“ ایک قسم کا پھاڑنا، یعنی زمین کو ہم نے عجیب طریقے سے پھاڑا۔ دانے سے نمودار ہونے والی کونپل خود کبھی زمین سے باہر نہیں نکل سکتی تھی، زمین میں ضرورت کے مطابق نرمی و نمی اور بیج میں یہ طاقت ہم نے رکھی کہ وہ زمین پھاڑ کر باہر نکل آیا۔

**آیت 27، 28** فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ...... : ”قَضْبًا“ ”قَضَبَ يَقْضِبُ“ (ض) (کاٹنا) کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے،

وَ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآىِٕقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ ﴿۳۵﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ ﴿۳۶﴾

اور زیتون اور کھجور کے درخت ﴿۲۹﴾ اور گھنے باغات ﴿۳۰﴾ اور پھل اور چارا ﴿۳۱﴾ تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے زندگی کا سامان ﴿۳۲﴾ پس جب کانوں کو بہرا کرنے والی (قیامت) آجائے گی ﴿۳۳﴾ جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا ﴿۳۴﴾ اور اپنی ماں اور اپنے باپ (سے) ﴿۳۵﴾ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے ﴿۳۶﴾

---

یعنی زمین کی وہ پیداوار جو سال میں کئی مرتبہ کاٹی جاتی ہے، مراد ترکاری ہے۔ وہ چارے بھی اس میں آجاتے ہیں جو بار بار کاٹے جاتے ہیں۔

**آیت 29** وَ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا : "نَخْلًا" کھجور کے درخت۔ کھجور کے پھل کے لیے دوسرے الفاظ ہیں، مثلاً "تمر" وغیرہ۔

**آیت 30** وَّ حَدَآىِٕقَ غُلْبًا : "حَدَآىِٕقَ" "حَدِيْقَةٌ" کی جمع ہے، پھل دار درختوں کا باغ جس کے گرد دیوار ہو۔ "حَدَقَ يَحْدِقُ" (ض) گھیرنا۔ "غُلْبًا" "أَغْلَبُ" اور "غَلْبَاءُ" کی جمع ہے۔ "غَلِبَ يَغْلَبُ" (س) موٹی گردن والا ہونا، مراد گھنے باغ۔

**آیت 31** وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا : "اَبًّا" زمین سے اگنے والی وہ نباتات جسے جانور کھاتے ہیں، لوگ نہیں کھاتے۔ (طبری عن ابن عباس وغیرہ) یہ "أَبَّ" (ن) (قصد کرنا) سے مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، یعنی "قصد کیا ہوا" کیونکہ جانور اس کی طرف لپکتے ہیں۔

**آیت 32** مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ : کائنات کا یہ عظیم الشان سلسلہ اور یہ تمام چیزیں تمھاری اور تمھارے ہی کام آنے والے جانوروں کی زندگی کے سامان کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اب اپنے کفران نعمت کو دیکھو کہ میں تمھاری خاطر یہ سب کچھ بنا سکتا ہوں مگر تمھارے خیال میں تمھیں مرنے کے بعد زندہ نہیں کر سکتا۔ نہیں، میں تمھیں ضرور دوبارہ زندہ کروں گا۔ آگے قیامت کا ذکر فرمایا۔

**آیت 33** فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ : "الصَّآخَّةُ" یعنی کانوں کو بہرا کر دینے والی نفخ صور کی ہولناک آواز جس سے قیامت قائم ہو جائے گی۔

**آیت 34 تا 36** ❶ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ...... : اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن آدمی کے ان لوگوں سے بھاگنے کا ذکر فرمایا جن سے محبت ہوتی ہے اور ترتیب میں محبت کے درجات کو ملحوظ رکھا، پہلے اس کا ذکر فرمایا جس کے ساتھ کم محبت ہوتی ہے، بڑھتے بڑھتے آخر میں بیٹوں کا ذکر فرمایا جن کے ساتھ مقدم الذکر تمام لوگوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ (التسہیل) جب اپنے پیاروں سے بھاگے گا تو دوسروں کا کیا ذکر؟

❷ سورۂ معارج میں اس کے برعکس بیٹوں سے شروع کیا اور فرمایا کہ مجرم کی دلی خواہش ہوگی کہ اس دن کے عذاب سے بچنے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

ع ۱ / ۴۲ / ۵

اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی ﴿۳۷﴾ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے ﴿۳۸﴾ ہنستے ہوئے، بہت خوش ﴿۳۹﴾ اور کچھ چہرے، اس دن ان پر ایک غبار ہوگا ﴿۴۰﴾ ان کو سیاہی ڈھانپتی ہوگی ﴿۴۱﴾ یہی ہیں جو کافر ہیں، نافرمان ہیں ﴿۴۲﴾

کے لیے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو اور اپنے پناہ دینے والے قبیلے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو فدیہ میں دے کر اپنی جان بچالے۔ دیکھیے سورۂ معارج (۱۰ تا ۱۴)۔

③ بھاگنے کی وجہ وقوع قیامت کی وجہ سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ اور بدحواسی ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر باقی انبیاء علیہم السلام بھی "نَفْسِيْ نَفْسِيْ" کہیں گے۔ اس کے علاوہ یہ خوف ہوگا کہ رشتہ دار کوئی حق نہ مانگ لے، اس کے خلاف کوئی شہادت نہ پیش کر دے اور ظلم کے بدلے میں اس کے گناہ نہ اٹھانے پڑ جائیں وغیرہ۔

**آیت 37** لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ ...... : عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( تُحْشَرُوْنَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا، قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلٰی بَعْضٍ؟ فَقَالَ الْأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يُهِمَّهُمْ ذَاكِ )) [ بخاري، الرقاق، باب كيف الحشر : ٦٥٢٧ ] "تم ننگے پاؤں، ننگے جسم، بغیر ختنہ کی حالت میں اٹھائے جاؤ گے۔" عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! پھر تو مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "معاملہ اس سے سخت ہوگا کہ یہ بات ان کی سوچ میں بھی آئے۔" ترمذی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر یہ آیت پڑھی: ﴿ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴾ [ عبس : ۳۷ ] "اس دن ان میں سے ہر آدمی کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے بے پروا بنا دے گی۔" [ ترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة عبس : ٣٣٣٢، قال الشيخ الألباني حسن صحيح ]

**آیت 38، 39** وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ...... : چہروں کی یہ روشنی اور خوشی اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیے جانے کے بعد ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴾ [ الانشقاق: ۷ تا ۹ ] "تو اس وقت جس شخص کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے گھر والوں کی طرف واپس آئے گا۔"

**آیت 40 تا 42** وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ...... : کافر اور فاجر لوگوں کے چہروں پر سیاہی کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس کی آیت (۲۷) کی تفسیر۔

سورۃ التکویر ۸۱ مکیۃ | بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ | اٰیاتھا ۲۹ رکوعھا ۱

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۪ۙ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا ﴿۱﴾ اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے ﴿۲﴾ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے ﴿۳﴾

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَّنْظُرَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُ رَأْيُ عَيْنٍ فَلْيَقْرَأْ: ﴿ اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ﴾ [ التکویر : ۱ ] وَ ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ﴾ [ الانفطار : ۱ ] وَ ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ﴾ [ الانشقاق : ۱ ] )) [ مسند أحمد : ۲/۲۷، ح : ۴۸۰۶۔ ترمذي : ۳۳۳۳، سنده صحیح ] ''جسے یہ بات پسند ہو کہ وہ قیامت کے دن کی طرف ایسے دیکھے جیسے آنکھ سے دیکھتا ہے تو وہ سورۂ تکویر، سورۂ انفطار اور سورۂ انشقاق پڑھ لے۔''

اس سورت کی ابتدائی آیات میں قیامت کو واقع ہونے والی بارہ چیزیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی چھ چیزیں پہلے نفخہ کے وقت ہوں گی اور آخری چھ چیزیں دوسرے نفخہ کے وقت۔ ان کے بعد تیرھویں آیت میں وہ بات بیان فرمائی جو ان سب چیزوں کے ذکر سے مقصود ہے، یعنی اس وقت ہر جان جو کچھ لے کر آئی ہے اسے جان لے گی۔

**آیت 1** **اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ** : ''كَوْرُ الْعِمَامَةِ وَ تَكْوِيْرُهَا'' پگڑی لپیٹنا۔ ''تَكْوِيْرُ الْمَتَاعِ'' سامان جمع کر کے باندھ دینا۔ (خلاصہ قاموس) ''**کُوِّرَتۡ**'' یعنی اتنی وسعت والے سورج، اس کی شعاعوں اور روشنی کو لپیٹ دیا جائے گا اور وہ بالکل بے نور ہو جائے گا۔ چاند کا بھی یہی حال ہوگا، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكَوَّرَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر : ۳۲۰۰ ] ''سورج اور چاند قیامت کے دن لپیٹ دیے جائیں گے۔''

**آیت 2** **وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ** : ''**انۡکَدَرَتۡ**'' طبری نے اس کے دو معانی نقل فرمائے ہیں، پہلا ''تَنَاثَرَتْ'' یعنی بکھر کر گر جائیں گے اور دوسرا ''تَغَيَّرَتْ'' یعنی متغیر ہو جائیں گے۔ کدورت صفائی کی ضد ہے۔ دونوں معانی ملحوظ رکھے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ستارے بکھر کر گر جائیں گے، ان کی روشنی اور صفائی ختم ہو جائے گی اور وہ بے نور ہو جائیں گے۔

**آیت 3** **وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ** : اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو زمین کے اندر گاڑ رکھا ہے اور زمین میں وہ کشش رکھی ہے جو انھیں باندھ کر رکھے ہوئے ہے۔ اللہ کے حکم سے قیامت کے دن وہ کشش ختم ہو جائے گی اور یہ جامد پہاڑ دھنی ہوئی اُون کی طرح ذرہ ذرہ ہو کر بادلوں کی طرح چل پڑیں گے، حتیٰ کہ سراب کی طرح ہو جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ سُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَکَانَتۡ سَرَابًا ﴾ [ النبا : ۲۰ ] ''اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن جائیں گے۔'' مزید تفصیل کے لیے سورۂ نبا کی اسی آیت کی تفسیر دیکھیے۔

وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿۴﴾ وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴿۵﴾ وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿۶﴾ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿۷﴾ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾

**اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی ﴿۴﴾ اور جب جنگلی جانور اکٹھے کیے جائیں گے ﴿۵﴾ اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے ﴿۶﴾ اور جب جانیں ملائی جائیں گی ﴿۷﴾ اور جب زندہ دفن کی گئی (لڑکی) سے پوچھا جائے گا ﴿۸﴾ کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی؟ ﴿۹﴾**

**آیت 4** وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ: "اَلْعِشَارُ" "عُشَرَاءُ" کی جمع ہے، دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں جو عربوں کے ہاں نہایت عزیز ہوتی تھیں۔ صور پھونکے جانے کی ابتدا میں جو گھبراہٹ پیدا ہوگی اس میں اتنی نفیس اور عزیز چیزوں کو بھی کوئی نہیں سنبھالے گا، ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔

**آیت 5** وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ : جنگلی جانور جو ایک دوسرے سے بھاگتے ہیں، اس گھبراہٹ میں جمع ہو جائیں گے، کوئی کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔

**آیت 6** وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ : "سَجَرَ التَّنُّوْرَ" اس نے تنور جلایا۔ "سَجَّرَ" میں مبالغہ ہے، خوب بھڑکایا۔ سمندروں کے بھڑکائے جانے کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ زمین کے نیچے جو بے پناہ حرارت اور آگ ہے، جو آتش فشاں پہاڑوں کے بیدار ہونے کی صورت میں کبھی کبھی ظاہر ہوتی رہتی ہے، وہ اللہ کے حکم سے سمندروں کو بھڑکا کر انھیں بھاپ بنا کر اڑا دے گی۔ پھر پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی ختم ہو کر زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسوں کا مرکب ہے، جن میں سے ایک جلانے والی اور دوسری جلنے والی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کی عجیب قدرت ہے کہ ان دونوں کو ملا کر آگ بجھانے والا پانی بنا دیا ہے۔ قیامت کے وقت اللہ کے حکم سے ان دونوں کا ملاپ ختم ہو جائے گا اور وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ کر بھڑکانے اور بھڑکنے لگیں گی، جس سے سمندروں کا یہ بے حساب پانی چشم زدن میں اڑ جائے گا۔ بہرحال اللہ کا حکم ہوگا تو سمندر آگ سے بھڑکنے لگیں گے۔

**آیت 7** وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ : ''اور جب جانیں ملائی جائیں گی'' اس کی دو تفسیریں ہیں، پہلی یہ کہ جانیں جسموں کے ساتھ ملائی جائیں گی۔ یہاں سے دوسرے نفخہ کے بعد کے حالات ہیں، تو سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ دوسری یہ کہ جانوں کی قسمیں بنا دی جائیں گی، نیکوں کو نیکوں کے ساتھ اور گناہ گاروں کو گناہ گاروں کے ساتھ ملا دیا جائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ﴾ [ الصافات : ۲۲ ] ''جمع کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم شکلوں کو اور ان کو جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔'' دوسری تفسیر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے۔

[ دیکھیے بخاري، التفسیر، باب : ﴿إذا الشمس كورت﴾، بعد ح : ۴۹۳۷ ]

**آیت 9، 8** ① وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ...... : "اَلْمَوْءٗدَةُ" وہ لڑکی جسے زندہ دفن کر دیا گیا ہو۔ جاہلیت میں بعض عرب عار

وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾

اور جب اعمال نامے پھیلائے جائیں گے ﴿۱۰﴾ اور جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی ﴿۱۱﴾

سے بچنے کے لیے لڑکیاں زندہ دفن کر دیتے تھے کہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں یا کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ بعض فقر کی وجہ سے ایسا کرتے تھے اور بعض تو فقر کی وجہ سے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ہندوستان کے راجپوتوں اور بعض دوسری قوموں میں بھی یہ رواج رہا ہے، آج کل برتھ کنٹرول کے نام سے حکومتیں منظم طریقے سے یہ کام کر رہی ہیں۔ چین میں شہروں میں ایک بچے اور دیہاتوں میں صرف دو بچوں کی اجازت ہے۔ چونکہ اکثر لوگوں کو لڑکے مرغوب ہوتے ہیں، اس لیے لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں کئی مائیں دودھ ہی نہیں پلاتیں اور اس طرح قتل کا ارتکاب کرتی ہیں۔ مسلمان ملکوں کے بعض حکمران بھی کفار کی ترغیب سے رزق کے وسائل کی کمی (املاق) کا بہانہ بنا کر تحدید نسل بلکہ مسلمانوں کی نسل کشی کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور اس کے لیے ایسے طریقے پھیلا رہے ہیں جن سے بچہ پیدا ہونے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً جرثومے اور بیضے کی رگ ہی کاٹ دینا اور دوسرے ناقابل بیان طریقے اور یہ کام اس رسول ﷺ کی امت کے لوگ کر رہے ہیں جس نے عزل (جماع کرتے ہوئے انزال کے وقت بیوی سے علیحدہ ہو جانے) کو بھی ناپسند فرمایا، حالانکہ عزل کی صورت میں حمل کا امکان رہتا ہے، کیونکہ منی کے جرثومے انزال سے پہلے بھی مذی کے ذریعے سے رحم میں داخل ہو سکتے ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ عزل کرو یا نہ کرو، جو بچہ پیدا ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ اس کے باوجود ایک مرتبہ جب لوگوں نے آپ سے عزل کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: « ذٰلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ وَهِيَ : ﴿ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴾ [التکویر: ۸] » [مسلم، النکاح، باب جواز الغیلة...... : ۱۴۴۲/۱۴۱] ”یہ پوشیدہ طریقے کا زندہ دفن کرنا ہے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وعید کے تحت آتا ہے کہ جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا۔“ مقصد یہ ہے کہ عزل میں امکان حمل کے باوجود اس کے تسلسل کا نتیجہ نسل انسانی کی ہلاکت ہے۔ اس حدیث سے منع حمل کے دوسرے ظالمانہ طریقوں کی وعید خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے۔

**آیت 10** ﴿ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ : اعمال نامے جو بند تھے، پھیلا کر سامنے کر دیے جائیں گے، تاکہ ہر عمل کرنے والا اپنے عمل خود پڑھ لے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ لوگوں میں ان کے اعمال نامے دائیں یا بائیں ہاتھوں میں پھیلا دیے جائیں گے۔

**آیت 11** ﴿ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ : ”كَشَطَ“ (ض) ”اَلشَّيْءَ“ کسی چیز سے وہ چیز اتار دینا جس نے اسے ڈھانپ رکھا ہو۔ ”كَشَطَ الْبَعِيْرَ“ اونٹ کی کھال اتارنا۔ عالم بالا پر آسمان کا پردہ جو کھال کی طرح چڑھا ہوا ہے اسے اتار کر تہ کر دیا جائے گا۔ (طبری) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۴] ”جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔“ کھال اتار دیے جانے کے بعد عالم بالا سب کے سامنے آشکار ہو جائے گا۔

وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ ﴿۱۳﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴿۱۴﴾ فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَ الَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ﴿۱۷﴾ وَ الصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۹﴾

اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی ﴿۱۲﴾ اور جب جنت قریب لائی جائے گی ﴿۱۳﴾ ہر جان، جان لے گی جو لے کر آئی ﴿۱۴﴾ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان (ستاروں) کی جو پیچھے ہٹنے والے ہیں! ﴿۱۵﴾ جو چلنے والے ہیں، چھپ جانے والے ہیں! ﴿۱۶﴾ اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے! ﴿۱۷﴾ اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے! ﴿۱۸﴾ بے شک یہ یقیناً ایک ایسے پیغام پہنچانے والے کا قول ہے جو بہت معزز ہے ﴿۱۹﴾

**آیت 13،12** ﴿ وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ …… : یہ دونوں چیزیں میدانِ محشر میں ہوں گی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فجر (۲۳) اور سورۂ شعراء (۹۰، ۹۱) کی تفسیر۔

**آیت 14** ﴿ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ : شروع سورت سے یہاں تک کل بارہ چیزوں کا ذکر ہوا ہے، جب یہ بارہ چیزیں ہو جائیں گی تو کیا ہوگا؟ اس کا جواب ہے: ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ﴾ کہ ہر جان جو کچھ لے کر آئی ہے اسے جان لے گی۔ "نَفۡسٌ" کی تنکیر عموم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "ہر جان" کیا گیا ہے۔

**آیت 16،15** ﴿ فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ …… : "اَلۡخُنَّسُ" "خَنَسَ" (ض) (پیچھے ہٹنا) سے "خَانِسٌ" کی جمع بروزن "رُکَّعٌ" ہے۔ "خَنَّاسٌ" بھی اسی سے ہے۔ اسی طرح "الۡکُنَّسِ" "کَانِسٌ" کی جمع ہے۔ "کِنَاسٌ" ہرن وغیرہ کی درختوں میں بنائی ہوئی جگہ، جہاں وہ چھپ جاتے ہیں۔ "کَنَسَ" (ض) چھپنے کی جگہ میں داخل ہوگیا، چھپ گیا۔ "الۡجَوَارِ" "جَرٰی یَجۡرِیۡ" سے "جَارِیَۃٌ" کی جمع ہے۔ مراد سورج، چاند اور ستارے ہیں۔ انھیں "اَلۡخُنَّسُ" (پیچھے ہٹنے والے) اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ سب مغرب میں غروب ہونے کے بعد پھر پیچھے یعنی مشرق کی طرف آنا شروع ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ مشرق سے دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں۔ "الۡجَوَارِ" چلنے والے، یعنی ان کا کام ہی چلتے رہنا ہے، مغرب سے واپس مشرق کی طرف اور وہاں سے دوبارہ مغرب کی طرف۔ "الۡکُنَّسِ" چھپنے والے، یعنی مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

**آیت 18،17** ﴿ وَ الَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ …… : "عَسۡعَسَ" آنے اور جانے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ "تَنَفَّسَ" سانس لیتے ہوئے چھاتی پھیلتی ہے، صبح کی روشنی پھیلنے کی کیفیت کی نقشہ کشی انسان کے سانس لینے کی کیفیت کے ساتھ کی ہے۔

**آیت 19** ﴿ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ : یہ ان قسموں کا جواب ہے، یعنی امر الٰہی کے پابند یہ سیارے، روزانہ جاتی ہوئی

ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿۲۳﴾

بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے ﴿۲۰﴾ وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، امانت دار ہے ﴿۲۱﴾ اور تمھارا ساتھی ہرگز کوئی دیوانہ نہیں ہے ﴿۲۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً اس نے اس (جبریل) کو (آسمان کے) روشن کنارے پر دیکھا ہے ﴿۲۳﴾

رات اور پھیلتی ہوئی صبح کا یہ مستحکم نظام زبردست شہادت ہے کہ یہ وحی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک نہایت معزز اور ان عظیم صفات والا فرشتہ (جبریل علیہ السلام) ہی لے کر آیا ہے۔ دن رات، سورج چاند اور ستاروں کے نظام کی طرح یہاں بھی کسی شیطان کا دخل نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں "رَسُوْلٍ" سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، کیونکہ مشرکین مکہ کبھی کہتے: ﴿ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ﴾ [ النحل : ۱۰۳ ] ''اسے کوئی بشر ہی سکھاتا ہے۔'' کبھی کہتے: ﴿ اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ﴾ [ سبا : ۸ ] ''کیا اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا یہ دیوانہ ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کے قول کے جھٹلانے کو یہ آیات نازل فرمائیں اور فرمایا کہ نہ اللہ کے رسول مجنون اور دیوانے ہیں، نہ انھوں نے اپنی طرف سے اس قرآن کو بنایا ہے اور نہ کسی انسان نے انھیں یہ قرآن سکھایا ہے۔ یہ ایسا کلام نہیں ہے جس طرح شیاطین چوری سے آسمان کی کچھ باتیں سن کر کاہنوں سے کہہ دیتے ہیں، بلکہ پیغام کے طور پر اللہ کی طرف سے ایک صاحب قوت، معتبر اور امانت دار فرشتے نے یہ قرآن اللہ کے نبی کو پہنچایا ہے۔ (احسن التفاسیر)

**آیت 20** ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ : "ذِیْ قُوَّةٍ" کی تنوین تعظیم کے لیے ہے، بڑی قوت والا۔ سورۂ نجم میں بھی جبریل علیہ السلام کا یہ وصف بیان ہوا ہے، فرمایا: ﴿ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ﴾ [ النجم : ۵، ۶ ] ''اسے نہایت مضبوط قوتوں والے (فرشتے) نے سکھایا۔ جو بڑی طاقت والا ہے۔'' جبریل علیہ السلام کی قوت کا ذکر یہاں اس لیے فرمایا ہے کہ ان کی قوت کے سبب سے شیطان ان سے بھاگتا ہے، جیسا کہ بدر میں انھیں دیکھ کر بھاگا تھا۔ (دیکھیے انفال: ۴۸) مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام کی قوت کی وجہ سے ان کی پیغام رسانی میں نہ شیطان کا کچھ دخل ہے اور نہ ان کی امانت داری کے سبب اس پیغام رسانی میں کسی خیانت کا دخل ہے، اس لیے کسی شک و شبہ کے بغیر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ (خلاصہ احسن التفاسیر)

**آیت 21** مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ : وہاں اس کی بات مانی ہوئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں میں سے ہے، جیسا کہ حدیث معراج میں ہے کہ جبریل علیہ السلام کے کہنے پر آسمان کے دروازے کھلے۔

**آیت 23** وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ: روشن کنارے سے مراد آسمان کا مشرقی کنارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے، ایک دفعہ زمین پر اور دوسری دفعہ آسمان پر۔ (دیکھیے نجم: ۱ تا ۱۸) یہاں پہلی مرتبہ کا ذکر ہوا ہے، آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا، ان کے چھ سو پر تھے اور پورا افق ان سے بھرا ہوا

وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور وہ غیب کی باتوں پر ہرگز بخل کرنے والا نہیں ﴿۲۴﴾ اور وہ ہرگز کسی مردود شیطان کا کلام نہیں ﴿۲۵﴾ پھر تم کہاں جا رہے ہو؟ ﴿۲۶﴾ یہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جہانوں کے لیے نصیحت ہے ﴿۲۷﴾ اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے ﴿۲۸﴾ اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے ﴿۲۹﴾

تھا۔[ دیکھیے بخاري، بدء الخلق، باب إذا قال أحدکم آمین..... : ۳۲۳۴ تا ۳۲۳۵ ]

**آیت 24** وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ : "ضَنِيْنٌ" بخیل۔ یعنی اللہ تعالیٰ انھیں غیب کی جو بات بتاتے ہیں وہ اسے اپنے پاس ہی نہیں رکھ لیتے بلکہ امت تک پہنچا دیتے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « مَنْ حَدَّثَكَ أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَمَ شَيْئًا مِمَّا أُنْزِلَ عَلَيْهِ، فَقَدْ كَذَبَ، وَاللّٰهُ يَقُوْلُ: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ » [ بخاري، التفسیر، باب : ﴿يا أيها الرسول بلغ ...﴾ : ۴۶۱۲ ] "جو شخص تمھیں بتائے کہ محمد ﷺ نے آپ پر نازل ہونے والی کوئی بات چھپائی ہے، تو اس نے یقیناً جھوٹ بولا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ [ المائدۃ : ۶۷ ] "اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔"

بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ مطلب نکالا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب جانتے تھے، کیونکہ بخل وہی کر سکتا ہے جس کے پاس کوئی چیز موجود ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [ النمل : ۶۵ ] "(اے نبی!) کہہ دے، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو غیب کی جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ لوگوں کو بتانے میں آپ بخل نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو غیب کی کچھ باتیں بتا دی جائیں تو وہ اس سے عالم الغیب نہیں بن جاتا، کیونکہ وہ صرف اتنی بات جانتا ہے زیادہ نہیں۔ ورنہ اگر اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیب کی کئی باتیں بتائی ہیں تو امت کو بھی عالم الغیب ماننا پڑے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ بتایا گیا تھا آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق وہ سب کچھ امت کو بتا دیا۔

**آیت 29** وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ : یعنی تمھارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے اور توفیق دینے پر موقوف ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ یونس (۱۰۰)، انعام (۱۱۲)، قصص (۵۶) اور سورۂ دہر (۳۰)۔

سورۃ الانفطار ۸۲ آیاتہا ۱۹ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿۶﴾ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ﴿۷﴾ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴿۸﴾ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ﴿۹﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا ﴿۱﴾ اور جب ستارے بکھر کر گر جائیں گے ﴿۲﴾ اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے ﴿۳﴾ اور جب قبریں الٹ دی جائیں گی ﴿۴﴾ ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا ﴿۵﴾ اے انسان! تجھے تیرے نہایت کرم والے رب کے متعلق کس چیز نے دھوکا دیا؟ ﴿۶﴾ وہ جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر تجھے برابر کیا ﴿۷﴾ جس صورت میں بھی اس نے چاہا تجھے جوڑ دیا ﴿۸﴾ ہرگز نہیں، بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو ﴿۹﴾

**آیت 3** وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ : یہاں فرمایا کہ سمندر پھاڑ دیے جائیں گے، پچھلی سورت میں فرمایا بھڑکائے جائیں گے، تو دونوں باتیں ہی حق ہیں، پہلے قیامت کے شدید زلزلوں سے ساری زمین جا بجا پھٹ جائے گی، سمندر درمیان میں حائل رکاوٹیں ختم ہونے سے ایک ہو جائیں گے، پھر ان میں آگ لگ جائے گی۔

**آیت 4** وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ : دوسرے نفخہ سے قبریں پھٹیں گی اور مردے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔

**آیت 5** عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ : جو اچھے یا برے اعمال موت سے پہلے کیے، یا جو اچھے یا برے طریقے پیچھے چھوڑ گیا، جن کے ثواب و عذاب کا سلسلہ اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہا، وہ سب سامنے آ جائیں گے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو عمل شروع عمر میں کیے اور جو آخر عمر میں کیے۔

**آیت 5** يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ : اتنی مہربانیوں والے رب کے متعلق دھوکا کھانے اور کفر کرنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

**آیت 8،7** الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ...... : وہ تجھے بے ڈھب بنا سکتا تھا، بندر، خنزیر یا کوئی اور جانور بھی بنا سکتا تھا۔ اتنی اچھی ترکیب سے جب پہلے بنا دیا تو جزائے اعمال کے لیے دوبارہ کیوں نہیں بنا سکتا؟

**آیت 9** كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ : یعنی دھوکا کھانے کا سبب یہ نہیں کہ تمھیں رب کریم کی مہربانیوں پر بہت اعتماد ہے، بلکہ یہ باطل خیال ہے کہ ہمیں نہ دوبارہ زندہ ہونا ہے اور نہ اعمال کا بدلا ملنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام بداعمالیوں کا اصل

وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۚۖ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ؕ﴿۱۶﴾

حالانکہ بلاشبہ تم پر یقیناً نگہبان (مقرر) ہیں ﴿۱۰﴾ جو بہت عزت والے ہیں، لکھنے والے ہیں ﴿۱۱﴾ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۲﴾ بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے ﴿۱۳﴾ اور بے شک نافرمان لوگ یقیناً بھڑکتی آگ میں ہوں گے ﴿۱۴﴾ وہ اس میں جزا کے دن داخل ہوں گے ﴿۱۵﴾ اور وہ اس سے کبھی غائب ہونے والے نہیں ہیں ﴿۱۶﴾

سبب روز جزا کو جھٹلانا ہے اور اسی کو تم جھٹلا رہے ہو۔

**آیت 11، 10** وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ...... : حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں، یعنی فرشتے۔ "حَافِظِيْنَ" یعنی کوئی عمل ان کی نگرانی سے باہر نہیں۔ "كِرَامًا" عزت والے، اس لیے کہ وہ لکھنے میں کوئی خیانت نہیں کرتے، نہ کوئی بات لکھنے سے چھوڑتے ہیں اور نہ زیادہ لکھتے ہیں۔

**آیت 12** يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ : تمھارا کوئی مخفی سے مخفی کام، حتیٰ کہ تمھاری نیتیں اور ارادے بھی ان سے پوشیدہ نہیں۔ لہٰذا تمھارا یہ سمجھنا کہ تمھارے چھپا کر کیے ہوئے گناہ ریکارڈ میں نہیں آئیں گے اور تم ان کی سزا سے بچ جاؤ گے، زبردست نادانی ہے۔ ان فرشتوں کا مزید ذکر سورۂ ق (۱۷، ۱۸) میں دیکھیے۔

**آیت 14، 13** اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ...... : فرشتوں کے تیار کردہ اعمال ناموں کا نتیجہ یہ ہے کہ نیک لوگ نعمت میں اور نافرمان بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوں گے۔ "الْاَبْرَارَ" "بَرٌّ" کی جمع ہے، وہ شخص جس میں "بِرٌّ" (نیکی) پائی جائے۔ نیکی کیا ہے اور نیک کون ہے اس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت (۱۷۷) یعنی "آیت برّ" میں ملاحظہ فرمائیں۔ "الْفُجَّارَ" "فَاجِرٌ" کی جمع ہے، یہاں مراد کافر ہیں، کیونکہ مومن ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔

**آیت 16، 15** يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ...... : "بِغَآئِبِيْنَ" پر باءِ نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "کبھی غائب ہونے والے نہیں۔" کیا گیا ہے۔ فاجر لوگ قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، کبھی اس سے نہیں نکلیں گے۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اگرچہ وہ قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوں گے مگر اس سے پہلے قبر میں بھی وہ آگ سے غائب نہیں ہیں، جیسا کہ آل فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [المؤمن: ٤٥، ٤٦] "اور آلِ فرعون کو بدترین عذاب نے گھیر لیا جو آگ ہے۔ اس پر صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (کہا جائے گا کہ) آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔"

وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ ﴿۱۷﴾ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ ﴿۱۸﴾ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا ﴿۱۹﴾

**آیت 18، 17** وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۔۔۔ : قیامت کی عظمت و اہمیت ذہن میں بٹھانے کے لیے سوال اور پھر تکرار سوال ہے۔

**آیت 19** يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۔۔۔ : دنیا میں بظاہر لوگوں کی کچھ ملکیت بھی ہے اور ایک حد تک نفع و ضرر کا اختیار بھی ہے، مگر قیامت کے دن اللہ کے علاوہ نہ کسی کا اختیار رہے گا، نہ ملکیت اور نہ حکومت، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المومن : ۱٦] ''آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟ صرف اللہ کی جو ایک ہے، زبردست ہے۔'' رہی شفاعت تو وہ بھی کسی کے اختیار میں نہیں ہوگی، بلکہ صرف وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا، فرمایا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرۃ : ۲۵۵] ''کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔'' مزید دیکھیے سورۂ نبا کی آیت (۳۸) کی تفسیر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ﴿۲﴾ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ؕ﴿۳﴾ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ﴿۴﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ﴿۵﴾ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بڑی ہلاکت ہے ماپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ① وہ لوگ کہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔ ② اور جب انھیں ماپ کر یا انھیں تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں ③ کیا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں ④ ایک بہت بڑے دن کے لیے ⑤ جس دن لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے ⑥

**آیت 1** وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ : "اَلتَّطْفِيْفُ" ماپ یا تول میں کمی کرنا۔ ماپ تول کے علاوہ لین دین کے جتنے بھی دیگر پیمانے ہیں ان میں کمی بھی "اَلتَّطْفِيْفُ" ہے۔ "اَلطَّفِيْفُ" بالکل تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں۔ "صاع" بھرا ہوا ہو، مگر پورا بھرنے سے کم ہو تو اس کمی کو "طَفَفُ الصَّاعِ" کہتے ہیں۔ چونکہ ماپ تول میں کمی کرنے والا کوئی بڑا مال نہیں چراتا بلکہ تھوڑی سی چیز چراتا ہے، اس لیے اسے "اَلْمُطَفِّفُ" کہتے ہیں۔ یہ فعل کمینگی کی انتہا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اتنی تھوڑی تھوڑی چیز کی چوری کرنے والا شخص بڑا مال اڑانے سے بھی پرہیز کرنے والا نہیں، صرف اپنی کم ہمتی یا پکڑے جانے کے خوف سے اتنی چوری پر صبر کیے بیٹھا ہے، ورنہ اس کی طبیعت کے فاسد ہو جانے اور امانت سے خالی ہو جانے میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل شنیع کا ارتکاب کرنے والوں کو "وَيْلٌ" کی وعید سنائی ہے، جس کا معنی ہلاکت ہے۔ آخرت میں ہونے والی ہلاکت کا تو کچھ شمار ہی نہیں، اس کی کچھ تفصیل اسی سورت میں آ رہی ہے، اگرچہ وہ مکذبین (جھٹلانے والوں) کے لیے ہے، مگر یہ فعل بھی آخرت کی تکذیب ہی سے سرزد ہوتا ہے، جبکہ دنیا میں اس سے ہونے والی ہلاکت رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی، حدیث لمبی ہے، اس کا ایک فقرہ یہ ہے: (( وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ، إِلَّا أُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ، وَشِدَّةِ الْمَؤُوْنَةِ، وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ )) [ ابن ماجه، الفتن، باب العقوبات : ۴۰۱۹ ] "جو قوم بھی ماپ تول میں کمی کرتی ہے اسے قحط سالیوں، سخت مشقت اور حکمرانوں کے ظلم کے ساتھ پکڑ لیا جاتا ہے۔" شیخ البانی رحمہ اللہ نے مستدرک حاکم کی سند کی وجہ سے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ [ دیکھیے سلسلة الأحادیث الصحیحة : ۱۰۶ ] شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

تنبیہ: ترمذی کی روایت کہ "ویل جہنم کی ایک وادی ہے" صحیح نہیں۔ [ دیکھیے ضعیف ترمذي، سورة الأنبیاء : ۳۳۸۹ ]

**آیت 4** اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ ...... : یعنی اگر وہ سمجھتے کہ ہمیں ایک دن پیش ہو کر حساب دینا ہے تو کبھی ماپ تول میں کمی نہ کرتے۔

**آیت 6،5** لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ...... : "ایک بڑے دن کے لیے" بڑا دن اس لیے کہ اس کی مقدار ہی پچاس ہزار سال ہے۔ (دیکھیے معارج: ۴) اور اس لیے بھی بڑا ہے کہ پیشی عام عدالت میں بھی گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہے، اس دن تو رب العالمین

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَ مَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ہرگز نہیں، بے شک نافرمان لوگوں کا اعمال نامہ یقیناً دائمی سخت قید کے دفتر میں ہے ⑦ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ دائمی سخت قید کا دفتر کیا ہے؟ ⑧ ایک کتاب ہے، واضح لکھی ہوئی ⑨ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ⑩ جو جزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں ⑪ اور اسے کوئی نہیں جھٹلاتا مگر ہر حد سے نکل جانے والا، سخت گناہ گار ⑫ جب اس کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ⑬

کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: « تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتّٰى تَكُوْنَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ فَيَكُوْنُ النَّاسُ عَلٰى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَّكُوْنُ إِلٰى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّكُوْنُ إِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّكُوْنُ إِلٰى حَقْوَيْهِ وَ مِنْهُمْ مَنْ يُّلْجِمُهُ الْعَرَقُ إِلْجَامًا قَالَ وَ أَشَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ إِلٰى فِيْهِ » [ مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب في صفة يوم القيامة ...... : ٢٨٦٤ ] ''قیامت کے دن سورج مخلوق کے قریب ہو جائے گا یہاں تک کہ ان سے ایک میل کی مقدار کی طرح ہوگا۔ تو لوگ اپنے اعمال کے اندازے کے مطابق پسینے میں ہوں گے، جو ان میں سے بعض کے ٹخنوں تک ہوگا، بعض کے گھٹنوں تک، بعض کی کمر تک اور بعض کو پسینا لگام کی طرح لگام ڈال لے گا۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کے ساتھ اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا۔'' ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کانوں کے نصف تک پسینے کا ذکر کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''جس دن لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے۔'' [ بخاري، التفسير، باب : ﴿ يوم يقوم الناس ..... ﴾ : ٤٩٣٨ ]

**آیت 7 تا 11** ﴿ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ...... ﴾ : ''كَلَّآ'' یعنی یہ بات ہرگز نہیں کہ تم جس طرح چاہو اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے ماپ تول میں کمی کرتے رہو اور وہ وقت ہی نہ آئے کہ تم سے اس ظلم کے متعلق باز پرس ہو۔ نہیں، بلکہ نافرمان لوگوں کا اعمال نامہ سجین میں ہے۔ ''سِجِّيْنٌ'' ''سِجْنٌ'' سے مبالغہ ہے، جس کا معنی قید خانہ ہے۔ قاموس میں ہے: ''اَلسِّجِّيْنُ الدَّائِمُ الشَّدِيْدُ'' یعنی دائمی سخت قید۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں ہمیشہ جہنم میں رہنے والوں کے نام اور ان کے اعمال محفوظ ہیں (گویا یہ دائمی قید والوں کا رجسٹر ہے)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ''سِجِّيْنٌ'' کی وضاحت کی ہے کہ وہ ''كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ'' یعنی ایک واضح لکھی ہوئی کتاب ہے، جس میں کوئی کمی بیشی یا رد و بدل نہیں ہو سکتا کہ کوئی نام یا عمل داخل کر دیا جائے یا مٹا دیا جائے۔ ''وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ'' سے معلوم ہوا کہ ماپ تول میں کمی کرنے والے درحقیقت قیامت کے دن پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴ كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝۱۵ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝۱۶ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۷

ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے ۝۱۴ ہرگز نہیں، بے شک وہ اس دن یقیناً اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے ۝۱۵ پھر بے شک وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں یقیناً داخل ہونے والے ہیں ۝۱۶ پھر کہا جائے گا یہی ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ۝۱۷

آیت 14 ❶ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ......: "كَلَّا" "ہرگز نہیں" مطلب یہ ہے کہ اس جھٹلانے والے کے آیات کو جھٹلانے کی وجہ یہ نہیں کہ یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں یا ان کے حق ہونے میں کوئی شبہ ہے، بلکہ اس کی بداعمالیاں سیاہ زنگ کی صورت میں اس کے دل پر غالب آ چکی ہیں، اسے نہ حق حق نظر آتا ہے نہ باطل باطل۔ مستشرقین اور منکرین حدیث کی طرح پہلے منکرین کا بھی یہی حال تھا کہ اگر قرآن میں کوئی نئی بات آتی تو کہتے: ﴿ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [ القصص : ۳٦ ] "ہم نے تو یہ بات اپنے پہلے باپ دادا میں سنی ہی نہیں۔" اور اگر وہ بات پہلی کتابوں میں موجود ہوتی تو کہتے یہ وہاں سے سرقہ کیا گیا ہے، یعنی "اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ" کہ یہ تو پہلوں کی کہانیاں ہیں۔ ﴿ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ [ التوبۃ : ۳۰ ] "اللہ انھیں مارے، کدھر بہکائے جا رہے ہیں۔"

❷ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: "أَيْ رَكِبَهَا كَمَا يَرْكَبُ الصَّدَأُ وَ غَلَبَهَا" (زمخشری) "یعنی ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے اور غالب آ گیا ہے جیسے زنگ چڑھ جاتا ہے۔" "رَانَ" کا فاعل "مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" ہے، یعنی جو کچھ وہ کمایا کرتے تھے وہ زنگ بن کر ان کے دلوں پر چھا گیا ہے۔ گناہ کا خاصہ ہے کہ اگر بار بار کیا جائے اور توبہ نہ کی جائے تو پورے دل کو گھیر لیتا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيْئَةً نُكِتَتْ فِيْ قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَ تَابَ سُقِلَ قَلْبُهُ وَ إِنْ عَادَ زِيْدَ فِيْهَا حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهُ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِيْ ذَكَرَ اللّٰهُ: ﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ )) [ ترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة ويل للمطففين : ۳۳۳٤ ] "بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ لگ جاتا ہے، جب باز آ جائے اور معافی مانگ لے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کرے تو داغ بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ سیاہ داغ اس کے پورے دل پر غالب آ جاتا ہے۔ یہی وہ "ران" ہے جو اللہ عزوجل نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ "ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر، جو وہ کماتے تھے۔" یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

آیت 15 تا 17 كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ ......: یہ کافر جو کہتے ہیں کہ اگر قیامت ہوئی بھی تو دنیا کی طرح وہاں بھی پروردگار کی نوازشیں ہمیں پر ہوں گی، ان کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں، انھیں تو پروردگار کے قریب تک نہیں آنے دیا جائے گا، بلکہ وہ حجاب میں رکھے جائیں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس دن نافرمان اللہ تعالیٰ سے محجوب ہوں گے اور اہلِ ایمان کو وہ نظر

كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۞ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۞ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۞ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۞ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۞ عَلَى الْأَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۞ تَعْرِفُ فِيْ

ہرگز نہیں، بے شک نیک لوگوں کا اعمال نامہ یقیناً بہت ہی اونچے لوگوں کے دفتر میں ہے ⑱ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ بہت ہی اونچے لوگوں کا دفتر کیا ہے؟ ⑲ ایک کتاب ہے، واضح لکھی ہوئی ⑳ جس کے پاس مقرب (فرشتے) حاضر رہتے ہیں ㉑ بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے ㉒ تختوں پر (بیٹھے) دیکھ رہے ہوں گے ㉓ تو ان کے

آئے گا۔ اگر دیدار الٰہی کے منکروں کے کہنے کے مطابق اللہ تعالیٰ کسی کو بھی نظر نہیں آئے گا تو یہ آیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ صریح الفاظ میں فرمایا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۞ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [ القيامة : ۲۲، ۲۳ ] ''کئی چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔'' حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے جو ایمان والوں کو حاصل ہوگی۔ (اللہ اپنے فضل سے ہمیں بھی اپنا دیدار نصیب فرمائے) اس کے ساتھ انھیں کھانے پینے، نکاح وغیرہ یعنی جنت کی دوسری نعمتیں بھی میسر ہوں گی۔ نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلا عذاب یہ ذکر فرمایا کہ وہ اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ پھر وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ [ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُمَا ]

**آیت 18 تا 21** كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ ...... : ''كَلَّآ'' یعنی یہ بات ہرگز نہیں کہ نافرمانوں کا یہ حال ہوگا تو نیکوں سے بھی یہی سلوک ہو۔ ''عِلِّيِّيْنَ'' اور ''عِلِّيُّوْنَ'' ''عِلِّيٌّ'' کی جمع ہیں جو ''عُلُوٌّ'' سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے ''بہت ہی اونچا شخص'' اور ''عِلِّيُّوْنَ'' کا معنی ہے ''بہت ہی اونچے لوگ۔'' اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق یہ ایک کتاب ہے جس میں نیک لوگوں کے نام اور ان کے اعمال واضح طور پر لکھے ہوئے ہیں، ان میں کوئی ردّ و بدل یا کمی بیشی ممکن نہیں۔ ''يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ'' یعنی اس کی نگرانی کے لیے مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ چونکہ وہ نیک لوگوں کا دفتر ہے، اس لیے اس کو دیکھنے کے لیے انھی مقرب لوگوں کو وہاں حاضر ہونے کی اجازت ہے جن کا وہ دفتر ہے۔ اس صورت میں ابرار ہی مقرب ہیں۔

**آیت 22، 23** إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ...... : یہاں سے نیک لوگوں کو ملنے والی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ تختوں پر بیٹھے کبھی دوزخیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ رب تعالیٰ نے انھیں کتنی بڑی مصیبت سے بچایا ہے، کبھی جنت کی نعمتوں کا نظارہ کرتے ہوں گے اور کبھی دیدار الٰہی سے آنکھوں کو شاد کام کر رہے ہوں گے۔

**آیت 24** تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ : دنیا میں خوش حال لوگوں کے چہروں کی تازگی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب آسائش لوگ ہیں، اسی طرح جنتی لوگوں کے چہرے جنت کی نعمتوں سے ایسے تر و تازہ، پُر رونق اور خوش و خرم ہوں گے کہ دیکھنے والا دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ وہ کس قدر نعمت اور عیش و آرام میں ہیں۔

وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝۲۴ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝۲۵ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝۲۶ وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝۲۷ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۲۸ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝۲۹

چہروں میں نعمت کی تازگی پہچانے گا ۝۲۴ انھیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہوگی ۝۲۵ اس کی مہر کستوری ہوگی اور اسی (کو حاصل کرنے) میں ان لوگوں کو مقابلہ کرنا لازم ہے جو (کسی چیز کے حاصل کرنے میں) مقابلہ کرنے والے ہیں ۝۲۶ اور اس کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی ۝۲۷ جو ایک چشمہ ہے، جس سے مقرب لوگ پییں گے ۝۲۸ بے شک وہ لوگ جنھوں نے جرم کیے، ان لوگوں پر جو ایمان لائے، ہنسا کرتے تھے ۝۲۹

**آیت 26،25** يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ...... : " رَحِيْقٍ " خالص شراب جس میں کھوٹ نہ ہو۔ " مَّخْتُوْمٍ " اگرچہ جنت میں شراب کی نہریں موجود ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ [ محمد : ۱۵ ] "اور شراب کی کئی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہیں" مگر یہ ایک خاص شراب ہوگی، جو برتنوں میں بند ہوگی، جن پر مہر مٹی یا راکھ کے بجائے کستوری کی ہوگی۔ " خِتٰمُهٗ مِسْكٌ " کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ پیتے وقت آخری گھونٹ کے ساتھ کستوری جیسی خوشبو آئے گی نہ کہ دنیا کی شراب کی طرح بدبو کا بھبھوکا اٹھے گا۔

**آیت 28،27** وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ...... : "مِزَاجٌ" آمیزش، ملونی، وہ چیز جو دوسری چیز میں لذت بڑھانے یا خوشبو پیدا کرنے یا تیزی کم کرنے کے لیے ملاتے ہیں، مثلاً کسی پھل کا جوس یا روح کیوڑا، الائچی، گلاب، کستوری وغیرہ یا ٹھنڈا میٹھا پانی یا دودھ وغیرہ، یہ صرف مثال ہے، جنت کی نعمتوں کی کیفیت اور لذت اللہ تعالیٰ جانتا ہے، یا وہ جانیں گے جنھیں وہ حاصل ہوں گی۔

" تَسْنِيْمٍ " باب تفعیل کا مصدر ہے۔ "سَنِمَ" (س) "سَنَّمَ، تَسَنَّمَ أَيْ تَرَفَّعَ" بلند ہونا، اونچی جگہ سے گرنا۔ یہ "تَسْطِيْحٌ" (ہموار ہونے) کی ضد ہے۔ (قاموس) " تَسْنِيْمٍ " جنت کے ایک چشمے کا نام ہے، جس کا پانی اہل جنت پر اوپر سے گر رہا ہوگا، یعنی وہ رحیق مختوم میں اس چشمے کا پانی ملا کر پییں گے جو اوپر سے گر رہا ہوگا۔ (طبری) یا اس چشمے کا نام تسنیم اس لیے ہے کہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ اور اونچے درجے کا مشروب ہے جو مقربین کو برابر پینے کے لیے ملے گا اور ابرار کو رحیق مختوم میں آمیزش کے لیے دیا جائے گا۔

**آیت 29** اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ...... : " يَضْحَكُوْنَ " "ہنسا کرتے تھے" کہ ان پر کیا پاگل پن سوار ہے کہ دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر کل کی ان دیکھی خیالی لذتوں کے وعدوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ " كَانُوْا " اور " يَضْحَكُوْنَ " کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ یہ ان کا ہمیشہ کا مشغلہ تھا۔ یہ صرف مکہ کے مشرکین کی بات نہیں، آج کے ملحد اور بے دین بھی مسلمانوں کو رجعت پسند، دقیانوسی، تنگ نظر، تاریک خیال اور اس قسم کے طنزیہ خطابات دے کر خوش ہوتے اور اپنے دل کا بخار نکالتے رہتے ہیں۔ بہت سے شاعروں نے بھی جنت اور اہل جنت پر چوٹیں کی ہیں، ان سب کو ان آیات کے مضمون سے ڈرنا چاہیے۔

وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۝۳۰ وَ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝۳۱ وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝۳۲ وَ مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ۝۳۳ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝۳۴ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ۝۳۵ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ ع ۸

اور جب وہ ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارے کیا کرتے تھے ۝۳۰ اور جب اپنے گھر والوں کے پاس واپس آتے تو خوش گپیاں کرتے ہوئے واپس آتے تھے ۝۳۱ اور جب انھیں دیکھتے تو کہا کرتے تھے بلاشبہ یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں ۝۳۲ حالانکہ وہ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے ۝۳۳ سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں ۝۳۴ تختوں پر (بیٹھے) نظارہ کر رہے ہیں ۝۳۵ کیا کافروں کو اس کا بدلا دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟ ۝۳۶

**آیت 30** وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ : "يَتَغَامَزُوْنَ" "غَمْزٌ" ابروؤں اور پلکوں کے ساتھ اشارہ کرنا، یعنی یہ مجرم لوگ اہل ایمان کی کتاب و سنت کے مطابق ہیئت و لباس، طرز گفتگو، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے حصول کے لیے محنت دیکھ کر ان کی تحقیر کرنے اور مذاق اڑانے کے لیے ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے تھے کہ یہی وہ سر پھرے لوگ ہیں جنھوں نے خیالی جنت کے لیے اپنے آپ کو دنیا کی لذتوں سے محروم رکھا ہوا ہے۔

**آیت 31، 32** وَ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ ...... : "فَكِهِيْنَ" "فَكِهٌ" کی جمع بروزن "فَرِحٌ" ہے، جسے ہنسانے کے لیے باتیں بنانے والے، خوش گپیاں کرنے والے، یعنی گھر واپس آتے ہوئے بھی اہل ایمان کو موضوع بنا کر خوب باتیں بناتے، خوش گپیاں کرتے تھے اور انھیں گمراہ قرار دیتے تھے۔

**آیت 33** وَ مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ: یہ ان لوگوں کی حماقت کی طرف اشارہ ہے کہ انھیں تو اپنے انجام کی فکر ہونی چاہیے تھی، اہل ایمان پر طنز کرنے اور مذاق اڑانے کا انھیں کیا حق تھا اور کس نے انھیں ان کی نگرانی پر مقرر کیا تھا؟

**آیت 34** فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... : یعنی قیامت کے دن معاملہ الٹ ہو جائے گا، اب اہل ایمان کفار پر ہنستے ہوں گے کہ یہ لوگ کس درجہ احمق تھے کہ خود گمراہ ہونے کے باوجود ہمیں گمراہ کہتے تھے اور واضح دلائل کے باوجود نہ انھوں نے پیدا کرنے والے کا حق پہچانا اور نہ آخرت کی فکر کی اور یہ جانتے ہوئے بھی دنیا کی لذتوں میں مست رہے کہ یہ عارضی ہیں۔

**آیت 35** عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ: جہنمیوں کی بری حالت دیکھ رہے ہوں گے۔ مزید وضاحت کے لیے اس سورت کی آیت (۲۳) کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

**آیت 36** هَلْ ثُوِّبَ ...... : کافر جو کچھ کرتے تھے جہنم میں انھیں ہر چیز کا بدلا مل گیا، ایک مسلمانوں سے مذاق رہ گیا تھا، آج مسلمانوں کے ان سے جوابی مذاق کے ساتھ وہ بدلا بھی پورا ہو گیا۔ "هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ" میں سوال بھی کافروں کو ذلیل کرنے کے لیے ہے، پوچھنے کے لیے نہیں۔ ان آیات سے ملتی جلتی آیات کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون کی آیات (۱۰۸ تا ۱۱۱)۔

سُوْرَةُ الانْشِقَاقِ ۸۴ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا ۲۵ رُكُوْعُهَا ۱

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا ① اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گا اور یہی اس کا حق ہے ② اور جب زمین پھیلا دی جائے گی ③ اور اس میں جو کچھ ہے اسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی ④ اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گی اور یہی اس کا حق ہے ⑤

**آیت 1** اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ : دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ [ النبا : ۱۹ ] ''اور آسمان کھولا جائے گا تو وہ دروازے دروازے ہو جائے گا۔'' اور فرمایا: ﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا﴾ [ الفرقان : ۲۵ ] ''جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹے گا اور فرشتے گروہ در گروہ اتارے جائیں گے۔'' یہ نفخہ ثانیہ کے ساتھ ہوگا، آگے زمین سے مردوں کے نکلنے کے ذکر سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔

**آیت 2** وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ : "اَذِنَتْ" (س) کان لگانا، غور سے سننا، یعنی غور سے سن کر اطاعت کرے گا۔ اسی طرح زمین حکم سنتے ہی وہ سب کچھ باہر پھینک دے گی جو اس میں ہے۔ "حُقَّتْ" "هُوَ حَقِيْقٌ بِكَذَا أَوْ مَحْقُوْقٌ بِكَذَا" سے ماخوذ ہے، یعنی وہ اس چیز کے لائق ہے۔ اس کا نائب فاعل "السَّمَآءُ" کی ضمیر ہے۔ بیضاوی نے فرمایا: "حُقَّتْ" أَيْ جُعِلَتْ حَقِيْقَةً بِالْإِسْتِمَاعِ وَالْإِنْقِيَادِ." زمخشری نے فرمایا: " وَ هِيَ حَقِيْقَةٌ بِأَنْ تَنْقَادَ وَلَا تَمْتَنِعَ." زمین و آسمان کو اللہ کا حکم سن کر اطاعت سے انکار کی جرأت ہی نہیں، یہ صرف انسان ہی ہے کہ اللہ کے احکام نہ کان لگا کر سنتا ہے اور نہ اطاعت کرتا ہے۔

**آیت 3** وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ : "مُدَّتْ" "مَدَّ يَمُدُّ" (ن) کھینچنا، پھیلانا، یعنی جس طرح چمڑے کو کھینچا جائے تو اس کی اونچ نیچ اور تمام شکنیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ طول و عرض میں پھیل جاتا ہے، اسی طرح زمین سے پہاڑ، سمندر اور ہر قسم کی بلندی و پستی ختم ہو جائے گی، جس سے وہ ہموار ہو کر پھیل جائے گی اور اس میں آدمیوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش بہت زیادہ ہو جائے گی۔

**آیت 4** وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ : یعنی تمام فوت شدہ لوگوں کو حشر کے لیے باہر پھینک دے گی اور وہ خزانے اور بنی آدم کے اعمال کی شہادتیں جو اس کے بطن میں ہیں سب نکال باہر پھینکے گی۔ "تَخَلَّتْ" "خَلَا يَخْلُوْ" (ن) (خالی ہونا) سے باب تفعّل ہے جس میں مبالغہ ہوتا ہے، یعنی بالکل خالی ہو جائے گی۔

**آیت 5** وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ : تفصیل کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۲) کی تفسیر۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝﴾

اے انسان! بے شک تو مشقت کرتے کرتے اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، سخت مشقت، پھر اس سے ملنے والا ہے ⑥ پس لیکن وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ⑦ سو عنقریب اس سے حساب لیا جائے گا، نہایت آسان حساب ⑧ اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش واپس آئے گا ⑨

**آیت 6** ﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ﴾ ...... : "كَادِحٌ" "كَدَحَ يَكْدَحُ" (ف) خوب کوشش کرنا، مشقت جھیلنا، زخمی کرنا۔ "اِلٰى" کے لفظ سے اس میں رب تعالیٰ کی طرف جانے کا مفہوم ادا ہو رہا ہے، یعنی اے انسان! تو زندگی بھر کسی نہ کسی کام کی مشقت میں مبتلا رہ کر آخر کار اچھے یا برے اعمال لے کر اپنے رب کے حضور پیش ہونے والا ہے۔

**آیت 7 تا 9** ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ﴾ ...... : آسان حساب کا مطلب یہ ہے کہ کرید کرید کر اصلی حساب نہیں ہوگا، فقط اعمال نامہ پیش ہوگا اور غلطیاں بھی سامنے لائی جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دے گا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَيْسَ أَحَدٌ يُحَاسَبُ إِلَّا هَلَكَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! جَعَلَنِيَ اللّٰهُ فِدَاءَكَ، أَلَيْسَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ : ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ [ الانشقاق : ۷، ۸ ] قَالَ ذَاكَ الْعَرْضُ يُعْرَضُوْنَ، وَمَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ هَلَكَ » [ بخاري، التفسير، باب : ﴿فسوف يحاسب حسابا يسيرا﴾ : ۴۹۳۹ ] "جس کسی کا بھی حساب لیا گیا وہ ہلاک ہو گیا۔" عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: "یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے! کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہوگا؟" آپ نے فرمایا: "یہ صرف پیشی ہے (جس میں صرف اس کے اعمال) پیش کیے جائیں گے اور جس سے حساب میں پڑتال کی گئی وہ ہلاک ہو گیا۔"

جن بندوں پر اللہ کی نظر عنایت ہوگی ان کے آسان حساب کی ایک صورت وہ ہوگی جو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَدْنُوْ أَحَدُكُمْ مِنْ رَبِّهِ حَتّٰى يَضَعَ كَنَفَهُ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُ عَمِلْتَ كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُوْلُ نَعَمْ، وَيَقُوْلُ عَمِلْتَ كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُوْلُ نَعَمْ، فَيُقَرِّرُهُ ثُمَّ يَقُوْلُ إِنِّيْ سَتَرْتُ عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، فَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ » [ بخاري، الأدب، باب ستر المؤمن على نفسه : ۶۰۷۰ ] "تم میں سے ایک (بندہ) اپنے رب کے قریب ہوگا، یہاں تک کہ وہ اپنا دامن اس پر رکھے گا (کہ کسی اور کو خبر نہ ہو)، پھر فرمائے گا: "تو نے یہ یہ کام کیے؟" وہ کہے گا: "ہاں!" اور فرمائے گا: "تو نے یہ یہ کام (بھی) کیے؟" وہ کہے گا: "ہاں!" پس اللہ تعالیٰ اس سے اقرار کروا لے گا، پھر فرمائے گا: "میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالا، سو آج میں تمھیں وہ گناہ معاف کرتا ہوں۔" آسان حساب کی ایک صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾

**اور لیکن وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا گیا ﴿۱۰﴾ تو عنقریب وہ بڑی ہلاکت کو پکارے گا ﴿۱۱﴾ اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا ﴿۱۲﴾ بلاشبہ وہ اپنے گھر والوں میں خوش تھا ﴿۱۳﴾**

جسے چاہے گا تھوڑی نیکی کا ثواب بہت زیادہ عطا فرما دے گا، جیسا کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی امت کے ایک آدمی کے گناہوں کے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ننانوے (۹۹) دفتر کاغذ کے ایک پرزے کے مقابلے میں ہلکے ہو جائیں گے جس پر ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ '' لکھا ہوگا۔ [ دیکھیے ترمذي، الإيمان، باب ما جاء فیمن یموت وھو یشھد أن لا إله إلا اللّٰه : ۲۶۳۹، و صححه الألباني ] غرض اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے گا حساب آسان کر دے گا، مگر شرط یہ ہے کہ آدمی ہر طرح کے شرک ظاہری اور شرک باطنی یعنی ریا سے پاک ہو، پھر اگر گناہ گار توبہ کے بغیر بھی مر گیا تو اللہ کی ذات سے رحمت اور آسانیٔ حساب کی توقع ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [ النساء : ۴۸ ] ''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے جسے چاہے گا بخش دے گا۔'' مشرک کے لیے معافی نہیں، دوسروں کی مغفرت اللہ کی مشیّت پر ہے۔ اس لیے نہ اس کے غضب سے بے خوف ہونا چاہیے اور نہ اس کی رحمت سے مایوس ہونا چاہیے۔

**آیت 10** وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ ...... : یہاں پیٹھ کے پیچھے اعمال نامے ملنے کا ذکر ہے اور سورۂ حاقہ (۲۵) میں بائیں ہاتھ میں، غور کریں تو صاف سمجھ میں آ رہا ہے کہ ان مجرموں کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے، جہاں انھیں بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا۔

**آیت 11** فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا : یعنی عذاب کے ڈر سے ہلاکت کو پکارے گا، تاکہ وہ مر کر عذاب سے نجات پا جائے۔

**آیت 13،12** وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا : اسے دنیا میں آخرت کا کوئی خوف نہ تھا، وہ اپنے بیوی بچوں اور دنیا کی نعمتوں میں ایسا مگن اور خوش تھا کہ پروردگار کے پاس حاضری کو بھول ہی گیا۔ نتیجہ یہ کہ آج جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے برعکس اہل ایمان اپنی دنیا میں گزری ہوئی زندگی کو یاد کر کے کہیں گے: ﴿ اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴾ [ الطور : ۲۶ ] ''ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرنے والے تھے (کہ انجام کیا ہوگا)؟'' آج وہ اپنے گھر خوش خوش لوٹیں گے، فرمایا: ﴿ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴾ [ الانشقاق : ۹ ] ''اور وہ اپنے گھر کی طرف خوش خوش واپس لوٹے گا۔''

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَ الَّيْلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾

یقیناً اس نے سمجھا تھا کہ وہ کبھی (اپنے رب کی طرف) واپس نہیں لوٹے گا ﴿۱۴﴾ کیوں نہیں! یقیناً اس کا رب اسے خوب دیکھنے والا تھا ﴿۱۵﴾ پس نہیں، میں شفق کی قسم کھاتا ہوں! ﴿۱۶﴾ اور رات کی اور اس چیز کی جسے وہ جمع کرتی ہے! ﴿۱۷﴾ اور چاند کی، جب وہ پورا ہوتا ہے! ﴿۱۸﴾ کہ تم ضرور ہی ایک حالت سے دوسری حالت کو چڑھتے جاؤ گے ﴿۱۹﴾

**آیت 15،14** اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ... : "حَارَ يَحُوْرُ حَوْرًا" (ن) لوٹنا۔ پیٹھ کے پیچھے اعمال نامہ ان لوگوں کو ملے گا جن کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے اور نہ کوئی حساب کتاب ہوگا۔ فرمایا، کیوں نہیں! یقیناً تمھارا حساب ضرور ہونا تھا، تمھارا رب تمھارے اعمال واقوال اور احوال سب کچھ خوب دیکھ رہا تھا اور تمھارا اعمال نامہ بھی تیار کروا رہا تھا، مگر اس نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت تمھیں مہلت دے رکھی تھی، اب وہ مہلت ختم ہوگئی، اب اپنے انکار اور بے فکری کا نتیجہ بھگتو۔

**آیت 16** فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ: قسم سے پہلے "لَا" کا مطلب منکرین کی بات کی نفی ہے۔ "الشَّفَقُ" سورج غروب ہونے کے بعد آسمان کے کنارے کی سرخی جو عشاء تک رہتی ہے۔

**آیت 17** وَ الَّيْلِ وَ مَا وَسَقَ: "وَسَقَ" (ض) جمع کرنا اور اٹھا لینا۔ ساٹھ (۶۰) صاع غلے کا ایک وسق ہوتا ہے، اسے وسق کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ غلے کی خاص مقدار جمع کیے ہوتا ہے۔ "وَ مَا وَسَقَ" کے عموم میں تمام آدمی اور جانور آ جاتے ہیں، کیونکہ وہ سب دن بھر چلنے پھرنے کے بعد رات کو آرام کے لیے اپنے اپنے ٹھکانے پر جمع ہو جاتے ہیں۔

**آیت 18** وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ: "اِتَّسَقَ" اوپر مذکور "وَسَقَ" سے باب افتعال ہے، جمع ہونا، یعنی چودھویں رات کا پورا چاند بن جائے۔

**آیت 19** ❶ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ: قرآن مجید میں مذکور قسمیں بعد میں آنے والے جواب قسم کی تاکید کے لیے آتی ہیں اور عام طور پر اس کے یقینی ہونے کی دلیل ہوتی ہیں۔ یہاں جس بات کو ثابت کرنے کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں وہ یہ حقیقت ہے کہ تم ضرور ہی ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے جاؤ گے۔ اب قسموں پر غور کیجیے! تینوں آیات میں مذکور چیزوں کا ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہونا صاف واضح ہے، یعنی دن بھر کی دھوپ کے بعد سورج غروب ہو کر شفق پھیل جاتی ہے، پھر رات چھا جاتی ہے۔ اللہ کی مخلوق دن کو پھیل جاتی ہے اور رات کو جمع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چاند پہلی رات خنجر نما شکل میں ہوتا ہے، پھر بدلتے بدلتے مہ کامل بن جاتا ہے، پھر دوبارہ گھٹنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ تمھیں بھی ایک حالت پر دوام نہیں ہے، بلکہ ان اشیاء کی طرح تمھارا ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے چلے جانا بھی یقینی ہے۔ اسی طرح زندگی کے بعد موت، پھر زندگی اور ہر عمل کی جزا و سزا کا ہونا بھی یقینی ہے۔

❷ رسول اللہ ﷺ نے "طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کی تفسیر فرمائی: «حَالًا بَعْدَ حَالٍ» [ بخاري، التفسير، باب: ﴿ لتركبن طبقا

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

تو انھیں کیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۲۰﴾ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے ﴿۲۱﴾ بلکہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا جھٹلاتے ہیں ﴿۲۲﴾ اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں ﴿۲۳﴾ پس انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے ﴿۲۴﴾ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے ﴿۲۵﴾

عن طبق ﴾ : ٤٩٤٠ ] ''یعنی ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں۔'' آدمی ہر لمحے نئی سے نئی حالت میں منتقل ہوتا جائے گا۔ بڑے بڑے تغیرات یہ ہیں، مٹی سے پیدا ہو کر نطفہ، پھر ماں کے پیٹ کی مختلف حالتیں، پھر پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی، بیماری، فقر، غنا، پھر موت، قبر اور قیامت، غرض انسان بے شمار احوال سے گزرتا ہوا جنت یا دوزخ کو پہنچ جائے گا۔

**آیت 20** فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: یعنی جب ایک حالت پر قرار نہیں تو یہ لوگ دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ انھیں یہ ضد کیوں ہے کہ ہمیں مر کر اسی حال میں رہنا ہے؟

**آیت 21** وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ ...... : اور پیدا کرنے والے کا کلام سن کر بھی نہیں جھکتے۔

**آیت 22** بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : یعنی یہ بات نہیں کہ قرآن کے دلائل میں کوئی کمی ہے یا اس کی آواز ان کے دلوں کی گہرائی تک نہیں پہنچی، بلکہ انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ ہم نے ماننا ہی نہیں۔ چنانچہ یہ کفر و عناد ہی تکذیب کا باعث ہے۔

**آیت 23** وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ : "يُوْعُوْنَ" "وِعَاءٌ" سے مشتق ہے، جس کا معنی برتن ہے، "أَوْعَى الْمَالَ" اس نے مال جمع کیا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جو اعمال وہ آخرت کے لیے جمع کر رہے ہیں، زبانی جھٹلانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے دلوں میں جو کبر و عناد جمع کر رکھا ہے اور آپ کے خلاف جو جو سازشیں انھوں نے تیار کر رکھی ہیں وہ اللہ کو ان سے بھی زیادہ معلوم ہیں۔

**آیت 24** فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ : بشارت اس خوشی کی خبر کو کہتے ہیں جس کا اثر "بَشَرَةٌ" (جلد) پر ظاہر ہو جائے، یہاں عذابِ الیم کے لیے بشارت کا لفظ بطور استہزا ہے۔

**آیت 24** اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... : "غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" "مَنَّ يَمُنُّ" (ن) (قطع کرنا) سے اسم مفعول ہے، کہا جاتا ہے: "مَنَنْتُ الْحَبْلَ" "میں نے رسی کاٹ دی۔" یعنی ایسا اجر جو کبھی قطع نہیں کیا جائے گا۔ مراد جنت ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، جس کی کوئی نعمت نہ کم ہوگی اور نہ ختم ہوگی۔

سورۃ البروج ٨٥ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — آیاتہا ٢٢ رکوعہا ١

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿١﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿٢﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴿٣﴾ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ﴿٤﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ﴿٥﴾

قسم ہے برجوں والے آسمان کی! ﴿١﴾ اور اس دن کی جس کا وعدہ دیا گیا ہے! ﴿٢﴾ اور حاضر ہونے والے کی اور جس کے پاس حاضر ہوا جائے! ﴿٣﴾ مارے گئے اس خندق والے ﴿٤﴾ جو سراسر آگ تھی بہت ایندھن والی ﴿٥﴾

یہ سورت مسلمانوں کو اہلِ مکہ کی ایذا رسانی پر صبر و استقامت کی تلقین کے لیے نازل ہوئی۔ اس مقصد کے لیے پہلی امتوں کے مسلمانوں کو پیش آنے والے شدید ترین امتحان اور اس پر ان کے صبر و ثبات اور انھیں ستانے والوں کے انجامِ بد کا تذکرہ فرمایا، تاکہ ان کے حالات سن کر انھیں تسلی ہو اور یقین ہو جائے کہ جس طرح اصحاب الاخدود مارے گئے اسی طرح وہ لوگ بھی مارے جائیں گے جو اب مسلمانوں کو امتحان میں ڈال رہے ہیں۔

**آیت 1** وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ: "الْبُرُوْجِ" "بُرْجٌ" کی جمع ہے، اس کا اصل معنی ہے "نمایاں اور ظاہر ہونے والی چیز۔" "تَبَرَّجَ" کا معنی بے پردہ ہونا، ظاہر ہونا ہے۔ اس لیے بلند محل کو بُرج کہتے ہیں، شہر کی فصیل کے بلند حصوں کو بھی برج کہتے ہیں اور آسمان پر ستاروں کے اجتماع سے جو صورتیں نظر آتی ہیں انھیں بُروج کہتے ہیں۔ وہ آسمانی ٹھکانے بھی بُروج کہلاتے ہیں جن میں شیطانوں سے آسمان کی حفاظت کے لیے فرشتے پہرا دیتے ہیں۔ سورج اور چاند کی منزلوں کو بھی بُروج کہا جاتا ہے۔

**آیت 2** وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ: قیامت کا دن، جس کا جزا و سزا کے لیے وعدہ کیا گیا ہے۔

**آیت 2** وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ: "شَاهِدٍ" حاضر ہونے والا۔ "مَشْهُوْدٍ" جس کے پاس حاضر ہوا جائے۔ لفظوں کے لحاظ سے اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کہیں حاضر ہو سکتے ہیں اور مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جن کا مشاہدہ ہو سکتا ہے یا جن کے پاس کوئی حاضر ہو سکتا ہے۔ اہلِ علم نے "شَاهِدٍ" اور "مَشْهُوْدٍ" کی تفسیر کرتے ہوئے جس چیز کو زیادہ اہم یا معروف یا مناسب سمجھا اس کے ساتھ تفسیر کر دی۔ چنانچہ بہت سے صحابہ و تابعین نے "شَاهِدٍ" سے مراد یومِ جمعہ اور "مَشْهُوْدٍ" سے مراد یومِ عرفہ لیا ہے۔ الفاظ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ فرد ہے جو کہیں حاضر ہوتا ہے اور حاضری کا ہر وہ موقع ہے جس میں کوئی فرد حاضر ہوتا ہے۔

**آیت 4** ﴿١﴾ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ: "خَدَّ يَخُدُّ خَدًّا" (ن) "اَلْأَرْضَ وَ فِي الْأَرْضِ" زمین میں لمبا گڑھا کھودنا۔ "الْاُخْدُوْدِ" لمبا گڑھا۔ خندق، کھائی۔ اس کی جمع "أَخَادِيْدُ" ہے۔ یعنی عظیم الشان برجوں والا آسمان، قیامت کا دن، کسی بھی مقام پر حاضر ہونے والے لوگ اور کوئی بھی موقع جس میں لوگ حاضر ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں اگر اپنا وجود رکھتی ہیں اور یقیناً ان کے وجود میں کوئی شبہ نہیں تو یہ بات بھی یقینی سمجھو کہ جن لوگوں نے بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر انھیں آگ سے بھرا،

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ﴿۷﴾ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾

جب وہ اس کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے ﴿۶﴾ اور وہ اس پر جو وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، گواہ تھے ﴿۷﴾ اور انھوں نے ان سے اس کے سوا کسی چیز کا بدلا نہیں لیا کہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو سب پر غالب ہے، ہر تعریف کے لائق ہے ﴿۸﴾

پھر جو اہلِ ایمان اپنے ایمان پر ڈٹے رہے اور مرتد نہ ہوئے انھیں اس آگ میں پھینک کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھتے رہے، وہ مارے گئے، کیونکہ وہ زبردست ہستی جو ان برجوں والے آسمان کو تھامے ہوئے ہے، جس نے انصاف کے لیے قیامت کا دن مقرر کر رکھا ہے اور جس کی نگاہ سے نہ کسی جگہ کوئی حاضر ہونے والا غائب ہے اور نہ حاضری کا کوئی موقع، وہ ان سنگ دل ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ضرور دے گا اور وہ نہ اس کی نگاہ سے غائب ہو سکیں گے اور نہ عذاب سے بچ سکیں گے۔

❷ دنیا میں ایسے کئی واقعات ہوئے جن میں اہلِ ایمان کو خندق کھود کر آگ میں جلا دیا گیا، سند کے لحاظ سے سب سے صحیح ایک کافر بادشاہ کا وہ طویل واقعہ ہے جو صحیح مسلم میں صہیب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حدیث لمبی ہے، اس کے آخر میں ہے کہ اس کافر بادشاہ کی رعایا کے لوگ مسلمان ہو گئے تو اس نے گلیوں کے کناروں پر گڑھے کھدوا کر ان میں آگ بھڑکائی اور حکم دیا کہ جو شخص اسلام نہ چھوڑے اسے آگ میں پھینک دو، چنانچہ اہلِ ایمان کو ان گڑھوں میں پھینک دیا گیا۔ مفصل واقعہ کے لیے دیکھیے صحیح مسلم میں ”بَابُ قِصَّةِ أَصْحَابِ الْأُخْدُوْدِ (۳۰۰۵)۔“ تفسیر ابن کثیر میں مومنوں کو آگ میں جلائے جانے کے مزید واقعات بھی موجود ہیں۔

**آیت 7،6** اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ …… : یعنی کنارے پر بیٹھ کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، انھیں جلتے ہوئے دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس طرح کے واقعات کافر قوتوں کے زیر سایہ آج بھی ہو رہے ہیں، مثلاً انڈیا، برما اور افریقہ وغیرہ میں مسلمانوں کو زندہ جلانے کی خبریں تواتر سے آ رہی ہیں، ان کا انجام بھی اصحاب الاخدود کی طرح ہوگا۔ (ان شاء اللہ) مگر ان مظلوم مسلمانوں کو کفار کے ظلم و ستم سے بچانا دنیا کے تمام مسلمانوں پر فرض ہے، جس کی ادائیگی میں کوتاہی اور جہاد ترک کرنے ہی کی وجہ سے کفار کو یہ جرأت ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚۙ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا﴾ [النساء: ۷۵] ”اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار بنا۔“

**آیت 8** ❶ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ …… : ان اہلِ ایمان نے ان ظالموں پر یا کسی دوسرے پر کوئی زیادتی نہیں کی تھی جس

الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ؕ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ ﴿ؕ۱۰﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۬ؕ ذٰلِكَ

وہ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اس کی ہے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۹﴾ یقیناً وہ لوگ جنھوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو آزمائش میں ڈالا، پھر انھوں نے توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے ﴿۱۰﴾ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہ رہی ہیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۱﴾

کا وہ بدلا لے رہے ہوں، ان کا جرم صرف اللہ پر ایمان لا کر اس پر قائم رہنا تھا۔ آیت میں "اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا" فرمایا ہے جو حال و استقبال پر دلالت کرتا ہے، "اِلَّا اَنْ آمَنُوْا" نہیں فرمایا جو ماضی کا صیغہ ہے، یعنی ان کا جرم یہی نہ تھا کہ وہ ایمان لے آئے تھے، بلکہ یہ تھا کہ وہ اب بھی ایمان پر قائم تھے۔

❷ بِاللّٰهِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ: یعنی ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا کوئی جرم یا غلط کام نہ تھا، بلکہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے تھے جو عزیز و حمید ہے اور آئندہ آیت میں مذکور صفات کا مالک ہے اور ان صفات کی وجہ سے اس کا حق ہے کہ اس پر ایمان رکھا جائے۔ یہ قرآن مجید کا خاص اسلوب ہے کہ واقعات بیان کرتے ہوئے بھی وہ عقائد کی درستی اور احکام کی وضاحت کا اہتمام جاری رکھتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ آیت ہے۔

**آیت 10** اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ...: "فِتْنَةٌ" کا معنی ہے، کھرے کھوٹے کی آزمائش کے لیے سونے کو آگ میں ڈالنا۔ پھر یہ لفظ جلانے، ستانے، عذاب دینے اور حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ "اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوۡا" سے مراد اصحاب الاخدود بھی ہیں، جنھوں نے اہل ایمان کو آگ کی خندقوں میں ڈالا اور کفار قریش اور بعد میں آنے والے وہ تمام ظالم بھی جو انواع و اقسام کے عذاب دے دے کر اہل ایمان کو ایمان سے ہٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ "فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ" جہنم میں کئی طرح کا عذاب ہے، سب سے سخت عذاب جلنے کا ہے، اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر فرمایا، اس کے علاوہ اہل ایمان کو جلانے والوں کے حسب حال جلنے ہی کا عذاب ہے۔ "ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا" (پھر توبہ نہیں کی) اللہ کی شان کریمی دیکھیے کہ اہل ایمان کو جلانے والوں کو بھی جہنم کی سزا تب سنائی جب وہ توبہ کے بغیر مریں، کیونکہ توبہ کرنے سے گزشتہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس سے توبہ کی ترغیب بھی نکل رہی ہے۔

**آیت 11** اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...: یہاں ایمان و عمل صالح والے لوگوں کے لیے جنت کی بشارت کے ذکر کی دو مناسبتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اگر مسلمانوں کو ستانے والے لوگ بھی ایمان لا کر صالح عمل والے بن جائیں تو ان کے لیے بھی وہ باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہتی ہیں۔ دوسری یہ کہ ایمان اور عمل صالح کے حامل جن مسلمانوں کو آزمائش کی

الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ⑪ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ⑫ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ⑬ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ⑭ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ⑮ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ⑯

بے شک تیرے رب کی پکڑ یقیناً بہت سخت ہے ⑫ بے شک وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور (وہی) دوبارہ پیدا کرے گا ⑬ اور وہی ہے جو بے حد بخشنے والا، نہایت محبت کرنے والا ہے ⑭ عرش کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے ⑮ کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے ⑯

بھٹیوں میں جھونکا جا رہا ہے وہ غم نہ کریں، یہ وقت گزر جانے والا ہے، آخرت میں ان کے لیے وہ عظیم الشان باغات تیار ہیں جن کے تلے نہریں بہ رہی ہیں اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان والوں کو آزمائشوں اور مصیبتوں میں ثابت قدم رکھنے والی چیز اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں جنت دے گا۔ کس قدر ظالم ہیں وہ لوگ جو روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر جنت کا مذاق اڑاتے اور اسے بے وقعت قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ سجدہ کی آیت (۱۶) کی تفسیر۔

**آیت 12** اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ: "بَطْشَ" وہ پکڑ جس میں تیزی اور سختی پائی جائے۔ رب تعالیٰ کی بطش جسے وہ خود شدید بتا رہا ہے، کس قدر سخت ہوگی؟ اہل ایمان کو ایذا پہنچانے والوں کو ڈرایا جا رہا ہے کہ رب تعالیٰ کی پکڑ بہت سخت ہے، اس سے بچ جاؤ۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾ [ھود: ۱۰۲] "اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو اس حال میں پکڑتا ہے کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، یقیناً اس کی پکڑ بڑی دردناک ہے، بہت سخت ہے۔"

**آیت 12** اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ: یہ نہ سمجھنا کہ دنیا میں تمھارے ظلم و ستم پر باز پُرس نہیں ہوئی تو مرنے کے بعد بھی نہیں ہوگی، جس نے تمھیں پہلے پیدا کیا وہی دوبارہ زندہ کر کے تمھیں تمھارے اعمال کی جزا دے گا۔

**آیت 14** وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ: اللہ تعالیٰ کے قہر و جلال کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی صفات رحمت کا تذکرہ ہے کہ اگر تم توبہ کر لو تو وہ بے حد بخشنے والا ہے۔ "الْوَدُوْدُ" "وَدَّ يَوَدُّ وُدًّا" (س) سے "فَعُوْلٌ" کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے، بہت محبت کرنے والا، یعنی وہ بندوں کا دشمن نہیں بلکہ ان سے بہت محبت کرنے والا ہے، سزا صرف اس کو دیتا ہے جو سرکشی پر اتر آئے۔

**آیت 16،15** ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ...... : وہ تمھاری طرح معمولی اور عارضی اقتدار والا نہیں، بلکہ اس عرش عظیم کا مالک ہے جو زمین و آسمان اور ان کے مابین سے بھی بڑا ہے، نہ وہ تمھاری طرح کم ظرف ہے کہ معمولی سی قدرت ملے تو ظلم پہ اُتر آئے، بلکہ وہ بڑی شان والا ہے اور نہ وہ تمھاری طرح بے بس ہے کہ مجبور ہو کر اسے اپنے ارادے ترک کرنا پڑیں، بلکہ وہ جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔ ایسے زبردست قوت والے پروردگار سے تمھیں ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کی رحمت کا

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

ع ۲ / ۱۰

کیا تیرے پاس ان لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ ﴿۱۷﴾ جو فرعون اور ثمود تھے ﴿۱۸﴾ بلکہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں ﴿۱۹﴾ اور اللہ ان کے پیچھے سے (انھیں) گھیرنے والا ہے ﴿۲۰﴾ بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے ﴿۲۱﴾ اس تختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے ﴿۲۲﴾

طلب گار رہنا چاہیے۔ یاد رہے کہ یہاں "ذُو الْعَرْشِ" کے بعد "الْمَجِيْدُ" بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اس لیے اس پر رفع ہے، یہ "الْعَرْشِ" کی صفت نہیں، ورنہ یہ مجرور ہوتا۔

**آیت 18،17** هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ...... : یہ جو فرمایا تھا کہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے، اسے دلوں میں جما دینے کے لیے ثمود اور فرعون کے دو قصے جو عرب میں زیادہ مشہور تھے، وہ اہلِ مکہ کو یاد دلائے، تاکہ وہ ان قصوں سے عبرت پکڑیں۔ (احسن التفاسیر) اس کے علاوہ نبی ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دلانا بھی مقصود ہے۔

**آیت 20،19** بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... : حق تو یہ تھا کہ پہلے سرکشوں کا انجام دیکھ کر یہ لوگ ایمان لے آتے، مگر یہ اُلٹا خواہ مخواہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، وہ جب چاہے پکڑ لے۔

**آیت 22،21** بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ...... : اور اگر ان کا جھٹلانا اس خیال سے ہے کہ یہ کلامِ الٰہی نہیں یا اس میں شیطان کا کچھ دخل ہے تو ان کی یہ بات بھی غلط ہے، بلکہ یہ بڑی شان والا قرآن ہے، اس لوح میں سے اتارا گیا ہے جس کی فرشتوں کے ذریعے سے حفاظت کی جاتی ہے، کسی شیطان کا اس میں دخل نہیں ہوسکتا۔ اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اگر انھیں شبہ ہے تو وہ بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر لے آئیں، جب یہ نہیں کر سکتے تو اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں کیا شبہ رہ گیا؟ (ماخوذ از احسن التفاسیر)

سُوْرَةُ الطَّارِقِ ۸۶ مکیۃ ۳۶ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — اٰیاتہا ۱۷ رکوعاتہا ۱

وَالسَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ① وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ② النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ③ اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ④ فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ⑤ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ⑥ يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِ ⑦

قسم ہے آسمان کی اور رات کو آنے والے کی! ① اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ② وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے ③ نہیں کوئی جان مگر اس کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے ④ پس انسان کو لازم ہے کہ دیکھے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ⑤ وہ ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے ⑥ جو پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے ⑦

**آیت 1 تا 4** ① وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ......: "طَرَقَ يَطْرُقُ" (ن) کا اصل معنی زور سے مارنا ہے جس سے آواز پیدا ہو۔ "مِطْرَقَةٌ" (ہتھوڑا) اور "طَرِيْقٌ" (راستہ) اسی سے مشتق ہیں، کیونکہ راستے پر چلنے والوں کے قدم زور سے پڑتے ہیں تو آواز دیتے جاتے ہیں۔ "الطَّارِقِ" رات کو آنے والے کو کہتے ہیں، کیونکہ عام طور پر اسے دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ "النَّجْمُ الثَّاقِبُ" میں الف لام جنس کے لیے ہے، اس لیے اگرچہ لفظ واحد ہے مگر اس میں تمام ستارے آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو پیدا کرنے کا ایک مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ شیطانوں سے آسمان دنیا کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ (دیکھیے صافات: ۶، ۷) "اِنْ" نفی کے معنی میں ہے اور "لَمَّا" بمعنی "اِلَّا" ہے۔

② قسم کسی بات کی تاکید کے لیے اٹھائی جاتی ہے اور عموماً اس بات کی شہادت ہوتی ہے جس کے لیے قسم اٹھائی گئی ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آسمان اور چمک دار ستارے کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ ہر جان کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اور ستاروں کا یہ عظیم الشان سلسلہ جو بغیر کسی سہارے کے قائم ہے اور جس میں کوئی خرابی یا حادثہ پیش نہیں آتا، اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ جس قادر مطلق نے ان کی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے وہی ہر جان کی بھی حفاظت کر رہا ہے اور ہر چیز کا اصل حافظ وہی ہے، اگر وہ ایک لمحہ کے لیے اپنی توجہ ہٹا لے تو سب کچھ فنا ہو جائے۔ جس طرح اس نے شیطانوں سے آسمانوں کی حفاظت ستاروں کے ذریعے سے کی ہے، اسی طرح آفات سے حفاظت کے لیے ہر شخص پر باری باری آنے والے فرشتے مقرر کیے ہیں (دیکھیے رعد: ۱۱) اور اس کے اعمال کو لکھ کر محفوظ کرنے کے لیے کراماً کاتبین مقرر کیے ہیں۔ دیکھیے سورۂ انفطار (۱۰ تا ۱۲)۔

**آیت 5 تا 7** ① فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ......: ایک مقرر وقت تک انسان کی ذات کی حفاظت اور اعمال کی نگہداشت

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ⑧ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ⑨

بے شک وہ اسے لوٹانے پر یقیناً قادر ہے ⑧ جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی ⑨

یوم حساب کے لیے ہے، اگر اسے اپنا دوبارہ زندہ کیا جانا محال معلوم ہوتا ہے تو اپنی پیدائش پر غور کر لے کہ کس چیز سے ہوتی ہے؟ ایک اچھلنے والے پانی سے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پانی جیسی مائع چیز پر صورت گری کر کے ایک کامل انسان پیدا کر دیا، جس میں مکمل اعضائے جسم، حیات، قوت، عقل اور اِدراک سب کچھ موجود ہے تو یقیناً وہ اس انسان کو اس کی مٹی سے دوبارہ پہلی صورت میں پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ بتاؤ، انسان کو پانی سے بنانا مشکل ہے یا اسی کی خاک سے دوبارہ بنا دینا؟ اور پہلی دفعہ بغیر نمونے کے پیدا کرنا مشکل ہے یا پہلے نمونے پر دوبارہ بنا دینا؟

❷ منی اگر چہ بظاہر خُصیوں میں بنتی ہے، مگر جب پیدا کرنے والے نے بتا دیا کہ اس کا اصل مرکز پیٹھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہے تو اس حقیقت میں شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ بعض اہلِ علم کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جدید طب نے بھی تسلیم کیا ہے کہ جنین کے خُصیے ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گردوں کے قریب ہوتے ہیں، پھر ولادت سے پہلے اور بعض اوقات ولادت سے کچھ دیر بعد فوطوں میں اتر آتے ہیں، مگر پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا مقام وہی "بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ" رہتا ہے، بلکہ ان کی شریان بھی پیٹھ کے قریب شہ رگ (اَوْرَطی) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ سے گزرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ گویا خصیتین بھی اصل میں پیٹھ کا جز ہیں جو جسم کا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے باہر فوطوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ اب مادۂ منویہ اگر چہ خصیتین میں پیدا ہوتا اور کیسۂ منی میں جمع ہوتا ہے، مگر اسے خون پہنچانے اور حرکت دینے والا مرکز "بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ" ہی ہے۔ دماغ سے اعصاب کے ذریعے سے جب اس مرکز کو حکم پہنچتا ہے تو اس مرکز کی تحریک سے کیسۂ منی سکڑتا ہے اور ماءِ دافق پچکاری کی طرح اچھل کر نکلتا ہے۔ الحمد للہ، جدید طب بھی اس حقیقت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ بالفرض اگر وہ اس حقیقت تک نہ پہنچ پاتی تو قرآن کا بیان پھر بھی اٹل حقیقت تھا۔ قصور انسانی تجربات و مشاہدات کا تھا جو اپنی نارسائی کی وجہ سے خالق کی بیان کردہ حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

**آیت 9،8** اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۞ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ : "تُبْلَى" "بَلَا يَبْلُوْ" (ن) آزمائش کرنا، جانچ پڑتال کرنا، یہاں ظاہر کیا جانا مراد ہے، کیونکہ جانچ پڑتال تبھی ہوگی جب چھپے ہوئے اعمال ظاہر ہوں گے۔ "السَّرَآئِرُ" "سَرِيْرَةٌ" کی جمع ہے۔ "سِرٌّ" اور "سَرِيْرَةٌ" اس چیز کو کہتے ہیں جو چھپائی جائے۔ (قاموس) اس سے مراد وہ ارادے، نیتیں اور عقائد ہیں جن کا علم خود آدمی کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا اور وہ اعمال بھی جن کا علم کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ "يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ" "رَجْعِهٖ" کا ظرف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو اس دن دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّ لَا نَاصِرٍ ⑩ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ⑪ وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ⑫ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ⑬ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ ⑭

تو اس کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ⑩ قسم ہے آسمان کی جو بار بار بارش برسانے والا ہے! ⑪ اور زمین کی جو پھٹنے والی ہے! ⑫ کہ بے شک یہ یقیناً ایک دوٹوک بات ہے ⑬ اور یہ ہرگز مذاق نہیں ہے ⑭

**آیت 10** فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّ لَا نَاصِرٍ: آدمی گرفتار ہو جائے تو اپنی قوت سے چھوٹ جاتا ہے یا کسی کی مدد سے، مگر اس دن اس میں نہ خود بچ نکلنے کی قوت ہوگی اور نہ کوئی اس کی مدد کو آنے والا ہوگا۔

**آیت 12،11** وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ...... : "الرَّجْعِ" کی تفسیر مجاہد نے بارش کی ہے۔ [ دیکھیے بخاري، التفسیر، باب سورۃ الطارق، بعد ح : ۴۹۴۰ ] اکثر مفسرین نے یہی معنی کیا ہے۔ "الرَّجْعِ" کا لفظی معنی لوٹنا یا لوٹانا ہے، چونکہ بارش بار بار پلٹ کر برستی ہے، اس لیے اسے "رجع" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے، وہ بھاپ پلٹ کر پھر بارش کی صورت میں برستی ہے، پھر وہ پانی اڑتا ہے پھر برستا ہے، اس لیے اسے "رجع" کہا ہے۔ "الصَّدْعِ" کا معنی پھٹنا ہے۔

**آیت 13** اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ: بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ قرآن قولِ فصل ہے، اس میں شک نہیں کہ قرآن قولِ فصل ہے، مگر پچھلی آیات اور قسموں کی مناسبت کو مدنظر رکھیں تو یہاں مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ قولِ فصل سے مراد قیامت بپا کرنے اور انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہونے کی بات ہے، یعنی آسمان سے بار بار برسنے والی بارش اور اس کی نمی سے پھٹ کر بیج کو اُگا کر باہر لے آنے والی زمین شاہد ہے کہ تمھارے دوبارہ زندہ کیے جانے کی بات دوٹوک بات ہے، قیامت کے دن تم بھی اسی طرح زندہ ہو کر زمین سے نکل آؤ گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ أَرْبَعُوْنَ ...... ثُمَّ يُنْزِلُ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْبَقْلُ، لَيْسَ مِنَ الْإِنْسَانِ شَيْءٌ إِلَّا يَبْلٰى إِلَّا عَظْمًا وَّاحِدًا وَ هُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ وَمِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » [ بخاري، التفسیر، باب : ﴿ یوم ینفخ في الصور ...... ﴾ : ۴۹۳۵۔ مسلم : ۲۹۵۵ ] "دو نفخوں کے درمیان چالیس کا فاصلہ ہوگا ...... پھر آسمان سے بارش برسے گی تو لوگ اس طرح اُگیں گے جس طرح سبزی اُگتی ہے اور انسان کا کوئی حصہ نہیں جو بوسیدہ نہ ہو، سوائے ایک ہڈی کے اور وہ دُم کی ہڈی ہے، قیامت کے دن اسی سے مخلوق کو جوڑا جائے گا۔"

**آیت 14** وَ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ: یعنی دوبارہ زندہ ہونے کی بات تم سے مذاق کے ساتھ نہیں کہی جا رہی، یہ حکیم و علیم کا قول ہے، کسی جاہل کا نہیں جو مذاق کر رہا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے گائے ذبح کرنے کے حکم پر ان سے کہا کہ کیا آپ ہمیں مذاق کر رہے ہیں تو انھوں نے فرمایا: ﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [ البقرۃ : ۶۷ ] "میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔"

اِنَّهُمۡ يَكِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ۟ۙ﴿۱۵﴾ وَّ اَكِيۡدُ كَيۡدًا ۟ۚ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الۡكٰفِرِيۡنَ اَمۡهِلۡهُمۡ رُوَيۡدًا ﴿۱۷﴾ ع

بے شک وہ خفیہ تدبیر کرتے ہیں، ایک خفیہ تدبیر ﴿۱۵﴾ اور میں بھی خفیہ تدبیر کرتا ہوں، ایک خفیہ تدبیر ﴿۱۶﴾ سو کافروں کو مہلت دے، مہلت دے انھیں تھوڑی سی مہلت ﴿۱۷﴾

آیت 15 تا 17 ﴿ اِنَّهُمۡ يَكِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ...... ﴾ : ”رُوَيۡدًا“ مختار الصحاح میں ہے: ” فُلَانٌ يَمْشِيْ عَلٰى رُوْدٍ بِوَزْنِ عُوْدٍ أَيْ عَلٰى مَهْلٍ وَ تَصْغِيْرُهُ رُوَيْدٌ“ یعنی ”رُوَيْدٌ“ ”رُوْدٌ“ بروزن ”عُوْدٌ“ کی تصغیر ہے جس کا معنی مہلت ہے۔ گویا ”رُوَيۡدًا“ کا معنی تھوڑی سی مہلت ہے۔ آیت میں یہ ”اَمۡهِلۡهُمۡ“ کے مصدر محذوف ”إِمْهَالًا“ کی صفت ہے۔ یہ لوگ قیامت کو جھٹلانے اور حق کو مٹانے کے لیے خفیہ تدبیریں کر رہے ہیں اور میں خفیہ طور پر ان کے توڑ کے لیے ان سے بھی بڑی تدبیر کر رہا ہوں۔ آپ نہ ان کی مخالفت سے گھبرائیں، نہ جلد عذاب کی دعا کریں اور میرے کہنے پر انھیں تھوڑی سی مہلت دیں، آخر انھوں نے میرے ہی پاس آنا ہے، پھر میں جانوں اور یہ جانیں۔
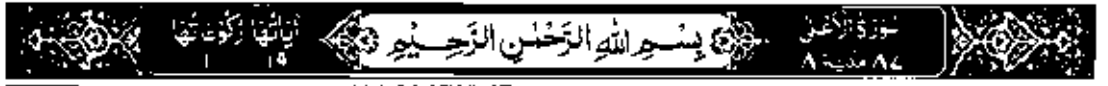
سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی ۸۷ مکیۃ ۸ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰیَاتُهَا ۱۹ رُکُوْعُهَا ۱

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۙ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے ① وہ جس نے پیدا کیا، پس درست بنایا ② اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر ہدایت کی ③

**آیت 1** ① سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى: ''تَسْبِیْحٌ'' کا معنی ہے ''ہر برائی سے پاک کرنا۔'' رب الاعلیٰ کے نام کو پاک کرنے کے حکم کے مفہوم میں کئی چیزیں شامل ہیں، پہلی یہ کہ ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰی'' کہو۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى'' پڑھتے تو کہتے: (( سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰی )) [ أبو داوٗد، الصلاۃ، باب الدعاء في الصلاۃ : ۸۸۳، وصححه الألباني ] ''پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند ہے۔'' اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں اس حکم پر عمل کے لیے ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰی'' کم از کم تین دفعہ پڑھتے تھے۔ [ دیکھیے نسائي، التطبیق، باب نوع آخر : ۱۱۳۴، صحیح ] دوسری یہ کہ اپنے رب کو ہر قسم کے نقص، عیب، کمزوری اور کسی بھی شریک سے پاک سمجھو اور اس کا اعلان کرتے رہو، تاکہ مشرکین اور باطل عقیدہ لوگوں کے کانوں میں یہ آواز پڑتی رہے۔ تیسری یہ کہ رب تعالیٰ کے نام کی تعظیم کرتے رہو، اسے ایسے طریقے سے یا ایسی جگہ یا ایسے الفاظ میں یاد نہ کرو جو اس کی شان کے لائق نہ ہو، یا جس سے اس کی بے ادبی ہوتی ہو یا استہزا کا پہلو نکلتا ہو یا اس کے ساتھ کسی کے شریک ٹھہرائے جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے لیے سب سے زیادہ سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو خود اس نے اپنے لیے استعمال کیے ہیں۔ چوتھی یہ کہ اللہ کا نام کسی مخلوق پر نہ بولو، مثلاً عبدالرحمن کو رحمان مت کہو۔ اگر لفظ مشترک ہو تو مخلوق پر اس انداز سے نہ بولو جس سے خالق کو یاد کرنا چاہیے۔

② ''اپنے رب کے نام کی تسبیح کر'' یا ''اپنے رب کی تسبیح کر'' دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، کیونکہ ''رب'' بھی اس کا نام ہے۔ لفظ ''نام'' اس لیے بڑھایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور کُنہ تک تو پہنچ ہی نہیں سکتے، تمھاری رسائی اس کے نام تک ہے، سو اس کی تسبیح کرتے رہو۔ بعض نے فرمایا کہ جب نام کی تسبیح ضروری ٹھہری تو اس کی ذات تو بالاولیٰ تسبیح کی حق دار ہے۔

**آیت 2** الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى: ''الَّذِيْ خَلَقَ'' (جس نے پیدا کیا) اس کا مفعول بہ محذوف ہے، یعنی یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ کسے پیدا کیا، کیونکہ پیدا کرنا کام اسی کا ہے اور سب اسی کی مخلوق ہیں۔ ''فَسَوّٰى'' ''پس درست بنایا'' یعنی ہر چیز کو ٹھیک، متوازن اور عمدہ ترین شکل میں بنایا، کوئی چیز بے ڈھب اور غیر متوازن نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴾ [ السجدۃ : ۷ ] ''وہ جس نے جو چیز پیدا کی خوب صورت پیدا کی۔'' اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں رب تعالیٰ کی بعض وہ صفات بیان ہوئی ہیں جن کی وجہ سے وہ تسبیح کا مستحق ہے۔

**آیت 3** وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى: یعنی اس نے ہر چیز کے متعلق اندازہ لگا کر پہلے ہی لکھ دیا کہ وہ کیا کرے گا؟ اس کا

وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۟ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۟ؕ﴿۵﴾ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۟ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا يَخْفٰى ۟ؕ﴿۷﴾

اور وہ جس نے چارا اگایا﴿۴﴾ پھر اس نے اسے سیاہ کوڑا کرکٹ کر دیا﴿۵﴾ ہم ضرور تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا﴿۶﴾ مگر جو اللہ چاہے یقیناً وہ کھلی بات کو جانتا ہے اور اس بات کو بھی جو چھپی ہوئی ہے﴿۷﴾

رزق، عمر، سعادت یا شقاوت سب کچھ لکھ دیا۔ اسی کا نام تقدیر ہے، اللہ تعالیٰ کا اندازہ ہمارے اندازے کی طرح نہیں کہ غلط ہو جائے۔ ''فَهَدٰى'' پھر جس نے جو کچھ کرنا تھا اسے اس راہ پر لگا دیا۔ ایک معنی یہ ہے کہ ہر جاندار کو پیدا کرکے اس کی ضرورتوں کا اندازہ مقرر کر دیا کہ اسے کیا کیا ضرورت ہوگی، پھر اسے اس کی ضروریات و مصالح حاصل کرنے کا راستہ بتا دیا، مثلاً بچے کو پستان چوسنے کا اور نر و مادہ کو بقائے نسل کا راستہ بتا دیا اور اس پر چلا دیا۔ پرندوں کو شام کے وقت اپنے گھونسلوں کی طرف واپسی کا اور شہد کی مکھی کو اپنے چھتے کا راستہ بتا دیا اور اس پر چلا دیا۔

**آیت 4، 5** وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ...... : حیوانوں کی ایک بڑی ضرورت چارا تھی، جو اس نے اُگایا، پھر بتدریج اسے سیاہ کوڑا بنا دیا۔ یہ اشارہ ہے ہر چیز کے کمال کے بعد زوال کی طرف۔

**آیت 6** سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قیامہ کی آیات (۱۶ تا ۱۹) کی تفسیر۔ یہ پیشین گوئی ابتدائے اسلام میں مکہ کے اندر ہوئی، پھر سب لوگوں نے دیکھا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ کو صرف ایک دفعہ جبریل علیہ السلام سے سن کر کسی کتابت یا تکرار کے بغیر اتنا بڑا قرآن حفظ ہو گیا۔ یہ قرآن کا بھی معجزہ ہے کہ اس کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کا بھی جنھیں قرآن یاد ہوا اور پھر بھولا نہیں۔

**آیت 7** ❶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ : یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہے بھلا دے۔ بعض اوقات کچھ آیات اس طرح بھی منسوخ کی جاتی تھیں کہ وہ آپ ﷺ کو بھلا دی جاتیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ [ البقرۃ : ۱۰۶ ] ''جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔''

❷ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا يَخْفٰى: ''وہ کھلی اور چھپی سب باتیں جانتا ہے'' یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ بیان فرمائی ہے کہ وہ کھلی اور چھپی سب باتیں جانتا ہے، کوئی بات اونچی آواز سے کی گئی ہو یا آہستہ یا بالکل مخفی ہو وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (دیکھیے رعد : ۱۰۔ طٰہٰ : ۷۔ انعام : ۳۔ انبیاء : ۱۱۰۔ ملک : ۱۳) ابن جوزی کے استاذ وزیر ابن ہُبیرہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس بات پر بہت غور کیا کہ چھپی ہوئی باتوں کو تو واقعی صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، مگر بلند آواز سے کی گئی باتیں تو ہم بھی جانتے اور سمجھتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان باتوں کے جاننے کو اپنی خاص صفت کے طور پر کیوں بیان فرما رہے ہیں؟ پھر میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ بلند آواز کے ساتھ اگر ایک وقت میں کئی آدمی بولنا شروع کر دیں تو ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا، یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے کہ وہ ساری مخلوق کی بلند آواز سے کی ہوئی باتیں سنتا ہے اور چھپی ہوئی باتیں بھی۔ اس مقام پر یہ صفت بیان

وَ نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝۹ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝۱۱

اور ہم تجھے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے ⑧ سو تو نصیحت کر، اگر نصیحت کرنا فائدہ دے ⑨ عنقریب نصیحت حاصل کرے گا جو ڈرتا ہے ⑩ اور اس سے علیحدہ رہے گا جو سب سے بڑا بدنصیب ہے ⑪

کرنے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہو رہا ہے کہ جب جبریل علیہ السلام پڑھیں تو آپ یاد کرنے کے لیے ساتھ ساتھ نہ پڑھیں، ان کے ساتھ ساتھ پڑھیں گے تو سمجھنا مشکل ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، یہ اللہ ہی کی شان ہے کہ بلند آواز سے کی گئی باتیں ہوں، خواہ کروڑوں لوگوں کی ہوں یا چھپی ہوئی، وہ سب جانتا ہے۔

**آیت 8** وَ نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى: یعنی ہم آپ کے لیے یہ آسانی فرمائیں گے کہ آپ کے خاموش رہ کر سنتے جانے سے آپ کو وحی الٰہی یاد ہو جائے گی۔

**آیت 9 تا 11** فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ......: ”تو نصیحت کر اگر نصیحت کرنا فائدہ دے“ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نصیحت فائدہ نہ دے تو کیا نصیحت چھوڑ دی جائے؟ جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں، بلکہ نصیحت کرتے رہنا لازم ہے۔ تو پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟ آیت کی مختلف تفاسیر میں سے تین تفسیریں زیادہ قریب ہیں: ① تفسیر ثنائی میں ہے کہ اس آیت کی بنا پر بعض لوگ گمراہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا چھوڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ نصیحت کے نفع دینے کی صورت میں نصیحت کرنے کا حکم ہے ورنہ نہیں، یہ ان کی غلطی ہے۔ آیت میں ”اِنْ“ ہے کہ جب تک انسان کو کسی قطعی دلیل سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ فلاں شخص کو نصیحت فائدہ نہ دے گی ”اِنْ“ کا محل رہتا ہے اور قطعی دلیل صرف وحی الٰہی ہے۔ وحی کے بغیر ہر حال میں نصیحت کے مفید ہونے کا امکان باقی ہے، اس لیے جب تک تمھیں وحی الٰہی سے معلوم نہ ہو جائے کہ فلاں کو نصیحت نفع نہ دے گی وعظ و نصیحت کرتے جاؤ۔ ظاہر ہے کہ تمھارے پاس وحی الٰہی نہیں، اس لیے تم ہمیشہ نصیحت کرتے رہو۔ (مختصراً)

② دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى“ (نصیحت کر، اگر نصیحت فائدہ دے) کا یہ مطلب نہیں کہ جسے نصیحت فائدہ دے اسے نصیحت کر دوسرے کو نہ کر، کیونکہ یہ تو معلوم ہی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصیحت کر اگر کسی ایک کو بھی نصیحت فائدہ دے۔ گویا ”نَفَعَتْ“ کا مفعول محذوف ہے، یعنی ”اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى أَحَدًا“ اور ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی کو تو فائدہ ہوتا ہی ہے، اس لیے آپ ہر شخص کو نصیحت کرتے جائیں۔ ”سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ......“ ڈرنے والا قبول کرے گا اور بدبخت اجتناب کرے گا، آپ کا کام نصیحت کرتے چلے جانا ہے اس امید پر کہ نصیحت کسی کو تو فائدہ دے گی۔

③ تیسری تفسیر یہ ہے کہ ”اِنْ“ حرف شرط ”اِذَا“ کے معنی میں ہے، یعنی نصیحت کر جب نصیحت کرنا فائدہ دے۔ موقع و محل کا خیال رکھو، بے موقع بات مؤثر نہیں ہوتی۔ جب دیکھو کہ سننے کی طرف مائل ہیں تو نصیحت کرو اور جب ضد اور سرکشی پر اترے ہوئے ہوں تو کنارہ کشی اختیار کرو، یہ نہیں کہ نصیحت ہی چھوڑ دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو، نوح اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے اپنی

الَّذِیْ یَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰى ﴿۱۳﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۱۶﴾ وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾

ع ۱ ۱۹ ۱۲

وہ جو سب سے بڑی آگ میں داخل ہوگا ﴿۱۲﴾ پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا ﴿۱۳﴾ بے شک وہ کامیاب ہوگیا جو پاک ہوگیا ﴿۱۴﴾ اور اس نے اپنے رب کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی ﴿۱۵﴾ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو ﴿۱۶﴾ حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے ﴿۱۷﴾ بے شک یہ بات یقیناً پہلے صحیفوں میں ہے ﴿۱۸﴾ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں ﴿۱۹﴾

اپنی اقوام کو ان پر عذاب آنے تک نصیحت ترک نہیں کی۔

**آیت 12، 13** الَّذِیْ یَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ...... : سب سے بڑی آگ اس لیے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے اُنہتر (۶۹) گنا بڑھی ہوئی ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۳۲۶۵) "ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰى" یعنی نہ مرے گا کہ جان چھوٹ جائے اور نہ ایسی زندگی ہوگی کہ کوئی راحت ہو۔

**آیت 14، 15** قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ......: یعنی کفر وشرک اور گناہوں سے پاک ہو کر اللہ اکبر کہہ کر پانچوں نمازیں پڑھیں۔

**آیت 16، 17** بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ...... : فرمایا، آخرت کی بھلائی کے کاموں میں تم اس لیے کوتاہی کرتے ہو کہ دنیا کے مشغلوں کو چھوڑنا تمھیں شاق گزرتا ہے، حالانکہ تم اسے نہ بھی چھوڑو گے تو وہ تمھیں چھوڑ دے گی، کیونکہ وہ باقی رہنے والی نہیں ہے اور اگر آخرت کو اختیار کر لو گے تو وہ تمھیں کبھی نہیں چھوڑے گی، پھر سوچ لو کسے ترجیح دینی چاہیے۔

(خلاصہ احسن التفاسیر)

سورۃ الغاشیۃ ۸۸ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — آیاتہا ۲۶ رکوعاتہا ۱

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا تیرے پاس ڈھانپ لینے والی کی خبر پہنچی؟ ① اس دن کئی چہرے ذلیل ہوں گے ② محنت کرنے والے، تھک جانے والے ③ گرم آگ میں داخل ہوں گے ④ وہ ایک کھولتے ہوئے چشمے سے پلائے جائیں گے ⑤

**آیت 2، 1** هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ...... : "اَلْغَاشِيَةِ" "غَشِيَ يَغْشٰى" (س) سے اسم فاعل ہے، ڈھانپ لینے والی۔ مراد قیامت ہے جو ہر چیز پر چھا جائے گی۔

**آیت 4، 3** ❶ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ...... : کافر دنیا میں جتنی محنت بھی کرے وہ قیامت کے دن گرد و غبار کی طرح اڑا دی جائے گی۔ (دیکھیے فرقان: ۲۳) یہی حال دکھاوا کرنے والے اور سنت کو چھوڑ کر خود ساختہ عمل کرنے والے کا ہے کہ سخت محنت کے باوجود جہنم میں جائے گا۔ (دیکھیے سورۂ کہف کا آخری رکوع مع تفسیر) اسی مفہوم کے پیش نظر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ" سے مراد نصاریٰ لیے ہیں۔ [ دیکھیے بخاري، التفسیر، سورۃ: ﴿ هل أتاك حدیث الغاشیة ﴾، بعد ح: ۴۹۴۱ ] نصرانی راہبوں کی شدید ریاضتیں مشہور ہیں، مگر وہ قیامت کے دن ان کے کسی کام نہیں آئیں گی۔

اسی طرح جو لوگ خود ساختہ ورد و وظیفے یا عبادتیں کرتے ہیں یا اپنے بنائے ہوئے طریقوں پر عبادت کرتے ہیں، خواہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر کریں یا الٹے لٹک کر یا سانس بند کر کے کریں یا مشرکین کی طرح کسی مخلوق کا تصور باندھ کر کریں یا ضربیں لگا کر، اتنی سخت مشقتوں کے باوجود وہ قیامت کے دن ذلیل ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَرِدُ عَلَيَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَهْطٌ مِّنْ أَصْحَابِيْ فَيُحَلَّؤُوْنَ عَنِ الْحَوْضِ فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ! أَصْحَابِيْ، فَيَقُوْلُ إِنَّكَ لَا عِلْمَ لَكَ بِمَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ، إِنَّهُمُ ارْتَدُّوْا عَلٰى أَدْبَارِهِمُ الْقَهْقَرٰى فَأَقُوْلُ سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ » [ بخاري، الرقاق، باب في الحوض: ۶۵۸۵، ۶۵۸۴ ] "قیامت کے دن میرے ساتھیوں میں سے ایک جماعت مجھ پر پیش کی جائے گی، پھر انھیں حوض سے روک دیا جائے گا تو میں کہوں گا: "اے میرے رب! یہ تو میرے ساتھی ہیں۔" تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا نئی چیزیں شروع کر دی تھیں، بلاشبہ یہ لوگ ایڑیوں کے بل الٹے لوٹ گئے تھے۔" تو میں کہوں گا: "پھر جس نے میرے بعد تبدیلی کر دی اسے مجھ سے دور لے جاؤ، اسے مجھ سے دور لے جاؤ۔"

❷ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً : "حَامِيَةً" "حَمِيَ يَحْمٰى حَمْيًا" (س) "اَلنَّارُ" (آگ کا سخت گرم ہونا) سے اسم فاعل مؤنث ہے، سخت گرم۔

**آیت 5** تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ : "اٰنِيَةٍ" "أَنٰى يَأْنِيْ إِنًى" (ض) سے اسم فاعل مؤنث ہے۔

لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ ۙ﴿۶﴾ لَّا يُسۡمِنُ وَ لَا يُغۡنِيۡ مِنۡ جُوۡعٍ ؕ﴿۷﴾ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ﴿۸﴾ لِّسَعۡيِهَا رَاضِيَةٌ ۙ﴿۹﴾ فِيۡ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ﴿۱۰﴾ لَّا تَسۡمَعُ فِيۡهَا لَاغِيَةً ؕ﴿۱۱﴾ فِيۡهَا عَيۡنٌ جَارِيَةٌ ۘ﴿۱۲﴾ فِيۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّ اَكۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّ نَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ ۙ﴿۱۵﴾ وَّ زَرَابِيُّ مَبۡثُوۡثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾ اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ﴿ٝ۱۷﴾ وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ ﴿ٝ۱۸﴾ وَ اِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ﴿ٝ۱۹﴾ وَ اِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ ﴿ٝ۲۰﴾

ان کے لیے کوئی کھانا نہیں ہوگا مگر ضریع سے ﴿۶﴾ جو نہ موٹا کرے گا اور نہ بھوک سے کچھ فائدہ دے گا ﴿۷﴾ کئی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے ﴿۸﴾ اپنی کوشش پر خوش ﴿۹﴾ بلند جنت میں ہوں گے ﴿۱۰﴾ وہ اس میں بے ہودگی والی کوئی بات نہیں سنیں گے ﴿۱۱﴾ اس میں ایک بہنے والا بڑا چشمہ ہے ﴿۱۲﴾ اس میں اونچے اونچے تخت ہیں ﴿۱۳﴾ اور رکھے ہوئے آبخورے ہیں ﴿۱۴﴾ اور قطاروں میں لگے ہوئے گاؤ تکیے ہیں ﴿۱۵﴾ اور بچھائے ہوئے مخملی قالین ہیں ﴿۱۶﴾ تو کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے ﴿۱۷﴾ اور آسمان کی طرف کہ وہ کیسے بلند کیا گیا ﴿۱۸﴾ اور پہاڑوں کی طرف کہ وہ کیسے نصب کیے گئے ﴿۱۹﴾ اور زمین کی طرف کہ وہ کیسے بچھائی گئی ﴿۲۰﴾

**آیت 6** لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ : "ضَرِيۡعٌ" ایک خاردار پودا ہے جو تازہ ہو تو اہلِ حجاز اسے "شِبۡرِق" کہتے ہیں اور خشک ہو تو "ضَرِيۡعٌ" جو سخت زہریلا ہوتا ہے۔ [ دیکھیے بخاري، التفسیر، سورۃ : ﴿هل أتاك﴾، بعد ح : ۴۹۴۱ ]

**آیت 11** لَا تَسۡمَعُ فِيۡهَا لَاغِيَةً : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ نبا کی آیت (۳۵) کی تفسیر۔

**آیت 12** فِيۡهَا عَيۡنٌ جَارِيَةٌ : "عَيۡنٌ" (چشمہ) یہ یا تو اسم جنس ہے اور لفظ واحد ہونے کے باوجود بے شمار بہنے والے چشمے مراد ہیں، یا واحد ہے اور تنوین تعظیم کے لیے ہے، ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔

**آیت 12** فِيۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ : جہاں سے وہ گرد و پیش والی ہر چیز کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔

**آیت 14** وَّ اَكۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ : "اَكۡوَابٌ" "كُوۡبٌ" کی جمع ہے، وہ پیالے جن کی نہ ڈنڈی ہو نہ ٹونٹی۔

**آیت 17 تا 20** ❶ اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ ..... : قیامت اور قیامت کے دن جہنمیوں اور جنتیوں کا حال ذکر کرنے کے بعد ان چیزوں کو دیکھنے کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں اور نہ کسی نے جنت یا جہنم میں جانا ہے تو ان چار چیزوں کو دیکھ لیں۔ اتنی عظیم الشان چیزیں پیدا کرنے والا پروردگار کیا ان لوگوں کو دوبارہ نہیں بنا سکتا؟
❷ عرب کا بادیہ نشین تمام شہری تکلفات سے دور اونٹ پر سوار ہو کر سفر کر رہا ہو اور فطرت اپنی اصل صورت میں اس کے سامنے جلوہ گر ہو تو تھوڑا سا غور کرنے پر بھی ہر چیز میں اسے اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت نظر آئے گی۔ اوپر دیکھے تو سورج یا

فَذَكِّرْ ۛ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾
فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾

**پس تو نصیحت کر، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ﴿٢١﴾ تو ہرگز ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے ﴿٢٢﴾ مگر جس نے منہ موڑا اور انکار کیا ﴿٢٣﴾ تو اسے اللہ عذاب دے گا، سب سے بڑا عذاب ﴿٢٤﴾ یقیناً ہماری ہی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے ﴿٢٥﴾ پھر بے شک ہمارے ہی ذمے ان کا حساب ہے ﴿٢٦﴾**

چاند ستاروں سے بھرا ہوا لامحدود محکم آسمان، نیچے دیکھے تو صفائی سے بچھی ہوئی وسیع زمین، دائیں بائیں دیکھے تو زمین میں گڑے ہوئے بلند و بالا پہاڑ اور اپنی سواری کو دیکھے تو صحرا کے مطابق بناوٹ رکھنے والا ہفتوں بھوک اور پیاس برداشت کرنے والا اونٹ، کوئی چیز بھی تو اس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں۔ اتنی عظیم مخلوق کے مالک کے لیے اس حقیر انسان کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے جسے پہلے بھی اسی نے پیدا کیا ہے؟

**آیت 22،21** ﴿ فَذَكِّرْ ۛ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ...... : آپ کا کام نصیحت کرنا ہے، زبردستی مسلمان کرنا نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [البقرة: ٢٥٦] ”دین میں کوئی زبردستی نہیں۔“

**آیت 24،23** ﴿ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ...... : مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو منہ موڑ کر کفر پر اصرار کرتا ہے اسے پوچھا ہی نہ جائے، بلکہ اگر وہ کافر ہی رہنا چاہتا ہے تو رہے، مگر مسلمانوں کی حکومت تسلیم کرے، اپنے ہاتھوں سے انھیں جزیہ دے اور اپنی ذلت کا اقرار کرے (یہ دنیا کا عذاب ہے) ورنہ لڑنے کے لیے تیار رہے۔ (دیکھیے توبہ: ٢٩) اور قیامت کو اس کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں غلامی سے بڑی ذلت کوئی نہیں اور آخرت میں آگ سے بڑا عذاب کوئی نہیں، دونوں عذاب اکبر ہیں۔

**آیت 25** ﴿ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ : ”اِيَابٌ“ ”آبَ يَؤُوْبُ“ (ن) کا مصدر ہے، لوٹنا۔

سورۃ الفجر ۸۹ مکیۃ ۱۰ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | آیاتہا ۳۰ رکوعاتہا ۱

وَ الْفَجْرِ ۙ﴿۱﴾ وَ لَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ الشَّفْعِ وَ الْوَتْرِ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ؕ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے فجر کی! ① اور دس راتوں کی! ② اور جفت اور طاق کی! ③ اور رات کی جب وہ چلتی ہے! ④ یقیناً اس میں عقل والے کے لیے بڑی قسم ہے ⑤

**آیت 1** وَ الْفَجْرِ: "الْفَجْرِ" سے مراد صبح ہے۔ سورۂ تکویر میں بھی یہ قسم مذکور ہے: ﴿وَ الصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ﴾ [ التکویر: ۱۸ ] "اور قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے۔" ضروری نہیں کہ اس سے کسی خاص دن کی صبح ہی مراد لی جائے، ہر صبح ہی قیامت کی دلیل ہے، جس کے ساتھ سوئی ہوئی مخلوق بیدار ہو جاتی ہے اور موت کے بعد اٹھنے کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔

**آیت 2** وَ لَيَالٍ عَشْرٍ: بہت سے مفسرین نے "وَ لَيَالٍ عَشْرٍ" سے ذوالحجہ کی پہلی دس راتیں مراد لی ہیں۔ اہلِ عرب حج کے ایام کی بہت تعظیم کرتے تھے، ان دنوں میں ہر طرف سے لوگوں کا مکہ میں اجتماع قیامت کے دن کے اجتماع کی یاد دلاتا ہے، مگر لفظ عام ہیں تو بہتر ہے مفہوم بھی عام ہی رکھا جائے۔ چاند کی راتوں کا ہر عشرہ نئے انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے، پہلے عشرے میں چاند بڑھتا جاتا ہے، آخری میں گھٹتا جاتا ہے اور درمیانی عشرہ عروج و زوال کا جامع ہونے کے باوجود تقریباً روشن ہوتا ہے۔ یہ انقلاب قیامت قائم ہونے کی دلیل ہے۔

**آیت 3** وَ الشَّفْعِ وَ الْوَتْرِ: جفت وہ عدد ہے جو دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جائے، جیسے دو، چار، چھ وغیرہ اور طاق وہ عدد ہے جو اس طرح تقسیم نہیں ہوتا، مثلاً ایک، تین، پانچ وغیرہ۔ کائنات کی کوئی بھی چیز گنتی کے وقت ان دو حالتوں سے خالی نہیں۔ تمام چیزیں بڑھتے وقت بھی طاق سے جفت اور جفت سے طاق ہوتی چلی جاتی ہیں اور گھٹتے وقت بھی۔ مثلاً ایک سے دو، پھر تین، پھر چار وعلیٰ ہذا القیاس اور دس سے نو، پھر آٹھ سے سات وعلیٰ ہذا القیاس۔

**آیت 4** وَ الَّيْلِ اِذَا يَسْرِ: "يَسْرِ" اصل میں "يَسْرِيْ" ہے، آیات کے فواصل کی مطابقت کے لیے یاء حذف کر کے راء پر کسرہ باقی رکھا گیا ہے۔ "سَرٰى يَسْرِيْ سُرًى" (ض) رات کا چلنا۔ سورۂ مدثر میں فرمایا: ﴿وَ الَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ﴾ [ المدثر: ۳۳ ] "اور قسم ہے رات کی، جب وہ جانے لگے۔" یعنی رخصت ہوتی ہوئی رات قیامت قائم ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

**آیت 5** ❶ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ: "هَلْ" کے معنی کے لیے دیکھیے سورۂ دہر کی پہلی آیت۔ "حَجَرَ يَحْجُرُ" (ن) منع کرنا، روکنا۔ عقل کو "حِجْرٍ" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کو ہر غلط کام سے روکتی اور منع کرتی ہے۔

❷ قرآن مجید میں مذکور قسمیں عام طور پر کسی نہ کسی بات کی شہادت اور دلیل کے لیے آتی ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قسمیں کھا کر عقل والوں کو کیا باور کروایا جا رہا ہے؟ جواب اگرچہ لفظوں میں موجود نہیں مگر آئندہ آیات سے صاف واضح ہے، یعنی ان

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿٦﴾ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿٧﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿٨﴾ وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿٩﴾ وَ فِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١١﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کس طرح کیا ﴿٦﴾ (وہ عاد) جو اِرم (قبیلہ کے لوگ) تھے، ستونوں والے ﴿٧﴾ وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا ﴿٨﴾ اور ثمود کے ساتھ (کس طرح کیا) جنھوں نے وادی میں چٹانوں کو تراشا ﴿٩﴾ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (کس طرح کیا) ﴿١٠﴾ وہ لوگ جو شہروں میں حد سے بڑھ گئے ﴿١١﴾

سب چیزوں پر غور کرو تو تمھیں یقین ہو جائے گا کہ اتنے زبردست تغیرات لانے والا پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ تمھیں دوبارہ زندہ کر کے تمھیں تمھارے اعمال کی جزا و سزا دے اور اگر تم سرکشی پر اڑے رہے تو عاد و ثمود اور قوم فرعون کی طرح دنیا میں بھی تم پر عذاب کا کوڑا برسا دے۔

**آیت 7،6** اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ...... : "الْعِمَادِ" اسم جنس ہے جو واحد و جمع سب پر آتا ہے، ستون۔ "اِرَمَ" نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک آدمی کا نام ہے جس کی نسل سے عاد ارم تھے۔ عادِ ارم سے مراد عادِ اولیٰ ہیں جن کی طرف ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے اور عادِ ثانیہ یا عادِ اُخریٰ ثمود کو کہتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ارم خاص اس جگہ کا نام تھا جہاں عاد رہتے تھے۔ (واللہ اعلم) البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان لوگوں کی باتوں کو خرافات قرار دیا ہے جنھوں نے ارم ایک ایسا شہر بیان کیا ہے جس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی تھی۔ "ذَاتِ الْعِمَادِ" کا لفظی معنی ہے "ستونوں والے۔" ان کا یہ لقب اس لیے ہے کہ وہ بڑے قد آور تھے (جس طرح کھجوروں کے تنے۔ دیکھیے حاقہ: ۷) اور اس لیے بھی کہ وہ بڑے بڑے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے اور محض شان و شوکت کے اظہار کے لیے اونچی سے اونچی یادگاریں بناتے تھے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۱۲۸)۔

**آیت 9** وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ : "جَابُوْا" "جَابَ يَجُوْبُ جَوْبًا" (ن) کاٹنا۔ "الصَّخْرَ" اسم جنس ہے، چٹانیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ ثمود پہلے لوگ ہیں جنھوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر گھر بنائے۔ (شوکانی) آج کل اس "وادی القریٰ" کا نام "العلاء" ہے جو سعودی عرب میں ہے اور وہ مدائن صالح (جو ثمود کا مرکزی شہر تھا) سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ (دیکھیے سورۂ حجر: ۸۲) (اشرف الحواشی)

**آیت 10** وَ فِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ : "الْاَوْتَادِ" "وَتَدٌ" کی جمع ہے، لکڑی یا لوہے وغیرہ کی میخیں۔ "ذِي الْاَوْتَادِ" "میخوں والا" یعنی بڑے لشکروں والا، جن کے خیمے گاڑنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں میخیں مہیا رہتی تھیں، یا سخت ظالم کہ جس پر ناراض ہوتا اس کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھکوا دیتا تھا۔

فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

پس انھوں نے ان میں بہت زیادہ فساد پھیلا دیا ﴿۱۲﴾ تو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا ﴿۱۳﴾ بے شک تیرا رب یقیناً گھات میں ہے ﴿۱۴﴾ پس لیکن انسان جب اس کا رب اسے آزمائے، پھر اسے عزت بخشے اور اسے نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی ﴿۱۵﴾ اور لیکن جب وہ اسے آزمائے، پھر اس پر اس کا رزق تنگ کر دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ﴿۱۶﴾ ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے ﴿۱۷﴾ اور نہ تم آپس میں مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو ﴿۱۸﴾ اور تم میراث کھا جاتے ہو، سب سمیٹ کر کھا جانا ﴿۱۹﴾ اور مال سے محبت کرتے ہو، بہت زیادہ محبت کرنا ﴿۲۰﴾

**آیت 12** فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ: یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر و شرک اور اس کی مخلوق پر ظلم و ستم۔ (اشرف الحواشی)

**آیت 13** فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ: ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر برسانے والی آندھی بھیجی، کسی کو چیخ نے پکڑ لیا، کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت کی آیت (۴۰) کی تفسیر۔

**آیت 14** اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ: "رَصَدَ يَرْصُدُ رَصْدًا" (ن) کسی کے راستے میں اس پر حملے کے انتظار میں بیٹھنا۔ "اَلْمِرْصَادُ" گھات، چھپ کر بیٹھنے کی جگہ جس میں بیٹھ کر دشمن پر حملے کا انتظار کیا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان کے لیے مقرر کردہ وقت کے انتظار میں ہے، جب مقرر وقت آتا ہے پکڑ لیتا ہے۔

**آیت 15 تا 20** فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ……: قیامت کے منکرین کے نزدیک چونکہ سبھی کچھ دنیا ہے اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں جو آسودہ حال ہے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے اور جو تنگ حال ہے اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہے۔ فرمایا یہ بات ہرگز درست نہیں، فرعون اور دوسرے لوگوں کے واقعات ابھی تم نے سنے، ان کی خوش حالی اور پھر ان پر آنے والے عذاب کو یاد کرو تو سمجھ لو گے کہ دنیا کی آسودہ حالی یا بدحالی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے کہ کافر خوش حالی میں سرکشی اور تنگی میں شکوہ و ناشکری کر کے ناکام ہو جاتے ہیں اور مومن نعمت پر شکر کے ساتھ اور مصیبت میں صبر کے ساتھ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تمھارا حال تو یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ خوش حالی کی نعمت کا شکر ادا کرو اور بطور شکر مستحقین پر خرچ کرو، تم اتنا بھی نہیں

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾

ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی ﴿٢١﴾ اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے ﴿٢٢﴾

کرتے کہ یتیم کے ساتھ عزت کا برتاؤ ہی کرلو، یا مسکین کو کھلاتے نہیں تو کسی دوسرے کو ترغیب ہی دے دو۔ تم تو میراث کا مال بھی جو تمھیں بغیر محنت کے مل گیا ہے، عطا فرمانے والے کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے حصے پر قناعت کے بجائے سارا ہی لپیٹ جاتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم مال عطا فرمانے والے کے بجائے مال سے محبت کرتے ہو اور حد سے بڑھ کر کرتے ہو۔

آیت 21 كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا: "كَلَّآ" ہرگز نہیں، یعنی تمھیں ہرگز ایسے نہیں کرنا چاہیے، بلکہ وہ وقت سامنے رکھنا چاہیے جب قیامت کے پہلے نفخہ کے ساتھ زمین ریزہ ریزہ کر کے ہموار چٹیل میدان بنا دی جائے گی۔

آیت 22 ① وَ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا: اور دوسرے نفخہ کے ساتھ تمام لوگ زندہ ہو کر اس چٹیل میدان میں کھڑے ہو کر انتظار کر رہے ہوں گے، اس وقت رب تعالیٰ جس طرح اس کی شان کے لائق ہے نزول فرمائے گا۔ ساتھ ہی فرشتے صف در صف آئیں گے، زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور اعمال نامے پیش کیے جائیں گے۔ انبیاء اور گواہوں کو لایا جائے گا اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کیے جائیں گے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ زمر (۶۹) کی تفسیر۔

② اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خود صاف الفاظ میں اس دن اپنے آنے کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آنے کے عجیب عجیب مطلب نکالے ہیں۔ چنانچہ کسی نے کہا رب کا حکم آئے گا، کسی نے کہا یہ صرف تمثیلی انداز ہے، مطلب صرف یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا رعب اس طرح طاری ہوگا جس طرح بادشاہوں کے آنے کے وقت ہوتا ہے۔ بعض بزرگوں نے ترجمے میں تبدیلی کر کے حاشیہ لکھا ہے: ''اصل الفاظ ہیں "وَ جَآءَ رَبُّكَ" جن کا لفظی ترجمہ ہے ''اور تیرا رب آئے گا'' لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' ان بزرگوں کی غلطی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے جیسا سمجھا کہ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے تو اس کا پہلی جگہ سے منتقل ہونا لازم ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے آسمانِ دنیا پر اترنے یا زمین پر آنے کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ وہ عرش پر نہیں رہا۔ اب تو اللہ کی مخلوق میں بھی اس کے عجائبات ظاہر ہو رہے ہیں کہ بجلی اپنے مستقر میں ہونے کے باوجود ریموٹ کے ذریعے سے بغیر تار کے کہاں تک پہنچ جاتی ہے، خالق کی صفت تو مخلوق سے بہت ہی برتر ہے۔ پھر اس میں صرف یہی خرابی نہیں کہ اللہ کے آنے کی صفت کا انکار کیا، بلکہ اسے مخلوق سے بھی عاجز جانا کہ مخلوق جہاں چاہے آ جا سکتی ہے، مگر خالق میدانِ محشر میں فیصلے کے لیے بھی نہیں آ سکتا۔ مومن کا کام یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ وہ قیامت کے دن آئے گا تو وہ اس پر ایمان رکھے اور یہ بات اللہ کے سپرد کر دے کہ وہ کس طرح آئے گا۔ یقیناً وہ اسی طرح آئے گا جس طرح اس

وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰىؕ ﴿۲۳﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْۚ ﴿۲۴﴾ فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌۙ ﴿۲۵﴾ وَّ لَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌؕ ﴿۲۶﴾ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُۗۖ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةًۚ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْۙ ﴿۲۹﴾ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۠ ﴿۳۰﴾

اور اس دن جہنم کو لایا جائے گا، اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں ﴿۲۳﴾ کہے گا اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے آگے بھیجا ہوتا ﴿۲۴﴾ پس اس دن اس کے عذاب جیسا عذاب کوئی نہیں کرے گا ﴿۲۵﴾ اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھے گا ﴿۲۶﴾ اے اطمینان والی جان! ﴿۲۷﴾ اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو راضی ہے، پسند کی ہوئی ہے ﴿۲۸﴾ پس میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا ﴿۲۹﴾ اور میری جنت میں داخل ہو جا ﴿۳۰﴾

کی شان کے لائق ہے اور جس کی تفصیل سمجھنا عاجز مخلوق کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

**آیت 23** وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ : عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « یُؤْتٰی بِجَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ لَهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ زِمَامٍ، مَعَ كُلِّ زِمَامٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ یَجُرُّوْنَهَا » [ مسلم، الجنة وصفة نعیمها، باب جہنم أعاذنا اللّٰہ منها : ۲۸٤۲ ] ''اس دن جہنم اس حال میں لائی جائے گی کہ اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی، ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ کر لائیں گے۔''

**آیت 27** یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ : ''النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ'' اطمینان والی جان، جسے اللہ، اس کے رسول اور ان کے احکام کے حق ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں، بلکہ پوری تسلی ہے۔

سُوْرَةُ الْبَلَدِ ۹۰ مکیۃ ۳۵ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اٰیاتھا ۲۰ رکوعاتھا ۱

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

نہیں، میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں! ① اور تو اس شہر میں رہنے والا ہے ② اور جننے والے کی قسم! اور اس کی جو اس نے جنا! ③ بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے ④ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہوگا؟ ⑤ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال برباد کر ڈالا ⑥

**آیت 1 تا 4** لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ...... : قسم سے پہلے "لَآ" (نہیں) فرما کر ان لوگوں کی بات کی نفی کی گئی ہے جو قسم کے بعد آنے والی بات کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چند قسموں کے بعد فرمایا، یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے، اگر وہ سمجھے کہ میں دنیا میں عیش و آرام کے لیے آیا ہوں تو اس کا خیال غلط ہے۔ اس حقیقت کا یقین دلانے کے لیے پہلی قسم شہر مکہ کی کھائی، جو اس دعوے کی دلیل بھی ہے، کیونکہ اس شہر کی آبادی کی ابتدا، اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی زندگی، ان کے بعد کی تاریخ، خصوصاً اس شہر میں رہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، آپ کی یتیمی اور بے سروسامانی، نبوت کی ذمہ داری کے بعد اپنی ہی قوم کا جان لینے کے درپے ہو جانا، یہ سب چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ انسان یقیناً مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جننے والے ماں باپ اور ان کے جنم دیے ہوئے بچے کی قسم ہے۔ ماں باپ کو اولاد کے حصول کی جستجو سے لے کر ان کی پرورش تک جن مصائب سے گزرنا پڑتا ہے اور ان کے جنم دیے ہوئے بچے پر نطفہ ہونے سے لے کر ولادت تک، پھر ولادت سے بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک جو کچھ گزرتا ہے، وہ سب کچھ اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ شروع سے آخر تک سختیاں اور مصیبتیں ہی جھیلتا رہتا ہے، کبھی بیماری میں گرفتار ہے، کبھی رنج میں، کبھی فقر و فاقہ میں، کبھی کسی اور فکر میں۔ اگر کبھی کسی خوشی یا راحت کا کوئی لمحہ آتا بھی ہے تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور ہوتی ہے، کوئی اور نہ ہو تو اس کے زوال کی فکر ہی اسے مکدر کرنے کے لیے کافی ہے۔

**آیت 5** اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ: جن سختیوں اور مصیبتوں میں آدمی زندگی بسر کرتا ہے ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنی حقیقت کو پہچانتا اور اس میں عاجزی اور انکسار کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اکڑفوں دکھاتا ہے اور سمجھتا ہے مجھ پر کون قابو پا سکتا ہے؟ (اشرف الحواشی)

**آیت 6** يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا : یعنی دین حق کی مخالفت یا جاہلانہ رسم و رواج میں روپیہ لٹانے کو بڑا کمال سمجھتا

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۝ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝

کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ ⑦ کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں ⑧ اور ایک زبان اور دو ہونٹ ⑨ اور ہم نے اسے دو واضح راستے دکھا دیے ⑩ پھر (بھی) وہ مشکل گھاٹی میں نہ گھسا ⑪ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ مشکل گھاٹی کیا ہے؟ ⑫ (وہ) گردن چھڑانا ہے ⑬

ہے اور اسے فخر یہ بیان کرتا ہے۔ (اشرف الحواشی)

**آیت 7** اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ : کیا وہ خیال کرتا ہے کہ جب وہ فخر و ریا کے لیے مال لٹا رہا تھا تو کسی نے اسے نہیں دیکھا؟ یقیناً ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

**آیت 8 تا 10** اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ...... : " نَجْدٌ " کا لغوی معنی "بلند جگہ" ہے۔ "النَّجْدَيْنِ" دو بلند جگہوں سے مراد ماں کی چھاتیاں ہیں۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کے مطابق ماں کی چھاتیوں کی طرف لپکتا ہے، انھیں منہ میں ڈال کر دودھ چوستا ہے جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس کی یہ رہنمائی نہ کرے تو کوئی بچہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ آنکھوں، زبان اور ہونٹوں کے الفاظ کے ساتھ ماں کی چھاتیوں کی مناسبت واضح ہے۔ اکثر مفسرین نے "النَّجْدَيْنِ" سے مراد خیر و شر کے دو واضح راستے لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ کی بغاوت کرتے ہوئے اور بے تحاشا مال لٹاتے ہوئے یہ گمان کیسے کر لیا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ کوئی اس سے پوچھنے والا ہے؟ حالانکہ جن آنکھوں سے وہ دیکھ رہا ہے وہ ہم نے بنائی ہیں، زبان اور ہونٹ جن سے ڈینگیں مار رہا ہے وہ بھی ہم نے پیدا کیے ہیں، پھر ہم نے اسے خیر و شر کے راستے کا شعور بھی عطا فرمایا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے آنکھیں عطا کرنے والا خود ہی دیکھ نہ رہا ہو، اسے زبان اور ہونٹ دینے والا اسے پوچھ بھی نہ سکتا ہو اور خیر و شر کا شعور عطا فرمانے والا اس سے اس شعور کے استعمال کے متعلق باز پرس ہی نہ کرے؟

**آیت 11** فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ : اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مال کی نعمت عطا فرمائی ہے اس کا تقاضا یہ نہ تھا کہ اسے ناحق اڑاتا، بلکہ یہ تھا کہ وہ بلندیاں جو سخت جدوجہد سے حاصل ہوتی ہیں انھیں سر کرنے کے لیے مشکل گھاٹی میں بے دریغ گھس جاتا، مگر اس نے اس مشکل گھاٹی میں گھسنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ مشکل گھاٹی اس لیے فرمایا کہ نفس کو ان کاموں کا سرانجام دینا دشوار ہوتا ہے۔ " الْعَقَبَةَ " کے معنی ہیں گھاٹی، پہاڑ پر چڑھنے کا مشکل راستہ۔

**آیت 12، 13** وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ...... : مال دار کے لیے بلندیوں پر لے جانے والا مشکل راستہ کیا ہے؟ وہ گردن چھڑانا ہے، کیونکہ غلامی سے بڑی ذلت کوئی نہیں اور آزادی دلانے سے بڑھ کر کسی کے ساتھ کوئی حسن سلوک نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا يَجْزِيْ وَلَدٌ وَالِدًا إِلَّا أَنْ يَّجِدَهٗ مَمْلُوْكًا فَيَشْتَرِيَهٗ

اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾

یا کسی بھوک والے دن میں کھانا کھلانا ہے ﴿۱۴﴾ کسی قرابت والے یتیم کو ﴿۱۵﴾ یا مٹی میں ملے ہوئے کسی مسکین کو ﴿۱۶﴾ پھر (یہ کہ) ہو وہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی ﴿۱۷﴾

---

فَيُعْتِقَهُ ›› [ مسلم، العتق، باب فضل عتق الوالد : ۱۵۱۰ ] ”کوئی اولاد اپنے والد کا بدلا نہیں دے سکتی سوائے اس کے کہ اسے غلامی کی حالت میں پائے اور خرید کر اسے آزاد کر دے۔“ گردن چھڑانے کی ایک اور فضیلت بھی ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ‹‹ مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُّؤْمِنَةً أَعْتَقَ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِّنْهُ عُضْوًا مِّنَ النَّارِ حَتّٰى يُعْتِقَ فَرْجَهُ بِفَرْجِهِ ›› [ مسلم، العتق، باب فضل العتق : ۱۵۰۹/۲۳ ] ”جو شخص مومن گردن کو آزاد کرے اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کا ایک عضو آگ سے آزاد کرے گا، حتیٰ کہ اس کی شرم گاہ کے بدلے اس کی شرم گاہ کو آزاد کر دے گا۔“ گردن چھڑانے میں غلام آزاد کرنے کے ساتھ کسی ناحق گرفتار کو رہائی دلوانا اور کسی مقروض کی گردن قرض سے چھڑانا بھی شامل ہے۔

**آیت 14 تا 16** اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ...... : یوں تو قحط اور بھوک کے وقت کسی بھی یتیم کو کھانا کھلانا ثواب کا کام ہے، لیکن جو یتیم رشتہ دار بھی ہو اس کی خبر گیری کرنا مزید اجر کا باعث ہے۔ اسی معنی میں سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ‹‹ اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ ، وَ إِنَّهَا عَلٰى ذِي الرَّحِمِ اثْنَتَانِ، صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ ›› [ مسند أحمد : ۲۱٤/٤، ح : ۱۷۸۹۱۔ ترمذي : ٦٥٨۔ ابن ماجه : ۱۸٤٤، و صححه الألباني ] ”مسکین پر صدقہ کرنا (صرف) صدقہ ہے اور رشتہ دار مسکین پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔“

**آیت 17** ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... : جنت کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے یہی کافی نہیں کہ گردنیں آزاد کرے یا یتیم اور مسکین کو کھانا کھلائے، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ایمان بھی ضروری ہے، اگر ایمان نہیں تو کوئی عمل قبول نہیں۔ (دیکھیے نساء: ۱۲۴۔ نحل: ۹۷۔ بنی اسرائیل: ۱۹) پھر ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کرنے کی وصیت اور تاکید بھی ضروری ہے۔ سورۂ عصر میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

” ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا “ کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ مشکل گھاٹی کی چڑھائی کے لیے جو امور ضروری ہیں ان میں پہلے گردن چھڑانا اور یتیم یا مسکین کو کھانا کھلانا ہے، پھر اس کے بعد ایمان لانا اور حق و مرحمت کی وصیت کرنا ہے، مگر اہلِ علم فرماتے ہیں کہ ” ثُمَّ “ ہمیشہ ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہوتا، بعض اوقات ترتیب ذکری کے لیے بھی ہوتا ہے، یعنی موقع کی

اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ۞ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا هُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَةِ ۞ عَلَيۡهِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَةٌ ۞

ع ۱۵

یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں ⑱ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہی بائیں ہاتھ والے ہیں ⑲ ان پر (ہر طرف سے) آگ بند کی ہوئی ہوگی ⑳

مناسبت سے بعد کی ایک چیز پہلے ذکر کر دی جاتی ہے۔ یہاں مال داروں کے لیے خرچ کرنا چونکہ بہت مشکل کام ہے اس لیے پہلے اس کا ذکر فرمایا، پھر ایمان اور تواصی بالحق والمرحمہ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ایمان کے بغیر گردن چھڑانا، کھانا کھلانا یا نیکی کا کوئی بھی کام بے سُود ہے۔

**آیت 19،18** اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ...... : دائیں ہاتھ والے سے مراد یہ ہے کہ انھیں ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا، اسی طرح بائیں ہاتھ والوں کو ان کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں ملے گا۔ "اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ" کا دوسرا معنی ہے برکت والے، خوش نصیب اور "اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَةِ" کا معنی نحوست والے، بدنصیب بھی ہے۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ ۹۱ مکیۃ ۲۶ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا ۱۵ رُكُوْعَاتُهَا ۱

وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا ۪ۙ﴿۱﴾ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۪ۙ﴿۲﴾ وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۪ۙ﴿۳﴾ وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۪ۙ﴿۴﴾ وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا ۪ۙ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے سورج کی! اور اس کی دھوپ کی! ① اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آئے! ② اور دن کی جب وہ اس (سورج) کو ظاہر کر دے! ③ اور رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لے! ④ اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا! ⑤

**آیت 1** وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا: پہلی آیت سے لے کر آٹھویں آیت تک تمام قسموں کا جوابِ قسم یہ ہے کہ ''جس شخص نے اپنے نفس کو پاک کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے مٹی میں دبا دیا وہ ناکام ہوا۔'' ان قسموں اور جوابِ قسم کی مناسبت یہ ہے (واللہ اعلم) کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لیے پیدا فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ [ البقرۃ : ۲۹ ] ''وہ ذات کہ زمین میں جو کچھ ہے اس نے سب تمھارے لیے پیدا فرمایا۔'' حتیٰ کہ آسمان کی چھت، زمین کا فرش، سورج اور اس کی دھوپ، اس کے بعد چاند اور اس کی چاندنی اور دن کو آفتاب کا اُجالا، پھر رات کا اس کو ڈھانپ لینا اسی کے فائدے کے لیے ہے، فرمایا: ﴿ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ﴾ [ إبراھیم : ۳۳ ] ''اور اس نے تمھارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو مسلسل چلنے والے ہیں اور تمھارے لیے رات اور دن کو مسخر کر دیا۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور نفسِ انسانی کو بہترین شکل و صورت میں بنا کر اسے نیکی اور بدی کی پہچان بھی کرا دی۔ ہر آدمی ان سب چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور شعور سے محسوس کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص ان عظیم الشّان مخلوقات کو اور ان کے خالق کے احسانات کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر اپنے آپ کو کفر و شرک اور ظلم و زیادتی سے پاک کر لیتا ہے یقیناً وہ اپنا مقصدِ تخلیق پورا کر دینے کی وجہ سے کامیاب ہے اور جو شخص ان سب چیزوں سے آنکھیں بند کر کے اپنے نفس کو شہوت، غضب اور شرک و کفر کے کیچڑ میں دبا دیتا ہے وہ ناکام ہے۔

**آیت 2** وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا: ''تَلَا يَتْلُوْ'' (ن) پیچھے آنا۔ اور چاند کی قسم جب وہ سورج کے پیچھے آتا ہے! یعنی سورج غروب ہونے کے بعد جب چاند کی روشنی پھیلتی ہے۔

**آیت 3** وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا: ''جَلّٰى يُجَلِّيْ تَجْلِيَةً'' (تفعیل) ظاہر کرنا، روشن کرنا۔ اور دن کی قسم جب وہ اس سورج کو ظاہر کرتا ہے! یعنی جب اس میں سورج پوری روشنی اور گرمی کے ساتھ چمکتا ہے۔

**آیت 4** وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا: جب رات سورج کی روشنی کو مکمل طور پر چھپا کر خوب اندھیری ہو جاتی ہے۔

**آیت 2** وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا: ''بَنٰى يَبْنِيْ بِنَاءً'' (ض) بنانا۔ واضح رہے کہ عام طور پر ''مَنْ'' علم والوں، مثلاً اللہ تعالیٰ،

وَالْاَرْضِ وَ مَا طَحٰىهَا ۙ۝۶ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۙ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۙ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ۝۹ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؕ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَاۤ ۙ۝۱۱

اور زمین کی اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا! ⑥ اور نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے ٹھیک بنایا! ⑦ پھر اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیزگاری (کی پہچان) اس کے دل میں ڈال دی ⑧ یقیناً وہ کامیاب ہوگیا جس نے اسے پاک کرلیا ⑨ اور یقیناً وہ نامراد ہوگیا جس نے اسے مٹی میں دبا دیا ⑩ (قوم) ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے جھٹلا دیا ⑪

فرشتوں اور انسانوں کے لیے آتا ہے، جبکہ "مَا" ان کے علاوہ کے لیے آتا ہے، مگر بعض اوقات کسی خاص مقصد کی وجہ سے اس کا الٹ بھی ہو جاتا ہے اور "مَا" علم والوں کے لیے بھی آجاتا ہے، جیسا کہ "مَا" یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی اور قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا! یہاں "مَنْ" کے بجائے "مَا" اس لیے لایا گیا ہے کہ وہ یہاں "اَلَّذِيْ" کے معنی میں ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ قرآن مجید میں "مَا" کا لفظ علم والوں کے لیے متعدد مقامات پر آیا ہے، مثلاً: ﴿وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ﴾ [ الکافرون : ۳ ] ''اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔'' اور فرمایا: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ [ النساء : ۳ ] ''سو عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو۔''

**آیت 6** وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا: "طَحَا يَطْحُوْ طَحْوًا" (ن) اور "دَحَا يَدْحُوْ دَحْوًا" (ن) کا ایک ہی معنی ہے، بچھانا۔ اور زمین کی قسم اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا!

**آیت 6** فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا: "لَهِمَ يَلْهَمُ لَهْمًا" (س) "اَلشَّيْءَ" کسی چیز کو ایک ہی بار نگل جانا۔ "أَلْهَمَ اللّٰهُ يُلْهِمُ إِلْهَامًا" (افعال) اللہ تعالیٰ کا دل میں کوئی بات ڈال دینا، سمجھا دینا، اس کی توفیق دے دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں اس کی نیکی اور بدی کی پہچان رکھ دی ہے۔ یہ پہچان پہلے عقل و فطرت میں رکھی گئی، پھر انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے دوبارہ یاد دہانی کروائی گئی، تاکہ لوگ نافرمانی سے بچیں اور پرہیزگاری اختیار کریں۔ دیکھیے سورۂ دہر (۳) اور سورۂ بلد (۱۰)۔

**آیت 10** وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا: "دَسّٰى" "دَسَّ يَدُسُّ دَسًّا" (ن) سے مبالغے کے لیے باب تفعیل ہے، معنی ہے مٹی میں دبا دینا، یہ اصل میں "دَسَّسَ" تھا، دوسرے سین کو الف کر دیا، جیسے "تَقَضَّضَ الْبَازِيْ" (باز شکار پر ٹوٹ پڑا) کو "تَقَضّٰى الْبَازِيْ" کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ﴾ [النحل:۵۹] ''یا اسے مٹی میں دبا دے۔''

**آیت 11** كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَاۤ: "طَغْوٰى" (سرکشی) "طَغَا يَطْغُوْ" (ن) کا مصدر ہے، جیسا کہ "دَعَا يَدْعُوْ" کا مصدر "دَعْوٰى" ہے۔ بطور مثال تاریخ میں سے ایک قوم کا ذکر فرمایا، جس نے سرکشی کی وجہ سے اپنے آپ کو مٹی میں دبا دیا۔

اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰىهَا ﴿۱۲﴾ۙ فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقۡيٰهَا ﴿۱۳﴾ؕ فَكَذَّبُوۡهُ فَعَقَرُوۡهَا ۙ۬ فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِذَنۡۢبِهِمۡ فَسَوّٰٮهَا ﴿۱۴﴾ۙ وَ لَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا ﴿۱۵﴾ ع۱۵

جب اس کا سب سے بڑا بدبخت اٹھا ⑫ تو ان سے اللہ کے رسول نے کہا اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری (کا خیال رکھو) ⑬ تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، پس اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ دیں، تو ان کے رب نے انھیں ان کے گناہ کی وجہ سے پیس کر ہلاک کر دیا، پھر اس (بستی) کو برابر کر دیا ⑭ اور وہ اس (سزا) کے انجام سے نہیں ڈرتا ⑮

ثمود صالح علیہ السلام کی قوم تھی، ان کے معجزہ طلب کرنے پر انھیں ایک اونٹنی دی گئی اور انھیں کہا گیا کہ ایک دن اس کے پینے کی باری ہوگی اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کی۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۱۵۵)۔

**آیت 12** اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰىهَا: جن لوگوں کے مویشی زیادہ تھے ان پر یہ پابندی بہت شاق گزری اور انھوں نے اس اونٹنی کو کاٹ ڈالنے پر اتفاق کر لیا، مگر اس کام کا بیڑا ان کے سب سے بڑے بدبخت نے اٹھایا۔ تاریخ اور شعر عرب میں اس کا نام قُدار بن سالف بیان کیا گیا ہے۔

**آیت 13** فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقۡيٰهَا: "نَاقَةَ اللّٰهِ" (اللہ کی اونٹنی) فعل محذوف "اِتَّقُوْا" کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ نسبت اس اونٹنی کے شرف اور خصوصیت کی وجہ سے ہے، (جیسے "بیت اللہ" میں ہے) ورنہ سب اونٹنیاں اللہ ہی کی ہیں۔

**آیت 14** ❶ فَكَذَّبُوۡهُ فَعَقَرُوۡهَا: اگرچہ ایک آدمی نے کونچیں کاٹ کر اسے ہلاک کیا تھا، لیکن چونکہ ساری قوم اس کے ساتھ تھی بلکہ انھی کے کہنے پر اس نے یہ کام کیا تھا، اس لیے ان سب کو مجرم قرار دیا گیا اور فرمایا کہ "انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں۔"

❷ فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِذَنۡۢبِهِمۡ فَسَوّٰٮهَا: قاموس میں ہے: "دَمَّمَ الْقَوْمَ كَدَمْدَمَهُمْ وَ دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ، طَحَنَهُمْ فَأَهْلَكَهُمْ." "دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ" اس نے انھیں پیس کر ہلاک کر دیا۔ اونٹنی کو مار ڈالنے کے تین دن بعد ان پر ایک زبردست غیبی چیخ کے ساتھ عذاب آیا اور وہ اس طرح نابود ہو گئے جیسے کبھی وہاں تھے ہی نہیں، صرف صالح علیہ السلام اور اہل ایمان بچے۔ سورۂ ہود (۶۲ تا ۶۸)، اعراف (۷۳ تا ۷۹) اور سورۂ شعراء (۱۴۱ تا ۱۵۹) میں یہ واقعہ تفصیل سے گزر چکا ہے۔

**آیت 15** وَ لَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا: "هَا" ضمیر کا مرجع وہ "دَمْدَمَةٌ" ہے جو "فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ" کے ضمن میں موجود ہے۔ یعنی دنیا کے بادشاہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو ڈرتے ہیں کہ نامعلوم اس کا انجام کیا ہوگا؟ مقتول کا کوئی وارث بدلا لینے کے لیے نہ اٹھ کھڑا ہو یا ملک میں بغاوت نہ ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَ الَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى ۙ﴿۱﴾ وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الۡاُنۡثٰۤى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰى وَ اتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰى ۙ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰى ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰى ۙ﴿۸﴾ وَ كَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰى ؕ﴿۱۰﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے! ﴿۱﴾ اور دن کی جب وہ روشن ہو! ﴿۲﴾ اور اس کی جو اس نے پیدا کیا نر اور مادہ! ﴿۳﴾ بے شک تمھاری کوشش یقیناً مختلف ہے ﴿۴﴾ پس لیکن وہ جس نے دیا اور (نافرمانی سے) بچا ﴿۵﴾ اور اس نے سب سے اچھی بات کو سچ مانا ﴿۶﴾ تو یقیناً ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے ﴿۷﴾ اور لیکن وہ جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا ﴿۸﴾ اور اس نے سب سے اچھی بات کو جھٹلا دیا ﴿۹﴾ تو یقیناً ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے ﴿۱۰﴾

**آیت 1 تا 3** وَ الَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى: یعنی ان چیزوں کی قسم جو اس نے پیدا کیں، نر ہیں یا مادہ! "الذَّكَرَ وَ الۡاُنۡثٰۤى" "مَا خَلَقَ" سے بدل ہے۔ ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا! تیسرا ترجمہ ہے، نر اور مادہ کو پیدا کرنے کی قسم!

**آیت 4** اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى: یعنی جس طرح رات دن اور نر و مادہ مخلوقات میں باہمی اختلاف اور تضاد ہے اسی طرح تمھاری کوششوں اور تمھارے اعمال میں بھی اختلاف ہے، پھر ان کا نتیجہ اور جزا و سزا بھی الگ الگ ہے۔

**آیت 5 تا 7** فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰى...... : "الْحُسْنٰى" "أَحْسَنُ" کی مؤنث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِىۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴾ [ حٰمٓ السجدۃ : ۳۳ ] "اور اس شخص سے زیادہ اچھی بات کس کی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ بے شک میں فرماں برداروں سے ہوں؟" جس شخص میں بھی بھلائی کے یہ تین جامع اوصاف ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے فراخ دل ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی اور ہر حرام کام سے بچتا ہے اور سب سے اچھی بات یعنی اللہ کے ایک ہونے کو اور اس کی نازل کی ہوئی ہر بات کو سچ مان کر اس کا تابع ہو جاتا ہے، تو اس کے اس میلان اور رجحان کے مطابق ہم بھی اس کے لیے نیکی اور جنت کے راستے پر چلنا آسان کر دیں گے، یعنی اس کے لیے نیکی کرنا آسان ہو جائے گا اور گناہ کرنا مشکل۔

**آیت 8 تا 10** وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰى...... : یعنی جس میں شر کے یہ تین جامع اوصاف ہیں کہ وہ بخل کرتا ہے، اخروی انجام اور حلال و حرام کی پروا ہی نہیں کرتا اور سب سے اچھی بات یعنی اللہ کے ایک ہونے اور اس کی نازل کردہ باتوں کو جھٹلاتا ہے، تو ہم بھی اسے اس کی خواہش کے مطابق اس راستے پر چلنے دیتے ہیں جو مشکلات و مصائب کا راستہ ہے اور جہنم کی طرف

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ﴿۱۱﴾ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿۱۲﴾ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾ لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۱۶﴾

اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا جب وہ ( گڑھے میں ) گرے گا ⑪ بلاشبہ ہمارے ہی ذمے یقیناً راستہ بتانا ہے ⑫ اور بلاشبہ ہمارے ہی اختیار میں یقیناً آخرت اور دنیا ہے ⑬ پس میں نے تمھیں ایک ایسی آگ سے ڈرا دیا ہے جو شعلے مارتی ہے ⑭ جس میں اس بڑے بدبخت کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا ⑮ جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا ⑯

لے جانے والا ہے، یعنی اس کے لیے نیکی کرنا مشکل اور گناہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

**آیت 11** وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى: جب جہنم میں گرے گا تو وہ مال جو اس نے بخل کر کے جمع کیا تھا اس کے کسی کام نہ آئے گا۔

**آیت 12** اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى: دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ [ البقرۃ : ۱۲۰ ] ”کہہ دے اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔“ یعنی جو راستے لوگوں نے اپنی مرضی سے یا آبا و اجداد کو دیکھ کر یا غیر قوموں کی نقل کرتے ہوئے اختیار کیے ہیں وہ چونکہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں، اس لیے کتنے بھی خوش نما ہوں ہدایت نہیں، ضلالت ہیں۔ اللہ کی ہدایت وہ ہے جو خود اس کی طرف سے آئی ہو اور وہ صرف قرآن مجید ہے یا حدیثِ رسول ﷺ۔

**آیت 12** وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى: راستہ بتانا صرف ہمارے ذمے کیوں ہے؟ اس لیے کہ دنیا اور آخرت دونوں کے بنانے والے اور ان کے مالک ہمیں ہیں، تو ان کا راستہ بھی ہم ہی جانتے ہیں۔

**آیت 14** فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى: ”تَلَظّٰى“ اصل میں ”تَتَلَظّٰى“ ہے جو ”لَظًى“ سے باب تفعّل کا مضارع ہے، شعلے مارتی ہے۔ میرا کام راستہ بتانا ہے، وہ میں نے بتا دیا اور نہ ماننے والوں کو زبردست شعلے مارتی ہوئی آگ سے ڈرا دیا، اب ماننا یا نہ ماننا تمھارا کام ہے، سب کو زبردستی مسلمان بنا دینا میری حکمت کے خلاف ہے۔

**آیت 16،15** لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ...... : اسی آیت سے مُرجیہ (ایک باطل فرقہ جس کے نزدیک ایمان صرف دل کی تصدیق کا نام ہے ) نے استدلال کیا ہے کہ جہنم میں صرف کافر ہی جائیں گے، کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ لیکن یہ عقیدہ ان صریح آیات و احادیث کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی جن کو اللہ تعالیٰ کچھ سزا دینا چاہے گا، کچھ عرصہ کے لیے جہنم میں جائیں گے، پھر وہ نبی ﷺ، ملائکہ اور دیگر صالحین کی شفاعت یا محض اللہ کی رحمت سے نکال لیے جائیں گے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [ النساء : ۱۱۶ ] ”بے شک اللہ یہ بات معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا۔“ اب اگر وہ شخص جو شرک نہیں کرتا بلکہ مسلمان ہے، وہ جہنم میں جائے گا ہی نہیں تو ”يَغْفِرُ

وَ سَیُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَی ﴿ۙ۱۷﴾ الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ﴿ۚ۱۸﴾ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰۤی ﴿ۙ۱۹﴾ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰی ﴿ۚ۲۰﴾ وَ لَسَوۡفَ یَرۡضٰی ﴿۲۱﴾

اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیز گار دور رکھا جائے گا ﴿۱۷﴾ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے ﴿۱۸﴾ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلا دیا جائے ﴿۱۹﴾ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے ﴿۲۰﴾ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا ﴿۲۱﴾

مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" (اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا) بالکل بے معنی کلام بن جائے گا، پھر تو یوں کہنا چاہیے کہ اس کے علاوہ وہ سب کچھ معاف کر دے گا، "لِمَنْ يَّشَآءُ" (جسے چاہے گا) کی شرط کی ضرورت ہی نہیں۔ صحیح بخاری میں مذکور احادیثِ شفاعت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ جہنم میں صرف بڑے بد بخت داخل ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ پکے کافر اور نہایت بد بخت ہیں جہنم دراصل انھی کے لیے بنائی گئی ہے، جس میں وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے داخل ہوں گے۔ اگر کچھ نافرمان قسم کے مسلمان جہنم میں جائیں گے تو وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے نہیں جائیں گے، بلکہ بطور سزا داخل ہوں گے اور ان کا یہ دخول عارضی ہوگا۔

**آیت 17، 18** وَ سَیُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَی ...... : جہنم سے وہی شخص دور رہے گا جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ وہ خود بھی پاک ہو جائے اور اس کا مال بھی۔

**آیت 19، 20** وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰۤی ...... : وہ مال اس لیے خرچ نہیں کرتا کہ کسی کے احسان کا بدلا اتارنا چاہتا ہے، بلکہ خرچ کرنے سے اس کی نیت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رضا اور جنت میں اس کا دیدار نصیب ہو جائے۔

**آیت 21** وَ لَسَوۡفَ یَرۡضٰی: یعنی جنت کی بے بہا نعمتیں اور بلند مراتب پا کر ضرور خوش ہوگا۔ اکثر مفسرین نے صحیح احادیث و آثار کی رُو سے کہا ہے کہ اس سورت میں خرچ کرنے والے سے مراد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں کہ وہ کمزور مسلمان غلاموں کو کفار کے مظالم سے بچانے کے لیے خرید کر آزاد کر دیتے اور نیکی کا ہر کام خوشی خوشی محض رضائے الٰہی کے لیے کرتے تھے۔ یقیناً ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان آیات کا اوّلین مصداق ہیں مگر الفاظ عام ہیں، اس لیے ان میں ہر وہ مسلمان داخل ہے جو ان صفات کا حامل ہے۔

سورۃ الضحیٰ ۹۳ مکیۃ ۱۱ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ آیاتہا ۱۱ رکوعہا ۱

وَ الضُّحٰی ۙ﴿۱﴾ وَ الَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی ؕ﴿۳﴾ وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ؕ﴿۴﴾ وَ لَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ؕ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی! ﴿۱﴾ اور رات کی جب وہ چھا جائے! ﴿۲﴾ نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا ﴿۳﴾ اور یقیناً پیچھے آنے والی حالت تیرے لیے پہلی سے بہتر ہے ﴿۴﴾ اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا ﴿۵﴾

---

**آیت 1 تا 3** ① وَ الضُّحٰی ۙ وَ الَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ......: ”الضُّحٰی“ سورج طلوع ہونے کے بعد جب پوری طرح روشن ہو جاتا ہے۔ ”سَجٰی“ ”سَجَا يَسْجُوْ سَجْوًا“ (ن) پُرسکون ہونا۔ ”وَدَّعَكَ“ ”وَدَعَ يَدَعُ“ (چھوڑنا) سے باب تفعیل ہے جو چھوڑنے میں مبالغے کا معنی رکھتا ہے۔ ”قَلٰی“ ”قَلٰی يَقْلِيْ قِلًى وَ قَلَاءً“ (ض، س) ”اَلرَّجُلَ أَبْغَضَهُ“ کسی سے بغض رکھنا۔

② جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے تو دو یا تین راتیں (تہجد کے لیے) نہ اٹھے۔ ایک عورت آئی اور کہنے لگی: ”اے محمد! مجھے امید ہے کہ تمھارا شیطان تمھیں چھوڑ گیا ہے، دو تین راتوں سے میں نے اسے تمھارے پاس آتے نہیں دیکھا۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ [ بخاري، التفسیر، باب قوله: ﴿ما ودعك ربك وما قلى ﴾: ۴۹۵۰ ] جندب رضی اللہ عنہ ہی سے مروی دوسری روایت میں ہے کہ ایک دفعہ جبریل علیہ السلام نے آنے میں دیر کر دی، یہاں تک کہ مشرکین کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ [ طبري: ۲۴/ ۴۸۷، ح: ۳۷۸۵۷ ] قسم اور جوابِ قسم میں مناسبت یہ ہے کہ دوپہر کو سورج خوب روشن ہوتا ہے، اس کے بعد سیاہ رات چھا جاتی ہے تو کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی وجہ سے ہے، تو وحی کی روشنی کے بعد کچھ دیر اگر وقفہ ہو گیا تو کیوں سمجھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں چھوڑ دیا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دن بھر آفتاب کی روشنی و گرمی کے بعد انسانی جسم کو آرام اور سکون کے لیے رات کی ضرورت ہے، اسی طرح وحی کے بارِ گراں کے بعد طبیعت کو سکون اور مزید وحی کے تحمل کے لیے وقفہ کی ضرورت ہے۔

**آیت 4** وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی: اس میں آپ کو تسلی دلائی کہ ہر آنے والا لمحہ آپ کے لیے پہلے لمحے سے بہتر ہے۔ اسی طرح آئندہ بھی بعد کی ہر حالت آپ کے لیے پہلی سے بہتر ہوگی۔ نبوت کے بعد کی زندگی آپ کے لیے پہلے سے بہتر اور آخرت کی زندگی دنیا سے بہتر ہوگی۔

**آیت 5** وَ لَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی: یہ مزید تسلی ہے، اس میں اللہ کی فتح و نصرت، لوگوں کا فوج در فوج اسلام میں

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸

کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا، پس جگہ دی ⑥ اور اس نے تجھے راستے سے ناواقف پایا تو راستہ دکھا دیا ⑦ اور اس نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا ⑧

داخل ہونا، زمین کے مشارق و مغارب کا آپ کی امت کے قبضے میں آنا، قیامت کو آپ کے ہاتھ میں "لِوَاءُ الْحَمْدِ" ہونا، مقام محمود ملنا، شفاعت کبریٰ، امت کی مغفرت، غرض وہ سب کچھ شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا اور دے گا۔

**آیت 6** اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى: "آوٰى يُؤْوِيْ إِيْوَاءً" (افعال) جگہ دینا۔ اس میں آپ کے ابتدائی حالات کا بیان ہے، آپ ماں کے پیٹ میں تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ والدہ نے آپ کو پالا۔ چھ برس کے تھے کہ والدہ فوت ہو گئیں، پھر دادا نے پرورش کی۔ آٹھ برس کے تھے کہ وہ بھی فوت ہو گئے، پھر چچا ابوطالب نے بیٹوں سے بڑھ کر پالا۔ یہ سب اسباب اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے فضل سے مہیا کیے۔

**آیت 7** وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى: نبوت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی برائی سے آپ کی حفاظت فرمائی، حتیٰ کہ فرمایا: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [ یونس : ۱۶ ] "(انھیں کہہ دو کہ) یقیناً میں نے نبوت سے پہلے ایک عمر تم میں گزاری ہے، کیا تم عقل نہیں کرتے؟" مگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے، یہ آپ کو معلوم نہ تھا، یہ اس وقت معلوم ہوا جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ﴾ [ الشورٰی : ۵۲ ] "اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔" اس آیت میں اس احسان کا ذکر ہے کہ تم راستے سے ناواقف تھے، تو وہ تمھیں ہم نے بتایا۔ اس کے علاوہ دیکھیے سورۂ ہود (۴۹)، عنکبوت (۴۸) اور سورۂ قصص (۸۶)۔

**آیت 8** وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى: "عَالَ يَعِيْلُ عَيْلًا وَ عَيْلَةً" (ض) فقیر ہونا۔ "عَآئِلًا" فقیر۔ سورۂ توبہ میں فرمایا: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ﴾ [ التوبۃ : ۲۸ ] "اور اگر تم کسی قسم کے فقر سے ڈرتے ہو تو اللہ جلد ہی تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔" رسول اللہ ﷺ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گئے، انھوں نے اپنی میراث میں ایک لونڈی ام ایمن کے علاوہ کوئی زیادہ مال نہیں چھوڑا۔ بچپن میں اپنے فقر کا حال رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمایا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (( مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ، فَقَالَ أَصْحَابُهُ وَأَنْتَ؟ فَقَالَ نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلٰى قَرَارِيْطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ )) [ بخاري، الإجارۃ، باب رعي الغنم على قراريط : ۲۲۶۲ ] "اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے بھیڑ بکریاں نہ چرائی ہوں۔" آپ کے صحابہ نے کہا: "اور آپ نے بھی (چرائی ہیں)؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "میں انھیں مکہ والوں کے لیے چند قیراطوں پر چرایا کرتا تھا۔" ظاہر ہے اگر آپ ﷺ کے پاس اپنی یا ابوطالب کی بھیڑ بکریاں ہی ہوتیں تو آپ کو اہلِ مکہ کی بھیڑ بکریاں اجرت پر چرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

پس لیکن یتیم، پس (اس پر) سختی نہ کر ۝۹ اور لیکن سائل، پس (اسے) مت جھڑک ۝۱۰ اور لیکن اپنے رب کی نعمت، پس (اسے) بیان کر ۝۱۱

افلاس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح غنی کر دیا کہ مکہ کی سب سے مال دار خاتون خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہلے آپ کو تجارت میں شریک کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کر لیا اور اپنا تمام مال آپ کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ آپ کے پاس بنو نضیر، بنو قریظہ، خیبر، بحرین اور یمن وغیرہ کی غنیمتوں اور خراج کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ مالی غنا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا قلبی غنا بھی عطا فرمایا تھا کہ آپ اس طرح بے دریغ خرچ کرتے تھے جیسے آپ کو فقر کا کوئی خوف ہی نہ ہو۔

**آیت 9** فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ : آپ نے یتیمی اور اس کی تلخی اور بے چارگی دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح آپ کو جگہ دی اور آپ پر بے پناہ مہربانیاں فرمائیں، اب دونوں چیزوں کا تقاضا ہے کہ یتیم پر سختی نہ کرو بلکہ زیادہ سے زیادہ حسنِ سلوک کرو۔

**آیت 10** وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ : اسی طرح آپ نے تنگ دستی دیکھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا غنی کرنا بھی، ان دونوں کا تقاضا ہے کہ سائل کی ضرورت پوری کرو۔ اگر نہیں کر سکتے تو لطف و کرم سے پیش آؤ، جھڑکی نہ دو اور آپ نے کتاب اور ایمان سے ناواقفی کا زمانہ دیکھا ہے، پھر اللہ نے آپ کو یہ نعمتیں دیں، اب اگر کوئی علم کے متعلق سوال کرے یا کسی چیز کا سوال کرے تو اسے ڈانٹنا ہرگز نہیں! بلکہ کوئی علم کا طالب ہو یا مال کا، اس سے حسنِ خلق کے ساتھ پیش آئیں، اس کی حاجت پوری کریں یا اچھے طریقے سے عذر پیش کر دیں۔

**آیت 11** وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ : اور شکر ادا کرنے کے لیے اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہو۔
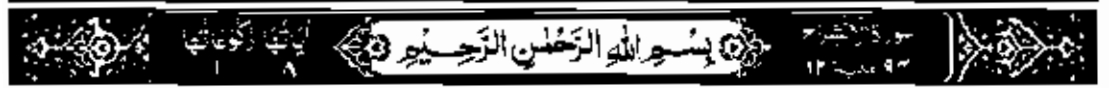
سورۃ الم نشرح ۹۴ آیات ۸ رکوع ۱
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿۱﴾ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿۲﴾ الَّذِیْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا ہم نے تیرے لیے تیرا سینہ نہیں کھول دیا ① اور ہم نے تجھ سے تیرا بوجھ اتار دیا ② وہ جس نے تیری کمر توڑ دی ③

**آیت 1** اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ: سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کے حق ہونے پر اطمینان، دل کا نورِ ہدایت سے روشن ہونا اور ذکرِ الٰہی سے نرم ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ [ الأنعام : ۱۲۵ ] ''تو جسے اللہ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ [ الزمر : ۲۲ ] ''تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، سو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے (وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ایسا نہیں؟) پس ویل ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کی طرف سے سخت ہیں، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔'' اس کے علاوہ شرح صدر سے مراد طبیعت کا رسالت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے خوش دلی کے ساتھ آمادہ ہونا بھی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تو انھوں نے کہا: ﴿وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ﴾ [ الشعراء : ۱۳ ] ''اور میرا سینہ اس سے تنگ ہوتا ہے۔'' اور دعا کی: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ [ طٰہٰ : ۲۵ ] ''اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔''

شرح صدر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن میں اور نزولِ وحی کے آغاز میں اور معراج کی رات شق صدر کے بعد آپ کے سینے کو ایمان و حکمت سے بھر دینا بھی شامل ہے، جیسا کہ صحیحین اور دوسری کتب احادیث میں آیا ہے۔

**آیت 2، 3** وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ...... : بوجھ اتار دینے سے مراد وحی الٰہی برداشت کرنے کی استعداد پیدا کرنا ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا﴾ [ المزمل : ۵ ] ''یقیناً ہم تجھ پر ایک بھاری بات نازل کریں گے۔'' حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترتی تو اس کے بوجھ سے وہ اونٹنی جس پر آپ سوار ہوتے بیٹھ جاتی۔ [ مسند أحمد : ۶/ ۱۱۸، ح : ۲۴۸۶۸، سندہ صحیح ] اس کے علاوہ نبوت کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی مراد ہے، جسے آپ بہت شدت سے محسوس کرتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾ [ الشعراء : ۳ ] ''شاید آپ اپنے آپ کو اس لیے ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر یہ بوجھ بھی اتار دیا: ﴿لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ [ البقرۃ : ۲۷۲ ] ''تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔''

وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۶﴾

اور ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر دیا ④ پس بے شک ہر مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہے ⑤ بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے ⑥

آیت 4 ① وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ: یعنی دنیا اور آخرت میں آپ کا نام بلند کیا، زمین کے مشرق و مغرب تک آپ کی امت کی حکومت پھیلا دی، کلمۂ شہادت، اذان، اقامت اور خطبہ و تشہد وغیرہ میں اللہ کے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اللہ کی اطاعت کے ساتھ آپ کی اطاعت فرض ہے، کوئی وقت ایسا نہیں جس میں کہیں نہ کہیں آپ کا ذکر خیر نہ ہو رہا ہو۔ قیامت کو اولاد آدم کی سیادت، کوثر، لواء الحمد، مقام محمود اور شفاعت کبریٰ کے ساتھ آپ کا ذکر بلند ہوگا۔

② یہاں تین نعمتوں کا ذکر ہے، شرح صدر، وضع وزر اور رفع ذکر، تینوں کو بیان کرتے ہوئے "لَكَ" یا "عَنْكَ" فرمایا، اس میں آپ ﷺ کی عزت افزائی کا اظہار ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی خاطر کیا گیا ہے۔

آیت 6،5 ① فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا......: اس میں آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بشارت ہے کہ مشکلات کے دن تھوڑے ہیں، ہر مشکل کے بعد بلکہ اس کے ساتھ ہی آسانی شروع ہو جاتی ہے۔ "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" کا یہی مطلب ہے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ ایک ایک مشکل کے ساتھ دو دو آسانیاں ہیں۔ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے ان کی سند کے ساتھ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، انھوں نے فرمایا: "كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ لَا يَغْلِبُ عُسْرٌ وَاحِدٌ يُسْرَيْنِ اثْنَيْنِ" "وہ (صحابہ) کہا کرتے تھے کہ ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی۔" ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ ابن کثیر نے اس کی تفصیل یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دہرا کر یہ بات فرمائی ہے: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ اور عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی اسم دوسری دفعہ معرفہ ہو کر آئے تو اس سے مراد پہلا اسم ہی ہوتا ہے اور اگر وہ پہلے نکرہ آئے اور دوبارہ بھی نکرہ ہو کر آئے تو وہ پہلے نکرہ سے الگ ہوتا ہے۔ یہاں دوسری دفعہ "الْعُسْرِ" معرفہ آیا ہے جب کہ "يُسْرًا" دوسری دفعہ بھی نکرہ ہو کر آیا ہے، تو معنی یہ ہوا کہ "اسی پہلی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔" یعنی ایک مشکل کے ساتھ دو آسانیاں ہیں۔ اس قاعدے کی ایک مثال سورۂ مزمل میں ہے، فرمایا:
﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ۬ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ﴾ [ المزمل: ۱۵، ۱۶ ] "ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شہادت دینے والا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا، تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی۔" پہلے "رَسُوْلًا" سے مراد ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں، دوسرے سے موسیٰ علیہ السلام اور تیسرا "الرَّسُوْلَ" معرفہ آیا ہے اور اس سے مراد وہی رسول ہے جو اس سے پہلے مذکور ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

② یاد رہے کہ نکرہ کو دوبارہ نکرہ کی صورت میں لانے کا یہ قاعدہ اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے، مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ مشہور نحوی ابن ہشام نے "مغنی اللبیب" میں اسے خطا قرار دیا ہے، کیونکہ کئی دفعہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے ابن عاشور نے

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر ۝ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر ۝

''التحریر والتنویر'' میں اور زمخشری نے ''کشاف'' میں حسن بصری اور قتادہ کے اقوال اور بعض مرسل روایات میں آنے والی بات کہ ''لَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ'' (ایک مشکل دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آئے گی) کے متعلق فرمایا کہ آیت سے یہ بات اس کے تکرار کی وجہ سے نکلتی ہے، اس قاعدے کی وجہ سے نہیں، پھر دونوں مفسروں نے اپنے اپنے انداز سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

**آیت 8،7** ❶ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ...... : آپ کے دنیا کے کام ہوں یا تبلیغ دین یا جہاد فی سبیل اللہ، اگرچہ یہ سب عبادات اور نیکیاں ہیں مگر ان میں پھر بھی مخلوق سے کچھ نہ کچھ رابطہ رہتا ہے، جب بھی ان کاموں سے کچھ فراغت ملے، تو ہر چیز سے منقطع ہو کر اپنے رب سے تعلق جوڑ کر ذکر الٰہی، تلاوت قرآن، قیام اور رکوع و سجود کی محنت کریں اور اپنی تمام رغبت اپنے رب ہی کی طرف رکھیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ مزمل کے شروع میں کہی گئی ہے، فرمایا: ﴿ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴾ [المزمل: ۷، ۸] ''یقیناً تجھے دن میں بہت لمبی مصروفیت ہے اور اپنے رب کا نام ذکر کر اور ہر طرف سے کٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا۔''

❷ فَانْصَبْ: ''نَصِبَ يَنْصَبُ نَصَبًا'' (س) کے مفہوم میں محنت و مشقت کے ساتھ تھکن بھی شامل ہے، یعنی صرف راحت کے وقت ہی نہیں، طبیعت کے نہ چاہتے ہوئے بھی عبادت اور ذکر الٰہی کی مشقت جاری رکھ۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت اتنا قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں پر ورم آ جاتا، جیسا کہ صحیحین میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

سُوْرَةُ التِّيْنِ ٩٥ مَكِّيَّة ٢٨ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ٨ رُكُوْعَاتُهَا ١

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ① وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ ② وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ④ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ⑤

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے انجیر کی! اور زیتون کی! ① اور طور سینین کی! ② اور اس امن والے شہر کی! ③ بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا کیا ہے ④ پھر ہم نے اسے لوٹا کر نیچوں سے سب سے نیچا کر دیا ⑤

**آیت 1** وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ: انجیر اور زیتون دو ایسے پھل ہیں جو اپنی جامعیت اور فوائد کی کثرت میں انسان کے جامع الفضائل ہونے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، اس لیے انھیں انسان کے احسنِ تقویم میں پیدا کیے جانے کے شاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین نے انجیر اور زیتون سے مراد سرزمین شام لی ہے جہاں یہ کثرت سے ہوتے ہیں اور جہاں عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے بہت سے پیغمبر پیدا ہوئے ہیں اور یہی بات راجح ہے، کیونکہ اس کے بعد طور سینا اور بلد امین کا ذکر ہے۔

**آیت 2** وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ: طورِ سینا جہاں اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے۔ مزید دیکھیے سورۂ مومنون (۲۰)۔

**آیت 3** وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ: شہر مکہ جو ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے آباد کیا اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اسے بلد امین اس لیے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کے لیے دعا کی تھی: ﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ [ البقرة : ۱۲۶ ] ''اے میرے رب! اس (جگہ) کو ایک امن والا شہر بنا دے۔''

**آیت 4** لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ ...... : قسم اور جوابِ قسم میں مناسبت یہ ہے کہ سرزمین شام میں پیدا ہونے والے جلیل القدر پیغمبروں اور طور سینا اور شہر مکہ کی شہرت کا باعث بننے والے پیغمبروں کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔

**آیت 5** ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ: اس بہترین بناوٹ میں اس کی شکل و صورت کا حسن، اس کی عقل، اس کی فطرت پر پیدائش اور وہ سب کچھ شامل ہے جو کسی حیوان کو حاصل نہیں۔ پھر اگر وہ اس عقل اور فطرت کے تقاضوں پر عمل نہ کرے بلکہ انسانیت سے اتر کر حیوانیت میں جا گرے اور شہوت و غضب اور دوسری حیوانی صفات سے مغلوب ہو جائے، تو اس سے زیادہ نیچا اور ذلیل کوئی نہیں، کیونکہ پھر وہ اس حد تک گر جاتا ہے کہ کوئی حیوان نہیں بھی گرتا، حتیٰ کہ وہ اپنے مالک و خالق کو بھی بھول جاتا ہے، اس کے ساتھ شریک بنانے لگتا ہے اور زمین میں ایسا فساد برپا کرتا ہے جو کوئی حیوان بھی نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ آگ ہے اور اس میں گرنے والوں سے نیچا اور ذلیل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ انھی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ [ الأعراف : ۱۷۹ ] ''یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔''

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۟ؕ۶ فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۟ؕ۷ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ ۟۠۸

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا اجر ہے ⑥ پس اس کے بعد کون سی چیز تجھے جزا کے بارے میں جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟⑦ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟⑧

**آیت 6** اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ..... : اور اگر یہ احسنِ تقویم کے مطابق ایمان لا کر عمل صالح کرے تو اس کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

**آیت 7** فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ : اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا، پھر بعض نے تو اس ساخت کے تقاضوں کے مطابق ایمان اور عمل صالح اختیار کیا اور بعض نافرمانی کی وجہ سے ''اسفل السافلین'' ٹھہرے۔ ان دونوں کے عمل کا لازمی نتیجہ ہے کہ ایک دن ایسا ہو جس میں ہر ایک کو نیکی اور بدی کی جزا و سزا دی جائے۔ اتنی واضح دلیل کے بعد اے انسان! تجھے کون سی چیز آمادہ کر رہی ہے کہ تو جزا کو جھٹلا دے؟ اس کا دوسرا ترجمہ یہ ہے: ''اے نبی! اس کے بعد کون ہے جو تجھے جزا کے بارے میں جھٹلائے؟''

**آیت 8** اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ : کوئی معمولی سا انصاف کرنے والا ہو وہ بھی اپنے اختیار میں جزا و سزا کا اہتمام کیے بغیر نہیں رہے گا، تو اللہ جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، وہ اس کا اہتمام کیوں نہیں کرے گا؟

ترمذی وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی سورت ''وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ'' پڑھے اور ''اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ'' پر پہنچے تو کہے: « بَلٰی وَ أَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ » ''کیوں نہیں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔'' [ ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ والتین : ۳۳۴۷ ] مگر یہ روایت صحیح نہیں، کیونکہ ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اعرابی نے یہ روایت بیان کی ہے جس کا نام ہی معلوم نہیں۔

سورۃ العلق ۹۶ مکیۃ ۱ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — آیاتھا ۱۹ رکوعھا ۱

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ۝۲ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا ① اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ② پڑھ اور تیرا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے ③ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا ④

یہ قرآن مجید کی پہلی وحی ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک لمبی حدیث میں وحی کے آغاز کا ذکر ہے کہ وہ سچے خوابوں سے ہوا، پھر آپ ﷺ غار حرا میں کئی کئی راتیں خلوت اختیار کرنے لگے۔ وہیں آپ کے پاس فرشتہ آیا اور آپ سے کہا: « اِقْرَأْ » ''پڑھ۔'' آپ نے کہا: « مَا أَنَا بِقَارِئٍ » ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' جبریل علیہ السلام نے آپ کو زور سے دبایا اور پھر وہی لفظ "اِقْرَأْ" کہا۔ آپ وہی جواب "مَا أَنَا بِقَارِئٍ" دیتے رہے۔ تیسری دفعہ زور سے دبانے کے بعد فرشتے نے کہا: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴾ [ العلق : ۱ تا ۵ ] [ دیکھیے بخاري، التفسیر، باب : ۴۹۵۳ ]

**آیت 1** ① اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ: پہلی وحی میں پڑھنے کا حکم دینے سے پڑھنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا حکم دیتے وقت اپنے رب ہونے اور پیدا کرنے کی نعمت کا ذکر فرمایا، کیونکہ سب سے پہلی اور بڑی نعمت پیدا کرنا ہے، باقی تمام نعمتیں اس کے بعد ہیں، خلق ہی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ دوسری نعمت رب ہونا، یعنی پرورش کرنا ہے۔ یعنی ان نعمتوں والی ہستی کے نام کی برکت سے پڑھ، اس کی برکت سے تو قاری بھی بن جائے گا۔

③ "الَّذِيْ خَلَقَ" (جس نے پیدا کیا) کا مفعول حذف کر دیا گیا ہے کہ کسے پیدا کیا؟ یعنی جب پیدا کرنا اسی کا کام ہے، تو پھر یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کسے پیدا کیا۔

**آیت 2** خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ: رحم میں قرار پکڑنے کے بعد نُطفہ سب سے پہلے ''علقہ'' کی شکل اختیار کرتا ہے۔ "عَلِقَ يَعْلَقُ" ( س ) چمٹنے کو کہتے ہیں۔ "عَلَقَةٌ" جما ہوا خون، جو رحم کی دیوار کے کسی حصے سے چپک جاتا ہے۔ ''علقہ'' کا دوسرا معنی جونک ہے، وہ بھی کسی نہ کسی کو چمٹ جاتی ہے۔ خون کی وہ پھٹکی شکل وصورت میں جونک سے ملتی جلتی ہوتی ہے، اس میں نہ جان ہوتی ہے نہ شعور اور نہ عقل وعلم۔ پھر اللہ تعالیٰ اس حقیر سی پھٹکی سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرما دیتا ہے۔

**آیت 4،3** ① اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ...... : رسول اللہ ﷺ کے دہشت زدہ ہو جانے کی وجہ سے دوبارہ فرمایا، پڑھ! تجھے وہ پڑھا رہا ہے جس سے زیادہ کرم والا کوئی نہیں۔

② یہ اس کے کرم کی انتہا ہے کہ اتنی حقیر چیز سے پیدا ہونے والے انسان کو علم جیسی بلند ترین صفت سے نواز دیا، بلکہ قلم کے ساتھ علم سکھایا، جس سے علم محفوظ ہوتا اور ایک آدمی سے دوسرے آدمی اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا ہے، یہ نہ ہوتا تو

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝۶ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝۷ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝۹ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝۱۰ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝۱۱ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝۱۲ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۳ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝۱۴

اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا ⑤ ہرگز نہیں، بے شک انسان یقیناً حد سے نکل جاتا ہے ⑥ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غنی ہوگیا ہے ⑦ یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے ⑧ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے ⑨ ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے ⑩ کیا تو نے دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہو ⑪ یا اس نے پرہیزگاری کا حکم دیا ہو ⑫ کیا تو نے دیکھا اگر اس (منع کرنے والے) نے جھٹلایا اور منہ موڑا ⑬ تو کیا اس نے یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ⑭

علم محدود اور پھر معدوم ہو جاتا۔

**آیت 5** عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ : انسان پیدا ہوتا ہے تو کچھ بھی نہیں جانتا (دیکھیے نحل : ۷۸) اللہ تعالیٰ ہی اسے آہستہ آہستہ سب کچھ سکھاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی اپنے ایک اَن پڑھ بندے کو عالم بلکہ عالموں کا استاذ بنائے گا۔

**آیت 6 تا 8** ① كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ...... : "كَلَّآ" کا معنی "ہرگز نہیں"، "خبردار" اور "حق یہ ہے" میں سے موقع کی مناسبت سے کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ "الرُّجْعٰى" "رَجَعَ يَرْجِعُ" (ض) سے "بُشْرٰى" کے وزن پر مصدر ہے۔

② یہ آیات پہلی پانچ آیات کے بعد وقفہ سے نازل ہوئیں، جب ابوجہل نے آپ کو نماز پڑھنے سے روکا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل آیا اور کہنے لگا: "کیا میں نے تمھیں اس سے منع نہیں کیا؟" یہ بات اس نے تین بار کہی۔ نبی ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو اسے ڈانٹا، اس پر ابوجہل کہنے لگا: "تم جانتے ہو اس شہر میں مجلس کے ساتھی مجھ سے زیادہ کسی کے نہیں۔" تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں: ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ [العلق : ۱۷، ۱۸] "پس وہ اپنی مجلس کو بلا لے۔ ہم عنقریب جہنم کے فرشتوں کو بلائیں گے۔" [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ اقرأ باسم ربك : ۳۳۴۹] ترمذی اور البانی رحمہما اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

③ سورت کی ابتدائی پانچ آیات کے ساتھ ان آیات کی مناسبت یہ ہے کہ انسان اتنی نعمتیں جو اوپر ذکر ہوئیں، ملنے کے باوجود احسان ماننے اور شکر کرنے کے بجائے سرکشی اختیار کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اسے ضرورت کی ہر چیز دے کر دوسروں سے غنی کر دیتا ہے تو وہ بندگی کی حد سے نکل کر مقابلے پر آجاتا ہے۔ فرمایا، بندے! جتنی چاہے سرکشی کر لے، یقیناً تجھے اپنے رب کے پاس واپس آنا ہے۔

**آیت 9 تا 14** اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ...... : ان آیات میں ابوجہل کے رویے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا،

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾

**ہرگز نہیں، یقیناً اگر وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور اسے پیشانی کے بالوں کے ساتھ گھسیٹیں گے ﴿۱۵﴾ پیشانی کے ان بالوں کے ساتھ جو جھوٹے ہیں، خطا کار ہیں ﴿۱۶﴾ پس وہ اپنی مجلس کو بلا لے ﴿۱۷﴾ ہم عنقریب جہنم کے فرشتوں کو بلا لیں گے ﴿۱۸﴾**

اے مخاطب! بھلا تو نے اس شخص کو دیکھا جو اللہ کے بندے یعنی رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے؟ بھلا یہ بھی کوئی جرم ہے جس سے وہ منع کر رہا ہے؟ پھر تو نے دیکھا، اگر یہ نماز پڑھنے والا راہِ راست پر ہو یا امر بالمعروف کر رہا ہو تو کیا اس سے یہ سلوک ہونا چاہیے؟ پھر کیا تو نے دیکھا کہ اگر یہ منع کرنے والا جھٹلا رہا ہو اور منہ موڑ رہا ہو تو کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے؟ آیت: ﴿ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴾ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ کیا تو نے دیکھا کہ یہ نماز سے منع کرنے والا نماز سے روکنے کے بجائے ہدایت پر ہوتا یا نیکی کا حکم دیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

**آیت 15 تا 18** ❶ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا ...... : " لَمْ يَنْتَهِ " (وہ باز نہ آیا) "اِنْتَهٰى يَنْتَهِيْ اِنْتِهَاءً" (افتعال) سے جحد معلوم ہے۔ " يَنْتَهِ " اصل میں "يَنْتَهِيْ" تھا، حرف جزم " لَمْ " کی وجہ سے یاء گر گئی۔ " لَنَسْفَعًا " اصل میں "لَنَسْفَعَنْ" ہے، جو "سَفَعَ يَسْفَعُ" (ف) (زور سے کھینچ کر گھسیٹنا) سے جمع متکلم مضارع معلوم بانون تاکید خفیفہ ہے۔ چونکہ وقف کی حالت میں نون تاکید خفیفہ ''الف'' کے ساتھ بدل جاتا ہے، جیسا کہ نون تنوین ''الف'' کے ساتھ بدل جاتا ہے، اس لیے نون تنوین "خَبِيْرًا" اور "بَصِيْرًا" کی طرح اسے بھی "لَنَسْفَعَنْ" کے بجائے '' لَنَسْفَعًا '' کی صورت میں لکھا گیا ہے اور اس میں مصحف عثمانی کی پیروی کی گئی ہے۔ " وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ " بھی ایسے ہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یوسف کی آیت (۳۲) کی تفسیر۔

" اَلنَّاصِيَةُ " سر کے اگلے حصے کے بالوں کو ''ناصیہ'' کہا جاتا ہے۔ " الزَّبَانِيَةَ " "زِبْنِيَةٌ" کی جمع ہے۔ عرب پولیس کے سپاہی کو "زِبْنِيَةٌ" کہتے ہیں۔ یہ "زَبَنَ يَزْبِنُ زَبْنًا" (ض) سے مشتق ہے جس کا معنی ''ہٹانا، دھکا دینا'' ہے۔ چونکہ افسر جس سے ناراض ہو سپاہی اسے دھکے مار کر نکال دیتے ہیں، اس لیے انھیں ''زبانیہ'' کہا جاتا ہے۔ یہاں جہنم کے فرشتے مراد ہیں کہ اگر یہ باز نہ آیا تو وہ اسے دھکے دے کر نکال دیں گے، بلکہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

❷ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوجہل نے کہا: ''کیا محمد (ﷺ) تمھارے ہوتے ہوئے اپنا چہرہ زمین پر رکھتا ہے؟'' کہا گیا: ''ہاں!'' ابوجہل نے کہا: ''لات اور عزیٰ کی قسم! اگر میں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا، یا اس کے چہرے کو مٹی سے لت پت کر دوں گا۔'' چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ اس کا ارادہ آپ کی گردن کو روندنے کا تھا، اچانک لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایڑیوں پر واپس پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھوں کے

# كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ۩ ﴿١٩﴾

ہرگز نہیں، اس کا کہنا مت مان اور سجدہ کر اور بہت قریب ہو جا ﴿١٩﴾

ساتھ کسی چیز سے بچ رہا ہے۔ اس سے پوچھا گیا: ''تجھے کیا ہوا؟'' اس نے کہا: ''میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق، بڑا ہولناک منظر اور پَر ہیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَوْ دَنَا مِنِّي لَاخْتَطَفَتْهُ الْمَلَائِكَةُ عُضْوًا عُضْوًا » [مسلم، صفات المنافقين، باب قوله : ﴿ إن الإنسان ليطغى...... ﴾ : ٢٧٩٧ ] ''اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اسے ایک ایک عضو کر کے اچک لیتے۔''

آیت 19 ❶ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ : فرمایا، وہ آپ کو نماز سے روکتا ہے تو آپ اس کا کہنا ہرگز نہ مانیں، بلکہ آپ نماز پڑھتے، سجدہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ » [ مسلم، الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود؟ : ٤٨٢ ] ''بندہ اللہ کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو، تو تم (سجدے میں) دعا زیادہ کیا کرو۔'' صحیح مسلم ہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ [ دیکھیے مسلم، المساجد، باب سجود التلاوة : ١٠٨/٥٧٨ ]

❷ اگرچہ ان آیات کا اوّلین مصداق ابوجہل ہے، مگر الفاظ عام ہونے کی وجہ سے ہر وہ شخص ان کا مصداق ہے جس میں یہ صفات پائی جائیں، خواہ کوئی ہو اور کسی زمانے کا ہو اور ہر مومن کو حکم ہے کہ ایسے سرکش آدمی کا کہنا نہ مانے اور اللہ کے سامنے سجدہ کرتا رہے اور اس کا قُرب تلاش کرتا رہے۔

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ ۹۷ مکیۃ ۲۵ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ۵ رُكُوْعَاتُهَا ۱

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بلاشبہ ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا ①

**آیت 1** ① اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ : ”ہم نے اسے قدر کی رات میں نازل کیا“ یعنی قرآن مجید کو۔ جب کوئی چیز اتنی مشہور ہو کہ خود بخود ذہن میں آ جاتی ہو تو اس کی عظمت واضح کرنے کے لیے نام لینے کے بجائے اس کی ضمیر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

② ”الْقَدْرِ“ کا معنی تقدیر ہے، یعنی تقدیر کی رات۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾ [ الدخان : ٤ ] ”اس رات میں ہر محکم کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔“ یعنی سال بھر میں جو کام ہونا ہوتا ہے اس رات میں لوحِ محفوظ سے نقل کر کے ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے سرانجام دیتے ہیں۔ ”الْقَدْرِ“ کا دوسرا معنی عظمت ہے، یعنی عظمت والی رات۔ اس کے بعد اس کی عظمت پر دلالت کرنے والی چیزیں بیان کی ہیں، یعنی اس کا ہزار مہینے سے بہتر ہونا، اس میں ملائکہ اور جبریل علیہ السلام کا اترنا اور اس کا سراسر سلامتی والی ہونا۔ لیلۃ القدر کے مفہوم میں یہ معنی بھی شامل ہے۔

③ لیلۃ القدر میں قرآن مجید اتارنے کا مطلب عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر میں پورا قرآن ایک ہی دفعہ آسمانِ دنیا پر نازل کیا گیا، پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے کئی سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۱۰۶): ﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ﴾ کی تفسیر کی تحقیق میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے متعلق فرمایا ہے کہ اسے طبری، نسائی (سنن کبریٰ تفسیر سورۂ فرقان)، حاکم (مستدرک: ۲ / ۲۲۸) اور بیہقی (دلائل النبوۃ : ۷/ ۱۳۱) نے روایت کیا ہے اور سب نے اسے ”دَاوُدُ بْنُ أَبِيْ هِنْدٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ“ کی سند سے بیان کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری (۴/۹) میں ان کی موافقت کی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کے نزول کی ابتدا لیلۃ القدر میں ہوئی۔ یہ معنی شعبی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ (طبری) اور زمین پر قرآن مجید کے لیلۃ القدر میں اترنے کا معنی اس کے سوا ہو بھی نہیں سکتا۔

④ اس رات کے رمضان میں ہونے کی تصریح خود قرآن میں ہے، فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [ البقرۃ : ۱۸۵ ] ”رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔“ اور صحیح احادیث میں ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کی کوئی ایک طاق رات (۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹) ہے۔ متعین نہ کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مسلمان ان راتوں میں زیادہ سے زیادہ عبادت کر لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے آخری عشرے ہی میں شب بیداری، اعتکاف اور گھر والوں کو جگانے کا اہتمام کرتے تھے۔ [ دیکھیے بخاري، فضل ليلة القدر، باب العمل في العشر الأواخر من رمضان : ۲۰۲٤ ]

وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴

اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ قدر کی رات کیا ہے؟ ۲ قدر کی رات ہزار مہینے سے بہتر ہے ۳ اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر امر کے متعلق اترتے ہیں ۴

**آیت 2** وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ : یہ سوال اس رات کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، یعنی مخلوق میں سے کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو اس رات کی عظمت جان سکے اور بتا سکے، یہ جاننا اور بتانا اللہ ہی کا کام ہے۔

**آیت 2** لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ : یعنی لیلۃ القدر اپنی برکتوں اور عبادت کے اجر و ثواب کے لحاظ سے ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جن میں یہ رات نہ ہو۔ پھر ہزار ماہ سے یا تو یہ عدد مراد ہے یا عربوں کے عام دستور کے مطابق کثرت مراد ہے جو اس عدد سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہاں بعض مفسرین نے بنو اُمیہ کے ایام حکومت (جو ایک ہزار ماہ تھے) کی مذمت میں ایک روایت لکھی ہے، حالانکہ ترمذی رحمہ اللہ نے اسے روایت کر کے خود ہی ضعیف قرار دیا ہے۔ [ دیکھیے ترمذي، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ لیلۃ القدر : ۳۳۵۰ ] اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ بنو اُمیہ کا عہد اگرچہ خلفائے راشدین کے عہد کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر وہ بھی اسلام کے عروج کا عہد ہے جس میں اسلام کا پھریرا مشرق سے مغرب تک لہرایا۔ انھی کے عہد تک پورا عالم اسلام ایک خلیفہ کے تحت رہا اور اسلام غالب، سر بلند اور محفوظ رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( لَا يَزَالُ هٰذَا الدِّيْنُ عَزِيْزًا مَنِيْعًا إِلَى اثْنَيْ عَشَرَ خَلِيْفَةً، كُلُّهُمْ مِّنْ قُرَيْشٍ )) [ مسلم، الإمارۃ، باب الناس تبع لقریش…… : ۱۸۲۱/۹، عن جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ ] ”یہ دین بارہ خلفاء تک غالب و محفوظ رہے گا، جو سب قریش سے ہوں گے۔“ ابوداؤد میں انھی جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی الفاظ یہ ہیں: (( لَا يَزَالُ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا حَتّٰى يَكُوْنَ عَلَيْكُمْ اثْنَا عَشَرَ خَلِيْفَةً، كُلُّهُمْ تَجْتَمِعُ عَلَيْهِ الْأُمَّةُ، كُلُّهُمْ مِّنْ قُرَيْشٍ )) [ أبو داوٗد، کتاب المھدي : ۴۲۷۹، وقال الألباني صحیح ] ”یہ دین قائم رہے گا حتیٰ کہ بارہ خلفاء ہوں، جن سب پر امت جمع ہوگی، سب کے سب قریش سے ہوں گے۔“ روافض اور ان سے متاثر لوگ اسلام کے اس سنہرے دور کے متعلق فضول باتیں کرتے رہتے ہیں، حالانکہ اس کے بعد نہ امتِ مسلمہ کو ایک خلیفہ پر جمع ہونے کی سعادت حاصل ہو سکی اور نہ اسلام اس طرح غالب رہا جس طرح ان کے عہد میں غالب تھا۔

**آیت 4** ① تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا……: ”الرُّوْحُ“ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ [ الشعراء : ۱۹۳ ] ”یہ قرآن روح الامین لے کر اترے ہیں۔“ ملائکہ میں شامل ہونے کے باوجود ان کے شرف کی وجہ سے ان کا الگ ذکر فرمایا، جس طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں فرشتوں کے ذکر کے بعد ان کے شرف کی وجہ سے ان کا خاص طور پر الگ ذکر فرمایا: ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ

ع ۵ ۲۲

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

وہ رات فجر طلوع ہونے تک سراسر سلامتی ہے ⑤

لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة : ۹۸] ”جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ سب کافروں کا دشمن ہے۔“

② یعنی ملائکہ اور جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر امر کے متعلق آئندہ سال میں جو کچھ ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے وہ لے کر زمین پر اترتے ہیں۔

**آیت 5** ① سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ: ”سَلٰمٌ“ خبر مقدم اور ”هِيَ“ مبتدا مؤخر ہے، یعنی وہ رات طلوع فجر تک سراسر سلامتی ہے۔ مغرب سے فجر تک رات بھر اس میں اہل ایمان شیطان کے شر اور ہر قسم کے فتنے سے سلامت رہتے ہیں اور اپنے دلوں میں عجیب اطمینان وسکون اور سلامتی محسوس کرتے ہیں۔

② لیلۃ القدر، اس کی تلاش اور اعتکاف کے مسائل وفضائل کے لیے کتب احادیث کا مطالعہ فرمائیں۔

سورۃ البینۃ ۹۸ مدنیۃ ۱۰۰ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — آیاتھا ۸ رکوعاتھا ۱

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا باز آنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آئے ① اللہ کی طرف سے ایک رسول، جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے ② جن میں لکھے ہوئے مضبوط احکام ہوں ③

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنِيْ أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ : ﴿لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ قَالَ وَسَمَّانِيْ ؟ قَالَ نَعَمْ، فَبَكٰى »[ بخاري، التفسير، سورة : ﴿ لم يكن ﴾ : ۴۹۵۹ ] ’’اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں ”لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا“ پڑھ کر سناؤں۔‘‘ اُبی رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’اور کیا اللہ نے میرا نام بھی لیا ہے؟‘‘ آپ نے فرمایا: ’’ہاں!‘‘ تو اُبی رضی اللہ عنہ (یہ سن کر خوشی سے) رونے لگے۔‘‘

**آیت 1** لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا...... : ”مُنۡفَکِّیۡنَ“ ”فَكَّ يَفُكُّ فَكًّا“ (ن) ”اَلشَّيْءَ“ کسی چیز کو دوسری سے جدا کرنا، ”اَلْعُقْدَةَ“ گرہ کھولنا اور ”اَلْخَتَمَ“ مہر توڑنا۔ ”اِنْفَكَّ يَنْفَكُّ“ (انفعال) ایک چیز کا دوسری چیز سے الگ ہونا جس کے ساتھ وہ خوب جڑی ہوئی تھی، جیسے ”اِنْفَكَّ الْعَظْمُ“ ”ہڈی اپنے جوڑ سے الگ ہو گئی۔“ ”مُنۡفَکِّیۡنَ“ اسم فاعل ہے، (اپنے کفر سے) باز آنے والے، الگ ہونے والے۔ یعنی پیغمبر آخر الزماں اور قرآن بھیجنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکینِ عرب کو راہِ حق پر لایا جائے، کیونکہ یہ لوگ اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ ان کا راہ حق پر آنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک پیغمبر آئے جو ایک مقدس آسمانی کتاب لائے جس میں عمدہ و دل نشیں مضامین ہوں اور وہ انھیں پڑھ کر سنائے، کسی حکیم یا صوفی یا عادل بادشاہ کے بس کی بات نہ تھی کہ انھیں راہِ راست پر لے آتا۔ (اشرف الحواشی)

**آیت 3،2** رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً...... : قرآن مجید کو ”صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً“ اور اس میں موجود احکام اور سورتوں کو ”قَیِّمَۃٌ“ (نہایت مضبوط) قرار دیا ہے کہ ان میں کسی قسم کی ناپاک بات یا کمزور اور بے بنیاد قصہ یا حکم نہیں۔ اگر کسی شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پاک صحیفوں اور ان میں لکھے ہوئے مضبوط احکام کی پاکیزگی اور مضبوطی معلوم کرنے کا شوق ہو تو وہ قرآن مجید کا بائبل کے مجموعے میں موجود پہلے صحیفوں کے ساتھ موازنہ کر لے، جن میں صحیح باتوں کے ساتھ عقل و اخلاق سے گری ہوئی باتیں، واضح تحریف شدہ احکام اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اور انبیائے کرام کی توہین اور ان پر تہمتوں کی نجاست صاف نظر آتی ہے، مثلاً لوط اور سلیمان علیہما السلام پر بے بنیاد تہمتیں، جن سے وہ ہر طرح سے پاک اور بری ہیں۔

وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۞ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۞

اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی، جُدا جُدا نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیل آگئی ④ اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے ⑤

**آیت 4** : ❶ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ …… : اس آیت میں اہلِ کتاب کے ایک جرم کا ذکر فرمایا، مشرکین کا نام نہیں لیا، کیونکہ جب پڑھے لکھوں کا یہ حال ہے تو جاہل مشرکین کی ضد اور عناد کا اندازہ خود کر لیں۔ اہلِ کتاب کا یہ جرم ان کا باہمی تفرقہ تھا اور اس جرم کا ارتکاب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بھی کیا اور آپ کی آمد پر بھی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ اس آیت میں وضاحت فرمائی کہ ان کے الگ الگ بہتر (۷۲) فرقے بننے کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں اللہ کے حکم کا علم نہ تھا، نہیں! بلکہ "اَلْبَيِّنَةُ" (کھلی دلیل اور واضح حکم) موجود ہونے کے باوجود باہمی ضد اور عناد کی وجہ سے کسی نے احبار و رہبان میں سے کسی ایک کے اقوال کو حجت مان کر اس کے نام پر فرقہ بنا لیا اور کسی نے دوسرے کے نام پر۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( تَفَرَّقَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى إِحْدٰى وَ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً، أَوِ اثْنَتَيْنِ وَ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً، وَالنَّصَارٰى مِثْلَ ذٰلِكَ، وَ تَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً )) [ ترمذي، الإيمان، باب ما جاء في افتراق هذه الأمة : ۲٦٤٠، وقال ترمذي و الألباني حسن صحيح ] "یہود اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے، نصرانیوں کا بھی یہی حال ہوا اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔" اس افتراق کا حل پہلے بھی یہ تھا اور اب بھی یہی ہے کہ تمام امت اللہ کے نازل کردہ احکام پر متفق ہو جائے، علماء کے اقوال سے کتاب و سنت سمجھنے میں مدد لی جائے مگر ان میں سے کسی کے قول کو شرع سمجھ کر فرقہ نہ بنایا جائے، بلکہ جہاں اس کی بات وحی الٰہی کے خلاف ہو، خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، اسے یکسر ترک کر دیا جائے۔

❷ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد آپ پر اہلِ کتاب کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ ہرگز نہ تھی کہ انھیں آپ کے سچا ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کی واضح بشارت اور نشانیاں موجود ہونے کی وجہ سے وہ آپ کو اپنے بیٹوں کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پہچانتے تھے، مگر محض حسد اور عناد کی وجہ سے آپ کے بارے میں جدا جدا ہو گئے، کوئی ایمان لے آیا اور کوئی کفر پر ڈٹا رہا۔ حسد اور عناد ایک تو یہ تھا کہ آپ بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل سے کیوں ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی مذہبی سرداری چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

**آیت 5** وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ …… : "اَلْقَيِّمَةِ" "قَامَ يَقُوْمُ" سے "فَيْعِلَةٌ" کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ ⑥ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ؕ ⑦ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ

بے شک وہ لوگ جنھوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا، جہنم کی آگ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہی لوگ مخلوق میں سب سے بُرے ہیں ⑥ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وہی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں ⑦ ان کا بدلا ان کے رب کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں، جن

جس میں تاء مبالغے کے لیے ہے، نہایت مضبوط، سیدھی جس میں کوئی کجی نہیں: "أَيْ ذٰلِكَ دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ" یعنی یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔ "حُنَفَآءَ" "حَنِيْفٌ" کی جمع ہے جو "حَنَفَ يَحْنِفُ حَنَفًا" (ض) (حاء کے ساتھ) سے "فَعِيْلٌ" بمعنی اسم فاعل ہے، اس کا لفظی معنی "ایک طرف مائل ہونا" ہے۔ اس کا اکثر استعمال "تمام راستوں سے ہٹ کر سیدھے راستے کی طرف آنے" کے معنی میں ہوتا ہے، جب کہ "جَنَفَ" (جیم کے ساتھ) کا مطلب "سیدھے راستے سے ہٹ کر ادھر ادھر ہو جانا" ہوتا ہے۔ اس آیت میں دین کا خلاصہ بیان فرما دیا کہ پہلی امتیں ہوں یا یہ امت، سب میں ایک ہی حکم ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کریں، جو ہر قسم کے شرک اور ریا سے پاک اور خالص اللہ کے لیے ہو اور باطل پر چلنے والے تمام گروہوں سے ہٹ کر ایک اللہ کی طرف یک سو ہو جائیں، جس طرح ابراہیم علیہ السلام ہو گئے تھے اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔ جب اس امت میں بھی وہی پہلا ہی حکم ہے اور پہلی امتوں کا اور اس امت کا دین قیم ایک ہی ہے، تو انھیں ماننے سے انکار کیوں ہے؟

**آیت 6** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ...... : "الْبَرِيَّةِ" "بَرَأَ يَبْرَأُ بَرْأً وَ بُرُوْءًا" (ف) (پیدا کرنا) سے "فَعِيْلَةٌ" کے وزن پر اسم مفعول کے معنی میں ہے، مخلوق۔ یعنی یہ لوگ تمام مخلوق حتیٰ کہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ [ الأعراف : ۱۷۹ ] "یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔" کیونکہ وہ جان بوجھ کر حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

**آیت 8،7** اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ...... : جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لائے اور انھوں نے صالح اعمال کیے ان کے لیے تین بڑی بڑی بشارتیں ہیں، پہلی یہ کہ وہ مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، کیونکہ اپنے اختیار سے گناہ چھوڑ کر ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کا درجہ یقیناً ان لوگوں سے بلند ہے جن میں نافرمانی کی استعداد ہی نہیں، دوسری یہ کہ ان کے لیے ہمیشہ رہنے کے لیے باغات ہیں، جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور تیسری یہ کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی جو آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے، فرمایا: ﴿ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [ التوبة :

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸

کے تلے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈر گیا۝۸

[ ۷۲ ] ''اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔'' ''اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے'' یعنی بے شمار نعمتوں کے بعد بھی اگر ان کا دل ہی خوش نہ ہوا تو کیا فائدہ؟ یہ نعمتیں اس کے لیے ہیں جو اپنے رب سے ڈر گیا۔ خالی بے روح کلمہ پڑھنے، بلاخشیت نماز اور بوجھل دل کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے اور بطور رسم عبادات ادا کرنے سے یہ مرتبہ نہیں ملتا، بلکہ اس کا مدار اللہ کے ڈر پر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ [ الرحمن : ٤٦ ] ''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اس کے لیے دو باغ ہیں۔''

سُوْرَةُ الزَّلْزَلَةِ ۹۹ مدنیۃ ۹۳ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ — اٰیاتُها ۸ رکوعاتُها ۱

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ② وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ③ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ④

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب زمین سخت ہلا دی جائے گی، اس کا سخت ہلایا جانا ① اور زمین اپنے بوجھ نکال باہر کرے گی ② اور انسان کہے گا اسے کیا ہے؟ ③ اس دن وہ اپنی خبریں بیان کرے گی ④

انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ زلزال کو قرآن کے نصف کے برابر قرار دیا ہے، مگر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ان روایات کو منکر اور ضعیف قرار دیا ہے۔ [ دیکھیے سلسلة الأحادیث الضعیفة والموضوعة : ۱۳٤۲ ]

**آیت 1** اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا : "زَلْزَلَ يُزَلْزِلُ زَلْزَلَةً وَ زِلْزَالًا" (فعللہ) سخت ہلانا۔ یہاں "زِلْزَالٌ" مصدر مفعول کے معنی میں ہے، یعنی سخت ہلایا جانا۔ اس سے مراد دوسرے نفخہ کے ساتھ آنے والا زبردست زلزلہ ہے، کیونکہ دوسرے نفخہ کے ساتھ ہی مردے قبروں سے نکلیں گے، فرمایا: ﴿ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ [ الزمر : ٦٨ ] ''پھر اس میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو یک لخت وہ کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے۔'' "زِلْزَالَهَا" (اپنے زلزلے) سے مراد یہ ہے کہ زمین کو سخت ہلا دینے کے لیے جتنا زبردست زلزلہ ہونا چاہیے اس قسم کے زلزلے کے ساتھ وہ سخت ہلا دی جائے گی۔

**آیت 2** وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا: "أَثْقَالٌ" "ثَقَلٌ" کی جمع ہے، مسافر کا سامان اور نفیس چیزیں جن کی وہ حفاظت کرتا ہے، یعنی زمین نے جو کچھ سنبھال کر رکھا ہوا ہے اسے باہر نکال دے گی۔ یا "ثِقْلٌ" کی جمع ہے جو حمل کو کہتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ ﴾ [ الأعراف : ۱۸۹ ] ''پس جب وہ (عورت) بھاری ہوگئی۔'' اس صورت میں زمین کو حاملہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یعنی اتنا شدید زلزلہ ہوگا کہ زمین پھٹ جائے گی اور اس میں جو فوت شدہ لوگ ہیں یا جو کچھ بھی زمین نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے باہر نکال کر خالی ہو جائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ﴾ [الانشقاق : ٤ ] ''اور اس میں جو کچھ ہے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔''

**آیت 2** وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا: ہر انسان ہی اچانک پیش آنے والے واقعات سے دہشت زدہ ہو کر یہ الفاظ کہے گا۔ خصوصاً کافر جو قیامت کا منکر تھا، اس کے لیے تو یہ بات حد سے بڑھ کر تعجب انگیز ہوگی۔

**آیت 4** يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا: یعنی زمین وہ سب کچھ بیان کرے گی جو اس پر کیا گیا اور بتائے گی کہ کس نے کس وقت کیا نیکی یا کیا بدی کی۔

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝٥ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝٦ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝٧ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝٨

اس لیے کہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہوگی ⑤ اس دن لوگ الگ الگ ہو کر واپس لوٹیں گے، تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں ⑥ تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا ⑦ اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا ⑧

آیت 5 بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا: کیونکہ اس کے رب نے اسے یہ حکم دیا ہوگا۔

آیت 6 يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ: "يَصْدُرُ" واپس لوٹیں گے، یعنی پہلے قبروں میں گئے تھے، اب وہاں سے حساب کے لیے میدانِ محشر میں اللہ کے حضور واپس لوٹیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾ [ البقرة : ۲۸ ] ''پھر وہ تمھیں مارے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' "أَشْتَاتًا" "شَتٌّ" کی جمع ہے، الگ الگ۔ "لِّيُرَوْا" "أَرٰى يُرِيْ إِرَاءَةً" (افعال) سے مضارع مجہول ہے، تاکہ وہ دکھائے جائیں اپنے عمل۔ "لِّيُرَوْا" میں ضمیر نائب فاعل ہے اور "أَعْمَالَهُمْ" مفعول ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اکیلا اکیلا اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے لیے پیش ہوگا، اس کا قبیلہ، اس کی جماعت اور دوست احباب کوئی ساتھ نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ [ الأنعام : ۹٤ ] ''اور یقیناً تم ہمارے پاس اس طرح اکیلے آئے ہو جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔'' الگ الگ ہو کر اس لیے لوٹیں گے کہ ہر ایک کو اس کے اعمال دکھائے جائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴾ [ بني إسرائيل : ١٤ ] ''اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب بہت کافی ہے۔'' یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ الگ الگ گروہ کی شکل میں میدان محشر کی طرف روانہ ہوں گے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حضور فرداً فرداً پیش ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّن يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴾ [ النمل : ۸۳ ] ''اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گروہ ان لوگوں کا اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، پھر ان کی جدا جدا قسمیں بنائی جائیں گی۔''

آیت 8،7 ① فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ......: "يَرَهُ" اصل میں "يَرَاهُ" ہے، جو "رَاٰى يَرٰى رُؤْيَةً" کا فعل مضارع ہے، "فَمَن يَعْمَلْ" شرط کی جزا ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، اس لیے الف حذف ہو گیا۔ "ذَرَّةٍ" بکھرے ہوئے غبار کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ جو روشن دان میں سورج کی شعاعوں سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ چھوٹی چیونٹی کو بھی "ذَرَّةٌ" کہتے ہیں۔ کافر ہو یا مسلمان، ذرہ بھر نیکی کی ہوگی تو دیکھ لے گا اور ذرہ بھر برائی کی ہوگی تو دیکھ لے گا، اعمال کے دفتر سے کوئی چیز غائب نہیں ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ﴾ [ الكهف : ٤٩ ] ''اور انھوں نے جو کچھ

کیا اسے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔'' البتہ اعمال کی جزا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہوگی۔ چنانچہ کافروں کے اعمال ضائع کر دیے جائیں گے، انھیں آخرت کے بجائے دنیا ہی میں بدلا دے دیا جائے گا۔ (دیکھیے اعراف: ۱۴۷۔ احقاف: ۲۰) اور انھیں کوئی سفارش فائدہ نہیں دے گی۔ دیکھیے سورۂ مدثر (۴۸)۔

قرآن مجید اور صحیح احادیث کی روشنی میں ان کے اعمال ضائع ہونے اور سفارش کے مفید نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے، ان پر جنت حرام ہے۔ البتہ بعض اعمال یا کسی شفاعت کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہو سکتی ہے، جیسا کہ ابوطالب کو صرف آگ کا جوتا پہنایا جائے گا اور کفار اپنے اپنے اعمال کے لحاظ سے جہنم کے مختلف درکات میں ہوں گے۔ منافقین آگ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے۔ (دیکھیے نساء: ۱۴۵) اہل ایمان کو ان کی برائیوں کی سزا تب ملے گی جب یہ شرطیں موجود ہوں: ① گناہ کبیرہ ہوں۔ (دیکھیے نساء: ۳۱) ② ان سے توبہ کیے بغیر فوت ہو جائیں۔ ③ ان کی نیکیاں میزان میں بھاری نہ ہو سکیں۔ ④ ان کے حق میں کوئی سفارش قبول نہ ہو۔ ⑤ ان کا کوئی عمل ایسا نہ ہو جس سے وہ مغفرت کے مستحق ہو چکے ہوں، مثلاً اہل بدر۔ ⑥ اللہ تعالیٰ نے وہ گناہ معاف نہ کیا ہو، کیونکہ گناہ گار مومن اللہ کی مرضی پر ہے، وہ چاہے تو اسے عذاب دے، چاہے تو بخش دے۔

❷ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو جامع اور بے نظیر آیت قرار دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کے متعلق فرمایا: «اَلْخَيْلُ ثَلَاثَةٌ: لِرَجُلٍ أَجْرٌ وَ لِرَجُلٍ سِتْرٌ وَ عَلٰى رَجُلٍ وِزْرٌ» ''گھوڑے تین طرح کے لوگوں کے لیے ہیں، ایک آدمی کے لیے اجر ہیں اور ایک آدمی کے لیے پردہ ہیں اور ایک آدمی پر بوجھ ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيَّ فِيْهَا إِلَّا هٰذِهِ الْآيَةَ الْفَاذَّةَ الْجَامِعَةَ: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾» [بخاري، التفسير، باب قوله: ﴿فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره﴾: ۴۹۶۲] ''اللہ نے اس کے متعلق اس بے نظیر و جامع آیت کے علاوہ مجھ پر کچھ نازل نہیں فرمایا: ''تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔''

سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ ۱۰۰ مکیۃ ۱۴ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰیاتھا ۱۱ رکوعاتھا ۱

وَ الْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پیٹ اور سینے سے آواز نکالتے ہوئے دوڑنے والے ہیں! ﴿۱﴾ پھر جو سم مار کر چنگاریاں نکالنے والے ہیں! ﴿۲﴾ پھر جو صبح کے وقت حملہ کرنے والے ہیں! ﴿۳﴾ پھر اس کے ساتھ غبار اڑاتے ہیں ﴿۴﴾ پھر وہ اس کے ساتھ بڑی جماعت کے درمیان جا گھستے ہیں ﴿۵﴾

---

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے، راجح یہی ہے کہ یہ مکی ہے۔ اس میں شواہد کے ساتھ انسان کا ناشکرا ہونا اور بخیل و حریص ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قیامت کا تذکرہ ہے۔

**آیت 1** وَ الْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا: "اَلْعٰدِيٰتِ" "عَدَا يَعْدُوْا عَدْوًا" (ن) (دوڑنا) سے اسم فاعل ہے، دوڑنے والے۔ "ضَبْحٌ" اس آواز کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کے جوف سے نکلتی ہے، جو نہ سانس کی آواز ہوتی ہے اور نہ ہنہنانے کی، اس لیے اس کا معنی "ہانپ کر" کرنا محلِ نظر ہے۔ آیت میں اگرچہ گھوڑوں کا لفظ نہیں، مگر لغت عرب میں "ضَبْحٌ" کا لفظ گھوڑے کے لیے آتا ہے یا کتے کے لیے، کیونکہ یہ مخصوص آواز انھی دو جانوروں سے نکلتی ہے۔ اس جگہ کتے مراد ہو ہی نہیں سکتے، اس لیے گھوڑے ہی مراد ہیں۔ یہاں تیز دوڑنے والے گھوڑوں کو بطور شاہد پیش کیا گیا ہے، وہ گھوڑے مسلمانوں کے ہوں یا کافروں کے، انھیں غازیوں کے ساتھ مخصوص بھی نہیں کیا گیا، کیونکہ مقصد گھوڑوں کی فضیلت بیان کرنا نہیں بلکہ انھیں آئندہ آنے والے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرنا ہے۔

**آیت 2** فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا: "اَوْرٰى يُوْرِيْ اِيْرَاءً" (افعال) چقماق (پتھر) سے آگ نکالنا۔ "قَدَحَ يَقْدَحُ قَدْحًا" (ف) آگ نکالنے کے لیے پتھر پر پتھر مارنا ہے، مراد سُم مارنا ہے۔ تیز دوڑتے ہوئے ان کے سُم پتھروں پر پڑتے ہیں تو ان میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔

**آیت 3** فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا: "فَالْمُغِيْرٰتِ" "اَغَارَ يُغِيْرُ اِغَارَةً" (افعال) سے اسم فاعل "مُغِيْرَةٌ" کی جمع ہے، لوٹنے کے لیے حملہ کرنے والے۔

**آیت 4** فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا: "فَاَثَرْنَ" "اَثَارَ يُثِيْرُ اِثَارَةً" (افعال) "اَلْغُبَارَ" غبار اڑانا۔ "نَقْعًا" غبار۔

**آیت 5** فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا: "وَسَطْنَ" "وَسَطَ يَسِطُ وَسْطًا" (ض) "اَلْقَوْمَ اَوِ الْمَكَانَ" "کسی چیز کے درمیان میں ہونا۔"

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾

بے شک انسان اپنے رب کا یقیناً بہت ناشکرا ہے ﴿۶﴾ اور بے شک وہ اس بات پر یقیناً (خود) گواہ ہے ﴿۷﴾ اور بے شک وہ مال کی محبت میں یقیناً بہت سخت ہے ﴿۸﴾ تو کیا وہ نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ ہے باہر نکال پھینکا جائے گا ﴿۹﴾

**آیت 7، 6** اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ...... : " كَنَدَ يَكْنُدُ " (ن) "كُنُوْدًا" (کاف کے ضمہ کے ساتھ) "اَلنِّعْمَةَ" نعمت کا انکار کرنا، ناشکری کرنا۔ " كَنُوْدٌ " (کاف کے فتحہ کے ساتھ) بروزن " فَعُوْلٌ " بمعنی فاعل برائے مبالغہ ہے، بہت ناشکری کرنے والا۔ یہ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے۔ اصل میں " كَنُوْدٌ " اس زمین کو کہتے ہیں جو کوئی چیز نہ اگاتی ہو۔ اس سورت میں پہلی پانچ آیات میں قسمیں اٹھانے کے بعد چھٹی آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان یقیناً اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ یہ پانچوں قسمیں اس دعوے کی دلیل اور شاہد کے طور پر لائی گئی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ گھوڑے اپنے مالک کے ایسے وفادار اور شکر گزار ہیں کہ رات جب وہ انھیں لے کر نکلتے ہیں تو وہ بلا چون و چرا چل پڑتے ہیں، نہ اپنے آرام کی پروا کرتے ہیں اور نہ رات کی تاریکی کی، پھر وہ مالک کے کہنے پر صدق نیت کے ساتھ اس طرح سرپٹ دوڑتے ہیں کہ ان کے جوف سے آواز نکلنے لگتی ہے اور تیزی سے دوڑتے ہوئے ان کے سُم جہاں پڑتے ہیں ان کی ٹھوکر اور رگڑ کے ساتھ پتھروں سے چنگاریاں نکلتی جاتی ہیں۔ پھر صبح کے وقت جب ہر چیز آرام کر رہی ہوتی ہے، ان کے مالک انھیں لے کر دشمن کو لوٹنے کے لیے دھاوا بولتے ہیں تو اس وقت بھی وہ غبار اڑاتے ہوئے دوڑتے چلے جاتے ہیں، خواہ غبار کے ساتھ سانس گھٹ رہا ہو، یا آگے دشمن کی تلواریں، تیر اور نیزے ان کے سینے چھید رہے ہوں، یہ کسی بھی چیز کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی حالت میں دشمن کی جماعت کے وسط میں جا گھستے ہیں۔ گھوڑے اپنے اس مالک کے لیے اتنی تگ و دو کرتے ہیں جو ان کی تھوڑی بہت خدمت کرتا ہے، جس نے نہ انھیں پیدا کیا ہے اور نہ ان کا حقیقی رازق ہے، تو کیا انسان اللہ تعالیٰ کے کہنے پر جو اس کا خالق بھی ہے، مالک اور رازق بھی اتنی تگ و دو کرنے اور قربانی دینے پر تیار ہے؟ وہ خود مانے گا کہ یقیناً نہیں، تو پھر اس کے ناشکرا ہونے میں کیا شک ہے؟

**آیت 8** وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ : یعنی اس ناشکری کا سبب مال کی شدید محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حرص، طمع اور بخل کی بدعادتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ اپنے مُنعمِ حقیقی کو بھلا بیٹھا ہے۔

**آیت 9** اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ : یعنی انسان اپنے رب کی ناشکری کرتا ہے اور مال سے شدید محبت کی وجہ سے اپنے مالک کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ سب کچھ نکال باہر پھینکا جائے گا جو قبروں میں ہے اور ان میں موجود تمام مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکال باہر کیا جائے گا؟ " اَفَلَا يَعْلَمُ " (تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا) کا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ اس وقت سے نہیں ڈرتا کہ اپنے مالک کو کیا جواب دے گا؟

وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ﴿ۙ۱۰﴾ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر کر دیا جائے گا ﴿۱۰﴾ بے شک ان کا رب اس دن ان کے متعلق یقیناً خوب خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۱﴾

**آیت 10** **وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ:** دوسرے اعمال تو پہلے ہی ظاہر ہو چکے تھے، مگر دل کی نیت اور ارادے کے متعلق خیال ہو سکتا تھا کہ اسے کون جانتا ہے، تو اس وقت وہ بھی ظاہر کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ ﴾ [الطارق : ۹] ''جس دن پوشیدہ راز ظاہر کیے جائیں گے۔''

**آیت 11** **اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ:** اس آیت پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ تو ہمیشہ ہی بندوں کے حالات سے باخبر ہے، پھر اس دن کو خاص کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن جب ظاہری اعضا سے سرزد ہونے والے اعمال کے علاوہ دلوں کے اعمال ظاہر کر کے ان کی بھی جزا و سزا دی جائے گی، تو اگر پہلے کسی کو شک تھا تو اس دن وہ بھی دور ہو جائے گا کہ یقیناً ان کا رب ان کے متعلق خوب خبر رکھنے والا ہے۔

سورۃ القارعۃ ۱۰۱ مکیۃ ۳۰ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — آیاتہا ۱۱ رکوعہا ۱

اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ کھٹکھٹانے والی ① کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟ ② اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ کھٹکھٹانے والی کیا ہے؟ ③ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں گے ④

یہ سورت مکی ہے اور اس میں قیامت کے احوال، اعمال کے وزن اور ان کی جزا و سزا کا بیان ہے۔

**آیت 1** اَلْقَارِعَةُ: "قَرَعَ يَقْرَعُ قَرْعًا" (ف) شدت کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹانا۔ "اَلْقَارِعَةُ" "اَلطَّآمَّةُ، اَلصَّآخَّةُ، اَلْحَآقَّةُ، اَلْغَاشِيَةُ" اور "اَلْوَاقِعَةُ" کی طرح قیامت کا ایک نام ہے، کیونکہ صور کی آواز کانوں اور دلوں بلکہ ہر چیز کے ساتھ شدت سے ٹکرائے گی، حتیٰ کہ اس آواز کی وجہ سے زمین اور پہاڑ بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً﴾ [ الحاقۃ : ۱۴ ] "اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا۔"

**آیت 3، 2** مَا الْقَارِعَةُ ۚ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ: یعنی وہ "اَلْقَارِعَةُ" کیا ہے؟ کس قدر عجیب اور کتنی خوف ناک ہے؟ تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ "قارعہ" کیا چیز ہے؟ یعنی وہ اتنی عظیم الشان اور عجیب و غریب ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اس کی شدت و عظمت جانتا ہی نہیں کہ تجھے بتائے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، اس لیے اس نے خود ہی اگلی آیت میں اپنے فضل سے اس کا کچھ حال بیان فرما دیا۔

**آیت 4** يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ: "اَلْفَرَاشُ" اسم جنس ہے، مفرد کے لیے "فَرَاشَةٌ" آتا ہے، پروانے۔ یعنی جس طرح پروانے بے شمار تعداد میں ایک دوسرے کے گرد اڑتے، گھومتے اور آپس میں ٹکراتے ہوئے آگ کی طرف تیزی سے جا رہے ہوتے ہیں اسی طرح سب لوگ ایسی ہی پریشانی اور تیزی کے ساتھ میدانِ محشر میں بلانے والے کی طرف جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۙ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ﴾ [ القمر : ۷، ۸ ] "ان کی نظریں جھکی ہوں گی، وہ قبروں سے نکلیں گے جیسے وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہوں۔ پکارنے والے کی طرف گردن اٹھا کر دوڑنے والے ہوں گے۔" اور فرمایا: ﴿مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ [ إبراہیم : ۴۳ ] "اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے، ان کی نگاہ ان کی طرف نہیں لوٹے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔" اور فرمایا: ﴿يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ﴾ [ طٰہٰ :

وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹

اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے ⑤ تو لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے ⑥ تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا ⑦ اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے ⑧ تو اس کی ماں ہاویہ ہے ⑨

١٠٨ ] ''اس دن وہ پکارنے والے کا پیچھا کریں گے، جس کے لیے کوئی کجی نہ ہوگی۔'' اور وہاں پہنچ کر بھی انھیں قرار نہیں ہوگا، بلکہ اسی طرح بے قرار و بے تاب بھاگتے پھریں گے، فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ...... لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴾ [ عبس : ٣٤ تا ٣٧ ] ''جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا...... اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی۔''

**آیت 5** وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ: ''اَلْعِهْنُ'' اُون یا رنگین اُون۔ ''اَلْمَنْفُوْشِ'' دھنکی ہوئی۔ قیامت کے دن پہاڑ دھنک کر اون یا روئی کے گالوں کی طرح کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴾ [ طٰہٰ : ١٠٥ ] ''اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، تو کہہ دے کہ میرا رب انھیں خوب اچھی طرح دھنک کر رکھ دے گا۔'' چونکہ پہاڑ سرخ، سیاہ، سفید اور بے شمار رنگوں والے ہیں، اس لیے جب وہ دھنکے جائیں گے تو رنگی اور دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے مختلف احوال کے لیے دیکھیے سورۂ نبا (٢٠) کی تفسیر۔

**آیت 6** فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ: ''مَوَازِيْنُ'' ''مِيْزَانٌ'' کی جمع ہے، ترازو۔ مراد ترازو کے پلڑے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (٨، ٩) کی تفسیر۔ اس کے بعد اعمال کا وزن ہوگا۔ ''مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ'' (جس کے پلڑے بھاری ہو گئے) سے مراد نیکیوں کے پلڑے ہیں۔

**آیت 7** فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ: ''عَاشَ يَعِيْشُ عَيْشًا وَ مَعَاشًا وَ عِيْشَةً وَ مَعِيْشَةً'' (ض) زندگی والا ہونا۔ ''عِيْشَةٍ'' ''فِعْلَةٌ'' کے وزن پر مصدر ہے، جو حالت اور کیفیت پر دلالت کرتا ہے، تو ''عِيْشَةٍ'' زندگی کی حالت۔ ''رَاضِيَةٍ'' ''رَضِيَ يَرْضٰى رِضًا'' (س) سے ہے، یہاں ''رَاضِيَةٍ'' بمعنی ''ذَاتُ الرِّضَا'' ہے، یعنی خوشی والی زندگی، جیسے ''تَامِرٌ'' کھجور والے کو اور ''لَابِنٌ'' دودھ والے کو کہا جاتا ہے۔

**آیت 8، 9** وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ......: ''هَاوِيَةٌ'' ''هَوٰى يَهْوِيْ هُوِيًّا'' (ض) گرنا۔ ''هَاوِيَةٌ'' کا لفظی معنی گڑھا ہے جس میں گرا جائے، مراد جہنم ہے۔ ''فَاُمُّهٗ'' ''اس کی ماں'' مراد اس کا ٹھکانا ہے، جس طرح ماں اپنے بچے کو گود میں جگہ دیتی ہے۔

وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾

اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ کیا ہے؟ ﴿۱۰﴾ ایک سخت گرم آگ ہے ﴿۱۱﴾

**آیت 10** ❶ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ: "مَاۤ اَدۡرٰىكَ" کے ساتھ سوال اس کی ہولناکی نمایاں کرنے کے لیے ہے۔
❷ "مَاهِيَهۡ" اصل میں "مَا هِيَ" ہے، وہ کیا ہے؟ یاء کے فتحہ کی حفاظت کے لیے وقف کے وقت اس کے بعد ساکن ہاء لگا دیتے ہیں، اسے ہائے وقف کہتے ہیں جو ملا کر پڑھیں تو گر جاتی ہے۔ بعض قُرّاء ملا کر پڑھنے کی صورت میں بھی اسے باقی رکھتے ہیں۔

**آیت 11** نَارٌ حَامِيَةٌ: "حَامِيَةٌ" "حَمِيَ يَحْمٰى حَمْيًا" (س) (گرم ہونا) سے اسم فاعل ہے، یعنی وہ ہاویہ صرف ایک بے انتہا گہرا گڑھا ہی نہیں بلکہ سراسر آگ ہے، جو سخت گرم ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( نَارُكُمْ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِيْنَ جُزْءًا مِّنْ نَارِ جَهَنَّمَ )) [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة : ۳۲۶۵ ] "تمھاری آگ جہنم کی آگ کے ستر (۷۰) حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔" اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

سورۃ التکاثر مکیۃ ۱۰۲ | بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ | آیاتہا ۸ رکوعہا ۱

اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

تمھیں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے غافل کر دیا ① یہاں تک کہ تم نے قبرستان جا دیکھے ②!

ابو مطرف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ "اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ" تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: (( يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ مَالِيْ، مَالِيْ، قَالَ وَهَلْ لَكَ يَا ابْنَ آدَمَ! مِنْ مَّالِكَ إِلاَّ مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ؟ )) [ مسلم، الزهد والرقائق، باب الدنيا سجن للمؤمن : ۲۹۵۸ ] "ابن آدم کہتا ہے میرا مال، میرا مال، حالانکہ اے آدم کے بیٹے! تیرے مال میں سے تیرا مال تو صرف وہی ہے جو تو نے کھایا اور فنا کر دیا، یا پہنا اور پرانا کر دیا، یا صدقہ کیا اور آگے بھیج دیا۔"

**آیت 1** ① اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ: "أَلْهٰى يُلْهِيْ" "لَهْوٌ" سے ہے، جس کا معنی ہے "کسی چیز کے ساتھ اتنا لگاؤ اور دلچسپی جو اسے اہم چیزوں سے غافل کر دے۔" "اَلتَّکَاثُرُ" "كَثْرَةٌ" سے باب تفاعل کا مصدر ہے، جس میں تشارک کا معنی پایا جاتا ہے، یعنی ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش۔ مال و اولاد اور جاہ و شرف، الغرض دنیا کی ہر چیز دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص اور پھر حاصل ہو جانے پر دوسروں پر فخر کرنا۔

② اس حرص کی حد کیا ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَّالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ، وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ )) [ بخاري، الرقاق، باب ما يتقي من فتنة المال : ۶۴۳۶ ] "اگر ابن آدم کے پاس مال کی بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی تلاش کرے گا اور آدم کے بیٹے کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ کوئی چیز نہیں بھرتی اور اللہ اس کی طرف پلٹ آتا ہے جو واپس پلٹ آئے۔" سب سے زیادہ نقصان دہ حرص دو چیزوں کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ )) [ ترمذي، الزهد، باب حديث ما ذئبان جائعان : ۲۳۷۶، وصححه الألباني ] "دو بھوکے بھیڑیے جو بھیڑ بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں، وہ انھیں اتنا خراب نہیں کرتے جتنا آدمی کے مال اور شرف (اونچا ہونے) کی حرص اس کے دین کو خراب کرتی ہے۔"

③ کس چیز سے غافل کر دیا؟ اللہ کے احکام سے، اس کے دین سے اور آخرت سے۔

**آیت 2** حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ: "زُرۡتُمُ" "زَارَ يَزُوْرُ زِيَارَةً" (ن) (ملنے کے لیے جانا) سے ماضی معلوم ہے۔ "الۡمَقَابِرَ" "مَقْبَرَةٌ" کی جمع ہے جو "قَبَرَ يَقْبُرُ قَبْرًا" (ن) (دفن کرنا) سے اسم ظرف ہے، دفن کی جگہیں، قبرستان۔ "زُرۡتُمُ

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۵ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۷ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۸ ع ۴/۸

ہرگز نہیں، تم جلدی جان لو گے ۳ پھر ہرگز نہیں، تم جلدی جان لو گے ۴ ہرگز نہیں، کاش! تم جان لیتے، یقین کا جاننا ۵ کہ یقیناً تم ضرور جہنم کو دیکھو گے ۶ پھر یقیناً تم ضرور اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے ۷ پھر یقیناً تم اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے ۸

---

الْمَقَابِرَ ” (قبرستان جا دیکھے) کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری موت آ گئی، یعنی موت آنے تک یہ غفلت طاری رہی، بلکہ جیسے جیسے موت قریب آتی گئی غفلت کا یہ نشہ بڑھتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَكْبَرُ ابْنُ آدَمَ، وَ يَكْبَرُ مَعَهُ اثْنَتَانِ حُبُّ الْمَالِ، وَطُوْلُ الْعُمُرِ » [ بخاری، الرقاق، باب من بلغ ستین سنة...... : ٦٤٢١ ] ”آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ دو چیزیں بڑی ہوتی جاتی ہیں، مال کی محبت اور لمبی عمر کی محبت۔“

**آیت 4، 3** كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ...... : یعنی اپنی غفلت کا انجام جان لو گے۔ تاکید کے لیے بات دہرائی ہے۔

**آیت 5 تا 7** كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ......: ” لَتَرَوُنَّ “ ”رَاٰى يَرٰى رُؤْيَةً“ (ف) (دیکھنا) سے جمع حاضر فعل مضارع معلوم بانون تاکید ثقیلہ ہے، تم ضرور بالضرور دیکھو گے۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ حاقہ کی آیت (۵۱) کی تفسیر۔ مسلمان اور کافر سبھی جہنم کو دیکھیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ﴾ [ مریم : ۷۱ ] ”تم میں سے ہر کوئی اس پر وارد ہوگا۔“ پھر اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لیں گے، کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا۔

**آیت 8** ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ : یعنی صحت و عافیت، کھانے پینے اور دوسری تمام نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا کہ ان کا کہاں تک شکر ادا کیا؟ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی لذت اور معمولی سے معمولی عافیت ایسی نہیں جس کے بارے میں سوال نہ ہو۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھوک کی وجہ سے گھر سے نکلے اور ایک انصاری کے گھر آئے، اس نے مہمانی میں کھجوریں اور بکری کا گوشت پیش کیا۔ آپ نے گوشت اور کھجوریں کھائیں اور اوپر سے شیریں پانی پیا۔ جب خوب سیر ہو چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَتُسْأَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِيْمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » [ مسلم، الأشربة، باب جواز استتباعه غیره...... : ۲۰۳۸ ] ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم سے قیامت کے دن اس نعمت کے بارے میں (بھی) سوال ہوگا۔“

سورۃ العصر ۱۰۳ مکیۃ ۱۳ ﴿ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴾ آیاتہا ۳ رکوعہا ۱

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

زمانے کی قسم! ① کہ بے شک ہر انسان یقیناً گھاٹے میں ہے ② سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے

یہ سورت قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے، مگر نہایت جامع سورت ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ ''مفتاح دارالسعادۃ'' میں فرماتے ہیں کہ شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اگر لوگ اس سورت میں غور و فکر کریں تو یہی ان کے لیے کافی ہے۔''

آیت 1 تا 3 ① وَالۡعَصۡرِ ۙ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ...... : قرآن مجید میں مذکور قسمیں عام طور پر اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہیں جو قسموں کے بعد مذکور ہوتا ہے۔ اس سورت کا مفہوم سمجھنے کے لیے خسارے کا مفہوم ذہن میں لانا ضروری ہے۔ خسارہ یا نفع کسی نہ کسی تجارت اور بیع میں ہوتا ہے جس میں آدمی اپنا رأس المال (سرمایہ) لگاتا ہے، اگر رأس المال فروخت ہو جائے اور رأس المال اور محنت سے بڑھ کر آمدنی ہو جائے تو یہ نفع ہے، ورنہ خسارہ۔ اس سورت میں زمانے کی قسم کھا کر یہ حقیقت مدلل کی گئی ہے کہ چار صفات والے لوگوں کو چھوڑ کر ہر انسان ہی خسارے میں ہے، کیونکہ انسان کے پاس رأس المال صرف اور صرف زمانے کا کچھ حصہ یعنی اس کی عمر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَوَ لَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِیۡرُ ﴾ [ فاطر : ۳۷ ] ''اور کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی کہ اس میں جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا حاصل کر لیتا اور تمھارے پاس خاص ڈرانے والا بھی آیا۔'' اور یہ سرمایہ ایسا ہے جو بہت تیزی سے خود بخود ختم ہو رہا ہے، اگر ختم ہونے سے پہلے پہلے اس سے قیمتی چیز، یعنی وہ چاروں صفات حاصل کر لیں تو نفع ہے ورنہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ جس طرح برف بیچنے والا اس کے پگھلنے سے پہلے پہلے اسے فروخت کر لے اور اس کی اچھی قیمت حاصل کر لے تو نفع ہے، ورنہ برف اس کا انتظار نہیں کرے گی بلکہ کچھ دیر کے بعد خود بخود تحلیل ہو جائے گی، پھر اس کے خسارے میں کیا شک ہے؟

② اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ : حقیقت یہ ہے کہ انسان کا خسارے سے بچنا بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ خسارہ رأس المال ضائع کرنے کا نام ہے اور انسان کا رأس المال عمر ہے اور ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی عمر ضائع نہ کر رہا ہو، کیونکہ آدمی پر جو گھڑی گزرتی ہے اگر اللہ کی نافرمانی میں گزری تو خسارے میں کوئی شک ہی نہیں، اگر مباح اور جائز کاموں میں گزری پھر بھی خسارہ ہے، کیونکہ اس گھڑی سے آدمی آخرت کے لیے کچھ حاصل نہ کر سکا اور اگر اطاعت اور نیکی میں گزری تو یہی نیکی اس سے بہتر طریقے پر یا اس سے بہتر کوئی اور نیکی بھی کر سکتا تھا، کیونکہ نیکی کے درجات کی کوئی انتہا نہیں اور اللہ کے جلال و قہر کے مراتب کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ اب جس قدر کسی شخص کو ان درجات کا علم ہوگا، ان پر عمل کرے گا اور دوسروں کو ان کی تعلیم دے گا اور خود صبر اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرے گا، تو اسی قدر خسارہ کم ہوتا جائے گا، ورنہ اعلیٰ درجے کو چھوڑ کر ادنیٰ درجے پر اکتفا تو ایک قسم کا خسارہ ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کسی نہ کسی قسم کے خسارے سے ضرور ہی دو چار رہتا ہے۔ (خلاصہ از رازی)

بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی ﴿۳﴾

③ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بعض لوگوں نے اس سورت سے ثابت کیا ہے کہ اعمال ایمان سے الگ ہیں، اس میں داخل نہیں ہیں، وہ نہ ہوں تب بھی ایمان کامل ہے، کیونکہ دونوں کو عطف کے ساتھ الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں، بلکہ ایمان دل، زبان اور ارکان تینوں کے اعمال کا نام ہے۔ اگر عطف کی وجہ سے یہ دونوں الگ الگ ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ حق کی وصیت عملِ صالح میں شامل نہیں، بلکہ عملِ صالح سے الگ کوئی چیز ہے۔ اسی طرح صبر کی وصیت حق کی وصیت اور عملِ صالح دونوں سے الگ کوئی چیز ہے، جب کہ یہ تینوں باتیں ہی درست نہیں۔ حق یہ ہے کہ ایمان کے بعد عملِ صالح کو الگ اس لیے ذکر کیا کہ ایمان کے اس جز کو کوئی شخص معمولی سمجھ کر اس سے بے اعتنائی نہ کر بیٹھے اور عملِ صالح میں سے حق کی وصیت اور صبر کی وصیت کو الگ اس لیے ذکر فرمایا کہ کوئی شخص اپنی ذات کی حد تک عملِ صالح کر کے یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں اب خسارے سے محفوظ ہوں۔ نہیں، بلکہ اسے یہ علم و عمل اور اس پر صبر دوسروں کو بھی سکھانا ہوگا۔

④ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ: خسارے سے بچنے کے لیے عمل سے خالی ایمان کافی نہیں اور نہ صرف خود عمل کر لینا کافی ہے، بلکہ ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید کرنا بھی ضروری ہے۔ حق سے مراد وہ ہدایت ہے جو وحی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، جس میں قرآن و حدیث دونوں شامل ہیں۔ پھر ان تینوں چیزوں یعنی حق پر ایمان لانے، اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں بے شمار مصائب و تکالیف پیش آ سکتی ہیں، ان پر خود صبر کرنا ہوگا اور تمام مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کریں۔ یہاں "تَوَاصَوْا" (ایک دوسرے کو وصیت کریں) فرمایا ہے، "أَوْصَوْا" (وصیت کریں) نہیں فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ سب مسلمان ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں۔ چند آدمیوں کے ادا کرنے سے یہ فرض ادا نہیں ہوتا۔

⑤ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ: صبر کا معنی باندھنا اور روکنا ہے۔ یہ تین قسم کا ہے: ① حق پر صبر اور اس کی مسلسل پابندی، مثلاً توحید، اتباعِ سنت اور نماز روزہ پر پابند رہنا۔ ② برائی سے صبر، مثلاً شرک، زنا، قتلِ ناحق اور جھوٹ وغیرہ سے صبر۔ ③ مصیبت پر صبر اور ہر قسم کے جزع فزع سے پرہیز۔

سورۃ الھمزۃ ۱۰۴ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — آیاتھا ۹ رکوعھا ۱

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بڑی ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے ① وہ جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا ②

آیت 1 وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ: "هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ" "هَمَزَ يَهْمُزُ هَمْزًا" (ن،ض) اور "لَمَزَ يَلْمُزُ لَمْزًا" (ن،ض) سے مبالغے کے صیغے ہیں، دونوں کے معنی آپس میں اس قدر ملتے ہیں کہ بعض نے انھیں ہم معنی قرار دیا ہے اور بعض نے فرق کیا ہے۔ دونوں کے مفہوم میں "اشارہ بازی، طعن اور عیب لگانا" شامل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ﴾ [ القلم : ۱۰، ۱۱ ] "ہر بہت قسمیں کھانے والے حقیر کی اطاعت نہ کر۔ جو بہت طعنہ مارنے والا (یا عیب لگانے والا)، چغلی میں بہت دوڑ دھوپ کرنے والا ہے۔" اور فرمایا: ﴿وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ [ الحجرات : ۱۱ ] "اور تم آپس میں عیب نہ لگاؤ۔"

آیت 2 ① الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ: یعنی لوگوں کی عیب جوئی، ان پر طعنہ زنی اور ان کی تحقیر کا اصل باعث اس کی مال جمع کرنے کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور شدید بخل ہے۔ اس بخل نے چونکہ اس میں فراخ دلی یا ہمدردی وغیرہ کی کوئی خوبی باقی نہیں چھوڑی، اس لیے وہ اپنی خست و کمینگی پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر صاحب خیر پر طعن کرتا اور اس کی عیب جوئی کرتا ہے، تاکہ کوئی اس کے بخل و حرص کی مذمت کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے۔ منافقین بھی یہی کام کرتے تھے، فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ﴾ [ التوبۃ : ۷۹ ] "یہ وہ لوگ ہیں جو خوشی سے صدقہ کرنے والے مومنوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور ان پر بھی جن کے پاس اپنی محنت کی کمائی کے علاوہ کچھ نہیں، سو یہ ان سے مذاق کرتے ہیں۔" اس کے علاوہ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کے لیے دوسروں کی بدگوئی اور عیب جوئی کرتا ہے اور اپنے آپ کو صاف ستھرا ظاہر کرتا ہے، تاکہ لوگ ہر سودے اور ہر کام میں کسی اور سے معاملہ کرنے کے بجائے صرف اس سے معاملہ کریں اور اس کا مال بڑھتا رہے۔ اگر "هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ" کا واضح نقشہ دیکھنا ہو تو جمہوری انتخابات میں کھڑے ہونے والے امیدواروں کے بیانات پڑھ لیں کہ وہ سیٹ کے حصول کے لیے اپنے حریفوں پر کس قدر طعن اور بہتان تراشی کرتے ہیں۔

② یعنی مال جو انسان کی ضرورت پوری کرنے اور آسائش حاصل کرنے کا ذریعہ تھا، وہ اس کے لیے اصل مطلوب بن گیا۔ اب وہ اسی کو جمع کرنے اور گن گن کر رکھنے کی دُھن میں لگا ہوا ہے۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۟ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۟ؗۖ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۟ؕ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۟ۙ

وہ گمان کرتا ہے کہ اس کے مال نے اسے ہمیشہ رہنے والا بنا دیا ③ ہرگز نہیں، یقیناً وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا ④ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ حطمہ کیا ہے؟ ⑤ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے ⑥

**آیت 3** **يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ:** "خَلَدَ يَخْلُدُ خُلُوْدًا" (ن) ہمیشہ رہنا اور "أَخْلَدَ يُخْلِدُ إِخْلَادًا" (افعال) ہمیشہ رہنے والا بنا دینا۔ "اَخْلَدَهٗ" ماضی کا صیغہ ہے، اس لیے آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے: "وہ گمان کرتا ہے کہ اس کے مال نے اسے ہمیشہ رہنے والا بنا دیا۔" اس کا طرز عمل بتاتا ہے کہ وہ مال کو موت سے بچانے والا سمجھتا ہے، کیونکہ اتنی عمر ہونے کے باوجود وہ مال جمع ہی کرتا جاتا ہے، نہ اللہ کا حق ادا کرتا ہے نہ بندوں کا، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ جمع کیا ہوا مال اسے مرنے نہیں دے گا بلکہ ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ورنہ ساٹھ ستر برس کی عمر میں اپنے لیے کروڑوں اربوں روپے جمع کرنے اور سیکڑوں برس باقی رہنے والی پختہ اور مضبوط عمارتیں بنانے کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ یہ مال اور عمارتیں اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا: ﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ﴾ [الشعراء: ۱۲۸، ۱۲۹] "کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک یادگار بناتے ہو؟ اس حال میں کہ لاحاصل کام کرتے ہو۔ اور بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہو، شاید کہ تم ہمیشہ رہو گے۔"

**آیت 4** **كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ:** "لَيُنْۢبَذَنَّ" "نَبَذَ يَنْبِذُ نَبْذًا" (ض) (کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پھینک دینا) سے واحد مذکر غائب مضارع مجہول بانون تاکید ثقیلہ ہے جو قسم کا مفہوم ادا کرتا ہے، یعنی یہ خیال ہرگز درست نہیں، بلکہ قسمیہ بات یہ ہے کہ اسے ہر حال میں اس دنیا سے جانا ہے۔ پھر اسے اس کے بُرے اعمال کی پاداش میں "حطمہ" میں پھینک دیا جائے گا۔ پھینکنے کے لفظ سے اس کی تذلیل و تحقیر نمایاں ہو رہی ہے۔

**آیت 5** **وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ:** یہ سوال اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی تم جان ہی نہیں سکتے کہ وہ کس قدر خوف ناک چیز ہے۔ "اَلْحُطَمَةُ" "حَطَمَ يَحْطِمُ" (ض) سے مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بہت ہی زیادہ توڑ پھوڑ دینے والی۔ اس میں جو چیز ڈالی جائے گی اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ رَأَيْتُ جَهَنَّمَ يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا» [بخاري، العمل في الصلاة، باب إذا انفلتت الدابة في الصلاة: ۱۲۱۲] "یقیناً میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کے اپنے حصے ایک دوسرے کو توڑ رہے تھے۔"

**آیت 6** **نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ:** "نَارُ اللّٰهِ" (اللہ کی آگ) اور "اَلْمُوْقَدَةُ" (بھڑکائی ہوئی) کہنے میں اس آگ کی جو ہولناکی بیان ہوئی ہے وہ کسی اور لفظ میں بیان ہو ہی نہیں سکتی۔

الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝۸ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹

وہ جو دلوں پر جھانکتی ہے ⑦ یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی ہے ⑧ لمبے لمبے ستونوں میں ⑨

**آیت 7** الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ: "**تَطَّلِعُ**" "اِطَّلَعَ يَطَّلِعُ اِطِّلَاعًا" (افتعال) جھانکنا۔ "**الْاَفْـِٕدَةِ**" "فُؤَادٌ" کی جمع ہے، دل۔ ''جو دلوں پر جھانکتی ہے'' یعنی وہ صاحبِ شعور ہے، دلوں میں جو کفر و نفاق اور بخل و کمینگی ہے یا ایمان اور سخاوت وکرم ہے سب دیکھ لیتی ہے اور جلاتی اسی کو ہے جو جلانے کے قابل ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی آگ بھی اگرچہ ہر چیز کو جلا ڈالتی ہے، مگر یہ آگ دل تک پہنچنے سے پہلے ہی آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے، جبکہ جہنم کی آگ جسم کو جلاتے ہوئے دل تک پہنچ جائے گی مگر آدمی مرے گا نہیں۔ دلوں تک آگ اس لیے پہنچے گی کہ دل ہی گندے عقائد، خبیث نیتوں اور کفر و نفاق کا مرکز ہے۔

**آیت 9،8** اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ......: "أَوْصَدَ يُوْصِدُ إِيْصَادًا" (افعال) "اَلْبَابَ" دروازہ بند کر دینا۔ "**مُّؤْصَدَةٌ**" اسم مفعول ہے، بند کی ہوئی۔ "**عَمَدٍ**" "عَمُوْدٌ" کی جمع ہے، یعنی انھیں جہنم میں لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ باندھ کر چاروں طرف سے بند کر دیا جائے گا، حتیٰ کہ کوئی دروازہ یا کھڑکی بلکہ کوئی شگاف یا درز بھی باقی نہیں چھوڑی جائے گی۔ [ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا ] دوسرا معنی یہ ہے کہ اس آگ کے شعلے لمبے لمبے ستونوں کی شکل میں ہوں گے۔

سورۃ الفیل ۱۰۵ آیاتہا ۵ رکوعاتہا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔
کیا تو نے نہیں دیکھا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کس طرح کیا ①

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ مکہ پر اپنا احسان ذکر فرمایا ہے کہ اس نے کس معجزانہ طریقے سے بیت اللہ کی حفاظت فرمائی اور اس کو گرانے کے لیے آنے والوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس بادشاہ کو برباد نہ کرتا تو اہلِ مکہ جس امن و چین اور آزادی کے ساتھ بیٹھے ہیں یہ امن و چین انھیں کہاں نصیب ہوتا؟ سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس واقعہ کے پچاس یا پچپن روز بعد پیدا ہوئے۔

آیت 1 ① اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ ...... : "اَلَمۡ تَرَ" کا لفظی معنی ہے ''کیا تو نے نہیں دیکھا؟'' مگر مجاہد رحمہ اللہ (جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں) نے اس کا معنی کیا ہے: "أَلَمْ تَعْلَمْ" ''کیا تجھے معلوم نہیں؟'' [ بخاري، التفسیر، باب سورة الفیل، قبل ح : ٤٩٦٤ ] جب قرآن اترا اس وقت یہ واقعہ اتنا معروف تھا گویا لوگوں کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہو۔ بعض لوگوں نے اس لفظ سے یہ کشید کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی ﷺ نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ کہ آپ عالم الغیب تھے۔ درحقیقت یہ کہنا کلام عرب اور اسلوب قرآن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَوَ لَمۡ یَرَ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰہُ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ فَاِذَا ہُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ﴾ [ یٰس : ۷۷ ] ''اور کیا انسان نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے پیدا کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑالو ہے۔'' اب کیا کسی انسان نے اپنے آپ کو نطفہ سے پیدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟'' "أَلَمْ تَعْلَمْ" (کیا تو نے نہیں جانا) کے بجائے "اَلَمۡ تَرَ" (کیا تو نے نہیں دیکھا) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اتنا یقینی واقعہ ہے کہ سمجھو تم نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے۔

② ''ہاتھی والوں'' سے مراد یمن کا ایک نصرانی حاکم ابرہہ اور اس کا لشکر ہے۔ ابرہہ نے ایک عظیم الشان گرجا بنا کر یہ چاہا کہ لوگ کعبہ کی طرح اس کی زیارت کے لیے آیا کریں۔ جب وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا تو وہ ایک بہت بڑا لشکر جس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے، اپنے ہمراہ لے کر بیت اللہ کو ڈھانے کی نیت سے مکہ پہنچا۔ جب مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان اس وادی میں پہنچا جس کا نام بعد میں وادی مُحَسِّر پڑا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے گروہ در گروہ پرندے نمودار ہوئے، جن کے پنجوں اور چونچوں میں کنکر تھے، انھوں نے اس لشکر پر وہ کنکریاں پھینکیں جن سے ابرہہ اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا۔ یہ سیرت اور تاریخ میں مذکور واقعے کا خلاصہ ہے۔ (دیکھیے سیرت ابن ہشام اور تفسیر ابن کثیر)

صحیح اسانید کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے بھی اس واقعے کا مختصر ذکر موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: (( إِنَّ اللّٰهَ حَبَسَ

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵ ع

کیا اس نے ان کی تدبیر کو بے کار نہیں کر دیا؟ ۝۲ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دیے ۝۳ جو ان پر کھنگر (پکی ہوئی مٹی) کی پتھریاں پھینکتے تھے ۝۴ تو اس نے انھیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا ۝۵

عَنْ مَكَّةَ الْفِيلَ ، وَسَلَّطَ عَلَيْهَا رَسُوْلَهُ وَالْمُؤْمِنِيْنَ ، فَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِيْ ، وَ إِنَّهَا أُحِلَّتْ لِيْ سَاعَةً مِّنْ نَهَارٍ ، وَ إِنَّهَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِيْ ‌» [ بخاري، اللقطة، باب كيف تعرّف لقطة أهل مكة ؟ : ۲۴۳۴ ] ''اللہ تعالیٰ نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا اور اس پر اپنے رسول اور ایمان والوں کو غلبہ عطا فرما دیا، تو یہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور میرے لیے بھی دن کی ایک گھڑی کے لیے حلال ہوا ہے۔ اب میرے بعد کسی کے لیے (اس میں لڑنا) حلال نہیں ہوگا۔'' دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کے زمانے میں نکلے، جب اس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے مکہ میں اترا جاتا تھا تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی، لوگوں نے (اسے اٹھانے کے لیے) کہا: «‌حَلْ حَلْ» لیکن وہ بیٹھی رہی۔ لوگوں نے کہا: ''قصواء اَڑ گئی، قصواء اَڑ گئی۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: «‌مَا خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ، وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ ، وَلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيْلِ ‌» [بخاري، الشروط، باب الشروط في الجهاد : ۲۷۳۱، ۲۷۳۲] ''قصواء اَڑی نہیں اور نہ یہ اس کی عادت ہے، اسے تو ہاتھیوں کو روکنے والے نے روک دیا ہے۔'' ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھی والے جب مکہ پر حملے کے لیے آئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں روک دیا تھا۔

**آیت 2** اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ: "تَضْلِيْلٍ" کا لفظی معنی گمراہ کرنا ہے، یعنی ان کی تدبیر اس طرف نہیں جانے دی جس طرف وہ لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی تدبیر سیدھی نہیں پڑنے دی۔

**آیت 2** وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ ...... : "اَبَابِيْلَ" عام طور پر ایک خاص قسم کی چڑیوں کو ''ابابیل'' کہا جاتا ہے، مگر یہ درست نہیں۔ "اَبَابِيْلَ" ان گھوڑوں یا پرندوں کو کہا جاتا ہے جو گروہ در گروہ اور جھنڈ کے جھنڈ آئیں۔ یہ لفظ جمع ہی استعمال ہوتا ہے، بعض نے اس کی واحد "إِبَّالَةٌ" بیان کی ہے۔

**آیت 4** تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ: "سِجِّيْلٍ" کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «‌هِيَ سَنْكِ وَ كِلْ» [ بخاري، التفسير، باب سورة : ﴿ألم تر﴾، قبل ح : ۴۹۶۴ ] ''اس سے مراد سنگ و گل ہے۔'' یعنی پکی ہوئی مٹی جسے کھنگر کہا جاتا ہے۔ لاوا اگلنے والے پہاڑوں کے ارد گرد اس قسم کے جلے ہوئے سخت سنگریزے عام ملتے ہیں۔

**آیت 5** ① فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ: "عَصْفٌ" اناج کے دانوں سے جو چھلکا اترتا ہے، بھوسا، توڑی۔ "مَّاْكُوْلٍ" "أَكَلَ يَأْكُلُ أَكْلًا" (ن) سے اسم مفعول ہے، کھایا ہوا، کھائے ہوئے بھس سے مراد جانور کی لید ہے، کیونکہ جانور بھس کھا کر لید کرتا ہے اور پھر وہ خشک ہو کر ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ سنگریزوں کے عذاب سے ان کے اعضا کے بکھر جانے کو اس کے

سورۃ قریش ۱۰۶ مکیۃ ۲۹ ﴿بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ آیاتھا ۴ رکوعھا ۱

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قریش کے دل میں محبت ڈالنے کی وجہ سے ① ان کے دل میں سردی اور گرمی کے سفر کی محبت ڈالنے کی وجہ سے ② تو ان پر لازم ہے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں ③ وہ جس نے انھیں بھوک سے (بچا کر) کھانا دیا اور خوف سے (بچا کر) امن دیا ④

ساتھ تشبیہ دی ہے۔ (طبری) اللہ تعالیٰ الفاظ کے استعمال میں اعلیٰ درجے کی شائستگی اختیار فرماتے ہیں، اس مفہوم کو ''لید'' کے بجائے ''کھائے ہوئے بُھس'' کے الفاظ میں ادا کیا ہے، اس سے ان کی زبوں حالی بھی نمایاں ہو رہی ہے۔ (قاسمی بحوالہ شہاب) یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ جانوروں کے کھانے کے بعد جو بُھوسا بچ جاتا ہے اسے وہ پاؤں میں روند دیتے ہیں اور وہ ادھر اُدھر بکھر جاتا ہے، وہ اس بُھوسے کی طرح ہو گئے۔

## سورۃ القریش

آیت 1 تا 4 ① **لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ** ...... : ''أَلِفَ يَأْلَفُ أَلْفًا'' (س) ''ہُ'' کسی سے مانوس ہونا، اس سے محبت کرنا۔ ''آلَفَ يُؤْلِفُ إِيلَافًا'' (افعال) کسی کو کسی چیز سے مانوس کر دینا، اس کے دل میں اس کی محبت ڈال دینا۔ ''**قُرَیۡشٍ**'' ''قَرْشٌ'' کی تصغیر ہے۔ ''قَرَشَ يَقْرِشُ قَرْشًا'' (ض، ن) جمع کرنا۔ قریش مشہور قبیلہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے۔ یہ نام ان کے حرم میں جمع ہونے کی وجہ سے رکھا گیا۔ یہ لوگ مختلف جگہوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ قُصی بن کلاب (رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ) کو خیال آیا کہ اپنے سارے قبیلے کو مکہ میں اکٹھا کرنا چاہیے، چنانچہ انھوں نے سارے قبیلے کو مکہ میں جمع کر دیا، اس لیے ان کا نام ''مُجَمِّعٌ'' پڑ گیا، اس طرح کعبہ کی تولیت بھی ان کے ہاتھ آ گئی۔ یا یہ نام سمندر کی ایک مچھلی کے نام پر رکھا گیا ہے جسے ''قریش'' کہتے ہیں۔ المنجد میں ہے کہ اس مچھلی کو ''كَلْبُ الْبَحْرِ'' کہا جاتا ہے، یہ سمندر کے جانوروں کو دانتوں سے اس طرح کاٹتی ہے جس طرح تلوار کاٹتی ہے، سمندر کے تمام جانور اس سے ڈرتے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے کئی احسانات ذکر فرمائے ہیں۔ قریش مکہ معظمہ میں رہتے تھے اور کعبہ کے مُتوَلّی تھے، یہ لوگ سال میں دو تجارتی سفر کرتے تھے، گرمی کے موسم میں شام کی طرف، کیونکہ وہ سرد علاقہ ہے اور سردی کے موسم میں یمن کی طرف، کیونکہ وہ گرم علاقہ ہے۔ پہلا احسان تو یہ کہ ان کے دل میں سفر کی محبت ڈال دی، نہ انھیں سردی کے سفر میں مشقت محسوس ہوتی ہے نہ گرمی میں اور سفر ہی دنیا میں وسیلۂ ظفر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو سفر سے مانوس نہ کرتا تو وہ

بھی اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے اور سفر سے جو مال و دولت، تجربہ و علم اور دنیا بھر کے لوگوں اور علاقوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے وہ کبھی حاصل نہ ہوتی۔ سفر سے مانوس ہونے کی یہی نعمت قریش کو آگے چل کر ہجرت کے سفر میں کام آئی، پھر کفار کے ساتھ لڑائی میں اور اس کے بعد روم و شام، عراق و فارس، ہند و سندھ، مصر و افریقہ بلکہ مشرق و مغرب کی فتوحات میں کام آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم قوم کے دنیا پر غالب آنے اور غالب رہنے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ سفر سے نہ گھبرائیں اور جب نکلنے کا موقع ہو زمین ہی سے نہ چمٹ جائیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کافر اقوام ہی بری، بحری اور فضائی سفروں کی اجارہ دار ہیں، مسلمان اکثر و بیشتر یہ سبق بھول چکے ہیں۔

دوسرا احسان یہ کہ اس وقت تمام عرب میں سخت بدامنی تھی، کسی کو خبر نہ تھی کہ کب اس پر حملہ ہو جائے اور اسے قتل کر دیا جائے، یا اٹھا لیا جائے یا مال لوٹ لیا جائے اور عورتیں اور بچے غلام بنا لیے جائیں۔ ایسے حالات میں صرف اہلِ مکہ ہی کو یہ امن حاصل تھا کہ کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھتا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ [العنكبوت : ٦٧] ”اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک امن والا حرم بنا دیا ہے، جبکہ لوگ ان کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔“ تیسرا احسان یہ کہ حرم کے باشندے ہونے کی وجہ سے تجارتی سفروں میں کوئی نہ ان کا قافلہ لوٹتا، نہ ان سے وہ ٹیکس لیے جاتے جو ہر قبیلہ اور ہر قوم اپنے علاقے سے گزرنے والوں سے لیتی تھی اور نہ انھیں کہیں جانے سے روکا جاتا تھا۔ چوتھا یہ کہ تمام دنیا کے لوگ حج و عمرہ کے لیے مکہ میں آتے اور دنیا بھر کا سامانِ تجارت یہاں پہنچتا۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے پھل ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے نتیجے میں یہاں پہنچتے، فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا ﴾ [القصص : ٥٧] ”اور کیا ہم نے انھیں ایسے امن والے حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں، یہ ہماری طرف سے رزق ہے۔“

ان تجارتی سفروں اور مکہ کی تجارت کے مالک ہونے کی وجہ سے قریش نہایت مال دار تھے اور حرم کی برکت سے امن و امان سے بھی بہرہ ور تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام نعمتیں اللہ کے گھر کی برکت سے تھیں اور صرف اور صرف رب تعالیٰ کا عطیہ تھیں، پھر جب یہ تمام نعمتیں اس گھر کے مالک نے دی ہیں تو تم اس اکیلے کی عبادت کیوں نہیں کرتے اور کیوں دوسروں کو اس کا شریک بنا کر ان کے آگے سجدے کرتے، ان کے آستانوں پر نذریں دیتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہو؟

② ”لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ“ (قریش کے دل میں محبت ڈالنے کی وجہ سے) ترکیب کے اعتبار سے کیا ہونا چاہیے؟ یہ جار مجرور کس کے متعلق ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ ”فَلْيَعْبُدُوْا“ کے متعلق ہے، یعنی اس وجہ سے انھیں اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے۔ یہ نحو کے مشہور امام خلیل بن احمد کا قول ہے، مگر اس پر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ پھر ”فاء“ کیوں آئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں شرط محذوف ہے، جس کے جواب میں فاء آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ان دوسری بے شمار نعمتوں کی وجہ سے یہ لوگ ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے تو اس گھر کا رب ہونے ہی کی وجہ سے اس کی عبادت کریں جس گھر کی برکت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ ① فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ② وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ ③

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کو جھٹلاتا ہے ① تو یہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے ② اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا ③

سے انھیں سردی و گرمی میں سفر کرنے، دائمی امن و امان اور وافر رزق کی نعمتیں میسر ہیں۔ (زمخشری)

کسی بھی جگہ میں امن اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ہمیں بھی رزق کی فراخی اور امن جیسی نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اسی کی عبادت کرنی چاہیے، غیر اللہ کی عبادت اور شرک سے بچنا چاہیے اور شرک کے اڈوں کی تعمیر و ترقی کے بجائے توحید کے مراکز کی تعمیر و ترقی کرنی چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو رزق کی تنگی اور بدامنی و فساد کا سامنا کرنا پڑے گا، جیسا کہ کرنا پڑ رہا ہے۔

## سورۃ الماعون

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین کا اختلاف ہے، مگر دکھاوے کے لیے نماز پڑھنے والوں کے تذکرے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مدنی ہے، کیونکہ مکہ میں کسی کو دکھانے کے لیے نماز پڑھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اوپر سورت کے نام کے ساتھ معروف قول کے مطابق مکی لکھا گیا ہے۔

**آیت 1 تا 3** اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ......: "دَعَّ یَدُعُّ دَعًّا" (ن) دھکے دینا۔ "کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کو جھٹلاتا ہے۔" یہ اولاً رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے، اس کے بعد ہر شخص اس کا مخاطب ہے۔ ان آیات میں قیامت کے دن اعمال کی جزا کو جھٹلانے کی وجہ سے کسی شخص میں جو سنگ دلی اور شقاوت پیدا ہوتی ہے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے سامنے چونکہ دنیا ہی سب کچھ ہوتی ہے، اس لیے اسے کسی یتیم سے ہمدردی اور مسکین کی غم خواری پر کسی فائدے کی توقع ہوتی ہے نہ ان کے حقوق غصب کرنے پر کسی باز پرس اور سزا کا خوف ہوتا ہے، لہٰذا وہ ان بے بس لوگوں کے معاملے میں نہایت بے رحم ہوتا ہے۔ یتیم اپنے باپ کی وراثت مانگے یا اپنا کوئی اور حق، وہ اسے دھکے مار کر باہر نکال دیتا ہے۔ مسکین پر رحم کرتے ہوئے اسے خود کھانا کھلانا تو دور کی بات ہے وہ کسی دوسرے کو اس کے لیے کہنے پر بھی تیار نہیں ہوتا۔ یتیموں اور مسکینوں سے ہمدردی صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو جزا و سزا پر ایمان رکھتا ہو۔

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۝۴ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۝۵ الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ۝۶

پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ④ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں ⑤ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں ⑥

**آیت 4 تا 6** فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ...... : "سَاهُوۡنَ" "سَهَا يَسْهُوْ سَهْوًا" (ن) (غافل ہونا) سے اسم فاعل "سَاهٍ" (بروزن قَاضٍ) کی جمع ہے۔ "يُرَآءُوۡنَ" "رَاءٰى يُرَاءِيْ مُرَاءَاةً وَرِيَاءً" (مفاعلہ) سے فعل مضارع جمع مذکر غائب ہے، دکھاوا کرنا۔ آیات کی باہمی مناسبت یہ ہے کہ پہلی آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو کھلم کھلا قیامت کو جھٹلاتے اور اس کا انکار کرتے تھے اور ان آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر دل سے قیامت کو نہیں مانتے۔ یہ منافقین تھے جو آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے نماز پڑھنا نہیں چاہتے تھے، مگر اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کے لیے انھیں پڑھنا پڑتی تھی۔ حقیقت میں وہ اپنی نماز سے غافل تھے، یہ غفلت کئی طرح سے تھی: ① طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ ان نمازیوں سے مراد منافقین ہیں جو صرف دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے تھے، یعنی لوگوں کے سامنے ہوتے تو پڑھ لیتے ورنہ چھوڑ ہی دیتے۔ ② اور پڑھتے بھی تو وقت ضائع کرکے پڑھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى إِذَا كَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَهَا أَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا إِلَّا قَلِيْلًا » [ مسلم، المساجد و مواضع الصلاۃ، باب استحباب التبکیر بالعصر : ٦٢٢ ] "یہ نماز منافق کی نماز ہے کہ وہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگے مارتا ہے، اس میں اللہ کو یاد نہیں کرتا مگر تھوڑا۔" ③ ان کا نماز ادا کرنے کا انداز بتاتا تھا کہ انھیں اپنی نماز سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی نماز کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [ النساء : ١٤٢ ] "بے شک منافق لوگ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ وہ (اللہ) ان کو دھوکا دینے والا ہے اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر بہت کم۔" ④ نماز میں بھول تو مخلص مسلمان سے بھی ہو سکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو گئی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا تھا، مگر نماز ہی سے بھول ہو جائے، یہ نفاق ہے۔ اس لیے "هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ" (ان سے ان کی نماز میں بھول ہو جاتی ہے) نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: ﴿ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ یعنی وہ اپنی نماز ہی سے بھولے ہوئے ہیں، انھیں خیال ہی نہیں کہ ہمیں نماز پڑھنی ہے۔ پڑھتے ہیں تو یاد ہی نہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، نہ خشوع ہے نہ خضوع، ڈاڑھی اور کپڑوں سے کھیل رہے ہیں، جمائیاں لے رہے ہیں، ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں، غرض ساری نماز پڑھ جاتے ہیں مگر کچھ پتا نہیں کہ کیا پڑھا؟

# وَ يَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۝۷

## اور عام برتنے کی چیزیں روکتے ہیں ۝۷

آیت 7 ﴿ وَ يَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ﴾: آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ تو ان کی نمازوں ہی سے ظاہر ہے، لوگوں سے بھی ان کا معاملہ درست نہیں۔ وہ معمولی چیز کے ساتھ بھی کسی کو فائدہ پہنچانے پر تیار نہیں ہیں، جب اس کے عوض انھیں دنیا میں کچھ ملنے کی توقع نہ ہو۔ "اَلۡمَاعُوۡنَ" "مَعْنٌ" سے ہے، جس کا معنی "شَيْءٌ قَلِيْلٌ" (تھوڑی کی چیز) ہے۔ "تفسیر الوسیط للطنطاوی" میں ہے: "اَلۡمَاعُوۡنَ" کی اصل "مَعُوْنَةٌ" ہے جس کا مادہ "عَوْنٌ" (مدد) ہے، اس کا "الف" "تاء" کے بدلے میں لایا گیا ہے جو آخر سے حذف کر دی گئی ہے۔ گویا "اَلۡمَاعُوۡنَ" سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عام ضرورتوں میں مدد لی جاتی ہے۔" (الوسیط) علی رضی اللہ عنہ اور بعض مفسرین نے اس سے مراد زکوٰۃ لی ہے، کیونکہ وہ کل مال کے مقابلے میں بالکل قلیل یعنی اڑھائی فیصد ہوتی ہے، یعنی یہ لوگ اتنا معمولی صدقہ کرنے پر بھی تیار نہیں۔ ابو ہریرہ، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور بہت سے مفسرین نے اس سے گھروں میں برتنے کی وہ چیزیں مراد لی ہیں جو ہر وقت ہر گھر میں نہیں ہوتیں بلکہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے سے مانگ لی جاتی ہیں، مثلاً سوئی، ہانڈی، کلہاڑی، پیالہ، آگ اور پانی وغیرہ اور عام طور پر "ماعون" کا اطلاق انھی چیزوں پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ معمولی سے معمولی چیز جو استعمال کے بعد انھیں واپس مل جائے گی، وہ بھی کسی کو دینے پر تیار نہیں، کیونکہ آخرت میں اس کے ثواب کی انھیں امید نہیں اور دنیا میں انھیں اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آخرت کو جھٹلانے والے ایسے لوگوں کے لیے تباہی اور بربادی کی وعید ذکر فرمائی ہے۔

سورۃ الکوثر ۱۰۸ مکیۃ ۱۵ ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ آیاتھا ۳ رکوعھا ۱

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بلاشبہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی ﴿۱﴾

مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے دعوتِ اسلام دینے کے بعد آپ پر بہت مشکل حالات گزرے، سب لوگ دشمن بن گئے، ہر طرف مخالفت، مالی پریشانیاں الگ، ایمان لانے والے بالکل تھوڑے سے، مزید یہ کہ نرینہ اولاد جو ہوئی وہ فوت ہو گئی، اس پر دشمن کا خوش ہونا اور آپ کا غمگین اور پریشان ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح سورۂ ضحیٰ میں آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّكَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ؕ﴿۴﴾ وَ لَسَوۡفَ یُعۡطِیۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰی﴾ [ الضحٰی : ۴، ۵ ] (اور یقیناً پیچھے آنے والی حالت تیرے لیے پہلی سے بہتر ہے اور عنقریب تیرا رب تجھے ضرور اتنا عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا) اور سورۂ انشراح میں فرمایا: ﴿وَ رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ﴾ [ الانشراح : ۴ ] (اور ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر دیا) اسی طرح اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا تذکرہ فرما کر آپ کو تسلی دی ہے۔

آیت 1 ﴿۱﴾ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ : "الۡكَوۡثَرَ" "كَثْرَةٌ" سے "فَوْعَلٌ" کا وزن ہے جو مبالغے کا معنی دے رہا ہے، بے انتہا کثرت۔ یعنی دشمن تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کے پاس کچھ نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپ کو بے انتہا دیا ہے۔ "الۡكَوۡثَرَ" میں وہ ساری خیر کثیر شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی، مثلاً اسلام، نبوت، اخلاقِ حسنہ، بہترین تابع دار امت، جنت اور دوسری نعمتیں جو شمار نہیں ہو سکتیں۔ لغت کے لحاظ سے "الۡكَوۡثَرَ" کا معنی یہی ہے، البتہ بہت سی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ محشر میں آپ ﷺ کو جو حوض عطا کرے گا اس کا نام بھی آپ ﷺ نے کوثر بتایا۔ اس لحاظ سے یہ تفسیر مقدم ہے، مگر ترجیح کی ضرورت تب ہے جب دونوں تفسیروں میں تعارض ہو، جو یہاں ہے ہی نہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ انھوں نے "الۡكَوۡثَرَ" کے متعلق فرمایا: ''اس سے مراد وہ خیر ہے جو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی۔'' راوی کہتا ہے کہ میں نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے؟ تو سعید رحمہ اللہ نے کہا: ''جنت میں جو نہر ہے وہ بھی اس خیر میں شامل ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی۔'' [ بخاري، التفسير، سورة : ﴿ إنا أعطيناك الكوثر ﴾ : ۴۹۶۶ ]

﴿۲﴾ نہر کوثر جنت میں ہے اور حوضِ کوثر محشر کے میدان میں ہوگا، بعض اوقات اس پر بھی نہر کوثر کا لفظ آتا ہے، کیونکہ اس حوض میں بھی جنت کے دو پرنالوں سے پانی گر رہا ہوگا۔ گویا حوض کا اصل بھی جنت والی نہر کوثر ہے۔ (فتح الباری) انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: « بَيْنَمَا أَنَا أَسِيْرُ فِي الْجَنَّةِ إِذَا أَنَا بِنَهَرٍ حَافَتَاهُ قِبَابُ الدُّرِّ الْمُجَوَّفِ، قُلْتُ مَا

هٰذَا يَا جِبرِيْلُ !؟ قَالَ هٰذَا الْكَوْثَرُ الَّذِيْ أَعْطَاكَ رَبُّكَ فَإِذَا طِيْبُهُ أَوْ طِيْنُهُ مِسْكٌ أَذْفَرُ ﴾ [ بخاري، الرقاق، باب في الحوض : ٦٥٨١ ] ''میں جنت میں چلا جا رہا تھا تو اچانک ایک نہر آ گئی جس کے کنارے کھوکھلے موتیوں کے قُبے تھے۔ میں نے کہا: ''اے جبریل! یہ کیا ہے؟'' تو انھوں نے فرمایا: ''یہ کوثر ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی ہے۔'' پھر دیکھا تو اس کی خوشبو یا مٹی مہکنے والی کستوری کی طرح تھی۔''

③ حوضِ کوثر میدانِ محشر میں ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ اپنی امت کا استقبال کریں گے اور انھیں پانی پلائیں گے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ حوضِ کوثر کی روایات تیس (۳۰) سے زیادہ صحابہ سے آئی ہیں، جن میں سے بیس (۲۰) صحابہ کی احادیث صحیحین میں ہیں، باقی دوسری کتابوں میں ہیں۔ ان کی نقل صحیح ہے اور ان کے راوی مشہور ہیں۔[ دیکھیے فتح الباري، كتاب الرقاق، باب الحوض ]

④ ابو ذر رضی اللہ عنہ حوضِ کوثر میں جنت کے پرنالوں کا گرنا اور حوض کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! حوض کے برتن کیسے ہوں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:﴿ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَآنِيَتُهُ أَكْثَرُ مِنْ عَدَدِ نُجُوْمِ السَّمَاءِ وَكَوَاكِبِهَا، أَلَا فِي اللَّيْلَةِ الْمُظْلِمَةِ الْمُصْحِيَةِ، آنِيَةُ الْجَنَّةِ مَنْ شَرِبَ مِنْهَا لَمْ يَظْمَأْ آخِرَ مَا عَلَيْهِ، يَشْخَبُ فِيْهِ مِيْزَابَانِ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْ شَرِبَ مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ عَرْضُهُ مِثْلُ طُوْلِهِ مَا بَيْنَ عَمَّانَ إِلٰى أَيْلَةَ مَاؤُهُ أَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ وَ أَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ ﴾ [ مسلم، الفضائل، باب إثبات حوض نبينا ﷺ وصفاته : ٢٣٠٠ ] ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس کے برتن آسمان کے تاروں سے زیادہ ہیں، یاد رکھو! تارے بھی اس رات کے جو تاریک ہو اور بادل کے بغیر ہو۔ جنت کے برتن ایسے ہیں کہ جو ان سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا، اس وقت کے آخر تک جو اس پر گزرے گا۔ اس حوض میں جنت سے دو پرنالے گرتے ہیں، جو اس سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا، اس کا عرض اس کے طول کے برابر ہے، جتنا عمان سے ایلہ تک فاصلہ ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔''



⑤ کوثر کا ایک اور معنی بھی کیا گیا ہے، مشہور امامِ فقہ ابن جنی نے آیت: ﴿ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴾ کی مناسبت سے "الْكَوْثَرَ" کا معنی ''ذُرِّيَّةٌ كَثِيْرَةٌ'' (کثیر اولاد) کیا ہے۔ کفارِ قریش اور آپ سے دشمنی رکھنے والے کہتے تھے کہ آپ ''ابتر'' (بے اولاد) ہیں، فوت ہوگئے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہم نے آپ کو کوثر یعنی اولاد کثیر عطا فرمائی۔ مراد اولاد فاطمہ ہے، کیونکہ بیٹی کی اولاد بھی قرآن کی رو سے اولاد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ ﴾ [الأنعام : ٨٤] ''اور اس (ابراہیم) کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو (ہدایت دی)۔'' اس کے بعد کئی پیغمبروں کا نام لے کر فرمایا: ﴿ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ﴾ [الأنعام :٨٥] ''یعنی اس (ابراہیم) کی اولاد میں سے زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی ہدایت دی۔'' معلوم ہوا عیسیٰ علیہ السلام بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، حالانکہ ان کا باپ

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر ② یقیناً تیرا دشمن ہی لاولد ہے ③

بالاتفاق تھا ہی نہیں، بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بیٹی مریم کی اولاد ہیں۔ معلوم ہوا کہ آدمی کی بیٹی کی اولاد بھی اس کی اولاد ہوتی ہے۔ (قاسمی) یہ معنی یعنی اولادِ کثیر بھی "اَلْکَوْثَرَ" کے اس معنی میں شامل ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیا ہے، یعنی خیر کثیر اور اس کی "اَلْاَبْتَرُ" کے ساتھ مناسبت بھی ہے۔

**آیت 2** ① **فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ** : عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اس آیت میں نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ یہاں اصل مفہوم یہ ہے کہ نماز پڑھو تو صرف اپنے رب کے لیے اور قربانی کرو تو وہ بھی اسی کے لیے، کسی غیر کے لیے نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی سے کہا جائے، کھڑے ہو کر نماز پڑھو، تو اس سے مراد نماز پڑھنے کا حکم دینا نہیں ہوتا بلکہ مراد یہ حکم ہوتا ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھو، بیٹھ کر نہ پڑھو۔ یہی مفہوم سورۂ انعام میں بھی ادا ہوا ہے، فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الأنعام: ۱۶۲، ۱۶۳] ''کہہ دے بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔''

② اللہ تعالیٰ نے کوثر عطا فرمانے کا احسان ذکر کر کے صرف رب تعالیٰ ہی کے لیے نماز اور قربانی کا حکم دیا۔ "اَلْکَوْثَرَ" (خیر کثیر) کے لفظ میں وہ سب کچھ آ گیا جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا، کوئی چیز ایسی نہیں جو اس میں شامل نہ ہو۔ ''فَصَلِّ'' کی فاء کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی ہے تو اس کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی ہر عبادت (بدنی ہو یا مالی) صرف اسی کے لیے ہونی چاہیے، کسی غیر کے لیے نہیں۔ یہ انتہائی ناشکری ہے کہ ہر نعمت اللہ نے دی ہو اور بدنی یا مالی بندگی کسی اور کی ہو۔

③ بظاہر کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی، پس تو ہمارے ہی لیے نماز پڑھ اور قربانی کر، مگر فرمایا: ''تو اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔'' اسے "اِلْتِفَاتٌ مِّنَ الْمُتَكَلِّمِ إِلَى الْغَائِبِ" کہتے ہیں۔ مقصد توجہ دلانا ہے کہ رب ہونے کی وجہ سے ہمارا حق ہے کہ ہماری ہی عبادت کرو، کسی اور کی نہیں۔

④ بعض روایات میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "وَانْحَرْ" کا معنی نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا ہے، مگر وہ روایات صحیح نہیں۔ البتہ سینے پر ہاتھ باندھنے کا مسئلہ دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

**آیت 3** ① **اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ** : "شَانِئٌ" "شَنِئَهٗ شَنْئًا" (س، ف) (بروزن فَلْسٌ) "وَشَنَئَانًا" (نون کے فتحہ اور سکون کے ساتھ) سے اسم فاعل ہے، اس کا معنی ''دشمنی رکھنے والا'' ہے۔ "اَلْاَبْتَرُ" جس کی اولاد نہ ہو۔ اصل میں یہ "بَتَرَهٗ" سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے "قَطَعَهٗ" اس نے اسے کاٹ دیا۔ "حِمَارٌ أَبْتَرُ" وہ گدھا جس کی دُم کٹی ہوئی ہو۔ دُم کٹے سانپ کو بھی ''ابتر'' کہتے ہیں۔
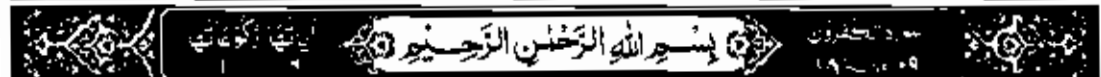
سورۃ الکافرون ۱۰۹ — بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — آیاتہا ۶ رکوعہا ۱

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کہہ دے اے کافرو! ① میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو ② اور نہ تم اس کی عبادت کرنے

② "ھُوَ" ضمیر لانے کے علاوہ "اَلْاَبْتَرُ" پر الف لام لانے سے کلام میں مزید حصر پیدا ہو گیا، یعنی دشمن ہی لاولد ہے، آپ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دشمن کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) اکیلے ہیں، ان کی اولاد نہیں، مر گئے تو کوئی نام لینے والا نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، آپ کے نام لینے والے بے شمار ہوں گے اور قیامت تک رہیں گے۔ کلمہ پڑھتے وقت، اذان میں، اقامت میں، نماز میں، درود میں، غرض آپ کا ذکر ہمیشہ رہے گا۔ آپ کی نسبت پر لوگ فخر کریں گے۔ اولاد بھی بہت ہوگی، مگر آپ کے دشمن کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔ اگر ان کی نسل چلی بھی تو اسے اپنے کافر باپ کی طرف منسوب ہونے پر کوئی فخر نہیں ہوگا۔

## سورۃ الکافرون

**آیت 1 تا 6** ① قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ... : طبرانی اور تفسیر ابن ابی حاتم وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایتیں آئی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ اور چند دیگر مشرکوں نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ تم ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دو، اس طرح ہم اور تم مل جل کر مکہ میں رہیں، اگر تم ایسا نہیں کرتے تو ایک سال تم ہمارے بتوں کی پوجا کر لیا کرو، دوسرے سال ہم تمھارے اللہ کی بندگی کر لیا کریں گے، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ اگرچہ اس شان نزول کی روایت کی سند میں ایک شخص ابو خلف عبداللہ ضعیف ہے، لیکن آیت: ﴿قُلۡ اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ تَاۡمُرُوۡٓنِّیۡۤ اَعۡبُدُ اَیُّہَا الۡجٰہِلُوۡنَ ﴾ [ الزمر : ۶۴ ] ( کہہ دے! پھر کیا اللہ کے غیر کے بارے میں تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں اس کی عبادت کروں اے جاہلو! ) کے مضمون سے اس شان نزول کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ قریش کی جس فرمائش کا ذکر اس شان نزول کی روایت میں ہے، آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے آپ ﷺ سے اس قسم کی فرمائش ضرور کی تھی۔ (احسن التفاسیر)

② صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے طواف کی دو رکعتوں میں سورۂ اخلاص اور سورۂ کافرون پڑھیں۔ [ مسلم، الحج، باب حجۃ النبی ﷺ : ۱۲۱۸ ] صحیح مسلم ہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دونوں سورتیں یعنی سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص فجر کی دو رکعتوں (سنتوں) میں پڑھیں۔ [ مسلم، صلاۃ المسافرین وقصرها، باب استحباب رکعتی سنۃ الفجر ... : ۷۲۶ ] رسول اللہ ﷺ تین وتر پڑھتے تو اس کی دوسری رکعت میں سورۂ کافرون پڑھا کرتے تھے۔ [ دیکھیے ترمذی، الوتر، باب ما جاء في ما يقرأ به في الوتر : ۴۶۲، وصححه الألباني ]

③ سورت کا مضمون یہ ہے کہ ساری دنیا کے کافروں کو سنا دو کہ مسلمان غیر اللہ کی عبادت کسی صورت نہیں کر سکتے، اس مسئلے پر

ع ۲۲ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں ③ اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی ④ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں ⑤ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے ⑥

سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں۔

④ تکرار کی حکمت: ① بہت سے اہلِ علم نے فرمایا کہ آیات میں تکرار تاکید کے لیے ہے کہ مسلمان کسی صورت بھی توحید کے متعلق کفار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور یہ کلام عرب اور قرآن مجید کا عام اسلوب ہے، جیسے فرمایا: ﴿ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴾ [ النبا : ٤، ٥ ] "ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے۔ پھر ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے۔" اور رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ ؓ کی موجودگی میں علی ؓ کو دوسرے نکاح کی اجازت کے متعلق فرمایا: « فَلَا آذَنُ، ثُمَّ لَا آذَنُ، ثُمَّ لَا آذَنُ » [ بخاري، النكاح، باب ذبّ الرجل عن ابنته في...... : ٥٢٣٠ ] "میں اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔" اسی طرح سورۂ رحمان اور مرسلات میں آیات کا بار بار تکرار ہے۔ یہاں تکرار کا مقصد یہ ہے کہ یہ کبھی ممکن ہی نہیں کہ میں توحید کا راستہ چھوڑ کر شرک کا راستہ اختیار کر لوں اور نہ یہ ممکن ہے کہ تم کافر رہتے ہوئے غیر اللہ کی عبادت کو یکسر ترک کر کے ایک اللہ کی عبادت پر قانع ہو جاؤ۔ شوکانی نے تکرار تاکید کے لیے ہونے کے علاوہ دوسری توجیہات کو تکلف قرار دیا ہے۔

② بخاری ؒ نے (ابوعبیدہ سے) یہ تفسیر نقل فرمائی ہے کہ آیت: ﴿ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے کہ میں اب موجودہ وقت میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو اور آیت: ﴿ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ بھی جب تک میں زندہ ہوں کبھی اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم نے عبادت کی ہے۔ اسی طرح کفار کے متعلق فرمایا کہ نہ اب زمانۂ حال میں تم اس (اکیلے اللہ) کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ آئندہ زمانۂ استقبال میں۔ اس پر ایک سوال ہے کہ کافروں کے متعلق کیسے فرمایا کہ وہ آئندہ ایک اللہ کی عبادت نہیں کریں گے، ہو سکتا ہے آئندہ وہ مسلمان ہو جائیں اور فی الواقع بے شمار کافر مسلمان ہوئے بھی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کافر رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں، مسلمان ہو جائیں تو الگ بات ہے۔ دوسرا جواب بخاری ؒ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ آیات سن کر ان کے کفر میں اضافہ ہی ہوتا ہے، ایمان ان کی قسمت میں نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴾ [ المائدة : ٦٨ ] "اور یقیناً جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو سرکشی اور کفر میں ضرور بڑھا دے گا۔" بخاری ؒ کے الفاظ یہ ہیں: "وَقَالَ غَيْرُهُ : ﴿ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ اَلْآنَ وَلَا أُجِيْبُكُمْ فِيْمَا بَقِيَ مِنْ عُمْرِيْ ﴿ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴾ وَهُمُ الَّذِيْنَ قَالَ : ﴿ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ

رَبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴾ [ المائدة : ٦٧ ]" [ بخاري، التفسير، سورة : ﴿قل يأيها الكافرون﴾، قبل ح : ٤٩٦٧ ] مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔

④ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے کہ پہلی دو آیات میں "مَا" موصولہ ہے اور دوسری دو میں مصدریہ۔ معنی یہ ہوگا کہ میں اس چیز کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو (یعنی معبودانِ باطلہ کی) اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں کرتا ہوں (یعنی ایک اللہ کی) اور نہ میں وہ عبادت کرنے والا ہوں جو تم کرتے ہو (یعنی جس طرح تم تالیاں اور سیٹیاں بجا کر ذکر کرتے ہو اور کپڑے اتار کر ننگے ہو کر طواف کرتے ہو، میں اس طرح عبادت نہیں کرتا) اور نہ تم وہ عبادت کرنے والے ہو جو میں کرتا ہوں، یعنی صرف اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر عبادت کرو، تم ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

④ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا "لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ" جملہ فعلیہ ہے، اس کا معنی ہے کہ نہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس کی تم کرتے ہو اور "وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ" جملہ اسمیہ ہے، جس میں نفی کی تاکید زیادہ ہے، یعنی میری شان ہی نہیں اور نہ کسی وقت مجھ سے ممکن ہے کہ (رسول ہوتے ہوئے) شرک کا ارتکاب کروں۔ یعنی نہ مجھ سے یہ فعل واقع ہوا ہے اور نہ مجھ سے اس کا شرعی امکان ہے۔ "مَا عَبَدْتُّمْ" ماضی شاید اس لیے فرمایا کہ میری نبوت سے پہلے بھی تم نے جو شرک کیا اس وقت بھی وہ میرے لائق نہیں تھا، نہ میں نے اس وقت یا بعد میں کسی غیر کی پرستش کی۔ کفار کا حال دونوں جگہ جملہ اسمیہ "وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ" سے بیان فرمایا، یعنی تم میں استعداد ہی نہیں اور نہ تم سے ممکن ہے کہ تم بلا شریک غیرے اللہ واحد کی پرستش کرو۔

⑤ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ: اس کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت آیاتِ جہاد سے منسوخ ہے، مگر یہ درست نہیں۔ اب بھی کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [ البقرة : ٢٥٦ ] ''دین میں زبردستی نہیں۔'' اگر وہ کفر پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو جزیہ ادا کر کے کفر پر رہ سکتے ہیں، ہاں فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔

اس آیت سے ان لوگوں کے نظریے کی تردید ہوتی ہے جو اسلام، موجودہ نصرانیت، یہودیت، ہندو ازم اور تمام مذاہب کو ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر قرار دے کر سب کو درست قرار دیتے ہیں۔

⑥ "وَلِيَ دِيْنِ" اصل " وَلِيَ دِيْنِيْ " ہے، چونکہ دوسری آیات نون پر ختم ہو رہی ہیں اس لیے آخر سے "یاء" حذف کر دی، مگر اس پر کسرہ باقی رکھا ہے۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ ۱۱۰ مدنية ۱۱۴ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ۳ رُكُوْعَاتُهَا ۱

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝۱ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے ① اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں ② تو اپنے

**آیت 1 تا 3** ① اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ...... : ابن کثیر نے فرمایا کہ "الْفَتْحُ" سے مراد یہاں فتح مکہ ہے، اس پر اتفاق ہے۔ عرب کے قبائل اسلام قبول کرنے کے لیے فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ اپنی قوم پر غالب آ گیا تو بلاشبہ وہ نبی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ہاتھوں سے مکہ فتح فرما دیا تو وہ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد دو سال نہیں گزرے تھے کہ سارا عرب مسلمان ہو گیا اور تمام قبائل میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اسلام کا اقرار نہ کرتا ہو۔ (الحمد للہ) بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا، جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے چاہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر پہلے اسلام قبول کر لے اور تمام قبائل اپنے مسلمان ہونے کے لیے فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اسے اور اس کی قوم کو چھوڑ دو، اگر یہ ان پر غالب آ گیا تو بلاشبہ وہ نبی ہے۔ [ دیکھیے بخاري، المغازي، باب : ۴۳۰۲ ]

② ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن عمر رضی اللہ عنہ نے شیوخ بدر کی موجودگی میں مجھے بلوایا اور حاضرین سے پوچھا: ''اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ﴾ کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟'' تو ان میں سے بعض نے کہا کہ اس میں ہمیں حکم ہوا ہے کہ جب ہمیں فتح و نصرت حاصل ہو تو اللہ کی حمد اور استغفار کریں اور بعض خاموش رہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ابن عباس! تم بھی یہی کہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''نہیں!'' فرمایا: ''تو تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی موت کا وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہے، فرمایا: ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ﴾ ''جب اللہ کی نصرت اور فتح آ گئی۔'' یہ (فتح و نصرت) آپ ﷺ کی موت کی علامت ہے، لہٰذا اب آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے استغفار کیجیے، یقیناً وہ توّاب ہے۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس سورت کے متعلق مجھے بھی یہی معلوم ہے۔'' [ بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ فسبح بحمد ربك...... ﴾ : ۴۹۷۰ ]

③ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شیوخ بدر نے جو تفسیر کی ہے وہ بھی بہت خوب صورت مفہوم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد آٹھ رکعات ادا فرمائیں۔ اس لیے امیر لشکر کے لیے مستحب ہے کہ کوئی شہر فتح کرنے کے بعد اس میں داخل ہو تو آٹھ رکعات (نوافل) پڑھے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مدائن فتح کیا تو ایسے ہی کیا تھا۔ البتہ عمر بن خطاب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے جو مفہوم سمجھا ہے کہ اس میں آپ ﷺ کو آپ کی موت کی اطلاع دی گئی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا کام مکمل ہو چکا، اب آپ کو ہمارے پاس آنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی سمجھا، اس لیے اس کے

بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۳

رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے ③

بعد آپ ﷺ تسبیح وتحمید اور استغفار کثرت سے کرنے لگے۔

④ اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے بھی زیادہ آخرت کی تیاری شروع کر دی اور زیادہ سے زیادہ تسبیح وتحمید اور استغفار کرنے لگے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ" نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز نہیں پڑھی جس میں یہ نہ پڑھا ہو: « سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ » [ بخاري، التفسير، سورة ﴿إذا جاء نصر الله﴾ : ۴۹۶۷ ] "تو (ہر عیب سے) پاک ہے، اے ہمارے پروردگار! ہم تیری تعریف اور پاکی بیان کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے بخش دے۔" بخاری کی اس سے بعد والی روایت بھی عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ آپ ﷺ اپنے رکوع اور سجدے میں کثرت سے یہ دعا پڑھتے تھے: « سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ »[ بخاري، التفسير، سورة ﴿إذا جاء نصر الله﴾ : ۴۹۶۸ ] "اے ہمارے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تو (ہر عیب سے) پاک ہے، ہم تیری تعریف اور پاکی بیان کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے بخش دے۔" آپ ﷺ یہ دعا قرآن پر عمل کرتے ہوئے پڑھتے تھے۔

⑤ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ جَلَسَ فِيْ مَجْلِسٍ فَكَثُرَ فِيْهِ لَغَطُهُ فَقَالَ قَبْلَ أَنْ يَّقُوْمَ مِنْ مَّجْلِسِهِ ذٰلِكَ : سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ، إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا كَانَ فِيْ مَجْلِسِهِ ذٰلِكَ »[ ترمذي، الدعوات، باب ما يقول إذا قام من مجلسه : ۳۴۳۳، وقال الألباني صحيح ] "جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں شور وغل زیادہ کر بیٹھے، پھر اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے یہ پڑھ لے تو اس مجلس میں اس سے جو کچھ ہوا وہ معاف کر دیا جاتا ہے: « سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ » "اے اللہ! تو پاک ہے اور تیری حمد کے ساتھ (ہم تیری تعریف کرتے ہیں)، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں اور تیری طرف توبہ کرتا ہوں۔"

⑥ "اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا" میں "كَانَ" استمرار کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: "یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

سورۃ اللھب ۱۱۱ مکیۃ ۶ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | آیاتھا ۵ رکوعاتھا ۱

تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ؕ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوگئے اور وہ (خود) ہلاک ہوگیا①

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب (سورۂ شعراء کی) آیت: ﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (اے نبی! اپنے سب سے قریبی خاندان والوں کو ڈرا) اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھے اور آواز دی: «يا بني فِهْرٍ! يا بني عدِيٍّ ! لِبُطُوْنِ قُرَيْشٍ حَتّٰى اجْتَمَعُوْا، فَجَعَلَ الرَّجُلُ إِذَا لَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَّخْرُجَ أَرسل رَسُوْلاً لِيَنْظُر ما هُوَ، فجاءَ أَبُوْ لَهَبٍ وَقُرَيْشٌ فَقَالَ أَرَأَيْتَكُمْ لَوْ أَخبَرْتُكُمْ أَنَّ خَيلاً بِالْوَادِي تُرِيْدُ أَنْ تُغِيرَ عليكُمْ ، أَكُنْتُمْ مُصدِّقِيَّ؟ قَالُوْا نَعَمْ، مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا، قَالَ فَإِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ، فقال أَبُوْ لَهَبٍ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ، أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا ؟ فَنَزَلَتْ : ﴿ تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ؕ۝ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ﴾» [بخاري، التفسير، باب : ﴿وأنذر عشيرتك الأقربين......﴾ : ۴۷۷۰ ] ”اے بنی فہر! اے بنی عدی!“ اور قریش کے قبیلوں کے نام لے کر پکارا، یہاں تک کہ وہ جمع ہو گئے۔ کوئی آدمی خود نہ آ سکا تو اس نے کسی کو بھیج دیا تاکہ دیکھے کہ کیا بات ہے۔ ابولہب اور قریش کے دوسرے لوگ آ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ بتاؤ کہ اگر میں تمھیں اطلاع دوں کہ وادی میں ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں! ہم نے آپ سے سچ کے علاوہ کبھی کوئی اور تجربہ نہیں کیا (یعنی آپ کو ہمیشہ سچا ہی پایا)۔“ آپ نے فرمایا: ”تو پھر میں تمھیں ایک سخت عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہوں۔“ ابولہب کہنے لگا: ”سارا دن تیرے لیے ہلاکت ہو! تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا ہے؟“ تو یہ سورت اتری: ﴿ تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ؕ۝ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ﴾ ”ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوگئے اور وہ (خود) ہلاک ہوگیا۔ نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا۔“

**آیت 1** ① **تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ:** ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا۔ ”لَهَبٍ“ شعلے کو کہتے ہیں، ”اَبِيْ لَهَبٍ“ شعلے کا باپ یا شعلے والا۔ رخساروں کی خوب صورتی اور سرخی کی وجہ سے یا طبیعت کی تیزی اور جوش کی وجہ سے ابولہب کے نام سے مشہور ہوا، پھر جہنمی ہونے کی وجہ سے فی الواقع شعلے والا ہی بن گیا۔ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت عداوت تھی۔ باوجود اس کے کہ چچا باپ کی طرح ہوتا ہے، یہ ہر موقع پر آپ کی مخالفت کرتا اور ایذا پہنچانے کی کوشش کرتا۔ آپ کے دشمنوں میں سے یہ واحد شخص ہے جس کے نام سے قرآن میں اس کے برے انجام کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں نسب اور خاندان کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایمان اور کفر کی بنیاد پر اپنے اور غیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت اور آپ کو ہلاکت کی بددعا دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ”تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ“

مَآ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ؘ﴿۲﴾

نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا ﴿۲﴾

فرمایا۔ اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں، پہلا یہ کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ خود ہلاک ہو گیا۔ یہ معنی تو ظاہر ہے۔ دوسرا یہ کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو جائیں اور وہ (فی الواقع) ہلاک ہو گیا۔ یہ معنی فَرّاء نے کیا ہے، یعنی اس کی بد دعا کے مقابلے میں اہل ایمان کی بد دعا کی جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ فرما دیے کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو جائیں، پھر بتایا کہ وہ ہلاک ہو چکا۔

❸ ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے'' یہاں ہاتھوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ ایذا رسانی میں ہاتھوں کا حصہ دوسرے تمام اعضا سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور ان کے ساتھ زیادہ تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہاتھوں سے مراد اولاد اور ساتھی ہیں، جو مددگار ہوتے ہیں اور دست و بازو بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ایسا ہی ہوا، اس کے مددگار جنگ بدر میں برباد ہو گئے، وہ خود جنگ میں نہیں گیا، شکست کی خبر آئی تو اسی صدمے سے مر گیا۔

**آیت 2** مَآ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ: ''نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا'' کمائی سے مفسرین نے اس کے بیٹے مراد لیے ہیں، علاوہ ازیں اس نے اپنے خیال میں جو اعمال نیکی سمجھ کر کیے تھے وہ اس کے کسی کام نہ آئے۔
صحیح بخاری میں ہے: «قَالَ عُرْوَةُ: وَ ثُوَيْبَةُ مَوْلَاةٌ لِأَبِي لَهَبٍ وَ كَانَ أَبُو لَهَبٍ أَعْتَقَهَا فَأَرْضَعَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، فَلَمَّا مَاتَ أَبُو لَهَبٍ أُرِيَهُ بَعْضُ أَهْلِهِ بِشَرِّ حِيبَةٍ (بِشَرِّ خَيْبَةٍ) قَالَ لَهُ مَاذَا لَقِيتَ، قَالَ أَبُو لَهَبٍ لَمْ أَلْقَ بَعْدَكُمْ غَيْرَ (لَمْ أَلْقَ بَعْدَكُمْ خَيْرًا غَيْرَ) أَنِّي سُقِيتُ فِي هٰذِهِ بِعَتَاقَتِي ثُوَيْبَةَ» [بخاري، النكاح، باب: «و أمهاتكم اللاتي أرضعنكم»: ۵۱۰۱] ''عروہ نے کہا کہ ثُوَیبہ ابولہب کی لونڈی تھی جسے ابولہب نے آزاد کیا تھا، پھر اس نے نبی ﷺ کو دودھ پلایا۔ جب ابولہب فوت ہوا تو اس کے گھر والوں میں سے کسی کو خواب میں ابولہب بہت بری حالت میں دکھایا گیا، اس نے اس سے پوچھا: ''تم کس چیز کو ملے؟'' ابولہب نے کہا: ''میں تمھارے بعد (کسی خیر کو) نہیں ملا سوائے اس کے کہ میں اپنی اس (انگلی اور انگوٹھے کی درمیانی جگہ) سے پلایا گیا ہوں، میرے ثُوَیبہ کو آزاد کرنے کی وجہ سے۔'' فتح الباری میں ہے کہ سہیلی نے ذکر کیا کہ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب ابولہب فوت ہوا تو میں نے اسے ایک سال بعد خواب میں بہت بری حالت میں دیکھا تو اس نے کہا: ''میں تمھارے بعد کسی راحت کو نہیں ملا مگر اتنا ہے کہ ہر سوموار کو میرا عذاب ہلکا کر دیا جاتا ہے۔'' کہا: ''اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ سوموار کے دن پیدا ہوئے تھے اور ثُوَیبہ نے ابولہب کو آپ کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی تو اس نے اسے آزاد کر دیا۔'' (فتح الباری) نبی ﷺ کا میلاد منانے والے حضرات نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ نبی ﷺ کا یوم میلاد منانا جائز ہے۔ ان حضرات نے خیال نہیں فرمایا کہ یہ عباس رضی اللہ عنہ کا خواب ہے جو اس وقت ابھی کافر تھے، مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اب ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ نہ ابولہب کا مال اس کے کام آیا اور نہ جو اس نے کمایا اور ایک طرف ایک شخص کے زمانۂ کفر کا خواب ہے کہ ثُوَیبہ کا آزاد کرنا اس کے کام آیا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ نبی ﷺ کا

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّ امْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

عنقریب وہ شعلے والی آگ میں داخل ہوگا ③ اور اس کی بیوی (بھی آگ میں داخل ہوگی) جو ایندھن اٹھانے والی ہے ④ اس کی گردن میں مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی ⑤

خواب شریعت میں حجت ہے کیونکہ وہ وحی الٰہی ہے، نبی کے سوا کسی مسلمان کا خواب بھی حجت نہیں، چہ جائے کہ کسی غیر مسلم کا خواب شرعی دلیل بنایا جائے، جب کہ وہ خواب صریح طور پر قرآن مجید کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن نے ابولہب کے ہاتھوں کا نام لے کر ان کے ہلاک ہونے کی وعید سنائی ہے۔ پھر ان حضرات نے یہ بھی خیال نہیں فرمایا کہ میلاد منانے کی اگر کوئی اصل ہوتی تو اس نیکی سے رسول اللہ ﷺ، خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور اہل بیت ہر سال محروم نہ رہتے۔ رہی یہ بات کہ بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اسے کیوں ذکر فرمایا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اسے "كِتَابُ النِّكَاحِ" میں ذکر فرمایا ہے اور ان کا مقصد اس سے یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ابولہب کی لونڈی ثُویبہ نے دودھ پلایا تھا اور اسی نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کو بھی دودھ پلایا تھا، اس لیے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح نبی ﷺ کے لیے جائز نہ تھا، کیونکہ وہ آپ کی رضاعی بھتیجی تھی۔ بخاری رحمہ اللہ نے اسے میلاد منانے کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ ہی کوئی صاحب عقل کسی غیر مسلم کے خواب سے شریعت اخذ کرتا ہے، خصوصاً جب وہ صاف قرآن مجید کے خلاف بھی ہو۔ قرآن کی اس صریح آیت کی رو سے ابولہب کو ثُویبہ لونڈی کا آزاد کر دینا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

**آیت 4،3** ① **سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ......:** "امْرَاَتُهٗ" کا عطف "سَيَصْلٰى" میں ابولہب کی طرف لوٹنے والی ضمیر پر ہے، یعنی وہ اور اس کی بیوی شعلے مارتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل کا نام اروی بنت حرب بن امیہ تھا، یہ قریش میں اونچے نسب والی عورت تھی، ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کی بہن اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھی اور اپنے خاوند کی طرح رسول اللہ ﷺ سے سخت عداوت رکھتی تھی۔ (ابن کثیر)

② "**حَمَّالَةَ الْحَطَبِ**" "امْرَاَتُهٗ" سے حال ہے، یعنی اس کی بیوی ایندھن اٹھائے ہوئے آگ میں داخل ہوگی۔ مفسرین نے اس کے تین معانی بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ وہ گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے جہنم میں داخل ہوگی، جو جہنم کو بھڑکانے کے لیے ایندھن ہے، دوسرا یہ کہ وہ لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف عداوت کی آگ بھڑکاتی رہتی ہے اور تیسرا یہ کہ اپنی پیٹھ پر ایندھن لا کر آپ کی راہ میں کانٹے بچھاتی رہتی ہے۔

**آیت 5** **فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ:** "جِيْدٌ" گردن۔ "مَسَدٍ" کھجور کی چھال کی رسّی یا گُوگل کے درخت کی چھال کی رسی یا کسی بھی چیز کی بنی ہوئی رسی یا خوب مضبوط بٹی ہوئی رسی۔ لوہے کی رسی کو بھی "مَسَدٍ" کہتے ہیں، یعنی جہنم میں اس حال میں داخل ہوگی کہ اس کی گردن میں مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی۔ صحیح بخاری میں مجاہد سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ زنجیر ہے جو آگ میں ہوگی، جس میں مجرم پروئے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴾ [ الحاقة : ۳۲ ] "پھر ایک زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، اسے داخل کر دو۔"

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کہہ دے وہ اللہ ایک ہے ①

اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مشرکین نے کہا، اے محمد! ہمارے لیے اپنے رب کا نسب بیان کیجیے تو اللہ عزوجل نے ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' نازل فرمائی۔'' [ مستدرك حاكم : ٢/ ٥٤٠، ح : ٣٩٨٧ ] اس سورت کے صحیح احادیث میں بہت سے فضائل آئے ہیں، اختصار کی وجہ سے چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں: ① ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک آدمی کو (قیام اللیل میں) ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' بار بار پڑھتے ہوئے سنا (اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں پڑھ رہا تھا)۔ صبح ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے اس کا ذکر کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے کم سمجھ رہا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! إِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ)) [ بخاري، فضائل القرآن، باب فضل : ﴿ قل هو الله أحد ﴾ : ٥٠١٣، ٥٠١٤ ] ''قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ سورت قرآن کے ایک تہائی حصے کے برابر ہے۔'' ② عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا، وہ نماز میں اپنی قراءت کو ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' کے ساتھ ختم کرتا تھا۔ جب وہ لوگ واپس آئے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((سَلُوْهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذٰلِكَ؟)) ''اس سے پوچھو وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟'' لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: ((لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ وَ أَنَا أُحِبُّ أَنْ أَقْرَأَ بِهَا)) ''اس لیے کہ یہ رحمان کی صفت ہے اور مجھے اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔'' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَخْبِرُوْهُ أَنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهُ)) [ بخاري، التوحيد، باب ما جاء في دعاء النبي صلی اللہ علیہ وسلم أمته ...... : ٧٣٧٥ ] ''اسے بتا دو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھتا ہے۔'' سوتے وقت اور دوسرے اوقات میں معوذتین کے ساتھ ملا کر یہ سورت پڑھنے کی احادیث معوذتین کے شروع میں آئیں گی۔ (ان شاء اللہ)

تنبیہ: بعض روایات میں اس سورت کو روزانہ دو سو مرتبہ یا سو مرتبہ یا پچاس مرتبہ پڑھنے کی مختلف فضیلتیں آئی ہیں، مگر ان روایات کی سندیں صحیح نہیں ہیں۔ شوکانی نے فتح القدیر میں وہ روایات درج کر کے ان کا ضعف واضح کیا ہے۔ ابن کثیر نے بھی ان روایات پر کلام کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سورت کو تین سے زیادہ کسی عدد میں مسنون سمجھ کر پڑھنا درست نہیں۔ ہاں! اپنی سہولت کے لیے کوئی شخص کوئی عدد مقرر کر لے، اسے مسنون نہ سمجھے تو درست ہے۔

**آیت 1** ❶ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ: اس کی ترکیب کئی طرح سے کی گئی ہے، زیادہ واضح دو ہیں: ① ''هُوَ'' مبتدا ہے، لفظ ''اللّٰهُ'' پہلی خبر اور ''اَحَدٌ'' دوسری خبر۔ معنی یہ ہوگا: ''(ہمارے جس رب کا نسب پوچھ رہے ہو) وہ اللہ ہے (وہ) ایک ہے۔'' ② ''هُوَ'' مبدل منہ اور لفظ ''اللّٰهُ'' بدل، دونوں مل کر مبتدا اور ''اَحَدٌ'' خبر ہے۔ معنی یہ ہوگا: ''وہ اللہ (جس کے متعلق تم

پوچھ رہے ہو) ایک ہے۔‘‘

2 کائنات کے خالق اور پروردگار کے بے شمار ناموں میں سے لفظ ’’ اَللّٰهُ ‘‘ بطور علم یعنی اصل نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے، باقی نام اس کی کسی نہ کسی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی اصل ’’ اَلْإِلٰهُ ‘‘ ہے، ’’ إِلٰهٌ ‘‘ کا معنی معبود ہے۔ تو لفظ ’’ اَللّٰهُ ‘‘ کا معنی یہ ٹھہرا کہ وہ خاص ہستی جو عبادت کے لائق ہے، کیونکہ اس میں کمال کی تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ ’’ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ‘‘ کا معنی یہ ہے کہ وہ رب جس کے متعلق تم پوچھ رہے ہو وہ کوئی نئی یا نامعلوم ہستی نہیں، بلکہ وہ اللہ ہے جسے تم بھی جانتے اور مانتے ہو، وہی جو معبود برحق ہے اور وہ اللہ ایک ہے۔

3 اَللّٰهُ اَحَدٌ: اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کے تین معانی ہو سکتے ہیں اور تینوں یہاں درست ہیں، پہلا یہ کہ وہ ایک ذات ہے، دو یا تین یا زیادہ نہیں اور اس کی ذات میں تعدد نہیں، دوسرا یہ کہ وہ معبود برحق ہونے میں اکیلا ہے، اس کا کوئی ثانی یا شریک نہیں اور تیسرا یہ کہ وہ ایک ہے، اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور نہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتا ہے۔ اس ایک ہی آیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی قسم کا شریک بنانے والوں کی تردید ہو گئی، خواہ وہ مجوس (آتش پرست) ہوں، جو دو خالق مانتے ہیں، ایک خیر کا خالق (یزداں) اور دوسرا شر کا خالق (اہرمن)، خواہ تثلیث (تین خداؤں) کو ماننے والے ہوں، خواہ ہندو ہوں جو کروڑوں دیوتاؤں کو خدائی میں حصے دار مانتے ہیں اور خواہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہوں جو ہر چیز ہی کو اللہ مانتے ہیں، کیونکہ اگر ہر چیز ہی اللہ ہے یا ہر چیز میں اللہ ہے تو اللہ ایک تو نہ رہا، جبکہ اللہ تعالیٰ کا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ ایک ہے، اس میں تعدد اور کثرت نہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کے عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی جو اللہ کے علاوہ کسی کو عالم الغیب یا اختیارات کا مالک سمجھ کر مدد کے لیے پکارتے ہیں اور انھیں خدائی اختیارات میں اللہ کا شریک بناتے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کی بھی تردید ہو گئی جو اللہ کی ذات سے ٹکڑوں کے جدا ہونے کے قائل ہیں، کوئی کہتا ہے عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، کوئی کہتا ہے عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، کوئی کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور میں سے پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ ان تمام صورتوں میں کوئی نہ کوئی ہستی اللہ کی شریک ٹھہرتی ہے اور وہ ایک نہیں رہتا۔ میں نے ایک صاحب کی تقریر سنی، وہ کہہ رہے تھے: ’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور میں سے نور ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے نور میں سے نور کس طرح جدا ہو سکتا ہے؟ میں آپ کو مثال سے سمجھاتا ہوں، دیکھیے! یہ ایک موم بتی جل رہی ہے، اس میں سے ایک اور موم بتی جلا لیں تو کیا پہلی کے نور میں کوئی کمی واقع ہو گی؟ ہرگز نہیں، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور میں سے نور ہیں اور اللہ کے نور میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔‘‘ اس بے چارے نے یہ نہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مثالیں بیان کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [ النحل : ۷۴ ] ’’پس تم اللہ کے لیے مثالیں مت بیان کرو، کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘ اور نہ یہ سمجھا کہ پہلی موم بتی میں کوئی کمی ہو یا نہ ہو، دو موم بتیاں تو بن گئیں، جب کہ اللہ ایک ہے اور نہ یہ سمجھا کہ اللہ کا نور نہ کسی سے نکلا ہے اور نہ اس سے کوئی نکلتا ہے۔ یہ عقیدہ تو بعینہٖ وہی عقیدہ

# اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲

## اللہ ہی بے نیاز ہے ۝۲

ہے جو نصرانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختیار کیا۔

اسی طرح "اَللّٰهُ اَحَدٌ" سے ان لوگوں کی بھی تردید ہوگئی جو کہتے ہیں کہ بندہ جب زیادہ عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں اتر آتا ہے، پھر وہ اللہ ہی بن جاتا ہے اور دلیل میں صحیح بخاری کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا فرمان نقل ہوا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ... ان لوگوں نے سورۂ اخلاص پر غور نہ کیا کہ اس صورت میں اللہ ایک تو نہ رہا، جبکہ اس کا سب سے پہلا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ ایک ہے اور نہ اس حدیث کے آخر پر غور کیا جس میں واضح الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا وہ بندہ اگر مجھ سے مانگے تو میں اسے دوں گا اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دوں گا۔ اگر "من تو شدم تو من شدی" کے مطابق اللہ اور بندہ ایک ہوگئے تو پھر مانگے گا کون اور دے گا کون؟ پناہ مانگنے والا کون ہوگا اور پناہ دینے والا کون؟

اسی طرح ان لوگوں کی بھی تردید ہوگئی جو کہتے ہیں کہ بندہ عبادت کرتے کرتے اللہ کے ساتھ اس طرح واصل ہو جاتا ہے کہ وہ وہی بن جاتا ہے، جس طرح لوہا گرم ہوتے ہوتے آگ بن جاتا ہے۔ اس غلطی کی بنیادی وجہ بھی اللہ کے لیے مخلوق کی مثالیں بیان کرنا ہے، جبکہ اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ ان بے چاروں نے یہ نہ سوچا کہ آیت ﴿ اَللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ (اللہ ایک ہے) اس کی نفی کر رہی ہے، بندہ تو اللہ سے الگ ایک ذات ہے۔ مخلوق اور خالق دو ہیں ایک نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، دو ایک کیسے بن گئے؟ یہ تو وہی نصرانیوں والا عقیدہ ہے کہ باپ خدا، بیٹا خدا، روح القدس خدا، مگر تین نہیں بلکہ ایک خدا۔ اللہ کے بندو! دو یا تین ایک کیسے بن گئے؟ الغرض، یہ ایسی مبارک سورت ہے کہ اللہ کی توحید کے خلاف جتنے عقیدے ہیں اور ان کی جتنی بھی توجیہیں کی جاتی ہیں، یہ اکیلی سورت بلکہ اس کی ایک آیت ہی ان کی تردید کے لیے کافی ہے۔ پھر اگر رسول اللہ ﷺ نے اسے قرآن کا ثلث (ایک تہائی) قرار دیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

**آیت 2** ❶ **اَللّٰهُ الصَّمَدُ:** "الصَّمَدُ" کی تفسیر میں سلف کے کئی اقوال ہیں، ان کا خلاصہ تین اقوال میں آ جاتا ہے: ① "**الصَّمَدُ**" وہ سردار ہے جس کی طرف لوگ قصد کر کے جائیں، جس سے بڑا کوئی سردار نہ ہو۔ یہ "صَمَدَ" (قصد کرنا) سے مشتق ہے۔ گویا "**الصَّمَدُ**" بمعنی "مَصْمُوْدٌ" ہے۔ اکثر سلف نے یہی معنی کیا ہے۔ ② جو کھاتا پیتا نہ ہو۔ ③ جس کا پیٹ نہ ہو، جو کھوکھلا نہ ہو، جس سے کچھ نکلتا نہ ہو۔ اصل میں یہ تینوں معانی صمد میں آ جاتے ہیں۔

❷ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب خبر پر الف لام آ جائے تو کلام میں حصر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر "اَللّٰهُ صَمَدٌ" ہوتا تو معنی یہ تھا کہ اللہ صمد ہے۔ اب "**اَللّٰهُ الصَّمَدُ**" فرمایا تو معنی یہ ہے کہ اللہ ہی "صمد" ہے، کوئی اور صمد نہیں۔ اس سے پہلی آیت میں "**اَللّٰهُ اَحَدٌ**" فرمایا، جس کا معنی ہے اللہ ایک ہے۔ وہاں "اَللّٰهُ الْاَحَدُ" نہیں فرمایا کہ اللہ ہی ایک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

## لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝۳

نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا ③

وہاں حصر کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ وہ ہستی جو ایک ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے، کسی اور کو اَحد کہہ ہی نہیں سکتے۔ ہر ایک کا ثانی کسی نہ کسی طرح موجود ہے، کسی اور چیز میں اس کا ثانی نہ ہو تو مخلوق ہونے میں اس کے بے شمار ثانی موجود ہیں، اس لیے اس کائنات میں ایک ہستی صرف اللہ کی ہے، اس لیے وہاں حصر کی ضرورت ہی نہیں، جبکہ صمد ہونے کے دعوے دار بے شمار ہیں، جن کے پاس لوگ اپنی ضرورتوں کے لیے جاتے ہیں۔ اس لیے فرمایا اصل صمد صرف وہ ہے، کیونکہ دوسرے لوگ کتنے بھی بڑے سردار ہوں، لوگ ان کے پاس اپنی حاجتوں کے لیے جاتے ہوں، مگر وہ خود کسی نہ کسی کے محتاج ہیں۔ یہ صرف اللہ کی ہستی ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، باقی سب اس کے محتاج ہیں، وہ سب کو کھلاتا ہے، خود کھانے کا محتاج نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ [ الأنعام : ١٤ ] ''حالانکہ وہ کھلاتا ہے اور اسے نہیں کھلایا جاتا۔'' پھر نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ ''الصَّمَدُ'' کے اس مفہوم کو ''بے نیاز'' کا لفظ کافی حد تک ادا کرتا ہے۔

**آیت 3** ① **لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ:** ''نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا'' اس آیت میں نصرانیوں کا رد ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، یہودیوں کا رد ہے جو عُزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، مشرکین عرب کا رد ہے جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے ہیں، فلاسفہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ عقول عشرہ اللہ سے نکلی ہیں اور اب کائنات کا نظام وہ چلا رہی ہیں، ہندوؤں کا رد ہے جو کروڑوں کی تعداد میں مخلوق کو خدا مانتے ہیں اور ان مسلمان کہلانے والوں کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمۂ اہلِ بیت اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور سے پیدا ہوئے ہیں۔

② اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے لیے اولاد کی نفی کے بہت سے دلائل بیان فرمائے ہیں، ان میں سب سے واضح چار ہیں، پہلی دلیل یہ ہے کہ اولاد لازماً باپ کی جنس سے ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جنس ہی نہیں۔ اس آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے: ﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ﴾ [ المائدة : ٧٥ ] ''نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، اس سے پہلے کئی رسول گزر گئے اور اس کی ماں صدیقہ ہے۔ وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔'' یعنی مسیح ابن مریم علیہما السلام سے پہلے کئی رسول گزرے، وہ پہلے نہیں تھے، پھر پیدا ہوئے، وہ حادث تھے جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے۔ باپ اور اولاد کی جنس ایک ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور عیسیٰ علیہ السلام حادث ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کھاتا نہیں اور وہ دونوں کھاتے تھے۔ جنس ایک نہ رہی تو اولاد کیسے بن گئی؟ دوسری دلیل یہ کہ والد اولاد اس لیے حاصل کرتا ہے کہ وہ اس کا محتاج ہوتا ہے اور اللہ کو کسی کی کوئی حاجت نہیں۔ اس آیت میں یہی فرمایا ہے: ﴿ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ﴾ [ يونس : ٦٨ ] ''انھوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد پکڑی ہے، وہ پاک ہے، وہی تو غنی ہے۔'' یعنی وہی تو ہے جو غنی ہے، جسے کسی کی حاجت نہیں، وہ اولاد کیوں بنائے گا؟ تیسری دلیل یہ کہ تمام مخلوق اللہ

# وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

## اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے ﴿۴﴾

کے بندے اور غلام ہیں اور بندہ ہونا بیٹا ہونے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، فرمایا: ﴿ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [ مریم: ۹۲، ۹۳ ] ”اور رحمان کے لائق ہی نہیں کہ وہ اولاد پکڑے، آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے رحمان کے پاس بندہ (غلام) بن کر آنے والا ہے۔“ یعنی رحمان کی اولاد کس طرح ہو سکتی ہے، جب کہ زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام اور بندہ بن کر پیش ہونے والا ہے؟ بیٹا ہو اور غلام بھی ممکن ہی نہیں۔ چوتھی دلیل یہ کہ اولاد اسی کی ہوتی ہے جس کی بیوی ہو اور اللہ تعالیٰ کی بیوی ہی نہیں تو اولاد کیسے ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ﴾ [ الأنعام: ۱۰۱ ] ”اس کی اولاد کیسے ہوگی جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں۔“

❸ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (( كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، وَشَتَمَنِي وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، فَأَمَّا تَكْذِيبُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ لَنْ يُعِيدَنِي كَمَا بَدَأَنِي، وَلَيْسَ أَوَّلُ الْخَلْقِ بِأَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ إِعَادَتِهِ، وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا، وَأَنَا الْأَحَدُ الصَّمَدُ لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لِي كُفُوًا أَحَدٌ )) [ بخاري، التفسير، سورة ﴿ قل هو الله أحد ﴾: ۴۹۷۴ ] ”ابن آدم نے مجھے جھٹلا دیا حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو اس کا یہ کہنا ہے کہ جس طرح اس نے مجھے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے دوبارہ نہیں بنائے گا۔ حالانکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا مجھے دوبارہ بنانے سے آسان نہیں ہے اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے اولاد بنائی ہے، حالانکہ میں احد ہوں، صمد ہوں۔ میں نے نہ کسی کو جنا، نہ کسی نے مجھے جنا اور نہ ہی کوئی میرے برابر کا ہے۔“

❹ وَلَمْ يُوْلَدْ: ”اور وہ جنا نہیں گیا“ یعنی کسی نے اس کو نہیں جنا، اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کے سوال کا جواب ہے جنھوں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنے رب کا نسب بیان کیجیے، کیونکہ جو پیدا ہوگا وہ حادث ہوگا، ہمیشہ سے نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهُ )) [ بخاري، التوحيد، باب: ﴿ وكان عرشه على الماء ﴾: ۷۴۱۸ ] ”اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔“ معلوم ہوا کہ جو ولادت کے مرحلے سے گزرا ہو یا خلق کے مرحلے سے گزرا ہو وہ اللہ نہیں ہو سکتا۔ غلط کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے اور ازلی (یعنی ہمیشہ سے) ہے، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور سے جدا ہوئے ہیں، مگر درحقیقت وہی ہیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ جو پیدا ہوا وہ ہمیشہ سے کیسے ہو گیا؟

**آیت 4** ❶ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ: ”كُفُوًا“ ہم مثل، جوڑ، جو برابر کا ہو۔ ”قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ“ کہنے سے اولاد اور کفو کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے مگر ان کو پھر الگ بھی ذکر فرمایا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۹۸): ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ

وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ (جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بلاشبہ اللہ سب کافروں کا دشمن ہے) میں ملائکہ میں شامل ہونے کے باوجود جبریل اور میکائیل کو الگ ذکر فرمایا ہے۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ دوبارہ ذکر کر کے اس کی طرف خاص توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس سے مزید وضاحت اور تفصیل ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے ایک شخص کو صرف "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کہنے سے ان دونوں باتوں کی طرف توجہ ہی نہ ہوتی یا توجہ ہوتی بھی تو وہ اتنی وضاحت سے نہ سمجھ سکتا جتنی وضاحت سے وہ انھیں الگ ذکر کرنے سے سمجھا ہے۔ علم بلاغت میں اسے تجرید کہتے ہیں۔ (التسہیل)

❷ رسول اللہ ﷺ نے اس سورت کو قرآن کا ثلث قرار دیا ہے، یہ قرآن کا ثلث کس طرح ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خود اس کی وضاحت نہیں فرمائی، اہلِ علم نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کی توجیہ فرمائی ہے۔ بعض نے اس سے مراد ثواب لیا ہے، بعض نے فرمایا، قرآن مجید کے تین ثلث ہیں، ایک ثلث احکام، دوسرا وعد و وعید اور تیسرا اسماء و صفات ہے اور اس سورت میں اسماء و صفات بیان ہوئے ہیں۔ بعض نے اللہ کی معرفت، آخرت کی معرفت اور صراطِ مستقیم کو قرآن کے تین ثلث قرار دے کر اللہ کی معرفت کو اس سورت کا موضوع قرار دیا ہے۔ بعض نے توحید، رسالت اور آخرت کو تین حصے قرار دیا اور اس سورت کو توحید کی جامع ہونے کی وجہ سے ثلثِ قرآن قرار دیا۔ یہ اختلاف خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہر ایک نے اپنے ذہن سے ایک بات سوچی ہے، رسول اللہ ﷺ سے اس کی وضاحت نہیں آئی، ورنہ سب اس پر متفق ہو جاتے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس بات پر ایمان رکھا جائے کہ یہ سورت قرآن کے ثلث کے برابر ہے اور یہ بات اللہ کے سپرد کر دی جائے کہ ثلث کے برابر کس طرح ہے؟

❸ رسول اللہ ﷺ صبح کی سنتوں میں "قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" اور "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" پڑھا کرتے تھے۔ [دیکھیے مسلم، صلاۃ المسافرین، باب استحباب رکعتي سنة الفجر...... : ۷۲۶] سورت ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ توحید عملی کی جامع ہے کہ میں اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتا ہوں، نہ کروں گا اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ میں کسی اور کی عبادت کروں اور سورت ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ توحید علمی کی جامع ہے کہ اللہ کے متعلق عقیدہ و علم کیا ہونا چاہیے۔ (زاد المعاد)
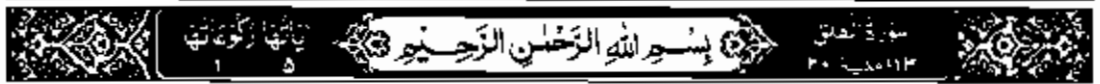
اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کسی بھی قسم کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے لیے سورۂ فلق اور سورۂ ناس جیسی کوئی چیز نہیں۔ ان سورتوں میں تمام جسمانی و روحانی آفات سے بچنے اور انھیں دور کرنے کی زبردست تاثیر موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سورتوں کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے، خصوصاً پناہ کے باب میں ان کو بے مثل قرار دیا ہے۔ یہاں چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

① عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (( أَلَمْ تَرَ آيَاتٍ أُنْزِلَتِ اللَّيْلَةَ لَمْ يُرَ مِثْلُهُنَّ قَطُّ : ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ وَ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ )) [ مسلم، صلاۃ المسافرین، باب فضل قراءۃ المعوذتین: ۸۱۴ ] ''کیا تم نے وہ آیات نہیں دیکھیں جو آج رات نازل کی گئی ہیں، جن کی مثل کبھی دیکھی ہی نہیں گئی؟ وہ سورۂ فلق اور سورۂ ناس ہیں۔'' ② ابن عابس جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: (( أَلَا أُخْبِرُكَ بِأَفْضَلِ مَا يَتَعَوَّذُ بِهِ الْمُتَعَوِّذُوْنَ؟ قَالَ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ وَ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ هَاتَيْنِ السُّوْرَتَيْنِ )) [ نسائي، الاستعاذۃ، باب ما جاء في سورتي المعوذتين: ۵۴۳۴ ] ''کیا میں تمھیں سب سے بہتر وہ چیز نہ بتاؤں جس کے ساتھ پناہ پکڑنے والے پناہ پکڑتے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ'' اور ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' یہ دو سورتیں۔''

③ عبداللہ بن خبیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (( خَرَجْنَا فِيْ لَيْلَةِ مَطِيْرَةٍ وَظُلْمَةٍ شَدِيْدَةٍ نَطْلُبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ لَنَا، قَالَ فَأَدْرَكْتُهُ، فَقَالَ قُلْ، فَلَمْ أَقُلْ شَيْئًا، ثُمَّ قَالَ قُلْ، فَلَمْ أَقُلْ شَيْئًا، قَالَ قُلْ، فَقُلْتُ مَا أَقُوْلُ؟ قَالَ قُلْ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ حِيْنَ تُمْسِيْ وَ تُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَكْفِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ )) [ ترمذي، الدعوات، باب الدعاء عند النوم: ۳۵۷۵، وقال الألباني حسن ] ''ہم ایک بارش اور سخت اندھیرے والی رات میں نکلے، ہم رسول اللہ ﷺ کو تلاش کر رہے تھے، تاکہ آپ ہمیں نماز پڑھائیں۔ چنانچہ میں آپ سے جا ملا، تو آپ نے فرمایا: ''کہو۔'' میں نے کچھ نہ کہا، آپ نے پھر فرمایا: ''کہو۔'' تو میں نے کچھ نہ کہا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''کہو۔'' میں نے کہا: ''میں کیا کہوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' اور مُعَوِّذَتَیْن صبح و شام تین تین مرتبہ کہہ، یہ تجھے ہر چیز سے کافی ہو جائیں گی۔'' ④ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''مُعَوِّذَتَیْن نازل ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ جنوں سے اور انسان کی نظر سے پناہ مانگا کرتے تھے، جب مُعَوِّذَتَیْن اتریں تو آپ نے ان دونوں کو معمول بنا لیا اور ان کے علاوہ کو چھوڑ دیا۔'' [ ترمذي، الاستعاذۃ، باب ما جاء في الرقية بالمعوذتين: ۲۰۵۸ ] ترمذی نے اسے حسن صحیح اور البانی نے صحیح کہا ہے۔

⑤ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مُعَوِّذَتَیْن کے متعلق پوچھا۔ عقبہ فرماتے ہیں کہ (ہم نے یہ سوال کیا تو) رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان دونوں سورتوں کے ساتھ صبح کی جماعت کروائی۔ [ نسائي، الاستعاذۃ، باب ما

# قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ①

## تو کہہ میں مخلوق کے رب کی پناہ پکڑتا ہوں ①

جاء في سورتي المعوذتين : ٥٤٣٦ ، وصححه الألباني ] اس سے معلوم ہوا کہ ان کا نام معوذتین معروف تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے لمبی سورتوں کی جگہ انھیں کافی قرار دیا۔ [ دیکھیے ترمذي، الاستعاذة، باب ما جاء في الرقية بالمعوذتين : ٢٠٥٨ ]

⑤ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں : ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات جب اپنے بستر پر آتے تو دونوں ہتھیلیوں کو جمع کرتے پھر ان میں پھونکتے۔ دونوں میں "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"، "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" پڑھتے، پھر دونوں ہتھیلیوں کو اپنے جسم پر جہاں تک ہو سکتا پھیرتے۔ پھیرنے کی ابتدا سر، چہرے اور جسم کے سامنے والے حصے سے کرتے۔ آپ اس طرح تین مرتبہ کرتے۔'' [ بخاري، فضائل القرآن، باب فضل المعوذات : ٥٠١٧ ] ⑥ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے : ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوتے تو اپنے آپ پر معوذات پڑھ کر پھونکتے تھے۔ جب آپ کا درد بہت بڑھ گیا تو میں آپ پر پڑھتی اور آپ ہی کا ہاتھ اس ہاتھ کی برکت کی امید سے (آپ کے جسم پر) پھیرتی تھی۔'' [ بخاري، الاستعاذة، باب ما جاء في المعوذات : ٥٠١٦ ] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ان تینوں سورتوں کو مذکورہ اوقات میں روزانہ پڑھنا چاہیے، یہ ہر قسم کی روحانی اور جسمانی بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتی ہیں اور جن و انس میں سے شیاطین کے شرور و آفات سے بھی اللہ کی پناہ میں رکھتی ہیں۔

تنبیہ: جب ہم "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" یا معوذات پڑھتے ہیں تو ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبان سے یہ الفاظ ادا کر دیے جائیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ تمام خیالات، خواہشات اور اعمال ترک کرنے کی کوشش کی جائے جو شیطان کو پسند ہیں۔ جس طرح کسی شخص پر کوئی درندہ حملہ آور ہو تو اس کا صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میں فلاں قلعہ میں پناہ لیتا ہوں، بلکہ اسے اس قلعہ میں پہنچنے کی جدوجہد بھی کرنا ہوگی۔ اسی طرح دشمن کے حملے سے اللہ کی پناہ طلب کرنے والے اور اس پر فتح و نصرت کی دعا کرنے والے کے لیے پناہ اور دعا کے الفاظ ہی منہ سے ادا کر دینا کافی نہیں، بلکہ دشمن کے خلاف تیاری، میدان میں نکلنا اور قتل و قتال کے لیے تیار رہنا بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ دعا بھی کی جائے تو واقعی اللہ تعالیٰ کی پناہ بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کی حفاظت بھی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عملاً تو ہر بات میں شیاطین الانس والجن کی پیروی کرے، مگر منہ سے اللہ کی پناہ طلب کرتا رہے تو یہ پناہ طلب کرنا اسے شیاطین سے اور ان کے وسوسوں سے نہیں بچا سکتا۔ اس کی ایک جامع مثال یہ ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے والا شخص یقیناً جنت میں جائے گا، اس پر جہنم کی آگ حرام ہے، مگر کیا صرف یہ الفاظ ادا کرنے والا جہنم سے اللہ کی پناہ میں چلا جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ وہ جو "صَادِقًا مِنْ قَلْبِهٖ" ہو، یعنی سچے دل سے صرف اللہ کو معبود برحق مانے اور اسی کی عبادت کرے، اس کے لیے یہ فضیلت ہے۔ اگر وہ کسی غیر کو یا اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنا لے تو پھر کروڑ دفعہ بھی ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھتا رہے تو جہنم سے نہیں بچ سکتا۔ (ملخص از قاسمی)

**آیت 1** ① قُلْ اَعُوْذُ ...... : "اَعُوْذُ" "عَاذَ يَعُوْذُ عَوْذًا وَمَعَاذًا" (ن) پناہ پکڑنا۔ پناہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ

# مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲

## اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ②

آدمی کسی چیز سے خوف محسوس کرے اور سمجھے کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس سے بچنے کے لیے وہ کسی دوسرے کی حفاظت میں چلا جائے یا کسی چیز کی آڑ لے لے۔ ظاہر ہے پناہ اسی کی لی جاتی ہے جس کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ اس خوف ناک چیز سے بچا سکتا ہے۔ پناہ بعض اوقات ایسی چیزوں کی لی جاتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے بعض خوف ناک چیزوں سے بچنے کا سبب بنا دیا ہے، مثلاً دشمن سے بچنے کے لیے کسی قلعہ یا خندق یا مورچے وغیرہ کی پناہ لینا اور کسی ظالم سے بچنے کے لیے کسی طاقتور آدمی یا قوم کی پناہ لینا، یہ پناہ کسی بھی چیز کی لی جا سکتی ہے اور بعض اوقات یہ سمجھ کر پناہ لی جاتی ہے کہ وہ خطرات جن میں دنیا کے بچاؤ کے تمام ذرائع و اسباب بے کار ہو جائیں ان میں فلاں ہستی بچا سکتی ہے۔ سورۂ فلق اور سورۂ ناس میں جس پناہ کا ذکر ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں جہاں بھی اللہ سے پناہ مانگی گئی ہے اس سے مراد پناہ کی دوسری قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے سے یہ پناہ مانگنا شرک ہے۔ مشرک لوگ اپنے تحفظ کے لیے اللہ کو چھوڑ کر دیوی دیوتاؤں، جنوں، فرشتوں یا پیروں، پیغمبروں کی پناہ لیتے اور ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں تعلیم دی کہ ایسے تمام خطرات سے بچنے کے لیے میری ان صفات کی پناہ لو جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ ایسے تمام خطرات سے میں ہی تمھیں بچا سکتا ہوں۔

② **بِرَبِّ الْفَلَقِ:** "فَلَقَ يَفْلِقُ فَلْقًا" (ض) پھاڑنا۔ یہاں مصدر "**الْفَلَقِ**" مفعول "مَفْلُوْقٌ" کے معنی میں ہے۔ اس کی تفسیر میں معتبر اقوال دو ہیں، پہلا قول جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کا ہے جو ابن ابی حاتم نے حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے، ان کے علاوہ کئی تابعین کا بھی یہی قول ہے کہ "**الْفَلَقِ**" کا معنی صبح ہے، کیونکہ صبح رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**فَالِقُ الْإِصْبَاحِ**﴾ [ الأنعام : ٩٦ ] ''یعنی وہ رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح لانے والا ہے۔'' صبح کے رب کی پناہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ جو رب رات کی تاریکی کو دور کر کے روشن صبح لانے والا ہے میں ساری مخلوق کے شر سے اس کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ جب وہ رات کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے، جس میں بے شمار شرور پائے جاتے ہیں تو اس کے لیے دوسرے شرور کو دور کرنا اور ان سے بچانا تو معمولی بات ہے۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے جو طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور ضحاک کا قول بھی یہی ہے کہ "**الْفَلَقِ**" سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو پھاڑ کر نکالا ہے، مثلاً زمین سے نباتات، پہاڑوں سے چشمے، بادلوں سے بارش اور رحم مادر اور انڈوں سے حیوانات۔ ان کے علاوہ جہاں بھی پیدائش کا معاملہ ہے اکثر میں انشقاق (پھٹنے) کا سلسلہ موجود ہے۔ گویا "**الْفَلَقِ**" کا معنی مخلوق ہے، مطلب یہ ہوگا کہ میں ساری مخلوق کے مالک کی پناہ پکڑتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی مخلوق کے شر سے بچا لے۔ یہ معنی زیادہ جامع ہے، اس لیے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

**آیت 2** ① **مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ:** ''اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی'' اس میں ہر مخلوق کے ہر شر سے پناہ مانگ لی

## وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝

**اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے ③**

گئی ہے۔کوئی نقصان، تکلیف یا پریشانی باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آ گئی ہو۔حقیقت یہ ہے کہ پناہ مانگنے کے لیے یہ بہت ہی جامع سورت ہے، کیونکہ جب بندہ ساری مخلوق کے ہر شر سے بچنے کے لیے اس کے رب کی پناہ میں چلا گیا تو پھر مخلوق میں سے کون ہے جو اسے نقصان پہنچا سکے اور اگر وہ مالک ہی اپنی مخلوق کو نقصان پہنچانے سے نہ روکے تو مخلوق کے شر سے کون بچ سکتا ہے؟

② اس آیت میں مخلوق کے اس شر سے بھی پناہ مانگ لی گئی جو پہنچ چکا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ اسے دور کر دے اور اس سے بھی جس کا خوف ہے۔

**آیت 3** ① **وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ**: اگرچہ ساری مخلوق کے شر سے پناہ مانگنے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہی جس کے شر سے پناہ مانگی جائے، مگر مخلوق میں سے چند چیزوں کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کا سبق دیا گیا، کیونکہ یہ بہت ہی خوف ناک ہیں اور ان کے شر سے پناہ مانگنے کی تو بہت ہی ضرورت ہے۔

② "**غَاسِقٍ**" کا معنی ہے تاریک، سخت اندھیرے والی۔ قاموس میں ہے: "غَسَقَ اللَّيْلُ أَيِ اشْتَدَّتْ ظُلْمَتُهُ" ''یعنی "غَسَقَ اللَّيْلُ" کا معنی یہ ہے کہ رات کی تاریکی بہت سخت ہوگئی۔'' سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ ﴾ [ بني إسرائيل: ۸۷ ] ''رات کے سخت تاریک ہونے تک۔'' "**وَقَبَ**" (ض) داخل ہونا، غائب ہونا۔ فرّاء نے "**غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ**" کا معنی کیا ہے: "اَللَّيْلُ إِذَا دَخَلَ كُلَّ شَيْءٍ وَ أَظْلَمَ" ''رات جب ہر چیز پر چھا جائے اور تاریک ہو جائے۔'' تاریک رات کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کی تلقین اس لیے کی گئی ہے کہ اندھیری رات میں بے شمار شرور وخطرات ہوتے ہیں، اکثر مجرم، چور، ڈاکو، زانی، قاتل اور شب خون مارنے والے رات ہی کو نکلتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو رات ہی میں قتل کرنے کے منصوبے بنائے گئے، تاکہ نہ آپ بچاؤ کر سکیں اور نہ قاتل کا پتا چل سکے۔جنگلی جانوروں مثلاً شیر، چیتے، بھیڑیے وغیرہ اور حشرات الارض مثلاً سانپ، بچھو وغیرہ کا خطرہ رات کو زیادہ ہو جاتا ہے اور مچھر، کھٹمل وغیرہ رات کو جو تکلیف دیتے ہیں سب جانتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق اکثر بیماریوں کے جراثیم اندھیرے میں پیدا ہوتے ہیں اور سورج کی روشنی میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اندھیرے میں وہمی چیزوں کا خوف مزید بڑھ جاتا ہے۔ ان سب پر مزید یہ کہ ان سب شرور کے اندھیرے میں واقع ہونے کی وجہ سے انسان ان سے اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا، اس لیے اندھیری رات کی برائیوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی۔

③ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاند دیکھا تو فرمایا: (( يَا عَائِشَةُ! اسْتَعِيذِيْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ هٰذَا، فَإِنَّ هٰذَا هُوَ الْغَاسِقُ إِذَا وَقَبَ )) [ ترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة المعوذتين: ۳۳٦٦، وصححه الترمذي والألباني ]

وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵

اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے ④ اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے ⑤

''اے عائشہ! اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو، کیونکہ یہی "غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ" ہے۔'' اس صورت میں "غَاسِقٍ" کا معنی ''اندھیرے والا'' اور "اِذَا وَقَبَ" کا معنی " اِذَا غَابَ " ہے، یعنی ''جب غائب ہو جائے۔'' شاہ رفیع الدین نے ترجمہ یوں کیا ہے: ''اور برائی اندھیرا کرنے والے کی سے، جب وہ چھپ جائے۔'' یعنی چاند غروب ہو کر اندھیرا پھیلا دیتا ہے۔ بعض مفسرین نے "غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ" سے سورج مراد لیا ہے، کیونکہ سورج غائب ہو کر سخت تاریکی پھیلنے کا باعث بنتا ہے۔ بہر حال ان تفسیروں اور پہلی تفسیر میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ مراد تاریکی کے شر سے پناہ مانگنا ہی ہے۔

**آیت 4** وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ: "النَّفّٰثٰتِ" "نَفَّاثَةٌ" کی جمع ہے جو "نَفَثَ يَنْفُثُ نَفْثًا" (ن ، ض) (پھونک مارنا، جس کے ساتھ تھوڑی سی تھوک ہو) سے مشتق ہے، بہت پھونکیں مارنے والی عورتیں یا جماعتیں۔ اگر "نَفَّاثَةٌ" میں تا، "عَلَّامَةٌ" کی طرح مبالغے کے لیے ہو یا "النَّفّٰثٰتِ" سے مراد نفوس ہوں تو عورتوں کے علاوہ بہت پھونکیں مارنے والے مرد بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ "الْعُقَدِ" "عُقْدَةٌ" کی جمع ہے، گرہیں۔ ابن جریر اور مفسرین سلف کے مطابق گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں سے مراد جادو کرنے والی عورتیں یا لوگ ہیں، کیونکہ انھوں نے جس پر جادو کرنا ہوتا ہے اس کے بال یا کوئی چیز حاصل کر کے اس پر جادو کرتے ہوئے کسی تانت یا دھاگے میں گرہیں ڈالتے جاتے اور منتر پڑھ پڑھ کر ان میں پھونکیں مارتے جاتے ہیں۔ ان کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کی تلقین اس لیے کی گئی کہ وہ چھپ کر وار کرتے ہیں۔ آدمی کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ اسے تکلیف کیوں ہے، وہ بیماری سمجھ کر علاج معالجہ میں لگا رہتا ہے اور تکلیف بڑھتی جاتی ہے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ "الْعُقَدِ" (گرہوں) سے مراد مردوں کے پختہ عزم اور ارادے ہیں اور "النَّفّٰثٰتِ" سے مراد یہ ہے کہ جس طرح تھوک کے ساتھ رسی کی گرہیں نرم کی جاتی ہیں اس طرح عورتیں اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مردوں کے پختہ ارادوں کو بدل دیتی ہیں، اس آیت میں ان عورتوں کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی۔ یہ معنی پر لطف ہونے کے باوجود سلف کی تفسیر کے خلاف ہے اور اکثر یہ معنی کرنے والے وہ لوگ ہیں جو جادو سے نقصان پہنچنے کے قائل نہیں اور انھیں اپنے اس موقف پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ بخاری و مسلم اور حدیث کی بہت سی دوسری کتابوں میں مروی حدیث کو ماننے ہی سے انکار کر دیتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ لبید بن اعصم نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا تھا اور آپ اس جادو کی وجہ سے کچھ عرصہ بیمار اور پریشان رہے تھے۔ [ دیکھیے بخاري، کتاب الطب، باب ھل یستخرج السحر؟ : ۵۷۶۵، ۵۷۶۳ ]

**آیت 5** ① وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ: "حَسَدَ" کا معنی ہے کسی شخص پر اللہ کی نعمت سے جلنا کہ یہ نعمت اسے کیوں ملی اور اس کے زوال کی تمنا کرنا۔ پھر خواہ یہ خواہش یا کوشش ہو کہ وہ حسد کرنے والے کو ملے یا نہ ہو۔ قباحت کے لحاظ سے حسد کے کئی درجے ہیں، سب سے بدتر یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت دی ہے اس سے چھن جانے کی تمنا کے ساتھ

ساتھ قول وعمل کے ذریعے سے یہ کوشش بھی کرے کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے۔ پھر بعض کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے اور بعض کو اس سے غرض نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسی پر خوش ہوتے ہیں کہ اس کے پاس یہ نعمت نہیں رہی۔ دوسرا یہ کہ عملی طور پر تو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے، لیکن دل میں یہ خواہش رکھے کہ اس کے پاس سے یہ نعمت نہ رہے۔ یہ دونوں صورتیں حرام ہیں۔

2 سوال پیدا ہوتا ہے کہ حاسد کے شر سے پناہ مانگتے وقت "اِذَا حَسَدَ" (جب وہ حسد کرے) کی قید کیوں لگائی؟ جواب یہ ہے کہ حاسد کے حسد کا نقصان دوسرے شخص کو اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے حسد کے تقاضے کے مطابق قول یا فعل سے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، یا حسد کے تقاضے کے مطابق یہ خواہش رکھے کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے۔ حسد کی ایک صورت یہ ہے کہ دل میں خیال آتا ہے کہ فلاں شخص کو یہ نعمت کیوں ملی، مگر آدمی اس خیال کو ہٹا دیتا ہے، نہ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ایسا ارادہ یا خواہش رکھتا ہے کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے، اس پر مؤاخذہ نہیں۔ ایسے خیالات آ ہی جاتے ہیں، کیونکہ انسان کی طبیعت میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا کوئی ہم جنس کسی خوبی میں اس سے بڑھ کر ہو، تو جو شخص حسد کے تقاضے پر عمل نہ کرے بلکہ ایسے خیال آنے پر انھیں دور کرنے کی کوشش کرے اور محسود (جس کے ساتھ حسد ہو) کے ساتھ احسان کرے، اس کے لیے دعا کرے اور اس کی خوبیاں عام بیان کرنا شروع کر دے، تاکہ دل میں اس بھائی کے ساتھ حسد کے بجائے محبت پیدا ہو جائے تو اس کے شر سے پناہ مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا حسد کے تقاضے پر عمل کرنے کے بجائے اس سے مقابلہ کرنا اور اسے دور کرنے کی کوشش کرنا تو ایمان کے اعلیٰ درجے کی علامت ہے اور حسد سے نجات پانے کا طریقہ بھی یہی ہے۔

3 حسد کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حاسد دراصل اللہ تعالیٰ پر ناراض ہوتا ہے کہ اس نے اسے وہ نعمت کیوں دی۔ پھر بندے پر اس کے کسی جرم کے بغیر ناراض ہوتا ہے، کیونکہ اس نعمت کے حصول میں اس کا کچھ اختیار نہیں۔ تو حاسد دراصل اللہ کا بھی دشمن ہے اور اللہ کے بے گناہ بندوں کا بھی۔

4 حسد کا علاج یہ ہے کہ بندہ سوچے کہ حسد کا نقصان دین و دنیا میں حسد کرنے والے ہی کو ہے، محسود کو کوئی نقصان نہیں، نہ دنیا میں نہ دین میں، بلکہ اسے دین و دنیا میں حاسد کے حسد سے فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ دین میں فائدہ یہ ہے کہ وہ مظلوم ہے، خصوصاً جب حاسد قول یا عمل سے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، تو قیامت کو اسے ظلم کا بدلا ملے گا اور ظالم حاسد نیکیوں سے مفلس رہ جائے گا اور دنیاوی فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے دشمن غم و فکر اور عذاب میں مبتلا رہیں اور حاسد جس عذاب اور مصیبت میں گرفتار ہے اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو سکتی ہے؟ وہ ہر وقت حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے اور اطمینان اور دلی سکون سے محروم ہوتا ہے۔

5 حسد آدمی کو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے، اہلِ علم فرماتے ہیں کہ آسمان میں اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی نافرمانی

حسد کی وجہ سے واقع ہوئی کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کی وجہ سے اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور زمین پر پہلی نافرمانی، یعنی آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے ایک کے دوسرے کو قتل کرنے کا باعث بھی یہی حسد تھا۔ برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام اور ان کے والدین پر جو ظلم کیا اس کا باعث بھی حسد تھا۔ یہودی لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں، ایمان نہ لائے تو اس کا باعث بھی یہی حسد تھا اور یہی حسد تھا جس کی بنا پر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا۔ گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر کے پیچھے بھی عموماً حسد ہی کا جذبہ چھپا ہوتا ہے، اس لیے ان کے شر کے بعد حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی۔

6 بعض اوقات حسد کا لفظ "غِبْطَة" (رشک اور ریس) کے معنی میں بھی آ جاتا ہے، یعنی کسی شخص پر اللہ تعالیٰ کی نعمت دیکھ کر یہ خواہش کرنا کہ مجھے بھی یہ نعمت مل جائے، لیکن یہ خواہش نہ ہو کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے۔ یہ خواہش حرام نہیں، مگر صرف دو چیزوں میں رشک کرنا پسندیدہ ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ » [ مسلم، صلاة المسافرين و قصرها، باب فضل من يقوم بالقرآن ... : ۸۱۵۔ بخاري : ۵۰۲۵ ] "حسد (رشک کرنا) نہیں مگر دو چیزوں میں، ایک وہ آدمی جسے اللہ نے قرآن دیا تو وہ رات کی گھڑیوں اور دن کی گھڑیوں میں اس کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا ہے تو وہ رات اور دن کی گھڑیوں میں اس میں سے (نیک کاموں میں) خرچ کرتا رہتا ہے۔"

سُوْرَةُ النَّاسِ ۱۱۴ مکیۃ ۲۱ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰیَاتُهَا ۶ رُکُوْعَاتُهَا ۱

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

تو کہہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب کی ﴿۱﴾ لوگوں کے بادشاہ کی ﴿۲﴾ لوگوں کے معبود کی ﴿۳﴾

**آیت 1 تا 3** ❶ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ...... : پناہ کا مطلب پچھلی سورت میں گزر چکا ہے۔ آدمی جب کسی سے خطرہ محسوس کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے کسی مُربّی (پرورش کرنے والے)، مثلاً ماں یا باپ کی پناہ لیتا ہے، ان سے چمٹ جاتا ہے، تاکہ وہ اسے بچا لیں۔ اگر وہ کمزور ہوں اور نہ بچا سکتے ہوں تو بادشاہ سے بچانے کی درخواست کرتا ہے اور اس کی پناہ لیتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ اپنی قوت اور فوج کے ذریعے سے اسے بچا سکتا ہے۔ اگر نظر آ رہا ہو کہ اس خطرے سے بچانا بادشاہ کے بس کی بات بھی نہیں تو پھر اس ہستی کی پناہ لیتا ہے جسے وہ غیبی قوتوں کا مالک سمجھتا اور جس کی عبادت کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیوی اسباب ختم ہونے کے بعد اسے اس کے علاوہ کہیں سے پناہ نہیں مل سکتی۔

اس سورت میں وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ لینے کے لیے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ساتھ پناہ پکڑنے کی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر اپنے کسی پرورش کرنے والے کی پناہ پکڑنا چاہو تو بجائے اس کے کہ کسی ایسے شخص کی پناہ پکڑو جو کسی ایک آدھ یا چند آدمیوں کی پرورش کر رہا ہو اور حقیقت میں وہ خود محتاج ہو، تم اس کی پناہ پکڑو جو سب لوگوں کا رب اور سب کی پرورش کرنے والا ہے، جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اگر کسی صاحبِ قوت بادشاہ کی پناہ پکڑنا چاہو تو بجائے اس کے کہ ان بادشاہوں کی پناہ پکڑو جو فوجوں کے محتاج ہیں، جن کا اقتدار محدود اور عارضی ہے اور جن کی اپنی زندگی اور اپنا نفع و نقصان ان کے ہاتھ میں نہیں، تم اس کی پناہ پکڑو جو تمام لوگوں کا بادشاہ ہے اور اس کی قوت اور بادشاہی کسی فوج یا سالار کی محتاج نہیں اور اگر کسی ایسی ہستی کی پناہ لینا چاہو جسے غیبی قوتوں کا مالک ہونے کی وجہ سے تم عبادت کا حق دار سمجھتے ہو تو وہ صرف اور صرف ایک ہی ہے، جو تمام لوگوں کا معبود برحق ہے اور صرف وہی تمھیں ان خطرات میں پناہ دے سکتا ہے جن کے سامنے تمام مُربّی اور تمام بادشاہ بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نہ کوئی غیبی قوتوں کا مالک ہے، نہ کائنات کی کسی چیز میں کسی دوسرے کا دخل ہے اور نہ کسی کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

❷ سورۂ فلق میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "بِرَبِّ الْفَلَقِ" کے ساتھ ساری مخلوق کے شر سے عموماً اور مخلوق میں سے تین چیزوں کے شر سے خصوصاً پناہ مانگی گئی ہے، یعنی اندھیری رات، گرہوں میں پھونکنے والیوں اور حاسد کے شر سے اور اس سورت میں صرف ایک چیز یعنی ہٹ ہٹ کر وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ساتھ پناہ مانگی گئی، کیونکہ پہلی تینوں چیزیں انسان کے جسم و جان کو نقصان پہنچانے والی ہیں، جب کہ وسوسہ اس کے ایمان کو نقصان پہنچانے والا ہے اور ایمان کی حفاظت کی فکر جسم و جان سے بھی اہم ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ۬ الْخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾

وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے، جو ہٹ ہٹ کر آنے والا ہے ﴿۴﴾

❸ پہلی تین آیات میں "النَّاسِ" کا لفظ بار بار لایا گیا ہے، حالانکہ "بِرَبِّ النَّاسِ" کے بعد والی آیات میں "النَّاسِ" کی ضمیر بھی لائی جا سکتی تھی۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم) کہ لوگوں کے وسوسے کا شر اتنا خوف ناک ہے کہ بندہ بار بار اس کا حوالہ دیتا ہے کہ یا اللہ! لوگوں کا رب بھی تو ہے، لوگوں کا بادشاہ بھی تو ہے اور لوگوں کا الٰہ بھی تو ہے، اس لیے لوگوں کے شر سے پناہ بھی تو ہی دے سکتا ہے۔ اس سورت میں ان تینوں صفات کی پناہ پکڑتے وقت ضمناً بھی بار بار لوگوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے، پھر "مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ......" کے ساتھ صاف لفظوں میں بھی لوگوں کے وسوسے کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ تفسیر قاسمی میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ ناصر سے ایک اور حکمت نقل کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پناہ مانگنے والے بھی چونکہ لوگ ہیں، اس لیے پناہ مانگتے وقت بار بار ان نسبتوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے درمیان اور لوگوں کے درمیان موجود ہیں کہ یا اللہ! تو لوگوں کا رب بھی ہے، لوگوں کا بادشاہ بھی اور لوگوں کا معبود برحق بھی، تو جب لوگوں کا سبھی کچھ تو ہی ہے تو تیرے علاوہ انھیں پناہ دینے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ (قاسمی)

**آیت 4** ❶ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ۬ الْخَنَّاسِ: "الْوِسْوَاسِ" واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو یہ "وَسْوَسَ يُوَسْوِسُ" کا مصدر ہے، وسوسہ ڈالنا، جیسے "زِلْزَالٌ" (زاء کے کسرہ کے ساتھ) ہے، سخت ہلانا۔ (زمخشری) یہاں "الْوَسْوَاسِ" واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے، یہ مصدر نہیں بلکہ صفت ہے، جو اسم فاعل کے معنی میں ہے، بہت وسوسہ ڈالنے والا، جس طرح "ثَرْثَارٌ" (بہت باتیں کرنے والا) اور "دَحْدَاحٌ" (بہت چھوٹے قد والا) وغیرہ ہیں۔ (تفسیر ابن قیم)

❷ "الْوَسْوَاسِ" مضاعف رباعی ہے، اس کے مفہوم میں تکرار (بار بار وسوسہ ڈالنا) شامل ہے، جس طرح "زَلْزَلَ" کے مفہوم میں بار بار ہلانا اور "ثَرْثَرَ" میں بولتے چلے جانا شامل ہے۔ "الْوَسْوَاسِ" کا معنی بہت وسوسہ ڈالنے والا جو بار بار وسوسہ ڈالتا ہے۔

❸ "وَسْوَسَةٌ" کا اصل معنی وہ ہلکی یا دبی ہوئی حرکت یا آواز ہے جو عام طور پر محسوس نہ ہوتی ہو۔ اس سے مراد وہ بات بھی ہوتی ہے جو بالکل آہستہ آواز سے کسی کے کان میں کہی جائے اور صرف اسی کو سنائی دے اور وہ بھی جو آواز کے بغیر کسی کے دل میں ڈال دی جائے، جیسے شیطان انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

❹ "الْخَنَّاسِ" "خَنَسَ يَخْنِسُ" (ض، ن) پیچھے ہٹنا، ہٹانا۔ سورۂ تکویر میں ستاروں کو "اَلْخُنَّسُ" فرمایا ہے، کیونکہ وہ روزانہ مغرب میں غروب ہوتے ہیں، پھر پیچھے ہٹتے ہوئے دوبارہ مشرق سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ "الْخَنَّاسِ" مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بہت پیچھے ہٹنے والا۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ ایک دفعہ ہی وسوسہ ڈال کر پیچھے نہیں ہٹ جاتا، بلکہ بار بار وسوسہ ڈالتا، بار بار پیچھے ہٹتا اور پھر ہٹ ہٹ کر وسوسہ ڈالتا ہے۔ شیطان کو "الْوَسْوَاسِ ۙ۬ الْخَنَّاسِ" اس

# الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝

وہ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے ۝

لیے کہا گیا ہے کہ وہ آدمی کے دل میں بُرے خیالات ڈالتا ہے، جب وہ اللہ کا ذکر کرے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے، جب ذکر سے غافل ہو تو دوبارہ لوٹ کر وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلَاةِ أَدْبَرَ الشَّيْطَانُ وَلَهُ ضُرَاطٌ، حَتّٰى لَا يَسْمَعَ التَّأْذِيْنَ ، فَإِذَا قُضِيَ النِّدَاءُ أَقْبَلَ، حَتّٰى إِذَا ثُوِّبَ بِالصَّلَاةِ أَدْبَرَ ، حَتّٰى إِذَا قُضِيَ التَّثْوِيْبُ أَقْبَلَ حَتّٰى يَخْطُرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهِ ، يَقُوْلُ اذْكُرْ كَذَا ، اذْكُرْ كَذَا، لِمَا لَمْ يَكُنْ يَذْكُرُ ، حَتّٰى يَظَلَّ الرَّجُلُ لَا يَدْرِيْ كَمْ صَلّٰى )) [ بخاري، الأذان، باب فضل التأذين : ۶۰۸ ] ''جب نماز کے لیے اذان ہوتی ہے تو شیطان گوز مارتا ہوا پیٹھ دے کر بھاگ جاتا ہے، تاکہ اذان نہ سنے۔ جب اذان پوری ہوتی ہے تو آ جاتا ہے، پھر جب نماز کی اقامت ہوتی ہے چلا جاتا ہے، جب اقامت مکمل ہوتی ہے تو واپس آ کر آدمی اور اس کے دل کے درمیان خیالات ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے فلاں چیز یاد کر، فلاں چیز یاد کر، وہ چیزیں جو اسے یاد نہیں تھیں، یہاں تک کہ آدمی کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے۔'' معلوم ہوا کہ آدمی نماز میں دل سے حاضر نہ ہو تو شیطان اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ وہ صرف اس ذِکر سے پیچھے ہٹتا ہے جس میں زبان کے ساتھ دل بھی شریک ہو۔

**آیت 5** ❶ **الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ:** وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات سے اللہ کی پناہ مانگے کہ وہ اس کے دل میں کوئی وسوسہ ڈال دے اور اسے راہِ حق سے ہٹا دے اور اس بات سے بھی کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر انھیں اس کے خلاف بھڑکا دے، جس کے نتیجے میں دین پر عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے کے راستے میں وہ اس کے لیے رکاوٹ بن جائیں۔ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ ہی اس کے شر سے بچا سکتا ہے، اس لیے اسی کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

❷ آدمی کوئی نیکی کرے یا برائی اس کا آغاز دل میں اس کا خیال پیدا ہونے سے ہوتا ہے، خیال جما رہے تو وہ خواہش کو ابھارتا ہے، خواہش سے ارادہ بنتا ہے، ارادہ پختہ ہو جائے تو عزم بنتا ہے، عزم نیت کا باعث ہوتا ہے، نیت اعضا کو عمل کے لیے حرکت میں لے آتی ہے اور آخری مرحلہ اس نیکی یا بدی پر عمل کا ہوتا ہے۔ دل میں پیدا ہونے والا یہ خیال اگر نیکی کا ہو تو رحمان کے مقرر کیے ہوئے فرشتے کی طرف سے ہوتا ہے اور اِلہام کہلاتا ہے، اگر بدی کا ہو تو وسوسہ کہلاتا ہے اور یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ ان دونوں کا فرق اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ خیال کتاب و سنت کی رُو سے نیکی کا کام ہے تو اِلہام ہے، ورنہ وسوسہ۔ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم اس لیے دی گئی کہ جہاں سے برائی شروع ہوتی ہے وہیں تم اللہ کی پناہ میں چلے جاؤ، تاکہ اللہ تعالیٰ شروع ہی میں تمھیں اپنی پناہ میں لے لے۔ جس سے نہ وہ وسوسہ دل میں جگہ پکڑے گا

# مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾

جنوں اور انسانوں میں سے ﴿۶﴾

اور نہ بعد کے مراحل کی نوبت آئے گی۔

❸ وسوسہ ڈالنے والوں کا شر صرف ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ کئی طرح سے آدمی کو راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دوسرے اہلِ علم نے اس کی کئی صورتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ آدمی کو صریح کفر و شرک اور اللہ اور اس کے رسول کی بغاوت اور دشمنی پر آمادہ کرتے ہیں، اگر اس میں ناکام ہوں اور آدمی ایمان پر قائم رہے تو وہ اسے دوسرے شر یعنی بدعت میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدعت میں مبتلا کرنا انھیں آدمی کو بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا کرنے سے بھی زیادہ پسند ہے، کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جسے آدمی نیکی سمجھ کر کرتا ہے۔ اگر وہ سنت پر قائم رہے تو اسے کسی نہ کسی کبیرہ گناہ سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خصوصاً اگر وہ دینی عالم ہو، تاکہ بدنام ہو کر دین کا کام نہ کر سکے۔ اگر اس میں بھی کامیاب نہ ہوں تو چھوٹے گناہوں کی رغبت دلاتے ہیں، تاکہ وہ انھیں معمولی سمجھ کر ان کے بوجھ تلے دب جائے۔ یہ بھی نہ کر سکیں تو نیکی کے کاموں سے ہٹا کر ان کاموں میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں جن میں نہ ثواب ہے نہ عذاب اور اس طرح اس کی عمر برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر وہ اپنے وقت کو بے کار کاموں میں لگانے پر کسی صورت آمادہ نہ ہو تو نیکی کے بڑے کام سے ہٹا کر چھوٹے کام میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً دعوت و جہاد سے ہٹا کر نفلی نماز روزے میں لگا دیتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو دل میں ریا یا اپنے عمل پر غرور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی صورت ان کے قابو میں نہ آئے تو شیطان اور اس کے وہ چیلے بے شمار طریقوں سے اسے بدنام کرنے اور تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ نہ ہو سکے تو اسے غصہ دلا کر فہم و شعور سے بیگانہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس وقت بھی اگر وہ اللہ کی پناہ میں چلا جائے تو ان کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ [الأعراف: ۲۰۰] ''اور اگر تجھے شیطان کی طرف سے کوئی چوکا لگے (یعنی شیطان تجھے غصہ دلائے) تو اللہ کی پناہ مانگ۔'' غرض موت تک یہ دشمن اپنی دشمنی سے باز نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آخر وقت تک اپنی پناہ میں رکھے۔ (آمین)

**آیت 6** مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ: لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالنے والے شیطان جن بھی ہوتے ہیں اور انسان بھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ [الأنعام: ۱۱۲] ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے ساتھ ایک جن شیطان اور ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے، شیطان کا کام برائی کا وسوسہ ڈالنا اور فرشتے کا کام بھلائی کا الہام کرنا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( مَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ اللّٰهُ بِهِ قَرِيْنَهُ مِنَ الْجِنِّ، قَالُوْا

وَ إِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ وَ إِيَّايَ إِلَّا أَنَّ اللّٰهَ أَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ فَلَا يَأْمُرُنِيْ إِلَّا بِخَيْرٍ ﴾[ مسلم، صفة القيامة، باب تحريش الشيطان...... : ۲۸۱٤ ] ''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنوں میں سے اس کا ایک قرین (ساتھی) مقرر کر رکھا ہے۔'' صحابہ نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اور آپ کے ساتھ بھی وہ مقرر ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں، میرے ساتھ بھی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد کی ہے تو وہ تابع ہو گیا ہے اور وہ مجھے خیر کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیتا۔'' صحیح مسلم کی اسی حدیث میں سفیان سے مروی یہ الفاظ ہیں: ﴿ وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِيْنُهُ مِنَ الْجِنِّ وَ قَرِيْنُهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ ﴾ [ مسلم، صفة القيامة، باب تحريش الشيطان...... : ۲۸۱٤ ] ''(ہر آدمی کے ساتھ) جنوں سے اس کا قرین (ساتھی) اور فرشتوں سے اس کا قرین (ساتھی) مقرر کیا گیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے دو انصار صحابہ سے فرمایا: ﴿ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ، وَ إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ يَّقْذِفَ فِيْ قُلُوْبِكُمَا سُوْءًا أَوْ قَالَ شَيْئًا ﴾ [ بخاري، بدء الخلق، باب صفة إبليس و جنوده : ۳۲۸۱ ] ''شیطان انسان میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اور میں ڈرا کہ وہ تمھارے دلوں میں کوئی وسوسہ، یا فرمایا کوئی چیز ڈال دے گا۔'' شیطان اور اس کا جنّی قبیلہ انسانوں کی نگاہوں سے مخفی رہ کر فتنہ انگیزی کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ (دیکھیے انعام: ۲۷) رہے انسانی شیطان تو وہ ہمیشہ چھپ کر تو حملہ آور نہیں ہو سکتے، مگر اپنی باتوں اور طرزِ عمل سے وسوسہ ڈالتے اور دل میں برائی کا بیج بو دیتے ہیں۔

دوسرے وسوسہ ڈالنے والوں کے علاوہ انسان کا اپنا نفس بھی وسوسہ ڈالتا ہے۔ اس کی غلط خواہشات اور بداعمالیاں اسے برائی کے لیے اُکساتی اور اُبھارتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ﴾ [ قٓ : ١٦ ] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان چیزوں کو جانتے ہیں جن کا وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے: ﴿ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ﴾ [ ابن ماجه، النكاح، باب خطبة النكاح : ۱۸۹۲۔ ترمذي : ۱۱۰۵، وصححه الألباني ] ''اور ہم اپنے نفس کی برائیوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔'' ان تمام وسوسہ ڈالنے والوں سے، خواہ وہ شیاطین الجن ہوں یا شیاطین الانس یا خود آدمی کا نفس ہو، اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی ان کے شر سے بچا سکتا ہے۔